تاوان

عرض مصنف

"تاوان" کی پہلی قسط غالباً مئی 1993ء کے سرگزشت میں شائع ہوئی تھی۔ قریباً چھ سال ہوئے ہیں ماہ بہ ماہ "تاوان" کا سفر جاری ہے۔ یہ کوئی دیو مالائی یا ماورائی کہانی نہیں۔ اس کی جڑیں اسی ماحول اور معاشرے میں ہیں جہاں میں اور آپ رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ہی گلی کوچوں اور ہمارے ہی شہروں قصبوں کی روئیداد ہے۔ اس روئیداد میں آپ کو بہت سے جانے پہچانے چہرے اور مناظر سانس لیتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اس کہانی کی خوں رنگ شاموں' جیسی کوئی شام آپ نے بھی دیکھی ہو گی۔ اس کہانی کی اسرار بھری راتوں جیسی کوئی رات آپ پر بھی گذری ہو گی۔ ایسی اُجلی صبحیں اور ایسی فسوں خیز دوپہریں آپ کے علم میں بھی آئی ہوں گی۔

یہ آبلہ پا شاہجہاں کی کہانی ہے۔ وہ لڑکپن میں یتیم ہُوا اور اس کی ننھی سی بہن اس کی کل کائنات ٹھہری۔ چند سال بعد جب امارات سے آئے ہوئے ایک امیرزادے نے شاہجہاں کی بہن کو ہوس کی نظر سے دیکھا تو شاہ جہاں کو یوں لگا کہ اس کی کائنات جان لیوا زلزلوں کی زد میں آگئی ہے.......... یہی وہ لمحہ تھا جب شاہجہاں......... جہانی استاد بنا......... اس کے ہاتھ میں ایک لہو پینے والا خنجر آ گیا۔ اس خنجر کے ساتھ جب وہ جرائم کی دنیا میں داخل ہوا تو ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج اٹھا۔ اکڑی ہوئی گردنیں اس کے سامنے جھکتی چلی گئیں اور بڑے بڑے روشن نام اس سورج کے سامنے تاریک ہو گئے۔ شاہجہاں کو ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ مزاحمت کہا گیا لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ صحرائی بگولوں کی طرح آزاد پھرنے والا یہ شخص لڑکپن سے ہی ایک نازک لڑکی کی ریشمی زلفوں میں یوں جکڑا ہوا ہے کہ جنبش

تک نہیں کر سکتا۔ وہ لڑکی اس کے پاس تھی لیکن بہت دور بھی تھی۔ ایک عجیب فاصلہ حائل تھا ان کے درمیان۔ شاہجہاں یہ فاصلہ پاٹنا چاہتا تھا لیکن بے رحم وقت اس سے ایک ایک پل کا تاوان مانگ رہا تھا۔

اس سلسلہ وار کہانی کی اشاعت کے موقعے پر میں محترم معراج رسول صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کہانی کو ایک دوسرے ادارے سے مجموعے کی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ محترم بھائی سید انور فراز صاحب کا بھی بے حد مشکور ہوں۔ اس کہانی میں اکثر ان کا مشورہ شامل حال رہا ہے اور وقتاً فوقتاً مفید ڈسکشن ہوتی رہی ہے۔

دل چاہ رہا ہے کہ اس موقعے پر بھائی ساجد امین اور خالد محمود کا ذکر بھی کروں۔ ان دونوں نے "کاروبار" کے حوالے سے اکثر میری ذمے داریاں بھی نبھائی ہیں۔ ان کے اس ایثار کی وجہ سے میں لکھنے لکھانے اور آپ تک پہنچنے کے قابل ہوتا ہوں۔

غفار بھائی نے حسبِ سابق اِن مجموعہ جات کو بھی عام ڈگر سے ہٹ کر شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔

میں اِس اُمید کے ساتھ یہ پیش لفظ ختم کرتا ہوں کہ اگلا صفحہ اُلٹتے ہی آپ تلخ و شیریں حقائق کی ایک ایسی دنیا میں داخل ہوں گے جو فسوں خیز افسانوں سے بڑھ کر دلچسپ اور تحیر خیز ہے۔

طاہر جاوید مغل

دیباچہ

کراچی کے ماہنامہ جرائد نے جب عروج پایا تو آپ بیتی کے انداز میں بیان کردہ طویل داستانوں نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ یہ طویل آپ بیتیاں ہر پرچے کی لازمی ضرورت قرار پائیں اور ان کے بغیر پرچوں کی سرکولیشن میں اضافہ یا استحکام ایک کارِ دشوار ٹھہرا مگر ایسی کسی کہانی کو عرصہ دراز تک اس ڈھنگ سے لکھنا کہ وہ اپنے قارئین کو اپنی دلچسپی کے سحر میں گرفتار بھی رکھے' کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اتنی لمبی سانسوں کے رستم قلم کہاں ہوتے ہیں! تاریخ ادبیات پر نظر ڈالیں تو "طلسم ہوشربا" کے بعد اردو میں ضخامت کے اعتبار سے پھر نظر "علی پور کا ایلی" پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے۔ باقی کہانیاں تو ان کے مقابلے میں افسانچے ہی نظر آتی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ڈائجسٹوں کو اپنی ابتدا ہی میں ایسے "اوپنر" مل گئے تھے جو ایک لمبی اور شاندار اننگ کھیلنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے آغاز ہی میں ایسے دل کش اور منفرد شاٹس کھیلے کہ دیکھنے والے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ تحریر کے میدان میں قلم کا سر چڑھ کر بولنے والا جادو جگانے والے اولین مصنف محترم انوار مجتبیٰ صدیقی اور حضرت اقلیم علیم تھے۔

ممکن ہے کسی صاحب نظر کو میری اس ذاتی رائے سے اختلاف ہو اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میری نظر سے ابتدائی زمانے کی کوئی معرکہ آرا سلسلہ وار کہانی نہ گزری ہو۔ بہرحال میرے علم کے مطابق تو ستر کے عشرے کی ابتدا میں مذکورہ بالا مصنفین ہی کی سلسلہ وار کہانیاں دھوم مچا رہی تھیں۔ انوار صاحب کی سونا گھاٹ کا پجاری' غلام روحیں' انکا اور اقابلا کسے یاد نہ ہوں گی اور اقلیم صاحب کی مفرور کی انفرادیت اور روایت شکنی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ تیسرا نام اس دور کے حوالے سے جناب ایم۔ اے راحت کا ہے جنہوں نے ساموں' ہمالیہ' پارس' سوکھے گلاب' آسیب' دہشت کدہ اور کالا جادو جیسی شہرہ آفاق اور رجحان ساز کہانیاں لکھ کر ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ بعد میں طویل کہانی نویسی کے فن میں اپنا لوہا منوانے والوں میں برادرم ایچ اقبال' "قبلہ" شکیل عادل زادہ' محی الدین نواب' (جن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ "دیوتا" لکھ کر داستان گوئی کے منبر کی امامت پر فائز ہو چکے ہیں۔) مرحوم جبار توقیر صاحب' "علامہ" احمد اقبال اور عزیزی محمود احمد مودی کے اسمائے گرامی ممتاز و مشہور ہوئے۔ ان تمام حضرات نے اس سرزمین بے آب و گیاہ کو اپنی طبع رواں سے خوب خوب سیراب کیا۔ نت نئے موضوعات کے ایسے ایسے بیج بوئے جن سے پھوٹنے والے پودے آج قد آور درخت نظر آتے ہیں۔ الفاظ و بیان کے وہ گل کھلائے جن کی خوشبو سے دماغ ابھی تک معطر ہیں۔

یہاں ایک وضاحت بہت ضروری ہو گئی ہے ورنہ امکان ہے کہ یہ سطور پڑھنے والے مجھے کوتاہ نظری کا طعنہ دے بیٹھیں۔ مندرجہ بالا تمام گفتگو' میں نے ستر کی دہائی کے حوالے سے کی ہے' اس سے پہلے بھی طویل کہانیاں لکھی گئی تھیں جن کے لکھنے والوں میں ایس ایم الیاس مرحوم کا نام

قابلِ ذکر ہے۔ لیکن اس دور کا بعد کے زمانے سے موازنہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ طاہر جاوید مغل کو اگر اس میدان میں ایستادہ مذکورہ قد آور ستونوں کے درمیان مضبوط بنیاد کا ایک نیا ضوفشاں مینار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ۱۹۹۲ء میں جب اس جواں قلم شہسوارِ ادب نے "ناداں" کے تانے بانے بننا شروع کیے تو مجھے یقین تھا کہ مستقبل کی ایک ناقابلِ فراموش سرگزشت شروع ہو چکی ہے۔ اس داستان کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے زورِ بیان اور کثرتِ مشاہدہ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناداں کے مرکزی کردار اور ان کے حوالے سے ہمارے سامنے آنے والے موضوعات ڈائجسٹوں کے قارئین کے لیے اجنبی نہیں۔ محبت' نفرت' سیاست' منافقت اور انتقام انسانی زندگی اور معاشرے کا ازل سے حصہ ہیں اور شاید ابد تک رہیں۔ لہٰذا دنیا میں جنم لینے والی ہر کہانی کے اجزائے ترکیبی میں ان کا شامل ہونا ناگزیر ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے ان سے کہانی کے کرداروں اور ماحول کو کیسا بنایا' سنوارا ہے اور اس طرح وہ جو پیغام اپنے پڑھنے والوں تک ان ذرائع سے پہنچانا چاہتا ہے اسے پہنچاتے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ اس تناظر میں مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ طاہر نے بحیثیت مصنف اپنی یہ ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی اور کمال کے ساتھ پوری کی ہے اور کر رہے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو ہنسانا بھی جانتے ہیں اور رلانا بھی۔ ان کے قلم کی جنبش پڑھنے والے کے دل کی دھڑکنوں میں کمی بیشی کا سبب ہوتی ہے۔ ناداں کا مطالعہ کرنے والے میرے اس دعوے کی صداقت کا خود تجزیہ کریں گے۔

تادمِ تحریر ناداں کی ستر اقساط لکھی جا چکی ہیں۔ ہر قسط تقریباً تیس سے پینتیس صفحات پر محیط ہوتی ہے اس طرح یہ اب تک ہزاروں صفحات پر پھیل چکی ہے اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔ اس طوالت کے باوجود پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی اور شوقِ بے پایاں کا عنصر قائم و دائم رکھنا کسی مصنف کی خلاقی اور تحریری کمال کا کھلا ثبوت ہے۔ ورنہ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ چند اقساط لکھ کر ہی مصنف کا دم پھولنا شروع ہو جاتا ہے اور کہانی کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ خدا طاہر کو نظرِ بد سے بچائے کہ ان کی کہانی نہایت سبک رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور وہ خود بھی ابھی تک تازہ دم ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر
(اقبالؒ)

سید انور فراز

۱۱-۱۲-۹۵

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پرپیچ سرگزشت

رات بڑی سرد تھی' یخ بستہ اور ہڈیوں میں اترتی ہوئی۔

دور کہیں مشرق سے بلند ہونے والا پندرھویں رات کا چاند دھیرے دھیرے تاریک آسمان پر بلند ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی گول' سنہری' گیس بھرا غبارہ کسی بچے کے ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہو۔ اٹک جیل کے کہنہ سال درو بام چاندنی میں نہاتے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ آہنی سلاخیں چمک رہی تھیں اور بیرکوں کے گدلے فرش پر روشن لکیریں سی رینگ رہی تھیں۔ وہی چاندنی جو باغوں میں' کھلیانوں میں' میدانوں میں اور پہاڑوں پر حسن بن کر برس رہی تھی اس جیل میں اتری تو پوری جان سے سسک اٹھی تھی۔

میں نے جیل کا پھٹا پرانا جوؤں سے بھرا ہوا خاکستری کمبل اچھی طرح شانوں پر لپیٹ کر دیوار سے ٹیک لگائی اور بے خیالی میں سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ ابھی رات کا آغاز ہی ہوا تھا لیکن یوں لگتا تھا' سورج غروب ہوئے مدتیں بیت گئی ہیں۔ مدتیں بیت گئی ہیں کہ میں اسی طرح کوٹھری میں بیٹھا سلاخوں سے باہر جھانک رہا ہوں اور چاندنی میں یادوں کی بساط بچھا کر کسی نئی چال سے رات کو ہرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مشقت کے بعد ساڑھے چار بجے ہی قیدیوں کو بیرکوں میں بند کر دیا جاتا تھا اس لئے رات ان کے لئے کچھ زیادہ ہی طویل ہو جاتی تھی اور ہجر کی راتیں تو ویسے بھی لامتناہی ہوتی ہیں۔ ایسی "ہجر کی راتوں" میں جب ساون' چاندنی یا بہار کی پیوندکاری ہو جاتی ہے تو ان کا درد بھی بیکراں ہو جاتا ہے۔ انسان کے اندر آپوں آپ ہی غم کا کوئی سوتا پھوٹ نکلتا ہے اور وہ جذبات کے اظہار کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔

نجانے کیوں مجھے توقع تھی کہ میرا بیرک کا ساتھی نور محمد ابھی کچھ دیر میں ننگے فرش پر لیٹا لیٹا اپنا بایاں ہاتھ کان پر رکھے گا اور آنکھیں بند کر کے کوئی درد بھری تان لگائے گا۔ نفسیات کہتی ہے کہ ایک جاندار مخصوص ماحول میں' مخصوص ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بار بار کے تجربے سے ہم اس ردعمل کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ میری بھی پیشین گوئی تھی کہ نور محمد ابھی اپنی درد بھری آواز سے اس جاں گسل سکوت پر ایک کاری ضرب لگائے گا اور کوٹھری کوٹھری اور بیرک بیرک پھیلی ہوئی خاموش وحشت کچھ دیر کے لئے ہی سہی لیکن درہم برہم ہو جائے گی۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میری بائیں جانب تاریکی میں کوئی پانچ فٹ کے فاصلے سے نور محمد کی دل سوز آواز

فضا میں ابھری اور گونجتی چلی گئی۔ یہ وہی ہردلعزیز گیت تھا جس کی فرمائش اکثر قیدی نور محمد سے کیا کرتے تھے۔

کدی آ مل رانجھن وے۔ میں لُک لُک نیر بہانواں
اتھے سبھ میرے ویری وے۔ کنوں دل دا حال سناواں۔
وے رانجھن وے۔۔۔

گیت کے بول اور اس پر نور محمد کی آواز عجب سماں باندھ جایا کرتا تھا۔ جہاں تک نور محمد کی آواز جاتی تھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسا کرتے تھے۔ نور محمد کا گیت ہر قیدی کے سامنے جیسے بھولی بسری یادوں کے انبار لگا دیتا تھا اور جب تک گیت گونجتا تھا' قیدی نگاہیں' ان انباروں میں کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں۔ خوش گلو نور محمد جیل کی ان سنگلاخ بیرکوں میں سوز و گداز کا واحد حوالہ تھا۔ وہ یہاں کا مہدی حسن تھا' احمد رشدی تھا' مسعود رانا' سلیم رضا' عبلیٰ' فیلوی' نورجہاں' مالا' تسیم بیگم سب کچھ وہی تھا۔ وہ ایک شخص نہیں تھا' پورا ایک عہد تھا آواز کی دنیا کا۔ اس رات بھی جب اس کی آواز گونجی تو ہر قیدی کی طرح میں بھی سوچوں کے دریا میں بہتا نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔۔۔ کدی آ مل رانجھن وے۔ میں لُک لُک نیر بہانواں

میری نگاہوں کے سامنے ایک سولہ سالہ تومند لڑکے کی شبیہہ ابھری جو اپنی پانچ سالہ گڑیا سی بہن کو سینے سے لگائے بارش میں بھیگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ اپنی غضبناک چچی کی چیخ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دور' جہاں اس کی بہن کے پھول سے گال بے رحم تھپڑوں سے محفوظ رہیں۔ جہاں اس کے ریشمی بال بے دردی سے کھینچے نہ جائیں۔ جہاں اسے پیٹ بھر کر کھانا ملے اور وہ نیند بھر کر سو سکے۔۔۔ وہ چلتا جا رہا تھا۔۔۔ اور بس چلتا جا رہا تھا۔

پھر چولستان کے ایک قصبے میں ایک چھوٹے سے گھر کا منظر اس کی نگاہ کے سامنے آیا۔ یہاں وہ اپنی ننھی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ وہی اس کی ماں تھی' وہی باپ' وہی بھائی اور وہی سرپرست۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے نہلاتا تھا۔ اسے کپڑے پہناتا تھا۔ گود میں بٹھا کر اس کی کنگھی کرتا تھا اور اپنے ساتھ لپٹا کر سلاتا تھا۔ یہ لڑکا کون تھا؟ یہ میں ہی تھا۔ وہ میری بہن شگفتہ تھی جسے میں پیار سے شفتا کہا کرتا تھا۔

پھر میرے تصور نے شفتا کو نوخیز لڑکی کے روپ میں دیکھا۔ وہ میٹرک کی طالبہ تھی۔ سفید براق لباس میں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دیتی تھی۔ وہ جوانی کی دہلیز پر تھی مگر۔۔۔ اب بھی میری گود میں بیٹھتی تھی۔ مجھ سے چمٹ کر لیٹتی تھی اور میرے پیٹ پر ٹانگ چڑھا کر کہانیاں سنتی تھی۔ کون کہتا ہے وہ بڑی ہو چکی تھی؟ وہ تو چھوٹی سی بچی تھی' معصوم اور سادہ۔ جس کے دل کی صاف تختی پر صرف اپنے بھیا کا نام لکھا تھا۔ دنیا اس کے لئے اس نام سے شروع ہو کر اسی نام پر ختم ہو جاتی تھی۔ وہ کہاں جوان ہوئی تھی؟ وہ معصوم تھی اور اس کے خواب بھی معصوم تھے۔ وہ اس شہزادے کے خواب نہیں دیکھتی تھی جو اڑنے والے گھوڑے پر سوار آتا ہے اور سنہرے مستقبل کی باتیں کرتا ہے۔ وہ تو ابھی تتلیوں' پھولوں اور شگوفوں کے سپنے دیکھتی تھی۔ کہانیوں کی کتابیں پڑھتی اور پرندوں کے گیت سنتی تھی۔ ہر شب تارے اسے سکھیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے دیکھتے تھے اور ہر صبح صحرا کی نرم ریت اس کے تلوے چومتی تھی۔ اس لئے وہ اس شہزادے کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی جس نے ایک روز اسے درختوں کی اوٹ سے گھورا تھا۔ یہ شہزادہ اڑنے والے گھوڑے پر نہیں جیپ پر سوار تھا۔ وہ کسی سنہرے دیس سے نہیں "امارات" سے آیا تھا اور چکور کے شکار پر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہرکاروں کی ایک پوری فوج تھی۔ میری ننھی بہن نے اس کرخت چہرہ شہزادہ کو دیکھا تھا تو بھاگ کر گھر آ گئی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔۔۔ ایکا ایکی میرے تصور نے جست بھری اور وڈیرے کی حویلی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ علاقے کا پولیس انسپکٹر بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ایک طوفانی شب تھی۔ وڈیرے کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

"شاہ جہاں! اب بھی وقت ہے۔ مان جاؤ۔ تمہاری بہن شہزادی کہلائے گی۔ کروڑوں اربوں میں کھیلے گی۔ میں تمہیں اپنی طرف سے ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری بہن وہاں سکھی رہے گی۔"

میں نے کہا تھا۔ "سائیں' تیری اپنی دو بیٹیاں بھی تو جوان ہیں۔ وہ کچھ کم خوبصورت نہیں۔ تو انہیں اس امیر زادے کے حرم میں داخل کیوں نہیں کر دیتا؟"

وڈیرے نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا تھا اور سانپ کی طرح پھنکارا تھا۔ "لگتا ہے تو بہن بھی بیاہے گا اور ذلت کا ہار بھی گلے میں پہنے گا۔"

پھر وہ رات میری نگاہوں میں کوندی جب میں نے ان تین افراد کو قتل کیا جو دیوار پھاند کر میری شفتا کو اٹھانے آئے تھے۔ وہ بڑی سنگین رات تھی۔ میں اپنی لاڈلی بہن کو کندھے پر اٹھا کر ننگے پاؤں چار میل بھاگا تھا۔ اس رات میں نے اپنی بہن کو تو امارات کے امیر زادے سے بچا لیا تھا مگر اپنے اندر کے مصلح جو قانون پسند شہری کو نہیں بچا سکا تھا۔ اس رات

ویرانے میں ایک بے چراغ کٹیا کے اندر ایک موت واقع ہوئی تھی اور ایک نیا انسان وجود میں آ گیا تھا۔ مرنے والے کا نام شاہجہاں بی اے ایل ایل بی تھا اور وجود میں آنے والے کا نام جمالی استاد۔

اگلے تین برس میں "جمالی" بن کر میں نے جو جو کچھ کیا اسے قلمبند کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔ میری بہن ایک محفوظ پناہ گاہ میں تھی اور میں اس کی طرف سے قطعی بے فکر تھا۔ اب میں تھا اور میرے دشمن تھے۔ میں نے دیوانہ وار ان سے ٹکر لی اور ہر رزم گاہ میں ان کے سامنے ڈٹ گیا۔ یہ ایک خونی بازی تھی جس میں شب و روز میری جان داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھوں کم از کم پندرہ قتل ہو گئے اور سیکڑوں ایسے جرائم میرے کھاتے میں لکھے گئے جن میں سے ہر ایک کے بدلے مجھے عمر قید ہو سکتی تھی' لیکن جب میں نے خود کو قانون کے حوالے کیا تو ان سب جرائم کے بدلے مجھے صرف بارہ سال قید کی سزا ہوئی۔ اس رعایت کا ایک سبب تو میرے جرائم کا پس منظر تھا لیکن ایک سبب اور بھی تھا۔ اس کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا۔ ہاں۔۔۔ اتنا بتا دوں کہ میرے "ہتھیار پھینکنے" کی وجہ میری بہن تھی۔ یہ ایک طویل روداد ہے' مختصراً یہ کہ وہ ایک روز جان جوکھم میں ڈال کر مجھ تک پہنچی تھی۔ بلک بلک کر روئی تھی' پوری جان سے میرے ساتھ لپٹ گئی تھی اور میں اس کے اشکوں میں بہہ کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ اس ناقابل شکست عہد کے ساتھ کہ اب میری جان جائے تو جائے میں جرم کے راستے پر قدم نہیں رکھوں گا۔ اپنی شفتا کی خاطر میں نے جمالی استاد کے ٹکڑے کر کے اسے لاہور جیل کے احاطے میں دفن کر دیا تھا۔ اب جو شاہ جہاں کمبل لپیٹے اس کوٹھری میں بیٹھا چاند کو تک رہا تھا' وہ ایک اور شخص تھا۔ سیدھا سادا بھلا مانس اور بالکل مختلف۔ اس میں کوئی اکڑ نہیں تھی۔ اس کا کوئی دبدبہ نہیں تھا۔ وہ کسی کو گریبان سے نہیں پکڑتا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کے پاؤں کی انگوٹھوں سے اوپر نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ نمبردار قیدیوں کی گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا تھا اور ہنٹر' تھپڑ' ٹھڈے وغیرہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ دیر ہوئی اس کی آنکھوں میں کوندنے والی بجلیاں بجھ چکی تھیں اور اس نے اپنے بازوؤں کی تڑپتی مچھلیوں کو مصلحت کے انجکشن لگا کر مفلوج کر دیا تھا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا۔ جیسے تیسے اپنی باقی کی آٹھ سال قید کاٹنا اور اس میں بذریعہ "نیک چلنی" زیادہ سے زیادہ تخفیف کرانا تاکہ وہ جلد از جلد اس منحوس چار دیواری سے نکل کر اس آزاد فضا میں پہنچ سکے جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔ وہ عزیز ہستی جو ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اس کی زندگی کا محور تھی۔

ہاں میرے اندر وہ پہلے والا شاہ جہاں اب مر چکا تھا۔ اپنی تمام تلخ یادوں سمیت مٹی اوڑھ چکا تھا۔ اب جو زندہ تھا' وہ ایک تھکا ہارا مسافر تھا جسے کسی کی معصوم مسکراہٹ درکار تھی۔۔۔ اور بس۔

"کدی آ مل رانجھن وے" نور محمد وجد کے عالم میں بار بار یہی بول دہرا رہا تھا۔ ہر لحہ اس کی آواز بولوں میں ایک نیا رنگ بھر رہی تھی۔ اس کی آواز جہاں تک جا رہی تھی وہیں تک کیف طاری تھا۔ قیدی سلاخیں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر اس کے گیت کو تھاپ دے رہے تھے۔

یکایک یہ سب آوازیں رک گئیں اور سپہ داروں کی سیٹیوں سے سناٹا گونج اٹھا۔ چاند بھی جیسے ایکا ایکی ڈر کر کسی بدلی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ دو واچ مین بھاگتے ہوئے آئے۔ ان کے ساتھ چیکر جمعدار شاہنواز نمودار ہوا۔ اس نے غرا کر اس محفل نشاط کے شرکاء کو ایک مشترکہ گالی دی اور بولا۔ "خبردار' نان سینس کے بچو! خاموش بیٹھو۔ جیلر صاحب راؤنڈ پر ہیں۔"

ہر ذی نفس کو سانپ سونگھ گیا۔ اس وقت جیلر صاحب کا راؤنڈ پر آنا سمجھ میں نہیں آیا۔ بہرحال یہ جیل تھی اور یہاں سب کچھ متوقع تھا بلکہ جو بات زیادہ غیر متوقع تھی وہی عین متوقع تھی۔ قدموں کی بوزنی ٹھک ٹھک سنائی دی اور جیلر صاحب پورے طمطراق کے ساتھ اندھیرے سے برآمد ہوئے۔ شاید ہر بری چیز اندھیرے سے ہی برآمد ہوتی ہے۔ جیلر صاحب کا قد کوئی ساڑھے چھ فٹ تھا۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ بات کرتے تو منہ سے پھر جھڑتے تھے۔ وہ اس جیل کے تین جیلروں میں سب سے سخت گیر شمار ہوتے تھے۔ ان کا نام عادل خاں تھا۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی سپاہی حضرات بیرک کا اکلوتا زرد بلب روشن کر چکے تھے۔

عادل خاں نے بیرک کے سامنے ٹھہر کر ایک نظر بغور قیدیوں کا جائزہ لیا۔ سب جاگ چکے تھے۔ اتنے شور سے تو قبر میں سویا مردہ بھی اللہ اکبر کہہ کر اٹھ جاتا۔ اب وہ سب ڈرے سہمے کبوتروں کی طرح اپنی اپنی جگہ کھڑے جیلر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھ سمیت ان کی تعداد دس تھی۔ دس عدد ڈرے ہوئے انسان ایک ڈرانے والے کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے۔ عادل خاں کی نظر مجھ پر جم کر رہ گئی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے چیکر جمعدار کی طرف دیکھا۔ اس

نے ادب سے کہا۔ "جی سر! یہی شاہ جہان ہے۔"

جیلر نے مجھے سرتاپیر گھورا۔ "اس تختی کے چیچڑ کو ذرا باہر لاؤ۔"

خون میری رگوں میں جمنے لگا۔ نجانے کون سی بلا گلے پڑنے والی تھی۔ حکم ملتے ہی پہریدار کنجیوں کا بہت بڑا گچھا جھلاتا دروازے کی طرف بڑھا۔ کھٹ پٹ کی کچھ آوازیں آئیں اور جمعدار نے کرخت دار آواز میں باہر آنے کا حکم سنایا۔ تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے کمبل اتارا اور پانچ فٹ کے دروازے سے سر جھکا کر باہر نکل آیا۔ مسلح سنتری اپنی اپنی جگہ کچھ اور بھی چوکس ہو گئے۔ جیلر اب مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی نگاہیں برمے کی طرح میرے جسم کو چھید رہی تھیں۔ بے حس و حرکت وہ میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ یہ چند لمحے کا سکوت بے حد جان لیوا تھا۔

یکایک جیلر نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ "تُو چاہتا کیا ہے؟"

"میں۔۔ میں کیا چاہوں گا جناب؟"

جیلر نے قمیص کی جیب سے ایک سفید کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ فل اسکیپ کا آدھا کاغذ تھا۔ اس پر بال پین سے لکھی ہوئی ایک تحریر تھی۔ نجانے کیوں کاغذ پر نظر پڑتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں یہ تحریر پہچانتا ہوں مگر لکھنے والا کون ہے؟ کچھ یاد نہیں آیا۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔

"بخدمت جناب۔ عزت مآب۔ سپرنٹنڈنٹ جیل اکرم خاں درانی صاحب۔" بس ابھی میں اتنا ہی پڑھ پایا تھا کہ ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ کان میں جیسے سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ جیلر عادل خاں کی خوفناک آواز کانوں میں گونجی۔ "حرامزادے! یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تُو نے؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا جیلر کے غضب کا سمندر اچھل گیا۔ یکلخت مجھ پر ٹھوکروں، مکوں اور تھپڑوں کی بارش ہو گئی۔ میں جیسے اچانک ہی کسی طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس طوفان کا زور ٹوٹا تو میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوا۔ کھدر کا کرتا جس پر سینے کی جانب [redacted] لکھا تھا پھٹ چکا تھا۔ یہی حال میرے بالائی ہونٹ اور دائیں ابرو کا ہوا تھا۔ چہرے سے رسنے والا خون ننگے پاؤں کی پشت پر بوند بوند گر رہا تھا۔ جیلر نے زمین پر گرا ہوا کاغذ اٹھایا اور بڑے طنزیہ لہجے میں پڑھنے لگا۔

"بخدمت جناب' عزت مآب سپرنٹنڈنٹ جیل اکرم خاں درانی صاحب' بندہ دوسری بار آپ کو چٹھی لکھ رہا ہے۔ خوف ہے کہ کہیں پہلے والی چٹھی آپ کو مل نہ سکی ہو۔ عرض احوال یہ ہے کہ میں پوری دیانتداری سے اور اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کی جیل میں سی کلاس قیدی نمبر [redacted] شاہ جہان کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ آپ شاہ جہان کی ہسٹری شیٹ دیکھ سکتے ہیں وہ ایک زمانے میں بے حد دشمنیاں پال چکا ہے۔ میری مصدقہ اطلاعات کے مطابق شاہ جہان کے ایک پرانے دشمن نے اسے جیل کے اندر قتل کرانے کے لئے کچھ نہایت خطرناک غنڈے جیل میں داخل کر دیے ہیں۔ آئندہ چند روز میں یہ لوگ کسی نہ کسی طرح شاہ جہان کو جان سے مار دیں گے۔ ایک بار پھر بتاتا ہوں کہ آئندہ چند روز میں یہ لوگ کسی نہ کسی طرح شاہ جہان کو جان سے مار دیں گے۔ اگر آپ مذکورہ قیدی کی جان بچانا چاہتے ہیں تو اسے فوری طور پر جیل کے اندر یا باہر کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دیں۔ فقط ایک خیر خواہ۔"

جیلر عادل خان نے میرے گمنام خیر خواہ کو بہن کی ایک ننگی گالی دی اور کاغذ کے پرزے کر کے میرے منہ پر مار دیے۔ "حرامزادے' تیرا خیال ہے کہ اس طرح تیری بی کلاس کی درخواست قبول کر لی جائے گی؟"

میں نے کہا "جناب! آپ کو زبردست غلط فہمی ہو رہی ہے۔ شاید۔۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ یہ خط میں نے باہر سے لکھوایا ہے۔"

"یہ پہلا خط نہیں ہے۔ اب تک اس طرح کے تین خط سپرنٹنڈنٹ صاحب کو موصول ہو چکے ہیں اور اگر چوتھا خط آیا نا تو میں تیری ماں۔۔۔"

میں خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔ کچھ بولنے کا مطلب مزید تھپڑ اور ٹھڈے کھانا تھا۔ جیلر عادل خاں کچھ دیر خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ ہم دونوں کے درمیان ماں کی گالی گونج رہی تھی۔ یہ صرف ایک گالی ہی نہیں تھی۔ اس میں نہایت بدترین قسم کی دھمکیاں بھی پوشیدہ تھیں۔ ان دھمکیوں کو جیل کا عملہ سمجھ سکتا تھا یا ہم بدنصیب قیدی۔۔۔

جیلر پاؤں پٹختا ہوا واپس چلا گیا۔ مجھے دھکیل کر دوبارہ بیرک میں بند کر دیا گیا۔ میں خون پونچھتا ہوا پھر اپنے ٹھنڈے کمبل میں آن بیٹھا۔ میرے سہمے ہوئے ساتھیوں نے طویل سانسیں کھینچیں اور آسیب زدگان کی طرح اپنی اپنی جگہوں پر جا لیٹے۔ بیرک کی بتی بجھا دی گئی تھی مگر سلاخوں سے باہر زمین پر پڑے سفید کاغذ کے ٹکڑے چاندنی میں چمک رہے تھے۔ یہ کس کی تحریر تھی؟ میرے ذہن پر بار بار اس سوال کا ہتھوڑا برس رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ کوئی چھ ماہ پہلے تک' میرے منع

کرنے کے باوجود شگفتہ درپردہ کوشش کرتی رہی تھی کہ مجھے کسی طرح جیل میں بی کلاس مل جائے لیکن مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ یہ خطوط اسی سلسلے کی کڑی ہوں گے۔ شگفتہ غیر قانونی طرزِ عمل کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر یہ ایسا کون تھا جو میری خیر خواہی پر اترا ہوا تھا؟ دیر تک سوچنے کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں ذہن خالی کر کے ٹھنڈی سخت زمین پر دراز ہو گیا۔

"کنجر سالا۔" میرے بالکل قریب سے نور محمد کی سرگوشی ابھری۔ وہ جیلر پر غصہ اتار رہا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "چھوڑ یار۔ اس کا بھی کیا قصور۔ اب سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اتنی سخت سردی میں اسے یہ خط تھما کر جیل دوڑا دیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ تو غصہ اتارنا ہی تھا۔"

نور محمد نے کہا۔ "سالا اتار لیتا غصہ گھر ہی میں۔ کاٹتا رہتا اپنی جورو کو رات بھر۔"

اس بات پر ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ ساتھ والی بیرک سے دس نمبری دتے قصائی کی آواز آئی۔ "او رے نور محمد' کہاں مر گیا ہے۔ ذرا ایک تان لگا عیسیٰ خیلوی والی۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا لنڈوری والیوں نے۔"

دوسری بیرکوں سے بھی اس فرمائش کے حق میں صدا بلند ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد نور محمد گا رہا تھا۔

چنے نال چانی تارے نال لو ماہیا
توں پھل موتیے دا میں تیری خوشبو ماہیا
میں تیری خوشبو ماہیا

پانچ چھ روز تک کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس رات بیرک کے سامنے پیش آنے والا واقعہ بھی قریباً قریباً سب بھول چکے تھے۔ جیل میں ایسی انہونیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ قید کے پہلے چند مہینوں ہی میں قیدی کی عزت نفس کی چادر پر ذلت کے اتنے داغ لگتے ہیں کہ کسی نئے داغ کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔ پھر اس چادر پر جتنی بھی سیاہی پھینکو وہ اور سیاہ نہیں ہوتی۔ میرے بیرک کے ساتھی بھی میری اس بے عزتی کو قریباً قریباً فراموش کر چکے تھے لیکن میں اسے صرف ایک تلخ واقعہ سمجھ کر بھولنے کو تیار نہیں تھا۔ میری چھٹی حس پکار پکار کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ مجھے کوئی ڈیڑھ ہفتہ پہلے کا ایک عجیب واقعہ یاد آ گیا تھا۔ وہ شاید شب برات کا روز تھا۔ مگر جیل میں شب براتیں' عیدیں سب برابر ہوتی ہیں۔ ہم جیل ہی کے احاطے میں ایک جگہ مشقت کر رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دفتر تک جانے والی سیوریج لائن کے لئے زمین کھودنی تھی۔ پچاس ساٹھ قیدی اس کام پر لگے ہوئے تھے۔ میں دفتر کی زیر تعمیر عمارت کے عین نیچے کام کر رہا تھا۔ یہ عمارت تین منزلہ تھی۔

اپنے مقدور کی طرح سخت زمین پر کدال چلاتے ہوئے میں کمر سیدھی کرنے کے لئے ایک پل کے لئے سیدھا ہوا۔ اسی وقت ہوا میں سرسراہٹ گونجی اور کسی کنکریٹ سے لدی پھندی ایک کڑاہی دھڑام سے میرے قدموں میں آن گری۔ اس تسلا نما کڑاہی میں کم و بیش آدھ من کنکریٹ ہوتا ہے۔ یہ کڑاہی عین اس جگہ گری جہاں ایک لمحہ پہلے میرا سر تھا۔ خدانخواستہ یہ آدھ من وزن میری گدی پر آگرتا تو دوسرا سانس لینا مشکل تھا۔ میں نے بوکھلا کر اوپر دیکھا۔ تیسری منزل پر ایک سایہ تیزی سے اوجھل ہو گیا۔ اردگرد کے قیدی جمع ہو کر میری خیریت دریافت کرنے لگے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس وقت میں نے اور دوسروں نے اس واقعہ کو صرف ایک حادثہ جانا تھا مگر اب مجھے وہ واقعہ کسی اور رنگ میں نظر آ رہا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا جب مکرانی کالو جان محمد نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تین قیدی بڑے بڑے دیگچے سر پر اٹھائے کھانا بانٹنے چلے آ رہے تھے۔ آج جلدی چھٹی ہوئی تھی اور کھانا وقت سے پہلے ہی آ گیا تھا۔ بمشکل ایک بجا ہو گا۔ قیدیوں نے دیگچے زمین پر رکھے اور ہیڈ لانگری نے رعونت سے آواز لگائی۔

"چلو بھئی چلو۔ سب لائن میں آؤ۔"

ہم دن بھر کی مشقت سے تھکے ماندے پاؤں گھسیٹتے اٹھے اور چونا بھری دیوار کے ساتھ قطار بنا کر بیٹھ گئے۔ لانگری نے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک پیالہ دے دیا دوسرے لانگری نے ایک دیگچے میں سے "تیل چینک" دال کی ایک ایک ڈوئی ہر پیالے میں انڈیلنی شروع کی۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرا لانگری میلے کچیلے جھولے میں سے ایک عدد میلی کچیلی روٹی نکال کر ہاتھ میں تھما رہا تھا۔ اس کے دوسرے جھولے میں ابلے ہوئے بساند مارتے چاول تھے۔ عرصہ چار سال سے میں ہر روز یہی جنس کھانا کھاتا چلا آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ابھی تک طبیعت اس کھانے پر جمی نہیں تھی۔ کبھی کبھی یہ بساند مارتی کنکریوں بھری خوراک دیکھ کر دل اچھل جاتا تھا اور بھوک مر کر بدبوؤں میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ اس دن تو ویسے بھی ہلکا سا بخار تھا مجھے۔

میں نے کھانے میں صرف دال لی۔ چاولوں کو روٹی پر

رکو کر لیتا اور لانگری کی نگاہ بچا کر پاجامے کے نیفے میں اڑس لیا۔ یہاں خوراک کے ایک ایک ذرّے کی قیمت تھی۔ میں ان ڈھیر سارے ذرّوں کو ضائع کیسے کر سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد پہریدار چابیوں کا رنگ چھنچھناتا پہنچ گیا۔

"چلو بے چلو۔ اپنی اپنی بیرک پکڑو۔"

ہم چابی بھرے کھلونوں کی طرح اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے اور قطار اندر قطار بیرکوں میں گھسنے لگے۔ جیل کی رات شروع ہو چکی تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد جونہی اندھیرا پھیلا میں نے نور محمد کو اشارے سے پاس بلایا اور نیفے سے روٹی چاول نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو نے نور محمد کو دیوانہ سا کر دیا۔ وہ وہیں گھٹنوں میں سر دے کر چپڑ چپڑ کھانے لگا۔ دو ہی منٹ میں وہ فارغ تھا۔ ہلکی سی ڈکار لے کر وہ ممنونیت سے میری پنڈلیاں دبانے لگا۔

"ماسٹر! کیا اینٹی کیا ہے؟"

نورے کا خیال تھا کہ شاید میں نے روٹی چاول اینٹی یعنی چوری کیے ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "ماسٹر! ایمان سے بڑا کرم نواز ہے تو۔ اتنے قیدیوں میں تجھے میرا ہی خیال کیوں آیا؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس لیے کہ تو اگلے ہفتے چھوٹ رہا ہے۔ میں نے سوچا جاتے جاتے تیری ایک دعوت ہی سہی۔"

جانے کے ذکر پر وہ اچانک ہی خیالوں میں کھو گیا۔

"ماسٹر! یہ بندہ بھی کیا چیز ہے۔ بری سے بری جگہ بھی رہے تو دل لگا لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ایک سال پہلے میں جیب تراشی کے شبے میں راہ چلتے پکڑا گیا تھا تو دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ گرفتار کرنے والوں نے مجھے عقابوں کی طرح اچک لیا تھا۔ میری بیوی حاملہ تھی۔ وہ دردِ زہ میں تڑپ رہی تھی۔ میں اس کی دوا لینے نکلا تھا۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ میرا جرم صرف یہ تھا کہ میرے کپڑے پھٹے پرانے تھے اور میں موقع واردات کے قریب موجود تھا۔ کتنا بڑا جرم تھا میرا؟ اور اس پر میں نے بے وقوفی یہ کی کہ تھانے پہنچ کر اپنی بے گناہی کے جوش میں انسپکٹر سے الجھنے کی کوشش کی۔ انسپکٹر نے کہا "بچے! میں تجھے بتاؤں گا' پولیس کے سامنے اکڑنے والے کا حشر کیا ہوتا ہے" اور اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ کئی مہینے تک تو مجھے کسی عدالت میں ہی نہیں پیش کیا گیا۔ مجھے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ میری بیوی زندہ ہے یا مر گئی۔ اپنے تین معصوم بچوں کی شکلیں میرے دماغ میں گھومتی رہیں۔ میں نے انہیں تصور میں بے سہارا سڑکو بھیک مانگتے دیکھا۔ دوسرے تیسرے مہینے میرے ایک دو نے کسی طرح مجھ تک رسائی حاصل کی اور اس کی زبان ان کی خیر خیریت کا پتا چلا لیکن میں نے اپنے اہل خانہ کو مصیبت کا علم نہیں ہونے دیا۔ میں ایک شریف آدمی میرے لوگوں کو معلوم پڑ جاتا کہ میں جیب تراشی کے جر گرفتار ہوں تو پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ میں کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔ ہوا تک نہیں لگنے دی۔ دوران مجھے عدالت نے نو ماہ کی قید سنا کر جیل بھیج دیا۔

اب میرے گھر والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں کراچی ہوں اور وہاں بطور کارپینٹر کام کر رہا ہوں۔ میرا دوست مہینے کراچی سے ایک خط میرے گھر پوسٹ کرا دیتا ہے۔ میں میری طرف سے لکھا جاتا ہے کہ میں کام میں بہت ہوا ہوں۔ انشاء اللہ اگلے مہینے واپس آنے کی کوشش کر گا۔ وہی میرا محسن ہر مہینے کچھ رقم بھی گھر بھیج دیتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اس جیل میں' میں نے ایک ایک پل گن گن کر کاٹا ہے۔ ایک ایک ساعت کو میں نے کھا طرح سر کیا ہے۔ کون سی اذیت ہے جو میں نے یہاں سہی۔ پھر بھی اب یہاں سے جانے کا سوچتا ہوں تو دل خا ہو جاتا ہے۔ تم سب سے بچھڑنے کا ملال ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے ماسٹر۔ بندہ اتنا کھلنڈرا کیوں ہے؟ جیل بھی جگہ ہے جس سے پیار کیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "نور محمد۔ بات یہ ہے کہ تم خود بہت ا ہو۔ تم اپنی اچھائیوں کے ساتھ جس ماحول میں بھی جاؤ اسے کسی نہ کسی حد تک اچھا کر لو گے اور پھر خود ہی ا ماحول سے پیار بھی کرنے لگو گے۔"

یکایک میں نے ایک ہلکی سی کراہ سنی۔ بلاشبہ یہ کراہ محمد کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا میرے قریب نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی وقت دوسری کراہ سنائی دی پہلی سے شدید تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نے نور محمد ہیولے کو متحرک دیکھا۔ "کیا بات ہے نور محمد؟" میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"ماسٹر! پیٹ... میرا پیٹ..."

میں نے جلدی سے اس کا پیٹ ٹٹولا۔ نور محمد کے دو ہاتھ پیٹ پر تھے اور وہ درد کی شدید لہر کے زیر اثر دہرا جا رہا تھا۔ یکایک وہ چیخنے لگا... اچانک ہی جیسے کوئی اس آنتوں پر چھریاں چلانے لگا تھا۔ "ہائے مر گیا... ہائے میر

رہا۔" بیرک کے قیدی جن میں سے بیشتر اونگھ رہے تھے ہڑبڑا کر ٹھے اور ہم دونوں کی طرف آئے۔

"وڈی کیا ہوا؟" کالو جانی نے چلا کر پوچھا۔

نور محمد اب فرش پر مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ ی واچ مین کو بلانے کے لیے چلانے لگے۔ واچ مین بھاگتا آیا۔ اس نے باہر سے بیرک کی بتی روشن کی۔ میں نے نور د کا چہرہ دیکھا اور کانپ گیا۔ اس کی دبلی پتلی گردن کی رگیں لی ہوئی تھیں اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑی تھیں۔ واچ مین لا کر بولا۔ "اوئے نورے کے پتر۔ کیا ہوا ہے تجھ کو؟"

لیکن "نورے کا پتر" جواب دینے کے قابل کہاں تھا۔ ے تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ چند اور واچ مین ی بھاگتے ہوئے پہنچ گئے۔ نور محمد کی حالت دیکھ کر ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے ایک واچ مین ے بجتی لہجے میں کہا کہ وہ جائے اور ڈاکٹر صاحب کو لائے۔ اچ مینوں نے مشورہ کیا اور ایک واچ مین ہماری بیرک کے ین سامنے صوبیدار کے دفتر کی طرف بھاگا۔ غالباً وہ ڈاکٹر نے جانے سے پہلے صوبیدار سے اجازت لینا چاہتا تھا۔ واچ ان بے حد بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ نور محمد کی حالت رناک تیزی سے بگڑ رہی تھی۔ وہ اب تکلیف سے بے قرار کر فرش سے سر ٹکرا رہا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا ر گود میں لے لیا اور پچکارتے ہوئے حوصلہ دینے لگا۔ ہاڑیں کھاتے ہوئے یکایک نور محمد نے خون کی قے کی اور ل کے خون کی حدت میرے پاجامے سے گزر کر میری انوں کو چھونے لگی۔ کسی آواز نے میرے اندر سے پکار کر ہا۔ "نور محمد مر رہا ہے۔ قیدی نمبر ۳۰۸ مر رہا ہے۔ وہ آواز ر رہی ہے جو اس جیل کی سنگی دیواروں میں گداز جگایا کرتی ی۔" میں نے نور محمد کا سر فرش پر پٹخا اور جیل کی سلاخوں سے چمٹ کر واچ مینوں کو پکارنے لگا۔ ان سے التجا کرنے لگا کہ وہ ڈاکٹر کو بلائیں۔ میرے ساتھ دوسرے تمام قیدی بھی راپا التجا بن گئے۔ ہمارے شور و غل سے واچ مینوں کا ماتھا نکا۔ دو واچ مین جیل کے اسپتال کی طرف بھاگے۔ ادھر نور ے تیاری کر لی۔

"نور محمد... نورے... نورے..."

میں نے حلق کی پوری قوت سے چلاتے ہوئے کہا لیکن ہ سننے کی حد سے گزر چکا تھا۔ جس وقت دو واچ مین پتال سے اسٹریچر لے کر بھاگتے ہوئے بیرک کی طرف رہے تھے' نور محمد نے آخری ہچکی لی اور ہمارے ہاتھوں میں توڑ دیا۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں جیسے اپنے گھر کا راستہ دیکھ رہی ہوں۔ منہ وا رہ گیا جیسے وہ اپنے غیر حاضر بچوں سے کہنا چاہتا ہو۔ کوئی سرگوشی کرنا چاہتا ہو۔ کوئی عذر پیش کرنا چاہتا ہو کہ وہ ایک روز اچانک انہیں بتائے بغیر کہاں چلا گیا تھا۔ بیرکوں کے گہرے سناٹے میں ایک درد بھری خاموش صدا گونج گئی۔

"کدی آ مل رانجھن وے۔ میں لکھ لکھ نیر بہانواں۔"

میری بیرک کے تمام قیدی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ بڑا نرم ہو جاتا ہے دل قیدیوں کا۔ ذرا ذرا سی ٹھیس سے ضبط کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ تو پھر ایک سانحہ تھا' اور ایسے شخص پر گزرا تھا جو ان بیرکوں کا محبوب گلوکار تھا۔

کرانی کالو جانی نے روتے ہوئے کہا۔ "وڈی نور محمد! تم تو سالا گھر کو جاتا تھا۔ یہ کدھر کو رخ پھیر لیا۔ بیوقوف مرنا تھا تو پہلے روز مر جاتا۔ وہی کیوں اتنا انتظار کرایا بیوی بچوں کو۔"

میرے دماغ میں تند آندھیاں چل رہی تھیں۔ کانوں میں وہی چیخ چیخ کی صدا گونج رہی تھی جو میں نے کوئی پون گھنٹا پہلے سنی تھی۔ کتنی رغبت سے میرا دیا ہوا کھانا کھایا تھا نور محمد نے۔ شاید یہ کھانا ہی اس کے لیے اجل کا پیغام بن گیا تھا۔ وہ روٹی اور چاول نہیں تھے۔ وہ زہر تھا۔ وہ موت تھی۔ وہ سنکھیا سے بھری ہوئی کڑاہی تھی جو دوسری بار میرے سر پر پھینکی گئی تھی۔ مگر اس دفعہ یہ کڑاہی زمین پر نہیں نور محمد کے سر پر گری تھی۔ اس جیب تراش کے سر پر گری تھی جس نے کبھی جیب نہیں کاٹی تھی اور جو ایک سال پہلے اپنے گھر سے بیوی کی دوا لینے نکلا تھا۔ آہ! میرا دل جیسے سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر سینے میں بکھر گیا۔

کالو جانی نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اس جیل میں مجھے سب سے پہلے جانی نے ہی ماسٹر کہنا شروع کیا تھا۔ اب بھی وہ ماسٹر کہتا تھا تو اس کا انداز سب سے جدا ہوتا تھا۔ وہ اس لفظ میں اس کے اعلیٰ ترین معنی بھر دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا سلطنت روما کا کوئی قدیم حبشی غلام بصد عجز و انکسار اپنے آقا کو مخاطب کر رہا ہے۔ نجانے اسے کیا نظر آیا تھا مجھ میں۔ بعض اوقات میں اس کے انداز پر جھینپ سا جاتا تھا...... "ماسٹر" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر اپنے موٹے ہونٹوں کو حرکت دی۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے نا؟ نورے نے تمہاری طرف آنے والی موت کو گلے لگایا ہے۔"

میں نے اشکبار نگاہیں جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں

یہی ہوا ہے۔ میرا ہی نوالہ اس کے گلے کا پھندا بنا ہے۔"

صوبیدار شب خوابی کے لباس میں تو تڑ مڑ کا تا موقع پر پہنچ چکا تھا۔ بیرک کی سلاخوں سے باہر جیل کے عملے کا اژدہام ہو رہا تھا۔ سب ہراساں نظروں سے مردہ نور محمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر قفل کھول کر اسے باہر نکالا گیا اور اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اب یہ ساری کارروائی بے کار تھی۔ قیدی تو آزاد ہو چکا تھا۔ اس چھوٹی جیل سے بھی اور باہر کی بڑی جیل سے بھی۔ وہ اوپر بہت اوپر کھلی فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔ کل شام اسے ایک ستارہ بن جانا تھا اور پھر اس کی بیوی ثریا اور بچوں نے ساری عمر اس ستارے کو دیکھنا تھا۔

اگلی صبح ساڑھے نو بجے کے قریب مجھ سمیت بیرک کے تمام قیدیوں کو سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں پیش کیا گیا۔ ہمیں الٹی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ جیسے راتوں رات ہم بے ضرر قیدیوں کی بجائے خونخوار قاتل بن گئے ہیں۔ یہ بات اب طشت ازبام ہو چکی تھی کہ نور محمد میرا دیا ہوا روٹی چاول کھانے کے بعد راہی عدم ہوا ہے۔ لہٰذا سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں موجود تمام افسران کی جلتی نگاہوں کا مرکز میں ہی تھا۔ جیلر اور صوبیدار حضرات تو مجھے کچا ہی چبا جانا چاہتے تھے۔ ہیڈ لانگری اور اس کے دو ساتھی بڑے اطمینان سے ایک طرف کھڑے تھے۔ یہاں ہم سب قیدیوں کی گالیوں، تھپڑوں اور ٹھوکروں سے جو تواضع ہوئی میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ یہ تو یہاں روز کا معمول تھا۔ چیدہ چیدہ افسران نے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالنے کے بعد مجھے خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرایا۔ موقع پر موجود اسلم رندھاوا نامی ایک ڈی ایس پی نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور پیٹ میں زوردار گھٹنا جما کر بولا "بہن کے ھٹکنے، مجھے یہ بتا روٹی چاول تو لے کر کیوں گیا تھا اندر؟"

پیٹ کی ضرب کی وجہ سے میں بولنے کے قابل نہیں رہا لیکن کالو جانی کوشش کے باوجود اور میری تمام ہدایات کے باوجود خاموش نہیں رہ سکا۔ اس نے قہر سے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب! ہم ہاتھ جوڑتا ہے۔ خدا کے لئے ہمارا مغز خراب مت کرو۔ تم یہ تو پوچھتا ہے 'روٹی چاول کیوں لے کر گیا تھا' ڈی یہ نہیں پوچھتا اس روٹی چاول میں موت کس نے ملایا تھا؟ کس حرامی نے ماسٹر کی جان لینے کی کوشش کیا تھا۔ کچھ انصاف کرو مائی باپ۔ تم کو بار بار چیخی ملتا ہے۔ تم کو بتایا جاتا ہے کہ کوئی حرامی سالا ماسٹر کو مارنا مانگتا ہے۔ تم کان نہیں دھرتا۔ اور اب کان دھرتا ہے تو صرف اس بات پر کہ روٹی چاول اندر کون لے کر گیا تھا۔"

ڈی ایس پی کا پارا ایکا ایک ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کی موجودگی میں اس نے خود پر ضبط کیا اور دو قدموں سے چلتا کالو جانی کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے تیور نے سمجھا دیا مجھے کہ اب کالو جانی کی خیر نہیں۔ نہایت خوفناک انداز میں لیکن آہستگی سے ڈی ایس پی نے ہاتھ بڑھا کر جانی کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور پوری شدت سے دانت پیس کر غرایا۔ "کلاٹ صاحب! یہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتائے گی کہ وہ روٹی چاول کھانے سے مرا یا زہریلے سگریٹ سے۔ زہریلی چرس کی تین پڑیاں نکلی ہیں بیرک کے شہتیر سے اور تم ابھی بیان دو گے کہ یہ چرس جیل کے اندر اور چھت کے شہتیر میں کیسے پہنچی اور کس نے پہنچائی؟"

میں سمجھ گیا کہ جیل کے حکام اس واقعے کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھانے میں زہر ثابت ہونے سے ان کی اپنی ذات پر حرف آتا تھا۔ ناقص انتظامات کی قلعی کھلتی تھی اور یہ بھی شبہ ہوتا تھا کہ شاید کوئی اہلکار اس سازش میں شریک ہے۔ لہٰذا ان لوگوں نے روٹی میں گندھے ہوئے زہر کو بڑی صفائی سے چرس کی پڑیوں میں کر دیا تھا۔ اب ہم لاکھ سر پٹختے رہتے "زہر" کا پرنالا وہیں تھا۔ اسپتال ان کا اپنا تھا۔ ڈاکٹر اپنے اور انگریز امپائر اپنے۔

کالو جانی سفید جھوٹ کی یہ ضرب سہہ نہ سکا۔ کراہ کر بولا۔ "ایس پی صاحب یہ غلط ہے۔ بالکل غلط۔ وڈی نورے نے کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا، کبھی کش نہیں لیا۔ سارا قیدی لوگ گواہ ہے اس کا۔"

اچانک جیلر عادل خاں تند بگولے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور جھپٹ کر کالو جانی پر جا پڑا۔ "سالے، حرامی، کتے کی اولاد، ہم جھوٹ بولتے ہیں۔" اس نے گریبان پکڑ کر کالو کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا اور اوندھے منہ ایک کرسی پر گرا۔ کرسی ٹوٹ گئی۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس کا منہ فرش سے لگا اور ہونٹوں سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ جیلر عادل خاں ایک ضخیم قوی ہیکل شخص تھا۔ اس کے باوجود کالو کے سامنے بچہ نظر آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کالو کے ہاتھ آزاد کر دیئے جاتے اور اسے عادل خاں کے مقابلے میں کھلی چھٹی دے دی جاتی تو وہ دو سیکنڈ کے اندر اندر اسے ناک آؤٹ کر کے زندگی کے رنگ سے باہر پھینک دیتا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ قانون نے باندھ رکھے تھے اور وہ عادل خاں کے سامنے چڑیا کے نومولود بچے کی طرح بے بس تھا۔ عادل خاں نے بے مثال "معدل

مظاہرہ کرتے ہوئے کالو کو کرسی کے ٹوٹے ہوئے ہتھے سے بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ جب شیشم کا مضبوط ہتھہ دوبارہ ٹوٹ گیا تو وہ اپنے وزنی بوٹ آزمانے لگا۔ آزاد حاضرین اور قیدی حاضرین خاموش تماشائی تھے۔ یوں لگتا تھا عادل خاں کالو سے کوئی پرانا بدلہ چکا رہا تھا۔ اس مار پیٹ میں اچانک کالو کے پاجامے کا ازار بند ٹوٹ گیا۔ ایکا ایکی اس کی بے بسی انتہا کو پہنچ گئی۔ اب ایک طرف وہ خود کو عادل خاں کی ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری جانب پشت پر بندھے ہاتھوں سے پاجامہ سنبھال رہا تھا۔ مارنے والے کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ شاید اسے اس بات کی فکر بھی نہیں تھی۔ دو درجن نگاہوں اور کالو کی عریانی کے درمیان ایک کھلے ازار بند کا پاجامہ لرز رہا تھا۔ یارو! مجھے کہنے دو کہ یہ پاجامہ ایک علامت تھی۔ انسانیت اور حیوانیت کے بیچ ایک حد فاصل تھا۔ یہ پاجامہ شرم کا پہناوا تھا۔ اسے مظلوم اور بے بس جسموں کے اوپر سے ہمیشہ ظالم اور زور آور لوگ کھینچتے رہے ہیں۔ صدیوں تک لرزتے ہوئے مظلوم ہاتھوں نے اس پہناوے کو تھاما ہے اور صدیوں جھکے ہوئے جابر ہاتھوں نے اسے تار تار کیا ہے۔ جوان باعصمت عورتوں کی فریادیں، باحیا مردوں کی گریہ زاری، معصوم بچوں کی چیخیں، بوڑھوں کے بالوں کی سفیدی، کوئی شے اس عمل کو روک نہیں سکی۔ ظلم اور بے بسی کے درمیان نجانے یہ کیسا رشتہ چلا آرہا ہے۔ کالو کی بے بسی کے منظر نے میری آنکھوں میں انگارے سے بھر دیئے۔ میرے ذہن میں دھند سی اٹھتی چلی گئی۔ ایکا ایکی سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے متحرک ہوا اور پاگلوں کی طرح جیلر عادل خاں پر جا پڑا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں کیا کر سکتا تھا سوائے اس کے کہ اپنے آگے کو بڑھتے ہوئے جسم کے زور سے عادل خاں کو گرا دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے سینے کی ضرب سے عادل خاں اچھلا اور کالو کے اوپر سے ہوتا ہوا ڈی ایس پی اسلم رندھاوا کے قدموں میں جا گرا۔ میری حرکت نہایت خوفناک تھی۔ اس حرکت نے سب کو کرسیوں سے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اب میں پہلو کے بل فرش پر پڑا تھا اور اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اپنی کمزور "جارحیت" سے میں جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ میں نے اٹھا لیا تھا اور اب مجھے اس جارحیت کا مزا چکھنا تھا۔ اس وقت میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی "کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے اور میں انہیں اپنا مطلب دکھا سکوں جو بڑے بڑے پھنے خانوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر چکا تھا، جس کے سامنے سر جھک جاتے تھے۔

یکدم میں نے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے اور فرش سے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی چند ساعتوں میں مجھے دوبارہ اسی فرش پر گرنا تھا تو اٹھنے کا فائدہ؟ میں نے رنجیدہ نگاہوں سے عادل خاں اور اسلم رندھاوا کو آدم خور وحشیوں کی طرح خود پر جھپٹتے دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

بپھرے ہوئے لشکریوں نے میرے قلعہ جسم کی خستہ فصیل کو مسمار کرنے کے لئے دھاوا بول دیا۔ پہلے اسلم رندھاوا اور عادل خاں کی وحشیانہ ضربیں میرے جسم پر پڑیں۔ پھر جیل کے جانے پہچانے لاٹھی بردار سپاہی لاٹھیاں سونت کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مجھے مارتے اور دھکیلتے ہوئے دفتر سے باہر لے آئے اور کھل کھلا کر ٹھکائی شروع کر دی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے نیم وا آنکھوں سے میں نے دیکھا، چند لاٹھی بردار کالو کو بھی اسی طرح پیٹ رہے تھے۔ وہ برہنہ تھا۔

○-------□-------○

ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنی ہی بیرک میں کراہتے ہوئے پایا۔ مجھے کھڑی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ اس سزا میں قیدی کو کھڑا رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کو کڑی میں ڈال کر سات آٹھ فٹ کی بلندی پر جنگلے سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ میری طرح کالو کو بھی ہتھکڑی لگی تھی۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھا۔ اس کے پاؤں بار بار جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیتے تھے اور وہ ہاتھوں کے بل جھول جاتا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بیرک کے جو ڈیرے دار جو آج نور محمد کی "رہائی" کے بعد سات رہ گئے تھے، کچھ تو سو چکے تھے اور کچھ ماتم زدہ خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی تو ہونٹوں سے بے ساختہ کراہیں نکل گئیں۔ ظالموں نے لوہے کا پنڈا سمجھ کر مارا تھا۔ جسم کا کوئی حصہ درد سے خالی نہیں تھا۔

"پانی۔" میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ میرے قریب سے ایک سایہ حرکت میں آیا۔ اس نے جھکے جھکے انداز میں اٹھ کر آہنی سلاخوں کا رخ کیا۔ سلاخوں سے باہر مٹی کا گھڑا اور سلور کا بے ڈھنگا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس بھرا اور قریب آکر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ گلاس پکڑتے ہوئے میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر اپنے ساتھی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

ہم دونوں کو بیرک کے اندرونی جنگلے سے باندھا گیا تھا۔ یہ جنگلا دو بیرکوں کی درمیانی دیوار کا کام بھی دیتا تھا۔ دوسری بیرک کے قیدی بھی تاریکی اوڑھ کر سو چکے تھے یا سونے والے

تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی قیدی مچھروں اور کھٹملوں سے بے نیاز ایسے نڈھال ہو کر پڑتے ہیں کہ شور محشر بھی انہیں کبھی جگاتا ہے اور کبھی نہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ واچ مین ہوتے ہیں جو رات کو کئی بار آکر بے پناہ شور کے ساتھ سلاخیں بجاتے ہیں۔ غالباً بتانا چاہتے ہیں کہ ہوشیار بیرک والو' کہیں خوابوں میں بھی آزاد ہونے کی کوشش نہ کرنا ہم ڈیوٹی پر موجود ہیں۔ ہم دونوں سے بے حد ہمدردی کے باوجود بیرک کے سارے قیدی ایک ایک کر کے سو گئے اور صرف وہ ساتھی جاگتے رہ گئے جنہیں رات بھر ہمیں کاٹنا تھا۔ یعنی مچھر پسو اور کھٹمل وغیرہ۔ جیل پر گہرا سناٹا طاری ہو گیا اس سناٹے میں درد کی لہریں اور بھی شور مچانے لگیں۔ میں نے سوچا اچھا ہی ہے جان محمد مکرانی عرف کالو جانی ابھی مکمل ہوش میں نہیں آیا۔ اسے بھی میری طرح کراہنے کے سوا اور کیا کرنا تھا۔ مجھے تو خدا کے ایک بندے نے پانی پلا دیا تھا اسے تو پانی پلانے والا بھی اب کوئی نہیں تھا۔ کل رات اور دن کے واقعات ذہن میں کسی دھندلی فلم کی طرح متحرک ہو گئے۔ میرا چاول روٹی سینے میں چھپانا۔ خوش گلو نور محمد کا تڑپ تڑپ کر مرنا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دفتر میں لاٹھیوں سے میری اور کالو کی بے طرح پٹائی۔ آٹھ پہر میں کیا کچھ نہ بیت گیا تھا۔ میری تین سال کی "نیک چلنی" ایک دن میں غارت ہوتی نظر آتی تھی۔ پھر میرا دھیان ان خطوط کی طرف چلا گیا جو بقول جیلر صاحب انہیں موصول ہو رہے تھے۔ ان کی تحریر میری جانی پہچانی تھی اور ان کے مندرجات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔ اب اس میں شبے کی تنہ بھر گنجائش نہیں تھی کہ مقدر کے مارے شاہ جہاں کو مکرر مارنے کے لئے کوئی نادیدہ ہستی کمر ہمت باندھ چکی ہے۔ یہ صورت حال غیر معمولی نہیں تھی۔ کیونکہ جیل میں آنے سے پہلے میں نے جو اندھا دھند زندگی گزاری تھی اور جس فراخ دلی سے دشمنیاں اور رقابتیں مول لی تھیں اور بستی بستی اور کوچے کوچے جو ہنگامۂ محشر برپا کیا تھا اس کی بازگشت مجھے کسی بھی وقت سنائی دے سکتی تھی۔۔۔ اور میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار بھی رہتا تھا لیکن یہ بات بے حد تکلیف دہ تھی کہ جیل حکام جانتے بوجھتے بھی میری حفاظت کی ذمے داری پوری نہیں کر رہے۔ مجھ پر کنکریٹ کی کڑاہی گرنے والے واقعے سے وہ بے خبر نہیں تھے۔ اب صرف میری وجہ سے نور محمد المناک موت سے دوچار ہو گیا تھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ سختی سے واقعات کا نوٹس لیتے اور اس سلسلے میں تحقیق کرتے مگر وہ اس گاڑی کو کسی اور ہی لائن پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اپنے چاروں طرف ایک پراسرار خطرے کی بو سونگھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بہت کم دھوکا دیا اور یہی حس مجھے اپنے گرد و پیش سے خبردار کر رہی تھی۔ میں نے تہیہ کیا کہ اب اپنی جانب سے کوئی غفلت نہیں برتوں بلکہ کوشش کروں گا کہ حفاظت خود اختیاری کے لئے کم سے کم کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار میسر آسکے۔ ایسے حالات میں معمولی تیز دھار آلہ بھی حوصلے کا باعث ہوتا ہے۔

گہری تاریکی میں دیوار سے ٹیک لگائے میں آئندہ منصوبہ بندی کرتا رہا۔ بعض اوقات آدمی جس خطرے کو دور محسوس کرتا ہے وہ اچانک ہی اس کے سامنے آن وارد ہوتا ہے۔ اس کے تمام منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں اور خود کو حالات کی آندھی پر تنکے کی طرح محو پرواز پاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ دیوار سے لگے لگے اچانک سرسراہٹ سی سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ دیکھ دوسری بیرک سے کسی نے سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈالا اور کوئی باریک سی ٹھنڈی سی شے میری گردن سے لپٹ گئی ابھی اس شے کی ماہیت پر ہی غور کر رہا تھا کہ دوسرے ہاتھ نے پوری قوت سے میرا منہ ڈھانپ لیا۔ وہ ایک نہایت کھردری ہتھیلی والا مضبوط ہاتھ تھا۔ میرا سر جیسے سلاخوں میں دھنس کر رہ گیا۔ اس وقت مجھے علم ہوا کہ میری گردن سے مس ہونے والی چیز کیا ہے۔ پورے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ تانبے یا لوہے کا باریک تار تھا جسے کوئی بے پناہ قوت میری گردن میں دھنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور میں یکسر بے بس تھا ایک ہی ساعت میں موت میری آنکھوں کے سامنے ناچ گئی میں نے پہلے اپنے ہونٹوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی پھر ہتھکڑی کو زور سے جھنجھنایا' پھر پاؤں میں پڑا ہوا سلور کا گلاس ٹھوکر مار کر ہوا میں اڑا دیا۔۔ مگر بیرک کے ساتھیوں کی نیند میں خلل نہیں پڑ سکا۔ یہ سب کچھ تین یا چار سیکنڈ کے اندر اندر وقوع پذیر ہوا۔ شدید چبھن سے اندازہ ہوا کہ تار میری جلد کو کاٹ چکا ہے اور اب شہ رگ کی طرف اس کا مختصر لیکن مہلک سفر شروع ہو گیا ہے۔

"شاہ جہاں کیا خیال ہے؟ کلمہ پڑھ لو" ذہن میں کوندے کی طرح یہ سوچ لپکی ساتھ ہی یہ سوال بھی ابھرا کہ یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ غالباً۔۔ غالباً حملہ آور ساتھ والی بیرک میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ وہ جو بھی تھا بہت پھرتیلا اور گرانڈیل تھا۔ اس نے میری "گہری ہتھکڑی" کے سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور فرشتۂ اجل کی طرح مجھے آلیا تھا۔ "شفقا

حافظ۔۔ اور خدا حافظ کالو جانی۔۔ خدا حافظ میرے دوستو اور دشمنو!" میں نے تار کی چبھن سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ نرخرا کٹا ہے یا نہیں۔ عید قرباں پر بکرے کی گردن کٹتی ہے تو گلے سے خرخر کی آواز نکلتی ہے۔ میرے گلے سے تو خرخر کی آواز نہیں نکل تھی۔ شاید ابھی کچھ کسر باقی تھی۔

اچانک نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے ایک بھرپور ٹانگ کالو جانی کی ناف پر دے ماری۔ وہ غالباً بے ہوشی کی سرحد پار کر آیا تھا۔ ناف پر لات پڑتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور اول فول بکنے لگا۔ کالو کی چیخ کافی بلند تھی۔ میں نے ڈوبتی نظروں سے دیکھا' بیرک کے فرش پر ایک سائے نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔ میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے بند ہونٹوں سے غوں غاں کی آوازیں نکالیں۔ سایہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ میرے دل میں آس کا دریچہ وا ہوا۔ یہ ایک موہوم سی امید تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اپنے ساتھی کی صورت حال جاننے تک اور اس کے شور مچانے تک میرے گلے سے لپٹا ہوا تار جلد سے گزر کر شہ رگ کو قطع نہیں کرے گا۔ یہ ساعتوں کا کھیل تھا' یہ لمحوں کی بات تھی۔ میں نے زور زور سے اپنی ہتھکڑی کو حرکت دی۔ میرا بیرک کا ساتھی تیزی سے میری طرف لپکا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں دیکھا اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنے پاجامے کے نیفے سے کوئی آٹھ انچ لمبی نوکدار چیز نکالی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ سریے کا ٹکڑا تھا جو اس نے سپرنٹنڈنٹ کے زیر تعمیر دفتر سے حاصل کیا تھا اور جسے کئی روز کی محنت سے نوکدار بنایا گیا تھا۔ اس نے یہ ٹکڑا اپنے داہنے ہاتھ میں لیا اور پوری قوت سے میرے بائیں پہلو میں گھونپ دیا ہاں میرے بائیں پہلو میں گھونپ دیا۔ کچھ سوچنے کی مہلت نہیں تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔ صرف درد محسوس کرنے کی مہلت تھی اور وہ میں کر رہا تھا۔ پسلیوں کے نیچے انگارہ سا اتر گیا تھا۔ میرے قاتل نے ایک جھٹکے سے یہ سریا باہر نکالا اور دوسری مرتبہ میرے پیٹ میں گھونپا۔ میں جان کنی کے عالم میں بری طرح تڑپا اور نجانے کس طرح میرے ہونٹوں پر سے اس آہنی ہاتھ کی گرفت ختم ہو گئی "بچاؤ۔۔ بچاؤ" میں سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ یہ آواز ایک دھماکے سے شب کے سکوت کو چکنا چور کر گئی۔ میں نے بیرک کے فرش سے کئی سر ابھرتے ہوئے دیکھے۔ بیرک سے باہر راہداری میں بھاگتے قدموں کی صدائیں آئیں۔ ایک کہرام سا مچ گیا۔ مددگار ہاتھ میری طرف لپکے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ سب سے پہلے مجھ تک پہنچنے

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلکتے ہوئے زمانے کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

والے ہاتھ مجھے سہارا دیں گے یا میرے جسم میں کچھ اور نوکدار سریے اتار دیں گے۔ اس گھڑی یوں لگ رہا تھا کہ ان دیواروں میں میرے دشمن کے علاوہ اور کوئی نہیں رہ گیا۔ اچانک ہی مجھ پر بے ہوشی غالب آنے لگی۔

○———□———○

اس کے بعد کے واقعات میرے ذہن میں کسی دھندلے خواب کی طرح محفوظ ہیں۔ کچھ آوازیں کچھ لمس، کچھ ذائقے، کچھ بوئیں اور مناظر۔ ان میں ربط نہیں ہے لیکن یہ بے ربطی واقعات کو الجھاتی نہیں۔ مجھے یاد ہے کچھ سپاہی مجھے ڈنڈا ڈولی کرکے اسپتال کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں گھبراہٹ اور عجلت تھی۔

"سریا مارا ہے۔"

"چاقو مارا ہے۔"

"کس نے مارا ہے؟"

"جلدی کرو۔۔۔ جلدی کرو۔"

پھر میں نے جیل کے ڈاکٹر مصطفےٰ ہمدانی کا چیچک زدہ چہرہ خود پر جھکے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور بیزاری تھی۔ تب میں نے خود کو کسی گاڑی میں پایا۔ گاڑی ہچکولے کھاتی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے گلے پر روئی کا تھبہ تھا اور ایک پٹی تھی۔ جیل اسپتال کے میلے کچیلے کمپاؤنڈر نے میرا بایاں پہلو بار رکھا تھا اور دو مسلح سنتری میرے پاؤں کی طرف چوکس بیٹھے تھے۔

تیسری مرتبہ میرے ذہن نے غنودگی کا پردہ چاک کیا تو میں نے گاڑی کو ایک جھٹکے سے رکتے پایا۔ میں نے چند فائروں کی آواز سنی۔۔۔ ۳۸ بور کا ریوالور۔۔۔ شاٹ گن۔۔۔ پھر ۳۸ بور کا ریوالور۔۔۔ پھر ایم جی۔۔۔ شاٹ گن۔۔۔ ۳۸ بور۔۔۔ شاٹ گن۔۔۔ کسی کی زخمی چیخ۔۔۔ ایک للکارتی ہوئی گندی گالی، بھاگتے قدموں کی آواز۔ میں نے چندھیائی آنکھوں سے دیکھا پاؤں کی طرف بیٹھے مسلح فرشتے غائب تھے۔ میلا کچیلا کمپاؤنڈر ندارد تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ساری دنیا ہنگاموں کی زد میں آ گئی؟ یکایک کہیں قریب سے بھاگتے قدموں کی صدا آئی۔ گاڑی کو ہچکولے لگے جس سے اندازہ ہوا کہ ایک یا دو افراد نے پھرتی سے فرنٹ سیٹ سنبھال لی ہے۔ دروازے بند ہوئے۔ ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھی۔ یہ ایک شدید جھٹکا تھا۔ میرا پہلو الامان پکار اٹھا۔ پھر جھٹکے پر جھٹکا لگنے لگا۔ گاڑی زلزلوں کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ مجھ پر غنودگی غالب آنے لگی۔ وہی غنودگی جس کا تعلق میرے پہلو سے اٹھنے والی شدید ٹیسوں سے تھا۔ میں نے

ڈوبتے ذہن سے سوچا یہ کیسی غنودگی ہے جو دو سے اور گہری ہو جاتی ہے۔۔۔؟ دور کہیں عقب میں ابھی تک فائر گونج رہے تھے۔

آخر میں نے خود کو ایک آرام دہ مسہری پر پایا۔ یہ ایک وسیع کمرا تھا۔ چھت کافی بلند تھی۔ دیواروں پر نقش و نگار تھے اور جس پلنگ پر میں دراز تھا وہ بھی جہازی سائز کا ایک منقش پلنگ تھا۔ کمرے کی آرائش و زیبائش دیکھ کر جو پہلا خیال ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ میں شہر سے دور کسی جاگیردار یا وڈیرے کی حویلی میں ہوں۔ اونچی محرابی کھڑکیوں میں رنگ دار شیشے تھے اور ان سے چھن چھن کر آنے والی روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ شام ہو رہی ہے یا صبح ہونے والی ہے۔ اس کے باوجود کمرے میں سردی نہیں تھی۔ غالباً میرے پلنگ کے بالکل پاس سرہانے کی طرف انگیٹھی یا ایسی ہی کوئی چیز دہک رہی تھی۔ میں نے سر کو حرکت دی تو اندازہ ہوا کہ گردن پر ایک موٹی پٹی ہے۔ ایکا ایکی گزرے ہوئے تمام واقعات یاد آ گئے۔ میرا بایاں ہاتھ آپوں آپ پہلو پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی پٹی موجود تھی۔ ہاتھ کو حرکت دینے سے مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں دواؤں کی بو تھی۔ یہ دوائیں شاید میرے پاس تپائی پر رکھی تھیں۔ میرے جسم پر جیل کے لباس کی جگہ نیلی شلوار قمیص تھی۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں اور اس دوران مجھ پر کیا بیتی ہے۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ایک نرم خدوخال والی نرس بلی کی چال چلتی آئی اور اس نے بڑے پیار سے میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹھونس دیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ میری نبض دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا جیسے کسی اسپتال میں ہوں۔ میرا معائنہ کرنے کے بعد نرس نے چارٹ پر کچھ نوٹ کیا اور اونچی ایڑی پر کولہے مٹکاتی باہر نکل گئی۔ اس کی بے آواز چال سے بھی مجھے پتا چلا کہ فرش پر دبیز قالین ہے۔ میری زخمی گردن نے جہاں تک اجازت دی میں آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اچانک سامنے کا دروازہ بے آواز کھلا اور ایک درمیانی عمر کا شخص بڑی متانت سے چلتا ہوا میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس کے جبڑے چوڑے اور خدوخال سخت تھے لیکن چہرے پر بڑی نرم مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ وہ بڑی نفیس شلوار قمیص میں تھا۔ کندھے پر گرم چادر، پارس میں کسیا اور سپید ہاتھوں میں بیش قیمت انگشتریاں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر میں کسی وڈیرے خنزیرے کی حویلی میں ہوں تو وہ وڈیرا یہی ہے۔ اس شخص

کے عقب میں مجھے جو چیز۔۔۔ بلکہ چیزیں نظر آئیں وہ زیادہ حیران کن تھیں۔ یہ دو عدد دیو نے تھے۔ ہلکی سرخ دھاری دار وردیوں میں ملبوس انہوں نے اپنے کولہوں سے ہولسٹر لٹکا رکھے تھے۔ ہولسٹروں میں ننھے منے ریوالوروں کے نقرئی دستے چمک رہے تھے۔ ان کالے بھجنگ بونوں کی آنکھیں زرد تھیں۔ صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں کسی دوسرے ملک سے امپورٹ کیا گیا ہے۔ میں نے جاگیرداروں کے بڑے عجیب عجیب شوق دیکھے ہیں لیکن ایسا شوق پہلی بار ملاحظہ کر رہا تھا۔

قیمتی انگشتریوں والا سرخ و سپید شخص بڑی آہستگی سے میرے سرہانے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹھگنے باڈی گارڈ کرسی کی دونوں جانب چوکس کھڑے ہو گئے۔ وہ ملائمت سے بولا۔ "میرا نام آغا قادر زمان ہے۔ میں یہاں کا زمیندار ہوں۔ تم اس وقت میری زمینوں پر ہو۔"

"کون سی جگہ ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"تم ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ بہتر ہے کہ مکمل آرام کرو۔ میں اس وقت صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ یہاں تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ایک نرس اور ایک ملازمہ ہر وقت خدمت کے لئے موجود ہوگی۔ ڈاکٹر رحمان بھی تمہیں گاہے بگاہے دیکھنے کے لئے آتا رہے گا۔ بے شک تمہارے ذہن میں کچھ سوال ابھر رہے ہوں گے لیکن میری درخواست ہے کہ ان سوالوں کے جواب کے لئے تھوڑا سا انتظار کرو۔ تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن حلق میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ آغا قادر زماں نے اپنے ملائم میٹھے لہجے میں چند مزید باتیں کیں اور اپنے محافظوں کے ساتھ باہر نکل گئے۔ اس کے جاتے ہی نرس ایک بار پھر میرے گرد چکرانے لگی۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کو میں بلاجھجک حسینۂ عالم کہہ سکتا تھا بشرطیکہ مقابلۂ حسن میں صرف جسم کی موزونیت اور کشش کے معاملات دیکھے جاتے۔ وہ موٹے نقوش اور قدرے سانولے رنگ کی ایک نہایت متناسب الاعضاء لڑکی تھی۔ قد، کمر، شانے، گردن، ہر حصہ جیسے بین الاقوامی معیاروں کے عین مطابق ترشا ہوا تھا اوپر سے اس کی چال۔ کچھ ایسی مستانی اور بہکی ہوئی تھی کہ دیکھ کر دل تنتیس چونتیس ہونے لگتا تھا۔ یاالٰہی یہ سر منڈواتے ہی کیا افتاد آن پڑی۔ میں نے گھبرا کر سوچا۔ یہ لڑکی واقعی اتنی فٹ فاٹ ہے یا ان چار برسوں کا قصور ہے جو میں جیل کی ویران تاریکی میں جھونک آیا ہوں۔ بڑی بکھیڑے والی بات

تھی۔ اس دگرگوں حالت میں یہ لڑکی خواہ مخواہ میری دھڑکنیں زیر و زبر کرنے اس کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے میرے سرہانے رکھی انگیٹھی میں مزید کوئلے ڈالے۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کئے اور ساٹھ واٹ کا بلب جلا دیا۔ اس کا مطلب تھا رات ہو رہی ہے۔ تب اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا اور نیم باز آنکھوں سے بولی۔ "صیب جی۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے آواز میں مٹھاس سمیٹ کر پوچھا۔

"پیشاب وشاب کا معاملہ ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں دروازے پر ہی بیٹھی ہوں۔"

"رحمت تیرے کی۔" میں نے دل میں سوچا۔ "سارا مزا کرکرا کر دیا؟"

بعد کے چھ روز ان ہی دونوں عورتوں کے درمیان گزرے۔ بس ایک آدھ بار ڈاکٹر رحمان آیا اور چارٹ وغیرہ دیکھ کر چلا گیا۔ وہ ایک سیدھا سادا ڈاکٹر تھا، جس کے چہرے ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے انتہا قابل ہونے کے باوجود یہاں کے کرتا دھرتا آغا قادر زمان سے بے حد خوف کھاتا ہے۔ نرس شکیلہ ایک روایتی نرس تھی۔ وہ ہر وقت تنے رہتی تھی۔ شاید اس کی انسٹرکشنز۔۔۔ ہی ایسی تھیں۔ اس کمرے میں میری دلبستگی کا واحد سامان نجو تھی۔ نجمہ پروین عرف نجو وہی آفتِ جاں تھی جو آغا قادر زمان کی طرف سے میری خدمت گزاری پر مامور کی گئی تھی۔ وہ بڑی بانکی چھیلی لڑکی تھی۔ اپنے آپ سے ہوشیار، اپنے گرد و پیش سے باخبر رہنے اور اپنے فرائض سے آگاہ۔ میں پہلے دن ہی تاڑ چکا تھا کہ اگر مجھے اس حویلی اور یہاں کے باسیوں کے بارے میں کچھ جاننا ہے تو مجھے نجو کو شیشے میں اتارنا ہوگا۔ اپنی اس کوشش میں میں ساٹھ فیصد تک کامیاب ہوا تھا۔ اگر گردن تین چار انچ اور حرکت کر سکتی تو شاید کامیابی کا تناسب بڑھ جاتا۔ بہرحال اتنا تو ہو ہی گیا تھا کہ نجو آلا بالا ٹال کر میرے پاس آ جاتی تھی اور نرس کی غیر موجودگی میں نہ صرف میری مسکراہٹوں بلکہ سوالوں کا جواب بھی دیتی تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

میں اس وقت بھکر سے کوئی سو میل دور ایک جاگیردار آغا قادر زماں کی زمینوں پر تھا۔ آغا قادر زماں بڑا تگڑا زمیندار جاگیردار تھا۔ اس کے جلال کا معمولی سا اندازہ اس حویلی سے ہوتا تھا جو کوئی چار ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور ہنوز اس کی تعمیر جاری تھی۔ اس حویلی میں بجلی پانی کا سارا انتظام اپنا تھا بلکہ حویلی کے ایک حصے میں چھوٹا سا اسپتال بھی قائم تھا جس

میں آپریشن تھیٹر کی سہولت موجود تھی۔ میرا آپریشن اسی اسپتال میں کیا گیا تھا۔ نجو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں لایا گیا ہوں۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ پچھلے ہفتے بدھ کی رات جاگیردار قادر زمان کا ملازم خاص فلک شیر مجھے جاگیر میں لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ تین بندے اور بھی تھے انہوں نے مجھے ایک وگین سے اتار کر سیدھا اسپتال پہنچا دیا تھا۔ میں اس وقت بے ہوش تھا۔ نجو کا ذاتی خیال تھا کہ میں جاگیردار جی کا کوئی کارندہ ہوں جو کسی پھڈے میں زخمی ہو گیا ہے۔ میں نے اس حویلی کے دوسرے باسیوں کے بارے میں جاننے کی بہت کوشش کی لیکن نجو اس بات پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ بہت محتاط اور چوکس لڑکی تھی۔ حویلی کے بارے میں اس نے صرف اتنا بتایا کہ میں اس وقت حویلی کے مہمان خانے میں ہوں۔ حویلی کی اصل عمارت یہاں سے کوئی سو گز دور ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کو کھسکتا رہا۔ کھڑکیوں کے رنگین شیشوں پر صبح اور شام باری باری آ کر دستک دیتے رہے۔ میرے زخموں کا معقول علاج ہو رہا تھا اور خوراک بھی مناسب تھی۔ میں تیزی سے صحت یابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نجو، شکیلہ، ڈاکٹر رحمان اور گیٹ پر کھڑے ایک دراز قد پہریدار کے علاوہ مجھے کوئی پانچواں شخص وہاں نظر نہیں آیا۔ جس گیٹ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ مجھے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا تھا اور اس کے بارے میں نجو نے بتایا تھا کہ یہ حویلی کے مہمان خانے کا گیٹ ہے۔ بعض اوقات تو مہمان خانے کے در و دیوار پر ایسا گہرا سناٹا چھا جاتا تھا کہ شبہ ہوتا شاید میرے علاوہ کوئی موجود ہی نہیں۔ ہر روز میں سوچتا تھا کہ شاید آج قادر زماں صاحب میری مزاج پرسی کے لئے تشریف لائیں اور یکسانیت کے اس عذاب سے نجات کی کوئی راہ نکلے۔ مگر یہ امید بر نہ آئی۔ پہلے دن کی ملاقات کے بعد وہ جیسے مجھے بھول ہی گئے تھے۔ مجھے اس کمرے میں اب چودہ دن ہو گئے تھے اور ہر لحظہ گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر نجو کی صورت میں تازہ ہوا کے جھونکوں کی آمد و رفت نہ ہوتی تو شاید میرا دم گھٹ جاتا۔ میرے ذہن میں سوالوں کا ایک انبار لگ چکا تھا اور بے خبری بوجھ بن کر میرا ٹینٹوا دبا رہی تھی۔ آغا قادر زمان کون تھے؟ میں اس تک کیسے پہنچا؟ جیل کی ایمبولینس پر حملہ کرنے والے کون تھے؟ اس تصادم کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس حویلی میں میری حیثیت کیا ہے؟ قانونی لحاظ سے میری پوزیشن کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر سوال پھانس بن کر دماغ میں دھنسا ہوا تھا ——— جیل میں پیش آنے

والے واقعات کا مسئلہ بھی ذہن کو الجھائے رکھتا تھا۔ گمنام خطوط لکھنے والا کون تھا؟ اور وہ کون لوگ تھے جو مجھے مارنا چاہتے تھے؟ کیا وہ لوگ اب بھی میری تلاش میں تھے؟ اور کہیں میں اس وقت ——— ان ہی کے نرغے میں تو نہیں؟ یہ آخری سوال سب سے بڑھ کر پریشان کن اور تکلیف دہ تھا۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس پکار پکار کر ایک اعلان کر رہی تھی۔ یہ اعلان میرے لئے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں تھا۔ کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ماضی جسے میں دفنا چکا ہوں' جسے میں اس کی تمام ہنگامہ آرائیوں اور خونچکانیوں سمیت دفن کر چکا ہوں' تمام حسرتوں' تمناؤں' مسرتوں' شادمانیوں' کامرانیوں اور شکستوں سمیت گاڑ چکا ہوں ——— پھر زندہ ہونے والا ہے ——— وہ تمام روز و شب وہ تمام شہر و بن' تمام بستیاں اور تمام لوگ' تمام حادثے اور تمام معرکے پھر عدم سے وجود میں آنے والے ہیں۔ وہ سب کچھ ہونے والا ہے جو ہو تا رہا ہے۔ کوئی نادیدہ ہاتھ پھر میری رگ جاں میں حالات کے تیر پرونے والا ہے۔ کوئی نامہرباں ساعت پھر مجھے صدیوں کے گرداب میں پھینکنے والی ہے۔

جب ایسے خیال ذہن پر یورش کرتے تو میں کانپ اٹھتا۔ میری آنکھوں میں تین برس کا منظر گھوم جاتا جب میری بہن میری زندگی کا حاصل شفتا آخری بار مجھے سیشن کورٹ میں ملی تھی۔ اس روز مجھے کوٹ لکھپت جیل سے ایک پیشی کے سلسلے میں لایا گیا تھا۔ میں نے جیل کے ایک مقدم کو گھونسہ مار کر اس کے دو دانت توڑ دیے تھے۔ مقدم طویل قید کاٹنے والا قیدی ہوتا ہے۔ اسے ایک وردی دی جاتی ہے اور کچھ مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مقدم نے ایک نو عمر قیدی پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ مشقت کے دوران اسے بری طرح مارتا تھا اور رشوت طلب کرتا تھا۔ تہی دست قیدی کو لواحقین سے جو کچھ ملتا مقدم کو دے دیتا پھر بھی اس کی جان نہیں چھوٹتی تھی۔ ایک روز میں نے اس مقدم کو قیدی سے نہایت گندی زبان استعمال کرتے سنا۔ میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا تو بات بڑھ گئی۔ میرے ایک زوردار مکے نے اس کے دو دانت توڑ دیے۔ مقدم کے ایک قد آور ساتھی نے مجھے عقب سے دبوچنا چاہا تو میں نے گھوم کر اس کی گردن پکڑ لی۔ سپاہیوں نے مجھے چاروں طرف سے دبوچ لیا۔ مجھ پر مار پٹائی کا کیس بنا اور عدالتی کارروائی کے بعد میری قید میں ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا یعنی ایک برس کاٹنے کے باوجود میری قید بارہ برس

ہی رہی۔ اس روز عدالت میں شفتا نے سیاہ برقع کی نقاب اٹھا کے بڑی حسرت سے میرا چہرہ دیکھا تھا اور کہا تھا۔ "آپ کو کیا معلوم' یہ سال کیسے کٹا تھا؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شفتا کا وہ فقرہ میرے دل میں ترازو ہو گیا تھا۔ بعض فقرے ایسے ہی کایا پلٹ اور بعض ساعتیں ایسی ہی انقلاب آفریں ہوتی ہیں۔ میں شفتا کے ان لفظوں میں بھری ہوئی مایوسی اور دل گرفتگی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں سراپا پسینے میں نہا گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا کہ اب میں پہلے والا شاہ جہاں نہیں رہوں گا۔ میں وہ شاہ جہاں بنوں گا جس کے شفتا نے خواب دیکھے ہیں۔ جس کی چاہت میں وہ ایک مدت سے کانٹوں پر لوٹ رہی تھی۔ جسے سزائے موت سے بچانے کے لئے اس نے اپنی ان گنت راتیں مصلے پر بیٹھ کر کاٹ رہی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا میں شفتا کی توقعات پر پورا اتروں گا۔ یہ قید و بند میں نے اسی کے لئے توقبول کی تھی ورنہ کون مائی کا لال تھا جو مجھے ان سلاخوں کے پیچھے پہنچاتا؟ کس کو اتنی توفیق تھی۔ جو کام بڑے بڑے شہ زور نہ کر سکے وہ اس نازک لڑکی نے کیا تھا۔ اب اسی شفتا کی روتی ہوئی آنکھیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں قید کے یہ بارہ سال سر جھکا کر اور انگارہ دل بجھا کر کاٹ دوں۔ اپنے منہ زور جذبوں کو اپنے اندر دفن کر دوں اور کوئی ایسا کام نہ کروں جس کے بعد پھر میری شفتا کو کیلنڈر کی طرف دیکھ کر اشک بار ہونا پڑے۔ اس روز میں نے شفتا سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ بھی مجھ سے ملنے نہ آئے اور میرے بچے کھچے خیر خواہوں کو بھی بتا دے کہ وہ مجھ سے ملاقات کی زحمت نہ کریں۔ اب میں اپنے پیاروں کو اپنی شکل اسی وقت دکھاؤں گا جب بارہ سال بامشقت کی یہ بھاری گٹھڑی میرے سر سے اتر چکی ہوگی۔

اس روز میں نے خود سے جو عہد کیا تھا اس پر اب تک حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر بدل لیا تھا۔ جیل کے خود سر' ہتھ چھٹ اور اکھڑ کینوں کے درمیان رہ کر ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر میں نے کیا تھا ——— میری خواہش تھی کہ جب میں جیل سے نکلوں تو اندر یا باہر سے میری مکمل صفائی ہو چکی ہو لیکن ——— لیکن اب اپنی ساعت میں یہ پراسرار صدائیں کیا اعلان کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی لحد ماضی کی مٹی میں جنبش کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ یہ قیامت سے پہلے کون زندہ ہونے والا تھا؟

یکایک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ نجو موتی سائن کی سرخ پھولدار قمیص اور سفید شلوار پہنے خوبصورت چال چلتی اندر آ گئی۔ اس کا جسم ہر حرکت کے ساتھ شاعری کرتا محسوس ہوتا تھا۔ اس شاعری سے صرف نظر کرتے ہوئے میں نے نگاہیں اس کے ہاتھوں پر جما دیں۔ ان میں ٹرے تھی اور ٹرے میں دوپہر کا کھانا۔ مرغ مسلم کی اٹھی ہوئی ٹانگ دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ گرم گرم تندوری روٹیاں' سلاد کے ہرے ہرے پتے' ٹماٹر کی سرخی اور پیاز کے چھلے۔ زیادہ دلفریب نظارہ سوئٹ ڈش کا تھا۔ آج وہ ظالم فرنی لئے آ رہی تھی اور فرنی بھی وہ جس پر پستہ جما تھا۔ میں نے رال ٹپکا کر گاؤ تکیے کا سہارا لیا۔ وہ قریب چلی آئی۔ سب سے دلفریب نظارہ وہ ہوتا تھا جب وہ جھک کر ٹرے میرے سامنے ریشمی لحاف پر رکھتی تھی۔ میری نظر دسترخوان سے اٹھتی تھی تو گریبان میں جا الجھتی تھی اور پھر دائیں بائیں مچلنے لگتی تھی۔ ایسے میں ایک آدھ گرم گرم فقرہ بھی ہو جاتا تھا ——— لیکن آج تو نظر کا راستہ مسدود تھا۔ اس نے سرخ دوپٹہ بڑی دور اندیشی سے اوڑھ رکھا تھا۔ تب میری نگاہ اس کے چہرے پر گئی اور اندازہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ اس وقت کوئی آٹھ پہر بعد دکھائی دی تھی۔ ناشتا اور رات کا کھانا نرس شکیلہ نے مجھ تک پہنچایا تھا۔

"کیا بات ہے سوہنیو!" میں نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ میں نے یہ رویہ منصوبہ بندی کے تحت اپنا رکھا تھا۔ اس کی پلکیں تھرائیں اور کھانا رکھ کر جلدی سے سیدھی ہو گئی۔

"کسی سے کوئی مارا ماری ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔ وہ پھر بھی خاموش رہی۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

وہ وحشی ہرنی کی طرح دائیں بائیں دیکھنے لگی پھر بولی۔ "چھوڑیں سیب جی کوئی دیکھ لے گا۔"

"تو پھر بتاؤ کیا بات ہے؟"

"اچھا جی ——— میں ——— رات کو آؤں گی۔ جب باجی شکیلہ سو جائے گی۔" اس کا اشارہ نرس کی طرف تھا۔

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا وہ جلدی جلدی کمرے کی چیزیں درست کرنے کے بعد باہر چلی گئی۔

معلوم نہیں کیا بات تھی جو وہ پھلجھڑی بجھی ہوئی دیا سلائی نظر آ رہی تھی۔ رات کا کھانا دیتے ہوئے بھی وہ بالکل لئے دیئے رہی۔ رات نو بجے کے بعد میں دیر تک انتظار کرتا رہا۔ مگر اس نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ اگلے روز بھی سارا دن یہ جدائی برقرار رہی۔ شام کو میں نے نرس شکیلہ سے پوچھا تو

اس نے کہا کہ اسے نزلہ بخار ہو گیا تھا ابھی آئی ہے۔

میں نے کہا۔ "ذرا بھیجو تو۔ یہ تکیے کا غلاف اتنا میلا ہو رہا ہے۔ اسے ہی بدل ڈالے۔"

نرس نے "اچھا" کہا اور باہر نکل گئی۔

کوئی دس منٹ بعد وہ شعلہ بدن' غنچہ دہن سیاپے دار چال چلتی اندر آ گئی۔

"جی صیب جی۔"

"نیک بی بی' ذرا پاس آ ــــ اتنی دور کھڑی ہے' میں کھا جاؤں گا؟" اس نے ہونٹوں کو عجیب انداز میں جنبش دی اور قریب آ گئی۔ میں نے کہا "میرے کمنوں! کچھ تو بتاؤ۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیوں یوں تماشہ جایا ہوا ہے؟"

"بس جی یو تھا ہی ایسا ہے۔"

"معاملہ کیا ہے بتائے گی نہیں؟"

وہ خاموش کھڑی رہی۔ اچانک قدرت نے میری مدد کی۔ بتی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے پکڑا اور سامنے رضائی پر گرا لیا۔ "ہائے میں مرگئی" وہ تڑپی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے دونوں بازوؤں سے اسے جکڑ لیا۔ اس کے دلکش گداز جسم کا سارا بوجھ میری ٹانگوں پر تھا۔

"ہاں بلیک بیولی! بتائے گی نہیں کیا بات ہے؟"

"خدا کے لیے چھوڑ دیں۔ باجی شکیلہ آ جائے گی۔"

اتنے میں سچ مچ نرس کی آواز آئی۔ "نجو دیکھو ذرا۔ ٹیبل کے نیچے لالٹین رکھی ہوگی۔ وہ جلا دو۔"

نجو پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "اچھا باجی۔ میں ڈھونڈ رہی ہوں ــــ ابھی جلاتی ہوں۔"

آواز دبا کر وہ پھر مجھ سے ترلا کرنے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ کوئی دیکھ لے گا میں نے کہا "ایک ہی شرط ہے۔ مجھے بتاؤ کہ چپ شاہ کا روزہ کیوں رکھا ہوا ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اچانک اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یکدم بے حد سنجیدہ ہو گئی ہے۔ میں نے بھی اس کے جسم سے اپنی گرفت ختم کر دی۔ وہ آہستگی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے اس کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے مگر لگتا تھا وہ مجھ پر کوئی اہم انکشاف کرنے والی ہے۔

"ہاں ــــ کہو نا کیا بات ہے؟"

اس کی سہمی سہمی عجیب سی آواز آئی۔ "صیب جی' صیب جی ــــ آپ یہاں سے چلیں جائیں۔ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔"

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ "کیسا خطرہ۔ کون ہے دشمن میرا؟"

اس نے اپنی سرد انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ "آہستہ بولیں جی۔ یہ دیواریں بڑی چغل خور ہیں ــــ آپ اس سرّان جوگی حویلی کو نہیں جانتے۔ نہ ہی میں آپ کو کچھ بتا سکتی ہوں۔ بس آپ کو جان پیاری ہے تو ــــ" اس کا گلا رندھ گیا وہ جلدی سے اٹھ کر جانے لگی تو پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اتنے میں نرس شکیلہ کی آواز آئی۔

"نجو لالٹین نہیں ملی؟"

"نہیں جی۔" نجو نے گھبراہٹ میں کہا۔

"اچھا رہنے دے۔ کوئی موم بتی ڈھونڈ لے۔ جنریٹر خراب ہو گیا ہے۔ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی بتی ــــ میں ذرا ڈاکٹر رحمان کی طرف جا رہی ہوں۔"

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ نرس کے بعد اب نجو کے پاس اٹھ بھاگنے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔ میں نے اسے گھیر کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اس خطرے کی نوعیت جاننے کی کوشش کرنے لگا جس سے وہ مجھے آگاہ کر رہی تھی۔

یہ ایک طویل کوشش ثابت ہوئی۔ آخر میں نجو کے پتھر کو موم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گہری تاریکی میں پلنگ کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس نے کھوئے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

"صیب جی' مجھے بتائیں۔ کوئی گبھرو کتنا بھی زور آور ہو کتنا بھی وڈے دل کا ہو۔ ہوتا تو بندہ ہی ہے نا۔ اسے شکاری گھوڑوں کے آگے جنگلی سؤر کی طرح بھگایا جائے تو وہ کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔ کہاں تک چھپ سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "کس نے بھگایا تھا اسے؟ کس نے بھگایا تھا؟"

وہ بولی "میرے ماں جائے کو۔ میرے بھائی ولایت علی کو۔ جاگیرداروں نے بھگایا تھا اور وہ پسلا بندہ تھوڑا ہی تھا اور نہ ہی آخری تھا۔ یہاں تو پتا نہیں کب سے ایسا ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

"کیا کیا تھا تیرے بھائی نے؟" مجھ پر حیرانی غالب آتی جا رہی تھی۔

"کچھ کرنا ضروری تو نہیں ہوتا نہ۔ میرے ویر نے بھی کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے میلے میں کبڈی کھیلتے ہوئے جاگیردار کے بھتیجے سے خود کو چھڑا لیا تھا۔ صیب جی اس میں ولایت کا کیا قصور تھا۔ اس نے تو بیدار بخت کو کبڈی کھیلنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ تو کھیڈ تھی اور کھیڈ میں سب کچھ ہوتا

ہے۔ اس دن سے بیدار بخت نے میرے ویر کو اپنا دشمن سمجھ لیا ــــ آخر ایک دن اس پر الزام لگ گیا کہ اس نے ماسٹر رسید کی کڑی کو کھیتوں میں خراب کیا ہے ــــ جاگیرداروں نے اسے پکڑ لیا۔ اسے بیلے کی کی سزا ہوئی۔ بیلے کی سزا کا آپ کو نہیں پتا صیب جی" نجو سسک اٹھی۔ دس بارہ سیکنڈ چپ رہ کر بولی "جاگیرداروں نے جسے پانی پلا پلا کر مارنا ہوتا ہے اسے بیلے کی سزا دیتے ہیں ــــ اس بدنصیب کو بیلے کے گھنے درختوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور جاگیردار اپنے بندوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ شام سے پہلے پہلے اگر وہ اسے مار لیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا ہے ــــ"

میں بے پناہ حیرت سے یہ روداد سن رہا تھا "تو کیا۔ تیرا بھائی ــــ؟"

"جی صیب جی! وہ مارا گیا۔ اسے مرنا ہی تھا۔ ہمیں پتا ہے اللہ بھی ان کو معاف کرتا ہے جنہیں جاگیردار معاف کر دیتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک چال ہے لوگوں کو دھوکا دینے کی۔ جاگیرداروں کی مرضی کے بغیر اس بیلے سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اگر کوئی بچ سکتا تو میرا ویر ضرور بچتا۔ وہ شیر تھا صاحب جی۔ وہ ہتھ چوڑی چھاتی اس کی' اچا لمبا بادامی آنکھوں والا۔ بڑا چھولا تھا وہ۔ کبڈی کھیلتا تھا تو نظر ہی نہیں ٹکتی تھی اس پر۔ اٹھاراں سال کا تھا۔ انیسواں ابھی چڑھا نہیں تھا ــــ"

ایک بار پھر نجو کی آواز رندھ گئی اور وہ اس جوان مرگ کی یاد میں آنسو بہانے لگی۔

میں نے کہا۔ "کیا یہاں کے لوگ اس بات پر احتجاج نہیں کرتے؟"

"احتجاج ــــ یہ کیا ہوتا ہے صیب جی؟"

نجو نے میرے سوال کا بڑا مفصل جواب دیا تھا۔ میں گنگ کر رہ گیا۔ "احتجاج کیا ہوتا ہے" دنیا کے اکثر مظلوموں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ احتجاج کیا ہوتا ہے۔

اچانک مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا۔ میں نے پوچھا "نجو تو ــــ تو ان باتوں سے ــــ مجھے کیا بتانا چاہتی ہے؟"

نجو اندھیرے میں عجیب انداز سے میری جانب دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں سے التجا بھری صدا نکلی "صیب جی تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس کے الفاظ بہت کچھ سمجھا رہے تھے مجھے۔ میں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "نجو! کہیں تیرا مطلب یہ تو نہیں کہ مجھے بھی ان حالات سے واسطہ پڑنے والا ہے۔"

یکایک اس نے میرا بازو تھام لیا اور سر ٹکا کر سسکنے لگی۔ اچانک بتی آ گئی کمرے کی آدھی رات چمکتی دوپہر میں بدل گئی۔ کرنٹ جیسے بلب کے ساتھ ہی میرے جسم میں بھی آ گیا تھا۔ نجو بدک کر مجھ سے جدا ہوئی اور لالٹین کو الماری میں ختم یود کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں غائب ہو گئی۔

نجو نے جو کچھ بتایا تھا وہ نامکمل ہونے کے باوجود مکمل تھا۔ کچھ کڑیاں گمشدہ ضرور تھیں مگر اس سے صورت حال کی ایک دھندلی سی تصویر میری آنکھوں کے سامنے بن گئی تھی۔ اب اس بات میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ میں واقعی اپنے دشمنوں میں ہوں۔ میری جو دیکھ بھال اور خاطر داریاں ہو رہی ہیں وہ وقتی ہیں اور عنقریب مجھے کسی سخت امتحان میں ڈالا جانے والا ہے۔ نجو نے بیلے کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ جاگیردار اپنے معتوب کو گھنے کے درختوں میں چھوڑ کر اس کے پیچھے گھوڑے لگا دیتے ہیں۔ یہ بات میرے حلق سے کچھ نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ شاید وہ کوئی سنی سنائی بات کر رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک آدھ بار کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہو جسے بڑھا چڑھا کر داستان بنا لیا گیا ہو۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ میں اچھے لوگوں میں نہیں ہوں اور مجھے مستقبل میں ان سے اچھائی کی توقع بھی نہیں کرنی چاہئے۔ غالباً میں ان کے لئے بہت زیادہ اہم بھی نہیں تھا۔ ورنہ اتنے دنوں میں کوئی تو میری خبر لیتا۔ مجھے صرف دو عورتوں اور دو مردوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

سوچتے سوچتے میری نگاہ کھڑکی کے باہر چلی گئی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ آج پہلی بار گیٹ پر دراز قد پہریدار نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید کہیں پیشاب وغیرہ کرنے گیا ہو گا لیکن آدھ گھنٹا گزرنے کے باوجود وہ دکھائی نہ دیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آس پاس موجود نہیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ کیوں نہ اس بہتری موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔ میرا تجربہ ہے کہ بعض اوقات طویل منصوبہ بندی کی بجائے آناً فاناً عمل کر گزرنے سے غیر متوقع کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے مجھے نجو نے یہاں سے فرار ہونے کی ترغیب دی تھی۔ فی الحال میں ان لوگوں کی نظر میں زخمی تھا اور وہ میری طرف سے زیادہ خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ آگے چل کر میری نگرانی کے انتظامات مزید سخت ہو جاتے۔ میں دو روز سے چپکے چپکے کمرے میں چل پھر کر دیکھ رہا تھا اور مجھے کافی افاقہ محسوس ہوا تھا۔ کم از کم میں ایک دو آدمیوں سے تو نمٹ

سکتا ہی تھا۔ آنا فانا میں ایک اہم فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے بستر چھوڑ کر چپل پہنی۔ پھل کاٹنے والی ایک دندانی دار چھری تپائی پر رکھی تھی میں نے رومال میں لپیٹ کر قمیص کے نیچے چھپالی۔ اب میرے پیٹ کی پٹی اتر چکی تھی صرف گردن پر روئی کا ایک پھبہ ٹیپوں سے چپکا ہوا تھا۔ کمرے کی بتی بجھا کر میں نے اندر ہی دو تین چکر لگائے اور ٹانگوں کو چالو کیا۔ پھر کمبل اوڑھا اور اللہ کا نام لے کر۔ آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نگاہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑی۔ یہاں سرنجیں، دوائیاں، تولیے وغیرہ رکھے تھے۔ ایک پلنگ بھی پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نرس کا کمرا ہے۔ نرس ڈاکٹر رحمان کی طرف گئی ہوئی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا۔ میں کمرا پار کر کے ایک جالی دار دروازے تک آیا اور اسے بے آواز کھول کر باہر آ گیا۔ غالباً پندرہ بیس روز بعد میں کھلی فضا میں پہنچا تھا۔ ہوا میں بے حد خنکی تھی۔ تاروں سے ڈھکا ہوا آسمان بتا رہا تھا کہ یہ ایک خالص دیہاتی علاقہ ہے۔ میں چپل کی آواز دباتا ایک دیوار کے سائے سائے لکڑی کے پھاٹک کی طرف بڑھا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے انداز بدلا اور بڑے عام طریقے سے تیز تیز چلتا ہوا باہر آ گیا۔ کمبل میں نے سر کے اوپر سے اوڑھ رکھا تھا اور بادی النظر میں مجھے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ نجو کے بیان کے عین مطابق مجھے کوئی سو گز کے فاصلے پر حویلی کی اندرونی عمارت نظر آئی۔ ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں اس کا ایک حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ حویلی جدید قدیم کا امتزاج تھی۔ اس کی وسعت کا اندازہ کم از کم یہاں سے کرنا ممکن نہیں تھا۔ پیشانی پر وہی معروف الفاظ لکھے تھے۔ ھذا من فضل ربی۔ کاش کوئی ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھ سکتا۔ میرے قدموں کے نیچے ایک کچا راستہ تھا جس پر اینٹوں کی سرخ کیری بچھی ہوئی تھی۔ راستے کے کنارے پھولدار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ بائیں جانب کوئی پچاس گز کی دوری پر ایک بہت بڑا آہنی گیٹ نظر آ رہا تھا۔ غالباً یہ ہی حویلی کا بیرونی گیٹ تھا۔ اس گیٹ کی جانب جانا حماقت تھی۔ تاہم مجھے گیٹ کی موجودگی سے اندازہ ہوا کہ حویلی کی بیرونی دیوار کس طرف اور کتنے فاصلے پر ہو گی۔ میں نے رخ پھیرا اور درختوں کے سائے سائے جنوبی سمت بڑھنے لگا۔ جلد ہی دیوار کے آثار نظر آئے۔ دیوار زیادہ بلند نہیں تھی۔ یہی کوئی آٹھ فٹ اونچی ہو گی۔ کوئی تو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میں یوں بہ آسانی یہاں سے فرار ہو سکتا ہوں۔ بہرحال آگے تو بڑھنا ہی تھا۔ چند گز اور نزدیک ہوا تو حوصلوں پر اوس سی پڑ گئی۔ دیوار کے اوپر

خاردار تاروں کی دو فٹ چوڑی باڑ نظر آ رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس میں کرنٹ بھی ہو۔

ابھی میں اس صورتحال پر غور ہی کر رہا تھا کہ نزدیک سے کوئی چیز اچھل کر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ بچ نکلنے کا موقع نہیں تھا۔ میرے سینے پر زوردار دھکا لگا اور میں لڑھکتا ہوا ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ کسی خونخوار کتے نے مجھ پر چھلانگ لگائی ہے لیکن یہ سوچ درست ثابت نہیں ہوئی۔ جو شے میری گردن سے لپٹ گئی تھی وہ کتے سے کہیں سخت جان اور زور آور تھی۔ اس کی گرفت میں میری زخمی گردن پس کر رہ گئی۔ پھر جو آواز اس آفت کے حلق سے برآمد ہوئی تھی وہ کسی کتے کی نہیں تھی۔ عجیب ڈراؤنی آواز تھی جیسے کئی بچے مل کر چلا رہے ہوں اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پیلی آنکھوں والے کسی وحشی بونے کی زد میں ہوں۔ وہ نامراد باؤلے بندر کی طرح میرے کندھوں پر سوار ہو کر گردن کو اپنی سڈول ٹانگوں میں جکڑ چکا تھا اور اب میرے بال کھینچ کھینچ کر کریہہ آواز میں چیخ رہا تھا۔ ابھی میں اس دھکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ اس بیر تسمہ پا کا ایک اور بھائی اندھیرے میں سے برآمد ہوا اور میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اس کے تیز نوکیلے دانت کھچا کھچ میری ران میں اتر گئے۔ بڑی قوت تھی کم بخت کے جبڑوں میں۔ تکلیف کی شدت نے میرے بدن میں چنگاریاں بھر دیں۔ میں پشت کے بل زمین پر گرا اور دوسری ٹانگ پوری قوت سے بونے کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ میرے کندھوں والا بونا بھی کمر پکڑ کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا میرے گرنے سے اس کی پشت سڑک کے کنارے سے ٹکرائی تھی۔ یہ کنارہ نوکدار اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ نتیجے میں بونے کی ریڑھ کی ہڈی "کڑک" ہو گئی تھی۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے ٹانگ پر حملہ آور ہونے والا بونا مجھ پر آ پڑا تھا میں نے ایک جھٹکے سے اسے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ ارادہ یہی تھا کہ سالے کو نوکدار اینٹوں پر دے ماروں لیکن اسی وقت دو بھاگتے ہوئے آدمی نظر آئے۔ ان میں سے اگلے کے ہاتھ میں ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ارادہ بدل کر بونے کو اس پر کھینچ مارا۔ ریوالور والے کی کراہ بونے کی کریہہ چیخ میں دب کر رہ گئی۔ میں پینترا بدل کر دوسرے شخص کو دبوچنا چاہتا تھا کہ اچانک عقب سے کوئی چار عدد افراد نے مجھے چھاپ لیا۔ ماں بہن کی گندی گالیاں میرے کانوں میں گونجیں اور ریوالور کی ٹھنڈی نال گردن سے آ لگی۔ ایک شخص نے ہاتھ بڑھا کر میرے نیفے سے پھل

نے والی چھری کھینچ لی۔ میں نے جیسے خود سے پوچھا "ہاں نی شاہ جہاں کچھ اور چلے گا یا بس۔" گردن کی ٹیسوں اور بے کی ٹانگوں نے شاہ جہاں کی ترجمانی کرتے ہوئے بہک تے زبان کو رس گایا "بادشاہو جان دیو۔" میں نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ لیے۔

مجھے دوبارہ کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اگلے روز کوئی دس بجے آغا قادر زماں کی صورت نظر آئی۔ اس وقت ڈاکٹر رحمان میری نئی اور پرانی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرنے کے بعد گیا ہی تھا۔ میں مسہری پر نیم دراز اپنے پیٹ کو سہلا رہا تھا جب السلام و علیکم کی آواز کانوں میں گونجی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ زماں صاحب اپنے وردی پوش بونے باڈی گارڈ کے ساتھ رو برو تھے۔ حسب سابق بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"سکھو جوان کیا حال ہے؟" انہوں نے ملائم لہجے میں پوچھا۔ رات والے واقعے کا کوئی اثر ان کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

"ٹھیک ہوں جناب" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سگار کا کونا توڑ کر انہوں نے اپنے سرخ و سپید ہونٹوں میں لگایا۔ ایک بونے نے جلدی سے آگے بڑھ کر امریکن لائٹر سے آگ دکھائی۔ وہ دھواں چھوڑ کر مسکرائے "جنیوا کنونشن کے قواعد سے فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔"

وہ سوال نظر انداز کر کے بولے "لیکن یاد رہے جنیوا کنونشن نے فرار کا حق صرف جنگی قیدیوں کو دیا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو آپ کی نظر میں قیدی ہوں۔ اس بات کا پتا مجھے ابھی چل رہا ہے۔"

"بہت خوب۔ تم قیدی بھی نہیں تھے اور فرار ہونے کی کوشش بھی کر رہے تھے؟"

"میں تو صرف چہل قدمی کے لئے نکلا تھا۔"

"ہوں" انہوں نے ایک لمبی آواز نکالی۔ "لگتا ہے تمہیں چہل قدمی کی عادت ہے۔ آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تھوڑی سی چہل قدمی کراتا ہوں۔"

"بصد شوق" میں نے بستر سے اترتے ہوئے کہا۔

زماں صاحب بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میں ان کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھا تو دونوں باڈی گارڈ بڑی ہوشیاری سے میرے عقب میں چلنے لگے۔ کمرے سے نکل کر ایک طویل راہداری میں داخل ہوئے۔ فرش بالکل صاف تھا اور دونوں طرف پلائی ووڈ کے منقش دروازے تھے۔ چلتے

چلتے زماں صاحب بولے۔ "تم نے رات مجھے میرے قیمتی محافظ سے محروم کر دیا۔ بیچارہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو گیا۔" میں سمجھ گیا کہ یہ اسی بونے کی بات ہو رہی ہے۔ رات جس کی کمر پر چوٹ لگی تھی۔

زماں صاحب نے کہا۔ "یہ بونے میں نے کینیا سے منگوائے تھے۔ تین چار بونیاں بھی ہیں۔ بچے دے رہی ہیں۔ دس بارہ سال میں اچھا خاصہ دستہ بن جائے گا۔ ویسے سارے بچے بونے نہیں ہوتے۔ کوئی کوئی ہوتا ہے۔"

بونوں کی بات وہ یوں کر رہے تھے جیسے کسی پالتو چیز کی بات کی جاتی ہے۔ راہداری میں چلتے ہوئے زماں صاحب ایک دروازے کے سامنے رکے تو ٹھگنے محافظ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ ایک قالین پوش زینہ طے کر کے میں نے خود کو ایک گیلری نما کمرے میں پایا۔ اس کمرے کی آرائش سے جاگیرداروں کی امارت کا برملا اظہار ہوتا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک سرخ پردہ نظر آ رہا تھا۔ پردے کی بالکل سامنے قطار میں کوئی چار عدد کرسیاں رکھی تھیں۔ دائیں جانب ایک خوبصورت الماری تھی اس میں درآمدی شراب کی بوتلوں کی پوری دکان سجی ہوئی تھی۔ الماری کے نیچے ایک خانے میں کچھ ہیڈ فونز وغیرہ پڑے تھے۔ ایک بات کی مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی۔ کرسیاں سرخ پردے کے بالکل قریب رکھی تھیں۔ اگر پردے کے پیچھے کوئی اسکرین وغیرہ تھی تو کرسیوں کو اتنا قریب رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال یہ معمہ تھوڑی دیر بعد حل ہو گیا۔ میں اور زماں صاحب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ٹھگنے محافظ ہمارے عقب میں چوکس ہو گئے۔ زماں صاحب نے اپنے مخصوص ملائم لہجے میں کہا۔ "تم فن حرب کے جادوگر ہو لیکن تمہارے پیچھے جو ڈنڈے پیر کھڑے ہیں ہر داؤ کا توڑ جانتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ جتنی دیر میں پلک جھپکتی ہے اتنی دیر میں ان کے ریوالور ہولسٹر سے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں اور ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔"

میرے اندر سے کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ "شاہ جہاں، تم کسی دلدل میں پھنسنے جا رہے ہو۔ یہ آغا قادر زماں کوئی معمولی شخص نہیں کوئی بہت گھنی شے ہے۔" اور یہ حقیقت تھی مجھے قادر زماں میں کوئی منفرد رنگ نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے چار سالہ دور آفت گری میں بڑے سورما دیکھے تھے لیکن اس شخص کی مسکراہٹ میں جو درندگی جھلکتی تھی اس کا نیا ہی ڈھنگ تھا۔ مجھ جیسا شخص بھی ان سے بات کرتے ہوئے ایک سنسناہٹ سی جسم میں محسوس کرتا تھا۔ آپ نے کبھی

کسی شخص کا بخار میں تپا ہوا چہرہ دیکھا ہے؟ بس ایسی ہی کیفیت ہر وقت آغا زماں کے چہرے پر طاری رہتی۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی اور ہونٹوں پر زہر خند۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور یہ امر اسے میرے لئے اور بھی خطرناک بناتا تھا۔

اس کے اشارے پر ایک ٹھگنے محافظ نے بڑی پھرتی سے میری کمر ایک پیٹی میں کس دی۔ یہ پیٹی اس نے جہاز کی نشست کی طرح کرسی کے پہلو سے نکالی تھی۔ کمرے کی بتی بجھا دی گئی۔ دوسرے محافظ نے سرخ پردے کی ڈوری کھینچی اور اپنی آنکھوں سے کوئی دو فٹ کے فاصلے پر مجھے ایک شیشہ نظر آیا۔ چار ضرب آٹھ کا یہ ہلکا رنگ دار شیشہ ایک کمرے کا منظر نظروں کے سامنے لے آیا۔ یہ درمیانے سائز کا چوکور کمرا پہلی منزل پر واقع تھا اور گیلری سے اس کا سامنے کا حصہ صاف نظر آتا تھا۔

پھر کمرے میں چند بلب مزید جلے۔ وہاں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ کمرے میں دو میزوں پر کوئی اشیاء پڑی تھیں جن کے بارے میں کوئی ٹھوس تجزیہ نہ کر سکا۔ ہمارے سامنے والے شیشے جیسا ایک اور شیشہ روشن کمرے کی دوسری جانب بھی نظر آ رہا تھا۔ شاید وہاں بھی کوئی گیلری تھی جس میں بیٹھ کر کمرے کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ اچانک ہمارے نیچے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت لڑکھڑاتی ہوئی اندر گری۔ خدا کی پناہ ___ میں سر تاپا کانپ گیا۔ یہ پچاس سالہ عورت کپڑوں کی قید سے آزاد تھی اور بری طرح چیخ و پکار کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک ایک قمیص تھی جسے خونخوار شکلوں والے چار بونے اس سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بوسیدہ قمیص پھٹ گئی اور بوڑھی عورت فرش پر گٹھڑی ہو کر اپنا آپ چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ آہ و بکا کر رہی تھی لیکن اس کی معمولی سی آواز بھی ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ غالباً وہ ہمیں دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ چار بونوں کے پیچھے چار بونے مزید داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور بوڑھی عورت سے وحشیانہ چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں یا یہ چھت پورے وزن کے ساتھ ہم پر آن گرے۔ خدا کی پناہ۔ کیا سفاکی تھی۔ کیسی حیوانیت تھی۔ ایک ایسی ہی عورت نے جاگیردار آغا زماں کو جنم دیا تھا اور شاید اب بھی اس کی ماں تھی۔ کیا یہ لوگ ہوش و حواس سے بالکل بیگانے ہو چکے ہیں؟ اندر ہی اندر کرب سے میرا وجود ریزہ ریزہ ہزارہا ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دونوں محافظ ریوالوروں پر ہاتھ رکھے پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ وہ جیسے کہیں بھی نہیں دیکھ رہے تھے اور ہر جگہ دیکھ رہے تھے۔ میری بدقسمت آنکھوں نے دیکھا، کمرے کے اندر بونوں نے بڑھیا کو اب چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں باریک آہنی سوئے تھے، سگریٹ تھے، ڈسپوزایبل سرنجیں تھیں، مجبور تھے۔ ایک ٹھگنے کے ہاتھوں میں پیتل کے پنجے تھے۔ وہ ان چیزوں سے بڑھیا کو بے پناہ تکلیف پہنچا رہے تھے۔ بیچاری کا جھریوں بھرا جسم لہو لہان تھا۔ وہ فرش پر تڑپ رہی تھی، اٹھ رہی تھی، گر رہی تھی، ہاتھ جوڑ رہی تھی، پاؤں پڑ رہی تھی مگر وہ ابلیس زادے اس کے گرد ناچ رہے تھے۔ ہوا میں قلابازیاں کھا رہے تھے۔ چیخ چیخ کر اور ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ بڑھیا بیچاری افریقہ کے کسی جنگل میں کسی آدم خور قبیلے کے ہتھے چڑھ گئی ہو اور وہ اسے دیگ میں ابالنے سے پہلے موت کا رقص کر رہے ہیں۔ میں نے کن انکھیوں سے جاگیردار کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی شیطانی مسرت تھی۔ ہونٹ ایک آسودہ مسکراہٹ کے زیر اثر کھنچے ہوئے تھے۔ وہ بالکل نارمل انداز میں سگار کے کش لیتا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں آئی کہ سب اندیشے بھول کر اس رذیل ترین انسان پر جا پڑوں اور اس کی گردن توڑ کر اس کا قصہ پاک کر دوں۔ مگر پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میں مکمل طور پر تاریکی میں تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا میں جس دلدل میں ہوں یہ کتنی گہری ہے، اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہے۔ میں اس میں کتنا دھنسا ہوا ہوں اور کیوں دھنسا ہوا ہوں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

آغا زماں نے بالکل عام سے لہجے میں کہا "وہ دوسری جانب شیشہ دیکھ رہے ہو نا۔ وہاں بھی ایسی ہی کرسیاں رکھی ہیں۔ جانتے ہو وہاں کون ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرایا "وہاں اس بڑھیا کا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ بہت لطف اندوز ہو رہا ہو گا۔"

میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے "بب... بڑھیا کا بیٹا؟"

"ہاں۔ یہ وہی پہریدار ہے جو رات تمہاری ڈیوٹی چھوڑ کر ماں کے پاس چلا گیا تھا اور تمہیں اکیلے چہل قدمی کا موقع مل گیا تھا۔"

آغا زماں کے لہجے میں طنز کا سمندر تھا ___ اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جس پہریدار کی وجہ سے

رات مجھے اپنے کمرے سے نکلنے کا چانس ملا تھا اسے سزا دی جا رہی تھی۔

میں نے پوچھا "یہ یہ عورت؟"

جاگیردار مسکرایا "تمہیں بتایا تو ہے۔ ماں ہے اس کی۔ بہر تو بکتا تھا ماں بیمار ہے۔ اسے دیکھنے چلا گیا تھا۔ بیمار تھا ایسے اچھل کود کر سکتا ہے؟ بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

جاگیردار کی باتیں میرے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل رہی تھیں۔ اوپر سے اس کا نرم ملائم لہجہ۔ بے حد گہرا شخص تھا یہ اور انتہا درجے کا سفاک بھی۔ مہمان نوازی کے انداز میں بولا "اگر اندر کی آوازیں سننا چاہو تو ہیڈ فونز موجود ہیں۔"

"جی نہیں شکریہ" میں نے لہجے میں بے پناہ نفرت سمیٹ کر کہا۔

اس کے ماتھے پر بل تک نہیں آیا۔ اسی اثناء میں کمرے کے اندر بدنصیب عورت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ وحشی بونوں کا کھیل ختم ہو گیا۔ انہوں نے عورت کے بازو پکڑے اور اسے چکنے فرش پر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ آغا زماں نے نیا سگار سلگا لیا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ ابھی کسی اور شخص کا تماشا بننا باقی ہے۔ اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک محافظ نے باہر سے کوئی چٹ لا کر آغا زماں کے ہاتھ میں تھما دی۔

چٹ پڑھنے کے بعد آغا زماں نے گہری سانس لی۔ بے دلی سے بولا "چلو یار جی! یہ کھیل ادھورا ہی رہ گیا۔ ابھی اس بڑھیا کی بہو کی انٹری بھی ہونا تھی۔ خیر ہوتا رہے گا یہ سب کچھ۔ آؤ ہم چلتے ہیں۔ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے مجھے۔"

میں حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ آغا زماں کے اشارے پر ایک بونے نے آگے بڑھ کر میری بیلٹ کھول دی۔

پہلے کی طرح آگے پیچھے ہم کمرے سے باہر نکلے۔ راہداری کے سرے پر پہنچ کر آغا زماں کو بائیں جانب مڑنا تھا۔ مڑنے سے پہلے وہ رک گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں بولا "اس بڑھیا کی جگہ تمہاری بہن بھی ہو سکتی ہے، اس کا ہونے والا شوہر بھی ہو سکتا ہے اور تم خود بھی ہو سکتے ہو۔ میرا خیال ہے تم کافی سمجھدار ہو۔ اب چہل قدمی کی کوشش نہیں کرو گے۔"

وہ مڑا اور ٹک ٹک ایڑی بجاتا راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ میں ٹھگنے محافظوں کے درمیان ساکت کھڑا تھا۔ زمین جیسے میرے قدموں کے نیچے سے نکل چکی تھی اور آسمان ٹوٹ ٹوٹ کر میرے کاسۂ سر پر گر رہا تھا۔ آغا زماں کے منحوس منہ سے نکلے ہوئے زہرناک الفاظ کالے ناگ بن کر میری سماعت میں پھنکار رہے تھے۔ ان کی پھنکار صورِ اسرافیل سے کم دہشت ناک نہیں تھی "اس بڑھیا کی جگہ تمہاری بہن بھی ہو سکتی ہے۔ بہن بھی ہو سکتی ہے۔"

میری بہن جس کے چہرے پر فرشتوں کا تقدس تھا جو ایک نظر دیکھنے سے میلی ہوتی تھی۔ اس بہن کو اس ننگِ انسانیت نے ایسی فحش گالی دی تھی۔ میں نے بے پناہ درندگی کے ساتھ ریوالور بردار بونوں کو دیکھا۔ اس لمحے یہ بونے مجھے کچھ اور بھی بونے نظر آئے۔ ایک ساعت کی دیر تھی کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح ان پر جا پڑتا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز بالکونی سے آئی تھی۔ ایک پہلوان نما شخص جس نے قمیص کے نیچے تہمد باندھ رکھا تھا طاقتور ایم جی رائفل کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا۔ شاید اس نے میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھے تھے۔ وہ پوری طرح چوکس نظر آ رہا تھا۔ غصیلے لہجے میں بولا۔ "بھاجی! ایدھر اودھر کی دیکھ دے او۔ چلو انیاں چھوٹیاں نال اپنے کمرے چے ٹر جاؤ۔ چلو شاباشے۔"

میں نے ایک قہرناک نظر اپنے قرب و جوار پر ڈالی اور ان چھوٹوں یعنی بونوں کے آگے آگے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے میں پہنچتے ہی دروازے کو مقفل کر دیا گیا۔ زیبی بانو بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آج واقعی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ڈربے میں ہوں۔

رات ہوتے ہوتے مجھے شدید بخار ہو گیا۔ پتا نہیں یہ گردن کے اس زخم کا قصور تھا جو کل رات لڑائی بھڑائی میں تازہ ہو گیا تھا یا پھر رنگ دار شیشے کی اوٹ سے میں نے انسانیت کی جو "عزت و تکریم" دیکھی تھی اس نے خون میں آتش گھول دی تھی؟ میرا پورا جسم پھنکنے لگا اور ٹمپریچر ایک سو پانچ تک چلا گیا۔ کوئی آدھ پہر میں ہوش و حواس سے تقریباً بیگانہ رہا۔ گاہے گاہے مجھے ڈاکٹر رحمان، زیبی بانو کی صورت خود پر جھکی نظر آتی۔ کبھی کبھی ماتھے پر پٹیوں کی ٹھنڈک بھی محسوس ہوتی۔ تیسرے روز صبح کے وقت میرے بخار میں کمی آئی اور میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا۔ ڈاکٹر رحمان نے بتایا کہ اب میری حالت کافی بہتر ہے۔ اس نے بخار کے لئے جو اینٹی بائیوٹک دی تھیں انہوں نے زخموں پر بھی اچھا اثر کیا تھا اور "بہیں" "کنٹرول" ہو گئی تھی۔ بہرحال اس نے مجھے چار پانچ

روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

اس کے بعد ڈیڑھ ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ میرے چاروں طرف بے خبری کا اندھیرا تھا اور دیواریں تھیں۔ حالات جوں کے توں تھے سوائے اس کے کہ میرے کمرے کے دونوں دروازے اب ہر وقت مقفل رہتے تھے اور جس وقت نرس شکیلہ یا نجو کمرے میں ہوتیں ایک رائفل بردار کھڑکی کے قریب فاصلے پر نظر آتا۔ یہ وہی پہلوان نما شخص تھا جسے میں نے چند روز پیشتر بالکونی میں دیکھا تھا۔ قادر زماں نے بھی اس دن کے بعد صورت نہیں دکھائی تھی شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ بقول شاعر۔

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

وہ میری جیل سے "رہائی" کا کوئی چھبیسواں دن تھا جب ایک روز صبح صبح ایک حجام میری خدمت میں حاضر ہو گیا۔ دیہاتی حجاموں کے برعکس وہ خاصا ماڈرن ثابت ہوا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح اور قینچی مشین کی طرح چلتی تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے میرے سر داڑھی اور مونچھوں کے خودرو جھاڑ جھنکاڑ کو کاٹ چھانٹ کر بڑی مناسب سی شکل دے دی۔ بعد ازاں میرے منع کرنے کے باوجود اس نے میرے بالوں پر ایک خاص قسم کا اسپرے کیا اور ساتھ ساتھ کنگھی کرتا رہا۔ یہ عمل اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار دہرایا۔ مونچھیں اور ابرو بھی اس اسپرے کی زد میں آئے۔ یہاں تک کہ ہاتھوں اور کلائیوں کے بالوں پر بھی اس نے وہی اسپرے کر دیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی اور حجام کی کاریگری کا معترف ہونا پڑا۔ اس کے دعوے کے عین مطابق میرے تمام بالوں میں ایک خاص طرح کی چمک آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں ایک ہلکا سا براؤن رنگ نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی سستے قسم کا بازاری کلر نہیں تھا بلکہ بالوں کا حصہ بن کر بالکل نیچرل ہو گیا تھا۔ میں اب ایک ہلکے بھورے بالوں والا شخص تھا جسے پنجابی میں "لکا بھورا" کہا جاتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ چہرے پر کوئی بھی تبدیلی لائے بغیر صرف بالوں کی تراش خراش اور ان کی رنگت بدلنے سے آدمی اپنی شباہت کس حد تک بدل سکتا ہے۔

حجام اپنے کام سے فارغ ہو کر گیا تو ایک گوری چٹی بھرے بھرے جسم والی پچیس تیس سالہ عورت کمرے میں آ گئی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ صورت سے ہی آفت کی پرکالہ لگتی تھی۔ وہ بڑی ڈیزائن دار پھنسی پھنسی شلوار قمیص پہنے تھی۔ دوپٹے کی جگہ اس کے گلے میں ڈوریوں والا فیتہ جھول رہا تھا۔ یہ فیتہ اس کا مکمل تعارف تھا۔ اس نے اندر گھستے ہی میرے تناور جسم کو گہری نظر سے دیکھا۔ بڑی تیکھی نظر تھی اس کی۔

"ادھر آؤ چوہدری صاحب۔ ذرا ناپ لے لوں۔" ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "آقا صاحب کہیں میری شادی تو نہیں کر رہے؟"

"بڑا شوق ہے آپ کو شادی کا؟" وہ میری چھاتی کا ناپ لیتے ہوئے بولی۔

"نہیں مجھے تو آم کھانے سے غرض ہے۔ شادی ضروری تو نہیں" میں جان بوجھ کر خود کو دل پھینک ظاہر کر رہا تھا۔

"بڑے شریر ہو جی تُسی" وہ اندر ہی اندر گھبرا کر بولی۔ اس کے ہاتھ میرے بدن پر گردش کر رہے تھے۔ پانچ منٹ اس نے میرا ناپ لیا اور کولہے مٹکاتی باہر نکل گئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر رحمان آیا۔ اس نے میری بدلی ہیئت دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اس میں کچھ تھا..... غالباً ڈبیا میں آئی لینز تھے۔ ڈاکٹر رحمان نے کہا

"یہ تمہارے بالوں سے میچ کریں گے۔ بالکل صحیح نمبر ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ لگانے کا طریقہ تو آتا ہی ہوگا۔"

میں نے ڈبیا لے کر غور سے دیکھا۔ سستے سے لینز تھے۔ بلکہ مجھے تو استعمال شدہ محسوس ہوتے تھے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یہ تجربہ کر چکا تھا۔ بے پناہ خارش ہوئی تھی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے ڈاکٹر رحمان سے معذرت کرلی کہ میں یہ نہیں لگاؤں گا اور مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر رحمان بولا۔ "ضرورت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ جاگیردار جی کو ہے اور یہ ان کی ہدایت ہے۔"

میں نے کٹیلے لہجے میں کہا "میں کسی کی ہدایات کا پابند نہیں ہوں اور آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں آخر مجھ سے؟"

ڈاکٹر رحمان نے میرا سوال مکمل طور پر نظرانداز کیا۔ "اچھا۔ میں ڈبیا یہاں رکھ دیتا ہوں۔ تم اس بارے میں جاگیردار صاحب سے بات کرلینا۔"

ڈاکٹر رحمان کی روانگی کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ معلوم نہیں یہ لوگ کیا چاہ رہے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ بھی تو بتایا نہیں گیا تھا۔ میں ایک قیدی تھا۔ چند ہفتے پہلے تک بڑی نیک نیتی سے اپنی قید کاٹ رہا تھا میں۔۔۔ اور اب بھی میری یہی خواہش تھی کہ میں جیل میں پہنچوں اور میری رہائی کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے جہاں سے ٹوٹا ہے لیکن حالات کے اشارے کچھ اور ہی نقشہ کھینچ رہے تھے۔ میں سوچتا رہا اور میرے ذہن پر وسوسوں کی یلغار شدید تر ہوتی گئی۔

یہ کیفیت کوئی ایک گھنٹے بعد نجو کی آمد پر ختم ہوئی۔ وہ شام کا کھانا لائی تھی۔ جیل میں رہ کر میری سونگھنے کی حس کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ نجو کے دروازہ کھولتے ہی مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کھانے کی ٹرے میں کیا کیا "حشر سامانیاں" ہیں۔ چاولوں کی خوشبو تو مجھے آج کل ساتھ والے گاؤں سے آ جاتی تھی۔ جونہی نجو قفل کھول کر اندر داخل ہوئی پہلوان نما رائفل بردار کھڑکی کے قریب ٹہلنے لگا۔ میں بھی آج اسے خاطر میں لانے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ نجو کو اپنے پاس ٹھہرانے کا پورا انتظام کر چکا تھا۔ نرس چونکہ آج چھٹی پر تھی لہٰذا میں نے گردن کی پٹی ڈھیلی کر کے پھیر رکھی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔

"پہلے یہ میری پٹی ٹھیک سے باندھ دو۔ پھر کھانا کھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اس نے ڈری ہوئی نظروں سے کھڑکی کے پار دیکھا۔ پھر جھجکتی ہوئی پلنگ کے بازو پر بیٹھ گئی اور پٹی کھولنے لگی۔ اس کے جوان جسم کی مخصوص دیہاتی خوشبو میرے احساس کو سلگانے لگی۔ پہلوان کھڑکی پر آ کر کچھ دیر گھورتا رہا پھر کچھ کہے بغیر اپنی جگہ پر چلا گیا۔

میں نے بغور نجو کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب اکثر خاموش نظر آتی تھی۔ پہلے والی تن فن اس میں کہیں نہیں تھی۔ لگتا تھا اس کے مزاج کے ساتھ اس کے جسم کی جولانیاں بھی تھمنے سے لگی ہوئی ہیں۔ اعضاء کا "سارے گا ما پا" آہنگ اور ربط سے محروم تھا۔ میں نے اسے ترنگ میں لانے کے لئے تھوڑی سی شرارت کی مگر وہ لفٹ سے مسکرائی نہ ہوئی۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ "نجو! تو تو کہتی تھی مجھے کسی بیلے ویلے کے چکر میں پالا جانے کا ڈر ہے گھوڑوں کے آگے سوڑ کی طرح بھگایا جانے گا۔ یہ تو مجھے دولہا بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

وہ گمبھیر سنجیدگی سے بولی "صیب جی! اللہ آپ پر رحم کرے۔ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟ سوڑ سے یا دولہے سے؟"

اس نے میری بات نظرانداز کر کے کہا "میرا خیال ہے جی کہ اب جاگیردار نے پروگرام بدل دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ اب آپ کو بیلے نہیں لے جایا جائے گا۔"

"پھر کیا کرے گا؟ اپنی گھر والیوں سے میرا تعارف کرائے گا؟"

"صیب جی" وہ کھوئے ہوئے بولی "آپ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔"

"کیسی غلطی جان جی۔"

"صیب جی۔ اس دنیا میں پیار نہیں کرنا چاہئے۔ بندہ جتنا پیار کرتا ہے اتنا ہی روتا ہے۔ اتنا ہی پھنستا ہے۔ آپ نے بھی کسی سے پیار کیا ہے نا۔ آپ بھی پھنس گئے ہیں۔ گردن تک دھنس گئے ہیں۔"

"نجو کھل کر بات کر۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"صیب جی! آپ کی۔۔۔ آپ کو اپنی بہن بڑی پیاری ہے نا۔ بڑا لاڈ ہے نا آپ کو اس سے۔ اسی لئے آپ کی زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی ہے جس نے آپ کو گھیر لیا ہے۔" میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گردن سے روئی کا پنبہ ہٹاتے ہوئے بولی "اپنی مصیبت کے ذمے دار آپ خود ہیں۔ آپ نے خود اپنا بھانڈا پھوڑا ہے۔ پچھلی جمعرات آپ کو سخت بخار تھا نا۔ بخار کی حالت میں آپ پتا نہیں کیا کیا ہذیان بک رہے تھے۔ اسی حالت میں جاگیردار جی آپ کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کے سامنے بھی آپ عجیب عجیب باتیں کرتے رہے۔ بے ہوشی میں کبھی جاگیردار کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگتے کبھی اس کی منت سماجت کرنے لگتے اور کہتے "میری بہن کو کچھ نہ کہنا۔ اسے کچھ نہ کہنا۔ تم جو کہو گے میں کروں گا۔ کہو گے تو اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لوں گا۔ تمہاری ہر بات مانوں گا۔ میری شفتا کو کچھ نہ کہنا۔ وہ بڑی لاڈلی ہے۔ وہ میری جان ہے۔ میری جان کو کچھ نہ کہنا" لگتا تھا آپ کے دماغ پر کسی واقعے کا اثر ہے۔ پتا نہیں آپ کیا کچھ کہتے رہے اور جاگیردار جی خاموشی سے سنتے رہے پھر چپ چاپ باہر چلے گئے۔"

میں بوتھوں کی طرح منہ کھولے نجو کو دیکھ رہا تھا۔ نجو کی سرمئی آنکھوں میں گہری تشویش تھی۔ وہ چور نظروں سے کھڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

"صیب جی! میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ کچھ بتا سکوں۔ یہ حویلی بڑی ظالم ہے اور یہاں رہنے والوں کے ہاتھ

بڑے لچے ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پتا نہیں آپ۔۔۔ آپ یہ سب کچھ کیسے برداشت کریں گے۔ کاش آپ ان کے دشمن نہ ہوتے۔ آپ کیوں ہوئے تھے ان کے دشمن؟"

دل و دماغ بھیانک اندیشوں کی زد میں تھا۔ سوچ کے پرندوں پر خوف کے عقاب جھپٹ رہے تھے۔ میں نے کہا "نجو! تیرا مطلب ہے کہ۔۔۔ قادر زماں۔۔۔ میری بہن کو۔۔۔ اس چار دیواری میں لا سکتا ہے؟"

نجو نے میری پٹی کو آخری گرہ دی اور رو دی موٹے موٹے آنسو چھپانے کے لئے دوسری طرف پھیر لیا۔ ایک لمحے بعد اس کی بھیگی لرزتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "یہ کام ہو چکا ہے صیب جی۔ آپ کی بہن اسی حویلی میں ہے۔"

دھماکوں سے جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ رگوں میں خون اچھلا اور تند ریلے کی طرح ہوش و خرد کو بہا لے گیا۔ میرا جسم زلزلوں کی زد میں آیا اور ہر شے تہس نہس ہو گئی۔ میرے اندر سے کسی نے للکار کر جاگیردار آغا زماں کو آواز دی۔ کتے تجھے پتا ہے تو نے کس کی غیرت کو للکارا ہے۔ تجھے پتا ہے کچھ؟ کچھ پتا ہے تجھے؟ میں لپکتا ہوا دروازے پر آیا۔ میرے سامنے چکنے فرش والی طویل راہداری تھی۔ میں نے اپنا سانس اندر کھینچا، میرے حلق سے ایک خوفناک چنگھاڑ نکلی "شفقتا" یہ آواز میرے اپنے لئے بھی پہچاننا مشکل تھی۔ میں اندھوں کی طرح طویل راہداری میں بھاگتا چلا گیا۔ نجانے کس طرح میں کھلی فضا میں پہنچا۔ مہمان خانے کے ایک حصے میں بہت سی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے بجے سنورے تانگے، جیپیں اور کاریں کھڑی تھیں۔ اندر سے گھنگھروؤں کی چھم چھما چھم اور طبلے کی دھنا دھن سنائی دے رہی تھی۔ کوئی طوائف ایک پرانا فلمی گانا لہک لہک کر گا رہی تھی۔

"رنگ بدلتی رات بڑی رنگین ہے ہائے بڑی سنگین ہے۔"

میں نے ایک لحظہ رک کر پیچھے دیکھا۔ ایم جی والا پہلوان موت بن کر لپکا آرہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ کسی بھی وقت مجھ پر فائر کھول سکتا تھا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ مجھے ایم جی سے ڈر کر رک جانا تھا یا جھپٹ کر ایک برآمدہ پھلانگنا تھا اور اس دروازے میں گھس جانا تھا جہاں سے گھنگھروؤں کی صدا آ رہی تھی۔ میرے ذہن نے آگے بڑھنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ میں نے نیچے جھک کر پوری قوت سے دوڑ لگائی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے دروازے تک پہنچنے سے پہلے گولی نہ چلتی۔ گولی چلی اور میرے پاؤں کے قریب دو شعلے سے لپک گئے۔ کچھ کہا نہ جا سکتا تھا کہ پہلوان کا نشانہ چوکا ہے یا اس نے جان بوجھ کر میرے جسم کو نہیں چھیدا۔ میں بھاگتے ہوئے توپ کے گولے کے مانند چوبی دروازے سے ٹکرایا۔ بالائی شیشے چھناکے سے ٹوٹے۔ اندرونی چٹخنی اکھڑ کر دور جا گری اور میں لڑھکتا ہوا اندر جا گرا۔

ایک لمحے کے لئے میں نے خود کو ٹھنڈے فرش پر پایا۔ یہ شطرنج کے خانوں جیسا ٹائل دار فرش، قمقموں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں میری نگاہ بائیں جانب ایک کھلے دروازے میں گئی۔ رقص و سرود کی محفل اسی کمرے میں جمی ہوئی تھی۔ فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ موٹی گردنوں اور صحت مند چہروں والے کوئی دس پندرہ افراد مجھے نظر آئے۔ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دو گولیوں کی گونج اور میرے دروازے سے ٹکرانے کی صدا ابھی فضا میں باقی تھی۔ سازندوں کے ہاتھ ابھی سازوں پر پوری طرح رکے نہیں تھے۔ یہ سب ایک یا دو ساعتوں کا ماجرا تھا۔ میری نظر قادر زمان پر پڑی جو ایک سرخ گاؤ تکیے سے ٹیک ہٹا کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح محافظ کو دیکھا جو اپنی بندوق سیدھی کر رہا تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ محافظ کی بندوق سیدھی ہونے سے پہلے میں اسے چھین لوں گا اور اس سے پہلے کہ قادر زماں پورے قد سے کھڑا ہو کر دائیں بائیں ہٹے اس بندوق کی نال اس کی کنپٹی سے لگ چکی ہوگی۔

میں نے اپنی جگہ سے جست کی اور قریباً آٹھ فٹ درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے محافظ پر جا پڑا۔ میرا ہاتھ سیدھا بندوق کے دستے پر آیا تھا۔ اپنی جست کے زور پر میں پہریدار سے بندوق چھینتا ہوا دائیں کندھے کے بل فرش پر بچھی چاندنی پر گرا اور لڑھکنی کھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ کی بندوق جاگیردار کی کنپٹی کی طرف سیدھی ہوئی لیکن یہیں میں غلطی کر گیا۔

میں جاگیردار کے عقب میں ان دو بونے باڈی گارڈز کو نہ دیکھ سکا تھا جو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے اور جن کی پھرتی اور چستی کے بارے میں اب تک بہت کچھ سن چکا تھا۔ عین کسی شکاری کتے کی طرح ایک بونے نے جاگیردار کے عقب سے چھلانگ لگائی اور سیدھا میری بندوق پر آیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ٹریگر دبا دیا۔ بندوق کا رخ تبدیل ہو چکا تھا گولی اس چودہ پندرہ سال کے خوبصورت لڑکے

جو گھنگھرو باندھ کر رقص کر رہا تھا۔ ایک چیخ کے ساتھ اس نے پنڈلی پکڑی اور دہرا ہو گیا۔ حاضرین محفل اٹھ اٹھ کر چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ میرے سر پر کسی نے عقب سے زوردار ضرب لگائی اور میں لڑکھڑا کر ایک ہارمونیم پر گرا۔ پھرتی سے گھوم کر دیکھا ضرب لگانے والا وہی پہلوان تھا۔ وہ ایک لمحہ پہلے تند بگولے کی طرح اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور آتے ہی اس نے ایم جی کا وزنی کندا میری گدی پر آزما ڈالا تھا۔ میں ایسے بے ڈھنگے طریقے سے گرا تھا کہ بندوق میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اب میرا داہنا ہاتھ ایک وزنی پاندان پر تھا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر یہ پاندان پہلوان کی گردن پر کھینچ ماروں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ موٹی گردنوں اور صحت مند چہروں والے وہ تمام حاضرین جو پہلے لمحے میں چیخیں مارتے ہوئے باہر کو بھاگے تھے اب سنبھل کر پلٹ آئے تھے۔ انہوں نے مجھے چاروں طرف سے دبوچ لیا۔ ایک لمحے بعد پہلوان کی گن بھی میرے سینے سے آن لگی اور اس کے بے رحم دباؤ نے مجھے سمجھا دیا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ اب اصولی طور پر مجھے جدوجہد ترک کر دینی چاہئے تھی مگر میرے سینے میں ایسی آگ لگی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے سامنے ایک گہرے دھوئیں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کے تمام قانون قاعدے بھول چکے تھے۔ میں ہار کر بھی ہار تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ بے سود ہے سخت ہاتھوں کی گرفت میں مچل رہا تھا اور ایم جی کا بوجھ اپنے سینے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے حلق سے فلک شگاف چنگھاڑیں نکل رہی تھیں۔ ان چنگھاڑوں کا ہدف آغا زماں تھا۔

"کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے جرأت کیسے ہوئی۔ تو جانتا نہیں میں کون ہوں۔ میں تیرا نشان مٹا دوں گا۔ تیری نسلوں کو ختم کر دوں گا۔"

وہ شاہ جہاں جس کی قبر لاہور جیل کے احاطے میں تھی، زندہ ہو رہا تھا۔ اس کے کفن کے تمام بند ڈھیلے ہو گئے تھے۔ "سؤر کی اولاد! تو نے میری بہن کو ہاتھ لگایا؟ اس کی طرف نگاہ بھی اٹھائی تو میں تیری اس جاگیر کو راکھ کا ڈھیر کر دوں گا۔ خدا کی قسم۔۔۔ قبرستان بنا دوں گا ان ساری زمینوں کو۔ کہاں ہے میری بہن۔۔۔ میں پوچھتا ہوں کہاں ہے میری بہن۔ حرامزادے کچھ نہ کہنا اسے۔۔۔"

میرے منہ میں جو اول فول آ رہا تھا وہ بک رہا تھا۔ جاگیردار بڑے اطمینان سے کھڑا نیا سگار سلگا رہا تھا۔ دو پہلوانوں نے پوری کوشش سے میرے ہاتھ موڑ کر پشت پر لگا دیئے تھے اب تیسرا شخص انہیں رسی سے باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان سب نے مل کر مجھے بے بس کر دیا۔ ایک چارپائی کی ادوائن سے مجھے پوری طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ سب حاضرین میری طرف الجھی الجھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غالباً یہ لوگ باہر کے تھے اور انہیں جاگیردار نے میری ذہنی صحت کے بارے میں شک میں مبتلا کیا تھا۔ اسی دوران میں نے ڈاکٹر رحمان اور نرس شکیلہ کو تیزی سے اندر آتے دیکھا۔ شکیلہ کے ہاتھ میں ایک بھری ہوئی سرنج تھی۔ وہ میری طرف بڑھی۔ میرے تڑپنے مچلنے کے باوجود اس نے میرے بازو کی نس میں خواب آور انجکشن لگا دیا۔ لمحوں میں میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پوری طرح غافل ہونے سے پہلے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر رحمان اس لڑکے پر جھکا ہوا تھا جسے میری گولی نے زخمی کر دیا تھا۔ لڑکا بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کی گھنگھرو والی ٹانگ ڈاکٹر رحمان کے ہاتھ میں تھی اور اس کے کندھے دو مردوں کی گرفت میں تھے۔ لڑکے کے سینے سے قمیص کھنچ سی گئی تھی اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ وہ لڑکا نہیں ہے۔ وہ بوائے کٹ لڑکی تھی جس نے مردانہ تراش کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

○———□———○

میں اوندھے منہ بستر پر پڑا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ کھڑکی کے پھاٹک پر دراز قد پہریدار ڈیوٹی دے رہا تھا۔ دھوپ کافی چڑھ آئی تھی۔ میں نے کروٹ بدلنی چاہی تو اندازہ ہوا کہ دونوں ہاتھ عقب میں کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ چند لمحوں میں رات کے تمام واقعات نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ میں قریباً دس گھنٹے انجکشن کے زیر اثر رہا تھا۔ اب اثر ختم ہوا تھا تو روح اور جسم کے سارے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

"شفقتا۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ میرے جسم کا ہر عضو تن گیا۔ جی چاہا کہ پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا شروع کر دوں مگر پھر قدموں کی نازک سی آواز نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ کوئی آ رہا تھا۔

چند لمحے رنگین آنچل کی جھلک نظر آئی اور ایک سرو قد لڑکی ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو گئی۔ میں اس لڑکی کو آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ تھوڑا سا نکھرا ہوا چہرہ، صراحی دار گردن اور ہموار کندھے۔ وہ قبول صورت تھی لیکن جو بات نجو کے پیکر جمال میں تھی وہ اس میں کہاں۔ اس نے گرما گرم حلوہ پوری، ابلے ہوئے دو انڈے اور چائے میرے سامنے رکھ دی تو میں نے پوچھا۔

"نجو کہاں ہے؟"

وہ بے رخی سے بولی "مجھے کیا معلوم"

"پھر کسے معلوم ہے؟"

"مالکوں کو معلوم ہوگا یا پھر اسے معلوم ہوگا جہاں وہ گئی ہے۔" آخری الفاظ اس نے بہت چبا کر کہے تھے۔ "اسے معلوم ہوگا جہاں وہ گئی ہے۔" یہ الفاظ ایک خاص سمت اشارہ کررہے تھے۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ رات میں نے اچانک اس کمرے سے بھاگ کر اور جاگیردار کی محفل طرب کو درہم برہم کرکے جہاں اپنا نقصان کیا تھا وہاں نجو کو بھی کسی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میری اس ہنگامہ آرائی کا سبب اپنی بہن کے متعلق میری معلومات تھیں۔ یہ معلومات حویلی ہی کے کسی فرد نے مجھ تک پہنچائی تھیں اور سامنے کی بات تھی کہ نرس 'نجو یا ڈاکٹر رحمان میں سے کسی نے پہنچائی ہیں۔ جاگیردار کو درست نتیجے تک پہنچنے میں چند لمحے کی دیر بھی نہیں لگی ہوگی۔ جس وقت میں آپے سے باہر ہو کر یہاں سے بھاگا اس وقت میرے پاس نجو کے سوا اور کون تھا۔

میں نے اس نئی لڑکی سے پوچھا۔ "کیا۔ اسے کوئی سزا وغیرہ دی گئی ہے۔"

"مجھے نہیں پتا جی۔" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی "اب ناشتا کریں ٹھنڈا ہورہا ہے۔"

مجھے بھی تاؤ آگیا۔ "ناشتا میں اپنے سر سے کروں۔ ان تیرے خصموں نے ہاتھ تو میرے باندھ رکھے ہیں۔" میں نے اپنی زنجیر زور سے جھنجھنا کر اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

لیکن اگر میرا خیال تھا کہ وہ میری زنجیر کھولیں گے تو یہ بچگانہ خیال تھا کھڑکی پر ایم جی والے پہلوان کی منحوس صورت نظر آئی۔ اس نے نہایت قہر سے مجھے گھورا۔ پھر لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جیسموں! کھلا دے اس نئے اپاہج کو اپنے ہاتھ سے 'بڑا محتاج ہے بچارا۔"

لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی اور پوری توڑ کر حلوے سے نوالہ بنانے لگی۔ بھوک تو میری مر کر نجانے کس قبرستان میں دفن ہو چکی تھی۔ سینے میں ایک آگ فروزاں تھی اور گزرنے والا ہر لمحہ اس آگ کی حدت میں اضافہ کررہا تھا۔ لڑکی کا چوڑیوں والا گورا ہاتھ جب لقمہ بنا کر میرے ہونٹوں کے قریب آیا تو کھانے کی خوشبو سے میرا جی متلانے لگا۔ میں نے لحاف کے نیچے سے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اٹھائیں اور پوری قوت سے کھانے کی ٹرے پر دے ماریں۔ یہ ٹرے لڑکی اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔ ایک ٹانگ ٹرے پر اور دوسری لڑکی کے کولہے پر پڑی۔ دونوں چیزیں "اڑتی ہوئی کمرے کے وسط میں جا پڑیں۔ ٹرے کی کھڑکھڑاہٹ اور لڑکی کی چیخ ایک ساتھ کمرے میں گونجی۔ گرم گرم چائے اور حلوے نے قالین پر گل کاریاں کردیں۔

ایک ساعت میں لڑکی کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہوا اور وہ قالین پر ہی بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا مضروب دبانے لگی۔

پہلوان نے کھڑکی میں سے چنگھاڑ کر مجھے گالی دی۔ اس نے رائفل کا رخ میرے سینے کی طرف کر رکھا تھا اور لگتا تھا ابھی گولی مار دے گا۔ تاہم وہ گولی مجھے مار نہیں سکتا تھا۔ مجھے لات کے لئے اسے طویل چکر کاٹ کر کمرے کے اندر آنا پڑتا۔ لہٰذا وہ کھڑکی ہی میں تاؤ کھا کر رہ گیا۔ مجھے اس کی جھلاہٹ نے لطف دیا۔ اچانک سامنے والا دروازہ کھلا اور چوکھٹ میں جاگیردار قادر زمان نظر آیا۔ اس کی نگاہ ایک ہی ساعت میں کمرے کی ہر شے پر دوڑ گئی۔

"چچ چچ۔ بہت بری بات ہے یار جی۔ اچھے بھلے سیانے آدمی ہو۔ کیوں ہم بے قصوروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔" پھر وہ جیسموں سے مخاطب ہوا۔ "چل کڑیے۔ تو باہر چل اور یہ بھانڈے ٹھانڈے بھی لے جا یہاں سے۔"

جیسموں کراہتی ہوئی اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی قالین سے برتن اکٹھے کرنے لگی۔ جب وہ باہر چلی گئی تو آغا زمان بڑی متانت سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بونے باڈی گارڈ کراماً کاتبین کی طرح اس کے دائیں بائیں تھے۔ آج ان کی زرد آنکھوں میں میرے لئے دشمنی کی نمایاں جھلک تھی۔ جاگیردار نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں میرا حال احوال دریافت کیا اور لینز والی ڈبیا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے یار جی! ان کو لگا ہی لو۔ یہ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

میں اب تک مکمل خاموشی سے جاگیردار کی باتیں سن رہا تھا۔ ہر لحظہ میرے سینے میں برپا طوفان تند و تیز ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میری زبان کو تاب خاموشی نہیں رہی۔ میں نے اپنے لہجے کو کم سے کم خوفناک بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جاگیردار! میں اپنی بہن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ اچھا" آغا زماں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "تو اتنی سی بات پر آنکھوں میں آنسو بھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ تم اس سے ملو۔ چلو اٹھو ابھی۔ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔"

میں نے بستر سے حرکت کی۔ ٹھگنے باڈی گارڈ بے حد چوکس نظر آنے لگے۔ جونہی میں چپل پہن کر دروازے کی طرف گھوما وہ میرے عین پیچھے آگئے۔ دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور ذہن میں ان گنت سوال تھے۔ نجانے میری تیرہ بخت آنکھوں کو کیا دیکھنا تھا۔ چکنے فرش والی راہداری سے گزر کر ہم پہلو کے کمرے میں داخل ہوئے اور میرے سامنے ایک قالین پوش زینہ آیا تو ذہن کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے اور میرے ساتھ ساتھ شاید اس جاگیردار کا بھی۔ اگر میں اپنی بہن کو اس سرخ پردے کے پیچھے کسی عذاب میں مبتلا دیکھ لیتا تو پھر باقی کیا بچ رہا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے تو کیا' میری ٹانگیں تو آزاد تھیں۔ میرا جبڑا تو زنجیر نہیں تھا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میں بونے محافظوں کی گولیوں کی پروا کئے بغیر جاگیردار آغا زمان پر جا پڑوں گا اور اس کے نرخرے کو اپنے دانتوں سے ادھیڑوں گا یا اس کی گردن کو اپنی ٹانگوں میں جکڑ کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کردوں گا۔ یہ نہ ہوگا تو کچھ اور ہو جائے گا۔ کچھ اور نہ ہوا تو کچھ اور ہو جائے گا۔ ہاں یہ نہیں ہوگا کہ پھر میں زندہ رہوں اور جاگیردار بھی اس گیلری سے صحیح سلامت واپس آجائے۔ ہاں۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔

میں خونخوار بونوں کی زد میں زینے طے کرتا ہوا جاگیردار کے ساتھ اس منحوس گیلری میں پہنچا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا دو ہفتے پہلے نظر آیا تھا۔ وہی کرسیاں وہی سرخ پردہ' وہی شراب کی بوتلیں اور ہیڈ فونز وغیرہ۔ آج یہ گیلری میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی اور سینے کے اندر کوئی طبل سا بج رہا تھا۔ کوئی اذان سا ہو رہا تھا۔ حسب سابق جاگیردار نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی چھوڑ کر نشست سنبھال لی۔ بونے عقب میں ہوشیار کھڑے تھے۔ آج مجھے بیلٹ نہیں باندھی گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے۔

جاگیردار کے اشارے پر ایک بونے نے لائٹ آف کردی اور دوسرے نے پردے کی ڈوری کھینچ کر پردہ ہٹا دیا۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا کیونکہ میں اپنی آنکھیں بند کرچکا تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے میں مرنے کی پوری تیاری کرلینا چاہتا تھا۔ آخر میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں شیشے کی دوسری جانب نشیب میں مجھے روشن کمرا نظر آیا۔ وہاں میری بہن موجود تھی۔ میں اپنی بہن کو آج ساڑھے تین برس بعد دیکھ رہا تھا۔ ساڑھے تین برس قبل وہ پہلی اور آخری بار مجھ سے جیل میں ملنے آئی تھی۔ اس کے بعد کتنے موسم اور کتنے شب و روز گزر گئے تھے۔ اپنی سادہ معصوم بہن کی صورت جیل کی تاریکیوں میں میری امید کا جگنو بنی رہی تھی۔ جیل کی تاریک راتوں میں' میں نے سینکڑوں مرتبہ اس کی ہنسی سنی تھی اور اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ وہ مسکراہٹ جس نے مجھے پھولوں اور تتلیوں سے آباد بیرکوں میں بچپن کی بے فکر نیندیں دی تھیں اور مستقبل کے سہانے خواب بھی دکھائے تھے۔ میں نے دیکھا رنگ دار شیشے کی دوسری جانب میری بہن ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں ایک پرات میں تھے۔ پرات میں گرم پانی تھا اور روئی کے ٹکڑے تھے۔ ایک ملازمہ بڑے آرام سے اس کے پاؤں دھو رہی تھی۔ شفتا کے ہاتھ میں ایک تھالی کے اندر سیب کے ٹکڑے تھے۔ وہ بڑی بے دلی سے اور آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

"شفتا' شفتا۔" میں پورے زور سے چلایا۔ شفتا چند فٹ دور تھی لیکن اس تک میری آواز نہیں پہنچ سکی۔ میں نے بے قرار ہو کر اپنا سر رنگ دار شیشے سے ٹکرا دیا۔ کھٹکے کی آواز نے دونوں ملازماؤں کو اوپر دیکھنے پر مجبور کردیا۔ شفتا نے بھی تھالی سے سر اٹھا کر ایک خالی نظر اوپر ڈالی لیکن تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کچھ نظر نہیں آرہا۔

میں نے التجا کے لہجے میں کہا "جاگیردار! ایک بار مجھے اپنی بہن سے ملا دو' صرف ایک بار۔"

جاگیردار نے میرے کندھے پر دوستانہ تھپکی دی۔ اس کے اشارے پر بونوں نے ڈوری کھینچ کر پردہ برابر کردیا اور بتی جلا دی۔ "آؤ یار جانی! کمرے میں چلتے ہیں" جاگیردار نے بے پناہ سفاکی سے کہا "تمہاری بہن بھی وہیں پہنچ جائے گی۔"

جاگیردار کی ہدایت پر عمل کرنے کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ ہم اپنی جگہوں سے اٹھے اور پہلے والی ترتیب سے چلتے دوبارہ کمرے میں پہنچ گئے۔ نئی خادمہ قالین پر سے حلوے اور چائے کی آلائش صاف کرچکی تھی اور اب یہاں کے دستور کے مطابق ہاتھ ناف پر باندھے ایک کونے میں مؤدب کھڑی تھی۔ نرس شکیلہ بھی مجھے وٹامن کا انجکشن دینے کے لئے موجود تھی۔

"چلو کڑیو' تم دونوں باہر چلو۔" جاگیردار نے حکم صادر کیا۔

وہ دبے قدموں باہر نکل گئیں تو قادر زمان اور میں آمنے سامنے کرسیوں پر آبیٹھے۔

زمان نے سگار سلگایا۔ گھنی اور سخت مونچھوں کے نیچے

سے اس نے خوشبودار دھواں فضا میں چھوڑا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یار جی! میرے کچھ اصول ہیں اور ان اصولوں کو میں جان سے عزیز رکھتا ہوں۔ میری دوستی دشمنی محبت نفرت سب اصولوں پر قائم ہے۔ تم میرے ان اصولوں سے اختلاف کر سکتے ہو لیکن مجھے بے اصولی کا طعنہ نہیں دے سکتے۔ تم اب تک یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے کہ تمہاری حیثیت یہاں ایک قیدی کی ہے۔ تمہاری اس قید کا سبب کیا ہے یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ فی الحال میں تمہیں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ جو بات میں اب تم سے کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اپنی بہن کو دیکھ چکے ہو اور یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ وہ ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے اور اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں۔ یہ صورتحال اسی طرح برقرار رہے گی لیکن اس کے لئے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ میری بہن یہاں یرغمال ہے۔"

"ہاں یار جی! تمہاری بہن یہاں یرغمال ہے۔ تسلی ہو گئی ہو تو کچھ آگے عرض کروں۔"

"کہو۔"

جاگیردار نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ "تمہیں ایک شخص کو قتل کرنا ہے" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میری سوالیہ نظریں بدستور جاگیردار کے چہرے پر لگی تھیں۔ اس نے واسکٹ کی جیب سے ایک تصویر نکالی اور میرے سامنے تپائی پر رکھ دی۔

میں نے تصویر اٹھائی اور ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں اس شخص کو پہچانتا تھا۔ یہ ایک پینتالیس پچاس سالہ شخص تھا۔ تصویر میں وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ بچوں میں ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی۔ اچانک مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ اس شخص کا نام رجال ساہی تھا۔ احمد رجال ساہی لاہور جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اپنی قید کا اولین سال میں نے اسی جیل میں کاٹا تھا۔ یکبارگی رجال ساہی کے بارے میں مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ عام جیل افسران سے بہت مختلف تھا۔ دھیمے لہجے میں بات کرنے والا اور انسان کو انسان سمجھنے والا۔ میں نے اسے زیادہ مرتبہ نہیں دیکھا۔ شاید پورے سال میں تین چار بار سامنا ہوا تھا۔ ہر بار اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لئے نرم خوئی کی جھلک ملی تھی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا بھی تھا "شاہ جہان! میں نے تمہاری ہسٹری شیٹ دیکھی ہے اور فائل بھی پڑھی ہے خاصے دلچسپ آدمی ہو تم" ایسی باتیں وہ اکثر دوسرے قیدیوں سے بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے اندر آدمی کو سمجھنے اور پرکھنے کی لامحدود خواہش تھی۔ جیل میں بھی وہ نت نئی اصلاحات کرتا رہتا تھا۔ وہ سپرنٹنڈنٹ سے زیادہ ایک ریفارمر نظر آتا تھا۔

آج اس شخص کی تصویر میرے سامنے تھی اور ایک جاگیردار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اسے قتل کر دوں۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر جاگیردار آغا زمان نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ چپ ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا "اس کا قصور؟"

"قصور تو تمہاری بہن کا بھی کچھ نہیں اور تم نے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑا لیکن تم دونوں گردن تک حالات کی کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہو۔ یاد رکھو شاہ جہان یہ دنیا ایک جنگل ہے اور جنگل میں کسی شکار کو کسی شکاری سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کا قصور کیا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ بہت دنوں بعد دل میں تمباکو کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے کہا "ایک سگار مل سکتا ہے۔"

جاگیردار مسکرایا "سوری۔ یہ بھی میرا ایک اصول ہے۔ ہاں سگریٹ مہیا ہو سکتے ہیں۔ کون سے پیو گے۔"

"جو مہیا ہو سکیں۔"

اس نے ایک مشٹنڈے کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور چند لمحوں بعد گولڈ لیف کا پورا ایک ڈبا تپائی پر لا رکھا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ چند کش لینے کے بعد جذبات کا ابال کم ہوا اور دماغ قدرے معروضی انداز میں سوچنے لگا۔

"اگر میں اس شخص کو قتل کر دوں تو پھر؟" میں نے کہا۔

"پھر تمہاری بہن ہر طرح سے محفوظ ہوگی۔"

"زمان صاحب! کھل کر بات کریں۔ اگر میں آپ کے کہنے پر اس شخص کو قتل کر دوں تو آپ مجھے اور میری بہن کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے؟"

جاگیردار کے چہرے سے مسکراہٹ کا نقاب اتر گیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا "یار جی! تم اس وقت کوئی مطالبہ پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو اور نہ ہی میں تمہارا کوئی مطالبہ مان سکتا ہوں۔ مجھے تمہارا جواب ہاں یا نہ میں چاہئے" میں سن ہو کر رہ گیا۔ جاگیردار کا بے پناہ اعتماد ظاہر کرتا تھا کہ وہ کچے پاؤں پر نہیں کھڑا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے کہا "ایک بات اور۔ میں اس کام کے لئے تمہیں زیادہ

مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ آٹھ دس روز کے اندر اندر تمہیں یہ قصہ ختم کرنا ہوگا۔ دوسری صورت میں تمہیں ناکام تصور کیا جائے گا۔"

میں نے اوپر تلے سگریٹ کے چند کش لئے اور کہا "ٹھیک ہے زمان صاحب۔ میں یہ کام کروں گا۔"

جاگیردار نے کہا "مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا شاہ جہان۔ مجھے پتا ہے تم کوئی ایویں شیویں شے نہیں ہو۔ بڑی جوئے باز روح ہے تمہارے اندر لیکن امید کرتا ہوں کہ تم مجھے اور خود کو کسی امتحان میں نہیں ڈالو گے" پھر میری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے بولا "ہو سکتا ہے ہر جوئے باز کی طرح تمہارے دل میں بھی خیال ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد کسی چال سے دوبارہ حویلی میں گھس کر اپنی بہن کو نکالنے کی کوشش کرو یا کوئی اور کمانڈو شانڈو ایکشن دکھاؤ۔ میری گزارش ہے کہ ایسے بچگانہ خیالوں کو دل میں جگہ نہ دینا۔ میں کوئی شیخی نہیں بگھار رہا۔ تمہارا واسطہ آغا قادر زمان سے پڑا ہے اور زمان جیسا ایک آدمی بھی تمہیں آج تک نہیں ملا۔"

آغا زمان کی بات میں خاصا وزن تھا۔ میں خود یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ کسی اور ہی نسل کا شخص ہے۔ اس کی طاقت اور رسوخ میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ میری جہاندیدہ نگاہیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ آغا زمان نے اس حویلی میں چن چن کر ایسے غنڈے جمع کر رکھے تھے جو اپنی مثال آپ تھے۔ کوئی سندھ کا تھا تو کوئی پنجاب کا کوئی سرحد کا تھا تو کوئی بلوچستان کا۔ ان میں سے ہر ایک کسی بلا سے کم نہیں تھا۔ یقیناً اس انتخاب کے لئے اس نے زبردست محنت کی تھی اور منہ مانگے معاوضے دیے تھے۔ ان میں سے چند ایک ڈشکروں کو میں پہچان بھی گیا تھا۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے پہچانا تھا یا نہیں۔ یہ خطرناک قسم کے قاتل اور ڈکیت تھے۔ میں نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا یہ حویلی کا صرف ایک رخ تھا یقیناً پس پردہ اور بھی بہت کچھ تھا۔ اور میری شفتا اس خطرناک حویلی میں مقید تھی۔ نہایت بدترین قسم کے عذاب اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔

میں نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو غور سے دیکھا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں زمان صاحب۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔ ویسے یہ شخص اس وقت ہے کہاں؟"

"لاہور میں۔ اقبال ٹاؤن۔ ستلج بلاک۔ کوٹھی کا نمبر تمہیں مہیا کر دیا جائے گا۔"

"ریٹائرڈ ہے یا حاضر سروس؟"

"حاضر سروس۔"

"زمان صاحب۔ اگر میں اس کوشش میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتا ہوں تو؟"

"یوں تو اس کا امکان بہت کم ہے۔ بہرحال ایسا ہوا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تم گرفتار ہوئے ہو یا تم نے خود کو گرفتار کرایا ہے۔ اگر تم واقعی گرفتار ہوئے تو سمجھا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔"

"میری گرفتاری سے آپ پر بھی حرف آ سکتا ہے؟"

"تم میری فکر چھوڑ دو۔"

"میری گرفتاری کی صورت میں کیا میری بہن کو چھوڑ دیا جائے گا؟"

"یار جی! کیا میں نے ایسی کوئی بات کی ہے۔ میرا خیال ہے تم فضول سوالات سے پرہیز کرو۔ ویسے بھی یہ سوال قبل از وقت ہے۔"

"میں اس کام کے لئے کب روانہ ہو سکتا ہوں؟"

"جب چاہو۔ اگر چاہو تو آج ہی بلکہ اسی وقت جا سکتے ہو۔ کیا تم خود کو اس قابل سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں" میں نے مختصر جواب دیا "آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"جو تم چاہو۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ یہ کام تمہیں اکیلے ہی کرنا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اپنے لہجے کی تلخی چھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا مدد چاہئے تمہیں؟"

میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا "کچھ زیادہ نہیں۔ لباس وغیرہ تو آپ میرا سلوا ہی چکے ہوں گے۔ چھ سات ہزار روپیہ خرچ کے لئے۔ ایک ریوالور اور ہو سکے تو ایک سواری۔"

"ٹھیک ہے یہ چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔"

"میں آج ہی روانہ ہونا چاہوں گا۔"

"بصد شوق۔ ساہی کے بارے میں تمہیں تمام معلومات ایک گھنٹے کے اندر اندر مل جائیں گی۔ ان معلومات کے بعد بھی اگر کوئی سوال ہو تو مجھ سے رابطہ قائم کر لینا۔ میں کل تک حویلی میں ہی ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند منٹ کی مزید گفتگو کے بعد جاگیردار وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد ایم جی والا پہلوان ایک کنجی لے کر آیا اور اس نے میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔

مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں کوئی گیارہ بجے حویلی سے روانہ ہوا۔ ایک پرانے ماڈل کی نہایت خستہ حال اوپل کار میں ہم نے کچے پکے راستے پر کوئی چھ میل کا فاصلہ طے کیا "ہم" سے میری مراد میں اور ڈرائیور ہے۔ میں نے اعلیٰ کپڑے کی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس پر سیاہ شیروانی تھی۔ شیروانی کی جیب میں پارکر کے دو قیمتی قلم اور کلائی پر راڈو گھڑی۔ بال میں نے سیدھے اوپر کو بنا رکھے تھے۔ اس ٹپ ٹاپ میں، میں کسی سیاسی لیڈر سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ چھ میل کی کیچڑ پیمائی کے بعد ہم پکی اینٹوں کے بنے ہوئے ایک حویلی نما مکان کے سامنے پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں کسی شخص نے ہمیں دیکھا تو بڑے ادب سے کھڑے ہو کر سر جھکایا تھا۔ اس حویلی نما مکان کے سامنے بھی چند ملازم پیشہ غلام صورت لٹھ بردار وں نے جھک کر کورنش بجایا۔ کھٹارہ گاڑی سیدھی احاطے میں داخل ہو گئی۔ یہاں پکے فرش پر مجھے کوئی ساتھ آٹھ گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک جیپ۔ ایک نسان جیپ۔ تین ٹویوٹا کاریں۔ ایک نسان سنی۔

ڈرائیور نصیب خان نے ڈیش بورڈ پر رکھی ایک چابی اٹھائی اور مجھے دیتے ہوئے کہا "صاحب! یہ نسان سنی آپ کے لئے ہے۔"

میں اوپل سے اترا اور سلیم شاہی جوتا پانی سے بچاتا ہوا نسان سنی میں گھس گیا۔ گاڑی کے شیشے ہلکے رنگ دار تھے۔ ڈیش بورڈ پر دو تین فائلیں پڑی تھیں۔ مجھے معلوم تھا ان فائلوں میں اوٹ پٹانگ کاغذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہیں یہاں صرف رعب داب کے لئے رکھا گیا ہے۔ میں نے ریوالور شیروانی کی جیب سے نکال کر سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ ڈیش بورڈ کا زیریں خانہ کھول کر گاڑی کے کاغذات چیک کئے۔ پٹرول ریزرو دیکھا اور روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔ میں احاطے سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ آگے کچے راستے کی بجائے نیم پختہ سڑک ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حویلی کی تمام اچھی گاڑیاں یہاں رکھی گئی تھیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج کوئی چار برس بعد میں ایک بار پھر آزاد تھا۔ گو یہ آزادی مشروط تھی مگر آزادی تو تھی۔ میرے چاروں طرف کھیت تھے، درخت تھے، ہوا تھی اور آسمان تھا۔ یہ سب چیزیں بے زبان خاموشی کہہ رہی تھیں "ابھی زندگی حسین ہے شاد جہان! ابھی کچھ لوگ آزاد ہیں، ابھی کچھ لوگ خوش ہیں،

ابھی پرندے شاخوں پر چہکتے ہیں اور ابھی بچے بارش میں بھاگتے ہیں، ہم ابھی گھروں میں چولہے جلتے ہیں اور ابھی ساگر کی رنگینیوں پر کسی کا انتظار کرتی ہیں۔ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ لاہور جیل، اٹک جیل، جاگیردار کی حویلی، مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میرے تصور میں وہی چھوٹا سا گھر آ رہا جہاں میں اپنی پیاری بہن کے ساتھ رہتا تھا اور جہاں صبح شام ہماری خوشیوں کے پھول کھلتے تھے۔ زندگی اپنے حسین اور معصوم رنگوں میں مسکراتی تھی۔

گاڑی نیم پختہ راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی رہی۔ میں حویلی سے کوئی بیس میل کی طرف نکل آیا۔ آخر پختہ سڑک نظر آ گئی۔ یہ ایک برانچ روڈ تھی اور کہیں آگے جا کر جی ٹی روڈ سے ملتی تھی۔ میں جب اس سڑک پر پہنچا شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ ابر آلود شام نے لمحوں میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن متحرک ہو گیا وہ منصوبہ جو چپکے چپکے میرے ذہن میں پرورش پا رہا تھا اب نمایاں صورت میں سامنے آ گیا۔

کوئی پچاس میل پختہ سڑک پر چلنے کے بعد میں نے گاڑی ایک چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے روکی۔ میلے کچیلے کپڑوں والا ایک لڑکا میرے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا "کیا پکا ہے؟" اس نے چار پانچ سالن گنوا دیئے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے سب کی ایک ایک پلیٹ لے آؤ اور گرم گرم روٹی۔" اس نے پلک جھپکنے میں آرڈر کی تعمیل کی۔ میں نے گاڑی میں ہی دستر خوان لگا لیا۔ آلو قیمہ ماش کی دال، لوبیا، شاہی کباب۔ میں نے مردہ بھوک کے ساتھ کھانا کھایا اور چائے پی کر گاڑی کے اندر ہی سے ٹیلی ویژن کا نظارہ کرنے لگا۔ یہ ٹیلی ویژن ہوٹل والے نے ایک چبوترے پر چڑھا رکھا تھا۔ چار سال بعد ٹیلی ویژن کا نظارہ عجیب سا لگا۔ نو بجے کی خبروں تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ ہوٹل والوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں کسی پیچھے رہ جانے والے ہم سفر کا انتظار کر رہا ہوں۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے میں روانہ ہوا اور چند فرلانگ آگے جا کر اسے ایک کچے راستے پر ڈال دیا بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ دلدلی راستے پر یہ نازک اندام گاڑی کراہتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی نو آموز حسینہ ہو۔ میں گاڑی کو وہاں تک لے جانا چاہتا تھا جہاں تک یہ جا سکتی تھی اور جہاں یہ بند ہو جاتی۔ میں دو حرف بھیج کر پیدل آگے بڑھ سکتا تھا۔ بہرطور گاڑی نے میرا پورا ساتھ دیا۔ میں قریباً چھ میل کا شارٹ کٹ لگا کر اپنی منزل کے قریب جوار میں پہنچ گیا۔ یہاں میں نے گاڑی گنے کے دو کھیتوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ چھو

ڑی اور پیدل آگے بڑھنے لگا۔ گاڑی چھوڑنے سے پہلے میں نے اعشاریہ پچیس کا ریوالور دوبارہ شیروانی میں رکھ لیا تھا۔ راستے کیچڑ آلود تھے اور تاریکی میں پاؤں کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بارش نے تمام کپڑے بھگو دیئے اور نہایت ٹھنڈی ہوا پر اسرار ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی۔ سمت کا ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا لیکن میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی وارفتگی میری راہنما تھی۔ گرتا پڑتا پھسلتا سنبھلتا کیچڑ میں لت پت چلا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے سلیم شاہی جوتے بھی اتار کر پھینکنا پڑے۔ شیروانی کے بٹن میں نے کھول دیئے تاکہ کسی اچانک صورتحال پر حرکت کرنے میں آسانی رہے۔ میرا رخ جاگیردار کی حویلی کی جانب تھا۔ ذہن میں کوئی واضح تصور نہیں تھا کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ صرف یہی ایک خیال تھا کہ مجھے بغیر مزاحمت جاگیردار کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں اور اس کے حکم پر دوبارہ جرم کی راہ اختیار کرنے سے پہلے کچھ تڑپ پھڑک لینا چاہئے۔ ابھی تک میں بے گناہ تھا۔ مجھے جیل کی ایمبولینس سے زبردستی اغوا کیا گیا تھا اور اب تک میں حبس بیجا میں تھا لیکن اگر اب میرے ہاتھوں کسی اعلیٰ سرکاری افسر کا قتل ہو جاتا تو مجھ پر لاقانونی اور غارت گری کا وہی دروازہ کھل جاتا تھا جس میں ایک دفعہ داخل ہو کر میں اب تک پچھتا رہا تھا۔ اپنی پیاری بہن کی مصیبت نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کرنا ہے مجھے۔ ذہن میں ایک موہوم سا منصوبہ تھا جو نہایت خطرناک بھی تھا اور ظاہری طور پر ناقابل عمل بھی۔ میں کسی بھی طرح حویلی میں گھسنا چاہتا تھا۔ اس حویلی کی بھول بھلیوں سے شفتا کو نکالنا تو شاید دشوار ہوتا لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ میں کسی ایسے فرد تک پہنچ جاؤں جس کی جان جاگیردار کو ایسے ہی پیاری ہو جیسے مجھے شفتا کی جان تھی۔ سچی بات ہے گردش حال نے مجھے ہر ضابطہ اخلاق سے بے نیاز کر دیا تھا۔ حالات کو بھول جانا بھی انسان کی مجبوری ہے۔ اپنی بہن کو بے رحم قاتلوں کے چنگل سے نکالنے کے لئے میں جاگیردار کے کسی بھی چہیتے کی کنپٹی پر اپنا ریوالور رکھ سکتا تھا۔ چاہے وہ کوئی صد سالہ بوڑھا ہوتا یا دو سال کا بچہ۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں کوئی اور طریقہ نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کا مطلب "شفتا" کی اذیتناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔ یہ تصور ہی میرے لئے جان لیوا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا جب دور سے حویلی کی مدھم روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں اور محتاط ہو گیا۔ صبح بوقت روانگی میں محل وقوع کا جائزہ لے چکا تھا کماد اور مکئی کے کھیتوں سے ہوتا ہوا میں وسیع و عریض عمارت کے پچھواڑے کی جانب نکل گیا۔ دور سے حویلی کی سنگلاخ بے رحم چار دیواری نظر آنے لگی۔ اس چار دیواری کے کئی حصے ٹیوب لائٹس کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ میں محتاط قدموں سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ کماد کے کھیت بیرونی چار دیواری سے ملے ہوئے تھے۔ میں ان کھیتوں میں چلتا اور بارش میں کانٹے توڑتا بیرونی دیوار کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ میں پہلی دفعہ اس دیوار کے اتنا نزدیک آیا تھا۔ اس کی اونچائی میرے اندازے سے کوئی ایک فٹ سے زیادہ یعنی نو فٹ تھی۔ اوپر خاردار باڑ تھی جو لوہے کے اینگل آئرن کے ساتھ اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ صرف بارش کی مدھم صدا تھی جو مسلسل کماد کے پتوں پر گر رہی تھی۔ ایکا ایکی مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ کوئی میرے بہت قریب موجود تھا۔ کوئی انسان یا جانور؟ میں اپنی جگہ بے حرکت بیٹھ گیا اور فصل کی اوٹ سے تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ خود بخود ریوالور پر پہنچ چکا تھا۔

چند لمحے بعد مجھے حویلی کی دیوار کے ساتھ ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس کا فاصلہ مجھ سے کوئی پچیس فٹ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہیولا کسی انسان کا ہے۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز بھی یہی کچھ سمجھا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دھم دھم کی آوازیں آئیں۔ میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ دیوار کی جڑ میں بیٹھا ہوا ہیولا دیوار سے سر ٹکرا رہا ہے۔ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے بے پناہ حیرانی سے سوچا اس بلاخیز سردی میں اس تاریکی اور بارش میں یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟ کیوں حسرت اور غم کی تصویر بنا ہوا تھا؟

اس شخص کا سر دیوار کی طرف تھا۔ یوں بھی میں بے آواز چلتا یہاں تک پہنچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری آمد سے بے خبر رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں فصل کی اوٹ سے نکلا اور دھیمے قدموں سے ہیولے کی جانب بڑھا۔ اچانک وہ پراسرار شخص میری موجودگی سے باخبر ہو گیا اس کے سر نے تیزی سے حرکت کی۔ پھر کسی بدکے ہوئے جانور کی طرح وہ اٹھ بھاگا۔ اس کے انداز میں انتہا درجے کا خوف شامل تھا۔ میں بے ساختہ اس کے پیچھے لپکا۔ اس موقع پر آواز دینا درست نہیں تھا۔ دوڑ میں وہ مجھ سے کم تیز نہیں تھا لیکن ایک جگہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اس کے سنبھلتے سنبھلتے میں سر پر جا پہنچا۔ اس

سے پہلے کہ وہ اپنی سابقہ رفتار تک پہنچتا میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا نرم نرم روئی جیسی دلدل پر زمین پر گرا۔ اس کے جسم پر ہاتھ پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مضبوط جسم کا مالک ایک کڑیل جوان ہے۔ نیچے گرتے ہی اس کے منہ سے ایک فحش گالی نکلی اور اس نے بے دریغ میری پیشانی پر ٹکر دے ماری۔

مجھے اس سے اس حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو اسے نیچے بھی گرانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا میں نے صرف اسے روکنے کی کوشش میں کیا تھا۔ ٹکر کھا کر میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ میں نے جواباً ایک زوردار ہاتھ اس کی ٹھوڑی پر جما دیا۔ وہ زور لگا کر مجھے پہلو کے بل گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے اس کے بائیں ہاتھ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ بایاں ہاتھ مجھ سے پنجہ آزما نہیں تھا بلکہ کسی اور کام میں مصروف تھا۔ میری یہ خبرداری میری زندگی کی ضمانت بن گئی۔ ورنہ جو گراری دار چاقو میرے مقابل کی قمیص کے نیچے سے اس کے ہاتھ میں آنے والا تھا وہ ایک لمحے کے بعد میری آنتیں کیچڑ پر ڈھیر کر دیتا۔ چاقو کے باہر آتے آتے میں نے مقابل کی کلائی جکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے ایک طوفانی مکا اس کی ناک پر مارا۔ میرا واسطہ ایک سخت جان سے پڑا تھا۔ ورنہ وہ یہ مکا کھا کر ضرور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیتا۔ اس نے نہ صرف اس ضرب کو برداشت کیا بلکہ ایک منہ زور جھٹکے سے مجھے نیچے کر لیا۔ میری سلامتی کا دارومدار میرے دائیں ہاتھ کی گرفت پر تھا۔ اگر یہ گرفت ختم ہو جاتی تو بے مہار چاقو جسم کے کسی بھی حصے میں داخل ہو جاتا۔ دلدلی زمین پر ہم دونوں کے درمیان ایک سنگین کشمکش شروع ہو گئی۔ میں کسی قیمت پر کلائی سے اپنی گرفت ختم کرنا نہیں چاہتا تھا اور میرا حریف ہر قیمت پر اپنے چاقو کے آزادانہ استعمال کی خواہش رکھتا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں بوچھاڑ کی صورت نکل رہی تھیں۔ لگتا تھا دنیا سے بہت اکتایا ہوا ہے۔ مرجانا چاہتا ہے یا مار دینا چاہتا ہے۔ پتا نہیں کس کا ستایا ہوا تھا جو میری جان کو آگیا تھا اور واقعتاً اگر اس کے مقابل کوئی کمزور شخص ہوتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ میں نے اسے بمشکل قابو کر رکھا تھا۔ آخرکار مجھے ایک موقع مل گیا میں نے زور آزمائی کے دوران اپنی ایک ٹانگ غیر محسوس طور پر آزاد کرائی اور پھر گھٹنے کی ایک وحشیانہ ضرب اس کی ناف پر دے ماری۔ یہ ایک تباہ کن ضرب تھی۔ ایک لمحے کے لئے مقابل کے رگ پٹھے ڈھیلے ہوئے اور میں نے پوری قوت سے اس کا بازو موڑ کر پیٹھ پر لگا لیا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ آہ نکلی۔ چاقو کیچڑ میں گرا ہوئے

چھل کی طرح اس کے ہاتھ کی مٹھی سے جدا ہو کر کیچڑ میں جا گرا۔ میں نے اڑنگا لگا کر اسے دھکا دیا اور وہ میرے اوندھے منہ کھیت میں گرا۔ مجھ پر اب دہشت غالب تھی اور اگر میرا حریف مزید تن فن دکھاتا تو میں بلا دریغ اس کا کندھا اکھاڑ ڈالتا۔

"کون ہے تو؟" میں نے غصیلی سرگوشی کی۔ جواب میں اس نے جاگیردار اور حویلی کے مکینوں کو شاہکار گالیاں دیں اور مجھے بھی اس رگڑے میں رکھ لیا۔ غالباً وہ مجھے جاگیردار کا کارندہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اور رانی خان کے ساتھ اپنی زبان ذرا قابو میں رکھ اور دوست دشمن کی پہچان کر۔ میرا جاگیردار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس نے مجھ سے ایک نازیبا رشتہ جوڑ کر فرمایا۔ "پھر کس سے تعلق ہے تیرا؟"

دل چاہا کہ میں بھی جواباً اس سے کوئی اچھا رشتہ جوڑ دوں۔ لیکن یہ موقع گالی گلوچ کا نہیں تھا۔ میں نے کہا "پاگل خانے اگر تو میری بات اطمینان سے سننے کا وعدہ کرے تو میں تیرا بازو چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس نے قدرے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "تو کون ہے تو؟"

میں نے آہستگی سے اس کا بازو چھوڑ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کیچڑ پوش میرے سامنے تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھ بھائی۔ اگر زور آزمائی کا شوق ہے تو میں اب بھی حاضر ہوں لیکن اس سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہم دونوں کسی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ــــ تو کیا کر رہا تھا وہاں حویلی کی دیوار کے ساتھ؟"

میرے حریف نے مجھے سر تا پا گھورا اور اس کا رویہ نرم پڑتا محسوس ہوا۔ وہ بولا "اگر تم جاگیردار کے بندے نہیں تو تم وہاں کیا کر رہے تھے؟"

میں نے سر کھجایا "سوال تو تیرا معقول ہے بھائی ــــ لیکن کیا یہاں کھڑے کھڑے جواب چاہتے ہو؟"

یکایک جیسے ہم دونوں کے درمیان بہت سے شکوک و شبہات دور ہو گئے۔ اس نے کہا "میرا نام صفدر علی ہے ــــ میں اس سامنے والے گاؤں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ہم وہاں جا سکتے ہیں۔"

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ کھیتوں کے پار گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ کا فاصلہ ہو گا۔ میں نے کیچڑ میں ہاتھ پھیر کر صفدر علی کا گمشدہ چاقو تلاش کیا اور اسے تھماتے ہوئے بولا "چلو ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ ویسے بھی یہاں رکنا مناسب

نہیں۔"

ہم اونچے کماروں کے اندر پگڈنڈی پگڈنڈی چلتے گاؤں میں پہنچ گئے۔ اس وقت رات ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ بارش میں بھیگا اور سردی میں ٹھٹھرا ہوا گاؤں تاریکی کا کمبل اوڑھے بے خبر سو رہا تھا۔ کہیں کوئی پہریدار نہیں تھا۔ آوارہ کتے بھی کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ صفدر علی اور میں گاؤں کے بیچوں بیچ پہلے ایک ٹھٹھرے ہوئے جوہڑ میں غوطہ زن ہوئے۔ کیچڑ سے کچھ رہائی حاصل ہوئی تو ایک مکان کے دروازے کے سامنے جا رکے۔ دستک پر لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور کسی نے اندر سے کنڈی گرا دی۔ میں نے دیکھا ایک تیس پینتیس سالہ شخص دو بیساکھیوں کے سہارے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں لالٹین پھنسائے کھڑا تھا۔

صفدر علی نے کہا "معاف کرنا شامت۔ مجھے دیر ہو گئی۔ راستے میں یہ بھائی صاحب مل گئے تھے۔ مسافر ہیں ان کی گاڑی ڈیک نالے کے پاس خراب ہو گئی ہے۔"

شامت جلدی سے دروازہ چھوڑتے ہوئے بولا "آؤ آؤ جی آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔"

ہم تینوں آگے پیچھے گھر کی بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ شامت ایک باخلاق دیہاتی تھا۔ وہ اس وقت گھر والوں کو جگا کر چائے پانی کا انتظام کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سختی سے روک دیا۔ صرف یہ درخواست کی کہ خشک کپڑوں کا ایک جوڑا مل جائے۔ شامت نے پلک جھپکنے میں مجھے ایک تہبند قمیص لا کر دی اس دوران میرا "حریف" صفدر علی مٹی کی انگیٹھی میں آگ جلا چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرا گرم ہو گیا۔ ہم دونوں کپڑے بدل کر آگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ شامت کو مجبور کر کے ہم نے سونے کے لئے بھیج دیا۔ وہ صفدر علی کی پھولی ہوئی ناک دیکھ دیکھ کر شک میں مبتلا ہو رہا تھا۔ میرے زوردار مکے نے صفدر علی کو بیس بوسہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے چہرے پر بھی خراشیں تھیں اور شیروانی کا گلا ادھڑا ہوا تھا۔ بارش میرے پہلے ہی بھیگے تھے۔ ان حالات میں شامت علی کا شک میں مبتلا ہونا غلط نہ تھا۔ شامت کے جانے کے بعد صفدر علی نے کہا۔

"بیچارا بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں نے خوامخواہ اس سے جھوٹ بول دیا۔ خیر کوئی بات نہیں صبح بتا دوں گا۔ اب آپ بتائیں یہاں کس طرح آنا ہوا؟"

وہ ایک دم ہی "تم" سے آپ پر آگیا تھا۔ شاید میرے قیمتی لباس اور ٹیپ ٹاپ نے اسے متاثر کیا تھا۔ میں نے بے تکلفی سے کہا "بھرا میرے! یہ "آپ شاپ" چھوڑ۔ مجھے "تم" کہہ کر ہی بلا۔ سید ھا سادا بندہ ہوں میں تیری طرح۔" وہ ناک سہلا کر بولا "ہاں تو کیا مصیبت آن پڑی تھی تم پر اس وقت؟"

میں نے کہا "یہی سوال میں تم سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔"

درحقیقت ہم دونوں پہل کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ شکوک دور ہو چکے تھے لیکن اعتماد ــــ کی فضا ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوئی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اچانک میری نگاہ اس گیلی شلوار پر جا پڑی جو ابھی صفدر نے اتار کر کھونٹی پر لٹکائی تھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شلوار پر پیچھے کی طرف خون کے تازہ دھبے ہیں۔ یقینی بات تھی کہ ابھی تک یہ صفدر کی نظر نہیں پڑی ورنہ وہ ضرور انہیں چھپانے کی کوشش کرتا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"یہ خون؟"

اس نے چونک کر پیچھے دیکھا اور اپنا داغدار لباس دیکھ کر خجل سا ہو گیا۔ خون کے کچھ دھبے اس کی قمیص پر بھی نظر آ رہے تھے۔ گہری سانس لے کر بولا "اچھا ــــ پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں ــــ میں گجرات کا رہنے والا ہوں۔ ڈبل ایم اے کرنے کے بعد بیروزگار پھر رہا ہوں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اور تم نے کہانیوں میں بھی پڑھا ہو گا ہر پڑھے لکھے بیروزگار نوجوان کی ایک محبوبہ بھی ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے اور جس کے بچوں کا باپ بننے کے لئے وہ دفتروں کے راستے میں جوتیاں گھستا ہے اور نوکری کی تلاش کرتا ہے۔ میرے حالات بھی اس سے ملتے جلتے ہیں۔ میں انجم نامی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ ان کی رہائش ہمارے ہی محلے میں ہمارے گھر کے قریب ہے۔ بے حد شریف اور خاموش طبع لوگ ہیں۔ انجم تین بہنوں میں منجھلی ہے بھائی وغیرہ کوئی نہیں۔ اس کے والد اکاؤنٹنٹ ہیں۔ انجم سے میری وابستگی بہت پرانی ہے۔ اس وقت وہ شاید نویں میں پڑھتی تھی اور میں سیکنڈ ایئر میں تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری محبت میں شدت آتی گئی۔ گزرنے والے ہر موسم اور بیتنے والے ہر سال کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے گئے۔

ہمارے اس تعلق نے قریباً چھ سال ہر اونچ نیچ کا مقابلہ کیا تھا اور اب اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جلد یا بدیر ہم اپنی منزل پالیں گے۔ آج سے کوئی چار مہینے پہلے تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزمرہ زندگی کے معمولی مسئلوں کے علاوہ کوئی بڑا

مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر ایک واقعے نے سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ انجم کے پڑوس میں ایک نئے کرایہ دار آکر رہائش پذیر ہوئے۔ یہ کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ ان کی لڑکیاں بے حد فیشن ایبل تھیں۔ ایک لڑکی فلموں وغیرہ میں گلوکاری بھی کرتی تھی۔ ایک روز وہ لڑکی دھوپ سینکنے اپنے گھر کی چھت پر چڑھی۔ اس نے لڑکوں کی طرح بال کٹوا رکھے تھے اور پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر انجم نے اپنی چھوٹی بہن سے کہہ دیا۔

"دیکھو پرکٹی کبوتری۔"

یہ بات کسی طرح اس لڑکی کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ انجم کے ساتھ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی بہنیں بھی کوٹھے پر آگئیں۔ اور گالی گلوچ کی۔ بات مردوں تک پہنچ گئی۔ انجم کے گھر ان کے دور پار کا رشتہ دار آیا ہوا تھا۔ یہ ذرا جھگڑالو قسم کا شخص تھا۔ اس کی وجہ سے یہ جھگڑا اور بڑھ گیا۔ دونوں طرف سے تین چار آدمی زخمی ہوئے اور تھانے کچہری تک بات پہنچی۔ وہ شخص تو لڑائی بڑھا کر واپس دبئی چلا گیا اور انجم کے گھرانے کی مصیبت آگئی۔ انہیں روز گمنام خط اور دھمکیاں ملنے لگیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ پڑوسیوں سے دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ محلے داروں نے مل جل کر اس ناپسندیدہ گھرانے کو وہاں سے مکان بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعے کے تھوڑے ہی دنوں بعد لاابالی قماش کے شخص کالج کے راستے میں انجم کا پیچھا کرنے لگے۔ انجم نے گھر والوں کو اس بارے میں بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے مجھ سے اشارتاً ذکر کیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے کہ انجم اغوا ہو گئی۔ میرے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ پولیس میں رپورٹ درج ہوئی۔ انجم کے سابقہ پڑوسیوں کو شامل تفتیش کیا گیا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ یہ بہت بااثر لوگ ہیں۔ اپنے ہاتھ پاؤں بچانا خوب جانتے ہیں۔ انہی دنوں اپنے ایک جاننے والے کی زبانی مجھ پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ اصغر نامی یہ شخص جی ٹی روڈ کے ایک پیٹرول پمپ پر کام کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ کل رات ایک ٹویوٹا کار پیٹرول پمپ پر پیٹرول کے لئے رکی۔ اس میں کچھ سازندے اور ایک ادھیڑ عمر نائیکہ سوار تھی۔ اس کے علاوہ سیاہ برقعے میں ایک لڑکی بھی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر باریک نقاب تھا۔ پانی پینے کے لئے اس نے نقاب ہٹایا تو اصغر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ انجم تھی۔ اسے ننانوے فیصد یقین ہے کہ وہ انجم تھی۔ اتنے میں گاڑی آگے چل دی۔ اصغر کو کچھ اور تو نہیں سوجھا اس نے نمبر نوٹ کر لیا۔ یہ نمبر آکر اس نے مجھے دے

دیا۔ یہ بھکر کا نمبر تھا۔ میں نے ایک واقف کار کے ذریعے فوری طور پر پتا کروایا۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی کسی آغا قادر زماں کے نام رجسٹرڈ ہے اور یہ شخص گاؤں جھوک خاص کا رہنے والا ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہ شخص بہت بڑا جاگیر دار ہے اور نہایت بااثر شخص ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کیا کروں۔ پولیس کی طرف سے مجھ قلاش شخص کو کیا مدد مل سکتی تھی۔ بااثر افراد کے سامنے قانون کے محافظوں کی کارکردگی ویسے بھی صفر رہ جاتی ہے۔ یوں بھی میں اس معاملے کی تشہیر کر کے انجم کی بربادی کو بدترین شکل دینا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن کی محبت نے پکارا اور دل نے مجبور کیا تو میں تمام اندیشوں کو جھٹک کر اکیلا ہی گجرات سے براستہ جھنگ بھکر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد میں قصبوں کے ... میں یہاں پہنچا۔ پیٹ میں بھوک اور جسم پر میلا کچیلا لباس تھا۔ میں اس گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ رات کے اندھیرے میں دبی دبی چیخیں سن کر ٹھٹھک گیا۔ یہ نسوانی آوازیں درختوں کے اندر سے آرہی تھیں۔ میں حیران ہو کر درختوں کی طرف بڑھا تو ایک دبلے پتلے دراز قد دیہاتی نے میرا راستہ روک لیا۔ کہنے لگا "کیا بات ہے یار؟"

میں نے کہا "وہاں کیکروں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟"

کہنے لگا "میری گھر والی ہے۔ اس پر جن کا سایہ ہے۔ پیر صاحب سے اس کا علاج کروا رہا ہوں۔"

اتنے میں عورت کی چیختی ہوئی آواز آئی "خدا کے لئے بچاؤ۔ خدا رسولؐ کے لئے بچاؤ۔"

میں نے دبلے پتلے شخص سے کہا "پہلوان جی یہ تو کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔"

اس شخص کے چہرے پر ایک کھسیانی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ میرے گلے میں بازو ڈال کر مجھے ایک طرف لے گیا اور لوفر پن سے بولا۔ "یار جی! چھوڑو کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ جوان جہان آدمی ہو۔ چلو تم بھی رانجھا راضی کر لینا۔ بڑی چلتی پھرتی کڑی ہے۔ اسے دو یا تین سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ یہ آوازیں تو وہ نخرے میں نکال رہی ہے۔"

میرے ذہن میں انگارے بھر گئے۔ یہ خبیث مجھے بھی اپنے ساتھ گناہ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ چور کو سارے چور نظر آتے ہیں۔ اسے بھی ہر شخص عزت کا لٹیرا نظر آ رہا تھا۔ درحقیقت وہ میرا ڈیل ڈول دیکھ کر ڈر گیا تھا اور اب اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ حالات کو کیسے قابو کرے۔ اتنے میں لڑکی کی ایک اور چیخ سنائی دی۔ میں قابو سے باہر ہو گیا۔ بے

بے پروا ہو کر میں نے ایک زوردار ہاتھ اس کے منہ پر مارا وہ اچھل کر جھاڑیوں میں گرا۔ میں لپک کر چیخوں کی سمت گیا۔ چند گز آگے ایک چھوٹی سی کٹیا نظر آئی۔ اندر لالٹین کی مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کٹیا میں داخل ہوتا دبلے شخص نے میرے عقب سے آواز دی۔

"باوے۔۔۔ باوے۔"

باوے اس شخص کا نام تھا جو کٹیا کے اندر لڑکی سے دست درازی کر رہا تھا۔ آواز سنتے ہی وہ باہر کی طرف لپکا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا دستی چمٹا تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس نے چمٹے کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور بے دریغ میرے سر کو نشانہ بنایا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور ٹانگ کی زوردار ضرب مد مقابل کے سینے پر لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی گز پیچھے جھاڑیوں میں گرا اور ایکدم اٹھ کر بھاگ نکلا۔ اتنے میں مجھے عقب سے بھی بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ یقینی بات تھی کہ دبلا پتلا شخص بھی فرار ہو رہا ہے۔ دونوں خاصے بودے ثابت ہوئے تھے۔ میں کٹیا میں گھسا تو لالٹین کی روشنی میں ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کے جسم پر ناکافی لباس تھا شاید اسی وجہ سے وہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکی تھی اور ایک کونے میں کئی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ میں نے اپنی گرم چادر اسے تن ڈھانپنے کے لئے دی اور تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اس نے بتایا "میرا نام صغراں ہے۔ میرا بھائی ٹانگوں سے معذور ہے۔ میری ماں بیمار رہتی ہے اور پچھلے سال میرا چاچا (باپ) سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو چکا ہے۔ یہ جنگلی والا شیطان جسے سب "بابا جی" کہتے ہیں میری ماں کو الٹے سیدھے تعویذ دیتا رہتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ تیرے گھر پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ اس لئے تمہیں مصیبت پر مصیبت پڑتی ہے۔ وہ میری ماں کو روز جنگل میں بلا کر دم کیا کرتا ہے۔ کچھ دنوں سے ماں زیادہ بیمار ہے اور آ نہیں سکتی۔ اس کی جگہ وہ مجھے بلا لیتا ہے اور مجھ پر دم کر دیتا ہے اور میں جا کر ماں کو پھونکیں مار دیتی ہوں۔ آج اس کا دم کچھ لمبا ہو گیا۔ مجھ سے کہنے لگا تیرے گھر پر نحوست کے سائے بڑے گہرے ہو گئے ہیں۔ تیری ماں یا تیرے بھائی کی جان جا سکتی ہے۔ مجھے ایک دوسرا وظیفہ کرنا ہو گا۔ اس نے مجھے زبردستی کر پاس بٹھا لیا اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا۔ لگتا تھا اس نے کوئی نشہ بھی کر رکھا ہے۔ کہتا تھا یہاں جو کچھ ہوا اس کا ذکر باہر جا کر نہ کرنا۔ ورنہ صبح فجر کی اذان سے پہلے تیرے گھر میں ایک موت ہو جائے گی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بالکل شیطان بن گیا۔ میں نے پہلے اسے روکنے کی کوشش کی پھر چیخ پکار کرنے لگی۔"

لڑکی کی ساری کہانی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ کوئی نئی کہانی نہیں تھی۔ ایسی کہانیاں جہالت کے شاخسانہ گاؤں گاؤں اور دیہہ دیہہ بکھری ہوئی ہیں۔ میں صغراں کو لے کر اس کے گھر آگیا۔ شامت اور اس کی ماں کو سارا واقعہ معلوم ہوا تو وہ میرے بے حد ممنون ہوئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک بے ٹھکانا آدمی ہوں۔ تھوڑی بہت ڈاکٹری آتی ہے۔ شہری زندگی سے گھبرا کر گاؤں آگیا ہوں۔ سوچتا ہوں یہاں کوئی دواخانہ کھول لوں۔ ان لوگوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں جتنے دن چاہوں ان کے گھر میں رہ سکتا ہوں اور اپنے دواخانے کے لئے مناسب جگہ ڈھونڈ سکتا ہوں۔ یہ سادہ لوح دیہاتی مجھے واقعی ڈاکٹر قسم کی چیز سمجھ رہے ہیں۔

"یہاں اپنے قیام کے بعد مجھے شامت سے بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے پتا چلا کہ جاگیردار قادر زمان کون ہے اور کس کردار کا آدمی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خاندانی تماش بین ہے اور ہر مہینے کم از کم ایک مجرا اس کی حویلی میں ضرور ہوتا ہے جس میں ادرگرد کے زمیندار اور خوشحال لوگ بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ وہ شہر سے نت نئی طوائف بلاتا ہے اور اسے بے پناہ انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور دور کی طوائفیں اس کی حویلی میں آنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری انجم بھی نامعلوم حادثوں کا شکار ہو کر اس حویلی میں پہنچی ہے اور ابھی تک یہاں ہے۔ اپنی آمد کے دوسرے روز ہی رات کے وقت میں ایک خنجر سے لیس ہو کر قادر زمان کی حویلی جا پہنچا اور کسی طرح اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش نہایت طویل ثابت ہوئی کئی راتیں میں لگاتار جدوجہد کرتا رہا لیکن کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہیں آیا جو مجھے سلامتی کے ساتھ اندر پہنچا سکے۔ میں کوئی کم ہمت شخص نہیں ہوں اور نہ ہی موت سے ڈرتا ہوں لیکن حویلی کے اندر میں پر نہیں مار سکا۔ شاید تم نے نہ دیکھا ہو دیوار کے اوپر چاروں طرف ایک خاردار باڑ ہے۔ کم بختوں نے اس باڑ میں کرنٹ چھوڑ رکھا ہے۔ اندر پانی کی اونچی ٹنکی ہے۔ یہ ٹنکی واچ ٹاور کا کام دیتی ہے۔ ایک یا دو پہریدار وہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں اور چاروں طرف نظر رکھتے ہیں۔ ایک روز چاندنی میں انہوں نے شاید کھیتوں میں میرا سایہ دیکھ لیا۔ تڑ تڑ ہوائی فائرنگ ہونے لگی۔ ایک دو گولیاں میری طرف بھی آئیں۔ میں جان بچا کر بھاگ نکلا۔"

ایک لمحہ رک کر منور علی نے سگریٹ سلگایا اور بولا "تین روز پہلے مجھے معلوم ہوا کہ حویلی میں کام کاج کے لئے ملازم

بھرتی کئے جارہے ہیں۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور پھٹا پرانا لباس پہن کر ملازمت کی جستجو میں حویلی چلا گیا۔ وہاں جاگیردار قادر زماں کا ایک منشی امیدواروں سے سوال جواب کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک قریبی گاؤں سے روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ میں نے اپنی بول چال ایسی رکھی جس سے ظاہر ہو کہ میں معمولی پڑھا لکھا ہوں۔ مجھے ملازم رکھ لیا گیا۔ میں اب خوش تھا کہ حویلی میں داخل ہو کر انجم کا سراغ لگا سکوں گا۔ مگر اپنی ملازمت کے پہلے ہی گھنٹے میں میں پکڑا گیا۔ ایک شخص نے جاگیردار کے منشی کو بتا دیا کہ میں قریبی گاؤں سے نہیں بلکہ شہر سے آیا ہوں۔ میں نے بہت صفائی پیش کی کہ میرا اصل تعلق گاؤں سے ہی ہے اور میں واقعی بیروزگار ہوں مگر میری صفائی کا منشی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے نزدیک میرا یہ جرم ہی بہت تھا کہ میں نے جھوٹ بول کر نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ منشی حکم دین کی ہدایت پر مجھے لکڑی کی ایک ٹکٹکی میں کس دیا۔ اور پشت پر تیس بید مارے گئے۔ یہ بڑے ظالم قسم کے بید تھے۔ میری کھال ادھڑ گئی۔ یہ میرے لباس پر جو خون تمہیں نظر آرہا ہے انہی زخموں کا ہے۔ تمہارے ساتھ دھینگا مشتی میں یہ زخم پھر چھل گئے ہیں۔ بہرحال میں پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ منشی نے مجھے صرف جھوٹ بولنے کی سزا دی۔ اگر ان لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میری آمد کا اصل مقصد کیا ہے تو شاید اس وقت میری لاش کہیں سڑ رہی ہوتی۔ اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کروں۔ پرسوں والے واقعے کے بعد میں بہت دل برداشتہ ہو گیا ہوں کئی بار تو جی میں آئی ہے کہ بس خودکشی ہی کر لوں۔ کل صبح میں واپس چلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ اس بیچاری کی مدد میں تو کیا شاید قانون بھی نہ کر سکے۔ بڑی بدنصیب نکلی ہے وہ۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے صفدر علی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ ایکدم چپ ہو گیا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ یخ بستہ تاریکی اور بارش میں بیٹھا اس حویلی کی دیوار سے سر کیوں پھوڑ رہا تھا۔ کیوں رو رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا؟ اس دیوار کی دوسری طرف اس کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھی اور وہ اس دیوار کو عبور کرنے سے عاجز تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اسے رونا ہی تھا۔ اچانک میرے ذہن میں اس لڑکی کا سراپا آیا جسے میں نے کچھ روز پہلے حویلی کے مہمان خانے میں ناچتے دیکھا تھا اور جو میری گولی لگنے سے زخمی ہو گئی تھی۔ پہلے میں اسے نو عمر لڑکا سمجھا تھا لیکن بعد میں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ کہیں وہی تو انجم نہیں تھی۔

میں نے صفدر علی سے کہا۔

"انجم وہ تو نہیں جس کے بال چھوٹے چھوٹے ہیں اور گردن لمبی ہے۔ بائیں رخسار پر ایک نمایاں تل ہے۔"

صفدر علی نے الجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا پھر اٹھ کر ایک تھیلے سے تصویر نکال لایا "یہ دیکھو یہ اس کی تصویر۔"

میں نے تصویر دیکھی اور بھونچکا رہ گیا۔ میری گولی سے زخمی ہونے والی انجم ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ تصویر میں اس کے بال کافی لمبے نظر آرہے تھے اور اس نے بڑا خوبصورتی سے کامدار آنچل سر پر ڈال رکھا تھا۔ وہ بلکے میک اپ میں تھی۔ یہ تصویر شاید کسی شادی میں اتاری گئی تھی۔ ایک خوبصورت دوشیزہ کی ایک دلکش تصویر تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور پوری بات سمجھ میں آتی چلی گئی۔ غالباً انجم کے خوبصورت بال اس کے اغوا کے بعد تراشے گئے تھے اور اس بات کا تعلق اس چار ماہ پرانے جھگڑے سے تھا جس کے نتیجے میں انجم اغوا ہوئی۔ انجم نے ایک بدقماش گھرانے کی لڑکی کو پر کٹی کبوتری کہا تھا۔ اس ایک فقرے کا انتقام لینے کے لئے ان شقی القلب لوگوں نے اسے کیا سے کیا بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ انسان کبھی کبھی کتنا سنگدل اور جنونی ہو جاتا ہے۔ ایک ذرا سی بات اس کے لئے زندگی موت کا مسئلہ بن جاتی ہے اور وہ اس بات کے لئے مر بھی جاتا ہے اور مار بھی دیتا ہے۔

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ صحن کی جانب سے "دھم" کی مدھم آواز سنائی دی۔ صاف محسوس ہوا جیسے کوئی چار دیواری پھاند کر اندر آیا ہے۔ صفدر نے جلدی سے لالٹین بجھا دی۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جھری سے آنکھیں لگا دیں۔ ہمارے خدشات درست ثابت ہوئے۔ بیرونی دروازے کے قریب دیوار سے ایک سایہ سا چپکا ہوا تھا۔ لمحہ بھر بعد سائے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ پھونک پھونک کر زمین پر پاؤں جماتا بڑی احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بے آواز دروازے کی کنڈی گرائی اور پٹ کھول دیئے۔ کم از کم پانچ آدمی اور اندر گھس آئے۔ ان سب نے پگڑیوں کو ڈھاٹوں کی صورت چہروں پر لپیٹ رکھا تھا۔ دو تین کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور دو کے کندھوں پر رائفلیں تھیں۔ وہ چند ثانیے صحن میں کھڑے محل وقوع کا جائزہ لیتے رہے پھر وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں شماست ماں اور بہن کے ساتھ سو رہا تھا۔ پہلے انہوں نے کنڈی ہلا

ہلا کر کھولنے کی کوشش کی پھر دروازے کو ہلانے لگے۔ آہٹ پر اندر سے شماست کی دہلی دہلی آواز آئی۔

"کون؟" مسلح افراد میں سے کسی نے جواب نہیں دیا

"کون ہے؟" شماست نے دوبارہ پوچھا۔

جواب میں ایک لمبے شخص نے غضبناک لہجے میں گالی دے کر کہا "ہاں رے ویر' دروازہ کھول۔ تیرے پیو آئے ہیں۔"

تب دو افراد نے بھاگ کر دروازے کو کندھے سے ٹکر ماری۔ وہ پرانی لکڑی کا ڈھیلا ڈھالا دروازہ تھا۔ تڑاخ سے کھل گیا۔ اندر سے نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ پانچوں افراد بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ دو تین گرجدار آوازیں سنائی دیں اور چیخنے والی آوازیں سہم کر خاموش ہو گئیں۔ مسلح افراد نے اہل خانہ کو ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیا تھا۔

"کہاں ہے وہ تیرا بہنوئی؟" چند لمحے بعد کسی نے غرا کر کہا۔ پھر شماست کو ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اپنی بیساکھیوں پر لڑھکتا ہوا صحن میں آگرا۔

ایک چوڑے چکلے شخص نے دراز قد شخص سے کہا۔

"استاد جی' ایک دروازہ وہ ہے۔" اس کا اشارہ ہمارے کمرے کی طرف تھا۔

تین چار تو بی کیلتے ہوئے ہمارے دروازے پر پہنچ "دروازہ کھول اوئے بھڑوے" دراز قد شخص جسے استاد جی کہا گیا تھا بے پناہ طیش سے بولا۔

ہم دونوں تاریکی میں خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر زور سے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک بظاہر اس نے اپنی لاٹھی سے دی تھی لیکن آواز سے اندازہ ہوا کہ یہ لاٹھی نہیں بلکہ لمبا سا آہنی چمٹا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔

صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی "باوا اور اس کے ساتھی۔"

زور سے بجلی چمکی۔ چند لمحوں کے لئے صحن کا منظر واضح ہو گیا۔ میرا ہاتھ دیوار کی طرف بڑھا۔ یہاں میری گیلی شیروانی لٹکی ہوئی تھی جس کی جیب میں اعشاریہ پچیس کا بھرا ہوا ریوالور تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور شاپنگ بیگ کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔

صفدر لالٹین بجھا چکا تھا لہٰذا کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ میں نے ہاتھ گھما کر صفدر کا کندھا ڈھونڈا پھر اس کے کان میں سرگوشی کی "میں چارپائی کے نیچے چھپ جاتا ہوں تم دروازہ کھول دو۔"

"لیکن..." صفدر کے ہونٹوں سے لرزاں آواز نکلی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں" میں نے اس کی بات کاٹی "نہیں کھولو گے تو وہ توڑ دیں گے۔ چلو کھول دو دروازہ۔"

میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا اور خود جہازی سائز کی چارپائی کے نیچے رینگ گیا۔ یہاں ایک صندوق پڑا ہوا تھا۔ صندوق کے عقب میں دیوار کے ساتھ میرے لئے چھپنے کی بڑی موزوں جگہ بن گئی تھی۔ میں یہاں گھس گیا۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا اور ریوالور کی لبلبی پر شہادت کی انگلی بالکل تیار حالت میں تھی۔

دروازہ ایک بار پھر زور سے کھٹکھٹایا گیا اور اس کے ساتھ ہی کریہہ گالیوں کی بوچھاڑ اندر آئی۔ ان گالیوں کے پس منظر میں شماست کی ماں اور بہن کی چیخیں گھٹی گھٹی تھیں۔ یوں لگتا تھا حملہ آوروں نے انہیں بری طرح خوفزدہ کر رکھا ہے۔ قدموں کی چاپ سے میں نے اندازہ لگایا کہ صفدر دروازے کی جانب بڑھا ہے۔ اس کے ہاتھوں نے ٹٹول کر کنڈی تلاش کی اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی لالٹین کی روشنی کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ساتھ ہی صفدر کو زوردار دھکا لگا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا چارپائی پر گرا۔ کئی افراد یلغار کر کے اندر گھس آئے۔ نیم تیرگی میں مجھے ان کی صرف زیریں ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ اندر گھستے ہی انہوں نے صفدر کو بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ گھونسوں اور ٹھوکروں کے علاوہ وہ اسے رائفل کے بٹ بھی رسید کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں کمرے کی کئی اشیا ٹوٹ گئیں پھر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ اسی کمرے میں تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تھا تو اس دروازے پر میری نگاہ پڑی تھی۔ پہلی نظر میں لگتا تھا یہ اٹیچڈ باتھ روم ہے مگر ایسے دیہات میں اٹیچڈ باتھ روم کا تصور ایسا ہی تھا جیسے کسی کچی بستی میں فائیو اسٹار ہوٹل کا۔ یہ دروازہ بغلی کمرے کا تھا اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ خاصا وسیع کمرا تھا۔ غالباً برآمدے کے در بند کر کے اسے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی تاکہ سردیوں میں گائیں بھینسیں وغیرہ باندھی جا سکیں یا پھر غلہ ذخیرہ ہو سکے۔

صفدر مار کھاتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا تو اس کے پیچھے ہی بیساکھیوں کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ یہ بیساکھیاں شماست کی ٹانگیں تھیں اور ان کے عقب میں اس کی ماں اور بہن کے ننگے پاؤں نظر آرہے تھے۔ حملہ آوروں انہیں بھی

دھکیلتے اور گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بغلی دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ صرف دروازہ ہی بند نہیں ہوا' اندر سے کنڈی بھی چڑھ گئی۔ اب چیخنے چلانے اور گرجنے برسنے کی آوازیں بہت مدھم سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً حملہ آور بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ آوازیں مدھم رہیں ورنہ مارپیٹ تو وہ اس کمرے میں بھی پوری آزادی سے کر سکتے تھے۔

میں چند لمحے اپنی جگہ سکڑا سمٹا' اندر سے آنے والی آوازوں پر غور کرتا رہا۔ صفدر کو بدستور مار پڑ رہی تھی۔ شماست اور شماست کی ماں حملہ آوروں سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔

میں بغیر آواز پیدا کیے چارپائی کے نیچے سے نکلا اور بغلی دروازے پر جا پہنچا۔ ایک روشن جھری سے آنکھ لگائی تو اندر کے وسیع منظر کا ایک حصہ سامنے آ گیا۔ دراز قد شخص جسے اس کے ساتھی "استاد" کہہ رہے تھے' اپنی سیاہ پگڑی اتار چکا تھا۔ یہ پگڑی اس نے صفدر کے گلے میں ڈال رکھی تھی اور پوری قوت سے بل دے رہا تھا۔ گلا بھنچنے سے صفدر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں' اس کی ٹھوڑی نیچے سے پھٹی ہوئی تھی اور ناک سے بھی خون رس رہا تھا۔ کھدر کی قمیص والے چوڑے چکلے شخص نے صفدر کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور پورے زور سے اس کا سر نیچے جھکانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تکبیریں نکال اوئے۔ نکال تکبیریں" اس نے صفدر کو ماں کی گالی دیتے ہوئے حکم دیا۔

صفدر نے پورے زور سے ٹانگ چلائی۔ چوڑا چکلا شخص اچھل کر دور جا گرا اور میری نگاہ کے فریم سے آؤٹ ہو گیا۔ دراز قد شخص نے پوری قوت سے پگڑی کو جھٹکا دیا اور صفدر کو دیوار پر دے مارا۔ یہ ایک خوفناک ٹکر تھی۔ میرا کلیجا دہل کر رہ گیا۔ کراچی کے ایک قمار خانے میں' میں نے اسی انداز میں ایک شخص کا بھیجا سر سے باہر نکلتے دیکھا تھا۔ دیوار سے ٹکرا کر صفدر کراہا اور سر تھامے گھٹنوں کے بل زمین پر جا گرا۔ اسے شدید چوٹ آئی تھی لیکن وہ ابھی حواس میں تھا۔ دراز قد شخص نے اس کے بال مٹھی میں لے کر چہرہ دو تین بار زمین پر رگڑا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا "اس کتی کے پتر کو باندھ کر ایک طرف ڈالو۔ اس سے بعد میں نبٹیں گے۔"

دو ڈھاٹا پوش آگے بڑھے اور صفدر کو گھسیٹ کر ایک جانب لے گئے۔ میں نے پہلی بار غور سے دراز قد شخص کو دیکھا۔ وہ سراپا چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ سر پر استرا پھرا ہوا' آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور مکاری سے بھری ہوئی۔ اس کی دائیں کنپٹی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوتی قمیص میں تھا۔ میں نے دیکھا' اس کی ریچھ جیسی آنکھیں ایک رخ پر جمی تھیں۔ دروازے کی جھری سے مجھے نظر تو نہیں آیا' لیکن میں جان گیا کہ وہ کسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھری ہوس اور چہرے پر چھائی ہوئی خباثت اعلان کر رہی تھی کہ اس کی مرکز نگاہ شماست کی بہن ہے۔ سفاکی سے مسکراتے ہوئے اس کی باچھیں کانوں تک چلی گئی تھیں۔ بھاری آواز میں بولا "ادھر لاؤ ناں اس چوزے کو' ہم بھی دیکھیں کیوں آدھا پنڈ پاگل ہو گیا ہے اس کے لئے۔"

ایک تیز چیخ سنائی دی پھر دو افراد شماست کی بہن کو گھسیٹ کر دراز قد استاد کے سامنے لے آئے۔ میں نے دیکھا' وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک گوری چٹی لڑکی تھی۔ نقوش اچھے تھے لیکن اس وقت دہشت نے اس کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ اپنے لباس اور اپنے آپ میں سمٹی ہوئی وہ اصل قد کاٹھ سے کہیں مختصر نظر آ رہی تھی۔ اب میرے لئے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میرے بازو خود بخود اینٹھتے جا رہے تھے اور انگلیوں کی پوریں سنسنا رہی تھیں۔ ایک خوابیدہ شخص میرے اندر بیدار ہو رہا تھا۔ میں نے بہ آہستگی رخ پھیرا اور کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

باہر صحن میں مکمل تاریکی تھی۔ بارش مکمل رک چکی تھی اور گاہے گاہے بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ صحن میں کوئی نہیں۔ وہ پورا گینگ ساتھ والے کمرے میں گھسا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند قدم اٹھا کر میں طویل کمرے کے بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ روشنی کی کرنیں یہاں سے بھی پھوٹ رہی تھیں۔ اندر کسی کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "ناچو۔۔۔ ناچو" استاد تھا اور اس ڈری سہمی ہوئی لڑکی کو رقص کا حکم دے رہا تھا جو تقریباً پندرہ منٹ پہلے اپنی ماں اور بھائی کی حفاظت میں چین کی نیند سو رہی تھی۔ ان پندرہ منٹوں میں اس کی دنیا کے اندر قیامت گزر گئی تھی اور ابھی حشر برپا ہونے والا تھا۔ میں نے ریوالور پر گرفت مضبوط کر کے دروازہ آہستہ سے دھکیلا اور یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ یہاں بھی اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس دروازے میں بھی جھریاں موجود تھیں لیکن یہ بہت باریک تھیں اور اندر جھانکنا ناممکن تھا۔ میں تیزی سے پہلے والے کمرے میں واپس

اب میرے سامنے دو راستے تھے۔ خاموشی سے بیرونی دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل جاؤں اور محلے والوں کو جگا دوں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ استاد اور اس کے ساتھیوں کو للکاروں یا دروازہ توڑ کر اندر گھس جاؤں۔ دونوں صورتوں میں ہنگامہ ہونا تھا اور شور و غل بھی مچنا تھا۔ یہ صورت حال میرے لئے نقصان دہ تھی۔ اس ہنگامے کے بعد گاؤں میں میری موجودگی کا راز فاش ہو جانا یقینی تھا۔ عین ممکن تھا کہ کسی طرح آغا قدر زماں کو بھی خبر ہو جاتی۔ میں صبح گیارہ بجے دہلی سے لاہور جانے کے لئے نکلا تھا اور اب ایک ایسے گاؤں میں موجود تھا جو نہ لاہور کے راستے میں پڑتا تھا اور نہ ہی یہاں میری موجودگی کا کوئی اور جواز بنتا تھا۔ آغا قدر زماں جیسا شخص ایک لمحے میں بات کی تہ تک پہنچ سکتا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ میں معاملے کے اس رخ کو اچھی طرح دیکھوں' صفدر اور شماست کی مدد تو کروں لیکن اس طرح کہ میری اپنی ہستی خدائی فوجداروں کے قہر و غضب سے محفوظ رہے۔

اندر سے ایک بار پھر گھٹی گھٹی چیخ ابھری۔ اس کے ساتھ ہی چمٹا بجنے کی آواز آئی۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ دماغ میں جیسے انگارے بھرتے گئے۔ انسانیت کی تذلیل اپنے عروج پر تھی۔ اس گرجتی برستی دہشت کی واردات میں ہر خوف و خطرے سے بے نیاز ہو کر چند شیطان صفت اپنی من مانی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چمٹا بجانے والا ایک کوتاہ قد شخص تھا۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان' جسم پر چربی چڑھی ہوئی تھی۔ دیگر افراد کی طرح اس نے بھی ڈھاٹا چہرے سے ہٹا لیا تھا۔ اس کے رخساروں پر چیچک کے داغ تھے اور مہندی رنگے لمبے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی "بلا" ہے۔ بلوے کی سرخ آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس کے چہرے پر لعنت کا نزول تھا۔ نچلا ہونٹ فحش انداز میں دانتوں تلے دبا کر وہ چمٹا بجا رہا تھا۔ استاد کے ہاتھ میں اب بندوق نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بندوق کی نال لڑکی کی گردن پر رکھی ہوئی تھی اور دوسرے ہاتھ سے چٹکی بجا بجا کر اسے ناچنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ لڑکی کا چہرہ خوف اور بے بسی کی تصویر تھا۔ میں کوشش کے باوجود اسے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔

"ناچ نا۔۔۔ میں کہتا ہوں ناچ' نہیں تو لاش گرا دوں گا" استاد نے عجیب وحشت بھرے لہجے میں کہا۔ استاد کی آواز بڑی خام قسم کی تھی' بھنچی ہوئی اور بھرائی ہوئی سی۔ وہ پورے زور سے بھی بولتا ہو گا تو بیس قدم سے دور آواز نہ جاتی ہو گی۔ استاد کا مطالبہ سن کر لڑکی ہاتھ جوڑنے لگی۔ ایک جانب سے اس کی ماں بھاگ کر آئی اور استاد کے قدموں میں گر گئی۔ استاد نے ایک زوردار ٹھوکر سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں آئیں جن سے اندازہ ہوا کہ کمرے کے مشرقی کونے میں استاد کے گماشتے عورت کو مار رہے ہیں۔

"ناچ" استاد نے بندوق کی نال لڑکی کی گردن میں دھنسا دی۔

لڑکی اب دہشت کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ درخت کی دو ٹوٹی شاخوں کی طرح اوپر اٹھائے اور حد درجے کی بے بسی سے استاد کی طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "کیسے ناچوں؟ مجھے ناچنا نہیں آتا' میرے ماں باپ نے مجھے ناچنا نہیں سکھایا۔ انہوں نے مجھے سر ڈھانپنا سکھایا ہے۔ سنبھل کر چلنا سکھایا ہے اور چلتے ہوئے نگاہ نیچی رکھنا سکھایا ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں کیسے ناچا جاتا ہے؟" لڑکی کی معصوم آنکھوں میں بلکتی ہوئی وہ بے بسی مجھے پوری جان سے تڑپا گئی۔ ایک لمحے میں اندیشوں کے بادل ہوا ہو گئے۔ میرے ذہن میں یہ سوچ بجلی کوندے کے مانند لہرائی "شاہ جہاں! اگر تو آج اس معذور بھائی کی بہن کو نہ بچا سکا تو کل اپنی بہن کو بھی نہ بچا سکے گا۔ یہ مت سوچ کہ کس کی بہن مصیبت میں ہے۔ بس یہ سوچ کہ "بہن" مصیبت میں ہے' وہ رشتہ مصیبت میں ہے جو ماں کے دودھ کی طرح پاک اور خالص ہوتا ہے۔" میری پوروں میں سنسناتی حرارت شعلہ بن گئی۔ میں نے ٹھوکر مار کر ایک کرسی کو الٹایا اور دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ آہٹ ہوتے ہی کمرے میں چمٹے کی آواز تھم گئی اور گھمبیر [illegible] رہی۔ پھر کوئی دبے قدموں دروازے تک آیا۔

"کون ہے؟" بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ تب کسی نے کنڈی گرائی۔ دروازہ کھولا۔ لالٹین کی روشنی کسی مستطیل کی صورت میں اندر آئی۔ اس مستطیل میں کسی راکھاں بردار کا سایہ تھا۔ جونہی راکھاں بردار نے دروازے سے سر نکالا' میں نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑا اور پورے زور سے اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میری نگاہ سب سے پہلے استاد پر پڑی جو آنکھیں پھاڑے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی گرفت میں آئے ہوئے شخص کو پوری قوت سے دھکیل کر استاد پر دے مارا۔ یہ سب کچھ ایک ساعت کے مختصر حصے میں ہوا۔ [illegible] استاد اس افتاد کے لئے قطعی تیار نہیں تھا

تھا۔ زوردار جھٹکے سے وہ ڈکراتا ہوا کمرے کے وسط میں گرا۔ بارہ بور بندوق اس کے ہاتھوں سے نکل کر چارپائی کی طرف لڑھک گئی۔ دائیں جانب کھڑے دو افراد لاٹھیاں سونت کر میری طرف آئے لیکن اس سے پیشتر کہ ان کی اُٹھی ہوئی لاٹھیاں میرے جسم کو چھوتیں، میں نے بھاگ کر ایک تسکی بخش ٹکر ایک لاٹھی بردار کے سینے پر ماری۔ اس اثنا میں دوسرے کے پیٹ میں لات پڑی اور وہ کیچوے کی طرح دُہرا ہو کر فرش پر گر گیا۔ تیسرا رائفل بردار پھٹی ہوئی آنکھوں سے منظر دیکھ رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گولی چلائے یا تماشا دیکھتا رہے۔ پھر غالباً اس نے گولی چلانے کے لئے ہی رائفل سیدھی کی تھی کہ یکایک کوئی شے اس کے ہاتھوں سے ٹکرائی اور وہ تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ صفدر کے ہاتھ میں شامت کی ایک بیساکھی تھی۔ اس نے زمین پر پڑے پڑے اسی بیساکھی سے رائفل بردار کو شدید ضرب لگائی تھی۔ درحقیقت یہ لمحہ اس لڑائی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ میں رائفل بردار سے کوئی چار گز کے فاصلے پر تھا۔ اگر وہ گولی چلانے میں کامیاب ہو جاتا تو میرا زخمی یا مرحوم ہونا یقینی تھا لیکن اب مجھے اتنی مہلت مل گئی تھی کہ میں رائفل بردار کے دوبارہ سنبھلنے سے پہلے اس پر جا پڑوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے ایک طویل جست بھری۔ اس جست کا اختتام ایک زوردار ٹکر پر ہوا۔ یہ ٹکر رائفل بردار کی عین پیشانی پر پڑی تھی اور پھر وہی آواز آئی جو ناریل کے بجّے فرش پر گرنے سے آتی ہے۔

رائفل بردار الٹ کر دور جا گرا۔

میری نگاہ استاد پر پڑی۔ وہ ابھی رائفل اُٹھانے کے لئے جُھکا ہوا تھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر رائفل کو ٹھوکر ماری۔ وہ چارپائی کے نیچے گھس گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا بایاں بازو سانپ کی طرح استاد کی گردن سے لپٹ گیا اور ریوالور کی سرد نال اس کی کنپٹی سے لگ گئی۔

"خبردار!" میں نے غرا کر کہا "گولی ماردوں گا۔"

اپنا لہجہ سن کر مجھے یک گونہ تسلی محسوس ہوئی۔ اس لہجے میں وہی وحشت سمٹ آئی تھی جو میرے مدِمقابل کو مسحور کر کے اسے حوصلہ ہارنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ یہ لہجہ مصنوعی نہیں تھا کہ اسٹیج کے اداکار کی طرح میں جب چاہے اپنا لیتا۔ یہ تو ایک قدرتی عمل تھا جس پر میرا اختیار نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لہجے کا تعلق میرے غیظ و غضب سے تھا۔ جب یہ غضب ایک خاص نقطے پر پہنچتا تھا تو یہ لہجہ آپوں آپ میرے نتھنوں میں اُتر آتا تھا۔ اس سفاک لہجے نے مجسم تخیم استاد کو جیسے بجلی کا جھٹکا دیا۔ اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور بھسا کر رہ گیا۔

"خبردار" میں پھر چلایا "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ ماردوں گا اسے۔"

خدا گواہ ہے، اس گھڑی مجھے وہ تنومند افراد چیونٹیوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا جب چاہوں انہیں مسل کر رکھ دوں۔ بلّے نے اپنے آہنی جبڑے کو نیزے کی طرح سنبھال رکھا تھا اور پوری طاقت سے صفدر پر حملہ آور ہوا کو تھا مگر میری آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔ "پیچھے ہٹ جا کتے پیچھے ہٹ جا۔ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو جا۔" میں نے خونخوار لہجے میں حکم دیا۔ بادا اُلٹے قدموں چلتا پیچھے ہٹ گیا۔ اب کمرے میں موجود پانچوں حملہ آور دم بخود کھڑے تھے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ بازی اتنی تیزی سے اور اس انداز میں پلٹ جائے گی۔

"تم رائفل پھینک دو" میں نے استاد کی گردن کو جکڑے رہتے ہوئے رائفل بردار کو حکم دیا۔

وہ جیسے پہلے سے میرے حکم کا منتظر تھا۔ اس نے رائفل یوں فرش پر پھینکی جیسے اس میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ میرے اشارے پر زخمی صفدر لنگڑاتا ہوا اٹھا اور رائفل تک گیا۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی اس نے ... دیوار سے لگا اور اپنے قریب کھڑے دونوں افراد ... کر لیا۔ ایسے معاملوں میں وہ خاصا ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔ سخت جان بھی ورنہ جیسی مار اسے پڑی تھی، وہ بمشکل پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ اسلحہ آشنا شخص ہے۔

گھٹی گھٹی چیخیں ایک بار پھر میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ میں نے دیکھا کہ شامت کی بہن اور ماں کمرے کے ایک تاریک گوشے میں سمٹی بیٹھی تھیں۔ لڑکی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا لیکن چیخیں پھر بھی اس کے ہونٹوں سے نکلتی جا رہی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس لڑائی کے دوران ماں بیٹی کمرے سے نکل نہیں سکی تھیں۔ اگر وہ باہر جاتیں تو اس وقت پورا محلہ صحن میں جمع ہو چکا ہوتا۔ میں نے شامت سے کہا کہ وہ انہیں اور ساتھ والے کمرے ... کر دروازہ اندر سے بند کر لے۔ اس نے معمول کی طرح میرے حکم پر عمل کیا۔ اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے خون آلود ہونٹ پونچھ کر بیساکھیاں سنبھال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے راستہ دینے کے لئے میں نے تخیم استاد کو گھسیٹ کر ایک کونے

میں کر لیا۔ استاد کی گردن پر بے پناہ دباؤ تھا اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اگر وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ میرا لہجہ اسے باور کرا چکا تھا کہ اگر وہ مزاحم ہوا تو میں اسے "اناللہ" کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ رہی سہی کسر میری گرفت نے پوری کر دی تھی۔ یہ گرفت اس بات کا ٹھوس ثبوت تھی کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہوا ہے۔ زور آور ہونے کے باوجود استاد گردن کو معمولی سی حرکت بھی نہ دے سکتا تھا اور اگر دیتا تھا تو نتھنوں سے کراہ نکل جاتی تھی۔

دروازہ اندر سے بند ہو گیا تو میں نے شامت سے کہا کہ وہ چارپائی کے نیچے سے دوسری بندوق بھی نکال لے اور اسے اَن لوڈ کر کے گولیاں مجھے دے دے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد شامت نے گولیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ اب میں بالکل بے فکر تھا۔ میں نے بادے کو حکم دیا کہ وہ پگڑیوں سے اپنے تینوں ساتھیوں کے ہاتھ پُشت پر باندھ دے۔ بادے نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر استاد کا تاریک چہرہ دیکھا اور پھر فوراً میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے حرکت میں آ گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں افراد کے ہاتھ باندھ دیے۔ صفدر نے اپنی نگرانی میں مضبوط گرہیں لگوائیں۔ بعد ازاں بادے کے ہاتھ صفدر نے باندھے۔ اس عرصے میں استاد بدستور گھٹی گھٹی آواز میں بولتا رہا۔ معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر بہت نپا تلا دباؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ بول تو سکتا تھا مگر اس کی بکواس میری سمع خراشی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا، وہ کوئی کام کی بات نہیں کر رہا، صرف پھسپھسی دھمکیاں دے رہا ہے یا مصالحت کی پیش کش کر رہا ہے۔ مجھے ان دونوں معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

چاروں افراد کے ہاتھ بندھ گئے تو میں نے استاد کی کنپٹی سے پستول ہٹا کر گردن چھوڑ دی۔ وہ شہ رگ کو مسلتا ہوا غرایا "دیکھو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ تمہیں معلوم نہیں، میں کون ہوں؟"

"اوئے کنجر ہے تو۔ مجھے پتا ہے" میں نے غرا کر کہا۔ میرا غصہ عروج پر تھا۔

شامت نے عاجزی سے میری طرف دیکھا اور بولا "اب بس۔ اس معاملے کو اور نہ بڑھائیں۔ ہم۔۔۔ میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ آپ ان کو جانے دیں۔"

"تاکہ یہ کل پھر تمہاری بہن کو نچانے آ جائیں؟" میں نے زہر بجھے لہجے میں کہا۔

شامت منمنایا "یہ زور والے لوگ ہیں۔ میرا ان کا

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دل گداز داستان

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: ۔ ۷۲۲۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور
فون: ۔ ۷۲۲۳۸۵۳

کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ تو چلے جائیں گے لیکن یہ ہمیں زندہ درگور کردیں گے۔"

میں نے کہا "گھبراؤ مت پیارے۔ اگر اس بات سے ڈر رہے ہو تو یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ میں ان کو اس قابل نہیں چھوڑوں گا۔ چند قبروں سے کبھی مُردے نکلتے دیکھے ہیں تم نے نہیں دیکھے نا؟"

شامت نے گھگھیا کر کہا "دو منٹ کے لئے ایک طرف آکر میری بات سن لیں۔"

میں نے گہری نظروں سے شامت کو دیکھا۔ شامت کے عقب میں اس کی ماں اور ہمشیرہ نظر آ رہی تھیں۔ دونوں کمرے کے اسی نیم تاریک گوشے میں سمٹی بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی فریاد تھی جیسے بہ زبانِ خاموشی درخواست گزار ہوں کہ میں شامت کی بات سن لوں۔ میں نے صفدر سے کہا کہ وہ استاد کو نشانے پر رکھے اور ذرا سے شبے پر اس کی مصیبت آسان کر دے۔ صفدر نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ سخت زخمی تھا لیکن میرے استاد نے اسے چاق و چوبند کردیا تھا۔ میں شامت کو لے کر ساتھ والے کمرے میں آگیا۔ شامت نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھائی صاحب، ہم پر رحم کیجئے۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں ان کو چھوڑ دیجئے۔"

میں نے کہا "الٹی بات کر رہے ہو بھائی۔ مُردے کو چھڑوانے کے لئے ہیں کہ پکڑاتے ہیں۔ ویسے استاد ہے کون؟"

شامت نے کہا "اس کا نام کاوین ہے۔ بڑا خطرناک غنڈا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ "باوے" سے اس کی جان پہچان ہے۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ یہ بڑا ظالم ہے جی۔ قبر تک بندے کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔۔۔ اور۔"

بولتے بولتے شامت چپ ہوگیا۔ سہم کر اپنے خول میں سمٹ گیا "رک کیوں گئے۔ بولتے کیوں نہیں؟" میں نے اسے گھورا۔ وہ خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں شامت کی ڈھارس بندھائی۔ پھر اسے کہا کہ وہ ماں اور بہن کو لے کر اسی کمرے میں چلا جائے جہاں وہ سو رہا تھا۔ اس کمرے کے معاملات ہم جانیں اور ہمارے حریف۔ کچھ پس و پیش کے بعد شامت نے میری بات مان لی اور دونوں عورتوں کو لے کر صحن کی دوسری طرف والے کمرے میں چلا گیا۔ حالانکہ میں نے شامت کو کافی حد تک مطمئن کردیا تھا، پھر بھی اس کی طرف سے خطرہ موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ جب ہم استاد "کارمین اینڈ کمپنی" سے نمٹنے میں مصروف ہوں وہ خوف زدہ ہو کر ماں بہن کے ہمراہ گھر سے نکل جائے۔ ایسی صورت میں سارا کھیل چوپٹ ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں شامت اور دونوں عورتوں کو خود دوسرے کمرے میں چھوڑنے گیا تاکہ باہر سے کنڈی لگا سکوں۔ یہیں پر میری نگاہ ایک بڑے کیمرے پر پڑی۔ یہ کیمرا فلیش گن سمیت ایک بڑے صندوق پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے شامت سے کہہ کر یہ کیمرا حاصل کرلیا اور اصطبل نما طویل کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ یہاں صورت حال جوں کی توں پڑی تھی۔ باوا سمیت چار افراد مسافر کی مرغیوں کی طرح دیوار کے ساتھ بندھے پڑے تھے اور استاد کارمین کو صفدر نے بندوق کی زد میں لے رکھا تھا۔ صفدر کی انگلی لبلبی پر تھی اور آنکھوں میں وہی دلیری جو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دینے والے شخص کی آنکھ میں نظر آیا کرتی ہے۔ صفدر نے اب تک خود کو ایک بہتر ساتھی ثابت کیا تھا پھر بھی مجھے احساس ہوا کہ مجھے یوں استاد کارمین کے پاس تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے تھا۔ وہ ہوا بدمعاش کسی درندے کی طرح زور آور اور خطرناک تھا اگر وہ زخمی صفدر سے بھڑ جاتا تو لمحوں میں اس پر غالب آجاتا۔

میں نے کارمین کے سامنے پہنچتے ہوئے کہا "ہاں استاد جی۔ فرماؤ اب آپ کی کیا خدمت سیوا کی جائے۔"

وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "دیکھو کاکا! اس بات کو جتنا بڑھاؤ گے، بڑھتی جائے گی، تم مجھ کو دلیر لگتے ہو۔ تم میرے ہاتھوں مرو گے تو مجھے افسوس ہوگا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" میں نے چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، خود بھی امن سے رہو گے اور جن کی حمایت کر رہے ہو، وہ بھی فائدے میں رہیں گے۔"

میں نے چہرے پر سوچ کے اثرات پیدا کیے "اگر میں تمہاری بات مان لوں تو شامت کا پیچھا چھوڑ دو گے؟"

استاد کی باریک آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شامت نے مجھے دوسرے کمرے میں جا کر اس کا ٹھیک ٹھاک تعارف کرا دیا ہے اور اب میں معاملہ رفع دفع کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی ڈھلکی ہوئی گردن تھوڑی سی تن گئی۔ نیچے فرش پر خون تھوک کر بولا "شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاش ہیں۔ چار چوفیرے کسی سے پوچھ لو" جس نے کارمین کے ساتھ ٹکر

لی ہے اس نے منہ کی کھائی ہے، اس کا انجام بُرا ہوا ہے۔ اب یہ شامت کا بچہ اپنی قسمت کو رو رہا ہے۔" پھر اس نے صفدر کو عجیب نظروں سے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارے اس بندے نے باوے کو مارا ہے اور باوا اپنا جگر ہے۔ خدا کی قسم اس وقت گورنر بھی آجاتا تو اس کی اور شامت کی جان نہ چھڑا سکتا۔ پر تمہاری خاطر میں ان دونوں کو معاف کر سکتا ہوں۔"

کارمین جیسے بڑے بڑے بدخصلت میں نے دیکھے تھے۔ ایسے لوگوں کی لعنتی زبان پر آکر تو ماں اور بہن جیسے الفاظ اپنی حرمت کھو دیتے ہیں، وعدوں اور سمجھوتوں کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ اپنے تجربے کی بنا پر مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ اگر خدانخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ میری عقل پر پتھر پڑ جائیں اور میں کاوین کی باتوں میں آکر اس کے گماشتوں کو کھول دوں اور اسلحہ انہیں لوٹا دوں تو وہ اس سنہرے موقعے سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں گے۔ عین ممکن تھا کہ صبح اس مکان میں ہم سب کی لاشیں پڑی ہوں اور شامت کی بہن کسی ویران ڈیرے میں شرابی مردوں کے ساتھ زندگی جاری ہو۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل گئی۔ میں نے استاد کارمین سے مخاطب ہو کر کہا "اس کا مطلب ہے، تم شامت اور صفدر کو معافی دینے پر تیار ہو۔" وہ اس بات پر عجیب سا منہ بنا کر رہ گیا۔ میں نے اپنا سوال مکمل کرتے ہوئے کہا "لیکن اگر انہوں نے معافی نہ لی ہو تو؟"

"کیا مطلب؟" استاد نے خشک لہجے میں کہا۔

"مطلب یہ کہ اگر انہوں نے معافی لینے کے بجائے تمہاری دُم میں نمدہ فٹ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہو؟"

کارمین کا چہرہ ایک لمحے میں کئی رنگ بدل گیا۔ میرے لہجے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کی بدبختی کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا۔ وہ کراہ کر بولا "لگتا ہے، تم اپنی ماں کو بین کرا کر رہو گے۔" تھوکتے ہوئے اس نے ایک پاؤں کا وزن بے قراری سے دوسرے پاؤں پر ڈالا تھا۔ میں اس کے بائیں پاؤں کی لرزش صاف محسوس کر رہا تھا۔ میرے لئے اس نتیجے پر پہنچنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ کارمین کا بایاں ٹخنہ شدید زخمی ہے یا ٹوٹ چکا ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میرے جانے کے بعد اس نے صفدر پر جھپٹنے یا اس سے رائفل چھیننے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے صفدر سے کہا "یار صفدر! لگتا ہے استاد کارمین کا ٹخنہ پنکچر ہو چکا ہے، ذرا دیکھ تو سہی۔"

استاد کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میری ہدایت پر صفدر نے آگے بڑھ کر رائفل کی نال کارمین کے ٹخنے پر ماری۔ وہ درد سے تڑپ گیا۔ چہرہ لال بھبھوکا کر کے اس نے صفدر کو ایک کلاسیکل گالی دی اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

میں نے صفدر سے کہا "یار! میرا تو ارادہ تھا کہ اس بہن کے خصم کو مقابلے کی دعوت دوں لیکن یہ تو نرا ہیجڑا نکلا۔ ایک ہی جھٹکے میں ہڈی تڑوا بیٹھا۔ یار دیکھ کہیں یہ واقعی ہیجڑا تو نہیں۔ اتنی نرم و نازک ہڈیاں ایک مرد کی کیسے ہو سکتی ہیں۔"

"ہاں، یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا" صفدر نے کہا اور پُرتجسس انداز میں کارمین کی طرف بڑھا۔

یہ بے عزتی کارمین کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کے منہ سے گالیوں کا غلیظ فوارہ پھوٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صفدر سے بچنے کے لئے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ جونہی وہ میرے قریب پہنچا، میں نے پوری نفرت سے ایک ٹانگ اس کی پیٹھ پر جمائی اور وہ چیختا ہوا باوے پر جا ڈھیر ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ میرے دماغ میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں تھوڑی دیر پہلے کا وہ منظر گھوم رہا تھا جب یہ خبیث انسان ایک بے گناہ لڑکی کی گردن میں بندوق دھنسا کر اسے ناچ دکھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ دو ٹوٹی شاخوں کی طرح اٹھے ہوئے ہاتھ اور ایک فریادی نگاہ میرے تصور میں چمک گئی۔ میں نے فرش پر پڑے استاد کی ایک ٹانگ پر پاؤں رکھ کر دوسری ٹانگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کا زخمی ٹخنہ میرے ہاتھ میں آیا تو وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا۔ اگر اس کا لاؤڈ اسپیکر خراب نہ ہوتا تو یہ آواز گلی کے آخری سرے تک جاتی مگر اب یہ آواز کمرے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ میں نے ٹخنے کو دو تین جھٹکے دیے تو استاد سر زمین پر پٹخنے لگا۔ کتنا کم ہمت ہے انسان۔ پھر بھی من مانیاں کرتا ہے۔ ظلم کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ ظلم اس پر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہی احساس میں استاد کو دلانا چاہتا تھا۔ اس کا ٹخنہ ٹوٹ چکا تھا اور چوٹ تھوڑی ہو کر ناقابلِ برداشت ہوئی تھی۔ ایسے میں معمولی سی جنبش بھی برداشت نہیں ہوتی، کہاں میں اس کا پاؤں رسے کی طرح مروڑ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے استاد کارمین جیسے پاگل ہوگیا۔ پہلے اس نے مجھے خوفناک گالیاں دیں۔ پھر منتیں سماجتیں کرنے لگا۔ منتیں سماجتیں ناکام ہوئیں تو مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی، نتیجے میں اوندھے منہ زمین پر گرا اور ایک بار پھر گالیوں پر اتر آیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کے اندر گالیوں کی جتنی "ورائٹی"

ہے" آج خرچ ہوجائے۔ اب اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی اور رنگ لیموں کی طرح زرد ہوچکا تھا۔ سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ اپنی ٹانگیں میرے پہلوانی داؤ سے آزاد نہیں کرا سکا تھا اور یہی بات اس کے ساتھیوں کے لئے زیادہ دہشت ناک تھی۔ وہ دم بخود بیٹھے تھے۔

کاریین نیم جان ہوگیا تو میں نے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور اسے سیدھا کھڑا کردیا۔ وہ ویو کا ویو تھر تھر کانپ رہا تھا اور "ہائے ہائے" کر رہا تھا۔ میں نے صفدر سے کہا "تجھے چمٹا بجانا آتا ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میرے تاثرات دیکھ کر صفدر بھی دم بخود سا نظر آتا تھا۔ میں نے زمین پر پڑا چمٹا اٹھا لیا اور استاد کاریین کو حکم دیا کہ وہ ڈانس کرے۔

"ہائے میرا گٹا۔۔۔ ہائے اوئے میں مرگیا۔"

استاد بچوں کی طرح رو رو کر بہانے بازی کرنے لگا۔ ایسے لحیم شحیم آدمی کا بچوں کی طرح گڑگڑانا اور بہانہ بازی کرنا ذرا مشکل سے تصور میں آتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔ میں نے بارہا ایسا دیکھا ہے۔ بڑے بڑے پھنے خاں اور زور آور لوگ اذیت سے بے بس ہوکر بچوں کی طرح بلکتے ہیں اور فقیروں کی طرح رحم کی بھیک مانگتے ہیں۔ استاد کاریین بھی یہی کر رہا تھا۔ اس کا ٹخنہ چکنا چور تھا اور میری "دسترس" میں تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اس کے ٹخنے پر ہلکی سی ٹھوکر ماری' وہ تڑپ گیا۔

"ناچ حرام زادے" میں نے بے پناہ غضب سے کہا۔

استاد کاریین نے بے بسی سے پہلے میرے ریوالور اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ یکبارگی اس کی ساری پھنے خانی ناک کے راستے بہہ گئی۔ وہ ریتلی دیوار کی طرح گرا اور میرے قدموں میں بکھر گیا۔ اپنی جان کو عذاب سے نکالنے کے لئے وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس کی حاضر دماغی نے مجھے دل ہی دل میں مسکرانے پہ مجبور کردیا لیکن میں اسے ایسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے کھینچ تان کر دوبارہ دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف گر جاتا تھا۔ میں نے اسے ایک طرف سے سہارا دیا۔

"صفدر' وہ گٹھڑی لاؤ" میں نے فرش پر پڑی سیاہ گٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

صفدر نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے کاریین کے ہاتھ کس کر پشت پر باندھ دیئے اور صفدر سے کہا کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے۔ پھر میں ساتھ والے کمرے سے ایک دوپٹا' پیتل کے دو بندے اور لپ اسٹک لے آیا۔ یہ اشیا مجھے اس صندوق سے ملیں جو چارپائی کے نیچے پڑا ہوا تھا اور جس کی اوٹ میں مجھے چھپنے کی جگہ ملی تھی۔ کاریین بدستور "بے ہوش" پڑا تھا یعنی بے ہوش بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کانوں میں بندے ڈال دیئے اور سر پر دوپٹا پھیلا دیا۔ بعد ازاں لپ اسٹک سے اس کے ہونٹ رنگنے لگا۔ کاریین اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دینے لگا۔ وہ عجب مصیبت میں تھا۔ عورت بننے کی ذلت بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور "ہوش" میں آکر مزاحمت کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا (کیونکہ ایسی صورت میں اس کا ٹخنہ پھر ٹھوکروں کی زد میں آجاتا) وہ بے ہوشی کا ڈراما رچائے ہوئے جو تھوڑی بہت مزاحمت کرسکتا تھا کر رہا تھا۔ استرا پھرے سر پر کامدار دوپٹا اور کانوں میں بندے' کاریین کی صورت قابل دید تھی۔ صفدر بھی اپنی چوٹیں بھول کر مسکرانے پر مجبور ہوگیا۔

میں نے قریبی پڑچھتی سے کیمرا اٹھایا اور فلیش گن چارج کرکے کھٹا کھٹ کاریین کی کئی تصویریں اتار لیں۔ دیوار کے سہارے ٹانگیں پھیلائے پڑا وہ جتنا مضحکہ خیز لگ رہا تھا شاید میں بیان نہ کرسکوں۔ اس کے ساتھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے اور فریادی نگاہوں کی زبان میں مجھے صلہ رحمی کی تلقین کر رہے تھے۔ سب سے پتلی حالت بادے کی تھی۔ وہ جانتا تھا' یہ سارا بکھیڑا اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔ نہ وہ شماست کی بہن پر بری نظر ڈالتا نہ صفدر کی مداخلت پر اسے اپنی حویلی سے بھاگنا پڑتا' نہ انتقام کی خاطر وہ استاد کاریین کو اس چار دیواری میں لاتا اور نہ استادیوں یادگار طریقے سے ذلیل و خوار ہوتا۔

میں نے سب سے پہلے بادے ہی کو تختۂ مشق بنایا۔ اس کے سر پر دوپٹا ڈال کر ہونٹوں پر لالی لگائی۔ جھمکے پہنائے اور چھنکار زدہ چہرے کی تین تصویریں لے لیں۔ پھر یہی عمل باقی تینوں افراد کے ساتھ بھی دہرایا۔ کسی نے چوں و چرا نہیں کی۔ بس دلہنوں کی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے اور مونچھیں پھڑکاتے رہے۔ استاد اب ڈھلک کر فرش پر گرچکا تھا۔ وہ بے ہوشی کی اچھی اداکاری کر رہا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اداکاری ہے۔ اگر میں ابھی اس کے ٹخنے سے محبت کرتا تو وہ مسرت سے لوٹ پوٹ ہوجاتا اور اٹھ اٹھ کر میری بلائیں لینے لگتا۔ بہرحال وہ کافی ذلیل ہوچکا تھا' اب میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

میں نے صفدر سے کہا "تجھے کہا تھا نا' یہ کاریین ہیجڑوں کے قبیلے سے ہے۔ دیکھو لالی کتنی سج رہی ہے اس کے ہونٹوں پر' لگتا ہے ابھی اٹھ کر ٹھمکا لگانے لگے گا۔" صفدر مسکرانے لگا' میں نے کہا "کیا خیال ہے' تھوڑا سا ٹھمکا لگوایا نہ جائے ان سب سے۔ وہ کون سا گورس ہے قلم تمیں مار خان کا۔۔۔ ہائے۔ او میری جھانجھر' چھن چھن چھنکے۔۔۔ او میری جھانجھر۔۔۔ استاد یہ گانا گائے تو بالکل شیریں باتی لگے۔ ذرا غور سے دیکھ یار' اس کی شکل میں تجھے شیریں کی جھلک نظر نہیں آتی! وہی ناک' وہی کان۔۔۔ ویسا ہی بھاری وجود۔۔۔"

صفدر کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ بادا گھگھیا کر بولا "معاف کردے جیون جو گیا۔ بہت ہوچکی ہے ہم سب سے۔ ہماری توبہ' ہمارے اگلے پچھلوں کی توبہ۔۔۔ بس اب جانے دے ہم کو۔ ہمارے سروں پر قرآن رکھوا لے اگر ہم اس واقعے کا کسی سے ذکر کریں یا دوبارہ کوئی ایسی حرکت کریں تو۔"

ایک دوسرا غنڈا جو نسبتاً نوجوان تھا' باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا۔ اب معلوم نہیں یہ رونا خوف کے سبب تھا یا چوٹ کے سبب۔ اس شخص کی ناک پر میری ٹکر پڑی تھی۔ تو جمعے ہی گھنٹے میں یہ ناک پھول کر کپا ہوگئی تھی اور اب سوجن آنکھوں کو چڑھ رہی تھی۔ میں نے بادے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر تم چاہو تو اس واقعے کا ذکر ہر کسی سے کرسکتے ہو بلکہ مسجد سے اعلان کرا سکتے ہو اور اس گھر میں آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے' جب چاہو دیوار پھاند کر آجاؤ لیکن ایک بات یاد رکھنا' تمہاری تصویریں اس کیمرے میں محفوظ ہیں اور میں خود بھی اس گاؤں کے اردگرد ہی موجود رہتا ہوں۔ جب بھی تمہاری محبت پکارے گی' میں کچے دھاگے سے بندھا چلا آؤں گا۔"

وہ چاروں صم بکم بیٹھے رہے۔ بھرا ہوا ریوالور میری گود میں رکھا تھا۔ میں نے صفدر سے کہا کہ وہ چاروں کے ہاتھ کھول دے۔ اس نے ہاتھ کھول دیئے۔ میں نے ان کی بندوقیں تو قبضے میں رکھیں لیکن چمٹا اور لاٹھیاں وغیرہ واپس کردیں۔ پھولی ہوئی ناک والا نوجوان ان سب میں قد آور تھا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے استاد محترم کو کندھے پر لادے۔ دو ساتھیوں کی مدد سے اس نے بے ہوش کاریین کو بمشکل کندھے پر لادا۔۔۔ پھر وہ چاروں اس کمرے سے یوں نکلے جیسے یہ چھت ایک دھماکے سے ان پر گرنے والی ہو۔ ذرا دیر بعد میں نے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ پانچوں بدمعاش اپنی دمیں کٹوا کر روانہ ہوچکے تھے۔

میں نے صحن میں نکل کر دیکھا۔ بارش رک چکی تھی۔ بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی چاند اپنی جھلک دکھا جاتا تھا۔ میری کلائی کی گھڑی رات کے تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھانے اور مال غنیمت یعنی بندوقوں کو سنبھالنے کے بعد میں اور صفدر شماست کے پاس پہنچے۔ صفدر کی آواز پر شماست نے دروازہ کھولا۔ نیند ان تینوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ شماست کی بہن صغراں ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ رو رو کر ماں بیٹی کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔

شماست کی بیمار ماں نے بلک کر کہا "اب ہمارا کیا ہوگا پتر۔ بادا اور اس کے بدمعاش ہمارا جینا حرام کردیں گے۔"

"آپ کا جینا حلال رہے گا ماں جی" میں نے اطمینان سے کہا "بادے کی اب جرأت نہیں کہ اس گھر یا گاؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ اللہ نے چاہا تو اب آپ کو اس کی صورت نظر نہیں آئے گی" میں نے یہ بات پورے یقین سے کہی تھی۔ میں بدمعاشوں کی تمام اہم اقسام اور ان کے مزاجوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کاریین بدمعاشوں کی کن ٹٹی قسم سے تھا۔ یہ لوگ عام طور پر مرنے مارنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ زیادہ سے زیادہ کسی کا ہاتھ پاؤں توڑ دیا' کسی کا مویشی چھین لیا۔ ایسے لوگ صرف اپنے ڈیل ڈول اور بول چال کے سبب لوگوں پر اپنی دہشت قائم رکھتے ہیں۔ ان کی دہشت برقرار رکھنے میں سب سے اہم رول ان کے چمچوں کڑچھوں کا ہوتا ہے۔ اپنے سے بڑے بدمعاش کے تھپڑ کھا کر بھی چپ رہتے ہیں بشرطیکہ یہ رسوائی سرعام نہ ہو۔ یہ تمام صفات کاریین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں لہٰذا مجھے یقین تھا کہ وہ اب کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گا۔

ماں بیٹی کو ہر طرح کی تسلی تشفی دینے کے بعد صفدر اور شماست کے ساتھ دوسرے کمرے میں آگیا۔ بستر پر کیمرا پڑا دیکھ کر شماست نے کہا "آپ نے اس کیمرے سے بادے وغیرہ کی تصویریں اتاری ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا "لیکن اس میں تو فلم ہی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "فلم کے بغیر بھی تو تصویریں اتاری جاسکتی ہیں۔ یہ سارے اخباری فوٹوگرافر وفوتاں اور ریلیوں میں یہی کچھ تو کرتے ہیں۔"

صفدر اور شماست حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے' پھر صفدر میری بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔ مسکرانے سے اس کی کھنچی ہوئی باچھ خون آلود ہوگئی۔ وہ جب درد سے کراہ اٹھا۔ چوٹیں اب ٹھنڈی ہوکر تکلیف دینے لگی تھیں۔ کندھے کے پچھلے حصے پر آنے والا زخم تو خاصا سنگین تھا۔ میں

نے اندازہ لگایا کہ ٹانکے لگانے کی ضرورت ہے مگر اس وقت کسی ڈاکٹر تک رسائی ناممکن تھی۔ راکھ رکھ کر خون بند کیا گیا اور پٹی باندھ دی گئی۔ دیگر چوٹوں کو بھی حسب شدت زیب منت دی گئی۔ شامت کے پاس اسپرین کی گولیاں موجود تھیں۔ دو گولیاں کھا کر صفدر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ میں نے شامت سے کہا کہ وہ اب جا کر آرام کرلے' وہ کہنے لگا "صفراں آپ کے لئے کھانا تیار کر رہی ہے۔ اگر آپ نے سونا ہے تو کھانا کھا کر سویئے۔"

میں حیران ہوا کہ رات ساڑھے تین بجے یہ کھانے کا کون سا وقت ہے۔ شاید اہل خانہ نے سمجھا تھا کہ لڑائی مارکٹائی سے ہمارا کھایا پیا ہضم ہو چکا ہے لہٰذا میزبانی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے انہوں نے چولہا روشن کر لیا تھا لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ یہ کھانا ان کوششوں کے لئے خراج تحسین ہے جو ہم نے کاربن اینڈ کمپنی کو یہاں سے رخصت کرنے کے سلسلے میں کی تھیں۔ محبت کا کتنا سادہ سا اظہار تھا۔۔۔ کھانا۔۔۔ رات کے ساڑھے تین بجے گرما گرم کھانا۔ انڈوں پراٹھوں کی خوشبو ذرا تیز ہوئی تو صفدر کے چہرے پر بھی رونق نظر آنے لگی۔ وہ گھنٹے بارش میں بھیگنے اور پھر زبردست دھینگا مشتی کے بعد اسے واقعی بھوک لگی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد شامت کی والدہ ایک گول ٹرے میں کھانا لگائے اندر داخل ہوئیں۔ عقب میں صفراں تھی۔ اس نے دودھ سے لبالب بھرا جگ اور گلاس وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔ میں نے کہا "ماں جی! آپ نے اس وقت کیوں تکلیف کی؟"

"وہ گلوگیر آواز میں بولی "پتر! اپنوں کے لئے کیا تکلیف ہوتی ہے؟"

اس چھوٹے سے فقرے میں اس نے تشکر' محبت اور ہمدردی کے تمام جذبات سمو دیے تھے۔ باہر بارش ایک بار پھر شروع ہو چکی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی اور بوندیں ٹیناٹپ گلی میں گر رہی تھیں۔ لالٹین کی خواب ناک روشنی میں انڈوں' پراٹھوں اور نیم گرم دودھ کا یہ ناشتا یادگار تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھول گیا کہ میں کس صورت حال سے دوچار ہوں اور ابھی ایک گھنٹا پہلے ساتھ والے کمرے میں کیسا میدان کارزار گرم ہوا تھا۔

اس ناشتے کے بعد مجھے اور صفدر کو تنہائی نصیب ہوئی تو رات کی سیاہی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ کہیں دور سے کسی بھیگے ہوئے مرغ نے بڑی ڈھیلی ڈھالی اذان بلند کی۔ صفدر نے کھوئے کھوئے انداز میں سگریٹ کے چند طویل کش لئے اور بولا "ہماری بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔"

"کون سی بات؟"

"انجم والی۔"

"ہاں۔۔۔" میں نے چونک کر کہا "اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کٹے بالوں والی وہ لڑکی انجم ہی تھی۔"

صفدر کی آنکھوں میں ایک دم آنسو تیرنے لگے "کتنا بدبخت ہوں میں۔ سب کچھ جانتا ہوں پھر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے حویلی کی اونچی دیوار ہے اور دوسری طرف وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ میں نے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ جس کے بغیر زندہ رہنے کو میں کفر سمجھتا تھا۔"

ایک دم ہی مجھے بھی گہری اداسی نے ڈھانپ لیا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اس اونچی دیوار کی دوسری طرف صفدر کا پیار تھا اور میری پیاری بہن تھی۔ وہ دیوار ہم دونوں کی دشمن تھی۔ اس میں لگا ہوا اینٹ گارا' اس پر کھنچے ہوئے خاردار تار اور تاروں میں دوڑتا ہوا کرنٹ' یہ سب کچھ ہمارے جذبوں کا امتحان تھا۔ صفدر علی کی باتوں سے یہ حقیقت اب مجھ پر واضح ہو چکی تھی کہ میں نے حویلی کے متعلق جو اندازے قائم کیے تھے وہ زیادہ درست نہیں تھے اور اگر میں چوری چھپے اندر گھسنا چاہوں تو اس میں ناکامی یا موت کے سوا کوئی تیسری چیز مشکل سے ہی ہاتھ آئے گی۔ میرے خیال میں حویلی کی بیرونی دیوار سے بھی اہم رکاوٹ' وہ اونچی بنگلی تھی جو صفدر کے بقول واچ ٹاور کا کام دیتی تھی اور جہاں ہر وقت مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ حویلی میں قیام کے دوران' میں ایک دفعہ بیرونی دیوار کے قریب پہنچ کر دیکھ چکا تھا۔ قریباً پوری دیوار پر روشنی کا انتظام تھا۔ بلی کا نومولود بچہ بھی دیوار پار کرنے کی کوشش کرتا تو بلندی سے نظر آجاتا۔ صفدر کے بقول' خاردار تار میں کرنٹ تھا۔ اس کرنٹ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ جہاں کرنٹ دوڑایا جاتا ہے وہاں اکثر الارم کا انتظام بھی کر دیا جاتا ہے۔ جونہی بجلی کی رو منقطع ہوتی ہے یا کسی کو کرنٹ لگتا ہے' مخصوص الارم بجنے لگتے ہیں۔۔۔ یہ ساری رکاوٹیں مجھ سے تقاضا کر رہی تھیں کہ جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا جائے لیکن یہیں یہ سوال پیدا ہو جاتا تھا کہ ہوش سے کیا کام لیا جائے؟ کیا ہوش کی چارپائی بچھا کر اس پر غور و فکر کا تکیہ رکھا جائے اور آرام کیا جائے یا پھر قدم بڑھائے جائیں اور اس دیوار کو چیلنج کیا جائے جو ظلم اور احتساب کے درمیان حائل تھی۔

مجھے سوچ میں غلطاں دیکھ کر صفدر نے پوچھا "کیا سوچ

رہے ہو؟"

میں نے کہا "میری گاڑی یہاں سے کوئی ایک میل دور گنے کے کھیتوں میں کھڑی ہے۔ اگر یہ گاڑی پکڑی گئی تو بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"تو تم گاڑی پر یہاں آئے تھے؟"

"ہاں۔"

صفدر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھو' میں نے تو سب کچھ بتا دیا لیکن تم نے اب تک ایک لفظ اپنے متعلق بتا کر نہیں دیا۔"

مجھے احساس ہوا کہ صفدر سے ذہنی ہم آہنگی کے لئے ضروری ہے کہ میں بھی اسے مختصراً اپنے بارے میں آگاہ کر دوں۔ میں نے نیا سگریٹ سلگایا اور اپنے ماضی کو گوشۂ تاریکی میں رکھتے ہوئے اسے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔ جیل کے شب و روز' خود پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کی روداد' ایمبولینس گاڑی سے اپنا اغوا' آغا قادر زماں کی حویلی میں گزارے ہوئے روز و شب' اپنی بہن کی بدنصیبی کا تذکرہ اور آخر میں ایک اہم مہم پر روانگی' میں نے اختصار کے ساتھ سب کچھ صفدر کو بتا دیا۔ صرف وہ باتیں چھپائیں جن کا چھپانا میرے اور اس کے لئے سود مند تھا۔

صفدر حیرت کے سمندر میں غلطاں' سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس نے سوالات بھی کیے۔ جب یہ روداد ختم ہوئی تو میرے اور صفدر کے درمیان آپوں آپ ہی اپنائیت اور ہمدردی کا مضبوط رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ اس شخص سے ملے مجھے چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن لگتا تھا میں چھ برس سے اسے جانتا ہوں۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے لئے پہلے سے دل میں ایک گوشہ خالی پڑا ہوتا ہے۔ صفدر نے گہری سانس لیتے ہوئے سگریٹ کو ایک خالی پلیٹ میں مسلا اور بولا "تمہاری تشویش بجا ہے۔ وہ گاڑی کسی بھی وقت قادر زماں کے بندوں کو نظر آ سکتی ہے۔ انہیں تمہاری تلاش میں اس گاؤں تک پہنچتے آدھ گھنٹا بھی نہیں لگے گا۔"

"پھر تمہارا کیا مشورہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

صفدر نے جیسے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ تاثرات سے لگتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی اور تشویشناک سوال سر ابھار رہا ہے۔ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا "تم نے کبھی باوے کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے' قادر زماں کی حویلی میں؟"

"نہیں تو" میں نے چونک کر کہا "قادر زماں سے باوے کا کیا تعلق؟"

"تعلق ہے" صفدر نے کہا "میں نے شامت سے سنا ہے کہ پیری مریدی کے علاوہ باوے کی ایک اور وجہ شہرت بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ قادر زماں کے لئے مخبری کرتا ہے۔ ہر گاؤں دیہہ میں قادر زماں کا کوئی نہ کوئی مخبر موجود رہتا ہے اور اس گاؤں میں باوے کو مخبری کا ذمے دار سمجھا جاتا ہے۔"

تشویش کی ایک لہر میرے جسم میں بھی دوڑ گئی۔ اگر باوے کا حویلی سے کوئی تعلق تھا اور اس نے مجھے حویلی میں دیکھ لیا تھا تو زبردست گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ میری یہاں موجودگی کی اطلاع قادر زماں کو ہو سکتی تھی۔ امکان آٹھ دس فیصد سے زیادہ نہیں تھا لیکن امکان تو تھا۔ پھر ایک اور بات میرے ذہن میں آئی۔ اگر قادر زماں نے مخبری کا نظام قائم کر رکھا تھا تو عین ممکن تھا کہ یہ سلسلہ شہر تک پھیلا ہوا ہو۔ خاص طور پر ان لوگوں کے گرد جو قادر زماں کے نشانے پر تھے یا اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں سپرنٹنڈنٹ جیل' احمد رجال ساہی کے گرد بھی قادر زماں کے مخبر موجود ہو سکتے تھے۔ یہ مخبر قادر زماں کو اطلاع پہنچا سکتے تھے کہ کل جو شخص رجال ساہی کو قتل کرنے کے مشن پر حویلی سے روانہ ہوا ہے وہ ابھی تک راستے ہی میں کہیں اٹکا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں جتنا سوچ رہا تھا' مجھے یہ ضروری محسوس ہو رہا تھا کہ میں جلد سے جلد لاہور پہنچ جاؤں۔

○☆○

ابھی پو پھٹی نہیں تھی کہ میں شامت کے گھر سے رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ صفراں نے میری شلوار دھو دی تھی اور جہاں تک ممکن ہو سکا تھا شیروانی سے کیچڑ وغیرہ بھی صاف کر دی تھی۔ میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ جوتوں کا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اپنا سلیم شاہی جوتا میں نے گاڑی سے اترنے کے بعد راستے ہی میں اتار پھینکا تھا۔ شامت کے گھر میں ننگے پاؤں پہنچا تھا اور اب تک ننگے پاؤں تھا۔ میں اپنے ننگے پاؤں دیکھ رہا تھا' جب صفدر نے میری مشکل آسان کرنے کے لئے اپنی نسواری رنگ کی گرگابی میرے سامنے پھینک دی۔

"پہن لو یار' میرا خیال ہے آ جائے گی۔"

میں نے گرگابی میں پاؤں گھسیڑا۔ صفدر کے "خیال" کی تصدیق ہو گئی۔ گرگابی مجھے پوری تھی۔ جو تھوڑی بہت تنگی تھی وہ چلنے پھرنے سے دور ہو سکتی تھی۔ میں جانے کے لئے

تیار ہوا تو شامت کی ماں روتی ہوئی میرے گلے سے لپٹ گئی "پترا تم تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آیا ہے لیکن تیرے بعد ہمارا کیا بنے گا۔ ہمیں لاوارث کر کے مت جا۔"

شامت نے بھی دبے لفظوں میں خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں ہادا اور اس کے بندے پھر نہ آجائیں۔

میں نے کہا "آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ ایسے مشٹنڈوں سے نمٹنے کا مجھے بڑا طویل تجربہ ہے اور اسی تجربے کی بنا پر میں آپ کو گارنٹی دے رہا ہوں کہ وہ اب آپ کو اپنا کالا منہ نہیں دکھائیں گے۔ ویسے بھی میں آپ کی طرف سے بے خبر نہیں رہوں گا، ہو سکتا ہے ایک دو روز میں پھر یہاں کا چکر لگاؤں۔" پھر میں نے صفدر کو ایک طرف لے جا کر کہا "مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں کہ کارین پھر ادھر کا رخ کرے گا۔ اگر تم زیادہ ہی احتیاط کرنا چاہتے ہو تو "مالِ غنیمت" میں سے ایک رائفل لوڈ کر کے پاس رکھ لو، کچھ اور نہیں تو تمہارے میزبانوں کا حوصلہ ہی بلند رہے گا۔"

وہ اقرار میں سر ہلانے لگا، مجھ سے کافی متاثر نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک اس منظر کی پرچھائیاں تھیں جب گرانڈیل کارین میرے پہلوانی طرز کے داؤ میں کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور نکلنے سے قاصر تھا۔

میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "اور اب خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ میرے لئے انجم اور اپنی بہن میں کوئی فرق نہیں، انشاء اللہ وہ دونوں رہا ہوں گی اور بہت جلد ہوں گی۔"

اہلِ خانہ کو خدا حافظ کہہ کر میں شامت کے مکان سے نکلا اور نیم تاریک گلی میں احتیاط سے چلتا جنوب کی طرف بڑھنے لگا۔ شامت کے گھر سے ایک بہت پرانی برساتی مجھے دستیاب ہو گئی تھی۔ اس کی پھٹی برساتی نے بارش کو خیر کیا روکنا تھا، میری سیاہ شیروانی ضرور چھپائی تھی۔ اب راستے میں کوئی دیکھ بھی لیتا تو وہ زیادہ حیرت کا اظہار نہ کرتا۔

گاؤں سے نکل کر مجھے قدرے اطمینان ہوا اور میں مکئی کے کھیتوں میں ایک تنگ راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ بارش نے جگہ جگہ دلدل بنا رکھی تھی۔ ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے جانے والا لطیفہ مجھ پر صادق آتا تھا۔ گاؤں سے تین فرلانگ آگے آیا تھا کہ اچانک بارش شدت اختیار کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی اولے بھی پڑنے لگے۔ یہ موسمی تبدیلی میرے حق میں تھی۔ میں گاڑی تک پہنچتے ہوئے کم سے کم افراد کا سامنا کرنا چاہتا تھا اور بارش اس سلسلے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اس کھیت میں پہنچا جہاں گنے کے ڈھلے ڈھالے سبز پودوں کے درمیان سرخ نسان سنی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ ایک چھم چھم کرتی دوشیزہ ہو اور اپنی رومانی مجبوریاں سمیٹے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اندھا دھند بارش نے نشیب و فراز ایک کر رکھے تھے اور ٹائروں کے نشانات پانی میں معدوم ہو چکے تھے۔ میں چھپا چھپ پانی میں چلتا گاڑی تک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اندر پہنچتے ہی یخ بستہ ہوا سے نجات مل گئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرے اور سر کے بالوں کا براؤن رنگ بھیگنے کے باوجود جوں کا توں تھا۔ بالکل اصل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ سے کنگھا نکال کر بال پھر سیدھے اوپر کو بنا لیے۔ براؤن مونچھوں اور بھوؤں نے میری صورت حیران کن حد تک بدل رکھی تھی۔ رہی سہی کسر آئی لینس نے پوری کر دی تھی۔ حلیے کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور ریورس گیئر لگا کر کھیت سے باہر لے آیا۔ اب ایک طویل بل کھاتا کچا راستہ میرے سامنے تھا جو جگہ جگہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک بار پھر میں نے وہی شارٹ کٹ استعمال کیا جس نے حویلی تک میرا سفر قریباً ۲۰ میل کم کر دیا تھا۔ چھ میل کا نہایت کٹھن سفر کر کے میں قریباً ایک گھنٹے میں اس برانچ روڈ پر پہنچ گیا جو ٹریموں ہیڈ ورکس کے قریب مین روڈ سے جا ملتی تھی۔ اس وقت تک آٹھ بج چکے تھے۔ چھاجوں برستی بارش میں اکا دکا گاڑیاں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک جگہ رک کر چائے پی۔ تازہ اخبار پر نظر دوڑائی اور پھر پوری رفتار سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے راوی کا پل پار کیا اور لاہور میں داخل ہو گیا۔ راوی روڈ پر بادشاہی مسجد کی جھلک نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی مینارِ پاکستان سر اٹھائے کھڑا تھا، پس منظر میں شاہی قلعے کے در و دیوار تھے۔ بھولے بسرے مناظر آنکھوں میں اترے تو سینے میں یادوں کی کئی گٹھڑیاں کھل گئیں۔ فضاؤں سے جانی پہچانی خوشبو آنے لگی اور سماعت میں وہ آوازیں رس گھولنے لگیں جو ہر شہر کی الگ پہچان ہوتی ہیں۔ میں نے اگر پچھلے کئی گھنٹے سے آنکھیں بند بھی رکھی ہوتیں تو یہاں پہنچ کر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ جس شہر میں میں پہنچا ہوں وہ لاہور ہے۔ زندگی سے معمور، زندہ دلوں کا گہوارہ، زندہ لاہور۔

مختلف جانی پہچانی سڑکوں سے گزرتا ہوا میں لوئر مال کی طرف چلا گیا۔ میں راستے ہی میں طے کر چکا تھا کہ مجھے گاڑی کہاں روکنی ہے۔ لوئر مال سے چوبرجی کی طرف جاتے ہوئے

میں راستے میں ایک ہوٹل کی پارکنگ میں جا رکا۔ یہ جگہ میرے لئے ہر طرح سے محفوظ تھی اور یہ بھی امید تھی کہ کمرا مل جائے گا۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر نکلا تو ایک "پولیس پارٹی" ہوٹل سے نکلنے کے بعد دانتوں میں خلال کرتی اپنی پٹرولنگ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں اس وقت ایک مفرور تھا اور ہر مفرور پولیس کو دیکھ کر اندر سے رکتا ضرور ہے۔ میں بھی تھوڑا سا رکا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ یہ "رکاوٹ" چہرے تک آجاتی۔ میں نے ایک اچٹتی نگاہ قانون کے محافظوں پر ڈالی اور ان کے پاس سے گزرتا ہوا ہوٹل میں آگیا۔ حسب توقع مجھے ایک ڈبل بیڈ دستیاب ہو گیا۔ فرضی شناختی کارڈ پر میرا نام چوہدری احسان الٰہی درج تھا۔ میرا کمرا اسی نام سے بک ہوا۔ میں ہیڈ ویٹر کو کھانے اور لباس کے متعلق کچھ ضروری ہدایات دے کر اپنے آرام دہ کمرے میں آگیا۔

کھانے سے فارغ ہوا تو شام کے پانچ بجے تھے لیکن میں نے اس پانچ کو رات کا ایک جانا اور لمبی تان کر سونے کا ارادہ کر لیا۔ سونے سے پہلے اکثر لوگوں کی طرح مجھے بھی ہلکا پھلکا میوزک بھاتا ہے۔ بیڈ کے سرہانے سائیڈ ٹیبل میں ایک ریڈیو ٹیپ ریکارڈ فٹ تھا۔ میں نے ریڈیو آن کیا۔ ایک اسٹیشن سے فلمی گانے اور غزلیں وغیرہ نشر ہو رہی تھیں۔ میں نے ناب گھما کر آواز صاف کی اور تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ موسیقی کی لہروں پر تیرتا ہوا دھیرے دھیرے نیند کی پُرسکون جھیل کی جانب بہنے لگا جہاں سفید براق بطخیں تیر رہی تھیں اور آبی پرندے چہک رہے تھے۔ یکایک جیسے کسی نے میرے کانوں میں خنجر گھونپ دیا۔ درد کی ایک شدید لہر دماغ سے اٹھی اور پورے جسم میں دوڑ گئی۔ سماعت میں ایک پرانے گانے کے بول پوری سفاکی سے گونج رہے تھے۔

"یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے ... افسوس ہم نہ ہوں گے ... یہ زندگی کے میلے۔"

میں نے تڑپ کر ہاتھ بڑھایا اور ریڈیو آف کر دیا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار اس گانے نے مجھ پر ایسا ہی اثر کیا تھا اور جب بھی یہ واقعہ رونما ہوا تھا میں کئی ماہ تک ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ سے دور رہا تھا۔ میری کچھ بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں اس گانے سے۔ ایسی یادیں جو دل و دماغ پر یلغار کرتی تھیں تو جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا اور دل زخمی کبوتر کے مانند پسلیوں میں پھڑپھڑاتا رہتا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے بعض نغموں یا اشعار کے ساتھ ایسی یادیں بندھ جاتی ہیں کہ یاد اور نغمہ لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ پھر یاد اور نغمے میں سے کوئی ایک جب بھی ہمارے احساس کو چھو کر گزرتا ہے، دوسرا خود بخود دل و خیال پر دستک دینے لگتا ہے۔ جیسے اٹک جیل کے در و بام میں گونجنے والا گیت "ٹنڈی آئیں وانجن دے، میں لک ٹک نیر بہانواں" ان بولوں کے ساتھ ہی نور محمد کا چہرہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ تصور میں آجاتا تھا۔ نور محمد کا خیال آتے ہی میری سوچوں کا دھارا یکلخت مختلف سمت میں رواں ہو گیا۔ آہ نور محمد! کیا بیتی تھی تجھ پہ۔ کیسی حادثوں بھری رات تھی وہ جس نے تجھے مجھ سے جدا کیا۔ کتنے ہولناک مناظر تھے وہ؟ میں یاد کر کے لرز گیا۔ معلوم نہیں نور محمد کے لواحقین کو اس کی موت کی خبر پہنچی تھی یا نہیں اور اگر پہنچ گئی تھی تو ان کا کیا حال ہوا تھا۔ وہ بیمار بیوی کی دوا لینے گھر سے نکلا تھا اور ایک سال تک واپس نہیں لوٹا تھا اور اب اسے کبھی نہیں لوٹنا تھا۔ کسی جمعرات کو نہیں، کسی تہوار کو نہیں، کسی موسم میں نہیں ... پھر کالو کمرانی کا خیال ذہن میں آیا۔ جیل کے عملے نے مار مار کر اسے نیم جاں کر دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھا اور تھا بھی یا نہیں۔ اس کالے شخص کا روشن تصور ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر بولا "ماسٹر! اپن کو بھول مت جانا، اپن کو یاد رکھنا، اپن اٹک جیل کی بیرک نمبر ۲ میں چکی پیستا ہے لیکن اپن کا دل تمہارے قدموں سے لپٹا رہتا ہے۔"

تلخ سوچوں کا سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو دراز ہوتا چلا گیا۔ وہ تفکرات بھی ذہن میں در آئے جن کے خوف سے میں کبوتر کی طرح آنکھیں میچ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ دو دن کی ایک اور شب خواب کے دھندلکوں میں کٹ جائے۔ اپنی معصوم بہن کی مجبوریاں قطار اندر قطار میرے سامنے آئیں جیسے عہدِ قدیم کی زر خرید لونڈیاں بندھے ہاتھوں اور رستے زخموں کے ساتھ سفاک آقاؤں کے سامنے کھڑی ہوں۔ میں نظر بھر کر ان مجبوریوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے میرے اندر ایک آتش فشاں دہکنے لگتا تھا اور مجھے لگتا تھا، میں پھٹ پڑوں گا اور قرب و جوار کی ہر شے کو جلا کر خاکستر کر دوں گا۔ اس آتش فشاں کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے میں نے باتھ روم میں گھس کے دو گلاس پانی پیا پھر تین سلیپنگ پلز کھائیں اور نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔

اگلے روز میری آنکھ دس بجے سے پہلے نہیں کھلی۔ حسب ہدایت ہیڈ ویٹر نے میرے لئے ایک پتلون قمیص کا بندوبست کر دیا تھا۔ نہا دھو کر میں نے لباس بدلا، ناشتا کیا اور اس کام کے لئے تیار ہو گیا جس کے لئے یہاں پہنچا تھا۔ میرے پاس سپرنٹنڈنٹ احمد رجال ساہی کا مکمل ایڈریس

موجود تھا۔ گھر کا نقشہ، اہلِ خانہ اور ملازمین کی تعداد، مختلف معمولات، سب کچھ میرے پاس نوٹ تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور جانے بچانے راستوں سے گزرتا ہوا اقبال ٹاؤن پہنچ گیا۔ سیج بلاک اور مطلوبہ کوٹھی ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ تقریباً ڈیڑھ کنال میں یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ نیم پلیٹ پر "ساہی ہاؤس" کے حروف چمک رہے تھے۔ میں گاڑی گیٹ کے سامنے سے گزارتا چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوٹھی بند پڑی ہے۔ کچھ آگے جاکر میں واپس پلٹا اور کوٹھی کے عین سامنے رُک گیا۔ وہ ڈھلوان فرش یعنی "ریمپ" جو کوٹھی کے گیٹ تک پہنچتا تھا گرد آلود تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے دو تین دن میں کوئی گاڑی کوٹھی میں آئی گئی نہیں۔ بہرحال اگر کوئی کوٹھی میں تھا بھی تو میرے لیے اندیشے کی بات نہیں تھی۔ یہ دفتری اوقات تھے اور اسی فیصد امید تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب اس وقت کام پر ہوں گے۔ ان کے سوا مجھے اس گھر میں اور کون پہچان سکتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کال بیل پر انگلی رکھی اور ان الفاظ کو ترتیب دیا جو مجھے اہلِ خانہ سے کہنے تھے اور جن کی تراش خراش میں رات سونے سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد گیٹ کی دوسری جانب کھٹ پٹ سنائی دی اور چھوٹی سی چھدری داڑھی والے ایک پنجابی بابا جی نے دروازہ کھول دیا "جی جناب؟" انہوں نے کھوجی نظروں سے مجھے دیکھا۔

ایک نظر صحن کے اندرونی حصے میں ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اہلِ خانہ گھر سے باہر ہیں، میں نے کہا "مجھے ساہی صاحب سے ملنا ہے۔"

بابا جی نے پوچھا "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"گجرات سے۔ میرا نام احسان الٰہی ہے۔"

بابا جی بولے "ساہی صاحب تو نتھیا گلی گئے ہوئے ہیں۔"

"کب سے؟"

"دو روز ہوئے۔"

"کب تک واپسی ہو گی؟"

"ٹھیک طرح پتا نہیں جی۔ ڈیڑھ دو مہینے کا پروگرام ہے۔"

"اوہ" میں نے ہونٹ سکیڑے "گھر میں اور بھی کوئی نہیں۔"

"نہیں جی۔ گھر والے بھی ساتھ ہی گئے ہیں۔"

بابا جی سخت مزاج چوکیدار ہونے کے باوجود کو آپریٹو ثابت ہوئے۔ تھوڑی سی کوشش کرکے میں نے ان سے رجال ساہی صاحب کا ایڈریس اور فون نمبر بھی لے لیا۔ یہاں سے فراغت پاکر میں انارکلی گیا۔ سب سے پہلے منور علی کے جوتوں سے نجات حاصل کی۔ اس کے بعد دو جوڑے کپڑوں کے مع ایک صندوق خریدے۔ دوپہر کا کھانا ایک پسندیدہ ہوٹل میں کھایا۔ اس ہوٹل کا نام بتاؤں گا تو پھر ایک لمبا قصہ شروع ہو جائے گا۔ یہ دلچسپ ذکر پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ مذکورہ ہوٹل میں جاکر یہ اطمینان ہوا کہ مجھ سے معمولی طور پر واقف لوگ مجھے اس حلیے میں پہچاننے سے قاصر ہیں۔

وہ مہلت جو میں سوچ بچار کے لئے حاصل کرنا چاہتا تھا مجھے خود بخود مل گئی تھی۔ جس شخص کی روح قبض کرنے کے لئے مجھے عزرائیل کی معاونت سونپی گئی تھی وہ لاہور میں موجود نہیں تھا۔ نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے میرا ایک دو دن غیر فعال رہنا سمجھ میں آتا تھا۔ اس بات کا اطمینان کرنے کے بعد کہ میرا آسانی سے پہچانا جانا ممکن نہیں، میں نے دوسرے روز بھی ہوٹل سے نکل کر کچھ ضروری شاپنگ کی اور پبلک لائبریری میں جاکر پرانے اخبارات دیکھے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جیل میں مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے اور میرے اغوا کا ذکر اخبارات میں آیا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس انداز میں؟ کوشش بسیار کے بعد میں اس حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر دیکھ سکا۔ یہ خبر ٹھیک پانچ ہفتے پہلے ایک روزنامے میں شائع ہوئی تھی۔ لکھا تھا۔

"شیخ راشد بن ارشد مرڈر کیس کا مجرم شاہ جہاں جیل سے فرار" نیچے مختصر احوال درج تھا جس کے مطابق قیدیوں کے درمیان ہونے والے جھگڑے میں زخمی ہو گیا۔ اسے ایمبولینس میں اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے ایمبولینس کا راستہ روکا اور فائرنگ کے شدید تبادلے کے بعد مجرم کو چھڑا کے لے گئے۔ اس حملے میں پولیس کے دو ہیڈ کانسٹیبل زخمی ہوئے۔

میں خبر پر اور اس کے شائع کرانے والوں پر لعنت بھیج کر لائبریری سے نکل آیا۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ میں نے گاڑی کا رُخ ہوٹل کی طرف موڑ دیا۔ چوبرجی کی طرف جاتے ہوئے میں جین مندر کے چوراہے سے گزرا تھا جب اچانک احساس ہوا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ حیرت کی بات کہ مجھے یہ شبہ ایک رکشے پر ہوا تھا۔ یہ رکشا مسلسل میرے پیچھے آ رہا تھا اور میرے نزدیک رہنے کے لئے اس نے تیز رفتار اختیار کر رکھی تھی۔ غالباً اسی رفتار کے سبب وہ نگاہ میں آیا تھا۔ میں نے ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور سیدھا چوبرجی چوک میں پہنچ کر مزنگ چنگی کی طرف مڑ گیا۔ یہاں سے میں نے جین روڈ کا راستہ اختیار کیا اور دوبارہ جین مندر کی طرف چل دیا۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رکشا مسلسل پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے کار سے درمیانی فاصلہ برقرار رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی ہوئی تھی۔ کھلی سڑک آتی تو وہ پیچھے رہ جاتا لیکن جونہی ٹریفک کے سبب میں رفتار دھیمی کرنے پر مجبور ہوتا، وہ گاڑیوں کے دائیں بائیں سے رستہ بناتا میرے قریب پہنچ جاتا۔ تقریباً بیس منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد میں نے گاڑی جناح گارڈن کے ایک مشرقی گیٹ سے اندر داخل کردی اور لاک کرکے باہر نکل آیا۔ رکشا شور مچاتا اور دھواں چھوڑتا گیٹ کے عین سامنے آ رکا۔ اس کے اندر سے ایک لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ جدید تراش کے خوب صورت لباس میں تھی۔ لمبے براؤن بال شانوں اور پشت پر جھول رہے تھے۔ ایک شانے سے پشمینہ لٹک رہا تھا۔ دوپٹا کسی تیلگوں آبشار کی طرح گردن کے عقب سے نمودار ہوتا تھا اور نشیب و فراز کو طے کرتا گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ رکشے سے اُتر کر ایک حسین مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ہو گئی اور ہانپی ہانپی سی یک ٹک میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھوں کا فوکس درست کیا اور یکلخت رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ غزالہ تھی۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟ بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ بھول کر بھی مجھے یاد رہتی تھی۔ جیسے یہ یاد رہتا تھا کہ ایک سانس کے بعد مجھے دوسرا سانس لینا ہے۔ چلتے ہوئے ایک پاؤں اٹھانے سے پہلے دوسرا پاؤں زمین پر رکھنا ہے، سوتے ہوئے آنکھیں موندنی ہیں، جاگتے ہوئے پلکیں جھپکانی ہیں اور پانی پیتے ہوئے گھونٹ بھرنا ہے۔ ان سب افعال کی طرح غزالہ کی یاد بھی میری عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں بھولنے یا نہ بھولنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں خیال اور بے خیالی ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ اور غزالہ اس وقت میرے سامنے تھی۔ اپنی نگاہوں میں اَن گنت شکوے سمیٹے وہ مجھے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ دھیمے قدموں سے چلتی میری طرف آئی جیسے ایک بلند و بالا لہر ساحل کو تہ و بالا کرنے کے لئے بڑھ رہی ہو لیکن بظاہر خاموش اور ہموار ہو، کوئی شور ہو نہ شوریدہ سری۔ وہ میرے بالکل سامنے آ رکی۔ میں نے سوچا، اب وہ چہرہ دوڑے گی۔ ساحل کو تہ و بالا کردے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی فطری تحمل مزاجی نے اسے اس جذباتی پن سے دور رکھا۔ بس دو آنسو اس کے شاداب رخساروں پر ڈھلک آئے، اس نے ایک مدھم سسکی لی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔

"تم۔ تم کہاں تھے شاہ جہاں؟"

ایک آواز اس کے سینے کی گہرائیوں سے نکلی اور میرے دل کی گہرائیوں کو چھو گئی۔ کبھی کبھی انسان ماحول سے کتنا بیگانہ ہو جاتا ہے، ویران گوشے میں رنگ و بو کی دنیا بسا لیتا ہے اور کبھی بھری پُری سڑک پر مکمل تنہائی ڈھونڈ لیتا ہے۔ غزالہ اس وقت خود کو تنہا سمجھ رہی تھی حالانکہ کم از کم دس افراد کی نگاہیں ہم پر تھیں جن میں سائیکل اسٹینڈ والا، رکشے والا، خوانچے والا اور چھ سات دیگر افراد شامل تھے۔ میں نے بہ آہستگی اسے جدا کیا "یہ کیا حرکت ہے؟ لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

وہ جانتے بوجھتے بھی میرے شانے سے چمٹ سی گئی۔ اس کی ناک میرے گوشت میں دھنس رہی تھی اور سسکیاں خبر دے رہی تھیں کہ میرے شانے سے قمیص بھیگنے والی ہے۔ میں نے اس کے کندھوں کو بظاہر نرمی لیکن سختی سے پکڑا اور خود سے علیحدہ کردیا۔

"غزالہ! خود کو سنبھالو۔ لوگ ہمارا مذاق اُڑائیں گے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی عود کر آئی تھی۔

وہ میرے دھکے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چہرے پر بے بسی تھی جیسے کوئی بچہ بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے بزرگ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگے اور دھکے سے دور ہٹا دیا جائے۔ میں چاہتے ہوئے بھی غزالہ سے ہمدردی کا ایک لفظ نہیں کہہ سکا اور پارکنگ والے سے ٹوکن لے کر درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ سراسر اضطراری حرکت تھی۔ میں سیر کے موڈ میں تھا اور نہ ہی چاہتا تھا کہ غزالہ میرے پیچھے آئے اور فلمی ہیروئنوں کی طرح میری منتیں سماجتیں کرے۔ درحقیقت یہ واقعہ میرے لئے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس حد تک غیر متوقع کہ میں چکرا گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ یہاں سے کھسک جاؤں۔ میں ایک روش پر دس پندرہ قدم آگے گیا تھا کہ چوڑیوں کی چھنک نے خطرے کی اَن گنت گھنٹیاں بجا دیں۔ غزالہ میرے عقب میں آ رہی تھی۔

"شاہ جہاں" اس کی روہانسی آواز اُبھری۔

صورتِ حال لمحہ بہ لمحہ مضحکہ خیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ میرے تعاقب میں تھی، مجھے پکار رہی تھی اور میں چلتا جا رہا تھا۔ یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں رُک گیا۔ اس دفعہ حد ہو گئی۔ مجھے لگا، ہم سچ مچ کسی رومانی کہانی کے دو کردار ہیں اور

جیتی جاگتی دنیا سے نکل کر لفظوں اور سطروں میں گم ہو گئے ہیں۔ اردگرد کو خاطر میں لائے بغیر غزالہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی جیسے ایک بیل جڑ سے لے کر آخری کونپل تک کسی درخت سے پیوست ہو جائے۔

وہ مجھے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے بولی "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ شاہ جہاں۔ میں مر جاؤں گی۔ مجھے معاف کر دو' اگر معاف نہیں کرنا۔ تو میری جان لے لو۔"

میں مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن صورت حال کی سنگینی میری پیشانی کو عرق آلود کرنے لگی۔ کئی نگاہوں کے سامنے ایک حسین و جمیل لڑکی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کے منہ زور جذبوں نے اسے ہر احساس سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میرا سینہ جذبات سے عاری تھا۔ درون دل جو چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی وہ مجھ میں ہی جانتا تھا لیکن میں نے خود پر قابو پا رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں ایک مرد تھا یا شاید اس لیے کہ خود پر قابو پانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ بگڑتی صورت حال کے پیش نظر میں نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ غزالہ کو بہ آہستگی خود سے جدا کیا اور نرمی سے کہا۔ "غزالہ! خود کو سنبھالو۔ کیوں تماشا بنا رہی ہو۔ چلو آؤ گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"

اس نے منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور گردن جھکا کر رونے لگی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ چلاتا ہوا گاڑی تک لے آیا۔ غزالہ کو اگلی نشست پر بٹھا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اسی وقت میری نگاہ رکشا ڈرائیور پر پڑی۔ وہ فریادی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو' اے اہلِ وفا ہم بھی راہوں میں پڑے ہیں۔ اگر ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا انعام شتام نہیں تو کرایہ ہی دیتے جائیے۔ میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیا۔ وہ میرے بجائے غزالہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رکشے کی طرف بڑھ گیا۔ دیگر تماشائی بھی جیبیاں نکال نکال کر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بہرحال یہ بھی ان کی مہربانی تھی کہ خاموش تھے اگر ان میں سے کوئی شوخ طبع آواز سے بھی کسنے لگتا تو یہ اس کا "استحقاق" تھا۔

جناح گارڈن سے گاڑی نکالنے کے بعد میں نے مال روڈ کے ایک چائنیز ریستوران کے سامنے روکی۔ ڈنر کا وقت ابھی بہت دور تھا۔ ڈائننگ ہال قریباً خالی پڑا تھا۔ ہم ایک نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔

"کولڈ کافی" میں نے ویٹر سے کہا۔

غزالہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی شبنم سے دھلی شفاف آنکھوں میں ایک بھولی بسری یاد جگنو کی ما چمک گئی۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ وہ اب سر جھکائے اپنے ہینڈ بیگ کے بکل کو ناخن سے کھرچ رہی تھی جیسے کنگنا سارا کام اس نے مجھے سونپ دیا ہو۔

میں نے احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا اور لہجے میں ساختہ تجلت سمیٹ کر کہا۔ "غزالہ! تم نے میرے قریب غلطی کی ہے۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ چاہوں بھی تو تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تم مجھ اگر کچھ کہنا چاہتی ہو تو میں نے بھی تم سے بہت کچھ کہنا لیکن اس کے لیے فرصت اور مناسب موقع کی ضرور ہے۔"

وہ پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پتلیوں کے آ میں یقین کم اور شبہات بہت زیادہ تھے۔ میں نپے تلے لفظ سے ان شبہات کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے با کرانے لگا کہ میری یہ بے رخی مستقل نہیں ہے۔ کچھ نامسا مجبوریوں کے سبب میرا اس سے دور رہنا ضروری ہے۔ سنتی رہی۔ چہرے پر خاموشی کا گمبھیر پردہ تھا۔ اس پردے دوسری جانب دیکھنا میرے لیے نہ پہلے کبھی ممکن ہوا تھا اب تھا۔ اس نے مجھ سے ٹیلی فون نمبر اور ایڈریس مانگا۔ نے اسٹیشن کے ایک ہوٹل کا پتا دیا۔ وہ ٹٹولنے والی نظرو سے مجھے دیکھنے لگی۔ ان نظروں سے بچنے کے لیے میں جلدی جلدی ٹال دیا کہ فی الحال میرا مستقل پتا کوئی نہیں ہے رنگا میں نے اس کا پتا بھی لکھ لیا اور وعدہ کیا کہ میں آج شا کسی وقت اسے فون کر دوں گا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ میرے کھوکھلے وعدے ایک سخت تبصرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہایت عجلت میں گفتگو سمیٹنے کے بعد میں غزالہ کے ساتھ ریسٹورنٹ سے با نکل آیا۔

اس رات میں ہوٹل میں تقریباً دس بجے تک جاگتا اور خالی نظروں سے ٹی وی اسکرین کو گھورتا رہا۔ خالی نظرو سے ٹی وی اسی وقت دیکھا جاتا ہے جب ذہن بے حد مصروف ہو۔ غزالہ نے اچانک سامنے آ کر سوچوں کی دنیا میں تہلکہ دیا تھا۔ بے شمار زخموں کے منہ کھل گئے تھے اور ان گنت خوابیدہ درد جاگ اٹھے تھے۔ میں اپنے آپ سے لڑتا رہا اس لاانتہائی کرب پر قابو پانے کی سعی کرتا رہا۔ رہ رہ کر سوال ذہن میں ابھر رہا تھا کہ غزالہ میرے پیچھے کیسے لگ گئی غالباً وہ رکشے پر سوار کہیں جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ڈرائیور کو میرے تعاقب کا حکم دے دیا تھا اور آخر مجھ تک

پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ نوٹ کرنے والی بات یہ تھی کہ اس نے میرے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود مجھے پہچان لیا تھا۔ بصد کوشش تقریباً بارہ بجے میں نے خیالات کی اس امبر بیل سے نجات پائی اور دل ہی دل میں اس فیصلے کا اعادہ کیا کہ کل علی الصباح میں نتھیا گلی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

ضروریات سے فارغ ہو کر میں بستر پر دراز ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا جب میری نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی "روم کی" پر پڑی۔ رواج کے مطابق اس "کی" کے ساتھ بھی ایک دیدہ زیب "کی رنگ" تھا۔ بیضوی شکل کا یہ "کی رنگ" چمکدار اسٹیل کا تھا اور اس پر ہوٹل کا نام و پتا کندہ تھا۔۔۔۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں بری طرح چونک گیا۔ جس وقت غزالہ میرے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہی تھی' یہ کی رنگ ڈیش بورڈ کے نچلے خانے میں پڑا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا تو کیا۔۔۔۔؟ کیا غزالہ نے اس کی رنگ کو نہ دیکھا ہوگا؟ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کی رنگ کی دونوں جانب ہوٹل کا نام نمایاں حروف میں کندہ تھا۔۔۔ تو کیا غزالہ میرے جھوٹ سے واقف ہو چکی تھی۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یقیناً ایسا ہو چکا ہے۔ غزالہ جیسی باریک بیں لڑکی میری اس غلطی سے فائدہ نہ اٹھاتی' ممکن ہی نہیں تھا۔۔۔ وہ میرا ایڈریس جان چکی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ کیسے کشادہ آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر مجھے ایک آدھ روز لاہور میں مزید قیام کرنا ہوتا تو صبح منہ اندھیرے میرا ہوٹل تبدیل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں غزالہ سے مڈھ بھیڑ کا خطرہ کسی طور پر نہیں لے سکتا تھا۔۔۔ یہ دوری میرے لیے کڑی آزمائش تھی لیکن قربت اتنی جان لیوا تھی کہ میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔۔۔

خیالوں میں غلطاں میں نیند کی وادی میں چلا گیا۔ نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر جیسے آڑا ترچھا پڑا تھا ویسے ہی سو گیا تھا اور اب اسی پوز میں آنکھ کھل گئی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں ہاتھ پر کوئی شے رینگ رہی ہے۔ یہ ہاتھ بستر سے نیچے جھول رہا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر ہاتھ کھینچا لیکن وہ کسی کی گرفت میں تھا اور اسی وقت میری نگاہ ایک نسوانی جسم پر پڑی۔ ٹیبل لیمپ کی نہایت مدھم روشنی میں بلیو جینز حوا میرے ہاتھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی مانگ روشنی میں باریک چمکیلی لکیر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا لیکن نہیں۔۔۔ میرے سامنے قالین پر غزالہ بیٹھی تھی۔

میں خیالوں میں گم یونہی دروازہ مقفل کیے بغیر نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔۔۔ میرے سوتے میں غزالہ اندر چلی آئی تھی۔ میں نے بے یقینی سے وال کلاک کی طرف دیکھا' رات کے ڈھائی بجے تھے۔ خدا کی پناہ! رات کے ڈھائی بجے غزالہ نثار اس ہوٹل تک پہنچی تھی اور میرے کمرے میں گھسی تھی۔ میرے سنگین ترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ میرے ساتھ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے غزالہ نے ہوٹل کا کی رنگ دیکھ لیا تھا۔۔۔ نتیجے کے طور پر وہ اس وقت میرے کمرے میں موجود تھی۔ غزالہ کا سامنا کیے بغیر لاہور چھوڑنے کا میرا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دل معمول سے دوگنا رفتار سے دھڑک رہا ہے۔ گہری نیند سے اچانک جاگنا پڑے تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نہ صرف گہری نیند سے جاگا تھا بلکہ ایک ہوشربا منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجب ڈھنگ سے غزالہ بیٹھی تھی میرے سامنے۔۔۔ جیسے وہ کوئی سیال شے ہو جو میرے قدموں میں بہہ رہی ہو یا پھر کوئی پجارن اپنے وجود کی نفی کر کے اپنے دیوتا کے چرنوں میں ہر شے نچھاور کرنے کا ارادہ باندھے ہوئے ہو۔ میں اندر سے کانپ گیا۔ میں اس قابل نہیں تھا۔ وہ کیوں مجھے آزمائش کے کانٹوں پر گھسیٹ رہی تھی۔ میں دیوتا نہیں تھا' ایک انسان تھا۔ ایک جوان مرد تھا' میری رگوں میں کھولتا ہوا لہو تھا اور اس لہو میں شیطانیت کے بے رنگ جرثومے بھی تیرتے تھے۔ انسانیت کے جرثومے کسی بھی وقت ان بے رنگ جرثوموں سے شکست کھا سکتے تھے۔ رگ و پے میں ہر دم جاری رہنے والی اس جنگ میں کسی بھی وقت حیوانیت کا پلہ بھاری ہو سکتا تھا۔ اس کمرے میں یہ حیوانیت جیت جاتی تو کیا کچھ نہ ہو جاتا۔ ایک حسین جوان لڑکی سراپا خود سپردگی میرے قدموں میں پڑی تھی' میری نگاہ کرم کی منتظر تھی اور میرا دل معمول سے دوگنا رفتار کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔

"غزالہ! تم یہاں؟" میں نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔

اس نے سر اٹھایا۔ مانگ کی روشن لکیر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی پلکیں اٹھیں اور نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر کانپ گیا۔ وہاں ایک اور ہی رنگ تھا کوئی جدا ہی موسم تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اپنا گود میں پڑا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ میری گود میں رکھ دیا۔

میرا ہاتھ اس کے رخسار تک جا لگا۔ بھیگی ہوئی چیز نہیں جلتی لیکن رخسار بھیگا ہوا تھا اور جل رہا تھا۔

وہ عجیب خوابیدہ آواز میں بولی "مجھ سے دور نہ جاؤ شاہ جہاں۔ میں گناہگار ہوں تو مجھے سزا دو۔ میں تمہارے سامنے ہوں جو چاہو مجھ سے سلوک کرو لیکن مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

میرے دل کی سنگلاخ زمین سے ایک نمی سی رسنے لگی۔ یہ دو آتشیں آنسو تھے۔ آنکھوں سے بہت دور تھے لیکن تھے تو آنسو۔ میں نے اپنی آنکھوں کی مردانہ شان برقرار رکھنے کے لیے ان آنسوؤں کو سینے کے ریگزار میں جذب کر دیا۔ غزالہ کا سر میری گود میں تھا۔ شہد رنگ ریشمی بال میری بانہوں پر اور میرے بستر پر دور تک منتشر تھے۔ اور بال ہی منتشر نہیں تھے وہ خود بھی منتشر تھی۔ بے ترتیب تھی، بے قاعدہ تھی۔ یہ بے قاعدگی بے حد جذبات انگیز تھی اور غزالہ کی خاموشی نے اسے اور ہیجان خیز بنا دیا تھا۔ وہ نرم و گداز لمس، وہ سانسوں کا زیر و بم، وہ خود فراموشی و خود سپردگی کی ادا، ایک قیامت تھی جو مجھ پر ٹوٹ گئی تھی۔ میرا ہاتھ غزالہ کے ملائم بالوں میں سرایت کر گیا پھر جلتی انگلیوں نے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ یہ ہاتھ اور انگلیاں جیسے خود کار ہو گئی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دماغ میں تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں، یادوں کے بگولے چکرا رہے تھے۔ کوئی دور افتادہ نغمہ، کوئی بھولی بسری لے سماعت میں گونجنے لگی۔۔۔ جیسے کوئی گھسی پٹی بلیک اینڈ وائٹ فلم چل رہی ہو، زرد زرد، بجھی بجھی۔۔۔ شکستہ کرسیوں والا خستہ حال سینما ہال ہو اور آواز گونج رہی ہو۔۔۔ "یہ زندگی کے میلے۔ یہ زندگی کے میلے" پھر دو بیلگوں مردہ چہرے آنکھوں کے سامنے آئے، پھر ایک کرخت چہرہ عورت دکھائی دی۔ وہ دہکتے چمٹے سے میری بہن کو داغنا چاہ رہی تھی۔ میری بہن چیخنے لگی، یہ چیخیں ابھرتی اور پھیلتی چلی گئیں۔ قرب و جوار کی ہر آواز ان چیخوں میں دب گئی۔ میں نے جھٹکا دیا۔ غزالہ جیسے اچھل کر قالین پر جا گری۔ اس کی سہمی ہوئی حیرت زدہ نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ میں رخ پھیر کر اپنی الماری کی طرف بڑھا۔ اٹیچی گھسیٹ کر باہر نکالا اور ہینگروں سے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔

دو یا تین منٹ کے اندر میں اپنے مختصر سامان کی ہر شے پیک کر چکا تھا۔ روم سروس کا فون اٹھا کر میں نے استقبالیہ پر اطلاع دی کہ میں کمرا چھوڑ رہا ہوں، بل تیار کر دیا جائے۔ غزالہ ابھی تک اسی طرح قالین پر گری پڑی رہی تھی۔ چہرہ بانہوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ کاؤنٹر پر خوابیدہ ملازم مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پچھلی رات کا یہ "چیک آؤٹ" اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے بل ادا کیا۔ ایک پورٹر نے اٹیچی کیس اٹھایا اور میرے ساتھ پارکنگ کی طرف چل پڑا۔

○☆○

ڈرائیونگ سے میرا اعصابی تناؤ اکثر دور ہو جاتا ہے۔ لاہور سے مری تک میں نے دھیمی رفتار سے گاڑی چلائی۔ سات گھنٹے کا سفر تقریباً دس گھنٹے میں طے کیا۔ مری تک میں اپنے اندرونی ہیجان پر خاصی حد تک قابو پا چکا تھا۔ بہتری کے لیے میں نے ایک شب مری میں قیام کیا۔۔۔ اس قیام سے نہ صرف بے خوابی اور سفر کی تلافی ہوئی بلکہ میں خود کو "کام" کے لیے آمادہ محسوس کرنے لگا۔ میرے حاصل کردہ ایڈریس کے مطابق احمد رجال ماہی نتھیا گلی کے نواح میں ایک نجی رہائشی تفریح گاہ میں مقیم تھا۔ روڈ سے تقریباً ایک میل ہٹ کر یہ نہایت پُر فضا مقام تفریح گاہ بنانے والوں نے ایک پوری پہاڑی خرید کر وہاں بوٹنگ، اسنوکر، ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول اور اسی طرح کی دیگر تفریحات فراہم کی گئی تھیں۔ قیام کا بندوبست بھی منفرد تھا۔ اعلیٰ طبقے کے افراد بوجھل اور بوجھل جیبوں کے ساتھ یہاں آتے تھے اور ہلکے ہو کر واپس لوٹتے تھے۔۔۔ مری پہنچ کر مجھے ایک اور بات کا علم ہوا۔ "الفردوس" نامی اس تفریحی مقام پر صرف جوڑوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یعنی مجھ جیسے "چھڑے چھانٹ" اپنے بل بوتے پر اس گوشۂ فردوس کا سکون برباد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اطلاع میرے لیے خوش کن نہیں تھی کیونکہ پروگرام کے مطابق مجھے الفردوس میں رہائش پذیر ہو کر رجال ماہی سے مل کر یا ملے بغیر یہ جاننے کی کوشش کرنی تھی کہ کچھ لوگ انہیں عدم آباد روانہ کرنے پر کیوں تلے ہیں اور کیا میرے اور ان کے اس خطرے سے بچنے کی کوئی صورت ہے؟

بہرحال اگلے روز میں نے نتھیا گلی کا رخ کیا۔ آخری ہفتہ تھا۔ چھ ہزار فٹ کی بلندی پر خنکی کا راج تھا۔ تاہم یہ ایک چمکیلی صبح تھی اور قرب و جوار کے مناظر ہمیشہ سے زیادہ نکھرے نظر آتے تھے۔ میں بل کھاتی سڑک پر درمیانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتا تقریباً بارہ بجے "الفردوس" پہنچ گیا۔۔۔ اس مقام کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پُرسکون اور خوب صورت جگہ تھی۔ ایک پوری پہاڑی کو خاردار تاروں کے ذریعے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ا

بنی تھیں، مصنوعی جھیل بنی تھی اور پھولوں کے تختوں میں کھائی ہوئی پختہ روشیں تھیں۔ پارکنگ لاٹ میں کھڑی قیمتی گاڑیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں "بابرکت ہستیاں" موجود ہیں۔ "انگلش میڈیم بچے" چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کی سریلی آوازیں پہاڑوں میں دور تک گونج رہی تھیں۔ گرین میدان میں افسرانہ شان والے معزز حضرات گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک جانب نوجوان نسل کے شوخ نمائندے بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف دو یورپین خواتین تصویر کشی میں مصروف تھیں۔ میں اپنا اٹیچی کیس اٹھائے استقبالیہ میں پہنچا۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے توصیفی جھلک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ سفر نے میرا حلیہ زیادہ "تباہ" نہیں کیا۔ اپنے لہجے میں چاشنی پیدا کر کے میں نے اس مہ جبین سے ایک عدد کمرے کی درخواست کی۔

"مع روم ود فیملی؟" شیریں آواز میں پوچھا گیا۔

"تو" مجھے اپنے کیس کے سب سے کمزور پہلو پر روشنی ڈالنا پڑی۔ "بنٹ ڈے وال بی ہیران تو آر تھری ڈیز۔"

لڑکی کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ وہ اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے بولی۔ "ویری ساری سر۔ ہمارے کچھ رولز ہیں۔ فیملی کے بغیر ہم آپ کو یہاں خوش آمدید نہیں کہہ سکتے۔ ویسے دو روز کے لیے ایک سوئٹ خالی ہے۔ اگر آپ ریزرو کرانا چاہیں تو ایسا ممکن ہے۔"

میں نے اس پری چہرہ کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔ اس بے چاری کے پاس اتنی اتھارٹی نہیں تھی۔ اصل اتھارٹی منیجر کے پاس تھی اور منیجر کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا اب آ گیا ہوں تو منیجر سے درخواست کر کے دیکھ لوں۔ یعنی وہ جو کسی نے کہا ہے نا کیا دوری ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب۔

وہیں استقبالیہ میں بیٹھ کر میں "فردوسیوں" کی نقل و حرکت دیکھتا رہا اور اپنا مطلوبہ چہرہ ڈھونڈتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں کم از کم چالیس فیملیز قیام پذیر تھیں۔ ان میں سے پندرہ بیس افراد اور بچے کر ادھر ادھر نظر آ رہے تھے۔ باقی سب کے سب میری آنکھوں سے اوجھل تھے۔ یقیناً رجال ماہی صاحب بھی انہی میں سے ایک تھے۔ میں سوچنے لگا اگر منیجر نے بھی انکار کر دیا (اور امکان بھی یہی تھا) تو میرا اگلا عمل کیا ہو گا۔ کیا الفردوس میں رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک عدد خاتون کا انتظام کرنا پڑے گا۔ یعنی کوئی خوش رو لڑکی جو میری منکوحہ یا غیر منکوحہ بن کر میرے ساتھ یہاں قدم رنجہ فرما سکے۔۔۔ کہاں سے کیا جائے اس لڑکی کا انتظام؟ اتنی جلدی تو شاید کوئی چالاک فلمی ہیرو بھی یہ بندوبست نہ کر سکتا۔ سراسر ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات تھی۔۔۔ اچانک میرا دھیان واپس مری اور مری سے واپس بھکر چلا گیا۔ وہاں سے لڑکی کا انتظام ہو سکتا تھا بلکہ "انتظام" کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آغا قادر زماں کی حویلی میں درجنوں لڑکیاں بھری پڑی تھیں اور ان میں سے کوئی مناسب لڑکی منتخب کی جا سکتی تھی۔ کہاں نتھیا گلی اور کہاں بھکر۔ سفر بہت طویل تھا اور پھر تاخیر بھی ہوتی تھی۔ فوراً ذہن ٹیلی فون کی طرف چلا گیا۔ آغا قادر زماں کے تین نمبر اس وقت میرے پاس موجود تھے، دو بھکر کے اور ایک لاہور کا۔ میں نے سوچا فون پر اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کروں اور کہوں کہ اپنے کسی گماشتے کے ساتھ ایک یا دو لڑکیاں یہاں روانہ کر دے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک نیا خیال برق کی طرح ذہن میں کوند گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ٹیلی فون کے استعمال پر ایک لاکھ بار لعنت بھیجی اور فی الفور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "چوہدری صاحب، آپ جا رہے ہیں؟"

"ہیں! میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ بہرحال آپ ایک ہفتے کے لیے سوئٹ بک کر دیجیے" میں نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا نکالا اور پے منٹ کر دی۔ بٹوے میں معتبر قسم کے نوٹ دیکھ کر لڑکی امپریس ہوئی۔ درخواست سے بولی "آپ تھوڑا سا ویٹ کر لیجیے، سر آنے ہی والے ہیں۔"

مجھے اب "سر" کی ضرورت تھی نہ اس سے کوئی اپیل کرنے کی بلکہ میں اب اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتا تھا، مبادا سچ مچ اس کا دل پسیج جائے اور وہ اپنے قواعد و ضوابط پر لات مار کر میری درخواست قبول کر لے۔ رسید لے کر میں استقبالیہ سے نکلا اور سیدھا اپنی گاڑی میں آیا۔ ذرا سی دیر بعد میں واپس مری کی طرف جا رہا تھا۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے تراشیدہ بالوں والی اس لڑکی کی صورت تھی جسے میں نے حویلی میں ناچتے دیکھا تھا اور جو بعد ازاں صفدر علی کی بدنصیب محبوبہ ثابت ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا وہ حویلی میں تھی۔ بعید از امکان نہیں تھا کہ میں آغا قادر زماں سے ایک لڑکی کا مطالبہ کروں تو اسی کی رہائی کی کوئی سبیل نکل آئے۔ امکان معدوم تھا لیکن ناپید نہیں تھا۔ میں اس موقعے

سے فائدہ اٹھا کر کوئی ایسی صورت حال پیدا کر سکتا تھا کہ قادر زماں' انجم کو میرے ساتھ نتھیا گلی روانہ کر دے۔ اس کے نزدیک وہ ایک عام بازاری لڑکی تھی اور ایسے کاموں میں عموماً بازاری لڑکیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔

○☆○

ٹھیک ایک روز بعد رات کی تاریکی میں میری گاڑی نے مجھے حویلی تک پہنچا دیا۔

یہ وہی مہمان خانہ تھا جہاں میں کئی روز قیام پزیر رہا تھا' سانولی سلونی نجو نے میری تیمارداری کی تھی۔ اپنے پُرشباب جسم سے میرے افسردہ دل کے تاروں کو چھیڑا تھا اور پھر ایک روز مجھ سے ہمدردی جتانے کی پاداش میں اسے منظر سے ہٹا لیا گیا۔۔۔ کسی اور منظر میں فٹ کر دیا گیا تھا اور وہ منظر کیسا تھا' میں کچھ نہیں جانتا تھا' مجھے اپنے قرب و جوار میں اپنی معصوم بہن کی خوشبو محسوس ہوئی اور سینے میں وحشی گھوڑوں کی راسیں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ میں نے ان گھوڑوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے حواس کو جکڑ لیا۔ انہیں ایک نقطے پر مرکوز کر کے قرب و جوار سے لاتعلق ہو گیا۔

آغا قادر حویلی میں تھا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب وہ حویلی کی نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ مسلح آدمیوں کی معیت میں مجھے نشست گاہ کے اندر پہنچا دیا گیا۔ یہ نشست گاہ ایک وسیع ایوان کی طرح تھی۔ فرش پر دبیز قالین' دیواروں پر جہازی سائز کے غالیچے اور پینٹنگز' فرنیچر' پردے' رنگ و روغن غرض ہر شے اپنی مثال آپ تھی' اہم بات یہ کہ آرائش میں بھونڈا پن نہیں تھا۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ جس حویلی کی نشست گاہ ہے وہ ایک مضافاتی علاقے میں زرعی زمینوں کے درمیان کھڑی ہے۔ نشست گاہ کی بڑی دیوار پر ایک سیاسی جماعت کے کچھ قائدین کی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں کے ایک شاہانہ کرسی پر آغا قادر زماں شب خوابی کے لباس میں بیٹھا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میری آمد سے پہلے وہ خواب گاہ میں جانے والا تھا یا جا چکا تھا۔ اس کے منہ میں سگار تھا اور دونوں پہلوؤں پر حسب معمول دو تگڑے باڈی گارڈ چوکس کھڑے تھے۔

"آؤ یار جی!" اس نے اٹھ کر خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور نشست پیش کی۔ میں بیٹھ گیا "خیریت تو ہے یار جی" اس نے بڑے ملائم لہجے میں کہا۔

"خیریت ہی ہے" میں جواب دیا۔ "ایک کام آپڑا تھا آپ سے"

"حکم کرو بادشاہو"

"مجھے ایک لڑکی چاہیے" ایک دو ہفتے کے لیے۔"

"لڑکی؟" قادر زماں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ احمد رجال ساہی لاہور میں نہیں نتھیا گلی پر ہے' اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میرے ساتھ ایک لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔"

"کھل کر بات کرو یار جی۔" قادر زماں نے کرسی پر پہلو بدلا۔

میں نے مختصر لفظوں میں ساری صورت حال بتائی اور وضاحت کی کہ مجھے لڑکی کیوں درکار ہے۔ پوری بات سن کر قادر زماں نے ایک گہرا کش لیا۔ "یار جی! بہتر تھا کہ تم یہاں نہ آتے۔ تمہارے پاس رقم تھی' لاہور چلے جاتے' وہاں کسی اڈے سے کرائے کی لڑکی لے جاتے' ایک چھوڑ درجنوں مل جاتی ہیں۔"

میں نے بات بنائی۔ "یہ میں نے بھی سوچا تھا لیکن بازاری لڑکیوں کے چہرے پر چھاپ سی لگی ہوتی ہے۔ وہ دور سے پہچانی جاتی ہیں اور میں کسی طرح کا رسک نہیں لینا چاہتا۔ کوئی ایسی لڑکی ہو جو واقعی گھریلو لگے۔"

قادر زماں نے کہا "تو حویلی سے دیکھ لے کوئی لڑکی۔۔۔ وہ نرگس۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟ شکیلہ' وہ کام نہیں دے جائے گی۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں' کافی عمر ہے اس کی اور ویسے بھی جلد گھبرا جانے والی ہے۔"

"تو پھر ایسا کرو یار جی' چار پانچ لڑکیاں منگوا لیتے ہیں' ان میں سے چن لو۔" قادر زماں اب میرے ڈھب پر آرہا تھا۔ میں نے اس کی "تجویز" مان لی۔ قادر نے آواز دی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور وہ ایم جی والا رجی پہلوان نظر آیا جو مجھ پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور ہمارے درمیان نفرت کی ایک چنگاری سی چھوٹ گئی۔

"جی جاگیردار" پہلوان نے قادر زماں کے سامنے جھک کر کہا۔

قادر زماں نے اسے لڑکیوں کے بارے میں ہدایات دیں اور ساتھ ہی کافی لانے کو کہا۔ پہلوان چلا گیا۔

قادر زماں کے کہنے پر میں اسے اب تک کی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ اس کا لہجہ چھتے کی طرح شہد ٹپکا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آغا قادر زماں کا حساب الٹ ہے۔ اسے جب کسی شخص پر غصہ آتا ہے تو

اس کا لہجہ نرم و ملائم ہو جاتا ہے۔ غصہ بڑھتا جائے تو لہجہ ملائم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس شخص کو آپ۔۔۔ حضور جیسے القاب سے نوازنے لگتا ہے اور پھر اس کی کم بختی آجاتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ملازمہ شاندار ٹرالی میں کافی لے آئی۔ اس کے پیچھے ہی پہلوان چند لڑکیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کی تعداد چھ تھی اور وہ ساری خوبصورت تھیں لیکن ان میں نجو نہیں تھی نہ انجم' نرگس شکیلہ بھی نہیں تھی۔ وہ ساری کچی نیند سے بیدار ہوئی تھیں اور بڑی عجلت میں تیار ہو کر یہاں پہنچی تھیں۔ کچھ شرمائی شرمائی سی تھیں۔ معلوم نہیں' وہ یوں طلب کیے جانے سے کیا مطلب "نکال رہی تھیں۔ میں نے لڑکیوں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے تین تو صاف طور پر بازاری نظر آرہی تھیں۔ یقیناً وہ طوائفیں تھیں اور ناؤ نوش کی محفلوں کو رونق بخشنے کے لیے یہاں موجود تھیں۔ باقی تینوں میں سے دو پڑھی لکھی ملازمائیں تھیں۔ ویسی ہی ملازمائیں جو شیوخ و امراء کے محلات میں ہوتی ہیں اور انہیں احساس دلاتی رہتی ہیں کہ بیسویں صدی میں بھی آقائی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔۔۔ مذہب اور قانون میں خود ساختہ سقم تلاش کر کے پُرشباب جسموں میں طمانیت ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آخری لڑکی کے بارے میں میں کوئی واضح اندازہ قائم نہ کر سکا۔ مجھے وہ کوئی نوعمر سی ستائی نظر آئی جو کسی المیے کے نتیجے میں یہاں آپھنسی تھی۔

بازاری لڑکیوں کو تو میں نے پہلی نگاہ ہی میں رد کر دیا۔ ان تینوں لڑکیوں کو بھی کسی نہ کسی وجہ سے قابل قبول نہیں پایا۔ آخری فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا لہٰذا آغا قادر زماں نے تمام لڑکیوں کو واپس بھیج دیا اور پہلوان سے کہا کہ وہ اور لڑکیاں لائے۔

اس دفعہ پہلوان نے آنے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ شاید وہ ان لڑکیوں کو بھی پہلے پھیرے میں ہی اطلاع دے آیا تھا۔ اس مرتبہ جو لڑکیاں قادر زماں کے سامنے حاضر ہوئیں ان کی تعداد پانچ تھی اور ان میں انجم بھی موجود تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

اس کھیپ میں دو لڑکیاں تو عورتیں کہلانے کی مستحق تھیں۔ انہیں ری جیکٹ کرنے میں مجھے کوئی تردد نہیں ہوا۔ ان تینوں میں سے ایک بازاری خدوخال کی تھی جبکہ دوسری صورت سے زیادہ نوخیز نظر آرہی تھی۔ میں نے انجم کو غور سے دیکھا۔ کچھ دیر نگاہوں میں تولتا رہا لیکن فوراً پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

"کیا بات ہے؟" قادر زماں نے پوچھا۔ "کوئی پسند نہیں آئی؟"

میں نے کہا "آپ ہی کچھ مدد کریں۔ میری تو عقل خبط ہو رہی ہے۔"

قادر زماں نے نوخیز لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا نام فرزانہ ہے۔۔۔ بڑی حاضر دماغ ہے لیکن۔۔۔ لیکن عمر کی ذرا چھوٹی ہے۔"

"جی ہاں" میں نے فوراً تائید کی۔ "اس سے تو یہ بائیں طرف والی ٹھیک رہے گی۔" میرا اشارہ انجم کی طرف تھا۔

قادر زماں کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے الجھن کے آثار نظر آئے اور پھر غائب ہو گئے۔ وہ بولا "تو تم اسے مناسب سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "جو موجود ہیں ان میں سے تو یہی مناسب نظر آتی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" قادر زماں نے کہا۔ اس نے پہلوان کو اشارہ کیا۔ وہ لڑکیوں کو لے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ نوجوان عورتوں کو یوں سامنے کھڑا کر کے ان کا انتخاب کرنا اور پھر ملاحظے کے بعد ہانک کر لے جانا بڑا ہتک آمیز محسوس ہوتا تھا مگر اس جنسی حویلی میں ایسے واقعات معمول کے مطابق ہی سمجھے جاتے تھے۔ قادر زماں نے نئے سگار کا کونا توڑتے ہوئے کہا "یہ لڑکی زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ "بھاگ جائے گی؟"

"نہیں۔۔۔ خیر ایسا بھی نہیں ہے لیکن ذرا نئی ہے۔ اکیلا مت چھوڑنا۔"

"کیا بازاری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ حیرت ہے کہ پھر بھی تمہیں پسند آگئی ہے۔"

میں نے کہا "شکل سے تو نہیں لگتی۔۔۔ چال ڈھال سب مختلف ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے" قادر زماں نے تائید کی۔ پھر اس نے گفتگو کا رُخ احمد رجال ساہی کی طرف موڑ دیا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ میں نے اسے ختم کرنے کے لیے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے۔۔۔ کوئی منصوبہ تھا ہی نہیں تو میں اسے کیا بتاتا۔ بس یہ یقین دلا دیا کہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں یہ کام ہو جائے گا۔

○☆○

اگلی شب رات دس بجے میں حویلی سے انجم کے ہمراہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ زرق برق لباس میں تھی۔ زر بفت کا

شلوار قمیص جس کی سنہری زمین پر نیلگوں پتیاں تھیں۔ اودا ریشمی دوپٹا' وی گلے کا ہم رنگ سوئیٹر' کانوں میں چھم چھم کرتے آویزے' انگلیوں میں پکھراج کے چھلے' چہرے پر ہلکا سا میک اپ' نہایت کم سنی میں بھی وہ واقعی گلبرگ کی کوئی نوجوان مسز لگ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس خاموشی کا تعلق اس کے اندر کے خوف اور اداسی سے تھا۔ وہ ذری سہمی بیٹھی تھی جیسے ابھی تک قادر زماں کی آنکھیں اب بھی اس کی نگراں ہوں۔ حویلی سے یہاں تک ہم دونوں کے درمیان ایک لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی بات تو جدا رہی میں نے بھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نجانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ یہاں کی ہوائیں بھی قادر زماں کی مخبر ہیں اور جو میں کہوں گا وہ کسی نہ کسی طور اس تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت ہم حویلی سے تقریباً دس میل دور آ چکے تھے جب میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

"تمہارا نام انجم ہے؟"

"جی"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"لاہور کی؟"

"جانتی ہو' میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں؟"

"شاید کسی ہل اسٹیشن پر۔"

"اور کیا معلوم ہے؟"

"بس اتنا بتایا گیا ہے کہ مجھے آپ کی بیوی بن کر جانا ہے۔ میرا نام نادیہ احسان ہے اور ہم ہنی مون پر نکلے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا میرے ساتھ جانے میں تمہاری رضامندی شامل ہے؟"

وہ بولی "جہاں میں ہوں وہاں رضامندی کا لفظ بے معنی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم حبس بے جا میں ہو؟"

اس نے سہمی نظروں سے مجھے دیکھا "پلیز احسان صاحب۔ ایسی باتیں نہ پوچھئے جن کا میں جواب نہ دے سکوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا "کیا ایسی باتوں کی کوئی لسٹ تمہارے پاس ہے جو میں پوچھ سکتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' صفدر کا انتخاب قابل داد تھا۔ انجم دو اہم نسوانی خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ دلکش جسم کی مالک تھی لیکن چہرے پر معصومیت کا پڑاؤ تھا۔ یعنی شباب اور معصومیت اس کے پیکر میں یکجا ہو گئے تھے۔ اچانک سینے سے آہ سی نکل گئی۔ نجانے اس خوب صورت پیکر پر گزشتہ شب و روز میں کیا بیت چکی تھی۔ اس لاوارث باغ کی فصل پر کن کن لوگوں نے ہاتھ صاف کیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تمہارا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہے اور ان لوگوں کے چنگل میں پھنسے تمہیں چند ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ بولی "احسان صاحب! میں درخواست کرتی ہوں' مجھ سے اس طرح کے سوال نہ کیجئے۔"

"کس قسم کے سوال؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے جواب پر اصرار کیا تو وہ روہانسی آواز میں بولی "میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہ پوچھئے ورنہ میرے ساتھ ساتھ آپ اپنا بھی نقصان کریں گے۔"

"تو حال کے بارے میں پوچھ لوں؟"

"کیا پوچھنا ہے؟"

"تم ہی بتاؤ کیا پوچھوں۔ اچھا' صفدر کے بارے میں پوچھ لوں؟"

وہ سیٹ سے یوں اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میری نگاہیں ونڈ اسکرین پر تھیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

میں نے مسکرا کر کہا "بھئی' صفدر تو ماضی نہیں ہے' حال ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"کون ہیں آپ؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تمہارا خیر خواہ۔"

"ک۔ کس صفدر کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

"اس صفدر کی جو تمہیں گلی گلی اور کوچے کوچے میں ڈھونڈ رہا ہے۔ جس کی بے خواب آنکھوں میں تمہاری تصویر ہے اور ہونٹوں سے تمہارا نام چپکا ہوا ہے۔"

وہ ہکلا کر بولی "میں کچھ نہیں جانتی وہ کون ہے۔"

"لیکن میں تو جانتا ہوں۔ میں نے اسے حویلی کی دیواروں سے سر ٹکراتے دیکھا ہے۔ وہ تمہاری تلاش میں دیوانہ ہو رہا ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" انجم نے پوچھا۔

"میں صفدر کا دوست ہوں اور اسی کے کہنے پر تمہیں یہاں سے نکال کر لے جا رہا ہوں۔"

وہ حیرت کی تصویر بنی میرا چہرہ دیکھتی رہی۔ شاید وہ سوچ

بھی نہ سکتی تھی کہ کوئی اسے اس بلند و بالا حویلی سے نکالے گا اور یوں آسانی کے ساتھ۔ کوئی ہنگامہ ہو گا نہ گولی چلے گی۔ خون کا ایک قطرہ بہے گا نہ کہیں آہٹ ہو گی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا "ہاں انجم۔۔۔ میں تمہیں قادر زماں کے چنگل سے چھڑا لایا ہوں۔ تم آزاد ہو۔۔۔ کم از کم اس وقت آزاد ہو۔"

"صفدر۔۔۔ صفدر کہاں ہے؟" انجم نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ یہیں قریب ہی موجود ہے لیکن اسے دیکھنے کے لیے تمہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"نہیں نہیں" وہ جذباتی انداز میں بولی "مجھے اس سے نہیں ملنا۔ مجھے نہیں ملنا اس سے۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ چھوڑ دو مجھے' میں۔۔۔ میں واپس جاؤں گی۔" اس کا ہاتھ خود بخود دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بولی "یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اتار دیں مجھے' مجھے کہیں نہیں جانا۔"

گاڑی کی رفتار اب کافی تیز ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں جان چکا تھا کہ وہ۔۔۔ کم از کم چھلانگ نہیں لگائے گی۔

"بے وقوف مت بنو انجم!" میں نے تحکم سے کہا "خدا کا شکر ادا کرو' تم ان منحوس دیواروں سے باہر ہو اور ایک بات یاد رکھو۔ جو ہاتھ تمہیں حویلی سے نکال سکتے ہیں وہ تمہاری حفاظت بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ کراہی "میں کہتی ہوں' آپ گاڑی روک دیں۔ میں اس حویلی سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی۔"

میں نے اطمینان سے کہا "تم جا سکتی ہو۔۔۔ اور جا رہی ہو۔" وہ سپٹا کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیش بورڈ سے سر ٹکائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

ہم برانچ روڈ پر پہنچے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دونوں اطراف تاریک کھیت تھے۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ بس کسی وقت کوئی لوکل ویگن یا ٹریکٹر ٹرالی شور مچاتی گزر جاتی۔ تھوڑا آگے جا کر سڑک خراب ہو گئی اور مجھے رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ اچانک ایک شخص کنارے سے برآمد ہوا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ یہ کوئی ادھیڑ عمر دیہاتی تھا۔ ہیڈ لائٹس میں اس کا نیلا تہبند اور سرخ دوسوتی کا سفید کھیس صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا ارادہ گاڑی روکنے کا نہیں تھا مگر پھر دیہاتی کے انداز نے ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا اور یہ گھبراہٹ کسی اداکاری کا نتیجہ نہیں تھی۔ میں نے بریک لگائے۔ دیہاتی لپک کر کھڑکی پر پہنچا۔

"باؤ جی! ڈاکو پڑ گئے ہیں۔ اللہ رسول کے واسطے ہماری مدد کرو۔"

"کہاں ہیں ڈاکو؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سامنے درختوں کی پچھلی طرف مکان میں سب کو لہولہان کر رہے ہیں۔ اندر سے بچوں کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں۔" یہ فقرہ ادا کرتے کرتے وہ پچھلا دروازہ کھول کر نشست پر بیٹھ گیا۔ پھٹی ہوئی آواز میں بولا "تھوڑا آگے چنے پل کے پاس ٹیلی فون ہے۔ تھانے کا نمبر بارہ چوالیس ہے آپ ذرا جلدی پہنچا دیں۔"

دیہاتی کے لب و لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلا گیئر لگایا اور چند سیکنڈ میں رفتار چالیس تک پہنچا دی۔ حتی الامکان رفتار سے گاڑی دوڑا کر ہم کوئی ایک منٹ میں چنے پل پر پہنچ گئے۔ یہاں ٹائروں کی ایک دکان تھی' ایک پان سگریٹ کا کھوکھا تھا اور ایک چھوٹی سی دکان پر ندیم میڈیکل اسٹور کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ تینوں دکانیں بند پڑی تھیں۔ گاڑی رکتے ہی دیہاتی دوڑا اور میڈیکل اسٹور کا بند دروازہ دھڑ دھڑ بجانے لگا۔ فوراً اندر روشنی ہوئی اور کسی نے دروازہ کھول دیا۔ یہ ایک نوجوان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر نیلے رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی۔ قمیص جرسی کے اندر ہی سمٹ سما گئی تھی اور شلوار کے بل آزار بند تک نظر آ رہے تھے۔ بکھرے بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نیند سے جاگا ہے۔ دیہاتی اور میڈیکل اسٹور والا چند لمحے تیز لہجے میں باتیں کرتے رہے پھر دونوں بھاگتے ہوئے گاڑی تک آئے۔ دونوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ دیہاتی نے روہانسے لہجے میں کہا "ٹیلی فون تو خراب پڑا ہے جی۔"

"تھانہ کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تھانہ نہیں جی' چوکی ہے۔" میڈیکل اسٹور والا بولا "یہاں سے کوئی چار میل دور ہے لیکن آگے جا کر کچے سے گزرنا پڑتا ہے۔"

دیہاتی بھرائی ہوئی آواز میں بولا "وہ تو ماردیں گے جی' چھوٹے چھوٹے بچوں کو بالکل جناور بنے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "تو چلو' تو پھر ہم تینوں چلتے ہیں۔ راستے میں کوئی اور ملا تو اسے بھی ساتھ لیتے چلیں گے۔"

دیہاتی کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلا گئے۔ یہی تاثر اسٹور والے کے چہرے پر نظر آیا۔ دیہاتی بولا "میں جانتا ہوں جی ان کو۔۔۔ بڑے خونی بندے ہیں وہ۔ ان سے تو پولیس ہی نبٹ سکتی ہے۔"

اسٹور والے نے کانپتی آواز میں تائید کی "اللہ رحم کرے جی۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

اتنے میں ایک ویگن کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں نے گاڑی سے باہر نکل کر ویگن کو روکا۔ یہ لوکل روٹ پر چلنے والی ایک چھلیچر گاڑی تھی۔ اندر صرف تین افراد تھے۔ ڈرائیور، کنڈیکٹر اور ان کا ایک ساتھی۔ میں نے انہیں صورت حال بتائی اور تعاون کی اپیل کی۔ وہ پہلے تو ہمیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگے لیکن جب نگاہ میری گاڑی پر اور اندر بیٹھی ہوئی انجم پر پڑی تو قدرے مطمئن ہوئے۔ تاہم یہ اطمینان ایسا نہیں تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی چل دیتے۔ ڈرائیور نے مجھے مخلصانہ مشورے سے نوازتے ہوئے کہا "صاحب جی! آپ خواہ مخواہ کسی چکر میں نہ پڑ جائیں۔ آپ کے ساتھ بی بی بھی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ پولیس کو اطلاع دیں۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ تینوں بھی خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ اتنے میں ایک اور گاڑی کی روشنیاں چمکیں۔ یہ ایک بس تھی۔ میں نے اور اسٹور والے نے آگے بڑھ کر ہاتھ ہلایا لیکن بس فراٹے بھرتی گزر گئی۔ میں نے ویگن والوں سے کہا "جانا نہیں یار۔۔۔ کسی اور گاڑی کو روکتے ہیں۔ آٹھ دس بندے اکٹھے ہو جائیں تو ابھی دیکھ لیتے ہیں ان اچکوں کو۔"

میری اس نئی تجویز کے باوجود ویگن والوں نے انجن بند کرنے اور گاڑی سے اترنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ رُکنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہم سڑک کی طرف متوجہ تھے کہ انہوں نے ویگن آگے بڑھا دی۔ جاتے جاتے کنڈیکٹر نے کھڑکی سے منہ نکال کر آواز دی "ہم چوکی جا کر اطلاع دیتے ہیں جی۔"

معلوم نہیں انہوں نے اطلاع بھی دینا تھی یا نہیں۔ خاصے خود غرض اور تھڑدلے نظر آتے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ کسی ایسے معاملے میں میرا ملوث ہونا ٹھیک تو نہیں تھا لیکن کان لپیٹ کر یہاں سے گزر جانا بھی بہت کٹھن تھا۔ ایک تنہا مکان میں ایک بے بس و ناچار کنبہ غنڈوں کے رحم و کرم پر تھا اور بچے مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ میں نے گھوم کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور انجن اسٹارٹ کر دیا "آؤ چاچا" میں نے دیہاتی سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ میڈیکل اسٹور والا بھی چند لمحے سوچنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے یوٹرن لیا اور طوفانی رفتار سے واپس روانہ ہوا۔ کن انکھیوں سے میں نے دیکھا' انجم ہراساں اور خاموش تھی۔ سترہ اٹھارہ برس تک گھریلو زندگی گزارنے والی لڑکی اچانک ہی حادثوں کے دھارے پر بہنے لگی تھی۔ ایک پرسکون گلی میں سفر کرتے کرتے وہ ایک ایسی شاہراہ پر نکل آئی تھی جہاں بے پناہ رفتار' خوف ناک شور اور حادثات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ ہراساں نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ پلک جھپکتے میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں دیہاتی نے ہمیں روکا تھا۔ دیہاتی کے اشارے پر میں نے گاڑی بائیں جانب کچے میں اتار دی۔ خاصا اونچا نیچا راستہ تھا۔ رفتار کی وجہ سے گاڑی بری طرح اچھل رہی تھی۔ درختوں کے ایک بڑے جھنڈ کے درمیان سے گزر کر ہم ایک کنوئیں پر پہنچے اور وہاں سے ایک ہل چلے کھیت میں گھس گئے۔ تقریباً نصف فرلانگ دور ایک تنہا مکان دکھائی دے رہا تھا۔ دیہاتی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "یہی مکان ہے۔"

میں نے بریک لگا کر ہیڈلائٹس سامنے پھینکیں۔ مکان کے باہر ایک تانگا کھڑا تھا۔ نہایت صحت مند گھوڑے والا۔ ایسا تانگا عرف عام میں "ریس تانگا" کہلاتا ہے۔ اس میں صرف دو تین آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے' ہاں پائیدانوں پر کھڑے ہو کر زیادہ بندے بھی سفر کر لیتے ہیں۔ تانگا دیکھ کر دیہاتی نے خوف زدہ آواز نکالی "یہ تانگا ان کا ہے۔ وہ اندر ہی ہیں جی۔ وہ دیکھئے ان کی سفید گھوڑی بھی نظر آ رہی ہے۔"

میں نے سیٹ کے نیچے سے ریوالور نکالا' سیفٹی کیچ ہٹایا اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اوپر تلے کئی ہوائی فائر کر دیے۔ اس کے ساتھ میں ہارن بھی بجا رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ "گھس بیٹھیے" اگر بھاگنے والے ہیں تو بھاگ جائیں لیکن انہوں نے اپنے ردعمل سے ثابت کیا کہ وہ بھاگنے والے نہیں۔ دھماکے ہوتے ہی مکان کا بیرونی دروازہ کھلا۔ کسی شخص نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اس کے بعد دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ ہماری گاڑی رینگتی ہوئی اب مکان سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے انجن بند کر کے لائٹس آف کر دیں۔ دھماکوں کے بعد فضا میں ایک سراسیمگی سی پھیل گئی تھی۔ مجرم کایاں تھے۔ باہر نکل کر صورت حال دریافت کرنے کے بجائے وہ اندر دبک کر بیٹھ رہے تھے۔ اب گیند ہمارے کورٹ میں تھی کہ ہم صورت حال دریافت کریں اور پھر کریں جو کرنا ہے۔ ہمیں خبر دینے والے دیہاتی کا نام طفیل تھا۔ میں نے طفیل سے پوچھا "کچھ پتا ہے اندر گھسنے والے کتنے بندے تھے؟"

وہ بولا "مجھے کچھ پتا نہیں باؤ جی' میں اس مکان کے پچھواڑے' جنگل میں رہتا ہوں۔ مویشیوں کی دوا دارو کرا

ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کنوئیں سے طہارت کر کے واپس آ رہا تھا کہ یہ تانگا میرے پاس سے گزرا۔ ساتھ میں سفید گھوڑی بھی تھی۔ میں اس تانگے کو اور تانگے والوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ بڑے کشتی کے پتر ہیں۔ اکا دکا ان کی بدمعاشی سے بچے نہیں۔ میں گھبرا گیا تھا۔ ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکا کہ وہ کتنے ہیں۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا "میں ان سامنے والی جھاڑیوں کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا' تانگا مکان کے سامنے رُکا۔ بندے چھلانگیں مار کر اترے اور ان میں سے دو دیوار پھلانگ کر اندر گھس گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد عطا محمد کی بیوی بچے چیخنے چلانے لگے۔ پھر دروازہ کھلا اور عطا محمد کا چھوٹا لڑکا شوکت چیختا ہوا باہر نکلا۔ ایک لمبے آدمی نے دوڑ کر اسے پکڑا اور گھسیٹ کر اندر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی مکان کے صحن کی بتی بجھ گئی۔ میں دوڑتا ہوا سڑک پر پہنچا اور آپ کو ہاتھ دے کر روکا۔"

"وہ دیکھیں جی۔ وہ دیکھیں" اسٹور والے نے انگلی اٹھا کر دہشت زدہ سرگوشی کی۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ حویلی نما مکان کی چھت پر سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق یا لاٹھی تھی۔ وہ بڑی بے خوفی سے کھڑا تھا۔ پھر وہ نیچے صحن میں کھڑے کسی شخص سے باتیں کرنے لگا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے لیکن آواز سے بدمعاشی صاف جھلک رہی تھی۔ بھاری بھرکم کھردری آواز جو بولنے والے کی اکڑفوں اور دیدہ دلیری کی گواہ تھی۔

میں نے طفیل سے پوچھا "ابھی تم نے عطا محمد کا نام لیا ہے۔ کیا یہ اسی کا مکان ہے؟"

طفیل نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا "یہ کنواں اور آلے دوالے کے چار پانچ کھیت اسی کے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے اس نے اپنی دو جوان بیٹیوں کی شادی کی ہے۔ میرے خیال میں تو اب اس کے گھر پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ پتا نہیں' یہ حرام زادے یہاں کیا لوٹنے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "کوئی مال ڈنگر ہو گا' گھر کا سامان وغیرہ؟"

طفیل بولا "کچھ بھی نہیں جی۔ سب کچھ بیچ کر اس نے شادی پہ لگا دیا۔ اب تو بھوک اور قرض کے سوا اس کے گھر میں کچھ بھی نہیں۔"

میں نے کہا "تو پھر کوئی جوان لڑکی ہو گی؟"

وہ فوراً نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں باؤ جی' عطا محمد ہے' اس کی ادھیڑ عمر بیوی ہے یا دو لڑکے ہیں' اسکول کی عمر کے۔ ان میں ایک تو شوکت ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اندر سے نکلا تھا۔ مجھے پکا یقین ہے' اس کے سر پر کوئی شے ماری ہے انہوں نے۔ چھو نقصان ہو رہا تھا اس کا۔"

اچانک میری سماعت سے ایک غیر مانوس سرسراہٹ ٹکرائی۔ دائیں طرف دس گز کے فاصلے پر گنے کے کھیت میں کوئی موجود تھا۔ کوئی انسان یا جانور۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ یکایک کوئی بھاگ اٹھا۔ میں نتائج سے بے پروا ہو کر اس کے پیچھے لپکا۔ دس گز کا فاصلہ میں نے پلک جھپکتے میں طے کیا۔ اسی وقت مجھے بھاگنے والا کھیت سے نکلتا دکھائی دیا۔ وہ دھوتی کرتے میں تھا اور بھاگ کر ایک دوسرے کھیت میں گھس جانا چاہتا تھا۔ میں گولی نہیں چلانا چاہتا تھا لہٰذا بھاگتے بھاگتے میں نے ریوالور جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ جونہی میرا اور اس شخص کا درمیانی فاصلہ کم ہوا' میں نے جست بھری اور اس کے اوپر گرا۔ میرا ہاتھ اس کے کالر پر پڑا تھا۔ "چرر" کی آواز سے کرتا پھٹ گیا اور وہ اوندھے منہ میرے سامنے گرا۔ گرنے سے اس کے منہ پر چوٹ آئی تھی۔ اس چوٹ نے جیسے اس کے دماغ میں انگارے بھر دیے۔ وہ غرا کر پلٹا اور زوردار ٹانگ میرے سینے پر رسید کی۔ میرے زمین سے اٹھتے اٹھتے وہ بھی پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ پھر میں نے کمانی دار چاقو کھلنے کی مخصوص آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے عقب میں چند گز کے فاصلے پر گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ یقیناً یہ انجم تھی۔ وہ لوگ طفیل وغیرہ گاڑی سے نکل کر ہمارے پیچھے لپکے تھے اور اب تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

میرا مدمقابل درمیانے قد کا ایک گٹھا ہوا شخص تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ چاقو کا استعمال اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے چاقو والا ہاتھ دو تین مرتبہ تیزی سے لہرایا۔ ہر بار چاقو کا پھل سنسناتا ہوا میرے چہرے کے پاس سے گزرا۔ درحقیقت مدمقابل مجھے میدان سے بھگانا چاہتا تھا۔ اس کے ہر وار پر میں ایک آدھ فٹ پیچھے کھسک گیا لیکن نہ تو بھاگا اور نہ کسی طرح کی پریشانی کا اظہار کیا۔ جھنجھلا کر اس نے مجھ پر سیدھا وار کیا۔ مدمقابل کا ہاتھ حرکت میں آتے ہی میں جان چکا تھا کہ یہ وار میری دائیں ران پر ہے۔ میں نے بائیں جانب حرکت کر کے یہ وار بچایا اور ایک بھرپور ٹھوکر چاقو زن کی پسلیوں پر رسید کی۔ وہ ڈکراتا ہوا انجم اور طفیل کے پاس گرا۔ انجم چلا کر کار کی طرف دوڑی۔ طفیل بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ پسلیوں پر پڑنے والی ٹھوکر نے مدمقابل کو غصے میں اندھا کر دیا۔ وہ اٹھتے ہی بلا سوچے سمجھے تیر کی طرح میری طرف آیا جیسے ایک ہی وار میں میرا خاتمہ بالخیر کر ڈالے گا۔ میرا تجربہ ہے کہ تیز رفتار آنے

کے ساتھ یوں جارج کرنے والے شخص کے آگے بھاگا جائے یا پیچھے نہ ہٹا جائے تو معمولی کوشش سے اسے فیصلہ کن ضرب لگائی جاسکتی ہے۔ میں پوری چوکسی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نگاہیں حریف کے چاقو پر تھیں۔ جونہی اس نے اپنی دانست میں مجھے "قتل" کیا۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ چاقو والا ہاتھ لہراتا ہوا میرے سر کے اوپر سے گزرا۔ میرے دونوں ہاتھ حملہ آور کے کولہوں پر جم چکے تھے۔ وہ اپنے زور میں میرے اوپر چڑھا آرہا تھا۔ یکایک میں نے اسے پھول کی طرح سر سے اونچا اٹھالیا۔ یہ سارا ساعتوں کا کھیل تھا۔ اور اس کھیل میں میری طاقت سے زیادہ توازن اور ٹائمنگ کا عمل دخل تھا۔ اس توازن اور ٹائمنگ کو ایک بارہ سالہ بچہ بھی سمجھ لیتا تو حملہ آور کو سر سے اوپر اٹھا سکتا تھا۔ میں نے دو قدم بھاگ کر اس شخص کو پگڈنڈی پر پٹخ دیا۔ کھیت میں اس لیے نہیں پٹخا کہ وہاں ہل چلا ہوا تھا اور اسے چوٹ "نہ" لگنے کا احتمال تھا۔ وہ سر کے بل ایک بیری کی جڑ میں گرا اور لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ میں نے اسے چھاپنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ اس کا دایاں ہاتھ خالی تھا۔ یعنی سر کے بل گرنے کے بعد وہ اپنے ہتھیار پر گرفت قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ میں نے اس کا بازو موڑا تو وہ تڑپ کر اوندھا ہو گیا۔ میں نے ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"ہاں۔۔۔ رانی خاں کے سالے۔ بتاؤ کون کھوپڑی میں ہوشندان؟" میں نے استفسار کیا۔

وہ کراہ کر رہ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تن پھن ختم ہو چکی ہے۔ غالباً گرنے سے ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی تھی۔ طفیل اور اسٹور والا لڑکا اب میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ طفیل کے ہاتھ میں گاڑی کا آہنی جیک راڈ تھا اور لڑکا بھی کسی ڈنڈا نما شے سے مسلح نظر آرہا تھا۔

میں نے طفیل کو اشارہ کیا۔ اس نے آہنی راڈ نیچے کو تھما کر حملہ آور کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ ہم اسے ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں لے آئے۔

گاڑی کی اندرونی بتی روشن کی تو انجم کی چیخ نکل گئی۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے بوکھلا کر رہ گیا۔ خوف ناک چپل کا چاقو ابھی تک حملہ آور کے ہاتھ میں تھا لیکن اب یہ بائیں ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ معلوم نہیں کس وقت اس نے چاقو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں منتقل کر لیا تھا۔ مقام شکر تھا کہ اسے چاقو استعمال کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ورنہ جب ہم اسے ڈنڈا ڈولی کر کے لا رہے تھے وہ بڑی سہولت سے میرا پیٹ چاک کر سکتا تھا۔ میں نے جھپٹ کر چاقو اس کے ہاتھ سے

نکال لیا۔ سر کے بل گرنے سے اس کی پیشانی پر شدید چوٹ آئی تھی۔ بائیں ابرو کے اوپر نیلا گنبد بن گیا تھا اور خون رس رس کر کان کی انار کلی میں گھس رہا تھا۔ اس کے حواس اب قدرے بحال ہو رہے تھے۔ نیم باز آنکھوں سے مجھے گھور کر وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کسی حد تک خوف زدہ بھی تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو پائی تھی کہ وہ چاقو گھونپنے کی کوشش میں اچانک پگڈنڈی پر کیسے جاگرا۔

وہ چوبیس پچیس برس کا ایک غنڈا صورت شخص تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی پیشانی کا نیلا گنبد ٹٹولا اور زہریلے لہجے میں بولا "تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ استاد تمہاری ٹانگیں چیر کر رکھ دے گا۔"

"کون ہے وہ محترم خان؟" میں نے پوچھا۔

"نام سنو گے تو پیشاب نکل جائے گا۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں نے مسکرا کر کہا "مجھے بڑی رکاوٹ ہے پیشاب میں' تم نام لو شاید میرا بھلا ہو جائے۔"

"استاد کاریگن کہتے ہیں اسے۔ وہ سامنے مکان میں موجود ہے۔" میرے حریف نے دھماکا کیا۔

میں چند لمحوں کے لیے سناٹے میں آگیا۔ استاد کاریگن سے اتنی جلدی پھر ملاقات ہو جائے گی' یہ امید نہیں تھی۔ یہ ہمارے سامنے پڑا ہوا غنڈا غالباً ان افراد میں شامل نہیں تھا جو پانچ روز پہلے شامت کے گھر مجھ سے اپنی گت بنوا چکے تھے۔ میں نے طفیل وغیرہ کی طرف دیکھا۔ استاد کاریگن کا نام سن کر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ طفیل نے سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ بے زبان خاموشی کہہ رہا تھا "باؤ جی! یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ کسی اور کی بات پر نہیں تو میری بات پر اعتبار کرو۔ یہ ناکوں چنے چبوائیں گے آپ کو۔"

میں نے بڑی مایوسی کے انداز میں کہا "تو تم۔۔۔ استاد کاریگن کے بندے ہو؟"

اس کی گردن تھوڑی سی تن گئی۔ ایک دم ہی وہ ہوشیار اور چوکس نظر آنے لگا تھا جیسے وہ ہمارے قبضے میں نہ ہو بلکہ ہم سب اس کے قبضے میں ہوں۔ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے مختصر نظروں سے مکان کی طرف دیکھا۔ غالباً اسے یقین تھا کہ ابھی استاد وغیرہ اس کی مدد کو پہنچ جائیں گے۔ اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ شخص مکان کے اندر سے ہی آیا ہے۔ ہوائی فائرنگ کے بعد یہ شخص مکان کے پچھواڑے سے نکلا تھا اور صورت حال

جاننے کے لیے کھیتوں کھیتوں چلتا یہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے تہ بند کی ڈب میں ایک وڈیو کیسٹ تھا۔ میں نے ڈب کھول کر کیسٹ نکال لیا "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ تمہیں استاد ہی بتائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ موقع دیکھ کر ساتھیوں کو آواز دینے کی کوشش میں ہے۔

"استاد محترم کو یہاں بلانا چاہتے ہو تو بلاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لیا اور اس کا گریبان کھینچتے ہوئے بولا "چلو اٹھو بلالو استاد کو۔ اسے کہو کہ تمہاری ماں کا خصم چوہدری احسان آیا ہے لیکن یہ بھی بتا دینا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہے۔ اگر اس نے چلت پھرت دکھانے کی کوشش کی تو دوسرا ٹخنہ بھی توڑ دوں گا۔۔۔ جاؤ بلا لاؤ ان سب بہن کے بھنگیوں کو۔"

اس شخص کے چہرے پر خوف امڈ آیا۔ میں نے اسے گاڑی سے نکال کر دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دور چلا گیا۔ پھر مکان کی طرف اس طرح بڑھا کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور دوسری مکان کی طرف۔ اس کی سست روی دیکھ کر میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ اس فائر کے سبب اس شخص نے آخری دس گز کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور دروازہ کھلوا کر اندر گھس گیا۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا رہا۔ ریوالور میری گود میں تھا۔ طفیل' انجم اور اسٹور والا لڑکا تذبذب میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ تو وہ جان ہی گئے تھے کہ میں ان بدمعاشوں کو جانتا ہوں لیکن کیا وہ بھی مجھے پہچانیں گے اور میرے سامنے سر اطاعت خم کریں گے اس کا انہیں یقین نہیں تھا۔

میری گردن کا زخم ابھی اندر سے کچا تھا۔ جو ہلکا مشتی ہوتی تھی تو گلا سامنے کی طرف سے دکھنے لگتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے گلے پر ہاتھ پھیرتا رہا اور چوکس نظروں سے مکان کی طرف دیکھتا رہا۔ ہمیں تقریباً تین منٹ انتظار کرنا پڑا پھر مکان کا بیرونی دروازہ کھلا اور لالٹین کی روشنی چمکی۔ اس روشنی میں میری نگاہ سب سے پہلے استاد کاریگن پر پڑی۔ وہ بیساکھیوں پر کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو موٹے تازے گرگے تھے۔ ان میں سے ایک وہی دراز قد نوجوان تھا جس کی ناک پر میں نے اپنے سر سے بوسہ دیا تھا اور جو بعد از اں بے ہوش کاریگن کو اٹھا کر شامت کے مکان سے نکلا تھا۔ اس کے پاس اب بھی رائفل تھی لیکن یہ رائفل ہاتھ کے

بجائے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ استاد کاریگن سمیت یہ تینوں افراد درمیانی رفتار سے چلتے گاڑی کی طرف آئے۔ انجم کا ہاتھ بے اختیار میرے کندھے پر آگیا۔ میں اس کے خوفزدہ لمس کو نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی سے نکلا اور استاد کاریگن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ استاد کاریگن گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں دونوں مسٹنڈے پوری طرح چوکس تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا' اگلے لمحے کیا ہو جائے گا۔ بالکل ویسٹرن اسٹائل فلموں کا سین تھا جن میں لوگ اچانک اسلحہ ہاتھ میں لے کر تھا تھا شروع کر دیتے ہیں۔

چند لمحے اس گمبھیر خاموشی میں بیتے پھر استاد کاریگن بیساکھیوں کو حرکت دے کر ایک قدم آگے آیا "بادشاہ! تم یہاں کیسے؟" وہ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے جواب دیا "تم سے کہا تھا ناکہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ جب بھی تمہاری محبت' میری محبت کو آواز دے گی۔ میں سر کے بل چلا آؤں گا۔"

استاد کاریگن نے بُرا سا منہ بنایا "باؤ! میں سیدھا سادہ بندہ ہوں' مجھ سے سیدھی ساری بات کرو۔ میں تم سے ٹھٹھا لگانا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں' تم مجھ سے ٹھٹھا لگانا نہیں چاہتے۔ تم تو ٹھٹھا لگانا چاہتے ہو کمزور نہتے لوگوں سے جو تمہاری منتیں سماجتیں کریں۔ تمہارے ٹھڈے کھائیں اور تمہارا ظلم بھی برداشت کریں۔ مجھ جیسے کُنگ سے ٹھٹھا لگا کر تمہیں ٹوٹے ہوئے گوڈے گٹوں کے سوا کیا ملے گا۔"

کاریگن خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا' پانچ روز پہلے کی وہ موسلا دھار رات اس کی چشم تصور میں گھوم رہی تھی۔

وہ زرا لجاجت سے بولا "باؤ یار! تم تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہو۔ کون سا گناہ ہو گیا ہے ہم سے؟"

"ہاں گناہ تو انہی لوگوں کا ہے۔" میں نے جواب دیا "کتنے پاپی ہیں یہ لوگ' گھروں کے دروازے اندر سے بند رکھتے ہیں' تمہیں دیواریں پھلانگنی پڑتی ہیں پھر جس کا گلا دباتے ہو وہی آنکھیں نکالتا ہے۔ جس کی عزت تار تار کرتے ہو وہی چیخ و پکار کرتا ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہے! ظلم سہنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا ان شدروں کو۔"

میرے طنزیہ لہجے نے کاریگن پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔ اس کے اندر پانچ روز پہلے والی تن پھن کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ دبے لہجے میں بولا "باؤ یار! اگر یہ تمہارے کوئی عزیز رشتہ دار ہیں تو ہم چلے جاتے ہیں یہاں سے۔۔۔ مولا قسم ہم تو بھنوں کے جن

ہیں۔ کبھی آزما کے تو دیکھو ہم کو۔"

میں نے کہا "آزما کے تو دیکھ لیا ہے۔ تمہیں کہا نہیں تھا' بندے کے پتر بن جاؤ۔ چھوڑ دو یہ علاقہ۔"

وہ چڑ چڑا ہو گیا "باؤ یار! ہم نے کوئی ڈاکا تو نہیں ڈالا۔ پوچھ لے گھر والوں سے۔ کیا زیادتی کی ہے ہم نے ان سے۔ وہ چھوٹا منڈا ابھی خود ہی بھاگتے ہوئے گر گیا ہے۔ اور کسی کو ہاتھ بھی لگایا ہو ہم نے تو کوڑھے ہو جائیں۔"

"تو پھر کیا کر رہے تھے اندر؟ بیو کا منہ کالا رہے تھے؟"

وہ میرے لہجے کو نظر انداز کر کے بولا "بس ایک رات کا بسیرا کرنا تھا یہ۔ صبح بانگ کے ٹیم نکل جانا تھا یہاں سے۔"

"رات کا بسیرا۔ یہ تمہارے بہنوئی کا گھر تھا؟" میں نے پھر چرکا لگایا۔

وہ پیچ و تاب کھا کر بولا "باؤ یار! کیوں ناراض ہوتے ہو اپنے بچوں سے۔ تمہیں برا لگا ہے تو دفع ہو جاتے ہیں یہاں سے۔" پھر دراز قد نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا "جھالے! جا بلا لا کیرے اور رحمت کو۔"

"ٹھہرو" میں نے جھالے کو ڈانٹ پلائی "اتنی جلدی کس بات کی ہے' پہلے اندر جا کر تمہارا رین بسیرا تو دیکھ لیں۔"

کارین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انجم حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن زیادہ حیرت طفیل اور اسٹور والے کے چہرے پر تھی۔ وہ کارین کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس شیر کے منہ سے میاؤں میاؤں کی آواز نکل رہی ہے۔ ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ کارین یہاں پہنچتے ہی ہم سب کو گاڑی میں بند کرے گا اور پیٹرول وغیرہ چھڑک کر آگ لگا دے گا لیکن وہ تو برف کی ٹھنڈی ٹھار ڈلی بنا میرے لہجے کی حرارت سے پگھلا جا رہا تھا۔ ریوالور میں نے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا لیکن اس طرح کہ اس پر میری گرفت بدستور قائم رہی "چلو آؤ ذرا اندر دیکھیں تمہاری شرافت کے نمونہ جات۔"

میں نے کارین کو ساتھ لیا اور مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ رائفل بردار میرے دائیں پہلو پر تھا۔ اس کی ہر جنبش میری نگاہ میں تھی لیکن محسوس ہوتا تھا کہ وہ مزاحمت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ شاید کارین وغیرہ کو یقین تھا کہ یہ معاملہ زیادہ بگڑنے نہیں پائے گا۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی تھی۔ بہرحال وہ شرافت سے میرے ساتھ چل رہے تھے۔ میری ہدایت پر طفیل اور اسٹور والا لڑکا انجم کے پاس ہی رک گئے تھے۔ بیرونی دروازے سے گزر کر ہم مکان میں داخل ہوئے۔ سامنے کے چھوٹے صحن میں بلب روشن تھا۔ یہ ایک حویلی نما دو منزلہ مکان تھا۔ شاید علی گڑھ کالج سے بھی پہلے کا تعمیر شدہ۔ لکڑی کے منقش دروازے' جگہ جگہ طاقدان' نانک شاہی اینٹیں اکثر جگہوں پر پلستر کے نیچے سے جھانک رہی تھیں۔ پہلو کی دیوار پر بے شمار اپلے لگے ہوئے تھے۔ ان اپلوں کے قریب ہی ایک وچھیری اور مریل سی بھینس بندھی ہوئی تھی۔ بھینس کی کھرلی کے پاس مرغیوں کے بے شمار پر پڑے تھے اور تازہ خون دکھائی دے رہا تھا۔ لگتا تھا' تھوڑی دیر پہلے آٹھ دس مرغیاں کاٹی گئی ہیں۔ مکان کے پہلو سے ایک تنگ راہداری گزرتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پچھواڑے میں کافی کھلا احاطہ ہے اور وہاں کئی اقسام کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ برآمدے سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچے۔ اس کمرے کے دروازے پر بڑا سا زنگ آلود تالا لگا تھا۔ ابھی طفیل نے بتایا تھا کہ عطا محمد کے گھر میں چوری کوئی بھی نہیں ہے۔ پھر اس تالے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں دو لاٹھیاں کھڑے تھے۔ پانچ روز پہلے یہ دونوں میرے ہاتھوں پٹ چکے تھے اور اس پٹائی کے آثار جدیدہ ان کے چہروں پر پائے جاتے تھے۔ کارین نے انہی کے نام رحمت اور کیرے لیے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رحمت' کیرے اور کارین سمیت یہاں موجود پانچوں بن بلائے مہمان نشے میں ہیں۔ اس امر کی تصدیق جلد ہی ہو گئی۔ میں نے مقفل کمرے کے عین سامنے ایک کشادہ کمرے میں جھانکا تو وہاں اور ہی رنگ نظر آیا۔ ایک اجلی سی دری بچھی تھی۔ اس پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ قریب ہی شراب خانہ خراب کی بوتلیں اور گلاس رکھے تھے لیکن یہ بوتلیں ابھی کھولی نہیں گئی تھیں اور تاش کی بازی بھی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ ابھی تیاری کے مراحل میں تھا۔ کمرے کے مشرقی کونے میں لکڑی کی تپائی پر ٹیلی ویژن رکھا تھا اور اس پر ایک بوسیدہ سا وی سی آر پڑا ہوا تھا۔ وی سی آر کے پاس دو تین کیسٹ رکھی تھیں۔ کئی لمبے چوڑے انتظامات تھے رات گزارنے کے۔ کمرے میں جو سب سے چونکا دینے والی شے نظر آئی وہ ٹی وی کی اسکرین تھی۔ اس پر ایک نہایت بے ہودہ انگلش فلم چل رہی تھی۔ یوں لگا' اٹھارہ انچ کی اسکرین پر دنیا جہان کی شیطانیت سمیٹ دی گئی ہے۔ افراتفری میں رحمت اور کیرے کو ٹی وی آف کرنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اسکرین کو گھورتے دیکھا تو کیرے نے لپک کر سوئچ آف کر دیا۔

"بہت خوب۔ بہت خوب" میں نے جیکٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر تالی بجائی "شب بسری کا اچھا انتظام کر رکھا ہے تم نے۔"

اتنے میں کہیں نزدیک ہی کوئی دروازہ کھٹ کھٹ بجنے لگا۔ ساتھ ہی کوئی گھٹی گھٹی آواز میں پکار رہا تھا۔ یہ آوازیں سن کر کارین کے چہرے پر مزید پھٹکار برس گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے لگا کہ وہ پانچ روز پہلے کا سبق فراموش کر کے ایک دم مجھ پر چڑھائی کر دے گا۔ اپنی اکلوتی ٹانگ پر اچھلے گا اور بلائے ناگہانی کی طرح جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور بے بسی کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

میں نے کہا "استاد' لگتا ہے تمہارے میزبان تم سے کچھ زیادہ ہی خوش ہیں۔ آؤ ذرا ہم بھی ان کی خوشی میں شریک ہوں۔"

وہ مصالحانہ انداز میں بولا "باؤ یار! تم ہمیں شرمندہ کر رہے ہو۔ کوئی زیادتی نہیں کی ہے ہم نے یہاں۔ بس ذرا تفریح کرنے کے لیے آئے تھے۔ عطا محمد کے مکان میں بجلی ہے۔ میں نے کہا چلو ٹیلی ویژن چل جائے گا۔ دو تین فلمیں دیکھ کر ان گھنٹوں کا راتجگا راضی ہو جائے گا۔ میں تو مرغیوں کے پیسے بھی دے رہا تھا عطا محمد کو لیکن وہ خوامخواہ بھڑک گیا۔ کہنے لگا' میں یہاں یہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ مجبوراً اسے پچھلے کمرے میں بند کرنا پڑا۔"

"بالکل ٹھیک کیا ہے تم نے۔ ایسے بے لحاظ شخص کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ تم نے تھوڑی سی تفریح ہی کرنی تھی نا۔ شراب پینی تھی یا بلیو پرنٹ دیکھنا تھا۔ بہت ہوتا تو آپس میں مار کٹائی کر لیتا تھی یا دھوتیاں اتار کر بھنگڑا ڈال لیتا تھا۔ اس کی بھلا عطا محمد کو کیا تکلیف تھی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر پڑا رہتا آرام سے ایک کمرے میں۔ صبح سویرے تمہیں ملتوے پراٹھے کا ناشتا کراتا اور رخصت کر دیتا۔"

کارین نے بے بسی کی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کوئی شے اسے مجھ پر ٹوٹ پڑنے سے روکے ہوئے تھی۔ ممکن تھا کہ وہ مجھے تھانہ سمجھ رہا ہو۔ اس کے ذہن میں یہ بات اٹکی تھی کہ میرے ساتھی میرے اردگرد موجود ہیں۔ میری خود اعتمادی نے اسے بری طرح مرعوب کر دیا تھا۔ وہ یہ گھٹنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں اس روز کی طرح آج بھی یہ بازی پلٹ سکتا ہوں۔ میں نے کارین کو ساتھ لیا اور اس دروازے پر پہنچا جو اندر سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ یہ کوئی اسٹور قسم کا کمرا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی گرا دی۔ اندر چودہ' بارہ اور دس سال کی عمر کے تین لڑکے تھے۔ ان کا باپ ایک سفید ریش شخص تھا جس کی پگڑی گلے میں پڑی تھی اور گریبان پھٹا ہوا تھا۔ اس نے سب سے چھوٹے لڑکے کو پہلو سے لگا رکھا تھا اور پگڑی کا ایک پلو اس کی پیشانی پر دبا رکھا تھا۔ لڑکے کے رونے دھونے سے پتا چلتا تھا کہ اس کی پیشانی پر زخم آیا ہے۔

مجھے دیکھ کر بوڑھے نے برہمی سے کہا "تم یہ دروازہ کھول دو اور جو حرام کاری کرنی ہے اس کمرے میں کرتے رہو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

وہ غلطی سے مجھے بھی کارین کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر کہیں پاس سے ایک ادھیڑ عمر عورت بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ گیلے آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ باورچی خانے سے آئی ہے۔ وہ بھی دوپٹا منہ میں لے کر رو رہی تھی۔ عورت کو دیکھ کر زخمی لڑکا اور زور زور سے رونے لگا۔ عورت نے "میرا پتر" کہہ کر اسے گلے سے لگا لیا اور سر چومنے لگی۔ کارین اینڈ کمپنی دم بخود کھڑی تھی۔

میں نے بوڑھے عطا محمد سے کہا "میاں جی! آپ گھبرائیں مت۔ میں پولیس کا آدمی ہوں۔ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا آپ سے۔ آپ اس کمرے میں آرام سے بیٹھیں۔ بچے کی مرہم پٹی کریں۔ میں ذرا ان "ماں کے شیروں" سے دو باتیں کر لوں۔"

"پولیس" والی ہوائی میں نے یوں ہی چھوڑی تھی لیکن اس ہوائی کی روشنی نے اہل خانہ کے چہروں کو منور کر دیا۔ دوسری طرف کارین اینڈ کمپنی جن کے چہرے پہلے ہی تاریک تھے اور تاریک ہو گئے۔ میں کارین کو ساتھ لے کر پہلے والے کمرے میں آ گیا۔ اس کے ساتھیوں کو میں نے باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا۔ تنہائی پا کر کارین نے اپنی رہی سہی اکڑفوں کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ عاجزی سے بولا "باؤ یار! تو پولیس والا ہے یا نہیں لیکن میں تجھے عزت کی جگہ ہی سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تجھے یار کہا ہے اور کارین جسے ایک بار یار کہہ دیتا ہے اس کے یاروں کی جوتی ہو جاتا ہے۔"

"برے کی ماں کا سر یار ہو تم" میں نے بلا جھجک کہا "تم صرف ڈنڈے کو پوجنے والے بھین بدمعاش ہو۔ اپنی گندی زبان سے یار اور یاری جیسے لفظوں کو ناپاک نہ کرو۔ صرف یہ بتاؤ کہ یہاں کیا کرنے آئے تھے۔" میں اسے پوری طرح ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

وہ قہر کا گھونٹ بھر کر بولا "میں نے تمہیں حقیقت بتا دی ہے' اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے جو ہم چھینے آتے۔ یقین نہیں تو خود چل پھر کر دیکھ لو۔ صرف رات گزارنے آئے تھے۔ صبح ہوتے ہی چلے جانا تھا۔ اب تم ناراض ہوتے ہو تو ابھی دفعان ہو جاتے ہیں۔"

"وہ تمہارا حرامی یار' بلا کہاں ہے؟" میں نے رعب سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو لاہور گیا ہوا ہے۔ اپنے بڑے پیر صاحب کے پاس۔" کارمین اب میری گالیاں بھی آسانی سے ہضم کر رہا تھا۔

میں نے انگلی اٹھا کر کہا "دیکھو' اس بہن کے دیر کو سمجھا دو' اگر پھر اس نے شامت کے گھر کی طرف آنکھ بھی اٹھائی تو وہی چمٹا گرم کر کے۔۔۔ گھسا دوں گا سمجھ دے ہو نا میری بات؟"

کارمین کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔ غالباً سر کی اس حرکت پر اسے بعد میں کئی ہفتے شرمندگی رہی ہو گی۔ میں کارمین کو ذلیل تو کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ ڈر بھی رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ حد نہ گزر جائے جس کے گزرنے پر مرئل کتا بھی دانت چمکانے لگتا ہے۔

اتنے میں دروازے پر بوڑھے عطا محمد کی صورت نظر آئی۔ وہ مدہانسی آواز میں بولا "انسپکٹر صاحب! دو منٹ کے لیے میری بات بھی سن لیجیے۔" بغیر کسی لکھت پڑھت کے بوڑھے عطا محمد نے مجھے انسپکٹر مان لیا تھا۔

"جی فرماؤ میاں جی" میں نے دروازے میں آتے ہوئے کہا۔

عطا محمد مجھے اپنے پیچھے چلاتا پچھلے کمرے میں لے آیا۔ پھر یہاں بھی تسلی نہیں ہوئی تو وہ اس کمرے میں آگیا جسے کھانا پکانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں چولہے پر دیگچہ چڑھا ہوا تھا اور ایک بڑی پرات میں آٹا گوندھا رکھا تھا۔ دیگچے کے پاس ہی مرغی کا دُھلا ہوا گوشت رکھا تھا۔ یہ سارے شب بسری کے انتظامات تھے جو کارمین اینڈ کمپنی نے اہل خانہ سے زبردستی کروائے تھے اور اب جو میری وجہ سے درہم برہم ہو گئے تھے۔

عطا محمد نے کہا "انسپکٹر صاحب! آپ اکیلے تو نہیں ہیں نا۔۔۔ میرا مطلب ہے' یہ بڑا خطرناک بدمعاش ہے۔ دس پندرہ بندے آپ کے ساتھ ہوں تو پھر ہاتھ ڈالیں اس پر۔"

میں نے کہا "یہ میرا کام ہے عطا محمد' تم فکر مت کرو۔ باقی ان لوگوں نے تم سے کچھ چھینا تو نہیں ہے؟"

"نہیں جی' ہمارے پاس کیا ہے چھنوانے کو۔" عطا محمد نے سادگی سے کہا "لیکن۔۔۔ لیکن آپ اس معاملے کو معمولی نہ سمجھیں۔ یہ حرام زادے آج چلے بھی گئے تو پھر آجائیں گے۔ یہ نہ آئے تو کوئی اور آجائے گا' مجھے پکا یقین ہے کہ ایسا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

عطا محمد نے مجھ سے جوابی سوال کیا "اس بدیسا کھیلا والے نے کیا بتایا ہے آپ کو؟"

"کچھ نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ ہم یہاں رات گزارنے کے لیے آئے تھے۔ تم لوگوں نے بات نہیں مانی تو تمہیں کمرے میں بند کر دیا۔"

عطا محمد کے چہرے پر لکیروں کا جال تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تشویش اور سوچ کی گہری پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ بولا "چترجی' یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی بہت گہرا چکر ہے۔ دراصل۔۔۔ دراصل کچھ لوگ ہمیں اس مکان سے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ مکان بیچ کر چھوڑ کر چلے جائیں۔"

میں نے عطا محمد کے لہجے سے متاثر ہو کر پوچھا "کیا اس سے پہلے بھی کوئی ایسی بات ہوئی ہے؟"

"ہوئی ہے چترجی! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں اور ایک دو نہیں کئی دفعہ ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟ پہلے بھی یہ مسٹنڈے یہاں آتے رہے ہیں؟"

"نہیں جی' یہ اخیر تو انہوں نے پہلی دفعہ مچایا ہے۔ اس سے پہلے دھمکیاں دیتے رہے ہیں اور ڈرا بے شمار رہے ہیں۔ ادھر ملک رؤف ہے' مترانوالی گاؤں کا۔ اسی کی حویلی ہے یہ۔ آلے دوالے کی زمین بھی اسی کی ہے۔ ہم لوگ دامونکہ والا سے گھر بار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بس دشمنی چل گئی تھی شریکوں سے۔ بڑا لڑکا اسی دشمنی کی آگ میں مر گیا۔ جوان لڑکیاں تھیں گھر میں اور میں بوڑھی جان۔ نہ کوئی بازو نہ سہارا۔ میں نے سوچا کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو کیا کروں گا' کس کے ہاتھ پر اپنی عزت کا لہو تلاش کرتا پھروں گا۔ چپ چاپ زمین اور حویلی بیچی اور کان لپیٹ کر یہاں آگیا۔ کاشتکاری کے سوا کاشتکار اور کیا کر سکتا ہے۔ میں نے بھی یہی کچھ کرنا تھا۔ یہاں پانچ چھ کھیت ملک رؤف سے لے لیے اور کام شروع کر دیا۔ ایک پرانا سا ٹریکٹر بھی لے لیا تھا مگر تھوڑے دن پہلے بیٹیوں کی شادی پر بیچنا پڑا۔ یہ حویلی بھی زمین کے ساتھ ہی ملی تھی۔ ابھی کچھ روپیہ رہتا ہے اس اینٹ گارے کا۔ سوچتا ہوں' آڑے آڑے سے تین چار سال اور گزر جائیں۔ رزاآ پتر اپنے منہ سر ہو جائے تو میں گرتے مُردے میں بھی جان پڑ جائے لیکن یہ تو تب ہی ہے کہ سر چھپانے کو جگہ ملی رہے اور کسی طرح دال روٹی چلتی رہے۔"

میں نے کہا "کون نکالنا چاہتا ہے آپ کو اس مکان سے؟ کہیں یہ وہی پچھلی دشمنی تو نہیں؟"

عطا محمد بولا "پتا نہیں پتر جی۔ شاید قسمت میں ہی چکر ہے۔ لگتا ہے' کچھ لوگ ملک رؤف کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ جیسے بھی ہو وہ ہم سے یہ مکان خالی کرا دے۔ پہلے تو وہ منہ زبانی کہتا تھا۔ پھر دھمکیاں دینے لگا۔ میری بیٹیوں کی شادی تھی۔ گاؤں کے سیانوں نے کہا کہ وہ کم از کم شادی تک تو چین سے بیٹھے۔ شادی کے تیسرے چوتھے دن ہی کوئی شخص ہمارے گھر میں گھس آیا۔ ایک پالتو کتا تھا۔ یہ شیر جیسا' اللہ بخشے میرے وڈے پتر کی نشانی۔ پتا نہیں اس شخص نے اسے کیا کھلا دیا یا کیا کر دیا۔ صبح اس کی لاش دیکھی تو میرے بچے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ پھر ایک دن پچھلے احاطے سے کوئی ساری سبزی توڑ کر لے گیا۔ اس سے اگلے دن دو رستہ گیروں نے گھر میں گھسنے کی کوشش کی۔ شکر ہے میری نظر پڑ گئی میں نے دو ہوائی فیر نکالے تو وہ بھاگ گئے۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ یہ لوگ تمہیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

"بالکل جناب' مجھے پکا یقین ہے یہ بندے بھی ملک رؤف نے بھیجے ہوں گے۔ وہ ہر صورت اس حویلی کو خالی کرانا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ ملک رؤف کو کوئی دوسرا مجبور کر رہا ہے۔"

"یہی مطلب ہے میرا جی۔ ملک کو حویلی کی ضرورت ہوتی تو وہ چھ مہینے پہلے بیچتا ہی کیوں۔ اب بھی مجھے یہی نظر آرہا ہے کہ اسے حویلی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا چنگا بھلا گھر بار ہے' کھر ہے' اسے اس کباڑ خانے کی کیا ضرورت ہو گی۔ کوئی اور ہے جو اس سے یہ حویلی خالی کروانا چاہتا ہے اور حیرانی کی بات ہے کہ ہمیشہ کے لیے بھی نہیں صرف تین چار مہینے کے لیے۔ پچھلے جمعے ملک رؤف مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں حویلی چھوڑنا نہیں چاہتا تو تین چار مہینے کے لیے خالی کر دوں۔ وہ انتظام لکھ کر دے سکتا ہے کہ وہ حویلی میں بطور کرایہ دار رہتا ہے اور مقررہ وقت پر حویلی خالی کر دے گا۔ میں نے جواب میں کہا' ملک صاحب اس کا مطلب ہے یہاں ضرور کوئی غیر قانونی کام ہو گا۔ اب یہ حویلی میرا گھر ہے میں اس گھر میں حرام کاری نہیں ہونے دوں گا۔ ملک رؤف منہ سے تو کچھ نہیں بولا لیکن لگتا تھا اندر سے ہانڈی کی طرح اُبل رہا ہے۔"

میں نے عطا محمد سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے' ملک رؤف کیا کرنا چاہتا ہے یہاں؟"

بوڑھے کے چہرے پر ایک بار پھر سنسنی کے آثار نظر آئے۔ اس کی آنکھوں میں تشویش اور الجھن اس طرح یکجا ہو گئی تھی کہ ایک کو دوسری سے جدا کرنا مشکل تھا۔ اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ استاد کارمین اور اس کے مرگے کمرا خالی کر رہے تھے۔ عطا محمد کا بڑا لڑکا ان کے سرہانے کھڑا نگرانی کر رہا تھا۔ عطا محمد نے کہا "آپ کس تھانے میں ہیں جی؟"

یہ غیر متوقع سوال تھا۔ میں سٹپٹایا لیکن فوراً سنبھل گیا "میں شاہ پور سے آیا ہوں۔ ایس ایچ او ہوں وہاں کا۔"

"ایس ایچ او تو وڈا تھانیدار ہوتا ہے نا؟"

"وڈی تو اللہ کی ذات ہے بابے' بس آپ مجھے تھانیدار کہہ سکتے ہیں۔"

عطا محمد نے اپنی دبی ہوئی آواز کچھ اور دبا لی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں خود بخود ایک لرزش سی آگئی۔ کہنے لگا "مجھے لگتا ہے یہاں کوئی بہت وڈا چکر چلنے والا ہے۔ بہت ہی وڈا اور خطرناک۔ اندر ہی اندر کوئی ڈراؤنی سازش ہو رہی ہے یہاں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "کوئی تین مہینے پہلے کی بات ہے' ایک روز ملک رؤف دو نوجوان بندوں کے ساتھ میرے گھر آیا۔ یہ دونوں شہری بابو تھے۔ کافی اونچے لمبے اور صحت مند۔ ان میں سے ایک نے گلے میں کیمرا ڈال رکھا تھا۔ ملک رؤف نے کہا کہ یہ اس کے دوست ہیں' شہر سے آئے ہیں' انہیں گاؤں کے پرانے ڈیروں اور حویلیوں کی تصویریں اتارنے کا شوق ہے۔ یہ حویلی کی تصویریں وغیرہ لینا چاہتے ہیں۔ اس وقت مجھے ملک رؤف نے حویلی خالی کرنے کے لیے دھمکیاں وغیرہ دینا شروع نہیں کی تھیں۔ میں نے ان تینوں کو "جی آیاں نوں" کہا اور حویلی میں لے آیا۔ وہ سامنے والے بڑے کمرے میں بٹھایا۔ ملک رؤف نے کہا کہ مہمان مکئی کی روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ابھی پکوا لاتا ہوں۔ میں نے گھر والی کو آٹا گوندھنے کا کہا۔ مجھے شک تھا کہ ملک رؤف مجھ سے حویلی اس لیے خالی کرا رہا ہے کہ ان لوگوں کو بیچنا چاہتا ہے۔ چھپ کر کسی کی بات سننا گناہ ہے لیکن میں شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر بڑے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دروازے سے کان لگا کر میں نے سنا' کیمرے والا بابو جس کا نام ناصر تھا' ملک رؤف سے کہہ رہا تھا کہ گاڑی میں کوئی نئے رہ گئی ہے' وہ لے آئے۔ پتا نہیں کوئی سیل وغیرہ تھے جو انہوں نے کیمرے میں ڈالنے تھے۔ ملک رؤف "اچھا صاحب" کہہ کر نکل گیا تو وہ دونوں بندے ایک

دم چوکس ہو گئے۔ سب سے پہلے وہ اس دروازے کی طرف آئے جس کے پیچھے میں کھڑا تھا۔ انہوں نے بغیر آواز پیدا کیے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر وہ بڑی تیزی سے کمرے کی دیواریں دیکھنے لگے۔ میں ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ لگتا تھا' وہ اس کمرے میں پہلے بھی آئے ہیں اور یہاں کوئی خاص نشانی ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دیواروں پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ پھر چھت کو گھورنے لگے۔ تب وہ دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

ناصر نے کہا "یہی ہے؟"

دوسرے نے کہا "ہاں یہی ہے' بالکل یہی ہے۔"

ناصر کے چہرے پر خوف سا نظر آنے لگا' بولا "یار! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

دوسرا ہنس کر بولا "ڈریں وہ جو مریں گے' جن کی لاشیں سڑکوں پر تڑپیں گی اور مُردہ خانوں میں اکڑیں گی۔ ہمیں تمہیں کیا ڈرنا۔"

ناصر نے کہا "یار! آہستہ بولو' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "گاؤں میں نہیں ہوتے۔ بڑے بادشاہ لوگ ہوتے ہیں سب۔ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔ وہ لطیفہ سنا ہے تم نے....."

اتنے میں برآمدے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ ملک رؤف واپس آ رہا تھا۔ دونوں ٹھٹک کر چپ ہو گئے۔ ناصر نے جلدی سے اندرونی دروازے کی چٹخنی اتار دی اور اپنی جگہ یوں بیٹھ گیا جیسے یہاں سے ہلا ہی نہیں تھا۔ میں باورچی خانے میں واپس آ گیا۔ میری بیٹیوں نے میرا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر پوچھا "کیا ہوا ہے ابا؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں نے کیا دیکھا' کیا سنا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے "ڈریں وہ جن کی لاشیں سڑکوں پر تڑپیں گی اور مُردہ خانوں میں اکڑیں گی۔" وہ دونوں شہری بابو تھوڑی دیر رکے اور تصویریں وغیرہ اتار کر واپس چلے گئے لیکن مجھے سوچوں کے زور کے سمندر میں پھینک گئے۔ پتا نہیں وہ کیا بات کر گئے تھے۔ چار پانچ روز غور کر کے میں نے سب کچھ رب توکلی چھوڑ دیا۔ بس اتنا کیا کہ اس کمرے کو تالا لگا دیا جس میں وہ دونوں بابو کچھ ڈھونڈتے رہے تھے۔ آپ نے برآمدے کے پاس وہ تالے والا کمرا دیکھا ہی ہوگا۔ اس دن سے آج تک وہ اسی طرح بند ہے۔ میں تو اللہ کی ذات پر بھروسا رکھنے والا بندہ ہوں جی۔ جب تک وہ سوہنا رب نہ چاہے کوئی چور ڈاکو یا جن آسیب بندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جینوں اللہ رکھے اونوں کون چکھے۔ پچھلے دنوں ایک اللہ والے سے دو تعویذ کرا کے میں نے دروازے سے باندھ دیے تھے۔ جہاں اللہ کا نام ہو وہاں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔"

بوڑھے عطا محمد کی باتیں مجھے اپنے ساتھ بہا کر کہیں سے کہیں لے جا رہی تھیں۔ اگر اس کی بات درست تھی اور ملک رؤف اسے حویلی سے نکالنے کے لیے کوششیں کر رہا تھا تو یہ چکر واقعی گہرا ہو جاتا تھا۔ میرا دھیان کاربین اور کار... کے بارے کی طرف جا رہا تھا۔ بارا آغا قادر زماں کا مخبر جانا جاتا تھا اور یہ علاقہ آغا قادر زماں کی جاگیر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس معاملے کا تعلق براہِ راست آغا قادر زماں سے ہو۔ آغا قادر زماں برائی کا درخت تھا جس سے جرائم کی بے شمار شاخیں پھوٹتی تھیں۔ یہ درخت اتنا گھنا تھا کہ اس کے نیچے کوئی اور پودا پروان چڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ اس خستہ حال دیہاتی مکان میں کوئی گڑبڑ ہے یا ہونے والی ہے تو اس کا تعلق آغا قادر زماں سے ہوگا۔ ابھی استاد کاربین اپنے گماشتوں کے ساتھ یہاں سے رفو چکر نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا تو اسے روک کر اس مسئلے پر پوچھ گچھ کر سکتا تھا۔ کچھ اندازہ ہوتا۔ کم از کم یہی پتا چلتا کہ وہ یہاں صرف رات گزارنے کے لیے ٹھہرے تھے یا کسی سازش کو پروان چڑھانے کے لیے..... لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ کاربین وغیرہ مجھے کچھ بھی سمجھ رہے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں یہاں اکیلا تھا۔ اگر کاربین کے ساتھی اپنی ہچکچاہٹ کو خیرباد کہہ کر میرے مقابل آ جاتے تو لینے کے دینے پڑ سکتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ اس وقت ان پر اور رعب نہ گانٹھا جائے اور وہ جو مجھ سے کھسک رہے ہیں تو انہیں کھسکنے دیا جائے۔ اس معاملے کی ٹوہ بعد میں بھی لگائی جا سکتی تھی۔ اس وقت میرے سامنے اصل ٹارگٹ احمد رجال ساہی تھا۔ مجھے نتھیا گلی پہنچنا تھا اور جلد سے جلد الفردوس میں اپنا کمرا آباد کرنا تھا۔

○☆○

استاد کاربین اور اس کے ساتھی اپنے ... سفید گھوڑی پر بیٹھ کر نکل گئے تو میں نے عطا محمد کو تسلی دی اور خود بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ بطور پولیس انسپکٹر میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس معاملے کی چھان بین کروں گا اور اگر واقعی کوئی سازش پروان چڑھ رہی ہے تو اسے بے نقاب کیا جائے گا۔ عطا محمد' شکیل اور ...والا سب کے سب میرے بے حد احسان مند نظر آئے۔

بابا عطا محمد نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا "تھانیدار پتر! رب تجھے اور تیری تھانیداری کو سلامت رکھے۔" تھانیداری سے اس کی مراد انجم تھی۔ انجم کو یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ میں جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا کیونکہ اپنی "تھانیداری" سلامت رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ اگر قریبی گاؤں کا کوئی معزز پولیس والا یہاں پہنچ جاتا تو مجھے اپنا بھرم قائم رکھنا مشکل ہو جاتا۔

پکی سڑک پر پہنچتے ہی میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ شب رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق میں چاہتا تھا کہ ہم ناشتا جہلم میں کریں۔ جی ٹی روڈ کے کنارے واقع ایک ہوٹل اس "کام" کے لیے نہایت مناسب تھا۔ عطا محمد والے چکر میں ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لیٹ ہوئے تھے۔ یعنی وہاں سے رخصت ہوتے ہوتے ہمیں ڈیڑھ بج گیا تھا۔ ہم میں نے یہ لیٹ نکال لی اور صبح ساڑھے سات بجے ہم جہلم پہنچ گئے۔ راستے بھر انجم کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اب مجھ سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ ظاہر ہے' وجہ استاد کاربین وغیرہ ہی تھے۔ ان نامی گرامی غنڈوں نے جس طرح میرے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا وہ یقیناً انجم کے لیے حیران کن تھا۔ کاربین کے چاقو بردار بھتیجے سے میری جھڑپ بھی انجم کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سر سے اونچا کر کے پگڈنڈی پر دے مارا تھا۔ انجم کے لیے طاقت اور پھرتی کا یہ مظاہرہ مرعوب کن تھا اور وہ اپنی مرعوبیت کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انجم کے رویے میں وہ بے اعتمادی جو آغاز میں نظر آ رہی تھی' خاصی حد تک کم ہو گئی ہے۔ وہ میری باتوں پر بھروسا کرنے لگی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں امید کی ایک ننھی سی کرن بھی روشن ہو رہی ہے۔ وہ میری کہی ہوئی باتوں کی بازگشت سن رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ کیا واقعی وہ قادر زماں کے آہنی جال سے نکل گئی ہے۔ راستے میں اس نے میرے بارے میں کئی سوالات کیے تھے۔ میں نے محتاط انداز میں ان سوالوں کے جواب دیے اور اسے یقین دلا دیا کہ میں صفدر کا ایک دیرینہ دوست ہوں' حال ہی میں کویت سے آیا ہوں اور بہت جلد اسے صفدر سے ملانے والا ہوں۔

جہلم کے اس ہوٹل کا پرسکون ماحول انجم کو بھی پسند آیا۔ نیم گرم پانی سے منہ دھو کر وہ خاصی فریش نظر آ رہی تھی۔ اودا ریشمی دوپٹا اور دوری گلے کا ہم رنگ سویٹر اس کی سانولی رنگت پر خوب جچ رہا تھا۔ بوائے کٹ بال کم لڑکیوں کے چہرے پر اتنے اچھے نظر آتے ہیں۔ وہ اونچی ایڑھی کی جوتی پر نزاکت سے چلتی میری طرف آئی تو میں صفدر کے انتخاب کا معترف ہو گیا.... میں نے محسوس کیا کہ پنڈلی کے زخم کی وجہ سے انجم کی چال میں ابھی تک ہلکی سی لنگڑاہٹ ہے لیکن یہ لنگڑاہٹ ایسی نہیں تھی کہ عام شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک پاؤں کی جوتی تھوڑا سا کاٹ رہی ہے۔

ناشتے کے دوران اور بعد میں ہمارے درمیان مسلسل ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ اس گفتگو نے انجم کو میری ذات پر مزید اعتماد بخشا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا تو ماحول اس امر کے لیے سازگار تھا کہ میں انجم سے وہ حالات پوچھوں جن سے وہ اغوا ہونے کے بعد دوچار رہی ہے۔ میرے اس سوال کا جواب انجم کے لیے بہت کٹھن تھا لیکن وہ اس کٹھنائی پر قابو پانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ بہت آہستہ روی سے سہی لیکن آغا قادر زماں کا سحر اس پر سے ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے جھکی جھکی نظروں سے جو کچھ بتایا اور اس کی باتوں سے میں نے جو نتائج اخذ کیے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

تقریباً چار ماہ پہلے انجم کو گجرات سے دو بدقماش افراد نے اغوا کیا تھا۔ یہ اس لڑکی کے بھائی تھے جسے انجم خرابیِ تقدیر کے باعث بری کبوتری کہہ بیٹھی تھی۔ انجم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس بات کا پتنگڑ بن جائے گا اور پتنگڑ بھی ایسا کہ نتیجے میں وہ ایک دن اغوا ہو کر بے ضمیر لوگوں کے رحم و کرم پر ہو گی۔ انجم کو اغوا کرنے والے دونوں افراد کے نام علاؤالدین اور شبیر احمد تھے۔ ان کا ایک دوست بھی تھا لیکن انجم اس کے نام سے بے خبر تھی' انہوں نے انجم کو سہ پہر کے وقت اغوا کیا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں بذریعہ ٹیکسی کار وہ اسے لاہور لے گئے۔ ایک فلیٹ میں لے جا کر وہ اس کی عزت برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اس فلیٹ پر پولیس کا چھاپا پڑ گیا۔ علاؤالدین اور شبیر نے بڑی افراتفری میں انجم کو پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اتارا اور ایک کار میں ڈال کر دو گھنٹے تک یونہی شہر میں گھماتے رہے۔ اس وقت انجم کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ برقعے میں لپٹی بے چارگی کے عالم میں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پڑی تھی۔ دو گھنٹے کی اس شہر گردی میں علاؤالدین اور شبیر نے دو تین افراد سے ملاقات بھی کی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جلد از جلد انجم سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ رات کوئی تین بجے وہ اسے لے

گر لاہور کے بازارِ حسن پہنچ گئے۔ انجم اس وقت تک پوری طرح ہوش میں آچکی تھی لیکن بے بس تھی۔ ایک نیم تاریک گلی سے ایک پہلوان نما شخص نے اسے گود میں اٹھا کر زینے طے کیے اور ایک جھلمل کرتے خوب صورت کمرے میں لے آیا۔ یہاں بہت گوری چٹی' بادامی آنکھوں والی ایک ادھیڑ عمر عورت موجود تھی۔ اس کا نام زہرو جان تھا۔ وہ مسلسل پان چبا رہی تھی اور تولنے والی نظروں سے انجم کو دیکھ رہی تھی۔ علاؤالدین اور شبیر احمد اس عورت کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران انجم یخ بستہ فرش پر بے بسی کے عالم میں پڑی رہی۔ کوئی دو گھنٹے بعد بادامی آنکھوں والی نائیکہ واپس انجم کے پاس آئی۔ وہ بڑے افسوس سے انجم کے کٹے ہوئے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ (یہ بال علاؤالدین اور شبیر نے فلیٹ میں زبردستی کاٹ دیے تھے) نائیکہ کے ساتھ چوڑے جبڑوں اور بجھے بالوں والا پہلوان نما شخص بھی تھا۔ نائیکہ زہرو جان نے انجم کا منہ، سر چوما اور پہلوان سے اس کی رسیاں کھلوائیں۔ وہ علاؤالدین اور شبیر کو غائبانہ صلواتیں سنا رہی تھی کہ انہوں نے پھول سی لڑکی کو کتنی بے دردی سے جکڑ رکھا ہے۔

اس دن کے بعد وہی چوبارہ انجم کا مسکن ٹھہرا۔ پہلے چند روز وہ کچھ تڑپی مچلی' پھڑپھڑائی لیکن زہرو جان نے کبھی محبت سے' کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے اسے رام کرلیا۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے انجم کے دل میں یہ بات سمو دی کہ جہاں وہ آچکی ہے وہاں سے واپس جانا ناممکن ہے۔ گو یہ جگہ بھرے پرے لاہور میں ہے لیکن لاہور جیسی ہر بستی سے بہت دور ہے۔ ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر ہے اور انجم کا ماضی بھی اتنے ہی فاصلے پر رہ گیا ہے۔ اس کے ماں باپ' بہن بھائی' عزیز و اقارب سب لامتناہی دوریوں پر چلے گئے ہیں۔ اب ان کی بہتری اور انجم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ کبھی انہیں نظر نہ آئے۔ انجم نے اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچا لیکن حوصلہ نہ کرسکی پھر اس بے حوصلگی کی سزا میں اسے طبلے کی دھنا دھن پر ناچنا پڑا۔ اپنے کومل جسم کو ریزہ کی طرح توڑنا موڑنا پڑا اور آنکھوں کے سارے کے سارے خواب نوچ کر نائیکہ کے اگالدان میں پھینکنا پڑے لیکن کچھ بھی تھا' ابھی وہ زخمی شمشیرِ ستم تڑپنے سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔ قفس پنچھی کو راس آتے آتے ہی آتا ہے۔

ایک روز نائیکہ کی ہزار نصیحتوں کے باوجود اس نے چوبارے سے فرار ہونے کی کوشش کی' نتیجہ میں پکڑی گئی۔ [illegible]

پھینک دیا گیا۔ رات کسی وقت نیم بے ہوشی کے عالم میں انجم نے دیکھا کہ نائیکہ زہرو جان کیمرے سے اس کی تصویریں لے رہی ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے جسم کی طرف دیکھا۔ کپڑوں کے نام پر ایک دھجی بھی نہیں تھی۔۔۔ اگلے روز تصویریں انجم کو دکھائی گئیں۔ ان تصویروں نے ایک دھار دار قینچی کی طرح پل بھر میں انجم کے پر کاٹ دیے۔ وہ سمجھ گئی کہ جب تک زندہ ہے' اس بندی خانے سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ نائیکہ زہرو نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کا شکر کرو کہ ان تصویروں میں تم 'تنہا' ہو۔ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ میں تمہاری بہتری چاہتی ہوں۔ میں تمہیں اگالدان نہیں بنانا چاہتی جو ہر کسی کی ٹھوکروں میں رہتا ہے۔ میں تمہیں خوشبو دار گلدستے کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہوں جسے نرمی سے چھوا جاتا ہے اور جھکا کر سونگھا جاتا ہے۔"

اس چوبارے میں انجم نے تین ماہ تک رقص کی تربیت حاصل کی۔ نائیکہ زہرو جان اسے کم از کم ایک برس تک ہر خوشہ چین کی نگاہ سے دور رکھنا چاہتی تھی لیکن حسن کو جتنا چھپایا جائے وہ اتنی ہی نمایاں ہوتی ہے۔ جھنگ کا ایک پٹواری ہاتھ دھو کر انجم کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ اسے اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ آغا قادر زماں تھا۔ پٹواری نے نوٹوں کا ڈھیر نائیکہ کے سامنے رکھ دیا۔ زبان میں یہ انجم کی نتھ اترائی کا معاوضہ تھا۔ ان کی چمک اتنی زیادہ تھی کہ نائیکہ زہرو جان اپنے اقرار پر قائم نہ رہ سکی۔ اسے انجم سے کیا ہوا یہ وعدہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک برس تک کسی مرد کو اس کے قریب نہیں آنے دے گی۔ سب کچھ طے ہوگیا لیکن انجم کو نہیں بتایا گیا کہ اس کی شہ رگ پر چھری چلائے جانے کا وقت آگیا ہے۔ جاگیردار آغا قادر زماں کے بستر ہوس کی زینت بننا ہے۔ اسے صرف اتنا بتایا گیا کہ وہ جھنگ جا رہی ہے جہاں دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر ایک ودائی تقریب میں رقص کرے گی۔ اس سے پہلے انجم کسی تماشائی کے سامنے نہیں ناچی تھی۔ اسے یہ مرحلہ بہت کٹھن محسوس ہوا تو اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ سازوں کی لے پر خریداروں کے اشاروں پر ناچنے جارہی ہے۔ اور کیا ہوتا ہے' یہ بھی اسے معلوم نہیں تھا۔ شراب، بند کمرا اور بپھرا ہوا مرد' اسے کسی کے بارے میں علم نہ تھا۔

انجم کو قادر زماں کی حویلی میں لایا گیا۔ یہاں

معلوم ہوا کہ اس پر کیا بیتنے والی ہے لیکن اب فرار کے راستے مسدود تھے۔ چاروں طرف بلند دیواریں تھیں اور مونچھوں والے تلنگے پہرے دار تھے۔ یہ جاگیرداری کی سلطنت تھی اور اس مملکت میں پرندہ بھی اس کی منشا کے بغیر پر نہیں مار سکتا تھا۔ انجم ایک شریف لڑکی تھی۔ عزت سے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اس میں وہ تمام اوصاف تھے جو شریف خون کا سرمایہ ہوتے ہیں لیکن یہ بھی اٹل حقیقت تھی کہ وہ اپنی جان سے گزرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک اسے یقین نہ ہوجاتا کہ اب بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ پھر وہ شب آئی جب پاؤں میں گھنگرو پہن کر اسے آغا قادر زماں اور اس کے معزز مہمانوں کے سامنے ناچنا پڑا۔ ان گنت نگاہوں کے تیر اس کے جسم کے پار ہوگئے اور وہ ناچتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ رات اس پر بہت بھاری ہے' یہ محفل آرائی' یہ دورِ پیمانہ' یہ انتظام و اہتمام یونہی نہیں تھا۔ آج آغا قادر زماں ان نوٹوں کی قیمت وصول کرنے والا تھا جو چند روز پہلے بازارِ حسن میں زہرو جان کے سامنے ڈھیر کردیے گئے تھے۔ آج قادر زماں کو اپنا مال کھرا کرنا تھا' اپنے ٹکے پورے کرنے تھے۔۔۔ وہ ناچ رہی تھی اور اس کی ساتھی مغنیہ گا رہی تھی "رنگ بدلتی رات بڑی رنگین ہے" اور پھر وہ واقعہ ہوا جس کی انجم کو ہرگز توقع نہیں تھی' کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔ عشرت کدے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو اشخاص لڑھکتے ہوئے اندر آگئے۔ ایک شخص سیدھا آغا قادر زماں کی طرف بڑھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا' ایک تگڑے باڈی گارڈ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اچانک ہی کمرے میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ پھر دھماکا ہوا۔ نووارد شخص کے ہاتھوں ایک گولی انجم کی پنڈلی میں لگی اور وہ چیخ کر اپنی نائیکہ کے سامنے قالین پر گری۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بے ہوش ہوگئی۔۔۔ وہ دوبارہ اپنے حواس میں آئی تو ایک آرام دہ کمرے میں لیٹی تھی۔ نائیکہ کی جگہ اس کی نگہبان ایک نرس تھی اور اس کی بائیں پنڈلی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ زخمی ہوجانے کے سبب انجم پر سے اس رات آنے والی بلا ٹل گئی۔ حویلی کا ڈاکٹر عبدالرحمٰن انجم کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے گولی نکال دی گئی تھی لیکن زخم بھرنے میں ابھی خاصا وقت لگنا تھا۔ انجم غائبانہ طور پر اس شخص کی شکر گزار تھی جس نے اس رات اس کے جسم پر گولی ماری اور اس زہر سے اسے بچالیا جو ذلت بن کر اس کے رگ و پے میں دوڑنے والا تھا۔

اب ایک ہفتے سے انجم مکمل طور پر صحت مند تھی۔ بس معمولی سی لنگڑاہٹ باقی رہ گئی تھی۔ اپنی حالت کی بہتری کا احساس انجم کے لیے سوہانِ روح تھا۔ وہ جانتی تھی' اس کی مثال قربانی کے اس جانور سی ہے جس کی بیماری ہی اس کی زندگی کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ خوف کے اتھاہ سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ ایک بار پھر حالات نے پلٹا کھایا اور میں نے اسے اس اہم مہم کے لیے منتخب کرکے حویلی سے نکال لیا۔ اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کل رات جب میں نے قادر زماں سے انجم کو مانگا تھا تو اس کا چہرہ کیوں اتر گیا تھا۔ اس کی حالت اس شخص جیسی ہوگئی تھی جس کے منہ سے نوالہ چھین لیا گیا ہو۔ تاہم ایک "بڑے مقصد" کی خاطر اس نے ایک چھوٹی سی عیاشی کو تیاگ دیا تھا اور انجم کو میرے ساتھ روانہ کردیا تھا۔

یہ جان کر مجھے بے نام مسرت کا احساس ہوا کہ انجانے میں سہی لیکن میں نے دو بار انجم کی عزت کو رائگاں ہونے سے بچایا ہے۔ پہلی بار وہ میری گولی سے زخمی ہوئی اور دوسری بار جب پھر اس پر ہوس کار رال ٹپکا رہے تھے' میں اسے قفس سے اڑا کر کھلی فضاؤں میں لے آیا تھا۔ انجم کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ حویلی کے مہمان خانے میں اسے میرے ہی ہاتھوں گولی لگی تھی۔ میں نے فی الحال اسے یہ بتانا مناسب بھی نہیں سمجھا۔

باتوں کے دوران ہمارا سفر طے ہو رہا تھا جیسے شب و روز کے جھمیلوں میں زندگی چپکے چپکے طے ہوتی جاتی ہے۔ جس وقت ہم مری [illegible] سے گزرنے کے بعد نتھیا گلی میں داخل ہوئے' ہم دونوں کے درمیان اجنبیت اور تکلف کے بہت سے پردے ایک ایک کرکے اٹھ چکے تھے۔ وہ مجھے اپنا مخلص ساتھی اور غم گسار سمجھ رہی تھی اور یہ توقع بھی کر رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ میں اسے اس دلدل سے نکالنے میں کامیاب ہوجاؤں اور یہ کوئی ایسی "نہ پوری ہونے والی" آس بھی نہیں تھی۔ دیکھا جاتا تو انجم اس دلدل سے نکل چکی تھی۔ میں اسے حویلی سے نکالنے میں کامیاب رہا تھا اور میں نے قادر زماں کو ایسی کوئی ضمانت بھی نہیں دی تھی کہ انجم کو دوبارہ حویلی لاؤں گا۔ میں ایک پُرخطر مشن پر تھا۔ مجھے ایک نیم سرکاری عہدیدار کو قتل کرنا تھا۔ اس کوشش میں مجھے یا انجم کو کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا تھا۔ ہم پکڑے جاسکتے تھے' اغوا ہوسکتے تھے' کسی گولی یا تیز دھار آلے کا شکار ہوکر کسی ندی نالے میں بہہ سکتے تھے۔۔۔ یعنی میں انجم کو حویلی واپس لے کر نہ جاتا تو اس کا جواز فراہم کرنے کے لیے میرے پاس سو دلیلیں تھیں۔ اب آجا کے تصویروں والا قضیہ رہ جاتا تھا جو

انجم کے بقول لاہور کے بازارِ حسن میں اُتاری گئی تھیں اور وہ نائیکہ زہرہ بان کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ تصویریں انجم کے لیے مصیبت کا باعث بن سکتی تھیں لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا جب انجم، زہرہ جان یا قادر زماں سے بغاوت کرتی یا انہیں دغا دیتی۔ میں نے انجم کو اس طرح اس چکر سے نکالنا تھا جیسے مکھن سے بال۔ میرے لیے کوئی ایسی صورتِ حال پیدا کرنا مشکل نہیں تھا کہ نائیکہ زہرہ جان، انجم کو مُردہ تصور کر لیتی یا اس کی گمشدگی کو حادثہ جان کر ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیتی۔

میں خیالوں کے تانے بانے میں اُلجھا رہا اور ہماری منزل نزدیک آگئی۔ میں نے انجم کو ایک بار پھر اہم ہدایات ذہن نشین کرائیں اور اسے پیش آمدہ حالات کے لیے پوری طرح تیار کر دیا۔

اس مرتبہ مجھے الفردوس میں بہ آسانی داخلہ مل گیا۔ میرا کمرا پہلے سے بُک تھا۔ بڑی طرح دار جگہ تھی۔ یہ دوسری منزل کا ایک سجا سجایا سوئٹ تھا۔ ایک بیڈ، ایک سٹنگ روم، اٹیچڈ باتھ اور شاندار بالکونی جہاں سنگِ مرمر کے گملے دھرے تھے اور ان میں مولسری اور گلاب کے پھول مہک رہے تھے۔ عقب سے ایک دُھلی دھلائی شفاف سڑک گزرتی تھی جس کے دونوں کناروں پر چیڑ اور اخروٹ کے درخت پہرے داروں کے مانند کھڑے تھے۔ یہ الفردوس کی ہی سڑک تھی اور ایک نیم دائرے کی شکل میں پوری تفریح گاہ کا احاطہ کرتی تھی۔ اس سڑک کے پار پھل دار درختوں کی قطاریں تھیں۔ چیری، خوبانی وغیرہ کے پیڑ صاف نظر آ رہے تھے۔ اس سے آگے پہاڑوں اور وادیوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں "میرا جانی" کی چوٹی تھی۔ کسی نوخیز سرکش حسینہ کی طرح وہ اپنے بلند و پست نمایاں کیے کھڑی تھی اور ہر آنکھ کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ ہمیں یہ سارے مناظر اس پانچ ضرب آٹھ فٹ کی کھڑکی سے نظر آ رہے تھے جو کمرے کے مشرقی رُخ پر کھلتی تھی۔

انجم نے کمرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اچھا کمرا ہے۔"

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "اگر باہر دیکھو تو کمرا اور بھی اچھا ہے۔"

وہ میری بات پر مسکرانے لگی اور کھڑکی میں آ کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ پہاڑوں کی شام تیزی سے اپنے سائے پھیلا رہی تھی۔ سبزے سے بھری ہوئی جگمگاتی سڑک پر الفردوس کے خوب صورت اور خوش لباس رہائشی چہل قدمی میں مصروف تھے۔ کوئی جوگنگ کر رہا تھا، کوئی بچہ گاڑی دھکیل رہا تھا۔ کوئی یونہی اکیلا مستی میں مگن رواں چلا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا، شاید اسی سڑک پر رجال ساہی صاحب کی بھی دید ہو جائے۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز مجھے بائیں جانب کوئی پانچ میٹر کی دوری سے سنائی دی تھی۔ ایک بھاری بھرکم بارعب مردانہ آواز۔ میں بے ساختہ کھڑکی سے سر نکالنے پر مجبور ہو گیا۔ ذرا آگے جھک کر بائیں طرف دیکھا تو دیدے پھٹے رہ گئے۔ جس شخص کو میں سامنے سڑک پر ڈھونڈ رہا تھا وہ میرے بالکل قریب موجود تھا۔ بائیں جانب ایک کمرے چھوڑ کر وہ ایک کھڑکی میں کھڑا تھا اور کسی سے بات کر رہا تھا۔ میری مراد احمد رجال ساہی سے ہے۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں، لاہور جیل میں ایک برس تک ساہی صاحب سے واسطہ رہا تھا۔ میں انہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی وہ ان شخصیات میں سے تھے جن سے ایک بار مل لیا جائے تو حافظے پر اَن مٹ نقوش بن جاتے ہیں۔ کھڑکی میں مجھے ساہی صاحب کی جو جھلک دکھائی دی تھی اس میں وہ پہلے سے کچھ فربہ اور عمر رسیدہ نظر آ رہے تھے لیکن تھے تو ساہی صاحب ہی۔ پاکستانی فلم اسٹار سنتوش کمار کی طرح نازک چہرے اور امیرانہ خدوخال والے ساہی صاحب کی آنکھیں ہر وقت گہرے تفکر میں ڈوبی رہتی تھیں۔ عام زندگی میں بھی وہ جیل سپرنٹنڈنٹ سے زیادہ ایک فلسفی قسم کی شخصیت نظر آتے تھے۔ تاہم انہیں قریب سے جاننے والے اچھی طرح سمجھتے تھے کہ نرم ملائم لہجے میں بولنے والے اس شخص کے اندر ایک آہنی انسان چھپا ہوا ہے جو جاں نثار محافظ ہے اور باطل کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

ساہی صاحب نے مجھے نہیں دیکھا تھا کیونکہ جس وقت میری نگاہ اُن پر پڑی تو وہ دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھ بھی لیتے تو شاید اس لمحے میں مجھے فوراً نہ پہچان پاتے۔ وہ کسی خاتون سے باتیں کر رہے تھے۔ گاہے گاہے اُبھرنے والی مترنم ہنسی اور انتہائی رسیلی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ خاتون کوئی نوجوان لڑکی ہے۔ میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ساہی صاحب کے اہلِ خانہ میں سے ہوگی۔

انجم بغور میرے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ پوچھنے لگی "کوئی واقف مل گیا ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور ایک بار پھر ساہی اور اس لڑکی کی باتوں پر کان لگا دیے۔ وہ کسی

موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اس بحث کا کوئی کوئی لفظ میرے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ میرے مطلب کی گفتگو نہیں تھی۔ اس گفتگو سے مجھے صرف یہ بات معلوم ہوئی کہ ساہی صاحب سے ہم کلام لڑکی ان کی بیٹی ہے۔

O☆O

الفردوس میں دو روز ہم نے گھومتے پھرتے، کشتی چلاتے اور لوڈو کھیلتے گزار دیے۔ اسی دوران ایک مرتبہ ساہی صاحب سے بھی آمنا سامنا ہوا لیکن حسبِ توقع وہ مجھے فوری طور پر پہچان نہیں سکے۔ ویسے بھی یہ مڈبھیڑ تقریباً سو گز کی دوری سے ہوئی تھی۔ میں ساہی صاحب کے سامنے آنے کے لیے کوئی مناسب موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ ایسا موقع جو ہمیں آدھ پون گھنٹا تنہائی فراہم کر سکے اور میرے منصوبے کے عین مطابق بھی ہو۔ یہ سوال میرے ذہن میں ہر گھڑی میخ کی طرح گڑا رہتا تھا کہ آغا قادر زماں اتنے بڑے سرکاری افسر کو قتل کرانے کا رسک کیوں لے رہا ہے۔ ایسی کیا ابتلا اس پر آن پڑی ہے کہ اسے یوں "سرکاری دربار" سے براہِ راست ٹکر لینی پڑ رہی ہے۔ ایک بات تو طے تھی کہ میں قادر زماں کے شیطانی عزم کی تکمیل نہیں کروں گا۔ قتل اور وہ بھی ساہی صاحب جیسے نیک بندے کا! میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن جس ترازو کے ایک پلڑے میں میرا یہ ارادہ تھا اسی کے دوسرے پلڑے میں میری بہن تھی۔ وہ بہن جو میری خزاں رسیدہ زندگی کا آخری پھول تھی اور جسے تازہ بہار کا چہرہ دکھانے کے لیے میں اپنی پوری زندگی سخت ترین موسموں کی نذر کر سکتا تھا۔ حالات کی ترازو کا یہ توازن میرے لیے جان لیوا تھا۔ خود کو اس کرب ناک کیفیت سے نکالنے کے لیے مجھے ایک تیسرا راستہ درکار تھا۔ ایسا راستہ جس پر چل کر میں رجال ساہی صاحب کے ساتھ اپنی بہن کی زندگی بھی بچا سکوں۔

اب تک میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق ساہی صاحب کے ساتھ ان کی علیل مسز کے علاوہ تین بچے اور دو نوکر بھی تھے۔ بچوں میں دو تو واقعی بچے تھے۔ یعنی ان کی عمریں اندازاً بارہ اور چودہ سال تھیں۔ یہ دونوں لڑکے تھے اور سارا دن اسنوکر روم میں کھیلتے رہتے تھے جبکہ تیسری لڑکی تھی۔ اس کی عمر تقریباً بیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آواز جیسے خوب صورت تھی۔ صورت بھی اچھی تھی لیکن وہ میں ابھی دور سے دیکھ پایا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے ساہی صاحب کے ساتھ تصویر میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ تصویر مجھے قادر زماں نے حویلی میں دکھائی تھی اور اپنی دانست میں مجھے مقتول کا "چہرہ کرایا" تھا۔ میں نے مسز ساہی کو بھی دیکھا تھا۔ ماں بیٹی کی شکل کافی ملتی تھی۔ مسز ساہی جوانی میں خاصی حسین رہی ہوں گی مگر عمر اور بیماری نے ان کے چہرے پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ میں نے انہیں بالکونی میں آرام کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس وقت بڑا لڑکا ان کے کندھے دبا رہا تھا۔ میں نے اپنے قیام کے دوران یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس تفریح گاہ میں رجال ساہی صاحب کی مع اہل و عیال موجودگی دراصل مسز ساہی کی علالت کے سبب ہی ہے۔ شاید ڈاکٹروں نے انہیں تبدیلیِ آب و ہوا کا مشورہ دے رکھا تھا۔

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ سہ پہر کے بعد میں اور انجم گھڑ سواری کے لیے نکل گئے۔ دیگر تفریحات کی طرح گھڑ سواری کے لیے بھی یہ شرط تھی کہ دورانِ تفریح الفردوس کی حدود سے باہر نہ نکلا جائے۔ پختہ سڑک پر ہم نے تفریح گاہ کا ایک راؤنڈ مکمل کیا اور پھر مونگ پھلی ٹونگتے ہوئے پیدل ہی واپس روانہ ہو گئے۔ مجھے اوّل دن سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہاں چند آنکھیں ہماری نگراں ہیں لیکن ابھی تک اس امر کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ اپنی نگرانی کا شبہ ہونا ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے۔ آدمی کی حرکات و سکنات، سوچ و بچار، معمولات ہر چیز پر اثر پڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے، پاؤں میں اَن دیکھی بیڑی سی پڑ گئی ہے۔ اگر نگرانی کے ساتھ موت یا گرفتاری وغیرہ کا خطرہ بھی وابستہ ہو تو ہر پل سُولی پر گزرتا محسوس ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بعض نازک مزاج قسم کے لوگ زیرِ نگرانی ہونے کے احساس سے ہی اعصابی مریض بن جاتے ہیں۔ بہرحال اس روز گھڑ سواری سے واپس آتے ہوئے میں نے اپنے شک کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پختہ سڑک پر ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔ میں انجم کو لے کر ایک سرسبز ڈھلوان پر اُتر گیا۔ چیڑ کے بلند و بالا درختوں کے درمیان ہم سنبھل سنبھل کر نیچے اُترنے لگے۔ کیمرا میرے گلے میں تھا۔ گاہے گاہے میں انجم کی ایک آدھ تصویر بھی اُتار لیتا تھا۔ اس ڈھلوان کا ایک مختصر چکر کاٹ کر ہم دوبارہ پختہ سڑک پر پہنچ سکتے تھے۔ اس دوران کوئی ہمارے پیچھے آتا تو بھی بہ آسانی نظر آ سکتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے لیکن اپنے قرب و جوار میں مجھے کوئی مشتبہ متنفس دکھائی دیا نہ کوئی ایسی ویسی سرگرمی نظر آئی۔ ہم دھیرے دھیرے سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ اب ہمارے سامنے چڑھائی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انجم کو دشواری پیش آ رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اسے سہارا دینے کے

لیے آگے بڑھتا اس کا پاؤں رپٹا اور وہ لڑھک کر آٹھ دس فٹ نیچے چیڑ کے تنے سے جا ٹکرائی۔

وہ کافی زور سے گری تھی۔ میں نے لپک کر اسے سنبھالا۔ وہ کپڑے جھاڑ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی لیکن اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ مشہور ہے کہ دُکھتی چک دُکھ جاتی ہے۔ انجم کی بھی زخمی پنڈلی پر ہی چوٹ آئی تھی۔ اس نے میرے سہارے سے اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ میں نے کیمرا اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا "چلو میں تمہیں اُٹھا لیتا ہوں۔"

اس نے سمٹ کر میری طرف دیکھا لیکن میری آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر نہیں تھا جو اسے مزید سمٹنے پر مجبور کرتا۔ بلاشبہ وہ جوان اور حسین تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ گھوم پھر رہے تھے۔ رات کو ایک ہی کمرے میں سو رہے تھے لیکن میرے لیے وہ صفدر کی امانت تھی۔ وہ صفدر جو صرف چھ گھنٹے میرے ساتھ رہا تھا لیکن برسوں سے شناسا لگتا تھا۔ سچ کہا گیا ہے کہ کبھی برسوں کی قربت سے بھی اجنبیت دور نہیں ہوتی اور کبھی لمحوں کے شناسا رگِ جاں سے قریب ہو جاتے ہیں۔ کچھ عجیب طرح کی اپنائیت محسوس کی تھی میں نے صفدر کے لیے اور اسی حوالے سے انجم کے ساتھ بھی میرا ایک پیارا سا بے نام رشتہ قائم ہو گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اعتماد لہجے میں کہا "تو انجم میں تمہیں اُٹھا لیتا ہوں۔" میرے لہجے کی سچائی نے انجم کا ہر وسوسہ دور کر دیا۔ وہ میری طرف جھکی اور میں نے اسے پھول کے مانند اٹھا لیا۔ ڈھلوان طے کر کے ہم پختہ سڑک پر پہنچے تو وہ اصرار کر کے میرے بازوؤں سے اُتر گئی۔ میں اسے سہارا دے کر کمرے تک لے آیا۔

گرنے سے اس کے ٹخنے اور پنڈلی پر گہری خراشیں آئی تھیں۔ پرانے زخم سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ میں نے فون پر منیجر سے رابطہ قائم کیا۔ مجھے فرسٹ ایڈ بکس کی ضرورت تھی لیکن منیجر صاحب ڈاکٹر فراہم کرنے پر تل گئے۔ ڈاکٹر کی مجھے ضرورت تو تھی لیکن میں یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ انجم کی پنڈلی پر گولی کا زخم تھا اور ڈاکٹر کے آنے سے خواہ مخواہ ہماری حیثیت مشکوک ہو سکتی تھی۔ میں نے خود ہی پنڈلی کا زخم دھو کر پٹی کر دی۔ چند "پین کلر" گولیاں گاڑی کے ڈیش بورڈ میں موجود تھیں، وہ میں نے لا کر انجم کو دیں۔ خیال تھا کہ رات سکون سے کٹ جائے گی لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ میں ٹی وی سے شام سات بجے کی انگلش خبریں سن رہا تھا جب بیڈ روم سے انجم کی ہائے ہائے سنائی دینے لگی۔ اسے درد ہو رہا تھا۔ رات کو درد بڑھ بھی سکتا تھا۔ ضروری تھا کہ ابھی اس کا سدِباب کر لیا جائے۔ جو درد کش دوا انجم استعمال کرتی رہی تھی وہ نتھیا گلی یا پھر ایبٹ آباد سے مل سکتی تھی۔ میں نے سوچا "رات بے چینی سے گزارنے سے بہتر ہے کہ ابھی تھوڑی سی دقت برداشت کر لی جائے۔" میں نے الیکٹرک ہیٹر گھما کر انجم کی طرف رکھا۔ پانی کا جگ اور گلاس بھی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر جیکٹ پہن کر باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ انجم کی آنکھوں میں خدشات کا سیلاب اُمڈ آیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟ اس وقت نہ جائیں۔ اگر جانا ہے تو مجھے ساتھ لے کر جائیں۔"

میں نے اسے پچکارا۔ "حوصلہ رکھو انجم، میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں آجاتا ہوں۔ چار پانچ میل کا تو سفر ہے نتھیا گلی تک۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب" اس نے بند کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا "میں اب کافی ٹھیک ہوں۔ درد کم ہو گیا ہے۔ آپ اُتار دیں جیکٹ۔"

میں دیکھ رہا تھا، وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ خوف کی اذیت سے بچنے کے لیے زخم کی اذیت سے انکار کر رہی ہے۔ میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا "اچھا میں نہیں جاتا لیکن نیچے جا کر ڈاکٹر سے تو مل سکتا ہوں۔ شاید وہ کوئی حل بتا دے۔"

یہ بات بھی انجم کے دل کو نہیں لگی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر کے باہر نکل آیا۔ مطلع ابر آلود ہو چکا تھا اور یخ بستہ ہوا سائیں سائیں کرتی بالکونی سے گزر رہی تھی۔ دور نیچے وادی میں ٹمٹماتی روشنیاں بادلوں کے سبب نگاہ سے اوجھل تھیں۔ میں نے دروازہ باہر سے لاک کیا اور چابی دروازے کی نچلی درز سے اندر کھسکا دی۔

پارکنگ لاٹ تک پہنچنے میں مجھے دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے پھر تھوڑی ہی دیر بعد میں تیزی سے نتھیا گلی کی طرف جا رہا تھا۔

میں جس وقت نتھیا گلی مین روڈ پر پہنچا، ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سڑک پر گہما گہمی تھی۔ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے میں نے گاڑی روکی اور اندر داخل ہو گیا۔ اسی وقت ایک شخص تیز قدموں سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب سے ہو کر سڑک پر پہنچا اور نیلے رنگ کی پجارو میں بیٹھ گیا۔ اس وقت میڈیکل اسٹور کی چھت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرتی یا سامنے کھڑا ہوا سیلزمین ہوا میں معلق ہو جاتا تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی، جتنی اس شخص کو دیکھ کر ہوئی۔ کتنی ہی دیر تو مجھے اپنی بصارت پر یقین

ہی نہیں آیا۔ میں اپنی ایڑیوں پر گھوم کر سکتے کی کیفیت میں نیلی جیپ کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ حیرت کا یہ شدید ترین ریلا گزر گیا تو دل و دماغ میں تہلکہ سا مچ گیا۔ یوں لگا، جسم کے تمام مساموں سے پسینے کے دھارے بہہ نکلے ہیں اور میں ابھی یہاں کھڑا کھڑا اپنے عرق میں غرق ہو جاؤں گا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ دکان میں موجود لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں اور ابھی ابھی جو خاتون دکان میں داخل ہوئی ہے وہ آگے جانے کے لیے مجھ سے رستہ طلب کر رہی ہے لیکن مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میڈیکل اسٹور، نتھیا گلی، "الفردوس" میں کراہتی ہوئی انجم، مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ یاد رہا تھا تو اتنا کہ میں نے ابھی اس شخص کو دیکھا ہے جو جرائم اور فتنہ گری کی دنیا میں یکتا ہے۔ جو ہلاکت، بربادی اور تباہی کا دوسرا نام ہے اور جسے کسی شہری بستی میں دیکھے جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اس شہری بستی میں بربادیاں ڈیرے ڈالنے والی ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے صدا اُبھری "یارب! یہ شخص کیوں ہے یہاں؟ میرے پاک وطن میں، پاک فضاؤں میں یہ پلید صورت کیوں نظر آئی ہے۔ کیوں دیکھا ہے میں نے اسے یہاں؟" ایک ٹیس سینے کی گہرائیوں سے اُبھری اور میں جیسے صدمے سے پاگل ہو گیا۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! اس شیطان کو پکڑ لو۔ اسے بھاگنے نہ دینا۔ یہ نکل گیا تو اس بستی میں سرایت کر جائے گا۔ زہر بن کر زمین کی شریانوں میں دوڑ جائے گا اور قیامت بن کر نشیب و فراز کو ڈھانپ لے گا۔ اسے پکڑ لو شاہ جہاں، ختم کر دو اسے۔ قدرت نے تمہیں ایک سنہرا موقع دیا ہے۔ اگر بس چلتا ہے تو اسے مار ڈالو۔ اس سے ایک لفظ کا تبادلہ کیے بغیر اسے گولیوں سے چھلنی کر دو۔" عجیب جنونی انداز میں، میں نے جیکٹ کی جیب تھپتھپائی۔ ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور سامنے کھڑی عورت کو دھکیلتا ہوا سڑک کی طرف بھاگا۔

شیطان کو لے کر وہ شیطانی گاڑی تقریباً دو سو گز آگے نکل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، انجن اسٹارٹ کیا اور گیئر لگا کر ایکسیلیریٹر پورا دبا دیا۔ نسان سنی کمان سے نکلے تیر کی طرح پجارو کے پیچھے لپکی۔ ارد گرد کھڑے لوگوں نے حیرت آمیز خوف کے عالم میں مجھے دیکھا اور بھاگ بھاگ کر میری زد سے نکلے۔ میری نگاہیں جیپ کی ٹیل لائٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ مین روڈ پر کچھ آگے جا کر تاج محل اور نیو تاج محل ہوٹل کے سامنے مجھے رکنا پڑا۔ ایک بڑی کار پارکنگ کے لیے ریورس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ٹریفک رک گیا تھا۔ میں نے سائیڈ سے گاڑی نکالنا چاہی لیکن ناکامی ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں ہارن بجنے لگے اور ٹریفک کانسٹیبلوں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔ میں پیچ کر رہ گیا۔ جی چاہا، نتائج کی پروا کیے بغیر گاڑی دوڑاتا چلا جاؤں اور جس قیمت پر بھی ہو، نیلی جیپ کو جا لوں۔ بے بسی کے وہ لمحات میرے لیے ناقابلِ فراموش تھے۔ پجارو جیپ اس ٹریفک سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اسٹیئرنگ سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو لہولہان کر لوں۔ ٹریفک سارجنٹ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں کسی شدید عذاب میں گرفتار ہوں اور پلک جھپکنے میں اس ٹریفک جام سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ وہ اپنی توند سنبھال کر آگے آیا اور میری گاڑی کے سامنے سے ٹریفک کو رواں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ مسلسل ہارن پر جما ہوا ہے اور لوگ تعجب سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاید وہ میری ذہنی حالت پر شک کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کیا قیامت گزر گئی ہے۔ اس ٹریفک جام کے سبب ایک آدم خور درندہ، ممکنہ موت کی گرفت سے نکل گیا ہے، قلانچیں بھرتا ہوا، بے خبر انسانوں کے ہجوم میں گم ہو گیا ہے۔ یہ کتنا بڑا سانحہ تھا، یہاں پر کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔

ٹریفک بحال ہونے میں تقریباً دو منٹ لگے۔ راستہ ملتے ہی میں اندھا دھند گاڑی بھگانے لگا۔ ایک موہوم امید کے سہارے میری نگاہیں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا کہ ہر بند دروازہ توڑ دوں اور اس کے پیچھے جھانک کر دیکھوں کہ وہاں نیلی جیپ تو موجود نہیں۔ تقریباً دس منٹ میں یونہی دیوانوں کی طرح نتھیا گلی کی نیم تاریک سڑکوں پر چکراتا رہا۔ شیطان اور شیطانی گاڑی کہیں نظر نہیں آئے۔ آہستہ آہستہ میری نگاہیں عقب نما آئینے پر مرکوز ہونے لگیں۔ پچھلے دس منٹ سے اس آئینے میں مسلسل جگمگاہٹ نظر آ رہی تھی۔ بلکہ یہ جگمگاہٹ "الفردوس" سے ہی میرے ساتھ تھی۔ برسوں سے جو وسوسہ مجھے گھیرے ہوئے تھا وہ آج حقیقت نکلا تھا۔ میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ ڈارک بلیو رنگ کی جو سوزوکی کار میرے پیچھے آ رہی تھی اسے میں الفردوس کے پارکنگ لاٹ میں بھی دیکھ چکا تھا۔

یکایک میرے اندر حیرت کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں اور انگلیوں کی پوریں جلنے لگیں۔ میں نے گاڑی کا رُخ خان پور جانے والی سڑک کی طرف موڑ دیا۔

نتھیا گلی سے نکلتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈارک بلیو گاڑی میرے تعاقب میں ہے۔ میں اسے تعاقب میں رکھ کر تقریباً چار کلومیٹر آگے سنسان سڑک پر لے آیا۔ اب مجھے کسی اندھے موڑ کی تلاش تھی۔ خان پور اور نتھیا گلی کے درمیانی راستے میں "اندھا موڑ" تلاش کرنا ایسے ہی تھا جیسے حافظ آباد میں تربوز کا کھیت تلاش کرنا، لاہور میں دودھ دہی کی دکان ڈھونڈنا یا پشاور میں کسی خان صاحب کی دید کا آرزو مند ہونا۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے ایک مناسب موڑ نظر آ گیا۔ میں نے گاڑی موڑتے ہی کنارے پر کھڑی کر دی۔ روشنیاں بجھائیں اور بھرا ہوا ریوالور تھام کر باہر نکل آیا۔ مجھ پر ایک وحشت ناک موڈ طاری ہو چکا تھا اور اس موڈ کے زیرِ اثر ہر ممکنہ خطرہ ہیچ نظر آ رہا تھا۔ ریوالور ہاتھ میں لے کر میں سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ حسبِ توقع بیس تیس سیکنڈ بعد ڈارک بلیو گاڑی کی روشنیاں چمکیں اور وہ موڑ سے نمودار ہوئی۔ گاڑی کی رفتار تقریباً چالیس کلومیٹر تھی۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ نتیجے میں وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ جونہی میں ہیڈ لائٹس کی زد میں آیا، ڈرائیور نے اضطراری طور پر بریک دبا دیئے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس خالی سڑک پر اتنی سخت سردی میں یوں کوئی اس کا راستہ روکے کھڑا ہوگا۔ ٹائروں نے احتجاجی چیخ بلند کی اور گاڑی لہراتی ہوئی میری گاڑی کے پہلو میں جا رکی۔ اس سے پہلے کہ میرا "متعاقب" صورتِ حال پوری طرح سمجھ پاتا، میں تڑپ کر گاڑی تک پہنچا۔ بایاں ہاتھ اگلے دروازے کے ہینڈل پر آیا اور دروازہ جھٹکے سے کھل گیا۔

"کک کیا ہے؟" گاڑی چلانے والے کے حلق سے ناقابلِ شناخت آواز نکلی۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ کنپٹی سے چھونے والے ریوالور نے فوراً ہی سوال کنندہ کی تسلی کر دی تھی۔ مدھم روشنی میں میں نے دیکھا، وہ تقریباً پینتیس برس کا ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ اسے دیکھتے ہی میانوالی کے بجلے بھینڈو کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ خوش حالی کے دور میں ایسے بھینڈو عید قربان پر ہمارے گھر کے آنگن میں بھی ذبح ہوا کرتے تھے۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے بھینڈو نے گاڑی کی ہم رنگ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ خدوخال خالص پنجابی قسم کے تھے۔ وہ گاڑی میں تنہا تھا۔

"خبردار" میں نے پھنکار کر کہا "چالاکی دکھائی تو اسی جگہ ٹھنڈا ٹھار کر دوں گا۔" اپنے لہجے کی اجنبیت کا احساس خود مجھے بھی ہو رہا تھا۔ یہ لہجہ میرے اندرونی غضب کا کرشمہ تھا۔ اسے سن کر بھینڈو کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے دہن کھولا لیکن پھر زبان کو زحمتِ کلام دیئے بغیر جبڑا بند کر لیا۔ میں نے اگلے دروازے سے ہاتھ داخل کر کے پچھلے دروازے کا کھٹکا اٹھایا اور دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے ــــ کون ہو تم؟" شلوار قمیص والے بھینڈو نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں تیرا گمشدہ باپ ہوں، چل ریورس کر اس ماں کو اور موڑ کر واپس چل۔"

"دیکھو ــــ تت ــــ تم مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں دھمکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں نے تیری دُم میں نمدہ فٹ کر دیا ہے اور اگر اینگی بینگی کرے گا تو آنکھیں چیر کر جھولی میں رکھ دوں گا۔ چل میرا پُتّر ریورس کر گاڑی کو۔"

شلوار قمیص والے نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نگاہ دوڑائی اور جو دیکھا اس کے نتیجے میں چپ چاپ گاڑی ریورس کرنے لگا۔ میرا ریوالور بدستور اس کی کنپٹی پر تھا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے اس کے نسواری کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب ریوالور کی گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا، ریوالور بھی موجود ہے۔ جیبیں ٹٹولنے کے بعد میں نے آگے جھک کر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا تو ریوالور کی تلاش ختم ہو گئی۔ ہتھیار ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر بھینڈو بُری طرح کسمسایا لیکن کچھ کر نہیں سکا۔ میں نے دیکھا، ہیجانی کیفیت سے اس کا سارا جسم لرز رہا ہے۔

گاڑی نتھیا گلی کی طرف نصف کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکی تو میں نے بھینڈو کو رکنے کا حکم دیا۔ اس نے پتھریلے کنارے پر اتار کر گاڑی روک دی۔ بائیں طرف نشیب میں تاریک ڈھلوان تھی۔ چیڑ اور دیودار کے دیو قامت درخت نامعلوم پستی سے ابھر کر نامعلوم بلندی تک چلے گئے تھے۔ میں نے ریوالور کی یخ بستہ نال بھینڈو کی چربیلی گردن میں دھنسا دی۔ "چل اسٹیئرنگ موڑ کر اس ماں کو نیچے اُتار۔"

"کک ــــ کیا؟"

"میں پشتو میں گفتگو نہیں فرما رہا۔ چل اُتار اس گاڑی کو نیچے۔"

"تت ــــ تمہارا دماغ تو خراب نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"خراب تو نہیں ــــ لیکن ہو جائے گا اور جب میرا دماغ خراب ہو جائے تو میں بندے کو ایسی جگہ گولیاں مارتا ہوں کہ وہ پوسٹ مارٹم کراتے ہوئے بھی شرماتا ہے ــــ چل ماں صدقے اُتار دے اس گاڑی کو نیچے۔"

بھینڈو نے لرز کر گاڑی ڈھلوان کی طرف موڑ دی۔ اسے آگے اور پیچھے دونوں طرف موت نظر آ رہی تھی۔ ڈھلوان خطرناک تھی لیکن میں جانتا تھا، ایسی خطرناک بھی نہیں۔ نتھیا گلی جاتے ہوئے میں نے یہاں رک کر انجم کو دور بین سے بندروں کی خرمستیاں دکھائی تھیں۔ یہ سارا جنگل بندروں سے اَٹا پڑا تھا۔ میں چونکہ دن کی روشنی میں یہ جگہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ اور کچھ ہو جائے تو ہو جائے لیکن گاڑی یہاں اُلٹنے کی نہیں۔ وہ بیچے ڈھلوان سے نیچے اُتر گئے تو بھینڈو نے پھر بریک لگا دیئے جیسے کوئی پہاڑی بکرا پتھر سے کودتے کودتے جھجک جائے۔ میں نے ریوالور بے رحمی سے اس کی گردن میں دھنسا دیا۔ آہنی نال کے دباؤ میں دنیا کی خطرناک ترین دھمکی پوشیدہ تھی۔ موت کی دھمکی ــــ وجود سے عدم وجود میں چلے جانے کی دھمکی ــــ مجبوراً بھینڈو کو پاؤں بریک پیڈل سے ہٹانا پڑا۔ گاڑی جھرجھری لے کر نشیب میں اتری اور اچھلتی کودتی لڑھکتی چلی گئی۔ قریباً تیس میٹر نیچے جا کر ایک تناور درخت سے اس کا نسلی بخش ٹکراؤ ہوا۔ چھناکے سے ہیڈ لائٹس بجھ گئیں اور ونڈ اسکرین تڑخ گئی۔ بھینڈو کے منہ سے بے اختیار "بے" کی آواز نکل گئی تھی۔ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش تھا لیکن اچانک پھنسا تھا اور اس بُری طرح پھنسا تھا کہ بوکھلا کر رہ گیا تھا۔

"دیکھ لیا نا؟" وہ احتجاجی انداز میں چلایا۔

"ہاں دیکھ لیا ہے ــــ" میں نے جواب دیا۔ "اور اب جو تم نے دیکھنا ہے وہ اللہ کسی کو نہ دکھائے۔"

میرے لہجے کی سفاکی محسوس کر کے بھینڈو کی آنکھیں اور پھیل گئیں۔ "کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟" وہ اپنے لہجے میں دنیا بھر کی معصومیت سمیٹ کر بولا۔ یہ لہجہ سن کر مجھے لگا جیسے الفردوس کے مین گیٹ پر چکرانے والا خونخوار کتا کسی شاخ پر بیٹھ کر چہک رہا ہے۔ مصیبت میں انسان کیسے کیسے لباس بدلتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے اَنا اور گھمنڈ کے خدا اس کو کتنی بے دردی سے ٹھوکریں مارتا ہے۔ یہ خونخوار صورت والا بدفطرت شخص اپنی زندگی میں نجانے کتنے لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا چکا تھا لیکن اس وقت خود کو معصوم جان کر اللہ میاں کی گائے بن رہا تھا۔ یوں بول رہا تھا جیسے منہ میں دانت نہیں۔ روئی کو موتی کہہ رہا تھا لیکن میں اس کی آواز سن رہا تھا نہ اداکاری دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہوں میں تو ایک شیطان کا چہرہ گھوم رہا تھا اور کانوں میں پھنکارتی ہوا اس کا شور تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے بھینڈو کے گلے سے اونی مفلر اتارا اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزار کر "ہیڈ ریسٹ" کے ساتھ گرہ دے دی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ بھینڈو مزاحمت کے لیے صرف تیاری ہی پکڑ سکا۔ وہ جب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوا تو اس کی گردن ہیڈ ریسٹ کے ساتھ جکڑی ہو چکی تھی۔ اب وہ جب تک ہاتھ پیچھے لے جا کر گرہ نہ کھولتا، گردن کو نشست سے آزاد نہیں کرا سکتا تھا اور میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں اسے ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا تھا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "تجھے ٹائم بم پر بٹھا رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے ہکلا کر پوچھا۔

میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا، بہت جلد مطلب اس پر واضح ہو جائے گا۔ گاڑی کے تباہ شدہ بونٹ میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور پلاسٹک وغیرہ جلنے کی بُو آ رہی تھی۔ یہ آگ گو ابھی مدھم تھی لیکن کسی وقت بھی پھیل کر پیٹرول لائن یا ٹینکی تک پہنچ سکتی تھی۔ اس کے بعد یہ کار ایک بم ہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور قریب ہی بیس فٹ دور ایک چیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ریوالور کا رُخ بھینڈو کی سمت ہی تھا۔ یکایک اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں اور بدحواسی کے عالم میں اس نے خود کو کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ صورتِ حال کی تہ تک پہنچ گیا تھا اور اب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"خبردار" میں دہاڑا۔ "اپنے ہاتھ مفلر سے دور رکھو۔"

خوف کی فراوانی میں اس نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ میری انگلی نے اوپر تلے دو بار ٹریگر پر حرکت کی اور دو گولیاں دھماکوں کی آواز سے گاڑی کی نشست میں پیوست ہو گئیں۔ شور سے جنگل گونج اٹھا اور قریبی ٹھکانوں پر سوئے ہوئے ان گنت پرندے پھڑ پھڑا کر اُڑ گئے۔ کہیں نشیب سے خوابیدہ بندروں کی چیخ بھی سنائی دی۔ اس کے علاوہ کچھ نامانوس آوازیں تھیں جنہیں میں اپنی ناتجربہ کاری کے سبب کسی جانور سے منسوب نہ کر سکا۔ دھماکوں نے وہی کام کیا جو بشیر یا کے مریض کے منہ پر تھپڑ کرتا ہے۔ بھینڈو نے لرز کر

ہاتھ سفلری گن سے دور ہٹالیے۔

"مجھے مت مارو۔" وہ گھگھیایا۔ "میں مرنا نہیں چاہتا۔ مم۔ مجھے یہاں سے نکالو۔" اس کی نگاہیں گاڑی کے سلگتے بونٹ پر تھیں اور وہ دروازہ کھول کر اپنا نصف دھڑ گاڑی سے باہر نکال چکا تھا۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ جب تک سفلری گن قائم ہے' وہ مکمل طور پر گاڑی سے باہر نہیں آ سکتا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"گل۔ گلزار احمد۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"کیوں پیچھا کر رہے تھے؟"

"نہیں۔ میں پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو بچے۔ جتنی دیر کرے گا' اتنا ہی خطرہ بڑھے گا۔ اگر تیرے دماغ میں گوبر نہیں بھرا ہوا تو پیٹرول کی بُو تجھے آ رہی ہوگی۔ آ رہی ہے نا؟"

اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور ایک بار پھر گردن چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ میں نے تاک کر فائر کیا' اعشاریہ چھتیس کی گولی اس دفعہ اس کے کان کو چھوتی گزر گئی۔ اس دفعہ وہ چیخ پڑا۔

"مم۔ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ جو پوچھو' بتا دیتا ہوں لیکن مجھے یہاں سے نکال لو۔"

"تم صرف اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" میں نے بے حد اطمینان سے کہا۔ "جب تک میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکلنے نہیں دوں گا۔ بہتر ہے کہ مشین کی طرح بولنا شروع کر دو۔ جو میں پوچھتا جاؤں' بتاتے جاؤ۔ شاید یہ گاڑی پھٹنے سے پہلے میرے سوال پورے ہو جائیں۔"

میرے لہجے کی قطعیت نے گلزار کو جیسے لرزے کا بخار چڑھا دیا۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں مجھے اس کا رُخ منحوس نظر آ رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

"پوچھو۔ کیا پوچھتے ہو۔" وہ گڑگڑایا۔

"تمہیں آغا قادر زماں نے بھیجا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے پھرتی سے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟"

"دو بندے اور ہیں۔ ایک کا نام مشتاق اور دوسرے کا اکبر نیازی ہے۔ ہم۔ باری باری تم پر نگاہ رکھتے ہیں۔"

"احمد رجال ساہی صاحب کو کیوں مروایا جا رہا ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔"

"تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ میرے خیال میں فیول لائن لیک ہو چکی ہے۔ کار کے آس پاس پیٹرول پھیلا ہوا ہے اور آگ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

گلزار نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "جاگیردار صاحب مجھے بھوکے کتوں سے نچوا دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو جب ہو گا تب ہو گا مگر یہ گاڑی اب تمہیں زیادہ وقت نہیں دے گی۔" گلزار پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے میں گاڑی سے کچھ اور دور چلا گیا۔

گلزار نے کراہ کر کہا۔ "ساہی صاحب ایک ایسے شخص کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں جو جاگیردار صاحب کا گُرگا' جن ہے۔ جاگیردار صاحب کے سامنے اب دو ہی رستے ہیں۔ اپنے جن کو بچالیں یا ساہی صاحب کو ٹھکانے لگا دیں۔"

میرے ذہن میں ایک ہفت رنگ پھلجھڑی چھوٹی۔ میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ "کیا جاگیردار کا وہ جن بھی اس وقت تھیاگلی میں موجود ہے؟"

"ہاں۔" گلزار کے ہونٹوں سے بے اختیار نکل گیا۔ موت کے خوف نے اس کی مزاحمتی سوچ کو کرچی کرچی کر ڈالا تھا۔

میں نے اپنی نگاہیں گلزار کی وحشت زدہ آنکھوں میں گاڑ دیں اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔ "کیا یہ وہی شخص ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نیلی پجارو میں پیٹرول پمپ کی طرف گیا ہے؟"

"مجھے چھوڑ دو' میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔" موت کے جبڑوں میں پھنسے ہوئے گلزار نے ایک بار پھر فریاد کی۔

"نہیں' پہلے بتاؤ۔"

"کیا پھر مجھے چھوڑ دو گے؟"

"نہیں' یہ کوئی وعدہ نہیں ہے۔ تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ جلدی بکو۔"

"ہاں۔ ہاں۔ یہ وہی شخص ہے۔" گلزار کے سینے سے کراہتی ہوئی صدا بلند ہوئی۔

"تم جانتے ہو' یہ کون ہے؟" میں نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔ صرف اتنا پتا ہے' یہ بارڈر پار سے آیا ہے۔ شاید چندی گڑھ سے یا کپور تھلہ سے۔ کسی بہت وڈے چوہدری کا پتر ہے۔ ایک پورا پنڈ جلا دیا تھا اس نے' دس بارہ بندے بھی مارے ہوئے ہیں۔"

گلزار اپنی طرف سے سنسنی خیز انکشافات کر رہا تھا۔ میں

اس کی بے خبری پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے اس شخص کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا' کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ خونی آندھی کو ہوا کا جھونکا کہہ رہا تھا۔ کینسر کے ناسور کو پھنسی بتا رہا تھا۔ ایک عفریت کا تعارف اس نے مجھ سے معمولی قاتل کے طور پر کرایا تھا۔ نجانے کیوں میری سماعت میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو کسی ناصر ساہی شخص سے اس کے ساتھی نے کہے تھے اور میں نے تین روز پہلے بوڑھے عطا محمد کی زبانی سنے تھے۔ "ہم کیوں ڈریں۔ ڈریں وہ جن کی لاشیں سڑکوں پر تڑپیں گی اور مُردہ خانوں میں اکڑیں گی۔" ان الفاظ کی بازگشت ابھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ صوتی لہریں پھیلتی گئیں۔ آگے۔ اور آگے۔ اس نیلی پجارو تک جو کسی گیراج میں' کسی پورچ میں یا کسی چاردیواری میں کھڑی تھی۔ یا پھر کسی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔

یکایک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ سلگتی گاڑی کے بونٹ سے دو دفعہ "بھک بھک" کی آواز آئی پھر ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور گلزار سمیت سوزوکی کے پرخچے اڑ گئے۔

میں چند لمحے مبہوت کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا ہوا ہے۔ گاڑی کا ایک جلتا ہوا دروازہ مجھ سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ فضا میں اب تیزی سے جلتے پلاسٹک کی بُو پھیل رہی تھی۔ دھماکا میری توقع سے زیادہ زوردار تھا۔ صرف پیٹرول کی ٹینکی پھٹنے سے ایسا شدید دھماکا ہرگز نہ ہوتا۔ شاید گاڑی میں کوئی آتش گیر مادہ بھی رکھا تھا۔ یہ سارے خیالات دو تین سیکنڈ کے اندر میرے ذہن سے گزرے۔ اچانک مجھے کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں سکتے کی سی کیفیت سے نکل کر آوازوں کی طرف متوجہ ہوا۔ قریبی درختوں سے ایک سایہ سا نکل کر بڑی تیزی سے اطلوالوں پر چڑھ رہا تھا۔ بلا سوچے سمجھے میں نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی اور سائے کے پیچھے لپکا۔ بھرا ہوا ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بھاگنے والے نے پتلون کوٹ پہن رکھا ہے۔ یعنی وہ کوئی مقامی شخص نہیں تھا۔ اس کے بھاگنے کا انداز مجھے واضح طور پر سرخ جھنڈی دکھا چکا تھا۔

"رک جاؤ۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میری وارننگ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اسے رکنے کی ہدایت کی اور اس ہدایت کو بے اثر پاکر ٹریگر دبا دیا۔ میں نے ٹانگوں کا نشانہ لیا تھا لیکن گولی بھاگنے والے کو نہیں لگی۔ ہاں اتنا فائدہ ہوا کہ وہ پھسل کر گر گیا۔ یہ چند ساعتوں کی مہلت میرے لیے بہت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھ کر بھاگتا' میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ہاتھ ہتھیار سے خالی تھے۔ میری بھرپور ٹھوکر اس کی کمر پر پڑی۔ وہ اٹھتا اٹھتا پھر منہ کے بل گرا۔ میں نے چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چلانے کی کوشش کرے گا لہٰذا ریوالور والا بازو میں نے اس کے نیچے سے یوں گزارا کہ اس کی گردن میری کہنی کے شکنجے میں دب کر رہ گئی۔ خالی ہاتھ سے میں نے اس کے بال جکڑ لیے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا طاقتور شخص تھا لیکن یہ جانتے ہوئے کہ میرے ہاتھوں میں ریوالور بھی ہے اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ گردن پر بے پناہ دباؤ کے سبب اس کے حلق سے "خرر خرر" کی آواز برآمد ہو رہی تھی۔ یہ آواز اس بات کا اعلان تھی کہ میرا حریف چیخنے چلانے سے قاصر ہے۔ میں نے اس کے سر کو دو تین بار سنگلاخ زمین سے پٹخا اور پھر کھینچ کر سیدھا بٹھا دیا۔

"خبردار۔ آواز نکالی تو بھیجا پگھلا دوں گا" میں نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔

ایم اے راحت کی ایک خوبصورت اور دلچسپ ناول

پرواز

اس نوجوان کی سرگزشت جس کی رگوں میں وطن کی محبت دوڑ رہی تھی

کوئی شکست کوئی ناکامی اسے اپنی راہ سے متزلزل نہ کرسکی

ایڈونچر سے بھرپور

قیمت /50

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

اشاعت: علی بک سٹال نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور

اب ہم دونوں ایک خودرو جھاڑی کی اوٹ میں رکے بیٹھے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ کار میں ہونے والا زوردار دھماکا اور پھر فائر کی آواز کسی کو یہاں کھینچ لائے گی۔ یہ ایک سنسان علاقہ تھا۔ اور سڑک پر بھی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی پھر بھی کسی کی مداخلت کا خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ کم از کم پانچ منٹ ہم اپنی جگہ بالکل بے حرکت بیٹھے رہے۔ شروع کے ایک دو منٹوں میں تو میرے حریف نے تڑپنے مچلنے کی کوشش کی لیکن پھر خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک بدبودار شخص تھا۔ لگتا تھا کئی ہفتوں سے اس نے صابن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ رہی سہی کسر شراب نے پوری کر دی تھی۔ اس کے منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کوٹ کی جیب میں ایک پوا اس وقت بھی موجود تھا۔ اس نے ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھا رکھے تھے اور گلے میں مفلر تھا۔ اس گیٹ اپ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موٹر سائیکل یا اسکوٹر پر یہاں پہنچا ہے۔

پانچ منٹ میں گاڑی کے شعلے مدھم پڑ گئے۔ میں اپنے شکار کو دبوچے ہوئے اٹھا اور گھسیٹتا ہوا "جائے حادثہ" پر لے آیا۔ یہاں آگ کی وجہ سے خوشگوار حرارت موجود تھی لیکن اس حرارت کا مزہ کرکرا کرنے کے لیے سوختہ گوشت اور پلاسٹک کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے شکنجے میں جکڑے ہوئے شخص کی نگاہیں کار کی طرف اٹھیں اور ان نگاہوں میں خوف کا تاثر ابھرا تو میں جان گیا کہ اسے گلزار کی جلی ہوئی لاش نظر آئی ہے۔ میں نے نگاہوں کو اس کریہہ منظر سے بدمزہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنے شکار کو گھسیٹ کر ایک درخت کی جڑ میں بٹھا دیا۔ گردن سے بازو ہٹا تو اس نے پہلی بار مجھے اپنی آواز سے متعارف کرایا۔ ڈیل ڈول کے برعکس اس کی آواز خاصی منحنی تھی۔ یوں لگا جیسے سلطان راہی 'بابرا شریف' کی آواز میں بول رہا ہے۔ ممکن تھا گردن پر پڑنے والے دباؤ نے اس کے گلے میں یہ "نسوانیت اور مٹھاس" بھری ہو۔

وہ کراہ کر بولا "تم قاتل ہو۔ تم نے گلزار کو جان سے مارا ہے۔ قادر زماں صاحب تمہیں کتے کی موت دیں گے۔"

اس کا یہ فقرہ مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ یہی وہ دوسرا ہرکارہ ہے جو قادر زماں کے حکم پر میری نگرانی کر رہا ہے "مرحوم گلزار" نے اس کا نام مشتاق عرف مشتاقی بتایا تھا۔ میں نے بے پروائی سے ریوالور کو گردش دی اور پھنکار کر کہا "میرے خیال میں اگر اب میں تمہیں شوٹ کر دوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ تم خود ہی مجھے یہ سمجھا چکے ہو کہ تمہیں چھوڑنے کا مطلب کتے کی موت مرنا ہے اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا... کتے کی موت تو بالکل نہیں" میں نے ریوالور والا بازو بالکل سیدھا کیا اور اس کی پیشانی کا نشانہ لے لیا۔ "چلو چلنے کی تیاری کرو۔" میری سرد آواز ابھری۔

"کک... کہاں؟" وہ لرز کر بولا۔

"جہاں تمہارے بڑے جا چکے ہیں' اور جہاں ابھی تمہارا ساتھی پہنچا ہے۔" کلمہ وغیرہ پڑھ لو بھائی۔"

ادھیڑ عمر مشتاقی کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں اسے عملی جامہ پہنانے میں تاخیر نہیں کروں گا لیکن زبان سے نکلے الفاظ واپس لینا بھی ناممکن تھا۔ اس نے بدستور بہت دھیمی کا لہجہ اختیار کیے رکھا اور بولا "دد... دیکھو' تم غلطی پر غلطی کر رہے ہو۔ میں جانتا ہوں' گلزار گاڑی میں آگ لگنے سے مرا ہے لیکن مجھے گولی مارو گے تو یہ سراسر قتل ہوگا۔"

"تمہاری کس بات پر یقین کروں؟" میں سفاکی سے مسکرا دیا "ابھی تم مجھے قاتل قرار دے رہے تھے' اب اس مقدمے سے بری کر رہے ہو۔"

اس نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی اہم بات کہنے سے پہلے تنہائی کا یقین کر لینا چاہتا ہو پھر اس کی لرزاں آواز ابھری "دیکھو... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ خاموش رہوں گا۔ میں سمجھوں گا' میں نے یہاں کچھ دیکھا ہی نہیں... میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ اگر تم کہو تو مسجد میں جا کر بڑی سے بڑی قسم اٹھا لیتا ہوں۔ یہ بات ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان رہے گی... میں وعدہ کرتا ہوں تم سے" ایک ہی سانس میں اس نے تیسری بار مجھ سے وعدہ کیا۔

اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا لیکن اتنا زیادہ ہرن ہو چکا تھا کہ وہ پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک ہی خواہش تھی... زندگی کی خواہش۔ موت کے سوا اس وقت وہ ہر چیز قبول کر سکتا تھا۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا مگر اس سے چند گز کے فاصلے پر ایک لاش پڑی تھی اور اس کو موت کی دھمکی دینے والے کا لہجہ خوف ناک حد تک سچا تھا۔

میں نے ریوالور کی نال نیچے جھکائی اور مشتاقی سے چند گز کے فاصلے پر ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے رعب میں آتے دیکھ کر مشتاقی نے ایک دم بڑی بڑی قسمیں کھانی شروع کر دیں اور مجھ پر اعتماد جمانے کے لیے دیوانہ وار کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا واسطہ دیا۔ اس بیوی کا واسطہ دیا جو سال میں چھ مہینے رود گرد

سے تڑپتی رہتی تھی اور اپنی وہ بے شمار مجبوریاں گنوائیں جن کے سبب وہ قادر زماں کی نوکری کرنے اور مختصر تنخواہ کے عوض ماں باپ کی گالیاں سننے پر مجبور تھا۔ پھر اس نے جان بچانے کے لیے آخری راز بھی چل دیا۔ اس نے راشگاف اعلان کیا کہ مرنے والے کی موت سے اسے خوشی نہیں ہوئی تو غم بھی نہیں ہوا۔ وہ کئی معاملات میں اس کا رقیب تھا اور اس کی موت سے اسے مستقبل میں روحانی و جسمانی سکون حاصل ہونے کی امید ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو کتنی بھیانک شے ہے موت! عاقل بالغ انسان بھی بچے کی طرح بلکنے اور حیلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مشتاقی مجھے قائل کرنے کے لیے جتنا زور لگا رہا تھا' میرے اندر اس کے لیے اتنی ہی بے رحمی پروان چڑھ رہی تھی۔ دل کا موسم تو اس وقت بدل گیا تھا جب ایک گھنٹا پہلے میں نے میڈیکل اسٹور میں شیطان کی صورت دیکھی تھی۔ اب ایک شخص کو جہنم واصل کرنے کے بعد سینے میں ہمکتی ہوئی درندگی عروج پر آ گئی تھی۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے اس وقت میں ایک دو تو کیا آٹھ دس افراد کو بھی عدم آباد کے ٹکٹ تھما سکتا تھا۔ تاہم تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے میں نے مشتاقی کو بولنے کا موقع دیا۔ جب وہ خوب بول چکا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے دوستانہ عزائم کے ثبوت میں میرے چند سوالوں کے جواب دے۔ اسے تاریکی کے آئینے میں موت کی شکل نظر آ رہی تھی۔ انکار اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا اور وہ فرفر بولنے لگا۔ اس نے تصدیق کی کہ اس کا نام مشتاق ہے۔ ان کا تیسرا ساتھی اکبر نیازی آج شام ہی جھنگ واپس چلا گیا تھا۔ مشتاقی نے یہ وضاحت بھی کی کہ مرنے والا "گلزار" الفردوس کے اندر میری نگرانی کرتا تھا جبکہ وہ اور اکبر نیازی یہ کام الفردوس کے باہر انجام دیتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ گلزار میری نگرانی کے لیے الفردوس میں بغیر ایک عدد خاتون کے کیونکر گھس سکا؟ جواب میں مشتاقی نے بتایا کہ اس کے ساتھ ایک عدد خاتون بھی موجود تھی اور وہ اب بھی کمرا نمبر ۲۸ کے آرام دہ بیڈ پر لیٹی گلزار کا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں نے مشتاقی سے خاتون کا نام حلیہ' حسب نسب سب پوچھ لیا۔ میرے پوچھنے پر مشتاقی نے وضاحت کی کہ جاگیردار کو رپورٹ پہنچانے کا ذمے دار اکبر نیازی تھا۔ وہ اب پرسوں واپس آئے گا اور اس کی واپسی سے پہلے اگر کوئی اہم اطلاع ہوتی تو جاگیردار صاحب سے گلزار نے فون پر رابطہ قائم کرنا تھا۔

جو اہم باتیں مشتاق مجھے بتا سکتا تھا بتا چکا تھا۔ اب مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنی بہت سی پریشانیاں اور الجھنیں بتائی تھیں۔ میں نے اسے ان تمام الجھنوں سے آزاد کرنا بہتر سمجھا۔ اس جیسے شوہر کی کمائی اور باپ کے سائے سے لواحقین محروم ہی رہتے تو افضل تھا۔ ریوالور کا رخ اس کے چہرے کی طرف کیے میں اس کے قریب پہنچا اور اچانک اپنا دایاں بازو اس کی گردن میں حائل کر دیا۔ میرے بازو کی یہ مخصوص گرفت غیر معمولی طور پر سخت تھی۔ جیسا کہ آپ اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں' کارمین جیسے تنومند بدمعاش بھی اس گرفت میں آ کر چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے مشتاق کو اپنے اسی داؤ میں پورے پانچ منٹ تک بے بس کیے رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی داؤ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ بازو اپنی جگہ جمتا تھا تو حریف کے ہر عضو بدن کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ حرکات و سکنات سے لے کر بصارت' سماعت اور گویائی تک سب کچھ میرے بازو کے تابع ہو جاتا تھا۔ اس موقعے پر "مقبوضہ" شخص کو بے ہوش یا راہیِ عدم کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں ہوتا تھا۔ گرفتاری سے پہلے اپنی مار دھاڑ سے بھرپور زندگی میں میں نے بیسیوں مرتبہ یہ داؤ استعمال کیا اور شاید ہی کبھی ناکامی ہوئی ہو۔ ہاں چند بار یوں ضرور ہوا کہ جس شخص کو میں نے بے ہوش کرنا چاہا وہ حشر تک کے لیے بے ہوش ہو گیا۔ ایک ایسا ہی سنگین لیکن دلچسپ واقعہ میں آگے چل کر آپ کو سناؤں گا۔

ہاں' تو میں ذکر کر رہا تھا مشتاقی کا۔ میرے ہتھے چڑھنے کے بعد اس شخص نے زبان سے جو پہلا فقرہ ادا کیا تھا اس نے اس کی موت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی تھی۔ یعنی وہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ قادر زماں کا کارندہ ہے اور قادر زماں کا تعلق کس درندے سے ہے' یہ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے جان گیا تھا۔ اس حوالے سے اب مشتاقی کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے اس کی گردن میں لپٹے بازو کو مخصوص حرکت دی۔ ہڈی ٹوٹنے کی مانوس آواز آئی اور چند جھٹکوں کے ساتھ مشتاق وجود سے عدم وجود میں چلا گیا۔ یہ عمل بے حد خوفناک ہونے کے باوجود میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں نے گردن جھکا کر دیکھا۔ کار کے چند جلتے حصوں کی روشنی میں مشتاقی کی آنکھیں خوف سے کشادہ نظر آ رہی تھیں۔ غالباً اسے آخری وقت میں ہی احساس ہو سکا تھا کہ اس پر کیا گزری ہے۔

سخت سردی کے باوجود میرا جسم پوری طرح گرم تھا۔ ہر عضو میں بے نام توانائی کی برق کوند رہی تھی۔ میں نے تیزی

سے اپنے شکار کی جیبیں ٹٹولیں۔ شراب کا پوا برآمد کیا۔ اس میں سے ابھی ایک دو گھونٹ ہی لیے گئے تھے۔ میں نے ڈھکن دانتوں سے گھما کر بوتل کا منہ کھولا اور مشتاق کے لباس پر آتم الخبائث کا چھڑکاؤ سا کر دیا۔ بقیہ شراب دوبارہ جیب میں رکھ دی۔ پھر اسے گھسیٹ کر سلگتی ہوئی کار کے قریب ڈال دیا۔ میرے ساتھ دھینگا مشتی کے دوران مشتاق اوندھے منہ گرا تھا۔ اس کے چہرے پر خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اب وہ جس طرح کار کے قریب پڑا تھا' دیکھ کر پہلا خیال یہی آتا تھا کہ وہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہوا ہے' حادثے کے وقت وہ اچھل کر کار سے دور جا گرا ہے اور یوں جلنے سے بچ گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' مشتاق کے گلے میں مفلر تھا لہٰذا میرے "گردن توڑ" داؤ کا شائبہ تک اس کی جلد پر محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے کار کے قریب ایسے رخ سے ڈالا تھا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے لڑھکا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ صورت حال تفتیش کرنے والوں کے لیے اور بھی گمراہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ چونکہ مشتاق نشے میں تھا لہٰذا سوچا جا سکتا تھا کہ بدمستی کے سبب وہ پُرخطر راستے پر کار کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور اپنے ہمراہی سمیت لقمۂ اجل بن گیا۔

موقعے پر ضروری انتظامات کرنے کے بعد میں نے وہاں ایک پل بھی ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ڈھلوان طے کر کے میں سڑک پر آیا اور اس اسکوٹر یا موٹر سائیکل کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا جس پر مشتاق یہاں پہنچا تھا۔ میری تلاش رائیگاں نہیں گئی۔ جلد ہی مجھے کچھ فاصلے پر ایک اسکوٹر کا ہیولا دکھائی دے گیا۔ یہ اسکوٹر موڑ سے کوئی سو گز دور ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتا میں اسکوٹر تک پہنچا۔ اسکوٹر کا ہینڈل قفل سے آزاد تھا۔ مشتاق کے دستانے اب میری جیب میں تھے۔ میں نے دستانے پہنے' کک لگائی اور موقعے سے روانہ ہو گیا۔ اپنی کار تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ سے زائد نہیں لگے۔ یہاں میں نے اسکوٹر کھڈ کے کنارے چیڑ کے خشک پودوں میں چھپایا' جیب سے رومال نکال کر مختلف جگہوں سے انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

○☆○

قریباً پندرہ منٹ بعد میری گاڑی طوفانی رفتار سے الفردوس کے مین گیٹ میں داخل ہوئی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لگتا تھا' اگر جلد ہی میں نے اپنا سینہ کسی کے سامنے کھول نہ دیا تو وہ پھٹ جائے گا لیکن کس کے سامنے کھولتا میں اپنا سینہ؟ یہاں کوئی میری سننے والا نہیں تھا۔ اور سنتا بھی تو کیا سمجھتا؟ اسے کیا معلوم ہوتا' جو درندہ ہے جو ان خوب صورت کوہساروں میں گھومتا پایا گیا ہے۔ میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں روکی اور بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ میری پہلی دستک پر انجم نے دروازہ کھول دیا۔ شاید وہ دروازے کے پاس ہی موجود تھی۔ اس کا چہرہ شکوؤں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ میں اس سے کہہ کر گیا تھا کہ نیچے ڈاکٹر سے ملنے جا رہا ہوں اور اب پورے دو گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ ان دو گھنٹوں میں میں دو آدمی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ ایک گاڑی میرے ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی اور ایک ایسے شخص کی دید میری آنکھوں کا قرار لوٹ چکی تھی جو جرائم کی دنیا کا مانا ہوا آفت زادہ تھا۔

"کہاں ۔۔۔ کہاں گئے تھے آپ؟"

انجم کے لہجے میں بے پناہ ناراضگی اور بے چینی جھلک رہی تھی۔ لگتا تھا' میری گمشدگی کی پریشانی نے اس کے لیے درد کش گولیوں کا کام کیا ہے۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نہیں تھے صرف میرے انتظار کا کرب تھا۔ میں نے اپنے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اسے شانوں سے تھام کر صوفے پر لے آیا۔ وہ انسانی مٹھی میں بند چڑیا کی طرح لرز رہی تھی۔ بال منتشر اور لباس بے ترتیب تھا۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری انجم! میں تمہاری دوا لینے نتھیا گلی چلا گیا تھا۔ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ میں فون کرنا چاہتا تھا لیکن پتا نہیں لائنوں میں کیا خرابی تھی۔ کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ آئی ایم رئیلی سوری ڈیئر۔"

انجم کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے پھر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ وہ ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی "آپ کو اندازہ نہیں' یہ دو ڈھائی گھنٹے میں نے کیسے گزارے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔"

میں نے انجم کی دوا نکالنے کے لیے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسی وقت مجھے یاد آیا کہ دوا تو میں نے لی ہی نہیں۔ میں میڈیکل اسٹور میں داخل ہی ہوا تھا کہ شیطان کی صورت نظر آ گئی تھی اور پھر کچھ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میرا ذہن کوئی بہانہ تراشتا' انجم نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی' بولی "نہیں ۔۔۔ ابھی دوا رہنے دو۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ ضرورت پڑی تو لے لوں گی۔"

اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ میں اس کے لیے دوا لینے گیا تھا اور اپنے لیے درد لے آیا ہوں۔ ایسا بے کراں درد جو گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اب رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ انجم کے پرس میں دو نیند آور گولیاں موجود تھیں۔ میں نے اصرار کر کے اسے ایک گولی کھلا دی اور سونے کے لیے بستر پر لٹا دیا۔ وہ گاہے گاہے غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگتی تھی۔ شاید خطرات کو سونگھنے والی مخصوص نسوانی حس اس کے اندر بھی جاگ چکی تھی۔

"کیا بات ہے؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "آپ کچھ اکھڑے اکھڑے ہیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"کہیں کسی سے جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"آپ کی جیکٹ پیچھے سے خراب ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہیں گرے ہیں آپ۔"

مجھے فوراً مشتاق کے ساتھ ہونے والی دھینگا مشتی یاد آ گئی لیکن فوراً ہی جواب بھی سوجھ گیا۔ میں نے کہا "تمہیں بتایا تو ہے گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اس وقت مکینک نے کہاں ملنا تھا۔ خود ہی نیچے گھس کر ٹھوکا ٹھاکی کرنی پڑی۔ یہ دیکھو ہاتھ بھی چھل گیا ہے۔"

"اوکے۔ گڈ نائٹ" اس نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ میرے جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔

انجم کی خاطر مجھے قریباً ایک گھنٹا اور انتظار کرنا پڑا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ گہری نیند سو گئی ہے اور اب دو تین گھنٹے تک کروٹ نہیں بدلے گی تو میں نے لباس بدلا اور دروازہ مقفل کر کے باہر نکل آیا۔ یہ نصف شب کا عمل تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر گلے ملنے کے لیے قریب تر ہو رہی تھیں۔ بالکونی میں نکلتے ہی سرد ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا۔ اس وقت گرم کمرے سے باہر نکلنا اور اپنی طرح کسی دوسرے کو بے آرام کرنا قطعی نامناسب تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ جو نامناسب تھا وہی مناسب ہو گیا تھا۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ان آنکھوں کی روشنی بجھا آیا تھا جو مجھ پر نگراں تھیں۔ اب ساہی صاحب سے ملاقات کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نپے تلے قدموں سے ساہی صاحب کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا اور دروازے پر دستک دی۔ میری تیسری یا چوتھی دستک پر اندر سے کسی کی خوابیدہ آواز ابھری۔ یقیناً یہ ساہی صاحب تھے "کون ہے؟" چند لمحے بعد دروازے کے بالکل قریب سے ان کی آواز آئی۔

"دروازہ کھولیے سر' آپ کے لیے ٹیلی گرام ہے" میں نے ویٹر کے لب و لہجے میں جواب دیا۔

چٹخنی نے حرکت کی اور دروازہ کھل گیا۔ میں اعشاریہ پچیس کا ریوالور پہلے ہی ہاتھ میں لے چکا تھا۔ جب ساہی صاحب نے مجھ پر نگاہ ڈالی' ریوالور کی سرد نال ان کی پیشانی کو چھو چکی تھی۔ ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ میں تیزی سے انہیں دھکیل کر اندر داخل ہوا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

کمرے میں نیلگوں بلب جل رہا تھا۔ بلب کی روشنی میں ساہی صاحب نے بغور میرا جائزہ لیا۔ وہ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں سے ان کے ذہن کی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ ان کے برق رفتار ذہن نے بڑی سرعت سے ماہ و سال کا فاصلہ طے کیا اور لاہور جیل میں پہنچ گیا۔ پھر ذرا سی دیر میں وہ مجھے پہچان گئے۔ ان کی کشادہ آنکھیں کچھ اور کشادہ ہو گئیں۔ شہادت کی انگلی میرے چہرے کی طرف اٹھی اور لرزاں ہونٹوں سے کانپتی آواز برآمد ہوئی "تم ۔۔۔ تم تو شاہ جہاں ہو' تم تو جیل میں تھے۔"

"بالکل صحیح پہچانا ہے آپ نے" میں نے سرگوشی کی۔ کسی قریبی کمرے سے مسز ساہی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کون ہے جی؟"

میں نے ساہی صاحب کی پیشانی پر ریوالور کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری آنکھوں کی خاموش ہدایت پر ساہی صاحب نے فوراً عمل کیا۔ وہ اپنی مرتعش آواز کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے بولے "کوئی نہیں' ویٹر تھا' سو جاؤ۔"

میں نے ریوالور پیشانی سے ہٹا کر ساہی صاحب کی کمر سے لگا دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے لیے مجھے خود پر بہت جبر کرنا پڑ رہا تھا "اس ساتھ والے کمرے میں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری بچی" ساہی صاحب نے جواب دیا۔

"اور پچھلے کمرے میں؟"

"بچے ملازم کے ساتھ سو رہے ہیں۔"

"کس کمرے میں جانا پسند کریں گے آپ؟" میں نے پوچھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" ساہی صاحب پہلی مرتبہ غرائے۔

"یہ آپ کو اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔"

"اس ریوالور کو جیب میں رکھ لو" وہ تحکم سے بولے "جب تک تم اس چھت تلے ہو' میں تمہارے خلاف کوئی

ایکشن نہیں لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

میں نے کہا "مجھے آپ کے وعدے پر سو جان سے اعتبار ہے لیکن آپ کے اہل خانہ نے تو کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ممکن ہے' آپ کا ملازم یا آپ کے لڑکوں میں سے کوئی فون کے ڈائل میں انگلی گھمادے۔"

"نہیں ہوگا ایسا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔"

میں نے ایک لفظ کہے بغیر ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ مجھے ساہی صاحب کے قول پر پورا اعتبار تھا۔ ساہی صاحب نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسری دستک پر اندر روشنی ہوئی' پھر دروازہ کھلا اور ایک قیامت چوکھٹ پر نظر آئی۔ وہ ایک حسین اور نوخیز لڑکی تھی۔ شب خوابی کے لبادے میں ملبوس اور سراپا نیند کے خمار میں چُور' کوئی کیمرا اسے اپنی آنکھ میں محفوظ کر لیتا تو خوابیدہ حُسن کے عنوان سے ایک شاہکار فوٹو گراف وجود میں آسکتا تھا۔ اس نے ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈالی پھر جھجک کر ایک بازو موڑا اور سینے پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سوالیہ نظریں ساہی صاحب کی طرف اٹھ گئیں۔

"بٹیا! مہمان آگئے ہیں۔ آپ ذرا ماما کے کمرے میں چلے جایئے۔"

دوشیزہ کے چہرے پر ناگواری کی شکن ابھر کر غائب ہوگئی "اوکے پاپا" وہ لہجے میں ملائمت سمیٹ کر بولی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ رخ پھیرتی اس کی نگاہیں پلٹیں اور ایک بار پھر میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ وہ میری شباہت میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے بغور دیکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ساہی صاحب کی طرف دیکھا۔ اس بار بھی اس کا انداز سوالیہ تھا۔ مجھے ساہی صاحب کی آنکھوں میں ہلکی سی سراسیمگی نظر آئی۔ کوئی بات تھی جو خاموشی کی زبان میں باپ بیٹی کے درمیان ہوئی تھی۔ پھر یہ بات بیٹی کے ہونٹوں پر بھی آگئی۔ وہ حیرت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"پاپا! یہ وہی تو نہیں۔ میرا مطلب ہے شاہ جہاں صاحب۔ جو لاہور جیل میں..."

"نہیں نہیں" برجستہ ساہی صاحب نے تیزی سے بیٹی کی بات کاٹی "یہ وہ نہیں ہیں' ایک پرانے واقف کار ہیں' اپنے کسی کام سے آئے ہیں۔"

"اوہ!" لڑکی کے ہونٹوں سے نکلا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی واپس کمرے میں گئی۔ غالباً بیڈ شیٹ درست کرنے گئی تھی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھوں میں لیڈیز شوز تھے۔ ایک ترچھی نظر مجھ پر ڈالتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم کمرے کے اندر آگئے۔

یہ کمرا خوب آراستہ تھا۔ فضا میں بھینی سی نسوانی مہک رچی بسی تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ساہی صاحب بھی سلیپنگ سوٹ میں تھے۔ وہ اب اپنے اعصاب پر مکمل قابو پا چکے تھے اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔

ایک سگریٹ سلگا کر بولے "غالباً تم نے بال رنگے ہوئے ہیں اور آنکھوں کا رنگ بھی تبدیل کر رکھا ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے" میں نے جواب دیا۔

"دو ڈھائی ماہ پہلے تمہارے فرار کی خبر میری نظروں سے گزری تھی لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم سے اس طرح ملاقات ہوگی۔"

"میرے وہم و گمان میں بھی بہت کچھ نہیں تھا ساہی صاحب' لیکن وہ سب کچھ ہوا ہے۔ میں جو بڑی خاموشی سے اٹک جیل میں اپنی سزا کے دن گن رہا تھا اچانک پھر طوفان کے دھارے پر بہنے لگا ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا' اچانک مجھ پر کیا بیتی ہے۔"

ساہی صاحب نے کہا "شاید تم مجھے کوئی کہانی سنا رہے ہو لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"میرے پاس آپ سے بھی کم وقت ہے ساہی صاحب" میں نے ترت جواب دیا "معلوم نہیں' کس گھڑی کیا آفت ٹوٹ پڑے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک ایسے شخص کو یہاں دیکھا ہے کہ آپ سنیں گے تو کئی راتوں تک آپ چین کی نیند سے محروم رہیں گے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ" وہ غرائے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر ساہی صاحب کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا "جناب! اب سے تقریباً چار گھنٹے پہلے نتھیا گلی کے مین بازار میں' میں نے شنکر شکرا کو ایک میڈیکل اسٹور سے نکلتے دیکھا ہے۔"

اپنا فقرہ ادا کر کے میں ساہی صاحب کے ردِعمل دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ میری اطلاع نے انہیں بُری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خاصے حیران ہوئے لیکن یہ حیرانی میری توقعات سے کم تھی۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ ساہی صاحب پہلے سے اس بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

وہ بولے "کہیں تم نے دھوکا تو نہیں کھایا۔"

"نہیں جناب۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے بہت قریب سے اسے دیکھا ہے۔ اس کا جھالا ہے اور نتھیا گلی کی

بھول بھلیوں میں اسے کھویا ہے۔"

ساہی صاحب کی فراخ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ میرے سینے پر گرے ہوئے کوہِ گراں کا کچھ بوجھ جیسے اچانک ساہی صاحب کے سینے پر منتقل ہوگیا تھا۔ وہ کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی آواز میں بولے "اگر واقعی ایسا ہے تو بہت تشویشناک ہے۔"

چند ہی لمحوں میں وہ ریوالور ہم دونوں کے درمیان سے ہٹ گیا تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے ساہی صاحب کی پیشانی کو چھوا تھا۔ ایک غم مشترک نے ہم دونوں کو مفرور اور جیلر کی نشستوں سے اٹھا کر ایک ہی ہموار مسند پر برابر برابر لا بٹھایا تھا۔ میرے خیال میں اعتبار کی وہ فضا جو میں بصد کوشش بھی قائم نہ کر سکتا' اس ایک نام نے پلک جھپکتے میں قائم کر دی تھی۔ بہرحال ساہی صاحب کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے فرار کی روداد شروع سے سننا چاہتے ہیں۔ میں تو خود یہ سب کچھ بتانے کو بے تاب تھا۔ ان کا مدعا زبان پر آتے ہی میں نے حقیقتِ حال کی کتاب ان کے سامنے کھول دی۔ میں نے اٹک جیل میں خود پر ہونے والے حملوں کے تذکرے سے اسٹارٹ لیا اور قادر زماں کی "مہمان نوازی" سے لے کر اپنی بہن کی بے بسی تک اور خود پر تھوپے گئے مشن سے لے کر شنکر شکرا کے دیدار تک سب کچھ ساہی صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ ان سے کچھ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میری زندگی... کا ایک ایک ورق ان کا پڑھا ہوا تھا۔ یہ نئے ورق بھی ان کی نظر میں آہی جاتے تھے' میں نہ پڑھتا تو وہ خود پڑھ لیتے۔ صرف میں نے ایک بات ان سے چھپائی تھی اور وہ یہ کہ میں جس شخص کو قتل کرنے جھنگ سے نکلا ہوا ہوں وہ خود ساہی صاحب ہیں۔ میری پوری کتھا سننے کے بعد انہوں نے ایک گہری آہ بھری اور ہاتھ پشت پر باندھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کا چہرہ اب اضطراب کی آماجگاہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے حالات پر غور کر رہے تھے' کہنے لگے "تمہاری باتوں سے شنکر شکرا اور قادر زماں کا تعلق ثابت ہوتا ہے۔"

"بالکل" میں نے جواب دیا "قادر زماں اس شخص کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے جو شنکر شکرا کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

وہ بولے "تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ اعلیٰ حکام شنکر کی آمد سے دو ہفتے قبل آگاہ ہو چکے ہیں۔ میں بذاتِ خود اس کی گرفتاری میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ یہ پورا کیس محکمے کی نگاہ میں ہے۔ میری نظر میں تو کوئی ایسا شخص یا پارٹی نہیں ہے جو پولیس کے علاوہ شنکر کی آمد سے آگاہ ہو اور اسے

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدرُوح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان۔
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۰/ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علم بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور۔
فون: ۷۲۲۳۸۵۲

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

مار گرانے کی فکر میں ہو۔"

میں نے جواب دیا "جناب! میں نے کب کہا ہے کہ میں جس شخص کو قتل کرنے نکلا ہوں وہ غیر سرکاری ہستی ہے یا پولیس سے اس کا تعلق نہیں۔"

"کیا مطلب؟" ساہی صاحب نے کہا۔ پھر اچانک ان کے چہرے پر زلزلے کے ابتدائی آثار نمودار ہوئے۔ ان کی کشادہ آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ وہ مرتعش آواز میں بولے "تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"وہی جو آپ سمجھ چکے ہیں" میں نے جواب دیا "میں ایک پولیس آفیسر کی جان لینے کے مشن پر ہوں اور الفردوس میں میری موجودگی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔"

ساہی صاحب کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہوا اور وہ عجیب لہجے میں بولے "جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں آپ ہی کے قتل پر مامور ہوں جناب۔ پچھلے تین روز سے ایک لڑکی کے ساتھ یہاں موجود ہوں اور آپ سے ملنے کا موقع تلاش کر رہا ہوں۔"

میرے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ ساہی صاحب کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ رینگ کر ریوالور سے قریب تر ہو گیا۔ میں ساہی صاحب کا پرستار تھا اور وہ میرے قدردان تھے لیکن یہ موت اور زندگی کا معاملہ تھا اور اس سے میری بہن کی جان اور آبرو بھی نتھی تھے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اگر ساہی صاحب مجھ پر قابو پا لیتے تو میں یہ بازی ہار جاتا اور نتیجے میں زمانے بھر کی سختیاں میری پھول جیسی بہن پر ٹوٹ پڑتیں۔ میں یہاں خود کو ساہی صاحب کے حوالے کرنے نہیں آیا تھا، ان سے ایک ڈیل کرنے آیا تھا، اور اس ڈیل کے دوران بہرحال مجھے واپسی کا راستہ کھلا رکھنا تھا۔ بے شک ساہی صاحب مجھے اس چھت تلے امان دے چکے تھے لیکن خود کو سو فیصد ان کے رحم و کرم پر چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

"ہاں ساہی صاحب" میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں آپ ہی کے قتل پر مامور ہوں اور یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ یہ ذمے داری اٹھانے پر کیوں مجبور ہوا ہوں۔ اب بتائیے مجھے کیا کرنا ہے اور میرا جو گناہ ہے وہ بھی مجھے بتا دیجیے۔ اگر اپنے جرائم کی سزا میں جیل کاٹنا میری ذمے داری تھی تو کیا جیل سے باہر میری آبرو کی حفاظت قانون کی ذمے داری نہیں تھی؟ اگر تھی تو پھر میری بہن کیوں اغوا ہوئی۔ کیوں اس حرامی قاررزماں کے عشرت کدے میں پہنچی اور کیوں اب تک وہاں ہے؟ ساہی صاحب! آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کیسی آگ سینے میں چھپائے ہوئے ہوں۔ تین برس پہلے لاہور جیل میں اس آگ کو آپ نے اپنی باتوں سے مدھم کیا تھا۔ اب یہ آگ بھڑ بن کر مجھے چاٹ رہی ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں ساہی صاحب اس دفعہ بہت کچھ جل جائے گا" میرا لہجہ بتدریج کرخت و تند ہو رہا تھا۔

اچانک بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ساہی صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف الفردوس کا منیجر تھا۔ میں نے اسے اس کی آواز سے پہچانا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ میرے کان دروازے کی دوسری جانب سے آنے والی آوازوں پر لگ گئے۔ منیجر حادثے کا ذکر کر رہا تھا۔ گفتگو میں دو تین بار کار کا ذکر آیا تو پوری توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ چند قدم چل کر میں کھڑکی کی طرف آیا۔ یہاں سے راہداری میں ہونے والی گفتگو واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ منیجر ساہی صاحب کو بتا رہا تھا الفردوس میں ٹھہرا ہوا گلزار نامی ایک شخص کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص ہلاک ہوا ہے۔ دونوں کی لاشیں اور تباہ شدہ کار ابھی تھوڑی دیر پہلے نتھیا گلی جانے والی سڑک کے کنارے ملی ہے۔ پولیس کی طرف سے منیجر حسنین شاہ کو بلاوا آیا تھا اور وہ ساہی صاحب سے درخواست کرنے آ دھمکا تھا کہ وہ متعلقہ انسپکٹر کو ایک کال کر دیں تاکہ معاملہ الجھنے نہ پائے۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ حادثے میں تباہ ہونے والی کار "الفردوس" کی ملکیت تھی۔ منیجر حسنین شاہ نہ صرف ساہی صاحب کو جانتا تھا بلکہ ان سے قریبی مراسم بھی رکھتا تھا۔ ساہی صاحب نے اس سے متعلقہ تھانے کا فون نمبر لیا اور کال کا وعدہ کر کے رخصت کر دیا۔ ساہی صاحب کے لوٹنے سے پہلے میں صوفے پر آ بیٹھا۔

وہ آئے تو میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولے "ایک حادثہ ہو گیا ہے مین روڈ پر دو افراد مارے گئے ہیں۔ شاید ڈرائیور نشے میں تھا۔"

پھر وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھے اور متعلقہ تھانے کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ تین چار مرتبہ ڈائل کرنے کے باوجود ناکامی ہوئی۔ اس دوران منیجر حسنین پھر دروازے پر آ دھمکا۔ لگتا تھا متعلقہ پولیس آفیسر سے اس کی کوئی رنجش ہے جس کے سبب وہ تنہا پولیس اسٹیشن جاتے گھبرا رہا تھا۔ مختصر گفتگو کے بعد ساہی کمرے میں واپس آئے۔ مجھ سے کہا "مجھے تھوڑی دیر کے لیے منیجر کے ساتھ جانا ہے۔ تم اپنے روم میں واپس جاؤ۔ میں ابھی ایک گھنٹے میں تم سے پھر رابطہ کرتا ہوں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا اور ان کے ساتھ ہی باہر راہداری میں آ گیا۔

جونہی میں راہداری میں پہنچا ایک سایہ سا ستون کی اوٹ سے نکلا اور عفریت کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے عقب سے مجھے یوں جکڑا کہ میرے دونوں بازو اس کے بیچ میں آ گئے۔ ایک سفید پوش شخص سامنے سے برآمد ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں جان گیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس والا ہے۔ ہاتھ گھما کر ایک طوفانی مکا اس نے میرے جبڑے پر رسید کیا۔ میں نے جھکا کر سر کے پچھلے حصے کی ضرب جپھا مارنے والے کی ناک پر رسید کی۔ گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو میں تیزی سے الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور اسے ایک دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس نے کراہ کر مجھے اپنے بازوؤں سے آزاد کیا۔ مکا مارنے والا سادہ پوش پھر میری طرف جھپٹ رہا تھا۔ میں نے سیدھی ٹانگ اس کے سینے پر رسید کی اور وہ ہوا میں اچھل کر ساہی صاحب کے قدموں میں گرا۔ راہداری میں ایک دم ہی ہنگامہ دھماچوکڑی مچ گئی تھی۔ دو سادہ پوشوں کو پسپا کر کے میں پوری قوت سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ ذہن میں یہی خیال تھا کہ ساہی صاحب نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ انہوں نے اپنا وعدہ اس طرح نبھایا ہے کہ نبھا بھی دیا ہے اور توڑ بھی دیا ہے۔ اپنی چھت تلے انہوں نے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا لیکن جونہی راہداری میں نکلا، مجھ پر سادہ پوش چھوڑ دیے ہیں۔ سرخ قالین سے ڈھکی ہوئی سیڑھیاں مجھ سے قریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ان سیڑھیوں تک پہنچ گیا تو سادہ پوش میری گرد بھی نہ پا سکیں گے لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ابھی میں نے سیڑھیوں کی طرف نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ عقب سے کسی نے چلا کر مجھے رکنے کی وارننگ دی۔ اس کے ساتھ ہی فائر ہوا۔ معلوم نہیں یہ ہوائی فائر تھا یا سیدھا، بہرحال گولی مجھے لگی نہیں۔ فائر ہوتے ہی سیڑھیوں سے دو اور سپاہی نمودار ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی کلاشنکوف تھی۔ چند ہی لمحوں میں میں بدترین صورت حال کا شکار ہو چکا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے ڈب کی جیب سے ریوالور نکال لیا تھا لیکن دونوں طرف سے گھر جانے کے بعد یہ ریوالور چلانا اپنی بدقسمتی پر مہر تصدیق ثبت کرنا تھا۔ راہداری کے عین وسط میں پہنچ کر میں نے رخ پھیرا اور چند قدم بھاگ کر پوری قوت سے ایک بغلی دروازے کو کندھے کی ٹکر رسید کی۔ ان دروازوں کی چٹخنیاں میری دیکھی بھالی تھیں۔ مجھے یقین کامل تھا کہ یہ ٹکر کارگر ثابت ہو گی۔ مجھے اپنے تخمینے پر شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ کندھے کی ضرب سے چٹخنی ٹوٹ گئی۔ میں بگولے کی طرح اندر گھسا۔ یہاں نائٹ بلب روشن تھا۔ وسیع بیڈ پر ایک "جوڑا" پھٹی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک ہی کمبل کو یوں مضبوطی سے تھام رکھا تھا جیسے وہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تو متاع حیات ان سے چھن جائے گی۔ میں ریوالور بدست ان کی طرف بڑھا تو لڑکی نے ایک سریلی چیخ کے ساتھ "متاع حیات" کو ہاتھ سے گرا دیا اور متاع جسم و جاں کو سمیٹ کر باتھ روم کی طرف بھاگی۔ بیڈ سے باتھ روم کے دروازے تک جیسے ایک روشن لکیر سی لپک گئی۔ لڑکی کا ساتھی کمبل سمیت ایک کونے میں دبک گیا اور "ڈیئر، ڈیئر" چلانے لگا۔ میں سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر جھپٹا۔ پٹ کھولے اور بلا دریغ باہر کود گیا۔ میرے پاؤں چند فٹ نیچے ہموار چھجے پر آ ٹکے۔ چھجا سڑک سے قریباً پندرہ فٹ بلند تھا۔ میں لٹک کر بہ آسانی نیچے کود سکتا تھا لیکن جس جگہ مجھے کودنا تھا عین وہیں پولیس کی ایک پٹرولنگ گاڑی کھڑی تھی اور اس میں موجود مسلح جوان میرے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ یقینی بات تھی کہ عمارت کے اندر ہونے والے پہلے فائر نے ان کو چاروں سمت چوکس کر رکھا تھا۔

"خبردار ارے" ایک حوالدار نما شخص کے حلق سے خطرناک آواز نکلی "اپنی جگہ کھڑے رہو نہیں تو گولی چلا دوں گا۔"

اس کے ہاتھ میں ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ کے پاس کھڑے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بھی رائفل کی نال میری طرف سیدھی کر لی تھی۔ میری انگلی ریوالور کے ٹریگر پر مچلی لیکن مجھے معلوم تھا گولی چلانا بہت مہنگا سودا ہے۔ کھڑکی سے سادہ پوش کود کر چھجے پر پہنچے اور انہوں نے تین اطراف سے مجھے دبوچ لیا۔

○☆○

نیم تاریک لاک اپ میں ٹھنڈے ٹھار فرش پر بیٹھا میں آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ ساہی صاحب کا میری نگاہوں میں ایک مقام تھا بلکہ اگر میں کہوں کہ میری زندگی کے تند و تیز ریلے کو ایک مدھم ہموار ندی کا روپ دینے میں میری بہن شگفتہ کے بعد ساہی صاحب کا سب سے زیادہ رول تھا تو بے جا نہ ہو گا لیکن ساہی صاحب نے آج مجھ سے جو سلوک کیا تھا وہ کسی طور ان کے شایان شان نہ تھا۔ میری

پوری پچاس کر بھی ان کے دل میں میرے لیے رحم کی رمق پیدا نہیں ہوئی تھی اور یہ جان کر بھی کہ قادر زماں اور شکر شکرا جیسے لوگ میرے گرد منڈلا رہے ہیں انہوں نے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ موقع ملتے ہی انہوں نے مجھے بے دست وپا کیا تھا اور اس تاریک حوالات میں پہنچا دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ نذیر حسین سے ملنے کمرے سے نکلے تھے تو اسے کوئی اشارہ دے آئے تھے۔ نتیجے میں پولیس موقع پر پہنچ گئی اور جب میں کمرے سے نکلا تو دھر لیا گیا لیکن اب ایک بات مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ کمرے کے باہر مجھے دبوچنے والے سادہ پوش مقامی نہیں تھے۔ وہ سب کے سب میانوالی کی طرف کے اونچے لمبے "ڈھول سپاہی" تھے اور بوقت گرفتاری انہوں نے مجھے جن گالیوں سے نوازا تھا وہ بھی غیر مقامی لب ولہجے میں تھیں (گرفتاری کے وقت اور پھر گاڑی میں میرے ساتھ کافی مارپیٹ بھی کی گئی تھی۔ میرا گریبان اُدھڑ چکا تھا اور چہرے پر گہرے نیل تھے)

میں اس تاریک لاک اپ میں قریباً دو گھنٹے بند رہا۔ اس دوران کوئی انسانی صورت دکھائی دی نہ کوئی "آہٹ آواز" کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ غالباً نتھیا گلی کی کوئی مضافاتی چوکی تھی۔ اجاڑ بیابان اور منفی دو درجۂ حرارت پہ برف خانہ ہی ہوتی۔ گرفتاری کے وقت لباس اور جوتوں کے سوا ہر چیز میرے جسم سے علیحدہ کر لی گئی تھی۔ اس میں دستی گھڑی بھی شامل تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ نو ساڑھے نو کا وقت ہے لیکن دن کی روشنی بھی لاک اپ سے اتنی ہی دور تھی جتنی میرے جسم سے زندگی کی حرارت۔ مجھے یقین تھا کہ اس یخ بستہ بدبودار لاک اپ میں حوالاتی پر کوئی تشدد نہ کیا جائے تو بھی وہ ایک دو روز میں سب کردہ ناکردہ گناہ قبول کر لیتا ہوگا۔

مجھے بڑے زور کا پیشاب لگ رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں نے برداشت کیا پھر اونچی آواز میں "کوئی ہے۔ کوئی ہے" کی آوازیں لگانے لگا۔ تین چار منٹ کی مسلسل آوازوں کے بعد ایک انسانی چہرہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اوپر کو اٹھی ہوئی نوکدار مونچھوں والا یہ ایک مریل سا سنتری تھا۔ وہ اپنی کڑک دار آواز میں بولا "تو یوں لگ کر لوٹے میں سے بالٹی بھر پانی نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"کون مر گیا ہے؟ کیوں بین کر رہے ہو؟" اس نے گرج کر کہا۔

میں نے جواب دیا "ابھی تو کوئی نہیں مرا لیکن مر جائے گا۔ مجھے سخت پیشاب آ رہا ہے۔ مثانہ پھٹ جائے گا۔"

وہ بولا "یہ حوالات ہے لالہ! یہاں بہت کچھ پھٹتا ہے ایک تمہارا مثانہ پھٹ جائے گا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔"

"میرے لیے تو قیامت آ جائے گی" میں نے کراہ کر کہا "دیکھو! میں تم سے دل لگی نہیں کر رہا۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔"

"کیا دے سکتے ہو تکلیف رفع کرانے کا؟"

"آدھی سلطنت دے سکتا ہوں" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

"کیا مطلب!" سنتری نے پوچھا۔

"فی الحال تو دعائیں دے سکتا ہوں" میں نے بات بدلی "ضمانت ہو گئی تو جو کہو گے دے دوں گا۔" ایسے بدترین حالات میں اکثر میری حسِ مزاح جاگ اٹھتی تھی۔

"دیکھو! یہاں ریٹ مقرر ہیں" وہ سنجیدگی سے بولا "بڑے کے دو روپے، پیشاب پانچ روپے، بڑا پیشاب ایک بار مفت پھر ہر بار دس روپے لیے جاتے ہیں۔ خالی سگرٹ (سگریٹ) آٹھ آنے، بھرا ہوا چار روپے لیکن یہ سارے ریٹ نقد ہیں۔ ادھار بھی چلتا ہے لیکن بندہ اعتباری ہونا چاہیے اور ریٹ بھی ڈبل ہو گی۔"

"میں ڈبل ریٹ دینے کو تیار ہوں اور اعتبار ابھی ثبوت کے کرنا ہوگا کیونکہ میری گاڑی چھوٹنے والی ہے۔"

وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔ مجھ سے ایک قسم لی۔ کسی نذر حسین کو آوازیں دینے لگا۔ کہیں قریب سے قدموں کی ٹھک ٹھک ابھری اور ایک ہٹا کٹا ہیڈ کانسٹیبل رائفل بدوش آن پہنچا۔ اس کی آمد پر مریل سنتری نے ایک ترپ کھونٹی سے چابیوں کا گچھا اتارا اور لاک اپ کا تالا کھولنے لگا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ انگلیوں کی پوروں میں سنسناہٹ جاگ اٹھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ سنتری نے اپنے دستانہ پوش ہاتھوں سے تالا کھولا، کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس وقت ایک گرجدار آواز نے ہم تینوں کو گڑبڑا دیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، میرے سامنے ایک جیلر ساڑھے چھ فٹا جیلر عادل خان کھڑا تھا۔ یہ وہی تند خو شخص تھا جس نے جیل میں نور محمد کی موت کے بعد مجھے کالو جانی کو بے طرح پیٹا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں قہر اترا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک انسپکٹر اور چند دوسرے پولیس والے تھے۔ وہ تیزی سے بڑھا اور مریل سنتری کو اپنے ہاتھ سے دھکیل کر دور ہٹا دیا۔

"پاگل کے بچے ہو تم" وہ سنتری پر دہاڑا "کس نے کہا تھا تمہیں تالا کھولنے کو" پھر وہ انسپکٹر کی طرف گھوما "کیا کر رہا تھا تمہارا یہ سنتری؟ جانتے ہو کون ہے جسے باہر نکال رہے ہو تم؟"

انسپکٹر نے قہر آلود نظروں سے اپنے سنتری کو گھورا۔ اس نے پہلے تو ایک لرزہ کانپتا سیلوٹ کیا پھر ہکلا کر بولا "یہ مہا نجی۔ بڑے زور کا پیشاب لگا ہے۔"

"اور تم اسے پیشاب کرانے کے لیے باہر نکال رہے تھے؟" عادل خان نے طنزیہ لہجے میں بات مکمل کی۔

"جج.....جی ہاں۔"

"بے حرامی! تم سب کو اپنے پیشاب میں بہا کے بھاگ جاتا" عادل خان نے دانت کچکچائے۔

پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے دروازے کو دوبارہ تالا لگایا اور کچھ دیر مجھے اڑنے بھینسے کے مانند گھورنے کے بعد انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ انسپکٹر نے ایک رجسٹر عادل خان کی طرف بڑھا دیا۔

جیلر عادل خان نے کوئی تحریر پڑھنے کے بعد اس پر دستخط کیے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے خوف ناک ترین دھمکیاں دینے کے بعد باہر نکل گیا۔

میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری گرفتاری کیسے عمل میں آئی ہے۔ اگر یہ سب ساہی صاحب کا کیا دھرا تھا تو پھر یہ جیلر عادل خان آناً فاناً اٹک جیل سے یہاں کیسے آن ٹپکا تھا اور وہ میانوالی کے سادہ پوش۔ یہ معاملہ کچھ الجھا ہوا لگتا تھا۔ میں اس سردی مارے لاک اپ میں دوپہر تک بیٹھا رہا اور خود کو بدترین حالات کے لیے تیار کرتا رہا۔ کسی قریبی کمرے سے جو تند و تیز آوازیں آ رہی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند افراد میں گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ آوازوں میں عادل خان کی آواز نمایاں تھی۔ گاہے گاہے وہ بھڑک کر زور سے بولنے لگتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس بحث میں اٹک جیل کا ایک اور افسر بھی شریک ہے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ٹرنک کال کرتے ہوئے زور زور سے باتیں بھی کیں۔ اسی گفتگو میں میرا نام اور کسی انچارج لیبر کا ذکر آیا۔ دوپہر کے فوراً بعد حالات نے پلٹا کھایا اور میں ایک بار پھر ششدر رہ گیا۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مقامی پولیس انسپکٹر سمیت تین چار افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ساہی صاحب بھی تھے۔ وہ اس وقت پینٹ کوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کی نگاہوں میں مجھے پہلے سے بڑی اپنائیت محسوس ہوئی۔ لاغر سنتری نے لپک کر میرے قفس کا دروازہ کھولا اور میں پھڑپھڑا کر باہر آ گیا۔ میری سوالیہ نظریں ساہی صاحب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آؤ" انہوں نے ہمدردی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں ان کے ساتھ چلتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ یہاں تاریک شیشوں والی ایک بند ویگن کھڑی تھی۔ میں ساہی صاحب کے ساتھ اس اسٹیشن ویگن میں سوار ہو گیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہ اسٹیشن ویگن ایک بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔

O☆O

یہ نہایت خوب صورتی سے آراستہ ایک کاٹیج نما جگہ تھی۔ نشست گاہ کے شیشوں سے دور تک وادی کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس وادی کی ایک طرف نتھیا گلی اور دوسری جانب مری کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ وادی میں دور نیچے چمکتی چھتوں والے لاتعداد مکانات تھے اور ان کے درمیان ہریالی اور راستے کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ نشست گاہ میں الیکٹرک ہیٹر لگے تھے اور ان کی خوشگوار حرارت میں مجھے اپنی جسمانی چوٹوں کی شدت کم محسوس ہونے لگی۔

ساہی صاحب نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا "میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اپارٹمنٹ سے نکلتے ہی تمہیں دبوچ لیا جائے گا۔ یہ لوگ دراصل جھنگ سے ہی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ پہلے تمہیں جھنگ کے اس ہوٹل میں گرفتار کرنے کا پروگرام بنایا گیا جہاں تم نے ساتھی لڑکی کے ساتھ ناشتا کیا تھا لیکن پھر تمہارے تعاقب کو طول دیا گیا۔ مری اور نتھیا گلی کے راستے میں کہیں پولیس پارٹی تمہیں کھو بیٹھی۔ دراصل ان کی گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ بہرحال وہ مسلسل تمہاری تلاش میں رہے اور کل رات الفردوس میں انہوں نے تمہارا کھوج لگا لیا۔ اٹک جیل کے جیلر عادل خاں ان تمام حالات سے باخبر تھے۔ رات الفردوس میں چھاپے کی نگرانی بھی انہوں نے خود کی۔"

میں ساہی صاحب کی گفتگو کامل اطمینان سے سنتا رہا۔ میری باری آئی تو میں نے صرف ایک فقرہ کہا "اب میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟"

وہ بولے "حکم نہیں دینا! ایک نہایت اہم مشورہ کرنا ہے تم سے۔"

"قانون کے محافظ کا مشورہ مجرم سے! یہ کیسی بات کر رہے ہیں آپ؟"

وہ بولے "تم مجرم ہوتے تو اس وقت یہاں نظر نہ آتے۔ اسی حالات میں اخبار در گزرے ہوتے۔ میرا جرائم اعتمادات

ہر تمہیں یہاں لایا ہوں تو اس کا کوئی جواز ہے۔"

"آپ کا یہ جواز بہت سے لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا جناب۔ آپ کس کس سے لڑیں گے؟"

"یہ میرا معاملہ ہے' تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بلکہ میرا خیال ہے ابھی ایک آدھ روز تک تم مکمل آرام کرو' کچھ ذہنی سکون ہو تو پھر تسلی سے بات کریں گے۔"

"ذہنی سکون اور تسلی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔ میری معصوم بہن اس درندے کے جنگل میں ہے۔ کاش آپ میری جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیے۔ کاش!"

"سوچ رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔ تمہیں کیا معلوم' میں کیا سوچ رہا ہوں۔ تسلی رکھو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

ساہی صاحب کے لہجے میں یقین کی ایسی جھلک تھی کہ لمحوں میں مرجھائے دل کی کلی میں جان دوڑ گئی۔ یقیناً وہ کوئی ایسی بات جانتے تھے جو میں نہیں جانتا تھا یا پھر وہ حالات کا رہ پہلو دیکھ رہے تھے جو میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ مجھے اپنی طرف سے مکمل سکون آرام فراہم کرنے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ انہوں نے کہا کہ اب کل صبح ملاقات ہوگی۔ جاتے جاتے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انجم تھوڑی دیر میں الفردوس سے یہاں میرے پاس پہنچ جائے گی۔

میں حالات کی اس تبدیلی پر محو حیرت تھا۔ یہ بات تو اب میرے ذہن میں صاف ہو گئی تھی کہ میری اچانک گرفتاری میں ساہی صاحب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن ابھی تک یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں واقعی دوبارہ چھوٹ گیا ہوں' میں کوئی معمولی حوالاتی نہیں تھا۔ میں ایک کروڑپتی عرب' شیخ راشد بن ارشد کا قاتل تھا اور اس جرم میں طویل سزا بھگت رہا تھا۔ اب پھر میں نے "جیل توڑی" تھی اور باہر نکل کر دو بندے مزید انا بلند کر دیے تھے (یہ اور بات ہے کہ میری اس کارروائی کا ابھی تک کسی کو علم نہیں تھا) اس کے علاوہ فرار کے بعد دو ہیڈ کانسٹیبل حضرات کو زخمی کرنے کا الزام بھی میرے سر آچکا تھا۔ ایسی چارج شیٹ کے ہوتے ہوئے ساہی صاحب مجھے یوں پولیس اسٹیشن سے اٹھا لائے تھے جیسے بارش کے آثار دیکھ کر باپ' بیٹے کو اسکول سے چھٹی کرالاتا ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو پھر یقیناً ان کے سامنے کوئی نہایت اہم معاملہ تھا اور اس معاملے میں انہیں دیگر اعلیٰ افسران کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی' اس "کو آپریشن" کے بغیر یہ

اس لائن پر سوچتے ہوئے میرا ذہن خود بخود شکر شکرا کی طرف جانے لگا۔ کہیں۔۔۔ کہیں ساہی صاحب مجھے اس شیطان کے مقابل تو نہیں لانا چاہتے۔ شکر شکرا جیسے وحشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا کسی عام شخص کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ماضی میں جن معدودے چند افراد نے اس کے سامنے خم ٹھونکنے کی جرات کی تھی اور اب تک حیات تھے ان میں سے ایک ناچیز میں بھی تھا۔ شاید میرے اسی نادر تجربے سے فائدہ اٹھانے کے لیے مجھے اس برفاب لاک اپ سے نکال کر فرحت بخش حرارت میں پہنچایا گیا تھا۔ حرارت کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں ننھا منا کلی کی تمام خنکی لہرا دوڑ گئی۔ "کیا مجھے ایک مرتبہ پھر شکر شکرا سے آنکھیں چار کرنا ہوں گی؟" یہ خیال سوہان روح تھا۔

یکایک مجھے اپنے خیالات سے چونکنا پڑا۔ کاٹیج کے دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ دروازہ ہونے۔ کسی نے چوکیدار سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا پھر سبک قدموں سے نشست گاہ کی طرف آیا۔ قدموں کی چاپ بتا رہی تھی کہ یہ کوئی لڑکی ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساہی صاحب کو گئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ یقیناً یہ انجم ہی تھی۔ میں اس کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا اور ذہن میں وہ الفاظ دہرانے لگا جو مجھے معذرت میں اس سے کہنے تھے۔

دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ "کم ان" میں نے کہا۔

دروازہ کھلا تو میں ششدر رہ گیا۔ انجم کے بجائے حور شمائل' پری پیکر سامنے کھڑی تھی جس سے راشد صاحب کے اپارٹمنٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہلکے لباس میں وہ سراپا رعنائی تھی۔ اس نے ہیکی سی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ پارس میں جو گرتے تھے اس انداز سے "السلام علیکم" کہا اور اندر آگئی۔

"آپ یہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں" وہ بغور میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ تو خود خدمت کے قابل نظر آرہے ہیں!" افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ اس کی نگاہیں چہرے کے نیلگوں ابھاروں پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں سمجھا نہیں" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"لگتا ہے' انہوں نے کافی مارا ہے آپ کو۔ آپ کو کچھ نہ ہوا ہو تا۔"

"آپ کو [illegible] کیسے [illegible] سمجھا" "آپ

وقت یہاں آنا چاہیے تھا۔ کیا آپ نے ڈیڈی سے اجازت لی ہے؟"

"یہ میرا اور ڈیڈی کا معاملہ ہے۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ ہیں کون؟" لڑکی کے لہجے میں ٹین ایجرز کی مخصوص شوخی اور خود سری تھی۔

"میں آپ کے ڈیڈی کا ایک دیرینہ شناسا ہوں۔ میرا نام احسان الٰہی ہے اور گجرات سے آیا ہوں۔"

وہ بولی "یہ تو وہ کوائف ہیں جو الفردوس کے رجسٹر میں درج ہیں۔ میں آپ سے اصل تعارف حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"غالباً آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں۔"

اس نے ہینڈ بیگ کھول کر اندر سے اخبار کے چند پرانے تراشے نکالے۔ ان تراشوں کو بڑی احتیاط سے تہ کر کے رکھا گیا تھا۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ ان تراشوں میں میری تصویریں تھیں اور عرب شیخ کے قتل کی تفصیلات تھیں۔ یہ سب کچھ تقریباً سات برس پہلے شائع ہوا تھا۔ لڑکی نے ایک تراشا کھول کر تصویر سامنے کی اور اس کا موازنہ میرے چہرے سے کرنے لگی۔ پھر تصویر میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی "دیکھیے' یہ کس کی تصویر ہے؟"

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

وہ ایک دم میرے قریب آگئی۔ اتنا قریب کہ اس کے کنوارے بدن کی مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی اور سانسوں کی حدت گالوں سے ٹکرانے لگی۔ اس کا جسم چند انچ مزید پیش قدمی کرتا تو فاصلے کا تصور ختم ہو جاتا۔ وہ عجب بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے رخ پھیرا اور بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کی آنکھوں پر رنگدار لینس ہیں۔ اور بال بھی ڈائی کیے ہوئے ہیں" بڑے اعتماد سے اس نے اعلان کیا۔ میں نے اس موقعے پر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ ایسے میں اس کے دانت گلابی ہونٹوں کے درمیان لشکارے مارنے لگے۔ وہ تراشیدہ بالوں کو پیشانی سے جھٹک کر بولی "میرا خیال ہے' اب آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ ہی شاہ جہاں ہیں۔"

میں نے لاتعلقی سے کہا "میں کہہ چکا ہوں' آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

وہ بولی "یعنی آپ نے طے کر رکھا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے مانیں گے نہیں۔ چلیں ایسے ہی سہی۔ اگر آپ خود کو فریب دینا چاہتے ہیں تو دیتے رہیں۔ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ میں آپ کو احسان الٰہی کہہ لوں گی" اپنے شوخ لہجے پر وہ خود ہی ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "اگر آپ ڈیڈی سے پوچھے بغیر آئی ہیں۔ تو میرے خیال میں' اب آپ کو رکنا نہیں چاہیے۔"

"کیوں۔ مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟" وہ بات کا رخ خواہ مخواہ دوسری طرف موڑ لے گئی "جناب احسان صاحب! خطرہ اس سے ہوتا ہے جو اجنبی ہو۔ دیکھا بھالا نہ ہو۔ میں تو آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ اوہ سوری' میرا مطلب ہے شاہ جہاں صاحب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ شاید شاہ جہاں بھی اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتے ہوں گے۔ میرے گھر میں اکثر ان کی باتیں ہوئی ہیں۔ ان کی کہانیاں سنائی گئی ہیں۔ ان کی بہادری' ذہانت اور شرافت کے تذکرے ہوئے ہیں۔ میں چاہوں تو ان سے پوچھے بغیر ان کی بائیوگرافی لکھ سکتی ہوں۔"

تب میں نے کہا "لیکن یہ باتیں آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"یوں ہی" وہ ٹھوڑی کو ہاتھوں کے پیالے میں ٹکا کر بولی "جو اچھا لگے اس کا تذکرہ کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ سچ پوچھیے احسان صاحب تو میں بہت امپریس ہوں شاہ جہاں صاحب سے۔ پتا نہیں کیوں وہ میرا آئیڈیل بن چکے ہیں۔ بہت سوچتی ہوں ان کے بارے میں۔ دل چاہتا ہے کبھی ان سے ملاقات ہو۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھوں' پہروں ان سے باتیں کروں۔ ان کے حالات سنوں' ان کے تجربات سے "گین" کروں۔"

میں دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگا۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ وہ کچی عمر کی نادان لڑکی تھی اور ساہی صاحب کی بیٹی تھی۔ اس کے بارے میں ایسے ویسے خیال کا گزر بھی میرے دل میں نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ اتنی بے باک اور صاف گو تھی کہ اس کی باتوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔

میں نے اسے اس کی عمر کا احساس دلانے کے لیے انداز تخاطب کو بدلا "دیکھو بے بی' میں اگر اس کاٹیج میں ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ ساہی صاحب میری یہاں موجودگی کو چھپانا چاہتے ہیں' تمہارا یہاں آنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ اب یہاں اپنا وقت ضائع کر کے تم بڑی غلطی کر رہی ہو۔"

اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور مزید تسلی سے بیٹھ گئی "جناب احسان صاحب! آپ مجھے انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کا قصور نہیں' شاید میری شکل ہی ایسی ہے

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کافی حد تک ذہین اور باخبر واقع ہوئی ہوں" اس نے بڑی ادا سے گردن مٹکائی۔

باخبری کا دعویٰ سن کر میں نے بھی پینترا بدلا "مثلاً کیا اطلاع ہے تمہیں؟"

وہ مسکرائی "بہت اطلاعات ہیں بلکہ آپ اس وقت مجھے وزیر اطلاعات بھی کہہ سکتے ہیں لیکن مت سمجھیے کہ میں شیخی میں آ کر آپ کو کچھ بتا رہی ہوں گی۔ اوں ہوں — ناممکن' میں بتا چکی ہوں آپ کو کہ باخبر ہونے کے علاوہ میں — ذہین بھی ہوں۔"

میرے تاثرات پھر گہری سنجیدگی میں ڈھل گئے لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی یخ بستہ فقرہ اس کی طرف اچھالتا یا خود ہی صوفے سے اچھل کر باہر نکل جاتا' وہ تیزی سے بولی "نہیں — نہیں۔ اتنی مایوسی صورت مت بنایئے۔ میں آپ کو اپنی معلومات سے آگاہ کرتی ہوں۔ دیکھیے مجھے پتا ہے کہ آپ — اوہ سوری شاہ جہاں صاحب' ایک نہایت — نہایت خطرناک "فائٹر" ہیں۔ چار پانچ آدمیوں سے بیک وقت لڑنا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک طرف رکھ دینا شاہ جہاں صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ نے امارات کے ایک شہزادے کو قتل کیا تھا۔ اس قتل کے بعد آپ کافی عرصے روپوش رہے تھے۔ یہ ہاتھ پاؤں توڑنے کا فن اسی عرصۂ روپوشی میں ہی آپ نے کہیں سے سیکھا تھا اور پھر واپس آ کر خاص و عام میں دھومیں مچائی تھیں۔ آپ کو عام لوگ استاد جہانی کے نام سے یاد کرنے لگے تھے' یہاں تک کہ —"

"کیا تم خاموش نہیں رہ سکتیں؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے سہمنے کی ایکٹنگ کی اور قالین کے بیل بوٹوں کو گھورنے لگی۔

وہ جان بوجھ کر گفتگو کا رخ اپنے من چاہے موضوع کی طرف موڑ رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولی "عجیب بات ہے۔ آپ خود ہی سوال پوچھتے ہیں اور جب جواب دیا جاتا ہے تو بگڑ جاتے ہیں — آخر چاہتے کیا ہیں آپ؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اس چھت تلے تنہا چھوڑ دیں" میں نے بڑی واضح بے رخی سے کہا۔

"ارے' آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئے" وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی "اچھا جی ٹھیک ہے — اب ہم سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن جناب! یہ باتیں ہم دونوں کے درمیان رہنی چاہئیں قطعی طور پر۔"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اچھل کر صوفے سے اٹھی اور کمال دلیری سے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی پھر بند کھڑکیوں پر ایک نظر ڈال کر بے تکلفی سے میرے سامنے آ بیٹھی۔

"شاہ جہاں صاحب — اررر احسان صاحب! اپنی باخبریاں آپ کو گنوانے لگی تو آپ سٹپٹا کر رہ جائیں گے" وہ بولی "فی الحال یہ جان جایئے کہ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ میں آغا قادر زماں' شگفتہ عرف شفتا' انڈین ایجنٹ شکر شکرا اور آپ کی ساتھی انجم وغیرہ کے بارے میں چیدہ چیدہ اور ضروری ضروری ساری باتیں جان چکی ہوں۔ پورے کے پورے حالات میرے سامنے ہیں' آنے والے واقعات کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے کھنچا ہوا ہے — جی ہاں' میں بتا چکی ہوں بڑی خرانٹ لڑکی ہوں میں۔ پتا نہیں کیسے — کیسے میری چھٹی حس مجھے بہت سی باتوں کا پتا دے دیتی ہے۔"

میں سچ مچ حیران ہو گیا اور تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے یوں آلتی پالتی ماری کہ جوتوں کے تلوے صوفے اور اس کی شلوار سے دور رہے۔ بڑی چمک تھی اس کے نوخیز ٹخنوں میں۔ داہنی کہنی داہنی ران پر رکھ کر اس نے ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکائی اور بولی "پاپا مجھ سے ہر معاملے میں گفتگو کرتے ہیں۔ چند روز پہلے انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ضلع جھنگ کے دو تین بڑے زمینداروں کے خلاف ایکشن ہونے والا ہے۔ اس سلسلے میں اوپر کی سطح پر تیاری ہو رہی ہے اور جلد ہی چھاپے پڑیں گے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ یہ زمیندار اپنے اپنے علاقے میں بہت بااثر اور خود سر ہیں۔ ان کے خلاف انتظامیہ کو مسلسل رپورٹیں مل رہی ہیں — اب میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہو نہ ہو ان زمینداروں میں قادر زماں بھی شامل ہے۔" اس نے رک کر میرے تاثرات کا جائزہ لیا اور بولی "بلکہ — میرا خیال ہے' میں آپ کو بتا ہی دوں کہ ان میں قادر زماں بھی شامل ہے۔ ضلعی انتظامیہ ان زمینداروں پر بڑا کڑا ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں پچھلے کئی ماہ سے ہوم ورک جاری تھا۔"

میرے دل میں امید کی کونپل پھوٹنے لگی۔ شاید میں بتانا بھول گیا' ساہی صاحب کی صاحب زادی کا نام فریال تھا۔ فریال کی باتوں میں وزن تھا اور لہجے سے دانائی جھلک رہی تھی۔ اس گھڑی وہ مجھے واقعی بہت باخبر اور دانشور لگی۔ اپنی سوچتی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولی "یہ اپنے شاہ جہاں صاحب گرفتارِ بلا ہونے کے باوجود کافی تگڑے محسوس ہوتے ہیں' میرا خیال ہے جو کام وہ سخت عذاب جھیل کر بھی نہ کر سکتے وہ یوں چٹکیوں میں ہونے والا ہے جب زماں صاحب کا تختہ ہی الٹ جائے گا تو نہ قید خانہ رہے گا اور نہ نیک بخت شاہ جہاں صاحب کی بہن اور ہماری باتیں یوں حویلی سے نکلے گی جیسے مکھن میں سے وہ کیا نکل آتا ہے؟ — ہاں بال۔ لیکن — لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ماتھا پکڑ کر کہنے لگی "ایک تو مصیبت یہ ہے کہ میں ذہین بہت ہوں۔ میرا دماغ ہر وقت دور دور کی خبریں لاتا رہتا ہے۔ پتا نہیں آپ سمجھیں گے کہ نہیں میری بات؟"

"ہاں — ہاں' سمجھاؤ۔ میں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ بولی "آپ یقین کریں' ذہین ہونا ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ ذہانت تو رہی ایک طرف' نری یادداشت بھی تیز ہو تو بندہ پچھتاوا ہو جاتا ہے۔ وہ شعر تو آپ نے سنا ہو گا کہ یادِ ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا' میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ اب یہ جاگیردار قادر زماں والا معاملہ ہی دیکھیں۔ مجھے نہ جانے کیوں وسوسے گھیر رہے ہیں۔ لگتا ہے یہ بیل" وہ "نہیں چڑھے گی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

میرا دل سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ معلوم نہیں کس قماش کی لڑکی تھی۔ کبھی لگتا تھا' پاگل ہے۔ کبھی پاگلوں کی ڈاکٹر لگتی تھی۔ اچانک ہی وہ چونک گئی "پاپا آ رہے ہیں" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ میں نے بھی کان لگائے۔ پہلے تو کوئی آواز نہیں آئی پھر کافی فاصلے پر انجن کی مدھم گنگناہٹ سنائی دی۔

"او مائی گاڈ۔ وہ تو میری چٹنی کر دیں گے" وہ صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ناچ گئی۔ پھر دانتوں میں انگلی دبا کر بولی "شاہ جہاں صاحب — سوری احسان صاحب! میں باتھ روم میں گھس جاتی ہوں۔ میرا خیال ہے' وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے شاید کھڑے کھڑے ہی چلے جائیں۔ آپ بالکل خاموش رہیں میرے بارے میں — اچھے؟" اس نے لپک کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ ساہی صاحب کی سرخ گاڑی اب مین گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ پردہ چھوڑ کر وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف گئی۔ پھر اچانک رک کر پیشانی پیٹنے لگی "او مائی گاڈ — او مائی گاڈ۔ نری چغد ہوں میں — گاڑی تو میری باہر کھڑی ہے' چھپنے سے فائدہ — ذرا بتایئے آپ چھپنے سے کیا فائدہ؟"

اس طوفانی لڑکی نے لمحوں میں مجھے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کی بلوری آنکھیں حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں پھر جلدی سے مجھ پر جھکی۔ اس کی ایک نوکیلی لٹ میرے رخساروں کو چھو گئی

"دیکھیے! میری آپ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا' آپ یہاں ہیں۔ میں یہاں ایک ٹرنک کال کرنے آئی تھی۔ بس — لیجیے آپ یہ میگزین پڑھیے۔ میں یہاں بیٹھ کر فون کرتی ہوں۔ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟" مجھے میگزین تھما کر وہ جلدی سے فون کے سامنے جا بیٹھی۔ دو تین ہندسے ڈائل کیے پھر چونک کر ماتھا پیٹنے لگی "او گاڈ — او مائی گاڈ۔ دیکھی آپ نے میری عقل؟ دروازے کی چٹخنی گرائی ہی نہیں' کیا مشکوک ڈراما کر رہی ہوں۔"

بھاگ کر اس نے چٹخنی گرائی اور دوبارہ فون کے سامنے آ بیٹھی۔ اسی دوران ساہی صاحب گاڑی سے باہر آ چکے تھے۔ چوکیدار سے باتیں کرتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا اور ان کی نگاہیں فریال پر جم گئیں۔ بڑے کمال کی ایکٹریس تھی وہ۔ اتنے انہماک سے فون پر جھکی ہوئی تھی کہ شبانہ اعظمی بھی دیکھتی تو چکرا جاتی لیکن جو اندر آیا تھا وہ بھی اس کا باپ تھا۔ ساہی صاحب ناک اور منہ سے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے چند لمحے بغور بیٹی کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ فریال نے باپ کی طرف دیکھا تو ڈائل سے انگلی نکال کر کھڑی ہو گئی۔

"وہ میں فون کرنے آئی تھی پاپا۔ نوشین کی برتھ ڈے تھی نا آج — سوچا — چلو۔"

ساہی صاحب بھاری آواز میں بولے "مجھے نوے فی صد یقین تھا کہ آج کسی وقت تم یہاں ضرور آؤ گی۔ کسی نوشین کو فون کرنے' کسی شائستہ کو ہیلو ہیلو کہنے یا کسی آنٹی کی خیریت پوچھنے۔"

"جی — جی۔" وہ ہکلائی۔

"چلو پھر اب کھسک جاؤ یہاں سے ورنہ پٹ جاؤ گی۔"

"پہلے آپ دروازہ تو چھوڑیے پاپا۔"

"یہ لو چھوڑ دیا" وہ ایک طرف ہٹ گئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر دروازے تک پہنچی پھر ایک دم لپک کر باہر نکل گئی۔ ساہی صاحب کی گھنی مونچھوں تلے غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے "اس نے تمہیں زیادہ تنگ تو نہیں کیا؟"

"جی نہیں — میرا مطلب ہے کچھ اتنا زیادہ نہیں۔"

"بہت ذہین لڑکی ہے۔ کل رات تمہیں ایک نظر دیکھ کر پہچان گئی تھی۔ فوٹو اسٹیٹ کی طرح حافظہ ہے اس کا۔ اور بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن ایک خامی نے سب کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ غیر سنجیدہ بہت ہے۔ بندے کا ناک میں دم کر دیتی ہے۔

ہم تو خیر عادی ہیں لیکن باہر کا شخص بوکھلا اٹھتا ہے۔"
"لیکن میرے ساتھ تو اخلاق سے ہی پیش آتی ہیں۔"
"ہاں ۔۔۔" وہ کچھ چونک سے گئے "تمہاری بات اور ہے۔ تم سے غائبانہ بہت متاثر ہے وہ ۔۔۔ اور اس کی وجہ ۔۔۔ شاید میں خود ہی ہوں۔"
"میں کچھ سمجھا نہیں۔"
ساہی صاحب کا چہرہ ایک عجیب سی دھند میں چھپ گیا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے "اسے تمہاری ساری کہانی معلوم ہے۔ اکثر مجھ سے سوال پوچھتی رہتی ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو تم اس کا آئیڈیل ہو لیکن میری اس بات کا کوئی دوسرا مطلب ہرگز نہیں۔ میں اس کے ذہنی رویوں سے پوری طرح آگاہ ہوں۔ وہ اندر سے بے حد معصوم اور سادہ ہے۔ چند برس پہلے اس نے میری زبانی تمہاری کہانی سنی تھی۔ یہ کہانی اس کے ذہن میں پیوست ہو گئی۔ اور اب تک پیوست ہے۔ وہ اکثر خواہش کرتی تھی کہ وہ شگفتہ اور شاہ جہان سے ملنا چاہتی ہے۔ میں کہتا تھا کہ اگر کوئی موقع آیا تو ضرور ملواؤں گا ۔۔۔ کل وہ موقع آیا لیکن اس طرح کہ میں تمہارا تعارف اس سے کرانے کی ہمت نہ کر سکا۔ تم مجھ پر ریوالور تان کر میرے اپارٹمنٹ میں گھسے تھے اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کس ارادے سے آئے ہو۔ اس کے ذہن میں تمہارا جو امیج بنا ہوا ہے وہ میں برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اسی وقت سے یقین تھا کہ اب وہ چپکی نہیں بیٹھے گی اور تمہارا حدود اربعہ جاننے کی کوشش ضرور کرے گی۔ دیکھ لو تم اس کی ہوشیاری۔ اس کاٹیج میں وہ اس سے پہلے صرف دو مرتبہ آئی ہے اور وہ بھی رات کے وقت۔ اب وہ تمہاری تلاش میں نکلی ہے تو سیدھی یہاں پہنچی ہے اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میں تمہیں کہیں بھی رکھتا تو وہ ایک دو روز میں تم تک پہنچ جاتی۔"

میں حیرانی سے ساہی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ کہاں میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید ساہی صاحب مجھے نہ پہچان سکیں اور کہاں ان کی دختر نیک اختر بھی مجھے پہلی نگاہ میں پہچان چکی تھی۔ ساہی صاحب کچھ دیر فریال کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ تھرڈ ایئر میں پڑھتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اس نے ضلعے میں پہلی اور صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ ریاضی اور الجبرا وغیرہ کے مضامین میں اسے حیران کن دسترس حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ کالج کی ہاکی ٹیم کی کپتان ہے اور قومی سطح کے کئی مقابلوں میں حصہ لے چکی ہے۔

فریال کے مختصر تعارف کے بعد ساہی صاحب اصل موضوع پر آ گئے۔ انہوں نے جاگیردار قادر زماں کا ذکر کیا اور مجھے رازداری کا پابند کر کے وہی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے فریال بتا چکی تھی۔ انہوں نے جاوید درانی نامی ایک اعلیٰ پولیس افسر کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ یہ نوجوان افسر حال ہی میں انگلینڈ سے ٹریننگ لے کر لوٹا ہے۔ اس کے عزائم بہت بلند ہیں اور وہ پنجاب کے دیہی علاقوں کو ہر قسم کے جرائم سے پاک کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ وہ نچلی سطح پر پکڑ دھکڑ کرنے کے بجائے سرکردہ لوگوں پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اس نے بہت اچھی طرح ہوم ورک بھی کیا ہے۔ ساہی صاحب اس کارروائی کو میری خوش قسمتی پر محمول کر رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ شگفتہ کو اس جاگیردار کے چنگل سے بغیر کسی دشواری کے نکالا جا سکے گا۔

میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا "ساہی صاحب! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' شگفتہ سے بڑھ کر مجھے اس دنیا میں کوئی عزیز نہیں۔ اسے کچھ ہو گیا تو خدا گواہ ہے' میں بھی نہیں رہوں گا۔ مجھے نہیں معلوم' پولیس قادر زماں کے خلاف کس قسم کی کارروائی کرنا چاہتی ہے لیکن جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے' اس پر کچا ہاتھ ڈالنا پولیس اور انتظامیہ کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو گا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' میں پورے تین ہفتے اس حویلی میں رہا ہوں۔ وہاں کے بہت سے نشیب و فراز میں نے دیکھے ہیں۔ اگر آپ کسی طرح مجھے جاوید درانی صاحب سے ملا سکیں تو ممکن ہے میں انہیں کوئی کام کی بات بتاؤں۔"

ساہی صاحب نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون پر میری ایس پی جاوید سے بات ہوئی ہے۔ وہ اس وقت اسلام آباد میں ہے۔ میں نے اس سے تمہارا ذکر کیا ہے۔ اس کا بھی یہی خیال ہے کہ تم سے ملا جائے۔ کل دوپہر میں مری جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے' تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مری سے اسلام آباد ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔ ہم جاوید کے پاس ایک گھنٹا بیٹھ کر بھی نو بجے تک واپس آ جائیں گے۔"

میں نے کہا "جیسے آپ کی مرضی' لیکن میری یہ نقل و حرکت بالکل پوشیدہ رہنی چاہیے۔"

"تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اسی اسٹیشن ویگن میں جائیں گے جو تمہیں یہاں تک لائی ہے' کیا خیال ہے؟"

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سینے میں عجب ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ساہی صاحب کے پاس آتے ہوئے میں نے

تصور بھی نہیں کیا تھا کہ قادر زماں کے بارے میں کسی ایسی بات کا پتا چلے گا۔ میں اسے امداد غیبی ہی قرار دے سکتا تھا۔ وہ شخص جو اپنے اثر و رسوخ میں پہاڑ تھا' ایک بھونچال کی زد میں آنے والا تھا۔ وہ اب تک بے کس لوگوں کی زندگیاں مسمار کرتا رہا تھا لیکن یہ سب کچھ کیسے ہو سکے گا؟ مجھے یقین پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس رات میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب سی رہی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کسی اعلیٰ و ارفع ذات سے اظہار تشکر کروں۔ اپنے رخساروں کو آنسوؤں سے بھگوؤں اور اپنے آلام سے چھٹکارے کے لیے کسی کے سامنے دست دعا پھیلاؤں۔

میں دیر تک جاگتا رہا اور گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ نہ جانے کس وقت نیند آئی۔ نیند کے دوران میں کسی وقت جاگا تو پتا چلا کہ انجم بھی آ چکی ہے۔ وہ میرے قریب ہی صوفے پر لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔ اس دفعہ سویا تو پھر خوب سویا۔ دن چڑھے ملازم ذوالقرنین ناشتے کے لیے جگانے آیا لیکن میں نے کھانے پر نیند کو ترجیح دی۔ دوپہر کو خود بخود آنکھ کھل گئی۔ دیوار گیر کھڑکیوں کی دوسری جانب منظر بدلا ہوا تھا۔ کل شام سنہری دھوپ چمک رہی تھی اور بیسیوں میل تک وادیاں اور پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ اب چند گز دور کے منظر بھی دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف دھواں دھواں بادل تھے اور برف کی باریک پھوار گر رہی تھی۔ پہاڑوں کے موسم ایسے ہی سیلانی ہوتے ہیں۔ پانی نیم گرم تھا بلکہ ٹھنڈا ہی تھا۔ جی کڑا کر کے غسل کیا۔ باتھ روم سے نکلا تو میز پر گرما گرم کھانا اور کافی کے برتن چُنے تھے۔ قریب ہی انجم بغلوں میں ہاتھ دیے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے فر کا گلابی کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کی رنگت نے رخساروں پر منعکس ہو کر انہیں شعلہ رخ کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کی طمانیت ظاہر کرتی تھی کہ اب وہ دورے کے شکنجے سے آزاد ہے۔ میز پر سجے ہوئے برتنوں سے پتا چلا کہ انجم کے علاوہ بھی کوئی کھانے میں شریک ہو گا۔ یہ تیسرا شخص کون ہو سکتا تھا' یقیناً ساہی صاحب۔

میرا قیافہ درست نکلا۔ چند لمحوں بعد ساہی صاحب دونوں ہاتھ آپس میں رگڑتے بغلی دروازے سے برآمد ہوئے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ وہ سر کے اشارے سے جواب دیتے سیدھے کھانے کی میز پر آ گئے۔ بڑی جلدی میں نظر آتے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے کہا "ہمیں دو بجے تک روانہ ہو جانا چاہیے۔ موسم خراب ہے۔ مری پہنچنے میں کافی وقت لگے گا۔ وہاں بھی ایک آدھ گھنٹے کا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں' چھ بجے تک ہم اسلام آباد پہنچ جائیں۔ جاوید درانی وقت کا بہت پابند ہے۔ ان دنوں تو وہ مصروف بھی بہت ہے۔ بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے اس نے۔"

کھانے کو "برنچ" کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس میں ناشتے اور لنچ کی مشترکہ خصوصیات تھیں۔ غالباً یہ اہتمام میرے لیے ہی کیا گیا تھا۔ جوس اور انڈے کے علاوہ چکن پلاؤ' سلاد اور قورمہ بھی موجود تھا۔ بھوک چمکی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی لیکن سیر ہو کر کھایا۔ میز سے اٹھتے ہی ہم جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پورچ میں رنگ دار شیشوں والی اسٹیشن ویگن تیار کھڑی تھی۔

میں نے انجم کو تسلی تشفی دی اور جلد ہی آنے کا کہہ کر سبز نمبر پلیٹ والی ویگن میں آ بیٹھا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی سے ہیٹر آن کر رکھا تھا ورنہ برفیلی فضا میں آتے ہی ہماری قلفی جم جاتی۔ قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ویگن ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ اوورکوٹ میں ملبوس ایک اور صاحب ناک سے دھواں اڑاتے اور ہونٹوں سے "سی سی" کی آوازیں نکالتے ویگن کی طرف لپکے۔ ایک ملازم نے ان کے سر پر چھاتے کا سایہ کر رکھا تھا۔ یہ صاحب مجھے صورت سے ہی پولیس آفیسر نظر آ رہے تھے۔ اگلے چند منٹوں میں یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ ان کا نام غالباً غلام عباس قسم کا تھا۔ عہدے کے لحاظ سے یہ ایس پی تھے اور ان کا تعلق بھی ساہی صاحب کی طرح محکمہ جیل خانہ جات سے تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی اسلام آباد جا رہے تھے۔ دونوں آفیسرز کی آپس میں بے تکلفی تھی۔ تھوڑی دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر ساہی صاحب نے انکشاف کیا "گوجر خان میں آج کوئی ملازم فوت ہو گیا ہے۔" ملازم کی اصطلاح ساہی صاحب نے سرکاری افسر کے لیے استعمال کی تھی۔

غلام عباس صاحب چونک گئے "کون فوت ہوا؟"

"یہ پتا نہیں چل سکا لیکن ہوا ضرور ہے۔ مجھے گیارہ بج کر پچاس منٹ پر اسلام آباد سے کال آئی تھی۔ ہیڈ کوارٹرز سے رمضان پراچہ بول رہا تھا۔ موسم خراب ہے' آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔ پہلے وہ اپنی پروموشن کی بات کرتا رہا پھر "فوتگی" کا ذکر ہی کیا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ میں نے بعد میں پندرہ بیس منٹ کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ لائنیں ڈیڈ پڑی ہیں۔"

"اوہ ۔ پتا نہیں کس کا بلاوا آیا ہے" غلام عباس صاحب

نے اظہار افسوس کیا' پھر ذرا چونک کر بولے "لیکن بھئی یوں تو ہمارا پروگرام بھی درہم برہم ہو جائے گا' کوئی اہم ملازم ہے تو یقیناً جاوید درانی بھی گوجر خان گیا ہوگا۔"

ساہی صاحب نے کہا "ہاں' اس بات کا خدشہ تو ہے لیکن جاوید مقررہ وقت پر اسلام آباد پہنچنے کی پوری کوشش کرے گا۔ اگر بندہ رات کو فوت ہوا ہے تو یقیناً ظہر تک جنازہ ہو جائے گا۔"

غلام عباس صاحب اس صورت حال سے مطمئن نظر نہیں آتے تھے' بولے "یار! میرا تو خیال ہے' ایسے خراب موسم میں نہ ہی جائیں۔ فون ہو جاتا تو بھی بات تھی۔ اب معلوم نہیں' وہاں کیا صورت حال ہے۔"

ساہی صاحب اپنے ساتھی کی رائے سے ہرگز متفق نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جاوید درانی نے جو وقت دیا ہے اس پر ضرور ملے گا چاہے اسے اپنے دس پروگرام کینسل کرنا پڑیں۔

مری تک راستے میں ساہی صاحب اور غلام عباس صاحب میں مسلسل اس معاملے پر بحث ہوتی رہی۔ ساہی صاحب' جاوید درانی کو وعدے کا پابند ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے جبکہ غلام عباس صاحب اس کی مخالفت میں بول رہے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جاوید درانی اپنی طاقت سے اونچی پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے' وہ قابل ضرور ہے لیکن اپنی قابلیت کو بے کار مہم جوئی میں صرف کر رہا ہے۔

غلام عباس اور ساہی صاحب میں ہونے والی گفتگو کے سبب مجھے جاوید درانی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ وہ پاک پتن شریف کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ حافظ قرآن بھی تھا۔ چند برس پہلے اس کا چھوٹا بھائی جو زبان سے معذور تھا' گم ہو گیا تھا۔ بہت تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ خود ہی کسی طرف نکل گیا ہے جبکہ اہل خانہ اس گمشدگی کی وجہ دشمنی قرار دے رہے تھے۔ مخالف پارٹی زور آور تھی۔ انہوں نے جاوید درانی اور اس کے اہل خانہ پر جوابی پرچے کروا دیے۔ یعنی مدعی ملزم بن گئے۔ جاوید درانی کے بھائی کا سراغ ملنا تو رہا ایک طرف' انہیں اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ جاوید درانی کے بڑے بھائی کو جیل جانا پڑا اور جاوید کی دو بہنوں کے رشتے ایک ساتھ ٹوٹ گئے۔ انہی حالات میں جاوید کو ماں جیسی شفیق ہستی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ ان کٹھن حالات نے جہاں جاوید درانی سے بہت کچھ چھینا وہاں آگے بڑھنے کا عزم بھی دیا۔ اس نے پولیس آفیسر بننے کی ٹھانی اور آخر اس خواب کو حقیقت کا روپ دینے میں کامیاب رہا۔ نہ صرف وہ پولیس آفیسر بنا بلکہ اعلیٰ تربیت کے لیے بیرون ملک بھی گیا اور اب اپنے محکمے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔

مری پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ یہاں شدید برف باری ہوئی ہے اور سنی بینک سے آگے راستہ بند ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ہم مری جانا چاہتے ہیں تو گاڑی سے اتر کر پیدل مارچ کریں۔ اس لامحدود سردی اور محدود وقت میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا لہٰذا فیصلہ ہوا کہ مری کا پروگرام منسوخ کیا جائے اور سیدھے اسلام آباد کا رخ کیا جائے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری گاڑی اسلام آباد میں داخل ہوئی اور چند کشادہ سڑکوں سے گزر کر ایک گنجان آبادی میں پہنچ گئی۔ ایک جگہ گاڑیوں کی چھوٹی سی قطار میں اسٹیشن ویگن رکی۔ ساہی صاحب اتر کر ایک طرف بڑھ گئے۔ یہی جاوید درانی کی رہائش گاہ تھی۔ ساہی صاحب مجھے اندر لے جانے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لینے گئے تھے۔ ان کی واپسی میں خاطر خواہ تاخیر ہوئی۔ ہم شدت سے انتظار کر رہے تھے قریباً دس منٹ بعد وہ واپس آئے۔ وہ اسٹیشن ویگن میں داخل ہوئے تو ہم ان کا چہرہ دیکھ کر چونک گئے' وہ رو رہے تھے۔

"کیا ہوا ساہی؟" غلام عباس صاحب چلا کر بولے۔ ڈرائیور بھی ہکا بکا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے عباس" ساہی صاحب نے روتے ہوئے کہا "ہمارا آنا بے کار گیا۔ جاوید درانی ہمیں نہیں مل سکے گا' وہ وعدے کا جھوٹا نکلا۔"

میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ آگے کی بات میں ساہی صاحب کے کہے بغیر سمجھ رہا تھا۔ جاوید درانی اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ یہ خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی موت کی ادھوری اطلاع آج صبح ٹیلی ویژن پر سنی گئی تھی۔ غلام عباس اور ساہی صاحب افراتفری کے عالم میں ویگن سے نکلے اور اس سفید گیٹ والے مکان کی طرف بڑھ گئے جس کے سامنے کاروں کی ایک طویل قطار کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ان کے پیچھے ہی ڈرائیور بھی باہر نکل گیا۔

چند ہی منٹ میں تمام صورت حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ ڈرائیور نے آ کر بتایا کہ جاوید درانی صاحب کو آج علی الصباح گوجر خان کے قریب جی ٹی روڈ پر حادثہ پیش آیا۔ ان کی گاڑی ریت سے بھرے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اس حادثے میں جاوید صاحب کا ڈرائیور ہلاک اور گن مین شدید زخمی ہوئے ہیں۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ آناً فاناً یہ کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی۔ وہ نوجوان پولیس آفیسر جس کا دل خدمت کے جذبے سے سرشار تھا' جو جرائم کے بڑے بڑے بت توڑنا چاہتا تھا اور طویل منصوبوں سے لیس ہو کر میدان میں آیا تھا' آغاز جنگ سے پہلے ہی چکنا چور ہو کر ڈھے گیا تھا۔ میرا سینہ غم سے لبریز ہو گیا۔ نہ جانے کہاں دل کے کسی گوشے سے آواز آنے لگی' اس شخص کو مرنا ہی تھا' آج نہ مرتا تو کل مر جاتا۔ اس نے خود اپنے لیے موت کا راستہ چنا تھا۔ خیالات کا دھارا کچھ اور گہرائی میں چلا گیا۔ ذہن میں یہ سوچ ابھرنے لگی۔ کہیں وہ کسی سازش کا شکار تو نہیں ہوا۔ یہ بات بظاہر ناممکن تھی لیکن ایسی ناممکن بھی نہیں تھی۔ جرم و سزا کی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ انہونیاں ہونیاں بن جاتی ہیں۔ یہ حادثہ بھی دست قاتل کا شاخسانہ ہو سکتا تھا۔ اچانک میری سماعت میں نرال کا کہا ہوا ایک فقرہ گونجنے لگا۔ کل کتنی آسانی اور روانی سے اس نے ایک پیش گوئی کر دی تھی۔ اس نے کہا تھا' قلور زماں اور دیگر وڈیروں کے خلاف کارروائی کی جا رہی ہے لیکن لگتا نہیں کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی۔ اگر یہ چھٹی حس تھی تو حیرت ناک تھی۔ اس کھلنڈری لڑکی نے یہ فہم و فراست' یہ بصیرت کہاں سے پائی تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں وہ سیاست اور قانون جیسے بوجھل موضوعات پر روانی سے بولتی تھی اور سننے والے کو قائل کر دیتی تھی۔

میرا اسٹیشن ویگن سے نکلنا مناسب نہیں تھا لہٰذا وہیں دبکا بیٹھا رہا اور خیالوں میں گم رہا۔ ساہی صاحب نے مرحوم آفیسر کی آخری رسومات میں شرکت کی اور تھکے ہارے' نڈھال' رات گیارہ بجے واپس آئے۔ ان کی آنکھیں متورم اور چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ میں ان کے اس موڈ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان کے اندر کا سخت گیر قانون پسند شخص باہر نکل آیا تھا' اور مجرم اور جرم کے خلاف جوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ مری تک راستے میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ بے حد خراب موسم کی وجہ سے آگے جانا ممکن نہیں تھا لہٰذا سنی بینک کے ہی ایک اچھے ہوٹل میں شب گزارنے کا فیصلہ ہوا۔

ہوٹل کے یخ بستہ کمرے کی سردی میں آتش دان کا شعلہ شمع کا شعلہ محسوس ہوتا تھا۔ نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے جواں مرگ ایس پی کو دیکھا تک نہیں تھا' نہ ہی چوبیس گھنٹے پہلے میں اس کے متعلق کچھ جانتا تھا لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ویسے ہی شناسا بچھڑ گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ شخص میرے ذہن میں "پیدا" ہوا تھا' جوان ہوا تھا' اپنے منصوبوں اور عزائم کے ساتھ میری سوچوں میں دندنایا تھا اور پھر مر گیا تھا۔ کیسا ملنا اور کیسا بچھڑنا تھا۔ آتش دان کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں زندگی کے طوفانی رویوں پر غور کرنے لگا۔ اچانک ساہی صاحب کی بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

وہ بولے "جاوید مرا نہیں۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ٹرک ڈرائیور مفرور ہے۔ وہ پکڑا جائے تو ابھی اسی وقت مجرموں کو ہتھکڑی لگ سکتی ہے۔"

میں نے ساہی صاحب کی تائید کی "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جن حالات میں یہ سانحہ ہوا ہے' ذہن کوئی اور بات مانتا ہی نہیں۔"

وہ بولے "جاوید کے سامان میں سے ایک اہم بریف کیس بھی غائب ہے۔ اس بریف کیس میں پولیس آپریشن کے حوالے سے نہایت اہم کاغذات تھے۔ حادثے کے بعد یہ بریف کیس گاڑی سے نکالا گیا ہے۔"

میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے؟ پولیس کی کارروائی پروگرام کے مطابق ہوگی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ساہی صاحب مایوسی سے بولے "جاوید درانی اسی آپریشن کا کرتا دھرتا تھا۔ سب کچھ اسی کا ارینج کیا ہوا تھا۔ اب بات کم از کم ڈھائی ماہ آگے جا پڑی ہے۔"

"لیکن اس دوران تو مجرم اپنے دفاع میں بہت کچھ کر چکے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' منظر سے ہی غائب ہو جائیں۔"

"یہ خدشات تو اپنی جگہ موجود ہیں۔ بہرحال یہ بات بھی اعلیٰ افسران میں طے ہے کہ اب مرحوم کے مشن کو ادھورا نہیں چھوڑا جائے گا' میں نے آج ایک کمیٹی تشکیل دینے کا مطالبہ کیا ہے جو اس سلسلے میں فوری اقدامات کرے گی۔"

گو ساہی صاحب کی باتیں حوصلہ افزا تھیں لیکن ان میں مایوسی کی آمیزش بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی' غالباً مجھے یہ مایوسی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ میں چوبیس گھنٹے پہلے تک بہت پُرامید تھا لیکن اب امید پھر ناامیدی کے تاریک غار میں اترتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا' قلور زماں کے خلاف میدان جنگ میں میری بہن اور میں پھر تنہا رہ گئے ہیں۔ فرعون صفت جاگیردار کا خوف ایک بار پھر میرے اعصاب کو جھنجھوڑنے لگا تھا۔ کچھ وہی کیفیت ہو رہی تھی جو حویلی سے نکلتے ہوئے انجم پر طاری تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی

کہ جاگیردار قرب وجوار میں کہیں موجود نہیں وہ اس سے ہیبت زدہ تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جاگیردار کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ آج یہ آنکھیں مجھے خود پر مرکوز محسوس ہو رہی تھیں۔ جاگیردار کے دو آدمی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے۔ بظاہر یہ ایک حادثہ تھا اور ابھی تک پولیس بھی اس حادثے کی تہ تک نہیں پہنچی تھی۔ تاہم ضروری نہیں تھا کہ واقعے کی اصلیت تادیر چھپی رہے۔ گاڑی میں دھماکا ہونے سے پہلے میں نے گلزار پر ایک فائر کیا تھا اور گولی ڈرائیونگ سیٹ میں دھنس گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی شہادتیں موقع پر موجود رہ گئی ہوں گی۔ ان شہادتوں کی موجودگی میں کبھی بھی وقت تفتیش کا رخ مڑ سکتا تھا۔ جہاں تک قادر زماں کا تعلق ہے' مجھے یقین تھا کہ وہ حادثے کی خبر سنتے ہی میری طرف سے شک میں مبتلا ہو گیا ہوگا اور اب گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ شک تقویت پکڑ رہا ہوگا۔ میں جاگیردار کی حویلی سے صرف آٹھ روز کی مہلت لے کر نکلا تھا اور یہ مہلت اب ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس مہلت میں اضافے کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ جاگیردار میری طرف سے کس حد تک مطمئن ہے۔ ان حالات میں صرف ایک بات میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ تین روز پہلے الفردوس سے میں درجنوں افراد کی موجودگی میں گرفتار ہوا تھا۔ یقیناً ان درجنوں افراد میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو بطور نگراں گلزار بھینڈو کے ساتھ الفردوس میں مقیم تھی۔ اس کے توسط سے قادر زماں کو پتا چل سکتا تھا کہ میں گرفتار ہوا ہوں۔

○☆○

چار روز بعد کی بات ہے۔ میں لنچ کے بعد سو رہا تھا' اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے فریال بیٹھی تھی۔ یہ اسی کاٹیج کا ایک کمرا تھا جہاں میں برفاب لاک اپ سے رہائی پا کر فروکش ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں انجم مقیم تھی۔ اس کے علاوہ ایک ملازم اور گن مین بھی اس کاٹیج کے مکینوں میں شامل تھے۔ میں یقیناً فریال کی آواز سے جاگا تھا۔ وہ بڑے فریش موڈ میں تھی۔ آج اس نے نیلی جینز پر کھلی آستینوں والا سفید سوئٹر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں حسب معمول ٹینس شوز تھے۔ لگتا تھا' جوگنگ کرتی چلی آئی ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں عجب بے باکی تھی۔ لگتا تھا' اپنے پُرخطر نشیب و فراز کا اسے رتی بھر احساس نہیں۔

"ہیلو' کیسے ہیں آپ؟" وہ بولی۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "ویری سوری' میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں دوپہر کو بیس منٹ سے زائد نہیں سوتا۔"

"دراصل' ایک بڑی اہم بات کرنی تھی آپ سے۔ پچھلے تین چار روز سے موقع ڈھونڈ رہی تھی لیکن پاپا نے ہی نہیں تھے۔ آج ہمت کر کے آ ہی گئی کیونکہ آج نہ آتی تو ملاقات کا چانس بالکل ہی "ہم" ہو جاتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ہائے اللہ' آپ کو کچھ پتا نہیں۔ جناب! ہم واپس لاہور جا رہے ہیں۔ کل یا شاید پرسوں۔"

"یعنی آپ کی فیملی واپس جا رہی ہے؟"

"ہماری فیملی ہی نہیں آپ بھی واپس جا رہے ہیں" اس نے شوخ لہجے میں تصحیح کی۔

"یہ آپ کے پاپا کا پروگرام ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے اقرار میں جواب دیا پھر بالوں کو پیشانی سے جھٹک کر مخروطی ہاتھوں کے پیالے میں نکالا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ موضوع بدل رہی ہے۔ کچھ دیر لگاوٹ سے میرا چہرہ دیکھتی رہی پھر بولی "شاہ جہاں صاحب۔ سوری ۔ سوری احسان صاحب' میرا جی چاہتا ہے کہ شاہ جہاں صاحب کے لیے کچھ کروں۔ سچ میں بہت پسند کرتی ہوں ان کو ۔ ارے آپ ایسے مجھے کیوں گھور رہے ہیں' میں آپ کی نہیں شاہ جہاں صاحب کی بات کر رہی ہوں۔ جی ہاں۔ میں نے کل پاپا سے بات کی تھی۔ وہ ہمیشہ میری بات مانتے ہیں۔ امید ہے' اس مرتبہ بھی مانیں گے۔ پتا ہے میں نے انہیں کیا مشورہ دیا ہے؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے انہیں کہا ہے کہ وہ شگفتہ باجی کو جاگیردار کے حبسِ بے جا سے نکالنے کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔"

"کیا مطلب؟ طاقت استعمال کریں؟"

"نہیں ۔ نہیں" فریال نے کہا "اس سے ڈیل کی جائے۔ کسی ہم عصر چودھری کے ذریعے اس سے رابطہ کیا جائے اور گفت و شنید کے ذریعے شگفتہ باجی کو رہائی دلوائی جائے۔ اس سلسلے میں فیصل آباد کا ایک زمیندار میاں سودہ بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ بااثر سیاسی شخصیت ہے پاپا سے اس کے مراسم ہیں اور وہ پہلے بھی پولیس سے تعاون کرتا رہا ہے۔"

"نہیں فریال" میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا "تم یہاں بیٹھ کر بات کر رہی ہو جبکہ میں اس جہنم سے گزر کر آیا ہوں۔ اس خبیث شخص کی خباثت میرے لیے کھلی کتاب کے مانند ہے۔ میں اپنی بہن کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ تم نہیں جانتیں' وہ کس قماش کا شخص ہے اور کیا کر سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کریں گے' کیا یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟" فریال نے کہا۔

"میں سوچنے کے لیے وقت چاہتا ہوں' ممکن ہے کوئی بہتر صورت سامنے آ جائے۔"

"شاید آپ پولیس آپریشن کا انتظار کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتی یہ انتظار مختصر ثابت ہوگا۔ ایسے آپریشنز کا نیم ایک مرتبہ ٹوٹ جائے تو بحال ہوتے مدت لگ جاتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ۔ سب معلوم ہے۔ پلیز تم فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہ کرو۔"

"لیکن کیوں؟" وہ تنک کر بولی۔

"اس لیے کہ یہ سب کچھ ناقابلِ عمل ہے۔"

"شکر ہے' آپ نے یہ بات تسلیم کی۔" اس نے فوراً پینترا بدلا۔ ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ تھی۔

"کہنا یہ چاہتی ہوں کہ آپ ابھی میری ذہانت کا اعتراف کریں گے۔ یہ تجویز جو میں نے آپ کو ابھی دی ہے' میری نہیں پاپا جانی کی تھی بلکہ اب بھی ہے۔ اگر پاپا جانی آپ کو خود اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے تو عین ممکن تھا آپ ان کی افسری کے رعب میں آ جاتے اور اس پروگرام میں روشن پہلو تلاش کر لیتے۔ جو کہ سراسر غلط ہوتا۔ اب آپ نے اس پروگرام کو غیر جانبداری سے دیکھا ہے اور ناپسند کیا ہے' اس کا مطلب ہے یہ واقعی ناقابلِ عمل ہے۔"

یہ گھن چکر لڑکی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ مخاطب کو بوکھلا کر رکھ دیتی تھی۔ بات کرتے کرتے اچانک پٹڑی سے اتر جاتی تھی اور کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیتی تھی۔ اب بھی اس نے یہی کیا۔ صوفے سے اٹھ کر اچانک میرے قریب آ بیٹھی۔ اتنا قریب کہ اس کا گداز کندھا میرے بازو سے چھونے لگا۔ خوشبو کے ایک جھونکے نے مجھے حصار میں لے لیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں لے لیا اور مجھے اصل نام سے مخاطب کرتے ہوئے بے باکی سے بولی۔

"آپ میرے آئیڈیل ہیں شاہ جہاں صاحب۔ میں پہلے بھی آپ کو چاہتی تھی لیکن آپ سے مل کر اور آپ کو پرکھ کر یہ چاہت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ آئی لو یو۔ آئی لو یو" اس نے اپنی خوب صورت ٹھوڑی میرے کندھے میں دھنسا دی' اس کے ریشمی بالوں کی آوارہ لٹیں نہایت بے تکلفی سے میرے شانے پر استراحت کر رہی تھیں۔ میں سپاٹ ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں یہ کیسی بے باکی تھی۔ اس ساری بے باکی کے بعد اب اگلا قدم تو یہی تھا کہ وہ مجھ سے بغل گیر ہو جاتی۔ میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا البم تھا۔ یہ البم اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"دیکھیے یہ کس کی تصویریں ہیں؟"

میں نے تھوڑا سا پیچھے کو کھسکتے ہوئے البم کھولا۔ پہلی تصویر ہی میری تھی۔ یہ کالج کے زمانے کی تھی۔ اپنے چند دوستوں کے ساتھ میں ایران گیا تھا۔ تہران کے ایک بازار میں میں گز بھر کی روٹی ہاتھ میں لیے کھڑا تھا' دوسری تصویر بھی میری ہی تھی۔ میں اپنی بہن شگفتہ کے ساتھ گھر کے باغیچے میں کھڑا تھا۔ ہمارے چاروں طرف خوش رنگ پھول مہک رہے تھے۔ تیسری چوتھی تصویر بھی میری تھی۔ یہ پورا البم میری تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں میرے بچپن سے لے کر جیل جانے تک کی تصویریں موجود تھیں۔ معلوم نہیں فریال نے یہ تصویریں کہاں سے اور کیونکر حاصل کی تھیں۔ اکثر تصویروں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اصل سے کاپی کرائی گئی ہیں۔ کئی تصویریں انلارج بھی کرائی گئی تھیں۔ ان میں ایک تصویر بہت خوب صورت تھی۔ یہ بھی کالج کے زمانے کی تھی۔ ان دنوں مجھے باڈی بلڈنگ کا شوق چرایا ہوا تھا۔ میں تن سازوں کے انداز میں مسلز ابھارے سائڈ پوز دے رہا تھا۔ قریب ہی شگفتہ بیٹھی شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ فریال بھی البم پر جھکی ہوئی تھی اور دلچسپی سے تصویریں دیکھ رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ کسی تصویر پر تبصرہ بھی کرنے لگتی تھی۔ وہ میرے اس قدر قریب تھی کہ اس کے گداز جسمانی خطوط مجھ پر وضاحت سے عیاں ہو رہے تھے لیکن وہ قطعی بے خبر تھی۔ وہ جو بہت ہوشیار اور باخبر ہونے کا دعویٰ کرتی تھی' اپنے بارے میں واقعی بہت بے خبر تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی دلکش ہے اور اس کی ہیجان خیز جسمانی ساخت صنفِ مخالف پر کیا غضب ڈھا سکتی ہے۔ وہ اپنی طرف سے اس درجہ بے پروا تھی کہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ پوز کر رہی ہے۔ ساہی صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کی خود فراموشی کسی بھی شخص کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ البم میں ایک تصویر میرے بچپن کی تھی۔ اس میں میری والدہ کا صرف ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے کندھے سے تھاما ہوا تھا اور میں فطری لباس میں ٹانگیں چوڑی کیے کھڑا تھا۔ یہ تصویر سامنے آئی تو فریال دونوں

ہاتھوں سے منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ میں نے جلدی سے صفحہ پلٹ دیا۔ وہ اور شدت سے ہنسنے لگی۔ اس کا پورا جسم ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ ہنستے ہنستے وہ دہری ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی "لگتا ہے بچپن میں آپ کے طور اطوار کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ آپ کی والدہ نے یہ تصویر آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اتاروی ہوگی۔"

میں نے البم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا "یہ تصویریں تمہیں ملیں کہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی ملتا ہے جی" وہ بڑی ادا سے بولی۔

"کیا ساہی صاحب کو ان تصویروں کا پتا ہے؟"

"کیوں پتا نہ ہوگا۔ میں انہیں خود یہ البم دکھا چکی ہوں۔"

میں نے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگایا اور دھواں چھوڑ کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا "مجھے یہ بتاؤ فریال، کیا کسی غیر مرد کی تصویریں اکٹھی کرنا اور یوں البم میں سجا کر رکھنا اچھی بات ہے؟"

"تو اس میں بری کون سی بات ہے؟" وہ پورے اعتماد سے بولی "لوگ اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں، اداکاروں اور ہیروز کی تصویریں اپنے پاس رکھتے ہیں۔ کون ہے جس کے پاس ایسی تصویریں نہیں ہوتیں؟"

"لیکن میں ظہیر عباس ہوں نہ امیتابھ بچن، نہ کوئی سیاسی ہیرو۔ ایک قاتل اور مفرور ہوں۔ جیل میں مجھے [redacted] کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چکی پسوائی جاتی ہے اور روٹی دینے کے لیے ننگے پاؤں قطار میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں میرا مقدر ہیں اور میرا حال و ماضی ان گالیوں سے لتھڑا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، تم نے تصویروں کے یہ بدنما دھبے اپنی زندگی کے صاف شفاف البم سے کیوں چپکا رکھے ہیں۔"

"بس جناب، اب زیادہ باتیں نہ بنائیں۔ کوئی بھی اپنے آئیڈیل کے بارے میں ایسی باتیں سن کر چپ نہیں رہ سکتا۔ جی ہاں!"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں، کیوں بنا رکھا ہے تم نے مجھے اپنا آئیڈیل؟"

"اگر آپ میری تعریفیں سننے کے خواہش مند ہیں تو جناب میں سارا دن اور ساری رات آپ کے اس سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔ اور اگر مجھے زچ کرنے کے موڈ میں ہیں تو پھر خاموش رہیے۔ جو بلا ٹل رہی ہے اسے ٹلنے دیجیے۔ جی ہاں۔۔۔ بس میں آپ کو چاہتی ہوں، چاہتی تھی اور چاہتی رہوں گی۔"

"آخر کس قسم کی چاہت ہے یہ؟" میں یہ معاملہ صاف کر لینا چاہتا تھا۔

"بتاؤں؟" اس نے عجیب انداز میں پوچھا۔

"بتاؤ" میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر میرے قریب آگئی۔ قالین پر بیٹھ کر اس نے کہنی میرے گھٹنے پر ٹکائی اور ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر جما کر ڈرامائی انداز میں میرا چہرہ تکنے لگی "مجھے۔۔۔ آپ سے عشق ہے" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی "لیکن عشق میری ہی طرح انوکھا اور سرپھرا ہے۔ اس عشق میں آپ کے علاوہ ایک اور شخص بھی شامل ہے۔ میں آپ دونوں سے عشق کرتی ہوں۔ نہ کسی سے کم اور نہ کسی سے زیادہ۔ اب آپ پوچھیں گے، وہ دوسری ہستی کون ہے لیکن میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گی۔"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ یہ لڑکی کسی بھی شخص کو دس بارہ گھنٹوں میں پاگل کر سکتی تھی۔ بہتری یہی سمجھا کہ اس سے سوال و جواب کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ ماروں۔ اگر یہ جا رہی ہے تو جانے دوں اسے۔

میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔"

"صحیح ہے" وہ بولی "کہیں یہ نہ ہو کہ پہلا موضوع بھی آپ کے چکراتے ہوئے دماغ سے نکل جائے۔"

"کون سا؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"اُف اللہ۔۔۔ اُف اللہ" اس نے مخصوص انداز میں ماتھا پیٹا "ساری رات کہانی سناتی رہی ہوں اور اب آپ پوچھ رہے ہیں، نائلہ عورت تھی یا مرد۔ بندۂ خدا! آپ ذہین آدمی ہیں۔ ذرا دماغ کو حاضر کیجیے۔ میرے یہاں آنے کا مقصد یہ تھا کہ پاپا کے آنے سے پہلے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر دوں تاکہ آپ ان کی تجویز پر صحیح ردعمل کا اظہار کر سکیں۔ بجائے اس کے کہ آپ میری معاملہ فہمی کی تعریف کریں، مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کس موضوع پر بات کرنے آئی تھی۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے، میں سمجھ گیا ہوں" میں نے جان چھڑائی۔

"سمجھ لیجیے اور پاپا کو سمجھا بھی دیجیے۔ انہیں صاف بتا دیجیے کہ قدر زماں کس قماش کا آدمی ہے اور اس لاتوں کے بھوت کو باتوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی تو شگفتہ باجی

کے لیے کیا خطرات پیدا ہو جائیں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں" میں نے پیشانی تھام کر کہا۔

"اور ہاں یاد آیا۔ جانے کے لیے تیار رہیے، میرا خیال ہے کل ہم کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔"

"اور میرے آنے کا ذکر پاپا سے نہ کیجیے گا ورنہ وہ میرے خلاف پینلٹی اسٹروک دے دیں گے۔"

"اوکے۔"

"انجم باجی تو شاید سو رہی ہیں، انہیں سلام کہیے گا۔"

"اوکے۔"

"ارے البم تو میں بھول ہی گئی۔" وہ دروازے سے نکلی نکلی پھر چھپاک سے اندر آگئی۔ مجھے یقین تھا اب دوبارہ نکلنے میں دس منٹ اور لے گی۔

○☆○

ساہی صاحب اس روز تو نہیں آئے لیکن اگلے روز صبح سویرے کاٹج پہنچ گئے۔ انہوں نے وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے فریال میرے گوش گزار کر چکی تھی۔ وہ شگفتہ کے لیے میری ہی طرح پریشان نظر آتے تھے اور اسے جلد از جلد قدر زماں کے چنگل سے نکالنا چاہتے تھے۔ پھر ایک اور بات بھی تھی۔ اگر میرا اندازہ درست تھا اور وہ اپنے طور پر مجھے شکر شکرا کے مقابل لانے کا ارادہ کر چکے تھے تو اس کے لیے بھی میرے پاؤں سے شگفتہ کی زنجیر توڑنا ضروری تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میری جوان بہن بھی جاگیردار کی دسترس میں رہے اور میں شکر شکرا سے دو دو ہاتھ بھی کرتا رہوں لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، مجھے دو فیصد امید بھی نہیں تھی کہ بات چیت کی صورت میں میری بہن کا کوئی بھلا ہوگا۔ قدر زماں مشتعل ہو کر کوئی بھی اقدام کر سکتا تھا۔ شگفتہ کی حیثیت اس منحوس حویلی میں وہی تھی جو درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں ایک تنہا ہرنی کی ہوتی ہے۔ جنگل کے بادشاہ کی ہوس ناک نگاہ ہر گھڑی اس پر مرکوز تھی۔ وہ جب چاہے اسے دبوچ سکتا تھا۔ اسے زندگی کے بدترین عذابوں سے دوچار کرا سکتا تھا۔ اس کی شہ رگ کو بھنبھوڑ کر خون کا آخری قطرہ تک اپنے جہنمی پیٹ میں اتار سکتا تھا۔ میں اس معصوم زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لہٰذا نہایت عاجزی کے ساتھ میں نے ساہی صاحب کی اس تجویز سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ فی الحال وہ اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیں۔ ساہی صاحب نے بڑے کھلے ذہن سے میری گزارشات کو سنا اور وعدہ کیا کہ میرے مشورے کے بغیر وہ اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

ساہی صاحب نے مجھے بتایا کہ کل علی الصباح وہ براستہ سڑک لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اور انجم کو ایک بند اسٹیشن ویگن میں لے جایا جائے گا۔ لاہور میں ہماری رہائش کا بندوبست بھی ہو چکا تھا۔ اگلے روز ہم صبح نو بجے ہمیں نتھیا گلی سے روانہ ہونا تھا لیکن عین وقت پر اسٹیشن ویگن خراب ہو گئی۔ ہم نے ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کیا۔ آخر ساہی صاحب کو فون کیا گیا، وہ ابھی نتھیا گلی میں ہی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم فلائنگ کوچ کے ذریعے لاہور چلے جائیں۔

یہ کوچ بارہ بجے چلی اور براستہ ایبٹ آباد لاہور روانہ ہوگئی۔ پنڈی تک تو ہمارا سفر بالکل خیریت سے گزرا لیکن پنڈی سے چند اوباش نوجوان کوچ میں سوار ہوئے اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر ہلا گلا کرنے لگے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ چڑی جینز، کارڈرائے کی پتلونیں اور پاؤں میں عجیب عجیب قسم کے جوگر۔ یہ سب کھاتے پیتے گھرانوں کے بگڑے ہوئے شہزادے تھے۔ لوفرانہ گانے الاپنے اور ایک دوسرے کو فحش مذاق کرنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہیں تھا۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی گوارا کی جا سکتی تھی لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے اشاروں کنایوں میں انجم کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ اس کی گلابی چادر پر تبصرہ کیا، اس کے گھونگھٹ کو تنقید کا نشانہ بنایا پھر اس کے بیٹھنے کے انداز پر گفتگو کرنے لگے۔ میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے زبان کھولی تو خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔ دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ یہ انڈین فلموں کے مصنوعی ہیرو کسی اگلے اسٹاپ پر کوچ سے اتر جائیں لیکن نہ تو وہ اترے اور نہ اپنی حرکات سے باز آئے۔ مجبوراً مجھے زبان کھولنا پڑی۔ کوچ میں موجود دو تین مسافروں نے بھی میرا ساتھ دیا اور ان لڑکوں کو سمجھایا کہ وہ انسانوں کی طرح سفر کریں۔ انہوں نے بمشکل دس پندرہ منٹ شرافت سے کاٹے اور ایک بار پھر اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ان میں سے دو لڑکے تو خاص طور پر بہت خطرناک اور گھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک لڑکے کی بات پر غور کیا تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے کہہ رہا تھا۔

"چوہدری جی! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ یہ اس بازار کا مال ہے، انہیں تو پوچھ کر دیکھ لیں۔"

ایک دوسرا نوجوان بولا "پوچھنے کی کیا ضرورت ہے"

سونگھ کر دیکھ لیں 'اصلی چوباروں والی مشک ہے۔"

سب سے پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے دو لڑکے کھڑکی پر طبلہ بجا بجا کر گانے لگے "تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں مستانی سی۔"

انجم کا بُرا حال تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی رو رہ کی طرح لرز رہی تھی۔ اس کا لرزنا اور ڈرنا سمجھ میں آتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس پر لگایا جانے والا الزام درست ہے۔ ان اوباش نوجوانوں میں سے یقیناً کوئی اسے بازارِ حسن میں دیکھ چکا تھا۔ جیسے تیسے ہم نے گوجر خان تک کا سفر کاٹا۔ یہاں فلائنگ کوچ ایک ریسٹورنٹ پر رکی۔ مسافر چائے وغیرہ پینے کے لیے ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ میں اور انجم بھی ایک میز پر جا بیٹھے۔ انجم سرگوشی میں بولی "میرا خیال ہے گاڑی بدل لیں۔ یہیں سے کسی دوسری کوچ میں بیٹھ جائیں گے۔"

میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ کوچ بدلنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہمارے پاس کون سا سامان تھا۔ میں نے جا کر کنڈیکٹر سے کہہ دیا کہ میری عزیزہ کی طبیعت خراب ہے لہٰذا ہم آگے نہیں جائیں گے۔ نو عمر کنڈیکٹر ساری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے ہونٹوں میں مسکراہٹ دبا کر اقرار میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ انجم باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں واپس آ کر میز پر بیٹھ گیا۔ مسٹنڈوں کی ٹولی چند گز دور ایک دوسری میز کے گرد بیٹھی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے نشہ کیا ہوا تھا یا کیا بات تھی کہ مسلسل بول رہے تھے اور ہوٹنگ کر رہے تھے۔ انجم باتھ روم سے نکل کر میز کی طرف آئی تو وہ کورس میں گانے لگے "توبہ یہ متوالی چال، جھک جائے پھولوں کی ڈال" انجم اب رو دینے کے قریب تھی۔ بات تھی بھی رونے والی۔ فلائنگ کوچ روانہ ہو چکی تھی اور یہ مسٹنڈے ہمارے ساتھ ہی ریسٹورنٹ میں رہ گئے تھے۔ اب اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ بات بڑھ کر رہے گی۔

میں نے ریسٹورنٹ میں نگاہ دوڑائی۔ ہال کمرے میں چند ملازمین کے علاوہ دو تین گاہک بھی تھے۔ اس کے علاوہ کاؤنٹر کے پیچھے ایک منیجر نما شخص تھا اور ایک باوردی کانسٹیبل دروازے کے پاس کھڑا دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ ان میں مجھے ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو آگے بڑھ کر میری مدد کر سکے۔ وہ سبھی صورتِ حال سے آگاہ تھے لیکن اپنی اپنی بزدلی کے خول میں چھپے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ کانسٹیبل بھی نظر بچا کے کھسکنے کی فکر میں تھا۔ یہ منظر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں نے ایسے بہت سے مناظر دیکھے ہیں جب کسی تھا

مظلوم کو ظالموں کے چنگل میں دیکھ کر شرفا کے محلوں کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں اور کانوں کے شٹر گرائے جاتے ہیں۔ مسٹنڈوں کی ٹولی کا سرغنہ ایک تیم شحیم نوجوان تھا۔ کسی اعلیٰ افسر کا لختِ جگر دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا "یارو! اس بندے کے سر کو گرمی چڑھ رہی ہے کہیں اٹھا کر کچھ دے نہ مارے۔"

اس کا ساتھی بولا "آخر بھائی ہے۔ اس کی بہن ہے۔ مم میرا مطلب ہے اس کی ٹرم پر پاؤں رکھو گے تو کاٹے گا نہیں۔"

ایک کوجیک نما لڑکا بولا "سور بہ پینے والے بھائی کاٹتے نہیں ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے' پھنسا ہوا ہے بے چارہ۔ تیر نظر کا شکار ہے۔ مجبور ہے اُف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

وہ سب گیدڑوں کی طرح ہم آواز ہو کر چلّانے لگے "مجبور ہے اُف اللہ۔ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ مجبور ہے اُف اللہ۔"

میرے رگ پٹھے اکڑتے جا رہے تھے۔ انگلیوں میں دوڑتی ہوئی حرارت شعلہ بننے والی تھی۔ انجم نے میری کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے لرزاں ہاتھ سے میری کہنی تھام لی۔

"درگزر کریں۔" وہ خوف زدہ انداز میں بولی "مُنہ بھونک کر چلے جائیں گے۔"

لیکن میں جانتا تھا' یہ بیماری بغیر علاج کے ٹلنے والی نہیں۔ میں انجم سے بازو چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور ان میں سے دو تین تو خاصے فائٹر قسم کے غنڈے تھے۔ بہت دنوں بعد ایسی خالص فلمی سچویشن سے پالا پڑا تھا۔ فلموں میں اور ڈراموں میں تو لڑائیاں آپ نے اکثر دیکھی ہوں گی۔ باکسنگ' جوڈو کراٹے اور کشتی وغیرہ کے مقابلے بھی ملاحظہ کیے ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسٹریٹ فائٹ ایک بالکل۔۔۔ بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق تربیت سے کم اور دل و دماغ سے زیادہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک بہت بڑا باکسر یا کراٹے کا قومی چیمپئن اسٹریٹ فائٹ میں بُری طرح پٹ جائے اور ایک مدقوق سا لڑکا اپنے حریفوں کو لہولہان کر ڈالے۔ میں بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسٹریٹ فائٹ کا تعلق براہِ راست انسان کے اندر بھڑکنے والی آگ سے ہوتا ہے۔ یہ آگ جتنی تیز ہو گی اسٹریٹ فائٹر اتنا ہی کامیاب ہو گا۔ میں اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی کسی خود نمائی کا شکار ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسٹریٹ فائٹ میں

میں نے بڑے بڑے جگادریوں کو نیچا دکھایا ہے اور ان کی زبان سے اپنے لیے "استاد جانی" کے الفاظ سنے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے استاد کہنے والوں میں جہاں میرے ہم عمر نوجوان تھے وہاں گھاگ قسم کے جہاندیدہ افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک شخص کالو جانی کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں' بات دوسری جانب نکل رہی ہے۔ میں ذکر کر رہا تھا گوجر خان کے لب سڑک ریسٹورنٹ کا اور پانچ عدد لوفروں کا۔ مجھے اپنے سامنے کھڑا پا کر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز بہت ڈھیلا ڈھالا اور تاؤ دلانے والا تھا۔ ان کے تیم شحیم سرغنہ کے منہ میں چیونگم یا الائچی وغیرہ تھی اور جبڑا مشین کی طرح چل رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی نہیں" وہ اطمینان سے بولا "اگر بناؤ گے تو بن جائے گی۔"

"کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے انداز پر ذرا سا گڑبڑایا پھر فوراً ہی اس کے سرخ و سفید چہرے پر خون کی یورش ہوئی۔ خطرناک لہجے میں بولا "ہم ایسی غلطی کیسے کر سکتے ہیں جھارا صاحب۔"

میں نے کہا "تمہاری ماں تمہیں پیدا کرنے کی غلطی کر سکتی ہے تو تم بھی ایسی غلطی کر سکتے ہو۔"

یہ فقرہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ خوفناک انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ دایاں مُکا بے پناہ قوت سے اس نے میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ لیکن اس کے سامنے کوئی عام شخص نہیں تھا' استاد جانی تھا اور استاد جانی پر وار کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے یہ مُکا بچایا' جونہی وہ اپنے زور میں ترچھا ہوا میری بھرپور ٹانگ اس کی پسلیوں پر پڑی۔ وہ اچھل کر کرسیوں پر گرا اور لڑھک کر کاؤنٹر سے جا ٹکرایا۔ انجم کی چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے منیجر کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا' وہ سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ دو لڑکے عقب سے بڑھے اور ایک ساتھ مجھ سے لپٹ گئے۔ میں اس اقدام کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے پہلے آگے کو زور لگا کر ان کا توازن خراب کیا اور پھر تیزی سے الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور ان دونوں کو دیوار سے ٹکرا دیا۔ ایک کے سر پر نہایت شدید چوٹ آئی اور اس نے پہلی فرصت میں میری کمر چھوڑ دی۔ دوسرے کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میں نے اس کی رانوں میں گھٹنا رسید کیا اور ایک طوفانی جھٹکے سے اسے کئی فٹ دور پھینک دیا۔

سرغنہ پہلی ضرب سے سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بھاری بھرکم کرسی اٹھائی اور چند قدم بھاگ کر پوری قوت سے مجھ پر دے ماری۔ میں نے تیزی سے جھک کر خود کو بچایا۔ کرسی میرے اوپر سے اڑتی ہوئی عقب میں انجم کو لگی۔ وہ چیخ کر ایک بڑے گلدان پر گری اور اسے توڑتی ہوئی فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس منظر نے میرے ذہن میں چنگاریاں بھر دیں۔ جونہی سرغنہ میرے قریب پہنچا' میں نے ایک خوفناک ٹکر اس کی ناک پر رسید کر دی۔ وہ تڑپ کر میز پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس ٹکر نے میرے حریفوں میں وحشت دوڑا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوجیک نما شخص نے مجھ پر جوابی وار کیا تو اس میں بوکھلاہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ اس نے کرسی کے ٹوٹے ہوئے ہتھے سے میرے سر کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔ لیکن یہ ہتھا اس کے ساتھی کی چھاتی پر لگا۔ کوجیک نما شخص اپنا توازن کھو چکا تھا۔ میں نے اس ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی رانوں میں ہاتھ دیا' دوسرا ہاتھ اس کے گریبان پر آیا اور وہ پھول کی طرح میرے ہاتھوں میں اٹھتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' یہ سارا توازن اور ٹائمنگ کا کھیل ہوتا ہے۔ میں نے کوجیک نما شخص کو گھما کر چٹخ فرش پر دے مارا اور پھر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ اب میں نے دیکھا کہ ایک اور شخص بھی میری طرف سے اس لڑائی میں شریک ہو گیا ہے۔ یہ وہی کانسٹیبل تھا جو تھوڑی دیر پہلے بھیگی بلی بنا کھسکنے کے چکر میں تھا۔ اس نے میرے پانچ حریفوں میں سے سب سے "ماٹھے" حریف کو چھاپ لیا تھا اور اب وہ دونوں فرش پر گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ میرے سامنے اب صرف دو غنڈے تھے۔ انجم کی کراہوں نے میرے سر میں انگارے دہکا رکھے تھے۔ میں نے ان بگڑے رئیس زادوں کو تیس سیکنڈ کے اندر اندر روئی کی طرح دھنک دیا۔ ان کی انگلش میڈیم گالیاں دیکھتے ہی دیکھتے چیخ و پکار میں بدل گئیں۔ جبکنیں پھٹ گئیں' پتلونیں اُدھڑ گئیں اور چہرے لہولہان ہو گئے۔ سرغنہ اور اس کے دو ساتھی ہال سے بھاگ چکے تھے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ہاکیاں' ڈنڈے اور اسلحہ وغیرہ لینے گئے ہوں لیکن میں جانتا تھا ہفتہ بھر بھی انتظار کروں تو وہ نہیں لوٹیں گے۔ باقی جو دو رہ گئے تھے ان میں سے ایک تو بالکل بے ہوش پڑا تھا۔ دوسرے کی کلائی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فرش پر بیٹھا مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں اسے مرغا بھی بنا دیتا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کانسٹیبل کا نام طفیل محمد تھا۔ وہ میری حمایت میں بڑا سرگرم نظر آ رہا تھا' کہنے لگا "بادشاہو! میں تھانے اطلاع دیتا

ہوں نے ان سب پر دفعہ ۳۲۰ نہ لگواؤں تو نام نہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ سارا معاملہ میں خود سنبھالوں گا۔ ہرجانہ مرجانہ سب کچھ یہی دیں گے۔ دہائی خدا کی' ہمارے تھانے میں ایسی دیدہ دلیری۔۔۔ یہ تو اب اپنی نسلوں کو بھی نصیحت کریں گے کہ گوجر خان کی حد میں کوئی جرم نہ کرنا۔"

میں نے انجم کو سنبھالا۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اب ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جاتے بہتر تھا۔ میں نے انجم کے کان میں سرگوشی کی "ہم اسپتال کے بہانے یہاں سے نکلیں گے۔ تم اپنی آنکھیں بند رکھو" وہ میری بات سمجھ گئی۔ یوں ظاہر کرنے لگی کہ نیم بے ہوش ہے۔ طفیل محمد نے اس کی گلابی چادر اٹھا کر سر پر ڈالی۔ میں نے اس کا منہ سر چادر میں لپیٹا' وہ مسلسل کراہ رہی تھی۔ اب ریسٹورنٹ میں خاصا مجمع لگ چکا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص بولا "اگر انہیں ہسپتال لے جانا ہے تو کار حاضر ہے۔"

یہ پیش کش ہماری ضرورت کے عین مطابق تھی۔ میں نے انجم کو بازوؤں میں اٹھایا اور باہر کھڑی ٹویوٹا کرولا میں لے آیا۔ اسے پچھلی نشست پر لٹا کر میں نے سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی کہنی پر گہری خراش آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ میں نے وہاں اپنا رومال باندھ دیا۔ گاڑی ہمیں لے کر جی ٹی روڈ پر آئی اور تیزی سے جنوب کی سمت بڑھنے لگی۔ ہم اسپتال جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہاں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ راستے میں ایک بس اڈے کے قریب مجھے کافی تعداد میں ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں۔ میں نے کار والے کو رکنے کا کہا۔ انجم بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اپنے خیر خواہ کو سمجھایا کہ میری ساتھی کو ہوش آگیا ہے اور میں اسپتال جا کر خواہ مخواہ معاملے کو طول دینا نہیں چاہتا۔ وہ میری بات سمجھ گیا تاہم انجم کے اتنی جلد ہوش میں آجانے پر وہ حیران بھی تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور انجم کو لے کر ٹیکسی اسٹینڈ پر آگیا۔ ایک اچھی حالت کی ٹیکسی کا ڈرائیور ہمیں تین سو روپے میں لاہور لانے پر رضامند ہوگیا۔ ہم نے پچھلی نشست سنبھالی اور لاہور روانہ ہوگئے۔

انجم خاصی مغموم اور ہراساں نظر آرہی تھی۔ ریسٹورنٹ کے واقعات کو دو گھنٹے گزرنے کے باوجود اس کے جسم کی لرزش برقرار تھی۔ اس کے علاوہ وہ تکلیف بھی محسوس کررہی تھی۔ کرسی لگنے اور گرنے سے اس کی ٹانگ پر چوٹ آئی تھی اور پنڈلی کا درد پھر جاگ اٹھا تھا۔

گوجرانوالہ تک تو وہ جیسے تیسے برداشت کیے بیٹھی رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔ میں نے کاموکی کے ایک میڈیکل اسٹور سے پین کلر لے کر اسے کھلائیں تاہم افاقہ نہیں ہوا۔ لاہور پہنچتے پہنچتے وہ درد سے تڑپنے لگی۔

لاہور میں ہماری رہائش کا انتظام شادمان کالونی کے ایک مختصر لیکن صاف ستھرے مکان میں کیا گیا تھا۔ ساہی صاحب کا ایک بااعتماد گھریلو ملازم یہاں پہلے سے موجود تھا۔ اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور نثار علی کو بھی ہمارے ساتھ ہی رہنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آرام کرنے اور دوا کھانے سے انجم کی تکلیف کم ہوجائے گی لیکن صورت حال برعکس نکلی۔ رات نو بجے تک وہ درد سے بے حال ہوگئی۔ عجیب سا کیس تھا اس کا۔ زخم اوپر سے مندمل ہوچکا تھا' پنڈلی قریباً صاف وشفاف نظر آتی تھی لیکن جب درد اٹھتا تھا تو پوری ٹانگ پھوڑا بن جاتی تھی۔ یہ میرا ہی لگایا ہوا زخم تھا۔ جب وہ درد سے تڑپتی تھی۔ غیر شعوری طور پر میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا تھا۔ وہ میرے پاس صفدر کی امانت تھی' اس کی حفاظت اور دیکھ بھال ہر طرح میری ذمے داری تھی۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں تھا جب کوٹھی کے گیٹ پر کار کا ہارن سنائی دیا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ وہ فریال ہے۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کار میں لاہور پہنچی تھی اور شاید پہنچتے ہی میری طرف چلی آئی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے جوگنگ شوز پر بے آواز چلتی اندر آگئی "ہیلو" وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔

میں نے کہا "فریال! تم بار بار غلطی کررہی ہو۔ ساہی صاحب مجھے خود سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں شاہ جہاں صاحب" وہ بولی "میں بے حد احتیاط سے آپ کے پاس آئی ہوں۔ کوئی میرا پیچھا کرتے ہوئے آپ تک پہنچ جائے تو اپنے ہاتھوں سے سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گی" پھر اس کی نظر انجم پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ جلدی سے اس کے سرہانے پہنچی "کیا ہوا ہے انہیں؟"

"شدید درد ہو رہا ہے" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہائے اللہ" وہ بے قرار ہوگئی۔ بڑھ کر اس نے انجم کا چہرہ اپنی گود میں رکھ لیا اور تسلی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد بولی "شاہجہاں صاحب' انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے' ہم ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے۔"

"آپ یوں کہیں کہ ہم ہر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے۔ جس ڈاکٹر کے پاس میں آپ کو لے جاؤں گی وہاں جانے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔"

"لیکن۔۔۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"آپ مجھ پر اعتماد کریں شاہجہاں صاحب" وہ عجب سنجیدگی سے بولی "میری ذات سے آپ کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"بہتر ہے کہ ساہی صاحب سے مشورہ کرلیں۔"

"اس وقت آپ مجھے ہی ساہی صاحب سمجھ لیں" وہ تیزی سے بولی پھر کھڑکی کھول کر ڈرائیور کو آوازیں دینے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم انجم کو سوزوکی وین میں ڈالے گلبرگ کی طرف جارہے تھے۔ انجم درد سے بے ہوش ہونے والی تھی۔ فریال نے اس کا سر گود میں رکھا ہوا تھا اور مسلسل دلاسا دے رہی تھی۔ بیس منٹ بعد ہم ایک کلینک کے سامنے رکے۔ انجم نے سر پر چادر ڈال کر گھونگٹ سا نکال لیا۔ وہیل چیئر پر بٹھا کر اسے کلینک میں پہنچایا گیا۔ یہ ایک لیڈی سرجن تھیں۔ صرف خواتین کا معائنہ کرتی تھیں۔ میں باہر برآمدے میں بیٹھ گیا اور فریال' انجم کو لے کر خواتین والے حصے میں چلی گئی۔ لگتا تھا کلینک میں اس کی کافی جان پہچان ہے۔ جلد ہی انجم کو اندر بلالیا گیا۔۔۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں فارغ ہوئیں۔ انجم اپنے پاؤں پر چل کر آرہی تھی۔ چہرے کی گلابی رنگت بھی کافی حد تک بحال ہوگئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم وین میں آبیٹھے۔ فریال نے بتایا کہ ڈاکٹر نے دوا دی ہے۔ نس میں انجکشن بھی لگایا ہے۔ ایکسرے سے پتا چلا ہے کہ اندر زخم میں "پس" ہے تاہم فکر کی کوئی بات نہیں۔ کل انہوں نے اسپتال میں بلایا ہے۔ معمولی سا آپریشن ہوگا اور زخم صاف کردیا جائے گا۔

انجم خود بھی کافی مطمئن نظر آرہی تھی۔ بولی "بڑی اچھی ڈاکٹر ہے۔ بہت ہمدرد اور خوش اخلاق۔"

فریال نے مجھ سے کہا "آپ ملیں گے ڈاکٹر سے؟" پھر خود ہی بولی "آئیں شکریہ ادا کر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "شکریہ ادا کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر وین سے اتر آئی۔ ہم دوبارہ کلینک میں داخل ہوئے۔ راہداری سے گزر کر ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ خادمہ نے فریال کا پیغام اندر پہنچایا اور تھوڑی دیر بعد خادمہ ہمیں اندر لے گئی۔۔۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔

میرے سامنے سفید براق لباس میں غزالہ کھڑی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ غزالہ حال ہی میں امریکا سے سرجری کا کورس کرکے آئی ہے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ایک بڑا کلینک بھی چلارہی ہے اور میں جس مسیحا کے پاس انجم کو لایا ہوں وہ بھی قاتلِ ہوش دخترِ غزالہ ہے۔ اس سے میری آخری ملاقات دو ہفتے پہلے لاہور ہی کے ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے حسین ہونٹوں کی ہوش رُبا التجاؤں کو ٹھکرایا تھا اور اسے اپنے قریب سے دھکیل کر قالین پر پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد میں شعلۂ جوالا بنا ہوٹل سے چیک آؤٹ کرگیا تھا اور مری جاکر دم لیا تھا۔ اب پھر وہی غزالہ میرے روبرو کھڑی تھی۔ ایک نوجوان لیکن نامور سرجن' ایک امریکا پلٹ حسین اور ذہین دوشیزہ۔ لوگ اس کے دروازے کے سامنے قطار بناتے تھے' اس سے ملنے کے لیے ہفتوں پہلے وقت لینا پڑتا تھا اور وہ میرے سامنے سراپا عجز وانکسار بنی کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ لرز رہے ہیں اور ہونٹ سفید پڑ رہے ہیں۔

"پلیز بیٹھیے" وہ جھکی جھکی نظروں سے بولی۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔ ورنہ اس کلینک پر تھوکتا بھی نہیں" میرے ہونٹوں سے زہریلی پھنکار نکلی۔

"پلیز میری بات سن لیجیے" اس نے اپنی اشک بار نگاہیں اٹھائیں۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آفت جاں فریال مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر جاچکی ہے اور میری پشت پر دروازہ بند ہے "میں معافی چاہتا ہوں" میں نے بے انتہا تلخ لہجے میں کہا "تم نے میرے مریض کو دیکھا ہے' یہ لو اس کا معاوضہ" میں نے جیب سے پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اس کی وسیع میز پر پھینک دیے۔

"شاہ جہاں" اس نے کراہ کر میرا بازو تھام لیا۔ اس کی فریادی انگلیاں میرے گوشت میں پیوست ہورہی تھیں۔ میں نے جھٹک کر بازو چھڑایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

فرش کو پاؤں سے کوٹتا ہوا میں وین میں پہنچا تو احساس ہوا کہ میرے انداز نے کلینک میں موجود ہر وجود کو متحیر کردیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فریال' غزالہ کے بارے میں کیونکر اور کیسے جان سکی ہے؟

وین میں فریال پہلے سے موجود تھی۔ میرے اتنی جلد لوٹ آنے پر وہ مایوس نظر آتی تھی۔ میں نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا اور انجم کے پاس بیٹھ گیا۔ شاید میں راستہ بھر کسی سے کوئی بات نہ کرتا لیکن وین کے اسٹارٹ ہوتے ہی مجھے اپنی زبان کھولنی پڑی۔ پارکنگ میں کھڑی ایک گاڑی نے مجھے بُری طرح چونکا دیا تھا۔ یہ ایک نسان سنی تھی' اس پر جھنگ کی نمبر پلیٹ تھی اور کھڑکیوں پر پردے تھے۔ یہ گاڑی

میں قادر زماں کی گاڑیوں میں دیکھ چکا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس گاڑی میں یہاں کون آیا تھا؟ اگر کوئی عورت تھی تو کون تھی؟ کہیں اس نے انجم کو دیکھ تو نہیں لیا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ عورت اکیلی نہیں آئی ہوگی' اس کے ساتھ کوئی مرد ہوگا۔ وہ مرد' زنانہ انتظار گاہ میں موجود تھا۔ کیا میں بھی پہچانا جا چکا تھا؟ یہ خیال زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا۔ فریال اور انجم حیرت سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا آپ کو؟" انجم نے میرا بازو ہلا کر پوچھا۔

"تمہیں اندر حویلی کی کوئی عورت تو نظر نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" انجم نے فوراً جواب دیا "اگر ہے بھی تو میں نے نہیں دیکھی۔ کیوں کیا بات ہے؟"

میں نے سامنے کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کیا "وہ دیکھو یہ حویلی کی گاڑی ہے۔"

انجم کے چہرے پر بھی تاریک سائے لہرا گئے۔ اسے ہراساں دیکھ کر مجھے اپنے حواس پر قابو پانا پڑا۔ ساتھ ہی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ مجھے اس سے بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اطمینان کی صرف ایک ہی بات تھی گرد و پیش میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر کلینک میں حویلی کا کوئی بندہ موجود تھا اور وہ ہماری طرف سے مشکوک ہو چکا تھا تو ضروری تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کرتا لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ مزید تصدیق سفر کے دوران کی جا سکتی تھی۔ میں نے ڈرائیور نثار کو گاڑی بڑھانے کی ہدایت کی۔ شہر کی طرف جانے کے بجائے میں نے نثار کو جیل روڈ پر ڈالا پھر لارنس روڈ کے قرب و جوار میں گھوم پھر کر اطمینان کر لیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔ اس کے بعد میں نے نثار کو شادمان چلنے کو کہا۔

راستے میں انجم اور فریال سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں تاہم ڈرائیور کی موجودگی میں وہ اس نازک مسئلے کو چھیڑنے سے باز ہی رہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی فریال نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے اپنی عیاری سے سوالات کا جال بچھایا کہ میں اسے غزالہ کے حوالے سے دانستہ بھول ہی گیا۔ میرا ذہن مکمل طور پر [illegible] کی طرف منعطف ہو گیا۔ میں نے فریال کو ساتھ والے کمرے میں لے جا کر کہا "دیکھو فریال! مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلومات چاہئیں۔ اس میں کون یہاں آیا تھا۔ کس نیت سے آیا تھا [illegible]؟"

"کیوں نہیں" وہ خم ٹھونک کر بولی۔

"لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔"

"آپ یہ بات نہ کہتے تو آپ کے الفاظ بچ جاتے۔"

"کیا میں تمہارا انتظار کروں؟" میں نے پوچھا۔

"کتنا پیارا لگا ہے یہ لفظ آپ کے منہ سے" وہ اٹھلا کر بولی۔

"کون سا لفظ؟"

"انتظار کا" اس کے لہجے میں شوخی تھی پھر بوجھل نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی وہ باہر چلی گئی۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن پر خیالات کی یورش تھی۔ بار بار کچھ صورتیں تصور کے پردے پر ابھر رہی تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں صورت غضنفر شاہ کی تھی۔ یہ صورت تصور میں ابھرتی تھی تو کانوں میں دھماکے ہونے لگتے تھے اور فضا میں بارود کی بو محسوس ہوتی تھی۔ گہرا تعلق تھا نحوست کا اس صورت سے۔ یہ نحس شخص میرے ارد گرد موجود تھا۔ دور تھا یا نزدیک۔۔۔ وہ ان فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔

رات ایک بجے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف فریال تھی "ہیلو" اس کی رسیلی آواز ابھری۔

"ہاں میں احسان بول رہا ہوں۔"

"آپ کے لہجے میں اتنی اداسی ہے کہ لگتا ہے برسوں سے تھکے ہارے ہوئے ہیں۔"

"کام کی بات کرو فریال۔"

"آپ کا کام ہو گیا ہے۔"

"ہاں کہو۔"

"گاڑی میں ترنم نام کی صاحبہ جھنگ سے آئی تھیں ان کے ساتھ ایک گن مین اور ایک ڈرائیور تھا۔ جس وقت ہم کلینک پہنچے گن مین کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کا نام غالباً اسد ہے۔ ترنم صاحبہ کا پورا نام مسز ترنم زماں ہے۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

فریال کی اطلاعات سنسنی خیز تھیں۔ خاص طور پر آخری فقرہ۔ اس نے خاتون کا نام ترنم زماں بتایا تھا۔ یعنی وہ قادر زماں کی بیوی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق قادر زماں کی کئی بیویاں تھیں۔ ان میں سے کچھ حیات تھیں اور کچھ داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ اب معلوم نہیں زندہ شریک حیات میں سے وہ کون سی شریک حیات تھی۔ فریال کی بات میں تسلی کا پہلو یہ تھا کہ جس وقت ہم کلینک پہنچے صرف ڈرائیور وہاں موجود تھا اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ

مجھے پہچانتا ہو۔ جہاں تک مسز ترنم زماں کا تعلق تھا تو یقیناً وہ انجم کو نہیں پہچانتی ہوگی۔ حویلی میں انجم عیاشی کا سامان تھی اور ایسے ساز و سامان کو "نیک بیبیوں" کی نگاہ سے دور رکھا جاتا ہے۔

وہ رات میں نے بستر پر کروٹیں بدلتے گزاری اور اگلے روز فریال کو فون پر صاف بتا دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کی اوچھی حرکت نہ کرے۔ وہ جس عورت کے پاس مجھے لے گئی تھی اس کے لیے میرے دل میں کوئی جگہ ہے نہ آنکھ میں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ انجم کے آپریشن کے لیے وہ کوئی اور ڈاکٹر تلاش کرے اور اگر نہیں کر سکتی تو میں خود انتظام کر لوں گا۔

فریال نے میرے تلخ ترش لہجے کو بڑے [illegible] سے سہا اور اپنے ملتجی لہجے سے میرے شعلوں پر چھینٹے دینے کی کوشش کی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ انجم کے آپریشن کے لیے کسی دوسرے ڈاکٹر کو ارینج کر رہی ہے۔

اگلے روز شام تک اس نے تمام انتظام کر لیا۔ ایک قابل بھروسا ڈاکٹر کے پرائیویٹ کلینک میں انجم کی پنڈلی کا چھوٹا سا آپریشن ہوا اور ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد وہ دس بارہ گھنٹوں میں گھر واپس آ گئی۔

انجم کے کامیاب آپریشن نے میرے ذہن سے ایک بھاری بوجھ اتار دیا تھا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ کئی روز کے بعد پہلی مرتبہ میں نے شیو بنائی' غسل کیا اور لباس بدلا۔ موسم بھی خوش گوار تھا۔ دو روزہ بوندا باندی کے بعد دھوپ نکلی ہوئی تھی اور کوٹھی کے چھوٹے سے لان میں سدا بہار پھول مہک رہے تھے۔ جی چاہا' اپنے حالات سے تمام ذہنی رابطے منقطع کر کے اس ماحول میں گم ہو جاؤں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی باد سموم کے بجائے تازہ ہوا کو سینے میں اتاروں' تصور میں رقصاں خونی بھوتوں کے بجائے حسین مناظر پر نگاہ ڈالوں۔ میں نے کمرے سے باہر لان میں کرسی ڈال کر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ فضا میں بدستور زہریلی ہوا کی یورش رہی۔ مہکتے پھولوں پر بدستور سائے رقصاں رہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کے لیے تصور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس [illegible] جہاں میں اور ننھے پھولوں کے درمیان پھولوں کی طرح مسکراتے تھے۔ ہمیشہ کے سبزہ زار' دوڑانے کے لیے مضبوط بانہیں سہارا دیتی تھیں۔ تارے جھلملاتے رخساروں پر ماں باپ کے بوسے ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ صبح و شام کتنے حسین ہوا کرتے تھے۔ میں اپنے تصور کو دھکیل دھکیل کر اس دنیا میں لے گیا۔ خوابوں کے جھولے میں جھولنے لگا اور رنگین فضا میں اڑنے لگا۔

یکایک قدموں کی چاپ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دیکھا' ٹینس شوز میں بلی کی چال چلنے والی خوبرو فریال سامنے کھڑی تھی۔ اس کے رخسار سنہری دھوپ میں تمتما رہے تھے۔

"ہیلو" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"ہیلو" میں نے زبردستی مسکرا کر جواب دیا "بیٹھو۔"

وہ بولی "اکیلی کیسے بیٹھوں' میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔"

"کون ہے؟"

"ڈاکٹر غزالہ" اس نے میری سماعت میں دھماکا کیا۔

میں کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ غضب کی ایک لہر سینے سے بلند ہوئی اور کنپٹیاں جل اٹھیں۔ میں غرایا "فریال' میں نے تم سے کہا تھا کہ اب اس عورت کا ذکر میرے سامنے نہ کرنا۔ تم اسے یہاں اس چار دیواری میں لے آئی ہو۔ میرا خیال ہے مجھے تمہارے پاپا کی دی ہوئی یہ پناہ گاہ اب چھوڑنی پڑے گی۔ میں ابھی فون کرتا ہوں ساہی صاحب کو" غصے میں کھولتا ہوا میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔

"ارے بابا' یہ غضب نہ کریں' پہلے دیکھ تو لیں ڈاکٹر غزالہ یہاں کیوں آئی ہیں اور ان کے ساتھ کون ہے؟" مجھے متحیر چھوڑ کر اس نے دروازے کی طرف رخ پھیرا اور بولی "غزالہ باجی' آ جائیں۔"

چند لمحے کے توقف سے دروازے میں جنبش ہوئی اور غزالہ اندر آئی۔ غزالہ کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ میں نے لڑکی کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یوں لگا ایک دھماکے سے کائنات میں ان گنت پھلجھڑیاں چھوٹ گئی ہیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔ یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ یہ حالت خواب ہے یا بے داری۔۔۔ میں نے آنکھوں کو زور سے جھپکا' میرے سامنے شگفتہ کھڑی تھی۔ قادر زماں کی حویلی میں پھنسی ہوئی وہ وحشی ہرنی جس پر ہزاروں شکاریوں کی نگاہیں تھیں۔ وہ سب زنجیروں کو چھڑا کر اور سارے حصار توڑ کر میرے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ میں جیسے ہوا میں اڑتا ہوا آگے بڑھا۔ شگفتہ نے اپنے بازو کھولے اور ہم ایک دوسرے میں سما گئے۔ ایک جان دو بدن کی طرح۔ دھوپ اور حدت کی طرح' چاندنی اور ٹھنڈک کی طرح' رات اور روشنی کی طرح۔

وہ میرے سینے میں دھنس گئی اور میں اس کے بالوں میں چھپ گیا "شفتا شفتا" میں اسے بار بار پکار رہا تھا۔ وہ میری ہر پکار کے جواب میں بھیا کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور ۔۔۔ دور سے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

"شفتا تو ٹھیک تو ہے نا۔ تجھے کوئی دکھ تو نہیں دیا گیا۔ بتا' تو ٹھیک ہے نا۔"

میں بار بار اس کا سر چوم رہا تھا' اسے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت اسی عالم خود فراموشی میں گزرا۔ میرے رخسار اشکوں سے تر تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ آج قریباً ساڑھے تین برس بعد میں نے اسے چھوا تھا' اس کی آواز سنی تھی اور یہ وہی شفتا تھی جس سے چند گھنٹے جدا رہنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب ہم جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ چکے اور دل کی بھڑاس اشکوں کے راستے نکال چکے تو فریال نے شفتا کو غزالہ کے پاس بیڈ روم میں چھوڑا اور مجھے لے کر نشست گاہ میں آگئی۔ میں حیران پریشان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان گنت سوالات ہونٹوں تک آنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے فریال سے کہا "سچ بتاؤ فریال' میری بہن کو کون لایا ہے یہاں؟"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں' اسے لانے والی ڈاکٹر غزالہ ہیں۔"

"لیکن کیسے ۔۔۔ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"

"آپ میری بات پر یقین کریں گے؟" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں کروں گا ۔۔۔ بتاؤ تم۔"

وہ بولی "کل صبح ڈاکٹر غزالہ خود جھنگ گئی تھیں ۔۔۔ شگفتہ باجی کو لانے کے لیے۔ انہوں نے قادر زماں سے ملاقات کی اور اسے مجبور کیا کہ وہ شگفتہ باجی کو چھوڑ دے۔"

"کیسے مجبور ہو گیا وہ۔ کیا مجبوری تھی اسے؟"

"بہت بڑی مجبوری تھی۔ قادر زماں کا تمام اثر و رسوخ اس کی ساری دولت اور طاقت اس مجبوری کے سامنے ہیچ تھی۔ اسے ڈاکٹر غزالہ کی بات ماننا پڑی اور وہ سب کچھ کرنا پڑا جو ڈاکٹر غزالہ نے کہا۔"

"میں تمہاری پہیلیاں سمجھنے سے قاصر ہوں فریال ۔۔۔ مجھے صاف لفظوں میں بتاؤ میری بہن یہاں کیونکر پہنچ سکی؟"

فریال نے پیشانی سے بال پیچھے ہٹائے اور سنجیدہ لہجے میں بولی "قادر زماں کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے لیکن اولاد

کے جدید ترین اسپتالوں میں علاج کرایا لیکن اولاد سے محروم رہا۔ اب اس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہے اور اس کے کانوں نے پہلی بار باپ بننے کی خوشخبری سنی ہے۔ مسز ترنم سے اس کی شادی دو برس قبل ہوئی تھی۔ شادی کے تین ماہ بعد وہ ایک حادثے میں زخمی ہوئی اور اسے شدید اندرونی ضربیں پہنچیں۔ وہ کئی ماہ ڈاکٹر غزالہ کے زیر علاج رہی۔ ڈاکٹر غزالہ نے اسی وقت میاں بیوی کو بتا دیا تھا کہ ترنم کا اندرونی نظام متاثر ہوا ہے اور اگر وہ امید سے ہوئی تو اس کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ تاہم چند ماہ بعد وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ قادر زماں کی کئی بیویاں اولاد کی نعمت سے محروم رہی تھیں لیکن ترنم کے لیے صورت حال مختلف نکلی۔ شادی کے ڈیڑھ برس بعد وہ امید سے ہو گئی۔ قادر زماں اسے لے کر ڈاکٹر غزالہ کے پاس آیا تو ڈاکٹر غزالہ حیران رہ گئیں۔ انہیں سخت افسوس ہوا کہ میاں بیوی نے ان کی ایڈوائس کو نظر انداز کیا ہے۔ اس معاملے پر بحث کے دوران ڈاکٹر غزالہ اور قادر زماں میں تلخ کلامی بھی ہو گئی۔ ڈاکٹر غزالہ نے مسز ترنم زماں کا کیس لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جواب میں قادر زماں نے جاگیردارانہ لہجے میں ڈاکٹر غزالہ کو برا بھلا کہا اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ وہ مسز ترنم کو یہ کہتے ہوئے کلینک سے لے گیا کہ دنیا میں ڈاکٹروں کی کمی نہیں لیکن یہاں صورت حال نے ایک نئی کروٹ لی۔ حادثے کے بعد مسز ترنم کافی عرصہ ڈاکٹر غزالہ کے زیر علاج رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر غزالہ پر بے پناہ بھروسا کرنے لگی تھی۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر ڈاکٹر غزالہ کے علاوہ کسی اور نے اس کا کیس کیا تو وہ زندہ نہیں بچ سکے گی۔ قادر زماں اسے امریکا اور ویانا تک لے کر گیا لیکن وہ اس بات پر مصر رہی کہ اس کی زندگی بچانے کی کوشش ڈاکٹر غزالہ کے ہاتھوں ہو۔ آنے والے لمحات کا خوف اسے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا اور وہ روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں زچہ اور بچے کی زندگی کے لیے خطرہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مجبور ہو کر قادر زماں نے ایک بار پھر ڈاکٹر غزالہ کے کلینک کا رخ کیا۔ پہلے رعونت لہجے میں بات چیت کی' پھر خوشامد اور لالچ کے ہتھیار آزمائے لیکن ڈاکٹر غزالہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ یہ کیس نہیں کریں گی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ پچھلے ایک ماہ سے مسز ترنم زماں لاہور ہی میں مقیم تھی اور کسی طرح ڈاکٹر غزالہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہفتے کے روز بھی وہ اچانک اسی ضرورت

کا پتا چلانے کے لیے کہا تو میں سیدھی ڈاکٹر غزالہ کے پاس گئی۔ آپ جناب! یہ نہ پوچھئے گا کہ میں ڈاکٹر غزالہ کو کیسے جانتی ہوں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں' میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں اور شاید وہ بھی جو آپ بھی نہیں جانتے۔ جی ہاں' ڈاکٹر غزالہ کی اور آپ کی ساری کہانی مجھے معلوم ہے۔ وہ آپ کی چچا زاد ہیں۔ آپ کا بچپن اکٹھے گزرا ہے۔ میں جانتی ہوں' آپ بچھڑے بچھڑے کیسے ملے تھے اور ملتے ملتے کیسے بچھڑ گئے ہیں۔ جی ہاں' سب کچھ معلوم ہے مجھے ۔۔۔ وہ تصویریں جو آپ نے میرے البم میں رکھی تھیں' ڈاکٹر غزالہ کے ہی گھر سے ملی ہیں مجھے ۔۔۔" بولتے بولتے وہ اچانک چپ ہو گئی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ موضوع سے ہٹ گئی ہے۔ بال جھٹک کر بولی "ہاں ۔۔۔ میں مسز ترنم کی بات کر رہی تھی۔ اس رات میں ڈاکٹر غزالہ کے پاس پہنچی اور جھنگ کی نمبر پلیٹ والی گاڑی کے بارے میں پوچھا ۔۔۔ ڈاکٹر غزالہ نے مجھے ترنم کے بارے میں بتایا۔ اس رات ہم دونوں میں دیر تک گفتگو ہوئی بلکہ میں ڈاکٹر غزالہ کے ساتھ ان کے گھر ہی چلی گئی تھی۔ رات ایک بجے جب میں نے آپ کو فون کیا تھا تو ڈاکٹر غزالہ میرے پاس ہی کھڑی تھیں۔ میں انہیں شگفتہ باجی کی مصیبت کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی۔ اگلے روز مجھے بتائے بغیر ڈاکٹر غزالہ خود جھنگ پہنچیں اور قادر زماں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا علم مسز ترنم کو بھی نہیں ہے۔ وہ جھنگ سے شام کو واپس آئیں اور کل صبح سویرے پھر چلی گئیں۔ قادر زماں سے ان کی تفصیلی بات چیت ہو گئی۔ اس مرتبہ وہ جھنگ سے لوٹیں تو شگفتہ باجی ان کے ساتھ تھیں۔"

میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن' یہ روداد سن رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر مجھ پر اتنی مہرباں ہو سکتی ہے۔ کیسے بھی ہوا تھا لیکن یہ سب کچھ ہو چکا تھا' شگفتہ اس حویلی سے نکل چکی تھی۔ قادر زماں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی مونچھ نیچی کی تھی۔ اپنی قیمتی زچہ اور اس سے بھی قیمتی بچے کو بچانے کے لیے اس نے زنداں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ میں سینکڑوں مرتبہ قسمت کی یہ کرشمہ سازیاں دیکھ چکا ہوں۔ انسان کو وہاں سے خوشی اور غم مل جاتے ہیں جہاں سے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اچانک فریال کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بڑی ادا سے آگے کو جھکی ہوئی میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کو ہمارا دوسرا محبوب کیسا لگا؟"

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"غزالہ جی کی" وہ شوخی سے بولی "آپ کی طرح غزالہ جی بھی میری محبوب ہیں۔ میں پگلی آپ دونوں کے عشق میں گرفتار ہوں۔ دونوں پر مرتی ہوں' نہ کسی پر کم نہ زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پتا ہے کیا ہے؟" میں خاموش رہا تو وہ اٹھ کر بے باکی سے میرے پاس آ بیٹھی' حسب سابق اپنی ٹھوڑی میرے شانے پر گاڑ کر بولی "میں آپ دونوں کو ایک دیکھنا چاہتی ہوں ۔۔۔ بالکل ایک ۔۔۔ ایک ذرا سا' ذرا سا فاصلہ بھی نہ ہو آپ دونوں میں" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

غزالہ کے ذکر نے ایک دم میرے سینے میں سرد لہر دوڑا دی۔ مسرت کی دھوپ کو غم کے دبیز بادل ڈھانپنے لگے۔ مجھے لگا کہ میرا پورا جسم ایک آہنی شکنجے میں کسا گیا ہے' یہ شکنجہ مختلف اطراف میں زور لگا رہا ہے اور میں دو حصوں میں تقسیم ہو رہا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اذیت انتہا کو پہنچ گئی۔ قرب و جوار کی آوازیں ٹوٹ کر بکھر گئیں اور ان کے ٹکڑوں سے ایک نئی صدا وجود میں آگئی۔ بھولی بسری سی کھوئی کھوئی سی ۔۔۔ "یہ زندگی کے میلے ۔۔۔ یہ زندگی کے میلے' دنیا میں کم نہ ہوں گے' افسوس ہم نہ ہوں گے۔"

مجھے احساس ہوا کہ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی ہیں اور پہلو میں بیٹھی فریال حیرت سے میری طرف دیکھ رہی ہے ۔۔۔ خود فراموشی کی یہ کیفیت تیزی سے مجھ پر طاری ہو رہی تھی' میں نے خود کو فوری طور پر سنبھالا دینے کی کوشش کی اور سر جھٹک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ معلوم نہیں فریال نے مجھ سے کیا کہا اور کچھ کہا بھی یا نہیں ۔۔۔ میری سماعت مفلوج ہو رہی تھی۔ تیزی سے قدم اٹھاتا میں اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ذہن میں ایک آرزو انگاروں کی طرح سلگ رہی تھی' کاش یہ سب کچھ غزالہ کے ہاتھوں نہ ہوا ہوتا' کاش میری ذات پر یہ احسان عظیم کرنے والی جلیس احمد کی بیٹی نہ ہوتی۔ کاش ۔۔۔ آتش زیر پا کی طرح میں کمرے میں چکرانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' غزالہ کا سامنا کیسے کروں۔ دل چاہ رہا تھا' شفتا کو اس کمرے میں بلاؤں اور اسے ساتھ لے کر عقبی کھڑکی سے نکل جاؤں۔ یہ گھر یہ شہر اور ہو سکے تو ملک ہی چھوڑ دوں۔ ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں کبھی غزالہ اور اس کے احسان کا سامنا نہ

سے جہاں میں چکرا رہا ہوں اور یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں۔ وہ باتھ روم میں گئی تھی' جب میں نے اندر آکر دروازہ بند کر لیا تھا۔ پانی گرنے کی مدھم آواز سن کر میں چونکا' پھر اس سے پہلے کہ میں صورت حال کی تہ تک پہنچتا' باتھ روم کا دروازہ کھلا اور غزالہ اپنے لمبے گھنے بال جوڑے کی صورت سمیٹی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا تھا۔ چہرہ سفید گلاب کے مانند نکھرا ہوا تھا۔ وہ اکہرے بدن کی لیکن کشادہ شانوں والی تھی۔ جلد چکیلی اور تنی ہوئی' رخساروں کی ہڈیاں ذرا سی ابھری ہوئیں اور پیشانی تابندہ تر۔ کمرے کی مدھم روشنی میں میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ دل موہ لینے والے حسن کی ہر تعریف پر پوری اترتی تھی۔ اس نے اپنی جھیل سی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں اشکوں کے موتی چمکے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے ارادہ ترک کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میری پنڈلیاں اس کے بازوؤں کے حصار میں تھیں اور اس کا چہرہ میرے گھٹنوں سے چھو رہا تھا۔ اس نے اپنی خاموشی کو زبان بنایا اور سسکیوں کے لہجے میں ہر وہ بات کہہ گئی جو وہ ہونٹوں سے کہہ سکتی تھی۔ اس سے پہلے میری بے رخی اور کج کلاہی نے مجھے اس قسم کی صورت حال سے نکال لیا تھا لیکن آج یہ ہتھیار بھی کند تھے۔ شگفتہ کی "وہ" میری زبان کو مقفل کر چکی تھی۔ میں اندر سے کتنا بھی ٹوٹا ہوا تھا' کتنا بھی دکھی تھا لیکن اس وقت غزالہ کو خود سے دور جھٹکنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں اپنا تمام غضب اور ساری شعلہ فشانی اپنے اندر چھپائے خاموش کھڑا رہا۔ کوئی ایسا درمیانی راستہ ڈھونڈتا رہا کہ غزالہ کی آنکھوں سے خون کے آنسو بھی نہ نکلیں اور میں اس سے چھٹکارا بھی پالوں۔

میری پنڈلیاں غزالہ کی گرفت میں تھیں اور میں خاموش کھڑا تھا۔ اس دریا کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس کی آنکھوں میں پوری طغیانی پر نظر آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کی سسکیاں مدھم پڑیں تو میں نے بہ آہستگی اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم کی اور ایک قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ناک اور ہونٹ دونوں ہاتھوں میں چھپائے کھڑی ہو گئی۔ وہ سرنگوں تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ مجھے دیکھنے کے بعد وہ جوڑا باندھنے کا عمل مکمل نہیں کر سکی تھی اور یہ ڈھیلا ڈھالا جوڑا اس کے شانے پر ریشم کے تھان کے مانند کھل چکا تھا۔

میں نے اپنی آواز میں حتی الامکان نرمی سمیٹتے ہوئے کہا:

"غزالہ! میں تمہارا احسان مند ہوں۔ اس احسان کی جو قیمت تم چاہو مجھ سے وصول کر سکتی ہو۔ ایک زر خرید غلام سمجھ کر مجھے لے جاؤ اور جس بازار میں چاہو فروخت کر دو لیکن جو امر میرے اختیار میں نہیں وہ تمہارے بھی علم میں ہے۔ مجھے اس کے لیے مجبور نہ کرنا۔"

وہ روتے ہوئے بولی "میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ خدا کی قسم میں نے کچھ بھی نہیں کیا' مجھے کوئی دعویٰ نہیں ہے آپ پر۔ میں بغیر کسی شرط کے آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"نہیں غزالہ! اس وقت میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ اگر بخش سکتی ہو تو یہ احسان مجھے بخش دو۔ میں جب تک زندہ رہوں گا اس احسان کو یاد رکھوں گا۔"

"شاہ جہاں" وہ بلک پڑی۔

اس کی بے بسی ناقابل بیان تھی لیکن میں خود بھی بے بس تھا۔ رخ پھیر کر میں دروازے کی طرف بڑھا۔ چٹخنی کھول کر باہر نکلنا چاہا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔ یہ خیال برق کی طرح ذہن میں کوندا کہ یہ کام فریال کے سوا کسی اور کا نہیں "فریال! دروازہ کھولو۔" میں نے چلا کے کہا' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جھنجلا کر دروازے پر مکے برسانے لگا "دروازہ کھولو فریال' دروازہ کھولو" میری آواز میری توقع سے زیادہ بلند تھی۔ فریال نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا؟" وہ متحیر اور خوف زدہ تھی۔

میں نے اسے جھٹکے سے ایک طرف ہٹایا اور لمبے ڈگ بھرتا گھر سے باہر نکل گیا۔

رات قریباً نو بجے تک میں یونہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ شگفتہ سے دوبارہ ملنے کی خوشی اور غزالہ سے دوبارہ ملنے کی تلخی یوں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ میں جلد از جلد گھر واپس لوٹنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ غزالہ ابھی وہاں موجود نہ ہو۔ اس کا سامنا کرنا اور اس کی لاچاری دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔

رات نو بجے میں گھر لوٹا تو حسب توقع فریال' شگفتہ کے پاس موجود تھی۔ دونوں شدت سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ فریال کی آنکھوں میں ناراضی کی جھلک تھی لیکن چہرے کی بشاشت بھی اپنی جگہ برقرار تھی۔ مجھے گھور کر کہنے لگی "بڑے کٹھور ہیں آپ۔ اگر سنگدلی کا مقابلہ ہو تو دنیا بھر کے مردوں میں آپ اول رہیں۔ غضب خدا کا' غزالہ جی کے سبب آپ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آئے اور آپ کی وجہ سے ان

کی آنکھوں نے خون کے آنسو بہائے۔ میں... خیر رہنے دیجئے اس وقت" اس نے ترچھی نظروں سے شگفتہ کی طرف دیکھا "اس وقت شگفتہ باجی موجود ہیں' اکیلے میں آپ کی خبر لوں گی۔ بڑی اچھی طرح پوچھوں گی آپ سے۔"

کچھ دیر بعد وہ ہم سے رخصت ہو کر واپس چلی گئی۔ انجم نیند کی گولی کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اب میں اور شگفتہ اس چار دیواری میں تنہا تھے۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے تھے' جی چاہا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے جائیں۔ نگاہوں کو گویائی دے دیں اور لمس کی سرگوشیاں سنیں۔ میں نے اپنی بہن کو دیکھا' وہ میری ہی طرح تناور تھی' اونچی لمبی دھریک کی طرح' کھلے ہاتھ پاؤں والی' ذرا دیر کے لیے دھوپ میں بیٹھتی تھی تو رخساروں سے لہو ٹپکنے لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی سب سے خوب صورت چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ بے حد سیاہ اور سچے موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی لیکن اس وقت وہ کملائے ہوئے پھول کی طرح نظر آتی تھی۔ چہرہ اترا ہوا' ہونٹ خشک اور گردن سے نیچے ہنسلی کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ اس کی پژمردگی دیکھ کر میں پوری جان سے تڑپ گیا۔ وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ میں نے اس کے کانچ سے نازک اور شفاف ہاتھ تھام لیے "گھبراؤ مت شفتا! میں تم سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ جب تمہارے حواس بحال ہوں تو تسلی سے مجھے بتا دینا۔ اور اگر... اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو بے شک نہ بتاؤ۔ میں تمہارے زخم کریدنا نہیں چاہتا۔"

"آپ اور میں دو نہیں بھیا" وہ منمنائی "میں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ میں آپ سے کیا چھپا سکتی ہوں؟"

میں نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ ایک ننھی گڑیا کی طرح میری بانہوں میں سمٹ گئی۔ دونوں جہاں کی دولت میرے بازوؤں کے حصار میں تھی۔ میں نے اس کے ملائم بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اسے کندھے سے لگائے لگائے میں زینوں کی طرف بڑھا اور چھت پر آ گیا۔ درمیانی راتوں کا چاند سیاہ آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں یوں براجمان تھا جیسے وہ کوئی داستان گو ہو اور کہکشاؤں کے درمیان بیٹھا کوئی دلچسپ کہانی سنا رہا ہو' دلچسپ اور حیرت ناک جسے سن کر ستارے آنکھیں جھپک رہے ہوں اور ہوا چلنا بھول گئی ہو۔ چھت پر خنکی تھی۔ میں نے اپنی گرم چادر کی بکل کھولی اور شفتا کو بھی اس میں چھپا لیا۔ ہمسائی کے چھجے تلے بید مجنوں سے بنا ہوا ایک کرسی نما جھولا تھا۔ ہم اس جھولے میں بیٹھ گئے۔ جھولے میں بیٹھتے ہی مجھے بچپن کا ایک جھولا یاد آ گیا۔ یقیناً شگفتہ کو بھی یاد آ گیا ہوگا۔ وہ جھولا چارپائی کی ادوائن سے تیار کیا جاتا تھا۔ برآمدے کی دھواں دھواں چھت پر چیڑ کی کڑیوں میں سے رسی گزاری جاتی تھی اور جھولے کی نشست بنانے کے لیے تکیے کی چوکی رکھ دی جاتی تھی۔ ہماری والدہ ہم دونوں کو ساتھ ساتھ بٹھا دیتی تھیں۔ پھر بڑے لاڈ سے جھولا جھلاتی تھیں اور گاتی تھیں "ہونٹے ماہیاں ... چنگ چڑھائیاں" آسمان پر تاریک بادل امڈ آتے تھے اور چندا ہم سے آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ آج بھی وہی چاند تھا' وہی جھولا تھا' وہی شفتا تھی اور میں تھا لیکن کچھ چہرے ساتھ چھوڑ چکے تھے اور انہیں کبھی واپس نہیں آنا تھا۔ "ہونٹے ماہیاں" کا رسیلا گیت بھی ان چہروں کے ساتھ ہی فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

میں نے کہا "شفتا! میں نے تو تمہیں رکھ پور میں ماسی سرداراں اور پھوپھڑ شریف کی حفاظت میں چھوڑا تھا۔ تم وہاں سے یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

وہ بولی "مجھے کچھ معلوم نہیں بھیا یہ سب کیسے ہوا' میں کچھ نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "جتنا بھی جانتی ہو بتا دو۔"

وہ بولی "آخری بار آپ سے لاہور جیل میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے پابند کیا تھا کہ اب کبھی آپ سے ملنے نہ آؤں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں رکھ پور میں پھوپھڑ شریف کے گھر اس طرح دن گزار رہی تھی کہ چھوٹے سے گاؤں میں بھی کئی لوگوں کو میرا پتا نہیں تھا۔ ان چار برسوں میں' میں نے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا۔ گھر سے بھی سخت ضرورت کے تحت نکلتی تھی۔ رکھ پور کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے ماں باپ حال ہی میں سیلاب کی نذر ہوئے ہیں اور میں ان کی جدائی میں گم صم رہتی ہوں۔ یہ شب برات سے ایک دن پہلے کی بات ہے' پھوپھڑ شریف گاؤں کے دائرے میں گیا اور وہاں سے بڑا گھبرایا ہوا واپس آیا۔ مجھے کمرے میں لے جا کر کہنے لگا' شگفتہ پتر! شہر سے بری خبر آئی ہے۔ جیل میں لڑائی میں شاہجہاں زخمی ہو کر حسن ابدال کے کسی اسپتال میں پڑا ہے۔ اس کے دو دوست اطلاع دینے آئے ہیں۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پھوپھڑ شریف کے ساتھ میں گلی میں آئی۔ یہاں ایک سفید جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو پہچانتی تھی' اس کا نام سید جان ہے اور وہ لاہور جیل میں آپ کے ساتھ ہی قید کاٹ رہا تھا۔ اس نے گلوگیر آواز میں بتایا کہ اسپتال میں آپ کی حالت نازک ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ پھوپھڑ شریف نے مجھے سہارا دے کر جیپ میں سوار کرا

اور ہم بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک جگہ پھوپھڑ شریف نے سید جان سے پوچھا کہ وہ کس طرف جارہے ہیں؟ یہ راستہ تو حسن ابدال نہیں جاتا۔ سید جان بولا حسن ابدال ہی پہنچے گا۔" پھوپھڑ شریف نے تکرار کی تو سید جان کے ساتھی نے ایک دم چادر میں سے پستول نکال لیا اور اس زور سے پھوپھڑ شریف کی گردن پر مارا کہ وہ چلتی جیپ سے اچھل کر سڑک پر گرا اور کئی قلابازیاں کھا کر بے سدھ ہوگیا۔ یہ ایک سنسان سڑک تھی اندھیرا بھی پھیل چکا تھا۔ سید جان نے جلدی سے جیپ روکی اور مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس نے میرے منہ میں زبردستی فلالین کا کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ اپنے مفلر سے کس کر باندھ دیے۔ سید جان کے ساتھی نے نیچے اتر کر پھوپھڑ شریف کے بے سدھ جسم کو گھسیٹا اور سرکنڈوں میں جا کر چھپا دیا۔ میں چیخ رہی تھی اور تڑپ رہی تھی لیکن میری آواز جیپ سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا اور آخر کار میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو خود کو ایک سجے سجائے کمرے میں دیکھا۔ ایک موٹی سی بھدی سی عورت میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے بالوں میں مہندی لگا رکھی تھی اور پان کھا کھا کر دانت ختم کر رکھے تھے۔ بڑی ڈراؤنی شکل تھی اس کی۔ اس کا نام جنداں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سپاہن رہی ہے اور بگڑی تگڑی عورتوں کو سیدھا کرنا اسے خوب آتا ہے۔ مجھے جہاں لے جایا گیا تھا وہ کوئی بہت بڑی حویلی ہے۔ وسیع کمرے ہیں قیمتی فرنیچر ہے اور رنگ دار وردیوں والے بونے ملازم گشت کرتے رہتے ہیں۔ جنداں ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ بہت سخت گیر عورت ہے۔ حویلی میں موجود عورتوں کو قابو میں رکھنا اس کی ذمے داری ہے اور کبھی کبھی وہ انہیں سخت سزائیں بھی دیتی ہے۔ دو تین ہفتے پہلے ایک "نجو" نام کی لڑکی کو جنداں کے پاس لایا گیا۔ اس سے کوئی قصور ہوا تھا۔ وہ جنداں کے خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جنداں اسے ایک کمرے میں لے گئی جہاں سے تین چار روز تک لڑکی کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ ایک روز میں نے اس کمرے میں دیکھ لیا۔ جنداں نے لڑکی کے پاؤں باندھ کر اسے ٹھنڈے فرش پر اوندھا لٹایا ہوا تھا اور چمڑے کے ایک بہت بڑے جوتے سے اسے مار رہی تھی۔ لڑکی کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ اگلے روز میں نے اس لڑکی کو دیکھا اسے ایک اسٹریچر پر ڈال کر ایک اسٹیشن کار میں رکھا جارہا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے تھے اور چہرہ بالکل مردے کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ غالباً وہ مرچکی تھی

اور اگر زندہ تھی تو آخری سانس لے رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں کئی راتوں تک سو نہ سکی۔ ہر گھڑی موت میری آنکھوں کے سامنے ناچتی تھی۔ میں سوچتی اب آپ کی صورت کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ مجھے اس حویلی میں کیوں لے جایا گیا اور وہ لوگ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ میرے کھانے پینے اور آرام کا مکمل خیال رکھا جاتا تھا لیکن میں حویلی کے دو تین کمروں تک محدود تھی۔ حویلی کا مالک ایک گھنی مونچھوں والا سرخ و سپید شخص ہے۔ میں نے صرف دو مرتبہ اسے دیکھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک بیبا صورت لڑکی کے ساتھ باغیچے میں ٹہل رہا تھا۔ دوسری مرتبہ شکاری کتوں کے ایک غول کے ساتھ سرخ رنگ کی اسٹیشن ویگن میں سوار ہو رہا تھا۔ دونوں مرتبہ اس کے ساتھ دو بونے باڈی گارڈ تھے۔ ان کے رنگ سیاہ اور آنکھیں گہری زرد تھیں۔ وہ تازی کتوں ہی کی طرح چوکنے اور خونخوار نظر آتے تھے۔ پرسوں کی بات ہے جنداں نے مجھے نہانے اور لباس بدلنے کا حکم دیا۔ وہ بات بات پر گالی نکالتی ہے لیکن پرسوں اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ میں لباس بدل چکی تو وہ ڈاکٹر غزالہ کو لے کر میرے پاس آئی۔ ڈاکٹر غزالہ نے اکیلے میں مجھے تسلی دی اور کہا کہ وہ میری ہمدرد ہے اور بہت جلد مجھے یہاں سے نکال لے جائے گی۔ میں نے ڈاکٹر غزالہ سے پھوپھڑ شریف اور ماسی سرداراں کے بارے میں پوچھا لیکن وہ ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اگلے روز ڈاکٹر غزالہ پھر میرے پاس آئیں۔ ان کے چہرے پر کامیابی کی خوشی تھی۔ انہوں نے کہا "چلو شگفتہ! میں تمہیں لینے آئی ہوں۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بلکہ سچ پوچھتے ہیں بھیا! تو اب بھی یقین نہیں۔ لگتا ہے ابھی تک کوئی خوب صورت خواب دیکھ رہی ہوں۔ آنکھ کھلے گی تو آپ ہوں گے نہ یہ گھر نہ شہر۔ میں اسی بند کمرے میں پڑی ہوں گی اور جنداں آسیب کی طرح میرے سر پر سوار ہوگی۔" یہ کہتے کہتے وہ بے ساختہ میرے کندھے سے پیوست ہوگئی جیسے سچ مچ خواب ٹوٹنے سے خوف زدہ ہو۔

میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا "نہیں میری بہن! اب یہ خواب نہیں ٹوٹے گا۔ میں اسے نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ یہ تجھ سے وعدہ ہے تیرے بھیا کا۔ اب تیری آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔"

وہ میرے کہے کو غلط ثابت کرنے پر تل گئی۔ اسی گھڑی رونے لگی لیکن یہ اور طرح کے آنسو تھے۔ ان کی تاثیر اور تھی۔ ان کے نکلنے کا سبب اور تھا۔ میں اس کا کندھا تھپکنے لگا۔ اچانک ہمیں چونکنا پڑا۔ نیچے سیڑھیوں کی طرف سے انجم

کی خوابیدہ آواز سنائی دی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی یا شاید پانی طلب کر رہی تھی۔ اس کا آپریشن ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ گاہے گاہے درد محسوس کرنے لگتی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو شگفتہ جلدی سے اٹھ گئی۔

"نہیں بھیا! آپ بیٹھیں میں دیکھتی ہوں۔" اس نے دل پہ پتھے اور قلانچیں بھرتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف لپک گئی۔

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ چست توانا اور ہر گھڑی کام میں لگی رہنے والی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے دیکھنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ میں اس جگہ بیٹھا بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔ معلوم نہیں پھوپھڑ شریف پر کیا گزری تھی۔ شگفتہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زخمی ہوا ہے لیکن یہ زخم شدید نوعیت کا بھی ہوسکتا تھا۔ پھوپھڑ شریف ہمارا دور پار کا رشتے دار تھا۔ محکمۂ انہار میں ملازم تھا۔ نرینہ اولاد سے محروم تھا۔ صرف دو بیٹیاں تھیں اور انہیں بیاہ چکا تھا۔ دکھ پور میں اس کی عزت تھی۔ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے وقت جب شگفتہ کا سوال میرے سامنے آیا تو میرا ذہن فوراً پھوپھڑ شریف کی طرف گیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اس سے ہمارا کوئی رشتہ ناتا ہے۔ وہ لاہور سے خاصی دور تلہ گنگ چکوال میں رہتا تھا۔ میں نے بڑی رازداری کے ساتھ شگفتہ کو پھوپھڑ شریف کے سپرد کردیا تھا اور پھوپھڑ نے دل و جان سے اس کی نگہداشت کا ذمہ اٹھایا تھا۔ اب میری وجہ سے اس پر مصیبت نازل ہوئی تھی اور وہ نہ جانے کس حال میں اور کہاں تھا۔ پھر میرا دھیان نجو کی طرف چلا گیا۔ شگفتہ کی باتوں سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ یہ وہی نجو ہے جو شروع شروع میں حویلی کے اندر میری خدمت گار مقرر ہوئی تھی اور پھر مجھ سے ہمدردی جتانے کی سزا میں منظر سے ہٹا دی گئی تھی۔ نجو کا انتہائی پرکشش سراپا میری نظروں میں گھوما۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا سب شاعری تھا۔ سیاہ روشنائی سے لکھی ہوئی بے حد دلفریب شاعری۔ اس بے چاری پر نہ جانے کیا کیا ظلم توڑے گئے تھے۔ میں نے تصور ہی تصور میں اسے سزا سے جہنم میں روتے بلکتے دیکھا اور دل سینے میں کٹ کر سو ٹکڑے ہوگیا۔ کیا وہ مرچکی ہے؟ یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست ہوگیا۔ میں بید مجنوں کے جھولے سے اٹھا اور بے قراری سے چھت پر ٹہلنے لگا۔ سوچوں کا بڑا ریلا حضرت کا سنہ سر میں رینگ رہا تھا۔ سیکڑوں سوال تھے اور ہر سوال کی سیکڑوں شاخیں تھیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے ــــ اب مجھے کیا کرنا چاہیے ــــ شگفتہ کی آواز نے میرے خیالوں کا سلسلہ منقطع

کیا۔ وہ مجھے نیچے کمرے میں بلا رہی تھی۔

میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو شگفتہ کو انجم کے سرہانے کھڑا پایا۔ انجم گہری نیند میں تھی۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں کے ساتھ وہ کوئی حسین و جمیل لڑکا ہی دکھائی دیتی تھی لیکن گردن کی نزاکت لو اس سے نیچے کا جسم گواہی دیتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ اپنے پُرشباب جسم میں ہزاروں حلاوتیں سمیٹے ہوئے اور اپنی نوخیز دھڑکنوں میں ان گنت بھید چھپائے ہوئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے شگفتہ اور میں نے اس کی جو بڑبڑاہٹ سنی تھی وہ حالت خواب میں ہی بلند ہوئی تھی۔ شگفتہ نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے اور انجم کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ کیا۔ میں شگفتہ کے پاس کھڑا محویت سے انجم کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد اس کے ہونٹ پھر مرتعش ہوئے اور وہ "صفدر" کا نام پکارنے لگی۔

"صفدر ـــ میں ڈوب جاؤں گی صفدر۔ میرا ہاتھ نہ چھوڑنا ـــ ہائے میں ڈوب رہی ہوں میں ڈوب رہی ہوں۔"

پھر اس نے زور سے جھرجھری لی اور کراہ کر کروٹ بدل لی۔ اس کا لباس بے ترتیب ہوگیا تھا۔ شگفتہ نے جلدی سے

ابنِ حسن عثمان آبادی کا ایک شاہکار ناول

تحیر تجسس اور رومان سے بھرپور

ایک چونکا دینے والا ناول

راتوں کے اندھیرے دور کرنے والے اُن بدنصیب چراغوں کی داستان جن کے پاس اپنے لیے صرف اندھیرے تھے کیونکہ صدیوں سے ایک بددعا اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔

اُن نوابوں کی کہانی جن کی قسمت میں جوان ہونے کے بعد راتوں میں جاگنا اور رونا لکھا تھا۔ ایڈونچر سے بھرپور ناول

قیمت ۱۰/- روپے

ڈاک خرچ -/۲۰ روپے

کمبل اس پر کھینچ دیا اور آپریشن والی ٹانگ کو نرمی سے اٹھا کر دوبارہ گدے کا سہارا دے دیا۔ وہ ایک بار پھر گہری نیند سو گئی تھی۔

ہم دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے "یہ صفدر کون ہے؟" شگفتہ نے پوچھا۔

میں جوان بہن کو اس کا کیا جواب دیتا۔ "ہے ایک عزیز" میں نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

ذہن ایک دم ہی اس گاؤں کی طرف چلا گیا تھا جہاں شامت کے گھر میں صفدر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس سے رخصت ہوئے اب کوئی تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جان سکے تھے۔ میری نگاہوں میں صفدر کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ بے طرح یاد آنے لگا جس میں اس نے انجم کی باتیں کی تھیں اور وہ آنکھیں یاد آنے لگیں جن میں آس کی لو بجھ کر بھی نہیں بجھی تھی۔

مجھے رخصت کرتے وقت صفدر کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں اتنی جلدی اسے اتنی بڑی خوش خبری سناؤں گا۔ اس سے بڑھ کر خوش خبری اس کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی کہ انجم اس حویلی سے آزادی حاصل کر چکی تھی اور کئی سنگدل ہاتھوں میں رہنے کے باوجود اب تک اس کی آبرو کا نگینہ ٹوٹنے سے محفوظ رہا تھا۔ میرا دل چاہا ابھی اور اسی وقت اڑ کر صفدر کے پاس پہنچ جاؤں اور اسے بتاؤں کہ کبھی واپس نہ آنے والا وقت اس کے لیے واپس آگیا ہے۔ شب و روز کی آندھیاں انجم کو وہیں چھوڑ گئی ہیں جہاں سے اڑا لے گئی تھیں۔ وہ ہر طرح سلامت ہے اور اس کی راہ تک رہی ہے۔

خوش خبری کا یہ امرت صفدر کے کانوں میں ٹپکانے کے لیے میں بے تاب ہو گیا۔ میں نے اسی وقت ساہی صاحب کو فون کیا۔ ساہی صاحب کو شگفتہ کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ فون پر کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے تھے پھر بھی انہوں نے مجھے پُرجوش مبارک باد دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک روز کے لیے جھنگ جانا چاہتا ہوں، اس دوران انجم اور شگفتہ کی حفاظت کے لیے ایک گن مین درکار ہے۔

انہوں نے کہا "میں ابھی دو گن مین بھیج دیتا ہوں لیکن مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ انجم کے بارے میں صفدر کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ صفدر کے سارے قصے سے آگاہ تھے۔ میری بات سمجھ گئے تاہم انہیں میرا جھنگ جانا کچھ پسند نہیں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ صفدر کو پیغام دے کر یہاں بلا لیا جائے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ میں پوری احتیاط برتوں گا، وہ بے فکر رہیں۔

○☆○

اگلے روز علی الصباح شگفتہ سے رخصت ہو کر میں عازمِ جھنگ ہو گیا۔ مجھے لاری اڈے تک پہنچانے کے لیے ساہی صاحب نے اسٹیشن ویگن بھیجی تھی۔ میں نے اسٹیشن ویگن کے اندر ہی اپنا گیٹ اپ تبدیل کیا۔ بالوں کے مصنوعی رنگ اور آئی لینس سے میں رات ہی چھٹکارا پا چکا تھا۔ خالص دیہاتی قسم کے لباس کا انتظام بھی رات ہی ہو گیا تھا۔ یہ ساہی صاحب کے ایک سیالکوٹی ملازم کا لباس تھا۔ میلا کچیلا نیلا تہبند، پاپلین کی خاکی قمیص، بوسیدہ سی سفید پگڑی اور اسی رنگ کا خستہ سا کھیس۔ میں نے یہ سب کچھ زیب تن کر لیا۔ میرا تجربہ ہے کہ سردیوں کے موسم میں دیہی علاقے کا باشندہ بڑی آسانی سے اپنا آپ چھپا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کھیس، کمبل یا لوئی سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں سر لپیٹ کر اس طرح بکل ماری جاتی ہے کہ بس آنکھیں ہی آنکھیں نظر آتی ہیں۔ اگر لاہور کے مال روڈ پر کوئی ایسا شخص گھومتا نظر آ جائے تو یقیناً لوگ اسے پکڑ کر تھانے میں جمع کرا دیں۔

بادامی باغ سے مجھے جھنگ کی نان اسٹاپ بس مل گئی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب میں جھنگ پہنچا اور وہاں سے دوسری بس پکڑ کر بھکر روانہ ہو گیا۔ اس سے آگے تانگے کا سفر تھا۔ کسی "ناپ چڑھے" ہوئے دیہاتی کی طرح منہ سر لپیٹے میں آسانی سے سفر کرتا رہا اور عصر کی اذانوں کے بعد "جھوک صفاس" کے نواح میں پہنچ گیا۔ جاگیردار قادر زماں، اس کی حویلی اور حویلی سے آباد رنگین و سنگین دنیا یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، میں چاہتا تو کسی ٹیلے پر چڑھ کر حویلی کے خونی برج دیکھ سکتا تھا لیکن میں اس وقت کسی اور کام سے آیا تھا۔ کچھ دیر میں کھیتوں میں بے مقصد گھومتا رہا۔ جونہی شام پڑی اور اندھیرا گہرا ہوا، میں نے شامت کے گاؤں کا رخ کیا۔ شامت کا گھر ڈھونڈنے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ دروازے پر دستک دی تو شامت ہی باہر آیا۔ بیساکھیوں پر آگے کو جھکا ہوا اس کا چہرہ مجھے پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کھیس کا پلو چہرے سے سرکایا۔ اس نے غور کر مجھے دیکھا اور ایک دم چونک گیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کی یلغار ہوئی۔

"شی" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی "صفدر کہاں ہے؟" مدھم سرگوشی میں، میں نے پوچھا۔

"اندر ہے۔ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں۔"

"ماں اور صغراں کہاں ہیں؟"

"وہ باورچی خانے میں ہیں، بلاؤں ان کو؟" شامت نے سرگوشی کی۔

"نہیں۔ پہلے میں صفدر سے مل لوں۔"

میں شامت کے ہمراہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ کچے صحن میں بہت تھوڑی روشنی تھی۔ چند مرغیاں گھوم رہی تھیں، ایک طرف چارپائی کے پاس گوبھی کے کٹے ہوئے ڈنٹھل پڑے تھے۔ الگنی پر نیم خشک کپڑے جھول رہے تھے۔ میں صحن پار کر کے برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔ لالٹین کی روشنی میں صفدر انگیٹھی دہکائے خاموش بیٹھا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ کسی بہت گہری سوچ میں گم تھا۔ یوں لگتا تھا بیٹھے بیٹھے سو گیا ہے۔ میں آہستگی سے اس کی طرف بڑھا۔ ارادہ یہی تھا کہ بالکل قریب جا کر اسے السلام علیکم کہوں گا اور وہ اچھل پڑے گا لیکن السلام علیکم کہنے کی نوبت نہیں آئی۔ ابھی میں اس سے پانچ چھ قدم دور ہی تھا کہ اس کے حساس کانوں نے میرے چور قدموں کی آہٹ سن لی۔ بے انتہا پھرتی سے اس کا ہاتھ قریب رکھی ہوئی رائفل پر آیا اور اس نے تڑپ کر رخ میری طرف پھیر لیا۔ بلاشبہ وہ ایک چوکس آدمی تھا۔ اگر میں واقعی کسی بری نیت سے اس کی طرف جا رہا ہوتا تو یادگار طریقے سے پھنستا۔ جونہی اس نے مجھے پہچانا ہم بغل گیر ہو گئے۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" اس نے بے تابی سے پوچھا "میں تو آج نکلنے والا تھا تمہاری تلاش میں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی دیر لگاؤ گے تم۔"

"ہوئی جو تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مطلب؟"

"ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے" اس کے چہرے پر ایک چمک آ کر غائب ہو گئی جیسے خوشی کی آس لگانا بھی وہ گناہ سمجھتا ہو۔

پھیکی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولا "کیوں مذاق کرتے ہو یار! خوش خبری اور میرے لیے؟"

"ہاں، تمہارے لیے اور خوشخبری بھی ایسی کہ جس کے بعد کچھ سننے کی خواہش نہ رہے" رگوں میں اس کے مضبوط اعصاب چٹختا چور ہو گئے، اس کے وجیہہ چہرے نے رنگ بدلا اور وہ منہ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "انجم آزاد ہو گئی ہے صفدر۔۔۔ وہ بالکل خیریت سے ہے اور "شادمان" لاہور کی ایک کوٹھی میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

صفدر کے چہرے پر شادیٔ مرگ کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ حیرت سے میرا چہرہ تکتا رہا۔ پھر لرزاں آواز میں بولا "سچ کہہ رہے ہو یار؟ اگر جھوٹ ہے تو ابھی بتا دو۔ میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے، تمہیں ایسے یقین نہیں آئے گا۔۔۔ چلو اٹھو۔ ابھی چلو لاہور۔۔۔ آخری بس ابھی نکلی نہیں ہو گی۔"

"کس کی بات ہو رہی ہے۔ کون جا رہا ہے لاہور؟" شامت کی والدہ کی آواز آئی۔ پھر دھڑام سے دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"میں احسان ہوں ماں جی" میں نے اس کی مشکل آسان کی۔

"احسان پتر" اس نے چونک کر کہا پھر تیزی سے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی بانہوں میں ایک ماں کے جسم کی گرمی تھی۔ وہ بار بار میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور شانہ چومنے لگی۔ بڑی ممتا بھری عورت تھی وہ۔ مجھے انڈے، پراٹھے اور دودھ کا وہ گرما گرم ناشتا یاد آگیا جو چند ہفتے پہلے میں نے اسی کمرے میں کیا تھا۔ ناشتے کی مہک ابھی تک میرے سانسوں میں رچی ہوئی تھی۔ آوازیں سن کر شامت کی بہن صغراں بھی کمرے میں آ گئی۔

"بھائی سلام" اس نے سر پر دوپٹا ٹکا کر بڑے ادب سے سلام کیا۔

میرا ہاتھ بے اختیار اس کے سر کی طرف اٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب گھل مل کر ایک گھر کے افراد کی طرح باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی شامت وغیرہ کو پتا چل گیا کہ وہ لڑکی قادر زماں کے چنگل سے نکل آئی ہے جس کے لیے صفدر در بدر بھٹک رہا تھا۔ اس اطلاع نے سب کے چہرے کھلا دیے۔ صفدر پر تو جیسے سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ مجھے احساس تھا کہ انجم کو دیکھے بغیر اس کے لیے یہ شب گزارنا اب نہایت کٹھن کام ہے۔ میں نے اس بات کا انتظار نہیں کیا کہ وہ خود مجھ سے لاہور چلنے کا مطالبہ کرے بلکہ اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "چلو بھئی لاہور۔۔۔ وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

صغراں جلدی جلدی اس کے کپڑے [illegible] کرنے لگی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ شماست نے باہر جاکر دیکھا۔ چند لمحے بعد وہ ہاتھ میں تہ شدہ کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا' مجھ سے کہنے لگا "ایک لڑکا یہ پرچا دے گیا ہے آپ کے لیے۔"

"کون لڑکا؟" میں بُری طرح چونک گیا۔

"سوچی خوشیے کا بیٹا تھا' کہہ رہا تھا ایک آدمی دے گیا ہے۔"

میرے لیے پرچا؟ اور اس جگہ؟ ذہن میں خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بج اٹھیں' میں نے جلدی سے کاغذ کھولا۔ کاپی سائز کے لائن دار ورق پر بال پوائنٹ کی تحریر تھی' سب سے اوپر میرا نام احسان الہی اور بریکٹ میں شاہ جہاں لکھا تھا' نیچے درج تھا۔

"بڑے بھولے ہو تم۔ بڑے بھولے ہو۔ قادر زماں کے نوکروں سے کوئی خوش بُو نہیں چرا سکتا' تم اس کی حویلی سے دو لڑکیاں نکال لائے ہو اور سمجھ رہے ہو کہ وہ چپکا بیٹھا رہے گا۔ بے وقوف ہو تم' تمہیں کچھ پتا نہیں' تمہاری بہن شگفتہ اور انجم اب بھی اس حویلی میں ہیں۔ قادر زماں جب چاہے گا وہ کچے دھاگے سے بندھ کر اس کے پاس چلی جائیں گی۔ اب وہ اس کے لیے گھڑے کی مچھلیاں ہیں۔ تم کو کیا معلوم' قادر زماں کیا ہے؟ میں تمہاری خیر خواہی میں صرف یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو لے کر کہیں بہت دور نکل جاؤ۔ بس بغیر کسی اگر مگر کے بھاگ نکلو۔ اتنے فاصلے پر چلے جاؤ کہ جھوک ضامن کے جاگیرداروں کی سوچ بھی وہاں تک نہ پہنچ سکے تاہم ایسا کرنے کے بعد بھی تم کوئی گارنٹی حاصل نہیں کرو گے' صرف امید رکھ سکو گے کہ لڑکیاں بچ جائیں گی۔

تمہارا خیر خواہ"

پرچا میرے ہاتھوں میں کانپ گیا۔ سینے میں دبے ہوئے اندیشے تازہ قبریں.... پھاڑ کر نکلے اور عفریتوں کی طرح میرے گرد چکرانے لگے۔ دل کے اندر کہیں بہت گہرائی سے آواز آئی۔ یہ پرچا صداقت سے خالی نہیں ہے۔ جاگیردار کے زنداں کی دیواریں ایسی کمزور نہیں تھیں کہ انجم اور شگفتہ اتنی آسانی سے باہر آجاتیں۔

صفدر نے مجھے جھنجوڑ کر کہا "کیا بات ہے یار! کیا لکھا ہے؟"

اچانک مجھے آہٹ سنائی دی۔ میری نگاہ صفدر کے عقب میں دروازے کی طرف اٹھی۔۔۔ اور اٹھی رہ گئی۔

وہاں بادا کھڑا تھا۔ اس کے مہندی رنگے بال لالٹین کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ وہ حسب معمول تہبند قمیص پہنے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو بڑے لفافے تھے۔ ایک میں کیلے' کینو وغیرہ تھے۔ دوسرے میں کوئی مٹھائی قسم کی چیز تھی۔ کمرے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا۔ صفدر' بادے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر دوستانہ لہجے میں بولا۔

"آجاؤ یار' آجاؤ۔ کوئی غیر نہیں ہے یہاں' وہی اپنا احسان الہی ہے۔" بادا بُری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔ بہرحال اس نے اندر آنے میں ہی بہتری سمجھی۔ صفدر نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "تمہارے بعد بادا تین چار دفعہ یہاں حاضری دے چکا ہے۔ بے چارہ تم سے ملنے کے لیے تڑپ رہا تھا' کچھ خاص انس ہوگیا ہے اسے تم سے۔ جب بھی آتا ہے تمہارا نام لے لے کر آہیں بھرتا ہے۔"

صفدر کے تبصرے نے بادے کی شرمندگی میں اضافہ کردیا۔ وہ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا "جیون ہوگیا' اب اور شرمندہ نہ کر۔ میں بڑا پچھتا رہا ہوں اپنے کیے پر۔"

صفدر نے کہا "ہر معقول بندے کو اپنے گناہوں پر پچھتانا چاہیے۔" پھر مجھ سے بولا "ویسے بادے کے پچھتانے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ نیک بہو بیٹیوں کی طرح بادے نے زندگی میں کبھی تصویر نہیں اتروائی تھی۔ تم نے نہ صرف اس کی تصویر اتاری بلکہ اپنے پاس بھی رکھ لی۔ اب شب و روز اسے یہ فکر کھاتی ہے کہ کہیں یہ تصویر کسی ایرے غیرے کے ہاتھ میں چلی گئی تو وہ بدنام ہوجائے گا۔" بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ بادے کو اپنی ان تصویروں کا غم کھائے جا رہا تھا جو چند ہفتے پہلے اس نے مجھ سے اتروائی تھیں۔ ان تصویروں میں بادے کے کانوں میں جھمکے تھے' سر پر دوپٹا تھا اور ہونٹوں پر لالی تھی۔ جس کیمرے سے یہ تصویریں اتاری گئی تھیں اس میں فلم نہیں تھی لیکن بادے کو اس بات کا کیا پتا تھا۔ اب وہ صفدر اور شماست وغیرہ کی چاپلوسی کر رہا تھا کہ کسی طرح تصویریں اسے واپس مل سکیں۔

شماست کی والدہ نے کہا "پتر احسان' اب غصہ جانے دو۔ اب تو بادا صاحب نے منزاں کو چھوٹی بہن کہہ دیا ہے۔ ان کی جو تصویریں تمہارے پاس ہیں وہ واپس کردو۔ ان کا پیری فقیری کا کام ہے۔ ایسے کام والے بندے کی بدنامی ہوجائے تو بڑی تھو تھو ہوتی ہے۔ روزگار ٹھپ ہوجاتا ہے۔"

عورت کی سادہ لوحی پر قربان جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اتنا کچھ دیکھ کر بھی وہ بادے کو بادا صاحب کہنے پر مصر تھی۔ یہ احترام کا جذبہ نہیں تھا' خوف تھا جو پیروں فقیروں کے حوالے سے ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا "ماں جی! یہ پیری فقیری نہیں فراڈ ہے۔ ایسی روزی بند ہی ہوجائے تو اچھا ہوتا ہے۔ میں دوسروں کی تصویریں چاہے واپس کردوں مگر اس کی نہیں کروں گا۔ میں تو آیا ہی اس لیے ہوں کہ اس کے جھوٹ کا پول کھول سکوں۔"

بادے کی بُری حالت تھی۔ وہ رحم طلب نظروں سے کبھی صفدر کو اور کبھی مجھے دیکھتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ جس کے در پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے وہ خود چڑھاوے لے لے کر مریدوں کے گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ وہ قادر زماں کا مخبر تھا مگر میرے سامنے بے بس ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا' تصویریں منظرِ عام پر آگئیں تو قادر زماں بھی اسے بے عزت ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں بادے کی بے بسی سے لطف اٹھاتا لیکن تھوڑی دیر پہلے موصول ہونے والے رقعے نے میرے دماغ کی چولیں ہلا رکھی تھیں۔ میں صفدر کو لے کر جلد از جلد یہاں سے روانہ ہوجانا چاہتا تھا۔ میں نے صفدر کو ساتھ والے کمرے میں لے جاکر بتایا کہ ہمارا یہاں سے فوراً روانہ ہونا ضروری ہے۔ صفدر بھی نادیدہ خدشات کی بُو سونگھ چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ رخصت ہوتے وقت صفدر نے بادے کو ایک طرف لے جاکر تسلی تشفی دی اور "جبین السطوہ" میں اسے ڈرایا دھمکایا بھی کہ اگر وہ نیک چلنی پر قائم نہ رہا تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ شماست کی والدہ ہماری روانگی پر آزردہ تھیں۔ انہوں نے ہمیں ڈھیر ساری دعاؤں اور دو عدد امام ضامنوں کے ساتھ رخصت کیا۔ آخرکار اہلِ خانہ کو الوداع کہہ کر ہم گاؤں کی تاریک گلیوں میں داخل ہوگئے۔ دور فاصلے پر جھوک ضامن کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بلند و بالا حویلی کی روشن برجیاں اپنے اندر ان گنت بھید چھپائے ساکت کھڑی تھیں۔ ہم جھوک ضامن اور وہاں کی روشن برجیوں سے پہلو بچاتے ہوئے نیم پختہ راستے پر آگئے۔ چار سو اندھیرا تھا۔ راستے پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوگئی تھی۔ ہم نے ایک ریڑھے والے کو بیس روپے کی بخشش کرکے پختہ سڑک تک جانے پر راضی کرلیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم بس پر بیٹھے اور لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔

تمام راستے میرا دماغ گمنام شخص کے پیغام میں الجھا رہا۔ صفدر نے ایک دو مرتبہ اس بارے میں پوچھا لیکن میں ٹال گیا۔ وہ انجم سے ملنے کی خوشی میں سرشار تھا اور میں اس کی یہ خوشی داغدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گاہے گاہے میں کن انکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھ لیتا تھا۔ جوں جوں لاہور قریب آرہا تھا' صفدر کی آنکھوں میں چمک نمایاں ہورہی تھی۔ چار گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ہم نصف شب کے وقت لاہور پہنچے اور بادامی باغ کے بس اڈے سے شادمان کالونی کا رخ کیا۔

گھر پہنچے تو ساہی صاحب کے بھیجے ہوئے مسلح محافظوں نے استقبال کیا۔ وہ اب تک پوری چوکسی سے پہرا دے رہے تھے۔ اندر انجم اور شگفتہ جیسے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ انجم نے صفدر کو اور صفدر نے انجم کو دیکھا' دونوں مبہوت رہ گئے۔ ان کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ چند لمحوں کے لیے انہوں نے اردگرد کے ماحول کو قطعی فراموش کردیا۔ جذبات کے دھارے میں یوں بہہ گئے کہ ان کی طرف دیکھتے رہنا ناممکن ہوگیا۔ شگفتہ تو آثار دیکھ کر ہی وہاں سے کھسک گئی تھی۔ میں بھی گرمئ جذبات محسوس کرکے باہر نکل آیا۔ یہ وہی انجم تھی جو چند روز پہلے صفدر سے ملنے کے خیال سے ہی خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اب خود کو محفوظ چار دیواری میں پاکر اور محبوب کو سامنے دیکھ کر وہ سارے اندیشے بھول گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد صفدر کمرے سے باہر آیا تو اس کا دلکش چہرہ شبنم میں نہائے پھول کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ بچھڑے محبوب سے مل کر وہ آسودگی کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وصل کے یہ لمحات بہت تند و تیز تھے اور وہ ان لمحات میں محبت کے سوا اور کچھ نہیں کرپایا۔ انجم سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ وہ جاگیردار کی حویلی سے کب اور کیونکر رہائی پاسکی۔ اب یہ ساری روداد وہ مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا تھا اور دینا بھی چاہتا تھا مگر پھر صورت حال دوسرا رُخ اختیار کرگئی۔ فون کی گھنٹی بجی اور شمشاد نے آکر مجھے بتایا کہ ساہی صاحب کی کال ہے۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ساہی صاحب کی آواز میں جوش آمیز عجلت تھی۔ کہنے لگے "شاہ جہاں! میں تمہارے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔ فوراً ہیڈ کوارٹر چلے آؤ۔"

"لیکن جناب! میں یعنی خود۔۔۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے "سوال جواب نہیں جو میں کہہ رہا ہوں کرو۔ یہاں تمہارا انتظار ہورہا ہے۔ جلدی کرو۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے فون بند کردیا۔ ٹھیک

منٹ بعد پولیس کی گاڑی دروازے پر آن رُکی۔ مجھے لانے کے لیے ایک انسپکٹر کو بھیجا گیا تھا۔ وہ بڑے احترام سے پیش آیا اور غیر متوقع شائستگی کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ میری یوں روانگی نے شفقا کو ایک دم پریشان کر دیا تھا' تاہم میرے سمجھانے پر وہ سمجھ گئی اور آنسوؤں کی خوب صورت آنکھوں میں چمکتے چمکتے رہ گئے۔ پولیس کار نے چار میل کا فاصلہ صرف پانچ چھ منٹ میں طے کر لیا۔ کار کا ہوٹر مسلسل بج رہا تھا اور میں ایک مدبرانہ شان سے پچھلی نشست پر براجمان تھا۔ ایک جیل کا قیدی نمبر ۴۳ اپنے جوتوں سے اٹے ہوئے کمبل میں لیٹا شاید کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک بہت بڑے محرابی دروازے پر رُکی۔ میں انسپکٹر اور دو سپاہیوں کی معیت میں آیا اور ہال کی دوا سے آراستہ ایک کانفرنس روم میں پہنچ گیا۔ یہاں مستطیل میز کے گرد تقریباً چھ عدد اعلیٰ پولیس افسران موجود تھے۔ ان میں سے دو تین کو میں چہروں سے بھی پہچانتا تھا۔ شناسا چہروں میں ڈی آئی جی مستقیم شاہ کا چہرہ بھی شامل تھا۔ وہ بانی قوم کے پورٹریٹ کے عین نیچے بیٹھے تھے۔ ٹوپی اُتار کر میز پر رکھی ہوئی تھی اور اپنی نیم سفید کنپٹی کو شہادت کی انگلی سے مسلسل کھجا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور الیکٹرک ہیٹروں کی وجہ سے کانفرنس روم میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ مجھے ایک خالی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ ڈی آئی جی صاحب نے بنفس نفیس مجھ سے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ اس گفتگو کی حیثیت انٹرویو کی سی تھی۔ مجھ سے شنکر عرف شنکر شکرا کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی؟ ہم دونوں کی چپقلش کا آغاز کیسے ہوا؟ حقیقی طور پر کتنی مرتبہ میرا اور شکرا کا آمنا سامنا ہوا؟ کپور تھلہ اور جالندھر میں میں کتنا عرصہ رہا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سوالوں کے جواب پوری احتیاط سے دیے۔ میں جانتا تھا' پولیس افسران پہلے سے بہت کچھ جانتے ہیں اور ان سے غلط بیانی کا مطلب شکوک و شبہات کی فضا پیدا کرنا ہے۔ شنکر سے میری پہلی ملاقات اپنی گرفتاری سے دو برس پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یہ میری زندگی کا بے حد پُرآشوب دور تھا۔ اپنی بہن کے مجرم قبیح راشد بن ارشد کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں ایک بگولے کی طرح چکراتا پھرتا تھا اور پولیس اس بگولے کو مٹھی میں بند کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لکھنؤ میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ شنکر اور اس کے تربیت یافتہ غنڈوں نے مسلمانوں کا ایک پورا محلہ برباد کر دیا تھا۔ پھر شنکر ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر کو اُٹھا کر شاہ تاج ہوٹل میں لے گیا تھا۔ وہ ایک بند کمرے میں چاقو کی نوک پر بے بس لڑکی کی عزت لوٹ رہا تھا اور اس کے ہرکارے کمرے سے باہر کے روتے بلکتے وارثوں کو ٹھوکریں رسید کر رہے تھے۔ میں نے.... تار تار لباس کے ساتھ ایک بڑھیا کو ایک غنڈے کے پاؤں میں لوٹتے اور التجائیں کرتے دیکھا تھا۔ میں نے ایک سفید ریش بوڑھے کو چھوٹے بچوں کی طرح روتے سنا تھا۔ میں نے اس نوعمر بچے کا کرب محسوس کیا تھا جو اپنی مصیبت زدہ بہن کو آپی آپی کہہ کر پکار رہا تھا۔ اور پھر میں بے پروا ہو کر میں اس بند دروازے سے جا ٹکرایا تھا جس کی دوسری طرف شیطانیت برہنہ رقص کر رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی تھی اور میں اپنی پوری جسمانی قوت سے اس درندے پر پل پڑا تھا جس نے ایک دوشیزہ کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ شاہ تاج ہوٹل کے دوسرے فلور پر کمرا نمبر ۴۱ میں میرے اور شنکر کے درمیان ایک خون ریز لڑائی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب نیچے سڑک پر پولیس کاروں کے سائرن سنائی دیے تو شنکر شکرا میرے نیچے تھا۔ بھاگنے سے پہلے میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی تھی اور میرے کانوں نے اس کی منحوس کراہ سنی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے جس شخص کو گرایا ہے وہ اب تک ایک خلقت کے لیے ناقابل تسخیر رہا ہے' وہ شنکر ہے جس کے سائے سے بھی لوگ بدکتے ہیں اور جس کی سفاکی شیطانیت کا شہرہ دور و نزدیک ہے۔ مجھے کئی دن بعد معلوم ہو سکا تھا کہ میں نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری وجہ سے نہ صرف مسلمان لڑکی شنکر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئی تھی بلکہ وہ زخمی بھی ہوا تھا اور اس کے کئی ساتھی پولیس کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ اس رات میں نے شنکر کو جو زخم دیا تھا وہ ابھی تک اس کے بائیں رخسار پر موجود تھا۔ یہ اس کراری دار چاقو کا گھاؤ تھا جس کی نوک پر شنکر نے لڑکی کو بے بس کر رکھا تھا۔ یہ چاقو شنکر کے رخسار کو اندر تک چیر گیا تھا اور میں نے رخسار کی سفید چربی کے نیچے سے اُبلتے ہوئے خون کا دلکش نظارہ کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے اور شنکر کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ میرا گروہ شنکر کی طرح بہت بڑا نہیں تھا۔ مٹھی بھر ساتھی تھے لیکن جتنے بھی تھے جاں نثار تھے۔ سب نے خوب جم کر میرا ساتھ دیا تھا۔ لکھنؤ اور پھر جالندھر اور کپور تھلہ میں کسی جگہ ہم نے شنکر کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے۔

کانفرنس روم میں مجھ سے ان واقعات کے بارے میں جو

کچھ پوچھا جاتا رہا' میں بتاتا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد یہ نشست برخاست ہو گئی اور ساہی صاحب مجھے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں آ بیٹھے۔ اس کمرے میں مکمل تنہائی تھی۔ ساہی صاحب نے میرے لیے چائے اور بسکٹ منگوائے۔ ایک طرح سے یہ پیشگی ناشتا تھا (کیونکہ اب صبح ہونے والی تھی) گرما گرم چائے سے شب بیداری کے اثرات زائل ہونے لگے۔ ساہی صاحب نے اٹھ کر ایک کھڑکی سے پردے ہٹا دیے۔ صبح کا ملگجا اُجالا کمرے میں جھانکنے لگا۔ ساہی صاحب کے چہرے پر جوش نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگے "شاہ جہاں! تمہیں کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا' میں تمہیں ایک نہایت اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔ اس ذمے داری کا تعلق شنکر سے ہے۔ تمہیں اس کی گرفتاری میں پولیس کی مدد کرنا ہے۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! حیرت کی بات ہے' پولیس ایک قیدی سے مدد طلب کر رہی ہے۔"

وہ بولے "قیدی تو تم ہو' اور اس بات سے تمہیں خود بھی انکار نہیں ہو گا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ قانون کی مدد کر کے تم اپنے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر لو گے۔ عین ممکن ہے کہ اسپیشل کیس کی حیثیت سے تمہاری سزا پر بھی نظرثانی کی جا سکے۔" میں ساہی صاحب کی باتوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور یہ بھی جان رہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ وہ ایک تحقیقی ذہن کے مالک انسان تھے۔ مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہمیشہ نت نئے راستے اختیار کیے تھے اور کامیاب ہوئے تھے۔ مجھے شنکر کے سامنے لانے کا منصوبہ بھی یقیناً انہی کا تیار کردہ تھا۔ یہاں اتفاقاً صورت حال کچھ عجب رنگ اختیار کر گئی تھی۔ جاگیردار قادر زماں نے مجھے ساہی صاحب کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا تھا اور ساہی صاحب نے مجھے بھی اس "لشکر" میں شامل کر لیا تھا جس کی بنیاد میں ان کو قتل کرنے کی سازشیں دوڑ رہی تھیں۔ بعض شنکر شکرا کی تلاش۔ ساہی صاحب نے اپنی سوچتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولے "شاہ جہاں! میں اوّل روز سے تم پر بھروسا کرتا آیا ہوں۔ اوّل روز سے میری مراد وہ دن ہے جب میں نے تمہیں لاہور جیل کے احاطے میں دیکھا تھا۔ بعد میں گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اعتماد اور بھروسے کی یہ کیفیت میرے اندر مستحکم ہوئی ہے۔ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہاری قدر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد پر پورے اترو گے۔"

اس کے بعد وہی باتیں ہوئیں جو پہلے سے میرے ذہن

مقبول عام مصنف ایم۔ اے راحت کے سدابہار قلم سے شاہکار ناول

سامون

مستقبل کو رقم کرنے کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان کا احوال

★

وہ شاندار ماضی سے منہ موڑ کے آگ اور خون کے راستے پر چل نکلا۔

سامون

نہایت منفرد پُراسرار سلسلہ

★

مکمل تین حصوں میں شائع ہو گیا ہے

فی حصہ ۔/۲۰ روپے

[illegible]

20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 7247414

اسٹاکسٹ:۔ علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ 7223853

لہو کا سراغ

محمود احمد مودی

قیمت ۔/۱۵۰ ڈاک خرچ ۔/۲۰

علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

میں تھیں۔ ساہی صاحب نے مجھے آگاہ کیا کہ انہوں نے نئی ذمے داری پر مجھے رہائی دلائی ہے اور افسران کو اس امر کی ضمانت دی ہے کہ شنکر کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں پھر خود کو جیل حکام کے سپرد کر دوں گا۔

میں نے اس سلسلے میں سوچنے کے لیے ساہی صاحب سے تھوڑا سا وقت مانگا۔ وہ زیرک انسان تھے۔ جان چکے تھے کہ میری سوچ بچار ان کے حق میں ہی جائے گی۔ انہوں نے بلا حجت مجھے مہلت دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تسلی بھی دی کہ شگفتہ اور انجم کی طرف سے پریشان ہونے کی مجھے اب قطعی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں ان کے ساتھ ان کی کوٹھی میں رہیں گی اور ان کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتی جائے گی۔ میں خود بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس وقت انجم اور شگفتہ کے لیے ساہی صاحب کی کوٹھی سے بہتر ٹھکانا اور کوئی نہیں۔ ساہی صاحب کی محفوظ محل وقوع والی کوٹھی ہر طرح مناسب تھی۔ ویسے بھی جب سے ساہی صاحب کے قتل کی سازش کا انکشاف ہوا تھا' سرکاری طور پر وہاں پولیس گارڈ متعین کر دی گئی تھی اور اب وہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ ساہی صاحب نے شگفتہ کو پناہ دینے کا اعلان کر دیا تو میری ایک بڑی الجھن رفع ہو گئی اور میں ذہنی طور پر شنکر سے نبرد آزما ہونے کے لیے تقریباً آمادہ ہو گیا۔

O☆O

رات کے گیارہ بجے تھے۔ صفدر ڈرائنگ روم میں صوفے پر سو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں انجم اور شگفتہ محو خواب تھیں۔ اصولاً اس وقت مجھے بھی سو جانا چاہیے تھا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور باہر برآمدے میں گشت کرنے لگا۔ جسم میں عجب سی حرارت جاگی ہوئی تھی۔ تندوتیز ہوا نے مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کیا۔ میرے ذہن کے افق پر شنکر کی منحوس صورت ایک غبار کی طرح چھانے لگی۔ اس شخص سے پنجہ آزمائی کرنا اسے کیفر کردار تک پہنچانا میرا ایک دیرینہ خواب تھا۔ تاہم گرفتاری پیش کرنے کے بعد میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس خواب کی تعبیر مل سکے گی۔ اب ناگاہ حالات نے پلٹا کھایا تھا اور میں خود کو اپنے اس دیرینہ حریف کے روبرو پا رہا تھا۔ مجھے اب تک جو معلومات حاصل ہوئی تھیں' ان کے مطابق شنکر کو تین ماہ پیشتر پہلی مرتبہ اسلام آباد کے سیکٹر جی ۱۳ میں دیکھا گیا تھا۔ اسے شناخت کرنے والا سوا دتھا جبکہ شنکر ایک سرخ رنگ کی ڈاٹسن پر جا رہا تھا۔ اور نی نے کچھ دور تک شنکر کا پیچھا کیا لیکن پھر ایک چوراہے پر اسے کھو بیٹھا۔ امداد علی محکمۂ پولیس کا ایک قابل اعتبار و تجربہ کار تھا۔ اس کی اطلاع کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ جی ۱۳ جیسے حساس علاقے میں شنکر جیسے مجرم کی موجودگی نے ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجا دیں۔ تین چار دن زور وشور سے کارروائی ہوئی لیکن شنکر کی موجودگی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ تفتیش کرنے والے اہلکار ٹھنڈے پڑ گئے اور افسران یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انسپکٹر امداد علی کو دھوکا ہوا ہے۔ دو ہفتے بعد ایک بڑے سرکاری عہدیدار نے شنکر کو لاہور ائرپورٹ پر دیکھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اسے ٹھیک طرح پہچان سکتا' وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔ اس سرکاری عہدیدار کی گواہی کے بعد پولیس کو پختہ یقین ہو گیا کہ بدنام زمانہ شنکر شکرا ملک میں موجود ہے اور کسی خطرناک ارادے سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ساہی صاحب شنکر کے بارے میں گراں قدر معلومات رکھتے تھے۔ انہیں اسی لیے میں اسلام آباد طلب کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ شنکر کی گرفتاری میں متعلقہ پولیس کی مدد کریں۔ ساہی صاحب نے اپنی نگرانی میں کئی مقامات پر چھاپے پڑوائے۔ مشکوک افراد کی پکڑ دھکڑ کی' ائرپول سے رابطہ کیا لیکن ایک بھی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اس طرح دو ماہ گزر گئے۔ باخبر حلقوں میں سراسیمگی تو برقرار رہی لیکن تلاش کی سرگرمی ماند پڑ گئی۔ یہاں تک کہ چند روز پہلے میرے بیان نے ایک بار اس سارے معاملے میں جان ڈال دی۔ میں نے شنکر کو بجلی کے میڈیکل اسٹور سے نکلتے دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ساہی صاحب بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ میں شنکر کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ میری اطلاع واہمہ بھی قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔ مجھے تو خبر ہی نہیں تھی کہ شنکر کو اس سے پہلے پاکستان میں دیکھا گیا ہے۔ یوں میری اطلاع کے فوراً بعد پولیس ایک بار پھر پوری تندہی سے متحرک ہوئی تھی۔ رہی سہی کسر ایس پی جاوید کے قتل نے پوری کر دی تھی۔ اس قتل کے ڈانڈے بھی شنکر کی سرگرمیوں سے جا ملتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں اپنی سوچوں میں غلطاں ٹہل رہا تھا۔ جب کار کے ہارن نے چونکا دیا۔ یہ فریال کی گاڑی تھی۔ ہارن ایک بار بجا تو پھر بجتا ہی چلا گیا۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ گاڑی میں خود فریال ہی ہے۔ میں نے

کرنے آتی تھی؟ مگر میں نے بھاگ کر گیٹ کھولا اور فریال کی گاڑی ایک فراٹے سے اندر آ گئی۔ انجن بند کر کے وہ بڑے اسمارٹ انداز میں نیچے اتری۔ سفید شلوار قمیص پر اس نے سرخ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ گھنے بالوں کی پونی ٹیل کندھوں پر تھرک رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی وہ صبح نو کی طرح تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔

"ہائے اللہ' آپ جاگ رہے ہیں؟" وہ مخصوص انداز میں آنکھیں نچا کر بولی۔ "مجھے یقین تھا' پورا یقین تھا۔۔۔ غزالہ جی کو دکھی کر کے آپ کبھی چین سے نہیں سو سکیں گے۔ بندہ پوچھے' کس حکیم نے مشورہ دیا تھا آپ کو کہ غزالہ جیسی مہرباں سے ایسا رویہ اختیار کریں۔ توبہ ہے اللہ۔ توبہ۔ بے رخی اور سردمہری کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں ہوتی غزالہ جی کی جگہ تو کبھی آپ کو معاف نہ کرتی۔ زندگی بھر صورت نہ دکھاتی آپ کو۔ بہرحال' غزالہ جی کا دل بڑا نرم ہے۔ مجھے یقین ہے' آپ صدق دل سے کوشش کریں تو وہ پسیج جائیں گی۔ کچھ سفارش میں بھی کروں گی آپ کی' کچھ شگفتہ بھی کرے گی۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ میرا خیال ہے' آپ تو رہنے ہی دیں' ہم دونوں خود ہی منالیں گے غزالہ جی کو۔ آپ تو اناڑی ہیں۔ کام سنوارنے جائیں گے تو اور بگڑ جائے گا۔ بس آپ چپکے رہیے' ہم خود سنبھال لیں گی دونوں۔۔۔" وہ بولی تو نان اسٹاپ بولتی ہی چلی گئی۔

میں نے اس کی بات کاٹی "آپ غلط فہمی دور فرما لیجیے۔ میں کسی پچھتاوے میں یہاں نہیں ٹہل رہا۔ نہ ہی میرے ذہن میں آپ کی غزالہ جی کا خیال ہے۔ کچھ اور مسائل ہیں میرے لیکن یہ بات چھوڑیے' آپ نصف شب کے بعد یہاں کیسے نمودار ہو رہی ہیں؟"

وہ ناک سکوڑ کر بولی "جب آپ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ میں اوٹ پٹانگ لڑکی ہوں اور میری کوئی کل سیدھی نہیں تو پھر یہ سوال کر کے آپ خود کو اوٹ پٹانگ کیوں ثابت کر رہے ہیں؟"

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "فریال! تمہارے پاپا کو معلوم ہو کہ تم اس وقت یہاں ہو تو وہ کیا سوچیں گے؟"

وہ بولی "دیکھیں شاہ جہاں صاحب! میں کئی بار عرض کر چکی ہوں کہ آپ میری فکر میں دبلے نہ ہوں۔ میرے پاپا مجھے کچھ نہیں کہنے' ہاں اگر آپ خواہ مخواہ میرے پاپا سے خوف کھاتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ لیکن خوف کی گرہ میری ذات میں نہیں' آپ کی ذات میں ہے۔ اگر کلیئر کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔"

میں گہری سانس لے کر ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا "کیا میں اس وقت آنے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں؟"

"بالکل پوچھ سکتے ہیں۔" وہ بڑے سلیقے سے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کہو" میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ بولی "آج میں بہت خوش ہوں لیکن ساتھ ڈر بھی رہی ہوں۔ بالکل وہی حالت ہے جو کوئی اہم میچ شروع ہوتے وقت ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے شاہجہاں صاحب! میں آپ کو ایک بار پھر ایکشن میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی جمالی استاد کے روپ میں جو ہر خطرے میں بلا جھجک کود پڑتا تھا جو لڑتا بھڑتا تھا' پلٹتا جھپٹتا تھا' ہنگامہ خیزی کرتا تھا اور جس مقام سے گزرتا تھا ایک کہانی چھوڑ جاتا تھا لیکن اس بات کا اندیشہ بھی ہے کہ آپ کے سامنے شنکر جیسا خطرناک شخص ہے۔ میں نے پاپا کی الماری میں اس کی فائل دیکھی ہے۔ بہت ڈر لگا ہے مجھے یہ فائل پڑھ کر۔ یوں محسوس ہوتا ہے' اس فائل میں کسی انسان کا نہیں' درندے کا تذکرہ ہے۔"

"پھر اب کیا کروں میں؟" میں نے سادہ لوحی سے پوچھا۔

"آپ کو ہماری خاطر بہت احتیاط کرنا ہو گی۔"

"مثلاً کس کس کی خاطر؟"

"میری خاطر' شگفتہ کی خاطر اور۔۔۔ سب سے بڑھ کر غزالہ جی کی خاطر۔"

عجب اول جلول لڑکی تھی۔ یوں بات کر رہی تھی جیسے واقعی کوئی میچ ہونے والا ہے۔ میں پیڈ باندھے بلے بازی کے لیے تیار بیٹھا ہوں اور وہ ایک پرستار کی حیثیت سے مجھے سنبھل کر کھیلنے کا مشورہ دے رہی ہے۔ میں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا "تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ میں واقعی اس کام کے لیے تیار ہوں۔"

"کس کام کے لیے؟"

"یہی' شنکر کی گرفتاری میں مدد دینے کے لیے۔"

"مجھے ایک سو دس فیصد یقین ہے کہ آپ یہ کام کریں گے اور ضرور کریں گے۔ جناب' اتنی کوڑھ مغز نہیں ہوں میں۔ سویٹر سے خلا زدگی کو دیکھ کر اس کا اندازہ بھانپ لیتی ہوں۔ آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں' کیا آپ اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہو چکے۔۔۔ کہو! اپنے دل پر ہاتھ رکھیے۔"

اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر میرے سینے پر رکھ دیا۔ اس کشمکش میں وہ ایک بار پھر میرے بہت قریب آ گئی تھی۔

اتنی قریب کہ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا۔ میں نے آہستہ سے اسے دھکیل کر دور ہٹاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میں مانتا ہوں' سب کچھ مانتا ہوں۔"

وہ بولی "اتنی آسانی کے ساتھ نہیں جاؤں گی یہاں سے۔ آپ کو تفصیل بتانا پڑے گی۔"

"کیسی تفصیل؟"

"اُف اللہ" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا "آپ بڑے بھولے ہیں۔ اگر آپ یہ بات مانتے ہیں کہ آپ نے شنکر کی تلاش میں پولیس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یقیناً آپ کے ذہن میں کوئی پلان بھی ہوگا۔ یعنی آپ کیسے تعاون کریں گے۔ بندوق اٹھا کر اکیلے نکل کھڑے ہوں گے یا کسی لاش اٹھانے والے کو بھی ساتھ لے جائیں گے؟ ہم... میرا مطلب ہے شنکر کی لاش۔ پھر یہ کہ علی الاعلان میدان میں کود پڑیں گے یا رازداری سے اس کارِ خیر میں حصہ لیں گے؟ جسمانی جہاد کریں گے یا اخلاقی نصیحت فرمائیں گے؟"

فریال کا سوال واقعی اہم تھا۔ اس نے جس نکتے پر انگلی رکھی تھی' میں پچھلے ایک گھنٹے سے اسی پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھ سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنی تمام تر توانائی بروئے کار لاؤں۔ میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور فریال کی حسین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ایس پی برکت کو جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔ برکت صاحب ہی شنکر کا کیس ہینڈل کر رہے ہیں۔ پچھلے ہفتے وہ ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ نتھیا گلی گئے ہوئے تھے۔"

"بالکل وہی برکت صاحب" میں نے تصدیق کی "میرا خیال ہے کہ ساہی صاحب مجھے عام اہلکار کی حیثیت سے برکت صاحب کی ٹیم میں شامل کر دیں۔ میرا مطلب ہے کانسٹیبل یا ہیڈ کانسٹیبل کے طور پر۔ یوں میں برکت صاحب کے قریب رہ کر ان کا طریقۂ کار دیکھوں گا اور جہاں میرے تعاون کی ضرورت ہوگی وہاں تعاون بھی کروں گا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ شنکر میری موجودگی سے لاعلم رہے گا۔"

فریال نے ماہر سراغ رساں کی طرح چٹکی بجائی۔ اس کا یہ انداز بالکل ساہی صاحب سے ملتا جلتا تھا۔ سوچ بھرے لہجے میں بولی "آپ کا فیصلہ مناسب ہے۔ اب ابا جی بھی شاید اسی نتیجے پر پہنچیں لیکن اس کام میں ایک دشواری ہے۔ کیا آپ اس سے پہلے برکت صاحب سے ملے ہیں؟"

"نہیں' باقاعدہ ملاقات تو نہیں ہوئی۔ کل ساہی صاحب نے ہیڈ کوارٹر میں ذکر کیا تھا۔"

"او اچھا" اس نے ہونٹ سکوڑے پھر حسب عادت ایک دم پھرتی سے اٹھ گئی۔ سوئٹر کی آستینیں چڑھا کر ٹینس شوز کے تسمے کھولنے لگی۔

"کیا کر رہی ہو؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"آج شام جم کے بعد نہائی نہیں ہوں' نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"کیا!" میں حیرت سے تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں' نہانے کو جی چاہ رہا ہے۔ سستی سی چھائی ہوئی ہے۔ آپ کے باتھ میں ایک شاور لے کر ابھی نکل آتی ہوں۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ رات کے بارہ بجے' میرے کمرے میں اور پھر میرے باتھ روم میں شاور! کوئی دیکھ لیتا تو کیا سوچتا... عجیب آفت آ گئی تھی۔ میں نے کہا "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ اس وقت نہاؤ گی' اتنی سردی میں! یہاں گیزر وغیرہ نہیں ہے ٹھنڈا ٹھار پانی ہے اندر ہی جم جاؤ گی۔"

وہ بولی "بے فکر رہیں آپ' مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ ٹھنڈے پانی سے زیادہ حرارت ہے میرے اندر۔" حرارت کا لفظ اس نے بے انتہا معنویت سے استعمال کیا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا وہ مذاق کر رہی ہے لیکن وہ سنجیدہ تھی۔ سچ مچ نہانے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں میری چھوٹی بہن سو رہی تھی۔ میں بوکھلا کر رہ گیا۔ بہتر یہی سمجھا کہ اونچی آواز میں تکرار کرنے کے بجائے اس مصیبت کو [illegible] دوں۔ غالباً وہ میرا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ مقفل کر کے چابی گریبان میں پہنچا دی "جی نہیں' آپ بیٹھیں رہیے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تکلف کی۔"

اب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا "پاگل مت بنو فریال۔ اپنی عزت کا نہیں تو کسی دوسرے کی عزت کا خیال کرو۔"

وہ چہک کر بولی "میرے شاور لینے سے آپ کی عزت کو کون سا مرض لاحق ہو جائے گا۔ آخر مرا ہی نا... یہاں میں کوئی بیہودگی سوچیں نہیں ہیں۔ ذہن صاف ہو تو [illegible] گھبرائیں نہیں آپ میرے شاور لینے سے۔"

"فریال! چابی مجھے دے دو۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں دوں گی" وہ ترکی بہ ترکی بولی "اب تو میں یہ باتھ روم استعمال کر کے رہوں گی۔"

میں اس کے رونے پر حیران ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' ساہی صاحب کی اس بے سروپا بچی کو کیسے ہینڈل کروں۔ یکایک وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ چابی میرے حوالے کرتے ہوئے بولی "دیکھا بوکھلا گئے نا... مجھے خدشہ ہے آپ برکت صاحب کے ساتھ چل نہیں سکیں گے۔"

یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے ساتھ کوئی ڈراما کر رہی تھی۔ اپنے چکراتے ذہن کو سنبھالا دے کر میں نے پوچھا "کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

وہ صوفے پر پھیل گئی "کہنا یہ چاہ رہی ہوں جناب کہ برکت صاحب کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنی طرز کے عجیب گورکھ دھندے ہیں موصوف۔ اب دیکھیں' میں نے کتنی غلط بات کی۔ رات کے بارہ بجے ٹھنڈے ٹھار پانی سے نہانے کا ارادہ کیا' وہ بھی آپ کے کمرے میں اور پھر آپ کو کمرے سے نکلنے بھی نہیں دیا۔ ان تمام احمقانہ باتوں کے باوجود میں نے آپ کو ڈانٹا بھی۔ بس سمجھ لیں' یہ ایک مثال ہے برکت صاحب کے رویے کی۔ وہ بھی ایسی ہی خرافات انجام دیں گے اور پھر آپ کو ڈانٹ بھی پلائیں گے۔ وہ محاورہ ہے نا... زبردست کا ٹھینگا۔ پتا نہیں کس پر' بس وہی حال ہے برکت صاحب کا۔ ان کے ساتھ رہنے کے لیے آپ کو لوہے کے اعصاب کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے دل میں سوچا "اے فتنہ پرور لڑکی! جو شخص تیرے ساتھ ایک گھنٹا گزار سکتا ہے وہ ہر ارضی و سماوی آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔" شاید یہی بات میں زبان سے بھی کہہ دیتا لیکن اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ قریب رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے ریسیور اٹھایا' دوسری طرف ساہی صاحب تھے۔ ان کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک بستر سے دور ہیں۔ کہنے لگے "شاہ جہاں! میں نے کل تم سے ایس پی برکت کا ذکر کیا تھا۔ برکت آج علی الصباح ایک اہم شخص سے پوچھ گچھ کرنے شیخوپورہ جا رہا ہے۔ اگر تم ساتھ جانا چاہو تو چلے جاؤ' ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

میرے پوچھنے پر ساہی صاحب نے بتایا کہ اس شخص کا نام مالک محمد ہے۔ کافی عرصے تک دبئی میں رہا ہے۔ اب یہاں شیخوپورہ میں اس نے ایک بڑی کوٹھی بنائی ہوئی ہے اور پراپرٹی کا کام کرتا ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جرائم پیشہ لوگوں سے مالک محمد کے تعلقات ہیں۔ اس پر تیمور زماں سے میل جول رکھنے کا شبہ بھی کیا جا رہا ہے۔

میں نے کہا "جناب! اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی اصل حیثیت میں سامنے نہ آؤں بلکہ برکت صاحب بھی میری اصلیت سے بے خبر ہی رہیں تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے' آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اگر مجھے ایک عام پولیس اہلکار کی حیثیت سے برکت صاحب کے ساتھ اٹیچ کر دیا جائے تو مناسب ہے۔"

ساہی صاحب جلد ہی میرا مدعا سمجھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں مجھے پھر رنگ کرتے ہیں یا ہو سکتا ہے خود ہی آ جائیں۔ فون بند کر کے میں نے فریال کو مژدہ سنایا کہ اس کے بابا جانی خود یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ اس کا ردعمل میری منشا کے عین مطابق تھا۔ گھبرا کر جلدی جلدی جوتے پہننے لگی اور گھنٹوں کی مصروفیت منٹوں میں سمیٹ کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔ رات دن جیسے ان کے لیے ایک برابر تھے۔ ساہی صاحب نے دوسری مرتبہ رات دو بجے رنگ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تمام انتظام ہو گیا ہے۔ میں مرکزی تھانے کے ہیڈ کانسٹیبل احسان الٰہی کی حیثیت سے برکت صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے ایک شناختی نمبر بھی دیا۔ اس کے علاوہ یہ بتایا کہ میری سرکاری رائفل اور سفید شلوار قمیص وہ ڈرائیور نثار کے ہاتھ مجھے بھیج رہے ہیں۔

اسی روز علی الصباح چار بجے ہم دو کاروں پر سوار لاہور سے شیخوپورہ روانہ ہوئے۔ اس پولیس پارٹی میں ایس پی برکت اور انسپکٹر باجوہ کے علاوہ سات اہلکار تھے۔ آٹھواں میں تھا جو اہلکار تھا بھی اور نہیں بھی۔ دیگر تین کانسٹیبل حضرات کی طرح میرے پاس بھی بارہ بور کی آٹومیٹک رائفل تھی۔ دو کانسٹیبل وردی میں تھے اور دو بغیر وردی کے جن میں ایک میں تھا۔ جناب برکت صاحب کا مزاج ویسا ہی تند و تیز پایا جیسا سنا تھا۔ وہ دیہی علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک چوہدری ٹائپ آفیسر تھے۔ قد تقریباً چھ فٹ' توند تھوڑی سی نکلی ہوئی۔ بھرے بھرے جسم اور کانوں پر بے تحاشا بال۔ بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ بہرحال' وہ ایس پی تھے اور اگر ایس پی تھے تو کوئی وجہ تھی۔ ساہی صاحب ان سے میرا غائبانہ تعارف کرا چکے تھے۔ اس تعارف کے مطابق میں [illegible] پولیس کا ایک ہونہار اور نڈر رائفل مین تھا جو کئی پولیس مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا اور بروقت جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ اس متاثر کن تعارف کے باوجود ایس پی صاحب نے مجھے آغاز ہی میں "اوئے لمبو" کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر طرزِ تخاطب بتدریج درشت اور کسیلا ہوتا گیا' یہاں تک

کہ شیخوپورہ کے نواح میں پہنچتے پہنچتے وہ دوسرے ماتحتوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی روانی سے "بھوتنی دا" کہنے لگے۔ بھوتنی دا ان کا تکیہ کلام بھی تھا۔ ہر دو تین فقروں کے بعد "بھوتنی دا" ان کی گفتگو میں در آتا تھا۔ مثلاً "راستہ بھوتنی والا سیاہی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ دیکھو اس بھوتنی دے بس والے کو' کیسے ماں کو بیچوں بیچ چلا رہا ہے۔ اوئے شوکے 'بھوتنی دے' اپنی طرف والی کھڑکی بند کر" وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی چند ایک گالیاں تھیں جو وہ روانی سے دہرا رہے تھے۔ ایس پی برکت اور انسپکٹر باجوہ کے درمیان گاہے گاہے جو گفتگو ہو رہی تھی اس سے پتا چلا کہ مالک محمد پر بڑا پکا ہاتھ ڈالا جا رہا ہے لیکن یہ ہاتھ اس طرح ڈالا جا رہا ہے کہ مالک محمد کی گرفتاری کو قادر زماں والے معاملے سے منسلک نہ کیا جا سکے۔ مالک محمد کو ایک ڈیڑھ برس پرانے کیس کے سلسلے میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ اس کیس میں مالک محمد پر ایک امام مسجد کو اغوا کرنے' حبس بے جا میں رکھنے اور شدید جسمانی ضرر پہنچانے کے الزامات تھے۔ امام مسجد کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اور پانچ چھ ماہ بعد زخم خراب ہونے کے سبب وہ چل بسا تھا۔

ہماری منزل شیخوپورہ سے تقریباً سات میل شمال کی طرف تھی۔ درختوں میں گھرا ہوا یہ ایک نیم پختہ قصبہ تھا۔ یہاں تک پہنچنے والا راستہ بھی نیم پختہ ہی تھا۔ ہماری گاڑیاں دھول اڑاتی اور ہچکولے کھاتی سات بجے کے قریب ایک شاندار کوٹھی کے سامنے جا رکیں۔ یہ کوٹھی قصبے کے ٹاٹ میں "مخمل کا پیوند" نظر آتی تھی۔ اندرونی عمارت کے سامنے کافی کھلا کرا سی لان تھا۔ اس لان میں ہیبت ناک صورت والا ایک کتا بندھا تھا اور خوب صورت رنگوں والے دو مور ٹہل رہے تھے۔ میں نے دیکھا' دو ملازم صورت افراد کوٹھی کی بیرونی دیوار پر سفیدی پھیر رہے تھے۔ یہ سفیدی آرائش کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کے نیچے کچھ نعرے چھپائے جا رہے تھے۔ غالباً رات کے اندھیرے میں کوئی کوٹھی کی دیوار پر کچھ لکھ گیا تھا۔ کوٹھی کے گیراج میں صرف ایک سوزوکی وین کھڑی تھی جسے دیکھ کر انسپکٹر باجوہ نے شبہ ظاہر کیا کہ "مطلوبہ شخص گھر میں نہیں ہے۔" گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے پولیس کی آمد کو حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثر کے ساتھ دیکھا۔ فوراً اندر اطلاع پہنچائی گئی۔ سفید بالوں اور گول مٹول ناک والا ایک ادھیڑ عمر شخص سلیپر پہنے برآمد ہوا۔ اس نے اپنا نام رمضان بتایا اور کہا کہ وہ شیخوپورہ نویس ہے اور پراپرٹی کے کام میں مالک محمد کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مالک محمد کا ملازم خاص ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ

مالک صاحب علی الصباح لاہور چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی دس بجے تک ہوگی۔

ایس پی برکت نے کوٹھی کا مین گیٹ کھلوایا اور اپنی کار اندر پارک کر دی۔ پھر انسپکٹر باجوہ کو ہدایت کی کہ وہ دو کانسٹیبلوں کے ساتھ فوراً قصبے کے ناکے پر چلا جائے اور جیسے ہی مالک محمد واپس پہنچے' اسے ساتھ لے کر یہاں آ جائے۔ انسپکٹر باجوہ نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم ایس پی برکت کے ساتھ کوٹھی میں آ گئے۔ یہاں برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر عورت تین بچوں کو لیے کھڑی تھی۔ تینوں لڑکے تھے۔ وہ سب پریشان نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے کی عمر سات سال کے قریب تھی' منجھلا اندازاً چار سال کا اور چھوٹا دو سال کا تھا۔ چھوٹے دونوں بچوں کا رنگ گندمی اور بال گھونگریالے تھے۔ جبکہ بڑا بچہ بہت گورا چٹا اور تیکھے نقوش والا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی بادامی تھا۔

مالک محمد کے ملازم خاص رمضان نے ہمیں ڈرائنگ روم میں پہنچایا۔ وسیع ڈرائنگ روم کی آرائش سے جہاں دولت مندی کا اظہار ہوتا تھا وہاں یہ بھی پتا چلتا تھا کہ اس سجاوٹ میں کسی باذوق خاتون کا ہاتھ ہے۔

ایس پی برکت نے رمضان سے چند سوالات کرنے کے بعد اسے باہر بھیج دیا اور اس ادھیڑ عمر خادمہ کو بلایا جو برآمدے میں بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ عورت کا نام بشیراں تھا۔ وہ عام سی دیہاتن نظر آتی تھی' اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب زمینداروں اور چوہدریوں کے گھروں میں کام کرنے والی' بچے بہلانے والی' برتن مانجھنے والی اور بچا کھچا کھانا میلی چادر کے پلو سے ڈھانپ کر گھر لے جانے والی۔ پولیس کی آمد سے وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا کہ اس گھر میں خدمت انجام دیتے ہوئے اسے صرف ایک مہینہ ہوا ہے لہٰذا یہاں کے حالات کے بارے میں اس کی معلومات بہت کم ہیں۔

ایس پی نے ڈانٹتے ہوئے کہا "میں بھوتنی دا جو پوچھ رہا ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جتنا بھی جانتی ہو بتاؤ۔ جتنا بھی جانتی ہو۔"

بشیراں نامی یہ ملازمہ اور سہم گئی۔ وہ رو دینے کے قریب تھی۔ پولیس سے تو ڈر ہی رہی تھی' اپنے مالک سے بھی خوف زدہ تھی کہ معلوم نہیں وہ بعد میں اس سے کیا سلوک کرے۔ میں اسے تسلی دیے بغیر نہ رہ سکا "گھبراؤ نہ مائی۔ ہمارے ہوتے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جو بھی جانتی ہو کھل کر بتاؤ۔"

میرا فقرہ نشانے پر لگا۔ عورت قدرے پرسکون نظر آنے لگی لیکن ایس پی صاحب کو میری یہ دخل در معقولات پسند نہیں آئی۔ انہوں نے جلتی نظروں سے مجھے گھورا جیسے یہ بیان خاموشی فرما رہے ہوں "کاکا جی! تو ہیڈ کانسٹیبل ہے' اپنی اوقات میں رہ۔ ورنہ میں بھوتنی دا بڑا خر دماغ ہوں۔" عورت نے ایس پی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ مالک محمد کی بیوی گھر میں نہیں ہے۔ اسے گئے ہوئے پانچ چھ ماہ ہوئے ہیں۔ غالباً وہ روٹھ کر گئی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں مالک محمد کو بچے سنبھالنے میں بہت دشواری تھی۔ اس نے بچوں کے لیے دو تین آیا بدلی ہیں' اب پچھلے ایک ماہ سے وہ یہاں کام کر رہی ہے۔

ایس پی برکت نے تینوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ بچے مالک محمد کے ہیں؟"

"جج۔۔۔ جی حضور" عورت نے ہکلا کر کہا۔ پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی "ہم۔۔۔ مجھے تو یہی پتا ہے۔"

"کیا مطلب! اس میں شک والی کون سی بات ہے؟"

"یہ۔۔۔ بڑا لڑکا۔۔۔ شاید بی بی کے پہلے خاوند سے ہے لیکن مالک اسے اپنا ہی کہتا ہے۔"

میں نے چونک کر بڑے لڑکے کو دیکھا۔ پہلی نگاہ ہی میں وہ مجھے دوسرے دونوں بچوں سے مختلف نظر آیا تھا۔ اب بشیراں کی بات سے اس خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔

ایس پی نے گورے چٹے لڑکے کو غور کر دیکھا' وہ کچھ اور سہم گیا "ادھر آؤ میرے پاس" ایس پی برکت نے انگلی سے اشارہ کیا۔ لڑکا لڑکھڑاتا ہوا قریب آ گیا "کیا نام ہے تمہارا؟" ایس پی نے پوچھا۔

وہ آنسو بھری نظروں سے بشیراں کی طرف دیکھنے لگا۔ بشیراں نے کہا "یہ بول نہیں سکتا جناب۔ ماندرزو گونگا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟" ایس پی نے بشیراں سے پوچھا۔

"مالک اسے یوسف کہتا ہے۔"

"یہ شروع سے مالک کے ساتھ ہے؟"

"نہیں جی' کوئی چار مہینے ہوئے ہیں اسے یہاں۔ بی بی کے جانے کے دو ماہ بعد یہاں آیا تھا۔ میں ملازم ہوئی تو مالک نے مجھ سے کہا تھا' یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ اس کا خیال دوسرے دونوں بچوں کی طرح رکھنا۔"

"قصبے کے لوگوں کا کیا خیال ہے؟" ایس پی نے پوچھا۔

"وہ تو نئی طرح کی باتیں بناتے ہیں جی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مالک کا نہیں' بی بی کا بچہ ہے اور مالک اپنے سوتیلے بیٹے سے جو محبت کر رہا ہے وہ دکھاوے کی ہے۔ ورنہ میاں بیوی میں جھگڑے کی وجہ یہی لڑکا ہے۔ مالک کو بی بی کی پہلی شادی کا پتا نہیں تھا۔ جب پتا چلا تو دونوں میں ٹھن گئی اور وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ۔۔۔" بشیراں بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

"بات مکمل کرو" ایس پی برکت نے اسے جھاڑا۔

"وہ جی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ۔۔۔ بی بی کی۔۔۔ ناجائز اولاد ہے۔"

میں حیران ہو رہا تھا کہ مالک محمد جیسے با اثر اور تیکھے دار شخص پر لوگ اتنی آسانی سے الزام تراشی کر رہے ہیں۔

ایس پی نے بشیراں سے پوچھا "کیا بی بی بہت خوب صورت ہے؟"

یہ سوال غیر ضروری تھا۔ ابھی بشیراں بتا چکی تھی کہ وہ بی بی کے گھر چھوڑنے کے بعد یہاں آئی تھی۔ ویسے بھی بچوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کی ماں خوش شکل رہی ہو گی۔

بشیراں بولی "میں نے تو بی بی کو نہیں دیکھا جی۔ ہاں لوگ کہتے ہیں کہ بی بی بہت خوب صورت ہے' بالکل کشمیرن لگتی ہے۔"

یہ ایک بالکل غیر متعلقہ موضوع چھڑ گیا تھا۔ ہم یہاں مالک محمد کو ایک فوجداری کیس میں گرفتار کرنے آئے تھے' اس کے خانگی معاملات میں جھانکنے نہیں۔ بہرحال وقت گزارنے کے لیے یہ مصروفیت ٹھیک تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں مالک محمد کے تین ملازمین سے مالک کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ تینوں ملازمین میں سے کوئی بھی وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکا کہ یوسف' مالک کا بچہ ہے' بی بی کا یا دونوں کا۔ ہاں مالک کا دعویٰ یہی تھا کہ یوسف چھوٹے دونوں بچوں کا سگا بھائی ہے اور اس کی پیدائش کوہاٹ میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی نانی کے پاس رہتا تھا۔ مالک محمد کے بارے میں پتا چلا کہ بیوی کے جانے کے بعد سے وہ خاصا اپ سیٹ ہے۔ کاروبار میں دلچسپی بہت کم ہو گیا ہے۔ کوٹھی کے مردان خانے میں ہونے والی رقص و سرور کی محفلیں ختم ہو چکی ہیں اور مشتبہ لوگوں کی آمد و رفت بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ خاص طور پر پچھلے تین چار ماہ سے وہ بہت بدلا بدلا نظر آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عنقریب وہ یہ مکان بیچ کر کہیں اور شفٹ ہو رہا ہے۔

اس وقت ڈرائنگ روم کا وال کلاک نو بجا رہا تھا جب قصبے کے باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایس پی کے

ساتھ ہم سب اُچھل پڑے۔ فائرنگ پہلے رُک رُک کر ہوئی پھر ایک دم شدت اختیار کر گئی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ انسپکٹر باجوہ اور اس کے ساتھیوں کی کسی سے مڈبھیڑ ہو گئی ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ مخالف فریق مالک محمد ہے۔ وہ قرب و جوار کے علاقے میں سب سے دھڑلے دار شخص تھا۔ چار پانچ مسلح کارندے ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ پولیس پارٹی کو شروع سے یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے گرفتاری پیش نہیں کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ چھاپا مار پارٹی پوری تیاری سے آئی تھی۔ ایس پی کا اشارہ پاتے ہی ہم کار کی طرف دوڑے۔ ڈرائیور پہلے سے گاڑی میں موجود تھا۔ یوٹرن لے کر کار کمان سے نکلے تیر کی طرح قصبے کے بیرونی راستے کی طرف بڑھی۔ قصبے کی گلیوں میں لوگوں کے چہروں پر ہراس نظر آ رہا تھا۔ یہ تو وہ علی الصباح ہی جان چکے تھے کہ قصبے میں پولیس موجود ہے اور اب وہ "چور سپاہی" والی دوڑ بھی دیکھ رہے تھے۔ جونہی ہماری کار قصبے سے باہر نکلی' دوسری پولیس کار نظر آ گئی۔ ایک تنگ راستے پر موڑ کاٹتے ہوئے وہ جوہڑ میں گھس گئی تھی۔ بائیں طرف کے دونوں پہیے کیچڑ میں دھنسے ہوئے تھے اور ڈرائیور باہر نکلنے کے لیے جتنا زور لگا رہا تھا' گاڑی گھوم گھوم کر اتنی ہی پھنستی جا رہی تھی۔ ہم قریب پہنچے تو پہیوں کے اُڑائے ہوئے کیچڑ سے ہماری کار کی ونڈ اسکرین بھی تھتھڑ گئی۔ کچھ گارا ایس پی صاحب اور ڈرائیور کے کپڑوں پر بھی ہو گیا۔ انسپکٹر باجوہ بھنایا ہوا گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے دایاں کندھا بائیں ہاتھ سے تھام رکھا تھا اور انگلیوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اسے گولی لگی تھی۔ وہ چلا کر ایس پی برکت سے بولا "چوہدری صاحب! پیچھا کریں' وہ جا رہا ہے۔" اس نے انگلی سے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ابھی تک کسی گاڑی کی اُڑائی ہوئی دھول معلق تھی۔

ایس پی کے اشارے پر ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ ٹویوٹا کرونا' چاول کے کٹے ہوئے کھیت میں دو دو فٹ اُچھلتی درختوں کی طرف لپکی۔ جونہی ہم نیم پختہ راستے پر پہنچے' آگے جانے والی گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ یہ دو برس پرانے ماڈل کی پجارو تھی۔ اپنے عقب میں دھول کے مرغولے چھوڑتی وہ برق رفتاری سے نہر کی طرف جا رہی تھی۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پولیس پارٹی پر فائرنگ کر کے بھاگنے والا مالک محمد ہی ہے۔ نیلے رنگ کی یہ پجارو اسی کی ملکیت تھی۔ پجارو کی جھلک دیکھ کر ایس پی صاحب کے جوش و خروش میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ ہم نے رائفلیں سونت لیں۔ راستہ ناہموار تھا لہٰذا جیپ کو کار پر برتری حاصل تھی۔ یوں بھی ہمیں گرد و غبار کی وجہ سے دشواری پیش آ رہی تھی۔ کوشش کے باوجود ہمارا ڈرائیور جیپ سے درمیانی فاصلہ کم نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ فاصلہ تقریباً ۲۰۰ میٹر تھا اور اتنی دوری سے جیپ پر فائرنگ کرنا لاحاصل تھا۔

تقریباً تین میل آگے آکر جیپ اچانک زاویہ قائمہ پر گھوم گئی۔ یہ ایک نیم پختہ راستہ تھا جو کچے راستے کو قطع کرتا ہوا نہر کے پُل تک پہنچتا تھا۔ ہماری کار ہچکولے کھاتی اس نیم پختہ راستے پر پہنچی تو جیپ ایک بار پھر نظر آنے لگی۔ اس دفعہ مجھے جیپ کی نمبر پلیٹ بھی صاف نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ جیپ سے ہمارا فاصلہ اتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے۔ غالباً ہماری نظر سے اوجھل ہو کر جیپ چند لمحوں کے لیے ٹھہر گئی تھی یا آہستہ ہوئی تھی۔ میرے خیال میں ایس پی سمیت عملے کے کسی فرد نے یہ بات نوٹ نہیں کی۔ ایس پی صاحب کو صرف یہ مسرت تھی کہ درمیانی فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ نیم پختہ راستے پر آتے ہی جیپ کی برتری ختم ہو گئی۔ پولیس کار نے تیزی سے فراٹے بھرے اور آناً فاناً جیپ کو جا لیا۔ کار کو نزدیک پہنچتے دیکھ کر جیپ سے رائفل کا فائر ہونے لگا۔ ہم نے بھی جواباً برسٹ کرنے کی کوشش کی۔ چلتی گاڑیوں میں ایسی کوشش شاذ و نادر ہی کامیاب ہوتی ہے۔ یہاں بھی صورت حال یہی رہی۔ تاہم کچھ آگے جاکر پجارو ایک گڑھے میں اُچھلنے کے بعد ایک درخت سے جا ٹکرائی اور گھومتی ہوئی جھاڑیوں میں پھنس گئی۔ اس سے پہلے کہ جیپ کے دروازے کھلتے اور اندر موجود افراد فرار ہونے کی کوشش کرتے ہم سر پر پہنچ گئے۔ جب پجارو کا اگلا دروازہ کھلا اور ڈرائیور نے نکل بھاگنے کے لیے اپنی ٹانگ باہر نکالی' میری گولی اس کے سر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے گھبرا کر پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران ایک ہیڈ کانسٹیبل کی گولی نے جیپ کا پچھلا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ ہم بھاگتے ہوئے پہنچے۔ پجارو اور اندر موجود افراد کو للکار کر بے بس کر دیا۔ یہ کل چار افراد تھے۔ ان میں سے ڈرائیور خاصا زخمی ہوا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون اُبل اُبل کر سفید قمیص کو داغدار کر رہا تھا۔ ڈرائیور کی طرح باقی تین افراد بھی چٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ان میں سے دو کے پاس ریوالور اور ایک کے پاس ایم جی رائفل تھی۔ اگر وہ حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے تو ہمیں کافی دیر پجارو سے دور رکھ سکتے تھے مگر پجارو کے ٹکرا جانے سے وہ یوں گھبرائے تھے کہ نکل

بھاگنے کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکے تھے۔ ان افراد کو دیکھ کر ایس پی برکت کا چہرہ مایوسی کی آماجگاہ بن گیا اور مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ مالک محمد ان چار افراد میں موجود نہیں ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نذیر اور امان اللہ نے آگے بڑھ کر ملزموں کے ہتھیار لے لیے۔ ایس پی برکت نے اپنے ۳۸ بور ریوالور کی نال ایک فربہ شخص کی گردن میں دھنساتے ہوئے پوچھا "کہاں ہے وہ تمہارا باپ مالک محمد؟"

"وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔" فربہ شخص نے اپنے ہاتھ کے زخمی پنجے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم نے پولیس پارٹی پر فائرنگ کیوں کی؟"

"اگر وہ واقعی پولیس والے تھے تو ہمیں بہت افسوس ہے۔ ان میں سے صرف ایک نے وردی پہن رکھی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ اس نے بہروپ بھرا ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ہمارے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ جعلی پولیس والوں نے ہماری جیپ روک کر ایک بندے کو پھڑکا دیا تھا۔"

ایس پی برکت نے اپنے مخصوص تھانیدارانہ لہجے میں کہا "اصلی نقلی کی پہچان تو اب بڑے گھر میں تمہیں اچھی طرح کرائی جائے گی۔ ویسے اس وقت تم آ کہاں سے رہے ہو؟"

"فیصل آباد سے۔ وہاں ایک دوست کی شادی تھی۔"

گاڑی میں دو ہتھکڑیاں موجود تھیں۔ ان کی مدد سے چاروں ملزموں کے ہاتھ جکڑ دیے گئے۔ اس کے بعد جیپ کی تلاشی لی گئی۔ نشستوں کے نیچے سے شراب کی ایک خالی بوتل اور کچھ گولیاں برآمد ہوئیں۔ جیپ کا انجن ٹھس ہو چکا تھا۔ گاڑی کے کاغذات ایس پی برکت نے قبضے میں لے لیے۔ اب ایس پی کو واپس قصبے میں پہنچنے کی جلدی تھی۔ اصل ملزم ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کے ہاتھ آنے تک یہ "چھاپا" قطعی ناکام تھا۔ چاروں ملزموں کو پولیس کار میں ٹھونس دیا گیا۔ کار میں جگہ نہ ہونے کے سبب مجھے اور ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو پیدل مارچ کا حکم ہوا۔ کار دھول اُڑاتی قصبے کی طرف روانہ ہوئی تو ہیڈ کانسٹیبل نذیر نے ایس پی برکت کو نشانہ کوسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے افسر اعلیٰ سے خاصا ناخوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے تمام تر جذبات کو ایک فقرے میں سمیٹتے ہوئے کہا کہ ایس پی برکت کے نیچے کام کرنے سے بہتر ہے آدمی کسی روڈ رولر کے نیچے آکر کام تمام کرا لے۔

دونوں رائفلیں اور ایمونیشن اٹھا کر اب ہمیں تقریباً چار میل پیدل مارچ کرنا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو تھوڑی بہت میکینکی جاننے کا دعویٰ تھا۔ کہنے لگا "کیوں نہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جائے۔" مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا "کر کے دیکھ لو۔" وہ بونٹ اٹھا کر مختلف پرزوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ میرے ذہن میں بار بار وہ فرلانگ پیچھے کا وہ موڑ گھوم رہا تھا جہاں پہنچ کر جیپ کی رفتار اچانک کم ہو گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ مالک محمد جیپ میں موجود ہو اور اسے وہاں اُتار دیا گیا ہو۔ لحظہ بہ لحظہ یہ شبہ میرے اندر تقویت پکڑ رہا تھا۔ میں نے نذیر کو جیپ سے اُلجھتے چھوڑا اور خود دھیمے قدموں سے اس اندھے موڑ کی طرف چل دیا۔ رائفل بدستور میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ یہ سارا علاقہ سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے اَٹا ہوا تھا۔ آبادی دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ جس موڑ پر جیپ کی رفتار دھیمی ہوئی تھی' وہاں خاصے اونچے سرکنڈے تھے۔ میں محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک چیز پر جم کر رہ گئی۔ یہ سگریٹ کا ایک پیکٹ تھا۔ گرنے سے پیکٹ کا منہ کھل گیا تھا اور اس میں سے سگریٹ جھانک رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پیکٹ کسی کی جیب سے گرا ہے۔ ایکایک میرے رگ پٹھے اکڑ گئے۔ چار برس پہلے کا استاد جمالی پوری توانائی سے میرے اندر بیدار ہونے لگا۔ میری چھٹی حس نے واشگاف اعلان کیا کہ اطراف کے سرکنڈوں میں کوئی موجود ہے۔ میں نے رائفل کندھے سے اُتاری۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور دبے قدموں سرکنڈوں میں داخل ہو گیا۔ جیپ کو درخت سے ٹکرائے ابھی پندرہ منٹ سے زائد نہیں ہوئے تھے۔ اگر چلتی جیپ سے واقعی کوئی اُترا تھا تو عین ممکن تھا وہ ابھی انہی سرکنڈوں میں ہو۔ ذہن میں اُٹھنے والے سوال کا جواب کبھی کبھی بندے کو اتنی سرعت سے ملتا ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے۔ میں نے ابھی سرکنڈوں میں چند قدم ہی اُٹھائے تھے کہ زوردار دھماکا ہوا اور گولی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ تقدیر نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا فائر ہوتا میں نے چھلانگ لگائی اور تیز دھار سرکنڈوں کو توڑتا ہوا آٹھ دس فٹ بائیں جانب گرا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے مجھے ایک شخص کا کندھا نظر آیا۔ اس نے براؤن سویٹر پہن رکھا تھا۔ دوسرا فائر خالی جاتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور پوری طاقت سے اس براؤن سویٹر کی طرف بڑھا۔ اس مرتبہ براؤن سویٹر کی جھلک مجھے دس بارہ گز دور نشیب میں دکھائی دی۔ مجھ پر فائر کرنے والا راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔

"رک جاؤ" میں نے چلا کر کہا اور بھاگتے بھاگتے ایک ہوائی فائر کیا۔

سرکنڈے میرے چاروں طرف شور مچا رہے تھے۔ زمین ناہموار تھی۔ بھاگتے بھاگتے ہم دونوں میں سے کوئی بھی گر سکتا تھا۔ اچانک مجھے "ٹرچ" کی مخصوص آواز آئی۔ میرے آگے بھاگنے والے کا ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑی تسلی بخش صورت حال تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور تقریباً سو میٹر بھاگنے کے بعد اسے جا لیا۔ ہم دونوں اوپر نیچے ایک جوہڑ کے یخ بستہ پانی میں گرے۔ میں نے براؤن سویٹر والے کا چہرہ دیکھا۔ بلاشبہ وہ مالک محمد تھا۔ اس کے چہرے پر کنپٹی کے قریب ایک پرانا زخم تھا۔ جبڑے چوڑے اور بھنویں گھنی تھیں۔ اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جوہڑ میں گرتے ہی اس نے پلٹ کر مجھ پر حملہ کیا۔ ریوالور والا ہاتھ میری ٹھوڑی پر لگا اور دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ میں نے سنبھالا لے کر رائفل کی بٹ کی ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی۔ کوئی عام شخص ہوتا تو کٹے درخت کی طرح پانی میں جا گرتا لیکن وہ خاصا سخت جان تھا۔ ذرا سا لڑکھڑا کر جھکا اور سر کی زوردار ٹکر میری ناف پر مارنا چاہی۔ اس کے جھکتے ہی میں اس کی نیت پہچان گیا تھا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر میں نے خود کو "پوزیشن" میں لیا اور گھٹنے کی بھرپور ضرب اس کے جھکے ہوئے چہرے پر رسید کی۔ وہ کراہ کر پانی میں گرا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ پانی میں گرتے ہی اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ قدموں کے نیچے ٹھوس زمین کے بجائے جوہڑ کی کیچڑ تھی۔ میں نے ایک جست کے ساتھ اسے پھر دبوچ لیا۔ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ رہا تھا اور مزاحمت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اسے گریبان سے کھینچتا ہوا جوہڑ سے باہر لے آیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور پورا جسم جوہڑ کے گدلے پانی میں شرابور تھا۔ جوہڑ سے باہر آ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بری طرح لنگڑا رہا ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ اس نے چلتی جیپ سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کوشش میں اس کا ٹخنہ بری طرح مڑ گیا تھا۔ اچانک سامنے درختوں میں سرسراہٹ سنائی دی اور ایک شخص اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ یہ دراز گیسوؤں اور خستہ لباس والا ایک ملنگ نما شخص تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فائرنگ کی آواز اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وہ اُبھی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کک... کچھ نہیں" اس نے سہم کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

"ٹھہرو" ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ وہ جاتے جاتے رک گیا۔ "تم کہاں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پار... جی" اس نے ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"چلو! ... بتاؤ ذرا ... وکھلاؤ" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میرا ... لیے اور رائفل وغیرہ دیکھ کر ملنگ کو غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ وہ بلا چوں چرا ساتھ چل دیا۔ تھوڑا ہی آگے ایک ذرا تنگ آگے جھنگ کے بعد سے پودوں کے درمیان ایک کچا کوٹھا نظر آ رہا تھا۔ بالکل سنسان جگہ تھی۔ کوٹھے کے اندر کھجور کی چٹائی بچھی تھی۔ ایک جستی ٹرنک، بھنگ گھوٹنے کا سامان اور چند ٹوٹے پھوٹے برتن ... اس کٹیا کی کل متاع تھی۔ ملنگ خود بھی ایک بے ضرر سا شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور میں گرفتار شدہ ملزم سے پوچھ گچھ کے لیے اس کی کٹیا استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ معمولی تذبذب کے بعد وہ راضی ہو گیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ کٹیا سے دور نہیں جائے گا۔

دھوپ ایک دم ہی غائب ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا تو صبح سے چل رہی تھی اب اس کی خنکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ بھیگے کپڑوں کی وجہ سے ہمیں کچھ زیادہ ہی سردی لگ رہی تھی۔ میں نے قریب رکھی انگیٹھی کی سلگتی راکھ کریدی اور اس میں کچھ خشک لکڑیاں رکھیں۔ پھر قمیص اتار کر اور نچوڑ کر ایک طرف ڈال دی۔ میرے بات شروع کرنے سے پہلے ہی مالک محمد بول پڑا "میرا خیال ہے تم اے ایس آئی یا ایس آئی ہو۔"

میں نے اس کے خیال کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مجھے پولیس والا تسلیم کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا "ہاں۔ اے ایس آئی ہوں۔"

وہ بولا "شادی شدہ ہو؟" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ مالک محمد کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔ لگتا تھا وہ ملازمت کے لیے آنے والے کسی نوجوان کا انٹرویو لے رہا ہے۔ درحقیقت میرے رویے نے اسے شبے میں ڈال دیا تھا۔ میں اسے پکڑ کر ملنگ کی کٹیا میں لے آیا تھا اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ میں کچھ مک مکا کرنے کے چکر میں ہوں۔ اس نے کہا "دیکھو! میں تمہیں مناسب رقم دے سکتا ہوں لیکن... فی الوقت میرے پاس ڈیڑھ دو ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری جیب میں ڈیڑھ دو لاکھ بھی ہوتے تو مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ میں رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

وہ چونک گیا "لگتا ہے پولیس لائن میں نئے آئے ہو۔ میرا ایک بھتیجا بھی اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا تین سال پہلے۔ دو سال تک اس نے نہ رشوت کھائی اور نہ کوئی ناجائز کام کیا۔ اسے تین دفعہ لائن حاضر ہونا پڑا اور ایک دفعہ نوکری جاتے جاتے بچی۔ اب وہ ایک سال میں ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچ گیا ہے۔ ایک کوٹھی شیخوپورہ میں بنا رکھی ہے دوسری سالے کے نام سے لاہور میں بنا رہا ہے۔ خود عیش کرتا ہے اور دوسروں کو بھی کراتا ہے۔ یہ محکمہ نمک کی کان ہے۔ اس میں جو داخل ہوتا ہے اسے نمک ہونا پڑتا ہے۔"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "مالک محمد! تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمہیں یہاں رشوت کی وصولی کے لیے نہیں پوچھ گچھ کے لیے لایا ہوں۔"

وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اگلے چار پانچ منٹ میں اسے اس غیر یقینی کیفیت سے صاف نکال لیا۔ وہ اب "آخرکار" "حقیقت" تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں ایک ایماندار اہلکار ہوں اور اس سے صرف پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہت سنجیدہ بھی نظر آنے لگا۔ ایک گہری سانس لے کر بولا "اے ایس آئی احسان! میں جانتا ہوں برکت مجھے کیوں گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ امام مسجد شفیع والے کیس کا تو صرف بہانہ ہے اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ برکت جانتا ہے کہ میرا تعلق قادر زماں سے رہا ہے اور قادر زماں پر ایک خاص قسم کا شک کیا جا رہا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "مالک محمد! تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔ اگر تمہارا اشارہ شنکر شکرا کی طرف ہے تو میں اس کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہوں۔"

مالک محمد نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ایک اے ایس آئی رینک کا بندہ شنکر کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کرے گا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ میں شنکر شکرا کی بات ہی کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی تم خود بھی تسلیم کر رہے ہو کہ شنکر کے بارے میں تم سے اہم معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں؟"

"مجھے اس سے انکار نہیں۔" مالک محمد نے کہا "بلکہ میں کہتا ہوں اگر شنکر کے بارے میں کوئی پولیس کو درست معلومات فراہم کر سکتا ہے تو وہ میں ہی ہوں۔" اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا جیسے بات کرتے کرتے اچانک کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا ہو۔ اس نے سگریٹ نکالنے کے لیے قمیص کی جیب ٹٹولی۔ سگریٹ وہاں نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو مالک محمد کی طرح شرابور ہو چکے ہوتے۔ میں نے اپنی چرمی جیکٹ کی جیب سے اس کا گمشدہ پیکٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"یہ تمہارا ہی پیکٹ ہے۔ راستے میں ملا تھا۔" میں نے اس کی حیرت دور کی۔

سگریٹ سلگا کر اس نے چند طویل کش لیے۔ پھر دوستانہ لہجے میں بولا "اچھا بھئی اے ایس آئی! مجھ سے ایک سودا کر لو۔ میں تمہیں شنکر کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیتا ہوں جو مجھے معلوم ہے اور تم مجھے گرفتار کیے بغیر واپس چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں تم اس وقت سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ شنکر کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتانا ہی ہے۔ یہاں نہیں تو تھانے پہنچ کر بتا دو گے۔"

"لیکن وہاں پہنچ کر بتایا تو تمہیں کیا حاصل ہو گا۔ سب کچھ ایس پی برکت کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ اس کہانی میں تمہارا نام تک نہیں ہو گا۔ دیکھو! تم جوان سال ہو، تمہیں ترقی اور نیک نامی کی ضرورت ہے۔ ترقی اور نیک نامی یونہی پلیٹ میں رکھی نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ فائلوں میں اپنی کارکردگی درج کرانا ہوتی ہے۔ تم رشوت نہیں لیتے ہو، اچھی بات ہے لیکن اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے گرفتار کرنے کا کچھ صلہ تو تمہیں ملنا چاہیے۔ میں تمہیں ایسی اطلاع دے جاؤں گا کہ تم معمولی کوشش کے ساتھ شنکر تک پہنچ جاؤ گے۔ تمہارا شنکر تک پہنچنا یا اسے پکڑ لینا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہو گا کہ اسے چھپایا جا سکے اور اگر تم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہی جست میں تم انسپکٹر کے عہدے تک نہ پہنچ جاؤ۔"

شکار خود دام کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا کر لیے۔ لوہا گرم دیکھ کر مالک محمد نے ایک اور ضرب لگائی "اور دیکھو! اس میں کسی طرح کی بددیانتی بھی نہیں ہے۔ میری گرفتاری کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پولیس مجھ سے شنکر کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے اور جب تم یہ سب کچھ معلوم کر لو گے تو پھر مجھے چھوڑنے میں نہ کوئی حرج ہو گا اور نہ یہ بددیانتی کہلائے گی۔"

رائفل بدستور میری گود میں پڑی تھی اور میں آلتی پالتی مارے مالک محمد سے کوئی پانچ فٹ دور بیٹھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر

میں نے تھری کیسل کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر بولا "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم جان چھڑانے کے لیے اِدھر اُدھر کی نہیں ہانکو گے اور میں واقعی صحیح معلومات حاصل کروں گا؟"

مالک محمد کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی عود کر آئی۔ اس نے کہا "تمہارا سوال اپنی جگہ درست ہے۔ میں جو کچھ بتاؤں گا اس کی تصدیق کرنے کا تمہارے پاس کوئی طریقہ نہیں ہوگا لیکن کبھی کبھی بندے کو بغیر تصدیق کے بھی یقین کرنا پڑتا ہے اور ہم اکثر کرتے بھی ہیں۔ پھر ایک خاص بات اور بھی ہے جس کا تمہیں پتا نہیں۔ میں خود بھی تمہیں شنکر کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے پولیس مجھ تک نہ پہنچتی تو میں خود کسی ذریعے سے یہ ساری معلومات پولیس تک پہنچاتا۔"

میں نے کہا "تم اپنی باتوں سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں شنکر سے کوئی گزند پہنچا ہے اور اس کا بدلہ تم اس کے خلاف اطلاع دے کر چکانا چاہتے ہو؟"

"نہیں، مجھے شنکر سے کوئی گزند نہیں پہنچا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی صورت دیکھی ہے۔"

"پھر کیوں یہ خطرہ مول لے رہے ہو؟"

مالک محمد نے ایک طویل سانس لی "سب سے پہلے تو تم لوگ اپنی یہ غلط فہمی دور کرو کہ قمر زماں صاحب تمہیں شنکر کے بارے میں کوئی اہم سراغ دے سکتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی شنکر کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ابھی تک شاید ایک دفعہ ان کی ملاقات ہوئی ہے شنکر سے۔ شنکر کے بارے میں جو شخص پولیس کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے وہ صرف اور صرف عیسیٰ جان ہے۔ بارڈر پار سے آنے والے لوگوں کے ساتھ عیسیٰ جان کے بڑے پرانے رابطے ہیں۔ خاص طور پر پچھلے چند سال سے اس کا زیرِ اثر بھارتی بدمعاشوں کا گروہ بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "یہ نام میں نے سنا ہوا تو ہے لیکن اب کچھ یاد نہیں پڑ رہا۔ یہ وہی عیسیٰ جان تو نہیں جو پنڈی سے تین ائیرہوسٹسوں کو اغوا کر کے قبائلی علاقے میں لے گیا تھا!"

مالک محمد نے اثبات میں سر ہلایا "یہ وہی ہے۔ خوب صورت عورت کی بھوک اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس بات کو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ میں خود اس بوالہوس کا ڈسا ہوا ہوں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں!"

اچانک مالک محمد کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ اپنی بھاری بھرکم مونچھوں اور سخت گیر چہرے کے ساتھ یوں اشک بار ہوتا ہوا وہ مجھے عجیب سا لگا۔ جیسے کوئی پہلوان نزاکت سے "اُئی اللہ" کہہ کر کمر پر ہاتھ رکھ لے۔ میں نے نظر بھر کر مالک محمد کو دیکھا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک مدھم سا محراب نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ان دنوں نماز وغیرہ پڑھ رہا ہے۔ اس کی بول چال میں بھی اس کے خدوخال کے برعکس ایک طرح کی نرمی اور لچک پائی جاتی تھی۔ غالباً اس کے ملازمین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مالک محمد اندر سے بہت بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ بے حد سنجیدہ آواز میں گویا ہوا "تم نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ یہ محاورہ مجھ پر صادق آتا ہے۔ جس نے ایک چھوٹی مچھلی کو کھایا تھا، مجھ سے بڑی مچھلی نے مجھے نگل لیا ہے۔ جی چاہتا ہے اب تمہیں بتانے لگا ہوں تو کچھ بھی نہ چھپاؤں۔ تم جاننا چاہو گے کہ وہ چھوٹی مچھلی کون تھی جسے میں نے نگلا تھا۔ وہ نبیلہ تھی۔ لاہور میں رہتی تھی۔ ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھاتی تھی اور ایک ننھے بچے کی ماں تھی۔ اس کی شادی سولھویں سال ہی میں ہو گئی تھی۔ بہت خوب صورت تھی نا.... اور خوب صورت عورت زیادہ دیر اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اکیلی رہے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اس لیے سمجھدار والدین اپنی خوب صورت بچی کو فوراً کسی قدردان کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی خوب صورتی اپنے بچوں میں بانٹنا شروع کر دے۔ انیس سال کی عمر میں نبیلہ دو سالہ بچے کی ماں تھی۔ اس کا خاوند مشتاق محمد ایک بینک میں ملازم تھا۔ خوب گورا چٹا، بادامی آنکھوں والا تھا۔ نوکری تھی، چھوکری تھی اور بچہ بھی۔ وہ خود کو بہت خوش قسمت خیال کرتا تھا لیکن بدقسمتی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔"

اپنی کپکپی کم کرنے کے لیے مالک محمد نے اپنا بھیگا ہوا براؤن سوئٹر اتار پھینکا اور انگیٹھی کے کچھ اور قریب کھسک آیا۔ میں نے چند مزید ٹہنیاں انگیٹھی میں جھونک دیں۔ وہ سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا "یہ کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں خون میں بڑا جوش تھا۔ میرا ایک ساتھی "سوہنا ڈکیت" تھا۔ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ آلے دوالے میں اس کی بھی بڑی دہشت تھی۔ ہم دونوں نے مل کر پولیس بے چاری کو آگے لگا رکھا تھا۔ ایک عید کے موقع پر میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک فلائنگ کوچ پر ڈاکا ڈالا۔ اس کوچ میں نبیلہ بھی اپنے بچے کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ اس کا لشکارے مارتا حسن مجھ پر قیامت ڈھا گیا۔ وہ جو لوگ "پہلی نظر دی"... بات کہتے ہیں شاید وہی ہو گئی تھی۔ میں نے ڈکیتی کی اس واردات میں اغوا

کا جرم بھی شامل کر لیا اور نبیلہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے شہر اور اپنے والی وارثوں سے بہت دور سرحد کی ایک آزاد ایجنسی کے ایک چھوٹے سے ڈیرے پر نبیلہ میرے بستر کی جلوت بن گئی۔ میں نے ساری دنیا سے اس کا ناتا توڑ کر اسے صرف اپنے لیے خاص کر لیا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ایک بچے کی ماں بن گئی۔ دو سال بعد جب اس نے میرے دوسرے بچے کو بھی جنم دے دیا تو میں سمجھ گیا کہ اب میرا پلڑا پہلے خاوند پر بھاری ہو چکا ہے۔ اب میں اس کے دو بچوں کا باپ ہوں اور وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی اور واقعی یہی ہوا۔ واپس شیخوپورہ آ کر بھی وہ بڑی خاموشی سے میرے گھر پر آباد رہی۔ پہلے بچے کا غم آہستہ آہستہ اس کے اندر دفن ہو چکا تھا۔ اب دوسرے بچے تھے، ان کی بھاگ دوڑ تھی، گھر گرہستی کا چکر تھا۔ میں نے طاقت کے زور پر وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو کسی بھی اور طریقے سے زندگی بھر حاصل نہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ نبیلہ کی محبت بھی مجھے حاصل ہو چکی تھی۔ یقین کرو۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میری ساری برائیوں کے ساتھ اس نے مجھے قبول کر لیا تھا، جیسے وہ میری ضرورت تھی۔ میں بھی اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ ساتھ نبھانے کے لیے کچھ میں نے اپنے آپ کو بدلا تھا کچھ وہ خود بدل چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹی مچھلی میرے پیٹ میں ہضم ہو چکی تھی لیکن جب وہ ہضم ہو چکی تھی، ایک بڑی مچھلی مجھے کھانے کے لیے پہنچ گئی۔ یہ عیسیٰ جان تھا۔ یہ کوئی سات مہینے پہلے کی بات ہے۔ پشاور پولیس عیسیٰ جان کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ وہ پولیس کو چکمہ دے کر کرم ایجنسی میں گھس جانا چاہتا تھا لیکن کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ ایک رات وہ پناہ حاصل کرنے کے لیے میرے پاس شیخوپورہ چلا آیا۔ میں عیسیٰ جیسے زہریلے سانپ کو اپنی چھت تلے پناہ دینا نہیں چاہتا تھا لیکن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جرم کی دنیا میں رہ کر عیسیٰ سے دشمنی مول لینا شاید کوئی پاگل بھی پسند نہ کرے۔ وہ میرے دروازے پر آ گیا تھا تو اب اسے پناہ دینا ضروری تھا۔ عیسیٰ تقریباً ایک ماہ میرے گھر کے مردانے میں ٹھہرا رہا۔ اس ایک مہینے کے تیس دنوں میں ایک منحوس دن وہ بھی تھا جب اس نے میری بیوی نبیلہ کی جھلک دیکھی اور اپنی عادت کے مطابق بدنیتی کو دل میں جگہ دے لی۔ ایک مہینے بعد جب وہ میرے گھر سے رخصت ہوا تو مجھ سے مل کر نہیں گیا۔ نہ میری مہمانی کا شکریہ ادا کیا اور نہ میری ان کوششوں کی تعریف کی جو میں نے پولیس کو اس سے دور رکھنے کے لیے کی تھیں۔ وہ یہ سب کچھ کرتا بھی کیسے؟ میری بیوی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اسے اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔"

مالک محمد کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے۔ نیا سگریٹ سلگا کر بولا "میں اس روز تاریخ پر لاہور گیا ہوا تھا۔ شام کو واپس آیا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ عیسیٰ جان غائب تھا اور اس کے ساتھ ساتھ نبیلہ بھی۔ بچے رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔ گھر کے ملازموں نے مجھے باورچی خانہ دکھایا۔ یہاں فرش پر دودھ پھیلا ہوا تھا، برتن ٹوٹے ہوئے تھے اور نبیلہ کی ایک جوتی پڑی تھی۔ کسی کو یہ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ اس گھر میں [illegible] چند روز بعد مجھے عیسیٰ جان کا لکھا ہوا ایک خط موصول ہوا۔ اس نے لکھا تھا... "تمہاری میزبانی کا بہت شکریہ۔ اس کا بدلہ پھر کبھی چکا دوں گا۔ [illegible] گا نہیں کیونکہ میں بھولتا کچھ نہیں۔ اس کا ثبوت یہ عورت ہے جو میں تمہارے ڈیرے سے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ پندرہ برس پہلے تمہاری ہی برادری کے حشمت علی لکھو نے ایک بندہ قتل کر کے بنی رکھ سرکار میں پناہ لی تھی اور واپس جاتے ہوئے ایک عورت کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کا نام ارشاد تھا اور وہ رشتے میں میری پھوپھی تھی۔ میرے خیال میں اب اپنی گھر والی کا غم تمہیں زیادہ نہیں ستائے گا۔ ویسے بھی یہ خوب صورت عورتیں تو ہوتی ہی اغوا وغیرہ ہونے کے لیے ہیں۔ مرد بچے ایسی باتیں دل پر نہیں لگاتے۔ باقی تمہاری میزبانی کا ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔"

اگلے ایک ماہ میں، میں نے نبیلہ تک پہنچنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے لیکن ناکام رہا۔ عیسیٰ جان اسے لے کر قبائلی علاقے کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ عیسیٰ جان نے نبیلہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ عورت سے محبت کرتا ہے لیکن یہ محبت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ جسے چاہتا ہے اسے ہوس کی زبان سے چاٹ کر ختم کر دیتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ چھ ماہ اس کے پاس رہنے والی نوجوان لڑکی چالیس سال کی ادھیڑ عمر نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے نبیلہ کو بھی ختم کر دیا۔ ایک روز وہ اس کے پنجۂ ہوس سے فرار ہونے کی کوشش میں ایک چٹان سے گری اور سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گری۔ اس سانحے کی اطلاع مجھے عیسیٰ جان کے ایک ساتھی نے ہی دی تھی۔ وہ نبیلہ کے انجام سے اس قدر دکھی تھا کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے مجھے عیسیٰ جان کے ٹھکانے سے بھی آگاہ کر دیا۔ وہ کرم ایجنسی میں ٹل اور پاراچنار کے درمیان ایک پہاڑی علاقے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ پتا بھی چلا کہ سرحد پار کا بدنام قاتل شنکر، عیسیٰ

جان کے ڈیرے پر آتا ہے۔ میں اور میرا دوست سوہتا کو جرانوالہ اس وقت گراٹ میں تھے۔ ایک رات ہم مسلح ہو کر عیسیٰ جان کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن عیسیٰ تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ راستے ہی میں ہماری مڈبھیڑ عیسیٰ جان کے آدمیوں سے ہوئی۔ کوئی ایک گھنٹے تک زبردست گولی چلی۔ دو آدمی ان کے مارے گئے اور دو ہمارے۔ میری ٹانگ میں بھی ماؤزر کی گولی لگی۔ میں دو ہفتے پشاور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں رہا پھر شیخوپورہ واپس آگیا۔ گھر پہنچ کر میں نے خود کو کمرے میں بند کیا اور پورے آٹھ پہر سوچ بچار میں مصروف رہا۔ میرے سامنے اب دو راستے تھے۔ ایک انتقام کا اور دوسرا اپنے بچوں کی پرورش کا۔ پہلے راستے پر چلنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میری ساری زندگی ایسے ہی راستوں پر چلتے گزری تھی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ دشمنی اور انتقام کی اس آگ کو جتنا پھیلاؤں گا' پھیلتی جائے گی۔ میری زندگی' بچوں کی زندگی' ان کا مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا رہے گا اور اس کے بدلے حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ شاید مرنے والی میرے اندر شرافت اور نیکی کا جو بیج بوتی رہی تھی وہ چپکے چپکے بڑا ہو کر درخت بن گیا تھا۔ جو فیصلہ میں کرنا چاہتا تھا وہ بہت مشکل تھا لیکن میں نے کرلیا۔ میں نے اپنے دل کے ساتھ عہد کیا کہ اب صرف اور صرف اپنے بچوں کی پرورش کروں گا۔ باقی سارے کام چھوڑ کر سارے کھاتے بند کردوں گا۔ اس دن کے بعد میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ میں نے خود کو آہستہ آہستہ بدلنے کے بجائے ایک دم بدلا۔ ایک ہی دن میں ہر وہ کام چھوڑ دیا جس سے مرنے والی منع کیا کرتی تھی اور وہ ساری ذمے داریاں سنبھال لیں جو "بے آسرا بچوں کے باپ" کو سنبھالنی چاہیے تھیں۔ نبیلہ کو کھو کر مجھے احساس ہوا کہ بن ماں کے بچوں اور بن بیوی کے شوہر کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایک مہینے میں' میں نے وہ وہ عذاب سہے جن کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ روتے بلکتے بچے ماں کو پکارتے تھے تو میرے جسم کی بنیادیں ہل جاتی تھیں۔ میں رات رات بھر انھیں لے کر گھومتا تھا اور اپنی قسمت کو روتا تھا۔ اپنے گھر کی بربادی کا مزہ چکھا تو ایک اور شخص کی تکلیف کا احساس بھی ہوا۔ وہی شخص جسے میں نے پانچ برس قبل برباد کیا تھا۔ نبیلہ کا پہلا شوہر مشتاق محمد۔ وہ بھی تو ایک بچے کا باپ تھا۔ نجانے اس پر اور اس بچے پر کیا بیتی تھی؟ یہ سوال تیر بن کر میرے ذہن میں پیوست ہو گیا۔ دل میں درد جاگا تو اردگرد کی دنیا بدلی بدلی نظر آنے لگی۔ میں مشتاق اور اس کے بیٹے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ سراغ لگاتے لگاتے آخرکار میں

لاہور کی مضافاتی بستی گرد ماگھٹ پہنچا۔ مشتاق محمد سے آمنا سامنا ہوا۔ مجھے سامنے پاکر وہ چیخا چلایا نہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی' نہ میرا گریبان پکڑا' بس خاموش لیٹا رہا منوں مٹی کے نیچے۔ وہ ایک قبرستان کا مکین تھا۔ اسے مرے ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے۔ بیوی کی جدائی کا زخم کھا کر اس نے کثرت سے شراب نوشی شروع کردی تھی۔ اس کے پھیپھڑے خراب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اسے گلاب دیوی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ نوکری دو کری سب چھوٹ چکی تھی۔ فاقوں کا سامنا تھا۔ بچہ ایک خدا ترس محلے دار کے گھر میں پل رہا تھا۔ مشتاق تپ دق میں جلتا تھا۔ اسپتال کے وارڈ میں قیدی کی طرح رہتا تھا۔ بچے کو اس سے دور رکھا جاتا تھا اور بچے میں اس کی جان تھی۔ ایک رات جذبۂ پدری نے جوش مارا۔ وہ سب رکاوٹیں توڑ کر بچے سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ اسپتال کے عملے نے اسے روکنا چاہا۔ وہ ان سے الجھ پڑا۔ پھر زبردستی بھاگ کھڑا ہوا۔ اسپتال سے باہر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ وہ اپنی نیم جان ٹانگوں سے سڑک پر آیا تو اس ٹریفک کی تیز رفتاری کا اندازہ نہ کرسکا۔ اس کی سسکتی سمٹتی زندگی ایک لمبی چوڑی کار کے نیچے آکر کچلی گئی۔ نبیلہ کا پہلا بچہ یتیم ہو گیا اور یتیم کا اصلی ٹھکانا تو یتیم خانہ ہی ہوتا ہے۔ پانچ سال کی عمر میں یوسف یتیم خانے پہنچ گیا۔ اب پچھلے دو برس سے وہ وہیں رہ رہا تھا۔ میں تلاش کرتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے اپنے ساتھ یہاں شیخوپورہ لے آیا۔ اگر تم میرے گھر گئے ہو تو تم نے تیکھے نقوش والے ایک گورے چٹے لڑکے کو دیکھا ہو گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مالک محمد بولا "وہی یوسف ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر آیا تو سب کو یہی بتایا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ کبھی کبھی جذبات میں انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ یہاں شیخوپورہ میں کسی کو میرے آگے پیچھے کا پتا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دوسروں کو یقین دلانے میں کامیاب رہوں گا کہ یوسف میرا اور نبیلہ کا خون ہے اور اس طرح میرے گھر میں اسے ہمیشہ ایک مقام حاصل رہے گا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ زمانے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں' میری بات کا بھرم بھی نہیں رہ سکا۔ لڑکے کا رنگ روپ دیکھ کر لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ یہ میرا بیٹا نہیں۔ یہیں پر بس نہیں ہوئی ازدیں پڑوس والوں نے اپنے شک کا سہارا لے کر میری بیوی پر طرح طرح کے الزام لگانے شروع کردیے۔ یہاں تک کہا گیا کہ یوسف میرے گھر پر کسی گناہ کی نشانی ہے۔ یوں حالات نے وہ رُخ اختیار کرلیا جس کے متعلق میں نے سوچا تک نہیں

چہرے پر درد کا تاثر لیے مالک محمد نے کھجور کی چٹائی پر لوبلا لور اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ ٹخنے کی بخ ٹھنڈی ہو کر تکلیف دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا دل جسمانی تکلیف کے علاوہ روحانی کرب سے بھی لبالب بھرا ہے' اب یہ پیمانہ چھلک رہا ہے اور یہ داستان غم خود بخود مالک محمد کے ہونٹوں سے پھسلتی چلی آرہی ہے۔ وہ مسلسل بولنا چاہتا تھا اور سینے کا ہر زخم میرے سامنے کھول دینا چاہتا تھا۔ کہنے لگا "یقیناً تم حیران ہو گے کہ ان کو میرے خلاف باتیں بنانے کی جرأت کیونکر ہوئی اور مجھ جیسا زور آور' با اثر شخص یہ سب کچھ سن کر بھی خاموش کیوں رہا۔ اس نے آٹھ دس زبان درازوں کو ٹکڑے کر کے ان کیوں نہیں کردیا۔ بات پھر وہیں پر آجاتی ہے دوست! میں جس راہ کو چھوڑ چکا ہوں اس پر دوبارہ قدم رکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا ہے کہ ایک بدمعاش کے لیے بدمعاشی چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ موت تو ایک ہی بار آتی ہے لیکن گردن اٹھا کر چلنے والے کو گردن جھکا کر چلنا پڑے تو وہ دن میں کئی بار مرتا ہے۔ اوپر والے نے بڑے سے بڑے گناہ گار کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے لیکن نیچے والے جسے ایک بار ٹھکراتے ہیں پھر سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے' بالکل پتھر ہو جاتے ہیں۔ آج کل میں ایسے ہاتھوں سے ٹکرا کر لہولہان ہو رہا ہوں۔ اب یہ مولوی نبف والا کیس دیکھ لو۔ جب تک میں بدمعاش تھا کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ مجھے اس قسم کے کیس میں الجھاتا' قتل کا کیس تھا یہ۔ میرے مخالفوں نے مجھ سے سودے بازی کرنے کے لیے یہ ڈرامہ کھڑا کیا تھا۔ خود علاقہ انچارج نے مانا کہ خواہ مخواہ پولیس کا وقت ضائع کیا جارہا ہے۔ اب بدمعاشی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کررہا ہوں تو پولیس کو ہمارے بھولے بسرے قانونی تقاضے یاد آنے لگے ہیں۔ یہ تو ہوئی ایک طرف' دو دو بالشت کے بدمعاش اور دودھ کے دانتوں والے غنڈے میرے منہ کو آتے ہیں۔ انھیں سانس لینا سکھایا اور بازاروں میں بازو پھیلا کر چلنا آیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے شہدے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو۔ ان کا مطالبہ ہے کہ مالک محمد جتنا جھکا ہے اسے جھکاتے چلے جاؤ۔ ٹانگ کر پاؤں تلے روند روند کر مٹی میں ملا دو۔ پہلے وہ باتیں بناتے تھے' اب باقاعدہ نعرے بازی شروع کردی ہے۔ پچھلے اتوار رات کو کوئی میرے گھر کی دیواروں پر ننگی گالیاں لکھ گیا۔ میں نے ان پر سفیدی پھروا دی۔ پرسوں پھر

یہی حرکت دہرائی گئی۔ بڑی بےحیائی سے میرے بیوی بچوں پر گند اچھالا گیا۔ یوں لگتا ہے' وہ لوگ مجھ پر واپسی کا ہر راستہ بند کردینا چاہتے ہیں لیکن میں نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ ان کے بہکاوے میں نہیں آؤں گا۔ پچھلے چار پانچ مہینوں میں عذاب سہہ سہہ کر جو کچھ حاصل کیا ہے اسے گنوانا میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت ہو گی۔ میں نے یہ گھر چھوڑنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ بلکہ ایک دوسری جگہ رہائش کا انتظام بھی کرچکا ہوں۔ آج جو کچھ ہوا ہے' نہ ہوتا تو شاید تین چار روز تک میں پولیس کے لیے ایک لاپتا شخص ہوتا۔"

مالک محمد کی کہانی اثر انگیز تھی۔ انسان بھی عجب گورکھ دھندا ہے۔ کوئی شخص برسوں میں نہیں پہچانا جاتا اور کسی کے اندر جھانکنے کے لیے چند لمحے کافی ہوتے ہیں۔ مجھے یوں لگا کہ مالک محمد کے ماتھے پر ابھرتا ہوا مدھم محراب ایک سوراخ ہے۔ میں اس سوراخ کے راستے مالک محمد کے آرپار دیکھ سکتا ہوں۔ بالکل ایسے جیسے شیشے کے آرپار دیکھا جاتا ہے۔ مالک محمد کی داستان غم کا بیشتر حصہ شبہے سے بالاتر نظر آتا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا' خشکی اور تری کے شب و روز ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ دونوں جگہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ بہرطور اس گفتگو کے دوران ہم اصل موضوع سے کافی ہٹ گئے تھے۔ یعنی شنکر شکرا کا ذکر خیر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے مالک محمد کو بہ آہستگی واپس لائن پر چڑھاتے ہوئے کہا "تو۔ تمہارا خیال ہے کہ تمہارے پڑوسی عیسیٰ جان سے ہمیں شنکر کا سراغ مل سکتا ہے۔"

مالک محمد بولا "یہ میرا خیال نہیں حقیقت ہے۔ شنکر کے سلسلے میں اگر کوئی واقعی پولیس کو سراغ دے سکتا ہے تو وہ عیسیٰ جان ہے۔ شاید تم سمجھو کہ میں اپنی دشمنی چکانے کے لیے پولیس کو عیسیٰ جان کے پیچھے لگا رہا ہوں یا ممکن ہے تم اس سارے بیان کو ہی جھوٹ کا پلندا سمجھو۔ میں اس کے سوا اور کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ عیسیٰ جان کیفر کردار کو پہنچا تو میرا کلیجا ضرور ٹھنڈا ہو گا لیکن اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنا میرا اصل مقصد نہیں۔ میری زندگی کا رخ بدلا ہے تو بہت سی چیزیں جو پہلے نظر نہیں آتی تھیں' اب نظر آنے لگی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ بستیاں' یہ گلی کوچے عیسیٰ جان اور شنکر جیسے مجرموں سے پاک ہوں تاکہ میرے بچوں کے ساتھ ساتھ ملک کے ہر بچے کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ میں شنکر کے بارے میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں' پوری دیانت داری سے بتا رہا ہوں۔ سرحد پار کرنے کے بعد شنکر نے سب سے پہلے جس شخص سے رابطہ کیا وہ عیسیٰ جان ہی تھا۔ اب تک وہ

عیسیٰ جان کے ڈیرے پر ہی رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس وقت بھی جب ہم یہ باتیں کر رہے ہیں وہ عیسیٰ جان کے کسی ڈیرے پر داد عیش دے رہا ہو۔"

میں بہت تیزی کے ساتھ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے سرکاری رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے مالک محمد! مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ تم شنکر کی گرفتاری میں میری مدد کرو۔ میں تمہیں ساتھ لیے بغیر چلا جاؤں گا۔"

وہ بولا "میں اس سلسلے میں جس طرح کی مدد کر سکتا ہوں' تمہیں بتا چکا ہوں۔ عیسیٰ جان کا نام تو تم نے سن ہی لیا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ وہ کل سے آگے کرم ایجنسی کے علاقے میں روپوش ہے۔ کوئی بڑا جرم کرنے کے بعد وہ اسی طرح روپوش ہو جاتا ہے اور پھر مہینوں تک اپنے ڈیرے سے نہیں نکلتا۔ اب اس کے ڈیرے کی نشاندہی رہ جاتی ہے۔ نشاندہی سے یہ مطلب نہیں کہ میں کسی جگہ انگلی رکھ کر تمہیں بتاؤں گا کہ عیسیٰ جان یہاں رہتا ہے۔ وہ علاقہ اس طرح کا ہے کہ انگلی رکھ کر نشاندہی کی ہی نہیں جا سکتی۔ تم وہاں جاؤ گے تو خود اندازہ کر لو گے۔ ہمارے پوٹھوہار کی طرح کئی بھی بے آباد پہاڑیاں ہیں۔ بندہ اس علاقے کے پیٹ میں گھستا ہے تو چکرا کر رہ جاتا ہے۔ میرے پاس ہاتھ سے تیار کیا ہوا ایک نقشہ ہے۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کر سکو تو میں دو روز بعد یہ نقشہ تمہارے دیے ہوئے پتے پر پہنچا دوں گا۔ دوسری صورت میں' میں یہیں زمین پر لکیریں کھینچ کر تمہیں سمجھا سکتا ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ اس کاغذ پر بنے خاکے سے تمہیں زیادہ مدد ملے گی۔"

میں نے کہا "مالک محمد! جب ایک بار اعتبار کر لیا تو پھر کر لیا۔ اب بے اعتباری والی کوئی بات نہیں۔ جس طرح بہتر سمجھتے ہو کر لو۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں' بولا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں یہاں بھی سمجھا رہا ہوں' بعد میں ڈاک سے خاکے بھی بھیج دوں گا۔"

دیوار کا سہارا لے کر وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ میں نے چرمی جیکٹ کی جیب سے بال پین نکالا۔ مالک محمد نے سگریٹ کا خالی پیکٹ پھاڑ کر اسے گتے کی شکل دے دی۔ وہ چند لمحے آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا پھر جھک کر پیکٹ کے گتے پر لکیریں کھینچنے لگا۔

O☆O

میں سہ پہر کوئی تین بجے مالک محمد سے فارغ ہو کر واپس بکا والی جگہ پر پہنچا۔ اب وہاں نذیر محمد نہیں تھا۔ وہ اتنی دیر انتظار کر بھی کیسے سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ مجھ پر دو حرف بھیج کر وہ واپس قصبے جا چکا تھا۔ میں بھی ایک نظر جیپ کا ڈھانچہ لے کر واپس روانہ ہو لیا۔ دو ڈھائی میل چلنے کے بعد مجھے ایک خچر کی لفٹ مل گئی۔ خچر والا میرے اسلحے اور چرمی جیکٹ سے کافی مرعوب نظر آتا تھا۔ اس نے بڑے ہی خوشامدی لہجے میں مجھے خچر سواری کی دعوت دی۔ یوں لگا' وہ مجھے اپنے تمام کے تمام یعنی چاروں خچروں پر ایک ساتھ سوار کرانا چاہتا ہے۔ بہر طور مجھے ایک پر ہی بیٹھنا تھا اور میں بیٹھ گیا لیکن یہ سواری بار بہاری زیادہ دیر میرے نصیب میں نہیں تھی۔ جلد ہی سامنے سے پولیس کار کی اڑائی ہوئی دھول نظر آنے لگی۔ چند لمحے بعد پولیس کار بھی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اندر سے برکت صاحب کی سرخ آنکھیں پوری قہرناکی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ گرجے "اوئے لمبو! کہاں مر گیا تھا' تیرے باپ کے نوکر ہم دو گھنٹے سے ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں۔"

میں نے چہرے سے خالص ماتحتانہ شرمندگی ظاہر کی۔ اس موقعے کے لیے ایک بہانہ میں پہلے سے گھڑ چکا تھا۔ خچر سے کود کر میں نے کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور کہا "ویری سوری سر! میں جیپ کے لیے کینک ڈھونڈنے نکل گیا تھا۔"

برکت صاحب کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا "اوئے بھوتنی دے' یہاں جنگل میں تیرے کس مامے نے آٹو ورکشاپ کھول رکھی ہے؟"

میں نے کہا "جناب! ورکشاپ تو نہیں' ادھر سرکنڈوں کے پار وہی نالے سے ریکنڈز' رائل والے ریت نکالنے آتے ہیں۔ ایک راہ گیر نے بتایا تھا کہ ان میں کئی ایک بڑے پہنچے ہوئے کینک ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا' چلو قسمت آزمائی کرتے ہیں' شاید کام بن جائے۔ وہاں گیا تو خچروں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ واپسی پر ایک جگہ راستہ بھی بھول گیا۔ اس چکر میں دیر ہو گئی۔"

ایس پی برکت نے دانت پیس کر کہا "میرا تو خیال ہے پولیس لائن میں بھی تو راستہ بھول کر ہی آیا ہے۔ چل خان ذرا واپس' میں تیرا بھولپن نکالتا ہوں اچھی طرح۔" اس فقرے میں چند شاندار گالیاں بھی مناسب جگہوں پر نگینوں کی طرح فٹ تھیں جنہیں میں یہاں کوٹ نہیں کر رہا۔ سینے کا ایکٹنگ کرتا ہوا میں پولیس کار میں بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ میں ہم واپس قصبے میں پہنچ گئے۔ سردیوں کی شام تیزی سے پر پھیلا رہی تھی۔ برکت صاحب نے مالک محمد کے گھر کو ہی عارضی تھانے کی شکل دے دی تھی۔ قصبے کے

تقریباً ایک درجن افراد تفتیش میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کی چھترول بھی ہو چکی تھی۔ چھ چار رو جیپ کے سوار ایک علیحدہ کمرے میں بند کیے گئے تھے۔ انسپکٹر باجوہ ان سے مسلسل پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ ان میں سے زخمی ڈرائیور توصیف احمد نے کافی مار کھائی تھی اور ایس پی برکت کو یہ زعم تھا کہ انہوں نے توصیف سے بہت کچھ اگلوا لیا تھا۔ توصیف نے تسلیم کیا تھا کہ آج علی الصباح مالک محمد کو اپنے ساتھ لے کر لاہور گیا تھا۔ باقی تینوں افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ مالک محمد کو لاہور میں کسی مکان کا بیعانہ دینا تھا۔ مالک محمد کے کہنے پر انہوں نے اسے رائل پارک میں اتار دیا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔ مالک محمد نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں آ جائے گا۔ اگر نہ آیا تو وہ واپس چلے جائیں۔ ساڑھے سات تک انتظار کے باوجود مالک محمد نہیں آیا تو وہ واپس شیخوپورہ آ گئے۔

میں جانتا تھا' ڈرائیور توصیف کا یہ بیان جزوی طور پر درست ہے۔ مالک محمد ان کے ساتھ مکان کا بیعانہ دینے ہی گیا تھا اور عین ممکن ہے کہ وہ رائل پارک ہی پہنچا ہو لیکن وہاں سے اس کے محافظ تنہا واپس نہیں آئے تھے۔ مالک محمد ان کے ساتھ تھا۔ بعد ازاں وہ پولیس کے تعاقب کے دوران جیپ سے کود ا تھا۔

ایس پی صاحب توصیف کے بیان پر بہت تکیہ کر رہے تھے۔ انہوں نے وائرلیس پر لاہور ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کیا تھا اور مالک محمد کی تلاش کے احکام جاری کر دیے تھے۔ خود وہ قصبے میں رہ کر ملزم کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ جہاں بھی ہے آئے گا تو گھر ہی۔ قصبے میں کرفیو کی سی حالت تھی۔ کسی کو باہر سے اندر اور اندر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ قصبے کے راستے میں مختلف مقامات پر بھاری ڈیوٹیاں لگا دی گئیں اور رات بھر آنکھیں کھول کر پہرا دینے کا حکم صادر ہوا۔ اس حکم پر عمل کرنا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں تھا۔ قصبے سے باہر ایک ٹیوب ویل سے ملحقہ کوٹھری میں' میں رات بھر لحاف اوڑھ کر چین سے سویا بلکہ اپنے ساتھی نذیر محمد کی ڈیوٹی بھی میں نے دی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ سو جائے اور پھر خود بھی سو گیا۔ جب مالک محمد کو یہاں آنا ہی نہیں تھا تو اس کے انتظار سے کیا حاصل تھا۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے ہم اس "ناکام" چھاپے کے بعد لاہور واپس روانہ ہو گئے۔

اسی روز شام کو میں اکیلے میں ساہی صاحب سے ملا اور انہیں اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ میری رپورٹ یقیناً اہم اور چونکا دینے والی تھی۔ اسے خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ تگ و تازی میں مجھے ایک نہایت اہم کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ عمل دخل میرے بےپناہ جذبے کا بھی ہو۔ نتھیا گلی کے میڈیکل اسٹور میں شنکر شکرا کو دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک طوفان جاگ اٹھا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں بے حد غیر یقینی حالات سے گزر رہا تھا۔ ساہی صاحب سے رابطہ تو درکنار سامنا تک نہیں ہوا تھا۔ انجم' الفردوس کے کمرے میں بے یار و مددگار پڑی تھی اور میری بہن' میری زندگی' جاگیردار کی مٹھی میں تھی لیکن چند لمحوں کے لیے میں سب کچھ بھول گیا تھا اور میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش رہ گئی تھی' میں شنکر کو جالوں اور جہاں پاؤں رہیں' چل کر زمین میں گاڑ دوں۔ اس شیطان ابن شیطان کے لیے میرے دل میں نفرت کا سمندر بلکورے لیتا تھا۔ یہ وطن میرا گھر تھا اور اس گھر میں ایک انتہائی نجس جانور گھس آیا تھا' میں اس کا قصہ پاک کیے بغیر چین سے کیسے سو سکتا تھا۔ اسی جذبے کے تحت میں نے ساہی صاحب کی آواز پر کان دھرے تھے اور جب انہوں نے میری بہن اور انجم کو تحفظ فراہم کیا تو میں ان کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہو گیا تھا۔

ساہی صاحب نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "پھر اب کیا ارادے ہیں؟"

ہم شادمان کالونی والے مکان میں بیٹھے تھے۔ انجم اور شفا کے بعد اب میں اس بنگلے کا تنہا مکین تھا۔ میں نے کہا "ارادے تو آپ کے ہوں گے۔ مجھے تو صرف تعمیل کرنا ہے۔"

وہ بولے "ہم سب تعمیل کرنے والے ہیں۔"

"سوائے برکت صاحب کے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ بولے "بندہ گرم مزاج کا ہے لیکن نااہل نہیں ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ تم ساتھ رہو گے تو پتا چلے گا۔"

میں نے کہا "ویسے مجھے تو ابھی تک ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ جہاں تک گرم مزاجی کی بات ہے' میرا خیال ہے ایسے افسر ماتحتوں کو ہر وقت الرٹ رکھتے ہیں۔"

میں نے مالک محمد سے جو خاکہ حاصل کیا تھا وہ ساہی صاحب کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ بڑے غور سے دیکھتے رہے پھر بولے "ٹل اور پاراچنار کے درمیان ہے یہ جگہ۔ کافی ویران علاقہ ہے۔ اونچی نیچی گھاٹیوں کا سلسلہ ہے۔ انجان شخص ملزم کی تلاش میں خود گم ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں سدہ کے ایک صوبیدار کا نام آ رہا ہے۔ کیا بھلا سا نام تھا اس کا ۔۔۔ مرجان خان۔ اگر یہ شخص سدہ میں ہی ہے تو

بہ دیے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ میں آج ہی اس کا پتا کرواتا ہوں۔"

میں نے کہا "ہمیں جلد از جلد روانہ ہونا ہوگا۔ ایک طرح سے ہم واقعات کو حرکت دینے والی ڈور کھینچ چکے ہیں۔ مالک محمد کی گرفتاری کے لیے مارا جانے والا چھاپا سارے متعلقہ افراد کو ہوشیار کر چکا ہوگا۔ ممکن ہے کرم ایجنسی میں عیسیٰ جان بھی ٹھکانا تبدیل کر لے۔"

ساہی صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا۔ انہوں نے بہت کم وقت میں انتظام کر لیا۔ صرف تین روز بعد ہم ٹل جانے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ میری خواہش کے مطابق ساہی صاحب نے یہ بات کسی پر نہیں کھلنے دی کہ مالک محمد سے میری ملاقات ہو چکی ہے اور اسی کی نشاندہی پر اتنے وثوق کے ساتھ چھاپا مار پارٹی کرم ایجنسی روانہ کی جا رہی ہے۔ مالک محمد کی رہائش گاہ سے پہرا ہٹا لیا گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ موقع ملتے ہی وہ اپنے بچوں کو وہاں سے نکال لے جائے گا۔ وہ کہاں جائے گا' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ڈاک کے ذریعے مجھے مطلوبہ چابیاں روانہ کر چکا تھا اور اب ہمیں ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ مالک محمد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ڈاک کے ذریعے اس نے جو بوسیدہ پرچا مجھے ارسال کیا وہ پہلے خاکے سے کہیں زیادہ واضح اور تفصیلی تھا۔

ٹل روانگی سے چند گھنٹے پہلے میں شفقتا سے ملنے ساہی صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ شفقتا سخت پریشان تھی۔ اسے یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ میں پولیس کی چھاپا مار ٹیم کے ساتھ شنکر کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ وہ شنکر کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ اس کی درندگی' شیطانیت اور عیاری کچھ بھی شفقتا سے پوشیدہ نہیں تھا۔ بڑی ہی باخبر اور سیانی تھی میری بہن۔ تیمی کی گود میں پرورش پائی تھی نا..... چار سال پہلے شفقتا نے مجھے گرفتاری پیش کرنے پر آمادہ کیا تھا تو اس کی ایک وجہ شنکر بھی تھا۔ وہ مجھے اس دشمن جاں سے دور کر دینا چاہتی تھی لیکن آج ایک بار پھر میں اندھا راستوں پر بگٹٹ بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا۔ دشمنی کی اسی آگ کی طرف لپک رہا تھا جس کی حدت نے شب و روز شفقتا کا لہو سلگایا تھا۔ اس کی پریشانی سمجھ میں آتی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ ننھی بچی کی طرح مجھ سے چمٹ کر بیٹھ گئی۔ میں دیکھ نہیں رہا تھا لیکن جانتا تھا' آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسل رہے ہیں۔ میں دل میں اتر جانے والی ان معصوم آنکھوں کا راز داں تھا۔ ان کی ہر کیفیت بغیر دیکھے سمجھ سکتا تھا۔ میں نے شفقتا کے گلے میں بازو حمائل کر کے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ ہم گم خاموش قلم کے دو کرداروں کی طرح تھے بغیر کہے سنے ایک دوسرے کی بات سمجھتے تھے۔ مدعا بیان کرنے کے لیے زبان کی حاجت سے بے نیاز تھے..... وہ بے زبان خاموشی کہہ رہی تھی "بھیا! اتنی طویل جدائی کے بعد ایسا مختصر ملاپ۔ میں نے ابھی ٹھیک سے آپ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مت جاؤ بھیا۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میں پھر کھو جاؤں۔"

میں اسی کی زبان میں جواب دے رہا تھا "حوصلہ رکھو میری بہن! جب تک تیرے لبوں پر اپنے بھیا کے لیے دعائیں ہیں' کوئی اسے تجھ سے دور نہیں کر سکتا۔"

نجانے کتنی دیر ہم یونہی خاموش کھڑے رہے۔ پھر میں نے دکھا زبان کو زحمت کلام دی "اچھا شفقتا! میں چلتا ہوں۔"

وہ بولی "کیوں جاتے ہو بھیا؟"

میں نے کہا "جانا ضروری ہے۔ شنکر کو کیفر کردار تک پہنچانے کا اس سے بہتر موقع شاید کبھی نہ مل سکے۔"

یکلخت اس کی آنکھوں میں ان گنت التجائیں ابھر آئیں۔ یوں لگا' وہ مجھ سے لپٹ جائے گی اور ہر کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوگی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے فقط اتنا بولی "اپنا خیال رکھنا بھیا۔"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "بے فکر رہو۔ میری طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی۔ یہاں تم اور انجم انتہائی محفوظ ہاتھوں میں ہو۔ پھر صفدر بھی تمہاری خبرگیری کے لیے یہیں ہے۔ میں زیادہ دن لاہور سے باہر نہیں رہوں گا۔ بہت زیادہ تو دس پندرہ روز لگیں گے۔"

میں جانے کے لیے مڑا تو اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا "کل غزالہ باجی آئی تھیں۔"

میں ٹھٹک کر رہ گیا "کیا کہتی تھی؟"

"ایک تحریری پیغام دے گئی ہیں آپ کے لیے۔" انجم پوچھتی ہوئی وہ حسب عادت بھاگ کر اندر گئی اور الماری سے ایک بند لفافہ نکال لائی۔ میں نے خط نکالا۔ یہ غزالہ کی تحریر تھی۔ میں ان الفاظ کے زاویے' قوسیں اور خطوط کیسے بھول سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا' لکھنے والی کے جسم کی ساری دلکشی حروف میں ڈھل گئی ہے۔ کسی وقت یہ حروف مجھے بڑے پیارے لگتے تھے۔ میرا دل انہیں چومنے کو چاہتا تھا۔ خوشبو دار تھی یا ہر پیچ و خم۔ ولی نکال کر رکھ دوں نئی بہت پرانی بات تھی۔ اب تو اس تحریر کو دیکھ کر سینہ سلگ اٹھتا تھا۔ غزالہ نے لکھا تھا۔

"میں جانتی ہوں' آپ کے پاس میرے لیے معافی

سوا اور سب کچھ ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس التجاؤں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کبھی کبھی تو سوچنے لگتی ہوں' کاش! میں مسلمان نہ ہوتی' خدا رسول پر میرا ایمان نہ ہوتا۔ میں اپنے ہاتھوں اپنی جان لے کر آپ کو بتا سکتی کہ میں آپ کو کھو کر کتنا پچھتا رہی ہوں۔ خدشہ ہے کہ اپنے بارے میں زیادہ لکھوں گی تو آپ خط پڑھے بغیر پھاڑ دیں گے۔ اس لیے آپ کے بارے میں لکھ رہی ہوں اور اپنی بہن شفقتا کے بارے میں لکھ رہی ہوں۔ شاید اسی ذکر کے طفیل آپ ان چند جملوں پر نگاہ دوڑانا گوارا کر لیں۔ آج کل قادر زماں کی بیوی ترنم میرے زیر علاج ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار قادر زماں سے ملنا بھی ہوتا ہے۔ اس شخص کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اولاد ہے۔ یہ خواہش ترنم کے ذریعے پوری ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ ان دنوں ترنم پر ہزار جان سے فدا ہے۔ اس نے ترنم کو وہ رعایتیں بھی دے رکھی ہیں جو اس سے پہلے اس کی کسی بیوی کو حاصل نہیں تھیں۔ وہ اکثر اکیلی میرے کلینک آ جاتی ہے اور تنہائی میں مجھ سے گپ شپ کر لیتی ہے۔ میرے ذریعے ترنم کو آپ کے اور شفقتا کے متعلق کافی کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ترنم نے مجھ سے واشگاف الفاظ میں کہا ہے کہ جاگیردار دشمن کو معاف کرنے والا شخص نہیں۔ اس نے شفقتا اور انجم کو صرف مطلب براری کے لیے رہا کیا ہے۔ جونہی مطلب نکل جائے گا وہ سراپا انتقام بن جائے گا۔ ترنم بہت خوف زدہ ہے۔ وہ اندر سے بہت حساس بلکہ وہمی ہے۔ اب اسے یہ نیا واہمہ لاحق ہو گیا ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد قادر زماں نے آپ سے زیادتی کی تو اس زیادتی کا بوجھ اس کے بچے پر پڑے گا۔ وہ چاہتی ہے کہ بچے کی پیدائش سے پہلے پہلے آپ شفقتا اور انجم کو لے کر کہیں بہت دور نکل جائیں۔ تین چار روز پہلے وہ اپنے اکاؤنٹ سے دو لاکھ روپیہ نکلوا کر لے آئی۔ میرے سامنے ڈھیر کر کے کہنے لگی۔ ڈاکٹر! تم کسی طرح شاہ جہاں اور دونوں لڑکیوں کو ملک سے باہر بھجوا دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ میں نے اسے بمشکل تسلی تشفی دی اور رقم لوٹا دی مگر وہ اس شرط پر واپس گئی کہ میں اس کے خیالات سے آپ کو آگاہ کروں گی۔ میں آپ کو ٹیلی فون کرنا چاہتی تھی لیکن جانتی تھی' میری آواز سنتے ہی آپ فون بند کر دیں گے لہٰذا خط کا سہارا لے رہی ہوں۔ خط پڑھ کر ضائع کر دیں۔ ضروری تاکید ہے۔

فقط آپ کی غزالہ!"

○☆○

ساہی صاحب' خضادار فورس کے صوبے دار مرجان خان کا سراغ لگا چکے تھے۔ وہ ان دنوں ٹل سے کچھ فاصلے پر سدہ میں تعینات تھا۔ مرجان صاحب سے ساہی صاحب کا رابطہ ہو گیا تھا اور ساہی صاحب نے انہیں ہماری آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ خضادار فورس کا تعلق پولیٹیکل ایجنٹ سے ہوتا ہے۔ کرم ایجنسی میں اب اس فورس کو کرم لیوی کا نام دے دیا گیا ہے۔ اسی روز' شب دس بجے ہم لاہور سے بذریعہ کار ٹل کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ ایس پی صاحب کو بائی ائر پہلے پشاور پہنچنا تھا اور وہاں سے ٹل کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انسپکٹر باجوہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ ایک اے ایس آئی شاہنواز اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ پارٹی میں میری شمولیت پر برکت صاحب نے ایک بار پھر ناک بھوں چڑھائی تھی لیکن ساہی صاحب کے سامنے ان کی پیش نہیں گئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ برکت صاحب حاضر دماغ ہونے کے باوجود کسی وقت کوئی بات یکلخت فراموش کر دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ واقعہ' بات یا منظر ان کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے۔ اس کا ثبوت مجھے اس وقت ملا جب وہ ساہی صاحب کے سامنے میری شمولیت کے سلسلے میں ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ انہوں نے کئی ایک اعتراضات کیے لیکن وہ سب سے بڑا اعتراض ان کے ذہن سے محو ہو چکا تھا جو واقعی اعتراض تھا اور جس کے حوالے سے وہ مجھے خاصا ذرا دھمکا بھی چکے تھے۔ یعنی پجارو گاڑی کے دھواں دھار تعاقب کے بعد میرا اچانک غائب ہو جانا اور برکت صاحب کا مع پارٹی میری تلاش میں دو گھنٹے دربدر پھرنا۔ بہرحال' یہ ان کی یادداشت کا معاملہ تھا کہ انہیں یہ شکایت یاد نہیں آ رہی تھی۔ میں اس سلسلے میں "شکر" کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

ایک طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم رات دس بجے ٹل پہنچے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ "لکڑی منڈی" بھی ہے۔ رات دس بجے قصبہ "ہُو" کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب دروازے بند اور روشنیاں گل تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج کل یہاں ڈاکو دندناتے رہتے ہیں۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم چونکہ سادہ لباس میں تھے لہٰذا ہمیں بھی مشورہ دیا گیا کہ یوں رات کے اس پہر آزادانہ مت گھومیں۔ اسی قسم کی ہدایات ہمیں راستے میں بھی مل چکی تھیں۔ ایک چیک پوسٹ پر لکڑی کا بڑا سا گیٹ بند تھا اور ہمیں روک کر بتایا گیا تھا کہ آگے پہاڑی علاقے میں لوٹ مار کا خطرہ ہے۔ اپنی شناخت کروا کے ہم بمشکل گیٹ کھلوانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب اہل ٹل نے ہمیں ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تھا۔ اس زاویے سے ... تو ہم نہیں آ سکے۔ بہرحال

تھکاوٹ نے بُرا حال کر رکھا تھا۔ وہ رات ہم نے ٹل میں لکڑی کے ایک بیوپاری کے ڈیرے پر گزاری اور اگلے روز دوپہر سے پہلے سدہ پہنچ گئے۔

قبائلی علاقے میں کسی مجرم کو پکڑنے کے لیے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ سے رابطہ کیا جاتا ہے۔ ساہی صاحب یہ رابطہ کر چکے تھے لہٰذا ہمیں سدہ میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صوبے دار مرجان صاحب نے ہمارا استقبال کیا اور قصبے کے معززین سے تعارف کرایا۔ سردی نے پورے علاقے کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کوہ سفید کی طرف سے آنے والی برفیلی ہوا نے کڑکتے جاڑے کا سماں باندھ رکھا تھا۔ ہماری رہائش کا انتظام صوبے دار صاحب کے دفتر کے پاس ہی کیا گیا تھا۔ صوبے دار مرجان خود بھی مرنجاں مرنج شخصیت ثابت ہوئے۔ ان کا لال گلابی چہرہ شکنوں سے پُر تھا لیکن یہ مسکراہٹ کی شکنیں تھیں۔ ان شکنوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ بندہ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ ان شکنوں کے درمیان چہرے پر اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ وہاں غصے کی شکنیں نمودار ہو سکتیں۔ بالکل اسی طرح جیسے برکت صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی شکنوں کے لیے جگہ نہیں تھی۔ وہ پشتو آمیز اردو روانی سے بولتے تھے۔ دلچسپ باتوں کے دوران کام کی باتیں بھی اتنی آسانی سے کرتے جاتے تھے کہ طبیعت پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً دو دلچسپ لطیفوں کے درمیان انہوں نے ہمیں یہ بات وضاحت سے سمجھا دی کہ ہم جس علاقے میں گھسنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں ان کی معلومات بہت زیادہ نہیں ہیں کیونکہ اس سے پہلے انہیں وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے لیے یہ اطلاع مایوس کن تھی لیکن ان کے اندازِ بیان نے ہمیں مایوسی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ قبائلی لڑائی کا ایک دلچسپ واقعہ سناتے سناتے انہوں نے ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ اس مخصوص علاقے میں گھسنے سے پہلے ہم سب کو اپنے وصیت نامے تیار کر لینے چاہئیں کیونکہ قانون کے اکثر محافظ وہاں پہنچ کر اچانک شہادت کا رُتبہ پا جاتے ہیں۔ یہ تلخ حقیقت بھی انہوں نے ایسے شیریں انداز میں بیان کی کہ ہیڈ کانسٹیبل نذیر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر ایک نئی قسم کا تذکرہ کرتے کرتے انہوں نے اس میں سے کسی کبیر علی شاہ کا ذکر نکال لیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شخص خرلاچی کے معززین میں سے ہے۔ بہت پرانا شکاری ہے اور اکثر ان علاقوں میں گھومتا رہتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔

اگلے روز ہم کبیر علی شاہ سے ملنے خرلاچی روانہ ہو گئے۔ افغان سرحد کے بالکل قریب خرلاچی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ گاؤں بھی لکڑی کی مشہور منڈی ہے۔ خرلاچی پہنچ کر پتا چلا کہ کبیر علی شاہ خرلاچی کے قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں رہتا ہے۔ اس گاؤں کا نام آپ "تودل" تصور کر لیں۔ وہاں میں کبیر علی شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ لال رنگ اور چہرے والا ایک دلکش شخص تھا۔ اسے خوب صورت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایک انجانی مردانہ کشش اس کے اندر موجود تھی۔ وہ سیّد خاندان سے تھا اور گاؤں میں اسے پیر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ آٹومیٹک رائفل کندھے سے لٹکائے شاہانہ انداز میں ہمیں گاؤں کی سیر کرانے لگا۔ لوگ جھک جھک کر اسے سلام کرتے اور ہاتھ چومتے تھے۔ یہ رات ہم نے کبیر علی شاہ کے ڈیرے پر ہی گزاری۔ کبیر علی شاہ کا نشانہ دور و نزدیک مشہور تھا۔ اس کے مہمان خانے میں ہمیں مختلف اقسام کی درجنوں رائفلیں اور پستول نظر آئے۔ صوبے دار مرجان خان نے بتایا کہ ان علاقوں میں کتوں کے ذریعے شکار کا رواج نہیں ہے۔ کبیر علی شاہ وہ واحد شکاری ہے جس کے پاس بہترین شکاری کتوں کا غول موجود ہے۔ رات کو کئی بار مجھے ان کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ ان میں کوئی بہت جسیم ٹیریئر بھی تھا۔ رات سونے سے پہلے انسپکٹر باجوہ، صوبے دار مرجان اور کبیر علی شاہ دیر تک اس نقشے پر جھکے رہے جو [illegible] نے ساہی صاحب کو فراہم کیا تھا۔ ساہی صاحب نے ایس پی برکت کو اور انہوں نے انسپکٹر باجوہ کو دیا تھا۔ بحث مباحثے کے بعد باجوہ، صوبے دار مرجان اور کبیر علی شاہ میں طے ہوا کہ چھاپا مار پارٹی اس علاقے میں شکاریوں کے بھیس میں جائے گی لیکن جانے سے پہلے ایس پی برکت اور پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کی حتمی منظوری لی جائے گی۔

اگلے روز ہم سدہ واپس آ گئے۔ اب ایس پی برکت صاحب بھی کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ چھاپا مار پارٹی شکاریوں کے بھیس میں جائے گی تو انہوں نے اس فیصلے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ تاہم صوبے دار صاحب کی مدلل گفتگو نے انہیں قائل کر لیا۔

وہ ایک سرد لیکن چمکیلی صبح تھی۔ ہماری شکار پارٹی تین جیپوں اور ایک پک اپ پر سوار علی زئی کی طرف روانہ ہوئی۔ اس پارٹی میں پنجاب پولیس کے صرف چار ارکان تھے۔ باقی عملہ خاصادار فورس کا تھا۔ اس عملے میں صوبے دار مرجان خان کے علاوہ دو حوالدار اور آٹھ مسلح جوان تھے۔ سب شکاریوں کے بھیس میں تھے۔ اس کے علاوہ اصل شکاری کبیر علی شاہ بھی اپنے تین خادموں اور دس عدد کتوں

کے ساتھ اس پارٹی میں شریک تھا۔ پک اپ کافی بڑی تھی۔ اس میں نہ صرف کتے لاد دیے گئے تھے بلکہ چھت پر دیگر سامان بھی بار کر دیا گیا تھا۔ اس سامان میں تین خیمے، چند لالٹینیں، دو چولہے اور کھانے کے ضروری برتن شامل تھے۔ ہمارے اسلحے میں شکاری رائفلوں اور خنجروں وغیرہ کے علاوہ دو سب مشین گنیں بھی شامل تھیں۔ تاہم ان گنوں کو ایک جیپ کی پچھلی نشست تلے بڑی احتیاط سے چھپا دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے کے دشوار سفر کے بعد جب ہماری گاڑیاں ویران پہاڑیوں میں داخل ہوئیں تو مالک محمد کی بات یاد آنے لگی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ علاقہ بہت حد تک پوٹھوہار سے مشابہ تھا۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ جگہ جگہ کھنڈر اور وسیع نشیب نظر آتے تھے۔ ان نشیبی جگہوں میں بعض مقامات پر نیم پختہ ٹیلے ستونوں کے مانند کھڑے تھے۔ پُرپیچ گھاٹیوں کے درمیان چلتے چلتے اچانک زمین ختم ہو جاتی تھی۔ آگے جھانکو تو نشیب میں عمودی زاویے سے گہری وادی نظر آ جاتی تھی۔ ایسی وادیوں کی عمودی دیواروں میں قدرتی شگاف اور دور اندر تک گئے ہوئے غار پائے جاتے تھے۔ ان غاروں کے دہانوں پر جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے نظر آتا تھا۔ اپنی طرز کا عجب علاقہ تھا۔

صوبے دار مرجان صاحب اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں اس علاقے کی گاڑھی تاریخ ہمیں گھول گھول کر پلاتے جا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ علاقہ زوئے مشت کا حصہ ہے۔ یہاں کی کٹی پھٹی زمینوں پر آباد لوگوں کا تعلق لوتے زئی اور علی شیر زئی کے قبیلوں سے ہے۔ ان کی باتوں سے مزید پتا چلا کہ جنوب میں بھی سرسبز زمینیں ہیں مگر عرصہ دراز سے ان پر بنگش لوگوں کا تسلط ہے۔ انہوں نے ایک حکایت بھی سنائی کہ کس طرح زمینوں کی ملکیت پر بنگش اور اورتے زئی میں جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں قبیلوں نے ایک دانشور نائی کو منصف ٹھہرایا اور اس نے فیصلہ دیا کہ "رائی وائی راراسے پائی اسامہ دبنگش، غروہ اورتے زئی۔" یعنی نائی نے فیصلہ دیا ہے کہ ہموار علاقے بنگشوں کے اور غار پہاڑ اورتے زئی کے ہیں۔ نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ہمیں صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں شکار آسانی سے ملتا ہوگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، راستہ دشوار ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر گاڑیاں آگے لے جانا ناممکن ہو گیا۔ یہاں ایک نشیب میں بڑا سا تالاب موجود تھا۔ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ تالاب قدرتی نہیں بلکہ بنایا گیا ہے۔ ایسے تالاب ہم نے راستے میں بھی ایک دو جگہ دیکھے تھے۔ میرے پوچھنے پر کبیر علی شاہ نے بتایا کہ شکاریوں نے مرغابیوں اور کونجوں وغیرہ کو پھانسنے کے لیے یہ جوہڑ نما تالاب بنا رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تالاب انسانوں اور مویشیوں کی پانی کی ضرورت بھی پوری کرتے ہیں۔ پھر اس کی باتوں سے پتا چلا کہ جس ڈھوکی نامی تالاب کے کنارے ہم رکے ہیں یہاں تک کوئی شاذ و نادر ہی پہنچتا ہے۔ ایک تو راستہ دشوار گزار ہے، دوسرے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے کا خطرہ بھی شدید تر ہے۔ خطرے کے احساس نے تن بدن میں عجیب طرح کی سنسنی بھر دی۔ جیل کی بے کیف تیرگی میں زندگی کے چار سال جھونکنے کے بعد میں ایک بار پھر خود کو اپنے من چاہے ماحول میں پا رہا تھا۔ آزادی کی مہک نے خطرے کی بُو سے بغلگیر ہو کر ایک تیسری خوشبو کو جنم دیا تھا اور یہ خوشبو میرے حواس کو معطر کر رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد میں نے اپنے سینے میں ایک کیف آور جوش کی لہریں محسوس کیں اور پورے بازو کھول کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ اس انگڑائی کو ایس پی برکت کی کرخت آواز نے مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ مجھے اور کانسٹیبل نذیر کو ایک ساتھ مخاطب کر کے بولے "تم دونوں کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہاں کوئی نوکر بھوتنی دا نہیں آئے گا تمہارے کام سنوارنے۔ چلو پک اپ سے سامان اتار کر لاؤ۔"

ہیڈ کانسٹیبل نذیر اور میں پک اپ کی طرف بڑھے۔ خاصادار فورس کے جوان پہلے سے سامان اتار رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر انہوں نے بڑی چابک دستی سے تین خیمے کھڑے کر دیے۔ اس دوران ایک خیمے میں دسترخوان بچھایا جا چکا تھا۔ پہلے اعلیٰ افسران نے لنچ کیا پھر ہماری باری آئی۔ دشوار سفر کے باعث سب کو تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن کبیر علی شاہ بدستور ہشاش بشاش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کتے بے چین ہیں۔ جب تک انہیں پک اپ سے اتار کر ایک راؤنڈ نہیں لگوایا جائے گا وہ شور مچاتے رہیں گے۔ کبیر علی شاہ کے اصرار پر مرجان خان اور انسپکٹر باجوہ بھی کتوں کو ایک چکر لگوانے پر تیار ہو گئے۔ کتوں کو پک اپ سے اتارا گیا۔ ان میں دو بُل یعنی بُل ٹیریئر تھے۔ تین گریر اور باقی تازی تھے۔ بُل سب سے توانا تھے۔ وہ بڑی پھرتی کے ساتھ پک اپ سے اترے اور زنجیریں چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ کبیر علی شاہ کے اشارے پر اس کے خادموں نے سب کتوں کو آزاد چھوڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نشیب و فراز میں گم ہو گئے اور ان کی آوازوں سے ویرانہ گونجنے لگا۔ شکاری کتوں کے پیچھے پیدل بھاگنا جان جوکھوں کا کام ہے اور یہ کام کبیر علی شاہ کر رہا تھا۔ وہ ہمارے آگے آگے بڑی تیزی سے نشیب و فراز کو پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔ ہم سب پیچھے تھے اور

صوبیدار و مرجان صاحب ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ اتنے میں ہمارے بالکل قریب سے ایک نیولا فراٹے بھرتا نمودار ہوا اور ایک کھوہ میں غائب ہو گیا۔ وہ کسی گلہری یا خرگوش کے تعاقب میں تھا لیکن اس سے پہلے تازی کتوں نے ایک جنگلی بلے پر دانت آزما ڈالے۔ خون کی بو دونوں بُلی کتوں کو تازی کتوں کی طرف کھینچ لائی۔ اس موقعے پر صوبیدار مرجان اور ایک خادم نے لپک کر دونوں بُلی کتوں کو سنبھال لیا۔ صوبیدار نے بتایا کہ یہ دونوں کتے بڑے جارحانہ مزاج کے مالک ہیں۔ خاص طور پر شکار اور صنفِ مخالف کے معاملات میں یہ ضرور اپنی برتری جتاتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ کس طرح ایک کتیا پر حقِ ملکیت ثابت کرتے کرتے ان دونوں نے چند ماہ پہلے ایک بوڑھے خادم کو جان سے مار ڈالا تھا۔

اگلے تین روز ہم نے اس علاقے میں گھومتے پھرتے اور شکار کرتے گزار دیے۔ یوں لگ رہا تھا ڈاکوؤں وغیرہ کی صرف کہانیاں ہیں ورنہ اس علاقے میں کہیں کسی بندے بشر کا بسیرا نہیں۔ ہمارے چاروں طرف چٹانیں تھیں، غار تھے اور گھاٹیاں تھیں۔ شکار وافر تھا اور موسم بھی شکار کا تھا۔ گھومنے پھرنے کا لطف آ گیا۔ اور تو اور ایس پی برکت صاحب بھی ان مصروفیات میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے ایک مرغابی شکار کی۔ مرغابی ٹھٹھرے ہوئے پانی میں گری ظاہر ہے مرغابی کو نکالنے کے لیے مجھے یا ہیڈ کانسٹیبل نذیر کو ہی تالاب میں گھسنا تھا۔ قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ میں یخ بستہ پانی میں گھسا اور مرغابی پکڑ کر لرزتا کانپتا باہر نکلا۔ اب معلوم نہیں ایس پی صاحب کو مرغابی مار کر زیادہ مزہ آیا تھا یا مجھے تالاب میں غسل کرا کے۔ وہ اب صرف اور صرف مرغابی مارنا چاہتے تھے۔ مرغابیوں پر وہ اس قدر فریفتہ ہو چکے تھے کہ ایک روز ایک مرغِ زریں بڑے اشتیاق سے ان کا نشانہ بننے ان کی رائفل کے عین سامنے آ بیٹھا لیکن ان کا ٹارگٹ دور بیٹھی ہوئی ایک مرغابی تھی۔ انہوں نے مرغ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نتیجتاً دونوں پرندے بہ عافیت اپنے آشیانوں تک پہنچ گئے۔ ان تین دنوں میں صرف ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ دوسرے روز علی الصباح جب ہم شکاری کتوں کے ساتھ جنوب کے رخ پر جا رہے تھے، ایک عمر رسیدہ دیہاتی نے ہمارا راستہ روکا۔ اس کی دانست میں ہم انجان شکاری تھے جو شکار کے جوش میں بھٹک کر ادھر آ نکلے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ شکار کے لیے یہ علاقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہم نے سمجھا کہ وہ ڈاکوؤں وغیرہ کا تذکرہ کرے گا، وہ ایک اور ہی فسانہ لے بیٹھا۔ اس نے دور ایک طویل بل کھاتی گھاٹی کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس گھاٹی کے پار تقریباً تمام پہاڑیاں ہوائی چیزوں کے قبضے میں ہیں۔ ان ہوائی چیزوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ سن چھیالیس میں ایک انگریز کپتان اپنی پوری کمپنی کے ساتھ سلطان نامی نوجوان کا تعاقب کرتے ہوئے ان پہاڑیوں میں داخل ہوا تھا۔ سلطان کے ساتھ اس کی حاملہ بیوی بھی تھی۔ وہ میاں بیوی انگریز سرکار کے معتوب تھے۔ انگریز فوجیوں نے سلطان کو گھیر کر مار دیا اور کپتان نے اس کی بیوی نگینہ کو رات بھر زیادتی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد نشے میں دھت کپتان اور اس کے فوجی وہیں چھولداریوں میں سو گئے۔ صبح ان میں سے کوئی بھی نہیں اٹھ سکا۔ ان سب کے جسم پر گولیوں کے نشان تھے اور خون بہہ کر لوتھڑوں کی صورت میں پتھروں پر جما ہوا تھا۔ صرف ایک مسلمان حوالدار زندہ بچا تھا۔ ایک غیبی آواز نے اسے کہا کہ وہ جائے اور جا کر قاتلوں کے انجام سے لوگوں کو باخبر کرے۔ اس واقعے کے بعد ان پہاڑوں سے اکثر سلطان اور نگینہ کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ ان قہقہوں کے ساتھ مقتول فوجیوں کی چیخیں اور آہ و بکا بھی ابھرتی ہے اور صاف پہچانی جاتی ہے۔

بوڑھے نے جو کچھ بتایا وہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ایسے دور دراز اور بے آباد علاقوں میں ایسی کہانیاں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ ہاں اگر ایسی کوئی روداد ہمارے کانوں تک نہ پہنچتی تو یہ ضرور غیر متوقع بات ہوتی۔ کم از کم میں تو ضرور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ ہمارے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی! عمر رسیدہ پہاڑی اپنا کام کر کے چلا گیا اور ہم اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔ ہمارا کام ہی یہ تھا کہ ایسی جگہوں تک پہنچیں جہاں لوگ نہیں پہنچتے یا پہنچنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر یہ پہاڑیاں "ممنوعہ علاقہ" تھیں تو عین ممکن تھا، یہاں سے ہمیں کچھ حاصل ہو سکے۔ اس روز ہم گھاٹی تک ہی پہنچے تھے کہ تیز بارش شروع ہو گئی اور ایک دم اولے گرنے لگے۔ ہم نے درختوں تلے پناہ لی اور یہ کام کسی اور وقت پر اٹھا کر واپس آ گئے۔ اگلے دن ہم نہ صرف ان پہاڑیوں میں داخل ہوئے بلکہ خوب گھومے پھرے۔ نہ کسی شر شرار یعنی ہوائی چیز سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی کوئی بندہ بشر نظر آیا۔ چند جنگلی مار خوروں، چار خرگوشوں اور ایک عدد خار پشت کو نشانہ بنا کر ہم واپس آ گئے۔ دوسرے دن بھی ہمارا پروگرام انہی پہاڑیوں میں گھومنے کا تھا۔ کتوں کے غول کے ساتھ ہم نے پڑاؤ چھوڑا اور خم دار

گھاٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ گھاٹی ڈھائی تین فرلانگ طویل تھی اور اس کی شکل انگریزی کے حرف ایس سے مشابہ تھی۔ اس میں پھلاہی اور پھلدار کنکو کے بے شمار درخت اُگے ہوئے تھے۔ اس گھاٹی سے ملتا جلتا ایک نشان مالک محمد کے دیے ہوئے خاکے میں بھی موجود تھا۔ تاہم ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اسی جگہ موجود ہیں۔ ایس پی برکت صاحب آج ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم نے دو تین گھنٹے خوب شکار کھیلا، جنگلی بیر کھائے اور درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک گیدڑ اور گیدڑی کے رومانی مناظر دیکھے۔ دوپہر کو ہم سستانے کے لیے ایک ہموار جگہ پر جا بیٹھے۔ یہ مقام ایک بل کھاتے راستے کے کنارے واقع تھا۔ راستہ تو تھا لیکن آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک گھنٹے کے دوران میں نے ایندھن چننے والی دو بوڑھی پہاڑنوں اور ایک مدقوق چرواہے کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ ہماری پارٹی کے بیشتر ارکان سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ کتوں کے منہ پر جالیاں چڑھا کر انہیں دو درختوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ نشیب میں کوئی پچاس فٹ نیچے مجھے ایک شخص نظر آیا۔ وہ ایک ستون نما چٹان کے عقب سے اچانک یوں نمودار ہوا جیسے اُگ آیا ہو۔ وہ پیدل جا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چتکبرے گھوڑے کی راسیں تھیں۔ لگتا تھا گھوڑے کی اگلی ٹانگ پر تازہ تازہ چوٹ لگی ہے۔ ایک مسافر اپنے زخمی گھوڑے یا گھوڑی کو کھینچتا ہوا نامعلوم منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس میں چونکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ چونکنے والی بات اگر تھی تو مسافر کی شکل و صورت اور اس کے ڈیل ڈول میں تھی۔ نہایت کشادہ کندھوں والے اس شخص کو میں پہچانتا تھا۔ وہ جاگیردار قادر زماں کے ملازموں میں سے تھا اور میں حویلی میں کئی مرتبہ اسے دیکھ چکا تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ ایم جی والا وہی پہلوان تھا جو حوالات کے دوران میری نگرانی کر رہا تھا اور جب ایک رات میں نے حویلی کے مہمان خانے میں رقص و سرود کی محفل درہم برہم کی تھی تو اس نے پیچھے سے آ کر میری گردن پر رائفل کا کندا آزمایا تھا۔ میں بلندی پر تھا اور مجھ سے پہلوان کا مجموعی فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو گز تھا۔ اتنی دوری سے آدمی کو ٹھیک طرح شناخت کر لینا آسان نہیں ہوتا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، پہلوان کو شناخت کرنے میں اس کی صورت کے علاوہ اس کا ڈیل ڈول بھی مدد دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اندر مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ میں اس دور دراز خرابے میں جھوک شناسن کے ایک خاص الخاص شخص کا دیدار کر رہا ہوں۔ پہلوان کو پہچان لینے کے بعد مجھ سے جو پہلا بے ساختہ فعل سرزد ہوا وہ یہی تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا پہلوان کی طرف بڑھنے لگا۔ ذہن بار بار یہ ہدایات دے رہا تھا کہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں، جس سے پہلوان کے کھو جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ عجب وضع کے نشیب و فراز تھے۔ پلک جھپکنے میں پہلوان کو نگاہوں سے اوجھل کر سکتے تھے۔ انسپکٹر باجوہ یا کسی دوسرے شخص کو آگاہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ کسی کو بتائے بغیر میں پہلوان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

یہ میری زندگی کا طویل اور دشوار ترین تعاقب ثابت ہوا۔ گہری گھاٹیوں اور پیچ دار راستوں پر میں نے پہلوان کے پیچھے تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کیا۔ اس میں تقریباً دو گھنٹے لگے۔ ان دو گھنٹوں کا ہر پل میں نے کڑے مراحل پر گزارا تھا۔ ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہا تھا کہ میں پہلوان کو کسی گھاٹی میں کھو دوں گا یا وہ کسی موڑ پر اچانک مجھے دیکھ لے گا۔ اس چار میل کے راستے میں پہلوان صرف دو مقامات پر رکا۔ پہلی دفعہ اس نے دو خچر سواروں سے چند باتیں کیں۔ پھر ایک تالاب پر رک کر گھوڑے کو پانی پلایا اور خود بھی پیا۔ یہاں مجھے چند پاوندے (خانہ بدوش) بھی نظر آئے تھے۔ انہوں نے پہلوان کے زخمی گھوڑے کی ٹانگ ملاحظہ کی اور کچھ دیر پہلوان سے باتیں کرتے رہے۔ جوں جوں پہلوان دشوار گزار راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں عینی جان کے ڈیرے سے قریب تر ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ خوش فہمی تھی یا احوالِ واقعی مگر جو کچھ بھی تھا سنسنی خیز تھا۔ راستے میں جگہ جگہ جنگلی حیات کے مخصوص مناظر بھی دیکھنے میں آ رہے تھے۔ ایک جگہ درخت سے بندھی ہوئی ایک رسی نظر آئی۔ خون آلود رسی کے دوسرے سرے پر چند ہڈیاں اور ایک بھیڑ کے ٹوٹے پھوٹے پائے نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی شکاری نے جنگلی جانوروں کے شکار کے لیے اس بھیڑ کو چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہونے لگا کہ ہم پاوندوں کی کسی بستی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ ان ویران پہاڑیوں میں کہیں کہیں پاوندوں کے ڈیرے موجود تھے۔ یہ نہایت سخت جان لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں اور اکثر موسم تبدیل ہونے پر نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک پہاڑی کا چکر کاٹتے ہی مجھے اپنے سامنے ایک بستی نظر آئی۔ یہ خیمے اور نیم پختہ جھونپڑے تھے۔ بعض جھونپڑوں کے گرد

لکڑی کی باڑیں لگائی گئی تھیں۔ بستی کے بیچوں بیچ بھیڑ بکریوں کے لیے احاطے بنے ہوئے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا اس لیے احاطے خالی تھے۔ پاؤنڈوں کے ریوڑ اردگرد کی ڈھلوانوں پر چر رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر ان ریوڑوں کے درمیان لمبے بالوں والے محافظ کتے بھی گشت کرتے نظر آتے تھے۔ پہلوان تھکے تھکے قدموں سے بستی میں داخل ہو گیا۔ ایک دو افراد سے اس کی علیک سلیک بھی ہوئی۔ قرائن سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں ایک جانی پہچانی شخصیت ہے۔ یہ جگہ عیسیٰ جان کا ڈیرا تو ہرگز نہیں تھی پھر پہلوان یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ میں ابھی یہی بات سوچ رہا تھا کہ میرے دائیں جانب نزدیک ہی کہیں ہلکی سی غراہٹ ابھری۔ پھر "دبو دبز" کی آواز سنائی دی۔ کوئی چوپایہ مثلاً کتا وغیرہ جب کسی پر حملے کے لیے لپکتا ہے تو یہ مخصوص آواز ابھرتی ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا ہو تو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس آواز میں بڑی خوف ناک قسم کی سنسنی ہوتی ہے۔ گھنی جھاڑیوں میں سنائی دینے والی اس آواز نے مجھے بھی سیکنڈ کے دسویں حصے میں چوکنا کر دیا۔ میں نے تیزی سے رخ بدلا۔ بڑے قد کا ایک السیشن کتا برق رفتاری سے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ رائفل میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ بائیں ہاتھ نے ایک درخت کی شاخ کو تھام رکھا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں رائفل کو نال کی طرف سے تھام کر لٹھ کے طور پر استعمال کر سکتا..... کتے نے مجھ پر جست لگائی تو میں نے رائفل کی نال نیزے کی طرح اس کی پسلیوں میں ماری۔ ضرب لگانے کے ساتھ ساتھ میں بائیں طرف جھکا تھا اور یوں اس کی زد سے صاف بچ گیا تھا۔ خاموشی سے حملہ آور ہونے والا جسیم کتا اب پورے زور سے بھونک رہا تھا۔ زمین پر پنجے ٹکتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ ایک ہی حرکت میں اس نے اپنا رخ پھیرا اور مجھ پر چھلانگ بھی لگا دی۔ اس دفعہ میں نے اپنی گردن بمشکل اس کے سفید نوکیلے دانتوں سے بچائی۔ اس کے چھلانگ لگاتے ہی میں نیچے گر گیا تھا اس لیے وہ میرے اوپر سے رول کرتا ہوا جھاڑیوں میں جا گھسا۔ اس عمل کے دوران چند ساعتوں کے لیے میرا چہرہ اس کے بالوں بھرے پیٹ سے ٹکرایا تھا۔ گوشت کی حرارت اور تیز حیوانی بو میرے حواس کو چھوتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ اب مجھے اپنی طرف لپکتے ہوئے چند افراد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ گھیر دار شلواروں اور لمبے کرتوں والے باشندے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر جھول رہی تھی۔ باقی دو آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ یہ سب کچھ میں نے ایک ساعت کے مختصر وقت میں دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ کتا جھاڑیوں میں لوٹ لگانے کے بعد سیدھا ہو گیا ہے اور اب پھر میری طرف لپکنے کے لیے تیار ہے۔ دائیں ہاتھ میں رائفل کا بوجھ اور اس کا زاویہ میرے لیے تسلی بخش تھا۔ میرا بایاں کندھا زمین سے لگا ہوا تھا اور صرف ایک کروٹ لے کر میں کتے کو نشانہ بنانے کی پوزیشن میں آ سکتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میری زندگی میں یہ تیسرا یا چوتھا موقع تھا جب مجھے اس طرح کسی کتے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر بندے کی ایک سائیکی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی عادات ہوتی ہیں جن کا انسان کو خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ اس میں کیسے پختہ ہوئی ہیں۔ مجھے بھی ایسے لوگوں سے شدید نفرت ہے جو انسان پر کتا چھوڑتے ہیں اور کتے کے بل بوتے پر کسی کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کبھی بھی ایسا موقع آیا، میرے اندر شدید ہیجان سا پیدا ہوا اور کتے کے ساتھ ساتھ کتے کے مالک کے لیے بھی میرے دل میں عجب طرح کی بے رحمی عود کر آئی۔ السیشن نے گھوم کر رخ میری طرف کیا تو میں بھی تڑپ کر اوندھا ہو گیا۔ اب وہ میرے نشانے پر تھا۔ جونہی اس نے چھلانگ لگائی، میں نے لبلبی دبا دی۔ زوردار دھماکا ہوا۔ گولی یقیناً کتے کی کھوپڑی میں لگتی لیکن نشانہ خطا گیا۔ نشانہ خطا جانے کا سبب دراز قد شخص تھا جس نے عین فائر کے وقت مجھ پر لاٹھی سے حملہ کیا تھا۔ لاٹھی کی ضرب نے میرے دائیں بازو کو سن کر کے رکھ دیا۔ کتا غراتا ہوا میرے اوپر گرا تھا۔ وہ بے حد وزنی اور بدبودار کتا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جبڑا آزمایا لیکن دانتوں میں صرف جیکٹ ہی آئی۔ کتے کا خون آلود پیٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ اسے گولی لگی ہے۔ ایک باشندے نے رائفل میری طرف سیدھی کر رکھی تھی اور چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ رائفل اب میرے بائیں ہاتھ میں تھی اور دایاں ہاتھ کتے کی پچھلی ٹانگ پر جم چکا تھا۔ ایک جھٹکے سے میں سیدھا ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تینوں باشندوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں نے عظیم الجثہ السیشن کو پچھلی ٹانگ سے پکڑ کر گھمایا اور بے پناہ نفرت سے ایک باشندے پر دے مارا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر نظر آ رہی تھی۔ کتے اور اس کے مالک کا تصادم جتنا اچانک تھا اتنا ہی شدید بھی تھا۔ دونوں جیسے اڑتے ہوئے ایک بیس فٹ گہرے گڑھے میں جا گرے اور وہاں سے ڈھلوان پر لڑھک کر مزید نیچے چلے گئے۔ باقی دونوں افراد لمحے کے لیے اس منظر کے سحر میں گرفتار ہو گئے۔ میں نے لپک کر رائفل بردار کی رائفل پر ہاتھ رکھا اور سینے پر ٹانگ کی بھرپور ضرب لگائی۔ وہ حلق سے

"ہچ" کی آواز نکالتا ہوا گھاس پر گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے رائفل گھما کر دور جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دی۔ لاٹھی بردار نے اس موقعے پر خلاف توقع دلیری اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک نعرہ سا بلند کر کے مجھ پر لپکا اور لاٹھی میرے ہاتھوں پر ماری۔ ایک بار پھر دائیں بازو پر چوٹ لگی اور رائفل میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ لاٹھی کا دوسرا وار میں نے پیچھے ہٹ کر بچایا اور رائفل سونت لی لیکن جونہی قدم پیچھے ہٹانے کے بعد میرا پاؤں زمین پر آیا، ایک جھٹکے سے میری ٹانگ کولہے تک جھنجھنا گئی۔ اس کے ساتھ ہی کھٹکے کی آواز آئی اور ٹخنے کے پاس شدید درد کا احساس ہوا۔ دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اپنے ٹخنے کی طرف نظر اٹھانے سے پہلے میں جان چکا تھا کہ کیا گزری ہے۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔ زمین گھاس پھونس سے ڈھکی تھی اور یہ مقام بستی سے پھوٹنے والے راستوں سے کافی ہٹ کر تھا۔ ایسے مقامات پر طالع آزما شکاری اکثر جنگلی جانوروں کے لیے پھندے لگا دیتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو تو ایسی جگہوں کا پتا ہوتا ہے لیکن کوئی باہر کا شخص اگر زیر استعمال راستوں سے ہٹ کر چلے تو ایسے پھندوں سے دوچار ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے دل کڑا کر کے نظر کا زاویہ بدلا۔ پنڈلی کا نچلا حصہ ایک چوبی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کے بنے ہوئے دو کمان کی شکل کے ٹکڑے تھے۔ انہیں ایک اسپرنگ سے مربوط کر کے مٹی اور گھاس میں چھپایا گیا تھا۔ پاؤں کا وزن پڑتے ہی دونوں گولی کی رفتار سے بند ہوئے تھے اور ٹخنہ جکڑ لیا تھا۔ مقام شکر تھا کہ یہ شکنجہ لکڑی کا تھا ورنہ پنڈلی کی ہڈی بھی انا للہ ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹانگ کو حرکت دینا چاہی تو اندازہ ہوا کہ زور لگانے پر یہ "انا للہ والا کام" اب بھی ہو سکتا ہے۔ ایک شدید ٹیس نے مجھے پشت کے بل گرنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحوں کے لیے تو میرے دونوں حریف بھی نہ سمجھ سکے کہ اچانک یہ کیا ہوا ہے۔ پھر ان کے چہروں پر مسرت آمیز غضب کی یلغار ہوئی اور وہ غراتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی گرمجوشی تھی اس ملاپ میں۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم ایک جان تین قالب ہو کر رہ گئے۔ گھونسے، لاتیں، ٹھوکریں کیا تھیں جو انہوں نے مجھ پر نچھاور نہیں کیں۔ میری چرمی جیکٹ پھٹ گئی، قمیص ادھڑ گئی اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس دوران نشیب میں لڑھکنے والا شخص بھی لنگڑاتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا اور اس "پیار محبت" میں شریک ہو کر میری دلجوئی کرنے لگا۔ غالباً اپنے خونخوار کتے کو "خونوں خون" دیکھ کر اسے کچھ زیادہ ہی راحت نصیب ہوئی تھی۔ وہ کود کود کر میری بلائیں لے رہا تھا اور دانت پیس پیس کر صدقے واری جا رہا تھا۔ مجھے مار مار کر جب وہ تینوں بدحال ہو گئے تو آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگے۔ اس دوران نشیب سے تین اور افراد بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ یہ تینوں غالباً فائرنگ کی آواز سن کر آئے تھے۔ دراز قد شخص نے نئے آنے والوں میں سے ایک کی پگڑی لی اور مجھے اوندھا کر کے میری کلائیاں باندھنے لگا۔ رائفل بردار نے میرے لباس کی تلاشی لی اور جیکٹ کی جیب سے شکاری چاقو نکال لیا۔ میری دستی گھڑی، نقدی، انگوٹھی اور رائفل ان کے قبضے میں تھے۔

ان کی آنکھیں اور زبانیں مجھ پر آتش فشانی کر رہی تھیں۔ میں صرف آنکھوں کی زبان سمجھ سکتا تھا اس لیے انہوں نے جب تک میرا شکنجہ نہیں کھولا اور دھکیل دھکیل کر مجھے ڈھلوان تک نہیں پہنچا دیا، مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ السیشن مر چکا ہے۔ گولی اس کے سینے میں کہیں لگی تھی۔ رہی سہی کسر پتھروں پر گرنے سے پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے خوفناک دانت نکوسے بے نور آنکھوں سے گہرے نیلے آسمان کو تک رہا تھا۔

وہ لوگ مجھے رائفل کی نال سے دھکیل دھکیل کر نیچے اتارنے لگے۔ رخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے بستی میں لے جایا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے ناپسندیدہ تھی۔ تینوں خانہ بدوشوں سے میں نے لڑائی بھی اس لیے مول لی تھی کہ یہاں سے بچ کر نکل سکوں۔ اگر پاؤں پھندے میں نہ پڑتا تو پچاس فیصد سے زائد امکان تھا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا مگر اب وہی ہو رہا تھا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ مجھے گھیر کر بستی میں لے جایا جا رہا تھا جہاں جاگیردار قادر زماں کا اہلکار موجود تھا اور اس کے علاوہ معلوم نہیں اور کون کون تھا۔ ساری پلاننگ ہی غضب ہوتی نظر آ رہی تھی۔

کچھ دیر تو وسوسوں کی یلغار رہی۔ پھر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا اب یہ سوچنا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ہم بستی کے قریب پہنچے تو بچے بوڑھے اور عورتیں سب گھروں سے باہر نکل آئے۔ جس شخص کا کتا دار فانی سے رخصت ہوا تھا اس نے جوش میں آ کر مجھ پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ ایک بوڑھے نے اسے روکا۔ غالباً اپنی زبان میں اسے سمجھایا تھا کہ "جنیوا کنونشن" کے مطابق مجھے قیدیوں کے حقوق حاصل ہیں یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات کی ہوگی۔ نتیجتاً اس شخص نے لاٹھی چارج سے ہاتھ روک لیا اور زبانی کلامی غصہ اتارنے تک محدود رہا۔ بستی

دور سے جتنی چھوٹی نظر آتی تھی اتنی تھی نہیں۔ جھونپڑوں اور خیموں نے چار پانچ ایکڑ رقبہ گھیرا ہوا تھا۔ بھونکتے کتے' کڑکڑاتی مرغیاں' ممیاتی بکریاں اور گھورتے ہوئے مرد و زن۔ مجھے ان تمام نفوس کے درمیان سے گزار کر بستی کے مالک یعنی سردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس کا چہرہ خودرو بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھنی بھوؤں کے نیچے سے آنکھیں اور بھاری بھرکم مونچھوں تلے سے ہونٹ بمشکل نظر آتے تھے۔ چہرے کی طرح اس کا باقی جسم بھی گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ نجانے کیوں اسے دیکھ کر ڈارون کا نظریہ یاد آنے لگا۔ جونہی میں اس کے سامنے پہنچا ایک آدمی اونچی آواز میں بولا پھر دوسرا' پھر تیسرا' پھر ایکدم چاروں طرف سے گفتگو کے دریا بہہ گئے۔ وہ سب ایک ساتھ بول رہے تھے' جیسے قسم کھا رکھی ہو کہ کسی دوسرے کی بات سمجھنی ہے نہ اپنی سمجھانی ہے۔ دراز قد شخص بار بار اپنی شہادت کی انگلی میری چھاتی پر ٹھونکتا تھا اور کولہوں پر ہاتھ رکھ کر سردار کے نام کی دہائی دینے لگتا تھا۔ دھیرے دھیرے بولنے والوں کی آہ و بکا نے سردار پر بھی اثر کرنا شروع کر دیا۔ یعنی اس کی آنکھوں میں بھی میرے لیے نفرت کی بجلی کوندنے لگی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر ایک طویل فقرہ کہا جس میں سے صرف دو لفظ "باشندہ" اور "پہاڑ" میری سمجھ میں آئے۔ تاہم اس کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے بازپرس کر رہا ہے کہ میں کون ہوں' کب اور کیوں آیا ہوں؟ میں نے اردو میں پوچھا۔ "تم میں سے کوئی اردو سمجھتا ہے؟" وہ سب لاتعلقی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ یہ بڑا منفصل جواب تھا۔ میں دائیں بائیں دیکھ کر رہ گیا۔ دفعتاً میری نگاہ ایک چہرے پر ٹک گئی۔ پہلوان نما شخص مجھ سے قریباً پندرہ فٹ کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس کا رنگ پہلے سے سانولا ہو چکا تھا' شیو بڑھی ہوئی تھی اور چربی بھی کچھ پگھلی نظر آتی تھی لیکن وہ پہلوان ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے واضح شناسائی تھی۔ ہم دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر پہلوان معنی خیز انداز میں سر ہلا کر سردار کی طرف بڑھا۔ سردار کے قریب جھک کر اس نے کوئی بات کی۔ سردار نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پہلوان کے ساتھ ہجوم سے باہر نکل گیا۔ دونوں ایک بڑے جھونپڑے کے سامنے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ گاہے گاہے وہ مجھے دیکھ بھی لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد سردار نے چند عمر رسیدہ افراد کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ان میں خوب تبادلۂ خیال ہوا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں کیا پیش آنے والا ہے۔ کبھی لگتا تھا کہ حالات مزید بدتر ہونے والے ہیں تو کبھی اُمید کی کرن نظر آنے لگتی تھی۔ اب یہ اُمید کس چیز کی تھی' اس کا خود مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ پہلوان میری وکالت کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد معززین کی کانفرنس ختم ہوئی اور وہ لوگ میری طرف بڑھ آئے۔ اس مرتبہ جھوک ضامن کا پہلوان سب سے آگے تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے تسلی دینے والے انداز میں تھپکا پھر میرے ہاتھوں کی بندش کھولنے لگا۔

"بہت حیران ہوا ہوں میں تمہیں یہاں دیکھ کر۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"اتنا ہی حیران میں بھی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اکیلے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔"

"خدا کا شکر کرو' یہاں اس موقعے پر میں بھی موجود ہوں۔ اس کتے کے بدلے تمہاری ایک لت (ٹانگ) تو انہوں نے توڑ ہی دینی تھی۔ دوسری بھی ٹوٹ جاتی تو کوئی بڑی گل نہیں تھی۔"

"ایک تو سمجھو ٹوٹ ہی گئی ہے۔" میں نے دائیں پنڈلی پر زور دباتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ "ٹوٹی نہیں ہے۔ فیر تے گل ہے گی نئیں۔"

مجھے ساتھ لے کر وہ ہجوم سے باہر نکلا۔ سردار کے ہاتھ میں میری رائفل نظر آ رہی تھی۔ یہ رائفل اس نے پہلوان کو دی اور پہلوان نے میرے سپرد کر دی۔ میری گھڑی' انگوٹھی اور جیب سے نکلنے والا دو سو روپیہ بھی لوٹا دیا گیا۔ ہم دونوں آہستہ روی سے چلتے بستی کے [illegible] میں آ گئے جو پہلوان سے قریب تر تھا۔ مجھے چلنے میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک تنگ گلی سے گزار کر پہلوان مجھے ایک نیم پختہ جھونپڑے کے سامنے لے آیا۔ جھونپڑے کی دیواریں گارے اور پتھروں کی تھیں جب کہ چھت لکڑیوں کی تھی۔ اس جھونپڑے میں باقاعدہ لکڑی کا دروازہ لگا تھا۔ دروازے کے قریب ہی وہ زخمی گھوڑا [illegible] جسے پہلوان کھینچتا ہوا بستی تک لایا تھا۔ ہم اندر [illegible] ایک دری نما چٹائی پر بیٹھ گئے۔ یہاں [illegible] تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چھینٹ کے [illegible] والے تکیے پڑے تھے اور جھونپڑے کے [illegible] ایک چمنی سی اُٹھتی ہوئی اوپر چلی گئی تھی جیسا کہ [illegible] وہم ہوا کہ یہ ایک طرز کی انگیٹھی تھی جو جھونپڑے [illegible] رکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ جھونپڑے کا عقبی [illegible] میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ ایک الٹا

پردے سے گزر کر پہلوان اس عقبی حصے میں گیا اور ذرا دیر بعد ہاتھ میں ایک لوٹا نما برتن لیے نمودار ہوا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک چرچی سی تھی۔ لوٹے کے نیم گرم پانی سے اس نے میرا ہاتھ منہ دھلایا اور چہرے کے زخموں اور خراشوں پر لگانے کے لیے ایک دیسی ساخت کا مرہم دیا۔ میں نے پھٹی ہوئی جیکٹ اور قمیص اتار دی تھی۔ پہلوان اندر سے ایک لمبا سا زرق برق کرتا لے آیا جو ظاہر ہے مجھے پہننا پڑا۔ اتنے میں جھونپڑے کے عقبی حصے سے چوڑیوں کی کھنک صدا آئی اور کسی عورت نے دھیمی آواز میں پہلوان کو پکارا۔ پہلوان لپک کر گیا اور ایک گول ٹرے لیے واپس آ گیا۔ ٹرے میں گرما گرم قہوے کی کیتلی تھی۔ دو چھوٹی پیالیاں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تھالی میں کشمش' خشک خوبانیاں اور شہتوت تھے۔ اس علاقے میں مہمان نوازی کا بہترین انداز یہی تھا۔ پہلوان نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی اور بولا۔ "بادشاہو! یہ چیزیں اپنے وطن کے دودھ لسی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتیں' پر کھا کے دیکھو۔ ہیں بہت مزے دار۔"

ڈرائی فروٹ واقعی کھانے کے لائق تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اصلی افغانی قہوہ' مارکٹائی کے بعد اس ریفریشمنٹ نے خاصا لطف دیا۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے پہلوان نے کہا۔ "ہاں جی! اب بتاؤ' یہاں کیسے آنا ہوا اور کیا ارادے ہیں آپ کے؟"

یہ بڑا نازک سوال تھا۔ جواب دینے سے پہلے میں جاننا چاہتا تھا کہ پہلوان یہاں کس حیثیت سے موجود ہے۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق وہ قادر زماں کا مسلح محافظ تھا اور حویلی کے مہمان خانے میں اس کی حیثیت خدائی فوجدار کی تھی لیکن اب وہ اس سے دور اور زیادہ [illegible] میں نظر آ رہا تھا اور اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ قادر زماں سے تعلق ختم کر چکا ہے۔ اب معلوم نہیں یہ صرف میرا خیال تھا یا حقیقت میں ایسا ہو چکا تھا۔ میں نے پہلوان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اسے ٹٹولنا چاہا۔ میں نے پوچھا۔ "میرے ارادے' ارادے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

کہنے لگا۔ "یہ کہ آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' تم جاگیردار کے کہنے پر حویلی سے کسی مہم پر نکلے تھے۔ وہ کڑی کیا نام ہے اس کا... انجم۔ وہ بھی تمہارے ساتھ تھی۔ شاید نتھیا گلی جانا تھا تم نے۔"

میں نے اس کے سوال کا جواب ایسے انداز سے دیا کہ سب کچھ گول کر دیا اور گفتگو پھر اس سوال کے موڑ پر آ گئی کہ پہلوان یہاں کیوں پایا جاتا ہے؟ وہ میری باتوں سے کسی حد تک میرا مطلب سمجھ گیا۔ کہنے لگا۔ "گھبراؤ نہیں میرے بھرا۔ اس وقت ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں' جو بات کرنی ہے کھل کھلا کے کر۔"

میں نے انجان بن کر کہا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

اس نے تکیے سے ٹیک لگا کر ایک لمبی ڈکار لی۔ یوں لگا جیسے پیالی بھر قہوہ کسی اندھے کنوئیں میں جا گرا ہے۔ وہ حسبِ عادت انگلیوں سے اپنے گھونگریالے بالوں میں کنگھی کر کے بولا۔ "سمجھ تو تم سب کچھ رہے ہو' صیب یار۔ بس میرے منہ سے کہلوانا چاہتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے۔ اب پردے میں رکھنا بھی کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں جاگیردار کی نوکری پر لات مار آیا ہوں اور اتنے زور سے لات ماری ہے کہ خود بھی دھکے سے یہاں آ گرا ہوں۔ جاگیردار کا ایک بندہ ضائع ہو گیا ہے میرے ہاتھوں۔ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے میری بات؟"

میں نے کہا۔ "پہلوان! اگر سمجھانے ہی لگے ہو تو ذرا ٹھیک کر کے سمجھا دو۔ پھر میں بھی تمہیں ساری کتھا سنا دیتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "بڑے شکی مزاج کے ہو تم۔ اچھا چلو' پہلے میری ہی سن لو۔" پھر وہ اپنے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں واقعی کھل کر اپنے متعلق بتانے لگا۔ پہلوان کا نام شہباز تھا۔ وہ جدی پشتی جھوک ضامن کا رہنے والا تھا۔ اس کے بولنے کا انداز دلنشین تھا۔ بات کرتے کرتے مسکراتا تھا تو اندر کی طرف جھکے ہوئے دانت چمکنے لگتے تھے۔ ایسے دانتوں کے مالک عموماً سخت جان اور مضبوط اعصاب کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے پہلوان کے لیے شروع میں "پہلوان نما" کا لفظ استعمال کیا ہے' وہ جسیم ضرور تھا لیکن بھدا نہیں تھا۔ عمر بھی پچیس چھبیس سے زیادہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے پہلوان کے بجائے تنومند شخص کہا جا سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگا۔

"نجو کا پتا ہے نا...؟"

میں نے چونک کر کہا۔ "ہاں۔ وہی جو مہمان خانے میں نوکرانی تھی!"

بولا۔ "میری منگیتر ہے۔"

میرے لیے یہ اطلاع بالکل نئی تھی۔ میں نے پوچھا "لیکن نجو کا ذکر یہاں کیسے آ گیا؟"

"نجو کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ وہ خود بھی یہاں موجود ہے۔" پہلوان نے دھماکا خیز انکشاف کیا۔ میں حیرت سے

اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پہلوان نے میری حیرت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے نجو کو آواز دی۔ "نجو! ادھر آ۔" جھونپڑے کے عقبی حصے میں کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ پھر چھوٹے سے در پر جھولتا ادنی پردہ ہٹا اور میں نے نجو کو سامنے پایا۔ پہلوان شہباز کی طرح وہ بھی پنجابی لباس میں تھی۔ شاید اس لباس میں وہ ایک دفعہ حویلی میں بھی نظر آئی تھی۔ عنابی شلوار' عنابی پھولوں والا کرتا اور اسی رنگ کا دوپٹا۔ اس کا جسم ایسا تھا کہ ہر لباس اس پہ بجتا تھا۔ بقول شاعر بوسیدہ سے بوسیدہ کپڑا بھی تن سے چھو کر جگمگا اٹھتا تھا۔

"سلام صیب جی۔" اس کی جانی پہچانی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے کہا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ "تم یہاں؟" بے ساختہ یہ سوال میرے لبوں پر آیا۔

جواب میں نجو اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے پہلوان کی طرف دیکھنے لگی۔ نجو کے بارے میں مجھے سننے سے پتا چلا تھا کہ حویلی میں جنداں نامی عورت نے اسے زبردست تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ پھر اسے جاں بلب حالت میں کسی گاڑی میں ڈال کر حویلی سے لے جایا گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اب میں کبھی نجو کے متعلق اچھی خبر سن سکوں گا لیکن وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ کیا پوچھوں' کیا بتاؤں؟ پہلوان نے صورت حال بھانپ کر نجو سے کہا۔ "نجو! جا کھانا تیار کر' تیرے صیب جی نے آج کافی ورزش کی ہے۔ بھوک شوک لگی ہوگی۔"

نجو ایک نگاہ مجھ پر ڈال کر تیزی سے اندر چلی گئی۔

پہلوان نے سگریٹ سلگا کر سرگوشیوں میں کہنا شروع کیا۔ "نجو کا باپ میرے باپ کا بچپن کا یار تھا' ہم اسے تایا کہتے تھے۔ نجو سے میری منگنی بچپن میں ہوئی تھی۔ تائے کی موت کے بعد ہمارے تعلقات پہلے والے نہیں رہے تھے لیکن میں تو نجو کو منگ ہی سمجھتا تھا۔ تمہیں پتا ہے پچھلے سے پچھلے مہینے حویلی میں جو کچھ ہوا تھا' جاگیردار کو یقین تھا کہ تمہیں تمہاری بہن کے بارے میں بتانے والی نجو ہی ہے۔ ایسی غلطیاں جاگیردار کبھی معاف نہیں کرتا۔ اس نے نجو کو جنداں کے سپرد کر دیا۔ وہ عورت نہیں ایک ڈائن ہے' جو اس کے بس میں آ جاتا ہے اس کا خون چوس لیتی ہے۔ اس نے نجو پر بڑا ظلم ڈھایا۔ یہاں تک کہ وہ آخری دموں پر آ گئی۔ جاگیردار کو پتا چلا تو اس نے کہا کہ کڑی کو مار کر بیلے کی قبروں میں دبا دو۔ اسے گاڑی میں ڈال کر لے جانے والا میں ہی تھا۔ میرے ساتھ دوسرا بندہ ڈرائیور نصیب خاں تھا۔ بیلے کے راستے میں ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ نجو کو مرنے نہیں دوں گا' چاہے اس کے لیے مجھے جاگیردار سے بغاوت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ نصیب خاں میرا پرانا یار بیلی تھا لیکن میں جانتا تھا وہ اس معاملے میں میرا ساتھ نہیں دے گا اور یہی ہوا' جب میں نے نجو کو بچانا چاہا تو وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بیلے کی قبروں میں ہمارے درمیان ہاتھا پائی ہوئی اور میں نے ایک وزنی بیلچہ مار کر اس کا سر دو ٹکڑے کر دیا۔ نجو اس وقت نیم بے ہوش تھی۔ میں اسے گاڑی میں ڈال کر فیصل آباد لے گیا۔ فیصل آباد کے ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر میں نے جاگیردار کی گاڑی چھوڑ دی اور ایک ٹیکسی کر کے نجو کو اسپتال پہنچایا۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال ہے۔ یہاں دو ہفتے نجو کا علاج ہوا۔ رقم تو خرچ ہوئی مگر نجو کی حالت سنبھل گئی۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو میں اسے لے کر فیصل آباد سے بھی نکل گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم جاگیردار ... کے ہرکاروں سے بچ بچا کر یہاں آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔"

یہ روداد میرے لیے دلچسپ اور حیران کن تھی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ حویلی میں جب نجو میرے ساتھ لگاوٹ کا مظاہرہ کر رہی تھی تو پہلوان کس طرح پیچ و تاب کھاتا تھا۔ ایم جی رائفل اس کے ہاتھوں میں بے قابو ہونے لگتی تھی' اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ تصور میں کئی بار مجھے شہدائے عشق کی صف میں شامل کر چکا تھا۔ پہلوان کی داستان کے کئی پہلو ابھی وضاحت طلب تھے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ پہاڑی خانہ بدوشوں کی اس بستی تک کیوں کر پہنچ سکا اور خانہ بدوشوں نے دو آوارہ گردوں کو کیوں کر پناہ دی۔ پھر یہ بات بھی اچنبھے کی تھی کہ پہلوان ٹھیٹ پنجابی ہونے کے باوجود پشتو کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو پہلوان نے کہنا شروع کیا۔

"اوپر والا مسبب الاسباب ہے۔ صیب یار! یہ جو خانہ بدوش ہیں' افغان علاقے اور شمالی وزیرستان سے آتے ہیں۔ سردیوں کا موسم ان جھونپڑیوں میں گزار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ جو علاقہ ہے نا' آلے دوالے کا' اس کے بارے میں ایک کہانی ہے' سلطان نام کے کسی بندے کی۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز کپتان نے اسے اور اس کی بیوی کو قتل کیا تھا۔ بعد میں کپتان اور اس کے فوجی خود بھی مارے گئے تھے۔ یہاں کے لوگ جن بھوتوں اور ہوائی چیزوں پر بڑا یقین رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم پنجاب کے دیہاتی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بس یہ سمجھو کہ جو شے سمجھ میں نہ آئے' اسے شر

نذر کر دیتے ہیں۔" پہلوان نے اٹھ کر جھونپڑے میں ایک کھڑکی نما در کھولا۔ جھونپڑے سے باہر تاریکی پھیل چکی تھی۔ مدھم چاندنی رات میں دور پہاڑی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ پہلوان چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "لوگوں کا خیال ہے کہ وہ پہاڑیاں اور آلے دوالے کا سارا علاقہ سلطان کی روح کے قبضے میں ہے۔ یہاں جو ٹھہرتا ہے اسے سلطان اور اس کی بیوی کی روح تنگ کرتی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس علاقے میں گھاس اور ہریالی سب سے زیادہ ہے۔ مجبوراً پاوندوں کو یہاں ڈیرے لگانے پڑتے ہیں لیکن جب تک وہ یہاں رہتے ہیں' سلطان والی کہانی کا اثر ان کے دماغوں پر رہتا ہے۔ کسی بستی یا گاؤں سے بھاگا ہوا کوئی شادی شدہ جوڑا یا تنہا عورت ان ڈیروں پر آ جائے تو اسے نہ صرف ذرا پناہ مل جاتی ہے بلکہ اس کی حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا پتا نہیں تھا۔ ہم تو بھوک پیاس کے مارے' اتفاق سے اس طرف آ نکلے تھے۔ اب دیکھ لو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ ملک بشر گل نے ہمیں نہ صرف یہ جھونپڑا دیا ہے بلکہ اس میں دو مہینے کا راشن بھی ڈال دیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کا ارادہ ہے کہ وہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے گا۔ قبیلے والے افغان علاقے سے خشک میوہ' تمباکو' پیاز اور گھی وغیرہ لاتے ہیں اور یہ سامان کوہاٹ' ٹل' بنوں میں لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ ملک کا کہنا ہے کہ وہ اس تجارت کے لیے مجھے کچھ رقم قرضے کے طور پر دے سکتا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ ہم کسی غیر علاقے اور غیر قوم کے لوگوں میں ہیں۔ بالکل بہن بھائیوں جیسا سلوک ہے۔ میں اس سے پہلے جاگیردار کے کام سے لنڈی کوتل جاتا رہا ہوں بلکہ ایک دفعہ پورے چھ ماہ وہاں رہا تھا۔ مجھے پشتو کی سوجھ بوجھ ہے۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ یہاں رہ کر پوری ہو جائے گی۔ انشاءاللہ چند ماہ تک پورا پختون بن جاؤں گا میں۔"

پہلوان نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا لیکن نجانے کیوں میں اس پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک فاصلہ سا بدستور میرے اور اس کے درمیان موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہو۔ نجو کی خاطر جھوک ضامن چھوڑنے والی بات بھی میرے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سانولی سلونی نجو کو اپنی منگ بتا رہا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تائے کی موت کے بعد دونوں گھرانوں کے تعلقات پہلے والے نہیں رہے تھے پھر ایک دم وہ نجو کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر بھی تیار ہو گیا تھا۔ میری نگاہ میں پہلوان کا کردار کچھ ڈانوا ڈول سا ہو گیا تھا لہٰذا پہلوان کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے میں نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ اپنی گفتگو میں عیسیٰ جان اور شنکر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس کے بجائے یہ بتایا کہ میں اپنے چند دیرینہ ساتھیوں کے ساتھ شکار پر نکلا ہوا ہوں۔ ارادہ تھا کہ اگر کوئی اچھا سبب بن گیا تو غیر علاقے میں ہی رہ جاؤں گا۔ بہن کے سوا دنیا میں اور میرا کون ہے۔ موقع دیکھ کر اسے بھی یہاں بلا لوں گا اور اللہ اللہ خیر صلا۔

پہلوان نے میری روداد دھیان سے سنی۔ کہیں کہیں سوالات بھی کیے۔ میں اپنی طرف سے اس کی مکمل تسلی کراتا رہا۔ آخر میں وہ بولا۔ "لنگر خان کہتا ہے کہ تم اوپر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ کسی کو تاڑ رہے ہو۔" لنگر خان سے پہلوان کی مراد وہی شخص تھا جس نے مجھ پر کتا چھوڑا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں... دراصل کسی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ جھاڑیوں میں کوئی موجود ہے۔"

"کس کا پیچھا کر رہے تھے؟" پہلوان نے پوچھا۔

"تمہارا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ حیران ہو کر میرا چہرہ تکنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے میں نے بلندی سے اسے بستی کی طرف آتے دیکھا اور کیسے چار میل تک خاموشی سے اس کا تعاقب کیا۔ اب ساری بات پہلوان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام سے باگڑ خیل نامی بستی تک گیا تھا۔ واپسی میں ایک ڈھلوان پر گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ لنگڑانے لگا۔ مجبوراً اسے کھینچ کر واپس لانا پڑا۔

ہماری اس طویل گفتگو کے دوران جھونپڑے کے عقبی حصے میں کھانا تیار ہوتا رہا تھا۔ خوشبو نے کئی پینترے بدلے تھے اور اب پلاؤ اور قورمے کی خوشبو فائنل ہو چکی تھی۔ ذرا دیر بعد جو کچھ پردے کے پیچھے تھا وہ سامنے آ گیا۔ نجو گول ٹرے میں کھانا سجائے اندر داخل ہوئی۔ گھٹنے دری پر ٹکا کر اس نے آہستگی سے کھانا سامنے رکھ دیا۔ میری نگاہ بے اختیار اس کے گریبان کی طرف اٹھی لیکن گریبان تک پہنچنے سے پہلے ہی جھک گئی۔ معلوم نہیں اس جھونپڑے میں پہلوان اور نجو میں کیا رشتہ تھا مگر وقت کا تقاضا یہی تھا کہ اب نگاہ کو قابو میں رکھا جائے۔ نجو کے سیمابی جسم سے توجہ ہٹانے کے لیے میں پلاؤ کی چمک دمک اور قورمے کے رنگ روپ میں کھو گیا۔ ساتھ میں کوئی حلوہ قسم کی ڈش بھی تھی۔ اس کے علاوہ

میری سب سے بڑی کمزوری ٹماٹر اور پودینے کی سلاد تھی۔ معلوم نہیں نجو نے اس دور افتادہ خیمہ بستی میں یہ سارا تکلف کیسے کر لیا تھا۔ پہلوان تو کھاتے ہی پیٹ بھر کر ہیں میں نے بھی پہلوانوں کی طرح کھایا۔ کھانے کے دوران بھی ہم دونوں میں مسلسل گفتگو ہوتی رہی۔ کھانے کے فوراً بعد نجو نے قہوہ سرو کر دیا۔ جھونپڑے کے وسط میں واقع عجیب وضع کی انگیٹھی اب دہکائی جا چکی تھی۔ انگیٹھی کی خوشگوار حرارت میں بیٹھ کر قہوہ پینے کا لطف آ گیا۔ نجو گاہے گاہے آتی جاتی رہی۔ اس کا چلنا پھرنا بھی شاعری تھا تاہم یہ ایسی شاعری تھی جس میں گورے رنگ کا ردیف قافیہ نہیں تھا۔ یوں یہ آزاد شاعری بن گئی تھی اور عام شخص اس کی لطافت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ خبر نہیں پہلوان اور اس آزاد شاعری کے درمیان کیا رشتہ قائم ہو چکا تھا' میں اس بارے میں سوال کرنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ وہ خود اسی طرف آ گیا۔ دبے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں دراصل کسی مولوی صاحب کو تلاش کرنے گیا تھا باگڑ خیل۔ لیکن وہاں بھی بات نہیں بنی۔"

"کیا بات بنانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ "حبیب یار! تم پڑھے لکھے بندے ہو' ہم سے تو زیادہ عقل ہے تمہاری۔ ایک مسئلہ تو حل کرو۔ یہ بتاؤ کہ مرد اور عورت کیا خود اپنا نکاح نہیں کر سکتے۔"

"یہ نکاح کی بات درمیان میں کہاں سے آ گئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "یہی تو ساری بات ہے حبیب یار۔ دراصل ـــــ ہم دونوں رستے میں تو کہیں نکاح کر ہی نہیں سکے۔ افراتفری میں یہاں پہنچے اور یہاں ہمیں بتانا پڑا کہ میاں بیوی ہیں لہٰذا یہاں آ کر بھی نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ اب۔ اب نجو ہر وقت زور دیتی ہے کہ ہمارا نکاح ہونا چاہیے ورنہ ـــ یہ سب کچھ گناہ ہے۔ اب بتاؤ۔۔۔ اس جنگل میں نکاح خواں کہاں سے ڈھونڈوں' میں اور اگر مل بھی جائے تو کیا پتا وہ نکاح پڑھائے یا نہیں۔ پھر ضروری نہیں کہ یہ بات راز بھی رہے۔ ہم جھوٹے پڑ گئے تو ملک بشر گل ہمیں لات مار کر بستی سے باہر کرے گا اور یہ بھی بڑی بات نہیں کہ جرگے والے کوئی پھڈا ہی ڈال دیں۔"

پہلوان کی بات سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اور نجو یہاں میاں بیوی کی طرح رہ رہے ہیں۔ اب مزید وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک نکاح کا مسئلہ تھا تو میں اس بارے میں بھلا کیا مدد کر سکتا تھا۔ میری معلومات بس اتنی ہی تھیں کہ نکاح دو عاقل' بالغ اور مسلمان گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا یعنی نکاح خواں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تین مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دو عورتیں موجود ہوں تو پھر دو مرد کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ کی رعایت کم از کم میرے علم میں نہیں تھی۔ میں نے پہلوان کو سمجھایا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا وہ خیال کر رہا ہے۔ فی الحال وہ دونوں اس مسئلے کو نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔ اس دوران جھونپڑے سے باہر کسی شخص نے پہلوان کو پکارا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

چند لمحے بعد اس نے اندر آ کر کہا۔ "حبیب یار! میں ملک بشر گل کے پاس جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ اتنی دیر تم نجو سے باتیں شاتیں کرو۔"

اس نے نجو کو مجھ سے پردہ نہیں کروایا تھا اور نہ بات چیت کے سلسلے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ چلا گیا تو نجو میرے پاس آ بیٹھی۔ تاہم حویلی کے "بیٹھنے" اور اس "بیٹھنے" میں بہت فرق تھا۔ اس نے چادر سے سر ڈھک رکھا تھا اور بیٹھنے کے انداز سے متانت جھلکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "نجو! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کی وجہ صرف اور صرف میں ہوں۔"

ایک دم وہ بھی آزردہ ہو گئی۔ جیسے حویلی کے عقوبت خانے میں گزرے ہوئے عذاب ناک شب و روز اس کی نگاہوں میں گھوم گئے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ رو پڑے گی' پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دھیمی آواز میں بولی۔ "حبیب جی! میری جان بھی آپ کے کام آ جاتی تو میرا خوش بختی تھی۔"

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو نجو! میں اس قابل تو نہیں ہوں کیا بڑا پن دیکھا ہے تم نے مجھ میں؟"

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بات بدل کر بولی۔ "آپ یہاں آ گئے ہیں تو اب واپس نہ جائیں۔ اپنی بہن کو بھی یہاں بلا لیں۔ میں سچ کہتی ہوں' اس میں آپ کی بہتری ہے۔"

میں نے کہا۔ "لگتا ہے یہاں آ کر اور شہباز کے ساتھ رہ کر تم خوش ہو۔"

اس نے پلکیں جھپکا کر کہا۔ "خوشی تو مقدر سے ہے جی پر اتنا ضرور ہے کہ حویلی کے بھانبڑ سے دور ہو کر سکون مل گیا ہے۔ وہ جاگیر نہیں ہے جی' ایک دوزخ ہے۔ اللہ دیری دشمن کو اس میں نہ پھینکے۔"

"تمہیں ماں باپ تو یاد آتے ہوں گے ناں؟" میں نے کہا۔ "بھائی بہن' گھربار' ہم عمر سہیلیاں سب کچھ اتنی جلدی بھول تو نہ گیا ہو گا؟"

وہ آہ بھر کر بولی۔ "بہن تو ہے کوئی نہیں جی' ایک بھائی تھا' وہ بھی جاگیردار کے ہاتھوں مارا گیا۔ ابے کو پھانسی ہو گئی تھی۔ ایک ماں ہے' وہ بھی نہ ہونے جیسی۔ ازل کی بیمار ہے' ہر وقت افیم کھا کر پڑی رہتی ہے۔ ہاں گاؤں کی گلیاں' بازار ضرور یاد آتے ہیں۔ ساری عمر وہیں گزری ہے ناں۔"

میں نے پوچھا۔ "شہباز سے تمہاری منگنی تمہارے والد کے مرنے سے پہلے ہو گئی تھی؟"

"جی حبیب جی۔" نجو نے شہباز کے بیان کی تصدیق کی۔ "مجھے ہوش ہی نہیں ہے کہ کب کی بات ہے۔ میرے ابے کے پاس کافی زمینیں تھیں۔ کھاتا پیتا زمیندار تھا۔ شہباز کے گھر والے اتنے سکھی نہیں تھے۔ تیل کا ڈپو تھا ان کا' بس گزر ہو جاتی تھی۔ اس وقت شہباز کی ماں کہا کرتی تھی۔ کیا ہوا' کڑی کا رنگ ذرا پکا ہے تو شکل والی تو ہے ناں۔ میری ماں کہا کرتی تھی۔ دیکھنا جتنے' بڑی ہو کر میری کڑی دودھ کی طرح سفید نکلے گی۔ لیکن پھر میرے ابے پر قتل پڑ گیا۔ تین چار سال کے اندر تھانے کچہریوں کے چکر میں ساری زمینیں بک گئیں۔ جو کچھ تھا ہمارے پاس' ابے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد چاچی جتنے نے کبھی ہمارے گھر کی دہلیز پار نہیں کی۔ بس میری ماں ہی کبھی کبھار اسے مل آتی تھی۔ جب وہ بیمار ہو گئی تو یہ تعلق واسطہ بھی ختم ہو گیا۔ بھائی مجھ سے چھوٹا تھا۔ ماں کے ساتھ ساتھ اس کا بوجھ بھی مجھ پر تھا۔ مجھے حویلی میں نوکری کرنی پڑی پھر ایسا ہوا کہ جس بھائی کے لیے خوار ہوتی تھی وہ بھائی بھی نہ رہا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ جاگیرداروں نے اس بدنصیب کو جیلے میں بھگا بھگا کر مار دیا تھا۔" بھائی کے ذکر پر نجو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ تھوڑی دیر ناک سے سوں سوں کی آوازیں نکالتی رہی۔ پھر آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ "شہباز نہ ہوتا تو اب میں بھی جیلے کے قبرستان میں ہوتی۔ یہ مجھے اپنی جان پہ کھیل کے یہاں لایا ہے۔ اب۔ اب۔" کچھ کہتے کہتے وہ پھر رک گئی' پلکوں پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔

"ہاں۔ ہاں کہو۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔

وہ بولی۔ "شہباز مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم سردار بشر گل کے ساتھ افغانستان نکل جائیں گے۔ تھوڑے دنوں میں سردار اپنی بکریوں کا ایک اجڑ (ریوڑ) بیچ رہا ہے۔ اس نے شہباز کو رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ شہباز کہتا ہے' وہ سردار کے چھوٹے بھائی رستم کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ وہ افغانستان سے سودا لا کر یہاں منڈی میں بیچیں گے' اس میں بڑا منافع ہوتا ہے۔ اس نے میرے لیے چاندی کے زیور بنوا رکھے ہیں اور چند ریشمی جوڑے بھی لایا ہے۔ کہتا ہے' میں تجھے وہاں شہزادی بناؤں گا اور ایک سال تک کوئی کام کاج تجھ سے نہیں لوں گا۔" آخری جملہ جیسے روانی سے نجو کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ شرما گئی۔ خون کے دباؤ سے اس کا سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہو گیا۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "بستی والوں کو تو تم دونوں نے یہی بتایا ہے کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اب پھر نکاح کرو گے تو وہ کیا کہیں گے؟"

نجو کا سر ندامت سے جھک سا گیا۔ دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ "یہی تو الجھن ہے۔ شہباز یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے آج بھی کہیں گیا ہوا تھا۔ اب تک میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ پتا نہیں مولوی صاحب نے کیا بتایا ہے؟"

سچ کی بات نہ میں کر سکتا تھا' نہ نجو کرنے کی جرأت رکھتی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ دونوں اس بستی میں آ کر "من و تو کا فاصلہ" مٹا چکے تھے۔ نجو جیسی بے سہارا لڑکیوں کو مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے' چاہے وہ انہیں اپنی آبرو کی قیمت پر ہی ملے۔ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے پہلوان کو سونپ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ گھر گرہستی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی پہلوان واپس لوٹ آیا۔ اس نے بتایا کہ سردار کے پاس لنگر خان موجود تھا۔ اس نے اپنے کتے کا ریچھ ڈالا ہوا تھا۔ وہ السیشن کتا اس نے دو ماہ پہلے کسی پنتس سے ایک ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اب وہ رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔ بڑی بحث تکرار کے بعد پانچ سو روپے ہرجانہ طے ہوا ہے۔ یہ اطلاع دے کر پہلوان سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میری جیب میں وہی دو سو روپیہ تھا جو تلاشی کے دوران برآمد ہوا تھا اور بعد میں سردار بشر گل نے مجھے لوٹایا تھا۔ میں نے یہ دو سو روپے پہلوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو یہی روپے ہیں' باقی ڈیرے پر ہیں' صبح تمہیں لا دوں گا۔"

پہلوان نے ازراہِ تکلف یہ روپے لینے سے انکار کیا' تاہم میرے اصرار پر رکھ لیے۔ باقی تین سو روپیہ اس نے اپنے جستی ٹرنک میں سے نکالا۔ اس ٹرنک میں زرق برق زنانہ لباس بھی رکھے تھے۔ اس کے علاوہ زیور کے ایک ڈبے کی جھلک بھی دکھائی دی۔ نجو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ پہلوان اس کے چاؤ پورے کرنے کی فکر میں تھا۔

دو پانچ سو میٹر لے گیا اور سردار کو رسے کر جلد ہی واپس آگیا۔ اب رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔ کوہ سفید کو چھو کر آنے والی یخ بستہ ہوا جھونپڑوں اور اونی خیموں پر یلغار کر رہی تھی۔ کبھی کبھی دور سے کسی گیدڑ یا بھیڑیے کی چلاتی ہوئی آواز بلند ہوتی اور فضا میں ایک سنسنی سی بھر دیتی۔ میں اور شہباز پہلوان لحاف اوڑھ کر انگیٹھی کے قریب نیم دراز ہو گئے۔ پہلوان نے اپنی رائفل لوڈ کر کے سرہانے رکھ لی اور مجھے بھی ایسا کرنے کا مشورہ دیا۔ خشک خوبانیوں اور چنے سے بھری ہوئی تھال ہمارے درمیان تھی اور انگلیوں میں سگریٹ تھے۔ پہلوان تو چین اسموکر تھا۔ سگریٹ مٹھی میں بند کر کے بڑا ہولناک کش لگاتا تھا۔ وہ لباس اور ڈیل ڈول کی حد تک پہلوان تھا جب کہ باقی وہ ساری قباحتیں اس میں موجود تھیں جو کسی پہلوان کو تھوڑے ہی عرصے میں "سابق پہلوان" بنا دیتی ہیں۔

پہلوان نے کش لگا کر کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب ہم نے اٹک جیل کی گاڑی پر حملہ کیا تھا۔ یہ وہی ایمبولینس تھی جو تمہیں لے کر اسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ اس میں کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ ہم تو صرف ایمبولینس کے ڈرائیور نادر علی کو سبق سکھانے آئے تھے۔ یہ نادر علی کہنے کو تو ایک ڈرائیور تھا لیکن بڑا پھنے خاں اور پھڈے باز بندہ تھا' اور تو اور جاگیردار تک کو آنکھیں دکھا جاتا تھا' کہتے ہیں' جیل میں رہ کر مجھ سے ہیر نہیں ڈالا جاتا۔ وہ جاگیردار کی زمینوں میں رہ کر اس کے سامنے اکڑتا تھا۔ جاگیردار نے اسے اغوا کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہم نے ایمبولینس کو روکا تو اندر بیٹھے ہوئے پلسیوں نے ہم پر فائر کھول دیا۔ ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ پولیس والے گاڑی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ نادر علی بھی غائب ہو گیا۔ صرف تم اندر پچھلی سیٹ پر پڑے رہ گئے۔ تم بے ہوش تھے اور چھوٹی رنگا ہو رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ ہم جیل کی ایمبولینس تمہارے سمیت اپنے ساتھ لے گئے پھر کچھ آگے جا کر ایمبولینس تو چھوڑ دی مگر تمہیں بہنگ سے لے جا کر جاگیردار کی حویلی میں پہنچا دیا۔ اسپتال میں ڈاکٹر رحمان نے تمہارا علاج شلاج کیا اور تمہیں ہوش آگیا۔ قادر زماں نے اٹک جیل سے پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ تمہارا نام جمالی استاد ہے اور چند سال پہلے تم نے بڑی تڑتھلی ڈالی ہوئی تھی۔ جاگیردار نے کہا۔ یہ ہمارے کام کا بندہ ہے' اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو۔ بعد میں پتا چلا کہ جاگیردار نے تمہاری سگی بہن کا کھوج لگایا ہے اور اسے بھی اغوا کرا کے حویلی میں تاڑ لیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ تمہیں پھنسایا جا رہا تھا۔ چند دن بعد لندن کی بات سامنے آگئی۔ جاگیردار نے تمہیں وڈے جیلر ساہی کو ٹھکانے لگانے کے لیے لاہور روانہ کر دیا۔" پہلوان کی باتیں میرے لیے بہت کار آمد تھیں۔ آج کئی ماہ بعد میرے اغوا کی بات صاف ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا' قادر زماں نے مجھے کسی پلاننگ کے تحت اغوا نہیں کرایا تھا۔ پہلے اغوا ہوا تھا' پلاننگ بعد میں ہوئی تھی۔ شنکر کے ساتھ جاگیردار قادر زماں کا تعلق تھا اور ساہی صاحب ہاتھ دھو کر شنکر کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ شنکر آزادی سے کام نہیں کر پا رہا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ اس شخص کو راستے سے ہٹا دیا جائے جو ہر قدم پر رکاوٹ کھڑی کر رہا ہے۔ قادر زماں نے یہ کام مجھے سونپا۔ یوں وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ساہی صاحب راستے سے ہٹ جاتے اور میں بھی ایک بار پھر قاتل بن کر قادر زماں کی پناہ کا طلب گار ہو جاتا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ساہی صاحب اور میں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ الفردوس میں میرے اور ساہی صاحب کے درمیان سے کئی پردے اٹھ گئے اور مجھے اندازہ ہوا کہ شنکر ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے لیکن کئی اہم ترین سوالات ابھی تک حل طلب تھے۔ مثلاً جیل میں مجھ پر قاتلانہ حملے کرانے والا کون تھا؟ کنکریٹ سے بھری ہوئی گڑیا' نور محمد کی موت اور میری گردن میں دھنسنے والا آہنی تار' میں کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔ پھر شنکر شنکرا کی یہاں موجودگی بھی ابھی تک معما تھی۔ وہ اپنی تمام تر نحوست سمیت کس مقصد سے یہاں دندنا رہا تھا؟ اس فقرے کی بازگشت بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو جھنگ کے قریب ایک پرانی حویلی کے کمرے میں کہا گیا تھا اور سادہ لوح عطا محمد نے سنا تھا۔ "ڈریں وہ جو مریں گے' جن کی لاشیں سڑکوں پر ڈھیر ہوں گی اور قبرستانوں میں اکڑیں گی۔" اس زہرناک فقرے کا تعلق کس سے تھا اور یہ الفاظ ناصر نامی شخص کے ساتھی کی زبان سے کیوں ادا ہوئے تھے؟

وہ ساری رات میں نے پہلوان کے ساتھ گپ شپ کرتے گزار دی۔ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نجو امید سے ہے۔ یعنی محبت بے نشان نہیں رہی تھی۔ میں نے بڑے محتاط طریقے سے عیسیٰ جان کا ذکر کیا اور پہلوان سے سن گن لینے کی کوشش کی کہ وہ اس بارے میں کیا جانتا ہے۔ پہلوان نے اعتراف کیا کہ اس نے عیسیٰ جان کا نام سن رکھا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ عیسیٰ جان وارداتیں کرنے کے بعد قبائلی علاقے میں روپوش ہو جاتا

ہے۔ تاہم اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عیسیٰ جان آج کل یہیں زرے مشت کے علاقے میں ہے۔ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے پہلوان نے بتایا کہ عیسیٰ جان کو عورتوں کا شکاری کہا جاتا ہے۔ خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کو پھسلانے اور زبردستی خراب کرنے میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ پہلوان کو ائر ہوسٹسوں والے واقعے کا بھی پتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ان میں سے ایک ائر ہوسٹس بعد ازاں پشاور کے چکلے میں پائی گئی تھی۔ میری آنکھوں میں مالک محمد کی صورت گھومنے لگی اور پھر اس کے ساتھ نبیلہ کا انجانا سراپا بھی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انہی قاتل نشیب و فراز میں اس کی آبرو اور جان گئی تھی۔ اس سنگلاخ ویرانے میں معلوم نہیں وہ کتنا چیخی ہوگی' کتنا روئی ہوگی' اپنے معصوم بچوں کو اس نے کیسے کیسے یاد کیا ہوگا اور پکارا ہوگا۔ پھر وہ اپنی تمام بے بسیاں سمیٹ کر ایک گہرے کھڈ میں جا گری تھی' کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ اس کھڈ میں گرنے والی یہ پہلی عورت نہیں تھی اور نہ ہی آخری تھی۔ معلوم نہیں کب سے جرائم پیشہ لوگ قانون کے لمبے ہاتھوں کو کاٹ کر ان پہاڑوں میں پناہ لیے رہے ہیں۔ ان گنت برسوں سے "انصاف کی دوشیزہ" ان نشیب و فراز میں مسلسل سسکتی رہی ہے اور "لاقانونیت کا ریو" اس کے گرد برہنہ رقص کرتا رہا ہے۔ اس ملک میں' ان ہی سرحدوں کے اندر چند مخصوص علاقوں میں پہنچ کر مجرم ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال ہر غور کرنے والے کے ذہن میں چیخ بن کر ابھرتا ہے اور دیر تک سماعت میں گونجتا رہتا ہے۔

لالٹین کی خوابناک روشنی میں پہلوان اور میں مسلسل مصروف گفتگو رہے۔ رات بھیگتی چلی گئی اور آخرکار اس جھونپڑے سے باہر صبح کاذب کے آثار نظر آنے لگے۔ مجھے رہ رہ کر ساتھیوں کا خیال آ رہا تھا۔ میں کسی کو بتائے بغیر یہاں چلا آیا تھا اور اب میری "گمشدگی" کو قریباً پندرہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ یقینی بات تھی کہ سب لوگ میرے لیے فکرمند ہوں گے' خاص طور پر ایس پی برکت کا تو میری "جدائی" میں برا حال ہو رہا یقینی تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ پولیس والوں کا مخصوص گانا "آجا سورے بالما تیرا انتظار ہے" گا رہے ہوں اور تصوراتی تصور میں مجھ سے مکالمات کر رہے ہوں۔ میں نے سوچا کہ اندھیرا چھٹتے ہی یہاں سے نکل چلوں گا اور سات آٹھ بجے تک پڑاؤ میں پہنچ جاؤں گا تاکہ میری وجہ سے آج کا پروگرام درہم برہم نہ ہو لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے "میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا" یہاں بھی قدرت کاملہ نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ ساڑھے تین چار کا وقت تھا جب بستی کے کتے زور و شور سے بھونکنے لگے۔ جواب میں کچھ فاصلے سے چند اور کتوں نے بھی اچانک بھونکنا شروع کر دیا۔ میرے ساتھ ساتھ پہلوان کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ پہلوان نے اٹھ کر جھونپڑے کا کھڑکی نما در کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔ رائفل اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ رفتہ رفتہ بولی کتوں کی مخصوص آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ یہ یقیناً کبیر علی شاہ کے کتے تھے۔ نجو نے میری ادھڑی ہوئی جیکٹ سوئی دھاگے سے مرمت کر دی تھی اور قمیص کو بھی گزارے لائق کر دیا تھا۔ میں پہلوانی لباس اتار کر جلدی جلدی اپنی اوقات میں آیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پہلوان میری عجلت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھی ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے ہیں۔ ہماری آوازیں سن کر نجو بھی عقبی حصے سے آگئی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ہماری طرح وہ بھی نہیں سوئی۔ "صیب جی! آپ جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"شاید جانا ہی پڑے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن گھبراؤ مت' ابھی ہم یہیں ہیں۔ کل یا پرسوں دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

میرے جواب نے نجو کو مطمئن کر دیا۔ وہ میرے شکاری بوٹ لے آئی۔ انہیں دھو کر اور صاف کر کے اس نے بالکل چمکا دیا تھا۔ میرے بوٹ پہنتے پہنتے جھونپڑے کے دروازے پر دستک ہو گئی۔ ایک شخص نے پہلوان کو پکارا۔ پہلوان نے دروازے پر جا کر چند باتیں کیں اور آ کر مجھے بتایا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ کچھ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور اب سردار بشر گل کے پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے پہلوان کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہیں جھونپڑے میں اس سے رخصت ہو کر سردار بشر گل کے جھونپڑے پر پہنچ گیا۔ میری نگاہ سب سے پہلے انسپکٹر باجوہ پر پڑی' اس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل نذیر بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ کبیر علی شاہ' اس کے دو خادم اور خاصہ دار فورس کے پانچ جوان بھی اس پارٹی میں شریک تھے۔ مجھے دیکھ کر انسپکٹر باجوہ کے چہرے پر کامیابی کی چمک نمودار ہو گئی۔ اس وقت ہم شکاریوں کے بھیس میں تھے لہٰذا سیلوٹ وغیرہ کا چکر نہیں تھا۔ انسپکٹر باجوہ نے اپنے افسرانہ غصے پر قابو پا کر قدرے درشتی کے لہجے میں کہا۔ "بھلے مانس! یہ کیا کیا تم نے۔ ہمارا تو آدھا خون خشک ہو گیا ہے تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔"

"بس باجوہ صاحب' حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ ابھی

بتاتا ہوں آپ کو۔"

انسپکٹر باجوہ اور کبیر علی شاہ کی نگاہیں میرے چہرے کی خراشوں اور خستہ حال جیکٹ پر تھیں۔ میں نے پہلوان کو منع کیا تھا لیکن وہ پھر بھی میرے پیچھے موقعے پر پہنچ گیا۔ سردار بشر گل کے ساتھ پہلوان کی چند باتیں ہوئیں۔ میں نے پہلوان کے ذریعے سردار کا شکریہ ادا کیا' جواباً سردار نے پہلوان کی وساطت سے سب کو قہوے کی دعوت دی۔ کبیر علی شاہ نے مقامی زبان میں پائندہ سردار سے چند جملوں کا تبادلہ کیا۔ غالباً اس نے معذرت کی تھی اور کہا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنے پڑاؤ میں واپس پہنچنا چاہتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم پائندہ بستی سے رخصت ہو کر اپنے پڑاؤ کی طرف گامزن ہو گئے۔ دو فرلانگ کا فاصلہ انسپکٹر باجوہ نے بمشکل طے کیا پھر اپنی پوری افسرانہ شان سے مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ "ہاں بھئی! یہ کیا تماشا ہے۔ کچھ پتا ہے کتنا خوار ہوئے ہیں ہم۔ ایس پی صاحب نے ایک ایک بندے کو سمجھایا تھا کہ بغیر بتائے کوئی ادھر ادھر نہ ہو اور سب سے زیادہ زور تم پر دیا تھا۔ کچھ یاد ہے تمہیں؟"

"بالکل یاد ہے جناب۔" میں نے ماتحتانہ انکسار سے کہا۔ "لیکن موقع ایسا تھا کہ میں کسی کو نہ جگا سکا اور نہ بتا سکا۔ بس ایک دم ہی وہ خانہ خراب سامنے آ گیا تھا۔"

"کون آ گیا تھا سامنے؟"

"وہی جناب' جس سے ابھی ملے ہیں آپ۔ وہ لال کرتے اور دھوتی والا۔ پہلوان شہباز کہتے ہیں اسے۔"

"کون ہے یہ؟"

"بڑے کام کی شے ہے جی۔ میں نے یونہی چار میل اس کے پیچھے جوتے نہیں توڑے۔ یہ بندہ جھوک ضامن کا رہنے والا ہے۔ جاگیردار کی حویلی میں کام کرتا رہا ہے۔ اس کے خاص کارندوں میں شمار ہوتا تھا اس کا۔" انسپکٹر باجوہ کا تنا ہوا چہرہ نرم پڑ گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ اشتہاری بھیٹی جان اور جاگیردار قادر زماں میں ٹانکا ہے۔ یہ پہلوان اس ٹانکے کا کھلا ثبوت ہے۔"

انسپکٹر باجوہ نے پوچھا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جی۔" میں نے کہا۔ "رجال ساہی صاحب کو پتا ہے سب کچھ۔ انہوں نے ایک بار سادہ لباس میں مجھے قادر زماں کی حویلی بھیجا تھا۔ وہیں سے ہماری جان پہچان ہوئی تھی۔" انسپکٹر باجوہ کو ساہی صاحب سے میرے خصوصی تعلقات کا علم تھا لہٰذا وہ مرعوب سا ہو کر گردن سہلانے لگا۔

کبیر علی شاہ نے پوچھا۔ "کوئی کام کی بات معلوم ہوئی ہے اس سے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل معلوم ہو گا جی' کیوں نہیں معلوم ہو گا لیکن تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔ بندے کو ذھب پر بھی تو لانا ہوتا ہے۔"

"یہ ذھب کیا ہوتی ہے؟" کبیر علی شاہ سے نہ رہا گیا۔

"یہ ہوتی نہیں جی۔ ہوتا ہے۔ جیسے آپ منہ میں انگلی ڈال کر نسوار کو اس کے ٹھکانے پر لاتے ہیں یا پنجابی بھائی لسی پیتے ہوئے گلاس ہلا کر مکھن آگے کی طرف کرتے ہیں۔ تو اسے کہتے ہیں ذھب پر لانا۔"

بات کبیر علی شاہ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "اگر ایسا معاملہ تھا تو تم ادھر ہی رہتا۔ آرام سے اس کو ذھب پر لاتا' ادھر کون سا کام رکا ہوا ہے تمہارے بغیر۔"

میں نے کہا۔ "یہ بات آپ نے پہلے فرمائی ہوتی تو میں وہاں سے رخصت ہی نہ ہوتا۔ اب تو کچھ عجب سا لگے گا واپس جاتے ہوئے۔"

انسپکٹر باجوہ نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ ہم نے سفر جاری رکھا اور طلوع آفتاب کے تھوڑی ہی دیر بعد پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ یہاں ایس پی صاحب کا پارا ساتویں آسمان کی خبر لا رہا تھا۔ لگتا تھا' صرف مرغابی کو شوٹ کرنے کی جو قسم انہوں نے کھا رکھی ہے' آج توڑ دیں گے۔ بات تھی بھی غصہ دلانے والی۔ میں نے بڑی ڈھٹائی سے دوسری بار ان کے غیظ و غضب کو للکارا تھا۔ پہلے شیخوپورہ میں اسی طرح کسی کو بتائے بغیر غائب ہو گیا تھا اور اب یہاں یہ حرکت کی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چنگھاڑے۔ "اوئے بھوتنی دے۔" اس کے بعد فقرے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں تھا جسے یہاں لکھا جا سکے۔ میں اس لیے یہ سب کچھ سہہ گیا کہ یہ فقرہ میرے لیے نہیں ہیڈ کانسٹیبل احسان الٰہی عرف گجرات کے لیے تھا۔ اس نازک موقع پر انسپکٹر باجوہ نے میری وکالت کرتے ہوئے ایس پی کے کان میں کھسر پھسر شروع کی۔ ظاہر ہے' میری کارگزاری کے متعلق بتایا ہو گا۔ ایس پی کے غصے کا چڑھا ہوا دریا دھیرے دھیرے اترنے لگا۔ یہاں تک کہ چہرے کے مسخ شدہ نقوش اصل حالت میں آ گئے۔ انہوں نے مجھے "اوئے لمبو" کہہ کر بلایا تو میں سمجھ گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

اگلے دو روز ہم نے قریبی پہاڑیوں میں گھومتے اور شکار کھیلتے گزار دیے۔ صبح سویرے صوبے دار صاحب کے

باورچی لمبی شمی کے پراٹھے' مکھن اور تلے ہوئے دیسی انڈے رلا کر ناشتے رانوں میں رکھ دیتے' ہم رائفلیں سنبھالتے اور کتوں کے پیچھے پیچھے نشیب و فراز میں گم ہو جاتے۔ کتوں کا کیا ہوا شکار ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ وہاں کرن سے ہرنل اور ہرن گھوم رہے تھے' بس خرگوش' سیہ' بجو یا گوہ وغیرہ ملتے تھے۔ ایک دو گیدڑ بھی کتوں کے ہتھے چڑھے۔ اس مارا ماری سے بس کتوں کا پیٹ بھر جاتا تھا اور ہم "جنگلی قانون" کے عملی نفاذ کا نظارہ کر لیتے تھے۔ ہاں رائفل کے ذریعے ہم جو پرندے گراتے تھے ان کا گوشت کھانے کے قابل ہوتا تھا اور ہم کھاتے بھی تھے۔ دوران شکار مالک محمد کا فراہم کردہ نقشہ ہمہ وقت کبیر علی شاہ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہ اس بات کی تصدیق کر چکا تھا کہ ڈھوکی تالاب کے نواح میں "ایس" کی شکل میں بل کھاتی ہوئی کھائی وہی ہے جس کی نشاندہی تانگے میں کی گئی ہے۔ اس کھائی سے آگے وہ ایک آبی گزرگاہ اور پہاڑی درے کا کھوج بھی لگا چکا تھا۔ اگر اس پیش رفت کو درست تسلیم کر لیا جاتا تو ہم اس مقام سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں چند ماہ پہلے بھیٹی جان اور مالک محمد کے درمیان زوردار جھڑپ ہوئی تھی اور دونوں طرف کے دو دو آدمی کام آئے تھے۔ مالک محمد کو یقین تھا کہ بھیٹی جان کا ڈیرا جھڑپ والے مقام سے زیادہ دور نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جھڑپ ڈیرے پر ہی ہوئی ہو۔ ٹل شہر سے ہم ایک ایسے شخص کو بھی ساتھ لے آئے تھے جو اس خونی جھڑپ میں مالک محمد کی طرف سے شریک ہوا تھا۔ یہ ایک سیدھا سادہ وزیرستانی لشکری تھا۔ رقم لے کر وہ کسی کی طرف سے بھی لڑ سکتا تھا۔ تجربے کے بعد پتا چلا کہ وہ راستہ کھوجنے کے سلسلے میں ہماری کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔

کسی ویرانے میں شب و روز بسر کرنا ایسا آسان نہیں ہوتا جیسا کہانیوں اور فلموں وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ طعام و قیام سے لے کر رفع حاجات تک اور نہانے دھونے سے سونے جاگنے تک ہر معاملے میں کشٹ اٹھانا پڑتا ہے اور اگر موسم بھی سخت ہو تو کیا ہی کہنے۔ ہماری شکار پارٹی کو بھی موسم کی سختی درپیش تھی۔ ایسی برفیلی اور کسیلی ہوا سے بہت کم میرا واسطہ پڑا ہے۔ ہڈیوں میں گودا تک جمنے لگتا تھا۔ شکاری کتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ٹانگیں تو قدرے گرم ہو جاتی تھیں مگر بالائی جسم بدستور فریزر میں لگا رہتا تھا۔ کبیر علی شاہ پشتو آمیز اردو میں بار بار ہمیں ہدایت کرتا کہ ہوا کی براہ راست کاٹ سے بچیں' خاص طور پر سر ڈھانپ کر رکھیں۔ اس کا تجربہ تھا کہ ایسے موسم میں بعض اوقات شدید قسم کا سر درد شروع ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ کو نصیحتوں کی اور ڈاکٹر کو دواؤں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ہم سب نے کبیر علی شاہ کی ہدایات پر عمل کیا اور بھلے چنگے رہے لیکن وہ خود بیمار پڑ گیا۔ شاید اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کام دکھا گئی۔ ایک شام پڑاؤ میں واپس آتے ہوئے بارش شروع ہو گئی۔ ہم سب ایک پتھریلے سائبان تلے پناہ گزیں ہوئے مگر کبیر علی شاہ اپنے ایک پیچھے رہ جانے والے ملازم کی تلاش میں نکل گیا۔ بھیگ جانے سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا اور رات ہوتے ہوتے شدید بخار نے آ لیا۔ ضروری دوائیں ہمارے پاس موجود تھیں۔ صوبے دار صاحب خود بھی "میڈیسن" سے شغف رکھتے تھے۔ پڑاؤ ہی میں کبیر علی شاہ کو ٹریٹمنٹ دی گئی۔ صبح تک بخار میں افاقہ ہو گیا۔ بندہ سخت جان تھا' اس حالت میں بھی کتوں کے پیچھے بھاگنے کو تیار تھا مگر صوبے دار صاحب نے اعلان کیا کہ آج مکمل آرام کیا جائے گا۔ ایک طرح سے یہ سب کے دل کی آواز تھی۔ "تھکاوٹ" سب کی مشترکہ مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ اپنی اپنی مجبوریاں بھی تھیں' جیسے میری مجبوری سوجا ہوا ٹخنہ تھی۔ پھندے کی کال ہوئی "چنگی" کافی تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔

اس روز پڑاؤ میں خوب ہلا گلا رہا۔ تاش کی زبردست محفل جمی۔ ساتھ ساتھ سبز چائے کا دور چلتا رہا۔ شکار کیے ہوئے گوشت کا سالن بنایا گیا اور اسپیشل پراٹھے پکائے گئے۔ شام کو ایک الغوزہ نواز نے مختلف دھنیں بجانی شروع کیں اور خاصہ دار فورس کے چار جوانوں نے روایتی رقص پیش کیا۔ رقص و موسیقی کا ماحول بنا تو خاصہ دار فورس کے ایک کم گو افسر نائیک عباس خاں کے جوہر بھی کھل کر سامنے آئے۔ وہ کلاسیکی گلوکار تھا اور اچھے راگ الاپ رہا تھا۔ مجھے ملہار کی پہچان نہیں تھی اور نہ ہی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ملہار گانے سے برسات شروع ہو جاتی ہے مگر نائیک عباس خاں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ضرور۔ اس کے مظاہرۂ فن کے دوران ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ یعنی باد و باراں کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جڑ گیا اور ایسا جڑا کہ جڑتا ہی چلا گیا۔ جمعرات کی شام کو بارش شروع ہوئی اور اتوار کی شام تک پانی کا تار نہیں ٹوٹا۔ پنجابی کی وہ کہاوت درست ثابت ہو گئی تھی کہ "جمعرات دی جھڑی' سوتر دی لڑی۔" ہم اپنے خیموں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ لگتا تھا' روز حشر تک یہ بارش برسے گی اور جنگل نگاہوں کے سامنے رہے گا۔ "جنگل اور بارش" بڑا خوبصورت تصور ہے۔ شاعر

حضرات نے اس تصور کو شعروں میں باندھا اور مصوروں نے کینوس پر ابھارا ہے مگر علی زئی کے نواح میں اس جنگلی بارش نے ہمیں الناوکا کر رکھ دیا۔

یہ اتوار کی شام کا واقعہ ہے۔ ہم ٹھیرے ہوئے خیموں میں ٹھٹھرے سمٹے بیٹھے تھے کہ نشیب سے ابھرنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کبیر علی شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ شکاری تھا اور ایسے لوگ بڑی تیز حسِ سماعت رکھتے ہیں مگر وہ اس آواز کو سُن نہیں سکا۔ غالباً کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ممکن ہے بارش کی طوالت اور کتوں کے راتب کا حساب کتاب جوڑ رہا ہو۔ خوش گلو نائیک عباس خاں بھی اس آواز سے بے خبر رہا۔ وہ خیمے کے وسط میں گیس لیمپ کے قریب گردن جھکائے افسردہ بیٹھا تھا۔ اس افسردگی کی وجہ تو یقیناً کچھ اور رہی ہوگی مگر مجھے لگ رہا تھا کہ نائیک صاحب اس وقت کو کوس رہے ہیں جب انہوں نے پکّا راگ چھیڑ کر بارش کو دعوت دی تھی۔ نائیک کے عقب میں انسپکٹر باجوہ ایسے خراٹے لے رہا تھا جیسے وہ بارش کے ساتھ شرط باندھ کر سویا تھا۔ ظاہر ہے اس نے بھی یہ آواز نہیں سنی ہوگی۔ چند لمحے بعد آواز دوبارہ ابھری۔ اس مرتبہ قدموں کی چاپ خاصی واضح تھی۔ یہ ایک سے زائد افراد تھے جو نشیب سے برآمد ہو کر پڑاؤ کی جانب آ رہے تھے۔ اب کبیر علی اور نائیک عباس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے لپک کر اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ خیمے میں موجود باقی پانچ افراد بھی ایکدم چوکس ہو گئے۔ میں نے ٹارچ تھام کر خیمے کا پردہ ہٹایا۔ ورے کے عین سامنے تین "پہاڑی" کھڑے نظر آئے۔ ان میں سے دو کے پاس کلہاڑیاں اور ایک کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ ان تینوں نے برساتیاں اوڑھ رکھی تھیں پھر بھی لباس پانی میں شرابور اور پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ رائفل بردار کے چہرے پر پڑا۔ محسوس ہوا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ہوا ہے۔ پھر ایک دم میں پہچان گیا۔ وہ پاؤندوں کے سردار بشر گل کا چھوٹا بھائی رُستم تھا۔ نجو نے اپنے جھونپڑے میں اسی رُستم کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ شہباز اس کے ساتھ مل کر کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب ساتھ والے خیمے سے ایس پی صاحب مع صوبے دار مرجان کے باہر نکل آئے تھے۔ اس کے علاوہ قریب کھڑی جیپوں سے بھی فورس کے جوان باہر جھانکنے لگے تھے۔

"کون ہے؟" ایس پی نے کڑک کر پوچھا۔

میں نے بتایا کہ پاؤندہ بستی کے لوگ ہیں۔ اس اطلاع پر ساری "شکار پارٹی" ان کے گرد اکٹھی ہو گئی۔ کبیر علی شاہ نے آگے بڑھ کر سردار کے بھائی سے مکالمہ کیا۔ کافی سنجیدہ قسم کی گفتگو تھی یہ۔ اس میں ایک دو بار شہباز کا نام بھی لیا۔ میرے کان تو اجنبی قدموں کی چاپ سے ہی کھڑے ہوئے تھے اب صورتِ حال کی سنگینی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ پھر مکالمہ ختم کر کے کبیر علی شاہ نے مجھے بتایا کہ شہباز پہلوان کل رات سے لاپتا ہے۔ اس کے جھونپڑے سے کچھ چیزیں بھی غائب ہیں جن میں ایک جستی ٹرنک اور تین چار ہزار روپے نقد ہے۔ کوشش کے باوجود ابھی تک نہ شہباز کا کچھ پتا چلا ہے اور نہ گمشدہ چیزوں کا۔

یہ اطلاع تشویش ناک تھی۔ ظاہر ہے آج دن بھر تلاش کرنے کے بعد ہی یہ لوگ میری طرف آئے تھے۔ میری طرف آنے کی وجہ بھی عیاں تھی۔ صرف چار روز پیشتر پاؤندہ بستی میں پہلوان سے ملا تھا اور اس کے جھونپڑے میں رات گزاری تھی۔ یوں پہلوان سے میری شناسائی ثابت ہوئی تھی۔ اب بستی والوں نے سوچا ہو گا کہ ممکن ہے پہلوان مجھ سے ملنے کیمپ میں پہنچا ہو۔ رُستم وغیرہ کو معلوم تھا کہ ہمارا کیمپ ڈھوکی تالاب کے پاس ہے لہٰذا وہ پانچ چھ میل کا دشوار فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ہم نے تینوں افراد کو خیمے میں بٹھایا۔ قہوے اور بسکٹوں سے تواضع کی۔ کبیر علی شاہ نے انہیں بتایا کہ پچھلے تین دن سے مسلسل بارش ہو رہی ہے اور باہر کا کوئی بندہ بھولے سے بھی ادھر نہیں آیا۔ یہ مایوس کن اطلاع سننے کے بعد رُستم اور اس کے دونوں ساتھی جلد از جلد واپس جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایس پی صاحب کے خیمے میں جا کر ان سے رُستم کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی۔ ایس پی صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی تو ہم بیکار ہی بیٹھے تھے۔ ممکن تھا کہ حرکت میں برکت کا کوئی پہلو نکل آئے۔ خدشہ صرف ایک ہی تھا کہ کہیں پہلوان کی گمشدگی میں مجھے ملوث نہ کیا جائے۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر ایس پی صاحب کچھ سوچ رہے تھے۔ میں نے ان کی ہچکچاہٹ کا راز پا لیا تھا لہٰذا ایک دو جملوں میں ہی انہیں رام کر لیا۔ وہ کہنے لگے۔ "ٹھیک ہے۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ جانا چاہو تو جاؤ لیکن بہتر ہے کہ اکیلے نہ جاؤ۔ ویسے بھی زبان کی مشکل آئے گی۔"

انسپکٹر باجوہ نے کہا۔ "چوہدری صاحب! کیوں نہ نائیک عباس کو ساتھ بھیج دیا جائے۔"

ایس پی صاحب نے سوالیہ نظروں سے صوبے دار مرجان خان کی طرف دیکھا۔ مرجان خان نے کہا۔ "مجھے تو

اعتراض نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں خود بھی جانے کو تیار ہوں۔"

اس طرح طے پا گیا کہ میں اور عباس خاں بستی والوں کے ساتھ جائیں گے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ بارش کے سرلانوں سے جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شب کی تیرگی میں آسمان کسی زود رنج عاشق کے مانند زمین پر جھکا ہوا تھا اور نشیب و فراز بہتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو یوں لگنے لگتا تھا کہ زمین و آسمان کے قلابے میں پانی اور گرج چمک کے سوا کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا۔ میں اور نائیک عباس شکاری بوٹ پہن کر اور لونگفین کی ہوم میڈ برساتیاں اوڑھ کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ حسبِ معمول شکاری چاقو، ٹارچیں اور رائفلیں ہمارے پاس تھیں۔

توقع کے عین مطابق یہ ایک دشوار سفر ثابت ہوا لیکن اس کی طوالت ہماری توقع سے کم نکلی۔ پاؤندے راستے کی ہر پیچ سے واقف تھے۔ اس کے علاوہ انہیں شارٹ کٹ راستوں کا بھی علم تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں ڈھوکی تالاب سے پاؤندہ بستی میں لے آئے۔ بستی والے ہمیں دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوئے۔ ہمارے پہنچتے ہی سردار بشر گل نے ہمیں اپنے نیم گرم جھونپڑے میں بلا لیا۔ وہ چار عدد عورتوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔ یعنی وہ اس کی بیویاں تھیں۔ سب سے چھوٹی بیوی اس کے ساتھ جھونپڑے میں ہی رہتی تھی جب کہ باقی تین کے لیے دو علیحدہ خیمے نصب کیے گئے تھے۔ سردار نے جھونپڑے کے مردانے حصے میں ہمیں شرفِ ملاقات بخشا۔ پہلوان کی گمشدگی سے وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا۔ اس نے نائیک عباس خاں کو مترجم بنا کر مجھ سے چند سوال کیے۔ یہ سوال بالکل تفتیشی انداز کے تھے۔ سردار بشر گل نے پوچھا۔ "تم پہلوان کو کب سے جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "قریباً چھ ماہ سے۔ ضلع جھنگ کے ایک قصبے میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی پھر جان پہچان ہو گئی۔"

وہ بولا ... "پہلوان سے آخری ملاقات کب ہوئی؟"

"یہیں بستی میں منگل کی صبح۔ آپ لوگوں کے سامنے میں نے پہلوان کو خدا حافظ کہا تھا۔"

"منگل کی رات تم اس کے ساتھ جھونپڑے میں رہے تھے کیا اس نے کہیں آنے جانے کی بات کی تھی؟"

"بالکل نہیں۔ ایسی کوئی بات ہمارے درمیان نہیں ہوئی۔ پہلوان سارا وقت اپنے آنسوؤں، دکھڑوں کی باتیں کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ نے اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا ہے اور وہ آپ کے چھوٹے بھائی رُستم خاں سے مل کر کوئی کام کرے گا۔"

سردار نے اپنی گُڑگُڑی کی آدھی چلم ایک طویل کش میں برابر کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس کے دوست ہو، ہم سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ خود گیا ہے تو کہاں جا سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ بڑا مشکل سوال ہے سردار۔ مجھے اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں گیا۔ اگر اس کی بیوی یہاں ہے تو پھر اس نے کہاں جانا تھا۔ اس کے علاوہ نقدی اور زیورات کا غائب ہونا بھی ظاہر کرتا ہے کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے چوری وغیرہ؟"

"بالکل یہی بات ذہن میں آتی ہے۔"

سردار کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ خود بھی اسی انداز سے سوچ رہا ہے۔ میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں شہباز کی گھر والی سے مل آؤں؟"

سردار نے اس ملاقات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ درحقیقت بستی میں آ کر اور سردار بشر گل کی پوچھ گچھ کا سامنا کر کے میں نے اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا۔ اگر پہلوان کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی مجھ پر شک کر بھی رہا تھا تو اب مطمئن ہو گیا تھا۔ نائیک عباس خاں کو سردار کے جھونپڑے میں چھوڑ کر میں نجو کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں دو عورتوں کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔ بال پریشان، آنکھوں میں رت جگا، چہرے پر جیسے پہلوان کا انتظار نقش ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم سسک اٹھی۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں خود ہی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہ کوئی اٹھا کے لے گیا ہو گا۔ سارا علاقہ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ آ جائے گا کہیں نہ کہیں سے۔" وہ بدستور سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ جب آنکھوں کے راستے دل کا غبار ذرا بہہ گیا تو قدرے پُرسکون نظر آنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "تمہیں کب پتا چلا کہ شہباز جھونپڑے میں نہیں ہے؟"

وہ بولی۔ "شام کو دیر سے آیا تھا۔ کہتا تھا کہ سردار بشر گل کے پاس بیٹھا رہا ہوں۔ کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا اور سو گیا۔ میں بھی سو گئی۔ رات کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ جھونپڑے میں بڑی ٹھنڈ تھی۔ میں نے دیکھا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لالٹین کی لو اونچی کر کے دروازہ بند کرنے لگی تو شہباز

اپنے بستر پر نہیں تھا۔ پھر میری نظر پرچھتی پر پڑی۔ وہاں جستی ٹرنک بھی نہیں تھا۔ میں نے آگے دو اپنے کے جھونپڑوں سے پتا کیا، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اتنے میں سردار اور اس کا بھائی رستم بھی آ گئے۔ سب ڈھونڈنے لگے لیکن شہباز کا کوئی پتا نہیں چلا۔"

نجو کی پوری روداد سننے کے بعد میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے' کہاں جا سکتا ہے وہ؟ بستی میں سے کسی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا تھا اس کا؟"

وہ بولی۔ "جھگڑا تو کسی سے نہیں تھا' پر یہ بات تو کسی ایک کو معلوم ہو گی کہ وہ آج سردار سے پیسے لے کر آیا ہے۔"

"کون سے پیسے؟"

"وہی تین ہزار روپیہ جو جھونپڑے سے غائب ہوا ہے۔"

وہ رقم شہباز اسی رات سردار سے لے کر آیا تھا؟

یہ میرے لیے نئی اطلاع تھی۔ میرے پوچھنے پر نجو نے بتایا کہ یہ رقم اس نے شہباز کی جیب میں دیکھی تھی۔ پوچھنے پر شہباز نے بتایا کہ سردار سے لے کر آیا ہوں۔ نجو نے پوچھا کہ کیا کرنی ہے یہ رقم؟ وہ مسکرا کر بولا۔ کچھ کرنی ہے۔ نجو کے دو تین بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ نجو نے سوچا کہ شاید وہ اسے کوئی قیمتی تحفہ وغیرہ دینے کے چکر میں ہے۔ اس نے اسے منع کیا کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے انہیں ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے۔ شہباز اس کی باتیں سنتا رہا لیکن جواب کوئی نہیں دیا۔ میں نے نجو سے کہا۔ "تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تمہیں چوری کا شک ہے۔"

وہ بولی۔ "اس کے سوا اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے' سردار کے جھونپڑے سے ہی کوئی اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ جھونپڑے کے آس پاس پھرتا رہا۔ جب ہم سو گئے تو اندر گھس آیا۔ ہو سکتا ہے بعد میں شہباز کی آنکھ کھل گئی ہو۔ ٹرنک غائب دیکھ کر وہ جھونپڑے سے باہر نکل آیا ہو۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بستی سے باہر ڈھلان کے پاس کلہاڑی کا ٹوٹا ہوا دستہ ملا ہے اور گیلی جگہ پر پاؤں کے نشان بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے شہباز کی کسی سے لڑائی ہو گئی ہو۔"

ایک بار پھر نجو کے سانولے چہرے کو اندیشوں کی تیرگی نے ڈھانپ لیا۔ اس حالت میں وہ مجھے بڑی قابل رحم نظر آئی۔ اپنی جنم بھومی سے سیکڑوں میل دور اس ویرانے میں شہباز اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا اور اب وہ بھی لاپتا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے تمہارے جھونپڑے کا دروازہ دیکھا ہے۔ یہ باہر سے بند نہیں ہوتا لیکن اندر سے تو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے' رات کو تم دروازہ کھلا چھوڑ کر نہیں سوتے ہو گے؟"

میرے سوال کے جواب میں وہ لالٹین اُٹھا کر دروازے کے پاس پہنچ گئی اور اسے ہلا جلا کر بتانے لگی کہ کس طرح دروازے کو تھوڑی دیر آگے پیچھے حرکت دی جائے تو کنڈی خود بخود اتر جاتی ہے۔ دفعتاً میرے ذہن میں "باگڑ خیل" کے عجیب و غریب الفاظ گونجے۔ یہ اس بستی کا نام تھا جہاں پہلوان کسی مولوی صاحب کا کھوج لگانے گیا تھا اور وہاں سے واپس آیا تھا۔ پہلوان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ ایک دو روز پہلے بھی وہاں جا چکا ہے۔ میں نے نجو سے پوچھا کہ کیا باگڑ خیل میں پتا کرایا ہے؟ وہ نفی میں سر ہلانے لگی، بولی۔ "مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ اُدھر گیا ہو گا۔ کیا لینے جاتا تھا اس نے اور اگر جانا بھی تھا تو مجھے بتا کر جاتا اور پھر ٹرنک لے کر جانے کا کیا مقصد تھا؟" وہ بہت اُلجھی ہوئی تھی۔ بالکل روہانسی ہو رہی تھی۔ ایسی کیفیت میں اکثر لوگوں کا ذہن دور تک نہیں سوچ پاتا۔ میں نے نجو کو تسلی تشفی دی اور کچھ دیر سو جانے کی ہدایت کر کے واپس سردار بشر گل کے ٹھکانے پر آ گیا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی اور رات کے سمندر میں سردی کے آکٹوپس نے اس بستی کو بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ سردار کے جھونپڑے میں ایک اونی دری بچھی تھی۔ دری کے عین وسط میں لوہے کی ایک چوکی تھی اور چوکی پر ایک بڑی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ سردار سمیت چند سفید ریش افراد نے اس انگیٹھی کو گھیر رکھا تھا اور دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اس محفل میں چند حُقّہ گڑیاں بھی موجود تھیں اور ان کی تمباکو بھری چلمیں مسلسل سُلگ رہی تھیں۔ میں پہنچا تو سارے میری طرف متوجہ ہو گئے۔ بستی والے مجھ سے کچھ مرعوب سے تھے اور ایسا پہلے دن سے تھا۔ غالباً اوپر پہاڑی پر لنگر خاں اور میرے درمیان ہونے والے معرکے سے وہ متاثر ہوئے تھے۔ ایک خونخوار کتے سمیت تین مسلح افراد نے مجھ پر دھاوا بولا تھا اور میں نے انہیں اچھا خاصا سبق سکھایا تھا۔ اگر پاؤں پھندے میں نہ پڑ جاتا تو میں یقیناً ان پر حاوی رہتا جیسا کہ مجھے بعد میں پہلوان شہباز سے پتا چلا تھا۔ لنگر خاں اور اس کے دونوں ساتھی بستی کے سورماؤں میں شمار ہوتے تھے اور لڑائی کے بعد ان کی حالت دیکھ کر لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا لی تھیں۔ اس مار کٹائی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا خود پہلوان تھا۔ وہ اس سے پیشتر دہلی میں میرے دو معرکوں کا چشم دید گواہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے قادر زماں کے ایک بونے کی کمر توڑی تھی اور دوسری مرتبہ جب رقص و سرود کی محفل میں ہنگامہ کیا تھا۔ اب اس تیسرے واقعے نے اسے میرے دھواں دھار فن کا

معترف کر دیا تھا۔

قہوے کی پیالی سے ہاتھ تاپتے ہوئے میں نے نائیک عباس خاں کو ذریعۂ اظہار بنایا اور سردار بشر گل سے پوچھا کہ کیا واقعی اس نے شہباز پہلوان کو تین ہزار روپے دیے تھے۔ سردار کا جواب ہاں میں تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے ریوڑ کی فروخت کے بعد اسے کچھ رقم دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے آٹھ دس ہزار روپیہ دے دوں گا تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے لیکن وہ بہت بے صبرا ہو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اس نے سندھ میں کچھ نئی رائفلیں اور پستول دیکھے ہیں۔ فروخت کرنے والا بہت ضرورت مند ہے اور بیس پچیس ہزار کا اسلحہ کوڑیوں کے بھاؤ دے رہا ہے۔ وہ یہ سودا کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا' میرے پاس تو دو تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں۔ اس نے تین ہزار لے لیے۔ کل رات وہ نو بجے کے قریب میرے پاس سے اُٹھ کر گیا۔ صرف تین گھنٹے بعد یہ پتا چلا کہ وہ اپنے جھونپڑے سے غائب ہے۔ ہم جھونپڑے میں پہنچے تو اس کی بیوی جنگلی رو رہی تھی۔ جھونپڑے میں کہیں جدوجہد کے آثار نہیں تھے۔ بارش متواتر ہو رہی تھی۔ اس کے جھونپڑے سے باہر قدموں کے نشان بھی نہیں مل سکے۔ ہاں اوپر پہاڑی پر ایک کلہاڑی کا ٹوٹا ہوا دستہ اور پھٹی پرانی چپل ملی ہے۔ اب معلوم نہیں' یہ چیزیں ویسے ہی وہاں پڑی تھیں یا کوئی خاص بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "سردار بشر گل' آپ ایک کام کریں۔ جہاں اتنی بھاگ دوڑ کی ہے وہاں ایک آدمی باگڑ خیل بھی بھیج دیکھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں آنے کے بعد پہلوان دو تین مرتبہ وہاں گیا ہے۔"

باگڑ خیل کا ذکر سن کر ایک سفید ریش شخص چونکا۔ اس نے کہا۔ "دو ہفتے پہلے میں نے بھی شہباز کو باگڑ خیل میں دیکھا تھا۔ وہاں ایک جگہ پرندوں کی "بولی" ہو رہی تھی۔ شہباز ہجوم میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے بلانا چاہا لیکن وہ ایکدم لوگوں میں گم ہو گیا۔"

باگڑ خیل میں جانوروں کی بولی کے بارے میں' میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ اس سلسلے میں تفصیل پوچھی تو پائندہ سردار نے بتایا کہ باگڑ خیل کے لوگوں کا پیشہ ہی جانور اور پرندے وغیرہ پکڑنا ہے۔ کونج' مرغ زریں' شاہین' خارپشت' لومڑ' خرگوش اور بعض اوقات یہ لوگ بالائی علاقوں سے بھیڑیا اور ریچھ تک پکڑ لاتے ہیں۔ اس قوم کے لوگ دیگر بستیوں میں بھی آباد ہیں لیکن جہاں بھی ہیں شکار ہی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض جرائم پیشہ بھی ہیں۔ شہری علاقوں میں گھس کر چوریاں کرنا اور مار دھاڑ کر کے نکل جانا ان کا قدیم مشغلہ ہے۔ شکار چونکہ ان لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے لہٰذا یہ جانور بیچتے ہیں۔ خاص طور پر شاہین' عقاب وغیرہ کے بدلے میں کبھی کبھی انہیں کافی رقم مل جاتی ہے۔ مجھے پنجاب کے مختلف علاقوں میں گھومنے والے سانسی خانہ بدوش یاد آنے لگے۔ یہ بھی ایسے ہی جھگڑالو اور جرائم پیشہ قسم کے شکاری ہوتے ہیں۔ بات بہت دور نکل گئی تھی۔ میں عباس خاں کی مدد سے بمشکل اصل موضوع پر آیا۔ میں نے سردار بشر گل سے درخواست کی کہ ایک یا دو بندے باگڑ خیل بھیجے جائیں۔ سردار نے علی الصباح بندے بھیجنے کا وعدہ کر لیا لیکن میں اس سلسلے میں کوئی تاخیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جو وقت ہم نے سردار کے جھونپڑے میں سو کر گزارنا تھا' ممکن تھا اس کا ایک ایک پل شہباز کی جان کے لیے بہت قیمتی ہو۔ سردار کو تذبذب میں دیکھ کر میں خود باگڑ خیل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے سردار سے کہا کہ وہ اپنا صرف ایک آدمی ساتھ بھیج دے یا پھر راستہ ٹھیک طرح سمجھا دے۔ میری اس "سرگرمی" نے کام کر دکھایا اور سردار میں مہمان نوازی کا جذبہ پوری شدت سے بیدار ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر تین مسلح افراد دو عدد کتوں کے ہمراہ باگڑ خیل کی طرف روانہ کر دیے۔ میں نے اس پارٹی کا ساتھ دینا چاہا لیکن اس نے مجھے انگیٹھی کے سامنے سے جنبش نہیں کرنے دی۔

باگڑ خیل جانے والے افراد قریباً چار گھنٹے بعد واپس آئے۔ اس وقت شب کے دو بج چکے تھے۔ بستی سے کل تین افراد گئے تھے لیکن واپس آنے والے آٹھ تھے۔ ان میں سے چار افراد نے ایک چارپائی اُٹھا رکھی تھی۔ چارپائی پر کوئی موجود تھا۔ اسے بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر موٹی کاغذ ڈال کر رسّی وغیرہ سے باندھ دیا گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا جیسے یہ لوگ کسی کی ارتھی اُٹھائے لا رہے ہیں۔ سردار کے جھونپڑے میں پہنچنے سے پہلے ہی چارپائی والے ایک دوسری سمت میں مڑ گئے۔ صرف دو افراد ہمارے پاس آئے جو پہلوان شہباز کا پتا کرنے گئے تھے۔ ان لوگوں نے سردار بشر گل کے ساتھ چند جملوں کا تبادلہ کیا۔ اپنے مترجم عباس خاں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ چارپائی پر باگڑ خیل کا کوئی مریض ہے۔ اسے پائندوں کے معالج کے پاس لایا گیا ہے۔

آنے والے پہلوان کے بارے میں ایک دھماکا خیز خبر لائے تھے۔ اس خبر کو سن کر یوں لگا جیسے یہ خبر پہلے سے مجھے مل چکی تھی۔ کہیں بہت اندر دل کے نہاں خانے میں اس خبر کی گونج پچھلے کئی گھنٹوں سے موجود تھی۔ کاش! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش پہلوان کے جستی ٹرنک میں موجود وہ چاندی

کے زیور اور سپیوں سے جڑے لباس نجو کے لیے ہوتے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ سب کچھ ایک دوسری لڑکی کے لیے تھا۔ وہ لڑکی جو باگڑ خیل میں رہتی تھی اور جس کے ساتھ کل دوپہر شہباز کی رسم ہو گئی تھی۔ مقامی رواج کے مطابق لڑکی کے سرپرست نے چار ہزار روپے نقد اور دو قیمتی رائفلوں کے عوض اپنی لڑکی کا ہاتھ شہباز کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے سردار کے کارندے آزاد خاں نے کہا۔

"پہلوان شہباز چوری چھپے کئی بار باگڑ خیل جا چکا تھا۔ یہاں غلام خاں نامی ایک شخص سے اس کی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ غلام خاں عادی نشے باز ہے اور رقم کی اسے ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ پہلوان نے پہلی ملاقات میں ہی غلام خاں کی گوری چٹی خوبصورت لڑکی پر رال ٹپکا دی تھی۔ شادی کے لیے لڑکی کی عمر تھوڑی تھی۔ یعنی صرف چودہ برس مگر نوٹوں کی جھنک نے غلام خاں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کوشش کر کے اس نے اپنی بیوی کو بھی رضامند کر لیا۔ یوں اندر ہی اندر کھچڑی پک گئی اور غلام خاں نے چار ہزار روپے نقد اور دو رائفلوں کے عوض پہلوان سے لڑکی کا سودا کر دیا۔ ایک ہزار روپیہ پہلوان پہلے دے چکا تھا۔ تین ہزار روپیہ اس نے کل دیا اور مقامی رسم کے مطابق لڑکی سے عقد کر کے لے گیا۔"

میں نے حیرت سے یہ سب کچھ سنا۔ بظاہر بات عجیب سی لگتی تھی۔ بغیر کسی ضمانت اور گہری جان پہچان کے اتنا بڑا کام ہو گیا تھا۔ ایک شخص نے چار ہزار روپے کے بدلے اپنی نابالغ بیٹی ایک اجنبی اور بے ٹھکانا شخص کے ساتھ بیاہ دی تھی اور وہ اسے لے کر چلتا بنا تھا لیکن جس علاقے اور جس ماحول میں یہ واقعہ ہوا تھا، وہاں یہ غیر معمولی نہیں تھا۔ میں نے اس سے ملتے جلتے کئی واقعات سنے اور پڑھے تھے۔ دکھ کی بات صرف ایک ہی تھی کہ اس واقعے سے متاثر ہونے والی نجو تھی۔ وہ جو پہلوان شہباز کی حریص بانہوں میں کھو کر یہ سمجھ رہی تھی کہ اس سے محبت کی جا رہی ہے۔ اس کے کالے پن کو معاف کر کے ایک گورے مرد نے اسے اپنا لیا ہے۔ کیسا انوکھا خواب دیکھا تھا اس نے۔ وہ کسی کروڑ پتی سیٹھ کی اکلوتی بیٹی نہیں تھی، نہ کسی رعنا نسوا افسر کی دختر تھی۔ ایک معمولی لڑکی تھی وہ جس کے پاس اپنی خوش اطواری اور جسمانی دلکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ بیچ بازار کے لٹ گئی تھی۔ تمناؤں کے مزار پر رونے پیٹنے کے سوا اب اسے اور کچھ نہیں کرنا تھا۔ کاش! وہ یہ سوچ لیتی کہ یہ مشرق ہے۔ یہاں "کالے گورے" کا فتنہ ذہنوں میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کبھی گورا مرد سانولی یا کالی لڑکی سے شادی نہیں کرتا۔ اگر کہتا ہے کہ شادی کروں گا تو فریب ہے۔

کسی کو بری خبر پہنچانا ایک ناخوشگوار فریضہ ہوتا ہے اور یہاں یہ فریضہ مجھی کو ادا کرنا تھا۔ آنکھوں میں آس کے دیے جلا کر بیٹھی ہوئی نجو کو مجھے یہ بتانا تھا کہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ وہ زیور، وہ لباس، وہ خواب کسی اور کے لیے تھے جو شہباز نے اسے دکھائے تھے۔ وہ تو ایک گرد آلود زینہ تھی جس پر اپنا پاؤں رکھ کر اور جس کے بطن پر اپنا بیج چھوڑ کر شہباز آگے بڑھ گیا تھا۔ اب اس کا کوئی نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اپنی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ میں پلنے والی نشانی بھی اس کی اپنی نہیں تھی۔ پہلوان چار ہزار روپے کے عوض اس کالی لونڈی کو مع حمل پائندہ بستی میں بیچ کر جا چکا تھا۔ ہاں وہ بک چکی تھی۔ ابھی یہ بات مجھے کسی نے نہیں کہی تھی تاہم میں ان قبائل کے رسم و رواج کے متعلق تھوڑا بہت جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا، نجو فروخت ہو چکی ہے۔ اب اسے پھر خریدے بغیر اس بستی سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔

بہت بوجھل قدموں سے میں نجو کے جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اطلاع نجو کو کس طرح دوں اور دوں بھی یا نہیں۔ وقتی طور پر بات چھپائی جا سکتی تھی لیکن تا دیر نہیں۔ بستی کے چوراہے میں پہنچ کر میں نے دیکھا۔ دور نجو کا جھونپڑا نظر آ رہا تھا۔ نیم کھلی کھڑکی جیسے نجو کی آنکھ تھی جو پلک جھپکے بغیر اپنے چاہنے والے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی سے پھوٹنے والی روشنی میں بارش کی چمکتی بوچھاڑیں کسی برہن کے موسلا دھار آنسوؤں کی مثال تھیں۔ دفعتاً میں ٹھٹک گیا۔ مرزئی کے طویل پتوں سے بنے ہوئے ایک سائبان تلے خانہ بدوشوں کا ہجوم تھا۔ ان کے درمیان وہی چارپائی پڑی تھی جو میں نے تھوڑی دیر پہلے لوگوں کے کندھوں پر دیکھی تھی۔ چارپائی پر کوئی عورت دراز تھی۔ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ ایک سفید ریش بوڑھا اس کی کلائی تھامے بڑی محویت سے اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ عورت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ مجھے اس کے بستر پر خون کے دھبے نظر آئے۔ دفعتاً میری نگاہ عورت کے پہلو پر پڑی اور میں سر تا پا لرز گیا۔

عورت کے بائیں پہلو پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔ یہ پٹی کسی اوڑھنی کو پھاڑ کر بنائی گئی تھی اور اس کے نیچے روئی وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ جس چیز نے مجھے ششدر کیا وہ پٹی کے نیچے سے جھانکتا ہوا نیگوں گوشت تھا۔ میں نے جھک کر پٹی کو تھوڑا سا ہٹایا تو پیٹ کا شگاف نظر آ گیا۔ یہ کسی تیز دھار آلے کا مہلک "کٹ" تھا اور اس کے اندر سے انتیں باہر نکل رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے پٹی برابر کر دی۔ ایک مقامی شخص نے مجھے کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ غالباً کہہ رہا تھا کہ مجھے اس طرح نامحرم عورت کے جسم کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ ایک ہی نظر میں مجھے زخم کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اندرونی رگیں کٹنے سے خون پیٹ میں جمع ہو گیا تھا اور یہ صورت حال نہایت مخدوش تھی۔ ایک لڑکے نے کسی بڑھیا کے کہنے پر عورت کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ وہ تقریباً چالیس برس کی ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سانس لینے میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ باقی جسم کی طرح اس کے چہرے پر بھی تشدد کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے نقش اور خدوخال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مقامی ہے۔ بڑھیا نے صورت دیکھ لی تو عورت کا چہرہ ڈھک دیا گیا۔ اس دوران عباس نامی ایک شخص بھی میرے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ وہ اس سوال کا جواب معلوم کر چکا تھا۔ کہنے لگا "باگڑ خیل کی رہنے والی ہے۔ اس لڑکی سے آج صبح پہلوان شہباز کا بیاہ ہوا ہے اس کی ماں ہے۔"

"یعنی پہلوان کی ساس؟"

عباس نے اثبات میں جواب دیا، کہنے لگا۔ "اپنے شوہر کے ہاتھوں زخمی ہوئی ہے۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد میاں بیوی میں کسی بات پر تکرار ہو گئی تھی۔ شوہر غلام خاں نے پہلے اسے بری طرح مارا پھر چاقو کا وار کر کے شدید زخمی کر دیا۔ بے حسی کی انتہا ہے کہ بیوی کو گھائل کر کے خود کہیں چلا گیا۔ اب بیہ دوپہر سے گھر میں پڑی سسک رہی تھی۔ اڑوس پڑوس والوں نے اپنی سمجھ کے مطابق مرہم پٹی کر دی لیکن خون بند ہونے میں نہیں آ رہا۔"

عباس خاں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ لواحقین کو زخم کی سنگینی کا اندازہ نہیں۔ دوسری غلطی انہوں نے عورت کو بے احتیاطی سے یہاں لا کر کی تھی۔ راستے میں لگنے والے جھٹکوں سے بے چاری کی انتڑیاں نکل کر باہر آ گئی تھیں اور "بلیڈنگ" سے پیٹ مشکیزہ بن گیا تھا۔ پائندہ بستی کا بوڑھا معالج اپنی خزاں رسیدہ "عجیب الخلقت" بالشوں کو بار بار حرکت دے رہا تھا اور اس کے ہونٹ منتر پڑھنے والے انداز میں تھرتھرا رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ عورت کی جان بچانے کے بجائے اس کی جان چھڑانے کے لیے کوشاں ہے۔ زخمی عورت کو اس وقت اس دور دراز خیمہ بستی میں نہیں آپریشن ٹیبل پر ہونا چاہیے تھا اور آپریشن ٹیبل یہاں نہیں تھی۔ قرب و جوار میں بھی نہیں تھی۔ شاید پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر بھی نہیں تھی۔ بہت دور ہوتی ہیں ایسی چیزیں ایسی بستیوں سے۔ اور مرزئی کے اس شکستہ سائبان تلے مسلسل برستی بارش میں نامعلوم عورت کی زندگی مکمل قفل کر موت کے تاریک نالے کی سمت بہی جا رہی تھی۔

عورت کے سرہانے کھڑا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا اس کا بیٹا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے عباس کے توسط سے لڑکے سے رابطہ قائم کیا اور اسے کہا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں ہمیں کچھ بتائے۔ معالج کا عمل بہت طویل تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ بہ فرض محال عورت ساری رات بھی زندہ رہی تو یہ عمل جاری و ساری رہے گا۔ لڑکا ہمارے ساتھ ایک دوسرے سائبان تلے آ بیٹھا۔ وہ بہت تھکا ماندہ اور مغموم تھا۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ رو رو کر آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ اب یہ آنکھیں حیران تھیں جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ ماں مر گئی تو غم کا اظہار کیسے کرے گا۔ لڑکا تھوڑی بہت اردو بھی جانتا تھا۔ میں اس سے براہ راست سوال و جواب کرنے لگا۔ ظاہر ہے اس انٹرویو کا محور لڑکے کی جاں بہ لب والدہ ہی تھا۔ اس موقع پر مجھے کرشن چندر کی ایک یادگار تحریر یاد آنے لگی۔ سیکریٹریٹ کے احاطے میں ایک درخت زمین بوس ہو جاتا ہے۔ ایک بے چارہ قلم کار درخت کے نیچے دب جاتا ہے۔ یہ درخت چونکہ ایک اہم غیر ملکی شخصیت نے لگا رکھا ہے لہٰذا اسے کاٹ کر قلم کار کو بچانے کے لیے بالائی سطح سے منظوری کی ضرورت ہے۔ دفتری چکر بہت طویل ہیں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ سب مغضوب کے سرہانے بیٹھے رہتے ہیں اور وہ سسک سسک کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ جاتا ہے۔

یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔ اس دور دراز ویرانے میں بدنصیب عورت کی زندگی کے لیے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان دشوار راستوں پر عورت کو اٹھا کر رات بھر میں دس میل طے کر لینا بھی خاصا مشکل تھا اور پختہ سڑک تین گنا فاصلے پر تھی۔ اس طوفانی شب میں اگر کچھ کیا جا سکتا تھا تو وہ موت کا انتظار تھا اور یہ بھی احترام آدمیت ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ ورنہ ایسے بہت سے واقعات بھی سنے گئے ہیں کہ موت سے پہلے ہی تجہیز و تکفین سے فراغت پالی گئی۔ بعد میں مرحوم قبرستان جاتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سارے کیے دھرے پر پانی پھیر گیا۔

لڑکے کا نام سعد خاں تھا۔ وہ جاں بہ لب عورت سکینہ کا بیٹا تھا۔ سعد خاں نے ہم سے آدھ پون گھنٹے تک گفتگو کی۔ اس کی خمار آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہذیانی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور اپنے سوالات سے میں نے اسے جو کچھ بتانے پر مجبور کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سعد کا والد غلام خاں ایک ظالم شخص تھا اور سعد کی ماں کو بری طرح مارتا پیٹتا تھا۔ سعد کی دو سوتیلی مائیں اور بھی تھیں اور وہ دونوں سعد کی ماں سے چھوٹی تھیں۔ سعد کی ماں کوئی بیس برس پہلے "خوں بہا" میں غلام خاں کے قبضے میں آئی تھی۔ ایک دیرینہ قبائلی رواج کے مطابق مقتول کا خوں بہا سات عورتوں کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ غلام خاں کا ایک بھانجا یوسف زئی قبیلے کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ اس قتل سے حسب معمول قتل و غارت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا تھا لہٰذا دونوں قبیلوں کے بزرگوں نے ایک جرگہ قائم کیا اور اس جرگے نے قاتل و مقتول کے خاندانوں میں صلح کرا دی۔ اس صلح کی اہم ترین شرط یہ تھی کہ قاتل کا خاندان حسب رواج سات عورتیں مقتول کے خاندان کو دے گا۔ سعد کی ماں انہی سات عورتوں میں باگڑ خیل آئی تھی۔ تقسیم میں وہ غلام خاں کی باندی قرار پائی۔ بعد میں غلام خاں نے اس سے نکاح کر لیا لیکن اس کی حیثیت باندی کی سی ہی رہی۔ غلام خاں نے شادی کے پہلے روز سے اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور اب تک جاری تھا۔ سکینہ سے غلام خاں کے چار بچے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو تو غلام خاں کی ٹھوکروں سے شکم مادری میں جاں بحق ہو گئے تھے جبکہ باقی دو حیات تھے اور شفقت پدری کے "مزے" لوٹ رہے تھے۔ یاسمین چھوٹی تھی۔ وہ بھی ماریں کھا کھا کر جوان ہوئی تھی تاہم اب ڈیڑھ دو برس سے غلام خاں اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ یاسمین اب اس کے لیے ایک منافع بخش چیز بن گئی تھی۔ وہ جانتا تھا یاسمین کے عوض اسے ایک معقول رقم حاصل ہونے والی ہے لہٰذا وہ اسے صحت مند اور بے داغ رکھنا چاہتا تھا۔ آخر کار طویل انتظار کے بعد آج صبح اسے یہ رقم حاصل ہو گئی تھی۔ یہ کل چار ہزار روپے نقد اور دو رائفلیں تھیں۔ قبائلی رسم و رواج کے مطابق لڑکی کے عوض حاصل ہونے والی اس رقم سے عزیز و اقارب کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کا جہیز بنانے کے لیے کوئی قرض وغیرہ لیا گیا ہو تو چکا دیا جاتا ہے۔

غلام خاں نے یہ دونوں کام نہیں کیے۔ شادی کی دعوت سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ یہ بے عزتی سعد کی ماں نے اس امید پر برداشت کر لی کہ قرض کے بوجھ سے نجات مل جائے گی لیکن آج دوپہر جب غلام خاں سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو وہ صاف مکر گیا۔ اس نے سکینہ سے کہا کہ وہ چار ہزار میں سے ایک پھوٹی کوڑی دینے کا روادار بھی نہیں۔ سکینہ نے یہ سنا تو تیورا کر رہ گئی۔ یاسمین کو رخصت کرنے کی غرض سے اس نے خود کو قرضے میں جکڑ رکھا تھا۔ غلام خاں کا انکار سنا تو اس نے زندگی میں پہلی بار شوہر کے سامنے زبان کھولی۔ زبان کھولنے سے مطلب یہ نہیں کہ اس نے شوہر کو ترکی بہ ترکی جواب دیا، کوئی گالی دی یا بد دعا منہ سے نکالی۔ وہ صرف اتنا بولی کہ وہ قرض خواہوں کو کیا جواب دے گی۔ اس جملے کی پاداش میں غلام خاں نے سکینہ کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخا۔ روئی کی طرح دھنکا اور جب پھر بھی سینے کا آتش فشاں ٹھنڈا نہیں ہوا تو نیم بے ہوش بیوی کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا۔ وہ جب خون میں لت پت تڑپ رہی تھی تو غلام خاں نے اسے ٹھوکریں رسید کیں اور روندتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

میں اور عباس بڑے انہماک سے سعد خاں کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ سب کچھ عجیب لیکن اس ماحول میں قابل یقین تھا۔ اچانک ہمیں چونکنا پڑا۔ سردار بشر گل کے جھونپڑے کی طرف شور سنائی دیا۔ پھر کئی لالٹینیں نشیب و فراز پر اچھلتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں۔ یہ کوئی دس عدد افراد تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں اور کلہاڑیاں تھیں۔ وہ سردار بشر گل کے ساتھ لڑتے جھگڑتے سائبان کی طرف آ رہے تھے۔ ایک لمبے قد کا شخص بہت غصے میں دکھائی دیتا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی ہمارے پاس بیٹھے سعد خاں کی گھگھی بندھ گئی۔ ایک دم لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگ جائے گا لیکن شاید ٹانگوں نے ہی جواب دے دیا تھا۔ وہ اٹھنے کے باوجود بھاگ نہیں سکا اور پھر دھپ سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ دراز قد شخص نے لالٹین کی روشنی میں زخمی عورت کا چہرہ دیکھا پھر سرہانے کھڑے ایک شخص کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔ وہ بے چارہ لڑکھڑا کر سائبان سے باہر گرا۔ چارپائی لے کر آنے والے چاروں افراد اب بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ دراز قد شخص رائفل لہرا لہرا کر ان پر گرجنے لگا۔ گاہے گاہے وہ سردار بشر گل کے لتے بھی لے لیتا تھا۔ بشر گل کے بھائی رستم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو نووارد نے اسے بھی بری طرح لتاڑ دیا۔ وہ پھولی ہوئی کنپٹیوں والا بے حد غصیلا اور خطرناک شخص نظر آتا تھا۔ میرے اپنے کان تو وہاں ہونے والی گفتگو

سمجھنے سے قاصر تھے۔ عباس کے ہی کانوں سے سن سکتا تھا۔ میں نے عباس سے دریافت کیا تو پتا چلا کہ یہی غلام خاں ہے۔ وہ اس بات پر برہم ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بیوی کو یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ اگر وہ مرتی تھی تو مر جاتی، بستی سے باہر نہ آتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بازمردوں کے درمیان ہونے والی یہ تکرار سنگین صورت اختیار کر گئی۔ گردنیں تن گئیں، مٹھیاں بھنچ گئیں اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ سردار بشر گل اور اس کے ساتھیوں نے معذرت خواہانہ رویہ ترک کر کے کسی بات پر اڑ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں عباس سے پوچھا تو یہ اندازہ درست نکلا۔ سردار بشر گل نے کہا تھا کہ انہوں نے زخمی عورت کو پناہ دی ہے اور ٹھیک دی ہے۔ یہ ایک انسانی زندگی کا سوال تھا اور ہے بھی ہے۔ وہ اس عورت کو زخمی حالت میں یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ سردار بشر گل کا یہ اعلان غلام خاں اور اس کے ساتھیوں کے لیے جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ وہ ایک دم طیش کی انتہا کو پہنچ گئے۔ غلام خاں نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور اس کی آنکھوں میں جنون ناچنے لگا۔ دوسری طرف بشر گل، رستم اور دوسرے لوگ بھی چوکس ہو گئے جیسا کہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ کسی بھی جوڑے یا مصیبت زدہ عورت کو بستی میں پناہ دے کر اپنے تئیں ایک عالی روایت کا پاس کرتے تھے۔ اب بھی انہوں نے یہی کیا تھا۔

مشتعل افراد کے درمیان ہونے والی گفتگو کہیں کہیں سے میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے چہروں کا اتار چڑھاؤ بھی صورت حال کی وضاحت کر رہا تھا۔ آناً فاناً یوں لگا کہ ابھی گولی چل جائے گی پھر بشر گل کا بھائی رستم آگے بڑھا اور اس نے غلام خاں سے چند باتیں کیں۔ اس گفتگو کے بعد باقی لوگ دائیں بائیں ہٹ گئے اور درمیان میں صرف رستم اور غلام خاں کھڑے رہ گئے۔ دونوں کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور چہرے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں مطلق دیر نہیں لگی کہ رستم نے خون ریزی سے بچنے کے لیے غلام خاں کو دو بدو مقابلے کی دعوت دی ہے جسے غلام خاں نے ایک غضب ناک ادا کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔ شواہد بتا رہے تھے کہ ان لوگوں میں پہلے سے بھی کوئی [illegible] موجود تھی جو اب ایک دم ابھر کر ہنگامہ خیز ہو گئی ہے۔ بارش اب باریک پھوار کی صورت گر رہی تھی۔ کبھی کبھی بادلوں سے چاند بھی جھانکنے لگتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے

لوگ ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے اور ایک لمبے تڑنگے پاؤندے نے غلام خاں اور رستم کے ہاتھ میں تیز پھل کی کلہاڑیاں تھما دیں۔ دونوں نے اپنی اپنی رائفلیں سائبان کے نیچے ایک چارپائی پر رکھ دیں۔ میں وہاں پاس ہی کھڑا تھا۔ رستم کی آٹومیٹک گن تھی جبکہ غلام خاں کے پاس بارہ بور کی دو نالی تھی۔ رائفل کو جھالروں اور بیل بوٹوں سے سجایا گیا تھا۔ چوبی دستے پر اردو کے دو شعر کندہ تھے اور نیچے غلام خاں آف باگڑ خیل لکھا ہوا تھا۔ شعر عام بازاری قسم کے تھے لیکن انہیں دیکھ کر مجھے اس بات کا پتا چل گیا کہ غلام خاں اردو کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔

مقابلہ اب شروع ہی ہوا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ مار دھاڑ کرتے گزارا ہے لیکن میرے جیسے شخص کے لیے بھی یہ منظر ہیجان خیز تھا۔ آناً فاناً سرعام دو افراد کا مرنے مارنے پر تل جانا اور پوری خونخواری کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آ جانا بعینہٖ کسی فلم کا منظر لگتا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اب یہاں کیا ہو گا۔ کیا یہ دونوں ایک دوسرے پر براہ راست وار کریں گے یا صرف داؤ پیچ کا مظاہرہ ہو گا۔ اگر براہ راست وار کریں گے تو کیا مخالف کو زخمی کیا جائے گا یا جان سے مار دیا جائے گا! دو تین بڑے بوڑھے اب بھی بیچ بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے لیکن لگتا تھا معاملہ اب کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا دونوں قبیلوں میں دو تین ماہ پہلے بھی کسی چراگاہ کی ملکیت پر جھگڑا ہو چکا تھا۔ اب اس تازہ واقعے نے پرانے زخم بھی ہرے کر دیے تھے اور دونوں طرف کے لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

بیچ بچاؤ کرانے والے دو بوڑھے ابھی میدان میں ہی تھے کہ غلام خاں نے کسی بات پر مشتعل ہو کر رستم پر حملہ کر دیا۔ اس نے چار فٹ لمبی کلہاڑی سیدھی اوپر اٹھائی اور بے دریغ رستم کے سر کو نشانہ بنایا۔ رستم نے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ وار بھٹک کر اس کے کندھے پر لگا، موٹی اونی صدری کی وجہ سے کندھے کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا لیکن ضرب کی شدت سے رستم ڈگمگا گیا۔ غلام خاں کا دوسرا وار رستم نے بڑی مہارت سے اپنی کلہاڑی پر روکا اور کچھ مہلت حاصل کرنے کے لیے پانچ چھ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بے حد خوف ناک نظارہ تھا۔ یہ امر سو فیصد یقینی تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہاں دونوں میں سے کسی ایک کی لاش تڑپ رہی ہو گی یا کوئی ایک شدید زخمی حالت میں پڑا ہو گا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے

کلہاڑیاں تھامے وہ دونوں نیم دائرے میں چکر لگانے لگے۔ مجمع دم بخود تھا اور تماشائی نگاہیں تیز دھار کلہاڑیوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ایکا ایکی یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوگیا۔ میں اپنے نزدیک کھڑے افراد کو دھکیلتا ہوا میدان میں آیا اور دونوں کلہاڑی برداروں کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ غلام خاں جیسے دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑا۔ اس کے ہاتھوں کے اشارے بتا رہے تھے کہ وہ مجھے درمیان سے ہٹنے کے لیے کہہ رہا ہے۔

میں نے بڑے تحمل سے غلام خاں کو مخاطب کیا "اردو سمجھتے ہو؟"

"کیا بات ہے؟" وہ تنک کر بولا۔

"کس بات پر لڑ رہے ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"تم یہ بات پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" وہ بپھر کر میری طرف آیا۔

"تمہارا خیر خواہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "اگر اس دنگے فساد کا مقصد زخمی عورت کو یہاں سے لے جانا ہے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیسی مدد؟"

"یہی کہ میں عورت کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ حرام زادہ بشر گل اور اس کے گماشتے ایسا ہونے دیں گے؟"

"یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد آ کر تم اپنی بیوی لے جانا۔"

غلام خاں کا ایک ساتھی آگے آیا اور غلام خاں کے برعکس ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا "خوچہ، تم جو بھی ہے اپنا چونچ بند رکھو۔ ام اپنے جھگڑے چکانا اچھی طرح جانتا ہے۔ تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ۔ یہ عورت ابھی اور اسی وقت یہاں سے جائے گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر غلام خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیمے لہجے میں کہا "تم مجھے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ سمجھدار نظر آتے ہو۔ ایک ایسے معاملے کے لیے اپنی جان خطرے میں مت ڈالو جو تھوڑی دیر بعد خود بخود حل ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم نے اپنی گھر والی کو کوئی معمولی زخم نہیں لگایا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر آ چکی ہیں اور خون اندر ہی اندر بہہ کر اسے جاں بہ لب کر چکا ہے۔ زیادہ دیر کی مہمان نہیں ہے وہ اور مُردے کو پناہ دے کر بشر گل کیا کرے گا؟ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟"

غلام خاں کی پیشانی پر تشویش کی ایک معمولی سی شکن ابھر کر غائب ہوگئی۔ اس اطلاع نے اسے مطلق غمزدہ نہیں کیا تھا۔ اس کے ردِعمل سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی بیوی کی بات نہیں کی، کسی بچھڑی کے مرنے کی بات کی ہے۔ اس نے حقارت آمیز نگاہ میری بائیں جانب ڈالی۔ جہاں سائبان کے نیچے تنگی چارپائی پر وہ عورت سسک رہی تھی۔ یہ برس ہا برس سے اس کی بیوی تھی۔ جس کے جسم نے اس کی لاتعداد راتوں کو جگمگایا تھا اور جس کے سخت بازوؤں نے بڑا رہا مرتبہ اس کے سامنے دسترخوان بچھایا تھا۔ جو صرف اس کے بچے پیدا کرتی رہی تھی بلکہ ننگے پاؤں اس کی بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھی بھاگتی رہی تھی۔ آج وہ عورت اپنی ساری خدمات کا صلہ ایک دردناک زخم کی صورت لے کر دنیا سے منہ موڑ رہی تھی اور غلام خاں ندامت کے آنسو بہانے کے بجائے تکبر سے مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ اس نے کلہاڑی کا پھل نیچے جھکا کر ایک قہر آلود نگاہ سامنے کھڑے رستم پر ڈالی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم یہ بات سردار بشر گل کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ اگر وہ مر رہی ہے تو وہ اس کا مُردہ شہر میں لے جا کر خراب کرنا کیوں چاہتا ہے۔ اسے کہو بہتری اسی میں ہے کہ میری بیوی میرے حوالے کر دی جائے۔"

میں نے کہا "یہ بات میں تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری اردو سردار کی سمجھ میں نہیں آئے گی بلکہ یہاں موجود کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہوں، مجھے روپے میں چار آنے امید بھی نہیں کہ یہ بے چاری ایک گھنٹے تک زندہ رہ پائے گی۔ اب یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک مرتی ہوئی عورت کے لیے تم لوگ خون بہانے لگے ہو اور نہ ختم ہونے والی دشمنی کی شروعات کر رہے ہو۔ نہ کرو یہ سب کچھ۔ مجھے غیب کا علم تو نہیں لیکن یقین ہے کہ ایک گھنٹے تک تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

میرے لہجے میں چھپی ہوئی زہر آلود تلخی کو غلام خاں نہیں چھو سکا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اپنے بپھرے ہوئے غصے کا رخ میری طرف موڑ دیتا۔ غلام خاں کو نرم پڑتے دیکھ کر میں نے عباس خاں کے کان میں کھسر پھسر کی۔ اس نے میری ترجمانی کرتے ہوئے سردار بشر گل سے کہا کہ غلام خاں مان گیا ہے۔ وہ لوگ عورت کا علاج معالجہ جاری رکھیں۔ ماحول کا تناؤ ایک دم کم ہوگیا۔ رستم پیچھے ہٹا تو غلام خاں کے ساتھیوں نے بھی غلام خاں سے کلہاڑی لے لی۔ بیچ بچاؤ کرانے والے

بوڑھے ایک بار پھر سرگرم ہوگئے اور دونوں فریقین کو پند و نصائح کی ڈوز دینے لگے۔ بیچ کی بات غلام خاں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھی۔

شکستہ بانہوں والا سن رسیدہ معالج ایک بار پھر اپنی ناقابلِ فہم کارروائیوں میں مصروف ہوگیا۔ اس کا معاون ایک منقش پیالے میں سے کسی لیس دار دوا کے چمچ بھر بھر کر عورت کے منہ میں ڈالتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا یہ کارروائی بھی کسی ٹونے ٹوٹکے کا حصہ ہے کیونکہ دوا پلانے والے کو اس بات سے غرض نہیں تھی کہ دوا مریضہ کے حلق میں جا رہی ہے یا نہیں۔ وہ صرف ایک مخصوص وقفے سے مشینی انداز میں چمچ مریضہ کے ہونٹوں پر انڈیل رہا تھا اور بس۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ مریضہ کا گھونگھٹ ہٹائے بغیر کیا جا رہا تھا۔ معالج نے آٹے کا ایک پیڑا سا مریضہ کی دونوں چھاتیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا اور گاہے گاہے کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیتا تھا۔ ایسی چند پھونکوں کے بعد وہ مٹی کے لوٹے سے کسی تیل نما مادے کے چند قطرے قمیص کے اوپر ہی سے عورت کے زخم پر ٹپکاتا اور ہونٹوں سے ایک ناقابلِ فہم آواز نکال کر آگے پیچھے جھولنے لگتا۔ ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پندرہ بیس منٹ بعد عورت کا دم اکھڑنے لگا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ علاج معالجے کے جھمیلوں سے آزاد ہوگئی۔ معالج مایوسی سے سر ہلاتا اپنی جھونپڑی میں واپس چلا گیا۔ لوگ گم صم چارپائی کے گرد کھڑے تھے۔ عورت کی موت کے ساتھ ہی ماحول میں موجود بچی کھچی کشیدگی بھی دم توڑ گئی۔ سردار بشر گل، غلام خاں اور دیگر سرکردہ افراد میں کچھ دیر بات چیت ہوئی پھر میت کو واپس لے جانے کے انتظام ہونے لگے۔ کسی کو احساس تک نہیں تھا کہ غلام خاں ایک قاتل ہے اور اس کے دستِ ستم ایجاد کا شکار ہونے والی بدنصیب عورت ان کے درمیان لاش کی صورت پڑی ہے۔ ان کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ مرنے والی مارنے والے کی بیوی تھی اور بس۔ ممکن ہے ان کے دلوں میں رنج اور غصے کے جذبات ہوں لیکن ان جذبات کے اظہار کی ان کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں تھی۔

یہاں تک کہ اس ہجوم میں میرا ہم زباں اور ساتھی عباس خاں بھی بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے نجو کے جھونپڑے کی طرف اٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری طرح کے غم نے دل کو گھیر لیا۔ مجھے یاد آیا کہ

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

کوئی ایسا نہیں

قیمت:
جلد اول: 150
جلد دوم: 150

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:-
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:- ۷۲۴۲۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور۔
فون:- ۷۲۲۳۸۵۳

ابھی مجھے ایک نہایت ناخوشگوار فریضہ انجام دینا ہے۔ نجو کو بتانا ہے کہ شہباز پہلوان نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور اپنی آبرو اور محبت کی قیمت اسے کیا ملی ہے۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا تو نجو مجھے جھونپڑے سے باہر ہی کھڑی دکھائی دے گئی۔ وہ طائرانہ نگاہوں سے ہجوم کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی نجانے کیوں میرا حوصلہ ڈوب گیا۔ میرا دل چاہا کہ اسے شہباز کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ جو خواب اس نے اپنی آنکھوں میں سجا رکھے ہیں انہیں اتنی بے دردی سے مت نوچوں کہ بے چاری کا کلیجا بھی کھنچ کر آنکھوں کے رستے نکل آئے۔ شاید جو کچھ میں نے سنا وہ جھوٹ ہو اور اگر سچ ہو تو ہو سکتا ہے یہ سچ کسی دوسرے سچ میں بدل جائے۔ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ کارخانۂ قدرت میں انہونیوں، کرشموں اور معجزات کی تعمیر شبانہ روز جاری رہتی ہے۔ میں بوجھل قدموں سے نجو کے جھونپڑے کی سمت بڑھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہوشیار ہو گئی۔ آنکھوں میں آس نے چراغاں کر دیا اور ہونٹ شدتِ انتظار سے لرز اٹھے۔ مجھے لگا جیسے وہ بہ زبان خاموشی التجا کر رہی ہے۔ "صیب جی! مجھے کوئی اچھی خبر سنا بُری خبر سننے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔" میں نے اپنے اندوہ کو سینے کی گہرائی میں دھکیل دیا اور چہرے سے بشاشت ہویدا کر لی۔

"کک... کچھ پتا چلا؟" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑی۔

"ہاں" میں نے اعتماد سے جواب دیا "تھوڑا بہت کھوج ملا تو ہے۔" وہ سرتاپا سوال بن گئی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "آج باگڑ خیل کے ایک دکاندار نے بتایا ہے کہ اس نے بدھ کے روز شہباز کو باگڑ خیل کے بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے سر پر معمولی زخم تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی کام سے پارا چنار جا رہا ہے۔ ایک دو روز تک واپس آ جائے گا۔"

"پھر وہ اب تک آیا کیوں نہیں؟" نجو کی فکرمندی جوں کی توں رہی۔

"بھئی یہ تو اب اس سے پوچھنا۔ ویسے نہ آنے کی ایک وجہ بارش بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سارا علاقہ ندی نالوں سے اٹا پڑا ہے اور تو اور پارا چنار جانے والی مین سڑک بھی کئی جگہ برساتی نالوں کے اندر سے گزرتی ہے۔ ہو سکتا ہے راستے بند ہو گئے ہوں اور وہ پارا چنار میں رکا بیٹھا ہو۔"

نجو نے مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا جیسے بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ناکام ہو کر وہ گہری سوچ میں غلطاں ہو گئی۔ میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ چوری کا کیس ہی ہو۔ شہباز نے مجرموں کا پیچھا کیا ہو اور وہ اسے زخمی یا بے ہوش کر کے بھاگ نکلے ہوں۔ بعد میں شہباز انہیں ڈھونڈتا ہوا باگڑ خیل جا پہنچا ہو۔"

"د... وہ زیادہ زخمی تو نہیں تھا؟" نجو کے لہجے میں وفا شعار عورت کی پریشانی عود کر آئی۔

"زیادہ زخمی ہوتا تو پارا چنار کیسے بھاگا جاتا۔ یہاں جھونپڑے میں لیٹا تمہیں نخرے نہ دکھا رہا ہوتا۔" نجو کے چہرے پر شرم کی پرچھائیں لہرا گئی لیکن اگلے ہی لمحے اسے پھر سنجیدہ ہونا پڑا۔ تشویش ناک سوچوں نے جیسے دوبارہ ذہن پر یلغار کر دی تھی۔

وہ منمنائی "صیب جی! کہیں کوئی خطرے والی بات نہ ہو؟"

"خطروں کی ایسی تیسی" میں نے اسے دلاسا دیا "تم بالکل بے فکر ہو کر ہوئے آرام سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹو۔ میں صبح سویرے پارا چنار جاؤں گا اور جیسے بھی ہوا اس نالائق کو کان سے کھینچ کر تمہارے پاس لاؤں گا۔"

لمبی پلکوں تلے نجو کی سیاہ آنکھوں سے احسان مندی جھلکنے لگی۔ وہ جھونپڑے سے باہر کھڑی تھی۔ پانی سے بھاری تیز ہوا اسے بائیں پہلو سے چھو رہی تھی۔ لباس اس پہلو سے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا دستِ ہوا نے بڑی چابک دستی سے اس کا ایک پہلو عریاں کر دیا ہے۔ کسی یونانی سنگتراش کا نمونۂ شاہکار نظر آ رہی تھی وہ۔ اس جھونپڑے میں نکھر کر اس کا جسم جیسے اور بھی مکمل ہو گیا تھا۔ اب اسے بلا جھجک کسی بھی مقابلۂ حسن میں کھڑا کیا جا سکتا تھا لیکن شرط وہی تھی جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ضروری تھا کہ اس مقابلۂ حسن میں صرف جسمانی نزاکت اور خوب صورتی کے معاملات دیکھے جائیں۔ شکل و صورت کے لحاظ سے نجو قبول صورت تو تھی لیکن خوب صورت نہیں تھی۔

نجو کو دلاسا دے کر اور خدا حافظ کہہ کر میں سردار بشر گل کے جہازی سائز جھونپڑے میں واپس آ گیا۔ وہاں میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ میں نے جس طرح غلام خاں اور رستم کو خوں ریزی سے بچایا تھا یہ سردار سمیت سب کے لیے متاثر کن تھا۔ میری طاقت کے تو وہ پہلے ہی قائل ہو چکے تھے، اب ذہانت کے بھی معترف ہو رہے تھے۔ بات معمولی سی تھی لیکن بروقت میرے ذہن میں آ گئی تھی اور یوں ایک دم توڑتی عورت کے سرہانے فساد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ سردار کے جھونپڑے میں میں نے اپنی نشست سنبھال لی تو ایک طویل کش لینے کے بعد سردار نے گڑگڑی ایک طرف رکھ دی۔ پہلے تو اس نے چند الفاظ میری تعریف میں کہے کہ میں نے

دانائی سے کام لے کر رستم اور غلام خاں میں ہونے والی لڑائی روک دی ہے پھر وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ وہ نجو کے بارے ہی بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا یقین نہیں آتا کہ شہباز نے ایسا کیا ہے لیکن مانے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اس بات کے چار سے زائد گواہ موجود ہیں۔ معلوم نہیں وہ بے چاری اس صدمے کو کیسے برداشت کر پائے گی۔ آخر میں سردار نے پوچھا کہ کیا میں نے اسے اس بارے میں بتا دیا ہے؟

میں نے کہا "ہاں۔ تھوڑا بہت اشارہ دیا ہے لیکن کھل کر بات نہیں کی۔"

میرے اور سردار کے درمیان یہ گفتگو حسبِ سابق عباس خاں کے توسط سے ہو رہی تھی۔ سردار نے کہا "بہتر تھا کہ تم اسے بتا دیتے۔ کسی کو جھوٹی آس دلانا گناہ سے کم نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "لیکن سردار، ابھی تک کوئی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ ہو سکتا ہے یہ معاملہ ویسا نہ ہو جیسا ہمارے سامنے آیا ہے۔"

"اب اور پیچھے کیا رہ گیا ہے؟" سردار نے کہا "گواہ موجود ہے۔ غلام خاں ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں موجود تھا۔ لڑکی کی والدہ کا جنازہ ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے اور کس بات کی تصدیق کرنی ہے ہمیں۔"

میں بھی سردار کے منہ سے یہی کہلوانا چاہتا تھا۔ انگلیوں کے سرے جوڑتے ہوئے میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "سمجھ میں نہیں آتا اب اس لڑکی کا کیا ہو گا۔ اس کی زندگی تو شوہر سے شروع ہو کر شوہر پر ہی ختم ہوتی تھی۔ کہیں مایوسی میں وہ کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔ میرا خیال ہے ہمیں اسے جلد از جلد گاؤں واپس پہنچا دینا چاہیے۔"

"کون سے گاؤں؟" سردار نے چونک کر پوچھا۔

"جھوک ضامن۔ جھنگ کا ایک مضافاتی گاؤں ہے۔ میں بھی وہیں کا رہنے والا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس کے والدین کو۔"

سردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے دور رنگی رنگین گڑگڑی کو من پسند عورت کی طرح اپنی طرف کھینچا اور نے کا بوسہ لے کر ایک ہی کش میں سلگتی چلم کو راکھ کر دیا۔ اس کی تقلید میں مصاحبین نے بھی اپنی اپنی گڑگڑیوں پر طبع آزمائی کی اور جھونپڑا دھواں دھواں ہو گیا۔ سردار نے دھوئیں کی اوٹ سے اپنی سرخ آنکھیں مجھ پر جمائیں اور بولا "خیر اتنی جلدی کی ضرورت بھی نہیں۔ ہمیں شہباز کا انتظار کرنا چاہیے۔ ممکن ہے وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہو۔"

یہ عذرِ لنگ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل سردار کہہ چکا تھا کہ اب تصدیق کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا۔ میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ قبائلی رواج کے مطابق نجو پاوندوں کی ملکیت ہو چکی ہے اور اب میں قیمت چکائے بغیر اسے یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔ اب میں نے عباس خاں کے ذریعے سردار سے کھل کھلا کر بات کی۔ جلد ہی سردار بشر گل کا مدعا سامنے آ گیا۔ شہباز کے فرار ہونے کے بعد وہ نجو کو اپنی ملکیت جان رہا تھا۔ تین ہزار روپیہ تو شہباز نقد لے کر گیا تھا اس کے علاوہ ان دونوں پر سردار کا کچھ بیش دو ہزار روپیہ خرچ اٹھ چکا تھا۔ پھر ایک قیمتی رائفل بھی سردار نے شہباز کو تحفے میں دی تھی جو اب شہباز پہلوان دلہن کے عوض غلام خاں کو سونپ چکا تھا۔ کل ملا کر تقریباً آٹھ ہزار روپے کی رقم بنتی تھی۔ سردار بشر گل منافع لینے کا روادار نہیں تھا لہٰذا وہ آٹھ ہزار کے عوض نجو کو آزاد کرنے پر رضامند تھا۔ جونہی سردار بشر گل کے منہ سے آٹھ ہزار کے الفاظ نکلے، میں نے "ہاں" کہہ دی۔ ایک ہزار روپیہ میں نے فوراً سردار کے ہاتھ میں تھمایا اور بقایا ادائیگی کے لیے ۴۸ گھنٹے کی مہلت طلب کر لی۔ اس کام سے فراغت پا کر میں اور عباس خاں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے سردار کے نیم گرم جھونپڑے میں ہی لیٹ گئے۔ صبح اب ہونے ہی والی تھی۔ جونہی رات کی ابر آلود تیرگی پر دن کی نکھری ہوئی روشنی غالب آئی ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

○☆○

ہم ڈھوکی تالاب پر پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ پڑاؤ میں صوبیدار صاحب کے دو خانساموں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ معلوم ہوا سب لوگ صبح سے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ آج کئی روز بعد مطلع صاف ہوا تھا۔ دھلا دھلایا جنگل سورج کی نرم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے اپنے گھونسلوں سے نکلے تھے اور رزق کی تلاش میں محوِ پرواز تھے۔ جنگل کی دوسری مخلوق از قسم خرگوش، بِلّا اور گلہری وغیرہ بھی حرکت میں برکت کے مقولے پر عمل پیرا تھی۔ یقیناً ان سے بڑے جانور بھی محوِ گشت ہوں گے مگر وہ ہماری نگاہ سے اوجھل تھے۔ میں اور عباس چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے آئے تھے۔ بھوک خوب چمکی ہوئی تھی۔ ہم نے افسرانِ اعلیٰ اور دیگر احباب کا انتظار ضروری نہیں سمجھا۔ ہیڈ خانساماں کے سامنے درخواست گزاری اور اس نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمارے سامنے دستر

خوان بچھا دیا۔ مرغابی کے گوشت کا نہایت لذیذ پلاؤ تھا۔ ساتھ میں پودینے کی چٹنی اور آلو کا شوربہ تھا۔ چٹائی پر بیٹھ کر یہ لنچ کرنے میں جو لطف آیا شاید کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی نہ آتا۔ ایک تو کھانا مزے دار تھا دوسرے اس میں گناہ کی لذت بھی شامل تھی۔ جی ہاں' جناب ایس پی برکت صاحب سے پہلے کھا لینا اور وہ بھی چوری چھپے گناہ کے زمرے میں ہی آتا تھا۔ اگر وہ ہمیں اس حالت میں دیکھ لیتے تو یقیناً الٹا لٹکا کر کھایا پیا باہر نکال لیتے۔ میں کھانے کے آخری مراحل میں تھا جب اچانک میرے ذہن میں زخمی عورت کی دید کا منظر تازہ ہو گیا۔ خاکستری پٹی کے نیچے سے جھانکتی ہوئی نیلگوں آنتیں! دل متلا سا گیا۔ اس کے بعد ایک لقمہ لینے کو دل نہیں چاہا۔ سگریٹ سلگا کر میں سوچ میں گم ہو گیا۔ آخر کیا قصور تھا اس بدنصیب کا؟ یہی ناں کہ وہ ایک بیٹی کی ماں تھی اور اسے عزت سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو ہمیشہ کے لیے وداع کرنے سے پہلے وہ اس کے کچھ چاؤ پورے کرنا چاہتی تھی اور وہ "چاؤ" بھی کیا ہوں گے' چند معمولی چیزیں ہوں گی اور کپڑوں کے دو تین جوڑے' کچھ کھانے پکانے کے برتن' اوڑھنے بچھانے کی ایک دو چادریں ۔۔۔ اور بس۔ ان چیزوں کے حصول کے لیے اس بے چاری نے قرض لیا تھا اور اب وہ یہ قرض چکانا چاہتی تھی۔ اپنے شوہر کی کمائی سے نہیں' اپنی بیٹی کے عوض حاصل ہونے والی رقم سے۔ یہ رقم آنسوؤں کے مول حاصل ہوئی تھی اور اس کا بیاج وہ کسک تھی جو بیٹیوں کو انجانے دیس رخصت کرنے والی ماؤں کے دل میں ہمیشہ رہتی ہے۔ اس رقم پر صرف اور صرف سکینہ کا حق تھا۔ اس نے غلام خاں سے بصد عاجزی یہ حق مانگا تھا اور نتیجے میں خنجر گھونپ کر اس کی آنتیں باہر نکال دی گئی تھیں۔

شکاریاں کی واپسی ڈھائی بجے کے قریب ہوئی۔ وہ سب مت تھکے ماندے تھے۔ آتے ساتھ ہی وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد برکت صاحب نے مجھے اپنے خیمے میں طلب کیا۔ صویدا اور کبیر علی شاہ بھی وہیں موجود تھے۔ کبیر علی شاہ نے کہا "کانسٹیبل صاحب! یہ آج کل تم کیا چکر چلاتا پھرتا ہے۔ وہ تمہارا پہلوان' کیا نام ہے اس خدائی خوار کا ہاں شہباز' اس کا کچھ کھوج موج لگا کہ نہیں۔"

میں نے کہا "کھوج تو لگا ہے جی' لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔"

"کیا مطلب؟" کبیر شاہ نے پوچھا "تم تو ایسے بات کرتا ہے جیسے وہ کچھ لے کر رفوچکر ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں' رفوچکر ہی سمجھیں' لیکن دکھ اس بات کا نہیں کہ وہ کچھ لے گیا ہے بلکہ اس بات کا دکھ ہے کہ وہ کچھ چھوڑ گیا ہے۔"

کبیر علی شاہ نے ایس پی برکت سے مخاطب ہو کر کہا "ایس پی صاحب! کبھی کبھی تو ام کو لگتا ہے آپ کا یہ کانسٹیبل ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں کام کرتے کرتے ادھر آ گیا ہے۔ ہر بات گھما پھرا کر کرتا ہے۔"

برکت صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا "بات کو الجھایا مت کرو۔ کھل کر بتاؤ کیا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "وہ میں نے آپ سے نجو نام کی لڑکی کا ذکر کیا تھا ناں' جس کے ساتھ شہباز بغیر نکاح کے رہ رہا تھا۔"

"ہاں ہاں ام کو معلوم ہے۔" کبیر شاہ نے زبردست دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا "تم آگے بولو۔"

میں نے ساری کہانی دہرا دی۔ چھپانے سے کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی عباس خاں سائے کی طرح میرے ساتھ رہا تھا۔ میں چھپاتا تو وہ ظاہر کر دیتا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اب نجو کی حیثیت اس بستی میں یرغمالی کی ہے اور سردار بشر گل اس کی رہائی کے لیے آٹھ ہزار روپیہ طلب کر رہا ہے۔

صویدا' مرجان اور کبیر علی شاہ اس روداد سے بہت متاثر نظر آتے تھے جبکہ برکت صاحب کا معاملہ برعکس تھا۔ چونکہ اس قصے کا عیسیٰ جان وغیرہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا وہ بے زاری ظاہر کرتے ہوئے اٹھ گئے اور دانتوں میں خلال کرتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔

کبیر علی شاہ نے شہباز کو کوستے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے وہ نر کا بچہ نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو یوں اپنی عورت کو پاؤندوں میں چھوڑ کر نہ جاتا۔ کانسٹیبل بھائی خدا کا قسم ام کو یہ سب سن کر دکھ ہوا ہے۔"

صویدا' مرجان نے پُرسوچ لہجے میں کہا "یہ بات تو طے ہے کہ وہ رقم لیے بغیر لڑکی کو آزاد نہیں کریں گے۔ یہ بھی تم نے اچھا کیا کہ انہیں فوراً پیشگی رقم دے دی۔ اب کم از کم پرسوں تک تو وہ پابند ہیں۔"

میں نے سرگوشی کے لہجے میں صویدا سے کہا "آپ ذرا اپنی طرف سے بات کر کے مجھے ایس پی صاحب سے اجازت لے دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہی واپس چلا جاؤں۔"

"کس لیے؟" کبیر علی شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"رقم کا انتظام کرنے کے لیے" میں نے سادگی سے جواب دیا "وہ حسن ابدال کے قریب ہمارا ایک رشتے دار رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔"

کبیر علی شاہ نے تنک کر کہا "کیسا بات کرتا ہے احسان

اہی کیا ام مر گیا ہے۔ ام انتظام کرے گا رقم کا' تم بالکل بے فکر رہو۔ ابھی شام سے پہلے تم کو پیسہ مل جائے گا۔ تم جا کر یہ پیسہ سردار کے منہ پر مارو اور اپنا عورت چھڑا کر لاؤ۔"

صویدار نے بھی کبیر شاہ کی تائید کی اور مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے "بے فکر رہو ہم شام تک رقم کا انتظام کر لیں گے۔ رقم دے کر اپنی عورت لے آؤ' اگر پاؤندے پھر بھی اڑی مڑی کریں تو پھر ہم انہیں دیکھیں گے۔ تم یہاں ہمارے مہمان ہو۔ یہ تمہارا نہیں اب ہمارا مسئلہ ہے۔"

میں نے کہا "جناب اگر ایسا ہے تو پھر میں یہ رقم قرض کے طور پر لوں گا اور واپس جاتے ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔"

کبیر شاہ نے میری پیٹھ تھپکی "چھوڑو یار! یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فضول میں اپنا دماغ ہلکا مت کرو۔ جاؤ آرام کرو شاباش۔"

حسب وعدہ شام سے تھوڑی دیر قبل کبیر علی شاہ نے سات ہزار کے نوٹ گن کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ وہ کھاتا پیتا شخص تھا۔ ممکن تھا اس نے یہ ساری رقم جیب سے ہی ادا کر دی ہو۔ اس کا ایثار اور اعتماد میرے لیے متاثر کن تھا۔ رقم مہیا کرنے کے علاوہ اس نے برکت صاحب کو بھی قائل کر لیا تھا کہ ان کا ہیڈ کانسٹیبل جو کچھ کر رہا ہے وہ عین مناسب اور حسب حال ہے۔ لڑکی کو رہا کرانا نہ صرف ان کا اخلاقی بلکہ قانونی فرض بھی ہے۔ برکت صاحب بُرا سا منہ بنا کر چپ ہو گئے۔ ان کی کون سی پتنگ پھنکری لگ رہی تھی۔ ہاں لڑکی برآمد ہو جاتی تو ان کی ریپوٹیشن پر تھوڑا سا رنگ لگ سکتا تھا۔

اگلے روز علی الصباح میں اور عباس خاں رائفلوں سے مسلح ہو کر پاؤندہ بستی کی جانب روانہ ہو گئے۔ میرے ٹخنے کی چوٹ اب بہتر تھی۔ بس معمولی سا لنگ رہ گیا تھا۔ چند فرلانگ چلنے کے بعد پاؤں گرم ہوئے تو لنگ بھی دور ہو گیا۔ ڈاؤسے پاؤندہ بستی تک کے سارے شارٹ کٹ اب مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ طویل فاصلے کو مختصر تر کرتے ہوئے ہم نے ڈیڑھ گھنٹے میں نصف سفر طے کر لیا۔ اونچی نیچی گھاٹیوں کے درمیان ایک ویران تالاب پر ہم کچھ دیر سستانے کے لیے رکے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں چند یوم قبل میں شہباز پہلوان کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچا تھا۔ پہلوان نے یہاں رک کر پانی پیا تھا اور چند پاؤندوں نے اس کے گھوڑے کی زخمی ٹانگ کا معائنہ کیا تھا۔ میں اور عباس دو پتھروں پر بیٹھ گئے۔ میں نے زخمی ٹخنے کو سہلانے کے لیے بائیں پاؤں کا شکاری بوٹ کھولا لیکن ابھی بوٹ پاؤں سے علیحدہ نہیں ہوا تھا کہ ایک گرجتی ہوئی سی آواز کان میں پڑی۔ کوئی کسی بربری کی طرح چلّا رہا تھا۔ چلّانے والے کی آواز میں گونج تھی جس کا مطلب تھا وہ کسی غار یا کھوہ میں بول رہا ہے۔ ذرا غور سے سنا جاتا تو صاف پتا چلتا تھا کہ بولنے والا نشے میں ہے اور چیخنے کے ساتھ ساتھ کسی کو پیٹ بھی رہا ہے۔ میں اور عباس خاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک ساتھ اٹھ کر ہم آواز کی سمت بڑھے۔ آواز کا منبع ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ تقریباً پچاس گز دور ایک تنگ کھائی میں پھلاہی اور کرنگا کے درختوں کے درمیان ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کھوہ کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ آواز کھوہ کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے تیار حالت میں کر لیا۔ عباس خاں نے میری تقلید کی۔ محتاط قدموں سے دہانے تک پہنچ کر میں نے اندر جھانکا۔ چند قدم آگے کھوہ میں ایک خم تھا لہٰذا اندرونی منظر نظر نہیں آیا۔ ہاں آواز اب بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ الفاظ پشتو کے تھے لہٰذا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ شرابی دہاڑنے کے ساتھ ساتھ کسی کی دھنائی بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں تجسس کی ڈور سے کھوہ میں کھنچا چلا گیا۔ خم کی دوسری جانب میری نگاہ جس چہرے پر پڑی وہ میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ یہ غلام خاں تھا پرسوں رات میری اس سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کی لاش لے کر پاؤندہ بستی سے رخصت ہوا تھا۔ اب میں اسے یہاں نشے میں دھت دیکھ رہا تھا۔ نشے ہی کی وجہ سے اس کی آواز کچھ بدلی بدلی تھی لہٰذا میں فوراً شناخت نہیں کر پایا تھا۔ غلام خاں کے سامنے گدھے کا ایک نومولود بچہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ تین ہفتے عمر رہی ہو گی۔ پھلاہی کی ایک موٹی مضبوط شاخ غلام خاں کے ہاتھ میں تھی اور اس نے اس شاخ سے مار مار کر گدھے کے بچے کو لہولہان کر رکھا تھا۔ میری طرف دیکھ کر غلام خاں چونکا۔ چند لمحے آگے پیچھے جھولتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ شرابیوں کی طرح انگلی لہرا کر بولا "تم وہی ہو ناں جس نے پرسوں رات ۔۔۔ پرسوں رات۔ آں کیا کیا تھا تم نے پرسوں رات؟ ہاں یاد آیا۔ تم نے اس حرامی کو میرے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا۔"

میں سمجھ گیا کہ غلام خاں کا اشارہ رستم کی طرف ہے۔

"ہاں وہی ہوں میں۔" میں نے تصدیق کی "لیکن تم یہاں ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اس کا دماغ ٹھیک کر رہا ہوں۔" وہ گدھے کی طرف اشارہ کر کے پھنکارا "اس کی ماں گدھی کا دماغ بھی میں نے

بالکل ٹھیک کردیا تھا۔ میرے اشارے پر چلتی تھی۔ ذرا چوں چرا بھی نہیں کرتی تھی میرے سامنے۔ یہ تو کوئی شے ہی نہیں۔ ابھی کل کا بچہ ہے۔ اسے ناک سے پانی نہ پلاؤں تو غلام خاں نام نہیں میرا۔" غصے سے چیخ کر وہ ایک بار پھر کم سن گدھے پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بدنصیب جانور کی پچھلی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ وہ شاخ کی ضرب کھا کر اچھلتا تو بائیں جانب بری طرح ڈگمگا جاتا تھا۔ غلام خاں پر جیسے جنون طاری تھا۔ گدھے کی پشت پر ضربیں لگاتے ہوئے وہ چیخنے لگا "بتا... بتا کہاں ہے وہ کلماڑی جس سے مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ بتا کہاں چھپا رہا ہے اسے؟"

نشہ کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا تھا۔ وہ بالکل ٹن ہو رہا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ گدھے کو سعد خاں کہہ کر مخاطب کر رہا ہے اور اس بے چارے کی پٹائی بھی بطور سعد خاں ہی ہو رہی ہے۔ سعد خاں، غلام خاں کے بیٹے کا نام تھا۔ پرسوں رات میں نے اسے زخمی ماں کے سرہانے کھڑے دیکھا تھا۔ بعد میں اس نے ہمیں اپنی ماں پر گزرنے والی مصیبت کی بپتا سنائی تھی۔ غلام خاں نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیسی شراب کا ادّھا برآمد کیا اور چند بڑے گھونٹ لینے کے بعد پھنکارا "دیکھو۔ دیکھو ذرا اس ماں کے لال کی طرف۔ خدائی خوار کیسے طرح گھورتا ہے مجھ کو۔ ماں کا بدلہ لے گا مجھ سے۔ مجھ کو قتل کرے گا۔ اتنی طاقت ہے تجھ میں؟ ہے اتنی طاقت؟" وہ ایک بار پھر کم سن گدھے پر پل پڑا اور اس کی چمڑی ادھیڑنے لگا۔ عباس خاں اور میں نے اسے بمشکل قابو کیا اور ایک طرف لے جا کر آگ کے سامنے بٹھایا۔ یہ آگ خود غلام خاں نے ہی جلا رکھی تھی۔ قریب ہی شراب کی خالی بوتل اور بچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں۔ غلام خاں جو واہی تباہی بک رہا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ سکینہ کی موت کے بعد وہ زبردست نفسیاتی دباؤ میں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سکینہ کا نوجوان بیٹا ماں کی دردناک موت کا بدلہ لے گا اور گھات لگا کر اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اپنے ذہن میں رقصاں خوف کے بھوتوں سے نجات پانے کے لیے وہ ان ویران پہاڑیوں میں چلا آیا تھا اور شراب پی کر غل غپاڑہ کر رہا تھا۔ کسی لکڑہارے کا بھٹکا ہوا یہ گدھا بھی شامت اعمال کے نتیجے میں اس کھوہ تک آ گیا تھا اور اب غلام خاں کے دست ستم کا شکار تھا۔ بیٹے کے حوالے سے غلام خاں کے ذہن میں جتنی بھی نفرت تھی اس نے بے گناہ جانور پر نکالی تھی۔

ہم غلام خاں کو اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتے تھے لیکن نجانے کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ غلام خاں ہمیں اپنے "داماد" شہباز پہلوان کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اسے کچھ نہ کچھ تو معلوم ہو گا کہ شہباز اس کی بچی کو لے کر کہاں گیا ہے۔ وہ نشے میں تھا اور ایسی حالت میں انسان اکثر دل کی بات بھی نکال باہر کرتا ہے۔ میں غلام خاں کے قریب ہی بیٹھ گیا اور گپ شپ کرنے لگا۔ اس کی سوئی ابھی تک گدھے اور اس کی ماں پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کو بے نقط سنا رہا تھا اور بار بار چھاتی پھیلا کر زخمی گدھے کی طرف لپکنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایسے میں عباس خاں اور میں اسے بمشکل سنبھال کر دوبارہ آگ کے پاس بٹھاتے تھے۔ میں نے اسے شہباز پہلوان کی طرف لانے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کوئی جتن کامیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر بار شہباز پہلوان کی بات میں سے بھی سعد خاں کا ذکر نکال لیتا تھا اور گدھے پر جھپٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ اس کی بچی کی شادی کس روز ہوئی تھی۔ تو اس نے جواب دیا۔ "جمعے کو ہوئی تھی۔ جمعے کی رات کو ہی میں نے خواب میں دیکھ لیا تھا کہ یہ خنزیر کا بچہ میری جان کا دشمن ہے۔ اس کے دل میں آگ بھڑک رہی ہے میرے لیے۔ میں کوئی اپنی شادی تو نہیں کر رہا تھا۔ اس کی بہن کا بوجھ ہی سر سے اتار رہا تھا۔ یہ کیوں لال لال آنکھوں سے گھورتا تھا مجھے۔ میں کوئی اس کا دیا کھاتا ہوں... سب یہ حرامی میرا دیا کھاتا ہے۔"

کافی دیر الٹی سیدھی ہانکنے کے بعد وہ ایک دم نڈھال ہو کر سو گیا۔ اس کی آنکھ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کھلی۔ اس دوران میں اور عباس خاں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے والے گدھے کو اس عقوبت خانے سے محفوظ دوری پر پہنچا آئے تھے اور تھوڑا سستا بھی لیا تھا۔ جاگنے کے بعد غلام خاں نے ہوش و خرد کی باتیں شروع کیں۔ اس کا تین چوتھائی نشہ اتر چکا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار میرے چوڑے چکلے جسم پر پھسل رہی تھیں۔ غالباً میرے قد کاٹھ نے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ایک شکاری کی حیثیت سے جانتا تھا اور اسی حیثیت سے مجھے مخاطب بھی کر رہا تھا، کہنے لگا۔

"یار، تم اچھے بھلے سمجھ دار بندے ہو۔ کیا رئیس زادوں کی ٹولی کے ساتھ خرگوش اور مرغابیاں مارتے پھرتے ہو۔ کوئی بڑا کام کرو جس سے نام ہو اور پیسہ بھی ملے۔ ان پہاڑوں پر چلے جاؤ، کوئی ریچھ مارو، بھیڑیا مارو، عقاب پکڑو۔ کتوں کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگ بھاگ کر کیا ملتا ہے تمہیں؟" اس کی اردو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔

میں نے کہا "لگتا ہے شکار سے تمہیں بھی دلچسپی ہے؟"

"دلچسپی؟" وہ بولا "ہمارا تو اوڑھنا بچھونا ہی شکار ہے لیکن تمہاری طرح رئیسوں کا خدمت گار بن کے پانی سے مرغابیاں نہیں نکالی ہیں ہم نے اور نہ ان کے شکاری تھیلے اٹھائے ہیں۔ خود شکار کیا ہے، کمایا بھی ہے اور عیش بھی کیا ہے۔" غلام خاں کی نگاہ دور رس تھی۔ لگتا تھا وہ بندے کے اندر تک دیکھ سکتا تھا۔ کہنے لگا "میرا خیال ہے تم دیہاتی بندے ہو۔ کسی چکر میں آ کر ان رئیس شکاریوں میں پھنس گئے ہو۔"

میں نے اس کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے کہا "پیٹ ہی سب سے بڑا چکر ہے خاں جی، بندہ روٹی روزی کی تلاش میں کیا کچھ نہیں کرتا۔"

وہ دھیان سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کی آنکھوں میں نشے کی دھند نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک تیز تیکھی چمک نے لے لی تھی۔ وہ بولا "سگریٹ ہو گا تمہارے پاس؟" میں نے جیکٹ کی جیب سے ڈبیا نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر چند طویل کش لیے اور بولا "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے اپنا فرضی تعارف کرایا جس کے مطابق میرا نام احسان الہٰی تھا۔ میں لاہور میں ایک ورکشاپ چلاتا تھا۔ عباس خاں میرا پرانا دوست تھا۔ میں اس کے پاس سندھ آیا ہوا تھا۔ عباس خاں کے افسروں نے شکار کا پروگرام بنایا تو میں بھی عباس خاں کے ہمراہ اس شکار پارٹی میں شامل ہو گیا۔ غلام خاں دھیان سے یہ روداد سنتا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری روداد سننے کے بعد وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ شاید عباس خاں کی وجہ سے چپ تھا۔ اس نے عباس خاں کے ساتھ ابھی تک کھل کر بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے خاص اہمیت دے رہا تھا۔ غلام خاں کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے میں نے عباس خاں کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کھوہ میں جلتی ہوئی آگ اب سرد پڑ چکی تھی۔ ایندھن کے لیے عباس خاں کو باہر بھیجنا حسب حال تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ باہر سے کچھ خشک لکڑیاں ڈھونڈ لائے۔ عباس خاں باہر چلا گیا تو غلام خاں ایک دم ڈھب پر آ گیا۔ کہنے لگا "یار، تم میرے دل کو لگے ہو۔ جی چاہتا ہے تم سے تعلق بنا رہے۔ اگر تم تھوڑا سا بھروسا کر سکو تو میں تمہیں ایک زبردست منافعے کا کام بتا سکتا ہوں۔ سمجھو چاندی کے بدلے سونا ملنے والی بات ہے۔" میں ہمہ تن متوجہ ہو گیا، وہ بولا "بات تو سرمایہ داروں والی ہے لیکن میں تو سرمایہ کاری نہیں کر رہا۔ جو کہہ رہا ہوں، بچے

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۳۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے ہاکر یا قریبی
بکسٹال سے طلب فرمائیں

دل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہیں سے پانچ چھ ہزار کا انتظام کرسکو تو دو روز کے اندر میں تمہیں تین گنا منافع دے سکتا ہوں۔ یعنی تم چھ ہزار دو گے تو میں اٹھارہ ہزار تمہیں دوں گا۔"

دنیا کا بہت سرد گرم دیکھا تھا اب بندے کا لہجہ پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ غلام خاں کا اچھا یا برا ہونا علیحدہ بات تھی لیکن در حقیقت جو کہہ رہا تھا دل سے کہہ رہا تھا۔ دو دن کے اندر چھ کے بدلے اٹھارہ؟ کون سی سونے کی کان اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ یہ کوئی غیر قانونی کام ہوگا اور غلام خاں کسی حوالے سے مجھے بھی اس میں ملوث کرے گا۔ وہ جیسے میرے چہرے سے دل کا حال بھانپ گیا۔ کہنے لگا "یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس قانونی کام میں بھی تمہیں ہاتھ پاؤں نہیں ہلانا پڑے گا۔ بس رقم دے کر آرام سے بیٹھ جاؤ اور دو روز بعد اٹھارہ ہزار وصول کرلو۔"

"کیا کوئی خاص سودا مارنے والے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا "نہیں... ہاں چلو ایسا ہی سمجھ لو لیکن اس سودے کی تفصیل میں فی الحال نہیں بتا سکتا اور میرا خیال ہے تمہیں پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمہیں صرف اپنے منافعے سے غرض ہونی چاہیے۔"

چھ ہزار کے اٹھارہ ہزار بنانے میں مجھے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ پیسہ کبھی بھی میری ضرورت نہیں رہا بلکہ اکثر اوقات اس کی موجودگی میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ جیب بھاری ہو تو ساتھ ہی میری طبیعت بھی بھاری ہونے لگتی ہے لیکن غلام خاں کی باتوں نے میرا تجسس ابھار دیا تھا۔ آخر وہ کیسا سودا تھا جس میں وہ اتنے یقین کے ساتھ دو روز میں تین گنا منافعے کی پیش کش کر رہا تھا۔

میں نے غلام خاں کی بھوری آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا "اگر میں چھ ہزار روپیہ تمہیں ابھی فراہم کردوں تو...؟"

اس کی آنکھوں میں حریص چمک نمودار ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اور جوش سے بولا "اگر تم ابھی چھ ہزار دے دو اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم باگڑ خیل پہنچ جائیں تو کل دوپہر تک میں اٹھارہ ہزار نقد تمہاری جیب میں ڈال سکتا ہوں۔ کہو کبھی ایسا بندہ ملا ہے تمہیں؟" وہ بڑے فخریہ انداز میں گردن اکڑا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

عباس خاں واپس آگیا تھا اس لیے ہمیں گفتگو کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ عباس خاں کے آنے سے بجھتی ہوئی آگ کو پھر ایندھن مل گیا اور اس کے ساتھ ہی کھوہ میں خوش گوار حرارت جاگ گئی۔ ہم آلو والے پراٹھے اور لسوڑے کا آچار پڑاؤ سے ہی لے کر آرہے تھے۔ سہ پہر ہونے والی تھی اس لیے کھانے سے فراغت پالی گئی۔ غلام خاں، عباس کی موجودگی سے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے ایک طرف لے جاکر اسے سمجھایا کہ میرا یہ دوست سیدھا سادہ ابوسا بندہ ہے اس کی وجہ سے فکرمند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم یہ سمجھو کہ میں تمہارے ساتھ اکیلا ہی ہوں۔

غلام خاں کی پوری طرح تسلی تو نہیں ہوئی بہرحال وہ عباس کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگیا، ہم تقریباً تین بجے اس کھوہ سے برآمد ہوئے اور پُرپیچ راستے پر سفر کرتے شمال کی جانب بڑھنے لگے۔ ہماری منزل باگڑ خیل تھی۔

○☆○

ڈھوکی تالاب سے تقریباً دس میل شمال مغرب کی طرف پہاڑوں میں گھری ہوئی یہ چھوٹی سی بستی باگڑ خیل کہلاتی تھی۔ کوئی دو ڈھائی سو گھر ہوں گے۔ ان میں نیم پختہ مکان بھی تھے، لکڑی کے گھروندے بھی اور عارضی جھونپڑے بھی۔ بستی کے بیچوں بیچ ایک بل کھاتا بازار تھا۔ جب ہم بستی میں پہنچے، سورج دور سرحد پار کے پہاڑوں میں اوجھل ہو رہا تھا۔ شام کی نتھی پہ سردی کا پرندہ بس اترنے ہی والا تھا۔ بازار کی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی، بس اکا دکا دکانوں کے سامنے کمبل پوش شکاری کونجوں کے پنجرے لیے ٹہل رہے تھے۔ ایک جگہ چھوٹا سا مجمع لگا تھا اور بٹیر کی لڑائی ہو رہی تھی۔ قریب ایک پنجرے میں ایک منحوس شکل جانور پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر غلام خاں نے بتایا کہ یہ چرخ ہے۔ چرخ کی بدبو اور غلاظت کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ دوپہر کا کھانا معدے میں بے قرار ہو کر رہ گیا۔ سب کچھ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ خوب صورت بھی اور بدصورت بھی۔ یہ تمام کا تمام ایک نظام کا حصہ ہے۔ بدصورتی نہ ہو تو خوب صورتی کے کیا معنی؟

غلام خاں کا مکان کافی کشادہ تھا۔ یہ ایک طاقتور اور بااختیار مرد کا حرم تھا۔ یہاں وہ اپنی تین بیویوں اور ان کے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ سب اس کے سامنے بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھیڑ کو تو وہ چند روز پہلے ذبح بھی کر چکا تھا۔ ایک مظلوم عورت کو بھیڑ کہتے ہوئے دل دُکھتا ہے لیکن اسے انسان بھی کس برتے پر کہا جاسکتا تھا!

وجود سرتاپا محکومیت کے سانچے میں ڈھل چکا تھی، کہاں وہ رہ گئی تھی انسان۔ کہتے ہیں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید عورت پر ہونے والے ظلم کی تالی بھی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ آخر کیوں ظلم سہتی ہے عورت؟ اگر مذہب اور معاشرے کے نام پر ظلم کرنا گناہِ عظیم ہے تو مذہب اور معاشرے کے نام پر ظلم سہنا بھی گناہِ عظیم ہے۔ غلام خاں کے گھر میں مجھے سکینہ کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ اس کی آہ و زاری، اس کے نوحے ان در و دیوار میں رچے بسے تھے۔ مجھے لگا کہ میں کسی آسیب زدہ گھر میں آگیا ہوں۔

گھر کے مردانے میں غلام خاں نے ہمیں ایک کشادہ کمرا دیا تھا۔ اس میں فرشی بستر کے علاوہ انگیٹھی کی سہولت بھی موجود تھی۔ غلام خاں کے مطالبے پر میں نے چھ ہزار روپیہ اسے ادا کردیا۔ رقم ہاتھ میں آتے ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسی کام سے گیا ہے جس میں ایک ہزار لگا کر کئی ہزار کا منافع ہاتھ آتا ہے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ سکینہ کا قتل بھی غلام خاں کے اسی لالچ کا شاخسانہ تھا۔ وہ اس سودے میں غیر معمولی منافع حاصل کرنے کے لیے رقم جمع کر رہا تھا اور سکینہ بے چاری بے خبری میں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ کاش غلام خاں سے میری ملاقات کچھ عرصے پہلے ہو جاتی۔ ممکن تھا سکینہ کے بچنے کا کوئی وسیلہ بن جاتا۔

غلام خاں مغرب کے فوراً بعد گیا تھا۔ اس کی واپسی عشا کے بعد بھی نہیں ہوئی۔ اسی دوران سعد خاں بھی کہیں سے گھومتا ہوا ہمارے کمرے میں آنکلا۔ ہمیں اپنے گھر میں دیکھ کر وہ ازحد حیران ہوا۔ اصولی طور پر اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ ہم یہاں کیسے آئے ہیں لیکن اس نے نہیں پوچھا۔ لگتا تھا باپ کے رعب و دبدبے نے اسے لکیر کا فقیر بنا رکھا ہے۔ وہ وہی بات بتاتا ہے جو اس سے پوچھی جاتی ہے اور وہی بات پوچھتا ہے جس کے پوچھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ عجب صورت حال تھی۔ وہ باپ کے خوف سے ڈرا سہما نظر آتا تھا جبکہ باپ اپنے تئیں اس سے دہشت زدہ تھا۔ یقیناً دونوں میں سے ایک کا خوف بے معنی تھا... اور غالب امکان یہی تھا کہ غلام خاں کا خوف بے معنی تھا۔ اس کے اپنے ہی ضمیر کی ملامتیں عفریت بن کر اس سے چمٹی ہوئی تھیں۔ جب رشتوں میں بے اعتمادی کا زہر گھل جائے تو ایسی ذہنی بیماریاں تو جنم لیتی ہی ہیں... غلام خاں کی واپسی تقریباً نو بجے ہوئی۔ اس وقت میں اور عباس خاں کمرے میں تنہا تھے۔ میں نے باہر

احاطے میں کھلنے والی کھڑکی سے دیکھا۔ غلام خاں گھوڑے پر سوار بیرونی دروازے کے سامنے رکا۔ نیچے اتر کر اس نے اپنی رائفل کندھے پر درست کی اور گھوڑے کو کھونٹے سے باندھ دیا۔ اس وقت میری نگاہ گھوڑے کی پشت پر پڑی۔ یہاں زین کے ساتھ کوئی چوکور چیز منسلک تھی جیسے اسلحے کی پیٹی ہو، یہ پیٹی نما چیز ایک اونی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ غلام خاں نے بڑی احتیاط سے اسے زین سے جدا کیا اور اٹھا کر برآمدے کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ وہ جس انداز سے چل کر برآمدے کی طرف گیا اس سے پتا چلا کہ وہ اسلحے کی پیٹی نہیں کیونکہ وہ بے حد ہلکی تھی۔ غلام خاں نے اسے یوں تھام رکھا تھا جیسے ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھوں میں ہو۔

رات کے کھانے پر غلام خاں ہمارے ساتھ تھا اور نارمل انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ میں منتظر رہا کہ شاید وہ خود ہی اپنی آمد و رفت سے پردہ اٹھائے لیکن وہ اس سلسلے میں یکسر خاموش رہا۔ وہ ایک تند خو شخص تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھنے والا اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا لیکن اس وقت وہ قابلِ برداشت موڈ میں تھا۔ اسے چیڑ چپڑ کھاتے اور دیے تھما تھما کر بولتے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص صرف تین روز پہلے اپنی بیوی کو قبر میں اتار چکا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا بھی یہ خود تھا۔ کھانے کے دوران غلام خاں کے دوسرے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میلے کچیلے کپڑوں والے وہ خوف زدہ بچے کٹھ پتلیوں کی طرح غلام خاں کے گرد حرکت کرتے تھے اور ان کی ڈوریں غلام خاں کے ہاتھ میں تھیں۔ ہمارے سامنے اس نے چھوٹی بچی کو اس زور سے ڈانٹا کہ اس کا پیشاب خطا ہوگیا اور سعد خاں کو اسے اٹھا کر باہر لے جانا پڑا۔

اگلے روز علی الصباح غلام خاں نے ہمیں اٹھا دیا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ کھڑکی سے باہر سارے مناظر ایک ہی منظر میں چھپ گئے تھے اور یہ دھند کا منظر تھا۔ لکڑی کی تپائی پر "چائے رس" کا ناشتا تیار رکھا تھا۔ پانچ منٹ میں ہم نے ناشتا کیا اور پانچ منٹ میں ہی غلام خاں نے اپنی باربور کی رائفل کو صاف کرکے بالکل چمکا لیا۔ یہ وہی رائفل تھی جس کے دستے پر شعر کندہ تھے اور غلام خاں کا نام نامی درج تھا "ہم باگڑ خیل سے باہر جارہے ہیں" غلام خاں نے اعلان کیا۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ کپڑے جھاڑ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ پیدل سفر تھا۔ غلام خاں اور عباس نے کمبل کی بکل مار رکھی تھی، میں نے خود کو چرمی جیکٹ میں سمیٹا ہوا

تھا۔ ہم تینوں مسلح تھے۔ غلام خاں کے ایک ہاتھ میں وہ پُراسرار ڈبا تھا جو اس نے رات گھوڑے سے اتارا تھا۔ یہ ڈبا دراصل ایک پنجرہ تھا جس کے چاروں طرف ایک اونی چادر لپیٹ دی گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر غلام خاں نے بتایا کہ اس میں باز ہے۔ اس کی بات پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ باز سے قیمتی شے اس پنجرے میں بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کل رات غلام خاں یہی پرندہ خرید کر لایا تھا۔ میرے کہنے پر غلام خاں نے چادر کا کونا ہٹا کر مجھے اس کی جھلک بھی دکھا دی۔ واقعی وہ ایک شاندار پرندہ تھا۔ اسے دیکھ کر آدمی متاثر ہو تا تھا۔ یقیناً ایسے پرندے کو پرندوں کا بادشاہ کہلانے کا حق حاصل تھا۔ غلام خاں نے بتایا کہ اسے مشرقی شہباز (ایسٹرن ہاک) کہا جاتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پرندے کی لمبائی کم و بیش ۲۵ انچ تھی۔ سر گردن اور پشت سنہری مائل سلیٹی رنگ کی تھی۔ سینہ اور بطن بالکل سفید تھا اور ان پر آر پار خوب صورت سیاہ دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ میں محویت سے قدرت کے اس انمول شاہکار کو دیکھتا چلا گیا۔ اس شخص پر افسوس ہونے لگا جو اس کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ نہیں تھا اور جس نے چند ہزار کے عوض یہ پرندہ ہاتھ سے کھو دیا تھا۔

ہم نے اونچے نیچے راستوں پر سفر جاری رکھا اور ڈھائی گھنٹے میں باگڑ خیل سے پانچ میل دور آ گئے۔ دورانِ سفر غلام خاں نے باز والا پنجرہ ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کیا۔ آٹومیٹک رائفل بالکل تیار حالت میں اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ آخر ایک دشوار راستے سے گزر کر ہم ایک تنگ سرنگ میں داخل ہوئے۔ یہاں تاریکی تھی۔ مجھے اپنی ٹارچ جلانا پڑی۔ کئی جگہ راستہ اتنا تھوڑا تھا کہ پھنس پھنسا کر گزرنا پڑا۔ سرنگ سے نکل کر ہم ایک دم کھلے آسمان تلے آ گئے۔ یہ ہموار جگہ اردگرد کی پہاڑیوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ جنگل میں منگل کا محاورہ اس جگہ پر صادق آتا تھا۔ ان پہاڑیوں میں شاذ و نادر ہی آدم زاد کی صورت نظر آتی تھی لیکن اس مقام پر کم از کم دس افراد موجود تھے۔ آپ اسے نو گھنٹے کی سنسان پہاڑیوں کا ریستوران کہہ سکتے ہیں۔ ٹرک اڈوں پر بچھی ہوئی جہازی سائز کی چارپائیوں جیسی چند چارپائیاں یہاں بھی موجود تھیں۔ اب معلوم نہیں انہیں یہاں تک کیسے پہنچایا گیا تھا۔ قریب ہی ایک کھوہ دھوئیں سے سیاہ نظر آ رہی تھی۔ یہاں چولہا بنا ہوا تھا اور ان دھلے برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ موقعے پر موجود افراد بھی "ان دھلے" برتنوں جیسے ہی

تھے کوئی یہاں پڑا تھا کوئی وہاں۔ ان کے قریب چائے کی پیالیاں، سالن کی پلیٹیں اور شراب کی خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے چار تو بے خبر سو رہے تھے۔ تین جاگ رہے تھے اور تین سو رہے تھے نہ جاگ رہے تھے۔ ان اونگھنے والوں میں ایک لڑکی بھی تھی اور زبانِ حال سے پکار رہی تھی کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ بے حد رنگا رنگ لباس پہن رکھا تھا اس نے اور اس سے بھی رنگا رنگ میک اپ تھا۔ شاید وہ میک اپ نہ کرتی تو خوش شکل نظر آتی مگر لیپا پوتی نے اسے بالکل "نمونہ" بنا رکھا تھا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اس بے ہودہ میک اپ کو مزید بے ہودہ بنانے میں کچھ قصور ان مردوں کا بھی ہے جو اس کے اردگرد مدہوش پڑے تھے۔

ہمیں دیکھ کر منگول خدوخال والا ایک گرانڈیل شخص ہمارے قریب آ گیا۔ ایک دھلی ہوئی پلیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اس نے غلام خاں کو کڑے تیوروں سے گھورا اور کوئی بات پوچھی۔ غلام خاں نے جواب دیا۔ اس نے ایک اور بات پوچھی۔ غلام خاں نے اس کا بھی جواب دیا تھوڑی دیر یہ تفتیشی گفتگو جاری رہی۔ پھر گرانڈیل شخص نے پنجرے سے کپڑا ہٹا کر پرندے پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد بڑی تیز نظروں سے مجھے سرتاپا گھورا۔ میری طرف اشارے کر کر کے غلام خاں سے چند سوالات کیے اور آخر میں اپنا گھڑے جیسا سر سہلاتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ شواہد سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس طویل گفت و شنید کے نتیجے میں ہمیں "ریستوران" میں استراحت کرنے اور کھانے پینے کی اجازت مل گئی ہے۔ ایک چارپائی پر گانے بجانے کے آلات رکھے تھے' انہیں ایک طرف سمیٹ کر ہم نے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص نے ہمارے سامنے کڑک چائے کی پیالیاں لا رکھیں۔ اس جگہ کا منظر سچ مچ کسی ریستوران سے مشابہ تھا۔ رات دیر تک کھلے رہنے والے ریستورانوں اور کلبوں میں صبح نو، دس بجے تک ایسی ہی بے ترتیب غنودگی چھائی رہتی ہے۔ دن کے دس بجے اگر کوئی گاہک آ جائے تو اسے یوں گھورا جاتا ہے جیسے وہ سحری کے وقت جگانے آ گیا ہے۔

ہم چائے پیتے رہے اور دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔ غلام خاں کی زبانی پتا چلا کہ یہ اڈا اسی ادھیڑ عمر شخص کا ہے جس نے ابھی چائے ہمارے سامنے رکھی ہے۔ اس کا نام اکبر ہے۔ مدہوش پڑی لڑکی اس کی کوئی رشتے دار ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اسے بنوں کی طرف سے اغوا کر کے لایا

ہے۔ ڈیڑھ دو برس سے اس نے لڑکی کو اڈے میں رکھا ہوا ہے اور اس سے پیشہ کرواتا ہے۔ ایک بار کچھ لوگ لڑکی کو اغوا کرنے کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ انہی دنوں اکبر نے اس منگول کو نوکر رکھا تھا۔ یہ بھی کوئی اشتہاری ملزم ہی ہے۔ ہم تو معلوم نہیں کیا ہے لیکن یہاں آنے جانے والے اسے منگول ہی کہتے ہیں۔ بڑا غصیلا شخص ہے۔ اسی اڈے پر ہونے والے ایک جھگڑے میں دو افراد کو قتل بھی کر چکا ہے۔

میں نے غلام خاں سے پوچھا "یہاں کسی سے ملنا ہے ہمیں؟"

"ہاں" غلام خاں مختصر جواب دے کر چپ ہو گیا۔ لیکن پھر اسے خود ہی خیال آیا اور وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "یہ پکھبو (پرندہ) ہمیں بیچنا ہے۔ اس کا خریدار یہیں آئے گا۔ میں نے کل شام ایک بندے کے ہاتھ اسے پیغام بھیج دیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اپنے ٹھکانے سے چل پڑا ہو گا۔"

میں جاننا چاہتا تھا کہ خریدار کون ہے اور غلام خاں اس سے کیا قیمت وصول کرنے والا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ باز کس سے اور کتنے میں خرید کر لایا ہے۔ یہ سارے سوال اہم تھے لیکن میں بھانپ چکا تھا کہ غلام خاں ان میں سے کسی کا جواب نہیں دے گا۔ پوچھ کر خواہ مخواہ خجل ہونے والی بات تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' اڈے پر چھائی ہوئی بے ترتیب غنودگی سمٹتی گئی۔ اس پہاڑی ریستوران کے معزز گاہک انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ اٹھتے ساتھ ہی انہوں نے ایک دوسرے کو شاندار گالیوں سے نوازنا شروع کیا۔ کچھ کلیاں اور غرارے وغیرہ کرنے لگے۔ سرخ انگارا آنکھوں والے ایک گیم تحیم پوٹھوہاری نے اٹھتے ساتھ ہی بوتل کو منہ لگایا۔ ان میں سے شاید ہی کسی نے خاص طور پر ہمارا نوٹس لیا ہو۔ سب اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ غلام خاں نے یہاں پہنچتے ہی باز والا پنجرہ ایک بڑی چارپائی کے نیچے کھسکا دیا تھا۔ اب وہ مشکل سے ہی کسی کی نگاہ میں آ سکتا تھا۔

رنگ برنگی لڑکی بیدار ہو کر نہ جانے کس کونے کھدرے میں جا چھپی تھی۔ بس کبھی کبھی دھواں دھار کھوہ کے پچھواڑے سے اس کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ دوپہر کا کھانا دال گوشت اور ایک ایک موٹی خمیری روٹی پر مشتمل تھا۔ کھانے کے بعد تین چار افراد واپس لوٹ گئے تاہم جانے والوں کی جگہ پانچ چھ اور آ گئے۔ یہاں سے جانے اور یہاں آنے والا ہر شخص مسلح تھا۔ میری نگاہ بار بار کلائی کی

گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ ہمیں اس "ریستوران" میں پہلو بدلتے پانچ چھ گھنٹے ہو چکے تھے لیکن تھا جس کا انتظار وہ خریدار نہیں پہنچا تھا۔

اکتاہٹ عروج پر پہنچی تو ہم نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی تاش کی بازی شروع کر دی۔ کھیل کے دوران میں' غلام خاں کو ٹٹولنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ وہ نشے میں تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا۔ سعد خاں کی بڑی بڑی آنکھوں اور ان میں لپکتی ہوئی سرخی کا ذکر کیا۔ وہ اسٹارٹ ہو گیا اور جوان بیٹے کے حوالے سے اس کے ذہن میں ہو سکتے ہوئے خدشات ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب نہیں تو ایک دو سال تک ضرور ذہنی مریض بن جائے گا۔ "مکافاتِ عمل" سے کسی کو مفر نہیں۔ جہاں شامتِ اعمال کا حقیقی اہتمام نہ ہو سکے وہاں قدرت تصوراتی اہتمام کر دیتی ہے۔ مجرم کو اس کا ذہن سزا دیتا ہے۔ اس کی سوچوں کے تازیانے اس کی کھال ادھیڑتے ہیں۔ میں غلام خاں سے ہونے والی گفتگو کو بتدریج اس کی نوبیاہتا بیٹی یاسمین اور داماد شہباز پہلوان کی طرف لے گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ شہباز اب کہاں پایا جاتا ہے۔ غلام خاں کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے پاراچنار کا رخ کیا ہے۔ ممکن ہے وہ شہر ہی میں کہیں کرائے کی چھت تلے رہ رہے ہوں۔ لاری اڈے کے قرب و جوار میں ایک ٹکا فروش رحمان زئی سے اس کے بارے میں پتا چل سکتا تھا۔ میں نے یہ معلومات اپنے ذہن کی "ڈائری" پر نوٹ کر لیں۔

جونہی اندھیرا پھیلا' اس پہاڑی ریستوران میں مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ایک بڑا سا گیس لیمپ چارپائیوں کے عین درمیان لکڑی کی تپائی پر رکھ دیا گیا۔ روشنی ہوتے ہی رات والی لڑکی چھم سے برآمد ہوئی اور پورے ماحول کو جگمگا گئی۔ وہ بڑے ہیجان خیز لباس میں تھی۔ میک اپ ابھی "درہم برہم" نہیں ہوا تھا لہٰذا وہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ چارپائیوں کے عین درمیان ایک الاؤ تو پہلے سے بھڑک رہا تھا' اب یہ دوسرا متحرک الاؤ حاضرین کو گرمانے لگا تھا۔ چائے' شراب' قہوہ' روٹی سب کچھ وہی سرو کر رہی تھی۔ غلام خاں نے سرگوشیوں میں اس اڈے کے قوانین بتاتے ہوئے کہا کہ یہاں ہفتے میں پانچ روز ناچ ہوتا ہے۔ ناچ کے بعد باقاعدہ بولی لگتی ہے۔ جو تین افراد سب سے زیادہ بولی دیتے ہیں ان کے لیے شراب اور کباب کے علاوہ شباب کا انتظام بھی ہو جاتا ہے۔ باقی صرف شراب اور کباب پر گزارا کرتے ہیں اور رتجگا کر کے سو رہتے ہیں یا

واپس چلے جاتے ہیں۔

آٹھ بجے کے قریب اچانک غلام خاں کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ تنگ دروازے میں سے گزر کر ایک قوی الجثہ شخص اس روشن احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا لیکن چوڑا چکلا اور مضبوط شخص تھا۔ اس کا چہرہ بھوری مونچھوں اور داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ پیشانی پر کوئی تازہ زخم تھا جس پر پٹی باندھی گئی تھی۔ وہ مقامی لباس یعنی شلوار قمیص اور کمبل میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں پشاوری چپل اور ہاتھ میں چھوٹی نال کی طاقتور رائفل تھی۔ اسے دیکھ کر غلام خاں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اڈے پر موجود دوسرے لوگ بھی چونک سے گئے' چند لمحوں میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے بیشتر نہ صرف نووارد کو جانتے ہیں بلکہ اس سے مرعوب بھی ہیں۔

نووارد نے اندر آتے ہی لڑکی کی کمر پر اس زور کی چٹکی لی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے لڑکی کے بال مٹھی میں جکڑے اور بڑی شدت کے ساتھ ایک نازیبا حرکت کی۔ منگول (شکرا) جو اب تک آسیب کی طرح ہر شخص کے سر پر سوار تھا صرف مسکرا کر رہ گیا۔ نووارد کی نگاہ جونہی غلام خاں پر پڑی وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ میں نے قریب سے دیکھا تو اس کی شخصیت اور بھی بھاری بھرکم نظر آئی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو گرجنے برسنے کے بجائے "ٹک بولی" کے قائل ہوتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں اور صرف اپنی جسمانی حرکات اور حد درجہ اعتماد سے ہی دوسروں کے دل پر رعب جما لیتے ہیں۔ غلام خاں نے جھک کر اس سے مصافحہ کیا' اس کے بعد عباس خاں نے اس کا انگشتریوں بھرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ تب میری باری آئی۔ اس نے بے پروائی سے اپنا ہاتھ میری طرف پھینکا۔ میں نے بھی کسی خاص گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی تیز نگاہ میرے سراپا پر دوڑی۔ اس کی آنکھوں میں وہی تاثر نظر آیا جو مجھے سمجھا دیا کرتا تھا کہ سامنے والے شخص نے مجھے اہمیت دی ہے اور میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوں جسے دیکھ کر یونہی نگاہ پھیری جائے۔

نووارد نے غلام خاں سے میرے متعلق کچھ پوچھا۔ اس میں سے صرف "پنجابی" کا لفظ میری سمجھ میں آیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ پوچھ رہا ہے "یہ پنجابی کون ہے؟" غلام خاں نے اس سوال کا تسلی بخش جواب دے دیا۔ ویسے بھی یہاں کسی پنجابی سندھی یا بلوچی کا پایا جانا غیر متوقع نہیں تھا۔ یہ آزاد علاقہ پاکستان بھر کے مفروروں کی جنت تھا اور جنتی کہیں کا بھی ہو جنت کی طرف کھنچ ہی آتا ہے۔ غلام خاں اور نووارد میں مختصر گفتگو ہوئی جس کے بعد غلام خاں چارپائی کے نیچے سے باز والا پنجرہ نکال لایا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہی وہ خریدار ہے جس کا ہم صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔ نووارد کے اشارے پر منگول الاؤ کی طرف گیا اور گیس لیمپ اٹھا کر پنجرے کے قریب لے آیا۔ غلام خاں نے بڑی احتیاط اور نزاکت کے ساتھ اونی چادر ہٹائی اور پنجرے کا دروازہ کھول کر باز کو باہر نکال لیا۔ باز کی جھلک دیکھتے ہی سب لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ واقعی ایک شاندار باز تھا اور بڑی بات یہ کہ تربیت یافتہ تھا۔ ہاتھ پر چرمی دستانہ چڑھا کر نووارد نے باز کو مٹھی پر بٹھا لیا۔ باز کے پنجے میں چھلا تھا اور اس سے ریشمی ڈوری منسلک تھی۔

نووارد پرندے کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ اس دوران غلام خاں نے اپنے لباس میں سے ایک چرمی پوٹلی برآمد کی۔ اس میں کلیجی کے ٹکڑے تھے۔ یہ ٹکڑے ایک پلیٹ میں ڈالے گئے اور لڑکی کسی خادمہ کے انداز میں پلیٹ پکڑ کر نووارد کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی دودھیا کمر پر نووارد کی دست درازی کا نشان نیلگوں ابھار کی صورت نمایاں ہو گیا تھا۔ نووارد کی پوری توجہ اب باز کی طرف تھی۔ اس نے پلیٹ میں سے کلیجی کے ٹکڑے لے لے کر باز کو کھلانے شروع کر دیے۔ "منگول" نامی شخص خوشامدانہ انداز میں نووارد کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے نووارد کو مخاطب کر کے پرندے کی تعریف میں کوئی بات کی۔ اس کے جملے میں صرف ایک لفظ میری سمجھ میں آیا اور اس لفظ نے مجھے یوں چونکایا کہ سراپا جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یوں لگا کہ بے خیالی میں میرا ہاتھ کسی ہزار وولٹ کے ننگے برقی تار سے چھو گیا ہے اور میرے جسم کا ہر ذرہ تھرا اٹھا ہے۔

لفظ کی گونج ابھی تک میری حیرت زدہ سماعت میں باقی تھی۔ منگول نامی غنڈے نے نووارد کو ملک عیسیٰ کہہ کر مخاطب کیا تھا "ملک" کا لفظ تکریم کے طور پر کسی بھی شخص کے نام کے ساتھ لگایا جا سکتا تھا۔ میں حیرت سے گنگ تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں میں عیسیٰ جان کے روبرو ہونے کا "شرف" تو حاصل نہیں کر چکا؟ مقام شکر تھا کہ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو کسی نے نہیں دیکھا۔ نووارد سمیت وہ سب پرندے میں مگن تھے۔ میں نے بے اختیار اپنے ہاتھ کو حرکت دے کر پہلو میں رائفل کی موجودگی کا یقین کیا اور چاروں خانے چوکس ہو گیا۔

پرندے کا معائنہ کر چکنے کے بعد نووارد اپنی جگہ سے اٹھا

اور غلام خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے احاطے سے باہر لے گیا۔ وہ دونوں دھواں دھواں کھوہ میں داخل ہوئے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ گمان غالب یہی تھا کہ وہ "سودے" کی بات کرنے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' اپنے شک کی تصدیق کیسے کروں' یہاں کوئی ہم زبان نہیں تھا اور جو ہم زبان تھا وہ میری کیفیت سے بے خبر تھا۔ عباس خاں کو بالکل پتا نہیں چلا تھا کہ میں نے کیا بات نوٹ کی ہے اور اب کس خلش میں جلا ہوں۔ میں نے اسے ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کہا "عباس! مجھے ایک شک ہوا ہے؟"

"کیسا شک؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بندہ جو باز خرید رہا ہے عیسیٰ جان ہے۔"

میرے فقرے نے عباس خاں کے سر پر بم کے دھماکے کا کام کیا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا "اتنا حیران ہونہ بتاؤ" میں نے اسے تنبیہہ کی' وہ نارمل نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا' میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔ تم ذرا ٹوہ لگاؤ کہ کیا یہی عیسیٰ جان ہے لیکن بڑی احتیاط سے۔ کوئی گھپلا ہوا تو یہاں ہم دونوں کی لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔"

عباس خاں کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کوئی گڑبڑ کر دے گا۔ وہ اتنا پست حوصلہ تو نہیں تھا' پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ غالباً ایک دم عیسیٰ جان کا سن کر وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اسے کہا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہے' میں خود معلوم کر لوں گا۔ صبح سے خاموش ساز بج اٹھے تھے اور نوخیز لڑکی الاؤ کی خواب ناک روشنی میں رقص کرنے لگی تھی۔ کسی پشتو فلمی گانے کی دھن تھی جس پر وہ اپنے لچک دار بدن کو توڑ مروڑ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے بولی سے پہلے ہی بولی شروع ہو چکی ہے۔ دیکھیے صاحبان! یہ سڈول بانہیں دیکھیے' یہ پشت' یہ کندھے' یہ سامنے کا گداز اور یہ لچکیلی بانہیں۔ دیکھیے اور اندازہ لگائیے' ان لق و دق پہاڑوں میں اس نرم نرم ریشم کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ تک دھنا دھن... تک دھنا دھن۔ ویرانہ گونج رہا تھا' رباب چل رہا تھا اور شبانہ ناچ رہی تھی۔ میں نے یونہی شبانہ لکھ دیا۔ پتا نہیں اس کا کیا نام تھا۔ ویسے ناموں میں رکھا بھی کیا ہے۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ وہ ان گنت زمانوں سے اسی طرح محو رقص تھی۔ مذہب کے ٹھیکے دار' معاشرے کے چوہدری اور اخلاقیات کے کرتا دھرتا' ہزار ہا سال سے اسے نچا رہے تھے اور اس پر لعنت ملامت کے ڈونگرے بھی برسا رہے تھے۔ یہ دونوں کام ہمیشہ سے ہو رہے ہیں اور شاید ہمیشہ جاری رہنے ہیں۔

ہم بیٹھے رہے اور لڑکی ناچتی رہی۔ سرخ آنکھوں والے پوٹھوہاری پر اس کی خاص نظر کرم تھی' اس کے علاوہ وہ مجھ پر بھی توجہ دے رہی تھی۔ مجھ پر توجہ دینے کی دو ہی وجوہات سمجھ میں آتی تھیں۔ ایک تو میں پہلی بار اس محفل میں شرکت کر رہا تھا' دوسرے میں غیر مقامی تھا۔ اور میرا لباس نسبتاً امیرانہ تھا۔

غلام خاں اور نووارد کی واپسی تقریباً نصف گھنٹے بعد ہوئی۔ جونہی وہ روشنی میں آئے' مجھے اندازہ ہو گیا کہ غلام خاں کی واسکٹ میں ایک بھاری رقم منتقل ہو چکی ہے۔ غلام خاں کا ہشاش بشاش چہرہ بھی اس حقیقت کا غماز تھا۔ نووارد اس پہاڑی ریستوران کے مالک سے باتیں کرنے لگا جبکہ غلام خاں ہماری طرف چلا آیا۔

"سودا ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" غلام خاں نے سرد مہری سے جواب دیا اور ایک گلاس میں تین چار انچ شراب بھر کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے' چلیں واپس؟"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" غلام خاں نے اپنے مخصوص غصیلے لہجے میں کہا "اتنی رات گئے کہاں جانا ہے۔ کل دن چڑھے نکلیں گے یہاں سے۔"

"میری رقم!" میں نے ڈھیٹ بن کر پوچھا۔

"میں بھاگ نہیں رہا ہوں یہاں سے" وہ میرے کان میں پھنکارا "تمہارے چھ ہزار میرے سینے پر لکھے ہوئے ہیں۔" اس کی باتوں سے کسی نودولتیے کی تن فن جھلک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی لمبی رقم ہی ہاتھ لگ گئی ہے۔

میں نے کہا "بے اعتباری والی بات نہیں ہے غلام خاں۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہاں آئے ہیں تو اب کچھ خرچ بھی کریں۔ تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ یہاں بولی شولی بھی ہوتی ہے۔"

وہ میری بات کی تہ تک پہنچ کر بولا "نہیں... نہیں' آج کچھ نہیں ہو گا یہاں۔ آج ملک عیسیٰ یہاں ہے۔ آج رات کوئی بولی نہیں ہو گی۔"

"یہ ملک عیسیٰ ہے کون؟" میں نے پوچھا۔

وہ آواز دبا کر بولا "تیرے میرے جیسے اس کے جوتوں میں بہہ جاتے ہیں۔ بہت پہنچی ہوئی چیز ہے یہ... حرام زادے' تیری قسمت اچھی تھی جو بچ گیا۔ ورنہ جس طرح تو نے اس سے مصافحہ کیا تھا وہ بگڑ جاتا تو ہاتھ کندھے سے اکھاڑ کر پھینک دیتا تیرا۔"

میں نے اپنے لہجے میں خود ساختہ خوف سمیٹ کر پوچھا "کہیں ۔ کہیں یہ عیسیٰ جان ۔ تو نہیں ہے؟"

"ہاں وہی ہے" غلام خاں نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔

ایک دم ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ عیسیٰ جان کسی ارنے بھینسے کی طرح جھومتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ ہمارے قریب بیٹھے دو افراد نے جلدی سے اٹھ کر اس کے لیے جگہ بنادی۔ منگول بھاگ کر آیا اور جھک کر اس کے گلاس میں شراب انڈیلنے لگا۔ وہ پھیل کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور ارد گرد موجود افراد سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اس چہرے کو دیکھ کر یقیناً لوگوں کے دلوں میں دہشت پروان چڑھتی ہوگی۔ میں بھی اسے چھ سات سال پیشتر دیکھتا تو یقیناً ہراساں ہوتا۔ لیکن اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ پچھلے سات برسوں میں ایسے موقعے بھی آئے تھے کہ دہشت نے مجھ سے وحشت کھائی تھی اور موت میرے آگے لگ کر اندھادھند بھاگی تھی۔ جیسے صحراؤں میں ننگے پاؤں چلنے والوں کے تلوے بے حس ہو جاتے ہیں' میرے ذہن میں بھی دہشت کا خانہ بند ہو چکا تھا۔

میں نے عیسیٰ جان کو نگاہوں نگاہوں میں تولا اور میری انگلیوں کی پوروں میں سنسنی خیز حرارت جاگ اٹھی۔ یہی وہ عیسیٰ جان تھا جسے عورتوں کا شکاری کہا جاتا تھا اور جس کا خوف روئے مشت کے پیچ و خم میں کسی آسیب کی طرح چکرا تا تھا۔ اسی شخص کے بارے میں مالک محمد نے کہا تھا کہ اس سے ٹکر لینے کی حماقت کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔ یہی عیسیٰ جان تھا جو مالک محمد کے گھر میں پناہ گزین ہوا تھا اور پھر اس کے بچوں کی ماں کو لے بھاگا تھا۔ وہ نیلہ کا قاتل تھا اور معلوم نہیں نیلہ جیسی کتنی عورتیں اس کے بستر ہوس پر روندی جا چکی تھیں۔ عیسیٰ جان کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ تھا کہ ایک ابلیس اس کے سایۂ عاطفت میں تھا۔ شکر شکرا' جس کا نام ایک گالی تھا اور جس کا وجود نحوست اور بربادی کا دوسرا نام تھا' وہ عیسیٰ جان کی ہی پناہ میں تھا۔

حسب توقع عیسیٰ جان بلانوش ثابت ہوا۔ وہ گلاس پہ گلاس چڑھا رہا تھا اور پھر بھی پوری طرح ہوش میں تھا۔ وہ نہایت قیمتی برانڈ کے امپورٹڈ سگریٹ پی رہا تھا اور ان سگریٹوں کو آگ دکھانے والا لائٹر کم و بیش چار پانچ ہزار کا تو ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس محفل رقص و سرود میں عیسیٰ کو ایک بار بھی لائٹر جلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ جونہی وہ نیا سگریٹ ہونٹوں میں دباتا دائیں بائیں سے کوئی نہ کوئی شخص لپک کر سگریٹ کو آگ دکھا دیتا۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور رات میں گویا ہاتھ لال پری اب ساری محفل پر سایہ فگن تھی۔ میرے اور عباس خاں کے سوا ہر کوئی ترنگ میں تھا۔ پی تو ہم بھی رہے تھے لیکن اس حد تک کہ گلاس ہونٹوں تک لاتے تھے اور پھر نظر بچا کر دائیں بائیں الٹ دیتے تھے۔ مستی میں آکر ایک فربہ اندام آفریدی نے کان پر ہاتھ رکھا اور ایک سریلی تان اٹھائی۔ پشتو گیتوں کی دھنیں بہت دلکش ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک خوبصورت گیت تھا۔ ساز بجانے والوں نے خود کو اس گیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا اور لڑکی نے بھی اپنے رقص کے بھاؤ تاؤ بدل لیے۔ یقیناً یہ کوئی "خود ساختہ" قسم کا فحش گیت رہا ہو گا کیونکہ سننے والوں نے ہائے ہائے کے نعرے بلند کیے اور عیسیٰ جان کے ہونٹوں پر بھی لوفرانہ ہنسی سج گئی۔

گیت کا ٹکڑا گا کر آفریدی چپ ہو گیا تو سرخ آنکھوں والے پوٹھوہاری نے ایک مصرعے کی تان اٹھائی۔ گیت کا مطلب کچھ اس طرح تھا تیرے پراندے کے سرخ پھندنوں پر نظر پڑتی ہے تو جم کر رہ جاتی ہے۔ میں تیری چال دیکھتا اس طرح تیرے پیچھے چل رہا ہوں جیسے بھوکا بچھڑا سبز چارے کے پیچھے چلتا ہے۔ عیسیٰ جان کو اب ساز کے ساتھ آواز کا لطف آنے لگا تھا۔ پوٹھوہاری خاموش ہوا تو اس نے تیسرے شخص کو کچھ گانے کے لیے کہا۔ اس نے بھی بلا جھجک ایک ٹکڑا گا کر سنا دیا۔ اب یہ سلسلہ چل نکلا۔ باری باری سب ایک ایک دو دو شعر گا کر سنانے لگے۔ جن کی آواز اچھی تھی انہوں نے پورا پورا گیت گایا۔ یہاں تک کہ عباس خاں کی باری آ گئی۔ عباس خاں واقعی ایک خوش گلو شخص تھا۔ اس محفل میں ایک بھی اس کے پائے کا "گلوکار" نہیں تھا۔ میں نے پڑاؤ میں اسے سنا تھا اور گلوکاری کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتے ہوئے بھی اسے پسند کیا تھا۔ عباس خاں نے ایک گیت کا ٹکڑا گایا تو آواز کے سحر نے سب کو متاثر کیا۔ اس سے پورا گیت سنانے کی فرمائش کی گئی۔ مجبوراً اسے پورا گیت گانا پڑا۔ محفل جھومنے لگی۔ خوب داد دی گئی۔ یہ گیت ختم ہوا تو ایک اور کی فرمائش ہو گئی۔ اس مرتبہ فرمائش جان محفل یعنی رقاصہ لڑکی کی طرف سے تھی۔ عباس خاں کو یہ فرمائش بھی پوری کرنی پڑی۔ عباس خاں کے بعد میری باری آنی تھی اور میں از حد پریشان تھا کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹوں گا۔ موسیقی سے میرا شوق صرف اور صرف سننے کی حد تک تھا۔ بہرحال قدرت نے میری یہ مشکل آسان کر دی۔

عباس خاں خاموش ہوا تو پوٹھوہاری نے رقاصانہ طور پر ایک اور گیت شروع کر دیا۔ اس گرم گرم گیت کے دوران ہی عیسیٰ جان جھومتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور رقاصہ لڑکی کو بغل میں دبوچ کر دھواں دھواں کھوہ میں روپوش ہو گیا۔ جان محفل رخصت ہو گئی تو محفل بھی زیادہ دیر نہیں چل سکی۔ شرکائے محفل تھوڑی دیر گالیاں بکنے اور ایک دوجے کو فحش مذاق کرنے کے بعد اپنی اپنی جگہ "ٹلم لیٹ" ہونے لگے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر محفل اختتام کو پہنچ گئی۔

سب مدہوش ہو کر چارپائیوں پر پڑ رہے۔ حالانکہ یہ جگہ چھت کے بغیر تھی مگر چاروں طرف سے اس طرح ٹیلوں میں گھری ہوئی تھی کہ ہوا کا گزر نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر مسلسل بھڑکتے ہوئے الاؤ نے فضا کو گرم رکھا تھا۔ عباس خاں اور میں ایک ہی چارپائی پر آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ رائفلوں کو سرہانے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ غلام خاں الاؤ کے بالکل قریب زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنی رائفل سر کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ نیند غلام خاں کی آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ اس کی واسکٹ میں ایک موٹی رقم موجود تھی۔ اس رقم کی موجودگی میں اسے نیند آ ہی نہیں سکتی تھی۔

دوسری طرف میرا بھی سونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ پروگرام ہوتا بھی تو نیند کیسے آتی۔ ذہن تو گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ عیسیٰ جان یہاں موجود تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا' وہ کب یہاں سے رخصت ہونے والا ہے اور کہاں جانے والا ہے۔ اب میرے سامنے دو ہی راستے تھے پہلا یہ کہ عیسیٰ جان کو گن پوائنٹ پر رکھ لوں اور اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کروں' دوسرا یہ کہ شہباز پہلوان کی طرح اس کا بھی تعاقب کروں اور اس کا ٹھکانا ہوا اس کے اڈے تک پہنچ جاؤں۔ دونوں صورتوں میں خطرات موجود تھے بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک خطرات تھے۔ یہ علاقہ عیسیٰ جان کا گڑھ تھا اور یہاں اسے رائفل کے زور پر اپنی مرضی سے چلا لینا آسان کام نہیں تھا۔ اسی طرح اس کا تعاقب بھی ناکامی سے دوچار ہو سکتا تھا۔ وہ ایک کھاگ اور پختہ کار مجرم تھا' شہباز پہلوان نہیں تھا کہ ناک کی سیدھ میں چلتا رہتا اور مجھے اپنے پیچھے لگائے پھرتا۔ اس نے ہر قدم پھونک کر رکھنا تھا اور اپنے گرد و پیش سے پوری طرح باخبر رہنا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس سواری ہے یا وہ پیدل واپس جائے گا۔ اگر وہ گھوڑے گھر دقیو پر آیا تھا تو میرے لیے اس کے پیچھے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔

اسی کشمکش میں وقت گزرتا رہا۔ کھوہ کے اندر سے کبھی کبھی عیسیٰ جان یا رقاصہ لڑکی کی مدھم آواز سنائی دے جاتی تھی۔ عباس خاں سو چکا تھا بلکہ میں خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہا تھا۔ نیم وا آنکھوں سے میں کبھی کبھی غلام خاں کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی واسکٹ کے زیریں حصے پر جم کر رہ گیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ ہاں۔ میری طرح وہ بھی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ منگول نامی ڈشکرا اور پھولی ہوئی ناک والا ادھیڑ عمر شخص مسلسل جاگ رہے تھے۔ اگرچہ کیداری کا مسئلہ ہوتا تو ان میں سے ایک سو سکتا تھا غالباً وہ عیسیٰ جان کی خوشنودی کے لیے ایسا کر رہے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ عیسیٰ جان کو کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے' ایسے میں وہ سوئے پائے گئے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔

رات آخری پہر' ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ میں نے غلام خاں کو اپنی جگہ سے اٹھتے اور اپنا کمبل وغیرہ سنبھالتے دیکھا۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ کھسکنے کی تیاری کر رہا تھا۔ منگول ڈشکرے کے پاس جا کر اس نے دھیمی آواز میں چند باتیں کیں۔ کھانے اور شراب وغیرہ کا بل چکایا اور الاؤ کی جلتی ہوئی لکڑی سے سگریٹ سلگا کر اس تنگ راستے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے پھنس پھنسا کر ہم اس احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ غلام خاں سے ایسی بدعہدی کی مجھے توقع نہیں تھی۔ غالباً اس کی نیت میں فتور رقم ملنے کے بعد آیا تھا۔ یہ پیسہ چیز ہی ایسی ہے۔ بڑے بڑے نیکوکاروں کا پتا پانی کر دیتا ہے۔ غلام خاں تو تھا ہی ایک گھٹیا اور بد خصلت انسان۔

میں بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اڈے کا مالک ادھیڑ عمر شخص میرے قریب آ گیا۔ اپنی گرگری کے کچوکوں سے اس نے مجھے "جگایا" اور غلام خاں کی خالی جگہ کی طرف اشارے کر کر کے کچھ کہنے لگا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اڈے کے مالک کے طور پر یہ اس کی ذمے داری تھی کہ مجھے میرے ساتھی کی پراسرار روانگی سے آگاہ کرتا۔ ادھیڑ عمر شخص کی آواز سن کر عباس خاں بھی جاگ اٹھا۔ لگتا تھا وہ بھی زیادہ گہری نیند نہیں سویا۔ ادھیڑ عمر شخص نے عباس سے پوچھا کہ جانے والے سے انہیں کچھ لینا دینا تو نہیں تھا۔ عباس نے اس سوال کا ترجمہ کر کے میری جانب اچھال دیا۔ میں نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ لینا دینا تو کچھ نہیں تھا مگر اس کا یوں جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے عباس سے کہا "میں ابھی آتا ہوں"

رائفل تھام کر اور جوتی پہن کر میں تیزی سے غلام خاں کے پیچھے گیا۔ دراز نما راستے سے گزر کر باہر آیا تو یخ بستہ ہوا نے استقبال کیا۔ یہاں ایک طرف لمبے بالوں والے تین گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ ان میں سے ایک گھوڑا عیسیٰ جان کا ہو۔ دور نیچے ڈھلوان پر چند لمحوں کے لیے غلام خاں کی ٹارچ چمک کر اوجھل ہوگئی۔ میں نے تاریکی میں راستہ دیکھنے کے لیے پوری طرح آنکھیں کھولیں اور احتیاط سے نیچے اتر گیا۔

تقریباً چار فرلانگ آگے جا کر ایک تنگ گھاٹی میں میں نے غلام خاں کو جالیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بری طرح چونکا۔ پھر بوکھلاہٹ کے بجائے اس کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ میری ٹارچ کے روشن دائرے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے وہ بولا ”کیا بات ہے، کیوں نیند حرام ہوگئی ہے تمہاری؟“

میں نے کہا ”اس سوال کا جواب مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو۔“

وہ جھنجھلا کر بولا ”تمہارے چھ ہزار لے کر میں بارڈر پار نہیں کر جاؤں گا۔ بال بچے، گھر بار سب کچھ یہیں ہے میرا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔ میں بھاگ نہیں جاؤں گا۔ ابھی ایک دو گھنٹے میں واپس آجاتا ہوں۔“

میں نے اس کے تند و تیز لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر اپنی رقم کی واپسی پر اصرار کیا تو اس نے پہلے سے گن کر ایک طرف رکھے ہوئے چھ ہزار روپے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوگئی۔ اس نے بڑے ”احسان“ کے ساتھ دو ہزار روپے اور میری طرف اچھالے اور بولا ”اب دفع ہو جاؤ۔“

”لیکن تم نے اٹھارہ ہزار کا وعدہ کر رکھا ہے“ میں نے بدستور محاذ آرائی کا لہجہ اختیار کیے رکھا۔

وہ بولا ”میرے پاس نہیں ہے اٹھارہ ہزار۔ اگر پوری بے منٹ ہو جاتی تو میں دے دیتا لیکن ابھی تو میری لگائی ہوئی رقم بھی نہیں ملی۔“

میں نے کہا ”مجھے بے منٹ سے غرض نہیں۔ تم نے صرف چوبیس گھنٹے کی بات کی تھی اور اب دوسرا دن ہوگیا ہے اور اگر بے منٹ کی بات کرتے ہو تو اس کا بھی مجھے پتا ہے، پوری رقم تمہاری جیب میں ہے۔ اگر نہ ہوتی تو رات کے اس پہر تم چوروں کی طرح بھاگ نہ رہے ہوتے۔“

ایکا ایکی سب کچھ غلام خاں کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ وہ خطرناک انداز میں بولا ”چھالا دو پیسے ۔۔۔ میں پورے کردیتا ہوں“ میں جانتا تھا کہ وہ آٹھ ہزار واپس لے کر رائفل میری طرف سیدھی کرلے گا۔

میں نے کہا ”چورے تم نے کیا کرنے ہیں؟ آٹھ ہزار میرے پاس ہیں، دس ہزار اور روپے دو۔“

اس نے انگلی میری جانب سیدھی کی اور منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے بولا ”دیکھو ۔۔۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بہت برا آدمی ہوں میں۔ میرا دماغ گھوم گیا تو پھر کچھ نہیں ہوسکے گا۔ ابھی وقت ہے بھاگ جاؤ یہاں سے۔“

میں نے کہا ”بھاگنا ہوتا تو پیچھے کیوں آتا؟“

ایک دم وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور قمیص کے نیچے سے اس نے خمدار خنجر نکال لیا۔ یقیناً یہ وہی خنجر تھا جو چند روز پہلے بدنصیب سکینہ کا پیٹ چاک کر چکا تھا۔ غلام خاں اتنے غصے میں تھا کہ کوئی اور اسے دیکھتا تو سکتے میں آجاتا۔ ایسے لوگ زخم لگنے سے پہلے ہی مقتول ہو جایا کرتے ہیں۔ جانیرو ہی ہوتے ہیں جو یہ بات جانتے ہیں کہ غصیلے قاتل اور اندھے قاتل میں انیس بیس کا ہی فرق ہوتا ہے۔ خنجر سونت کر غلام خاں تیر کی طرح میری طرف آیا۔ اس کا بایاں ہاتھ مجھے گریبان سے پکڑنے کے لیے یا دھکیلنے کے لیے یا یونہی غیر ارادی طور پر میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ یہ اٹھا ہوا ہاتھ اناڑی پن کی نشانی تھا۔ ماہر خنجر زن چارج کرتے ہوئے کبھی یہ انداز نہیں اپناتا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ٹانگ استعمال کرنے کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے پہلو بدل کر یہ وار بچایا اور بالکل صحیح وقت پر ایک ٹھوکر غلام خاں کے کولہوں پر رسید کی۔ وہ توازن کھو کر سر کے بل ایک تناور میہانی سے ٹکرایا اور ایک کراہ کے ساتھ نشیب میں لڑھک گیا۔ میں نے اس کا سایہ میہانی کی شاخوں کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھا۔ پھر ایک چھپاکے کی آواز آئی اور غلام خاں کے منہ سے مغلظات کا دھارا بہہ نکلا۔ ٹارچ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ غلام خاں نے خنجر نکالتے ہوئے اپنی ٹارچ نیچے گرا دی تھی، وہ اب بھی گھاس پر پڑی ہوئی جل رہی تھی۔ میں دونوں ٹارچیں سنبھال کر نشیب میں پہنچا۔ غلام خاں مجھے ایک گڑھے میں گرا نظر آیا۔

ڈھلوان پر واقع یہ ایک دلدلی سا گڑھا تھا اور اوپر تک یخ بستہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ گڑھے کا بالائی کنارا پانی کے کٹاؤ نے کھوکھلا کر دیا تھا اور یہاں ایک تناور درخت کی جڑیں زمین سے نکل کر پانی میں تیر رہی تھیں۔ غلام خاں نے ان جڑوں کو تھام کر گڑھے سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو میری

بروقت ٹھوکر نے اسے پھر گڑھے کے وسط میں پہنچا دیا۔ اس کشمکش میں رائفل ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ گڑھے میں غتربود ہو چکی تھی۔ ہاں خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ اب خنجر سے اپنا پیٹ چاک کرنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا اور شاید وہ جھلاہٹ میں ایسا سوچ بھی رہا ہو۔ اس نے آغاز ہی میں رائفل استعمال نہ کرکے غلطی کی تھی اور اب رائفل اس کے ہاتھ میں رہی تھی نہ خنجر کسی کام کا۔

لڑکھڑا کر وہ ایک بار پھر اڑنے بھینسے کی طرح کنارے پر چڑھا۔ میں نے بھی دوبارہ ٹانگ کو حرکت دی۔ شکاری بوٹ کی ضرب اس کے منہ پر پڑی۔ ایکشن ری پلے ہوا اور وہ پھر گڑھے کے وسط میں گرا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ فرطِ غضب کے سبب منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ جو بھی غلیظ ترین گالی اس کی زبان پر آسکتی تھی وہ لا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایسی خوفناک دھمکیاں تھیں جو پتھر کا جگر پانی کرسکتی تھیں۔ دو ٹھوکریں کھانے کے بعد غلام خاں پر جیسے جنون سوار ہوگیا۔ وہ اچھل اچھل کر کنارے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور میری ٹھوکریں کھا کھا کر پانی میں گرنے لگا۔ آخر وہ بے دم ہوگیا۔ اس کے اگلے دو تین دانت ٹوٹ چکے تھے اور چہرہ لہولہان تھا۔ وہ اس قدر ہانپ گیا تھا کہ اب بولنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔

میں نے اطمینان سے کہا ”تم کہہ رہے تھے کہ بہت برے ہو تم۔ میرے خیال میں تمہیں غلط فہمی رہی ہے۔ تمہارے جیسا بھیا بندہ تو میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔ اتنی مار کھا کر بھی جو شخص مارنے والے کو انگلی تک نہ لگائے وہ برا کہاں سے ہوا۔ اسے تو درویش کا خطاب ملنا چاہیے۔“

غلام خاں کے لہولہان ہونٹوں سے ایک بار پھر گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ جوشِ غضب میں اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی اور یہ کیفیت اس سے عجیب و غریب گالیاں موزوں کرا رہی تھی۔ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر وہ فاتر العقل نظر آنے لگا تھا۔ چیخ کر بولا ”میں سب سمجھ گیا ہوں۔ ہاں سب سمجھ گیا ہوں میں ۔۔۔ تم ۔۔۔ یہ رقم مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔ ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔ ایک کوڑی نہیں۔“

میں رائفل ہاتھ میں لے کر گڑھے کے کنارے بیٹھ گیا ”رقم تو بعد کی بات ہے پیارے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ وہ باز کہاں سے لیا ہے، کتنے میں لیا ہے، کتنے میں بیچا ہے۔ اور اس سے پہلے ایسے کتنے سودے کر چکے ہو تم؟“

اس نے ایک بہت گہری سانس لے کر اپنے غضب کے منہ زور گھوڑے پر کاٹھی ڈالنے کی کوشش کی اور میری طرف انگلی اٹھا کر لرزاں لہجے میں بولا ”دیکھو ۔۔۔ میں آخری بار ۔۔۔ آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں، میرے رستے سے ہٹ جاؤ ۔۔۔ ہٹ جاؤ ورنہ بڑا دکھ اٹھا کر مرے گا۔“

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے کہا ”جہانی استاد کا نام سنا ہے؟ نہیں سنا ناں، یہی تیری بدقسمتی ہے۔ جہانی استاد جو کہتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور آج جہانی استاد تجھ سے کہہ رہا ہے کہ جو پوچھا جا رہا ہے وہ بتا دے ورنہ بے موت مارا جائے گا۔“

میرے بدلے ہوئے لہجے نے اسے ٹھٹکا دیا۔ یہ وہی لہجہ تھا جو مدمقابل کے اعصاب پر سوار ہو کر اسے مفلوج کردیتا تھا۔ کوئی چیز جیسے دھماکے سے غلام خاں کے اندر ٹوٹ گئی، شاید یہ اس کی خودسری اور ہٹ دھرمی کا بت تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میر کو سوا میر مل گیا ہے لیکن رسی جلنے کے باوجود بل نہیں گیا۔ وہ اپنے لہجے کی تن فن برقرار رکھتے ہوئے بولا ”نہیں بتاؤں گا۔ کچھ نہیں بتاؤں گا، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے ۔۔۔ میں نے اٹھارہ ہزار کی بات تم سے نشے میں کی ہوگی لیکن تم نے اس بات کو پکڑ کر کتے کی طرح بھونکنا شروع کر رکھا ہے۔ میں دس ہزار کی وہ ہڈی تمہارے منہ پر مار رہا ہوں۔“

میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کرلی اور بے انتہا سرد لہجے میں کہا ”اب بات دس ہزار کی نہیں۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور یاد رکھو یہ میری آخری وارننگ ہے۔“

غلام خاں کا چہرہ بھیگا ہوا تھا ورنہ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں ہو جاتے۔ وہ بدبخت اندر سے مسمار ہوگیا تھا لیکن اس کی سرخ گردن ابھی تک اکڑی ہوئی تھی۔ غلام خاں سے کچھ پوچھنا میرا مطمح نظر نہیں تھا۔ وہ میرے سوالوں کے جواب نہ بھی دیتا تو کیا فرق پڑ جاتا لیکن اس کی اکڑی ہوئی سرخ گردن اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

”نہیں بتاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں“ وہ اپنی ہمت جمع کرکے بولا۔ غالباً اسے یقین نہیں تھا کہ میں آخری حد تک جاؤں گا۔ میں نے رائفل اور ٹارچ کنارے پر رکھ کر یخ بستہ پانی میں چھلانگ لگائی اور چند لمحوں میں غلام خاں کو روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا مگر اس کا ایک ہاتھ ابھی تک واسکٹ کی اندرونی جیب ہی پر رکھا ہوا تھا۔ میں اسے ٹانگ سے گھسیٹ کر گڑھے سے باہر لایا۔ رائفل کے ساتھ ساتھ ”قاتل خنجر“ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس کا لباس کیچڑ سے لت پت

اور خونیں وحشتوں سے داغدار تھا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی ایک تنگ گھاٹی میں تھے اور قرب و جوار سے ہمیں دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے غلام خان کی واسکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک رومال میں لپٹے ہوئے کرنسی نوٹ باہر نکال لیے۔ نوٹ بھیگ چکے تھے۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی تین گڈیاں تھیں۔ یعنی ڈیڑھ لاکھ روپیہ سکۂ رائج الوقت۔

ان میں سے صرف ایک گڈی ذرا ہلکی تھی۔ اس میں سے آٹھ ہزار روپیہ نکال کر مجھے دیا گیا تھا۔ میں نے غلام خان کی تمام جیبیں کھنگال ڈالیں۔ ایک جیب سے ڈیڑھ سو روپے کے کرنسی نوٹ ملے۔ ایک جیب میں ایک بوسیدہ سی ڈائری تھی جس میں چند کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ قمیص کی جیب سے ایک بال پوائنٹ اور ریزگاری ملی۔ ڈائری کے کاغذات میں ایک رسید بھی تھی۔ سادہ کاغذ پر لکھی ہوئی یہ رسید باگڑ خیل کے کسی گل جان نامی شخص کی طرف سے تھی۔ دو روز پہلے گل جان نے ایک باز بعوض بارہ ہزار روپے نصف جن کے چھ ہزار روپے ہوتے ہیں 'غلام خان کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ کل رقم نقد وصول کرلی گئی تھی اور اب اس پرندے پر گل جان کا کوئی حق دعویٰ نہیں تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ یعنی گل جان نامی کسی انجان شخص سے یہ باز بارہ ہزار روپے میں خرید کر غلام خان نے ڈیڑھ لاکھ میں بیچا تھا۔ لالچ کی انتہا یہ تھی کہ اس سودے میں ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب منافع حاصل کرکے بھی وہ میرے اٹھارہ ہزار لے کر رفوچکر ہو رہا تھا۔ روپے کی بات نہیں تھی 'بات غلام خان کی تھی۔ وہ ایک خصیلا درندہ تھا۔ غیر تو غیر اپنے بھی اس کے شر سے محفوظ نہیں تھے۔ میں نے باگڑ خیل میں اس کے اہل خانہ کو دیکھا تھا۔ وہ اس کے اہل خانہ نہیں تھے 'یرغمالی تھے۔ اس کی وحشت ناک آواز ان کے پیشاب خطا کردیتی تھی۔ وہ اس کے گھر میں یوں رہتے تھے جیسے کسی خون آشام مگرمچھ کے ساتھ جھیل کی ہر مخلوق رہتی ہے۔

میں جو کچھ غلام خان سے معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے اس کی جامہ تلاشی سے معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے غلام خان کے کمبل سے اپنے شکاری بوٹوں کی کیچڑ صاف کی۔ یہ کمبل اس وقت میانی کی شاخوں سے الجھ گیا تھا جب غلام خان گڑھے میں گرا تھا۔ اپنی جیکٹ کی جیبوں سے کیچڑ اور پانی وغیرہ نکال کر میں نے ٹارچ پتلون میں ٹھونسی 'رائفل اٹھائی اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ غلام خان زخموں سے چور ہو کر نڈھال پڑا تھا۔ میں نے بے پناہ سفاکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا "غلام خان! میں جو جاننا چاہتا تھا جان گیا ہوں۔ اب میں تمہیں چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن چھوڑوں گا نہیں۔ میں نے تم سے 'بکری' کا وعدہ کیا تھا اور میں وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

غلام خان کو میری آنکھوں میں یقیناً موت نظر آئی تھی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میری رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور غلام خان کی پیشانی پر سیاہ سوراخ نمودار ہوگیا۔ میں نے ایک دس پندرہ کلو کا پتھر اس کے کمبل میں رکھا اور کمبل اس کے پیٹ سے باندھ دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی گرنس رائفل اور خنجر وغیرہ "ڈھونڈنے" کے لیے یخ بستہ گڑھے میں اتر چکا تھا۔ یہ سارا واقعہ تقریباً بیس منٹ کے اندر وقوع پذیر ہوگیا تھا۔ میں نے نوٹوں کی بھیگی ہوئی گڈیاں چرمی جیکٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھنی چاہیں لیکن ان کا ابھار مشکوک نظر آرہا تھا۔ میں نے کل دس ہزار روپیہ نکال کر باقی ساری رقم رومال میں لپیٹی اور اسے گڑھے کے قریب جھاڑ جھنکاڑ کے اندر ایک محفوظ رخنے میں چھپادیا۔ اس کے بعد میں مستحکم قدموں سے واپس "پہاڑی ریستوران" کی طرف روانہ ہوگیا۔ رات ابھی تاریک تھی تاہم مشرق سے صبح صادق کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ میرے بھیگے کپڑوں میں سے ہوا بدن چیرتی گزر رہی تھی۔ ابھی میں بلندی کی طرف سو ڈیڑھ سو گز ہی گیا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ تو ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے آئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ٹارچ کی روشنی میرے اردگرد چمکی۔

"کون ہے؟" یہ عیسیٰ جان کی آواز تھی۔ "میں اس آواز کو اور اس صورت کو بھلا کیسے نہ پہچانتا؟ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مجھ سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ وہ دونوں جیسے ایک دم ہی اندھیرے سے اگ آئے تھے۔ عیسیٰ جان نے مجھے "اردو" میں مخاطب کیا تھا 'اس کا مطلب تھا وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ کہیں غلام خان کو جہنم واصل کرتے ہوئے مجھے دیکھ تو نہیں لیا گیا؟ یہ سوال میری سوچوں میں سنسنایا اور تیر کی طرح ذہن میں پیوست ہوگیا۔

"میں ہوں احسان" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔ ایک لمحے کے توقف سے عیسیٰ جان نے پوچھا "کچھ پتا چلا تم کو؟"

"نن۔۔۔ نہیں 'کچھ پتا نہیں چلا۔"

"ابھی ادھر ایک فائر ہوا تھا؟" عیسیٰ جان نے پوچھا۔

"میں نے کیا تھا 'میرا خیال تھا شاید کوئی جواب آئے لیکن کچھ نہیں۔"

عیسیٰ جان دوسرے شخص کے ساتھ چلتا ہوا اب میرے قریب آگیا تھا 'اس نے ٹارچ کی روشنی میرے لباس پر ڈالی۔ "اوے خوچہ 'یہ کیا ہوا۔ کہاں گرا ہے؟"

میں نے کہا "ادھر ڈھلوان پر دو تین گڑھے ہیں۔ اندھیرے میں پاؤں پھسل کر گڑھے میں چلا گیا تھا۔"

عیسیٰ جان نے کہا "اوے یہ غلام خان ایک دم کیوں رفوچکر ہوگیا۔ کوئی پیسہ ویسہ تو نہیں لے گیا تمہارا؟"

"نہیں 'میرے ساتھ تو اس کا حساب بے باق تھا" میں نے جواب دیا "پر یہ سمجھ مجھے بھی نہیں آئی کہ وہ ایک دم کیوں نکل گیا۔"

عیسیٰ جان کا ساتھی بولا "اس کے پاس کافی رقم تھا۔ اتنی جلدی اور اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا اس کو۔"

ہم کچھ دیر ٹیلوں میں گھومتے اور غلام خان کو آوازیں دیتے رہے پھر ڈیرے پر واپس آگئے۔ میں نے شکر کیا کہ عیسیٰ جان نے گڑھے کا رخ نہیں کیا۔ اپنی طرف سے میں نے شواہد ختم کردیے تھے پھر بھی گڑھے کے گردوپیش میں کوئی منظر عیسیٰ جان کی عقابی نگاہوں میں کھٹک سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پو پھٹ گئی۔ تاریکی کی دبیز دھند سے نشیب و فراز نمودار ہونے لگے۔ خوابیدہ جنگل ایک انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا تھا۔ عیسیٰ جان رت جگے کے بعد بھی بالکل تر و تازہ نظر آتا تھا۔ اجالے میں اس کی صورت اور بھی کرخت دکھائی دی۔ نہ جانے کیوں اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے جاگیردار قادر تاباں کا تصور میں آیا اور تمتمایا ہوا چہرہ یاد آنے لگا "تمتماہٹ" کی حد تک دونوں چہرے ایک جیسے تھے۔

میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔ عباس خان کا مشورہ یہ تھا کہ ہم عیسیٰ جان کے روانہ ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔ یوں ہمیں اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے میں آسانی رہے گی۔ میرا اپنا خیال بھی اس سے ملتا جلتا تھا لہٰذا جب ہم نے عیسیٰ جان کو چارپائی پر سے اٹھ کر اور چائے کا ناشتا کرتے دیکھا تو خود بھی ڈیرا چھوڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہماری تیاری دیکھ کر عیسیٰ جان نے ایک دم ہانک لگائی "او خوچہ! تم کدھر جاتا ہے۔ ادھر تو ہمارے پاس" اس کے بھاری بھرکم لہجے میں عجب طنطنہ اور ٹھہراؤ تھا۔ ہم اس کے قریب پہنچے۔

میں نے کہا "ہم جا رہے ہیں ملک عیسیٰ۔ ادھر شکارپور میں ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

وہ بولا "اوے عباس خاناں۔۔۔ تم بھی جاتا ہے؟"

عباس خان نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ جوش سے بولا "تم نہیں جائے گا اوئے۔۔۔ تم ہمارے ساتھ جائے گا۔ رات تمہارا آواز ہمارے دل میں لگا ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ وہاں رات کو تم ہمارے ڈیرے میں گائے گا۔ ہمارا لوگ بہت خوش ہوگا تمہیں سن کر۔" عباس خان کا چہرہ ایک دم زرد ہوگیا۔ وہ پہلے ہی عیسیٰ جان سے کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ منہ سے تو نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس معاملے میں وہ زیادہ ملوث نہ ہو۔ عیسیٰ جان نے اس کے دبلے پتلے کندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ مارا "اوئے پاگل کا بچہ۔ کیا چوزے کے ماتھ کانپتا ہے۔ ادھر ہم تمہارا یخنی نہیں بنائے گا۔ بس گانا سنے گا اور انعام دے کر واپس بھیج دے گا۔ گھبرانے کا بات نہیں۔ بے شک اپنے اس ساتھی کو بھی ساتھ لے جاؤ" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا۔۔۔ ہاں احسان الٰہی۔ تم بھی چلو ہمارے ساتھ 'کل واپس آجانا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ایک مشکل ترین مسئلہ خود بخود حل ہو رہا تھا۔ میں نے بے حد احتیاط سے عباس خان کے بازو میں چٹکی لی اور عیسیٰ جان سے کہا "ٹھیک ہے ملک جی۔ جیسے تمہارا حکم۔" پھر سوالیہ نظروں سے عباس خان کی طرف دیکھا۔ عباس خان نے بھی رضامندی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

O☆O

ایک پہر دن چڑھے ہم ڈیرے سے عیسیٰ جان کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے۔ ہم اپنی رضامندی سے جا رہے تھے لیکن لگتا تھا کہ اگر رضامندی نہ ہوتی تو بھی ہمیں جانا ہی پڑتا۔ یہ عیسیٰ جان کی فرمائش تھی اور حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ معلوم نہیں اس پتھر میں فنون لطیفہ سے شغف کی یہ کیسی جونک لگی ہوئی تھی کہ وہ عباس خان کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ کہیں یہ کوئی چکر نہ ہو۔ بعید از قیاس نہیں تھا کہ عیسیٰ جان کو ہم پر کسی طرح کا شبہ ہوچکا ہو۔ یہ علاقہ اس کی "عملداری" میں آتا تھا اور یہاں پائے جانے والے کسی بھی مشتبہ فرد کو چھان بین کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کا اسے "حق" حاصل تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا 'اب ہمیں اس کے ساتھ جانا تھا۔ بوقت روانگی میرے ذہن میں بار بار تجو کا خیال آرہا تھا۔ پاؤندہ بستی سے آتے ہوئے میں نے تجو کے سلسلے میں سوار بشیر گل سے ۴۸ گھنٹے کی مہلت مانگی تھی۔ یہ مہلت اب گزر چکی تھی تاہم مجھے امید تھی کہ سوار میرا انتظار کرے گا۔

ہم ڈیرے سے روانہ ہوئے تو عیسیٰ جان کے ساتھ دو

اور افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک وجیہ، سرخ آنکھوں والا پوٹھوہاری تھا۔ اس کا نام راجا رحیم معلوم ہوا۔ راجا رحیم کے تنومند گلے میں چاندی کا ایک لاکٹ تھا۔ اس میں ایک معروف سیاسی پارٹی کے اعلیٰ سربراہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اسی پارٹی کے رہنماؤں کی تصاویر میں جاگیردار قادر زماں کے ڈرائنگ روم میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ یہ پارٹی چند ہی برس پہلے تشکیل دی گئی تھی اور اس کا پُرجوش سربراہ استبدادی نظام کو تہ وبالا کرنے کا ولولہ انگیز نعرہ لے کر میدان میں کودا تھا۔ یہ پارٹی بڑی تیزی سے زیریں سطح تک منظم ہو گئی تھی اور عوام الناس اس کے نعروں سے متاثر ہو رہے تھے۔ حکومتِ وقت کے لیے یہ پارٹی اور پارٹی کا سربراہ سب سے بڑا چیلنج تھے۔

ڈیرے کے احاطے سے پھوٹنے والی تنگ راہ سے گزر کر ہم کھلی جگہ آ گئے۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ عیسیٰ جان یہاں گھوڑے پر آیا تھا۔ اس کا نہایت صحت مند مشکی گھوڑا ان تین گھوڑوں میں سے ایک تھا جو رات میں نے غلام خاں کے تعاقب میں روانہ ہونے سے پہلے دیکھے تھے۔ مشکی گھوڑا عیسیٰ جان نے سنبھال لیا۔ باقی دو گھوڑوں میں سے ایک پر میں اور عباس خاں سوار ہو گئے جبکہ دوسرے پر عیسیٰ کے دونوں ساتھیوں نے سواری کی۔ باز والا پنجرہ عیسیٰ جان کے گھوڑے پر تھا۔ پنجرے کے گرد ابھی تک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ ڈیرے سے تقریباً دو میل آگے آ کر ہمیں گھوڑوں سے اترنا پڑا۔ یہاں دشوار چڑھائی تھی۔ چڑھائی چڑھ کر ہم بلندی پر پہنچے تو مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ پہاڑی اور گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی "ایس" کی شکل کی کھائی ہمارے بائیں ہاتھ کوئی ایک میل پیچھے رہ گئی تھی۔ اب ہم گنجان درختوں والے نہایت دشوار گزار علاقے میں داخل ہونے والے تھے۔ جب ہم نے دوبارہ گھوڑے سنبھالے تو مجھے اور عباس خاں کو علیحدہ علیحدہ گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ میں پوٹھوہاری راجا رحیم کے پیچھے بیٹھا تھا جبکہ عباس خاں دوسرے شخص کے پیچھے۔ مزید حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ہم دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ یہ پٹیاں راجا رحیم ڈیرے پر سے ہی لے کر آیا تھا۔ پٹی بندھواتے وقت میں نے سوالیہ نظروں سے عیسیٰ جان کی طرف دیکھا تو وہ بولا "گھبراؤ مت یارا! تمہیں بارڈر پار نہیں لے جائے گا۔ اِدھر ہی رکھے گا۔ ہم ذرا کولوگ ہے۔ ذرا چھپ چھپا کر رہتا ہے۔ جیسے تم شکاری لوگ جانور کے پیچھے بھاگتا ہے یہ خاصہ دار اور ملیشیا والا ہمارا بُو سونگھتا ہے۔"

"لیکن آپ کو ہم سے کیا خطرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کو اپنے سائے سے بھی خطرہ ہوتا ہے لالے کی جان۔" عیسیٰ جان نے جواب دیا۔

بند آنکھوں کے ساتھ ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے اچھی طرح اطراف کا جائزہ لے لیا تھا۔ اب میں کوشش کر رہا تھا کہ سمتوں کو یاد رکھ سکوں۔ تقریباً ایک میل تک ہم نے شمال مشرق کی طرف سفر جاری رکھا۔ پھر دو موڑ آئے اور ہمارا رخ شمال کی جانب ہو گیا۔ یہاں آ کر راستہ ایک دم دشوار ہو گیا۔ ہم گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل آگے بڑھنے لگے۔ یہ پاپیادہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور ہم کسی سرنگ یا ایسی ہی نیم تاریک جگہ سے گزر کر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہو گئے۔ یہاں قریب ہی کوئی جھرنا گرتا تھا اور لوگوں کے چلنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں ہماری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ میں نے قرب وجوار پر نگاہ ڈالی۔ بے شک ہم عیسیٰ جان کے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔

یہاں خود رو داڑھیوں، کرخت چہروں اور شرابی آنکھوں والے کئی افراد نظر آئے۔ ان میں سے بیشتر سامنے ایک چشمے پر نہا رہے تھے اور کپڑے دھو رہے تھے۔ وہ طویل رسیوں پر درجنوں شلواریں، قمیصیں اور چادریں جھول رہی تھیں۔ ان میں مجھے دو تین زنانہ لباس بھی نظر آئے۔ سامنے ایک پتھریلی دیوار پر گولیوں کے ان گنت نشان تھے۔ غالباً یہاں نشانے کی مشق کی جاتی تھی۔ پہاڑی، چنار اور صنوبر کے گھنے درختوں میں پتھریلی دیواروں والے کوئی درجن بھر کوٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہاں ایک اصطبل نما احاطے میں پندرہ بیس گھوڑے اور چند خچر بھی بندھے تھے۔ اس اصطبل کی دیواروں پر اُپلے لگائے گئے تھے۔ یہ اُپلے اس بات کا ثبوت تھے کہ یہاں گائے بھینس بھی پائی جاتی ہے۔ ہمیں نیچی چھت والے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ زمین پر بہت سستی چٹائی بچھی تھی اور دیواروں پر چند کلہاڑیاں آویزاں تھیں۔ یہاں پہنچ کر راجا رحیم نے ہم سے رائفلیں لے لیں۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں رینگتے ہوئے خدشات پھن پھیلا کر پھنکارنے لگے۔ کہیں عیسیٰ جان ہم سے چوہے بلی کا کھیل تو نہیں کھیل رہا تھا۔ عباس خاں کی خوش گمانی اپنی جگہ لیکن اتنے اہتمام سے ہمارا یہاں لایا جانا اندیشوں کا جواز پیدا کر رہا تھا۔ ان اندیشوں کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک عجیب طرح کی سنسنی بھی بھری ہوئی تھی۔ یہ سنسنی پہاڑی ریستوران والے ڈیرے سے روانہ ہوتے ہی رگوں میں سرایت کرنے

لگی تھی اور اب پورے جسم کا احاطہ کر چکی تھی۔ اس سنسنی کا منبع محمود شکر شکرا تھا۔ شکر شکرا ابلیس ابنِ ابلیس، مجسم لعنت و نحوست اسی جگہ موجود تھا۔ اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ اب جلد یا بدیر اس سے میرا سامنا ہونے والا تھا۔ اس ملاقات کے بعد جو بھی ہو جاتا کم تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شکر مجھے پہچان نہ پائے یا مجھے اور نظر انداز کر دے۔ وہ تو خونخوار کتے کی طرح ناک سکیڑ کر دشمن کی بُو سونگھ لیا کرتا تھا۔

مجھے امید تھی کہ جلد ہی عیسیٰ جان یا راجا رحیم سے دوبارہ ملاقات ہو گی لیکن وہ تو ہمیں یہاں لا کر جیسے بھول ہی گئے۔ دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی لیکن کسی نے آ کر حال احوال نہیں پوچھا۔ ہاں ہر دو گھنٹے بعد ہمیں کڑک چائے ملتی رہی اور رات کا کھانا بھی کمرے میں اہتمام سے چن دیا گیا۔ کھانے میں حسبِ توقع گوشت کا سالن تھا۔ سالن میں پاؤ پاؤ کی بوٹیاں تھیں اور ساتھ ہی دو دو انچ موٹی پکی پکی روٹیاں تھیں۔ اس کے علاوہ دہی تھا اور شراب خانہ خراب تھی۔ شراب کی مقدار سے اندازہ ہوا کہ یہاں باقاعدہ بھٹی لگی ہوئی ہے اور چشمے کا پانی یہ لوگ صرف منہ ہاتھ اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

رات بہت سرد اور تاریک تھی۔ افغان علاقے کی بلند وبالا برف پوش چوٹیاں یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ ان سے چھو کر آنے والی ہوا فصیلِ جاں کو لرزہ براندام کر دیتی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں اور عباس خاں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئے۔ عیسیٰ جان کی پہلی وعدہ خلافی سامنے آ چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ رات کو اس کے ڈیرے پر گانے بجانے کی محفل ہو گی اور اگلے روز ہم واپس لوٹ سکیں گے لیکن آج شب یہاں کسی محفل کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ عباس اپنے خشک لبوں پر بار بار زبان پھیرتا تھا۔ اس کے اعصاب پر عجیب طرح کا خوف سوار تھا۔

غلام خاں کی جامہ تلاشی سے حاصل ہونے والی تمام اشیا (سوائے رقم کے) میرے شکاری بوٹ میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں غلام خاں کی چھوٹی سی بوسیدہ ڈائری بھی تھی۔ تسمے کھول کر میں نے یہ چیزیں نکالیں اور ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی یادداشتیں اور کئی طرح کا حساب کتاب لکھا ہوا تھا۔ غلام خاں نے صرف دو ماہ پہلے پشاور میں ایک زرگر سے پانچ تولے کے طلائی زیورات ادھار خریدے تھے۔ یہاں لکھا ہوا تھا "نیری بائی کے لیے"۔ ایک اور جگہ لکھا ہوا تھا دس نومبر کو جمعے کے روز نیری بائی کو ایک ہزار دیا۔ اسی طرح کئی جگہ نیری بائی کا نام موجود تھا۔ یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ تین بیویاں غلام خاں کے لیے تھوڑی پڑ رہی تھیں اور وہ سکونِ دل کی خاطر پشاور تک بھاگا پھر رہا تھا لیکن سکونِ دل اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ برباد کر کے بھی اس نے بے سکون ہی رہنا تھا۔ شاید ڈیڑھ کروڑ بھی ہوتا تو بے کار تھا۔

اس کی اپنی سوچ ہی اس کے جسم کے لیے تازیانہ بن چکی تھی۔ نوجوان بیٹے کا خوف اس کے دل میں سما گیا تھا۔ وہ اس وہم کا شکار تھا کہ بیٹا اسے قتل کر دے گا اور سکینہ کی موت کے بعد تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ سعد خاں اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اپنے بے ضرر بیٹے سے اتنا خوف زدہ تھا کہ اس کی جان کے لیے خطرہ بن چکا تھا اور بیٹے پر ہی کیا موقوف، وہ اپنے اردگرد موجود ہر شخص کے لیے خطرہ تھا۔ غصے میں پھنکارتا، کھولتا اور اُبلتا ہوا سنگین خطرہ۔ اسے گولی مار کر میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ یہ آزاد علاقہ تھا۔ یہاں خون کا بدلہ خون تھا۔ بدنصیب سکینہ کا باپ، بھائی یا کوئی ہمت والا بیٹا یہاں موجود ہوتا تو غلام خاں سے اس قتل کا بدلہ ضرور لیتا۔ وہ بدلہ میں نے لیا تھا اور غلام خاں کی پیشانی میں سوراخ کر کے اسے یخ بستہ گڑھے کی تہ میں منکر نکیر کے حوالے کر آیا تھا۔

اس وقت میری کلائی کی گھڑی دس بجا رہی تھی جب ہمارے کمرے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور عیسیٰ جان دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ راجا رحیم کے علاوہ ایک ہٹا کٹا وزیرستانی بھی تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی مجھے عیسیٰ جان کے تیور کچھ بدلے ہوئے نظر آئے۔ اس نے جگر پاش نظروں سے ہمیں دیکھا اور راجا رحیم سے بولا "ان دونوں کی تلاشی لو۔ وہ ڈیڑھ لاکھ ان کے پاس ہونا چاہیے۔"

"ڈیڑھ لاکھ" کے الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ عیسیٰ جان میرے اور غلام خاں کے تصادم سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں جب غلام خاں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ڈیرے کی طرف واپس آ رہا تھا، راستے میں عیسیٰ جان اچانک ہی سامنے آیا تھا۔ یوں لگا تھا وہ اندھیرے سے اُگ آیا ہے۔ یقیناً وہ چھپ کر بیٹھا تھا اور گڑھے پر پیش آنے والا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

ہم دونوں نہتے تھے۔ راجا رحیم اور تنومند وزیرستانی آگے بڑھے اور بڑے کرخت انداز میں ہماری تلاشی لینے لگے۔ گیارہ ہزار کے کرنسی نوٹوں کے سوا میرے پاس سے کچھ نہیں نکلا۔ غلام خاں کی ڈائری، بال پوائنٹ اور رسیدیں وغیرہ چند

منٹ پہلے میں چٹائی کے نیچے رکھ چکا تھا۔ عباس خاں کی جامہ تلاشی بھی بے ثمر رہی۔ عیسیٰ جان آگے آیا اور میرے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ مار کر بولا "کہاں رکھا ہے رقم؟"

"کون سی رقم؟" میں نے تھپڑ بڑی حوصلہ مندی سے برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو غلام خاں کی رواسکٹ سے نکالا ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"رقم تو تمہارا والد محترم بھی نکالے گا احسان الٰہی' اور وہ بھی نکالے گا جو تم نے کبھی لوٹا ہی نہیں۔ اپنا ماں بہن بیچ کر بھی تم ہمارا مطالبہ پورا کرے گا۔ اگر نہ کرے گا تو ہمارا نام عیسیٰ جان نہیں۔"

وزیرستانی نے اچانک ہی اپنی رائفل ہماری طرف سیدھی کرلی تھی اور اب اپنے سردار کے اگلے حکم کا منتظر تھا "یہ دونوں حرامی اس کمرے سے باہر تو نہیں نکلا؟" عیسیٰ جان نے اپنے کارندوں سے پوچھا۔ دونوں کارندوں نے مشینی انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔ عیسیٰ جان اپنے کارندوں پر اور اپنے اردگرد کے ہر شخص پر حاوی ہوجانے کی قدرتی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک عجب طنطنہ تھا اس کی حرکات و سکنات میں۔ اس نے اشارے سے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ کمرے کی تلاشی لیں۔ حکم پر عمل کیا گیا۔ ہم رائفل کے نشانے پر تھے اور ایک کونے میں کھڑے تھے۔ چند ہی منٹ میں چٹائی کے نیچے سے غلام خاں کی اشیاء برآمد کرلی گئیں۔

عیسیٰ جان نے اپنی رائفل کی سرد نال عین میری پیشانی پر رکھی اور سفاک آواز میں بولا "ہم نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ کہاں چھپایا ہے وہ رقم؟"

"میں کسی رقم کے بارے میں نہیں جانتا" میں نے پوری بے باکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

میرے یوں دیکھنے سے وہ ایک دم بھڑک گیا تاہم لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ برقرار رہا' کہنے لگا "دیکھو احسان الٰہی۔ تم نے غلام خاں کو مارنے میں جتنا ٹائم لیا ہم اس سے آدھا بھی نہیں لیتا۔ چوتھا حصہ بھی نہیں لیتا۔ ہمیں بتاؤ غلام خاں کا سرخ رومال اور اس میں بندھا ہوا ڈیڑھ لاکھ روپیہ کہاں ہے؟"

میں نے دیکھا اس کی انگلی لبلبی پر تھی۔ غلام خاں نے اس انگلی کو سمجھنے میں غلطی کی تھی اور مارا گیا تھا لیکن میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے لبلبی پر رکھی ہوئی ایسی کئی انگلیاں دیکھی تھیں۔ مجھے معلوم رہتا تھا کون سی انگلی حرکت کرسکتی ہے اور کون سی نہیں۔ عیسیٰ جان کی انگلی کم از کم اس وقت حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ پیشانی پر سرد لوہے کے دباؤ کو خاموشی سے جھیلتا رہا۔ اور ایک دم۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں عیسیٰ جان کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی معمولی شخص کے سامنے نہیں کھڑا۔ اس نے رائفل میری پیشانی سے ہٹائی اور غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد گمبھیر آواز میں بولا "کون ہے تم؟"

"احسان الٰہی" میں نے کہا۔

وہ بولا "اتنا تو جانتا ہے ہم۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ ہاں۔ شکاریوں کے بھیس میں وہ وردی والے چور ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ تمہارا ایس پی برکت' صوبے دار مرجان اور وہ الو کا پٹھا کبیر علی شاہ سب ہمارا اوازہ کے نیچے ہے۔ سب کو چبا کر ڈال دے گا ایک طرف۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ عیسیٰ جان کے انکشافات دھماکا خیز تھے۔ میں نے عباس خاں کی آنکھوں میں خوف کا سیلاب امڈتے دیکھا اور مجھے لگا کہ وہ زود رنج لڑکا لڑکھڑا کر گر جائے گا۔ یہ سوال چیخ بن کر ذہن میں ابھرا کہ عیسیٰ جان نے یہ نام کیسے لے لیے؟ جواب ایک ہی تھا' کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

عیسیٰ جان کی سنگ پاش نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔ وہ مسکرا کر بولا "کیا سوچ رہا ہے فیثاغورث کی طرح۔ ملنا چاہتا ہے اپنے لوگوں سے؟" پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے راجا رحیم کو اشارہ کیا۔ وزیرستانی کی طرح اس نے بھی رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور سیفٹی کیچ ہٹا کر ہمیں نشانے پر رکھ لیا "چلو" عیسیٰ جان نے ادھ کھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں مخاطب کیا۔ ہم دروازے کی طرف بڑھے تو دونوں رائفل بردار بڑے ماہرانہ انداز میں ہمارے پیچھے ہو گئے۔

کمرے سے باہر یخ بستہ ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ پتھریلی دیواروں والے اکثر کمروں میں لالٹین اور دیے وغیرہ کی روشنی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت بڑی بڑی مونچھوں والا ایک فربہ اندام قبائلی سب مشین گن لیے چوکس کھڑا تھا۔ دروازے پر تالا جھول رہا تھا۔ عیسیٰ جان کو دیکھتے ہی فربہ اندام پہرے دار نے قریب رکھی لالٹین ہاتھوں میں پکڑی اور جھک کر تالا کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔

سامنے ایک دیوار سے لالٹین جھول رہی تھی۔ اس کی روشنی میں ہمیں اپنی پوری ٹیم نظر آگئی۔ ایس پی برکت

صاحب' انسپکٹر باجوہ' صوبے دار مرجان' فورس کے جوان سب وہاں موجود تھے۔ اگر کوئی نظر نہیں آیا تو وہ کبیر علی شاہ تھا یا ہیڈ کانسٹیبل نذیر۔ وہ سب کے سب چٹائی پر بیٹھے تھے اور ایسے بیٹھے تھے کہ انہیں دیکھ کر آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایس پی برکت صاحب کا سر ایک خصاروار کی گود میں تھا اور خصاوار کا سر صوبے دار مرجان صاحب کی پشت پر دھرا ہوا تھا۔ مرجان صاحب ہاتھ پاؤں پھیلائے اوندھے پڑے تھے اور آنکھیں بند کیے نجانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔ انسپکٹر باجوہ سب سے الگ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا اور عجیب سی آواز میں بھوں بھوں رو رہا تھا۔

باقی لوگوں کا حال بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ ان سب کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ انہیں زیادہ مقدار میں افیون وغیرہ کھلا کر دیکھنے والوں کے لیے قابل رحم بنا دیا گیا ہے۔ کہاں وہ چوڑی چھاتیوں والے چھ چھ فٹ لمبے جوان جو قانون توڑنے والوں کے دانت کھٹے کرنے کا عزم رکھتے تھے اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار' ذوئے مشت کے نشیب و فراز میں ڈاکوؤں کو کھوجتے پھرتے تھے اور کہاں یہ سکڑے سمٹے زمین چاٹتے ہوئے افیونچی۔ میں ششدر رہ گیا۔ یقیناً انہوں نے خود سے تو یہ لعنتی نشہ نہیں کیا ہوگا' انہیں زبردستی بلکہ بہ زور بازو اس حال کو پہنچایا گیا تھا۔

ایس پی برکت صاحب نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ سر جیسے ان کے کندھوں پر سنبھل نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر مجھے پہچاننے کی کوشش کرتے رہے پھر بے دم سے ہو کر دوبارہ خصلوار کی جھولی میں ڈھے گئے۔ ایک لانس نائیک میرے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس نے عباس خاں کو پہچان کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن پر کٹے پرندے کی طرح اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ عیسیٰ جان کے اشارے پر فربہ اندام چوکیدار نے دروازہ پھر مقفل کر دیا۔ رائفلوں کی زد میں ہم دونوں کو واپس پہلے والے کمرے میں لایا گیا۔

عیسیٰ جان اب پہلے سے زیادہ بااعتماد نظر آرہا تھا۔ غالباً اس اعتماد میں گوناگوں اضافے کا ایک سبب عباس خاں کے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی اور بدحواسی بھی تھی۔ وہ اوچھے اور دو ہے گانے والا نازک مزاج لڑکا نہ جانے کس طرح لانس نائیک بھرتی ہو گیا تھا۔ اب موت اس کی آنکھوں میں ہی نہیں' پورے جسم میں ناچ رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر عیسیٰ جان ایک کرسی نما شے پر بیٹھ گیا۔ امپورٹڈ سگریٹ نکال کر اس نے اپنے طلائی لائٹر سے سلگایا تو انگلیوں میں ڈائمنڈ کی انگشتریاں جگمگا اٹھیں۔ دھواں فضا میں چھوڑ کر اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"ہم اسی وقت تم دونوں کو پہچان گیا تھا جب غلام خاں نے تمہارا تعارف شکاری کے طور پر کرایا تھا۔ تمہارا اگرا میں لوگ اسی دن ڈھوکی تالاب سے پکڑا گیا تھا جس دن تم پائندہ بستی کی طرف گئے تھے۔ بس ایک وہ کافر کا بچہ۔ کیا نام ہے اس کا کبیر علی شاہ' وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کا دو کتا ہم نے مار دیا پر وہ خود بچ کر نکل گیا۔ چھوڑے گا نہیں ہم اس کو۔ اگر وہ یہیں ہے تو اسے ڈھونڈے گا اور ڈانڈا ڈولی کر کے لائے گا یہاں" میں نے خاموشی سے یہ سب کچھ سنا۔ عیسیٰ جان نے میری طرف انگلی اٹھائی "انسپکٹر باجوہ کہتا ہے تم اس کا ہیڈ کانسٹیبل ہے' کیا یہ بات صحیح ہے؟"

میں نے کہا "تم کو کیا لگتا ہے؟"

وہ بولا "مجھ کو تو ایک دم غلط لگتا ہے۔ تم کوئی چار سو بیسی کر رہا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل تمہارے مافق خطرناک نہیں ہوتا۔ ایک دم چابی والا کھلونا ہوتا ہے وہ۔"

"مجھ میں تمہیں کیا خطرناک نظر آگیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"او خدائی خوار' تجھ پر اوپر والے کا مار" عیسیٰ جان نے دانت نکوس کر کہا "ابھی تو نے کچھ کیا ہی نہیں۔ چھ فٹ کا بندہ بھون کر پانی میں غرقاب کر دیا اور دامن صاف کا صاف۔"

لگتا تھا عیسیٰ جان نے غلام خاں کی موت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اگر ایسا تھا تو پھر وہ رقم کے بارے میں کیوں نہ جان سکا؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ عیسیٰ جان جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے وہ مجھے رقم ٹھکانے لگاتے نہیں دیکھ سکا۔ اب وہ اس سلسلے میں میری زبان کھلوانا چاہتا تھا اور اس کے ارادے خطرناک نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر رائفل میری طرف سیدھی کرلی اور بڑے ضدی لہجے میں مجھ سے رقم کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

اس کی انگلی حسب سابق لبلبی پر تھی اور وہ دعویٰ کر رہا تھا کہ جس طرح میں نے غلام خاں کو گولی ماری تھی' وہ مجھے مار دے گا۔ میں زیادہ دیر اسے تناؤ میں رکھنا نہیں چاہتا تھا' کوئی کتنا بھی بڑا "نفسیات داں" ہو زیادہ دیر اس قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ عیسیٰ جان زچ ہو کر مجھے گولی مار سکتا تھا کیونکہ میری وفات حسرت آیات کے بعد بھی وہ گڑھے کے اردگرد رقم ڈھونڈ سکتا تھا۔ جبکہ مجھے گولی کھانے میں فرشتۂ اجل سے

ملاقات کے سوا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک لاکھ چالیس ہزار روپیہ بچاکر میں نے کون سا محل کھڑا کرلینا تھا۔ میں نے مفاہمت کی راہ اختیار کرتے ہوئے عیسیٰ جان سے عندیہ ظاہر کیا کہ میں اسے رقم کے بارے میں بتادوں گا۔

اس نے کہا "ہم جاننا چاہتا ہے کہ وہ کہاں چھپایا ہے تم نے؟"

میں نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرا یہ ہلکا پھلکا انداز عیسیٰ جان کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ جس قسم کا شخص تھا لوگ کم ہی اس کے سامنے یہ لہجہ اختیار کرتے ہوں گے۔ وہ مجھے کڑی نظروں سے گھور کر بولا۔ "ہمارا خیال ہے تم نے گڑھے کے آس پاس درختوں میں کہیں رکھا ہوگا۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے" میں نے جواب دیا۔

"کہاں رکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس طرح تو نہیں بتاسکوں گا" میں نے جواب دیا "اندھیرا تھا اور وہاں چاروں طرف ایک جیسے ہی درخت ہیں ـــ ہاں وہاں پہنچ کر پتا چلانا مشکل نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے" عیسیٰ جان اپنی جگہ سے کھڑا ہوکر بولا "اب آرام کرو۔ صبح تمہیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔"

وہ کچھ جھنجلایا ہوا سا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ وہیں "پہاڑی ریستوران" پر اس نے ہم دونوں کی تلاشی کیوں نہ لے لی۔ دراصل میری پھولی ہوئی جیکٹ کی وجہ سے وہ دھوکے میں رہا۔ اسے یقین تھا کہ رقم میرے پاس ہی ہوگی۔ عیسیٰ جان اور اس کے دونوں مسلح لشکری باہر نکل گئے تو دروازے پر ایک وزنی تالا پڑ گیا اور یوں باقی "چھاپامار ٹیم" کی طرح ہم بھی پابند سلاسل ہوگئے' ہاں یہ فرق ضرور تھا کہ ہم نشے میں نہیں تھے۔

میں نے عباس خاں کی ڈھارس بندھائی اور اس پر لحاف ڈال کر اسے سوجانے کی ہدایت کی۔ خود میں بھی لحاف لپیٹ کر لالٹین کے قریب دراز ہوگیا۔ ذہن گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایس پی برکت اور دیگر حضرات کیسے "ٹریپ" ہوئے؟ کبیر علی شاہ کہاں ہے؟ شنکر ابھی تک سامنے کیوں نہیں آیا؟ یہ اور ایسے کئی سوال ذہن کو کچوکے لگا رہے تھے اور ان سب سوالوں پر حاوی یہ سوال تھا کہ عیسیٰ جان اب محبوس افراد کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسی مثالیں موجود تھیں کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار مجرموں کے ہتھے چڑھے اور ان کے بدلے خطیر رقم بطور تاوان مانگی گئی۔ انہیں قتل بھی کیا جاتا تھا اور بعض اوقات افغان علاقے میں اسمگل بھی کردیا جاتا تھا۔ اس زونے مشت کے اس دور افتادہ خرابے میں بھی یہ سب کچھ ہوسکتا تھا۔

میں لحاف میں خود کو چھپائے دیوار کی طرف چہرہ کیے لیٹا تھا۔ پتھر کی چوکور سلوں کی دیوار جسے جگہ جگہ پھانس نما لکڑیوں سے سہارا دیا گیا تھا' میری آنکھوں سے صرف ایک فٹ کی دوری پر تھی۔ بے خیالی میں دیوار کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک میں چونک پڑا۔ دیوار کی ایک سل اپنی جگہ سے ہوا کھسکی ہوئی سی لگی۔ میں نے ہاتھ سے دبایا تو وہ ہلنے لگی جیسے وہ دیوار میں نہ چنی ہو کسی میز پر دھری ہو۔ سل ہلنے کے ساتھ ہی پتھر کے کچھ چھوٹے ٹکڑے فرش پر آن گرے۔ میں چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ لالٹین اٹھا کر نزدیک کی اور غور سے دیوار کا یہ حصہ دیکھا۔ ایک دم رگوں میں خون کی گردش تیز ہوئی۔ پتھر کی اس سل کے اردگرد مسالا۔ اور گارا کرید کرید کر اسے بڑی حد تک دیوار سے جدا کردیا گیا تھا۔ یقیناً یہ کام کئی دنوں بلکہ ڈیڑھ دو ہفتوں میں انجام پایا تھا۔ نقب زن کوئی ہوشیار شخص واقع ہوا تھا۔ وہ سل کو آخری حد تک کمزور کرچکا تھا اس کے باوجود طائرانہ نگاہ سے دیکھنے پر دیوار صحیح سالم نظر آتی تھی۔ سل کے اردگرد نمودار ہونے والی درزوں کو اس نے پتھر کے ٹکڑوں اور مٹی سے اس طرح بھردیا تھا کہ کہیں کوئی رخنہ نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا تھا اس کمرے کے دائیں بائیں اور عقب میں کمرے تھے۔ پھر یہ نقب کیا معنی رکھتی تھی؟ کیا نقب زن صرف ساتھ والے کمرے میں پہنچنا چاہتا تھا!

میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور بڑی احتیاط کے ساتھ سل کے اردگرد سے پتھر کے چھوٹے ٹکڑے اور بھربھری مٹی نکالنی شروع کی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ موٹی دیوار تھی۔ نقب زن سل کے چاروں طرف تقریباً ایک فٹ گہرا خلا پیدا کرچکا تھا۔ شاید اسے ایک آدھ دن اور ملتا تو وہ اس خلا کو آر پار کردیتا۔ سل کے چاروں طرف یہ خلا دو انچ چوڑا تھا لیکن کہیں کہیں یہ چوڑائی چار انچ سے تجاوز کررہی تھی۔ جہاں چوڑائی زیادہ تھی وہاں کریدنے کا کام زیادہ آسانی سے ہوا تھا لہٰذا خلا گہرا ہوگیا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سردیوں کی طویل رات ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ایک لمبی سلاخ میرے پاس ہو تو دس پندرہ منٹ کی کوشش سے میں یہ چوکور سل اس دیوار میں سے باہر کھینچ سکتا ہوں۔ کھانے کے برتن

ابھی تک کمرے کے ایک گوشے میں دھرے تھے۔ میں نے وہاں سے سالن کا بڑا چمچ لیا اور اس کی ڈنڈی سے دیوار کا کچا مسالا کریدنے لگا۔ یہاں سے خلا کی چوڑائی زیادہ تھی لہٰذا میرا پورا ہاتھ اندر جارہا تھا۔ شروع میں دقت ہوئی لیکن جلد ہی سرخ بھربھری مٹی باہر آنے لگی۔ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ دو گھنٹے کی لگاتار جدوجہد نے مجھے پسینے میں شرابور کردیا اور چمچ مسلسل استعمال سے ٹیڑھا ہوکر رہ گیا۔ عباس خاں بھی اب جاگ چکا تھا اور یہ سارا منظر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس مہم جوئی کے حق میں نہیں تھا لیکن میرے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ دل ہی دل میں وہ میری ناکامی کے لیے دعا گو ہے۔

"احسان صاحب! ام کو لگتا ہے یہ دیوار ڈیڑھ فٹ کا نہیں ہے۔ ڈیڑھ فٹ کا ہوتا تو اب تک آپ کا ہاتھ آرپار ہوچکا ہوتا۔" ابھی الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ میرا ہاتھ آرپار ہوگیا۔ مسالا اور کنکر وغیرہ پرشور آواز سے ساتھ والے کمرے میں گرے۔ آواز معمولی تھی لیکن شب کے گمبھیر سناٹے میں اسے پرشور کہے بنا چارہ نہیں تھا۔ عباس خاں سہم کر رہ گیا۔ اس کے سہمنے کی وجہ نہایت معقول تھی۔ دیوار میں سوراخ نمودار ہوتے ہی دوسری جانب سے مدھم نسوانی بڑبڑاہٹ سنائی دی تھی' پھر کوئی لڑکی یا عورت خوابیدہ آواز میں چیخی تھی ـــ اس کے بعد دیوار کی دوسری جانب دھڑ دھڑ دروازہ بجنے کی آواز آئی اور عورت زور زور سے چلانے لگی۔

"دروازہ کھولو۔ میں کہتی ہوں بالی خاں دروازہ کھولو ـــ بالی خاں ـــ بالی خاں" وہ مسلسل پکارتی جارہی تھی۔

عورت کا لب ولہجہ غیر مقامی تھا۔ وہ اردو بول رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ یہ بھی ہماری ہی طرح کوئی مجبور ولاچار ہستی ہے۔ میں نے دیوار کے سوراخ سے منہ لگایا پھر جونہی عورت چیختے چیختے سانس لینے کے لیے رکی۔ میں نے تیز سرگوشی کی "میری بات سنو بہن۔ میری بات سنو۔ میں دشمن نہیں ہوں۔" عورت کی چیخ وپکار تھم گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے میری آواز سن لی ہے اور میری اردو دانی نے اسے چونکا دیا ہے "بہن' میری بات سنو" میں نے درخواست کے لہجے میں کہا "میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں' ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کرسکتے ہیں۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا یہ تیر بھی نشانے پر لگا۔ سوراخ میں چمکتی ہوئی روشنی کا زاویہ تبدیل ہوا' مجھے اندازہ ہوا کہ عورت لالٹین لے کر کمروں کی درمیانی دیوار کی طرف آرہی ہے۔

"کون ہو تم؟" سوراخ کے قریب سے ایک نہایت ڈری سہمی ہوئی آواز ابھری۔

"آپ کی طرح کا قیدی ہوں میں بھی۔ خدارا آپ کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جو قسم کہیں میں کھانے کو تیار ہوں۔"

"ک ـــ کیا چاہتے ہو تم؟"

"آپ کا اعتماد اور تعاون۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں ـــ اور یہ دیوار کیوں توڑی ہے تم نے ـــ کیا اس سے پہلے بھی تم ہی اس دیوار کو کھودتے تھے؟"

"جی ہاں" میں نے بے ضرر جھوٹ بولا "بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔ اب تھوڑی سی ہمت آپ کریں۔ جو کام میں کئی گھنٹوں میں نہیں کرسکا' وہ آپ دس پندرہ منٹ میں کرلیں گی۔ اگر کوئی آہنی سلاخ یا اس قسم کی چیز آپ کے پاس ہے تو اپنی طرف سے اس سل کو میرے کمرے میں دھکیلنے کی کوشش کریں۔"

"لیکن تم چاہتے کیا ہو؟" عورت کے لہجے میں بدستور خوف کی لرزش تھی۔ ویسے وہ کوئی پڑھی لکھی خوش اطوار خاتون معلوم ہوتی تھی۔

میں نے کہا "بہن جی' ایک قیدی رہائی کے سوا اور کیا چاہتا ہے۔ یقیناً آپ بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ یقین کریں آج رات ہم دونوں کی مراد پوری ہوسکتی ہے اور ایسے محفوظ طریقے سے کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ ہم یہ رستہ بنالیں تو میں آپ کو سب کچھ بتادیتا ہوں۔ آپ خود کہیں گی کہ ـــ ہاں' ہم رہا ہوسکتے ہیں۔"

میں اپنے پُراعتماد لہجے سے عورت کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ اور وہ میرے دکھائے ہوئے من پسند خواب میں الجھنے لگی تھی۔ میں نے اشاروں کنایوں میں عباس کو خاموش رہنے کا اشارہ کردیا تھا اور عورت کے سامنے خود کو تنہا ظاہر کررہا تھا۔ دو کے بجائے اکیلے مرد پر اعتماد کرنا عورت کے لیے زیادہ آسان تھا۔

دو تین منٹ ہمارے درمیان گفتگو ہوئی اور عورت میرے ڈھب پر آگئی۔ میں نے عورت کے متعلق جو اندازے لگائے وہ بالکل درست تھے۔ عیسیٰ جان کی بنائی ہوئی زنجیریں ہم دونوں کے درمیان درد مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔ عورت نے میرے کہنے پر عمل کیا اور کسی نوکدار چیز سے سل کے اردگرد کا مسالا جھاڑنے لگی۔ اس

طرف سے میں نے بھی کوشش جاری رکھی۔ دس پندرہ منٹ میں ہم چوکور سل دیوار سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ پیٹ کے بل لیٹ کر میں سوراخ میں سے بہ آسانی گزر گیا۔ دوسری طرف لالٹین کی روشنی میں ایک حسین و جمیل شاداب عورت میرے سامنے تھی۔ اس کی عمر پچیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اپنے خدوخال سے وہ وسطی پنجاب کی رہنے والی نظر آتی تھی۔ لمبا قد' بھرا بھرا جسم' سبز شلوار قمیص پر اس نے ایک سفید چکیلی جرسی پہن رکھی تھی۔ گرم چادر اس کے سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگری ہوئی تھی اور سپید کبوتروں جیسے نرم و نازک ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف و ہراس لیے وہ میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھی۔

"گھبراؤ نہ بہن۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر قریبی چارپائی پر بٹھا دیا۔

"کک ـــ کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟" اس نے درمیانی خلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـــ میرا ساتھی ہے۔ تم میری طرح اس پر بھی بھروسا کرسکتی ہو۔"

اس کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ میں نے خلا کے پاس جھک کر عباس خان کو ہدایت کی کہ وہ اپنی لالٹین بجھا دے۔ دونوں کمروں کی درمیانی دیوار کے ساتھ لکڑی کی ایک الماری رکھی تھی۔ الماری کی ایک سائڈ کو سنگار میز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں شیشہ لگا ہوا تھا اور نیچے شیلف پر میک اپ کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت نے خوشبو لگا رکھی ہے اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی ہے۔ کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان پر پھولدار چادریں بچھی تھیں اور سرخ شنیل کے لحاف رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں انگیٹھی بھی موجود تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک چارپائی پر کوئی سو رہا ہے۔ قد کاٹھ سے وہ بچہ نظر آتا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے عورت سے پوچھا۔

"بچہ ہے۔ میرے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے" عورت نے مختصر جواب دیا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ لکڑی کی الماری کو تھوڑا سا کھسکا کر خلا کے سامنے کردیا جائے۔ عورت نے میرا ہاتھ بٹایا اور ہم نے الماری کو حرکت دے کر درمیانی خلا ڈھانپ دیا۔ میں نے عورت کا اعتماد بحال کرنے کے لیے پہلے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ ظاہر ہے یہ ایک ادھورا تعارف تھا بلکہ میرے نام کی حد تک فرضی بھی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم لاہور سے آئے ہیں۔ کچھ مقامی دوستوں کے ساتھ مل کر ڈھوکی تالاب کے علاقے میں شکار کھیل رہے تھے کہ عیسیٰ جان کے ہتھے چڑھ گئے۔ اب کئی دنوں سے اس ڈیرے پر پابند ہیں۔ عورت جلد از جلد جاننا چاہتی تھی کہ میرے پاس وہ کون سی جادو کی چھڑی ہے جس کے بل بوتے پر میں یہاں سے نکلنے کا دعویٰ کررہا ہوں۔ چھڑی تھی ہی نہیں تو میں دکھاتا کیا۔

یہ کمرا بھی ہمارے کمرے کی طرح تین اطراف سے گھرا ہوا تھا اور قطعی ناقابل شکست تھا بلکہ یہاں تو دروازے کے ساتھ وہ سلاخ دار کھڑکی بھی نہیں تھی جو ہمارے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی جگہ صرف ایک روشن دان سا تھا۔ تاہم میں نے اپنی مایوسی عورت پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اسے اپنے سوالوں کے دھارے میں بہا کر "تعارف" کی طرف لے گیا۔ وہ ایک سمجھ دار اور محتاط عورت تھی۔ اپنی سائڈ ہر طرح محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے شائستہ لہجے میں معذرت چاہی کہ وہ اپنا نام پتا نہیں بتا سکتی تاہم یہ بتا سکتی ہے کہ وہ کیسے اور کیونکر یہاں پہنچی۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ جو وہ بتا رہی تھی میں نے اسی کو غنیمت جانا۔ عورت نے بتایا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ عیسیٰ جان نے کسی طور اس کے شوہر کو بلیک میل کیا اور پولیس سے بچنے کے لیے ان کے گھر میں ایک ماہ تک زبردستی پناہ گزین رہا۔ اسی دوران اس کی نیت خراب ہوگئی۔ جب وہ ان کے گھر سے رخصت ہوا تو ساتھ ہی اسے بھی اغوا کرکے یہاں قبائلی علاقے میں لے آیا۔ اب وہ پچھلے کئی ماہ سے یہاں اس کی حبس بے جا میں تھی اور وہ سارے دکھ جھیل رہی تھی جو ایک مغویہ کی قسمت ہوتے ہیں۔

میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خوبرو عورت کو سرتاپا گھورا پھر میرے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی "میں ـــ میں تمہیں پہچان گیا ہوں ـــ تم نبیلہ ہو۔ مالک محمد کی بیوی ـــ تم شیخوپورہ میں رہتی ہو۔"

عورت کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور چہرہ چند لمحوں میں کئی رنگ بدل گیا "کک ـــ کس کی بات کررہے ہو؟" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

"چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں نبیلہ۔ تم اعتراف کرو یا نہ کرو' حقیقت یہی ہے کہ تم نبیلہ ہو ـــ اور میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ غالباً وہ باتیں بھی جو ابھی تمہارے

علم میں نہیں۔ تمہارا پہلا خاوند' تمہارا تیسرا بچہ' تمہاری وہ مجبوری جس نے تمہیں مالک محمد کی بیوی بنایا۔ یہ سب کچھ میرے علم میں ہے۔"

نبیلہ جان گئی کہ اب ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سراسیمگی لہریں لے رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ بولی "آپ کیوں کررہے ہیں ایسی باتیں' کون ہیں آپ؟"

میں نے ملائمت سے کہا "تمہارا خیر خواہ ہوں نبیلہ' اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اجنبیت کی دیوار نہیں گراؤ گی... تو ہم وقت ضائع کرتے رہیں گے۔ اور آج کی رات یہ وقت ہی سب سے قیمتی چیز ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے' نہ صرف خود بلکہ کچھ اور لوگوں کو بھی نکالنا ہے۔ مجھے بتاؤ تم یہاں کیسے پہنچی ہو' کب سے یہاں بند ہو اور تمہارے خیال میں یہاں سے نکلنے کے امکانات کیا ہیں؟"

وہ بولی "پہلے آپ بتائیں' آپ مالک محمد کو کیسے جانتے ہیں' کیا آپ ان سے ملے تھے؟"

"ہاں' مالک محمد سے میری پرانی صاحب سلامت ہے۔ قدو زماں ہمارا مشترکہ دوست تھا۔ اکثر جھوک ضامن میں مالک سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ چند روز پہلے میں شیخوپورہ میں تمہارے گھر جاچکا ہوں۔ تمہارے بچوں سے بھی ملا ہوں' وہ سب تمہاری جدائی میں پریشان ہیں اور ہر پل تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

بچوں اور شوہر کا سن کر وہ مصیبت زدہ تڑپ اٹھی۔ آنسوؤں نے آنکھوں پر یلغار کی اور احتیاط کا ہر بند توڑ کر رخساروں پر بہہ نکلے "کیسے ہیں میرے بچے' آپ نے خود انہیں دیکھا تھا؟ وہ ٹھیک تو ہیں ـــ بیمار تو نہیں ہوگئے' بیلی کیسا تھا' زیادہ روتا تو نہیں تھا ـــ" ایک دم اس کی ہچکیاں تیز ہوگئیں اور وہ کلیجا تھام کر آگے کو جھک گئی۔

سردی بہت زیادہ تھی اور چادر اس کے کندھوں سے ڈھلک کر زمین پر گرگئی تھی۔ میں نے چادر اٹھائی اور احتیاط سے اس کے سر پر ڈال دی۔ میرے ہمدردانہ انداز نے اسے کھل کر رونے پر مائل کردیا۔ مٹی سے آلودہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کررہی تھی لیکن غم کی یورش میں فصیل ضبط کا ہر بند ٹوٹتا چلا گیا۔ میں نے اسے رونے دیا۔ یہ آنسو اس کی آنکھوں کو شیشے کی طرح شفاف کررہے تھے اور میں جانتا تھا جب تھوڑی دیر بعد وہ پلکیں اٹھائے گی تو اس شیشے کے آرپار سب کچھ صاف نظر آئے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب گھٹا جھوم کر برس چکی اور نبیلہ کا چہرہ دھلا ہوا زرد گلاب سا نظر آنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اور اس کے درمیان بہت سے پردے اٹھ گئے ہیں۔ پردیس میں تو دیس کی طرف سے آنے والی ہوا بھی اچھی لگتی ہے' میں تو پھر ایک جیتا جاگتا فرد تھا۔ نہ صرف اس کا گھر دیکھ کر آیا تھا بلکہ اس کے جگر گوشوں سے بھی مل چکا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی گم شدہ جنت کا حال دریافت کرنے لگی' کرید کرید کر سوال پوچھنے لگی۔ میں بتاتا جارہا تھا اور اپنے کام کی باتیں اس سے پوچھتا بھی جارہا تھا۔ یہ امر میرے لیے نہایت خوش گوار حیرت کا سبب بنا تھا کہ وہ ابھی تک حیات تھی۔ معلوم نہیں مالک محمد تک اس کے مرنے کی غلط اطلاع کیونکر اور کیسے پہنچی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ مالک محمد اسے مردہ تصور کرچکا ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس کا پہلا بچہ مل چکا ہے اور اب مالک محمد نے اسے بیٹوں کی طرح گھر میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاعات یقیناً اس کے لیے سنسنی خیز تھیں اور میں فی الحال اسے مزید ہیجان کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے بے دار ہونے کے بعد وہ بری طرح چیخی چلائی تھی اور دروازہ بھی پیٹتی رہی تھی پھر بھی کوئی اندر نہیں آیا' اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ آہ بھر کر بولی "یہاں چیخنے چلانے پر کوئی کان نہیں دھرتا' گونگے بہرے لوگ ہیں یہ۔ پتا نہیں کتنی راتیں میں نے اسی طرح چیختے چلاتے گزاری ہیں۔ اب تو عادت سی ہوچلی ہے رونے کی اور رو کر سو رہنے کی۔"

میں نے پوچھا "اتنی چیخم دھاڑ کے باوجود یہ لڑکا بھی بے سدھ پڑا رہا ہے۔ کہیں اسے بھی کوئی نشہ وغیرہ تو نہیں کھلایا گیا؟" میرا اشارہ چارپائی پر سوئے لڑکے کی طرف تھا۔

"آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں" نبیلہ نے جواب دیا "لیکن ـــ اسے نشہ کھلانے والی میں خود ہوں۔ میں اسے اس کمرے میں رکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ افیون کھا کر بے سدھ پڑا رہے۔ رات بھر اس کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے' یہ بے خبر سویا رہے۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے نبیلہ کے چہرے پر خجالت اور بے کسی کا ایسا تاثر ابھرا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ "رات بھر اس کے کمرے میں کچھ بھی ہوتا رہے' یہ بے خبر سویا رہے" اس کمرے میں کیا ہوسکتا ہے؟ یہ سوال کسی جواب کا طالب نہیں تھا۔ نبیلہ ایک مغویہ تھی۔ کمزور و ناتواں عورت' اس کے محافظ بازو اس سے بہت دور تھے۔ کسی کو اپنی بے کسی کا تاوان ادا کرنے کے لیے اس نے لباس میں خوشبو لگا رکھی تھی اور چہرے پر سنگھار کر رکھا تھا۔ سرکس میں جھولا جھولنے

والے شیر اور سائیکل چلانے والے چیتے کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ ان بے زبان جانوروں کو خلاف فطرت کاموں پر مجبور کرنے کے لیے کیا کیا ستم ڈھائے گئے ہیں۔ نیلہ بھی ستم زدہ تھی۔ اس کے لباس کی خوشبو اور چہرے کا سنگھار بھی ایسے ہی ناروا جبر کی کہانی سنا رہا تھا۔ آنسوؤں اور آہوں کے درمیان اس نے مجھے اپنی روداد سناتے ہوئے کہا "عیسیٰ جان مجھے شیخوپورہ سے نوشہرہ لے آیا تھا۔ یہاں اس کا ایک شناسا رمضان ملتانی ٹرانسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ عیسیٰ جان نے مجھے دو تین روز اس کے گھر رکھا۔ رمضان ملتانی کا ایک ٹرک جو زری وغیرہ کا سامان لے کر نوشہرہ سے ٹل جا رہا تھا۔ عیسیٰ جان میرے ساتھ اس ٹرک میں چھپ گیا اور یوں ہم ٹل پہنچے۔ آگے کا سفر ہم نے گھوڑوں پر طے کیا۔ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں پہنچایا گیا۔ اس ڈیرے پر کم از کم سو افراد موجود ہیں، وہ سب کے سب خطرناک لوگ ہیں، ان کے پاس جدید رائفلیں ہیں، وہ اکثر آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور قتل و غارت کی نوبت آ جاتی ہے لیکن عیسیٰ جان کا ایک ساتھی شنکر شکرا کہلاتا ہے۔ بعض لوگ اسے شنکر بھارتی بھی کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بے حد خطرناک شخص ہے۔ چند روز پہلے عیسیٰ جان کے کچھ ساتھیوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی پاداش میں شنکر شکرا نے تین مردوں اور ایک عورت پر تیل چھڑک کر انہیں سرعام زندہ جلا دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈیرے پر لڑائی جھگڑا نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے اور ہر شخص پر اسی شنکر نامی قاتل کی دہشت سوار ہو گئی ہے۔ اس ڈیرے پر مردوں کے علاوہ چار پانچ عورتیں بھی موجود ہیں۔ وہ سب اغوا کر کے لائی گئی ہیں اور اب ہنسی خوشی ان ڈاکوؤں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔"

نیلہ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ تاہم اس نے اشاروں کنایوں میں اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالوں سے جو کچھ اگلوایا اس کا لب لباب یہ ہے۔ عیسیٰ جان ایک گھناؤنا اور بے رحم شخص تھا لیکن نیلہ کے ساتھ اس کا رویہ خاصا مختلف رہا تھا۔ وہ اس کی ظاہری و باطنی خوبیوں سے متاثر ہوا تھا اور اس سے نرمی کا برتاؤ کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے سوا کسی کو نیلہ کے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ وہ نیلہ کو اپنے مخصوص لہجے میں "شہزادی" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کے لیے رنگ برنگ پوشاکیں لے کر آیا تھا اور چاہتا تھا کہ نیلہ پیچھے کا سب کچھ بھول کر ہر وقت بنی سنوری رہے۔ شروع شروع میں نیلہ بہت چیخی چلائی تھی اور اس نے کئی بار بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن آخر جان گئی تھی کہ یہ سب کوششیں بے سود ہیں۔ وہ عیسیٰ جان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اپنے جگر گوشوں کو دوبارہ دیکھنے کی آس نے اسے زندہ رکھا اور وہ یونانی دیومالا کی ایک صابر دیوی کی طرح ہر شب سانپ کا ڈنک کھا کر بھی چاند کی کرنوں سے اپنے گمشدہ بچوں کی پوشاکیں بنتی رہی اور ان سے دوبارہ ملنے کی دعا کرتی رہی۔ نیلہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ عیسیٰ جان اکثر اس کمرے میں آتا ہے اور صبح تک رہتا ہے۔

میں نے ایک نگاہ کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ دروازے سے باہر سرد تاریک رات کی حکمرانی تھی۔ دور نزدیک سے کوئی آواز کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی، کچھ فاصلے پر گنگناتا ہوا جھرنا بھی شاید رات کے اس پہر خاموش ہو گیا تھا "کیا سوچ رہے ہیں؟" نیلہ نے پوچھا۔

میں نے ایک نگاہ اس کے دلکش سراپا پر ڈالی اور نگاہیں چرا کر پوچھا "کہیں ایسا تو نہیں کہ عیسیٰ جان۔" میں نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"نہیں۔ اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہ نہیں آئے گا۔"

اس نے میرے ادھورے سوال کا مکمل جواب دے دیا "لیکن آپ یہ بات مت بھولیں کہ۔" وہ کچھ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گئی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے اس کی وسیع و عریض آنکھوں میں جھانکا۔

"آپ بہت خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں" وہ بولی "معلوم نہیں آپ کی اس حرکت کا انجام کیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کل اس سانولے شخص کی جگہ آپ کھڑے ہوں دیوار کے ساتھ۔"

"دیوار کے ساتھ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اچانک یہ خیال ذہن میں برق کی طرح کوندا کہ مجھے اپنی زبان قابو میں رکھنی چاہیے۔ میں نے نیلہ کو یہی بتایا تھا کہ میں اپنے شکاری دوستوں کے ساتھ پچھلے کئی روز سے یہاں محبوس ہوں۔ شاید نیلہ اسی تناظر میں کسی واقعے کا ذکر کر رہی تھی۔

میرے سوال پر وہ چونک سی گئی، مجھے گھور کر بولی "کل آپ یہاں نہیں تھے کیا؟"

"نہیں۔ میں اور عباس خان دو تین روز سے دن کے وقت ڈیرے سے باہر ہوتے ہیں۔ عیسیٰ جان کو غلط فہمی ہے کہ ہم نے کچھ قیمتی رائفلیں ڈھوکی تالاب کے ارد گرد چھپا رکھی ہیں۔ وہ ہم سے وہ رائفلیں برآمد کرانا چاہتا ہے۔"

ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ میں بھی بول رہا تھا۔ ایسی کچھ ضرورت تو نہیں تھی جھوٹ بولنے کی لیکن اس مرحلے میں میں کسی قیمت پر نیلہ کا اعتماد کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ حیرت سے بولی "کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اپنے ساتھی کی موت سے بھی بے خبر ہیں؟"

میرا دماغ سنسنا کر رہ گیا "کن ساتھیوں کی بات کر رہی ہو تم؟"

وہ بولی "آپ خود ہی تو بتا رہے ہیں کہ پکڑے جانے والے شکاری آپ کے ساتھی ہیں۔ شاید آپ بے خبر ہیں کہ پچھلے تین روز سے ان پر سخت مصیبت آئی ہوئی ہے۔ میں اس کھڑکی سے سارا تماشا دیکھتی رہی ہوں۔ وہ جس کی گردن اور ٹھوڑی پر پھنسی کے داغ سے تھے۔ دبلا پتلا لمبا سا شخص "کیا نام تھا اس کا" آپ کا ساتھی تھا آپ تو جانتے ہوں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کی بات کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ میں نذیر کے متعلق کوئی بُری خبر سننے والا ہوں، میں نے کہا "نذیر نام تھا اس کا۔ کیوں "کیا ہوا ہے اسے؟"

وہ غمناک انداز میں بولی "کل قتل کرا دیا اسے شنکر نے اور اب پتا نہیں کس کی باری ہے؟"

"کیا ہوا نذیر کے ساتھ؟" میں نے آزردہ لہجے میں پوچھا۔

"بڑا سفاک آدمی ہے وہ شنکر بلکہ اسے آدمی کہنا ہی نہیں چاہیے۔ اس کی صورت بھی کہاں ملتی ہے انسانوں سے کوئی خونخوار جانور لگتا ہے۔ آپ نے وہاں جھرنے کے پاس "چاند ماری" کا میدان تو دیکھا ہو گا۔ وہیں گولی ماری تھی انہوں نے اس بے چارے کو۔ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا اور سر پر کھانسی کے شربت کی چھوٹی سی بوتل رکھ دی تھی۔ شنکر اور دوسرے نشانہ باز اس بوتل کو نشانہ بناتے تھے۔ ایک بوتل ٹوٹ جاتی تھی تو دوسری رکھ دی جاتی تھی۔ وہ کب تک زندہ رہتا۔ آخر اسے مرنا ہی تھا اور وہ مر گیا۔ ایک شخص کی گولی اس کی پیشانی پر لگی اور وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے مگر دو روز تک اس بدنصیب نے جو عذاب سہا اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔ موت کے خوف نے اس کے اعصاب کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کسی وقت وہ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا "نشانہ بازوں" کے قدموں میں گر پڑتا اور ان کی منتیں سماجتیں کرتا۔ وہ پچکار پچکار کر اسے پھر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتے اور تسلی دیتے کہ اگر وہ ان کے کہے پر عمل کرتا رہا تو زندہ رہے گا۔ کل چاند ماری شروع ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی اسے گولی لگ گئی۔ اس کی جگہ گھونگریالے بالوں والے اس سانولے شخص کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کل وہ پورا ایک گھنٹا موت کے منہ میں رہا ہے۔ معلوم نہیں اب بھی اس کی جان بخشی ہوتی ہے یا نہیں۔"

گھونگریالے بالوں اور سانولے شخص کا اشارہ بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ نیلہ انسپکٹر باجوہ کی بات کر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ دیر پہلے جب عیسیٰ جان مجھے ایس پی اور صوبے دار وغیرہ سے ملوانے لے گیا تھا تو وہاں انسپکٹر باجوہ گھٹنوں میں سر دیے زار و قطار رو رہا تھا۔ غالباً نیلہ کی اطلاعات درست ہی تھیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کے بعد اب انسپکٹر باجوہ کو دردناک صورت حال کا سامنا تھا۔ میری نگاہوں میں ہیڈ کانسٹیبل نذیر کی صورت گھومنے لگی۔ خاصا بذلہ سنج بندہ تھا وہ۔ میں اس کا "ہم منصب" تھا لہٰذا وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ ایس پی برکت کی تلون مزاجی پر سرگوشیوں میں چٹ پٹے تبصرے کرنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ مجھے اس کی کئی خوبصورت باتیں یاد آئیں اور دل اندوہ سے لبریز ہو گیا۔

بحیثیت مجموعی یہاں صورت حال ہماری توقع سے خاصی مختلف نکلی تھی۔ سب سے بڑا "سیٹ بیک" تو یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ایس پی صاحب ڈاکوؤں پر چھاپا مارتے ڈاکوؤں نے ان پر چھاپا مار دیا تھا اور اب چھاپا مار پارٹی اپنی گاڑیوں اور اسلحے سے محروم ہو کر نیٹے میں مجبوریاں بند پڑی تھی۔ دوسرے عیسیٰ جان کے اس ڈیرے پر مجرمان باصفا کی تعداد ہمارے اندازوں سے زیادہ تھی۔ نیلہ نے بتایا تھا کہ یہاں کم از کم سو افراد ہیں۔ سو نہ بھی ہوتے تو ساٹھ ستر کہیں نہیں گئے تھے۔ الٹے لینے کے دینے پڑنے والا محاورہ یہاں صادق آ رہا تھا۔ شنکر شکرا اور عیسیٰ جان وغیرہ پر قابو پانا تو بعد کی بات تھی پہلے تو یہاں سے نکلنے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ نیلہ ایسی موٹے دماغ کی نہیں تھی کہ صورت حال سمجھ نہ سکتی۔ وہ جان چکی تھی کہ میرے پاس ایسا کوئی پلان ولان نہیں جو جادو کی چھڑی کا کام کرے اور ہم یہاں سے جان بچا کر نکل جائیں۔ صرف اسے تعاون پر آمادہ کرنے کے لیے میں نے پلان کی بات کی تھی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا، نیلہ اور میں ایک دوسرے پر اعتماد کر رہے تھے تاہم اس دو طرفہ اعتماد کے حصول کے سوا یہ جدوجہد ناکام ہی رہی تھی۔ اور اب نیلہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔ دونوں کمروں کی درمیانی دیوار کا خلا ایک جان لیوا زخم کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے کھلا

پڑا تھا۔ نہ یہ رفو ہو سکتا تھا اور نہ اسے ٹانکے لگ سکتے تھے۔ اور پردہ پوش رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" آخر نبیلہ کے دل کی بات زبان پر آہی گئی۔

"یہ تمہارے سوچنے کی نہیں ہمارے سوچنے کی بات ہے۔ دیوار ہم نے پھاڑی ہے۔ تم چیخنے چلانے اور دروازہ پیٹنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھیں اور وہ تم نے کیا ہے۔ اس کے بعد صدمے سے بے ہوش ہو گئیں اور صبح تک بے ہوش رہیں۔۔۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟"

"لیکن آپ۔۔۔ آپ دونوں کا کیا ہوگا؟ رو عیسیٰ جان تو آپ سے بہت بری طرح پیش آئے گا۔۔۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔ یہ بہت برا ہوا ہے' بہت ہی برا ہوا ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"دیکھو نبیلہ" میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کرو۔ صبح جو ہوگا دیکھا جائے گا اور ہم خود دیکھیں گے' یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"

اچانک ہم دونوں کو بری طرح چونکنا پڑا۔ کچھ فاصلے پر باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر کوئی بھاری بھرکم قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ دنیا جہان کا خوف نبیلہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی "ہائے میں مرگئی' عیسیٰ آرہا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میں بھی چکرایا لیکن پھر خطرات سے ٹکرانے والی ترنگ میرے اندر بیدار ہو گئی۔ میں نے دیکھا لکڑی کی الماری بالکل ٹھیک جگہ پر تھی۔ خلا کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا اور فرش پر گرنے والا ملبا بھی الماری کے نیچے چھپ گیا تھا۔ میں نے نبیلہ کے کان میں تیز سرگوشی کی "میں دروازے کے پاس کھڑا ہو جاتا ہوں' دروازہ کھلے گا تو باہر نکل جاؤں گا' گھبرانا مت ورنہ بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"لیکن؟" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز حلق ہی میں گھٹ گئی۔ باہر دروازے کا تالا کھولا جا رہا تھا۔ کھانسی کی آواز سے اندازہ ہوا کہ تالا کھولنے والا عیسیٰ جان ہی ہے۔ کنڈی گرا کر اس نے دروازے کو دھکیلا مگر اندر سے بھی کنڈی لگی ہوئی تھی۔

اس نے دستک دی اور ملائم آواز میں بولا "شہزادی! ہم تمہارا عیسیٰ جان ہے' دروازہ کھولو" وہ ہلکے سے نشے میں تھا۔

نبیلہ کا چہرہ مٹی ہو رہا تھا۔ اس کی کشادہ آنکھیں سوالیہ انداز سے میرے چہرے پر جمی تھیں۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی رفاقت میں اس نے مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا ہے' میں نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی قابل اعتراض چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے آنکھوں سے اسے اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھول دے۔ وہ دروازے کی سمت بڑھتی ہوئی خوابیدہ لہجے میں بولی "اچھا۔ آتی ہوں" میں نے جلدی سے لالٹین کی لو نیچی کی اور دیوار سے پشت لگا کر چوکھٹ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں نبیلہ کا نقرئی چوڑیوں والا ہاتھ فضا میں اٹھا اور حنائی انگلیوں نے باہم مجڑ کر چٹخنی کو تھام لیا۔ فیصلے کا لمحہ آپہنچا تھا۔

جونہی دروازہ کھلا اور عیسیٰ جان اندر آیا' میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بس یہ ایک ساعت کا کھیل تھا۔ عیسیٰ جان نے اندر آکر جو ایک ساعت اپنی منظورِ نظر کو دیکھنے میں صرف کی تھی وہ میرے کام آگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ گھوم کر دروازہ بند کرتا' میں اس کے دائیں پہلو سے بال بال بچتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

باہر نکلتے ہی مجھے اپنی دائیں جانب ایک سایہ نظر آیا۔ یہ عیسیٰ جان کا کارندہ تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچنے کا نہیں حرکت میں آنے بلکہ حرکت میں رہنے کا وقت تھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میرا جو "مومینٹم" بنا تھا وہ ابھی تک برقرار تھا۔ اسی مومینٹم کو بڑھاتے ہوئے میں نے جست کی اور چودہ پندرہ فٹ کا فاصلہ پھلانگ کر پہرے دار پر جا پڑا۔ میرا بچاؤ اسی صورت میں تھا کہ پہرے دار کی آواز نہ نکلے اور میں اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے منہ پر آیا اور میں اسے اپنے جسم سے دھکیلتا ہوا ہموار زمین پر گرا۔ یہی وہ وقت تھا جب عیسیٰ جان دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا رہا تھا۔ پہرے دار کے گرنے اور اس کی رائفل زمین سے ٹکرانے کی صدا زیادہ بلند نہیں تھی لیکن ایسی معمولی بھی نہیں تھی کہ کسی کے نوٹس میں نہ آسکتی۔ خاص طور پر عیسیٰ جان سے خطرہ تھا جو توقع سے قریب تر تھا۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے تڑپتے پھڑکتے پہرے دار کو گھسیٹا اور چشمے کی طرف میدانی کے گھنے پودوں میں لے گیا۔ وہ اپنے ہونٹ میری ہتھیلی سے آزاد کرانے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور اس کی یہ کوشش کسی بھی لمحے کامیاب ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کی تومند گردن اپنے بازو کے مخصوص داؤ میں جکڑی اور معمولی کوشش سے اسے ان

فضیل کر دیا۔ بعد ازاں مجھے اپنی اس کارروائی پر افسوس بھی ہوا کیونکہ پہرے دار ہوش میں رہتا تو مجھے یہاں کے حالات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ کم از کم یہی پتا چل جاتا کہ شکر زہرے پر ہے اور اگر ہے تو کہاں ملے گا۔ اب پہرے دار کو ہوش میں لانے کی کوشش فضول تھی بلکہ یہ بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ آئندہ ہوش میں آئے گا یا نہیں۔ وہ بے طرح مزاحمت کر کے نہ صرف میرے کام سے گیا تھا بلکہ ممکن تھا اپنے کام کا بھی نہ رہا ہو۔ وہ بہت گہرے سانس لے رہا تھا' آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور ان میں صرف سفیدی نظر آرہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اس کی کمر سے گولیوں والا بیلٹ کھولا اور اپنی کمر سے باندھ لیا۔ رائفل لوڈ تھی۔ میں نے اسے چیک کرنے کے بعد کندھے سے لٹکا لیا۔ پہرے دار کی جامہ تلاشی کے دوران ایک ٹارچ اور پیش قبض نما خنجر بھی میرے ہاتھ لگا۔ میں نے یہ چیزیں اپنی جیکٹ میں منتقل کر لیں اور پیش آمدہ ہنگامے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔

اچانک مجھے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر تاریکی میں ایک خوابیدہ سی آواز ابھری "بالی خاں" کوئی بالی خاں کو پکار رہا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ بالی خاں وہی ہے جو میرے پہلو میں بے سُدھ پڑا ہے۔ کچھ دیر پہلے کمرے میں نبیلہ نے بھی اسی بالی خاں کو آوازیں دی تھیں۔ اس وقت بالی خاں نے سنتے ہوئے بھی نہیں سنا تھا اب وہ سننے سے معذور تھا۔

بالی خاں کو آوازیں دینے والا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں زمین پر بیٹھے بیٹھے اردھے منہ لیٹا اور تیزی سے ایک طرف رینگ گیا۔ چند فٹ آگے جا کر میں نے رخ اس طرح پھیرا کہ میرا چہرہ بے ہوش بالی خاں کی طرف ہو گیا۔ بالی خاں کا ڈیڑھ فٹ لمبا لشکری خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار۔ بالی کو ڈھونڈنے والا چھریرے بدن کا ایک نوجوان تھا۔ وہ ہاتھ میں لالٹین لیے ایک میدانی جھاڑی کے عقب سے نمودار ہوا۔ رائفل اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چائے یا قہوے کا پیالہ تھا۔ پیالے کی طرح نوجوان کے نتھنوں سے بھی دھواں خارج ہو رہا تھا۔ وہ جانتا نہیں تھا موت اس کے کس قدر قریب سانس لے رہی ہے۔ میں نے دیکھا' وہ خوب صورت تھا اور اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا کاش وہ یہاں نہ آتا اور اگر آگیا ہے تو بالی خاں کو دیکھے بغیر چلا جائے۔

بالی خاں سے آٹھ دس فٹ دور رک کر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ بالی کا جسم چونکہ ایک گڑھا نما نشیب میں تھا اس لیے لالٹین کی روشنی اس پر نہیں پڑی اور نوجوان واپس پلٹ گیا۔ مگر پھر اچانک اس کی بدقسمتی نے آواز دی۔ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا بالی خاں کے حلق سے خرخر کی مدھم آواز نکلی۔ نوجوان بری طرح چونک گیا۔ لالٹین اور پیالہ ایک ساتھ ایک پتھر پر رکھ کر اس نے بڑی پھرتی سے رائفل ہاتھ میں کی اور بالی خاں کی طرف آیا۔ میں اب پوری طرح تیار تھا۔ جونہی اس نے جھک کر بالی خاں کو دیکھا' میں گھات میں بیٹھے شکاری جانور کی طرح اس پر جھپٹا۔ میں اس کی گردن دبوچنا چاہتا تھا لیکن وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ میں صرف اس کے لمبے بالوں کو مٹھی میں جکڑ سکا۔

ہر قبائلی کی طرح اس کے پاس بھی خنجر موجود تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے خنجر ہاتھ میں کر لیا لیکن مجھے اس پر فوقیت حاصل تھی۔ خنجر پہلے سے میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے وہ اس کی گردن میں گھونپ دیا۔ دونوں ہنسلیوں کے درمیان سے خنجر کی نوک اس کی گردن میں گھسی اور شہ رگ کاٹتی ہوئی پچھلی طرف سے نکل آئی۔ مغضوب کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔ وہ بدنصیب کسی شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور اندھیرے میں کسی کا سہارا ڈھونڈتا ہوا اوندھے منہ جاں بہ لب بالی خاں پر جا گرا۔ میں نے اپنا خنجر اس کی گردن میں ہی انکا رہنے دیا اور اس کا خنجر اس کی بند مٹھی سے نکال کر اپنے لباس میں رکھ لیا۔ لالٹین بجھا کر اور قہوے کا پیالہ جھاڑیوں میں پھینک کر میں محتاط قدموں سے چشمے کی طرف گیا اور چاند ماری کے احاطے سے گزر کر ان نیچی چھت والے کمروں کے عقب میں آگیا جو ایک قطار کی صورت دور تک چلے گئے تھے۔ ان کمروں کے عقب میں سلاخ دار کھڑکیاں تھیں اور کسی کسی کھڑکی میں رات کے اس آخری پہر بھی روشنی کے آثار نظر آرہے تھے۔

میں اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا' ایک وحشت سی تھی جو مجھ پر طاری ہو رہی تھی اور اس وحشت کا سبب شنکر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ یہیں کہیں تھا۔ انہی دیواروں میں کہیں پوشیدہ تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس میری رگوں میں آتشیں سیال بن کر دوڑنے لگا تھا۔ طویل دیوار کے ساتھ جھک کر چلتا ہوا میں ایک روشن کھڑکی کے قریب پہنچا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن اس سے آگے دو کمرے چھوڑ کر جو کھڑکی تھی وہاں زندگی کے آثار موجود تھے۔ کوئی وہاں بول رہا تھا۔ میں جھک کر چلتا ہوا دو

تاریک کھڑکیوں کے نیچے سے گزرا اور روشن کھڑکی تک پہنچ گیا۔ یہ کھڑکی آدھ کھلی تھی اور اندر کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے محفوظ زاویے سے کمرے میں جھانکا اور چونک گیا۔

اس غیر معمولی طور پر کشادہ کمرے میں کم و بیش پندرہ افراد موجود تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور دو گیس لیمپس کی روشنی میں وہ گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ ان مقامی لوگوں میں تین غیر مقامی بھی موجود تھے۔ یہ ملتان یا خانیوال کی طرف کے چوہدری ٹائپ افراد تھے۔ ان میں گھنی مونچھوں اور بادامی آنکھوں والے ایک نوجوان کو دیکھ کر میں بُری طرح چونک گیا۔ یہ ملک میں اس نئی اُبھرنے والی سیاسی پارٹی کا سرگرم رُکن تھا جو آمریت کی بساط لپیٹ دینے کا عزم لے کر میدان میں آئی تھی اور اپنی طاقت کا منبع عوام کو بتا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اس پارٹی کے ایک مخالف سیاسی لیڈر نے راولپنڈی میں ایک بڑے جلسۂ عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلسے کو سبوتاژ کرنے کے لیے فائرنگ کی گئی تھی جس کے نتیجے میں کئی افراد ہلاک و زخمی ہوئے تھے اور پورے ملک میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس فائرنگ کیس کی خبریں ابھی تک اخباروں کی زینت بن رہی تھیں۔ نامزد ملزمان میں یہ گھنی مونچھوں والا نوجوان بھی شامل تھا۔ اس کی تصویر میں ایک سے زائد مرتبہ اخبار میں دیکھ چکا تھا۔ اب یہ شخص راولپنڈی اور ملتان سے سینکڑوں میل دور اس دور دراز ویرانے میں ان خطرناک لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا اور اپنی گھنی مونچھوں کے نیچے سے سگریٹ کا دھواں خارج کر رہا تھا۔ مجھے اس کا نام یاد آ گیا۔ وہ عتیق عرف پاشا تھا۔ پاشا چونکہ اٹک جیل کے ایک وارڈن کا نام بھی تھا اس لیے مجھے یاد رہ گیا تھا۔

پاشا یقیناً صاف سیدھی اردو بول سکتا ہو گا لیکن مقامی افراد میں بیٹھ کر وہ بھی شوقیہ اردو کی ٹانگ توڑنے میں مصروف تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا "نہیں رستم خاں، ہم تمہیں اور مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بس اب جانا چاہیے ہمیں۔"

رستم خاں ایک زخم زخم چہرے والا خطرناک شخص تھا۔ وہ بولا "خوا زا! تم پھر طوطے کا مافق رٹ لگاتا ہے۔ جب ملک عیسیٰ نے بات ختم کر دیا تو بس پھر ختم ہے۔ تم یہیں رہے گا۔ اب اگر جائے گا تو ہم سب کو ناراض کر کے جائے گا۔"

پاشا نے کہا "دیکھو رستم! صرف ہماری وجہ سے یہاں چار آدمیوں کا جان چلا گیا ہے۔ ہم یہاں اور دنگا فساد نہیں چاہتا۔"

رستم تنک کر بولا "چار کیا چار سو آدمیوں کا جان بھی چلا جائے تو تم یہیں رہے گا۔ یہ ملک عیسیٰ کا حکم ہے۔ اور تم خود کو ہم سے جدا کیوں سمجھتا ہے۔ ہم سب ایک ہے۔ ایک ہی لیڈر کا لیڈری مانتا ہے ہم سب۔ بس اب ہم کو کچھ نہیں سننا۔"

پاشا کا ایک ساتھی اپنی بھاری بھرکم ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "خان صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہتا ہے، ہم آپ کے جذبے کا قدر کرتا ہے لیکن اگر آپ آپس میں لڑے گا تو یہ ہمارا ہی نقصان ہے۔ لشکر خاں کے ارادے مجھے کچھ اچھے نہیں لگے۔ جب تک ہم یہاں ہیں وہ بس گھورتا رہے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ اپنے بندوں کا انتقام لینے کے لیے کوئی اوچھی حرکت نہ کر بیٹھے۔ سؤر کا بال ہے اس کی آنکھ میں۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" رستم خاں نامی شخص نے اپنا پنجہ اٹھایا "کس کی کیا مجال کہ سردار کے سامنے گردن بھی سیدھی کرے۔"

پاشا کا ساتھی بولا "میں گردن سیدھی کرنے کی نہیں، پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی بات کر رہا ہوں۔ آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہاں ہونے والی گفتگو سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جلسۂ عام کی فائرنگ کیس میں ملوث ہو کر ان تین افراد نے عیسیٰ جان کے پاس پناہ لے رکھی ہے جبکہ لشکر خاں نامی کوئی دوسرا شخص ان کے یہاں رہنے کے خلاف ہے اور اس کا خیال ہے کہ ان پناہ گزینوں کی وجہ سے پولیس اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے سرگرم ہو جائے گی۔ اس معاملے پر ہونے والی تلخ کلامی کے نتیجے میں چند روز پہلے لشکر مشتعل ہو کر چار افراد کو زندہ جلا چکا ہے۔ اس واقعے سے یہ معاملہ گمبھیر تر ہو چکا ہے اور اب یہ پناہ گزیں افراد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ لشکر خاں کون شخص ہے جو عیسیٰ خاں اور شنکر سے اختلافِ رائے کی جرأت کر رہا ہے اور چار ساتھیوں کا نقصان کرا کے بھی اپنے مؤقف پر ڈٹا ہوا ہے۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک شخص ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ سب مشین گن والا وہی فربہ اندام شخص تھا جسے میں نے ایس پی برکت، صوبیدار مرجان اور باجوہ وغیرہ کا پہرا دیتے دیکھا تھا۔ وہ کمرے میں گھسا تو سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے مقامی زبان میں کوئی سنگین اطلاع حاضرین کو پہنچائی۔ ایک دم سب لوگ باہر

کی طرف لپکے۔ ان کے چہروں پر شدید تناؤ نظر آ رہا تھا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ ابھی یہاں بالی خاں اور نوجوان پہرے دار کی بات کی گئی ہے۔ نوجوان پہرے دار تو مر ہی چکا تھا، عین ممکن تھا کہ بالی خاں بھی عدم آباد سدھار گیا ہو اور اب دونوں کی لاشیں چشمے کے قریب دیکھ لی گئی ہوں۔

اس وقت مجھے سب سے محفوظ جگہ چھت نظر آئی۔ چند قدم بائیں جانب ہٹ کر میں نے ایک کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں رکھا اور اچک کر منڈیر تھام لی۔ پھر رائفل چھت پر رکھ کر میں نے کلائیوں پر زور دیا اور بہ آہستگی اوپر پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا، چشمے کے قریب سیمالی کے پیڑوں میں لالٹینیں گردش کر رہی تھیں اور تیز لہجے میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی پھر ان آوازوں میں کسی مرد کے دھاڑیں مار مار کر رونے اور کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ چاند ماری کے احاطے میں چند افراد کی ایک ٹولی جھگڑنے والے انداز میں زور زور سے بول رہی تھی۔ یکایک مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا — حالات نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لے لی تھی۔ نوجوان پہرے دار اور بالی خاں کی موت کو لشکر خاں والے جھگڑے سے نتھی کر دیا گیا تھا۔ یوں لگا جیسے ان دور افتادہ پُرسکون ٹیلوں میں اچانک ہی کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ خوابیدہ رات شورِ محشر کے ساتھ جاگی اور ہر طرف کہرام مچ گیا۔

چھت پر اوندھے لیٹے ہوئے میں نے دیکھا۔ دس بارہ افراد کی ایک مسلح ٹولی رائفلیں لہراتی اور للکارتی ہوئی ڈھلوان کی طرف بھاگی، ان کے پیچھے تین تین چار چار کی ٹولیوں میں کئی اور افراد دوڑے۔ ڈھلوان پر بھی پتھریلے کوٹھوں کی دو قطاریں موجود تھیں۔ تاہم وہاں مکمل تاریکی تھی اور لگتا تھا مکین سوئے ہوئے ہیں۔ جونہی مشتعل افراد ان کوٹھوں تک پہنچے اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ دھماکوں سے نشیب و فراز لرز اٹھے اور ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ فائرنگ کے ساتھ چیختے دھاڑتے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے اور ان کی شدت میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک پُرشور دھماکے سے در و دیوار دہل گئے۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لڑائی میں دستی بم استعمال ہوا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے ایسے ہی دو اور دھماکے ہوئے، میں نے دیکھا ڈھلوان پر واقع ایک مکان سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ فائرنگ اب دو طرفہ ہو رہی تھی اور اس کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔

میں چھلانگ لگا کر چھت سے اترا اور بھاگتا ہوا اس کمرے تک پہنچا جہاں ایس پی برکت اور صوبیدار مرجان سمیت تمام افراد بند تھے۔ اب دروازے پر کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے رائفل کی نال آہنی تالے پر رکھی اور اوپر تلے دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ کر لٹک گیا۔ دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا تو سب لوگ اسی طرح الٹے سیدھے پڑے نظر آئے۔ انہیں کچھ ہوش نہیں تھا کہ باہر کیا قیامت برپا ہے۔

"اٹھو — اٹھو" میں چیخا "بھاگو یہاں سے" وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے، میں نے انہیں کھینچ کھینچ کر بٹھایا۔ رائفل کے کندے سے ٹھوکے دیے۔ ان میں سے چند ایک نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر پھر گر گئے۔ صرف انسپکٹر باجوہ ہمت کر کے دروازے تک آیا۔ میں نے اسے سہارا دیا لیکن اس میں چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے کندھے پر اٹھاؤں مگر اچانک وہ ڈھے گیا اور گھٹنوں کے بل گر کر قے کرنے لگا۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں عباس خاں اور نبیلہ کی خبر لوں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ جھک کر بھاگتا ہوا میں اپنے بندی خانے کے دروازے تک پہنچا۔ ابھی میں دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک شخص کی طرف اٹھی اور رک گئی۔ مجھ سے صرف دس گز کے فاصلے پر مجسم شیطان — شنکر شکرا کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے مجھے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی طاقتور رائفل تھی۔ حسبِ معمول باریک ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وہ مخصوص چمک تھی جو صرف سفاک ترین قاتلوں کے حصے میں آتی ہے۔

ایک لمحے کے اندر اندر ماضی کی ایک طویل فلم میری نگاہوں کے سامنے چل گئی، وہ سارے زخم، سارے حادثے اور معرکے یاد آ گئے جو شنکر شکرا سے وابستہ تھے۔ رگ رگ اینٹھ گئی۔ بے اختیار میں نے رائفل شنکر کی طرف سیدھی کی۔ وہ غیر معمولی پھرتی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں جانتا تھا شنکر سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں۔ ضروری تھا کہ میں اپنی مرضی کا میدان چنوں، ایسی جگہ جہاں ہم دونوں کے لیے برابر کے مواقع ہوں۔ میں ایک دم ڈھلوان کے درختوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

ممکن ہی نہیں تھا کہ شنکر میرے پیچھے نہ آتا۔ اور وہ آ رہا تھا۔ میں بغیر دیکھے جان سکتا تھا کہ وہ آ رہا ہے۔ میری رائفل کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پانچ گولیاں لوڈ کیں اور دائیں جانب زیادہ گھنے درختوں کی طرف

مڑ گیا۔ اسی وقت میرے عقب میں دو دھماکے ہوئے اور گولیاں درختوں کی شاخوں سے ٹکراتی ہوئی نکل گئیں اچانک مجھے احساس ہوا کہ شنکر رک گیا ہے۔ ایک تناور درخت کی اوٹ لے کر میں نے آہٹوں پر کان لگائے۔ وہ واقعی رک چکا تھا۔ اس کے انتہائی عیار ذہن نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ ان گنجان درختوں میں میرے پیچھے گھس کر وہ مجھے کوئی رعایت دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے درخت سے ٹیک لگائے سانسیں درست کیں اور شنکر کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کسی لومڑی ہی کی طرح گھاگ اور دغاباز تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا وہ۔۔۔ ایسے حریف کے مقابلے میں ایک لمحے کی سستی کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ آیا تو میرے دائیں پہلو سے آئے گا۔ یہ جگہ نسبتاً بلند تھی اور وہ "نشیب کے نقصان" سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں نے اپنی تمام توجہ اس پہلو پر مرکوز رکھی اور الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تقریباً پچاس قدم پیچھے ہٹنے کے بعد میں ٹھٹک گیا۔

اچانک سامنے کنو کے ایک جھنڈ میں سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی "ہینڈز اپ" میں نے موت جیسے سرد لہجے میں شنکر کو پکارا۔ کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ قریب تھا کہ میں گولی چلا دیتا مگر ایک آواز نے میرا ہاتھ روک دیا۔۔۔ کنو کے جھنڈ میں شنکر نہیں تھا۔ کوئی لڑکی تھی یا بچہ تھا جو گھٹی گھٹی آواز میں رو رہا تھا۔ میں رائفل سونتے پتھر کی اوٹ سے نکلا۔

"کون ہے؟" میں نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

کسی مرد کا سایہ میرے سامنے ابھرا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں ٹارچ نہیں جلا سکتا تھا لہٰذا اسے دیکھنے کے لیے چند قدم آگے آیا۔ "ہم عباس خاں ہے جی" تاریکی سے عباس خاں کی لرزاں آواز ابھری۔ اس نے خود کو کمبل میں لپیٹ رکھا تھا، پھر اس کے دائیں بائیں دو اور سائے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نبیلہ تھی اور دوسرا وہ بچہ جسے میں نے نبیلہ کے کمرے میں محوِ خواب دیکھا تھا۔

"آ۔۔۔ آپ یہاں؟" بے اختیار نبیلہ کے منہ سے نکلا۔

میں ان تینوں کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ صورتِ حال کتنی مخدوش ہو گئی ہے۔ میں اس وقت ایک "سراپا موت" کے روبرو تھا۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن ان تین جانوں کا میں کیا کرتا؟ مجھے کیا کرنا چاہیے۔۔۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے تیزی سے سوچا۔ ڈیرے کی طرف مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ تھری ناٹ تھری، اعشاریہ پچیس، بارہ بور، ایم جی، سب کچھ چل رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کسی وقت سب مشین گن کی خوفناک تڑتڑ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ پیچھے موت تھی اور آگے ان دیکھا جنگل، میں ان تینوں کو کدھر دھکیلتا!

"آؤ میرے ساتھ" میں نے ان تینوں سے کہا۔ بچہ نیند میں لڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ عباس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا کہ گولیاں چلتے ہی نبیلہ جان بی بی والے کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس نے دروازہ بھی بند نہیں کیا۔ ہم الماری دھکیل کر بچے والے کمرے میں پہنچا۔۔۔ بی بی بولا نکل چلتے ہیں۔ ہم نے بچے کو اٹھایا اور دوڑ پڑا۔۔۔ قسمت تھا کہ بچ نکلا۔۔۔ ورنہ تو گولی چل رہا ہے کہ۔۔۔

عباس خاں کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ دھماکوں کے ساتھ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں سے گزر گئیں۔ نبیلہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گری اور اس کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ عباس خاں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور ہم سر جھکا کر بھاگتے چلے گئے۔

"پکڑو حرامزادوں کو" شنکر کی درندگی سے بھرپور آواز جنگل میں گونجی "کوئی بچ کر نہ جائے۔۔۔ کوئی نہیں۔"

مجھے اردگرد کچھ فاصلے پر لالٹینیں اور ٹارچیں چمکتی دکھائی دیں۔ شنکر نے وہی کیا تھا جو اس جیسے گھاگ دشمن کو کرنا چاہیے تھا۔ تنہا میرے پیچھے آنے کے بجائے وہ ایک مسلح جتھا لے آیا تھا۔ اب ان میں چند ایک ہلاک یا زخمی بھی ہو جاتے تو ہم بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔ میرے قیاس کے مطابق وہ کم از کم بیس افراد تھے اور نیم دائرے میں پھیل کر ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک پختہ کار مجرم اور مفرور تھا۔ وہ شب و روز بارود کی بو سونگھتے تھے اور کسی شخص کو مار دینا ان کے لیے کسی مچھر مسلنے کے برابر تھا۔

موت کے ان ہرکاروں کو خود سے فاصلے پر رکھنے کے لیے میں نے گھوم کر دو تین فائر کیے اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ سماعت شکن دھماکوں نے بچے کو سہما کر رکھ دیا تھا، وہ کسی ننھے سے بلونگڑے کی طرح میری بغل میں گھستا جا رہا تھا۔ میں نے حساب جوڑا، میرے پاس اب آٹھ گولیاں تھیں۔۔۔ آٹھ گولیاں جن سے چار جانوں کی حفاظت کرنا تھی۔۔۔ فی جان دو گولیاں۔۔۔ بڑا کمزور دفاع تھا یہ۔۔۔ دستِ قدرت ہی حرکت میں آتا تو ہم اس حصار سے نکل سکتے تھے۔

بیس تیس گز آگے جا کر میں نے تین فائر مزید کیے اور پھر نیا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا۔ غالباً اس میگزین میں کوئی خرابی تھی۔ کوشش کے باوجود میں کوئی مزید فائر نہیں کر سکا۔ رائفل اب میرے ہاتھ میں لاٹھی سے زیادہ قدر نہیں رکھتی تھی۔ اس لاٹھی سے میں کتنوں کا سر پھاڑ سکتا تھا؟ ایک عجب طرح کی جھنجلاہٹ مجھ پر طاری ہوتی چلی گئی۔ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ عباس خاں نے نبیلہ کو سہارا دے رکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک اس کا پاؤں رپٹا اور وہ میرے سامنے لڑھک کر بیس پچیس فٹ گہری کھائی میں جا گرا۔ میں نے اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرانے اور دردناک چیخ بلند ہونے کی آوازیں سنیں۔ اگر عباس خاں جان سے نہیں گیا تھا تو شدید زخمی ضرور ہو چکا تھا مگر ہم اسے رک کر دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکھڑانے والا سنبھلا رہتا ہے اور سہارا دینے والا ڈھے جاتا ہے۔ جس شخص نے اب تک بڑی کوشش سے نبیلہ کو سہارا دیے رکھا تھا وہ خود ڈھے گیا تھا۔

میں نے رائفل بائیں ہاتھ میں لے کر نبیلہ کی کلائی تھامی اور اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے چند ہفتے پہلے کہاں سوچا تھا کہ مالک محمد سے جس انگلش میڈیم اسکول کی استانی کا ماجرا سن رہا ہوں وہ کچھ عرصے بعد [illegible] کے ایک ٹھٹھرے ہوئے جنگل میں برہنہ سر و برہنہ پا میرے ساتھ بھاگ رہی ہوگی۔۔۔ ایسے کہ ہمارے چاروں طرف شعلوں کا رقص ہوگا اور خوفناک للکارے ہوں گے۔

"بھاگو۔۔۔ نبیلہ تیز بھاگو" میں نے اسے بے رحمی سے کھینچتے ہوئے کہا۔ میری نگاہ بیس تیس گز دور ایک کچی پکی سطح پر تھی۔ یہاں مرزئی کے اونچے پودے تھے اور کوتاہ قد جھاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا یہ جھاڑیاں کانٹوں سے لیس ہوتی ہیں لیکن قدرت بھی موت دکھا کر بخار پر راضی کرتی ہے۔ ان کانٹوں کی چبھن اب ہمارے لیے محاورتاً کانٹے کی تکلیف تھی۔ اولین مقصد یہ تھا کہ اندھیرے میں سنسنانے والے پگھلے سیسے سے بچا جائے۔

"وہ جا رہے ہیں" اچانک نشیب سے شنکر کی للکارتی ہوئی آواز ابھری، اس کے ساتھ ہی ہمارے قدموں میں چنگاریاں بکھر گئیں۔

ہم گرتے سنبھلتے جھاڑیوں کی طرف لپکے۔ میری نگاہ ایک ٹیلے پر پڑی اور چمک اٹھی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔۔۔ ہاں یہ جیپ ہی تھی بلکہ دو جیپیں تھیں۔ وہ ناہموار جگہ پر بے ڈھنگے طریقے سے کھڑی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی جیپیں تھیں جن پر ہم ڈھوکی تالاب کے پڑاؤ تک پہنچے

کنارہ
مصنف
محمود احمد مودی
ناشر
۱۵۰

تھے "شکار پارٹی" پر قابو پانے کے بعد یہ لوگ دونوں گاڑیاں بھی جیسے تیسے یہاں تک لے آئے تھے۔ اس سے آگے جانا ممکن نہیں ہوا لہٰذا انہیں یہیں گھنی جھاڑیوں کے چھوڑ دیا گیا تھا۔

اچانک ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ وقتِ رخصت ہم نے ایک جیپ کی نشست کے چور خانے میں دو سب مشین گنیں اور ان کے سیکڑوں راؤنڈ رکھے تھے۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا یہ اسلحہ اب بھی اس جیپ میں موجود تھا؟ اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دینا تھا، میں نے خود معلوم کرنا تھا اور میرے پاس سیکنڈوں کی نہیں لمحوں کی مہلت تھی۔ میں نبیلہ اور بچے کے ساتھ اندھا دھند بھاگتا ہوا پچھلی جیپ تک پہنچا۔ ہم گھوم کر دوسری سائڈ میں آئے تو عارضی طور پر گولیوں کی زد سے نکل گئے۔ میں نے دروازے کھینچے، جیپ لاک تھی۔ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور پوری قوت سے کندے کی ضرب شیشے پر لگائی۔ ایک دھماکے سے شیشہ چور ہو گیا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر دروازہ کھولا اور لپک کر پچھلی نشست پر آیا۔ کہیں قریب سے شنکر کی پاٹ دار آواز ابھری "گاڑی کی طرف گئے ہیں"

ایک دوسری آواز آئی "اگلی گاڑی کی طرف ہیں۔"

تیسری آواز آئی "نہیں، پچھلی گاڑی ہے۔"

"بھون دو۔۔۔ لونڈی بچوں کو" شنکر ہنکارا۔

ٹن ٹن کی آواز سے جیپ کی باڈی لرز اٹھی۔ درجنوں گولیوں نے آہنی چادر میں سوراخ کر دیے تھے۔ نبیلہ اور بچہ اگلے ٹائر سے چپکے چیخ رہے تھے۔ میں نے نشست اٹھا کر دیوانہ وار تاریک خلا میں ہاتھ چلایا۔ میری انگلیاں شفاف سرد لوہے سے ٹکرائیں۔

لوہا۔۔۔ جو سب مشین گن تھا لوہا۔۔۔ جو موت تھا!

میں نے اوندھے منہ لیٹے لیٹے سب مشین گن چور خانے سے نکالی اور اسے لوڈ کرنے لگا۔ اس دوران چند اور گولیاں جیپ کے شیشے توڑتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔ نبیلہ اور بچہ بدستور اگلے ٹائر سے چپکے ہوئے

تھے۔ اچانک نبیلہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ معلوم نہیں اسے گولی لگ گئی تھی یا وہ صرف خوف زدہ تھی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ اب شنکر اور اس کے ہرکارے کسی بھی وقت ہمیں چھلنی کرسکتے تھے۔ میں نے بھاری بھرکم سب مشین گن کی نال ایک ٹوٹے شیشے سے باہر نکالی اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اب میں اپنی طرف بڑھنے والی موت پر آگ برسانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ سب مشین گن کو اسٹین گن بھی کہا جاتا ہے۔ مشین گن میں گولیوں کا بیلٹ چلتا ہے جبکہ سب مشین گن میں میگزین استعمال ہوتا ہے۔ میرے پاس جو سب مشین گن تھی اس کے میگزین میں اٹھائیس گولیاں ڈالی جاسکتی تھیں۔ ایک دفعہ کلک کرکے یعنی اسپرنگ کھینچ کر تمام راؤنڈ فائر کیے جاسکتے تھے۔ میں نے گن کو "ایف" پر سیٹ کرکے کندا شانے سے پیوست کرلیا۔

اچانک میری نگاہوں کے سامنے ٹارچ کی روشنی چمکی اور پھر ایک جھاڑی کی اوٹ سے تین سائے نکلے اور پوری رفتار سے جیپ کی طرف لپکے۔

یہ بڑا جارحانہ انداز تھا۔ فوجی زبان میں اسے چارج کرنا کہتے ہیں۔ جنگ عظیم دوئم کے موضوع پر بننے والی فلموں میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ خاص طور پر جاپانی فوجیوں کا یہ انداز تو خوف اور دہشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لڑائی کے دوران اچانک وہ اپنی پوزیشنیں چھوڑتے تھے اور چیختے چلاتے ہوئے اتحادی مورچوں پر حملہ آور ہوجاتے تھے۔ ایسے حملوں میں اگر ایک جاپانی بھی گولیوں سے بچ جاتا تھا تو وہ دشمن کے مورچوں تک ضرور پہنچتا تھا اور کم از کم ایک شخص کو سنگین میں پرو دیتا تھا۔ اور اکثر بچ رہنے والے جاپانیوں اور سنگین میں پروئے جانے والے اتحادیوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی تھی۔ چھوٹے پیمانے پر یہاں بھی وہی منظر دہرایا جارہا تھا۔

جیپ کی طرف لپکنے والے سراپا موت تھے۔ میرے ذہن میں آیا کہ میری جوابی فائرنگ سے ان کا کوئی ساتھی ہلاک یا شدید زخمی ہوچکا ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ مخالف فریق کے حد درجہ غیظ و غضب کی ایک وجہ ان کا جانی نقصان بھی تھا۔ ڈھلوان پر بھاگتے ہوئے میں نے جو آخری تین گولیاں چلائی تھیں ان میں سے ایک گولی ایک شخص کی کھوپڑی میں لگی تھی اور نتیجے میں اس کا مغز چہرے پر بہہ نکلا تھا۔

میں مچان میں بیٹھے شکاری کے مانند پوری طرح چوکس تھا۔ جونہی بھاگنے والے مناسب فاصلے پر پہنچے میں نے ٹریگر دبا دیا۔ سب مشین گن کا خوفناک قہقہہ فضا میں گونجا۔ تاریکی میں شعلے لپکے اور دو حملہ آور بھاگتے بھاگتے اوندھے منہ گرے اور دور تک لڑھک گئے۔ تیسرے نے پھرتی اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ ٹھٹک جاتا یا رک کر ساتھیوں کو دیکھتا، اس نے بھاگتے بھاگتے جست لگائی اور اڑتا ہوا اوندھے منہ ایک تاریک نشیب میں گرا۔ میں نے بلا توقف سب مشین گن کا رخ نشیب کی طرف پھیر کر لبلبی دبائی، ایک مرتبہ پھر دھماکوں سے شعلے لپکے اور گرد و پیش لرز اٹھے۔ نشیب میں کودنے والا میری رینج سے باہر تھا لہٰذا برسٹ رائگاں گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ نشیب میں اوجھل ہونے والا شنکر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایسی تیزی اور پھرتی کا مظاہرہ صرف وہی کرسکتا تھا۔ جونہی میرا دوسرا برسٹ ختم ہوا، دائیں جانب میمانی کے جھنڈ سے کم و بیش چار افراد مزید برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار تھے۔ وہ بھی فائرنگ کرتے ہوئے جیپوں کی طرف لپکے۔ سراسر اضطراری حرکت تھی۔ چند لمحے پہلے وہ نہ صرف سب مشین گن کی گھن گرج سن چکے تھے بلکہ اپنے ساتھیوں کو پیوند خاک ہوتے بھی دیکھ چکے تھے، ان کے لیے مناسب اقدام یہی تھا کہ یوں سامنے آنے سے گریز کرتے مگر غیظ و غضب نے ان کے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھڑا دیا تھا۔ مجھے لقمۂ تر سمجھ کر جونہی کھلی جگہ پر آئے، میں نے ان کے منہ میں لوہے کے چنے ڈال دیے۔ ایک بار پھر سب مشین گن نے آگ اگلی اور دو افراد پھڑک کر کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ بقیہ دو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئے پھر آڑ کی تلاش میں ان کی نگاہ ایک ساتھ سامنے والی جیپ کی طرف اٹھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ جیپ کی طرف دوڑتے، میں نے آخری راؤنڈ فائر کیے۔ اس دفعہ میں نے جسموں کو چھیدنے کے بجائے اعصاب کو نشانہ بنایا۔ دونوں حملہ آوروں کے پاؤں میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹے اور قلانچیں بھرتے ہوئے جھاڑیوں میں گم ہوگئے۔ میں نے فوراً دوسرا میگزین گن سے اٹیچ کرلیا۔ ایک بار پھر میری نگاہ اس نشیب کی طرف اٹھی جہاں تین چار سیکنڈ پہلے شنکر اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ نچلا کیونکر بیٹھ سکتا تھا۔ کسی بھی لمحے وہ جوابی وار کرنے والا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس کا وار بڑا تند و تیز ہوگا۔ وہ تو مقابل کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینے کا عادی تھا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں توقع کررہا تھا کہ شنکر نشیب سے برآمد ہو یا کلا دا کا ٹ کر دائیں طرف سے آئے گا مگر جس وقت میں

سوچ رہا تھا، وہ کسی زہریلے ناگ کے مانند پھنکارتا ہوا جیپ کے عین پہلو میں پہنچ چکا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، دونوں جیپیں سخت ناہموار جگہ پر کھڑی تھیں۔ میں جس جیپ میں گھسا ہوا تھا اور جس کے ایک ٹائر کے ساتھ نبیلہ اور بچہ جونکوں کی طرح چپکے ہوئے تھے، تقریباً تیس درجے کے زاویے سے بائیں پہلو پر جھکی ہوئی تھی۔ شنکر نے دائیں پہلو سے زور لگایا اور معمولی کوشش سے جیپ الٹا دی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے سنبھلنے یا باہر کودنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آناً فاناً میرے پاؤں ڈگمگا گئے۔ تھوڑی سامنے شیشے سے ٹکرائی اور مجھے پتا چلا کہ جیپ لڑھک چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں نبیلہ کی کربناک چیخیں گونجیں۔ جیپ ڈھلوان پر تھی۔ اس نے دو تین قلابازیاں کھائیں اور چند کمزور درختوں کو توڑتی ہوئی ایک بڑے پتھر سے جا ٹکرائی۔ ونڈ اسکرین سمیت کوئی شیشہ سلامت نہیں بچا تھا۔ چھت اگلے حصے سے پچک چکی تھی۔ میں نے خود کو بروقت ایک نشست سے جکڑ لیا تھا لہٰذا شدید چوٹوں سے محفوظ رہا۔

جونہی جیپ کی جان لیوا حرکت تھمی، میں نے سب مشین گن کی تلاش میں چاروں طرف ہاتھ گھمایا۔ نئی نویلی جیپ نے کئی قلابازیاں کھائی تھیں لیکن اس عمل کے بعد کسی جمناسٹ کی طرح اپنے پاؤں پر ہی کھڑی ہوئی تھی۔ یعنی چاروں ٹائر زمین پر تھے اور اس کا لیول سو فیصد درست تھا۔ میں پشت کے بل درمیانی نشست پر لیٹا تھا۔ جیپ کی اندرونی لائٹ خود بخود آن ہوگئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن دونوں نشستوں کے درمیان فرش پر پڑی ہے۔ میرے ہاتھ سے اس کا فاصلہ دو فٹ سے زائد نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے کہ میری بے تاب انگلیاں مشین گن کے مہربان لوہے کو چھوتیں، جیپ کی کھڑکی پر شنکر شکرا نظر آگیا۔ جیپ کی اندرونی روشنی میں اس کا چہرہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر میں کہوں کہ وہ بہت خوب صورت اور بہت بھیانک تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے اندر کی درندگی نے اس کے خوب صورت نقوش کو سفاکی کی تہ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ خونی تھا، قاتل تھا، گینگسٹر تھا، دہشت گرد تھا اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔ اس کے جسم کا ہر عضو فولاد میں ڈھلا ہوا تھا اور اس کے کاسۂ سر میں مغز کی جگہ کوئی انگارا دہکا رہتا تھا۔

وہ پیدائشی لڑاکا تھا اور پہلا قتل اس نے صرف تیرہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ نشہ تو اس کی گھٹی میں شامل تھا۔ اس کی ماں ایک ڈکیت تھی۔ ڈھاٹا باندھ کر اور سانڈنی پر سوار ہوکر ڈاکوؤں کا ساتھ دیتی تھی اور جوش میں آکر مردانہ وار بڑھکیں مارتی اور رائفلیں چلاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے شنکر کو شراب کی گھٹی دی تھی اور لڑکپن سے ہی اسے گاہے گاہے شراب پلانے لگی تھی۔ بہت کچھ سن رکھا تھا میں نے شنکر کے بارے میں اور جو کچھ سن رکھا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا تھا اسے۔

شنکر کے ہاتھ میں یقیناً کوئی ہتھیار تھا لیکن کھڑکی کے چوکھٹے میں مجھے صرف اس کا بالائی دھڑ نظر آرہا تھا۔ اس کے کندھے نے جنبش کی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنا مسلح ہاتھ میرے روبرو لا رہا ہے۔ مجھے "ہینڈز اپ" کرانے کے لیے یا شاید میری پیشانی پر سرخ بندیا لگانے کے لیے۔ میری نگاہ جیپ کے دروازے پر پڑی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ لاک نہیں۔ جیپ کے لڑھکنے سے جہاں اور بہت سی شکست و ریخت ہوئی تھی، وہاں یہ دروازہ بھی کھل چکا تھا۔ تاہم دیکھنے میں وہ بند ہی لگتا تھا۔ یہ کھلا ہوا دروازہ میرے لیے امید کی کرن تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ فرش کی طرف جھک کر گن اٹھاتا، اسے پوزیشن میں لاتا اور شنکر پر فائر کھولتا، ہاں اتنا وقت ضرور تھا کہ لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑتا، انہیں سمیٹتا اور پوری قوت سے دروازے پر دے مارتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس سے پیشتر کہ شنکر کا ریوالور جیپ کی کھڑکی میں طلوع ہوتا اور شنکر کے زہریلے ہونٹوں سے کوئی پھنکار نکلتی، میرے دونوں پاؤں بھرپور قوت سے جیپ کے دروازے پر پڑے۔ شنکر دروازے سے جڑا کھڑا تھا۔ دروازے پر لگنے والی ضرب درحقیقت اس کے جسم پر لگی تھی اور یہ کوئی معمولی ضرب نہیں تھی۔ اس کے پیچھے میرے جسم کی پوری قوت اور میرے دل میں چھپی ہوئی بے پناہ نفرت تھی۔ شنکر اچھل کر سنگلاخ زمین پر گرا اور لڑھک کر پھر نشیب میں چلا گیا۔

میں نے دوسری جانب کا دروازہ کھولا۔ نبیلہ اور بچہ چلا کر مجھ سے لپٹ گئے۔ جیپ بائیں جانب الٹی تھی اور وہ مخالف سمت میں تھے ورنہ ان کا بچنا محال تھا۔ میں ان دونوں کو اپنی اوٹ میں لیتا ہوا الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ پیچھے ہٹنے کے ساتھ ساتھ میں فائر بھی کررہا تھا۔ میں نے گن کو سنگل شاٹ پر سیٹ کرلیا تھا۔ ہر بار لبلبی دبانے سے صرف ایک ہی راؤنڈ فائر ہورہا تھا۔ جیپ سے اترنے کے بعد پانچ چھ سیکنڈ کے اندر میں نے آٹھ یا نو راؤنڈ فائر کیے۔ ان میں سے آخری راؤنڈ ایک حملہ آور کی چھاتی میں لگا اور وہ ہم سے صرف دس گز کی دوری پر چیخ کر ڈھیر ہوگیا۔ جیپ سے اترتے وقت میں نے

گولیوں سے بھرے ہوئے دو بیگ اپنی جیکٹ اور سینے کے درمیانی خلا میں رکھ لیے تھے۔ اس کے علاوہ تین لوڈڈ میگزین بھی تھے۔ اس سازوسامان کے ساتھ میں شنکر کے نرغے سے نکلنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا مگر میں اکیلا نہیں تھا۔ نبیلہ اور بچہ میرے ساتھ تھے اور میں انہیں اس منجدھار میں چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔

ایکا ایکی ہمارے اطراف میں فائرنگ شدت اختیار کر گئی۔ نبیلہ کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی آہ نکلی اور اس کی کیفیت دیکھ کر بچے کا خوف بھی سوا ہو گیا لیکن میں کچھ اور محسوس کر رہا تھا۔ دھماکے ضرور ہو رہے تھے مگر ہمارے آس پاس پچھلے جیسی سنسناہٹ نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو بہت کم اور پھر جلد ہی مجھ پر یہ خوش آئند انکشاف ہوا کہ بستی میں ہونے والی لڑائی اس ڈھلوان تک پھیل گئی ہے۔ شنکر کے مخالفین یہاں تک پہنچ گئے تھے اور انہوں نے آناً فاناً شنکر اور اس کے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ فائرنگ میں شدت آتی جا رہی تھی اور گاہے گاہے تاریکی میں جنگلی للکارے بھی گونجنے لگے تھے۔ اسے تائید غیبی ہی کہا جا سکتا تھا۔ میں نے روتے لڑکھڑاتے بچے کو ایک بازو میں سمیٹا اور نبیلہ کے ساتھ گھنے تاریک درختوں میں بھاگتا چلا گیا۔

نشیب و فراز سے پُر تاریک جنگل میں معمولی رفتار سے چلنا بھی کارے دارد ہوتا ہے کہاں یہ کہ ہمیں بھاگنا پڑ رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کون سا پاؤں اٹھنے کے بعد واپس زمین پر ٹکنے پڑے گا۔ چاروں طرف اندھی گولیوں کی پرواز تھی اور خونخوار رائفلوں کی ٹھکاٹھک تھی۔ بچہ میرے بائیں بازو پر تھا۔ دوسرے ہاتھ میں گن تھی اور نبیلہ نے میری جیکٹ تھام رکھی تھی۔ گاہے گاہے جیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ "ہائے اللہ" پکار اٹھتی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس سنگلاخ راستے میں اس کے نازک کھوؤں پر نہ جانے کیا بیت رہی تھی۔ ایک دو بار وہ لڑکھڑائی بھی تاہم خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔ جلد ہی ہم فائرنگ رینج سے باہر نکل آئے اور جنوب کی طرف نسبتاً کم گنجانی درختوں کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ ہم موت کے نرغے سے بچ کر نکلے تھے لیکن ابھی اس بات پر یقین کر لینا ہمارے لیے دشوار تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ جیپ کے گرد ہونے والی فائرنگ کے دوران نبیلہ بُری طرح چیخی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "نبیلہ تم زخمی تو نہیں؟"

"نہیں" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اور آپ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں" میں نے جواب دیا۔

بچہ بدستور نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میرے کندھے پر اس کی گردن بار بار دائیں بائیں ڈھلک جاتی تھی۔ کسی وقت گردن کو زوردار جھٹکا لگتا تھا تو اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل جاتی۔ ہم قریباً آدھا گھنٹہ بدستور حرکت میں رہے۔ تاریک جنگل میں یہ نیم شب کی جوگنگ بے حد ہولناک تھی۔ سخت سردی میں جسم پسینے سے شرابور، سانس ہانپتے ہوئے اور قدم گاہے سست پڑتے ہوئے گاہے تیز ہوتے ہوئے۔ تاہم گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے خود کو "ایس" کی شکل والی کھائی کے قریب پایا۔ یہ کھائی کا مغربی حصہ تھا۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ زیادہ نہیں تھی اور زمین بھی نسبتاً ہموار تھی۔ [illegible] کے درخت یہاں کثرت سے تھے اور یہ ایک خودرو باغ سا بن گیا تھا۔ درحقیقت کھائی عبور کرنے کے بعد ہی ہم خود کو محفوظ تصور کر سکتے تھے لہٰذا میں نے بہتر جانا کہ کلاوا کاٹنے کے بجائے ناک کی سیدھ میں کھائی کے اندر اترا جائے۔

تاریکی میں پُرخطر ڈھلوان پر اترنا نہایت دشوار تھا مگر جیسے تیسے ہم یہ کام کر گزرے۔ کھائی کے اندر تیز خنک بستہ ہوا کی کاٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ فائرنگ کی آوازیں ہمارے دائرۂ سماعت سے باہر رہ گئی تھیں یا ممکن تھا لڑائی ختم ہو گئی ہو۔ میری جیکٹ میں سب مشین گن کے میگزین آپس میں ٹکرا کر مسلسل آواز پیدا کر رہے تھے۔ میں نے تمام ایمونیشن جیکٹ اور سینے کے درمیانی خلا سے نکال کر جیبوں میں ٹھونس لیا۔ بچہ غنودگی کے عالم میں "پیشاب پیشاب" کی رٹ لگانے لگا۔ نبیلہ نے اسے سہارا دے کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بٹھا دیا۔ میں پندرہ بیس قدم آگے نکل کر راستے کا جائزہ لینے لگا۔ تاروں کی روشنی میں ان دیکھے علاقے کے مدھم خدوخال ہی نظر آ رہے تھے۔ اچانک ایک کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز میرے سامنے چند فٹ کے فاصلے سے آئی تھی۔ بولنے والی کوئی عمر رسیدہ عورت تھی۔ اس ویرانے میں آواز بالکل آسیبی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک رائفل بردار پٹھانی عورت سینہ تانے کھڑی تھی۔ مجھے اس کے عقب میں ایک خاکستری [illegible] روشنی کی چمک سی دکھائی دی جیسے کہیں قریب ہی کسی غار میں لالٹین جل رہی ہو اور اس کا موہوم سا عکس پتھر [illegible] پڑ رہا ہو۔

عورت کا کھلی آستینوں والا لمبا لبادہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں زبردست جارحانہ پن تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ میں نے ایک قدم بھی

آگے بڑھایا تو وہ گولی چلا دے گی۔ سب مشین گن میرے ہاتھ میں تھی اور ایسے زاویے پر تھی کہ میں معمولی سی جنبش سے عورت کو شوٹ کر سکتا تھا مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بے حس و حرکت دیکھ کر عورت ایک بار پھر غرائی۔ وہ پشتو میں مخاطب تھی۔ میری سمجھ میں الفاظ تو نہیں آئے لیکن بات سمجھ میں آ گئی۔ ظاہر ہے وہ مجھے گن پھینکنے کا حکم دے رہی تھی۔ نہ جانے دل میں کیا آئی کہ میں نے نیچے جھک کر گن زمین پر رکھ دی۔ وہ چند قدم بڑھا کر میرے سامنے آ گئی۔ اب نیم تاریکی میں میں اس کا سراپا بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ کوئی لمبی چوڑی عورت نہیں تھی۔ درمیانہ قد تھا۔ جسم بھی دبلا سا تھا لیکن عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی کمر میں خم نمایاں نہیں رہا تھا۔ وہ کسی فولادی میخ کی طرح سنگلاخ زمین پر گڑی کھڑی تھی اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

میں اس کے سوال کا جواب نہ دے پایا تو وہ دو قدم اور آگے بڑھی اور میری چھاتی پر زور سے رائفل کا ٹھوکا دیا۔ اسی لمحے میں دو ستون نما پتھروں کے درمیان سے نکل کر ایک اور شخص موقعے پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کلہاڑی دکھائی دی۔ قریب پہنچنے پر نوارد خاصا کم عمر نظر آیا۔ بمشکل گیارہ بارہ سال کا دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھی عورت اور اس کا نوعمر ساتھی تند لہجے میں مجھ سے کچھ دریافت کرنے لگے۔ اتنے میں نبیلہ اور اس کا ساتھی بچہ بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ نبیلہ اور بچے کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ دونوں میرے ساتھی ہیں، تند خو بڑھیا کے تیور قدرے نرم پڑ گئے۔ اس نے رائفل میری چھاتی سے ہٹائی اور سوالیہ نظروں سے نبیلہ کی طرف دیکھنے لگی۔

کلہاڑی بردار لڑکا پشتو آمیز اردو میں مجھ سے مخاطب ہوا "تم اردو بولتا؟" میں نے فوراً ہاں میں جواب دیا وہ بولا "کون ہے۔ کدھر سے آتا ہے؟"

"مسافر ہے۔ یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ ہم نل سے آیا تھا۔ شکار کھیلنے کے لئے یہ میرا بہن اور ہے اور اس کا بچہ۔ باقی لوگ ہم سے بچھڑ گیا۔ گاڑی واڑی سب ان کے پاس رہ گیا۔ ہم سخت مصیبت میں ہے۔"

لڑکے نے تیز نظروں سے میری پھولی ہوئی جیکٹ کو دیکھا پھر اس کی نگاہ زمین پر پڑی ہوئی سب مشین گن پر جم گئی۔ اس نے بڑھیا سے کوئی بات کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن کے سبب شکاری کی حیثیت سے میری پہچان مشکوک ہو گئی تھی۔ تاہم نبیلہ اور بچے کی موجودگی بدستور مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ بڑھیا اور کلہاڑی بردار لڑکا

خونِ آشام

مصنف: ایم اے راحت

قیمت -/۳۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲ روپے

ایک ایسے بڈھے بادشاہ کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔

وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔

★

اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی

پبلشرز

علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

تینوں کو روشنی کی طرف لے گئے۔ اس دوران بڑھیا ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی رائفل کا رُخ مسلسل میرے سر کی طرف تھا۔ اکثر پٹھان عورتیں بھی مردوں کی طرح زبردست نشانہ باز ہوتی ہیں‘ یہ منحنی بڑھیا بھی یقیناً انہی میں سے ایک تھی۔ بے حد ہم آہنگی تھی اس کی حرکات وسکنات میں۔ دور سے نظر آنے والی روشنی لالٹین کی تھی مگر یہ لالٹین کسی کھوہ یا غار میں نہیں‘ ایک خیمے میں جل رہی تھی۔ یہ درمیانے سائز کا ازلی خیمہ ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں استادہ تھا۔ خیمے پر میدانی کے گھنے پیڑوں کا سایہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلندی سے ہمیں خیمہ یا اس میں جلتی ہوئی روشنی کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی۔ یہاں مجھے ایک خچر‘ ایک گدھا اور دو گھوڑے بندھے نظر آئے۔ گھوڑوں کو سردی سے بچانے کے لیے ان کی پشت پر بورے باندھ دیے گئے تھے۔ خیمے کے اندر چٹائی کے بستر پر ایک نوجوان دراز تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور چہرہ مدقوق تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بیمار ہے اور یہ کوئی ایسی بیماری ہے کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔

کلہاڑی بردار لڑکے نے خیمے میں پہنچ کر کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور میری سب مشین گن اٹھانے کے لیے باہر نکل گیا۔ وہ گورا چٹا گدرائے ہوئے جسم کا لڑکا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے پر کالک لگی ہوئی تھی جیسے چولہا جھونکتا رہا ہو۔ حجامت اس نے نائی کے بجائے غالباً کسی موچی سے بنوا رکھی تھی۔ بڑے بے ڈھنگے بال تھے۔ مجھے اس لڑکے میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم میں فوری طور پر اپنے اس احساس کو کوئی معنی نہیں پہنا سکا۔

بڑھیا بدستور میرے سر پر رائفل تانے کھڑی تھی۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ مسلسل ہمیں دھتکار رہی تھی۔ اس کے اشارے پر ہم تینوں خیمے کی عقبی دیوار کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گئے۔ میرے لیے اس نحیف ونزار عورت پر قابو پانا چنداں مشکل نہیں تھا۔ ایسے مواقع پر استعمال ہونے والے کسی "طریقے" سے کسی بھی لمحے اسے زیرِ دام لایا جاسکتا تھا لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تند مزاجی سے قطع نظر عمر رسیدہ عورت کی دلیری اور خود اعتمادی متاثر کن تھی اور مناسب نہیں تھا کہ میں اس خود اعتمادی کو مجروح کروں۔ اس کے حکم پر عمل کرتے ہوئے میں نے فرمانبرداری سے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی اور مختلف جیبوں میں ٹھنسی ہوئی سب مشین گن کی گولیاں اسے دکھادیں۔ غالباً اسے خدشہ تھا کہ جیکٹ کے اندر بھی کوئی آتشیں ہتھیار ہوگا لیکن صرف گولیاں دیکھ کر وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ اس دوران لڑکا باہر سے میری سب مشین گن اٹھا لایا تھا۔ خیمے میں پہنچ کر اس نے بڑی چابک دستی سے گن کو اَن لوڈ کیا اور خیمے کے ایک کونے میں چٹائی کے نیچے کہیں چھپا دیا۔ بستر پر لیٹا ہوا بیمار نوجوان بھی کچی پکی اردو بول لیتا تھا۔ وہ کہنے لگا "ہم نے پہلی بار دیکھا ہے کہ کوئی شخص اس طرح عورت اور بچہ لے کر یہاں شکار کھیلنے نکلا ہو۔"

"بس غلطی ہو گئی بھائی..... بہت بڑی غلطی ہوئی" میں نے مایوسی سے سر ہلایا! "ہم ادھر پنجاب میں شیخوپورہ چھانگے مانگے کی طرف شکار کھیلا کرتے ہیں۔ وہاں سیدھے سادے راستے ہیں۔ ہر جگہ جیپیں پہنچ جاتی ہیں۔ شکار کا شکار ہوتا ہے اور پکنک کی پکنک۔ شکار پارٹیوں میں عورتیں اور کبھی کبھی تو بچے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بس وہاں کے بھولے ہوئے ہم ادھر بھی آ گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں تو سمجھ میں آیا ہے کہ مقامی دوست ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

"کون مقامی دوست؟" نیم دراز نوجوان نے پوچھا۔

"کراچی کا ایک شکاری ہے۔ کبیر علی شاہ اور کرم ایجنسی کا صوبے دار مرجان ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ دوست ہیں۔ انہوں نے سمجھایا تھا کہ یہاں شکار پر نکلنا آسان نہیں ہے۔ بس مت ہی ماری گئی تھی ہماری۔"

"اب کہاں ہیں وہ لوگ؟"

میں اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ ایک کہانی میں ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ عام فہم انداز میں میں نے یہ کہانی ان لوگوں کے گوش گزار کردی۔ اس مختصر کہانی کے مطابق ہم ڈھوکی تالاب کے کنارے فروکش تھے۔ پڑاؤ سے گھومنے پھرنے کے لیے نکلے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو سب کچھ درہم برہم پایا۔ خیمے چاروں شانے چت پڑے تھے۔ شکار پارٹی غائب تھی۔ نہ کہیں سامان دکھائی دے رہا تھا، نہ سواری کے جانور۔ غالب گمان یہ ہے کہ ڈاکوؤں کا کوئی جتھا ہمارے ساتھیوں کو ہانک کر لے گیا ہے۔

یہ کہانی چونکہ جزوی طور پر درست تھی لہٰذا ہمارا "بیان" پراثر انداز ہوا۔ بیمار نوجوان کا نام رشید اور وہ بڑھیا کا فرزند ارجمند تھا۔ لڑکے کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ رشید کا بھائی ہے اور اس کا نام خاور ہے۔ رشید نے کہا "اگر بات وہی ہے جو تم بتا رہا ہے تو پھر بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ اس علاقے میں جنگلی جانور کے ساتھ ساتھ انسان بھی رہتا ہے لیکن خصلت سب کا جنگلی جانور جیسا ہے۔ تم نے ڈبل غلطی کیا۔ ایک تو اس علاقے میں شکار کے لیے آیا اور پھر

عورت اور بچہ کو لے آیا۔ ام کو تو لگتا ہے تمہاری طرح تمہارا میزبان بھی عقل سے پیدل ہے۔ خدا کے بندے ادھر دُنیا لے کر آئے گا جوان عورت کو۔ شکر کرو تم بچ گیا۔ انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہنا اور منہ دکھانے کا بھی کیا ہے، تم نے واپس ہی نہیں جانا تھا۔ عورت تو رہی ایک طرف یہاں تو مرد کا بھی بولی لگ جاتا ہے۔"

میں حیرت زدہ چہرے سے رشید خاں کی باتیں سن رہا تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ صورت حال کی اصل سنگینی جان کر میری سٹی گم ہو رہی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران بڑھیا رائفل سمیت خیمے کے دروازے پر بیٹھ گئی تھی۔ رائفل اب اس کی گود میں تھی مگر ہاتھ بدستور دستے پر تھا۔ وہ کسی بھی صورت حال کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں ہلکی بادامی‘ بال برف کے مانند سفید‘ رخسار جھریوں بھرے اور کمر لاٹھی کی طرح سیدھی۔ وہ بے حد سخت جان تھی اور اس کا ایک ثبوت اس کا لباس بھی تھا۔ شدید سردی کے باوجود وہ صرف شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ قمیص کو چوغا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ یہ سیاہ چوغا گھٹنوں سے نیچے تک پہنچتا تھا اور اس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ خیمے کا در اب اونی پردے سے بند کر دیا گیا تھا اور لالٹین بجھا دی گئی تھی۔ اس کے باوجود خیمے میں روشنی تھی۔ یہ روشنی آہنی انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کی تھی۔ ان انگاروں میں گاہے گاہے شعلے کی لپک پیدا ہوتی تھی تو کمرا زیادہ روشن نظر آنے لگتا تھا۔

خیمے کی حرارت میں پہنچتے ہی نبیلہ کے ساتھ آنے والا بچہ بے سدھ ہو کر سو گیا تھا۔ اس کا سر نبیلہ کی گود میں تھا اور ٹانگیں چٹائی پر۔ میں دیکھ رہا تھا کہ نبیلہ کے پاؤں زخمی ہیں اور ان سے خون رس رہا ہے لیکن وہ خود شاید ان زخموں سے بے خبر تھی۔ اندیشوں کی نیشتر زنی نے اس کے حواس مفلوج کر رکھے تھے۔ غالباً وہ اب بھی شنگ اور عینی جان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ہم ان درندوں کے چنگل سے ابھی بہت دور نہیں گئے تھے۔ یہ انہی کا علاقہ تھا۔ یہاں درخت کے ہر پتے، مٹی کے ہر ذرے اور پتھر کے ہر ریزے پر ان کی چھاپ تھی اور پھر یہ مصیبت تو ایک خونخوار رائفل کی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی! یقیناً نبیلہ اس رائفل سے بھی خوف زدہ تھی۔ لال بی بی نامی یہ بڑھیا اپنے بیمار بیٹے کی زبانی ہماری گزارشات سے آگاہ ہو چکی تھی پھر بھی اس کے چہرے پر نرمی کی کوئی جھلک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ چائے پانی کا پوچھنا تو دور کی بات ہے‘ وہ ہمارے ہاتھ پاؤں ہلانے پر بھی راضی نہیں تھی۔ جب نبیلہ نے بچے کا سر اپنی گود سے نکال کر اسے انگیٹھی کے نزدیک چٹائی پر لٹانا چاہا تو وہ چلا کر کھڑی ہو گئی تھی اور رائفل تان کر خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگی تھی اور ایک بار تو میرے داڑھی کھجانے پر ہی وہ "ہوشیار باش" ہو گئی تھی۔ وہ جہاندیدہ عورت تھی اور لگتا تھا حالات کی بہت ستائی ہوئی بھی ہے۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کسی بھی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتی۔

سارا معاملہ سب مشین گن کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا۔ جو کہانی میں نے سنائی تھی اس میں یہ سب مشین گن کسی طور پر فٹ نہیں بیٹھی تھی۔ ہم ڈھوکی تالاب کے پڑاؤ سے گھومنے پھرنے کے لیے نکلے تھے تو یہ سب مشین گن کیوں ہمارے ساتھ تھی اور سب مشین گن ہی نہیں اس کے اَن گنت راؤنڈز بھی تھے۔ اس کے بعد نبیلہ کے ساتھی بچے کا معاملہ تھا۔ وہ صاف طور پر نشے میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے رشید خاں کو یہ بتا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ راستے میں بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ ہم نے اسے سلانے کے لیے تھوڑی سی افیون کھلادی ہے مگر رشید اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

ہمارے میزبانوں کی بے اطمینانی اپنی جگہ‘ بہرحال مجھے یہ اطمینان تھا کہ اس ٹھٹھرتی ہوئی تاریک شب کی صبح کرنے کے لیے یہ محفوظ ترین خیمہ ہر طرح مناسب ہے۔ خیمہ ایسے ڈھنگ سے لگایا گیا تھا کہ خصوصی کوشش کے بغیر دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر رشید کی والدہ لال بی بی خود ہمارے راستے میں نہ آتی تو ہم بھی اس خیمے کو دیکھے بغیر آگے نکل گئے ہوتے۔

لال بی بی اور بیمار نوجوان رشید کے درمیان مسلسل گفتگو ہو رہی تھی۔ اس گفتگو کی نوعیت ہماری سمجھ سے باہر تھی۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ لال بی بی اور اس کے بیٹے میں کسی بات پر اختلاف ہے۔ لال بی بی ہمارے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا چاہتی تھی جبکہ نوجوان رعایت دینے کا خواہش مند تھا۔ سب کچھ پردۂ راز میں تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ سخت رویے کی کیا نوعیت ہوگی اور اگر رعایت برتی جائے گی تو اس سے کیا مطلب ہوگا۔ لال بی بی کے کہنے پر فربہ اندام لڑکا ایک بڑے چرمی تھیلے میں سے ایک رسی نکال لایا۔ رسی دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لال بی بی ہماری مشکیں کس کے ایک طرف ڈال دینا چاہتی ہے جبکہ رشید خاں اس سلوک کو نارو

سمجھ رہا ہے اور اختلاف کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ بات یقیناً ہماری مشکیں کسنے کی ہی ہو رہی تھی۔ رشید خاں نے احتجاج کر کے رسی واپس تھیلے میں رکھوا دی اور والدہ کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اماری والدہ کہتی ہے تم وہ نہیں ہے جو بنا رہا ہے۔ جیسا مشین گن تمہارے پاس ہے ویسا صرف ڈاکو لوگ کے پاس ہوتا ہے یا کرم لیوی کے پاس۔"

میں نے کہا "تم بتاؤ کیا ہم شکل سے تمہیں ڈاکو یا کرم لیوی والا نظر آتا ہے؟"

وہ بولا "شکلیں دھوکا دیتی ہیں بابو صاحب۔ ویسے اگر تم ڈاکو یا لیوی والا نہیں تو بھی ہمارے لیے تو خطرناک ہی ہے۔ تم یہاں سے جائے گا تو دوسروں کو بتائے گا کہ وہاں ویران گھاٹی میں اکیلا خیمہ لگا ہوا ہے۔ پھر ہمارے لیے یہاں رکنا مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ اگر نہیں جائے گا تو کوئی نہ کوئی خدائی خوار ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا۔ اس لیے اماری والدہ کہتی ہے کہ تم کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔"

خاصی مہم جو قسم کی بڑھیا تھی یہ۔ بہرحال رشید خاں خود بخود میرے پسندیدہ موضوع کی طرف آ رہا تھا' میں نے کہا "اگر ایسا ہی ڈر ہے تو پھر یہاں پڑاؤ سے مطلب؟ کیا کسی سے چھپے ہوئے ہو؟"

وہ تنک کر بولا "اماری رگوں میں افغان خون ہے۔ کسی سے چھپتا نہیں ہے ام اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ اماری اس بوڑھی ماں کو دیکھو' اگر یہ تم جیسے جوان کو نہتا کر کے یہاں باندھ سکتی ہے تو ام کیا نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں بھی ام اپنے دشمن کا گلا دبا کر اس کا دم کھینچ سکتا ہے۔"

جوش کے سبب رشید خاں کا جسم کمبل کے نیچے لرز کر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا دایاں پہلو ٹھیک طور پر کام نہیں کر رہا۔ خاص طور پر ٹانگ' پاؤں سے لے کر کولہے تک قطعی مفلوج ہے' میں نے نرمی سے کہا "میں خدانخواستہ تمہیں بزدل نہیں کہہ رہا۔ اگر دشمن نے چھپنا بزدلی ہے تو مورچے میں بیٹھا سپاہی بھی بزدل ہے۔ یہ سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کہنے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ جگہ کسی طور پر بھی تمہارے پڑاؤ کے لیے مناسب نہیں' خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہارے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔"

"کون لڑکی؟" رشید خاں بُری طرح گڑبڑایا۔

"میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ چکے ہو" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ میرا لہجہ اتنا دھیما تھا کہ آواز رشید کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

رشید خاں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ نہیں سکتا تھا۔۔۔ اگر جھٹلاتا تو صرف اپنے آپ کو دھوکہ دیتا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس خیمے میں ایک خوبرو نوجوان لڑکی تھی۔۔۔ یہ گدرائے ہوئے جسم کا وہی لڑکا تھا جو لالی کے پیچھے کلہاڑی لیے برآمد ہوا تھا اور بعد میں میری سٹین گن باہر سے اٹھا کر لایا تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی مجھے شبہ ہو گیا تھا۔ پھر خیمے میں پہنچ کر اور اس کی چال ڈھال دیکھ کر شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ پندرہ سولہ سالہ لڑکی موٹے اونی کپڑوں میں اس کے جسمانی نشیب و فراز تھے تراشیدہ بالوں اور مردانہ لباس کے سبب اسے طور پر شناخت کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ رشید خاں کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر میں نے کہا "میرے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تمہارے ساتھ عورت تو میرے ساتھ بھی عورت ہے۔ ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کر کے ایک دوسرے کا سہارا بن سکتے ہیں۔ جس تمہاری والدہ نے مجھے روکا' میرے ہاتھ میں بھری ہوئی تھی' اگر میں نے اس وقت کچھ نہیں کیا تو اب کیوں کروں گا۔ یقین رکھو میری طرف سے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

رشید خاں پر میری باتوں کا اثر ہو رہا تھا اور اس کی کیفیت اس کی نیلگوں آنکھوں سے ظاہر تھی۔۔۔ جلد ہی دونوں میں ایک بے نام سے اعتماد کا رشتہ استوار ہو گیا۔ رشید خاں بولا "تم جو کوئی بھی ہے' تمہارا نگاہ خاصا تیز ہے۔ امید نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی پہچان جائے گا۔ یہ ہماری بیوی ہے۔ تین ماہ پہلے شوال کے مہینے میں اس سے شادی ہوا تھا۔ بس اس روز سے ام بستر پر پڑا ہے اور یہ بیچارہ رات دن آنسو بہا رہا ہے۔"

میں نے کہا "لگتا ہے تمہاری دائیں ٹانگ اور دائیں بازو پر اثر ہے۔ کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی تھی؟"

"ہاں۔ گولی لگا تھا ادھر۔ ابھی تک وہیں پھنسا ہوا ہے۔" اس نے انگلی سے اپنی کمر کی طرف اشارہ کیا۔

"یعنی تین ماہ پہلے لگی ہوئی گولی ابھی تک جسم میں ہے؟"

"ہاں" رشید خاں نے افسردگی سے کہا "پہلے بہت درد ہوتا تھا۔ اب درد نہیں ہوتا مگر جسم آدھا رہ گیا ہے۔ آدھا

جسم زندہ ہے آدھا مُردہ۔ یہ آدھی زندگی پوری موت سے بدتر ہے بھائی صاحب۔"

"کوئی جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' جھگڑا ہی تھا لیکن دشمن بزدل تھا۔ پیٹھ سے وار کیا اس کافر کے بچے نے۔ گولی چلا کر بھاگ گیا۔۔۔ وہ امارا سہاگ رات تھا۔ خوشی کا رات جس کا ہر ایک کو انتظار ہوتا ہے۔ ام نے وہ رات اپنی موت سے لڑتے ہوئے گزارا۔"

دھیرے دھیرے رشید خاں کی زبان رواں ہو رہی تھی۔ وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ اس دشمن کے بارے میں بتانے لگا جو اس کی کنواری خوشیوں کو آنسوؤں اور آہوں میں ڈبو گیا تھا۔ ان حالات سے پردہ اٹھانے لگا جن کا شکار ہو کر وہ اور اس کے اہل خانہ اس ویرانے میں بے یار و مددگار پڑے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑاتے اونی خیمے میں' انگاروں کی خواب ناک روشنی کے سامنے بیٹھ کر رشید خاں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

رشید خاں کے بڑے بھائی کا نام مرزا محمد تھا۔ وہ لوگ عین افغان سرحد پر توشک نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد مرزا محمد روزگار کے چکروں میں ایسا الجھا کہ بُری صحبت کا شکار ہو گیا۔ علاقے میں کچھ لوگ پوست کی کاشت اور ناجائز فروخت کا کام کرتے تھے۔ مرزا محمد ان میں شامل ہو گیا۔ مرزا محمد کے اہل خانہ کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ خاص طور پر مرزا محمد کی ماں رات دن اس صدمے سے ہلکان رہتی تھی۔ اس کی رگوں میں پختون خون تھا۔ بہت عسرت اور تنگ دستی کے دن بھی اس نے دیکھے تھے لیکن کسی موقعے پر بھی عزت نفس کو سینے سے جدا نہیں کیا تھا اور سفید پوشی کا بھرم قائم رکھا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک مرزا محمد راہِ راست پر نہیں آتا وہ بستر پر سوئے گی نہ اپنے کمرے سے قدم باہر نکالے گی۔ ماں کے علاوہ رشید خاں کو بھی اپنے بڑے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ درحقیقت وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ بھائی کی بے راہ روی دیکھ کر رشید خاں بھی خون کے آنسو بہاتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی دو برس تک چلا۔ آخر مرزا محمد کو اپنے پیاروں کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس نے جرائم پیشہ لوگوں سے قطع تعلق کر لیا اور محنت مزدوری کا راستہ اپنایا۔ مرزا محمد کو چھوٹے بھائی کے سر پر سہرا دیکھنے کی بہت آرزو تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی شادی سے پہلے رشید خاں کو دولہا بنائے گا۔ اس نے رات دن محنت کر کے

ماہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رُکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت :
جلد اول : ۱۵۰ روپے
جلد دوم : ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ :
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اس شادی کا اسباب جمع کیا اور شادی کی تاریخ پکی کر دی۔ رشید خاں کی ہونے والی دُلہن اس کی ماموں زاد تھی۔ کئی سال پہلے دونوں کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پایا۔ ایک رات رشید خاں چاندنی سی دُلہن کی ڈولی لے کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ بڑی دھوم دھام کی شادی تھی یہ۔ مرزا محمد نے اس تقریب پر اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کیا تھا۔ پارا چنار سے ڈھول تاشے والے بلائے گئے تھے۔ زنانہ لباس میں رقص کرنے والوں کی ایک منڈلی سندھ کے نواح سے آئی تھی۔ براتیوں نے سروں پر گیس لیمپ اٹھا رکھے تھے اور روشنی کے ہنڈولے برات کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ رسم کے مطابق برات کے راستے میں آنے کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا اور کچھ لوگ زبردست ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ اس وقت برات دُلہا کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی اور شگون کے طور پر دُلہا دُلہن کے قدموں میں بھیڑ ذبح کی جا رہی تھی، جب اچانک دُلہا تڑپ کر گھوڑے سے گرا اور ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ ہوائی فائرنگ کرنے والوں میں سے کسی نے رشید خاں کو نشانہ بنایا تھا۔ ایک گولی رشید خاں کا کندھا چھیدتی گزر گئی جبکہ دوسری کمر میں پیوست ہو گئی تھی۔ براتیوں میں سے ہی کسی نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا۔ جب وہ رشید خاں کو گھائل کر کے بھاگا تو لوگ اس کے پیچھے لپکے اور پچاس ساٹھ قدم آگے اسے ایک گلی میں مار گرایا۔ اسے خود کار رائفل کا پورا برسٹ لگا تھا۔ نتیجے میں وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ زخمی

پھڑکتے دُلہے کو اٹھا کر فوراً مقامی معالج کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے کندھے سے بہنے والا خون روک کر مرہم پٹی کر دی اور کمر سے گولی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ چیر پھاڑ کے باوجود وہ گولی تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ آخر کوشش ترک دی۔ وہ سہاگ رات جو بہت منتوں اور دعاؤں کے بعد آئی تھی، درد و کرب کی خونی لہروں میں یوں ڈوبی کہ اس کا ہر لمحہ ایک کراہ بن گیا۔ مرزا محمد کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کا لاڈلا بھائی، اس کے ارمانوں کا دُلہا خون میں نہا کر بستر پر جا گرا تھا اور یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔ رشید خاں کو گھائل کرنے والا رشید خاں کا اپنا دشمن نہیں تھا۔ وہ مرزا محمد کا دشمن تھا۔ وہی جرائم پیشہ لوگ جن سے مرزا محمد نے قطع تعلق کر لیا تھا اس کی خوشیوں کے قاتل بنے تھے۔ انہوں نے اپنی رنجش کے بدصورت اظہار کے لیے ایک خوب

صورت دن کا انتخاب کیا تھا۔ برات میں ہونے والی ہوائی فائرنگ کے دوران دُلہا کو ہلاک کرنے کا منصوبہ کسی شاطر ذہن کی پیداوار تھا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوتی کہ کس کی گولی رشید خاں کو چاٹ گئی ہے مگر دستِ قدرت نے اس منصوبے کو مکمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔ رشید خاں بچ گیا ــــ یہ اور بات ہے کہ یہ زندگی صرف نام کی زندگی تھی۔ بستر سے لگا تو مرزا محمد کو تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ وہ جلد از جلد اسے صحت یاب دیکھنا چاہتا تھا لیکن صحت یابی کے حصول کے لیے صرف بھاگ دوڑ ہی کافی نہیں تھی، پیسے کی ضرورت بھی تھی اور مرزا محمد سب کچھ شادی پر لگا چکا تھا۔ وہ قرض لے لے کر بھائی کا علاج کرانے لگا۔ جس نے جس جگہ کا کہا وہ بھائی کو لے کر وہاں چل دیا۔ تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک، حکمت، ڈاکٹری قریباً سبھی کچھ وہ آزما چکا تھا۔ اسے اب پتا چلا تھا کہ رشید خاں کا علاج صرف کسی بڑے شہر کراچی، لاہور وغیرہ میں ہی ممکن ہے۔ دس روز پہلے وہ اپنے گاؤں تو... سے ایک خانہ بدوش قافلے کے ساتھ کل کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں میں وہ اپنی مختصر کھیتی اور مکان بیچ چکا تھا لہٰذا اس کی روانگی مستقل نوعیت کی تھی۔ یعنی وہ واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ بیمار بھائی کے علاوہ اس کی دُلہن اور اپنی والدہ کو بھی مرزا محمد نے ساتھ لیا۔ خانہ بدوش قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ اس علاقے سے گزرے تو ایک شب کے لیے یہاں پڑاؤ کرنا پڑا۔ اس کھائی میں خانہ بدوشوں نے خیمے گاڑ دیے۔ ان خیموں میں مرزا محمد کا خیمہ بھی تھا۔ اس رات پچھلے پہر رشید خاں کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ مرزا خیمے کے دروازے پر کھڑا کسی اجنبی سے باتیں کر رہا ہے۔ اجنبی کی آواز سن کر مرزا محمد اور رشید کی والدہ بھی جاگ گئی۔ مرزا محمد نے رشید سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ سے باہر جا رہا ہے۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آ جائے گا لیکن اگر دیر بھی لگ گئی تو وہ پریشان نہ ہوں۔ قافلے کی روانگی سے پہلے وہ ہر صورت میں پہنچ جائے گا۔ مرزا محمد چلا گیا اور اگلے دن دس بجے تک واپس نہیں آیا۔ قافلہ کوچ کے لیے تیار تھا، صرف مرزا محمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس کی تلاش میں ادھر اُدھر گھوڑے دوڑائے گئے لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اسی کشمکش میں سہ پہر کے تین بج گئے۔ پاوندوں کا قافلہ سالار اب مزید انتظار کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ دیگر لوگ بھی روانگی کے لیے بے تاب تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ علاقہ جرائم پیشہ افراد کا گڑھ ہے اور یہاں مسلسل دو راتیں پڑاؤ کرنا

بھی مناسب نہیں۔ وہ اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف رشید خاں کی ماں اپنے بیٹے کے بغیر آگے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر قافلے والے اس کے لیے نہیں رک سکتے تو نہ رکیں وہ اپنے بیٹے کے لیے ضرور رکے گی۔ چار بجے کے قریب پاوندوں کا قافلہ یہاں سے روانہ ہوا اور لال بی بی اپنے بیمار بیٹے اور جوان بہو کے ساتھ اس ویرانے میں تنہا رہ گئی لیکن وہ ایسی تنہا بھی نہیں تھی۔ اس کا حوصلہ اور غیر متزلزل یقین اس کے ساتھ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے چاروں طرف بھیانک اندیشے منہ پھاڑے کھڑے ہیں لیکن وہ اس حصار میں بھی بیٹے کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ ماں تھی۔ اس نے مرزا محمد کو جنم دیا تھا۔ اسے ایک ایک پور بڑھتے پھولتے دیکھا تھا۔ اب وہ جوان تھا اور اس نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ واپس آئے گا، وہ اس کا انتظار کرے۔ یہاں ماں کا قدم آگے کیسے اٹھ سکتا تھا۔ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ دل کٹ جانے سے بچہ آزاد ہو جاتا ہے لیکن ماں پھر بھی بندھی رہتی ہے۔ ایک ان دیکھی آنول زندگی بھر اسے اپنے بچے سے باندھے رکھتی ہے اور اس آنول کو کوئی نہیں کاٹ سکتا۔ نہ وقت کا تیز دھارا، نہ رشتوں کی قینچی، نہ معاشرے کا جبر، نہ حالات کی ستم ظریفی۔ کچھ نہیں۔ بیٹے کا انتظار کرنے کے لیے لال بی بی نے مردانہ وار رائفل تھام لی اور خیمے کی حفاظت کرنے لگی۔ ساری رات مرزا محمد کی راہ دیکھی گئی لیکن وہ نہیں آیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ شام ہوئی تو لال بی بی نے بہو کے بال کاٹ کر اسے مردانہ لباس پہنا دیا اور کلاشنکوف سے مسلح کر کے ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر دیا۔ اب انہیں اس پُرخطر مقام پر ڈیرا ڈالے چھ روز ہو چلے تھے۔ آنکھیں ہر گھڑی مرزا محمد کی منتظر تھیں اور کان ہر پل اس کی آہٹ پر لگے تھے۔

رشید خاں کی روداد میں نے پوری توجہ سے سنی۔ اس کی باتوں پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہماری اس طویل گفتگو کے دوران رشید کی والدہ لال بی بی اپنی جگہ چوکس بیٹھی رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بدستور رائفل پر اور نگاہیں میری حرکات و سکنات پر رہی تھیں۔ بے حد محتاط اور کسی حد تک تنومند عورت تھی وہ۔ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے مگر اس عورت کو نیند آئی نہ اس نے پہلو بدلا۔۔۔ ہاں، رشید خاں کچھ دیر بعد لیٹا لیٹا سو گیا۔ نیلہ بھی کبھی کبھی نیند کی جھونک میں میرے کندھے سے آ ٹکراتی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ پہاڑ سی

رات کٹی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ اجالا پھیلا تو خیمے کے روزن سے باہر کا منظر صاف دکھائی دینے لگا۔ یہاں سبزہ پوش اور برہنہ دونوں طرح کی چٹانیں موجود تھیں۔ کہیں کہیں نم پختہ زمین پر وہ سوراخ نظر آتے تھے جو خیمے کی چوبیں اکھاڑنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ادھ جلی لکڑی کے ٹکڑے، جانوروں کا فضلہ اور خشک چارے کے ڈنٹھل ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان چیزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند روز پہلے یہاں کسی قافلے نے پڑاؤ کیا ہے اور یہ خیمہ اسی پڑاؤ کی باقیات ہے۔

دن چڑھتے ہی رشید اور اس کی والدہ میں پھر تکرار ہونے لگی۔ رشید کی زبانی پتا چلا کہ لال بی بی نے اب اپنے مؤقف میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لی ہے۔ رات وہ ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں باندھنا چاہتی تھی مگر اب اس نے نیلہ اور لڑکے کو اس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ رشید خاں اس سلسلے میں بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کر رہا تھا لیکن ماں کو سختی سے روکنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا "ٹھیک ہے، جیسے تمہاری والدہ کی خوشی لیکن پہلے منہ ہاتھ دھو کر چند لقمے تو حلق سے اتار لیں۔"

رشید خاں نے یہ بات والدہ سے کہی تو وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔ وہ رائفل سر پر تان کر مجھے خیمے سے باہر لائی اور گدلے پانی سے بھرا ہوا ایک لوٹا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایسے پانی سے منہ ہاتھ دھونے سے بہتر تھا کہ تھوڑی سی اور مٹی رُخ بدحال پر مل لی جائے۔ میں نے آدھے لوٹے سے اپنے شکاری بوٹوں کی کیچڑ صاف کر لی۔ باقی آدھے لوٹے کا کوئی مناسب استعمال سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز پہلے میرے کانوں سے ٹکرائی اور ایک لمحے بعد لال بی بی بھی اس سے باخبر ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جھریوں بھرے چہرے پر اندیشوں کی یلغار ہو گئی۔ اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں میں رائفل کو بے پناہ مضبوطی سے تھاما تو کلائی کی پھولی ہوئی رگیں ابھر کر نمایاں ہو گئیں۔ وہ آواز کی سمت دیکھنے لگی۔

اس گھڑی اس پر قابو پانا میرے لیے قطعی مشکل نہیں تھا مگر میں اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ جنوب کے رُخ پر قدرے بلندی سے آنے والی یہ آواز گھوڑوں کی ٹاپوں کی تھی۔ کم و بیش تین گھوڑے سرعت سے کھائی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لال بی بی نے غرا کر مجھے واپس چلنے کا حکم دیا۔ میں لوٹا تھام کر فرمانبرداری سے واپس خیمے میں آ گیا۔ لال بی بی

نے جلدی سے ۔۔۔ برابر کر کے چرخ دوری کس دی۔ اب اس کی رائفل میرے سینے کی طرف تھی۔ نگاہیں میرے چہرے سے پیوست اور کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کی غفلت کے بعد اب وہ پھر پوری طرح چوکس نظر آ رہی تھی۔ رشید خاں کی نوبیاہتا بیوی گلشن نے بھی کلہاڑی تھام لی تھی اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

گھوڑوں کی ٹاپیں مدھم پڑ گئیں۔ یقیناً وہ لوگ کھائی کی پرخطر ڈھلوان طے کر رہے تھے۔ کھائی میں پہنچ کر آوازوں کا رخ کھائی کے متوازی ہو گیا۔ گھڑسوار کھائی کے اندر ہی اندر چلتے خیمے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خیمے کے اندر تناؤ عروج کو پہنچ گیا۔ نبیلہ کے چہرے پر ہراس تھا۔ یقیناً میری طرح اس کی نگاہ میں بھی عیسیٰ جان اور شکر کے چہرے گھوم رہے تھے، تاہم ہمارے "میزبان" امید و بیم کی کیفیت میں تھے۔ وہ آنے والوں سے خوف زدہ تو تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ توقع بھی تھی کہ شاید مرزا محمد واپس لوٹ آیا ہو۔

ٹاپیں خیمے سے قریب تر ہوتی گئیں پھر تقریباً بیس گز کی دوری سے آگے نکل گئیں۔ یہ خیمہ بڑی محفوظ لوکیشن پر تھا اور میری توقع کے مطابق گھڑسوار خیمے کو دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر نہیں ۔۔۔ اچانک ٹاپیں تھم گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہم ایک سنگین غلطی کر چکے ہیں۔ مختلف آہٹوں سے پتا چل رہا تھا کہ گھوڑے عین اس مقام پر رکے ہیں جہاں تھوڑی دیر پہلے میں اور لال بی بی پانی کا لوٹا لیے کھڑے تھے۔ میں نے وہاں شکاری بوٹ دھوئے تھے اور پھر ہاتھ منہ دھونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ بہ عجلت خیمے میں لوٹنا پڑا تھا۔ خشک زمین پر تازہ گرا ہوا پانی ایک مصیبت کا پیش خیمہ بن گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لال بی بی بات کی تہ تک پہنچتی گھوڑے خیمے کے قرب و جوار میں وندنانے لگے۔ گھڑسواروں کی تعداد پانچ سے کم نہیں تھی، وہ اونچی آواز میں بول رہے تھے اور خاصے پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ لال بی بی بڑے دھیان سے ان کی آوازیں سن رہی تھی۔ یقیناً کل رات اسی طرح اس نے ہماری آہٹیں بھی سنی تھیں اور پھر رائفل تان کر میرے روبرو پہنچ گئی تھی۔

خیمے کے باہر سے لال بی بی کے ساتھ گھڑسواروں کا مختصر مکالمہ ہوا پھر رائفل پر چڑھی ہوئی ایک سنگین نے خیمے کے کپڑے کو زمین سے چھت تک پھاڑ ڈالا اور ایک نہایت ہٹا کٹا شخص رائفل سونتے اندر گھس آیا۔ لال بی بی نے چلا کر اسے وارننگ دی پھر تھائیں سے گولی داغ دی۔ نووارد فائر ہونے سے پہلے ہی جھک چکا تھا۔ گولی اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

اس سے پہلے کہ لال بی بی دوسری بار ٹریگر دباتی وہ ناگہانی کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ کہاں وہ بوڑھی عورت کہاں وہ پلا ہوا شنگرا۔ اس نے پھرتی سے رائفل کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ رائفل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور یہ خیمے کی چھت میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ نووارد زوردار جھٹکے سے رائفل چھینی تو لال بی بی اڑتی ہوئی بوجھ ٹکرائی۔ بوڑھی دلیری سے کلہاڑی سونت کر آگے بڑھی تھی۔ اسے موقع ملتا تو یقیناً وہ نووارد کو کاری ضرب لگاتی، راستے میں ہی ساس نے اس کا زور توڑ دیا اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل شوہر کے پہلو میں جا گری۔

رشید خاں کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے عقب میں نبیلہ ایک کونے میں سہمی چلا رہی تھی۔ اگر اس ہنگامے سے کوئی لاتعلق تھا تو وہ نبیلہ کے ساتھ آنے والا لڑکا تھا۔ وہ کمبل کے نیچے بے سدھ پڑا تھا۔ اس سے پیشتر کہ گلشن سنبھل کر دوبارہ کلہاڑی استعمال کرتی دو اور افراد بھڑ مار کر اندر گھس آئے اور انہوں نے کلہاڑی سمیت اسے دبوچ لیا۔ ایک اور شخص نے اندر گھس کر میرے سر سے سیون ایم ایم کی نال لگا دی۔

سب سے پہلے اندر آنے والے کے ہاتھ میں اب دو رائفلیں تھیں اور اس لوفر نے یہ دونوں رائفلیں بڑے نامناسب طریقے سے نبیلہ کے سینے پر رکھ دی تھیں۔ یہ آخری حد تھی اور وہ اس سے آگے بڑھتا تو یقیناً مجھے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا۔

اس کھیل کا پانسا پلٹ دینا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ کام میں کھیل کے دوران کسی وقت بھی کر سکتا تھا اور اب بھی کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ حملہ آوروں کی تعداد پانچ تھی۔ ان میں سے سرغنہ کے علاوہ کوئی بھی لڑائی مارکٹائی میں مشاق نظر نہیں آتا تھا۔ یہ صرف گولی چلانے والے لوگ تھے۔ جیسے کیلکولیٹر نے لوگوں کو حساب کتاب سے دور کر دیا ہے اسی طرح ہر وقت پاس رہنے والا آتشیں اسلحہ بندے کو زور آزمائی سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ یعنی ادھر گرما گرمی پیدا ہوئی، ادھر گولیاں چلنے لگیں اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ نہ پنجہ لڑا، نہ مکالات ہوئی نہ کوئی اور کلاسیکل داؤ پیچ دیکھنے میں آیا۔ گلشن کو دبوچنے والے دونوں افراد اب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ان کی گرفت میں تھی۔ ایسے موقعوں پر مرد کی نگاہ دھوکا کھا سکتی ہے لیکن اس کے ہاتھ نہیں۔ موٹے کپڑوں کے باوجود گلشن کی اصلیت

بنا رہ سکتی تھی۔ ایک شخص نے پرجوش لہجے میں سرغنہ سے کہا: "داوڑ کیہ مندوسے 'وا جلکیہ وسے" یعنی سردار یہ تو لڑکی ہے۔

یہ اعلان سن کر ہنستے ہنستے سردار کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ وہ نبیلہ کے پاس سے ہٹ کر گلشن کی طرف آ گیا۔ رائفل گلشن کے کندھے پر رکھ کر دوسری رائفل سے اس نے اس کے چہرے کو چھوا اور بک بک کرنے لگا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن رشید خاں کا لال پیلا چہرہ بتا رہا تھا کوئی نہایت واہیات بات کہی گئی ہے۔

آنے والے اپنے حلیے اور طور اطوار سے سکہ بند ڈاکو لگتے تھے۔ لباس میلے کچیلے اور داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ بالوں پر گرد، آنکھوں میں کیچ اور کمر سے گولیوں کے بیلٹ بندھے ہوئے۔ ان میں سے ایک کے پاس بالکل نیو برانڈ گن بھی تھی۔ انہوں نے نبیلہ یا مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اس کا مطلب تھا وہ عیسیٰ جان کے گروہ سے نہیں۔ لیکن ایسا ہونا ضروری بھی نہیں تھا۔ عین ممکن تھا عیسیٰ جان کے کئی ساتھی میری اور نبیلہ کی صورت سے ناآشنا ہوں۔ جیسا کہ نبیلہ نے بتایا تھا، وہ اغوا ہونے کے بعد بیشتر وقت ایک مختصر کمرے میں بند رہی تھی۔ عیسیٰ جان نے اپنے کسی کو اس کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ایک طرح سے یہ قید تنہائی تھی۔ اس قید تنہائی کی وجہ سے کئی لوگ اس کی صورت دیکھنے سے محروم رہے ہوں گے۔ رہا بچہ تو وہ ابھی تک کمبل میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ صرف سانسوں کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمبل کے نیچے کوئی ذی روح موجود ہے۔

ان لوگوں سے خیر کی توقع رکھنا ایسے ہی تھا جیسے پانی سے آگ کی، آگ سے ٹھنڈک کی اور بچھو سے ڈنک نہ مارنے کی توقع رکھی جائے۔ ان کی صورتیں ہی بتا رہی تھیں کہ وہ پرلے درجے کے بدقماش لوگ ہیں اور یہاں دو عورتوں کی موجودگی میں وہ ابلیس کو بھی مات کر دیں گے۔ لال بی بی حملہ آوروں کی گرفت میں زبردست مزاحمت کر رہی تھی۔ انہوں نے اسے پگڑی سے باندھ کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اب نبیلہ اور گلشن سے انہیں کوئی خطرہ تھا نہ فالج زدہ رشید خاں سے۔ باقی میں تھا، سو میں بھی بھیگی بلی بنا خاموش کھڑا تھا۔ میں اداکار کبھی نہیں رہا لیکن ایسا گیا گزرا بھی نہیں کہ جو چھپانا چاہوں، چھپا نہ سکوں۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر حملہ آوروں نے مجھ سے کوئی بہت زیادہ خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ انہوں نے گرج برس کر مجھے بھی نبیلہ اور گلشن کے پاس چٹائی پر بٹھا دیا۔

O☆O

دوپہر تک دو مسلح افراد ہمارے سروں پر بندوقیں تانے کھڑے رہے، ان میں سے ایک کا نام جبار خاں تھا اور وہ شکل و صورت سے بھی "جبار خاں" ہی نظر آتا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں لیڈر یا سرغنہ کی حیثیت حاصل تھی۔ پارٹی کے باقی تین افراد اپنی رائفلیں لوڈ کر کے کسی جانب نکل گئے تھے۔ ویسے وہ خیمے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ رہ رہ کر ان میں سے کسی کی للکارتی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشے میں ہیں۔ غالباً یہ لال پری کا نشہ تھا۔ کل رات کے خونی مناظر کسی سنسنی خیز فلم کی طرح میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کی دردناک موت کا تصور، عیسیٰ جان کے ڈیرے پر میرے ہاتھوں دو افراد کا قتل۔ اس واقعے کے نتیجے میں برپا ہونے والا خونی ہنگامہ، اندھیرے میں شعلوں کی لپک اور دستی بموں کی گھن گرج، پھر عباس خاں کا گہری کھائی میں گرنا اور اس کی دردناک چیخ۔ وہ چیخ جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیا وہ عباس خاں کی آخری چیخ تھی؟ یہ سوال کسی انگارے کی طرح ذہن میں چمکتا تھا اور پورے بدن میں کرب کی لہریں دوڑا دیتا تھا۔ معلوم نہیں عباس خاں اس وقت کہاں اور کس حال میں تھا۔

میں سوچوں کے جنگل میں گھومتا رہا اور میری نگاہ خیمے کے وسط میں رکھی انگیٹھی پر جمی رہی۔ انگیٹھی میں اب راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عربی کے اونٹ کے مانند "سردی" پوری کی پوری خیمے میں گھسی بیٹھی تھی۔ میرے بالائی جسم پر اب صرف ایک قمیص تھی۔ گولیوں سے بھری ہوئی جیکٹ حملہ آوروں کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے بڑی باریک بینی سے مختلف جیبوں کی تلاشی لی تھی۔ جیکٹ میں گولیوں کی موجودگی نے جبار خاں کو میرے متعلق سخت شک میں ڈال دیا تھا۔ اس کی پوچھ گچھ کے جواب میں میں نے وہی روداد سنائی تھی جو اس سے پہلے رشید خاں اور اس کی والدہ لال بی بی کو سنا چکا تھا۔ سب مشین گن کے بارے میں میں نے بتایا کہ وہ راستے میں مجھ سے کہیں گر گئی ہے۔

دوپہر سے ذرا قبل نبیلہ کے ساتھ آنے والا بچہ دوہرے کمبل کے نیچے کسمسانے لگا۔ اس کا نشہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ نبیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے جبار خاں کی طرف دیکھا جیسے بچے کے قریب جانے کی اجازت مانگ رہی ہو۔ جواب میں جبار خاں نے قہرآلود نظروں سے اسے گھورا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ جہاں بیٹھی ہے بیٹھی رہے۔ بچہ چند کروٹیں بدل کر خود ہی اٹھ

بیٹھا۔ میں نے پہلی بار اس کی شکل دیکھی اور دنگ رہ گیا۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا تھا۔ کہاں؟ شاید لاہور میں، شاید جھنگ میں یا پھر اٹک جیل کی بچہ بیرکوں میں۔۔۔ کہیں نہ کہیں دیکھا تھا میں نے اس بچے کو۔ کیا اس بچے کو اغوا کر کے یہاں پہنچایا گیا ہے؟ یہ سوال بچے کو دیکھتے ہی ذہن میں ابھرا۔ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" میں تھا تو اغوا کرنے والا شکریا عیسٰی جان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ بھیڑیوں کے نرغے میں ایک معصوم میمنے کو دیکھ کر نبیلہ کے اندر کی عورت جاگ اٹھی تھی اور اس نے عیسٰی جان سے کہہ کر بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، ورنہ اب تک اس کا نہ جانے کیا حشر ہو گیا ہوتا۔

بے دار ہونے کے بعد بچے نے اجنبی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ نبیلہ کے سوا خیمے میں کوئی اس کے لیے شناسا نہیں تھا۔ وہ گرد و پیش کے ماحول کو حیرت آمیز خوف سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک اسے کوتے ہو گئی۔ تے میں خون کی آمیزش صاف نظر آ رہی تھی۔ نبیلہ اسے سنبھالنے کے لیے لپکی مگر جبار خاں کے ساتھی پہرے دار نے رائفل سے دھکیل کر اسے پرے پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ نبیلہ اب چپکی بیٹھ جائے گی لیکن وہ بپھر کر پہرے دار پر آئی اور اسے دھکیل کر بچے تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بچے کی ماں نہیں تھی لیکن "ماں" تو تھی۔ اور ماں بھی ایسی جو اپنے پھول سے بچوں سے دور کر دی گئی تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ ممتا دوڑ رہی تھی۔ پہرے دار نے دست درازی کی تو نبیلہ نے بے ساختہ اسے تھپڑ کھینچ مارا۔ چٹاخ کی آواز سے خیمہ گونج اٹھا۔ ایک دم پہرے دار پر درندگی طاری ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی جو شکاری جانور کی آنکھوں میں شکار دیکھ کر نمودار ہوتی ہے۔ اس نے اڑنگا لگا کر نبیلہ کو نیچے گرا دیا اور بے دریغ ٹھوکریں مارنے لگا۔ اتنے میں ایک تیسرا شخص بھی اندر داخل ہو گیا۔ اس نے ساتھی کی مدد کرتے ہوئے نبیلہ کو بالوں سے پکڑا اور باہر کھینچنے لگا۔ جبار خاں نے لپک کر سیون ایم ایم کی نال میری پیشانی سے لگا دی۔

تھپڑ کھانے والا پہرے دار خوف ناک انداز میں گلشن کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ صورتِ حال اچانک ہی سنگین رخ اختیار کر گئی تھی۔ دونوں خواتین کو خیمے سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ وہ خطرہ جو رات کی سیاہی میں چھپا ہوا تھا، دن دہاڑے نبیلہ اور گلشن کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

اب میرے لیے چپکا رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جھک کر کہنی کی بھرپور ضرب جبار خاں کے سینے پر لگائی۔ یہ ایک جچی تلی ضرب تھی۔ جبار اچھل کر خیمے کے چاک شدہ کپڑے سے ٹکرا کر باہر جا گرا۔ اس کی رائفل میرے ہاتھ میں رہ گئی۔ یہ واقعہ نصف سیکنڈ کے مختصر عرصے میں وقوع پذیر ہوا۔ گھسیٹ کر باہر لے جانے والا شخص بمشکل میری طرف مڑا تھا کہ میں نے جبار خاں سے چھنی ہوئی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور وہ دھکے سے لالاں بی بی کے قدموں میں گرا۔ لالاں بی بی دہشت زدہ سی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ چیخ مارنے کے انداز میں کھلا ہوا تھا مگر آواز حلق سے برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ لالاں بی بی کے قدموں میں گرنے والا شخص غیر مسلح تھا لہٰذا اسے اسی حال پر چھوڑ کر میں باہر لپکا۔ باقی دو افراد دوڑتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے اگلا زیادہ تیز رفتار تھا اور زیادہ بد قسمت بھی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں ہوتی تو اور بات تھی مگر وہ جوش کے عالم میں خالی ہاتھ ہی خیمے کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا جیسے اندر گھستے ہی ہنگامہ برپا کرنے والے کی گردن مروڑ کر رکھ دے گا۔

مجھے رائفل بدست دیکھ کر اس نے "بریک" لگایا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ رکتا رکتا بھی وہ میرے سامنے پہنچ گیا۔ میں رائفل کو گھما کر لاٹھی کی طرح پکڑ چکا تھا۔ اس کا نہایت جاندار ضرب آنے والے کے چہرے پر پڑی اور نقشے کا بگڑتا بنا گئی۔ وہ چکر کھا کر بے جان شے کی طرح زمین پر گرا اور بے سدھ ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے اوندھے منہ زمین لی۔ ماؤزر کی دو گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر سے گزر گئیں۔ یہ فائر عقب میں آنے والے شخص نے کیے تھے۔ شاید وہ مزید فائر بھی کرتا مگر اسی دوران سرغنہ جبار خاں جو خیمے کے چاک شدہ حصے سے باہر جا گرا تھا اور جس کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی، اپنے پورے وزن کے ساتھ مجھ پر آ گرا۔ گوشت و پوست کے جسم کے بجائے کوئی پتھریلا مجسمہ میری پشت پر لڑھک گیا تھا۔ میری پسلیوں نے بڑی مشکل سے یہ بوجھ سہا۔ میری ایک کہنی آزاد تھی، اس کا ایک بھرپور وار جبار خاں کو میری کمر سے اچھال سکتا تھا مگر اسے خود سے جدا کرنا میرے لیے سود مند نہیں تھا۔ میں ماؤزر کی زد میں تھا اور جبار خاں کے میرے ساتھ چمٹے رہنے میں میری سلامتی تھی۔ میں جبار خاں سے گتھم گتھا ہو گیا اور ہم دونوں لڑھکتے ہوئے کئی فٹ نشیب میں پہنچ گئے۔

لڑھکتے وقت جبار خاں کی ایک پنڈلی میری ٹانگوں کی قینچی میں تھی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ اس پنڈلی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دوں اور میں نے جبار خاں سے کوئی رعایت نہیں کی۔ ماؤزر بردار لبلبی پر انگلی رکھے ہمارے گرد چکرا رہا تھا اور موقعے کی تلاش میں تھا۔ پانچواں شخص چونکہ جھاڑیوں کے اندر نبیلہ سے الجھا ہوا تھا لہٰذا ماؤزر بردار کے سوا مجھے کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ میں ماؤزر بردار کی طرف سے ایک غلطی کا منتظر تھا۔ تھوڑا سا وقت ضرور لگا لیکن ماؤزر بردار نے مجھے "مایوس" نہیں کیا۔ ہیجانی کیفیت میں وہ جونہی میرے اور جبار کے سر پر پہنچا، میں نے ایک دم جبار خاں کو چھوڑا اور اس پر جھپٹ پڑا۔

وہ اس حرکت کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جبار خاں نے مجھے جکڑ رکھا ہے جبکہ حقیقت برعکس تھی۔ جبار خاں کی بائیں پنڈلی کی دونوں ہڈیاں سرکنڈے کی طرح ٹوٹ چکی تھیں۔ اس مہلک چوٹ کے بعد اس کی گرفت میرے جسم پر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لہٰذا اسے چھوڑ کر ماؤزر بردار پر جھپٹنے میں مجھے قطعی مشکل پیش نہیں آئی۔ ماؤزر بردار پشت کے بل میرے نیچے گرا۔ میرے ہاتھ پاؤں نے تیزی سے حرکت کی اور چند سیکنڈ میں اسے روئی کی طرح دھنک دیا۔ وہ خود کہیں گرا، اس کا ماؤزر کہیں اور پگڑی کہیں۔ میں نے اس کا ماؤزر ان لوڈ کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

اس کشمکش کے دوران میں نے کن انکھیوں سے نبیلہ کی طرف بھی دیکھا تھا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں تھی اور جبار خاں کا ساتھی اسے بری طرح روند رہا تھا۔ تاہم جب ماؤزر بردار سے فراغت پا کر میں نے نبیلہ کی طرف دیکھا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ نبیلہ نے غیر متوقع طور پر بے حد جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سنبھل کر حملہ آور پر ٹوٹ پڑی تھی اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں تو اینٹ سے ضرور دے رہی تھی۔ حملہ آور اسے تھپڑ مارتا تو وہ اپنی ہمت کے مطابق بدلہ چکا دیتی۔ وہ اس کے بال کھینچتا تو وہ اس کے جسم میں دانت گاڑ دیتی۔ گاہے گاہے وہ اس کے جسم کے نازک حصوں کو بھی نشانہ بنا رہی تھی۔ صنفِ نازک کی دلیرانہ مزاحمت کا یہ منظر بڑا ہیجان خیز تھا۔ یہ تنگ آمد بجنگ آمد والی بات تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے سے طاقتور مرد کی منتیں سماجتیں کرنے والی اور آنسو بہانے والی سراپا قہر بن گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے نبیلہ کے اندر چھپا ہوا کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ عیسٰی جان کے ڈیرے پر اکلوتے روزن والے بند تاریک کمرے میں ایک قابض شخص نے اس کی عزتِ نفس اور اس کے جسم پر جتنے چرکے لگائے تھے وہ ان سب کا بدلہ آج چکا دینا چاہتی تھی۔۔۔

آخر مجھے محسوس ہوا کہ حملہ آور برداشت کی آخری حد کو چھونے لگا ہے اور اب وہ موقع ملنے پر رائفل کے استعمال سے دریغ نہیں کرے گا۔ میں اس پر قابو پانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ نبیلہ اور حملہ آور کی کھینچا تانی میں اچانک حملہ آور کی رائفل سے گولی چل گئی۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ یہ گولی نبیلہ یا حملہ آور میں سے کسی کو بھی لگ سکتی تھی لیکن اتفاقاً کسی کو بھی نہیں لگی۔۔۔ یہ دو نالی رائفل تھی۔ برق کی طرح یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ اس رائفل سے ایک فائر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی اب رائفل خالی تھی۔ میں نے عقب سے جا کر حملہ آور کے سر پر اپنی سیون ایم ایم کا آہنی کندا مارا اور پھر اسے دھکیل کر نبیلہ سے دور پھینک دیا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ پانچ میں سے اب صرف دو افراد مزاحمت کے قابل تھے اور وہ دونوں میرے نشانے پر تھے۔ ان میں سے ایک کا کندھا خون اگل رہا تھا اور دوسرے کے چہرے پر نبیلہ کے تیز ناخنوں کی ان گنت خراشیں تھیں۔ جو افراد مزاحمت کے قابل نہیں تھے ان میں سرغنہ جبار کی حالت سب سے بری تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور مضروب پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تڑپنے کے ساتھ ساتھ وہ پشتو میں ہائے وائے بھی کرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا تحیر بھی تھا۔ شاید اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک تنہا شخص یہ سب کچھ کر چکا ہے۔ اگر چار برس پہلے کے "جہانی استاد" سے اس کا تعارف ہوتا اور وہ اسے کراچی کے قمار خانوں اور شہرِ پُرہنگام بمبئی کے بدنام اڈوں میں مار پیٹ کرتے دیکھ چکا ہوتا تو یوں پریشان نہ ہوتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب بھی مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ میں جرائم پیشہ حلقوں کا ایک مانا ہوا اسٹریٹ فائٹر تھا۔ اور اسٹریٹ فائٹر کیا ہوتا ہے یہ شاید بہت سے لوگوں کو علم نہیں۔ پہلوانی، کراٹے، کنگ فو، تنجا، جوڈو اور دیگر عسکری علوم کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اسٹریٹ فائٹر ان سب سے جدا چیز ہے۔ ہر عسکری فن کچھ اصولوں کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً جوڈو میں آپ ضرب نہیں لگا سکتے۔ پہلوان کراٹے استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک ماہر لٹھ باز چاقو چھری کے استعمال سے نابلد ہوتا ہے لیکن جب اسٹریٹ فائٹنگ کی بات ہوتی ہے تو پھر ایک ہی اصول سامنے رکھا جاتا ہے "فائٹ اینڈ فائٹ"۔ اسٹریٹ فائٹر دشمن کو زیر کرنے کے لیے لڑتا ہے اور

اس کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی ہے اور اکثر اوقات اس آگ میں بڑے بڑے فائٹر اور مارشل آرٹس کے سپر اسٹار موم کی طرح پگھلتے دیکھے گئے ہیں۔ میری ایماندارانہ رائے ہے کہ جیسے شاعر، مصور اور ادیب تربیت سے نہیں بنتے ایسے ہی لڑنے مرنے کا فن بھی سیکھنے سے نہیں آتا۔ یہ فن ہوتا ہی نہیں، یہ تو ایک نیلی آگ ہوتی ہے جو سماج کے ظالم ہاتھ کسی شخص کے اندر روشن کرتے ہیں اور ناانصافیوں کی ہوا اسے بھڑکا کر شعلہ بنا دیتی ہے۔

جونہی لڑائی تھمی بچہ بھاگ کر خیمے سے نکلا اور نبیلہ سے لپٹ گیا۔ نبیلہ اسے لے کر میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ نبیلہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور رخساروں پر وہی نشان تھے جو کسی کٹنے بلی کے کاٹنے سے جلد پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کا ایک دم بھڑک جانا اور کھائل شیرنی کی طرح حملہ آور پر جاپڑنا سمجھ میں آتا تھا۔ اسے جب تک مارا پیٹا گیا تھا وہ سہتی رہی تھی لیکن جب اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا تھا، وہ سب کچھ فراموش کر کے سراپا مزاحمت بن گئی تھی۔ گلشن بھی اپنا تار تار گریبان سنبھالتی میرے قریب آگئی۔ حملہ آوروں کے پاس کل تین رائفلیں اور ایک ماؤزر تھا۔ ان میں سے ایک دونالی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ ایک رائفل میرے قبضے میں تھی۔ ماؤزر میں نے ناکارہ کر کے جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ اب صرف ایک رائفل باقی تھی۔ یہ اس شخص کے کندھے پر تھی جس نے خالی ہاتھ خیمے میں گھسنے کی دلیری کی تھی اور منہ کی کھا کر ادھ موا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک رائفل لال بی بی والی بھی تھی اور وہ خیمے کے اندر پڑی تھی۔

میں نے گلشن سے کہا کہ وہ یہ دونوں رائفلیں اٹھا کر میرے پاس لے آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ نبیلہ کی طرح گلشن بھی سہمی سہمی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا یہ روپ ان دونوں کے لئے قطعی غیر متوقع اور بے حد متاثر کن تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں کی صورت حال مکمل طور پر ہمارے قابو میں آچکی تھی۔ میری ہدایت پر نبیلہ اور گلشن خیمے میں گئیں اور لال بی بی کی بندشیں کھول کر اسے باہر لے آئیں۔ وہ جھگڑا کرنے والے انداز میں مسلسل بول رہی تھی اور جبار خان کو خاص طور پر لعن طعن کا نشانہ بنا رہی تھی۔ قریب آکر اس نے میرا شانہ تھاما اور شکایت کرنے والے انداز میں کچھ کہنے لگی۔ اس کی باتیں میرے پلے نہیں پڑیں لیکن اتنا پتا ضرور چل گیا کہ مجھ سے اسے جتنی بھی شکایتیں تھیں وہ دور ہو چکی تھیں اور وہ میرے "چھپے رستم" ہونے پر خوش تھی۔

جس دوران لال بی بی مجھ سے باتیں کر رہی تھی گلشن دوبارہ خیمے میں گئی اور وہاں سے میری سب مشین گن نکال لائی۔ میں نے سب مشین گن کو لوڈ کر کے اسے فیتے کی مدد سے گلے میں لٹکا لیا۔ میرے گلے میں جھولتی "موت" کی دیوی نے میرے حریفوں کو کچھ اور ہراساں کر دیا۔ میں نے کچھ پوچھ گچھ کے لیے ان میں سے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو اردو بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اس کا نام جمعہ خان تھا اور یہ وہی شخص تھا جس نے نبیلہ پر چڑھائی کی تھی اور نتیجے میں لہولہان ہو کر پسپا ہوا تھا۔ میں نے اسے سب مشین گن کے نشانے پر رکھا اور دیگر افراد سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔ وہ چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس سنگین صورت حال میں بھی اس کے چہرے پر کوئی خاص پریشانی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی میں اس سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک بار پھر قرب وجوار گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھے۔

اس دفعہ آنے والے زیادہ تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تعداد پندرہ بیس کے قریب ہے۔ وہ بے حد تیزی سے نمودار ہوئے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرتا، وہ ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ہم کھلی جگہ پر تھے اور نشیب میں تھے۔ وہ بلندی پر تھے اور انہیں درختوں کی آڑ بھی میسر تھی۔ اگر میں سب مشین گن کے زعم میں ان سے الجھنے کی کوشش کرتا تو سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ نووارد افراد کے لباس اور حلیوں سے عیاں تھا کہ وہ انہی پانچ افراد کے ساتھی ہیں جو ابھی میرے ہاتھوں پٹ پٹا کر بیٹھے ہیں۔ نووارد افراد کو دیکھتے ہی جبار خان اور جمعہ خان وغیرہ کے چہرے کھل اٹھے۔ وہ ایک دم ہی خود کو بے حد محفوظ خیال کرنے لگے تھے۔ دوسری طرف نبیلہ اور گلشن کے چہرے دھواں دھواں نظر آنے لگے۔ نبیلہ نے بچے کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور لال بی بی نے جلدی سے رائفل اپنے ہاتھ میں کر لی۔

آنے والوں میں چوڑے شانوں اور فراخ پیشانی والا ایک شخص سب سے نمایاں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ٹوٹ پھوٹ کے علاوہ میرے ہاتھ میں چمکتی ہوئی سب مشین گن بھی دیکھ چکا تھا۔ تاہم ان دونوں عوامل کو خاطر میں لائے بغیر وہ بڑے اعتماد کے ساتھ گھوڑے سے اترا اور سنبھل سنبھل کر چلتا میرے سامنے پہنچ گیا۔ دو افراد ذرا مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ آنے والے نے از خود اپنا تعارف

کراتے ہوئے اپنا نام لشکر خان بتایا اور پشتو آمیز اردو میں بولا "ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم ایس پی برکت اور صوبیدار مرجان کا ساتھی ہے۔ شاباش ہے۔ تم نے بڑا دلیری کا بات کیا ہے۔"

لشکر خان کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں عیسٰی جان کے ڈیرے پر اس کے متعلق سن چکا تھا۔ اس شخص نے عیسٰی جان اور لشکر جیسے دو عفریتوں سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے دلیرانہ عزائم نے اسے میری نظروں میں اہم بنا دیا تھا۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک ایک بے خوف شخص نظر آتا تھا۔ جس بات کو صحیح سمجھنے والا اس پر اڑ جانے والا، دل میں کچھ نہ رکھنے والا، بے ریا، بے کھوٹ اور دو ٹوک۔ ایسے لوگ جس شعبے میں بھی ہوں، اپنی صاف گوئی کی وجہ سے بہت سے دشمن بنا لیتے ہیں لیکن جو ان کے دوست ہوں وہ واقعی دوست ہوتے ہیں، بے حد وفادار اور مشکل وقت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانے والے۔

لشکر خان نے تیزی سے اپنے ساتھیوں کی ابتری کا جائزہ لیا اور کوئی سوال پوچھے بغیر بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "کیا جبار خان وغیرہ نے کوئی بدتمیزی کیا تھا؟"

"بدتمیزی بہت چھوٹا لفظ ہے خان" میں نے جواب دیا "یہ تمہارے ساتھی بدکار اور زانی لوگ ہیں۔ مجبور عورت کو دیکھ کر ان کے اندر چھپا ہوا زہریلا ناگ پھن پھیلا کر جھومنے لگتا ہے۔ میرے بس میں ہو تو ابھی ان کے سر پتھروں سے کچل کر لاشے دریا میں بہا دوں۔"

لشکر خان نے کہا "تم بہادر آدمی ہے۔ جو شخص دشمن پر قابو پا کر بھی اسے سخت سزا نہیں دیتا وہ بہادر ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان لوگوں کو معاف کر دے گا۔ ان کو کیے کا سزا ضرور ملے گا اور ابھی ملے گا۔"

لشکر خان کی آنکھوں میں قہر کی آگ دہک رہی تھی۔ اس نے ایک غضب ناک نگاہ جبار خان پر ڈالی اور اپنے ساتھ آنے والے گھڑ سواروں سے پشتو میں گفتگو کرنے لگا۔ پھر اس گفتگو میں گلشن ... نبیلہ اور لال بی بی بھی شریک ہو گئیں۔ لال بی بی دہائی دینے والے انداز میں چیخ چیخ کر لشکر خان سے کچھ کہنے لگی، میں دیکھ رہا تھا کہ جبار خان، جمعہ خان وغیرہ کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ لشکر خان کا موڈ بدلتے ہی ان کی ساری تن فن ختم ہو گئی تھی اور وہ انسانوں کے بجائے مٹی کے ڈھیر نظر آنے لگے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے موقعے پر صورت حال عجب رنگ اختیار کر گئی۔ آتش مزاج لشکر خان کے ساتھ آنے والے گھڑ سواروں نے جبار خان، جمعہ خان اور ان کے دیگر ساتھیوں کو مختلف پیڑوں سے اس طرح باندھ دیا کہ وہ پیڑوں سے بغل گیر نظر آنے لگے۔ صرف ایک شخص کو اس سلوک سے معاف کر دیا گیا اور یہ وہ تھا جس کے چہرے کا بھرتا میری بندوق نے بنایا تھا اور جو خیمے سے چار پانچ گز کی دوری پر بے ہوش پڑا تھا۔ چاروں افراد کو رسیوں کے ذریعے باندھا جا چکا تو لشکر خان کے ایک ساتھی نے اپنے گھوڑے کی خورجین سے ایک چرمی کوڑا برآمد کیا۔ یہ کوڑا دیکھنے میں ہی خوف ناک نظر آتا تھا۔ اسے مزید اذیت ناک بنانے کے لیے اس کے گرد لوہے کا باریک تار لپیٹا گیا تھا۔ یہ کوڑا ایک بے ڈھنگے کوہستانی نے ہاتھ میں لیا اور کسی ماہر کوڑا زن کے انداز میں ٹھمکیں نکالتا اور بازو لہراتا ہوا جمعہ خان کے سر پر پہنچ گیا۔

جمعہ خان تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تمام نشہ ہرن ہو چکا تھا اور اب وہ سراپا فریاد تھا، تاہم یہ فریاد اس کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ غالباً ان لوگوں کے نزدیک سزا سے بچنے کے لیے معافی کی درخواست 'مردانگی کی شان' کے خلاف تھی۔ بہرطور ان سب کے چہروں سے یہ بات عیاں تھی کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ اپنے سردار سے بے حد شرمندہ ہیں۔ ان چاروں کو درختوں کے ساتھ بندھے دیکھنے کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ گو ان کی بندشیں بہت مضبوط نہیں تھیں لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان کو باندھنے والی اصل شے رسی نہیں لشکر خان کی دہشت اور برتری تھی۔

میں نے دبے لفظوں میں لشکر خان سے کہا "سردار لشکر خان! میرا خیال ہے ان کو کیے کی کافی سزا مل چکی ہے۔ ویسے بھی یہ اپنی حرکت پر نادم نظر آ رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔"

لشکر خان آنکھیں نکال کر بولا "تمہارا اب اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جس طرح تمہارے علاقوں میں کچھ پولیس کیس ناقابل ضمانت اور ناقابل راضی نامہ ہوتا ہے اسی مافق یہاں بھی کچھ جرم ناقابل معافی ہے۔"

لشکر خان کے بارے میں میرا قیافہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مصلحت کوش تھا نہ گول مول رکھنے والا۔ اس کا ہر انداز پُرجوش اور ایک قطعیت لیے ہوئے تھا۔ بے شک جنہیں وہ سزا دے رہا تھا وہ اس کے ساتھی تھے اور اس نازک وقت میں اسے ایک ایک ساتھی کی ضرورت تھی مگر وہ انصاف کو نظریۂ ضرورت کی بھینٹ نہیں چڑھا رہا تھا۔ اس نے کوئی

سوچ بچار نہیں کی تھی کوئی لمبی چوڑی پلاننگ نہیں تھی۔ جونہی اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی جرم وار ہیں وہ وہیں موقعے پر انہیں سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ انصاف کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ تاخیر سے نہ ہو اور لشکر خاں کے "انصاف" میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔

لشکر خاں نے اشارہ کیا اور قیم شحیم کوہستانی نے پہلا کوڑا پوری قوت سے جمعہ خاں کی پیٹھ پر مارا۔ "شڑاپ" کی تیز آواز کھائی میں دور تک گونجی۔ نبیلہ کے ساتھ آئے ہوئے بچے نے رونا شروع کر دیا۔ آٹھ دس سیکنڈ کے وقفے سے دوسرا کوڑا مجرم کی پیٹھ پر پڑا۔ پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ چار کوڑے تو اس نے ضبط سے برداشت کیے پھر اس کی چیخیں نکل گئیں۔ کوڑا پڑتے ہی اس کا جسم اچھلتا تھا اور وہ تنے سے سر ٹکرانے لگتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شلوار کے چیتھڑے اڑ گئے اور دھجیوں کے نیچے سے خون آلود گوشت جھانکنے لگا۔ گلشن اور نبیلہ سہم کر بچے سمیت خیمے کے اندر جا چکی تھیں۔ لال بی بی بھی منہ موڑے کھڑی تھی۔ تیس پینتیس کوڑے رسید کرنے کے بعد جمعہ خاں کو چھوڑا گیا تو وہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اب جبار خاں کی باری آئی۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ ٹوٹی ہوئی پنڈلی نے اسے درد سے بے حال کر رکھا تھا۔ یہ وقت اسے کوڑے رسید کرنے کا نہیں اسپتال پہنچانے کا تھا۔ مجھے اس پر واقعی ترس آیا۔

میں نے خیمے کا رُخ کیا۔ نبیلہ بچے کو گود میں سمیٹے کانوں میں انگلیاں دیے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے شانے سے ہلایا تو وہ میری آمد سے آگاہ ہوئی۔ میں نے کہا "نبیلہ! تم لشکر خاں سے بات کرو۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بات مان جائے گا۔"

وہ خوف زدہ انداز میں نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس کے اندر کی بپھری ہوئی تند و عورت اب پھر چھوئی موئی سی ہو کر سو چکی تھی۔ اپنی آبرو کو جارحیت کے جبڑوں میں دیکھ کر اس نے جو جدوجہد کی تھی وہ بالکل غیر ارادی تھی۔ جونہی وہ کٹھن ترین گھڑیاں گزر گئی تھیں وہ اپنے آپ میں آ گئی تھی۔ دندانِ ہوس کے لیے لوہے کا چنا بن جانے والی اب پھر گوشت و پوست کی عورت تھی۔ وہ انکار میں سر ہلانے لگی "نن۔۔۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے زہر لگتے ہیں یہ۔ سارے۔ آپ۔۔۔ آپ خود بات کریں۔"

میں نے کہا "دیکھو نبیلہ! ہمیں دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو چننا ہے۔ اگر ہم یہاں سے بچ کر نکلنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے لشکر خاں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس وقت وہ ہماری خاطر اپنے آدمیوں کی کھال ادھیڑ رہا ہے ہماری خاطر بھی کیا تمہاری خاطر۔ اگر تم خود اپنے مجرموں کو معاف کر دو گی تو وہ اپنا ہاتھ روک لے گا۔ یہ خیر سگالی کا جذبہ ہم سب کے لیے سود مند ہو گا۔ چلو شاباش اٹھو۔۔۔ اس سے بات کرو۔"

میں نے بازو سے تھام کر نبیلہ کو اٹھایا۔ وہ ہراساں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ جبار خاں کو پہلا کوڑا مارا جا چکا تھا اور یہ ایک کوڑا کھا کر ہی اس نے پانی طلب کر لیا تھا۔ گھنی مونچھوں والا ایک شخص اسے پیالے سے پانی پلا رہا تھا۔ جبار خاں کا باجبروت چہرہ لیموں کے مانند زرد تھا اور زخمی ٹانگ مسلسل کانپتی چلی جا رہی تھی۔

"چلو نبیلہ" میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

وہ دھیمے قدموں سے باہر نکلی اور زخمی پاؤں پر لنگڑا کر چلتی ہوئی لشکر خاں کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کوئی بات کر رہی تھی۔ لشکر خاں نے پہلے تو واضح طور پر انکار میں سر ہلایا پھر اس کے چہرے پر تذبذب نظر آنے لگا۔ میں نے گلشن کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی لشکر خاں سے رحم کی درخواست کرے۔ وہ فوراً نبیلہ کی مدد کو پہنچ گئی۔۔۔ تھوڑی دیر میں ان دونوں نے لشکر خاں کے غضب کو ماند کر دیا۔

جمعہ خاں مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور وہ عجب مضحکہ خیز انداز میں تنے سے بندھا جھول رہا تھا۔۔۔ ڈکل پہ کرم ہونے کے بعد لشکر خاں نے باقی تینوں افراد کو کھلوایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ نبیلہ اور گلشن سے دست بستہ معافی مانگیں۔ معمولی تذبذب کے بعد تینوں افراد نے اس حکم کی تعمیل کی۔

سرما کی نرم دھوپ اب نشیب و فراز پر چمک رہی تھی۔ لشکر خاں کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں کو گھاس پر منہ مارنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ لشکر خاں خود بھی سستانے کے لیے خیمے میں آ گیا۔ ان سب کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ رات بھر زبردست بھاگ دوڑ میں مصروف رہے ہیں۔ تھکن سے چور ہونے کے علاوہ وہ بھوکے بھی تھے لیکن اس خیمے میں اتنا راشن نہیں تھا کہ سب کی پیٹ پوجا ہو سکتی اور اگر پیٹ پوجا ہو جاتی تو پھر اس خیمے کے مکینوں کو فاقہ کشی کا سامنا ہوتا۔ لشکر خاں کے استفسار پر لال بی بی نے مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی۔ اس کے بعد ہماری باری آئی۔ میں نے بلا کم و کاست سب کچھ لشکر خاں کے گوش گزار کر دیا۔ لشکر

خاں نے ایک بار پھر میری ہمت کی داد دی کہ میں عیسیٰ جان کو جل دے کر اس کی حراست سے نکل بھاگا تھا اور نہ صرف خود نکلا تھا بلکہ ایک مجبور عورت اور بچے کی مشکل بھی میرے سبب آسان ہو گئی تھی۔ لشکر خاں کو یہ جان کر دکھ ہوا کہ میرا ساتھی راستے میں بلندی سے گر کر لاپتا ہو گیا ہے۔ اس موقعے پر لشکر خاں نے انکشاف کیا کہ جیپوں تک پہنچنے سے پیشتر ہم نے بھاگتے ہوئے جو فائر کیے تھے ان میں سے ایک فائر نے عیسیٰ جان کے ایک قریبی ساتھی حشمت کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔

لشکر خاں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ رات بھر عیسیٰ جان اور لشکر خاں کے ساتھیوں میں آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے اور اس خونی آنکھ مچولی میں دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک یا زخمی ہو چکے ہیں۔ وقتی طور پر لشکر خاں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی۔ تاہم اس کے عزائم بلند تھے اور وہ عیسیٰ جان کے چہیتے شنکر شکرا کے خلاف آتش فشاں کے مانند کھول رہا تھا۔ لشکر خاں کا خیال تھا کہ گروہ میں پھوٹ کی وجہ صرف اور صرف شنکر ہے۔ عیسیٰ جان کی غیر موجودگی میں قائم مقام سردار لشکر خاں تھا لیکن جب سے شنکر آیا تھا اکثر معاملات اسی کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ عیسیٰ جان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں وہ بڑے دھڑلے سے حکم چلاتا اور من مانی کرتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے اس نے گروہ میں اپنے مخالفین کو بے جا تشدد کا نشانہ بنانا بھی شروع کر دیا تھا۔

لشکر خاں نے کہا "چار انسانوں کے زندہ جلنے کا منظر اماری آنکھوں میں نقش ہو چکا ہے اور ام ہی نہیں جس نے بھی وہ منظر دیکھا ہے کبھی بھول نہیں سکتا۔ خوام نے قسم کھایا ہے کہ اس کافر کو اس کرتوت کی سزا ضرور دے گا۔ اگر سزا نہ دے سکا تو رائفل پھینک دے گا اور مونچھ کٹوا کر گھر میں بیٹھ جائے گا۔"

لشکر خاں کے سارے ساتھی شنکر کے خلاف بھرے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شنکر نے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کروانے کے لیے ڈراما کھیلا ہے۔ اپنے دو ساتھیوں کو خود ہی قتل کروایا ہے اور الزام ان پر لگا دیا ہے۔

جن "دو ساتھیوں" کا ذکر ہو رہا تھا ان کے بارے میں مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔ وہ میرے ہی ہاتھوں عدم آباد رخصت ہوئے تھے۔ ان کی رخصتی غیر متوقع طور پر ایک زبردست کشمکش کا باعث بن گئی تھی اور عیسیٰ جان کے گروہ میں پہلے سے موجود بے چینی سیدھی سادی بغاوت میں بدل گئی تھی۔ باغی لشکر خاں تھا اور اس کے ساتھی تھے۔ انہوں نے شنکر اور عیسیٰ جان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ اب بھی اپنے سردار اعلیٰ عیسیٰ جان کے بارے میں ان کا رویہ زیادہ سخت نہیں۔ ان کی نفرت کا اصل نشانہ شنکر شکرا تھا جو بقول ان کے اپنی حرکتوں سے سردار کو باقی گروہ سے الگ تھلگ کر رہا تھا۔ لشکر خاں میرے بارے میں اب سبھی کچھ جان چکا تھا۔ سوائے اس بات کے کہ میں ہیڈ کانسٹیبل احسان الٰہی نہیں شاہجہاں ہوں۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں ایس پی برکت اور دیگر دو افراد کے ساتھ پنجاب سے عیسیٰ جان کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہاں کرم ایجنسی سے سویدا، مرجان اور شکاری کبیر علی شاہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ ہم شکاریوں کے بھیس میں ڈھوکی تالاب پہنچے تھے اور پچھلے کئی روز سے گرد و نواح میں گھوم رہے تھے۔ لشکر خاں نے پوچھا "اب تمہارا کیا ارادہ ہے کانسٹیبل صاحب؟"

میں نے کہا "ارادہ تو یہی ہے کہ کسی طرح اس جنگل سے نکل کر اپنے افسروں تک پہنچوں اور انہیں رپورٹ پیش کروں۔"

"مثلاً کیا رپورٹ پیش کرے گا تم؟"

"یہی کہ گروہ کا سراغ لگ گیا ہے اور چھاپا مار پارٹی کے ارکان کو ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا ہے۔"

"خو اس کے بعد کیا ہو گا۔ کیا تم یہ سوچتا ہے کہ کرم لیوی کیل کانٹے سے لیس ہو کر عیسیٰ جان کے ڈیرے پر دھاوا بول دے گا۔"

میں نے کہا "کرم لیوی دھاوا نہ بولے گی تو اپنے آدمیوں کو بچانے کی کوشش تو کرے گی۔ وہ سب ایجنسی کے ملازم ہیں اور ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔"

لشکر خاں نے کہا "لیکن امارا خیال ہے کہ اب عیسیٰ جان تم کو نہیں ملے گا۔ جس ڈیرے پر تم نے اسے دیکھا تھا وہاں اب تمہیں کتے بلی کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ ڈیرا تبدیل کر چکا ہے؟"

"پکا پکا بات ہے" لشکر خاں نے پورے یقین سے کہا "لیکن اماری بات کا یہ مطلب نہیں کہ تم واپس شہر نہ جاؤ اور اپنے بڑوں کو اطلاع نہ کرو۔ ضرور کرو بلکہ جتنا جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارے ساتھ دو جوان عورت ہے اور جس کے ساتھ جوان عورت ہو اسے عیسیٰ جان سے بہت بچ کر رہنا چاہیے۔ وہ بہت خراب کرتا ہے عورت کو لیکن ایک بات ام تم سے ضرور کہے گا۔"

"وہ کیا؟"

"ابھی تم یہاں سے نکلے گا تو یہ تمہارے لیے خطرناک ہوگا۔ عیسیٰ جان کا آدمی پاگل کتوں کے مافق چاروں طرف دوڑتا پھرتا ہے۔ یہ بڑا محفوظ جگہ ہے۔ تم یہاں آسانی سے پانچ چھ روز چھپ سکتا ہے۔ معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو تم پھر یہاں سے نکلو۔"

لشکر خاں نے ایک مفید رائے دی تھی۔ میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس گھاٹی سے باہر ہماری سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ پناہ کے لیے بہترین جگہ تھی یہ۔ میں نے لشکر خاں سے پوچھا کہ وہ اب کہاں جا رہا ہے۔ وہ بولا "زیادہ دور نہیں۔ ہو سکتا ہے شام تک ام بھی یہاں تمہارے پاس آ جائے۔ اس گھاٹی کا پیٹ بہت بڑا ہے۔ لشکر خاں تو کیا پورا لشکر یہاں سما سکتا ہے۔"

لشکر خاں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ پورا لشکر تو نہیں مگر پندرہ بیس افراد ایک دو خیموں میں یہاں با آسانی چھپ سکتے تھے۔ میں نے لشکر خاں سے کہا "سردار تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم یہ جنگل چھوڑو گے نہیں۔ عیسیٰ جان سے ٹکر لو گے۔"

وہ بولا "اماوا ٹکر عیسیٰ جان سے نہیں۔ اس کافر کے بچے شنکر سے ہے۔ ہم مجرم ہے لیکن وطن دشمن نہیں۔ وہ وطن دشمن ہے اور وطن دشمن اس کے پاس پناہ لیتے ہیں۔ راولپنڈی کے ایک جلسہ میں فائرنگ ہوا۔ کئی لوگ اپنی جان سے گیا۔ بیسیوں زخمی ہوا۔ اس فائرنگ کیس کا مجرم امارے پاس پناہ لیتا ہے او عیسیٰ جان شنکر کی خاطر ان ظالموں کو پناہ دیتا ہے۔ ام کو یہ منظور نہیں۔ ام کو شنکر بھی منظور نہیں۔ وہ مردود مارا جائے گا تو عیسیٰ جان پھر امارا اپنا ہو جائے گا۔ لاٹھیاں مارنے سے پانی پھٹ نہیں جاتا۔ عیسیٰ جان جیسا بھی ہے، اماوا سردار ہے اور ام اسے سردار ہی سمجھے گا۔ وہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ ام اسے راستے پر لائے گا اور اگر وہ نہیں آئے گا تو پھر امارے درمیان بندوق فیصلہ کرے گا۔" اس نے جوش کے عالم میں اپنی بندوق ہوا میں لہرائی اور اس کا چہرہ آگ بگولا دکھائی دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد لشکر خاں گھوڑے کی پشت پر سوار تھا اور اس کے تمام ساتھی عقب میں پا بہ رکاب تھے۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو نیم بے ہوش تھے۔ ایک جمعہ خاں جسے میں ورجن کے قریب کوڑے پڑے تھے اور دوسرا وہ حملہ آور جس کے چہرے پر میری رائفل کا بٹ لگا تھا۔ ان دونوں کو احتیاط سے گھوڑوں پر اوندھا لٹا دیا گیا تھا۔ جبار خاں کی ٹانگ کے گرد تین سیدھی لکڑیاں رکھ کر میں نے ایک پگڑی مضبوطی سے لپیٹ دی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے کچھ افیون بھی کھلا دی تھی اور اب وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔

لشکر خاں کے جاتے ہی لالی بی بی، گلشن اور نبیلہ وغیرہ نے مجھے گھیر لیا۔ رشید خاں بستر پر دراز تھا اور اس کی نگاہیں بھی مجھ پر ہی لگی تھیں۔ لالی بی بی نے بڑی محبت سے میرا منہ چوما اور بلائیں لینے لگی۔ میرے اور لشکر خاں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ سارے لوگ مجھے پولیس کانسٹیبل کی حیثیت سے جان چکے تھے۔ رشید خاں اپنی نحیف آواز میں بولا "ام کو پہلے ہی شبہ تھا کہ آپ صرف شکاری نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ پولیس میں وہ کر خاص قسم کا ٹریننگ ہوا ہے آپ نے... مگر حیرت کا بات ہے کہ آپ ابھی تک کانسٹیبل ہی ہے۔ آپ کو تو کوئی بڑا افسر ہونا چاہیے تھا۔ ڈپٹی کمشنر وغیرہ..."

رشید خاں اپنی معصومیت کے سبب میرے لیے "ڈپٹی کمشنر" کا عہدہ تجویز کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایسے عہدوں پر ہاتھ پاؤں کی طاقت سے نہیں کرسی کی طاقت سے لڑا جاتا ہے۔ اثر و رسوخ کے اڑنگے سے بڑے بڑے سورماؤں کو چت کیا جاتا ہے اور اختیار کی تلوار سے دشمنوں کے گلے کاٹے جاتے ہیں۔ ایک ناتواں شخص بھی ایسے عہدوں پر فائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر ایک حریص اور بے قرار روح موجود ہو۔ میں نے کہا "رشید خاں! مجھے اتنی بڑی بددعا نہ دو۔ ہیڈ کانسٹیبل ہو کر ایسی مصیبتوں سے واسطہ پڑ رہا ہے تو ڈپٹی کمشنر ہو کر کیا نہیں بیت جائے گی۔ میں کوئی ایسا کنگ کمانڈو بھی نہیں ہوں۔ بس عورتوں کی عزتی دیکھ کر اچانک دماغ گھوم گیا تھا۔ اب یہ سوچ کر ہول رہا ہوں کہ اگر جبار خاں کی طرح لشکر خاں کا بھی میٹر گھوم جاتا تو بڑا برا انجام ہوتا ہم سب کا۔"

لالی بی بی بدستور میرے لیے دعائیہ کلمات کہہ رہی تھی۔ رشید خاں نے کہا "آپ اپنے بارے میں کچھ بھی کہو مگر یہ سچ ہے کہ آپ امارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے انسان ہی رہنے دو بھائی۔ فرشتوں کو پولیس میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔ میرے ایس پی کو پتہ چل گیا کہ میں فرشتوں میں پاؤں دھرنے لگا ہوں تو کھڑے کھڑے میری چھٹی کرا دیں گے۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ روزگار سے محروم ہو گیا تو فرشتے کی جگہ انسان بھی نہیں رہ جاؤں گا۔"

گلشن نے اس گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "آپ کے یہاں ہونے سے ام کو بہت ڈھارس ملا ہے۔ اب ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ واپس نہ چلا جائے۔"

میں نے کہا "بی بی گلشن! غالب خستہ کے بغیر کوئی کام نہیں رکا کرتا۔ تم میری موجودگی کو رحمت سمجھ رہی ہو جبکہ اس ساری زحمت کا اصل سبب میں ہی ہوں۔ نہ میں یہاں ہوتا، نہ تمہاری ساس محترمہ صبح سویرے میرا منہ دھلانے باہر لے جاتیں، نہ وہاں پانی گرتا اور نہ کسی کو ہمارا کھوج ملتا۔ میری تو مخلصانہ رائے ہے کہ ہمیں اجازت دو اور اگر تم اپنی کسی مجبوری کے تحت اجازت نہ مانگیں تو زبردستی ہمیں اجازت عنایت کر کے اس خیمے سے چلتا کرو۔ خاص طور پر میری موجودگی کا رسک تو بالکل مت لو۔"

میں اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نتیجہ برعکس برآمد ہو رہا تھا۔ رشید خاں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ اپنا کانپتا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر بولا "ام آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہے بھائی صاحب! جہاں آپ نے اماوا اتنا مدد کیا ہے وہاں کچھ مدد اور کریں، وہ آپ کر بھی سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل اور حوصلہ دیا ہے۔ آپ..."

"کیسی مدد؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

وہ بولا "آپ دیکھتا ہے ام بیمار ہے۔ خیمے سے نہیں نکل سکتا۔ نہ اماوا ماں اور بیوی باہر جا سکتا ہے۔ آپ امارے بھائی کا پتا کر دیں۔ ام آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولے گا۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے رشید خاں باقاعدہ رونے لگا۔ گلشن اور لالی بی بی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ گم ہونے والا گھر کا سربراہ تھا۔ وہ اس کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ ان کے لیے راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ خود کہیں کھو گیا تھا۔ میں نے رشید خان سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور وعدہ کیا کہ مجھ سے اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکا، کروں گا۔

○☆○

ہم رات گئے تک خیمے میں جاگتے رہے۔ باتیں کرتے رہے، آگ سینکتے رہے اور قہوہ پیتے رہے۔ جلوت اور خلوت میں یہی فرق ہوتا ہے کہ خلوت میں چھوٹا سا غم بھی پہاڑ محسوس ہوتا ہے اور جلوت کی گہما گہمی میں چیختے چنگھاڑتے غم بھی گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہم پر بہت کچھ بیت چکا تھا مگر خیمے میں ہلکی پھلکی باتوں کا جو سلسلہ شروع تھا اس نے ہمیں بہت کچھ بھلا دیا تھا۔ لشکر خاں واپس نہیں آیا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ لشکر خاں کی موجودگی سے فائدے کے بجائے الٹا ہمارا نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ ایک خیمہ اس گھاٹی کے جھاڑ جھنکاڑ میں یوں گم تھا کہ بے نشاں ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر بیس تیس افراد مزید آ جاتے اور چھ سات خیمے اور لگ جاتے تو یہ پناہ گاہ، پناہ گاہ نہ رہتی۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے جب میں خیمے سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟" نبیلہ اور رشید خاں نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

"جہاں مجھے جانا چاہیے" میں نے جواب دیا۔

"مطلب؟" نبیلہ نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہو سکتا ہے عباس خاں زخمی حالت میں وہیں پڑا ہو جہاں گرا تھا۔ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا شخص کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اور ہم کل سے اب تک بہت سا وقت ضائع کر چکے ہیں۔ اب اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے آدھ پون گھنٹے میں میں وہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ بہت ہوا تو ایک گھنٹا لگ جائے گا۔ اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ دو بجے تک میری واپسی یقینی ہے..."

رشید خاں کی آنکھوں میں بے چینی نظر آنے لگی، بولا "بھائی جان نے بھی بالکل ایسا ہی بات کہا تھا۔ وہ دو گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا اور اب تک نہیں آیا۔ اب آپ جا رہے ہیں۔ یہ نہ ہو ام آپ کا بھی راہ دیکھتا رہ جائے۔ مت جاؤ بھائی صاحب۔ خواہ مخواہ خود کو خطرے میں مت ڈالو۔"

میں نے کہا "ایک طرف آپ لوگ کہتے ہیں کہ میں مرزا محمد کو تلاش کروں، دوسری طرف مجھے خیمے سے قدم باہر نہیں نکالنے دیتے۔ ایسا کیسے چلے گا۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ آپ لوگ اب نہتے نہیں ہیں، اسلحہ ہے آپ کے پاس۔ حوصلے سے کام لیں۔ کچھ نہیں ہوگا یہاں..."

اہل خیمہ کو تسلی تشفی دے کر میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سردی عروج پر تھی۔ میں نے جیکٹ کے نیچے مرزا محمد کی ایک پرانی صدری پہن لی۔ چہرے کو ہوا کے تھپیڑوں سے بچانے کے لیے گلشن کی ایک اونی شال سے کام لیا گیا۔ میں نے یہ شال ڈھاٹے کی طرح چہرے پر لپیٹ لی۔ لالی بی بی کی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ گولیوں والا بیلٹ کمر سے باندھ کر اور ایک ٹمٹماتی ٹارچ لے کر میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پٹھان زادی ہونے کے ناتے گلشن بھی اپنی ساس کی

طرح اسلحہ شناس تھی۔ میں نے سارس ہو کو سب مشین گن کا استعمال سمجھا دیا۔ وہ بہت کچھ پہلے سے جانتی تھیں صرف میگزین ایجیکٹ منٹ کے بارے میں بتانے کی ضرورت پڑی۔

خیمے سے باہر ہوا برف پوش تھی۔ سانس ہونٹوں سے نکلتے ہی جمنا شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے ٹارچ روشن کر لی اور احتیاط سے کھائی کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ کنارے کی پُر خطر ڈھلوان ٹارچ کے بغیر طے کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ جو گھوڑا میں نے سواری کے لیے منتخب کیا تھا وہ توانا ضرور تھا مگر سردی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ ڈھلوان عبور کرتے کرتے وہ تین چار دفعہ پھسلا اور ایک دفعہ تو لڑھکتے لڑھکتے بچا۔ مجھے احساس ہوا کہ سردی کے مارے جانور کو ڈھلوان پر لانے سے پہلے ذرا وارم اَپ کر لینا چاہیے تھا۔ جونہی ہم یخ بستہ اور دھند آلودہ گھاٹی سے برآمد ہوئے ہڈیوں میں اترتی ہوئی تند و تیز ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ لگا جیسے اب تک ہم ایک کمرے میں تھے اور اب کھلی جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ میرے سامنے تیرگی تھی اور اس تیرگی میں جھومتا ہوا جنگل تھا۔ زوئے مشت کا یہ جنگل اپنے اندر ان گنت بھید چھپائے ہوئے تھا۔ گھنے چھتنار درختوں کے نیچے اور ویران گھپاؤں میں ان گنت کہانیاں سنسنا رہی تھیں اور اسی جنگل میں یقیناً ایسی جگہیں بھی ہوں گی جہاں ابھی تک کسی انسان کا قدم نہیں پڑا ہو گا۔ چاند ستاروں کی فکر میں مبتلا ہونے والا ابنِ آدم ابھی اپنی زمین ہی کو پوری طرح نہیں دیکھ پایا۔ وہ چاند پر پاؤں رکھ کر خوش ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ ایسی جگہ پاؤں رکھ رہا ہے جہاں ابھی تک کسی انسان کا پاؤں نہیں پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ اس جنگل میں بھی کئی ایسے مقامات ہوں گے جو روزِ آفرینش سے انسانی آنکھ سے اوجھل ہوں گے۔ ایسی جگہوں پر جا کر کیا ہم یہ خوشی حاصل نہیں کر سکتے کہ ہم وہاں قدم رکھ رہے ہیں جہاں کروڑوں سال سے کسی کا قدم نہیں پڑا۔

میں نے اپنی یادداشت کے خانے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور ذہن میں سمتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جس وقت عباس خاں پھسل کر تاریک نشیب میں گرا ہم مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ اسی سمت میں تھوڑا آگے جا کر ہمیں جیپیں ملی تھیں اور جیپوں میں سے سب مشین گن ملی تھی جس کی مدد سے ہم موت کا گھیراؤ توڑنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہاں سے ہم نے جنوب کی طرف رخ کیا تھا اور بغیر کسی جانب مڑے کھائی تک پہنچے تھے۔ ان سمتوں کو ذہن میں رکھا جاتا تو عباس خاں تک پہنچنے کے لیے مجھے جنوب مشرق کی سمت تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

میں گھوڑے کو ڈُکی چال چلاتا گھنے درختوں میں محوِ سفر رہا۔ یہ پہاڑی علاقے میں پلا ہوا گھوڑا تھا۔ اس میں اور میدانی گھوڑے میں وہی فرق تھا جو جیپ اور کار میں ہوتا ہے۔ نشیب و فراز کو پھلانگتا خطرناک راستوں سے بچتا اور محفوظ رستے اختیار کرتا وہ بلا رکے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اب اس کے پاؤں میں لرزش تھی نہ جسم میں تناؤ۔ لگتا تھا سفر کے شروع میں بُری طرح پھسلنے کی خفت وہ اپنی رواں دواں چال سے دور کرنا چاہتا ہے۔

جب کسی وقت وہ کسی گڑھے کو عبور کرنے کے لیے اچھلتا تو میری جیکٹ کی جیب میں پڑی ہوئی طلائی چوڑیاں اور دوسرا زیور کھنک اٹھتا۔ یہ زیور ابھی تھوڑی دیر پہلے خیمے میں نبیلہ نے میرے حوالے کیا تھا۔ یہ وہ زیور تھا جو عیسیٰ جان نے اسے دیا تھا اور جسے ہر رات پہن کر کانٹوں کے بستر پر عیسیٰ جان کا انتظار کرنا نبیلہ کی مجبوری تھی۔ جونہی یہ مجبوری دور ہوئی تھی نبیلہ نے یہ زیور اپنے جسم سے نوچ کر علیحدہ کر دیا تھا۔ بالکل جیسے کوئی سانپ بچھو کو اپنے جسم سے علیحدہ کرتا ہے اور اسے دور پھینک دینا چاہتا ہے۔ زیور مجھے دے کر وہ بولی تھی "اسے رستے میں کہیں پھینک دیں آپ" میں نے زیور کی طرف دیکھا تھا۔ کم و بیش پندرہ ہزار کا سونا تھا اور وہ اسے پھینکنے کے لیے کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کی دلی کیفیت کو سمجھ رہا تھا میں۔ اس کے پاس متبادل انتظام نہیں تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنا قیمتی لباس بھی اتار کر آگ پر رکھ دیتی۔ بات کپڑے اور زیور کی نہیں ہوتی، اس نیت کی ہوتی ہے جس سے یہ چیزیں عورت کو پہنائی جاتی ہیں۔ کبھی پیتل کا زیور اور معمولی سرخ جوڑا زندگی بھر کے لیے عورت کی آنکھوں کا نور بن جاتا ہے اور کبھی ہیروں جڑے گہنے اور اطلس و کمخواب کے پیراہن اسے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ ایک طرف میری جیب میں کھنکتے ہوئے طلائی زیور تھے جن میں ایک عورت کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور دوسری طرف میرے چہرے پر لپٹی ہوئی ایک معمولی شال تھی جس میں سہاگ کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میرا دھیان ان زیوروں سے شال کی طرف منعطف ہو گیا۔ یہ گلشن کی شال تھی۔ کوئی مجھ سے پوچھتا تو میں اسے بتاتا کہ اس شال کی کیا قیمت ہے اور وہ زیور کتنے بے وقعت ہیں۔

مجھے اپنی متعین کردہ سمت میں سفر کرتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا اور ابھی تک گرد و نواح میرے لیے قطعی

اجنبی تھے۔ کوئی شناسا ٹیلا، رستہ یا جھنڈ نظر نہیں آتا تھا۔ ہاں ایک مقام پر چند سایوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یقیناً وہ خطرناک لوگ ہوں گے۔ میری خوش قسمتی کہ میں نے بروقت خود کو ایک آڑ میں چھپا لیا اور بچ گیا۔ میں نے پندرہ بیس منٹ مزید گھوڑا ہنکایا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ میں راستہ کھو چکا ہوں۔ افسوس ضرور ہوا لیکن یہ کوئی ایسی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ میں جانتا تھا اس کوشش میں کامیابی ناکامی کے امکانات مساوی ہیں۔ تیرہ و تاریک جنگل، افراتفری کا عالم اور بے نشان راستے۔ ایسے میں کسی گم کردہ مقام کو ڈھونڈ لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور میں یہ جوئے شیر نہیں لا سکا تھا۔ تاہم واپس جانے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ تھوڑی سی کوشش اور کی جائے۔ نئے سرے سے ایک بار پھر ذہن میں نقشہ کھینچ کر سمتوں کا تعین کیا اور سفر کا رخ جنوب مشرق سے مشرق کی طرف پھیر لیا۔

آدھ پون گھنٹے کی جنگل نوردی کے بعد اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک جانی پہچانی جگہ کے نزدیک پہنچ چکا ہوں۔ بڑا غیر متوقع انکشاف تھا یہ۔ میں اپنے تئیں جہاں سمجھ رہا تھا وہاں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر اور بالکل مختلف سمت میں۔ بے آباد علاقوں اور دشوار گزار راستوں پر سفر کرنے والے جانتے ہیں کہ وہاں مسافر کیسے بھٹکتا ہے اور سمتوں کا فریب کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ ایسے علاقوں میں سفر کرتے ہوئے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ آپ دو روز کے جاں گسل سفر کے بعد خود کو اسی مقام پر پائیں جہاں سے روانہ ہوئے تھے یا پھر اندھیری رات میں تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہو کہ یہ سفر دائرے کا سفر تھا۔ بھٹکنے والے نے سفر تو نہیں کیا تھا لیکن اپنی مطلوبہ جگہ سے کافی دور نکل گیا تھا۔ یہ جانوروں اور انسانوں کو ایک گھاٹ پانی پلانے والا چھوٹا سا آبی ذخیرہ تھا۔ میں اپنے "جنبی کیمپ" ڈھوکی باب سے پائندہ بستی کی طرف جاتے ہوئے دو مرتبہ یہاں سے گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ میں پہلوان شہباز کا تعاقب کر رہا تھا اور اس نے یہاں رک کر اپنے لنگڑے گھوڑے کو پانی پلایا تھا۔ دوسری مرتبہ غلام خاں کی آواز سن کر مجھے یہاں رکنا پڑا تھا۔ بعد ازاں جب عباس خاں اور میں نے ایک کھوہ میں جھانک کر دیکھا تھا تو غلام خاں ایک گمنام گڑھے کو بیٹھا پایا گیا تھا۔

وہ تمام مناظر میری نگاہوں میں تازہ ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی نجو کا خیال برق کی طرح ذہن میں کوندا۔ یہ سب کہ جیسے اب تک نجو اور اس کے خیالات نے ڈھکا ہوا تھا۔ سب کچھ میرے ذہن میں تھا لیکن واقعات کی تیز رفتاری مجھے سانس لینے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ میں دو گھنٹے پہلے خیمے سے روانہ ہوا تو اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ پائندہ بستی میں نجو میری منتظر ہے اور مجھے اس کے پاس جانا ہے لیکن عباس خاں تک پہنچنا نجو سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ اگر عباس خاں زخمی تھا اور کسی تنگ و تاریک کھائی میں پڑا سسک رہا تھا تو گزرنے والا ہر لمحہ اس کی زندگی کے لیے ایک قیمت رکھتا تھا۔ میں نے انتہائی خلوص سے تمام خطرات کو نظر انداز کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن پہنچ نہیں سکا تھا۔ نجو تک۔ شاید انسانی ارادوں کی یہی ناکامی اور حالات کا یہی ان جانا بہاؤ اہلِ فکر کے لیے قدرت کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور وہ بے ساختہ یہ اعلان کرنے لگتے ہیں کہ ہاں قدرت ہے۔ کوئی برتر قوت ہے جو نظامِ ہستی چلا رہی ہے۔ کرشمہ سازیاں کر رہی ہے، حیرانیاں بکھیر رہی ہے اور انہونیوں کو ہونیوں میں بدل رہی ہے۔

پائندہ بستی یہاں سے صرف ایک گھنٹے کے راستے پر تھی اور راستہ بھی میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے ذہن کی سلیٹ سے عباس خاں کا نام صاف کر کے نجو کا نام لکھا اور گھوڑے کا رخ پائندہ بستی کی طرف موڑ دیا۔ ہوا اب ٹھہر گئی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کے جھومتے بھوت اب پرسکون نظر آتے تھے۔ گاہے گاہے دور یا نزدیک سے کسی شب بیدار جانور کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ تاریکی کی دبیز چادر میں چھپا ہوا کوئی چرخ یا گیدڑ جاگ جاتا تو فوراً یہ احساس ہوتا کہ یہاں کسی بھی وقت کسی خطرناک جانور سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ ایسے میں رشید خاں کی بات کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے کہا تھا کہ زوئے مشت کے ان نشیب و فراز میں جنگلی جانوروں کے علاوہ انسان بھی ملتے ہیں مگر خصلت ان انسانوں کی بھی جانوروں سی ہے۔

میں نے جان بوجھ کر دشوار گزار راستے اختیار کیے تاکہ جانور نما انسانوں سے مڈبھیڑ کے امکانات کم سے کم ہوں۔ بے حد محتاط انداز میں سفر کرتا ہوا میں تقریباً ایک گھنٹے میں پائندہ بستی پہنچ گیا۔ بادل اب آزاد ہو چکے تھے اور ہوا بھی ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھی۔ آسمان پر تاروں کی روشنی تھی لہٰذا ارد گرد کے مناظر قدرے واضح نظر آ رہے تھے۔ میرے بائیں جانب درختوں کا وہ جھنڈ تھا جہاں ایک پھندے میں میرا تخنہ پھنسا تھا اور لنگڑ خاں نامی شخص کا ایک کتا میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ دائیں طرف نشیب میں بہت سمت خانہ بدوشوں کے جھونپڑے اور اونی خیمے تھے۔ ان

جھونپڑوں اور خیموں میں رات کے اس آخری پہر بھی کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید ان روشن جھونپڑوں میں ایک جھونپڑا نجو کا بھی ہو۔ وہ اس کا دیپ جلائے پہلوان کا اور میرا انتظار کر رہی ہو۔ یہ خیال آتے ہی سینے میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

میں چھ روز پہلے اس بستی سے روانہ ہوا تھا تو میں نے نجو سے ایک وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ آرام سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹے۔ پہلوان شہباز کو ڈھونڈ کر لانا میرا کام ہے اور میں اسے لے کر آؤں گا۔ آج آتی تاخیر کے ساتھ میں آیا بھی تھا تو خالی ہاتھ تھا۔ نجو کے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ دل میں آئی کتنا اچھا ہو کہ پہلوان شہباز خود ہی واپس آ چکا ہو۔ وہ رو برو کر نجو سے اپنی غلطی کی معافی مانگ چکا ہو اور دونوں میں زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان ہو چکے ہوں۔ وہ چاندی کے زیور، وہ بھڑکیلے جڑے لباس اور وہ سارے خواب جو شہباز نے نجو کو دکھائے تھے اور جن پر وہ اپنا حق سمجھتی تھی اسے واپس مل چکے ہوں۔ پیسے کے زور پر خریدی ہوئی یاسمین ان دونوں کے درمیان سے یوں نکل چکی ہو جیسے کبھی تھی ہی نہیں..... لیکن یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں۔ شہباز لوٹنے کے لیے نہیں گیا تھا اور وہ لوٹتا بھی کیوں۔ اس پُر خطر ویرانے سے دور زیارا چنار کی کسی پُر سکون چار دیواری میں وہ ایک نوخیز دلہن کے باغِ حُسن سے خوشہ چینی کر رہا تھا۔ نہ اتنی جلدی وہ باغ بے ثمر ہونے والا تھا اور نہ شہباز کا پاپی پیٹ اتنی جلدی بھرنے والا تھا۔ شاید چند ہفتوں یا مہینوں بعد اسے احساس ہوتا کہ اس نے نجو کے ساتھ ظلم کیا ہے لیکن فی الحال تو وہ اونچی ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

میں نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور دھیمی رفتار سے ڈھلوان طے کرنے لگا۔ ہوا کے دوش پر اجنبی جسم کی بُو سونگھتے ہی بستی کے کتوں نے زور و شور سے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور میں کسی بھی متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ جلد ہی بستی کے دو گھڑ سوار پہرے دار میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ سردی کی وجہ سے انہوں نے منہ سر لپیٹ رکھے تھے۔ ایک پہرے دار کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے کمبل کی بُکل میں سے ہاتھ باہر نکال کر ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پھینکی۔ مجھے یاد آیا کہ پہرے داروں کی طرح میں نے بھی اپنا چہرہ چھپا رکھا ہے۔ جونہی اونی شال میں نے چہرے سے ہٹائی ان دونوں نے مجھے پہچان لیا۔ ٹارچ والے گھڑ سوار نے اپنی رائفل دوبارہ کندھے سے آویزاں کر لی۔ دوسری رائفل کی نال بھی، جو خطرناک انداز میں میری جانب اٹھی ہوئی تھی، جھک گئی۔ پہرے دار جانتے تھے کہ میں ان کی زبان سے نا آشنا ہوں پھر بھی رسمی انداز میں انہوں نے چند کلمات ادا کیے جن کا لب لباب یقیناً علیک سلیک تھا۔ میں صرف مسکرانے اور سر ہلانے پر اکتفا کرتا رہا۔ وہ مجھے لے کر بستی کی طرف چل دیے۔ مجھے پہرے داروں کے ساتھ دیکھ کر کتوں کی بھونکا بھانکی ماند پڑ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم سردار بشر گل کے جنازی سائز جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے۔

پہرے دار چند لمحے آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے شاید سوچ رہے تھے کہ اتنی رات گئے سردار کو جگائیں یا نہیں۔ پھر ایک پہرے دار غالباً سردار کو جگانے کے لیے ہی آگے بڑھا تھا مگر ایک دم اسے رکنا پڑا۔ جھونپڑے کا چوبی دروازہ کھلا اور سردار بشر گل رائفل تانے باہر نکل آیا۔ پہرے دار نے جلدی سے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور بشر گل سے میرا تعارف کرایا۔ مجھے پہچان کر بشر گل کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔ میں اڑتالیس گھنٹے کی مہلت لے کر گیا تھا اور اب پورے چھ روز بعد شکل دکھا رہا تھا۔ پہرے داروں نے میرا گھوڑا ایک طرف باندھ دیا اور میں سردار بشر گل کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ وسط میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور رنگین قالین پر گاؤ تکیے بکھرے ہوئے تھے۔ کہنے کو یہ جھونپڑا تھا لیکن "رتبے" کو کسی بنگلے سے کم نہیں تھا۔ سردار نے اپنی رائفل ایک طرف رکھ کر لالٹین کی لو اونچی کی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں برہم نظر آتی تھیں اور دبیز مونچھوں تلے ہونٹ جیسے مجھ پر برس پڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ اس بڑبڑاہٹ کے دوران وہ گاہے گاہے مجھ سے کوئی سوال بھی پوچھ رہا تھا۔ ظاہر ہے یہی پوچھ رہا تھا کہ تین بتیاں گزاری اتنی رات دیر اور ۔۔۔ کیوں گزاری اتنی ۔۔۔ اور وہ دوسرا جن کہاں ہے جو میرے لیے مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں گونگے کی ماں کی طرح بشر گل کی ساری رمزیں سمجھ رہا تھا مگر صرف رمزیں سمجھنے سے گزارا مشکل تھا۔ میں نے اپنی پتلون کی جیب تھپتھپائی اور اشاروں کی زبان میں بشر گل کو سمجھایا کہ میں رقم لے آیا ہوں لڑکی کہاں ہے؟ جواب میں کسی درجہ اطمینان کا اظہار کرنے کے بجائے بشر گل بدستور ۔۔۔

مجھے سنہ بتاتا رہا۔

اچانک مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ نجو کے ساتھ کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ بدترین حالات میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں کسی وقت کوئی بھی آفت اس پر ٹوٹ سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی ہی غلطی سے کسی مصیبت کا شکار ہو جاتی۔ آخری ملاقات میں میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے قراری دیکھی تھی جو جال میں پھنسی ہوئی کونج کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ وہ جال توڑ کر اڑنا چاہتی ہے، اس گمشدہ رفاقت کی تلاش میں جس کے بغیر وہ نامکمل ہے۔۔۔ کہیں نجو نے بھی تو یہ جال توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کئی طرح کے اندیشے میرے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ میں نے ایک بار پھر شہادت کی انگلی سے ناک کو چھوا اور بشر گل سے اشاراتی زبان میں پوچھا کہ نجو کہاں ہے۔ اس نے ٹریفک پولیس کے منچلے سپاہی کی طرح بازو پھیلا کر بائیں جانب اشارہ کیا اور بڑبڑانے لگا۔ بائیں جانب جھونپڑے کا زنان خانہ تھا۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں یہ سمجھا کہ نجو بشر گل کے زنان خانے میں ہے یعنی قصہ پاک ہو چکا ہے اس کا لیکن پھر فوراً ذہن نے دلیل دی کہ بشر گل یوں مجھے اپنے حرم میں گھسنے کی ہدایت جاری نہیں کر سکتا۔ بائیں جانب سے اس کی مراد جھونپڑے سے باہر بائیں جانب ہے۔ بروقت بات ذہن میں آ گئی تھی ورنہ زبردست دنگا فساد ہوتا تھا۔ زنانہ حصے میں یقیناً بشر گل کی سب سے چھوٹی اور سب سے چہیتی بیوی تھی۔ رات کے اس پہر وہ فطری لباس سمیت کسی بھی لباس میں ہو سکتی تھی۔ میں اندر قدم رکھتا تو یقیناً بشر گل میرا قتل اپنے اوپر فرض کر لیتا۔

بشر گل کا مطمح نظر جاننے کے بعد میں جھونپڑے سے باہر نکلا اور درمیانی رفتار سے نجو کے جھونپڑے کی طرف چل رہا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد بھی جب مجھے روکا نہیں گیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے "گونگے کی رمز" سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے۔ بشر گل نے مجھے نجو کے جھونپڑے کی طرف ہی روانہ کیا تھا۔ پہرے داروں میں سے ٹارچ بردار پہرے دار سائے کی طرح میرے پیچھے آ رہا تھا اور پوری طرح چوکس تھا۔ نجو کے جھونپڑے سے میرا فاصلہ جوں جوں کم ہو رہا تھا، دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھی؟ اکیلی تھی یا کسی کے ساتھ تھی اور تھی بھی یا نہیں۔ جونہی میں جھونپڑے کے سامنے پہنچا، ایک لمبا تڑنگا شخص قریبی سائبان سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ یوں لگا جیسے وہ خاص طور پر نجو کی حفاظت کے لیے ہی یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے منہ سر ایک دبیز کمبل میں لپیٹ رکھا تھا پھر بھی میں اسے پہچان گیا۔ یہ لنگر خاں تھا۔ اس نے مجھ پر کتا چھوڑا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ غالباً وہ بھی مجھے نہیں بھول سکتا تھا کیونکہ میں نے اس کا کتا مار دیا تھا۔ مجھے پہچانتے ہی لنگر خاں کی آنکھوں میں حیرت آمیز غصے کی جھلک نظر آئی۔ اس نے بازو پھیلا کر بڑی درشتی سے میرا راستہ روک لیا۔ میرے پیچھے ٹارچ بردار پہرے دار آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے پکار کر لنگر خاں کو تنبیہ کی کہ مجھ سے الجھنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ جھونپڑے میں جانے کی اجازت مجھے سردار نے دی ہے۔ لنگر خاں مجھے گھورتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ مجھے توپ کے منہ پر رکھ کر اُڑا دیتا۔ اس کا یہ غیر معمولی طیش اور معاندانہ رویّہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کتے والے معاملے پر تو راضی نامہ ہو چکا تھا اور لنگر خاں ہرجانے کے طور پر پانچ سو روپیہ بھی وصول کر چکا تھا پھر یہ نگاہوں کی شعلہ فشانی کیا تھی؟

"نجو!" میں نے جھونپڑے کے در پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

فوراً اندر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی اور روزنوں سے جھانکتی ہوئی روشنی نمایاں ہو گئی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ میری آواز سے یقیناً اچھل کر کھڑی ہوتی تھی۔ جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور میں نے "سانولی حسینہ" کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے لمبے بال ہموار شانوں پر بے ترتیب تھے۔ دروازہ کھولتے ہوئے گرم چادر اس کے سر سے پھسل گئی تھی اور اب جسم سے بھی پھسلتی جا رہی تھی۔۔۔ جسم جو تصویر تھا، جسم جو شاہکار تھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے اور شفاف پتلیاں کہہ رہی تھیں کہ وہ دیر تک اور موسلا دھار روتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم پھر رو پڑی۔ ایک ہی لمحے میں آنکھوں کے پیمانے بھرے، چھلکے اور بہہ نکلے۔ میں اس سرعت پر حیران رہ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ چادر کا پلو منہ میں ٹھونس کر وہ جلدی سے پلٹ گئی۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو نجو؟" میں نے پوچھا۔

"جی" اس نے اقرار میں سر ہلایا اور تیزی سے جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے بتائے بغیر ہی جان گئی ہے کہ شہباز پہلوان میرے ساتھ نہیں آیا اور یہ بھی جان گئی ہے کہ میرے پاس اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں۔ چند ہی لمحے بعد وہ واپس میرے

سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ آنسوؤں کے دھاروں پر قابو پا چکی تھی۔ "آپ نے بہت دیر لگا دی۔" اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

وہ اصل سوال نظرانداز کر رہی تھی اور اصل سوال شہباز کے بارے میں تھا۔ اس کے ملنے یا نہ ملنے کے متعلق تھا اور جیسے وہ سوال کو نظرانداز کر رہی تھی ویسے ہی میں جواب سے پہلو بچا رہا تھا۔ یہ چاہ رہا تھا کہ باتوں ہی باتوں میں اسے پتا چل جائے کہ شہباز کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں جیسے خالی ہاتھ گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا ہوں۔ خود کو مشکل میں دیکھ کر میں نے زبان دانی کا سہارا لیا اور نرم و ملائم لفظوں میں لپیٹ کر یہ سخت نوکیلی خبر اس کے دائرۂ سماعت میں دھکیل دی کہ میں فی الحال شہباز کو اپنے ساتھ نہیں لا سکا ہوں۔ تاہم اس کے ساتھ اسے یہ تسلی دی کہ شہباز کا پتا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے اور بہت جلد میں اسے ڈھونڈ لوں گا۔ میری یہ بات کوئی ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ شہباز کے سسر مرحوم غلام خان کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شہباز نے یا ڈیپنار کا رخ کیا ہے اور وہاں بس اڈے کے قریب رحمان زئی نامی ایک تکا فروش سے اس کے ٹھکانے کا پتا چل سکتا ہے۔ نجو اس بے وفا کی طرف سے بے حد فکرمند تھی۔ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتی تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ میں نے ان تمام سوالوں کا منہ ایک ہی جواب سے بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نجو! اگر مجھ پر بھروسا کر رہی ہو تو پھر پورا بھروسا کرو۔ فی الحال میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ہاں یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ خیریت سے ہے اور بہت جلد تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

نجو جذباتی لہجے میں بولی "حبیب جی! میں تو زندگی بھر اس کا انتظار کر سکتی ہوں پر یہ ونیڈرا لے انتظار کرنے دیں تو پھر ہے نا۔" ایک دم پھر اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا "سردار بشر گل نے کوئی بات کی ہے؟"

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنی جلدی آنکھیں پھیر لیں گے۔ کل تک سردار بشر گل ہمارا گھر آباد کرنے کی باتیں کرتا تھا اور کہتا تھا تم اس کے مہمان ہیں۔ اس کے گھر کے جی ہیں مگر شہباز کے جاتے ہی وہ غیر ہو گیا ہے۔ جمعرات کے روز اس نے اپنی سب سے چھوٹی بیوی کو میرے جھونپڑے میں بھیجا تھا۔ وہ بہت دیر یہاں بیٹھی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں کا کوئی کوئی لفظ ہی میری سمجھ میں آتا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھے کسی غلط کام کے لیے تیار کر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھے حوصلہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ کام مجھ کو کرنا ہی پڑے گا۔ پھر جی اس عورت جوگی نے ایک بندے کو جھونپڑے میں بلا لیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تکنے لگا اور بشر گل کی بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ اس بندے کا نام لنگر خاں ہے اور وہ اب بھی جھونپڑے کے باہر بیٹھا میری چوکیداری کر رہا ہے۔ یہ بات جمعرات کو ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ بشر گل اور اس کی بیوی مجھے لنگر خاں کے ہاتھ بیچ دینا چاہتے ہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کھڑے کھڑے مجھے موت آ جائے یا زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں بغیر کچھ کھائے پیئے جھونپڑے میں پڑی رہی اور روتی رہی۔ کل سردار بشر گل خود میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریشمی جوڑا تھا۔ یہ جوڑا اس نے میری جھولی میں رکھ دیا۔ سردار کے ساتھ لنگر خاں بھی تھا۔ لنگر خاں کو دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ میں نے جوڑا اٹھا کر انگیٹھی پر پھینک دیا۔ سردار بشر گل نے مجھے تھپڑ مارا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ میرے منہ میں بھی جو آیا میں نے کہا۔ نہ اس کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی نہ میرا کہا ہوا وہ سمجھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سردار مجھے دھمکیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جھونپڑے کے دروازے پر ایک رائفل والا آن کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ اب میں اپنی مرضی سے باہر پاؤں نہیں رکھ سکتی۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت آئی اور ایک نیا جوڑا میرے سامنے پھینک گئی۔ یہ دیکھیں۔ یہ ہیں وہ دونوں جوڑے۔" نجو نے جھونپڑے میں بچھی چٹائی ایک طرف سے اٹھائی اور نیچے سے کپڑے کے دو گولے نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ سیپیوں جڑے دو ریشمی جوڑے تھے اور ان میں سے ایک جگہ جگہ سے جلا ہوا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں ذرا دشواری نہیں ہوئی کہ یہ عروسی جوڑے ہیں۔ میں نے اس پائندہ بستی میں کئی نو بیاہتا عورتوں کو ایسے ہی گلابی لباس میں دیکھا تھا۔ خود شہباز پہلوان کے ٹرنک میں بھی ایک ایسا ہی زرق برق جوڑا نظر آیا تھا۔

نجو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں رو رو کر ہلکان ہوتی رہی۔ نہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی اور نہ اب آ رہی ہے کہ سردار نے اتنی جلدی آنکھیں کیوں پھیر لی ہیں۔ کسی عورت کا مرد گم ہو جائے تو بڑے بوڑھے کئی سال اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں۔ شہباز تو گم بھی نہیں ہوا۔ اپنے کام سے خود کہیں گیا ہے اور اس کے جاتے ہی یہ لوگ مجھے دوہتی بنانے لگ گئے ہیں۔" نجو کی

آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ وہ پائندوں کے رویے پر حیران تھی کہ شہباز کے جاتے ہی وہ کیوں بدل گئے ہیں۔ اسے اصل حقیقت معلوم نہیں تھی۔ شہباز اسے آٹھ ہزار میں فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا چکا تھا۔ اب وہ اس جھونپڑے کی کھڑکی سے لگ کر تمام عمر بھی اس کی راہ دیکھتی تو اسے نہیں آنا تھا اور جن لوگوں نے رقم خرچ کی تھی انہوں نے وصول بھی کرنا تھی۔ یقیناً سردار بشر گل نے اپنے تئیں یہ محسوس کیا تھا کہ میں ایک کالی کلوٹی حاملہ عورت کے لیے سات ہزار کی رقم لے کر نہیں آؤں گا لہٰذا اس نے میرا زیادہ انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور مہلت ختم ہونے کے دو دن بعد ہی لنگر خاں سے سودا پٹا لیا تھا۔

میں نے نجو سے پوچھا "تم نے یہ جوڑا پہنا تو نہیں؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگی، بولی "سردار کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے سردار کے سامنے اونچا نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اسے ناراض کر کے میں اپنا ہی نقصان کر رہی تھی۔ اگر مجھے کوئی لنگر خاں سے بچا سکتا تھا تو وہ سردار تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس سے ملنا چاہیے۔ پر بات پھر "بولی" پر آ جاتی تھی۔ نہ میں سردار کی بولی سمجھتی ہوں نہ وہ میری۔ میں تو کسی کو یہ بھی نہیں سمجھا سکتی تھی کہ سردار سے ملنا چاہتی ہوں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ شام ہوتے ہی جھونپڑے کے باہر سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ لنگر خاں کے ساتھی تھے اور کسی طرح کی خوشی منا رہے تھے۔ میں یہیں انگیٹھی کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ سردار خود ہی جھونپڑے میں آ گیا۔ میں نے رو رو کر اس کی منت کی کہ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے۔ میرا مرد اللہ نہ کرے مجھے چھوڑ نہیں گیا۔ وہ کسی کام سے گیا ہے اور جلد واپس آ جائے گا۔ میرے رونے بلکنے کا بشر گل پر کچھ اثر ہوا۔ وہ جھونپڑے سے باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک بچے کو لے کر واپس آ گیا۔ نو دس سال کا یہ بچہ اردو کا کوئی کوئی لفظ بول لیتا تھا۔ وہ لڑکا مجھے بہت دیر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مجھے دکھاتا تھا اور "دس۔۔۔ دن" کہہ کر ریشمی جوڑے کی طرف اشارہ کرنے لگتا تھا۔ بہت دیر کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ بشر گل مجھ پر ترس کھاتے ہوئے مجھے دس دن کی مہلت دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ دس دن تک شہباز آ گیا تو ٹھیک، نہیں تو مجھے یہ جوڑا پہننا پڑے گا۔" بات ختم کر کے نجو نے سر جھکا لیا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ جھونپڑے کے سامنے لنگر خاں نے سوٹا پھٹا کر میرا راستہ کیوں روک لیا تھا۔ مجھے کچھ ایسی نفرت اس کی جنگلی جانور کی سی ہوئی تھی جس کے منہ سے کسی نے شکار چھین لیا ہو۔ سردار کا کارندہ میرے عقب میں نہ ہوتا تو شاید وہ جنگلی جانور ہی کی طرح مجھ پر جھپٹ بھی پڑتا۔

میری اور نجو کی گفتگو کے دوران ہی سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا اور بستی میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ یقیناً یہ خبر بستی میں گرم ہو چکی تھی کہ نجو کے دو والی وارثوں میں سے ایک آ گیا ہے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر تجسس نگاہوں والی کئی عورتوں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ آخر میں نے اٹھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ نجو جلدی جلدی میرے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ پچھلے ایک ہفتے کا تمام اندوہ اس کی آنکھوں کے راستے بہہ کر نکل چکا تھا اور اب وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اسے جھونپڑے میں تیزی سے ادھر اُدھر گھومتے دیکھنا ایک دلچسپ تجربہ تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی یہ تجربہ کر رہا تھا۔ اکثر عورت کی ملاحت اسے اور حسین بنا دیتی ہے یا شاید یہ مرد کی نگاہ کا خبث ہے جو عورت کو ملول دیکھنا چاہتا ہے۔ میری چور نگاہیں اس کے سراپا سے ٹکراتی رہیں اور دل میں کھُدبُد ہوتی رہی۔ بڑا بدنصیب تھا یہ شہباز بھی۔ یا شاید اسے اس سراپا کی قدر ہی نہیں تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر "بندر کیا جانے ادرک کا سواد" والا محاورہ اس پر صادق آتا تھا بلکہ میرے خیال میں نجو کے ارد گرد رہنے والے بہت سے مردوں پر یہ محاورہ صادق آتا تھا۔ یہ بے مثال بدن کسی قدردان کی نگاہوں میں آتا تو وہ اش اش کر اٹھتا۔ یہ ایک ایسا دمکتا ہوا ہیرا تھا جو کیچڑ میں پڑا تھا اور جس کے گرد بے ذوق کیچوے رینگ رہے تھے۔

خوشبو بتا رہی تھی کہ نجو میرے لیے ٹھیک ٹھاک ناشتا تیار کر رہی ہے۔ اس میں دیسی گھی کا پراٹھا تھا۔ انڈے کا حلوہ تھا اور چائے، باقرخانی وغیرہ بھی تھی لیکن اس ناشتے کے ساتھ "دشمن کہاں کند" والا حساب ہوا۔ ابھی سجائی نے میری ہوتی ہوئی بھوک کے حوالے ہونے ہی والی تھی کہ جھونپڑے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی طیش میں بھری غراہٹیں ابھریں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے لنگر خاں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ سردار بشر گل کا چھوٹا بھائی رُستم تھا۔ وہ دونوں مجھے لینے آئے تھے۔ رُستم نے سردار کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے دو تین بار کچھ کہا۔ ان الفاظ میں "معنی" کا لفظ نمایاں تھا۔ میں جانتا تھا "معنی" کرنے والا مترجم کو کہتے ہیں یعنی رُستم بتا رہا تھا کہ جھونپڑے میں مترجم

موجود ہے اور سردار اس کے ذریعے مجھ سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے اس بستی میں کسی مترجم کا نام نشان نہیں تھا۔ اب اردو بولنے والا نہ جانے کہاں سے مل گیا تھا۔

میں نے اپنی رائفل سنبھالی اور ناشتے کے لیے ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا لنگر خاں اور رستم کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں بستی کے لوگ مجھے رک رک کر دیکھتے اور چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ میرے ہاتھوں لنگر خاں اور اس کے ساتھیوں کی درگت سب کو یاد تھی اور جنہیں بھول ہوتی تھی مجھے دیکھ کر انہیں بھی یاد آگئی تھی۔ میرا گھوڑا سردار کے گھوڑوں کے ساتھ بندھا ہوا چارے پر منہ مار رہا تھا۔ میں اس کی پیٹھ تھپکتا ہوا سردار کے جھونپڑے میں داخل ہوگیا۔ یہاں سردار مترجم کے ساتھ بیٹھا گڑگڑی پی رہا تھا۔ جھونپڑے میں دھوئیں کے مرغولے تھے اور اگربتیوں کی مہک تھی۔

مترجم کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ جمعہ خاں تھا۔ کل اسے لنگر خاں نے کوڑے لگوائے تھے اور وہ کوڑے کھاتے کھاتے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک زردی کھنڈی ہوئی تھی اور وہ پیٹھ کے نیچے ایک گدا رکھے بڑی مشکل سے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک گئے۔ جمعہ خاں کا اس جھونپڑے میں پایا جانا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران تھا۔ مجھے پہچان کر پہلے تو اس کے چہرے پر خجالت نمودار ہوئی پھر جلد ہی اس خجالت کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔ سردار بشر گل نے جمعہ خاں سے چند باتیں کیں۔ غالباً یہ پوچھا کہ کیا ہم دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ جمعہ خاں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا۔ میں نے جمعہ خاں سے پوچھا "تم اب تک یہاں ہو؟"

وہ قدرے مؤدب انداز میں بولا "نہیں، سردار بھی ہے۔"

"دریا خان؟"

"وہ بھی یہیں ہے۔"

"کہاں ہیں سارے؟"

"بستی سے باہر گیا ہوا ہے۔ خوا بھی کچھ ٹائم میں واپس آئے گا۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ جمعہ خاں اس وقت پاژندوں کے مخصوص لباس میں تھا۔ اگر وہ جھونپڑے سے باہر ہوتا اور اس نے حسب رواج منہ سر پگڑی میں لپیٹ رکھا ہوتا تو میرے لیے اسے پہچاننا خاصا دشوار ہوتا۔

"کیا تم لوگ اب یہیں رہو گے؟" میں نے جمعہ خاں سے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب تو آپ کو ہمارا سردار ہی دے سکتا ہے۔ ویسے ایک بات ہم بھی معلوم کرنا چاہتا ہے۔ آپ یہاں ... ہمارا مطلب ہے ... آپ کیسے آگیا یہاں؟"

"میں پہلے بھی یہاں کئی دفعہ آچکا ہوں۔ یہاں میرا ایک واقف کار رہتا ہے۔ کچھ دنوں سے وہ لاپتا ہے۔ اس کے لیے ہم سب پریشان ہیں۔"

سردار بشر گل نے جب دیکھا کہ "مترجم" نے اپنی ہی کانفرنس شروع کر دی ہے تو مداخلت کی اور ہم دونوں کو اصل موضوع پر لے آیا۔ مترجم کی وساطت سے میرے اور سردار کے درمیان گفتگو کچھ اس طرح ہوئی۔

"تم اب تک کہاں تھے؟" سردار نے پوچھا۔

"میں ایک چکر میں پھنس گیا تھا سردار" میں نے جواب دیا "بہت کوشش کی کہ وقت پر پہنچ سکوں لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے چند دن بھی میرا انتظار گوارا نہ کیا۔ لڑکی کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اسے کسی لنگر خاں کے حوالے کر رہے تھے۔"

"یہ بالکل غلط بات ہے" سردار بھڑک کر بولا۔

"لیکن لڑکی نے مجھے خود بتایا ہے" میں نے کہا۔

"اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا بالکل ایسا ارادہ نہیں تھا کہ اسے کسی کے حوالے کریں۔"

"تو پھر وہ شادی کا جوڑا، وہ تاج گلانا اور لڑکی کو ڈانٹ ڈپٹ؟"

سردار نے گڑگڑی کے چند گہرے کش لیے اور اسے ایک طرف رکھ کر بولا "ہمارے مقامی رسم و رواج کے مطابق شہباز کے چلے جانے سے لڑکی خود بخود اس کی زوجیت سے آزاد ہوگئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی عورت سے فوراً کسی دوسرے مرد کا نکاح پڑھا دیا جاتا ہے۔ ایسی عورت کو عدت پوری کرنا ہوتی ہے اور اگر اس مدت میں پتا چل جائے کہ وہ امید سے ہے تو پھر بچے کی پیدائش تک وہ کسی دوسرے کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ ہاں ہمارے قبائل میں یہ رعایت ضرور ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے عورت کسی دوسرے مرد سے منسوب ہو سکتی ہے۔ ہم نجو کو لنگر خاں کے حوالے نہیں کر رہے تھے، صرف اس سے منسوب کر رہے تھے کیونکہ لنگر خاں اس کی قیمت ادا کر چکا تھا لیکن جب وہ رونے دھونے لگی تو ہم نے یہ رسم بھی ملتوی کر دی۔"

میں نے کہا "کچھ بھی ہے آپ کے لیے ضروری تھا کہ

محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک لازوال ناول

● جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی معاشرتی اور رومانی داستان۔

● محبت کیا ہے؟ اس ناول میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا۔

دلِ پارہ پارہ

قیمت: ۱۲۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ!

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

بے کے اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

کم از کم دو تین ہفتے تو میرا انتظار کرتے۔ آپ نے تو ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے۔ ادھر مہلت پوری ہوئی' اُدھر آپ نے اسے منسوب کرنا شروع کر دیا۔"

سردار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کرخت آواز میں بولا "تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو کہ مقامی رسم و رواج سے آگاہ نہیں ہو۔ یہاں ہر قبیلے کے کچھ اپنے قانون قاعدے ہوتے ہیں۔ ہمارے رواج کے مطابق بیوہ یا مطلقہ کو فی الفور کسی مرد سے منسوب ہونا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ رشتۂ ازدواج میں بندھنے کو تیار نہیں۔ ایسی عورتیں جبراً قبیلے سے باہر فروخت کر دی جاتی ہیں۔"

میں رسم و رواج کی اس طویل بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ سیدھی سادی معاملت یہ تھی کہ میں نجو کی باقی قیمت یعنی سات ہزار روپیہ ادا کروں اور اسے ہر بندش سے آزاد کراؤں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ایک بار پھر میرے پاس مطلوبہ رقم موجود نہیں تھی۔ جس وقت عیسیٰ جان مجھے اپنے ڈیرے پر لایا' میرے شکاری بوٹوں میں کل گیارہ ہزار روپے تھے۔ ان میں سے دس ہزار روپیہ میں نے غلام خاں مرحوم کی رقم میں سے نکالا تھا اور ایک ہزار پہلے سے میرے پاس موجود تھا۔ یہ ساری رقم میری جامہ تلاشی کے دوران عیسیٰ جان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ بہرحال میں بالکل تہی دست بھی نہیں تھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں وہ طلائی زیور موجود تھے جو کل روانہ ہوتے وقت نبیلہ نے مجھے پھینکنے کے لیے دیے تھے۔ ایک بار تو میرے جی میں بھی آئی تھی کہ انہیں پھینک ہی دوں لیکن پھر نہ جانے کیوں میں نے انہیں جیب میں پڑا رہنے دیا تھا۔ بعض اوقات آدمی کی جیب میں لٹوانے کے لیے کچھ ہو تو جان لٹنے سے بچ جاتی ہے۔ شاید میں نے بھی لاشعوری طور پر یہ سوچا ہو کہ راستے میں کسی جرائم پیشہ گروہ سے ملاقات ہو گئی تو انہیں یہ زیور دے کر گھوڑا اور رائفل وغیرہ بچا لوں گا۔ راستے میں تو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا لیکن یہ حادثہ ضرور ہوا تھا کہ میں راستہ بھول گیا تھا۔ اور پھر عباس خاں کو بھول کر نجو کی طرف آنا پڑ گیا تھا۔ اب میری جیب میں پڑے ہوئے یہ زیور نجو کا تاوان ادا کر سکتے تھے۔ یہ عیسیٰ جان کے زیور تھے لیکن حقیقت میں اس کے بھی نہیں تھے۔ یہ کسی گھر میں نقب لگا کر کسی نامعلوم عورت سے چھینے گئے تھے... دوسرے لفظوں میں یہ عورت کے زیور تھے اور اب عورت کے کام ہی آ رہے تھے۔

میں نے سردار بشر گل سے کہا "ایک ہزار روپیہ میں نے آپ کو دے دیا تھا۔ اب سات ہزار باقی ہے۔" زیور نکالنے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بشر گل نے انکار میں سر ہلا کر میرے خدشات درست ثابت کر دیے۔

وہ بولا "نہیں میاں! وہ سودا ختم ہو چکا ہے۔ اب نیا سودا ہوگا۔"

ایک لمحے کے لیے میرا دماغ گھوم گیا۔ جی چاہا کہ اس نیک صورت بد خصال بڈھے پر جا پڑوں اور مار مار کر بھرکس نکال دوں لیکن پھر مجھے خود پر قابو پانا پڑا۔ یہ لمحات جوش کا نہیں ہوش کا تقاضا کر رہے تھے۔ میں نے صبر کا ایک بڑا سا آتشیں گھونٹ بھرا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

وہ بولا "نہیں کوئی ایسی بات نہیں کر رہا جو تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے۔ اڑتالیس گھنٹے کی مہلت ختم ہونے کے بعد ہمارا سودا ختم ہو چکا ہے۔"

میں نے پوچھا "اب کیا مطالبہ ہے آپ کا؟"

وہ بولا "اصولی طور پر تو اب تمہیں اس سلسلے میں لشکر خاں سے بات کرنی چاہیے تھی۔ بہرحال میں تمہیں کسی دوسرے کے پاس بھیج کر خراب کرنا نہیں چاہتا۔ لشکر خاں سے سودا ختم کرنے کے لیے ہمیں اسے کچھ نہ کچھ ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ ہمارے درمیان آٹھ ہزار طے ہوا تھا۔ اس میں تین ہزار ہرجانے کا شامل کر لو۔ کل گیارہ ہزار روپیہ بنتا ہے۔ میں اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ جو ایک ہزار تم نے پیشگی دیا تھا وہ اس میں سے کاٹ لوں۔ اب دس ہزار کے عوض تم لڑکی لے جا سکتے ہو مگر مہلت اب بھی اڑتالیس گھنٹے کی ہوگی۔ اس کے بعد میں یا جرگا کسی طرح ذمے دار نہیں ہوں گے۔"

نجو کے بھاؤ تاؤ کی بات سردار یوں کر رہا تھا جیسے وہ رائفل ہو یا زمین کا کوئی ٹکڑا ہو۔ اس کے خیال میں میرے پاس سات ہزار روپیہ تھا اور تین ہزار روپیہ مزید لانے کے لیے وہ مجھے پھر اڑتالیس گھنٹے کی مہلت دے رہا تھا۔ مجھے اس مہلت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اب یہ سودے بازی مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے طلائی چوڑیاں نکالیں اور سردار کے سامنے رکھ دیں۔ چوڑیاں کم و بیش چار تولے کی تھیں اور ان کی قیمت ہرگز بارہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ خالص سونا دیکھتے ہی سردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی کہ سردار ایک حریص آدمی ہے اور دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ لشکر خاں کو ہرجانہ دینے کی بات وہ صرف سودا پٹانے کے لیے کر رہا تھا۔ تین ہزار روپے ہرجانہ کس نے دینا تھا۔ بہ فرضِ محال' اس مد میں کچھ رقم دی بھی جاتی تو وہ تین چار سو سے زائد نہ ہوتی۔

چوڑیوں کو تھوڑی دیر ہاتھوں میں گھمانے کے بعد سردار نے ایک کارندے کو جھونپڑے میں بلایا اور کوئی ہدایت دے کر باہر بھیج دیا۔ چار پانچ منٹ بعد ہی ایک بہت بڑے پگڑ والا منحنی سا شخص جھونپڑے میں داخل ہوا اور سردار کو تعظیم پیش کر کے دو زانو بیٹھ گیا۔ یہ بستی کا زرگر تھا۔ اس نے روشنی کی طرف رُخ پھیر کر چوڑیوں کو بغور دیکھا' پھر لباس سے کسوٹی برآمد کی اور سونے کی پرکھ کرنے لگا۔ دیر تک سردار بشر گل اور زرگر گفتگو میں مصروف رہے پھر مترجم کی زبانی مجھے بتایا گیا کہ چوڑیوں کی قیمت آٹھ ہزار سے زائد نہیں ہے۔ بہرحال مجھ سے خاص رعایت کرتے ہوئے سردار انہیں نو ہزار میں رکھنے پر آمادہ ہے۔ یعنی ایک ہزار روپیہ اب بھی میرے ذمے واجب الادا ہے۔ میں اس موقعے پر کوئی تنازعہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اپنا سارا غصہ میں نے تصوراتی حوالے سے نکالا۔ یعنی خیال ہی خیال میں زرگر کی بہت بڑی پگڑی کو جھانپڑ مار کر گرایا۔ اسے دو تین بار اٹھا کر زمین پر پٹخا' پھر ٹانگوں سے پکڑ کر چیرا اور جھونپڑے سے باہر پھینک دیا۔ یہ سارا عمل میرے ذہن میں مکمل ہوا تھا لہٰذا زرگر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ بدستور سردار بشر گل کے ساتھ عاطفت میں بیٹھا رہا اور اپنی باریک بد دیانت آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے خاموشی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر آدھ تولے کی ایک انگوٹھی نکالی اور زرگر کے سامنے قالین پر پھینک دی۔ اس نے اس انگوٹھی کو بھی پرکھا۔ زرگر اور سردار میں تبادلۂ خیال ہوا اور پھر سردار نے یہ زیور قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں سردار کے جھونپڑے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے سے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آٹھ دس افراد تیز قدموں سے جھونپڑے کی طرف آ رہے تھے پھر دروازہ کھلا اور میں نے لشکر خاں کو اپنے سامنے پایا۔ وہ بھی جمعہ خاں کی طرح پاؤندوں کے لباس میں تھا۔ اس کے عقب میں تین چار شناسا افراد اور تھے۔ انہوں نے بھی پاؤندوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ باقی چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ اجنبی چہرے والوں کی تعداد پانچ تھی۔ وہ قدرے گھبرائے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے لباس دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ عیسیٰ جان کے ڈیرے سے آئے ہیں۔

لشکر خاں کے تین ساتھیوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک انسانی جسم اٹھا رکھا تھا۔ یہ کوئی مرد تھا۔ وہ سرتاپا کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ کمبل پر خون کے دھبے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں نے اس خونچکاں جسم کو جھونپڑے کے ایک گوشے میں لکڑی کے چوکور تختے پر ڈال دیا۔ جسم کو تختے پر رکھا گیا تو مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے یہ جسم زندگی سے خالی ہو چکا ہے اور اگر نہیں ہوا تو بس ہونے ہی والا ہے۔ ایک دم ہی سب لوگ زخمی کے گرد جمع ہو گئے تھے اور تیز تیز لہجے میں بول رہے تھے۔ مجھے کچھ دکھائی دے رہا تھا نہ کسی بات کی سمجھ آ رہی تھی۔ اچانک جمعہ خاں نے گھوم کر میری طرف اشارہ کیا اور سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا دل ایک دم اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے اندازہ ہوا کہ اس زخمی شخص کا تعلق مجھ سے ہے۔

جمعہ خاں کے توجہ دلانے پر لشکر خاں نے پہلی بار میری طرف دیکھا تھا۔ میری یہاں موجودگی پر اس کی آنکھوں میں واضح حیرت نظر آ رہی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ تیزی سے زخمی کے قریب پہنچا۔ اس کے خونچکاں چہرے سے کمبل ہٹایا جا چکا تھا۔ مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ میرے سامنے دنیا و مافیہا سے بے خبر' جو شخص پڑا ہوا تھا وہ انسپکٹر باجوہ تھا۔ رائفل کی گولی اس کی بائیں آنکھ سے ذرا نیچے چہرے اور سر میں گھس گئی تھی۔ اس کا سانولا چہرہ آنکھوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں سکتے میں رہ گیا۔ صرف دو روز پہلے میں نے انسپکٹر باجوہ کو عیسیٰ جان کے ڈیرے پر زندہ سلامت دیکھا تھا۔ اس کے گرد موت کے سائے ضرور تھے لیکن وہ زندہ تھا۔ اور زندہ ہی نہیں تھا' اس کے اندر زندگی کی خواہش بھی زندہ تھی۔ ڈیرے سے فرار ہوتے وقت جب میں نے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے نکالنا چاہا تھا تو نشے کے باعث کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ صرف انسپکٹر باجوہ تھا جس نے بھرپور کوشش کی تھی اور لڑکھڑاتا ہوا میرے ساتھ دروازے تک آ گیا تھا۔

"انسپکٹر... انسپکٹر" میں نے اضطراری کیفیت میں اسے پکارا۔ وہ کچھ کہنے سننے کی منزل سے بہت دور جا چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو ہلایا تو میری انگلیوں کی پوریں خون سے لتھڑ گئیں۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ سینے سے کان لگا کر دھڑکنوں کا کھوج لگایا۔ کچھ بھی واضح نہیں ہو سکا۔ وہ اگر مرا نہیں تھا تو نہ ہونے کے برابر زندہ تھا۔ اس دوران لشکر خاں میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ سب کیسے ہوا خان! کس نے مارا ہے اسے؟"

وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "کون مار سکتا ہے"

خود سوچو کون مار سکتا ہے اسے؟"

"شنکر!" میرے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"بالکل ..... یہ اسی کا کارنامہ ہے۔ وہ خنزیر کا بچہ ام لوگوں پر اپنا نشانہ پختہ کرتا ہے۔ بندے کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرتا ہے۔ اس کے سر پر بوتل رکھتا ہے اور گولی سے اڑاتا ہے۔"

نبیلہ نے جو کچھ بتایا تھا درست نکلا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نذیر کے بعد اب باجوہ کو بھی دردناک طریقے سے گولی ماردی گئی تھی۔ نبیلہ کے جملے میری سماعت میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا "ایسا مخص مرگیا تو ایک سانولے سے آدمی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا گیا۔ کل وہ پورا ایک گھنٹا موت کے منہ میں رہا ہے۔ معلوم نہیں اب بھی اس کی جان بخشی ہوتی ہے یا نہیں۔"

اور وہی بات ہوئی تھی۔ اس دن تو باجوہ بچ گیا تھا لیکن آج اس کی صرف چند سانسیں بچ سکی تھیں۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب باجوہ گھٹنوں میں سر دیے زاروقطار رو رہا تھا۔ اسے نشہ کھلایا گیا تھا لیکن موت کا خوف نشے کی دبیز تہ چیر کر اس کے ذہن تک پہنچ رہا تھا۔ وہ آنے والے کل سے خوف زدہ تھا۔ جب چاند ماری کے احاطے میں اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا جاتا تھا اور گولیاں اس پر مینہ کی طرح برستی تھیں..... اور آج وہ سب کچھ ہوگیا تھا۔ در سارے عذاب باجوہ پر گزر گئے تھے جس کا اس نے اندیشہ کیا تھا۔ کاش وہ اس دن ہمت کرکے میرے ساتھ ہی ڈیرے سے نکل آتا۔ اگر وہ نہیں نکل سکا تھا تو میں اسے لے آتا لیکن یہ دونوں کام نہیں ہوسکے تھے۔ میں باجوہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر نبیلہ اور عباس وغیرہ کی طرف گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری واپسی تک باجوہ سنبھل جائے گا اور میں اسے سارا دے کر وہاں سے نکال لوں گا مگر پھر چند قدم کے فاصلے پر شیطان ملعون شنکر سے ملاقات ہوگئی تھی اور میں اس میں الجھ کر ڈیرے سے باہر نکل گیا تھا۔

قصبے کے بوڑھے معالج کو دیکھ کر میں اپنے خیالوں سے چونکا۔ وہ اپنے اول جلول معاون کے ساتھ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر جاں بہ لب باجوہ پر جھک گیا۔ اس نے بغور زخم کا معائنہ کیا اور پھر مایوسی سے سرہلا کر پیچھے ہٹ گیا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو..... "اب علاج معالجے کا فائدہ تو نہیں لیکن چونکہ ہم قصبے کے واحد معالج ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں "شفا" بھی بہت ہے لہٰذا کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید کوئی کرشمہ ہوجائے" اس نے اپنی گٹھڑی ایک چارپائی پر رکھی اور رنگ برنگی مرہموں، معجونوں اور سفوفوں کا بند ڈبا کھول کر بیٹھ گیا۔ اس کی سو سڑی خزاں رسیدہ بانہیں بڑی بے موقع سستی کے ساتھ حرکت کررہی تھیں جیسے اس نے قسم کھا رکھی ہو کہ مریض کی حالت چاہے کچھ بھی ہو، اپنی رفتار میں رد و بدل نہیں کرے گا۔

میری نگاہوں میں غلام خاں کی بیوی ملکینہ کا چہرہ گھوم گیا۔ زخمی ہوکر وہ بھی اسی "مسیحا" کے دستِ شفا کی زد میں آئی تھی۔ اسی طرح وہ چت لیٹی تھی اور یہ بوڑھا معالج ام مختلف کارروائیاں ڈال رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ راہی ہوگئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا انجام اس دفعہ بھی مختلف نہ ہوگا لیکن اس انجام سے باجوہ کو بچانے کے لیے میں کیا کر سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کی زندگی کا ٹمٹماتا چراغ چند لمحوں میں بجھا چاہتا تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی امید ہوتی کہ باجوہ کو بچایا جاسکتا ہے تو میں فرشتۂ اجل کے اس عمر رسیدہ ہرکارے کو دھکیل کر باجوہ سے دور ہٹا دیتا اور ہر وہ کوشش کر ڈالتا جو کی جاسکتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا اس لیے ہرکارے کو ہٹانے کے بجائے میں خود پیچھے ہٹ گیا۔

بوڑھے معالج نے حسب سابق باجوہ کے زخم پر میلی سی پٹی رکھی اور پٹی کے اوپر سے ایک تیل نما مائع وقفے وقفے سے انڈیلنا شروع کیا۔ اس کے اسسٹنٹ بھی حسب معمول مختلف کارستانیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ جھونپڑے میں گہری خاموشی تھی۔ اچانک باجوہ کا سر غیر محسوس طور پر بائیں طرف ڈھلک گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس معمولی لیکن نہایت اہم جنبش کو تقریباً سبھی حاضرین نے محسوس کیا۔ بوڑھے معالج نے تیل انڈیلنے والا چمچ ایک طرف رکھا، باجوہ کی سانولی کلائی اٹھا کر نہایت غور و خوض سے نبض کا معائنہ کرنے لگا۔ بعدازاں اس نے سینے پر کان رکھ کر دھڑکن سنی۔ آنکھوں کے پپوٹے کھول کر پتلیاں دیکھیں اور مایوسی سے سرہلا کر کھڑا ہوگیا۔ باجوہ کو گرد آلود خونچکاں کمبل سے ڈھانپ دیا گیا۔

لشکر خاں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھونپڑے سے باہر لے آیا۔ قریباً دس بج چکے تھے۔ سورج گیلے سبزے سے شبنم چننے کی اپنی سی کوشش کررہا تھا۔ ہم نے جھونپڑے سے باہر کئی افراد ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ لشکر خاں مجھے ان کے درمیان سے گزار کر کھلی دھوپ میں لے آیا اور ہم دونوں ایک جگہ بیٹھ گئے۔

لشکر خاں بولا "ام تمہارا چہرہ دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ تم

بہت ڈرا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے تم یہ سوچ رہا ہو کہ کسی طرح اس جنگل سے نکلے اور "ملیوی" کا مدد لے کر آئے۔ لیکن..... تمہارے سے امارا ایک برادرانہ مشورہ ہے۔ ایسا کوئی بھی کوشش نہ صرف تمہارے لیے خطرناک ہوگا بلکہ اس سے اس بدکار شنکر کا انجام بھی کچھ اور دور چلا جائے گا۔"

میں نے کہا "ملیوی (مقامی پولیس) کے آنے سے شنکر کا انجام کیسے دور ہو جائے گا؟"

وہ بولا "ملیوی یہاں کچھ نہیں کرسکتا۔ ایک ہزار آدمی بھی آجائے گا تو یہ جنگل ان سب کو چاٹ جائے گا۔ کچھ کا زندگی ختم ہوگا، کچھ کا حوصلہ اور پھر وہ سب نامراد واپس چلا جائے گا۔ ملیوی آنے کا فائدہ صرف شنکر اور عیسیٰ جان کو ہوگا۔ اب تم پوچھے گا وہ کیسے؟ برادر! وہ ایسے کہ ملیوی شنکر اور عیسیٰ جان کو ہی نہیں مارے گا، ام کو بھی مارے گا۔ ام بھی تو ڈاکو ہے اور جب وہ ام کو مارے گا تو ام عیسیٰ جان اور شنکر سے کیسے لڑے گا۔ ام بھی روپوش ہو جائے گا پھر ام میں سے کچھ ساتھی دل چھوٹا کرکے عیسیٰ کے ساتھ جا ملے گا اور بنا بنایا کھیل برباد ہو جائے گا۔"

میں نے پوچھا "تمہارا خیال ہے کہ تم عیسیٰ جان سے ٹکر لے سکتے ہو؟"

"بالکل..... بالکل لے سکتا ہے۔ تم جانتا ہے لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ امارا لوہا فولاد کا ہے اور عیسیٰ کے لوہے میں ٹکر کا مٹی مل گیا ہے۔ تم دیکھنا ام اس پھسپھسے لوہے کا کیسے برادہ بناتا ہے۔ بہت سا لوگ شنکر سے نالاں ہے۔ وہ عیسیٰ جان کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ بس موقعے کا انتظار میں ہے۔ آج بھی دیکھو ہمارے ساتھ پانچ آدمی آیا ہے۔ یہ سب لعنت بھیج کر آیا ہے عیسیٰ پر اور شنکر پر۔"

میں نے پوچھا "باجوہ کی لاش وہی لائے ہیں؟"

"ہاں، وہی لایا ہے۔ بلکہ امارا خیال ہے وہ آیا ہی اس لیے ہے کہ اس نے انسپکٹر پر ہونے والا ظلم دیکھا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جب انسپکٹر کو گولی لگا تو شنکر نے اسے ٹھوکر مارا اور ماں بہن کا گالیاں دیا پھر شنکر کے ساتھیوں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور جانور کے مافق گھسیٹ کر ڈیرے سے باہر پھینک دیا۔ یہ پانچ آدمی جب بستی سے نکل رہا تھا، انہوں نے انسپکٹر کو جھاڑیوں میں پڑے دیکھا، اس وقت انسپکٹر کا سانس چل رہا تھا۔ انہوں نے اسے گھوڑے پر ڈالا اور ادھر لے آیا۔"

"انسپکٹر کے بعد اب کس کی باری آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مالوم نہیں" لشکر خاں نے جواب دیا "لیکن امارا خیال ہے کہ اب وہ خنزیر کا بچہ اپنا ہاتھ روک لے گا۔ وہ جانتا ہے سب کو ماردیا تو یرغمال کیسے بنائے گا۔ رہ باقی لوگوں کو یرغمال بنا کر رکھے گا اور فائدہ اٹھائے گا۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے۔ ممکن ہے حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ وہ پاگل کتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس نے سب کو ایک ایک کرکے مار ڈالا تو یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ میں آزاد ہونے کے باوجود کچھ نہ کرسکوں۔"

لشکر خاں بولا "وہ پاگل کتا ہوگا لیکن اس کے ساتھ عیسیٰ جان بھی ہے۔ وہ ابھی پوری طرح پاگل نہیں ہوا۔ ام کو یقین ہے کہ وہ سارا قیدی مار کر اپنا نقصان نہیں کرے گا اور تم یہ بھی مت سمجھو کہ تم آزاد ہے۔ یہ سارا جنگل اب..... جنگ کا میدان ہے۔ اپنی جان پر کھیلے بغیر کوئی یہاں سے جاسکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ ہمارے چالیس آدمی کے مقابلے میں عیسیٰ جان کے پاس ڈیڑھ سو سے کم آدمی نہیں ہے۔ وہ سب کا سب ہتھیار بند ہے اور شکاری کتوں کی طرح ہمارا بو سونگھتا پھرتا ہے۔ بہت جلد وہ اس پاؤندہ بستی میں آئے گا اور سردار سے پوچھ گچھ کرے گا۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ کسی جھونپڑے میں اپنے لیے جگہ بنالو اور یہ لباس بھی بدلنا ہوگا تم کو۔"

اب مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ زاکورس کے ان دو گروہوں میں شروع ہونے والی لڑائی کی آگ پورے جنگل میں پھیل گئی تھی۔ یہ آگ یوں تو پہلے سے بھڑک رہی تھی لیکن اسے الاؤ بنانے میں کچھ ہاتھ میرا بھی تھا۔ میرے ہاتھوں دو افراد کے قتل ہونے کے بعد یہ تنازعہ ایک دم سنگین رُخ اختیار کرگیا تھا اور اب اونچے نیچے ٹیلوں میں، ڈرے سہمے جنگل میں دور دور تک موت کے سائے رقصاں تھے۔ میں نے لشکر خاں سے پوچھا "اگر لڑائی ہوئی تو سردار بشر گل بھی ہمارا ساتھ دے گا؟"

وہ بولا "خو یہ بہت مشکل ہے اور ام خود بھی نہیں چاہتا کہ نہتے لوگوں کو لڑائی میں گھسیٹے۔ پوری پاؤندہ بستی میں صرف پندرہ بیس رائفل ہے۔ ان پندرہ بیس رائفل کے لیے سب عورتوں بچوں کو توپ کے منہ پر باندھنا کوئی اچھا بات نہیں۔ بستی میں کسی کو مالوم نہیں کہ ام نے یہاں کیسے پناہ لیا ہے۔ صرف سردار بشر گل کو مالوم ہے کہ اس نے ام کو پناہ دیا ہے۔ امارے درمیان طے ہے کہ اگر عیسیٰ جان کے سامنے امارا راز کھل گیا تو بشر گل اس معاملے سے بالکل الگ ہوجائے گا۔ وہ یہ کہہ کر اپنا جان چھڑالے گا کہ ام زبردستی

اس بستی میں گھس بیٹھا ہے۔"

لشکر خاں مجھ سے کافی دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مخالفین کو نیچا دکھانے کے سلسلے میں کافی پُرامید ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آئندہ تین چار روز میں عیسیٰ جان کے کئی ساتھی اپنا کیمپ چھوڑ کر اس کے پاس آجائیں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ جان سے مقابلہ کرنا یا معاملات طے کرنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ عیسیٰ جان گروپ سے لشکر خاں گروپ کو جو شکایات تھیں ان میں سب سے اہم شکایت گروہ میں ششکر کی موجودگی اور اس کا بڑھتا ہوا عمل دخل تھا۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھی اب ایک دن کے لیے بھی ششکر کو گروہ میں برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ دوسرا بڑا مسئلہ ان دو افراد کا تھا جن کا تعلق ایک ابھرتی ہوئی سیاسی پارٹی سے تھا اور جنہوں نے ایک جلسۂ عام میں فائرنگ کے بعد عیسیٰ جان کے پاس پناہ لی تھی۔ ایک طرح سے یہ معاملہ بھی ششکر کے معاملے سے منسلک تھا۔ پناہ لینے والے افراد کو ہر طرح ششکر کی حمایت حاصل تھی۔ لشکر خاں اور اس کے ہم نوا چاہتے تھے کہ ان دونوں افراد کو فی الفور ڈیرے سے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے بعد چار افراد کو زندہ جلا دینے کا معاملہ تھا۔ مجرموں کو اس بہیمانہ واردات کی قرار واقعی سزا دینا عیسیٰ جان کا فرض تھا جو اس نے پورا نہیں کیا تھا۔ اس طرح اور بھی کئی چھوٹے موٹے معاملات تھے جو ان دونوں گروپوں میں روز افزوں کشیدگی کا سبب بن رہے تھے۔

میں نے لشکر خاں سے کہا "خان! مجھے اس وقت سب سے زیادہ فکر اس عورت اور بچے کی ہے جنہیں میں ڈیرے سے نکال کر لایا تھا۔ وہ ابھی کھائی میں ہی خیمہ لگائے ہوئے ہیں۔ اگر دوبارہ عیسیٰ جان کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت برا سلوک ہوگا ان سے۔ اس کے علاوہ اس خیمے میں سب مشین گن بھی ہے۔ وہ غلط ہاتھوں میں چلی گئی تو نئی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔"

لشکر خاں نے کہا "تم کسی بات کا فکر نہ کرو برادر، بی بی اور بچے کو حفاظت سے یہاں لانا اب امارا ذمے داری ہے۔ ام ابھی اپنے بندوں کو ادھر بھیجتا ہے۔ تم بس یہ دعا کرو کہ وہ امارے لوگوں کے پہنچنے تک محفوظ رہے۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہے تو میں بھی ساتھ جانا چاہوں گا۔"

وہ بولا "یہ خطرناک کام ہے برادر۔ ایسے کام کا نام کو مت بولو۔ امارا آدمی پاوندوں کے بھیس میں جائے گا۔ تم جائے گا تو فوراً پہچانا جائے گا۔ خواہ مخواہ کا مشکل کھڑا ہوجائے گا۔ جاؤ شاباش، تم آرام کرو۔ شام تک وہ بی بی اور بچہ لوگ یہاں پہنچ جائے گا۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے ان دونوں کے علاوہ رشید خاں اور اس کے گھر والے بھی ساتھ آنا چاہیں۔"

"خواہ مخواہ اپنا دماغ مت تھکاؤ برادر۔" لشکر خاں نے "ام سب انتظام کر کے بھیجے گا۔ جو بھی آنا چاہے گا۔ آجائے گا جو نہیں آنا چاہے گا ام اس کو مجبور نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "یہی تو مسئلہ ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارے بھیجے ہوئے آدمیوں کے ساتھ وہ لوگ آنے سے انکار کردیں اگر میں ساتھ ہوں گا تو زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔"

لشکر خاں بولا "تم نے بات بالکل ٹھیک کیا ہے لیکن ام مسئلے کا حل بھی امارے پاس ہے۔ وہ بی بی۔ کیا نام ہے اس کا۔ نبیلہ۔ وہ پڑھا لکھا ہے ناں اور تم بھی پڑھا لکھا ہے۔ انگریزی جانتا ہے اور امارا خیال ہے تم بھی جانتا ہوگا۔ اس کو انگریزی میں چٹھی لکھو اپنے دستخط کے ساتھ اور ساری بات بتادو۔ اسے سمجھادو کہ تمہارا آنا کیوں مشکل ہے۔ وہ انگریزی کی چٹھی پر پورا اعتبار کرے گا۔ ام کو یقین ہے وہ اتنا بے وقوف نہیں کہ جھوٹ سچ میں فرق نہ کرسکے۔"

لشکر خاں کو قائل کرنا خاصا مشکل نظر آرہا تھا۔ میں کہتا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی تو وہ اردو میں ہی چٹھی لکھوالیتا۔ میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ لشکر خاں بولا "امارے درمیان بہت سا بات ہوا لیکن اصل بات نہ ام نے پوچھا اور نہ تم نے بتایا۔ ام تو تمہیں بی بی اور بچے کے پاس خیمے میں چھوڑ کر آیا تھا تم ادھر بشر گل کے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

جواب میں میں نے لشکر خاں کو بتایا کہ کس طرح میں نائیک عباس خاں کو تلاش کرنے کھائی سے نکلا اور کیسے راستہ بھٹک کر پاوندہ بستی کی طرف نکل آیا۔ میں نے اسی ضمن میں نجو اور پہلوان شہباز کا ذکر بھی کردیا اور بتایا کہ اس سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ بستی میں آچکا ہوں۔ لشکر خاں نے یہ ساری روداد دھیان سے سنی اور بیچ میں مجھ سے سوالات بھی پوچھتا رہا۔ اسے یہ جان کر افسوس ہوا کہ نجو کی واپسی کے سلسلے میں سردار بشر گل نے مجھ سے کوئی رعایت نہیں کی اور اصل رقم مع سود حاصل کی ہے۔ تاہم اس کے نزدیک یہ سب کچھ حسبِ معمول تھا کیونکہ خانہ بدوش ایسے معاملوں میں بہت سخت واقع ہوئے تھے۔ عباس خاں کا ذکر کرتے ہوئے لشکر خاں نے کہا "زندگی اور موت خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تم اپنے جس ساتھی کو زندہ سمجھ رہا تھا وہ ابھی تمہارے سامنے دم توڑ گیا اور جس کو تم موت کے

والے سمجھ رہا تھا وہ زندہ ہے۔ ابھی جو لوگ عیسیٰ جان کو چھوڑ کر ہمارے پاس آیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ عباس خاں کے سر اور ایک ٹانگ پر چوٹ آیا ہے۔ ویسے اس کا حالت خطرے سے باہر ہے۔ ڈیرے پر اس کا مرہم پٹی کرکے اسے ایس پی برکت وغیرہ کے ساتھ بند کردیا گیا ہے۔"

یہ ایک اچھی خبر تھی۔ پچھلے چھتیس گھنٹوں میں میں عباس خاں کے لیے بہت فکرمند رہا تھا۔ اس کی معیت مجھے رو رو کر نُور محمد کی یاد دلاتی تھی۔ اٹک جیل میں تڑپ تڑپ کر جان دینے والا نُور محمد بھی تو عباس خاں کی طرح ایک خوش آواز شخص تھا۔ اس آواز کی موت کا صدمہ ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھا کہ یہ دوسری آواز بھی میری آنکھوں کے سامنے خاموشیوں کے گہرے کنوئیں میں اتر گئی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ یہ آواز بھی دم توڑ گئی ہے لیکن اب لشکر خاں کی زبانی پتا چل رہا تھا کہ نہیں "ابھی "نغمہ" زندہ ہے۔

لشکر خاں اور میں پتھر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لشکر خاں واپس سردار بشر گل کے جھونپڑے میں جانا چاہتا تھا جبکہ میں نجو سے دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے لشکر خاں سے کہا "تم چلو۔ میں ابھی اس لڑکی سے مل کر آتا ہوں" لشکر خاں اپنی بھاری بھرکم رائفل کندھے پر ڈال کر سردار کے جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

انسپکٹر باجوہ کی لاش ابھی تک اسی جھونپڑے میں رکھی تھی۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ ابھی بستی میں کسی کو اس کی موت کی خبر نہیں دی گئی تھی۔ جھونپڑے کا دروازہ بند تھا اور سردار بشر گل کے دو خاص آدمی پہرہ دینے والے انداز میں وہاں موجود تھے۔ جھونپڑے میں رکھی ہوئی باجوہ کی لاش کا تصور کرکے ایس پی برکت کا چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ ہر ماتحت کو "بھوتنی دا" کہتے تھے لیکن انسپکٹر باجوہ کے لیے یہ لقب استعمال نہیں کرتے تھے۔ صوبیدار مرجان نے ایک روز پوچھا تھا کہ وہ انسپکٹر کے لیے یہ لقب استعمال کیوں نہیں کرتے؟ ایس پی برکت نے کہا تھا "میں اسے اس لیے بھوتنی دا نہیں کہتا کہ یہ سچ مچ بھوتنی کا ہے" "کیا مطلب؟ صوبیدار نے وضاحت چاہی تھی "یہ میری ساس کا بیٹا ہے" ایس پی برکت کا جواب تھا۔ آج ایس پی کا وہ خوش باش برادرِ نسبتی انسانوں سے اور دنیا سے ہر نسبت توڑ کر راہیٔ عدم ہوگیا تھا۔

میں دھیمے قدموں سے نجو کی طرف روانہ ہوگیا۔ جھونپڑے میں نجو نے گڑ کے چاول پکا رکھے تھے۔ چاولوں کی خوشبو جھونپڑے میں اور جھونپڑے سے باہر پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کسی بڑے دیگچے میں یہ ڈش تیار کی گئی ہے۔ میں نے جھونپڑے کا درمیانی پردہ اٹھا کر دیکھا تو یہ اندازہ درست نکلا۔ نجو ایک دیگچے کے قریب بیٹھی تھی۔ آج اس نے نیا لباس پہنا تھا اور بال بھی سلیقے سے باندھ رکھے تھے۔ رات والی سوگواری اب اس کے چہرے پر نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ نجو بن سنور کر معقول شکل و صورت کی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس "معقول صورت" میں اس کی جسمانی دلکشی جمع کردی جاتی تو وہ سیکڑوں ہزاروں عورتوں میں ایک تھی۔ میں نے پوچھا "یہ اتنے ڈھیر سارے چاول کیوں پکائے ہیں؟"

وہ ذرا شرما کر بولی "صیب جی! میں نے منت مانی تھی۔"

"کیسی منت؟"

"یہی کہ آپ یا شہباز میں سے کوئی دو روز میں واپس آگیا تو میٹھے چاول بانٹوں گی۔ اللہ نے میری سن لی ہے۔ اب مجھے بھی منت پوری کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا "شہباز والی بات تو میری سمجھ میں آتی ہے لیکن میرے آنے سے اتنی خوشی کیوں۔ میں تو تمہارے لیے کوئی اچھی خبر بھی نہیں لایا؟"

"آپ آگئے ہیں۔ یہی بڑی بات ہے۔ اب اللہ سوہنا کرم کرے گا تو اچھی خبر بھی آجائے گی۔"

اس کی آنکھوں میں ایک دم آس کے دیے جل اٹھے۔ وہی دیے جو وہ پچھلے ایک ہفتے سے شب و روز جلائے ہوئے تھی۔ ان دیوں کی روشنی میں وہ ایک تاریک راستے پر اپنے گھر والے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کی راہ جو اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا، جو اس کی زندگی میں شوہر بن کر آیا تھا اور لٹیرا بن کر رفع ہوگیا تھا۔ نجو کو اس کی دغابازی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اسے سر کا تاج سمجھ رہی تھی اور رات دن اس کے لیے دعاگو تھی۔

گرم گرم چاولوں کی ایک تھالی بھر کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ چاولوں کو دیسی گھی میں چکایا گیا تھا۔ ان میں کشمش، بادام اور سونف وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ شکل و صورت گواہ تھی کہ بڑے مزے دار چاول ہیں مگر چکھے بغیر ہی وہ مجھے کڑوے لگے۔ ان میں ایک سیدھی سادی عورت کی ناکام تمناؤں کا ارتعاش تھا۔ اس کے علاوہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں انسپکٹر باجوہ کی لاش دیکھ کر آیا تھا۔ اس کی موت کا غم ایک سیاہ دھند کی طرح میرے سینے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایسے میں کچھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پلیٹ ایک طرف ہٹادی۔

وہ گھبرا کر بولی "صیب جی! کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔ بس دل نہیں چاہ رہا۔"

"آپ نے ناشتا بھی نہیں کیا۔ اب وہ تہری چاول ہی کھالیتے۔"

"نہیں۔ ابھی رکھو۔ میں ٹھہر کر کھالوں گا۔ دل کچھ پریشان ہے۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے صیب جی؟"

"دراصل۔۔۔ میرا ایک ساتھی مارا گیا ہے۔"

"ہائے ربا" نجو نے سینے پر ہاتھ رکھا "کب کی بات ہے یہ؟"

"ابھی جب میں سردار کے جھونپڑے میں گیا ہوں تو پتا چلا ہے۔۔۔ کسی نے گولی ماردی ہے اسے۔"

نجو کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندوہ میں ڈوب گئیں "کون تھا وہ۔ کس نے ماری گولی؟"

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مقتول کے اغوا کا ذکر کیا اور دیگر تفصیل بتائی تو نجو کا دھیان خود بخود شہباز کی طرف چلا جائے گا اور وہ جو پہلے ہی پریشان ہے مزید پریشان ہوجائے گی۔ میں نے گول مول بات کی اور اسے بتایا کہ مقتول شکار پارٹی میں ہمارے ساتھ آیا تھا۔ بعد میں کہیں کھو گیا۔ شاید بارڈر کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں اسے کسی نے گولی ماردی۔

نجو کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ چاولوں کی تھالی اٹھا کر خاموشی سے اندر لے گئی۔ میں نے اونی پردے کے ادھر سے اسے آواز دی "نجو! بات سنو۔"

"جی صیب جی؟" وہ گم صم سی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"دیکھو، اگر چاول پکالیے ہیں تو بچوں وغیرہ کو کھلا دو۔ انہیں ضائع مت کرنا۔"

وہ بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے صیب جی۔ سردار کے جھونپڑے میں آپ کے دوست کی میت پڑی ہے اور میں یہاں چاول بانٹتی پھروں۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟"

"پھینک آؤں گی ڈنگروں کی کھرلی میں۔"

"دیکھو تم نے یہ کام ثواب کے لیے کیا تھا اور ثواب چیز کو ضائع کرنے میں نہیں، اسے ضرورت مند تک پہنچانے میں ہے۔ اگر بانٹنا نہیں چاہتی ہو تو خاموشی سے بچوں کو یہاں جھونپڑے میں بلا کر کھلا دو۔ میں سردار کے جھونپڑے میں جارہا ہوں۔ وہاں کفن دفن کا انتظام کرنا ہے۔ شام کو واپس آؤں گا۔" نجو سر جھکا کر ناک سے "سوں سوں" کی آواز نکالتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں اٹھ کر سردار کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس دور دراز مقام سے انسپکٹر کی لاش واپس شہر تک اور اس کے گھر تک پہنچانا بہت مشکل کام تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ بستی سے باہر نکلتے ہی عیسیٰ جان کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ کا امکان تھا لہٰذا امانت کے طور پر اسے وہیں بستی کے قریب میانی کے پیڑوں تلے دفنا دیا گیا۔ اپنے عزیز و اقارب سے بہت دور اس انجان علاقے میں اجنبی لوگوں کے کندھوں پر انسپکٹر باجوہ کا سفر آخرت رقت آمیز تھا۔ سہ پہر کو اسے سپرد خاک کرکے ہم واپس آگئے۔ شام کے بعد تک میں سردار بشر گل کے جھونپڑے میں موجود رہا۔ لشکر خاں اور زخمی جبار بھی وہاں تھے۔ مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی لیکن اہم موضوع ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ عیسیٰ جان اور اس کے گروہ کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ شام کے فوراً بعد لشکر خاں کو ایک اور خوشخبری ملی۔ عیسیٰ کے ساتھیوں میں سے دس افراد پر مشتمل ایک اور ٹولی پائندہ بستی پہنچ گئی تھی۔ ان افراد کو عیسیٰ جان سے "توڑ" کر پائندہ بستی لانے والا لشکر خاں کا ہوشیار ساتھی جمعہ خاں تھا۔ اس کی وفاداری غیر متزلزل تھی۔ صرف ایک دن پہلے اسے لشکر خاں کے حکم پر کوڑوں سے ادھیڑا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ دل میں کوئی رنجش رکھتا یا ویسے ہی لشکر خاں کو چھوڑ جاتا، وہ پوری سرگرمی سے اس کا ساتھ دے رہا تھا اور تکلیف کے باوجود زرد چہرہ کراس "سرد جنگ" میں اپنا کردار ادا کررہا تھا۔

لشکر خاں کے اصرار پر مجھے بھی اپنا لباس تبدیل کرنا پڑا۔ ایک لمبے چوڑے پائنچے کی گھیردار شلوار، فراک نما کرتا اور صدری پہن کر میں خود کو بہت بدلا ہوا محسوس کررہا تھا۔ سردار کے آرام دہ جھونپڑے میں رات گئے تک گڑگڑیاں سلگتی رہیں اور قہوے کی پیالیاں چکراتی رہیں۔ آخر یہ محفل برخاست ہوئی اور میں لیٹنے کے لیے اپنے ٹھکانے پر آگیا۔ یہ خیمہ نجو کے جھونپڑے سے قریب ہی تھا۔ میرے علاوہ لشکر خاں کے دو ساتھی بھی اس خیمے میں مقیم تھے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کی تعداد اب پچاس سے اوپر ہوچکی تھی۔ ان پچاس افراد کے لیے ابھی نیا خیمہ یا جھونپڑا کھڑا نہیں کیا گیا تھا۔ بس وہ اسی طرح ایک ایک دو دو کرکے بستی میں پھیل گئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کو بھی بستی کے گھوڑوں میں خلط ملط کردیا گیا تھا اور اب ان کی الگ سے پہچان بہت مشکل تھی۔

حسب رواج اس اونی خیمے میں ایک چٹائی موجود تھی۔ خیمے کے درمیان ایک انگیٹھی سلگ رہی تھی اور انگیٹھی کے

اردگرد بھیڑ کی کھال کے تین بستر بچھے تھے۔ میرے خیمے کے ساتھی میرے آنے سے پہلے ہی نیند کے آغوش میں جاچکے تھے۔ میں نے ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اپنے فرشی بستر پر دراز ہوگیا۔ بعض اوقات ایک بالکل معمولی سی بات انسان کے ذہن میں ایک ایسی کھڑکی وا کرتی ہے جس کی دوسری طرف یادوں کا ایک جہان آباد ہوتا ہے۔ کھڑکی کھلتے ہی ایک عہد ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور یکے بعد دیگرے بیت جانے والے شب و روز، گھڑیاں، پل اور لمحے قطار اندر قطار ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ بالکل جیسے وہ اب بھی زندہ ہوں، اپنی تمام جزئیات اور اپنے مکمل رنگ و روپ کے ساتھ۔ نہ جانے ذہن کا وہ کون سا نہاں خانہ ہے جہاں وقت محفوظ ہوتا ہے اور مختلف یادوں کی کھڑکیوں میں بڑی ترتیب سے آراستہ ہوجاتا ہے۔ ایسی ترتیب کے ساتھ کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی ہزاروں لاکھوں یادوں میں سے اکثر یادیں ڈھونڈنے پر فوراً مل جاتی ہیں۔

بستر پر دراز ہوتے ہی میرے ذہن میں جو کھڑکی کھلی تھی اس میں میری زندگی کی اہم ترین یادیں محفوظ تھیں۔ اس کھڑکی کے کھلنے کی وجہ کوئی بہت اہم واقعہ یا منظر نہیں تھا، ایک معمولی سی بات تھی۔ نجو نے آج میٹھے چاول پکا کر بچوں کو کھلائے تھے۔ اس نے منت مان رکھی تھی۔ ایک ایسی ہی منت برسوں پہلے بھی ایک عورت نے مانی تھی۔ اس منت کی نسبت سے مجھے بہت کچھ یاد آرہا تھا۔ کئی خیال رہ رہ کر ذہن پر یلغار کررہے تھے۔ سارا دن تو مصروف رہا تھا لیکن اب بستر پر لیٹتے ہی ایک داستان نگاہوں کے سامنے کھل گیا تھا۔ لگا جیسے کسی طوفانی جھکڑ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر زمین سے اٹھایا ہے اور وقت کی سرنگ سے گزار کر کئی برس پیچھے ایک مکان کی چھت پر پھینک دیا ہے۔ میں اس چھت پر کھڑا منڈیر کے رخنوں میں سے ایک کمرے میں جھانک رہا ہوں۔ اس کمرے میں ایک لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور دیکھتا چلا جارہا ہوں۔ میری آنکھ جھپک رہی ہے نہ میری سانس چل رہی ہے۔ بس دل دھڑک رہا ہے اور اس کی ہر دھڑکن سے کسی کی صدا آرہی ہے۔ یہ کس مکان کی چھت ہے؟۔۔۔ یہ کون لڑکی ہے؟ میں اس چھت کو اور اس لڑکی کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ بھول ہی نہیں سکتا۔ کوئی پودا اپنی زمین کو، کوئی شعلہ اپنی شمع کو اور کوئی برگ اپنی شاخ کو بھول سکتا ہے؟ اور بھول کے زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ میرے گھر کی چھت ہے جہاں میں اپنے والدین اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا ہوں۔ دور ایک دوسرے مکان کے کمرے میں آئینے کے سامنے بال سنوارنے والی لڑکی میری زندگی ہے، میری پہلی اور آخری خواہش۔۔۔ غزالہ!

ایک دم ہی میں سب کچھ بھول گیا۔ زوئے مشت کا یہ ویرانہ، یہ پائندہ بستی، یہ سردی کی لہروں پر ڈولتا ابھرتا خیمہ۔۔۔ نجو، فریال، عیسیٰ جان، ننگر، لشکر خاں، کچھ بھی مجھے یاد نہ رہا۔ میرا ذہن برسوں کے فاصلے لمحوں میں پاٹتا ہوا ساہیوال کے اس مضافاتی قصبے میں پہنچ گیا جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی اور پروان چڑھا تھا۔ جہاں میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہوا تھا، میرے پاؤں نے پہلا قدم اٹھایا تھا، میرے قلم نے پہلا لفظ لکھا تھا اور پھر میرے دل نے پہلی محبت کی تھی۔ پہلی محبت جس میں کوہی ندیوں کی شوریدہ سری، سمندروں کی گہرائی اور اکھاڑ دینے والے طوفانوں کی شدت تھی۔۔۔ ایسے طوفان جو حبس میں جنم لیا کرتے ہیں اور ہمارا قصبہ حبس اور گھٹن میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس قصبے پر اور اردگرد کے چند دیہات پر ایک خدائی فوجدار کی طرف سے ایک ایسا قانون نافذ کردیا گیا تھا جس کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ جی دار متوالے اسے توڑیں۔۔۔ سزا کے خوف سے بے نیاز ہوکر اس کی دھجیاں بکھیریں اور بکھیرتے رہیں۔ "جل کوٹ" نام تھا ہمارے قصبے کا۔ قصبے کے چوہدری بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ اردگرد کے سات آٹھ دیہات ان کی ملکیت تھے۔ بڑے چوہدری کا نام نادر علی تھا لیکن خاص و عام اسے وڈا میاں کہتے تھے۔ میں نے بچپن میں وڈے میاں کو دیکھا تھا تو وہ کلین شیو تھا لیکن پھر اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھ لی تھی۔ اس داڑھی میں سیاہی اور سفیدی ایسے ہی ملی ہوئی تھی جیسے وڈے میاں کے کردار میں۔ وہ نمازی تھا، خیر خیرات کرتا تھا۔ گیارھویں شریف کی دیگیں پکاتا تھا اور علاقے میں اصلاحی کمیٹیاں قائم کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ذخیرہ اندوز تھا، دھوکے باز تھا، سخت مزاج تھا اور اکثر لوگ کہتے تھے کہ قاتل بھی ہے۔ وڈے میاں نے اپنی زمینوں کو ایک چھوٹی سی جاگیر کی شکل دے رکھی تھی اور اس جاگیر میں وہ مطلق العنان حکمران تھا۔ اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات حتمی اور ہر فیصلہ قانون ہوتا تھا۔ یہ بات مشہور تھی کہ وڈے میاں کے باپ چوہدری سہراب نے اپنی بیٹی کو ایک کم درجہ زمیندار سے پیار کرنے کی سزا یہ دی تھی کہ بیٹی کو اس کے محبوب اور محبوب کے اہل خانہ سمیت گولیوں سے چھلنی کردیا تھا۔ بعد میں ان چند لاشوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی اور راکھ دریا برد کردی گئی تھی۔ اس عظیم سانحے کی دہشت

بیٹے ایک نسل ہی کو متاثر نہیں کیا تھا اس کے بعد آنے والی نسل میں بھی یہ دہشت سرایت کر گئی تھی اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی شدت بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی تھی۔ وڈا میاں نہ صرف اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا تھا بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے گیا تھا۔ اس نے چوہدراہٹ سنبھالتے ہی اپنے دیہات میں ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرایا تھا کہ ان دیہات میں ہر شخص کو اور خاص طور پر نوجوانوں کو پابند زندگی گزارنی ہوگی۔ یہاں کا کوئی نوجوان سینما دیکھنے شہر نہیں جائے گا اور نہ شہر کے کسی کھیل تماشے میں حصہ لے گا' کوئی لڑکا بال نہیں بڑھائے گا' کڑھائی دار کرتا نہیں پہنے گا۔ سرِ عام گانا نہیں گائے گا اور کوئی ساز بجانا نہیں سیکھے گا۔ دیہات کی حدود میں ریڈیو اخبار وغیرہ "حرام" ہوں گے۔ اس حرام کو حلال کرنے والے ہر شخص کو سزا دی جائے گی۔ اگر کسی لڑکی لڑکے میں میل ثابت ہوگیا تو دونوں سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے اور اگر ان کے والدین ذمے دار پائے گئے تو وہ بھی پیسے جائیں گے۔

جن دنوں یہ "حکم نامہ" جاری ہوا میں سات آٹھ سال کا تھا۔ معاملات کی کچھ زیادہ خبر نہیں تھی لیکن ایک طرح کی دہشت میں نے اس وقت بھی اپنے قصبے میں سنسناتی محسوس کی تھی۔ اس دہشت کی اصل وجہ میری سمجھ میں اس وقت آئی تھی جب ہمارے قصبے میں یکے بعد دیگرے دو نوجوانوں کو "جرم محبت" یا "شبۂ محبت" میں ذلت آمیز سزا دی گئی۔ وہ مناظر میرے پردۂ ذہن پر کسی دھندلی زرد فلم کی طرح متحرک ہیں۔ ان لڑکوں کے سر' مونچھیں' بھنویں سب کچھ مونڈ دیا گیا تھا پھر ان کے چہرے کالے کرکے انہیں گدھے پر الٹا بٹھایا گیا تھا اور گلے میں جوتیوں کے ہار ڈال کر پیچھے لڑکے لگا دیے گئے تھے۔ یہ عبرت ناک جلوس پورے قصبے سے گزرا تھا اور ہر آنکھ نے محبت کو تماشا بنتے دیکھا تھا۔

یہ دو واقعات آخری نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی اکثر ڈنکے کی چوٹ پڑتی رہی تھی اور بدنصیب نوجوانوں پر فرد جرم عائد کرکے ان سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا رہا تھا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ "طاقت" کسی مسئلے کا حل نہیں اور محبت میں تو یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ اسے جتنا دباؤ اتنا ہی ابھرتی ہے۔ وڈے میاں کے علاقے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ تمام تر خوف اور دہشت کے باوجود محبت کرنے والے محبت کرتے رہے' آنکھیں ملتی رہیں اور دل دھڑکتے رہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ سب کچھ نہایت احتیاط اور رازداری سے ہونے لگا۔ وڈا میاں بڑے فخر سے اعلان کیا کرتا تھا کہ یہ غیرت مندوں کا علاقہ ہے۔ یہاں نوجوان لڑکیاں غیر لڑکوں سے پینگیں نہیں ڈالتیں اور کھیتوں میں رنگ رلیاں نہیں منائی جاتیں لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ ان دیہات میں بھی وہ سب کچھ ہوتا تھا جو ازل سے زندگی کا حصہ رہا ہے اور کبھی کبھار وڈے میاں کو اس کا ثبوت بھی مل جاتا تھا۔ ایسے میں وڈے میاں کا قہر پوری ہولناکی سے اپنے معتوب پر ٹوٹتا اور دیکھنے والوں کو دہلا جاتا۔ چند ماہ نسبتاً خاموشی سے گزرتے "اہل دل" سہمے سہمے رہتے۔ بڑے بوڑھے تواتر سے اپنے بچوں کو سمجھاتے رہتے۔۔۔ لیکن پھر غیر محسوس طور پر سابقہ معمولات لوٹ آتے اور فطرت خاموشی سے اپنے راستے بنانے لگتی۔

میں بھی اسی حبس زدہ فضا میں پل کر لڑکپن کی حدود تک پہنچا تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر ہوگی میری' مڈل کا امتحان میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اور اب میٹرک کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میرے والد کا نام وقار احمد تھا۔ وہ محکمہ انہار میں ایس ڈی او تھے۔ صرف تنخواہ پر گزارا کرتے تھے اور شب و روز سفید پوشی برقرار رکھنے کی فکر میں رہتے تھے۔ سفید پوشی برقرار رکھنے کی فکر کوئی معمولی فکر نہیں ہوتی۔ اس فکر نے انہیں چالیس سال کی عمر میں دل کا مریض بنا دیا تھا۔ ایک دفعہ وہ شدید بیمار ہوئے تو ڈاکٹری رپورٹوں سے پتا چلا کہ ان کے دل میں ایک خطرناک سوراخ ہے۔ ان دنوں ایسے مرض سے شفایاب ہونے کی توقع نہ ہونے کے برابر تھی۔ اگر ہوتی بھی تو ہمارے پاس اتنا سرمایہ کہاں تھا کہ مسیحائی کی نذر کیا جاتا۔ بیرون ملک تو دور کی بات ہے' اندرون ملک بھی مہنگا علاج کرانا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ والد صاحب کے دوستوں نے کوشش کی کہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے انہیں باہر بھیجا جائے اور اس سلسلے میں ارباب اختیار کو درخواستیں بھی گزاریں۔ ممکن ہے کچھ درخواستوں پر تھوڑی بہت کارروائی ہوئی ہو لیکن والد صاحب کی وفات تک یہ درخواستیں صرف درخواستیں ہی رہیں۔ میری جنت نشیں والدہ ایک بے حد سادہ اور شوہر پرست عورت تھیں۔ میں نے پندرہ سولہ سال کی عمر تک انہیں کبھی والد صاحب سے اونچی آواز میں بولتے نہیں سنا۔ بڑی ملائم آواز میں وہ انہیں "آپ" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں' جواب میں والد صاحب بھی انہیں آپ' جناب' حضور جیسے القابات سے نوازتے تھے۔ ابا سے امی کی محبت پہلے بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن جب سے وہ بیمار ہونے لگے' وہ ان پر نچھاور ہوکر رہ گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ گھر سے باہر اور گھر کے اندر اپنے مجازی خدا کے لیے ایک ایسی جنت تعمیر کردیں کہ جس میں کسی پریشانی

اور بے قراری کا سایہ تک نہ ہو۔

میرے چچا جلیس نثار احمد بھی جل کوٹ میں ہی رہتے تھے۔ ان کا گھر ہماری ہی گلی میں دو تین مکان چھوڑ کر تھا۔ چچا جلیس کا میلان شروع سے زمینیں خریدنے اور بیچنے کی طرف تھا۔ انہوں نے اس کاروبار میں کافی پیسہ کمایا تھا۔ اچھا کھاتے پہنتے تھے اور جل کوٹ میں ان کا نیم ماڈرن مکان وڈے میاں کی حویلی کے بعد سب سے شاندار سمجھا جاتا تھا۔ غزالہ چچا جلیس کی اکلوتی بیٹی تھی اور بے حد لاڈلی بھی۔ بچپن سے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے آئے تھے۔ کبھی کبھی تھوڑا وقت ساتھ گزارنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ سیاہ آنکھوں والی وہ گڑیا سی لڑکی نگاہ کے راستے نہ جانے کب میرے دل میں اتر گئی تھی اور اس کی محبت گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرے لہو میں رچتی بستی چلی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اکثر مجھے اس محبت کا احساس ہوتا رہتا تھا لیکن شدید ترین احساس اس دن ہوا تھا جب غزالہ جل کوٹ کے گلیاں کوچے ویران چھوڑ کر پڑھنے کے لیے ساہیوال اپنی خالہ کے پاس چلی گئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ قصبے کی ساری خوبصورتی اور رونق اپنے چھوٹے سے اٹیچی میں بھر کر لے گئی ہو۔ وہ اٹیچی کیس تھا یا عمرو عیار کی زنبیل! جل کوٹ کے سارے قہقہے' ساری مسکراہٹیں' پنگھٹوں کی گہما گہمی' میلوں کی رونق' موسموں کی ترنگ' صبحوں کی چمک' شاموں کی جگمگاہٹ سب کچھ اس اٹیچی کیس میں بند ہوکر رہ گیا تھا اور وہ اٹیچی ساہیوال کی کسی چار دیواری میں کسی الماری کے اندر جا چھپا تھا۔

غزالہ کے جانے کے بعد میں ہفتوں سوچتا رہا کہ میں کیوں اداس ہوں اس کے لیے؟ اس نے تو کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی' ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نخوت آمیز سنجیدگی کی ایک تہ اس کے من موہنے نقوش کو ڈھانپ لیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے شاہ جہاں کے بجائے ہمیشہ "اے جانی" کہہ کر بلایا تھا۔ بالکل اسی انداز میں جیسے چچا جلیس بلاتے تھے اور چچی فاخرہ بلاتی تھیں لیکن کچھ بھی ہے' میری اداسی ایک حقیقت اور محبت بھی ایک حقیقت تھی۔ غزالہ سے جدا ہوکر میں دن رات تڑپتا رہا۔ اس کا تصور شب و روز میری نگاہ میں رہتا تھا۔ وہ دس گیارہ سال کی تھی لیکن اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ نکلتا ہوا قد' کھلے ہاتھ پیر' صراحی سی گردن اور آنکھیں جن میں سچے موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ سردیوں کی دوپہر میں وہ قصبے کے اسکول سے پڑھ کر واپس آتی تو اس کے شہابی رخسار انگاروں کی طرح دہکتے دکھائی دیتے۔ ان رخساروں کو دیکھ کر میرے دل میں اشتیاق جاگتا کہ اپنے ہاتھوں کو برف کی سل پر رکھ دوں اور جب ہتھیلیاں ٹھنڈی ہوجائیں تو ان سے دھیرے دھیرے ان رخساروں کو سہلانے لگوں۔ سہلاتا چلا جاؤں یہاں تک کہ ایک عمر بیت جائے لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ ان دہکتے رخساروں والی غزالہ بڑی شان سے قدم اٹھاتی ہمارے بوسیدہ دروازے کے سامنے سے گزرتی اور اپنی شاندار حویلی کے گیٹ میں اوجھل ہوجاتی۔ میں بھاگ کر چھت پر آجاتا۔ وہ اپنے گھر کے نیم روشن کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوجاتی۔ اپنے شہابی رخساروں کا نظارہ کرتی اور لمبے بال کھول کر کنگھے سے سنوارنے لگتی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اس کے بال پشت کے خم تک پہنچتے تھے۔ شاید یہی بال تھے جن کے سبب وہ عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ سر کو بڑے انداز سے ایک طرف جھکا کر وہ اپنے بالوں میں کنگھا کرتی اور میں اپنی دھڑکنوں سے برسرِ پیکار ہوجاتا۔ جب وہ شہر چلی گئی تو مجھے چچا جلیس کی شاندار حویلی بھی اپنے مکان کی ہی طرح بوسیدہ نظر آنے لگی۔ نیم روشن کمرے میں رکھا ہوا آئینہ ویران ہوگیا اور کھڑکیوں میں یادوں کے جالے لٹک گئے۔

لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ عارضی فاصلے محبت میں شدت پیدا کردیتے ہیں۔ میرے اندر بھڑکنے والی آگ بھی فزوں تر ہوگئی تھی۔ جب دو تین ہفتے بعد غزالہ شہر سے قصبے میں آتی تو میں دیوانہ وار اس کے گرد چکراتا۔ بہانے بہانے سے چچا کی حویلی میں جاتا اور غزالہ کے قرب سے اپنے سینے کی آگ کم کرنے کی کوشش کرتا۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ یقیناً اندھی ہوتی ہے۔ میں بھی جانتے بوجھتے ایک جہنم زار میں قدم رکھ رہا تھا۔ محبت کرنا اور وہ بھی وڈے میاں کی راجدھانی میں' اندھا پن ہی تو تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں ایک ایسی راہ پر چل رہا ہوں جو عنقریب مجھے پاتال میں گرا دے گی۔

مجھ سے چھوٹے دو بھائی بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے۔ شگفتہ مجھ سے دس گیارہ برس چھوٹی تھی۔ جب میں سولہ سال کا تھا' اس کی عمر پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی والدین کی آنکھ کا تارا تھے۔ اپنی بیماری کی نوعیت جاننے کے بعد والد صاحب ہم دونوں کو کچھ زیادہ ہی وقت دینے لگے تھے۔ خاص طور پر انہیں میری تربیت کی بہت فکر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے وصیتیں کر رہے ہوں۔ ان کا ہر حرف میرے لیے مشعل راہ تھا۔ وہ مجھے سر اٹھا کر جینے کا فن سکھا رہے تھے۔ خودداری اور محنت کی وہ راہ دکھا رہے تھے

جس پر چلنے والے کے سر پر عزتِ نفس کا تاج ڈگمگاتا نہیں اور اسے اپنے ضمیر کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہونا پڑتا۔

ابا جان اچھی کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے اور موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ گو ہمارے قصبے میں کئی دوسری چیزوں کی طرح موسیقی بھی شجرِ ممنوعہ تھی۔ تاہم والد صاحب کے پاس ایک پرانا ٹیپ ریکارڈر موجود تھا۔ کبھی کبھی وہ بند کمرے میں موسیقی سے دل بہلاتے۔ میں نے اکثر انہیں یہ گیت سنتے پایا۔ 'یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے' افسوس ہم نہ ہوں گے۔ اس وقت مجھے یا شفا کو ان کی بیماری کا کچھ پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں جب بھی ابا جان یہ گیت سنتے میرا سینہ یاس کی دھند سے بھر جاتا۔ ایک عجب سی بے کلی سماعت کے راستے لہو میں سرایت کرتی اور دل کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ ایک دفعہ میں نے دروازے کی جھری سے ابا جان کو یہ گیت سنتے دیکھا۔ چیک بوشرٹ پہنے وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ بالوں سے بھرے ہوئے دونوں بازو سینے پر باندھ رکھے تھے۔ گود میں فیض احمد فیض کی ایک کتاب دھری تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ دور خلا میں کسی نادیدہ نقطے کو دیکھ رہے تھے۔ فضا میں بول ابھر رہے تھے۔ کوئی نہ ساتھ دے گا' سب کچھ یہیں رہ جائیں گے ہم اکیلے' یہ زندگی کے میلے' دنیا میں کم نہ ہوں گے۔ وہ منظر آج تک میری نگاہوں میں نقش ہے۔ اس کے بعد مجھے کبھی ابا کے کمرے میں جھانکنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ایک موقعے پر کچھ دنوں کے لیے ابا زیادہ علیل ہوگئے۔ یہ سخت سردیوں کے دن تھے۔ ابا کو سینے میں درد تھا اور گاہے گاہے ٹمپریچر بھی بڑھ جاتا تھا۔ پورے ہفتے امی ابا کی پٹی سے لگی رہیں۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں وہ۔ نہ رات کو سوتی تھیں نہ دن کو آرام کرتی تھیں اور یہ بھی نہیں کہ ان کے چہرے یا حرکات و سکنات سے سستی ظاہر ہو۔ پورے گھر میں چکراتی پھرتی تھیں۔ ادھر ابا نے آواز دی "نصرت بیگم" ادھر وہ پکاریں "جی آئی" اور آواز کے ساتھ ہی ان کے سرہانے پہنچ گئیں۔ دو ہفتے بعد ابا جان ٹھیک ہوئے اور اپنے پاؤں پر چل کر جمعے کی نماز پڑھنے گئے تو امی جیسے جی اٹھیں۔ اس روز انہوں نے میٹھے چاول پکائے تھے اور بچوں میں تقسیم کیے تھے۔ یوں تو گڑ کے چاول تھے مگر بڑے اہتمام سے پکائے گئے تھے۔ بادام گری اور کشمش ڈالی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں امی کے جہیز کے ساتھ آنے والا پیتل کا ایک بہت بڑا دیگچہ تھا۔ اس میں یہ چاول پکے تھے۔

امی وہ دیگچہ گھسیٹ کر صحن میں لے آئی تھیں۔ اس روز انہوں نے رنگ دار لباس پہن رکھا تھا۔ سپید رخساروں پر چاندی کے خوب صورت بُندے ہلکورے لے رہے تھے۔ اپنے شوہر کی صحت یابی پر تھالیاں بھر بھر کر چاول بانٹتی ہوئی وہ ماں ایک بیٹے کی آنکھ کو بڑی پیاری لگی تھی۔ کچھ چاول قریبی گھروں میں دینے کے لیے ماں نے علیحدہ رکھے ہوئے تھے۔ ان چاولوں میں سے دو تھالیاں چچا جلیس کے گھر دینی تھیں۔ یہ کام میرے ذمے لگا۔ ماں نے ایک ٹرے میں تھالیاں رکھ کر خوان پوش سے ڈھکیں اور بولیں "جاؤ پتر! اپنی چچی کو دے آؤ۔"

میرے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ آج تو میں سر کے بل بھی چچی کے گھر جا سکتا تھا۔ کل سے غزالہ آئی ہوئی تھی اور اسے دیکھنے اور چھونے کی حسرت میرے سینے میں پچھلے تین ہفتوں سے الاؤ کی طرح بھڑک رہی تھی۔ میں ایسا جلد باز تو نہیں تھا اور نہ ہی ایسا بے وقوف' لیکن نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ غزالہ کو چھونے کی طلب میرے اندر بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس طلب کو بڑھانے میں کچھ ہاتھ میرے شہری کزن فاروق کا بھی تھا۔ وہ میٹرک کا امتحان دے کر چھٹیاں گزارنے جل کوٹ آیا ہوا تھا۔ اس کی بالغانہ صحبت اور سنسناتی سرگوشیوں نے میرے سینے میں ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ غزالہ کی خاموشی' اس کی بے رخی اور بے پروائی کی فاروق نے ایسی ایسی توضیحات کی تھیں کہ میں بزعمِ خود رانجھا بن کر غزالہ کو ہیر سمجھنے لگا تھا۔ ایسی ہیر جسے میرا ایک پُرتپش لمس چند لمحوں میں بالغ کر سکتا تھا اور جو میری بانسری کی دھن پر بے تاب ہو کر مچل سکتی تھی۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں اپنے انجام سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنا ایک اندھا' پہاڑ کے سامنے پہنچ کر پہاڑ کی موجودگی سے ہوتا ہے۔

میں چاول دینے چچی کے گھر پہنچا تو حالات بڑے ہی سازگار نظر آئے۔ چچی اور دو نوکرانیاں حویلی کی چھت پر دھوپ سینک رہی تھیں۔ چچا گھر میں نہیں تھے اور غزالہ کا چھوٹا بھائی نیپو کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ غزالہ ننھے نیپو کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی ایک انگلش کتاب پڑھ رہی تھی۔ شہر جا کر وہ انگلش میڈیم اسکول میں داخل ہوئی تھی اور مجھ سے کئی جماعتیں پیچھے ہونے کے باوجود اس کی انگلش مجھ سے اچھی تھی۔ پڑھائی سے ہٹ کر بھی وہ بے حد ذہین تھی اور نوعمری میں ہی بڑوں جیسی باتیں کرتی تھی۔ میں برآمدے میں کھڑا اسے بغور دیکھتا رہا۔ وہ میری آمد سے بے خبر تھی۔ میں نے جی بھر کے اسے نگاہوں میں اتارا اور پھر اندر چلا گیا

"اسلام علیکم" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ تم کب آئے جانی؟" اس نے جلدی سے دوپٹا سر پر رکھ لیا۔ سر کے سوا اسے ڈھانپنا بھی کیا تھا۔ ابھی لڑکپن اور بلوغت کے درمیان کھڑی تھی وہ۔

"ہوا ایک منٹ ہوگیا ہے" میں نے کہا۔

"تو کیا کر رہے تھے اتنی دیر سے؟" اس نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں دیکھ رہا تھا" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

"اچھا' خواہ مخواہ باتیں نہ بنایا کرو۔" وہ ناگواری سے بولی "امی اوپر چھت پر ہیں۔"

"لیکن میں تو تم سے ملنے آیا ہوں" میں نے لڑکپن کی شوخی سے کہا۔

"کیا کہنا ہے مجھ سے؟"

"بتاؤں؟" میرے ذہن میں دھند سی پھیل رہی تھی۔

"بتاؤ" وہ جزبز ہو کر بولی۔

میں نے ٹرے میز پر رکھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ اس واضح "اظہار" کے بعد غزالہ کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اسے ایک دم چپ لگ جائے گی اور وہ شرمانا' بل کھانا شروع کر دے گی لیکن میری اس حرکت نے اسے بالکل سیخ پا کر دیا' اور اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ تھیوری اور پریکٹیکل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میرے شہری کزن کا پڑھایا ہوا پہلا سبق ہی غلط ثابت ہوگیا تھا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ پیچھے ہٹنے کے بجائے مجھے بہتر نظر آیا کہ آگے بڑھوں اور سینے میں مہینوں سے جاری کشمکش کو کسی نتیجے پر پہنچا دوں۔

میں نے آگے بڑھ کر غزالہ کو بانہوں میں لے لیا۔ مجھے اس کے جسم سے کچے آموں کی خوشبو آئی۔ مجھے لگا جیسے میں ابھی بابِ فردوس کے باغ میں پیڑ سے اترا نہیں ہوں۔ عجب دیوانگی سی مجھ پر طاری ہوئی۔ اس کا نوخیز شاخ سا جسم میرے جذبات کے تند جھونکوں میں لچک کر دوہرا ہو گیا پھر یہ شاخ زیادہ لچکی تو تڑاپ کر شائیں سے میرے رخسار پر آپڑی۔ اس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ وہ مجھے دھکیل رہی تھی۔ مار رہی تھی' مجھ پر چلا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس کا منہ بند کر دیا۔

تھپڑ کھا کر ایک دم ہی جیسے میں ہوش میں آگیا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ کنڈی لگانے کی سنگین غلطی کے بعد میں غزالہ کو دبوچنے کی سنگین ترین غلطی بھی کر چکا ہوں۔ ایک دم ہی میرے جذبات کا چڑھا ہوا دریا ایک خشک آب جو بن گیا۔

میں نے دیکھا' غزالہ کی قمیص دو جگہ سے پھٹ چکی ہے اور اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر میری ہتھیلی کی مہر تھی ورنہ وہ چلا چلا کر پوری حویلی یہاں جمع کر لیتی۔ میں سراپا کانپنے لگا "مجھے معاف کر دو غزالہ۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تمہیں خدا کا واسطہ' کسی کو کچھ نہ بتانا۔"

میں نے اسے چھوڑا تو وہ ایک جھٹکے سے دور جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں نیلی آگ روشن تھی۔ میں نے ایک ذرا سہمی نگاہ بند دروازے پر ڈالی اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں شرمندہ ہوں غزالو' مجھے غلطی لگ گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔ تم جو قسم چاہو مجھ سے لے لو۔ آئندہ میں تمہیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔"

وہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ ساکت و جامد۔ میں جانتا تھا کہ اس کی خاموشی گفتگو سے زیادہ مہلک ہے۔ اچھی بات پر اَڑ جانے کا اس کا یہ مخصوص انداز تھا۔ میں نے چچا چچی تک کو اس انداز کے سامنے بے بس دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے معاف نہیں کرے گی اور میری اس حرکت کا ڈھنڈورا ابھی پوری حویلی میں پٹ رہے گا۔ نسلوں سے پابندیوں میں جکڑا ذہن خوف سے چیخ گیا۔ ایک لمحے کے لیے دادے میاں کا چہرہ میری نگاہ میں گھوما اور میرے دل میں آئی کہ اپنے راز کو راز رکھنے کے لیے اس لڑکی کو قتل کر دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ابھی قتل کی لکیریں بننا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی ان ہتھیلیوں پر ایک نیک ماں کے بوسے چمکتے تھے اور پھر یہ لڑکی جو زہر آلود تلوار کی طرح میری آنکھوں کے سامنے تھی' میری محبت بھی تو تھی۔ میں اسے کیسے مار سکتا تھا۔ میں اس کے سامنے بس گڑگڑا سکتا تھا اور اپنے گناہ کی معافی طلب کر سکتا تھا اور میں نے یہ سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پھٹی ہوئی قمیص کے ساتھ باہر جانے لگی اور مجھے اپنا انجام نظر آیا تو میں رو دیا لیکن وہ کسی روبوٹ کی طرح سیدھی چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

آنکھوں سے جذبات کی پٹی ہٹنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں ایک خوفناک چکر میں پھنس گیا ہوں۔ دادے میاں نے معاف کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف چچی سے بھی کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو ہمیں ذلیل و خوار کرنے کے لیے کسی موقعے کی تاک میں رہتی تھی۔ میں نے گھر واپس پہنچ کر اپنے کزن فاروق کو اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ وہ ہنس دیا اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا' بولا "تم نرے چغد ہو شاہجہاں۔ اس گاؤں میں رہ کر شاہ دولے کے چوہے بن گئے ہو۔ چھوٹا سا تمہارا دماغ ہے اور اس سے بھی

چھوٹا دل۔ یہ لڑکیاں ایسے ہی نخرے دکھایا کرتی ہیں۔ تم دیکھنا کسی کو بھنک تک نہیں پڑے گی۔ اگر پڑے گی بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ اور۔۔۔ اور تم نے کیا بھی کیا ہے؟"

"لیکن وہ تو پھٹی قمیص کے ساتھ باہر نکل گئی تھی؟"

"ارے گھامڑ! صرف تجھے دکھانے کے لیے۔ باہر جاتے ہی اس نے قمیص چادر سے ڈھانپ لی ہوگی۔ آج رات میں رہ قمیص کہیں ٹھکانے لگ جائے گی اور پھر روزِ حشر تک اس کا پتا نہیں چلے گا۔"

فاروق نے جو کچھ کہا تھا حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ شام کی اذان سے پہلے پہلے یہ خبر چچا کی حویلی سے نکل کر پورے جل کوٹ میں پھیل گئی کہ وقار احمد کے بیٹے نے چچا کی بیٹی سے زیادتی کی ہے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ میرے ذہن میں فوری بات یہی آئی کہ جل کوٹ سے بھاگ جاؤں۔ میری ماں بیرونی دروازے کے پاس گھر میں جنبھی چارلوں والا۔ بجھ دھو رہی تھی۔ ابھی وہ اس واقعے سے بے خبر تھی لیکن کسی بھی لمحے یہ خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچنے والی تھی۔

میں نے مکان کی عقبی دیوار پھلانگی اور ایک ایسی گلی میں آگیا جو کچھ آگے جاکر کھیتوں سے جاملتی تھی۔ نیم تاریک گلی میں دوڑتا ہوا میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ کچھ آوازیں آئیں اور میرے دائیں بائیں سے وڈے میاں کے کارندے نمودار ہوگئے۔

اُن کی تعداد دس بارہ سے کم نہیں تھی۔ دو تین کے ہاتھ میں بندوقیں تھیں اور اتنے ہی لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ غالباً انہوں نے مجھے گھر کی دیوار پھلانگتے دیکھ لیا تھا اور ساتھ والی گلی میں دوڑتے ہوئے میرے سر پر پہنچ گئے تھے۔ وہ دو اطراف سے نمودار ہوئے تھے۔ میرے عقب میں سپاٹ دیوار تھی اور سامنے ایک جوہڑ۔ شفق کی سیاہی مائل سرخی جوہڑ کے پانی میں منعکس ہو رہی تھی۔ ایک بچہ دو بھینسوں کو دھکیل دھکیل کر جوہڑ سے باہر نکال رہا تھا۔ جوہڑ کے کنارے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر چند بطخیں بڑی متانت سے ایک قطار میں چلی جارہی تھیں۔ سب کچھ ویسے ہی تھا جیسے میں روز دیکھتا تھا۔ صرف میں جانتا تھا کہ میرے سینے میں کیا اتھل پتھل مچی ہوئی ہے اور میرے سر پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

میں بھاگ کر بطخوں کے درمیان سے گزرا۔ وہ کائیں کائیں کرتی دائیں بائیں لپکیں۔ میں نے جوہڑ میں چھلانگ لگائی اور اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلاتا دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اپنے عقب میں وڈے میاں کے کارندوں کی غلیظ گالیاں سنائی دیں۔ ان میں سے چند نے میرے پیچھے ہی چھلانگیں لگادیں اور کچھ کلاوا کاٹ کر دوسرے کنارے کی طرف بڑھے تاکہ اگر میں جوہڑ پار کرلوں تو مجھے روکا جاسکے۔ میرے جوہڑ پار کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ میرے پیچھے پانی میں کودنے والوں نے جوہڑ کے عین وسط میں مجھے دبوچ لیا۔ یوں لگا جیسے میں ایک دم فولادی ہتھوڑوں کی زد میں آگیا ہوں۔۔۔ وہ مجھے مار رہے تھے۔ اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینک رہے تھے اور ماں بہن کی بدترین گالیاں دے رہے تھے۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلنے لگا۔ میری قمیص پھٹ گئی اور غوطے کھا کھا کر دم آنکھوں میں آگیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جوہڑ کے کناروں پر بہت سے لوگ اکٹھے ہوچکے ہیں اور میری دُرگت بنتے دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت ذہن کو "تکلیف" کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا "بے عزتی" کا تھا۔ یہ سوچ سوہانِ روح ہو رہی تھی کہ ابھی چند لمحوں میں میری نیک نام ماں کو اور میرے بیمار باپ کو میری حالت کا پتا چلنے والا ہے۔

وڈے میاں کے کارندے مجھے کھینچتے ہوئے پانی سے باہر لائے اور بے دریغ پیٹنے لگے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں احتجاج کر رہا تھا، اپنی صفائی پیش کر رہا تھا یا انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں مزاحمت کر رہا تھا اور ابھی تک اسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح ان کے نرغے سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ ایک سخت ہاتھ نے میرے پھٹے ہوئے گریبان کو دبوچ رکھا تھا، ایک ہاتھ کی نہایت ظالمانہ گرفت میرے بھیگے بالوں پر تھی، ایک ہاتھ شلوار کے نیفے میں تھا۔۔۔ یہ ہاتھ اور ایسے ہی کئی ہاتھ مجھے وڈے میاں کی حویلی کی طرف کھینچ اور دھکیل رہے تھے۔ ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ ڈری ہوئی نگاہیں تھیں اور کچھ تماشا دیکھتی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں اور نگاہوں میں ہر گھڑی اضافہ ہو رہا تھا۔ قصبے کی فضا میں جیسے کھلبلی مچ گئی تھی۔ دروازے دھڑ دھڑ کھل رہے تھے اور لوگ لپک لپک کر باہر آرہے تھے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! وہ جو سب کچھ تو ان گلی کوچوں میں ہوتے دیکھ رہا ہے آج تجھ پر بیتنے والا ہے۔ تیرے گلے میں جوتوں کے ہار ڈالے جانے والے ہیں اور تجھ پر ملامت کے ڈونگرے برسنے والے ہیں۔ کیا تو نے کبھی تصور بھی کیا تھا کہ تیرے ساتھ ایسا ہوگا؟ نہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہو اور ابھی ایک چیخ کے ساتھ تیری آنکھ کھلنے والی ہو۔۔۔ کاش یہ خواب ہو" کاش۔۔۔ "میرے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

پھر میں نے خود کو وڈے میاں کی حویلی کے دروازے کے عین سامنے پایا۔ یہاں ایک طرف حویلی کا اصطبل تھا اور دوسری طرف نوکروں کی کوٹھریاں دور تک چلی گئی تھیں۔ سامنے ایک چوک سا تھا جس میں لوہے کا ایک طویل پائپ گڑا ہوا تھا۔ ایک رسّی کے ذریعے پائپ پر روشن لالٹینیں آویزاں کی جاسکتی تھیں۔ رمضان شریف کے مہینے میں سحری اور افطار کے وقت اس پائپ پر مختلف رنگوں کی لالٹینیں آویزاں کرکے لوگوں کیلئے آسانی پیدا کی جاتی تھی۔ اس پائپ کے نیچے ٹین کی چھت والا ایک بوسیدہ کمرا تھا۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا ڈھول پڑا رہتا تھا جسے نوبت کہا جاتا تھا۔ یہ نوبت صرف خاص خاص مواقع پر بجائی جاتی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ جل کوٹ کی یہ مشہور نوبت جس کی آواز دو کوس تک جاتی ہے "آج میرے لیے بجنے والی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے وڈے میاں کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہ حویلی کے بجائے اس گلی سے برآمد ہوا جو ہمارے محلے میں جاتی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ اس وقت میری چچی سے مل کر آرہا تھا۔ چچا اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ وہ قصبے سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ ہوتا تو شاید میں اپنے عبرت ناک انجام سے بچ جاتا، بچتا نہ تو میری سختی ہی کچھ کم ہوجاتی لیکن وہ وڈے میاں سے نہیں ملا۔ وڈے میاں کی ملاقات صرف چچی سے ہوئی اور چچی میرے کیس کو جتنا سنگین بناسکتی تھی اس نے بنادیا۔ نہ مجھے اس سے رعایت کی توقع تھی اور نہ اس نے کی۔ وڈے میاں کے اختیار میں پھانسی دینا نہیں تھا ورنہ وہ یقیناً میرے لیے موت کا پروانہ بھی جاری کرالیتی۔ اس کی زبان سے میرے لیے الفاظ نہیں زہر میں بجھے ہوئے تیر نکلا کرتے تھے اور یہ بھلے وقتوں کی بات تھی۔ آج تو میں اس کی بیٹی کی قمیص پھاڑ کر آیا تھا، آج وہ برق بن کر مجھے خاکستر بھی کردیتی تو کم تھا۔ وڈے میاں نے خون بار نظروں سے مجھے گھورا، میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن خون آلود ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ نسل در نسل خون میں سرایت کرنے والا خوف ذہن کو جکڑ چکا تھا۔ میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہ گار سمجھنے پر مجبور تھا، تاہم دل میں ایک آس بھی تھی۔ شاید۔۔۔ شاید وڈے میاں مجھ پر رحم کرے۔ میرے سفید پوش باپ کی کوئی نیکی کام آجائے۔ میری تہجد گزار ماں کی کوئی دعا لگ جائے یا میری خاندانی شرافت کے کچھ رعایتی نمبر مل جائیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اپنے خاندان کی بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد چودھریوں نے کسی کو معاف نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

وڈے میاں کے ایک اشارے پر اس کے نوکروں نے مجھے اٹھا کر اوندھے منہ پختہ فرش پر پٹخ دیا اور تیل میں بھیگے ہوئے چرمی کوڑے سے بے دریغ میری کھال ادھیڑی جانے لگی۔ یہ بڑی ظالم مار تھی۔ مجھے یاد ہے، میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ بے عزتی کے احساس پر جسمانی اذیت کا احساس غالب آچکا تھا۔ اس دن مجھے پتا چلا تھا کہ اچھے بھلے جاندار لوگ کوڑے کھاکر وڈے میاں کے پاؤں میں کیوں لوٹنے لگتے ہیں اور کیوں رحم کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ میں انہیں بزدل سمجھتا تھا لیکن آج پتا چلا تھا کہ وہ بزدل نہیں بدنصیب تھے۔۔۔ کوڑے کی وہ مار مجھے آج تک یاد ہے اور اس مار کی چند ایک نشانیاں بھی میری پیٹھ پر موجود ہیں۔۔۔ اس کے بعد بھی کئی دفعہ لڑائی بھڑائی میں میرا کوڑے سے سامنا ہوا ہے لیکن جو اذیت وڈے میاں کے خاندانی کوڑے میں رچی بسی تھی کسی اور کوڑے میں نہیں پائی۔ اس بے پناہ اذیت کی ایک وجہ اور بھی میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں اس وقت ایک نوخیز لڑکا تھا۔ جلد ریشم کی طرح ملائم تھی۔ ماں باپ نے کبھی کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں ہونے دی تھی۔ ایسے میں وڈے میاں کا کوڑا جھیلنے کے لئے قوتِ برداشت آتی تو کہاں سے آتی۔ پھر بھی میں نے وڈے میاں کے آگے ہاتھ جوڑے نہ فریاد کی۔ بس اپنے ہی کرب کی دھنا دھن پر رقصِ بسمل کرتا رہا۔

"بٹھاؤ اس کھوتے کے پتر کو کھوتے پر" وڈے میاں کی تحکمانہ آواز پگھلے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتری۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وڈے میاں کا ملازم کرموں چن اور اس کا بیٹا اصطبل کی طرف سے ایک گدھے کو کھینچتے ہوئے میری طرف لا رہے تھے۔ ٹین کی چھت تلے رکھی ہوئی نوبت زور شور سے بجنے لگی تھی۔۔۔ تماشائی چاروں طرف سے امڈے آرہے تھے۔ ایک کرخت ہاتھ آگے بڑھا اور اس نے میرے چہرے پر کچھ ملنے کی کوشش کی۔ یہ کالک تھی۔۔۔ یہ کالک میرے چہرے پر نہیں محبت کے چہرے پر ملی جارہی تھی، فطرت کے چہرے پر ملی جارہی تھی۔ میں نے شدید مزاحمت کی۔ اور مجھے یاد ہے اس موقعے پر میں نے وڈے میاں سے کوئی بات بھی کی تھی۔ شاید کوئی التجا کی تھی، کوئی صفائی پیش کی تھی، کوئی دلیل پیش کی تھی۔ جواباً وڈے میاں نے بڑی نفرت سے مجھے ٹھوکر رسید کی تھی۔ اس کے گماشتے مجھے گھسیٹتے ہوئے ذلت کے عمیق ترین گڑھے کی طرف لے چلے تھے۔۔۔ اور اس وقت میں نے فیصلہ کرلیا

تھا کہ اس گڑھے میں نہیں گروں گا۔ نہ گلے میں جوتیوں کے ہار پہنوں گا' نہ منہ کالا کراؤں گا اور نہ گدھے پر بیٹھوں گا۔۔۔ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر یہ سب کچھ ہو گا تو میری لاش کے ساتھ ہو گا' میرے ساتھ نہیں۔۔۔ وقار احمد کے بیٹے کے ساتھ نہیں۔ اور پھر میں نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ مجھے یاد ہے میں دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ دانتوں سے کاٹ رہا تھا' مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ درجنوں ہاتھ مجھے گرفت میں لے رہے تھے اور میں ان کی گرفت سے پھسل رہا تھا۔

کسی شخص کو زبردستی گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس نہیں نکالا جا سکتا' ایسے جلوس اس وقت نکلتے ہیں جب سزا دینے والا پوری طرح غالب اور سزا پانے والا پوری طرح مغلوب ہو جائے۔۔۔ جل کوٹ کے باسیوں نے پہلی مرتبہ انہونی ہوتے دیکھی کہ وڈے میاں کے سفاک کارندے ایک "مجرم" کو "محبت" کی موجب سزا دینے میں ناکام رہے۔ تاہم اس جان لیوا کشمکش میں میرے جسم پر کپڑے کا ایک تار باقی نہ بچا تھا۔ میں سراپا برہنہ تھا۔ وڈے میاں کے جھنجلائے ہوئے کارندوں نے میرے برہنہ جسم پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ پھر جب میں نیم بے ہوش ہو گیا تو میرے گلے میں پگڑی کا ایک پھندا ڈال کر مجھے گلی میں گھسیٹا جانے لگا۔ یہی وقت تھا جب ابا جان ہانپتے کانپتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ وہ جس بیٹے کو اپنی طرح باوقار اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے وہ کسی جانور کی طرح گلی میں گھسیٹا جا رہا تھا اور اس کا ننگا جسم ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ مر نہ جاتے تو کیا ہوتا۔۔۔

اور وہ مر گئے۔ اسی جگہ وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا اور تکلیف سے دوہرے ہو گئے۔ لوگوں نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ سنبھلنے کے لیے نہیں گرے تھے۔ بے حد شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ایک۔۔۔ چند منٹ کے اندر اندر ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ کسی نے میرے گلے سے پگڑی نکالی' کسی نے تہبند باندھا اور کسی نے سہارا دے کر اٹھایا۔ نوبت خاموش ہو چکی تھی اور میں مبہوت کھڑا تھا۔ نہ میری آنکھ میں آنسو تھا اور نہ ہی دل میں کوئی شدید قسم کا اضطراب۔ یوں لگتا تھا کوئی معمولی واقعہ رونما ہوا ہے۔ والد صاحب فوت ہو چکے تھے مگر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابھی وہ زندہ ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا چاہیے۔ میں نے دیکھا لوگ میرے والد صاحب کی لاش چارپائی پر رکھ کر ایک طرف بھاگے جا رہے تھے۔ پھر ہمارے محلے کی طرف سے روتی پیٹتی عورتیں برآمد ہوئیں۔ ان میں میری والدہ سب سے نمایاں تھیں۔ وہ عورت جو بلوغت سے لے کر اب تک سات پردوں میں رہی تھی ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگتی آ رہی تھی۔ کاش اس وقت زمین پھٹ جاتی یا آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اپنی والدہ کی دلدوز چیخیں سنیں۔ وہ لوگوں کے ازدحام میں مجھے اور والد صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ عورتیں انہیں سنبھال رہی تھیں' مرد دلاسا دے رہے تھے۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو کر چند گلی میں گر گئیں۔ تماشائی ایک دم ان کے گرد جمع ہو گئے جیسے وہ چند لمحے پہلے والد صاحب کے گرد جمع تھے۔

میں جیسے خواب میں چلتا ہوا اپنی ماں کے پاس پہنچا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں' کنپٹی سے لہو بہہ رہا تھا اور دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں والی عورتیں انہیں پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں اور پانی ان کی باچھوں سے باہر چلا جا رہا تھا۔ کلائیوں میں موتیے کے گجرے ٹوٹ چکے تھے اور زیور رخسار پر چاندی کا بندا "مردہ" پڑا تھا۔ کسی جذباتی عورت نے میرے سر پر دو ہتڑ مارا اور مجھے کوسنے لگی۔ "نامراد! تو مر کیوں نہ گیا پیدا ہوتے ہی۔۔۔ لعنت ہے تیری زندگی پہ۔۔۔ لعنت ہے"

"لعنت ہے تیری زندگی پہ۔۔۔ لعنت ہے" یہ آواز جیسے پورے جل کوٹ میں گونج رہی تھی۔ میرے والد صاحب کی موت کی تصدیق راستے ہی میں ہو گئی۔ لوگوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسپتال لے جا کر ان کی چیر پھاڑ کرائی جائے۔ وہ انہیں واپس جل کوٹ لے آئے۔ وہ سارے مناظر میری آنکھوں میں ایک دھندلے خواب کی طرح متحرک ہیں۔ ہمارے گھر کے صحن میں نیم کے پودے تلے عورتوں کا ہجوم ایک چارپائی پر والد کا بے حس و حرکت جسم۔ ان کی چھاتی سے لپٹی ہوئی میری ننھی بہن۔ نوحے' چیخیں' آہ و بکا۔۔۔ پھر والد صاحب کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ وہ سفر آخرت پر جانے کے لئے تیار تھے۔ سر کے خوبصورت بالوں میں گلاب کی پتیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ نیلگوں ہونٹ ذرا سے وا تھے۔ وہ نیم باز آنکھوں سے اپنے گلشن کے در و دیوار پر آخری نگاہ ڈال رہے تھے۔

والد کی وفات کے بعد امی جان چھ روز مسلسل بے ہوش رہیں۔ ان کے ایک نتھنے سے کبھی کبھی خون رسنے لگتا تھا۔ انہیں ساہیوال "مشن اسپتال" لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے دماغ کی نس پھٹ چکی ہے۔ ساتویں روز وہ ہستی بھی مجھ سے جدا ہو گئی جس کے ہاتھ ہر وقت میرے لئے دعا کے

لئے اٹھے رہتے تھے اور جس کا آنچل وقت کی چلچلاتی دھوپ میں میرے سر کا سایہ تھا۔ میری ماں مر گئی۔ میں اور شفتا اس دنیا میں تنہا رہ گئے۔ تپتی کا سورج سوا نیزے پر آ گیا اور ہمارے کومل جسموں کو جھلسانے لگا۔ ہم چند روز قصبے کے امام صاحب کے گھر میں رہے پھر چچا جلیس اپنے گھر لے گیا۔ معلوم نہیں ایسا لوگوں کے طعنوں کی وجہ سے ہوا' ضمیر کی ملامت کے سبب یا پھر سچ مچ وقتی طور پر چچا کے دل میں رحم پیدا ہو گیا تھا۔ شفتا کو تو گھر میں رکھا گیا تاہم مجھے فارم پر بھیج دیا گیا۔ یہ فش فارم تھا اور یہاں چچا نے بھینسیں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں فارم پر ہی سوتا' وہیں کھانا کھاتا اور میری کتابیں بھی وہیں تھیں۔ وہ میری زندگی کے بہت کٹھن شب و روز تھے۔ باپ کی مہربان صورت' ماں کی نرم گود اور صحن میں نیم کی ٹھنڈی چھاؤں ہر گھڑی یاد آتی تھی۔ میں پہروں کتابوں پر سر جھکائے روتا رہتا۔ کوئی آواز دیتا تو یک دم چونک اٹھتا۔ کوشش ہوتی کہ آمنا سامنا نہ ہو۔ سامنا ہو جاتا تو آنکھیں چرانے لگتا۔ یوں لگتا میں ابھی تک چوراہے کے بیچ ننگا پڑا ہوں اور پورا قصبہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

ایک دو ماہ تو خیریت سے گزرے پھر چچا نے فارم پر مجھ سے ہلکا پھلکا کام لینا شروع کر دیا "جانی! آج باغیچے میں گوڈی کر دینا۔۔۔ آج بھینسوں کے لئے چارا بنا دینا۔۔۔ آج تالاب کی بانہہ ٹھیک کر دینا" پڑھائی سے میرا دل تو پہلے ہی اچاٹ ہو چکا تھا اب میں نے کتابیں بند کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ مجموعی طور پر چچا کا سلوک مجھ سے زیادہ برا نہیں تھا۔ مجھے کھانا وقت پر مل جاتا تھا۔ کپڑے گھر سے دھل کر آ جاتے تھے۔ کام بھی زیادہ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہاں قصبے میں جانے پر پابندی تھی۔ جیسے مجھے کوئی چھوت کا مرض ہے اور میں قرنطینہ میں رکھا گیا ہوں۔

شفتا کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی رہتی تھیں۔ چار پانچ مہینے میں وہ صرف تین بار مجھ سے مل سکی۔ تیسری بار میں نے اسے دیکھا تو وہ بڑی مرجھائی ہوئی تھی۔ اس کا لباس بھی میلا کچیلا تھا۔ اس روز پہلی بار میرے سینے میں شفتا کے لئے ایک طرح کی محبت جاگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس گڑیا سی بہن کو اس طرح آغوش میں چھپاؤں کہ وہ دنیا کی ہر بلا سے محفوظ ہو جائے۔ میں ہی اس کی ماں بن جاؤں' اس کا باپ بن جاؤں' اس کا آشیانہ بن جاؤں اور وہ ہر شے بن جاؤں جو اس سے چھین لی گئی ہے۔ اس روز میرے مردہ تن میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوئی تھی۔ میں اپنی ننھی بہن کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔۔۔ پر زندہ رہنے کی یہ خواہش اس وقت عروج پر پہنچ گئی تھی جب مجھے ایک دیرینہ دوست کی زبانی پتا چلا تھا کہ چچا کے گھر میں میری بہن سے اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔ چچی اس سے نوکروں کی طرح کام لیتی ہے اور چچا کی غیر موجودگی میں مارنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔۔۔ میری بہن پانچ ساڑھے پانچ برس کی نازک گڑیا تھی۔ یہ عمر تتلیوں کے پیچھے بھاگنے کی تھی۔۔۔ یہ باپ کے سینے پر مچل کر سونے کا زمانہ تھا۔۔۔ اور وہ وقت کی چکی میں پسی جا رہی تھی۔ اس کا کیا قصور تھا سوائے اس کے کہ وہ میری بہن تھی اور میرا قصور کیا تھا سوائے اس کے کہ میں نے محبت کی تھی اور اس محبت سے ہارا ہوا ایک کمزور لمحہ مجھے چچا زاد کے قریب لے گیا تھا۔

وہ ساون کی ایک خوبصورت شام تھی۔ بادل برس برس کر ابھی کھلا تھا۔ دور مشرقی افق پر قوس قزح چمک رہی تھی۔ ایسی ہی نکھری نکھری سہانی شاموں میں ابا جان ہمیں اپنی انگلی سے لگا کر کھلانے نکلتے تھے۔ آسمان اس وقت کتنا وسیع اور خوبصورت ہو جاتا تھا۔ لگتا تھا نور کی روشنائی سے فضا میں کوہ قاف کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اس روز اپنی گم گشتہ جنت دیکھنے کے لئے میرا دل بے قرار ہو گیا تھا۔ میں اپنا گھر دیکھنا چاہتا تھا اور میرے قصبے میں داخلے پر چچا کی طرف سے پابندی تھی۔ میں بہت دیر سوچتا رہا اور پھر "جوہی" کے اونچے کھیتوں میں چلتا قصبے کی طرف بڑھنے لگا۔ قصبے کے دامن میں ایک ٹیلا "ٹبلا" تھا۔ میں اس پر چڑھ گیا۔ مجھے گھر کی چھت اور صحن میں خاموش کھڑی نیم نظر آنے لگی۔ میں اپنی نگاہوں سے نیم کے چمکیلے پتوں کو چومنے لگا۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ وہ بھی رو رہے ہیں۔ میں نے تصور کی نگاہوں

سے دیکھا۔ اس نیم تلے ایک ویران صحن ہے جس میں خشک پتے بکھرے ہیں او. دیواروں پر ویرانی پر پھیلائے سو رہی ہے۔ خالی کمروں کا منظر آنکھوں کے سامنے آیا اور کانوں میں وہ غم گشتہ گیت گونجنے لگا جس میں زندگی کے میلوں اور زندگی کی بیوفائی کا ذکر تھا۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ میری نگاہ چند بچوں پر پڑی۔ وہ آبادی اور کھیتوں کے سنگم پر ایک گلی میں کھیل رہے تھے۔ مجھے لگا ان میں شفتا بھی ہے۔ میں اسے دیکھنے کے لئے بے قرار ہو اٹھا۔ گو یہ چچا کی حکم عدولی لیکن میں اس حکم عدولی سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ میں کھیتوں کے اندر ہی اندر چلتا گلی تک پہنچ گیا۔ وہ شفتا ہی تھی۔ اس کے بال گرد میں اَٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر میل کچیل اور لباس پر یتیمی کی چھاپ تھی۔ پہلی نظر میں وہ مجھ سے پہچانی ہی نہیں گئی۔

"شفتا" میں نے اسے آواز دی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لئے اپنائیت کے ساتھ ساتھ اجنبیت بھی تھی جیسے وہ کسی دوراہے پر کھڑی ہو۔ میں نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ بس کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی نازک ہتھیلی پر جلنے کا داغ تھا۔ زخم پر نیلی دوا لگی ہوئی تھی اور کھرنڈ کے نیچے سے سرخ گوشت نظر آرہا تھا۔

"یہ کیا ہوا شفتا۔ کیسے جل گیا؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ عجب سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ جو ہر وقت چہکتی تھی' اب باتیں کرنا بھی بھول گئی تھی۔ ایک لڑکی نے کہا "یہ شرارتیں کرتی تھی۔ اس کی چاچی نے ا. سے گرم چمٹا لگایا ہے۔" میں سرتاپا لرز گیا۔

"کیا شرارت کی تھی تم نے شفتا؟ کیا کیا تھا۔ بتاؤ کیا کیا تھا؟"

وہ خاموش رہی اور اپنے فراک کا کونا مروڑتی رہی۔ اس کی ننھی سی کول مٹول ناک پر پسینے کی چمک تھی۔ وہ کرب ناک انداز میں شرما رہی تھی۔ میرا قلم وہ نقشہ کھینچنے سے قاصر ہے جو اس وقت میں نے اپنی معصوم بہن کے چہرے پر دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے "کیا شرارت کی تھی تم نے؟" میں نے اسے دونوں شانوں سے جھنجوڑ کر بلند آواز پوچھا۔

ایک لڑکا بولا "اس نے شرارت نہیں کی تھی' چوری کی تھی۔ دودھ پر سے ملائی اتار کر کھائی تھی۔ اس کی چاچی نے پکڑ لیا اور جس ہاتھ پر ملائی لگی ہوئی تھی اس پر گرم چمٹا لگا دیا۔"

میں نے بے اختیار اپنے ہونٹ شفتا کی زخمی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔ "میری بہن... میں تجھ پر قربان۔ تیرے لیے میں اپنی زندگی لٹا دوں گا۔" اسی لمحے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اپنی بہن کو یہاں رہنے دوں گا نہ خود رہوں گا۔ دور ___ کہیں بہت دور نکل جاؤں گا' کبھی واپس نہ آنے کے لئے ___

بعض فیصلے ایسے ہی طوفانی ہوتے ہیں۔ لمحوں کی جنبش سے زندگیوں کا رُخ متعین ہو جاتا ہے اور سینے میں اٹھنے والی ایک ہی بلند و بالا لہر سفینوں کو منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے شفتا کو بازوؤں میں اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھیتوں میں آگیا۔ اس وقت قوس قزح میرے سامنے تھی ___ اور دور افق کے اس پار کہیں کوئی مہرباں زمیں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے کئی میل پیدل سفر کیا۔ پھر ایک تانگے میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سے بغیر ٹکٹ گاڑی میں سوار ہوا اور بہاولپور کے نزدیک ایک ویران اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں ٹکٹ چیکر کے ہاتھوں پکڑا گیا جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ کھوڑ ریکا تھا۔ میرے پاس ادا کرنے کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ٹکٹ چیکر عبداللہ شاہ ایک مہربان شخص ثابت ہوا' نہ صرف یہ کہ ہمیں اپنے گھر لے گیا بلکہ چند روز بعد اس نے ریلوے اسٹیشن پر ہی ایک چھوٹا سا خوانچہ بھی لگوا دیا۔ عبداللہ ایک دکھی باپ تھا۔ بیٹے لڑ جھگڑ کر اس سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا گھریلو ماحول سے دل برداشتہ ہو کر نجانے کدھر کا رخ کر گیا تھا۔ عبداللہ چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں اپنی بیمار بیوی کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔ چند ہی روز میں ہم وہاں ایک گھر کے افراد کی طرح گھل مل کر رہنے لگے۔ عبداللہ کی بیوی ایک خاموش طبع سیدھی سادی عورت تھی۔ اولاد کے دکھ نے اسے تپ دق کا مریض بنا دیا تھا۔ کوارٹر کے ایک علیحدہ کمرے میں وہ سارا دن لیٹی کھانستی رہتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی اس کی کوٹھری میں گھسنے لگتا تو وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگتی اور ہاتھ کے اشارے سے منع کرتی کہ ہم اندر نہ آئیں۔ مجھے اس قریب المرگ عورت میں اپنی بچھڑی ہوئی ماں کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں اسے "ماں جی" کہنے لگا۔ ان دنوں میں جو کماتا تھا ماں جی کے دوا دارو پر خرچ کر دیتا۔ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ ان کے پاؤں دباتا اور پنکھا جھلتا رہتا۔ کوئی تین ماہ بعد ماں جی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس چار دیواری میں چاچا عبداللہ یکسر تنہا رہ گیا۔ وہ ہم بہن بھائی سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم اس کے ساتھ ہی رہیں۔

میرے لئے وہ فیصلے کا دور تھا۔ میرے سینے میں ہر وقت انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ یہ آگ چچا جلیس اور چچی فاخرہ کے لئے بھی اور ان سفاک چوہدریوں کے لئے تھی جو وڈے میاں' چھوٹے میاں' نکے میاں اور پتا نہیں کیا کیا کہلاتے تھے۔ اپنے والدین کے مُردہ چہرے میری نگاہوں میں گھومتے تھے تو دل چاہتا تھا پورے جل کوٹ کو جلا کر راکھ کر دوں ___ اور پھر خود بھی آگ اوڑھ کر ابدی نیند سو جاؤں۔ کبھی کبھی یہ احساس آتشیں نیزے کی طرح میرے دماغ میں گھس جاتا کہ اپنے والدین کو قتل کرنے والا میں خود ہوں۔ میں نے کیوں ایسا کام کیا جس کا نتیجہ میرے ماں باپ کی ابدی جدائی کی صورت میں نکلا۔ کیوں میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ کیا میں جانتا نہیں تھا کہ چچی کا دل ہمارے گھرانے کے خلاف نفرت اور کدورت سے بھرا ہوا ہے اور غزالہ اسی چچی کی بیٹی ہے۔ کیوں میں نے اسے اپنے خیالوں کا محور بنایا اور اس سے آرزوئیں وابستہ کیں ___ کبھی یوں ہوتا کہ فلموں میں دیکھے ہوئے اور کہانیوں میں پڑھے ہوئے مناظر میری آنکھوں میں گھومنے لگتے اور میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ سوچتا کہ میں ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو کر اپنے دشمنوں کے لئے موت کا پیامبر بن جاؤں لیکن ایسے لمحوں میں شفتا کی من موہنی صورت آنکھوں کے سامنے آتی اور میرے جسم اور ذہن کے تنے ہوئے تار ڈھیلے پڑنے لگتے۔ میں سارے طوفانی خیالات ذہن سے جھٹک کر صرف اور صرف شفتا کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتا۔

پیلے رنگ کے کوارٹروں کی طویل قطار میں ہمارا کوارٹر آخری تھا۔ دو کمرے' ایک کوٹھری' ایک رسوئی اور ایک چھوٹا سا صحن۔ چار دیواری سے باہر ہر طرف ریت ملی مٹی تھی اور صحرائی جھاڑیاں۔ ہم نے اپنے آنگن میں پھولدار پودے لگائے' دیواروں پر بیلیں چڑھائیں اور منڈیروں پر پرندوں کے لئے پانی اور دانے کے پیالے رکھے۔ چاچا عبداللہ کی ڈیوٹی اکثر رات کی ہوتی تھی' صبح دم وہ واپس آجاتا اور میں خوانچہ لگانے کے لئے اسٹیشن چلا جاتا۔ اگر کبھی اس کی ڈیوٹی دن کی ہوتی تو میں رات کو خوانچہ لگا لیتا۔ اسٹیشن کے رات دن تو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ میرا خوانچہ بڑھتے بڑھتے اب ایک چھوٹی سی دکان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ چائے' بسکٹ' پیسٹری' شامی کباب' سگریٹ' کولڈ ڈرنک' سبھی کچھ وہاں ملتا تھا۔ معمولی کوشش سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔

میں نے شفتا کو ایک مقامی اسکول میں داخل کرا دیا اور خود بھی دوبارہ کتابوں سے ناتا جوڑا۔ اسٹیشن سے فارغ ہوتے ہی میں یوں گھر کو لپکتا جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ شفتا میرے لئے مقناطیس ہی تو تھی۔ وہ میری زندگی کا محور تھی اور میرے زندہ رہنے کا جواز بھی۔ اس کے لئے بھی میں سب کچھ تھا۔ وہ سات سال کی ہو چکی تھی لیکن مجھ سے لپٹ کر سوتی تھی' میرے ہاتھ سے کھانا کھاتی تھی اور میری گود میں بیٹھ کر کہانیاں سنتی تھی۔ میں ایک ماں کی طرح اسے نہلاتا' کپڑے پہناتا اور اس کے بالوں میں کنگھی کرتا تھا۔ ایک باپ کی طرح اس کی انگلی پکڑ کر اسے اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا' اپنے سینے کو اس کے لئے بچھونا بناتا تھا اور پھر ایک بھائی کی طرح اس سے کھیلتا تھا۔ اس سے روٹھتا اور اسے مناتا تھا ___

اسی طرح آٹھ برس گزر گئے۔ میں نے ایل ایل بی کر لیا اور نوکری کی تلاش میں جُت گیا۔ شفتا ننھی کونپل سے ایک نوخیز پودا بن گئی ___ وہ اب دسویں جماعت میں تھی اور جب سفید یونیفارم اور سفید دوپٹے میں اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلتی تو یوں لگتا جیسے کوئی خوبصورت فرشتہ رات بھر شبنم میں نہا کر اور سپیدۂ سحر سے سنور کر زمین پر اتر آیا ہو۔ دیکھنے والی نگاہ اس پر پڑتی تھی تو جم کر رہ جاتی تھی۔ نوکری کی تلاش میں مجھے آئے دن بہاولپور جانا پڑتا تھا لیکن میری کوشش رہتی تھی کہ شفتا کو خود اسکول چھوڑ کر آؤں اور وہاں سے لاؤں۔ میں جب تک اس سے دور رہتا ایک عجب بے کلی دل کو گھیرے رہتی۔ شاید یہ بے کلی اس دورِ پُرآشوب کا پیش خیمہ تھی جو مجھ پر اور شفتا پر آنے والا تھا۔

اور پھر ایک روز وہ واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ ایک معروف وکیل صاحب کو اپنے مشاورتی ادارے کے لئے اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ یہ اسامی میری ضرورت کے عین مطابق تھی اور مجھے پچھتر فیصد امید تھی کہ میں یہ ملازمت حاصل کر لوں گا۔ رات بہاولپور میں گزار کر میں اگلے روز دوپہر کے وقت گھر واپس پہنچا۔ میری غیر موجودگی میں شفتا کو اسکول سے لانے اور لے جانے کا کام اکثر چاچا عبداللہ کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک دو روز سے وہ بھی بیمار تھے۔ دوپہر ایک بجے کے قریب شفتا اسکول سے واپس آئی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میں دہل گیا۔ شفتا کے رخساروں پر سرخی اور زردی کی آمیزش بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ ہانپتی ہوئی اور پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازے کو کنڈی لگائی' کتابیں چارپائی پر پھینکیں اور بھاگ کر میری گود میں گر گئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ایک پل میں مجھے لگا پوری کائنات سسک اٹھی ہے۔ وہ

میری کائنات ہی تو تھی۔ "کیا ہوا شفقا؟" میں نے کانپتے ہاتھوں میں اس کا گلابی چہرہ لیا اور لرزاں لہجے میں اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔

"وہ میرا پیچھا کر رہے تھے"

"کون؟"

"وہ جیپوں والے شکاری۔ ان کے ساتھ پیر حتمال شاہ کا بیٹا بھی تھا"

میرے سینے میں آتش فشاں پھٹا اور رگوں میں آتشیں لاوا بہہ نکلا "کیوں پیچھا کر رہے تھے تمہارا؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں بھیا۔ میں فاطمہ کے ساتھ گھر کی طرف آ رہی تھی۔ باہو کی باغیچی کے پاس ان کی جیپیں ہمارے پاس رک گئیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ"

اس سے پہلے کہ شفقا کچھ اور کہتی، کچھ فاصلے پر ایک جیپ کا شور سنائی دیا۔ میں لپک کر کمرے میں گیا۔ دیوار سے لٹکے ہوئے ہولسٹر سے لائسنس یافتہ ریوالور نکال کر نیفے میں اڑسا اور بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا ایک جیپ ہمارے گھر کے عین سامنے سے گزر کر ساتھ والی گلی میں مڑ گئی۔

اسی شب مجھے حتمال شاہ کی حویلی میں حاضر ہونے کا حکم ملا تھا۔ پیر حتمال شاہ علاقے کا سب سے معتبر شخص تھا۔ شکار کی غرض سے آنے والے عرب امیرزادے اور شیوخ اکثر حتمال شاہ کی رہائش گاہ کو ریسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس "ریسٹ ہاؤس" کے حوالے سے بہت سی گفتنی و ناگفتنی کہانیاں مشہور تھیں۔ حتمال شاہ کا پیغام ملتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ چولستان کے اس دور افتادہ مقام پر ایک سرخ جھکڑ چلنے والا ہے۔ یہ جھکڑ جہاں کئی لوگوں کی جان لے گا وہاں بہت سی چیزوں کو بھی الٹ پلٹ کر رکھ دے گا۔

حتمال شاہ کی حویلی میں مجھ پر وہی بجلی گری تھی جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ امارات سے آئے ہوئے ایک شہزادے راشد بن ارشد نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے اور وہ ایک اہم معاملے میں مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ملنے سے صاف انکار کر دیا اور طیش میں ابلتا ہوا اپنے گھر واپس آ گیا۔

دو روز بعد پولیس انسپکٹر عالم کھونڈو اور حتمال شاہ خود میرے گھر پہنچ گئے۔ وہ بڑے ڈپلومیٹ طریق سے مجھے اپنے ساتھ حویلی لے گئے۔ بڑے پیار و محبت سے انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ایک بہت خوش قسمت شخص واقع ہوا ہوں۔ میری بہن پر ایک ایسے شخص کی نگاہ انتخاب پڑی ہے جو اپنے مال و دولت اور رتبے کے اعتبار سے بادشاہ سے کم نہیں۔ وہ میری بہن کو عقد میں لینا چاہتا ہے۔ میری بہن شہزادی کہلائے گی۔ کروڑوں میں کھیلے گی اور تمہارا مرتبہ بھی ایک دم زمین سے آسمان پر پہنچ جائے گا۔ میں نے پھنکار کر حتمال شاہ سے کہا تھا "سائیں! تیری اپنی دو بیٹیاں بھی تو جوان ہیں۔ وہ کچھ کم خوبصورت نہیں۔ انہیں امیرزادے کے حرم میں داخل کیوں نہیں کر دیتا"۔

میرے جواب پر حتمال شاہ کا پارا ساتویں آسمان کو چڑھ گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ مجھ پر بھوکے کتے چھوڑ دیتا لیکن اس وقت اسے حکمت سے کام لینا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ بری طرح تمتمایا لیکن پھر اپنی اصل حالت میں آ گیا۔ کچھ یہی کیفیت انسپکٹر عالم کھونڈو کی بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں سمجھایا کہ میری شہ رگ حیات ان کے قدموں تلے ہے۔ وہ ذرا سا دباؤ ڈالیں گے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ چاچے عبداللہ کی نوکری، میری دکان، گھر۔۔۔ یہ رشتے ناتے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

میں نے سینہ تان کر کہا "کچھ باقی نہ رہے۔ میری غیرت تو باقی رہے گی۔ میری معصوم بہن تو ہوس کی سولی پر نہیں چڑھے گی"

پیر حتمال شاہ نے مصنوعی افسردگی سے کہا تھا "ایسا نہ ہو سکے گا جو تم چاہ رہے ہو۔ بڑے لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تمہارا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا"

میں نے کہا تھا "سائیں! مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تیرے منہ میں ایک ہوس پرست کی زبان بول رہی ہے۔ جا اور جا کر اپنے شیخ کو بتا دے۔ یہاں ہر جاندار ایسا نہیں ہے جسے اس کا عقاب نوچ ڈالے گا۔ یہاں خالص جبڑا چیرنے والے سر پھرے لوگ بھی ملتے ہیں اور ایسا ایک سر پھرا وہ ہے جس کی بہن پر اس نے اپنی ناپاک نظر ڈالی ہے"

میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت حتمال کی بھی تھی۔ اپنے آقا کے ولی نعمت کی طرف سے اسے یقیناً تحمل و بردباری کی ہدایات ملی ہوئی تھیں اور وہ اب تک ان ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم میرے چٹانی لہجے نے اس کی منافقت کا خول چٹخا کر رکھ دیا۔ سانپ اپنی اصل میں آ کر پھنکار اٹھا "صحرا زادے! تو اپنی اوقات سے آگے جا رہا ہے لگتا ہے۔۔۔ تو بہن بھی بیاہے گا اور ذلت کا ہار بھی پہنے گا"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا "سائیں! مجھے گالی دے۔ بہت پچھتائے گا اگر اب گالی دے گا تو"

قریب تھا کہ میں اور حتمال شاہ دست و گریباں ہو جاتے، انسپکٹر عالم کھونڈو بیچ میں آ گیا۔ اس نے مجھے بڑی سرد نگاہ سے گھورا اور بولا "ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اب تم سے تھانے میں ملاقات ہو گی۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر تم وہاں بھی جا کر ایسی ہی اکڑ فوں دکھا سکو تو"

میں کوئی ان پڑھ دیہاتی نہیں تھا۔ بی اے، ایل ایل بی تھا۔ تھانہ کچہری میرے لئے جانی پہچانی جگہیں تھیں۔ میں جانتا تھا انسپکٹر عالم مجھ پر یونہی ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ وہ مجھے پھنسانے کے لئے کوئی جھوٹا کیس تیار کرے گا۔ اپنے ایک دوست اور ماہر قانون دان ایڈووکیٹ ظفر احسن صاحب کی مدد سے میں نے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی اور دیگر قانونی بندیاں بھی کر لیں۔ میری تیاریاں دیکھ کر انسپکٹر عالم، حتمال شاہ اور ان کے آقائے ولی نعمت شیخ راشد بن ارشد نے ایک دم چپ سادھ لی۔ چند ہفتوں کے لئے معاملہ بالکل دب گیا بلکہ میں نے یہ بھی سنا کہ شیخ راشد سیر و سیاحت سے فارغ ہو کر واپس جا چکا ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ شیخ راشد شکاری باز کے مانند بہت اوپر بلندی پر تھا اور پر سمیٹ کر برق رفتاری سے شکار پر گرنے والا تھا۔

دوسری طرف میں بھی غافل نہیں تھا۔ اپنی شفقا کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دینا میرے لئے انتہائی سہل تھا۔ [illegible] آنکھیں کھول کر بند کر لینا۔ آٹھ برس پہلے میں نے اپنے جس جنگجو لڑکے کو بیدار ہونے سے روک لیا تھا وہ اب پوری طرح بیدار تھا۔ یہ بہن ہی تو تھی جس کی خاطر میں ساری ذلتیں سینے سے لگا کر زندگی کا زہر پیا تھا۔ اب [illegible] والوں نے اس بہن کو نشانے پر رکھ لیا تھا۔ میں اپنے حواس کھوتا تو اور کیا ہوتا۔ نئے زخموں کے ساتھ ساتھ پرانے زخم بھی ہرے ہو گئے تھے۔ پوری دنیا کے لئے میرے دل میں نفرت کا ایک طوفان امڈ آیا تھا۔ مجھے اپنے ارد گرد موجود ہر شخص کے کندھوں پر چچا جلیس یا وڈے میاں کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ قریب ہوا کی ہر آواز پر حتمال شاہ اور انسپکٹر عالم کھونڈو کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔ یہ دنیا ظالموں اور جابروں سے بھر [illegible] گئی اور میرا دل ان کے خلاف نفرت سے لبریز ہو گیا تھا۔ میں پیش آمدہ حالات کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ میرے [illegible] میں ہر وقت ریوالور رہتا تھا اور پنڈلی سے خنجر بندھا ہوا [illegible]

طاہر جاوید مغل کے دل گداز
قلم سے ایک خوبصورت ناول
پرستش
قیمت: ۱۵۰ روپے
محبت کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک پُراثر کہانی
بہترین گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۲۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳
[illegible]

اور پھر وہ طوفانی رات مجھ پر وارد ہوئی جب ڈاکوؤں کے بھیس میں حشمال شاہ کے کارندے اور پولیس کے سادہ پوش میری بہن کو اٹھانے کے لئے میری چار دیواری میں داخل ہوئے۔ چاچا عبداللہ اس دن شہر گیا ہوا تھا۔ شاید کرائے کا کوئی مکان دیکھنے ۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم یہ کوارٹر چھوڑ دیں ۔۔۔۔ میری بہن میری چارپائی کے ساتھ چارپائی جوڑے اس طرح سوئی ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اپنا ہاتھ میرے سپرد کر کے وہ ہر فکر سے آزاد ہو کر نیند کی وادی میں جا چکی تھی۔ مجھے جاگنا تھا کیونکہ وہ سو رہی تھی ۔۔۔۔ اور میں کوئی تنہا نہیں جاگ رہا تھا۔ میرے ساتھ شفتا کی "ماں" جاگ رہی تھی، اس کے "اباجان" جاگ رہے تھے، وہ نیم شب کی دعائیں جاگ رہی تھیں جو کبھی ہم دونوں کے لئے مانگی گئی تھیں اور وہ عہد جاگ رہا تھا جو میں نے بہ زبان خاموشی اپنی ماں کی قبر سے کیا تھا۔ "ماں! تیرا بیٹا یتیم ہوا ہے، تیری بیٹی یتیم نہیں ہوئی میں تیری گڑیا کی حفاظت کروں گا۔ اپنی ہر سانس اس کے لئے وقف کر دوں گا ۔۔۔۔" اور یہ عہد نبھانے اور سانس لٹانے کی گھڑی تھی ۔۔۔۔ صحن میں کسی کے کودنے کی آواز آئی تو میں بھاگ کر کھڑکی میں پہنچا تھا۔ آدھ کھلی کھڑکی سے میں نے دیکھا ایک سایہ بیرونی دروازے کے پاس متحرک تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور تین مزید افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ وہ سب ڈھاٹا پوش تھے اور ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ میں نے لپک کر اپنا ریوالور تکیے کے نیچے سے نکالا اور کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اس دوران وہ لوگ برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔

"رک جاؤ" میری آواز گھر کی چار دیواری میں گونجی "آگے بڑھے تو ڈھیر کر دوں گا" ابھی میرے فقرے کی بازگشت فضا میں تھی کہ دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے گولی چلائی لیکن نشانہ خطا گیا اور ایک گرانڈیل شخص بھاگتا ہوا مجھ پر آ پڑا۔ میں پشت کے بل چارپائی پر گرا اور اسے توڑتا ہوا فرش بوس ہو گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اسی وقت شفتا کی چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں بھر گئیں۔ میں دیوانہ وار حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چار تھے۔ ان میں سے ایک نے شفتا کو دبوچ رکھا تھا اور باقی تین مجھ سے برسرپیکار تھے اور وہ کوئی معمولی لوگ بھی نہیں تھے۔ پلے ہوئے جسموں والے منتخب غنڈے تھے۔ اس مختصر کمرے میں ایک دو منٹ ہمارے درمیان سخت جدوجہد ہوئی پھر انہوں نے مجھے گرا لیا اور مارنے لگے۔

باہر طوفانِ باد و باراں کا قیامت خیز شور تھا اور اندر غیظ و غضب کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔ وہ اپنے طور پر مجھے بے دست و پا کر چکے تھے، اس سنگین حقیقت کا انہیں علم نہیں تھا کہ میری پنڈلی سے ابھی تک ایک خنجر بندھا ہوا ہے۔ میں حملہ آوروں کی گرفت میں مچل رہا تھا اور میرا ایک ہاتھ مسلسل پنڈلی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جونہی خنجر میرے ہاتھ میں آیا میں سراپا موت بن گیا۔ اس وقت مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ صرف کانوں میں شفتا کی دبی دبی چیخیں گونج رہی تھیں اور نگاہوں میں حملہ آوروں کے کرخت چہرے تھے۔ جیسے بادلوں میں برق لہراتی ہے، میرا خنجر حملہ آوروں کے درمیان چمکا اور انہیں زخم زخم کر گیا ۔۔۔۔ دس سیکنڈ کے مختصر وقفے میں وہاں تین لاشیں تڑپ رہی تھیں اور ایک شخص زخمی ہو کر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔

میں حملہ آوروں کو پہچان چکا تھا۔ ان میں سے دو حشمال کے آدمی تھے۔ میں نے انہیں قتل کر دیا تھا اور یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی۔ میں نے ان سرکاری سانڈوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جنہیں کوئی انگلی تک لگانے کا مجاز نہیں تھا۔ اب میرا اور شفتا کا یہاں رہنا عبرت ناک موت کو دعوت دینا تھا۔ گزرنے والا ہر سیکنڈ ہماری زندگیوں کو موت کے قریب کر رہا تھا۔ میں نے تڑپتی پھڑکتی لاشوں کے قریب سے ایک شاٹ گن اٹھائی اور گولیوں والا بیلٹ کندھے پر ڈال کر شفتا کی طرف بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں منہ پر ہاتھ رکھے جانے سے اس کا دم گھٹ گیا تھا یا اپنے بازوؤں میں گوشت کے لوتھڑے دیکھ کر اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ گیا تھا۔

"شفتا! ہوش کرو۔ شفتا ہوش کرو میری بہن" میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا پھر مایوس ہو کر اسے کندھے پر ڈال لیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور زمین پر گری ہوئی لالٹین بجھ گیا۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ میں نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شفتا کا دوپٹا اور پاؤں سے ٹٹول کر اپنی جوتی تلاش کی اور گھر سے باہر نکل آیا۔

طوفانی جھکڑ ریلوے کالونی کے در و دیوار ہلا رہے تھے اور بادلوں کی گھن گرج لرزہ خیز تھی۔ رہ رہ کر بارش کی بوچھاڑ پڑتی اور لگتا تھا آسمان سے تیر برس رہے ہیں۔ امارات کے امیر زادے اور حشمال شاہ کو اس واقعے کی اطلاع ہونے سے پہلے میں جتنی دور نکل جاتا اتنا ہی میرے لئے بہتر تھا۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی اور اس میں میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ میرے پاس ایک بہن کے سوا اور کچھ نہیں تھا، وہ میری متاعِ

حیات تھی اور میں اپنی متاع کو بازوؤں میں سمیٹے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ وہ طوفانی رات زندگی بھر کے لئے میرے حافظے پر نقش ہو چکی ہے۔ بجلی کے کوندے، بادلوں کی گرج، اٹھا اٹھا کر پٹختی ہوئی ہوا اور وہ بے سمت سفر۔ حشمال شاہ کے کارندے شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں تھے اور میری نگاہیں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ آخر کار یہ پناہ گاہ مجھے میسر آئی۔ قصبے سے قریباً پانچ میل آگے سرکاری رکھ کے قریب یہ ایک ویران اور بے چراغ کٹیا تھی۔ طوفان نے اسے منہدم کر دیا تھا لیکن ملبا اس طور گرا تھا کہ جھونپڑی کی صورت برقرار رہی تھی اور اس کے اندر پناہ لی جا سکتی تھی ۔۔۔۔ درختوں میں گھری ہوئی اس تباہ حال جھونپڑی کے اندر میں نے مسلسل دو راتیں گزاریں۔ تیسری رات جھونپڑی کے مکین وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک عمر رسیدہ جوڑا تھا۔ کوئی انہیں دیکھتا تو بھکاری سمجھتا لیکن بظاہر بھکاری نظر آنے والے ان میاں بیوی نے ہمارے ساتھ جو تعاون کیا وہ شاید کوئی شہنشاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں حشمال شاہ کی زد سے نکالنے کے لئے ان دونوں نے نہ صرف اپنی جان خطرے میں ڈالی بلکہ ہمارے لئے لباس، سواری اور رقم کا انتظام بھی کیا۔ زندگی میں بڑی موٹی موٹی رقمیں دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے لیکن ایک لرزاں ہاتھوں والے بوڑھے نے زادِ راہ کے طور پر جو چند بوسیدہ نوٹ مجھے تھمائے تھے وہ آج تک میرے حافظے میں ایک خزانے کی طرح محفوظ ہیں اور دمک رہے ہیں۔

میں اپنی بہن کو لے کر پہلے لاہور اور پھر چکوال آ گیا۔ پولیس ہر جگہ میرے پیچھے تھی اور حشمال شاہ کے کارندے بھی پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ میں جان چکا تھا کہ حالات کی بے رحم کروٹ نے مجھے ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے۔ جس پر مجھے مسلسل بھاگنا ہو گا۔ جہاں بھی رکوں گا وہیں مارا جاؤں گا۔ دوسرے لفظوں میں شاہ جہاں بی اے، ایل ایل بی اب ایک سرپٹ بھاگتے ہوئے شخص کا نام تھا۔ میں نے سوچا "شاہ جہاں جب بھاگنا ہی مقدر ہے تو پھر یوں بھاگو کہ موت تمہارے پیچھے نہیں آگے ہو" اور پھر میں نے یہی کر دکھایا۔ وقت گواہ ہے کہ میں موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگا ہوں۔ میں نے دشمنوں کی نیندیں حرام کی ہیں اور ان کے چہروں پر اپنی وحشت کے پہرے بٹھائے ہیں۔ وہ اثر و رسوخ کے گھوڑوں پر سوار تھے اور مجھے ایک بند گلی میں بھگا رہے تھے۔ بے موت مرنے کے بجائے میں پلٹا اور پوری وحشت سے ان پر جھپٹ پڑا۔ تاہم اس خونی جھپٹ سے پہلے ہی میں نے اپنی بہن کو محفوظ ہاتھوں میں پہنچا دیا۔ چکوال کے قریب رکھ پور نامی قصبے میں پھوپھڑ شریف سے ہمارے گھرانے کے تعلقات بڑے پرانے تھے۔ والد صاحب کی طرح پھوپھڑ شریف بھی محکمہ انہار میں تھا۔ وہ والد صاحب کو سگے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس نے شفتا کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی نگہداشت کرنے کی پوری ذمے داری اٹھا لی۔

کھروڑ پکا سے میرے اور شفتا کے فرار کے بعد جس ہستی پر سب سے زیادہ ستم ڈھایا گیا وہ چاچا عبداللہ تھا۔ حشمال شاہ کے ایما پر پولیس والے اسے کوارٹر سے پکڑ کر لے گئے اور سات روزہ ریمانڈ کے دوران اسے سخت تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کی جسمانی حالت اور عمر کے پیش نظر عدالت نے اس کا مزید ریمانڈ نہیں دیا اور وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا لیکن حشمال شاہ اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اپنے کارندوں کے قتل نے اسے دیوانہ کر دیا تھا اور وہ حساب بے باق کرنے کے لئے جلد از جلد مجھ تک اور شفتا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جو واحد "کلیو" اس کے ہاتھ میں تھا وہ چاچا عبداللہ تھا۔ انسپکٹر عالم کھوڑو نے بھاگ دوڑ کر کے ایک بار پھر چاچا عبداللہ کا ریمانڈ لے لیا اور اس مرتبہ تھانے میں اس پر اتنا تشدد کیا گیا کہ بعد ازاں اسپتال میں چل بسا۔ سرکاری کاغذوں میں اس کی موت کی وجہ ہارٹ اٹیک تھی مگر سب جانتے تھے کہ وہ کیسے مرا ہے اور بہ فرضِ محال اس پر ہارٹ اٹیک ہی ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے۔

کھروڑ پکا میں ہی ایک نوجوان وکیل اسد غوری نامی بھی رہتا تھا۔ میرا اور اس کا صرف اتنا تعلق تھا کہ کبھی راہ چلتے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے وہ میرے پورے نام سے بھی واقف نہ ہو۔ چاچے عبداللہ سے بھی اس کا تعلق صرف محلے داری کا تھا۔ غوری نے اس واقعے کا بے حد اثر لیا۔ اس نے اپنے طور پر انسپکٹر عالم اور حشمال شاہ وغیرہ پر کیس کر دیا۔ اس نے مؤقف اختیار کیا کہ انسپکٹر عالم نے ذاتی دشمنی چکانے کی خاطر بہیمانہ تشدد کے ذریعے حوالاتی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ انسانی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے اس نوجوان وکیل نے حشمال شاہ اور انسپکٹر عالم کے خلاف جو آواز اٹھائی اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا۔ آٹھ دس روز بعد ہی اسد غوری کی نوبیاہتا بیوی غائب ہو گئی۔ وہ اپنے چودہ سالہ دیور کے ساتھ میکے سے سسرال آ رہی تھی کہ دونوں کہیں راستے ہی میں رہ گئے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد اسد غوری نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس کی بیوی واپس

آگئی ہے۔ تاہم وہ سخت بیمار ہے۔ قصبے میں یہ بات عام تھی کہ غوری کی بیوی ثریا اغوا ہونے کے بعد سے انسپکٹر عالم اور اس کے عملے کے قبضے میں تھی اور وہ اسے برے سلوک کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ ثریا کی بیماری کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اس کے پیٹ میں بچہ تھا جو ضائع ہو چکا ہے۔ دوسری طرف اسد غوری اور اس کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ دیور بھابی غلط بس میں سوار ہو کر ہیڈ سلیمانکی پہنچ گئے تھے۔ پھر سیلاب کی وجہ سے انہیں وہاں رکنا پڑ گیا اور وہ کوئی اطلاع بھی نہ دے سکے۔ اس بیان کو چند ہی روز بعد ثریا نے اپنے عمل سے غلط ثابت کر دیا۔ اس نے بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ بمشکل اس کی جان بچائی جا سکی۔ اس کی حالت سنبھلتے ہی اسد غوری اسے لے کر کہیں چلا گیا۔۔۔ کبھی کہروڑپکا واپس نہ آنے کے لیے۔ اسد غوری کے دیگر اہل خانہ بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔

چاچا عبداللہ کی اذیت ناک موت ایک ایسا واقعہ تھا جسے میں بھلائے نہیں بھول سکتا تاہم میری یہ خواہش ہرگز نہیں تھی کہ میں اس قتل کے بدلے کسی اور کا قتل کروں۔ میں نے قانون کا امتحان قانون توڑنے کے لئے نہیں انصاف حاصل کرنے کے لئے پاس کیا تھا۔ میں تو ان تین افراد کا مقدمہ بھی قانون کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا جو اپنی شقاوت کی حفاظت کرتے ہوئے میرے ہاتھوں سے قتل ہوئے تھے۔۔۔ میں نے قانون ہاتھ میں لینا ہوتا تو والدین کی موت کے بعد تیرہ سال تک کتابوں کا ساتھ نہ نبھاتا، رات کی تھکی ماندی گھڑیوں میں لالٹین کے سامنے کمان ہو کر نصابی اوراق پر عرق ریزی نہ کرتا۔ میرا ٹھکانا بازار ہوتے منچلوں کی بیٹھکیں ہوتیں اور میری دلچسپی ان سرگوشیوں میں ہوتی جو گمراہ نوجوانوں کے ہونٹوں سے نکلتی ہیں اور جرائم کی الف ب سکھاتی ہیں۔۔۔ میں ہرگز جرم کی دنیا میں قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے لئے کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں گیا تھا۔ میرے اور عدالت کے درمیان ایک فلک بوس دیوار کھڑی کر دی گئی تھی اور اس دیوار کی دونوں جانب متھال شاہ کے ہرکارے اور انسپکٹر عالم کے سادہ پوش دندناتے پھرتے تھے۔ میں بصد کوشش اپنے محترم استاد ایڈووکیٹ ظفر احسن کے پاس پہنچا تھا اور ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے مدد سے انکار نہیں کیا تھا لیکن اقرار کی دشوار گھاٹی سر کرتے ہوئے انہیں جو ذہنی اذیت اٹھانی پڑی تھی اسے صرف میں نے محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے حوصلہ نہیں ہوا تھا کہ میں ایک مہربان سے اتنی بڑی قربانی طلب کروں۔ پھر ایک روز میری برداشت کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ میرے ظرف کا پانی بہہ نکلا تھا۔ میں نے بے تحاشا شراب پی تھی اور جھومتا ہوا شاہراہِ قائداعظم کے معروف ترین چوک میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں سامنے ہی وہ بلند و بالا ہوٹل تھا جہاں متھال شاہ آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر میں نے متھال شاہ کو پکارا تھا "باہر نکل کتے! آ پکڑ مجھ کو۔ آ باہر اگر ہمت ہے تو۔ میں تیرا مقبرہ بنا دوں تو شاہ جہاں نام نہیں میرا۔"

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔ ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ چاروں طرف ٹریفک کانسٹیبل کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ پھر ہوٹل کے مین دروازے سے تین چار ڈشکرے برآمد ہوئے تھے۔ ان میں متھال کا وفادار کتا محسن بھی شامل تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھنکارا تھا "رانی خاں کے سالے! کیوں بھونکتا ہے کتے کی طرح۔ تیرے جیسے خارش زدہ جانوروں کے لئے پیر صاحب اپنی زبان نہیں ہلایا کرتے، صرف اشارہ کیا کرتے ہیں مجھ جیسے حقیر خادموں کو۔" اس کے ساتھ ہی محسن مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔ شراب تو انسان کو کمزور کر دیتی ہے، یقیناً اس روز مجھے شراب کا نہیں سرکشی کا نشہ تھا۔ متھال شاہ کے آدمی جتنی شدت سے مجھ پر جھپٹے تھے میں نے اتنی ہی شدت سے ان پر جوابی حملہ کیا۔

میرے ہاتھ میں وہی خنجر تھا جو اس سے پہلے متھال شاہ کے تین ڈشکروں کا لہو پی چکا تھا۔ اس خنجر کی وحشت نے میرے حریفوں کو ڈگمگا سا دیا۔ ان میں سے ایک کی ران پر گہرا زخم آیا اور دوسرا اپنا کندھا پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ اس دوران مجھے بھی ایک چاقو کا گھاؤ لگا۔ اچانک کچھ فاصلے سے پولیس جیپ کا سائرن سنائی دیا۔ میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت میرے جسم میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ شراب کی بوتل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ میں نے پوری قوت سے محسن کے منہ پر توڑ دی اور ریگل سینما کی طرف بھاگ نکلا۔ پچاس ساٹھ گز آگے نسبت روڈ پر میں نے ایک شیورلیٹ کو زبردستی روکا اور اس میں بیٹھ کر گنگا رام اسپتال کی طرف نکل گیا۔

اگلے ہی روز میں نے ایک خط لکھا تھا۔ یہ خط انسپکٹر عالم یا متھال شاہ کے نام نہیں تھا۔ متھال شاہ کے "حقیر خادم" محسن کے نام تھا۔ میں نے لکھا "تم جس شخص کے حقیر خادم ہو وہ بے چارہ خود بھی اتنا حقیر ہے کہ میرے ہاتھوں قتل ہونے کی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ میں اس شخص کو قتل کروں

گا جو پردے کے پیچھے بیٹھ کر تمہارے حقیر مالک کی ڈوریں ہلاتا ہے۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ گئے ہو اور وہ سب بھی جان جائیں گے جن کو تم یہ خط سناؤ گے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سب سے۔۔۔ وہ شخص اب زندہ نہیں بچے گا۔"

شیخ راشد بن ارشد کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ شخص جو یہاں شہزادہ بنا پھرتا تھا، اپنے وطن میں ایک مجرم تھا۔ لاکھوں ڈالر کے غبن سمیت کئی الزامات تھے اور ریاستی قانون کے مطابق اس پر مقدمے چل رہے تھے۔ اپنے حلقے میں وہ بے حد عیاش اور حسن پرست مشہور تھا۔۔۔ عورت، شکار اور ہیرے یہ اس کی تین بڑی کمزوریاں سمجھی جاتی تھیں۔ ان کمزوریوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی انسانیت کی پست ترین سطح تک پہنچ جاتا تھا۔ میری بہن کی نسبت سے اس کے مکروہ دل میں جو بدنیتی پیدا ہوئی تھی وہ اس کی ضد بن گئی۔ وہ خود پس منظر میں تھا اور بظاہر اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا تھا لیکن اس کے ہرکارے پوری تندہی سے اپنے ہدف تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے اور میری بہن کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مرکز و منبع وہی تھا۔ میں کیوں کسی اور کو گنہگار ٹھہراتا اور اس سے الجھ کر اپنی توانائیاں ضائع کرتا۔ کیوں نہ میں اس سارے فساد کی جڑ تک پہنچتا اور اسے اکھاڑ پھینکتا۔ شیخ راشد بن ارشد تک پہنچنا بے شک دشوار تھا۔ وہ بلٹ پروف گاڑی میں گھومتا تھا اور مسلح گارڈز کے نرغے میں رہتا تھا۔ جن جگہوں پر اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہاں مجھ جیسے بے بضاعت شخص کا داخلہ اکثر ممنوع ہوتا تھا لیکن پانی کی طرح انتقام بھی اپنے راستے تلاش کر لیتا ہے۔

میں بھی ایک روز اس شخص تک پہنچ گیا جس نے میری جمی جمائی زندگی اکھاڑی تھی اور میرے محسن چاچا عبداللہ کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ شیخ راشد کہاں ہے تاہم اس بات کا یقین تھا کہ وہ پاکستان میں ہی ہے اور متھال شاہ وغیرہ سے مسلسل رابطہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ میں نے ایک چال کھیلی۔ ایک روز میں نے اپنے ایک دوست عزیز احمد سے رابطہ کیا۔ عزیز بہاولپور کا رہائشی تھا اور یہیں ایک مقامی کالج میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ کالج، یونیورسٹیاں ہنگاموں کی وجہ سے بند تھیں۔ عزیز کو ڈھونڈنے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ بہرحال ایک پرانے ٹھکانے سے وہ مجھے دستیاب ہو ہی گیا۔ ابھی میں نے محسن نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے محسن پیر متھال شاہ کا خاص کارندہ تھا۔ وہ مکرانی تھا اور ذرا بیٹھی ہوئی آواز کے ساتھ بڑے خاص لب و لہجے میں بولتا تھا۔ میں جانتا تھا عزیز معمولی کوشش سے محسن کے لب و لہجے کی نقل کر لے گا۔ میرا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ عزیز آوازوں کی نقالی میں بڑا ماہر تھا۔ اس نے میری توقع سے بڑھ کر محسن کے لب و لہجے کی کاپی کی۔

میں نے عزیز احمد کے ذریعے پولیس انسپکٹر عالم کھوڑو کو کہروڑپکا کے تھانے میں کال کروائی۔ یہ بڑی ایمرجنسی قسم کی کال تھی۔ عزیز نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں عالم کھوڑو کو اطلاع دی کہ شیخ صاحب شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ وہ چند سپاہیوں کو لے کر فوراً موقعے پر پہنچے۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر عالم تفصیلات پوچھتا، لائن کٹ جانے کے تاثر کے ساتھ فون بند کر دیا گیا۔ محسن اس وقت متھال شاہ کے ساتھ کہروڑپکا سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ابتدائی مرحلے میں یہ کال "فراڈ" ثابت ہو سکے گی۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ راشد کے ٹھکانے پر بھی فون ہوتا اور انسپکٹر وہاں رابطہ قائم کر کے صورتِ حال سے آگاہ ہو جاتا۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، فون موجود تھا لیکن انسپکٹر عالم نے یہ عقلمندی نہیں کی) جس وقت عزیز احمد نے بہاولپور سے انسپکٹر عالم کو کال کی، میں تاریک شیشوں والی ایک کرولا گاڑی میں تھانے سے صرف تین سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ لباس، ٹوپی اور عینک کی مدد سے میں نے اپنا حلیہ کافی حد تک بدل رکھا تھا اور امید نہیں تھی کہ غور سے دیکھے بغیر کوئی مجھے پہچان سکے گا۔

ہنگامی کال کے ذریعے جو تیر ہم نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ عین نشانے پر لگا۔ کال موصول ہونے کے صرف پانچ منٹ بعد انسپکٹر عالم کی نیلی جیپ طوفانی رفتار سے بڑی سڑک کی طرف جاتی نظر آئی۔ میں اسی گھڑی کے انتظار میں تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں انسپکٹر عالم کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ بڑی سڑک تک قریباً پانچ میل کا فاصلہ خطرناک تھا کیونکہ ٹریفک کم تھا اور مسلسل پیچھے رہنے والی گاڑی نظر میں آسکتی تھی لیکن بڑی سڑک پر اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ویسے بھی انسپکٹر بڑی بدحواسی کے عالم میں روانہ ہوا تھا۔ امید نہیں تھی کہ وہ یا اس کے ساتھی اپنے عقب پر خصوصی نگاہ رکھ سکیں گے۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ انسپکٹر عالم بہاولپور شہر کا رخ کرے گا لیکن یہ یقین اس وقت شک میں بدل گیا جب انسپکٹر عالم نے جی ٹی روڈ پر سفر جاری رکھا اور بہاولپور سے آٹھ دس میل آگے نکل کر جام پور نامی قصبے کی طرف مڑ گیا۔ یہ قصبہ

ایک معروف اداکار کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس فلمی اداکار کا تعلق اس قصبے سے تھا اور یہ تعلق برقرار رکھنے کے لئے اس نے یہاں ایک بڑی کوٹھی بنوا رکھی تھی۔ بعد میں اس کی کوششوں سے نہ صرف جام پورہ میں بجلی پہنچی تھی بلکہ گزارے لائق سڑک بھی پہنچ گئی تھی۔ پاکستانی فلم اسکرین کا یہ ہردلعزیز اداکار اکثر سیر و سیاحت اور شکار کے لیے یہاں آتا رہتا تھا۔ اب انسپکٹر عالم کھوڑو کی جیپ جام پورہ کی طرف مڑتے دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ شیخ راشد جام پورہ میں ہے اور اگر وہ جام پورہ میں ہے تو یقینی بات ہے کہ فلمی اداکار کا مہمان ہے۔

اگلے آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرا یہ قیافہ بالکل درست نکلا۔ انسپکٹر عالم کی دھول اڑاتی جیپ جام پورہ کی آبادی میں گم ہوگئی۔ میں نے اپنی کرولا ہیں جوہڑ کے کنارے اونچے نیچے سرکنڈوں میں چھپا دی اور پیدل قصبے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں مقامی لباس شلوار قمیص میں تھا۔ کندھے پر ایک بڑا رومال، آنکھوں پر دھوپ کی عینک اور سر پر سندھی ٹوپی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور چہرے پر مسلسل تھکن کی تہیں تھیں۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کھروڑ پکا کا وہی بابو شاہ جہاں ہے جس نے پانچ چھ ماہ پہلے وکالت کا امتحان پاس کیا ہے اور جسے سفید پتلون اور کالے کوٹ میں دیکھ کر جنوبی کھروڑ پکا کی کئی بڑی بوڑھیوں نے اپنی بیٹیوں کے لئے رشتے ڈھونڈنے چھوڑ دیے تھے۔

میں جام پورہ میں ایک حجام کی دکان پر پہنچا اور وہیں سے مجھے تمام مطلوبہ معلومات مہیا ہوگئیں۔ شیخ راشد بن ارشد پچھلے دو روز سے یہیں فلمی اداکار کی رہائش گاہ پر قیام پذیر تھا۔ یہاں قریبی ساحل پر وہ مچھلی کا شکار کھیل رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آج کسی وقت پچھلے پہر شیخ واپس چلا جائے گا۔ میرے پاس ایک تیز دھار خنجر کے علاوہ اڑتیس بور کا ریوالور اور قریباً تیس راؤنڈ تھے۔ یہ سارا اسلحہ میں نے محفوظ طریقے سے لباس میں چھپا رکھا تھا۔ نجانے کیوں اس قصبے میں پہنچتے ہی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں شیخ کو اس قصبے سے زندہ سلامت واپس نہیں لوٹنے دوں گا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ امارات کے امیرزادے کا دانہ پانی آج پورا ہوگیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو اپنے قدموں تلے جتنا روند سکتا تھا روند چکا ہے۔ اپنے حصے کا ظلم بھی کر چکا ہے اور اپنے مقدر کی بددعائیں بھی سمیٹ چکا ہے۔ شمع جیسی جتنی لڑکیاں اس کی میلی نظر کا شکار ہوتا تھیں ہو چکی ہیں اور ثریا جیسی جتنی سہاگنیں اس کے بستر پر پامال ہونا تھیں، ہو چکی ہیں۔ اب اس کے گناہ و ثواب کا کھاتا بند ہونے والا ہے۔

ظہر کی اذان کے تھوڑی ہی دیر بعد میں ٹہلتا ہوا جام کے شاندار وھائٹ ہاؤس کی طرف نکل گیا۔ فلمی اداکار کی رہائش گاہ وھائٹ ہاؤس ہی تھی۔ وہ پوری کی پوری سفید سے بنی ہوئی تھی۔ جام پورہ میں اس عمارت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ کوڑے کے ڈھیر میں ایک موتی پڑا ہوا ہے۔ اس عمارت کے سامنے ایک وسیع احاطہ تھا۔ اس احاطے کی دیواریں زیادہ بلند نہیں تھیں۔ پورچ کے قریب تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر باقی تمام احاطے میں گھاس کا فرش تھا اور مختلف اقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ چھپ کر بیٹھ رہنے کے لئے یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ میں نے ایک محفوظ مقام سے چار دیواری پھلانگی اور گھنے درختوں کے اندر ہی اندر پورچ کے قریب پہنچ گیا۔ میری خواہش تھی کہ میرے تیز دھار خنجر شیخ راشد کے خون کا ذائقہ چکھے لیکن یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ موقع محل کے مطابق مجھے ریوالور سے کام لینا تھا۔

میں کیلے کے کوتاہ قد پودوں میں قریباً ڈھائی گھنٹے بیٹھا رہا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور نگاہیں پورچ پر جمی ہوئی تھیں۔ پورچ میں موجود گاڑیوں سے پتا چلتا تھا میزبان اور مہمان دونوں یہیں ہیں۔ ہاں انسپکٹر عالم جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس لوٹ گیا تھا اور اس کی نشانی کے طور پر صرف ایک مسلح رائفل مین گیٹ پر ٹہل رہا تھا۔ شیخ کے ذاتی گارڈز بھی عمارت ہی میں تھے اور کبھی کبھار ان میں سے کوئی باہر نکل کر سگریٹ پھونکتا تھا۔ شام چھ بجے کے قریب پورچ میں ہلچل نظر آنے لگی۔ شیخ کی وسیع و عریض مرسڈیز اندرونی دروازے کے سامنے لائی گئی۔ اس کے آگے ایک سرخ گاڑی تھی جس میں دو ریوالور بردار افراد سوار تھے۔ مرسڈیز کے عقب میں گارڈز کی جیپ تھی۔ چار گارڈز جیپ میں تھے جبکہ دو انتہائی پرچوکس کھڑے تھے۔

میں درختوں اور پودوں کی اوٹ میں چلتا ہوا موقعے اور نزدیک ہوگیا۔ فیصلہ کن گھڑی بس اب پہنچا ہی چاہتی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں اس شام کے ساتھ ہی شیخ کی زندگی کی شام بھی کر دینا چاہتا تھا۔ یہ پہلا قتل تھا جو مستقبل کا جانی پورے ہوش و حواس اور منصوبہ بندی سے کر رہا تھا۔ جونہی شیخ راشد عمارت سے باہر آیا، میرا سینہ شدت سے دھڑک اٹھا اور رگ و پے میں ایک آگ لپک گئی۔

خوش پوش اور دراز قد تھا۔ مردوزن کے جھرمٹ میں سب سے نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جھلستے چہرے پر خود پسندی اور نخوت کی چھاپ دور ہی سے نظر آ رہی تھی۔ اس کے سپید ہاتھوں میں نہایت قیمتی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔۔۔ اور یہی وہ ہاتھ تھے جو میری بہن کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ میں آج ان ہاتھوں کو بے جان کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قدم قدم پر حسین مسکراہٹیں اور قہقہے سمیٹتے ہوئے شیخ راشد بن ارشد جونہی اپنی گاڑی کے قریب پہنچا، میں درختوں کی اوٹ سے برآمد ہوا۔۔۔ اپنا ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا اور قریباً دس فٹ کے فاصلے سے پانچ گولیاں شیخ کے جسم میں اتار دیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے تین گولیاں اس کے سینے پر لگی تھیں، ایک گردن میں اور ایک چہرے کے کسی حصے پر۔ دھماکوں سے پورچ گونج اٹھا۔ ایک ساتھ درجنوں چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے شیخ کو لہرا کر ایک باڈی گارڈ کے بازوؤں میں جھولتے دیکھا۔ تین گارڈز کے ہاتھ بیک وقت اپنے اسلحوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بیرونی چار دیواری مجھ سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں کتنی بھی تیزی سے بھاگتا، گارڈز فائر سے پہلے چار دیواری پھلانگ نہیں سکتا تھا۔ میں صرف اتنا کر سکتا تھا کہ ایک مشکل اینگل سے بھاگوں، یہ کوشش کروں کہ میرے اور گارڈز کے درمیان زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں آئیں تاکہ گولی لگنے کا امکان کم سے کم ہو۔۔۔ یہ سب کچھ میں پہلے سے سوچ چکا تھا لہٰذا دوبارہ سوچنے میں میں نے ایک پل بھی ضائع نہیں کیا اور پوری رفتار سے چار دیواری کی طرف بھاگا۔ میرے عقب میں گولیاں چلیں لیکن قسمت نے ساتھ دیا۔ میرے عقب میں آنے والی موت پورچ کے گول ستونوں اور درختوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ میں نے بحفاظت چار دیواری پھلانگی اور گلی میں آگیا۔

اب گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس سے پیشتر کہ شیخ راشد کے گارڈز اور دیگر افراد میرے پیچھے گلی میں پہنچتے اور مجھے مختلف اطراف سے گھیر لیا جاتا، میں ایک مکان میں گھس گیا۔ اہل خانہ مجھے دیکھ کر گھبرائے لیکن میں نے ریوالور دکھا کر انہیں خاموش کروا دیا۔ یہ ایک اسکول ماسٹر عابد علی کا گھر تھا۔ یہاں وہ اپنی بیوی، دو جوان بچوں اور اندھے بہرے باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ ماسٹر عابد علی ایک سمجھدار شخص تھا۔ وہ میرے ہاتھوں میں ریوالور کے علاوہ آنکھوں میں خون کی سرخی بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ چند لمحے پہلے میں ایک شخص کو گولیوں سے چھلنی کر چکا ہوں۔ میرے سر پر خون سوار ہے لہٰذا وہ اپنی اور اہل خانہ کی خیریت چاہتا ہے تو خاموشی سے میری ہدایت پر عمل کرے۔ عابد علی میری بات سمجھ گیا۔ اس نے مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ مہیا کردی اور اہل خانہ کو میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہدایت کرکے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ شیخ راشد دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گیا تھا۔ اب پورے جام پورہ میں پولیس دندنا رہی ہے اور قصبے کے اندر بھی میری تلاش جاری ہے۔

میں پورے اڑتالیس گھنٹے ماسٹر عابد علی کے گھر میں پناہ گزیں رہا۔ میرے اور اہل خانہ کے درمیان صرف خوف کا رشتہ تھا اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور اس رشتے کو مستحکم رکھے ہوئے تھا۔ میری تلاش کی سرگرمی ماند پڑی تو تیسری شب میں نے خاموشی سے جام پورہ چھوڑا اور پیادہ ایک طرف روانہ ہوگیا۔ کار کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ یقینی طور پر پولیس کی نظر میں آچکی تھی۔ یہ کار اس واردات سے پہلے میں نے ایک مقامی میمن کے ڈرائیور سے چھینی تھی۔ کافی قیمتی کار تھی۔ اس قیمتی کار میں جو سب سے قیمتی چیز رہ گئی وہ ایک شاٹ گن تھی۔ یہ وہی گن تھی جو تین ہفتے پہلے میں نے اپنے گھر میں متھال شاہ کے آدمیوں سے چھینی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آنے والے دنوں میں یہ شاٹ گن میرے لئے بہت مددگار ثابت ہوگی۔

جام پورہ سے راہِ فرار اختیار کرکے میں ایک بار پھر لاہور آگیا۔ اپنا حلیہ میں نے راستے ہی میں تبدیل کرلیا تھا۔ داڑھی مونچھیں منڈوا دی تھیں اور سر کے بال بھی کافی چھوٹے کروا دیے تھے۔ لاہور میں لنڈا بازار سے میں نے دو تین جینز اور قمیصیں خرید لیں۔ سارا دن کسی لائبریری میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھا رہتا، رات کو "دو نت ہاتھیوں" میں گھس جاتا اور منہ سر لپیٹ کر سو رہتا۔ اخباروں میں میرے کارنامے کا ذکر شہ سرخیوں میں آ رہا تھا۔ متھال شاہ کے تین آدمیوں کا قتل پھر ایک ریلوے ملازم کی پولیس تشدد سے موت اور پھر شیخ راشد بن ارشد کا دھڑن تختہ، درجنوں افراد کی موجودگی میں، یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں لہٰذا اگر اس معاملے میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جام پورہ کے وھائٹ ہاؤس میں شیخ کے قتل کے درجنوں چشم دید گواہ موجود تھے اور میں جانتا تھا جس گھڑی میں گرفتار ہوا بلیک وارنٹ میرے بائیں ہاتھ میں آجائے گا۔

میں لاہور میں زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا۔ جلد ہی میرے اور میرے حریفوں کے درمیان وہ آنکھ مچولی پھر شروع ہوگئی جو

تین ماہ پہلے ایک طوفانی رات کو ریلوے کالونی کے کوارٹر نمبر 18 بی سے شروع ہوئی تھی اور شیخ راشد کے قتل کے بعد جس کی نوعیت سنگین تر ہو گئی تھی۔ ایک روز جب میں پنجاب پبلک لائبریری سے جی پی او کی طرف جا رہا تھا تو انار کلی والے چوراہے میں جمال شاہ کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ ان میں خونخوار سمن بھی شامل تھا۔ وہ ایک سفید ٹویوٹا کار میں سوار تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بریک لگائے۔ میں نے گاڑی کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلتے دیکھے۔ میں اس وقت زیبرا کراسنگ پر تھا۔ میری دائیں جانب ایک نوجوان ڈبل سائلنسر سرخ ہنڈا 175 پر بیٹھا تھا۔ ان دنوں یہ موٹر سائیکل طلبہ میں بہت مقبول تھی۔ نوجوان دیگر گاڑیوں کے ہمراہ سرخ سگنل پر کھڑا تھا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک اس پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔ میں نے خود کو "اپنے قاتلوں" کے روبرو پا کر موٹر سائیکل پر جھپٹا مارا۔ میری ٹانگ کی زوردار ضرب نوجوان کی چھاتی پر پڑی۔ وہ دھان پان سا لڑکا تھا۔ ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور الٹ کر سڑک پر گرا۔ موٹر سائیکل گرنے سے بچ گئی کیونکہ اس پر میری گرفت مضبوط تھی۔ میں موٹر سائیکل پر سوار ہوا۔ انجن پہلے سے اسٹارٹ تھا۔ مجھے گیئر لگانے اور کلچ چھوڑنے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا۔ ہنڈا 175 گرجی اور کمان سے نکلے تیر کی طرح چوراہے کی طرف بڑھی۔ دو ٹریفک کانسٹیبل سارا منظر آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ میری طرف لپکے لیکن ان کی لپک میں وہی سستی تھی جو ایک نہایت تیز رفتار گیند کی طرف لپکنے والے فیلڈر میں ہوتی ہے۔ جو ہاتھ زخمی کرانے سے بہتر سمجھتا ہے کہ چوکا ہو جائے۔

موت میرے تعاقب میں تھی۔ میں نے موٹر سائیکل کو لاہور کی سڑکوں پر ہوائی جہاز بنا دیا۔ میں تنگ گلیاں استعمال کر کے سفید ٹویوٹا سے پیچھا چھڑا سکتا تھا لیکن جونہی میں اسمبلی ہال سے شارع فاطمہ کی طرف مڑا، دو موٹر سائیکل سوار سارجنٹ میرے پیچھے لگ گئے۔ اور پھر اسی پر بس نہیں ہوئی گنگا رام اسپتال کے عین سامنے کھڑی ایک پولیس جیپ نے مجھے دیکھ کر سائرن بجایا اور میرا تعاقب شروع کر دیا۔ پولیس کے آگے لگ کر بھاگنا ایک سنسنی خیز تجربہ تھا، ہر گھڑی یہ احساس تھا کہ ابھی دھماکا ہو گا اور ایک انگلی جیسی گولی پشت میں گھس جائے گی۔ مزنگ چونگی تک پہنچتے پہنچتے میں نے تین چار بار مڑ کر دیکھا۔ پولیس جیپ سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے ٹریفک پولیس کے سارجنٹ تھے اور آخر میں سفید ٹویوٹا بڑی شان سے لہراتی چلی آ رہی تھی۔

فیروز پور روڈ پر اچھرہ موڑ تک تو خیریت گزری لیکن جونہی نہر کے کنارے کھلی سڑک پر پہنچا عقب سے اوپر تلے تین فائر ہوئے۔ یہ سیون ایم ایم تھی۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے پہلو سے گزری۔ دوسری موٹر سائیکل کی باڈی میں کہیں لگی اور تیسری نے میرا بازو چھید دیا۔ درد کی ایک شدید لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ پولیس کی جیپ اب تیزی سے میرے قریب پہنچ رہی تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ موٹر سائیکل سمیت نہر میں کود جاؤں اور تیر کر دوسری طرف پہنچ جاؤں لیکن پھر میں نے موٹر سائیکل کو بائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دیا۔ دائیں طرف ایک گیٹ نظر آیا۔ یہ یونیورسٹی کیمپس ہی کی کوئی عمارت تھی۔۔۔ شام کے جھٹپٹے میں گیٹ پر ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر چوکیدار کھڑا تھا اور اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے تاریکی کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو تیزی سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ گیٹ آدھ کھلا تھا۔ میں نے ٹانگ کی ضرب سے اسے مزید کھول دیا اور موٹر سائیکل اندر لیتا چلا گیا۔ میرے عقب میں گاڑیوں کے پہیے چرچرائے اور وہ بھی گیٹ میں داخل ہو گئیں۔ میں نے موٹر سائیکل ایک نیم روشن برآمدے میں پھینکی، قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آ گیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ایک گرلز ہاسٹل میں گھس آیا ہوں۔ جونہی میں نے سیڑھیوں کے اختتام پر ایک طویل برآمدے میں قدم رکھا، دور بالکونی میں کھڑی ایک لڑکی چیخنے والے انداز میں پکاری۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب ایک دروازہ کھلا اور درجنوں لڑکیاں حیران پریشان چہرے بنائے باہر نکل آئیں۔ میں نے ریوالور دوبارہ لباس میں چھپا لیا۔ لڑکیوں میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں کھانے کے چمچے اور پلیٹیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میس میں سے برآمد ہوئی ہیں۔

"کون ہو تم؟" ایک ساتھ کئی سُریلی آوازیں اُبھریں۔

میں نے ایک ہاتھ سے زخمی بازو دبایا اور التجائیہ لہجے میں کہا "کچھ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ پلیز میری مدد کیجئے۔"

لڑکیاں ہراساں نظر آنے لگیں۔ نیچے پولیس جیپ کا سائرن گونج رہا تھا اور میں کہہ رہا تھا کہ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی سیڑھیوں سے بھاگتی ہوئی اوپر آئی۔ "وہ برآمدے۔۔۔ تمہاری موٹر

سائیکل پڑی ہے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں" میں نے ہکلا کر جواب دیا۔

"تم بیلی کالج میں پڑھتے ہو؟"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ ہاں" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اقرار میں سر ہلانا مناسب سمجھا تھا۔ لڑکیوں نے مجھے یوں ڈھانپا جیسے مرغیوں کے نرم و نازک پر چوزوں کو ڈھانپتے ہیں۔ وہ تیزی سے مجھے طعام گاہ میں لائیں اور ایک بغلی دروازے سے گزار کر اور ایک تنگ زینہ چڑھا کر اسٹور نما تاریک کمرے میں لے آئیں۔ مجھ سے موٹر سائیکل کے بارے میں پوچھنے والی لیڈر نما لڑکی نے مجھے اسٹور روم میں دھکیلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ان دنوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہنگامے ہو رہے تھے اور طلبہ کی پولیس سے ٹھنی ہوئی تھی۔ جس موٹر سائیکل پر میں یہاں پہنچا تھا وہ دیکھنے میں ہی کسی اسٹوڈنٹ کی نظر آتی تھی۔ اس کے ہینڈل میں فائل بھی اڑسی ہوئی تھی، اس حوالے سے مجھے بھی کوئی سینئر اسٹوڈنٹ سمجھ لیا گیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹر سائیکل کی ٹینکی پر "بیلین" کا بڑا سا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ اسی اسٹیکر کو دیکھ کر لیڈر نما لڑکی نے مجھ سے بیلی کالج کے بارے میں سوال کیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے اسٹور سے نکالا گیا تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔ پولیس اور جمال شاہ کے ہرکارے میری تلاش میں ناکام ہو کر واپس جا چکے تھے۔ پولیس میری تلاش میں ہاسٹل کے اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ حالات ایسے تھے کہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ چند روز پہلے ایک مظاہرے کے دوران پولیس سے یہ غلطی سرزد ہوئی تھی اور اس وقت سے ہاسٹل کی طالبات سراپا احتجاج بنی ہوئی تھیں۔ گولی میرے بازو کے اندر رہی تھی۔ میں نے خود ہی خون روکنے کے لئے پٹی باندھ لی تھی۔ بازو سے گولی نکالنے کے لئے میڈیکل کی دو طالبات نے وہیں ایک کمرے میں میرا چھوٹا سا آپریشن کر ڈالا۔ اس ہاسٹل میں ان دونوں طالبات کی حیثیت مہمان کی تھی۔ نو بجے سے پہلے پہلے انہیں واپس چلے جانا تھا لیکن میری دیکھ بھال کے لئے انہوں نے وہیں رُکنے کا فیصلہ کیا۔

میری خون آلود قمیص اتار دی گئی تھی۔ میں ایک نرم و نازک بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور اس خوف میں مبتلا ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں کب میرا بھانڈا پھوٹ جائے۔ جن دو طالبات نے میرے بازو کی چیر پھاڑ کی تھی ان میں سے ایک لڑکی کے چہرے پر بار بار میری نگاہ جم جاتی تھی۔ جونہی میں اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں دیکھتا، ایک سنسنی سی میرے رگ و پے میں پھیلنے لگتی۔ نو دس برس پہلے جلال کوٹ میں غزالہ کو آخری بار دیکھا تھا۔ جلال کوٹ سے نکلتے ہی ماضی سے میرا ہر رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے چولستان کے اس دور دراز قصبے میں ایک نئی زندگی شروع کی تھی، ایک بالکل مختلف شخص کے روپ میں۔ ماضی کی کوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی نہ کوئی چہرہ آنکھوں میں چمکا تھا اور نہ کوئی راستہ میرے قدموں تلے آیا تھا۔ میں اپنی جنم بھومی سے اور اس سے وابستہ تلخیوں سے بہت دور۔۔۔ بہت دور رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ چچا جلیس، چچی فاخرہ، غزالہ اور ٹیپو اب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ وڈے میاں زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اس کی حویلی کے سامنے رکھی ہوئی نوبت اب بھی بجتی ہے یا کوئی سرکش ہاتھ اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر چکا ہے۔ برسوں بعد کی گرد سے جھانکنے والا ایک مانوس چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تھا اور دل کی زمین پر زلزلے برپا ہونے لگے تھے۔ یہ وہی چہرہ تھا جو کبھی میرے دل کا داغ تھا اور پھر پھیل کر میری زندگی کا داغ بن گیا تھا۔

وہ بھی گاہے گاہے چونک کر میری طرف دیکھنے لگتی تھی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہ پا رہی ہو۔ جونہی اس کی ساتھی لڑکی کسی کام سے باہر گئی، میں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی "تم۔۔۔ تم غزالہ ہو؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں شک کی دھندلاہٹ، یقین کی چمک میں بدل گئی۔

"اور۔۔۔ تم۔۔۔ تم شاہ جہاں ہو۔" اس نے کہا۔

اس وقت اچانک دوسری لڑکی اندر آ گئی۔ ہمیں چپ ہونا پڑا۔ اس دوسری لڑکی کا نام طاہرہ تھا۔ وہ میڈیکل کالج میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ بڑے شوخ لہجے میں بولتی تھی اور بہت زیادہ بولتی تھی۔ پچھلے دو گھنٹے میں وہ پچیس چھبیس ہزار الفاظ تو ضرور استعمال کر چکی تھی۔ ان میں سے چار ہزار الفاظ اس نے صرف اتنی سی بات سمجھانے میں استعمال کئے تھے کہ میرے جسم پر بہت گھنے بال ہیں جو اسے بے حد اچھے لگتے ہیں کیونکہ اس کے منگیتر کے جسم پر بھی ایسے ہی بال ہیں۔ اب اگر میں یہ پوچھ بیٹھتا کہ اپنے منگیتر کے جسم کے بال اس نے کیسے دیکھ لئے تو یقیناً جواب میں مسیح ہو جاتی۔۔۔ طاہرہ بول رہی تھی اور اس کی آواز کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے غزالہ تھی اور اس کے سوا میں ہر شے بھول گیا تھا۔

غزالہ کلی سے نوشگفتہ پھول میں ڈھل چکی تھی۔ اس کے سراپا میں قیامتیں چھپی ہوتی تھیں۔ نگاہ اس کی طرف اٹھتی تو جھکنا بھول جاتی تھی۔ جو قیامت اس نے دس برس پہلے مجھ پر توڑی تھی وہ اسے بھولی نہیں تھی۔ گزرتے ہوئے وقت نے اس کے اندر احساس ندامت جگایا تھا اور یہ احساس بڑھتے بڑھتے اب ضمیر کی خلش بن چکا تھا۔ ایک کسک تھی جو وہ شب و روز اپنے سینے میں چھپائے پھرتی تھی۔ وقت سب سے بڑا انقلابی ہے اور اس انقلابی وقت نے غزالہ کے تنگی پکڑ میں جو نمک لگا رکھی تھی۔ وہ مجھ سے ملی تو دس برس پہلے خاک اوڑھ کر سو جانے والا ماضی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

پھر ایک روز مال روڈ کے ایک ریستوران میں میں اور وہ نیم تاریک گوشے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ غزالہ مجھے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد نے جل کوٹ میں اپنی زمینیں بیچ دی تھیں۔ پانچ چھ برس پہلے انہوں نے جرمنی میں اپنا کام شروع کر لیا ہے اور وہیں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین بار چکر لگاتے ہیں اور مل کر واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ گلبرگ میں رہتی ہے۔ بھائی کریسنٹ ماڈل اسکول میں پڑھ رہا ہے اور وہ کنگ ایڈورڈ میں فورتھ ائیر کی طالبہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی ساہیوال والی خالہ بھی لاہور میں شفٹ ہو چکی ہیں اور گلبرگ ہی میں رہتی ہیں۔ غزالہ نے کہا "تمہارے جانے کے بعد ابو اور امی نے تمہیں بہت تلاش کروایا۔ ارد گرد کے دیہات میں منادی کروائی۔ مسجدوں میں اعلان ہوا۔ پھر کئی روز اخباروں میں اشتہار بھی آتے رہے۔ آخر سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ ابو کو تمہارے گم ہونے کا اتنا دکھ تھا کہ وہ کئی ماہ بیمار پڑے رہے۔ دراصل انہی دنوں ان کا دل جل کوٹ سے اچاٹ ہو گیا تھا اور وہ لاہور شفٹ ہونے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اور صرف ابو ہی نہیں ہم سب بھی تمہیں مس کرتے تھے۔" ایک لمحہ توقف کر کے غزالہ نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ تھا۔ اس رنگ میں سب سے نمایاں عنصر پشیمانی کا تھا۔ ایک خاموش نوحہ ہم دونوں کے درمیان گونج رہی تھی اور کسی کو برہنہ بدن گلیوں میں گھسیٹے جانے کا منظر ہم دونوں کے تصور میں اتر آیا تھا۔ اس منظر کے تصور میں اترتے ہی مجھے اپنی نگاہ جھکا لینی چاہئے تھی، لیکن میں نے نگاہ نہیں جھکائی۔ یہ کام غزالہ نے کیا۔ اس کی شرمسار پلکوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "شاہ جہاں! شرمندگی کا لفظ اس احساس کو بیان کرنے کے لئے بہت چھوٹا ہے جو تمہارے جانے کے بعد میرے دل میں گھر کئے ہوئے ہے۔ میں جانتی ہوں، تمہارے اور تمہارے گھرانے کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا۔ کاش اس روز.........." ایک دم اس کی آواز بیٹھ گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن بہت جلدی چپ ہو گئی۔

خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ میں اس کے بغیر کہے سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ اپنی زبان سے میرے کانوں میں اظہار ندامت کا رس گھولے۔ میں نے اسے خجالت سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ میرے دل میں اس کے لئے رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں کسی طرح صاحب اختیار ہو جاؤں اور ساری دنیا میری نظر کرم کی طالب ہو جائے تو چچا جلیس کی لڑکی وہ آخری ہستی ہو گی جس پر میں رحم کی نظر ڈالوں گا۔ میرے سینے میں چچی فاخرہ اور اس کی ہم صفت بیٹی کے لئے نفرت کا ایک سمندر ہلکورے لیتا رہتا تھا اور یہ سمندر اس وقت بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ تاہم میں نے چہرے پر نرم خطوط ابھار رکھے اور ریستوران کے اس پر سکون گوشے میں غزالہ سے ہم کلام رہا۔

اسے قریب سے دیکھ کر اور مل کر میرے اندر کا خختم شخص پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ چچی فاخرہ کی بیٹی سے انتقام لوں۔ چہرے پر ایک نیا چہرہ سجا کر اس سے یوں ہی ملتا رہوں اور اسے ایک ایسے راستے پر لانے کی کوشش کروں جہاں اس کا ہر قدم میری طرف اٹھے اور اس کی ہر سوچ کا مرکز و محور میری ذات ہو۔ غزالہ سے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اپنے مقاصد کے حصول میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔۔۔۔ آنے والے دنوں میں یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری یلغار سے پہلے ہی میرا ہمزاد اس لڑکی کو فتح کر چکا ہے۔ یہ ہمزاد کون تھا؟ شاید وہی احساس ندامت جو غزالہ کے ساتھ ہی پل پل کر جوان ہوا تھا اور ہر گھڑی اسے میری یاد دلاتا رہا تھا۔ اب وہ ایک حسین دوشیزہ تھی۔ وہ بجا طور پر خود سے یہ توقع رکھ سکتی تھی کہ اس کے حسن کے احترام میں اسے معاف کیا جا سکتا ہے اور اس کی سحر انگیز شخصیت کے صلے میں اس سے محبت کی جا سکتی ہے۔

میرا ڈھونگ اسے یقین دلانے لگا کہ میں ماضی کی رنجشوں کو فراموش کر کے اس کی ذات میں گم ہوتا جا رہا

ہوں۔ اس احساس کے رد عمل میں وہ خود بھی میرے اندر گم ہونے لگی۔ اس کے گھر والوں کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی میرے بارے میں کیا جانتی تھی۔ اس کی نظروں میں میں ایک نوجوان ہونہار وکیل تھا۔ میری بہن منتقا اپنے ننھیال میں مقیم تھی اور میں عنقریب لاہور میں کوئی اچھا روزگار حاصل کرنے والا تھا۔

وہ بے خبر تھی کہ میں چار افراد کا قاتل ہوں۔ دو صوبوں کی پولیس میرے پیچھے ہے اور چولستان کے خطرناک ترین غنڈے پاگل کتوں کی طرح مجھے کھوجتے پھرتے ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ بڑی کامیابی کے ساتھ اس سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے کئی بار چاہا کہ والدین کو میرے بارے میں بتا دے اور مجھے ان سے ملوائے لیکن میں نے ہر بار اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ کبھی کبھی وہ کہتی "شاہ جہاں! آپ اتنے پُراسرار کیوں ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے آپ کسی جاسوسی فلم کے کردار ہیں، جو کسی لڑکی سے ملنے کے لئے اندھیرے سے نکلتا ہے اور اندھیرے ہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں، کبھی وہ ان سے بچتا ہے، کبھی ان کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔"

آخر غزالہ کو مطمئن کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی کہانی اسے سنا ڈالی تھی۔ اس کہانی میں چولستان کے ایک وڈیرے اور اس کے گماشتوں کا ذکر تھا جنہیں وکیلوں کے ایک پینل نے کسی کیس میں سزا دلوائی تھی۔ اس پینل میں، میں بھی تھا۔ اب وہ لوگ ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے تھے اور خواہ مخواہ الجھتے رہتے تھے۔ میں نے غزالہ کو یقین دلایا کہ جلد ہی یہ مخاصمت ختم ہو جائے گا۔ معلوم نہیں غزالہ میری توضیح سے مطمئن ہوئی یا نہیں...... مجھے اس سے غرض بھی نہیں تھی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ وہ بدستور مجھ سے مل رہی تھی اور میرے لئے اس کی خود سپردگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔ آخر ایک ایسا اسٹیج آ گیا جب وہ مکمل طور پر میرے رنگ میں رنگ گئی۔ اب وہ ایک پکا ہوا پھل تھی جو میری ضیافت طبع کے لئے ہر وقت تیار تھا۔ میں جب چاہتا ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیتا۔

اپنی کامیابی کے نشے نے مجھے سرشار کر دیا۔ میرے اندر کا ختم المزاج وحشی پوری طرح بیدار ہو گیا...... میں چچی فاخرہ کی بیٹی کو برباد کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے حسین سراپا کو نوچ کر عبرت نشاں بنا دینا چاہتا تھا اور میرے خیال میں یہ سزا ان عورتوں کے ڈھائے ہوئے ستم کے مقابلے میں معمولی تھی۔ انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا میرے ساتھ۔ انہوں نے میرے اور منتقا کے سر سے باپ کا سایہ چھینا۔ ماں کی گود چھینی، نیم کا پیڑ چھینا، پھولوں والا آنگن چھینا اور آخر میں زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا۔ ان عورتوں کی بدولت مجھے بھرے بازار میں جانوروں کی طرح مارا گیا۔ گلیوں میں گھسیٹا گیا اور اس طرح باپ کے سامنے لایا گیا کہ میرے جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں تھا۔ تم...... میں وہ گھڑیاں کیسے بھول سکتا تھا۔ نہیں بھول سکتا تھا اور جب یاد کرتا تھا تو خون کے آنسو روتا تھا۔ وہی کرب میرے رگ و پے کو چیر دیتا تھا جو بڑے میاں کے کوڑے سے لپک کر میری ننگی پشت میں سرایت کر گیا تھا اور ہمیشہ کے لئے وہاں ٹھہر گیا تھا۔

پھر ایک روز میں اور غزالہ ہوٹل کے ایک کمرے میں تنہا تھے۔ یہاں سب کچھ میرے بس میں تھا۔ میں اسے قدم قدم چلاتا خود سپردگی کی ایک ایسی منزل پر لے آیا جہاں اس کے سامنے صرف میں ہی میں تھا۔ وہ میری دسترس میں تھی۔ یہ ایک ایسا دوراہا تھا جہاں سے کسی بھی سمت سفر کیا جا سکتا تھا۔۔۔ اور پھر ایک دم میرے قدم زمین میں پیوست ہو گئے تھے۔ مجھے روکنے والی کیا شے تھی؟ شاید مرحوم باپ کی اور افتادہ صدا، شاید ماں کی نگہبان آنکھیں، شاید خون میں تیرتے ہوئے وہ کردار ساز جرثومے جو مجھے وراثت میں ملے تھے۔ میرے ہاتھ لرز اٹھے تھے، آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے پھوٹ رہے تھے، میں نے غزالہ کو جھٹک کر دور پھینک دیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی چلی گئی تھی۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے" میں حلق کی پوری قوت سے دہاڑا تھا "دفع ہو جاؤ کتیا...... جاؤ...... اپنی پیاری ماں کے صدقے میں نے تمہیں معاف کیا۔ جاؤ...... چلی جاؤ۔"

وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور دندناتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اسے قریباً گھسیٹ کر باہر نکال دیا تھا میں نے۔

میرا خیال تھا کہ غزالہ اب کبھی مجھے اپنی صورت نہیں دکھائے گی۔ میں اسے آنکھوں سے ہی نہیں اپنے ذہن سے بھی دور کر چکا تھا۔ اور پھر ذہن میں اتنی جگہ ہی کہاں تھی کہ کوئی غیر ضروری سوچ وہاں ٹھہر سکتی۔ ان دنوں بڑی "مصروف" زندگی تھی میری۔ میں جرم کی دنیا میں پورے طمطراق سے قدم رکھ چکا تھا۔ اس کٹھن راستے پر آتے ہی میرا سامنا شنکر شکرا جیسے بدنام زمانہ شخص سے ہو گیا تھا۔ وہ بڑی اونچی ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور یہ بلندی مجھے بھی بہت اوپر لے گئی تھی۔ وہ ہنگاموں کے دن اور ہنگاموں کی راتیں تھیں۔ شب و روز کے ہر ہر پل میں گولیوں سنسناہٹ، خنجروں

کی جنگ، دھمکیوں کی گھن گرج اور رقص و سرود کی فتنہ خیزیاں تھیں۔ جل کوٹ کے وڈے میاں جیسے بدماغ چوہدریوں کا دھڑن تختہ کردینا اب میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور میں یہ کھیل ضرور کھیلنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ اپنی "مصروفیات" سے کچھ وقت نکال کر میں جل کوٹ پہنچا تھا۔ میں ایک کار میں سوار تھا۔ اس کار میں میرے ساتھ چار افراد سوار تھے جنہیں ضلع لاہور میں چوٹی کا غارت گر سمجھا جاتا تھا۔ ان غارت گروں کے علاوہ میری کار میں اتنا اسلحہ موجود تھا جس سے پورے نہیں تو نصف جل کوٹ کو بہ آسانی موت کی نیند سلایا جاسکتا تھا۔ تقریباً بارہ برس کے بعد میں نے وہ جگہ دیکھی تھی جہاں ایک نوعمر لڑکے کے سرپر آسمان توڑ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی گئی تھی۔ اب وہاں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ وہ ٹین کا سائبان نما کمرا اور اس میں رکھی ہوئی جہازی سائز کی کہنہ نوبت بھی موجود نہیں تھی لیکن وڈیروں کی حویلی نہیں بدلی تھی۔ اسی شان اور دبدبے سے کھڑی تھی جیسے بارہ سال قبل میں نے دیکھی تھی۔ میں کسی صحرائی بگولے کی طرح حویلی میں گھس گیا تھا۔ حویلی کے وسیع و عریض صحن میں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک مقامی دینی مدرسے سے کوئی ڈیڑھ سو طلبہ قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ پتا چلا کہ آج وڈے میاں، چھوٹے میاں اور ان کے ایک چچا زاد کی دوسری برسی ہے۔ یہ تینوں افراد دو سال پہلے ایک جھگڑے میں ہلاک ہوچکے تھے۔ خاندانی رقابت داروں نے انہیں گھات لگا کر مارا تھا اور لاشیں گھوڑوں تلے روند ڈالی تھیں۔

میرے اندر انتقام کے شعلے پھن پھیلا کر سرنگوں ہو گئے تھے۔ میں جانتا تھا میری جگہ وڈے میاں ہوتا اور میں وڈے میاں کی جگہ ہوتا تو اس روز حویلی میں شعلے ضرور بھڑکتے۔ ان شعلوں میں وڈا میاں نہ جلتا مگر اس کے اہل خانہ ضرور جلتے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ضرور زندگی سے محروم ہوتے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اپنے غضب کی آگ کو سینے کے آتش کدے میں سمیٹ کر اور اپنے آبائی گھر پر ایک نظر ڈال کر میں جل کوٹ سے واپس آگیا تھا۔۔۔ اس عہد کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن مجھے پھر جل کوٹ آنا ہے۔

مجھے یاد ہے اپنے اندر کی نیلی آگ کو سرد کرنے کے لئے اس رات میں نے بے تحاشا شراب پی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں بوتلیں لئے میں رات گئے تک لاہور کے بازار حسن میں گھومتا رہا تھا۔ میں نے ہوائی فائرنگ کرکے چوباروں کی رنگین کھڑکیاں توڑ دی تھیں، دکن سے بدمعاشوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا۔ راہ گیروں کو ٹھوکریں رسید کی تھیں۔ کون تھا جو مجھے روکتا۔ کس میں ہمت تھی کہ جمالی استاد کی راہ میں مزاحمت کرتا۔ پھر میں بادشاہی مسجد کی طرف نکل گیا۔ اس کی اونچی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا منٹو پارک میں پہنچا تھا۔ یہاں میری شاندار کرولا کھڑی تھی۔ میرا مجراتی گارڈ لنگوا ہر کے قریب چوکسی سے پہرا دے رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا دیا تھا اور گاڑی کی طرف لے آیا تھا۔ ڈرائیور نے فوراً ہی اپنی نشست سنبھال لی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھنا چاہا تھا جب لنگو نے میری توجہ سامنے فٹ پاتھ کی طرف دلائی تھی۔ میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ایک سفید واکس ویگن کے قریب غزالہ کھڑی تھی۔ لنگو نے بتایا۔

"بی بی ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی تھی"

میں نے غور سے غزالہ کو دیکھا تھا، میری گاڑی یہاں کھڑی دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ سفید ماکل لباس میں وہ چاندنی میں نمایا ہوا تاج محل دکھائی دے رہی تھی۔ خوبصورت، رومان انگیز اور اداس۔ میں، میرا گارڈ اور دوسرا نمبر ڈرائیور رنگیل باز اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔۔۔ تاج محل اور ایسے گندے ماحول میں؟ یا شاید وہ بادشاہی مسجد تھی جو بازار حسن کی غلاظت میں شرمسار کھڑی تھی۔

"کیوں کھڑی ہو یہاں۔ کیا لینے آئی ہو؟" میں چیخا تھا۔ سڑک سے گزرتے ہوئے اکا دکا سائیکل سوار مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

"شاہ جہاں! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز میرے ساتھ چلو؟" وہ افسردگی سے بولی تھی۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر اور تیری "پلیز" پر۔ چلی جاؤ یہاں سے۔ گیٹ لاسٹ۔ آئی سے گیٹ لاسٹ" میں گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈھیر ہوگیا تھا اور میرے کارندے مجھے لے کر بڑی سڑک پر آگئے تھے۔

"عورت ایک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" اس مقولے کی صداقت مجھ پر انہی آشوب دنوں میں ظاہر ہوئی تھی۔ مستقبل کی ایک خوبصورت اور نہایت ذہین ڈاکٹر ایک بدمعاش سے محبت کر رہی تھی۔ دھتکارے جانے کے باوجود اس شخص کا سایہ بنی ہوئی تھی جو قاتل، ڈکیت، شرابی، عیاش اور جنونی سب کچھ تھا۔ وہ ایک نرم و نازک پرندہ تھی اور اس بات پر مصر تھی کہ گوشت نوچ لینے والے اور خون پی جانے والے عقاب کے گھونسلے میں جائے گی۔ اس پر سب کچھ عیاں ہوچکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں ناک ناک جرم کی دلدل میں دھنس چکا ہوں۔ میری واپسی کی کوئی امید ہے اور نہ میں واپس آنا چاہتا ہوں پھر بھی وہ میرا پیچھا کر رہی تھی۔

انہی راستوں پر چلتے چلتے آخر وہ شام آئی تھی جب ایک روز شفتا مجھے ملی تھی اور اس کے ملنے سے میری زندگی ایک ایسے انقلاب سے آشنا ہوئی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی داستان کے شروع میں میں اس واقعے کا ذکر کرچکا ہوں۔ شفتا مجھے جرم کی دلدل سے نکالنے کے لئے آئی تھی۔ اور وہ یہ کام کر گزری تھی۔ کیوں کر گزری تھی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ یہ کام کرسکتی تھی۔ روئے زمین پر وہی تھی جو یہ کام کرسکتی تھی۔ میں اس کے آنسوؤں میں یوں بہہ گیا تھا کہ سیدھا عدالت کے دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

وہ زمانہ ایک انسان کے اندر سے نئے انسان کی نمو کا زمانہ تھا۔ حوالات، کچہریاں، وکیل، عدالتیں اور جج بھولے بسرے منظر ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ عدالتوں کی کارروائی طویل اور تھکا دینے والی تھی۔ میرے حق میں یہ بات جا رہی تھی کہ جو افراد میرے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں اکثریت قانون کے مفروروں کی تھی یا وہ ایسے لوگ تھے جو عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے تو موت کا پروانہ ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا۔ میں نے پہلے چار قتل اپنی معصوم بہن کی جان اور آبرو بچاتے ہوئے کئے تھے۔ یہ حقیقت بڑے جاندار طریقے سے عدالت کے سامنے پیش کرنے کا سہرا میرے استاد محترم اور بلند پایہ قانون داں جناب ظفر احسن کے سر ہے۔ دراصل یہ ظفر احسن ہی تھے جن کے مسلسل اصرار پر شفتا مجھ تک پہنچی تھی اور اس نے مجھے پیش ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ میرے قابل وکیل کی کوششوں سے جیوری کے دل میں میرے لئے نرم گوشے پیدا ہوئے۔ آخرکار ہائی کورٹ میں میری اپیل منظور ہوئی اور میں جو سیشن کورٹ سے پھانسی کا مستحق قرار پا چکا تھا، زندگی کی طرف لوٹ آیا۔

مجھے مختلف مقدمات میں بارہ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ اس قید کا پہلا سال میں نے لاہور جیل میں کاٹا۔ لاہور میں ہی میرے ہاتھوں ایک مقدم کے دانت ٹوٹنے کا واقعہ ہوا۔ نتیجے میں قید کا ایک سال کاٹنے کے بعد بھی میری قید میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ شفتا کی آہ و زاری نے میرے دل میں زلزلے برپا کردیے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح جرم کی دنیا کو خیرباد کہہ کر جیل میں آیا ہوں اسی طرح اپنے اندر کے استاد جمالی کو بھی خیرباد کہہ کر جیل میں ایک سیدھا سادہ بے ضرر قیدی بن جاؤں گا۔ میری زندگی کا اولین اور آخری مقصد صرف اور صرف سزا بھگت کر اس دنیا میں واپس جانا ہوگا جہاں میری بہن شفتا میری راہ دیکھ رہی ہے۔

مقدم والے واقعے کے بعد مجھے اٹک جیل میں منتقل کردیا گیا۔ اٹک میں میں نے تین سال کاٹے تھے جب کچھ پُراسرار لوگ میرے درپے ہوگئے اور مجھے مارنے کی کوشش کرنے لگے پھر نور محمد کے قتل کا خونی واقعہ رونما ہوا اور وہ حادثوں بھری رات مجھ پر وارد ہوئی جب میں اٹک جیل سے اغوا ہوکر آغا قادر زماں کی حویلی میں پہنچ گیا تھا۔

گزرے والے حالوں کے حوالے سے سوچ کا جو طویل سفر شروع ہوا تھا وہ چھبیس چھبیس برسوں کا فاصلہ طے کرکے پھر اپنے نقطۂ آغاز پر پہنچ گیا۔ میں خیالوں کی دنیا سے واپس اسی خیمے میں آگیا جو رات کے سمندر میں سردی کی لہروں پر ڈوب ابھر رہا تھا اور جس کی ٹھٹھری ہوئی فضا میں انگیٹھی کی آگ بجھتے بجھتے اب راکھ بن چلی تھی۔ خیمے سے باہر پاؤندوں کے کتوں کا شور تھا اور خیمے کے اندر دو افراد کے خراٹے گونج رہے تھے۔ اس کے علاوہ پوری بستی میں کوئی آہٹ، کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میری آنکھیں اب نیند سے بوجھل ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ سچ کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مجھے بھی اس ٹھٹھرے ہوئے خیمے اور اس پُرخطر اندھیرے کے حصار میں نیند دبوچنے لگی۔ میں نے کمبل دوہرا کرکے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا، رائفل بالکل تیار حالت میں سینے سے لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ شب کا باقی حصہ جیسے ہوا کے ایک جھونکے کے مانند گزر گیا۔ کوئی جھنجوڑ کر مجھے جگا رہا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ خیمے میں اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے جگانے والا خود لشکر خان تھا۔

"اٹھو برادر! تمہارے لئے ایک اچھا خبر ہے" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"کیسی خبر؟" میں کمبل کے حصار سے نکل کر بیٹھ گیا۔

"تمہارا بی بی اور بچہ لوگ یہاں پہنچ گیا ہے۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔ دروازے سے باہر تیسرے سائبان کے نیچے"

میں نے دیکھا نبیلہ اور بچہ دونوں موجود تھے۔ وہ اسی لباس میں تھے جس میں، میں انہیں لال بی بی اور رشید خان کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ نبیلہ کے زخمی پاؤں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس نے ایک بڑی سی مردانہ چپل پہن رکھی تھی۔ لڑکا اب ہوش میں تھا اور ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا۔ نبیلہ کا بازو تھامے وہ یوں کھڑا تھا جیسے ایک پل کے لئے بھی اسے خود سے جدا نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں اٹھ کر جلدی سے ان دونوں کے پاس پہنچا۔ نبیلہ گلہ آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی "آپ تو ایک گھنٹے کا کہہ کر نکلے تھے؟" اس نے

احتجاج کیا۔

"بس حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں واپس نہ لوٹ سکا۔۔۔ اور۔۔۔ وہ دوسرے لوگ کدھر ہیں؟" میں نے لال بی بی وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

"انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ وہ لال بی بی تو اچھل اچھل کر آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ کہتی تھی' بیٹے کے بغیر تو میری لاش بھی یہاں سے نہیں جائے گی۔ ماں کی وجہ سے رشید خاں اور اس کی بیوی بھی وہاں رہنے پر مجبور ہو گئے"

"یہ ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ بڑا خطرناک کام کیا" لشکر خاں نے کہا۔

میں نے نبیلہ سے پوچھا کہ ان دونوں کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ وہ بولی "راستے میں تو نہیں ہوئی لیکن کل کا سارا دن سخت پریشانی میں گزرا۔ ہمیں آپ کی طرف سے بڑی فکر تھی۔" وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو اس طرح؟" میں نے پوچھا

وہ مسکرا کر بولی "کیا آپ واقعی ہیڈ کانسٹیبل ہیں؟"

"کس وجہ سے شک ہو رہا ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا

"اس خط کی وجہ سے" اس نے وہ خط مجھے دکھایا جو کل لشکر خاں نے مجھ سے لکھوایا تھا۔ وہ بولی "اگر ہیڈ کانسٹیبل اتنی اچھی انگریزی لکھتا ہو تو پھر انسپکٹر کو انگریزی ادب کا کیڑا ہونا چاہیے۔ حیرت ہے اتنی انگریزی پڑھ کر بھی آپ نے یہ نوکری کی ہے؟"

میں نے کہا "انگریزی پڑھ کر نوکری کی ہے تو اچھا کیا ہے۔ کچھ لوگوں کو تو بے روزگاری کی وجہ سے ڈاکے بھی ڈالنے پڑتے ہیں۔۔۔ بہرحال وہ گن کہاں ہے جو کل میں نے لال بی بی کو دی تھی؟" میرا اشارہ سب مشین گن کی طرف تھا۔

لشکر خاں کا ایک ساتھی آگے بڑھا اور کپڑے میں لپٹی ہوئی گن میرے حوالے کر دی۔ تکیے کے ایک غلاف میں گن کے میگزین اور راؤنڈ وغیرہ تھے۔ یہ اشیا وہ کافی بحث و تکرار کے بعد لال بی بی سے حاصل کر سکے تھے۔ وہ اسلحہ شناس جہاندیدہ بڑھیا اس گن کی قدر و قیمت سمجھتی تھی اور کسی صورت اسے خود سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی حالانکہ میں اس کی رائفل بھی خط کے ساتھ ہی ارسال کر چکا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی ایک گھڑسوار موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ لشکر خاں کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کا گھوڑا پسینے سے شرابور تھا اور وہ خود بھی ہانپا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لشکر خاں کے نزدیک پہنچ کر وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا۔ لشکر خاں کے احترام میں جھکا اور اسے کوئی اطلاع دینے لگا۔ اطلاع یقیناً سنسنی خیز تھی۔ موقع پر موجود لشکر خاں کے سبھی ساتھی چوکس نظر آنے لگے۔ وہ لوگ کچھ دیر تک تیز لہجے میں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ پھر چند آدمی سردار بشر گل کے جھونپڑے کی جانب بھاگ گئے۔ لشکر خاں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"برادر! تم لوگ بھی اپنے خیمے میں جاؤ۔ اپنا ہتھیار متھیار چوکس رکھو۔ بی بی سے کہو پردے میں رہے۔ سردار عیسیٰ اور جنگر ادھر آ رہا ہے۔ اَمارا کوشش ہو گا' وہ اَمارے بارے میں جانے بغیر واپس چلا جائے۔ تم اَمارا مطلب سمجھ رہا ہے ناں؟"

"بالکل سمجھ رہا ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

لشکر خاں ہمیں کچھ مزید ہدایات دے کر آگے بڑھ گیا۔ میں نبیلہ اور بچے کو لے کر نجو کے جھونپڑے میں آ گیا۔ میرے ساتھ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ میں نے نجو کو سمجھایا کہ وہ ان دونوں کو جھونپڑے میں رکھے اور ہو سکے تو نبیلہ کو کسی پاؤندہ عورت کا لباس مہیا کر دے۔

"خیر ہے صیب جی؟ آپ بڑے گھبرائے ہوئے لگتے ہیں" نجو نے پوچھا۔

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔۔۔ سمجھ لو کہ کچھ لوگ ہمیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ رہے ہیں" اس سے پہلے کہ نجو مزید سوال کرتی' میں اپنے خیمے کی طرف لوٹ آیا۔ خیمے میں میرے دونوں ساتھی بھی اب جاگ چکے تھے اور ہوشیار باش نظر آتے تھے۔ میری بھاری بھرکم سب مشین گن دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور اس میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے سب مشین گن کا ایک میگزین لوڈ کرنے کے بعد اسے کاک کر لیا اور دوسرا تیار حالت میں پاس رکھ لیا۔ ابھی ہمیں خیمے میں آئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک گھنٹی کی صدا بستی میں گونجنے لگی۔ یہ صدا بستی کے پاس ہی ایک اونچے ٹیلے سے آ رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر پہلے سے موجود اضطرابی کیفیت اب شدید ہو گئی تھی۔ ایک شخص نے اٹھ کر خیمے کے روزن سے باہر جھانکا۔ اسی دوران لشکر خاں کا قریبی ساتھی جمعہ خاں آندھی اور طوفان کی طرح خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے ہم تینوں کو ساتھ لیا اور بستی کے مغربی کنارے پر پہنچ گیا۔ یہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور کچھ کلہاڑیوں اور

لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ یہ سب کے سب بستی کے لوگ تھے۔ سردار بشر گل تیز تیز لہجے میں انہیں کچھ سمجھا رہا تھا۔ ان سے کچھ فاصلے پر لشکر خاں اور اس کے مسلح ساتھی بھی صف بندی میں مصروف نظر آ رہے تھے۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی قلعے میں محصور سپاہی دفاعی پوزیشن سنبھال رہے ہیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں زوئے مشت کی یہ پاؤندہ بستی نشیب میں واقع تھی۔ یہ ایک وادی سی تھی جس کی تین اطراف میں بالکل عمودی دیواریں تھیں۔ ان اطراف سے کوئی بستی میں داخل ہونا چاہتا تو اسے بیشتر جگہوں پر باقاعدہ رسے یا طویل سیڑھی کی ضرورت پڑتی۔ ایسی کئی پچیلی زمینیں اس علاقے میں عام ہیں۔ ہموار زمین پر چلتا ہوا مسافر ایک دم خود کو گہری کھائی کے کنارے پاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ اندھیرے میں جا رہا ہوتا تو اپنا کیا حشر کرتا۔ اس بستی کی تین اطراف بھی ایسی ہی کئی پچیلی بلند زمین سے محفوظ تھیں۔ چوتھی سمت میں ڈھلوان تھی اور یہیں سے بستی میں آمدورفت ہوتی تھی۔ اب اس سمت کو مورچہ بندی سے محفوظ کیا جا رہا تھا۔ حکمت عملی میں یہ اچانک تبدیلی معلوم نہیں کیوں رونما ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر لشکر خاں لپکتا ہوا میری طرف آیا۔

"برادر! تم اَمارا مہمان ہے۔ اَم نہیں چاہتا کہ تم لڑے۔ تم پیچھے اپنی بی بی اور بچہ لوگ کے پاس جاؤ۔ لیکن تمہارا یہ گن اَمارا بہت مدد کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "خان پیارے! ہم بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے لیکن کچھ پتا بھی چلے کیا معاملہ ہے؟"

وہ تیزی سے بولا "ابھی دو آدمی عیسیٰ جان کے پاس سے بھاگ کر اَمارے پاس آیا ہے۔ بالکل بھروسے کا آدمی ہے وہ لوگ۔۔۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بستی میں عیسیٰ جان کا ایک مخبر موجود تھا۔ اس کافر کے بچے نے سارا بھید کھول دیا ہے۔ آج صبح اس نے جا کر عیسیٰ جان کو بتایا ہے کہ سردار بشر گل اَمارے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اب عیسیٰ جان یہاں اَم کو ڈھونڈنے نہیں آ رہا' ساری بستی کا ملیا میٹ کرنے آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ڈیڑھ سو سے کم آدمی نہیں ہے اور سب کا سب ہتھیار بند ہے۔ خوچے بہت گڑبڑ ہوا ہے' پر جو بھی ہوا ہے اس کا سامنا تو اب کرنا ہے۔ اور اَمارے خدا نے چاہا تو اَم کرے گا"

میں نے کہا "خان! تم مجھے برادر بھی کہتے ہو اور یہ بھی سمجھتے ہو کہ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر پیچھے عورتوں کے پاس جا بیٹھوں گا۔۔۔ ذرا سوچو ایسا ہو سکتا ہے؟"

"نہیں برادر! اَمارا یہ مطلب نہیں۔ اَم تمہارا حوصلہ جانتا ہے۔ جو شخص عیسیٰ کی قید سے نکل سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں خان۔ ہم اکٹھے لڑیں گے۔ اب جو بھی ہونا ہے ہم سب کے ساتھ ہو گا"

تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد لشکر خاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کی مورچہ بندی کا جائزہ لیا۔ وہ ایسی لڑائیوں میں ماہر نظر آتے تھے۔ ہر شخص اپنی مناسب ترین پوزیشن پر موجود تھا۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کے دائیں بائیں پاؤندوں کے مسلح آدمی تھے۔ ان سب کے چہرے تمتما رہے تھے اور وہ مرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ یہ سب لوگ قریباً دو سو گز طویل "محاذ" پر پھیلے ہوئے تھے اور یہی وہ ڈھلوان تھی جہاں سے بستی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

میں نے لشکر خاں سے پوچھا "اگر وہ لوگ چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچ گئے اور اوپر سے بستی پر فائر کرنے لگے تو۔۔۔؟"

"کچھ نہیں ہو گا" لشکر خاں بولا "ایک بھی دوربار رائفل نہیں ہے ان لوگوں کے پاس۔ ویسے بھی بستی کا لوگ خیمے چھوڑ کر جھونپڑیوں میں چلا گیا ہے۔ اوپر سے گولا چلا بھی تو جھونپڑے میں بیٹھا ہوا لوگ خیریت سے رہے گا۔ بالکل پکے مکان کے مافق ہیں یہ جھونپڑے"

لشکر خاں کی بات ٹھیک تھی۔ جھونپڑوں کی دیواروں کو سرخ مٹی کا لیپ کر دیا گیا تھا۔ چھتوں پر بھی مٹی کی موٹی تہ موجود تھی۔ ایسے میں ان پر فائرنگ کے اثرانداز ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ لشکر خاں کے مشورے سے میں بھی ایک صف میں شامل ہو گیا۔ ایک پتھر کی اوٹ میں آسن جما کر میں نے سب مشین گن کو پوزیشن میں کیا اور آنے والے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔۔۔ لمحے جو سنسنی خیز تھے۔ جو مہیب ہو سکتے تھے اور نامہرباں بھی۔ دھماکا خیز بھی اور پُرسکون بھی۔ اچھے بھی اور برے بھی۔۔۔

قریباً دس منٹ بعد میں نے پہلی مرتبہ حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں اور پھر قریباً پندرہ منٹ بعد بستی کے نواح میں پہلی گولی چلی۔ یہ ایک پُرجوش تجربہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی فکرمندی بھی دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھی۔ اگر عیسیٰ اور جنگر وغیرہ اس لڑائی میں کامیاب ہوتے تو بستی اور بستی کے مکینوں پر قیامت گزر جانا تھی اور بستی کے مکینوں میں اس وقت نجو' نبیلہ' نامعلوم بچہ اور میں بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ چھاپا مار پارٹی کے مجھ سمیت

ساتھیوں کی قید یا رہائی کا دارومدار بھی اس لڑائی کے نتیجے پر تھا۔ ایک طرح سے یہ لڑائی اب میری ذاتی لڑائی بھی تھی۔

عیسیٰ اور شنکر نے بستی کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ وہ صبح نو بجے کے قریب پہنچے تھے۔ دوپہر بارہ بجے تک وقفے وقفے سے کئی بار گولیاں چلیں تاہم کوئی شخص ہلاک یا شدید زخمی نہیں ہوا۔ دوپہر تک حملہ آور اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ صرف شمالی رُخ سے ہی بستی میں داخل ہوسکتے ہیں اور یہی وہ سمت ہے جہاں انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ اسی سمت میں مرکوز کردی۔ نسبتاً اونچی جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جہاں پتھروں کی قدرتی آڑ موجود نہیں تھی وہاں آڑ کا انتظام کرلیا۔ اس مقصد کے لئے درختوں کے تنے اور پتھر وغیرہ استعمال کئے گئے۔ اسی دوران عیسیٰ کے ساتھیوں نے ایک اہم پیش رفت بھی کرلی۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اس چشمے پر قابض ہوگئے جس سے بستی کو پانی فراہم ہوتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا عیسیٰ جان وغیرہ کو چشمے کی طرف متوجہ کرنے والا وہی مخبر تھا جو اس سے پہلے اپنے سردار بشر گل کو اس معاملے میں ملوث کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بستی کی ساری آبادی اس چشمے سے پانی حاصل کرتی ہے اور اگر انہیں پانی سے محروم کردیا جائے تو وہ سخت مشکل میں پڑجائیں گے۔ اس کے مشورے پر شنکر نے پندرہ بیس افراد کے ساتھ مل کر تیزی سے کارروائی کی اور دو افراد کو قتل کرکے چشمے پر قبضہ کرلیا۔

○☆○

بستی کا محاصرہ ہوئے چار روز ہوچکے تھے۔ وقفے وقفے سے گولیاں بھی چل رہی تھیں۔ تیسرے روز رات کے وقت عیسیٰ جان کے کچھ جوشیلے ساتھیوں نے اچانک ہلّا بول کر بستی میں گھسنے کی کوشش کی۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھی غافل نہیں تھے۔ انہوں نے فی الفور جوابی کارروائی کی۔ اس جھڑپ میں میں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اس لڑائی میں لشکر خاں کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا اور تھوڑی دیر میں چل بسا۔ حملہ آوروں کا نقصان چار گنا تھا۔ ان کے چار آدمی ہلاک ہوئے اور چاروں کی لاشیں ہماری پوزیشنوں سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر پڑی رہ گئیں۔ کوئی بھی ان لاشوں کو اٹھانے کا رسک نہیں لے رہا تھا۔ آخر بستی کے آوارہ کتے ان پر منہ مارنے لگے۔ تاہم اگلی شب عیسیٰ جان کے آدمی لاشیں اٹھا کر لے گئے۔

موسم ٹھنڈا تھا۔ شروع میں تو پانی کی وجہ سے دقت محسوس نہیں ہوئی لیکن پھر احساس ہونے لگا کہ روزمرہ کے معمولات جاری رکھنے کے لیے پانی کتنا ضروری ہے۔ پوری بستی میں اب ایک قطرہ پانی نہیں تھا۔ نہائے اور کپڑے دھوئے بغیر تو مہینوں گزارا ہوسکتا ہے لیکن روٹی بھی تو پانی ہی سے پکتی ہے اور ہنڈیا بھی پانی کے بغیر چولہے نہیں چڑھتی۔ سردیوں میں ایک دو روز تو پیاس برداشت کی جاسکتی ہے لیکن اس کے بعد نہیں۔ صورتِ حال روز بروز مخدوش ہورہی تھی۔ یہ امید رکھنا عبث تھا کہ ہم حملہ آوروں کو مار بھگائیں گے۔ ہاں یہ توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اکتا کر خود ہی محاصرہ اٹھالیں۔ تاہم ایسے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس ایمونیشن کی مقدار تسلی بخش ہے اور بوقتِ ضرورت انہیں مزید کمک مل سکتی ہے۔ وہ ہمیں اشتعال دلا کر بار بار فائرنگ کراتے تھے جیسے اسی کوشش میں ہوں کہ ہمارا اسٹاک ختم کیا جائے۔

پانچویں روز صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ باگڑ خیل کے لوگ بھی اس محاصرے میں عیسیٰ جان کے ساتھ شریک ہوگئے ہیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں پاؤندوں اور باگڑ خیل والوں میں پہلے سے چپقلش چلی آرہی تھی۔ یہ کسی چراگاہ پر قبضہ جمانے کا معاملہ تھا۔ اس چپقلش کی سنگین نوعیت کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب معمولی سی بات پر "مرحوم" غلام خاں اور سردار بشر گل کا بھائی رستم بھڑک اٹھے تھے اور کلہاڑیاں سونت کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔ میں نے ان دونوں کو بمشکل ایک دوسرے سے علیحدہ کیا تھا اب یہی چپقلش ایک نئے رنگ میں سامنے آئی تھی۔ عیسیٰ جان اور اس کے ساتھیوں کا حصار پہلے ہی بہت مضبوط تھا۔ اب باگڑ خیل والوں کے شامل ہونے سے اس میں اور مضبوطی آگئی۔

دوسری طرف پانی نہ ملنے سے بستی کے حالات ابتر ہورہے تھے۔ پانی کے علاوہ ایک مسئلہ ایندھن کا بھی تھا۔ خشک ایندھن بالکل ختم ہوچکا تھا۔ دو روز تک لوگوں نے لکڑی کی ناکارہ اور نیم کارآمد اشیا توڑ کر آگ جلائی پھر کارآمد اشیا آگ میں جھونکی جانے لگیں۔ اب ایندھن قریباً ناپید تھا۔ اگر چشمے سے عیسیٰ جان کے آدمیوں کا قبضہ ختم کیا جاسکتا تو پانی کے علاوہ ایندھن کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا تھا۔ چشمے کے اردگرد کافی تعداد میں خشک درخت موجود تھے اور ان میں سے کچھ کٹے ہوئے بھی تھے۔

لمحہ بہ لمحہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال سب کے لئے پریشان کُن تھی۔ شام کو سردار بشر گل کے وسیع و عریض جھونپڑے میں دیر تک صلاح مشورے ہوئے۔ موضوعِ بحث یہی تھا کہ چشمے کا کنٹرول دوبارہ کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ باگڑ خیل والوں کا میدان میں اتر آنا بھی ہر ایک کے لئے باعثِ تشویش تھا۔ سردار بشر گل نے کہا کہ اگر کل تک بہتری کی کوئی صورت نہ نکلی تو چشمے پر ہلّا بولنا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ پانی اور ایندھن کے نہ ملنے کی وجہ سے لوگ کچا گوشت کھانے پر مجبور ہورہے ہیں——— واپس اپنے "مورچے" میں جانے سے پہلے میں نجو اور نبیلہ کو دیکھنے گیا۔ بستی کے عام مکینوں کی طرح ان کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ موت کا خوف تو محاصرے کے پہلے روز سے ہر ایک کو دامن گیر تھا۔ اب اس خوف میں سردی اور بھوک کا خوف بھی شامل ہوگیا تھا۔ نجو نے بتایا کہ وہ پچھلے تین دن سے کچا گوشت کھا رہے ہیں۔ جھونپڑے ساری رات برفاب بنے رہتے ہیں۔ نبیلہ کے ساتھ آنے والے بچے کو کل سے شدید بخار تھا۔ اس کی طبیعت پہلے بھی خراب تھی۔ اب ناقص غذا کے سبب وہ زیادہ بیمار ہوگیا تھا۔

اس شب مورچے میں بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آنے لگی تو خود کو چوکس رکھنے کے لیے میں نے قریب بیٹھے کوہستانی سے گپ شپ شروع کردی۔ اس کا نام گل شیر تھا۔ معلوم نہیں گل کے ساتھ شیر کیوں لگادیا گیا تھا۔ گل کے ساتھ تو ہمیشہ بلبل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گل کے ساتھ شیر نہ لگایا گیا ہو بلکہ شیر کے ساتھ گل لگایا گیا ہو۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر اعتراض کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ شیر آخر شیر ہوتا ہے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ کچھ بھی لگا سکتا ہے بلکہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں 'وہ اپنی پسند کے مطابق بچہ' انڈا یا دونوں چیزیں ایک ساتھ دے سکتا ہے۔ گل شیر کو میرے ساتھ اس یخ بستہ مورچے میں بیٹھے آج چوتھی شب تھی۔ ان چاروں راتوں میں میں نے ڈٹ کر نیند پوری کی تھی بلکہ اکثر دن کے وقت بھی جھپکی جھپکی لے لی تھی' وجہ گل شیر ہی تھا۔ معلوم نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا' وہ اپنے حصے کی ڈیوٹی میں تو جاگتا ہی تھا' میرے حصے کی ڈیوٹی میں بھی آنکھ نہیں جھپکتا تھا——— آخر اسے مسلسل جاگتے دیکھ کر میں نے مسلسل سونا شروع کردیا تھا۔ خطرات تو ہم جیسوں کو ویسے بھی لوری دیا کرتے ہیں اور جب سونے میں کوئی اندیشہ بھی نہ ہو تو لوری کا بھرم رکھنے میں کیا حرج رہ جاتا ہے۔

میں نے جب بھی کہا "بھائی گل شیر! تھوڑی سی نیند لے لو" تو اس نے لال لال آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ نسوار کی ڈبیا سے ایک بڑا سا چٹکا لے کر نچلے ہونٹ میں رکھا اور مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایسی بہت سی قبائلی لڑائیوں میں حصہ لے چکا ہے۔ کئی مرتبہ اسے پورا پورا ہفتہ کچھ کھائے پیئے بغیر مورچے میں چوکس رہنا پڑا ہے۔ اب ایسی عادت بن چکی ہے کہ رائفل ہاتھ میں تھامتے ہی اس کی نیند اڑن چھو ہوجاتی ہے۔

گل شیر کا تعلق لشکر خاں والے جتھے سے تھا تاہم وہ پاؤندہ بستی اور اس کے گرد و نواح کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "بھائی گل شیر! تمہارے خیال میں چشمہ کتنے فاصلے پر ہے یہاں سے؟"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا "خوچہ اتنی دور نہیں ہے۔ بالکل پاس ہے——— یہ سامنے کا ٹیلا ہے نا——— اس کی دوسری طرف ہے۔ بہت ہوا تو تین سو قدم کا پاصلہ ہوگا" وہ بعض حضرات کی طرح "ف" کو بڑی باقاعدگی سے "پ" میں بدل دیتا تھا۔ شہادت کی انگلی سے اپنی دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ اونچا پیڑ دیکھ رہا ہے نہ تم۔ اس پر چڑھے گا تو دوسری طرپ چشمہ صاپ صاپ نظر آئے گا۔"

سنبل کا یہ درخت کافی اونچا تھا۔ چالیس پچاس فٹ سے کم بلندی کیا رہی ہوگی اس کی۔ چاند تاروں کی مدھم روشنی میں وہ ساکت کھڑا دیو ہیکل مخلوق نظر آرہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس مخلوق کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ پچھلے پانچ روز سے میں یہاں موجود تھا اور کئی بار اس درخت پر نگاہ پڑ چکی تھی لیکن نگاہ ڈالنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ واقعی بہت بڑا درخت تھا یہ اور بہت شاندار بھی۔ نجانے کیوں دل چاہا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر خاموشی سے اس درخت پر چڑھا جائے اور ذرا گرد و پیش کا جائزہ لیا جائے۔ کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے——— یعنی بے کار رو کچھ تو کیا کرو۔ [illegible]

میں نے اپنی سب مشین گن گل شیر کو سونپی اور اس کی بارہ بور رائفل کندھے پر لٹکا کر درخت پیمائی کے لئے تیار ہوگیا۔ گل شیر نے مجھے روکنا چاہا مگر چونکہ اس "چاہت" کے پیچھے کوئی اتھارٹی نہیں تھی' میں اسے "کارنر" کرکے درخت کی طرف رینگ گیا۔ درمیانی فاصلہ بمشکل بیس پچیس فٹ تھا۔ تنے کی لپیٹ سات آٹھ فٹ سے کیا کم ہوگی۔ میں تنے کے پیچھے کھڑا ہوا تو سامنے سے آنے والی گولیوں سے بالکل محفوظ ہوگیا۔ تنا کھردرا تھا اور اس پر نجانے بے شمار ابھار تھے۔ میں نے شاخوں کا جائزہ لیا پھر گھٹنوں کے بل جھک کر جست لگائی اور ایک دس فٹ اونچی شاخ سے جھول کر اوپر پہنچ گیا۔ جل کوٹ میں سولہ برس کی عمر تک شب و روز میرا ایسے ہی درختوں سے واسطہ رہا تھا۔ بچپن کی یہ مہارت اب

کام آرہی تھی۔ میں شاخوں پر مضبوطی سے ہاتھ پاؤں جماتا اوپر جانے لگا۔ کوشش یہ تھی کہ میری نقل و حرکت حتی الامکان غیر محسوس ہو اور ساکت ہوا میں برگ و بار اسی طرح محو خواب رہیں جیسے میرے چڑھنے سے پہلے تھے۔

اونچے درختوں پر چڑھتے ہوئے جوں جوں بلندی کی طرف جائیں کام دشوار ہوتا جاتا ہے۔ نازک شاخوں پر ہاتھ پاؤں کا وزن بڑی مہارت سے تقسیم کرنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون سی شاخ وزن سہارے گی اور کون سی نازک اندام "ارے اللہ" کہہ کر پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گی۔

خاصی بلندی پر پہنچ کر میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ ٹیلے کی دوسری جانب چشمے کے خدوخال صاف نظر آرہے تھے۔ یقیناً وہاں پانی ذخیرہ کرنے کا انتظام بھی تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ چشمہ ٹیلے کے بالکل ساتھ ہی واقع ہے۔ گل شیر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ فاصلہ ڈھائی تین سو قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ یقیناً چشمے کے اردگرد عیسیٰ جان کے مسلح کارندے بھی ہوں گے مگر تاریکی میں ان کی پوزیشنیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ یہ سوچ کر میرا دل دھڑک اٹھا کہ سب مشین گن کے ذریعے ان پوزیشنوں کو بہ آسانی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔۔۔۔ کچھ دیر گردونواح کا جائزہ لینے کے بعد میں جس خاموشی سے درخت پر چڑھا تھا اسی خاموشی سے نیچے اتر آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہیں ایک پتھر کی اوٹ میں میرے اور لشکر خاں کے درمیان اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

"نہیں برادر! یہ بہت خطرناک کام ہے" لشکر خاں نے کہا "جب تک اجالا نہ ہوجائے تم اوپر سے سردار عیسیٰ کے کسی لشکری کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔ اور جیسے ہی اجالا ہوگا تم اوپر درخت پر بالکل صاف نظر آجائے گا۔ عیسیٰ کا حرامی بندوقچی تم کو فوراً اسے پہلے مار گرائے گا۔"

"ایک طریقہ ہوسکتا ہے برادر" میں نے اس معاملے میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "درخت کافی گھنا ہے۔ مجھے یقین ہے جب تک میں گولی نہ چلاؤں گا میری پوزیشن کا پتا نہیں چلے گا۔ کیوں نہ میں تین چار برسٹ ماروں اور نیچے چھلانگ لگا دوں۔۔۔۔۔"

"اور تمہارا ہڈی پسلی ایک ہوجائے۔" لشکر خاں نے میرا فقرہ مکمل کیا۔

"خان! اس کا بھی حل سوچا جاسکتا ہے۔ چھلانگ لگانے کے لئے جال یا کوئی اور چیز نیچے رکھی جاسکتی ہے۔"

"تمہارا بات اماری سمجھ میں نہیں آتا برادر۔۔۔۔ یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ تم کیوں اپنا جان عذاب میں ڈالتا ہے۔ آج سردار بشر گل کے جھونپڑے میں صلاح مشورہ ہوا ہے۔ کل نہیں تو پرسوں تک اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔"

"میں جانتا ہوں جو حل نکلے گا۔ آٹھ دس آدمی جان سے جائیں گے اور معلوم نہیں اس قربانی کا فائدہ بھی ہوگا یا نہیں۔"

"کچھ بھی ہے برادر! جیسے تم سوچ رہے ہو اس سے بڑھ کر خوفناک کام اور کوئی نہیں۔ تم اس درخت پر چڑھنے کا بات کرتا ہے' ام کہتا ہے تم اس سامنے والے پتھر پر کھڑے ہوکر دیکھ لو' ایک دم گولی نہ آجائے تو لشکر خاں نام نہیں امارا۔"

نشیب میں بیٹھے ہوئے لشکر خاں نے ایک کلو بھر کا پتھر اٹھایا اور باؤلنگ کرنے والے انداز میں زور سے گھما کر اس چٹان پر پھینکا جو درخت کے قریب تھی۔ نشانہ ٹھیک تھا اور قریباً پندرہ فٹ کی بلندی تک چلی گئی تھی۔ پہلا پتھر تو بے نتیجہ رہا لیکن جونہی دوسرا پتھر چٹان سے ٹکرا کر لڑھکا' تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ ہم نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سر نیچے جھکا لئے۔ سردار بشر گل ہمارے دائیں جانب قریباً دس فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ وہ زور سے پکارا۔ غالباً لشکر خاں سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کیا کررہے ہو تم لوگ۔ لشکر خاں نے جواب میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ بشر گل اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر چلتا ہوا ہماری پوزیشن پر آگیا۔ لشکر خاں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ظاہر ہے موضوع گفتگو وہی تجویز تھی جو ابھی میں نے لشکر خاں کو پیش کی تھی۔ بشر گل کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے یہ تجویز پسند آئی ہے لیکن لشکر خاں کی طرح وہ بھی مجھے خطرے میں جھونکنے سے ہچکچا رہا ہے۔

اس معاملے میں ہم تینوں میں دیر تک بات ہوتی رہی۔ بشر گل میری اس بات سے متفق تھا کہ میری سب مشین گن سے چشمے پر موجود افراد کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ کام کرنے کے فوراً بعد درخت سے کسی جال یا کپڑے وغیرہ میں چھلانگ لگائی جاسکتی ہے۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ یہ کام میرے بجائے کوئی مقامی شخص کرے۔ لشکر خاں کا خیال بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ کچھ دیر بعد بشر گل کا بھائی رستم بھی اس گفتگو میں شریک ہوگیا۔ وہ خاصا جوشیلا شخص تھا۔ اس کی موجودگی سے بات چیت تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔۔۔۔ آخر رات گئے ہم نے ایک پلان تیار کرلیا۔

اس پلان کے مطابق کل رات آخری پہر مجھے خاموشی

سے ستمبل پر چڑھنا تھا اور سب مشین گن کے ساتھ پوزیشن سنبھال کر بیٹھ جانا تھا۔ اس کارروائی کو آپ چشمے پر "فضائی حملہ" کہہ سکتے ہیں۔ زمینی حملے کی قیادت رستم نے کرنا تھی۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ دس پندرہ افراد کے ساتھ بالکل چوکس حالت میں رہے۔ جونہی میں درخت سے چشمے کے محافظوں کو نشانہ بناؤں وہ اپنی جگہ سے حرکت کرکے چشمے پر پہنچ جائے۔ درخت سے میرے کودنے کا مسئلہ کافی ٹیڑھا تھا' یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں بروقت کود بھی سکوں گا یا نہیں اور اگر کودا تو راستے میں اٹک جاؤں گا یا نیچے پہنچوں گا۔ اور اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ روشنی پھیلنے پر میں نیچے سے دیکھ تو نہیں لیا جاؤں گا۔ درحقیقت یہ ایک جان لیوا مہم تھی۔ کوئی عام شخص ایسی پلاننگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایسا سوچ رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک عام شخص نہیں تھا۔

سات برس پیشتر مجھ پر ٹوٹنے والے مصائب کے پہاڑ نے مجھے عام شخص رہنے ہی نہیں دیا تھا۔ میں دنیا کو دھوکا دیتا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر اور لہجے میں منافقت سمیٹ کر خود کو ایک عام شخص ظاہر کرتا تھا لیکن میں نہیں تھا ایک عام شخص۔ میرے اندر ایک سفاک درندہ چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ جیل سے رہا ہوگیا تھا اور اب آزادی کی ہوا اس کی بے خوفی اور درندگی کو جوبن پر لارہی تھی۔

رات تاریک اور سرد تھی۔ درمیانی راتوں کا چاند مغربی افق پر موجود تھا لیکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات آخری پہر مطلع ابر آلود ہونا شروع ہوا تھا اور اب آسمان کا بیشتر حصہ بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔ جونہی میری کلائی کی گھڑی نے چار بجائے' میں نے اپنے قریب بیٹھے گل شیر کا کندھا تھپتھپایا اور مدھم آواز میں کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔"

گل شیر منمنایا "اپنا خیال رکھنا بھائی۔۔۔۔ گولی چلا کر "پورا" چھلانگ مارنا "فضول" میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری دائیں جانب قریباً بیس فٹ آگے کی طرف رستم اپنے دستے کے ساتھ بالکل تیار حالت میں موجود تھا۔ وہ کل بیس افراد تھے۔ ان میں مقامی صرف رستم ہی تھا' باقی سب لشکر خاں کے آدمی تھے۔ وہ خودکار رائفل اور شاٹ گنوں سے مسلح تھے' اس کے علاوہ ان کے پاس دو عدد دستی بم بھی تھے۔ میں نے رستم کی طرف دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ اس نے بھی ہاتھ لہرا کر جواب دیا۔ میں اوندھا لیٹ گیا اور حسب سابق رینگ کر چلتا ہوا ستمبل تک پہنچ گیا۔

تنے کی آڑ میں کھڑے ہوکر میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ایک دوشاخے سے جھول کر درخت پر آگیا۔ سب مشین گن بھی ساتھ تھی لہٰذا اس دفعہ درخت پر چڑھنا نسبتاً دشوار ثابت ہوا۔ مورچا جمانے کے لئے ایک مضبوط دوشاخہ میں کل دن کے وقت ہی منتخب کرچکا تھا۔ سب مشین گن کو مناسب جگہ جمانے کے بعد میں نے چند بالائی شاخوں کو نیچے جھکا کر زیریں شاخوں میں پھنسا دیا اور اس طرح میرا بایاں پہلو زیادہ محفوظ ہوگیا۔ کالی جیکٹ میں نیچے ہی اتار آیا تھا۔ اب میرے جسم پر ایک خاکستری قمیص تھی اور شلوار بھی کچھ ایسے شوخ رنگ کی نہیں تھی۔ اگر میں اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تو اندھیرا چھٹنے پر بھی نیچے سے دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

وقت کی رفتار کبھی نہیں بدلتی لیکن موقع محل کے لحاظ سے وقت گزرنے کا احساس بدلتا رہتا ہے۔ اس بلند و بالا درخت پر ٹنگ کر اجالے کا انتظار کرنا بہت کٹھن تھا۔۔۔۔ لیکن کرنا تھا۔ میں بیٹھا رہا اور وقت رینگتا رہا۔ آخر مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ سیاہی میں سفیدی کی آمیزش ہونے لگی۔ شاخوں پر پرندے چہچہائے اور میری نگاہوں کے سامنے نشیب و فراز نمایاں ہوتے چلے گئے۔ میں بالکل بے حس و حرکت ہوگیا۔ ایک معمولی سی جنبش' ایک ذرا سی حرکت موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ موت جو دیکھا بھالا سا تھی اور جو مجھے ہر طرف سے نشانہ بنا سکتی تھی۔

ملگجے اجالے میں میں نے چشمے کا منظر دیکھا۔ پتھروں سے پھوٹتا ہوا پانی ایک شفاف تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ تالاب کے کنارے چند برہنہ چٹانیں زمین میں پیوست تھیں۔ ان چٹانوں کے عقب میں عیسیٰ جان کے آدمیوں کی پوزیشنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کل چار آدمی تھے۔ ان کے کندھوں پر بھاری کمبل تھے۔ رائفلیں گود میں رکھے وہ پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک اونگھ رہا تھا جبکہ باقی باتوں میں معروف تھے۔ یہ تعداد میری توقع سے بہت کم تھی۔ میں نے دیگر محافظوں کی تلاش میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ چشمے کی دوسری جانب ایک جگہ راکھ اور کوئلوں کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں رات کو آگ جلائی گئی ہے۔ اردگرد کی زمین سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ اس سیاہی مائل زمین کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھوہ یا دراڑ نظر آرہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس دہانے میں نقل و حرکت کے آثار نظر آئے۔ ایک شخص ہاتھ میں بڑی سی سیاہ رنگ کیتلی لئے برآمد ہوا۔ رائفل اس کے کندھے سے بھی

جھول رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ایک ساعت کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ وہ درخت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ خون رگوں میں سنسنا اٹھا۔ سب مشین گن کی لبلبی پر میری انگلی اور تن گئی۔

اطراف کا جائزہ لے کر کیتلی والے نے اپنے سر پر ٹوپی درست کی اور کھوہ کی طرف رُخ پھیر کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو کا نتیجہ فوراً نکلا۔ کھوہ کے دہانے سے دو آدمی قہقہے لگاتے ہوئے برآمد ہوئے اور چشمے پر جا کر منہ ہاتھ دھونے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے منہ ہاتھ دھونے کے دوران چار افراد مزید کھوہ سے نکل آئے اور چند قدم چل کر چشمے کی طرف آ گئے۔ ایک مخصوص مقام پر پہنچتے ہی وہ سب جھک جاتے تھے اور باقی کا فاصلہ دوڑ کر اور جھک کر طے کرتے تھے۔ یقیناً اس مقام سے گزرتے ہوئے وہ لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کے نشانے پر ہوتے تھے۔

میں نے تقریباً پانچ منٹ ان کی مصروفیات کا جائزہ لیا۔

اب صورت حال مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ چشمے پر محافظوں کی کُل تعداد گیارہ تھی۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ عیسیٰ جان کا اصل دستہ چشمے سے اندازاً پچاس گز کی دوری پر تھا۔ وہ ڈھلوان کے عرضی رُخ پر دور تک مورچے جمائے ہوئے تھے۔ خود کو گولیوں کی براہ راست زد سے محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے اپنے سامنے درختوں کے تنے اور پتھر وغیرہ چُن رکھے تھے مجھے ان رکاوٹوں کے پیچھے ان کے متحرک ہیولے صاف نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی کوئی آواز بھی کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ سب لوگ گھوڑوں پر یہاں پہنچے تھے۔ سارے گھوڑے تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن ان میں سے کچھ میدانی کے ایک جھنڈ میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ باز خیل والوں کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ میرے خیال کے مطابق وہ اس "میدان جنگ" کے عقب میں تھے اور ان کی حیثیت "ریزرو فوج" کی تھی۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں بلاحظہ فرمائیں۔

محترم شمیم نوید کے فسوں خیز قلم سے ناقابل فراموش ناول

دیدبان

خیر و شر کا ازلی تصادم، قدم قدم پر نئی کروٹیں،
ہنگامے جگاتی حیرت انگیز داستان،
ایک انوکھی کہانی، ایک مکمل تاریخ

- وہ دیوتاؤں کی چہیتی تھی۔
- پُراسرار سرگوشیاں اس کی رہنما تھیں۔
- اس کے ہاتھ میں زندگی کی ریکھا تھی نہ موت کی۔
- وہ سانپوں سے بڑھ کر زہریلی تھی۔
- اس کی آنکھوں سے موت کی کڑکتی بجلیاں نکلتی تھیں۔
- وہ انتقام کی بھڑکتی آگ کو دشمن کے خون کے چھینٹوں سے سرد کرنا چاہتی تھی۔
- پُراسرار اور شیطانی قوتیں اس کی راہ میں حائل تھیں

60

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ' اُردو بازار لاہور
7247414

علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

تاوان

میں نے نیچے دیکھا۔ پلان کے مطابق جبر گل اور اس کے ساتھی اپنی ڈیوٹی انجام دے چکے تھے۔ بستی کے ارد گرد مرزئی کے پورے کثرت سے تھے۔ ان لوگوں نے رات پہلے پھر بست سے پودے کاٹے تھے اور دو بڑے گٹھوں کی صورت میں باندھ کر درخت کے عین نیچے اس جگہ ڈال دیئے تھے جہاں مجھے چھلانگ لگانا تھی۔ مرزئی کے پتے لمبے اور لچکدار ہوتے ہیں۔ اسلیے ڈھائی گٹھوں کی شکل میں بندھ کر یہ پتے میری ضرورت کے عین مطابق ہو گئے تھے۔ میری دائیں جانب رستم اور اس کے رضاکار ساتھی کارروائی کے لئے بالکل تیار نظر آ رہے تھے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اپنی توجہ چشمے پر مرکوز کر دی۔ ایک یا دو محافظوں کے سوا اس وقت سب کے سب میرے نشانے پر تھے۔

جونہی میری انگلی نے ٹریگر پر حرکت کی، قرب و جوار دھماکوں سے لرز اٹھے۔ میگزین میں اٹھائیس گولیاں تھیں۔ میں نے چار مساوی برسٹ مارے۔ چشمے کے ارد گرد موجود محافظوں پر موت کی بارش برس گئی۔ میں نے انہیں اچھل اچھل کر چشمے کے پانی میں اور پتھروں پر گرتے دیکھا۔ ان میں سے پانچ چھ تو یقیناً موقع پر ہلاک ہو گئے، باقی بھی گولیوں سے چھلنی تھے۔ جونہی گن خالی ہوئی میں نے خود کو کسی بے جان شے کی طرح نیچے گرا دیا۔ میرا یہ اقدام بروقت اور عین ضرورت کے مطابق تھا۔ میں پشت کے بل مرزئی کے نرم گدے پر گرا تو کئی شاخیں ٹوٹ کر مجھ پر آن گریں۔ یہ میرے گرنے سے نہیں گولیوں کی بوچھاڑ سے ٹوٹی تھیں۔

ظاہر ہے یہ گولیاں برسانے والے عیسٰی جان کے لشکری تھے۔ میں نے ایک سیکنڈ کی تاخیر کی ہوتی تو نیچے آنے کے بجائے یقیناً "اوپر" چلا گیا ہوتا۔

سب کچھ عین پلان کے مطابق ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا خواب تھا جو حرف بحرف شرمندہ تعبیر ہوا۔ میری سب مشین گن کا پہلا قہقہہ سنتے ہی رستم اور اس کے ساتھی چشمے کی طرف لپکے۔ جب وہ موقعے پر پہنچے تو چشمے کے محافظ خاک و خون میں تڑپ رہے تھے۔ جو ایک آدھ سب مشین گن کی مار سے بچ گیا تھا وہ رستم کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس سے پہلے کہ عیسٰی کے لشکری صورت حال کو سمجھتے، رستم اور اس کے ساتھی چشمے پر پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ دوسری طرف لشکر خاں اور اس کے جتھے نے بھی زبردست فائرنگ شروع کر دی۔ ایک دم ہی پہاڑیاں دھماکوں سے لرز اٹھیں اور زوئے مشت کی یہ ڈھلوان میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگی۔ جونہی عیسٰی جان کو احساس ہوا کہ چشمہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے، وہ غضبناک ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ بھرپور جوابی حملہ کر کے چشمے کا کنٹرول دوبارہ حاصل کیا جائے لیکن اب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

لشکر خاں اور اس کے ساتھی، عیسٰی جان کے ارادے کے سامنے دیوار بن گئے۔ اس لڑائی میں ہر قسم کی خود کار رائفلوں کے علاوہ دستی بم اور ڈائنامائیٹ کے کیپل بم استعمال ہوئے۔ نعروں اور دھماکوں کی گھن گرج سے سینہ

گونج اٹھیں اور دھواں دھواں فضا میں بارود کی بو پھیل گئی۔ تقریباً پانچ منٹ کے طوفانی معرکے کے بعد لڑائی اچانک ختم ہو گئی۔ اس لڑائی میں کم از کم ڈیڑھ درجن افراد ہلاک اور اس سے دوگنے زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ہمارے ساتھی صرف پانچ تھے۔ دو افراد کو شدید اور قریباً دس افراد کو معمولی زخم آئے۔ لڑائی رکنے کے بعد سب سے پہلے زخمیوں کو طبی امداد پہنچائی گئی۔ پھر میں اور لشکر خاں چشمے پر پہنچے۔ یہاں عیسیٰ کے ساتھیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس سارے واقعے میں میرے لئے مایوسی کی صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ ان لاشوں میں شکر شکرا کی لاش شامل نہیں تھی۔ کاش چشمے کے محافظوں میں وہ بھی شامل ہوتا۔ میں نے لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ کل آٹھ لاشیں تھیں اور ان میں سے چھ میری گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ باقی تین افراد زخمی حالت میں فرار ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں کی رائفلیں، گولیوں کی پیٹیاں، گرم چادریں اور پگڑیاں وغیرہ موقع پر بکھری ہوئی تھیں۔ لشکر خاں کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے یہ سامان سمیٹ لیا۔ میرے پوچھنے پر رستم نے بتایا کہ صرف ایک گرفتاری ہوئی ہے اور گرفتار ہونے والا مرد نہیں عورت ہے۔۔۔۔ یہ اطلاع میرے لئے حیران کن تھی۔

میں نے پوچھا "کون عورت ہے؟"

رستم نے مترجم کے ذریعے کہا "تم اسے نہیں جانتے۔ وہ ایک رقاصہ ہے۔ عیسیٰ جان کے آدمیوں نے اسے زبردستی یہاں رکھا ہوا تھا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو وہ اس سامنے والی کھوہ میں تھی۔ اس نے عقلمندی کی کہ ادھر ہی دبکی رہی۔ باہر نکلتی تو دوسروں کے ساتھ ہی لمبی لیٹ جاتی۔"

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

رستم مجھے اور لشکر خاں کو لے کر کھوہ میں چلا گیا۔ یہ کھوہ باہر سے جتنی تنگ نظر آتی تھی اندر سے اتنی ہی کشادہ تھی۔ کھوہ میں گھاس کے خشک پتے بچھا کر اوپر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ یوں آٹھ ضرب دس کا ایک نرم بچھونا بن گیا تھا۔ ایک طرف دو لالٹینیں [illegible] رکھی تھیں۔ لالٹینوں کی روشنی میں میں نے دیکھا، بچھونے کے کونے پر کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگائے وہی نرم و نازک لڑکی بیٹھی تھی جسے میں اس سے پہلے پہاڑی ریستوران میں دیکھ چکا تھا۔ آج وہ بہت بدلی بدلی نظر آتی تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا، آنکھوں میں رت جگا اور زلفیں پریشان۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہاڑی ریستوران میں اس نے مجھے جیکٹ اور پتلون میں دیکھا تھا۔ اب میں پاؤندوں کے لباس میں تھا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بے زاری سے منہ پھیر کر رہ گئی۔ بڑی تھکی تھکی نظر آرہی تھی وہ۔ اس مزدور کی طرح جس سے اس کی ہمت سے زیادہ کام لیا جا رہا ہو اور وہ بھی بغیر معاوضے کے۔ پہاڑی ریستوران میں سجنے والی محفل میں مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ اردو جانتی ہے اس لئے میں نے اس سے اردو میں سوال کیا تھا۔ میں نے لشکر خاں اور رستم وغیرہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھ سے قدرے مرعوب نظر آرہے تھے۔ بغیر کوئی سوال پوچھے وہ دونوں باہر چلے گئے۔ کھوہ میں موجود دیگر دو افراد بھی باہر نکل گئے۔ اب میں اور رقاصہ لڑکی وہاں اکیلے تھے۔ وہ گم صم بیٹھی تھی۔ کسی یخ بستہ پتھریلی مورتی کی طرح۔ بہت برہم نظر آرہی تھی وہ۔ اور یہ برہمی جیسے کسی ایک کے لئے نہیں ساری "مرد برادری" کے لئے تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہاں اس سے ناروا سلوک ہوتا رہا ہے۔ مجھے وہ لمحات یاد آئے جب آدھ گھنٹا پہلے میں درخت پر مورچہ جمائے بیٹھا تھا اور کھوہ میں سے دو وحشی قہقہے بکھیرتے برآمد ہوئے تھے۔ یقیناً ان وحشیوں اور ان کے قہقہوں کا تعلق اسی رقاصہ اور اس کی برہمی سے تھا۔ کھوہ میں میں اس کے پاس اکیلا رہ گیا تو وہ کچھ اور بھی بے زار نظر آنے لگی۔

"تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے لہجے میں شائستگی سمیٹ کر کہا۔

اس نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ میں نے سوال دہرایا تو وہ جیسے پھٹ پڑی "کیا لینا ہے تمہیں نام پوچھ کر؟ جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ نام پوچھے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔"

"لیکن میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے نام پوچھنا ضروری ہے" اس نے زمین پر تھوک کر عجیب سے انداز میں بال جھٹکے جیسے اپنے بالوں کی ضرب سے مجھے دور ہٹا دینا چاہتی ہو۔ میں نے کہا "تم اتنی خفا کیوں ہو۔ عیسیٰ جان اور اس کے آدمیوں نے تم سے برا سلوک کیا ہوگا، ہم نے تو نہیں۔ ہم تو خود ان کے برے سلوک کا شکار رہے ہیں۔ اور پھر تمہیں میرا تو خاص طور پر شکرگزار ہونا چاہئے کہ تم سے دست درازی کرنے والے میرے ہاتھوں گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔"

اس کے چہرے پر بے زاری کا تاثر برقرار رہا۔ تلخ لہجے میں بولی "تم سب مرد ایک جیسے ہوتے ہو۔ مجھے اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے کہ مجھے نوچنے کھسوٹنے والا عیسیٰ جان کا کوئی نہیں لشکر خاں کا ساتھی ہے۔ میرا کام تمہارے بدبودار

جسموں تلے روندا جانا ہے۔۔۔ اور بس۔" اس نے عجیب سے انداز میں خود کو مرزئی کے بچھونے پر پھینک دیا اور نفرت سے چیختی ہوئی آواز میں بولی "جو کرلو جو کرنا ہے اپنی۔۔۔" اس نے اس فقرے میں ایک ایسا لفظ استعمال کیا کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یہ ایک ناقابل برداشت گالی تھی میرے لئے۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک زور کا تھپڑ گال پر جڑ دیا۔ وہ درد سے چیخ اٹھی۔ جھنجھنا کر اس نے مجھے جوابی تھپڑ رسید کرنا چاہا لیکن میں نے کلائی تھام لی۔ وہ غرائی اور وحشی بلی کی طرح پنجے نکال کر مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس کے لمبے ناخن میری آنکھوں میں پیوست ہونے کے لئے لپکے۔ میں نے بروقت اس کی دوسری کلائی بھی تھام لی۔ اس کے نوخیز جسم میں کسی جنگلی گھوڑی کی سی طاقت تھی۔ فرط غضب نے اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر مجھے گرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں پہلے تو دفاع کرتا رہا لیکن جب اس کا انداز بالکل ہسٹریائی ہو گیا تو میں نے اس کی ایک کلائی چھوڑ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک ہی جھٹکے سے اسے زمین بوس کر دیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اس کی دونوں کلائیاں میری گرفت میں تھیں اور وہ پوری طرح میرے نیچے دبی ہوئی تھی۔ ایک رم مردانہ قہقہے میرے کانوں میں گونجے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، رستم اور گل شیر وغیرہ کھوہ کے دہانے پر کھڑے تھے۔ غالباً دھینگا مشتی کی آوازیں اور لڑکی کی چیخ و پکار انہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ گل شیر زور سے بولا "ذرا جم جما کے کانسٹیبل صاحب، بالکل تیر کے مافق سیدھا کرو اس کو۔" پھر وہ دونوں ہنستے ہوئے باہر نکل گئے اور جاتے جاتے کھوہ کے دہانے کو ایک سل نما پتھر سے ڈھک گئے۔

میں نے لڑکی کو کچھ دیر اپنی گرفت میں رکھا اور جب اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑا تو چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ اسی مرزئی کے بچھونے پر چت لیٹی رہی۔ اس کا گریبان جو پہلے ہی پھٹا ہوا تھا اب کچھ اور پھٹ گیا تھا۔ بدن کے سربستہ راز عیاں ہونے میں بس تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی لیکن لڑکی کو کچھ پروا نہیں تھی۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی اور ایک بازو آنکھوں پر رکھ کر آنسو بہاتی رہی۔ میں قریباً پانچ منٹ تک خاموشی سے اس کے پاس بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میری جیب میں فرسٹ ایڈ کی کچھ چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے تھوڑی سی روئی نکال کر ہائیڈروجن میں بھگوئی اور لڑکی کی گردن پر آنے والی خراشوں کو صاف کرنے لگا۔ ان میں سے ایک آدھ خراش میرے ہاتھوں بھی آئی ہوگی لیکن زیادہ تر خراشیں پہلے کی تھیں اور ان میں سے چند کافی گہری تھیں جیسے کسی شرابی نے اسے گردن سے دبوچا ہو اور اس کا گوشت ناخنوں میں بھر کر لے گیا ہو۔ ہائیڈروجن زیادہ تکلیف نہیں دیتا پھر بھی لڑکی سسک اٹھی۔ گردن کے علاوہ اس کے شانے اور ایک ہاتھ پر بھی معمولی زخم تھے۔ ان سارے زخموں پر میں نے ایک مرہم لگا دیا۔ کاش میرے پاس کوئی ایسا مرہم بھی ہوتا جو میں اس کی کچلی ہوئی روح کے زخموں پر لگا سکتا۔ وہ خاموش لیٹی رہی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ کر اس کے کانوں میں جمع ہوتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔

کھوہ کی تاریکی سے باہر دن کا اجالا تھا۔ سورج اب کافی اوپر آگیا تھا۔ چشمے کے ارد گرد لشکر خاں کے ساتھیوں نے اپنی پوزیشنیں مستحکم کر لی تھیں۔ میری سب مشین گن بھی یہاں پہنچ چکی تھی اور میری ہدایت کے مطابق اسے ایک نہایت مناسب جگہ پر پوزیشن کروا دیا گیا تھا۔ رستم، گل شیر اور چند دیگر لشکری کھوہ کے قریب ہی ایک دری پر بیٹھے چائے روٹی کا ناشتا کر رہے تھے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے یہاں سخت خون خرابہ ہوا تھا اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں مگر اس خون خرابے کا کوئی اثر اب ماحول پر نظر نہیں آتا تھا۔ لاشیں اٹھائی جا چکی تھیں۔ زخمی بستی کے واحد معالج خزاں رسیدہ بانسوں والے بوڑھے کے حوالے ہو چکے تھے اور جو زندہ سلامت تھے وہ اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ آئے دن کی قبائلی لڑائیوں نے ان لوگوں کے مزاج کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ میں کھوہ سے باہر نکلا تو گل شیر نے نمکین روٹی کا ایک بڑا سا نوالہ منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا "ہاں خوچے! ناشتا ہاشتا کرے گا یا پہلے نہائے گا؟" اس نے عام سے انداز میں بات کی تھی لیکن لہجے میں چھپی ہوئی معنی خیزی مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "گل شیر! اچھی طرح سن لو اور دوسروں کو بھی سمجھا دو۔ کھوہ میں میرے اور لشکر خاں کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا اور جب تک لڑائی کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا تم لوگوں کو شراب وغیرہ پینے سے گریز کرنا چاہئے۔۔۔ اور۔۔۔"

میری بات منہ میں ہی رہ گئی۔ اچانک زوردار دھماکوں سے گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں سے گزر گئیں۔ رستم اور گل شیر اوندھے منہ دسترخوان پر لیٹ گئے۔ مجھے بھی جلدی سے ایک پتھر کی اوٹ میں ہونا پڑا۔ فائرنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارے حریفوں نے اپنی پوزیشنیں تبدیل کی ہیں۔

غالباً اب وہ کسی بلند جگہ سے گولی چلا رہے تھے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں نے اس حربے کا فوری توڑ کیا۔ انہوں نے اپنی پوزیشنیں تھوڑی تھوڑی تبدیل کرلیں اور یوں گولیوں کی براہ راست زد سے نکل گئے۔ فائرنگ تھمی تو میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا رستم اور گل شیر کی طرف گیا۔ رستم نے اوندھے لیٹے لیٹے زمین سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ گل شیر اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے سر کے قریب روڑی خون سے رنگین نظر آرہی تھی۔۔۔ وہ مر چکا تھا۔ چند لمحے پہلے مجھے ناشتے کی دعوت دینے والا اور نہانے کی ہدایت کرنے والا اب خود "نہانے" کے لئے تیار تھا۔ چائے کا پیالہ اس کے نیچے اوندھا ہوچکا تھا اور نمکین روٹی کا لقمہ اس کے منہ میں تھا۔ جو رزق قسمت میں نہیں ہوتا وہ نوالہ بن کے بھی حلق سے دور رہتا ہے۔ گولی گل شیر کے سر میں لگی تھی۔ ایک ہی گولی نے گل کی پتیاں بکھیر کر شیر کا جگر چیر دیا تھا اور یوں "گل شیر" وجود سے عدم وجود میں چلا گیا تھا۔

○☆○

اسی رات سردار بشر گل کے جھونپڑے میں آئندہ کی حکمت عملی طے کرنے کے لئے پُرہجوم نشست ہوئی۔ یہیں پر مجھے پتا چلا کہ روغندار شخص لشکر خاں تھا جس نے سردار بشر گل کے خلاف مخبری کی تھی اور نتیجے میں عیسیٰ جان نے "کارِ لشکر" کے ساتھ بادیندہ بستی پر چڑھائی کردی تھی۔ سردار بشر گل کے جھونپڑے میں بیٹھے ہوئے جرگے نے لشکر خاں کی غیر موجودگی میں اس پر مقدمہ چلایا اور اسے سزائے موت دی۔۔۔ میں جانتا تھا نجو کے لئے یہ ایک خوش کن خبر ثابت ہوگی۔ اسے اس خونخوار کتے سے خلاصی مل گئی تھی جو اس کی ٹانگ کھینچنے کے لئے اس کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا۔

لشکر خاں والے معاملے کے بعد لڑائی کی حکمت عملی پر بات شروع ہوئی۔ اس امر کا پتا چلنے کے بعد کہ بازخیل والے بھی میدان میں اتر آئے ہیں باشندوں میں بہت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ بازخیل والے ان کے پرانے حریف تھے اور بادیندہ بستی کا ہر فرد اس لڑائی کو اپنی لڑائی سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ مزید براں چشمے کا قبضہ دوبارہ حاصل کرنے سے بھی باشندوں کے حوصلے بڑھے تھے اور اب وہ اس دفاعی لڑائی کو جارحانہ انداز دینا چاہتے تھے۔ لشکر خاں ایسی لڑائیوں کا بیس سالہ تجربہ رکھتا تھا۔ اسی حوالے سے تمام داؤ پیچ اور ہتھکنڈے اسے ازبر تھے۔ اس کا خیال تھا کہ چشمے پر قبضہ کرنے کے بعد اب ان کے لئے بہت آسان ہوگیا تھا کہ عیسیٰ جان، افضل اور ان کے ساتھیوں کو زطوان کے بالائی سرے سے رگیدا کر نشیب میں پہنچا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بار بار مجھ سے مشورہ بھی کیا جارہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس لڑائی میں میری حیثیت ایک سپاہی کی ہے کمانڈر وہ خود ہیں۔ جہاں مجھے کہیں گے میں کھڑا ہوجاؤں گا۔ مرنے کی بات ہوگی تو سب سے پہلے مروں گا۔ پیچھے ہٹنے کا مرحلہ ہوگا تو سب سے آخر میں ہٹوں گا۔۔۔ چونکہ مجھے یہاں کے نشیب و فراز اور لڑائی کے طور طریقوں کا زیادہ علم نہیں لہٰذا میں حملے کے بارے میں کسی قسم کا مشورہ نہیں دے سکتا۔۔۔

بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ عیسیٰ کے ساتھیوں کو نئے ٹھکانوں پر مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع نہیں دینا چاہئے اور آج ہی رات پچھلے پہر ایک بھرپور حملے سے انہیں نشیب میں دھکیل دینا چاہئے۔ اس دلیرانہ فیصلے کا روحِ رواں لشکر خاں تھا۔۔۔ وہ ایک پیدائشی لڑاکا نظر آتا تھا۔ جتنا بڑا اس کا سینہ تھا اتنا ہی بڑا اس میں دل بھی تھا۔۔۔ حملے کا فیصلہ ہوچکا تو بستی میں ہلچل نظر آنے لگی۔ ہر شخص حسبِ مقدور اس لڑائی میں حصہ لینے پر تیار نظر آتا تھا مگر اسلحے کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں سونت کر خودکار رائفلوں کے سامنے آجانا کسی طرح دانشمندی نہیں تھی۔ کلہاڑی اور لاٹھی بردار زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتے تھے کہ باقی تین اطراف سے بستی کی حدود پر نگاہ رکھیں۔

ایمن اور ربانی کے صحت یاب ہوجانے سے بستی میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ خیمے تو پچھلے روز سے خالی تھے لیکن جھونپڑوں کے اندر سے چولہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا اور نیم سوختہ گندم و گوشت کی حیات بخش خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ اب میں اس بستی میں ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ بچے مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے اور عورتیں گھونگھٹ کی اوٹ سے احسان مندی کی نگاہ ڈالتی تھیں۔ چشمے والے واقعے کے بعد لوگ مجھ سے خاص طور پر متاثر نظر آتے تھے۔ میں نجو اور نبیلہ کی طرف جارہا تھا۔ ان کا اور بچے کا حال احوال دریافت کرنا تھا۔ بچے کا بخار اب ٹوٹ گیا تھا لیکن گاہے گاہے پھر ہوجاتا تھا۔ مجھے اس لاغر بچے کی طرف سے بہت فکر تھی۔ میں نے بچے سے کئی بار اس کا نام پتا پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بس منمنا کر چپ ہوجاتا تھا۔ بہت کوشش سے اس نے اپنا نام گُتّا بتایا تھا۔ لگتا تھا اس کے ذہن پر تشدد یا کسی صدمے کا اثر ہے۔۔۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے نبیلہ کے پاس تھا مگر نبیلہ بھی اس کے بارے میں صرف یہی جانتی تھی کہ اس کا نام گتا ہے۔

ابھی میں نجو کے جھونپڑے سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی

تھا کہ لشکر خاں کا قریبی ساتھی جمعہ خاں دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا۔ کہنے لگا "بھائی صاحب! ذرا جلدی چلو۔ آپ کو امارا سردار بلاتا ہے۔"

سردار سے اس کی مراد لشکر خاں تھا۔ جمعہ خاں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی فوری نوعیت کا معاملہ ہے۔ میں نجو اور نبیلہ کی طرف جانے کا خیال ترک کرکے جمعہ خاں کے ساتھ ہولیا۔ زطوان پر واقع مورچوں کے درمیان سے گزر کر ہم چشمے پر پہنچے تو لشکر خاں کھوہ کے پاس ہی کھڑا تھا۔ کہنے لگا "برادر! وہ لڑکی کرن تم سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے تمہیں بلا رہا ہے۔ کہتا ہے بہت ضروری بات کرنا ہے۔"

لشکر خاں کی زبانی مجھے پتا چلا کہ رقاصہ کا نام کرن ہے۔ میں نے کھوہ کے دہانے پر رکھا ہوا چپٹا پتھر ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ لڑکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ رد اپنا چاک گریبان گرہ دے کر سمیٹ چکی تھی اور بال بھی اب پریشان نہیں تھے۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کی جگہ اب ٹھہراؤ نظر آرہا تھا۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے مجھے بغور دیکھنے کے بعد اس نے پلکیں جھکالیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کہا "تمہارا خیر خواہ ہوں اور اگر تم یہ بات دل سے جان لو تو پھر اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ہموار لہجے میں بولی "مجھے پتا چلا ہے کہ تم لوگ ملک عیسیٰ سے لڑائی کا ارادہ کررہے ہو۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے یہ بات درست ہو۔ مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔"

وہ بولی "اگر تم نے آج رات حملہ کیا تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہوگی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کہا "جو کام بغیر خون خرابے کے ہوجائے اس کے لئے خون خرابے سے کیا فائدہ؟"

"کیا مطلب؟"

"کل رات میں نے عیسیٰ کے ساتھیوں کی باتیں سنی تھیں" کرن نے جواب دیا۔ "ان لوگوں میں بڑی سخت پھوٹ پڑ چکی ہے۔ آدھے بندے ایک طرف ہیں آدھے دوسری طرف۔۔۔ اگر تم لوگ تھوڑا سا انتظار کرو تو ہوسکتا ہے وہ لوگ خود ہی یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے کرن کی باتوں پر غور کیا۔ اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جو کچھ بتا رہی تھی وہ ممکن بھی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے یہ باتیں کب سنیں؟"

وہ بولی "کل رات اور پرسوں رات بھی۔ ملک عیسیٰ کے بندے کھوہ سے باہر بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ رات کو ان کی آواز اندر تک آتی تھی۔ میں کھوہ کے منہ کے پاس چلی جاتی تھی۔ کل رات مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ہفتے کی سویر ملک عیسیٰ اور اس کا یار شنکر کہیں جائیں گے۔ ان کی واپسی دو دن بعد ہوگی۔ اگر تم لوگ حملہ کرنا ہی چاہتے ہو تو پرسوں ہفتے کی رات کرو۔ مجھے پکا یقین ہے کوئی تمہارا مقابلہ نہ کرے گی۔"

کرن نامی یہ رقاصہ بڑی اہم معلومات بہم پہنچا رہی تھی۔ وہ عیسیٰ اور اس کے کارندوں کے خلاف نفرت سے سلگ رہی تھی۔ اس کی "نفرت" نے اظہار کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا اور وہ رضاکارانہ طور پر ہمیں ہمارے مخالفین کی کمزوریوں سے آگاہ کرنے لگی تھی۔ میں نے اس بارے میں کرن سے تفصیلی بات کی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ جان کے بیشتر ساتھی شنکر کی وجہ سے اس سے نالاں ہیں۔ تاہم وہ اپنی ناراضگی کا کھل کر اظہار نہیں کرسکتے اور مخالفانہ جذبات اندر ہی اندر ان میں بھڑکتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر چار افراد کو زندہ جلادینے کا واقعہ سب کے لئے رنج کا باعث ہے۔ پچھلے دنوں شنکر کے ہاتھوں پولیس کے دو آدمی بھی ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ دونوں یرغمالی تھے اور عیسیٰ کے بیشتر ساتھیوں کا خیال تھا کہ انہیں قتل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ شنکر نے بلا مقصد صرف اپنی دہشت بٹھانے کے لئے دونوں افراد کو جان سے ماردیا۔ چاند ماری کے میدان میں ان پر نشانہ بازی کی گئی یہاں تک کہ وہ جاں بحق ہوگئے۔

یہ تمام باتیں پہلے سے میرے علم میں تھیں لہٰذا کرن کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں نے کرن کے ذاتی خیالات جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ پچھلے چار پانچ روز میں اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک ہوا ہے۔ عیسیٰ جان پہلے بھی اس کے لئے مصیبت بن کر آیا کرتا تھا۔ پہاڑی ریستوران میں اس کے وارد ہوتے ہی کرن اس کے لئے وقف ہوجاتی تھی۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا اور اس کی "محبت" میں زبردست قسم کا جارحانہ پن ہوتا تھا۔ کرن یہ سب کچھ برداشت کرنے کی عادی ہوچکی تھی کیونکہ جس جگہ وہ لوگ اپنا دھندا کرتے تھے وہاں عیسیٰ

مخص کو ناراض کرنا خود کو شیر کے جبڑوں میں پھینکنا تھا لیکن اس دفعہ تو عیسیٰ جان نے حد کردی تھی۔ ایک گری پڑی شے کی طرح وہ کرن کو ریستوران سے لے آیا تھا اور اپنے آدمیوں کے سامنے یوں بچھا دیا تھا جیسے بھوکے مویشیوں کے سامنے چارپائی پر چارا بچھایا جاتا ہے۔ ان تین چار راتوں میں سب کچھ کرن کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ وہ رات دن عیسیٰ کو کوستی تھی اور بددعائیں دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ کے ساتھی اس سے باغی ہو رہے ہیں تو ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ عیسیٰ پہلے سے بہت زیادہ بدل چکا ہے اور اس کے بدلنے کا اصل سبب ہی شنکر بھارتی ہے جو انسان سے زیادہ جانور اور جانور سے زیادہ شیطان نظر آتا ہے۔ یہاں پر کرن کی "ملاقات" اس سے بھی ہو چکی تھی۔

دو انسان ایک دوسرے کو سمجھنا چاہیں تو ان کے لئے بہترین ذریعہ یہی ہے کہ وہ گفتگو کریں۔ کرن اور میں تقریباً دو گھنٹے گفتگو میں مصروف رہے۔ اس گفتگو کے دوران ہمارے درمیان سے کئی پردے اٹھ گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ راپے "پہاڑی ریستوران" کا مالک اریز عرا اکبر رشتے میں کرن کا ماموں سسر ہے۔ وہ اسے بتوں سے نہیں پنڈی کے نواحی علاقے رواٹ سے اغوا کر کے لایا ہے اور پچھلے دو سال سے اس سے پیشہ کروا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ شروع شروع میں واپس جانے کے لئے بہت تڑپتی تھی لیکن اب سب کچھ بھول چکی ہے بلکہ سوچتی ہے کہ واپس نہ ہی جائے تو بہتر ہے۔ جو زخم مندمل ہو چکے ہیں انہیں کریدنے سے کیا حاصل۔ بس کبھی کبھار اپنے باپ کی یاد آتی ہے۔ وہ اس سے بہت لاڈ کرتا تھا۔ بڑے چاؤ سے اس نے اس کا بیاہ کیا تھا اور ہر وقت اس کی بابل میں آنسو بہاتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا یہ آنسو خون کے آنسو بننے والے ہیں۔ سسرال جانے والی بیٹی کے لئے اس کی نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے سسرالی رشتہ دار اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک گھرانا تو بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کا گڑھ تھا اور اسی گھرانے سے کرن کے خاوند کی دیرینہ رقابت تھی۔ اس رقابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کرن اغوا ہو کر ان پہاڑوں میں پہنچ گئی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ کرن ایک باہمت لڑکی ہے اور اپنی عمر کی لڑکیوں سے زیادہ جہاندیدہ اور معاملہ فہم بھی۔ غالباً یہ صفات اسے رنگا رنگ لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ کہنے لگی "تم چاہو تو تمہاری ان [illegible] کر سکتی ہوں۔ ہفتے کی صبح عیسیٰ، شنکر کو لے کر ان کے

یہاں سے جل جائی (چلا جائے گا) ہفتے کی دوپہر تم مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں واپس عیسیٰ کے ساتھیوں میں پہنچ جاؤں گی اور سارا معاملہ ٹھیک کر لوں گی۔"

"کیا ٹھیک کر لو گی؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ان لوگوں کو جانتی ہوں جو بڑھ چڑھ کر عیسیٰ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ میں ان کے کان میں یہ بات ڈال دوں گی کہ آج رات حملہ ہوگی۔ وہ اس لڑائی میں حصہ نہ لیں۔ انہوں نے حصہ نہ لیا تو عیسیٰ کے چیچوں چانٹوں کی گنتی سو پچاس سے زیادہ نہ ہوگی۔ مجھے پکا یقین ہے۔ پھر سردار عیسیٰ اور شنکر بھی ان میں نہیں ہوں گے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگیں تو میرا نام بدل دینا۔"

میں نے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ قریبی بستی باگڑ خیل کے لوگ بھی عیسیٰ جان کے ساتھ مل گئے ہیں۔"

"مجھے سب پتا ہے۔" کرن نے میری بات کاٹی۔ "یہ پرانی بات ہے۔ جو نئی بات ہے اس کا پتا مجھے ہے، تمہیں نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"باگڑ خیل والے کل رات ہی واپس جل (چلے) گئے تھے۔ تم نے سنا ہی ہوگا کہ ان پہاڑیوں کے بارے میں کسی سلطان نام کے پردیسی کی کہانی مشہور ہے۔ باگڑ خیل کے لوگ ان پہاڑیوں کی طرف آنے سے بڑا ڈرتے ہیں۔ کسی سخت ضرورت کے بغیر کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ باگڑ خیل، پاؤندوں سے لڑنے آ تو گئے تھے پر ان کے دل میں ڈر تھا۔ انہوں نے یہاں صرف ایک ہی رات کاٹی۔ صبح کچھ باگڑ خیلوں نے بتایا کہ انہیں ساری رات چیخیں اور بین سنائی دیتے رہے ہیں۔ اور تو اور خود بستی کے سردار نے کالے کپڑوں والی تین عورتوں کو دیکھا جو اپنے بال کھولے پتھروں پر بیٹھی تھیں اور رانیں پیٹ پیٹ کر پتا نہیں کس کا ماتم کر رہی تھیں۔"

یہ ایک نہایت خوش آئند خبر تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سنبل کے درخت پر سے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے کہیں بھی باگڑ خیل والوں کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے لیکن اب کرن کے بیان سے صورت حال واضح ہو رہی تھی۔

کرن نے جتنی بھی باتیں کی تھیں اپنے اندر وزن رکھتی تھیں اور موقع محل کے لحاظ سے سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ بہت ممنون دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا تھا صرف اس کے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ یہ کام تو کوئی

بھی کر سکتا تھا۔ ہاں ایک کام تھا جو یہاں موجود کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اور وہ یہ کہ میں نے اسے مزید زخم نہیں آنے دیے تھے۔ وہ بے چاری اس معمولی بات کو بہت بڑی بات کہہ رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کرن کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے اور وہ جو کرنا چاہتی ہے اسے کرنے دیا جائے۔

کرن سے بات کرنے کے بعد میں نے سردار جبیر گل اور لشکر خاں وغیرہ سے طویل ملاقات کی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں طے پایا کہ حملہ ہفتے کی شب تک ملتوی کر دیا جائے۔

○☆○

دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کسی وقت بالکل تاریکی چھا جاتی تھی۔ بستی کی ڈھلوان پر راز محاذ خاموش تھا۔ مورچے، مورچوں میں بیٹھے ہوئے لڑاکے اور ان کی رائفلیں، شاخوں پر پرندے اور چشمے میں ہرشے جیسے مراقبے میں چلی گئی تھی۔ اگر کوئی چیز متحرک تھی تو وہ ذہن تھے۔ سوچ کی کسوٹی پر آنے والے لمحوں کی پرکھ ہو رہی تھی۔ کیا ہونا چاہیے، کیسے اور کب ہونا چاہیے۔ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اس طوفان کی شدت کم یا زیادہ ہو سکتی تھی لیکن بہرحال اسے آنا تھا۔

یکایک ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ چشمے کی دائیں جانب سے ایک لڑکی نکلی اور اندھادھند بھاگتی ہوئی درختوں میں داخل ہو گئی۔ جونہی وہ درختوں میں پہنچی لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کی رائفلیں آگ اگلنے لگیں۔ ٹھائیں ٹھائیں سے جنگل گونج اٹھا۔ لڑکی اوندھے منہ ایک نشیب میں گر گئی۔ چند لمحوں کے لئے یوں محسوس ہوا کہ وہ نشانہ بن گئی ہے۔ مگر اچانک وہ پھر اٹھی اور تیزی سے بھاگتی گئی۔ رائفلیں ایک بار پھر تڑتڑ بولیں۔ اس مرتبہ یہ تڑتڑاہٹ دو طرفہ تھی۔ سامنے سے بھی فائر آ رہا تھا۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کا نشانہ لڑکی تھی جبکہ مخالفین چشمے کے محافظوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں فائرنگ ایک بار پھر تھم گئی۔ یہ عجلت آمیز "سیز فائر" اس امر کا غماز تھا کہ دونوں فریق اپنی اپنی "فائر پاور" محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

چشمے کے قریب سے "فرار" ہو کر جانے والی لڑکی کرن تھی اور یہ سب کچھ ہمارے منصوبے کے مطابق ہوا تھا۔ لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں نے بھاگتی ہوئی کرن پر گولیاں تو چلائی تھیں لیکن اسے نشانہ نہیں بنایا تھا۔ کرن اب واپس عیسیٰ جان کے ساتھیوں میں پہنچ چکی تھی۔ اس کی واپسی کا نتیجہ کچھ بھی نکلتا ہمیں ہر صورت رات بارہ بجے کے بعد عیسیٰ کے مورچہ بند ساتھیوں پر حملہ کرنا تھا۔

اور پھر بارہ بج گئے۔ بوندا باندی شام ہی سے جاری تھی۔ سردی میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن جب رگوں میں خون گرم ہو تو باہر کا درجہ حرارت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ شب بیدار جنگلی جانوروں کی ترانوں کے سوا ہر طرف خاموشی تھی۔ لشکر خاں اپنے ساٹھ عدد جانبازوں کے ساتھ بالکل تیار حالت میں تھا۔ بے شک یہ "جانباز" ڈاکو تھے لیکن اس وقت ایک چھوٹی برائی ایک بڑی برائی سے ٹکرا رہی تھی۔ سردار جبیر گل اور رستم کے ساتھ پینتیس رائفل بردار تھے۔ ان میں سے دس افراد کے پاس وہ رائفلیں تھیں جو چشمے والے معرکے میں ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ ان رائفل برداروں کے علاوہ پائندہ بستی کے قریباً پچاس کلہاڑی بردار بھی لڑائی میں حصہ لینے کے لئے تیار تھے۔ ان پچاس افراد کو عقب میں رکھا گیا تھا اور شدید ضرورت کے تحت ہی انہیں لڑائی میں کودنا تھا۔ ہمارا مقابلہ کم و بیش دو سو افراد سے تھا۔ ان میں سے چالیس پچاس افراد عیسیٰ جان کا ساتھ چھوڑ بھی جاتے تو بھی ہمیں ایک سخت مقابلہ درپیش تھا۔

جونہی گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر جمع ہوئیں، لشکر خاں نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور اپنے پچیس افراد کے ساتھ اٹھ کر مخالف مورچوں کی طرف بھاگا۔ یہ لڑائی کا آغاز تھا۔ ایک دم ہی خوابیدہ جنگل ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ رائفلوں کی خاموش سرد نالیں آگ اگلنے لگیں۔ لشکر خاں کے حملہ آور ہوتے ہی رستم بھی حرکت میں آیا اور اپنے جانبازوں کے ساتھ اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا مخالفین کے بائیں پہلو پر جا پڑا۔ زبردست فائرنگ کی آڑ میں، میں اپنی سب مشین گن کو اٹھا کر پچاس ساٹھ گز آگے ایک بلند جگہ پر لے گیا اور ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں مورچہ جما کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ ابھی ابھی عیسیٰ جان کے ساتھیوں سے خالی ہوئی تھی اور یہاں سے سب مشین گن کو بہتر طریقے سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

شب خون کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ اچانک اور شدید ہو۔ یہ دونوں خوبیاں اس شب خون میں موجود تھیں۔ خاص طور پر لشکر خاں کا حملہ قابل دید تھا۔ وہ اچانک اٹھا تھا اور ناک کی سیدھ میں مخالفین کے وسطی مورچوں پر جا پڑا تھا۔ سب سے شدید معرکہ بھی اسی جگہ ہوا۔ وہ ڈھلوان کا وسط تھا اور وہاں عیسیٰ جان کے ساتھیوں نے سب سے مضبوط مورچے بنائے تھے۔ میرے دیکھتے ہی

دیکھتے دیکھتے وہاں دستی بموں کے کئی زبردست دھماکے ہوئے اور رائفلوں سے نکلنے والی گولیوں نے آتشیں جال بچھا دیا۔ میرے چاروں طرف موت کا ننگا رقص تھا نعروں کی گونج تھی اور شعلوں کی لپک۔ اس ہنگامۂ محشر میں رہ رہ کر میری سب مشین گن کا نغمہ بھی گونج جاتا تھا۔ چار برس جیل کی ویران تاریکی میں جھونکنے کے بعد میں پھر اسی ماحول میں لوٹ رہا تھا جہاں شب و روز میرے گرد خطرات کا ہجوم رہتا تھا اور زندگی موت سے آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔

پانچ چھ منٹ تک زبردست لڑائی ہوئی پھر ایک دم ہمارے سامنے مزاحمت کی دیوار ڈھے گئی۔ مخالفین کے پاؤں یوں اکھڑے جیسے کبھی زمین پر پڑے ہی نہ تھے۔ رائفلوں سے نکلنے والے شعلے بتا رہے تھے کہ وہ جنگل میں دور تک بکھر گئے ہیں اور تیزی سے مزید دور جا رہے ہیں۔ کرن کا کہا درست ثابت ہو رہا تھا بلکہ توقع سے زیادہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ عیسٰی جان کے ساتھیوں میں کم از کم نصف تعداد نے لڑائی میں حصہ ہی نہیں لیا تھا اس کے علاوہ باگز خیل والوں کی موجودگی کے آثار بھی کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ دس منٹ کے اندر اندر یہ سارا کھیل ختم ہو گیا۔ دور جنگل میں اکا دکا دھماکوں کے سوا خاموشی چھا گئی۔

ڈھلوان پر اور اس کے ارد گرد لالٹینیں گردش کرنے لگیں۔ لڑائی میں ہونے والا جانی نقصان ہماری توقع سے بہت کم تھا۔ صرف پانچ افراد موقع پر ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں دو لشکر خاں کے اور تین عیسٰی جان کے ساتھی تھے۔ گولیوں اور دستی بموں کے پرچھوں سے زخمی ہونے والوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ چودہ پندرہ افراد کو زخم آئے تھے جبکہ چھ افراد شدید طور پر زخمی ہوئے تھے۔ ان میں رقاصہ کرن بھی تھی۔ ایک دستی بم کا ٹکڑا اس کے پہلو میں لگا تھا اور پسلیاں توڑتا ہوا پیٹ میں گھس گیا تھا۔ وہ سانس لینے میں سخت دقت محسوس کر رہی تھی۔ بڑی قابل رحم حالت تھی بے چاری کی۔ لالٹین کی لرزتی روشنی میں میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ اس کے سر کا ایک حصہ مٹی اور خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "تمہیں کہا تھا ناں کہ عیسٰی کے بندے سر پہ پاؤں رکھ کر نہ بھاگیں تو میرا نام بدل دینا۔"

میں نے اپنی چادر سے اس کا منہ اور سر صاف کیا پھر اسے بازوؤں میں اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ ہلنے جلنے سے اسے سخت تکلیف ہوئی اور اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کا خون بڑی تیزی سے ضائع ہو رہا تھا۔ وہ نحیف آواز میں بولی "تمہیں بچ جاؤں گی؟"

اس سوال کا حتمی جواب قادر و توانا ہی دے سکتا تھا میں سفید جھوٹ ہی بول سکتا تھا۔ "کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے اسے تسلی دی اور بالوں کی گرد آلود لٹ اس کے چہرے سے ہٹا کر اس کے کان میں اڑس دی۔

جب بڑی بڑی پگڑیوں والے پاؤندے اس کی چارپائی اٹھا کر بستی کی طرف لے گئے تو میں نے صدق دل سے دعا کی کہ اس مصیبت زدہ لڑکی کی مشکل آسان ہو جائے۔ وہ ازل سے بے رحم پنجوں میں بہت تڑپ چکی ہے۔ اب اسے اور نہ تڑپنا پڑے۔ اور میری یہ دعا قبول ہوئی۔ اسی رات کرن مر گئی... یا کہہ لیجئے کہ بجھ گئی۔ اسے موت کے اٹل بادل نے ڈھانپ لیا۔ بے شک وہ کرن تھی لیکن گندگی کے ایک ڈھیر پر جا پڑی تھی۔ یہاں رینگنے والے زہریلے حشرات نے اس کے جسم پر ایسے زخم لگائے تھے جن کا مرہم کسی کے پاس نہیں تھا... اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔

لڑائی میں عیسٰی جان کے دس ساتھی مع اسلحہ اور گھوڑے گرفتار ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی چند گھوڑے اور رائفلیں ہاتھ لگیں۔ اس کامیابی کی اہم وجہ بروقت کارروائی تھی۔ ہم نے ایک ایسے وقت حملہ کیا تھا جب عیسٰی اور شنکر موقع پر موجود نہیں تھے۔ اس کے علاوہ مخالفین کی اپنی صفوں میں کھینچا تانی عروج پر پہنچی ہوئی تھی... اس لڑائی کے نتیجے میں لشکر خاں علاقے کا سب سے بااثر شخص بن کر ابھرا... اور یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر عیسٰی جان کے بیشتر ساتھی لشکر خاں سے آملیں گے۔

پاؤندہ بستی میں لڑائی کے ہنگامے سے فارغ ہوتے ہی لشکر خاں نے اپنے قائم مقام جمعہ خاں کو ضروری ہدایات دیں اور میرے ساتھ عیسٰی جان کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمارا اوّلین مقصد ایس پی برکت اور دیگر ساتھیوں کی رہائی تھا۔ یہ سب لوگ عیسٰی جان کے ڈیرے پر مقید تھے۔ انہیں وہاں سے نکالنے کے لئے یہ موقع مناسب ترین تھا۔ عیسٰی جان کے شکست خوردہ ساتھی تتر بتر ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ کو آج صبح تک لشکر خاں کی اطاعت قبول کر لینا تھی اور باقیوں کو جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھٹکنا تھا۔ عیسٰی اور شنکر بھی یہاں موجود نہیں تھے لہٰذا ڈیرے پر کسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ لشکر خاں نے کل پچیس آدمی اپنے ساتھ لئے۔ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے۔ رائفلوں کے علاوہ سب مشین گن بھی ہمارے پاس تھی۔ رہنمائی کے

لئے اسد خاں نامی ایک شخص ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پاس ایک طاقتور ٹارچ تھی اور وہ اس علاقے کا کیڑا سمجھا جاتا تھا۔

ہم بستی سے روانہ ہوئے تو دو بجے کا عمل تھا۔ قریباً ایک میل آگے عیسٰی جان کے کچھ ساتھیوں سے ہماری مڈھ بھیڑ ہوئی۔ یہ ٹولی پچیس تیس افراد پر مشتمل تھی۔ لشکر خاں کو پہچان کر وہ اس کی حمایت میں نعرے لگانے لگے اور ہمارے قریب آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس لڑائی میں انہوں نے حصہ نہیں لیا بلکہ حتی المقدور لشکر خاں وغیرہ کی مدد کی ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے ایک شخص کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس کی بہت اچھی درگت بنائی گئی تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے، ہونٹ خون آلود اور سر میں خاک تھی۔ میں پہچان گیا... وہ لنگر خاں تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنے قبیلے سے غداری کر کے عیسٰی جان کے لئے مخبر کے فرائض انجام دیئے تھے اور بعد میں چشمے اور راشن کے ذخیرے پر قبضہ کروایا تھا۔ عیسٰی جان کے باغیوں نے لنگر خاں پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ لڑائی کے دوران انہوں نے اسے دبوچ لیا تھا اور اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ عیسٰی اور شنکر کی دہشت کے سبب وہ کھل کر لشکر خاں کی حمایت نہیں کر سکے ورنہ ان کے دل لشکر خاں اور جمعہ خاں وغیرہ کے ساتھ دھڑک رہے تھے اور وہ انہیں کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کو صرف اس بات کا دکھ تھا کہ اس فساد کی اصل جڑ شنکر شکرا موقع پر موجود نہیں اور وہ اپنے قرار واقعی انجام سے بچ گیا ہے۔

ان لوگوں نے اپنے ہتھیار لشکر خاں کے حوالے کر دیئے اور وفاداری اطاعت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر ان پرجوش افراد اور لشکر خاں کے درمیان ایک طویل مکالمہ ہوا جس کے بعد یہ لوگ فوراً لشکر خاں سے ہاتھ ملا کر پاؤندہ بستی کی طرف چلے گئے اور ہم نے عیسٰی جان کے ڈیرے کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ سزائے موت کے مجرم لنگر خاں کو ان لوگوں کے ساتھ ہی واپس بستی بھیج دیا گیا تھا۔

شارٹ کٹ راستے استعمال کرتے ہوئے ہم ساڑھے چار بجے کے قریب عیسٰی جان کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ہماری پارٹی میں تین ایسے افراد بھی شامل تھے جو چند روز پہلے تک یہاں کی انتظامیہ میں شامل تھے۔ ان کی حکم عدولی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لشکر خاں ڈیرے سے ایک فرلانگ ادھر ہی درختوں میں ٹھہر گیا۔ ہم سب نے اس کی تقلید کی۔ لشکر خاں نے ان تین افراد کو ضروری ہدایات دے کر ڈیرے پر بھیجا۔ مقصد یہی تھا کہ ڈیرے پر موجود افراد سے براہ راست ٹکراؤ نہ ہو۔ حکمت عملی کے تحت پہلے انہیں باہر لایا جائے اور پھر گھیر لیا جائے۔ ہمیں طویل انتظار کی زحمت نہیں ہوئی۔ ابھی مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہوا تھا کہ ڈیرے کی طرف سے ایک گھوڑا سرپٹ بھاگتا نمودار ہوا۔ گھڑ سوار انہی تین افراد میں سے ایک تھا جو تھوڑی دیر قبل بھیجے گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ ڈیرے پر کل تین عورتیں اور دس مرد ہیں۔ اسد خاں نے ان سب کو ایک کمرے میں جمع کر لیا ہے۔ یہ کام کافی آسان ثابت ہو رہا تھا بلکہ اس سے بھی آسان ثابت ہو سکتا تھا اگر اسد خاں وغیرہ ان لوگوں کو خود ہی ہینڈز اپ کر دیتے لیکن انہوں نے احتیاط سے کام لیا تھا۔ اس علاقے میں ہینڈز اپ کرنے اور ہینڈز اپ ہونے کا رواج کم ہی تھا۔ ہر شخص مسلح ہوتا تھا اس لئے فوراً فائرنگ اور جوابی فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔ وہ دس افراد تھے اور تین افراد کا انہیں ہینڈز اپ کرانا یا ہتھیار رکھوانا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لشکر خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب ذرا چلو چلتے ہیں۔"

ہم نے گھوڑے وہیں چھوڑے اور درختوں کے درمیان چلتے ہوئے احتیاط سے ڈیرے کی طرف بڑھے۔ ہمارا رخ ان کچی کوٹھریوں کی طرف تھا جن میں سے ایک کوٹھری میں نیلہ سے میری ملاقات ہوئی تھی اور ایک دوسری کوٹھری میں میں نے ایس پی برکت، بابرہ اور دیگر ساتھیوں کو بے ہوش پڑے پایا تھا۔ میرے سینے میں نقارہ سا بجنے لگا۔ ڈیرے پر ہو کا عالم تھا۔ چشمے کے قریب سے گزرے تو مجھے وہ جگہ نظر آئی جہاں دو پہرے دار میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے تھے اور جن کی موت سے لشکر خاں اور عیسٰی جان میں خونریز تصادم کی ابتدا ہوئی تھی۔

ایک دم میں ٹھٹک گیا۔ میں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا تھا۔ یقیناً لشکر خاں وغیرہ کی نگاہ بھی اس منظر پر ضرور پڑی ہوگی۔ نیچی ڈالیوں میں کچھ جانوروں کے ہیولے نظر آ رہے تھے اور غرّاہٹیں ابھر رہی تھیں۔ یہ عین وہی مقام تھا جہاں میں نے بابا خاں کا کام تمام کیا تھا۔ یہاں کچھ گیدڑ ایک انسانی لاش کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے۔ جھاڑیوں میں الجھی ہوئی ایک انسانی ٹانگ ہمیں چالیس پچاس قدم کے فاصلے سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ خدا کی پناہ! یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ سیاہی مائل انتڑیاں شاخوں میں الجھی ہوئی تھیں اور بدبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

یکایک خونخوار جانوروں کو ہماری موجودگی کا احساس ہوگیا۔ وہ ایک دم بدکے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھنی جھاڑیوں میں روپوش ہوگئے۔ لاش ملاحظہ کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو شاید ہم آنکھ بچا کر اور ناک ڈھانپ کر نکل جاتے مگر آنکھ بچانے اور ناک ڈھانپنے سے ذہن تو دیکھنا اور سونگھنا نہیں چھوڑتا۔ میرے ذہن میں یہ لاش اور اس کی بدبو پوری طرح بھر گئی۔ معلوم نہیں یہ کس کی لاش تھی۔ ایس پی برکت، صوبیدار مرجان، اکبر علی شاہ، کرم لیوی کا کوئی کڑیل جوان؟ یہ کسی کی بھی لاش ہوسکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ بالی خاں کی ہی ہو لیکن اگر بالی خاں کی لاش تھی تو یہاں کیوں پڑی تھی؟ عیسیٰ جان وغیرہ نے اسے تزک و احتشام سے دفن کیوں نہیں کردیا تھا۔ یقیناً یہ بالی خاں کی لاش نہیں تھی۔

لشکر خاں کے پیچھے پیچھے بلی کی چال چلتے ہوئے ہم سب ایک کشادہ کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ کمرا اس ڈیرے کے حجرے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے پر جوتوں کے ڈیڑھ درجن جوڑے پڑے تھے۔ ادھ کھلے دروازے کی دوسری طرف سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم نے کمرے کو تین اطراف سے گھیر لیا۔ ان تین اطراف میں سلاخ دار کھڑکیاں موجود تھیں۔ ایک بند تھی اور دو کھلی ہوئی تھیں۔ بند کھڑکی کو بھی رائفل کے ٹہوکے سے کھولا گیا۔ عین اسی وقت لشکر خاں نے لات مار کر دروازے کے پٹ وا کردیئے اور دہاڑ کر بولا "خبردار۔ یہ کولئے وہ والم" یعنی خبردار، میں گولی مار دوں گا۔۔۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے مرد و زن نے چاروں طرف دیکھا اور انہیں سانپ سونگھ گیا۔

○☆○

ڈیرے پر موجود افراد پر قابو پاتے ہی ہم نے اس زنداں کا رخ کیا جہاں چھاپہ مار پارٹی کے ارکان کو رکھا گیا تھا۔ ضخیم پہرے دار سے چابیاں چھین کر ہم اس آہنی دروازے والی کوٹھری کی طرف روانہ ہوئے جہاں کچھ روز پہلے مجھے پا بہ زنجیر لایا گیا تھا۔ کوٹھری کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پھر اس مقام سے گزرنا ہوا جہاں تھوڑی دیر پہلے گیدڑ ایک بدبودار لاش کی کھینچا تانی کر رہے تھے۔ اب وہاں ایک تنہا لومڑی گھوم رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ یوں درختوں میں گم ہوئی جیسے کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ یہ لاش جمعہ خاں کے سگے بھائی کی ہے۔ ڈیرے پر ہونے والی لڑائی میں وہ ہلاک ہوا تھا اور عیسیٰ جان وغیرہ نے اس کی لاش جنگلی جانوروں کی کھینچا تانی کے لئے عین اس جگہ پھکوا دی تھی جہاں سے بالی خاں کی لاش اٹھائی گئی تھی۔

ہم اس بدبودار فضا سے سانس روک کر اور ناک دبا کر گزرے اور آہنی دروازے والی کوٹھری کے سامنے آگئے۔ یہ کوٹھری اس قطار میں آخری تھی اور اس کے ساتھ ہی ڈیرے کا اصطبل تھا۔ اصطبل میں اب بھی چند گھوڑے اور خچر دیکھے جاسکتے تھے۔ لشکر خاں نے جھک کر آہنی دروازے کا تالا کھولا اور پٹ وا کردیئے۔ دروازہ کھلتے ہی میری نظر اپنے ساتھیوں پر پڑی۔ ان کی صورتیں پہچاننا مشکل ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، چہرے زرد اور بال منتشر۔ وہ برسوں کے بیمار دکھائی دیتے تھے۔ اب انہیں دو کوٹھریوں میں رکھا گیا تھا۔ ہم جس کوٹھری میں داخل ہوئے وہاں ایس پی برکت کے علاوہ صوبیدار مرجان بھی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہوئی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ آج بھی نشے میں تھے۔ تاہم یہ نشہ زیادہ تیز نہیں تھا۔ میں نے لپک کر ایس پی صاحب کو سنبھال لیا ورنہ وہ ضرور ایک دبلے پتلے لانس نائیک پر جا گرتے۔ ایس پی صاحب نے اپنی سرخ انگارا آنکھوں سے بغور مجھے دیکھا اور لڑکھڑائی آواز میں بولے "یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کہاں مرگئے تھے تم جاکر؟ ہیڈ کوارٹر میں اطلاع نہیں کرسکتے تھے۔ اور وہ۔۔۔ حرامی باجوہ کدھر ہے؟ وہ سلطانی گواہ بن گیا ہوگا۔ بے ایمان کی اولاد ہے۔ میں نمٹ لوں گا اس سے۔ اور تم۔۔۔ تم بڑے بھوتنی کے ہو۔ تم نے بھی مخبری کی ہے۔ میں۔۔۔ جانتا ہوں سب۔۔۔ اور وہ کھوتے کا پتر۔۔۔ میرے سالے کا سسر۔۔۔ چک جھمرہ میں بیٹھ کر ٹیلی فون کرتا ہے' اور میرے دشمنوں کو یارنیاں دیتا ہے۔۔۔ میں نکالوں گا اس کی ہیلو ہیلو۔۔۔" پتا نہیں وہ کیا بولتے جا رہے تھے۔ شاید خود بھی نہیں جانتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اس سے ملتا جلتا حال باقی لوگوں کا بھی تھا۔ کرم لیوی کے ایک حوالدار نے باقاعدہ مجھ پر چڑھائی کردی اور مجھے گریبان سے جھنجوڑنے لگا۔ اپنے زعم میں وہ عیسیٰ جان کے کسی ساتھی کو زیر کر رہا تھا۔ اسے برسرپیکار دیکھ کر ایس پی صاحب بھی آگے بڑھے اور مجھے لنگڑائی دے کر گرانے کی ناتواں کوشش کرنے لگے۔ صوبیدار مرجان صاحب بالکل لاتعلق ہوکر ایک طرف بیٹھے تھے اور ان کا سر پنڈولم کی طرح ہلتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بڑے مضحکہ خیز مناظر تھے۔ ہم ان مصیبت زدگان کو بمشکل کوٹھریوں سے نکال کر باہر کھلی ہوا میں لائے

اور چارپائیوں پر لٹایا۔

انہیں اندھا دھند افیون کھلائی جاتی رہی تھی۔ اگر یہ سلسلہ چند روز مزید جاری رہتا تو وہ سب کے سب ناکارہ ہو جاتے یا ویسے ہی عدم آباد کا ٹکٹ کٹا لیتے۔ برآمد ہونے والے قیدیوں میں تین اجنبی بھی تھے۔ ان میں سے دو تو ڈیرے ہی کے آدمی تھے جنہیں عیسیٰ جان نے کسی وجہ سے خفا ہو کر قید میں ڈال رکھا تھا۔ ایک شخص باہر کا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی بھٹکا ہوا مسافر نظر آیا۔ سخت سردی میں بھی اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ اور پھٹی پرانی بنیان تھی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر تشدد کے نمایاں نشانات تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شکل جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ میں نے ایک طرف بلا کر اس سے حال احوال دریافت کیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا لیکن اتنا خوفزدہ تھا کہ بات اس کے منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ کافی تگ و دو کے بعد میں نے اسے بولنے پر آمادہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اپنے ایک پرانے قرض دار سے پیسے لینے کے لئے وہ اس ڈیرے پر آیا تھا۔ یہاں قرض دار سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔ قرض دار کے ساتھیوں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کر کوٹھری میں بند کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے۔

میں نے پوچھا "کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ یہ عیسیٰ جان کا ڈیرا ہے؟"

وہ بولا "ام کو پتا تھا جی۔ لیکن امارا مجبوری تھا۔ ام کو پیسوں کا سخت ضرورت ہے۔ امیں آنا پڑا یہاں۔ خدا گواہ ہے' ام کسی کا مخبر نہیں ہے' نہ امیں کسی سے کچھ لینا دینا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا "امارا بھائی بیمار تھا۔ ام اس کو شہر لے جانا چاہتا تھا۔ خوا امارا بوڑھا ماں بھی امارے ساتھ تھا۔ وہ بدنصیب ام کو ڈھونڈتا پھرتا ہوگا۔ امارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے بھائی صاحب۔۔۔ بڑا زیادتی ہوا ہے۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ لال بی بی' رشید خاں اور گلشن کے چہرے نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ واضح طور پر اس کے نقوش میں رشید خاں کی مشابہت تھی۔ میں نے کہا "تمہارا نام مرزا محمد ہے؟"

یہ نام سن کر وہ چونک گیا۔ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم کو کیسے مالوم ہوا؟"

اتفاق سے نو بیاہتا گلشن کی سرخ شال میرے پاس موجود تھی۔ میں نے قمیص کے نیچے سے اسے کمربند کے طور پر باندھ رکھا تھا اور اس میں مقتول پہرے دار سے چھینے ہوئے خنجر کے علاوہ ایک چھوٹا سا ریوالور بھی اڑس رکھا تھا۔ میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہ شال کھولی اور مرزا محمد کو دکھاتے ہوئے کہا "اسے پہچانتے ہو؟" وہ غور سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "یہ رشید خاں کی بہو کی شال ہے۔"

وہ پہچان گیا اور اس کی حیرت کئی گنا بڑھ گئی۔ "تم۔۔۔ تم ملا ہے ان لوگوں سے؟" اس نے ہکلا کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ سراپا لرز رہا تھا۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اسے بتایا کہ اس کے اہل خانہ سے میری ملاقات کہاں اور کن حالات میں ہوئی تھی اور اب وہ لوگ کہاں ہیں۔ میرے بیان کے دوران مرزا محمد کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ ان سب رنگوں پر بے قراری کا رنگ غالب تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے اہل خانہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ ان سے دو ہفتے کی مہلت لے کر آیا تھا اور یہاں پہنچے اب اسے دو ہفتے ہوچکے تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی باہمت والدہ ابھی تک اسی جگہ اس کا انتظار کر رہی ہے جہاں وہ اسے چھوڑ کر آیا تھا تو وہ حیران رہ گیا اور اس کی آنکھیں بے اختیار آنسو بہانے لگیں۔

اس نے اپنے پکڑے جانے کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔ تین ہفتے پہلے مرزا محمد خانہ بدوشوں کے ہمراہ ٹل جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ ایک رات انہوں نے "ایس" کی شکل والی گھاٹی میں پڑاؤ ڈالا۔ رات کو ایک گھڑسوار اس سے خیمے میں ملنے آیا۔ وہ ایک دیرینہ واقف کار تھا اور خیمے کو پہچان کر مرزا محمد تک پہنچا تھا۔ اس نے مرزا محمد پر انکشاف کیا کہ وہ معروف ڈکیت عیسیٰ جان کے گروہ میں شامل ہوگیا ہے اور عیسیٰ جان کا ڈیرا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ مرزا محمد کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ صبح ہوتے ہی یہاں سے کوچ کر جائیں ورنہ ان کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ شناسا کی باتیں سن کر مرزا محمد کا ذہن کسی اور طرف چل نکلا۔ اس نے اپنی بستی کے ایک خانوں نامی شخص کو اچھے دنوں میں کچھ رقم قرض دی تھی اور یہ خانوں کچھ عرصہ پہلے عیسیٰ جان کے گروہ میں شامل ہوچکا تھا۔ مرزا محمد کے دل میں آئی کہ کیوں نہ وہ خانوں سے اپنی رقم کا تقاضا کر کے دیکھے۔ شاید عام حالات میں وہ ڈاکوؤں کے اڈے پر جانے اور ایک ڈاکو سے رقم کا مطالبہ کرنے کی حماقت نہ کرتا مگر ضرورت انسان کو مجبور کردیتی ہے۔ اپنے لاڈلے بھائی کی بیماری کے سبب مرزا محمد بھی مجبوری کی آخری حدود کو چھو رہا تھا۔ خانوں

سے آٹھ ہزار روپے کی رقم اسے واپس مل جاتی تو اس کے کئی مسائل حل ہو جاتے۔ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر اپنے شناسا کے ساتھ عیسیٰ جان کے اڈے کی طرف چل نکلا۔ وہاں خانوں سے ملاقات تو ہوئی لیکن الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ آٹھ ہزار روپیہ دینے کے بجائے خانوں نے نہ صرف اس کا اسلحہ چھین لیا بلکہ گھڑی، جوتے اور کپڑے تک اتروا لئے اور جب تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق مرزا محمد نے احتجاج کیا تو اسے پولیس کا مخبر قرار دے کر بندی خانے میں ڈلوا دیا۔ پھر بھی مرزا محمد کی قسمت اچھی تھی کہ مارپیٹ کے دوران اس سے وہ "سچ" نہیں اگلوا لیا گیا جسے وہ چند میل دور خیمے میں چھوڑ آیا تھا یعنی اس کا بھائی، ماں اور جوان خوبصورت بھاوج۔ اگر خانوں وغیرہ کو معلوم ہو جاتا کہ مرزا محمد کے اہل خانہ بھی اس کے ساتھ ہیں تو وہ انہیں بھی کھینچ کر ڈیرے پر لے آتے اور مرزا محمد کی عزت تار تار ہونے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔

چھاپا مار پارٹی کے ارکان رہا ہو چکے تھے۔ اب ہمارا یہاں رہنا بے مقصد تھا۔ تاہم ڈیرا چھوڑنے سے پہلے ہم نے یہاں کی تلاشی لینا ضروری سمجھا۔ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ہم نے قریباً ایک گھنٹا تلاشی میں صرف کیا۔ سخت سردی اور تھکن کے عالم میں کی جانے والی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ ڈیرے سے معقول مقدار میں مال مسروقہ ہاتھ لگا۔ اس میں تقریباً دس عدد چھوٹی بڑی رائفلیں اور ان کا ایمونیشن تھا۔ اس کے علاوہ دو ٹیپ ریکارڈر، دو ویڈیو سیٹ، کیمرے اور کچھ دستی گھڑیاں شامل تھیں۔ یہ سارا سامان ایک بڑے آہنی صندوق میں بند کر کے زمین دوز کر دیا گیا تھا۔ عیسیٰ جان کے دو قریبی ساتھی ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو اس صندوق تک پہنچنا ناممکن تھا۔ عیسیٰ جان کے خاص کمرے میں الماری نما سنگھار میز کے چور خانے سے ولایتی شراب کی چند بوتلیں، نقد رقم اور طلائی زیورات برآمد ہوئے۔ عیسیٰ جان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ جو کچھ برآمد ہو چکا ہے وہ اصل سامان کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ یہ سارا سامان ہم نے کینوس کے بڑے بڑے تھیلوں میں بند کر کے تین خچروں پر لاد دیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں ڈیرا چھوڑنے میں زیادہ تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ عین ممکن تھا کہ عیسیٰ جان اور شنکر کے منتشر ساتھی جمع ہو کر پھر اس ڈیرے کا رخ کریں اور ہمیں ان سے لڑنا پڑے۔ تاہم لشکر خاں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ جان کا گروہ جس طرح منتشر ہوا ہے اب کئی ماہ تک اکٹھا نہیں ہو سکے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اب عیسیٰ کو بالکل نئے سرے سے جتھا بندی کرنی پڑے۔ نجانے کیوں میں لشکر خاں کے خیال سے اتفاق نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ شنکر تھا۔ میں جو کچھ شنکر کے بارے میں جانتا تھا لشکر خاں نہیں جانتا تھا بلکہ وہاں پر کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔۔۔ اور شنکر عیسیٰ کے ساتھ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے عیسیٰ تنہا ہو کر بھی پہلے سے طاقتور تھا۔ بہرطور میں اپنے احساسات وضاحت سے لشکر خاں تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

چھاپا مار پارٹی کے ارکان پر آہستہ آہستہ افیون کا اثر کم ہو رہا تھا اور امید تھی کہ سہ پہر تک وہ سفر کے قابل ہو جائیں گے۔ مرزا محمد پر یہ اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے دوپہر ایک بجے اسے ڈیرے سے روانہ کر دیا۔ منزل تک پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ اسد خاں کو بھیجا گیا۔ مرزا محمد کو لباس مہیا کر دیا گیا تھا۔ گھوڑا اس کا اپنا ہی تھا جو ابھی تک ڈیرے کے اصطبل میں بندھا ہوا تھا۔ روانہ ہوتے وقت مرزا محمد کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ میں نے گلشن کی سرخ شال اس کے حوالے کر دی اور اس کے ساتھ ہی آٹھ ہزار روپے کی رقم اس کی جیب میں ڈال دی۔ "یہ کیا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"یہ وہ رقم ہے جو تم نے خانوں کو قرض دی تھی۔" میں نے جواب دیا "خانوں خود یہ رقم واپس کرتا تو اس کے گناہوں کا بوجھ کم ہو جاتا مگر یہ رقم ہم نے بزور بازو حاصل کی ہے۔"

"لیکن یہ رقم خانوں کی تو نہیں ہے؟"

"یہ اس ڈیرے سے ملی ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہے۔ اس سارے مال میں خانوں کا حصہ بھی تو ہو گا۔ تم سمجھو یہ خانوں کی رقم ہے۔ لمبے چکروں میں مت پڑو۔ بس اسے اپنے پاس رکھو۔"

مرزا محمد کے چہرے پر تھوڑی دیر تذبذب کے آثار نظر آئے پھر ضرورت کی چھپکلی تذبذب کے پتنگے کو ہڑپ کر گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سر جھکا لیا۔ چند لمحے بعد مرزا محمد گھوڑے پر سوار ڈیرے سے باہر نکل رہا تھا۔ ایک راہ گم کردہ مسافر اپنے خیمے کی طرف لوٹ رہا تھا، خیمہ جہاں ایک ماں کی ممتا اپنے بیٹے کی منتظر تھی۔ ایک بھائی کی محبت دستِ شفا کا اور ایک دلہن کی آنکھیں سہاگ رات کا انتظار کر رہی تھیں۔ میں دیر تک مرزا محمد اور اسد خاں کو نشیب و فراز میں ڈوبتے ابھرتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پھلاہی، چنار اور ہیمانی کے گھنے پیڑوں کی آڑ لے کر میری

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

میں ایک گہری سانس لے کر لشکر خاں کی طرف گھوما۔ "چلو برادر! اب ہم بھی چلنے کی تیاری کریں۔" میں نے لشکر خاں سے کہا۔ میرے لہجے میں ایک عجب طرح کی بے قراری بخود سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔ ابھی میرے الفاظ کی بازگشت فضا میں تھی کہ دائیں جانب جھاڑیوں میں حرکت ہوئی۔ کوئی چیز اڑتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ بظاہر یہ پتھر تھا لیکن پتھر نہیں تھا۔۔۔ یہ موت تھی۔۔۔ یہ ایک دستی بم تھا۔۔۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ دستی بم ہے!

لشکر خاں مجھ سے صرف چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ چکا تھا مگر جب تک وہ گردن پھیر کر اس چیز کا مشاہدہ کرتا جس نے مجھے بے طرح چونکنے پر مجبور کیا تھا، ہوا میں تیرتی ہوئی موت یقیناً ہم دونوں کے درمیان لینڈ کر چکی ہوتی۔ سیکنڈ تو ایک بہت طویل عرصہ ہے۔ اس سے کہیں کم مہلت تھی میرے پاس۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور حتی الامکان تیزی سے جست کر کے لشکر خاں پر جا پڑا۔ شدید دھکے کے نتیجے میں لشکر خاں پشت کے بل اور میں اوندھے منہ پتھریلی زمین پر گرا۔ حرکی قوت کے سبب ہم دور تک گھسٹتے چلے گئے۔ میں نے لشکر خاں کی رائفل زمین سے ٹکرانے اور لڑھکنے کی آوازیں سنیں۔ پھر ایک زوردار دھماکے نے سماعت کو جھنجوڑ دیا۔ میں نے اپنے سر کا پچھلا حصہ اور کہنیاں بازوؤں میں چھپا رکھی تھیں۔ دھماکے کے بعد پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ میں زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہوں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لشکر خاں سیاہ دھوئیں کے بادل میں سے نمودار ہو رہا تھا۔ بظاہر وہ بھی محفوظ رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ان جھاڑیوں کی طرف دیکھا جہاں سے دستی بم اچھالا گیا تھا۔ مجھے ایک کریم کلر پتلون کی جھلک نظر آئی۔ کوئی تیزی سے فرار ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس مفرور کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ مجھے یاد ہے، لشکر خاں اور اس کے دو ساتھی بھی میرے پیچھے آ رہے تھے۔ "رک جاؤ۔" میں نے بھاگتے بھاگتے ریوالور نکال لیا اور چیخ کر کہا۔

یکایک کریم پتلون والا لڑکھڑایا اور مرزنی(?) کے پودوں میں گرا۔ میں اسے دبوچنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک اور انکشاف ہوا۔ پتلون والے سے آگے بھی کوئی بھاگ رہا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے لشکر خاں سے کہا "خان! تم اسے سنبھالو۔" لشکر خاں نے بھاگتے بھاگتے حلق سے ایک ایسی آواز نکالی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات سمجھ گیا ہے۔ ٹانگوں کی پوری قوت سے میں نے کوئی چالیس گز کا فاصلہ طے کیا اور پھر مجھے وہ دوسرا شخص بھی نظر آ گیا۔ اس نے سرخ چیک دار کوٹ پہن رکھا تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ہم پر دستی بم پھینکنے والے وہی دو افراد ہیں جو یہاں عیسیٰ جان کے پاس پناہ لیے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے عیسیٰ جان اور لشکر خاں میں چپقلش شروع ہوئی تھی۔ یکایک فائر ہوا۔ گولی میری دائیں جانب شاخوں سے ٹکرائی گزر گئی۔ یہ فائر سرخ کوٹ والے کی طرف سے ہوا تھا۔ میں نے ہوائی فائرنگ کی۔ میرے ریوالور نے پے در پے تین شعلے اگلے۔ سرخ کوٹ والا بھاگتے ہوئے بری طرح لنگڑانے لگا۔ "رک جاؤ۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ اس نے پلٹ کر ایک اور فائر کر دیا۔ یہ گولی میرے کان کے نزدیک سے گزری۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ "بھاگو گے تو مارا جاؤ گے۔" میں نے چیخ کر وارننگ دی۔ یہ "وارننگ" پنجابی زبان میں تھی لہٰذا اس کا اسٹائل خود بخود سلطان راہی جیسا ہو گیا۔

اس دوران لشکر خاں کے دو تین ساتھی بھی درختوں کی آڑ لیتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ سرخ کوٹ والے نے اپنے چاروں طرف موت کی سرسراہٹ محسوس کی تو ایک دم ہمت ہار دی۔ ریوالور پھینک کر اس نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیے۔ لشکر خاں کے ساتھی لپک کر گئے اور اسے رائفلوں کے کندوں سے بری طرح مارنے لگے۔ شاید وہ اسے جان ہی سے مار ڈالتے کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے چھڑایا اور سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

گرفتار ہونے والوں میں سرخ کوٹ والا پاشا تھا۔ دوسرے نے اپنا نام حبیب بتایا۔ جس وقت ہم نے ڈیرے پر ہلہ بولا، یہ دونوں اتفاقاً باہر تھے۔ تاہم ایسی پوزیشن میں نہیں تھے کہ بھاگ سکتے۔ ہم سارا وقت ان کے اردگرد ہی رہے تھے۔ وہ بھاگنا چاہتے تو فوراً نگاہ میں آ جاتے اور گولی کا نشانہ بنتے۔ آخر موقع تاک کر انہوں نے دفاعی انداز چھوڑ دیا اور جارحانہ اقدام کا فیصلہ کیا۔ دستی بم کی موجودگی انہیں شہ دے رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ دو تین تو دستی بم کا شکار ہو جائیں گے۔ ان کی رائفلیں حاصل کر کے وہ باقی افراد کو بھی ہینڈز اپ کرا لیں گے یا پھر ویسے ہی بھون ڈالیں گے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔۔۔ میں جانتا تھا کہ ان سے پوچھ گچھ کی کوشش بیکار ہے۔ وہ ان لڑکوں میں سے نہیں تھے جو آسانی سے ٹک دیتے ہیں۔ ان کی زبانیں کھلوانے کے لیے خاصے اہتمام کی ضرورت تھی۔ میری گولی نے پاشا کی پنڈلی کو نشانہ بنایا تھا۔ دل گوشت چھاڑ کر نکل گئی تھی۔ میں نے اس کی مرہم پٹی کروائی۔ لشکر خاں نے ان دونوں کی مکمل تلاشی لے کر مشکیں کس دیں اور

ایک موٹے تازے خچر پر لاد دیا۔ جس جگہ دستی بم گرا تھا وہاں زمین سیاہ ہو گئی تھی۔ اس سیاہ زمین کے پاس ہی ایک گھوڑے کی لاش پڑی تھی۔ دستی بم کا پرخچہ گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کے عین درمیان لگا تھا اور اس بے زبان مرگ نے چند سیکنڈ کے اندر جان دے دی تھی۔ لشکر خاں مسلسل مجھے احسان مندی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "برادر! بچانے والا تو خدا ہے لیکن تم وسیلہ بنا ہے۔ تم ام کو نہ بچاتا تو اس غازی مرد کے ساتھ ساتھ ام بھی لمبا لیٹ گیا ہوتا۔"

میں نے کہا "دراصل درختوں کی طرف تمہاری پشت تھی۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے کوئی سر سے گرنے والی ٹوپی کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔"

وہ بولا "تم کچھ بھی بولو لیکن ام اپنے پر تمہارا احسان سمجھتا ہے۔"

ہوا کا رخ ذرا سا بدلا تو بدبو کے بھبکے ہمارے نتھنوں میں گھسنے لگے۔ یہ جمعہ خاں کے بھائی کی بے گور و کفن لاش تھی جو کئی دنوں سے جانوروں کی کھینچا تانی کا شکار ہو رہی تھی۔ ہم نے بوجھل دلوں کے ساتھ اس کے باقی ماندہ حصے ایک گڑھے میں دبا دیے اور ڈیرے سے روانہ ہو گئے۔ پاشا اور مجیب کے علاوہ ڈیرے سے گرفتار ہونے والے دیگر تیرہ افراد بھی ہمارے ساتھ تھے۔

O☆O

پاؤندہ بستی واپس پہنچنے میں ہمیں قریباً چار گھنٹے لگ گئے۔ ہماری سست رفتاری کی ایک وجہ ایس پی برکت اور دیگر "نو رہاشدہ قیدی" بھی تھے۔ ان کی حالت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی۔ خاص طور پر ایس پی برکت صاحب تو ٹھیک سے گھوڑے پر بھی نہیں بیٹھ پا رہے تھے۔ غیر محسوس طور پر کبھی ان کا پاؤں ایک طرف لٹک جاتا کبھی دوسری طرف۔ سویدا اور مرجان کا سر بدستور پنڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ کسی بات کی فیصلہ کن انداز میں نفی کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں "نہیں یہ نہیں ہو سکتا' ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

ہم پاؤندہ بستی پہنچے تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ سردی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ رات آٹھ نو بجے تک پاؤندہ بستی عموماً سنسان نظر آنے لگتی تھی تاہم آج صورت حال مختلف تھی۔ بستی میں روشنیاں جل رہی تھیں اور لوگ گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ خاص طور پر سردار کے جھونپڑے کے اردگرد کافی رونق دکھائی دیتی تھی۔ یہ سب کچھ ہم نے بلندی سے دیکھا۔ بستی میں داخل ہونے کے لیے ڈھلوان پر پہنچے تو ہمیں گھنٹے پہلے کے سارے مناظر نگاہوں میں تازہ ہو گئے۔ گولیوں کی تڑتڑ' ڈائنامائٹ اور گرینیڈز کے دھماکے' جنگی نعرے اور لشکریوں کی چیخ و پکار' مکمل جنگ کا سماں تھا وہ۔ یہ سوچ کر عجیب سا احساس ہونے لگا کہ ٹھیک چوبیس گھنٹے پہلے اس ڈھلوان پر مرنے مارنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں... اور اب مرنے مارنے کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ وہی درخت تھے' وہی پتھر' وہی ٹیلے لیکن یہاں گھومنے پھرنے والے کچھ لوگ آج سطح زمین کے نیچے جا چکے تھے۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں رقاصہ کرن زخمی ہو کر گری تھی اور ہم نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ قامت سنبل کے پاس وہ جگہ تھی جہاں دو روز پہلے تک میرا اور گل شیر کا مورچا تھا۔ لڑائی کے دوران اس مورچے کے عین اوپر کوئی دستی بم گرا تھا۔ زمین اُدھڑی ہوئی تھی اور ایک نازک پودا کٹ کر مورچے میں بے جان پڑا تھا۔

ہم بستی میں داخل ہوئے تو گہماگہمی کی وجہ ہماری سمجھ میں آ گئی۔ یہ گہماگہمی جرگے کے ایک فیصلے کے نتیجے میں نظر آ رہی تھی۔ چند روز پہلے لشکر خاں کی غیر موجودگی میں جرگے نے اسے موت کی سزا دی تھی۔ اب اس سزا پر عملدرآمد کیا جا رہا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ کسی ایڈونچر فلم کا سین تھا۔ لشکر خاں 'پھلاہی کے مضبوط تنے کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی پگڑی گلے میں جھول رہی تھی اور چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ گیس بمبس کی روشنی میں اس کا چہرہ کپڑے کی طرح سفید دکھائی دیتا تھا۔ لشکر خاں کے قریب ہی چار تنومند اصیل گھوڑے ایک چنار سے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ لشکر خاں کے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں کھڑے تھے۔ سردار بشر گل اور سفید بالوں والے چند بوڑھے ایک بڑی چارپائی پر براجمان تھے اور تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔

ہماری آمد کی اطلاع ملتے ہی وہ چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیگر لوگ بھی لشکر خاں کو نظرانداز کر کے ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ ایس پی برکت اور کرم لیوی کے خستہ حال جوانوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جا رہا تھا۔ سردار کے جھونپڑے کے عین سامنے الاؤ کے پاس چند جہازی سائز کی چارپائیاں ڈال دی گئیں۔ قہوے کی بڑی بڑی کیتلیاں ہمارے گرد گردش کرنے لگیں اور جرگے کے ارکان بڑے اشتیاق سے ہماری باتیں سننے لگے۔ لشکر خاں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ عیسیٰ جان کے ڈیرے پر کیسے دھاوا بولا گیا اور کس طرح قیدیوں کو رہائی دلائی گئی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران چاروں طرف لوگ خاموش اور بے حرکت کھڑے رہے۔ ان سب

کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ فتح مندی کی جھلک ہر آنکھ میں نمایاں تھی۔ میرے پوچھنے پر سردار بشر گل نے بتایا کہ جنگ کے تمام مقتولین کو نمازِ عصر کے بعد دفن کر دیا گیا ہے۔ کرن بھی ان میں شامل تھی۔ کرن نے جس جذبے سے عیسیٰ جان کے خلاف ہماری مدد کی وہ قابلِ تحسین تھا۔ کرن کو لڑائی کے دوران گولی لگی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس کی گولی تھی؟ ہماری یا عیسیٰ جان کے آدمیوں کی؟ بہرطور وہ گولی کسی مرد نے ہی چلائی تھی۔ کئی سال تک شب و روز مرد کے دستِ ستم کا شکار رہنے والی آخر ایک مرد کے ہاتھوں ہی ابدی نیند سو گئی تھی۔ پاؤندہ بستی کے بہت سے لوگ کرن کے نام سے واقف تھے اور اسے پہاڑی ریستوران کی دلکش رقاصہ کی حیثیت سے جانتے تھے۔ ان میں سے کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ رقاصہ جو ہر رات حسن کا بازار لگاتی ہے اور اپنی اداؤں کی قیمت وصول کرتی ہے' ایک روز ایسی ادا سے موت کو گلے لگائے گی کہ وہ سب اس کے احسان تلے دب جائیں گے۔

جونہی ہماری بات چیت اختتام کو پہنچی' لشکر خاں کے گرد پھر تماشائیوں کا ہجوم ہونے لگا۔ وہ غدار تھا' ان کا مجرم تھا' اس کی مخبری کا نتیجہ کھلی جنگ کی صورت میں نکلا تھا اور اس جنگ کے نتیجے میں کئی عورتیں بیوہ اور کئی بچے یتیم ہوئے تھے۔ ان سب مرنے والوں کا خون لشکر خاں کی گردن پر تھا اور قبائلی قانون کے مطابق اس کی گردن کا مارا جانا ضروری تھا لیکن گردن مارنے کے لیے گھوڑوں کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بات فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے دیکھا' ایک درمیانی عمر کا شخص ہجوم سے نکل کر آگے آیا۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھا۔ بھاری بھرکم پگڑی گلے میں جھول رہی تھی۔ سردار بشر گل کے سامنے پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ تب میں نے غور سے دیکھا اس کے منہ میں گھاس یا ایسی ہی کوئی دوسری چیز تھی۔ گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر جھکا ہوا وہ بالکل کوئی چوپایہ نظر آتا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں سردار بشر گل سے کوئی بات کی۔ لہجہ سراسر فریادی تھا۔ میرے دریافت کرنے پر سویدا اور مرجان نے بتایا کہ یہ شخص لشکر خاں کا بڑا بھائی ہے اور مقامی رواج کے مطابق سردار بشر گل سے رحم کی درخواست کر رہا ہے۔ منہ میں گھاس لے کر چوپائے کی طرح کھڑا ہونے کا مطلب اپنی بے پناہ ندامت اور عاجزی کا اظہار ہے۔ (اس طرح کا ایک منظر میں پشاور کے ایک نواحی گاؤں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت معاملہ دو پارٹیوں میں خون بہا کی ادائیگی کا تھا) کچھ دیر تک سردار بشر گل اور لشکر خاں کے بھائی میں بات ہوتی رہی۔ پھر لشکر خاں کا بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دو افراد اسے کندھوں سے تھام کر ایک جانب لے گئے۔ آثار سے ظاہر تھا کہ لشکر خاں کے لیے رحم کی یہ اپیل مسترد ہو گئی ہے۔ ہجوم میں اب بے قراری نظر آ رہی تھی۔ تماشائیوں میں بہت کم ایسے تھے جو لشکر خاں کو رحم کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ زیادہ تر نگاہیں دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں یا ان میں لشکر خاں کے لیے قہر کے جذبات موجزن تھے۔ میں نے لشکر خاں سے پوچھا "لشکر خاں کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟"

وہ بولا "ابھی تمہاری آنکھوں کے سامنے آ جائے گا برادر... وہ چار عدد گھوڑا دیکھ رہا ہے تم؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لشکر خاں بولا "وہ چاروں گھوڑا بھاگے گا اور اس بدبخت کا جسم پھاڑ کر پھینک دے گا۔"

گھوڑے جسم پھاڑ کر پھینک دیں گے؟ یہ بات فوراً میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب دو افراد نے لشکر خاں کے پاؤں سے ٹانگوں کے مضبوط رسے باندھنے شروع کیے تو آنے والے لمحوں کا خونیں نقشہ میری نگاہوں میں کھنچ گیا۔ خدا کی پناہ... ایک نہایت ہولناک منظر یہاں دیدہ و دل کا امتحان لینے والا تھا۔ لشکر خاں کی دونوں ٹانگوں کو دو دو گھوڑوں نے مخالف سمت میں کھینچنا تھا اور اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ نسیم حجازی کے ناول "آخری چٹان" میں تاتاریوں کے ظلم و ستم کا باب ایسے ہی خونچکاں واقعات سے عبارت ہے۔ تاتاری سمرقند و بخارا کے اسیران کو اسی طریقے سے دو حصوں میں تقسیم کروا لیتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک روز یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ پڑھنے سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق اس روز مجھ پر پوری طرح عیاں ہوا۔ میں نے لشکر خاں کا زردی مائل سفید چہرہ دیکھا۔ اس کی اندر کو دھنسی آنکھیں' خشک ہونٹ' منتشر بال' وہ چند گھنٹوں میں برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ قدرت بھی انسان کو کیا کیا تماشے دکھاتی ہے۔ یہی لشکر خاں تھا جو چند روز پیشتر بڑے طمطراق سے نجو کے جھونپڑے کے باہر پہرا دے رہا تھا۔ اس وقت اس کے سان و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ حالات اتنی تیز رفتاری دکھائیں گے۔ چند روز کے اندر اندر وہ نہ صرف اپنے قبیلے کے خلاف مخبری کرے گا بلکہ ایک دھواں دھار جنگ کے بعد پکڑا بھی جائے گا' اور پھر اسی جھونپڑے کے سامنے جہاں سے وہ سیکڑوں مرتبہ آزادانہ گزر چکا ہے' ایک پیڑ سے یوں بندھا ہوگا کہ اہل قبیلہ اس کی تکا بوٹی کرنے کے لیے بے تاب ہوں گے۔

میری نگاہیں لشکر خاں کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ اپنے انجام کے بارے میں پُریقین تھا اور اس کیفیت نے اس پر عجب بے حسی طاری کر دی تھی۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے اسے

اپنے آپ سے اور اردگرد کے ماحول سے کوئی سروکار نہ ہو۔ نجانے کیوں میرے دل میں آئی کہ آگے بڑھ کر لنگر خاں کے لیے رحم کی درخواست کروں۔ لنگر خاں میرے پہلو میں کھڑا تھا اور میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ارادے کو بھانپ لیا۔ میرا بازو تھام کر بولا "نہیں برادر! آگے جانے کا ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی فائدہ ہے۔ تمہارا یا ہمارا بات اب کوئی نہیں سنے گا۔ یہ اس قبیلے کا اندرونی معاملہ ہے اور قبائلی جرگہ مجرم کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

"پھر بھی خان! ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ جرم کے مقابلے میں یہ سزا بہت سخت ہے۔ اور اگر یہ لوگ اسے مارنا ہی چاہتے ہیں تو پھر سیدھی طرح گولی ماردیں۔"

لنگر خاں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا یہ بات بھی فضول ہے۔ یہاں سب کچھ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح قبیلے کا قانون ہوتا ہے اور قبیلے کا قانون بتاتا ہے کہ غدار کا سزا عبرتناک موت ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر یہ شخص سردار بشر گل کا سگا بھائی بھی ہوتا تو جرگہ اسے معاف نہ کرتا۔"

ہماری گفتگو کے دوران ہی لنگر خاں کی ٹانگیں رسّوں سے باندھی جا چکی تھیں اور یہ کوئی معمولی رسّے نہیں تھے' ہر رسّا تقریباً تین انچ لپیٹ کا تھا اور اس کی لمبائی پچاس گز سے کم نہیں تھی۔ ان دونوں رسّوں کو دو دو گھوڑوں کی پشت سے منسلک کر دیا گیا۔ گھوڑوں پر چاق و چوبند سوار براجمان ہو گئے تو ایک سن رسیدہ باریش شخص جھک کر چلتا ہوا لنگر خاں کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں سنہرے دانوں والی ایک بڑی تسبیح جھول رہی تھی۔ لنگر خاں کے سامنے کھڑا ہو کر وہ پہلے تو کچھ پڑھتا رہا پھر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں کافی فاصلے پر تھا لہٰذا اس گفتگو کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی۔ غالباً لنگر خاں سے اس کی وصیت دریافت کی جا رہی تھی۔ ہجوم کی بے قراری دم بہ دم بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ بار بار آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور لٹھ بردار انہیں پیچھے دھکیل دیتے تھے۔ تماشائی لنگر خاں کے چاروں طرف موجود تھے' تاہم ہجوم سامنے کی طرف تھا۔ تماشائیوں کے اس حصار میں دو مقامات پر شگاف ڈالے گئے تھے۔ یعنی وہاں سے تماشائیوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ یوں لنگر خاں کی دائیں اور بائیں جانب ہجوم میں دو راستے بن گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' گھوڑوں کو ان راستوں میں سے بھاگ کر جانا تھا۔

ساری تیاری مکمل ہو چکی تو وہ رسیاں کھول دی گئیں جن کے ذریعے لنگر خاں کو درخت سے باندھا گیا تھا۔ صرف گردن کے قریب ایک دو بندشیں باقی رہ گئیں۔ لنگر خاں کا رنگ اب کورے لٹھے کے مانند سفید دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے چکر آ رہے ہیں اور گرنے سے بچنے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ ابھی تک تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ رسّوں کو مخالف سمتوں میں کھینچنے والے گھوڑے اس کے دائیں اور بائیں جانب قریباً تین تین گز کے فاصلے پر موجود تھے۔ گھوڑوں سے منسلک رسّوں کو اس طرح رکھ دیا گیا تھا کہ ان کے الجھنے کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہا تھا۔

یکایک ہجوم سے زوردار نعرے بلند ہونے لگے۔ دھکم پیل انتہا کو پہنچ گئی۔ پہرے دار لاٹھیاں مار مار کر لوگوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔ میں نے دیکھا' سردار بشر گل نے اپنے اژدہے جیسے ریوالور سے ہوائی فائر کیا۔ فائر ہوتے ہی گھڑسواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی' سدھائے ہوئے گھوڑے کمان سے نکلے تیروں کی طرح دو مخالف سمتوں میں لپکے۔ رسّے کھلتے چلے گئے۔ چالیس پچاس گز کا فاصلہ لمحوں میں طے ہو گیا۔ میری نگاہیں خودبخود لنگر خاں کی طرف سے ہٹ چکی تھیں۔ میں اس وقت دائیں جانب والے گھوڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب رسّا تن گیا تو گھوڑے ذرا سا لڑکھڑائے اور پھر سیدھا نکلتے چلے گئے۔ لنگر خاں کی آخری دردناک چیخ تماشائیوں کے بے پناہ شور اور نعروں میں دب گئی۔ دائیں جانب والے گھوڑے کافی آگے جانے کے بعد جب گھوم کر روشنی میں واپس آئے تو میری اُڑتی ہوئی سی نظر ان پر پڑی۔ ان کے عقب میں خون آلود چیتھڑوں میں لپٹی ایک ناقابل شناخت چیز گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ میں کوشش کے باوجود اس چیز پر دوبارہ نگاہ نہیں ڈال سکا۔

○☆○

تاریخ گواہ ہے کہ فتح کا جشن اکثر و بیشتر لاشوں کے انباروں پر منایا جاتا ہے۔ ان میں دشمنوں کی لاشوں کے علاوہ فاتح فوج کے اپنے سپاہیوں کی لاشیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی سی بستی میں اگلی رات جشن کا سماں رہا۔ ہوائی فائرنگ ہوتی رہی۔ منچلوں کی ٹولیاں رقص کرتی رہیں اور جگہ جگہ بھڑکتے الاؤ روح افروز منظر پیش کرتے رہے۔ سردار بشر گل کے جھونپڑے میں زبردست میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں بشر گل کے علاوہ' لنگر خاں' صوبیدار مرجان اور ایس پی برکت وغیرہ شامل تھے۔ بشر گل اور لنگر خاں مجھے بھی اس مباحثے میں شامل کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں بتایا کہ ایس پی برکت اور صوبیدار مرجان میرے افسران اعلیٰ ہیں۔ میں ان کے برابر بیٹھ کر میٹنگ میں حصہ لوں گا تو وہ میرے کان کھینچ کر

لے آئیں گے۔ بشر گل اور لنگر خاں کو میری یہ وضاحت مطمئن نہیں کر سکی تھی۔ بہرطور انہوں نے اپنی بات پر زور نہیں دیا تھا۔

میں چاہتا تو میٹنگ میں شریک ہو بھی سکتا تھا لیکن مجھے وہاں ہونے والی طویل اور خشک گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ گفتگو لنگر خاں اور اس کے ساتھیوں کے مستقبل کے بارے میں ہو رہی تھی۔ صوبیدار مرجان صاحب نے بڑے طمطراق سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ لنگر خاں اور اس کے چیدہ ساتھیوں کو کرم ایجنسی کی انتظامیہ سے غیرمشروط معافی دلا سکتے ہیں لہٰذا وہ ان کے ساتھ پولیٹکل ایجنٹ کے پاس چلیں اور اپنے ہتھیار ان کے سپرد کر دیں۔ لنگر خاں اور اس کے قریبی ساتھیوں کو یہ تجویز پسند آئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود بھی مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ کی اس زندگی سے اکتائے ہوئے ہیں اور اب یہ سلسلہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ (انہیں معافی کی ایک ایسی ہی پیش کش چند ماہ پہلے بھی ہو چکی تھی لیکن اس وقت عیسیٰ جان کی وجہ سے یہ بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی) اب جبکہ ایجنسی کا ایک ذمے دار شخص براہ راست لنگر خاں کو یہ پیشکش کر رہا تھا تو لنگر خاں کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کریں۔

انہیں بشر گل کے جھونپڑے میں غوروفکر کرتے چھوڑ کر میں نجو کے پاس چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی نجو کے چہرے پر جیسے آس کا ایک چراغ روشن ہو گیا۔ وہ خاموش رہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں سوال بن جاتی تھیں۔ یہ آنکھیں مجھ سے شہباز پہلوان کے بارے میں پوچھتی تھیں کہ وہ کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ جس نے ہماری راتوں کی نیند اور دن کا سکون چرا لیا ہے؟ تم اسے اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آتے۔ کیوں اکیلے چلے آتے ہو؟ کیا تمہیں احساس نہیں کہ انتظار کی کیفیت کتنی جاں گسل ہوتی ہے؟ اب مجھے نجو کی ان سوالیہ نگاہوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا' یہ قابل رحم نگاہیں ہیں پھر بھی ان نگاہوں کی تپش چہرے پر محسوس کر کے مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

میں جھونپڑے میں داخل ہوا تو نبیلہ بھی وہیں موجود تھی۔ اس کے زخمی تلوے اب ٹھیک تھے۔ نہا دھو کر اس نے نجو کا ایک جوڑا پہن لیا تھا۔ یہ کپڑے اسے ذرا ڈھیلے تھے پھر بھی اچھے لگ رہے تھے۔ سفید پھولوں والی زرد شلوار قمیص تھی۔ اس کے ساتھ زرد رنگ کی ہی جرسی تھی۔ یقیناً وہ ایک خوبرو عورت تھی۔ وہ ایسے حالات سے گزری تھی کہ پتھر کی عورت بھی ہوتی تو چکنا چُور ہو جاتی۔ وہ پتھر کی نہیں گوشت و پوست کی تھی۔ بیتے ہوئے روز و شب کی نحوستیں اور ملامتیں تاریک پرچھائیوں کی طرح اس کے چہرے پر چھائی رہتی تھیں۔ وہ ذلت کے جس مقام سے گزر چکی تھی اس کے بعد وہ شاید خودکشی کر لیتی مگر اپنے بچوں کی محبت اسے اس فعل سے دور رکھے ہوئے تھی۔ وہ ایک عورت کی حیثیت سے شاید مر چکی تھی مگر ماں کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میں نے انگیٹھی کے سامنے بیٹھتے ہوئے نبیلہ کی آنکھوں میں جھانکا' اس کے پپوٹے بھاری تھے۔ لگتا تھا کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔

"کیا ہوا نبیلہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کی جگہ نجو نے جواب دیا۔ "صیب جی! آپ۔۔۔ آپ بی بی کو جلدی سے اس کے گھر والے کے پاس کیوں نہیں لے جاتے۔ بے چاری بڑی پریشان ہے۔ اپنے بچوں کے لیے۔ رات اس نے کوئی برا خواب دیکھا ہے۔ بس صبح سے روتی چلی جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے چپ ہوئی تھی۔ اب آپ کو دیکھ کر پھر گلیڈولے آئی ہے۔"

میں نے کہا "نبیلہ! سخت وقت تو گزر گیا ہے اب کیوں روتی ہو۔ اب تو تم دوبارہ اپنوں میں جانے والی ہو۔ بس تمہیں یہی خوشخبری سنانے کے لیے تو آیا تھا۔"

خوشخبری کا سن کر نبیلہ کی اشکبار آنکھوں میں جیسے اجالا سا ہو گیا۔ وہ وضاحت طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "ہاں' ہم واپس جا رہے ہیں۔ بس دو تین دن تک۔ اب کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے۔ عیسیٰ جان اور شنکر کے ساتھی تتر بتر ہو چکے ہیں۔ جو باقی بچے تھے وہ ہمارے ساتھ آ گئے ہیں۔ اب یہاں سے نکل کر کرم پہنچنا ہمارے لیے ایسے ہی ہے جیسے لاہور سے اٹھ کر شیخوپورہ چلے جانا۔ کوئی فکر فاقے کی بات نہیں ہے۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔ اللہ نے چاہا تو چند روز تک تم اپنے بچوں میں پہنچ جاؤ گی۔"

نبیلہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے حالات کی اس مہربان کروٹ پر اسے بھروسا نہ ہو رہا ہو۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا "نبیلہ! تم خوش قسمت ہو۔ تمہارا شوہر مالک محمد ایک حقیقت پسند شخص ہے۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس کے دل میں تمہارے لیے اب بھی وہی محبت ہے جو اس حادثے سے پہلے تھی۔ وہ جانتا ہے کہ تم حالات کے جبر کا شکار ہوئی ہو اور اسے۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ

تمہیں اس جبر سے بچانے کی سب سے زیادہ ذمے داری خود اسی پر عائد ہوتی تھی۔ وہ مرد تھا' اسے تمہاری حفاظت کرنا چاہیے تھی جو وہ نہیں کرسکا۔ وہ نہیں قصوروار کیسے ٹھہرا سکتا ہے' وہ تو خود تم سے عفو اور درگزر کا طالب ہے۔ تمہیں عیسیٰ جان کی قید سے چھڑانے کے لیے وہ کئی بار کوشش کرچکا ہے اور ایک دفعہ تو عیسیٰ جان کے ڈیرے کے پاس خونریز لڑائی بھی ہو چکی ہے۔ اس لڑائی میں چار آدمی مارے گئے تھے۔ یقیناً مالک محمد اس کے بعد بھی تمہاری رہائی کی کوششیں جاری رکھتا مگر پھر عیسیٰ جان نے ایک چال کھیلی' اور مالک محمد کو تمہارے مرنے کی جھوٹی اطلاع پہنچادی۔ اس اطلاع نے مالک محمد کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ وہ اتنا مایوس ہوا کہ خودکشی کا سوچنے لگا۔ لیکن پھر جس طرح تم اپنے بچوں کے لیے زندہ ہو' اسے بھی بچوں کے لیے زندہ رہنا پڑا۔ یہ زندگی مالک محمد کے لیے کتنی دردناک ہے اس کا احوال وہ خود ہی تمہیں بتائے گا۔ اس کے ملازم بتاتے ہیں کہ وہ دن رات تمہاری یاد میں آنسو بہاتا ہے اور اپنی قسمت کو کوستا ہے۔ اس نے اپنا سارا وقت تمہارے بچوں کی نگہداشت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور وہ اس گھر میں ایک ایسے بچے کو بھی لے آیا ہے جسے دیکھ کر تم سانس لینا بھول جاؤ گی۔"

"میں... میں کچھ سمجھی نہیں۔" نبیلہ عجب خوابیدہ آواز میں بولی۔ اس کے حواس پر جیسے سکتہ طاری تھا۔

میں نے کہا "جب اپنے گھر پہنچو گی تو سب سمجھ جاؤ گی اور پہچان بھی لو گی۔ وہ تمہارا خون ہے۔ تمہارے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں تمہیں کیا یاد دلاؤں۔ یاد تو وہ چیز دلائی جاتی ہے جو بھولی ہوئی ہو۔ اور مجھے یقین ہے' ایک ماں اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولتی..."

نبیلہ کی متورم آنکھوں میں ایک دم حیرت کا سمندر موجزن ہوگیا اور وہ رو دینے والی آواز میں بولی "خدا کے لیے پہیلیاں نہ بجھوائیے۔ مجھے بتائیے کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارے پہلے بیٹے یوسف کی۔ یوسف اب تمہارے گھر میں ہے اور تمہارے دیگر بچوں کے ساتھ رہ رہا ہے۔ مالک محمد اسے لاہور سے ڈھونڈ کر لایا ہے۔ وہ کہتا ہے یوسف اب اسی کے گھر میں پرورش پائے گا۔ اسے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار دے رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دیتا رہے گا۔" نبیلہ حیرت کا بت بنی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ "تمہاری جدائی نے مالک محمد کو بہت بدل دیا ہے۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اب تمہیں اس سے مل کر ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوگا۔ وہ اپنی ساری بری عادتیں چھوڑ چکا ہے۔ ساری برائی صحبتیں اور محفلوں کو خیرآباد کہہ چکا ہے۔ اب وہ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ دینداری کی باتیں کرتا ہے اور سر جھکا کر رزق حلال کمانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

نبیلہ کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ میری باتوں پر پچاس فیصد سے زیادہ یقین نہیں کرپا رہی تھی لیکن یہ پچاس فیصد بھی اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کرنے کے لیے کافی تھے۔ پھر اچانک... بالکل اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ یہاں سے جانے اور شوہر سے ملنے کے لیے بری طرح تڑپ اٹھی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ یکایک اس نے لاچار ہو کر سر جھکا لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کی چادر سر سے ڈھلک کر کندھوں پر آئی اور پھر زمین پر گر گئی۔ نجمہ نے چادر اٹھا کر دوبارہ اس کے سر پر ڈالی اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی دوران دروازے سے لشکر خان کی آواز ابھری۔ وہ مجھے باہر بلا رہا تھا۔

"ہو برادر۔" اس نے مخصوص انداز میں آواز دی۔ "ذرا باہر آکر ہمارا بات سن لو۔"

میں اٹھ کر باہر نکلا۔ وہ اپنی پگڑی کے پلّے سے رائفل کا دستہ چمکا رہا تھا اور بے خیالی میں مسکراتا جا رہا تھا' مجھے دیکھ کر کہنے لگا "برادر! وہ ایس پی برکت تمہارا افسر ہے؟"

میں نے "ہاں" میں جواب دیا۔ وہ بولا "بس تمہارا افسری ہی اس کے کام آگیا ورنہ آج میٹنگ میں امارے ہاتھ سے ٹھنڈا ہوگیا ہوتا وہ۔ اس پاگل کے بچے نے جبار خاں کو بھوتنی کا کہا۔ ام ایسا بے وقوف نہیں ہے کہ بھوتنی کا مطلب نہ سمجھے۔ اس نے امارے ساتی کو ماں کا گالی دیا تو اس کا مطلب ام کو گالی دیا۔ ام نے بندوق سیدھا کر کے اس کے کھوپڑے کا نشانہ لے لیا۔ وہ تو عین وقت پر امارا دماغ کام کرگیا۔ ام کو یاد آیا کہ یہ بدبخت ایس پی ہی نہیں ہے تمہارا افسر بھی ہے۔ بس اسی رشتے ام نے معاف کیا اس کو۔ لیکن برادر' اس چڑی مار کو بتادو کہ یہاں کسی کو "بھوتنی کا" نہیں کہے گا۔ گالی نہیں چلے گا یہاں اور اگر گالی چلے گا تو پھر گولی چلے گا۔"

لشکر خاں کی باتیں سن کر میرے لیے ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔ سیر کو سوا سیر مل گیا تھا۔ تکیہ کلام کے سبب اکثر لوگوں کو شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے اور محترم ایس پی صاحب کا تکیہ کلام تو تھا ہی فتنہ خیز۔ میں نے لشکر خاں سے کہا "خان بھائی! ناراضگی کی بات نہیں۔ یہ لفظ ایس پی صاحب نے غصے میں نہیں کہا۔ بس ان کے منہ سے نکل گیا۔ یہ تکیہ کلام ہے ان کا۔ تم سمجھتے ہو تکیہ کلام؟"

"ام سب سمجھتا ہے برادر! تکیہ کلام' تکیہ کا مین اور پچا نہیں کیا کچھ۔ ایسی باتیں بہت سنا ہوا ہے ام نے۔ اگر یہ ایس پی کا تکیہ کلام ہے تو پھر امارا تکیہ کلام رائفل ہے۔ وہ ام کو اپنا تکیہ کلام مارے گا تو ام اس کو گولی مارے گا... بس۔"

میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "اچھا چھوڑو اس بات کو' میٹنگ میں کیا فیصلہ ہوا؟"

"فیصلہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔" لشکر خاں سیدھے سادے پٹھانی لہجے میں بولا۔ "ام کوئی بات ہیر پھیر سے نہیں کرتا برادر' صوبیدار کا کہنا تھا کہ ام سب اس کے ساتھ شہر چلیں۔ وہ ام کو حکومت سے معافی لے کر دے گا۔ ام نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ ام سب بات مان رہا ہے لیکن وہاں جا کر معافی نہیں لے گا۔ حکومت خود یہاں آکر ہم کو معافی دے۔ ام معافی لینے سے انکار کرے تو پھر قصوروار ہے۔ جس وقت ام کو معافی مل جائے گا اس وقت ام اپنا ہتھیار گولہ بارود سب کچھ ان کے حوالے کر دے گا۔ ام میں سے ہر بندے کو ایک بندوق کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے اور وہ بھی اپنی حفاظت کے لیے۔ ام بندوق چلانا نہیں چاہتا' ام ہل چلانا چاہتا ہے۔ کھیت میں خون پسینہ گرا کر بچوں کے لیے روٹی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یقین کرو برادر' ام اور امارا سب ساتھی اس زندگی سے عاجز آچکا ہے۔ ام ان سب کی طرف سے حکومت کو ضمانت دے گا کہ وہ سب کا سب شریف آدمی بن کر رہے گا اور اس وقت تک پھر قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا جب تک پانی ان کے سر سے نہ گزر جائے۔"

میں نے پوچھا "کیا صوبیدار نے تمہاری تجویز مان لی ہے؟"

لشکر خاں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ "صوبے دار اچھا آدمی ہے۔ اب تک جتنا بھی افسر یہاں آیا ان سب سے اچھا آدمی ہے۔ بلکہ ام تو کہے گا' آج ایک ہی میٹنگ میں ام نے حکومت کا سب سے اچھا اور سب سے برا افسر دیکھ لیا ہے۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ صوبیدار مرجان کے ساتھ ایس پی برکت کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "اب ایسی بھی بات نہیں ہے خان بھائی۔ ایس پی دیکھنے میں جتنے بدمزاج نظر آتے ہیں حقیقت میں نہیں۔ تم ان سے صرف ایک بار ملے ہو اور اتنی جلدی کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔"

وہ بولا "بس ایک بار ملنے سے ہی جی بھر گیا ہے۔ اب دوبارہ ملنے کا ہوس نہیں ہے ام کو۔"

ہماری باتوں کے دوران ہی دور سے ایس پی صاحب تشریف لاتے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر لشکر خاں بولا۔ "بس برادر! ام چلتا ہے۔ وہ تمہارا ایس پی آتی ہے۔ اس نے اپنا تکیہ کلام بولا تو امارا مغز خراب ہوجائے گا۔"

میں نے لشکر خاں کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھ کر چل دیا۔ مجھے دیکھ کر ایس پی صاحب سیدھے میرے پاس آگئے۔ میں نے اٹھ کر انہیں سلیوٹ مارا۔ مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ مجھے میری اب تک کی کارکردگی پر شاباش وغیرہ دیں گے لیکن انہوں نے میرا یہ اندازہ غلط ثابت کردیا۔ بڑی کنجوسی سے ہی سہی لیکن انہوں نے میری بھاگ دوڑ کا اعتراف کیا۔ کہنے لگے "احسان الٰہی مجھے سردار بشر گل وغیرہ نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ تم نے موقع کے لحاظ سے اچھی کارکردگی دکھائی ہے لیکن میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوتا کہ تم عیسیٰ کے ڈیرے سے رہائی پاتے ہی لیوی کے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ممکن تھا یوں باجوہ کی جان بچ جاتی۔"

میں نے سوچا' اگر میں نے صورت حال کی وضاحت کرنی چاہی اور ایس پی صاحب کو بتایا کہ جنگل میں لڑائی کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اور میرا زندہ سلامت لیوی والوں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا تو وہ آگ بگولا ہوجائیں گے۔ پھر ان کی دھواں دھار گرجتی چمکتی گفتگو میں "میری تعریف" کے وہ چند بول بھی غتربود ہوجائیں گے جو قصداً یا سہواً ایس پی صاحب کی زبان سے ادا ہوگئے تھے۔ میں نے بم کو لات مارنے سے بہتر سمجھا کہ خاموش رہوں۔ وہ کچھ دیر صورت حال پر اپنا ماہرانہ تبصرہ نشر فرماتے رہے پھر انہوں نے اعلان کیا کہ کل علی الصباح ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے لہٰذا میں جانے کی تیاری کرلوں۔

جب ایس پی برکت صاحب نے یہاں آنے کی تیاری کی تھی تو ان کی پارٹی چار ارکان پر مشتمل تھی۔ اب صرف دو رکن رہ گئے تھے۔ یعنی ایک ایس پی صاحب اور دوسرا میں۔ یعنی اب میں اکیلا ہی ان کی پارٹی تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایس پی صاحب نے واپسی کا فرمان ذرا افراتفری میں جاری کردیا ہے۔ ہم اتنی جلدی یہاں سے روانہ نہیں ہوسکتے تھے اور صوبیدار مرجان صاحب تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کل یہاں سے واپس چل دیں گے۔ اس کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں تھی مگر یہ وجہ برکت صاحب کے ذہن سے اتری ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی کسی بات کو بالکل فراموش کردیتے تھے۔ اب وہ جس بات کو فراموش کیے ہوئے تھے وہ یہ تھی کہ کیپر

علی شاہ ہم میں نہیں تھا اور ہم اسے تلاش کیے بغیر زوئے مشت کے اس ویرانے سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ جب ہمارے ڈھوکی تالاب والے پڑاؤ پر عیسیٰ جان اور شنکر کے ساتھیوں نے ہلا بولا تو کبیر علی شاہ فرار ہو گیا تھا۔ عیسیٰ جان نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ بچ نکلا ہے۔ اس کے دو کتے مارے گئے تھے لیکن وہ اپنی کتوں کے ساتھ جنگل میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس واقعے کو اب کم و بیش دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ان دو ہفتوں میں ہم نے زوئے مشت کے اس ویرانے میں کافی خاک چھانی تھی مگر کبیر علی شاہ سے کہیں مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اب دو ہی امکانات تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی طور اس ویرانے سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ کسی کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔

میں نے ایس پی صاحب سے کہا "جناب! وہی ہو گا جو آپ حکم دیں گے لیکن میرا خیال ہے صوبیدار صاحب اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہونے پر تیار نہیں ہوں گے۔"

"وہ کیوں نہیں ہوں گے۔" ایس پی صاحب تنک کر بولے۔ "اس نے یہاں چاول کاشت کیے ہوئے ہیں۔"

"جناب! وہ کبیر علی شاہ کا معاملہ بھی تو ہے ناں؟"

ایس پی کے چہرے نے رنگ بدلا۔ میرے اس فقرے سے ان کا دھیان فوراً کبیر علی شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ تاہم اپنی "غیب دماغی" کو چھپانے کے لیے انہوں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑ کر بولے "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ کبیر علی شاہ کو نہیں ڈھونڈیں گے ہم۔ لیکن اس کے نہ ملنے پر ہم یہاں ڈیرا ڈال کر تو نہیں بیٹھ سکتے۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا ہے۔ یہ بھی تو سوچو جو ملازم (پولیس والے) مر کر دفن ہو چکے ہیں ان کے وارثوں کو ابھی تک اطلاع بھی نہیں۔ آخر میں نے بھی کسی کو جواب دینا ہے۔ وہاں ہیڈ کوارٹر میں میرا باپ نہیں بیٹھا ہوا جو گود میں بٹھا کر میری بڑا چاپلی کرے گا۔"

اگلے دو روز ہم نے قرب و جوار میں کبیر علی شاہ کو تلاش کرتے ہوئے گزارے۔ اس تلاش میں ہمارے ساتھ پاؤندہ بستی کی تقریباً نصف آبادی اور پاؤندہ کے کئی درجن کتے شامل تھے۔ لشکر خاں، امجد خاں اور سردار بشر گل اس علاقے کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھے۔ انہوں نے تلاش کرنے والوں کو دس بارہ ٹولیوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ٹولی کے ساتھ دو یا تین کتے تھے۔ اس کے علاوہ کم از کم دو مسلح افراد بھی ہر ٹولی میں شامل تھے۔ دو روز کی جاں گسل کوشش کے باوجود کامیابی کی صورت دکھائی نہیں دی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس مہم کے دوران عیسیٰ جان کے بھگوڑے ساتھیوں میں سے آٹھ دس افراد مع اپنے گھوڑوں اور اسلحے وغیرہ کے گرفتار ہوئے۔ اس کے علاوہ گھنے جنگل میں خرگوش، گوزن اور مارخور وغیرہ کا شکار بھی کیا جاتا رہا۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ساری پارٹیاں واپس آ گئیں۔ سب مایوس تھے لیکن سب سے زیادہ مایوسی صوبیدار مرجان خان کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ کبیر علی شاہ مرجان صاحب کا گہرا دوست تھا اور ان کے کہنے پر ہی اس مہم میں شریک ہوا تھا۔ اب اس کے بغیر واپس جاتے ہوئے مرجان صاحب اندیشوں کی چکی میں نہ پستے تو اور کیا ہوتا۔

O☆O

اگلے روز ہم پاراچنار جانے کے لیے سردار بشر گل وغیرہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن نجانے کیوں میرے ذہن میں ایک بے نام اندیشے کا سایہ رینگ رہا تھا۔ میری "کثرتِ بولنے والی" چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ جلد یا بدیر کوئی ناپسندیدہ واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ یہ واقعہ کیا ہو گا اور کب ہو گا یہ سب کچھ بے خبری کی دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اہلِ بستی نے ہمیں بڑی محبت سے رخصت کیا۔ خاص طور پر سردار بشر گل تو ہماری راہ میں بچھا جا رہا تھا۔ اس گرمجوشی کا ایک سبب وہ تین عدد رائفلیں بھی تھیں جو لڑائی میں ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ لشکر خاں سے مشورہ کر کے میں نے یہ سب رائفلیں سردار بشر گل کو سونپ دی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی بستی کا "دفاع" مضبوط کر سکیں۔ ان رائفلوں کے سبب بستی کا دفاع واقعی مضبوط ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہم نے بشر گل کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس مرتبہ موسم گرما شروع ہونے سے پہلے ہی پہاڑوں پر چلا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ڈاکو منظم ہو کر پھر بستی پر ہلا بولنے کی کوشش کریں۔ سردار نے ہماری یہ تجویز منظور کر لی تھی اور روانگی کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ وقتِ رخصت سردار بشر گل مجھ سے کچھ شرمسار نظر آیا۔ اس نے مجھے وہ رقم لوٹانے کی کوشش کی جو نجو کی رہائی کے عوض مجھ سے حاصل کی تھی لیکن میں نے رقم واپس لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر وہ یہ رقم لوٹانا ہی چاہتا ہے تو اسے اپنی بستی میں کسی اچھے کام پر صرف کر دے۔

ہمارا قافلہ پاؤندہ بستی سے پاراچنار کے لیے روانہ ہوا تو اس میں کم و بیش چالیس افراد شامل تھے۔ تقریباً ہر شخص کے لیے ایک گھوڑا موجود تھا۔ باربرداری کے چند خچر اس کے علاوہ تھے۔ لشکر خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہمیں کئی

میل آگے تک چھوڑنے آیا۔ وقتِ رخصت اس نے بے پناہ محبت اور یادگار گرمجوشی سے مجھے گلے لگایا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، پاراچنار افغان سرحد سے چند میل کے فاصلے پر ایک بارونق قصبہ ہے اور کرم ایجنسی کا انتظامی مرکز ہے۔ زوئے مشت کے اس دور دراز ویرانے سے پاراچنار کا سفر ہمارے لیے بے حد کٹھن تھا۔ اس طویل اور خشک سفر میں اس کے سوا کوئی دلچسپ واقعہ نہیں ہوا کہ قید ہونے والے ڈاکوؤں میں سے ایک "ناتھا" نامی شخص باپ بن گیا۔ اس کی چالیس سالہ رکھیل ناجاں نے راستے ہی میں ایک بچے کو جنم دیا۔ بچہ جو صرف بچہ تھا۔ نہ شیطان، نہ فرشتہ، نہ چور نہ قطب۔ اس سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں تھی اور اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ نفرت کرنے والے ناتھا کے اپنے ساتھی ہی تھے۔

ان لوگوں میں دو عورتیں بھی تھیں لیکن کسی عورت نے زچگی میں ناجاں کی مدد کی نہ زچگی کے بعد بچے کو ہاتھ لگایا۔ ایک پتھر کی اوٹ میں زچہ اور بچہ بے یار و مددگار پڑے رہے۔ آخر بچے کو سنبھالنے کے لیے نبیلہ آگے بڑھی۔ وہ ایک ماں تھی اور ممتا سے بھرپور تھی۔ اس نے بچے کو نہلایا دھلایا اور ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے آئی۔ خوش آواز لانس نائیک عباس خاں نے بچے کے کان میں اذان دی اور صوبیدار مرجان نے شہد میں تھڑی ہوئی انگلی اس کے منہ میں رکھ دی۔ میں نے دیکھا، ان تمام کارروائیوں کے دوران نجو کی نگاہیں بچے پر جمی ہوئی تھیں۔ عجب محویت تھی ان نگاہوں میں۔ وہ مستقبل کی ماں تھی۔ شاید اس کی بانہوں نے ابھی سے ایک بچے کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ ہم نے اس بچے کا نام بشارت رکھا۔ حقیقتاً یہ بچہ ہمارے لیے خوش قسمت ثابت ہوا۔ اس کی پیدائش سے ایک روز پہلے ہم راستے سے بھٹکے ہوئے تھے۔ شارٹ کٹ لگانے کے چکر میں صوبیدار مرجان صاحب ہمیں ایک الجھے ہوئے راستے پر لے آئے تھے۔ تاہم اس روز ہمیں وہ مین سڑک نظر آ گئی جو چند آبی نالوں سے گزرنے کے بعد پاراچنار جا نکلتی تھی۔

پاراچنار پہنچتے ہی ہم پانچوں یعنی میں، ایس پی برکت، نجو، نبیلہ اور ممتا نامی بچہ دوسرے لوگوں سے علیحدہ ہو گئے۔ پاراچنار میں ہمارا قیام لیوی کے ایک نائب صوبیدار کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہ حویلی نما مکان شہر کے ایک گنجان بازار میں واقع تھا۔ اس مکان میں فروکش ہوئے ہمیں دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایس پی برکت صاحب واپس لاہور جانے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میرا یہاں رکنا ضروری تھا۔ اس کی وجہ نجو تھی۔ نجو کے ہونے والے بچے کا باپ شہباز پہلوان یہیں پاراچنار میں تھا۔ واپسی سے پہلے میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس ملاقات کے لیے صرف دو تین گھنٹوں کی مہلت درکار تھی مگر ایس پی صاحب اتنی مہلت دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے روانگی کے آرڈر جاری کر دیے اور ہمیں ٹل تک پہنچانے کے لیے لیوی کی ایک اسپیشل جیپ بھی منگوا لی۔ اس جیپ میں میرے اور ایس پی کے علاوہ نجو، نبیلہ اور ممتے نے بھی سفر کرنا تھا۔ میں جانتا تھا اگر میں نے ایس پی صاحب سے دو تین گھنٹے کی مہلت مانگی تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے کوئی شخص صرف ایک لنگوٹا باندھ کر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ بحث و تکرار کے بجائے واک آؤٹ کر دیا جائے۔

ایس پی صاحب اندر کمرے میں میزبانوں کے ساتھ کافی پی رہے تھے۔ میں چونکہ "ہیڈ کانسٹیبل" تھا اس لیے باہر ایک ملازم کے ساتھ بیٹھا چائے نوش کر رہا تھا۔ نجو اور نبیلہ گھر کے زنان خانے میں تھیں۔ چائے ختم کرتے ہی میں نے زنان خانے کا رخ کیا۔ درمیانی دروازے پر دستک دی۔ ایک بوڑھی ملازمہ باہر نکلی۔ میں نے اسے نبیلہ کو بلانے کو کہا۔ چند لمحے بعد نبیلہ دروازے پر آ گئی۔ میں نے سرگوشی میں کہا "نبیلہ! نجو کو بلا لاؤ۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن گھر والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ یہی سمجھیں کہ تم باہر بازار سے کوئی چیز خریدنے جا رہی ہو۔ مثلاً کوہاٹی چپل، دنداسہ یا کشمش وغیرہ۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

نبیلہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ میں یونہی سے انداز میں ٹہلتا ہوا بیرونی گیٹ کی طرف آ گیا۔ شومئی قسمت "اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے برکت صاحب کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے گرجدار آواز میں مجھے اندر بلایا۔ "جی سر" میں نے اندر جا کر سلیوٹ مارا۔

وہ پنجابی میں بولے۔ "جی سر کے بچے! وہاں خالہ جی کی باغیچی میں ٹہل رہا ہے اور کوئی کام نہیں ہے تجھ کو؟"

"کام؟ کون سا کام جناب؟"

"وہ تمہاری ماں کھڑی ہے سامنے۔ اس کا پیٹرول چیک کرو، موبل آئل وغیرہ دیکھو۔ فالتو ٹائر کی ہوا بھی دیکھو ٹھیک طرح۔ ذرا ٹیوننگ تم نے ہی کرنی ہے۔ ابھی آدھ پون گھنٹے میں ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

ایس پی صاحب کا یہ نادر شاہی حکم جیپ کے بارے میں تھا۔ ان کا اندازِ گفتگو ہی یہی تھا۔ خود اپنے لیے بھی ایسے ہی "صاف ستھرے" الفاظ استعمال میں لاتے تھے لہٰذا غصہ کرنا بے وقوفی تھی۔ میں نے بھرپور کھناک سے سلیوٹ کیا اور باہر آگیا۔ جیپ کا دروازہ کھول کر اندر سے بونٹ اٹھایا اور باہر نکل کر انجن پر جھک گیا۔ اٹھے ہوئے بونٹ کی وجہ سے وہ "بھوتنی کی" کھڑکی اوجھل ہو گئی جہاں سے برکت صاحب نے مجھے تاڑا تھا۔ اس دوران نبیلہ اور نجو بھی باہر نکل آئیں۔ گھنا ان کے ساتھ تھا لیکن ایک اور عورت بھی تھی۔ یہ ادھیڑ بوڑھی ملازمہ تھی۔ حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے وہ نجو اور نبیلہ کو شاپنگ میں مدد دینے کے لیے آئی تھی۔ جونہی وہ تینوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں' میں بھی بونٹ کھلا چھوڑ کر باہر آگیا۔

بازار میں گھما گہمی تھی۔ دائیں جانب چالیس پچاس قدم آگے بازار مزید تنگ ہو جاتا تھا اور وہاں بیچ بیچ میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں اب پاؤنڈوں والا لباس اتار کر عام شلوار قمیص پہن چکا تھا۔ قمیص پر سیاہ جیکٹ تھی اور سر پر گول گرم ٹوپی۔ میں اس حلیے میں جنوبی پنجاب سے آیا ہوا لکڑی یا خشک میوے کا کوئی تاجر دکھائی دیتا تھا۔ سب مشین گن لیوی والوں نے واپس لے لی تھی۔ اب میرا ساتھی وہی ہمدم دیرینہ ساز اڑتیس بور کا ریوالور ہی تھا۔ میں نے اسے جیکٹ کی دائیں جیب میں رکھا ہوا تھا۔ بائیں جیب میں ایک ہاتھ ڈال لیا تھا اس لیے دونوں طرف کا ابھار برابر ہو گیا تھا۔

بڑھیا جونک کی طرح نجو اور نبیلہ سے چپکی ہوئی تھی۔ میں فوراً اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ از خود ایک طرف چلی گئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے نبیلہ نے کھسکنے پر مجبور کیا تھا۔ کیسے؟ یہ نبیلہ یا نجو نے نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے نبیلہ نے اسے عورتوں کے استعمال کا "مخصوص زیرِ جامہ" لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ظاہر ہے ایسی چیزیں ہر دکان سے دستیاب نہیں ہو جاتیں۔ جب تک بڑھیا واپس آتی' ہم کئی گلیاں کراس کر کے قصبے کے وسطی علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے یہاں لاری اڈے کا پتا دریافت کیا اور پک اپ پر سوار ہو کر لاری اڈے پہنچ گیا۔ پک اپ سے اترتے ہی سامنے ایک ہوٹل کے بورڈ پر نظر پڑی۔ "وزیری ریسٹورنٹ۔ طعام اور قیام کا بندوبست۔ سستے کمرے' گرم ٹھنڈے پانی کا انتظام" میں خراپ سے ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ نبیلہ اور نجو مقامی رواج کے مطابق سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ پنجابی ہیں' پٹھان ہیں' ملکی ہیں یا غیر ملکی۔ ایشیائی ہیں' یورپین ہیں اور سرے سے عورتیں بھی ہیں یا نہیں۔ صرف مجھے اور بچے کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا تھا کہ ہم پنجاب سے آئے ہیں۔

ہوٹل کے بوسیدہ کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر وزیرستانی براجمان تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا۔ میں نے اس سے تین بستر کا ایک کمرا طلب کیا۔ اس نے جواباً مجھ سے شناختی کارڈ مانگ لیا۔ میری جیب میں ہیڈ کانسٹیبل احسان الٰہی کا آئی ڈی کارڈ موجود تھا۔ میں نے نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس کارڈ نے جادو کی چھڑی کا کام کیا۔ ہوٹل والے نے بغیر کسی پوچھ تاچھ' مول تول اور لکھت پڑھت کے کمرے کی چابی ہمارے حوالے کر دی۔

یہ نیچی سی چھت والا مختصر کمرا' جھلنگا چارپائیوں' بوسیدہ لحافوں اور قلعی بھری دیواروں سے آراستہ تھا۔ تین چارپائیوں کے درمیان ایک بوسیدہ تپائی پڑی تھی۔ کسی زمانے میں اس تپائی پر پالش کی گئی ہو گی اور اس کی چولیں بھی مضبوط ہوں گی مگر اب تو یہ ایسی خستہ حال بڑھیا کے مانند تھی جو اٹھتے بیٹھتے کڑ کڑ بجتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے اس تپائی کا ذکر ذرا تفصیل سے کروں۔ اسے خودکار تپائی بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہ ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی۔ جونہی چائے کے برتن تپائی پر رکھے جاتے تھے' چائے دانی سے چائے خود بخود پیالیوں میں آنے لگتی تھی۔ اسی طرح سالن بھی اونگے سے پلیٹوں میں چلا آتا تھا۔ لقمہ توڑنے کے لیے دونوں ہاتھ استعمال کرنے پڑتے تھے۔ ایک ہاتھ سے لقمہ توڑا جاتا تھا اور دوسرے سے تپائی تھامی جاتی تھی۔ جہاں کسی نے اس اصول کی خلاف ورزی کی' تپائی فوراً ناراض ہو گئی اور جواد گرانے کا کوئی ایسا پینترا بدلا کہ اور رکھی ہوئی ہر شے تہ و بالا کر دی۔ وزیری ہوٹل کی وہ یادگار تپائی اب بھی میرے ذہن میں ہے اور اس کی یاد آتے ہی کئی لطیفے خود بخود ذہن کو گدگدانے لگتے ہیں۔ اس تپائی نے ہمارے چار روزہ قیام کے دوران جو آخری کارنامہ انجام دیا وہ یہ تھا کہ ہمارے ایک مہمان نے اس تپائی پر تشریف رکھنے کی حماقت کی اور تپائی نے اس کی تشریف پر ایسی خونچکاں چٹکی کاٹی کہ وہ کئی روز بلبلاتا رہا۔ اس مہمان کا ذکر آگے آئے گا۔

نجو' نبیلہ اور گڈے کو ہوٹل میں سیٹ کر کے میں شہباز پہلوان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اب شام کے سائے پھیل رہے تھے اور سردی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں

نے باہر نکلنے سے پہلے ایک بڑے کمبل کی بکل ماری۔ اس نے جہاں مجھے سردی سے محفوظ رکھا وہاں میری شناخت کو بھی دھندلا دیا۔ لاری اڈے کی طرف جاتے ہوئے میں ایس پی صاحب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان کی حالت کا تصور کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اگر میں اس وقت ان کے سامنے ہوتا تو یقیناً وہ وقفہ تین سو دو میں اندر ہو جاتے۔ تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انہیں بتائے بغیر موقعے سے غائب ہوا تھا اور ایسے وقت غائب ہوا تھا جب وہ میری غیر حاضری کسی طرح "فورا" نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے تصور میں انہیں دانت کچکچاتے اور سر کے بال نوچتے دیکھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے لیے بغیر کل کے لیے روانہ ہو چکے ہیں یا ابھی میرا انتظار کر رہے ہیں۔ بہرحال آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ وہ جس حال میں بھی تھے' میرے سامنے تو نہیں تھے۔

لاری اڈے پر پہنچ کر میں نے تکا فروش رحمان زئی کا کھوج لگانا شروع کیا۔ غلام خاں نے بتایا تھا کہ شہباز پہلوان کا پتا اس شخص سے لگ سکتا ہے۔ رحمان زئی کو ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا پٹھان تھا۔ دبلا پتلا اور ہوشیار چالاک۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی تھڑا نشین ہو گا مگر اس کی باقاعدہ دکان تھی۔ دکان میں لکڑی کے اسٹول اور میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ گاہک ان میزوں کے گرد بیٹھے خمیری روٹی اور گرما گرم تکے کھا رہے تھے۔ کچھ دیر قریب جوار کا جائزہ لینے کے بعد میں رحمان زئی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کچھ چونک سا گیا۔ "کیا بات ہے بھائی؟" اس نے پشتو کے لہجے میں اردو بولی۔ اس کی اردو سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ مجھے غیر مقامی کے طور پر پہچان چکا ہے۔

میں نے کہا "خان! تمہارا تھوڑا سا وقت چاہیے۔ بس پانچ منٹ۔"

اس نے ایک چینے کے ساتھ سیخ کبابوں کے نیچے انگاروں سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی پھر اپنے معاون لڑکے کو گدی پر بٹھایا اور صافی سے ہاتھ پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے لبِ سڑک ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چند رسمی فقروں کے تبادلے کے بعد میں اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے رحمان زئی کو بتایا کہ میں شہباز کا دیرینہ دوست ہوں اور اس کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔ شہباز پہلوان کا نام سن کر رحمان زئی کے چہرے نے رنگ بدلا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کرے گا۔ آئندہ ہونے والی گفتگو میں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ رحمان زئی پہلے تو صاف مکر گیا کہ وہ کسی شہباز کو جانتا ہے۔ جب میں نے شہباز پہلوان کا پورا تعارف کرایا اور غلام خاں وغیرہ کا ذکر کیا تو اس نے چونکنے کی اداکاری کی اور اقرار کیا کہ چند روز پہلے شہباز پہلوان سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بولا "اس کے ساتھ کوئی عورت مورت تھا۔ بس وہ ایک سیکنڈ کے لیے ادارا دکان کے سامنے ٹھہرا۔ سلام دعا کیا اور پھر ملنے کا کہہ کر آگے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ لوٹا ہی نہیں۔ معلوم نہیں کدھر گیا۔"

"اس بات کو کتنے دن ہوئے ہیں؟"

"خوام نے کوئی لکھ کر تو نہیں رکھا ہوا۔ بس ادارا خیال ہے دس بارہ یا چودہ پندرہ روز ہوا ہو گا۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ رحمان زئی سے کچھ اگلوا سکوں لیکن وہ بھی ایک خرانٹ تھا۔ الٹا مجھے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یعنی میں کہاں سے اور کیوں آیا ہوں۔ میں نے اپنی طرف سے ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ رحمان زئی مجھ سے جلد از جلد پیچھا چھڑا کر واپس اپنی گدی پر چلا گیا۔ بہت خشک مزاج بلکہ بداخلاق شخص تھا۔ میں سمجھ گیا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ جی تو یہی چاہا کہ الو کے پٹھے کو سیخ میں پرو کر کبابوں کے ساتھ لگا دوں لیکن پھر خود پر ضبط کیا اور ایک ٹھنڈا گلاس پانی پی کر آگے چل دیا۔

مجھے یقین تھا کہ شہباز پہلوان یہیں کہیں موجود ہے۔ کسی سرائے میں' ہوٹل میں یا ہو سکتا ہے کہ وہ رحمان زئی کے گھر ہی میں کہیں ہو۔ میں واپس لاہور جانے سے پہلے ایک بار اس کا گریبان پکڑنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے نجو جیسی سیدھی سادی لڑکی کو اس کے عزیز و اقارب سے سیکڑوں میل دور لا کر اس طرح دھوکا کیوں دیا۔ اپنی سوچوں میں گم میں یونہی چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص نے پہلو سے آکر میرا راستہ روک لیا۔

"السلام علیکم' پنجیر۔ جوڑ ہے۔" اس نے باقاعدہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کی حیرت زدہ نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ یوں لگا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا پہچان چکا ہے اور اب تذبذب میں ہے کہ اس نے صحیح پہچانا ہے یا نہیں۔ اپنی انگلی میری طرف اٹھا کر وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ "تم۔۔۔ تم جانی استاد تو نہیں ہو؟"

یہ ایک دھماکا خیز سوال تھا لیکن میں چونکہ پہلے سے تیار تھا لہٰذا اپنے چہرے کے تاثرات میرے اختیار میں رہے۔

میں نے الجھے ہوئے انداز میں نوواردکی طرف دیکھا۔ "کون جمالی استاد؟"

نووارد گڑبڑا گیا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم مضبوط اور پیشانی پر کسی تیز دھار آلے کا ایک زخم تھا۔ تاہم جسم کی چوڑائی کے مقابلے میں لمبائی بہت کم تھی اور اس خامی کے سبب اس کی شخصیت متاثر کن نہیں رہی تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی وہ مجھے کوئی جرائم پیشہ شخص نظر آیا۔ وہ خود بھی کشمکش میں جتلا تھا لہٰذا اب میں نے جمالی استاد ہونے سے صاف انکار کردیا تو وہ پریشان ہوگیا۔ پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑا سا بے پروا بھی نظر آنے لگا۔

"کون ہے تم؟" اس نے ذرا اکڑتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں لکڑی کا بیوپاری ہوں۔ سیالکوٹ سے آیا ہوں مال خریدنے۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو اور یہ جمالی استاد کا کیا چکر ہے؟"

وہ کچھ دیر مجھ تاڑنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا "خو تیرا صورت ایک جوئے خانے کے مالک شخص سے ملتا ہے۔ چار پانچ سال پہلے جب ام لاہور میں تھا تو اخباروں میں اس کا کئی تصویر دیکھا تھا ام نے۔ ان دنوں چھوٹا موٹا بدمعاش لوگ اس کے نام سے کانپتا تھا۔ کچی آبادی کی جس کنٹری میں ام رہتا تھا وہاں کے ایک سوالی کو اس نے مارا تھا۔ بہت بڑا غنڈا تھا وہ۔ ام نے وہ لڑائی نہیں دیکھا پر لوگ بتاتا ہے کہ اس غنڈے کا چھوٹا بڑا سب پیشاب کپڑے میں نکل گیا تھا۔"

باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم پٹڑی سے اتر گیا "لیکن تم یہاں کیا کررہا ہے۔ ادھر تو لکڑی کا کوئی کاروبار نہیں ہے۔ یہ کام تو آگے خراچی میں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "میں یہاں لکڑی خریدنے نہیں آیا۔ ایک دوست کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

وہ بولا "ام کو اس کا نام اور حلیہ حلیہ بتاؤ۔ شاید ام تمہارا کچھ مدد کرسکے۔" پھر ایک دم جیسے اس کے ذہن میں کوئی بات آئی اور وہ بری طرح چونک گیا، کہنے لگا "کہیں تم اس مسجد والے پہلوان کو تو نہیں ڈھونڈ تا؟"

مسجد والی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن "پہلوان" والا اشارہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔ میں نے کہا "ہاں وہی پہلوان۔ اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"شہباز نام ہے نا اس کا؟" نووارد نے میرے رہے سہے خدشات بھی رفع کردیے۔

"بالکل وہی۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ دیکھو۔۔۔ وہ سامنے مسجد نظر آرہا ہے؟ وہیں رہتا ہے۔"

میں نے دیکھا، قریباً سو گز دور گلی کے آخری سرے پر ایک مسجد کے مینار نظر آرہے تھے۔ یہ مسجد دو منزلہ تھی۔ مسجد کے نیچے بازار کی دکانیں تھیں۔ نووارد گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "خو، ابھی تو دروازہ بند ہوگا، امام صاحب باہر تالا لگا جاتا ہے۔ عشا کے ٹائم دروازہ کھلے گا تو مل لینا پہلوان سے۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ عشا کا وقت ہونے میں آدھ پونا گھنٹا باقی تھا۔ نووارد کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلوان کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔ میں اسے لے کر ایک قہوہ خانے میں آ بیٹھا۔ نووارد نے اپنا نام زریں گل بتایا۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "میں اس بازار کے نکڑ پر کپڑا رحمان زئی کا دکان ہے۔ یہ شہباز پہلوان یہاں آکر اس کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ پہلوان کے ساتھ اس کا عورت بھی تھا۔ نیا بیاہ کرلایا تھا اس کو۔ پر اس بدبخت عورت کا آنکھ پیچھے کسی کے ساتھ لڑا ہوا تھا۔ دو تین دن بعد ہی وہ اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گیا۔ جاتے جاتے پہلوان کا بہت سا سامان بھی لے گیا۔ پہلوان کا اب بُرا حال ہے۔ سارا دن مسجد میں پڑا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے۔"

یہ اطلاع میرے لیے بے حد حیران کن تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا پہلوان نے یہ شادی بڑے شوق سے کی تھی۔ سانولی سلونی نجو کو چھوڑ کر اس نے چم چم کرتی نوخیز دلہن خریدی تھی اور اس "کارِ خیر" میں دلہن نے بھی پوری آمادگی سے حصہ لیا تھا۔ پھر اچانک اس شادی کا دھڑن تختہ کیسے ہوگیا تھا۔ مجھے دال میں کالا نظر آرہا تھا۔ رحمان زئی نے جس طرح مجھے ٹرخانے بلکہ بھگانے کی کوشش کی تھی وہ بھی توجہ طلب بات تھی۔ اس نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ شہباز پہلوان سے اس کی ملاقات علیک سلیک تک محدود رہی تھی لیکن یہ زریں گل بتا رہا تھا کہ نوبیاہتا جوڑے نے اس کے گھر قیام کیا تھا اور وہیں سے یاسمین پہلوان کے منہ پر کالک مل کر بھاگی تھی۔

ابھی زریں گل سے میری گفتگو جاری تھی کہ دور فاصلے پر امام صاحب مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے نظر آئے۔ یہ سیڑھیاں چائے خانے کی ایک کھڑکی سے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ زریں گل نے بھی امام صاحب کو دیکھ لیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور چائے خانے سے نکل کر مسجد کی طرف چل دیے۔ ہمارے سیڑھیوں پر پہنچتے پہنچتے عمر رسیدہ امام

صاحب دروازہ کھول چکے تھے۔ سامنے ہی برآمدے میں مجھے ایک شخص لیٹا نظر آیا۔ وہ مقامی لباس شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر ایک بڑا سا صافا باندھ رکھا تھا۔ اس کا ناک نقشہ دیکھ کر ہی میں جان گیا کہ وہ شہباز پہلوان ہے۔ زریں گل نے آگے بڑھ کر پہلوان کا پاؤں ہلایا۔ وہ جاگ گیا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند سے جاگا تھا اس لیے کچھ دیر خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں شناسائی اور حیرت کے تاثرات ابھرے اور نمایاں ہوتے چلے گئے۔

نمازِ عشا کے بعد میں اور شہباز ایک حجرہ نما کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہ ساری مسجد لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ برفانی ہوا شالی جھروکوں سے اندر آتی تھی اور پوری مسجد میں گھوم جاتی تھی۔ تاہم حجرے میں قدرے سکون تھا۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے حجروں کی دو قطاریں صحن میں دونوں طرف موجود تھیں۔ شہباز نے بتایا کہ ان میں لوگ اعتکاف کے لیے بیٹھتے ہیں۔ قدیم نقش و نگار والے اس حجرے میں بیٹھ کر عجیب سی روحانیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ساری مناجات، دعائیں اور نیم شب کی سسکیاں اس حجرے میں رچی بسی تھیں جو گئے زمانے میں یہاں کی فضا میں ابھری تھیں۔ بڑی پُرانوار جگہ تھی یہ لیکن ہم اس جگہ کسی اور ہی طرح کی گفتگو کرنے کے لیے بیٹھے تھے۔ بہتر تھا کہ ہم یہ گفتگو مسجد سے باہر بیٹھ کر کرتے لیکن شہباز نے سخت سردی اور تیز ہوا میں مسجد سے باہر جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

وہ کچھ دیر غمناک صورت بنائے خاموش بیٹھا رہا پھر گہری سانس بھر کر بولا "حبیب یار! میں تو یہی کہوں گا کہ قدرت نے مجھے نجو سے بے وفائی کی سزا دی ہے۔ میں نے بڑا ظلم کیا ہے اس بے چاری پر۔ وہ کیا کیا سوچتی رہی۔ کیسے کیسے خواب دیکھتی رہی اور میں اس کا سب کچھ چھین کر رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح نکل بھاگا۔ کبھی کبھی تو سوچتا ہوں، یہ سزا بھی میرے لیے کم ہے۔"

میں نے پوچھا "لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ اور پھر اتنی جلدی! شادی کے چوتھے پانچویں روز ہی۔۔۔"

پہلوان نے سرد آہ بھری۔ "اس حرام زادی کا یار شادی کے روز سے ہمارے پیچھے تھا۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ ہمیں ایک رات بھی اکٹھا نہ رہنے دے مگر اسے موقع نہیں مل سکا۔ ہم بالز خیل سے روانہ ہوتے ہی ایک قافلے میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ قافلہ ہمارے ساتھ ہی یہاں پاراچنار پہنچا۔ یہاں رحمان زئی نے ہمیں گھر میں مہمان ٹھہرا لیا۔ رحمان زئی

پہلے لنڈی کوتل میں کباب بیچتا تھا اور میری اس سے وہیں جان پہچان ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ جب تک کرائے کا مکان نہیں ملتا ہم اس کے گھر میں رہ لیں۔ گھر میں رحمان زئی کی بیوی کے علاوہ تین بچے اور دو بھائی بھی رہتے ہیں۔ ان سب پر میری وجہ سے مصیبت آئی۔ ایک رات کسی نے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ ظاہر ہے یہ کام یاسمین کے عاشق نے کروایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس رات میرے بار بار کہنے پر بھی یاسمین نے کھانا نہیں کھایا۔ اس کے سوا باقی سارا گھر اگلے روز دوپہر تک بے سُدھ پڑا رہا۔ دوپہر کے وقت جب آنکھ کھلی تو یاسمین غائب تھی۔ وہ جاتے جاتے اس پورے کمرے کا صفایا کرگئی جس میں ہم رہ رہے تھے۔ زیور، کپڑا، نقدی، کچھ چھوڑ کر نہیں گئی وہ۔"

میں نے پوچھا "تم نے اسے تلاش نہیں کیا؟"

"نہیں حبیب یار!" پہلوان نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "لعنت بھیج دی میں نے اس بے حیا پر۔ رحمان زئی اور دوسرے لوگوں نے بہت کہا کہ رپورٹ کرتے ہیں مگر میں نے انکار کردیا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کام یاسمین کے عاشق کا ہے۔ میرا مطلب ہے آمنا سامنا ہوا ہے تمہارا اس سے؟"

"آمنا سامنا ہوا ہے حبیب یار! تب ہی تو پتا چلا ہے۔ جس روز ہم یہاں پاراچنار پہنچے اس سے اگلے روز وہ مجھے ڈاک خانے والے چوک میں روک کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی نشہ وغیرہ کررکھا تھا اس نے۔ کہنے لگا۔ میرا نام بندال خاں ہے۔ جس کے پیچھے پڑ جاؤں، قبر تک جاتا ہوں۔ یاسمین میری منگ ہے۔ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ وہ آؤٹ ہو رہا تھا۔ میں نے خواہ مخواہ تماشا لگانا ٹھیک نہیں سمجھا، کنی کترا کر آگے نکل گیا۔ وہ پھر میرے پیچھے آیا۔ بازو پکڑ کر بولا۔ بالز خیل کی لڑکی کو لے کر نکل جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ میں تمہیں دو روز کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد جو ہوگا اس کے ذمے دار تم ہوگے۔ میں نے اسے دھکے دے کر پیچھے ہٹایا اور رحمان زئی کی دکان پر آگیا۔ اسی رات یاسمین غائب ہوگئی۔۔۔"

اچانک حجرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ پہلوان نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر امام صاحب تھے۔ انہوں نے بڑے مشفق انداز میں شہباز پہلوان کو مخاطب کیا اور اطلاع دی کہ کوئی باہر اس سے ملنے آیا ہے۔ پہلوان مجھ سے "ابھی آیا" کہہ کر باہر نکل گیا۔ میں حجرے کی ملگجی تاریکی میں بیٹھا اپنے خیالوں میں گم۔۔ ہوان کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں

ہوئی۔ اندر آکر اس نے حجرے کو دوبارہ کنڈی لگا دی۔ کہنے لگا "میب یار! تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم رحمان زئی سے مل چکے ہو۔"

میں نے کہا "یہ تو تمہارے پوچھنے کی بات تھی کہ میں یہاں کیسے پہنچا۔"

وہ بولا "بس پریشانی میں دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔ ہاں بتاؤ رحمان زئی کا تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے غلام خان سے ہونے والی ملاقات کا احوال بتایا اور یہ بتایا کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا تاہم یہ بات میں نے گول کر رکھی کہ نجو بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ توجہ سے سنتا رہا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس نے کہا "ابھی جو شخص مجھ سے ملنے آیا وہ رحمان زئی ہی تھا۔ مجھے بتانے آیا تھا کہ ایک انجان شخص میرا پتا ڈھونڈتا پھرتا ہے' مجھے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

اس نیم روشن نیم گرم حجرے میں شہباز پہلوان سے میری گفتگو بہت دیر تک جاری رہی' یہاں تک کہ سرو رات سائیں سائیں کرنے لگی' اور چوبی مسجد کے خالی برآمدوں میں ٹکراتی ہوئی ہوا تند و تیز ہو گئی۔ آثار سے نظر آنے لگا کہ آسمان بادلوں سے ڈھک گیا ہے اور جلد ہی بوندا باندی شروع ہونے والی ہے۔ شہباز پہلوان اپنے ماضی قریب پر بے حد شرمسار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ساری گفتگو کا محور یہی بات تھی کہ اس نے نجو سے بے وفائی کی ہے اور اس بے وفائی کی سزا میں وہ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہے۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "شہباز! تم نے سب کچھ لٹایا ہے لیکن ایک نہایت قیمتی چیز ابھی تمہارے پاس ہے اور وہ ہے نجو کی محبت۔ نجو ابھی تک تمہاری بے وفائی سے بے خبر ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"یہ ہوا ہے۔" میں نے کہا "پاؤندہ بستی میں سب لوگ نجو کے لیے گونگے تھے اور وہ بھی سب کے لیے گونگی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ تم بغیر بتائے اچانک کہاں چلے گئے اور تمہارے جانے کی وجہ کیا تھی۔"

"لیکن میب یار! تم تو سب کچھ جانتے تھے۔"

"میں جانتا تھا لیکن میں نے بتایا نہیں۔ درحقیقت مجھے ہمت ہی نہیں ہوئی کہ میں یہ روح فرسا اطلاع اسے دے سکوں۔ وہ بے چاری تو رات دن تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ ہر روز ایک نئی امید کے ساتھ جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی ہو جاتی تھی اور اندھیرا چھانے تک کھڑی رہتی تھی۔"

شہباز نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور دیر گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ حجرے کی تاریکی میں ایک ساکت ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا "شہباز! اگر تم نیک نیت ہو تو میں ہوں قدرت نے تمہیں ایک سنہرا موقع دیا ہے۔ تم اس کی کلائی نجو کے آنسو پونچھ کر کر سکتے ہو۔ تم نے اسے بس دکھ دیے ہیں لیکن ان سارے دکھوں کا مداوا تمہاری پُرخلوص مسکراہٹ سے ہو سکتا ہے۔ تم اس کا سب کچھ تم بھی اسے اپنا سب کچھ بنا لو۔ اس سے نکاح کر لو اور خاموشی سے یہاں سے کسی شہر یا قصبے میں آباد ہو جاؤ۔"

شہباز بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میب یار! تم میری پردہ داری کر کے مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کن لفظوں میں تمہارا شکریہ کروں۔"

میں نے کہا "اگر واقعی شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو تو لفظوں سے نہیں اپنے عمل سے کرو۔ نجو کو وہ سب کچھ دو جو تم نے چھینا ہے۔"

وہ بولا "میب! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اس کا سامنا کروں۔"

میں نے کہا "اگر اسے چھوڑنے کی ہمت کر لی تھی تو اسے اپنانے کی ہمت بھی کرو۔ وہ تم سے زیادہ دور بھی نہیں ہے شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ وہ یہاں سے صرف تین چار فرلانگ کے فاصلے پر لاری اڈے کے ایک ہوٹل میں موجود ہے۔"

شہباز پہلوان واقعی حیران رہ گیا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ کس طرح اس کے آنے کے بعد سردار بشر گل وغیرہ نے نجو پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور سات ہزار روپے کے عوض اس کی شادی ایک بدقماش سے کی جا رہی تھی۔ پاؤندہ بستی میں ہونے والی لڑائی سے لے کر پارا چنار پہنچنے تک کے تمام چیدہ چیدہ واقعات میں نے شہباز پہلوان کو بتائے۔ وہ حیرانی کے عالم میں سنتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا "میب! مجھے نجو کے پاس لے چلو۔ میں اسے کھو کر بہت پچھتایا ہوں۔ میں خدا کے گھر میں بیٹھ کر قسم کھاتا ہوں کہ اب زندگی بھر اسے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

اس کی آواز جذبات سے رندھی ہوئی تھی۔ تاریکی میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا' میں صرف اس کے لب و لہجے سے اس کے تاثرات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ لب و لہجہ تو یہی بتا رہا تھا کہ وہ واقعی بہت پچھتا رہا ہے لیکن اگر وہ واقعی

رہا تھا تو پھر ابھی تک یہاں پارا چنار میں کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ اس نے مڑ کر نجو کی خبر تک نہ لی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ واپس نہ گیا تو نجو کسی پاؤندے کی زر خرید لونڈی بن جائے گی۔ نجو کے پیٹ میں اس کا بچہ تھا۔ اسے اپنے بچے کی بھی پروا نہیں ہوئی تھی۔

ہم فجر کی اذان تک اس حجرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب اللہ اکبر کی صدا یخ بستہ فضا میں بلند ہوئی تو امام صاحب ایک چراغ لے کر حجرے میں داخل ہوئے۔ وہ ہمیں جگانے آئے تھے لیکن ہم سوئے ہی کب تھے۔ انہوں نے چراغ ہمارے درمیان رکھ دیا۔ میں نے دیکھا شہباز پہلوان کی آستینیں وضو کے لیے اڑس رکھی ہیں۔

○☆○

میں نجو کو متحیر کرنا چاہتا تھا اس لیے نبیلہ کو اشارے سے روانہ کر دیا۔ نجو پہلو کے بل لیٹی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ منا کو خود سے لپٹائے باتیں کر رہی تھی۔ شہباز دروازے کی دہلیز پر آکر خاموش کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو نجو کون آیا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نگاہ شہباز پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا ہاتھ خودکار طور پر اپنے دوپٹے کی طرف بڑھا اور پلو سر پر آگیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو سے چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ شاید وہ اٹھ کر شہباز کے گلے لگ جائے گی لیکن پھر عورت کا فطری حجاب اس پر حاوی ہوا اور وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔

پہلوان نے آگے بڑھ کر بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "پاگلے! اب تو میں آگیا ہوں' اب کیوں روتی ہے۔ اچھا استقبال ہے بھئی' نہ جی آیاں نوں' نہ سلام نہ دعا اور رونا شروع کر دیا۔"

نبیلہ جان چکی تھی کہ یہی نجو کا گمشدہ گھر والا ہے۔ وہ بولی "بھائی صاحب! آپ نے ہماری بہن کو ستایا بھی تو بہت ہے۔ آپ کو کیا معلوم' مرد کے بغیر بے سہارا عورت پر کیا گزرتی ہے۔ کہاں رہ گئے تھے آپ؟"

"یہ لمبی کہانی ہے' اطمینان سے سنی سنائی جائے گی۔" میں نے گفتگو کا رخ موڑا۔ "فی الحال تو تم اپنی اس روتمند بہن کو چپ کراؤ۔ میں ذرا ناشتے وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ ناشتا لگنے سے پہلے پہلے سامنے والے گرم حمام ...

"ٹاری؟ یہ ٹاری کیا ہوتا ہے؟" نبیلہ نے پوچھا۔

"یہ ہوتا نہیں ہوتی ہے' تم انگلش میڈیم ہو تمہیں کیا پتا ہوگا' ٹاری جھٹ پٹ نہانے کو کہتے ہیں۔ پہلوان سے پوچھو' یہ تمہیں مزید تفصیل بتائے گا۔"

ان چاروں کو کمرے میں چھوڑ کر میں ہوٹل کے کاؤنٹر پر آیا اور وہاں کے اکلوتے بیرے کو ناشتے کا آرڈر دے کر حمام کی طرف لپکا لیکن نہانا میری قسمت میں نہیں تھا۔ ابھی میں ہوٹل کے اندر ہی تھا کہ ایک کریہہ سے کوتاہ قد زریں گل اٹھا اور لپک کر میرے راستے میں آگیا۔ "بھائی صاحب' ام رات بارہ بجے تک مسجد کے باہر کھڑا رہا لیکن آپ تو پھر ایسا اندر گھسا کہ باہر نکلنے کا نام نہیں لیا۔"

وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے وہ کوئی پلید چیز ہے اور اس کا مسجد میں گھسنا ممنوع تھا' میں نے کہا "اگر ایسی بات تھی تو تم اندر آجاتے۔"

"نہیں ایسا تو نہیں تھا' بس ویسا ہی بات تھا۔ ام نے سوچا تم باہر نکلے گا تو کچھ گپ شپ کرے گا۔ دراصل ... دراصل ام بہت حیران ہے تمہارا صورت دیکھ کر۔ خدا قسم' تم اس جہانی استاد کا جڑواں بھائی لگتا ہے۔ اگر اس کا تصویر ہمارے پاس ہوتا تو ام تم کو دکھاتا۔ تم خود حیران رہ جاتا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "فرض کرو' میں جہانی استاد ہوتا تو کیا کرتے تم۔"

وہ اپنی چوڑی چھاتی کو ہاتھ سے سہلا کر بولا "ام کیا کرتا' ام اس کا ہاتھ چوم لیتا۔ اس کو اپنی پلکوں پر بٹھا کر اپنے گھر لے جاتا۔ اس کا خاطر تواضع کرتا۔ وہ امارا ہیرو (ہیرو) ہے امارا دل کا جانی ہے۔ اس نے جس موالی کو مارا تھا وہ بڑا خطرناک غنڈا تھا۔ ام سے اس کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ ام سے کہتا تھا اس کنڑی میں رہنا ہے تو چوہے کا مانند رہو۔ جیسے سب دوسرا لوگ رہتا ہے۔ جھیل میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں ڈالا کرتے۔ خود کو مگرمچھ سمجھتا تھا خدا ای خوار۔ جہانی استاد نے اس مگرمچھ کا ایسا مرمت بنایا کہ دوبارہ اس نے کبھی اپنا منحوس صورت کسی کو نہیں دکھایا۔" پھر زریں گل اس واقعے کی تفصیل بتانے پر تل گیا۔ اس نے میری ایسی ایسی صلاحیتوں کا ذکر کیا جو واقعی مجھ میں ہوتیں تو میری بہت بڑی خوش قسمتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے میرے کچھ ایسے کارنامے بھی گنوائے جن سے میں خود بے خبر تھا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ ظاہر ہے مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ بہت باتونی تھا زریں گل اور مصیبت یہ تھی کہ وہ چودہ پندرہ منٹ

پہلے مجھ پر ایک احسان بھی کرچکا تھا (مجھے شہباز پہلوان تک پہنچانے والا وہی تھا) میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش تو کرسکتا تھا لیکن زبردستی پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتا جیسے سوچ رہا ہو شکل و صورت تو وہی ہے لیکن رعب داب جانی استاد والا نہیں کہاں وہ قاتلوں کا قاتل اور کہاں یہ بات بات پر مسکرانے والا شخص۔ گھنٹے سوا گھنٹے بعد جب میں زریں گل سے جان چھڑانے میں کامیاب ہوا تو ناشتے کے خالی برتن ہمارے کمرے سے باہر آرہے تھے۔

وزیری ہوٹل میں ہم نے ایک اور کمرا کرائے پر لے لیا۔ یہ کمرا پہلے کمرے سے ملحق تھا۔ اس نئے کمرے میں نجو، نبیلہ اور ثمنا شفٹ ہوگئے۔ پہلوان اور میں نے پہلا کمرا سنبھال لیا۔ زریں گل اور کباب فروش رحمان زئی بھی ہم سے ملنے آجاتے تھے۔ رحمان زئی اور زریں گل کے نزدیک میں شہباز پہلوان کا ایک کانسٹیبل دوست تھا اور پہلی بیوی سے شہباز کی صلح کرانے کے لیے یہاں آیا ہوا تھا۔ ہم اس ہوٹل میں کل چار روز ٹھہرے۔ اس دوران شہباز نے مستقبل کی مکمل منصوبہ بندی کرلی۔ ایک ہزار روپے کی رقم اس کے پاس کسی طور بچ گئی تھی۔ ایک ہزار روپیہ اسے اپنے دوست رحمان زئی سے قرض مل سکتا تھا۔ ہزار پندرہ سو روپیہ اسے ہم نے اکٹھا کردیا۔ شہباز نے فیصلہ کیا کہ وہ پاراچنار سے سدہ چلا جائے گا اور وہاں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کردے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے سسر یعنی غلام خاں سے خطرہ محسوس کررہا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سسر صاحب میرے ہی ہاتھوں راہئ عدم ہوچکے ہیں۔ میں نے اسے بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ پاراچنار میں نہ رہے۔ کسی دوسرے قصبے یا شہر میں چلا جائے۔

وزیری ہوٹل میں چار روزہ قیام کے دوران ایک اہم واقعہ بھی ہوا۔ ایک روز میں اتفاقاً پہلوان والی چارپائی پر لیٹا تو مجھے موٹے غلاف والے تکیے میں ایک ابھار سا محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا تو پہلوان اسی تکیے پر جھکا ہوا کچھ کررہا تھا۔ تجسس سے مجبور ہوکر میں نے غلاف اٹھا کر دیکھا۔ اندر پہلوان کی ایک پرائیویٹ چیز موجود تھی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ عام سی شے تین چار روز بعد کتنی اہم ہوجائے گی۔ اس شے کا ذکر ابھی آگے آئے گا۔ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد شہباز نے نجو کو اپنے بارے میں یہ بتایا کہ جس شب وہ جھونپڑے سے غائب ہوا اس جھونپڑے میں چوری کی واردات ہوئی تھی وہ مجرموں کا پیچھا کرتے ہوئے پاراچنار پہنچا اور یہاں الجھ کر رہ گیا۔ وضاحت سے مطمئن ہوگئی تھی۔ اب نجو اور شہباز میں بظاہر کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ ایک روز وہ نکاح خواں کو لے آیا۔ رحمان زئی نے چھوہاروں کے ساتھ ساتھ ایک عدد معتبر گواہ کا بندوبست بھی ہوٹل کے کمرے میں ہی نہایت خاموشی کے ساتھ شہباز نجو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

نکاح سے اگلے ہی روز ہم نے واپس لا[illegible] ٹھانی۔ جس وقت میں اور نبیلہ اپنا مختصر سامان باندھ رہے تھے زریں گل پھر ہوٹل میں آدھمکا۔ اس کے دل میں شک کسی طور نہیں جارہا تھا کہ میں جانی استاد یا اس کا قریبی رشتے دار ہوں اس روز بھی وہ مجھے اسی سلسلے میں کریدنے کے لیے ہوٹل آیا تھا۔ باتوں باتوں کے دوران بدقسمتی سے وہ ہمارے کمرے کی عجیب الخلقت تپائی پر بیٹھ گیا اور اسے ناقابل برداشت چٹکی کی سزا بھگتنا پڑی۔ اس کی پشت والی جلد تپائی کے دو تختوں کی درز میں آگئی اور اس بری طرح آئی کہ خون بہہ نکلا۔ اس سانحے پر سب کے آنسو آگئے۔ ہنس ہنس کر ہنسی مذاق کے اس ماحول میں ہی پہلوان شہباز اور زریں گل سے رخصت ہوگئے۔ زریں گل اور شہباز ان چار پانچ دنوں میں خاصے بے تکلف ہوگئے تھے۔ شہباز پہلوان کا خیال تھا کہ زریں گل ایک مخلص ہے اور ایماندار بھی۔ وہ کاروبار شروع کرنے میں زریں گل سے مدد لے گا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے حصے دار بنا لے۔

ہم بعد از دوپہر بذریعہ بس ٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ میں اور ثمنا دروازے کے پاس والی سیٹ پر تھے۔ ڈرائیور کے عقب میں ایک زنانہ سواری کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اس طرح چادر اوڑھے ہوئے تھی کہ چہرے کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جونہی بس پاراچنار سے نکلی میں نے کنڈیکٹر سے بس رکوانے کو کہا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ہم نے ٹل تک کا کرایہ دیا تھا اور پاراچنار سے نکلتے ہی اترنا چاہ رہے تھے۔ اس نے حیران تو ہونا ہی تھا۔ یہی حیرانی نبیلہ کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بہرحال ہم ادا شدہ کرایے سے کم سفر کررہے تھے نہ کہ زیادہ لہٰذا کنڈیکٹر نے اگلے اسٹاپ پر ہمیں اتار دیا اور جب میں نے کرایے کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا تو وہ مجھے ایسی نگاہوں سے

دیکھنے لگا جیسے کسی پاگل کو دیکھا جاتا ہے۔

نبیلہ بولی "یہ کیا کررہے ہیں آپ؟ یہ آخری بس تھی۔ آپ نے سنا نہیں ڈرائیور کیا کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا "جب ہم نے ٹل جانا ہی نہیں تو پہلی بس ہو یا آخری کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوکر بولی۔

میں ہاتھ کے اشارے سے ایک سوزوکی وین روک چکا تھا لہٰذا گفتگو یہیں ختم ہوگئی۔ وین والے نے پشتو میں پوچھا "کہاں جانا ہے؟" یقیناً یہی پوچھا ہوگا۔ میں نے فتح ہوٹل کا نام لیا۔ اس نے انکار میں سر ہلانا چاہا لیکن میرے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا۔ فتح ہوٹل پاراچنار کے جنوبی حصے میں تھا (اب تو شاید وہاں ایک مارکیٹ ہے) ہوٹل تک کا راستہ ہم سب نے خاموشی سے طے کیا۔ یہ ہوٹل ویسا ہی تھا جیسا ہم لاری اڈے کے علاقے میں چھوڑ کر آئے تھے۔ بس یہی غنیمت تھا کہ کمرے میں چار دیواریں پوری تھیں اور سر پر چھت موجود تھی۔ باقی بستر، کھانا، سروس سب کچھ رودیشا قسم کا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کو جوتے کی نوک پر رکھنے والا جانی استاد اور لکھ پتی پراپرٹی ڈیلر کی بیوی نبیلہ ایک نامعلوم بچے کے ساتھ اس سیلن زدہ ہوٹل میں ٹھہرنے پر مجبور تھے۔ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ کمرا میں نے ایک روز پہلے ہی بک کرالیا تھا لہٰذا وین سے اتر کر کمرے تک پہنچنے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کمرے میں پاؤں رکھتے ہی نبیلہ نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ کیوں؟ کون؟ کس لیے؟ اردو میں "ک" اور انگریزی میں "ڈبلیو" سے شروع ہونے والے سارے سوالیہ الفاظ اس نے مجھ پر استعمال کر ڈالے۔

میں نے کہا "نبیلہ! میں تمہاری دلی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ تم جلد از جلد اپنے بچوں کی صورتیں دیکھنا چاہتی ہو لیکن جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا انتظار اور کرلو۔ یہ مہینوں یا ہفتوں کی بات نہیں صرف دنوں کی بات ہے۔ دو یا تین دن۔ پھر ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

"لیکن کیوں؟ اب کس بات کا انتظار ہے آپ کو؟"

میں نے کچھ دیر نبیلہ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھا۔۔۔۔ فی الحال اس سے سنجیدہ بات کرنا بے مقصد تھا۔ وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کوئی بات مشکل سے ہی اس کی سمجھ میں آتی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بس۔۔۔ یونہی۔ ایک دو روز یہاں رکنے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے شادی کرانا ایک خوشگوار عمل ہے ایسے ہی نوبیاہتا جوڑے کو ہنستے کھیلتے دیکھنا بھی ایک خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ نجو کو رات دن آنسو بہاتے دیکھا ہے تو اب خواہش ہورہی ہے کہ اسے قہقہے بکھیرتے بھی دیکھوں۔"

وہ بولی "ایسی بات تھی تو پھر آپ ان سے رخصت ہی کیوں ہوئے؟"

"بس کبھی کبھی ایسے ہی انوکھا سا کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں کے درمیان ہوتے تو وہ بدستور شرمائے لجائے ہوئے رہتے۔ اب وہ خود کو آزاد سمجھیں گے اور خوب انجوائے کریں گے۔"

وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولی "اور آپ اس انجوائے منٹ کا مشاہدہ کیسے کریں گے؟"

"ابھی دور دور سے کروں گا اور کیسے کروں گا۔ انہیں پاراچنار میں گھومتے پھرتے شاپنگ وغیرہ کرتے دیکھوں گا۔"

وہ بولی "آپ بڑے بھونڈے طریقے سے مجھے بہلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں جانتی ہوں بات کوئی اور ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو شہباز پہلوان پر اعتبار نہیں۔"

"بات اعتماد کی نہیں اطمینان کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے جاؤں تو میرا دل پوری طرح مطمئن ہو۔"

"اور کیسے مطمئن ہوگا آپ کا دل؟"

"جوڑے کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر۔" میں نے پھر غیر سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی "مطلب یہ ہے کہ آپ کچھ نہیں بتائیں گے۔"

میں نے تردید کرنا ضروری نہیں سمجھا اور جھک کر آتشدان میں لکڑیاں جوڑنے لگا۔۔۔ اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے اسی کمرے میں بند ہوکر گزارے۔ باہر کوئی کام نہیں تھا ویسے بھی بہت سردی تھی۔ نبیلہ رہ رہ کر مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھنے لگتی تھی۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں جہاں چاہتا اسے لے جاسکتا تھا۔ جہاں چاہتا ٹھہرا سکتا تھا۔ وہ ایک ہی کمرے میں میرے ساتھ رات گزارنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی لیکن میرا موجودہ رویہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔

اگلے روز شام سے تھوڑی دیر پہلے زریں گل ہمارے کمرے میں پہنچا۔ اس نے منہ سر کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ سخت سردی کے سبب اس کی ناک اور رخسار ہمیشہ سے زیادہ سرخ نظر آتے تھے۔ اس کمرے کا نام میں اسے بتا چکا تھا لہٰذا اسے یہاں پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ نبیلہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

میں نے پوچھا "ہاں بھئی زریں گل کیا رپورٹ ہے؟"
وہ بولا "ابھی تک تو رپورٹ بالکل ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ ام کو تو کوئی ایسا بات نظر نہیں آیا۔ کل شام شہباز پہلوان اپنی لی لی کو لے کر ہوٹل سے نکلا تھا۔ انہوں نے بازار سے ایک دو چیز خریدا۔ پھر رحمان زئی کا رکان سے روسٹ چرغا لیا اور واپس چلا گیا۔ آج صرف پہلوان باہر نکلا تھا اور وہ بھی صبح کے وقت۔ اس نے حمام سے شیو وغیرہ بنوایا اور نہا دھو کر واپس چلا گیا۔"
میں نے کہا "ٹھیک ہے تم اپنا کام جاری رکھو۔ دن میں ایک آدھ بار ویسے بھی مل لیا کرو شہباز سے۔ اسے ذرا ٹٹولنے کی کوشش بھی کرو لیکن یہ کوشش بڑی احتیاط سے ہونی چاہیے۔"
"ام کو زیادہ سمجھانے کا ضرورت نہیں ہے بھائی صاحب۔ ام سب کچھ سمجھتا ہے۔ ام آج بھی ملا تھا پہلوان سے ڈیڑھ دو گھنٹا گپ شپ ہوتا رہا ہے۔"
ہماری اس گفتگو کے دوران نبیلہ بھی کمرے میں ہی تھی۔ اب بات اس پر کافی حد تک واضح ہو چکی تھی اس لیے وہ مطمئن نظر آتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں شہباز پہلوان پر اعتبار کر کے بھی اعتبار نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک کانٹا سا میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کانٹا نکل جائے اور میں اطمینان کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو سکوں۔ میں نے زریں گل کو دو روز پہلے اعتماد میں لے کر بتا دیا تھا کہ میں حقیقت میں پاراچنار سے روانہ نہیں ہو رہا۔ میں نے پوری بات سمجھانے کے بعد اسے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے پہلوان کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔
اگلے روز رات گئے تک میں انتظار کرتا رہا لیکن زریں گل نے صورت نہیں دکھائی۔ اس سے اگلے روز بھی وہ شام تک نہیں آیا۔ شام کے بعد میں خود باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ آدھمکا۔ اس کا قد پانچ فٹ سے کچھ کم ہی رہا ہوگا۔ بھاری بھرکم کمبل کی بُکل مار کر وہ بالکل ہی گول مٹول نظر آنے لگتا تھا۔ چال بھی کچھ ایسی ہی اوٹ پٹانگ تھی۔ لگتا تھا گیند لڑھکتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے اس کے لیے گرما گرم قہوہ منگوایا۔ گرما گرم قہوہ پیتے ہوئے اس نے ٹھنڈی ٹھار خبریں سنائیں۔ اس نے بتایا کہ پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں کوئی ایسا موقع نہیں ملا جس کی بنا پر پہلوان پر شک کیا جا سکے۔ ان اڑتالیس گھنٹوں میں تو پیا بتا جوڑا زیادہ تر کمرے میں ہی بند رہا ہے۔ کل صرف دو مرتبہ پہلوان باہر نکلا تھا۔ ایک دفعہ نہانے اور شیو بنانے کے لیے دوسری مرتبہ میڈیکل اسٹور سے سر

درد کی دوا لینے کے لیے۔ زریں گل نے کہا "بھائی صاحب آج ام خود بھی پہلوان سے ملا تھا۔ ڈھائی تین گھنٹے تک کا بازی لگایا ہے ام نے۔ اماری بات کا برا مت ماننا یار، امارا خیال ہے کہ تم بالکل فضول میں اس پر شک کر رہا۔ دل کا حال تو اللہ جانتی ہے لیکن وہ ام کو برا نہیں لگتا۔ آج ہم سے کاروبار کا باتیں کرتا رہا۔ وہ چاہتا ہے کہ سترہ میں ایسا کاروبار کر لیا جائے جس میں بھاگ دوڑ زیادہ نہ ہو اور سکون کا روزی ملے۔"
زریں گل گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ہمارے پاس رکا پھر جانے کے لیے اٹھ گیا۔ میں نے خرچے کے لیے ڈھائی تین سو روپے زبردستی اس کی جیب میں رکھ دیے۔ مجھے امید نہیں تھی اب کل شام سے پہلے زریں گل دوبارہ اپنی صورت دکھائے گا لیکن ایک ہی گھنٹے بعد جب وہ پھر ہوٹل میں آدھمکا تو میں حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ حواس ہو رہا تھا۔ غالباً وہ بھاگتا ہوا آیا تھا اس لیے کچھ ہانپ رہا تھا۔ میری اس سے ملاقات برآمدے میں ہی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے بازو سے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ کہنے لگا "بھائی صاحب! ایک بالکل خاص خبر ہے آپ کے لیے۔"
"کیسی خبر؟"
"ابھی تھوڑی دیر پہلے ام نے الف خاں کو پہلوان کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔ آپ جانتا ہے الف خاں کو؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا "بڑا بدمعاش آدمی ہے یہ بردہ فروشی کرتا ہے۔ اس کا روزگار یہی ہے۔ ام تو حیران ہے کہ پہلوان کے ساتھ اس کو کیا کام ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کا خیال ٹھیک ہی ہو۔ اگر پہلوان الف خاں جیسے بندے سے مل سکتا ہے تو پھر وہ ہر بُرا کام کر سکتا ہے۔"
میں نے پوچھا "اب وہ الف خاں کہاں ہے؟"
زریں گل بولا "ام اسے پہلوان کے کمرے میں چھوڑ کر آیا ہے۔ امارا خیال ہے ابھی وہ ادھر ہی ہوگا۔"
میں نے جیکٹ تھپتھپا کر جیب میں ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کیا پھر کمرے میں جا کر نبیلہ کو بتایا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں لوٹتا ہوں، وہ اندر سے کنڈی چڑھا لے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور فتح ہوٹل سے نکل آیا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔
ٹھیک سوا نو بجے ہم وزیری ریسٹورنٹ کے سامنے پک اپ سے اتر رہے تھے۔ نیلے رنگ کی ایک ہنڈوین ریسٹورنٹ کے دروازے پر کھڑی تھی۔ زریں گل نے اشارے سے بتایا کہ الف خاں اسی وین میں پہنچا ہے۔ میں نے زریں گل سے

کہا کہ اب وہ جائے۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔
وہ بولا "کیا کرے گا تم؟"
"جاؤ۔" میں نے غرا کر کہا۔
وہ ایک دم گھبرا سا گیا۔ پھر دائیں ہاتھ گھوم کر ایک تاریک گلی میں روپوش ہو گیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ پہلوان سے وابستہ تمام خوابیدہ خدشات جاگ اٹھے تھے اور چیخ چلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وزیری ہوٹل میں قیام کے دوران میں یہاں کے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ ہوٹل کے عقب میں ایک کھائی نما ڈھلوان تھی۔ سبزے سے ڈھکی ہوئی اس کھائی میں بازار کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس کھائی کی طرف سے ہوٹل میں داخل ہونا اور دوسری منزل تک پہنچنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ شاید میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ وزیری ہوٹل میں ہمارے کمرے دوسری منزل پر تھے۔ کمروں کی عقبی کھڑکیاں ایک متروک راہداری میں کھلتی تھیں۔ اس راہداری میں ہوٹل کا گرد آلود کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔
میں گھوم کر ہوٹل کی عقبی سمت میں پہنچا۔ یہاں ایک پتھریلی سلائیڈ سی تھی جو اندازاً دس فٹ کی بلندی پر چلی گئی تھی۔ اس سلائیڈ پر چڑھ کر راہداری میں کودنا مشکل تو نہیں تھا لیکن کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنا بھاری بھرکم کمبل اتار کر ایک کھو کے نیچے رکھا پھر اپنے جوتے اور جرابیں بھی اتار دیں۔ چکنی ملائم سلائیڈ پر چڑھنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاؤں میں جوتے نہ ہوں۔ ننگے پاؤں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا میں سلائیڈ کے بالائی سرے پر پہنچ گیا۔ ایک جھٹکے سے میں نے میرے دونوں ہاتھ راہداری کی بیرونی منڈیر پر ٹکا دیے۔ یونہی ہوا میں لٹکے لٹکے میں نے راہداری سے ابھرنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کی۔ یہ ایک ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ راہداری میں کوئی آواز تھی ہی نہیں۔ میں نے بازوؤں پر اپنا جسم اوپر اٹھایا اور منڈیر سے گزر کر راہداری میں پہنچ گیا۔
سردی کے سبب ہوٹل کے مکین سرِ شام ہی کمروں میں بند ہو چکے تھے۔ راہداری میں چھ کمروں کی عقبی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ ان میں سے صرف دو کھڑکیاں روشن نظر آ رہی تھیں۔ اور یہ وہی کمرے تھے جو تین روز پہلے تک ہمارے زیرِ استعمال رہے تھے۔ میں لکڑی کے کھردرے فرش پر دبے پاؤں چلتا ایک کمرے کی کھڑکی پر پہنچا۔ اندر ایک ٹرانسسٹر ریڈیو کی کھڑکھڑ گونج رہی تھی۔ کوئی دور دراز کا اسٹیشن ٹیون کیا گیا تھا جہاں سے ابھرنے والی آوازیں لہروں کے شور میں ڈوب

کر رہ گئی تھی مگر ریڈیو سننے والے کو یہ خیال نہیں تھا کہ وہ کوئی دوسرا اسٹیشن لگائے یا سوئچ آف کر دے۔ میں نے اندازہ لگایا کمرے میں جو کوئی بھی ہے وہ سو رہا ہے۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن کمرے کا اندرونی منظر دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تاہم یہ ناکامی اس وقت کامیابی میں بدل گئی جب میں نے راہداری کی اگلی کھڑکی پر طبع آزمائی کی۔
یہ اس دوسرے کمرے کی کھڑکی تھی جہاں پہلوان اور میں رہتے تھے۔ میرے اور نبیلہ کے چلے جانے کے بعد پہلوان کو دو کمروں کی ضرورت نہیں تھی مگر معلوم نہیں کیوں ابھی تک اس نے دونوں کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ میں نے کھڑکی کی ایک جھری سے آنکھ لگائی تو صرف تین چار فٹ کے فاصلے پر مجھے پہلوان بیٹھا نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ لمبوترے چہرے اور چمکیلی آنکھوں والا ایک لمبا تڑنگا پٹھان بیٹھا تھا۔ عام پٹھانوں کے برعکس اس شخص کا رنگ زیادہ سرخ و سفید نہیں تھا۔ یقیناً یہی الف خاں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ الف خاں شہباز سے اردو میں ہی بات چیت کر رہا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دوسرے کمرے میں نیو سو رہی تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی گفتگو کا کوئی لفظ اس کے کانوں میں پڑے۔ انہوں نے دونوں کمروں کی درمیانی دیوار سے بھی حتی الامکان فاصلہ رکھنے کی کوشش کی تھی (کیونکہ یہ دیوار لکڑی کی تھی) اور اس کوشش میں وہ کھڑکی سے بالکل قریب ہو گئے تھے۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رات کو اس وقت کوئی اس تاریک راہداری میں موجود ہوگا اور کھڑکی سے کان لگا کر ان کی باتیں سنے گا۔ الف خاں کہہ رہا تھا۔ "زیادہ [illegible]
اور ہم تو نہیں مچائے گی؟"
پہلوان نے کہا "میں نیند کی دوا لے آیا ہوں آج [illegible] دوائیوں کی دکان سے۔ تین چار گولیاں کھلا دوں گا چھ گھنٹے [illegible] کے لیے بالکل مٹی بن جائے گی۔"
الف خاں نے کہا "میں بعد کی بات کر رہا ہوں۔ وہ پہلے [illegible] رالی چھک چھلو تو ایک فتنہ تھی۔ چوبیس گھنٹے تک اس نے [illegible] سینے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیا۔ دولتیاں جھاڑ جھاڑ کر ستیا ناس [illegible] کر دیا میرے ایک بھلے مانس گاہک کا۔"
"لڑکی بھی تو نگینہ تھی الف خاں۔ پورے باگڑ خیل کی [illegible] ملائی اتار کر لے آیا تھا میں۔۔۔ اور تمہیں پتا نہیں ہے اس [illegible] کے باپ کا۔ بڑا تیز طرار شخص ہے وہ۔ پندرہ ہزار تو کیا کوئی [illegible] ایسے بندے سے پندرہ لاکھ میں بھی دشمنی مول نہ لے۔ بس [illegible] ہمارا ہی جگرا ہے۔ سانپ کے منہ سے موتی لائے اور پندرہ [illegible]

چھکوں کے بدلے تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا۔"

الف خاں بولا "تیری کیا بات ہے شہباز، تیرا تو ہر سودا موتی ہوتا ہے۔ ایک یہ موتی ہے جو ساتھ والے کمرے میں پڑا ہے۔ اس کالی کلوٹی کا بھی تو پندرہ ہزار مانگ رہا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کر۔ یہ علاقہ غیر ہے۔ ایسا دانہ تو لاہور میں بھی آٹھ دس ہزار میں ہاتھ آجاتا ہے۔" الف خاں روانی سے اردو بولتا تھا۔ لگتا تھا کافی عرصہ پنجاب میں رہا ہے۔

شہباز نے بدمعاشوں کے مخصوص انداز میں چرس بھرا سگریٹ مٹھی میں دبا کر طویل کش لیا اور بولا "الف خاں! استاد بنتے ہو لیکن مال کی پہچان نہیں ہے تمہیں۔ گھوڑے کے کتنے رنگ ہوتے ہیں لیکن رنگ کوئی نہیں دیکھتا۔"

"جانے رے یار۔" الف خاں بیوپاریوں کے لہجے میں بولا "چچوڑی ہوئی گنڈیری میرے منہ میں دے رہا ہے تو اور وہ بھی حد بالا کی قیمت پر۔"

"چچوڑی ہوئی گنڈیری نہیں ہے یہ۔" پہلوان بولا "رس سے بھرا ہوا گنا ہے۔ تم چپکے بقیہ بات کر رہے ہو، ہم نے چکھا ہے۔ قسم اوپر والے کی نشہ ہی نشہ ہے سر سے پاؤں تک۔"

الف خاں نے کہا "کچھ بھی ہے، بارہ ہزار سے زیادہ میں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔" پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولا "اور ہاں وہ مولوی گوہر امان والی لڑکی کا کیا بنا؟"

"وہ تو سارا دھندا ہی چوپٹ ہو گیا یار۔" پہلوان نے تاسف سے کہا "میں تو اب مولانا کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ مسجد کے قریب سے گزروں گا تو وہ اپنے شاگرد پیچھے لگا دیں گے۔"

"کیوں تم نے ان کی بکری چوری کر لیا ہے؟"

"یار! بکری چوری کر لیتا تو بات بھی تھی۔ بکری بھی کھلے سے بندھی رہی، مفت میں تین سو روپیہ بھی گیا اور بدنامی علیحدہ۔"

"تین سو روپیہ۔۔۔؟ وہ کیسے؟"

پہلوان نے ایک آنکھ دبائی۔ "بس چندہ دیا تھا مسجد میں۔۔۔ دل کے سکون کے لیے۔۔۔ بیوی جو بھاگ گئی تھی۔ بے سکونی تو ہونا ہی تھی۔ پر سکون پھر بھی نہیں ملا۔ اوپر سے وہ مسکینوں کا ہمدرد، سلطانے ڈاکو کا سالا، شاہ جہاں بھی بھاگیا۔"

"یار! ویسے گوہر امان کی بیٹی تھی نگینہ۔"

"چلو پھر بھی سہی۔ کسی اور چکر میں لے آئیں گے اسے۔"

"اب مشکل ہے شہباز۔ گوہر امان ایک سوراخ سے دوسری بار نہیں ڈسا جائے گا۔ معلوم نہیں پہلے اس نے کیسے تم پر اتنا اعتبار کر لیا۔ سنا ہے ایک دو دفعہ وہ تمہیں گھر بھی لے گیا تھا۔"

"ایک دو دفعہ نہیں پانچ چھ مرتبہ۔ اس کی گھر والی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ بیٹا جی! ہم تمہارا گھر پھر آباد کریں گے۔ تم اپنے وطن سے ہجرت کر کے آیا ہے اور مہاجر سے اچھا سلوک کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ بھی دیتی ہے۔۔۔ سالی مولویانی۔"

الف خاں نے ایک گہری سانس لی۔ "اچھا مہاجر صیب! اب میں چلتا ہوں۔ پرسوں ہی ملاقات ہوگی، تم سارا کام تیار رکھنا۔"

"بالکل تیار ہوگا۔ لیکن پیسے میں گڑبڑ نہیں کرنا۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں۔۔۔ پورا بارہ ہزار گن کر دوں گا۔"

"بارہ نہیں ہوگا الف خاں۔" بھاؤ تاؤ کے جوش میں پہلوان کی آواز بلند ہو چکی تھی۔

"ہوگا کیوں نہیں، تمہارا باپ بھی کرے گا۔" الف خاں ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پہلوان اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائے کچھ دیر کرسی پر بیٹھا رہا۔ سگریٹ کے تین چار گہرے کش لے کر اس نے ٹکڑا ایڑی تلے مسلا۔ پھر دونوں بازو اوپر اٹھا کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ بہت مطمئن اور سرشار دکھائی دے رہا تھا وہ۔ غالباً سوچ رہا تھا کہ تیرہ ساڑھے تیرہ ہزار میں سودا پٹ ہی گیا ہے۔ میری نگاہیں پہلوان کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کے اندر کو مڑے ہوئے چمکیلے دانت اس کی غیر معمولی قوت ارادی کو ظاہر کرتے تھے۔ بے ڈول پہلوانوں کی طرح اس کا چہرہ بھدا نہیں تھا بلکہ وہ خاصا پرکشش دکھائی دیتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو پیدائشی طور پر اپنی مٹھی میں گیدڑ سنگھی لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ لگتا تھا پہلوان اپنی یہ "گیدڑ سنگھی" عورتوں پر آزمانے کا فن اچھی طرح سیکھ چکا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک کرسی پر بیٹھا اپنی چوڑی چکلی چھاتی پر ہاتھ مارتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ قہوے کے برتن مسہری سے اٹھا کر اس نے لنگڑی تپائی پر رکھے۔ پھر ایک نظر کھڑکی کی کنڈی پر ڈالی اور مطمئن ہو کر کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ یقیناً وہ کمرا مقفل کر کے ساتھ والے کمرے میں جا رہا تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راہداری میں بھاگتا ہوا سامنے کی طرف آیا۔ مجھے اب چھ کمروں کے چھ بند دروازے نظر آرہے تھے۔ برآمدہ خالی تھا۔ پھر مجھے پانچویں کمرے کے دروازے پر ایک ہیولا نظر آیا۔ بلاشبہ وہ پہلوان تھا۔ میں

لکڑی کے فرش پر ننگے پاؤں بھاگتا ہوا اس کے سر پر پہنچا۔ وہ کمرے سے نکل کر دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ میں نے عقب سے اس کی گردن دبوچی اور دھکیل کر پھر کمرے میں لے گیا۔ یہ بڑی مضبوط اور تکلیف دہ گرفت تھی۔ پہلوان کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ دائیں جانب لائٹ کا سوئچ تھا۔ میں نے ہاتھ مار کر سوئچ آن کیا اور پھر فوراً ہی دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

میری اس کارروائی کے دوران شہباز میری گرفت میں مچلتا رہا لیکن پھر اچانک اس کا داؤ چل گیا۔ اپنے بھاری بھرکم جسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اچانک مجھے پشت کے بل مسہری پر گرا دیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میرا سر بھرپور طریقے سے دروازے والی دیوار سے ٹکرایا اور پہلوان کی گردن پر میری گرفت نرم پڑ گئی۔ پہلوان نے پورا زور لگا کر گردن چھڑانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اگر اسے پہلے پتا چل جاتا کہ یہ عارضی کامیابی کتنی مہنگی پڑے گی تو شاید وہ کبھی یہ کوشش نہ کرتا۔ اس کی گردن اتنی بری طرح مسلی گئی تھی کہ وہ فوری طور پر سیدھا کھڑا نہیں ہو سکا۔ میں نے اس ایک ساعت کی مہلت سے فائدہ اٹھایا اور میری ٹانگ پورے زور سے پہلوان کے پیٹ پر پڑی۔ وہ لڑکھڑا کر لازمی طور پر ہوٹل کی چوبی تپائی پر گرا اور اسے شہید کر گیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ پُرشور آواز سے فرش پر گرتا میں نے اسے پھر لپک لیا۔ اس کا بایاں بازو میری گرفت میں آیا۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں یہ بازو دو جگہ سے توڑ ڈالا۔ پہلوان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کا سر زمین سے لگا ہوا تھا اور اپنے مڑے ہوئے بازو کے سبب وہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے سے معذور تھا۔ میں نے جیکٹ سے ریوالور برآمد کر کے اس کی کنپٹی سے لگا دیا "خبردار حرامی! آواز نکالی تو گولی مار دوں گا۔"

چند لمحے میں اور پہلوان بالکل ساکن حالت میں رہے۔ میں پہلوان کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ فی الحال وہ مزاحمت ترک کر چکا ہے تو میں نے اس کا بازو چھوڑا اور چند قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اپنے شکستہ بازو کو سیدھے ہاتھ سے تھام کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی گردن پر ضرب آئی تھی لیکن بازو کی زیادہ سخت ضرب نے گردن کی تکلیف اسے بھلا دی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں تحیر، تکلیف اور غصے کے جذبات گڈمڈ تھے۔ کبھی ایک جذبہ نمایاں ہو جاتا تھا تو کبھی دوسرا۔ "کیا بات ہے؟" وہ عجیب پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"تیری ماں کا سر۔" میں نے کہا "ریوالور کے ساتھ کھڑا ہو جا ورنہ عمر بھر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔" میرے لہجے سے جھلکتی درندگی نے اسے سراپا لرزا دیا تھا لیکن بندہ ڈھیٹ تھا، اکڑا کھڑا رہا۔ ہاں تھوڑا سا پیچھے ضرور کھسک گیا۔ میرا ریوالور اس کی کھوپڑی کی طرف سیدھا تھا۔ میرے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ پہلوان سے مختصر زور آزمائی کے دوران جو آوازیں پیدا ہوئی تھیں وہ ہوٹل میں موجود لوگوں کو اس کمرے کی طرف کھینچ سکتی تھیں۔ خاص طور پر ساتھ والے کمرے میں نجو کا باخبر ہونا تو عین ممکن تھا۔ میں تھوڑی دیر سن گن لیتا رہا۔ پھر قدرے مطمئن ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ دائیں طرف والے کمرے غالباً خالی تھے۔ جہاں تک نجو کا تعلق تھا، اس کے بارے میں بعد ازاں پتا چلا کہ وہ خواب آور دوا کے زیر اثر تھی۔ پہلوان کا زخمی بازو تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے ہونٹ سفید ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "حرامزادے! تو کیا سمجھتا تھا کہ میں نجو کو تیرے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"کک۔۔۔ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"کتنے میں بیچا ہے غلام خاں کی بیٹی کو؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے کہا "اس کتے الف خاں کے ساتھ تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں میں نے۔ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ عورتوں کا بیوپار کرتا ہے تو۔ تیری سب سے کم سزا یہ ہے کہ تجھے ایک کھلے میدان میں بٹھایا جائے اور تجھ پہ بھی ڈال کر بھوکے کتے چھوڑ دیے جائیں۔" میں نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی ٹانگوں کے درمیان ماری۔ وہ تڑپ کر گھٹنوں کے بل گرا اور اپنا اکلوتا ہاتھ گود میں بھینچ کر بل کھانے لگا۔ چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ میں چہرے کے تاثرات سے اس کے دل کا حال پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک بھرپور کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن اوپر تلے پہنچنے والی جسمانی ضربات نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ریوالور کی موجودگی میں کوئی کارگر حملہ کر سکتا۔ خاص طور پر ٹوٹے ہوئے بازو کی تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ اور پھر یکدم اس نے ہمت ہار دی۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دیکھو صیب یار! میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ جو بھی بات ہے وہ ہم انسانوں کی طرح طے کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "بہت ڈھیٹ ہو کر اب بھی خود کو انسان سمجھ رہے ہو۔ میرے خیال میں تم دو ٹانگوں والے بھیڑیے ہو اور بھیڑیوں کو مارنا میرا پرانا مشغلہ ہے۔" فقرے کے آخری الفاظ ادا کرتے کرتے میری آواز کچھ بھیانک سی ہو گئی تھی۔ شہباز پہلوان سرتاپا لرز گیا۔ اس کی نگاہیں خود بخود میرے ریوالور پر جم گئیں۔ میرے لہجے میں اسے فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ میرے اس بدلے ہوئے روپ کو اس نے بے پناہ حیرت سے دیکھا اور جیسے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے یقین ہو گیا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ روئے زمین کے بدترین پیشے میں ملوث تھا۔ اس میں وہ جرأت کیسے آسکتی تھی جو کسی شخص کو موت کے روبرو بھی سربلند رکھتی ہے۔ وہ ایکدم گھگیانے لگا۔

"مجھے مت مارنا استاد! تم جو کہتے ہو میں کرنے کو تیار ہوں۔ میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "پہلوان! تمہاری "زبان" وہ نہیں جس سے قسم لی جاتی ہے۔ یہ کاٹ کر بھوکے کتوں کے آگے پھینک دی جانے والی زبان ہے۔ ایک ہفتہ پہلے تم نے اسی زبان سے خانۂ خدا میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ اب ساری زندگی نجو کو کوئی دکھ نہیں دو گے۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھو گے۔ چار روز پہلے خدا کو حاضر ناظر جان کر تم نے اسی زبان سے نجو کو اپنی شریک حیات بنایا تھا اور آج تھوڑی دیر پہلے اسی زبان سے اسے ایک بردہ فروش کے ہاتھ بیچا ہے۔ معلوم نہیں اس سے پہلے یہ لعنتی زبان ایسے کتنے سودے کر چکی ہے۔ تم خود ہی بتاؤ یہ زبان اعتبار کے قابل ہے؟ بتاؤ... بولو۔"

پہلوان نے سر جھکا لیا۔ "میں اپنی غلطی مانتا ہوں، اپنی ساری غلطیاں مانتا ہوں۔ میں خود کو ٹھیک کروں گا۔ تم جیسے کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے، صرف ایک بار میری زبان کا اعتبار کر لو۔ میں بالکل بدل جاؤں گا۔ میں خود کو بدل کر دکھا دوں گا۔"

"نہیں پہلوان۔" میں نے سرد لہجے میں اس کی اپیل رد کر دی۔ "جو شخص خانۂ خدا کو اپنی ناپاک خواہشات کے لیے استعمال کر سکتا ہے اور اعتکاف کے حجرے میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں کہہ سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

میں نے ریوالور کے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا۔ پہلوان کی پھٹی پھٹی آنکھیں میری انگلیوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے تڑپ کر میرے ننگے پاؤں پکڑ لیے۔ "نہیں استاد! گولی مت چلانا۔ مجھے مار کر تم اپنے ہاتھ سے نجو کو بیوہ کر دو گے۔"

میں نے اطمینان سے کہا "میں اسے بیوہ نہ کروں گا تو تم اسے رنڈی خانے میں بٹھا دو گے۔ تم ایک سانپ ہو۔ تمہارا سر کچلنا ہی نیکی ہے۔"

وہ ایک بار پھر منتیں سماجتیں کرنے لگا اور بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا کہ اگر میں اسے زندہ چھوڑ جاؤں تو وہ چور سے قطب بن کر دکھا دے گا۔ وہ ایسے اسٹیج پر تھا کہ میں اس سے جو بھی پوچھتا وہ بتا دیتا۔ میں نے اسے حکم دیا کہ وہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا "کوئی ہتھیار تو نہیں ہے تمہارے پاس یا تمہارے اردگرد اس کمرے میں؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا "کوئی تیز دھار آلہ یا ایسی چیز جس سے تم مجھے نقصان پہنچا سکو؟" اس نے کہا کہ نہیں، ایسی کوئی شے اس کمرے میں نہیں۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب مجھے بتاؤ کہ کیا کچھ کرتے رہے ہو اب تک اور کیسے کرتے رہے ہو؟"

اس کی مزاحمت بالکل دم توڑ چکی تھی۔ امید کی کرن دیکھ کر وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح فرفر بولنے لگا۔ تھرڈ ڈگری کی چکی میں پس کر ملائم ہو جانے والے حوالاتی کی طرح اس نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو میں پوچھنا چاہتا تھا بلکہ وہ بھی بتا دیا جو میرے لیے پوچھنا ضروری نہیں تھا۔ اس کی روداد قریباً پون گھنٹے میں ختم ہوئی۔ اس دوران میرے ریوالور نے اسے نشانے پر لیے رکھا۔ پہلوان کی داستان میرے لیے چونکا دینے والی نہیں تھی۔ وہی سیاہ کاریاں تھیں جن کی پہلوان جیسے شخص سے توقع کی جا سکتی تھی۔ نجو سے پہلے وہ قریباً آٹھ لڑکیوں اور عورتوں کو اسی طرح ورغلا کر علاقہ غیر میں لا چکا تھا اور فروخت کر چکا تھا۔ پائندہ بستی میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لنڈی کوتل آتا جاتا رہا ہے۔ حقیقت میں اس نے لنڈی کوتل کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی لعنتی سرگرمیوں کا مرکز یہی پاڑا چنار اور سدہ کے گرد و نواح کا علاقہ تھا۔ کباب فروش رحمان زئی اس کے ساتھیوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کاروبار میں پوری طرح ملوث تھا۔ جھوک نہال میں پہلوان کے ہاتھوں آغا قادر وہاں کے بندے کا قتل اس وجہ سے نہیں ہوا تھا کہ پہلوان نجو کو بچانا چاہتا تھا۔ اس قتل کا سبب رقم کی تقسیم کا معاملہ تھا۔ وہ شخص پہلوان کا رازدار تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ پہلوان کا کچا چٹھا آغا قادر کے سامنے کھول دے گا۔ نتیجے میں پہلوان نے کلہاڑی مار کر اس کا سر دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ ایسے ہی کئی اور انکشافات پہلوان نے کیے۔

اپنی روداد سنانے کے دوران ایک مرحلے پر پہلوان نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں اسے گولی نہیں ماروں گا۔ میں نے یہ وعدہ کر لیا کیونکہ یہ وعدہ کرنے سے میرے پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ میں پاگل نہیں تھا کہ اسے گولی مار کر چند درجن آدمی اس کمرے میں اکٹھے کر لیتا... اور پھر ایک دو گولی سے وہ مرنے والا بھی کہاں تھا۔ اس نے جس طرح گردن میرے آہنی شکنجے سے چھڑانے میں کامیابی حاصل کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بداعمالیوں کے باوجود ابھی اس کے چربی دار جسم میں کافی قوت موجود ہے۔ پہلوان کو انجام تک پہنچانے کے لیے میرے پاس ایک تیز دھار خنجر موجود تھا۔ یہ پائندہ بستی کے مقتول پہریدار کا خنجر تھا اور پچھلے کئی روز سے میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔

پہلوان نے میری جتنی سماجتیں کی تھیں اور جتنے عہد و پیماں باندھے تھے وہ پانچ چھ سال پہلے باندھے ہوتے تو یقیناً میں تسلیم کیا ہوتا۔ لیکن اب نہیں... مجھے چہروں کی پہچان ہو چکی تھی۔ میں نے اس دنیا کا ایسا روپ دیکھا تھا کہ اس کے بعد کچھ دیکھنے کی ہوس نہیں رہی تھی۔ میں آپ کو کیا بتاؤں، میں نے کیا کیا دیکھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا اس سے بھی بڑھ کر انسان کی نفسیات دیکھی تھی۔ دنیا کی مشکل ترین مخلوق ہے انسان اور اس کی نفسیات اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

میرے سامنے گڑگڑاتے پہلوان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ جھوٹے وعدے کر رہا ہے لیکن وہ جھوٹے وعدے کر رہا تھا۔ کم از کم میں اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے جھوٹے ہونے کا ایک ثبوت ابھی صرف چند لمحے پہلے مجھے مل چکا تھا۔ میں نے پہلوان سے کہا تھا کہ اگر اس کمرے میں اس نے کوئی ہتھیار وغیرہ چھپا رکھا ہے تو میرے حوالے کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے تکیے میں ایک تیز دھار اُسترا چھپا رکھا تھا۔ اس ہوٹل میں قیام کے دوران میں نے تکیے کے غلاف میں جو خاص چیز دیکھی تھی وہ اُسترا ہی تھا اور اب وہ اُسترے والا تکیہ پہلوان کے بالکل قریب موجود تھا۔ پہلوان نے اپنے اس ہتھیار سے محروم ہونا پسند نہیں کیا تھا، اس امید پر کہ شاید اسے کوئی کاری وار کرنے کا موقع مل جائے۔ اُسترے والا تکیہ پہلوان کے دائیں ہاتھ کے نیچے تھا اور اگر میں چند لمحوں کی غفلت برتتا تو پہلوان اس اُسترے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آج وہ میری آنکھوں کے سامنے میرے ریوالور کی زد میں جھوٹ بول رہا تھا۔ میں اس وقت کے لیے اس پر کیسے اعتبار کر لیتا جب

میرے اور اس کے درمیان نامعلوم فاصلے حائل ہو جاتے۔

میں اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے پر مجبور تھا۔ میں نے پہلوان سے پوچھا "وہ دوا کہاں ہے جو تم پرسوں نجو کو کھلانا چاہتے تھے؟"

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا "دوسرے کمرے میں پڑی ہے، نیچے والی دراز میں۔"

میں نے کہا "جاؤ... خود دوا نکال کر لاؤ۔"

وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے میری بات کو مذاق سمجھ رہا ہو۔ یہ بھی اس کے اندر کا چور تھا۔ یہ چور یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اس وقت اسے اپنی نگاہوں سے دور کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا "دیکھ کیا رہے ہو۔ جاؤ... دوا نکال کر لاؤ۔"

وہ لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے سے کشمکش ہویدا تھی۔ ایک الجھی ہوئی نظر مجھ پر ڈال کر وہ آگے بڑھا اور اپنا دایاں ہاتھ دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھایا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ بالکل آخری لحات میں میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ پنڈلی سے خنجر نکالنے کے بجائے میں نے آگے جھک کر تکیے کے غلاف میں سے اُسترا کھینچا۔ اس کام میں بمشکل نصف سیکنڈ لگا۔ اُسترا پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ پہلوان دروازے کو کھینچنے سے دھکیل کر کنڈی گراتا، میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے ہونٹوں پر آیا اور دائیں ہاتھ میں چمکتے اُسترے نے بڑی صفائی سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی۔ پہلوان میری گرفت میں تڑپا لیکن اس کا جسم بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ وہ صرف اپنا چہرہ گھما سکا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ ان آنکھوں نے بصارت ماند پڑنے سے پہلے جو آخری منظر دیکھا وہ میرے دائیں ہاتھ میں خون آلود اُسترے کا منظر تھا۔

○☆○

تھوڑی دیر بعد میں دوسرے کمرے میں نجو کو گہری نیند سے جگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ دوا کے زیر اثر تھی اس لیے بیدار ہو کر بھی سوئی سوئی لگتی تھی۔ "کیا بات ہے میب جی؟" اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا "آپ تو... واپس چلے گئے تھے۔"

"چلا گیا تھا لیکن پھر آ گیا ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ "تم جلدی سے اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

میرا کہا اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا مگر اس بار شاہی حکم پر وہ حیران نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کی نگاہ میرے

ننگے پاؤں پر پڑی۔ پہلوان کی گردن سے فوارے کی طرح چھوٹنے والے خون کے کچھ چھینٹے میرے پاؤں کی پشت پر موجود تھے۔ وہ ایک دم بے حد پریشان ہو گئی۔ مسہری سے اٹھتے ہوئے بولی "صیب جی! کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی جھگڑا شگڑا ہو گیا ہے؟"

"ہاں! لمبا ہی جھگڑا ہوا ہے۔" میں نے کہا "ہمارا یہاں سے فوراً نکل جانا ضروری ہے۔"

وہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھی۔ کلائیوں میں سہاگ کی نشانی ست رنگی چوڑیاں تھیں۔ وہ کراہ کر بولی "لیکن ــــ شہباز کہاں ہے؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" میں نے آواز دبا کر کہا "تم جوتی پہن لو اور گرم چادر لے لو، ہم یہاں سے جا رہے ہیں ــــ ابھی اسی وقت۔"

"اور باقی سامان؟"

"کچھ لینے کی ضرورت نہیں، بعد میں دیکھا جائے گا۔"

وہ جب چرمی بیگ میں سے گرم چادر نکال رہی تھی، میں نے کمرے میں موجود تینوں بستروں سے چادریں اتار دیں اور انہیں گرہیں دے کر باندھ دیا۔ کمرے کی بتی بجھا کر ہم باہر برآمدے میں آ گئے۔ زینوں کی جانب سے کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ غالباً کوئی ملازم تنگ زینوں سے چارپائی اوپر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں گھوم کر اس عقبی راہداری میں آ گئے جہاں سے میں ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔ یہاں حسب سابق تاریکی اور خاموشی تھی۔ میں نے نجو کو سمجھایا کہ اسے اس راہداری سے پندرہ سولہ فٹ نیچے ہوٹل کے پچھواڑے اترنا ہے۔

"کیسے؟" وہ ڈر کر بولی۔

"ان چادروں کے ساتھ۔" میں نے اسے بستر کی چادریں دکھائیں۔ مجھے بھروسا نہیں تھا کہ وہ چادروں کے "رسّے" کو مضبوطی سے پکڑ کر لٹک سکے گی، میں نے اس رسّے کے ایک سرے کو اس کی کمر سے لپیٹ کر موٹی سی گرہ دے دی۔ گرہ سخت تھی۔ وہ بے ساختہ "ہائے اللہ" کہہ کر رہ گئی۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہاں سے پہلوان والے کمرے کی کھڑکی صرف دو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ نجو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کھڑکی کے دوسری طرف اس شخص کی لاش پڑی ہے جسے وہ اپنا مجازی خدا سمجھتی ہے۔ میں نے نجو کو بغلوں سے سہارا دے کر اٹھایا اور چادروں کے رسّے کے ذریعے نیچے پہنچا دیا۔ اس کام میں بمشکل دس سیکنڈ لگے۔ اب میرے اترنے کی باری تھی ـــ کسی کے پکے ... [illegible]

دو کی۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں سکوڑ کر درخت کی ایک موٹی شاخ منتخب کی۔ منڈیر سے شاخ کا فاصلہ پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ میں چھلانگ لگا کر بہ آسانی اس سے جھول گیا اور پھر آہستگی سے نیچے اتر آیا۔

درخت تلے میرا اثاثہ جوں کا توں موجود تھا یعنی کمبل اور جوتے۔ میں نے رومال سے خون آلود پاؤں صاف کر کے جوتے پہنے اور کمبل جھاڑ کر شانوں پر رکھ لیا۔ اس دوران نجو اپنی کمر کے گرد سے چادر کی گرہ کھول چکی تھی۔ یہ چادریں وہیں ایک جھاڑی میں چھپا کر ہم سڑک کی طرف بڑھے۔ میں سڑک کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا لیکن جانا اس لیے ضروری تھا کہ فتح ہوٹل پہنچنے کے لیے کرایے کی کار یا پک اپ وہیں سے مل سکتی تھی۔ ہم سڑک پر آئے تو وزیری ہوٹل سے ہمارا فاصلہ ایک فرلانگ کے قریب تھا۔ مجھے ایک پک اپ اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ عین اس لمحے میری نظر بائیں طرف ایک شخص پر پڑی اور میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ کالی ٹوپی اور نسواری چادر میں رحمان زئی مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے پہچان کر وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ "او خوچہ! تم تو چلا گیا تھا؟"

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "تمہارے سامنے ہوں۔ اس کا مطلب ہے پھر آ گیا ہوں۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" وہ حیرانی سے بولا "اور ــــ اور یہ بی بی کو لے کر اس وقت کدھر جا رہا ہے؟" نجو نے چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن رحمان زئی چادر سے اسے پہچان گیا تھا۔

"اس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے۔ ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ وہ الو کا پٹھا شہباز پتا نہیں کدھر چلا گیا ہے۔"

"ڈاکٹر؟ اس وقت کون سا ڈاکٹر ہو گا۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "اس کی آنکھوں میں شک کی دھندلاہٹ ہر گھڑی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے جواب میں بتایا کہ میرا ایک دوست ہے، وہ اس وقت مل جائے گا۔

"بھائی صاحب، کدھر جاؤ گے۔" ایک کھردری آواز میرے پہلو سے ابھری۔ یہ اس پک اپ کا ڈرائیور تھا جسے میں نے ابھی ہاتھ دے کر روکا تھا۔ رحمان زئی کے سوالات سے بچنے کا یہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے نجو کو لیا اور جلدی سے پک اپ میں بیٹھ گیا۔ رحمان زئی سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ پک اپ جھٹکے سے آگے بڑھی تو میں نے بیک ویو آئینے میں دیکھا۔ رحمان زئی مڑا اور تیزی سے وزیری ہوٹل کی طرف ... [illegible]

پک اپ کا ڈرائیور پنجابی نکل آیا۔ اس کا نام عنایت تھا۔ وہ پسرور نارووال سائیڈ کا رہنے والا تھا۔ اپنی کسی نامعلوم مجبوری کے سبب وہ یہاں ڈرائیوری کر رہا تھا۔ پک اپ کا مالک مقامی شخص تھا۔ عنایت اسے تین سو روپے روزانہ دیتا تھا۔ یہ سواریوں والی پک اپ تھی۔ ایسی گاڑیوں میں پچھلی جانب کینوس کی چھت ڈال کر اندر لکڑی کی نشستیں رکھ دی جاتی ہیں۔ آٹھ دس سواریوں کی جگہ ہوتی ہے لیکن رش کے اوقات میں پندرہ بیس افراد تک بٹھا لیے جاتے ہیں۔ فتح ہوٹل کے راستے میں عنایت سے میری گفتگو مسلسل ہوتی رہی۔ میں نے اس سے کہا "یار! ایک کام تو کرو ہمارا۔ پشاور میں ایک مرگ ہو گئی ہے، ہمارا اسی وقت وہاں جانا ضروری ہے۔ تمہاری گاڑی کی حالت اچھی ہے۔ تم جتنے پیسے کہو، میں دے دیتا ہوں۔ تم ہمیں صبح تک پشاور پہنچا دو۔"

وہ بولا "میں آپ کا خادم ہوں بادشاہو ــــ پر اس وقت ہم نکل نہیں سکیں گے۔ اس ٹائم ٹل پارا چنار روڈ پر ٹریفک بالکل بند ہو جاتا ہے۔ دو تین ہفتوں سے تو ٹرک وغیرہ بھی نہیں نکل رہے۔ ڈاکوؤں شاکوؤں کا چکر ہے ــــ پارا چنار سے نکلتے ہی چیک پوسٹ ہے، وہاں ملیشیا یا لیوی والے روک لیں گے ہمیں۔ وہاں سے کسی طرح نکل بھی گئے تو اگلی چوکی پر پکڑے جائیں گے۔"

"کوئی چور راستہ نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رستے تو ہیں جی۔ پر اس ٹائم ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہی ہو سکتا ہے کہ صبح صبح پہلی بس پر نکل جائیں آپ۔"

"بس تو بہت دیر سے نکلتی ہے اور پھر چلتی بھی کچھوے کی رفتار سے ہے۔"

"تو پھر مجھے حکم کریں جی۔ میں آ جاؤں گا گاڑی لے کر منہ اندھیرے۔ اگر واپس بھی آنا ہے تو پیٹرول کا خرچہ نکال کر جو دل میں آئے دے دیں۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر کہا "ٹھیک ہے۔ اب ہمیں فتح ہوٹل اتار دو۔ صبح جتنی جلدی ہو سکے پہنچ جاؤ۔ ہم تیار ملیں گے۔ پیٹرول کا خرچہ نکال کر آٹھ سو روپے تمہیں مل جائیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

عنایت محمد کے چہرے پر چمک آ گئی۔ دو طرفہ سفر کی یہ پیشکش اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ وہ بولا "بس جی ہم تو ... [illegible] ... جو مناسب سمجھیں۔"

ہمیں فتح ہوٹل اتار کر عنایت محمد واپس چلا گیا۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ اتنی رات گئے وہ کم بخت رحمان زئی معلوم نہیں کیا کرنے شہباز پہلوان کے پاس آیا تھا۔ اس کی وجہ سے سارا کھیل "اپ سیٹ" ہو گیا تھا۔ ظاہر تھا، پہلوان کا قتل اب راز نہیں رہے گا اور صبح ہونے سے بہت پہلے پارا چنار میں میری اور نجو کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ میں نجو کو لے کر اپنے کمرے میں پہنچا تو نبیلہ اور ممتا کے علاوہ ذریں گل بھی وہیں موجود تھا۔ کمرے میں مونگ پھلی کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ لگتا تھا میری غیر حاضری میں ذریں گل دو ڈھائی کلو مونگ پھلی ٹھکو چکا ہے۔ مونگ پھلی اور چلغوزے کا بیری تھا وہ۔ میرے ساتھ نجو کو دیکھ کر ذریں گل کے علاوہ نبیلہ بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ میں نے ان دونوں کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے ذریں گل سے پوچھا۔ "میں نے تو تمہیں گھر جانے کو کہا تھا؟"

"ام گھر ہی جا رہا تھا۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا "لیکن پھر ام نے سوچا آپ تو پہلوان کے پاس بیٹھا رہے گا۔ ادھر ہوٹل میں بی بی اور بچہ لوگ اکیلا ہو گا۔ زمانہ ٹھیک نہیں ہے بھائی صاحب۔ ام نے وقت گزارنے کے لیے مونگ پھلی لیا اور ادھر آ گیا بی بی جی کے پاس۔ بہت باتیں بنایا ام نے بی بی جی کے ساتھ۔ یہ دیکھیں بالکل پھریش نظر آ رہا ہے بی بی صاحب کا چہرہ۔"

یہ ذریں گل بڑی پہنچی ہوئی شے تھا۔ جتنا زمین کے اوپر تھا اس سے زیادہ نیچے تھا۔ میں اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ بغور میرا چہرہ دیکھتا جا رہا تھا۔ بالکونی میں پہنچتے ہی بولا "کیا ہوا بھائی صاحب۔ آپ بی بی کو کیوں لے آیا ــــ اور وہ الف خاں اور پہلوان؟"

میں نے کہا "یہ سب کچھ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم ایک کام کرو۔ ہمارا جلد از جلد یہاں سے جانا ضروری ہو گیا ہے۔ اور بہتر ہے ہم بس کے بجائے پک اپ وین وغیرہ کے ذریعے نکلیں۔ میں نے ایک پک اپ والے سے کہا تو ہے لیکن ہو سکتا ہے وہ نہ آ سکے۔ ہمارے پاس دوسرا انتظام ہونا چاہیے۔ تم کوئی بندوبست کر سکتے ہو؟"

میری توقع کے مطابق ذریں گل کا جواب "ہاں" میں تھا۔ وہ بولا "اما را بہنوئی پک اپ چلاتا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی کا بھی رو گاڑی چلتا ہے۔ اگر آپ ضروری سمجھتا ہے تو ام ابھی جاتا ہے اور ان سے بات کرلیتا ہے لیکن صبح سے پہلے ام یہاں سے نکل نہیں سکے گا۔ وجہ ــــ"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "تم جاؤ اور ان سے بات کرو۔ میں نے جس شخص سے بات کی ہے وہ چار بجے کا کہہ کر گیا ہے۔ اگر وہ پانچ بجے تک نہ آیا تو تم جا کر اپنے بہنوئی کو لے آنا۔ میں یہاں سے سیدھا پشاور جانا چاہتا ہوں۔"

زریں گل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر سوالات مچل رہے تھے لیکن میرا موڈ دیکھ کر وہ چپ رہا اور کمبل لپیٹ کر باہر چلا گیا۔ نہ اس نے کچھ پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا لیکن میرے خیال میں وہ بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ زریں گل کی روانگی کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور اطمینان سے ٹہلتا ہوا کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ نبیلہ اور نجو کے لیے ممکن نہیں تھا کہ میرے چہرے سے کسی بھی ہیجان خیزی کا اندازہ لگا سکیں' اور حقیقت یہ تھی کہ یہ سب کچھ واقعی میرے لیے کوئی ایسا ہیجان خیز بھی نہیں تھا۔ موت کے آگے اور پیچھے بھاگتے ہوئے ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا میں۔ چارپائی پر سوئے ہوئے منّے کے پاس بیٹھ کر میں آگے جھکا اور ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ انگیٹھی کی طرف پھیلا دیے۔

نجو اور نبیلہ دونوں خاموش اور مضطرب تھیں۔ وہ صورت حال جاننے کی خواہش مند تھیں اور یہ خواہش بالکل فطری تھی۔ خاص طور پر نجو تو سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔ میں اسے گہری نیند سے جگا کر یہاں لے آیا تھا۔ نہ اسے اپنے "شوہر" کا پتا تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ نصف شب کی یہ بھاگ دوڑ کا مقصد کیا ہے۔ وہ ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھی اور مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ کاش میں نے پہلے دن ہی اس پر ترس نہ کھایا ہوتا اور اسے بتا دیا ہوتا کہ جس شہباز کو وہ اپنا سب کچھ سمجھتی ہے وہ حقیقت میں کیا ہے۔ اب صورت حال اور گمبھیر ہو چکی تھی۔ شہباز راہئ عدم ہو چکا تھا اور نجو بے خبر تھی۔ اس کے کردار سے بھی اور اس کی موت سے بھی۔ اب اسے مزید بے خبر رکھنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا اسے کچھ نہ کچھ بتا دینا چاہیے۔ کم از کم وہ حقیقت کا سامنے کرنے کے لیے تیار تو ہو جائے گی۔

میں نے سگریٹ کے چند طویل کش لیے اور دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "نجو! میں تم سے ایک بہت اہم معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم میں اتنی سمجھ بوجھ ہے کہ اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکو اور جھوٹ سچ کا فرق جان سکو۔" نجو کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پوری طرح کھل گئیں اور میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے ان سحرکار آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا "مجھ پر بھروسا کرتی ہو نجو؟"

وہ بولی "کیوں نہیں سیب جی۔"

ان چار لفظوں میں اس نے اپنے جس بے پناہ اعتبار کا اظہار کر دیا وہ کوئی دوسرا شاید ایک طویل تقریر میں بھی نہیں کر سکتا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "مفہوم" بولنے والے کے لفظوں سے نہیں لہجے سے ادا ہوتا ہے۔

میں نے کہا "نجو! تمہیں سن کر صدمہ تو ہو گا لیکن آج میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ شہباز پہلوان وہ نہیں جو تم اسے سمجھتی ہو۔"

"ک۔۔۔کیا مطلب؟" اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"شہباز ایک دغا باز شخص ہے نجو۔ وہ پہلے روز سے تمہیں فریب دے رہا ہے۔ اس کا یہ فریب اگر تمہاری نظروں سے اوجھل رہا ہے تو اس کی وجہ صرف میں ہوں۔ میں سب کچھ جان گیا تھا اس کے باوجود میں نے تمہیں اندھیرے میں رکھا۔ اس امید پر کہ شاید وہ راہ راست پر آ جائے اور حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ یہی حال نبیلہ کا بھی تھا۔ وہ نجو کی کہانی سے پوری طرح آگاہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس کی موجودگی میں میں نے نجو سے بات کرنا نامناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں نے پاؤندہ بستی سے بات شروع کی اور نجو کو بتایا کہ جھونپڑے سے پہلوان کے غائب ہو جانے کی اصل وجہ کیا تھی اور کیوں وہ نکاح خواں ڈھونڈنے کے بہانے باگڑ خیل کے چکر لگایا کرتا تھا۔ میں نے باگڑ خیل میں اس کے معاشقے اور پھر شادی کا ذکر کیا۔ نجو سکتے کی سی کیفیت میں سنتی رہی۔ اس کا چہرہ گواہ تھا کہ وہ میری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو اہمیت دے رہی ہے۔ میں نے نجو کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا کہ کس طرح میں پہلوان کا کھوج لگاتا رہا اور کس طرح چند روز پہلے پاراچنار کی مسجد میں پہلوان سے میری طویل ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں پہلوان نے یاسمین کے بھاگ جانے کا رونا رو کر میری ہمدردی جیتنے کی کوشش کی تھی اور رضائے خدا میں بیٹھ کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرے گا۔ میں نے پہلوان کی یہ ساری فریب کاری نجو کے سامنے بیان کی۔ آخر میں میں نے نجو کو الف خاں کے بارے میں بتایا۔ دو گھنٹے پہلے وزیری ہوٹل کے کمرے میں الف خاں اور شہباز میں جو انکشاف انگیز گفتگو ہوئی تھی وہ میں نے حرف بحرف نجو کے سامنے بیان کر دی۔

نجو کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تاہم اس رونے سے بے چارگی یا صدمے کے بجائے نفرت اور قہر کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اس شخص کی طرح رو رہی تھی جسے اس کے کسی دشمن نے دھوکے سے مارا ہو اور رات کی تاریکی میں اس کا سب کچھ لوٹ کر لے گیا ہو۔ روتے روتے اس نے اپنے گلے سے وہ چاندی کا لاکٹ نوچ کر پھینک دیا جو شہباز نے اسے نکاح کے بعد تحفے میں دیا تھا۔ پھر وہ ہذیانی سے انداز میں چیخنے لگی۔ "حرامزادے' کتے' مجھے پہلے ہی تجھ پر شک تھا۔ تو نے مجھے برباد کر دیا۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔۔۔ کبھی نہیں۔"

اس نے اپنی کلائیاں زور زور سے مسہری کے بازو پر ماریں اور کئی ست رنگی چوڑیاں ٹوٹ کر انگیٹھی کے آس پاس بکھر گئیں۔ وہ بے دم ہو کر اوندھے منہ چارپائی پر گری اور بلک بلک کر رونے لگی۔ نبیلہ کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔ اس نے نجو کا سر اٹھا کر گود میں رکھ لیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اشارے سے نبیلہ کو کہا کہ اسے رونے دو۔ وہ جتنا کھل کے رو لیتی اس کے لیے بہتر تھا اور وہ واقعی کھل کر روئی۔ میں نے اسے بتایا کہ پہلوان سے میری لڑائی ہوئی ہے اور وہ میرے ہاتھوں شدید زخمی ہوا ہے۔ نجو کے ہونٹوں سے بے ساختہ بددعا نکلی۔ "مر جائے وہ۔۔۔ رب کرے' شام سے پہلے اس کا جنازہ اٹھے۔ اس کی بہنیں لاوارث ہوں۔ کوئی انہیں بھی سات سات ہزار میں بیچے۔"

وہ بول رہی تھی اور روتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے نجو کے سامنے پہلوان کی سیاہ کاریوں کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا لیکن سب سے بڑا ثبوت انسان کے اندر کی آواز ہوتی ہے اور یہ آواز نجو کو بتا رہی تھی کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' سو فیصد درست ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ میں نجو سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ پہلوان کی موت بھی نہیں۔ میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے اسے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا اور اب کسی بھی وقت میں اسے بتا سکتا تھا کہ جس بھیڑیے نے اس کی عزت کو اپنے خونی جبڑے میں بھنبھوڑا تھا اور اب اس برباد عزت کی لاش کو گلی گلی گھسیٹنا چاہتا تھا' میں نے اس کا سر کچل دیا ہے۔ اب وہ کسی امام مسجد کی بیٹی کو۔۔۔ کسی نجو یا کسی یاسمین کو گھات لگا کر شکار نہیں کر سکے گا۔

یکایک دروازے پر دستک سنائی دی۔ ہم تینوں چونک گئے۔ میں نے جیکٹ کی جیب تھپتھپا کر ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کیا' پھر دروازے کی طرف بڑھا "کون؟" میں نے لہجے کو بوجھل بناتے ہوئے پوچھا۔

"ام ہے۔۔۔ زریں گل۔" دوسری جانب سے زریں گل کی مدھم آواز ابھری۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ زریں گل کو دیکھے بغیر ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ زخمی ہے۔ پھرتی کر کر میں نے دروازہ کھولا۔ زریں گل ہانپا ہوا تھا اور کمرے میں جلنے والے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ برف کے مانند سفید نظر آ رہا تھا۔ "ایک منٹ امارا بات سنئے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

میں کمرے سے باہر آ گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ زریں گل مجھے تاریک بالکونی میں لے آیا۔ یہاں جنگلے کے ساتھ ساتھ چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور میز رکھی تھی۔ وہ نڈھال سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری کرسی سنبھال لی۔

"بہت گڑبڑ ہو گیا ہے۔" وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ "شہباز پہلوان کا لاش وزیری ہوٹل کے چھ نمبر کمرے سے مل گیا ہے۔ رحمان زئی' الف خاں اور اس کے غنڈے ہر جگہ آپ کو اور بی بی کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ابھی ام نے یہاں سے دو فرلانگ پیچھے بڑے ڈاک خانے کے سامنے ان کا ایک گاڑی دیکھا ہے۔ ام کو شک ہے کہ ان میں لیوی کا ایک آدمی بھی تھا۔"

میری نگاہ زریں گل کے بائیں شانے پر پڑی۔ یہاں کمبل پر خون کا ایک دھبا نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے پوچھا "تم زخمی ہو زریں گل؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "راستے میں وزیری ہوٹل کے سامنے الف خاں کے غنڈوں سے امارا مڈھ بھیڑ ہو گیا تھا۔ انہوں نے ام کو پہچان لیا اور روکنے کا کوشش کیا۔ ام نے سوچا' اگر ام پکڑا گیا تو یہ ام کو بہت مارے گا اور آپ کا پتا پوچھے گا۔ ام کو اپنی مار کا فکر نہیں تھا لیکن اگر کہیں مجبور ہو کر امارے منہ سے آپ کا پتا نکل جاتا تو ام سارا زندگی اپنے منہ پر لعنت بھیجتا۔ ام بھاگ کھڑا ہوا۔ انہوں نے گولی چلایا' ام نے بھی گولی چلایا۔ ادھر ایک گولی امارے کندھے میں لگ گیا۔ ام امام باڑہ ہوٹل کے سامنے سے ہو کر ایک گلی میں گھس گیا۔ ادھر حاجی شاہ کا ارتھوں والا احاطہ ہے۔ ام احاطے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ لوگ ام کو ڈھونڈ کر آگے نکل گیا تو ام چھپتا چھپاتا یہاں تک پہنچ گیا۔"

میں نے کمبل ہٹا کر زریں گل کا شانہ دیکھا۔ کوٹ میں

سوراخ نظر آرہا تھا اور سوراخ کے ارد گرد تقریباً آدھا مربع انچ جگہ خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ "یہ تو کافی نقصان کرلیا تم نے۔" میں نے افسوس سے سرہلایا۔

وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں میں وہی ڈرامائی کیفیت تھی جو پہلی ملاقات میں نظر آئی تھی جب شام کے جھٹپٹے میں وہ ایک گلی کے اندر میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اپنے زخمی شانے کو دائیں ہاتھ سے دبا کر وہ بولا "یہ کوئی نقصان نہیں ہے۔۔۔ جہانی استاد کے لیے تو ہمارا جان بھی حاضر ہے۔"

"کون جہانی استاد؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"اب انکار مت کرو استاد۔ ہم اپنے سر کا قسم کھا سکتا ہے کہ تم ہی جہانی استاد ہے۔ ہمارا نظر اتنا کچا نہیں ہے۔ ہم پہلے دن تم کو پہچان گیا تھا۔ اور اب تو۔۔۔ شک کا کوئی گنجائش نہیں رہا۔"

میں نے اس موضوع پر مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "تمہاری تیز نگاہی کی داد دینا پڑتی ہے زریں گل۔ بہرحال، جس کام کے لیے میں نے بھیجا تھا اس کا کیا بنا۔۔۔؟"

میرا اقرار سن کر زریں گل کے چہرے پر چمک آگئی۔ تھوڑی دیر کے لیے اس نے کندھے کی تکلیف کو جیسے فراموش کردیا۔ کمبل کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا "سب بالکل فٹ فاٹ ہوگیا ہے استاد۔ تم نے ہم کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ جس وین والے سے تم نے بات کیا تھا اس کا نام عنایت ہے اور وہ پنجابی ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یہی عنایت تو ہے جو ہمارے بہنوئی کے بھائی کا پک اپ چلاتا ہے۔ ہم نے اس سے صبح سویرے پشاور جانے کا بات کیا تو وہ فوراً سمجھ گیا۔ بہرحال، مختصر بات یہ ہے کہ اب بات بالکل پکا ہوگیا ہے۔ اپنا گھڑی دیکھو۔۔۔ ڈھائی بج گیا ہے۔ ٹھیک ڈیڑھ گھنٹا بعد عنایت پک اپ لے کر نیچے ہوٹل کے دروازے پر آجائے گا۔ پک اپ میں فروٹ کا کریٹ لدا ہوگا لیکن یہ کریٹ صرف دکھانے کے لیے ہوگا۔ اندر سے پک اپ کا باڈی بالکل خالی ہوگا۔ ہم کریٹ ہٹا کر اندر گھس جائیں گا تو عنایت پچھلے حصے میں دوبارہ کریٹ رکھ دے گا۔ ہم نے پک اپ میں کھانے پینے کا انتظام کردیا ہے بلکہ بچے کو پیشاب وشاب بھی کرانا پڑا تو اندر ہی کرا لے گا۔ ادھر ہم فجر ہوٹل سے چلے گا تو پنڈی جاکر ہی اترے گا انشاءاللہ۔"

زریں گل کی کارکردگی قابلِ قدر تھی۔ اس نے جو کیا عین ضرورت کے مطابق تھا لیکن وہ جو خود ساتھ جانے کی بات کررہا تھا، میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ زخمی تھا۔ اس کا ساتھ جانا کوئی ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ وہ میرے خیرخواہ کے طور پر مخالفین کی نظروں میں آچکا تھا اور اب زخمی بھی ہوا تھا۔ میں نے اس کے زخمی شانے کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "اب ہم بالکل ٹھیک ٹھاک ہے جہانی صاحب! ہم نے اپنا گولی خود ہی نکال لیا تھا۔ ہمارے بھائی کے پاس گولی نکالنے اور پٹی کرنے کا سارا سامان ہے۔ درد کا گولی بھی دیا ہے اس نے ہم کو۔ انشاءاللہ ہم تمہارے ساتھ جائے گا۔ تم کو آزاد علاقے کی حد سے باہر چھوڑ کر آئے گا۔ تم ہمارا رہبر جانی ہے۔ ہم آخر تک تمہارا ساتھ دے گا۔"

زریں گل کا جوش و جذبہ دیکھ کر میں نے اسے سختی سے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اب تک اپنی افادیت ثابت کی تھی۔ خاص طور پر پک اپ کا سفر محفوظ بنانے کی اس کی کوشش قابلِ تعریف تھی۔ یہ الف خاں بڑی سختی سے نظر آرہا تھا۔ اس سے ٹکرائے بغیر کرم ایجنسی سے نکلنا میری اہم ضرورت تھا اور یہ ضرورت اسی طرح پوری ہوسکتی تھی کہ ہم دورانِ سفر پس پردہ رہیں۔ زریں گل کے بقول الف خاں کا ایک چچازاد بھائی لیوی میں مقامی افسر تھا اور اس کی جائز و ناجائز اعانت کرتا رہتا تھا۔ اس اطلاع کے بعد میرے لیے یہ بھی مناسب نہیں رہا تھا کہ لیوی کی مدد لوں۔

چار بجے ہم روانگی کے لیے بالکل تیار ہوچکے تھے۔ سوا چار بجے ہوٹل سے باہر ایک پک اپ کی مدھم گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والی سڑک سنسان تھی۔ دکانیں بند تھیں اور مکانات تاریک نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا، شمالاً جنوباً چلنے والی سرد ہوا کے سوا ہر چیز گہری نیند میں ہے۔ یہ صورت حال ہمارے لیے مناسب تھی۔ زریں گل نے بالکونی سے باہر جھانکنا شروع کیا۔ ڈرائیور عنایت محمد پروگرام کے مطابق مصروفِ کار تھا۔ اس نے پک اپ کے عقبی حصے سے سیب کے کریٹ اتار کر سڑک پر رکھنے شروع کیے اور تھوڑی ہی دیر میں ہمارے لیے پک اپ میں سوار ہونے کا راستہ بنا لیا۔ پہلے نجو اور نبیلہ، زریں گل کے ساتھ باہر نکلیں۔ اس کے بعد میں سوئے ہوئے لڑکے کو اٹھا کر سڑک پر آگیا۔ میرے سڑک پر آنے تک نجو، نبیلہ اور زریں گل سوزوکی پک اپ میں سوار ہوچکے تھے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ جگہ اتنی تنگ نہیں تھی۔ عقبی حصے میں پھل کے کریٹوں نے مختصر جگہ گھیری تھی۔ پک اپ کا باقی سارا فرش

ہمارے استعمال میں تھا۔ پیٹیں وغیرہ نکال کر یہاں عنایت محمد نے ایک دری بچھا رکھی تھی۔ کھانے کے دو ٹفن اور ایک چھوٹا واٹر کولر بھی یہاں موجود تھا۔ اس کے علاوہ دل بہلانے کے لیے ٹرانسسٹر ریڈیو بھی تھا۔ ہم جم جما کر بیٹھ گئے تو عنایت نے جلدی جلدی عقبی حصے میں پھر سیب کے کریٹ چن دیے۔ یہ کام کرنے کے دوران وہ ہم سے دھیمے لہجے میں باتیں بھی کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ الف خاں کے آدمی ہمیں پورے پارا چنار میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بس اڈے اور ٹیکسی اسٹینڈ کے علاوہ شہر کے تمام اہم راستوں پر ان کا پہرہ ہے۔

سیبوں کی مہک بڑی اشتہا انگیز تھی۔ جی چاہا ابھی ایک آدھ کریٹ کھول لیا جائے۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد پک اپ نے ہلکا سا جھٹکا کھایا اور ہم اپنے طویل سفر پر روانہ ہوگئے۔ پارا چنار سے پشاور کا فاصلہ تقریباً ایک سو اٹھاون میل ہے لیکن یہ ایک سو اٹھاون میل بھی تین سو میل سے کم نہیں سمجھے جاتے۔ قبائلی علاقے میں سڑک بہت تنگ ہے۔ دو بسیں آمنے سامنے سے آجائیں تو دونوں کو اپنے ایک طرف کے ٹائر سڑک سے نیچے اتارنا پڑتے ہیں اور ان دنوں تو سڑک کی حالت ویسے بھی بہت خراب تھی۔ زریں گل کو امید نہیں تھی کہ ہم آٹھ گھنٹوں سے پہلے ٹل پہنچ سکیں گے۔ پارا چنار سے نکل کر قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ خلافِ توقع کہیں ہمیں روکا نہیں گیا۔ نہ لیوی والوں کی طرف سے، نہ کسی اور کی طرف سے۔ گاڑی میں ایندھن بہت کم تھا۔ دس پندرہ میل سفر طے کرنے کے بعد عنایت نے پیٹرول پمپ پر گاڑی روکی اور یہیں سے ہماری مشکلات کا آغاز ہوگیا۔ جونہی عنایت انجن بند کرکے گاڑی سے اترا، کوئی شخص بھاری بھرکم آواز میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ پھر کسی نے پک اپ کے عقبی حصے میں سیب کے کریٹوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ عنایت کی لرزتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "خان جی! ہم تو روزانہ اس روٹ پر چلنے والا ہے۔ آپ کیسی باتاں کررہے ہیں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ کوئی گڑبڑ ہوچکی تھی۔ کچھ دیر تک دو افراد دھیمے لہجے میں پشتو بولتے رہے پھر کسی نے کرخت آواز میں کہا "ہم اچھی طرح جانتا ہے اس گاڑی کو۔ یہ اس حرامی زریں گل کے بہنوئی کا ملکیت ہے۔ ایک طرف لگاؤ گاڑی۔ ہم اس کو ایسے نہیں جانے دے گا۔"

زریں گل کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ کچھ یہی کیفیت نجو اور نبیلہ کی بھی تھی۔ عنایت محمد بڑی جرأت سے اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کی کوشش کررہا تھا لیکن یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی تو اس نے پسپائی اختیار کی اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ آثار سے ظاہر تھا کہ وہ روکنے والوں کی ہدایت پر گاڑی کو ایک سائیڈ پر لگانے لگا ہے۔ یہ "روکنے والے" لیوی کے جوان تو ہرگز نہیں تھے۔ یقیناً ہماری بدقسمتی آڑے آگئی تھی اور انہی لوگوں سے ہمارا سابقہ پڑ گیا تھا جن سے بچ کر ہم نکل رہے تھے۔

میری جیکٹ میں اڑتیس بور کا ریوالور اور قمیص کے نیچے گولیوں والا بیلٹ تھا۔ اس بیلٹ میں چالیس گولیاں لگی ہوئی تھیں، چھ گولیاں ریوالور میں تھیں۔ زریں گل کے پاس آٹومیٹک رائفل تھی۔ جسے اس نے جھالروں اور نقش و نگار سے سجا رکھا تھا۔ اس رائفل کے قریباً چالیس راؤنڈ اس کے پاس موجود تھے۔ ہم دونوں پوری طرح چوکس ہوکر بیٹھ گئے۔ پک اپ حرکت میں آکر رینگتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر ایک زبردست جھٹکے سے اندھا دھند بھاگنے لگی۔ عنایت محمد صورت حال بھانپ کر نکل بھاگا تھا۔ نبیلہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ نجو کی متورم آنکھوں میں بھی اندیشوں کے سائے لہرا گئے۔ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کہ عنایت کے نکل بھاگنے کا فیصلہ غلط ہے یا درست، تاہم یہ حقیقت تھی کہ وہ پیٹرول ڈلوائے بغیر نکل بھاگا تھا اور اگر روکنے والوں کے پاس بھی گاڑی موجود تھی تو ہم دیر تک ان سے نہیں بچ سکتے تھے۔ ہمارے پیچھے کریٹس کی دیوار تھی اور ہم دیکھ نہیں سکتے تھے کہ تعاقب ہورہا ہے یا نہیں۔ میں نے چلا کر عنایت محمد سے اس بارے میں پوچھا تو اس کی ہیجانی آواز ابھری۔ "یہ الف خاں کے بندے ہیں صاحب۔ دو گاڑیاں ہیں۔ ایک ڈاٹسن پک اپ ہے۔ دوسری ٹویوٹا مارک ٹو۔"

"تو اب کیا کرو گے؟"

"یہ آپ بتائیں جی۔ میری سمجھ میں تو بس یہی گل آئی تھی کہ بھاگ نکلوں۔"

"اسلحہ بھی ہوگا ان کے پاس؟"

"ہاں جی۔ اسلحہ بھی ہے۔۔۔ ٹویوٹا کی کھڑکی سے رائفل کی نال نکلی ہوئی ہے۔ میں یہاں سے بھی صاف دیکھ سکتا ہوں۔" ڈرائیونگ کیبن سے عنایت کی آواز بمشکل ہم تک پہنچ رہی تھی۔ پک اپ بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کی رفتار اڑنے کی حد تک تیز تھی۔

"ادھر نزدیک کہیں لیوی کی چوکی ہے؟" میں نے چلا کر کہا۔

"ہاں جی۔۔۔ ہے چوکی۔ ایک ڈیڑھ میل کا فاصلہ

ہے۔"

"تو ٹھیک ہے' کسی طرح چوکی پہنچنے کی کوشش کرو۔"

یکا یک عقب میں ایک فائر ہوا اور ہمارے بدترین خدشات حقیقت میں بدل گئے۔ یہ ایم جی کا فائر تھا۔ گولی تقریباً پچاس گز کی دوری سے چلائی گئی تھی۔ عنایت محمد کے ہاتھوں میں پک اپ لہرا کر رہ گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے تین گولیاں اور چلیں۔ ان میں سے ایک گولی سیب کے کریٹوں میں لگی اور دو کریٹ لڑھک کر زریں گل پر آگرے۔ زخمی شانے کی وجہ سے اس کی کراہ نکل گئی۔ میں نے سہارا دے کر مزید کریٹوں کو گرنے سے روکا۔ منا اب جاگ رہا تھا اور ڈر کے مارے سن کر سہمے بلونگڑے کی طرح نیلہ کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ عجیب لڑکا تھا' اس کے ہونٹوں پر جیسے خوف کی مہر لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں کھولتا تھا تو بند کرنا بھول جاتا تھا اور بند کرتا تھا تو کھولنا بھول جاتا تھا۔

عقب میں آنے والے یقیناً پک اپ کے ٹائروں کو نشانہ بنا رہے تھے اور اپنی اس کوشش میں وہ کسی بھی وقت کامیاب ہو سکتے تھے۔ یکایک پک اپ لہرائی اور تقریباً ساٹھ میل کی رفتار سے بھاگتی ہوئی کچے میں اتر گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ گاڑی نے رس میں قلابازیاں نہیں کھائیں۔ ہمارے سر اچھل کر چھت سے ٹکرائے اور "مرے کو مارے شاہ مدار" کے مصداق دو اور کریٹ زریں گل کے سر پر آگرے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے چلا کر عنایت محمد سے پوچھا۔

وہ بولا "بادشاہو! کام خراب ہو گیا ہے۔ آگے پل پر دو ٹریکٹر ٹرالیاں پھنسی ہوئی ہیں۔"

"اب کدھر جا رہے ہو؟"

"جدھر کو منہ ہے۔" اس نے ترنت جواب دیا۔

انتہائی سنگین صورت حال میں بھی وہ اعصاب پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ کافی جی دار سا بھی ثابت ہو رہا تھا وہ۔

کریٹوں کے لڑھک جانے سے اب اتنی جگہ ہو گئی تھی کہ میں پک اپ کے فرش سے چار پانچ فٹ بلند ہو کر عقب میں جھانک سکتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے پک اپ کے عقبی پردے کی ڈوری کھولی۔ ترپال کا پردہ ہوا میں پھڑپھڑایا اور میں باہر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اب دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اونچے نیچے راستے پر ایک ٹرک نما اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے عقب میں ایک نیلی پک اپ تھی۔ پک اپ کے عقبی حصے میں دو تین افراد اس انداز میں کھڑے تھے جیسے وہ رائفلیں سونتے محاذ جنگ کی طرف جا رہے ہوں۔ میں نے جیکٹ سے ریوالور برآمد کیا اور زریں گل کو تھما کر اس سے رائفل لے لی۔

رائفل "کلاک" تھی اور سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ کریٹوں کے اوپر سے میں مارک ٹو کا نشانہ لینے لگا۔ ان اندھا دھند دھچکوں میں ٹائر کا نشانہ لینا تو درکنار' پوری گاڑی کا نشانہ لینا مشکل تھا۔ میں نے اوپر تلے چار فائر کیے اور مارک ٹو جو درمیانی فاصلہ تیزی سے کم کر رہی تھی' پھر دور چلی گئی۔ فائرنگ سے میرا مقصد بھی یہی تھا۔ عنایت محمد ایک ممتاز ڈرائیور تھا۔ انتہائی دشوار راستے پر وہ پک اپ کو... حتی الامکان رفتار سے بھگائے چلا جا رہا تھا۔ چار پانچ منٹ کے اندر فرنٹ کے نصف کریٹ جھٹکے کھا کھا کر باہر گر گئے۔ اب ہم پانچوں افراد گولیوں کے لیے مشکل نشانہ نہیں رہے تھے۔ خاص طور پر مارک ٹو سے جھانکنے والی ایم جی کسی بھی وقت ہمارے مزاج پوچھ سکتی تھی۔ حوصلہ افزا بات صرف ایک تو تھی اور وہ یہ کہ عنایت محمد مارک ٹو سے درمیانی فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا بلکہ اب اس فاصلے میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

ہمارے چاروں طرف کٹی پھٹی زمین تھی۔ کھائیاں تھیں' جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ۔ جونہی عنایت محمد نے ایک ٹیلے کا چکر کاٹا' مجھے اپنی بائیں جانب نشیب میں درختوں سے لدا پھندا ایک وسیع میدان نظر آیا۔ چھپنے کے لیے یہ جگہ بہت مناسب تھی۔ میں عنایت محمد کو اس طرف متوجہ کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ گاڑی خود بخود اسی طرف مڑ گئی۔ عنایت محمد کے ذہن میں بھی یہ بات آئی تھی۔ ہم اس وقت ٹیلے کی اوٹ میں تھے۔ جب تک مارک ٹو دندناتی ہوئی یہاں تک پہنچتی' گھنے درخت ہمیں پناہ فراہم کر سکتے تھے۔ اور اگر ہماری قسمت ساتھ دیتی اور یہ پتھریلی زمین پر ٹائروں وغیرہ کے نشانات نہ ملتے تو ہماری متعاقب گاڑیاں دھوکا کھا سکتی تھیں۔

نشیبی میدان میں اتر کر پک اپ مزید شدت سے اچھلنے لگی اور ایک موقعے پر تو گول مٹول زریں گل نجو کی گود میں جا بیٹھا۔ عنایت محمد نے چند سخت موڑ کاٹے اور پھر انجن بند کر کے پک اپ پھلاہی اور توت کے ایک گھنے جھنڈ میں گھسا دی۔ یہ ایک خطرناک اقدام تھا۔ پنجابی میں اسے "بنے یا بنے" کہتے ہیں یعنی تخت یا تختہ اگر یہ چال کامیاب ہو جاتی تو واقعی شاندار چال تھی۔ دوسری صورت میں ہمارا حال اس بارہ سنگھے جیسا ہوتا جو چیتے سے بچتے بچتے اپنے سینگ گھنی شاخوں میں الجھا بیٹھا تھا۔ بہرحال اس لحاظ سے عنایت محمد کا یہ فیصلہ مناسب تھا کہ پک اپ میں بہت تھوڑا ایندھن باقی

رہ گیا تھا اور اب وہ کسی بھی جگہ کھڑکھڑا کر مراقبے میں جا سکتی تھی۔

انجن کا شور بند ہوتے ہی جیسے کائنات میں ہر طرف سکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں ہماری دھڑکنوں کی آواز ابھر رہی تھی یا متعاقب گاڑیوں کی قریب آتی ہوئی گھوں گھوں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ میرے ذہن میں کئی روز سے خطرے کی جو گھنٹی بج رہی ہے کیا اس کا تعلق انہی واقعات سے ہے۔ اس سوال کا جواب وضاحت سے نہیں آیا۔ دل کہہ رہا تھا' نہیں وہ کوئی اور واقعہ ہے۔ کوئی نہایت خونی منظر جو میرے ذہن پر مدتوں نقش رہے گا۔ زریں گل رائفل سونت کر میرے پہلو میں آ بیٹھا تھا۔ اسے مطلق فکر نہیں تھی کہ اس کا زخمی کاندھا پھر خون اگل رہا ہے۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے' اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکوڑے' دور دشمن کو گھورتا ہوا وہ ایک کہنہ مشق لشکری دکھائی دیتا تھا۔

ہمیں صاف دکھائی تو نہیں دے رہا تھا لیکن آوازوں سے پوزیشن کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں تقریباً سو گز کی دوری سے سیدھی نکلتی چلی گئیں...... لیکن زیادہ دور نہیں گئیں۔ پچھلی گاڑی آہستہ ہوئی اور پھر رک گئی۔ اس نے کئی بار ہارن دیا جس کے بعد اگلی گاڑی بھی سست ہوئی اور نیم دائرے کی صورت میں گھوم کر ہمارے شمال کی طرف آ گئی۔ مجھے اپنی بائیں جانب سو ڈیڑھ سو گز کی دوری پر اس کی جھلک نظر آئی...... وہ انہونی نہیں ہو سکی تھی جس کی ہم توقع لگائے بیٹھے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کو شک ہو گیا تھا کہ ہم ناک کی سیدھ میں نہیں گئے بلکہ دائیں بائیں ہوئے ہیں۔ دائیں بائیں بھی میں نے محاورتاً کہہ دیا ہے۔ دائیں طرف چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ چھپنے کی جگہ یہی گھنے درخت تھے جو سڑک کی بائیں طرف دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

چھت اور کریٹوں کے درمیانی خلا سے گزر کر میں پک اپ سے باہر آگیا۔ زریں گل نے میری تقلید کی۔ ڈرائیور عنایت پہلے ہی باہر کھڑا تھا۔ ڈرائیور عنایت نہتا تھا یعنی لڑائی کی نوبت آتی تو وہ صرف دست بدست لڑائی میں کام آ سکتا تھا۔ میں نے زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ پوزیشن لے کر بالکل تیار کھڑا رہے۔ میں خود جھک کر چلتا ہوا چند قدم آگے گیا۔ آخر مجھے شاخوں کے درمیان سے دونوں گاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں منہ جوڑے کھڑی تھیں اور ان کے گرد شلوار قمیصوں والے کم از کم پانچ مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ یقیناً کچھ افراد ابھی گاڑیوں میں بھی ہوں گے...... اور پھر میری یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی کہ وہ صرف دو گاڑیاں ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ٹیلے کے عقب سے ایک اور گاڑی برآمد ہوئی۔ یہ جیپ تھی اور تیزی سے اچھلتی کودتی موقعے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر گاڑیوں سے باہر کھڑے افراد پھر گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ تینوں گاڑیوں کے سواروں میں دو تین منٹ تبادلہ خیال ہوا پھر جیسے وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ان کا شکار بائیں کنارے کے گھنے درختوں میں ہے۔

انہوں نے گاڑیوں میں تقریباً پچاس پچاس گز کا فاصلہ رکھا اور سست روی سے درختوں کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ واضح طور پر ہچکچا رہے تھے۔ یہ تو وہ جان ہی چکے تھے کہ ہم غیر مسلح نہیں ہیں۔ ہماری ٹھیک تعداد کا بھی انہیں علم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ خود کو گھیرے میں پا کر ہم ان پر کیا دھاوے ماریں گے۔ یہ علاقہ غیر تھا۔ یہاں خود کار رائفل تو بچہ بچہ لٹکائے پھرتا تھا۔ لڑائیوں میں دستی بم' راکٹ لانچر' بزوکا اور مارٹر تک استعمال ہوتی تھی۔ اگر ہم پک اپ میں سے مارٹر توپ نکال کر ان پر دھائیں دھائیں شروع کر دیتے تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یہی "بے معنی" خدشات تھے جو الف خاں اور اس کے ساتھیوں کو حد درجہ محتاط کیے ہوئے تھے۔ بہرطور ہمارے دشمنوں کی غلط فہمی ہمیں زیادہ دیر بچا نہیں سکتی تھی۔ اگر ہمیں بچنا تھا تو خدا کی مدد اور اپنی ہمت و کوشش سے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے زریں گل کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان تھا۔ مجھے اس کا قد کچھ اور بھی سکڑا ہوا نظر آیا۔ عنایت محمد بھی دھواں دھار ڈرائیونگ کے بعد اب خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ اگر ہماری پک اپ ان درختوں سے نکل کر روانہ ہو جاتی تو چوہے بلی کی اندھا دھند دوڑ ایک بار پھر شروع ہو جاتی تھی۔ ایسے میں جو بھی ان گھنے درختوں کے اندر چھپا رہتا وہ بچ جاتا۔ سو فیصد یقینی بات تو نہیں تھی لیکن اس میں روشن امکانات کی جھلک تھی۔ میں نے تیزی سے سوچا اور ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ "ادھر آؤ زریں گل۔" میں نے زریں گل کو بازو سے کھینچا۔ وہ فوراً میرے ساتھ چل پڑا۔ عنایت محمد بھی پیچھے آیا۔ پک اپ ایک چھوٹے سے درخت کے ساتھ ٹکرا کر رکی تھی۔ نازک درخت جڑ سے تقریباً اکھڑ چکا تھا۔ ہم تینوں نے جوانمرگ درخت کی لاش کھینچ کر ایک طرف ڈالی اور پک اپ کے سامنے سے راستہ صاف کر دیا۔

"یہ کیا کرتا ہے جانی استاد صاحب؟" زریں گل نے پوچھا۔

"استادوں استادی ہی کیا کرتے ہیں یارے۔" میں نے کہا "تمہیں بھی بڑا چاؤ تھا جمالی استاد سے ملنے کا۔ اب تھوڑا سا بھگتو بھی۔"

"بھگتو بھی۔۔۔ کیا مطلب؟ تمہارا کہا امارے سر آنکھوں پر۔ تم حکم کرو۔ ام ابھی ان حرامزادوں کے سینے چھلنی کرتا ہے۔"

"سینے چھلنی کرنے سے بات نہیں بنے گی زریں گل۔ ہمیں ان کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانی ہوگی۔"

"وہ کیسے؟" عنایت محمد نے پوچھا۔

میں نے زریں گل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "برادر! اب ٹائم بہت تھوڑا ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں' غور سے سن لو۔ میں پک اپ یہاں سے نکال رہا ہوں۔ تم عورتوں اور بچے کے ساتھ یہاں کسی محفوظ جگہ چھپ جاؤ۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ لوگ میرے پیچھے آئیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ دور لے جاؤں اور اپنے میں الجھائے رکھوں۔ اگر تم دیکھو کہ تینوں گاڑیاں میرے پیچھے روانہ ہو گئی ہیں اور یہاں کوئی نہیں تو سڑک پار کرو اور پیچھے کی طرف چل دو۔ تم نے دیکھا ہوگا' تھوڑا پیچھے ایک بس کو ٹھیک کیا جارہا تھا۔ سفید بس تھی۔ بہت سے بستر لدے ہوئے تھے اس پر۔ وہ تبلیغی جماعت والوں کی بس ہے۔ شاید کسی اجتماع پر جا رہے ہیں۔ بڑے اچھے اور مددگار لوگ ہوتے ہیں یہ۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ سوار کرلیں گے۔" یکایک فائرنگ ہونے لگی۔ غالباً یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اب کافی نزدیک آگئی تھی۔ میں نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر صوبیدار مرجان صاحب کا مکمل ایڈریس موجود تھا۔ میں نے یہ ایڈریس زریں گل کو تھماتے ہوئے کہا "یہ سندرا کا ایڈریس ہے۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ کل تک ہمیں ملاقات ہوگی۔"

"لیکن۔۔۔!؟"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "سندرا یا پچرتل۔ تم ان دونوں قصبوں میں سے کسی میں چلے جانا۔ میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا۔" پھر میں نے نبیلہ اور نجو کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بچے کو لے کر باہر آگئیں۔ واٹر کولر الٹ کر خالی ہو چکا تھا۔ ایک ٹفن کیریئر کا کھانا بھی کھل کر ضائع ہو چکا تھا۔ صرف ایک کیریئر سلامت تھا۔ وہ میں نے زریں گل کو تھمایا۔ پک اپ کا عقبی پردہ ڈوری سے اچھی طرح کس کر باندھ دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" نبیلہ نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

میں نے کہا "نبیلہ! تم دونوں زریں گل کے ساتھ رہو یہ پورے بھروسے کا آدمی ہے۔ جہاں لے جائے چلی جانا۔ میں آج یا کل کسی وقت تم سے آملوں گا۔" میں نے یہ بات انگریزی میں کہی تھی۔ نبیلہ کے علاوہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نبیلہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے میں انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔

پہلا گیئر لگا کر میں نے کلچ کو پاؤں کے دباؤ سے آزاد کیا۔ پک اپ نے جھرجھری لی اور اچھلتی کودتی آگے بڑھی۔ میں نے یوٹرن لے کر اسے گھنے درختوں سے باہر نکالا۔ کھلی جگہ پہنچتے ہی میں نے ایکسیلیریٹر پورا دبا دیا۔ میرا رخ شمال کی طرف تھا۔ پک اپ کمان سے نکلے تیر کی طرح سڑک کے متوازی آگے بڑھنے لگی۔ عقب نما آئینے پر نگاہ ڈالی تو سینے سے اطمینان کی سانس نکلی۔ الف خاں کی تینوں گاڑیاں حرکت میں تھیں۔ بالکل "شکار" کی سی بھاگ دوڑ تھی۔ جیسے جنگلی خرگوش کچھ دیر دم لینے کو جھاڑیوں میں دبک جاتا ہے اور شکاری کتے پاگلوں کی طرح اسے کھوجتے پھرتے ہیں۔ پھر وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنی دُمیں ہلانے لگتے ہیں اور کان غیرمرئی آوازوں پر لگا دیتے ہیں۔۔۔ جیسے ہی قسمت کا مارا جانور ان کی قربت سے گھبرا کر پھر بھاگتا ہے تو وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپک پڑتے ہیں۔ میں کسی سڑک کی طرف نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس جانب کا راستہ مسدود تھا۔ مجبوراً مجھے کچے میں ہی بھاگنا پڑ رہا تھا۔

میں متعاقب گاڑیوں کو اپنے پیچھے لگا کر قریباً دو میل کی دوری تک لے آیا۔ یہ وہ زیادہ سے زیادہ کامیابی تھی جس کی میں نے توقع کی تھی۔ اس دو میل کی دوڑ میں نہ صرف میں خود محفوظ رہا تھا بلکہ گاڑی کے ٹائر بھی برسٹ ہونے سے بچ رہے۔ اب متعاقب گاڑیوں سے میرا درمیانی فاصلہ بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ فاصلے کے ساتھ ساتھ بچ نکلنے کا چانس بھی کم ہوتا جارہا تھا۔ وہ لوگ فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ چونکہ اب فائرنگ بہت نزدیک سے ہو رہی تھی لہٰذا کسی بھی لمحے کوئی گولی ٹائر میں لگ سکتی تھی۔ گولی نہ بھی لگتی تو اب پیٹرول اپنے آخری قطروں پر تھا۔ یا ممکن ہے ختم ہی ہو چکا ہو اور پک اپ صرف متعاقب گاڑیوں کی دہشت سے بھاگی جارہی ہو۔ جنگلی خرگوش کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا جسم بے جان ہو چکا ہوتا ہے لیکن وہ کتوں کے آگے بھاگتا چلا جاتا ہے اور پھر پٹ سے گر کر مر جاتا ہے۔

ان آخری لمحات میں بھی میری نگاہیں سڑک کا کھوج لگا رہی تھیں لیکن سڑک کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ لگتا تھا وہ

اس خونی بھاگ دوڑ سے دامن بچانے کے لیے کسی کیچوے کی طرح رینگ کر جھاڑیوں میں گم ہو گئی ہے۔ میں نے ڈائل پر نگاہ ڈالی۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی چالیس پر لرز رہی تھی۔ اس راستے پر چالیس میل کی رفتار ہموار سڑک پر ایک سو ساٹھ میل کی رفتار سے زیادہ خطرناک تھی۔ پک اپ دو دو فٹ اچھل رہی تھی۔ کبھی سربسجود نظر آتی تھی اور کبھی گھوڑے کی طرح الف ہو جاتی تھی۔ اچانک مجھے بائیں طرف سے ایک مانوس غراہٹ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں گھوم کر دیکھتا' ایک پرچھائیں سی جھاڑیوں سے نمودار ہوئی اور لپک کر میری طرف آئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے گندم سے بھری ہوئی ڈھائی من کی بوری کھینچ کر مجھ پر دے ماری ہے۔ یہ ایک ناقابلِ برداشت دھچکا تھا۔ پک اپ تو پہلے ہی اشارے کی منتظر تھی۔ سٹیرنگ کا میرے ہاتھوں سے پھسلنا تھا کہ سب کچھ قابو سے باہر ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے گاڑی کا فرش میرے پاؤں تلے سے نکل گیا ہے۔ مشرق سے ابھرتا ہوا سورج ایک دم میرے سر پر سے گزر گیا اور جھاڑیاں' ٹیلے' درخت سب نگاہوں میں گڈمڈ ہوتے چلے گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی درندہ میرے بالکل نزدیک غرا رہا ہے اور پک اپ قلابازیاں کھا کر نشیب میں ڈھلک رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے میرے حواس معطل ہو گئے۔ یہ غالباً چار پانچ منٹ کا وقفہ تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دوران مجھے ارد گرد کی خبر نہیں رہی تھی۔ میں دھندلے منظر دیکھ رہا تھا اور قریب کی آواز کو سن رہا تھا۔ ہاں اتنی سکت مجھ میں نہیں تھی کہ کوئی ردعمل ظاہر کر سکوں۔ ان پانچ منٹوں کے دوران مجھے بری طرح مارا پیٹا بھی گیا تھا۔ پھر میں نے ایک شخص کو جو یقیناً رحمان ملک تھا' خود پر جھپٹتے دیکھا تھا۔ وہ غلیظ گالیاں بک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اُسترا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ام اسی اُسترے سے تیرا گلا کاٹے گا۔"

پھر ایک لمبے تڑنگے شخص نے اسے سنبھال لیا تھا۔ وہ اسے پشتو میں سمجھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "نہیں ابھی نہیں۔۔۔ ابھی ذرا ٹھہر جاؤ۔" دھیرے دھیرے میرے ذہن پر چھایا ہوا غبار چھٹنے لگا۔ آنکھوں میں روشنی اور کانوں میں سماعت اپنی اصل صورت میں لوٹنے لگی۔ میں نے پلکوں کو پوری طرح اٹھا کر اپنے سامنے کا منظر دیکھا۔ میں قریباً آٹھ افراد کے نرغے میں تھا۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور ان میں الف خاں سب سے نمایاں نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی کو چھوا۔ انگلیاں خون سے تربتر ہو گئیں۔ سر پر چوٹ آئی تھی اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میں زمین پر پڑا ہوں۔ میں نے کہنیوں پر زور دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پک اپ مجھ سے کوئی تیس گز کے فاصلے پر الٹی پڑی تھی۔ ٹائر آسمان کی طرف تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی کاکروچ الٹ گیا ہو اور سیدھا ہونے کی کوشش کرتے کرتے راہیٔ عدم ہو گیا ہو۔

پک اپ کے نیچے ایک جانور کی لاش دبی ہوئی تھی۔ یہ جانور پہلی نگاہ میں مجھے عجیب الخلقت لگا لیکن غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ ایک بڑے سائز کا کتا ہے۔ چہرہ دیکھ کر اسے کتا تسلیم کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن چہرے کے علاوہ اس کا جتنا بھی جسم پک اپ سے باہر نظر آرہا تھا وہ کتے سے مشابہ تھا۔ اس کے چہرے کے ساتھ معلوم نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ عجیب بھیانک سی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس جانور کے دخل در معقولات کے سبب میں پک اپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ کر مسمار شدہ حالت میں مسلح افراد کے قدموں میں پڑا تھا۔ یہ جانور پک اپ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے مجھ پر جھپٹا تھا اور سب کچھ تہہ و بالا کر گیا تھا۔

الف خاں نے نیچے جھک کر میرے گال اپنے ایک ہاتھ میں دبائے اور بڑی بے رحم آواز میں بولا "میں پوچھتا ہوں' کہاں ہے باقی کے لوگ؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے ایک زوردار ٹھوکر میری پسلیوں میں رسید کی اور اپنے ایک بوتھاری ساتھی سے گرج کر کہنے لگا۔ "کالے! مجھے لگتا ہے' یہ کتا اپنی بہنوں اور ان کے یاروں کو درختوں میں ہی چھوڑ آیا ہے۔ چلو گاڑیاں واپس موڑو۔۔۔ ورنہ نکل جائیں گے وہ۔"

الف خاں کے الفاظ میرے سینے میں خنجر کی طرح لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری بائیں آنکھ سوج چکی ہے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا ہے۔ "ریوالور۔۔۔ ریوالور کہاں ہے؟" میں نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میرا ہاتھ خود بخود جیکٹ کی جیب پر آیا۔ جیب ہلکی ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں ریوالور مار پیٹ کے دوران گر گیا تھا یا نکال لیا گیا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو الف خاں نے کنپٹی پر زوردار ٹھوکر ماری۔ میں پھر اوندھے منہ گرا۔ ذہن کے دھندلے آسمان پر ایک بار پھر تارے سے ناچنے لگے۔

"ڈالو اس۔۔۔ کو بھی گاڑی میں۔" الف خاں نے مجھے پشتو میں کوئی سخت قسم کی گالی دیتے ہوئے کہا۔ وہ اردو روانی سے بولتا تھا لیکن کہیں کہیں پشتو کے الفاظ استعمال کر جاتا تھا۔ دو ہٹے کٹے افراد نے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا۔ نیلی

پک اپ کے پاس پہنچ کر انہوں نے مجھے ایک دو بار جھلایا پھر بڑی بے دردی سے گاڑی میں پھینک دیا۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ گاڑی میں پھینکا جانے والا میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ خدا کی ایک اور بے چاری مخلوق بھی گاڑی کے فرش پر پڑی تھی۔ یہ وہی کتا تھا جسے چند منٹ پہلے میں نے پک اپ تلے دبا دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا' اس کتے کو تھوتھنی کے نزدیک کسی زہریلی چیز نے کاٹا ہے جس کی وجہ سے اس کا منہ جو پہلے ہی بہت بڑا تھا' سوج کر کپا بن چکا تھا۔ لعاب دہن' خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے اس دہشت ناک چہرے کو دیکھ کر کسی عفریت کا خیال آتا تھا۔ میں اس عفریت کے پہلو میں پڑا تھا۔ ہم دونوں کے زخموں سے رستا ہوا خون ایک دوسرے میں "مکس" ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے رگ پٹھوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ شدید چوٹوں کے باوجود میں اب خود کو مزاحمت کے قابل محسوس کر رہا تھا۔ بغیر ہاتھ سے چھوئے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر اپنی جگہ موجود ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ میں اس خنجر سے کیا کام لے سکتا ہوں۔ فوری جواب یہ تھا کہ کچھ بھی نہیں۔

میں اس وقت آٹھ مسلح افراد کے نرغے میں تھا اور ہر ایک سے بڑھ کر ایک خرانٹ نظر آتے تھے۔ مجھے اٹک جیل کا کالو کمرانی یاد آگیا۔ وہ ایسے افراد کے لیے "کھوچل" کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا۔ یعنی کھائے پیئے اور دنیا کا سرد گرم دیکھے ہوئے لوگ۔ وہ کہا کرتا تھا "ماسٹر! کھوچل بندہ منافع میں جیتا ہے' بالکل اپن کی طرح۔ وڈی لائف میں اس کے لیے کوئی بات نیا اور انوکھا نہیں رہتا۔ اور جب لائف میں کوئی نیا بات نہ ہو تو پھر لائف سے اتنا محبت نہیں ہوتا۔ بندہ ہر ٹیم مرنے مارنے کے لیے تیار رہتا ہے۔" اس وقت خرانٹ صورتوں والے آٹھ عدد "کھوچل" میرے گرد موجود تھے اور مجھے کوئی موقع دینے پر تیار نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' وہ لوگ الٹی ہوئی پک اپ کو سیدھا کر چکے تھے اور اب اس کی تلاشی لے رہے تھے۔ خنجر پنڈلی سے نکال کر ہاتھ میں کر لینے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے جلدی سے شلوار کا پائنچہ کھینچ کر خنجر نکالا اور قمیص کے نیچے رکھ لیا لیکن یہ جگہ محفوظ نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ رستے میں پھر میری تلاشی لی جاتی۔ میں نے تیزی سے پک اپ کا جائزہ لیا۔ اسی دوران قدموں کی آواز ابھری۔ مجبوراً میں نے خنجر پھر قمیص کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر کے بے حس و حرکت ہو گیا۔

آنے والے تین مسلح افراد تھے۔ ان میں رحمان زئی بھی تھا۔ وہ مدقوق سا کباب فروش بڈھا سب سے زیادہ برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے بھاری بھرکم پشاوری چپل میرے سر پر ٹھوکر ماری۔ میں ضبط کر کے بے سدھ لیٹا رہا۔ پوٹھوہاری بولا "جل تے نہیں گیا سوری دا۔" یعنی کہیں نہیں گیا۔

رحمان زئی بولا "کیا شرم والا نہیں ہے۔ مکر کیے ہے۔"

میرا مکر توڑنے کے لیے اس نے ایک اور ٹھوکر میری پسلیوں میں دی۔ میں نے اس ٹھوکر کے جواب میں وہی عمل ظاہر کیا جو "ریت کی بوری" کرتی ہے۔ "بے ہوش ہے رانی خاں کا سالا" رحمان زئی نے نتیجہ اخذ کیا۔ دونوں افراد رائفلیں تانے بالکل چوکس کھڑے تھے۔ دایاں رخسار انسانی اور حیوانی خون سے لتھڑے ہوئے فرش پر تھا اور منہ رحمان زئی کے جوتے سے چھو رہا تھا۔ عجیب بدبوئیں اٹھ رہی تھیں اس جوتے سے۔ سڑے ہوئے کیچڑ' گوبر کی بو' بساند چھوڑتے گوشت کی بو اور کسی غلاظت مارے بیت الخلا کی بو۔ میرے بس میں ہوتا تو ایک ثانیے پہلے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیتا لیکن میں "گہری بے ہوشی" میں لہٰذا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں' وقت کے ساتھ کتنا بدل جاتا ہے انسان۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں کیسے اس کے "مزاج" پوچھتی ہیں اور کیسے اسے اپنے من چاہے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ میں اپنے اسکول کالج اور گھر میں ایک نہایت نفاست پسند لڑکا مشہور تھا۔ میں اور میری بہن پھولوں اور تتلیوں سے پیار کرتے تھے۔ پودوں کی سرگوشیاں سنتے تھے اور رنگوں کی زبان سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہمارے قصبے جل کوٹ کے اکثر لڑکے شکار کھیلتے تھے مگر سولہ سترہ برس کی عمر تک میں نے کبھی چڑیا تک نہ ماری تھی۔ سڑک پر کسی مردہ جانور کو دیکھ لیتا تو ہفتوں گوشت کو ہاتھ نہ لگاتا۔ جنازے کی صورت دیکھ لیتا تو پہروں گم صم بیٹھا رہتا۔۔۔ آج میں ایک سیکنڈ کے اندر جان لینے اور جان دینے پر تیار ہو جاتا تھا۔ کٹے ہوئے اعضا' بھیانک زخم' لٹکی ہوئی انتڑیاں' مسخ لاشیں کچھ بھی مجھ پر اثر نہیں کرتا تھا۔ شاید یہ لچک قدرت نے ہی انسان کی فطرت میں رکھی ہے۔ کیسے کیسے انسان اجنبی سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں اور اس تبدیلی کے لیے کسی عمر کی قید بھی نہیں ہوتی۔ بچے' بوڑھے' جوان' عورت اور مرد سب وقت آنے پر اس انقلاب سے گزر جاتے ہیں۔

پک اپ کے خون آلود فرش پر لیٹے لیٹے مجھے زلالہ یاد آگئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس نے شباب کی پہلی سیڑھی پر

نفرت سے دھتکار دیا تھا۔ خاندانی فضیلت کے گھمنڈ میں مجھے اچھوت سمجھا تھا اور اپنی پھٹی ہوئی قمیص کا رونا یوں رویا تھا کہ جل کوٹ میں تہلکہ مچ گیا تھا۔۔۔ آج وہ لڑکی میری خاطر سب کچھ لٹانے پر تیار تھی۔ میری ایک نظر کرم کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔ میرے سائے سے بدکنے والی میرا سایہ بن گئی تھی' میرے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ میں اس پر پارس دھرتا گزر جاتا تھا۔ وہ شکوہ کرتی تھی نہ آہ بھرتی تھی۔ یہ سب گزرتے ہوئے وقت کی طلسم کاریاں ہیں۔

باقی دونوں گاڑیاں اسٹارٹ ہو چکی تھیں لیکن پک اپ کے ڈرائیور نے ابھی اگنیشن میں چابی نہیں گھمائی تھی۔ اچانک آنکھوں کی باریک جھری سے میں نے رحمان زئی کو نیچے جھکتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا' ایک ہاتھ نے قمیص کے اوپر سے میرے خنجر کو چھوا اور پھر فوراً دوسرا ہاتھ اسے نکال لے گیا۔ مجھے خنجر سے محروم کرنے والے یہ دونوں ہاتھ یقیناً رحمان زئی کے تھے۔ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں یہ واقعہ رونما ہوا اور میں جیسے اچانک مایوسی کے شکنجے میں دب گیا۔ رحمان زئی نے یا کسی دوسرے نے میرے زخمی سر پر رائفل کی وزنی نال سے عمودی ضرب لگائی اور میرے کانوں میں پشتو کے گالی نما الفاظ گونجنے لگے۔ بہت تکلیف دہ ضرب تھی یہ۔ میرے ہاتھ پاؤں اینٹھ کر رہ گئے۔ تاہم میں نے "بے ہوشی" کا بھرم قائم رکھا۔ کہتے ہیں' ہر انتہا کے بعد ایک ابتدا ہوتی ہے۔ مایوسی اور تکلیف کی انتہا کا یہ لمحہ بھی ایک مختلف کیفیت کی ابتدا بن گیا۔

اچانک میرے کانوں میں کتوں کی غراہٹیں ابھریں۔ یہ غراہٹیں دائیں جانب جھاڑیوں سے بلند ہوئی تھیں اور بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ جو پہلا احساس مجھے ہوا وہ یہی تھا کہ کتوں کا ایک غول الف خاں اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہو رہا ہے پھر مجھے سیون ایم ایم کا دھماکا سنائی دیا۔ یہ اتفاق تھا کہ میری نظر رحمان زئی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ناک سے عین اوپر ایک سیاہ نشان نمودار ہوتے دیکھا۔ یہ گولی کا نشان تھا۔ رحمان زئی پٹ سے اوندھے منہ کتے کی لاش پر گرا۔ دوسری گولی ایک نٹے کٹے شخص کے ہاتھ پر لگی اور ماؤزر جو اس کے ہاتھ میں تھا' نکل کر دور جا گرا۔

گولی چلانے والا جو بھی تھا' کمال کا نشانے باز تھا۔ کون تھا یہ نشانے باز؟ کس کے کتے تھے یہ؟ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کبیر علی شاہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومی۔۔۔ وہی کبیر علی شاہ جو اپنے شکاری کتوں کے غول کے ساتھ لاپتا ہو گیا تھا اور جسے ہم ان نشیب و فراز میں کئی روز سے تلاش کر رہے تھے۔ میرے دل نے پکار کر کہا۔۔۔ یہ بے مثال نشانے باز وہی ہے۔ وہ اپنے خونخوار کتوں کے ساتھ میری مدد کے لیے آ رہا ہے اور پھر اگلے ہی لمحے میں نے اسے اور اس کے کتوں کو جھاڑیوں سے نکلتے دیکھا۔۔۔ میرے سامنے دو تازی کتوں نے ایک ساتھ جست کی اور ہوا میں اڑتے ہوئے دو رائفل برداروں پر گرے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے بھی حرکت میں آ جانا چاہیے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس ماؤزر کی تلاش میں نگاہ دوڑائی جو ابھی نٹے کٹے شخص کے ہاتھ سے نکلا تھا۔ وہ مجھے پک اپ کے ایک کونے میں پڑا نظر آیا۔ میں نے اپنی پوری توانائی سے ماؤزر کی طرف جست کی۔۔۔ عین اسی لمحے پوٹھوہاری نے اپنی رائفل کا رخ میری طرف موڑ دیا۔

میں درمیانی فاصلہ پھلانگ کر ماؤزر پر گرا۔ ٹھیک اسی وقت رائفل کی نال میری طرف سیدھی ہو چکی تھی۔ فولادی نال کے تاریک سوراخ میں سے کسی بھی ثانیے میرے لیے موت برآمد ہونے والی تھی۔ فولادی نال کے اس تاریک سوراخ میں جھانکنا کیسا روح فرسا تجربہ ہوتا ہے یہ کچھ اسی شخص سے پوچھیے جسے شومیٔ قسمت ایسے منظر سے واسطہ پڑ چکا ہو۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ انتظار کے سوا میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا اور یہ کوئی ہفتوں دنوں یا گھنٹوں کا انتظار نہیں تھا۔ سیکنڈ کے ایک مختصر حصے کا انتظار تھا مگر صدیوں پر بھاری تھا۔ پھر میں نے ایک شکاری کتے کو عقب سے پوٹھوہاری پر جھپٹتے دیکھا' یہ گرے ہاؤنڈ کتا تھا۔ اس سبک رفتار کتے کا دھکا کھا کر پوٹھوہاری بری طرح لڑکھڑایا اور اوندھے منہ میرے قدموں میں آ گرا۔ اس کی رائفل سے دھماکے سے گولی نکلی۔ یہ گولی پک اپ کی باڈی میں کہیں لگی۔ میں نے ماؤزر پکڑا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ایک شخص پندرہ بیس قدم کی دوری پر اپنی رائفل کاک کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ رائفل سے مصروف تھے اور نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ انداز سے عیاں تھا کہ رائفل کاک کرنے کے بعد وہ جو پہلا کام کرے گا وہ مجھ پر گولی داغنے کا ہو گا۔ اس کام کے لیے اسے بمشکل ایک سیکنڈ کی مہلت درکار تھی۔ میں نے ماؤزر سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ یہ گولی اس نے سینے پر کھائی اور اچھل کر پشت کے بل گرا۔

میرے قدموں میں جیسے تہلکہ مچا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا' انسان اور کتا گتھم گتھا تھے۔ پوٹھوہاری پر چھلانگ

لگانے والے گرے ہاؤنڈ نے پلک جھپکنے میں اسے لہولہان کردیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر پک اپ سے باہر آیا۔ پک اپ سے باہر دائیں طرف جھاڑیوں کا منظر بھی پک اپ کے منظر سے ملتا جلتا تھا۔ یہاں چار کتوں اور الف خاں کے تین ساتھیوں میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے ایک تازی کتے نے ایک شخص کا نیٹوا اپنے دانتوں سے اُدھیڑا اور گردن سے خون کے فوارے چھوڑ دیے۔ "دھائیں" سے دو فائر ہوئے اور کتا تڑپ کر اپنے شکار کے اوپر گرا۔ شکار اور شکاری دونوں جان کنی کے عالم میں پھڑکنے لگے۔ کبیر علی شاہ میری پک اپ کے پیچھے پوزیشن لے چکا تھا۔ میں نے بھی بھاگ کر پک اپ کی آڑ لی۔ کبیر علی شاہ کی رائفل کا رخ الف خاں کی طرف تھا۔ الف خاں قریباً دس گز دور دو تازی کتوں سے اُلجھا ہوا تھا۔ کبیر علی شاہ نے کمال مہارت سے فائر کیا اور گولی دونوں کتوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی اپنے ہدف تک پہنچ گئی۔ الف خاں گولی کے دھکے سے اُچھل کر جھاڑ جھنکاڑ میں گرا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔

اچانک ہی الف خاں اور اس کے ساتھیوں کو احساس ہوگیا کہ وہ کھلی جگہ پر کتوں اور رائفلوں کا ہدف بن گئے ہیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پناہ کی تلاش میں بھاگے۔ آثار سے ظاہر تھا کہ کتے ان کا پیچھا کریں گے۔ یہ صورت حال کتوں کے لیے جان لیوا بھی ہوسکتی تھی۔ اس خطرے کو کبیر شاہ مجھ سے پہلے بھانپ چکا تھا۔ اس کے حلق سے مختلف آوازیں نکلیں اور تربیت یافتہ کتے ایک دم پلٹ کر پک اپ کی طرف آگئے۔ صرف ایک کتا زیادہ جوشیلا نکلا۔ یہ پاکل تازی کتے کی جسامت رکھنے والا سلوکی ہاؤنڈ تھا۔ وہ ایک بھاگتے ہوئے رائفل بردار سے لٹک گیا۔ اس کے جبڑے رائفل بردار کی پنڈلی میں تھے اور وہ وہاں سے لقمہ بھر گوشت نکالنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب تو ہوگیا لیکن رائفل بردار نے بھی بدلہ چکا دیا۔ اس نے فائر کیا اور گولی کتے کا جبڑا چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس زخم کا پتا ہمیں اس وقت چلا جب کتا اپنے مدمقابل کو جھاڑیوں میں پہنچا کر پک اپ کی اوٹ میں آیا۔ اس کی گردن خون سے سرخ ہورہی تھی اور وہ حلق سے ناقابلِ فہم آوازیں نکال رہا تھا۔ یوں تو سب کتوں کی حرکات سے سخت بے قراری ظاہر ہوتی تھی لیکن زخمی کتا کچھ زیادہ ہی بے چین دکھائی دیتا تھا۔ ویسے وہ ایک شاندار کتا تھا۔ میں نے راجستھان میں ایک شکاری سے سنا تھا کہ اس نسل کے کتے عرب شکاریوں میں بہت مقبول ہیں اور وہ تربیت یافتہ کتے منہ مانگی قیمت پر خریدتے ہیں۔

الف خاں اور اس کے ساتھی درختوں سے ڈھکی ہوئی چٹانوں کے پیچھے پناہ لے چکے تھے اور اب وہیں سے پک اپ پر فائر کررہے تھے۔ کبیر علی شاہ نے بھی جواباً چند فائر کیے پھر وہ میرا شانہ تھام کر بولا "آؤ احسان الٰہی! نکلیں یہاں سے۔"

میں نے پک اپ کی اوٹ سے ایک نگاہ اپنے سامنے ڈالی۔ رحمان زئی کی لاش ڈاٹسن پک اپ میں یوں پڑی تھی کہ اس کا آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا۔ جس کتے نے رائفل بردار کا نرخرا ادھیڑا تھا وہ اپنے شکار کے اوپر ہی بے سُدھ پڑا تھا۔ شکار اور شکاری دونوں راہیٔ عدم ہوچکے تھے۔ پوٹھوہاری کو میں نے زخمی حالت میں ڈاٹسن پک اپ سے لڑھکتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے پک اپ کے عقب میں پناہ لے رکھی ہے۔ جس شخص کو میں نے گولی "رسید" کی تھی وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ معلوم نہیں وہ قدموں پر چل کر گیا تھا یا الف خاں کے ساتھی اس کی لاش گھسیٹ لے گئے تھے۔

"چلو آؤ احسان الٰہی۔" کبیر شاہ نے مجھے پھر کندھے سے کھینچا۔

ہم دونوں جھک کر دوڑتے ہوئے عقبی درختوں کی طرف بڑھے۔ کتے میکانکی انداز میں ہمارے پیچھے آئے۔ چند گز آگے جاکر کبیر شاہ بھاگتے بھاگتے مڑا اور عقب میں چند فائر کیے۔ یہ بڑے موثر فائر تھے۔ میں نے بھی ماؤزر سے دو فائر جھونک مارے۔ تیسرے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ماؤزر خالی ہوچکا تھا۔

کبیر شاہ کے دوڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ ہے۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر ہم نہایت گھنے درختوں میں گھس گئے۔ یہاں جگہ جگہ چٹانی اُبھار بھی تھے۔ ہمارے عقب میں کافی پیچھے "بھاگو پکڑو" کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً الف خاں اور اس کے ساتھی جان گئے تھے کہ ہم بھاگ رہے ہیں۔ ان میں سے دو تو بلاشبہ ہلاک ہوچکے تھے۔ دو تین شدید زخمی ہوئے تھے۔ یعنی اب ایسے افراد جو پوری توانائی سے ہمارے پیچھے آسکتے دو یا تین تھے۔۔۔ اور انہیں بھی کتوں سے خطرہ تھا۔ کتوں کو ساتھ لے کر "بھاگنے والوں" کا تعاقب کیا جاتا ہے لیکن یہاں صورتِ حال برعکس تھی۔ کتے "بھاگنے والوں" کے ساتھ تھے۔۔۔ اور کتے بھی کوئی معمولی نہیں۔ اوّل درجے کے تربیت یافتہ اور مرمٹنے والے۔ ان میں سے ایک تو میرے سامنے جان سے گیا تھا اور ایک شدید زخمی ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الف خاں اور اس کے ساتھی پوری تندہی سے ہمارا پیچھا نہیں کرپائے۔ وہ ہمارے عقب میں آئے ضرور اور انہوں نے

فائرنگ بھی کی لیکن ہم ان کی زد سے بچ نکلے اور اندھا دھند بھاگتے ہوئے "موقعے" سے کافی دور نکل آئے۔ قرب و جوار میں دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اس مقام سے زیادہ دور نہیں جہاں سے نوئے مشت کے اندرونی حصوں کی طرف جانے والا کچا راستہ پھوٹتا ہے۔ ایک خشک نالے اور چند ٹیلوں کو پار کرکے ہم ایک ایسی کھائی میں گھس گئے جس میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ تھا اور الف خاں کے ساتھی یہاں پہنچتے بھی تو آسانی سے ہمارا کھوج نہیں لگا سکتے تھے۔ ایسی کھائیاں نوئے مشت میں ہر جگہ دیکھی جاسکتی تھیں۔ چھپنے، گھات لگانے اور مدعا غائب کرنے کے لیے یہ بڑی مناسب جگہیں تھیں۔

ہم نے یہاں رُک کر اپنی سانسیں درست کیں۔ کبیر علی شاہ کے کندھے سے کینوس کا ایک تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس نے تھیلے میں سے "کتوں کے منہ پر چڑھانے والی جالیاں" نکالیں۔ بڑی احتیاط لیکن پھرتی کے ساتھ اس نے کتوں کے منہ باندھ دیے اور دو زیادہ جوشیلے کتوں کے گلے میں زنجیریں ڈال دیں۔ کبیر علی شاہ کے پاس اب کل چار کتے رہ گئے تھے جن میں سے ایک زخمی تھا۔ نجیم شجیم بُولی (بولی) کتوں کے جوڑے میں سے ایک تو فاناردہ تھا جس نے پک اپ کی کھلی کھڑکی میں سے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور پھر اسی پک اپ کے نیچے آکر کچلا گیا تھا۔ دوسرا بولی بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اس دوسرے کتے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی سوالات تھے جو ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن ابھی ان سوالوں کا وقت نہیں آیا تھا۔ الف خاں اور اس کے ساتھی فاصلے پر ضرور رہ گئے تھے مگر ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ ہم دم سادھے اپنی جگہ بیٹھے رہے اور قرب و جوار کی آہٹیں لیتے رہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد کبیر شاہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ چند لمحے بعد میں بھی اس جائزے میں شریک ہوگیا۔ ہمارے چاروں طرف جنگلی گھاس، داب اور سرکنڈوں کی ہریالی تھی۔ اس ہریالی میں جگہ جگہ درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ عقب میں زرد بیلوں والی خاردار جھاڑیاں پہاڑی سلسلے کے دامن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا میلوں تک ہمارے سوا کوئی متنفس نہیں۔ آخری فائر ہوئے اب قریباً دس منٹ گزر چکے تھے اور آخری انسانی آواز بھی اتنی ہی دیر پہلے ہمارے کانوں میں پہنچی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر ماؤزر کو جیکٹ میں رکھ لیا۔ ویسے وہ ہاتھ میں بھی رہتا تو بے کار ہی تھا۔ اس کی آخری گولی

میں چند منٹ پہلے فائر کرچکا تھا۔ کبیر علی شاہ بدستور ریڈ الرٹ تھا۔ میں نے اس کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ سخت تشویش میں ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ ایک بے قرار تازی کو مسلسل سہلا رہا تھا اور بایاں مضبوطی سے خودکار رائفل پر جما ہوا تھا۔ وہ شکاری تھا اور جنگل میں شکاری کے حواس عام افراد سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ شاید وہ کوئی ایسی شے دیکھ رہا تھا جو میری نگاہ سے اوجھل تھی۔ اور صرف کبیر علی ہی نہیں مجھے اس کے کتے بھی بے قرار نظر آرہے تھے۔ کھائی میں گھسنے کے بعد وہ اچانک پُرسکون ہوگئے تھے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی تھی۔ جونہی کبیر علی شاہ ان کے منہ باندھ کر فارغ ہوا تھا وہ ایک بار پھر اپنی حرکات سے شدید بے چینی کا اظہار کرنے لگے تھے۔

کبیر علی شاہ اور اس کے کتوں کی بے قراری میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ کم از کم اس وقت تو ہم خطرے سے بہت دور

ایم اے راحت کے قلم سے

پرواز

ایڈونچر سے بھرپور ایک خوبصورت کہانی

اُس نوجوان کی سرگزشت جس کی رگوں میں
وطن کی محبت دوڑ رہی تھی مگر وطن نے اُسے کیا دیا

★

وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہربان
ہوئے تو وہ اندر سے ٹوٹ گیا۔ لیکن فتح اُسکا مقدر تھی

قیمت ۵۰/-
ڈاک خرچ
قارئین بیہ
۲۰/-
اپنی گرفت سخت کرتی ہوئی داستان

نظر آتے تھے۔ نہ فائر' نہ آہٹ' نہ کہیں انجن کا شور۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ الف خاں اور اس کے ساتھیوں نے فی الحال ہمارے پیچھے آنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ ان میں سے جو افراد زخمی ہوئے تھے انہیں فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی یقیناً الف خاں کے پیش نظر رہی ہوگی۔ وہ جان چکا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں کو دو ڈھائی میل پیچھے گھنے درختوں میں چھوڑ آیا ہوں۔ عین ممکن تھا کہ "بھاگتے چور کی لنگوٹی" والا محاورہ ذہن میں رکھ کر وہ انہیں پکڑنے کے لیے روانہ ہو گیا ہو۔ دو جوان عورتوں کی کشش یقیناً الف خاں جیسے بردہ فروش کے لیے کم نہیں رہی ہوگی۔

کبیر شاہ کی مضبوط گرفت نے مجھے چونکایا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ڈھلوان کی طرف کھینچ رہا تھا۔ بے حد مضبوط انداز تھا اس کا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کبیر شاہ اور کتوں کی پریشانی کا سبب وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔

"کیا بات ہے جناب؟" میں نے ہیڈ کانسٹیبل کا کردار نبھاتے ہوئے دبی سرگوشی میں پوچھا۔

کبیر شاہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے انداز میں شدید اضطراب پایا جاتا تھا۔ کتے ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ ہم بڑی تیزی سے پتھر پھلانگتے ہوئے ڈھلوان پر پہنچے۔ یہاں جنگلی گھاس کولہوں سے اوپر تک پہنچتی تھی۔ قدموں کے نیچے زمین ناہموار تھی اور دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی لہٰذا ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ کبیر شاہ کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے۔ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے میرا بازو تھاما اور قریباً کھینچتا ہوا ایک ٹیلے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک تنگ سے دہانے والی' غار نما کھوہ تھی۔ اس قسم کی کھوہ میں نے علاقے میں بہت دیکھی تھیں' اونٹ کی طرح دہانے سے تنگ لیکن اندر سے کشادہ ہوتی تھیں۔ ایک ایسی ہی کھوہ میں چند روز پیشتر جوانہ مرگ کرن سے میری دوسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے دست و گریباں ہو گئی تھی اور میں نے بمشکل اس پر قابو پایا تھا۔ اس کھوہ کا دہانہ بھی بعین ایسا ہی تھا۔ تاہم اس کھوہ کو انسانی ہاتھوں نے اندر سے کشادہ کیا تھا جبکہ یہ کھوہ قدرتی تھی۔

میں اور کبیر شاہ کھوہ کے دہانے سے پانچ چھ قدم دور تھے تب میں نے ایک عجیب سی غراہٹ سنی۔ یہ غراہٹ کہیں قریب سے ابھری تھی۔ میں فاصلے کا تعین نہیں کر سکا اور نہ ہی یہ جان سکا کہ کون سا جانور غرایا ہے اور غرایا بھی ہے یا صرف میرے کان بجے ہیں۔ بہرطور سنسنی کی ایک لہر سی بدن میں دوڑ گئی۔ ہم انتہائی حد تک جھک کر کھوہ میں داخل ہوئے۔ چاروں کتے بھی پیچھے ہی پیچھے ہڑبڑا کر اندر گھس آئے۔ دہانے کے قریب ہی پتھر کی دو بڑی سلیں رکھی تھیں۔ کبیر علی شاہ نے ایک سل کھینچ کر غار کے دہانے پر جمائی۔ پھر ہم دونوں نے دوسری سل اٹھا کر پہلی سل کے اوپر رکھ دی۔

کھوہ میں ایک دم گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی۔ صرف دہانے کے بالائی کنارے سے چند شعاعیں پھوٹ کر چھت کا ایک حصہ روشن کر رہی تھیں۔ ایک دم غراہٹ پھر ابھری۔ اس دفعہ آواز نہایت واضح تھی اور دہانے کے بالکل پاس سے آئی تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ آوازیں پہلے بھی سن چکا تھا۔ شاید اس وقت جب پک اپ کی کھلی کھڑکی سے بھاری بھرکم کتا توپ کے گولے کے مانند مجھ پر آ گرا تھا۔ کبیر شاہ دہانے کی بالائی جھری سے آنکھیں لگائے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ پہلے تو جنگلی گھاس اور کوتاہ قامت جھاڑیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک نقطے پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ خدا کی پناہ! یہ کیسا بھیانک خواب دیکھ رہا تھا میں۔ میرے سامنے کبیر علی شاہ کا دوسرا بُوبلی کتا کھڑا تھا۔ یہ کتا ہلاک ہو جانے والے کتے سے قدرے جسیم تھا اور زیادہ خونخوار بھی۔ ساٹھ کلوگرام سے کم وزن کیا رہا ہوگا اس کا۔ میں سندھ سے روانہ ہونے کے بعد اسے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا مگر آج کے دیکھنے اور اُس دیکھنے میں بہت فرق تھا۔ آج میرے سامنے ایک بوبلی نہیں عفریت کھڑا تھا۔ ہلاک شدہ کتے کی طرح اس کا چہرہ بھی گھونج کر نا قابل شناخت ہو چکا تھا۔ گردن اور چہرہ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ بالائی ہونٹ مڑ کر عجب کریہہ انداز میں اوپر کی طرف اٹھ گیا تھا اور آنکھیں... خدا کی پناہ... وہ کسی بدروح کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں دیکھ کر ذہن میں خوف کا ہزار پایہ رینگنے لگتا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کبیر علی شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا "خوچہ! یہ دونوں' بلنڈ اگ پاگل ہو گیا ہے۔ ایک دم خونخوار۔"

"لیکن... لیکن کیسے؟"

"ام کو خود پتا نہیں۔ یہ ایک ساتھ ایک جھنڈ میں گھسا تھا۔ وہیں کسی چیز نے انہیں کاٹ کھایا ہے۔"

"کیا چیز ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "گردن کے قریب دیکھو... وہ گول سا نشان نظر آ رہا ہے ناں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "یہ

سانپ یا چمگادڑ کے کاٹنے کا نشان ہے۔ ایسا ہی نشان اس دوسرے کتے کی تھوتھنی اور کان کے نیچے تھا۔ دو سال پہلے امارے بھائی کا ایک آئرش ہاؤنڈ اسی طرح زخمی ہو گیا تھا۔ وہ ہاؤنڈ نسل کا سب سے بڑا کتا ہوتا ہے۔ اس کا منہ بھی اسی طرح سوج گیا تھا۔ باؤلا جانور جب کتے کو کاٹتا ہے تو اسے بھی باؤلا کر دیتا ہے۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ کتا باؤلا ہو چکا ہے؟"

"ایسا ویسا باؤلا نہیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھو اور منہ سے نکلتا جھاگ دیکھو۔ اس وقت یہ ایک خونخوار درندہ ہے۔ ام نے بہت کم کسی جانور کو ایسا خراب حالت میں دیکھا ہے۔ ام کو یقین ہے جس بدنصیب کے جسم پر اس کا ایک دانت بھی لگ گیا وہ پاگل ہونے سے نہیں بچے گا۔" کبیر شاہ کے لہجے میں بے پناہ افسردگی اور رنج تھا۔

اب مجھے صورت حال کی اصل سنگینی کا احساس ہو رہا تھا اور یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کبیر شاہ اور اس کے کتے ایک دم بے چین کیوں ہو گئے تھے۔ یقیناً وہ ارد گرد پاگل بوبلی کی موجودگی محسوس کر چکے تھے۔ کبیر شاہ نے نہایت بروقت اقدام کیا تھا جو کھلی جگہ چھوڑ کر اس کھوہ میں گھس آیا تھا۔ کتے کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ اگر ہم اب تک کھلی جگہ پر ہوتے تو سخت مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہوتے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ یہ ایک جسیم نسل کا بوبلی تھا۔ زیادہ تر بوبلی کتوں کی طرح اس کی پچھلی ٹانگیں اگلی ٹانگوں سے لمبی نظر آتی تھیں۔ بال سیدھے' جبڑا لٹکا ہوا اور چہرے پر ڈھیلی کھال کی جھریاں تھیں۔ کتے کے حلق سے جو ایک مسلسل غراہٹ بلند ہو رہی تھی وہ اس کی اصل آواز سے بہت مختلف تھی۔ قطعی نامانوس سی آواز تھی یہ۔ کسی بہت بڑے اور گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی۔ ایک لرزا دینے والی کیفیت تھی اس کے اتار چڑھاؤ میں۔ وہ کھوہ کے دہانے کو دیکھ رہا تھا جیسے جان چکا ہو کہ اس کا شکار اس کھوہ میں ہے۔ اس کی خون بار آنکھوں کی سرخی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا' وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کی دُم نے تیزی سے گردش کی۔ تب وہ ایک خوفناک آواز کے ساتھ دہانے کی طرف لپکا۔ بالکل کسی اڑنے بھینسے کے انداز میں اس نے "دھائیں" سے ایک زوردار ٹکر پتھر کی سل کو ماری۔ یہ قریباً چار انچ موٹی پانچ مربع فٹ کی مستطیل نما سل تھی۔ خاصا وزن رہا ہوگا اس کا لیکن اگر ہم دونوں نے سل کو سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو وہ یقیناً اپنی جگہ چھوڑ دیتی۔

سل کو ٹکر مارنے کے بعد کتا پیچھے ہٹا تو اس کے لتھڑے ہوئے چہرے پر تازہ خون کی سرخی نظر آئی۔ یقینی بات تھی کہ وہ اپنے پاگل پن میں اس سے پہلے بھی مختلف اشیا سے سر ٹکراتا رہا ہے۔ سل کو ایک ٹکر مارنے کے بعد کتے کے ہیجان میں یکایک اضافہ ہو گیا۔ دس بارہ فٹ پیچھے ہٹنے کے بعد وہ ایک بار پھر دہانے کی طرف لپکا۔ ہم دونوں نے اپنے کندھے بالائی سل سے جوڑ لیے اور پتھر کے ساتھ پتھر کی طرح جم کر بیٹھ گئے۔ یہ ٹکر پہلی سے بھی شدید تھی۔ یوں لگا کہ تصادم کی شدت تھوڑی سی زیادہ ہوتی تو موذی جانور کی کھوپڑی کھل جاتی۔ کھوہ کے اندر چاروں کتے بے قراری سے چکرا رہے تھے۔ ان سب کے منہ بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ تاہم نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کتوں کی بے قراری میں غصہ نہیں بلکہ ایک طرح کا خوف سمٹا ہوا ہے۔

کھوہ سے باہر جانور کی گھمن گرج ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسری ٹکر مارنے کے بعد وہ اپنے دانتوں سے پتھر کی سل پر حملہ آور ہوا۔ وحشت نے جیسے اسے اندھا کر رکھا تھا۔ وہ پتھر کی سل پر جھپٹ جھپٹ کر اسے دانتوں سے "ادھیڑنے" کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوشش ناکام ہوئی تو وہ پھر ٹکر مارنے کے لیے پیچھے ہٹا۔

"خان صاحب!" میں نے چلا کر کہا۔ "گولی مارو اسے۔"

کبیر شاہ نے سیون ایم ایم ایک طرف پھینک دی اور جھنجلائے لہجے میں بولا۔ "یہ تو خالی ہو چکا ہے' تم اپنا ماؤزر نکالو۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرا ماؤزر تو کبیر شاہ کی رائفل سے پہلے ہی خالی ہو چکا تھا۔ یہ بڑا سنگین اتفاق تھا۔ ہم دونوں مسلح ہونے کے باوجود غیر مسلح تھے۔ جس وقت ہم مویشے سے فرار ہوئے ہمارے ارد گرد دو تین رائفلیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت ایک رائفل اٹھا لی ہوتی تو اب بے بسی کا سامنا نہ ہوتا۔ میں نے اپنے ماؤزر کے خالی ہونے کا مژدہ سنایا تو کبیر شاہ نے سر تھام لیا۔ "او خدایا! یہ بہت بُرا ہوا... بہت ہی بُرا ہوا۔"

پاگل کتے نے دو اور بھرپور ٹکریں سل کو رسید کیں پھر ایک دم کسی دوسری آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ بھاگتا ہوا جھاڑیوں کی طرف گیا۔ مشرق کی طرف منہ کر کے کچھ دیر غرایا اور پنجوں سے زمین کھودتا رہا پھر یکایک پُرسکون نظر آنے لگا۔ تیزی سے گردش کرتی ہوئی دُم نیچے لٹک گئی اور وہ کھوہ کے دہانے پر قریباً دس گز دور پھلاہی کے ایک درخت

کے سائے میں بیٹھ گیا۔ اس کا رخ دہانے ہی کی طرف تھا۔

کبیر شاہ بغور کتے کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی سانس روک کر آنکھیں دہانے کی جھری سے لگا رکھی تھیں۔ دو تین منٹ بعد کبیر شاہ نے گہری سانس لی اور چٹان سے ٹیک لگا کر آلتی پالتی مار لی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ غالباً وہ بھانپ چکا تھا کہ کتا فی الحال دہانے پر مزید یلغار نہیں کرے گا۔ "یہ بہت بڑا ہوا احسان الٰہی!" اس نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس اس وقت ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ" میری نگاہیں بدستور کھوہ سے باہر لگی ہوئی تھیں۔ الف خاں سے پیچھا چھڑاتے چھڑاتے ہم ایک بدتر دشمن کے مقابل آ گئے تھے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں تھا ہمارے پاس۔ کتے کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں تادیر قیام کا ارادہ رکھتا ہے اور اس قیام کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی ہم سے غافل نہیں ہوگا۔

میں نے دہانے کی جھری سے نگاہ ہٹا کر کبیر شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کا لباس بے حد بوسیدہ اور کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر میل کی تہہ جمی ہوئی اور بال منتشر تھے۔ اس کی حالت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ پچھلے دو تین ہفتے اس نے سخت ابتلا میں گزارے ہیں۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! کہاں چلے گئے تھے آپ؟ ہم تو ہلکان ہو گئے آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

وہ بولا "اور یہی شکوہ میری طرف سے بھی ہے۔ بہرحال یہ تو لمبی کہانی ہے۔ تم بتاؤ باقی لوگ کہاں ہے۔ ہمارا مطلب ہے مرجان اور ایس پی وغیرہ۔"

میں نے کہا۔ "ایس پی صاحب تو واپس لاہور جا چکے ہیں۔ مرجان صاحب میری اطلاع کے مطابق سندھ میں ہیں۔"

کبیر شاہ کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔ "تمہارا مطلب ہے ڈاکوؤں کے جنگل سے نکل گیا وہ سب لوگ۔۔۔؟"

میں نے افسردگی سے کہا۔ "ہاں۔۔۔ کچھ نکل گیا اور کچھ رہ گیا۔ پولیس پارٹی کے دو آدمی انہوں نے مار ڈالے۔ ان میں انسپکٹر باجوہ بھی ہے۔"

"او خدایا۔۔۔ انسپکٹر باجوہ مر گیا۔۔۔ بہت برا ہوا۔۔۔ بہت ہی برا ہوا۔۔۔ کیسے ہوا یہ سب اور۔۔۔ اور وہ دوسرا کون ہے؟"

"دوسرا ہیڈ کانسٹیبل نذیر تھا۔ ان دونوں کو عیسیٰ جان کے ساتھیوں نے دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی مار دی۔"

کبیر شاہ کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ "عیسیٰ جان۔۔۔؟ کس عیسیٰ جان کی بات کرتا ہے تم؟"

"وہی عیسیٰ جان جسے ہم سب جانتے ہیں اور جس کی تلاش میں ہم نے یہ شکار کا بکھیڑا پالا تھا۔"

"او خدایا۔۔۔ تو یہ عیسیٰ جان کا آدمی تھا۔ ام کو۔۔۔ ام کو پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ عیسیٰ جان کا کام ہوگا۔۔۔" کبیر علی شاہ پر خوف آمیز حیرت کا شدید حملہ ہوا تھا۔ وہ چند لمحے خاموشی کے ساتھ اس اطلاع کو جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو پھر مرجان اور ایس پی وغیرہ بچ کیسے نکلا۔۔۔ اور خود عیسیٰ جان کا کیا بنا۔ ام کو ذرا تفصیل سے بتاؤ برادر۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا اور کب؟"

میں نے کبیر شاہ سے سگریٹ لے کر اپنا سگریٹ سلگایا اور اسے ان واقعات کے بارے میں بتانے لگا جو اس کی غیر موجودگی میں ہم سب پر گزرے تھے۔ پہاڑی ریستوران سے عیسیٰ جان کے ڈیرے تک پہنچنے اور ڈیرے پر چھڑنے والی لڑائی سے لے کر پاوندہ بستی میں محصور ہو جانے تک کے سارے واقعات میں نے کبیر شاہ کے گوش گزار کیے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ گروہ میں پھوٹ پڑ جانے کے سبب عیسیٰ کے ساتھی تتر بتر ہو چکے ہیں اور وہ خود روپوش ہے تو حیرت کے مارے کبیر شاہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "آپ لشکر خاں کو جانتے ہیں؟"

وہ بولا۔ "ہاں سنا ہوا ہے نام۔ کہتے ہیں یہ عیسیٰ جان کا خاص آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اب وہ عیسیٰ کا خاص دشمن بن چکا ہے۔ ان دونوں میں دشمنی کا سبب وہ شنکر بھارتی ہے۔ شنکر نہ صرف عیسیٰ جان کے ساتھ ہے بلکہ اس سے ہماری مڈھ بھیڑ بھی ہو چکی ہے۔ عیسیٰ جان کے گروہ میں شنکر کا بڑھتا ہوا عمل دخل لشکر خاں کو پسند نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں میں اختلافات بڑھتے رہے اور نوبت مسلح تصادم تک پہنچ گئی۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ عیسیٰ کو تہس نہس کرنے میں سب سے نمایاں کردار لشکر خاں نے ادا کیا ہے۔"

ہماری گفتگو دیر تک جاری رہی۔ آخر میں میں نے کبیر شاہ کو نجو اور زمیلہ وغیرہ کے بارے میں بتایا اور ان حالات سے آگاہ کیا جن میں میں ان دونوں کو پارہ چنار سے پشاور لے کر جا رہا تھا۔ نجو کے نکاح سے لے کر الف خاں سے لڑائی تک تمام اہم باتیں میں نے کبیر شاہ کے گوش گزار

کیں۔ اگر میں نے اس گفتگو میں کوئی بات چھپائی تھی تو وہ یہ کہ نجو سے بے وفائی کی پاداش میں میں نے پہلوان کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ کبیر شاہ حیرت کے عالم میں سنتا رہا اور مختلف سوالات کرتا رہا۔ میرے بعد اس نے اپنی روداد سنائی۔ میری روداد کے مقابلے میں یہ کافی مختصر تھی۔ ویسے بھی کبیر شاہ کی نگاہ میں میں ایک کانسٹیبل تھا۔ اس نے میرے لیے زیادہ تفصیلات میں جانا ضروری نہیں سمجھا۔

اس کے بیان کے مطابق ڈھوکی تالاب والے پڑاؤ سے فرار ہونے کے بعد اس نے پہلا ہفتہ چھپ کر گزارا۔ وہ اپنے کتوں کے منہ باندھ کر ایک ویران کھنڈر میں گھس گیا تھا۔ چھ سات دن بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ قرب و جوار میں کوئی خطرہ نہیں تو اس نے زونے مشت سے نکلنے کی ٹھانی۔ تاہم جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ کام اتنا سہل نہیں۔ جنگل میں ڈاکوؤں کی نقل و حرکت بہت زیادہ تھی۔ ان سے کنی کترا کر نکلنے کی کوشش میں وہ ایسی بھول بھلیوں میں جا گھسا کہ جتنا نکلنا چاہتا تھا اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔ پھر ایک روز اسے جھاڑیوں سے ایک خون آلود ٹوپی اور ٹرپل ٹو رائفل کے دو خالی میگزین ملے۔ وہ پہچان گیا۔ ایسی رائفل صوبیدار مرجان کے پاس تھی۔ یہ ٹوپی بھی لیویز کے جوانوں میں سے کسی کی لگتی تھی۔ کبیر شاہ کو شک ہو گیا کہ اس کے ساتھی کہیں قرب و جوار میں ہیں۔ جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے واپسی کا خیال دل سے نکالا اور بڑے محتاط انداز میں ساتھیوں کی تلاش میں لگ گیا۔ اسی دوران ایک تاریک جھنڈ میں اس کے دونوں بولی بھی زخمی ہو گئے۔ شروع میں ان کے زخم معمولی نظر آتے تھے لیکن تین چار روز کے اندر حالت بگڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کبیر شاہ کی فکرمندی بھی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ یہ شبہ تو اسے پہلے ہی ہو گیا تھا کہ کتوں کے زخم معمولی نہیں ہیں۔ اب اسے یقین ہونے لگا کہ اس کے کتے باؤلے پن کا شکار ہو رہے ہیں۔

پانچ چھ روز پہلے رات کو شدید بارش ہوئی۔ کبیر علی شاہ کو سردی کے سبب بخار ہو گیا اور وہ رات بھر مدہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ اگلے روز جب وہ گیارہ بجے کے قریب وہ جاگا تو دونوں کتے موجود نہیں تھے۔ کبیر علی شاہ انہیں ڈھونڈنے نکلا تو چند گز آگے اسے ایک گیدڑ کی لاش نظر آئی۔ ان دونوں کتوں کو اس طرح سدھایا گیا تھا کہ وہ گیدڑ یا ہرن وغیرہ کی چیر پھاڑ نہیں کرتے تھے۔ صرف اسے گھیر کر رکھتے تھے تاکہ مالک پہنچ کر اس کا شکار کر سکے۔ مگر اس واقعے میں انہوں نے گیدڑ کی تکا بوٹی کر ڈالی تھی۔ گیدڑ کی لاش دیکھتے ہی کبیر شاہ کو اندازہ ہو گیا کہ کتے پاگل ہو چکے ہیں اور اب کسی کے لیے بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ وہ چاہتا تو اس صورت حال کو نظر انداز کر سکتا تھا مگر اس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی کہ وہ اس غفلت کا مرتکب ہو۔ وہ بڑی آزردگی کے عالم میں انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ یہ وہی کتے تھے جنہیں اس نے ایک ایک پور پروان چڑھایا تھا۔ وہ انہیں رات میں بادام اور دودھ ملا کر دیتا تھا اور قیمے والے پراٹھے کھلاتا تھا۔ صفائی ستھرائی کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ جب دیکھو چم چم کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں کے لیے بے شک وحشت کی علامت تھے لیکن اس کے لیے سراپا محبت تھے۔ میں نے خود دیکھا تھا وہ اپنے اگلے پنجے اٹھا کر کبیر شاہ کے کندھوں پر رکھ دیتے تھے اور اس کے چہرے سے اپنا چہرہ رگڑنے لگتے تھے۔ وہ ان کی ہر رمز سمجھتا تھا اور وہ بھی اس کے رمز شناس تھے۔ اب وہی کبیر شاہ انہیں شوٹ کرنے کے لیے نکلا تھا۔

مسلسل تین روز کتوں کے پیچھے بھٹکنے کے بعد آج اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ زونے مشت کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آیا ہے۔ اسے پارہ چنار کو جانے والی پختہ سڑک نظر آئی تھی۔ یہ اس کے لیے بڑی خوشی کی بات تھی۔ کئی روز کی دشت نوردی کے بعد آخر اسے راستے کا نشان مل گیا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور تشکر کے عملی مظاہرے کے لیے مزید چند گھنٹے کتوں کی تلاش میں صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ گمشدہ کتوں کے آس پاس پہنچ چکا ہے۔ سڑک کراس کر کے وہ تین چار فرلانگ مغرب کی سمت آیا تھا کہ اسے اچانک انجن کا شور سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی چند کرخت آوازیں کانوں میں پڑیں۔ وہ جھاڑیوں میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھا تو اس نے الف خاں کے ساتھیوں کو دیکھا جو میری الٹی ہوئی پک اپ سیدھی کر رہے تھے۔

بعد کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ فائرنگ کے تبادلے کے بعد ہم نکل بھاگے تھے اور اس تنگ گھاٹی میں پہنچ چکے تھے۔ کبیر علی شاہ ہوشیار ہو چکا تھا۔ ایک کتے کی لاش دیکھنے کے بعد وہ جان گیا تھا کہ دوسرا کتا بھی کہیں آس پاس موجود ہے۔ ان کتوں نے جوڑے کی صورت میں تربیت پائی تھی اور شکار کے دوران بھی ایک ساتھ رہتے تھے۔ کبیر شاہ کا اندازہ درست نکلا۔ گھاٹی میں پہنچتے ہی اس کے کتوں نے دوسرے بولی کی بو پالی اور بے قراری کے آثار نظر آنے لگے۔

یکایک میری اور کبیر شاہ کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پھلاہی کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا بولی ایک بار پھر شدت سے بھونکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کسی چیز پر جھپٹ رہا ہے۔ وہ کوئی سیاہ پرندہ تھا جو تیزی سے اُڑ گیا۔ کتے نے عجیب نشیلے انداز میں سر گھمایا اور بے حد وحشت کے ساتھ دہانے پر حملہ آور ہو گیا۔ اس کی یہ ٹکر بڑی زوردار تھی۔ ساٹھ کلوگرام وزن قریباً پچاس میل فی گھنٹا کی رفتار سے اڑتا ہوا سل سے ٹکرایا۔ میں اور کبیر شاہ سل کو بمشکل اس کی جگہ پر روک سکے۔ پہلی ٹکر کے بعد کتے کی وحشت انتہا کو چھو گئی۔ وہ پلٹ پلٹ کر جھپٹنے لگا۔ اس کی غراہٹیں لرزہ خیز تھیں۔

دو یا تین منٹ سل سے برسرپیکار رہنے کے بعد وہ حسب سابق ایک بار پھر اچانک پُرسکون ہو گیا اور دھیمی رفتار سے چلتا ہوا دوبارہ پھلاہی کے نیچے جا بیٹھا۔ اس کی تھوتھنی سے خون ٹپک رہا تھا اور گرد آلود ہونے کی وجہ سے چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا، پیڑ کی جڑ کے قریب ایک پہاڑی کوا اپنے ساتھی کوے یا کوّی کے ساتھ لڑتا ہوا عین بولی کے سامنے آن گرا تھا۔ بولی تو پہلے ہی اشارے کا منتظر تھا۔ چند فٹ کی دوری پر کوؤں کو لڑتے اور شور مچاتے دیکھ کر اس پر پھر دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ دہشت میں کوؤں پر جھپٹا۔ ایک اس کے دستِ ستم کا شکار ہوا اور دوسرا اُڑ گیا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ باؤلا جانور شور اور حرکت سے بہت جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔ آج اس اشتعال کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ بولی کی پہلی ٹکر لرزہ خیز تھی۔ اس نے تھوڑی سی قوت اور لگائی ہوتی تو شاید ہم دونوں سل سمیت کھوہ میں لڑھک جاتے۔

کتا اطمینان سے بیٹھ گیا تو کبیر شاہ سرگوشی میں بولا۔ "ہمارا خیال ہے اب یہ کچھ دیر سستائے گا۔ تم ادھر ہوشیار ہو کر بیٹھو ہم ذرا ابھت (کھوہ) کا جائزہ لیتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کبیر شاہ نے اپنے کوٹ میں سے ٹارچ نکال کر روشنی کی اور جھک کر چلتا ہوا کھوہ کے وسطی حصے کی طرف بڑھا۔ چاروں کتے اس کے پیچھے گئے۔ اب میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ دہانے کے قریب کھوہ کی چھت چار فٹ سے اونچی نہیں تھی۔ دیواریں کھردری تھیں لیکن جھاڑ جھنکار سے پاک نظر آتی تھیں۔ کھوہ میں گونجنے والی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی بہت وسیع کھوہ نہیں ہے۔ میں سل سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ کبیر شاہ کی ٹارچ کا نیم روشن دائرہ کھوہ کے طول و عرض میں گردش کر رہا تھا۔ کبھی یہ روشنی دور چلی جاتی تھی کبھی پاس آ جاتی تھی۔ وہ قریباً پانچ منٹ بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔ "احسان

الٰہی! یارا! ادھر تو کوئی رہتا ہے۔ وہاں ایک ترپال کے نیچے سامان پڑا ہوا ہے۔ کھانے پکانے کے برتن ہیں اور کپڑے لتے بھی۔" یہ اطلاع حیران کن تھی۔ اس نے ٹارچ میرے ہاتھ میں تھمائی اور بولا۔ "ہم ادھر بیٹھتا ہے تم دیکھ کر آؤ۔"

میں ٹارچ لے کر آگے بڑھا۔ چند گز آگے جا کر کھوہ کشادہ ہو گئی اور چھت بھی اونچی چلی گئی۔ میں اب سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔ کچھ فاصلے پر میں نے ایک بوری دیکھی۔ اس میں المونیم کے چند مڑے تڑے برتن رکھے تھے۔ پاس ہی سبز رنگ کا ایک بوسیدہ ترپال نظر آ رہا تھا۔ میں نے ترپال اٹھا کر دیکھا۔ نیچے پھول دار گندے رنگ کے تین لحاف اور دو کمبل تھے۔ دیگر سامان میں گھوڑے کا ایک ساز، ایک جوڑا زنانہ جوتا، ایک مرمت شدہ ڈھولک، دو لالٹینیں اور جستی ٹرنک تھا۔ جستی ٹرنک میں بھی گھریلو استعمال کی چند معمولی چیزیں رکھی تھیں۔ میں نے اچھی طرح کھوہ کا جائزہ لیا۔ کھوہ بیضوی شکل میں تھی۔ دونوں سروں میں اونچائی اور چوڑائی کم تھی۔ درمیانی حصہ کافی کشادہ تھا اور یہاں چھت بھی اونچی تھی۔ کھوہ کا مجموعی رقبہ ساٹھ مربع گز سے زیادہ نہیں تھا۔

میں واپس آیا تو کبیر شاہ نے پوچھا۔ "ہاں بھئی! کیا اندازہ لگایا تم نے؟" وہ سل سے ٹیک لگائے چوکس بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ "لگتا تو نہیں کہ یہاں کوئی رہتا ہے مگر اس سامان کی وجہ سے شک ہو رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "سامان کا کیا ہے کوئی بھی رکھ کر جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے چوری چکاری کا معاملہ ہو۔ مسروقہ مال میں سے قیمتی سامان رکھ کر بے کار چیزیں کوئی یہاں چھوڑ گیا ہو۔"

میں نے کہا۔ "لیکن اگر یہ بے کار چیزیں تھیں تو اسے ڈھانپ کر اور سلیقے سے کیوں رکھی ہوئی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں جھاڑ پونچھ بھی کی گئی ہے۔ فرش صاف ہے اور دیواروں پر بھی جالے دکھائی نہیں دیتے۔"

کبیر شاہ نے کہا۔ "احسان الٰہی! تم ایک خاص بات بھول رہے ہو۔ جس کھوہ میں رہائش ہو وہاں آگ ضرور جلائی جاتی ہے اور جہاں آگ جلائی جائے وہاں چھت کالی ہو جاتی ہے یا کسی دیوار پر دھوئیں کا نشان پڑ جاتا ہے۔ ہم کو تو یہاں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے تائید کی۔

وہ بولا۔ "کیا خیال ہے تمہارا۔ اس سامان کو ادھر پڑے کتنا دیر ہوا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پانچ چھ روز سے زیادہ نہیں ہوئے۔ ترپال اور دوسری چیزوں پر ابھی گرد کی تہ نہ ہونے کے

برابر ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ بات کیا ہے تم نے ہیڈ کانسٹیبل والا۔ ام نے بھی۔"

اچانک وہ چپ ہو گیا اور چونک کر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے بھی دہانے کی جھری سے آنکھیں لگائیں۔ بولی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور خوفناک آواز میں غرا رہا تھا۔ سفید جھاگ اس کی باچھوں سے بہہ کر زمین پر ٹپکتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ پھلاہی کی جڑ کی طرف تھا۔ میں نے دیکھا، بے حرکت پڑا ہوا کوا پھڑپھڑا رہا ہے۔ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ اسے پھڑپھڑاتے دیکھ کر بولی کی وحشت عود کر آئی تھی۔ ایک دم وہ اٹھا اور غراتا ہوا کوے پر جا پڑا۔ یہ ایک دلخراش منظر تھا۔ عالمِ وحشت میں بولی نے زخمی کوے کے ٹکڑے کر دیے۔ پھر وہ زمین تک کھود ڈالی جہاں کوا پڑا تھا۔ تب اس نے بے قراری کے عالم میں پھلاہی کے گرد چند چکر کاٹے اور ایک بار پھر عین اسی جگہ پر آ بیٹھا جہاں پر صبح سے براجمان تھا۔ اس کے سوجے ہوئے دہشت ناک چہرے پر کوے کے سیاہ پر اور چیتھڑے چپکے ہوئے تھے۔ اب وہ سیدھا دہانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور وہ واقعی کسی بد روح کی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ بد روح براہ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

○☆○

رات کے دو بجے تھے۔ ہمیں اس ساٹھ مربع گز کے سرد تاریک غار میں قید ہوئے اب اٹھارہ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے میں ترپال کے نیچے سے نامعلوم مکینوں کے لحاف نکال لایا تھا۔ یہ لحاف لپیٹ کر ہم دہانے کے قریب اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ کل صبح سے ایک دانہ ہمارے پیٹ میں گیا تھا نہ کتوں نے کچھ کھایا تھا۔ سردی میں بھوک ویسے ہی آنتیں کھودنے لگتی ہے۔ ہم نے تو اس پناہ گاہ میں پہنچنے سے پہلے بھاگ دوڑ بھی بہت کی تھی۔ کبیر شاہ بالکل خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ میں جانتا تھا، میری طرح اس کی آنکھوں میں بھی کل صبح کے مناظر کی فلم چل رہی ہے۔ بڑی وحشت ناک گھڑیاں تھیں وہ۔ رحمان زئی کا مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے پک اپ میں گرنا۔ پوٹھوہاری کو گرے ہاؤنڈ کا ادھیڑنا اور گھمسان کی لڑائی میں رائفل بردار اور دوزی کتے کی موت۔ ناقابلِ فراموش مناظر تھے یہ اور کبیر شاہ تو ان واقعات اور شب و روز کو تاحیات فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس جنگل میں گھسنے سے پہلے وہ دس عدد بہترین کتوں کا مالک تھا۔ اب اس کے پاس نہ صرف چار کتے تھے بلکہ ان میں سے بھی ایک شدید زخمی تھا۔ گولی اس کے دونوں گلے چیر کر نکل گئی تھی۔ کبیر شاہ کے کینوس بیگ میں فرسٹ ایڈ کا سامان بھی تھا۔ اس نے زخموں پر پٹی باندھ کر خون روک دیا تھا لیکن یہ قطعی ناکافی علاج تھا۔ کتے کے حلق سے برآمد ہونے والی باریک آواز بتا رہی تھی کہ وہ مسلسل تکلیف میں ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت سب سے اہم مسئلہ کھوہ سے نکلنے کا تھا۔ ہمارا خون خوار پہرے دار شام تک پھلاہی کے نیچے موجود تھا اور پوری طرح چوکس تھا پھر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ہم اسے دیکھ سکتے تھے نہ اس کی آواز ہم تک پہنچی تھی۔ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ رات ہی رات میں یہاں سے اٹھ کر چلا جائے گا۔ تاہم اس کے چلے جانے کے امکانات بھی اتنے ہی تھے جتنے نہ جانے کے۔ کھوہ سے باہر مکمل سناٹا تھا۔ گھٹا ٹوپ تاریکی میں کسی صدا کا وجود تھا نہ منظر کا، پھر بھی تصور کی نگاہ سے ہم دیکھ سکتے تھے کہ بولی پھلاہی کے نیچے خاموش بیٹھا ہے اور اس کی سرخ انگارا آنکھیں دہانے پر جمی ہیں۔ ایک غیر مرئی سرگوشی سناٹے میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ سرگوشی ہمیں تنبیہ کر رہی تھی۔ "وہ موجود ہے۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا اور یاد رکھو، وہ کسی بھی دشمن سے بڑھ کر خطرناک ہے کیونکہ اس کے لگائے ہوئے ایک چھوٹے سے زخم کا مطلب بھی دردناک موت ہے۔"

یہ ایک بڑی سنگین حقیقت تھی کہ ساٹھ کلوگرام وزنی کتا پوری طرح پاگل ہو چکا تھا اور وہ جسے بھی کاٹتا اس کے جسم میں باؤلے پن کے اثرات داخل کر دیتا۔ آتشیں ہتھیار کے بغیر اس جانور کے سامنے آنا اتنا ہی خطرناک تھا جتنا آنکھوں پر پٹی باندھ کر میدان جنگ میں گھس جانا۔ کہنے کو تو آتشیں ہتھیار ہمارے پاس بھی موجود تھے لیکن عسکری زبان میں ہماری فائر پاور صفر تھی۔ جہاں تک کتوں کا تعلق تھا، انہیں بولی کے سامنے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کسی طرح ہم یہ سوال پیدا بھی کر لیتے تو کتے "جواب" دینے سے انکار کر دیتے اور کھلے میدان میں نکلنے کے بجائے مورچا بند رہنا بہتر سمجھتے۔ کھوہ کو ہم اچھی طرح کھنگال چکے تھے۔ یہاں چھوٹے بڑے پتھروں کے سوا کوئی ایسی شے نظر نہیں آئی تھی جسے بولی کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اب آجا کے کبیر شاہ والی سیون ایم ایم دا تھی جسے لاٹھی کے طور پر برتا جا سکتا تھا۔ یا پھر میری پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر تھا۔ پک اپ چھوڑنے سے پہلے میں نے یہ خنجر موقع سے اٹھا لیا تھا۔

رات آخری پہر دہانے کی بغل سے ٹیک لگائے لگائے مجھے نیند آ گئی۔ "ایک بے رحم سے خواب" نے میری انگلی پکڑ لی اور مجھے کھوہ سے نکال کر بہت دور ایک ٹھٹھرے ہوئے برف زار میں لے گیا۔ یہاں برفانی ہوا چل رہی تھی اور "رینڈیرز" کے بجائے بڑے بڑے کوبلی کتے برف گاڑیاں کھینچ رہے تھے۔ ایک گاڑی میں مجھے الف خاں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے کوئی اسکیمو نظر آ رہا تھا۔ میں اس گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگتا زرد درختوں والے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ یہ دیکھ کر میں لرز گیا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں جو' نبیلہ اور زرین گل کو چھوڑ کر آیا تھا اور پھر اچانک مجھے وہ تینوں نظر آ گئے۔

وہ الف خاں کے ساتھیوں کے نرغے میں تھے۔ زرین گل شدید زخمی تھا اور دو آدمیوں کے سہارے نیم بے ہوش کھڑا تھا۔ نبیلہ اور جو چیخ رہی تھیں اور الف خاں کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ الف خاں کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی اور بالکل کوبلی کی طرح اس کی باچھوں سے جھاگ کے قطرے گر رہے تھے۔ پھر اچانک نجانے کہاں سے اس خواب میں ساہی صاحب کی اوٹ پٹانگ بیٹی غزال ٹپک پڑی۔ وہ بھاگ کر آئی اور عجیب بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئی۔ "شاہ جہاں صاحب۔ اوہ سوری۔ سوری احسان صاحب' کہاں رہ گئے تھے آپ۔ توبہ اللہ' بڑے خراب ہیں آپ۔ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تھے آپ کو۔ دیکھیے اس منحوس نے کیا آفت مچا رکھی ہے۔ ذرا دکھائیے اسے اپنا کمال مگر خبردار اپنے ہاتھ پاؤں بچا کے۔ ہم کو یہ ہاتھ پاؤں بڑے پیارے ہیں کیونکہ ہماری غزالہ جی کو پیارے ہیں۔" اس نے اپنے گرم ہونٹ میرے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ میں عقیدت کے اظہار سے ہراساں ہونے لگا۔ میں جسمانی استاد ضرور تھا' مشینی آدمی نہیں تھا اور نہ ہی سپرمین۔ مجھے بھی مار پڑ سکتی تھی۔ میں بھی کسی کے ہاتھوں پٹ سکتا تھا' ذلیل ہو سکتا تھا بلکہ شہید بھی ہو سکتا تھا۔ کسی کو کیا حق پہنچتا تھا' مجھے رستم زماں سمجھنے کا۔ اور مجھے اس بات پر مجبور کرنے کا کہ میں اپنے "امیج" کو برقرار رکھنے کے لیے خود کو مصیبت میں ڈالوں۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ الف خاں نے گھوم کر فائر کیا۔ طاقتور رائفل کی گولی غزال کی پشت پر لگی اور اس میں سے گزر کر میرے سینے سے پار ہو گئی۔ میں نے خونبد غزال کو ایک درخت کی اوٹ سے نکلتے اور چلا کر اپنی طرف لپکتے دیکھا۔۔۔ اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے بدستور بغل سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ کھوہ میں زخمی سلوکی باؤنڈ کی "ریں ریں" کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ کبیر شاہ بھی میری ہی طرح ٹیک لگائے لگائے سو گیا تھا۔ میں نے کھوہ سے باہر جھانکا۔ آثار بتا رہے تھے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا ہے۔ ٹارچ جلا کر میں نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ پانچ بج رہے تھے۔ اب کسی بھی وقت رات کی تاریکی میں اجالے کی سیندھ لگنے والی تھی۔ میرے بائیں ہاتھ کی پشت پر شدید جلن ہو رہی تھی۔ کل پک اپ سے لڑھکتے وقت جسم پر کئی خراشیں آئی تھیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک خراش تھی۔ معمولی رعایت کے ساتھ اسے زخم بھی کہا جا سکتا تھا۔ لہو رس کر خود ہی بند ہو گیا تھا۔ میں کل سے کئی دفعہ اس زخم کو دیکھ چکا تھا۔ دراصل اس اندیشے نے ذہن میں سر اٹھایا تھا کہ کہیں یہ کتے کے دانت کا نشان نہ ہو۔ جس وقت کتے نے پک اپ میں چھلانگ لگائی' پک اپ ایک موڑ پر گھوم رہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی سست ہو گئی تھی۔ کتا قدرے بلندی سے آیا تھا۔ وہ سیدھا اپنے نشانے پر یعنی میری گود میں گرا تھا۔ اس کے گرتے ہی پک اپ قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں کہ اگلے ایک دو منٹ میں میرے ساتھ کیا ہوا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے مجھے کاٹا ہو اور ہاتھ کا یہ زخم اس کے جبڑے کا مرہون منت ہو۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ تشویش ناک بات تھی (ظاہر ہے ایسا نہیں تھا ورنہ میں یہ روداد سنانے کے لیے حیات نہ ہوتا) کسی دانا نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان کی پچھتر فی صد مشکلات تصوراتی ہوتی ہیں۔ وہ ان آلام کے خوف میں خود کو ہلکان کرتا رہتا ہے جو حقیقتاً کبھی اس پر وارد نہیں ہوتے۔

تھوڑی دیر بعد کبیر شاہ نے بھی لحاف کی بکل میں انگڑائی لی اور جاگ اٹھا۔ گھڑی دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں بھی دہانے سے باہر پھلاہی کے پیڑ کی طرف جم گئیں۔ پیڑ کا ہیولا غیر محسوس طور پر مگر بتدریج تاریکی میں سے برآمد ہو رہا تھا اور اس پیڑ کے ساتھ ساتھ ارد گرد کے مناظر بھی ابھرتے چلے آ رہے تھے۔ ہماری نگاہیں پھلاہی کی جڑ پر لگی تھیں اور دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ کبھی شبہ ہوتا "ارشن جاں" اپنی جگہ موجود ہے۔ کبھی اس کی غیر موجودگی کا یقین ہونے لگتا تھا۔ آخر جھٹپٹے کی یہ صبر آزما گھڑیاں ختم ہوئیں۔ زمین کے رخ سے تاریکی کا نقاب پورا سرک گیا۔ جو کچھ نگاہ کے رو برو تھا' روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

کوبلی درخت کے نیچے موجود نہیں تھا۔ کبیر شاہ کے

چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا لیکن اس اطمینان کے پیچھے اضطراب کی ایک لہر بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی اور یہ اضطراب ناقابل فہم نہیں تھا۔ کتا پیڑ کے نیچے سے اٹھ گیا تھا' اس کا یہ مطلب کہیں تھا کہ وہ قرب و جوار میں بھی موجود نہیں۔ درخت سے چند فٹ آگے کا ایک مستطیل نشیب ہماری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ وہیں جنگلی گھاس میں دبکا بیٹھا ہو۔ ہم نے دہانے کی بالائی سل اتنی سرخ اس طرح سرکا دی کہ ایک جانب قریباً ڈیڑھ مربع فٹ کا خلا پیدا ہو گیا۔ قریباً تمام شکاری کتوں کے نام رکھے جاتے ہیں جنہیں وہ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اس کوبلی کا نام "لیپا" تھا۔ کبیر شاہ نے ہونٹوں کے گرد دونوں ہاتھوں کا بھونپو سا بنایا اور "لیپا۔ لیپا" کی آوازیں لگائیں۔ کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے کھوہ سے چند پتھر اٹھائے اور ایک ایک کرکے نشیب میں پھینکے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کے سوا ہر طرف خاموشی رہی۔

صورت حال حوصلہ افزا تھی۔ ہمارے اب تک کے جائزے کے مطابق کتے کا مرض ایسے اسٹیج پر تھا کہ وہ معمولی سی آواز پر بھڑک اٹھتا تھا۔ اگر وہ نصف میل قطر کے دائرے میں تھا تو کبیر شاہ کی آواز پر اس کا رد عمل سامنے آنا ضروری تھا۔ اس کا مطلب تھا' وہ اس دائرے میں نہیں ہے۔ میں نے کبیر شاہ کی خالی رائفل اٹھائی اور اس کے منع کرتے کرتے دہانے کے خلا میں سے رینگ کر باہر نکل آیا۔

"یہ کیا کر رہا ہے تم؟" کبیر شاہ جھلاہٹ سے بولا۔ "ایسا جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں خان صاحب۔" میں نے کہا۔ "ہم دونوں میں سے ایک کو تو باہر نکلنا تھا۔ میں نکل آیا ہوں تو کون سی بڑی بات ہے۔ آپ چوکس بیٹھے رہیں اور سوراخ کو کھلا رہنے دیں۔ میں نے خطرہ دیکھا تو واپس پلٹ آؤں گا۔"

کبیر شاہ میری اس دلیری پر برہم تو تھا ہی' حیران بھی تھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ایک تنخواہ دار کانسٹیبل اس قسم کے ایثار کا مظاہرہ کرے گا۔ گڑبڑا کر بولا۔ "تو ٹھیک ہے۔ اگر جانا ہے تو ام دونوں جائے گا۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ بھی رینگ کر دہانے سے باہر نکل آیا۔ اس نے کتے باندھ رکھے تھے ورنہ وہ بھی اس کے پیچھے باہر چلے آتے۔ میرے خیال میں تو مناسب یہی تھا کہ کبیر شاہ یہاں کتوں کے پاس رہتا اور دہانے کا راستہ کھلا رکھتا تاکہ بوقت ضرورت میں فوراً واپس پلٹ سکتا۔۔۔ بہرحال۔۔۔ ہم نے زور لگا کر سل کو دوبارہ اتنی سرخ پہ سرکایا اور دہانے کو بند کر دیا۔

اجالا اب پوری طرح پھیل چکا تھا۔ ہوا ساکت تھی۔ دھلا دھلایا جنگل دھند کی جھلی سی میں بالکل خاموش اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ (پرندوں کی چہچہاہٹ گو آوازوں کے زمرے میں آتی ہے لیکن جنگل میں اتنی ہوتی ہے کہ خاموشی ہی کا حصہ بن جاتی ہے) کبیر شاہ مجھے گھورتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔ "کانسٹیبل! تم ام کو کچھ جوشیلا اور جلد باز نظر آتا ہے۔ ایک بات ام تم کو بتاتا ہے۔ کتا نظر آ جائے تو زیادہ تیس مار خان بننے کی کوشش نہ کرنا۔ فوراً واپس پلٹ آنا۔ امارا خیال ہے کہ اب ام کو اس سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا بیماری اتنا بڑھ گیا ہے کہ اگلے پندرہ بیس گھنٹوں میں وہ خود ہی مر جائے گا۔ امارا بات سمجھ رہا ہے ناں تم۔۔۔؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم محتاط قدموں سے آگے بڑھے۔ مستطیل نشیب کے قریب کبیر شاہ کو درخت کی ایک مضبوط شاخ نظر آئی۔ اس نے یہ شاخ اٹھا لی۔ میں نے پنڈلی سے خنجر نکال کر چھوٹی بڑی ٹہنیوں کو علیحدہ کیا اور شاخ کو ایک قسم دار لاٹھی کی شکل دے دی۔ اس دوران ہماری نگاہیں بڑے غور سے گرد و نواح کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ ہمیں کہیں بھی کسی طرح کی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ ہم بے آواز چلتے ہوئے کھوہ کی چھت پر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے کبیر شاہ کو چونکتے دیکھا۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھولے ہوئے تھے۔ وہ جیسے ہوا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی میں نے بھی ایک ناخوشگوار بو محسوس کی جیسے تھوڑے فاصلے پر کسی مردہ جانور کا جسم پڑا ہو۔ ہم بو کے تعاقب میں گھنی جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ میری نظر ایک چھوٹی کلہاڑی پر پڑی۔ یہ تین فٹ لمبی کلہاڑی ایک جھاڑی میں اٹکی ہوئی تھی۔ ان ویران جھاڑیوں میں کلہاڑی کی موجودگی تعجب خیز تھی۔ کلہاڑی کے قریب ہی زمین پر چند سکے چمکتے نظر آئے جیسے کوئی بھاگتے بھاگتے یہاں گرا ہو اور اس کی جیب سے نکلنے والی ریزگاری یہاں پڑی رہ گئی ہو۔

رائفل پر (جسے لاٹھی کہنا زیادہ مناسب تھا) میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ ہم چند قدم آگے بڑھے تو شاخوں کے درمیان میں سے کسی کے نسواری کمبل کی جھلک نظر آئی۔ یہ ایک پھولی ہوئی انسانی لاش تھی اور اس میں سے اٹھنے والی بو قرب و جوار کو متعفن کر رہی تھی۔ قریب جا کر دیکھا تو ایک دلخراش منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔۔۔ یہ ایک تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سفید تھیں اور منہ پر

ناک انداز میں کھلا ہوا تھا۔ اس کی گردن اور پیٹ پر گہرے زخم تھے۔ ایک ہاتھ کی انگلیوں کا قیمہ بن گیا تھا اور دائیں بازو سے کوٹ کے چیتھڑے اُڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر جو خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوندا وہ یہی تھا کہ یہ بدنصیب شخص کبیر شاہ کے پاگل کتے کا شکار ہوا ہے۔ یہ واقعہ رونما ہوئے غالباً اڑتالیس گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ پرسوں شب ہونے والی بارش کے آثار لاش پر موجود تھے۔ یہ شخص ہم دونوں کے لیے اجنبی تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا اور کیسے اس دردناک موت سے دوچار ہوا۔ شاید وہ کھوہ کے مکینوں میں سے ایک تھا اور اس کی موت کے بعد باقی لوگ ہراساں ہو کر یہاں سے نکل گئے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کبیر شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کی گوری چٹی پیشانی پر لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے نیچے جھکا۔ میں نے رائفل کے ٹھوکے سے لاش کا چہرہ سیدھا کیا۔ اَن گنت چیونٹے اس کے زخمی رخسار پر رینگ رہے تھے۔ یکایک ایک مدھم غراہٹ نے ہم دونوں کو سراپا لرزا دیا۔ یہ غراہٹ عین ہمارے عقب سے بلند ہوئی تھی۔ فاصلہ چودہ پندرہ قدم رہا ہوگا۔ ہم نے ایک ساتھ گھوم کر دیکھا۔ خدا کی پناہ ــــ وہ ایک پرہول منظر تھا۔ کبیر شاہ کا پاگل "بولی" بہ آہستگی جھاڑیوں سے برآمد ہوا تھا اور ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ کل سے زیادہ بھیانک تھا اور بالائی ہونٹ مڑ جانے سے سفید دانت مستقل نظر آ رہے تھے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ بات ایک ساتھ ہمارے ذہن میں آئی کہ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہے۔ لیکن کیسے؟! ایک دم بھاگنے کا مطلب تھا کہ ہم کتے کو مشتعل کر دیتے اور وہ پوری قوت سے ہمارے پیچھے آتا۔

ہم بہ آہستگی الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگے۔ لاش سے کھوہ کی طرف پندرہ بیس قدم کا فاصلہ ہم نے اسی انداز میں طے کیا۔ کتا غراتا ہوا چند قدم آگے بڑھا اور اس کی دُم تیزی سے گردش کرنے لگی۔ یکایک کبیر شاہ کی تیز سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔ "بھاگو۔"

ہم مڑے اور پوری رفتار سے دہانے کی طرف لپکے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں تھی لیکن مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا کہ کتا کمان سے نکلے تیر کے مانند ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ کھوہ کی طرف وہ چالیس پچاس قدم کا فاصلہ لامتناہی تھا ــــ آخر مجھے گھومنا پڑا۔ اگر نہ گھومتا تو وہ میری چار روزہ حیات کی آخری غلطی ہوتی۔ کتا میرے سر پر یا

کہہ لیجئے کہ "پنڈلی پر" پہنچ چکا تھا۔ جب پچیس میل فی گھنٹہ رفتار سے بھاگتے ہوئے شخص کو گھومنا پڑے تو ظاہر ہے گرے گا۔ میں بھی گرا تاہم گرنے اور لڑھکنے کا عمل شروع ہونے سے پہلے میں سیون ایم ایم کے کندے سے ایک بھرپور ضرب کتے کے تھوبڑے پر لگا چکا تھا۔ معلوم نہیں ضرب شدید تھی یا اس میں فزکس کا کوئی اصول کار فرما تھا۔ کتا قلابازی کھا کر کتا ہوا میں اُچھلا اور "سمرسالٹ" لگا کر پشت کے بل جھاڑیوں میں گرا۔ میں ڈھلوان پر چند لڑھکنیاں کھا کر اٹھا اور سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کتا مجھ سے پندرہ گز کی دوری پر تھا۔ لمحوں کے لیے یوں لگا کہ وہ چکرا گیا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا مگر پھر اچانک وہ پوری طرح مستعد نظر آنے لگا۔ "آ جاؤ۔" مجھے اپنے عقب میں کبیر شاہ کی پکار سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دہانہ مجھ سے دس پندرہ قدم فاصلے پر تھا۔ کبیر شاہ بالائی سل گرا کر اندر گھسنے کا راستہ بنا رہا تھا۔ جونہی ساٹھ کلوگرام وزنی کتے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ نشیب میں چھلانگ لگائی اور میری طرف لپکا میں دوڑ کر کھوہ میں گھس گیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ زور لگا کر سل اٹھائی اور دوبارہ دہانے پر جڑ دی۔ یہ اقدام بالکل بروقت تھا۔ کتا حسب سابق پُر شور آواز میں سل سے ٹکرایا اور دھکے کھا کر دور جا گرا۔ اس مرتبہ اس نے صرف دو ہی ٹکروں پر اکتفا کیا۔ اس کے حلق سے عجیب کرب ناک سی آواز بلند ہو رہی تھی۔ کچھ دیر وہ دہانے کے گرد چکراتا رہا۔ پنجوں سے بھربھری مٹی کھودتا اور پتھروں پر دانت آزمائی کرتا رہا پھر نڈھال ہو گیا اور سست روی سے چلتا ہوا پھلاہی کے نیچے جا بیٹھا۔

○☆○

سورج نے اپنا سفر طے کیا اور دور مغربی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کے لیے غوطہ زن ہو گیا۔ سردی کا کارواں بڑی سرعت سے نشیب و فراز میں خیمہ زن ہو رہا تھا۔ ہمیں کھوہ میں بند ہوئے اب چھتیس گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ بھوک سے بُرا حال تھا۔ ہماری طرح بے زبان جانور بھی خالی پیٹ تھے اور تھوتھنیاں سنگلاخ زمین پر ٹکا کے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ہمارا "دشمن جاں" بدستور اپنی پوسٹ پر موجود تھا۔ پھلاہی کے نیچے وہ کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ بس کبھی کبھار اس کے کانوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے حلق سے گاہے گاہے ایک کربناک صدا بلند ہو کر فضا میں معدوم ہو جاتی تھی۔ کبیر شاہ کا خیال تھا کہ وہ مرنے والا ہے لیکن کب؟ اس سوال کا جواب کبیر شاہ نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی وہ دے سکتا تھا۔ کوئی جم

شہرۂ آفاق سلسلہ وار کہانی
شہ زور
تحریر
ایم اے راحت
دو حصوں میں مکمل
ایک ایسی خاتون رپورٹر کی داستان
جو قانون پرست، رحم دل، دلیر
اور انسانیت کی قدردان تھی
قیمت مکمل سیٹ -/۱۰۰
ڈاک خرچ -/۲۵
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور ـــــ فون ۷۲۴۷۴۱۴

نہیں دے سکتا تھا۔ جدید میڈیکل سائنس بھی نہیں دے سکی۔ ڈاکٹرز جن مریضوں کی زندگی چند ماہ بتاتے ہیں وہ بیس بیس سال زندہ رہتے ہیں اور بیس سال بعد مرنے کے بجائے مکمل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر صورتِ حال یہی رہی اور اندھیرا پھیل گیا تو کل صبح تک کے لیے ہمیں بدستور یہاں بند رہنا ہوگا لہٰذا کیوں نہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے کتے کو مارنے یا مار بھگانے کی ایک بھرپور کوشش کرلی جائے۔ کبیر شاہ غالباً ضرورت سے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ممکن تھا اس احتیاط میں لاشعوری طور پر کتے سے اس کی دیرینہ وابستگی کا عنصر شامل ہو گیا ہو۔ اسے حوصلہ نہ رہا ہو کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے مارے۔ کچھ بھی تھا وہ کتا تھا شیر نہیں تھا اور بقول کبیر علی شاہ' اب اس کی حالت بھی غیر تھی۔ ہم دو توانا افراد تھے اور بالکل خالی ہاتھ بھی نہیں تھے۔ ایسے میں اس بات کا روشن امکان تھا کہ اگر ہم باہر نکل کر کتے پر پل پڑیں تو اس کی کھوپڑی بجکانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں اپنا مدعا کبیر شاہ سے بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ کچھ آہٹوں اور آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔ یوں لگا کہ کچھ لوگ بڑے اطمینان سے بات چیت کرتے اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔ میں اور کبیر شاہ تن کر بیٹھ گئے۔ آوازیں مستطیل نشیب کے عقب سے آ رہی تھیں۔ بولنے والوں میں دو عورتوں کی آواز نمایاں تھی۔

آوازیں سنتے ہی کتے کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی کھڑا ہو کر نشیب میں جھانکنے لگا تھا۔ یہ بڑی تشویش ناک سچویشن تھی۔ بے خبر افراد انجانے میں "بڑی خطرناک سمت" میں نکل آئے تھے۔ چند لمحے گزرے اور کتے کے حلق سے دھیمی دھیمی پُرہول غراہٹ برآمد ہونے لگی۔ مجھے دہانے کی بالائی درز سے دو عورتوں کے سر دکھائی دیے۔ وہ نشیب سے بلندی کی طرف آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت جوان اور دوسری ادھیڑ عمر دکھائی دیتی تھی۔ ان کے عقب میں بھرے بھرے چہرے والا ایک گورا چٹا مرد تھا۔

"یہ کون بے وقوف کا بچہ ہے؟" کبیر شاہ بڑبڑایا۔ "اس کا اشارہ آنے والوں کی طرف تھا۔

ہم دونوں نے زور لگا کر بالائی سِل سرکائی۔ دائیں جانب چوکور خلا نمودار ہو گیا۔ میں نے خلا سے سر نکال کر آنے والوں کو بہ آوازِ بلند خبردار کیا۔ "رک جاؤ بی بی۔۔۔ رک جاؤ۔۔۔ آگے نہیں آنا۔"

ابھی آنے والوں نے بمشکل سر اٹھا کر دہانے کی طرف دیکھا تھا کہ کتا بڑے زور سے بھونکا اور اپنی جگہ سے ہوا میں آ گیا۔ اس کی لپک میں بے حد تیزی تھی۔ اسی کبیر شاہ کا یہ مفروضہ بالکل غلط محسوس ہوا کہ کتا نزع میں ہے اور زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ غالباً گزشتہ دو کبیر شاہ نے اسے جو مقوی غذائیں کھلائی تھیں اب طاقت اس کے جسم میں موت کے خلاف مزاحمت کر رہی تھی۔ کسی غضب ناک درندے کی طرح جھپٹتا ہوا نظروں میں نشیب میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آنے والوں کی وحشت زدہ چیخیں فضا میں گونجیں۔ وہ خونی کتے کی زد میں تھے۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے باوجود سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اب میرے لیے صبر محال تھا۔ میں نے بالائی سِل کو دھکیل کر نیچے گرایا اور تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ کبیر علی شاہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑا پھر اس نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی۔ باہر نکلتے ہی ہم آگے پیچھے موقعے کی طرف بھاگے۔

دلخراش چیخوں کے ساتھ کتے کی بھیانک آواز ہو کر ایک لرزہ خیز شور میں ڈھل گئی تھی۔ جونہی ہم میں پہنچے' خونی منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ایک لڑکی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھی ہوئی بے طرح چلا رہی تھی۔ اس سے چند قدم کی دوری پر گٹھیلے جسم کا شخص کتے کے نیچے تڑپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی لکڑی اور رائفل دور جا گری تھی اور ٹوپی ہوا کے زور سے ڈھلکتی چلی جا رہی تھی۔ کتے نے بدنصیب شخص پر حملہ کیا تھا۔ اس کا خونی جبڑا پیٹ کے زیریں حصے میں نظر آ رہا تھا۔ میں بغیر رُکے کتے کے سر پر پہنچا اور رائفل کے کندے سے ایک بھرپور ضرب اس کے سر پر رسید کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ ایک دلدوز منظر تھا۔ جبڑے خون آلود تھے اور اس کی تھوتھنی جیسے کسی کھوکھلی میں گھستی چلی جا رہی تھی۔ میں نے دیوانہ وار ایک اور ضرب اس کے سر میں لگائی۔ اس دوران کبیر شاہ کی بھرپور لات اس کی کمر پر پڑی۔ اس نے کرب ناک انداز میں سر گھمایا لیکن بدنصیب شخص کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوا۔

میں نے سیون ایم ایم پھینکی اور بھاگ کر تھری ناٹ تھری رائفل کی طرف گیا۔ رائفل اٹھاتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوڈ ہے۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے رخ پھیرا۔ کبیر شاہ کی چند گاڑی ضربیں کھانے کے بعد معتوب کو چھوڑ رہا تھا اور اب کبیر شاہ پر جھپٹ رہا تھا۔

وہ لیلا نہیں تھا جو اب تک کبیر شاہ کے اشاروں پر چلتا رہا تھا۔ یہ ایک بے رحم درندہ تھا۔ نہ کوئی اس کا مالک تھا اور نہ وہ کسی کا پالتو تھا۔ میں نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کتے کا نشانہ لیا اور دھائیں سے گولی داغ دی۔ نازک وقت میں میرا نشانہ اکثر درست لگتا ہے۔ کچھ کبیر شاہ کی صحبت کا اثر بھی رہا ہوگا۔ یہ گولی کتے کی کھوپڑی میں لگی اور بھیجا چیر کر دوسری طرف نکل گئی۔ وہ لڑھک کر کبیر شاہ کے قدموں میں گرا اور ایک بار زور سے اینٹھ کر ساکت ہو گیا۔

کتا یا بدروح وہ جو کوئی بھی تھا' ختم ہو گیا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والا لرزہ خیز شور تھما تو دیگر آوازیں سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ جھاڑی میں الجھی ہوئی لڑکی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔۔۔ اور موقع پر وہ اکیلی عورت نہیں تھی۔ سوڈیڑھ سو گز دور دو اور عورتیں بھی موجود تھیں۔ یہ عورتیں موقعے سے بھاگنے میں کامیاب ہوئی تھیں اور اب دور کھڑی واویلا کر رہی تھیں۔ زمین پر پڑا شخص ساکت ہو چکا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک جستی ٹرنک کھلا پڑا تھا۔ ٹرنک میں سے کپڑے اور کچھ دیگر سامان نکل کر دور تک بکھر گیا تھا۔ اس سامان میں مجھے ایک سارنگی کے علاوہ گھنگھروؤں کے دو جوڑے بھی نظر آئے۔ معلوم نہیں یہ ٹرنک معتوب کے ہاتھ سے چھوٹا تھا یا جھاڑی میں الجھ جانے والی لڑکی کے ہاتھ سے۔ بہرحال ٹرنک کے سامان سے یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا باقی سامان کھوہ کے اندر پڑا ہے۔ اس سامان میں ایک ڈھولک بھی موجود تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر معتوب کا چہرہ دیکھا تو شدید دھچکا لگا۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ چند ہفتے پہلے پہاڑی ریستوران میں سینہ پھلا کر چلنے والا منگول نامی ڈشکرا میرے سامنے بے سُدھ پڑا تھا۔ میرے خیال میں اسے معتوب کہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ معتوب کی تعریف سے آگے بڑھ کر مرحومین کے زمرے میں داخل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

کبیر شاہ نے جھاڑی سے نکلنے میں دراز قد لڑکی کی مدد کی۔ وہ روتی ہوئی منگول کے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ صاف نظر آتا تھا کہ زخمی ہونے والے سے اس کا کوئی قریبی رشتہ نہیں ہے' ورنہ یوں کھڑا رہنے کے بجائے وہ اس سے لپٹ گئی ہوتی یا پاس بیٹھ گئی ہوتی۔ دور نکل جانے والی دونوں عورتیں بھی سہمے سہمے قدموں سے جائے حادثہ پر پہنچ گئیں۔ ان کی نگاہیں کبھی مُردہ کتے کی طرف اٹھتی تھیں اور کبھی زخمی منگول کی طرف۔ ان میں سے ایک وہی ادھیڑ عمر عورت تھی جس کا سر ہم نے نشیب سے ابھرتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ دوسری ایک لڑکی تھی۔ اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نظر آتی تھی۔ پہلی لڑکی کے برعکس وہ خوش شکل بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں بھی منگول سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ لگتا تھا کہ عورتیں مُردہ کتے اور زخمی منگول دونوں سے دور رہنا چاہتی ہیں۔

"کیا ہوا اسے۔ کیا یہ مر گیا؟" ادھیڑ عمر عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی پاٹ دار آواز میں پوچھا۔ اپنے لب و لہجے سے وہ مجھے کوئی شریف عورت نظر نہیں آئی۔ دونوں لڑکیوں کے بارے میں بھی میری یہی رائے تھی۔

میں نے نیچے جھک کر منگول کی چربیلی دار تھوڑی ہلائی۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ کم از کم اس کی ناف سے خون کا اخراج روکنا ضروری تھا۔ میں نے دراز قد لڑکی کی اوڑھنی پھاڑ کر ناف کے گھاؤ میں رکھی اور منگول کا اپنا مفلر کس کر اس کی کمر سے لپیٹ دیا۔

اتنے میں سامان سے لدا ہوا ایک خچر بھی موقع پر پہنچ گیا۔ خچر والا ایک مقامی شخص تھا اور اس کے کندھے پر رسے کی بنی ہوئی ایک سستی رائفل لٹک رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کے خچر پر لدا ہوا سامان عورتوں کا ہی تھا۔ وہ اس سامان کے ساتھ عقب میں آ رہا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ چند منٹ پہلے یہاں کیا حادثہ گزرا ہے۔ وہ حیرت سے کبھی مُردہ کتے کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی زخمی منگول کی طرف۔ خچر کی لگام چھوڑ کر وہ منگول سے لپٹ گیا اور ناقابلِ فہم زبان میں اسے پکارنے لگا۔

میں نے ادھیڑ عمر عورت سے پوچھا۔ "یہ زخمی کا کیا لگتا ہے؟"

وہ بولی۔ "اس کا چاچا زاد ہے۔"

"اردو سمجھتا ہے؟"

"ہاں' تھوڑی بہت۔"

میں نے اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہارے بھائی کو علاج کی ضرورت ہے۔ اس کو خچر پر ڈال کر پکی سڑک تک لے جاؤ۔ وہاں سے کوئی سواری مل جائے گی یا سٹریچر کے لیے مل جائے گی۔ کوشش کرو تو ہو سکتا ہے اس کی جان بچ جائے۔"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ہوشیار شخص ہے اور اس علاقے میں اجنبی بھی نہیں ہے۔ تینوں نے مل کر جلدی جلدی خچر سے سامان اتارا۔ کبیر شاہ بھاگ کر کھوہ کے اندر سے دو لحاف لے آیا۔ ان لحافوں کو

خچر کی پشت پر رکھ کر گدڑی سی بنادی گئی۔ تب ہم تینوں نے مل کر نیم بے ہوش منگول کو اٹھایا اور خچر کی پشت پر اوندھا لٹا دیا۔ ان علاقوں میں بیماروں اور زخمیوں کی نقل و حمل کا طریقہ یہی تھا۔ منگول کی کمر سے بندھا ہوا مفلر خون میں بھیگنا شروع ہوگیا تھا۔ ظاہر تھا کہ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس کے لیے صرف دعا ہی کی جاسکتی تھی۔ خچر والے نے مزید وقت ضائع نہیں کیا اور مضروب کو لے کر فوراً روانہ ہوگیا۔ افراتفری میں اسے مضروب کی رائفل کا خیال نہیں آیا۔ یہ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھی اس سلسلے میں "تجاہلِ عارفانہ" سے کام لیا۔

○☆○

کتے کی لاش کو کھلے آسمان تلے چھوڑ کر ہم کھوہ میں واپس آگئے۔ ظاہر ہے تینوں عورتیں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ وہ اب اپنے حواس پر کافی حد تک قابو پاچکی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ ان تینوں کا تعلق گانے بجانے والے طبقے سے ہے اور ادھیڑ عمر عورت دونوں لڑکیوں کی نائکہ ہے۔ اپنے خدوخال اور لب و لہجے سے یہ تینوں جنوبی پنجاب کی لگتی تھیں۔ تاہم اس وقت وہ مقامی لباس میں تھیں اور چھوٹی لڑکی نے اپنے بال بھی بالکل مقامی انداز میں بنا رکھے تھے۔ اس چھوٹی لڑکی کا قد ساڑھے پانچ فٹ کے قریب تھا۔ عمر بمشکل سولہ برس رہی ہوگی۔ دوچھریرے بدن کی بڑی چاق و چوبند چیز تھی۔ اسے دیکھ کر اونچی لمبی لہلہاتی دھریک یا سرکش جنگلی گھوڑی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس ویرانے میں ایسی خوبرو لڑکی کا پایا جانا تعجب خیز تھا۔ یہ تو ایسے ہی تھا کہ بھیڑیوں سے بھرے ہوئے کسی جنگل میں ایک تنہا ہرنی چوکڑیاں بھرتی پھرتی ہو۔

کھوہ میں پہنچ کر نائکہ نے ہم سے پہلا سوال یہی پوچھا تھا کہ کیا یہ کتا ہمارا اپنا تھا۔ میں نے فوراً نفی میں سرہلا دیا۔ اس کتے کو خود سے منسوب کرنا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ یہ کتا ایک شخص کو ہلاک اور دوسرے کو شدید زخمی کرچکا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔ نائکہ نے بے تکلفی سے کتے کے نامعلوم مالک کو ایک مردانہ گالی دی اور بولی۔ "کسی شکاری کا ہوگا۔ پاگل کرکے چھوڑ گیا ہوگا ادھر۔ لوگوں کی جانیں چیرنے کے لیے۔ اللہ کرے کسی کی آئے ایسے لوگوں کو۔" پھر ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی "تم دونوں کو تو اوپر والے نے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے ہمارے لیے۔ میں تو سمجھی تھی بس اب آخری وقت آگیا ہے توبہ اللہ۔ جناور تھا کہ بلا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس بلا سے آپ کی ملاقات صرف پانچ منٹ کی رہی ہے۔ ہم پورے دو روز سے اسے برداشت کررہے تھے۔ پرسوں خرگوش کے شکار پر نکلے تھے ہم۔ ادھر جہاں اگر کتے بھی نہیں کھولے تھے کہ یہ موذی پہنچ گیا۔ اسی کھوہ میں گھس گئے اور یہ باہر ہمارے پہرے پر بیٹھ گیا۔ بس ہم اندر اور یہ باہر۔ اسی طرح چھتیس گھنٹے گزر گئے۔"

"پر تمہارے پاس ہتھیار تو تھے، گولی ماری ہوتی اسے۔" خرانٹ نائکہ نے نکتہ اٹھایا۔

"ہتھیار کے نام پر یہ رائفل ہی تھی۔" میں نے بتایا۔ "پتا نہیں کیا خرابی ہوگئی اس میں۔ گولی ہی نہیں چل رہی تھی۔"

اس ابتدائی گفتگو کے بعد میں نے نائکہ سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیسے پہنچی ہیں۔ اس نے میرے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ لے کر اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور بولی۔ "ناچ گانا کرتے ہیں ہم۔ پہلے کہیں اور ٹھکانا تھا۔ وہاں حالات ٹھیک نہیں رہے اس لیے یہاں چلے آئے۔ یہاں ٹھیک نہ رہیں گے تو کہیں اور چلے جائیں گے۔ پیٹ کا دوزخ ہی بھرنا ہے ناں۔ جہاں پیٹ ہوگا وہاں وسیلہ بھی بن جائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "حالات سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا کوئی دشمنی وغیرہ چل گئی تھی؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ بڑا لمبا چکر ہے۔ بُرے لوگوں، بُرے قصے۔ تم سن کر کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "پھر بھی کچھ تو بتائیں۔ میں بھی پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ یہاں اس دور دراز قبائلی علاقے میں آپ کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

وہ اپنے بارے میں بتانے کے بجائے الٹا مجھ سے میرے متعلق پوچھنے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میری فرمائش پوری کرنے سے پہلے میرے اور کبیر شاہ کے بارے میں مزید تسلی کرلینا چاہتی ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ تمہارا ساتھی کون ہے؟ اس قسم کے کئی سوال اس نے پوچھے۔ میں نے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دیے تو وہ اپنی زبان کا تالا کھولنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔ دونوں لڑکیاں الگ تھلگ اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے لالٹین میں تیل ڈال کر اسے روشن کیا تھا۔ اب ایک لڑکی خچر سے اترنے والا سامان کھوہ کے کشادہ حصے میں رکھ رہی تھی اور دوسری چولہا جلا کر کچھ پکانے کی فکر میں تھی۔ دونوں لڑکیاں نائکہ کو "باجی" کہہ کر بلاتی تھیں اور کوئی بات پو

ٹی تھیں۔ نائکہ بڑے مزے سے انہیں "جیا۔۔۔ چاند اور میری جان۔" جیسے القابات سے نواز رہی تھی اور مختلف ہدایات دے رہی تھی۔ فلاں چیز یہاں رکھو۔ فلاں کام ایسے کرو۔ یہ کام کل کرلینا، یہ کام ابھی کرو وغیرہ وغیرہ۔ نائکہ کی گفتگو زیادہ تر میرے ساتھ ہی ہو رہی تھی کیونکہ میں اس کا ہم زبان تھا۔ ہاں کبھی کبھی کبیر شاہ بھی کوئی سوال جوڑ دیتا تھا۔

نائکہ نے اپنے بارے میں رکھے چھپے الفاظ میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں (وہ انہیں بیٹیاں کہہ رہی تھی) نوزے مشت کے اندرونی علاقے سے آئی تھیں۔ پچھلے ڈیڑھ برس سے وہ نوزے مشت میں مقیم تھیں اور وہاں انہیں علاقے کے ایک معتبر اور نہایت بااثر شخص کی آشیرباد حاصل تھی۔ وہ علاقہ بُرے لوگوں سے بھرا پڑا ہے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔ وہ نجی محفلوں میں بلائی جاتی تھیں اور بڑے "باعزت" طریقے سے اپنا پیشہ جاری رکھے ہوئے تھیں۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ جو بااثر شخص ان کا پشت پناہ تھا اس کے ساتھیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ یہ ابتدا سے آئے ہوئے کسی شخص کو پناہ دینے کا جھگڑا تھا جو بڑھتے بڑھتے دشمنی کی شکل اختیار کرگیا۔ ایک دھڑے نے دوسرے دھڑے کے چار آدمی زندہ جلا دیے جس کے بعد نوبت مسلح تصادم تک پہنچ گئی۔ جب حالات زیادہ خراب ہوگئے تو نائکہ نے اپنی بچیوں کے ساتھ وہاں سے نکل آنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ خچر بردار جو منگول نامی زخمی کو شہر لے کر گیا تھا، پہریدار کی حیثیت سے نائکہ کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کا نام صولت خاں تھا۔ نائکہ نے صولت خاں کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کرے جو نوزے مشت کی خطرناک حدود سے باہر ہو لیکن محفوظ بھی ہو۔ صولت خاں نے اس کھوہ کا انتخاب کیا۔ نوزے مشت سے روانہ ہوتے وقت وہ کچھ سامان بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے یہ سامان کھوہ میں رکھا اور تینوں عورتوں کو لینے کے لیے واپس نوزے مشت کے ویرانے میں داخل ہوگیا۔ آج وہ پانچ روز بعد واپس آیا تھا۔ تینوں عورتوں کے علاوہ اس کے ساتھ اس کا چچازاد بھی تھا۔ یہاں یہ کتے والا حادثہ پیش آگیا اور صولت خاں کو اپنے چچازاد کے ساتھ شہر کی طرف بھاگنا پڑا۔

میرے لیے نائکہ کی روداد انکشاف انگیز تھی۔ اس نے واضح طور پر کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں رونما ہونے والے کن واقعات کا ذکر کررہی ہے اور وہ جس بااثر شخص کے بارے میں بتا رہی ہے وہ کون ہوسکتا ہے۔ درحقیقت منگول کو پہچانتے ہی مجھے شبہ ہوگیا تھا کہ یہ تینوں عورتیں اندرون نوزے مشت سے آئی ہیں اور ہو نہ ہو 'عینی جان' وغیرہ سے ان کا تعلق ہے۔ عینی جان سے تعلق کے بغیر کوئی عورت نوزے مشت میں رہ بھی کیسے سکتی تھی! طوفانِ نوح میں صرف چوٹی بچتی ہے یا وہ چیز جو چوٹی پر پناہ لیتی ہے۔

نائکہ نے جو کچھ بتایا میں نے اسی پر صبر شکر کرلیا۔ فی الحال اسے مزید کریدنا مناسب نہیں تھا۔ کرید کر حاصل بھی کیا ہونا تھا۔ اصل بات تو معلوم ہو چکی تھی۔ اب تفصیلات ہی تھیں مثلاً یہ کہ وہ اور اس کی دونوں بچیاں پنجاب سے اٹھ کر اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچیں؟ وہ مفرور تھیں، مجبور تھیں یا مخمور تھیں، اور یہ کہ اس بااثر شخص کا نام نامی کیا تھا جس نے انہیں نوزے مشت میں پناہ دی تھی اور منگول نامی شخص انہیں کہاں سے ملا وغیرہ وغیرہ۔ ان تفصیلات پر ضائع کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت تھا نہ ہی پیٹ میں ہونے والی بھوک اس کی اجازت دیتی تھی۔ ہمارے سامنے تو بس جلدی سے ماحضر آجانا چاہیے تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، کم عمر طوائف پتھر کے چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ "طوائف کے ہاتھ کی روٹی" کتنا غیر مانوس تصور تھا یہ۔ یہ ہاتھ تو صرف پان کھلانے اور شراب پلانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ایک طوائف کو روٹی پکاتے دیکھنا اتنا ہی دلچسپ تھا جتنا کسی برقع پوش خاتون کو سائیکل چلاتے دیکھنا۔ بہرطور مجبوری تھی۔ ہم نے نہ صرف طوائف کو اپنے لیے روٹی پکاتے دیکھا بلکہ یہ روٹی کھائی بھی۔ آم کے اچار اور گڑ کی ڈلی کے ساتھ۔ اور بعد میں فرحت بخش ڈکاریں بھی لیں۔ میں اور کبیر شاہ بلاشرکت غیرے چار چار روٹیاں کھا گئے۔ ابھی مزید کی ہوس تھی مگر پکانے والی کوئی گھریلو عورت نہیں تھی 'بھاؤ تاؤ' بتانے والی حرافہ تھی۔ کیا پتا وہ کس وقت آپ سے تم اور تم سے تڑاخ پر اتر آتی۔

ابھی تک تو پیاس محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن جب چھتیس گھنٹے بعد پیٹ میں اناج گیا تو یاد آیا کہ پانی بھی پینا ہے۔ کھوہ میں تو پانی تھا نہیں۔ ادھیڑ عمر نائکہ نے میرے ہاتھ میں چینل کا ایک کنستر تھمایا اور بولی کہ پانی لے آؤ۔

"کہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگی۔ "صولت خاں بتاتا تھا' ادھر پاس ہی ڈھلوان پر کوئی تالاب نالاب ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ جسے تالاب کہہ رہی تھی وہ گدلے پانی کا چھوٹا سا گڑھا تھا۔ پرسوں کھوہ کی طرف آتے ہوئے میری

نظر اس پر پڑی تھی۔ میں نے کنڈل اٹھایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر کبیر شاہ بھی اٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کتے بھی کچھ پیٹ پوجا کر لیں۔ ان کی پیٹ پوجا کے لیے ہمیں زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس انہیں کھوہ سے باہر کھلا چھوڑنا تھا۔ وہ اپنا رزق خود ڈھونڈنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔

یہ قمری مہینے کی درمیانی راتیں تھیں۔ آج مطلع بالکل صاف تھا اور یخ بستہ چاندنی نشیب و فراز کو دور تک روشن کر رہی تھی۔ ہم نے کتوں کو ساتھ لیا اور غار سے نکل آئے۔ کتوں کو کھلا چھوڑنے سے پہلے کبیر شاہ نے ضروری سمجھا کہ مردہ لیپا کی لاش زیر زمین کر دی جائے۔ باؤلے کتے کا جسم یوں کھلی جگہ پڑے رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ ہم نے ٹارچ کی روشنی میں ایک قبر نما گڑھا دریافت کیا اور لاش گھسیٹ کر اس میں ڈال دی۔ قرب و جوار میں چھوٹے بڑے پتھر بہت تھے۔ ہم نے ان پتھروں اور بجری نما سنگریزوں سے گڑھے کو بھرنا شروع کر دیا۔ لیپا اپنی تمام تر وحشت اور بدقسمتی سمیت زیر زمین جا رہا تھا۔ لیپا دراصل لیپارڈ کا مخفف تھا۔ لیپارڈ پہاڑی شیر کی ایک قسم ہے اور یہ کوبل قد و قامت میں شیر سے چھوٹا نہیں تھا۔ کتوں میں "لیپا" سے کبیر شاہ کو سب سے زیادہ محبت تھی' وہ بھی کبیر شاہ کے اشارے پر چلتا تھا۔ جو جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی دور بھی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں' بے پناہ قربت اور لاانتہائی ... ی میں بس ایک ذرا سا خلا ہوتا ہے۔ ایک حادثے نے یہ خلا پُر کر دیا تھا اور مالک پر جان چھڑکنے والا لیپا اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ اگر میری گولی نشانے پر نہ بیٹھتی تو دوسری بار رائفل لوڈ کرنے تک کبیر شاہ کا کیا حشر ہو گیا ہوتا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ کتا یقیناً سیکنڈوں میں اس کا تیا پانچا کر دیتا۔

کتے کی قبر تیار ہو گئی تو کبیر شاہ نے سرد آہ بھری اور نڈھال سا ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں کتوں کی زنجیریں کھولنے لگا لیکن پھر مجھے اس لاش کا خیال آیا جو اوپر جھاڑیوں میں پڑی تھی اور جس کی بو بھبکوں کی صورت میں رہ رہ کر کھوہ کے اندر پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں ہم سے حفظِ مراتب کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ جانور سے پہلے انسان کو دفن کرنے کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کون تھا لیکن انسان تو تھا اور اس کے مرتے ہی پوری نسلِ انسانی پر یہ فرض عائد ہو گیا تھا کہ اسے احترام سے دفن کرے۔ یہ ایک انسان کی لاش تھی مگر انسانوں کی موجودگی میں یونہی کھلی پڑی رہتی تو انسانیت کی لاش کہلاتی۔ میں نے کبیر شاہ کو یاد دلایا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کپڑوں کے تھیلے میں سے تازہ بیٹری سیل نکال کر ٹارچ میں ڈالے۔ ٹارچ کی دم توڑتی روشنی ایک دم جی اٹھی۔ ہم نے کتوں کو ساتھ لیا اور محتاط قدموں سے چڑھائی چڑھنے لگے۔

نامعلوم شخص کی بُری بھلی تدفین اور کتوں کو پیٹ پوجا کرانے کے بعد جب ہم کھوہ میں واپس پہنچے تو رات کے تقریباً ساڑھے دس بج چکے تھے یعنی ایک بالٹی پانی لاتے لاتے ہم نے دو گھنٹے صرف کر دیے تھے۔ تاہم خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم کون سا اپنے گھر میں تھے۔ یہ کھوہ ایک طوائف کا کوٹھا تھا اور ایسی جگہوں پر رات گئے آنا جانا معیوب نہیں ہوتا۔ کھوہ میں مکمل تاریکی تھی اور دہانہ بند تھا۔ میں نے پکار کر آواز دی تو نائیکہ نے بالائی سل ہٹا کر باہر جھانکا۔ "کہاں فوت ہو گئے تھے؟" وہ برہمی سے بولی۔

میں نے کہا۔ "فوت نہیں ہو گئے تھے' فوت ہونے والوں کو دفنا رہے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"کتے کو گڑھے میں دفنا رہے تھے۔ اس کی لاش کا کھلی جگہ پڑے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔" میں نے مختصر بات کی۔

نائیکہ نے دونوں سلیں ہٹا کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ کھوہ کے اندر خوشگوار حرارت تھی۔ وسطی حصے میں وہ چولہا جس پر نوخیز طوائف نے ہانڈی روٹی پکائی تھی' اب انگیٹھی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس میں انگارے دہک رہے تھے اور ان کی روشنی میں کھوہ کا ایک چوتھائی حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس حصے میں پاس پاس چار بستر بچھے تھے۔ ایک بستر پر دونوں لڑکیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ سفر کی تھکی ماندی تھیں اس لیے پڑتے ہی نیند میں غرق ہو گئی تھیں۔ نوخیز طوائف کچھ زیادہ ہی بے ترتیب دکھائی دے رہی تھی۔ ہاتھ کہیں' پاؤں کہیں اور تکیہ کہیں۔ اس بے ترتیبی کو چھپانے کے لیے نائیکہ نے اس پر ایک گرم چادر پھیلا دی تھی لیکن ادھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ چادر بھی بے ترتیب ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا نوخیز طوائف کا پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم سوتے میں بھی داد طلب کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑی طوائف سمٹ کے لیٹی تھی۔ پابند نظم کی طرح اس کے جسم کا ہر ہر ردیف اور قافیہ اپنی جگہ ٹھیک بیٹھا ہوا تھا۔ انگاروں کی مدھم روشنی نے اس کے جسم کی خامیاں چھپا کر خوبیاں نمایاں کر دی تھیں۔ وہ خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی جو خوب صورتی نوخیز طوائف کی بے ترتیبی میں تھی وہ بڑی طوائف کی ترتیب میں نہیں تھی۔

نائیکہ لڑکیوں کے ساتھ والے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ ہم دونوں نے باقی بستر سنبھال لیے۔ کبیر شاہ کو اپنے کتوں کے قریب رہنا تھا لہٰذا اس نے آخری بستر منتخب کیا۔ میرے حصے میں نائیکہ کے ساتھ والا بستر آیا۔ میں بستر پر نیم دراز ہوا تو نتھنوں میں الکحل کی بو گھستی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹھٹک کر دائیں طرف دیکھا۔ اس بو کا منبع کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ ساتھ والے بستر پر شراب کی بوتل موجود تھی۔ مجھے یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے نائیکہ شغلِ مے نوشی میں مصروف تھی۔ میں اسے سگریٹ پیتے اور مردانہ گالیاں بکتے تو پہلے ہی دیکھ چکا تھا' اب اس کی شراب نوشی بھی سامنے آ گئی تھی۔ درحقیقت یہ عورت ایک سکہ بند نائیکہ کی تمام مروّج خصوصیات اپنے اندر رکھتی تھی۔ ڈیل ڈول اور لب و لہجے کے لحاظ سے بھی وہ ایک دبنگ عورت تھی۔ اس کے کردار کی سب سے نمایاں صفت "بے باکی" تھی۔ اب یہ بے باکی ہی تو تھی کہ وہ ایک ویران کھوہ میں دو جوان لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی اور دو مسلح اجنبیوں کی موجودگی میں کسی طرح کی تشویش یا الجھن محسوس نہیں کر رہی تھی۔ "عزت و آبرو" وغیرہ کے الفاظ تو خیر ان عورتوں کے لیے بے معنی تھے لیکن زندگی تو بہرحال قیمتی چیز تھی اور پھر ان کے پاس قیمتی سامان بھی تھا۔ ایک جستی ٹرنک کو بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس ٹرنک میں وہ تحفے تحائف ہوں گے جو اس نائیکہ کی دونوں "بچیوں" نے اپنی اداؤں اور اپنے جسموں کے بدلے عیسیٰ جان اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے حاصل کیے ہوں گے۔ یہ پچھلے ڈیڑھ برس کی "حرام کمائی" تھی جو وہ اس ٹرنک میں بھر کر یہاں لے آئی تھی۔ اگر ہماری نیتوں میں فتور آ جاتا تو ہم انہیں مار پیٹ کر یا جہنم واصل کر کے یہ سب کچھ لوٹ سکتے تھے۔

"پیو گے؟" نائیکہ نے فراخدلی سے مجھے پیش کش کی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر پی کر میں آؤٹ ہو گیا تو؟"

وہ بولی۔ "کس کو ڈرا رہے ہو۔ یہاں کون سی شریف زادیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہوتے ہو آؤٹ تو ہو جاؤ۔" اس کا انداز بالکل کھلنڈرا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا قیمت ہوگی آؤٹ ہونے کی؟"

وہ بولی۔ "تم سے کچھ نہیں۔"

گفتگو خطرناک رُخ اختیار کر رہی تھی۔ میں نے وضاحت بدلتے ہوئے کہا۔ "آؤٹ ہونے سے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے سامان میں سے تالے والا ٹرنک لے کر چلتے بنیں۔"

وہ ذرا سا چونکی پھر میری انگلیوں سے سگریٹ کھینچ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ "یہ بال دھوپ میں چٹے نہیں کیے میں نے۔ بندہ دیکھ کر اس کی خصلت پہچان لیتی ہوں۔ تمہارے بارے میں مجھے کچھ اور پتا ہو یا نہ ہو لیکن اتنا پتہ ہے کہ تم ہماری خون پسینے کی کمائی پر ڈاکا نہیں ڈالو گے اور نہ ہی کوئی اور زبردستی کرو گے۔ کیوں ... ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں میں؟"

میں نے کہا۔ "اس سوال کا درست جواب تو میں شراب پینے کے بعد ہی دے سکتا ہوں۔"

وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "نہیں ... شراب میں کچھ نہیں ہوتا۔ نہ نشہ' نہ گناہ' نہ نیکی۔ جو کچھ ہوتا ہے بندے کے اندر ہوتا ہے۔" اس نے نصف گلاس اپنے اندر انڈیلا اور چیت لیٹ گئی۔

میرا سگریٹ ابھی تک اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ وہ سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولی۔ "میں یہ نہیں کہتی کہ شراب اچھی چیز ہے لیکن اس کا بُرا پن اس وقت چمکتا ہے جب اسے پینے والا بُرا ہو۔ میرا شوہر لطیف بھی تو شراب پیتا تھا لیکن شراب پی کر وہ دنگا فساد نہیں کرتا تھا' شعر جوڑتا تھا۔ وہ اونچا لمبا گبھرو جوان تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں چمٹا بجا کر گاتا تھا اور اپنے گانوں کے شعر بھی خود بناتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بولی دو دن کے اندر پورے سیالکوٹ میں مشہور ہو جاتی تھی۔ لوگ دور دور سے اس کا گانا سننے کے لیے آتے تھے۔ اس کے بولوں میں جادو تھا۔ سننے والے بغیر پیے ہی جھومنے لگتے تھے۔ ہم گاؤں میں رہتے تھے' ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں' ایسی سوہنی جوڑی مدتوں بعد دیکھی ہے لیکن یہ جوڑی ہمارے گاؤں کے زمیندار "دارا رمزی" کو پسند نہیں تھی۔ دارا کو جوانی میں ہی دس پندرہ پنڈوں کی چودھراہٹ مل گئی تھی۔ اس نے بڑی آفت اٹھائی ہوئی تھی۔ جو لڑکی پسند آ جاتی تھی اسے اٹھا کر ڈیرے پر لے جاتا تھا۔ میں اپنے سسرال میں جا کر شوہر کو تو بعد میں پسند آئی' پہلے چودھری دارا کو پسند آ گئی۔ پہلی نظر میں ہی مجھے چودھری کی آنکھوں میں سؤر کا بال نظر آیا۔ وہ بیس بائیس سال کا مسٹنڈا سا لڑکا تھا۔ میں جان کر حیران رہ گئی کہ دس پنڈوں کا چودھری ہے۔ چودھری' ان منہ زوروں میں سے تھا جو پسند آنے والی ہر چیز چھین لیتے ہیں۔ وہ مجھے بھی چھین لیتا پر میں اس کے گاؤں کی نوں (بہو) تھی۔ وہ دن دہاڑے مجھ پر ڈاکا نہیں مار سکتا تھا ... اس نے ڈاکا نہیں مارا' ڈاکے کی

تک چوری کی۔ شادی کے ٹھیک آٹھ مہینے بعد لطیف مر گیا۔ وہ ایک تھیٹر کے ساتھ لاہور کے میلہ چراغاں میں گیا ہوا تھا۔ وہیں اسے کچھ ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ زیادہ شراب پینے سے مرا ہے لیکن بہت سے لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ کسی نے اسے کچھ کھلا دیا ہے۔ شوہر کی موت کا صدمہ میں نے جیسے برداشت کیا وہ میں ہی جانتی ہوں۔ لطیف کے مرنے کے آٹھ دس مہینے بعد چوہدری دارا نے میری ماں سے میرا رشتہ مانگا۔ چوہدری کی ایک بیوی پہلے بھی تھی لیکن ایک دو بیویاں چوہدری جیسے بندے کو نئی شادی سے کیسے روک سکتی ہیں اور پھر چوہدری دارا کے پاس تو یہ بہانہ بھی تھا کہ اس کی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شاید میری ماں چوہدری کو "ہاں" ہی کر دیتی لیکن میں نے سہاگ کا جوڑا پہننے سے انکار کر دیا۔ چوہدری نے بہت زور لگایا۔ یہاں تک کہ میری ماں میرے گھر والوں اور عزیزوں تک کو میرے خلاف کر دیا لیکن میں کس سے مس نہ ہوئی۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اب شادی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنی ماں اور بھائی سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ مجھے مجبور کریں گے تو میں انہیں چھوڑ کر کسی طرف منہ کر جاؤں گی۔ اور پھر ساون کی ایک اندھیری رات کو مجھے گھر سے اٹھا لیا گیا۔ مجھے اٹھانے والا چوہدری دارا تھا۔ اپنے ڈیرے پر میرے ساتھ منہ کالا کرنے سے پہلے اس نے مجھے بتایا کہ میرے شوہر کو ہلاک کرنے والا وہی تھا۔ اس بے چارے کو شراب میں زہر دیا گیا تھا۔ مجھے کئی ہفتے اپنی ہوس اور انتقام کا نشانہ بنانے کے بعد چوہدری نے ایک شخص تبریز خان کے حوالے کر دیا۔ تبریز بردہ فروشوں کے ایک بڑے گروہ کا سردار تھا۔ وہ تین عورتوں کو قبائلی علاقے کے راستے کابل لے جا رہا تھا لیکن گوجر خان کے قریب پولیس کا چھاپا پڑا اور وہ ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ حالات نے کروٹ لی تھی لیکن تقدیر کروٹ نہ لے سکی۔ بہت بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں تبریز خان کے چنگل سے چھڑانے والے قانون کے محافظ نہیں، محافظوں کی وردی میں لٹیرے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق لاہور کی "قلم لائن" سے تھا اور تبریز خاں سے ان کا کوئی تنازعہ چل رہا تھا۔ یوں میں اپنی ماں کے گھر سے "اغوا" ہونے کے ایک ماہ بعد چوکی پہنچ گئی اور ہر رات نئی نئی شکلوں والے جانور میری چیر پھاڑ کرنے لگے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن اس کا انجام وہی ہوا جو ایسی کہانیوں کا ہوتا ہے۔۔۔ ایک رات چوکی کے قصبے سے چار مردوں نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا اور لاہور کی ہیرا منڈی میں لے آئے۔ میں عورت سے طوائف بن گئی اور ہیرا منڈی کے پنجرے میں پھڑپھڑانے لگی۔ انہی دنوں ایک اخبار کی خبر سے مجھے پتا چلا کہ میری زندگی برباد کرنے والا وڈیرہ چوہدری دارا لاہور کے ایک بھرے بڑے چوک میں اپنے دو ساتھیوں سمیت گولیوں سے چھلنی ہو گیا ہے۔ اسے قتل کرنے والے اس کے اپنے ہی گاؤں کے رہائشی "ڈوگر برادری" کے لوگ تھے۔ چوہدری دارا کی موت کے بعد ہیرا منڈی سے باہر میرا کوئی دشمن رہا تھا نہ محسن۔ اب کون تھا جس کے پاس جانے کے لیے میں اپنا جال توڑنے کی کوشش کرتی۔ ماں، بھائی بہن، عزیز رشتے دار اب کوئی میرا نہیں رہا تھا اور نہ میں کسی کی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اسی ماحول میں رہنا سیکھ لیا تھا۔ اپنے بچھڑے ہوؤں کا غم بھلانے کے لیے میں شراب پیتی تھی اور رات دن سگریٹ پھونکتی تھی۔ میں جب بھی شراب کا گلاس دیکھتی تھی میری نگاہوں کے سامنے لطیف کی شکل آ جاتی تھی۔ میں یہ سوچ کر شراب چڑھا جاتی تھی کہ شاید اس گلاس میں بھی کسی نے کچھ ملا دیا ہو اور میں دنیا کے جنجالوں سے چھوٹ کر لطیف کے پاس پہنچ جاؤں۔ بڑا دکھ تھا مجھے اس کے مرنے کا۔ میں خود کو اس کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی اور بیس سال گزرنے کے بعد آج تک سمجھتی ہوں۔ اس دکھ کا خاتمہ تو اب زندگی کے ساتھ ہی ہوگا۔"

ایک طویل آہ بھر کر اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر گئی۔ میں نے کبیر شاد کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر لیٹتے ہی ہماری گفتگو سے لاتعلق ہو گیا تھا اور اب گہری نیند سو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ڈھوکی تالاب والے پڑاؤ سے نکلنے کے بعد آج پہلی بار اسے پیٹ بھر کر کھانا اور نرم بستر نصیب ہوا تھا۔ میں نے کھدر کا لحاف اس کی چھاتی تک کھینچ دیا۔ اب میرے پاس آخری چار سگریٹ رہ گئے تھے۔ دو سگریٹ میں نے نائکہ کو دیے اور اپنے حصے کے دو میں سے ایک کو ماچس دکھا دی۔

پہلا کش کھینچتے ہوئے میں نے کہا۔ "تمہاری کہانی دکھ بھری ہے اور یہ تمہاری نہیں، ان گنت عورتوں کی کہانی ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہم نے ایک ایسی لڑکی کو دلالوں کے شکنجے سے نکالا ہے جس کا سر لڑکوں کی طرح مونڈ دیا گیا تھا۔ اس شریف زادی کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے پڑوسیوں کی فیشن زدہ لڑکی کو برقی کبوتری کہہ دیا تھا۔ یہ برقی کبوتری بازار حسن کا مال تھی اور گند پھیلانے کے لیے شریفوں کے محلے میں رہ رہی تھی۔ اسے "برقی" کہنے کی سزا شریف زادی کو یہ ملی کہ اسے کوٹھی سے اٹھا کر کوٹھے پر پہنچا دیا گیا۔ اس کے لمبے بال قینچی کیے گئے اسے طبلے کی دھنا دھن

پر نچایا گیا اور سارے بھاؤ تاؤ سکھا کر جسم فروش طوائف بنا دیا گیا۔"

نائکہ نے ایک اور جام حلق میں انڈیلا اور اپنی پھٹی ہوئی بے ہنگم آواز میں گنگنانے لگی۔ "جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں۔۔۔ کہاں ہیں۔۔۔ کہاں ہیں۔۔۔" گانے گاتے اس نے ایک دم پینترا بدلا اور اس گیت کے ساتھ ایک دوسرے گیت کا ٹکڑا جوڑ دیا۔ "یہاں قدر کیا دل کی ہوگی، یہ دنیا ہے شیشہ گروں کی۔ محبت کا دل ٹھوکروں میں ہے قیمت یہاں پتھروں کی۔۔۔" نشہ اب اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ آواز کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہ بھی لڑکھڑانے لگی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "لیکن۔۔۔ لاہور کا آرام و آسائش چھوڑ کر تم یہاں کیسے چلی آئیں۔ کیا کوئی چکر ہو گیا تھا وہاں؟"

وہ ہاتھ لہرا کر بولی۔ "تم بڑے نخرے ہو قربان الٰہی۔۔۔ ارے کیا نام بتایا تھا؟ احسان الٰہی۔ مجھے نشے میں دیکھ کر میرے اندر کی بات باہر لانا چاہتے ہو۔۔۔ ہے ناں؟ خیر۔۔۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم ویسے بھی بڑے بیبے بندے ہو۔ مجھے تو اپنے ہی جیسے لگتے ہو، دکھوں کے مارے ہوئے۔"

وہ آلتی پالتی مار کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور جس تکیے پر سر رکھ کر لیٹی ہوئی تھی وہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ بولی۔ "میرے یہاں آنے کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے۔ یہ ایک معمولی سی بات تھی جو بڑھ کر بہت بڑی ہو گئی۔۔۔ اتنی بڑی ہو گئی کہ میرے ہاتھوں ایک بندہ قتل ہو گیا۔۔۔ بلکہ قتل ہو گئی۔ دراصل وہ ہو گیا تھا نہ ہو گئی تھی۔ وہ ہیجڑا تھا۔ عبدالغنی نام تھا اس کا۔ میرے چوبارے کے سامنے اپنا چوبارا چلاتا تھا۔ بس یوں سمجھو کہ کاروباری دشمنی تھی ہماری۔ ایک روز اس کے دلال نے میری ایک بچی ستارہ کو سرعام گالیاں دیں اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ اس بات پر جھگڑا بڑھ گیا۔ میں عبدالغنی کے چوبارے پر شکایت کرنے گئی تو اس سے میری ہاتھا پائی ہو گئی۔۔۔ میری یہ دونوں بچیاں جو سوتی پڑی ہیں، میرے ساتھ ہی تھیں۔ ان کے نام عندلیب اور ترانہ ہیں۔ بڑی عندلیب اور چھوٹی ترانہ۔۔۔ ہم نے عبدالغنی اور اس کی ایک بھتیجی کو پکڑ لیا۔ خوب مارا ماری ہوئی۔ عبدالغنی نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے اپنی شلوار کے نیفے سے پستول نکال لیا۔ بس موت ہی آئی ہوئی تھی اس کی۔ میں نے پستول اس کے ہاتھوں سے چھینا اور پتا نہیں کیسے اس کو گولی مار دی۔ وہ تڑپ کر فرش پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی بھتیجی چیخیں مارتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ وہ واویلا کر رہی تھی۔ "مار دیا۔۔۔ قتل کر دیا" ہم تینوں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی بہتری سمجھی۔ میں بچیوں کو لے کر پچھلے زینے سے اتری اور بڑے بازار میں آ گئی۔ یہاں فوراً ہی ایک ٹیکسی والے نے ہمیں بٹھا لیا۔ ہم اچھرہ میں ایک جاننے والے کے ہاں چلے گئے۔ مجھے روپے میں چار آنے بھی ڈر نہیں تھا کہ عبدالغنی مر جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زخمی ہوا ہے اور مرہم پٹی کے بعد بھلا چنگا ہو جائے گا لیکن دو گھنٹے بعد پتا چلا کہ وہ اسی جگہ دم توڑ گیا تھا اور اب پولیس ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہاں چوکی کی طرف میرا ایک جاننے والا ملک کوثر علی تھا۔ ہم نے اس کے پاس پناہ لے لی۔ ہیرا منڈی کی خبریں ہم تک باقاعدگی سے پہنچ رہی تھیں۔ پتا چلا کہ مقتول عبدالغنی کے رشتے داروں میں تجمل حسین نام کا ایک بندہ ایک بہت بڑے سرکاری آدمی کا ڈرائیور ہے اور وہ ہمیں گرفتار کرانے کے لیے زبردست بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ شہادتیں، گواہ، ثبوت سب کچھ ہمارے خلاف تھا۔ ہم پر الزام ثابت ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی تھی اور پھر پولیس ہی نہیں عبدالغنی کے رشتے دار بھی ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پولیس کا منہ دیکھنے کے بجائے اپنے بدلے خود چکاتے ہیں۔ ان حالات میں ملک کوثر علی نے ہماری بہت مدد کی اور اپنے ایک واقف کار ٹرک ڈرائیور کے ذریعے ہمیں خاموشی سے قبائلی علاقے میں نکال دیا۔۔۔"

باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم پٹڑی سے اتر گئی۔ ہاتھ لہرا کر بولی۔ "دیکھو، تم شراب کو برا کہتے ہو۔ میں بھی اچھا نہیں کہتی لیکن دیکھو کتنے مزے کی بات ہے۔ میں نے بیس سال شراب پی مگر نشے میں کسی کو انگلی تک نہیں لگائی۔ کبھی دنگا فساد نہیں کیا اور جن دنوں میں نے شراب چھوڑی ہوئی تھی۔ گلاس کو ہاتھ تک نہیں لگاتی تھی ان دنوں مجھ سے ایک قتل ہو گیا۔ لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ ثریا بائی نے نشے میں قتل کیا مگر میں قسم کھاتی ہوں کہ میں نشے میں نہیں تھی۔ پچھلے چھ مہینے سے ایک قطرہ میرے حلق میں نہیں گیا تھا۔۔۔ یہ مت سمجھو کہ میں شراب کی طرف داری کر رہی ہوں۔ شراب بہت۔۔۔ بہت۔۔۔ بہت بری چیز ہے۔ گھروں کے گھر اجاڑ دیتی ہے لیکن شراب کی اصل برائی پینے والے کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ ایک ہی بوتل میں سے دو آدمی پیتے ہیں۔ ایک شرافت سے سو رہتا ہے اور دوسرا غنڈا گردی کرنے کے لیے گلیوں میں نکل آتا ہے۔ اب میں تمہیں اسی ہیجڑے عبدالغنی کے چھوٹے بھائی تبسم کی بات بتاتی ہوں۔ وہ بھی ہیجڑا ہے۔ ایک دن۔۔۔"

"ثریا بائی! چھوڑو ان ہیجڑوں کا ذکر۔" میں نے اسے

ٹوک دیا۔ "کچھ یہاں کی بات کرو۔ اس ڈیڑھ برس کے بارے میں بتاؤ جو تم نے یہاں اس ویرانے میں گزارا ہے۔ سچ کہتا ہوں تمہاری ہمت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے۔"

وہ بولی۔ "نہیں احسان الٰہی 'داد کی بات نہیں ہے۔ داد کی بات تو تب تھی کہ کوئی شریف زادی یہاں پر ڈیڑھ سال گزارتی اور اپنی عزت سلامت لے کر لوٹ جاتی۔ ہمارے پاس تو کچھ گنوانے کے لیے بھی نہیں تھا۔ بازارِ حسن اور زوئے مشت ہمارے لیے برابر تھے۔ وہاں بھی بھوکے کتے تھے۔ یہاں بھی بھوکے کتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ لاہور والا آرام و آسائش یہاں نہیں ہے لیکن یہ بات تو تم بھی مانو گے کہ آرام و آسائش کی زندگی کے لیے بندہ زندگی ہی ہار جائے تو بڑا گھاٹے کا سودا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "زوئے مشت میں تمہارا ٹھکانا کہاں تھا؟"

اگر میرا خیال تھا کہ وہ نشے میں آؤٹ ہو رہی ہے اور روانی میں بولتی چلی جائے گی تو یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے جو بات بھی کی گول مول انداز میں کی اور عیسیٰ جان' لشکر خاں اور ان کے ڈیرے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا۔ بس اتنی پیش رفت ہوئی کہ پہلے اس نے جسے "بااثر شخص" بتایا تھا' اب اسے ڈاکو تسلیم کر لیا اور بتایا کہ اردگرد کے سب لوگ اس سے خوف کھاتے تھے اور چونکہ وہ تینوں اس کی امان میں تھیں لہٰذا کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے کسی طرح کی زبردستی کرتا یا ان کے کاروبار میں رخنہ ڈالتا۔ وہ بولی۔ "ہمارے اڈے سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ناچ گانے کا ایک اور اڈا بھی ہے۔ وہاں کرن نامی لڑکی کام کرتی تھی۔ بڑی پیاری بچی تھی اور محنتی بھی بہت۔ میں اکثر اس سے ملنے جایا کرتی تھی پھر جب اردگرد کے حالات خراب ہوئے اور ہر روز خونخرابہ ہونے لگی تو ہمارا باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ امید تھی کہ سردار جلد ہی یہ لڑائی جھگڑے والا معاملہ ٹھیک کر لے گا مگر ٹھیک ہونے کے بجائے یہ بات اور بگڑتی گئی۔ ایک روز چند غنڈوں نے میرے ملازم صولت خاں کو بری طرح مارا پیٹا اور خطرناک دھمکیاں دیں۔ اس روز میں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ یہ اڈا چھوڑ کر کرن والے اڈے پر چلی جاؤں۔ صولت خاں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ اس جگہ کو علاقے میں اکبر کا ڈیرا کہا جاتا ہے۔ دو ہفتے پہلے ہم نے سامان سمیٹا اور دو خچروں پر لاد کر اکبر کے ڈیرے پر آ گئے۔ پھر اکبر کے ڈیرے پر جا کر پتا چلا کہ وہاں حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ مجھے یہ دردناک خبر بھی ملی کہ تین روز پہلے کرن مر گئی ہے۔ ایک پاس دور بستی کے پاس دو جتھوں میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں کرن بھی گر ہو گئی۔ اب میرا وہاں ایک پل بھی رہنا مشکل تھا۔ میں ڈیرے کے مالک اکبر سے کہا کہ وہ کسی طرح میرے اور میرا بچیوں کے نکلنے کا انتظام کرے۔ اس نے بتایا کہ ابھی علاقے میں بڑی گڑبڑ ہے' ہمارا سفر نکلنا ٹھیک نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ صولت خاں کچھ سامان لے کر چلا جائے اور ہمارے لیے کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈے۔ یہ رائے مجھے بھی پسند آئی۔ صولت خاں چلا گیا اور پانچویں روز واپس آ کر اس نے بتایا کہ پارہ چنار کے قریب پہاڑیوں میں ایک جگہ مل گئی ہے۔ لالہ اکبر نے اپنے ملازم کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا۔ یہ وہی بندہ ہے جسے کتے نے زخمی کیا ہے۔ اس کا نام تو قصاب خاں ہے مگر سب اسے منگول کہتے ہیں۔"

اتنی کتھا سنا کر ثریا بائی چپ ہو گئی۔ غالباً منگول ڈنگر کے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ وہ بچ جائے گا یا نہیں۔ اب صورتِ حال کا مکمل نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ ثریا اور اس کی دونوں کماؤ بچیوں کے بارے میں اب کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ ثریا نے زوئے مشت کے خراب حالات کا رونا بڑی شدت سے رویا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہیں ہو گا کہ ان حالات کو خراب تر کرنے میں جس شخص کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے وہ اس کے سامنے بیٹھا ہے (موجودہ لڑائی میں شدت اسی وقت پیدا ہوئی تھی جب میرے ہاتھوں عیسیٰ جان کے دو پہریدار ہلاک ہوئے تھے)

اب بوتل میں دخترِ انگور کے چند آخری گھونٹ رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ ثریا بائی یہ گھونٹ کل کے لیے بچانے کی کوشش کر رہی ہے مگر نشے میں "فکرِ فردا" کہاں تک ذہن کا ساتھ دے سکتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ثریا بائی نے سر جھٹکا اور یہ آخری گھونٹ بھی حلق سے اتار کر خالی بوتل ایک طرف لڑھکا دی۔

"ختم ہو گئی۔" وہ بڑبڑائی۔ "پینے لگو تو لگتا ہے کہ یہ خصم کھانی بوتل بھی ساتھ ہی پینے لگی ہے۔"

اس نے ایک ہچکی سی لی اور بستر پر پھیل کر لیٹ گئی۔ چولہا اب راکھ ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں انگارے سرد ہو رہے تھے' سردی شعلہ بن رہی تھی۔ لڑکیاں چونکہ چولہے کے بالکل قریب لیٹی تھیں لہٰذا ان کے اوپر صرف ایک کمبل نما چادر تھی۔ اب ٹھنڈ ہو جانے سے وہ بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔ مجھے ان کی طرف دیکھتے پا کر ثریا بائی نے جلدی سے لحاف ان پر کھینچ دیا۔ بالکل جیسے کوئی قصاب بلی کو گوشت

کی طرف دیکھتے پا کر گوشت کو کپڑے سے ڈھک دے۔ میں زیرِ لب مسکرا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ "اب کیا ارادے ہیں ثریا بائی! اس کھوہ میں قیام ہے یا کوچ ہے یہاں سے؟"

میرے "بائی" کہہ کر مخاطب کرنے کا اس نے بالکل برا نہیں مانا۔ پچھلے بیس برسوں کے رہن سہن نے اسے ایک بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اب وہ طوائف نہیں تھی' ایک ہوشیار نائیکہ تھی جو اپنے کاروبار کی ہر اونچ نیچ سے واقف تھی۔ وہ اوگھتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے احسان الٰہی' اب میرا دل بھر گیا ہے اس اللہ ماری جگہ سے۔ کسی اور جگہ چلے جائیں گے۔ کوئی یہی ایک آزاد علاقہ تو نہیں پاکستان میں۔"

"لگتا ہے یہ کھوہ تمہیں پسند نہیں آئی؟" میں نے اسے ٹٹولا۔

"ہاں' ٹھیک کہتے ہو۔" وہ بڑبڑائی۔ "یہ کوئی ٹھکانا ہے انسانوں کے رہنے کا؟ نہ پانی نہ ہوا' اور نہ آنے جانے والے کوئی بندہ بشر' اور تو اور بندہ سیدھا ہو کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اس غار میں۔ جان کا خطرہ علیحدہ ہے۔ آج تم نے حال چال پوچھ لیا ہے' کل کسی سوری سے کوئی سانپ بچھو وسٹ نہ رینگے نکل آئے گا۔ نہ جی نہ۔ میں تو بچیوں کو لے کر نہیں رہنا یہاں۔ ایسی ہی جیل میں رہنا تھا تو لاہور کیا برا تھا۔ بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔ وہ ہو جائے تو نکل جاؤں گی یہاں سے۔" بات کرتے کرتے وہ ذرا چونکی اور کہنے لگی۔ "یہ پکھا خیلہ کتنی دور ہے یہاں سے؟"

میں یہ نام پہلی بار سن رہا تھا لہٰذا سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بولی۔ "اچھے شکاری ہو تم۔ یہاں شکار کھیلتے ہو اور پاس پڑوس کی جگہ کا پتا نہیں۔ ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔ مجھے روپے میں چار آنے بھی یقین نہیں کہ تم نے اپنے بارے میں کوئی ڈھنگ کی بات بتائی ہے مجھے۔ بس ادھر ادھر کی مار کر اُلّو بنایا ہے۔ وہی جو تم "مردوں" کا کام ہوتا ہے۔۔۔ خیر کیا فرق پڑتا ہے مجھے۔"

میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ثریا بائی! تم غلط سمجھ رہی ہو' ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں ٹھہرا پنجابی' یہ پشتو کے نام پتے میری زبان پر نہیں چڑھتے۔ کبر شاہ کو پتا ہو گا سارا۔ ویسے میرا خیال ہے یہ پکھا خیلہ کوئی چھوٹی سی جگہ ہے۔"

وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے چھوٹی سی ہو لیکن یہاں کڑاک بڑا اسا جوڑا ہو رہا ہے۔ پوری رات کا جشن ہے۔ کئی کھیل تماشے ہوں گے۔ سو ڈیڑھ سو بندوں کے کھانے کا انتظام ہے۔ جشن کا سب سے جاندار آئٹم ناچ گانے کا ہے اور یہ ہمارا کام میری بچیوں نے سنبھالنا ہے۔"

"کون کرا رہا ہے یہ ناچ گانا؟" میں نے پوچھا۔

"ہے ایک جاننے والا اور وہ ایسا بندہ ہے کہ اس کی بات ٹالی نہیں جا سکتی ہے۔ اگر ٹالی جا سکتی تو میں نے ٹال دی ہوتی۔ سچ کہتی ہوں اس لڑکی کرن کی موت نے ادھ موا کر دیا ہے مجھے۔"

"تو نہ جاؤ اگر اتنا تنگ ہو کر جا رہی ہو تو۔"

"نہ جاؤں گی تو نقصان اٹھاؤں گی۔۔۔ پھنسی ہوئی ہوں اور جب پھنس گئی تو پھڑکنا کیسا؟"

"مطلب یہ کہ ڈر رہی ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔ وہ کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ تمہارے جیسے شکاری اس کی مٹھی چاپی کرتے ہیں۔ یہ وہی شخص ہے جس نے بڑے سردار سے ٹکر لی ہے۔ خوار مخواہ اس سے بگاڑ لے کر میں ایک خطرہ نہیں پالنا چاہتی۔ زوئے مشت سے چلی بھی جاؤں تو پھر بھی رہوں گی تو آزاد علاقے میں ہی۔ کہیں بھی اس سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔۔۔ اور پھر یہ رات بھی تو بات ہے۔ جشن نم ٹنٹا ختم۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ دو تجر کابلی صولت خاں واپس آ گیا تو جشن سے لوٹتے ہی یہاں سے نکلنے کی تیاری کروں گی۔"

"کب ہو رہا ہے یہ جشن؟" میں نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"کل رات۔ پرسوں صبح میں فارغ ہو جاؤں گی۔"

میرے ذہن میں لشکر خاں کا نام گونج رہا تھا۔ "بڑے سردار" سے ثریا بائی کی مراد یقیناً عیسیٰ جان تھا اور عیسیٰ جان سے ٹکر لینے والا لشکر خاں ہی تھا۔ تو کیا لشکر خاں کوئی جشن برپا کر رہا تھا۔ اسے کیوں یہ جشن کا سوجھا تھا۔ کہیں یہ گروہ کی سرداری سنبھالنے کا جشن تو نہیں تھا؟ لشکر خاں سے میری آخری ملاقات پاؤندہ بستی سے رخصت ہوتے وقت ہوئی تھی۔ وہ ہمیں بستی سے باہر تک چھوڑنے آیا تھا اور بڑی گرمجوشی سے الوداع کہہ کے گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر مقامی حکام نے نیک نیتی سے اسے معافی کی پیش کش کی تو وہ اپنے بیشتر قریبی ساتھیوں سمیت ہتھیار پھینک دے گا اور آئندہ کے لیے شریفانہ زندگی گزارنے کا عہد کرے گا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں اس تقریب پُرمسرت کا تعلق لشکر خاں اور اس کے ساتھیوں کو ملنے والی عام معافی سے تو نہیں تھا۔

میں نے اس سلسلے میں ثریا بائی کو کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بے خبر نکلی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ پکھا

خیلہ کے مقام پر جشن ہو رہا ہے جس میں سو ڈیڑھ سو افراد شرکت کر رہے ہیں اور ان میں زیادہ لوگ وہ ہیں جو بڑے سوار کے گروہ میں شریک رہے ہیں۔ تاہم اس گفتگو کے دوران او تھمتی ہوئی ثریا بائی کے منہ سے چند ایسی باتیں ضرور نکلیں جن سے مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ جشن برپا کرنے والا لشکر خاں اور اس کے ساتھی ہی ہیں۔

○☆○

اگلی صبح بڑی سہانی تھی یا شاید اس لیے سہانی نظر آ رہی تھی کہ میں جلدی اٹھ گیا تھا اور بیدار ہونے کے بعد یہ سوہان روح خیال بھی دامن گیر نہیں ہوا تھا کہ کھوہ سے باہر ایک پاگل کتا ہم سے شرط لگا کے بیٹھا ہے۔ میرے جلدی بیدار ہونے کی وجہ سردی ہی تھی۔ درحقیقت میرے اور کبیر شاہ کے حصے میں آدھا آدھا لحاف آیا تھا۔ صبح دم میں ایسے آدھے لحاف سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کبیر شاہ سمیت کھوہ کے باقی مکین گہری نیند سو رہے ہیں۔ صرف ثریا بائی کے چہرے کی رنگت اور سینے کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غفلت کی نہیں، ہوشیاری کی نیند سو رہی ہے۔ سوتے میں وہ تھوڑا سا ترچھی ہو گئی تھی اور یوں اس کا ایک بازو دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے جستی ٹرنک کو چھو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ٹرنک کو اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کروں تو وہ فوراً جاگ جائے گی۔ ظاہر ہے اس ٹرنک میں اس کی ڈیڑھ سالہ "محنت" کا پھل تھا۔ میں اس کے لیے کتنا بھی جیالا بندہ تھا۔ لیکن بندہ تھا اور بندہ بشر۔ بندہ بشری ہوتا ہے۔ کچھ ایسی ہی احتیاط ثریا بائی نے لڑکیوں کے سلسلے میں بھی کر رکھی تھی۔ چھوٹی لڑکی کو اس نے شانہ بشانہ سلا رکھا تھا اور بائیں ٹانگ اس کے پیٹ پر چڑھا دی تھی۔ یعنی ہوشیار نائیکہ کی دونوں ٹانگیں کھوہ کے رنگین اثاثوں کو چھو رہی تھیں۔ ان میں سے کسی اثاثے کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی جاتی تو وہ بیدار ہو جاتی۔ آزمائش کے طور پر میں نے لیٹے لیٹے پاؤں کے زور سے تالا بند صندوق کو تھوڑا سا کھسکایا۔

"ہوے ہے" نائیکہ کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھنے کے بعد تھوڑا سا نیچے کھسکی اور اپنا پاؤں پھر جستی ٹرنک سے جوڑ کر سو گئی۔

میں نے جیکٹ پہنی، کبیر شاہ کی چادر لپیٹی اور ہوا خوری کے لیے کھوہ سے باہر نکل گیا۔ نیند بھگا دینے والی ٹھنڈی ٹھار ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گھوم پھر کر واپس آیا تو کھوہ کے مکین پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔ کھوہ میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ یہ صرف آگ کا دھواں ہی نہیں تھا اس میں گھی کے تلے ہوئے پراٹھوں کی مہک بھی تھی۔ میں نے دیکھا دونوں لڑکیاں ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھیں۔ کبیر شاہ کے بارے میں ثریا بائی نے بتایا کہ وہ پانی لینے نالے کی طرف گیا ہے۔ اچھے بھلے بندے کو چوبارے والیوں نے "پانی بھرنا" بنا دیا تھا۔ وہ صرف میری وجہ سے خاموش تھا ورنہ کل شام ہی کھوہ سے کوچ کر جاتا۔ دراصل میں نے اس پر امکان ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس نائیکہ کو عیسیٰ جان کے بارے میں پتا ہو۔ ظاہر ہے وہ عیسیٰ جان کی پناہ اور سرپرستی میں رہی تھی اور اس کے بارے میں ہم دونوں سے زیادہ جانتی تھی۔ میں نے کبیر شاہ سے درخواست کی تھی کہ جیسے تیسے ان عورتوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنا ہے۔ کبیر شاہ نے پوچھا تھا "لیکن ان عورتوں کا کیا ہوگا جنہیں راستے میں چھوڑ آئے ہو؟" میں نے کہا تھا کہ ان کے ساتھ جو بھی بیتنی تھی اب تک بیت چکی ہوگی۔ اب ہمارے جلد یا دیر سے پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کبیر شاہ ایک خالی ٹین میں گدلا سا پانی لے کر واپس آ گیا۔ کتے آزاد تھے اور اس کے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے۔ سب سے آخر میں زخمی کتا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ ناشتے میں پراٹھے اور گھی شکر کے علاوہ انڈوں کا نمکین آملیٹ بھی تھا۔ "غار کے انسان" کے لیے اس سے بہتر ناشتا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پراٹھے اور گھی شکر کی موجودگی تو قابل فہم تھی لیکن انڈے نجانے یہاں تک کیسے پہنچ گئے تھے۔ میرے خیال میں یہ انڈے اس ٹوکری میں تھے جو "رقت آمد" ثریا بائی نے بڑی احتیاط سے ہاتھ میں لٹکا رکھی تھی۔

ثریا بائی کا رویہ ہم دونوں سے ادنیٰ ملازموں جیسا تھا۔ وہ بڑی دبنگ اور کسی حد تک گھمنڈی عورت تھی۔ یہ ان ہی برسوں کا کرشمہ تھا جو اس نے بازارِ حُسن کی دھواں دھواں فضا میں جھونکے تھے۔ پتا نہیں کس بات کا مان تھا اسے۔ کوئی ذرہ خطرہ محسوس نہیں کر رہی تھی وہ دو جوان جہان تر بیلوں سے۔ اس نے ہمیں ناشتا تو ٹھیک ٹھاک کرایا لیکن ناشتے کے بدلے کام بھی ٹھیک ٹھاک لیا۔ جونہی دھوپ ذرا چمکی اس نے دو خالی ٹین ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے اور "تالاب" سے پانی لانے کو کہا۔ کبیر شاہ بڑی مشکل سے یہ توہین برداشت کر رہا تھا۔ ایک موقع پر تو مجھے لگا کہ وہ ثریا بائی پر پھٹ ہی پڑے گا۔ میں نے بائی کی آنکھ بچا کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے اور سمجھایا کہ وہ بنا بنایا کام خراب نہ کرے۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ میری بات مان گیا۔

خالی ٹینوں میں ناکون کی رسی پرو کر انہیں بالٹی کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہم پانی بھر کر ٹین اٹھاتے تھے تو رسی انگلیوں میں دھنسنے لگتی تھی۔ جب ہم کوئی گھڑے کا تیسرا پھیرا لگا کر آئے تو کھوہ کے ایک حصے میں چادر تان کر اسے باقی کھوہ سے علیحدہ کیا جا چکا تھا۔

"ان میں سے کوئی حرامزادی بچہ تو نہیں جننے والی؟" کبیر شاہ نے جلے بھنے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں" میں نے کہا۔ "کل شام تک تو کسی کا پاؤں بھاری نہیں تھا۔"

یہ پردہ داری دراصل نہانے دھونے کے لیے کی گئی تھی۔ ثریا بائی نے مجھے حکم دیا کہ میں چولہے کے لیے ایندھن ڈھونڈ کر لاؤں۔ کبیر شاہ کو آرڈر ہوا کہ وہ کتوں کو کھوہ سے باہر کسی محفوظ جگہ باندھ کر آئے کیونکہ ان کی موجودگی میں "بچیاں" مسلسل خوف کھا رہی ہیں۔ کبیر شاہ کا پارا پھر ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ گیا مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے تھیلوں سے کتوں کی زنجیریں نکال لیں اور انہیں پٹے ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔ کبیر شاہ بھناتا ہوا کچھ دور ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ میں خود ہی اس کے کتے پہاڑی سے باندھ کر آیا اور جلانے کے لیے لکڑیاں ڈھونڈنے نکل گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ خشک لکڑی ڈھونڈنا اتنا ہی آسان تھا جتنا صحرا میں ریت تلاش کرنا۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی میں ایک بڑا گٹھا کندھے پر رکھ کر لے آیا۔ پردوں کے پیچھے کپڑے وغیرہ دھوئے جا رہے تھے اور ان میں سے کچھ ہیجان انگیز زنانہ کپڑے دھوپ میں سکھانے کے لیے باہر پتھروں پر پھیلا دیے گئے تھے۔ نائیکہ چھوٹی لڑکی کو ٹانگوں کے درمیان بٹھائے اس کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ "احسان الٰہی ..... کاکا! ذرا جلدی کرو۔ سردیوں کا دن ہے۔ دوپہر ہوتے ہی ڈھل جائے گا۔ شام تک بچیاں مشکل سے تیار ہو سکیں گی۔"

خود پر لعنت بھیجنے کو جی چاہا مگر یہ کام کبیر شاہ احسن طریقے سے کر رہا تھا لہٰذا ارادہ ملتوی کر دیا۔ "ہاں اب کیا کرنا ہے؟" میں نے بے دام غلام بن کر پوچھا۔

"بس آگ جلا کر تھوڑے سے کوئلے بنا دو۔ استری میں بھرنے ہیں۔ اور ہمیں تو بھوک ہے نہیں۔ تم نے اگر دوپہر کو روٹی کھانی ہے تو تھوڑے سے آلو چھیل لینا ..... یا رہنے دو آلو۔ بڑی بالٹی میں چاول رکھے ہوئے ہیں۔ دو گلاس چاول صاف کر کے اس میں مونگ کی دال ڈال لو۔ پانچ منٹ میں پک جائیں گے۔ ہم نے بھی دو ڈبکیاں لینی ہوں گی تو لے لیں گے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر لکڑیاں چولہے میں رکھیں اور آگ جلانے میں مصروف ہو گیا۔ ثریا بائی ہمیں کچھ زیادہ ہی "انڈر اسٹیمیٹ" کر رہی تھی۔ میرے بارے میں اسے غالباً یہ خوش فہمی بھی تھی کہ میں اس کی لڑکیوں پر شدومد سے رال ٹپکا رہا ہوں اور اس کھوہ میں کچھ اچھا وقت گزارنے کا خواہشمند ہوں۔

سہ پہر تک نائیکہ اور دونوں لڑکیاں تندہی سے تیاری کرتی رہیں۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اگر صولت خاں نہ پہنچا تو وہ پکا خیلہ کیسے جائیں گی۔ کبیر شاہ کو بھی اس مقام کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا اور اس نے اپنی لاعلمی کا اعلان بھی کر دیا تھا تاہم نائیکہ بالکل مطمئن نظر آتی تھی۔ جیسے جانتی ہو کہ صولت خاں جہاں بھی ہے پانچ بجے سے پہلے پہلے یہاں پہنچ جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ تین ساڑھے تین بجے وہ خچر پر سوار کھوہ میں آ دھمکا۔ وہ رات بھر کا جاگا نظر آتا تھا۔ آنکھیں سرخ، بال منتشر اور گرد آلود۔ اس نے ثریا بائی کو بتایا کہ مقتول "بارہ چنار اسپتال" میں ہے۔ اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔

وہ بولا "ہم آنا نہیں چاہتا تھا لیکن آنا بھی ضروری تھا۔ اب تم کو پکا خیلہ چھوڑ کر واپس چلا جائے گا۔ ہمارا بیمار کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ تم تینوں صبح لشکر خاں کے کسی بندے کے ساتھ واپس آ جانا" دانستہ یا نادانستہ اس کے منہ سے لشکر خاں کا نام نکل گیا تھا۔

اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس جشن کا تعلق لشکر خاں وغیرہ سے ہے۔ ثریا بائی نے صولت خاں کو تیز نظروں سے گھورا پھر بولی۔ "بندے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دو بندے جو ہیں ہمارے ساتھ۔ ان کو ساتھ ہی لے چلتے ہیں۔ بدذوق میلہ دیکھ لیں گے یہ بھی" اس کا اشارہ میرے اور کبیر شاہ کی طرف تھا۔

صولت بولا۔ "جیسا تمہارا مرضی۔ بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ تم۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا تو راستے میں لگ جانا ہے۔"

صولت خاں کی آواز سن کر چھوٹی لڑکی چھم چھم کرتی پردے کی اوٹ سے نکلی اور ہمارے پاس آ گئی۔ وہ ایک دم پٹاخا نظر آ رہی تھی ..... بلکہ بم! جو ایک زبردست آواز سے پھٹ کر قرب و جوار کے ہر ذی روح کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ہر عضو جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "مجھے دیکھو ..... میں خوب صورت ہوں۔ میں جوان ہو گئی ہوں۔"

اس کے بدن پر جھلملاتا ریشمی لباس تھا۔ یہی لباس جو تہہ ہو کر بچھونوں پر پڑا ہوا بھی ہیجان خیز نظر آ رہا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ عورت سے بچھڑ کر لباس۔ اور لباس سے بچھڑ کر عورت کی خوب صورتی آدھی رہ جاتی ہے۔ اب دونوں کی پوری خوب صورتی میرے سامنے تھی اور میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس لڑکی کے جوبن کا پھول زرد کے مشت کی اس چلچلاتی "مردانہ دھوپ" میں بھی اتنا شگفتہ کیوں نظر آ رہا ہے۔ وہ مکمل سولہ سنگار کیے ہوئے تھی۔ ہونٹوں پر سرخی' گالوں پر غازہ' آنکھوں میں کاجل' کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے۔ سرخ پھولوں والا بینک کا جھلملاتا لبادہ اس کی نصف پنڈلیوں تک پہنچ رہا تھا۔ فی الحال اس نے جرسی پہن رکھی تھی لیکن میں جانتا تھا اس کے بازو شانوں تک عریاں ہیں اور گریبان چونکا دینے والی حد تک کشادہ ہے۔

وہ سراپا خوشبو میں بسی ہوئی تھی اور ناخنوں پر نیل پالش لگا کر اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے دوسری لڑکی بھی برآمد ہوئی۔ وہ بھی قریباً تیار تھی۔ اس میں "چھوٹی" جیسی بات تو نہیں تھی لیکن ضروری اسٹیپ سے وہ بھی لیس تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی' چھوٹی لڑکی ترانہ بالکل ہشاش بشاش تھی اور کسی طرح کا بوجھ اس کے ذہن پر محسوس نہیں ہو رہا تھا جبکہ نائیکہ اور بڑی لڑکی عندلیب کی کیفیت برعکس تھی۔ ان کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ اس تقریب میں بامر مجبوری شرکت کر رہی ہیں۔ کل رات میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے نائیکہ کی آواز بڑی دھیمی تھی اور وہ بار بار قریب سوئی ہوئی ترانہ کو دیکھ لیتی تھی۔ میں نے قیافہ لگایا تھا کہ جہاندیدہ نائیکہ نے چھوٹی لڑکی کو پریشانی سے بچانے کے لیے اردگرد کے حالات سے بے خبر رکھا ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ اسے کرن کی ناگہانی موت کے متعلق بھی نہ بتایا گیا ہو۔

نائیکہ ثریا بائی نے صولت خاں سے مشورہ کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا۔ "کیوں بھئی کاکا انسان' جاؤ گے ہمارے ساتھ؟"

میں نے کہا۔ "جانے میں کیا حرج ہے مگر ہم تو بن بلائے مہمان ہوں گے۔"

وہ بولی۔ "کوئی بن بلایا نہیں ہوتا۔ دانے دانے پر مُہر ہوتی ہے اور پھر تم کون سا سرکاری سروے پر نکلے ہوئے ہو۔ خرگوش کے پیچھے ہی تو خجل ہو رہے ہو ناں۔ تفریح پر نکلے ہوئے ہو۔ تفریح وہاں بھی ہو جائے گی۔ بس اتنا ہے کہ تم ساتھ ہو گے تو ہمیں راہ میں آسانی رہے گی۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جانا تو ہمیں تھا ہی لیکن میں نے اشتیاق ظاہر نہیں کیا اور نیم دلی کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔

کھوہ ایسے سنسان مقام پر تھی کہ کسی کے اس طرف آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کوئی آتا بھی تو اس پُراسرار تاریکی میں گھسنے کا حوصلہ نہ کرتا پھر بھی حفظ ماتقدم کے تحت ثریا بائی نے آہنی صندوق میں سے زیادہ قیمتی چیزیں نکال کر ایک بڑے موٹے کاغذ میں لپیٹیں اور پھر انہیں ایک تھیلے میں ڈال کر کھوہ سے باہر کسی مقام پر چھپا آئی۔ یقینی بات تھی کہ ان اشیا میں نقدی اور زیورات وغیرہ شامل ہوں گے۔ اس کام میں آدھ گھنٹا اور لگ گیا۔ صولت خاں اب بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا اور اس کی نگاہ بار بار اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔

شام ساڑھے پانچ بجے ہم کھوہ سے روانہ ہوئے اور اونچے نیچے راستوں پر چلتے شمال مشرق کی طرف بڑھنے لگے۔ عندلیب اور ترانہ نے چہروں سمیت اپنی تمام زیب و زینت بوسیدہ چادروں میں چھپا رکھی تھی۔ کم از کم اس وقت وہ مکمل شرعی پردے میں تھیں۔ وہ دونوں خچر پر سوار تھیں اور صولت خاں لگام تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ خچر کے عقب میں ثریا بائی اپنے بھاری کولہے مٹکاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے عقب میں' میں اور کبیر شاہ تھے۔ شکاری کتے ہمارے دائیں بائیں دوڑتے اور غراتے چلے جا رہے تھے۔

سورج غروب ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا جب ہم ایک تنگ و تیرہ نما راستے سے گزر کر کچے پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں میں آ گئے۔ یہاں میمانی کے پودے بڑی کثرت سے تھے۔ جھاڑ جھنکار بھی بہت نظر آ رہا تھا۔ صولت خاں کے قدموں میں ایک خاص قسم کی تیزی آ چکی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہم منزل پر پہنچنے والے ہیں' لیکن منزل کے آثار کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پکّا خیمہ کے نام سے تو ہم نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی بستی ہوگی مگر یہاں ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے جا کر مجھے درختوں کے عقب سے روشنی اُمڈتی محسوس ہوئی۔ یہ روشنی براہِ راست دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صرف آسمان پر سرخی سی پھیلی ہوئی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ٹیلوں کے عقب میں کوئی بڑا الاؤ بھڑک رہا ہے یا بہت سی مشعلیں جل رہی ہیں۔ ہم ایک پیچ دار راستے پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور پھر انسانی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑنے لگیں۔ کسی جگہ بہت سے

لوگ جمع تھے۔ کبھی کوئی شخص بلند آواز سے بولتا تھا تو ہوا کے دوش پر تیر کر یہ آواز دور تک پہنچتی تھی۔ اور پھر اچانک درختوں سے نکل کر دو افراد ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ لشکر خاں اور جمعہ خاں کے ساتھیوں میں سے تھے۔ کبیر شاہ کی گرم چادر ابھی تک میرے جسم پر تھی۔ میں نے بُکل مارنے کے انداز میں منہ سر لپیٹ رکھا تھا۔ لشکر خاں کے آدمیوں کو دیکھ کر میں نے چہرہ مزید ڈھانپ لیا۔ صولت خاں اور نائیکہ کو پہچان کر مسلح افراد نے ذرا راستہ چھوڑ دیا۔ ہم آگے بڑھ گئے سو پچاس گز آگے ایک بار پھر ہمیں روکا گیا۔ آخر ہم ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی ایک مسطح جگہ پر پہنچ گئے۔

یہاں جنگل میں منگل کا منظر تھا۔ قریباً دو سو مشعلیں ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں روشن تھیں۔ اسی دائرے کے مرکز میں تین بڑے الاؤ بھڑک رہے تھے۔ قریب ہی چھ بڑی دیگیں ایک قطار کی صورت میں رکھی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے بھی آگ جل رہی تھی۔ فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی مہک پھیل رہی تھی۔ مشعلوں کے دائرے میں ایک رخنہ سا تھا۔ یہ رخنہ ایک قدرتی سرنگ کا دہانہ تھا۔ سرنگ کی چھت کافی بلند تھی اور وہاں بھی لوگ گھوم پھر رہے تھے۔ دہانے سے باہر ہموار زمین پر دو بڑی بڑی دریاں بچھی تھیں اور ان پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ یہ اس محفل کا اسٹیج تھا۔ اسٹیج پر کلف دار پگڑیوں اور اُجلے لباسوں والے تین افراد کھڑے تھے اور مختلف ساز بجا بجا کر کوئی پشتو گیت گا رہے تھے۔ ان کے اردگرد جو بیس تیس افراد بیٹھے تھے وہ بڑی توجہ سے گیت سن رہے تھے اور "واہ وا" بھی کر رہے تھے۔

ہم مشعلوں کے دائرے میں پہنچے تو دو افراد نے ثریا بائی کو پہچان کر گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ دونوں لڑکیاں اب خچر سے اتر آئی تھیں۔ حاضرین مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ صولت خاں نے خچر کو لے جا کر ایک طرف تاریکی میں میمانی کے پیڑ سے باندھ دیا پھر وہ کبیر شاہ سے بولا کہ وہ بھی کتوں کو کہیں باندھ دے۔ کبیر شاہ کو کتوں سے جدا ہونا بالکل پسند نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ ہم نے کتوں کے منہ پر جالیاں چڑھا کر انہیں کچھ فاصلے پر ایک درخت سے باندھ دیا۔ اردگرد موجود افراد جتنی دلچسپی لڑکیوں میں ظاہر کر رہے تھے اتنی ہی کتوں میں بھی ظاہر کر رہے تھے۔ ان تماشائیوں میں' میں نے جبار خاں کو بھی دیکھا۔ اس کی بغل میں بیساکھی تھی۔ یہ شخص میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ بہرحال وہ مجھے کبیر شاہ کے عقب میں دیکھ نہیں سکا۔

ہمارا استقبال کرنے والے دونوں افراد ہمیں لے کر ایک خیمے میں آ گئے۔ یہ خیمہ چند دوسرے خیموں کے ساتھ سرنگ نما غار کے قریب ہی لگایا گیا تھا۔ خیمے میں دری بچھی تھی۔ انگیٹھی دہک رہی تھی اور ایک طرف گانے بجانے کے چند آلات پڑے تھے۔ ظاہر تھا کہ یہ خیمہ پہلے سے اہلِ فن یا کہہ لیجیے کہ "فن کار خواتین" کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ خیمے کی نرم گرم فضا ہمارے ٹھٹھرے ہوئے جسموں کو بہت بھلی لگی۔ لڑکیوں نے بوسیدہ چادریں اتار پھینکیں اور انگیٹھی پر جھک کر بیٹھ گئیں۔ خیمے میں پہنچتے ہی اچانک صولت خاں کا لب و لہجہ بدل گیا۔ اس نے گمبھیر لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تم یہ رائفل اتار کر ہم کو دے دو۔" اس کا اشارہ میرے کندھے سے لٹکتی ہوئی تھری ناٹ تھری کی طرف تھا۔ یہ منگول کی رائفل تھی۔ صولت خاں یا نائیکہ مجھ سے کسی بھی وقت مانگ سکتے تھے لیکن اس خیمے میں پہنچ کر یہ رائفل جس انداز میں مانگی گئی تھی وہ چونکا دینے والا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بات شات کچھ نہیں۔" اس دفعہ ثریا بائی بولی۔ "تم یہ رائفل صولت خاں کو پکڑا دو۔" صولت کی طرح ثریا بائی کا لہجہ بھی اجنبی تھا۔

کبیر شاہ کا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ صرف میری وجہ سے چپ تھا اور میری وجہ سے اس لیے چپ تھا کہ میں یہاں کے حالات کے بارے میں اس سے زیادہ جان چکا تھا۔ ورنہ وہ یقیناً ثریا بائی اور صولت خاں وغیرہ سے پھڈا ڈال لیتا۔ میں نے کندھے سے رائفل اتاری اور صولت خاں کے حوالے کر دی۔ صولت اب اپنی رائفل ہاتھ میں لے چکا تھا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اگر میں نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو صورتِ حال نازک ہو جائے گی۔

"ثریا بائی' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"رہی جو کچھ ہونا چاہیے۔" اس نے ترت جواب دیا۔ پھر ہمیں یہاں لانے والے مسلح افراد کی طرف مڑی اور بولی۔ "خاں جی! یہ دونوں مشکوک بندے ہیں۔ کہتے ہیں شکار کھیلنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے یہ پنجابی اپنا نام احسان الٰہی بتا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ پولیس کا بندہ ہے۔ چوٹیں وغیرہ بھی آئی ہوئی ہیں اسے۔" بات ختم کرتے کرتے اس نے ہاتھ بڑھایا اور جھٹکے سے گرم چادر میرے سر سے کھینچ لی۔

میں موقع پر موجود دونوں مقامی افراد کے لیے اجنبی تھا۔ پھر بھی وہ تیز نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ صولت

خان نے کہا۔ "چلو بچہ جی سردار کے پاس۔ تمہارا شناخت پریڈ کرایا جائے گا۔" وہ اب رائفل ہم پر باقاعدہ سونت چکا تھا۔

ثریا بائی نے مقامی افراد سے پوچھا۔ "سردار کہاں ہے؟"

ان میں سے ایک بولا۔ "ادھر پاس ہی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو' ام ابھی پوچھ کر آتا ہے۔"

وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ صولت خاں اور دوسرا شخص بڑے تیز لہجے میں پشتو بولنے لگے۔ یقیناً موضوع ہم ہی تھے۔ ثریا بائی کے "عما خرانٹ" ہونے کا اندازہ تو مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا' اب اس کا بیّن ثبوت بھی مل گیا تھا۔ ثریا بائی کے علاوہ اب بڑی لڑکی بھی ہمیں خشمگیں نظروں سے گھور رہی تھی۔ ہاں چھوٹی لڑکی کی آنکھوں میں حیرانی اور سراسیمگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ دیگر معاملات کی طرح ثریا بائی نے اسے اس معاملے میں بھی الگ تھلگ رکھا تھا۔ ثریا بائی کا رویہ اس کے ساتھ وہی تھا جو بڑوں کا نا سمجھ بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ثریا بائی کا یہ عجب دوغلا پن تھا۔ ایک طرف وہ اسے بچی سمجھ رہی تھی اور دوسری طرف سجا بنا کر ایسی نگاہوں کے سامنے لے آئی تھی جن کی تپش سے نوزائیدہ کلی بھی پانچ منٹ میں پھول بن جائے اور اگلے پانچ منٹ میں بکھر جائے۔ نجانے کیوں مجھے اس ناداں لم ڈھینگ سی لڑکی پر رحم آیا۔ دو تین سال بعد اس کا شباب جوبن پر آجاتا تو وہ ایک لمبے تڑنگے مرد کے ساتھ خوب صورت جوڑا بنا سکتی تھی۔ ہنستے مسکراتے صحت مند بچے پیدا کر سکتی تھی۔ ایک خوش و خرم اور بھرپور زندگی گزار سکتی تھی لیکن یہ خرانٹ ثریا بائی اسے ان خونخوار پہاڑوں میں لے آئی تھی جہاں عیسیٰ جان جیسے وحشی بستے تھے جن کے بستر بوس پر مسل جانے والی عورت خود اپنے لیے ناقابل شناخت ہو جاتی تھی۔ میں ایک بار پھر یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ عیسیٰ جان کے "زیر سایہ" رہنے کے باوجود یہ لڑکی ابھی تک تر و تازہ اور زندگی سے بھرپور کیوں نظر آتی ہے۔

خیمے سے باہر جانے والا شخص دو تین منٹ میں ہی واپس آگیا۔ اس نے صولت خاں سے جو "پشتو ماری" اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ ہمیں سردار کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ رائفل بالکل تیار حالت میں صولت خاں کے ہاتھ میں تھی۔ تاہم باہر نکلنے سے پہلے اس نے اسے چادر میں چھپا لیا۔ ثریا بائی بھی ساتھ تھی۔ ہم آگے پیچھے خیمے سے باہر نکلے۔ اسٹیج کے قریب رونق میں کچھ اور اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے چند افراد کو دیکھا جو تین چار بڑے بڑے پتھر لڑھکا کر اسٹیج کے قریب لا رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ پتھر کسی کھیل تماشے میں استعمال ہوں گے۔ بائیں جانب الاؤ کے قریب رکھی دیگوں میں' ایک شخص سالم دُنبے ڈال رہا تھا۔ دیگ میں سالم دُنبے پکائے جانے کا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہم شعلوں کے قریب سے ہو کر سرنگ کے دہانے میں داخل ہوئے۔

اس سرنگ میں بھی چربی کے تیل کی مشعلیں جل رہی تھیں۔ ہلکا سا دھواں سرنگ میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سرنگ چھوٹی بڑی سرنگوں اور گھپاؤں کا ایک سلسلہ تھی۔ بڑی سرنگ کے دونوں اطراف کئی دہانے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے کچھ دہانوں میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔ ہم ایسے ہی دہانے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ یہاں گیس لیمپ کی روشنی تھی۔ فرش پر مزری کے خشک پتے بچھے ہوئے تھے اور ان پر دس پندرہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان افراد میں لشکر خاں سب سے نمایاں تھا۔ وہ آج صاف ستھرے لباس میں تھا اور اس نے باقاعدہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ صولت خاں نے مجھے دھکیل کر آگے کیا۔ لشکر خاں کی نگاہ مجھ پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ پھر اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے جذبات نے یلغار کی اور وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوئے بیدار! تم یہاں؟" اس نے کہا اور لپک کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ میں نے چہرہ پھیر کر ثریا بائی کو دیکھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ وہ بونقوں کی طرح کبھی مجھے اور کبھی صولت خاں کو دیکھ رہی تھی۔ صولت خاں کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اگلے پانچ دس منٹ ثریا بائی اور صولت خاں کے لیے بڑے انکشاف انگیز ثابت ہوئے۔ وہ جسے مجرم بنا کر لائے تھے وہ محرم نکلا تھا اور یہ وہی محرم تھا جو ثریا بائی کے پشت پناہ عیسیٰ جان کا "تختہ اُلٹانے" میں پیش پیش رہا تھا۔ لشکر خاں ہم پر صدقے واری جا رہا تھا۔ اس نے گمان بھی نہ کیا ہو گا کہ اتنی جلدی مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔ ابھی چند روز پہلے اسے الوداع کہہ کر ہم پارہ چنار روانہ ہوئے تھے۔ جب میں نے کبیر شاہ کا تعارف کراتے ہوئے اسے بتایا کہ یہ وہی پیر صاحب ہیں جن کی تلاش میں ہم نے دو روز تک مشرق کی خاک چھانی تھی تو وہ اٹھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

دیگر شناسا افراد کے علاوہ جمعہ خاں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ جمعہ خاں کے بھائی کی لاش ہم نے عیسیٰ جان

محی الدین نواب کا

نیا مجموعہ

شعلوں کی سیج

قیمت -/۱۳۵

ڈاک خرچ -/۲۰

قارئین کے وسیع حلقے میں محی الدین نواب کا نام جانا پہچانا ہے
محی الدین نواب نے بے شمار معاشرتی اور سماجی کہانیاں لکھی ہیں

شعلوں کی سیج

ایک ایسی کہانی جس میں محی الدین نواب نے معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہے۔

پبلشرز
اِرقاعی پبلشرز اینڈ ٹیکسیلرز
فون ۷۲۲۲۸۵۳
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

ملنے کا پتہ
علی میاں پبلی کیشنز
فون ۷۲۴۷۴۱۴
۲۰- عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ڈیرے پر اس حالت میں دیکھی تھی کہ گیڈر اسے نوچ رہے تھے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ابھی تک اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گرمجوشی سے ملا اور یہ محسوس کرکے کہ ہم تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتے ہیں اس نے دیگر حاضرین کو کمرے سے روانہ کردیا۔ روانہ ہونے والوں میں ثریا بائی اور صولت وغیرہ بھی تھے۔ وہ کچھ شرمندہ سے نظر آتے تھے۔ جاتے جاتے صولت خان مجھے تھری ناٹ تھری کی رائفل بھی واپس کرگیا۔ (مجھ پر شک کرنے کے سلسلے میں لشکر خان ثریا بائی سے بازپرس کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کردیا)

گرما گرم قہوے کے گھونٹ لیتے ہوئے میں نے لشکر خان کو مختصراً اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ لشکر خان توجہ اور دلچسپی سے سنتا رہا پھر اس نے اپنے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ یہ تقریب پُر مسرت کس سلسلے میں ہورہی ہے۔ ایجنسی کی طرف سے لشکر خان اور اس کے قریباً سو ساتھیوں کو عام معافی دے دی گئی تھی۔ چند روز پہلے ایجنسی کے دو اعلیٰ افسروں نے خود لشکر خان سے رابطہ کیا تھا اور تمام تفصیلات طے کی تھیں۔ لشکر خان اور اس کے ساتھیوں نے ممنوعہ بور کا تمام اسلحہ حکام کے حوالے کردیا تھا۔ اس کے علاوہ دو ایسے تحصیلداروں کو بھی چھوڑ دیا تھا جو پچھلے کچھ عرصے سے ان کے قبضے میں تھے۔ لشکر خان نے مجھے وہ دستاویزات بھی دکھائیں جو اس سلسلے میں لکھی گئی تھیں اور جن پر پولیٹیکل ایجنٹ سمیت کئی اعلیٰ عہدیداروں کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

لشکر خان بولا۔ "برادر! ام تو جشن منانے کا قائل ہی نہیں ہے لیکن ساتھیوں کے کہنے کا خیال کرنا پڑا ام کو۔ یہ سب چاہتا تھا کہ ایک دوسرے سے دور چلے جانے سے پہلے اور اپنے اپنے کام پر لگنے سے پہلے ایک بار کھل کر خوشی منالیں۔ وہ جبار خان بڑا شوقین بندہ ہے۔ اس نے کچھ گانے بجانے کا انتظام بھی کرلیا۔ یہ امارا جمعہ خان ایک کرتب دکھانے والے سینڈو کو لے آیا۔ کھانے کا انتظام پہلے ستر اسی آدمی کا تھا پھر بڑھتے بڑھتے ڈیڑھ سو آدمیوں کا ہوگیا ہے۔ خیر کھانے پینے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ امارا بس چلے تو ہر روز امارے دسترخوان پر اتنا لوگ جمع ہوجایا کرے۔"

میں نے پوچھا۔ "خیر اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

وہ بولا۔ "برادر! ارادہ تو بالکل نیک ہے اور امارا ہی نہیں امارے سب ساتھیوں کا نیک ہے۔ اب ایک نئی زندگی شروع کرے گا ام اور لوگوں کو بتادے گا کہ برا تو نبی بھی نیکی کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ اچھا بن سکتا ہے اور اچھا رہ سکتا ہے۔ یہ جمعہ خان گاؤں میں امارا پڑوسی ہے۔ اس کا اور اما کھیتی بھی ساتھ ساتھ ہے۔ امارے بعد جمعہ خان کا چاچا زمین پر پوست کاشت کرنے لگا تھا۔ ام اب انشاءاللہ سا پوست کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکے گا اور ادھر گندم، چاول ا مکئی اگائے گا۔ ام نے سارا پروگرام فٹ کرلیا ہے۔ جمعہ خا اور ام مل کر کام کرے گا۔"

میری نگاہ کمرے کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک عور پر پڑی۔ میں پہچان گیا۔ یہ عیسیٰ جان کے گروہ میں شامل و پختہ عمر عورت تھی جس نے سفر کے دوران ایک بچے کو جنم تھا اور ہم نے ازراہِ مذاق اس بچے کا نام بشارت رکھ دیا تھ بعد میں یہ نام درست ثابت ہوا تھا اور ہم جو کئی پہرے بھٹک رہے تھے راستے کا سراغ پاگئے تھے۔ مجھے عورت کی طرا دیکھتے پاکر لشکر خان نے کہا۔ "ہاں یہ وہی عورت ہے جو ا ساتھیوں سمیت لیوی کی قید میں گیا تھا۔ سمجھوتا ہونے بعد لیوی والوں نے انہیں بھی چھوڑ دیا ہے۔ یہ عورت ہنگ رہنے والا ہے۔ وہاں سے اغوا ہوکر آیا تھا لیکن اب ا رشتے دار اسے قبول نہیں کرے گا۔ فوراً گولی مار دے گ اس کے علاوہ تین عورتیں اور بھی ہے۔ ام کوشش کررہا کہ امارے ہی ساتھیوں میں سے کچھ لوگ ان سے شادی لے تاکہ یہ بھی عزت کی زندگی گزار سکے۔ یا کم از کم زندگی کے راستے پر قدم ہی رکھ سکے۔"

گفتگو میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ساڑھے سات بجے یہاں پہنچے تھے اور اب دس بجنے وا تھے۔ ایک شخص اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور اس پشتو میں لشکر خان کو کوئی اطلاع دی۔ یہ اطلاع کھانے بارے میں تھی۔ کھانا تیار ہوچکا تھا اور اب دسترخوان پر خان کا انتظار کیا جارہا تھا۔ ہم سرنگ سے نکل کر باہر آ مشعلوں کے دائرے میں منظر بدلا ہوا تھا۔ ایک ہموار جگ مرزئی کے جھنگ پتے اور گھاس وغیرہ بچھی ہوئی تھی۔ ا چادریں بچھائی گئی تھیں اور چادروں کے گرد لوگ ٹولیوں صورت میں بیٹھے تھے۔ بڑی بڑی تھالیوں میں خاص قسم چاول رکھے تھے۔ یہ چاول موٹے تھے اور ان میں دال سامنے ڈالے گئے تھے۔ دیگ میں دم دیے ہوئے ثابت گوشت بھی جگہ جگہ رکابیوں میں پڑا ہوا تھا پھر وہ بکرے تھے جنہیں سالم کا سالم آگ پر بھونا جاتا ہے۔ دور سے یوں لگتا تھا کہ پورا بکرا ہے۔ تاکہ ہوش و حواس دسترخوا کھڑا ہے۔ صرف گردن کے آگے سر کی کمی محسوس تھی۔ بھنے اور دم دیے ہوئے گوشت کے ساتھ دہی کی

لسی۔ اس علاقے میں لسی کا اہتمام عجیب لگتا تھا بہرحال یہ یہاں کا رواج تھا۔ بلوچستان میں بھی میں نے گوشت کے ساتھ لسی کا اہتمام دیکھا تھا۔

ہم ایک خالی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ بھنے ہوئے گوشت اور ڈیڑھ انچ موٹی خمیری روٹی کی مہک نتھنوں میں گھس کر معدے میں تہلکہ مچانے لگی۔ جونہی لشکر خان نے پہلا نوالہ اٹھایا، دوسرے لوگ بھی کھانے میں مصروف ہوگئے۔ مجھے چاول سب سے لذیذ لگے۔ یہ ایک طرح کی کھچڑی تھی۔ ایک مرتبہ پہلے میں کبیر شاہ کے ہاں یہ کھچڑی کھاچکا تھا لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ لشکر خان نے بتایا کہ اسے "میوالہ وریژے" کہتے ہیں اور باہر سے آنے والے معزز مہمان مقامی میزبانوں سے خاص طور پر اس کی فرمائش کرتے ہیں۔

"میوالہ وریژے" کھاتے ہوئے اور لشکر خان کے خوش باش ساتھیوں کے قہقہے سنتے ہوئے نجانے کیوں ایک بار پھر میرے ذہن میں وہی پراسرار اندیشہ رینگنے لگا جو پچھلے کئی دنوں سے رہ رہ کر میری دھڑکنوں کو زیروبم کررہا تھا۔ میں اس اندیشے کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا اور نہ اس کی کوئی واضح صورت میرے ذہن میں متعین تھی۔ بس ایک احساس سا تھا کہ کوئی سانحہ رونما ہونے والا ہے۔ کوئی قدرتی حادثہ، کوئی ناگہانی آفت، کوئی گمبھیر سازش۔ چھٹی حس ایک پرچھائیں کو دریافت کرتی تھی اور پھر یہ پرچھائیں پھیل کر گھٹاٹوپ تاریکی بن جاتی تھی۔ کسی وقت تو یہ گمان ہونے لگتا تھا کہ کہیں میں بھی تو اس کہانی کے توہم کا شکار نہیں ہوگیا جو سلطان نامی نوجوان اور ان ویران پہاڑیوں کے حوالے سے کہی جاتی ہے۔ اس کہانی میں سیاہ پوش نامہربان عورتوں کا ذکر تھا اور ان لوگوں کی بدقسمتی کے فسانے تھے جو چٹیل چٹانوں پر بدروحوں کا شکار ہوئے۔ طرفہ تماشا تھا۔ مجھ جیسا شخص جس نے زندگی کو ہمیشہ ٹھوس حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا تھا، اس ماحول میں آکر کسی وقت ڈھیلے ڈھالے انداز میں سوچنے لگتا تھا۔

سب نے سیر ہوکر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد خوشبودار قہوے اور سبز چائے کا دور چلا۔ ٹھٹھرے ہوئے موسم میں کھلے آسمان کے نیچے آگ کے گرد بیٹھ کر گرم سیال کی چسکیاں لینا اور خوب صورت لوک دھنیں سننا ایک یادگار تجربہ تھا۔ کبیر شاہ بھی زوئے مشت میں کام آجانے والے چیتے کتوں کا غم بھول کر ان مصروفیات میں دلچسپی لینے لگا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔ اس محفل میں رقص کا انتظام تو تھا لیکن "سرور" کا اہتمام کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو دسترخوانوں کے علاوہ مجھے کہیں ساغر و مینا کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ یہ سب وہی لوگ تھے جو چند ہفتے پہلے تک اپنے عمل سے خود کو اشرف المخلوقات کا الٹ ثابت کررہے تھے۔ غلیظ باطن، غلیظ ظاہر، دماغ میں انگارے، آنکھوں میں شعلے اور پاؤں میں بگولے بندھے ہوئے۔ آج وہ ایک نئے سفر کے آغاز پر بہت بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کم از کم ان کے ظاہر تو بہت صاف ستھرے دکھائی دے رہے تھے اور کہتے ہیں کہ ظاہر انسان کے باطن کا عکس ہوتا ہے۔

چند لوک گیتوں کے بعد نوجوانوں کی ایک ٹولی نے زبردست خٹک ناچ پیش کیا۔ ان کے پاس سچ مچ کی تلواریں تھیں اور وہ ان تلواروں کو بجلی کی طرح حرکت دے رہے تھے۔ خٹک ناچ کے بعد لمبے بالوں والا ایک بازی بلند رستم کا شخص میدان میں آگیا۔ اس نے چمکیلے بٹنوں والی صدری چپلون پہن رکھی تھی۔ بالائی دھڑ عریاں تھا اور آگ کی روشنی میں دہکا ہوا انگارا دکھائی دیتا تھا۔ یہی وہ سینڈو تھا جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے لشکر خان نے کیا تھا۔ سینڈو کے میدان میں آتے ہی لوگ سمٹ کر اسٹیج کے قریب پہنچ گئے۔ میں، لشکر خان اور کبیر شاہ بھی اسٹیج کے قریب بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئے۔ سینڈو نے سب سے پہلے تو حلق میں تلوار اتارنے کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کے ساتھ لوہے کے دو تنگ کڑوں میں سے گزر گیا۔ تب اس نے ایک وزنی پتھر اٹھانے کا مظاہرہ کیا۔ پتھر کو سر سے بلند کرنے کے بعد اس نے ہجوم میں موجود نوجوانوں کو چیلنج کیا کہ کوئی اس پتھر کو اٹھائے۔ تین نوجوان میدان میں آگئے۔ ان میں سے دو تو نہ اٹھا سکے لیکن تیسرا کامیاب رہا۔ سینڈو نے اب اس سے ڈیڑھ گنا بڑا پتھر اٹھاکر سر سے بلند کردیا۔ نوجوان نے یہ پتھر اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ ایک طرح سے وہ ہجوم میں سب سے زیادہ صحت مند نوجوان تھا۔ جب اس نے ہار مان لی تو سینڈو نے دوبارہ پتھر اٹھاکر دکھایا لیکن اس مرتبہ کمال کی بات یہ تھی کہ اس نے صرف ایک ہاتھ سے یہ کام کیا۔ تماشائیوں نے بے تحاشا داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ بعد ازاں سینڈو نے کراٹے کے کھلاڑیوں کی طرح ہاتھ اور پاؤں کی ضربات سے لکڑی اور چونے وغیرہ کی مختلف اشیا توڑیں۔ سینڈو کا آخری آئیٹم تین تین گھوڑوں کو بازوؤں کے زور سے روکنا تھا۔ تین گھوڑے ایک طرف تھے تین دوسری طرف۔ وہ رسوں سے بندھے ہوئے دو مخالف سمتوں میں زور لگا رہے تھے اور سینڈو ان پر قابو پائے ہوئے تھا۔ یہ قوت کے مظاہرے کے بجائے ایک اسٹنٹ تھا اور

میں اس کی تکنیک اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ بہرحال اس نظارے کو دیکھ کر میری نگاہ میں لنگر خاں کی موت کے خونی مناظر اُجاگر ہوگئے۔ گھوڑوں کا مخالف سمت میں بھاگ کر لنگر خاں کو چیر دینا اور اس کے جسم کے چرے ہوئے حصوں کا پتھریلی زمین پر گھسٹنا۔۔۔ خدا کی پناہ! ان مناظر کی یاد بھی کربناک تھی۔

سینڈو کے جانے کے بعد زور آزمائی اور نشانہ بازی کے کچھ اور مقابلے ہوئے پھر رقص و نغمہ کا پروگرام شروع ہوگیا۔ میں نے سابقہ "آکوس" کے اس گروہ میں عندلیب اور ترانہ نامی بجلیوں کو چمکتے دیکھا۔ ترانہ کا رقص خاص طور پر ہوش رُبا تھا۔ رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے اور ترانہ بڑی دھواں دھار قسم کی انقلابی شاعری کر رہی تھی۔ اس کے رقص میں خوب صورتی کم اور ہیجان خیزی زیادہ تھی۔ جیسے اپنے نوخیز جسم کی چکاچوند سے ہر آنکھ کو بے نور کردینا چاہتی ہو۔ تماشائی اپنا اپنا کلیجا تھامے سکتے کی حالت میں بیٹھے تھے۔ رقص و نغمہ کا یہ پروگرام خاصا طویل تھا۔ بیچ بیچ میں وقفے بھی ہوتے رہے۔ ایک ایسے ہی مختصر وقفے کے دوران نائیکہ ثریا بائی میرے پاس پہنچی اور لجاجت سے بولی۔

"احسان صاحب! ایک بات کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

لنگر خاں اس وقت اٹھ کر دوسرے مہمانوں کی طرف گیا ہوا تھا۔ خود میرا دل بھی ذرا ٹانگیں کھولنے کو چاہ رہا تھا۔ میں اٹھا اور ثریا بائی کے ساتھ تماشائیوں کے عقب میں آگیا۔ یہاں ایک چٹائی سائبان تلے مرونڈی کے خشک پتے بچھے ہوئے تھے۔ یہ جگہ مشعلوں کے دائرے سے باہر تھی اس لیے نیم تاریک تھی۔ پاس ہی کبیر شاہ کے چاروں کتے بندھے ہوئے تھے۔ ان کتوں کے سوا قرب و جوار میں کوئی شخص نہیں تھا۔

ہم پتوں کے بچھونے پر بیٹھ گئے تو ثریا بائی بولی۔ "میں بڑی شرمندہ ہوں احسان الٰہی۔ یہ علاقہ ہی ایسا ہے کہ یہاں ہر بندے کو بڑا ادا کر رہنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے انجان لوگوں پر اعتبار کرنا تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ ہر کوئی کسی کے نشانے پر ہے اور اس نے بھی کسی کو نشانے پر لے رکھا ہے۔ معافی کی گنجائش تو ہے ہی نہیں یہاں۔ میرا خیال ہے تم بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہوگے۔"

میں نے کہا۔ "ثریا بائی! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ تمہیں وہی کرنا چاہیے تھا جو تم نے کیا۔ شاید تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔۔۔ لیکن تمہیں شک کس بات پر ہوا تھا کہ ہم وہ نہیں جو تمہیں بتا رہے ہیں؟"

وہ بولی۔ "دو باتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ تم پنجابی تھے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ کہ تمہارے ساتھی کبیر شاہ کے پاس شکاری کتے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پچھلے دنوں عیسٰی جان یا لنگر خاں کے بندے کسی شکاری کی تلاش میں در در پھرتے رہے ہیں۔ مجھے اس معاملے کی زیادہ خبر نہیں تھی لیکن اتنا پتا تھا کہ اس بندے کا ملنا ان کے لیے بہت ضروری ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے ٹھیک بندوں پر ہاتھ ڈالا ہے لیکن انہیں پہنچایا غلط بندے کے پاس ہے۔ لنگر خاں کو نہیں ہماری ضرورت عیسٰی جان کو تھی کیونکہ عیسٰی جان کے ساتھ جو بھی بُرا بھلا ہوا ہے اس میں کافی سے زیادہ ہاتھ ہمارا ہے۔"

ثریا بائی نے ٹھنڈی سانس بھری اور پنجابی کی کہاوت دُہراتے ہوئے بولی۔ "موسیٰ ڈریا موت کولوں تے موت اگے کھڑی۔ بندہ جس بات سے بچنا چاہے وہی ہوتی ہے۔ میں کمزور عورت ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ کسی سے دشمنی مول لے سکوں۔ اس کوشش میں ہوں کہ عیسٰی جان یا لنگر خاں میں سے کسی سے نہ بگڑے۔ بس میں نے تو اب یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ یہاں نہیں رہوں گی۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں، سانڈوں کی لڑائی میں اُلّو خواہ مخواہ پھڑک جاتے ہیں۔ اب یہی ناچ گانے کا پروگرام لے لو۔ اگر نہ آتی تو لنگر خاں آنکھیں لال کرتا۔ اب آگئی ہوں تو ملک عیسٰی سے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ تو ہے بھی بڑا زہریلا۔ ذرا سی بات پر بندہ پار کردیتا ہے۔ پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہو تم لوگ کہ اس سے ٹکر لے رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "مٹی تو تمہاری بھی بڑی سخت معلوم ہوتی ہے۔ ڈیڑھ سال تم نے عیسٰی جان کے ساتھ گزارا ہے۔ کیسے نباہ کرتی رہی ہو اس سے۔ میں نے تو سنا ہے وہ چار مہینے میں عورت کو گنڈیری کی طرح چوس کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیتا ہے پھر یہ تمہاری "بچیاں" کیسے بچی رہ گئیں؟"

وہ سگریٹ سلگا کر بولی۔ "بس سمجھ لو کہ قسمت اچھی تھی میری۔ مجھ سے ملتے ہی اس نے ترانہ پر آنکھ رکھ لی تھی۔ ترانہ اب مشکل سے سولہ سال کی ہوئی ہے۔ اندازہ لگالو کہ ڈیڑھ برس پہلے کتنی عمر تھی اس کی۔ عیسٰی جان نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو سنبھال کر رکھو۔ ایک ڈیڑھ سال بعد میں اس کی نتھ اُتروائی دوں گا۔۔۔ (مطلب یہ کہ رکھیل بناؤں گا) میں نے ہامی بھرلی۔ ہامی بھرنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ مجھے

یہاں رہنا تھا اور رہنے کے لیے عیسٰی جان کی رضامندی اتنی ہی ضروری تھی جتنی زندہ رہنے کے لیے روٹی کی ہوتی ہے۔۔۔ عیسٰی جان کی اجازت مل گئی تو میں آزادی سے کام کرنے لگی۔"

وہ بڑے کھلے ڈُلے انداز میں بات کررہی تھی اور درمیان میں موٹی موٹی گالیاں بھی بکتی جاتی تھی۔ ایک پیشہ ور عورت کی خصوصیات اس کے تو رگ و پے میں بس چکی تھیں۔ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد اس نے بڑے اسٹائل سے آلتی پالتی ماری اور سگریٹ کے گہرے کش لیتے ہوئے بولی "تم نے بھی سرکاری سانڈ دیکھا ہے۔ یہ سانڈ ہر سانجھے علاقے میں آزادی سے گھومتا پھرتا ہے۔ جس کھیت میں چاہے گھس جاتا ہے۔ جس اناج پر چاہے منہ مار لیتا ہے۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اسے روکے۔ ڈنڈا سوٹا تو دور کی بات ہے کوئی اسے انگلی تک نہیں لگاتا۔ کھا کھا کے خوب صحت مند اور چکیلا ہوجاتا ہے وہ۔۔۔ ترانہ نے بھی پچھلا ڈیڑھ برس روہی کے دشت کے اس ویرانے میں سرکاری سانڈ کی طرح گزارا ہے۔ ایسی جوان جہان اور اچھی شکل کی لڑکی تو شہری علاقے میں بھی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتی اور یہ یہاں درختوں میں کدکڑے لگاتی پھرتی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک شکاری رہتا ہے یہاں لیکن وہ سب اسے دھی بہن سمجھنے پر مجبور تھے۔ حرامزادوں کے منہ سے رالیں ٹپکتی تھیں لیکن نظر سجدے میں پڑی رہتی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے پاس سے بھی گزرے۔"

میں نے کہا۔ "گویا یہ لڑکی تمہارے پاس عیسٰی جان کی امانت تھی۔" نائیکہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور نیا سگریٹ سلگانے میں مصروف رہی۔ یہ خاموشی اثبات کی ہم معنی تھی۔ میں نے کہا "لیکن کل رات تو تم نے کسی ایسی پابندی کا ذکر نہیں کیا تھا؟"

وہ اپنی پاٹ دار آواز میں بولی۔ "تم نے پوچھا تھا؟"

"اس کا مطلب ہے میں عیسٰی جان کی امانت میں خیانت کرنے کی کوشش کرتا تو تم میرا تیا پانچا کردیتیں۔"

وہ بولی۔ "ہاں، ایسا بھی ہوسکتا تھا۔ کم از کم ترانہ پر تو میں تمہارا سایہ بھی نہ پڑنے دیتی۔ ویسے مجھے یقین تھا اس طرح کی نوبت نہیں آئے گی۔ پچھلے بیس برسوں میں، میں نے کچھ اور سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو لیکن مردوں کو پہچاننا ضرور سیکھ لیا ہے۔ میری اب بھی یہی رائے ہے کہ تم دونوں بڑے بیبے بندے ہو۔"

میں نے کہا۔ "چلو ہم تو بیبے اور بھلے مانس ہوئے لیکن یہ سب کے سب جو تمہاری بچیوں کو دیکھ رہے ہیں، بیبے اور بھلے مانس نہیں ہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم یہاں سے ترانہ کو بحفاظت واپس لے جاسکو گی۔"

میں نے اس کے دل کا چور پکڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ "امید پر دنیا قائم ہے اور مجھے امید ہے کہ یہاں مجھ سے کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔"

اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کہیں قریب ہی درختوں سے کتے کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ قرب و جوار میں آوارہ کتوں کا پایا جانا ہرگز تعجب خیز نہیں تھا۔ تعجب خیز وہ آواز تھی جو کتے نے نکالی تھی۔ میں اس میدان کا پُرانا کھلاڑی تھا اور ان تمام آوازوں سے آگاہ تھا جو مار دھاڑ کرنے والے لوگ رات کی تاریکی اور دن کے اُجالے میں استعمال کرتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آواز کسی جانور کے نہیں انسان کے حلق سے نکلی ہے اور کسی دوسرے شخص کو متوجہ کرنے کے لیے نکالی گئی ہے۔ بہت مدھم سی آواز تھی یہ اور اسٹیج پر ہونے والے ڈھول ڈھمکے کی وجہ سے کچھ اور بھی مدھم سنائی دی تھی۔ تاہم اس مدھم آواز نے مجھے شک میں ڈال دیا اور میں ثریا بائی سے "ایک منٹ" کی اجازت لے کر درختوں کی طرف بڑھا۔ کبیر شاہ کے کتوں کے پاس سے گزرا تو وہ بھی کچھ بے چین نظر آئے۔ روشن مشعلوں کے دائرے سے باہر جنگل تاریک تھا۔ میں پندرہ بیس قدم آگے گیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ تھری ناٹ تھری میرے ہاتھ میں تھی۔ پھلاہی اور بیہانی کے گھنے پیڑوں کے درمیان کوئی آواز یا حرکت محسوس نہیں ہوئی۔ اسٹیج پر غالباً عندلیب نے اپنی کھنکتی آواز میں ایک اردو فلمی گانے کی تان بلند کی۔۔۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔۔۔ اے میرے حسین خوابوں کے مہمان خدا حافظ۔ تماشائیوں نے پُرجوش تالیاں بجا کر اس گانے کو خوش آمدید کہا۔ پھر ایک دم ساز بج اٹھے اور گانے کے ساتھ ساتھ گھونگھروؤں کی چھما چھم سنائی دینے لگی۔۔۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔۔۔ قربان خدا حافظ۔

میں گہری تاریکی میں دو تین قدم اور آگے بڑھا۔ ایک دم ایک کوتاہ قد پھلاہی کے پیچھے سے کوئی سایہ برآمد ہوا اور اندھا دھند بھاگتا ہوا گھنے درختوں کی طرف بڑھا۔ وہ میرے بہت ہی قریب سے نکلا تھا۔ بمشکل پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا ہمارے درمیان۔ ایک ساعت ضائع کیے بغیر میں اس کے پیچھے لپکا۔ تاریکی میں انجان راستے پر بھاگنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور راستہ بھی کہاں تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی ناہموار زمین تھی جہاں بھاگتے ہوئے کسی بھی وقت کسی تناور درخت سے ٹکرانے کا خطرہ موجود تھا۔ میں کوئی ایک

فرلانگ تک اسی طرح اس سائے کے پیچھے بھاگا۔ منہ خشک ہونے سے زبان پر عجیب سا ذائقہ پھیل رہا تھا۔ میرے اور بھاگنے والے کے درمیان اندازاً پندرہ قدم کا فاصلہ تھا اور میں نے یہ فاصلہ بڑھنے نہیں دیا تھا۔

اچانک وہ شخص رُک گیا۔ میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی تنومند "سینڈو" تھا جو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے اسٹیج پر جسمانی کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ ابھی تک سرخ پتلون میں ملبوس تھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں اس کا چوڑا چکلا سینہ نمایاں طور پر پھول پچک رہا تھا۔ یہ بات عیاں تھی کہ وہ مجھ سے ڈر کر نہیں بھاگا۔ اس کے بھاگنے میں کوئی مصلحت تھی۔ غالباً وہ جہاں چھپا ہوا تھا' وہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا۔ میں بے خبری میں چونکہ عین اسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں وہ چھپا ہوا تھا لہٰذا وہ اٹھ بھاگا تھا۔ اس کا خیال رہا ہوگا کہ کون اس کے پیچھے آئے گا۔ میں نہ صرف پیچھے گیا تھا بلکہ اس کی دُم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اب وہ بھنا کر پلٹا تھا اور دانت پیستا ہوا میرے سامنے آگیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں رائفل سیدھی کرتا۔ اس نے پھرتی سے ٹانگ چلائی۔ اس کی ٹھوکر میری دائیں کلائی پر پڑی۔ یہ کوئی معمولی ضرب نہیں تھی۔ زبردست قسم کی ٹائمنگ اور طاقت تھی اس کے پیچھے۔ رائفل پر میری گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی سینڈو نے کسی ہتھیار سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے جھک کر اپنا سر بچایا اور اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ حریف مقابل کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ غالباً یہ وہی تلوار تھی جو تھوڑی دیر پہلے اس نے مظاہرے کے دوران اپنے حلق میں گھسیڑ کر دکھائی تھی۔ تلوار کا وار خالی جاتے ہی وہ اپنی بائیں ایڑی پر گھوما اور دائیں ٹانگ گھما کر میرے چہرے پر رسید کی۔ کراٹے میں اس "حرکت" کو راؤنڈ ہاؤس کک کہا جاتا ہے۔ میں سینڈو کی اس حرکت کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا لہٰذا یہ وار بروقت ہونے کے باوجود اپنی شدت کھو بیٹھا۔ حریف مقابل کا پاؤں گھسٹتا ہوا سا میرے جبڑے پر پڑا۔

اب میری باری تھی۔ میں نے دائیں گھٹنے کی زوردار ٹھوکر سینڈو کے پیٹ میں رسید کی' وہ جھکا تو دایاں مُکا دھائیں سے اس کے چہرے پر پڑا۔ مارشل آرٹ میں معلوم نہیں اس جھٹکے کو کیا نام دیا جاتا ہے لیکن مجھے اتنا پتا تھا کہ بعض افراد کو اس قسم کا ایک ہی مُکا لمبا کر دیتا ہے۔ یہ سرکاری سانڈ کی طرح پلا ہوا سینڈو عام افراد میں سے نہیں تھا لہٰذا نہ صرف اس نے یہ مُکا برداشت کیا بلکہ ذرا سا لڑکھڑانے کے بعد غرا کر مجھ پر جھپٹا۔ اس مرتبہ تلوار کو اس نے کسی بڑے خنجر کی طرح استعمال کیا۔ نشانہ میرا پیٹ تھا۔ مجھے اپنی جگہ چھوڑنے میں اگر ایک ساعت کی بھی تاخیر ہو جاتی تو زندگی کی گاڑی چھوٹ گئی ہوتی۔ تلوار کی نوک میری جیکٹ پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ یہ وار بچانے کی کوشش میں میں پہلو کے بل کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا۔

طوفانی مُکا سہنے کے بعد سینڈو کی حالت کسی زخمی درندے کی سی ہو چکی تھی۔ اس نے پلٹ کر مجھ پر چھلانگ لگائی۔ یہ چھلانگ اس "زاویے" کی طرح تھی جو سوئمنگ پول میں لگائی جاتی ہے۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا مجھ پر آیا' تلوار کا رُخ اس دفعہ نیچے کی طرف تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر یہ وار بہ آسانی بچا لیا اور پھر تڑپ کر سینڈو کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میری کوشش تھی کہ اس کی گردن میرے بازو میں آ جائے اور میں اپنا مخصوص داؤ آزما سکوں۔ اس مقصد کے لیے دونوں ہاتھوں کا استعمال ضروری تھا مگر میرا ایک ہاتھ سینڈو کے تلوار والے ہاتھ سے مصروف تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لڑائی بھڑائی کا ماہر سینڈو مجھے اپنی پشت سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شیر کی پشت سے گرنے والا معاملہ تھا۔ جب تک میں اس کے اوپر تھا' محفوظ تھا۔ اب نیچے آیا تو اس کے جبڑوں میں آگیا۔ اس کی تلوار والی کلائی بدستور میرے ہاتھوں میں تھی مگر اس کا دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ اس ہاتھ سے اس نے چند دھواں دھار مُکے میرے جبڑے پر مارے۔ جوابی کارروائی کے طور پر میں نے کلائی موڑ کر تلوار اس کے ہاتھ سے چھڑا دی۔

اب مقابلہ برابر کا تھا۔ ہم کانٹوں اور کنکریوں سے "آراستہ" اکھاڑے میں پوری وحشت کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ میرے منہ میں ایک عجیب سا ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ حلق بالکل خشک ہو چکا تھا اور زبان منہ کے جوف میں چمڑے کے بوسیدہ ٹکڑے کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کیفیت کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب میں نے پنڈال سے سینڈو کے پیچھے دوڑ لگائی تھی۔ اب گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ کیفیت شدید تر ہو رہی تھی۔ سینڈو کے ساتھ براہ راست زور آزمائی کے دوران مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ میرے تمام قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں۔ تاہم ان نازک لمحات میں اس بارے میں سوچنے کی زیادہ مہلت نہیں تھی۔ جونہی میں تلوار کی فکر سے آزاد ہوا' میں نے دونوں ہاتھوں سے سینڈو کی توانا گردن کو گرفت میں لانے کی کوشش کی مگر کبھی کبھی وار الٹ بھی

جاتا ہے۔ شکار کرنے والا خود پھندے میں آ جاتا ہے۔ میرے ہاتھ' سینڈو کی عرق آلود گردن پر پھسل گئے اور اسی دوران میری گردن سینڈو کے فولادی بازوؤں میں جکڑی گئی۔ ایک ناتوانی سی میرے رگ و پے میں اترتی جا رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ پوری طاقت صرف کر کے میں نے اپنی گردن چھڑانی چاہی مگر "گرفت" معمولی نہیں تھی۔ میں نے نیچے پڑے پڑے حریف مقابل کی پسلیوں میں چند زوردار گھٹنے مارے۔ بڑی صحت مند قسم کی لچک تھی کم بخت کے جسم میں۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح اس نے اپنا جسم موڑ توڑ کر ایک تنگ کڑے میں سے گزار دیا تھا۔

پھر ایک دم میرا سانس پھول گیا۔ آنکھوں کے سامنے تو پہلے ہی اندھیرا تھا اب "آنکھوں تلے" بھی اندھیرا چھانے لگا۔ میری قوت مزاحمت اتنی جلدی ساتھ چھوڑنے والی تو نہیں تھی۔ یقیناً میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید کھانے میں کچھ تھا۔۔۔ یا قہوے میں۔۔۔ یا پھر چائے کی اس آخری پیالی میں جو میں نے ثوبالی کے ساتھ پتھریلے سائبان کے نیچے بیٹھ کر پی تھی۔۔۔ میں ایک بار پھر زور سے تڑپا لیکن گردن کے گرد کسا ہوا آہنی شکنجہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ موت مجھے آخری بار چھو کر گزر چکی تھی۔ آج وہ پھر مجھے چھونے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ چھونے کے لیے آگے بڑھنے والی کو معلوم نہیں "چھو" کر آگے بڑھنا تھا یا نہیں۔ میرے پیٹ میں موجود تمام عضلات اینٹھنے لگے۔ ہر چیز جیسے حلق کی طرف کھنچ رہی تھی۔

پھر ذہن میں ایک سرخی مائل تاریک پردہ تن گیا۔ اس پردے کی سرخی پر تاریکی بتدریج غالب آ رہی تھی۔ اچانک اس تیرگی میں روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن چمکی۔ مجھے اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر یاد آگیا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس خنجر تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہاتھ اور پنڈلی میں بمشکل ایک فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا لیکن میرے لیے بیکراں تھا کیونکہ زندگی اور موت کا فاصلہ تھا۔ آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے کے بعد میری انگلیوں کے پوروں نے خنجر کے شفاف دستے کو چھوا اور تھوڑی سی مزید ہمت کر کے اسے گرفت میں لے لیا۔

حریف مقابل گو میرے کان کے قریب غرا رہا تھا مگر اس کی یہ غراہٹیں دور۔۔۔ کہیں بہت دور سے ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک یہ غراہٹیں ایک کربناک آہ میں بدل گئیں۔ میرے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا خنجر دستے تک سینڈو کے پہلو میں اتر گیا تھا۔ جونہی میری گردن پر اس کی گرفت کمزور پڑی' بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار میرے پھیپھڑوں میں گھسی۔ آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی۔ میں نے دونوں پاؤں سمیٹ کر سینڈو کے پیٹ سے لگائے اور ٹانگوں کی زوردار "جرک" سے اسے نشیب میں لڑھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کانٹے دار جھاڑیوں پر گرا اور کئی شاخیں توڑتا ہوا اپنے جیسے کسی پتھر سے ٹکرایا۔ لہو ٹپکاتا ہوا خم دار خنجر میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ ٹانگوں کی پوری قوت صرف کر کے میں اٹھا اور رائفل کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک دم زور سے چکر آیا۔ یوں لگا جیسے میں ابھی تک صرف اپنی جان بچانے کے لیے ہوش میں تھا۔ میری ٹانگیں میرا بوجھ سہارنے سے انکاری تھیں۔ ایک بار پھر چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ کسی سہارے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں چلاتا میں اوندھے منہ زمین پر گرا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

○☆○

ہوا خنک تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلا احساس مجھے یہ ہوا کہ میں اسی جگہ پڑا ہوں جہاں بے ہوش ہوا تھا۔ جونہی حواس بحال ہوئے میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ دور مشرقی افق پر نگاہ پڑی اور اندازہ ہوا کہ شب گزر چکی ہے اور اب کسی بھی وقت صبح صادق کی سپیدی پھوٹنے والی ہے۔ میں نے چمکیلے ڈائل والی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اور اسی وقت میری نگاہ اپنے ہاتھ پر پڑی۔ ہاتھ خون آلود تھا اور انگلیوں میں ابھی تک خنجر دبا تھا۔ گھڑی ساڑھے چار کا وقت بتا رہی تھی۔ میں کم و بیش چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ یکبارگی بے ہوشی سے پہلے کے تمام مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں لپک کر نشیب کی طرف گیا۔ میرا حریف مقابل جھاڑیوں میں موجود تھا۔ وہ جس رُخ سے گرا تھا اسی رُخ پڑا رہ گیا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا' اس کی آنکھیں بند تھیں اور منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کے عریاں سینے پر ہاتھ رکھا تو لگا کہ برف کی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ خنجر اس کے بائیں پہلو میں بغل سے تقریباً چھ انچ نیچے لگا تھا' اور یہاں لہو کے لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ لوہے کے تنگ کڑے سے گزرنے والا نزع کے ناکے سے گزر کر موت کی وادی میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے نتھنوں سے گندھک اور جلے ہوئے ربڑ کی بُو ٹکرائی۔۔۔ یہ بُو جیسے فضا میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ "کہاں سے آ رہی ہے یہ بُو؟" میں نے سوچا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کوئی آواز' کوئی آہٹ' کوئی کھٹکا۔۔۔ بغور سننے کے باوجود کچھ سنائی نہیں دیا۔

میں نے ماچس کی چند تیلیاں ضائع کر کے جھاڑ جھنکار

میں سے اپنی تھری ناٹ تھری رائفل ڈھونڈی اور "سینڈو" کو اس کے حال پر چھوڑ کر ان درختوں کی طرف بڑھا جہاں محفل سجائی گئی تھی۔ میرے قدموں میں ابھی تک لرزش تھی اور سر بھاری ہو رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میں کسی تیز خواب آور دوا کے زیر اثر رہا ہوں۔ جوں جوں میں سرنگ کی طرف بڑھ رہا تھا' فضا میں گندھک کی ناگوار بو شدید ہو رہی تھی۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ ڈگمگاتے قدموں سے طے کر کے میں موقع پر پہنچا تو چھٹی حس دہائی دینے لگی کہ یہاں کوئی بہت خاص واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ آخر چند آخری قدم بھی طے ہو گئے اور میں جھاڑیوں کو پھاند کر اس میدان میں پہنچا جسے مشعلوں سے منور کیا گیا تھا۔

یہاں ایک حیرت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہ منظر ان چند مناظر میں سے ہے جو تاحیات میرے لیے ناقابل فراموش رہیں گے۔ میں ایک ہاتھ میں رائفل تھامے کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا رہ گیا۔ میرے سامنے لاشیں بکھری تھیں۔۔۔ چھوٹی بڑی' موٹی دبلی' اونچی نیچی' کچھ شناسا اجنبی لاشیں۔ وہ دور تک بکھری ہوئی تھیں۔ روشن اور نیم روشن مشعلوں کے درمیان مجھے صرف موت نظر آ رہی تھی۔ موت۔۔۔ جو میرے جانے کے بعد اس محفل رنگ و بو پر ٹوٹ کر برسی تھی اور زندگی کو بہا کر لے گئی تھی۔ میں بے خودی کے عالم میں بھاگ کر ان لاشوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ چند لمحوں کے لیے یہ بھی فراموش کر دیا کہ میں خود بھی کسی اندھی گولی کا نشانہ بن سکتا ہوں۔ میں ان لاشوں پر جھک گیا۔ انہیں ٹٹولنے لگا' جیسے آنکھوں سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہو اور اب میں ہاتھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں اور ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی زندہ نہیں تھا۔ ان کے بدن خود کار رائفلوں کی گولیوں سے چھلنی تھے۔ ان کے جسموں سے چھینٹوں کی صورت میں اڑنے والا خون ہر شے کو داغدار کر چکا تھا۔ اجلے لباس' کلف لگی پگڑیاں' گھونگھریالے بال' کھانے کے برتن' چادروں کے دستر خوان سب کچھ خون رنگ تھا۔ وہ کم و بیش پچاس لاشیں تھیں۔ ان پر برسنے والی موت اتنی اچانک اور تابڑ توڑ تھی کہ ایک شخص کی رائفل بھی اس کے ہاتھ میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ جہاں اور جس حال میں بیٹھے تھے' موت کا شکار ہو گئے تھے۔

مجھے جمعہ خان کی لاش نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں قہوے کی ٹوٹی ہوئی پیالی تھی اور آنکھیں حیرت آمیز کرب سے ابلی ہوئی تھیں۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر جبار خان اوندھا پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی ایک جانب اٹھی ہوئی بیساکھی سے جیسے اسٹیج کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ رقاصہ عندلیب کی لاش مجھے تین دوسری لاشوں میں دبی ہوئی نظر آئی۔ وہ چاروں بھاگتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنے تھے اور اوپر تلے گر گئے تھے۔ ان سب کی پشت پر گولیاں لگی تھیں اور کسی کے جسم پر نصف درجن سے کم نشان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ کچھ مقتولین کی آنکھیں اس انداز سے بند تھیں جیسے وہ گہری نیند یا بے ہوشی کی حالت میں موت کا شکار ہوئے ہوں۔ اسٹیج کے عین سامنے ایک خوبرو وزیرستانی یوں پڑا تھا کہ جانب کی ایک بوتل ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور کلام و دہن کی لذت سمیت اسے ہر لذت سے محروم کر گئی تھی۔ وزیرستانی کی لاش کے بالکل پاس مجھے ایک ادھ جلی لاش نظر آئی۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ نائیکہ ثریا بائی تھی۔ وہ بھاگنے کی کوشش میں گولی کھا کر ایک جلتی ہوئی مشعل پر گری تھی۔ اس کے بھاری ریشمی کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی اور آدھا دھڑ جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ کوئی میرے قدموں میں کراہا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ یہ ایک شدید زخمی شخص تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ سرتاپا لرزتے ہوئے بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھے مت مارو۔" یہ کوئی عام شخص نہیں تھا۔ ہر وقت حادثوں سے دوچار ہونے والا ایک پیشہ ور ڈاکو تھا۔ خبر نہیں اس نے کیا منظر دیکھا تھا کہ موت وحشت بن کر اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا' یہ سب کیا ہوا؟" میں نے اسے شانوں سے جھنجوڑ کر پوچھا۔ اس کے خون آلود ہونٹوں کے اندر زبان بل کھا کر رہ گئی۔ ایک سرد لہر سی میرے بدن میں دوڑنے لگی۔ کوئی آسیب خاموش درختوں میں سے رینگ کر باہر نکلا اور میرے گرد چکرانے لگا۔۔۔ نجانے کیوں اس کہانی کے مناظر میری نگاہوں میں چمک گئے جو میں نے عمر رسیدہ دوسائی سے سنی تھی اور جس میں زودے مشت کی پُر اسرار پہاڑیوں کے حوالے سے تڑپتی پھڑکتی لاشوں کا ذکر تھا۔ رات کی سیاہی میں انگریز کپتان کی کمپنی پر نادیدہ ہاتھوں نے گولیاں چلائی تھیں اور سوئی ہوئی کمپنی سوتی رہ گئی تھی۔۔۔ کیا یہاں آج پھر برسوں پرانی کہانی دہرائی گئی ہے؟ میں جانتا تھا کہ میری یہ سوچ غیر حقیقی اور بے جواز ہے لیکن پھر بھی میں سوچ رہا تھا۔ واقعے کی مماثلت میرے ذہن کو بہت متاثر کر رہی تھی۔

"لشکر خان کہاں ہے؟" میرے ذہن میں یہ سوال چیخ بن کر ابھرا۔ "لشکر خان۔۔۔ لشکر خان۔۔۔ کبیر شاہ۔" میں نے پکار کر کہا۔ میری آواز جنگل کے سناٹے کو اتھل پتھل کر کے فضا

میں گم ہو گئی۔ میں رائفل بدست سرنگ کے دہانے کی طرف لپکا۔ دہانے کے اندر مجھے ایک سازندے اور اس کے ساز کی لاش نظر آئی۔ دونوں کی زندگیوں کے تار ٹوٹے ہوئے تھے۔ سرنگ میں گندھک اور دیگر کیمیائی مادوں کی بو بہت تیز تھی۔ اس بو کا منبع و مرکز بڑی سرنگ میں سے پھوٹنے والی ایک ذیلی سرنگ تھی۔ اس سرنگ کا دہانہ ایک دراڑ کی شکل میں تھا۔ چوڑائی تقریباً ڈھائی فٹ' اونچائی تقریباً پانچ فٹ۔ اس دراڑ کے سامنے ایک بڑا پتھر اس طرح رکھ دیا گیا تھا کہ کوئی اندر سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔ یہ پتھر اس دراڑ کے سامنے موجود نہیں تھا۔ اس پتھر کو دھکیلنے اور دراڑ کے سامنے لانے کے لیے کم و بیش تین افراد کی ضرورت تھی اور اگر اسے کوئی اندر سے ہٹا کر دہانہ کھولنا چاہتا تو یہ بہت مشکل کام تھا۔ اس سیاہی مائل پتھر نے دراڑ پوری طرح نہیں ڈھانپا تھا۔ دہانے کا بالائی حصہ کھلا رہ گیا تھا۔ اس کھلے حصے میں سے کسی انسان کا گزرنا ناممکن تھا۔ ہاں دھواں یہاں سے خارج ہو سکتا تھا اور یقیناً ہو بھی رہا تھا۔ اسی دھوئیں کے سبب قرب و جوار میں گندھک وغیرہ کی بو پھیلی تھی۔

میں نے پکار کر کہا "کوئی ہے؟"

میری آواز دہانے کے بالائی خلا سے سرنگ میں گئی اور دور تک گونج گئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سرنگ شاخ در شاخ دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میری آواز کے جواب میں اندر موت کی خاموشی طاری رہی۔۔۔ زہریلے دھوئیں کے سبب مجھے شدید کھانسی ہونے لگی۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے رومال نکال کر منہ ڈھانپا اور پنجوں پر کھڑے ہو کر بالائی خلا سے سرنگ میں جھانکا۔ دھوئیں کی تلخی کے سبب تھوڑی دیر کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جلے ہوئے ریت' لکڑی اور راکھ کا چھوٹا سا ڈھیر نظر آیا۔ اسی ڈھیر کے پاس مجھے ایک لاش نظر آئی۔ میں نے پچھلے پانچ منٹ میں بہت سی لاشیں دیکھ لی تھیں لیکن سرنگ کے اندر پڑی ہوئی اس لاش کی دید نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے "موت" زودے مشت کے پاس کہانی میں ہی وارد نہیں ہوئی بلکہ پوری دنیا میں وارد ہو گئی ہے۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ درختوں پر بولتے پرندے' جھرنوں میں بہتا پانی' چاند کی ٹھنڈک' سورج کی حرارت' تاروں کی چھاؤں اور اس کے ساتھ ہی انسان اور اس کی انسانیت۔۔۔ کچھ باقی نہیں بچا۔

میرے سامنے اس معصوم بچے کی لاش پڑی تھی جس نے صرف اٹھارہ دن پہلے یہیں زودے مشت میں آنکھ کھولی تھی اور اپنے ننھے منے سینے میں پہلی سانس بھری تھی۔ اگر اس ناداں کو یہ معلوم ہوتا کہ سانس لینے کی یہ عادت کتنی بری ہوتی ہے اور اگر ایک بند سرنگ میں جہاں زہریلا دھواں بھرا ہو' سانس نہ لی جا سکے تو جان پر کیا بنتی ہے تو وہ شاید پہلی سانس ہی نہ لیتا۔۔۔ آہ۔۔۔ کتنا کرب تھا اس کے چہرے پر۔ اس کا نام ہم نے بشارت رکھا تھا۔ آج وہ بشارت "خونریز" کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔۔۔ کس نے قتل کیا تھا اسے اور اس کے ساتھ ان تمام لوگوں کو جو اپنے ماضی سے رخ پھیر کر مستقبل کی طرف دیکھ رہے تھے؟ جو ایک نئے عزم کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے تھے؟ اس سوال کے جواب میں میرے ذہن میں دو ہی ناموں کی گونج تھی۔۔۔ عینی جان اور لشکر شکرا۔ میں نے ابھی صرف مقتول دیکھے تھے' دست قاتل کی جھلک نہیں دیکھی تھی اور نہ کہیں کوئی ثبوت پایا تھا لیکن مجھے سو فی صد یقین تھا کہ یہ کام انہی خونخوار درندوں کا ہے جنہوں نے اپنی آسانی کے لیے انسانوں کی کھال پہن رکھی ہے۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ سرنگ کے اندر اور سرنگ سے باہر میرے چاروں طرف "موت" بکھری ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ تھری ناٹ تھری کے دستے میں پیوست ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک کہیں پاس سے ایک لرزہ خیز نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ "بچاؤ۔۔۔ خدا کے لیے بچاؤ۔"

میں نے چونک کر اپنی دائیں جانب دیکھا۔ چیخ کی آواز قریباً پچاس گز کی دوری سے آئی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' اس طویل سرنگ میں سے چھوٹی بڑی کئی سرنگیں پھوٹتی تھیں' یہ چیخ بھی کسی ایسی ہی سرنگ سے بلند ہوئی تھی۔ پکارنے والی کی آواز میں وہی کرب ناک لرزش تھی جو ذبح ہونے والی بکری کی آواز میں ہوتی ہے۔ دنیا جہاں کی التجائیں سمٹی ہوئی تھیں اس آواز میں۔ میں بھاگتا ہوا آواز کی سمت گیا۔ تھری ناٹ تھری میرے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں تھی۔ بیس تیس قدم بھاگنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ جس سرنگ یا کھوہ سے چیخ بلند ہوئی ہے وہاں دھواں بھرا ہوا ہے۔ عین اس وقت وہی عورت دوبارہ چیخی۔ "خدا کے لیے بچاؤ۔۔۔ خدا رسول کے واسطے مجھے بچاؤ۔"

اب اس کی آواز میں امید کا ہلکا سا جوش بھی شامل ہو گیا تھا۔ غالباً وہ میرے بھاگتے قدموں کی چاپ سن چکی تھی۔ باقی بیس قدم کا فاصلہ طے کر کے میں سرنگ کے دہانے پر پہنچا تو اندر آگ کے شعلے دکھائی دیے۔ یہ تنگ دہانے کی ایک خم دار سرنگ تھی بلکہ اسے کھوہ کہنا زیادہ مناسب ہ

کیونکہ زیادہ طویل نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے دیکھا، دہانے کے پاس ایک میلا کچیلا کنستر الٹا ہوا ہے اور اس میں سے تیل بہہ کر کھوہ میں اندر تک پھیل گیا ہے۔ یہ کنستر اور اس میں سے بہتا ہوا بدبودار تیل آگ پکڑ چکا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ڈھیر کی صورت میں پڑی ہوئی درجنوں مشعلیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ جوں جوں تیل پھیل رہا تھا آگ بھی بھڑک رہی تھی۔ ایک جواں سال عورت شعلوں کے عقب سے چیخ رہی تھی اور ایک کونے میں سمٹتی چلی جا رہی تھی۔ وہ انہی داشتاؤں میں سے ایک تھی جو ڈیرے پر عیسٰی جان کے ساتھیوں کے تصرف میں تھیں۔ شعلے ابھی اتنے بلند نہیں ہوئے تھے کہ عورت انہیں پھلانگ کر باہر نہ آسکتی لیکن وہ پھلانگنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی اور یہی بات خطرناک تھی۔ چند سیکنڈ اور گزر جاتے تو پھر اس کے لیے باہر نکلنا قطعی ناممکن ہو جاتا۔

میں نے چیخ کر کہا "کیا کرتی ہو۔ چھلانگ لگاؤ، جلدی کرو۔"

وہ کونے میں کچھ اور سمٹ گئی۔ اس کی حالت ایک خوفزدہ بچے کی سی تھی۔ آگ سے ہر کوئی ڈرتا ہے لیکن بعض لوگ خصوصی طور پر "آتش فوبیا" کا شکار ہوتے ہیں۔ اس عورت کا مسئلہ بھی غالباً یہی تھا۔ اب وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ صرف چیخ رہی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ آگ اس کی قدم بوسی کرنے والی تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر چھلانگ لگائی اور آگ کے اوپر سے گزر کر عورت کے پاس پہنچا۔ ایک بازو سے تھام کر میں نے اسے زور سے دھکیلا۔ وہ چیخی اور شعلوں کے درمیان سے گزر کر لڑھکتی ہوئی دور جاگری۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔ اس کی قمیص کا دامن آگ پکڑ چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی یہ آگ بجھائی اور اسے کھینچ کر کھوہ سے دور لے گیا۔ چند ہی لمحے بعد کھوہ میں رکھے ہوئے چند دوسرے کنستروں نے بھی آگ پکڑ لی اور اندر موجود ہر شے دھڑا دھڑ جلنے لگی۔

کھانس کھانس کر عورت کا بُرا حال تھا اور وہ اس "حال" کو مزید بُرا بنانے کے لیے رو بھی رہی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور خون ٹھوڑی سے گزر کر گریبان تک پہنچ رہا تھا۔ میں اسے سرنگوں کے اس سلسلے سے باہر لے آیا۔ وہ مجھے لشکر خاں کے دوست کی حیثیت سے پہچان چکی تھی اور اب ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ "انہوں نے سب کو مار دیا۔ یہ دیکھو لاشیں۔ یہ دیکھو۔۔۔ سب کو قتل کر دیا۔ وہ مجھے بھی مار دیں گے۔ خدا کے لیے یہاں سے نکل چلو۔"

وہ اردو بول رہی تھی تاہم اس کا لہجہ پوٹھوہاری تھا۔ وحشی ہرنی کی طرح اس کی نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ میں اسے سہارا دیتا ہوا ڈھلوان پر لے آیا اور چند گنجان جھاڑیوں کی اوٹ میں بٹھا دیا۔ یہاں گندھک آمیز دھوئیں کی بُو بہت کم تھی اور وہ خونچکاں مناظر بھی دکھائی نہیں دیتے تھے جو مشعلوں کے دائرے میں اور دائرے سے باہر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ تاریکی میں اب اُجالے کی جھلک نمایاں ہونے لگی تھی۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چہچہا اٹھتا تھا۔ بادِ صبا، ارد گرد کے سوگوار مناظر سے بے خبر اپنی مخصوص رفتار سے محوِ خرام تھی۔

عورت ذرا اپنے حواس میں آئی تو میں نے پوچھا "یہ سب کیا ہوا؟"

اس کا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ ان ہچکیوں کے درمیان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ بولی "مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں تو سرنگ میں تھی۔ ایک دم گولیاں چلنے لگیں۔ میں نے باہر مردوں کی چیخیں سنیں۔ ایسے لگا کہ بہت سے لوگوں نے ایک دم حملہ کر دیا ہے۔ میں بھاگ کر سرنگ کے دہانے پر گئی۔ میں نے دیکھا، سردار لشکر کے کچھ ساتھی جان بچا کر بھاگتے ہوئے سرنگ کی طرف آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ دو تین میرے سامنے گولیاں کھا کر اوندھے منہ گرے۔ میں بھی چیختی ہوئی واپس سرنگ میں آئی اور دوڑتی ہوئی اس کھوہ میں گھس گئی۔ وہاں مشعلوں اور لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے تھوڑی سی جگہ تھی۔ میں گھس کر بیٹھ گئی۔ پوری سرنگ چیخ پکار کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ اتنی فائرنگ ہو رہی تھی کہ لگتا تھا قیامت آ گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سردار عیسٰی کے دوست شنکر کی آوازیں سنیں۔ وہ کسی جانور کی طرح چنگھاڑ رہا تھا اور سردار لشکر خاں کو پکار رہا تھا۔ وہ سردار کو بڑی گندی گالیاں دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرنگ سے باہر نکل آئے ورنہ اندر ہی مارا جائے گا۔ کچھ دیر بعد سردار عیسٰی جان کی آواز بھی آنے لگی۔ اس نے سردار لشکر خاں کو پکار کر کہا "لگتا ہے تو اپنے باپ کا نہیں کسی چوہے کا نطفہ ہے۔ لعنت ہے تجھ پر اور تیری زندگی پر۔"

تھوڑی ہی دیر بعد سرنگ میں گندھک کی بُو اور دھواں پھیلنے لگا۔ میں جہاں چھپی ہوئی تھی وہاں بھی دھواں پہنچ رہا تھا۔ میں جیسے تیسے برداشت کر کے بیٹھی رہی۔ مجھے دہانے کی طرف سے ترانہ کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ زندہ بچ گئی تھی یا شاید بچا لی گئی تھی۔ اب سردار عیسٰی اور اس کے

ساتھی اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جا رہے تھے۔ وہ اسے مار بھی رہے تھے۔ اس بدنصیب کی آہ و پکار بڑی دردناک تھی۔۔۔ آدھ پون گھنٹے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ سرنگ خالی ہے اور سرنگ کے ارد گرد بھی کوئی نہیں۔ وہ لوگ جا چکے تھے۔ میں باہر نکلنے کا سوچ رہی تھی جب ایک دم مجھے آگ نظر آئی۔ دراصل جب میں دوڑتی ہوئی اندر آئی تھی تو میرا پاؤں لگنے سے ایک بند کنستر اُلٹ گیا تھا۔ اس میں مشعلوں کے لیے تیل تھا۔ ڈھکنے میں سے تیل رِس رِس کر کھوہ میں پھیل گیا اور پھر اس نے ایک جلتی ہوئی مشعل سے آگ پکڑ لی۔ دھواں میرے گلے میں بھر گیا اور میں مدد کے لیے چیخنے لگی۔ میں۔۔۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نہ آتے تو۔۔۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر سسکیاں لینے لگی۔

فرزانہ نامی اس عورت کے بیان سے صورتِ حال بڑی حد تک واضح ہو رہی تھی۔ یہاں جو قیامت ٹوٹی تھی اس کے توڑنے والے عیسٰی جان اور شنکر ہی تھے۔ ان کی منحوس صورتیں میری نگاہوں میں چکرانے لگیں۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ پچھلے کئی دنوں سے میری چھٹی حس جس خونی منظر کی جھلک دکھا رہی تھی وہ یہی ہے۔ یہی ہے وہ دردناک سانحہ جس کا تصور سوتے جاگتے میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ میں نے سوچا۔ کاش یہ سب کچھ ایک خواب کا حصہ ہو۔ ابھی ایک جھرجھری لے کر میں آنکھ کھول دوں اور بستر پر بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کروں کہ میں سو رہا تھا لیکن نہیں۔۔۔ یہ ایک ٹھوس نوکیلی حقیقت تھی جو میری جاگتی آنکھوں میں گھس رہی تھی اور سینے کو چھید رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا کہ اتنی جانوں کے زیاں کی کچھ نہ کچھ ذمے داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ میں شنکر شنکرا کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس بلا کا نام ہے اور انتقام میں بھڑک کر یہ بلا کس عفریت کا روپ دھار سکتی ہے۔ پھر میں نے لشکر خاں کو کیوں اپنے خدشات سے آگاہ نہ کیا۔ کیوں انہیں اس بات کا یقین نہ دلایا کہ عیسٰی جان سے ٹکر لینے کے بعد وہ ہر گھڑی اجل کے نشانے پر ہیں۔ کیوں میں نے اس حقیقت سے چشم پوشی کی کہ شنکر جلد یا بدیر بدلہ لے گا۔ میں نے ان نادانوں کو جشن مناتے دیکھا اور خود بھی اس جشن میں شریک ہو گیا۔ بھول گیا کہ یہ جشن اس شخص کی ناکامی کا جشن ہے جس نے ناکام ہونا سیکھا ہی نہیں۔ جو پہلی فرصت میں اپنا بدلہ چکاتا ہے اور اپنے حریف کو عبرت نشاں بنا دیتا ہے۔ جی چاہا تھری ناٹ تھری کی نال اپنی ہی کھوپڑی سے لگا کر لبلبی دبا دوں۔

میرے سینے میں آتش فشاں دہک رہا تھا۔ ایک لاوا تھا جو پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن جس کے لیے یہ لاوا مچل رہا تھا وہ قرب و جوار میں نہیں تھا۔ مجھے ایک بار پھر ان لوگوں کا خیال آیا جو بند سرنگ میں مُردہ یا نیم مُردہ پڑے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہوں مگر جس راستے سے انہیں لوٹنا تھا اسی راستے میں ایک بڑا پتھر حائل کر دیا گیا تھا۔ وہ اس پتھر کی دوسری جانب زہریلے دھوئیں سے بھری ہوئی سرنگ میں تڑپتے سسکتے رہے تھے اور اب بے سُدھ ہو گئے تھے۔ میں اٹھ کر پھر سرنگ کی طرف بڑھا۔ فرزانہ نے لپک کر میری پنڈلی تھام لی۔ "نہیں باؤ جی! تم مت جاؤ۔ وہ پھر آجائیں گے۔ وہ مجھے مار دیں گے۔"

میں نے ڈانٹ کر اسے چپ کرایا اور کہا کہ وہ خاموشی سے ادھر بیٹھی رہی، کوئی یہاں نہیں آئے گا۔ میرے لہجے نے اسے سہارا دیا اور وہ چپ ہو گئی۔ میں ڈھلوان طے کر کے ہموار میدان میں اُترا اور الٹی سیدھی پڑی لاشوں سے نظریں چراتا دہانے کی سمت بڑھا۔ اچانک کہیں پاس سے کسی جانور کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ ایسی آواز اس کتے کے حلق سے نکلتی ہے جس کا منہ جالی یا تسمے سے بند کر دیا گیا ہو۔ میں کبیر شاہ کے کتوں کو بھول ہی گیا تھا۔ انہیں میں نے خود اپنے ہاتھوں سے ان جھاڑیوں میں باندھا تھا۔ میں مشعلوں کے دائرے سے نکل کر جھاڑیوں میں پہنچا۔ وہ اسی درخت سے بندھے ہوئے تھے۔ اسے ان کی خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا تھا کہ حملہ آوروں کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی یا وہ عجلت میں انہیں نظر انداز کر گئے تھے۔ ان کے بچ نکلنے کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی۔ ان کے منہ بند تھے اور وہ زور و شور سے بھونک کر حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکے تھے۔ ورنہ جہاں انسان چھلنی کر دیے گئے تھے وہاں انہیں کون بخشتا۔ کتوں کو دیکھتے ہی کبیر شاہ کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں اسے زندہ دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔

چاروں کتے بے حد بے قرار تھے۔ ان کی غراہٹیں اس سانحے پر احتجاج کر رہی تھیں جو چند گھنٹے پہلے ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوا تھا۔ اپنی تمام تر حیوانیت کے باوجود وہ انسان کی "انسانیت" دیکھ کر لرزہ براندام تھے۔ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ میرے پاؤں سونگھنے لگے اور اپنی حرکات سے لگاؤ کا اظہار کرنے لگے۔۔۔ میں جانتا تھا کہ حملہ آوروں میں سے کچھ لوگ ارد گرد موجود ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے وہ کہیں گھات لگا کے بیٹھے ہوں اور میری ہر حرکت ان کی نگاہ میں ہو

لیکن سینے میں سرخ غبار کی طرح پھیلے ہوئے اندوہ نے مجھے ہر مصلحت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے کبیر شاہ اور لشکر خاں کو آوازیں دیں۔ میری صدا جنگل کی وسعت میں ایک پھڑپھڑاتے پرندے کی طرح گم ہو گئی۔ تھری ناٹ تھری پھینک کر میں نے ایک نئی نویلی انگلش گن تھام لی۔ یہ شاندار گن ایک ایسے بارعب وزیرستانی کے پہلو میں پڑی تھی جو اپنی تمام شان و شوکت کھو کر خاک و خون میں لتھڑا بے سُدھ پڑا تھا۔ گولیوں سے بھرا ہوا بیلٹ اس کے مُردہ جسم تلے دبا ہوا تھا۔ میں نے بھاری بھرکم جسم ہٹا کر یہ بیلٹ نکال لیا۔ وزیرستانی کی موت کمر میں لگنے والی ایک درجن گولیوں سے واقع ہوئی تھی۔ وہ ایسے رُخ سے گرا تھا کہ اس کی براؤن پگڑی خون آلود ہونے سے بچ گئی تھی۔ میں نے یہ پگڑی اُتار دی اور قریب رکھے ہوئے پانی کے ایک جگ میں بھگو کر چہرے سے لپیٹ لی۔ یوں زہریلے دھوئیں سے کسی حد تک بچاؤ ہو گیا۔ گن لوڈ تھی۔ میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور سُرنگ کی طرف بڑھا۔

اُجالا اب دھیرے دھیرے نشیب و فراز کو منور کر رہا تھا۔ روشنی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ یہ روشنی موت کو بے نقاب کر رہی تھی۔ میرے اردگرد کم و بیش پچاس لاشیں تھیں اور ان کے زخموں سے بہنے والا خون لوتھڑوں کی طرح مختلف اشیا پر جما ہوا تھا۔ میری نگاہ اس شخص پر پڑی جس نے تھوڑی دیر پہلے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کی تھی کہ میں اسے گولی نہ ماروں۔ وہ اب بڑے سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ گولی تو کیا ایٹم بم بھی اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ہر خوف سے آزاد ہو چکا تھا وہ۔۔۔ مجھے لگا وقاص عندلیب کا آخری نغمہ ابھی تک اس دھواں دھواں فضا میں گونج رہا ہے۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔۔۔ اے میرے حسین خوابوں کے مہمان خدا حافظ۔ ان میں سے ہر مرنے والا (چاہے وہ بہت بُرا تھا) کسی نہ کسی کے حسین خوابوں کا مہمان تھا۔

میں سُرنگ میں پہنچا۔ اندرونی سُرنگ کے دہانے پر سیاہ چٹان ایک حقیقت کی طرح اپنی جگہ موجود تھا۔ میں اسے ہٹائے بغیر سُرنگ میں نہیں جا سکتا تھا اور اسے ہٹانا آٹھ دس مددگاروں کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ہاں کوئی ایسی آہنی راڈ میرے ہاتھ لگ جاتی جو لیور کا کام دیتی تو کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس سُرنگ میں ایسی موزوں راڈ کا ملنا ایسا ہی تھا جیسے صحرا میں بھٹکنے والے کو پانی سے لدا ہوا اونٹ مل جائے۔ یا بلندی سے لڑھک جانے والے کے ہاتھوں میں ہوا شوٹ کی

دستی آجائے۔ ایسی چیزوں کی صرف تمنا کی جاتی ہے، یہ حاصل نہیں ہوتیں۔ مجھے بھی راڈ نہیں ملی اور نہ کوئی اس سے ملتی جلتی چیز۔ ہاں ایسے کچھ افراد مل گئے جو میری مدد کر سکتے تھے۔ بالکل اچانک مجھے بڑی سُرنگ کے دہانے سے قدموں کی آواز آئی۔ میں فوراً ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گیا۔ آنے والے تین افراد تھے۔ ان کے ہاتھ میں اسلحے کے نام پر کوئی شے نہیں تھی۔ وہ بہت ڈرے ہوئے تھے اور ہر قدم پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ پھر ایک بھاری بھرکم شخص نے اپنی دبلی پتلی آواز میں پکار کر کہا "توک دلتہ شتہ" یعنی "کوئی یہاں ہے؟"

میں اس شخص کو پہچان گیا۔ یہ ان باورچیوں میں سے ایک تھا جو رات کے پہلے پہر زور و شور سے سالم دُنبے پکانے میں مصروف تھے اور بڑی بڑی دیگوں کے گرد ماہرانہ انداز میں چکرا رہے تھے۔ میں رائفل سونتے ہوئے ان کے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تینوں اپنی جگہ ٹھٹک گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے عقب میں بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ چڑھتے سورج کی دھوپ میں ان کے طویل سائے سُرنگ کے دہانے پر رینگ رہے تھے۔ چند لمحے بعد یہ لوگ بھی میرے سامنے آگئے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ ایک کے سوا یہ سب غیر مسلح تھے۔ مسلح شخص لشکر خاں کا ساتھی نظر آتا تھا۔ باقیوں میں سے کوئی بھی لشکر خاں کے گروہ میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی شکل و صورت سے یہ لوگ اس طرح کے نظر آتے تھے۔ یہ لوگ یہاں جشن کے سلسلے میں مختلف خدمات انجام دینے کے لیے لائے گئے تھے۔ ان میں ایک سازندہ بھی شامل تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

لشکر خاں کا ساتھی روتے ہوئے بولا۔ "سب برباد ہو گیا بھائی صاحب! ان ظالموں نے کسی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ ام لوگ بھاگ کر درختوں میں چلا گیا تھا۔ بس قسمت اچھا تھا کہ جان بچ گیا۔ وہ سب کا سب بالکل دیوانہ ہو رہا تھا۔"

میں نے پوچھا "کون لوگ تھے وہ؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا "سردار عیسیٰ جان، شنکر اور ان کا کوئی چالیس ساتھی تھا۔ وہ سب کا سب بڑی گنوں سے مسلح تھا۔ کچھ کے پاس تو "جی تھری" بھی تھا۔ ام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انہوں نے بارش کے مافق گولی برسایا بھائی صاحب۔ بیٹھے بٹھائے سب کو بھون ڈالا۔ ام ادھر گھوڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ ام نے کھانے پینے کے برتنوں کو ایسے اچھلتے دیکھا جیسے بھاڑ پر مکئی کا دانہ اُچھلتا ہے۔ خدا کا پناہ، وہ سب کا سب وحشی ہو رہا تھا۔۔۔"

اس شخص کی بات ختم ہوئی تو میں نے ان لوگوں کو بتایا

کہ عیسیٰ اور شنکر نے کچھ لوگوں کو ایک اندرونی سُرنگ میں بند کر کے زہریلی گیس چھوڑ دی ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں میں سے کوئی زندہ ہو اور اسے ہماری مدد کی ضرورت ہو۔

لشکر خاں کا ساتھی ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ "او خدایا! تو یہ گندھک کا بُو ادھر سے ہی آرہا ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا "آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں سُرنگ کا دہانہ کھولنا ہے۔" میں مڑ کر اندرونی سُرنگ کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد وہ سب میرے پیچھے آئے۔ بڑی سُرنگ میں کچھ آگے جانے کے بعد ان میں سے کئی بُری طرح کھانسنے لگے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کپڑوں سے منہ ڈھانپ لیں۔

پتھر کو اس کی جگہ سے ہلانا مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ اب ہم نو افراد تھے۔ کوشش کرتے تو کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا۔ میں نے رائفل بردار شخص سے کہا کہ وہ بڑی سُرنگ کے دہانے پر واپس چلا جائے اور کوئی خطرہ محسوس کرے تو فوراً اطلاع دے۔ باقی افراد کے ساتھ میں اس تخروطی پتھر سے اُلجھنے لگا۔ پہلے ہم خالی ہاتھ جتے رہے پھر اس کوشش میں موٹی لکڑیاں، بندوقیں اور ڈنڈے وغیرہ لیور کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ آخر پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا۔

رائفل سونتے میں اندر داخل ہوا "ہیڈ باورچی" نے جو خاصا صحت مند بھی تھا، ہمت کی اور رائفل لے کر میرے پیچھے ہی پیچھے اندر آگیا۔ باقی لوگ باہر کھڑے رہے۔ میں نے معصوم بشارت کی لاش اٹھائی۔ وہ مر کر بھی پھول کی طرح ہلکا تھا۔ اس کا منہ کرب ناک انداز میں کھلا تھا اور ننھی منی آنکھیں بڑی حیرت سے کسی نامعلوم نکتے پر مرکوز تھیں جیسے سوچ رہی ہوں کہ کیا یہی زندگی ہے؟ اب مجھے اس معصوم کی ماں بھی دکھائی دے گئی۔ یقیناً وہ بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر گری تھی اور بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی لاش چند گز دور ایک پتھر کی اوٹ میں پڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا تھام رکھا تھا جیسے سینے میں رُکی ہوئی زہریلی ہوا سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی ہو۔ دہانے کے بالکل پاس مجھے وہ تار دکھائی دیے جو تار جل جانے کے بعد سفید راکھ کے ساتھ زمین پر پڑے رہ جاتے ہیں۔ ان تاروں اور لکڑی کے ادھ جلے ٹکڑوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے یہاں ایک بڑا الاؤ دہک رہا تھا۔ اس الاؤ پر گندھک کے علاوہ "الکوہروس" یا اسی قسم کا کوئی دوسرا مادہ پھینک کر زہریلی گیس پیدا کی گئی تھی اور اس گیس نے سُرنگ میں موجود افراد کو اذیت ناک موت سے دوچار کر دیا تھا۔

اب تک مجھے دو لاشیں دکھائی دی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ ابھی کئی اور ہولناک مناظر دیکھنے پڑیں گے۔ شنکر ٹھکرا اپنی جس سفاکی کے لیے مشہور تھا وہ سفاکی اس سُرنگ کے چپے چپے سے ہویدا تھی۔ فرزانہ اور دیگر افراد کے بیانات سے سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ باہر کھلے میدان سے جان بچا کر سُرنگ میں آنے والے لوگ اس بغلی سُرنگ میں گھس گئے تھے۔ یقیناً انہوں نے اندر سے فائرنگ بھی کی تھی۔ (مختلف گولیوں کے خول پوری سُرنگ میں بکھرے ہوئے تھے) شنکر ٹھکرا جیسا عیّار بخوبی جانتا تھا کہ دشمن کے تعاقب میں اندر گھسنا خطرناک ہے۔ وہ دہانے پر رہا اور پناہ لینے والوں کو للکارتا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آئیں۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو اس نے اپنی فطرت کے مطابق ایک بے رحمانہ فیصلہ کیا۔ دہانے پر زہریلا کیمیائی مادہ سُلگا کر سُرنگ بند کر دی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سُرنگ بند کرنے کے بعد کیمیائی مادہ اندر پھینکا گیا ہو۔ دہانے پر پتھر رکھنے کے باوجود اتنا خلا ضرور موجود تھا کہ جلتے ہوئے تار اور لکڑیاں وغیرہ اندر پھینکی جا سکتی تھیں۔۔۔

بشارت کی لاش کو اس کی ماں کے پاس لٹا کر میں نے دونوں پر اپنی چادر پھیلا دی اور آگے بڑھا۔ چند قدم دور مجھے مزید تین لاشیں دکھائی دیں۔ یہ تینوں لشکر خاں کے ساتھی تھے اور دم گھٹ کر اذیت ناک موت کا شکار ہوئے تھے۔ ان کی رائفلیں اور پگڑیاں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ گولیوں کے بہت سے خول بھی تھے۔

ان لاشوں کو پھلانگ کر میں آگے بڑھا تو ایک لرزہ خیز منظر دیکھنے میں آیا۔ سُرنگ کے ایک شگاف کے سامنے قریباً دس لاشیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر شمع کے گرد بکھرے ہوئے پروانوں کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ وہ شگاف شمع کے مانند تھا اور اس میں سے آنے والی تازہ ہوا کے طلب گار وہ پروانے تھے جو دامن میں ناکامی سمیٹ کر راہیٔ اجل ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی زبانیں منہ سے باہر تھیں اور آنکھیں ہیبت ناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ یہ سوراخ اتنا کشادہ نہیں تھا کہ معمولی جسامت کا شخص بھی اس میں سے گزر سکتا لیکن ایک تنومند شخص نے اس میں سے گزرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اس کا بالائی دھڑ عجیب بے ڈھنگے انداز سے سوراخ میں پھنسا ہوا تھا۔ شاید اس کے پھنسنے کے بعد ہی باقی لوگوں کی سانسیں مختصر ہوئی تھیں۔

کوئی اخباری فوٹوگرافر اس منظر کی تصویر لیتا تو وہ تصویر سنسنی خیز تصویروں کے بین الاقوامی مقابلے میں یقیناً کسی

انعام کی مستحق ٹھہرتی۔ بڑا دلدوز منظر تھا یہ۔ میں زیادہ دیر اس منظر پر نگاہ نہ رکھ سکا اور کسی زندہ انسان کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ میرے ساتھ آنے والا شخص دیوار کی طرف منہ کیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی آواز سُرنگ

میں گونج کر ایک ہولناک تاثر دے رہی تھی۔ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں مجھے دو لاشیں مزید نظر آئیں۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور ایک نوجوان لڑکا۔ ان کے جسم زندگی کی رمق سے خالی ہو چکے تھے۔ اس سُرنگ میں قریباً ستر لاشیں تھیں۔ لشکر خاں یا کبیر شاہ ان میں شامل نہیں تھے۔ میرے دل میں امید پیدا ہونے لگی کہ شاید وہ زندہ بچ گئے ہوں لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے بچے ہوں گے۔ سُرنگ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو واحد شگاف میں نے دیکھا تھا اس میں سے تین چار سال کا بچہ تو پھنس پھنسا کر نکل سکتا تھا' بالغ آدمی نہیں۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ دونوں اس پختہ قبر میں گھسے ہی نہ ہوں۔ مخبر وغیرہ کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی تھی۔

دہانے کا پتھر سرک جانے سے نسبتاً تازہ ہوا تیزی سے سُرنگ میں آ رہی تھی۔ دھواں باہر نکل گیا تھا اور بُو بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ دہانے پر کھڑے افراد میں سے چند اندر آ گئے تھے اور لاشوں کو چادروں سے ڈھک رہے تھے۔ ان کی رائفلیں اور متعلقہ اشیا ایک طرف اکٹھی کی جا رہی تھیں۔ موقع پر موجود افراد نے غیرارادی طور پر مجھے اپنا "لیڈر" تسلیم کر لیا تھا اور ہدایات کے لیے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں انہیں کام کرتے چھوڑ کر سُرنگ سے باہر آ گیا اور پھر بڑی سُرنگ کے دہانے پر کھڑے ہو کر میں نے ایک بار پھر ان دونوں کو آوازیں دیں۔ میری آواز پتھریلے نشیب و فراز میں دور تک گونجی اور کوئی جواب لیے بغیر واپس آ گئی۔ میرے پکارنے کا صرف اتنا نتیجہ نکلا کہ قریبی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی فرزانہ دوڑ کر میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس کی آنکھوں کو گرد و پیش کے اندوہناک منظر سے بچانے کے لیے واپس جھاڑیوں میں بھیج دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں محفوظ رہے گی۔ پھر دل کڑا کر کے میں ڈھلوان سے اُترا اور اس لاشوں بھرے میدان میں گھومنے لگا جسے کل رات سُرخ مشعلوں نے خوبصورت انداز میں گھیر رکھا تھا۔

سورج اب کافی بلندی پر آ گیا تھا۔ موت کے مناظر زیادہ وضاحت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے تھے۔ دو جنگلی بلیاں اس پتھر کے پاس بیٹھی تھیں جسے کل رات جنڈو نے ایک

ہاتھ سے اٹھا کر دکھایا تھا۔ ان بلیوں کی للچائی نظریں ادھر بکھری ہڈیوں پر تھیں۔ چند کوّے بڑی شانِ لاتعلقی سے لاشوں پر بیٹھے تھے۔ میں نزدیک گیا تو وہ پھڑپھڑا کر اُڑ گئے۔ میری نگاہ ان کا تعاقب کرتے ہوئے آسمان پر چلی گئی۔ دور بہت اوپر صاف شفاف نیلگوں فلک پر گدھ منڈلانا شروع ہو گئے تھے۔ گدھ جو موت اور ویرانی کی علامت ہے۔ اور جس کا سایہ آج پورے کرۂ ارض پر پھیل رہا ہے۔

میں دھیرے دھیرے لاشوں میں گھومنے لگا۔ مجھے لشکر خاں اور کبیر شاہ کی تلاش تھی اور یہ ایسی تلاش تھی جس میں تلاش کرنے والا تلاش کے ساتھ ساتھ اپنی ناکامی کی دعا بھی مانگتا رہتا ہے۔ میں بھی ہر اوندھی لاش سیدھی کرنے سے پہلے اپنا دل کڑا کر لیتا تھا۔ چند قدم آگے الٹی پڑی ایک دیگ کے پاس چار پانچ اکٹھی لاشیں دکھائی دیں۔ وہ سب اوپر نیچے پڑے تھے۔ جسم چھلنی تھے اور زخموں سے بہنے والا خون دسترخوان پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے انہیں الٹ پلٹ کر چہرے شناخت کیے۔ کوئی شناسا صورت دکھائی نہیں دی۔ میں اٹھنے ہی کو تھا کہ بُری طرح چونک گیا۔ ایک شخص کی ٹھوڑی دیکھ کر میری رگوں میں دوڑتا خون سنسنا اٹھا۔ خوبصورت گڑھے والی یہ ٹھوڑی میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے اس شخص کو کھینچ کر لاشوں تلے سے نکالا اور ایک پگڑی سے اس کا خون آلود چہرہ صاف کیا۔ میرے سامنے لشکر خاں پڑا تھا۔ خون کے جمے ہوئے لوتھڑوں میں سے اس کا چہرہ یوں برآمد ہوا تھا جیسے کیچڑ میں سے کوئی چمکدار روحانی چیز نکل آئے۔

"لشکر خاں۔ لشکر خاں" میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ خون آلود سینے سے کان لگایا۔ سینے میں دھڑکن کا ارتعاش موجود تھا جیسے کسی بہت گہرے کنوئیں میں ذرا سا پانی چمکتا ہے۔ زندگی کہیں بہت گہرائی میں لشکر خاں کے اندر ہلکورے لے رہی تھی۔

"لشکر خاں۔ لشکر خاں" میں نے اسے آواز دی۔ میرے بے قرار ہاتھ اس کا جسم ٹٹول رہے تھے۔ اس کا لباس خون سے اکڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھرا اور اٹھا کر لاشوں سے دور لے گیا۔ اس کی جگہ لاشوں میں نہیں زندہ انسانوں میں تھی۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اس جیسے لوگوں کو زندہ رہنا چاہیے تھا۔ ایک ہموار جگہ پر لٹا کر میں نے لشکر خاں کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم میں پانچ گولیاں تھیں۔ خوش قسمتی

تھی کہ ان میں سے تین گولیاں اس کے بائیں بازو میں ۔ت ہوئی تھیں۔ ایک ران میں تھی اور ایک پہلو میں۔ رں کے نیچے پڑے رہنے سے اس کا دم گھٹ گیا تھا جس کا ۔ت اس کے نیلگوں ہونٹ اور اوپر کو چڑھی ہوئی آنکھیں

ہے۔ میں نے اس کے منہ سے منہ لگا کر مصنوعی تنفس ہم کیا تو اس کے سینے میں دھڑکن کا ارتعاش بڑھتا ہوا ں ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد یہ دھڑکن صاف طور پر محسوس ہونے لگی۔

میری آواز سن کر سُرنگ سے تین چار افراد باہر نکل ے تھے اور اب میرے گرد کھڑے ترحم آمیز نظروں سے خاں کو دیکھ رہے تھے۔ لشکر خاں کے بچ نکلنے کی وجہ غالباً تھی کہ اس کا جسم لاشوں کے نیچے دبا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے بُری طرح لتھڑ گیا تھا۔ حملہ آور اسے شناخت نے میں ناکام رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ساتھیوں کے ۔بغل سُرنگ میں گھس گیا ہے۔ وہ دہانے سے باہر کھڑے ۔ا سے للکارتے اور "مشتعل" کرتے رہے تھے' پھر انہوں ۔دہاں زہریلی گیس چھوڑ دی تھی۔

اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ لشکر خاں ۔زخموں سے رِستا ہوا خون روکا جائے۔ ہم نے جل جل کر ۔ول پر راکھ کی پٹیاں باندھیں اور اسے ایک نرم بچھونے پر ۔ٹا لٹا دیا۔ اب اس کی حالت بہتر نظر آ رہی تھی۔

حقیقت وہ دم گھٹنے سے نیم مُردہ ہو رہا تھا ورنہ اس کے ۔وں کی حالت بہت سنگین نہیں تھی۔ صرف ایک پیٹ کا ۔م تھا جسے فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت تھی۔۔۔۔ ہم اس ۔ت پارہ چنار جانے والی پختہ سڑک سے صرف ایک گھنٹے کی ۔افت پر تھے۔ لشکر خاں کسی طرح پارہ چنار اسپتال پہنچ جاتا ۔وئی وجہ نہیں تھی کہ اسے زندگی سے ہاتھ دھونے ۔تے۔ اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ لشکر خاں کو ۔انے کے لیے ہر وہ کوشش کروں گا جو میرے اختیار میں ۔ے۔ میں بہت لاشیں دیکھ چکا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں میں ۔کئی زخمیوں کو اسپتال اور آپریشن تھیٹر سے دور اس ۔جل پھول" ویرانے میں زندگی کی جدوجہد کرتے اور ہارتے ۔جا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ لشکر خاں کو یوں ہارنے نہیں ۔ں گا۔ اسے آپریشن تھیٹر پہنچاؤں گا۔ اس کا ہاتھ دستِ ۔ا میں دوں گا۔ پھر آگے اس کی قسمت۔

۔یں دوڑتا ہوا اس مقام تک پہنچا جہاں گھوڑے بندھے ۔ے گھوڑوں کی تعداد گھٹ کر تیس چالیس رہ گئی تھی اور

ان میں سے کسی جانور کو بھی شاندار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' عیسیٰ جان اور شنکر تمام صحت مند گھوڑے اور اچھی رائفلیں مالِ غنیمت کے طور پر لے گئے تھے۔ میں نے موجود گھوڑوں میں سے تین اچھے گھوڑے منتخب کیے اور ان کی لگامیں تھام کر لشکر خاں کے پاس آ گیا۔ ایک گھوڑے کی پشت پر فوراً گدا تیار کیا گیا اور بے ہوش لشکر خاں کو اس پر اوندھا لٹا کر بندھنوں سے سہارا دے دیا گیا۔ دوسرا گھوڑا میں فرزانہ نامی اس عورت کے لیے لایا تھا جو جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی لیکن جب میں نے جھاڑیوں میں دیکھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اسے ادھر اُدھر تلاش کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی اور بے وقوفی سے بھاگی ہے۔ غالباً ایسا خوف کی زیادتی سے ہوا تھا۔ ایک قطعی محفوظ پناہ گاہ میں خود کو غیر محفوظ جان کر وہ اَن دیکھے راستے پر نکل گئی تھی۔ اب اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا تھا یا "نہیں ہوتا تھا" یہ اس کی اپنی ذمے داری تھی۔

اس دوران چار ایسے مزید افراد موقع پر پہنچ گئے جو فائرنگ کے وقت جان بچا کر جنگل میں نکل گئے تھے۔ یہ چاروں لشکر خاں کے ساتھی تھے۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے درختوں میں چھپ کر یہاں کی صورتِ حال دیکھ رہے تھے اور اب سامنے آ گئے تھے۔ وہ چاروں مسلح تھے۔ انہوں نے بھی عیسیٰ اور شنکر کے حملے کا وہی نقشہ کھینچا تھا جو اس سے پہلے

دوسرے لوگ پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فائرنگ شروع ہونے سے پہلے بہت سے لوگ ایک دوسرے سے سر چکرانے کی شکایت کر رہے تھے اور کئی تو نڈھال ہو کر لیٹ بھی گئے تھے۔ چنڈال کے پاس سے کسی نے پکار کر کہا تھا کہ قہوے میں کچھ ملا دیا گیا ہے۔ کوئی بھی قہوہ نہ پیئے' اس کے چند ہی سیکنڈ بعد اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

اس خوفناک شب خون سے بمشکل پچیس تیس افراد بچ سکے تھے اور ان میں زیادہ تر وہ تھے جو خواب آور قہوہ پینے سے محفوظ رہے تھے۔ ان چاروں افراد نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ حملہ آور کچھ افراد کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا۔ جو گھوڑے یہاں رہ گئے تھے ان میں سے کئی ایک کی راسیں کٹی ہوئی تھیں۔ راسوں کے یہ ٹکڑے یقیناً قیدیوں کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔

میں نے موقع پر موجود افراد سے کہا کہ وہ جہاں جہاں جانا چاہتے ہیں فوراً روانہ ہو جائیں اور اگر جائے واردات پر موجود اشیا میں سے وہ کوئی شے لے جانا چاہتے ہوں تو اپنی ذمے داری پر لے جائیں۔

ان میں سے کسی کی نگاہ اس لاوارث مال پر نہیں تھی۔ وہ سب کے سب دکھی اور سوگوار نظر آتے تھے۔ لشکر خان کے ساتھیوں میں سے دو افراد میرے ساتھ جانے کے خواہش مند تھے' مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا' وہ اپنی حفاظت کے خود ذمے دار تھے۔ پختہ سڑک پر پہنچ کر میں ان سے علیحدہ ہو سکتا تھا۔ ان کی ہمراہی سے میں یہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا کہ وہ کبیر شاہ کے کتوں کو سنبھال سکتے تھے۔ کتوں کے گلے میں طویل زنجیریں تھیں۔ میں نے دو افراد کو وہ دو کتے سونپ دیے۔ دونوں نے گھوڑوں پر بیٹھ کر زنجیریں سنبھال لیں۔ میں نے لشکر خان والے گھوڑے کی راسیں اپنے گھوڑے کی زین سے منسلک کر لیں۔

گھوڑے کو ایڑ لگانے سے پہلے میں نے ایک بار دور تک بکھرے ہوئے مردہ جسموں کا جائزہ لیا۔ کسی جنگلی فلم کا منظر لگ رہا تھا۔ لگتا تھا فلم بندی ہو رہی ہے۔ ابھی ہدایتکار سیٹی بجائے گا اور تمام مردے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں گے۔ میری نگاہ نائیکہ ثریا بائی پر جا ٹکی۔ اس کا ادھ جلا جسم بے ڈھنگے پن سے اوندھا پڑا تھا۔ سازندوں کی لڑائی میں ڈڈو یعنی مینڈک واقعی پھڑک کر رہ گئے تھے۔ پرسوں رات اس نے کھوہ میں مجھے اپنے مرحوم شوہر کا ایک پنجابی شعر سنایا تھا۔

لوکوں پہلے ڈب جاندا' بنیرا ایدی قسمت
بندہ کی اے یارو' اک سرگی دا تارا اے

یعنی انسان فجر کا تارا ہے۔ اپنی مختصر عمر تاریکی میں گزارتا ہے اور روشنی کا چہرہ دیکھنے سے پہلے ڈوب جاتا ہے۔ اپنے خوش فکر شوہر کی طرح ثریا بائی بھی ڈوب گئی تھی۔ بحیثیت عورت تو شاید وہ بہت پہلے مر چکی تھی۔ ایک نائیکہ بھی دم توڑ گئی تھی۔

ٹھیک نو بجے ہم پکا خیلہ نام کے اس خونی مقام سے پختہ سڑک کی جانب روانہ ہو گئے۔ زخمی کتا سلو کی بانسبت خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ جانوروں میں قوت برداشت انسان سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب شعور کی عدم موجودگی بھی ہے۔ وہ صرف تکلیف محسوس کرتا ہے، تکلیف کے ساتھ وابستہ خدشات اسے تنگ نہیں کرتے۔ اگر اس کے جسم پر کوئی پھوڑا ہے تو وہ صرف پھوڑے کی اذیت جھیلے گا۔ اسے یہ فکر دامن گیر نہیں ہو گی کہ یہ پھوڑا نہ ہو۔ نہ ہی وہ پھوڑے کی شکل و صورت دیکھ کر [illegible] ہو گا اور نہ نادان تیمارداروں کی باتیں اس کا کلیجہ کھائیں گی۔ کچھ یہی حال چھوٹے بچے کا بھی ہوتا ہے۔ زخمی کتا اپنی تکلیف کی سنگین نوعیت سے بے خبر ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا اور چوکس نظر آتا تھا۔ لشکر خان والے گھوڑے کی راسیں میرے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی تھیں اور اس حرام گھوڑے کو رواں رکھنے کے لیے مجھے راسوں کو جھٹکا دینا پڑتا تھا۔

ہم نو بجے چلے تھے۔ گھوڑے معمولی رفتار سے رہے تو بھی گیارہ بجے تک ہم پختہ سڑک پر پہنچ سکتے تھے۔ خان مسلسل بے ہوش تھا۔ بے ہوشی میں کسی وقت اس کے حلق سے عجیب سی خراہٹ بلند ہوتی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں اس کی سانس کی نالی پر دباؤ نہ ہو۔ گھوڑا موڑ میں نیچے اترا اور اس کی مڑی ہوئی گردن سیدھی کی۔ اس کی سانسیں قدرے ہموار ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ جسم آگ کے مانند تپ رہا ہے۔ زخمی ٹانگ بھی متورم ہوتی جا رہی تھی۔ پختہ سڑک کی طرف ہم نصف سے زائد فاصلہ طے کر چکے تھے' مجھے امید تھی کہ اگلے پندرہ بیس منٹ میں اس کھوہ تک پہنچ جائیں گے جہاں کبیر شاہ کے پاگل [illegible] نے ہمیں پورے دو دن قید رکھا تھا اور بعد میں [illegible] مرزا منگول پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ مجھے چوکنا پڑا۔ دائیں جانب میدانی کے پہلوؤں میں کچھ [illegible] سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے چند افراد دبے پاؤں چل رہے ہیں۔ میں نے کندھے سے آٹومیٹک رائفل اتار لی۔ چھٹی حس نے ایک سنگین خطرے سے خبردار کیا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید عینی جان اور لشکر سے ملاقات ہونے والی ہے۔ سینے میں سلگتی ہوئی آگ ایک دم بھڑک کر الاؤ بن گئی۔ میں مرنے مارنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ کبیر شاہ کے کتے ایک طرف دیکھ کر غراتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی دُمیں تیزی سے گردش میں تھیں۔

"ہینڈز اپ۔" اچانک میرے عقب سے ایک گرجدار آواز ابھری۔

میں نے گھوم کر دیکھا۔ ایک تناور درخت کی اوٹ سے رائفل کی نال جھلک رہی تھی۔ "خبردار [illegible]" آواز دوبارہ ابھری اور کسی نے پشتو میں ایک طویل دھمکی دی۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ یہ دھمکی شکاری کتوں کے بارے میں ہے اور دھمکانے والے نے کہا ہے کہ کتوں کو قابو میں رکھیں۔

اس اثنا میں دائیں بائیں سے بھی چند افراد نمودار ہو گئے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ان میں سے ایک موٹا تازہ شخص لیوی کے لباس' سیاہی مائل شلوار قمیص میں تھا جبکہ باقیوں نے عام کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ معمولی اشتعال پر وہ بے دریغ گولی چلا دیں گے۔ لیوی کی وردی والا موٹا تازہ شخص مجھے ان ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن سے ایک تھانیدار کے ہاتھوں پکڑے جانے والے قاتل کو دیکھتا ہے۔ شاید اس خشونت کی ایک وجہ میرا لباس بھی تھا۔ زخمی لشکر خان کو گھوڑوں کے درمیان سے نکالتے ہوئے خون کے دھبوں نے میرا لباس رنگین کر دیا تھا۔ قمیص تو میں نے چادر میں چھپا لی لیکن شلوار کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا' ابھی ابھی چار پانچ افراد کو تہ تیغ کر کے آیا ہوں۔

اس وقت میں کسی پھڈے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ساتھ ایک زخمی تھا اور مجھے اسے جلد از جلد اسپتال پہنچانا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو آنکھ کے اشارے سے سمجھایا کہ وہ کتوں کی زنجیریں چھوڑنے کی حماقت نہ کریں۔ حساس جانور حالات کی کروٹ کو سمجھ گئے تھے اور ان افراد پر جھپٹنے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے۔ وہ بار بار زنجیروں کو جھٹکا دیتے تھے اور درختوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

"رائفل پھینک دو۔" اس مرتبہ موٹے تازے لیوی والے نے اردو میں ہدایت جاری کی۔ وہ میرے خدوخال سے سمجھ گیا تھا کہ میں مقامی نہیں ہوں۔ وہ بے وقوفی کی حد تک جوشیلا نظر آتا تھا۔ ایسے لوگوں کے سامنے محتاط رہنا ہی عقلمندی ہوتی ہے' خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب ایسا شخص مسلح بھی ہو۔ میں نے رائفل کندھے سے اتاری اور زمین پر پھینک دی۔ لشکر خان کے دونوں ساتھیوں نے بھی میری تقلید کی۔ دو افراد پھرتی سے آگے بڑھے اور رائفلیں اٹھا کر واپس چلے گئے۔

"اور کوئی ہتھیار تو نہیں ہے تمہارے پاس؟" حوالدار نے کڑک کر پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم پر یہ رائفلیں کیوں تان رکھی ہیں تم نے؟"

"اس کا جواب ام تم کو چوکی پہنچ کر پوری تفصیل سے دے گا... خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ گرج کر بولا "اپنا ہاتھ سر سے اونچا رکھو۔"

میں نے اس کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم لیوی والے ہو تو ہمارا راستہ روکنے کے بجائے تمہیں ہماری مدد کرنی چاہیے۔ ہمارے ساتھ یہ شخص شدید زخمی ہے۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔"

وہ بولا "اسپتال بھی پہنچ جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ کون ہے تم اور کہاں سے آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "شکار کے لیے نکلے تھے۔ راستے میں کچھ مسلح افراد نے روک لیا۔ گھوڑے وغیرہ چھیننا چاہتے تھے ہم سے۔ ہم نے مزاحمت کی تو گولی چلا دی۔ ہم نے بھی جواب دیا مگر ہمارے اس ساتھی کو برسٹ لگ گیا۔ اب اسے پاڑہ چنار اسپتال لے جا رہے تھے ہم۔"

"بہت اچھے۔" حوالدار نے مٹکا سا سر ہلایا۔ "ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتا ہے۔ بڑا سورما ہے تم؟" پھر اپنے ایک نائیک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں گل جان... دیکھا تم نے' کیسا نر آدمی خرگوشوں کے پیچھے بھاگ کر ضائع ہو رہا ہے۔ اسے تو لیوی میں ہونا چاہیے۔"

"بالکل جی... لے چلیں انہیں چوکی۔" نائیک نے لقمہ دیا۔

حوالدار چند لمحے ہمیں خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر سب کو ایک مشترکہ گالی دے کر بولا۔ "چلو... اترو نیچے... اوندھے لیٹ جاؤ زمین پر... خبردار کوئی چالاکی نہیں چلے گا۔ اپنا نام نصیبت خان ہے... ایک سیکنڈ میں بندے کا ناریل توڑ دیتا ہے ام۔"

میں نے تحمل سے کہا۔ "نصیبت خان صاحب! آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم آپ کے غصے کے نہیں ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ شخص ڈاکوؤں کے ہاتھوں زخمی ہوا ہے

اور اگر جلدی اسپتال نہ پہنچ سکا تو دم توڑ جائے گا۔ یہ دیکھیں کیسے نیلے ہونٹ ہو رہے ہیں اس کے۔"

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "ہونٹ تو تم سب کا نیلا ہوگا بچہ جی۔۔۔ اگر ہمارا ہدایات نہ مانے گا تو ابھی نیلا ہو جائے گا۔۔۔ چلو نیچے اترو۔ ہم کہتا ہے جلدی کرو۔"

میں نے کہا "صوبیدار مرجان کو جانتے ہو تم؟"

"ہم کسی مرجان ورجان کو نہیں جانتا۔ ہم صرف قانون کو جانتا ہے۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ "تم بس نیچے اترو اور اوندھے لیٹ جاؤ زمین پر، جلدی کرو شاباش۔" اس کا لہجہ سنگین سے سنگین تر ہو رہا تھا۔

اچانک "بیپ۔۔۔ بیپ" کی مدھم آواز ابھری۔ یہ وائرلیس سگنل تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر چھوٹا سا وائرلیس سیٹ حوالدار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ حوالدار نے "ہیلو" کہہ کر کسی سے گفتگو شروع کی۔ یہ ساری گفتگو گاڑھی پشتو میں تھی۔ میری سمجھ میں صرف اتنی ہی بات آئی کہ حوالدار نصیبت خاں اپنے کسی افسر کو ہماری گرفتاری کی اطلاع دے رہا ہے۔ اس کے لہجے میں جوش تھا اور سرخ چہرہ مزید سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

وائرلیس پر گفتگو کرنے کے بعد حوالدار کا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ اس کے ماتحتوں نے باقاعدہ کھینچ کر ہمیں گھوڑوں سے اتار لیا اور جامہ تلاشی لینے لگے۔ خوش قسمتی سے میری پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر بچ گیا تھا۔ یہ خنجر میں ربڑ کی ایک کٹ میں خاص تکنیک کے ساتھ رکھتا تھا اور جب تک خصوصی طور سے پنڈلی کو ٹٹولا نہ جاتا اس کا پتا نہیں چلتا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک ڈیزل انجن کی گھڑ گھڑ سنائی دی اور میں نے لیوی کی ایک بڑی جیپ درختوں میں رکتے دیکھی۔ جیپ پر کم و بیش دس افراد سوار تھے۔ ان میں سے دو لیوی کی مخصوص وردی شلوار قمیص میں تھے جبکہ باقی سادہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس بشمول چینکی جیسی رائفلیں تھیں۔ آناً فاناً سب نے ہمیں گھیر لیا۔ ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے اور دھکیل دھکیل کر جیپ میں سوار کرا دیا گیا۔ چاروں گھوڑے بھی لیوی والوں نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ ان کا رویہ بے حد کرخت تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اتنی جلدی میں نے رائفل سے محرومی کیوں قبول کر لی۔۔۔ یہ لوگ کوئی بات سننے پر تیار ہی نہیں تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیں یہاں سے سیدھا پھانسی گھاٹ پر لے جائیں گے یا فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیں گے۔

جیپ پر آنے والوں میں ایک اونچا لمبا شخص تراب خاں جمعدار تھا۔ نوجوانی میں ہی اس کا آدھا سر گنجا ناک عقاب کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ میں نے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تراب خاں صاحب! ہم بڑے ہیں۔ سدہ میں صوبیدار مرجان صاحب سے رابطہ کریں۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم کون ہیں۔"

"کون صوبیدار مرجان؟" نوجوان تراب خاں کھانے والے لہجے میں بولا۔ "ہم سدہ کے کسی مرجان کو نہیں جانتا۔" اس نے مجھے پسٹل کی نال سے دھکیل دیا اور کھٹاک سے جیپ کا عقبی دروازہ بند کر دیا۔

میرا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے جیپ کے اندر سے پکار کر کہا "جمعدار صاحب! زخمی کی حالت ٹھیک نہیں۔ اگر اسے کچھ ہوا تو یاد رکھنا ساری ذمے داری تمہاری ہوگی۔۔۔"

میری آواز گھڑگھڑاتے انجن کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ جیپ نے ایک جھٹکے سے ناہموار راستے پر اچھلنا شروع کر دیا۔

O☆O

قریباً پندرہ منٹ کے دھواں دھار سفر کے بعد جیپ پختہ سڑک پر پہنچ گئی اور پارہ چنار کے بجائے سدہ کی جانب روانہ ہوگئی۔ جیپ کے عقب میں دو نشستیں لمبائی کے رخ آمنے سامنے تھیں۔ ایک نشست پر ہم تینوں بیٹھے تھے اور دوسری پر لیوی کے دو مسلح جوان۔ ان کی انگلیاں خودکار رائفلوں کے ٹریگر پر تھیں۔

پختہ سڑک پر نصف گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد جیپ ایک ناہموار پتھریلے راستے پر مڑی اور پانچ دس منٹ بعد ایک احاطے میں جا کر رک گئی۔ یہ سدہ کی کوئی پکٹ (چوکی) تھی۔ سامنے لکڑی کے ستونوں والا ایک برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں کیوواں گیلے پڑے تھے اور موٹے تنوں والے پہاڑی پودے نظر آ رہے تھے۔ احاطے کے عین وسط میں پھلاہی کا بڑا سا درخت تھا۔ اس درخت کی ایک بلند شاخ سے میلا سا رسا جھول رہا تھا۔ یہ رسا کسی گھر کے آنگن میں ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ شاخ سے جھولتا رسا کسی جھولے کا ہے جس میں بچے بیٹھتے ہیں اور اپنی آواز قلقاریوں سے بڑوں کا من لبھاتے ہیں۔۔۔ لیکن یہ چوکی تھی۔ یہاں جھولے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ملزموں کو الٹا لٹکایا جاتا تھا اور چھترول کر کے ان سے جرم کرایا جاتا تھا۔ یہ رسا یقیناً اسی مقصد کے لیے آویزاں کیا گیا تھا۔ مجھے پنجاب کے دیہی تھانوں اور

اس "پکٹ" میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ وہی خوف و ہراس کی فضا، وہی کالی کلوچ، وہی سُست الوجود اور بہت زمرم عملہ، اگر کوئی فرق تھا تو وہ زبان اور وردی کا تھا۔ ہر ریس "میں یہ جانے پہچانے سنا ظر دیکھ کر طبیعت خوش بھی ہوئی اور صاف بھی!

جمعدار صاحب تو ہمیں "پکٹ" میں اتارتے ہی جیپ لے کر کسی کام سے چلے گئے اور ہم بلا شرکت غیرے حوالدار صاحب کے حوالے ہو گئے۔ کچھ اتو کھی سی شے تھا یہ حوالدار بھی۔ حوالدار اکثر موٹے اور خوش طبع ہوتے ہیں۔ نصیبت خاں بھی ان اوصاف پر پورا اترتا تھا۔ ہماری گرفتاری کے وقت اس کے چہرے پر جو کرختگی نظر آئی تھی وہ اب رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب نارمل انداز میں باتیں کر رہا تھا اور آنکھوں کی سفاک چمک بھی ناپید ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کارکردگی سے بالکل مطمئن تھا۔

ہمیں برآمدے سے گزار کر وہ ایک ہال نما کمرے میں لے آیا۔ یہاں فرش پر بوسیدہ چٹائیاں بچھی تھیں۔ ہمیں چٹائیوں پر بٹھا کر وہ خود ایک کرسی پر براجمان ہو گیا اور کچھ سرکاری کاغذوں پر خانہ پری کرنے لگا۔ اس دوران اس نے پشتو میں اپنے عملے کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہدایات دوپہر کے کھانے کے متعلق تھیں۔ ان میں "تہ کا" یعنی مرغ اور "منترہ" یعنی سیب وغیرہ کا ذکر تھا اس لیے یہ بات تو واضح تھی کہ کھانا ہمارے لیے نہیں ہے۔ خانہ پری کے بعد حوالدار ایک اندرونی کمرے میں گیا اور کپڑے بدل کر آ گیا۔ اب وہ وردی کی جگہ کھلے ڈلے لباس میں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے شبہ ہوتا تھا کہ جمعدار صاحب جلد واپس نہیں لوٹیں گے لہٰذا نصیبت خاں خود کو "ایزی" محسوس کر رہا تھا اور ایک کارنامہ انجام دینے کے بعد ذرا موج میلا کرنے کے موڈ میں تھا۔

ایک بہت ہی کھٹارا قسم کا ٹیپ ریکارڈر نصیبت خاں کی میز پر رکھا تھا۔ غالباً ملزموں کے بیانات وغیرہ قلمبند کرنے کے لیے تھا۔ یہ بیٹری سے چلتا تھا۔ نصیبت خاں نے اس میں ایک بوسیدہ کیسٹ ڈالا۔ اس کی کئی ناہیں گھمائیں، کئی بٹن دبائے، پھر ایک خاص زاویے پر رکھ کر تھپکیاں وغیرہ دیں اور چالو کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر سے "گھر گھر" کی آواز آنے لگی۔ میں نے سمجھا شاید وہ ہمارا بیان ریکارڈ کرنے کے چکر میں ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ چند سیکنڈ بعد ٹیپ ریکارڈر سے موسیقی کی صدا بلند ہونے لگی اور نصیبت خاں گنگنانے کی دھن پر جھولتے ہوئے میز پر انگلیاں بجانے لگا۔

اس کی تمام تر توجہ دروازے پر تھی۔ نجانے کیسے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے شدید بھوک لگی ہے اور وہ کھانے کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ اندازہ درست تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک لانس نائیک بھاری بھرکم، چکنا چکنا سا "تشاہی" اٹھائے دروازے پر نمودار ہوا اور نصیبت خاں ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کھانا کھاتے نہیں اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ نصیبت خاں بھی کھانے پر باقاعدہ حملہ آور ہوا۔ اگر محافظین قانون کے مزاج کے مطابق کھانے کی ادائیگی نہیں کی گئی تھی تو اسے "مجرمانہ حملہ" بھی کہا جا سکتا تھا۔ مجھے لگا جیسے نصیبت خاں نے ہمارے ہاتھ ابھی تک اس لیے نہیں کھلوائے تھے کہ وہ پوری تسلی سے کھانا کھانا چاہتا تھا۔ نصیبت خاں اس وقت کھانے کے آخری مراحل میں تھا جب اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ فون کسی قریبی کمرے میں رکھا تھا۔ گھنٹی سن کر مجھے پہلی بار پتا چلا کہ یہاں فون بھی موجود ہے۔ میں نے نصیبت خاں سے کہا کہ میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔

اس نے پہلے تو ٹال مٹول کی لیکن پھر نجانے دل میں کیا آئی کہ میرے ہاتھ کھلوا دیے۔ میں ایک مسلح نائیک کی نگرانی میں دوسرے کمرے میں پہنچا۔ دور دراز قصبات اور چھوٹے شہروں میں عموماً فون نمبرز مختصر ہوتے ہیں۔ صوبیدار مرجان کا نمبر بھی صرف چار ہندسوں پر مشتمل تھا اسی لیے مجھے یاد رہ گیا تھا۔ یہ نمبر انہوں نے مجھے اپنے ایڈریس کے ساتھ ہی لکھوایا تھا۔ میں نے یہ نمبر ڈائل کیا۔ کسی بچے نے پشتو میں چوں چاں کی۔ یہ مرجان صاحب کے گھر کا نمبر تھا لہٰذا یہ چوں چاں غیر متوقع نہیں تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس چوں چاں کی جگہ ایک بھاری مردانہ آواز نے لے لی۔ میں پہچان گیا۔ یہ مرجان صاحب خود تھے۔ وہ پشتو میں کلام فرما رہے تھے۔ میں نے اردو میں اپنا تعارف کرایا۔ دوسری طرف چند لمحے پُرحیرت خاموشی رہی پھر مرجان صاحب کی چیختی ہوئی سی آواز آئی۔ "او خدائی خوار! احسان الٰہی! یہ تم کہاں سے بول رہے ہو بھئی۔۔۔ وہ تمہارا ایس پی تو بڑا گرم تھا تم پر۔ شکر کرو تمہارا اس سے آمنا سامنا نہیں ہوا ورنہ وہ تمہیں قتل کر کے ضرور پھانسی چڑھ جاتا۔ کہتا تھا۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ خواہ مخواہ تمہارا دل برا ہوگا۔ ویسے تم نے بھی تو اچھا نہیں کیا۔ اسے بتائے بغیر پارہ چنار سے غائب ہو گئے اور ساتھ دونوں لڑکیاں بھی لے گئے۔ کہاں تھے اب تک تم؟" مرجان صاحب نے ایک ہی سانس میں کئی اطلاعات دیں اور کئی سوالات بھی کر دیے۔

میں نے کہا "محترم! میں اب تک تو جہاں تھا گزارا کر رہا تھا لیکن اب بڑی نامعقول جگہ پر ہوں۔ آپ فوراً پہنچیے یہاں۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

"کیا بات ہے؟ تم بہت سنجیدہ لگ رہے ہو۔" مرجان صاحب نے پوچھا۔ وہ اردو بہت صاف بولتے تھے۔

میں نے کہا "بات ہی سنجیدگی کی ہے جناب۔ اب آپ سامنے ہوں تو کچھ بتاؤں آپ کو۔"

"کہاں سے فون کر رہے ہو؟" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

"سندہ کی کوئی مضافاتی چوکی ہے یہ۔ جمعدار تراب علی انچارج ہے یہاں کا' اور اس کا حوالدار نصیبت خاں' رانی خاں کا سالا بن کر چمٹا ہوا ہے مجھ سے۔"

"اچھا تو تراب خاں کی چیک سے بول رہے ہو تم۔" مرجان صاحب کی آواز آئی۔ "لیکن پہنچے کیسے ہو یہاں؟"

میں نے کہا "یہ تو آپ پہنچیں گے تو عرض کروں گا... فی الحال اتنا جان لیں کہ لشکر خاں شدید زخمی ہے۔ میں اسے پارہ چنار اسپتال لے جا رہا تھا کہ یہ حرامی نصیبت خاں بیچ میں ٹپک پڑا۔ اب معلوم نہیں یہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہیں۔ وہ اگر جلد اسپتال نہ پہنچا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

مرجان صاحب کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ "کیا ہوا لشکر خاں کو؟ وہ تو پرسوں اچھا بھلا میرے پاس سے گیا تھا۔ کہیں.... عیسٰی جان سے تو مڈھ بھیڑ نہیں ہو گئی؟"

"یہی سمجھ لیں۔" میں نے گول مول بات کی۔ "بس آپ جلد سے جلد پہنچیں یہاں۔"

ذرا توقف کے بعد مرجان صاحب نے کہا۔ "اس ہتھنی کے بچے نصیبت خاں کو تو بلاؤ ذرا فون پر۔" ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ تراب علی اور نصیبت خاں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

میں نے قریب کھڑے لانس نائیک سے کہا۔ "حوالدار کو بلاؤ۔"

لانس نائیک میری باتیں سنتا رہا تھا اور اس کا ماتھا ٹھنکا ہوا تھا۔ وہ میری "نگرانی" بیچ میں چھوڑ کر فوراً دوسرے کمرے میں حوالدار کو بلانے چلا گیا۔ میں چاہتا تو ان لمحات میں چوکی سے فرار ہونے کی ایک بھرپور کوشش کر سکتا تھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد حوالدار نصیبت خاں توند مٹکاتا اور مونچھیں صاف کرتا فون پر آگیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں ریسیور اٹھایا اور پھر اس کا رنگ اڑتا چلا گیا۔

دو منٹ بعد چوکی میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ نصیبت خاں نے سب سے پہلے تو اپنی میز کھانے کے برتنوں سے صاف کرائی۔ عملے نے منٹوں میں شاہانہ لنچ کا کھوج کھرا وہاں سے مٹا دیا۔ پھر نصیبت خاں بھاگا ہوا گیا اور اپنے کھلے ڈھلے کپڑے اتار کر وردی پہن آیا۔ حقیقی معنوں میں اس کے چھوٹ گئے تھے۔

مجھ سے کہنے لگا "صاحب بہادر! آپ نے ام کو کیوں نہیں بتایا۔ مرجان صاحب کو ادھر مرجان صاحب نام سے کوئی نہیں جانتا۔ سب ان کو قاضی صاحب کہتا۔ اوہ خدایا۔ یہ ام نے کیا کر دیا۔ برادر۔ اب امارا عزت نوکری تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ام تم کو اللہ کا واسطہ دیتا امارا شکایت نہ کرنا۔ جو کچھ بھی ہوا غلطی سے ہوا۔ ام سے معافی کا خواستگار ہے....." پھر وہ چیخ کر اپنے ماتحت سے بولا "اوئے گل جان' کتے کے بچے! چل ان دونوں کے کھول اور تینوں صاحب لوگوں کا رائفل مائفل بھی۔ آ.... اور سارا سامان بھی جو تلاشی میں نکلا ہے۔"

گل جان لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور جلدی جلدی دونوں ہمراہیوں کے ہاتھ کھولنے لگا۔ اس دوران میری نظر احاطے پر پڑی تو ایک سنتری پھلاہی کی بلند شاخوں سے نظر آیا۔ وہ وہاں سے رسّا اتار رہا تھا۔

حوالدار ایک بار پھر میرے سامنے دانت نکالنے لگا۔ "صاحب بہادر! ام سچ بولتا ہے۔ ام آپ سے بہت شرمندہ ہے.... آپ کسی سے پوچھ لیں۔ یہاں کوئی صوبیدار صاحب کو مرجان کے نام سے نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "نصیبت خاں! تمہاری بات سے یہ لگتا ہے کہ جو شخص یہاں کسی بڑے آدمی سے تعلق نہ رکھتا ہو تم اس سے من چاہا سلوک کر سکتے ہو۔ اس کی لیے بغیر اسے الٹا لٹکا سکتے ہو۔ اور کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر سکتے ہو.... میرے خیال میں تو تم کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو۔"

حوالدار نے تڑپ کر میرے گھٹنے تھام لیے۔ "ایسا دل پر اتنا چرکا مت لگاؤ صاحب.... ام ایسا بندہ نہیں۔ آپ اکیلا ہوتا تو شاید ام آپ سے ایسا بدتمیزی نہ کرتا۔ دراصل آپ کے ساتھیوں پر ام کو شبہ ہوا تھا۔ ام سمجھا اگر یہ ڈاکو ہے تو ان سے نرمی کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ ڈاکو لوگ بڑا خطرناک ہے صاحب۔ بالکل درندے ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے انہوں نے نوے مشت میں پولیس کے دو جوانوں کو بے دردی سے مار ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ بھی خون خرابہ ہوا ہے اور سنا ہے چار پانچ آدمی

زندہ بھی جلا دیا گیا ہے۔"

حوالدار پچھلے واقعات کا رونا رو رہا تھا۔ اسے ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ صرف بارہ گھنٹے پہلے نواحی جنگل میں کیا قیامت برپا ہو چکی ہے۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بکری کی طرح منمنانا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ زخمی کہاں ہے؟"

وہ مستعدی سے بولا۔ "آپ فکر مت کریں صاحب۔ وہ اب تک اسپتال پہنچ چکا ہوگا۔ تراب علی صاحب اسی کی طرف تو گیا ہے۔"

"کون سا اسپتال ہے؟"

"یہاں پاس ہی ہے جی مین روڈ پر۔ نیا بنا ہے۔ بڑا اچھا اسپتال ہے۔"

"اور وہ جو کتے تھے ہمارے ساتھ؟"

"وہ بھی ابھی یہاں پہنچ جاتا ہے جی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" پھر وہ اپنے ماتحت کو آوازیں دینے لگا۔ "او مستے خاں.... او مستے کہاں مر گیا ہے۔ جا صاحب لوگوں کے لیے چائے لے کر آ۔ ساتھ میں پیسٹری اور بسکٹ بھی لانا۔ جا جلدی کر فٹافٹ۔"

مستے خاں گولی کی رفتار سے باہر نکل گیا۔ میں اسے روکنا چاہتا بھی تو نہیں روک سکتا تھا۔ اچانک حوالدار کا دھیان ٹیپ ریکارڈر کی طرف چلا گیا۔ وہ ابھی تک زور شور سے بج رہا تھا۔ حوالدار نے اسے بند کرنا چاہا لیکن جس طرح اس نے چلنے سے انکار کر دیا تھا' اب بند ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ حوالدار نے جلدی جلدی اس کے کئی بٹن دبائے' ناہیں مروڑیں' تھپڑ مارے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا.... بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ اسی دوران چوکی سے باہر کسی گاڑی کا شور سنائی دیا۔ حوالدار نصیبت خاں کا سرخ رنگ زرد پڑ گیا۔ رنگ کی اس "تبدیلی" سے میں نے قیافہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ مرجان صاحب کی گاڑی ہے۔

نصیبت خاں چلا کر بولا "اوئے بدبخت گل جان! دیکھو اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بند کرو اس کو۔" گھبراہٹ میں وہ اپنے ماتحت سے بھی لنگڑی اردو میں بات کر رہا تھا۔ گل جان لپک کر آیا۔ دونوں ٹیپ ریکارڈر کو الٹا سیدھا کرنے لگے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ آواز پہلے سے بلند ہو گئی۔ نصیبت خاں کے چہرے پر رنگ برنگی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ٹیپ ریکارڈر کو فرش پر پٹخ کر اس گلوکارہ کا گلا گھونٹ دیتا جس کی آواز اب پوری چوکی میں گونج رہی تھی.... بڑا شوخ و شنگ گانا تھا جس میں جذبات بھڑکا دینے والے انداز میں آہیں کھینچی گئی تھیں اور ہائے وائے کی گئی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر نصیبت خاں نے ٹیپ ریکارڈر کو دو تین بار زمین پر مارا اور جب ناکامی ہوئی تو اسے نائیک گل جان کو تھماتے ہوئے گرج کر کوئی ہدایت دی۔ غالباً یہی کہا ہوگا کہ اس مصیبت کو کہیں چھپا آؤ۔

گاڑی اب چوکی کے مین دروازے کے سامنے رک چکی تھی اور دروازے بند کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گل جان ٹیپ ریکارڈر لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ بڑی مضحکہ خیز قسم کی پھرتی تھی اس کے باہر نکلنے میں۔ چند ہی سیکنڈ بعد قدموں کی آواز آئی اور میں نے مرجان صاحب کو برآمدے میں داخل ہوتے دیکھا۔ حوالدار لپک کر برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کھٹاک سے مرجان صاحب کو سلیوٹ کیا اور انہیں لے کر میرے پاس آگیا۔

مرجان صاحب نے مجھ سے باقاعدہ معانقہ کیا۔ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھ کر وہ پریشان تھے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ حال احوال پوچھنے لگے۔ گاہے بگاہے وہ خشمگیں نظروں سے حوالدار کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ وہ مسمسی صورت بنائے اٹین شین کھڑا تھا۔ اس کے ماتحت نے ٹیپ ریکارڈر کو غالباً کسی قریبی کمرے کی الماری یا پھر صندوق وغیرہ میں بند کر دیا تھا۔ اس کے باوجود گانوں کی مدھم آواز یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ حوالدار اور گل جان کی صورتیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ آواز ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسا انڈیل رہی ہے۔ تاہم یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ مرجان صاحب اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے یا شاید انہوں نے اس آواز کو قابلِ غور ہی نہیں جانا تھا۔ اسٹیج ڈراموں جیسی مزاحیہ صورت حال بنی ہوئی تھی۔ اسے بدحواسی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ موٹے دماغ کے نصیبت خاں اور گل جان کو بیٹری سیل کا خیال نہیں آیا تھا۔ اگر ٹیپ ریکارڈر بند نہیں ہو رہا تھا تو وہ اس کے بیٹری سیل نکال سکتے تھے۔

چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد مرجان صاحب نے حوالدار اور اس کے عملے کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ میں نے بھی لشکر خاں کے دونوں ساتھیوں کو باہر بھیج دیا۔ اب ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے تھے۔ میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں مرجان صاحب کو بتایا کہ اب تک میں کہاں تھا.... اور یہ کہ بیس پچیس میل دور نواحی جنگل میں کیا قیامت برپا ہو چکی ہے۔ ستر اسّی افراد کی ہلاکت کا سن کر مرجان صاحب کی

آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولے۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو احسان الٰہی! اتنی زیادہ موتیں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "یقین کرنا پڑے گا جناب۔۔۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے لیوی کو جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہیے ورنہ جنگلی جانور لاشوں کی چیر پھاڑ شروع کر دیں گے۔ پھر مرنے والوں کا اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ بھی وہیں ہیں۔"

"او خدایا!" مرجان صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "بہت بُری خبر سنا رہے ہو تم۔۔۔ بہت بُری۔ ہم تو خوش ہو رہے تھے کہ حالات سُدھر رہے ہیں اور عام معافی کے بعد بہت سے لوگ شریفانہ زندگی شروع کر دیں گے۔ ہم ان کی بحالی کے پروگرام کا سوچ رہے تھے اور یہاں سب کچھ ہی۔۔۔ او گاڈ" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے رنج و غم کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ لشکر خاں کا پتا کروائیں۔ اس کی حالت خطرے میں ہے اور ہو سکتا ہے اسے پشاور لے جانے کی ضرورت پڑے۔

وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں سے تھوڑی دیر تک ان کی دھاڑیں اور حوالدار کی منمناتی آواز سنائی دیتی رہی، پھر وہ فون پر کسی سے گفتگو کرنے لگے۔ یہ تمام بات چیت پشتو میں تھی۔ میری سمجھ میں صرف اتنی بات آئی کہ وہ اسپتال میں فون کر کے کسی لشکر خاں کے بارے میں ہدایات دے رہے ہیں۔ چند منٹ بعد وہ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا "گورنمنٹ اسپتال میں لشکر خاں کا آپریشن ہو رہا ہے۔ اس کے لیے خون کی ضرورت تھی۔ میں نے نصیبت خاں سمیت محلے کے چند آدمیوں کو بھیج دیا ہے۔ انشاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"اس کی حالت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس تھیٹر میں لے گئے ہیں اسے۔۔۔ میڈیکل آفیسر کہہ رہا تھا کہ خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔"

میں سگریٹ کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا۔ ایک دو سگریٹ بھی جیب میں تھے مگر پی نہیں سکتا تھا۔ میں "ہیڈ کانسٹیبل" تھا اور لیوی کے بڑے افسر کے سامنے سگریٹ سلگانا سراسر آداب اور قواعد کے خلاف تھا۔ میں نے پوچھا "جناب! میں نے زریں گل کو آپ کی طرف بھیجا تھا؟"

"کون زریں گل؟" مرجان صاحب کے جوابی سوال نے میرے ذہن میں سرسراتے اندیشوں کو ایک دم حقیقت کا روپ دے دیا۔

میں نے پوچھا "نجو یا نبیلہ میں سے کوئی آپ تک نہ پہنچا؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگے۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے تاثرات مرجان صاحب کی پریشانی میں اضافے کا باعث تھے۔ "کب بھیجا تھا تم نے انہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"تین روز پہلے" میں نے جواب دیا اور پھر تفصیل بتائی کہ کیسے پہلوان شہباز کے حامی لوگوں نے ہمیں ایک سنسان جگہ پر گھیر لیا تھا اور انہیں چکما دینے کے لیے میں دونوں عورتوں کو زریں گل کے سپرد کر کے بھاگ نکلا تھا۔

وہ گم صم بیٹھے سنتے رہے۔ میری بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے "میں تمہارے ساتھیوں میں سے ایک کو لے کر جائے واردات پر جا رہا ہوں۔ شام سے پہلے واپسی مشکل ہے۔ میں نے جمعدار تراب علی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوگی تمہیں۔ تھوڑی دیر بعد تراب علی آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میرے خیال میں تمہارا لشکر خاں کے پاس جانا ضروری ہے۔"

مرجان صاحب چلے گئے تو میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ زریں گل کی طرف سے مجھے کوئی اچھی خبر نہیں ملی تھی۔ اگر وہ لوگ الف خاں وغیرہ سے بچ گئے تھے تو ان کا مرجان صاحب کے پاس پہنچنا ضروری تھا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ پارہ چنار کے اس بدنام بردہ فروش کے ہتھے چڑھ گئے تھے یا پھر زریں گل کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ دیہی ڈرائیور رعایت علی تھا۔ وہ دونوں مرد دو عورتوں پر بہ آسانی قابو پا سکتے تھے۔ انہیں قابو کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر زریں گل کے رحم و کرم پر تھیں۔ وہ انہیں جہاں چاہے لے جا سکتا تھا اور جہاں چاہے ٹھہرا سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال کا ذمہ دار میں ہی تھا۔ میں وقتِ رخصت نجو سے کہہ کر آیا تھا کہ وہ زریں گل پر پورا اعتماد کرے۔ یہ انسان بھی عجیب "چیز" ہے۔ ایک گورکھ دھندا ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ بعض لوگ سو فیصد مخلص ہوتے ہیں اور ان کے اخلاص کی گواہی ان کا حال، ماضی اور مستقبل دیتا ہے مگر ان پر اعتماد کرنا نامعلوم وجوہ سے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ اپنی بُری شہرت اور غیر متاثر کن حالات

باوجود ہم پر اپنا اعتبار بٹھا دیتے ہیں۔ یہ زریں گل بھی شاید دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ چند روزہ شناسائی کو کافی سمجھتے ہوئے میں دو جوان عورتوں کو اس کے سپرد کیوں کرتا جبکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ زریں گل کا ماضی جرم کے چھینٹوں سے داغ دار رہا ہے۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ زریں گل نجو کو بی بی صاحبہ کہتا تھا لیکن دیکھتا انہی نظروں سے تھا جن سے ایک مرد عورت کو دیکھتا ہے۔ معلوم نہیں اس میں زریں گل کی نظر کا قصور تھا یا نجو کے سراپے کا۔ نجو کے سراپے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ اسے دیکھتے ہی مرد کو یاد آ جاتا تھا کہ وہ مرد ہے اور ایک عورت کو دیکھ رہا ہے۔ بے شک وہ اس کی خوبصورتی سے انکار کر دیتا مگر اس کی جسمانی کشش اور دلفریب نسوانیت لاشعوری طور پر اس کے ذہن کو جکڑ لیتی تھی۔ عجب سحر کار لڑکی تھی وہ۔

میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا جب تراب علی مجھے لینے پہنچ گیا۔ وہ اسی بڑے سائز کی کھٹارا جیپ میں تھا جس میں ہم یہاں پہنچے تھے۔ حوالدار نصیبت خاں کی طرح تراب علی بھی مجھ سے شرمندہ نظر آتا تھا۔ اپنی لنگڑی اردو میں وہ کافی دیر اپنے رویے کے لیے "عذر لنگ" پیش کرتا رہا۔ پھر مجھے اپنی جیپ میں بٹھا کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ سدہ کی آبادی میں داخل ہونے کے بعد ہم ہوسٹل علاقے کی طرف بڑھے۔ ایک چوک سے گزرتے ہوئے تراب علی نے جیپ ایک ذیلی سڑک کی طرف موڑ دی۔ میں اس سڑک کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سو ڈیڑھ سو گز آگے صوبیدار مرجان کی رہائش گاہ تھی۔ شکار کی مہم پر ندے مشت روانہ ہونے سے پہلے ہم اسی مکان میں رہے تھے۔ مجھے اُلجھن میں دیکھ کر تراب علی بولا۔ "بس جی ایک منٹ۔ قاضی خاں کے گھر میں ان کی گاڑی کی چابیاں رہتی ہیں۔" قاضی خاں سے اس کی مراد مرجان صاحب تھے۔

اس نے گاڑی مرجان صاحب کے گھر کے عین سامنے روکی اور اتر کر مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نشست پر تھوڑا سا پھیل کر بیٹھ گیا اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد مجھے ایک کمبل پوش اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ اس کا انداز کچھ مشکوک سا تھا۔ میں ایک دم چوکس ہو گیا۔ قریب آ کر کمبل پوش نے چہرے سے کمبل کا پلو ہٹایا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ زریں گل تھا۔ گول مٹول سرخ چہرے پر اس کی گول مٹول آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"سلاماں لیکم جی۔" اس نے کھڑکی کے عین سامنے ڈُکتے ہوئے کہا۔

"زریں گل تم؟" میں حیران رہ گیا۔

"جی استاد" اس نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا "ام کو یقین تھا کہ مرجان صاحب کے گھر کے سامنے آپ سے ملاقات ضرور ہوگا۔"

"لیکن۔۔۔ میں نے تو تمہیں مرجان صاحب کے گھر ٹھہرنے کو کہا تھا؟"

وہ بولا "آپ نے تو کہہ دیا تھا لیکن ام نے بعد میں سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجان صاحب کا گھر بھی امارے دشمنوں کی نظر میں ہو اور کوئی مصیبت کھڑا ہو جائے۔ دونوں بی بی اور بچہ امارے ساتھ تھا۔ اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا تو ام سارا زندگی اپنے پر لعنت بھیجتا رہتا۔"

"کہاں ہیں وہ لوگ؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

وہ بولا "بالکل خیریت سے ہیں۔ ادھر پاس ہی سنڈی میں امارے ایک رشتے دار کا گھر ہے۔ ام نے ان تینوں کو ادھر ٹھہرایا ہوا ہے۔ ام خود روزانہ یہاں آ جاتا تھا اور شام تک ادھر اُدھر گھومتا رہتا تھا۔ ام کو پتا تھا آپ سے ضرور مڈبھیڑ ہوگا۔"

زریں گل میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلا تھا۔ مرجان صاحب کے گھر نہ ٹھہر کر اس نے واقعی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ کرائم ایجنسی کے طول و عرض میں ہمارے لیے ہر طرف خطرات بکھرے ہوئے تھے۔ ایسے میں خود کو روپوش رکھنا بہترین حکمتِ عملی تھی۔

"وہاں سے کیسے نکلے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسا آپ نے کہا تھا۔ آپ کے جاتے ہی ام فوراً پکی سڑک کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ وہاں تبلیغی جماعت والوں کا بس موجود تھا۔ ام نے جماعت کے امیر سے کہا کہ کچھ غنڈا لوگ امارے پیچھے ہے، آپ ام کو بس میں بٹھا لیں اور کسی اگلے اسٹاپ پر اتار دیں۔ بڑا ہمدرد لوگ ہوتا ہے یہ۔ انہوں نے ام کو سوار کرا لیا اور ایک گھنٹے بعد یہاں سدہ میں اتار دیا۔۔۔" پھر میرے جسم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر بولا "آپ کی طرف سے بڑا فکر تھا ام کو۔۔۔ بی بی نجو نے تو رو رو کر خود کو ہلکان کر رکھا ہے۔ کہاں رہ گیا تھا؟"

میں نے کہا "یہ طویل کہانی ہے زریں گل۔۔۔ فرصت میں سن لینا۔ فی الحال تم ایسا کرو کہ نجو، نبیلہ اور بچے کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔۔۔ کاغذ قلم ہے تمہارے پاس؟"

"قلم تو ہے جی۔" اس نے اپنے زخمی شانے کو بمشکل حرکت دے کر قمیص کی جیب سے بال پوائنٹ نکالا۔ میں نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ایک کاغذ ڈھونڈا اور اس پر ساتھی

صاحب کا لاہور والا ایڈریس لکھ دیا۔
وہ کاغذ تھام کر بولا۔ "لیکن آپ؟"
"میں بھی ایک دو روز تک لاہور پہنچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں ایک ساتھی زخمی ہو گیا ہے' جونہی اس کی حالت بہتر ہوئی' میں اسے لے کر پہنچ جاؤں گا۔"
اتنے میں تراب علی کوٹھی کے گیٹ سے نکلتا دکھائی دیا۔ میں نے زریں گل کو جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے کمبل کا پلو چہرے پر ڈالا اور خاموشی سے ایک طرف نکل گیا۔ گہری سانس لے کر میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ دل و دماغ سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ زریں گل کے متعلق بدگمانی اور شکوک کے بادل جتنی جلدی "سوچ کے آسمان" پر چھائے تھے اتنی جلدی چھٹ بھی گئے تھے۔ یہ شخص اپنی جان خطرے میں ڈال کر تجو اور تبلہ کو یہاں تک لے آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ انہیں کامیابی سے لاہور تک پہنچا دے گا۔ کم از کم شکرا اور عیسیٰ جان وغیرہ سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ان کے لیے اجنبی تھا اور اگر برقع پوش عورتوں کو لے کر ان کے سامنے سے بھی گزر جاتا تو وہ اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔"

○☆○

اگلے چار پانچ روز میں نے بہت بھاگ دوڑ میں گزارے۔ اسپتال میں لشکر خاں کا آپریشن ہوا اور جب اس کی حالت کچھ سنبھلی تو بڑی رازداری سے اسے پشاور منتقل کروا دیا گیا۔ یہاں اسے ایک پرائیوٹ اسپتال میں رکھا گیا۔ میں ہمہ وقت اس کے قریب رہا۔ ان دیکھے دشمنوں سے اسے اب بھی خطرہ تھا اور جیسے اسے خطرہ تھا' مجھے بھی تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ شکر شکرا اور عیسیٰ جان سے یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ہیڈ کانسٹیبل کے بھیس میں' میں درحقیقت کون ہوں اور عیسیٰ جان کا گروہ توڑنے میں میرا کیا کردار رہا ہے۔ وہ یقیناً بھوکے کتوں کی طرح مجھے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اب قرب و جوار میں یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ کرائم ایجنسی کے علاقے میں دو گروہوں میں لڑائی ہوئی ہے اور ایک گروہ نے شب خون مار کر مخالف فریق کے درجنوں افراد ہلاک کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں بلو گرنگ کا ذکر بھی سننے میں آ رہا تھا۔
پشاور کے اسپتال میں تین چار دن گزارنے کے بعد لشکر خاں بات چیت کرنے کے قابل ہو گیا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ بات چیت کرنے بھی لگا۔ اس کے لبوں پر بدستور خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں جیسے بچ بچ خون تیرتا رہتا تھا۔ کسی وقت تو مجھے لگتا کہ وہ ایک دم اپنی "ٹو ریکر" کھینچ کر اٹھے گا اور بھاگ نکلے گا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر خوف آتا تھا۔ اس خونی رات کے مناظر اس کی آنکھوں میں نقش ہو چکے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ رو دھو کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرے لیکن رونا شاید اسے آتا ہی نہ تھا یا آتا تھا تو بھول گیا تھا۔ میں جان بوجھ کر پچھلا خیلہ رونما ہونے والے واقعات کا ذکر چھیڑتا۔ اس کے تر... ساتھیوں کی ترس ناک موت کا نقشہ کھینچتا۔ وہ آنکھیں... کر لیتا' ہونٹ بھی مضبوطی سے بند ہو جاتے' مٹھیاں بھی... ہو جاتیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو جاتے۔ میں ا... کرتا کہ وہ رو دے گا لیکن گوشوں کی یہ نمی آنسو نہ بن سکی۔
پانچویں یا چھٹے روز ہم پشاور سے بائی ائر لاہور پہنچ گئے۔ رات دس بجے ہمارا جہاز لاہور ائرپورٹ پر اترا۔ ساہی صاحب ہمیں خود ریسیو کرنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ منـ... بھی تھا۔ وہی بانکا سجیلا جوان جو اپنی محبوبہ کو قادر زماں کی... سے چھڑانے نکلا تھا اور جذبے کی سچائی نے اسے کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ وہ اور انجم ساہی صاحب کی تحویل میں تھے۔ ساہی صاحب اور منصور نے مجھے گرم جوشی سے ریسیو کیا۔ لشکر خاں کو ائرپورٹ سے ایک پرائیوٹ کلینک پہنچایا جانا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک اسٹیٹ کار موجود تھی۔ پولیس کے سفید پوش جوانوں کے ساتھ لشکر خاں کو کلینک روانہ کر دیا گیا۔ ہم ساہی صاحب کی رہائش گاہ کی طرف چل دیے۔
میری نگاہ شفتا کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ جیل میں تھا تو دل کو قرار تھا۔ معلوم تھا کہ صبر کے ویرانے دشت میں انتظار کا طویل سفر طے کرنا ہے۔ سینے کی تپش کو' آنکھوں کی پیاس کو جھیلنا ہے۔۔۔ اور میں جھیل رہا تھا۔ شفتا کے لیے' اپنی جان کے لیے۔ لیکن اب جبکہ میں آزاد فضا میں تھا' میرے لیے شفتا سے دور رہنا ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا کہ پچھلے ڈھائی ماہ میں نے کیسے گزارے ہیں۔ راستے میں ساہی صاحب نے مختصر الفاظ میں مجھے لاہور کے حالات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ زریں گل نامی شخص دو لڑکیوں اور ایک بچے کو لے کر پہنچ گیا تھا اور اب وہ چاروں شادمان والے مکان میں ہیں۔ (یہ وہی مکان تھا جہاں اس سے پہلے میں بھی رہ چکا تھا) ساہی صاحب نے مجھے شفتا کی خیریت سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کی فریال سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی ہے۔ پشاور سے بھی ساہی صاحب کے ساتھ فون پر مختصر بات ہوئی تھی اور انہوں نے شفتا کی خیریت سے آگاہ کیا تھا لیکن میرے دل...

تسلی اسی وقت ہونا تھی جب میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھنا تھا۔
ساہی صاحب کے گھر پہنچ کر میں شفتا کو ڈھونڈتا ہوا انیکسی میں پہنچ گیا۔ وہ انجم اور منصور کے ساتھ وہیں رہ رہی تھی۔ ساہی صاحب نے بتایا تھا کہ اس کی چنچل بچی فریال نے بھی وہیں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ کسی وقت ڈاکٹر فرخ لہ بھی آ جاتی ہے اور وہ سب مل کر اچھا وقت گزارتے ہیں۔ شفتا کو میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ میں ابھی انیکسی سے دور ہی تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ جب وہ آنکھوں کے سامنے ہوتی تھی تو کچھ نظر آتا تھا نہ محسوس ہوتا تھا۔ سب کچھ بھول جاتا تھا میں۔ اس وقت بھی میرے اردگرد منصور' انجم' فریال' ساہی صاحب اور دیگر افراد موجود تھے لیکن وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور چلے گئے تھے۔ میں صرف شفتا کو دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے بھیا کو۔
فریال' انجم' منصور سب مجھے دیکھ کر خوش تھے۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے بہت باتیں کرنا چاہتے ہیں لیکن فی الوقت میں ساہی صاحب کی تحویل میں تھا۔ ان کا استحقاق بہرحال زیادہ تھا۔ جونہی میں رل ملا کر فارغ ہوا وہ مجھے لے کر نشست گاہ میں آ گئے۔ کھڑکیاں دروازے بند ہو گئے۔ پردے کھینچ دیے گئے اور کافی لانے والے ایک ملازم کے سوا کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ رہی۔ ساہی صاحب سے مجھے کچھ چھپانا نہیں تھا اور نہ ہی میں نے چھپایا۔ بہت سی باتیں انہیں ایس پی برکت صاحب کی زبانی پہلے سے معلوم ہو چکی تھیں لیکن وہ سب کچھ میری زبان سے سننا چاہتے تھے۔ میں نے بھی الف سے یے تک سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ وہ درمیان میں سوالات بھی کرتے رہے اور کہیں کہیں اپنی رائے بھی بیان کرتے رہے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کی المناک موت کا انہیں بھی شدید دکھ ہوا۔ مجھے ان کے چہرے پر وہی تاثرات نظر آئے جو ایس پی جاوید درانی کی موت پر میں نے دیکھے تھے۔ ساہی صاحب کی صورت ہی سنتوش کمار سے نہیں ملتی تھی' وہ مرحوم فلمی اداکار کی طرح دھیمے مزاج کے بھی تھے لیکن غصے میں ان کا چہرہ شعلہ رنگ ہو جاتا تھا۔ وہ کافی دیر خاموشی سے سگریٹ پیتے رہے اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر گمبھیر آواز میں بولے "شاہ جہاں' تم نے میری توقع سے بڑھ کر کوشش کی ہے۔ میں تمہاری کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر وہ کام کیا ہے جس کام کے لیے بعض باوردی لوگ ساری عمر تنخواہیں کھاتے ہیں اور وقت آنے پر پیٹھ دکھا دیتے ہیں۔ شاہ جہاں! رئیلی! آئی ایم پراؤڈ آف یو۔"
میں نے کہا۔ "جناب! اس تعریف کا مستحق تو میں تب ہوتا جب شکرا انجام کو پہنچ جاتا۔ کاش میں آپ کے لیے کوئی اچھی خبر لا سکتا۔"
وہ مسکرا کر بولے۔ "کیا یہ اچھی خبر نہیں ہے کہ ڈاکوؤں کا ایک منظم گروہ تہس نہس ہو گیا ہے۔ ان کے ٹھکانے تباہ ہو گئے ہیں۔ تین مغوی ان کی قید سے آزاد ہوئے ہیں اور بے شمار مالِ مسروقہ برآمد ہوا ہے۔"
میں نے کہا "لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گروہ کے سرغنہ بچ نکلے ہیں۔"
"انشاء اللہ وہ بھی انجام کو پہنچیں گے۔" ساہی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"ساہی صاحب" میں نے میز کی شفاف سطح پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "جاگیردار قادر زماں اور شکرا وغیرہ میں رابطے ہو چکے ہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ روئے دشت میں بے ٹھکانا ہونے کے بعد شکر شکرا اور عیسیٰ جان قادر زماں کے پاس ہی پناہ گزین ہوں۔ اگر اس مرحلے میں قادر زماں پر ہاتھ ڈال دیا جائے تو مجھے یقین ہے شکر شکرا گرفت میں آ سکتا ہے۔"
ساہی صاحب نے ایک آہ کھینچی۔ "یہ بات میں بھی جانتا ہوں شاہ جہاں اور مرحوم ایس پی جاوید درانی بھی جانتا تھا۔ جاوید کے ذکر سے تم یہ مت سمجھنا کہ میں جاوید کی طرح کسی "روڈ ایکسیڈنٹ" میں قتل کر دیے جانے سے ڈرتا ہوں۔ خدا کی قسم' ایسا نہیں ہے اور میں وقت آنے پر ثابت بھی کر دوں گا لیکن میں نے زندگی میں کبھی ایسی کوشش نہیں کی جو مجھے ناکامی سے دوچار کرے اور مجرم کو نیا ولولہ بخش دے۔ کم از کم اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق میں ایسی صورت حال سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ قادر زماں پر مضبوط ہاتھ ڈالنے میں ناکامی ہو گی۔"
"یہ میرا ذاتی خیال نہیں۔" ساہی صاحب نے جواب دیا۔ "کل دوپہر ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ افسران کی طویل میٹنگ ہوئی ہے۔ یہ متفقہ رائے ہے کہ قادر زماں پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ قادر زماں کی پشت پناہی ایک ایسا شخص کر رہا ہے جسے بلا مبالغہ پنجاب میں طاقتور ترین شخص کہا جا سکتا ہے۔ چیمبل کا نام تو تم نے بھی سنا ہو گا۔"
میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ شخص نئی قائم ہونے والی

حکومت میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا۔ نوجوان اور پُرجوش سیاستدان کے طور پر یہ شخص ہزاروں لاکھوں لوگوں میں مقبول تھا۔ ان میں سے یقیناً کچھ ایسے بھی ہوں گے جو پوجنے کی حد تک اسے چاہتے ہوں گے۔ یہ شخص قادر زماں جیسے جاگیردار کا پشت پناہ ہوگا‘ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن ساہی صاحب جو کہہ رہے تھے اسے بھی جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ میری حیرت کو بھانپتے ہوئے ساہی صاحب بولے۔ ”یہ کئی چہروں والے لوگ ہوتے ہیں شاہ جہاں۔ کوئی چہرہ دوسرے چہرے سے نہیں ملتا۔ ابھی ہمارے سامنے دو چہرے ہیں۔ معلوم نہیں اس شخص کے اور کتنے روپ ہیں جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ بات میں بھی جانتا ہوں جناب۔ لیکن مجتبیٰ کے بارے میں میرے ذاتی خیالات کچھ اور تھے۔ میں سمجھتا تھا یہ دیہاتی پس منظر کا شخص عام سیاست دانوں سے مختلف ہوگا۔“

وہ بولے۔ ”یہ سیاست نمک کی کان ہے بھئی۔ اس میں ہر شے نمک ہو جاتی ہے۔ ابھی تم نے اس شخص کے کارنامے نہیں سنے۔ سنو گے تو کانوں کو ہاتھ لگاؤ گے۔ جسے تم دیہاتی پس منظر کہہ رہے ہو یہ درحقیقت جاگیردارانہ پس منظر ہے اور جاگیردارانہ ذہنیت والا شخص عام سیاستدانوں سے کچھ زیادہ ہی کرپٹ ثابت ہوتا ہے‘ ستم بالائے ستم کہ نوجوان بھی ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”قادر زماں سے اس شخص کے مراسم کیسے ہیں؟“

”بے حد قریبی۔“ ساہی صاحب نے جواب دیا۔ ”اور پچھلے تین چار مہینوں میں یہ مراسم تیزی سے پھلے پھولے ہیں۔ مجتبیٰ شکار کا شیدائی ہے۔ اس غرض سے وہ اکثر جھنگ جاتا رہتا ہے۔ ایسے میں وہ اکثر قادر زماں کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں جاگیردار ہیں اور اس قبیل کے لوگ اپنے مخصوص مشاغل کے سبب ایک دوسرے کے لیے اپنے دل میں ہمیشہ نرم گوشہ رکھتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اگر آپ کے اخذ کیے ہوئے نتائج صحیح ہیں اور یقیناً ہوں گے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایس پی جاوید کے قتل میں اس شخص کا ہاتھ ہو۔“

”نہیں“ ساہی صاحب نے اعتماد سے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہماری تحقیق کے مطابق اس وقت تک قادر زماں اور مجتبیٰ کے تعلقات اس نہج پر نہیں پہنچے تھے کہ قادر زماں کی خاطر مجتبیٰ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو قتل کرا دیتا۔ درحقیقت قادر زماں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے وہ بڑا سنہرا موقع تھا۔ ایس پی جاوید بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ افسوس وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک جرأت مند افسر سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ موجودہ وقت کا موازنہ اس وقت سے کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اب یہ کام کتنا مشکل ہو چکا ہے اور اس وقت مشکل نظر آنے کے باوجود نسبتاً آسان تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ہم بے بس ہیں۔“

”بے بس تو تم نہیں کہہ سکتے‘ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں مشکل میں ہیں۔ ہمیں ”دیکھو اور انتظار کرو“ کی پالیسی پر کرنا ہوگا۔“

”لیکن انتظار سے صورت حال مزید پیچیدہ بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے چند ماہ بعد قادر زماں آپ کو آج سے طاقتور نظر آئے۔ ابھی تو یہ حکومت نئی نئی بنی ہے۔ ارباب اختیار پر پُرزے نکالیں گے‘ پاؤں جمائیں گے ان کے قریبی اور بہی خواہ بھی طاقتور ہوتے جائیں گے۔ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کل قادر زماں پر گرفت کرنا ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے تب تک وہ اس قابل ہو چکا ہو کہ محض شک پر آپ کا تبادلہ کسی دور دراز مقام پر کرا دے یا پھر سبکدوشی کا پروانہ آپ کے ہاتھ میں تھما دیا جائے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو شاہ جہاں۔ مگر وقت ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ ہمیں ہر قدم پھونک کر رکھنا ہوگا۔ بہرطور اس موضوع پر ہم ایک دو دن میں تفصیل سے بات کریں گے۔ اس وقت بہت تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ مجھے بھی تھوڑی دیر کے لیے ہیڈ کوارٹر جانا ہے۔ انشاءاللہ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔“

ساہی صاحب کے پاس سے اٹھ کر میں انیکسی میں آیا۔ سب لوگ جاگ رہے تھے۔ فریال ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند نظر آتی تھی۔ وہ بلائے بے درماں اس وقت نصف شب کو بھی ٹینس شوز پہنے ہوئے تھی۔ ہر کام ایسا ہی اوٹ پٹانگ ہوتا تھا اس کا۔ انجم کی پنڈلی کا زخم اب بھر چکا تھا۔ اس کے بال پہلے سے لمبے ہو گئے تھے اور چہرہ بھرا بھرا نظر آتا تھا۔ فریال اس کی طرف دیکھ کر مسلسل شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہاں انجم کے حوالے سے کوئی بات مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔ یہ کیا بات ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا۔

کچھ دیر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی پھر میں اس کمرے میں آگیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں

نمی ہے۔ آج ان آنکھوں میں شُتنا کے سوا اور ابھی کون سکتا تھا اور شُتنا میرے سامنے تھی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ میرے ہاتھوں پر چوٹوں کے نشان تھے۔ وہ بے خیالی میں ان چوٹوں کو اپنی پوروں سے سہلا رہی تھی۔

”کہاں چلے گئے تھے بھیا۔ کیوں اتنی دیر لگائی؟“

میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور اسے چمکار کر بولا ”پگلی! وہ خوفناک کتے تمہیں دیکھے تم نے جو پشاور سے میرے ساتھ آئے ہیں۔ یہ شکاری کتے ہیں اور پچھلے ڈھائی ماہ میں نے انہی کتوں کے پیچھے بھاگتے گزارے ہیں۔ کام تو تھوڑا ہی تھا۔ پندرہ بیس روز میں ختم ہو گیا۔ پھر یہ بیو شکار کا سلسلہ چل نکلا۔ ہم تیراہ کے دشت میں نکل گئے۔ بڑا دشوار علاقہ ہے یہ۔ بندہ ایک بار بھٹک جائے تو ہفتوں راستہ ہی نہیں ملتا۔ چار سال بعد کھلی ہوا میں سانس لیا تھا تیرے بھیا نے‘ بس ایسا جنون سوار ہوا شکار کا کہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک دن پتا ہے کیا ہوا‘ ہم نے درخت پر ایک جنگلی بلا دیکھا۔“ بلے کے حوالے سے میں نے اسے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگے گی مگر وہ بمشکل مسکرا سکی۔

بولی ”بھیا جی! پتا نہیں کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ آخر یہ شنکر شکرا کیوں ہے یہاں؟ آپ اس کے پیچھے گئے تھے ناں؟“

میں نے کہا۔ ”گیا تھا اس کے پیچھے بھی لیکن اس سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ لگتا ہے وہ نکل گیا ہے پاکستان سے۔“

اس نے میرے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے اور لہجے میں بے پناہ التجا سمیٹ کر بولی۔ ”بھیا‘ تم بھی نکل جاؤ اس چکر سے۔ ہمیں کچھ لینا دینا نہیں ان لوگوں سے۔ تم بس جیل چلے جاؤ اور اپنی باقی کی سزا کاٹو۔ جیل سے باہر ہم دونوں کے لیے دکھوں کے سوا اور کچھ نہیں۔“

میں نے مسکرا کر کہا ”اور جیل میں بھی کون سا سکھ ہے۔ تم جان ہی چکی ہو مجھ پر کتنی بار حملہ ہو چکا ہے۔“

”پھر بھی بھیا۔ میں تمہیں شنکر شکرا جیسے وحشی سے لڑتے بھڑتے اور اس کے ہاتھوں زخم کھاتے نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ سسکنے لگی۔ ”نہیں بھیا! میں نہیں دیکھ سکتی۔ تم مان لو۔ وہ درندہ ہے۔ درندے اور انسان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم بھی جانتے ہو کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ پھر بار بار کیوں جاتے ہو اس کے سامنے۔ یہ پولیس والے تمہیں سزا میں کمی کا لالچ دے کر ایک خونی درندے سے لڑا رہے ہیں۔ ہمیں نہیں چاہیے ایسی رعایت‘ تم منع کر دو ساہی صاحب کو۔ ان سے کہہ دو کہ وہ اپنی لڑائی خود لڑیں۔ تم ایک قیدی ہو۔ تم بس سزا کاٹو۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں بھیا۔ میرا کوئی نہیں ہے تمہارے سوا۔“ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمیٹ کر اپنے شانے سے لگا لیا۔ وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ ”میں سب جانتی ہوں بھیا! تم مجھ سے چھپاتے ہو۔ تمہارے جسم کی یہ چوٹیں بتاتی ہیں کہ تم صرف شکار نہیں کھیلتے رہے ہو۔ تم اس شنکر شکرا کے پیچھے بھاگتے رہے ہو اور وہ تمہارے پیچھے بھاگتا رہا ہے۔ نہ کرو بھیا! یہ سب نہ کرو۔“ وہ اپنے کندھے سے میرا بازو ہٹا کر اٹھی اور روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میرے دل و دماغ میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ میں کتنی ہی دیر گم صم کرسی پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ دریچے سے باہر چاند کسی اونچے جامن کی شاخ میں الجھا ہوا تھا۔ اوس سے بھیگی ہوئی ہوا ہولے ہولے بام و در پر دستک دے رہی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ شُتنا ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ جس قانون نے آنکھیں بند کر کے مجھے بارہ سال کے لیے جیل میں پھینک دیا تھا‘ میں کیوں اس کی خاطر خود کو ایک آدم خور کے سامنے چارے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

ایک دم جی میں آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف شُتنا کو ساتھ لوں اور یہاں سے نکل جاؤں۔ یہ میرے لیے ایک سنہرا موقع تھا۔ نہ میرے پاؤں میں قانون کی زنجیریں تھیں اور نہ ابھی حالات کے نئے رُخ نے مجھے اپنے نشانے پر رکھا تھا۔ میں کہیں دور نکل سکتا تھا۔ اپنے لیے عافیت کا کوئی چھوٹا سا گوشہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ کسی بہت بڑے شہر کے کسی الگ تھلگ محلے میں یا کسی الگ تھلگ بستی کے چھوٹے سے مکان میں مجھے وہ تحفظ مل سکتا تھا جس کی مجھے اور شُتنا کو ضرورت تھی۔ میں نے اس انداز سے سوچا تو شُتنا کی باتیں بامعنی محسوس ہونے لگیں۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا کہ اٹک جیل کے حادثے سے شروع ہونے والی کہانی خوفناک تیزی سے خوفناک سمتوں میں پھیلنے والی ہے۔ حادثات کا ایک سلسلہ شروع ہو رہا ہے جس کو میں روکنا چاہوں بھی تو نہیں روک سکوں گا۔ شنکر شکرا یہاں موجود تھا اور اس کا ایک ہی مطلب تھا‘ کوئی خوفناک سازش ان فضاؤں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ کیا سازش تھی؟ کس کے خلاف تھی اور اس کے کرتا دھرتا کون تھے؟ یہ سب کچھ ابھی پردۂ راز میں تھا لیکن یہ سازش موجود تھی اور اس سے انکار کرنا خود کو کھلی آنکھوں سے اندھے کنوئیں میں گرانا تھا۔ شنکر کو جانتے

والے جانتے تھے کہ شنکر اور سازش لازم ملزوم ہیں۔ اس کلیے کی رو سے اس سازش کا وجود اسی گھڑی ثابت ہو گیا تھا جب میں نے اس سراپا نحوست کو نخیا گلی کے بازار میں ایک دکان سے نکلتے دیکھا تھا۔ آہ! کیسی بدبخت گھڑی تھی وہ۔

کمرے میں چکراتے چکراتے میں جیسے ہانپنے لگا۔ میرے اندر ایک جنگ ہو رہی تھی۔ ایک دوراہے پر کھڑا تھا میں۔ ایک راستہ میری اور شفقا کی سلامتی کی طرف جاتا تھا۔ اس منزل کی طرف جاتا تھا جس کے خواب میری ننھی بہن نے دیکھے تھے۔ ایک چھوٹا سا گھر' پھولوں بھرا آنگن۔ اپنے بھائی کا ساتھ اور زندگی کی ہر ننھی خوشی میں اس کی شرکت۔ دوسرا راستہ آگ اور خون کا راستہ تھا۔ اس راستے پر ایک قاتل ہر جھاڑی کے پیچھے ایک نئے روپ میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ بہت جاں لیوا راستہ تھا یہ لیکن اس راستے کی کشش اپنی ہزار بانہوں سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کوئی آواز پکار پکار کر کہہ رہی تھی "شاہ جہاں! تم اپنی بہن سے محبت کرتے ہو ناں ۔۔ اس محبت کو بے مثال کہتے ہو ناں؟ اسی بے مثال محبت کا تقاضا ہے کہ ایک شیطان کا راستہ روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ بہن ایک لڑکی نہیں "بہن ایک رشتے کا نام ہے اور یہ رشتہ اور اس جیسے تمام رشتے" اور ان پاک فضاؤں میں رچی ہوئی اس صورت حال سے منہ موڑ کر جانا چاہو تو جا سکتے ہو لیکن تمہارے ساتھ پچھتاوے کا ایک بہت وزنی پتھر بھی جائے گا جس کے نیچے عمر بھر تمہارے ضمیر کی لاش دبی رہے گی۔ شنکر کے "احسانات" تم پر پہلے ہی کچھ کم نہیں تھے۔ اب ان میں درجنوں احسانات کا اضافہ ہو چکا ہے۔ کیا تم کانسٹیبل نذیر اور انسپکٹر باجوہ کی دردناک موت بھول سکتے ہو؟ بے گناہ کرن کی آخری ہچکیاں فراموش کر سکتے ہو؟ شنکر خاں کے ساتھیوں کی جھلسی لاشیں تمہارے ذہن سے محو ہو سکتی ہیں؟ اور وہ معصوم بشارت جس کے ننھے سینے کو سانس لینے کے حق سے محروم کیا گیا اور وہ لوگ جو ایک بند ٹرک میں سسک سسک کر دم توڑ گئے!

میں نے کمرے کی کھڑکیاں پوری کھول دیں۔ یخ بستہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر گھس آئی۔ مجھے لگا کہ میرا لباس پسینے سے نم ہے۔ میں نے چاند کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے میں مجھے شفقا کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ میں پوری جان سے تڑپ گیا۔ ان آنکھوں کا ایک آنسو مجھے غرق کر سکتا تھا۔ یہ تو آنسوؤں کی جھڑی تھی۔ میں ڈوبنے لگا۔ بے دم سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ سگریٹ کے ٹکڑے نے میری انگلیاں جلا دیں لیکن مجھے اذیت کا احساس نہیں ہوا۔ ایک بار پھر میرے قدم کمرے کے قالین کو ۔۔۔ نے لگے۔ آخر کیا سازش تھی! کا تانا بانا بھکر اور جھنگ ۔۔۔ کے گرد و نواح میں بُنا جا رہا تھا جس میں قادر زماں جیسے بااثر لوگ ملوث ہو چکے تھے۔ سوچتا رہا اور چکراتا رہا۔ پھر نجانے کیوں میرے تصور میں سنسان حویلی در آئی جو میں نے بھکر سے جھنگ جاتے ہوئے ایک مضافاتی علاقے میں دیکھی تھی اور جس کے بارے مجھے پتا چلا تھا کہ اسے کچھ لوگ مکینوں سے خالی کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کئی نئے بدمعاش کارندے اور حویلی کے مالک عطا محمد کی صورتیں میری نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ مجھے کئی بار احساس ہو چکا تھا کہ شنکر شنکرا' قادر زماں اور ۔۔۔ جان کے درمیان پنپنے والے منصوبے کا حویلی سے کوئی تعلق ہے۔ حویلی کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میرے متحرک قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جس بات کو یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ حافظے کی گرفت میں نہیں آتی اور جب وہ تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور اسے بھی بھول جاتا ہے کہ اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ بھولی بسری بات پوری آب و تاب سے حافظے میں چمک اٹھتی ہے۔

اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے عیسیٰ جان کے ڈیرے سے برآمد ہونے والی نبیلہ کے ساتھ ایک دس گیارہ سال کا بچہ تھا۔ میں اس بچے کی شکل بارہا یاد کرنے کی کوشش کر چکا تھا لیکن ناکام ہوا تھا۔ ہر بار ایک دھندلاہٹ سی تصور پر چھا گئی تھی۔ اب اس کمرے میں گھومتے گھومتے اچانک مجھے یاد آ گیا تھا کہ وہ لڑکا کون ہے۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ اس بچے کو میں نے جھنگ کی اسی مضافاتی حویلی میں دیکھا تھا۔ وہ عطا محمد کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ کاوین دفیہ نے اس کا سر چھپا دیا تھا۔ وہ رو رہا تھا اپنی والدہ کی بانہوں میں سمٹا چلا جا رہا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی سوچ کے گھوڑوں کی لگامیں ٹوٹ گئیں اور وہ سرپٹ دوڑنے لگے۔ عطا محمد کا یہ لڑکا دور کے اس مہلک ویرانے میں کیسے پہنچا؟ اسے اغوا کیا گیا تھا؟ کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ اس سوال کا قریب ترین جواب یہ تھا کہ عطا محمد حویلی چھوڑنے پر رضامند نہیں تھا۔ جب اس پر دباؤ ڈالنے کے سارے حربے ناکام ہو گئے تو اس کے لخت جگر کو اٹھا لیا گیا۔ اٹھانے والے عیسیٰ جان کے آدمی تھے لہٰذا اس بات میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی کہ اس حویلی سے عیسیٰ جان' قادر زماں اور شنکر کا گہرا تعلق ہے۔ "وہ کہاں ہے؟" میرے ذہن میں یہ سوال پوری شدت ۔

ابھرا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا "صفدر۔ صفدر" میں نے آوازیں دیں۔

میری بلند آواز سن کر نہ صرف صفدر نکل آیا بلکہ فریال اور انجم وغیرہ بھی برآمدے کی طرف آتی دکھائی دیں۔

"کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب؟" صفدر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

میں نے اپنے تاثرات پر قابو پایا اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا "میں شادمان جانا چاہتا ہوں۔ کوئی گاڑی ہے یہاں؟"

"گاڑی تو ہے' لیکن اس وقت؟"

"ہاں اس وقت جانا ضروری ہے۔ وہ جو نبیلہ نام کی عورت آئی ہے وہ وہیں شادمان کالونی میں ہے ناں؟"

"میرا خیال ہے وہیں ہوگی۔" صفدر بولا "لیکن مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔"

"ٹھیک ہے' مجھے پتا ہے۔" فریال نے حسب عادت لٹک مٹک کر کہا "آپ مجھ سے پوچھئے ناں۔"

"ہاں ہاں بتاؤ۔"

"ہاں ہاں پوچھئے۔" وہ میری سنجیدگی کو یکسر نظرانداز کر رہی تھی۔

"کہاں ہے وہ عورت؟" میں نے سٹپٹائے لہجے میں کہا۔

وہ بولی۔ "کھڑے کھڑے پوچھیں گے یا کہیں تشریف رکھیں گے۔"

صفدر بولا "آئیے یہاں میرے کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔" اس نے دروازہ کھولا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

وہ بولی۔ "پچھلے منگل کو وہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایڈریس ان کے پاس موجود تھا۔ پاپا جانی نے انہیں شادمان میں ٹھہرا دیا اور ساتھ ہی سختی سے یہ ہدایت بھی کر دی کہ آپ کے لاہور پہنچنے تک وہ گھر کی چار دیواری میں رہیں گے۔ نہ کہیں جائیں گے اور نہ کسی سے ملیں گے۔ وہ نبیلہ نام کی عورت اپنے بچوں سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ پاپا کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ کسی طرح اسے بچوں سے ملوا دیں۔ پاپا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اسے ہر صورت چند دن انتظار کرنا پڑے گا۔ پاپا نے ان لوگوں کی حفاظت کے لیے دو مسلح گارڈ بھی پہنچا دیے تھے۔ ملازم نادر علی تو رہتا ہی وہیں ہے۔ اگلے روز نادر نے بتایا کہ رات کو نبیلہ بی بی چیختی چلاتی اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے نام لے لے کر پکار رہی تھی اور دروازوں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ اس واقعے کے کوئی چوبیس گھنٹے بعد نبیلہ کا شوہر مالک محمد اور اس کا بڑا بچہ اسے لینے کے لیے شادمان پہنچ گئے۔ ملازموں نے پاپا کو اطلاع دی۔ پاپا سخت حیران ہوئے۔ وہ بھاگم بھاگ شادمان پہنچے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ نبیلہ نے ٹیلیفون استعمال کیا تھا۔ وہ ایک کمرے کا تالا توڑ کر ٹیلیفون سیٹ تک پہنچی تھی۔ اس کے پاس اپنے شوہر کا ایک نمبر موجود تھا۔ اس نمبر پر بات کر کے اس نے شوہر کو شادمان والے پتے پر بلا لیا تھا۔

پاپا کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ ضبط کر گئے اور میرے خیال میں ضبط ہی کرنا چاہیے تھا۔ ایک عرصہ بچوں سے دور رہ کر اس عورت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اتنی دور سے اس قدر قریب آ کر بھی وہ اپنے بچوں سے مل نہیں پا رہی۔ ایک بچے کی صورت تو اس نے دیکھ لی ہے لیکن دو ابھی اس کی نظروں سے اوجھل ہیں۔"

میں نے پوچھا "اس کا شوہر اب کہاں ہے؟"

"وہ بھی کوٹھی میں ہے۔ پاپا جانی نہیں چاہتے تھے کہ وہ آپ کے آنے سے پہلے واپس جائے اور کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو جائے۔"

"اوہ۔ پھر تو پریشان ہوں گے وہ۔ میرا خیال ہے مجھے ابھی ان سے ملنا چاہیے۔"

فریال نے اپنی گاڑی کی چابی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے چابی تھام لی اور صفدر سے کہا "آؤ صفدر میرے ساتھ۔"

فریال پُرسوچ لہجے میں بولی۔ "ویسے مجھے بھی ساتھ ہی لے چلیں۔ ہو سکتا ہے گارڈ آپ کو روکنے کی کوشش کریں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اتنی رات گئے تو بندہ اپنے گھر میں بھی جائے تو بالکل صاف آواز میں بول کر تعارف کرانا پڑتا ہے۔ میں نے چابی اسے واپس تھما دی۔ وہ فوراً ہمارے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

○☆○

ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد ہم شادمان والی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں نبیلہ اور مالک محمد کے روبرو تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مالک محمد مجھ سے لپٹ گیا۔ آناً فاناً اس کی ہچکی بندھ گئی۔ نبیلہ بھی مسلسل اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے اپنے رخسار پر مالک محمد کے نم ہونٹوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ بولا "میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔ مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے تو نے احسان الٰہی۔"

یقیناً نبیلہ اسے تمام حالات سے آگاہ کر چکی تھی۔ میں

نے دیکھا' مالک محمد کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ جب سے یہاں آیا تھا' رو رہا تھا۔ یہ دکھ کے آنسو نہیں تھے' یہ مسرت اور تشکر کے آنسو تھے۔ وہ نبیلہ کو مُردہ تصور کر چکا تھا اور شب و روز پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جیون ساتھی کو کوئی سکھ نہ دے سکا۔ اس کے گھر میں اس کے بچوں کے سامنے عیش و نشاط کی محفلیں سجاتا رہا اور اس کی زندگی کو عذاب بناتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس سے منہ موڑ گئی۔ وقت کسی کے لیے نہیں پلٹتا۔ لیکن آج مالک محمد کے لیے وقت پلٹ آیا تھا۔ اس کی مُردہ بیوی زندہ ہو گئی تھی۔ اس کے بچوں کی ماں اپنے آنگن میں لوٹ آئی تھی۔ اب مالک محمد کے پاس ایک اور موقع تھا کہ وہ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر سکے اور وہ سب کچھ جو اس نے نبیلہ سے چھینا تھا اسے واپس لوٹا سکے۔

مالک محمد کے عقب میں سات سالہ یوسف کھڑا تھا۔ یہ گورا چٹا بچہ نبیلہ کے پہلے شوہر مشتاق سے تھا۔ وہی مشتاق جس کے گھر پر مالک محمد نے ڈاکا ڈالا تھا اور ایک لاٹنگ کوچ لوٹنے کے دوران اس کی بیوی (نبیلہ) کو بھی مالِ مسروقہ کے ساتھ لے گیا تھا۔ بعد میں مشتاق تپ دق کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ اب یہ بچہ مالک محمد کے پاس تھا اور وہ اسے اپنی ہی اولاد کی طرح پروان چڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "کیا حال ہے بیٹا؟" میں نے پوچھا۔

وہ زبان سے "غوں غاں" کر کے رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ زبان سے معذور ہے۔ نبیلہ کا ایک ہاتھ بچے کے کندھے پر تھا اور مضبوطی سے وہاں جما ہوا تھا جیسے وہ ڈر رہی ہو کہ پانچ سال بعد پیاسی آنکھوں کو سیراب کرنے والی صورت پھر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

میں نے نبیلہ سے پوچھا۔ "منا کہاں ہے؟"

وہ بولی "ساتھ والے کمرے میں سو رہا ہے۔" پھر پوچھنے لگی "کیوں خیریت ہے؟"

میں نے کہا "اس کے والدین کا پتا چل گیا ہے۔ قادر پور کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہے وہ۔"

"شکر ہے خدایا۔" نبیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ تفصیل پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسی دوران فریال کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ "عجیب ہے' اللہ یوں لگتا ہے اور تو کوئی اس کمرے میں ہے ہی نہیں۔ بس اپنی ہی باتیں کیے جا رہے ہیں اور وہ بھی کھڑے کھڑے۔ جناب عالی' اور کچھ نہیں تو کہیں بیٹھ ہی جائیں۔ بیٹھنے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے۔ وہ لطیفہ آپ نے سنا ہوا ہے ناں کہ ایک شخص سائیکل ہاتھ میں تھامے بھاگا جا رہا تھا۔ کسی شخص نے کہا 'بھئی بات سنو' وہ بولا "نہیں بھئی! بات سننے کا ٹائم ہوتا تو سائیکل پر بیٹھ جاتا۔"

نبیلہ کی اشکبار آنکھیں مسکرانے لگیں۔ میں نے پھر بار درمیان سے مالک محمد کا چہرہ دیکھا۔ اس کا چھوٹا داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ ماتھے کا محراب بھی کچھ گہرا ہو تھا۔ چہرے سے وہی روشنی جھلکتی تھی جو اکثر پابند صوم و صلوٰۃ نیک باطن لوگوں کے چہرے سے جھلکا کرتی ہے۔ اس کا روپ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ کل کا ڈکیت' بدمعاش اور عیاش شخص سخت حالات کی بھٹی میں تپ کر کیا سے کیا بن تھا۔ فریال نے بولنا شروع کر دیا تھا لہٰذا یہ ماحول کسی بھی سنجیدہ بات کے لیے سازگار نہیں رہا تھا۔ میں نے مالک محمد کو ساتھ لیا اور دوسرے کمرے میں آ بیٹھا۔ یہاں ایک بیڈ پر زریں گل دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے سن کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اگر اس کے سرہانے ڈھول بھی پیٹے جائیں تو اس کی آنکھ نہیں کھلے گی۔

مالک محمد نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "احسان صاحب! جس کو مُردہ سمجھ لیا گیا ہو وہ زندہ حالت میں سامنے آ جائے تو دل کی جو حالت ہوتی ہے وہ آپ خود سوچ لیجیے۔ میرے لیے تو نبیلہ مر چکی تھی۔ ہفتے کے روز جب اس کا فون آیا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ فون اس نے میرے ایک بھائی اعجاز کی دکان پر کیا تھا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت وہیں موجود تھا۔ فون سن کر اعجاز کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ دیر تک آواز پہچاننے کی کوشش کرتا رہا پھر مجھ سے کہنے لگا' 'کوئی عورت اپنے آپ کو نبیلہ بتا رہی ہے اور تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔' میں نے ریسیور پکڑ کر نبیلہ کی آواز سنی۔ یقین کریں مجھے لگا کہ میرے دل کی دھڑکن رک گئی ہے۔"

ان جذباتی لمحات کو یاد کر کے مالک محمد کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اور وہ رومال سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

مالک محمد نے بتایا کہ اس نے شیخوپورہ والا گھر بیچ ڈالا اور اب لاہور کی نئی آبادی سولہ سو ایکڑ میں گھر لے لیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے مخالفین نے لاہور تک اس کا پیچھا کیا' ہر ممکن طریقے سے اسے بھڑکانے کی کوشش کی لیکن چونکہ وہ سر جھکا کر جینے کا ڈھنگ سیکھ چکا ہے اس لیے ان کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ تھک ہار کر اب وہ چپ ہو گئے ہیں یا شاید بار بار لاہور آنا اور ناکام واپس جانا ان کے لیے مشکل کام ثابت ہوا ہے۔

میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "مالک صاحب

آپ مجتبیٰ کنور کو جانتے ہیں؟"

وہ بولا "مجتبیٰ کنور کو کون نہیں جانتا۔ آج کل تو پورے ملک میں اس کے نام کی گونج ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ قادر زماں کے بھی مجتبیٰ سے تعلقات ہیں۔"

"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔" مالک محمد نے جواب دیا۔ "مجتبیٰ صاحب اکثر شکار کھیلنے جھنگ جاتے ہیں۔ وہ تین چار دفعہ قادر زماں کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر چکے ہیں۔ بڑا مشہور معروف ریسٹ ہاؤس ہے یہ۔ شکار کے سیزن میں وہاں ہر وقت نامی گرامی مہمانوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ میرے خیال میں تو قادر زماں کو تھوڑے عرصے میں جو اتنا اثر و رسوخ حاصل ہوا ہے اس کی ایک وجہ یہ ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔"

میں نے پوچھا "آخری بار مجتبیٰ اس علاقے میں شکار کھیلنے کب گیا تھا؟"

وہ بولا "صرف تین چار روز پہلے مجتبیٰ صاحب وہاں گئے ہوئے تھے۔ یہ خبر اخبار میں بھی آئی تھی اور میرا تو خیال ہے ابھی وہ وہیں موجود ہوں گے۔"

مالک محمد کی یہ اطلاع میرے لیے خاصی اہم تھی۔ لگتا تھا وہ جھنگ' بھکر وغیرہ سے دور ہونے کے باوجود وہاں کے حالات کے بارے میں کافی جانتا ہے۔ میں جان بوجھ کر اس سے گفتگو کو طول دینے لگا۔ ہم کچھ دیر عیسیٰ جان' غضنفر اور قادر زماں کے باہمی تعلقات پر بات کرتے رہے۔ پھر باتوں باتوں میں میں نے اس حویلی کا ذکر چھیڑ دیا۔ جو میں نے جھنگ کے مضافات میں دیکھی تھی اور وہاں کچھ پُراسرار حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ میں نے مالک محمد سے کہا کہ قادر زماں اور اس حویلی میں کوئی گہرا تعلق ثابت ہوتا ہے۔ مالک محمد نے مجھ سے حویلی کا حدود اربعہ پوچھا اور کچھ دیگر سوالات کیے۔ پھر بولا "میں نے یہ حویلی دیکھی تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے۔ اس یقین کی وجہ یہ ہے کہ قادر زماں پہلے بھی ایسی حویلیوں میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"بس ان جاگیرداروں کے شوق ہوتے ہیں' کوئی نہیں کہہ سکتا کس وقت کس چیز پر دل آ جائے۔ یہ حویلیوں والا شوق قادر زماں کا اپنا تو نہیں ہے لیکن دلچسپی وہ پوری لیتا ہے۔"

"اصل شوقین کون ہے؟"

"میں نے ایک مرتبہ پوچھا تھا' کہنے لگا' ارمغان شاہ کا ایک دوست ہے۔ ولایت میں رہ کر آیا ہے۔ پتا نہیں کیا نام بتا رہا تھا اس کا۔"

"کوئی حویلی وغیرہ خریدی بھی ہے انہوں نے؟"

"تازہ خریدی ہوں گی۔ ایک کا تو مجھے بھی پتا ہے۔ تریموں ہیڈ ورکس کے پاس جہاں "جھنگ" سے آنے والی سڑک بڑی سڑک سے جا کر ملتی ہے' دائیں طرف سرکاری رکھ میں ایک حویلی ہے۔ کافی پرانی ہے' انگریزوں کے زمانے کی۔ کسی وقت ریلوے لائن اس رکھ کے اندر سے گزرا کرتی تھی۔ ریلوے کے انگریز افسر نے اس حویلی کو کوئلے کا گودام بنا دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں محکمۂ جنگلات نے یہاں اپنا دفتر قائم کر لیا۔ سن ۵۵ء کے سیلابوں میں اسے کافی نقصان پہنچا۔ جنگلات والے اپنا دفتر کہیں اور لے گئے۔ ایک نمبردار نے ملی بھگت سے یہ زمین اپنے نام کروا لی۔ زمین کے ساتھ ہی حویلی بھی اس کی ملکیت ہو گئی۔ اب کئی سالوں سے یہ ویران پڑی تھی۔ قادر زماں نے نمبردار سے منہ مانگے داموں اسے خرید لیا۔"

"اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سال ڈیڑھ سال تو ہو گیا ہو گا۔" مالک محمد نے جواب دیا۔ پھر اسے کوئی نئی بات یاد آئی۔ کہنے لگا۔ "ہاں۔۔۔ ایک اور حویلی کی بات بھی چل رہی تھی۔ بلکہ حویلی بھی کیا تھی' بس کھنڈر تھا۔ پرانا سا۔ قادر زماں کا منیجر اس کی بہت سی رنگین تصویریں کھینچ کر لایا تھا۔ قادر زماں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیلنڈر چھپوانے کے لیے ہیں لیکن پھر بعد میں اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ یہ دو ڈھائی کینال زمین خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

یہ بڑی عجیب سی صورت حال سامنے آئی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ جاگیردار قادر زماں یا اس کے کسی دوست کا شوق ہو لیکن اس شوق میں عیسیٰ جان اور غضنفر جیسے لوگوں کا ملوث ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جھنگ والی حویلی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے حویلی کے مالک کا بچہ اغوا کر کے آزاد علاقے میں پہنچا دیا تھا اور اس سے پہلے بھی وہ نہ جانے کیا کچھ کرتے رہے تھے۔ اس سلسلے میں میں نے مالک محمد کو کھوجنے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں خود کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ وہ اس بات سے اتفاق کر رہا تھا کہ پرانی عمارات کی خرید کے پیچھے کوئی گہرا چکر ہو سکتا ہے تاہم اس امکان کو بھی رد نہیں کر رہا تھا کہ یہ صرف جاگیردار کے دوست کا مشغلہ ہو۔

ہمارے درمیان دو ڈھائی گھنٹے گفتگو رہی۔ اس دوران صفدر' فریال' نبیلہ اور تنو ساتھ والے کمرے میں بیٹھے رہے جبکہ زریں گل شرط باندھ کر سویا رہا۔ وقتِ رخصت میں نے

مالک محمد سے کہہ دیا کہ وہ تجیلہ کو یہاں سے لے کر جا سکتا ہے لیکن بہتر ہے کہ وہ ابھی دس پندرہ روز اپنے گھر میں نہ جائے۔ اگر اس کے پاس کوئی اور ٹھکانا ہے تو وہ اسے وہاں رکھ لے یا پھر کسی ہوٹل میں کمرا لے لے۔ مالک محمد میری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ اندھیرا چھٹنے سے پہلے ہم اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ گئے۔ اگلے روز میں دوپہر بارہ بجے تک سویا رہا۔ جاگا تو طبیعت میں چستی تھی۔ نہا دھو کر کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے صفدر کو کمرے میں بلا لیا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔ پوچھنے پر تصدیق ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "صفدر یار! ایک کام کرنا ہے۔"

"بندہ حاضر ہے۔ آپ صرف حکم فرمائیں۔"

میں نے کہا "جھنگ جاؤ اور وہاں سے ایک آدمی کو کان سے پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

"بندے کا اتا پتا لکھوائیں۔" صفدر نے باقاعدہ ڈائری نکال لی۔ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

میں نے کہا "قادر پور سے آنے والی برانچ روڈ کو اُنتیسویں یا تیسویں میل کے نزدیک ایک اور سڑک قطع کرتی ہے۔ مجھے اس سڑک کا نام معلوم نہیں لیکن نام کے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ اس سڑک پر قریباً ایک میل شمال کی طرف جائیں تو ایک جگہ "چھتایل" آتی ہے۔ یہاں چند دکانیں ہیں، جن میں سے ایک ندیم میڈیکل اسٹور ہے۔ اسٹور کے مالک کا نام ندیم ہے۔ وہ نوجوان لڑکا ہے۔ بال گھونگھریالے اور ٹھوڑی پر مسا ہے۔ تم اسے دیکھتے ہی پہچان جاؤ گے۔ اس لڑکے کو بغیر کسی ہنگامے کے اور رازداری کے ساتھ یہاں لانا ہے۔"

"اگر نہ آئے تو؟" صفدر نے پوچھا۔

"تو پھر تمہاری نالائقی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بھلا مانس بندہ ہے۔ تم کوئی بھی معقول بہانہ بناؤ گے تو وہ ایک روز کے لیے دکان بند کر کے تمہارے ساتھ چلا آئے گا۔ مثلاً تم اس پر یہ جعلی عکس بھی ڈال سکتے ہو کہ تم سادہ لباس میں پولیس والے ہو اور اسے کسی تفتیش میں لے جانا چاہتے ہو، وغیرہ وغیرہ۔"

"اگر وہ جعلی عکس قبول نہ کرے تو پھر اس پر اصل عکس بھی ڈالا جا سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے پسٹل وغیرہ شو کرایا جا سکتا ہے؟"

"اگر کوئی چارہ نہ رہے تو پھر یہ بھی کر دیکھنا۔"

"چارہ کیلا نہ رہے جی۔" صفدر نے اطمینان سے کہا "اتنا بے چارہ نہیں ہوں میں۔ آپ نے ابھی آزمایا نہیں اس لیے کہہ رہے ہیں۔ بس یہ سمجھیں چوبیس گھنٹے کے اندر بندہ آپ کے پاس حاضر ہوگا۔ لیکن یہ صاحب ہیں کون؟"

"بس سمجھو ایک پرانا ملاقاتی ہے۔" میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ یہ شخص ہمیں جھنگ والی حویلی کے متعلق کچھ اہم باتیں بتا سکے گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے صفدر کو بھیجنے کی۔" بجلی دروازے کی طرف سے آواز آئی اور ہم دونوں بُری طرح چونک گئے۔ یہ فریال تھی۔ معلوم نہیں وہ کب سے وہاں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ حسبِ معمول اس نے چست ٹراؤزر پر ڈھیلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ٹینس شوز تھے۔ کلائیوں پر رنگ برنگے "رسٹ بینڈ" تھے۔ لگتا تھا ہاکی کھیل کر آئی ہے یا جا رہی ہے۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ ہماری ساری باتیں سن چکی ہے۔

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تھوڑے بہت آداب جانتی ہو تم؟"

وہ بولی "یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میں چھپ کر باتیں سن رہی تھی اور یہ سراسر آداب کے خلاف ہے۔ جناب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں چھپ کر نہیں سن رہی تھی۔ میں تو علی الاعلان سن رہی تھی۔ چھپ کر تو آپ بیٹھے ہوئے تھے کمرے میں۔"

میں جانتا تھا اس زبان دراز سے بحث فضول ہے لہٰذا موضوع بدل کر پوچھا "کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

وہ بولی "آپ کے کان اپنے ہیں یا کسی سرکاری عہدیدار کے ہیں؟ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے جناب کہ صفدر وہاں نہیں جا سکتا جہاں آپ اسے بھیج رہے ہیں۔ شادی کا دن قریب آ جائے تو دولہا کو ایسے ویسے کاموں پر نہیں بھیجا کرتے۔ ہماری بڑی بوڑھیاں تو کہتی ہیں کہ شادی سے پہلے کے ایک دو ہفتوں میں دولہا کے ساتھ ہر وقت کوئی باڈی گارڈ رہنا چاہیے کیونکہ ان دنوں میں وہ چڑیلوں بھوتوں کا آسان ہدف ہوتا ہے۔ ویسے شاہ جہاں صاحب! اس بات میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ دولہا بھی احتیاط کرے، آخر میں ایک آدھ چڑیل تو اسے چمٹ جاتی ہے جو ساری عمر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی۔ اور وہ اپنی مدد کے لیے چھوٹے چھوٹے چھتنے بھی بلا لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی بیوی۔"

صفدر کے تاثرات دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے پوچھا "کون دولہا بن رہا ہے؟ کس کی بات کر رہی ہو؟"

وہ چہک کر بولی "آپ کے سامنے کھڑے ہیں بادولت۔ ذرا ان کے ہاتھ تو دیکھیے۔ باقاعدہ مہندی لگی ہوئی ہے اسی لیے کمر کے پیچھے باندھ رکھے ہیں۔ بہرحال ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ان کا چہرہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ہونے والے دولہا کا سکہ بند چہرہ ہے۔ اب آپ ان سے سوال و جواب نہ شروع کر دیجیے گا۔ انہوں نے بولنا کچھ نہیں۔ یہ آئندہ برسوں میں نہ بولنے کی مشق کر رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے، مجھ سے پوچھیے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ پاپا جانی نے انجم اور صفدر کے تمام حالات سننے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔ یہ شادی خاموشی اور سادگی کے ساتھ پرسوں انجام پائے گی۔ آپ کو دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہیں آپ یہ سمجھیں کہ آپ کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اس شادی کی تاریخ آپ کی آمد کا یقین ہونے کے بعد مقرر کی گئی تھی۔ باقی اگر آپ چاہیں تو تاریخ "آگے پیچھے" بھی ہو سکتی ہے لیکن آپ کو پتا ہی ہے ایسے کاموں میں "آگے" والی بات کسی کو پسند نہیں آتی۔ خاص طور پر دولہا کو تو بالکل نہیں لہٰذا یہ شادی پرسوں بروز جمعہ سات بجے شام انجام پائے گی۔"

میں نے صفدر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "شاہ جہاں صاحب سائیں صاحب کا نام تو ویسے ہی بیچ میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ معاملے کو اس حد تک بگاڑنے میں اصل ہاتھ کسی اور کا ہے۔" صفدر کا اشارہ واضح طور پر فریال کی طرف تھا۔

"توبہ اللہ۔۔۔ معاملہ بگاڑ رہے ہیں ہم؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی "کچھ خدا کے خوف کو ہاتھ مارو صفدر۔ ساری زندگی عینک لگا کر ڈھونڈو گے تو ایسی نیک بی بی نہیں ملے گی۔ تم ایک بار انکار کرو۔ بائی گاڈ، پرسوں ہی تمہیں کسی شوہر کا رقیب نہ بنوا دوں تو کہنا۔ اور۔۔۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ پھر تمہیں بُرا لگے گا اور کھانا چھوڑ کر بیٹھ جاؤ گے۔"

وہ کسی پرانے واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ لگتا تھا ان دو ڈھائی مہینوں میں وہ سب آپس میں کافی بے تکلف ہو چکے ہیں۔ میں حیرانی کے عالم میں کبھی صفدر اور کبھی فریال کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بڑی محبت سے مجھے دیکھ کر بولی۔ "ویسے آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ جو کام صفدر نے کرنا تھا وہ میں کروا دوں گی اور بالکل ویسے ہی ہوگا جیسے آپ چاہتے ہیں۔ قادر پور جانے والی سڑک کو تیسویں میل پر جو چھوٹی سڑک کراس کرتی ہے اس پر ایک میل آگے "چھتایل" ہے جہاں تین چار دکانیں ہیں اور ان میں سے ایک ندیم میڈیکل اسٹور ہے۔ ہے نا؟ وہاں جو لڑکا ہے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ یہاں لانا ہے۔ بس جناب! اب آپ کچھ نہ بولیے۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ یہ کام ہو گیا آپ کا۔ اب آپ وہ کام کریں جو آپ کے کرنے کا ہے۔ آپ کے دوست کی خانہ آبادی ہو رہی ہے۔ آپ اُٹھیے اور رکشا پکڑ کر مزے مزے سے انارکلی چلے جائیے۔ وہاں کمپیکٹ مارکیٹ میں عروسی سجاوٹ کا سامان ملتا ہے۔ سجی سجائی مسہریاں بھی ہوتی ہیں۔ وہاں سے یہ سامان لائیے اور آتے آتے کچھ مٹھائی وغیرہ بھی لیتے آئیے۔۔۔۔ صفدر سے پوچھ لیجیے اگر اسے شیروانی اور کُلّے وغیرہ کا شوق ہے تو یہ چیزیں بھی وہیں سے مل جائیں گی۔ تاہم بہت تھوڑا ہے جی اور کام کافی کرنا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم کل تک آجائیں گی اور وہ بھی ہاتھ بٹا دیں گی لیکن اب آپ کے آنے سے ان پر تو یہاں کرفیو لگ گیا ہے۔ سب کچھ مجھے اور شگفتہ کو ہی سنبھالنا پڑے گا۔ ویسے بڑے کنفیوز ہیں آپ جی چاہتا ہے آپ ہاکی کے گول کیپر ہوں اور میں گول کر کر کے آپ کو دن میں تارے دکھا دوں۔ دُہائی خدا کی! اتنی اچھی لڑکی اور آپ کے پیچھے خاک چھانتی پھرتی ہے۔ کاش میں ایسا نہ "ہوتی ہوتی" بلکہ پیدا "ہوا ہوتا"۔ ایک منٹ میں شادی کر لیتا غزالہ جی سے۔"

اس کی زبان چلنا شروع ہوئی تو پھر چلتی چلی گئی۔ میں پہلے تو خاموشی سے برداشت کرتا رہا پھر میرے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہونے لگے۔ وہ فوراً بھانپ گئی۔ اُٹھتے ہوئے بولی۔ "بس بس چلتی ہوں میں۔۔۔ اور میری بات کو مذاق نہ سمجھیے گا۔ صفدر کو آپ جھنگ نہیں بھیجیں گے۔ وہ ندیم میڈیکل اسٹور والا کام آپ کا ہو جائے گا۔ او کے۔"

وہ کمرے سے باہر نکلی تو جیسے ایک طوفان تھم گیا۔ میں نے اٹھ کر دروازے کو چٹخنی چڑھائی اور صفدر سے پوچھا "بھئی! یہ کیا معاملہ ہے، بہت مگنی پٹ بیاہ۔ بڑی پھرتی دکھائی ہے تم نے۔"

جواب میں صفدر نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ شادی صفدر کی مرضی سے ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انجم اور وہ حالات کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کسی وقت ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بس یہی وقت تھا جو ان کا اپنا تھا اور صفدر نے اس "بچے" وقت میں اپنی زندگی کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو اپنی سچی محبت کے صدقے خطرات کے مہیب طوفانوں سے صاف بچ کر آئی

تھی، اگر پھر چلی جاتی تو صفدر پچھتاوے کی آگ میں راکھ ہو جاتا۔ اس نے خود کو اور انجم کو اس آگ سے بچانے کے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا اور انجم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ شہلا میں انجم کی رائے واضح نہیں تھی۔ غالباً وہ جن حالات سے گزری تھی ان کا تناؤ ابھی اس کے ذہن میں موجود تھا۔ پھر والدین کی غیر موجودگی کا مسئلہ بھی تھا۔ صفدر کی درخواست پر ساہی صاحب نے انجم کے والدین سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا آخری ٹھکانا چھوڑ کر جا چکے ہیں اور اب ان کا کچھ پتا نہیں۔ فریال اور ساہی صاحب نے اپنا کردار ادا کیا اور انجم کو شادی کے مشکل فیصلے پر آمادہ کر لیا۔

صفدر کے فیصلے پر تنقید کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا ٹھیک کر رہا تھا۔ مجھے انجم کی وہ شرمائی شرمائی نظریں یاد آئیں جن سے وہ کل رات صفدر کو دیکھ رہی تھی۔ یہ امر بالکل واضح تھا کہ وہ اس فیصلے میں اپنی رضامندی شامل کر چکی ہے۔ درحقیقت ساہی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچتے ہی مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ اب ساری بات کھل گئی تھی۔

صفدر نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کھولی اور بولا "آپ فریال کی باتوں پر نہ جائیں جی۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں نکل جاتا ہوں جھنگ کے لیے۔ ہو سکتا ہے آج ہی رات واپس آ جاؤں۔"

"میرے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "اس لڑکی کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے کے باوجود میں اسے تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ اس نے جو کہا ہے کر کے رہے گی اور ہو سکتا ہے اس کام کے لیے نکل بھی چکی ہو۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ خود جائے گی؟"

"خود بھی چلی جائے تو کوئی بہت زیادہ حیرت کی بات نہیں۔ ویسے میرا خیال ہے وہ ساہی صاحب کے کسی با اعتماد ملازم سے کام لے گی۔"

اچانک گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھی کے پچھواڑے سے کوئی چیخا۔ ہم دونوں دروازہ کھول کر آواز کی سمت دوڑے۔ کوریڈور میں میں نے ایک باوردی گارڈ کو دیکھا۔ ہاتھ میں رائفل تھامے وہ بھی آواز کی سمت بھاگا جا رہا تھا۔ ساہی صاحب کی یہ کوٹھی تو سائیڈ لین میں تھی۔ پچھلی سمت چھوٹا گیٹ تھا۔ آواز اسی گیٹ سے آئی تھی۔ میں اور باوردی گارڈ آگے پیچھے بھاگتے باہر نکلے۔ میری نظر کوٹھی کے پٹھان چوکیدار پر پڑی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی زخمی ران دبا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ کی خون آلود انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس طرف بچوں کا چھوٹا سا پارک تھا۔ پارک کی دوسری جانب سفیدے کے درختوں کے پیچھے میں نے ایک موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ پھر کوئی شخص تیزی سے موڑ کاٹ کر قریبی گلی میں روپوش ہو گیا۔ ارد گرد کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ صرف ایک رکشے والا کھڑا تھا۔ اس نے سواری اتاری تھی لیکن ابھی کرائے کے سلسلے میں "تکرار" شروع نہیں کی تھی۔ میں اچک کر ڈرائیور کے ساتھ ہی نشست پر بیٹھ گیا۔ "سڑک کی طرف چلو" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

رکشا ڈرائیور زخمی چوکیدار کو دیکھ کر سہما ہوا تھا۔ تا[illegible] میرے با اعتماد لہجے نے اسے حوصلہ دیا۔ رکشا پہلے سے اسٹارٹ تھا۔ اس نے کلائی موڑ کر گیئر لگایا اور رکشا کمان سے نکلے تیر کی طرح جیل روڈ کی طرف بڑھا۔ ۷۵ کا موٹر سائیکل کے پیچھے رکشا بھگانا ایسے ہی تھا جیسے [illegible] گھوڑے [illegible] تعاقب کیا جائے۔ بس ایک امید تھی کہ شاید ٹریفک کی بدنظمی کام آ جائے۔ کہیں آگے "ٹریفک جیم" ہو اور موٹر سائیکل والا رفتار سست کرنے پر مجبور ہو جائے۔ چند اندرونی سڑکوں کو طے کرنے کے بعد رکشے نے ایک خطرناک موڑ اور دو پہیوں پر گھوم کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ موٹر سائیکل کا دور تک پتا نہیں تھا۔ ذرا ہی دیر بعد فریال کی ٹو سیٹر بھی رکشے کے پہلو میں آ رکی۔ اسے صفدر ڈرائیو کر رہا تھا اور ساتھ والی سیٹ پر مسلح محافظ براجمان تھا۔ سانپ کی لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رکشے والے کو پچاس کا نوٹ تھما کر میں نے فارغ کیا اور فریال کی گاڑی میں بیٹھ کر واپس کوٹھی پہنچ گیا۔

زخمی چوکیدار کو سروسز اسپتال روانہ کیا جا چکا تھا۔ محلے دار کھڑے چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ جہاں چوکیدار کا خون گرا تھا وہاں اینٹوں کی کیاری سی بنا دی گئی تھی۔ ساہی صاحب کے پڑوسی ڈاکٹر صاحب نے بتایا انہوں نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چلون جیکٹ والا ایک لمبا سا شخص یہاں پارک میں بیٹھا تھا۔ اٹھ کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔ چوکیدار دوست محمد کو اس پر شک ہوا۔ اس نے [illegible] پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جائے گا؟ اسی سے بات بڑھ گئی۔ اس نے چوکیدار کو دھکا دیا۔ چوکیدار نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ چوکیدار دوست محمد کے منہ پر مارا اور ساتھ ہی چوکیدار کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ چوکیدار نے بلانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس شخص نے گولی

اور سفیدے کے درختوں کی طرف بھاگ گیا۔

چوکیدار کا زخمی ہونا غیر معمولی واقعہ تو نہیں تھا لیکن اتنا معمولی بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا ساہی صاحب کی کوٹھی کے گرد بھی خطرات کے سائے منڈلانے لگے ہیں۔ ذرا ہی دیر میں پولیس کی تین چار پٹرولنگ گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں۔ وائرلیس پر چاروں طرف پیغام نشر کیے جانے لگے۔ گشتی ٹیموں کو حملہ آور کے حلیے اور موٹر سائیکل کے ماڈل سے آگاہ کیا گیا اور اہم مقامات پر ناکہ بندی کی ہدایات جاری کی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایس ایس پی صاحب خود موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ پولیس نے چاروں طرف سے کوٹھی کو گھیر رکھا تھا۔

پولیس اہلکاروں کی پھرتیاں قابلِ دید تھیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند ماہ پہلے ساہی صاحب کے قتل کی سازش کا انکشاف ہو چکا تھا۔ (یہ وہی سازش تھی جس میں قلور زماں نے مجھے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا) دوسری وجہ ساہی صاحب کا ایک "اعلیٰ پولیس افسر" ہونا تھا اور میرے خیال میں یہی وجہ زیادہ اہم تھی۔ ورنہ روزانہ کتنے لوگوں کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ کتنے گھروں کے سامنے گولیاں چلتی ہیں لیکن پولیس کی مستعدی تو دور کی بات ہے "پولیس" بھی نظر نہیں آتی۔ بے گور و کفن لاشیں پڑی رہتی ہیں۔ زخمی سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ ڈاکو باقاعدہ محاصرہ کر کے شہریوں کو لوٹتے رہتے ہیں لیکن وحشت ناک چار دیواریوں میں بیٹھے بددماغ پولیس والوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

رات گئے تک ساہی صاحب کی کوٹھی پر پولیس والوں کا تانتا بندھا رہا۔ محلے داروں کے بیانات ہوتے رہے۔ ملازموں سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ چند اخباری رپورٹر بھی بو سونگھ کر آ گئے اور کسی چٹپٹی خبر کے لیے مواد ڈھونڈنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ کل کے اخبار میں اس خبر کا رنگ ڈھنگ کچھ اس طرح کا ہو گا۔ "جیل سپرنٹنڈنٹ قاتلانہ حملے میں بال بال بچ گئے ذاتی محافظ شدید زخمی۔" (اور بعینہٖ ایسا ہی ہوا۔ حالانکہ جب گولی چلی تو ساہی صاحب وہاں سے چالیس میل دور گوجرانوالہ میں تھے)

رات نو بجے کے قریب میں پولیس والوں کی خوشامدانہ تفتیش سے اکتا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کوٹھی کے عقبی باغ سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں ایک کتا ساہی صاحب کا تھا اور باقی وہی تھے جنہیں میں کرم ایجنسی سے لے کر آیا تھا۔ میں نے مرجان صاحب سے کہا تھا کہ وہ کبیر شاہ کے یہ کتے اپنے پاس رکھ لیں اور اس کے گھر پہنچا دیں لیکن وہ نہیں مانے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کبیر شاہ کا پتا نہیں چلتا ان کتوں کا منظرِ عام پر آنا ٹھیک نہیں۔ پھر ایک کتے کو علاج معالجے کی بھی ضرورت تھی اور یہ علاج لاہور میں بہتر طور پر ہو سکتا تھا لہٰذا میں چاروں کتے لاہور لے آیا تھا۔ اب سلوکی ہاؤنڈ لاہور کے جانوروں کے اسپتال میں زیرِ علاج تھا جبکہ باقی تینوں کتے ساہی صاحب کی کوٹھی میں تھے۔

آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ سونے سے پہلے میں نے اس پرائیوٹ کلینک میں فون کیا جہاں لشکر خان زیرِ علاج تھا۔ سینئر ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ ریسیور رکھتے ہی میں گہری نیند سو گیا۔۔۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو ناک میں کوئی چیز سرسرا رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ سامنے فریال کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کی ایک ٹہنی تھی۔ یہ باسی ٹہنی اس نے میرے سرہانے رکھے گلدان سے نکالی تھی اور میری ناک میں گھما کر مجھے جگا دیا تھا۔ یہ "ادب آداب" اسی سے مخصوص تھے۔ میں نے وال کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی، رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے لہجے کی برہمی کو آزاد چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کر لو تماشا" وہ اپنے خاص انداز میں بولی۔ "اب بات بھی مجھ سے پوچھی جا رہی ہے۔ بندۂ خدا، رات کے ایک بجے آپ کا مطلوبہ شخص حاضر کر رہی ہوں اور کوئی رونق نہیں آپ کے چہرے پر اور نہ کوئی احسان مندی آنکھوں میں نظر آئی ہے۔ آخر کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں آپ؟"

میں سمجھ گیا کہ اس کے بھیجے ہوئے آدمی جھنگ سے لوٹ آئے ہیں۔ "کہاں ہے لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں بٹھا آئی ہوں۔ بڑا ڈرا سا ہے، ہماری جمہوریت کی طرح۔"

"شاباش۔ یہ اچھا کام کیا ہے تم نے۔"

"دیکھیں شاہ جہاں صاحب! یہ شاباش۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ دودھوں نہاؤ قسم کے الفاظ مجھے بالکل پسند نہیں۔ آئی ایم اے وومین ناٹ اے چائلڈ۔"

"او کے! آئندہ احتیاط کروں گا۔" میں نے کہا اور سلیپنگ گاؤن پہن کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے ایک کمرے میں روشنی نظر آئی۔ میں نے دیکھا۔ انجم، شمسا اور دو تین ملازم لڑکیاں محفل جمائے بیٹھی

تھیں۔ ایک موٹی جوڑے کی کڑھائی سلائی ہو رہی تھی۔ یقیناً کچھ دیر پہلے فریال بھی یہاں موجود تھی کیونکہ اس کا ٹریڈ مارک یعنی ٹینس شوز وہیں قالین پر پڑے تھے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ٹیوب لائٹس کی روشنی میں صوفے پر ندیم میڈیکل اسٹور کا نوجوان مالک بیٹھا نظر آیا۔ وہ شلوار قمیص اور سوئٹر میں تھا۔ کچھ تو قد کاٹھ مختصر تھا کچھ وہ بیٹھا اس طرح تھا کہ بالکل چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہیں ابھری۔ اس میں اس کا بھی کیا قصور تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تھا تو میرا حلیہ بہت مختلف تھا۔ بال بھورے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ آنکھوں کا رنگ بھی بھورا ہی تھا۔ لباس اور وضع قطع سے میں ایک بالکل جدا شخص نظر آتا تھا۔

سلام دعا کے بعد میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کچھ یاد آیا میری صورت دیکھ کر؟" میں نے ملائم لہجے میں کہا۔

"نن ــــ نہیں ــــ جی۔" وہ منمنایا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "نومبر کی پہلی تاریخوں کی بات ہے۔ چنے کلی سے چار پانچ فرلانگ کی دوری پر عطا محمد کی حویلی میں کچھ لوگ گھس آئے تھے ــــ"

"جج ــــ جی۔" وہ ہکلایا۔ اس کے ذہن میں بازیافت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ نگاہیں بدستور میرے چہرے پر گڑی تھیں۔

میں نے کہا۔ "ایک گاڑی میں کچھ لوگ تمہاری دکان پر آئے تھے، وہ قریبی چوکی میں فون کرنا چاہتے تھے ــــ"

ایک دم نوجوان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "میں پہچان گیا ہوں آپ کو۔ آپ وہی تھانیدار ہیں جنہوں نے ایک ــــ غنڈے کو اٹھا کر زمین پر دے مارا تھا ــــ لیکن ــــ" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" میں اس کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"آپ کے ــــ شاید اپنے بال رنگے ہوئے ہیں۔"

"اب نہیں، اس وقت رنگے ہوئے تھے" میں نے وضاحت کی۔ "دراصل ایک شخص کو پکڑنے کے لیے بھیس بدل رکھا تھا۔ ہم پولیس والوں کو کبھی کبھی یہ تماشا بھی کرنا پڑتا ہے۔"

میرے نرم لہجے سے حوصلہ پا کر وہ بولا۔ "مم ــــ میرا قصور کیا ہے جناب! میں نے تو کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم نے غیر قانونی کام کیا ہے کچھ معلومات درکار تھیں تم سے، اس لیے بلایا ہے۔ انجم تھوڑی دیر میں تمہاری واپسی ہو جائے گی۔"

"کیسی معلومات جی اوــــ اور وہ اے ایس آئی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ ــــ"

"اے ایس آئی صاحب کو چھوڑو۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہو گا تمہیں یہاں بلانے کے لیے کہا ہو گا ــــ"

اتنے میں چائے آ گئی۔ میرے کہنے پر اس نے لرزتا ہاتھوں سے کپ اٹھایا۔ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے اس سے عطا محمد کی حویلی کے حالات پوچھے۔ وہ بولا "چاچا محمد تو وہ حویلی بیچ کر چلا گیا۔"

"کب کی بات ہے؟"

"مہینے سے اوپر ہو گیا ہے جی۔ ملک رؤف نے اس ناک میں دم کر رکھا تھا۔ چوری چکاری، لڑائی جھگڑا، توڑ پھوڑ، حویلی چھڑوانے کے لیے ہر کام کیا ہے اس نے۔ آپ نے دیکھا ہی تھا کہ اس روز غنڈے کس طرح ہلہ بول رہے تھے حویلی میں۔ بعد میں یہ معاملہ اور بگڑ گیا۔ عطا کا ایک حمایتی سرگودھا سے آ گیا۔ اس کا نام شوکا گجر ہے! علاقے میں اس کا کافی رعب داب ہے۔ پچھلے الیکشن میں گجر برادری کی طرف سے چھوٹی اسمبلی کا امیدوار تھا مگر ایک اور امیدوار کے حق میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے عطا محمد کی حمایت شروع کی تو ملک رؤف اور بھی بھڑک گیا۔ آمنے سامنے لڑائی تک نوبت آ گئی۔ تین چار روز پولیس وہاں حویلی میں بیٹھی رہی۔ پھر پتا چلا کہ راضی نامہ ہو گیا ہے۔ عطا حویلی بیچنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اب وہ حویلی ملک رؤف کے قبضے میں ہے۔ اس نے حویلی کے چاروں طرف کانٹوں والی باڑ لگوا دی ہے اور جنریٹر سے چلنے والی لائٹیں بھی لگوا دی ہیں ــــ" کچھ کہتے کہتے ندیم خاموش ہو گیا۔

"ہاں ــــ ہاں کہو۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔ "ڈرنے سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔"

وہ بولا "مجھے زیادہ کچھ پتا نہیں ہے جی۔ کبھی کبھار حویلی کی طرف جانا ہوتا ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کئی یہاں لمبی لمبی گاڑیاں آتی ہیں۔ ایک روز ملک رؤف کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزدوروں نے اسے دھکا لگایا۔ ان کا کہنا ہے کہ جیپ میں شراب کی بہت سی بوتلیں پڑی تھیں اور ان کی کھڑکھڑ دور تک سنائی دیتی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے جھونپڑی میں ایک کمہار رہتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رات کو حویلی میں ایک لڑکی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ بات پوری طرح درست بھی نہیں۔ اس کی بیوی نے بتایا کہ حویلی کے اندر سے ایک لڑکی ڈرتا ہوتا ہے۔ اس کے لڑکے کا نام حسان

رائڈ کرنے والا عقیل رہتا ہے۔ اس کے لڑکے کا نام حسان ہے۔ اس نے ایک رات دیکھا کہ حویلی کے اندر سے ایک لڑکی نکلی۔ اس کے کانوں میں جھمکے، گلے میں ہار اور باقی جسم پر بھی گہنے تھے لیکن گہنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ چیختی ہوئی بھاگی۔ اس کے پیچھے دو آدمی آئے۔ اندھیرے کی وجہ سے لڑکی لوہے کے تار نہ دیکھ سکی اور ان سے ٹکرا کر گر گئی۔ دونوں آدمی اس چیختی چلاتی لڑکی کو اٹھا کر پھر حویلی میں لے گئے۔ صبح حسان نے اپنے چاچے اور بڑے بھائی کو کانٹوں والے تار کے پاس خون کے دھبے دکھائے۔"

ندیم مجھے جو کچھ بتا رہا تھا، معلوم نہیں اس میں سچ کتنا تھا اور کتنا جھوٹ لیکن یہ بات ضرور ثابت ہو رہی تھی کہ ارد گرد کے لوگ حویلی کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں تک عورت اور شراب وغیرہ کا تعلق تھا، اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ جو مکان یا عمارت عام لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو جائے اس کے حوالے سے شراب، عورت یا جنوں وغیرہ کا ذکر چلنے کو ضرور ملتا ہے۔

ندیم سے میری گفتگو خاصی طویل ہو رہی تھی۔ مزید طویل ہو سکتی تھی مگر مجھے احساس تھا کہ اس نوجوان کو زیادہ دیر گھر سے دور رکھنا ٹھیک نہیں۔ میں نے فریال کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ اس لڑکے کو جیسے لائی ہے ویسے ہی واپس پہنچا دے۔ وقت رخصت وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "دیکھیں جی! ہم معمولی لوگ ہیں، ہم نے وہاں رہنا ہے۔ اگر کسی بات میں میرا نام آ گیا تو ــــ"

"کسی بات میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔" میں نے اسے تسلی دی اور فریال کے ساتھ باہر بھیج دیا۔

میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ عطا محمد کے بچے کو حویلی کے تنازعے میں اغوا کیا گیا تھا۔ شاید عطا محمد تنہا ہوتا تو اس اغوا کی نوبت نہ آتی لیکن اس کے خیر خواہ شوکے گجر نے بیچ میں کود کر معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ جب ملک رؤف اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو نظر آیا کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا تو انہوں نے عطا محمد کا بچہ اغوا کر لیا۔ ان کے لیے یہ کون سا مشکل کام تھا۔ وہ چاہتے تو جوان بیٹیوں سمیت عطا محمد کی پوری فیملی کو کرم ایجنسی پہنچا سکتے تھے اور ممکن تھا کہ عطا محمد یا شوکا گجر جھکنے سے انکار کرتے تو واقعی ایسا ہو جاتا۔ میری سوچ کی لہریں خود بخود اس حویلی کی طرف کھنچتی چلی جا رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں کیا جا رہا تھا کہ پرانی بے آباد عمارات میں قادر زماں یا اس کے دوست کی دلچسپی کسی مشغلے کا حصہ ہے۔ کسی نامعلوم شخص کے کہے ہوئے وہی منحوس

الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "گوریں وہ جن کی لاشیں چوراہوں میں تڑپیں گی اور مردہ خانوں میں اکڑیں گی۔" مجھے اپنے بدن میں سوئی کی لہر دوڑتی محسوس ہونے لگی۔

○☆○

شاہی صاحب کی کوٹھی میں گہماگہمی تھی۔ صفدر کی رسم نکاح ادا ہونے والی تھی۔ وہ بند گلے کی سرخ جرسی اور سفید پینٹ میں خاصا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ فریال کی چند سہیلیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ سات آٹھ مہمان شاہی صاحب کی طرف سے بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ گھر کے افراد اور ملازم تھے۔ اس سادہ اور مختصر تقریب کو فریال کی موجودگی نے رنگا رنگ بنا دیا تھا۔ وہ ہر طرف بگولے کی طرح چکراتی پھرتی تھی اور کوئی مرد و زن اس کی زد سے محفوظ نہیں تھا۔ خاص طور پر صفدر کا تو اس نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آتے جاتے چٹکیاں لیتی تھی۔ جو فقرے اس کی طرف اچھالے جا رہے تھے اس قسم کے تھے۔

"ٹھیک سے بیٹھو اور تھوڑا سا شرماؤ۔ لگتا ہے دوسری تیسری شادی کروا رہے ہو۔"

"حسّ بند رکھو۔ ابھی سے رال نہ ٹپک جائے۔"

"مونچھیں مت موڑو، شک ہوتا ہے کہ لڑکی بیاہنے نہیں اٹھانے آئے ہو۔"

"خبردار! میری سہیلیوں کو مت تاڑو۔"

وہ شگفتہ کے ساتھ مل کر صفدر کی جوتی چھپانے، دودھ پلانے اور گھوڑے (گھٹنے) پر بیٹھنے کے پروگرام بھی بنا رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صفدر کو یوں ادھ موا کر کے چھوڑے گی کہ وہ حجلہ عروسی میں جاتے ہی بے دم ہو کر گر پڑے گا۔ بے چارہ مجھے بھی چھیڑ جاتی تھی۔ "آپ بھی ذرا تیار ہو کر بیٹھیں جناب۔ خالہ جی آ رہی ہیں۔ اف اللہ، میں دیکھ کر آ رہی ہوں۔ اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ نظر نہیں ٹکتی تھی۔ ابھی دیکھئے گا کیسی آن بان سے طلوع ہوتی ہیں۔" پھر ساتھ ہی ساتھ شاہی صاحب کو بھی پکار جاتی تھی۔ "بابا جانی! یہ شاہ جہاں صاحب کا دھیان رکھیں۔ میں پھر کہہ رہی ہوں، یہ کھسکنے کے چکر میں ہیں۔"

شاہی صاحب ہنس کر کہتے "نہیں بھئی! ایک بار کہہ جو دیا ہے۔ یہ یہیں رہے گا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بڑی دیر سے گانا گانے کے لیے مچل رہی ہے لیکن شاہی صاحب اور چند دوسرے بزرگوں کی وجہ سے چپ تھی۔ جونہی یہ لوگ ٹی وی پر خبرنامہ سننے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں گئے، فریال کی ایک سہیلی نے جہازی سائز کا

پیانو سنبھال لیا۔ شگفتہ اور فریال پیانو کے پاس کھڑی ہو گئیں اور آواز سے آواز ملا کر گانے لگیں۔ "میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں۔ آجا دیکھ میرا انتظار آجا۔"

محفل کے جذباتی جوڑے اور دبلے سے میک اپ میں بڑی پیاری لگ رہی تھی شگفتہ۔ جی چاہ رہا تھا اسے دیکھتا چلا جاؤں۔ وہ اسی طرح گاتی مسکراتی رہے۔ اس کے کلیوں سے دانت چمکتے رہیں' اس کے نازک بدن کی ڈالی لچکتی رہے..... گاتا گاتے گاتے شگفتہ نے جان بوجھ کر گانے کے بولوں میں کوئی گھپلا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فریال بھی بھول گئی۔ وہ سٹپٹا کر اسے مارنے دوڑی "ٹھہر جا شگفتا کی بچی۔" شگفتا اسے جل دے کر دروازے کی طرف نکل گئی۔ محفل کشت زعفران بنی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت غزالہ بھی اندر داخل ہوئی۔ اس کے لمبے بالوں کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا حسب معمول اس کے کندھوں پر تھا۔ وہ سادہ سی شلوار قمیص میں تھی۔ چہرے کا میک بھی نمایاں نہیں تھا۔

اسے دیکھتے ہی فریال چیخ اٹھی۔ "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گئی۔"

اس نے غزالہ کو بازوؤں سے پکڑا اور بڑی پھرتی سے ایک چکر دے دیا۔ "کم آن لیٹ اس ڈانس۔" اس نے اپنی فرینڈز کو پکارا۔

وہ بھی آفت کی پرکالیاں تھیں۔ دو سیکنڈ میں ڈانس کے لیے تیار ہو گئیں۔ پیانو پر بیٹھی "فن کار" نے فاسٹ ڈانس کا "ردھم" دینا شروع کر دیا۔ مجھے غزالہ کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ وہ خود کو لڑکیوں کے نرغے سے نکال رہی تھی اور ساتھ ساتھ فریال کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے فریال کو اس انداز سے جھٹکا کہ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ دیگر لڑکیوں کے تھرکتے پاؤں بھی رک گئے۔ پیانو خاموش ہو گیا۔ غزالہ نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور سیدھی میری طرف آئی۔ اس کا انداز ٹھٹکا دینے والا تھا۔

"شاہ جی! ایک بات کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

کوئی ایسی بات تھی اس کے انداز میں کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اکیلے میں کہوں گی۔"

وہ آج بالکل مختلف روپ میں نظر آ رہی تھی۔ بچپن سے آج تک میں نے اسے ایسے موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے فریال پر نگاہ ڈالی۔ وہ اور تمام دوسری لڑکیاں غزالہ کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔ میں خاموشی سے قریبی کمرے کی طرف چل دیا۔ غزالہ میرے ساتھ آئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے بے باکی سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کا سینہ متلاطم تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی سراسیمگی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "شاہ جی! آپ نے کبھی میری بات نہیں مانی..... آج پہلی اور آخری بار میری بات مان لیں۔ جتنی جلد ہو سکتا ہے یہاں سے نکل جائیں۔ آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ میں خدا کی قسم کھاتی ہوں' وہ لوگ آپ کو مار دیں گے۔ آپ جانتے نہیں کہ وہ کیا کر سکتے ہیں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے انہیں بہت مشکلوں سے روکا ہے۔ پلیز آپ نکل جائیں۔" وہ با قاعدہ سسکنے لگی۔

"کون مار دیں گے' کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

"قادر زماں اور اس کے غنڈے۔" وہ روتے ہوئے بولی "وہ سب کچھ طے کر چکے ہیں۔ اب صرف عمل کرنا باقی ہے۔"

"کس نے کہا ہے تم سے؟"

"قادر زماں کی بیوی ترنم نے بتایا ہے سب کچھ۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس کا علاج کر رہی ہوں۔ وہ میرے پاس آتی رہتی ہے۔ کسی وقت مجھے بھی جھوک ضامن اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میں آج جھوک ضامن گئی ہوئی تھی۔ وہیں مجھے ساری بات معلوم ہوئی ہے۔ قادر زماں کا کوئی جاننے والا ہے 'عیسٰی جان'۔ وہ بھی چند گھنٹے پہلے تک جھوک ضامن میں موجود تھا۔ وہ لوگ جان چکے ہیں کہ آپ ساہی صاحب کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں قادر زماں سے صرف چند گھنٹوں کی مہلت لے کر آئی ہوں۔ اس کے بعد وہ کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہو گا۔ وہ عیسٰی جان وغیرہ کے سامنے مجبور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ نے عیسٰی جان کا بہت بڑا نقصان کیا ہے۔ وہ اور اس کے درجنوں ساتھی ہر قیمت پر آپ کو....." اس کا گلا رندھ گیا اور وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

غزالہ کی باتیں حقیقت سے قریب تر تھیں۔ اس کا لہجہ ان حالات کی تصویر کھینچ رہا تھا جو وہ کچھ دیر پہلے جھوک ضامن میں دیکھ کر آئی تھی اور یہ خاصی بھیانک تصویر تھی۔ درحقیقت اس بات کا شبہ مجھے کل ہی ہو گیا تھا کہ نوے مشت کے ویرانے میں بھڑکنے والی آگ کے شعلے ہمارے پیچھے ہی پیچھے لاہور پہنچ گئے ہیں۔ نامعلوم شخص کے ہاتھوں چوکیدار کا زخمی ہونا' ایک معمولی واقعہ ہونے کے باوجود

معمولی نہیں تھا۔ یہ واقعہ کئی خطرات کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ان میں ایک خطرہ یہ بھی تھا جس کی اطلاع اب غزالہ دے رہی تھی۔

میں نے غزالہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تمہیں میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری طرح کوئی شریف شہری نہیں جس کی جان اور مال بروقت خطرے میں رہتے ہیں۔ میں جالی استاد ہوں' بدمعاشوں اور غنڈوں سے ان کی زبان میں بات کرنا جانتا ہوں۔ برسوں پہلے تمہارے باپ اور تمہاری ماں نے مجھے جس جہنم میں پھینکا تھا' اب مجھے اس میں زندہ رہنا آ گیا ہے۔ میں تم لوگوں کے منصوبوں اور کوششوں سے زندہ نہیں رہا' اللہ کے کرم اور اپنی قوت بازو سے زندہ رہا ہوں اور جب تک میری سانسیں ہیں' زندہ رہوں گا۔ کوئی عیسٰی اور قادر زماں میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

یکایک غزالہ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور روتے ہوئے بولی۔ "شاہ جہاں! اپنا نہیں تو شگفتہ کا خیال کریں۔ آپ اسی راستے پر چل نکلے ہیں جس راستے سے آپ کو ہٹانے کے لیے اس نے جان ہلکان کر لی تھی..... اور اس مرتبہ آپ نے ایسے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے جو بندے کو چیونٹی کی طرح مسل دیتے ہیں۔ وہ انتقام میں پاگل ہو رہے ہیں۔ ان کی صورتیں دیکھ کر خوف آتا ہے۔ میں نے حویلی میں ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ کسی جگہ درجنوں افراد کو قتل کر کے آئے ہیں۔ وہ کسی لشکر خاں کا نام بھی لے رہے تھے جس کو انہوں نے کسی سرنگ میں زندہ دفن کر دیا ہے اور اس کے بال بچوں کو گاؤں میں جا کر ذبح کیا ہے....."

غزالہ لشکر خاں کے اہل خانہ کے قتل کی خبر دے رہی تھی۔ میرا دماغ ایک بار پھر گھومنے لگا۔ جی چاہا ابھی یہاں سے کوئی گاڑی پکڑ کر نکلوں اور سیدھا قادر زماں کی حویلی میں گھس جاؤں۔ جو سامنے آئے اسے ٹھنڈا کر دوں اور پھر خود بھی ٹھنڈا ہو جاؤں۔ لیکن یہ خیال تادیر میرے ذہن میں نہیں رہ سکا۔ یہ نئے ابھرنے والے بدمعاشوں کی سوچ تھی اور میں ایک پختہ کار شخص تھا۔ گئے برسوں کی مار دھاڑ سے بھرپور زندگی میں جہاں میں نے اور بہت کچھ سیکھا تھا وہاں منہ زور جذبوں پر قابو پانا بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ جذبوں پر حاصل ہونے والا اختیار ہی تو تھا جس نے میرے اندر بھڑکنے والی آگ سے غزالہ کو بچا رکھا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر اس آگ میں کودنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اپنے کومل بدن کو میرے اندر دہکتے ہوئے انگاروں کا رزق بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتی رہی تھی..... لیکن میں اسے پکڑ پکڑ کر کھینچتا رہا تھا۔ اور آج بھی کھینچ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا' وہ مجھ سے دور چلی جائے۔ مجھ سے اور میری زندگی سے کوئی سروکار نہ رکھے۔

"کچھ اور کہنا چاہتی ہو یا بس؟" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ بلک پڑی۔ میرا بازو تھام کر بولی۔ "شاہ جہاں! آپ چاہتے ہیں ناں کہ میں آپ سے دور چلی جاؤں۔ کبھی اپنی منحوس صورت آپ کو نہ دکھاؤں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔ میں آپ کی یہ خواہش پوری کر دوں گی۔ کبھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔ آپ..... آپ میری یہ آخری بات مان لیں۔ اس گھر سے نکل چلیں اور ایک دو ماہ کے لیے کہیں روپوش ہو جائیں۔ یہاں میں سب سنبھال لوں گی۔ ساہی صاحب کو بھی قائل کر لوں گی۔ شگفتا وغیرہ کی طرف سے آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ قادر زماں زبان دے چکا ہے۔ ویسے بھی جب تک اس کی بیوی کے بچہ نہیں ہو جاتا۔ وہ شگفتا اور رانجھو والا معاملہ نہیں چھیڑے گا۔"

میں نے بے رخی سے کہا۔ "مجھے تمہاری کوئی منطق سمجھ میں نہیں آ رہی اور نہ ہی میں سمجھنا چاہتا ہوں۔"

وہ شفاف آنکھوں میں آنسو لیے بے چارگی سے میری طرف دیکھتی رہی' پھر دھیمے لہجے میں بولی "کاش' میں اپنی بات آپ کو سمجھا سکتی۔" وہ شکست خوردہ نظر آ رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف مڑنے لگا تو کہنے لگی۔ "آپ وہی کریں گے جو آپ کی مرضی ہے۔ لیکن میرے ساتھ گاڑی تک تو جا سکتے ہیں آپ۔ آئیں..... میں آپ کو دکھاؤں کہ میں یہ سب کچھ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہی ہوں۔"

"کیا دکھانا چاہتی ہو؟"

"آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو زیادہ اچھا ہو گا۔" اس نے کہا۔

"کہاں ہے گاڑی؟" میں نے پوچھا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" وہ بولی۔

ہم کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر برآمدے میں آئے اور پورچ میں کھڑی نصف درجن گاڑیوں کے درمیان سے گزر کر مین گیٹ کی طرف آ گئے۔ کل کے واقعے کے بعد پولیس کا ایک دستہ یہاں مستقل چھاؤنی ڈالے بیٹھا تھا۔ گیٹ پر دو رائفل بردار محافظ چوکس کھڑے تھے۔ غزالہ کی منطق پر حیران ہونے کا مقام تھا۔ یہ فرض محال اگر مجھے پناہ ہی لینا تھی تو پھر ساہی صاحب کی کوٹھی سے محفوظ مقام اور کون سا ہو سکتا تھا۔ گیٹ سے گزر کر ہم کوٹھی کے پہلو میں

آئے۔ غزالہ نیلے رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن میں آئی تھی اور یہ ویگن کوٹھی سے کچھ فاصلے پر نیم تاریکی میں کھڑی تھی۔ گرم کمرے سے نکلنے کے بعد ہوا کی تکلیف دہ ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ سنسان سڑک پر غزالہ کے جوتے کی ایڑی "ٹھک ٹھک" بج رہی تھی۔ اس کا ہاتھ میکانکی انداز میں آنچل کو بار بار کندھے پر سنبھال لیتا تھا۔ ویگن کے نزدیک پہنچ کر اس نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا پھر پرس سے چابی نکال کر سائیڈنگ دروازہ کھول دیا۔ ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ دکھانا چاہتی تھی' ویگن کے عقبی یا درمیانی حصے میں تھا۔ میں نے دو قدم چل کر دروازے میں جھانکا۔ ایک ثانئے کے لیے محسوس ہوا کہ کوئی سایہ سا میرے پہلو میں متحرک ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں پوری طرح خطرے کا احساس کرتا' کوئی بہت وزنی چیز میرے سر کے پچھلے حصے سے ٹکرائی۔ آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ میں اوندھے منہ ویگن کے ٹھنڈے ہوتے پائیدان پر گرا۔ میری ٹھوڑی پائیدان کے نوک دار حصے سے ٹکرائی۔ میرے کانوں میں غزالہ کی دبی دبی سی مدھم چیخ گونجی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ڈوبتے ہوئے ذہن کو سہارا دیتا' ایک اور ضرب میری گدی پر لگی۔ میری آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی۔

○☆○

میری آنکھ ایک نیم روشن کمرے میں کھلی۔ دیواروں پر آف وھائٹ رنگ تھا' کھڑکیوں پر ڈارک براؤن پردے جھول رہے تھے۔ ان بیلگی پردوں کی دوسری جانب دن کی روشنی تھی یا رات کی تاریکی' میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ایک بلب میرے سرہانے روشن تھا' تاہم میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ میرا جسم چمڑے کی پٹیوں سے کسا ہوا ہے۔ ایک پٹی رانوں پر تھی۔ دوسری پیٹ پر اور تیسری سینے پر بغلوں کے عین نیچے اور پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوں تو آدمی آسانی سے چت نہیں لیٹ سکتا۔ میں بھی مشکل میں تھا۔ میرا ایک بازو کمر کے نیچے دبا ہوا تھا اور نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے ہاتھ بائیں پہلو پر تھے۔ میں لیٹے لیٹے بھی انہیں آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری ٹھوڑی اور سر پر پٹیاں ہیں۔ بے ہوشی کے دوران میرا لباس تبدیل کر دیا گیا تھا اور اب میں پتلون اور جیکٹ کے بجائے شلوار قمیص میں نظر آ رہا تھا۔

دھیرے دھیرے سب کچھ مجھے یاد آ گیا۔ میں اسٹیشن ویگن کے ... اڈے پر جھکا تھا اور کسی سخت کرنے

میرے سر کو دو مرتبہ تختۂ مشق بنایا تھا۔۔۔ غزالہ کی دبی دبی چیخ جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔ تو کیا میں اسی مصیبت کا شکار ہو چکا ہوں جس سے مجھے آگاہ کرنے کے لیے غزالہ' ساحل صاحب کی رہائش گاہ پر آئی تھی۔ قادر زماں' عینی جان اور شکر شکرا کے پُرغضب چہرے میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ معلوم نہیں ان منحوس تصورات کا ردِعمل تھا یا کوئی اور بات' میرے سر میں شدید ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی صدمے کی ایک نس سینے میں بھی اُٹھی۔ خدا جانے غزالہ کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ شفقا کے بعد وہ میرے لیے عزیز ترین ہستی تھی۔ اس بات کو میرے سوا کون جانتا تھا؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اگر اس پر کوئی آفت آئی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلا کر اپنی بندشوں کی مضبوطی جانچی۔ بندشیں "تسلی بخش" تھیں۔ میں سر کے سوا جسم کے کسی حصے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اور جب سر کو حرکت دی تو وہ درد سے پھٹنے لگا۔

"کوئی ہے؟" میں نے چلا کر کہا۔ "کوئی ہے حرامزادے کے کا بچہ۔"

کسی نے یہ القاب قبول کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے جسم کو زور زور سے جھنجوڑا۔ جس چیز پر میں لیٹا ہوا تھا وہ متحرک ہو گئی۔ یہ دراصل ایک اسٹریچر تھا اور مجھے جکڑنے والی پٹیاں اس کے ساتھ ہی منسلک تھیں۔ اسٹریچر کے نیچے پہیے تھے جو میرے ہلنے جلنے سے حرکت میں آ گئے تھے۔۔۔

مجھے یاد آیا کہ منور کی رسمِ نکاح ادا ہو رہی تھی۔ شفقا اور فریال ہم آواز ہو کر گا رہی تھیں۔ "آجا دیکھ میرا انتظار آجا۔" جس کا انتظار تھا وہ نہیں آیا تھا اور وہ آ گیا تھا جس کا کوئی انتظار نہیں کرتا' یعنی "کٹھن وقت"! اور میں اس وقت کا شکار ہو کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچ گیا تھا۔ خبر نہیں میرے بعد اس تقریب کا کیا بنا تھا اور شفقا کا کیا حال ہوا تھا۔

"کوئی حرام کا جنا ہے یہاں۔۔۔ کوئی کنجر۔۔۔ کوئی سالا۔۔۔ کوئی بہن کا دیر۔"

کوئی جواب نہیں آیا۔ مار دھاڑ کرنے والی روح میرے اندر بیدار ہوتی جا رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر چت لیٹا اردگرد کی آہٹیں لیتا رہا۔ یہ عمارت کسی بھی مصروف سڑک یا بازار وغیرہ سے دور تھی۔ ممکن تھا قرب و جوار میں آبادی ہو مگر یہ آبادی بہت پُرسکون تھی۔ شاید سارے ہی شاعر' مصوّر اور مفکر بستے تھے یہاں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شاعر' مصوّر اور مفکر نہ ہوں بلکہ سو رہے ہوں اور پاکستان کے "اسٹینڈرڈ ٹائم" کے مطابق گھڑیاں رات کے دو بجا رہی ہوں۔ کئی ایک

امکانات تھے۔ قرب و جوار سے جو واحد آواز آ رہی تھی وہ کسی "بلک ٹیکر" یا مسالا پیسنے والی مشین کی تھی۔ حقیقتِ حال واضح نہیں تھی لیکن قرائن سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ آواز اسی عمارت کے کسی کمرے سے آ رہی ہے۔

میں نے جسم کو بے ڈھنگے طریقے سے ہلایا جلایا تو کمرے کے وسط میں رکھے ہوئے اسٹریچر نے پھر دیوار گیر کھڑکی کی طرف حرکت شروع کر دی۔ یہ صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ اگر اسٹریچر اسی طرح فرش کی ڈھلوان کے ساتھ حرکت کرتا رہتا تو میں کھڑکی تک پہنچ سکتا تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ہی ایک الماری تھی۔۔۔ اور الماری میں سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا برآمد ہونے والی اشیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہوتی جس تک میرا ہاتھ پہنچ سکتا اور وہ میری رہائی میں مددگار بھی ثابت ہوتی۔

الماری تک پہنچنے تک کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ ابھی میں نے ایک چوتھائی سفر ہی طے کیا تھا کہ کہیں پاس ہی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور درمیانی عمر کی ایک سیاہ رنگ عورت اندر آئی۔ اس کی آنکھیں بہت سفید تھیں یا شاید کالے رنگ کی وجہ سے زیادہ سفید نظر آ رہی تھیں۔ ویسے وہ صاف ستھرے لباس میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور ٹرے میں دودھ سے بھرا ہوا جگ اور ایک پیالہ تھا۔ اس نے یہ برتن میرے قریب تپائی پر رکھ دیئے اور بھدّی سی آواز میں بولی "بیب۔۔۔ بب باؤ جی۔ یہ ممم۔۔۔ مم ملک شیک پی لیں۔" وہ ہکلاتی تھی۔

ابھی جو آواز آ رہی تھی وہ یقیناً اسی ملک شیک کی تھی۔ میں نے قہرناک نظروں سے عورت کو گھور کر کہا "یہ ملک شیک پلا دے جا کے اپنے خصم کو۔ مجھے یہ بتا کہ مجھے باندھنے والا کون۔۔۔ ہے؟" ساتھ ہی میں نے باندھنے والے کو ایک گالی بھی دے دی۔

عورت کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ پختہ عمر ضرور تھی لیکن گئی گزری نہیں تھی۔ گالی سن کر اس نے جلدی سے اوڑھنی سینے پر پھیلا لی۔ پھر ذرا اٹک کر بولی۔

"بب۔۔۔ بب باؤ جی۔۔۔ مجھ سے ننن۔۔۔ نخواہ مخواہ خفا ہونے کی لوڑ نہیں ہے جی۔ مم۔۔۔ میں تو حکم کی بب۔۔۔ بب بندی ہوں۔ مم ملک شیک پینا ہے تو تم منہ کھولیں۔ میں تم کچھ سے تت۔۔۔ تت تمہارے منہ میں ڈالتی جاؤں گی۔ نہیں تو میں جا رہی ہوں۔"

کافی پھرا آ رہا تھا جگ میں۔ میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

کوئی نہیں

قیمت :
جلد اول : ۱۵۰
جلد دوم : ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ :-
ناشر : علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ ، اردو بازار ، لاہور۔
فون :- ۷۲۴۷۲۱۳

اسٹاکسٹ : علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور۔
فون :- ۷۲۳۲۸۵۳

ریگ مال سے تھوڑی بہت طبیعت صاف کر دیتا اس کی۔۔۔ اتنے میں کال بیل کی آواز آئی۔ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور تھوڑی دیر بعد وہ جھٹکے کھاتی ہوئے واپس آگئی۔ عجیب سی چال تھی اس کی۔ لگتا تھا چلتے ہوئے بھی "ہکلاتی" ہے۔ اس کی چال دیکھ کر نجانے کیوں مجھے قلور زماں کی حویلی کا وہ بوڑھا یاد آگیا جس نے میرے ہاتھوں ریڑھ کی ہڈی تڑوائی تھی۔ بچہ ایسے ہی مضحکہ خیز جھٹکے تھے اس کی چال میں۔

"کون ہے؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہی۔۔۔ جج۔۔۔ جج" وہ کچھ زیادہ ہی اٹک گئی۔

"کون سا جج؟"

"جج نہیں۔۔۔ وہی جج۔۔۔ جج۔۔۔ جس نے تمہیں میہ۔۔۔ پکڑا ہے۔ اب سب کچھ پوچھو اس سے۔"

قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ نجانے کون سی منحوس صورت دکھائی دینے والی تھی۔ پھر دروازہ کھلا اور میں ششدر رہ گیا۔۔۔ میرے اندازوں کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آگری تھی۔

میرے سامنے غزالہ کھڑی تھی۔ اس نے قتل کی فیروزی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص پر فیروزی پھولوں والی سفید جرسی تھی۔ بال حسب معمول ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ غالباً ابھی کسی گاڑی سے اتری تھی۔ اس کے ہاتھ میں تین چابیوں والا ایک "کی رِنگ" جھول رہا تھا۔ اس "کی رِنگ" میں ایک لمبی چابی یقیناً کسی گاڑی کی تھی۔ کی رِنگ اور چابیوں کو دیکھ کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ نیلی اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھولتے وقت غزالہ کے ہاتھ میں کی چابیاں تھیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے بے ہوش کرکے یہاں لانے والی اور ایک اسٹریچر کے ساتھ چرمی پیٹیوں سے باندھنے والی غزالہ ہوگی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نیلی اسٹیشن ویگن میں جھانکنے کے لیے جھکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے پہلو میں ایک سایہ متحرک ہوا تھا اور کوئی وزنی شے میرے سر سے ٹکرائی تھی۔ اس تصادم کے ساتھ ہی غزالہ کی چیخ بھی ابھری تھی۔ اب مجھے یاد آرہا تھا کہ وہ چیخ اتنی بلند نہیں تھی اور نہ ہی اس میں تحیر کا عنصر تھا۔ یقیناً چیخنے والی پہلے سے جانتی ہوگی کہ سڑک کے اس تاریک کنارے پر کیا پیش آنے والا ہے۔

غزالہ کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں اور وہ بے حد گمبھیر انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے گڑبڑا کر پلکیں جھکا لیں۔ اس کا یہ انداز میرے تمام خدشات کی تصدیق کر رہا تھا۔ بے حد سرد لہجے میں میں نے کہا۔ "یہ ملازمہ کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں لانے والی تم ہو۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟"

"ہاں یہ درست ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیوں لائی ہو؟"

"اس لیے کہ آپ از خود آنے پر تیار نہیں تھے اور میں وہ کچھ دیکھ رہی تھی جو آپ نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے آپ کو سمجھانا چاہا کہ صورت حال کتنی خراب ہے لیکن آپ نے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ آپ کو انکل ساہی کی کوٹھی سے ہٹانے کی میری کوشش ناکام ہو گئی تو مجھے وہ کچھ کرنا پڑا جو میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں آپ کو باہر اسٹیشن ویگن تک لے آئی۔ یہاں میرا ڈرائیور بلخ احمد موجود تھا۔ مجھے پہلے سے خدشہ تھا کہ آپ میری بات ماننے سے انکار کر دیں گے لہٰذا میں نے بلخ احمد کو سب کچھ سمجھا رکھا تھا۔ اس نے چوٹ لگا کر آپ کو بے ہوش کر دیا۔ آپ کو یہاں لانے کا میرے پاس یہ واحد راستہ تھا۔ یہ میں ہی جانتی ہوں کہ ایسا کرنے کے لیے مجھے اپنے دل پر کتنا جبر کرنا پڑا ہے۔"

میں گم صم غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بظاہر اس ناتواں سی لڑکی نے کتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ وہ پوری پلاننگ کے ساتھ ساہی صاحب کی کوٹھی پہنچی تھی اور ایک پلاننگ کے مطابق مجھے وہاں سے نکال لائی تھی۔ اس نے اپنے ایک ملازم کے ہاتھوں مجھ پر حملہ کروایا تھا اور یہ کوئی معمولی حملہ نہیں تھا۔ میرے سر پر دو شدید ضربیں لگائی گئی تھیں گو ان ضربوں کا مقصد مجھے بے ہوش کرنا تھا لیکن ان کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ غزالہ کا یہ خطرناک اقدام ان بھیانک اندیشوں کی نشاندہی کرتا تھا جو میری نسبت اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ جیسے موت کو روبرو دیکھنے والا بخار پر راضی ہوجاتا ہے۔ شاید اسی طرح وہ بھی میری طرف بڑھتے ہوئے خطرات کو دیکھ کر میرے سر پر قیامت توڑنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ اب یہ خطرات حقیقی تھے یا تصوراتی؟ اس کا تعین فوری طور پر کرنا مشکل تھا۔ بہ فرض محال وہ حقیقی بھی تھے تو اس لڑکی کو کیا حق پہنچتا تھا میرے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا۔ میرے بارہا منع کرنے کے باوجود وہ کیوں دخل در معقولات سے باز نہیں

آرہی تھی۔ وہ ضد کر رہی تھی اور مجھے اس کی ضد سے "ضد" ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک میں پھٹ پڑا۔ میرے منہ میں جو آیا میں کہتا چلا گیا۔ میں نے اسے سخت ترین القابات سے نوازا اور بے غیرت اور بے حیا تک کہہ ڈالا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔" میں چیخا۔ "جو قیامت میرے سر پر ٹوٹ رہی تھی ٹوٹنے دی ہوتی۔ مجھے پہلے تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت تھی نہ اب ہے۔ میں اچھے برے لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں اور نمٹ کر دکھاؤں گا۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کسی خطرے سے ڈر کر تمہاری پناہ میں آجاؤں گا۔ میں ایسی زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں اور ایسی ہمدردی کرنے والے پر بھی۔۔۔ دیکھو غزالہ! میں نے تمہیں ہر طرح روک کر دیکھ لیا ہے۔ تم میرے معاملات میں دخل اندازی سے باز نہیں آئی ہو۔ تم میرے اندر کے حیوان کو جگا رہی ہو اور یہ کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔ میں یہ بات آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری زندگی سے نکل جاؤ۔ جو کچھ تم کر چکی ہو وہی بہت ہے اب جو کچھ کرو گی اس کے لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

وہ پتھر کا بت بنی سب کچھ سنتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھی۔ بڑے اطمینان سے اس نے اپنا ہینڈ بیگ سامنے والی میز پر رکھا اور اس میں سے مرہم پٹی کا سامان نکالنے لگی۔ ملازمہ ڈری سہمی ایک کونے میں دبکی ہوئی تھی۔ ہکلا کر بولی۔ "بب بی بی جی! اس نے ہم ہلک ٹیک بھی نہیں پیا اور۔۔۔"

"اچھا اچھا۔" غزالہ نے اس کی بات کاٹی "جگ یہاں رکھ جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔"

ملازمہ فوراً باہر نکل گئی۔ غزالہ ایک چھوٹی سی قینچی سنبھال کر میری طرف بڑھی اور سر پر بندھی ہوئی پٹی کاٹنے لگی۔ "مت ہاتھ لگاؤ مجھے۔" میں نے گرج کر کہا۔ "مجھے نہیں ہے ضرورت تمہاری ڈاکٹری کی۔"

میری آواز کمرے میں گونجی اور غالباً پوری کوٹھی میں سنی گئی۔ کہیں قریب ہی بندھا ہوا کوئی کتا زور و شور سے بھونکنے لگا اور اس کے ساتھ ہی کوئی پرندہ بھدی سی آواز میں چیخا۔ غزالہ پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے تسلی سے پٹی کی گرہ کاٹی اور بل کھولنے لگی۔ میں نے زور مار کر دیکھا۔ جسم پوری طرح کسا ہوا تھا۔ زبان کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا میں اور غزالہ کی حد تک زبان بے اثر ہی ثابت ہو رہی تھی۔ اب صرف گالی گلوچ کی کسر رہ گئی تھی اور گالی گلوچ میں کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ بھی تھا' چند ماہ پہلے

غزالہ مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کر چکی تھی۔ اس نے اپنا بہت کچھ داؤ پر لگا کر میری بہن کو جاگیردار تاروزماں کے چنگل سے نکالا تھا۔ وہ بہن جسے جھوک ضامن کی اونچی دیواروں والی حویلی سے برآمد کرنے کے لیے میں سر پر کفن باندھنے کی تیاری کر رہا تھا' یوں میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی جیسے کبھی جدا ہی نہ ہوئی ہو اور یہ سب کچھ غزالہ کی وجہ سے ہو سکا تھا۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں غزالہ سے زیادتی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ مجھے زبردستی یہاں لا کر اس نے ایک سنگین غلطی کی تھی لیکن وہ اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو میں اس سے کر رہا تھا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہونے لگے۔ میں نے اپنی نگاہ غزالہ کے چہرے سے ہٹائی۔ اس نے میرے سر کی پٹی کھول کر ٹوکری میں ڈال دی۔ زخم سر کے پچھلے حصے میں آیا تھا اور کافی تکلیف دہ تھا۔ غزالہ نے اسپرٹ سے اسے صاف کیا اور مرہم لگا کر نئی پٹی باندھ دی۔ یہی عمل اس نے ٹھوڑی کے زخم پر بھی دہرایا۔

"دوائی لے لیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کی گلابی ہتھیلی پر اینا کسل کیپسول اور اسپرین کی ٹکیا تھی۔

"مجھے کچھ نہیں لینا۔" میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سرنج میں انجکشن بھر کر اس نے میرے بازو میں لگا دیا۔ کچھ عجیب سا سوز طاری تھا اس پر۔ آنکھوں کے زیریں کنارے اور پھنگی سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا' وہ بہت مشکل سے آنسو ضبط کیے ہوئے ہے۔ مرہم پٹی کا سامان اپنے بیگ میں رکھنے کے بعد اس نے دیوار گیر کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ تب وہ میرے سرہانے آن کھڑی ہوئی۔ زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں گردن پوری طرح گھمانے کے باوجود اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہاں اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مخصوص خوشبو میرے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ یہی خوشبو تھی جس نے لڑکپن سے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ یہ ادھ پکے آموں کی وہ خوشبو تھی جو بہار کے پہلے جھونکوں کے ساتھ بابے حشمت کے باغ سے آتی تھی اور پورے جل کوٹ میں پھیل جاتی تھی۔ میں اس خوشبو کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ خوشبو میری زندگی کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ میری قوت ارادی نے اس کمزوری کو چھپا لیا تھا اور میری شخصیت میں کسی ناآسودگی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جینے کی آخری سانس تک اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ کمزوری میری رگ جاں میں بسی

رہے گی۔ کبھی کبھی میں اپنے اس مسئلے کے بارے میں بڑے معروضی انداز میں سوچتا تھا۔ آخر کیوں میں نے زندگی کے کچھ نامہرباں لمحوں تک کی تلخیاں اپنے دل و دماغ پر حاوی کرلی تھیں۔ بے شک ان "لمحوں" کے نتائج میرے لیے بہت بھیانک نکلے تھے لیکن وہ لمحے کچھ ایسے انوکھے تو نہیں تھے، وہ کسی پر بھی وارد ہو سکتے تھے۔ اوائل شباب میں جب جذبے منہ زور اور خیالات ناپختہ ہوتے ہیں تو نوجوانوں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں۔ کبھی ان رومانی واقعات کی شدت کم ہوتی ہے۔ کبھی زیادہ، کہیں دو پردۂ راز میں رہتے ہیں۔ کہیں طشت ازبام ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان واقعات میں "نادانی" قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم دونوں نے بھی نادانی کی تھی۔ میری نادانی یہ تھی کہ ایک نادان دوست کی باتوں میں آکر میں بزعم خود رومانی ناولوں کا ہیرو بن بیٹھا تھا۔ ایک بند کمرے میں میں نے ایک ایسی لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا جس کے ردعمل کے بارے میں، میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور یہ اس لڑکی کی نادانی تھی کہ اس نے رذے میاں جیسے سفاک کی "راجدھانی" میں رہتے ہوئے میری اس حرکت کا ڈھنڈورا ہر کس و ناکس کے سامنے پیٹ ڈالا تھا۔ بہرطور یہ بات سامنے کی ہے کہ یہ سارا قصہ لڑکپن کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ کچی عمر کی ان تلخیوں کو اپنی پوری زندگی پر حاوی کرلینا کسی طرح دانشمندی نہیں تھی۔ میں بارہا خود کو سمجھا چکا تھا کہ مجھے غزالہ کے حوالے سے اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ اس نفرت کو کھرچ دینا چاہیے جو میرے دل کے پرتوں میں سرایت کرتی جارہی ہے لیکن اس سوچ کا نتیجہ ہمیشہ برعکس نکلا تھا۔ میں نے خود کو جتنا سنبھالا تھا، اتنا ہی بکھرا ہوا پایا تھا۔ میں کوئی کمزور شخص نہیں تھا لیکن نجانے کیوں اس معاملے میں قطعی بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دم غزالہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے سرہانے کھڑی بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ "شاہ جہاں! آپ مجھ پر جتنا بھی خفا ہوں کم ہے۔ میں اس لائق ہوں کہ آپ میرے ٹکڑے کردیں لیکن میری ایک درخواست ہے۔ جہاں آپ نے اتنا عرصہ مجھے برداشت کیا ہے، چند روز اور کرلیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ—" ایک دم اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحے میرے سرہانے مکمل خاموشی طاری رہی پھر غزالہ کی اشک بار آواز دوبارہ ابھری۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خواہش پوری کروں گی۔ ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میں نے ہار مان لی ہے۔ جتنی نفرت آپ کے دل میں اپنے لیے ہے...

لیے نرم گوشہ نہیں بنا سکی۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر سسکنے لگی۔ وہ میری نگاہ سے اوجھل تھی لہٰذا کھل کر آنسو بہانے میں اس نے مضائقہ نہیں سمجھا۔ روتے ہوئے بولی۔ "شاہ جہاں! میرے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ میں جو کچھ کہہ سکتی تھی کہہ چکی ہوں شاید آپ بھی جو کچھ سن سکتے تھے سن چکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب جدا راستوں پر چلنے کا وقت آگیا ہے۔ میری یہ آخری خواہش پوری کردیں۔ اپنی زندگی میں سے چند دن مجھے دے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں اس کے بعد آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

میں نے سر پیچھے کی جانب موڑ کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن وہ میری نگاہ کے دائرے سے باہر کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔ "جو کہنا چاہتی ہو صاف کہو اور سامنے آکر کہو۔"

وہ بدستور میرے پیچھے کھڑی رہی۔ اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "میں ایک کمزور عورت ہوں، آپ کی بندشیں کھول دوں گی تو آپ من مرضی کریں گے۔ میں آپ کو یہاں پابند رکھنے پر مجبور ہوں لیکن یہ پابندی زیادہ طویل نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روز۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ ان دس پندرہ دنوں میں عینی جان اور شنکر وغیرہ میرا پیچھا چھوڑ دیں گے؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ بولی۔ "لیکن مجھے یقین ہے، میں اس مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گی۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے تجربے نے سکھایا ہے کہ موت سائے کی طرح انسان کا پیچھا کرتی ہے اور اگر اس کا پیچھا کیا جائے تو بھاگ اٹھتی ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ اس مکان میں مجھے چند روز قید رکھ کر میری جان بچالو گی بلکہ یہ خام خیالی ہے۔ تمہاری بے وقوفی ہے۔ کچھ نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ میرے گرد گھیرا مزید تنگ ہو جائے گا۔ اپنی دانست میں جسے تم بھلائی سمجھ رہی ہو وہ میرے حق میں خرابی ہے اور میں یہ بھی تمہیں بتا دوں کہ جو معاملہ شروع ہوا ہے وہ اب کسی کے روکے سے نہیں رکے گا۔"

"پھر بھی مجھ سے جو کچھ بن پڑا کروں گی۔ میں آپ کو اور شفتا کو ملک سے باہر بھجوا دوں گی۔ کسی دور دراز مقام پر، کسی چھوٹی سی غیر معروف جگہ پر، آپ کے لیے وہاں امن اور سلامتی سے رہنا ممکن ہو جائے گا۔"

"کون باہر جانے دے گا مجھے؟ میں ایک قیدی ہوں جسے خاص شرائط کے تحت پیرول پر جیل سے نکالا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو ساہی صاحب ہی تمہارا راستہ روک لیں گے۔ پھر

عینی جان اور شنکر کے گماشتے ہوں گے جو ہر طرف میری بو سونگھ رہے ہیں اور اگر ہم بہن بھائی ملک سے باہر نکل بھی گئے تو کیا ضمانت ہے کہ چند دن بھی محفوظ رہ پائیں گے۔ شنکر کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ بین الاقوامی شیطان ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ کیا کرسکتا ہے اور کہاں تک جاسکتا ہے؟"

وہ بولی۔ "میں نے ایک منصوبے پر بات کی تھی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہاں تک نوبت نہیں آئے گی۔ چند روز کے اندر آپ کے دشمن سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ میری اطلاعات کے مطابق پورے صوبے کی پولیس حرکت میں ہے۔ اب تک یہی سمجھا جا رہا ہے کہ ہم دونوں کو اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے عینی جان وغیرہ ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران ہی وہ میرے سامنے آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک والا جگ تھا۔ جگ سے اس نے کچھ مشروب پیالے میں انڈیلا اور شوپ والے چمچے میں بھر کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نجانے کیوں میں نے ہونٹ کھول دیے۔ وہ مجھے گھونٹ گھونٹ پلانے لگی۔ گاہے گاہے ایک رومال سے وہ میرے ہونٹ پونچھ دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ "جانتی ہو تمہاری اس حرکت کا شفتا پر کیا اثر ہوگا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ کہیں ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے۔"

وہ بولی۔ "خدا نہ کرے، آپ کو کچھ ہو جاتا تو پھر اس پر کیا بیتتی۔ یہ نہیں سوچا آپ نے۔ وہ حوصلہ مند لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمت سے کام لے گی اور ہو سکتا ہے کہ ایک دو روز تک میں اسے بتا بھی دوں۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "میں اس وقت کہاں ہوں؟"

"آپ مری میں ہیں۔ کشمیر پوائنٹ کی سڑک پر۔ یہ میری ایک دیرینہ دوست کا کلینک ہے۔ وہ صرف مہینے میں ایک بار یہاں آتی ہے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ غزالہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں لاہور سے قریباً ساڑھے تین سو کلومیٹر دور اس ہل اسٹیشن پر لے آئی تھی اور اب تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں الیکٹرک ہیٹر نصب تھا اس لیے مجھے نرم پہاڑی خنکی کا پتا بھی نہیں چل سکا تھا۔ مجھے وہ کرخت سی آواز یاد آئی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے سنی تھی۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ پہاڑی کوا تھا جو کہیں آس پاس بولا تھا۔ پرندے کا بولنا اس بات کا ثبوت تھا کہ کمرے سے باہر دن کی روشنی ہے۔ میں نے غزالہ سے وقت پوچھا تو تصدیق ہوگئی۔ سہ پہر کے تین بجے تھے اور یہ بدھ کا دن تھا۔ اس حساب سے میں قریباً

اٹھارہ گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ ظاہر تھا کہ میری بے ہوشی کو طوالت بخشنے میں کسی انجکشن وغیرہ کا عمل دخل بھی رہا ہے۔ میرا دھیان ایک بار پھر اپنے لباس کی طرف چلا گیا۔ یہ نئے کپڑے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پہنائے گئے تھے۔ پہنانے والا کون تھا؟ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں اٹھنے والا سوال جیسے سوچ کی لہروں پر سفر کرکے اس تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیلتے اور سمٹتے دیکھی۔

"یہ لباس تم نے بدلا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں گردن کو خم دیا۔ ریشمی بالوں کی کچھ دبیز تہوں نے پھسل کر چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بنا دیا۔ اس ریشمی گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے مختصر جواب دیا "ہاں۔"

اتنے میں باہر سے ملازمہ کی ہکلاتی ہوئی آواز آئی۔ "بی بی! باہر مستری آیا ہے۔ آپ کو بلا رہا ہے۔"

"اچھا آتی ہوں۔" غزالہ نے کہا اور میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔ میں اپنی جگہ چت لیٹا باہر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کرتا رہا۔ کسی قریبی کمرے میں گفتگو ہو رہی تھی لیکن الفاظ میرے پلے نہیں پڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گفتگو ختم ہوگئی اور کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگا کہ کسی وزنی شے کو گھسیٹ کر میرے کمرے کی سمت لایا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا شے تھی۔ چند منٹ مزید گزرے اور پھر تھرتھراہٹ کی پُرشور آواز سے کمرا گونج اٹھا۔ یہ برقی ویلڈنگ پلانٹ کی آواز تھی۔ اس پلانٹ کو کمرے کی درمیانی کھڑکی کے پاس استعمال کیا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں اس پلانٹ کے ذریعے کیا جوڑا اور اکھاڑا جا رہا تھا۔ میں اپنے اس مسئلے پر غور کر رہا تھا کہ میرا ذہن ایک تاریک سی دلدل میں دھنسنے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے غزالہ نے جو انجکشن مجھے لگایا تھا اس میں خواب آور دوا بھی شامل تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کمرے کا منظر بہت حد تک بدلا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل پڑی تھی اور سامنے ایک تپائی پر ٹی وی سیٹ بھی نظر آرہا تھا۔ ٹی وی سیٹ کے ساتھ کونے میں ایک بڑا ریفریجریٹر رکھا تھا۔ میں اسٹریچر کے بجائے بیڈ پر تھا اور ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ آزمائش کے لیے میں نے بایاں بازو اٹھایا تو سب سے پہلے نگاہ کلائی کی گھڑی پر پڑی۔ یہ میری ہی گھڑی تھی۔ صبح کے نو بجے تھے اور یہ جمعرات کا دن تھا۔ میں رات بھر بے خبر سویا رہا تھا۔ بیڈ کے

نیچے سلیپر کا جوڑا سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ سلیپر پہن کر میں سیدھا دروازے کی طرف گیا۔ حسب توقع وہ باہر سے لاک تھا۔ میں نے کھڑکی پر دھاوا بولا۔ پٹ کھولے تو باہر گرل نظر آئی۔ گرل پر باہر کی طرف دو انچ چوڑی اور چوتھائی انچ موٹی آہنی پٹیاں نظر آگئیں۔ یہ پٹیاں افقی رخ سے کھڑکی پر ویلڈ کردی گئی تھیں اور ان کے درمیان بمشکل چھ انچ جگہ بچی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل یہی پٹیاں ویلڈ کی جا رہی تھیں۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر میں نے روشندانوں پر نگاہ ڈالی تو وہاں بھی یہی "انتظام" دکھائی دیا۔

میرے اپنے لباس سمیت تین چار استری شدہ جوڑے بڑے سلیقے سے الماری میں جھول رہے تھے۔ اٹیچ باتھ روم میں صابن تولیا ٹوتھ پیسٹ سمیت تمام لوازمات موجود تھے۔ میں باتھ روم سے نکلا اور دانت کچکچا کر ایک زوردار لات بیرونی دروازے پر ماری۔ "دروازہ کھولو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔"

میری آواز دیواروں میں گونج کر رہ گئی۔ یقیناً یہ کمرا مکان کے وسط میں واقع تھا۔ میں کافی دیر تک پکارتا رہا لیکن کوئی جواب ملا اور نہ کہیں کوئی آہٹ ابھری۔ یوں لگتا تھا کہ یہ مکان ایک قبر ہے اور کسی وسیع و عریض قبرستان میں واقع ہے۔ آج تو مجھے اپنی پکار کے جواب میں کتے کی غراہٹ اور کوّے کی کائیں کائیں بھی سنائی نہیں دی۔ تاہم اس مکمل خاموشی کے باوجود نجانے کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ اس چار دیواری میں ایک یا ایک سے زائد افراد موجود ہیں جو یہاں وہاں دم سادھے بیٹھے ہیں۔

دروازے کی طرف سے مایوس ہو کر میں ریفریجریٹر کی طرف بڑھا۔ یہ کشادہ ریفریجریٹر نیچے سے اوپر تک اشیائے خورد و نوش سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے جائزہ لیا۔ پتیلی نما برتنوں میں پانچ چھ قسم کے سالن تھے۔ اس کے علاوہ چاول، ڈبل روٹی، انڈے، جام، مکھن، دودھ بہت کچھ بھرا ہوا تھا۔ میں تین وقت پیٹ بھر کر کھاتا تو بھی دو ہفتے تک مجھے اس کمرے میں ہر چیز دستیاب ہو سکتی تھی۔ ریفریجریٹر کی اشیا کو گرم کرنے کے لیے قریب ہی ایک "اوون" بھی رکھا ہوا تھا۔ "اوون" کے پاس ایک شیلف پر ڈسپوزایبل پلیٹوں، رکابیوں اور چمچوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ نچلے شیلف پر مختلف رسائل و جرائد کے علاوہ تازہ اخبار بھی پڑا تھا۔ درحقیقت غزالہ نے اس کمرے کو میرے لیے ایک بہت مضبوط لیکن نہایت آرام دہ جیل کی شکل دے دی تھی۔ میں اس کمرے میں موجود اشیا پر جتنا غور کر رہا تھا اتنا ہی حیران ہو رہا تھا۔ اس نے میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا بھی خیال رکھا تھا اور لحاظ سے میری مزاج آشنائی کا مظاہرہ کیا تھا۔ خوراک سے لے کر لباس تک اور سگریٹ کے برانڈ سے لے کر گلدان کے پھولوں تک ہر چیز میری پسند کے عین مطابق تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے، عورت جب صنفِ مخالف سے وابستگی کا اظہار کرنا چاہتی ہے تو اس اظہار کے لیے ہزار راستے ڈھونڈ لیتی ہے۔ اس حوالے سے اسے کبھی مجبور نہیں جاننا چاہیے۔

میں اپنے گرد و پیش پر نگاہ دوڑا رہا تھا کہ کھڑکی کے پاس آہٹ ہوئی۔ اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سے اندازہ ہوا کہ غزالہ آرہی ہے۔ وہ غزالہ ہی تھی۔ وہ آسمانی رنگ کے سوٹ میں تھی۔ کندھوں پر اسی رنگ کی گرم شال تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ اس ندامت کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا اور یوں میرے روبرو آئی تھی جیسے جیل میں کوئی قیدی سے ملاقات کرنے آتا ہے۔ میں نے اس صورت حال پر تبصرہ کرکے اسے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سگریٹ سلگا کر کھڑکی کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہم دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"پرسوں میں ترنم کو دیکھنے جھوک۔۔۔ نہ امن گئی تھی۔ اس کی ڈیلیوری میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے لیکن وہ ابھی سے ہر تیسرے چوتھے روز مجھے بلا لیتی ہے۔ پرسوں مجھے حویلی کئی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں اور کچھ اجنبی چہرے دکھائی دیے۔ یہ لوگ شکل و صورت سے قبائلی لگتے تھے۔ ترنم نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ عیسٰی جان نام کا ایک شخص حویلی میں مہمان ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے ارادے شگفتہ اور اس کے بھائی کے بارے میں خطرناک ہیں۔ وہ ایک اندرونی راستے سے مجھے حویلی کی نشست گاہ تک لے گئی۔ ایک تاریک گیلری میں نشست گاہ کے دو روزن کھلتے تھے۔ ان روزنوں سے صرف نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی بلکہ اندر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا جاگیردار قادر زماں سمیت وہاں چار آدمی موجود تھے۔ ان میں گٹھے ہوئے جسم اور گھنی مونچھوں والا ایک کوتاہ قد شخص عیسٰی جان تھا۔ اس کے پہلو میں بھوری آنکھوں والا ایک نہایت خطرناک صورت کا شخص بیٹھا تھا۔ اس کا نام قادر زماں کی زبانی معلوم ہوا۔ یہاں موضوعِ گفتگو وہی تھا جس کی طرف تھوڑی دیر پہلے ترنم نے اشارہ کیا تھا۔ عیسٰی جان کا چہرہ تپ کر انگارا ہو رہا تھا۔ وہ قادر زماں کو بتا رہا تھا کہ انہوں نے ا

...ریجنٹ میں دو درجنوں باغیوں کو زندہ دفن کر دیا ہے اور لشکر خاں ...شخص کے اہل خانہ کو عبرت ناک موت مارا ہے۔ عیسٰی ...ن کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آپ صحیح سلامت لاہور پہنچ ...ہ ہیں اور آپ نے انکل ساہی کے پاس پناہ لے رکھی ...ہے۔" ایک دم غزالہ کی آواز بھرّا گئی۔ وہ بولی۔ "وہ لوگ ...ے اور شگفتہ کے متعلق بڑے بُرے ارادے رکھتے ہیں۔ ...ی جان نے قسم کھا رکھی ہے کہ اس وقت تک کھانا کھائے ...ہ لباس بدلے گا جب تک اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ ...ہ لے لے گا۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے ان پر ...جگہ خون کے دھبے تھے۔ ان دھبوں کو چھپانے کے لیے ...نے جسم پر ایک کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ قادر زماں کے ...ار کے باوجود وہ کپڑے بدلنے پر تیار نہیں ہوا۔

قادر زماں نے کہا۔ "عیسٰی! شاہ جہاں تمہارا مجرم ہے ...کے ساتھ جو جی چاہے کرو لیکن اس کی بہن کو کچھ نہ کہو۔ ...ہماری نہیں میری مجرم ہے۔ اس کا حساب کتاب میں خود ...ں گا۔"

عیسٰی جان نے تفصیل پوچھی اور قادر زماں نے سب صاف صاف بتا دیا۔ اس نے کہا۔ "شگفتہ نامی وہ لڑکی مجھ چھن گئی ہے۔"

عیسٰی جان بولا۔ "وہ کون سورما ہے جو تم سے لڑکی چھین لے گیا ہے؟"

وہ بولا۔ "کوئی سورما نہیں، بس میری مجبوری آڑے آئی۔ میری بیوی کو بچہ ہونے والا ہے۔ بہت بگڑا ہوا کیس ہے، زندگی اور موت کا کچھ پتا نہیں۔ جو ڈاکٹر میری بیوی کا ...کر رہی ہے اس نے شرط رکھی تھی کہ میں شاہ جہاں کی ...و واپس بھیج دوں۔ صورت حال ایسی تھی کہ مجھے یہ ...ہو کرنا پڑا لیکن یہ زخم میرے سینے میں بالکل تازہ ...ہے۔"

لشکر نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اور بھی ...بات ہے۔ ہم اس لڑکی کو زندہ پکڑیں گے اور اسے ...حویلی میں پھینک دیں گے۔ تمہاری شرط کو بھی کچھ ...ہوگا اور مچھلی بھی گھڑے میں آ جائے گی۔"

قادر زماں نے یہ بات نہیں مانی۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی ...معاملے کو چھیڑنا نہیں چاہتا کیونکہ اس مرحلے میں ذرا ...ہمارا کھیل خراب کر سکتی ہے۔

...جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں قادر زماں کے دو محافظ ...گیلری کی طرف نکل آئے۔ مجھے اور ترنم کو فوراً وہ جگہ ...چھوڑ کر زنان خانے میں جانا پڑا۔ میں بہت خوفزدہ تھی۔ لگتا تھا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ اس مرحلے پر ترنم نے مجھے سہارا دیا۔ تھوڑی دیر کے لیے جیسے وہ ڈاکٹر اور میں مریضہ بن گئی تھی۔ میں نے ترنم سے کہا کہ میں جاگیردار صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس نے کوشش کرکے چند منٹ میں جاگیردار کو زنان خانے میں بلا لیا اور میری ملاقات کرا دی۔ میں نے جاگیردار سے صاف کہہ دیا۔ "زماں صاحب! مجھے شگفتہ کے بھائی کی زندگی خطرے میں نظر آتی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ میرے قبائلی مہمان وہ لوگ ہیں جن سے کرم ایجنسی میں شاہ جہاں نے ٹکر لی ہے۔ وہ سب اس کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کوئی کرشمہ ہی اب اس کی زندگی بچا سکتا ہے۔"

شاید آپ اسے میری خود ستائی سمجھیں یا خوشامد سے تعبیر کرنے لگیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں رو رہی تھی۔ میں نے جاگیردار سے کہہ دیا کہ اگر یہ لوگ اپنے ارادوں میں کامیاب رہے تو شاید میں بھی زندہ نہ رہوں۔ اسے اپنی اہلیہ کے لیے کوئی بندوبست کر لینا چاہیے۔

ایک طویل بحث کے بعد جاگیردار کا رویّہ نرم پڑ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "ڈاکٹر غزالہ! میں تمہیں رات نو بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اس دوران شاہ جہاں کو جہاں کہیں بھی لے جاؤ۔ اس کے بعد کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہے گا۔ یہ قبائلی لوگ ہیں۔ خود مریں گے یا شاہ جہاں کو ماریں گے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہوگی۔"

میں اسی وقت اپنے ڈرائیور رفیع احمد کے ساتھ جھوک خدامن سے نکلی اور جتنی جلدی آ سکتی تھی لاہور آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ انکل ساہی کے گھر صفدر کی رسم نکاح ادا ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس تقریب کو برباد کروں لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے تقریب میں جانا پڑا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے علم میں ہے۔"

اپنی بات ختم کرکے غزالہ ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں غزالہ سے کوئی سوال کرتا، کسی قریبی کمرے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی زور و شور سے بج اٹھی۔ غزالہ چونک کر اٹھی اور جلدی سے فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس کی باتوں کی آواز آنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے کہیں ٹرنک کال بُک کرا رکھی تھی۔ علیک سلیک کے بعد جب اصل گفتگو شروع ہوئی تو آواز ایک دم مدھم پڑ گئی۔ غالباً کوئی درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور غزالہ ٹیلی فون

سیٹ ہاتھ میں اٹھائے میری طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک اور چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ بے خیالی میں دوپٹا اس کے ایک کاندھے سے سرک گیا تھا اور چلتے ہوئے، جسم کا مد و جزر کا جاذب نظر منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے ریسیور دو آہنی پٹیوں کے درمیان سے گزار کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"شگفتہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔" اس نے دھاگا تیز اطلاع دی۔

میں ریسیور تھام کر چند لمحے تذبذب میں کھڑا رہا پھر ایر پیس کان سے لگا کر شگفتا کی آواز سنی۔

"ہیلو بھیا۔۔۔ ہیلو۔" وہ پکار رہی تھی۔

"ہیلو شگفتا۔" میں نے بھاری آواز میں کہا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ "کیسے ہو بھیا۔ میں پریشان تھی۔ ہم سب بہت پریشان تھے۔ باجی غزالہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ہے کہ وہ آپ کو یہاں سے لے گئی ہیں۔ یہاں بہت خطرہ ہے۔ پرسوں کسی نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی کہ کچھ لوگ زبردستی کوٹھی میں گھسنے والے ہیں۔ حالانکہ ساہی نے پہرا سخت کر دیا۔ رات دو بجے کوٹھی کے پاس والی سڑک سے ایک پاگل شخص کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے پاس دستی بم اور دوسرا اسلحہ تھا۔ گرفتار ہونے پر وہ بری طرح چیخنے چلانے لگا اور قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔ وہ قبائلی تھا۔ اس کے دو ساتھی بھی تھے جو موقعے سے فرار ہو گئے۔ جب اس قبائلی کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے لے جایا جا رہا تھا، اس نے ایک ایس آئی کا پستول کھینچ لیا۔ پہلے فائر کر کے ایس آئی کو زخمی کیا پھر اپنے سر میں گولی مار لی۔۔۔ کل گھر کے ایک پٹھان ملازم کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے پاس سے بہت سے افغانی نوٹ برآمد ہوئے ہیں۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ بھیا! آپ باجی غزالہ پر بھروسا کریں۔ وہ جو کچھ کر رہی ہیں آپ کے بھلے کے لیے ہے۔ آپ نہیں جانتے وہ کتنا چاہتی ہیں آپ کو۔ وہ بالکل بدل چکی ہیں بھیا۔۔۔ ہیلو بھیا! میری بات سن رہے ہو ناں۔۔۔ ہیلو۔"

"ہاں ہاں سن رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم خیریت سے تو ہو ناں؟"

"میری فکر مت کریں بھیا۔ وہ لوگ صرف آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ خدا کے لیے بھیا! یہاں آنے کی کوشش مت کریں۔ جب تک یہ لوگ پکڑے نہیں جاتے، آپ بالکل باہر مت آئیں۔ میں آپ کو کھو کر جی نہیں سکتی۔۔۔ پلیز بھیا۔۔۔ پلیز۔" وہ ہسٹریائی انداز میں رونے لگی۔

"حوصلہ رکھو شگفتا۔ کچھ نہیں ہو گا مجھے۔"

وہ بولی۔ "دیکھو بھیا! میری بات مان لو۔ وہیں رہو جہاں سے آئے ہو۔ جیل تمہارے لیے سب سے محفوظ ہے۔ تم ساہی صاحب سے کہہ دو کہ تمہیں ان چکروں میں نہیں پڑنا۔ تمہیں بس اپنی سزا کاٹنی ہے۔۔۔"

وہ بولتی چلی گئی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ جیل کی دیواریں بھی میرے لیے اتنی ہی غیر محفوظ ہو چکی ہیں جتنی ساہی صاحب کی کوٹھی یا لاہور کی کوئی سڑک۔ میں نے ان واقعات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو میرے جیل میں پیش آتے رہے تھے اور بتاتا بھی کیسے۔ وہ تو پہلے ہی ہلکان رہتی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "فکر مت کرو شگفتا! وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو۔"

"نہیں بھیا! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جونہی یہ قبائلیوں کا چکر ختم ہو گا، تم جیل واپس چلے جاؤ گے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرو گے؟"

"ہاں، تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کروں گا۔ اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ بھیا۔" اس کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے ریسیور غزالہ کو واپس دے دیا۔

غزالہ پھر کمرے میں چلی گئی۔ میں بے دم سا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ شگفتا کو روتے پا کر میرے جسم پر ہی ناتوانی اتر جایا کرتی تھی۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی تو نگاہ سامنے کھڑکی کی گرل میں اٹکے ہوئے اخبار پر جا پڑی۔ ایک جانی پہچانی تصویر دیکھ کر میں نے جلدی سے اخبار اٹھایا۔ اندرونی صفحے پر چھپی ہوئی ایک جیل کے ہیڈ لانگری کی تھی۔ وہ اپنی گھنی مونچھ، داغ داغ چہرے کی پوری نحوست کے ساتھ اخبار سے برآمد ہو رہا تھا۔ تصویر کے ساتھ دو کالمی خبر بھی موجود تھی۔ "زہر خورانی کا شکار ہونے والے نور محمد کا سراغ مل گیا۔" "شاہ جہاں کو ہلاک کرنے کے لیے کھانے میں زہر میں نے ملایا تھا۔" ہیڈ لانگری ستار احمد کا بیان۔

تفصیل میں درج تھا کہ چند ماہ پہلے ایک جیل میں پراسرار طور پر ہلاک ہونے والے قیدی نور محمد کے قاتل کا سراغ مل گیا ہے۔ اس سلسلے میں پولیس نے کئی افراد سے تفتیش کر رکھی تھی۔ چند روز پہلے ایک مقدم کے ہیڈ لانگری ستار احمد کو حراست میں لیا گیا۔ کل ستار احمد نے بات کا اعتراف کیا کہ کھانے میں اسی نے خود زہر ملایا تھا

بعد میں تفتیش کو غلط رخ دینے کے لیے بیرک کی چھت میں زہریلی چرس کی پڑیاں رکھنے والا بھی وہی تھا۔ اس سلسلے میں مزید انکشافات کی توقع ہے۔ یاد رہے کہ قیدی شاہ جہاں کا تعلق شیخ راشد بن ارشد کے مشہور مقدمۂ قتل سے ہے۔

میں نے اخبار کا خبر والا ٹکڑا پھاڑ کر علیحدہ کر لیا۔ کبھی کبھی ذہن میں اٹھنے والے کسی سوال کا جواب انسان کو کتنی جلدی مل جاتا ہے۔ ابھی شگفتا مجھے جیل جانے کے مشورے دے رہی تھی اور اس بات پر حیران تھی کہ میں ان سارے جھنجٹوں سے جان چھڑا کر جیل کیوں نہیں چلا جاتا۔ اگر آج کا اخبار اس کی نظر سے گزرتا اور وہ اس خبر کو دھیان سے پڑھتی تو یقیناً اس کی حیرانی دور ہو جاتی مگر حیرانی دور ہونے کے بعد اسے ایک اور جان لیوا پریشانی نے گھیر لینا تھا لہٰذا میں دعا کرنے لگا کہ یہ خبر اس ستم زدہ کی نگاہوں سے نہ ہی گزرے۔

اگلے چار روز میں نے اسی کمرے میں بند رہ کر گزارے۔ آزادی کے سوا وہاں ہر نعمت مجھے مہیا تھی۔

ان چار دنوں میں غزالہ سے صرف دو دفعہ ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات تو سرسری تھی۔ وہ میرے لیے چند کتابیں لے کر آئی تھی لیکن دوسری ملاقات تفصیلی اور عجیب و غریب ثابت ہوئی۔ اتفاق کی بات تھی کہ یہ میری سالگرہ کا دن تھا۔ مجھے بھولا ہوا تھا لیکن غزالہ کو یاد تھا۔ وہ باقاعدہ کیک اور تحائف لے کر آئی۔ ایک بہت قیمتی گھڑی تھی اور گرم سوٹ کا کپڑا تھا۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھڑی پہنانا چاہتی ہے۔ میں نے کلائی آگے بڑھا دی۔ بعد ازاں اس نے کیک پر موم بتیاں جلائیں۔ کیک کٹوایا۔ خود کھایا اور مجھے کھلایا۔ اس سارے عمل کے دوران ہم دونوں کے درمیان آہنی پٹیوں والی کھڑکی حائل رہی۔ بڑی عجیب سی صورتِ حال تھی یہ اور اس صورتِ حال سے بھی بڑھ کر عجیب موڈ ہو رہا تھا غزالہ کا۔ وہ ہر کلام جیسے الوداعی انداز میں کر رہی تھی۔ کچھ انوکھا سا حزن و ملال تھا اس کے انداز میں۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بڑی خوب صورتی لیکن بے حد سادگی سے خود کو سنوار رکھا ہے۔ کھلتے رنگوں والا لباس بہت ہلکا لیکن دل آویز میک اپ، پوائزن کی بھینی سی خوشبو سراپا کو گھیرے ہوئے۔ مرد کو رجھانے کی فطری خواہش ہر عورت میں موجود ہوتی ہے۔ مجھے یہ خواہش بڑے ڈھکے چھپے انداز میں غزالہ کے اندر کارفرما نظر آئی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر میرے جینے کے پتھر میں جونک لگانے کی آخری کوشش کر رہی تھی۔

وہ ایک ذہین و فطین لڑکی تھی۔ میں جانتا تھا کسی چال میں نہیں آئے گی پھر بھی میں نے محتاط انداز میں اپنی سی کوشش کی۔ میں نے بتدریج اپنا لہجہ نرم کر لیا اور اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم دونوں کھڑکی کے ایک طرف بیٹھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، جس طرح میں اپنی بھلائی چاہتا ہوں اسی طرح تم بھی میری بھلائی چاہتی ہو۔ فرق صرف طریقۂ کار کا ہے۔ ہم اس حوالے سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کمرے کا دروازہ کھول دوں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ آپ کو کیا معلوم کہ یوں آپ کو قید میں رکھ کر میرے دل پر کیا گزر رہی ہے مگر میں مجبور ہوں۔ میں جانتی ہوں، آزاد ہو کر آپ اپنی مرضی کریں گے اور مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کو ایسا کرتے دیکھ سکوں۔"

"تم کب تک مجھ پر پہرا بٹھا سکتی ہو؟"

"جب تک میرے بس میں ہے۔ کم از کم عیسیٰ اور شکر کے پکڑے جانے تک آپ کو یہیں رہنا ہو گا۔"

جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی وہ۔ میرا پارا پھر چڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ لہجے کی شگفتگی کا بھرم ٹوٹ جاتا، میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر وہ اکیلی وہاں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔

اسی شام چار بجے کے قریب وہ بہت گھبرائی ہوئی بنگلے میں داخل ہوئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی اسٹیشن ویگن کے بجائے کسی اور گاڑی میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں میرے سامنے تھے۔ یہ لمبا تڑنگا صحت مند شخص کوئی سابق فوجی لگتا تھا۔ بے حد سرخ و سفید رنگ تھا اس کا۔ وہ فوجیوں جیسی براؤن وردی میں تھا تاہم ٹوپی وردی سے میچ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کندھے سے خودکار رائفل جھول رہی تھی۔ رائفل کے شولڈر اسٹریپ میں دایاں انگوٹھا پھنسا کر اس نے بڑے ڈھنگ انداز میں مجھے گھورا پھر غزالہ کی کسی بات کے جواب میں اوپر نیچے سر ہلانے لگا۔ جلد ہی وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اگلے پانچ منٹ تک مجھے غزالہ کی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی رہی یا دروازوں کے تیزی سے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آتی رہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ بنگلے میں گھوم پھر کر دروازے لاک کر رہی ہے۔ معلوم نہیں کیا افتاد آپڑی تھی اس پر کہ وہ اپنے ساتھ مسلح گارڈ لے آئی تھی۔ وہ دو چار منٹ میں تھیں۔ یا تو اسے مجھ پر شبہ ہو گیا تھا کہ میرے پاس الہ دین کا چراغ ہے جس کے بل بوتے پر میں اس آہنی

پنجرے سے نکل جاؤں گا یا پھر اس نے میرے دشمنوں میں سے کسی کی صورت دیکھ لی تھی۔

چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ میرا دوسرا قیافہ زیادہ قرینِ حقیقت ہے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی میرے زندان کی کھڑکی کے قریب آئی۔ اب وہ چادر لیے ہوئے تھی اور ہینڈ بیگ اس کے کندھوں پر تھا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار نظر آتی تھی۔ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں میرا سیاہ ریوالور نظر آ رہا تھا۔ یہ ریوالور چھ روز پیشتر بے ہوشی کی حالت میں میرے جسم سے جدا کر لیا گیا تھا۔ ریوالور کی گولیاں غزالہ کی دوسری مٹھی میں دبی تھیں۔

اس نے دونوں چیزیں میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھ لیجیے۔ میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ریوالور اور گولیاں علیحدہ علیحدہ دینے میں یہی مصلحت کارفرما تھی کہ وہ مجھے فوری طور پر ریوالور سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔ اگر میری نیت میں کوئی فتور آتا بھی تو ریوالور لوڈ ہونے تک وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ چکی ہوتی۔

اب یہ بات قریباً ثابت ہو چکی تھی کہ اسے میری طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ یہ خطرہ کس نوعیت کا ہے؟

اس بارے میں میں صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔ رات آٹھ نو بجے تک میں نے صرف قیاس آرائیوں پر ہی گزارا کیا۔ آخر اس شغل سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا اور ریفریجریٹر سے کھانا نکال کر "اوون" میں گرم کرنے لگا۔ اچانک کچھ آوازیں کانوں میں پڑیں۔ پورچ کی جانب مسلح گارڈ کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ باتیں "بحث و تکرار" کے آہنگ میں تھیں۔ یوں لگا کہ گارڈ کسی کو اندر آنے سے روک رہا ہے۔ گیٹ کے قریب بندھا ہوا کتا بھی مسلسل بھونک رہا تھا۔ مجھے چوکس ہونا پڑا۔ ٹی وی آف کر کے میں کھڑکی کے پاس پہنچا اور آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ تکرار اب سنگین صورت اختیار کر گئی تھی۔ آنے والا مدھم آواز میں بول رہا تھا جبکہ گارڈ گھن گرج کے ساتھ انکار میں مصروف تھا۔ پھر یک لخت دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ میں نے ریوالور چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی بھاری بھرکم شے فرش پر گری۔ میرا ہاتھ خود بخود اپنے ریوالور تک پہنچ چکا تھا۔ بنگلے کی اکلوتی نوکرانی زور سے چلائی اور کوئی وزنی بوٹوں کے ساتھ بھاگتا ہوا کوریڈور میں آیا۔ اچانک پورے بنگلے کی لائٹ چلی گئی۔

کتا اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ ہلکان ملازمہ نے لے لی تھی۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی اور روتے ہوئے واویلا کر رہی تھی۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھ میں تھام کر دیوار سے پشت لگائی اور کسی بھی مصیبت کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔

چند سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ کوئی بھاگتا ہوا کمرے کے مقفل دروازے پر پہنچ گیا۔ بڑی افراتفری میں چابی گھمائی گئی۔ بمشکل قفل کھولنے کے بعد ایک دوسرا قفل کھولا گیا۔ دروازہ وا ہونے سے پہلے مسلح گارڈ کی گھبرائی ہوئی آواز آ رہی۔ "بابو صیب! یہ میں ہوں۔ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ آپ نکل جائیں یہاں سے۔"

دروازہ کھلتے ہی میں برآمدے میں آ گیا۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ ملازمہ غالباً بنگلے سے نکل بھاگی تھی۔ اس کی چیخیں اب کافی فاصلے پر سنائی دے رہی تھیں۔ گارڈ کی آواز سنائی دی۔ "دائیں طرف سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیلری میں چلے جائیں۔ وہاں سے نکلنا ہوگا۔"

گارڈ کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زخمی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق چند قدم چل کر میں دائیں طرف مڑا تو وہاں سیڑھیوں کے بجائے ایک راہداری کے آثار نظر آئے۔ اب معلوم نہیں مجھے دھوکا ہوا تھا یا گارڈ کی ہدایات ناقص تھیں۔ میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا کہ ایک ہیولا میرے سامنے متحرک ہوا۔ وہ ایک دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ میں اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور کی موجودگی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے تاک کر چوٹ لگائی۔ بڑی زوردار ضرب تھی۔ ریوالور فوراً اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا رخ لوہا پہلے دیوار سے ٹکرایا پھر فرش پر دور تک پھسل گیا۔ ایک قدم آگے بڑھا کر میں نے اپنا دایاں مدمقابل کے جبڑے پر رسید کرنا چاہا لیکن وہ کمال پھرتی سے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھا اور مجھے تھام کر پورے زور کے ساتھ دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس میں جنگلی گھوڑے کی سی پھرتی اور طاقت تھی۔ میں جانتا تھا کہ مجھے پوری قوت سے اپنا دفاع کرنا پڑے گا۔ اس کا زاویہ ایسا تھا کہ میں اپنا مخصوص وار استعمال کر سکتا تھا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ فوری طور پر جان چھڑانے کے لیے میں گولی چلا دیتا یا پھر ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگاتا۔ بہتر ہوا کہ دوسرا طریقہ اختیار کیا ورنہ مدتوں پچھتانا پڑتا۔ جونہی

اس نے میری رانوں میں ہاتھ دیا اور اٹھا کر مجھے پٹخنا چاہا میں نے ریوالور سے اس کے سر پر چوٹ لگائی۔ اس کے منہ سے آہ نکلی اور میرا جسم جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا۔ یہ صفدر کی آواز تھی۔ "صفدر" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ وہ ایک دم مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"او مائی گاڈ" اس کے منہ سے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر سہلا رہا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر گرم کشمیری ٹوپی ہے جس کے اوپر کس کر مفلر لپیٹا گیا ہے۔ اس ٹوپی کے سبب اس کا سر شدید چوٹ سے محفوظ رہا تھا۔

تکلیف کو اپنے اندر جذب کرنے میں اسے دو تین سیکنڈ لگے۔ پھر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لے کر اسی دروازے میں داخل ہو گیا جہاں سے نکلا تھا۔ اس کا ریوالور وہیں راہداری میں پڑا رہ گیا تھا۔ ایک لمبوترے کمرے سے گزار کر وہ مجھے پائیں باغ میں لے آیا۔ یہاں ہم لکڑی کی ایک دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے بیرونی گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ کے عین درمیان مجھے ایک السیشن کتے کی لاش نظر آئی۔ لاش کو پھلانگتے ہوئے ہم باہر نکلے اور ایک دس فٹ چوڑا ڈھلوان راستہ طے کر کے اوپر سڑک پر آ گئے۔ یہاں روشنی تھی۔ میں ذرا پہچان گیا۔ یہ مری کی جھیکا گلی روڈ تھی۔ اس سے لوپر والی دو سو گز کے فاصلے سے کشمیر پوائنٹ کو جانے والی سڑک گزرتی تھی۔ دونوں سڑکوں کے درمیانی خلا میں اکا دکا مکان اور بنگلے موجود تھے۔ تاہم یہ سب ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ کوٹھی نما بنگلے کے اندر جو مارا ماری ہوئی تھی اس کی آواز صرف ایک نزدیکی کاٹیج تک ہی پہنچ سکی تھی۔ کاٹیج کے اندر سے دو مقامی شخص برآمد ہوئے تھے اور تذبذب کے عالم میں ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسا ہتھیار بھی نہیں تھا جس سے ہمیں خطرہ لاحق ہو سکتا۔ سڑک پر پہاڑ والی سمت میں ایک سفید ویگن اسٹارٹ حالت میں کھڑی تھی۔ ہم تیزی سے سڑک پار کر کے کار میں آ بیٹھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"کوئے زریں گل کے بچے! خانہ خراب۔ یہ تم ہو؟" میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے گول مٹول شخص کو دیکھ لیا۔

"کیوں ام کیوں نہیں ہو سکتا استاد۔" زریں گل نے اپنی ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ "لاہور میں ام نے دو سال ٹیکسی چلایا ہے اور ایک سال ویگن دوڑایا ہے۔ جو کم بخت لاہور میں ویگن چلا سکتا ہے وہ پل صراط پر سے بھی ہوا کے مافق گزر سکتا ہے۔ تم گھبراتا شبراتا نہیں۔ ام بالکل ٹھیک ٹھیک چلائے گا اور تم کو آخری منزل تک پہنچائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ارے صفدر صاحب! یہ تمہارا ڈرائیور کیا کہہ رہا ہے؟"

صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخری منزل سے اس کی مراد بالکل آخری منزل نہیں۔ اس کی زبان پھسلتی ہے مگر گاڑی قابو میں رکھتا ہے۔ میں رستے میں ڈرائی لے چکا ہوں اس کی۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا معاملہ ہے بھئی۔ کہاں سے آ ٹپکے ہو اور بنگلے میں کسی کو اتا پتہ تو نہیں کر دیا تم نے؟"

"نہیں، صرف ایک کتا مرا ہے۔ گارڈ صرف زخمی ہوا ہے۔ دوسرے کو کمرے میں بند کر آیا ہوں۔ وہ نوکرانی خانہ خراب ویسے ہی بھاگ گئی تھی۔"

"گارڈ دو تھے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" صفدر نے جواب دیا۔ "ایک گیٹ پر تھا اور دوسرا بھی صحن میں۔ جب گیٹ والے نے بک بک شروع کی تو وہ بھی بندوق تان کر سامنے آ گیا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ دھینگا مشتی ہوئی۔ سالے بودے نکلے بالکل۔ کرائے کے سکہ بند ٹٹو تھے۔ ایک کو تو میں نے ٹانگ مار کر ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں گرا دیا اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ دوسرا رائفل سونت ہی رہا تھا کہ میری گولی اس کا ہاتھ چیر گئی۔ وہ گھبراہٹ میں کسی شے سے الجھ کر پشت کے بل آتش دان میں گرا اور پھر اٹھ کر اندر بھاگ گیا۔ میرا خیال ہے کہ لائٹ آف کرنے والا اور آپ کو بند کمرے سے نکالنے والا یہی ہے۔ اس دھینگا مشتی کے دوران نوکرانی کتا کھول چکی تھی۔ وہ تیر کی طرح لپکا۔ مجبوراً مجھے اس پر بھی گولی چلانا پڑی۔"

"تمہیں اس بنگلے کا پتا کیسے چلا؟"

"یہ ذرا لمبی بات ہے۔ ابھی آپ کو ہوٹل میں جا کر بتاتا ہوں۔" صفدر نے جواب دیا۔

"گویا کوئی کمرا لے رکھا ہے تم نے یہاں؟"

"جی ہاں، یہ بہت ضروری تھا۔"

گاڑی کشمیر پوائنٹ والی سڑک سے گھوم کر مری کے بارونق علاقے میں آ چکی تھی۔ صفدر نے اپنا مفلر مجھے دے دیا اور کہا کہ میں چہرہ ڈھانپ لوں اور سیٹ پر ذرا ریک کر

بیٹھوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ مال بردار گاڑیوں کے لیے کھلی تھی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور سردی بھی تھی۔ اس کے باوجود ہنی مون منانے کے لیے آنے والے جوڑے اور عام لوگ سیر گشت میں مصروف تھے۔ گاڑی سست روی سے جا رہی تھی۔ اچانک میں نے صفدر کو چونکتے دیکھا۔ وہ بائیں طرف والی کھڑکی میں دیکھ رہا تھا پھر مجھے بھی چونکنا پڑا۔ کھڑکی میں غزالہ کا چہرہ نظر آیا تھا۔

"رکو صفدر ___ رکو۔" وہ دروازہ تھام کر بولی۔

زریں گل نے جھٹکے سے بریک پیڈل دبا دیا۔ گاڑی رک گئی۔ غزالہ کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ پتھر کا بت نظر آنے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے گلابی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ بات کی تہ تک پہنچنے میں اسے کئی سیکنڈ لگ گئے۔ اس دوران اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

"صفدر! یہ اچھا نہیں کر رہے ہو تم۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں معلوم نہیں ___"

"ہمیں سب معلوم ہے۔" میں نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔ "اور تم خواہ مخواہ سڑک پر تماشا لگانے کی کوشش نہ کرو۔"

اس نے دروازہ اور مضبوطی سے تھام لیا۔ لہجے میں التجا بھر کر بولی۔ "میں آپ کو نہیں جانے دوں گی شاہ جہاں۔ آپ بہت خطرناک کام کر رہے ہیں ___ میں اپنے اور آپ کے لیے سنگاپور کے ٹکٹ لائی ہوں اور یہ دیکھیے ___ یہ آپ کا پاسپورٹ ہے۔" اس نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر پاسپورٹ اور ٹکٹ مجھے دکھائے۔ "صبح سات بجے ہماری فلائٹ ہے۔ میں سب انتظام کر چکی ہوں۔ آپ چلے گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"کھیل بگڑ چکا ہے غزالہ۔" صفدر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر مجھے یہاں پہنچنے میں تھوڑی سی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاہ جہاں صاحب سمیت آپ سب لوگ عیسیٰ جان کے ہتھے چڑھے ہوتے۔ عیسیٰ اور اس کے ساتھی یہاں پہنچنے کے لیے جھنگ سے روانہ ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آدھا پون گھنٹے تک وہ یہاں ہوں گے۔ اب تمہیں بھی اس بنگلے میں نہیں جانا چاہیے بلکہ بہتر ہے مری ہی چھوڑ جاؤ لیکن ایسا کرتے ہوئے اپنی نیلی ویگن استعمال مت کرنا۔ وہ ان لوگوں کی نظر میں ہے۔"

غزالہ صفدر کی باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ "صفدر! جو میں جانتی ہوں وہ تم لوگ نہیں جانتے۔ مت لے کر جاؤ انہیں۔"

میں نے سرد مہری سے کہا۔ "زریں گل! تم چلاؤ۔"

"پلیز شاہ جہاں۔" وہ بولی۔ آنسو اب اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے اب ٹھٹک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔

"بے وقوف مت بنو غزالہ۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ایک دم اس کے اندر جیسے کوئی شے بجھ گئی۔ کوئی تار تڑاخ سے ٹوٹا اور اس کے قویٰ ایکا ایکی مضمحل ہو گئے۔ بڑی آہستگی کے ساتھ اس نے گاڑی کے دروازے پر گرفت ختم کر دی اور ہولے ہولے پیچھے ہٹتے ہوئے کھڑکی میں سے نکال لیا۔ ہینڈ بیگ کا شولڈر اسٹرپ اس کے کندھے سے کھسکا اور ہاتھ میں آ گیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک صاف دیکھ رہا تھا۔ زریں گل نے گاڑی آگے بڑھائی۔ وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ کوئی جنبش نہیں ہوئی اس میں۔ صرف ریشمی بالوں کی ایک لٹ تھی جو اس کے چہرے پر جھول رہی تھی۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اسے کھو دیا ہے۔ ہمیشہ کے لیے ___ معلوم نہیں یہ بات دل میں کیوں آئی تھی۔ اس سے پہلے بھی تو کئی ایسے موڑ آئے تھے لیکن یہ احساس آج ہی میرے دل میں کیوں ہوا تھا۔ چودہ پندرہ برس بعد پہلی بار میرے دل میں غزالہ کے لیے ایک نرم گوشہ بیدار ہوا۔ کسی نے اندر سے پکار کر کہا۔ "یہ لمحے ہاتھ سے نکل گئے تو تم نیلی آگ کا ایندھن بنتے رہو گے۔ گاڑی رکوا لو ___ رکوا لو۔"

میں نے زریں گل سے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن "آواز" حلق میں ایک سرد گولے کی طرح اٹک گئی۔ گاڑی یو ٹرن لے کر مولوی تمیزالدین روڈ پر مڑ گئی اور شاپنگ کرنے والے چوک میں مجسمے کی طرح کھڑی غزالہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

تقریباً چالیس منٹ بعد ہم سنی بنک کے قریب ایک ہوٹل کے نیم گرم کمرے میں بیٹھے تھے۔ سڑک پر کھلنے والی کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور سامنے تپائی پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ بلب کی روشنی میں میں نے پہلی بار غور سے صفدر اور زریں گل کو دیکھے۔ وہ اپنے حلیے اور لباس سے ملنگ بنے

بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ دونوں نے شوخ رنگوں والی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں گہرے زرد رنگ کی گرگابیاں تھیں۔ زریں گل کے شانوں پر گرم چادر بھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا صفدر کی گرم چادر بنگلے میں ہونے والی مار کٹائی میں گر گئی تھی۔ صفدر کے بائیں ہاتھ کی پشت پر ایک زخم تھا جس پر تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کو مختصر الفاظ میں وہ باتیں بتا دیتا ہوں جو ان حالات میں آپ کے لیے جاننا ضروری ہیں۔ سات روز پہلے ساہی صاحب کی کوٹھی سے آپ کے غائب ہوتے ہی زور شور سے آپ کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ اس رات ساہی صاحب کا ارادہ بن گیا تھا کہ جاگیردار قاور زماں کو گرفتار کر لیا جائے لیکن پھر پنجاب کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی مداخلت پر یہ کام نہ ہو سکا۔ اس رات قاور زماں کی حویلی پر چھاپا بھی مارا گیا لیکن وہاں سے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ پورے علاقے میں سرگرمی سے مشکوک افراد کی تلاش ہو رہی تھی۔ میرے دل میں آئی کہ کیوں نہ اس بے آباد حویلی کو دیکھا جائے جس کا ذکر آپ نے کیا تھا اور جہاں ایک بار قاور زماں کے غنڈوں سے آپ کی ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور بذریعہ بس جھنگ پہنچ گیا۔ ہم دونوں اسی لباس میں تھے جس میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کل رات دس بجے کے قریب ہم حویلی پہنچے۔ جیسا کہ میڈیکل اسٹور والے لڑکے نے آپ کو بتایا تھا، حویلی کے چاروں طرف خاردار باڑھ لگوی گئی ہے۔ ہم نے ایک مقام سے باڑھ کاٹی اور اندر گھس گئے، کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ بہرحال ہم چھپ چھپا کر اندر داخل ہو گئے۔ ہماری کامیابی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ تیز بارش ہو رہی تھی اور وہ چوکیدار جسے حویلی کے سامنے والے دروازے پر ڈیوٹی دینا تھی، وہاں موجود نہیں تھا۔ حویلی اندر سے تقریباً خالی ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بالکل سجی سنوری تھی۔ یوں لگتا تھا، ہم ڈیڑھ دو سو برس پہلے کے کسی گھر میں کھڑے ہیں۔ رنگ و روغن، آرائشی سامان، فرنیچر، شمعدان۔ محسوس ہوتا تھا، ہر چیز عجائب گھر سے لائی گئی ہے۔ ہم ایک نیم تاریک راہداری میں پہنچے تو کھڑکیوں سے ایک روشن کمرے کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ میں نے ایک گرانڈیل شخص کو دیکھا، وہ قالین پر ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور شراب پی رہا تھا۔ پورا کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، وہ اٹھ کر فون سننے لگا، فون کی ایک گھنٹی ہمارے بالکل پاس بھی بجی تھی۔ یہ اس فون کی ایکسٹینشن تھی ___ میں نے اس دوسرے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ آپریٹر بتا رہا تھا کہ مری سے ٹرنک کال ہے، پھر ایک شخص کی بیٹھی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی، اس آواز کو میری طرح آپ بھی سیکڑوں میں پہچان سکتے ہیں۔ یہ اسی غنڈے کاریبن کی آواز تھی جو آپ کے ہاتھوں ٹانگ تڑوا چکا ہے۔ اس نے گرانڈیل شخص کو جلال کہہ کر مخاطب کیا اور پوچھا کہ ابراہیم صاحب کہاں ہیں۔ جلال نے جواب میں بتایا کہ وہ کسی کام سے بھکر گئے ہوئے ہیں۔ کاریبن نے سیکرٹری کا پوچھا، جلال نے بتایا کہ وہ بھی نہیں ہے۔ کاریبن نے دو ایک مزید نام لیے۔ جلال نے کہا کہ اس وقت حویلی میں اس کے اور چوکیدار افسر خان کے سوا اور کوئی نہیں، سب لوگ ابراہیم صاحب کے ساتھ گئے ہیں، ادھر بھکر سے ٹیلیفون آیا تھا، کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے۔ تب کاریبن نے کہا کہ وہ جھوک ضامن میں جاگیردار قاور زماں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن لگتا ہے کہ لائنیں خراب ہیں، لہٰذا وہ یہ اطلاع کسی طرح فوراً جھوک ضامن پہنچا دے کہ نیلی گاڑی کا سراغ لگ گیا ہے۔ گاڑی کی مالکن گاڑی چھوڑ کر بھاگ گئی ہے لیکن وہ مری میں ہی ہے۔ امید ہے کہ چند گھنٹوں میں اس کا کھوج کھرا مل جائے گا ___ اس بات چیت میں کاریبن نے غزالہ یا آپ کا نام نہیں لیا تھا لیکن میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ یہ بات آپ ہی کے بارے میں ہو رہی ہے ___ جلال نامی گرانڈیل شخص نے جواب میں کاریبن کو بتایا کہ یہ اطلاع ایک گھنٹا پہلے قاور زماں صاحب کو مل چکی ہے اور آج رات کسی وقت وہ اپنے آدمیوں کو مری روانہ کر دیں گے، جونہی فون پر ہونے والی یہ گفتگو ختم ہوئی، حویلی کا بیرونی دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک لڑکی اندر آ گئی۔ وہ سرتاپا بھیگی ہوئی تھی، اندر آتے ہی اس نے ملازموں کو آوازیں دینا شروع کر دیں لیکن ملازم یہاں ہوتے تو سامنے آتے۔ صرف چوکیدار افسر خان تھا جو ایک بالائی کمرے میں سو رہا تھا یا جلال تھا۔ جلال ڈگمگاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ لڑکی نے چیخ کر پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں؟ جلال نے بتایا کہ وہ بھکر گئے ہیں۔ وہ بولی اور دوسرے لوگ سارے کہاں مر گئے ہیں؟ جلال نے بتایا کہ وہ سب صاحب کے ساتھ گئے ہیں، کوئی بھاری مشین لوڈ کرا کے لانی تھی صاحب نے۔ لڑکی سخت پریشان نظر آنے لگی، کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلتی رہی، پھر فون پر کسی کے نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کوشش میں مکمل ناکامی ہوئی۔ اس نے جلال سے کہا کہ اس کی گاڑی دو فرلانگ دور پھنسی ہو

گئی ہے' وہ جائے اور پتا بدل کر لے آئے' شاید اسے واپس جانا پڑے۔ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ بھیگا ہوا لباس اس کے پرخطر جسمانی خطوط کو عیاں کر رہا تھا۔ وہ اپنے لباس اور بول چال سے کسی ریاست کی رانی نظر آتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکی کو دیکھ کر جلال کی آنکھوں میں ایک حریص چمک ابھرنے لگی ہے۔ لڑکی کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے وہ باہر نکل گیا۔ ہم دونوں اس نیم تاریک راہداری کے ایک گوشے میں چھپے رہے۔ فون والے کمرے کا منظر ہمیں صاف نظر آ رہا تھا۔ جلال کے بعد لڑکی بھی وہاں سے نکل گئی تھی۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس آئی۔ اب اس نے لباس بدلا ہوا تھا اور لمبے بال شانوں پر پھیلا رکھے تھے۔ ایک ہار جو دوری سے بہت قیمتی دکھائی دیتا تھا' اس کے گلے میں چمک رہا تھا۔ کمرے میں موجود سگریٹ کے دھوئیں سے اس نازک مزاج کو کھانسی ہونے لگی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کھڑکیاں کھول دیں۔ جلال نامی وہ شخص اپنا سامان بے توشی افراتفری میں وہیں چھوڑ گیا تھا۔ لڑکی نے غصے میں بوتل اور گلاس ایک قریبی کھڑکی سے باہر پھینک دیے اور ایک بار پھر کہیں فون ملانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔"

صفدر نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اپنا سگریٹ سلگایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جلال کی واپسی تقریباً ایک گھنٹا بعد ہوئی' اس کا لباس بھی جگہ جگہ سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کو "مژدہ" سنایا کہ گاڑی کا "جیک" جام ہے اور کوشش کے باوجود کھل نہیں سکا۔ اس کے علاوہ فاضل پہیے میں ہوا بھی برائے نام ہے۔ لڑکی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ باہر طوفان باد و باراں بھی زور پکڑ رہا تھا' اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ جس شخص کو "صاحب" کہہ رہی تھی وہ آج رات یہاں لوٹ سکے گا۔ جلال نامی اس شخص کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ اس گھر اور گھر کے مالک سے اس کا ٹھیک ٹھیک تعلق کیا ہے مگر نجانے کیوں اسے دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ لڑکی کے بارے میں اس کی نیت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ نیت کی اس خرابی کا ثبوت ملنے میں کچھ ایسی دیر بھی نہیں لگی' تقریباً دس منٹ بعد جب میں اور زریں گل زینے چڑھ کر بالائی منزل پر جانے اور وہاں کا جائزہ لینے کا سوچ رہے تھے' ایکا ایکی نشست گاہ کی طرف سے لڑکی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ "حرامی۔ کتے! میں تیری جان لے لوں گی' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" اس کے ساتھ ہی دھاچوکڑی کی آوازیں آنے لگیں۔ چند لمحے بعد لڑکی پھر چیخی۔ "افسر خان۔ افسر خان۔ کوئی ہے۔ بچاؤ۔ خدا کے لیے بچاؤ۔"

پھر برتن ٹوٹنے اور کراکری وغیرہ ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ لڑکی کی چیخیں دردناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اب ہمارے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا آسان نہیں تھا۔ میں نتائج سے بے پروا ہو کر اٹھا اور بھاگتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ نشے کی زیادتی سے جلال کی صورت غیر انسانی ہو رہی تھی۔ لڑکی قالین پر گری ہوئی تھی اور وہ اسے بُری طرح بھنبھوڑ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا بدبو اور بدصورتی خوشبو اور خوبصورتی کو "چبانے" کی کوشش کر رہی ہے۔

میں نے بڑھتے ہی ایک زوردار ٹھوکر اس کے سر پر رسید کی۔ وہ لڑھک کر مغلیہ طرز کی ایک منقش کرسی سے ٹکرایا لیکن فوراً سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک زوردار لات اس کی چھاتی پر رسید کی۔ وہ پشت کے بل دیوار سے جا ٹکرایا۔ دیوار سے ٹکراتے ہی جیسے اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے دیوار پر آویزاں دو سنہری کلہاڑیوں میں سے ایک اتاری اور پوری وحشت سے مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میرے پاس کمانی دار چاقو تھا۔ اس کمرے میں ہم دونوں کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی۔ مدمقابل سخت جان اور لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا' اگر وہ نشے میں نہ ہوتا تو شاید میں اسے زیر نہ کر سکتا۔ تقریباً پانچ منٹ ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہے۔ آپ جا کر دیکھئے گا' اس کمرے کی ہر شے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور دیواروں پر خون کے چھینٹے ہیں۔ جلال کی کلہاڑی کا ایک وار میں نے ہاتھ پر روکا تھا' یہ زخم اسی کی نشانی ہے۔ دونوں گھٹنوں پر سخت چوٹیں آئی ہیں اور اب زیادہ سردی کی وجہ سے تکلیف دے رہی ہیں۔ بالآخر جلال نامی وہ شخص میرے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر گر گیا۔ لڑکی کے کہنے پر میں نے اس کی مشکیں کس دیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک اسٹور نما کمرے میں پھینک دیا۔

میں جو کچھ ٹیلیفون پر سن چکا تھا اس کے بعد ضروری تھا کہ فوری طور پر جھنگ سے پنڈی کے لیے بس پکڑوں اور مری روانہ ہو جاؤں لیکن لڑکی جس نے اپنا نام ارجمند بتایا' مجھ پر بہت بھروسا کرنے لگی تھی اور چاہتی تھی کہ میں اور زریں گل صبح تک اس کے ساتھ رہیں' حالانکہ جلال نیم بے ہوشی کی حالت میں بند پڑا تھا' پھر بھی وہ اس سے خوف کھا رہی تھی۔ ارجمند کے اصرار اور موسلادھار بارش کی وجہ سے ہمیں چند گھنٹے مزید اس حویلی میں رکنا پڑا۔ صبح چار بجے کے قریب جونہی بارش کا زور ٹوٹا' میں اور زریں گل باہر نکلے

اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے ارجمند کی پنکچر کار تک پہنچ گئے۔ یہ نئے ماڈل کی شیراڈ تھی' جلال نے بکواس کی تھی کہ اس کا جیک کام نہیں کر رہا یا فاضل پہیے میں ہوا کم ہے۔ ہم نے پانچ منٹ میں شیراڈ کا پہیا بدلا اور واپس حویلی میں پہنچ گئے۔ حویلی کے بیرونی دروازوں کو مقفل کرنے کے بعد ارجمند ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ میری "لڑائی بھڑائی" سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ میں نے اسے اپنا نام راجو بتایا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ مجبوری کے تحت چھوٹے موٹے جرائم کرنے والا بے روزگار شخص ہوں۔ اپنے مخصوص نوابی لہجے میں وہ کہنے لگی "راجو! ہمیں تمہارے ہی جیسے کسی نوجوان کی تلاش تھی۔ ہم تم دونوں کو نوکری دیں گے۔ تنخواہ معقول ہوگی۔ کھانا پینا رہائش سب کچھ مفت۔" اس نے مجھے خوشاب کا ایڈریس دیا اور کہا کہ ہم کل یا پرسوں' دن میں کسی وقت اس ایڈریس پر پہنچ جائیں۔"

صفدر نے جیب سے ایک نہایت دیدہ زیب وزٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دکھایا۔ اس پر آر ایس افراہیم کا نام لکھا تھا اور خوشاب کے سب سے فیشن ایبل علاقے کا ایڈریس درج تھا۔ یہ وزٹنگ کارڈ دیکھ کر مجھے مالک محمد کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ پرانی حویلیاں خریدنے کا شغل قادر زماں کا اپنا نہیں ہے۔ اس کا ایک ولایت پلٹ دوست ایسی عمارتوں میں دلچسپی لیتا ہے اور وہ خوشاب کا رہنے والا ہے۔ صفدر جو کارڈ دکھا رہا تھا اس پر بھی خوشاب کا ایڈریس تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ مالک محمد نے اسی شخص کا ذکر کیا تھا۔ ارجمند نامی یہ لڑکی افراہیم کی بیوی ہو سکتی تھی' ممکن تھا داشتہ وغیرہ ہو۔ افراہیم جیسے لوگوں کے لیے ایسے بکھیڑے پالنا عام سی بات ہوتی ہے۔

صفدر نے اپنی باقی ماندہ روداد سناتے ہوئے کہا۔ "جھنگ میں ہم نے گاڑی ارجمند صاحبہ کے حوالے کر دی اور خود ایک کرائے کی کار پر مری روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ غزالہ کی کوئی ڈاکٹر دوست اسلام آباد میں رہتی ہے اور مری میں اس کا ذاتی بنگلا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ مری میں آپ کو اسی بنگلے میں رکھا گیا ہو۔ اس بنگلے کا ایڈریس فریال سے معلوم ہو سکتا تھا۔ پنڈی پہنچتے ہی میں نے مرکزی ٹیلیگراف آفس کے سامنے کار رکوائی اور لاہور میں فریال سے فون پر بات کی۔ فریال نے بنگلے کا ایڈریس دے کر ہمارا کام بہت آسان کر دیا۔ ہم سات بجے یہاں پہنچے تھے۔ آتے ہی ہم نے یہ کمرا کرائے پر لیا اور پھر آپ کو بنگلے سے نکالنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ بنگلے میں آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے لیکن اس بات کا یقین نہیں تھا اور یہ بات تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ غزالہ نے آپ کو یہاں ایک کمرے میں بند کر کے باہر پہرا بٹھا رکھا ہوگا۔ میں نے گارڈ سے غزالہ کا پوچھا تو وہ بولا کہ بیگم صاحب کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ میں نے گارڈ کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ آپ بھی اندر ہیں اور یہ گارڈ اپنی دانست میں آپ کا پہرا دے رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اندر بیٹھ کر بیگم صاحب کا انتظار کرنا چاہتا ہوں' وہ خر دماغ گارڈ کی طرح دُم پر کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً مجھے اس سے نمٹنا پڑا۔"

صفدر کی روداد سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ شفتا نے اس فون کال کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا جو چار روز پہلے غزالہ نے اسے بنگلے سے کی تھی اور لاہور میں ابھی تک یہی سمجھا جا رہا تھا کہ کُرم ایجنسی کے بگڑے ہوئے قبائلیوں نے مجھے اور غزالہ کو اغوا کیا ہے۔ غالباً شفتا کو زبان بندی کی یہ ہدایت غزالہ نے ہی کی تھی اور اس ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ میں ہر قسم کے پُرخطر رابطوں سے الگ تھلگ رہوں۔

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے صفدر سے پوچھا۔ "آپ کیا ارادے ہیں جناب کے؟"

وہ بولا۔ "فی الحال تو آپ اس کمرے کے اندر رہیں اور آرام کریں۔ یقینی بات ہے کہ پورے مری میں آپ کی تلاش ہو رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مال روڈ پر کوئی مصیبت کھڑی نہیں ہوئی' ورنہ جس طرح غزالہ نے ہمیں بیچ بازار روک لیا تھا' کوئی بھی شکاری کتا آپ کو تاڑ سکتا تھا۔ ہمیں یہاں کم از کم کل دوپہر تک رکنا ہوگا پھر براستہ نتھیاگلی ایبٹ آباد روانہ ہوں گے اور وہاں سے نکل چلیں گے سیدھے خوشاب۔ میں نے ارجمند سے کہہ دیا تھا کہ میرا ایک تیسرا ساتھی بھی ہے اور ممکن ہے پرسوں وہ بھی ہمارے ساتھ آ جائے۔ وہ بولی۔ اگر تمہارا ساتھی ہے تو ظاہر ہے تمہاری طرح کارآمد اور قابلِ اعتماد ہوگا۔ تم اسے لا سکتے ہو۔ میرا خیال ہے شاہ جمال صاحب! ان پرانی حویلیوں والے چکر کا کوئی سرا ہمارے ہاتھ آنے والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اگر ارجمند اور افراہیم کا تعلق قادر زماں وغیرہ سے ہے تو افراہیم کی رہائش گاہ پر کسی بھی وقت پہچانے جا سکتے ہیں۔"

"اس کا انتظام صفدر صاحب نے بڑی اچھی طرح کر لیا ہے جناب۔" زریں گل نے گفتگو میں ٹانگ اڑائی۔ "انہو نے بیگم صاحب سے فرمایا ہے کہ ام پر قتل حسن کا الزام ہے' پولیس ام کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ کھلے عام نہیں پھر سکتا۔ اس بات پر بیگم صاحب بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ایسا اگر

جواں مردوں پر ہی آتا ہے۔ ام کو تم پر پورا بھروسا ہے کہ تم امارے کام کا آدمی ثابت ہوگا۔ تم "پریشانی" مت کرو۔ ام تم کو کھلے عام نہیں چھوڑے گا۔ بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھے گا۔ تم اس قابل ہے کہ تمہیں سنبھال کر رکھا جائے۔ بیگم صاحب نے اور بھی بہت سی باتیں کہا۔" زریں گل کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شوخی لہرانے لگی۔ چائے کی چسکی لے کر بولا۔ "ام کو تو لگتا ہے استاد! آپ صفدر صاحب نے ایک ہی رات میں بیگم صاحب کے دل میں گڑبڑ گھوٹالا کر دیا ہے۔ وہ بڑے میٹھے لہجے میں بول رہا تھا صفدر صاحب سے۔ ویسے وہ ہے خوب صورت۔ ام نے اپنی تیس سالہ زندگی میں ایسا لڑکی کم ہی دیکھا ہے۔"

صفدر نے سنجیدگی سے کہا۔ "زریں گل صاحب! میرا خیال ہے کہ ابھی ہم میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی کہ تم ایسا مذاق کر سکو۔ ایک تو ایسی بھونڈی بات کر رہے ہو اور پھر خود کو تیس بتیس سال کا بتا رہے ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ پینتالیس سال سے کم عمر نہیں ہے تمہاری۔ کسی خامی کی وجہ سے بندے کی شادی نہ ہو سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ تیس سال کا رہتا ہے۔"

صفدر کا آخری جملہ پوری طرح زریں گل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور وہ منہ کھول کر بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شادی کی بات پر مجھے صفدر کی شادی یاد آ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری شادی کا کیا بنا؟"

وہ بولا۔ "وہی جو فلموں میں بنتا ہے۔ عین نکاح کے موقع پر دلہن چلی جاتی ہے اور جب واپس آتی ہے تو دولہن غائب ہو چکی ہوتی ہے۔ میرے والے واقعے میں دولہن تو غائب نہیں ہوئی لیکن وہ شخص غائب ہو گیا جس کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی آپ۔ ایک دم افراتفری مچ گئی۔ سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میرے خیال میں جو ہوا اچھا ہوا۔ اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ پُرمسرت موقعے سے زیادہ خوشی، موقعے کے انتظار میں ہوتی ہے جیسے عید سے اچھا دو دن لگتا ہے جب دوسرے دن عید ہوتی ہے۔ اب پھر نئے سرے سے عید کا انتظار کریں گے اور یقین ہے کہ "اس عید" میں آپ اور غزالہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے۔"

زریں گل بولا۔ "یہ عید میدکی بات کہاں سے نکل آیا استاد جی؟؟ ابھی تو بڑی عید کا گوشت بھی ہضم نہیں ہوا ہے۔"

"اسی وجہ سے تمہارے دماغ میں کوئی ڈھنگ کی بات نہیں آتی۔" صفدر نے کہا۔ "ہر کھانا آخری سمجھ کر کھایا کرو۔"

میں نے کہا۔ "یار! تم لوگوں کو فقرے بازی سوجھی ہے' مجھے اس بے وقوف لڑکی کی فکر ہے۔ بہتر تھا ہم اسے ساتھ ہی لے آتے۔"

صفدر بولا۔ "غزالہ اتنی ناسمجھ بھی نہیں ہے جی' جو لڑکی آپ کو لاہور سے اغوا تفصیل کرکے یہاں لا سکتی ہے۔ آپ کو ایک کمرے میں محصور کر سکتی ہے اور آپ کی حفاظت کے لیے مسلح گارڈز کا انتظام کر سکتی ہے وہ اپنا برا بھلا بھی سوچ سکتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے قادر زماں کے گماشتوں سے کوئی شدید خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یہ بات طے ہے کہ جب تک قادر زماں کی بیوی کو بچہ نہیں ہوگا' وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اس نے ایک ایک بندے کے کان میں بات ڈال دی ہو گی کہ ڈاکٹر غزالہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ غزالہ خطرناک لوگوں کو مناسب طریقے سے ہینڈل کر سکتی ہے۔ میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ اپنی تمام پیشہ ورانہ ذہانت اور قابلیت کے باوجود وہ ایک سیدھی سادی لڑکی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مری پہنچنے کے بعد وہ خود کو محفوظ تصور کرنے لگی اور اسی نیلی اسٹیشن ویگن میں گھومتی رہی جس کی تلاش ہر جگہ ہو رہی تھی۔"

صفدر بولا۔ "میں آپ کو چیلنج نہیں کر سکتا لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ جب نیلی گاڑی کو ٹریس کیا گیا اور عیسیٰ جان کے کارندے اس کے پیچھے لگ گئے تو اس نے کتنی ہوشیاری سے انہیں جل دیا۔ وہ دیر تک انہیں مری اور پنڈی کی سڑکوں پر چکر دیتی رہی اور پھر مرحبا ہوٹل کے سامنے گاڑی چھوڑ کر ایک ریسٹورنٹ کے عقبی دروازے سے نکل گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعے کے بعد اس نے آپ کے لیے گارڈز کا انتظام کیا ہوگا۔ ممکن ہے آپ کے پاسپورٹ اور سنگاپور کے ٹکٹ کا انتظام بھی اس کے بعد ہی ہوا ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ اب تک دانش مندی کا ثبوت دے رہی ہے تو پھر چاہیے تھا کہ تم اس کی دانش پر بھروسا کرتے اور مجھے جانے دیتے سنگاپور۔"

وہ بولا۔ "میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں دانش مندی کر رہا ہوں۔ یہ تو مردانہ ہٹ دھرمی ہے اور چسکا ہے خرابے بازی کا اور ادھر کھلی میں سر دینے کا۔ اور میں جانتا ہوں کہ آپ کے سر میں بھی اسی طرح کا سودا ہے۔ ورنہ کیوں آپ شکر شکرا کی محبت میں ایسے بے قرار ہوتے اور بھاگے

دوڑے مشت میں اس سے "معانقہ" کرنے جاتے۔ مجھے یہ غلط فہمی یا درست فہمی ہے کہ میں آپ کی فطرت پہچان گیا ہوں اور یہ "پہچان" آپ کو معلوم ہے کس لیے ہوئی ہے؟؟ اس لیے کہ میری اپنی فطرت میں اسی طرح کی گڑبڑ ہے۔ آپ اسے زبانی جمع خرچ نہ سمجھیں شاہ جہاں صاحب' سچ کہتا ہوں' مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے قادر زماں کے بعد اب عیسیٰ جان اور شکر بھی ہمارے مشترکہ دشمن ٹھہرے ہیں۔ شکر کے خلاف جو آگ آپ کے سینے میں بھڑک رہی ہے اس کی چنگاریوں نے میرے سینے میں بھی الاؤ بھڑکا دیا ہے۔ جی چاہتا ہے آج رات ہی شکر سے آمنا سامنا ہو جائے اور ہم اپنے دل کے ارمان پورے کر سکیں۔"

میں نے دیکھا' ڈبل دار قمیص کے نیچے سے صفدر کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور سینہ دیوار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک وفادار اور جانباز دوست کی آنکھیں ہیں۔ ایسا دوست جو جان بن کر جان میں سما جاتا ہے اور جس پر زندگی کی کٹھن ترین گھڑیوں میں بھی آنکھ بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ میں کچھ دیر بڑی وارفتگی سے صفدر کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر خود بخود ایک فقرہ میرے ہونٹوں پر آ گیا۔ میں نے کہا۔ "صفدر! مجھے "آپ" مت کہا کرو۔ وعدہ کرو کہ آئندہ مجھے اجنبیوں کے نہیں' دوستوں کے لہجے میں پکارو گے۔"

صفدر نے کہا۔ "یہ تو بڑی مشکل میں ڈال رہے ہیں آپ۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں مشکلوں کا چسکا ہے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "میرا خیال ہے مجھے اپنے الفاظ واپس لے لینے چاہئیں۔"

"سارے الفاظ نہیں۔" میں نے اسے ٹوکا۔ "صرف جناب' آپ اور فرمائیے وغیرہ واپس لے لو۔"

○☆○

ہم اگلے روز بھی شام تک مری سے نہیں نکل سکے۔ لہٰذا روانگی تیسرے دن پر ملتوی کر دی گئی۔ تیسرے روز ہم علی الصباح چار بجے نکلے اور نتھیا گلی سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد اور وہاں سے ایک طویل سفر کے بعد جھنگ پہنچ گئے۔ جھنگ میں ہم نے وہ پرائیویٹ کار چھوڑ دی جو تین روز پہلے صفدر نے کرائے پر لی تھی۔ وہ رات ہم نے اندرون جھنگ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گزار دی۔ وہیں صفدر نے میرے لیے ایک شلوار قمیص' جوتے اور گرم چادر حاصل کی۔ یہ بہت سستا سامان تھا۔ سر میں سرسوں کا تیل لگا کر گلے میں چاندی کا چھوٹا سا تعویذ پہن کر اور انگلیوں میں جھوٹے پتھر کی تین چار انگوٹھیاں ڈال کر میں خود کو اندرون لاہور گھومنے والا کوئی جیب کٹ غنڈا محسوس کرنے لگا۔ میری شان میں "اضافہ" کرنے کے لیے صفدر نے میرے گریبان کے بٹن کھول دیے اور سینے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "امید نہیں تھی کہ یہ لباس آپ کو اتنا جچے گا۔"

"ارے پھر وہی آپ" میں نے اسے ٹوکا۔ "اس لفظ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہو؟ اللہ کے بندے "تم" کہو۔ میں یہ لفظ تمہارے منہ سے سننے کے لیے ترس گیا ہوں۔"

"بہت مشکل کام ہے جناب۔" صفدر نے جان بوجھ کر "جناب" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک خودکار عمل ہوتا ہے جی۔ کس کو "تم" کہنا ہے اور کس کو "آپ" اس کا فیصلہ بندے کے اندرون خانہ بڑی خاموشی سے ہو جاتا ہے اور پھر اس فیصلے کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر زبردستی کی جائے تو یہ "زبردستی" عارضی ثابت ہوتی ہے۔"

وہ لمبی چوڑی تقریر جھاڑنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے اسے بمشکل اس حماقت سے روکا۔ پوری طرح تیار ہو کر ہم لاری اڈے پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑی اور خوشاب کے لیے روانہ ہو گئے۔ سردی کے موسم کا بھرپور وفائی اظہار ہے تھے ہم۔ زریں گل اور صفدر کے چہرے گرم چادروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ میں نے بھی مظفر کی پگڑی باندھ کر چادر ڈالی یوں چہرے پر سجا لیا تھا کہ آنکھوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ریوالور مع گولیوں والے بیلٹ کے میری قمیص کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ صفدر کے پاس وزیر آباد کا بنا ہوا کمانی دار چاقو تھا۔ زریں گل موسمن بنا ہوا تھا۔ یعنی موقع پڑنے پر سے تیغ لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہم اقبال کے شاہین تو نہیں تھے لیکن پلٹ کر جھپٹنے کی عمدہ مثال قائم کر رہے تھے۔ یعنی بجائے اس کے کہ ہم عیسیٰ جان اور قادر زماں کے کارندوں سے چھپتے پھرتے اور دفاعی پوزیشنوں پر چلے جاتے' ہم نے جارحانہ انداز اختیار کیا تھا اور دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے پلٹ پڑے تھے۔ حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا اور یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ میں پھر اسی خونی دھارے پر بہہ نکلا تھا جس کی روانی سے خود کو بچانے کے لیے میں نے خود کو حکام کے حوالے کیا تھا اور جیل میں پناہ لی تھی۔ حالات کے منہ زور ریلے میں جیل کے دو چار برس ایک تنکے کی طرح بہہ گئے تھے اور میں پھر موجوں کے حوالے تھا۔

براستہ جوہر آباد' خوشاب پہنچنے میں ہمیں قریباً تین گھنٹے لگ گئے۔ سہ پہر کے دو بجے تھے۔ ہم سیدھے ایک چائے خانے میں چلے گئے۔ پروگرام کے مطابق صفدر کو یہیں ارجمند بانو سے ملنا تھا۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو پھر ہمیں بھی اسی کے ساتھ چلے جانا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ہمیں چائے پیتا چھوڑ کر چائے خانے سے نکل گیا۔ اس کی واپسی خلاف توقع بہت جلدی ہو گئی۔ بمشکل آدھا گھنٹا لگا۔

"ہم تھنے جناب! سر منڈواتے ہی اولے پڑے ہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ارجمند صاحبہ بنفس نفیس آپ کو لینے آئی ہیں۔ سامنے بڑی سڑک کے موڑ پر ان کی سواری باد بہاری کھڑی ہے۔"

"ارے بھئی اتنی جلدی!" زریں گل نے حیرانی ظاہر کی۔

"ہاں راستے ہی میں ملاقات ہو گئی ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔ "میں ابھی فردوس کالونی کی مین روڈ ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ رانی صاحبہ کی گاڑی میرے قریب آن رکی۔ فوراً پہچان گئیں۔"

"ہاں' یہ تو پھر ہونا ہی تھا۔" زریں گل نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ صفدر نے یاد دہانی کے انداز میں کہا۔ "میں آپ دونوں کا سرغنہ لگتا تو نہیں ہوں لیکن مجبوری ہے آپ کو مجھے ہی سرغنہ سمجھنا پڑے گا۔ میرا نام راجو ہے۔ آپ کو ہم حسانی کہتے ہیں اور زریں گل' زریں پہلوان ہے۔ ہم تینوں کا تعلق پاک پتن شریف سے ہے لیکن شریفوں والا کوئی کام ہم میں نہیں۔ چھوٹے موٹے جرائم تو کرتے ہی رہتے ہیں لیکن ایک دو بندے بھی پار کر چکے ہیں۔ چلئے اب آئیے۔ بلکہ چلو اب آؤ۔" اس نے آخری جملہ خصوصی طور سے میری طرف دیکھ کر کہا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ کی "تم" والی خواہش بھی وقتی طور پر ہی سہی لیکن پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔"

ہم چائے خانے سے نکلے اور گنجان بازار سے گزر کر ایک کشادہ سڑک پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک چم چم کرتی سرخ شیراز کار کھڑی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر کار میں جھانک رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اندر بیٹھی ہوئی مخلوق بہت حسین ہے۔ ہم گاڑی میں داخل ہوئے تو یہ اندازہ ایک سو ایک فی صد درست ثابت ہوا۔ ایک حور شمائل پری جمال لڑکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال بڑے سلیقے سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ گدرایا ہوا پُر شباب جسم' تحفے سے لبالب بھری ہوئی بوتل جیسا تھا۔ وہ سیکسی نما ریشمی لبادے میں تھی۔ گلے میں سچے موتیوں کا ہار اور بائیں کلائی میں ہیرے کے دو کنگن اس کی ثروت مندی کی خاموش گواہی دے رہے تھے۔

"سلام بیگم صاحبہ۔" زریں گل اور میں نے قریباً ایک ساتھ کہا۔

اس نے ایک تیز نگاہ ہم پر ڈال کر سر کے اشارے سے جواب دیا۔

"یہی میرا یار حسانی ہے بیگم صاحبہ۔" صفدر بولا۔ "بچپن کا لنگوٹیا ہے۔ شیر کی طرح دلیر اور چیتے کی طرح پھرتیلا ہے۔ ہر بُرے بھلے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے اس نے۔" صفدر کا لہجہ ٹھیٹ لاہوری اور انداز "خوشامدی" تھا۔ اچھی بھلی اداکاری کر رہا تھا کم بخت۔

گاڑی کی معطر فضا میں ارجمند کی مترنم آواز ابھری۔ "اور یہ زریں پہلوان کیسا ہے؟"

صفدر زیر لب مسکرایا۔ "یہ لومڑی کی طرح عیار ہے جی۔ بلکہ اسے لومڑی سمجھئے لڑائی بھڑائی میں ایسے چکر دیتا ہے کہ مدمقابل کو کہ وہ ہانپ کر خود ہی گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ بند گھروں میں گھسنے کا بھی وسیع تجربہ ہے اسے۔ پچی بات یہ ہے کہ ہر بُرے سے بُرا کام کیا ہے اس حرامی نے' لیکن اس کی ایک خوبی سب خامیوں پر حاوی ہے۔ کتے سے بڑھ کر وفادار ہے۔ ایک بار جس کا نمک کھا لے اس پر جان بھی دیتا ہے۔"

مسکراتی ہوئی سی مترنم آواز پھر ابھری۔ "جمعت سے جانوروں کی خاصیتیں جمع ہو گئی ہیں تمہارے دوستوں میں۔ بہرحال تمہارے دوست ہیں۔ ظاہر ہے کام کے لوگ ہی ہوں گے۔"

"وقت آنے پر آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا بیگم صاحبہ۔" صفدر نے لہجے میں اعتماد سمیٹ کر کہا۔

گاڑی خوشاب کی مختلف سڑکوں پر تیزی سے فراٹے بھرتی ایک متمول علاقے میں پہنچ گئی۔ ایک بہت بڑے آہنی گیٹ کے سامنے پہنچ کر ہم رُکے۔ گیٹ پر موجود باوردی چوکیدار نے پھرتی سے گیٹ کھولا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھی کم و بیش چھ کنال میں تھی۔ صرف ایک تہائی ایریا "کورڈ" تھا۔ اس کورڈ ایریا کی تین اطراف خوشنما گراسی لان تھا۔ شام کی ڈھلتی ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ کوٹھی میں رئیسانہ رہن سہن کے شواہد بافراط نظر آ رہے تھے۔ میرے

اور صفدر کے علاوہ زریں گل بھی مضطرب تھا۔ پریشانی یہی تھی کہ کہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات درست ثابت نہ ہو جائے۔ اگر ابھی کوٹھی کے داخلی دروازے سے "قمر زماں یا ہمارا کوئی اور "دشمن جاں" نکلتا ہوا برآمد ہو جاتا تو حیرانی کی بات نہیں تھی۔ بہرحال خیریت گزری۔ کوٹھی کے پورچ یا گیراج میں ہمیں کوئی ایسی گاڑی دکھائی نہیں دی جو ہماری دھڑکنوں میں اضافے کا موجب بنتی۔ یوں لگتا تھا' کوٹھی میں اس وقت صاحب خانہ یعنی افراہیم صاحب بھی موجود نہیں۔

ارجمند بانو ہمیں لے کر گاڑی سے باہر نکلی تو اس کا جاذب نظر سراپا ہماری نگاہوں کے سامنے کسی ریشمی تھان کی طرح کھل گیا۔ وہ لاکھوں میں ایک لڑکی تھی۔ تھوڑی سی رعایت کے بعد اسے ملکوتی حُسن کی مالک کہا جا سکتا تھا۔ ہم گاڑی سے نکلے تو مجھے پہلی بار ارجمند کی گردن اور بائیں رُخسار پر خراشیں نظر آئیں۔ ان خراشوں پر کوئی مرہم لگا دیا گیا تھا۔ یقیناً یہ خراشیں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتی تھیں جو چار یوم پہلے جھنگ کی اس پُراسرار حویلی میں پیش آیا تھا اور جس کی تفصیل صفدر مجھے مری میں بتا چکا تھا۔ ارجمند کی شفاف ملائم جلد پر یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر جلال نے اندھی ہوس کے قلم سے لکھی تھی۔ وہ تو شاید اس طوفانی رات کی تنہائی میں پوری یکسوئی سے بیٹھ کر مکمل کتاب لکھ دیتا مگر صفدر نے مداخلت کر کے اس کے ارادے خاک میں ملا دیے تھے۔

ارجمند ہمیں چند وسیع و عریض کمروں سے گزار کر ایک نیم روشن کوریڈور میں لائی۔ یہاں ایک زینہ نظر آیا۔ وہ اوپر کے بجائے نیچے جاتا تھا۔ ہم پہلے ہی گراؤنڈ پر تھے۔ اس کا مطلب تھا زینہ ہمیں سپرد خاک کر دے گا۔ یعنی تہ خانے میں لے جائے گا۔ ہم نیچے اترے۔ وہ واقعی ایک تہ خانہ تھا مگر ہمارے تصورات سے بہت مختلف۔ فلمی تہ خانوں کی طرح نہ اس میں چمگادڑیں تھیں' نہ گاڑیوں کے استعمال شدہ ٹائر اور ڈرم۔ حتیٰ کہ فرش پر جھاڑ جھنکاڑ بالوں والا کوئی مدقوق قیدی بھی نظر نہیں آیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ فرش ہی نظر نہیں آیا۔ نیچی چھت کے ایک وسیع کمرے میں دبیز قالین بچھا تھا۔ اس کمرے میں تین اطراف صوفے لگے ہوئے تھے۔ رنگین ٹی وی' وی سی آر (جو ان دنوں عجوبہ سمجھا جا رہا تھا) فریج' تمام آسائشیں کمرے میں موجود تھیں۔

ارجمند نے کہا۔ "تم لوگ یہاں آرام سے رہو۔ ایک ملازم کے سوا یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ملازم کو بتا دو۔ ہم تین چار روز شاید تم سے نہ مل سکیں۔ اس کے بعد کوئی کام ہوا تو بتا دیا جائے گا۔"

صفدر نے تعظیم سے سر جھکایا۔ ارجمند باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے کہنے پر ہم نے بھی نشستیں سنبھال لیں۔ تہ خانے سمیت اس کوٹھی کی تمام تر اندرونی آرائش قدیم و جدید تہذیب کا خوب صورت امتزاج تھی۔ جہاں صوفے تھے وہاں ایک دو کمروں میں چاندنی بھی بچھی ہوئی تھی اور چاندنی پر گاؤ تکیے بھی رکھے ہوئے تھے۔ بجلی کے قمقموں کے علاوہ شمعدان بھی نظر آتے تھے اور دیواروں پر جہاں خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں وہاں تلواریں' ڈھالیں وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ صفدر نے بتایا تھا کہ جھنگ والی حویلی کو بھی ان لوگوں نے قدیم انداز میں ڈیکوریٹ کر رکھا ہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس انداز آرائش سے خاص لگاؤ ہے اس جوڑے کو۔

ارجمند بڑے شاہانہ انداز سے صوفے پر بیٹھی کھلی کھلی نظروں سے صفدر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے کے لیے بایاں ہاتھ اٹھایا تو کلائی میں جڑاؤ کنگن چمک اٹھے۔ وہ بولی۔ "ہم تم سے بہت متاثر ہوئے ہیں راجو! پرسوں کی رات ہمارے لیے ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تنہا ڈرائیونگ کر کے جھنگ والی حویلی میں جانا ہمیں اتنا مہنگا پڑے گا۔ عام طور پر ہم اکیلے سفر نہیں کرتے۔ ڈرائیور' ایک باڈی گارڈ اور بعض اوقات پرسنل سیکرٹری بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ بس نئی گاڑی کے شوق میں ہم تنہا چلے گئے۔ یہ اسپورٹس ماڈل شیراز جس پر تم یہاں آئے ہو' افراہیم نے چند روز پہلے ہمارے لیے باہر سے منگوائی ہے۔ افراہیم ہمارے شوہر ہیں۔ کل پرسوں تک ہم تمہیں ان سے ملوائیں گے۔ اس وقت وہ جھنگ میں ہیں۔ جھنگ والی حویلی میں ابھی تعمیر کا کام ہو رہا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں وہاں رُکے ہوئے ہیں۔ پرسوں ہم انہی سے ملنے جھنگ گئے تھے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہمیں وہاں نہیں ملیں گے اور ہمیں ایک طوفانی شب میں تن تنہا حویلی میں رُکنا پڑے گا۔ وہ خبیث جو تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا' پچھلے چھ ماہ سے ہمارے پاس ملازم تھا۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنا گر سکتا ہے۔ وہ انسان نہیں حیوان ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ اگلے آٹھ دس برس تک جیل سے باہر نہ آ سکے۔" پھر ایک گہری اور معطر سانس کی خوشبو اس نے کمرے میں بکھیر کر کہا۔ "کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان کی مکمل پرکھ ہو جاتی ہے۔ پرسوں گزرنے والی رات بھی ایک کسوٹی تھی۔ اس

رات ہمیں ایک بے حد کھوٹے اور ایک بہت کھرے انسان کی پرکھ ہوئی۔ وہ کھرے انسان تم ہو راجو۔ تم ہمیں جانتے نہیں تھے' کوئی تعلق ناتا نہیں تھا ہمارا تم سے اور ہم اپنے تمام اثر و رسوخ اور طاقت کے باوجود تمہارے رحم و کرم پر تھے۔ اس رات تم جیسا جرائم پیشہ شخص کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ہمیں جان سے مار سکتا تھا۔ ہمیں اغوا کرکے ہمارا تاوان طلب کر سکتا تھا اور کچھ نہیں تو یہ ہزاروں کا ہار' لاکھوں کے کنگن اور وہ بیش قیمت گاڑی تو اس کی دسترس میں تھی۔ بہرطور راجو! ہم تمہارے احسان مند ہیں اور رہیں گے۔ تم اور تمہارے ساتھی محنت سے کام کرو۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ رکھیں گے اور تمہارے لیے وہ سب کچھ کیا جائے گا جو ہم کر سکتے ہیں۔"

صفدر نے انکسار سے کہا۔ "یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے بیگم صاحب۔ ورنہ ہم آوارہ گرد کس کام کے ہیں۔"

ارجمند بانو نے سچے موتیوں کے ہار کو اپنی حنائی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا۔ "قدیم عمارتوں کی خرید اور ایک خاص ڈھنگ سے ان کی تزئین ہمارا اور ابراہیم کا دل پسند مشغلہ ہے۔ ہم ایسی مردہ عمارتوں کو زندہ کرکے اور وہاں وقت گزار کر خوش ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ عمارتیں ڈیکوریشن کے بعد اس قدر "چارمنگ" ہو گئی ہیں کہ ان میں داخل ہونے کے بعد نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایسی ہی دو حویلیاں ہمارے جاننے والوں نے ہم سے قیمتاً خرید کی ہیں۔"

وہ بڑی روانی اور بے تکلفی سے بول رہی تھی۔ ابھی وہ اس بارے میں ہمیں غالباً کچھ اور بتاتی لیکن کچھ آوازوں نے اسے اور ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ کسی عورت کی آہ و پکار تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی اور بیگم جی کے نام کی دہائی دے رہی تھی۔ کچھ افراد اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ سارا تماشا ان زینوں کے سامنے ہو رہا تھا جن سے اتر کر ہم اس تہ خانے میں پہنچے تھے۔ چیخ و پکار سن کر ارجمند اٹھ کھڑی ہوئی۔ دبیز قالین پر نزاکت لیکن تیزی سے پاؤں دھرتی ہوئی وہ زینوں کی طرف بڑھی مگر ابھی نصف راستے میں تھی کہ دھڑ دھڑ کی آوازیں آئیں اور کوئی بھاگتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ اس کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ بلکہ اگر سرد موسم کو مدنظر رکھا جاتا تو یہ لباس نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک پھٹی پرانی اوڑھنی اس کے کندھوں پر تھی اور اس کے نیچے گھسے پٹے کاٹن کی شلوار قمیص۔ لڑکی کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کی خستہ حالی کے اندر سے جوبن یوں پھوٹ رہا تھا جیسے گھٹا ٹوپ بادلوں سے سورج کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ زینے طے کرتے ہی وہ ارجمند کے قدموں میں گر پڑی اور فریادی لہجے میں بولی۔ "میں مر جاؤں گی بیگم جی! مجھے بچا لیں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ آپ کو خدا رسول کا واسطہ۔"

اس اچانک افتاد پر جہاں ارجمند برہم نظر آ رہی تھی وہاں اس کی آنکھوں میں ہمدردی بھی کروٹیں لینے لگی تھی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید یہ لڑکی بھی ان بدقسمت ملازماؤں میں سے ایک ہے جو اپنی مجبوریوں کے تحت بڑے گھرانوں اور عالی شان حویلیوں میں خدمت انجام دینے پر مجبور ہوتی ہیں اور گاہے گاہے اچھے جوبن کی پاداش میں نوچی کھسوٹی جاتی ہیں۔ کبھی صاحبان خانہ کے ہاتھوں اور کبھی ان کے منہ چڑھے "سینئر" ملازمین کے ہاتھوں' لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنا یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ لڑکی ٹھیٹ پنجابی لہجے میں واویلا کر رہی تھی اور دہائی دے رہی تھی کہ "بیگم جی" اس کا خاوند اسے واپس لوٹا دیں۔ وہ پکار رہی تھی۔ "میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گی بیگم جی! میرے سر کا سائیں مجھے دے دیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔" اس نے اپنی اوڑھنی ارجمند کے پاؤں میں ڈال دی اور پچھاڑیں کھانے لگی۔

میں نے دیکھا' ارجمند کے چہرے پر ترحم کی گہری بدلیاں تیرنے لگی ہیں۔ اس نے جھک کر لڑکی کے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور دلاسا دینے لگی۔ لڑکی نے حوصلہ پاکر ارجمند کی پنڈلیاں اپنے بازوؤں میں جکڑ لیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ایک ادھیڑ عمر مفلوک الحال شخص لڑکی کے پیچھے ہی پیچھے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت سے لڑکی کا کوئی قریبی عزیز لگتا تھا۔ اس نے لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ "بس کر اقبال' بس کر۔ چھوڑ بیگم جی کو۔ چھوڑ دے۔"

اس نے زور لگا کر لڑکی کے بازو کھول دیے اور اسے تقریباً گھسیٹ کر پیچھے لے گیا۔ دو ملازم صورت افراد نے بھی لڑکی کو تھام لیا اور کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔ وہ مسلسل بیگم جی کے نام کی دہائی دے رہی تھی اور پکڑنے والوں کی گرفت سے نکل نکل جا رہی تھی۔ پچیس تیس سیکنڈ میں یہ تماشا ختم ہو گیا اور ارجمند سمیت سب لوگ باہر چلے گئے۔ تہ خانے کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور اب باہر کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے صفدر اور زریں گل کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرح مبہوت تھے۔ میں نے صفدر سے پوچھا۔

"کہیں یہ وہی۔ جلال والا معاملہ تو نہیں۔ ممکن ہے یہ

جلال اس مجرمانہ حملے کا مرکزی کردار تھا جو چار روز پہلے جھنگ والی حویلی میں ارجمند پر کیا گیا تھا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" صفدر نے کہا۔ "عباس اور مٹھے سے تو یہ لوگ جلال کے بھائی بندی لگتے ہیں۔"

زریں گل بولا۔ "ام تو سمجھا نہیں کہ آپ کیا کہہ رہا ہے۔"

صفدر نے کہا۔ "سمجھنے کے لیے بندے کے پاس ایک مرد دماغ کا ہونا بہت ضروری ہے' بہرحال ہم دونوں یہ خیال ظاہر کر رہے تھے کہ ممکن ہے یہ عورت جو ابھی چیخ و پکار کر رہی تھی اسی شخص کی عزیزہ ہو جس نے چار روز پہلے جھنگ کی حویلی میں ارجمند پر حملہ کیا تھا۔ ظاہر ہے اب وہ شخص زیر عتاب ہوگا۔ ہو سکتا ہے یہ عورت اس کے لیے رحم کی اپیل کرنے یہاں پہنچی ہو۔"

زریں گل بولا۔ "آپ تو بہت دور کی کوڑی لا رہا ہے صفدر صاحب' امارا دماغ اتنا تیز نہیں لیکن ایسا کند ذہن بھی نہیں۔ ام نے جو اندازہ لگایا ہے وہ آپ کے اندازے کے مطابق نہیں ہے۔ امارا خیال ہے کہ اس عورت کا خاوند مر چکا تھا اور جو کچھ عورت کہہ رہا تھا وہ رحم کا اپیل نہیں تھا وہ تو بس رونا پیٹنا تھا۔"

زریں گل کی بات میں وزن تھا۔ ہم نے لڑکی کی جتنی چیخ و پکار سنی' وہ مبہم الفاظ پر مشتمل تھی۔ اس چیخ و پکار کی روشنی میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا مشکل تھا۔ بہرطور اتنی بڑی چار دیواری کے اندر یہ ہنگامہ ایسا غیر معمولی بھی نہیں تھا۔ ایسی چیختی چلاتی کہانیاں اس طرح کی وسیع چھتوں کے نیچے ہر روز جنم لیتی ہیں۔ بڑے بڑے فارم ہاؤسز' حویلیاں' کوٹھیاں اور بنگلے شاید بنائے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے اندر کچھ بھی ہوتا رہے' باہر سے وہ گوشۂ بہشت کے مانند پرسکون و پرامن دکھائی دیں۔

○☆○

چار روز ہم نے اس پرشکوہ تہ خانے میں بڑی آسائش سے گزارے۔ ہر سہولت ہمیں وہاں میسر تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے ہم قربانی کے بکرے ہیں اور کسی بھی وقت چھری کی دھار ہماری شہ رگ کو بوسہ دینے والی ہے۔ نجانے کیوں ارجمند بانو کی یہ عنایت و مہربانی ہمیں ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ درست تھا کہ صفدر نے ارجمند کو ایک مشکل صورت حال سے نکالا تھا اور پھر رات بھر اس کے جسمانی و مالی اثاثہ جات پر پورا اختیار رکھنے کے باوجود ایک "شریف النفس" انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا مگر اس احسان کا بدلہ اس جیسے کنگلے کو آٹھ دس ہزار روپے کا انعام بخش کر یا زیادہ سے زیادہ ہزار پندرہ سو کی نوکری دے کر دیا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو اسے باقاعدہ وی آئی پی بنا لیا گیا تھا اور اس سمیت ہم سب کی ناز برداریاں ہو رہی تھیں۔ ایک ملازم ہر وقت ہمارے ڈسپوزل پر تھا۔ رہائشی سہولتیں' تین وقت مرغن کھانا' مکمل آرام' ٹی وی اور ویڈیو۔ ہم جیسے فائیو اسٹار ہوٹل میں تھے۔ اگر کوئی پریشانی تھی تو یہی کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور ہماری ملاقات 'منکر نکیر جیسی' قادر زماں یا تیموں سے ہو جائے گی۔ کچھ بھی تھا' اس اندیشے کو کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ارجمند بانو یا اس کوٹھی میں موجود کوئی ملازم ہمیں پہچان چکا ہو اور مستقبل قریب میں یہ "ٹریٹمنٹ" ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہونے والا ہو۔

ان چار دنوں میں صرف ایک دفعہ ارجمند سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی پختہ عمر سیکریٹری کے ساتھ بڑے شاہانہ انداز میں اندر آئی تھی جیسے بکنگھم پیلس میں مادر ملکہ اپنا طویل گاؤن فرش پر گھسیٹتی معذور طلبہ کے وفد کو شرف ملاقات بخشنے آئی ہو۔ بڑے دھیمے دھیمے نرم لہجے میں ہمارا حال احوال پوچھ کر وہ فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اسے چار روز پہلے کا واقعہ یاد ہوگا اور وہ اس لڑکی کے بارے میں ہمیں کچھ بتائے گی جو اس روز روتی چیختی ہوئی تہ خانے میں چلی آئی تھی لیکن اس بارے میں ارجمند نے کوئی بات نہیں کی۔ ہم میں سے بھی کسی نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ارجمند کو دیکھ کر تمام منفی خیالات میرے ذہن میں دم توڑ جاتے تھے' کچھ عجیب سی معصومیت اور سادگی جھلکتی تھی اس کے چہرے سے۔ وہ یا تو زبردست اداکارہ تھی یا پھر واقعی اس کے اندر ایک نیک روح بستی تھی۔ جو وہ اپنی حیثیت اور مرتبے کے چمکدار خول میں چھپنے کے بجائے بے تکلف انداز میں جی رہی تھی اور اپنے اردگرد کے انسانوں کو انسان سمجھتی تھی۔

چوتھے روز شام کو ارجمند نے ہماری ملاقات اپنے شوہر نامدار مسٹر ابراہیم سے کروائی۔ دروازہ کھلا اور خوش پوش میاں بیوی اندر داخل ہوئے۔ ارجمند نے سیاہ رنگ کا ایک دیدہ زیب جوڑا زیب تن کر رکھا تھا۔ ہاتھی دانت کے جو زیور وہ پہنے ہوئے تھی' میں نے صرف لاہور کے عجائب گھر میں دیکھے تھے۔ ابراہیم درمیانی عمر اور درمیانے قد کا خوش رو شخص تھا۔ وہ گہری چیک سوٹ میں تھا' آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک تھی۔ ارجمند کے مقابلے میں اس کی عمر کافی زیادہ

تھی۔ وہ بڑی متانت سے قدم اٹھاتا ہمارے سامنے پہنچا اور فرداً فرداً تینوں سے مصافحہ کیا۔ صفدر کو اس نے باقاعدہ کندھا تھپک کر شاباش دی اور بولا۔ "ہم جی دار لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور جی دار شخص نیک بھی ہو تو بہترین ساتھی ثابت ہوتا ہے۔" پھر وہ ارجمند کی طرف گھوما اور کہنے لگا۔ "آپ نے انہیں سمجھایا بجھایا بھی ہے یا کہیں بند کر رکھا ہے۔"

وہ بولی۔ "ابھی تک تو کہیں ہیں۔"

افراہیم بولا۔ "یہ تو نامناسب ہے۔ انہیں ذرا ہوا خوری کروائیں اور کچھ نہیں تو جھنگ والی حویلی دکھلائیں۔ کل بعد دوپہر آپ کو تو آنا ہی ہے' انہیں بھی ساتھ لے آئیں۔ ذرا تفصیلی ملاقات رہے گی ان سے اور کوئی اچھا سا کام بھی سوچ لیں گے ان کے لیے۔"

ارجمند بولی۔ "چند چھوٹے موٹے کیس ہیں ان لوگوں پر۔ ہمارا خیال ہے کہ کوئی اچھا سا وکیل ہو تو ضمانتیں ہو جائیں گی۔ وہ آپ کے دوست ایڈووکیٹ جعفر بخاری آج کل کہاں ہیں؟"

"لاہور گئے ہوئے ہیں' لیکن ان کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ خوشاب میں ہی کسی کو کہہ دیں گے۔ میرا مطلب ہے کوئی سنگین معاملہ تو نہیں ہے ناں؟"

"سنگین بھی کہہ سکتے ہیں۔" ارجمند بولی۔ "ایک بس ڈرائیور کے قتل میں ملوث کیا گیا ہے ان لوگوں کو۔"

"اوہ اچھا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کرالیں گے ضمانت۔ میں نے ایک دو روز میں لاہور جانا ہے۔ جعفر بخاری سے بات کرلوں گا۔" پھر وہ صفدر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کل حویلی آؤ گے تو اس بارے میں آرام سے بات کریں گے۔"

اس نے ایک بار پھر صفدر کا شانہ تھپکا اور سگار کے کش لیتا ہوا زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ ارجمند اس کے ساتھ تھی۔ بہت بے جوڑ نظر آرہے تھے وہ دونوں۔

O☆O

اگلے روز ہم حویلی جانے کے لیے "میں منٹ" سے نکلے۔ پورچ میں پہنچے تو ارجمند شاندار جیگوار میں روانہ ہو رہی تھی۔ گاڑی کی پچھلی کھڑکیوں اور بیک اسکرین پر اندر کی طرف حسین ریشمی پردے تھے۔ ایک گارڈ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ارجمند نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ ہمیں ایک ۷۰ ماڈل ٹویوٹا میں جانا تھا۔ یہ گاڑی بھی وسیع پورچ میں ایک جانب تیار حالت میں کھڑی تھی۔ گاڑی کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ لان کی دوسری جانب سرونٹ

کوارٹرز پر پڑی۔ وہاں ایک کوارٹر کے سامنے وہی لڑکی نظر آئی جو چند دن پہلے "فیں منٹ" میں آکر واویلا کر رہی تھی۔ آج اس کے ساتھ ایک مفلوک الحال بوڑھے کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور سات آٹھ برس کی ایک بچی بھی آئی تھی۔ یہ سب لوگ ایک کوارٹر سے باہر دھوپ میں بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کے کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔ ہو سکتا تھا' ان کا تعلق خانہ بدوش قبیلے سے ہو۔ اوڈ' "چنگڑ" گگڑے' "سانسی" وغیرہ علاقے میں عام پائے جاتے تھے اور ان میں سے بعض مزدوری اور زیر تعمیر عمارتوں میں مزدوری بھی کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ چند روز پہلے چیخ و پکار کرنے والی لڑکی آج بالکل زمین پر بیٹھی تھی۔ اسے شاید حتمی ہو رہی تھی یا نے کی اس نے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ادھیڑ عمر عورت اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ بوڑھا منہ میں حقے کی نے پاس ہی خاموش کھڑا تھا۔ بس اتنی ہی جھلک نظر آئی کہ ہم درختوں کی اوٹ میں کھڑی گاڑی میں آ بیٹھے اور وہ ہمیں لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس لڑکی اور اس کے اہل خانہ کے حوالے سے کئی سوال میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔ تو طے تھا کہ یہ لوگ گھریلو ملازمین میں سے نہیں ہیں۔ افراہیم اور ارجمند نے انہیں کوٹھی میں کیوں رکھا ہے اور اس روز لڑکی نے ارجمند کے قدموں سے لپٹ کر

کیوں کیے تھے؟ نجانے کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے ثریا کی یاد آگئی۔ وہ زوئے مشت کے قتل عام میں رانی عرف تھی لیکن اس کی سنائی ہوئی کہانی ابھی میرے ذہن میں لے رہی تھی۔ نائکہ ثریا بھی اسی طرح جوانی میں بیوہ تھی۔ شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا محبوب اس سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا تھا۔ آغاز سفر میں ہی ساتھی کو کھو کر ثریا نے بھی اس طرح نوحے کیے ہوں' اسی طرح روئی پیٹی ہوگی۔ اسے ایک سازش کے تحت مروا دیا گیا تھا۔ معلوم نہیں افراہیم کی کوٹھی میں موجود یہ لڑکی بیوہ ہوئی تھی۔ ممکن تھا یہ بھی کسی چوہدری وارا کی سازش ہو۔

میں دیر تک اپنے خیالوں میں مگن رہا۔ گرم چادر کے نیچے ریوالور میری کمر سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے "ٹھنڈی" میری زیریں پسلیوں میں چبھ کر ایک اطمینان کے احساس کا موجب بن رہی تھی۔ سبز کھیت اور چاروں طرف بکھرے ہوئے دیہی مناظر کے درمیان ہماری گاڑی

سڑک پر سفر کرتی ہوئی قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں جھنگ پہنچ گئی۔ سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے خود کو رنگوں میں گھری ہوئی اس الگ تھلگ حویلی کے سامنے پایا جہاں چھ سات ماہ پہلے عطا محمد اور اس کے زخمی بچے سے میری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے کارمین اینڈ کمپنی کو وی سی آر اور بلیو پرنٹ سمیت تو دو گیارہ ہونے پر مجبور کیا تھا۔ اب یہ حویلی صفدر کے لیے بھی اجنبی نہیں رہی تھی۔ صرف چند رات روز پہلے وہ نہ صرف کامیابی سے یہاں گھسا تھا بلکہ اس نے طوفانی شب میں حویلی کی مالکن کو ایک نمک حرام کے ہاتھوں خوار ہونے سے بھی بچایا تھا۔ چھ سات ماہ پہلے کی حویلی اور اس حویلی میں نمایاں فرق نظر آرہا تھا۔ وہ ایک بے رنگ اور تباہ حال عمارت تھی لیکن یہ حویلی ایک خاص قسم کی شان سج دھج لیے ہوئے تھی اور خوبی یہ تھی کہ حویلی کو سنوارنے میں اس کی قدامت کو مجروح نہیں کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک ویران کھنڈر پر بہار آئی ہے' وہ پھر سے عمارت بن گیا ہے۔ ہنوز حویلی کی وسیع چار دیواری میں تعمیر کا کام جاری تھا اور اس کا ثبوت وہ بلڈنگ میٹریل تھا جو دیوار کے آروں کے حصار میں یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔

منزل پر پہنچ کر میرے اعصاب تن گئے تھے۔ یقیناً صفدر کی دل کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ یہاں کسی بھی مخالف شخص سے ہمارا ٹکراؤ ہو سکتا تھا اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں جو صورت حال سامنے آتی وہ ہمارے لیے کسی طور خوشگوار نہیں تھی۔ ہمارے حریف شمالی پنجاب میں دیہاتوں کی خاک ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور ہم اپنا بچاؤ کرنے کے لیے خود چل کر ان کے کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔ یوں تو ارجمند نے ہمیں تسلی دی تھی کہ حویلی میں اکا دکا مزدوروں کے سوا کوئی موجود نہیں ہے لیکن یہ تسلی اس بات کی گارنٹی نہیں تھی کہ قادر زماں یا شکر و غیرہ سے ہماری مڈھ بھیڑ نہیں ہو جائے گی۔

حویلی میں داخل ہو کر میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ صفدر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اندر داخل ہونے والے کو لگتا ہے جیسے غلطی سے وہ کسی کاسٹیوم فلم کے سیٹ پر چلا آیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کی حویلی لگتی تھی یہ۔ حویلی کے عقبی حصے میں سے تمام جھاڑ جھنکاڑ اور فالتو درخت صاف کیے جا چکے تھے۔ احاطے کے بیچوں بیچ کھدائی کرکے ایک تالاب کے آثار ڈھونڈے گئے تھے۔ اب اس تالاب کو اصل حالت میں لایا جا رہا تھا۔ تالاب کے قریب ہی واقع دو

علیم الحق حقی کے دو ناول
پرماتما
قیمت ۱۵۰/-
ببول
قیمت ۱۵۰/-
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

شکستہ برجیوں کو نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا تھا۔ ایک جانب کھدائی میں کام آنے والی ایک بڑی مشین کھڑی تھی۔ ایسی ہائیڈرالک مشینوں سے زمین کے اندر گہرائی تک کھدائی کی جا سکتی ہے۔ چند روز پہلے افراہیم صاحب غالباً کی مشین لینے بھکر گئے ہوئے تھے اور یہاں حویلی میں ان کی اہلیہ "شرابی جلال" کے چنگل میں پھنس گئی تھیں۔ احاطے کے ایک دور افتادہ گوشے میں ریت ملی ہوئی سرخ مٹی کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ صفدر نے بتایا کہ یہاں ایک کنواں ملا ہے اور یہ مٹی کنوئیں سے نکالی گئی ہے۔

وہ ہمیں کنوئیں کی طرف لے گیا۔ کنوئیں کا دہانہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ مشکل سے آٹھ فٹ قطر کا ہوگا۔ پنجاب میں ایسے کنوئیں کو کھوئی کہتے ہیں اور اس میں سے چرخی کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے۔ ایسے کنوئیں یا کھوئیاں بہت گہری ہوتی ہیں اور اکثر پانی ان کی تہ میں کسی تارے کے مانند چمکتا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کسی وقت یہ کنواں بھی بہت گہرا رہا ہو لیکن اس وقت اس کی گہرائی پچیس فٹ سے زائد نہیں تھی۔ کنوئیں کے اوپر ایک چرخی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ چرخی حال ہی میں لگائی گئی تھی اور اس کا مقصد پانی کھینچنا نہیں مٹی نکالنا تھا۔ چرخی کے ساتھ نائیلون کا مضبوط رسا بندھا تھا۔ اس رسے کا دوسرا سرا ایک ٹب نما بالٹی سے منسلک تھا۔ یہ رسا اور بالٹی کنوئیں کے کنارے مٹی کے ڈھیر پر رکھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ رسے کا ایک حصہ جزوی طور پر جلا ہوا ہے۔

اس پختہ کنوئیں کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کافی

پرانا ہے اندرونی چنائی نانک چندی اینٹوں کی تھی اور جو ملبا اس میں سے نکالا جا رہا تھا وہ بھی خاصا قدیم نظر آتا تھا۔ ہمیں کنوئیں کے کنارے کھڑے دیکھ کر ارجمند بانو بھی وہیں چلی آئی۔ بولی۔ "ہماری بڑی خواہش تھی کہ یہ کنواں صاف ہو جاتا۔ ہم اس کو بالکل اصل حالت میں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ یہ حویلی خریدنے کا فیصلہ ہم نے اس کنوئیں کو دیکھنے کے بعد ہی کیا تھا مگر۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کسی وجہ سے آپ نے کھدائی رُکوا دی ہے۔"

"رُکوا نہیں دی' رُکوانی پڑی ہے۔" وہ بولی پھر چند قدم چل کر کنوئیں کی منڈیر پر پہنچ گئی۔ اس کی تقلید میں ہم نے بھی اندر جھانکا۔ سخت جمی ہوئی مٹی کے اندر سے پولی تھین کی ایک موٹی شیٹ کا تین فٹ لمبا ٹکڑا جھانک رہا تھا۔ اس پر زنگ کے داغ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ٹکڑا ایک بڑی شیٹ کا کونا ہے جو مٹی میں دبی ہوئی تھی۔ کنوئیں کے عین وسط میں ایک اور شے دیکھ کر میں بُری طرح چونک گیا۔ یہ ایک شاٹ گن کا ڈبل بیرل تھا۔ بیرل قریباً آٹھ انچ تک مٹی سے باہر تھا اور زنگ آلود نظر آ رہا تھا۔

میرے بولنے سے پہلے ہی صفدر بول پڑا۔ "یہ کیا چیز ہے بیگم صاحب؟"

"رائفلیں ہیں۔" ارجمند بانو نے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ "معلوم نہیں کب سے یہاں دبی پڑی ہیں۔ تین چار ہم نے نکالی بھی ہیں۔ لگتا ہے پارٹیشن سے پہلے یہ اسلحہ کسی فوجی یونٹ نے یہاں پھینکا تھا۔"

صفدر نے کہا۔ "بیگم صاحب! کہتے ہیں جی کہ شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے۔ آپ کو پرانی چیزوں کا شوق ہے۔ آپ کی حویلی سے یہ انگریزوں کی چھوڑی ہوئی بندوقیں نکل آئی ہیں۔"

وہ بولی۔ "مگر یہ اینٹیق میں شامل نہیں ہیں۔ ایسی رائفلیں تو آج بھی ہماری پولیس استعمال کر رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "گستاخی معاف بیگم صاحب۔ یوں تو ہمارے ہاں موہنجوداڑو والی بیل گاڑی بھی چل رہی ہے اور وہ جو مٹی کے گھگو گھوڑے وہاں سے نکلے ہیں وہ آج بھی ہمارے دیہات میں بچوں کا کھلونا ہیں۔"

اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری جیسے میری دخل اندازی اسے پسند نہ آئی ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی طور ناگواری کا اظہار کرتی' صفدر نے کہا۔ "لیکن بیگم صاحب! کھدائی کیوں رکوا دی آپ نے؟"

"یہی تو مسئلہ بنا ہوا ہے۔" وہ بولی۔ "سیدھے مزدور ہیں۔ کام چھوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ کہتے ہیں یہاں بم ہے جی۔ گولہ بارود بھی ہو گا۔ کوئی دھماکا ہو گیا تو پھر۔ پہلے افراہیم جھنگ سے چار اور مزدور لے کر آئے انہوں نے بھی انکار کر دیا۔"

"کوئی دھماکا ہوا بھی تھا؟" میں نے اُدھ جلے ر... طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں۔ معمولی دھماکا ہوا تھا۔ ایک پرانی مائن (سُرنگ) بھی تھی مٹی کے اندر۔ ایک بھٹے ماتر نے دے ماری اس پر۔ وہ بلاسٹ ہو گئی۔ ٹانگیں زخمی اس کی۔"

صفدر نے کہا۔ "تو آپ پولیس کی مدد لے لیں۔ پاس ایک دستہ ہوتا ہے بم وغیرہ ناکارہ کرنے والا۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "لیکن بم یہاں ہیں کہاں۔ بس مسئلہ بنا رکھا ہے بزدلوں نے۔ کل افراہیم کہہ رہے اب تو خود ہی لنگوٹ کس کے نیچے اترنا پڑے گا۔"

صفدر خوشامدی انداز میں بولا۔ "ہم جو ہیں بیگم آپ ہمیں حکم کریں۔"

"ٹھہر جاؤ۔" ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں مٹی کھودنے کے لیے نہیں رکھا ہے۔"

وہ ہمیں لے کر تالاب کی طرف چلی آئی۔ تالاب پر مزدوروں سے باتیں کر رہی تھی تو ہم گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔ افراہیم صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے۔ صرف ایک ملازمہ کچی گھر میں یا ایک بوڑھا چوکیدار رہتا۔ "جلال" کی جگہ رکھا گیا تھا۔ صفدر نے کمرا بھی دکھایا جہاں "دلہن صورت" جلال سے ماری ہوئی تھی۔ اس واقعے کو اب سات آٹھ روز تھے لیکن ٹوٹ پھوٹ کے آثار ابھی تک وہاں موجود تھے۔ ایک آرنسٹ ٹائپ خوش پوش کا رہائشی کمرے میں اور مغلیہ طرز کے ایک زری تخت پوش کی مرمت ہو رہی تھی۔ ایک کونے میں ہم نے وہ چند رائفلیں دیکھیں جو ارجمند بانو کنوئیں سے نکلی تھیں۔ انہیں احتیاط سے الماری کے نچلے خانے میں چھپا گیا تھا۔ رائفلوں کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا' وہ اب استعمال کے قابل نہیں۔ ان میں سے تین تو ٹکڑوں میں بٹ چکی تھیں۔ ایک کا چوبی دستہ دیمک نے تمام کر رکھا تھا۔ ہاں ایک قدرے بہتر حالت میں تھی۔ میں نے دیکھا وہ سیون تھی۔ ایسی بندوقیں دوسری جنگ عظیم میں استعمال ہوئی تھیں اور اب بھی کئی ممالک کی آرمی میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ الماری میں ایک ٹوٹے پھوٹے لوہے کے چند قابل شناخت ٹکڑے بھی موجود تھے۔ یہ یقیناً وہ مائن تھی جو چند روز پہلے بلاسٹ ہوئی تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھا کر دیکھا۔ اس پر انگریزی کے ابھرے ہوئے حروف میں کچھ لکھا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر میں نے لوہے کا ٹکڑا واپس الماری میں رکھ دیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ ارجمند کسی بھاری آواز والے مرد سے باتیں کرتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ یہ افراہیم صاحب تھے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ہم تینوں نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ افراہیم صاحب ابھی کہیں سے آئے تھے۔ ان کے چہرے پر راستے کی گرد تھی اور ایک ہاتھ میں ان کی گاڑی کی چابی جھول رہی تھی۔

"ہاں بھئی۔ کیسی لگی تمہیں یہ جگہ؟"

"بہت خوب۔" صفدر نے دانت نکال کر کہا۔ "ہشیش محل لگتا ہے جی۔"

یہ بھروا افراہیم کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ وہ سگریٹ کا کش لے کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ارجمند نے پوچھا۔ "کوئی ملے؟"

"نہیں محترمہ۔" افراہیم صاحب نے مایوسی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب" اب مزدور ہی شہر سے غائب ہو گئے ہیں؟"

"خیر یہ بات تو نہیں۔" وہ بولے۔ "دراصل میں چاہتا تھا ایک دو سمجھدار مستری ہاتھ لگ جائیں۔ وہ نیچے اتر کر دیکھ لیں سب کچھ۔ عام پینڈو بندے ہوئے تو پھر ڈر کر بھاگ جائیں گے۔"

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں جناب۔" صفدر نے سینہ تان کر کہا۔ "ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ ہمیں حکم دیں۔ ہم اترتے جاتے ہیں نیچے۔ کھدائی کا سامان تو ہو گا یہاں۔ بس سمجھ لیتے ہیں سارا سلسلہ۔ جو بھی بندوق تڑیاں شڑیاں ہیں نکال باہر کھاڑ کر آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔"

افراہیم صاحب نے تعریفی نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا پھر ارجمند سے کہنے لگے۔ "یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ بالکل مناسب رہیں گے یہ لوگ۔"

ارجمند متذبذب نظر آ رہی تھی' بولی۔ "لیکن انہوں نے تو اسے ساتھ واپس جانا ہے۔"

"انہیں لے جائیں گی آپ۔ یہیں رہنے دیں۔ کل یا پرسوں خواتین کو میں چھوڑ آؤں گا۔"

ارجمند سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں بیگم صاحب! ہمارا تو کام ہی خطروں سے کھیلنا ہے۔ موت سے کیا ڈرنا۔ بڑے کہتے ہیں' جو ڈر گیا وہ مر گیا۔"

"شاباش۔" افراہیم صاحب نے صفدر کی پیٹھ تھپکی۔ "ہمیں تم جیسے باہمت لوگوں کی ہی ضرورت ہے۔"

صفدر نے کہا۔ "جناب' آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہ کون سا ایسا معرکے کا کام ہے۔"

افراہیم صاحب بولے۔ "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن پھر بھی تمہاری دلیری قابل تعریف ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے پورے مواقع ملیں گے۔"

زریں گل بولا۔ "خوچے آپ کا مطلب ہے کہ ایسی کام جو واقعی خطرناک ہوں گے۔"

"بالکل۔ بات یہ ہے کہ ہم میاں بیوی مہم جُو فطرت کے مالک ہیں اور کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے جو آسان ہو۔"

"کیا بات کیا ہے جی آپ نے۔" زریں گُل نے کہا۔ "زندگی کا اصل مزہ ہی خطرات سے کھیلنے میں ہے۔ قسم سے امارا دل تو چاہتا ہے ام پکا پکا آپ کے ساتھ فٹ ہو جائے یعنی نتھی ہو جائے۔ آپ ام تینوں کو حکم کریں ام ابھی لنگوٹا کس کے اتر جاتا ہے کنوئیں میں۔"

"ارے نہیں بھئی۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" افراہیم صاحب نے کہا۔ "کل صبح دیکھا جائے گا۔ ابھی کھانا وانا کھاؤ۔ آرام کرو۔ میں ملازم سے کہتا ہوں' وہ ابھی تمہارے لیے اوپر کی منزل پر ایک کمرا کھول دیتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ہم حویلی کی بالائی منزل پر ایک کشادہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہاں وہ آرائش و زیبائش تو نظر نہیں آتی تھی جو نیچے والی منزل پر تھی۔ پھر بھی رہنے کے لیے ایک معقول جگہ تھی۔ تین بستر مع لحاف' ایک الماری' ایک میز' دو کرسیاں' آتش دان میں خشک لکڑیاں اور الماری میں دیگر وغیرہ۔

موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ پھر یہ کھلا علاقہ تھا۔ ارد گرد درختوں کی بہتات تھی۔ سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ صفدر نے آتش دان کو "آباد" کرنا چاہا لیکن ماچس موجود نہیں تھی۔ وہ ماچس ڈھونڈنے باہر نکلا تو زریں گل بولا۔ "استاد جی! ام کو تو لگتا ہے یہ اپنا صفدر صاحب فٹ ہو گیا ہے بیگم صاحب پہ۔ آپ نے شاید دیکھا نہیں کہ اس کی

آنکھوں سے کیسا رال ٹپک رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"ہو چکا ہے جی۔ اب دیکھیں اس نے کیسے تاوان کنوئیں میں اترنے کا ہامی بھرا تھا اور صرف اپنی طرف سے نہیں ہماری طرف سے بھی بھروا۔ ہم کو تو یہ معاملہ ایسا سیدھا نہیں لگتا استاد جی۔ اگر ادھر سے ایک "مائن" نکلا ہے تو اور بھی نکل سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے 'مزدوروں نے یونہی کام سے انکار نہیں کیا ہے۔"

"بھئی! میں کب کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے یونہی انکار کیا ہے۔"

"پھر کیا ضرورت تھی صفدر صاحب کو تاوان ہامی بھرنے کا۔"

"اس لیے کہ صاحب اور بیگم چاہتے تھے کہ ہم ہامی بھریں۔" میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں یہاں لائے ہی اسی لیے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ صفدر کو تم اپنی طرح چغد نہ سمجھو۔ بہت گہری چیز ہے وہ۔"

اتنے میں صفدر واپس آگیا۔ ماچس کے علاوہ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے بھی تھی۔ ٹرے میں ڈرائی فروٹس اور چائے کے برتن بھی تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور آلتی پالتی مار کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر پلیٹ میں سے ایک چھوہارا اٹھا کر بولا۔ "یہ ڈرائی فروٹ دیکھ کر مجھے امرود کا ایک پودا یاد آگیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چھوہارا دیکھ کر تو نکاح یاد آتا ہے۔ تمہیں امرود کیسے یاد آگئے؟"

وہ بولا۔ "بیس برسوں کی بات ہے۔ عید پر ہم نے ایک بکرا خریدا تھا۔ صحن میں جس جگہ ہم اسے باندھتے تھے وہاں پاس ہی امرود کے پودے تھے۔ ایک پودا بالکل بکرے کے پاس تھا۔ جتنے دن عید نہیں آئی بکرا پودے پر منہ مارنے کی کوشش کرتا رہا لیکن رسی چھوٹی تھی 'کامیاب نہیں ہوا۔ جب عید کی صبح اسے ذبح کرنے لگے تو بڑے بھائی صاحب نے مجھ سے کہا۔ "یار کھلا دو اسے یہ پودا۔ کیا یاد کرے گا بھی۔" مجھے لگ رہا ہے جیسے آج ہمارے بارے میں بھی کوئی یہی بات کہہ رہا ہے 'ابھی کھلا دو ان کنگلوں کو ڈرائی فروٹس کیا یاد کریں گے یہ بھی۔"

میں نے کہا۔ "بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن پہلے اٹھ کر ذرا دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔"

صفدر نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ کھڑکیاں وغیرہ پہلے ہی بند تھیں۔ زریں گل نے آتشدان میں دی تھی۔ ہم تینوں آگ کے قریب ہو بیٹھے۔ "کیا خیال ہے آپ کا؟" صفدر نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو تمہارا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں ایک مقصد کے تحت بانس پر چڑھایا گیا ہے۔"

"یعنی بانس پر چڑھا کر موت کے کنوئیں میں پروگرام ہے؟"

"سو فی صد۔ وہ الو کی پٹھی خود تسلیم کر رہی ہے دھماکا ہوا تھا۔ جہاں سے مائن نکلی ہے 'وہاں سے اور نکل سکتا۔"

"لیکن اس حویلیوں والے چکر کا اس ناکارہ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں بھی ہو سکتا کہتے ہیں ایسے موقعوں پر 'تیل دیکھو اور تیل دیکھو۔"

صفدر بولا۔ "تیل کی دھار تو ہمیں بہا کے لے کنوئیں میں۔ تو کیا ہم اتر جائیں کنوئیں میں 'مرتبہ پانے کے لیے؟"

"ظاہر ہے۔ یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

صفدر نے حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میری غیر سنجیدگی میں عنصر کتنے فیصد ہے۔ پھر سگریٹ کا گہرا کش لے کر خیال ہے کہ ایک بات آپ نے بھی نوٹ کی ہوگی دیر یہاں رہے ہیں الو کی پٹھی سائے کی طرح ہمارے رہی ہے۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ ہم کسی مزدور یا سے بات نہ کر لیں۔"

"بھئی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قربانی کے ہمیشہ چھریاں وغیرہ چھپائی جاتی ہیں۔ الو کی پٹھی چلا ہوگا۔ ورنہ ممکن تھا وہ رات بھی یہاں ہمارے بسر کرتی۔" ہم ارجمند کے لیے تواتر سے الو کی استعمال کر رہے تھے۔

قدموں کی چاپ سن کر ہمیں چپ ہونا پڑا۔ اکلوتی ملازمہ تھی۔ وہ ہم سے کھانے کا پوچھنے آئی چھ ہی بجے تھے لیکن لگتا تھا کہ رات ہو چکی ہے۔ وقت نہیں تھا لیکن دوپہر کو کہیں ٹک کر نہیں کھایا بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ کھانا منگوا لیا۔ مینیو تھا۔ بھنی ہوئی چانپ 'بٹیر 'ماش کی دال ' اور ساتھ میں باداموں والا حلوہ۔ صفدر اور

اسے مشترکہ طور پر عید قربان کے بکرے کا مینیو قرار دیا۔ سرد موسم کی مناسبت سے کھانے کے ہمراہ دختر انگور بھی بوتل میں بند ہو کر آئی تھی۔ اس کے ملائم پیکر پر ہاتھ پھیر کر زریں گل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ کھانا لانے والی چھیل چھبیلی ملازمہ کو ہم نے ٹٹولنے کی کوشش کی (ہاتھوں سے نہیں) صفدر نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ چند دن پہلے کوئی دھماکا وغیرہ ہوا تھا یہاں؟ اس نے اس سلسلے میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے پاس بڑا معقول جواب تھا۔ کہنے لگی۔ "میں یہاں صرف تین چار دن پہلے آئی ہوں صاحب جی۔ بس اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آپ جانتے ہیں۔"

کھانے کے بعد ٹہلنے کے بہانے میں باہر برآمدے میں آگیا۔ ہوا سرد تھی۔ حویلی کے سامنے بلند و بالا درخت شائیں شائیں کر رہے تھے۔ چند ماہ پہلے انہی درختوں کے نیچے کارین کے غنڈے سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ خاردار تار ان درختوں کے نیچے سے گزرتے تھے اور حویلی کے چاروں طرف گھوم جاتے تھے۔ تقریباً ایک ایکڑ کا تو جگہ اس تار نے گھیر رکھی تھی۔ یقیناً یہ "حرکت" ناجائز تجاوزات کے زمرے میں آتی تھی لیکن یہاں پوچھنے والا کون تھا۔ برآمدے کے محرابی ستونوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں ایک راہداری میں آگیا۔ اس راہداری سے گزر کر میں حویلی کے اندرونی احاطے میں جھانک سکتا تھا۔ برآمدے کی طرح بلند و چھت والی یہ راہداری بھی سنسان تھی۔ در و دیوار میں ایک گہری بو رچی بسی تھی جو قدیم عمارتوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ کہیں کہیں دیواروں پر پرانی طرز کے لیمپ روشن تھے۔ میں سائقدمی والے انداز میں راہداری کے دوسرے سرے کی جانب بڑھا۔ احاطے میں کھدے ہوئے کنوئیں پر بلب روشن تھا اور کنوئیں کا گرد و پیش مجھے فاصلے سے بھی صاف نظر آرہا تھا۔

بالائی منزل پر آنے والی سیڑھیاں ایک قالین نما دری سے ڈھکی ہوئی تھیں لہٰذا میں اوپر آنے والے قدموں کی چاپ نہ سن سکا۔ صرف ایک سیکنڈ قبل مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ زینے طے کر کے راہداری میں قدم رکھنے ہی والے ہیں۔ میں اپنی جگہ رک گیا۔ زینوں کی طرف سے چند سر ابھرے اور پھر ایسی صورت دکھائی دی کہ جسم سنسنا اٹھا۔ وہ سردار قادر زماں تھا۔ دیواری لیمپ کی روشنی اس کے گالوں کو سرخ روشن کر رہی تھی۔ اس کی سلیٹی قمیص کا نیلگوں کالر اور کالی واسکٹ سے نکلا ہوا توانا کندھا ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں میں چمکے۔ قادر زماں کے ساتھ ابراہیم صاحب تھے اور ان کے پیچھے دو چاق و چوبند بونے سرخ وردیوں میں ملبوس چلے آرہے تھے۔ ان سب لوگوں کا رخ مخالف سمت میں تھا لیکن صرف ایک سیکنڈ بعد وہ زینے طے کر کے میری طرف گھومنے والے تھے۔

بہت نازک لمحہ تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں بائیں طرف لپکا۔ ایک دروازہ میرے سامنے تھا۔ میں اسے دھکیل کر اندر گھس گیا۔ دروازے پر "ڈور کلوزر" لگا تھا۔ میرے گھستے ہی وہ پھر بند ہو گیا۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے قدموں کے نیچے دبیز قالین ہے اور میں ایک آراستہ جگہ پر کھڑا ہوں۔ اندھیرے میں ٹٹول کر میں نے ایک صوفے کی پشت تلاش کی۔ میرا دوسرا ہاتھ ایک بند دروازے پر پڑا۔ میں نے دباؤ ڈالا تو یہ دروازہ بھی کھل گیا۔ یہی لمحے تھے جب مجھ پر ایک اور خوفناک انکشاف ہوا۔ راہداری میں بھاری قدموں کی چاپیں میرے دروازے کے سامنے پہنچ کر خاموش ہوئی تھیں۔ "کہیں آنے والے اس کمرے میں تو نہیں آرہے؟" یہ سوال چیخ بن کر میرے ذہن میں ابھرا۔

اس سوال کا جواب ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دروازہ کھلا اور راہداری میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی ایک چوڑی پٹی کی صورت میں اندر آئی۔ میں سرعت سے اس دوسرے دروازے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ باتھ روم ہے۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہونے اور کمرے کی لائٹس آن ہونے میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفہ آیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ پہلے بند ہوا تھا ورنہ میں قادر زماں کے سفاک باڈی گارڈز کے نشانے پر ہوتا۔ کمرے میں آوازوں اور آہٹوں کا سیلاب سا امڈ آیا۔ قادر زماں کسی بات پر بڑی گھن گرج سے ہنس رہا تھا۔ ابراہیم کے ساتھ دو مزید افراد کمرے میں موجود تھے۔ غالباً وہ بھی قادر زماں کے ساتھ ہی یہاں آئے تھے۔ ان کی آوازیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ ابراہیم قادر زماں کو کمرے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ "میرے خیال میں یہ بہترین کمرا ہے۔ یہ دروازہ بالکونی میں کھلتا ہے۔ بالکونی میں میں نے جنگلا لگوا دیا ہے۔ اور یہ کھڑکی دیکھو۔ نیچے سے اوپر تک شیشہ لگا ہے۔ اب تو اندھیرا ہے۔ صبح دیکھنا ڈیڑھ دو میل تک اوپن ویو ہے۔ اس سامنے والی دیوار پر پینٹنگ لگی ہے۔ یہ باتھ روم ہے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ آواز اب دروازے کے بالکل قریب سے آرہی تھی۔ جھماکے سے لائٹ آن ہوگئی۔ میں نے خود کو ایک کشادہ اور آراستہ باتھ روم میں

پایا۔ انگلیوں میں حرارت جاگ اٹھی۔ اعصاب نے اشارہ دیا کہ وہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے دیوار سے پشت لگا لی۔ دروازہ کھلا اور تھوڑا سا کھل کر ساکت ہو گیا۔ افراہیم کی آواز کمرے سے ابھر کر باتھ روم میں گونجی۔ "یہ اسٹور تھا۔ میں نے اس جانب سے دروازہ نکال کر باتھ روم بنا دیا۔"

"کیا بات ہے جان جی۔" قادر زماں نے ستائشی انداز میں کہا۔

دروازہ بند ہو گیا اور لائٹ آف کر دی گئی۔ میں نے گہری سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ایک قیامت سے سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کچھ دیر کمرے سے باتوں کی آواز آتی رہی پھر میں نے محسوس کیا کہ اب افراہیم اور قادر زماں کمرے میں اکیلے رہ گئے ہیں۔ بونے بازی گار راز بھی کمرے میں ہی تھے لیکن وہ قادر زماں کے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ انہیں الگ سے شمار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے بار ہا تعجب رہا کہ میں نے کبھی قادر زماں کو ان بازی گار رازوں کے بغیر دیکھا ہو۔ معلوم نہیں وہ کون سی زبان بولتے تھے لیکن ارد گرد کے لوگوں سے ان کا رابطہ صرف اشاروں کی زبان سے تھا۔

قادر زماں کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ افراہیم سے مخاطب تھا۔ "چھوڑو جان جی! کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ بہت پیسہ برباد کر چکے بس کرو اب۔"

افراہیم کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ بولا۔ "وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ قادر جی! جو تم سمجھتے ہو سمجھتے رہو۔ جو ہم کرتے ہیں کرتے رہیں گے۔"

قادر زماں نے کہا۔ "لیکن جان جی! کبھی کبھی یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے کاموں میں میں نے کسی کا بھلا ہوتے نہیں دیکھا۔"

چند لمحے کے توقف سے افراہیم کی سنجیدہ آواز ابھری۔ "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

"سمجھدار۔" قادر زماں نے اطمینان سے کہا۔ "اور اسی لیے اب تک خاموش ہوں مگر جان جی! ایک ڈیڑھ سال کم وقت نہیں ہوتا۔ اب تک زولت نہیں نکلا۔۔۔ تو نو کبھی نہیں نکلے گا۔"

"تو نہ نکلے! ہم کون سا ڈوب گئے ہیں۔" افراہیم نے بے پروائی سے کہا۔ "اور تمہاری رعایت سے اب تو حویلیوں والا کام بھی چل نکلا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔"

"تو کیا اب اس ... کے بھی دام کھرے کرنے کا ارادہ ہے؟" قادر زماں کا اشارہ حویلی کی طرف تھا۔

"ابھی نہیں یار۔" افراہیم نے جیسے تڑپ کر کہا۔ "تو یہاں ہنڈرڈ پرسنٹ چانس رہا ہے۔"

قادر زماں نے گہری سانس لی۔ "جان جی! دو کتو میں دانا کام ہے خطرناک ہے۔ پتا نہیں وہ مائی کی تھی؟ پنجرے اڑا دیے ہیں تین بندوں کے۔ یہ تو سب کچھ ہی نہیں اڑ گیا۔"

"بس ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔" افراہیم نے کہا۔

"شاید تمہیں احساس نہیں کتنی مشکل سے یہ معاملہ سنبھالا ہے۔" قادر زماں نے کہا۔ "انسپکٹر تو چیخ دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہے۔ راتوں رات میں نے ڈی ایس پی کو سرگودھا جا پکڑا۔ تو پتہ ہے مان گیا ورنہ آٹھ دس لاکھ سے کم کا کام نہیں ہے اور اب بھی بے فکر ہو کر نہ بیٹھ جانا۔ اس چنگڑ کو خاص خیال رکھنا۔ کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"خوشاب بھیج دیا ہے۔ ساس اور سسر بھی ساتھ ہیں۔ سوت کوارٹر میں رکھا ہوا ہے۔" افراہیم نے جواب دیا۔ "بس دو تین ماہ تک ان لوگوں کو باہر کی ہوا نہ لگے۔" قادر زماں نے تاکید کی۔ "اگر وہ کہنے کی ہوئی تو بہتر وقت پھر ان کا کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔"

"وارثوں کو کتنا دیا ہے؟" افراہیم نے پوچھا۔

"پندرہ پندرہ ہزار۔" قادر زماں نے جواب دیا۔ "زخمیوں کو آٹھ آٹھ ہزار، ایک کو پانچ ہزار۔ اس طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ آج کل میں ڈیرا اٹھا کر وہاں سے چلے جائیں گے۔ اس چنگڑی کا خاص دھیان رکھنا ہوگا۔"

چند سیکنڈ کمرے میں خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں گلاسوں کی کھنک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کمرے میں شغل مے نوشی جاری ہے۔ قادر زماں نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔ "اب کھدائی کا کیا کرو گے۔"

"کیا کرنا چاہیے؟" افراہیم نے جوابی سوال کیا۔

"اس ڈگنگ مشین نے کام نہیں دیا؟"

"نہیں۔ وہ تو بالکل بے کار رہی۔ خواہ مخواہ ... ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ اسٹیلے کو چھیڑے بغیر متوازی ایک اور کنواں کھودا جائے پھر نیچے سے ان دونوں کو ملا دیا جائے لیکن یہ کام زیادہ مشکل تھا۔ مطلب یہ کہ مزدوروں کو ہی نیچے اتارنا پڑے۔"

"بالکل۔"

"پھر کوئی انتظام ہوا؟"

"ہاں، ارجمند نے تین بندے گھیرے تو ہیں۔ صبح ان کو ...رائی کرتے ہیں۔ اگر بات نہ بنی تو پھر کچھ اور کر دیکھیں گے۔"

"جان جی! رسک لے رہے ہو تم۔" قادر زماں الجھے ...ے لہجے میں بولا۔ "کہیں مزید نقصان نہ کر بیٹھنا۔"

افراہیم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تم خود ہی تو کہا کرتے ہو ...ار۔ رسک کے بغیر چانس نہیں ملتا اور چانس کے بغیر زندگی ...ت کے سفر کی طرح بے مزہ رہتی ہے۔" بولتے بولتے ...ک اس نے ٹھٹک کر کہا۔ "ارے ہاں یاد آیا۔ وہ دونوں ...جوڑا پکڑا گیا یا نہیں۔ کیا نام بتائے تھے تم نے شاہ ...ں اور عالیہ۔"

"عالیہ نہیں غزالہ۔" قادر زماں نے تصحیح کی۔

"ہاں کچھ کھوج لگا ان کا؟"

"نہیں۔" قادر زماں کے لہجے میں مایوسی کی جھلک تھی۔ ...ڑا تنگ میں تھوڑا سا فرق پڑ گیا۔ صرف ایک گھنٹا پہلے ...اگر شاہ ...ت کے بنگلے تک پہنچ جاتے تو وہ دونوں مٹھی میں ...بس قسمت اچھی تھی ان کی جو نکل گئے۔ اب وہ عینی ...جسم ہو رہا ہے۔ بدلے کی آگ میں وہی خون آلود کپڑے ...ہوئے ہے جو قبائلی علاقے سے پہن کر آیا تھا۔ کہتا ہے ...تک شاہ جہاں کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کروں گا، پیٹ بھر ...نا کھاؤں گا نہ لباس بدلوں گا۔ شاید کوئی رسم پوری کر رہا ...ئلی علاقے کی۔"

"بھالی زرتم کا اب کیا ہو گا؟" افراہیم نے پُرسوچ لہجے ...چھا۔ "میرا مطلب ہے اس ڈاکٹر کے بچے۔"

...پرسوں فون آیا تھا اس حرامزادی کا۔" قادر نے ...کی بات کاٹی۔ "غالباً لاہور میں کسی جگہ سے بول رہی ...رہی تھی کہ وہ اپنے وعدے کی پابند ہے اور اس کی ...سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جہاں بھی ...تم کی ڈیلیوری سے چند روز پہلے جھوک خاصن پہنچ ...گی۔"

...ب گفتگو زرتم اور اس کی میڈیکل رپورٹس وغیرہ کے ...نے لگی۔ قادر زماں کے ساتھ ساتھ اب افراہیم کا ...خمار آلود ہوتا جا رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد افراہیم ...زماں کو گڈ نائٹ کہا اور جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اس ...کے بعد قادر زماں کچھ دیر کمرے میں ادھر ادھر ...۔ اب وہ کسی بھی لمحے باتھ روم میں داخل ہو سکتا ...تھوکر آنے والے لمحوں کے لیے پوری طرح تیار کر

خون آشام

مصنف: ایم اے راحت

قیمت -/۵۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲۰ روپے

ایک ایسے بوڑھے سادھو کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔
وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔

اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی

پبلشرز
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

چکا تھا۔ پشت دیوار کے ساتھ لگی تھی اور پاؤں یخ بستہ فرش پر قطعی بے حس و حرکت تھے۔ مجھے اس فرش پر کھڑے اب تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ خنکی پاؤں کے تلوؤں میں سرایت کرکے نچلے دھڑ کو برف کر چکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وقت پڑنے پر مطلوبہ سرعت سے حرکت کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ پھر باتھ روم کی لائٹ آن ہوئی۔ دروازہ کھلا اور قادر زماں دندناتا ہوا اندر آ گیا اس مرتبہ اس نے دروازہ پورا کھولا تھا۔ میں خود بخود دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب اگر قادر زماں دروازہ اندر سے بند کرتا تو مجھے اپنے سامنے پاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ڈولتے قدموں سے واش بیسن کی طرف گیا۔ دو کلیاں اور چند پُر شور غرارے کیے پھر دروازہ کھلا اور لائٹ آن چھوڑ کر کمرے میں چلا گیا۔

یقیناً وہ بستر سنبھال چکا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ ذہن پر خدشات اور توقعات کی یورش تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے کمرے میں جو انکشاف انگیز گفتگو ہوئی تھی اس سے پتا چلا تھا کہ سات روز پہلے کوٹھی میں کوئی معمولی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ یہ کسی طاقتور ٹائم بم کا خوفناک بلاسٹ تھا اور اس میں کم از کم تین افراد ہلاک اور نصف درجن زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں اس خانہ بدوش عورت کا خاوند بھی شامل تھا جس کو آج صبح ہم نے افراہیم کی کوٹھی میں دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ اب افراہیم اور اس کی بیوی تجربے کے طور ہمیں اس کوٹھی میں جھونک رہے تھے۔ قادر اور افراہیم کے مابین ہونے والی گفتگو سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ پرانی حویلیوں اور کھنڈرات کی "خرید و فروخت" اپنے طور پر کوئی مقصد نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی دوسرا مقصد ہے۔ یہ دوسرا مقصد کیا ہے جس کے حصول کے لیے عیسیٰ جان جیسے سفاک اور شکر شکرا جیسے بدنام زمانہ افراد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہیں؟ یہ سوال جتنا اہم تھا اتنا ہی پُر تجسس بھی تھا۔

میرا ذہن مصروف تھا لیکن کان کمرے سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ خاموشی گہری ہو گئی تھی اور رہ رہ کر کمرے میں لگے ہوئے فین ہیٹر کی مدھم گھوں گھوں واضح طور پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس آواز میں دھیرے دھیرے ایک اور آواز بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ قادر زماں کی گہری سانسوں کی صدا تھی۔ وہ نشے میں چور تھا اور بڑی سرعت سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اگلے تین چار منٹ میں بوجھل سانسوں کی یہ آواز خراٹوں میں تبدیل ہو جائے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد کمرے میں گونجتے ہوئے خراٹے اعلان کرنے لگے کہ جھوک خاصن کا فرعون صفت جاگیردار "گوڑھا" مر چکا۔

میں نے بہ آہستگی اپنی جگہ چھوڑی اور دروازے سے کمرے میں جھانکا۔ نائٹ بلب روشن نہیں کیا گیا تھا۔ باتھ روم کی لائٹ نے کمرے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔ ساٹن کے ڈبل بیڈ پر مخملی لحاف اوڑھے جاگیردار قادر چت لیٹا تھا۔ حالانکہ باتھ روم میں سلیپنگ گاؤن اور آرام دہ شلوار قمیص بھی موجود تھی لیکن وہ اپنے لباس میں ہی سو گیا تھا۔ میری نگاہ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پڑی اور رگوں میں جیسے چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ یہ وہی شخص تھا جس نے میری بہن پر غلط نگاہ ڈالی تھی اور انجم کو نچانے والا اور نجو کی چمڑی ادھیڑنے والا سفاک بھی اور یہ شخص صرف "انجم یا نجو" کا مجرم نہیں تھا۔ نجانے کتنے مرد و زن اس کی حویلی میں ایسے ہی گھناؤنے مظالم کا شکار ہوئے تھے اور سسک سسک کر مرے تھے۔ میرا جی چاہا کہ سوئے ہوئے قادر کو ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔ اس کے تکیے کے نیچے سے جھانکتے ہولسٹر میں سے پسٹل نکالوں اور گولیاں اس کے سر میں داخل کر دوں یا اپنا مفلر اس کی گردن پر لپیٹوں اور اس وقت تک دبائے رکھوں جب تک اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے نہ کھل جائیں اور میں ایسا کر سکتا تھا۔ حالات نے مجھے ایک ایسا موقع فراہم کیا تھا جس میں یہ کر سکوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ کوئی اندر سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ یہ انجام قادر زماں کے "شایان شان" نہیں۔ وہ بہت جلد بد ترین انجام سے دوچار ہوگا اور میرے سامنے ہوگا۔

میں دبیز قالین پر آہستگی سے پاؤں رکھتا قادر کے سرہانے پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے سانس کے ساتھ شراب کے بھبکے خارج ہو رہے تھے۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اور پھولی ہوئی کنپٹیاں دیکھ کر نجانے کیوں دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوما جب ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں میاں بوڑھا قادر زماں کے وحشی بونوں کا تختہ مشق بنا تھا۔ اس کی بے چارگی، اس کی چیخ و پکار وحشت ایک بار پھر میری نگاہوں میں آیا۔ معلوم نہیں اس میں کتنے بد نصیبوں نے آخری ہچکیاں لی تھیں اور شیشوں کے پیچھے بیٹھ کر اور کانوں پر ہیڈ فون لگا کر لوگوں نے کتنی بار زندگی کے تار تار ہونے کا تماشا دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے ایک بار پھر یہ خواہش میرے

ذہن میں ابھری کہ میں قادر زماں کو قتل کر دوں لیکن پھر جلد ہی عقل نے دلیل کے پتھر سے اس خواہش کو دبا دیا۔ میں قادر زماں پر حملہ آور ہوتا تو میرا اور میرے ساتھیوں کا اس حویلی سے نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اس حویلی میں اس وقت کتنے آدمی موجود ہیں۔ نگرانی کا کیا انتظام ہے اور یہ کہ میں اس کمرے سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں۔

میں بے آواز چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر غور سے دیکھا۔ حسب توقع "کی ہول" میں چابی موجود تھی اور غالب امکان تھا کہ دروازہ لاک کیا گیا ہے۔ میں نے کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ راہداری میں مکمل خاموشی تھی۔ ہاں نچلی منزل سے چلنے پھرنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں قادر زماں کے باڈی گارڈ کہاں تھے۔ میں نے قریبی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر راہداری میں جھانکنے کی کوشش کی۔ راہداری کی روشنی گل کر دی گئی تھی۔ کسی دور افتادہ بلب کی روشنی میں دروازے کے سامنے راہداری بالکل خالی نظر آ رہی تھی۔ باہر نکلنے کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ میں نے دو تین منٹ مزید ٹرن گن لی اور پھر گرم مفلر ڈھاٹے کی طرح چہرے سے لپیٹ کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بہ آہستگی چابی کو حرکت دی تو لاک کھل گیا۔ ہینڈل تھام کر میں نے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔ سرد ہوا بھرا مار کر گرم کمرے میں گھسی اور میں ہوا ہی کی طرح کمرے سے باہر نکل آیا لیکن ہوا ہی روانی برقرار رکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہوا۔ میں یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ قادر زماں کا خطرناک باڈی گارڈ دیوار سے لگا کھڑا ہے اور اس کا دایاں ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مجھے کمرے کے اندر اس کی مدھم سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے سکی تھی۔ بالکل یوں لگا جیسے وہ دیوار کے اندر سے نکل آیا ہے۔ اس کی چمکدار آنکھیں نیم تیرگی میں دمک رہی تھیں۔ اس نے بجلی کی پھرتی سے ریوالور نکالا۔ میں نے اتنی ہی برق رفتاری سے ٹانگ چلائی۔ ضرب اس کے سینے پر لگی۔ یہ بڑی زوردار ضرب تھی۔ ایک نارمل شخص کی ایک آدھ پسلی ٹوٹ جاتی لیکن کینیا کے اس تربیت یافتہ بونے نے اس ضرب کو حیرت ناک رد عمل سے بے اثر کر دیا۔ وہ ہوا میں اچھلا اور قلابازی کھا کر سالٹ لگا کر پنجوں کے بل فرش پر آیا لیکن یہاں اس سے تھوڑی سی غلطی ہوئی۔ غالباً بے حد چکنے اور ننگے فرش کی وجہ سے وہ پھسلا اور اوندھے منہ گرا۔ میرے لیے یہ موقع بہت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا چھوٹا سا مگر بے حد ہلاکت خیز ریوالور میری طرف سیدھا کرتا، میں نے چھلانگ لگائی اور پورے وزن کے ساتھ اس پر گرا۔ میرے ذہن میں یہ خیال پوری شدت سے موجود تھا کہ اس خطرناک ٹھگنے کو ایک موقع دینے کا مطلب زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ ان بونے شیطانوں سے میرا سابقہ دو مرتبہ پڑا تھا اور دونوں مرتبہ یہ احساس ہوا تھا کہ وہ کسی بھی لمبے چوڑے اور طاقتور مد مقابل سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہیں۔

جونہی میں بونے پر گرا ایک دھماکے سے گولی چلی اور حویلی کے گنبد و در و دیوار گونج اٹھے۔ ایک شعلہ سا میرے کان کے قریب لپک سا گیا تھا۔ میری تمام تر توجہ بونے کے ریوالور والے ہاتھ پر تھی مگر دھماکے کے فوراً بعد یہ ہاتھ مجھے خالی نظر آیا۔ میرے ساتھ ہونے والے زوردار تصادم میں ریوالور بونے کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اب ناقابل فہم زبان میں سریلی چیخ و پکار کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا بہت سے غصیلے بچے کورس میں بول رہے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دو ایک طوفانی مکے بونے کے جبڑے پر رسید کیے۔ میرا ہاتھ کسی چہرے کے بجائے پتھر پر پڑا۔ نیچے لیٹے لیٹے بونا غرایا اور اس نے ایک شدید ٹکر میرے چہرے پر رسید کرنا چاہی۔ میں نے بروقت چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔ یہ ٹکر میری چھاتی پر پڑی اور بالائی جسم جھنجھنا کر رہ گیا۔

اب زینوں کی طرف بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کمرے کی لائٹ بھی روشن ہو چکی تھی جہاں سے میں ابھی برآمد ہوا تھا۔ یہ وقت بھاگ نکلنے کا تھا۔ میں نے ایک اور ہاتھ بونے کے جبڑے پر رسید کیا اور اس کے اوپر سے اٹھ کر سامنے والے برآمدے ہی کی طرف بھاگا۔ بونا تڑپ کر مجھ سے ٹکرایا اور کسی جونک کی طرح میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ اس کے دانت بڑی بے دردی سے میرے پیٹ میں پیوست ہو گئے تھے۔ میں قمیص کے نیچے سویٹر پہنے ہوئے تھا ورنہ شاید پیٹ کی بوٹی اس موذی کے منہ میں آ جاتی۔

دھینگا مشتی میں اس کی سرخ ٹوپی گر چکی تھی۔ میں نے اس کے گھونگھریالے بال مٹھی میں جکڑے اور اپنی پوری قوت صرف کر کے اپنے پیٹ کا گوشت اس کے دانتوں سے چھڑا لیا۔ عجیب جناتی سی توانائی تھی مد مقابل کے جسم میں۔ وہ بدستور میری ٹانگ سے لپٹا تھا اور ساتھ گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کہنی کی فیصلہ کن ضرب اس کے سر میں لگائی۔ اس کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو میں نے دیوار کا سہارا لے کر دائیں ٹانگ کی ٹھوکر سے اسے دور پھینک دیا۔ زیریں منزل سے دوڑنے والے اب آخری زینوں پر تھے۔ قادر زماں کے کمرے کا دروازہ بھی کھل چکا تھا۔ میں اندھا دھند سامنے

والے برآمدے کی طرف بھاگا۔ "کاش صفدر اور زریں گل نے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا ہو۔" میں نے بھاگتے بھاگتے سوچا۔ راہداری طے کرتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ کئی افراد سرپٹ بھاگتے میرے پیچھے آرہے تھے۔ "بھاگو پکڑو۔" کئی آوازیں راہداری میں دور تک گونج رہی تھیں۔ میں نے دیکھا' ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور صفدر باہر جھانک رہا ہے۔ یقیناً وہ بھی شور سن کر ہی دروازے پر آیا تھا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا۔

"یہ میں ہوں صفدر۔" میں نے اسے اپنی پہچان کرائی اور جلدی سے دروازہ بند کرکے کنڈی چڑھادی۔ صفدر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے چہرے سے مفلر اتار پھینکا۔ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں اب دروازے کے سامنے سے آرہی تھیں۔ میں چھلانگ لگا کر بستر میں گھس گیا اور زریں گل کو بھی ایسا ہی کرنے کا کہا۔ "دروازہ کھولو صفدر' پوچھو کیا بات ہے؟" میں نے صفدر کو ہدایت کی۔ صفدر نے بڑی تیزی سے صورت حال کو جانچا اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی نے دروازے کو دھکیلا اور پھر ٹھکا ٹھک دستک دینا شروع کردی۔ صفدر نے دروازہ کھولا تو سامنے قادر زماں کے خونخوار باڈی گارڈز کے علاوہ افراہیم اور دو مسلح افراد نظر آئے۔ صفدر بستر سے نکلا تھا' بال منتشر اور چہرہ سویا سویا تھا۔ وہ جان بوجھ کر خواب ناک لہجے میں بولا۔ "کیا بات ہے جناب؟ کیا ہوا؟"

میں یہ سارا منظر لحاف کے نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ افراہیم نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں اور زریں گل اپنے لحافوں کے نیچے بے سُدھ پڑے تھے۔ ایک بونے باڈی گارڈ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ننھا منا چمکدار ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ "یہ۔۔۔ یہ آواز کیسی آئی تھی جی۔" صفدر نے مسکین لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کوئی وارداتیا گھس آیا تھا حویلی میں۔ تم کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھو۔"

اس کے ساتھ ہی وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور راہداریوں میں بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ہم دونوں کے بارے میں غالباً یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ شراب کے نشے میں مدہوش پڑے ہیں۔

میں نے سر سے لحاف ہٹا کر صفدر سے کہا۔ "شکر ہے کہ یہ چھوٹے باڈی گارڈز تمہیں پہچانتے نہیں تھے ورنہ ابھی پنجابی فلموں والا "کھڑاک" ہوجاتا۔"

"لیکن آپ اب تک تھے کہاں؟" صفدر نے پوچھا۔ "اور یہ کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ اس چھوٹے کے منہ سے تو خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔"

"سب بتاتا ہوں' ذرا پھریری تلے سانس لو۔" میں نے پیٹ سے قمیص اٹھا کر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں بونے دانت گاڑے تھے۔ ایک نیلے دائرے میں سے خون رِس رہا تھا۔ بس تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی بوٹی نکلنے میں۔ میں کچھ دیر حویلی کے طول و عرض سے ابھرنے والی مختلف آوازوں پر کان لگائے رہا پھر میں نے مختصر لفظوں میں صفدر کو بتایا کہ قریب ہی ایک کمرے میں کیا واقعہ پیش آیا ہے اور کس طرح میں بڑی مشکل سے بچ نکلنے سے پہلے ایک یخ بستہ باتھ روم میں بند تھا۔

حویلی میں قادر زماں کی موجودگی نے صفدر کو چونکا دیا۔ یہ جان کر بھی اسے سخت وحشت ہوئی کہ یہ کنوئیں میں ہونے والا دھماکا تین افراد کی جان لے چکا تھا۔ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن اتنے اہم واقعے کی خبر تو اخبار میں تو آنی چاہیے تھی۔"

"یہ سارا چکر ہی آف دی ریکارڈ ہے بھئی۔ اثر و رسوخ سے معاملہ دبا دیا گیا ہے۔ اگر کل ہمارے ساتھ کوئی واقعہ پیش آگیا تو یقینی بات ہے کہ اس کی خبر بھی اخبار میں آئے گی۔"

صفدر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو خاصی تشویشناک صورت حال ہے جناب۔ اگر واقعی مزید بارودی سُرنگیں موجود ہیں تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بارودی سُرنگ کو خاص طریقے سے ہی ہٹایا جاسکتا ہے' ورنہ پھٹ جاتی ہے۔"

"ہر بارودی سُرنگ تو نہیں پھٹتی۔" میں نے جواب دیا۔ "جس سُرنگ کو چارج حالت میں رکھا گیا ہو اور اس کے ساتھ اینٹی لفٹنگ آلہ لگایا گیا ہو' وہ پھٹتی ہے۔"

یہ دھماکا خیز قسم کی گفتگو سن کر زریں گل بھی چپ نہ رہ سکا۔ بولا۔ "استاد جی! ہم آپ کا پرستار ہے اور ہم جان لینے والا نہیں' جان دینے والا پرستار ہے۔ آپ کا ساتھ جہنم میں بھی ابھی خوشی جاسکتا ہے لیکن جہاں تک عقل کی بات ہے۔ ہمارا مشورہ یہی ہے کہ یہ کنوئیں والا کام خطرناک ہے۔ مناسب بات یہی ہے کہ آپ بیگم صاحبہ کو انکار کردے۔"

"لیکن اگر انہوں نے ہمارا انکار سننے سے انکار کردیا تو؟" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ ہم سے زبردستی بھی کرسکتی ہیں۔ رائفل کے زور پر بھی کنوئیں میں دھکیل سکتے ہیں۔

ابھی تو گھی سیدھی انگلیوں سے نکل رہا ہے اس لیے وہ چپ ہیں۔"

زریں گل کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ام بے بس ہیں۔"

"بالکل۔۔۔ مجبور ہیں اف اللہ کچھ کر بھی نہیں سکتے۔"

زریں گل بولا۔ "یہ سارا منصوبہ تمہارا ہی تھا صفدر صاحب' اب تم ہی اس کا کوئی حل نکالو۔ ویسے ابھی تو اتنا گڑبڑ بھی نہیں ہوا ہے۔ اگر ام چاہیں تو یہاں سے نکلنے کا کوشش بھی کرسکتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اس تجویز پر صفدر' زریں گل کو گھور کر دیکھے گا لیکن اس کے بجائے وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ بھی کنفیوژ ہے۔

میں نے ان دونوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اسلحے وغیرہ کے بارے میں میری معلومات تم دونوں سے زیادہ ہیں لہٰذا موجودہ پچویشن میں لیڈنگ رول مجھے ہی ادا کرنا ہوگا۔ بات یہ ہے عزیزان من کہ میں نے کنوئیں سے برآمد ہونے والے اسلحے کو بغور دیکھا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ تقسیم ہند سے پہلے کا یہاں دبا پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ چالیس پینتالیس سال یا اس سے بھی زیادہ ہوچکے ہوں۔ غالباً کسی فوجی یونٹ نے نامعلوم وجوہ سے یہ ایمونیشن اور ہتھیار یہاں پھینک دیے یا دبا دیے۔ بلکہ پھینکنے کے بجائے "دبانا" زیادہ قرین قیاس ہے۔ موم جامے کی دو دوہری تہہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سازو سامان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرطور اس واقعے کو اب ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور طے شدہ بات ہے کہ پرانا گولہ بارود نئے گولہ بارود کے مقابلے میں کہیں کم خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے گولہ بارود کو احتیاط سے ہینڈل کیا جائے تو اس کے پھٹنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اکثر جگہوں سے پچھلی جنگوں میں استعمال ہونے والے ناکارہ یا کارآمد بم ملتے رہتے ہیں۔ لوگ انہیں اٹھا کر گھروں میں لے جاتے ہیں۔ بچے انہیں کھلونا بنا لیتے ہیں۔ ایسے بم اس وقت تک بے ضرر ہی رہتے ہیں جب تک ان سے لوہا' پیتل وغیرہ اتارنے کی کوشش نہیں کی جاتی یا بھٹی میں نہیں جھونک دیا جاتا۔ یہ کنوئیں والی "مائن" بھی اس وقت پھٹی ہے جب کسی مزدور نے کدال سے اندھا دھند ضربیں لگائی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر نیچے اتر کر احتیاط سے جائزہ لیا جائے اور چھوٹے اوزاروں کی مدد سے مٹی کھودی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ وہاں سے بحفاظت باہر نہ آجائے۔"

زریں گل بولا۔ "استاد جی! آپ کا بات سولہ آنے ٹھیک ہے لیکن اگر یہ ایسا آسان کام تھا تو ان لوگوں نے خود کیوں نہیں کرلیا۔"

"وہی لاعلمی۔" میں نے کہا۔ "لاعلمی سب سے بڑا خوف ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو بس اتنا پتا ہے کہ "مائن" پھٹی ہے۔ مائن کیا ہوتی ہے' کیسے چلتی ہے۔ ایسی دھماکا خیز چیزوں کا میکنزم کیا ہوتا ہے' انہیں کچھ پتا نہیں۔ بس خوفزدہ ہیں یہ لوگ۔ کسی بم ڈسپوزل یونٹ کو بلا نہیں سکتے کیونکہ یہ سارا کام غیر قانونی ہے اور تاریکی میں ہورہا ہے۔ کنواں صاف کرنے کا کوئی اور طریقہ بھی کامیاب نہیں ہوا۔ اب ان کے پاس یہی حل ہے کہ ایک دو بندوں کی جان کا رسک لے کر انہیں پھر کنوئیں میں اتار دیں۔"

ہم بہت دھیمے لہجے میں باتیں کررہے تھے کیونکہ سامنے والے برآمدے اور بغلی راہداریوں میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ اس پُراسرار شخص کی تلاش ہنوز جاری تھی جو تھوڑی دیر پہلے جاگیردار قادر زماں کی خوابگاہ سے نکلا تھا اور ٹھگنے باڈی گارڈز کی پٹائی کرکے بھاگ گیا تھا۔ بہرطور ہمارے سر سے خطرہ ٹل چکا تھا۔ امید نہیں تھی کہ ایک بار کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ لوگ پھر دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ حقیقتاً بال بال بچا تھا میں۔ بلکہ ایک ہی منٹ میں یہ محاورہ دو دفعہ مجھ پر صادق آیا تھا۔ ایک مرتبہ جب بونے باڈی گارڈ کی بے خطا گولی میرے کان کے پاس سے گزر گئی تھی' دوسری مرتبہ جب میں پیچھے آنے والوں پر صرف دو سیکنڈ کی سبقت لے گیا تھا اور ان کے برآمدے میں پہنچنے سے پہلے پہلے میں نے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا تھا۔ یقیناً اس کے بعد بھی قسمت نے یاوری کی تھی ورنہ کمرے کا معائنہ کرنے والے دونوں باڈی گارڈز میں سے کوئی بھی لحاف اٹھا کر میرا چہرہ دیکھتا تو بحیثیت شاہ جہاں مجھے پہچان لیتا۔

تلاش کی سرگرمی اب حویلی کی نچلی منزل اور سامنے والے حصے تک محدود ہوگئی تھی۔ یہ سنسان علاقہ تھا۔ ایسی جگہوں پر اس قسم کی وارداتیں غیر معمولی نہیں سمجھی جاتیں۔ یوں لگتا تھا کہ اہل حویلی کا دھیان چوری چکاری کی واردات سے آگے نہیں گیا۔

"اب کیا پروگرام ہے جناب؟" صفدر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

"بارہ بجنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے' اب سونا چاہیے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میرا مطلب ہے صبح کا پروگرام؟"

"صبح کا پروگرام صبح کے حالات پر منحصر ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے قادر زماں اور افراہیم کی جو گفتگو سنی ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ علی الصباح قادر زماں یہاں سے نکل جائے گا۔ وہ آگے جنگل میں جا رہا ہے' اپنے ریسٹ ہاؤس تک۔ کچھ خاص مہمان آرہے ہیں اس کے شکار وغیرہ کھیلنے کے لیے۔ اگر حسب پروگرام قادر صبح سویرے یہاں سے نکل جاتا ہے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں پھڈا ہے۔ افراہیم ہمیں قادر زماں کے سامنے لانا چاہے گا اور ہمارا اس سے پردا ہے۔"

"پھر کیا کریں گے؟"

"یہی ہے کہ میں بیمار بن کر لیٹا رہوں گا۔ تم دونوں اس کے لیے اجنبی ہو۔ تمہارا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

O☆O

صبح سات آٹھ بجے تک ہم بے فکری سے سوتے رہے۔ سب سے پہلے منصور جاگا اور ہمیں سوتا چھوڑ کر حویلی میں گھوم پھر آیا۔ اس نے ہمیں جگا کر یہ خوش کن اطلاع دی کہ دس پندرہ منٹ پہلے جاگیردار قادر زماں اپنے چھ عدد ساتھیوں اور چند مزدوروں کے ساتھ یہاں سے کوچ کر گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ تین گاڑیوں میں آئے تھے۔ ایک بڑی جیپ تھی۔ ایک لوزر اور ایک سی ڈاٹسن۔

میں بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھا تو سر کے پچھلے حصے میں شدید ٹیس اٹھی۔ مجھے یاد آیا کہ رات کی مار دھاڑ میں سر کے پچھلے حصے میں چوٹ لگی تھی۔ یہاں پہلے سے نیم مندمل زخم تھا۔ یہ غزال کا دیا ہوا زخم تھا۔ اس ٹیس کے حوالے سے غزال کی شبیہ میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ مجھے لگا جیسے ابھی وہ مری کے جنرل پوسٹ آفس کے سامنے مجسمے کی طرح ساکت کھڑی ہے اور دم بدم دور جاتی ہوئی کار کو دیکھ رہی ہے۔ کوئی عجیب سی ناقابلِ مرمت شے ٹوٹ گئی تھی میرے دل میں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا شے ہے۔ مجھے شاہ جہاں سے جدائی اختیار کیے سات برس سے اوپر ہو چکے تھے۔ ان سات برسوں میں' میں ایک بار بھی نہیں پچھتایا تھا لیکن نجانے کیوں چند دنوں سے ایک پچھتاوا سا میرے دل میں گھر کر رہا تھا۔ دماغ کی نازک پرتوں پر بار بار یہ سوچ اپنی آہنی انگلیوں سے ضرب لگاتی تھی کہ مجھے اس وقت گاڑی روک لینا چاہیے تھی۔ مجھے اس وقت رک جانا چاہیے تھا۔ وہ انتا تھی' وہ ایک

عورت کی زندگی کا سب سے نامہربان لمحہ تھا اور اس لمحے کے بعد ایک نئی کیفیت کی ابتدا ہو چکی تھی۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ منصور نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ باہر ماہی تھی۔ ناشتے کا پرچہ لائی تھی۔ منصور نے کھڑکی سے ہی کہہ دیا۔ "ہماری بھوک تو ہر وقت چمکی رہتی ہے شہزادی' پوچھا نہ کرو۔ بس اپنے ساتھ جو کچھ ہے' لے آیا کرو۔"

چلتی پھرتی لڑکی تھی۔ اسے منصور کا چلنا پھرنا اچھا نہیں لگا۔ نخرے سے بل کھا کر واپس چلی گئی۔ رات کے برتن ابھی کمرے میں ہی پڑے تھے۔ دختر انگور کا آدھا رات زریں گل نے چوس لیا تھا' آدھا ابھی بوتل میں باقی رہ گیا تھا۔ میں نے یہ بھی آتشدان میں انڈیل کر بوتل خالی کر دی۔ تھوڑی دیر میں ایک جہازی سائز ٹرے میں بارونق ناشتا ہمارے سامنے تھا۔ نمکین اور میٹھے انڈے' پوری' دیسی گھی کے پراٹھے اور گرما گرم چائے۔

میں نے زیرِ لب کہا۔ "زریں گل لذت کر کھالو' آخری ناشتا ہے۔"

منصور بولا۔ "اس کی بات چھوڑیں' یہ تو ہر ناشتا کر کرتا ہے۔"

ہنسی چہلی باتوں کے دوران بھاری بھرکم ناشتا معدوں میں پہنچ گیا۔ ابھی چھیل چھبیلی ملازمہ کل اور خالی برتن اٹھا رہی تھی کہ ارجمند کا شوہر نامدار دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا۔ کندھوں پر ایک بھاری بھرکم ایرانی شال تھی۔ قطع سے کسی ریاست کا والی یا نواب نظر آنے کی کوشش تھا۔ خوشگوار موڈ میں اس نے ہمارا حال چال پوچھا اور بتایا کہ رات حویلی میں دو اچکے گھس آئے تھے۔ ان کا ایک بہت لمبا تڑنگا تھا۔ انہوں نے ایک معزز مہمان کے باڈی گارڈ کو زخمی کیا اور بھاگ گئے۔

دو اچکوں کا سن کر ظاہر ہے کہ ہم تینوں کو حیرت ہوئی۔ اس کے علاوہ بونے باڈی گارڈ کی ہوشیاری پر آفرین کہنے کو بھی دل چاہا۔ زخمی ہو گیا تھا اس لیے اس نے ایک کی بجائے دو مقابل ظاہر کیے تھے۔ آخر "گینیا" کا درآمد شدہ زماں کا باڈی گارڈ تھا' کوئی معمولی بونا نہیں تھا۔ وہ تھا کہ رات تاریکی میں مجھ کو ہی دو سمجھا ہو۔ میں نے سے کہنی ماری تھی اس کے سر پر۔ ایسے میں تو ایک

چار بھی نظر آسکتے ہیں۔

"ہاں بھئی۔ چلیں پھر کنوئیں پر؟" افراہیم نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"بالکل جناب۔ آپ حکم فرمائیے۔" منصور نے تیوروں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

تقریباً چودہ منٹ بعد ہم حویلی کے احاطے میں کنوئیں کے کنارے کھڑے تھے۔ ہمارے علاوہ احاطے میں آج کوئی چوتھا مزدور نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے حویلی کے دونوں ملازم بھی باہر بھیج دیے گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ کچھ آنکھیں یہاں وہاں سے ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ ممکن تھا کہ ان میں ارجمند بانو کی حسین و جمیل آنکھیں بھی ہوں جس کے بارے میں افراہیم نے بتایا تھا کہ وہ آج صبح سویرے ہی واپس چلی گئی ہے۔

ویسے تو ہمارے لباس ایسے نفیس نہیں تھے۔ تاہم کام کاج کے لیے ہمیں "مزید خستہ حال" کپڑے فراہم کر دیے گئے تھے۔ یہی پھٹے پرانے' پسینے اور مٹی کی بو میں بسے ہوئے کپڑے جو ہمارے ملک کے لاکھوں کروڑوں محنت کشوں کا پہناوا ہیں۔ معلوم نہیں افراہیم نے یہ کپڑے کہاں سے حاصل کیے تھے۔ خریدے تھے یا کسی کے جسم سے اتارے تھے۔ ان کپڑوں کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ افراہیم جیسے ثروت مند غور کر دیکھیں تو یہ کپڑے خود بخود اتر جاتے ہیں اور اس سلسلے میں مرد و زن' جوان و پیر' معتوب و محبوب' کسی کی تخصیص نہیں ہوتی۔

میں نے افراہیم کو بتایا کہ کنوئیں میں' میں اتروں گا اور میرے یہ دونوں ساتھی مٹی کھینچیں گے۔ منصور نے کہا۔ "کیوں نہ ہم دونوں اتریں؟"

میں نے کہا۔ "تمہارا بھی شوق پورا ہو جائے گا راجو۔ میں تھک گیا تو تم اتر جانا۔"

افراہیم نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ شاید میں اسے زیادہ ہی بااعتماد نظر آیا تھا۔ ایک کدال' کسّی اور لوہے کی بار مجھے مہیا کر دی گئی تھی۔ افراہیم بولا۔ "بہت دھیان سے بھئی۔ کدال وغیرہ بالکل نہیں چلانی۔ ابھی کھرپے سے مٹی نکالو۔ پہلے یہ دو نالی شاٹ گن باہر نکالو۔"

وہ پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے دیکھا' اس کے ہونٹوں پر سفیدی سی جم رہی ہے۔ کنوئیں میں اترنے کے لیے مٹی کی سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں پر دھیان سے پاؤں رکھتا نیچے پہنچ گیا۔ یہاں مجھے بارود کی بو صاف محسوس ہوئی۔ معلوم نہیں یہ بو کہاں سے آرہی تھی۔ میں نے کنوئیں کی پختہ دیواروں پر دو تین جگہ مٹی کا لیپ دیکھا۔ درحقیقت اس لیپ سے خوفناک دھماکے کے شواہد چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں دھڑکتے دل پر قابو پا کر شاٹ گن کے قریب بیٹھ گیا اور کھرپے سے کھدائی کرنے لگا۔ پوری کوشش کے باوجود ایک ہراس سا رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شاٹ گن کا دیمک زدہ دستہ نظر آنے لگا۔ میں نے گن کو ہلا کر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی دبی ہوئی تھی۔ اوپر کنوئیں کی منڈیر پر مجھے منصور اور زریں گل کے فق چہرے دکھائی دیے۔ افراہیم کا نصف چہرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے دو تین کھرپے اور چلائے تو ایک دم ٹھٹک گیا۔ میرا کھرپا ایک "مائن" سے ٹکرایا تھا۔ یہ ویسی ہی انگلش مائن تھی جس کے چند ٹکڑے میں نے حویلی کے کمرے میں دیکھے تھے۔ موٹائی چار انچ' قطر اٹھارہ انچ' وزن قریباً ۲۰ پونڈ۔ وہ اینٹی ٹینک تھی اور ۲۰ پونڈ "ٹی این ٹی" سے بھری ہوئی تھی۔ وہ آدم کش نہیں آہن شکن تھی۔ اور وہ ایک نہیں تھی۔ ایک مربع خلا میں مجھے اس جیسی کئی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے غور سے دیکھا، یہ دیمک زدہ لکڑی کا ایک بکس تھا۔ سائز ایک عام صندوق جتنا تھا۔ بکس کی چھت کا ایک حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ مائنز اسی چوکور خلا میں سے نظر آ رہی تھیں۔ وہ کل چھ تھیں اور تین تین اوپر نیچے رکھی تھیں۔ ان کی دید کسی ہیبت ناک تجربے سے کم نہیں تھی۔ ایک ایسی ہی مائن چند روز پہلے اس کنوئیں میں تین افراد کے چیتھڑے اڑا چکی تھی۔

"کیا بات ہے۔ رُک کیوں گئے ہو؟" اوپر سے افراہیم کی لرزیدہ آواز اُبھری۔

"یہاں سے کچھ نکلا ہے جی۔۔۔ میرا خیال ہے بارودی سُرنگیں ہی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

ایک عجیب سی سنسنی فضا میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ افراہیم نے کہا۔ "دھیان سے دیکھو کوئی اور شے ہوگی۔"

"نہیں جی۔ میں صاف دیکھ رہا ہوں۔ بارودی سُرنگیں ہیں۔ چھ سے کم نہیں ہیں۔"

"پھر۔۔۔؟" افراہیم نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

"میں نکالتا ہوں جی احتیاط سے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ خیر کرے گا۔"

صفدر نے کہا۔ "حسنے! میں آؤں نیچے؟"

"نہیں تمہاری ضرورت نہیں ہے ابھی۔" میں نے کہا اور کھرپے سے مٹی کھودنے لگا۔ کھرپے کی ہر ضرب جیسے ہمارے دلوں پر پڑ رہی تھی۔ آٹھ دس منٹ میں میں نے بکس کے اردگرد سے مٹی ہٹا دی۔ اب اس میں پڑی ہوئی "مائنز" واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' جیل جانے سے قبل میں بے حد طوفانی زندگی گزار رہا تھا۔ پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب میرے اور میرے حریفوں کے لیے میدانِ جنگ بنے ہوئے تھے۔ انہی پُر آشوب دنوں میں مجھے چند ماہ رینجرز کے ساتھ گزارنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہم پندرہ افراد ایک ویران چیک پوسٹ پر پھنس گئے تھے اور مسلسل سولہ دن تک نکل نہیں سکے تھے۔ ان دنوں میں نے اپنے رینجرز بھائیوں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ خاص طور پر میری "اسلحہ شناسی" میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔

میرے سامنے کنوئیں کی سرخی مائل مٹی میں جو مائنز پڑی تھیں وہ یقینی طور پر ٹینک شکن تھیں۔ چونکہ وہ بکس میں تھیں لہٰذا یہ بات یقینی تھی کہ انہیں ہلانے جلانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہر ٹینک شکن اور آرمر شکن مائن پر ایک پریشر پلیٹ ہوتی ہے۔ جب تک اس پلیٹ پر مقررہ حد سے زائد دباؤ نہ پڑے اس کے پھٹنے کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ ٹینک شکن مائن کا اپنا وزن تقریباً ۲۰ پونڈ ہوتا ہے اور اس پر دباؤ کی حد ۳۰۰ پونڈ سے ۴۰۰ پونڈ تک ہوتی ہے لہٰذا ایک بھاری بھرکم شخص بھی اس پر بلاخطر پاؤں رکھ کر گزر سکتا ہے۔

بکس کے اردگرد سے مٹی ہٹ چکی تھی۔ میں نے اسے خفیف جھٹکے دیے اور باہر کھینچ لیا۔ بکس اٹھانے سے بہتر تھا کہ اس میں سے مائنز نکال لی جائیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام مائنز بالٹی نما ٹب میں رکھ دیں اور صفدر اور زریں گل نے احتیاط سے انہیں اوپر کھینچ لیا۔ میری بے خوفی نے ان دونوں میں بھی اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ بہرحال ان کا رنگ ابھی تک سفید نظر آ رہا تھا۔ تین چار فٹ مزید کھدائی کرنے پر مجھے بالکل ایسا ہی ایک اور بکس نظر آیا۔ اس میں بھی چھ مائنز تھیں۔ اس بکس کی حالت زیادہ خستہ تھی اور دو تین مائنز بالکل ناکارہ دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے ان مائنز کو بھی احتیاط سے اوپر پہنچا دیا۔ دو بکس نکل جانے سے کنوئیں کے وسط میں کافی بڑا خلا نظر آنے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بارود کے چھوٹے سے ڈھیر پر کھڑا ہوں۔ آثار سے نظر آ رہا تھا کہ یہاں خاصی مقدار میں اسلحہ موجود ہے۔ جہاں سے میں نے دوسرا صندوق اٹھایا تھا وہاں لوہے کا ایک مستطیل ڈبا موجود تھا۔ اس کے ڈھکنے پر صرف برٹش اور ایس ٹی جی 24 کے الفاظ پڑھے جا رہے تھے۔ ٹوٹے ہوئے زنگ آلود ڈھکنے کے اندر سے مشعل نما اشیا جھانک رہی تھیں۔ اگر تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کنوئیں سے ایل جی ہیل شاٹ گن اور بارہ عدد طاقتور مائنز نہ نکالی ہوتیں تو شاید یہ مشعل نما اشیا میری سمجھ سے بالاتر رہتیں لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ میرا دھیان دستی بموں کی طرف چلا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم میں لمبوترے دستی بم بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ جنہیں "اسٹک گرینیڈ" کہا جاتا تھا۔ یقیناً یہ وہی تھے۔ میں نے جھک کر معائنہ کیا اور میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

میں نے احتیاط سے اس آہنی ڈبے کو کھولا اور چرخی کنوئیں سے باہر پہنچا دیا۔ میرے روکنے کے باوجود صفدر بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ اگلے چند منٹ میں ہم "اسٹک گرینیڈز" سے بھرے ہوئے ایسے ہی چھ بکس نکال کر اوپر پہنچا چکے۔ حوصلہ بڑھ گیا تھا لہٰذا اب کبھی کبھی کسّی بھی استعمال کر لیتے تھے۔ یہ سارا اسلحہ روغنی شیٹوں میں لپیٹ کر کنوئیں میں اتارا گیا تھا لیکن شیٹیں کئی جگہوں سے گل سڑ کر ناپید ہو چکی تھیں اور

مٹی میں دفن نظر آتی تھیں۔ کسّی کے مسلسل استعمال نے کھدائی کی رفتار قدرے تیز کر دی۔ کنوئیں کے ایک کنارے سے ہم نے پہلے چند خستہ حال رائفلیں اور ان کے ٹکڑے نکالے پھر ایک شاندار ایم جی گن برآمد ہوئی۔ یہ آہنی بکس میں تھی اور اس کے سینکڑوں راؤنڈ بھی ساتھ تھے۔

اب دوپہر ہو چکی تھی۔ افراہیم نے ہمیں کنوئیں سے باہر بلا لیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا دل ہم پر صدقے واری جانے کو چاہ رہا ہو لیکن مجبوری تھی' مالک اور نوکر کا فاصلہ بھی تو برقرار رکھنا تھا۔ اس نے فرداً فرداً ہماری پیٹھ ٹھونکی اور دو گھنٹے کی چھٹی مع پُرتکلف لنچ کے دی۔ یہ لنچ ہمیں ہمارے کمرے میں ایک نامانوس صورت والے شخص نے فراہم کیا۔ لنچ کے بعد ہم نے آدھ پون گھنٹا کمر سیدھی کی اور ایک بار پھر موت کے کنوئیں پر پہنچ گئے۔ ہماری نکالی ہوئی تازہ مٹی اب ایک بڑے ڈھیر کی صورت نظر آ رہی تھی۔ جو اسلحہ نکل رہا تھا وہ احاطے ہی میں ایک طرف بڑے ترپال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسلحے کے نیچے بھی ترپال بچھایا گیا تھا۔ میں نے افراہیم کی نگاہوں میں بے اطمینانی کی جھلک محسوس کی۔ وہ جب بھی اسلحے کی طرف دیکھتا تھا ایک خوف سا اس کے چہرے پر لپک جاتا تھا۔

کھدائی کا دوسرا سیشن ابتدا میں اتنا سنسنی خیز نہیں تھا۔ ہم نے تین چار فٹ تک زمین کھودی لیکن مٹی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ تاہم اس کے بعد پھر ایک موٹی شیٹ کی باقیات نظر آئیں۔ میں اور صفدر محتاط ہو گئے اور بیلچوں کے انداز میں کھرپے استعمال کرنے لگے۔ قدموں کے نیچے کسی بھاری بھرکم اور وزنی چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ یہاں مٹی میں نارنجی رنگ نظر آ رہا تھا جو غالباً کسی تیز اثر کیمیکل کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ جلد ہی قدموں کے نیچے پائی جانے والی بھاری بھرکم چیز آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ یہ دل ہولا دینے والا منظر تھا۔ ایک بھاری توپ کے گولے تین یا چار قطاروں میں نظر آ رہے تھے۔ انہیں عمودی رُخ سے رکھا گیا تھا۔ چند گولے لڑھکے ہوئے تھے اور ان کے گرد نارنجی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ایک گولے کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کا وزن پندرہ کلو گرام کے قریب تھا اور اسے سات انچ سے چھوٹے دہانے کی گن میں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تمام گولے خستہ حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں مارٹر ایم ایم جی گن میں استعمال ہونے والے نسبتاً چھوٹے شیل بھی تھے۔ یہ منظر کنوئیں کی منڈیر پر کھڑے افراہیم اور زریں گل نے بھی دیکھا۔ افراہیم کا چہرہ ایک بار پھر کورے لٹھے کے مانند سفید نظر آنے لگا۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور اپنی نگاہیں کنوئیں کی گہرائی میں مرکوز کر دیتا تھا۔

ہم نے ایک ایک کر کے یہ گولے کنوئیں سے باہر پہنچانے شروع کیے۔ دس بارہ گولے نکالنے کے بعد اچانک مجھے اپنا ہاتھ روکنا پڑا۔ اب آخری تین گولے رہ گئے تھے۔ ان میں ایک گولا بہت خستہ حالت میں تھا۔ اس کی کیسنگ جو المونیم یا لوہے کی تھی بہت پچک چکی تھی اور کسی کیمیائی ردِعمل کے سبب برباد ہو چکی تھی۔ اس ٹوٹی پھوٹی آؤٹر کیسنگ (خول) سے مجھے شیل کے اندر کی دنیا صاف نظر آ رہی تھی۔ دھماکا خیز مادّے میں اندر تک گیا ہوا "فیوز" سیاہ تاروں کا ایک خوفناک گولا اور اس کے ساتھ مشعل کا چھوٹا سا سلنڈر جو غالباً "زہریلے" قسم کی شے تھا۔ کنوئیں میں اترنے کے بعد پہلی بار میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس ہلاکت خیز شے کو ہلایا گیا تو یہ تباہی مچا دے گی۔ اگر چند روز پہلے اس کنوئیں سے نکلنے والی مائن پھٹ سکتی تھی تو یہ شیل بھی بلاسٹ ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس مائن کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہو۔ صفدر بھی اس شیل کو دیکھ کر نروس سا نظر آنے لگا۔ بولا۔ "اس کو ہلانا کچھ خطرناک سا لگ رہا ہے جی۔"

ہم دونوں کام چھوڑ کر باہر آ گئے۔ افراہیم کو صورتِ حال بتائی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کنوئیں میں اتر کر مخدوش شیل کا معائنہ کرتا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔ موسمِ سرما کا سورج بڑی تیزی سے مغرب میں غوطہ زن تھا۔ درختوں کے طویل سائے دیکھتے ہی دیکھتے شام کے جھٹپٹے میں مدغم ہو گئے تھے اور اب تھوڑی ہی دیر میں یہ جھٹپٹا تاریکی میں ڈھلنے والا تھا۔ مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ اب جو بھی کرنا ہے صبح کیا جائے۔

حویلی میں ہم چاروں اور اجنبی صورت والے ملازم کے سوا اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر ہم واپس اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ حویلی میں اور حویلی کے اردگرد گھومنے کو دل چاہتا تھا لیکن افراہیم کی باتوں سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہمیں اس کی اجازت نہیں دے گا۔

اندھیرا ہوتے ہی سردی دبے پاؤں آئی اور حویلی کے کہنہ سال دریچوں دروازوں پر دستک دینے لگی۔ غالباً بالائی علاقوں پر برف باری ہو رہی تھی۔ ہم نے کل کی طرح آتشدان سلگایا اور اردگرد کرسیاں جما کر مونگ پھلی ٹھونگنے لگے۔

صفدر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "آخر یہ چکر کیا ہے شاہ

جہاں صاحب؟ لگتا ہے کسی بہت خاص چیز کی تلاش میں ہیں یہ لوگ۔"

"ظاہر ہے' صرف کنواں صاف کروانے کے لیے تو اتنا بڑا رسک نہیں لیا جا سکتا۔۔۔ اور صرف کنوئیں کی بات ہی نہیں ہے۔ حالات کے رُخ سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حویلیوں کھنڈروں کی ساری خرید و فروخت کسی ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے ہے۔"

"اور یہ مقصد کسی چیز کی تلاش بھی ہو سکتا ہے۔" صفدر نے بات آگے بڑھائی۔

"بالکل۔۔۔ ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ سگریٹ کا کش لیا۔ دھوئیں کے ساتھ ایک عجیب سنسنی سی فضا میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے ہمیں یوں لگا جیسے ہم بحرالکاہل کے ویران جزیروں کے گرد گھومتی ہوئی کسی کہانی کے کردار ہیں اور کسی گمشدہ دفینے کی باتیں کر رہے ہیں۔

"ایک بات تو بالکل سامنے کی ہے۔" صفدر نے کہا۔ "جو کچھ بھی ڈھونڈا جا رہا ہے وہ اتنا گراں قدر ہے کہ اس کے لیے لاکھوں روپے کی زمینیں اور حویلیاں وغیرہ خریدی جا رہی ہیں پھر ان حویلیوں میں اس شے کو کھوجا جا رہا ہے۔ یقینی بات ہے کہ جیسے اس حویلی میں کھدائی ہو رہی ہے' دوسری حویلیوں میں بھی ہوئی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف ایسی حویلیاں یا کھنڈر خریدے گئے ہوں جن میں کنوئیں موجود ہیں۔۔۔ اور میرے ذہن میں ایک اور بات آ رہی ہے شاہ جہاں صاحب۔" صفدر نے کہا اور اس کی کشادہ پیشانی پر گہری لکیروں کا جال پھیل گیا۔ "کہیں یہ کوئی نوادرات وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے۔ اس کام میں بھی لوگ آج کل بڑا پیسہ بنا رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں یوگنڈا کی فرم کا اسکینڈل خبروں کا موضوع رہا ہے۔ اس فرم نے ساڑھے تین کروڑ ڈالر کے نوادرات ناجائز طور پر فروخت کیے ہیں۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ "تمہاری والی بات ایسی ناممکن بھی نہیں ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی اس قسم کی مہم جوئی کے خاصے شوقین دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے شوقین لوگوں کو اکثر کہیں نہ کہیں سے کوئی دلچسپ کھوج بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر نوادرات کا یہ ذخیرہ بہت نایاب اور بہت بڑا ہونا چاہیے۔۔۔ سکے یا برتن حاصل کرنے کے لیے تو پیسہ پانی کی طرح نہیں بہایا جا سکتا۔۔۔ اور پھر ہمیں حسینی جان اور ظفر شکراوی کی چوری بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ اگر ایسے نایاب [illegible] معاشوں کو "باز"

کیا گیا ہے تو پھر یہ معاملہ کروڑوں کا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور پارٹی یا پارٹیاں بھی اس چکر میں ہوں لیکن۔۔۔"

دل کی بات میرے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گئی۔

"لیکن کیا؟" صفدر نے تیزی سے پوچھا۔ میرے فقرے میں یہ بے محل فل اسٹاپ اسے قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

میں نے آتش دان کی آگ سے نیا سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں نوادرات والی بات پر میرا دل نہیں جم رہا۔ آثار قدیمہ کے شیدائی اور نوادرات میں دلچسپی لینے والے لوگ کچھ ناپ کے ہوتے ہیں۔ ایک آرٹسٹک ٹچ ہوتا ہے ان کے رویے میں اور کام میں۔ بے شک وہ یہ سب دولت کے لیے ہی کرتے ہیں لیکن ان کے کرنے اور ان کے کرنے میں فرق ہے۔"

"آپ نے اس حوالے سے کوئی خاص بات نوٹ کی ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"نہیں خاص بات تو نہیں لیکن مجھے اسّی فیصد یقین ہے کہ مسٹر اور مسز افراہیم وہ نہیں جو دونوں خود کو ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ الو کی پٹھی تو سو فیصد کسی بھوپے کی نسل سے ہے۔ کوئی نقاب اوڑھ رکھا ہے ان دونوں نے چہرے پر۔"

"لیکن افراہیم تو علاقے کی جانی پہچانی شخصیت ہے۔ لوگ مدتوں سے یہاں آباد ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"میرا مطلب شخصیت سے نہیں رویے سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ میاں بیوی اپنے رہن سہن عادات سے باور کرا رہے ہیں کہ انہیں قدیم چیزوں سے [illegible] ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے۔ ان کے لباس' زیورات' آرائش ہر چیز میں قدامت پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ قدامت پسندی قطعی مصنوعی ہے۔ غالباً قدیم حویلیوں کی خرید و فروخت کا جواز مہیا کرنے کے لیے انہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔"

زریں گل نے کہا۔ "استاد جی! آپ کا گازہ باتیں امارا سمجھ میں نہیں آتا لیکن آپ کا یہ بات دل کو بھی لگتا ہے کہ یہ خطرناک لوگ ہے۔ کیا پتا کوئی خزانہ وزانہ دفن ہو یہاں۔ امارے وطن میں بڑا بڑا رئیس جمع پونجی برتنوں میں بھر کر زمین میں دفن کر دیتا ہے اور اپنا بال بچے تک کو بے خبر رکھتا ہے۔ پھر ایک دم اللہ کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ سارا جمع پونجی گمشدہ ہو جاتا ہے۔ مدتوں بعد کسی کو کھوج ملتا ہے اور کبھی نہیں بھی ملتا۔

دادا ساری عمر اپنے دادا کا چھوڑا ہوا برتن ڈھونڈتا رہا۔ اس کو نہیں ملا پھر امارے باپ نے ڈھونڈا۔ اس کو بھی نہیں ملا۔ پھر ام ڈھونڈنے نکلا' ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک پہاڑ کی کھوہ سے ام کو پانچ چھ مہینے پرانا لاش مل گیا۔ کوئی کسی مسافر کو مار کر پھینک گیا تھا۔ بس ام وہ لاش ڈھونڈنے کے جرم میں پکڑا گیا۔ یہ آٹھ دس سال پرانا بات ہے۔ ام نے دو برس جیلوں کا وال کھایا ہے اسی چکر میں۔ ام کو تو لگتا ہے جناب! ادھر بھی ایسا ہی کوئی چکر ہے۔"

زریں گل نے سیدھے سادے انداز میں جو بات کی تھی اس میں وزن تلاش کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ جب بندے کے پاس وقت اور پیسہ وافر ہو تو کئی قسم کے خبط اسے گھیر لیتے ہیں۔ ممکن تھا یہ لوگ بھی کسی ایسے ہی خبط کا شکار ہوں لیکن ایک بات تھی۔ اگر واقعی یہ کوئی ایسا ہی چکر تھا تو پھر ارجمند اور افراہیم کے پاس اس مہم جوئی کے لیے یقیناً کچھ نہایت ٹھوس قسم کے جواز موجود تھے۔ اس "تلاش" پر اندھا دھند روپیہ خرچ کرنا اور بدنام زمانہ ٹھگوں اور مجرموں کو اپنی معاونت کے لیے جمع کر لینا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ لازمی طور پر زبردست منصوبہ بندی اور سوچ بچار کے بعد اس کام کا آغاز کیا گیا تھا۔ تاہم یہ سارے امکانات ہی تھے۔ اس پُراسرار سرگرمی کا مقصد ہمارے قیافوں سے بالکل مختلف بھی ہو سکتا تھا۔ درحقیقت کل رات ایک سنہری موقع میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں باتھ روم میں بند تھا اور مجھ سے چند فٹ کی دوری پر قلور زماں اور افراہیم انتہائی اہم معاملات کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس گفتگو کے دوران اس اصل مقصد سے بھی پردہ اٹھ جاتا جس کے لیے یہ ساری تگ و دو جاری تھی لیکن بدقسمتی کہ پیچھے کہ گفتگو انکشاف انگیز نہج پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ اس کا رُخ اچانک ہی مسز تریم اور اس کی زندگی کے مسائل کی طرف مڑ گیا تھا۔

زریں گل نے اپنی چترال کھجاتے ہوئے کہا۔ "امارے دماغ میں ایک اور بات بھی آ رہا ہے جی۔"

"دماغ کو تو تم خواہ مخواہ بیچ میں لا رہے ہو۔" صفدر نے ٹوکا۔

زریں گل سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "ام نے سنا تھا کہ یہ اسمگلر لوگ مال ادھر سے اُدھر پہنچانے کے لیے سرنگوں کا استعمال بھی کرتا ہے۔ یہ سرنگیں سونے کا کان سے کم نہیں ہوتا ہے۔ خاص خاص سرنگوں کا مالک ایک پھیرے کا لاکھوں روپیہ وصول کرتا ہے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

"بات تو بالکل سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن جس طرف تم اشارہ کرنا چاہتے ہو وہ بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اس سے پہلے تم جھنگ نہیں آئے ہو۔ جن سرنگوں کا تم ذکر کر رہے ہو وہ بارڈر کے آس پاس ہوتی ہیں جبکہ ہم اس وقت بارڈر سے بیسیوں میل دور بیٹھے ہیں۔ اتنی لمبی سرنگ کھودنا تو شاید ہماری گورنمنٹ کے بس میں بھی نہ ہو۔ اگر ہوتا تو اب تک زمین دوز ریلوے نظام شروع ہو چکا ہوتا اور ہم بس میں دھکے کھانے کے بجائے بذریعہ ٹیوب [illegible] خوشاب پہنچے ہوتے۔"

"آپ امارا مطلب نہیں سمجھا جناب! ام تازہ تازہ سرنگ کا بات نہیں کر رہا' پرانا سرنگ کا بات کر رہا ہے۔ دو تین سو سال یا اس سے بھی پرانا سرنگ کا۔ ایسا سرنگ تو پرانے زمانے میں عام ہوتا تھا۔ ہم نے مغل اعظم میں دیکھا تھا وہ کیا نام تھا اس کا۔۔۔ ہاں پرتھوی راج۔ اس نے مدھو بالا کو نیچے ہی نیچے آگرے سے ایران کی طرف نکال دیا تھا۔ امارا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو کسی بہت لمبا سرنگ کا کھوج مل گیا ہو۔ یہ بات ام یوں ہی نہیں کر رہا ہے۔ ام نے آج ایک چھوٹا سرنگ دیکھا بھی ہے۔ آپ دونوں تو نیچے کنوئیں میں کام کر رہا تھا' ام باہر مٹی کھینچنے کے لیے کھڑا تھا۔ پیشاب کے لیے ام پیچھے والے برآمدے میں گیا تو وہاں گول کوٹھری کے پاس ایک سرنگ نظر آیا ام کو۔ بالکل گول اور اندر تک گیا ہوا۔ وہاں بکھری ہوئی مٹی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرنگ کو تازہ تازہ صاف کیا گیا ہے۔"

صفدر بولا۔ "یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے بھئی! اکثر پرانی حویلیوں میں ایسی سرنگیں ہوتی تھیں لیکن وہ ہندوستان سے ایران یا لاہور سے آگرے نہیں جاتی تھیں۔ وہیں حویلی میں گھوم پھر کر ختم ہو جاتی تھیں۔ بعض اوقات ایسی ہی کسی لمبی سرنگ کے ذریعے حویلی کے مردانے کو زنان خانے سے ملا دیا جاتا ہے یا پھر یہ سرنگ حویلی سے باہر نکلنے کا محفوظ راستہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ فی الحال اس بحث کو لپیٹ کر اس مصیبت کے بارے میں سوچیں جو ہمارے سر پہ کھڑی ہے یعنی وہ شیل جسے ہم نے صبح کنوئیں سے نکالنا ہے اور جسے نکالے بغیر کھدائی جاری رکھنا ممکن نہیں۔"

صفدر نے کہا۔ "اس بارے میں میری معلومات صفر ہیں لیکن شیل کی حالت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ہلانا جلانا خطرناک ہے۔"

اس مرحلے پر ہمیں گفتگو روکنا پڑی۔ کھانا آ گیا تھا۔ کھانا کل سے زیادہ پُرتکلف تھا۔ میں نے کہا۔ "بھئی! تمہارے

کیے کی تصدیق ہو گئی۔ اس بھری پڑی ٹرے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ افراہیم صاحب کے نزدیک بھی شیل خطرناک ہے۔"

صفدر مسکرانے لگا۔ کھانا لانے والا ملازم وہی بے زبان سا شخص تھا۔ جہازی سائز کے طشت میں وہ کئی قسم کا گوشت، فرنی اور روغنی نان لایا تھا۔ اگر یہ ساری چیزیں کل والی چھیل چھبیلی ملازمہ کے ہاتھ میں ہوتیں تو کچھ زیادہ خوبصورت نظر آتیں کیونکہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔ ملازم نے کھانا میز پر سجا دیا۔ سخت سردی میں مسالے دار مچھلی کا نظارہ بڑا اشتہا انگیز تھا۔ ہم "بلا تمہید" شروع ہو گئے۔ اسی دوران وجودِ زن والی کسر بھی پوری ہو گئی۔ زنانہ جوتی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور کل والی ملازمہ ایک ٹرے میں سادہ اور "غیر سادہ" پانی سجائے اندر داخل ہو گئی۔ آج ایک کی جگہ دو بوتلیں تھیں اور یہ بوتلیں لانے والی خود بھی بڑے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

صفدر نے سینے پر ہاتھ مار کر سرگوشی میں کہا۔ "دیکھیے وہ گئے سارے سوہنیے۔ ہم تو سارا دن دید کو ترس گئے۔"

ملازم دور کھڑا تھا اس لیے سن نہیں سکا یا شاید سن کر انجان بنا رہا۔ لڑکی نے منہ بنانے کے بجائے ہونٹوں کو مسکرانے والے انداز میں کھینچا۔ "بارہاں کھلیے" کا یہ اشارہ بڑا واضح تھا۔ کوئی سنہ کا خواہش مند ہوتا تو شب بھر لمحوں سے آنکھ مچولی کھیل سکتا تھا۔ تاہم ہم میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی۔ کھانے کے دوران لڑکی ہمارے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ گاہے گاہے وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ہماری حوصلہ افزائی بھی کر رہی تھی۔ وہ بیس بائیس برس کی قبول صورت لڑکی تھی۔ چہرے مہرے اور گفتگو سے دیہاتن لگتی تھی۔ معلوم نہیں اس کی کون سی مجبوری یا خواہش اسے ان دیواروں میں کھینچ لائی تھی۔

صفدر نے کہا۔ "یوں لگ رہا ہے جیسے ہمیں جشنِ مرگ منانے کا بھونڈا سا موقع فراہم کیا گیا ہے۔"

"اور ظاہر ہے ہم مرنا نہیں چاہتے۔" زریں گل نے جامع تبصرہ کیا۔

"ہمیں ضروری ہے کہ رات کی منصوبہ بندی پر لعنت ارسال کر کے دن کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔" صفدر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر بتاؤ ناں بھائی۔ کیا کیا جائے؟" میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

صفدر بولا۔ "میرے ذہن میں تو ایک ہی بات آ رہی ہے اور وہ یہ کہ شیل نکالنے کے لیے چرخی استعمال کی جائے۔ رسی کے ایک سرے سے آہنی کنڈی منسلک کر دیتے ہیں۔ اس کنڈی کو شیل کے شکستہ حصے میں پھنسا کر اور دور کھڑے ہو کر چرخی سے اوپر کھینچ لیا جائے۔"

"لیکن اس کے بعد بھی شیل کے قریب جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"مگر اتنی دیر میں یہ علم تو ہو چکا ہوگا کہ ہلنے جلنے سے شیل بلاسٹ نہیں ہوا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن رسک اپنی جگہ موجود رہے گا۔ شیل کو کنڈی سے نکالتے ہوئے 'مقررہ جگہ پر رکھے ہوئے یا اس کے بعد بھی کسی وقت دھماکا ہو سکتا ہے۔"

صفدر بولا۔ "جناب! اتنا رسک تو پھر اس سارے گور دھندے میں موجود ہے۔"

"اس رسک کو ختم کیا جا سکتا ہے۔" میں نے تسلی کہا۔ "بالکل سیدھی سادی بات ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ بات ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے ہمارے ذہن میں آ جانی چاہیے تھی۔" صفدر اور زریں گل ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ کم از کم اس حد تک وہ مجھ پر اندھا اعتبار کرنے لگے تھے۔ میں نے کہا۔ "ہم نے دیکھا ہے کہ شیل کی آؤٹر کیسنگ ختم ہو چکی۔ اب اسے ناکارہ کرنے کے لیے کسی ماہر کی ضرورت نہیں۔ کام اتنا ہی سہل ہے جتنا کسی انگارے کو بجھا دینا۔ شیل کو پانی میں ڈبو دیا جائے تو یہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا دھماکا خیز گن پاؤڈر، سلفر اور پوٹاشیم نائٹریٹ جیسے اجزا پر مشتمل ہے۔ پانی ان اجزا کی موت ہے۔"

"اور ہماری زندگی۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔

وہ رات ہم نے بڑے سکون سے سوتے ہوئے گزاری۔ اگلے روز صبح آٹھ بجے تک یہ بات افراہیم کے میں بھی آ چکی تھی۔ اس نے کہا۔ "حسنے! میرا خیال ہے شیل نکالنے سے پہلے کنوئیں میں پانی چھوڑ دیا جائے۔"

"جیسے آپ کی مرضی صاحب۔" میں نے کہا۔ "حکم کے بندے ہیں جی۔ ہمیں تو اپنے بھی کہیں گے تو لائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ ہمیں شرمندہ نہ کرو بھئی۔" [illegible] نے کہا۔ "ہم پہلے ہی تمہاری جان جوکھم میں ڈالے ہیں۔"

اب سارا کام ہو گیا تھا تو اسے "جان جوکھم" کا [illegible] ہو رہا تھا۔ ورنہ منہ میں گھنگھنیاں [illegible] لے سارا دن [illegible]

دیکھتا رہا تھا۔ وہ حویلی میں واٹر پمپ نصب تھا۔ ڈیڑھ دو انچ کی ایک نال سے ہم نے کنوئیں میں پانی چھوڑ دیا۔ قریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر اس میں تین چار فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ایک گھنٹا مزید انتظار کیا اور پھر کنوئیں میں اتر کر گارے میں لتھڑے ہوئے تینوں رنگی شیل احتیاط سے باہر نکال لیے۔ میں اور صفدر بھی بری طرح لتھڑ گئے تھے۔ بہرحال ایک بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ افراہیم نے ہمارے غسل کے لیے گرم پانی کا انتظام کرایا۔ غسل خانہ بالائی منزل پر ہمارے کمرے کے قریب ہی تھا۔ پہلے صفدر نہایا پھر میں گھس گیا۔ نہانے کے دوران ہی مجھے نیچے احاطے سے کچھ بلند آوازیں سنائی دیں۔ غسل خانے میں ساڑھے پانچ فٹ کی بلندی پر ایک کھڑکی نما روشن دان تھا۔ اس میں سیمنٹ کی جالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے نہاتے نہاتے اس جالی میں سے جھانکا تو ایک عجیب منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک کتھئی رنگ کی سوزوکی کار بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی جبکہ ایک ترنگی لینڈ روور جیپ اندرونی دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ جیپ پر کئی جگہ گولیوں کے سوراخ تھے۔ ایک درمیانے قد کا چوڑا چکلا قبائلی کسی کو کھینچ کر جیپ سے باہر نکال رہا تھا اور ساتھ بلند آواز میں بول رہا تھا۔ اس شخص کے لباس پر خون کے سیاہی مائل دھبے تھے۔ جونہی اس کا رُخ تھوڑا تبدیل ہوا، میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ عیسیٰ جان تھا۔ اس نے چلاتے ہوئے ایک لڑکی کو گاڑی سے باہر گھسیٹا اور دھکیل کر دور پھینک دیا۔ لڑکی پہلو کے بل گھاس پر گری اور پھر ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ رو رہی تھی اور بڑے غصے میں عیسیٰ جان کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا، مجھے اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ عیسیٰ جان نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ لڑکی کو رسید کیا پھر اسے بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا برآمدے کی طرف لے چلا۔ لڑکی سفید شلوار قمیص میں تھی۔ اس کے صرف ایک پاؤں میں سینڈل تھا۔ دوسرا سفید پاؤں ننگا تھا اور کچی زمین پر انگلیوں کے نشان چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں میں لڑکی اور عیسیٰ جان میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اب صرف رونے دھونے اور گرجنے برسنے کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔

عیسیٰ جان کے ساتھ چند اور افراد بھی حویلی میں پہنچے تھے۔ یہ خطرناک صورتوں والے مسٹنڈے پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں سے چند ایک کو میں قادر زماں کی حویلی میں دیکھ چکا تھا اور اب اتنی دور سے بھی صاف پہچان رہا تھا۔ آنے والوں میں ایک قبائلی شخص زخمی تھا۔ اس نے دایاں کندھا بائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور خون اس کے پورے بازو کو [illegible] رہا تھا۔ یوں لگا جیسے یہ لوگ ابھی کہیں پولیس مقابلہ کر [illegible] آئے ہیں۔ بعد ازاں میرا یہ قیافہ بالکل درست ثابت [illegible] وہ بری طرح ہانپتے کانپتے ہوئے تھے اور ان کی آنکھوں [illegible] ہیجانی کیفیت تھی۔ لڑکی کے رونے اور پکارنے کی آواز[illegible] ابھی تک آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے [illegible] باہر آ گیا۔ صفدر اور زریں گل بالائی برآمدے میں کھڑے [illegible] ستونوں کی آڑ سے مین گیٹ کا منظر دیکھ چکے تھے اور اب [illegible] کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔

"کچھ دیکھا آپ نے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہاں سب کچھ دیکھا۔۔۔ وہ عیسیٰ جان ہے۔ پتا نہیں کس بدنصیب کو پکڑ لایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ لوگ کہیں کوئی مارا ماری کر کے آئے ہیں۔ پوری گاڑی گولیوں سے چھلنی ہو رہی ہے۔"

"یہ عیسیٰ جان تھا؟" صفدر نے حیرت سے کہا۔ اس سے پہلے اس نے صرف عیسیٰ جان کا نام سنا تھا۔

"ہاں یہی ہے وہ رانی خان کا سالا۔" میں نے کہا۔ "اب معلوم نہیں کس چکر میں یہاں پہنچا ہے۔"

زریں گل بولا۔ "استاد جی! اب آپ کو تو کمرے میں بند رہنا ہوگا۔ وہ فوراً سے پہلے پہچان جائے گا آپ کو۔"

"پہچاننے کی کیا بات ہے۔ وہ حرامی تو ڈھونڈتا ہی ان کو پھر رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

زریں گل بولا۔ "استاد جی! بہتر ہے آپ کمرے میں ہی رہیں۔ ہم دونوں افراہیم سے کہہ دے گا کہ آپ کا طبیعت ناساز ہو گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس بہانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "کنوئیں والا کام تو آج کے لیے بند ہی سمجھو۔ بڑے معزز قسم کے مہمان پہنچے ہیں۔ افراہیم کو ان کی خاطر مدارات کرنا ہوگی۔ ایسے میں کام کے لیے وقت کہاں سے نکلے گا۔"

اور پھر یہی ہوا۔ زریں گل اور صفدر نیچے گئے تو افراہیم نے کہہ دیا کہ آج وہ آرام کریں۔ کھدائی کا کام کل دیکھا جائے گا۔ ہم پردہ نشینوں کی طرح کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شام کی سیاہ بلی نے دن کے لتھڑے ہوئے چوزے کو آ دبوچا۔ حویلی میں ایک بے موقع خاموشی طاری تھی۔ چیختا چنگھاڑتا عیسیٰ جان، اس کے بپھرے ہوئے ساتھی، روتی بلکتی لڑکی اور افراہیم وغیرہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ یقیناً وہ اسی حویلی میں تھے لیکن کسی خاموش قلم کے

کرداروں کی طرح گم صم تھے۔ بس کبھی کبھی افراہیم کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ احاطے سے ایوزمی کی سمت یا ایوزمی سے برآمدے کی طرف آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔

"رات تقریباً نو بجے خاموشی کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ نچلی حویلی سے بات چیت کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر میں نے عیسٰی جان اور افراہیم کو نیم روشن برآمدے میں کھڑے دیکھا۔ وہ دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ عیسٰی جان کا واغدار لباس دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ حالت اس نے میری "جدائی" میں بنا رکھی تھی۔ میں اس کی "دیوانی محبت" کا جواب ویسی ہی "اندھا دھند محبت" سے دینا چاہتا تھا لیکن حالات نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی تھی۔ مجھے تحمل سے کام لینا تھا اپنے جذبات پر ہوش و خرد کا پہرا رکھنا تھا تاکہ اس درخت کی جڑوں کا پتا چل سکے جو شاخ در شاخ ایک لامتناہی رقبے پر پھیلا نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر برآمدے میں گفتگو ہو کر عیسٰی جان اور افراہیم واپس چلے گئے۔ میں نے عیسٰی کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ محسوس کی۔

تھوڑی دیر بعد منور میرے کہنے پر کن سن لینے کے لیے نیچے چلا گیا۔ میں اور زریں گل کمرے کی خوشگوار حرارت میں سستے برانڈ کے سگریٹ پھونکتے رہے۔ منور کی واپسی تقریباً تو ہے گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ عیسٰی جان نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس کے گھٹنے پر ضرب آئی ہے۔ ایک ملازم گرم پانی سے گھٹنے پر ٹکور کر رہا ہے اور عیسٰی ہولے ہولے کراہ رہا ہے۔ منور نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس سُرنگ کا معائنہ کر کے آیا ہے جس کا تذکرہ زریں گل نے کیا تھا۔ اس نے کہا میں نے آگے جا کر دیکھا ہے۔ وہ بالکل چھوٹی سی سُرنگ ہے۔ میرے خیال میں تو اسے سُرنگ کہنا بھی مناسب نہیں۔ چھ فٹ قطر کا تیس چالیس فٹ لمبا سوراخ ہے۔ کچی چھت کو سہارا دینے کے لیے بلیاں کھڑی کی گئی ہیں اور تختے وغیرہ لگائے گئے ہیں۔ غالباً اس جگہ بھی کچھ تلاش کیا جاتا رہا ہے اور پھر مایوس ہو کر یہ سلسلہ ترک کر دیا گیا ہے۔"

ہماری باتوں کے دوران کسی کمرے سے لڑکی کی دبی دبی چیخ و پکار ابھرنے لگی۔ وہ مصیبت میں تھی۔ کبھی اس کی صدا بالکل گھٹ جاتی تھی، کبھی ابھرتی اور پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ عیسٰی جان کے شیطانی شکنجے میں ہو۔ صنفِ نازک کے حوالے سے عیسٰی جان کا رویہ قابلِ صد نفرت تھا۔ وہ عورت کو مٹی کے کھلونے کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اب تو وہ ویسے بھی غصے سے بھرا ہوا تھا۔ کسی

نامعلوم دشمن سے ہونے والی جھڑپ میں اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی اور ایک ساتھی گولی لگنے سے زخمی ہو گیا تھا اس کے علاوہ لاکھوں کی گاڑی بھی برباد ہوئی تھی۔ اب وہ اپنے غضب کا نشانہ ایک بے کس عورت کو بنا رہا تھا جو کسی کی ماں، بہن یا بیٹی تھی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ جی چاہا سارے خدشات بالائے طاق رکھ کر نیچے اتروں اور اس لڑکی تک پہنچ جاؤں جو اس بے مروت کی تنہائی میں سراپا فریادی بنی ہوئی تھی۔ لیکن پھر ایکا ایکی یہ چیخیں تھم گئیں۔ فضا میں گھلا ہوا زہر معدوم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر جانبازی کی لہر بھی اپنی بلندی اور تندی کھونے لگی۔ انسانی جذبات گرد و پیش کے حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ مصلحتیں کسی نہ کسی انداز میں ہر شخص پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ یہ مصلحت ہی تو تھی کہ لڑکی کی چیخیں جانے کے بعد میں اپنی بے عملی کا جواز بنا رہا تھا۔ اس بات کا بہ خوبی امکان تھا کہ لڑکی کی مصیبت آسان ہو گئی ہو اور اس پر رحم کھا لیا گیا ہو گا لیکن اب چیخیں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں لہٰذا ہم اپنی بے قراری کو فریب دے رہے تھے۔

"پتا نہیں کون ہے بے چاری؟" زریں گل منمنایا۔

"مجھے تو لگتا ہے، یہ لوگ لاہور سے آ رہے ہیں" منور نے کہا۔

"کیسے اندازہ لگایا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی میں نیچے گیا تو گاڑیوں کے پاس سے گزرا تھا۔ رووَر کے ڈیش بورڈ پر دو پرچیاں پڑی تھیں، یہ راوی کے پُل پر ادا کیا جانے والا ٹول ٹیکس تھا۔"

"ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔" میں نے کہا "لیکن یہ بات ہے خطرناک۔ اگر یہ لوگ لاہور میں گھوم رہے ہیں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک انجم اور شفنا صاحب کی حفاظت میں ہیں لیکن ہیں تو لاہور میں ہی اور لشکر خاں بھی وہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار اسی طرف جا رہا ہے۔ وہ ابھی تک کلینک میں ہو گا۔ میں تو شکر کے کتے کسی بھی وقت اس کی بو سونگھ سکتے ہیں۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔" منور نے کہا "اگر ساہی صاحب یا ان کے کارندوں سے ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو گئی تو شکر اور عیسٰی لشکر خاں تک پہنچ جائیں گے۔"

زریں گل بولا۔ "ہماری سمجھ میں تو اس لڑکی کا چکر نہیں آ رہا۔ یہ حرامی لوگ اسے کیوں لایا ہے یہاں۔ اگر میرا

چلتا تو تمہارا ان کو لڑکیوں کا کیا کمی تھا۔"

رات ساڑھے دس بجے تک ہم بات چیت میں مصروف رہے۔ زریں گل نے چند پیگ لگا لیے تھے اس لیے پہلے وہ سو گیا پھر منور راز کیے لگا۔ اس کے بعد میں بھی لم لیٹ ہو گیا۔ حویلی میں اب خاموشی تھی۔ لڑکی سمیت کسی کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ بس مین گیٹ پر کھڑے دونوں چوکیدار کبھی کبھی کھانس کر یا ایک دوسرے کو پکار کر سنانے کی جھیل میں کنکر پھینک دیتے تھے۔ آتشدان اب راکھ ہو چکا تھا۔ میں نے لحاف گردن تک اوڑھ لیا اور سوچتے سوچتے نجانے کب نیند کی مہیان وادی میں چلا گیا۔ وادیٔ خواب، جہاں عیسٰی جان اور شکر کی آوازیں تھیں نہ انجم اور شفنا کے سہمے ہوئے چہرے، نہ لشکر خاں کا خونچکاں جسم اور نہ دور ویرانے میں دور تک بکھری ہوئی لاشوں کا روح فرسا منظر۔

اگلی صبح بڑی چمکیلی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو اوس سے بھیگے برگ و بار پر سنہری دھوپ نے افشاں چُن رکھی تھی۔ حسبِ معمول برآمدے میں پہنچ کر میں ایک چوکور ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ جس شاندار جیگوار گاڑی پر ہم یہاں آئے تھے وہ اب مین گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں ایک اسٹیشن ویگن تھی۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور انہیں چمکانے دمکانے میں مصروف تھے۔ غالباً کہیں جانے کی تیاری تھی۔ گولیوں سے چھلنی لینڈ روور اور ... رنگ کی سوزوکی کار کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں انہیں کہاں چھپا دیا گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے افراہیم، عیسٰی جان اور دو مسلح افراد باتیں کرتے ہوئے عقبی احاطے کی طرف سے نمودار ہوئے۔ عیسٰی جان کے ہاتھ میں کوئی شے تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ کنوئیں سے نکلنے والی ماتن تھی۔ عیسٰی بڑی بے خوفی سے اسے الٹ پلٹ کرتا چلا آ رہا تھا۔ جونہی وہ تینوں گاڑیوں کے نزدیک پہنچے، برآمدے سے باقی افراد بھی نکل آئے۔ وہ سب کے سب اپنے لباس تبدیل کر چکے تھے تاہم اسلحہ بدستور ان کے پاس تھا۔ ان کے تمتماتے ہوئے چہرے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس جتھے کے ارادے کچھ نیک نہیں ہیں۔

جیگوار کا ڈرائیور عقبی دروازہ کھولے تیار کھڑا تھا۔ عیسٰی جان نے ماتن ایک ملازم کے حوالے کر کے الوداعی کلمات ادا کیے، پھر ہاتھ ماتھے پر لے جا کر افراہیم کو سلام کیا اور اپنے زخمی گھٹنے کو سیدھا رکھتا ہوا جیگوار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک اسی باتی لباس میں تھا تاہم کمبل اس نے بدل لیا تھا۔ اب وہ ذہنی راز رکھنے کے بجائے

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/- روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۳۲۴۳۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۳۲۳۸۵۳

اپنے ھاکر یا قریبی
بکسٹال سے طلب فرمائیں

شیر کی شبیہ والا ایرانی کمبل لپیٹے ہوئے تھا۔ اس بھاری بھر کم کمبل کے سبب وہ بچہ اور بھی چوڑا چکلا اور روبنگ نظر آنے لگا تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر یہ مسلح پارٹی حویلی سے رخصت ہو گئی۔

رات میرے ذہن میں لشکر خاں کے حوالے سے جو تشویش پیدا ہوئی تھی وہ اب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد لشکر خاں کی خبر گیری کروں۔ میں نے صفدر کو اپنا پروگرام بتایا اور ہم ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد افراہیم کے پاس پہنچ گئے۔ وہ نچلے نشست گاہ میں بیٹھا تھا اور تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک ملازم اس کے قریب کھڑا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "آنکھوں پر پٹی باندھ کر گاڑی میں ڈالو اور پھینک آؤ کہیں۔ ہم نے آچار نہیں ڈالنا حرامزادی کا۔" نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہدایت اس لڑکی کے بارے میں ہے جو کل زبردستی یہاں لائی گئی ہے۔

میں نے دروازے پر ہی سے سلام کیا۔ وہ اخبار تہ کرتے ہوئے بولا۔ "آؤ بھئی! میں تمہاری ہی طرف توی بھیجنے والا تھا۔۔۔ چلو کپڑے وغیرہ بدل لو۔ کام شروع کرنے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب! میں چھٹی کی گزارش لے کر آیا ہوں۔"

"کیسی چھٹی؟" افراہیم کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔

میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "گھر سے نکلے ہیں بائیس روز ہو گئے ہیں جی۔ بچوں کی کوئی خیر خبر نہیں۔ راجو کا خیال تھا کہ میں تینوں کی طرف سے ایک چکر پاک پتن کا لگا آؤں۔ گھر والوں کو خرچہ مل جائے گا اور خیر خیریت کی اطلاع بھی ہو جائے گی۔"

افراہیم بولا۔ "اب زیادہ کام نہیں ہے بھئی۔ جہاں اتنے دن رکے' تین چار روز اور رک جاؤ۔ تمہاری بی بی صاحبہ کا کنواں چالو ہو جائے تو چلے جانا۔ وہ تو ایک ایک پل گن کر گزار رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب! راجو اور زریں تو یہیں ہوں گے' کام چلتا رہے گا۔ میں بھی ابھی نکل جاؤں تو کل بارہ ایک بجے تک واپس آجاؤں گا۔"

افراہیم اب میری اہمیت تسلیم کرنے لگا تھا۔ بولا "اگر ضروری ہی جانا ہے تو پھر راجو یا زریں کو بھیج دو' تم یہیں رہو۔"

"دراصل جناب۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ میری بیوی کو آج کل میں بچہ ہونے والا تھا۔ اس کی طرف سے بڑی فکر مندی ہے۔ گھر میں کوئی سنبھالنے والا نہیں۔ چاہتا ہوں کہ وہاں کسی کو دیکھ بھال کے لیے چھوڑ آؤں۔"

افراہیم نے عینک کے شفاف شیشوں کے پیچھے سے مجھے ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا پھر کہنے لگا۔ "لگتا ہے' پہلا بچہ ہے تمہارا۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے' چلے جاؤ لیکن جس طرح بھی ہو کل واپس آجانا۔ امکان تو نہیں مگر ہو سکتا ہے کہ کھدائی میں پھر کوئی رکاوٹ آجائے۔ تم اس معاملے کو بڑے اچھے طریقے سے ہینڈل کر رہے ہو۔"

پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند بڑے نوٹ گن کر میرے حوالے کر دیے۔ یہ رقم میری توقع سے کم از کم تین گنا تھی۔ یعنی تقریباً چھ ہزار روپے۔ وہ بولا۔ "ہم قدردان لوگ ہیں جسنے۔ جو ہمارے وفادار رہتے ہیں ہم بھی انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔"

میں نے بڑے انکسار سے دانت نکالے۔ وہ بولا۔ "رحمتہ بیگم نے تم تینوں پر اعتماد کیا ہے۔ ہمیں امید ہے تم اس اعتماد پر پورے اترو گے۔ ویسے تو تم سمجھدار نظر آتے ہو پھر بھی میں یہ یاددہانی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس حویلی کی کوئی بات حویلی سے باہر نہیں جانی چاہیے۔ خاص طور پر یہ اسلحے والا چکر بڑا خطرناک ہے۔ ہم ایک دو روز تک اس سلسلے میں پولیس کو رپورٹ کر دیں گے لیکن جب تک رپورٹ نہیں ہوتی یہ معاملہ بالکل راز رکھنا ہو گا۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خادم سب سمجھتا ہے جناب۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ بے ایمانی کی قسم تک حرامی نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ اور راجو کو میرے پاس بھیج دو۔"

میں نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور باہر نکل آیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اس برانچ روڈ پر کھڑا تھا جو ایک فرلانگ آگے "چیچہ کی" والی سڑک سے جا ملتی تھی۔ اس سڑک پر پہنچ کر میں کسی بھی سمت سفر کرنے کے لیے بس کا سکتا تھا۔

○☆○

شیخوپورہ پہنچ کر میں بس سے اتر گیا۔ شواہد سے تو ایسا ہوتا تھا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا بہر طور احتیاط ضروری تھی۔ میں نے شیخوپورہ کے ایک بازار سے کچھ مقصد شاپنگ کی اور پوری طرح تسلی کر لی کہ میں کسی کی نگاہ میں نہیں۔ شیخوپورہ سے ویگن میں بیٹھ کر لاہور پہنچ گیا۔ اس وقت تک چار بج چکے تھے۔ میں اسی "ٹاپ لباس" میں تھا جو صفدر نے خوشاب سے حاصل کیا تھا۔ سر پر مفلر لپیٹ کر اوپر سے میں نے کھیس نما چادر لے لی تھی۔ چھ کو بندرہ میں روز گزر چکے تھے لہٰذا بالوں نے چھوٹی سی داڑھی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مینار پاکستان کے پاس سے میں نے رکشا پکڑا اور سیدھا "شافی کلینک" جا پہنچا جہاں چند روز پہلے بڑی رازداری سے لشکر خاں کو "ایڈمٹ" کیا گیا تھا۔ کلینک سے کچھ فاصلے پر اترنے کے بعد میں نے گہری نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ یہ سولہ سوا ایکڑ اسکیم کی ایک کشادہ اور بارونق سڑک تھی۔ جب کوئی مشکوک شخص قرب و جوار میں دکھائی نہیں دیا تو میں چہل قدمی کے انداز میں کلینک کے سامنے سے گزر گیا۔ چند گز آگے جا کر واپس آیا اور اندر داخل ہو گیا۔ گھنی مونچھوں والے ایک فربہ اندام چوکیدار نے میرا راستہ روک لیا۔

"او خیر! کدھر کو جاتا ہے گائے کا مافق منہ اٹھا کر۔" اس نے پوچھا۔

"مریض کو دیکھنا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے سرتاپا مجھے گھورا۔ پھر ڈنڈے سے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "کون مریض' اور یہ کون سا وقت ہے مریض کو دیکھنے کا۔"

وہ تکرار پر آمادہ تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اتنے میں دو افراد ہمارے قریب پہنچ گئے۔ ان کی صورتیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ سادہ لباس میں پولیس والے ہیں۔ ان میں سے ایک سینئر اور دوسرا جونیئر تھا۔ سینئر نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا پھر ایک دم اس کا ہاتھ سلام کرنے کے لیے ماتھے پر پہنچ گیا۔ اس کی صورت میرے لیے بھی جانی پہچانی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس اے ایس آئی سے ساہی صاحب کی کوٹھی میں ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ ان سادہ پوشوں میں بھی شامل تھا جو پشاور سے میری آمد کے موقع پر مجھے لاہور ایئرپورٹ سے لینے آئے تھے۔ وہ چوکیدار کو ڈانٹ کر احترام سے مجھے اندر لے گیا۔

میں نے کہا۔ "تمہارا نام غالباً جمیل ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "لشکر خاں کہاں ہے؟"

"لل۔۔۔ لشکر خاں۔" اس کی زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔ پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "میرا خیال ہے ہم ساہی صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ وہی آپ کو سب کچھ بتائیں گے۔"

مطلب یہ تھا کہ لشکر خاں کلینک میں نہیں۔ میرے ذہن میں اندیشوں کے سانپ پھنکارنے لگے۔ میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ "لشکر خاں ٹھیک تو ہے ناں؟"

"بالکل خیریت سے ہے جی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔"

"لیکن ہے کہاں؟"

"اس بارے میں آپ کو ساہی صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ آیئے میرے ساتھ۔ اس پچھلے دروازے سے چلتے ہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک عقبی دروازے سے سڑک پر آگیا۔ یہاں نیلی واکس ویگن کار کھڑی تھی۔ سفید پوش اے ایس آئی نے پھرتی سے دروازہ کھول کر مجھے بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا تاہم میں نے سوال جواب کر کے اے ایس آئی کو آزمائش میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ اے ایس آئی کی گفتگو اور تاثرات سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کلینک میں کوئی سنگین واقعہ رونما ہو چکا ہے۔

قریباً دس منٹ کے حوصلہ آزما سفر کے بعد ہم ہیڈ کوارٹر کے مین گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ساہی صاحب اپنے آفس میں موجود نہیں تھے۔ وہاں آفتِ جاں ایس پی برکت صاحب براجمان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی مونچھیں پھڑک اٹھیں۔ کئی ہفتوں بعد ان سے آج ملاقات ہوئی تھی۔ پارہ چنار میں' میں نے انہیں زبردست صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وہ میزبان کے ساتھ قہوہ پیتے رہ گئے تھے اور میں نیلہ اور نیتو کے ساتھ رفوچکر ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑیں گے لیکن پھر بتدریج ان کی آنکھوں میں نرمی کے آثار نمودار ہو گئے۔ ظاہر ہے ساہی صاحب انہیں میری اصلیت سے آگاہ کر چکے تھے۔ ایک کڑوا سا گھونٹ بھر کر انہوں نے کہا۔ "آؤ استاد جانی! کہاں سے آرہے ہو۔ بڑی لمبی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ ایسے غائب ہوئے ہو جیسے گھوتے کے سر سے۔۔۔ بھوتی کے سینگ غائب ہوتے ہیں۔" انہوں نے اٹھ کر باقاعدہ مجھ سے مصافحہ کیا اور بیٹھنے کے لیے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اتنے میں ساہی صاحب کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور وہ بھی لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اندر آگئے۔ مجھے دیکھ کر انہیں شاک لگا اور ہاتھ کی فائل گرتے گرتے بچی۔ "تم شاہ جہاں؟ کہاں چلے گئے تھے بھئی؟" انہوں نے بھی برکت صاحب والا سوال کیا۔ "اور۔۔۔ اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ حلیہ صفدر نے بنوایا ہے جی۔"

"اس سے ملے ہو تم؟" ساہی صاحب کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"جی ہاں۔ صفدر سے بھی اور زریں گل سے بھی۔ وہ دونوں اس وقت جھنگ میں ہیں۔ اسی چیچہ کی والی حویلی میں اور آج صبح تک عینی جان بھی اُدھر ہی تھا۔"

"اوہ گاڈ۔۔۔ لگتا ہے تمہارے پاس بہت اہم خبریں ہیں۔" ساہی صاحب نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم سے بہت سے سوال کرنا چاہ رہے تھے اور کچھ بھی نہیں پوچھ پا رہے تھے۔

برکت صاحب بولے۔ "یار! شروع سے بتاؤ' تاکہ میرے پلے بھی کچھ پڑ سکے۔"

میں نے دونوں افسران کو مفصل رپورٹ دینی شروع کی۔ ساہی صاحب اس بات سے آج ہی باخبر ہوئے تھے کہ مجھے کوٹھی سے غائب کرنے والی غزالہ تھی۔ اس کے بعد ہونے والے واقعات سے وہ کماحقہ بے خبر تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں بتایا کہ مری کے بنگلے سے عین وقت پر مجھے' صفدر اور زریں گل نے نکالا تھا اور خوشاب لے آئے تھے۔ وہاں سے ہم ابراہیم کی کوٹھی میں پہنچے جہاں ارجمند بانو سے تعارف ہوا۔ بعدازاں ارجمند ہمیں چنے پل والی حویلی میں لے گئی۔ حویلی میں پہنچ کر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کسی چیز کی تلاش جاری ہے۔ میں نے ساہی صاحب کو حویلی کے پُراسرار کنوئیں اور وہاں ہونے والی کھدائی کا تمام احوال بتایا۔ یہ اطلاعات ساہی صاحب اور برکت صاحب کے لیے ازحد انکشاف انگیز تھیں۔ خاص طور پر پرانے اسلحے کی برآمدگی کی بات انہوں نے بڑی حیرانی سے سنی۔ ساہی صاحب کی پیشانی پر لکیروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد بولے۔ "یہ تو بہت گہرا چکر معلوم ہوتا ہے بھئی۔ کیوں برکت صاحب' آپ کا کیا خیال ہے؟"

برکت صاحب مونچھوں کو تاؤ دے کر بولے۔ "چکر تو واقعی گہرا ہے اور اگر ہم نے نرمی دکھائی تو اور بھی گہرا ہو جائے گا۔ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ صرف کنواں صاف کرنے کے لیے کوئی بھوتنی کا اتنا لمبا چوڑا کھڑاگ مول نہیں لے سکتا۔ پھر جس حرامزادے کا قادر زماں اور لشکر جیسے لوگوں سے ناتا ہو وہ کوئی شریفانہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ میرا تو خیال ہے' جتنی جلدی ہو سکے چھاپا مار کر اسلحہ برآمد کرنا چاہیے اور چار پانچ بندے پکڑ لینے چاہئیں۔ چھترول سے کام لیں گے تو ہمارا بہت سا وقت بچ جائے گا۔"

ساہی صاحب نے کہا۔ "بندے پکڑنے سے کچھ نہیں ہوگا برکت اور بندوں کو اصل بات کا پتا بھی نہیں ہوگا۔۔۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "تمہارا کیا خیال ہے شاہ جہاں؟"

"کسی حد تک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں اصل معاملے کی خبر چند گنے چنے افراد کو ہے جن میں قادر زماں' لشکر اور ممکن ہے عیسیٰ جان کا نام شامل ہو۔ اس کے علاوہ ایک پرسنل سیکرٹری ہے ارجمند بانو کی جو خاص رازداروں میں شمار کی جا سکتی ہے۔"

برکت صاحب بولے۔ "آپ لمبے چکروں میں نہ پڑیں جی۔ تین بندوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں حویلی میں اور سارے معاملے کو دبانے کی مجرمانہ کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں تو ہم اس وقت قادر زماں کی پیٹھ پر بھی ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔" برکت صاحب کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں اور وہ اس وقت صحیح معنوں میں باجلال پولیس افسر نظر آ رہے تھے۔

برکت صاحب اور ساہی صاحب میں کچھ دیر اس معاملے پر تبادلہ خیال ہوا۔ میں اس دوران بے قراری سے پہلو بدلتا رہا۔ میں جلد از جلد لشکر خان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ ساہی صاحب نے جلد ہی میری اس کیفیت محسوس کر لیا اور جان گئے کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ وہ اپنی نشست سمیٹ کر بولے۔ "شاہ جہاں! مجھے افسوس ہے کہ ہم لشکر خان کو شنکر اور عیسیٰ کی نظروں سے دور نہ رکھ سکے۔ کل نو بجے کے قریب شافی کلینک میں زبردست ہنگامہ ہوا ہے۔ قریباً آدھا گھنٹا فائرنگ ہوتی رہی۔ میرے دو جوان زخمی ہوئے ہیں' ایک نرس بھی لاپتا ہے مگر شکر ہے کہ لشکر خان کی جان محفوظ رہی ہے۔"

اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے ساہی صاحب نے کہا۔ "میں جانتا تھا کہ اگر شافی کلینک سے ہمارا رابطہ رہا تو لشکر خان کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ لشکر خان قریباً بیس روز کلینک میں رہا ہے' اس دوران میں' میں صرف ایک مرتبہ اس سے ملا ہوں ورنہ فون پر ہی ڈاکٹرز سے حال احوال پوچھ لیتا تھا۔ کلینک کے رجسٹر میں لشکر خان کا فرضی نام درج تھا اور اس کی حفاظت کے لیے سادہ پوش ہروقت موجود رہتے تھے۔ وہ تیزی سے روبہ صحت تھا اور تین چار روز میں اسے چھٹی ملنے والی تھی۔ اتفاقاً عیسیٰ جان کے ایک کارندے نے اس کا کھوج لگا لیا۔ اس بارے میں تفصیل وہ شخص تمہیں خود بتائے گا۔ بہرطور کل صبح نو بجے عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی ایک لینڈ روور جیپ میں سوار کلینک پہنچے اور انہوں نے لشکر خان کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ موقعے پر موجود میرے چار سادہ لباس جوانوں نے بڑی جاں نثاری کا مظاہرہ کیا اور عیسیٰ جان جیسے شخص کے سامنے ڈٹ گئے۔ عیسیٰ جان کے پاس خودکار رائفل تھی جبکہ اس کے دونوں ساتھی ماؤزر وغیرہ سے مسلح تھے۔ انہوں نے پولیس اہلکاروں پر گولی چلا دی۔

ایک جوان شدید زخمی ہو کر کلینک کے بیرونی گیٹ کے پاس گرا' دوسرا اس کمرے کے عین سامنے زخمی ہوا جہاں لشکر خان موجود تھا۔ سادہ پوشوں کی شدید مزاحمت سے یہ فائدہ ہوا کہ قریبی چوکی میں موجود پٹرولنگ پارٹی موقعے پر پہنچ گئی۔ عیسیٰ جان اور اس کے دونوں ساتھیوں نے خود کو گھرا ہوا پایا تو دوسری منزل پر چڑھ گئے۔ یہاں انہوں نے ایک لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو یرغمال بنا لیا اور کلینک کے عقبی راستے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس ڈرامے کے دوران ہی میں بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ دس پندرہ منٹ تک زبردست کشمکش رہی۔ میں جانتا تھا کہ عیسیٰ جان کس قماش کا شخص ہے۔ بے گناہ ڈاکٹر اور نرس کی زندگی خطرے میں تھی اور عین ممکن تھا کہ ان دونوں سے ہاتھ دھو کر بھی ہم عیسیٰ جان کو پکڑنے میں ناکام رہتے۔ وہ اور اس کے ساتھی پوری طرح مسلح تھے اور تادیر مزاحمت جاری رکھ سکتے تھے۔ مجبوراً پولیس کو اپنا ہاتھ روکنا پڑا۔ عیسیٰ جان نے ڈاکٹر اور نرس سمیت فرار ہونے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی لیکن نرس کو وہ بدبخت ساتھ لے گیا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا۔ ٹکسالی روڈ پر ایک ٹریفک جام کے سبب پولیس پارٹی کو رکنا پڑا لیکن لینڈ روور دو راہ گیروں کو کچل کر اور ایک رکشا الٹا کر نکل بھاگی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ راوی کے پل پر اس وقت گارڈ بدل رہی تھی۔ وائرلیس پر پیغام نشر ہونے کے باوجود مجرموں کو راوی پر روکا نہیں جا سکا۔ بعدازاں انہیں 'مریدکے' کے قریب روکنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش ایک تھا پٹرولنگ کار کے لٹنے کی تھی۔ انہوں نے خودکار رائفل سے لینڈ روور پر چورسٹ مارے لیکن جوابی فائرنگ سے ان کا اپنا ٹائر فلیٹ ہو گیا اور وہ سنگین حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچے۔"

ساہی صاحب کے انکشافات کے بعد میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ کل سہ پہر حویلی میں عیسیٰ کے ساتھ نظر آنے والی لڑکی وہی نرس تھی جسے کل الصباح شافی کلینک لاہور سے اغوا کیا گیا تھا اور عیسیٰ جان وغیرہ کل لاہور سے بھاگ کر ہی جھنگ پہنچے تھے۔ زمین پر نشان چھوڑتا ہوا لڑکی کا ننگا پاؤں میرے تصور میں آ گیا' اس کی گلابی ایڑی نرم و نازک انگلیاں اور وہ پوریں جو ہر قدم پر زمین میں پیوست رہنا چاہتی تھیں اور پھر اس کی کربناک چیخیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ کاش ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے۔

ساہی صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لشکر خان بہت جذباتی شخص ہے۔ اپنے ساتھیوں کی موت نے اسے نیم پاگل کر رکھا ہے۔ جس وقت کلینک میں فائرنگ ہو رہی تھی' وہ اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے پیٹ رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس نے ہوش مندی کا ثبوت دیا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دیا ورنہ وہ بے دریغ عیسیٰ جان کے سامنے آ جاتا اور مارا جاتا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے میں دو دفعہ کلینک سے فرار ہونے کی کوشش کر چکا تھا۔ آخر کل رات اس کا داؤ چل گیا اور وہ اپنے نگرانوں کو جل دے کر نکل بھاگا۔ میں نے فائرنگ کے فوراً بعد اسے گارڈن ٹاؤن کے ایک کلینک میں منتقل کرا دیا تھا۔ یہاں رات کے وقت اس نے باتھ روم کی کھڑکی کی جالی کاٹی اور نکل گیا۔ بالکل جنونی ہو رہا ہے وہ۔"

"یہ تو بڑی سنگین صورتِ حال ہے۔" میں نے کہا۔

"اصل خطرے کی بات تو تم نے ابھی سنی ہی نہیں۔" ایس پی برکت نے گفتگو میں ٹانگ اڑائی۔ "اس بھوتنی کے عیسیٰ جان کو پتا چل گیا ہے کہ لشکر خان لاہور سے بھاگ کر واپس پشاور کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ بھی کا چھنکا اب اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ اس کے پیچھے گیا ہے۔ لگتا ہے کہ ایجنسی میں ایک بار پھر ان میں رن پڑے گا۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ لشکر خان پشاور گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آج صبح عیسیٰ کا ایک حرامی چمچہ پکڑا گیا ہے اسٹیشن پر۔" ایس پی برکت نے کہا۔

ساہی صاحب نے گھنٹی بجائی۔ چاق و چوبند اے ایس آئی نے اندر آ کر سیلوٹ کیا۔ ساہی صاحب نے ہدایت کی' ملزم اورنگ خان کو پیش کیا جائے۔

چند منٹ بعد اورنگ خان ہمارے سامنے تھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک تنومند شخص تھا۔ لگتا تھا گرفتاری کے وقت اس نے خاصی مزاحمت کی ہے۔ اس کے نچلے ہونٹ پر ٹانکے لگے تھے۔ ایک آنکھ سوج کر کُپا ہو رہی تھی۔ ہونٹ سے بہنے والے خون نے کپڑے کی جیکٹ کو سامنے سے داغ دار کر رکھا تھا۔ اسے آہنی ہتھکڑی لگی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ نہایت خطرناک شخص ہے۔ ایس پی برکت نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کے پیٹ پر زوردار لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور پھسل کر فرش پر گرا۔ لگتا تھا اس کا دم خم ختم ہو چکا ہے۔ غالباً یہ کلاسیکل قسم کی چھترول کا کرشمہ تھا۔

ایس پی برکت نے کڑک کر کہا۔ "ہاں۔۔۔ جو کچھ ابھی بتایا ہے پھر سے بتا۔ الف سے یے تک۔ کوئی بات چھوٹنی نہیں چاہیے۔ چل ہاں صدقے۔۔۔ شروع ہو جا۔"

اورنگ خان نے اپنی اکلوتی آنکھ سے بڑی کینگی کے

ساتھ ہمیں دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں بولا۔ "کل جب ملک عیسٰی نے اسپتال میں گولی چلایا' ام وہاں قریب ہی موجود تھا۔"

ایس پی برکت نے اپنی چھڑی سے ملزم کی پنڈلی پر زوردار ضرب لگائی۔ "میاں سے نہیں' شروع سے بتا' جہاں سے وہ بھوتنی کا عیسٰی جان مری میں ماں کے چالیسویں پر گیا تھا۔"

ملزم نے جبڑے بھینچ کر چھڑی کی ضرب برداشت کی پھر شکست خوردہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ "ملک عیسٰی ام کو اور قادر زماں کے چند بندوں کو لے کر مری گیا تھا۔ ان کو اطلاع ملا تھا کہ شاہ جہاں وہاں مری میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ نیلی گاڑی کا سراغ تو لگ گیا تھا لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ گاڑی مری میں کس کے پاس اور کہاں دیکھا گیا ہے۔ اس کام میں پورا ایک دن لگ گیا۔ اس چکر میں شاہ جہاں اور اس کا ساتھی لڑکی بنگلے سے غائب ہوگیا۔ ملک عیسٰی منہ سے تو نہیں کہتا تھا لیکن اس کا پکا پکا خیال تھا کہ شاہ جہاں کو پکڑنے میں قادر زماں صاحب نے جان بوجھ کر ڈھیل کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شاہ جہاں پکڑا جائے اور وہ لیڈی ڈاکٹر ناراض ہوجائے جو اس کی حاملہ بیوی کا علاج کررہا ہے۔ مری میں ناکام ہونے کے بعد ملک عیسٰی نے چپکے چپکے فیصلہ کیا کہ ساہی صاحب کی کوٹھی پر ہلا بول کر شاہ جہاں کا بہن کو اٹھالیا جائے۔ پھر شاہ جہاں خود بخود سامنے آجائے گا لیکن کوٹھی پر بڑا سخت پہرا تھا۔ ام نے دو تین دفعہ کوشش کیا لیکن کوئی بس نہیں چلا۔ اس چکر میں امارا ایک بندہ بھی مارا گیا۔ بہرحال اس دوران ام کو پتا چلا کہ ابھی تو امارا اصل دشمن لشکر خاں بھی زندہ ہے۔ لشکر خاں کا کھوج لگانے والا ام خود تھا۔ اتفاق سے شافی کلینک کا پٹھان چوکیدار ظہور گل امارے گاؤں کا ہے۔ وہ دن کی شفٹ میں راوی کے پل پر ٹول ٹیکس والوں کا نوکری کرتا ہے۔ رات کو شافی کلینک میں چوکیداری کرتا ہے۔ جمعے کے روز رات آٹھ بجے ام اس سے ملنے آیا۔ وہ نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ ام اسپتال کے برآمدے میں گھومنے لگا۔ بس وہیں پر ام نے لشکر خاں کو ایک کمرے میں جاتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ ام حیران پریشان رہ گیا۔ ام کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور یقین آتا بھی کیسے' ام سمجھتا تھا کہ لشکر خاں مرچکا ہے۔ ام نے ظہور گل سے پوچھا کہ یہ شخص کب سے یہاں ہے اور اسے کون لایا ہے۔ اس کے بعد ام بھاگم بھاگ ملک عیسٰی کے پاس پہنچا اور اسے سب کچھ بتا دیا۔ ملک عیسٰی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

اس کے دماغ سے شاہ جہاں کا خیال نکل گیا اور لشکر خاں کو مارنے کے لیے وہ مچھلی کے ماند تڑپنے لگا۔ اس سے انتظار نہیں ہوا کہ اگلی رات کا انتظار کرسکے۔ صبح سویرے وہ کلینک کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ جس وقت کلینک میں فائرنگ ہوا' ام ایک پاس کی گلی میں موجود تھا۔ امارے پاس اسکوٹر تھا جو ام نے دو گھنٹے پہلے باوانی باغ کے علاقے سے چھینا تھا۔ پروگرام کے مطابق واپسی پر ام کو ملک عیسٰی کی گاڑی کے ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سوزوکی کار بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس میں قادر صاحب کا پانچ آدمی تھا۔ فائرنگ کے بعد جب ملک واپس ہوا تو سوزوکی کار اس کے ساتھ چل دیا لیکن اسکوٹر تھوڑا آگے جاکر بند ہوگیا اور کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہیں ہوا۔ یوں ام ملک عیسٰی سے بچھڑ گیا۔ ام کو معلوم نہیں تھا وہ کدھر گیا ہے اور کہاں ملے گا۔ امارے درمیان طے تھا کہ اگر کوئی بچھڑ جائے تو وہ راوی کے پار گوہستان ہوٹل" کے دس نمبر کمرا میں پہنچے۔ اس کمرے میں شکر شکرا ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ایک معمولی سا ہوٹل ہے جس کے دماغ میں نہیں آسکتا تھا کہ شکر جیسا شخص اس ہوٹل میں ہوگا۔ ملک عیسٰی سے بچھڑ کر ام کوہستان ہوٹل پہنچا۔ رات ام نے وہاں شکر صاحب کے ساتھ گزارا۔ سویرے امارا گرائیں ظہور گل کوہستان ہوٹل آیا۔ جیسا کہ ام نے بتایا ہے وہ راوی کے پل پر نوکری کرتا ہے۔ اس نے ام کو یہ اطلاع دے کر حیران کردیا کہ اسپتال کا مریض (یعنی لشکر خاں) ابھی تھوڑی دیر پہلے پشاور والا بیٹھ کر لاہور سے نکل گیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بس میں سوار دیکھا تھا۔ بس ٹول ٹیکس دینے کے لیے چند لمحوں کے واسطے رُکا تو ظہور گل کا نگاہ کھڑکی سے لشکر خاں پر پڑا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ لشکر خاں ہے۔ اس نے لشکر خاں کے رُخسار پر گولی کا زخم بھی دیکھا تھا اور یہ زخم دیکھنے کے بعد اس کے لیے شک کا کوئی گنجائش نہیں رہ گیا۔ یہ اطلاع سن کر امارے ساتھ ساتھ شکر صاحب بھی پریشان ہوگیا۔ ام چاہتا تھا کہ ملک عیسٰی کو جلد از جلد اطلاع دے لیکن ہم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ملک عیسٰی اسپتال میں پہرا توڑنے کے بعد کدھر گیا ہے۔ ابھی ام اسی سوچ میں تھا کہ ملک عیسٰی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ سب مسلح تھے اور شافی اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر اکرام سید کو اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ اس کی مدد سے اسپتال کے اندر پہنچ سکیں اور لشکر خاں کا قصہ تمام کر

ام نے ان کو بتایا کہ لشکر خاں اب شافی اسپتال میں نہیں بلکہ لاہور میں بھی نہیں۔ وہ پشاور روانہ ہوچکا ہے۔ بس پھر وہیں بیٹھے بیٹھے امارا پروگرام پشاور پہنچنے کا بن گیا۔ شکر صاحب نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ وہ فوراً مری چلا جائے گا اور اردگرد کے علاقوں میں شاہ جہاں کو تلاش کرے گا۔ جبکہ ملک عیسٰی اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ پشاور روانہ ہوگیا۔ ام بھی ان دس میں شامل تھا۔ ام سب کو علیحدہ علیحدہ مختلف سواریوں پر سفر کرنا تھا۔ عیسٰی جان اور دو ساتھی فلائنگ کوچ پر گیا۔ کچھ لوگ ایک لوڈر پر روانہ ہوا۔ ام کو اور برق نامی ایک شخص کو ریل گاڑی پر جانا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر پولیس کے سادہ پوشوں نے ام کو پہچان لیا۔ برق تو بچ نکلا مگر ام پکڑا گیا۔"

اورنگ خاں نامی اس شخص کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے اس سے چند سوال پوچھے۔ ان سوالوں کے جواب بھی اس نے فرفر دیے۔ ایس پی برکت اسے مسلسل چنگیز خانی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ساہی صاحب نے گھنٹی بجائی اور پولیس والے اسے سہارا دیتے ہوئے باہر لے گئے۔

میرے اندر تہلکہ مچا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "ساہی صاحب! لشکر خاں کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرا خیال ہے مجھے اس کی مدد کو پہنچنا چاہیے۔ یہ تنہا اس کی لڑائی نہیں ہے یہ میری اور ہم سب کی لڑائی ہے۔"

ساہی صاحب بولے۔ "میں اس بات سے غافل نہیں ہوں شاہ جہاں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ لشکر خاں کو تنہا چھوڑ دیا جائے گا۔ صورت حال پر ہماری گہری نگاہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ سے بات کی ہے۔ ایس پی برکت آج رات خود وہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم اس سلسلے میں قطعی بے فکر رہو۔ میرا خیال ہے کہ جھنگ میں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ وہاں کا جو احوال تم نے بتایا ہے وہ بے حد توجہ طلب ہے۔ لگتا ہے ہم کسی انکشاف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعی سود بنیز بڑی کا چکر ہو یا پھر..."

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ کوئی نئی بات ان کے ذہن میں آئی تھی۔ مجھے ان کے چہرے پر جوش کی چمک ماند پڑتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک نگاہ ایس پی برکت پر ڈالی۔ جہاندیدہ ایس پی نے ایک لمحے میں جان لیا کہ ساہی صاحب تنہائی چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی اور اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں ذرا اس بھوتنی دے حوالاتی کو دیکھ لوں۔ ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔"

پتا نہیں وہ کس حوالاتی کا ذکر کررہے تھے۔ ان کے لیے تو ساری مخلوق خدا بلکہ ہر ذی روح اور بے روح چیز بھوتنی کی تھی۔ ایس پی برکت باہر نکل گئے تو ساہی صاحب نے نیا سگار سلگایا اور بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "شاہ جہاں! میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اگر تم اس معاملے سے علیحدہ ہی ہونا چاہتے ہو تو بخوشی ہوسکتے ہو۔ بلکہ میرا خیال ہے تمہیں علیحدہ ہو ہی جانا چاہیے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری بہن اس قدر چاہتی ہے تم کو۔ وہ تمہارے لیے دیوانی ہے۔ خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہوا تو وہ صرف تمہارے ساتھ نہیں اس کے ساتھ بھی ہوگا۔ میں نے اس معاملے میں کافی سوچا ہے۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اگر..."

"ساہی صاحب۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں ان کی بات کاٹی اور اٹھ کھڑا۔ "میں جارہا ہوں۔"

"کہاں؟" وہ قدرے پریشان ہوکر بولے۔

"جہاں مجھے جانا چاہیے۔ چنیوٹ پل والی حویلی میں... گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ جو کچھ آپ کہنا چاہتے ہیں وہ سب میں جانتا ہوں اور اس کے جواب میں صرف اتنا کہوں گا کہ جو کچھ میں کررہا ہوں آپ کے لیے نہیں اپنے لیے کررہا ہوں۔ آپ سمجھیں کہ شکرا اور عیسٰی میرے ذاتی دشمن ہیں۔ اگر آپ مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیں گے تو خدا کی قسم میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ یک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان لمحوں میں وہ ہو بہو فلمی اداکار سنتوش کمار کی طرح لگ رہے تھے۔ ان کے ہونٹ مضبوطی سے بند تھے اور آنکھوں میں نمی کی چمک تھی۔ میرے فیصلہ کن لہجے کی گونج اور کمرے کی خاموشی آپس میں یوں گھل مل گئی تھیں کہ ایک کو دوسری سے جدا کرنا مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ "ساہی صاحب! آپ مجھ پر صرف ایک احسان کریں۔ میری بہن کو اس آگ سے دور رکھیں' پھر آپ دیکھیں کہ میں کیسے ان حرام زادوں کی نیندیں حرام کرتا ہوں۔ میں زمین ان پر تنگ نہ کردوں تو شاہ جہاں نام نہیں میرا۔"

کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی میری۔ میں جذباتی ہونا پسند نہیں کرتا لیکن معلوم نہیں کیوں اس وقت میں جذباتی ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سا جوش میرے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔ مزید کچھ کہے بغیر میں ساہی صاحب کے کمرے سے نکل آیا۔ میرے بدن میں ہلکی سی لرزش تھی۔ سے

سوئی کی وجہ سے نہیں اس پُرجوش لفظ کے سبب تھی جس نے ابھی میرے اعصابی نظام کو تہ و بالا کیا تھا۔ چادر اچھی طرح جسم سے لپیٹتا ہوا میں پولیس اسٹیشن کے احاطے کی طرف بڑھا۔ کسی قریبی کمرے سے ایس پی برکت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کسی حوالاتی پر برس رہے تھے۔ "میں بھوتنی کا بڑا خرد ماغ ہوں۔ روز تیرے جیسے دس اکھٹے بندے سیدھے کرکے سوتا ہوں۔ تو کیا شے ہے کالا کلی! ابھی تیری ماں کا خصم بھی یہاں آکر معافیاں مانگے گا۔"

میں احاطے میں پہنچا تو ایس پی برکت کی چنگھاڑ پیچھے رہ گئی۔ اچانک کسی نے پہلو سے آکر میرے کندھے پر بھاری بھرکم ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ساہی صاحب تھے۔ گمبھیر لہجے میں بولے۔ "شاہ جہاں! شگفتا اور انجم کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آج صبح انہیں لاہور سے باہر ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ میرے سوا کسی کو وہاں کا پتا معلوم نہیں۔ بلکہ میں تمہیں بھی بے خبر رکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھو وہ جہاں بھی ہیں بالکل محفوظ و مامون ہیں اور انشاء اللہ رہیں گی۔"

"تھینک یو سر۔" میں نے کہا۔

ساہی صاحب بولے۔ "ہم اپنی کشا کشی میں اس نرس کو تو بھول ہی گئے اگر وہ اب تک حویلی میں ہے تو ـــــ"

"نہیں سر۔" میں نے ان کی بات کاٹی۔ "وہ اب وہاں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اگلے دس بارہ گھنٹوں میں وہ کہیں نہ کہیں سے آپ کو مل جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ جھنگ پولیس اسے ڈھونڈ بھی چکی ہو۔"

میں نے انہیں مختصر الفاظ میں بتایا کہ حویلی سے روانہ ہوتے وقت میں نے لڑکی کے بارے میں افراہیم کی زبان سے کیا ہدایات سنی تھیں۔

ساہی صاحب نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "اپنا خیال رکھنا شاہ جہاں۔"

"آپ بھی اپنا خیال رکھیں جناب۔" میں نے کہا۔ "آپ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہے ہیں۔"

"وِش یو گڈ لک۔" ساہی صاحب بوجھل لہجے میں بولے۔

میں انہیں خدا حافظ کہہ کر مین گیٹ سے باہر نکل آیا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے بچھڑے ہوئے ہمزاد سے ملاقات ہو گئی ہے۔ کون تھا یہ ہمزاد؟ شاید جہانی تھا۔ وہ جہانی جسے میں نے سیکڑوں زنجیریں پہنا کر اور مصلحت کے شکنجوں میں جکڑ کر ماضی کے ایک تاریک تہ خانے میں دفن کر رکھا تھا۔ اس نے پچھلے چند ماہ میں ایک ایک کرکے اپنے سارے بندھن توڑ دیے تھے او کندھے سے کندھا ملائے میرے ساتھ چل رہا تھا۔

مین گیٹ سے نکلتے ہی سرد ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میرے سامنے بل کھاتی سیاہ سڑک تھی جو شب کے برف زار میں کسی منجمد سانپ کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ چادر میں سے ہاتھ نکال کر میں نے گھڑی دیکھی۔ دس کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں تیزی سے اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں چاہتا تھا کل دس بجے سے پہلے پہلے حویلی پہنچ جاؤں۔

O☆O

میں چنیوٹ کے اسٹاپ پر لوکل بس سے اُترا اور کھیتوں کے درمیان پیدل ہی چلتا ہوا حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ ... بج چکے تھے لیکن فضا میں ابھی تک دھند کے آثار باقی تھے۔ میں نے منہ سر اچھی طرح کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ ... اور چال ڈھال سے میں کوئی مقامی آوارہ گرد ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے پاؤں ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر چل رہے تھے اور ذہن اندیشوں سے برسرپیکار تھا۔ حویلی میں ہمارے ... اور خاص طور پر میرے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ... قیصر اور قادر زماں کے علاوہ ان کے درجنوں ہرکارے مجھے پہچانتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی حویلی میں موجودگی میرے لیے خطرۂ جان تھی۔

میں حویلی میں پہنچا تو کنوئیں پر کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ افراہیم نے چند اور مزدوروں کا بندوبست کر لیا ہوگا لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہی پہلے والے مزدور رہ گئے تھے، صنوبر اور زریں گل۔ صنوبر کنوئیں میں تھا اور مٹی کھود کھود کر بالٹی میں ڈال رہا تھا۔ زریں گل اوپر منڈیر پر کھڑا اور تھا، چرخی کے ذریعے اسے اوپر کھینچ رہا تھا۔ مٹی کی ڈھیری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے کام میں جتے ہوئے ہیں۔ آج افراہیم کے علاوہ ارجمند بھی وہاں موجود تھی۔ ایک کامدار شال اوڑھے، لمبے بال شانوں پر بکھرائے اور ہاتھ بغلوں میں دبائے وہ عین اسی جگہ ڈالے بیٹھی تھی جہاں پہلے اسلحے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ کل کھدائی نہیں کی گئی تھی۔ افراہیم، صنوبر اور زریں گل کو گولہ بارود ڈھونے پر لگا دیا تھا۔ اشیا بے حد احتیاط کے ساتھ احاطے کے اس دور افتادہ کمرے میں پہنچا دی گئی تھیں جہاں تالہ بند چوبی ڈبیوں تین کوارٹر نما کوٹھڑیاں بنی تھیں۔ اب وہ سارا کوڑا بانا

تالا بند کوٹھڑیوں میں منتقل تھا۔ ارجمند بانو کی کرسی کے پاس دو کرسیاں مزید رکھی تھیں۔ سامنے گول تپائی پر چائے کے منقش برتن دھوپ میں چمک رہے تھے۔ افراہیم تپائی کے پاس کھڑا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کے پاس جا کر مؤدبانہ سلام کیا۔ ارجمند تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ایسے ہی ستائشی جذبات افراہیم کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ "ستائش" اس خطرناک ڈیوٹی کے حوالے سے تھی جو میں نے دو دن تک کنوئیں پر انجام دی تھی اور کھدائی کی راہ میں حائل ہونے والی ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ دور کر دی تھی۔

افراہیم نے کہا۔ "ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے حسنے۔ چلو شاباش کپڑے بدل لو۔ راجو کو باہر بھیج دو۔ وہ دونوں مل کر مٹی کھینچیں گے تم کھدائی شروع کرو۔" میں نے فرمانبرداری سے سر جھکایا۔

ارجمند بولی۔ "تمہاری بیوی کا کیا حال ہے؟"

"شکر ہے جی۔ اللہ نے بیٹا دیا ہے۔" میں نے نئے نویلے باپ کی طرح دبے لہجے میں کہا۔

"ویری گُڈ۔" افراہیم نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے تمہیں ہماری ملازمت راس آگئی ہے۔"

دس پندرہ منٹ بعد میں کپڑے بدل کر کنوئیں میں اُتر رہا تھا۔ ارجمند ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ اس کا ہوا میں معلق پاؤں مضطرب انداز میں مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ ایسی ہی اضطرابی کیفیت اس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ ان لمحات میں وہ آنکھیں مجھے ایک انتہائی حریص عورت کی آنکھیں نظر آئیں۔ ایسی عورت جو دولت کی پجارن اور عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ جس کی آنکھوں میں گراں ترین خواب سجے ہوئے تھے اور وہ زر و جواہر کے بستر پر لیٹ کر ان خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف افراہیم بھی نارمل نظر آنے کے باوجود بھی نارمل نہیں تھا۔ اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ دا کسی زبردست اندرونی ہیجان کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہاتھ پشت پر باندھے وہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ کبھی ارجمند کی طرف چلا جاتا تھا اور کبھی منڈیر پر کھڑے ہو کر کنوئیں میں جھانکنے لگتا تھا۔ ان لمحات میں مجھے یہ بات قرین قیاس نظر آنے لگی کہ اس کنوئیں کی گہرائی سے کوئی ہیبت ناک "دفینہ" برآمد ہونے والا ہے۔

میں نے صنوبر کو باہر بلایا اور خود بھی سیڑھیوں پر پاؤں دھرتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ کنوئیں کی گہرائی اب چالیس فٹ سے زائد ہو چکی تھی۔ ... سے برآمد ہونے والی مٹی میں ریت بھی ملی ہوئی تھی۔ مٹی کے ساتھ ملبے کے چھوٹے موٹے اجزا بھی برآمد ہو رہے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ کسّی چلانی شروع کی اور کنوئیں کی گہرائی میں اضافہ کرنے لگا۔

وہ ایک سنسنی خیز دن تھا۔ کنوئیں میں کھدائی کے دوران ہر گھڑی یہ احساس ہو رہا تھا کہ جو کچھ پردۂ راز میں ہے ابھی سامنے آنے والا ہے۔ کوئی مدفون برتن، صندوق یا ایسی شے جس تک ابھی ہمارا تصور نہیں پہنچا تھا۔ آخر کچھ تو تھا جس کے لیے روز و شب ایک کیے جا رہے تھے۔ پانی کی طرح روپیہ بہایا جا رہا تھا اور انسانی جانوں تک کی پروا نہیں کی جا رہی تھی اور جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے تھے وہ ناداں نہیں تھے۔ بے حد فراٹ اور جہاندیدہ لوگ تھے۔ اپنی جیب کی ایک پائی اور اپنے وقت کا ایک لمحہ بے سود نہیں جانے دیتے تھے۔ تمام دن افراہیم اور ارجمند کی بے قراری دیدنی رہی۔ ان کا ہر لمحہ جیسے ایک تنے ہوئے رسّے پر گزر رہا تھا۔ شام تک ہم نے ریت ملی مٹی کے سوا کنوئیں سے اور کچھ برآمد نہیں کیا۔ جب اندھیرا پھیلنے لگا تو ہمیں چھٹی ملی اور ہم تھکے ماندے اپنے کمرے میں آگئے۔

اگلے تین روز تک ہمارے معمولات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ صبح سات بجے اٹھنا۔ منہ ہاتھ دھو کر مقوی ناشتا کرنا، پھر اس مقوی ناشتے کی قوت کو دوپہر تک پسینہ بنا کر کنوئیں میں بہانا۔ دوپہر ایک بجے دو گھنٹے کی چھٹی۔ اس چھٹی میں پُرتکلف اور ڈھیر سارا لنچ لنچ کے بعد تھوڑا سا آرام اور تب ایک بار پھر شام تک کنوئیں میں جان ماری۔ شام کے بعد رات نو دس بجے تک ہم کمرے میں آگ تاپتے تھے، مونگ پھلی، چلغوزے کھاتے تھے، گپیں ہانکتے تھے اور سرگوشیاں کرتے تھے۔ دولت و شباب تو ہم ٹھکرا چکے تھے۔ بہرحال شراب اور کباب باقاعدگی سے مل رہے تھے۔ ان میں سے میں اور صنوبر صرف کباب ہی استعمال کرتے تھے، شراب ہمیں راس نہیں تھی۔ وہ زریں گل کو راس تھی اور وہی اسے استعمال کرتا تھا۔ کنواں اب قریباً پچاس فٹ تک چلا گیا تھا۔ مٹی اور ملبے کے سوا اس میں سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ ہاں کنوئیں کا پختہ گھیرا بدستور مٹی سے برآمد ہو رہا تھا اور جب تک وہ برآمد ہو رہا تھا ہمیں نیچے ہی نیچے اُترنا تھا۔ تنگ کنوئیں میں جھانکنے سے اب خوف آتا تھا۔ سیڑھیوں والا نظام اب درہم برہم ہو چکا تھا۔ اب مجھے اور صنوبر کو رسّے کی کمند نما سیڑھی کے ذریعے نیچے اُترنا پڑتا تھا۔

کھدائی شروع ہونے کے بعد دو دن تک تو افراہیم اور ارجمند خاصے پُرامید نظر آئے تھے اور ان کے چہرے اندرونی

جوش سے تمتما رہے تھے لیکن پھر بتدریج یہ جوش پژمردگی اور مایوسی میں بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اب وہ اُلجھے اُلجھے اور خاموش نظر آتے تھے۔ ہمارے ساتھ بھی پہلے جیسا والہانہ رویّہ برقرار نہیں رہا تھا۔

ان چار دنوں میں ہمیں مسلسل یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں ہماری اصلیت کا بھانڈا بیچ چوراہے پر نہ پھوٹ جائے۔ کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے میں زیادہ وقت کنوئیں کے اندر کام کرتا تھا۔ ایک مفلر مستقل ڈھاٹے کی طرح ہر وقت میرے چہرے سے لپٹا رہتا تھا۔ کام ختم ہوتے ہی ہم کمرے میں گھس جاتے تھے اور شدید ضرورت کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ حویلی میں خاموش طبع غفورے اور چھیل چھبیلی لڑکی سمیت کل تین ملازم تھے۔ ان میں سے کسی کو میں نے کنوئیں کی طرف جاتے نہیں دیکھا بلکہ وہ احاطے میں داخل ہونے سے بھی گریز کرتے تھے۔ ارجمند بانو یا افراہیم کے علاوہ صرف ارجمند بانو کی سیکریٹری احاطے میں آتی تھی یا پھر ایک روز تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک سیٹھ نما شخص موقعے پر پہنچا تھا۔ مجھے قادر زماں کی آمد کا شدید خطرہ تھا لیکن اس کی طرف سے خیریت گزری' وہ اپنی منحوس صورت کے ساتھ حویلی میں دوبارہ دکھائی نہیں دیا۔

پانچویں روز علی الصباح افراہیم نے ہمیں پیغام بھجوایا کہ ہم زیریں منزل پر نہ آئیں کیونکہ پولیس آنے والی ہے۔ پیغام بر ملازم نے یہ بھی بتایا کہ آج کنوئیں پر کام بند رہے گا۔ یہ اطلاع حیران کن تھی۔ منور نے خیال ظاہر کیا کہ ہو سکتا ہے تین افراد کی ہلاکت راز نہ رہ سکی ہو۔ میرا اپنا دھیان بھی اسی طرف جا رہا تھا۔ تاہم دس گیارہ بجے تک ہمارا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ یہ پولیس' دھماکے کی تفتیش کے لیے نہیں' کنوئیں سے نکلنے والے اسلحے کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے آئی تھی۔ ایک ڈی ایس پی' ایک انسپکٹر اور عملے کے قریباً پندرہ افراد تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان میں بم ڈسپوزل یونٹ کے ارکان بھی تھے۔ یہ لوگ دو بڑی جیپوں پر حویلی میں پہنچے۔ ایک نیم فوجی قسم کا جڑے جڑے ٹائروں والا لوڈر بھی ان کے ساتھ تھا۔

منور عقبی برآمدے میں چلا گیا اور اس نے احاطے میں ہونے والی ساری کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ پولیس افسران اور بم ڈسپوزل یونٹ کے ارکان پہلے احاطے کی دور اُفتادہ کوٹھریوں میں پہنچے اور وہاں اسٹور کیے گئے انتہائی مہلک اسلحے کا جائزہ لیا پھر وہ لوگ کنوئیں پر آ گئے۔ بم یونٹ کے کچھ ارکان رسّی کی سیڑھی سے کنوئیں میں اُترے اور پانچ دس منٹ وہاں رہے۔ تب احاطے میں گھاس کے ایک سرسبز قطعے پر کرسیاں ڈال دی گئیں اور پولیس والوں نے چائے وغیرہ پی۔ اس موقعے پر ایک وکیل بھی وہاں موجود تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ افراہیم کا فیملی وکیل ایڈووکیٹ جعفر بخاری تھا۔ خوشاب روڈ کی کوٹھی میں ہماری "مہمانوں" کے حوالے سے افراہیم اور ارجمند ایڈووکیٹ جعفر بخاری کا ذکر کر چکے تھے۔ پولیس قریباً تین گھنٹے حویلی میں موجود رہی۔ دو گھنٹے تو کھانے پینے اور گفتگو میں صرف کیے گئے۔ ایک گھنٹے میں کنوئیں سے برآمد ہونے والا مہلک اسباب لوڈر پر بار کیا گیا۔ قریباً دو بجے پولیس اور تینوں گاڑیاں حویلی سے روانہ ہو گئیں۔ منور نے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام اسلحہ پولیس کو ہینڈ اوور نہیں کیا گیا۔ ایم جی گن' اسٹنگ گرینیڈز سمیت قریباً ایک تہائی ہتھیار خورد بُرد کر گئے ہیں۔

معلوم نہیں اس اسلحے کے بارے میں افراہیم اور ارجمند نے پولیس حکام کو کیا بتایا تھا اور کس طرح انہیں مطمئن کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس سلسلے میں تعلقات استعمال کیے گئے ہوں یا پھر رشوت وغیرہ دینے کی کوشش کی گئی ہو۔ بہر حال ایک بات طے تھی کہ پولیس اتنی بے خبر نہیں تھی جتنا اسے افراہیم اور ارجمند سمجھ رہے تھے۔ میری وساطت سے سب کچھ ساہی صاحب کے علم میں آ چکا تھا اور یقیناً وہ پولیس کو بھی مطلع کر چکے تھے۔

اس رات ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میں گہری نیند سو رہا تھا کہ کوئی بھاری بھرکم شے میرے سینے سے ٹکرائی' جیسے کسی نے سر پر پتھر دے مارا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ کمرے میں طوفان بپا تھا۔ ایک کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سے آنے والی روشنی میں کمرے کا منظر ناقابلِ یقین دکھائی دے رہا تھا۔ میرے سامنے ایک جسیم ضخیم شخص نے منور کو کندھے پر اٹھایا اور بڑی بے رحمی سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ وہ پشت کے بل دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ چارپائی پر گرا۔ اسی وقت میرے جبڑے پر ایک اور زوردار گھونسا پڑا اور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا زریں گل کے قدموں میں گرا۔ زریں گل فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ دو افراد اسے اندھا دُھند پیٹ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سائیکل یا موٹر سائیکل کی چین تھی۔ دوسرا کسی لٹھ قسم کی شے سے مسلح تھا۔ زریں گل کی چیخ و پکار میرے کانوں میں گونجی اور میں پوری طرح ہوش میں آ گیا۔

مجھے زوردار گھونسا رسید کرنے والا اب تپائی اٹھا کر سر سے بلند کر چکا تھا اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ شیشم کی یہ وزنی تپائی میرے سر پر قیامت توڑنے والی تھی۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑی اور تپائی کی مہلک زد سے نکل گیا۔ تپائی پر بڑی قوت صرف کی گئی تھی۔ اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے لپکتے لپکتے اس شخص کی ٹانگ کھینچنا چاہی جو زریں گل کو آہنی چین سے پیٹ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی شخص نے میرے سر پر بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کی۔ آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اس کے بعد پے در پے پسلیوں اور سر پر پڑنے والی ٹھوکروں نے میرا انجر پنجر ہلا دیا۔ حملہ آور انتہائی طیش میں تھے۔ مار پیٹ کے دوران ان کے منہ سے غلیظ گالیاں اُبل رہی تھیں۔

گھمسان کے رن میں اچانک مجھے موقع مل گیا۔ ایک بے تکے شخص کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے اندھا دُھند جھٹکے سے اسے زمین پر گرایا اور پھر پوری قوت سے گھسیٹ کر دیوار سے دے مارا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی۔ اس چیخ نے اس کے ساتھیوں کو ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا دیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین بردار کے پیٹ میں لات رسید کی۔ وہ ڈگمگاتا ہوا کھڑکی سے ٹکرایا اور اس کے شیشے چکنا چور کر کے باہر جا گرا۔ چین بردار نے زریں گل سے توجہ ہٹا کر میری طرف رُخ پھیرا۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ رُخ پھیرنے کے ساتھ ہی اس نے چین بھی گھمائی تھی۔ یہ بڑا مہلک وار تھا۔ چین میرے چہرے کا بھُرتا بنا سکتی تھی لیکن اب میں پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ نیچے جھک کر میں نے وار بچایا اور حملہ آور کو کندھے سے دھکیل کر دیوار سے ٹکرا دیا۔ بالکل اسی انداز میں چند لمحے پہلے منور دیوار سے ٹکرایا تھا۔

عین اسی لمحے زریں گل چیل کی طرح چین بردار پر جھپٹا اور اس سے چین چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ میری نظر منور پر پڑی' وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور دو افراد اسے بے دریغ پیٹ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ پر آہنی گھونسا میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آہنی مکے والے کے پہلو میں ٹانگ رسید کی۔ وہ چھوٹی ٹانگوں والا شخص تھا اور غیر متوازن انداز میں کھڑا تھا۔ میری جچی تُلی ضرب نے اسے فٹ بال کی طرح اچھال کر دہلیز پر پھینک دیا۔ دروازے کی چٹخنی ٹوٹ گئی اور پٹ چوپٹ کھل گئے۔ اچانک حملہ آور بھاگ نکلے۔ چین بردار کی چین کا ایک سرا ابھی تک زریں گل کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ بھاگا تو زریں گل اوندھے منہ دہلیز کے پاس گرا اور چین اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ میں نے تیزی سے حملہ آوروں کا تعاقب کرنا چاہا۔ زریں گل کو پھلانگ کر میں برآمدے میں پہنچا۔ چین بردار مجھ سے قریباً دس گز کے فاصلے پر تھا اور راہداری میں اوجھل ہونے ہی والا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا لیکن ابھی چند قدم ہی بھاگا تھا کہ اندھیرے میں حویلی کا بدحواس چوکیدار مجھ سے ٹکرایا اور میں گرتے گرتے بچا۔

بھاگ جانے والوں کے لیے یہی مہلت بہت تھی۔ میں جب راہداری میں پہنچا تو وہ آخری سرے تک خالی تھی۔ حویلی کی نچلی منزل میں بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں زینوں پر پہنچا تو افراہیم کا خاموش طبع ملازم (جسے ہم چُپ شاہ کہتے تھے) ٹرپل ٹو رائفل سے مسلح سیڑھیاں چڑھتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ارجمند بانو خود تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سلیپنگ گاؤن کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ غالباً اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ میں چُپ شاہ کو ایک طرف ہٹاتا اور کئی کئی زینے پھلانگتا نیچے پہنچا۔ مین گیٹ کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے صحن میں پہنچ کر دیکھا۔ یہ دوسرا چوکیدار تھا جو ہر وقت گیٹ پر رہتا تھا۔ اپنی موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے یا شاید صرف بوکھلاہٹ میں وہ ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر میں دوڑ کر گیٹ کی طرف گیا تو شاید وہ مجھے ہی بھون ڈالے۔ ویسے بھی گیٹ کی طرف جانا فضول تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ حملہ آور اس طرف نہیں آئے۔

چند منٹ کے اندر زریں گل اور چُپ شاہ نے میرے ساتھ مل کر پوری حویلی دیکھ ڈالی لیکن حملہ آوروں کا کھوج نہیں ملا۔ وہ حیرت انگیز طور پر غائب ہو چکے تھے اور کوئی کھوج کُھرا چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ زریں گل زخمی ہوا تھا۔ اس کی قمیص کئی جگہوں سے خون آلود ہو رہی تھی۔ چین کی ایک ضرب اس کی کلائی پر پڑی تھی اور کھال اُدھیڑ کر لے گئی تھی' اب سفید سفید گوشت کے اندر سے مسلسل خون رِس رہا تھا۔ سب سے زیادہ چوٹیں منور کو آئی تھیں۔ آہنی گھونسے اور ٹھوکروں سے اسے بُری طرح پیٹا گیا تھا۔ شاید حملہ آوروں کو تھوڑی سی مہلت اور ملتی تو وہ اس کی "خاص خاص ہڈیاں" توڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک بازو کی ہڈی تو اب بھی سلامت نظر نہیں آتی تھی۔ دونوں ہونٹ پھٹ گئے تھے اور سینے پر بھی گہری ضربات آئی تھیں۔ یہ اس کی ہمت تھی کہ بے ہوش ہوئے بغیر سب کچھ برداشت کر گیا تھا۔ ہمارے واپس پہنچنے سے پہلے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا غسل خانے تک پہنچ گیا تھا اور نل کی یخ بستہ دھار کے نیچے سر رکھ کر

تاوان ☆ 169 ☆ دوسرا حصہ

ناک منہ سے بہنے والا خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابراہیم حویلی میں موجود نہیں تھا۔ صرف ارجمند تھی اور ارجمند کا رویہ عجیب سا تھا۔ وہ ہم سے ہمدردی ظاہر کرنے کے بجائے برہم نظر آ رہی تھی۔ تیکھے لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ "کون لوگ تھے یہ؟"

میں نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے بیگم صاحب۔ ان سب کی صورتیں اجنبی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑے کے شخص نے اپنا چہرہ کپڑے میں چھپا رکھا تھا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" ارجمند بانو میری بات کاٹ کر بولی۔ "ہم نے خود سنا ہے، وہ لوگ تمہارے کمرے کا دروازہ پیٹ رہے تھے اور نام پکار رہے تھے تمہارے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی بیگم صاحب۔" صفدر نے کراہتے اور خون تھوکتے ہوئے کہا۔

"غلط فہمی ہمیں نہیں، تمہیں ہوئی ہے یا پھر جھوٹ بول رہے ہو تم لوگ۔ تم خود بتا رہے ہو کہ انہوں نے چہرے چھپا رکھے تھے، پھر تم نے کیسے جان لیا کہ وہ اجنبی تھے؟"

"سب نے چہرے نہیں چھپا رکھے تھے بیگم صاحب۔" میں نے تصحیح کی۔ "صرف ایک تھا اور آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی اجنبی ہے۔"

"ہمارا خیال ہے کہ ہم تمہیں حویلی میں رکھ کر غلطی کر رہے ہیں۔" ارجمند نے روکھے پھیکے سرد لہجے میں کہا۔ اس کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔ یہ وہ ارجمند بانو نہیں تھی جو چند روز پہلے صفدر کی جرأت اور شرافت کے گن گا رہی تھی اور اسے تاحیات منصب خاص پر سرفراز کرنے کا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔ یہ تو ایک جلی بھنی تند مزاج عورت تھی جس کے چہرے سے کوئی خوب صورت نقاب اتر گیا تھا۔

"ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے بیگم صاحب؟" صفدر نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

"نہیں خطا ہم سے ہوئی ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔ "تم لوگ صبح اپنا حساب کرلو۔ ہمیں یہ روز کی چخ چخ نہیں چاہیے۔ کبھی ہمارے ہاں اس طرح کے تماشے نہیں ہوئے جیسے اب ہو رہے ہیں۔" وہ صفدر سے براہ راست مخاطب ہو کر بولی۔ "ہمارے آدمی نے خود تمہیں دیکھا ہے نچلی منزل پر کھڑکیوں میں جھانکتے ہوئے۔ تمہارا کیا کام تھا اس طرف جھانکنے کا اور مہمانوں کے کمرے میں جانے کا... اور پھر وہ چوروں والا ہنگامہ۔ ہماری تو عقل خبط ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ وہ بندے سب سے بچ کر حویلی میں آئے اور نہ صرف جاگیردار صاحب کے بیڈ روم میں گھسے بلکہ مار دھاڑ کر کے

صاف نکل بھی گئے۔ اب تم لوگ کہہ رہے ہو کہ یہ تیا کرنے والے بھی انجان تھے۔"

صفدر نے سنبھیر لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحب، میرا ہے اب ہمیں چلے ہی جانا چاہیے۔ مالک کو نوکر پہ بھروسہ نہ رہے تو وہ نوکر نہیں رہتا کتا بن جاتا ہے۔ ویسے بھی آپ نکل گیا ہے۔ اب ہمارا جانا ہی بنتا ہے۔"

"تو جاؤ... دفع ہو جاؤ۔" وہ بھڑک کر بولی۔ "تم جاؤ ابھی جاؤ۔ ہمیں نہیں ضرورت تم جیسے منہ ملازموں کی۔ کسی کو ہمارے سامنے نگاہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی، تم زبان چلا رہے ہو۔ ہم منہ توڑ دیا کرتے ہیں اپنے سامنے بولنے والے کا۔" پھر وہ چیپ شاہ سے مخاطب ہوئی اور گرج کر بولی۔ "صادق! آؤ ہمارے ساتھ، ان کی مزدوری منہ پر مارو اور چلتا کرو انہیں۔"

بنا بنایا کھیل بگڑ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیوں ایک دم برہم ہو گئی تھی۔ میں نے صفدر کو آنکھ ماری۔ وہ اپنے زخم کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھا اور عاجزی سے بولا۔ "میں چاہتا ہوں بیگم صاحب! لیکن آپ یقین کریں..."

"آؤ صادق! میرے ساتھ۔" وہ سنی ان سنی کر کے اور پاؤں پٹختے ہوئے زینوں سے اتر گئی۔ یوں لگتا تھا وہ ہر قیمت پر چلتا کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں ابھی ہونے والا ہنگامہ بھی تو "پلانٹڈ" نہیں۔ اس حوالے سے ارجمند ایک سفید جھوٹ بول چکی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ حملہ آور ہمارے کمرے کا دروازہ پیٹ رہے تھے اور ہمارے نام پکار رہے تھے۔ یہ ناممکن بات تھی کیونکہ یہاں ہم نے فرضی نام اختیار کر رکھے تھے۔

صفدر کے زخموں سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ میں اسے کمرے میں لے گیا۔ آتشدان کی راکھ سے خون روکا گیا۔ نچلے ہونٹ کو ٹانکوں کی ضرورت تھی مگر یہاں ڈسپنسری بھی میسر نہیں تھی۔ بہرحال جیسے تیسے کام چلایا۔ بازو سوجتا چلا جا رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے ایک چادر سے پٹی پھاڑی اور فرسٹ ایڈ کی ترکیب کے مطابق اس کا بازو باندھ کر گلے میں لٹکا دیا۔ زریں گل سسکاریاں بھرتے ہوئے اپنی چوٹوں کا مداوا کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ نامعلوم حملہ آوروں کو پشتو اور اردو کی منتخب گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد چیپ شاہ تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ آ دھمکا۔ اس نے تین ہزار روپیہ نقد ہماری طرف پھینکا اور بولا۔ "بیگم صاحب کا حکم ہے کہ ہماری طرف سے

فارغ ہو۔ ابھی جانا چاہو تو بھی ٹھیک ہے۔ بہرحال صبح آٹھ بجے تک حویلی چھوڑ دینا۔"

ایک لفظ مزید کہے بغیر صادق عرف چیپ شاہ واپس لوٹ گیا۔ ہم گم صم بیٹھے تھے۔ بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے، والا معاملہ تھا۔ کیسی بلندی کیسی پستی۔ ایک ہی جھٹکے سے عرش سے فرش پر پہنچ گئے تھے۔ طوطا چشمی کی انتہا تھی۔ بے لحاظی سی بے لحاظی تھی۔ ہمارا وہ اندازہ سو فی صد درست نکلا تھا کہ اس جوڑے نے صرف اپنی غرض کے لیے صفدر کو بانس پر چڑھایا تھا۔ ورنہ لڑائی بھڑائی کے ماہر وفادار نوکروں کی ایسے لوگوں کو کیا کمی ہوتی ہے۔ اشارے کی دیر ہوتی ہے، ایک سے بڑھ کر ایک پالتو خان ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جاتا ہے۔ ہمیں پھانسنے سے ان لوگوں کا اصل مقصد کنوئیں کے گولہ بارود کی جانچ پڑتال تھا۔ بارودی سرنگوں والے علاقے میں فوجی دستوں کی پیش قدمی کے دوران ایک "ڈمی وہیکل" قافلے کے آگے آگے چلتی ہے تاکہ سرنگ پھٹنے سے اصل گاڑیوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ہمیں بھی ان لوگوں نے "ڈمی وہیکل" بنایا تھا۔ ہمیں کنوئیں میں اتار کر اس بات کے منتظر رہے تھے کہ کب ہمارے چیتھڑے اڑتے ہیں مگر ہمارے چیتھڑے نہیں اڑے تھے۔ ہم نے بڑی ہمت اور جانفشانی سے اپنا کام کیا تھا اور گولہ بارود سے بھرے ہوئے کنوئیں کو صاف کر کے ان کے راستے کی ناقابل عبور رکاوٹ دور کر دی تھی۔ ان لوگوں کا مقصد خواہ کچھ بھی تھا اور ہم نے خواہ کیسی بھی نیت سے یہ کام کیا تھا، ارجمند بانو اگر کی نیچی میں انسانیت کی رمق ہوتی تو وہ یوں کھڑے کھڑے ہمیں حویلی سے نہ نکالتی۔

زریں گل بولا۔ "استاد جی! ام نے بہت فلم دیکھا ہے۔ بہت فلم دیکھا ہے۔ ام نے پہلا فلم زیبا اور حبیب کا عید مبارک دیکھا تھا اس کے بعد پچھلے مہینے لگنے والی ندیم اور شبنم کی فلم تک ام نے کوئی فلم چھوڑا نہیں ہے۔ خدا کی قسم، ام نے کسی فلم میں ایسا سین یا رٹ نہیں دیکھا ہے۔ ایک شخص اپنی جان پر کھیل کر ایک عورت کا آبرو بچاتا ہے پھر اس کی خاطر موت کے کنوئیں میں اترتا ہے۔ رانی توپ کے گولے جتنا بڑا بڑا گولا اپنے سینے سے لگا کر باہر نکلتا ہے اور پھر اس کی جھڑکیاں سنتا ہے، اس سے گالیاں کھاتا ہے۔ امارا صفدر صاحب تو خوب صورت ہے۔ سلطان راہی جیسا ہیرو بھی ہوتا تو ہیروئن اس کے صدقے واری جاتا اور لک لک کر گاتا، تم ہی ہو محبوب میرے، خوچہ کیوں نہ تمہیں پیار کروں۔"

میں نے کہا۔ "یہ فلم کی دنیا نہیں ہے بھئی، صرف دنیا ہے۔ یہاں اور طرح کی کہانیاں اور مختلف قسم کے منظرنامے چلتے ہیں۔ اب اپنی ہی طرف دیکھ لو۔ تمہارے لکڑ دادا نے دولت زمین میں دبائی، تمہارے دادا نے تلاش کی انہیں نہ ملی، تمہارے والد نے تلاش کی نہ ملی۔ تم نے تلاش کی نہ ملی۔ سب کچھ ٹائیں ٹائیں فش۔ بتاؤ فلم میں ایسا ہو سکتا ہے؟ فلم بین تو آگ لگا دیں سینماؤں کو اگر اتنی دیر بعد بھی کچھ نہ ملے تو۔"

زریں گل بولا۔ "لیکن امارا کہانی ختم نہیں ہوا استاد جی۔ کیا پتا امارے بچے یا امارے بچے کے بچے کو کچھ مل جائے۔"

میں نے کہا۔ "اس طرح تو ابھی صفدر کی کہانی بھی ختم نہیں ہوئی۔ کیا معلوم جب ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں تو ارجمند بانو کو غلطی کا احساس ہو اور وہ گاتا گاتی ہوئی صفدر کے پیچھے لپکے، اکیلے نہ جانا... وغیرہ وغیرہ۔"

زریں گل قائل ہوتے ہوئے بولا۔ "ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے صفدر سے کہا۔ "بتاؤ بھئی والیو صاحب، کب نکالتی ہے گانے کی چویشن؟ ابھی یا صبح۔ ویسے میرا تو خیال ہے صبح تک ذہیت بنا کر پڑے رہیں یہیں۔ ہو سکتا ہے کہ صبح تک الو کی پٹھی کا پارا کچھ نیچے آ جائے یا ابراہیم ہی کہیں سے لوٹ آئے اور ہماری سفارش کر دے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

صفدر نے شرمیلے دلہا کی طرح منہ میں رومال دبا رکھا تھا۔ اس نے "قبول ہے" کہنے والے انداز میں سر ہلایا، یعنی بتایا کہ صبح جانے والا آئیڈیا حسب حال اور مناسب ہے۔ زخمی ہونٹوں کی وجہ سے اس کے لیے بولنا ممکن نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں بول رہی تھیں اور اپنی تمام تر ٹوٹ پھوٹ کے باوجود وہ مضمحل یا پریشان نہیں تھا۔ مجھے صفدر میں یہ بات بہت اچھی لگی تھی، وہ برے سے برے حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتا تھا اور اکثر اپنی خوش طبعی برقرار رکھتا تھا۔

ہم واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ وہاں سب کچھ تہ و بالا ہو رہا تھا۔ تپائی تین ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک چارپائی کا بازو بھی ٹوٹ چکا تھا۔ دو کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے تھے اور آتش دان کے پاس صفدر کے منہ سے بہنے والا خون دھبوں کی صورت میں موجود تھا۔ سب سے پہلے زریں گل نے یہ خون صاف کیا پھر ہم ادھر ادھر بکھری چیزوں کو ٹھکانے پر رکھنے لگے۔

ہم نے رات سوتے وقت دروازے کو اندر سے چٹخنی

چڑھائی تھی۔ یقیناً حملہ آور پہلے دروازہ دھکیلنے کی کوشش کرتے رہے تھے پھر وہ کھڑکیوں کی طرف آئے تھے۔ اتفاقاً انہیں ایک کھڑکی کھلی مل گئی تھی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے اندر گھسے تھے اور ہم پر پل پڑے تھے۔ ارجمند بانو کی یہ بات بھی سراسر جھوٹ تھی کہ حملہ آور ہمارے کمرے میں گھسنے سے پہلے دروازہ پیٹتے رہے تھے۔ دروازہ پیٹا جاتا تو ہمیں علم کیوں نہ ہوتا' زریں گل ہو سکتا ہے نشے میں ہو لیکن میں اور صفدر تو فوراً جاگ جاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ حملہ آور تھے کون اور انہیں ہم سے کیا دشمنی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں صفدر سے کچھ پوچھتا' وہ منمناتی ہوئی آواز میں خود ہی بول پڑا۔ "میرا خیال ہے جی۔۔۔ ان لوگوں میں وہ لمبا چوڑا بندہ جلال تھا۔"

یہ انکشاف حیرت ناک تھا۔ میں اور زریں گل تعجب سے صفدر کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولا "اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا لیکن ڈیل ڈول' اور قد کاٹھ سو فیصد جلال کا تھا۔"

صفدر کی بات دل کو لگ رہی تھی۔ اس مار دھاڑ میں سب سے زیادہ نقصان صفدر کو پہنچا تھا۔ لگتا تھا اسے خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ اب صفدر نے جو بات بتائی اس سے بہت کچھ واضح ہو رہا تھا۔ اگر یہ ضخیم شخص واقعی جلال تھا تو پھر ان لوگوں نے صفدر سے ان زخموں کا بدلہ لیا تھا جو اس نے دو ہفتے پیشتر اس چار دیواری میں جلال کو لگائے تھے۔ حملہ آوروں کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہمیں قتل یا اغوا کرنے نہیں آئے تھے' فقط ہڈیاں پسلیاں توڑنے کے خواہشمند تھے۔ ان کے "آلات حرب" سے بھی یہ بات عیاں ہوتی تھی۔ صفدر کو انہوں نے بری طرح مارا تھا اور یقیناً وہ اسے مزید نقصان پہنچاتے اگر ہم ان کے آڑے نہ آ جاتے۔

جلال کے حملہ آور ہونے تک تو بات سمجھ میں آتی تھی لیکن بعد کی صورت حال کسی خانے میں فٹ نہیں بیٹھ رہی تھی۔ ارجمند بانو کو یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی کہ حملہ آور ہمارے نام پکار رہے تھے اور کمرے کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ وہ اسی جھوٹ کو جواز بنا کر ہمیں حویلی سے نکالنے کے درپے ہو گئی تھی۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کی تھی کہ جلال جو ہماری اطلاعات کے مطابق پابہ زنجیر تھا' حویلی میں کیسے پہنچا اور اگر حویلی میں ہی کہیں محبوس تھا تو باہر کیسے نکلا اور کیونکر ساتھی جمع کرکے ہم پر حملہ آور ہوا۔ ہنگامے کے بعد ان لوگوں کا آناً فاناً غائب ہو جانا بھی غور طلب تھا۔ اس انداز میں سوچتے ہوئے یہ بات فوراً ذہن میں آتی تھی کہ جلال کو ہم پر حملہ کرنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے یا پھر یہ حملہ ارجمند بانو کی

رضامندی اور آشیرباد سے ہوا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کسی بدلی ہوئی صورت حال میں ارجمند بانو اور جلال مفاہمت ہو گئی ہو اور ہمارا کانٹا صاف کرنے کے لیے ار بانو نے جلال کو استعمال کیا ہو۔ یہ جرم کی دنیا تھی اور یہ حرص و ہوس کا کھیل ہو رہا تھا۔ اس کھیل میں کون کس ساتھ رہتا ہے؟ ہر گھڑی ساتھی بدلتے ہیں اور ہر آن حرکت میں رہتے ہیں۔

وہ شب ہم نے جیسے تیسے اس کمرے میں کاٹی۔ الصباح رائفل بردار جیپ شاہ دروازے کے آس پاس منڈلانے لگا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ہمیں تما بلاچوں وچرا حویلی چھوڑنا ہو گی۔

میں نے جیپ شاہ کے پاس جا کر نرمی سے کہا۔ "ہم صاحب' کچھ تم ہی ہماری مدد کرو اور نہیں تو بیگم جی سے مرتبہ بات ہی کرا دو۔"

جیپ شاہ کا جواب جتنا مختصر تھا اس سے زیادہ خشک تین لفظوں میں اتنی "خشکی" شاید ہی کوئی سمو سکتا ہو۔ "؟ دو جی" یہ تھا اس کا جواب۔

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی میں کمرے میں واپس آیا اور تھوڑی دیر میں ہم اپنے لتے سنبھال کر حویلی سے نکل رہے تھے۔

O☆O

"اب کیا پروگرام ہے استاد جی؟" حویلی سے دو میل دور آنے کے بعد زریں گل نے پوچھا۔ ہم بے مقصد چلتے جنوب کی سمت جا رہے تھے۔ دائیں بائیں کافی فا اب کھیت نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔

"آوارہ گردوں کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔" میں زریں گل کو جواب دیا۔ "ہاں ان کو پکڑنے کے پرو ضرور بنائے جاتے ہیں۔ بس خاموشی سے چلتے رہو۔ کہ کوئی ہمیں بھی پکڑنے پہنچ جائے۔"

"پکڑے گا تو کیا ہو گا؟ ناشتا تو کرائے گا ناں۔" زریں نے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

"ہاں بھوک تو لگ رہی ہے۔" صفدر نے منمنا کر تائید کی۔ بولتے وقت وہ ہونٹوں کو آزادانہ حرکت نہیں سکتا تھا۔

زریں گل نے کہا۔ "لیکن صفدر صاحب' تم کچھ کیسے؟ تم سے تو بولا بھی نہیں جا رہا۔ ایک فلم میں بدر ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ پشتو فلم تھا۔ اس میں بد نام جابر خان تھا۔ ہیروئن نادرہ یعنی مسرت شاہین ا

چاچا کی بیٹی ہوتا ہے۔۔۔" بولتے بولتے زریں گل اچانک چپ ہو گیا۔ اس کی نگاہ دور ایک کھیت پر جمی ہوئی تھی۔ نظر کو فوکس سیٹ کرتے ہوئے بولا۔ "استاد جی' ام کو دھوکا ہو رہا ہے یا وہ واقعی مکئی کا کھیت ہے۔"

"ہاں کھیت تو مکئی کا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو کیوں نہ بھٹے توڑیں وہاں سے۔ ماچس امارے پاس ہے۔ ادھر لکڑی ٹکڑی جلا کر بھون لے گا۔"

میں نے زریں گل سے کہا۔ "تجویز تمہاری ایسی بری تو نہیں لیکن پنجابی میں کہاوت ہے کہ چوری لکھ دی دی تے ککھ دی دی۔ یعنی چوری' چوری ہی ہے' چاہے تنکا چرا لو یا لاکھ روپیہ۔ میرا خیال ہے پشتو میں بھی اس سے ملتی جلتی کہاوت ضرور ہو گی۔"

وہ بولا۔ "جی ہاں۔۔۔ کہاوت تو بڑا سخت ہے لیکن بھٹوں کے بارے میں نہیں ہے اور پھر مجھے دو تین اور کہاوتیں بھی یاد آ رہا ہے۔ ان کہاوتوں سے اس پہلے والی کہاوت کا توڑ ہو جاتا ہے۔"

میں نے رائے طلب کرنے کے لیے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے خونچکاں لبوں کو زحمت کلام دیتا' دور ایک گاڑی کے آثار نظر آئے۔ یک لخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کافی فاصلے سے بھی میں پہچان گیا تھا۔ یہ افراہیم کی سفید جیگوار تھی۔ وہ حویلی کی جانب سے آ رہی تھی اور اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ہمارے قریب پہنچ گئی۔ اس میں افراہیم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ہمیں پہچانتے ہی افراہیم نے بایاں کنارہ لے لیا اور ہمارے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ ہم بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ افراہیم کے چہرے سے اس کے موڈ اور ارادے کو بھانپنا خاصا دشوار تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا' وہ گاڑی سے اتر کر ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔ ممکن تھا اس کا رویہ دوستانہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ارجمند بانو سے بڑھ چڑھ کر ہمارے لتے لے۔ آخر وہ اسی کی بیوی تھی اور زوجہ کی غلامی افراہیم جیسے زائد العمر خاوندوں کو اکثر راس ہوتی ہے۔

افراہیم دروازہ کھول کر باہر نکلا اور عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ "شکر ہے بھئی' جلدی مل گئے ہو۔ مجھے تو خدشہ تھا کہ شاید جھنگ تک دوڑ لگانی پڑے۔"

افراہیم کے نرم رویے کے جواب میں ہم تینوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ وہ صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیچ فٹ۔ تمہاری تو صورت نہیں پہچانی جا رہی۔۔۔ چلو۔۔۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہو گا۔"

میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "صاحب جی! بیگم صاحب نے ہمیں بہت برا بھلا کہا ہے۔ بس دھکے دے کر نکالنے کی کسر رہ گئی ہے جی۔ وہ کہتی ہیں۔۔۔"

"بھئی چھوڑو ان کی بات" افراہیم نے بے تکلفی سے مجھے ٹوکا۔ "وہ ذرا پریشان ہو رہی ہیں آج کل۔ تم نے دیکھا ہے کئی دنوں سے گم صم ہیں۔ ایسے میں تو وہ ہر کسی سے الجھ پڑتی ہیں۔ چند دن بعد خود ہی افسوس کرنے لگیں گی۔۔۔ بہادر آدمی ہو تم تو' خواہ مخواہ دل چھوٹا نہیں کرتے۔"

زریں گل بولا۔ "ام پر انہوں نے بہت الزام لگایا ہے صاحب جی۔ امارا دل۔۔۔"

"او خان! چھوڑو دل کو۔" افراہیم نے اس کی بات کاٹی۔ "ہم تمہارا دل جوڑ دیں گے' چلو شاباش۔۔۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔" افراہیم نے زریں گل کو باقاعدہ دھکیل کر گاڑی کی طرف بڑھایا۔ پھر ہمیں بھی گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم جیگوار کی خوشگوار حرارت میں لگژری نشستوں پر بیٹھے واپس حویلی کی سمت جا رہے تھے۔ یہ کایا پلٹ ہم تینوں کے لیے حیران کن تھی۔ یہ بات تو سو فی صد یقینی تھی کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس میں کسی "نیک ارادے" کا دور دور تک عمل دخل نہیں۔ جال کے بیچ سے جال ہی اگنا تھا۔ اب کہاں اگنا تھا؟ کس انداز سے اور کب اگنا تھا؟ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ راستے میں افراہیم نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک ضروری کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ کوئی تاریخ وغیرہ کا چکر تھا۔ واپس آیا تو اس معاملے کا پتا چلا' وہ فوراً ہمیں ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

حویلی سے ایک میل ادھر ہی جیگوار دائیں طرف نشیب میں اتر گئی اور ایک نہر کی "سڑک جیسی ہموار" لیکن کچی پٹڑی پر سفر کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ہم حیران تھے کہ حویلی کا جھانسا دے کر یہ الو کی پٹھی کا میاں ہمیں کدھر لے جا رہا ہے۔ وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہی ممکن تھا کہ حویلی میں اس نے ارجمند بانو کو سخت سست کہا ہو اور اسی بات پر پیچ و تاب کھایا ہوا ہو کہ اس نے ہم تینوں کو حویلی سے چلتا کرکے حویلی کے "سربستہ رازوں" کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب وہ ان رازوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک ایک تولہ سیسہ ہمارے سینوں میں اتارے اور جسد خاکی کسی پر فضا جگہ پر گاڑ کر ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس حویلی چلا جائے' یا ہمیں کسی عقوبت خانے میں لے جائے اور زبانیں کاٹ دے یا ٹھکا ٹھکا کر یادداشت پگھلا ڈالے۔ سب کچھ ہو سکتا تھا اور "کچھ

نہیں" بھی ہو سکتا تھا۔

اڑھائی تین میل کے سفر کے بعد گاڑی ایک پھاٹک کے قریب سے غیر ہموار راستے پر اتری اور چند فرلانگ تک ہچکولے کھانے کے بعد ایک چھوٹی سی چار دیواری کے سامنے جا کر رکی۔ گھنے درختوں میں سے یہ تین کمرے کا پختہ مکان اچانک ہی نمودار ہو گیا تھا۔ یہ پودوں کی نرسری تھی۔ درختوں کے درمیان تین چار کنال جگہ میں پھلواری تھی۔ اس پھلواری کا ایک سرا نہر کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ مکان کے صحن میں اور صحن سے باہر دور تک مٹی کے چھوٹے بڑے گملے اور پودے نظر آ رہے تھے۔ کھاد کے ایک بڑے ڈھیر کے پاس موٹے جسم کا سست سا شخص چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ گاڑی دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور احترام آمیز عجلت کے ساتھ ہماری طرف لپکا۔ غالباً وہ گاڑی کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے افراہیم باہر آ چکا تھا۔ فربہ اندام شخص نے دُہرے ہو کر سلام کیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ افراہیم سے مصافحہ کرنے کے بعد ناف پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شکل و صورت سے یہ شخص اچھا خاصا رنگیلا لگتا تھا مگر افراہیم کے روبرو بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔

افراہیم نے کہا۔ "سلطانے! یہ تینوں تمہارے مہمان ہیں۔ ان کی خاطر تواضع میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ تین چار روز یہاں رہیں گے۔ یہ راجو ہے۔ یہ حسانال اور یہ زریں پہلوان۔ راجو کو گہری چوٹیں لگی ہیں۔ تم فوراً گاؤں جاؤ اور ڈاکٹر کو لے آؤ مگر یہ کام بڑی راز داری سے ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر کو بھی سمجھا دینا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

سلطان نامی شخص نے سر جھکا کر اپنی اطاعت مندی کا اظہار کیا۔ افراہیم نے بیک وقت ہم تینوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم بے فکری سے یہاں رہو۔ میں کل یا پرسوں چکر لگاؤں گا پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ بس ایک بات ذہن میں رکھو۔ تم تینوں کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔ پکی ملازمت ہے تمہاری۔ کوئی کام ہو یا نہ ہو تمہیں تنخواہ اور دوسری سہولتیں ملتی رہیں گی۔ بیگم صاحبہ زبان کی جتنی سخت ہیں، دل کی اتنی ہی نرم ہیں اور وہ قدر دان بھی ہیں تمہاری۔ انہیں معلوم ہے تم نے نوکری میں کتنی بے خوفی اور محنت سے کام کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے کوئی ناراضگی نہیں رکھیں گی۔ بلکہ میں خود ان سے تمہاری صلح کرا دوں گا۔"

ہمیں تسلی تشفی سے نواز کر اور اپنی دانست میں پوری طرح مطمئن کر کے افراہیم نے ہمیں سلطان نامی شخص کے سپرد کر دیا اور اسے مزید کچھ ہدایات دے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ کچے راستے کی دھول اڑاتا سڑک کی طرف جا رہا تھا اور ہم اپنے ست الوجود میزبان کے ساتھ مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک کشادہ کمرے میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ وہیں ایک طرف پولی تھین کے چھوٹے چھوٹے لفافوں میں بہت سی پنیری رکھی گئی تھی۔ ہمیں کمرے میں بٹھا کر سلطان فوراً ڈاکٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اسکوٹر پر گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھ گھنٹے میں ہوئی۔ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر شخص گرم چادر اور اونی ٹوپی اوڑھے بیٹھا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ایم بی بی ایس نہیں بلکہ دیہاتی ڈاکٹر ہے۔ دیہات کے یہ ڈاکٹر عموماً کمپاؤنڈر حضرات ہوتے ہیں یا پھر ایسے عطائی جو حکمت، ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی وغیرہ کو ملا کر ایک نیا طریقۂ علاج ایجاد کر چکے ہیں۔ عرف عام میں اس طریقۂ علاج یا طریقۂ واردات کو کھچڑی پیتھی کہا جاتا ہے۔

اسکوٹر کی پچھلی نشست سے اترنے والے ڈاکٹر صاحب کا نام غلام رسول تھا۔ ایک بڑا سا چرمی بیگ ان کے ہاتھ میں تھا۔ جب بیگ کھلا تو پتا چلا کہ اس میں ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے جو بدگمانی ہمارے دلوں میں پیدا ہوئی تھی اس میں کمی واقع ہو گئی۔ رہی سہی بدگمانی اس وقت دور ہو گئی جب انہوں نے بڑے ماہرانہ انداز میں ہونٹ کے زخم کو دیکھا اور انجکشن دینے کے بعد ٹانکے لگانے شروع کیے۔ اعتماد اور مہارت میں غلام رسول بڑے اسپتال کے سرجن سے کم نہیں تھا۔ بڑی صفائی تھی اس کے ہاتھ میں۔ یوں لگا کہ صفدر کی پھٹی ہوئی باچھ کو ٹانکوں کے بجائے گوند سے جوڑ دیا گیا ہے۔ باقی زخموں کو بھی اس نے جراثیم کش محلول سے دھونے کے بعد مناسب ٹریٹمنٹ دے دی۔ بازو کے بارے میں وہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہڈی ٹوٹی نہیں صرف "کریک" وغیرہ آئی ہے۔ سردی کے سبب کلائی میں خون جم گیا تھا اور صفدر تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ غلام رسول نے ویٹو جینو لگانے کے بعد کلائی پر روئی رکھی اور پٹی باندھ دی۔

بعد ازاں زریں گل کے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی۔ آہنی چین کی ضربوں نے کئی جگہ سے اس کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے سر پر لمبا زخم بھی تھا۔ غلام رسول نے درد کش اور خواب آور انجکشن لگا دیے لہٰذا وہ تھوڑی ہی دیر میں دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سو گیا۔ ہم نے اس پر لحاف ڈالا اور خاموشی سے باہر آ گئے۔

سورج اب کافی اوپر آ چکا تھا۔ قرب و جوار سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ غلام رسول نے مجھے صفدر کے لیے دوا دی اور دوا کے اوقات وغیرہ سمجھانے کے بعد رخصت ہو گیا۔ اس دوران سلطان کا تیز طرار ملازم ہمارے لیے ناشتا لے آیا تھا۔ یہ ناشتا مکئی کے میٹھے پراٹھوں، گرم دودھ اور باقرخانی پر مشتمل تھا۔ ناشتا دیکھ کر ہمارے مردہ اجسام میں روح پھونکی گئی۔ مکئی کے پراٹھے دیکھ کر میں نے زریں گل سے کہا۔

"دیکھو یہ وہی بھٹے ہیں جنہیں ہم چرانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہم اپنے ارادے سے باز رہے اس لیے وہ بھٹے قدرت نے بہتر صورت میں ہمارے دسترخوان پر سجا دیے۔"

زریں گل مسکرا کر رہ گیا۔ کیف آور دھوپ میں بیٹھ کر لذیذ تر ناشتا کرنا ایک خوشگوار تجربہ ہوتا لیکن سلطان نے کہا کہ ناشتا اندر کمرے میں کرنا چاہیے۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ رسک لینے سے ڈر رہا ہے۔ نہیں چاہتا کہ ہم صحن میں بیٹھیں اور کوئی راہ گیر یا آتا جاتا شخص ہمیں دیکھ لے۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے ہم نے بڑے سکون سے اس الگ تھلگ مکان میں گزارے۔ صرف ایک دقت تھی۔ وہ نہر کا کنارہ تھا اور ہر طرف سبزہ تھا۔ لہٰذا سردی بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ رات اور دن میں کسی بھی وقت انگیٹھی سے جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ تیسرے دن نو دس بجے کے قریب افراہیم اپنی سرخ جیپ میں نرسری پہنچا۔ وہ بڑی نرمی سے پیش آیا۔ اس نے ہمارا حال احوال پوچھا اور بتایا کہ چند دن بعد ایک اور حویلی میں کام شروع ہونے والا ہے۔ وہ ہمیں وہاں لے جائے گا اور ہماری خواہش کے مطابق کوئی آسان کام ہمیں سونپ دے گا۔ وہ کافی جلدی میں نظر آتا تھا۔ کچھ دیر سلطان سے باتیں کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

ہمارا خیال تھا کہ اب افراہیم سے جلد ملاقات نہیں ہو گی اور اگلے آٹھ دس روز ہمیں اسی یخ بستہ مکان کی محدود چار دیواری میں تاش کھیل کر یا سو کر گزارنے ہوں گے لیکن تیسرے ہی روز افراہیم پھر آ دھمکا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ ہمارا کھانا مالی بشیر لے کر آتا تھا۔ وہ سلطان کا راز دار ملازم تھا اور ہر لحاظ سے اپنے مالک کی ضد تھا۔ سلطان سست اور پیٹو تھا۔ مالی بشیر دبلا، پھرتیلا اور کم خور تھا۔ سلطان خوشحال، باتونی اور بارعب تھا، مالی بشیر غریب، کم گو اور مسکین تھا۔ اور یہ تضاد ہر معاملے میں نظر آتی تھی۔ مالی بشیر ہمارا کھانا سفید گدھے پر لاتا تھا اور سلطان خالی برتن اپنے کالے اسکوٹر کی ڈگی میں رکھ کر واپس لے جاتا تھا۔ مالی بشیر دوپہر سے تھوڑی دیر قبل گاؤں سے آتا تھا۔ اس کے گدھے پر اکثر مٹی کے پختہ گملے لدے ہوتے تھے۔ ان ہی گملوں میں وہ کبھی بڑی احتیاط سے کھانے کے ڈبے بھی رکھ لیتا تھا۔ کسی وقت وہ یہ برتن چارے کے گٹھوں میں رکھ کر لے آتا تھا۔ بہر طور ہمارا کھانا خاص رازداری سے نرسری میں پہنچایا جاتا تھا۔ شروع شروع میں گدھے پر لد کر آنے والا کھانا کھاتے ہوئے زریں گل نے ناک بھوں چڑھائی لیکن ویسا پُرتکلف کھانا کسی بھی جانور پر لد کر آتا تو قابل نوش تھا۔ ایک دو روز میں زریں گل کو کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔

اس رات بھی ہم بکرے کی بھنی ہوئی چانپوں سے انصاف کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب انجن کی آواز سنائی دی اور ابراہیم کی جیگوار بڑی شان سے نرسری کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

افراہیم اوور کوٹ میں تھا۔ گلے میں مفلر اور ہاتھوں پر دستانے تھے۔ اگر اس نے فلیٹ ہیٹ بھی پہن رکھا ہوتا تو کسی جاسوسی فلم کا کردار لگتا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ اس کی چشمہ پوش آنکھوں میں دبا دبا جوش کروٹیں لے رہا ہے۔ سلطان اس وقت نرسری میں نہیں تھا۔ ہم تینوں نے اٹھ کر اسے سلام کیا۔ اس نے بتایا کہ ہمیں فوراً اس کے ساتھ چلنا ہے۔

ہم نے کون سا بوریا بستر لپیٹنا تھا۔ فالتو چادریں جھاڑ کر کندھوں پر رکھیں۔ گرد آلود جوتے پہنے اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اتنی دیر میں سلطان بھی اپنا اسکوٹر گھڑگھڑاتا ہوا پہنچ گیا۔ افراہیم نے اسے ایک جانب لے جا کر چند باتیں کیں اور پھر ہمیں شاندار جیگوار میں لاد کر نرسری سے روانہ ہو گیا۔ نجانے کیسی قسمت لے کر "تیار" ہوئی تھی یہ جیگوار بھی۔ اس کے نیچے تھرڈ کلاس راستہ تھا۔ اس کے اوپر خستہ حال لوگ بیٹھے تھے اور وہ سرسوں کے کھیتوں میں ہچکولے کھاتی کسی "کھنڈر چار دیواری" کی طرف جا رہی تھی۔

افراہیم نے ہمیں اپنی منزل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن غالب خیال یہی تھا کہ ننھے پل والی حویلی سے مکمل طور پر مایوس ہونے کے بعد وہ لوگ اب کسی اور جگہ قسمت آزمائی کر رہے ہیں۔ یہ جگہ کوئی حویلی بھی ہو سکتی تھی، کوئی کھنڈر بھی اور کوئی ایسا مقام بھی جو ابھی تک ہمارے تصور میں نہیں تھا۔ جو کچھ ہمیں معلوم تھا وہ یہ تھا کہ ایک مخصوص علاقے میں پرانی اور بے آباد جگہوں پر بے حد اہتمام کے ساتھ کچھ ڈھونڈا جا رہا ہے۔

ہم تینوں خاموش تھے اور یقینی بات ہے کہ اپنی اپنی جگہ اس سفر کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے۔ یہ سفر طویل بھی ہو سکتا تھا اور مختصر بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ افراہیم نے اس یخ بستہ موسم میں ہم کو رات نو بجے آ دبوچا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ہمیں کہیں دور لے جانا چاہتا ہو یا پھر رازداری کے پیش نظر اس نے یہ وقت چنا ہو۔ ڈھائی تین میل سڑک کی پٹڑی پر سفر کرنے کے بعد جیکوار نے دائیں طرف ٹرن لیا اور ہمارے بیشتر اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ گاڑی چنے تلی والی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ نوے فی صد امکان تھا کہ وہ اسی جانی پہچانی چار دیواری میں جا رہی ہے۔ افراہیم نے اپنے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا رکھی تھی۔ جب تک وہ خود یہ مہر نہ توڑتا ہم اسے بولنے پر آمادہ نہیں کر سکتے تھے۔

قریباً بیس منٹ میں ہم حویلی کے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ پوری حویلی تاریکی میں غرق تھی۔ نہ روشنی نہ کہیں کسی متنفس کے آثار۔ گیٹ پر ایک وزنی قفل "چوکیداری" کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ افراہیم نے خود نیچے اتر کر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں قفل کھولا اور گاڑی کو اندر احاطے میں لے جا کر بند کر دیا۔ افراہیم کی مسلسل خاموشی اب کچھ پُر اسرار سی ہو گئی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات چغلی کھا رہی تھیں کہ اس کے اندر ایک ہیجان برپا ہے اور وہ اس ہیجان کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ گاڑی سے اتر کر اس نے اندرونی دروازے کا بھی قفل کھولا۔ پھر اندھیرے میں ٹٹول کر ایک بلب روشن کیا اور ہمیں لے کر نشست گاہ میں آ گیا۔

حویلی میں ہر شے اسی طرح تھی جس طرح ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ وہی آرائش و زیبائش اور قدیم طرز کا طمطراق۔ تاہم کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ افراہیم نے ایک منقش تپائی سے ٹارچ اٹھا کر روشن کی اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ طویل راہداری ٹارچ کی روشنی میں طے کر کے ہم حویلی کے عقبی احاطے میں پہنچے۔ سب کچھ تیرگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف "پمپنگ مشین" کے قریب ایک کول کوٹھری تھی۔ افراہیم نے ٹارچ کی روشنی میں اس کا دروازہ کھولا اور ہمیں لے کر شکستہ زینوں پر آ گیا۔ یہ زینے ہم نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ یہ نیچے اترتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ حویلی کے تہ خانے میں جاتے ہیں۔ تاہم یہ تہ خانہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پندرہ بیس زینے اترنے کے بعد ہم ایک آہنی دروازے پر پہنچے۔ دروازے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ خستہ حال گرد و پیش میں یہ چم چم کرتا دروازہ حال ہی میں نصب کیا گیا ہے۔ دروازے کا قفل کھول کر افراہیم ہمیں حویلی کے وسیع تہ خانے میں لے آیا۔ جدید "بیس منٹ" کے برعکس ا... تہ خانے کی چھت کافی اونچی تھی۔ لمبائی کے رُخ پر یہ تہ قریباً اسی فٹ اور چوڑائی کے رُخ پچاس فٹ سے زائد چھت کو سہارا دینے کے لیے دو قطاروں میں ستون کھڑے کیے گئے تھے۔ یہ ستون، چھت اور دیواریں سب نانک چندی اینٹوں کا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ چکا تھا۔ زمین دوز مقامات کی مخصوص بو اس تہ خانے میں بسی تھی۔ افراہیم نے یہاں سوئچ کر لائٹس روشن کر دیں۔ یہ کچھ وضاحت سے ہماری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ تہ خانے کے پختہ فرش کو جگہ سے اکھاڑا گیا ہے اور عین وسط میں باقاعدہ گڑھا کھودا جا رہا ہے۔ جس سے نکلنے والی مٹی دو ڈھیروں میں ستون کے ساتھ پڑی ہے۔ افراہیم کی آنکھوں میں کروٹیں لیتا ہیجان اب زیادہ واضح صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کا چہرہ اندرونی ہیجان سے تمتما رہا تھا۔ وہ اپنی کیفیت کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کو یہاں ... ہے جتنے دن کام ہو گا' تم یہیں رہو گے۔ میں نے تمہارے کھانے پینے کا سارا بندوبست اندر ہی کر دیا ہے۔ وہ الیکٹرک ہیٹر ہے۔ تم اس پر کھانا وغیرہ پکا سکتے ہو۔ وہ والا دروازہ کمرے کا ہے' اس میں ضروری برتن اور موجود ہے۔ تمہاری چارپائیاں اور بستر وغیرہ بھی کمرے میں رکھے ہیں۔ تمہیں کسی ضرورت کے لیے تہ خانے سے نہیں جانا پڑے گا۔"

"لیکن ہمیں کرنا کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہی جو اس سے پہلے کنوئیں میں کرتے ر... کھدائی کرنی ہے۔ کھدائی کا سامان وہ سامنے رکھا۔ مزید کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دو لیکن گھبرانے کی نہیں' یہاں سے کوئی بانو نہیں' صرف مٹی نکلے گی۔"

"دھنگ... میرا مطلب ہے۔ کیونکہ" صفدر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"شاید تم کھدائی کی وجہ جاننا چاہتے ہو" افراہیم نے کہا۔ "یہ تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے۔ پھر بھی تمہیں بتا دوں گا' لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں خود بھی زیادہ نہیں جانتا۔" پھر ایک دم بات بدل کر صفدر سے کہنے لگا۔ "اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔ کام کر سکو گے یا نہیں؟"

"کیوں نہیں جناب۔" صفدر نے قربان جانے والے انداز میں کہا۔ "مٹی ہی کھودنی ہے' کوئی لوہا تو نہیں توڑنا۔"

"ونڈرفل۔" افراہیم کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "تم تینوں کی یہی بات مجھے پسند ہے۔ ہر گھڑی ہر طرح کے کام کے لیے تیار ــــ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارا ساتھ ٹوٹتے ٹوٹتے پھر بن گیا ہے ــــ چلو آؤ اسی خوشی میں میرے ساتھ پیگ ــــ کم آن ــــ کم آن لیٹ اس انجوائے بی فور ورک ــــ"

وہ آج بالکل بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی پُرجوش آواز تہ خانے کی پختہ دیواروں میں گونج کر عجیب سا تاثر ابھار رہی تھی۔ اس نے الیکٹرک ہیٹر آن کیا' اپنا اوورکوٹ اتار کر دور پھینک دیا اور ایک کہنہ سال چوبی الماری سے جانی واکر کی دو بوتلیں نکال کر مٹی کے ڈھیر پر پھینک دیں۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک تھی اور یہ چمکیلی آنکھیں فرش کے ناہموار گڑھے کو دیکھ کر اور بھی چمک اٹھی تھیں۔ یہ وہی کیفیت تھی جو آٹھ نو روز پہلے کنوئیں کی کھدائی کے دوران افراہیم اور ارجمند کے چہرے پر نظر آئی تھی۔ آج ارجمند بانو ہماری نگاہوں کے سامنے موجود نہیں تھی' صرف افراہیم تھا اور اس کا تمتمایا ہوا چہرہ تھا۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ کھیل جو اس سے پہلے ارجمند اور افراہیم مل کر کھیل رہے تھے' آج افراہیم تنہا کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کھیل میں افراہیم کو کامیابی کا اتنا یقین آج سے پہلے کبھی نہیں تھا۔

"راجو' کھولو ان بوتلوں کو اور گلاسوں میں بھر دو۔" افراہیم نے صفدر کو حکم دیا۔

صفدر نے بھنچے بھنچے انداز سے میری طرف دیکھا اور چوبی الماری سے چار گلاس نکال لایا۔ میرے اور صفدر کے لیے یہ صورت حال بڑی کٹھن تھی۔ اس سے پہلے ہم حویلی میں روزانہ ایک یا ڈیڑھ بوتل برباد کر کے یہ ظاہر کرتے تھے کہ تینوں مے نوش ہیں۔ آج خود پر لیا ہوا یہ الزام جھوٹا ثابت ہو رہا تھا۔ اگلے بیس تیس منٹ ہمارے لیے بڑے کٹھن تھے۔ جان بچانے کے لیے تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اس سے ملتی جلتی صورت حال تھی۔ ہم نے "کچھ" آگ حلق میں اور "زیادہ" دائیں بائیں انڈیل کر یہ وقت کاٹا۔ افراہیم بڑے جوشیلے انداز میں پی رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی آواز بھاری اور آنکھیں خمار آلود ہو گئیں۔ اس نے کوٹ بھی اتار دیا اور اسکارف کی طرح گلے سے لپٹا ہوا مفلر ڈھیلا کر دیا۔ بے انتہا خوش نظر آ رہا تھا وہ۔ ہماری موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو شاید وہ ناچنے لگتا۔ وہ گڑھے کے گرد یوں چکرانے لگا جیسے پروانہ' شمع کا طواف کرتا ہے پھر اندرونی مسرت و انبساط کے ریلے میں بہہ کر اس نے بوتل منہ سے لگائی اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔

اس کی چال میں اب لڑکھڑاہٹ آ رہی تھی۔ کچھ دیر صفدر کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بے تکلفی سے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے اور بوجھل لہجے میں بولا۔ "تم جانتے ہو وہ کیا چکر تھا؟ جانتے ہو تم؟ وہ حرامی جلال۔ جس سے تم نے میری بیوی کی جان چھڑائی تھی' پتا ہے کون ہے؟ وہ یار ہے میری بیوی کا۔ ہا ہا ــــ بیوی! ایسی کمتی عورت کے لیے یہ لفظ تو استعمال ہی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ عورت نہیں بلا ہے۔ جوان خون پینے والی' بے شرم' بے حیا' بدکار۔ میں اس حرامی جلال کو فوراً پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر کی معشوقہ جاگ اٹھی۔ کہنے لگی' نہیں ابھی اسے حویلی میں ہی بند رکھو۔ میں جانتا تھا' وہ کیوں ٹال مٹول کر رہی ہے۔ میں سب جانتا تھا لیکن خاموش تھا اور خاموش ہوں۔ مجھے معلوم ہے اپنے کیے کی سزا اس حرافہ کو اس کی توقع سے بڑھ کر بھگتنی والی ہے۔ وہ زندہ رہی تو ساری عمر ــــ ہاں ساری عمر اپنے زخم چاٹے گی۔"

افراہیم کی آواز تہ خانے میں گونج رہی تھی۔ ایک سرد رات میں ایک تاریک حویلی کے سنسان تہ خانے میں مٹی کے ڈھیر پر کھڑا وہ شخص ڈرامائی انداز میں بول رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم جانتے ہو' اس رات تم تینوں کو کس نے مارا تھا؟ وہ جلال تھا اور اس کے ساتھی تھے۔ مجھے معلوم ہے وہ سب کیسے ہوا تھا۔ تم بھی جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ میں اپنی بیوی سے چودہ سال بڑا ہوں لیکن وہ بدذات مجھے بوڑھا بلکہ مُردہ سمجھنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کے لیے میں نمائشی شوہر ہوں۔ خانہ پُری کرنے والا ایک ایسا شخص جس کے نام کے ساتھ وہ اپنا نام جوڑ کر معزز کہلا سکتی ہے اور آرام و آسائش حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر کسی اور کا راج ہے۔ جانتے ہو وہ کون ہے' میں نے ابھی بتایا تو ہے۔ وہی حرامی جلال۔ اب تم پوچھو گے جلال کے پاس کیا ہے جس سے محبت کی جائے۔ نہ تعلیمی قابلیت نہ کردار اور نہ مرتبہ۔ تمہاری حیرانی بجا لیکن تم بھول رہے ہو کہ اس کے پاس ایک ایسا جسم ہے جو میرے پاس نہیں۔ جوان مضبوط' لمبا چوڑا جسم۔ وہ اس جسم پر مرتی ہوئی ہے۔ تصور ہی تصور میں اس کی مضبوط بانہوں میں جھولتی ہے اور اس کے تکیے پر اپنے بال بکھیرتی ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ کچھ چھپا ہوا نہیں ہے مجھ سے۔ میں نے اسے بارہا کہا تھا کہ وہ اپنے اس چہیتے ملازم سے ہوشیار رہے۔ وہ کسی نہ کسی روز اسے ضرور نقصان پہنچائے گا ــــ اور پھر تم لوگوں نے دیکھ لیا جب اس بدبخت کو

موقع ملا وہ وحشی جانور کی طرح چیتی ناگن کی چیر پھاڑ پر آمادہ ہوگیا۔ بتاؤ ہوا یا نہیں؟ اگر راجو اسے نہ بچاتا تو شاید وہ اسے قتل ہی کر ڈالتا لیکن دیکھو۔ دیکھو اس عورت کا عشق' پھر بھی اپنے عاشق کو رعایتیں دے رہی ہے۔ نیک چلنی کے وعدوں پر پھر اس کی ملازمت بحال کی جا رہی ہے۔ مجرمانہ حملے کی کوشش' کوئی چھوٹا واقعہ نہیں تھا لیکن اپنے چلتروں سے اس عورت نے اسے چھوٹا بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن مجھے سو فی صد یقین ہے کہ ایک دو روز بعد وہ خود چل کر اس کمرے میں گئی ہوگی جہاں راجو نے جلال کو باندھ کر ڈال دیا تھا۔ اس نے اپنی گلابی انگلیاں بدنیت عاشق کے بالوں میں پھیری ہوں گی اور کہا ہوگا۔ معلوم ہے کیا کہا ہوگا؟" وہ باقاعدہ اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے جلال۔ میں تمہیں اس حال میں دیکھ رہی ہوں۔ جلال! تم جانتے ہو مجھے تمہاری صرف ایک چیز سے نفرت ہے اور وہ ہے تمہاری بلا نوشی۔ تم شراب چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آج میری جان کی قسم کھاؤ۔ شراب نہیں پیو گے۔"

اس حرامی نے کہا ہوگا۔ "میں ترے غم میں پیتا ہوں میڈم۔ جب تک تیرا غم نہیں چھوٹتا' شراب کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ ہاں اتنا وعدہ کرتا ہوں کہ اب تیرے سامنے نہیں پیوں گا اور نہ پی کر تیرے سامنے آؤں گا۔ تو بھی اپنے حسن کے جلوے اکیلے میں مجھے نہ دکھایا کر۔ میں بالکل دیوانہ ہو جاتا ہوں۔"

پھر بے وفا بیوی اور بدکار عاشق میں صلح ہو گئی ہوگی۔ جب صلح ہو گئی ہوگی تو پھر سارا زلزلہ راجو کی طرف بہہ نکلا ہوگا۔ جلال نے کہا ہوگا۔ "میڈم اس رقیب روسیاہ کی چھٹی ہونی چاہیے۔" وہ بولی ہوگی۔ "سر تسلیم خم ہے۔" جلال نے کہا ہوگا۔ "چھٹی سے پہلے اس کی جان لیوا ٹھکائی ہونی چاہیے۔" وہ بولی ہوگی۔ "بسر و چشم۔ جو مزاج یار میں آئے۔"

مزید غور و فکر کرنے کے بعد ان دونوں نے ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ رات کے وقت جلال اور اس کے ساتھیوں نے تمہارے کمرے میں گھس کر تمہیں مارا پیٹا۔ بعد میں اسی ہنگامے کو وجہ بنا کر ارجمند نے تمہاری چھٹی کرادی۔ کچھ سمجھ میں آرہی ہے میری بات؟"

افرائیم کی بات تھوڑی تھوڑی ہماری سمجھ میں آرہی تھی لیکن اس کا طرز ناقابل فہم تھا۔ کہاں یہ کہ ارجمند بانو کو آپ جناب کہہ کر بڑے احترام سے بلا تا اور کہاں اسے بے حیا اور بدکار جیسے خطابات سے نواز رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا اور سچ کہہ رہا تھا کیونکہ نشے میں اکثر سچ ہی کہا جاتا ہے۔ ظاہر اور باطن کا یہ فرق حیرت ناک تھا۔ پیاز کی طرح چھلکا دار لوگ تھے یہ۔ ایک چھلکا اترتے ہی دوسرا چھلکا سامنے آجاتا تھا۔ ارجمند بانو کا پہلا چھلکا اس وقت اترا تھا جب اس نے منصور کو اپنی آبرو کا محافظ قرار دے کر اور ملازمین خاص میں شامل کرنے کے بعد مٹی کھودنے کے لیے کنوئیں میں اتار دیا تھا۔ دوسرا چھلکا اس رات اترا تھا جب منصور پھٹے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس کے روبرو کھڑا تھا اور وہ ہم تینوں کو حویلی چھوڑنے کا حکم دے رہی تھی۔ تیسرا چھلکا آج اترا تھا جب اس کا شوہر نامدار اسے حرافہ قرار دے رہا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ چند روز پہلے منصور نے جس ولن سے جنگ کی تھی وہ ولن نہیں ہیرو تھا۔ ابھی نجانے اس عورت سے اور اس کے شوہر نامدار سے مزید کتنے چھلکے اترنے تھے۔

افرائیم نے ایک ستون سے ٹیک لگائی اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں بے وفا عورت کا ماتم کرنے والا شوہر نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں عورت جہاں ہوتی ہے وہاں بے وفائی بھی ہوتی ہے اور جو عورت آئی ہی گناہ کی نگری سے ہو اس کے ساتھ کیا کیا نجاست نہیں ہوگی۔ جانتے ہو یہ جلال کون ہے۔ یہ ایک ہندوستانی فلم فائٹر ہے۔ بڑے بڑے اسٹنٹ کرتا ہے۔ بلندی سے کودنا' بھڑکتی آگ سے موٹر سائیکل گزارنا' ہوا میں قلابازیاں کھانا۔ یہ سب کچھ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دلیپ کمار' دھرمیندر' ونود کھنہ نجانے کون کون اس کے کرتبوں کے سبب جنگجو ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ جس رات راجو نے اسے مار لگائی تھی وہ نشے میں تھا ورنہ اسے زیر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔"

میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ بیگم صاحب بھی ہندوستان سے آئی ہیں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "میں نے یہ کب کہا ہے۔ ہاہا۔ مان گئے بھئی۔ بڑے نخرے ہو تم لوگ۔ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نشے میں ہوں' جو پوچھو گے بتادوں گا۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں کس کو کیا بتانا ہے اور کب بتانا ہے۔ ایک بڑی انڈسٹری کا مالک ہوں میں۔ گھاس نہیں کھودتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ظل سبحانی" زریں گل نے "اصلی نشے" میں افرائیم کے پاؤں پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ "ام تینوں آپ کا خادم ہے۔ امارا عقل چھوٹا' امارا دل چھوٹا۔ آپ کا عقل بڑا' آپ کا دل بڑا' آپ کا سب کچھ بڑا۔ آپ نے اپنی عقل سے شہزادہ سلیم جیسے نوکری ناک میں نکیل ڈال دیا تھا اور کہا تھا۔ "خو بچے اکبر اعظم سے ٹکرائے گا تو ساری زندگانی پچھتائے گا۔ ام تو کسی گنتی میں نہیں ہے جناب۔ ام آپ سے چالاکی کیسے کر سکتا ہے اور ام کو چالاکی کرنے کا ضرورت بھی کیا ہے۔ بیگم صاحب ہندوستان سے آئے یا سمرقند بخارا سے' ام کو کیا۔ نہ ام کو چاہیے وفا۔ ام کو پیار چاہیے۔ ام کو سکون چاہیے' ام کو قرار چاہیے۔"

افرائیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔ "کافی رات ہو گئی ہے بھئی۔ صبح سویرے تمہیں کام شروع کرنا ہوگا۔ یہ ساری باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ فی الحال تم سو جاؤ اور ہاں ایک بات یاد رہے۔" بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ "اس جگہ تمہاری موجودگی بالکل راز رہنی چاہیے۔ کوئی آہٹ' شور یا دستک کچھ نہیں۔ یہاں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ وقتاً فوقتاً میں خود بھی یہاں آتا رہوں گا۔ میری غیر موجودگی میں دروازہ باہر سے بند رہے گا۔ کھدائی سے نکلنے والی مٹی ہم یہیں تہ خانے میں جمع رکھیں گے۔ کھدائی کے دوران ہماری کوشش رہے گی کہ زیادہ آواز پیدا نہ ہو۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو۔" ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ زریں گل سینے پر ہاتھ رکھ کر باقاعدہ جھک گیا۔

افرائیم نے کوٹ پہن کر اوور کوٹ شانوں پر ڈالا۔ ٹارچ سنبھالی اور زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند ہی لمحے بعد ہم آہنی دروازہ بند ہونے اور قفل میں چابی گھومنے کی آواز سن رہے تھے۔ ہم نے تہ خانے کے اندر بنے ہوئے اکلوتے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں واقعی ہماری ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ تین چارپائیاں اور بستر۔ کھانا پکانے کے چند ضروری برتن۔ ایک چھوٹی بوری میں آلو۔ دو تھیلوں میں دالیں اور چاول وغیرہ۔ اس کے علاوہ باورچی خانے میں استعمال ہونے والے دیگر لوازمات۔ چوبی الماری میں واٹ "اور جانی واکر کی بہت سی بوتلیں بھی رکھی تھیں۔ ایک ہیٹر کھانا پکانے کے لیے تھا دوسرا کمرا گرم رکھنے کے لیے۔ کمرے میں ہی ایک طرف کھدائی کا سامان بیلچے' کدالیں اور کھرپے وغیرہ رکھے تھے۔ عجیب سا ماحول تھا۔ ہم نے کمرے کا ہیٹر آن کیا اور چارپائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ کھدائی کا کام ایک دو دن میں ختم ہونے والا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کھدائی وسطی کمرے تک محدود رہے گی یا تہ خانے کا سارا فرش کھودا جائے گا۔

منصور اور میں دیوار سے ٹیک لگائے قریب لیٹے تھے۔ سرگوشی میں بولا۔ "یہ ارجمند بانو کا کیا چکر نکل آیا ہے بھئی۔ ویسے افرائیم کی بات مجھے کافی ٹھیک ہے۔ جس رات جلال نے ارجمند سے دست درازی کی کوشش کی' میں نے ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اندازہ ہوا تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق موجود ہے۔ یہ تعلق نوکر اور مالکن کے تعلق سے جدا کوئی چیز تھا۔ ارجمند' جلال کی شراب نوشی پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی اور اس سے برہم نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کے رویے میں بے ساختگی نہیں تھی۔ بعد ازاں جب میں نے جلال کو مار پیٹ کر باندھ دیا تو ارجمند نے ہدایت کی کہ میں اسے کمرے میں مقفل کر دوں۔ جب صبح ہم حویلی سے روانہ ہوئے تو اس وقت بھی وہ کمرے میں مقفل تھا۔ ارجمند چاہتی تو ہم اسے گاڑی میں ڈال کر پولیس اسٹیشن پہنچا سکتے تھے مگر یوں لگتا تھا کہ رات رات میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس وقت غور طلب بات یہ ہے کہ افرائیم نے ہمیں یہ سب کچھ کیوں بتا دیا ہے۔ آج کی ملاقات میں وہ بہت کھل کر بولا ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ نشے میں تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ مدہوش نہیں تھا۔ وہ جان بوجھ کر آزادانہ گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے اب اسے ہماری طرف سے کوئی خاص خطرہ نہ ہو۔"

منصور میری بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دم اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا گئے۔ وہ چارپائی پر سیدھا بیٹھ کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "آپ ۔۔۔ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

"یہی کہ وہ ہم سے واشگاف گفتگو کر رہا تھا۔ اسے خدشہ نہیں کہ ہماری وجہ سے اس کا کوئی راز افشا ہوگا۔ عین ممکن ہے' وہ طے کر چکا ہو کہ ہم اس تہ خانے سے باہر نہیں نکلیں گے۔"

"آپ کی بات میرے دل کو لگی ہے۔" منصور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی افرائیم کے رویے میں عجیب سی تبدیلی محسوس ہوئی ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اس قبیل کے لوگ اپنی نجی زندگی سے پردہ اٹھانے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں اور اگر وہ بلا وجہ پردہ اٹھا دیں تو پھر اس کے پیچھے کوئی بڑا مقصد ہوتا ہے۔"

زریں گل لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ آپ لوگ کیا کھسر پھسر کر رہا ہے۔ ام کو تو لگتا ہے کوئی خوف و خطرے والا بات کر رہا ہے۔ کہیں ۔۔۔ اس ابراہیم صاحب کا نیت امارے بارے میں خراب تو نہیں ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اس نے ام کو اس تہ خانے میں مار کر گاڑنے کا فیصلہ کرلیا ہو اور یہ جو ام سے کھدائی کرایا جانے والا ہے یہ امارا قبر کا کھدائی ہو۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دو تین ہفتوں میں ہم اس جوڑے کے بارے میں اتنا کچھ جان چکے ہیں کہ ہمیں مارنے سے ان کے بہت سے مسائل حل ہوجائیں گے۔"

زریں گل نے جھومتے ہوئے کہا۔ "اس سارے معاملے میں ام کے لیے خوشی کا صرف ایک ہی بات ہے۔ ام مرگیا تو آپ کے ساتھ ایک ہی قبر۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ آپ کیوں مرے۔ مریں آپ کے دشمن۔ ام اپنی جان پر کھیل جائے گا لیکن آپ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ ام آپ کا پرستار ہے اور آٹوگراف لینے والا نہیں جان دینے والا پرستار ہے۔ وہ کون سا گانا ہے مکیش کا۔ امارا پیار بھی تو ہے یہ بہار بھی تو ہے۔ تو ہی نظروں میں جان تمنا۔۔۔ ام اس کو بدل کریوں کہے گا۔ تو ہی نظروں میں استاد جانی۔"

وہ لہک لہک کر یہ گانا گانے لگا۔ صفدر نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیوں ناحق سے پہلے مرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ ابھی وہ تیرا سالا تجھے سمجھا کر گیا ہے کہ شور ہنگامہ نہیں ہونا چاہیے۔"

زریں گل ایک دم چپ ہوگیا۔ اس کی چوڑی اور گوری پیشانی پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا تھا۔ کہنے لگا۔ "استاد جی! آپ مانے یا نہ مانے لیکن ام کو لگتا ہے کہ یہ حرامی ابراہیم اپنی بیوی کو بھی چکر دے گیا ہے۔ اس نے بیوی کا تسلی کرا دیا ہے کہ حویلی میں کچھ نہیں۔ وہ مایوس ہو کر ادھر سے چلا گیا ہے۔ ابراہیم نے حویلی کو بند کرکے تالا لگوا دیا ہے۔ اب راتوں رات وہ ام کو اس تہ خانے میں لے آیا ہے اور اس خاص جگہ پر کھدائی کراتا چلا رہا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

میں نے کہا۔ "ہمارا خیال بھی وہی ہے جو تمہارا ہے لیکن اب ہمیں اس سے آگے سوچنا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ یہاں کسی بہت قیمتی شے کی تلاش ہو رہی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ قیمتی شے نوادرات یا سونے چاندی کی شکل میں ہے۔ افراہیم کے جوش و خروش سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی خاص کلیو آچکا ہے اور اسے یقین ہے کہ اس کی تلاش ختم ہونے والی ہے۔ فرض کریں اگر چند روز میں وہ سب کچھ اگر واقعی یہاں سے نکل آتا ہے جو افراہیم نکالنا چاہتا ہے اور راحت نکالنا چاہتی تھی اور جس کی تلاش کے حوالے سے قادر زماں 'شکر' اور عیسیٰ جیسے لوگ سرگرم رہے ہیں تو پھر ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا۔"

صفدر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ابھی یہ دیوانے کا خواب لگ رہا ہے۔ جہاں تک افراہیم کے جوش و خروش کی بات ہے تو وہ کنوئیں کی کھدائی کے دوران بے حد پُرجوش تھا اور اس سے پہلے اسی جوش و خروش سے انہوں نے نہ جانے کتنا پیسہ برباد کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہارے خیال سے بالکل اتفاق کر رہا ہوں مگر اس مرحلے میں ہمیں کوئی بھی امکان مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس تہ خانے آنے کے بعد میرے خیالات میں تھوڑی سی تبدیلی آئی۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے جو عنقریب ہمیں حیران کرنے والی ہے۔ ہم افراہیم جوش و خروش کو یکسر نظرانداز بھی کردیں تو اس تہ خانے ایک اور شہادت ایسی ہے جو ہمیں [illegible] ہے۔"

"کیا؟" صفدر نے بے ساختہ کہا۔ زریں گل بھی چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کے اس ڈھیر پر لے آیا جہاں تھوڑی دیر پہلے افراہیم کھڑا اور سلگتی نگاہوں سے فرش کے گڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ یوں تہ خانے کا فرش کئی جگہ سے اکھاڑا گیا تھا لیکن یہ وسطی گڑھا سب سے بڑا تھا۔ قطر تقریباً بارہ فٹ گہرائی درمیان سے چار فٹ اور کناروں سے ڈیڑھ دو فٹ تھی۔ فرش کدال سے توڑا گیا تھا۔ بعد ازاں بیلچے اور تسلے وغیرہ سے مٹی ہٹائی گئی تھی۔

میں نے صفدر کو گڑھے کے ٹیڑھے میڑھے کنارے پر لاتے ہوئے کہا۔ "اس جگہ کو غور سے دیکھو۔ کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے یا نہیں؟"

صفدر نے نیچے جھک کر چٹے کنارے کا معائنہ کیا بولا۔ "آپ کس فرق کی بات کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ فرش نانک چندی اینٹوں کا ہے اینٹوں کے اوپر وہ مسالا ہے جو ساری حویلی میں نظر آتا۔ اب فرش کے یہ ٹکڑے دیکھو جو یہاں سے اکھاڑے ہیں۔ یہ باقی کے فرش سے مختلف ہیں۔"

صفدر تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔ باقی فرش اور ٹکڑوں میں واضح فرق تھا۔ اکھاڑا جانے والا فرش بعد بنایا گیا تھا اور یہ تقریباً اسی طرز کا تھا جس طرز کے فرش کل بنائے جاتے ہیں۔ ان میں نیچے اینٹوں کی جگہ روڑی ہے۔ اس پر ریت اور سیمنٹ ملی بجری بچھا دی جاتی

ہے۔ آخر میں سیمنٹ کا محلول پھیر دیا جاتا ہے جسے "نیرو" کہتے ہیں اور جس کا مقصد فرش کو ہموار اور چکنا رکھنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس محلول میں کوئی رنگ بھی ملا دیا جاتا ہے۔ اس تہ خانے کے فرش میں سرخی مائل رنگ ملایا گیا تھا جس کے سبب فرش کا یہ ٹکڑا باقی فرش کے ساتھ مل گیا تھا اور خصوصی غور و فکر کرنے کے بغیر اس "پیوند" کا پتا چلانا مشکل تھا۔ ہم نے چونکہ اکھڑا ہوا فرش دیکھا تھا اس لیے شناخت ہمارے لیے مسئلہ نہیں رہی تھی۔

ہم ماہرین آثار قدیمہ نہیں تھے لیکن اتنا اندازہ تو ہم بھی کر سکتے تھے کہ فرش میں یہ "پیوند" لگے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ممکن تھا کہ بیس تیس سال یا اس سے بھی زیادہ گزر چکے ہوں گے۔ کھدائی کے دوران بڑی احتیاط سے اتنا ہی فرش اکھاڑا گیا تھا جو بعد میں بنا تھا' تاہم کہیں کہیں اس نئے فرش کے کنارے ابھی موجود تھے۔ صفدر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "شاہ جہاں صاحب' کیا ہو سکتا ہے یہاں؟"

وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔ پھر بھی یہ صدا چٹے دیواروں میں گونجی اور سرسراہٹ جگا گئی۔ "کیا ہو سکتا ہے یہاں؟" اس یخ بستہ شب کی تاریکی میں یہ سوال دور تک پھیلا اور گونجتا محسوس ہوا۔ ایک سیلن زدہ تہ خانے میں ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں مٹی کے ڈھیر پر کھڑے ہم تینوں بے حد عجیب لگ رہے تھے۔ کیا ہم واقعی کسی دفینے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ اس خاموش حویلی سے دس پندرہ میل دور جھنگ کا جیتا بستا شہر تھا۔ میں نے سوچا' وہاں ابھی سینماؤں کے آخری شو چھوٹے ہوں گے۔ سڑکوں پر چہل پہل ہوگی۔ تانگے' رکشا والے سواریوں کے لیے صدائیں لگا رہے ہوں گے۔ ہوٹلوں اور چائے خانوں پر گہما گہمی ہوگی۔ وہاں کسی نے کب سوچا ہوگا کہ بذریعہ کار صرف ایک پون گھنٹے کے فاصلے پر ایک تاریک حویلی کے ویران تہ خانے میں تین افراد شاہ جہاں' صفدر اور زریں گل ایک دفینے کے کنارے پر حیران کھڑے ہیں اور ایک الجھی سلجھی کہانی پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بعض کہانیاں بڑی خاموشی سے آغاز ہوا کرتی ہیں پھر وہ مدتوں کسی ریگستان' کسی برف زار' کسی قبرستان۔۔۔ یا حویلی میں منجمد پڑی رہتی ہیں۔ زمانوں بعد کوئی شخص ان تک پہنچتا ہے' ان کے جسم سے سوئیاں نکالتا ہے۔ ان کے ہونٹ چومتا ہے اور وہ زندہ ہوجاتی ہیں۔ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جاگ اٹھتی ہیں۔ شاید ہم بھی کسی ایسی ہی کہانی کے جسم سے سوئیاں نکالنے والے تھے۔۔۔ یا شاید ہم خود کہانی بن کر اس تہ خانے میں دفن ہونے والے تھے۔ نامعلوم زمانے تک کے لیے۔ جب کوئی چنیل کی اس کہنہ سال حویلی کے تہ خانے میں اترتا اور دیکھتا کہ ایک بہت عمیق گڑھے کے کنارے تین انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا' کیونکہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جو کہانی ہمارے سامنے ہے وہ کس مرحلے میں ہے۔ ہم اس کا آغاز کر رہے ہیں' اسے انجام دے رہے ہیں یا اس کے جسم سے سوئیاں نکال رہے ہیں یا پھر وہ کہانی نہیں ہے' صرف ایک واہمہ ہے۔ ایک سایہ ہے جو تخیل کی طلسمی روشنی بجھتے ہی فنا ہوجائے گا۔

صفدر نے مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر کہا۔ "شاہ جہاں صاحب' فرش میں فرق ضرور ہے لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ یہاں کچھ دفن ہی کیا گیا ہو۔ ممکن ہے صرف فرش کی مرمت کی گئی ہو۔ پرانی عمارتوں میں اکثر توڑ پھوڑ اور مرمت کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران زریں گل کچھ اور آگے چلا گیا تھا اور ایک جگہ بیٹھا بڑے غور سے کچھ دیکھ رہا تھا۔ دبی آواز میں پکار کر کہنے لگا۔ "استاد صاحب! ذرا ادھر آکر بھی دیکھیں۔"

میں اور صفدر اس کے قریب پہنچے۔ وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا وہاں ٹیوب لائٹ کی روشنی کافی نزدیک سے پڑ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "دیکھیں جی۔ یہاں مٹی پر کئی جگہ قدموں کا نشان موجود ہے۔ ایسا نشان پورے تہ خانے میں موجود ہے اور یہ افراہیم صاحب کے جوتے کا نشان ہے۔ اس نشان کے علاوہ اور کسی پاؤں کا نشان یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں جتنا کھدائی بھی نظر آرہا ہے وہ افراہیم صاحب نے خود کیا ہے اور اس کے علاوہ یہاں اور کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔"

زریں گل کی یہ تحقیق قابل قدر تھی۔ کہتے ہیں کچھ لوگ مدہوشی کی حالت میں زیادہ ہوش مند اور چوکس ہوجاتے ہیں۔ شاید زریں گل بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

○☆○

علی الصباح افراہیم نے ہمیں آجگایا۔ میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ یعنی صرف چار گھنٹے کی نیند لے سکے تھے ہم۔ اس نے ہدایت کی کہ ہم جلدی جلدی ناشتا کرلیں تاکہ کام شروع کیا جائے۔ پتا نہیں رات اس نے کیسے کاٹی تھی۔ ویسے لگتا تھا کہ جاگتے ہوئے ہی کاٹی ہے۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد بے خوابی کے آثار نظر آرہے تھے۔

کمرے میں موجود سامان کو دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچ کر

سب سے اچھا ناشتا حلوہ ہو سکتا ہے۔ زریں گل نے دعویٰ کیا کہ وہ حلوہ بہت اچھا بنا سکتا ہے اور بتایا کہ لاہور میں قیام کے دوران وہ پرانی انارکلی میں چھ ماہ حلوہ پوری بیچتا رہا ہے۔ اچھا حلوہ بنا کر اس نے اپنے دعوے کی سچائی ثابت کر دی۔

ہمارے ناشتا ختم کرنے سے پہلے ہی افراہیم ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بے تابی کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے جلدی جلدی بیلچے سنبھالے۔ ہتھیلیوں پر تھوکا اور اپنے کام میں جت گئے۔ کئی روز موت کے کنوئیں میں کھدائی کی تھی اس لیے یہ کام ہمارے لیے بالکل نیا نہیں رہا تھا۔ پہلے ہم نے گڑھے کے کنارے درست کیے اور پھر مٹی باہر نکالنے لگے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہم اس دائرہ نما دس فٹ قطر کے گڑھے کو صرف تین فٹ نیچے لے جا سکے۔ افراہیم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ پھر بھی ہم یہ بات سمجھ رہے تھے کہ یہ گڑھا گہرائی تک جائے گا اور عین ممکن ہے کہ کئی روز کھدائی جاری رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افراہیم کو کمرے میں سامانِ خورد و نوش جمع کرنے اور دیگر انتظامات کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ صبح سویرے ہمیں تہ خانے میں لاتا، کھدائی کراتا اور چلتا کرتا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ بات سوچ کر ذہن خواہ مخواہ الجھ رہا تھا۔ اگر تہ خانے کا فرش اکھاڑ کر کچھ دفن کیا گیا تھا تو اتنی گہرائی میں کیوں کیا گیا تھا۔ بالفرض اگر صندوق یا اسی قسم کی کوئی چیز تھی تو اسے بہ آسانی چھ سات فٹ کی گہرائی میں دبایا جا سکتا تھا۔

افراہیم تو دوپہر ایک بجے واپس چلا گیا لیکن ہم شام تک کھدائی میں مصروف رہے۔ گڑھے کی گہرائی قریباً آٹھ فٹ ہو چکی تھی اور نکلنے والی تازہ مٹی دو بڑے ڈھیروں کی صورت میں تہ خانے میں پڑی تھی۔ ہمیں امید تھی کہ شام کو افراہیم واپس آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ زریں گل نے الیکٹرک ہیٹر پر انڈے کا سالن تیار کیا لیکن چپاتیاں بنانے میں ناکامی ہوئی لہٰذا سادہ چاول پکائے گئے۔ سارا دن محنت کرکے ہم نے بالکل محنت کشوں کے انداز میں زمینی دسترخوان پر ماحضر تناول کیا۔ اس کے بعد صفدر نے خشک دودھ سے بڑی "خوش مزاج" قسم کی چائے تیار کی۔ چائے پینے کے بعد ہم تھکے ماندوں کو جلد ہی نیند نے آ لیا اور ہم تحت سرد تہ خانے میں الیکٹرک ہیٹر کے ارد گرد لحاف اوڑھ کر سو گئے۔

اگلے روز آٹھ بجے اٹھ کر اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر کام میں لگ گئے۔ گڑھا اب اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ بیلچوں سے مٹی باہر پھینکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ہم نے ایک بالٹی میں نائیلون کی رسی باندھ دی اور باری باری کنارے پر کھڑے ہو کر مٹی کھینچنے لگے۔ بارہ بجے کے قریب افراہیم آ گیا۔ گڑھے کی گہرائی دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے ہمیں شاباش دی اور باتوں باتوں میں ہم پر یہ ظاہر کیا کہ اگر تندہی اور تیزی سے کام کریں تو وہ ہمیں ہماری توقع سے بڑھ کر نوازے گا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم شام کو کھانا وغیرہ کھا کر اور تھوڑی دیر آرام کرکے تین چار گھنٹے "اوور ٹائم" لگائیں۔ بہت بے قرار نظر آ رہا تھا وہ اور جتنا نظر آ رہا تھا حقیقت میں اس سے کہیں بڑھ کر بے قرار تھا اور دیکھا جائے تو ہم بھی کچھ کم بے چین نہیں تھے۔ ایک تجسس تھا جس نے پچھلے دس پندرہ روز میں غیر محسوس طور پر پیش قدمی کی اور اب پوری طرح ہم پر غلبہ پا لیا تھا۔ ہم خود چاہتے تھے جلد از جلد اس کھیلے سے باہر آئے اور جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ بہ الفاظ دیگر بے خبری کا اندھیرا چھٹے اور دلچسپ پردہ جو کچھ سامنے آ جائے۔

ہم نے بخوشی شام کے بعد کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ بجے افراہیم تہ خانے سے باہر نکل گیا تھا۔ صفدر اور میں پانچ بجے چھٹی کی۔ اس وقت تک زریں گل کھانا پکا چکا تھا۔ ہم نے کھانا کھا کر کمر سیدھی کی اور پھر مصروف ہو گئے۔ گھنٹے ہم نے مسلسل کام کیا اور سخت سردی میں بھی ہماری پیشانیوں پر پسینہ چمکنے لگا۔ اچانک دروازہ کھلا اور افراہیم قدموں سے اندر آ گیا۔ اس وقت ہم کھدائی کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں بھئی نہیں کام ٹھیک نہیں۔ تمہاری کسّی کی آواز اوپر پہنچ رہی ہے نے تم سے کہا بھی تھا کہ بیلچہ استعمال کرو۔" ہم نے فوراً چھوڑ کر بیلچے تھام لیے۔ وہ بولا۔ "ایک آدھ گھنٹا بہت ہے سے کام کرنا ہوگا کچھ لوگ اوپر آئے ہوئے ہیں۔"

ہم نے سرِ تسلیم خم کیا اور کام میں لگ گئے۔ وہ لہجے میں ہمیں چند مزید ہدایات دینے کے بعد واپس چلا گیا بار جب وہ تہ خانے میں اترتا تھا تو ہمارے ذہن میں آتا تھا شاید وہ اس مرتبہ ہمیں اس "پُراسرار کھدائی" کے بارے میں کچھ بتائے گا۔ کوئی وضاحت، کوئی اشارہ، کوئی عندیہ ہر بار یہ خیال خام ثابت ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں افراہیم زبان یکسر خاموش تھی۔ شروع میں صفدر نے ایک دو بار گفتگو کا رُخ اس طرف موڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے فوراً روکھا پھیکا لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ ہم نے رات دس بجے تک کام کیا اور اس مرتبع نما گڑھے کو قریباً سولہ فٹ کی گہرائی تک لے گئے۔ جب سیاہی مائل ریت میں سے پانی رسنا شروع ہو گیا تو ہم نے کام بند کر دیا۔

سارا دن مزدوری کرنی پڑی تھی بلکہ اوور ٹائم لگانا پڑا تھا۔ ہمارے جسم ایسی مشقت کے عادی نہیں تھے لہٰذا

بے حد چُور ہو گئے۔ بستروں پر گرتے ہی ہم یوں سوئے کہ ارد گرد کی کچھ خبر نہ رہی۔ میری آنکھ قریباً آٹھ بجے صبح کھلی اس وقت بھی نہ کھلتی اگر ایک نامانوس شور میرے کانوں سے نہ ٹکراتا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آواز تہ خانے کے آہنی دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ غالباً کوئی بھاری بھرکم شے بڑی قوت سے دروازے کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور ننگے پاؤں زینے طے کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ میں دروازے سے کان لگانا چاہ رہا تھا جب مجھے ٹھٹک کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ کوئی عورت دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ کر زور سے چیخی۔ "رحمو۔ رحمو۔" یکایک کسی مرد نے ڈانٹ کر عورت کو دروازے سے دور ہٹا لیا۔ ڈانٹنے والا افراہیم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ دبی دبی آوازوں اور آہٹوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عورت کو زبردستی کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے۔

عورت روتے ہوئے بولی۔ "سرکار! آپ نے کہا تھا مجھے رحمو سے ملائیں گے، کہاں ہے رحمو؟ سرکار مجھے بتائیں کہاں ہے رحمو۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ اسی خانہ بدوش لڑکی کی آواز تھی جسے میں نے خوشاب والی کوٹھی میں چیختے چلاتے دیکھا تھا۔ اس نے ارجمند بانو کے قدموں میں گر کر دہائی دی تھی کہ وہ اس کا بچھڑا ہوا خاوند اسے واپس لوٹا دے۔ اب وہ اس حویلی میں تھی اور یہی التجا افراہیم سے کر رہی تھی۔

افراہیم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں کب کہہ رہا ہوں، رحمو سے نہیں ملاؤں گا تجھے۔ آ میرے ساتھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اسے۔"

"آپ مجھے تسلی دے رہے ہیں سرکار۔" لڑکی بلک کر بولی۔ "بیگم صاحبہ بھی مجھے تسلیاں دیتی رہی ہیں۔ آپ مجھے رحمو سے نہیں ملائیں گے۔ آپ مجھے کمرے میں بند کر دیں گے۔"

"نہیں کروں گا کمرے میں بند۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھ سے۔ سرکار کے وعدے کا اعتبار نہیں کرے گی تو؟" افراہیم اسے کھینچتا ہوا کافی فاصلے پر لے گیا لیکن میں نے چونکہ دروازے سے کان لگا رکھے تھے، مجھے سب کچھ سنائی دے رہا تھا۔

لڑکی نے سسکتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں سرکار۔ یہ میرے ننگے پاؤں دیکھیں۔ میں نے ابھی تک جوتی نہیں پہنی۔ ساری زندگی نہیں پہنوں گی۔ رحمو مجھ سے کہہ کے گیا تھا، شام کو مزدوری کے پیسے ملیں گے تو تیرے لیے بازار سے جوتی لے کر آؤں گا۔ وہ میرے پاؤں میں ایک کانٹا دیکھ کر تڑپ گیا تھا سرکار۔ اب دیکھیں میرے پاؤں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ وہ نہیں آیا سرکار۔ آپ کی بیگم صاحب نے اسے کس مزدوری پر لگا دیا ہے۔ اسے چھٹی دے دیں سرکار۔ میرا جھونپڑا خالی ہے۔ بالکل خالی ہے۔"

لڑکی کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اپنے محبوب خاوند کو کھو کر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ افراہیم نے اسے پچکارتے ہوئے دھیمی آواز میں کچھ کہا لیکن لڑکی مسلسل مزاحمت کرتی رہی۔ کھینچا تانی میں وہ دونوں پھر دروازے کے قریب آ گئے۔ ایک دم افراہیم گرج کر بولا۔ "میں بکواس کر رہا ہوں؟ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

لڑکی بھی آپے سے باہر ہو گئی۔ اس کے اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ چلا کر بولی۔ "ہاں ہاں۔۔۔ بکواس کر رہے ہو تم۔ جھوٹ بک رہے ہو۔ تم نے مار دیا ہے اسے۔ تم نے۔۔۔ تم نے اسے بارود سے بھرے ہوئے کنوئیں میں اتارا تھا۔ تم نے اس کے چیتھڑے اُڑا دیے ہیں۔ میں سب کو بتاؤں گی، ساری دنیا کو بتاؤں گی۔ تم میرے رحمو کے قاتل ہو۔ تم قاتل ہو۔ قاتل ہو۔"

پھر اچانک لڑکی نے خود کو افراہیم کی گرفت سے چھڑا لیا اور بھاگ اٹھی۔ افراہیم اس کے پیچھے بھاگا۔ یہ سارا منظر میں "کانوں" کی مدد سے دیکھ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ دونوں دروازے کے سامنے آٹھ دس گز کی دوری پر گرے۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور لڑنے بھڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

لڑائی کے دوران لڑکی نے ایک بار پھر خود کو افراہیم کی گرفت سے چھڑایا اور توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند دروازے سے ٹکرائی۔ آہنی دروازے سے لڑکی کے تصادم کی آواز پورے تہ خانے میں گونجی اور اس مرتبہ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ صفدر اور زریں گل بھی کسمسا کر اٹھ بیٹھے۔ افراہیم نے پھر لڑکی کو دبوچ لیا۔ لڑکی کی دبی دبی چیخ سنائی دی۔ پھر افراہیم کی زوردار کراہ ابھری۔ کسی اذیت کے سبب وہ تڑپ اٹھا تھا۔ ایک سیکنڈ کے بعد کوئی دھڑام سے پختہ فرش پر گرا اور اچانک سکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں تھوڑی دیر کسی کے ہانپنے کی صدا سنائی دیتی رہی پھر وہ بھی معدوم ہو گئی۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صفدر بھی ننگے پاؤں احتیاط سے زینے چڑھتا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کی بوجھل آنکھوں میں حیرت سوال بن کر ٹھہری ہوئی تھی۔ اچانک میری نگاہ اپنے پاؤں کی طرف اٹھی اور میں مبہوت رہ گیا۔ آہنی دروازے کی نچلی درز سے خون کی چند لکیریں تہ خانے میں در آئی تھیں اور نیلی سیڑھی طے کرنے کے بعد اب یہ

خون قطرہ قطرہ دوسری سیڑھی پر گر رہا تھا۔ صفدر نے میری نگاہوں کا تعاقب کیا اور خون دیکھ کر وہ بھی ششدر رہ گیا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دروازے کی دوسری جانب کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ یقینی بات صرف اتنی تھی کہ خوشاب کا ایک دولتمند، بارسوخ اور خاندانی شخص آرائیں افراہیم ایک خانہ بدوش لڑکی سے ستم کرتا تھا۔ لڑکی اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ جانا چاہتی تھی جب کہ وہ اسے روک رہا تھا۔ پھر ان دونوں میں سے ایک کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نیچے جا گرا تھا اور قرب و جوار میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ میں نے زینوں سے اترنے کے بعد صفدر اور زریں گل کو مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اب کیا ہوگا۔ افراہیم نے سختی کے ساتھ کئی مرتبہ ہمیں تاکید کی تھی کہ ہم خود سے دروازے پر دستک دینے یا کسی کو پکارنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر یہ ہدایت پیشِ نظر نہ ہوتی تو یقینی بات تھی کہ اب تک ہم دروازہ پیٹ چکے ہوتے۔

زریں گل نے سیڑھیوں پر بہہ آنے والے خون کو ہراساں نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "یہ تو زبردست قسم کا گڑبڑ ہو گیا ہے جی۔ کوئی زخمی ہوا ہے یا پھر۔۔۔"

زریں گل "قتل" کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن مجھے پچانوے فی صد یقین تھا کہ یہ کسی زخمی کا نہیں "مقتول" کا خون ہے۔ معذوب بے جان شے کی طرح بجتے فرش پر گرا تھا اور اس کے گرنے کے بعد کوئی آہٹ، آواز یا کراہ سنائی نہیں دی تھی۔ میرے کانوں میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو چند روز پہلے میں نے دوسری منزل کے ایک باتھ روم میں بند ہو کر سنے تھے۔ قادر زمان نے افراہیم سے کہا تھا۔ "اس جنگلی کا خاص خیال رکھنا۔ اگر وہ کتے کی بچی ٹھیک ہو گئی تو بہتر ورنہ اس کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔" یقیناً یہی "بندوبست" کرتے ہوئے وہ مخبوط الحواس لڑکی کو اس خالی حویلی میں لے آیا تھا۔ یہاں وہ اسے غیر معینہ مدت کے لیے پابہ زنجیر رکھ سکتا تھا۔ قتل کر کے گاڑ سکتا تھا یا پھر شہباز پہلوان جیسے کسی بردہ فروش کے حوالے کر سکتا تھا۔ آج لڑکی نے کسی نہ کسی طرح فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں براہِ راست افراہیم سے اس کا تصادم ہو گیا تھا۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ افراہیم کسی تیز دھار آلے سے لڑکی کو قتل کر چکا تھا یا لڑکی کا داؤ چل گیا تھا اور اس نے اپنے سہاگ کے قاتل کو انجام تک پہنچا دیا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورت ناممکن نہیں تھی۔ ظاہر ہے افراہیم کو لڑکی پر بالادستی حاصل تھی لیکن لڑکی بھی چھوئی موئی نہیں تھی۔ وہ کھلے ہاتھ پیروالی نوخیز لڑکی تھی۔ خانہ بدوش عورتیں ویسے بھی سخت جان ہوتی ہیں اور بعض تو اس حوالے سے شہری مردوں کو بھی مات دے دیتی ہیں۔ ایسے واقعات اکثر سننے کو ملتے ہیں کہ اینٹیں ڈھونے والی خانہ بدوش عورت کو کسی موٹے [illegible] اور بوجھ اٹھانے کے معاملے میں منہ کی کھائی۔

اگر دروازے سے باہر دوسری قسم کی صورتِ حال پیش آئی تھی۔ یعنی لڑکی افراہیم کا قصہ پاک کر چکی تھی تو کچھ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔ یہ حویلی مکینوں سے خالی تھی اور اس کے بیشتر دروازے مقفل تھے۔ ممکن تھا افراہیم نے ساز و سامان کی حفاظت کے پیشِ نظر ایک دو چوکیدار یہاں متعین کیے ہوں لیکن حویلی کے عقبی احاطے میں آنے کی ضرورت انہیں بھی نہیں تھی۔ دوسرے ان کی پوسٹ بھی یہاں سے بہت دور تھی۔ افراہیم کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہم اس تہ خانے میں ہیں۔ اگر وہ قتل ہو چکا تھا اور مخبوط الحواس لڑکی اسے قتل کر کے بھاگ چکی تھی تو عین ممکن تھا کہ ہم غیر معینہ مدت کے لیے اس تہ خانے میں بند ہو جائیں۔

سوچ کے گھوڑے باگیں چھڑا کر کہیں سے کہیں نکل گئے تھے۔ اچانک آہنی دروازے کے پاس قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں تیزی سے زینے طے کر کے دروازے پر پہنچا۔ چند ناقابلِ فہم آہٹیں سنائی دیں پھر یوں لگا جیسے کوئی فرش کو کپڑے، اخبار وغیرہ سے صاف کر رہا ہے۔ میں دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ صفدر زینوں کے درمیان تھا اور زریں گل پہلے زینے پر۔ ہم تینوں خاموش اور ساکت تھے۔ چند لمحوں بعد دروازے کے مضبوط لوہے سے ایک دوسرا لوہا ٹکرایا۔ یہ چابی تھی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ الٹے پاؤں نیچے اتر کر میں صفدر کے پاس تن کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے کے قفل میں چابی گھمائی اور دھکا دے کر پٹ کھول دیا۔ ہمارے سامنے افراہیم کھڑا تھا۔ اس کی پیشانی پر دائیں ابرو کے اوپر ایک نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔ اندر جھانکتے ہی اس نے سب سے پہلے زینوں پر نگاہ دوڑائی۔ بالائی زینوں پر خون کی ٹیک موجود تھی۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پریشانی جھلکی لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا۔ بڑے عام سے انداز میں گھوم کر اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور زینے اترتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسی آوازیں تھیں جناب؟" صفدر نے مسکین لہجے میں پوچھا۔

افراہیم نے ایک تیز نگاہ میں ہم تینوں کے تاثرات دیکھے۔ پھر سگریٹ کیس سے امپورٹڈ سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور بولا۔ "ایک پاگل لڑکی تھی۔ شاید تم نے خوشاب

میں بھی دیکھی ہو۔ اپنے گمشدہ شوہر کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ دورہ پڑتا ہے تو جو سامنے ہو اس کا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ آج اینٹ لے کر مجھ پر حملہ آور ہو گئی تھی پھر خود ہی پھسل کر سر زخمی کرا بیٹھی۔ بہت خون نکلا ہے۔ دس پندرہ ٹانکے تو لگیں گے۔"

"اوہ۔" صفدر نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ "ہم تو پریشان ہو گئے تھے آپ کی طرف سے۔ آپ نے منع کر رکھا تھا کہ دروازے تک نہیں جانا اس لیے چپکے بیٹھے رہے۔"

"شاباش۔ اچھا کیا ہے تم نے۔" افراہیم نے منتشر لہجے میں کہا۔ پھر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ "کام کی کیا پوزیشن ہے؟"

"پانی رسنے لگا ہے جی۔" میں نے رپورٹ دی۔

"ونڈر فل۔" افراہیم نے کہا اور تیز تیز قدموں سے گڑھے کی طرف بڑھا۔ پرسکون نظر آنے کے لیے اسے سخت کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ بے نام سی ہیجانی کیفیت طاری تھی اس پر۔ وہ تیزی سے سگریٹ پھونک رہا تھا اور ہر کش کے ساتھ دھوئیں کا ایک بادل فضا میں چھوڑ دیتا تھا۔ یقینی بات تھی، وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے ہاتھوں سے ایک انسانی جان لے چکا ہے۔ ایک طرف احساسِ جرم اس کے جسم میں ہیجان پیدا کر رہا تھا تو دوسری طرف گڑھے کی دید اس کے تنے ہوئے اعصاب کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اس نے سگریٹ پھونکتے ہوئے پروانہ وار گڑھے کے گرد چند چکر لگائے پھر ہمیں ہدایت کی کہ ہم کام شروع کریں۔

رات رات میں گڑھے کے اندر سے کافی پانی رس چکا تھا اور اب ہمیں یخ بستہ کیچڑ میں کام کرنا تھا۔ اس موقعے پر زریں گل نے ناشتے کے حوالے سے کچھ اعتراض اٹھانا چاہا مگر افراہیم کی اضطرابی کیفیت دیکھتے ہوئے میں نے اسے اشارہ کر دیا۔ ویسے بھی اب نو تو بج ہی چکے تھے۔ ہم ناشتے کو لنچ کے ساتھ ملا سکتے تھے۔ جرسیاں وغیرہ اتار کر اور شلواریں گھٹنوں سے اوپر تک کھینچ کر میں اور صفدر رسے کی خود ساختہ سیڑھی کے ساتھ کنواں نما گڑھے میں اتر گئے۔ یہاں اب ریت، مٹی اور پانی کا ملغوبہ سا تیار ہو چکا تھا۔ ہم بیلچوں کی مدد سے گیلی مٹی بالٹیوں میں بھرنے لگے اور زریں گل اسے اوپر کھینچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے صفدر کو بھی باہر بھیج دیا کیونکہ جگہ فراخ نہ ہونے کے سبب گیلی مٹی اوپر کھینچنا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ افراہیم کمرے سے کرسی کھینچ لایا تھا اور وہ گڑھے کے کنارے ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اسموکنگ کے ساتھ ساتھ اب وہ مے نوشی بھی کر رہا تھا۔ اس نے الماری میں سے ایک بوتل نکلوا لی تھی اور اس کا آتشیں سیال تیزی سے حلق میں انڈیل رہا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر صرف ہیجان اور جوش و خروش تھا لیکن ڈھائی تین گھنٹے کی کھدائی کے بعد اس جوش و خروش میں چھپی ہوئی اضطرابی کیفیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی آتش زیرپا کی طرح گڑھے کے ارد گرد چکرانے لگا۔

میری پنڈلیاں یخ بستہ پانی میں کھڑے کھڑے سُن ہو چکی تھیں۔ لباس کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا اور بیلچہ چلا چلا کر کمر دکھنے لگی تھی۔ مٹی اور ریت کھودتے ہوئے بار بار یہ احساس ذہن کو کچوکا لگا رہا تھا کہ یہیں آس پاس ہی حویلی کے کسی کونے کھدرے میں اس لڑکی کی لاش موجود ہے جو اپنے شوہر کی جدائی میں ہلکان تھی۔ جس کے ننگے پاؤں ایک جوتی کی آس میں شب و روز یخ بستہ راستوں کا عذاب برداشت کر رہے تھے اور جس کی کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں تھوڑی دیر پہلے تک برہا کے گیت گا رہی تھیں۔

یک لخت مجھے چونکنا پڑا۔ گدلے پانی کے نیچے میرے بیلچے کا پھل کسی دھاتی شے سے ٹکرایا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ کسی صندوق نما شے کا ڈھکنا تھا۔ میرے پاؤں نے جہاں تک حرکت کی وہاں تک اس دھاتی شے کے کنارے نے میرے پاؤں کو چھوا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

افراہیم نے میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ وہ چونک کر بولا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ "یہاں۔۔۔ کچھ ہے جناب۔"

افراہیم اب تک نجانے کیسے برداشت کیے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا اوور کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا، جوتے کھینچ کر اتارے، کوٹ کے بازو اُڑسے اور رسّی کی طویل سیڑھی سے لٹک کر نیچے اترنے لگا۔ کوٹ کی ایک پھولی ہوئی جیب میں پسٹل کی موجودگی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ افراہیم کا بس نہیں چلا تھا ورنہ شاید وہ سیڑھی بھی استعمال نہ کرتا اور براہِ راست کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا۔ اس کی بے قراری دیدنی تھی۔ صاف ستھری پتلون کی پروا کیے بغیر وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر گیا اور میرے ہاتھ سے بیلچہ لے کر اس مقام کو ٹٹولنے لگا جہاں دھات سے دھات کے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ بیلچہ دھاتی کنارے سے لگا تو افراہیم کے چہرے پر ہفت اقلیم کی خوشیاں سمٹ آئیں۔ اس نے پہلے اپنے پاؤں کو حرکت دے کر کنارے کے طول و عرض کا اندازہ کرنا چاہا پھر بے دریغ اپنے ہاتھ کیچڑ میں گھسیڑ دیے اور دیوانہ وار اس

نا معلوم شے کو ٹٹولنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کا تمام جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "راجو! یہاں سے سارا پانی اور کیچڑ کھینچو۔۔۔ فوراً" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "حسنے! تم بھی اوپر چلے جاؤ۔ میں یہاں نیچے بالٹیاں بھرتا ہوں۔"

عالم جوش میں وہ ایسا کام کرنے کی ہامی بھر رہا تھا جو اس کے نوکروں کے نوکر بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ میں نے کہا۔ "جناب! ہمارے ہوتے ہوئے آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔"

"کوئی تکلیف نہیں۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ "اوپر پہنچو۔۔۔ فوراً۔"

میں اور صفدر رسّی کی گیلی سیڑھی پر درمیان سے پاؤں جماتے اوپر چڑھنے لگے۔ کنارے پر زریں گل ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت سوال مچل رہے تھے لیکن موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموش تھا۔ افراہیم کی ہدایت کے مطابق ہم نے رسّی سے بندھی ہوئی ایک اور بالٹی گڑھے میں لٹکا دی۔ افراہیم بالٹیوں کو پانی اور کیچڑ سے بھرنے لگا۔ ہم تینوں انہیں اوپر کھینچنے لگے۔ بیس پچیس منٹ میں ہم نے گڑھا پانی اور کیچڑ سے خالی کر دیا۔ ۔۔ میں جو شے دبی ہوئی نظر آ رہی تھی وہ کوئی پیٹی تھی۔ ایسی جستی پیٹیاں گھروں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ تاہم اس پیٹی کا رنگ و روپ مختلف نظر آتا تھا۔ افراہیم نے جلدی جلدی بیلچہ چلانا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں پیٹی کا بالائی حصہ مٹی سے برآمد کر لیا۔ یہ سات ضرب تین فٹ کی پیٹی تھی۔ گہرائی ابھی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی۔ پیٹی کے کنڈوں میں پیتل کے دو بڑے بڑے قفل جھول رہے تھے۔ افراہیم کے اشارے پر میں ایک بار پھر رسّی کی سیڑھی سے لٹک کر گڑھے میں اتر گیا۔ افراہیم نے ہدایت کی کہ میں بیلچہ سنبھالوں اور پیٹی کو مٹی سے برآمد کرنے میں اس کی مدد کروں۔ میں تندہی سے بیلچہ چلانے لگا۔ گیلی مٹی بالٹیوں میں بھر بھر کر اوپر پہنچائی جا رہی تھی۔ جلد ہی پوری پیٹی مٹی سے باہر آ گئی۔

یہ پیٹی عام گھریلو پیٹیوں سے دو طرح مختلف تھی۔ ایک تو یہ لوہے یا جست کے بجائے تانبے کی ڈیڑھ سوت موٹی چادر کی تھی۔ دوسرے اس کا سائز لمبائی کے رخ پر عام پیٹیوں سے قریباً دو فٹ زائد تھا۔ پیٹی کی چاروں طرف مٹی جمی تھی۔ ہم نے کھرپیوں سے یہ مٹی ہٹانی شروع کی۔ جہاں جہاں کھرپے کے نوکیلے کنارے سے تانبے پر رگڑ آئی وہاں ایک چمکیلی لکیر سی نمودار ہو گئی۔ پیٹی میں لگے ہوئے تالے بھی مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تالے کے کوئی تعویذ قسم کی چیز بندھی تھی۔ یہ ڈیڑھ انچ مربع کی دھاتی ڈبیا تھی جو کالے رنگ کی موٹی ڈوری میں پرو کر پیٹی کنڈے سے منسلک کر دی گئی تھی۔ جس وقت ہم پیٹی نچلے کناروں سے مٹی ہٹا رہے تھے مجھ پر ایک اور سنسنی انکشاف ہوا۔ اس پیٹی کے نیچے بھی ایک ایسی ہی پیٹی تھی۔

بالائی پیٹی جب مٹی سے صاف ہو چکی تو افراہیم صفدر کو ہدایت کی کہ وہ ایک کدال نیچے گڑھے میں پھ صفدر نے کدال پھینک دی۔ یہ جاننا زیادہ دشوار نہیں افراہیم کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ قفل توڑنا چاہتا تھا۔ اس اپنے دونوں ہاتھ بڑے جوشیلے انداز میں رگڑے اور تھام کر پیٹی کے ایک کنڈے پر ضربیں لگانے لگا۔ کدال ضرب دھماکے کی طرح تہ خانے میں گونج رہی تھی۔ حیران تھا کہ وہ شخص جو کل رات مٹی کھودنے کی آواز بھی بدک رہا تھا اب دھائیں دھائیں کدال چلانے معروف تھا۔ کنڈے پر دس بیس ضربیں لگانے کے افراہیم کو اندازہ ہو گیا کہ یہ لوہا نہیں تانبا ہے۔ زوردار ضر سے ٹیڑھا تو ہو جائے گا لیکن آسانی سے ٹوٹنے کا نہیں بہتر یہ ہے کہ کنڈا اکھاڑنے کے بجائے قفل توڑنے کوشش کی جائے۔ اس نے مشورہ طلب نگاہوں سے طرف دیکھا۔ میں نے اس کے خیال کی تصدیق کرتے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ کنڈے کے بجائے تالے پر لگائی جائے۔ لائیں کدال مجھے دیں۔ میں کوشش ہوں۔"

اچانک ہی جیسے افراہیم کو احساس ہوا کہ فرطِ جو آ کر اس نے وہ کام شروع کر دیا تھا جو اسے نہیں کرنا چ تھا۔ یعنی اپنے ہاتھوں سے مٹی کھودنا اور کدال چلانا نے کدال میری طرف پھینکی اور دو قدم ہٹ کر کھڑا اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور آنکھوں میں فروزاں آگ روشن ہو چکی تھی۔ میں نے ایک خاص بات یہ بھی نوٹ وہ ہماری طرف سے بہت چوکس نظر آ رہا تھا۔ کدال ہاتھ میں آتے ہی وہ جس انداز میں پیچھے ہٹا تھا اور تن کر کھڑا ہوا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاشعوری اس کے ذہن میں کوئی خوف بیدار ہو چکا ہے۔ جدید پسٹل اس کے کوٹ کی پھولی ہوئی جیب میں موجود تھا لگ رہا تھا کہ اس کے دائیں ہاتھ اور اس جیب کے د ایک ہنگامی سا تعلق قائم ہو چکا ہے۔

میں نے ہتھیلیوں پر تھوک کر کدال کا ملائم دستہ مضبوطی سے تھاما اور نپے تلے انداز میں پیتل کے قدیم تالے پر ضربیں لگانا شروع کیں۔ ہر ضرب کی صدا گڑھے سے نکل کر تہ خانے میں گونج رہی تھی اور چاروں طرف سنسنی کی لہریں پھیلتی محسوس ہوتی تھیں۔ برسوں سے بند اس پیٹی میں سے کیا برآمد ہونے والا ہے؟ یہ سوال بے طرح اعصاب کو جکڑے ہوئے تھا۔

تجسس اردو کا لفظ ہے جس کے لیے انگریزی میں سسپنس کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں پانچ حرفی ہم شکل لفظ میں نے زندگی میں سیکڑوں مرتبہ سنے اور بولے تھے لیکن ان کی حقیقی معنویت مجھ پر آج آشکار ہو رہی تھی۔ غالباً صفدر اور زریں گل کی کیفیت بھی ان لمحوں میں مجھ سے مختلف نہیں رہی ہو گی۔ افراہیم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ تجسس و بے خبری لازم و ملزوم ہوتے ہیں اور معلوم نہیں افراہیم ہماری طرح بے خبر تھا یا نہیں۔ ہاں اتنی بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ ان لمحوں میں جوش و خروش اور مسرت کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ ان حدوں کے بعد دیوانگی کی حد شروع ہو جاتی اور دیوانہ وہ بہرحال نہیں ہوا تھا۔

کدال کی ایک ضرب ایسی جچی تُلی پڑی کہ ڈیڑھ کلو وزنی تالا کھنک سے ٹوٹ کر ایک طرف جھول گیا۔ اب دوسرے تالے کی باری آئی۔ اس تالے میں جھولتا ہوا تعویذ خالص چاندی کا تھا۔ افراہیم نے ایک جیبی چاقو سے سیاہ ڈوری کاٹ کر تعویذ تالے سے علیحدہ کر دیا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں اس تالے کے "دانت بھی کھٹے کروں۔"

یہ تالا کافی ڈھیٹ ثابت ہوا۔ کدال کی پے در پے ضربوں نے اس کی ظاہری شکل بری طرح بگاڑ دی لیکن وہ ٹوٹا نہیں۔ شاید یہ اس تعویذ کا اثر تھا جو اس سے باندھا گیا تھا یا پھر عجلت میں میں ہی ڈھنگ سے چوٹ نہیں لگا پا رہا تھا۔ میری معاونت کے لیے صفدر بھی گڑھے میں اتر آیا لیکن اس کے پہنچتے پہنچتے تالا ٹوٹ گیا۔ افراہیم نے آگے بڑھ کر دونوں تالے پیٹی سے علیحدہ کیے۔ کنڈیاں کھولیں اور پیٹی کا ڈھکنا اٹھانا چاہا۔ ڈھکنا بری طرح جام تھا۔ افراہیم کی زور آزمائی کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ہم تینوں نے مل کر زور لگایا پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ صفدر نے بیلچے کے پھل سے ڈھکنے کی چاروں طرف ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں۔ ڈھکنے اور پیٹی کی درمیانی درز سے مٹی جھڑ جھڑ کر نیچے گری۔ یہ بڑے تجسس کے لمحے تھے۔ تمام حسیات جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ صفدر نے بیلچہ ایک طرف رکھ دیا تو ہم تینوں نے کنڈے تھام کر ایک ساتھ زور لگایا۔ ایک جھٹکے سے ڈھکنا اوپر اٹھ گیا۔ ان گنت برسوں سے مقید ہوا آزاد ہو کر ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی۔ گڑھے سے اوپر تہ خانے کی چھت پر لگی ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی براہ راست اس پیٹی میں داخل ہوئی اور جو کچھ اس تاریک خلا میں تھا ہماری نگاہوں کے سامنے چمک اٹھا۔ ہم سانس روکے یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ تانبے کی اس پیٹی میں چند چھوٹے بڑے صندوق نظر آ رہے تھے۔ یہ صندوق پیٹی کے اندر عرضی رخ سے اوپر نیچے رکھے تھے۔ سب سے پہلے پیٹی کے فرش پر تین بڑے صندوق رکھے گئے تھے۔ اس کے بعد ان پر مختلف سائز کے صندوق جوڑ دیے گئے تھے۔ یہ تمام صندوق اپنی ساخت اور ڈیزائن میں مختلف ہونے کے باوجود قیمتی اور مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ انہیں مزید غور سے دیکھنے کے لیے افراہیم نے اپنی کنگ سائز ٹارچ بھی گڑھے میں منگوا لی تھی۔

پیٹی کے بائیں کونے میں سب سے اوپر ساگوان کا بنا ہوا سب سے خوب صورت بکس رکھا تھا۔ اس پر بیل بوٹے کندہ تھے۔ مضبوطی کے لیے بکس کے آٹھوں کونوں پر دھاتی خول چڑھائے گئے تھے۔ کنگنے کسی چمکدار دھات کے تھے اور ٹارچ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ پہلی نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو گیا کہ ماضی میں ان کنگنوں کو توڑا گیا ہے۔ ڈھکنے کا کچھ حصہ بھی اس "زبردستی" کا شاہد تھا۔ افراہیم نے بے تاب ہاتھوں سے اس چوبی بکس کو ترچھا کیا اور بہ آہستگی ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔ چند لمحوں کے لیے ہم مبہوت کھڑے رہ گئے۔ پلکیں جھپکنا بھول گئیں اور سانس سینوں میں ساکت ہو گیا۔ بکس میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی اور سب سے پہلے دائرۂ بصارت میں آئی وہ سونے اور چاندی کے جڑاؤ گہنے تھے۔ کچھ گہنے بکس میں کھلے پڑے تھے اور کچھ "زیورات کے مخصوص" سرخ ڈبوں میں تھے۔ افراہیم نے ٹارچ مجھے تھمائی اور عجیب ہیجانی کیفیت میں بکس کی اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس کے کپکپاتے ہوئے لرزاں ہاتھوں نے یکے بعد دیگرے سرخ ڈبے کھولے اور ہماری آنکھوں کے سامنے حسن کی دیوی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ سب زیورات قیمتی پتھروں سے مرصّع تھے اور انہیں دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ موجودہ مارکیٹ میں ان کی مالیت لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ہو گی۔ ہار، کنگن، جھومر، انگوٹھیاں، ونی بندے، چھوٹے چھوٹے جڑاؤ تاج، مواتہ، لائیں، منقش کمربند، پھر ایک نہایت بیش قیمت ہیروں جڑا

پاندان۔ یہ سب کسی رئیسانہ ٹھاٹ باٹ والے شخص کا ساز و سامان تھا۔ ہاتھی دانت کی ایک خوب صورت ڈبیا کھولی گئی تو اس کے نیلگوں مخمل پر بیش قیمت موتی جگمگا رہے تھے۔ نجانے کب سے یہ موتی اس سنسان تہ خانے کی کیچڑ میں دفن تھے لیکن ٹارچ کی روشنی میں یوں دمک رہے تھے جیسے ابھی کسی جوہری کے شوکیس سے نکلے ہوں۔ نیلگوں مخمل پر گرد کا ذرہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ افراہیم نے اپنی ٹھٹھری ہوئی انگلیوں سے ایک موتی اٹھایا تو ڈبیا کی اندرونی نفاست دھری کی دھری رہ گئی۔

ایکا ایکی افراہیم کو احساس ہوا کہ ساگوان کے اس بکس میں سے پھوٹنے والی دولت کی چمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دی ہیں اور وہ اپنے ارد گرد سے غافل ہو گیا ہے اور افراہیم کے زاویۂ نگاہ سے یہ ایک خطرناک غلطی تھی۔ وہ ایک مدفون لاوارث دولت کے روبرو کھڑا تھا اور جب انسان لاوارث دولت کے روبرو ہوتا ہے تو اکیلا ہوتا ہے۔ نہ کوئی اس کا دوست ہوتا ہے اور نہ بہی خواہ۔ وہ کسی پر اعتبار کر سکتا ہے.... نہ کوئی اس پر اعتبار کرتا ہے۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہر خزانے کے اوپر ایک سانپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ سانپ درحقیقت وہ موت ہوتی ہے جو لاوارث دولت پر اپنا سایہ کیے رکھتی ہے۔ اس دولت کے نزدیک آنے والا ہر شخص موت کے سائے میں آ جاتا ہے۔ کسی شے کے لیے لڑنا اور خون بہانا ازل سے ذی روح کی فطرت میں شامل ہے۔ شاید ہابیل اور قابیل سے بھی پہلے یہ سلسلہ جاری تھا۔ ایک کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگنے والے لوگ خونخوار جانوروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں، زر و جواہر تو بہت آگے کی چیز تھی۔

میرے ذہن نے خودکار طور پر کیلکولیشن کی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ ابھی تک جو کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے آیا تھا وہ صرف ایک بکس کا اسباب تھا۔ اس جیسے کم و بیش ایک درجن بکس، صندوق اور اٹیچی اس پیٹی میں موجود تھے اور پھر یہ ایک پیٹی بھی نہیں تھی۔ اس جیسی کم از کم ایک پیٹی اور ہمارے قدموں کے نیچے پڑی تھی۔ جس وقت میں یہ کیلکولیشن کر رہا تھا غالباً اسی وقت افراہیم نے بھی یہی حساب کتاب جوڑا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ کچھ اور محتاط ہو گیا اور اس کے اعصاب تن سے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ اپنی پھولی جیب سے قریب تر ہو چکا ہے۔ سفید موتیوں والی ہاتھی دانت کی ڈبیا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نازک موقع پر وہ اپنے دونوں ہاتھ خالی رکھنا چاہتا تھا لہٰذا یہ ڈبیا اس نے دور ہی سے پیٹی کے اندر پھینک دی۔ وہ ایک دھاتی صندوق سے ٹکرائی اور پیٹی ہی کے اندر کسی درز میں گم ہو گئی۔ صندوق سے ٹکرا کر وہ کھل گئی تھی۔ ممکن تھا کہ ایک آدھ موتی اچھل کر گڑھے کی کیچڑ میں جا گرا ہو لیکن افراہیم اس وقت اتنا "امیر" تھا کہ ایسے نقصان متحمل ہو سکتا تھا۔

وہ دبی سی آواز میں بولا۔ "راجو! یہ بکس ایک طرف رکھو اور نچلا بکس کھولو۔"

صفدر نے معمول کی طرح اس ہدایت پر عمل کیا۔ جب اس نے ساگوان کا بکس لمبائی کے رخ پیٹی کے درمیان رکھا تو بکس کی دائیں سائیڈ پر لکھے ہوئے کچھ حروف ہماری نگاہوں کے سامنے آ گئے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ان حروف پر ڈالی۔ افراہیم نے چشمہ درست کیا اور آگے جھک کر حروف کو پڑھنے لگا۔ تاہم ان لمحات میں بھی وہ ہماری طرف سے پوری طرح باخبر تھا۔ یہ دیکھ کر میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ اس کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں تھا۔ میں اس کی پھولی ہوئی جیب سے نگاہ ہٹا کر بکس کی تحریر پر جما... الفاظ غالباً سرکنڈے کے قلم کو نیلی روشنائی میں ڈبو کر لکھے گئے تھے لیکن امتدادِ زمانہ سے یہ روشنائی اتنی پھیکی پڑ چکی تھی کہ اس کا اصل رنگ شناخت کرنا دشوار تھا۔ یہ انگریزی کے کیپٹل حروف تھے اور کسی پڑھے لکھے شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ باریک بینی سے دیکھنے کے بعد میں جو پڑھنے میں کامیاب ہوا وہ یہ تھے۔ "ٹھاکر رام چند قلعہ گڑھ، رحیم یار خان۔"

بادی النظر میں لگتا تھا کہ یہ اسی بکس کے مالک ہے۔ چند ہی لمحے بعد اس اندازے کی تصدیق ہو گئی جب صفدر نے نیچے والا صندوق اٹھا کر ساگوان بکس پر رکھا اور اس کا دایاں پہلو ہمارے سامنے آیا۔ صندوق پر بھی بعینہٖ اسی تحریر میں یہی الفاظ درج تھے۔ حجم کے پیتل کا صندوق تھا۔ ڈھکنے کے حاشیے پر صورت بیل بنی ہوئی تھی۔ کنڈے روایتی تھے اور دستی منڈھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ صندوق چالیس برس پہلے کسی صاحبِ ثروت نے کسی مہنگی دکان سے منہ مانگے داموں خریدا ہو گا۔ اس صندوق کے کنڈے اناڑی پن سے توڑ دیے گئے تھے۔ صفدر نے ڈھکنا اٹھایا تو بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اس صندوق میں مخملی کپڑے کی ایک درجن پوٹلیاں تھیں۔ ان کے بالائی سروں پر گرہیں لگی تھیں۔ دو پوٹلیاں کسی چیز کی مدد سے پھاڑی

تھیں اور ان میں سے نکلنے والی طلائی اشرفیاں صندوق کے ایک کونے میں بے ترتیب پڑی تھیں۔ باقی پوٹلیوں کو کھولے بغیر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں بھی اشرفیاں ہیں۔ اس صندوق میں رول اور تہ کیے ہوئے بہت سے کاغذات بھی تھے۔ ان کاغذات کو دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ یہ رجسٹریاں وغیرہ ہیں۔ افراہیم نے آگے بڑھ کر ایک رول اٹھایا۔ اس کا ربر بینڈ ہٹا کر کاغذ کو سیدھا کیا اور ٹارچ کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ میری اچٹتی سی نگاہ کاغذ پر پڑی۔ موٹے ہولڈر کے ساتھ پرانے انداز میں لکھی ہوئی رجسٹری تھی۔

"مسماۃ رسولاں بیگم، بیوہ مہر دین قوم ارائیں۔ بنام تواری لال سکنہ فلاں فلاں۔"

افراہیم نے رجسٹری لپیٹ کر پھر صندوق میں رکھ دی۔ ڈھکنا گرا کر صندوق کو ایک طرف دھکیلا اور صفدر کو ایک دوسرا صندوق کھولنے کا اشارہ کیا۔

یہ صندوق پیٹی کے دائیں کونے میں تھا اور اس کے بھی تالے ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی کا صندوق تھا۔ لکڑی کے بارے میں مجھے بنیادی معلومات حاصل ہیں۔ صندوق کو دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ دنیا کی وزنی ترین لکڑی بلیک آئرن ووڈ ہے۔ یہ کافی نایاب لکڑی سمجھی جاتی ہے۔ اس صندوق کو مغلیہ انداز میں سنہری میخوں، پتریوں اور قبضوں وغیرہ سے سجایا گیا تھا۔ اس کے ایک پہلو پر جناب پرتھی پال جی، سکنہ پرانا گاؤں، کوٹ سمابہ، رحیم یار خان کے الفاظ درج تھے۔ نیچے سندھی میں بھی ایک دو الفاظ لکھے تھے۔ افراہیم کے اشارے پر صفدر نے ڈھکنا اٹھایا۔ اس صندوق کی متاع دیکھ کر ہمیں پہلے دونوں صندوق بھول گئے۔ اس صندوق کے دو حصے تھے۔ دو فٹ ضرب ڈیڑھ فٹ کا ایک خانہ نیچے سے اوپر تک جڑاؤ گہنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ گہنے ڈبوں سے نکال کر رکھے گئے تھے ورنہ ان کے لیے شاید ایسے صندوق بھی ناکافی ہوتے۔ صندوق کا دوسرا خانہ پہلے خانے سے تھوڑا ہی چھوٹا تھا۔ اس میں سونے کا ایک مکمل ڈائننگ سیٹ مع چمچ جات اور دیگر لوازمات رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں سوئٹزرلینڈ کے ساختہ دو ٹیبل کلاک بھی تھے۔ یہ کلاک مکمل طور پر سونے کے تھے اور ان کے ڈائل میں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ دونوں کلاکس پر وقت نو بجے کے آس پاس رکا ہوا تھا۔ معلوم نہیں یہ کس زمانے، کس سن اور دن کا وقت تھا اور صبح کا وقت تھا یا شام کا۔ مگر یہ وقت تھا جو کہیں ماضی کے ماہ و سال میں اپنے تمام تر اسرار و رموز کے ساتھ ان صندوقوں ہی کی طرح ساکت تھا۔

یہ ٹیبل کلاک ایک اخباری کاغذ میں لپیٹ کر رکھے گئے تھے۔ افراہیم نے ایک ٹیبل کلاک اٹھایا تو اخباری کاغذ کے ٹکڑے پر میری نگاہ پڑی۔ یہ ٹکڑا گزرے ہوئے وقت کے سبب اپنا اصل رنگ روپ کھو چکا تھا۔ تاہم اس کے اصل مندرجات پڑھے جا رہے تھے۔ ایک کونے میں وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تصویر تھی۔ وہ لنگوٹی پوش گاندھی کے شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ دونوں کسی بات پر کھل کر مسکرا رہے تھے۔ نیچے ایک طرف سرخی لگی ہوئی تھی۔ "بٹالہ کو مسلم آبادی سے خالی کرایا جا رہا ہے۔ مہاجرین کے قافلوں پر سکھوں کے حملے۔"

بائیں گوشے میں ایک اور دو کالمی خبر نظر آ رہی تھی۔ سرخی تھی۔ "قادیان کی اطراف میں کشیدگی بڑھ گئی۔"

یہ دو سرخیاں دیکھنے کے بعد میرے لیے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ یہ اخباری ٹکڑا کس دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ باؤنڈری کمیشن کا اعلان ہونے والا تھا یا ہو چکا تھا اور پاک و ہند کی سرحد کی دونوں جانب زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی نامعلوم اخبار کا یہ مختصر سا ٹکڑا دیکھ کر ایک پورا دور میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ تاریخ پاک و ہند کے حوالے سے پڑھی اور سنی ہوئی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ بنگال اور بہار میں خونی

قساوات، لٹے پٹے قافلوں کی دردناک مسافتیں، پھر قیامِ پاکستان کا اعلان اور پنجاب میں خون کی ہولی۔

اچانک میرا یہ شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ ہم اس عمیق گڑھے میں کھڑے جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں اس کا تعلق کسی نہ کسی طور اسی دورِ پُرآشوب سے ہے۔ افراہیم کچھ دیر بیش قیمت ٹیبل کلاک کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اسے صندوق میں رکھ کر اس نے صندوق کا ڈھکنا گرا دیا۔ نہایت وزنی ڈھکنا پُرشور آواز سے گرا اور تہ خانے میں یہ صدا دیر تک گونجتی رہی۔ افراہیم نے تیز نظروں سے باقی صندوقوں کا معائنہ کیا۔ وہ سب مقفل دکھائی دیتے تھے۔ بعض صندوقوں کے تالے آہنی تھے جبکہ کچھ کی کنڈیوں سے اچھی قسم کے تالے جھول رہے تھے۔

معائنے کے بعد افراہیم سیدھا ہوا اور الٹے قدموں چل کر پیٹی سے دور ہٹ گیا۔ "رکو" اس کی صدا تہ خانے میں گونجی۔ "پیٹی بند کردو۔"

صنوبر نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا۔ پیٹی کا ڈھکنا کچھ ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اسے بند کرنے میں دشواری پیش آئی۔ تاہم یہ دشواری ڈھکنا کھولنے کے معاملے میں معمولی تھی۔ جب میں اور صنوبر ڈھکنا بند کر رہے تھے، افراہیم رسّی کی سیڑھی پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ وہ گڑھے سے نکل کر زرّیں گل کے پہلو میں پہنچ گیا تو میں اور صنوبر بھی یکے بعد دیگرے باہر نکل آئے۔ افراہیم کے بال منتشر تھے۔ عینک ناک کی ڈھلوان پر تھوڑی سی کھسک چکی تھی۔ وہ ہانپا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے یک ٹک گڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہو کہ جو نگاہوں کے روبرو ہے وہ حقیقت ہے۔ یکایک اسے ہماری موجودگی کا احساس ہوا اور وہ چونک سا گیا۔ اس نے اپنا کیچڑ آلود ہاتھ کوٹ کی لتھڑی ہوئی جیب سے باہر نکالا اور گھڑی دیکھ کر بولا۔ "اوہ، ایک بج گیا۔ تم نے شاید ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے اب تم کوئی بھی کام کرنے سے پہلے کھانا کھالو۔"

"کوئی بات نہیں جناب، بالکل بھوک نہیں ہے۔" صنوبر نے کہا۔

"تمہارے چہرے بتا رہے ہیں کہ تم بھوکے ہو۔ چلو شاباش پہلے کھانا کھاؤ۔"

میں نے محسوس کیا کہ اسے ہماری بھوک کی زیادہ فکر نہیں۔ دراصل وہ اپنی بے پایاں مسرت و حیرت کو ہضم کرنے اور سوچ بچار کے لیے تھوڑا سا وقت چاہتا ہے۔

تہ خانے میں ایک بڑا جستی حمام پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے ٹونٹی کھول کر باری باری اپنے لتھڑے ہوئے ہاتھ پاؤں دھوئے پھر میلے کپڑوں کے ساتھ ہی کھانا تیار کرنے میں جُت گئے۔ یہ حقیقت تھی کہ ہماری بھوک مر چکی تھی۔ پچھلے تین چار گھنٹوں میں ہم جو دیکھ چکے تھے اسے دیکھنے کے بعد بھوک کا مر جانا عین حسبِ حال تھا۔ کل کے سنبھالے ہوئے سالن کو ہیٹر پر گرم کرتے ہوئے میں نے صنوبر اور زرّیں گل کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔ "ہمیں چوکس رہنا ہوگا۔ افراہیم ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

زرّیں گل نے جوابی سرگوشی کی۔ "سبزی کاٹنے والا چھری اماری شلوار کے نیفے میں ہے۔ ام نے ایک اور چھری بھی ادھر کمرے میں دیکھا ہے۔ وہ مل جائے تو کم از کم دو آدمی تو مسلح ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مسلح ہونے سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس خبیث کی جیب میں بھرا ہوا پستول ہے۔ چھری سے پستول کا مقابلہ اسی وقت ہو سکے گا جب ہم پہلے سے چوکس ہوں گے۔"

صنوبر بولا۔ "کیوں نہ اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس پر قابو پا لیا جائے۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ابھی اس شخص کو ہماری ضرورت ہے۔ اصل خطرہ اس وقت سامنے آئے گا جب وہ ہمیں غیر ضروری سمجھنے لگے گا۔"

افراہیم ہم سے پندرہ بیس قدم دور آرام کرسی پر براجمان تھا۔ بوتل اور گلاس ہاتھ میں تھے اور اپنی اندرونی ہلچل پر قابو پانے کے لیے وہ مسلسل گھونٹ لے رہا تھا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر زینوں کے قریب چکراتا رہا پھر گڑھے کے کنارے تن کر کھڑا ہوا۔ سگریٹ مسلسل اس کے ہونٹوں میں تھا۔ ابھی ہم نے کھانا ختم نہیں کیا تھا کہ وہ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ کہنے لگا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ شام کے بعد کچھ مہمان یہاں آئیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں یہاں تمہاری موجودگی کا علم ہو۔ میں تہ خانے کی بتیاں بجھا جاؤں گا۔ تم بھی اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لینا اور روشنی وغیرہ بجھا کر رکھنا۔ بلکہ بہتر ہے کہ میں کمرے کو باہر سے لاک کر جاؤں۔ ہاں۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "تم کسی قسم کا وہم دل میں نہ لانا۔ میں بے فیض شخص نہیں ہوں۔ تمہیں تمہاری محنت کا صلہ توقع سے بڑھ کر ملے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

اس کی آواز اندرونی ہیجان کے سبب لرز رہی تھی۔

اسی لرزش کو چھپانے کے لیے اس نے زیادہ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم کمرے میں چلے گئے۔ افراہیم نے تہ خانے کی تمام لائٹیں بجھا دیں اور ہمارے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ ہم نے کمرے کی بتی جلتی رہنے دی تھی۔ تاہم افراہیم نے یہ ہدایت کی کہ جب تہ خانے کا دروازہ کھلنے لگے تو ہم یہ بتی بھی بجھا دیں۔

○☆○

تہ خانے میں دن اور رات برابر تھے لیکن ہماری گھڑیوں کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ اس ویران حویلی سے باہر شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ ہم تصور کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ جھاڑ، کیکر اور ٹاہلی کے درخت دھیرے دھیرے اپنے خدوخال تیرگی کے حوالے کر رہے ہیں اور جلد ہی قرب و جوار میں سناٹے اور اندھیرے کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جائے گا۔

صنوبر نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ابھی ہڑبڑا کر اٹھوں گا تو خود کو ساہی صاحب کی حویلی میں پاؤں گا۔ فریال خالی گلاس لیے میرے سرہانے کھڑی ہوگی اور کہے گی، صنوبر اب بھی نہیں اٹھو گے تو پوری بالٹی سر پر انڈیل دوں گی۔"

زرّیں گل بولا۔ "امارا حال بھی آپ سے ملتا جلتا ہے۔ دن سے نسوار نہیں ملا۔ دماغ کو خشکی چڑھا ہوا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے چکر آتا ہے۔ لگتا ہے خواب میں چل پھر رہا ہوں۔ آنکھ کھل جائے گا پھر یہ حرامی افراہیم ہوگا نہ یہ کنواں نہ صندوق۔ استاد جی! کتنا عجیب لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔ ایسا تو جادو کی فلموں میں ہوتا ہے۔ ام نے جادو کا سب سے پہلا فلم ہزار داستان دیکھا تھا۔ اپنے محمد علی صاحب نے کام کیا تھا اس میں۔ ساتھ میں رانی اور طالش وغیرہ تھا۔ اس کے بعد حاتم طائی، گل بکاؤلی، پرستان، علی بابا چالیس چور، طلسمی فلم ام نے دیکھا۔ ایسا ہی ایک فلم ام نے پشاور میں دیکھا تھا۔ ام نے ایڈوانس بکنگ کرا رکھا تھا لیکن شو کے ٹائم ام کا سائیکل پنکچر ہوا۔ امارا مطلب ہے امارے سائیکل کا ٹائر پنکچر ہوا۔ ام ہاف ٹائم سے تھوڑی دیر پہلے سینما پہنچ سکا تھا۔ ام سینما میں گھسا تو اپنا سدھیر صاحب ایک غار میں سے جواہرات نکال کر لا رہا تھا۔ ام کو لگ رہا ہے استاد جی آج بھی ام نے ایک ایسا فلم دیکھا ہے جو پتا نہیں کب شروع ہوا تھا۔ خدا معلوم کب سے ان تالا بند صندوقوں تک پہنچنے کا کوشش ہو رہا تھا۔ ان کی تلاش میں کون کون سا کیا تھا اور کہاں کہاں کا خاک چھانا گیا تھا لیکن امارا قسمت کہ ام اس وقت اس اسٹوری میں داخل ہوا جب تلاش ملاش کا کام ختم ہونے کے قریب تھا۔۔۔ اوہ خدایا، امارا تو آنکھیں اب تک پھٹا ہوا ہے۔ پتا نہیں کتنا دولت ہے۔ اس سے تو۔۔۔ اس سے تو پشاور میں لاہور جیسا بادشاہی مسجد کھڑا کیا جا سکتا ہے۔"

زرّیں گل نے عام انداز میں بڑے پتے کی بات کہہ دی تھی۔ واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک فلم کو درمیان سے دیکھنے لگے ہیں یا کسی ناول کو بیچ میں سے پڑھنے لگے ہیں اور جس جگہ سے ہم نے دیکھنا یا پڑھنا شروع کیا ہے وہ کہانی کا ایک جاندار موڑ ہے۔ معلوم نہیں ارجمند، افراہیم اور ان کے بہی خواہ کب سے اس دفینے کی تلاش میں تھے۔ میری معلومات کے مطابق وہ ڈیڑھ دو سال سے سرگرداں تھے۔ اس سے پہلے وہ کئی حویلیاں خرید چکے تھے اور کئی ویرانوں کی خاک چھان چکے تھے۔

صنوبر بولا۔ "میرا خیال ہے آپ نے ایک بات نوٹ کی ہوگی۔ اس پیٹی کے نیچے بھی ایک پیٹی موجود ہے۔"

"بالکل موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرا خیال ہے افراہیم کو پہلے سے پتا تھا کہ ایک اور پیٹی بھی ہے۔"

زرّیں گل بولا۔ "امارا تو خیال ہے کہ اس حرامی کو ہر بات کا خبر ہے۔ ورنہ وہ نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ابھی سب کچھ کھدوا کر دیکھ لیتا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" میں نے کہا۔

"ام ہمیشہ سے ٹھیک کہتا ہے لیکن یہ صنوبر صاحب اماری بات کا قدر کرتا ہے نہ امارے دل کا اور امارے دماغ سے تو یہ ویسے ہی منکر ہے۔"

صنوبر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "شاہ جہاں صاحب! آخر یہ سب کیا ہے۔ خدا کی قسم میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ جس بات کو ہم کل تک مذاق سمجھ رہے تھے وہ حقیقت نکلی ہے اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنی بات چھوڑو۔ افراہیم اور ارجمند کے قریبی ساتھی بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ میں نے اپنے کانوں سے قادر زمان کو افراہیم کا مضحکہ اڑاتے سنا تھا اور ممکن ہے اسی وقت بھی وہ حویلی سے چند کوس دور مرغابیوں اور خرگوش کے پیچھے جنگل میں ہو رہا ہو، یہ جانے بغیر کہ جس دولت کے لیے وہ ہر حرام کام کر گزرتا ہے وہ ڈھیروں کے ڈھیر اس حویلی میں پڑی ہے۔"

صنوبر نے گرل والی کھڑکی میں سے گڑھے کی جانب ایک حیرت زدہ نگاہ ڈالی اور طویل سانس لے کر بولا۔ "او مائی گاڈ! اگر یہ واقعی اصلی سونا اور اصلی جواہرات ہیں تو پھر اس

دولت کا شمار کم از کم ہمارے لیے ناممکن ہے۔"

میں نے کہا۔ "ان چیزوں کے اصلی ہونے میں کس بات کا شک ہے؟ جو چیز منہ سے بول رہی ہے اور سونے کی حد تک تو میں گارنٹی دے سکتا ہوں۔"

"کوئی اندازہ قائم کیا ہے آپ نے ان صندوقوں کے بارے میں؟" صفدر نے گویا میرے خیال سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔

"آج تمام رات ہم نے اندازے ہی تو قائم کرنے ہیں۔" میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"تو پھر کچھ بولیں ناں۔" صفدر نے بے قراری سے پہلو بدلا۔ "میرے خیال میں آپ نے وہ اخباری تراشا بھی دیکھا ہوگا جس میں مخمل کلاک لپٹے ہوئے تھے۔"

"تم نے نہیں دیکھا؟"

"نہیں میں دور تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ سن سینتالیس کے وسطی مہینوں کا اخبار تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور گاندھی کی تصویر تھی' اس کے علاوہ فسادات کی چند ایک خبریں تھیں۔"

صفدر کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔ میرے جواب سے اس کے کسی اندازے کی تصدیق ہوگئی تھی' کہنے لگا۔

"میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے جناب۔"

"کیا؟"

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور کش لیتے کے دوران ہی اپنا ارادہ بدل دیا۔ بولا۔ "پہلے آپ بتائیں آپ نے کیا اندازہ لگایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بات تم نے شروع کی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلے تم اپنے اندازے کی "رونمائی" کرو۔"

"لیکن۔۔۔ چلیں اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے مزاحمت ترک کردی۔ کرسی سے ٹیک لگا کر اپنے پاؤں ہیٹر سے قریب تر کرتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ پارٹیشن کے وقت کچھ علاقوں میں ہندوؤں اور کچھ میں مسلمانوں نے اپنے جان و مال کے لیے خطرہ محسوس کیا تھا۔ ایسے واقعات بھی سنے گئے ہیں کہ کچھ اقلیتی باشندوں نے نقل مکانی سے پہلے اپنے قیمتی اثاثے کہیں دفن کردیے یا انہیں رازداری کے ساتھ' سرحد پار اپنے عزیزوں کے پاس پہنچادیا۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں پیٹیاں بھی جو اس گڑھے سے نکلی ہیں' جنوبی پنجاب سے مشرقی پنجاب روانہ کی گئی ہوں۔ بعد ازاں کسی حادثے یا سانحے کے سبب وہ یہاں جھنگ آپہنچی ہوں اور یہیں دبادی گئی ہوں۔ یہ سارا سامان ایک شخص کا نہیں ہے' اور ہو بھی نہیں سکتا' بے شمار دولت ہے یہ۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ صندوقوں پر مختلف لوگوں کے نام لکھے ہیں۔ ان سب کا تعلق رحیم یار خاں کے اردگرد کے علاقے سے ہے اور سبھی ہندو امرا ہیں۔ عین ممکن ہے کہ سرحد کی دونوں جانب حالات بگڑتے دیکھ کر علاقے کے صاحب ثروت ہندوؤں نے مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا ہو اور اپنے قیمتی اثاثے ایک جگہ جمع کرکے سرحد پار پہنچانے کی کوشش کی ہو۔"

اپنی بات ختم کرکے صفدر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ "تمہاری بات میں وزن ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ رحیم یار خاں کے ہندو ساہوکاروں اور سیٹھوں کے اثاثے یہاں جھنگ میں اور اس بے آباد جگہ میں کیسے پہنچے۔ جہاں تک ان اثاثوں کو سرحد پار کرانے کا تعلق ہے تو ان پیٹیوں کو اس طرف لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ رحیم یار خاں یا خان پور میں بیٹھا ہوا ہندو اپنے اثاثوں کو سیکڑوں میل کی پرخطر مسافت کیوں کرواتا۔ وہ قریبی بارڈر پار کرکے راجستھان میں داخل ہوتا اور سورت گڑھ' بیکانیر وغیرہ کی طرف نکل جاتا اور یہ لوگوں نے ایسا کیا بھی ہوگا۔"

"لیکن میں کسی حادثے یا واقعے کی بات کر رہا ہوں" صفدر نے کہا۔ "ممکن ہے کہ یہ پیٹیاں حادثاتی طور پر اس طرف آئی ہوں۔ رحیم یار خاں اور بارڈر کے درمیانی راستوں میں کسی نے ان پیٹیوں پر شب خون مارا ہو اور وہ انہیں اٹھا کر یہاں لے آیا ہو۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ صندوقوں کے تالے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ یقیناً بہت سی اشیا نکالی گئی ہوں گی۔ باقی اسباب لٹیروں نے یہاں دفن کردیا ہوگا تاکہ بوقت ضرورت نکال سکیں۔ بعد میں وہ خود بھی کہیں فسادات کی آگ میں جل مرے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "میرا اپنا خیال بھی تم سے زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن کچھ باتیں ابھی وضاحت طلب ہیں۔ پیٹیوں کی بناوٹ' شاید تم نے نوٹ نہیں کیا' یہ دونوں تانبے کی ہیں اور موٹی چادر سے بنائی گئی ہیں۔ ایسی پیٹیاں کم از کم میں نے تو نہیں دیکھیں۔ یقیناً کسی خاص مقصد کے لیے بنی ہوں گی۔ انہیں خصوصی طور پر بنوایا گیا ہے۔ لوہے کو فوراً زنگ لگنا شروع ہوجاتا ہے لیکن یہ رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ پیٹیاں دفن کرنے کے لیے بنوائی گئی تھیں۔ اگر تمہارا یہ مفروضہ درست مان لیا جائے کہ رحیم یار خاں کے نواحی مہاجنوں اور زمینداروں نے

پیٹیاں بھارت روانہ کی تھیں اور راستے میں ان پر شب خون مارا گیا تو پھر یہ پیٹیاں تانبے سے کیوں بنائی گئیں اور اگر یہ تانبے سے بنائی گئی تھیں اور انہیں زمین میں گاڑنا مقصود تھا تو پھر رحیم یار خاں سے جھنگ لا کر کیوں گاڑا گیا۔"

"ہاں یہ الجھن تو موجود ہے۔" صفدر نے اعتراف کیا۔

"دوسری الجھن یہ ہے کہ ان پیٹیوں کو اتنی گہرائی میں کیوں گاڑا گیا۔ اس مقصد کے لیے گیارہ بارہ فٹ گہرا گڑھا بھی کافی تھا' لیکن ہمیں دوسری پیٹی قریباً پینتیس فٹ کی گہرائی سے ملی ہے۔"

"یہ بات تو ہمارے ذہن میں بھی بڑا کھٹک رہا ہے۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔ "پشتو کی ایک مشہور کہانی میں ایک وزیرستانی نائی اپنی جھگڑالو ساس کی موت کے بعد اسے زمین میں بہت گہرا دفن کردیتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ پھر باہر نہ نکل آئے۔۔۔ لیکن اتنا گہرا تو وہ بھی دفن نہیں کرتا۔"

"یار! تم اپنی چونچ بند نہیں رکھ سکتے۔" صفدر نے زریں گل کو جھڑکا۔

زریں گل بڑبڑا کر اپنی چندیا سہلانے لگا۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تیسری الجھن یہ ہے کہ شکر فکرا اور عیسیٰ جان جیسے لوگ اس کھیل میں کیونکر شریک ہوئے۔ اگر یہ صرف تلاش کا کام تھا تو افراہیم خود بھی اسے باآسانی جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ پرانی حویلیاں خریدتا اور بیچتا رہتا' کسی کو کیا ضرورت تھی اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔ پھر اس نے کیوں نہایت خطرناک قسم کے لوگوں کو اپنا ہمراز بنایا۔"

صفدر نے کہا۔ "اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ان پیٹیوں کی تلاش میں سرگرداں رہنے والا افراہیم واحد شخص نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بھی اس مہم میں دلچسپی لے رہے تھے اور انہیں بددل کرنے یا میدان سے بھگانے کے لیے افراہیم نے خطرناک افراد کو اپنے گرد جمع کر رکھا تھا۔"

اچانک تہ خانے کے آہنی دروازے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ زریں گل چونک کر کھڑا ہوگیا۔ اسے افراہیم کی ہدایت واضح تھی کہ دروازہ کھلنے سے پہلے بتی بجھادی جائے۔

کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی پورا تہ خانہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اب ہمارے قدموں میں صرف ہیٹر کی سرخ روشنی تھی۔ زریں گل ہیٹر آف کرکے کمرے کی اکلوتی کھڑکی بھی بند کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے منع کردیا۔

وہ بولا۔ "استاد جی! کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے بتی دوبارہ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"افراہیم کا مہمان آگیا تو؟"

"تم نے سنا نہیں چندو نے کہا ہے کہ مہمان آئے گا۔ وہ صرف چکر تھا ہمیں کمرے میں بند کرنے کے لیے۔ اس بے بہا دولت کے ساتھ وہ ہمیں تہ خانے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا لہٰذا تالا لگا رہا دروازے کو۔"

بات زریں گل کی سمجھ میں آگئی تھی۔ صفدر بھی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔ کچھ دیر دروازے پر کھٹ پٹ ہوتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ جیسا کہ ہمیں اگلے روز پتا چلا کہ آہنی دروازے میں باہر کی طرف دو کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کنڈی چڑھانے اور اس میں تالا لگانے سے افراہیم کی تسلی نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس نے دوسری کنڈی کو بھی تیل وغیرہ دے کر چالو کیا تھا اور اس میں قفل ڈال دیا تھا۔ اس کی یہ احتیاط قابل فہم تھی۔ چنیل کی حویلی کا یہ بوسیدہ تہ خانہ اس وقت درجنوں بینکوں کی گنجائش سے زیادہ دولت اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

وہ رات ہم نے اس تہ خانے میں سوتے جاگتے گزاری۔ یہ بات واضح تھی کہ اگلا دن فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ رات رات میں افراہیم کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جائے گا اور صبح ہوتے ہی اپنے پروگرام پر عمل درآمد شروع کردے گا۔ یہ پروگرام کیا ہوسکتا تھا؟ میرے خیال میں دو صورتیں ہوسکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ افراہیم ان پیٹیوں میں سے ایک آدھ صندوق نکال لے اور سب کچھ یہیں دفن رہنے دے۔ پھر کسی مناسب وقت پر دوبارہ کھدائی کرے اور سب کچھ نکال کر محفوظ ترین مقام پر لے جائے۔ ایسی صورت میں اس گڑھے کو کل صبح چار عدد لاشوں کا تحفہ بھی مل سکتا تھا جن میں ایک لاش کل قتل ہونے والی خانہ بدوش لڑکی کی ہوتی اور باقی تین ہماری۔ دوسری صورت یہ تھی کہ افراہیم ہمیں اعتماد میں لیتا اور ہماری مدد سے اس بیش بہا اسباب کو کسی منتخب کردہ مقام پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسی صورت میں وہ ہمیں اس دولت میں سے معقول معاوضہ دینے کی پیش کش بھی کرسکتا تھا۔ جیسا کہ اس نے سہ پہر رخصت ہوتے وقت بھی اشارہ دیا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ مدد کے لیے ہمیں ہی کیوں منتخب کرے گا۔ وہ کرائے کے مزدور بھی پکڑ کر لاسکتا تھا۔ جواب یہ تھا کہ کرائے کے مزدور وہ نہیں کرسکتے تھے جو ہم کرسکتے تھے اور اس میں بوقت ضرورت بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ کی خدمات بھی شامل تھیں۔ ارجمند والے واقعے کے بعد وہ ہم تینوں پر اور خاص طور پر صفدر پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم "جی حضور" کہنے

والے قانع قسم کے واقعات ہیں۔ اس رات ارجمند واقعی صفدر کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک طوفانی شب میں ایک خوب صورت اجنبی لڑکی لاکھوں روپے کے زیورات پہنے کئی گھنٹے ایک اوباش شخص کی دسترس میں رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کرنے اور صاف بچ نکلنے کی پوزیشن میں تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ برسوں کا ساتھ بعض اوقات اتنا اعتماد بخش ثابت نہیں ہوتا جتنی آزمائش کی چند گھڑیاں ثابت ہوجاتی ہیں۔۔۔ یہ اعتماد ہی تھا جس کے سبب افراہیم ہم تینوں کو راستے سے ہٹا کر واپس لے آیا تھا اور اس تہ خانے میں ایک اہم ترین ذمے داری ہمارے سپرد کی تھی۔ لیکن یہ اندھا اعتماد نہیں تھا۔ اس کی ایک حد تھی اور جہاں یہ حد شروع ہوگئی تھی وہاں ہمارے کمرے کو باہر سے تالا لگ گیا تھا۔

افراہیم نو بجے کے قریب تہ خانے میں داخل ہوا۔ حسب توقع وہ اکیلا تھا۔ وہ فل بوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ اوور کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ بظاہر یہ عام سا انداز تھا مگر ہم جانتے تھے کہ عام نہیں ہے۔ کوٹ کی کم از کم ایک جیب میں آتشیں ہتھیار موجود تھا اور غالباً یہ وہی خوفناک نال والا "کولٹ ۴۵" تھا۔ تہ خانے میں اترتے ہی افراہیم نے سب سے پہلے گڑھے کا معائنہ کیا پھر ہمارے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور قفل کھول دیا۔ اس کی کھوئی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ شب بھر جاگتا رہا ہے۔ اس کے چہرے سے یہ ظاہر تھا کہ اب وہ اپنے غیر معمولی ہیجان پر کافی حد تک قابو پا چکا ہے۔ اس نے بے تکلفی سے ہمارے کمرے میں ایک کرسی سنبھال لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے ہونٹوں میں سگریٹ نہیں دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ پینا چاہتا بھی تھا لیکن اس کے لیے اسے اپنے ہاتھوں کو مصروف کرنا پڑتا اور فی الحال وہ اس قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

وہ کچھ دیر خالی نگاہوں سے ہیٹر کی سرخ روشنی کو گھورتا رہا پھر بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "ان باکسز تک پہنچنے کے لیے میں نے بہت مشقتیں اٹھائی ہیں۔ تفصیل بتانے لگا تو شاید سارا دن گزر جائے۔ ان دونوں باکسز (پیٹیوں) کا تعلق میرے بزرگوں سے ہے۔ کیا تعلق ہے؟ میرے خیال میں اس بارے میں جاننا تمہارے لیے اہم نہیں، اور ویسے بھی یہ روداد تمہارے لیے غیر دلچسپ ثابت ہوگی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ ان باکسز پر اگر کوئی اس دنیا میں اپنا حق جتا سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے ہمارے تاثرات دیکھے اور گہری سانس لے کر بولا۔ "تم تینوں میرے بھروسے کے آدمی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھ پر بھروسا کرو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنے دل ایک دوسرے کے بارے میں صاف کرلیں۔ دیکھو میں کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری کسی بات کا برا نہ ماننا۔ دولت ایسی شے ہے کہ دل و دماغ کو جکڑ کر بندے کی نیت کو ڈانواں ڈول کردیتی ہے (میں نے دل میں کہا 'بے شک ایسا ہی ہوتا ہے۔ ورنہ تو ارجمند بانو کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر سالن چوری مجھے کھدائی نہ کراتا) ہوسکتا ہے تم میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ مجھے ٹھکانے لگا کر یا بے بس کرکے یہ صندوق اڑائے جاسکتے ہیں۔ کوئی ایسا سوچے گا تو یہ اس کی سنگین غلطی ہوگی۔ ان صندوقوں کے پیچھے کون کون لوگ ہیں اور وہ کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں تم کچھ نہیں جانتے اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ میرے تمہارے جیسے سو پچاس آدمیوں کو چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں۔ میں تمہاری مردانگی اور دلیری پر شک نہیں کررہا صرف تمہیں تمہاری بے خبری سے آگاہ کررہا ہوں۔ یہ صرف میں جانتا ہوں کہ ان صندوقوں کو اس حویلی سے کیسے نکالا جائے گا، کہاں رکھا جائے گا اور کن کن لوگوں کو حصے ادا کرنے کے بعد یہ دولت "دولت" کہلا سکے گی لہٰذا مجھے امید ہے کہ تم میرے ساتھ پورا تعاون کرو گے اور جیسے اب تک نیک نیتی سے میرا ساتھ دیتے رہے ہو، آئندہ بھی دو گے۔ آئندہ سے میری مراد یہ نہیں کہ میں ہفتوں یا مہینوں تک تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ صرف ایک یا دو دن کی بات ہے اور اس دوران کی محنت کا معاوضہ تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہی نہیں تمہاری اولاد بھی اپنی تمام زندگی عیش و آرام سے گزار سکے گی۔"

اس نے بغور ہمارے چہرے دیکھے اور مسکرا کر بولا۔ "کہو دل میں کچھ ہلچل محسوس ہورہی ہے یا نہیں؟"

صفدر نے کہا۔ "ہم خود کو خوش قسمت سمجھ رہے ہیں جی کہ آپ جیسے بڑے آدمی کی خدمت کا موقع ہمیں ملا ہے۔ ہم آپ کے وفادار ہیں اور اللہ نے چاہا تو بڑی سے بڑی آزمائش میں سرخرو ہو کر دکھائیں گے۔۔۔ لیکن یہ سوال بار بار میرے دماغ میں آرہا ہے جی کہ یہ اتنی ساری دولت یہاں کیسے پہنچی اور کس نے رکھی؟"

افراہیم بولا۔ "میں نے کہا نا، یہ جاننا تمہارے لیے اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ دولت ہے اور اس میں تمہیں اتنا کچھ ملنے والا ہے کہ پھر تمہیں کبھی کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے دا...

عیش و آرام کی زندگی، مستقبل کا تحفظ، عزت و احترام، نام و ناموس، دین و دنیا کی بھلائی، یہ سب کچھ پیسے کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ دو دن بعد بھی تم وہی ہوگے جو آج ہو لیکن دنیا تمہارے لیے بہت بدل چکی ہوگی۔ تم زندگی کا ایک نیا رخ دیکھو گے۔ روٹی کی فکر، مقدموں کا ڈر، مشقت کی اذیت، کچھ تمہارے نزدیک نہیں پھٹکے گا۔ اگر تم اس ماحول سے جان چھڑا کر امریکا یا کینیڈا وغیرہ نکل جانا چاہو تو بھی تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ ذرا سوچو امریکا یا کینیڈا کے کسی خوب صورت شہر میں تمہارا اپنا مکان ہو، با سہولت کار ہو، نئی نئی رنگ رلیاں ہوں تو پھر جھنگ کے ان کھیتوں اور خرابوں میں کھیس کی بکل مار کر سیسے پھرنے کی کیا ضرورت ہے تمہیں۔۔۔ بتاؤ ہے کوئی ضرورت؟"

ہم تینوں نے شدومد سے نفی میں سر ہلایا اور رزتریں گل کی آنکھوں میں تو باقاعدہ مسرت کی چمک نمودار ہوگئی۔ افراہیم نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور چونک کر کھڑا ہوگیا۔ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "دس بجنے والے ہیں۔ آج ہمیں بہت کام کرنا ہے۔ یہ سارے صندوق گڑھے سے باہر نکالنے ہیں اور پھر اس گڑھے کو بھی پُر کرنا ہے۔ چلو ناشتہ کرو، کپڑے بدل لو تم لوگ۔"

ہم تینوں افراہیم کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے پھر جلدی جلدی کپڑے بدلے اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ افراہیم ہمیں لے کر گڑھے کے کنارے پہنچا۔ رات رات میں پھر کچھ پانی گڑھے میں جمع ہو چکا تھا۔ افراہیم نے مجھے گڑھے میں اتارا، صفدر اور رزتریں گل کو ہدایت کی کہ وہ پانی اور کیچڑ سے بھری ہوئی بالٹیاں اوپر کھینچیں۔ ناشتے اور چائے کے بعد ہم خود کو بالکل تازہ دم محسوس کررہے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہم نے گڑھے کو صاف و شفاف کردیا۔ اب افراہیم نے صفدر کو بھی گڑھے میں بھیج دیا۔ افراہیم کی ہدایت پر ہم نے پیٹی کا ڈھکنا کھولا اور پہلا صندوق رسی سے باندھ کر اوپر پہنچا دیا۔ صندوق وزنی تھا لیکن یہ وزن ریت یا مٹی کا نہیں زر و جواہر کا تھا لہٰذا اسے کھینچنے میں رزتریں گل اور افراہیم نے زیادہ دشواری محسوس نہیں کی۔ خاص طور پر افراہیم کے بازوؤں میں تو بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ساگوان کے صندوق کے بعد پیتل کے صندوق کی باری آئی۔ اس صندوق میں بھی ہینڈل موجود تھا۔ رسی باندھنے میں کوئی مشکل ہوئی نہ اسے اوپر کھینچنے میں زیادہ وقت لگا۔۔۔

قریباً دو گھنٹے میں ہم نے تانبے کی پیٹی سے تیرہ عدد صندوق نکال کر اوپر پہنچائے۔ بعد ازاں خالی پیٹی کے گرد رتی لپیٹی گئی اور اسے بھی کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔ اب بارہ بج چکے تھے۔ تھوڑا دم لینے کے لیے ہم گڑھے سے باہر نکل آئے۔ یہاں تہ خانے کے وسط میں فرش پر صندوقوں کا انبار لگ چکا تھا۔ ان سب صندوقوں پر نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ ہندو سیٹھوں اور زمینداروں کے نام تھے اور ان سب کا تعلق رحیم یار خاں کے گرد و نواح سے تھا۔

اُبلے ہوئے انڈے کھا کر اور دو پیالیاں کڑک چائے پی کر میں اور صفدر ایک بار پھر گڑھے میں اتر گئے۔ اب دوسری پیٹی کے لیے کھدائی کرنا تھی (یہ بات اب تک صاف ہوچکی تھی کہ گڑھے میں صرف دو ہی پیٹیاں ہیں) ہماری سپرویژن کے لیے افراہیم بھی گڑھے میں اتر آیا۔ کسّی اور بیلچے کی مدد سے ہم نے دوسری پیٹی کے ارد گرد سے مٹی ہٹانا شروع کی۔ یہ بھی اسی سائز اور ساخت کی پیٹی تھی۔ کنڈوں میں پیتل کے تالے لگے تھے اور ایک تالے میں چاندی کا تعویذ جھول رہا تھا۔ قریباً تین فٹ تک کھدائی ہوچکی تو صفدر اوپر چلا گیا اور رزتریں گل کے ساتھ مل کر مٹی اوپر کھینچنے لگا۔ افراہیم بالٹیاں بھر رہا تھا۔ اس کا سارا لباس مٹی اور گارے میں لتھڑ چکا تھا۔ کھدائی کے بعد پیٹی کے تالے توڑنے کا مرحلہ آیا۔ سابقہ تجربے کی روشنی میں ہم نے تالے توڑنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا لیکن ڈھکنا اٹھانے کا مرحلہ ایک بار پھر کٹھن ثابت ہوا۔ کدال، کسّی، بیلچہ، کھرپا ہر شے استعمال کی گئی اور کوشش بسیار کے بعد ہم قریباً ایک گھنٹے میں یہ پہاڑ سر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آخر سم سم کھلا اور ہمیں ایک بار پھر قیمتی صندوقوں کی جھلک نظر آئی۔ اس پیٹی میں بھی تین صندوقوں کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے۔ پہلا صندوق جو ہم نے کھولا وہ نصف خالی تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس میں سے بہت سا سامان نکال لیا گیا ہے۔ تاہم باقی دونوں صندوق لبالب بھرے ہوئے تھے۔ وہی شاہانہ ٹھاٹ باٹ والی اشیا تھیں۔ ہیروں جڑے ڈیکوریشن پیس، طلائی گہنے، موتیوں کے سیٹ، ایک صندوق میں اہم کاروباری کاغذات اور کچھ عدالتی فیصلوں کی نقول بھی تھیں۔ اسی طرح ایک صندوق میں دیگر گراں قدر اشیا کے علاوہ کرشن کی ایک طلائی مورتی بھی رکھی تھی۔

ان قیمتی اشیا کو چھوتے ہوئے افراہیم کی انگلیاں لرز رہی تھیں اور اس کے تمتماتے چہرے پر خون کی سرخی دھارے مار رہی تھی۔ حسب سابق ہم نے اس پیٹی کے صندوقوں کو بھی بذریعہ رسی اوپر پہنچانا شروع کیا۔ چالیس فٹ گہرے کنوئیں سے بیس یا تیس کلوگرام وزنی صندوق کو اوپر

نا آسان کام نہیں تھا۔ صندوق گڑھے کے ناہموار رے سے رگڑ کھاتے ہوئے جاتے تھے اور کسی وقت سنے میں اٹک بھی جاتے تھے۔ ایسے میں مجھے سیڑھی پر چڑھ نہیں آگے پیچھے کرنا ہوتا تھا۔ اس مصیبت کا اصل حل تو ئی تھی۔ تاہم عارضی حل ہم نے یہ نکالا کہ گڑھے کے ب کونے کو لکڑی کے چند تختوں سے ڈھانپ دیا اور رسی کھینچنے والے ان تختوں کے اوپر کھڑے ہو گئے۔ یوں صندوق ڑھے کے کنارے سے رگڑ کھانے سے محفوظ ہو گئے۔ پانچ صندوق اوپر پہنچ گئے تو افراہیم بھی صفدر اور زریں گل کا تھ بٹانے کے لیے اوپر چلا گیا۔

سہ پہر چار بجے تک ہم تمام صندوق اوپر پہنچا چکے تھے۔ دوسری پیٹی گڑھے کے اندر ہی رہنے دی گئی جس سے میں نے ندازہ لگایا کہ پہلی پیٹی بھی گڑھے میں پھینک دی جائے گی اور یہ صندوق یہاں سے پیٹیوں کے بغیر روانہ ہوں گے۔ افراہیم نے بتایا کہ ابھی دو ڈھائی گھنٹے میں گاڑی پہنچ جائے گی۔ ہم تمام صندوق ٹنٹوں کے قریب ترتیب سے رکھ دیں تاکہ روانگی کے وقت صندوق لوڈ کرنے میں وقت نہ ہو۔ ہم نے اس ہدایت کے مطابق صندوق ٹنٹوں کے قریب جوڑنے شروع کیے۔ ان میں سے دو تین صندوق خاص طور پر بہت وزنی تھے۔ معلوم نہیں ان کونوں میں کون کون سے دریا بند تھے۔

مدفون خزانوں کی تلاش' ہمیشہ سے بچوں بڑوں کی کہانیوں کا دل پسند موضوع رہا ہے۔ "ٹریژر آئی لینڈ" تو میں نے لڑکپن میں پڑھی تھی۔ بعد ازاں کچھ اور معروف کہانیاں کنگ سولومن مائنز' ٹریژر آف سکیرلینڈ اور کنگس مائنز آف سائلنس بھی میری نظر سے گزری تھیں۔ ایسی کتابیں صرف پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ میں نے بھی پڑھی تھیں' یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک روز بذاتِ خود مجھے بھی جھنگ کے نواح میں اس سے ملتی جلتی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا اور ایک سیلن زدہ تہ خانے میں زر و جواہر سے بھرے ہوئے صندوق میرے ارد گرد تاش کے پتوں کی طرح بکھرے ہوں گے۔

وہ چھ عدد صندوق جن کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے افراہیم تہ خانے سے باہر لے گیا۔ باقی تمام صندوق ہم نے ٹنٹوں کے قریب ترتیب سے رکھ دیے۔ اب افراہیم نے ہدایت کی کہ تانبے کی خالی پیٹی واپس گڑھے میں پھینک دی جائے۔ یہ ہدایت میری توقع کے عین مطابق تھی۔ ہم تینوں نے پیٹی اٹھائی اور اسے گڑھے کے کنارے سے نیچے لڑھکا دیا۔ وزنی پیٹی ایک گونج دار دھماکے سے گڑھے میں رکھی دوسری پیٹی پر گری۔ اگر یہ دھماکا تہ خانے سے باہر ہوتا تو یقیناً دور دور تک سنا جاتا۔ کئی سیکنڈ تک فضا میں صوتی لہروں کا ارتعاش باقی رہا۔

افراہیم نے کہا۔ "ابھی کچھ اور سامان بھی نیچے پھینکنا ہے۔ تم لوگ چائے وغیرہ پی لو۔ میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

حسبِ معمول وہ ہمیں تہ خانے میں بند کر کے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد یہ بات ہماری سمجھ میں آئی کہ وہ صندوق جن کے تالے ٹوٹے ہوئے تھے' افراہیم باہر کیوں لے گیا تھا۔ وہ ہمیں ان کھلے صندوقوں کے ساتھ تہ خانے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہر چیز پر اس کی گہری نظر تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔

سردی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا تہ خانے سے باہر سورج چار بجے ہی غروب ہو گیا ہے۔ جب تک ہم مصروف رہے تھے جسم گرم رہا تھا۔ اب فراغت ملتے ہی رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ ہیٹر کے گرد جمع ہو کر ہم نے گرما گرم چائے کا سہارا لیا۔ جب ہم آخری گھونٹ لے رہے تھے' تہ خانے سے باہر کسی شے کے گھسیٹے جانے کی آوازیں آئیں۔ میں لپک کر زینوں پر پہنچا۔ یہ آواز دروازے کے بالکل پاس سے آ رہی تھی۔ غالباً یہاں کوئی تیسری پیٹی بھی موجود تھی جسے گھسیٹ کر دروازے کی جانب لایا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد تہ خانے کا دروازہ کھل گیا۔ کھولنے والا افراہیم ہی تھا۔ اس کے کوٹ اور سر پر پانی کے چھینٹے دیکھ کر ہمارے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ سورج آج چار بجے ہی غروب ہو گیا ہے۔ درحقیقت باہر بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش ہو رہی تھی جس کے کچھ آثار افراہیم کے لباس پر بھی نظر آ رہے تھے۔ افراہیم نے ہم تینوں کو باہر بلایا۔ آسمان دور تک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور در و دیوار شام سے پہلے ہی تاریک ہو رہے تھے۔ آہنی دروازے کے پاس ہی ایک جستی پیٹی اور ایچی کیس رکھا تھا۔ اس کے علاوہ سیمنٹ کی ایک بوری اور ایک بڑے ترپال میں چھ سات کڑاہیاں ریت بھی یہاں موجود تھی۔ فوری طور پر اس "بلڈنگ میٹریل" کا کوئی استعمال ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ افراہیم کی ہدایت پر سب سے پہلے ہم نے یہ ریت اور سیمنٹ تہ خانے میں پہنچایا۔ اس کے بعد ایچی کیس افراہیم نے خود اٹھا لیا اور جستی پیٹی کے بارے میں حکم ہوا کہ ہم تینوں اسے زینوں سے نیچے اتاریں۔

پیٹی زیادہ وزنی نہیں تھی۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں لحاف وغیرہ رکھے گئے ہیں۔ ہم تینوں اسے با آسانی تہ خانے میں لے آئے۔ پیٹی بہت پرانی نہیں تھی اور اس میں چاپانا کا جدید تالا لگا ہوا تھا۔ ایچی کیس بھی بالکل نئے ماڈل کا تھا۔ اس کا ڈھکنا ریگزین کا تھا اور زیادہ تنا ہوا نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایچی میں گنجائش سے کم سامان رکھا گیا ہے۔ افراہیم نے ریت اور مٹی کے ڈھیر پر چڑھ کر ایچی گڑھے کے اندر پھینک دیا' اس کے بعد ہمیں حکم ہوا کہ ہم پیٹی گڑھے میں لڑھکا دیں۔

اچانک میری نگاہ پیٹی کے کونے پر ایک سرخ دھبے پر پڑی اور ایک جھماکا سا ذہن میں ہوا۔ اس سوال کا جواب مل گیا تھا جو پیٹی دیکھنے کے بعد سے مسلسل میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ بعض اوقات مشکل سوال ایسے ہی آسانی سے حل ہو جایا کرتے ہیں۔ اس پیٹی میں کیا تھا؟ اس پیٹی میں خانہ بدوش لڑکی کی لاش تھی۔۔۔ وہ لڑکی جو کل صبح افراہیم کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ افراہیم اس بدنصیب کی لاش اس عمیق گڑھے میں چھپانے کی کوشش کرے گا لیکن واقعات کی تیزی اور کام کی افراتفری میں پیٹی دیکھ کر بھی ہمیں خیال نہیں آیا تھا کہ اس میں لڑکی کی لاش ہو گی۔ اب پیٹی کے ایک کونے پر خون کے دھبے دیکھے تھے تو میرا ذہن فوراً کل کے سانحے کی جانب چلا گیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ مجھے دیکھتے پا کر اس نے میری نظروں کا تعاقب کیا تھا اور پیٹی کے کونے پر خون کا داغ دیکھ لیا تھا۔ غالباً "رنگے ہاتھوں" سے پیٹی کا ڈھکنا بند کرنے والے نے یہ نشان یہاں چھوڑ دیا تھا۔ اب صفدر کا ذہن بھی تیزی سے اس نتیجے کی طرف سفر کر رہا تھا جس تک میں چند سیکنڈ پہلے پہنچ چکا تھا۔۔۔ اور پھر ذہن کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا۔ صفدر کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ایک ہراساں نظر مجھ پر ڈالی اور ڈگمگا سا گیا۔ کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں تھا۔ افراہیم ہمارے سر پر کھڑا تھا اور پوری طرح چوکس تھا۔

پیٹی کو ریت اور مٹی کے ڈھیر پر چڑھانا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک خطرناک زاویے سے ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ اب میں نے غور کیا تو پیٹی کے اندر سے ایک ناگوار سی بو اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس میں شک و شبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ پیٹی میں لڑکی کی لاش ہے۔ کھینچ تان کر ہم پیٹی کو گڑھے کے کنارے پر لے گئے اور پھر افراہیم کے اشارے پر اسے اندر لڑھکا دیا۔ حسبِ سابق ایک بار پھر پُر شور دھماکے سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ جستی پیٹی پہلو کے بل دونوں پیٹیوں کے اوپر گری اور ایک جانب سے پچک کر کھل گئی۔ گڑھے میں گرنے سے چھوٹا ایچی کھل گیا تھا اور ا نچلی پیٹی پر اوندھا پڑا تھا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ اس میں بوسیدہ کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایچی افراہیم نے "ڈرامے" میں رنگ بھرنے کے لیے نیچے پھنکوایا تھا ورنہ کے سوا اسے اور کچھ نیچے نہیں پھینکنا تھا۔ اس نے لاش ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں بڑی چالبازی سے کام لیا تھا۔ یہ چالبازی یقیناً کارگر ہوتی اگر صرف ایک روز پہلے ہم اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو چکے ہوتے کہ افراہیم ایک بدنصیب کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہے۔

شام پانچ بجے ہم نے گڑھے کو بھرنے کا عمل شروع کیا۔ ظاہر ہے گڑھا کھودنے کے مقابلے میں اسے بھرنا کہیں آسان تھا۔ ہم کسّیاں استعمال کر رہے تھے اور افراہیم بھی ہمارے ساتھ جتا ہوا تھا۔ گڑھے میں گرنے والی مٹی کا ہر ذرہ اس جرم کو عمیق گہرائی میں دفن کر رہا تھا جس کا ارتکاب کل صبح ایک با اثر شخص نے اس چار دیواری میں کیا تھا۔۔۔ جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی لڑکی سے اس با اثر شخص نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کے جیون ساتھی سے ملائے گا اور کل صبح اس نے بڑی بے رحمی سے یہ "وعدہ" ایفا کر دیا تھا۔

گڑھے کی بھرائی کے دوران سات بجے کے قریب افراہیم چند منٹ کے لیے تہ خانے سے باہر گیا اور واپس آ کر اس نے بتایا کہ ہمیں یہاں سے لے جانے والا ٹرک پہنچ گیا ہے۔ ٹرک کی آمد کے بعد ہمیں زیادہ تیزی سے ہاتھ چلانے کی "ہدایت" جاری ہوئی۔ کناروں کی مٹی تو اب گڑھے میں گرائی جا چکی تھی' باقی مٹی قدرے فاصلے پر تھی اور اسے کسّیوں سے کھینچ کھینچ کر گڑھے تک لانا پڑتا تھا۔۔۔ پوری تندہی کے باوجود ہم رات دس بجے سے پہلے کام ختم نہیں کر سکے۔ گڑھا مٹی سے بھر کر فرش کے برابر ہو گیا تو اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ تہ خانے میں بکھری ہوئی اینٹوں کو گڑھے پر اس طرح جوڑا گیا کہ ان کی بالائی سطح فرش کے برابر ہو گئی۔ اس دوران صفدر اور زریں گل سیمنٹ اور ریت سے "برا بھلا" مسالا تیار کر چکے تھے۔ اس مسالے کو اینٹوں پر انڈیل کر ایک گرمالا نما لکڑی سے ہموار کیا گیا اور پختہ فرش کی شکل دے دی گئی۔

گڑھا پُر ہونے کے باوجود بہت سی مٹی بچ گئی تھی۔ یہ مٹی ہم نے کسّیوں کی مدد سے گڑھے کے نیم پختہ فرش پر اور گرد

ح میں بکھیر دی۔ اب کم از کم بادی النظر میں یہ اندازہ کرنا نہیں تھا کہ اس تہ خانے میں چند روز پہلے ایک گیتی ہا کھودا گیا ہے۔

رات کا کھانا ہم نے ساڑھے بارہ بجے کھایا۔ کھانے کے تازہ دم ہونے کے لیے افراہیم اور زریں گل نے بادہ نوشی مارا لیا جبکہ ہم نے کڑک چائے اور سگریٹ پہ اکتفا کیا۔ ے بنانے میں صفدر کو کمال حاصل تھا۔ چائے میں ایسی ڈال دیتا تھا کہ مُردہ بھی چکھ لے تو زندہ ہو جائے۔ دو دو ں نے ہمیں از سرِ نو چاق و چوبند کر دیا۔ افراہیم نے ہمیں دخترِ انگور کے حوالے سے دعوتِ گناہ دی لیکن پھر فوراً ی معذرت بھی قبول کر لی۔ میں نے اور صفدر نے یہ کر مؤقف اختیار کیا تھا کہ پینے پلانے کے بعد ہم دونوں لیے کوئی ڈھنگ کا کام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ہمارے اس ف کو تقویت بخشنے کے لیے زریں گل نے بھی اپنا کردار کیا۔ اس نے افراہیم کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ ٹھیک کہتے جناب! تھوڑا بولے گا تو کچن پھاڑ کر بولے گا۔ یہ دونوں تھوڑا ہے اور آؤٹ زیادہ ہوتا ہے۔ پیتے ہی "ٹچکا" پکا لنت مانگنے لگے گا اور نہ ملے گا تو آپس میں مارا ماری ے گا یا مُردار کی طرح گر کر سو جائے گا۔"

صفدر نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے لیکن تم بھی ذرا احتیاط ہی بہتر ہے۔ زیادہ چڑھاؤ گے تو لیلیٰ لیلیٰ کہہ کر ستونوں سے رہونے لگو گے۔ لاہور والا تماشا یاد ہے نا۔"

زریں گل ذرا جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے صفدر دبی آواز میں پوچھا۔ "یہ لیلیٰ کا کیا چکر ہے؟"

صفدر مسکرایا۔ "بتاؤں گا کسی وقت آپ کو۔"

○☆○

اس وقت ایک بجا تھا جب افراہیم نے تہ خانے کا ازہ کھولا اور ہمیں لے کر باہر آ گیا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں یت کرتی چلی جا رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل تھے بوندا باندی جاری تھی۔ دروازے کے بالکل قریب ایک ۔ یوں کھڑا تھا کہ اس کا رخ حویلی کے گیٹ کی جانب تھا رپشت کا ڈھکنا جسے "ڈالا" کہا جاتا ہے، نیچے گرا ہوا تھا۔ ے کے پاس ایک لمبا تڑنگا پنجابی ڈرائیور مؤدب کھڑا تھا۔ ں نے کمبل کی بُکل مار رکھی تھی اور سر پہ گرم ٹوپی تھی۔ ی قریبی بلب کی روشنی میں دراز قد ڈرائیور کا دراز تر سایہ خانے کے دروازے تک پہنچ رہا تھا جیسے تجسس سے مجبور کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پہلی نظر میں لگا کہ ائیور سگریٹ پی رہا ہے لیکن یہ دھند جمی ہوئی سانسیں تھیں جو ہم سب کے منہ سے خارج ہو رہی تھیں۔ ڈرائیور کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی بہت بڑی ناک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ علیحدہ سے اس کے چہرے پر رکھی ہوئی ہے۔ ٹرک کے قریب ایک طرف گنوں کا ایک بہت اونچا ڈھیر لگا تھا۔ یہ گنے گٹھوں کی شکل میں تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسی ٹرک سے اتارے گئے ہیں۔ ٹرک کے پاس جا کر دیکھا تو یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ ٹرک کے اندر ابھی گنے کے بہت سے ٹکڑے اور چھلکے وغیرہ موجود تھے۔ ٹرک کی باڈی میں جیسے گنوں کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔

افراہیم نے ڈرائیور کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ولی محمد ہے۔ ہمارے کارخانے میں کام کرتا رہا ہے۔ بہت محنتی بندہ ہے۔ یہ سارا ٹرک اس اکیلے نے خالی کیا ہے۔ آٹھ نو بجے سے لگا ہوا ہے۔ اب کہیں جا کر فارغ ہوا ہے۔" پھر وہ ولی محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ولی محمد! اب ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ اندر کچھ صندوق پڑے ہیں وہ ٹرک کے اگلے حصے میں رکھنے ہیں اور اس کے اوپر یہ سارا گنا واپس ڈالنا ہے۔"

"جو حکم سرکار۔" ولی محمد نے بے دام غلام کی طرح کہا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم چاروں واپس تہ خانے میں داخل ہوئے اور صندوق اٹھا اٹھا کر ٹرک پر لادنے لگے۔ تہ خانے کے صندوق ٹرک میں آ گئے تو ان چھ صندوقوں کی باری آئی جو افراہیم احتیاطاً تہ خانے سے باہر نکال لایا تھا اور اب ایک قریبی کمرے میں پڑے تھے۔ ان صندوقوں کے گرد نائیلون کی رسیاں باندھ کر انہیں سیل بند کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم چاروں نے ایک ہی پھیرے میں یہ صندوق بھی ٹرک میں پہنچا دیے۔ اس کے بعد گنا یعنی گنے چڑھانے کا کام شروع ہوا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں دو تختے اس طرح رکھ دیے گئے تھے کہ اوپر چڑھنے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ہم گنے کندھوں پر اٹھا اٹھا کر اندر پہنچانے لگے۔ ولی محمد انہیں شتابی سے جوڑتا چلا گیا۔ وہ گنوں کی لوڈنگ اور اَن لوڈنگ میں ماہر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی زیرِ نگرانی ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم نے تمام گنا ٹرک پر بار کر دیا۔ جو گنے بچ گئے وہ افراہیم کی ہدایت پر ہم نے تہ خانے میں پھینک دیے۔ اس کام کے دوران بوندا باندی جاری رہی تھی اور ہمارے تمام کپڑے بھیگ چکے تھے لیکن چونکہ ہم مشقت کا کام کر رہے تھے اور بڑی تیزی سے کر رہے تھے، سردی زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اب رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور گنوں سے بھرا ہوا یہ خستہ حال ٹرک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہونے کے

لیے پوری طرح تیار تھا۔ افراہیم کے اصرار پر ہم تینوں نے کیچڑ اور ریت میں لتھڑے ہوئے کپڑے بدل لیے۔ نیم گرم پانی سے اچھی طرح منہ سر اور ہاتھ پاؤں دھو کر اور گرم چادریں اوڑھ کر ہمارے حلیے پہلے سے کافی بہتر ہو گئے۔ زریں گل کا حلیہ زیادہ خراب نہیں ہوا تھا بہرطور اس نے بھی نیم گرم پانی سے پورا پورا حصہ لیا اور "نصف غسل" کر کے خود کو تازہ دم کر لیا۔ کپڑے بدل کر ہم باہر آئے تو ڈرائیور ولی محمد ٹرک میں سوار ہو رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی لہٰذا روانگی سے پہلے اس نے انجن گرم کر لینا مناسب سمجھا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے عقبی احاطے کی چار دیواری زیادہ دور نہیں تھی۔ بمشکل دس پندرہ گز کا فاصلہ رہا ہو گا۔ یہاں تین چار کچے کوٹھے بنے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ کوٹھے بعد میں حویلی کے کسی رہائشی نے مویشیوں وغیرہ کے لیے بنائے ہوں گے۔ ارجمند اور افراہیم نے ان کوٹھوں کو جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ شاید وہ انہیں سرونٹ کوارٹرز کا روپ دینا چاہتے تھے۔ اچانک میں نے افراہیم کو چونک کر اسی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔ اس نے کوئی ایسی چیز نوٹ کی تھی جو ہم گفتگو میں مصروف ہونے کے سبب محسوس نہیں کر سکے تھے۔ وہ بظاہر بے پروائی سے ٹہلتا ہوا ان کچے کوٹھوں کی طرف گیا۔ پھر ایکا ایکی وہ حویلی کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ گیٹ کے پاس پہنچا تو کسی تاریک کونے سے حویلی کا چوکیدار نکلا اور افراہیم سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے دونوں کو بڑی تیزی سے حویلی کے اندرونی حصے میں گھستے دیکھا۔

"کیا چکر ہے؟" صفدر نے میرے کان میں سنسناتی ہوئی سرگوشی کی۔

"کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

اچانک ایک مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی گن یا شاٹ گن کا لیور کھینچ کر اسے کاک کیا گیا ہو۔ میرے بدن میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ یہ آواز ان نیچی چھت والے کمروں کے عقب سے آئی تھی جہاں پہنچ کر افراہیم ٹھٹکا تھا اور تیزی سے مین گیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ "کلک کلک" کی یہ آواز بہت مدھم تھی لیکن میرا واہمہ نہیں تھی۔ اس آواز پر کسی دوسری آواز کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زریں گل کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس نے بھی یہ آواز سنی اور پہچانی ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، افراہیم یا چوکیدار میں سے ابھی تک کوئی باہر نہیں آیا تھا۔ ل نے جھک کر پنڈلی سے بندھے ہوئے رام پوری خنجر کو ٹٹولا اور تیزی سے کچے کوٹھوں کی طرف گیا۔ ان کوٹھوں کی چھت آٹھ فٹ سے بلند نہیں تھی۔ میں نے ایک طاق میں پاؤں رکھ کر جست لی اور منڈیر تھام لی۔ بازوؤں کے زور پر اٹھنے اور چھت پر پہنچنے میں مجھے چنداں دشواری نہیں ہوئی۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کوٹھوں کے عقب میں حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ کوئی موجود ہے۔ میں کچی چھت پر اوندھا لیٹ گیا اور آگے کی طرف کھسکتا ہوا منڈیر پر پہنچا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے عقب میں ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ ٹرک ڈرائیور ولی محمد تھا۔ میرے پیچھے ہی پیچھے وہ بھی چھت پر چڑھ آیا تھا اور اب جھک کر چلتا ہوا منڈیر کی طرف آ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لیٹ جانے کو کہا۔ وہ اوندھا لیٹ گیا اور کھسکتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے آخری دو فٹ کا فاصلہ گھسٹ کر طے کیا اور منڈیر سے نیچے جھانکا۔ میری نگاہ کا فوکس درست ہوا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ رگوں میں خون یکبارگی اچھلا اور ساکت ہو گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک انسانی سائے نظر آ رہے تھے۔ بالکل بے حس و حرکت اور خاموش۔ جیسے وہ اس تاریکی اور سکوت کا ہی ایک حصہ ہوں۔ میرے ذہن میں خطرے کی سیکڑوں گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اسی وقت فضا میں ایک رسّی سی لہرائی اور ڈرائیور ولی محمد کی گردن سے لپٹ گئی۔ یہ ایک کمند تھی جو دیوار کی جڑ سے اچھل کر آئی تھی۔ ولی محمد کے جسم نے ایک جھٹکا کھایا اور وہ ڈکراتا ہوا چھت سے نیچے تاریک زمین میں گرا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص نے کلہاڑی بلند کی اور پوری قوت سے ولی محمد کے سر کو نشانہ بنایا۔ ایسی آواز آئی جیسے خشک لکڑی کو پھاڑا گیا ہو۔ ولی محمد کی دوسری چیخ بڑی دلدوز تھی۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔ میں نے چند قدم بھاگ کر چھت کے احاطے میں چھلانگ لگائی اور سنبھل کر عمارت کی طرف بھاگا۔

اسی وقت دیوار کے عقب میں سمٹی ہوئی خاموشی ایک دھماکے سے ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ایک آتش فشاں تھا جو یکلخت جاگ اٹھا تھا۔ میں نے بیسیوں افراد کو بیرونی دیوار پھاند کر حویلی کے احاطے میں کودتے دیکھا۔ وہ سب کے سب خانہ بدوش تھے اور ان کے ہاتھوں میں برچھیاں، کلہاڑیاں اور رائفلیں چمک رہی تھیں۔ میں پوری قوت سے بھاگتا ہوا حویلی کے برآمدے میں گھسا۔ اسی وقت کسی اندرونی کمرے

سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ یہ وہی خوفناک ایم جی تھی جو چند روز پہلے کنوئیں سے نکلی تھی۔ تیس پینتیس برس یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے زمین کے اندر سوئی ہوئی موت' باہر نکل کر جاگ اٹھی تھی۔ وہ ایک زبردست برسٹ تھا۔ دیوانہ وار حویلی کی طرف آتے ہوئے لوگوں میں سے کچھ لڑکھڑا کر گرے اور باقی ٹھٹک کر دائیں بائیں پھیل گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مشین گن چلانے والے نے لوگوں کو براہ راست نشانہ نہیں بنایا بلکہ ان کے قدموں میں چنگاریاں بکھیری ہیں۔ میں ایک دروازہ کھول کر کمرے میں گھسا۔ یہاں افراہیم اور اس کے دونوں چوکیدار کھڑکیوں کے ساتھ پوزیشن لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چوکیدار کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ اس کا نام نشان علی تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا اور بھاری بھرکم مشین گن اسی کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔ نیم تاریکی کے سبب میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ دوسرے چوکیدار کے ہاتھ میں کون سا ہتھیار ہے۔ زریں گل اور صفدر اس کمرے میں نہیں تھے۔

یکایک باہر سے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ تھری ناٹ تھری' شاٹ گن' سیمی آٹومیٹک' بہت کچھ فائر ہو رہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ گئے تھے۔ فرش پر ہر طرف کرچیاں بکھر گئیں۔ ایک للکارتی ہوئی آواز فضا میں ابھری۔ "باہر نکل کتے۔۔۔ باہر نکل' بتا میری بچی کہاں ہے۔ ورنہ چھلنی کر دوں گا۔ ایک ایک بوٹی نوچ لوں گا تیری۔۔۔"

پھر وہ شخص دردناک آواز میں پکارنے لگا۔ "اقبال۔۔۔ اقبال۔۔۔ بالی۔" اس کی آواز حویلی کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی اور بلند و بالا چھتوں تلے گونج رہی تھی۔ یکایک زور سے بجلی چمکی اور اس کے ساتھ ہی ایک دھماکے سے کمرے کا بغلی دروازہ کھل گیا۔ تین خانہ بدوش آندھی کی طرح اندر داخل ہوئے۔ دو کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں جبکہ تیسرے کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ افراہیم نے اپنے کولٹ پسٹل سے ایک فائر کیا۔ یہ آخری گولی تھی جو پسٹل کے چیمبر سے نکلی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ چوکیدار نشان علی بھاری بھرکم ایم جی کو کھڑکی کی چوکھٹ سے ہٹا کر دروازے کی طرف موڑتا' اندر داخل ہونے والے افراد عفریتوں کی طرح افراہیم پر جا چڑھے۔ ایک کلہاڑی برق کی طرح لہرائی' افراہیم نے سر جھکا کر یہ وار بچایا' ورنہ کھوپڑی کے دو ٹکڑے ضرور ہوتے۔ کلہاڑی ایک قد آدم آئینے پر گری اور اسے چکنا چور کر گئی۔ دوسرے کلہاڑی بردار نے نشان علی کو نشانہ بنایا۔ وزنی کلہاڑی کا پھل نشان علی کی گردن پر لگا۔ وہ اچھل کر کمرے کے وسط میں گرا۔ میں نے اس کی گردن سے خون کا فوارہ چھوٹتے دیکھا۔ بھاری بھرکم مشین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ لڑھک کر میرے قدموں میں آن گری۔ جس وقت میں جھک کر مشین گن پر ہاتھ ڈال رہا تھا' کمرے میں خودکار رائفل کی تڑتڑ گونجی۔ کم از کم پانچ گولیاں نشان علی کے سر اور سینے میں پیوست ہو گئیں۔

مشین گن پر گرفت مضبوط کر کے میں نے سیدھا ہونا چاہا لیکن اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا کر میں نے ایک نئی زندگی حاصل کر لی۔ سب سے پہلے اندر داخل ہونے والے خانہ بدوش نے کچھ ایسی وحشت سے کلہاڑی گھمائی کہ اگر میں سیدھا کھڑا ہو جاتا تو آہنی پھل مغز میں دو دو انچ تک گھس گیا ہوتا۔ کلہاڑی کی دھار میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گئی اور اس نے خانہ بدوش رائفل بردار کو نشانہ بنایا۔ یہ ضرب اس کی گردن اور کندھے کے درمیان کہیں لگی۔ میں نے اسے خودکار رائفل سمیت ڈگمگاتے دیکھا۔ یہ چند ساعتیں میرے لیے غنیمت تھیں۔ میں نے مشین گن پوزیشن کی اور ٹریگر دبا دیا۔ میں جانتا تھا کہ میں کسی عام گن کا ٹریگر نہیں دبا رہا۔ یہ ہیوی فوجی گن تھی۔ ایک منٹ میں چھ سو سے زائد راؤنڈ فائر کرنے والی اور قریباً ایک میل تک اپنی راہ میں آنے والے ہر ذی روح کو چھلنی کر دینے والی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اسے بغیر اسٹینڈ کے استعمال کرنے کی غلطی کر رہا ہوں اور اس کا "ایمپیکٹ" بہت بائی ہوگا۔ میں پوری طرح چوکس تھا' پھر بھی جب ٹریگر دبا' میرے ہاتھ جھنجھنا اٹھے اور میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ دو سیکنڈ کے مختصر وقت میں کم از کم بیس گولیاں بیرل سے نکلیں اور کلہاڑی بردار کے جسم کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ غالباً وہ فرش بوس ہونے سے پہلے ہی راہیٔ عدم ہو چکا تھا۔ ان گولیوں نے صرف ہدف کو ہی نشانہ نہیں بنایا' وہ جسم بھی جو ہدف کے عقب میں تھا زبردست جھٹکوں سے اچھلا اور مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گرا۔ یہ وہ دوسرا کلہاڑی بردار تھا جو افراہیم کا ایک بازو زخمی کرنے کے بعد اس کے سر کو نشانہ بنانے جا رہا تھا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھوں میں اٹھی کی اٹھی رہ گئی تھی۔ اسے اپنے قدموں میں گرتے دیکھ کر افراہیم جیسے موت کے شکنجے سے نکلا اور اندرونی دروازے کی طرف بھاگ نکلا۔

یہی وقت تھا جب میں نے بھی دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ ہم دونوں کا یہ اقدام بالکل بروقت تھا۔ جونہی ہم اس دروازے سے گزر کر حویلی کی نشست گاہ میں داخل ہوئے

دو تین خانہ بدوش بغزا مار کر پچھلے والے کمرے میں گھس آئے۔ نشست گاہ کی روشنی میں' میں نے دیکھا' افراہیم کی چیک کر چکی تھی' گندھا خون اگو رہا تھا اور رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اسی وقت دائیں جانب کی کھڑکیوں سے کسی نے خودکار رائفل کا برسٹ مارا۔ ٹیوب لائٹ ٹوٹ گئی اور ڈرائنگ روم میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اسی اندھیرے میں' میں نے ان منقش تھالیوں کے فرش پر گرنے کی آواز سنی جو ڈرائنگ روم کے کارنس پر خوب صورتی سے سجائی گئی تھیں۔

قریباً ۳۵ پونڈ وزنی مشین گن کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے' میں جھک کر دوڑتا ہوا نشست گاہ سے گزرا اور ایک دروازے سے نکل کر پھر احاطے میں آ گیا۔ یہاں برآمدے کی مدھم روشنی پہنچ رہی تھی۔ مجھے اپنے اردگرد افراہیم نظر آیا' نہ دوسرا چوکیدار۔ "افراہیم صاحب۔۔۔ افراہیم صاحب۔۔۔"

میں نے دو تین بار زور سے پکارا۔ حویلی کے اندرونی کمروں میں ایک بار پھر فائرنگ ہونے لگی۔ خانہ بدوش چنگھاڑ رہے تھے اور بند دروازوں پر غضب ناک دھاوے بول رہے تھے۔ لگتا تھا' وہ آج اس حویلی کو خاکستر کر کے یہاں سے جائیں گے۔

"استاد جی۔" عقب کی تیرگی سے زریں گل کی آواز ابھری۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ صفدر اور زریں گل اس بھاری بھرکم ڈرلنگ مشین کے عقب میں تھے جو کچھ روز پہلے یہاں کھدائی کے لیے لائی گئی تھی اور اب برآمدے کے قریب بے کار کھڑی تھی۔ میں بھی دوڑ کر مشین کی آڑ میں ہو گیا۔ قرب و جوار میں اس وقت چھپنے کے لیے یہ موزوں ترین جگہ تھی۔ میرے ہاتھوں میں ربے مہلک ہتھیار کو صفدر اور زریں گل نے حیرت سے دیکھا۔ مشین گن کی گولیوں والا بیلٹ جو دو برسٹ کے بعد قریباً پانچ فٹ رہ گیا تھا۔ گن کے ساتھ ہی گھسٹتا ہوا آیا تھا۔

صفدر نے تیز سرگوشی کی۔ "آپ زخمی تو نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اچانک کچھ لوگ اس بغلی دروازے سے باہر نکل آئے جہاں سے چند لمحے پہلے میں نکلا تھا۔ ان میں سے کچھ تو ایک بند دروازے پر کلہاڑیاں برسانے لگے اور کچھ ہوائی نشانوں سے حویلی کی چھت کی طرف لپکے۔ باقی افراد دیوانوں کی طرح ہمارے آس پاس چکرانے لگے۔ ڈرلنگ مشین کی اس آڑ میں ہم زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ کسی بھی لمحے خانہ بدوش ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے یا ہم ان کا خون بہانے پر مجبور ہو سکتے تھے۔ میری نگاہ تہ خانے کی طرف اٹھی۔ تہ خانے کا آہنی دروازہ ہم سے تیس چالیس قدم کی دوری پر تھا۔ دروازے کے سامنے گنوں سے لدے ہوئے ٹرک کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ٹرک کا منہ حویلی کے گیٹ کی طرف تھا جیسے وہ اس گیٹ سے نکلنے کے لیے تیار ہو اور خود بھی یہ چاہتا ہو کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جائے۔

"صفدر۔" میں نے سرگوشی کی۔

"جی۔" اس نے ہنکارا بھرا۔

"ٹرک کی طرف چلتے ہیں۔"

ہم تینوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے اور جیسے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ٹرک کی طرف لپکے۔ میں جانتا تھا کہ نہ صرف ٹرک کا دروازہ کھلا ہے بلکہ چابی بھی اگنیشن میں موجود ہے۔ ہنگامہ شروع ہونے سے چند سیکنڈ پہلے میں نے خود دل محمد کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اور ٹرک اسٹارٹ کرتے دیکھا تھا۔ اب اگر قسمت ہمارا ساتھ دیتی اور چابی اگنیشن میں موجود ہوتی تو ہم ٹرک سمیت خانہ بدوشوں کے اس خونی نرغے سے نکل سکتے تھے۔

جونہی ہم ٹرک تک پہنچے حویلی کی چھت سے کوئی جانگلی لہجے میں پکارا۔ "وہ دیکھو' وہ جا رہے ہیں حرام کے جنے۔"

دائیں جانب سے میں نے کیبن کا دروازہ کھولا اور بائیں جانب سے صفدر نے۔ ایک سیکنڈ کے اندر ہم کیبن میں تھے۔ میں نے مشین گن کو بیلٹ سمیت صفدر کی گود میں پھینکا اور اندھوں کی طرح چابی کے لیے ہاتھ گھمایا۔ وہ بڑا خوش بخت لمحہ تھا جب میری انگلیوں نے اگنیشن میں جھولتی چابیوں کو چھوا۔ ٹرک کا ڈھیلا ڈھالا کلچ دبا کر میں نے چابی گھمائی۔ ایک جھرجھری سے چھ سلنڈر کا طاقتور انجن جاگ اٹھا۔ دو تین دفعہ تیزی سے ریس دے کر میں نے فرسٹ گیئر لگایا اور کلچ چھوڑ دیا۔ بھاری بھرکم ٹرک ایک جھٹکے سے آگے بڑھا تو اس کی چوبی باڈی سے چوں چراں کی بے شمار آوازیں ابھریں۔ اسی وقت عقب سے یکے بعد دیگرے شاٹ گن کے تین فائر ہوئے۔ کچھ چھرے ٹرک کی باڈی میں کہیں لگے۔ میں نے نہایت سرعت سے اسٹیئرنگ کو تھوڑا سا گھما کر ٹرک کا رخ گیٹ کی طرف سیدھا کیا اور گیئر بدلنے کے لیے بایاں پاؤں کلچ کی طرف بڑھایا۔ اسی لمحے میرے پہلو میں دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور میں نے گھنی مونچھوں والے ایک خونخوار صورت خانہ بدوش کو ایک فٹ کی دوری پر دیکھا۔ وہ ٹرک

کے پائیدان پر چڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں قریباً تین فٹ لمبی چمکدار کلہاڑی تھی۔ گیٹ کی طرف سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں مجھے کلہاڑی کا رنگین دستہ دکھائی دیا۔ اس دستے پر خانہ بدوش کے گہرے سانولے رنگ کی انگلیاں بڑی مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ ان انگلیوں میں مختلف رنگوں کی بھدی انگوٹھیاں ایک ساعت کے لیے میری نگاہوں میں چمکیں اور پھر کلہاڑی کا اٹھا ہوا دستہ تیزی سے نیچے آیا۔ یہ سب کچھ سیکنڈ کے ایک مختصر عرصے میں ہوا۔

صفدر نے کلہاڑی کا یہ جان لیوا وار اپنے ہاتھ پر روکا۔ کلہاڑی اس کی ہتھیلی سے پھسل کر اسٹیئرنگ پر لگی اور ضرب کی شدت سے سارا ڈیش بورڈ جھنجھنا اٹھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر صفدر نے ہاتھ کی گرفت کلہاڑی کے دستے پر مضبوط کی اور سر کی ایک خوفناک ٹکر خانہ بدوش کے چہرے پر لگائی۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی مگر کلہاڑی پر اس نے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ صفدر نے "فوراً سے پہلے" دوسری ٹکر ماری۔ یہ ٹکر پہلی سے بھی زیادہ شدید تھی۔ خانہ بدوش جو ذرا دیر پہلے خونخوار ہو رہا تھا ایک دم دفاعی پوزیشن میں آگیا۔ میں نے اس کے منہ اور نتھنوں سے سیاہی مائل لکیریں پھوٹتے دیکھیں۔ صفدر نے ایک دم کلہاڑی چھوڑ کر اسے زوردار دھکا دیا اور چلتے ٹرک سے نیچے پھینک دیا۔

اسی لمحے بائیں دروازے پر بھی کوئی خانہ بدوش کلہاڑیاں برسانے لگا۔ کلہاڑی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان بھی چلا رہا تھا اور نہایت غلیظ قسم کی گالیاں ہمارے کانوں میں زہر گھول رہی تھیں۔ کھڑکی کا بوسیدہ شیشہ ٹوٹ کر زریں گل کی جھولی میں آگرا۔ وہ کلہاڑی کی زد سے بچنے کے لیے پہلے تو صفدر کی طرف جھکا لیکن پھر اس کے پٹھان خون نے جوش مارا اور اس نے دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ غالباً وہ دروازہ کھول کر کلہاڑی بردار کو لات مارنا چاہتا تھا' تاہم اس مہم جوئی کی نوبت نہیں آئی۔ ٹرک رفتار پکڑ کر گیٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایک دھماکے سے چوبی گیٹ اور ٹرک کا تصادم ہوا۔ میں نے سائیڈ کے شیشے سے گیٹ کے ایک ستون کو منہدم ہوتے اور چوبی تختوں کو ادھر اُدھر بکھرتے دیکھا۔ جو خانہ بدوش ٹرک کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ وہ دوسرے ستون سے ٹکرایا اور گیٹ کے ملبے سے الجھ کر رہ گیا۔ اس دوران عقب سے خودکار رائفل کی تڑتڑ بھی گونجی لیکن یہ گونج کافی فاصلے پر تھی اور جب تک کوئی گولی براہ راست ٹائر میں نہ لگتی ہمیں کوئی فکر اندیشہ نہیں تھا۔

گیٹ سے نکلتے ہی ہم نے موڑ کاٹا اور حویلی کی بیرونی دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ اب ہم پیچھے سے کی جانے والی فائرنگ سے تقریباً محفوظ ہو چکے تھے۔ حویلی کے ارد گرد مجھے کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی۔ نہ ہی حویلی میں اس ٹرک کے سوا کوئی گاڑی موجود تھی' کم از کم ہمیں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خانہ بدوشوں کے لیے ہمارے تعاقب میں آنا ممکن نہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' وہ گھوڑوں پر یہاں پہنچے تھے اور یہ گھوڑے اور خچر وغیرہ انہوں نے حویلی سے کافی فاصلے پر باندھے تھے۔

حویلی سے نکل کر ایک فرلانگ تک میں ٹرک کو تیسرے گیئر میں بھگاتا چلا گیا پھر میں نے چوتھا گیئر لگایا اور بتدریج رفتار بڑھانے لگا۔ آج دس پندرہ منٹ کے اندر میں نے دو ایسے کام کیے تھے جو زندگی میں پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ ایک مشین گن چلائی تھی اور دوسرے' سامان سے لدا ہوا ٹرک ڈرائیو کیا تھا۔ دونوں تجربے حیرت ناک ثابت ہوئے تھے۔ ہوئی مشین گن چلا کر میں اس سے پہلے استعمال کیا ہوا تمام اسلحہ بھول گیا تھا اور پھر کچھ عرصہ پہلے نوشہرہ مشت میں چلائی ہوئی جدید "ایل ایم جی" ابھی کھلونا محسوس ہونے لگی تھی۔ جبکہ ٹرک کی ڈرائیونگ نے بھی پہلی ساری گاڑیوں کی ڈرائیونگ بھلا دی تھی۔

یہ ویسا ہی ٹرک تھا جیسے ہم پاکستانی سڑکوں پر ہر روز دیکھتے ہیں لیکن کبھی چلاتے نہیں۔ اللہ نہ کرے کسی عام ڈرائیور کو یہ ٹرک چلانا پڑے۔ اس ٹرک کا چال چلن کچھ عجیب سا تھا۔ معلوم نہیں پہلے سے ایسا تھا یا لوڈ ہونے کے بعد ایسا ہوا تھا۔ اسٹیئرنگ پتھر کی طرح سخت' توازن شرابی کی طرح خراب' ایکسیلیٹر بوڑھے شوہر کی طرح لاچار اور بریک ہر چند کہ ہے نہیں ہے۔ سیدھا چلتے چلتے وہ اچانک سڑک کا کنارہ لے لیتا تھا اور مڑنے کا نام ہوتے ہی ساری باڈی میں چڑیاں چہکنے لگتی تھیں۔ بڑا خوفناک ہلکورا تھا' لگتا تھا ابھی ایک طرف کے ٹائر ہوا میں معلق ہو جائیں گے اور ہم سیکڑوں من بوجھ کے نیچے ہوں گے۔ جب میں نے رفتار چالیس پر پہنچائی تو مرزا کی بائیسکل والی بیشتر خصوصیات ٹرک میں ظاہر ہو گئیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار احساس بھی ہو رہا تھا۔ باڈی کی تمام ترخامیوں کے باوجود ٹرک کا انجن دم دار تھا اور سرگوشیوں کی زبان میں ہم سے یہ عہد کر رہا تھا کہ ہر کٹھن راستے پر ہمارا ساتھ نبھائے گا۔

براہ راست پر پہنچ کر میں نے ٹرک کی رفتار مزید بڑھا دی۔ ہمیں کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے کچھ معلوم نہیں تھا اور یہ سارا پروگرام طے کرنے کے لیے ہم رُک بھی نہیں سکتے تھے

کی زد خانہ بدوشوں کی زد سے دور نکلنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کم از کم پانچ چھ میل کا فاصلہ ہم بغیر رکے طے کریں۔ اس کوشش میں گشتی پولیس سے مڈبھیڑ بھی ہو سکتی تھی اور کوئی دوسرا سانحہ بھی پیش آسکتا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پکی والی سڑک کراس کر کے ہم پانچ چھ میل تک سیدھے چلے گئے۔ اسی دوران صفدر اور زریں گل پوری طرح باخبر رہے تھے۔ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا تعاقب کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے ٹرک ایک کچی ذیلی راستے پر موڑا اور تین چار فرلانگ آگے جا کر اسے گھنے درختوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روکتے وقت میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ دوبارہ نیم پختہ راستے پر چڑھنے اور دوائیں یا بائیں مڑنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

رک کر میں نے ٹرک کی تمام لائٹس بجھا دیں۔ کچھ دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہے۔ ذہن خالی خالی سے جیسے کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا بولنا ہے یا کہنا ہے۔ صفدر نے کیبن کی اندرونی لائٹ جلائی اور اپنے حلیے کا جائزہ لیا۔ حلیہ شاندار تھا۔ وہ گرم چادر جو میں نے کپڑے کے اوپر اوڑھی تھی' بھاگ دوڑ میں کہیں گر چکی تھی۔ سامنے سے میری قمیص لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ مٹی غالباً اس وقت لگی تھی جب گیلی چھت پر مجھے پیٹ کے بل رینگنا پڑا تھا۔ دامن پر خون کے دھبے تھے۔ یہ اس خانہ بدوش کا تھا جو چلتے ٹرک پر چڑھ کر مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ بالوں اور دھار ٹکڑوں نے اسے جو نقصان پہنچایا تھا وہ ان خونیں دھبوں کی صورت میں میری قمیص پر تھا۔

صفدر اپنی ہتھیلی دیکھ رہا تھا۔ کلہاڑی یہاں پھسلتی ہوئی گزری تھی لہٰذا بہت گہرا کٹ نہیں آیا تھا۔ زریں گل نے اپنی چادر سے ایک پٹی پھاڑ کر صفدر کے ہاتھ پر باندھ دی۔ ضرب کی اصل شدت اسٹیئرنگ نے جھیلی تھی۔ کٹ آگیا تھا اور اسٹیئرنگ کے گرد لپٹے ہوئے ربڑ کے ٹکڑے نیم ہو کر نیچے لٹک رہے تھے۔ یہاں پہنچنے سے پہلے مشین گن سیٹ کے نیچے ایک مناسب خلا میں تھی۔ تاہم اس کا کچھ حصہ ابھی باہر تھا اور کچھ بلٹ اسٹرائپ بھی نظر آ رہا تھا۔ ہم نے کوشش کر کے گن کو سیٹ کے بالکل نیچے کر دیا اور موبل آئل کے ڈبے خلا میں اس طرح رکھ دیے کہ سیٹ کے نیچے جھانکنے سے فوراً گن پر نگاہ نہ پڑے۔

زریں گل دروازہ کھول کر نیچے اترا اور اس نے اپنی جھولی میں گرے ہوئے شیشے کے ٹکڑے نیچے جھاڑ دیے پھر اپنی چادر اتاری اور میری طرف بڑھا دی۔

"استاد جی' اس چادر کا تم کو ہمارے سے زیادہ ضرورت ہے۔"

میں اس کی بات سمجھ رہا تھا۔ میری قمیص خون سے داغدار ہو گئی تھی۔ فوری طور پر قمیص کو دھونا ممکن نہیں تھا۔ اس مسئلے کا عارضی حل چادر کی بُکل میں پوشیدہ تھا۔ میں نے زریں گل سے چادر لے کر جسم سے لپیٹ لی۔ اس دوران صفدر فرش اور نشستوں پر بکھرے ہوئے شیشے صاف کر چکا تھا۔ ہم نے کیبن کی اندرونی لائٹ پھر بجھا دی اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔

"یہ کیا چکر چل گیا ہے جی؟" صفدر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔" میں نے کہا۔ "غالباً یہ وہی لوگ ہیں جن کی لڑکی پرسوں ابراہیم کے ہاتھوں مری ہے۔ تم نے سنا ہی ہو گا کہ ایک شخص "بابل" کا نام لے لے کر آوازیں دے رہا تھا۔"

"ہاں جی' آواز تو ہم تک بھی پہنچی تھی لیکن میں اس شخص کو دیکھ نہیں سکا۔ دراصل جب ڈرائیور دل محمد چھت سے نیچے گرا اور آپ نے بھاگ کر چھلانگ لگائی' میں سمجھ گیا تھا کہ اب فائرنگ ہو گی۔ میں اور زریں گل کھلی جگہ پر تھے۔ ہم دوڑ کر ڈرلنگ مشین کی اوٹ میں چلے گئے۔ اگر نہ جاتے تو نقصان اٹھاتے۔"

دل محمد کا نام سن کر میری آنکھوں میں خونی منظر گھوم گیا جب ایک خانہ بدوش کی وزنی کلہاڑی نے انسانی سر کو نشانہ بنایا تھا اور یوں لگا تھا جیسے کسی نال پر پٹھان نے لکڑی پھاڑی ہو۔ وہ آواز جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے صفدر سے کہا۔ "دل محمد کا کام تمام ہو گیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا ہے وہ۔ اور وہ چوکیدار نشان علی بھی مارا گیا ہے۔"

"اوہ۔" صفدر کے ہونٹ تأسف سے سکڑ گئے۔

زریں گل بولا۔ "ہمارا تو خیال ہے اور لوگ بھی قتل ہوا ہو گا۔ تین چار بار مشین گن کا آواز سنا ہے ہم نے۔"

میں نے کہا۔ "دو بندے تو میرے ہاتھوں سے گرے ہیں۔ اس سے پہلے چوکیدار نشان علی نے بھی ایک دو برسٹ مارے تھے۔"

میری آنکھوں میں وہ منظر چمک گیا جب مشین گن سے گولیاں پانی کی دھار کے مانند نکلی تھیں اور ربد افراوا اچھل اچھل کر فرش پر ڈھیر ہوئے تھے۔ ایسے مناظر تو پر ذہن میں نقش رہتے ہیں۔

چند سیکنڈ کیبن میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ہم اپنے اپنے طور پر ان واقعات کی سنگینی اور حیرت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آئندہ کیا ہوتا ہے اور ہم نے کیا کرنا ہے۔

صفدر نے پوچھا۔ "گن آپ کے پاس کیسے آگئی؟"

"بس اتفاق ہوا۔" میں نے جواب دیا۔ "نشان علی کو گولیاں لگنے سے پہلے کلاشنکوف لگی تھی۔ کلاشنکوف کی چوٹ کھا کر وہ فرش پر گرا۔ گن اس وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹی تو میں نے اٹھالی۔"

"اور افرائیم؟" صفدر نے پوچھا۔

"اس کا کچھ پتا نہیں۔ وہ ڈرائنگ روم تک میرے ساتھ تھا۔ فائرنگ سے ٹیوب لائٹ ٹوٹی اور اندھیرا ہو گیا۔ میں نے اسے آوازیں دیں' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ پھر صفدر نے قمیص کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ مجھے تھمایا' دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ لرزاں ہاتھوں سے ماچس جلا کر دونوں سگریٹ سلگائے اور کش لینے لگا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" چند لمحے بعد اس کی گمبھیر آواز کیبن میں گونجی۔ اس کی آواز کی گمبھیرتا نے کیبن کی مختصر فضا کو کچھ اور بوجھل کر دیا۔ میں نے اس بوجھل بوجھ کو مسکراہٹ کی ضرب سے توڑنے کی کوشش کی۔

"پروگرام کیا ہے... اب سارے پروگرام ہمارے ہی ہیں۔ سم سم کھل گیا ہے۔ مال ہم نے خچروں پر لاد لیا ہے۔ اب چلتے ہیں کوہ قاف کی طرف۔ غالباً اس وقت ہمارا شمار دنیا کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے تم دونوں کا؟"

صفدر اور زریں گل کے تنے ہوئے اعصاب بھی کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ صفدر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت ہم بے حد امیر ہیں لیکن زور کس پر ہوا؟" "اس وقت" پر سوں پندرہ منٹ یا آدھے گھنٹے بعد کیا ہو گا یہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔"

"کیوں خبر نہیں... بالکل خبر ہے۔" میں نے اختلاف کیا۔ "یہاں تھوڑی دیر دم لے کر چلیں گے ہم لاہور' سوہا

بازار میں۔ وہاں کسی شریف سے سنار کے ہاتھ یہ زر گرم کے سو ڈیڑھ سو کروڑ میں۔ پانچ دس لاکھ کم بھی ملا تو گے۔ میرا خیال ہے کہ چالیس پچاس کروڑ تو ہمارے ہی آہی جانا چاہیے اور ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ۔ اگر اتنی لمبی رقم پا کر زریں گل پھٹ گیا تو ظاہر ہے شیئر میں اور اضافہ ہو جائے گا... سوہا بازار سے ہم گے اسلام آباد اور وہاں سے سیدھے امریکی سفارت سفارت خانے میں جو سب سے پہلا شخص ملے گا اس کے ساتھ ستر لاکھ روپیہ مار کر امریکا کا امیگریشن ویزا اور گرین کے حقوق لیں گے اور اوار والی فلائٹ سے نیویارک جائیں گے۔"

صفدر نے کہا۔ "آپ جیسے لوگ جب بھی جو آتے ہیں امریکیوں اور یہودیوں کا ہی بھلا کرتے ہیں۔ سوچئے اگر رقم ہمارے پاس آہی گئی ہے تو پھر کیوں امت کا فائدہ کریں۔ عمرے کا ویزا لگوا کر چلتے ہیں عرب۔ شاہ فیصل سے ملاقات کرتے ہیں۔ ان سے کچھ آپ ملائیں کچھ ہم ملاتے ہیں اور قطب جنوبی کے تودے کھینچ کر سعودی ساحل پر لاتے ہیں۔ یہ صحرائے الخالی سبزہ زار بن جائے گا۔ پھر وہاں رونق ہوں گی۔ شیوخ کے فارم ہاؤسز ہوں گے اور ہم ہوں۔"

زریں گل نے قہقہہ لگایا۔ "لیکن جناب یہ تب ہو گا' جب امارا پیٹ پھٹے گا... اگر آپ دونوں کے تو پھر؟"

"ہاں' یہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے پوری سنجیدگی سے ہوئے کہا۔

زریں گل بولا۔ "بڑے کہتے ہیں کہ زیادہ خوشی ہے نہ زیادہ پیسہ' بہتر تو یہ ہے کہ ام اس پیسے کو ہضم لے تھوڑا سا کم کر دیں۔ مثلاً یہ کہ آدھا پیسہ کسی نگاویں۔ وہ نیک کام کیا ہو سکتا ہے؟ بہت سے ہو سکے بات یہ ہے کہ ام کو لاہور کا بادشاہی مسجد اور مقبرہ اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں پشاور میں بنا دی جائیں تو کمال ہی آجائے۔ بالکل اسی ڈیزائن اور رنگ و روپ ہوں۔ زیر و زبر کا فرق نہ ہو دونوں میں۔ وہ والا لوگ لاہور میں مسجد اور مقبرہ دیکھ کر آئے تو پشاور دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو جائے۔"

صفدر بولا۔ "زیر زبر کا فرق تو ہو گا پیارے چیزیں رہ جائیں گی۔ مثلاً مقبرہ جہانگیر میں تو جہانگیر موجود ہے وہاں پشاور میں نہیں ہو گا۔"

... "صفدر صاحب! اندر کا کیا پتا ہوتا ہے' کچھ ہے ...

صفدر نے کہا۔ "بندہ کچھ دیر ساتھ رہے اور غور کرے تو پتا چل ہی جاتا ہے۔ تمہارے سر کا پول بھی تو کھل ہی گیا

کیا مطلب؟"

یہی کہ اندر کچھ نہیں... بھلے مانس اگر کوئی نیک کام ہے تو پھر شادی کر ڈالو۔ تمہارا جنازہ جائز ہو جائے۔ روپیہ پیسہ بھی آگئے ہیں تمہارے پاس۔ ہو سکتا ہے لیلیٰ بھی ہو جائے۔"

"لیلیٰ کا کیا چکر ہے بھئی؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

مسکرایا۔ "بڑی دردناک کہانی ہے جناب... فلمی کی ایک پری زریں صاحب کے دل میں اتری ہوئی مالیزا کی مسکراہٹ والی دیبا خانم سے عشق فرماتے ہیں بہت خاموش قسم کا عشق ہے اور بے حد پرانا' تقریباً پرانا جتنی دیبا خانم خود ہے۔ کئی بار دل بھی پھٹ چکے ہیں... خانم کے ساتھ کھنچوائی ہوئی ایک فوٹو بھی ہے ان کے

واہ کیا بات ہے۔" میں نے زریں گل کی پیٹھ ٹھونکی۔ شش کرے تو ایسا کہ جس میں سرے سے کامیابی کا خطرہ ہو کیا انتخاب ہے اور کیا حسین تمنا۔"

صفدر بولا۔ "زریں گل! میرا تو خیال ہے' پشاور میں مسجد بنوانے سے پہلے دو ڈھائی کروڑ خرچ کر ہی ڈالو تم بھی۔ اگر تم شادی کر دو تو ہم وعدہ کرتے ہیں تم سے کہ ایک یادگار بنا دیں گے اور اس قابل ہم ہیں کہ اس سکیں۔ تمہاری منگنی لاہور کے انٹر کان میں ہو گی منگنی پر ہم امریکا سے درآمد شدہ خسرے نچائیں گے۔ نکاح کسی شاندار تفریحی بجرے میں ہو گا اور اس اہتمام کیا جائے گا کہ ڈھولک بجانے کے مقابلے میں طور صوفیہ لورین ہماری طرف سے شریک ہوں۔ تمہاری اللہ نے چاہا تو کنکورڈ جہاز پر جائے گی اور لمے کی تو بات ہی چھوڑو۔ قیامت تک کے لیے ہم دنیا میں اپنا جھنڈا گاڑ دیں گے۔ اس میں ہم پورے کی روسٹ کر کے لٹکائیں گے اور اتنا کھانا پکائیں کھانا پکائیں گے..."

کراچی کو ایک سال کے لیے قحط پڑ جائے گا۔" میں نے

سوکھا پڑ جائے۔" صفدر نے کہا۔ "ہم نے یہاں

رہنا ہی کب ہے۔ جتنا پیسہ ہمارے پاس آگیا ہے ہم اس "خستہ حال" ملک میں رہ ہی نہیں سکتے۔ رہیں گے تو گھٹ کے مر جائیں گے۔ یہ کروڑوں اربوں کی خطیر رقم خرچ کرنے کے لیے ہمیں کھلا میدان چاہیے۔ بہت کھلا میدان' آراستہ بجرے' خوب صورت پلازہ' مہنگی ترین شرابیں' خوشبودار عورتیں... اب ان چیزوں کے بغیر جئیں گے تو خاک جئیں گے... چلیں جناب! اٹھائیں ڈھول اور تاشے اور پہنچیں سوہا بازار میں اس بھلے مانس سنار کے پاس۔"

بہت دیر تک ہم یونہی بے پر کی اڑاتے اور ہنستے رہے۔ غالباً ہم غیر ارادی طور پر اس ناقابلِ گمان صورتِ حال سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالات نے عجیب بے ڈھنگی چال چلی تھی۔ ہم جو چند روز پہلے تک پیٹنے پل کی حویلی میں لٹو تھجوں کی طرح مٹی ڈھو رہے تھے اس وقت ایک ایسے ٹرک کے مالک تھے جس میں کٹوں کے ڈھیر کے بے حساب و بے شمار دولت رکھی تھی۔ ایک دھندلا سا خواب جو نجانے کتنی آنکھیں کتنی دیر سے دیکھ رہی تھیں (اور جسے قادر زماں جیسے پریکٹیکل لوگ حقیقت آمیز مذاق سمجھ رہے تھے) ٹھوس حقیقت بن چکا تھا۔

افرائیم نے کہا تھا' دولت میں بے انتہا قوت ہے۔ یہ کسی آسیب کی طرح انسانی اعصاب کو جکڑ کر اس کے دل و دماغ میں زلزلہ برپا کر دیتی ہے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ کم از کم ہم تینوں کی حد تک تو یہ بات غلط ثابت ہوئی تھی۔ نہ ہمارے دل شدت سے دھڑکے تھے' نہ پیشانیاں عرق آلود ہوئی تھیں اور نہ آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے اجنبیت اور وحشت ابھری تھی۔ ہم بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک صندوق تک کھولنے کے روادار نہیں تھے۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میرا ذہن یہ بھی طے کر رہا تھا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ درحقیقت ہم بالکل آناً فاناً ایک حیران کن صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے۔ آج سے چند ماہ پہلے تحیا گلی میں شنکر شکرا کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں سب سے پہلا سوال یہ ابھرا تھا کہ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟ پھر ساہی صاحب سے ملنے کے بعد یہ یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ قادر زماں' شنکر اور عیسیٰ وغیرہ کسی سازش کا تانا بانا بن رہے ہیں۔ بعد ازاں ایسے اشارے ملے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ یہ سازش جھنگ اور بھکر کے گرد و نواح میں پنپ رہی ہے۔ اس وقت سازش کی نوعیت کے بارے میں کوئی واضح تصور ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔ وہی خدشات تھے

جو شکر شکرا اور عینی جیسے بدباطنوں کے حوالے سے ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے۔ منشیات کا چکر، اسلحے کی اسمگلنگ، اندرونی تخریب کاری اور اہم معلومات کا حصول وغیرہ ایسے معاملات تھے جو شکر شکرا کی موجودگی سے منتج ہو سکتے تھے مگر جو معاملہ نکلا تھا، وہ سب سے جدا اور سنسنی خیز تھا۔ ایک ویران حویلی کے تہ خانے سے سن ۷۴ کی گمشدہ دولت نکالی گئی تھی اور یہ دولت کسی عام شخص کی نہیں تھی اور نہ ہی کسی ایک شخص کی تھی۔ یہ برہمنوں لکھ پتی خاندانوں کے اثاثے تھے جو مشترکہ طور پر کہیں ارسال کیے گئے تھے اور بھٹک کر اس تہ خانے کی گہرائی میں پہنچ گئے تھے۔ ابھی ہم ٹھیک سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے لیکن عین ممکن تھا کہ یہ اس خطے میں دریافت ہونے والا سب سے بڑا دفینہ ہو اور سب سے بڑا نہ ہو تو چند بڑے دفینوں میں سے ایک ہو۔ یہ جو کچھ بھی تھا بے حد تہلکہ خیز تھا۔ ان ویران درختوں کی ٹھٹھرتی ہوئی تیرگی میں خاموش کھڑا ٹرک ـــ ٹرک نہیں تھا۔ یہ چار پہیوں والا ایک قیامت خیز راز تھا جس نے خود کو گنوں کے ڈھیر میں اور اپنی خستہ حالی میں کیموفلاج کر رکھا تھا۔

افراہیم کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ "تم کچھ نہیں جانتے کہ اس دولت کے پیچھے کون کون لوگ ہیں اور وہ کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ اتنے خطرناک ہیں کہ میرے تمہارے جیسے سو پچاس آدمیوں کو چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں۔۔۔"

افراہیم کی اس "تنبیہ" کو نظرانداز کرنا ہمارے لیے کسی طور سود مند نہیں تھا۔ یہ بات بالکل قرین قیاس تھی کہ اس دولت کے پیچھے اور لوگ بھی ہوں اور ممکن ہے وہ زیادہ دور بھی نہ ہوں۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ ہم جتنا رسک لے چکے ہیں وہی بہت ہے۔ اب ہمیں ٹرک کو حرکت میں نہیں لانا چاہیے۔۔۔ ہمارے سامنے موزوں ترین راستہ یہ تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک یہاں سے نکلے اور قریب ترین ٹیلی فون سیٹ پر پہنچ کر ساہی صاحب کو "صورت حال" سے آگاہ کر دے۔ ساہی صاحب کو اس جگہ کے حدود اربعہ سے آگاہ کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ ہم چنے پل کے معروف بس اسٹاپ سے قریباً چار میل کے فاصلے پر تھے اور یہاں تک پہنچنے کا تمام راستہ ہمارے ذہنوں میں نقش تھا۔

میری گھڑی ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ کسی بھی وقت مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ روشنی ہمارے لیے تاریکی سے زیادہ خطرناک تھی۔ یہ پورا علاقہ جاگیردار قادر زماں کی ہتھیلی کی طرح تھا، وہ جب چاہتا انگلیاں سمیٹ کر اس ہتھیلی کو مٹھی کی طرح بند کر سکتا تھا۔ بہت سے [illegible] کی طرح یہ امکان بھی موجود تھا کہ افراہیم خان یہاں شب خون سے بچ نکلا ہو اور اب وہ اور قادر زماں سیکڑوں ہرکاروں کے ساتھ ہمیں ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اور جو تھا وہ بھی تیزی سے گزر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "صفدر! ہم میں سے کسی ایک کو نکلنا ہوگا اور پولیس تک اطلاع پہنچانا ہوگی۔"

"پولیس سے آپ کی کیا مراد ہے؟" صفدر نے [illegible]

"ساہی صاحب، برکت صاحب یا پھر جھنگ [illegible] اعلیٰ رینک کا آفیسر۔"

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔" صفدر نے کہا۔ [illegible] معاملہ ہے کہ ہمیں اپنے سائے سے بھی بدکنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو صفدر! ہم تینوں میں سے جونیئر کوئی نہیں ہے۔ ہم نے جو کام بھی کرنا ہے مشورے اور باہمی رضامندی سے کرنا ہے۔ میں یہاں کے [illegible] بارے میں تھوڑا زیادہ جانتا ہوں۔ اگر تم دونوں سمجھو تو میں فون کرنے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ تم یہ ڈیوٹی دے لو۔"

زرین گل نے کہا۔ "لیکن ادھر فون ملے گا؟ سارا دیہاتی علاقہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیہاتی علاقہ تو ہے لیکن اتنا [illegible] نہیں۔ کہیں نہ کہیں سے بات ہو ہی جائے گی۔ میں پل پر چلا جاؤں گا۔ وہاں ندیم میڈیکل اسٹور میں ہے۔ یہ ندیم وہی لڑکا ہے جس سے لاہور میں تمہاری [illegible] ہو چکی ہے۔۔۔"

صفدر نے کہا۔ "بہ فرض محال اگر فون پر بات [illegible] تو؟"

میں نے کہا۔ "پھر میرے سامنے دو راستے [illegible] میرے اندازے کے مطابق پولیس چوکی یہاں [illegible] فاصلے پر نہیں ہے۔ وہاں فون بھی لگا ہوا ہے اور ادھر گاڑی بھی ہوگی۔ ساہی صاحب سے رابطے کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے [illegible] سوار ہو کر یا کسی اور گاڑی میں لفٹ لے کر جھنگ ایس پی صاحب کو خبر دوں۔"

صفدر بولا۔ "چوکی جانے کا خطرہ تو مول نہ [illegible] بہتر ہے۔ اکثر مقامی اہلکار قادر زماں کے اثر میں ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بھی کئی ہمیں ڈھونڈ

رہے ہوں اور ایک بات میں مزید کہنا چاہوں گا۔" صفدر نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیسی بات؟"

"آپ فون کرنے کے لیے مجھے بھیجیں۔ قادر زماں کے ہرکارے آپ کو صورت سے پہچانتے ہیں اور ویسے بھی ٹرک پر آپ کی ضرورت زیادہ ہے۔ اگر ٹرک کو یہاں سے چلانا پڑا تو آپ ڈرائیو کر لیں گے۔ میرے لیے تو زخمی ہاتھ کے ساتھ اتنے سخت اسٹیئرنگ کو ایک چکر دینا بھی مشکل ہوگا۔"

صفدر کی ہتھیلی سے مسلسل خون رس رہا تھا اور وہ ویسے بھی بائیں کندھے کو آزادانہ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ دوسرا زخم اس مار کٹائی کی نشانی تھا جو چند روز پیشتر حویلی میں [illegible] نے اس سے کی تھی۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے ہو گیا کہ صفدر فون کرنے کے لیے جائے گا اور میں زرین گل کے ساتھ ٹرک میں رہوں گا۔ صفدر کو میں نے تمام ضروری تفصیلات سمجھا دیں اور وہ ٹھیک چھ بجے ٹرک سے اتر کر اپنے "مشن" پر روانہ ہو گیا۔ میں نے اپنا خنجر اسے سونپ دیا تھا۔ اس نے گرم چادر مخصوص دیہاتی انداز میں سر سے لپیٹ لی اور اپنے بہروپ میں رنگ بھرنے کے لیے ٹرک سے دو گنے کھینچ کر بغل میں دبا لیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنے مضبوط دانتوں سے گنے کے لمبے لمبے چھلکے اتارتا درختوں میں اوجھل ہو رہا تھا۔

بادل رات میں چھٹ گئے تھے۔ درختوں پر پرندے تند و تیز شور سے چہچہا رہے تھے اور اُجالے کے تیر بتا رہے تھے کہ نئے دن کا سورج طلوع ہونے میں اب کچھ زیادہ دیر باقی نہیں۔ بھاری بھرکم مشین گن نشست کے نیچے تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر ایسی پوزیشن میں کر لیا کہ فوراً نکال کر استعمال کیا جا سکے۔ یہ مشین گن اس وقت ہمارا واحد ہتھیار تھی۔ یہ ہتھیار بے حد مؤثر تھا لیکن تادیر ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ محدود ایمونیشن کے سبب یہ شاندار گن کسی بھی وقت ڈنڈے کی بندوق بن سکتی تھی۔۔۔ ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا آزادانہ ٹرک کے کیبن میں پہنچ رہی تھی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں سن ہو گئیں اور بیٹھے بیٹھے نچلا دھڑ اکڑنے لگا۔ سورج نکلنے سے آدھ پون گھنٹا پہلے ہی ایک دھند نے ہمارا گھیراؤ کر لیا اور اردگرد کی ہر شے سفیدی کے پردے میں اوجھل ہونے لگی۔ موسم کی یہ کروٹ ہمارے حق میں تھی۔ ٹرک اب فاصلے سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب ایک سائیکل سوار دودھ فروش ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے نقاب نما گرم ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس ٹوپی میں سے صرف آنکھیں ہی نظر آتی ہیں۔ ان آنکھوں نے حیرت سے یہاں کھڑے ٹرک کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ سائیکل سوار تجسس سے مجبور ہو کر رک جائے گا لیکن پھر وہ سیدھا نکلتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو نو عمر لڑکے تین بھینسوں کو ہانکتے ہوئے گزر رہے۔ انہوں نے بھی ٹرک کو درختوں میں کھڑے دیکھ کر دلچسپی ظاہر کی۔ پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے باقاعدہ ایڑیاں اٹھا کر کیبن میں جھانکا لیکن دھندلے شیشوں کے سبب ٹھیک طور پر نہیں دیکھ سکے۔ غالباً ان کا ارادہ تھا کہ اگر کیبن خالی ہو تو وہ عقب سے کچھ موٹے تازے گنے کھینچ لیں۔۔۔ اس کے بعد قریباً آدھ گھنٹے تک ہمیں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہماری بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ پولیس کی آمد سے قبل ہم جتنی دیر یہاں رہیں گے خطرہ ہمارے لیے مسلسل بڑھتا رہے گا۔

قریباً نصف گھنٹے بعد ایک اور شخص دھند سے نمودار ہوا۔۔۔ اور یہ صفدر خود تھا۔ گرم چادر اس کے گلے میں پڑی تھی اور وہ قریب قریب بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی زرین گل منمنایا۔ "او خدایا! کوئی گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

صفدر کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور دور ہی سے نظر آتا تھا کہ وہ ہانپا ہوا ہے۔

زرین گل نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ صفدر نے اوپر چڑھنے کے بعد اپنا ہاتھ گرم چادر سے برآمد کیا تو میں چونک گیا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ ریوالور نظر آ رہا تھا۔ پائیدان پر پاؤں رکھتے ہی صفدر نے تیزی سے کہا۔ "افراہیم کے بندے آ رہے ہیں جی۔۔۔ نکلیں یہاں سے، جلدی کریں۔"

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اگنیشن میں چابی گھما چکا تھا۔ ٹرک کا طاقتور انجن انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور پہیے ایک جھٹکے سے متحرک ہو گئے۔ "کدھر جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دائیں طرف موڑ لیں۔" صفدر نے کہا۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"افراہیم اور قادر زماں کے چیلے پاگل کتوں کی طرح ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں وہ۔"

"یہ ریوالور۔۔۔؟"

"افراہیم کے چوکیدار سے چھینا ہے میں نے، پکی سڑک

کے پاس لدھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ کُل تین بندے تھے۔ ایک دم جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آگئے۔ میرا خیال ہے ہر آنے جانے والے کو روک رہے تھے۔ ایک نے چھو دیکھنے کے لیے میری چادر پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے گنڈا اس کی رانوں میں مارا اور پھر ٹانگ مار کر دور پھینک دیا۔ اسی دوران افراہیم کا چوکیدار مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اس سے ریوالور چھین لیا اور گولی چلا دی۔ ایک گولی اس کی ٹانگ میں لگی ہے، دوسری پیٹ میں۔ باقی دونوں خالی ہاتھ تھے۔ وہ جھاڑیوں میں گھس گئے ہیں اور ابھی دو منٹ پہلے میں نے افراہیم کی سفید جیگوار دیکھی ہے۔ وہ پہلے کھیتوں کے اندر سے گزرنے لگی تھی لیکن پھنس گئی اب وہ چکر کاٹ کر پل کی طرف سے آ رہی ہے۔"

"پھر اب کیا کریں؟" میں نے بے معنی سا سوال کیا۔

"بس چلتے جائیں۔ دیکھیں اب جو بھی ہوتا ہے۔"

"سیدھا ہی نکل چلیں؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جی۔ لگتا ہے پوری فوج پیچھے لگا دی ہے حرامزادوں نے۔ ہرنا کے پر بندہ کھڑا ہے۔" اس نے غصے میں افراہیم اور قادر زماں کو کچھ کلاسیکل گالیاں دیں اور نیچے جھک کر مشین گن کا جائزہ لینے لگا۔ یہ مشین گن نجانے کس زمانے میں اور کس ملک کی کس فیکٹری میں بنی تھی۔ اسے بنانے والے نے کہاں سوچا تھا کہ یہ ہتھیار جو نازی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے تیار کیا گیا ہے مدتوں ایک ویران کنوئیں میں دبا پڑا رہے گا اور جب باہر نکلے گا تو کچھ ایسے لوگوں کا سہارا بنے گا جو زر و جواہر سے بھرے ہوئے پچیس عدد صندوقوں کے ساتھ لٹیروں کے نرغے میں ہوں گے اور موت ان پر چاروں طرف سے چیلوں کی طرح جھپٹ رہی ہو گی۔ بہت محدود علم ہے انسان کا۔ وہ جس ہتھیار کو مدتوں سینے سے لگائے رہتا ہے وہ بے وفائی کرکے دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور اسی کی موت کا سبب بنتا ہے۔ وہ جس تحقیق یا ایجاد کے لیے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ گنوا دیتا ہے وہ کسی اور کے نام سے منسوب ہو جاتی ہے اور جس بیٹے کو وہ اپنے دشمن سے بدلہ لینے کے لیے پالتا پوستا ہے وہ اسی دشمن کی بیٹی سے پیار کرکے باپ کا دشمن بن جاتا ہے۔ عیار سے عیار انسان بھی ماضی پر نگاہ ڈالے تو اسے اپنی بے خبری اور معصومیت پر ترس آنے لگتا ہے۔

نیم پختہ راستے پر پہنچتے ہی میں نے ٹرک کی رفتار بڑھا دی۔ دھند کی وجہ سے گرد و نواح ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کس وقت کیا سامنے آجائے گا۔ ہمارے رگ و پے تنے ہوئے تھے اور ذہن کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا۔

پانچ چھ فرلانگ جانے کے بعد ایک گاؤں کے آثار نظر آئے۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہ گاؤں کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ راستے کی ایک جانب چوڑی کھائی تھی اور دوسری طرف گاؤں کے مکانات۔ دن کافی نکل آیا تھا اس کے باوجود گاؤں میں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہاں ایک جگہ چند مرغیاں کوڑے پر چونچیں مار رہی تھیں اور ان کے قریب دو آوارہ کتے کھڑے تیزی سے دُمیں ہلا رہے تھے۔ کتوں کی تمام تر توجہ کا مرکز ہمارا ٹرک تھا اور وہ تذبذب میں تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ ٹرک کے پیچھے بھاگیں یا بغیر چھان بین کے جانے دیں۔

یکایک میری اور صفدر کی نگاہ ایک ساتھ ایک بڑے دروازے پر پڑی اور ہم چونک گئے۔ لکڑی کا یہ پھاٹک کسی گودام نما عمارت کا تھا۔ اس وقت ہماری فوری اور اہم ترین ضرورت یہ تھی کہ ہم اس ٹرک کو کہیں چھپائیں۔ کوئی بھی جگہ ہو، کسی کی بھی ہو لیکن اس چار پہیوں والے "متحرک راز" کو آڑ فراہم کر سکتی ہو۔ میری اور صفدر کی آنکھیں چار ہوئیں۔ خاموشی کی زبان میں ہم نے ایک دوسرے کو مشورہ دیا کہ ٹرک کو اس گودام میں گھسا دیں۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بہت بڑی مصیبت کو سامنے دیکھ کر چھوٹی مصیبت یا پریشانی کا خطرہ مول لینا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم نے بھی یہ خطرہ اتنی آسانی سے مول لے لیا جتنی آسانی سے افطار کے وقت کیلا کھایا جاتا ہے۔

میں نے اسٹیئرنگ تیزی سے موڑا اور متذبذب کھڑے کتوں کے بالکل پاس سے ہو کر گزرا۔ وہ جارحانہ انداز ترک کرکے دفاعی انداز میں پیچھے ہٹے۔ مرغیاں پھڑپھڑا کر ٹرک زوے نکلیں۔ میں نے پھاٹک کے عین سامنے پہنچ کر بریک لگائے۔ صفدر کود کر نیچے اترا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے زرین گل بھی اتر گیا۔ پھاٹک پہلے ہی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ صفدر اور زرین گل نے اسے پورا کھول دیا۔ یہ گودام کا بیرونی حصہ تھا۔ اس سے آگے احاطہ اور چند دروازے نظر آرہے تھے۔ میں ٹرک کو سیدھا اندر لیتا چلا گیا۔ صفدر اور زرین نے جلدی سے پھاٹک بند کرکے اندرونی زنجیر چڑھا دی۔

صفدر کے پاس ریوالور موجود تھا۔ اگر گودام والے گفت و شنید سے مطمئن نہ ہوتے (اور امید تھی کہ نہیں ہوں گے) تو ہم انہیں بذریعہ ریوالور مطمئن کر سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ معاملہ بہت ہی بڑھ جاتا تو پھر معقول سکونِ قلب فراہم کرنے کے لیے ہمارے پاس دوسری جنگ عظیم کا موثر ترین ہتھیار بھی موجود تھا۔ جونہی میں نے ٹرک کا انجن بند کیا، ایک اندرونی دروازہ کھلا اور کھچڑی بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکل آیا۔ وہ شلوار قمیص پر لنڈے کا بھاری بھرکم کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی اور عینک کے نیچے دو کلف لگی کالی سیاہ مونچھیں چمک رہی تھیں۔ یقیناً وہ کلف لگا ہوا ہی باہر آیا تھا کیونکہ ایک مونچھ کچھ زیادہ ہی سیاہ نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی سر بھی کلف سے محروم تھا۔

اس شخص نے صفدر اور زرین گل کو دیکھا، پھر ٹرک کے بوجھ پر ایک نگاہ دوڑائی اور کیبن کی کھڑکی پر آکر میرا معائنہ کرنے لگا۔ "سلانوالی سے آئے ہو؟" اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "چوہدری فرزند علی کا مال ہوگا۔" اس نے ہماری دوسری مشکل بھی آسان کر دی۔

"ہاں جی، چوہدری صاحب کا مال ہے۔" میں نے ڈرائیور حضرات کے انداز میں ذرا جھوم کر ٹرک سے اترتے ہوئے کہا۔

"لیکن ملک صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔ کوئی بھی نہیں ہے۔ سب جوہر آباد گئے ہوئے ہیں۔" ہمارے میزبان نے ذرا تاسف سے اطلاع دی تھی لہٰذا ہم نے بھی افسوس کے انداز میں ہونٹ سکوڑنے ضروری سمجھے۔

"اوہ... یہ تو مسئلہ ہو گیا۔" میں نے صفدر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ افسوس میں سر ہلانے لگا لیکن دل میں وہ بھی خوش ہو رہا تھا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! جو ہم چاہ رہے تھے وہ ہمیں مل رہا تھا۔ پہلے ایک مہربان ملازم ملا تھا اور اب یہ اطلاع ملی تھی کہ گھر والے گھر میں نہیں ہیں۔

"کب تک آجائیں گے؟" صفدر نے پژمردہ سے لہجے میں پوچھا۔

"آج تو مشکل ہے۔ نمبردار فخر علی کی بیٹی کی شادی ہے۔ بڑی مشکل سے چار بجے تک فارغ ہوں گے۔ چار پانچ میل پکے کا سفر ہے۔ پکے تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ اب کل صبح ہی چلیں گے وہاں سے... لیکن تم کیوں پریشان ہو۔ یہ کون سا بھنڈی توری ہے جو باسی ہو جائے گی۔ کل لے جانا منڈی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ انداز الجھا الجھا سا تھا۔ وہ بولا۔ "ویسے فرزند صاحب نے پہلی بار کماد بھیجا ہے۔ اس سے پہلے تو گندم یا سرسوں آتا تھا یا توریا وغیرہ۔"

وہ ناقابل فہم باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی مبہم انداز میں سر

ہلاتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہم سلانوالی سے کسی فرزند علی نامی زمیندار کی فصل لے کر یہاں آئے ہیں۔ اس کی یہ غلط فہمی جتنی دیر برقرار رہتی اتنا ہی بہتر تھا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے احاطے میں پہنچے تو ایک پہلو میں ایک دروازہ کھلا او... پندرہ سولہ سال کی ایک پٹاخا سی لڑکی رحم سے اندر آئی۔ عا... دیہاتی لڑکیوں کی طرح وہ اچھے قد کاٹھ کی مالک تھی۔ تیر... نقش بھی اچھے تھے۔ کڑاکے کی سردی میں وہ صرف شلوار ار... قمیص پہنے ہوئے تھی اور بالکل ہشاش بشاش نظر آتی تھی۔ یقیناً اس کے اندر شباب کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ جس کی حرارت نے اسے موسم کی شدت سے بے گانہ کر دیا تھا۔

احاطے میں ایک طویل دیوار نظر آرہی تھی۔ اس دیوا... میں دو مقامات پر دروازے تھے۔ گرد و نواح کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوا کہ ایک ہی حویلی کو طویل دیوار کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ گودام کا کام دیتا ہے جبکہ دوسرے حصے میں حویلی کا مالک خود رہائش پذیر ہے۔ یہ لڑکی حویلی کے رہائشی حصے سے برآمد ہوئی تھی اور اب چوکھٹ پر کھڑی ذرا دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں منشی چاچا؟" اس نے عجیب بے تکلفی سے ہمارا تعارف چاہا۔ منشی چاچا کا لقب ادھیڑ عمر شخص کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

منشی چاچا نے کہا۔ "سلانوالی سے آئے ہیں۔ چوہدری فرزند کا مال لے کر۔"

"تو یہ گنے ان کے ہیں؟" اس نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں ان کے ہیں۔ کچھ سوگی؟" منشی چاچا نے پوچھا۔

"ہاں... دو تین اچھے اچھے نکال دو... لیکن ٹھہرو میں خود ہی نکال لیتی ہوں۔" وہ جیسے قلانچیں بھرتی ہوئی ٹرک تک پہنچی۔ پھر دلربا انداز میں گنے منتخب کرنے لگی۔ ہم حیرت سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ منشی چاچا نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ملک صاحب کی چھوٹی دھی رانی ہے۔ بہت لاڈ کرتے ہیں اس سے۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس دھی رانی نے بڑی مہارت سے چار صحت مند گنے ٹرک میں سے کھینچ لیے۔ غالباً اس نے دیوار کی دوسری طرف سے گنوں والا ٹرک گودام میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور اس کے بعد ہی یہاں آئی تھی۔ اس کا لباس قیمتی لیکن شکنوں سے بھرپور تھا۔ سلائی کرنے والے نے اسے بالکل ڈھیلا ڈھالا سا بنا دیا تھا۔ یہ لباس ہیما مالنی نے بھی پہنا ہوتا تو جسمانی کشش سے محروم نظر آتی پھر بھی لڑکی جب

کٹورا لے کر چلی تو اس کے بھرے بھرے کولہے نمایاں ہو گئے۔ ایک دم اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "کیا بات ہے بھائی جی! ایسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تم نے؟"

اس کے تیکھے لہجے نے میرے ساتھ ساتھ منصور اور زریں گل کو بھی گڑبڑا دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے منشی چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "بڑی نخرالیا ہے وہمی رانی۔۔۔ مذاق کرو ہی ہے تم سے۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔ اندر آؤ تم۔" وہ مجھے شانے سے تھامتے ہوئے بولا۔ اس وقت میری حیرت دوچند ہو گئی جب لڑکی نے "پتاخ" سے منصور کو آنکھ ماری اور شڑاپ سے دروازے میں غائب ہو گئی۔ منصور نے ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھا۔

دیوار کی دوسری جانب سے آواز آئی۔ "میں مذاق شذاق کوئی نہیں کر رہی چاچا۔ یہ بندے مجھے گڑبڑ لگتے ہیں۔ دیکھو۔۔۔ پہلا کیا ہی کانا نکل آیا ہے۔" پھر ایک کتا ہوا اس اڑتا ہوا آیا اور سیدھا زریں گل کی چھاتی پر لگا۔ منشی ایک بار پھر کھسیانی ہنسی ہنسا اور ہمیں لے کر کمرے میں آگیا۔ یہ درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ عین وسط میں بڑا دیے والی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ انگیٹھی کے پاس ہی لمبی نے والا حقہ پڑا تھا۔ رنگین پایوں والی چارپائی پر ایک فربہ اندام خشخشی سا شخص ٹھاٹ سے بیٹھا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔ منشی چاچا نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ملک صاحب کے پیرو مرشد ہیں۔ شاہ پور کے عرس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔"

ہم نے اپنے بہروپ کا بھرم قائم رکھنے کے لیے ننگے پیر صاحب کو ادب سے سلام کیا اور فرش پر بچھی دری پر بیٹھ گئے۔ پیر صاحب نے اپنی بڑی بڑی خوابیدہ آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور زیر لب بڑبڑا کر کوئی دعا یا بددعا دی۔ میرے خیال میں وہ بددعا ہی رہی ہوگی کیونکہ اسی وقت پیر صاحب کا ناشتا آگیا۔ ظاہر ہے عین ناشتے کے موقع پر ہمارا وارد ہونا پیر صاحب کو بُرا ہی لگا ہوگا۔

ناشتے میں حلوے سے بھرا ہوا ڈونگا تھا۔ بھاری بھرکم پراٹھے تھے۔ انڈوں کا نمکین آملیٹ تھا اور گرم دودھ سے بھرا ہوا جگ۔ گو ہم رات کے کھانے سے ایک بجے فارغ ہوئے تھے پھر بھی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ پیر صاحب کا ناشتا دیکھ کر اور چمک پڑی۔ زریں گل تو باقاعدہ رال ٹپکا رہا تھا۔ مگر مجال ہے کہ پیر صاحب نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ دس منٹ کے اندر اندر پیر صاحب نے سارا ناشتا اپنے پیٹ کے جہنم میں جھونک دیا اور اپنے چکنے ہاتھ چہرے پر پھیر کر چمکتے چہرے کو مزید چمکانے لگے۔ اس دوران منشی چاچا با

اوب دروازے پر کھڑا رہا اور ہم دم بخود دری پر بیٹھے رہے۔ بظاہر ہم کمرے میں بیٹھے تھے لیکن حقیقتاً اس گودام کے گرد و نواح میں گھوم رہے تھے۔ میں تصور کی نگاہ سے اس ٹرک کو دیکھ رہا تھا جو ہمارے ٹرک کے پہیوں نے گیلی زمین پر بنایا تھا اور جو کسی بھی وقت ہماری نشاندہی کر سکتا تھا۔ ٹرک جیسی بھاری گاڑی کے ٹریک کو پہچاننا چنداں مشکل نہیں تھا اور اس صورت میں کہ ڈھونڈنے والے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، کسی بھی وقت گودام کے پھاٹک پر نزول رونما ہو سکتی تھی۔

ناشتے کے بعد پیر صاحب نے جیسے پہلی مرتبہ ہماری موجودگی کا نوٹس لیا۔ ایک گونج دار ڈکار لے کر بولے۔ "کہاں سے آئے ہو بچہ؟"

"بچے" کا لفظ کانوں میں بُری طرح کھٹکا۔ پیر صاحب کی عمر مبارک اتنی نہیں تھی کہ وہ ہمیں اور خاص طور پر زریں گل کو بچہ کہہ سکتے۔ زریں گل سے پانچ چھ برس ہی بڑے ہوں گے وہ۔ بہرحال وہ "پیر صاحب" تھے۔ انہیں کہتے یا بچہ ہم کیا کر سکتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں میں نے فوراً وہی کچھ بتا دیا جو منشی چاچا نے ہمیں بتایا تھا۔۔۔ یعنی ہم سلانوالی سے آئے ہیں اور چوہدری فرزند علی صاحب نے ہمیں بھیجا ہے۔

منشی چاچا میرے قریب بیٹھ گیا اور کان سے منہ لگا کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ "پیر صاحب بڑی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، سب دیکھ لیتے ہیں۔ قبر پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بتا دیتے ہیں کہ اندر مُردہ کس حال میں ہے۔ بڑی گہری نظر دے رکھی ہے اللہ نے۔ بڑا اچھا موقع ہے۔ کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ لو۔"

"کیا بات ہے؟" منصور نے میرے بائیں کان میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "پیر صاحب! بڑی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے، سب دیکھ لیتے ہیں۔"

منصور نے چہرے کی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "بی بی سی کی نسل سے لگتے ہیں یہ۔ ویسے جو ہو رہا ہے وہ تو ان کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوا۔"

میں نے کہا۔ "بھئی رازداری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی پردہ پوشی کا حکم دے رکھا ہے۔۔۔ تم پیر صاحب کی خاموشی پر نہ جاؤ۔۔۔ قبر کے اندر مُردہ تک دیکھ لیتے ہیں یہ۔"

منصور نے سرگوشی کی۔ "وہ سامنے ٹرک کھڑا ہے، اس

میں صندوق تو نظر آئے نہیں اور قبر میں مُردہ دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں کیا پتا۔ ہو سکتا ہے دیکھ ہی لیتے ہوں۔"

ہماری سرگوشیاں طویل ہو گئیں تو پیر صاحب نے بھاری بھرکم لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے بچہ؟ کیوں پریشان ہو؟"

منصور نے دیہاتی لب و لہجے میں کہا۔ "ہمارے استاد جی، سرکار سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں جی۔۔۔ پر جھجک رہے ہیں۔ دراصل۔۔۔ دراصل۔"

"ہاں ہاں کہو بچہ، ملنگوں سے کوئی پردہ نہیں ہوتا۔" پیر فرتوت نے حوصلہ افزائی کی۔

منصور نے زریں گل کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ ہمارے استاد صاحب کا سگا چاچا ہے۔ جوانی میں اسے اس کی سوتیلی پھوپی نے تعویذ گھول کر پلا دیے تھے۔ بس اس وقت سے ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہے، اور عورت بھی ایسی کہ جس سے کبھی اس کی شادی نہ ہو سکے۔ آپ نے فلمیں تو دیکھی نہیں ہوں گی، ورنہ میں نام لیتا اور آپ سبحان اللہ کہہ اٹھتے۔ دیبا خانم نام ہے محترمہ کا۔ عورت بھی کیا، لڑکی ہیں اور شاید لڑکی ہی رہیں گی۔ ہم تو سرکار جب سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔"

"بات مختصر کرو۔" پیر صاحب نے جھلاہٹ آمیز بیزاری سے کہا۔ غالباً انہیں منصور سے ایسی لغویات کی توقع نہیں تھی۔

"بس سرکار، ہمارے استاد جی ہر وقت اپنے چاچا کی طرف سے پریشان رہتے ہیں۔ برادری کے رواج کے مطابق جب تک چاچے کی شادی نہیں ہوگی ان کا راستہ نہیں کھلے گا۔"

پیر صاحب نے اپنی سُرمہ لگی گہری بادامی آنکھوں سے زریں گل کو گھورا اور گلے میں جھولتی مالا کو موڑا دے کر بولے۔ "لیکن یہ تمہارے استاد کا چاچا تو پٹھان نظر آتا ہے۔"

"پٹھان نہیں ہے سرکار۔" منصور نے کہا۔ "بچپن میں اسے لڑکا والا اٹھا کر لے گئے تھے۔۔۔"

اچانک بھاری قدموں کی آواز آئی اور کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی۔ ہم چونک گئے۔ میں نے دیکھا، ہلکی کرتے منصور کا ہاتھ غیر محسوس طور پر چادر کے نیچے رینگ گیا ہے۔ منشی چاچا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا پھر "سلام جی" کہہ کر مؤدب انداز میں ایک طرف ہٹ گیا۔ اونچے شملے والا ایک بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ اس

کے پیچھے ٹاٹ کی چادر میں لپٹی ہوئی ایک دراز قد عورت تھی۔ اس کا چہرہ گھونگھٹ میں تھا تاہم چال ڈھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ نوجوان ہے۔ دونوں نے بڑے احترام کے ساتھ پیر فرتوت کو سلام کیا۔

منشی چاچا نے ہاتھ کے تیز اشارے سے ہمیں سمجھایا کہ ہم کمرے سے باہر آ جائیں۔ ہم نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور منشی چاچا کے انداز میں الٹے قدموں چلتے کمرے سے نکل آئے۔ وہ ہمیں ایک ہال نما اسٹور سے گزار کر ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں موٹے بان کی چند چارپائیاں پڑی تھیں اور بستر بکھرے ہوئے تھے۔ منشی چاچا نے بتایا کہ اس کا نام مختار احمد ہے اور وہ اس گودام کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ ابھی پیر صاحب کے ڈیرے پر حاضری کے لیے آنے والا جوڑا اسی گاؤں کا تھا۔ مرد ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا اور اپنی تیسری بیوی کو سلام کے لیے پیر صاحب کے پاس لایا تھا۔

میں نے منشی مختار سے پوچھا کہ سب گھر والے شادی پر گئے ہیں تو ملک صاحب کی بیٹی یہاں کیسے ہے۔

منشی مختار نے کہا۔ "جس گھر میں بیٹی کی شادی ہے اسی گھر میں ایک ہفتے بعد ہماری وہمی رانی دولہن بن کے جا رہی ہے۔ نمبردار نذر کے پتر سے شادی ہو رہی ہے ہماری سلمیٰ کی۔ اسی لیے گھر والے اسے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔"

لڑکی کی عمر کم تھی۔ اس کی شادی کا سن کر ہمیں حیرانی ہونی چاہیے تھی لیکن نہیں ہوئی۔ وہ جس طرح قلانچیں بھرتی اور آنکھیں مٹکاتی پھرتی تھی اس کی شادی ہو ہی جانی چاہیے تھی۔ ملک اور ملکانی سے ملے بغیر ہی مجھے ان کی دانائی پر یقین آگیا۔

ابھی ہم منشی مختار سے باتیں کر رہے تھے کہ سلمیٰ کمرے کی طرف آتی نظر آئی۔ اس کا دوپٹا پاؤں میں لٹک رہا تھا اور چہرے پر شدید گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر منشی چاچا کو آواز دی۔ منشی جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ سلمیٰ بار بار گودام کے احاطے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے کشادہ تھیں اور سیب کے مانند سرخ رُخسار زرد ہو رہے تھے۔ منصور نے چادر کے نیچے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی، میں اور زریں گل بھی پوری طرح چوکس ہو گئے۔

خطرے کی چاپ ہمیں بہت نزدیک سے آ رہی تھی۔ منشی [illegible] نے حوصلہ رکھو والے انداز میں سلمیٰ سے [illegible] کہا پھر

چیک درست کرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کھڑکی سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ کمرے میں آکر اس نے ہم تینوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی کروٹیں لے رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "تمہارا کوئی چوتھا ساتھی بھی ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے اور صفدر نے ایک ساتھ کہا۔

"پھر ٹرک کی چھت پر کون ہے؟"

"ٹرک کی چھت پر؟" میری حیرت دوچند ہو گئی۔

"تم تے بھولے کیوں بن رہے ہو۔" منشی نے سختی سے کہا۔ "جو بات ہے صاف صاف بتاؤ۔ کسی کو ٹکر ماری ہے؟"

"کس کی بات کر رہے ہو منشی جی۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "تمہارے ٹرک کی چھت پر بندہ لہولہان پڑا ہے اور تمہیں پتا ہی نہیں۔"

ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا احاطے کی طرف بڑھا۔ لڑکی جلدی سے سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ اس کی چنچل آنکھوں میں ہمارے لیے طنز آمیز بے کلی نظر آ رہی تھی۔ پہلو کی سیڑھی سے میں ٹرک پر چڑھا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر سناٹے میں رہ گیا۔ ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر ایک لہولہان خانہ بدوش بے سدھ پڑا تھا۔ مجھے صرف اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم تلے ایک ٹوٹی ہوئی برچھی دبی تھی اور سر کے پچھلے حصے میں گہرا زخم نظر آ رہا تھا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب چھ سات گھنٹے پہلے ہم چٹے پل کی حویلی سے نکلے تھے اور بپھرے ہوئے خانہ بدوش چیلوں کی طرح ہمارے ٹرک پر جھپٹے تھے۔ ایک کلہاڑی بردار تو کیبن میں ہی گھس آیا تھا اور صفدر نے اسے بمشکل نیچے پھینکا تھا۔ یقیناً یہ شخص بھی انہی میں سے ایک تھا۔

میں نے دیکھا' اس کی ران سے خون بہہ بہہ کر ایک میلے کچیلے کپڑے میں جذب ہوتا رہا تھا۔ یقینی طور پر یہ گولی کا زخم تھا اور یہ گولی اس کے اپنے ساتھیوں ہی کی چلائی ہوئی تھی۔ چھت پر چڑھ کر میں نے اسے سیدھا کیا۔ وہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ رنگ عام خانہ بدوشوں کی نسبت صاف تھا۔ کانوں میں مُرکیاں' ہاتھ میں کڑا' پاؤں میں ایک خستہ حال گرگابی۔ وہ تہبند' قمیص اور کُھنڈے کی جرسی پہنے ہوئے تھا۔ اب صفدر بھی چھت پر چڑھ آیا تھا اور حیرت سے اس بلائے ناگہانی کو دیکھ رہا تھا۔ میں [illegible] جیسے سے کان

لگایا۔۔۔ وہ زندہ تھا۔

میرے خیال میں گولی لگنے کے بعد وہ گٹھڑوں کے ڈھیر سے کیبن کی نسبتاً نیچی چھت پر گرا تھا اور اس کا سر چھت کے [illegible] دار اینگل آئرن سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کی فوری بے ہوشی کا سبب یہی چوٹ بنی تھی۔ گرنے کے دوران ہی برچھی کا دستہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے آیا تھا اور دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اب اس شخص کو ٹرک سے نیچے لانے کا مسئلہ تھا۔ میں نے صفدر کی مدد سے اسے بمشکل کندھے پر لادا اور سیڑھی اتر کر نیچے آ گیا۔ ہم اسے کمرے میں لائے اور فرش پر بچھی چٹائی پر لٹا دیا۔

منشی مختار اور سلمیٰ نامی لڑکی دونوں جواب طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "منشی جی! ہم بڑی سے بڑی قسم کھا سکتے ہیں ہمیں اس شخص کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اگر ہم نے اسے زخمی کیا ہوتا تو یہاں کیوں لاتے' راستے ہی میں کہیں پھینک آتے یا ٹرک میں کسی اس طرح چھپاتے کہ کسی کو نظر نہ آتا۔ یہ چھت پر پڑا تھا اور اردگرد کے کسی مکان کی چھت سے نظر آ سکتا تھا۔۔۔ میرا خیال ہے چھوٹی بی بی نے بھی اسے چھت سے ہی دیکھا ہے۔ کیا بی بی؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔

وہ بولی۔ "ہاں۔۔۔ میں اوپر سے گوہے (اُپلے) لینے گئی تھی۔ واپس آنے لگی تو اس بندے پر نظر پڑی۔۔۔" پھر ذرا رک کر بولی۔ "پر اگر اسے تم نے زخمی نہیں کیا تو یہ تمہارے ٹرک پر پہنچا کیسے؟"

صفدر بولا۔ "یہی بات تو ہمیں حیران کر رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کہیں۔۔۔ کہیں یہ گودام کی چھت پر سے ٹرک پر نہیں کودا۔"

اب بات منشی اور لڑکی پر آ رہی تھی اس لیے وہ ذرا وچیسے پڑ گئے۔ منشی بولا۔ "اس پنڈ کے آلے دوالے تو دور دور تک کوئی خانہ بدوش نہیں ہے۔ نہ ہی ہم نے کبھی کوئی ایسی شکل یہاں دیکھی ہے۔۔۔ یہ سوغات تم ہی کہیں سے لے آئے ہو۔"

میں نے زخمی کا تہبند کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ خود ہی باہر کھسک گئی۔ نامعلوم خانہ بدوش کی ران میں گولی لگی تھی مگر ایسے ڈھنگ سے لگی تھی کہ گوشت پھاڑ کر دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ زخم گھٹنے سے قریباً چار انچ اوپر تھا۔ ہڈی نقصان سے محفوظ رہی تھی۔ منشی باہر گیا اور زخموں پر لگانے والا پاؤڈر لے آیا۔ کمرے میں موجود لحاف سے ہم نے کچھ روئی نکالی اور زخم پر اس طرح پٹی باندھ

دی کہ خون رسنا بند ہو گیا۔ سر کے زخم کو بھی اسی طرح طبی امداد فراہم کر دی گئی۔

منشی کوئی چیز لینے کمرے سے باہر گیا تو صفدر نے جلدی جلدی زخمی کی تلاشی لی۔ یہ تلاشی سودمند ثابت ہوئی اور اس شخص کے لباس سے ایک کھلا ہوا کمانی دار چاقو برآمد ہوا۔ یہ چاقو صفدر نے زریں گل کے حوالے کر دیا۔ منشی چند منٹ بعد واپس آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ تو پولیس کیس ہے۔ اگر اس بندے کو کچھ ہو گیا تو تمہارے ساتھ ساتھ ہم بھی پھنسیں گے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "منشی جی حوصلہ رکھو۔ ایسی کوئی بات نہیں' ابھی تھوڑی دیر تک یہ ہوش میں آجائے گا۔ پھر خود ہی بتائے گا کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔"

ویسے دل ہی دل میں ہم دعا کر رہے تھے کہ یہ جلدی ہوش میں نہ آئے۔ کم از کم منشی کی موجودگی میں تو اسے بے ہوش ہی رہنا چاہیے تھا۔ تھوڑی دیر بعد منشی نے ہم سے کہا۔ "میں ذرا ڈیرے تک جا رہا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند رکھو۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یہاں کوئی زخمی ہے اور اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرنا۔ اس کمرے کے بالکل پیچھے پیر صاحب کا کمرا ہے۔ وہ وظیفے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ایسی حالت میں ان تک کوئی آواز نہیں پہنچنی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "تم بے فکر رہو منشی جی۔"

منشی کے جانے سے جہاں ہمیں تسلی ہوئی وہاں کچھ فکر بھی لاحق ہو گئی۔ خاص طور پر صفدر اور زریں گل پریشان نظر آ رہے تھے۔ آخر دل کی بات زریں گل کی زبان پر آ ہی گئی۔ مخصوص لہجے میں بولا۔ "یہ کافر کا بچہ منشی خان کہیں پولیس مولیس کو لینے تو نہیں چلا گیا؟"

صفدر بھی جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں تو منشی ایسی جلد بازی نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک ہم چوہدری فرزند علی کے بندے ہیں اور فرزند علی جو بھی ہے ملک صاحب سے اس کے تعلقات خاصے گہرے لگتے ہیں۔ ویسے بھی یہ کوئی قتل کا کیس تو ہے نہیں۔ یہ بات منشی کی سمجھ میں بھی آ گئی ہے کہ بندہ صرف بے ہوش ہے اور یقینی بات ہے کہ ہوش میں آ جائے گا۔"

صبح مطلع کچھ دیر کے لیے صاف ہوا تھا لیکن اب پھر آسمان پر گہرے بادل امڈ آئے تھے اور کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ بمشکل دس پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ تڑتڑا پڑنے لگا۔ موٹی بوندیں ٹپاٹپ کچے در و دیوار پر گریں اور پھر ایک ولولہ انگیز ردھم کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ گاؤں کی بارش ہمیشہ سے میرے دل کو بھاتی ہے۔ پانی کی چادر میں خاموشی سے بھیگتے ہوئے کچے کوٹھے۔ دیواروں میں چھپے ہوئے بھوسے کے تنکے۔ نالیوں میں خاموشی سے بہتا پانی اور پھر گھروں کے اندر جھکتی ہوئی زندگی۔ لحافوں میں بیٹھ کر کہانیاں کہنا' ریوڑیاں اور چڑوے کھانا۔ پوڑے تلنا اور شریر بچوں کا مختصر کمروں میں اودھم مچانا۔ گاؤں کی بارش سے میرے بچپن اور لڑکپن کی بہت سی سنہری یادیں وابستہ تھیں۔ آج ایک عرصے بعد گاؤں کی ایسی موسلا دھار بارش دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں یقیناً لطف اندوز ہوتا لیکن اس وقت ہم مصروف تھے اور مصروف بھی ایسے ویسے نہیں۔ ہم ہزاروں فٹ کی بلندی پر تنے ہوئے ایک رسے پر کھڑے تھے۔ ہمارے چاروں طرف گہری کھائیاں تھیں اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کوئی بے رحم جھونکا ہمیں موت کے حوالے کر سکتا تھا۔

زریں گل نے کہا۔ "استاد جی! وہ منشی کا بچہ گیا ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے چانٹے مانٹے مار کر اس بندے کو ہوش میں لانا چاہیے۔"

میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ ہم تینوں نے کوشش کی۔ زخمی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کی اور وہ تمام طریقے آزمائے جو کسی شخص کو ہوش میں لانے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ بالآخر خانہ بدوش کی پلکوں میں جنبش ہوئی اور کچھ دیر کسمسانے اور ناقابل فہم الفاظ بولنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک دو منٹ وہ خالی نگاہوں سے ہمارے چہرے تکتا رہا۔ پھر بتدریج مکمل حواس میں آ گیا۔

اس نے جو کچھ کیا اتنی تیزی سے کیا کہ ہم حیرت کا بُت بنے رہ گئے۔ یکایک اس نے اپنا سر تکیے سے اٹھایا اور زریں گل پر جھپٹ پڑا۔ اس نے زریں گل کا گریبان پکڑا' گریبان کے زور پر اٹھا اور پھر زریں گل کو نیچے لیتا ہوا دھڑام سے ایک چارپائی پر گرا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا بایاں ہاتھ بجلی کی سرعت سے اپنی قمیص کے نیچے گیا' وہ غالباً وہاں سے کمانی دار چاقو نکالنا چاہتا تھا لیکن چاقو وہاں نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زریں گل کی گردن دبوچ لی اور چلا کر بولا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہاری جان کھینچ لوں گا۔ بتاؤ کہاں ہے بالی۔۔۔؟ بتاؤ کہاں ہے؟"

وہ جنونی انداز میں زریں گل کی گردن دبا رہا تھا۔ اس

کے بازوؤں میں بلا کی طاقت تھی۔ اگر زریں گل کے کندھوں پر کمزور گردن ہوتی تو گاجر کی طرح ٹوٹ گئی ہوتی۔ میں اور صفدر خانہ بدوش پر جھپٹے۔ زریں گل نے جوابی اقدام کے طور پر پھرتی سے کمانی دار چاقو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تاہم اس نے عقلمندی کی کہ چاقو کو استعمال نہیں کیا۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ خانہ بدوش مسلسل زور لگا رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص زخمی ہے اور چند منٹ پہلے تک بے ہوش پڑا تھا۔ صفدر اور میں نے اسے چند شدید جھٹکے دیے اور پھر کھینچ کر ایک طرف پٹخ دیا۔ وہ چیخ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے اس کے منہ میں ایک پرانی بنیان ٹھونس دی اور اوپر سے ایک کپڑا باندھ دیا۔ صفدر نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ ہم نے اسے اوندھا کیا اور زریں گل کے مفلر سے اس کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے۔

کمرے میں ہونے والا شور یقیناً باہر تک پہنچا تھا۔ بند دروازے پر دستک ہوئی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ "حضرت پیر صاحب" وظیفہ ادھورا چھوڑ کر پرسش احوال کے لیے آئے ہیں لیکن میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک بوڑھی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی پرچھائیاں تھیں۔ اس کے عقب میں تھوڑی دور سلمٰی نظر آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے دور ہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں... سب ٹھیک ہے... تم جاؤ اور منشی چاچا کو بھیجو۔" میں نے اسے پچکار کر کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے غصیلی نظروں سے دیکھتی رہی پھر سرکش گھوڑی کی طرح پھنکارا مار کر واپس چلی گئی۔ بوڑھی ملازمہ بھی پیچھے ہی پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کے زنان خانے میں ان دو خواتین کے سوا کوئی اور نہیں۔ پیر فرتوت شاید کسی بہت گہرے مراقبے میں گیا ہوا تھا جو اتنا شور ہونے پر بھی بدمزہ نہیں ہوا تھا۔ رہا منشی مختار تو وہ ڈیرے پر گیا تھا اور لگتا تھا کہ تیز بارش کے سبب جلد واپس آنے سے قاصر ہے۔

میں نے تڑپتے مچلتے خانہ بدوش کے قریب بیٹھ کر بے حد نرمی سے اسے سمجھایا کہ "بالی" نامی لڑکی کو کسی طرح کا نقصان پہنچانے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم خود اس شخص سے چھپتے پھرتے ہیں جس نے "بالی" کو اغوا کیا ہے۔ میں نے افراہیم کا نام لیا اور اسے بتایا کہ وہ ہمارا بھی اتنا ہی دشمن ہے جتنا کہ اس کا ہو سکتا ہے۔

میرے نرم لب و لہجے نے خانہ بدوش پر اثر کیا اور اس کے تنے ہوئے رگ و پٹھے ڈھیلے پڑنے لگے۔ جب مجھے اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور اس نے خانہ بدوش کی بندشیں کھول دیں۔ وہ بولنے پر قادر ہوا۔ اس نے مخصوص کھردرے لہجے میں پہلا سوال یہ کیا کہ کہاں ہے؟

میں نے کہا۔ "تم حویلی سے کافی فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہو۔ ٹرک پر گر کر بے ہوش ہوئے تھے تم۔ اس ٹرک میں ہم تینوں سوار تھے۔ افراہیم نے ہمیں کئی سے زبردستی حویلی میں روک رکھا تھا۔ کل رات ہنگامہ ہوا تو ہم کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ تم چھت پر پڑے ہو۔ وہ تو یہاں ایک لڑکی نے دیکھا، ہمیں بتایا۔ تمہارے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم نے مرہم پٹی کی اور بہت دیر تک ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔"

میں خاصی دیر تک اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی کہ اگر افراہیم کے ساتھی تھے تو ہمیں کیا ضرورت تھی اس کی مرہم پٹی کرنے کی اور اس کے سامنے صفائیاں پیش کرنے کی۔ نے اسے کاٹ کر کہیں پھینک دیا ہوتا یا تھانے میں جمع کرا دیا ہوتا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ دشمنوں میں نہیں تو ایک دم اس کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو سیلاب کی طرح ابھرے اور رخساروں پر پھیلتے چلے گئے۔ وہ درد بھری آواز میں گالی دے کر بولا۔ "اس... حویلی والے نے ہماری بچی کو مار دیا ہے۔ مجھے یقین ہے اسے مار دیا ہے۔ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجاویں گے اور اس... کو... کے ڈھیر پر کھڑا کر کے ٹکڑے کریں گے اس کے۔" پھر چونک کر مجھ سے پوچھنے لگا۔ "تمہیں... تمہیں کچھ پتا ہے کا۔ تم بھی تو وہیں پر تھے۔ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ کہاں ہے وہ؟"

میں اسے بتا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کہاں ہے لیکن اس وقت میں نے اس آزردہ شخص کے ترین خدشات کو حقیقت کا روپ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا۔ "بالی تمہاری کیا لگتی ہے؟"

وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "وہ میری بھتیجی ہے بابو۔ سگا چاچا ہوں اس کا۔ میں نے بچپن میں اسے گودی ہے اپنے سینے پر سلایا ہے۔ اپنے ماں باپ سے جدا کر

کرتی تھی مجھ سے۔ میں نے ہی اس کا رشتہ ڈھونڈا تھا۔ اس کی شادی کی تھی۔ صرف چار مہینے پہلے بیاہ ہوا تھا اس کا۔ میرا کلیجا اپنے پلڑے میں باندھ کر لے گئی تھی وہ۔" وہ سسکیاں لینے لگا۔ پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہم نے اسے بمشکل سنبھالا۔ وہ بولا۔ "مجھے چھوڑ دے بابو۔ میں اس "حویلی والے" کے پاس جاؤں گا۔ اس سے اپنی بچی لوں گا یا اس کے ایک ہزار ٹوٹے کروں گا۔"

میں نے اسے سہارا دے کر پھر لٹا دیا۔ اس کے زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ ران کے زخم پر تازہ پٹی باندھنی پڑی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے جسم پر لحاف ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ افراہیم نے ہمیں وہاں زبردستی رکھا ہوا تھا۔ جتنے دن وہاں رہے ہیں ایک چھوٹے سے کمرے اور برآمدے سے باہر نہیں نکلے۔ اتنا اندازہ تو ہمیں ہے کہ حویلی میں ایک خانہ بدوش لڑکی لائی گئی تھی لیکن اسے کہاں رکھا گیا تھا اور اب وہ کہاں ہے' اس کا کچھ پتا نہیں۔"

وہ بولا۔ "آخر کوئی تو وجہ ہو گی "حویلی والے" نے تمہیں کیوں رکھا ہوا تھا وہاں؟"

میں نے کہا۔ "وہ تین چار دفعہ ہمیں حویلی کے پچھواڑے احاطے میں لے کر گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک کنوئیں میں کھدائی کروائی تھی۔"

خانہ بدوش کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ بولا۔ "ہمم... پھر کیا نکلا کنوئیں میں سے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ پرانا اسلحہ نکلا تھا۔ گلی سڑی بندوقیں تھیں اور دو تین بم وغیرہ..."

خانہ بدوش ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "بابو! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو بڑی تیز قسمت ہے تمہاری جو بچ گئے ہو۔ شاید تمہیں پتا نہیں کہ وہ کنواں اس سے پہلے تین بندوں کی جانیں لے چکا ہے... اور دو بندے ایسے ہیں جو ہاتھوں پیروں سے محتاج ہوئے ہیں۔"

ہم تینوں نے اس "انکشاف" پر حیرت کا اظہار کیا۔

خانہ بدوش بولا۔ "تین چار ہفتے پہلے اس کنوئیں میں بڑا دھماکا ہوا تھا۔ مرنے والوں میں میری بالی کا خاوند ہیرا (رحمو) بھی تھا۔ دھماکے سے ایک دن پہلے مزدوروں نے کنوئیں پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ کوئی نقصان ہو جائے گا۔ پھر "حویلی والے" نے ان کو لالچ دے کر اور پھر ڈرا دھمکا کر زبردستی کام پر لگایا۔ جب اگلے روز تین بندے مر گئے تو اس نے یہ بات چھپانے کے لیے ہمارے بڑے سردار کو حویلی میں بلایا اور اس کو لمبی رقم دے کر خرید لیا۔ اس کو پتا تھا کہ ہم لوگ سردار کے کہنے سے باہر نہیں جاتے اس لیے سردار کا منہ بند کر کے اس کی تسلی ہو گئی۔ پولیس تو پہلے ہی بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ راتوں رات سارا معاملہ طے ہو گیا۔ مرنے والوں کے وارثوں کو تھوڑی بہت رقم مل گئی اور سردار نے ایک بڑے پولیس افسر سے وعدہ کر لیا کہ ہم تین چار دن کے اندر ڈیرا اٹھا کر یہاں سے چلے جائیں گے۔

سب کچھ "حویلی والے" کی مرضی کے مطابق ہو گیا تھا مگر میری بالی کو "گھر والے" کی موت نے نیم پاگل کر دیا تھا۔ اس کو دورے پڑتے تھے اور وہ چیخنے لگتی تھی کہ ہیرے کو حویلی والوں نے قتل کر دیا ہے۔ کبھی وہ کہتی کہ وہ اس کے لیے نئی جوتی لینے بازار گیا تھا "حویلی والے" نے اسے اپنی لمبی گاڑی کے نیچے دے کر مار دیا ہے... اس کی حالت دیکھتے ہوئے حویلی والے اسے اور اس کے سسر کو خوشاب لے گئے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بالی کا دوا دارو کریں گے مگر ہم کو شک تھا کہ وہ اسے صرف اس لیے لے گئے ہیں کہ کہیں اس کی وجہ سے ان کا بھید نہ کھل جائے۔ میں دو تین دفعہ خوشاب میں بالی سے ملنے گیا لیکن کسی نے بھی مجھے کوٹھی کے اندر نہیں جانے دیا۔ مجھ کو اندازہ ہوا کہ بالی اور اس کے سسر وہاں قیدیوں کی طرح رہ رہے ہیں... پھر ایک روز ہم کو خبر ملی کہ بالی کوٹھی سے بھاگ گئی ہے اور "حویلی والے" اس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ "حویلی والے" کے دو ملازم ڈھونڈتے ہوئے ہمارے نئے ڈیرے پر بھی پہنچے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ لڑکی کو دورہ پڑا تھا اور وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں کہیں نکل گئی ہے۔

ہم کو شک تھا کہ یہ ساری چالبازی ہے۔ بالی کو غائب کیا گیا ہے۔ ہم نے ڈیرے کے کچھ لڑکے اپنے ساتھ ملائے اور اپنے طور پر بالی کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ پیرنیل کی حویلی میں تالا پڑ چکا تھا اور لگتا تھا کہ اب وہاں کوئی نہیں رہتا لیکن "حویلی والا" رات کے اندھیرے میں کبھی کبھی گاڑی پر یہاں آتا تھا۔ آخر ہم نے حویلی میں کام کرنے والے ایک نوکر کو پکڑا اور اس سے ہمیں پتا چلا کہ چند روز پہلے کالی چادر اور ننگے پاؤں والی ایک لڑکی کو حویلی میں لایا گیا تھا۔ اس خبر سے ہمارے پورے ڈیرے میں آگ بھڑک اٹھی۔ شاید لوگ غصے میں آ کر سردار کو بھی لٹکانے لگا دیتے پر وہ موقع تاڑ کر بیوی بچوں سمیت کہیں نکل گیا۔ ہاں سانسی قبیلے کے ایک سردار کو لوگوں نے بری طرح مارا پیٹا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک کنوئیں میں پھینک دیا۔ معلوم نہیں وہ بچا ہے یا نہیں۔ اس کے بعد

بچھرے ہوئے لوگ حویلی کی طرف بڑھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ حویلی میں کتنے لوگ ہیں اور کتنا اسلحہ ہے وہاں۔۔۔ یقین کرو باؤ! اگر کل رات حویلی میں ایک ہزار بندہ بھی بندوقیں لے کر کھڑا ہوتا تو ہم وہاں ضرور گھستے۔۔۔"

یا ہر بادل گرجتے برستے رہے اور اندر خانہ بدوش 'اپنی' جذبات میں ڈوبی ہوئی' روداد سناتا رہا۔ اس کے لفظوں میں ایک انمول درد کی مہک رچی بسی تھی۔ چاچے بھتیجی کا یہ پیار ایک دلگداز کیفیت کا حامل تھا۔ محبت رشتوں میں نہیں انسانوں میں ہوتی ہے اور اس کا تعلق طبقوں سے نہیں دلوں سے ہوتا ہے۔ میرا بھی تو ایک چاچا تھا' ایک باعزت خاندان کا باشعور فرد تھا۔ اس نے اپنے یتیم و بے آسرا بھتیجے بھتیجی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ انہیں روئی کپڑے پر نوکر بنایا گیا تھا اور دہکتے چمٹوں سے ان کے نازک جسم داغے گئے تھے۔ بچا جلیس اور چچی فاخرہ کی یاد آتے ہی ایک دم میرے دائمی زخموں سے خون رسنے لگا اور پھر اس کے ساتھ ہی غزال کا چہرہ بھی نگاہ میں گھوم گیا۔ میں نے اس پر بہت ستم ڈھائے تھے۔ جتنی کڑی آزمائشوں سے میں نے اسے گزارا تھا شاید ہی کسی نے کسی کو گزارا ہو لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میرے روئیے میں کسی پہاڑ کی طرح ٹھہری ہوئی یہ "بے رحمی" میری اپنی نہیں تھی۔ یہ بے رحمی و سنگ دلی مجھے عنایت ہوئی تھی۔ شاید اس روز' جس روز ایک ناسمجھ لڑکے کو سیکڑوں نگاہوں کے سامنے محبت کی سزا دی گئی تھی۔ آہ۔۔۔ کتنا مجبور تھا میں اس حوالے سے۔۔۔ مری' جی پی او کے سامنے کھڑی غزالہ میری نگاہوں میں دھندلاتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے بہت دور ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ میں بہت تھک گئی ہوں شاہجہاں۔ میری محبت ہار گئی ہے' تمہاری نفرت جیت گئی ہے۔ خدا حافظ۔۔۔ ہمیشہ کے لیے کیا وہ واقعی ایسا کہہ رہی تھی یا یہ میرا وہم تھا۔ میں نے غور سے اس کے گداز لبوں کی حرکت دیکھنا چاہی لیکن اس کا ہیولا مجھ سے دور تھا اور راستے میں دھند کی دبیز چادر تھی۔

منشی مختار ایک بجے کے قریب لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "میں تم سے کہہ کر بھی گیا تھا کہ شور شرابا نہ ہو۔ تم نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اگر پیر صاحب باہر نکل آتے تو۔۔۔؟"

میں نے کہا۔ "آسمان ہم نے نہیں' اس زخمی نے اٹھایا ہوا تھا۔ درد سے چیخ چلا رہا تھا۔ میرے پاس نیند کی تین گولیاں تھیں۔ اسے دے دی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سویا ہے۔"

نیند کی گولیاں میرے پاس تھیں نہ میں نے خانہ بدوش کو دی تھیں۔ خانہ بدوش کا نام دلبیت معلوم ہوا تھا۔ اس وقت دلبیت جاگتی آنکھوں سے سویا ہوا تھا۔ اس نے ایسا ہمارے ہی کہنے پر کیا تھا۔ منشی کی آمد سے پہلے میں نے دلبیت کو بتا دیا تھا کہ افراہیم کے بندے ہمیں چاروں طرف ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ہم نے اس گودام میں کسی چوہدری فرزند کے کارندوں کے طور پر پناہ لے رکھی ہے لہٰذا اسے اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔ منشی مختار نے گھورتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "اس حرامی نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں ہے؟"

"پوچھنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی منشی جی۔" منصور نے کہا۔ "ہوش میں آتے ہی تکلیف سے ہاں ہاں کرنے لگا تھا۔ وہ تو فوراً استاد جی نے ایک ساتھ تین گولیاں کھلا کر سلا دیا۔ ورنہ اب تک حضرت پیر صاحب شور سے بہرے ہو چکے ہوتے۔۔۔"

منشی کو پیر صاحب کے بارے میں منصور کی خیال آرائی پسند نہیں آئی۔ وہ بڑا سا منہ بنا کر بولا۔ "اچھا تم لوگ اب ذرا خاموشی سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے ابھی روٹی بھجواتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کہیں سے درد کی گولیاں مل جائیں تو اچھا ہے' ورنہ رات کو اس نے بڑا تنگ کرنا ہے۔ خواہ مخواہ پیر صاحب بھی پریشان ہوں گے۔"

زریں گل بولا۔ "تم رات کا بات کر رہا ہے۔ یہ تو ابھی بھی نیند میں ہائے ہائے کر رہا ہے۔"

منشی مختار جلدی سے بولا۔ "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے میں پتہ کرتا ہوں دوا کی کا۔"

وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا تو دلبیت نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ظاہر ہے وہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ سسکی لیتے ہوئے کہنے لگا۔ "باؤ! درد تو واقعی بہت ہو رہا ہے۔"

منصور نے کہا۔ "ہم بھی "واقعی" گولیاں منگوا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد بوڑھی ملازمہ ہمارے لیے کھانا لے آئی۔ کھانا ویسا ہی تھا جیسا ایک ٹرک ڈرائیور اور دو مزدوروں کو ملنا چاہیے تھا۔ ایک بڑی چنگیر میں آٹھ دس تندوری روٹیاں تھیں۔ دو بڑے بڑے پیالوں میں تندوری سالن تھا۔ ایک میں چنے کی دال تھی' دوسرے میں ڈھلے دُھلائے سے آلو مٹر۔۔۔ آہ! تمن کروڑ کی دولت منددں '

کھری چارپائی پر بٹھا کر ایسا غریبانہ کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ کیا معلوم تھا ان بے چاروں کو کہ وہ روٹھے ہوئے وقت کے ساتھ کیسی بدسلوکی کر رہے ہیں۔ جس چنگیر میں تندوری روٹیاں تھیں اسی میں پرانا سول کے دو پتے بھی رکھے تھے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے میں نے انہی تین گولیاں دلبیت کو کھلا دیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ٹرک کا ایک چکر لگایا۔ چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ ممکن تھا کہ کسی نے دو تین گنے مزید کھینچے ہوں لیکن گنوں کی پروا کس کو تھی۔ جو کچھ گنوں کے نیچے تھا اسے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ میں نے ٹرک کے پہیوں کے نشانات دیکھے۔ حالانکہ موسلا دھار بارش ہوئی تھی اور اب بھی بوندا باندی جاری تھی لیکن گیلی زمین پر پہیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ میں نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ نشان دور تک نظر آ رہے تھے۔ میری چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ اگر ہم پکڑے گئے تو انہی نشانات کے سبب پکڑے جائیں گے۔ میں ٹرک کی باڈی پر گولیوں کے نشان وغیرہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکامی ہوئی۔ پہیوں کی ہوا ٹھیک تھی۔ میں نے فالتو ٹائر بھی چیک کیے۔ پھر کیبن میں آ گیا اور ٹرک کے کاغذات دیکھے۔ ڈرائیونگ لائسنس ولی محمد سکنہ خوشاب کے نام کا تھا۔ لائسنس پر ولی محمد کی تصویر دیکھ کر اس کا حسرت ناک انجام آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ٹرک کا نمبر جھنگ کا تھا اور اس کی رجسٹریشن کسی عباس خان کے نام پر تھی۔ انشورنس کارڈ اور روٹ پرمٹ وغیرہ بھی ٹرک میں موجود تھا۔ "تھل پالی" چیک کرنے کے بعد میں واپس کمرے میں پہنچا تو منصور زیرِ لب مسکرا رہا تھا اور زریں گل چادر کا پلو منہ میں دبائے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی کوشش نے اس کا چہرہ سرخ تر کر دیا تھا اور توند میں جیسے زلزلہ برپا تھا۔

حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم ہنسی مذاق کی طرف متوجہ ہو سکتے۔ جب سے ہم یہاں پہنچے تھے ایک لمحے کے لیے بھی گردونواح کی فکر سے آزاد نہیں ہوئے تھے اور ایک گھنٹا پہلے تک منصور کا ہاتھ ہر آن ریوالور پر دھرا رہا تھا۔ معلوم نہیں میرے بعد انہوں نے کیا منظر دیکھا تھا کہ ہنسنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میرے استفسار پر منصور نے کمرے کے واحد روزن کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اس نے اس روزن سے جھانکا ہے۔ روزن کافی بلندی پر تھا اور دیوار سپاٹ تھی لیکن دلبیت قابلِ فہم تھی کہ منصور جیسا شخص کسی نہ کسی طرح روزن تک پہنچ گیا ہوگا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' اس نے اس

مقصد کے لیے ایک چارپائی کو سیدھا کھڑا کر کے دیوار کے ساتھ لگایا تھا اور پھر چارپائی کے اوپر سے اُچھل کر روشندان کی چوکھٹ تھامی تھی۔

روشندان کھول کر اس نے جس کمرے میں جھانکا وہ

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان.
ایک نہ رُکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے.
قیمت:
جلد اوّل: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بُک سٹال سے طلب فرمائیں
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون ۷۲۳۳۱۴۱۔۷۲۴۴۲۷۰

حضرت پیر صاحب کا کمرا تھا۔ صفدر نے بتایا کہ پیر صاحب' مراقبے میں نہیں اور نہ ہی وظیفہ وغیرہ فرما رہے ہیں' کمرے کو اندر سے کنڈی چڑھا کر وہ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں اور حلوے کے خمار میں خراٹے لے رہے ہیں۔ انہوں نے بعض فربہ اندام لوگوں کی طرح کھلا ڈلا ہو کر سونے کے لیے اپنا آزار بند ڈھیلا فرما دیا تھا جو گہری نیند میں "ڈھیلا تر" ہو گیا تھا اور یہی صورت حال صفدر اور زریں گل کی مسکراہٹوں کا سبب بنی تھی۔

اب یہ عقدہ بھی کھل گیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس کمرے میں سخت شور برپا ہونے کے باوجود پیر صاحب کی جلالی روح کیوں بیدار نہیں ہوئی تھی۔ روح کے ساتھ وہ خود بھی لمبی تانے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بازاری سرمہ بھر کر یہ دعویٰ کرنے والا زنا پیر کہ وہ بہت دور تک دیکھ سکتا ہے ہمارے گھٹنوں کے نیچے کیا جھانکتا' اپنے کمرے کے روشندان تک نہیں دیکھ سکا تھا اور جنہیں دیکھنا آتا تھا انہوں نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے جب دلہبت واقعی اونگھنے اونگھنے سو گیا تھا سلمٰی پھر آ دھمکی۔ وہ اب مختلف لباس میں تھی اور اس کا ہراس بھی کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ دوستانہ لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ "بھائی! کیا سچ مچ یہ بندہ آپوں آپ تمہارے ٹرک پر آن گرا تھا؟"

میں نے کہا۔ "بی بی! اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ ہم تمہیں ایسے بندے نظر آتے ہیں؟ سیدھے سادے دیہاڑی دار مزدور ہیں۔ گنا منڈی پہنچائیں گے اور وصولی کی رسید لے کر واپس ملانوالی چلے جائیں گے۔ پتا نہیں ——"

"دل تو میرا بھی کہتا ہے کہ تم ٹھیک بندے ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "ورنہ اب تک میں نے تمہیں اس کمرے میں ناز کر تمہارے ٹرک کی ہوا نکال دی ہوتی اور اس وقت تک تمہیں بند رکھتی جب تک میرا ابا یہاں نہیں پہنچ جاتا۔"

"بہت بہت شکریہ جی۔" صفدر نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے جی! اک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کے سب گھر والے تو چلے گئے ہیں شادی پر اور آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ گئے ہیں؟"

لڑکی کے چہرے پر دھنک کے رنگ بکھر گئے۔ ان لمحوں میں بڑی پیاری لگی وہ۔ غالباً اس کے یہی رنگ دیکھنے کے لیے صفدر نے بات چھیڑی تھی۔ زریں گل نے کہا۔ "بی بی جی! آپ تو بالکل لال ہو گیا ہے چقندر کے ماتق۔ کیا امارے صاحب نے کوئی غلط بات کہہ دیا۔"

وہ سنبھل کر بولی۔ "دہ —— دراصل میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ سردی سی لگ گئی تھی۔" پھر ایک دم اس نے موضوع بدلا۔ "رات کے کھانے میں تم تینوں کیا کھاؤ گے؟"

صفدر نے انکسار سے کہا۔ "پیر صاحب کے ساتھ جو بھی روکھی سوکھی ملے گی کھا لیں گے۔"

وہ صفدر کی بات سمجھ کر مسکرانے لگی۔ اچانک کمرے کی چھت سے "دھم" کی مدھم آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی بچہ قریبی چھت سے کودا ہے۔ اس آواز نے سلمٰی کو بھی تھوڑا سا چونکا دیا۔ اچانک مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ یوں لگا —— جیسے کوئی بہت بڑا خطرہ بہت خاموشی سے بہت قریب رینگ آیا ہے —— میں تڑپ کر اٹھا اور قریبی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر چھت کی طرف دیکھا۔ بارش کی چند بوندیں میرے چہرے سے ٹکرائیں —— اور پھر میری نگاہ ایک ایسے جسم پر پڑی کہ تھرا کر رہ گئی۔ وہ بچے کا ہی قد کاٹھ تھا لیکن بچہ نہیں تھا۔ وہ جاگیردار قادر زماں کا خونخوار پالتو بونا تھا۔ سراپا لوہے کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ بے حد سفاک اور تربیت یافتہ۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے تمام کوائف برقی رو کے مانند میرے ذہن میں سے گزر گئے۔

"صفدر، بھاگو۔" میں نے چلا کر کہا اور گھوم کر کمرے میں دیکھا۔

کمرے کی چھت میں ایک روزن تھا۔ اس روزن کو کر شے سے ڈھانپا گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس شیشے کو ہٹا روزن میں ایک خود کار رائفل کی نال گھسیڑ دی گئی۔ مجھے رائفل بردار کے بالوں سے بھرے ہاتھ اور کندھے کا ایک حصہ نظر آیا۔ پھر رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر آئی۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ کے مختصر وقفے میں ہوا۔ اب صفدر اور سلمٰی رائفل کی زد میں تھے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ گولیاں ان دونوں کے جسموں کو چھلنی کرنے والی تھیں ——

صفدر روزن میں سے نمودار ہونے والی موت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو جان بچانے کے لیے شاید کوئی کارگر کوشش کرتا مگر سلمٰی پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ ابھی وہ یہی نہیں جان سکی تھی کہ ہمارے چہروں پر زلزلے کیوں نمودار ہوئے ہیں اور کیوں میں نے چیخ کر اپنے ساتھی کو بھاگنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کی معصومیت آمیز خستگی کو ان برق رفتار لمحوں سے کوئی مطابقت نہیں تھی۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اسے گولیوں سے چھلنی ہو کر نیچے گرتے دیکھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا، نہیں اسے مرنا نہیں چاہیے۔ اس کی موت معصومیت' شوخی اور خوب صورتی کی موت ہے۔ اگر وہ مر گئی تو اس کے ساتھ یہ ساری صفات بھی مر جائیں گی پھر سات روز بعد کس کے لیے شہنائی بجے گی۔ کون ہاتھوں میں مہندی رچائے گا' کس کے جسم پر سرخ جوڑا سجے گا؟ اس لمحے کے مختصر حصے میں مجھے شگفتہ یاد آئی۔ فریال یاد آئی' غزالہ اور انجم یاد آئیں۔ مجھے لگا کہ وہ ساری لڑکیاں "تھوڑی تھوڑی" اس لڑکی میں موجود ہیں۔ یہ صرف ایک لڑکی نہیں' یہ علامت ہے دوشیزگی' اور پرجوش زندگی کی' یہ وہ وجود ہے جس سے فضاؤں میں موسیقی' پانیوں میں لہر اور کائنات میں رنگ ہے ——

میں نے دیوانہ وار جست لگائی اور اڑتا ہوا سا لڑکی کے اوپر گرا۔ اسی وقت کمرے کی مختصر فضا خوفناک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ میں صرف اتنا جان سکا کہ میں گولی لگنے سے محفوظ رہا ہوں۔ یکدم کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ کچھ خبر نہیں میں فرش پر کب گرا؟ کہاں چوٹ لگی اور لڑکی کو کتنی چوٹیں آئیں۔ مجھے صرف اتنا احساس تھا کہ ایک سیکنڈ کے لیے لڑکی میرے نیچے دب گئی تھی اور بری طرح چلائی تھی۔ پورے گودام میں ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ میں نے دیوانہ وار ہاتھ چلا کر لڑکی کی کلائی تھامی۔ وہ پاؤں سمیت کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ اس کے اٹھنے کا انتظار کرتا۔ میں اسے اندھا دھند گھسیٹتا ہوا کمرے سے نکلا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔ برآمدے کے آخری نمائیند تلے پہنچ کر میں نے اسے گندم کی چند بوریوں کے پیچھے دھکیل دیا۔

"سر نیچے رکھو" میں نے چلا کر کہا۔

وہ سہم کر دبک گئی۔ میں واپس مڑا تو ایک بدہیئت بونا چھلانگ لگا کر میرے سامنے آ گیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے کودا تھا۔ یوں لگا کہ کسی زہریلے درخت کا مکروہ پھل اچانک میرے سامنے آن گرا ہے۔ بونے کے ہاتھ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے اور ان لتھڑے ہاتھوں میں ریوالور تھا۔ میں نے تڑپ کر ٹانگ چلائی۔ بونا کسی گیند کی طرح اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ میں برآمدے سے نکلا اور پوری رفتار سے ٹرک کی طرف بھاگا۔

ٹرک —— جو ٹرک نہیں تھا چار پہیوں پر ایک قیامت خیز محاذ تھا اور جہاں ایک خوفناک مشین گن بالکل تیار حالت میں ہمارے دفاع کے لیے موجود تھی لیکن احاطے میں پہنچتے ہی میری نگاہ ٹرک کی طرف اٹھی اور تھرا کر رہ گئی ——

ٹرک کے کیبن میں ایک شخص گھسا ہوا تھا اور مجھے اس کے ہاتھ میں مشین گن نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں سناٹے میں رہ گیا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ایک نہیں دو افراد ہیں اور وہ مشین گن کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ یہ دوسرا شخص زریں گل تھا۔ میں نے اسے اس کی سرخ جرسی سے پہچانا۔ وہ نیچے تھا اور مدمقابل اوپر۔ پھر اچانک ہی خوفناک تڑتڑاہٹ گونجا جو میں اس سے پہلے دو مرتبہ چنے پل کی حویلی میں سن چکا تھا۔ یہ مشین گن کا نغمہ تھا۔ یہ دہکتی ہوئی موت کی آواز تھی۔ میں نے دیکھا زریں گل کے مدمقابل کا جسم جھٹکوں سے اچھلا پھر زریں گل نے اسے اپنے پاؤں سے دھکیل کر ٹرک کے ادھ کھلے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ یہ سارا واقعہ ایک یا دو سیکنڈ میں ظہور پذیر ہوا۔

میں ایک ستون کی اوٹ میں تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی گولی مجھے چاٹ سکتی تھی۔ میری سلامتی اسی میں تھی کہ بھاگ کر ٹرک تک پہنچ جاؤں۔ ستون اور ٹرک کا درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم رہا ہوگا لیکن یہ پل صراط کا سفر تھا۔ جس بونے کو میں ٹانگ مار کر برآمدے میں پھینک آیا تھا وہ ایک کھڑکی سے کود کر "شیڈ" میں آیا اور چاروں طرف میری تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہی وقت تھا جب مشین گن ایک بار پھر چلی۔ یہ ایک طویل برسٹ تھا۔ قریباً آٹھ ایم ایم کی گولیاں در و دیوار کو ادھیڑتی اور کھڑکیوں دروازوں کو چھلنی کرتی نہ جانے کہاں کہاں پیوست ہو گئیں۔ میں نے بونے کو اچھل کر ایک دلیز میں گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی چھت سے بھی ایک شخص بے جان شے کی طرح عین میرے سامنے گرا۔ یہ غالباً وہی رائفل بردار تھا جس نے چھت کے روزن سے صفدر اور سلمٰی پر گولی چلائی تھی۔ میں نے گرنے والے کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ اس کے چہرے گردن اور سینے پر کئی سیاہی مائل سوراخ تھے اور کسی بھی لمحے ان سوراخوں میں سے خون کے فوارے چھوٹنے والے تھے۔ میں نے جھک کر اس شخص کی خود کار رائفل اٹھائی اور ٹرک کی طرف بھاگا۔ ٹرک کی طرف بھاگنے کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ عسکری زبان میں زریں گل مجھے "کورنگ فائر" دے رہا تھا اور میں اس فائر سے فائدہ نہ اٹھاتا تو زبردست بے وقوفی کرتا۔ چند گز کا فاصلہ میں نے جیسے اڑتے ہوئے طے کیا۔ اس دوران زریں گل نے چھوٹا سا ایک اور برسٹ مارا تھا۔ اس برسٹ کی گونج ختم ہونے تک میں ٹرک کے اندر پہنچ چکا

تھا۔ (میں ڈرائیونگ والی سمت سے اندر داخل ہوا تھا)
ہیوی مشین گن کی فائرنگ نے قرب و جوار میں جیسے سراسیمگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہمارے اردگرد موجود لوگ یقیناً اسلحہ شناس تھے اور اسلحہ شناس بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ہیوی ایم جی کیا بلا ہوتی ہے۔ یہ وہ فوجی ہتھیار تھا کہ اگر کسی صحیح مقام پر نصب ہوتا اور اس کے لیے ایمونیشن کی کمی نہ ہوتی تو جرے سے بڑا معرکہ سر کر سکتا تھا۔
ابھی میں کیبن میں گھس کر دروازہ بھی بند نہیں کر پایا تھا کہ مجھے صفدر نظر آیا۔ وہ عین اس مقام پر کھڑا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں تھا اور وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ اس کے کندھے پر ولیبت کا زخمی جسم تھا۔ صفدر نے یقیناً جرأت کا ثبوت دیا تھا کہ ولیبت کو کمرے سے نکال لیا تھا۔ اب وہ تھوڑی سی جرأت اور کرتا تو وہ دونوں ٹرک تک بھی پہنچ سکتے تھے۔
"فائر کرو زریں گل" میں نے کہا۔
زریں گل نے گن کی نال دروازے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اس نے نال کا رخ قریبی چھتوں کی جانب کیا اور چھوٹے چھوٹے تین چار برسٹ مارے۔ اس دوران صفدر بھاگ کر ٹرک تک پہنچ گیا۔ زریں گل نے دروازہ کھولا۔ صفدر نے ولیبت کو ہمارے قدموں میں پھینک دیا اور پھر خود بھی اس پر سجدہ ریز ہو گیا۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھما کر انجن اسٹارٹ کیا۔ گودام کا احاطہ اتنا وسیع تھا کہ ٹرک کو موڑا جا سکتا تھا لیکن موڑنے کا وقت ہمارے پاس نہیں تھا۔ میں نے ریورس گیئر لگایا اور ایکسلریٹر کو آخری حد تک دبا کر کلچ چھوڑ دیا۔ کچی زمین پر ٹرک کے پچھلے پہیے گولی کی رفتار سے گھومے پھر بھاری بھرکم ٹرک حرکت میں آیا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند پھاٹک کی طرف ریورس ہوا۔ یہی وقت تھا جب میں نے اردگرد کی چھتوں پر کئی سر ابھرتے دیکھے۔ میں نے ونڈ اسکرین کے وائپر آن کیے تو سامنے کا منظر صاف ہو گیا۔ ایک بونا حیرت انگیز پھرتی سے بھاگتا ہوا آیا اور ایک چھت سے دوسری چھت پر کودا۔ ایک شخص نے ہاتھ لہرا کر کسی سے کچھ کہا۔ ایک رائفل نما چیز کی اوٹ سے رائفل کی نال نمودار ہوئی پھر ایکا ایکی چھت پر نظر آنے والے یہ سارے مناظر میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ ٹرک ڈیوڑھی میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے عقب میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بس اندازے سے گودام کے پھاٹک کو ٹکر ماری۔ ایک زبردست دھچکا لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹرک کے اگلے پہیے کئی انچ تک زمین سے اٹھ گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ اشیا کیبن کی چھت سے ہمارے اوپر گریں۔
ایک زوردار آواز سے پھاٹک ٹوٹ گیا اور ٹرک چنگھاڑتا ہوا گودام سے باہر نکل آیا۔ اب وہ گلی میں تھا جہاں دروازوں، کھڑکیوں اور مکانوں کی چھتوں پر ہراساں چہرے نمودار ہو رہے تھے۔ گلی میں آ کر ٹرک نے ایک مکان کی کچی دیوار گرائی اور خود بخود ترچھا ہو گیا۔ پہلا گیئر لگانے کے لیے مجھے ایک زاویہ درکار تھا۔ میں نے گیئر لگایا اور اسٹیرنگ کو پورا گھما کر ٹرک سیدھا کر لیا۔ گلی کے نکڑ پر مجھے ایک ٹویوٹا کرولا کھڑی نظر آئی۔ نئی نویلی نازک اندام گاڑی کیچڑ میں لتھڑی تھی لیکن پھر بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ ٹرک کسی دیوہیکل دلہن کی طرح چنگھاڑتا ہوا اس "مہ جبیں" کی طرف بڑھا۔ گلی اتنی کشادہ نہیں تھی کہ ٹرک گاڑی سے ٹکرائے بغیر گزر جاتا۔ ایک طرف کچی دیوار تھی اور دوسری طرف ریکی جوڑی کھائی۔ ٹویوٹا کھائی کی جانب تھی۔ میں نے اسٹیرنگ پر گرفت مضبوط کر کے رفتار تیز کر دی۔ ٹرک نے بڑے جارحانہ انداز میں اس نازک اندام پر چڑھائی کی۔ وہ اس سیکڑوں من متحرک بوجھ کی ضرب سے ٹوٹی، پچکی۔ ریورس ہو کر کچی دیوار سے ٹکرائی اور اسے مسمار کر کے بھینسوں کے ایک باڑے میں گھس گئی۔ ٹرک نے اپنا راستہ صاف کیا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔
یہی وقت تھا جب عقب سے فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے بائیں طرف دیکھا۔ کھیتوں میں ایک ہی رنگ اور ماڈل کی دو لینڈ کروزر جیپیں حرکت میں آئیں اور ٹرک کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگیں۔ مجھے کچھ فاصلے پر ایک سرخ سوزوکی بھی دکھائی دی۔ وہ ایک گھنے برگد تلے کھڑی تھی۔ اس کے چاروں دروازے کھلے تھے اور چند افراد دو کتوں سمیت بڑی افراتفری میں اس کے اندر گھس رہے تھے۔ آثار بتا رہے تھے کہ کچھ لوگ پوری قوت سے ہمارا تعاقب کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ صفدر نے بتایا تھا کہ یہ چند ایک افراد نہیں تھے۔ یہ خاصی بڑی تعداد میں تھے اور درجنوں گاڑیوں پر تھے۔ وہ اس پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کی متلاشی نگاہیں ہر شے کو چھید رہی تھیں۔ ہم کب تک خود کو ان سے دور رکھ سکتے تھے۔ وہ ہر طرف سے ہم پر جھپٹ رہے تھے۔ کسی بھی وقت بھٹکتا ہوا بیسا ٹرک کے کسی ٹائر میں گھس سکتا تھا اور کسی بھی وقت کوئی گولی ہمارا کام تمام کر سکتی تھی۔ ہمارے پاس ایک پاورفل مشین گن تھی لیکن یہ تادیر ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ کسی بھی وقت اس کا ایمونیشن ختم ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟ یہ سوال ت

پھاڑے کھڑا تھا اور اس "پھٹے ہوئے منہ" میں بے بسی کی گہری تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ قسمت ساتھ دیتی تو ہم کسی اونچی فصل یا جنگلے وغیرہ میں گھس کر اپنی جانیں تو شاید بچا لیتے لیکن وہ پچیس صندوق ہمارے ہاتھ سے نکلتا یقینی تھے جو اس ٹرک میں لدے ہوئے تھے اور جن میں سے ہر صندوق اپنے پیٹ میں بے شمار دولت چھپائے ہوئے تھا۔
تیسرا گیئر لگانے کے لیے میں نے لیور کی طرف دیکھا تو پہلی بار میری نگاہ ان اشیا پر پڑی جو چند لمحے پہلے کیبن کی چھت سے میری جھولی اور فرش پر گری تھیں۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یوں لگا جیسے دل سے نکلنے والی کوئی دعا اوپر والے نے پہلے آسمان پر آ کر سنی ہے اور پلک جھپکتے میں قبول کی ہے۔ میری جھولی میں مشین گن کے راؤنڈز اسٹریپ کا ایک دو گز لمبا ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک ایسا ہی ٹکڑا فرش پر پڑا تھا۔ ایک اور طویل ٹکڑے کا سرا کیبن کی چھت میں واقع ایک خلا سے جھانک رہا تھا۔ ان اسٹریپس کے علاوہ چند اسٹک گرینیڈز بھی فرش اور نشستوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ اسلحہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کھود کر نکالا تھا۔ ہم اسے کیسے نہ پہچانتے۔ ہم نے اسے پہچان لیا اور یہ بھی جان لیا کہ یہ سب کچھ پکے پھل کی طرح ہماری جھولی میں کیسے آن گرا ہے۔ ہمارے ہاں سڑکوں پر چلنے والے عام ٹرکوں کی طرح اس ٹرک کے کیبن میں بھی کافی ڈیکوریشن کی گئی تھی۔ چھت پر دو صندوق نما خلا تھے۔ ان میں ڈھکنے لگے تھے جو کھل کر نیچے جھول جاتے تھے۔ افراہیم نے یہ خلا اسلحہ رکھنے کے لیے استعمال کیے تھے۔ مشین گن کے سیکڑوں راؤنڈ، رائفل کے بھرے ہوئے میگزین اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ یہاں چھپا دیے گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ٹرک اور پھاٹک کے تصادم میں لگنے والے جھٹکے کے سبب ایک خلا کا ڈھکنا کھل گیا تھا اور اندر رکھا ہوا مہلک سامان ہمارے اوپر آن گرا تھا۔ شاید چھپر پھاڑ کر دینے والا محاورہ ایسے ہی موقعوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
ولیبت بدستور پہلو کے بل فرش پر لیٹا تھا۔ صفدر اب سیدھا ہو کر نشست پر بیٹھ چکا تھا اور اسٹک گرینیڈز واپس خلا میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زریں گل ہمہ تن مشین گن کی طرف متوجہ تھا۔ ٹرک اچھلتا کودتا نیم پختہ راستے کی طرف دوڑ رہا تھا۔
"ذرا قائم ہو کر زریں گل" میں نے توانا لہجے میں کہا "ایمونیشن کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔"
"آپ فکر ہی نہ کریں استاد جی۔ آپ کا سر کا قسم اب

آسیب
آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔
قیمت: ۷۰/روپے
براہِ راست منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴
اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔
فون: ۷۲۲۳۸۵۳
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

بکتر بند گاڑی بھی آیا تو پاس نہ پھٹکے گا۔" زریں گل نے سینہ پھلا کر کہا اور ثابت کیا کہ وہ ایک قابل بھروسا ساتھی ہے۔

صفدر چند لمحے راؤنڈز اسٹرپس کے ٹکڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تین اسٹرپس کو آپس میں جوڑ کر ایک لمبا اسٹرپ بنالیا اور اسے مشین گن میں پہلے سے لگے ہوئے اسٹرپ سے منسلک کردیا۔ یہ تسلی بخش منظر تھا۔ مشین گن ایک بار پھر لوڈ تھی اور اب دیر تک لوڈ رہ سکتی تھی۔ یوں لگا جیسے "جاں بہ لب" ہتھیار پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی جی اٹھے ہیں۔

اندھیرا اب گہرا ہو چکا تھا۔ میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن کرلیں۔ ہیڈ لائٹس کے ساتھ ہی اندرونی ڈائل بھی روشن ہو گیا۔ رفتار کی سوئی چالیس کے ہندسے پر لرز رہی تھی۔ اس ناہموار راستے پر اتنے زیادہ لوڈ کے ساتھ یہ رفتار بہت تیز تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جارہے ہیں۔ ہمارے نیچے کون سی سڑک ہے اور یہ ہمیں کہاں پہنچائے گی۔

زریں گل نے بتایا کہ جونہی کمرے میں گولی چلی' وہ بھاگ کر ٹرک میں آگیا تھا۔ اس نے نشست کے نیچے سے مشین گن نکالی مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے استعمال کرتا ایک شخص کیبن میں گھس کر اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ جواباً زریں گل نے کم و بیش ایک درجن گولیاں اس کے جسم میں سے گزار دی تھیں۔

زریں گل سے باتیں کرتے ہوئے میں سائڈ کے عقب نما آئینے پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جلد ہی مجھے اس آئینے میں گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ کم از کم تین گاڑیاں تھیں اور تیزی سے قریب آرہی تھیں۔ میں نے زریں گل سے پوچھا "زریں! کسی طرح کیبن کی چھت پر پہرا دے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں استاد! ام بس ایک سیکنڈ لگائے گا۔"

میں نے کہا "تو ٹھیک ہے' تم اوپر پہنچو۔ صفدر تمہیں گن تھماتا ہے۔"

"ام بھی لو استاد۔"

زریں گل نے اپنی چادر اتار کر زخمی وجاہت پر پھیلائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا "زریں گل! کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ گاڑیاں ہم سے دور رہیں۔ جونہی کوئی پولیس اسٹیشن نظر آئے گا' میں ٹرک وہاں گھسادوں گا۔"

"ام آپ کا بات اچھی طرح سمجھ رہا ہے استاد۔"

اس نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے ساتھ ہی لوہے کی سیڑھی تھی۔ اس نے اچھلتے کودتے ٹرک کے کھلے دروازے میں سے اپنا جسم موڑ کر باہر نکالا اور سیڑھی کے ذریعے کیبن کی چھت پر پہنچ گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر ایک چوکور خلا تھا۔ ایسے خلا تقریباً سبھی ٹرکوں میں ہوتے ہیں۔ گرمیوں میں کلینر یا ہیلپر وغیرہ یہاں اپنے بستر بچھا لیتے ہیں اور دوران سفر سکون سے محو خواب رہتے ہیں۔ (وجاہت گنے کے تھیلوں پر سے اسی خلا میں گر کر بے ہوش ہوا تھا) اس خلا میں زریں گل بڑے اچھے طریقے سے مورچا بند ہو سکتا تھا اور اس کی گن بھی چاروں طرف نشانہ لے سکتی تھی۔

زریں گل اوپر پہنچ گیا تو صفدر نے بھاری بھرکم مشین گن بھی اسے تھمادی۔ حسب توقع اس دوران تعاقب گاڑیاں کافی نزدیک پہنچ چکی تھیں۔ پھر ان میں سے گاہے گاہے فائر بھی ہونے لگے۔ میرے اندازے کے مطابق ایک لینڈ روور سب سے آگے تھی۔ اس کی روشن بتیاں سب سے جدا نظر آرہی تھیں۔ غالباً فائرنگ بھی اسی جیپ سے ہورہی تھی۔ اگلے چند سیکنڈ میں لینڈ روور نے ٹرک سے اپنا فاصلہ مزید کم کرلیا۔ فائرنگ سیون ایم ایم اور ٹرپل ٹو رائفل سے کی جارہی تھی۔ چند گولیاں سیٹیاں بجاتی کھڑکی کے بالکل قریب سے گزریں۔ یہ بے حد سنگین لمحے تھے۔ ٹرک کا کوئی ٹائر کسی بھی وقت نشانہ بن سکتا تھا۔ میں اندازہ نہیں کرپا رہا تھا کہ اس قدر لوڈ اور اتنی رفتار کے ساتھ بھاگتے ٹرک کا ٹائر برسٹ ہو گیا تو وہ الٹنے سے بچ سکے گا یا نہیں۔ اندھیرے میں ایک بار پھر تڑتڑ کی منحوس آواز گونجی اور کئی گولیاں دائیں دروازے کے بالکل پاس باڈی میں پیوست ہو گئیں۔ اور پھر وہ صدا ہمارے کانوں میں گونجی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ کیبن کی چھت سے مشین گن نے خوفناک قہقہہ بلند کیا۔ یہ ایک طویل برسٹ تھا۔ رات کے سناٹے میں سیکڑوں گز تک یہ آواز پھیلتی اور گونجتی محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا' چمکیلی بتیوں والی گاڑی بری طرح لہرائی پھر اس کی بتیاں عجیب انداز میں ناچ سی گئیں۔ گاڑی الٹ گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس ڈھنگ سے الٹی تھی مگر اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا رخ دوسری طرف ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی سرخ ٹیل لائٹس نظر آنے لگی تھیں۔ پھر اچانک یہ منظر بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹرک نے اپنا سارا لوڈ دو دائیں پہیوں پر منتقل کرتے ہوئے ایک خوفناک موڑ کاٹا اور تارکول کی سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے رفتار میں اضافہ کردیا۔ اسپیڈو میٹر سوئی پچاس کے اردگرد لرزنے لگی۔ ٹرک کے لیے

رفتار تھی مگر پیچھے آنے والی گاڑیاں اونچی رفتار سے بھی تعاقب جاری رکھ سکتی تھیں اور وہ جاری رکھے ہوئے تھیں۔ اندھیرے کی دبیز چادر میں ان کی ہیڈ لائٹس قاتل آنکھوں کی طرح مسلسل چمک رہی تھیں۔ ہاں یہ بات تھی کہ اب درمیانی فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ تعاقب میں آنے والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ مشین گن "چل" رہی ہے اور وہ لینڈ روور کا انجام بھی دیکھ چکے تھے۔

تین چار میل تک یہ صورت حال برقرار رہی۔ تب تعاقب گاڑیاں ایک بار پھر درمیانی فاصلہ کم کرنے لگیں۔ اس مرتبہ زریں گل نے انہیں صرف وارننگ دینا مناسب جانا۔ جب وہ خطرناک فاصلے پر پہنچ گئیں تو زریں گل نے اوپر تلے تین چار برسٹ فائر کیے۔ ایک بار پھر شب کا جگر موت کی گھن گرج نے چھلنی کردیا۔ ہمیں یوں لگا کہ ہم کسی محاذ پر ہیں اور مورچے میں دبکا ہوا کوئی فوجی دشمن پر آگ برسا رہا ہے۔ پیچھے آنے والی روشنیاں ایک بار پھر فاصلے پر چلی گئیں۔

فرش پر پڑے ہوئے وجاہت نے کراہ کر کہا "یہ سب کیا ہو رہا ہے یار! تم تو بڑے خطرناک لوگ لگتے ہو۔"

صفدر نے غرا کر کہا "ابھی جو بھی ہیں اب برداشت کرو۔"

وجاہت نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے کندھے سے تھام کر اسے پھر فرش پر لٹا دیا "نہیں چاچا! تم یہاں زیادہ حفاظت سے ہو۔" میں نے کہا۔

وہ کسمسا کر رہ گیا۔ ٹرک کا یہ کیبن خاصا کشادہ تھا۔ لمبائی ساڑھے چھ سات فٹ تھی۔ چوڑائی بھی پانچ فٹ سے کچھ ہی کم رہی ہوگی۔ درمیانے قد کا شخص کیبن میں ذرا سا جھک کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ خاصی آرام دہ جگہ تھی۔ نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک شخص با آسانی سو سکتا تھا۔ دوسرا نیچے فرش پر گزارا کر سکتا تھا۔ کیبن میں کئی خانے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف آہنی کھونٹی تھی جس پر مرحوم گل محمد کا ایک سویٹر لٹک رہا تھا۔ میری نشست کے عین پیچھے لوہے کا ایک تار جھول رہا تھا جس میں محصول کی بہت سی پرچیاں اور رسیدیں وغیرہ پروئی گئی تھیں۔ ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں نسوار کی ڈبیا' حقے کی نے' سگریٹ کا پیکٹ' ماچس' ایک بڑی ٹارچ اور چار بے کار بیٹری سیل پڑے تھے۔

ایک نظر کیبن کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اطراف میں نگاہ دوڑائی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ہم کس جگہ ہیں۔ درختوں کے ہیولوں اور کہیں کہیں کسی کٹیا کی ٹمٹماتی لالٹین کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم بارش سے بھیگی ہوئی ایک برانچ روڈ پر تھے۔ یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ سڑک اچھی تھی اور تازہ تازہ بنی تھی۔ پاکستان میں اچھی سڑک کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ تازہ تازہ بنی ہو۔ میرے اندازے کے مطابق ہم سمندری اور ماموں کانجن کے درمیان کہیں تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ہم نے اسی سمت میں سفر جاری رکھا تو جلد ہی دریائے راوی پر پہنچ جائیں گے۔ میں نے صفدر سے پوچھا تو اس نے بھی ایسا ہی خیال ظاہر کیا' کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ یہ سڑک چیچہ وطنی یا کمالیہ پر راوی سے جا ملے گی۔"

جب راستے کے بارے میں ٹھیک پتا نہ ہو تو مناسب یہی ہوتا ہے کہ کہیں رک کر معلومات حاصل کرلی جائیں لیکن ہم جس صورت حال کا شکار تھے اس میں رکنا تو درکنار' رفتار کم کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم دل ہی دل میں دعا گو تھے کہ کہیں کوئی پولیس اسٹیشن یا ناکا دکھائی دے اور ہم ٹرک روک سکیں مگر دعا کو اثر سے ہمیشہ ضد ہوتی ہے۔ اس دوران سڑک پر دور دور تک کہیں کسی محافظ قانون کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ صرف ایک مقام پر دو رائفل مین ایک چھتری تلے بیٹھے نظر آئے۔ خبر نہیں ناکے پر کھڑے تھے یا کسی سواری کا انتظار کررہے تھے۔ بہرحال وہ ہمارے لیے بے کار تھے۔ وہ صرف دو تھے اور ان کے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی۔ وہ بھلا اس مصیبت میں ہماری کیا مدد کرتے۔ ہمارے پیچھے آنے والے طوفان بلاخیز میں ان کی حیثیت دو تنکوں سے زیادہ نہیں تھی۔

یہ بڑی گمبھیر چویشن تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی تھی۔ جو لوگ ہمارے پیچھے آرہے تھے وہ ایک ان دیکھے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ نہ ہمارا پیچھا چھوڑ سکتے تھے نہ قریب آسکتے تھے۔ قریب آتے تو وہ مشین گن جاگ اٹھتی جو ایک میل کے دائرے میں ہر شے کا صفایا کر سکتی تھی اور دور جاتے تو ٹرک ہاتھ سے نکل جاتا اور ٹرک ہاتھ سے نکلنے کا مطلب وہی لوگ جانتے تھے جو اس کی قدروقیمت سے آگاہ تھے۔ یوں ہمارے پیچھے آنے والے اپنی تمام تر وحشت اور خونخواری کے باوجود ہم سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھے بالکل بھیڑیوں کے اس غول کی طرح جو مسلح شکاری کے قریب نہیں آتا لیکن اس کی جان بھی نہیں چھوڑتا۔ حالات نے عجب کھیل کھیلا تھا۔ وہ لوگ جو ہمارے تعاقب میں تھے انہوں نے خود ہمارا رخت سفر باندھا تھا۔ ہماری روانگی کے لیے ٹرک منگوایا تھا اور جو موذی مشین گن ہمارا دفاع کر رہی تھی وہ بھی انہی کی فراہم کردہ تھی۔ اس خیال کے تحت کہ کہیں

راستے میں ہمیں کوئی مشکل نہ ہو انہوں نے ٹرک کے اندر مناسب مقدار میں ایمونیشن بھی رکھوا دیا تھا اور ٹرک کی ڈیزل ٹینکی بھی فل کروا دی تھی۔ یہ سارا "انتظام" کرنے کے بعد اب وہ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے اور یہ امید کر رہے تھے کہ کسی نہ کسی طور پر ہمیں روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ قدرت انسان کے ارادے سے ایسے ہی کھیلا کرتی ہے۔

پانچ دس منٹ بعد ایک بار پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ اوپر سے زریں گل نے ہانک لگائی "صفدر صیب! امارا کباڑا ہو گیا۔ بالکل بھیگ گیا اے۔"

صفدر نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا "تمہارے نیچے ترپال رکھا ہے، وہ لے لو اور گن پر بھی ڈال دو۔"

"وہ تو ام نے ڈال دیا۔ پھر بھی امارا تلفہ جما جا رہا ہے۔ یہ ڈیوٹی تو ذرا ٹائم کے لیے بدل نہیں سکتا؟"

"کیا مطلب!" صفدر نے جانتے بوجھتے پوچھا۔

"یہ کہ آپ اوپر آ جائیے، ام نیچے آ جاتا ہے۔"

صفدر بولا "کیوں مذاق کرتے ہو یار۔"

"یار صفدر صیب! ام مذاق نہیں کر رہا۔ ہوا کی مارے امارا بدن بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ برف کے مافق۔"

صفدر اور زریں گل کی اسی گفتگو کے دوران ہم ایک بڑے پل پر پہنچ گئے۔ ہمارا اندازہ درست نکلا تھا، ہم دریائے راوی کراس کر رہے تھے۔ اب معلوم نہیں یہ کون سی جگہ تھی۔ اس پل پر بھی دو تین سپاہی دکھائی دیے۔ بارش سے بچنے کے لیے وہ ایک کونے میں سمٹے ہوئے تھے۔ بیزاری، سستی اور بے چارگی ان کے چہروں سے مترشح تھی۔ انہیں تکلیف دینے کا مطلب اپنی تکالیف میں بے پایاں اضافہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہم بغیر رکے آگے نکل گئے۔ پل سے گزرنے کے دوران متعاقب گاڑیاں ہمارے بہت قریب پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک مارک ٹو اس قدر نزدیک تھی کہ میں اس میں بیٹھے ہوئے افراد کے چہرے دیکھ سکتا تھا۔ کسی گاڑی نے ہم پر فائر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ زریں گل نے گولی چلائی۔ جیسے ایک خاموش معاہدے کے تحت یہ طے پایا تھا کہ یہ جگہ فیصلہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔

پل پار کرتے ہی ایک بار پھر مسلح شکاریوں اور بھیڑیوں کے غول والی دوڑ شروع ہو گئی۔ وہ رات ــــ اور اس رات میں اپنے جو ڈرائیونگ کی، وہ یادگار تھی۔ بھیگی سڑکوں کی عنصری تاریکی میں وہ ایک اندھا سفر تھا۔ ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ کدھر جا رہے ہیں اور نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ اس سفر کا اختتام کہاں ہوگا۔ ہم اپنے اندازے کے مطابق لاہور کی طرف گامزن تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے راستے میں تھیٹی یا ہا بھٹیاں والا کا قصبہ آئے گا اور میں ٹرک سیدھا وہاں کے تھانے میں گھسا دوں گا۔ وہاں سے فون یا وائرلیس پر لاہور سے امداد طلب کی جا سکے گی اور جب تک امداد نہ پہنچے گی ہماری مشین گن افراہیم اور قادر زماں کے کارندوں کو مناسب دوری پر رکھنے میں کامیاب رہے گی لیکن اس وقت یہ سارے خیالات درہم برہم ہو گئے جب سڑک کے کنارے ایک خستہ حال سنگ میل پر نظر پڑی اور پتا چلا کہ ہم کہیں شیر گڑھ کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق جھنگ کی جانب سے آتے ہوئے شیر گڑھ کا قصبہ منڈالہ خورد کے بعد آتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم لاہور کی طرف جانے کے بجائے اوکاڑہ کی جانب نکل آئے تھے پھر بھی واضح نہیں تھا کہ ہم جس جگہ موجود ہیں وہ شیر گڑھ سے مشرق میں ہے یا مغرب میں۔

تاریک شب، بارش کی بوچھاروں اور رزیلی سڑکوں کے پیچ و خم نے سمتوں کو گڈمڈ کر دیا تھا اور یہی وقت تھا جب ہمیں پتا چلا کہ تعاقب کرنے والے کس چیز کے انتظار میں تھے۔ وہ کمک کا انتظار کر رہے تھے اور یہ کمک مزید افراد گاڑیوں کی شکل میں نہیں اسلحے کی شکل میں تھی۔ اس سے پہلے متعاقب افراد کے پاس زوردار گن نہیں تھی اور گن کی موجودگی میں وہ تیز رفتار رائفل یا گن کے بغیر ٹرک روکنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ اب انہوں نے لمبی رینج کی گن حاصل کر لی تھی۔ میں ٹھیک طرح تو نہیں جان سکا کہ وہ کون سی گن ہے۔ بہرحال اس کا پہلا فائر ہی ٹرک کی چھت میں لگا اور فائر کے دھماکے سے اندازہ ہوا کہ لمبی رینج کی گن ہے۔ اب تک ہماری برتری ختم ہو گئی ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

صفدر نے ٹرک کی کھڑکی سے منہ باہر نکالا اور زریں گل کو چیخ کر ہدایت کی کہ وہ جوابی فائر کرے۔ چند لمحے بعد گن کا کرخت قہقہہ گونجا اور فضا سنسنا اٹھی۔ تاہم اس قہقہے کا جواب "نہیں" تھا۔ فوراً کاؤنٹر فائر ہوا۔ عقب کسی گاڑی نے ایک زبردست برسٹ مارا اور میں نے کھڑکی میں جگنو سے چمکتے دیکھے۔ صفدر نے چھت کے ہاتھ ڈالا اور مشین گن کے کئی "راؤنڈ اسنیپ" یا لیے۔ ان اسٹریپس کو آپس میں جوڑ کر لمبی بیلٹ بنائی جا سکتی تھی۔ صفدر کو اب یہ کام کرنا آ گیا تھا۔ اس نے

اسٹریپ جوڑے اور انہیں دولی کی شکل میں بازو پر ڈال کر کیبن کی چھت پر چلا گیا۔

اگلے بیس پچیس منٹ نہایت معرکہ آرا ثابت ہوئے۔ دونوں طرف سے فائر ہو رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق زریں گل اور صفدر نے کم و بیش پانچ سو راؤنڈ فائر کیے۔ مشین گن کا پلہ متقابل رائفلوں پر بہرصورت بھاری تھا اور یہی وجہ تھی کہ پیچھے آنے والی گاڑیاں نزدیک نہیں آ پا رہی تھیں۔ اس دوران ٹرک کا ایک ٹائر بھی برسٹ ہوا لیکن یہ پچھلا ٹائر تھا۔ جوڑے میں سے ایک ٹائر سلامت رہا تھا اور ٹرک اسی پر بھاگ رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے عقب میں ایک پولیس جیپ کا سائرن سنا۔ جیپ نمایاں تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچ گئی۔ یہ کوئی جذباتی اور بے وقوف سا افسر لگتا تھا۔ خواہ مخواہ بہتی آگ میں کود پڑا تھا۔ اگر ہم واقعی جرائم پیشہ ہوتے اور ٹرک میں چرس یا افیم قسم کی چیز لے جا رہے ہوتے تو یہ بہادری اس پولیس والے کو بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔

پولیس جیپ سائرن بجاتی اور بڑی تیزی سے لہراتی ٹرک کے متوازی آ گئی۔ ایک گنجے سر والے انسپکٹر نے کھڑکی سے جھانکا اور ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا اس کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک رائفل مین تھا۔

"گاڑی روکو" وہ چلایا "ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔" اس کے ہاتھ میں ۳۸ بور کا پستول تھا۔

اس کا ڈرائیور مشاقی کا مظاہرہ کر کے ٹرک کو اوور ٹیک کر گیا اور پھر جیپ کی رفتار کم کر کے ٹرک کو رکنے پر مجبور کرنے لگا۔ میری توقع کے مطابق یہ چوہدری ٹائپ انسپکٹر تھوڑا سا بہادر اور تھوڑا سا بے وقوف تھا۔ اس کی بہادری اور بے وقوفی دونوں خطرناک تھیں۔ وہ زریں گل کی رعایت کا فائدہ اٹھا کر ہمارے قریب پہنچ گیا تھا اور اب یہاں سے با آسانی ٹرک کے ٹائر ناکارہ کر سکتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آنے سے پہلے ٹرک روک لوں۔ بایاں کنارہ لے کر میں نے بتدریج ٹرک کی رفتار کم کی اور اسے روک لیا۔ جیپ کے دونوں بائیں دروازے کھلے۔ اگلے دروازے سے موٹا تازہ انسپکٹر اور پچھلے سے دبلا پتلا رائفل مین برآمد ہوا۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں سیاہ پستول نظر آ رہا تھا۔ پستول کی نال اس نے زمین کی طرف جھکا رکھی تھی جیسے ڈر ہو کہ وہ خود بخود چل جائے گا۔ رائفل مین کا ہاتھ بھی رائفل پر تھا۔ انسپکٹر نے کھڑکی پر پہنچ کر کہا "نیچے اترو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ٹرک پر سے فائر ہو رہا ہے۔"

"کس چیز کا فائر؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تم نیچے اترو۔" اس کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔

میں نے کہا "فائر ہم نہیں کر رہے۔ وہ کر رہے ہیں جو پیچھے آ رہے ہیں۔"

"یہی بات وہ کہہ رہے ہیں" انسپکٹر نے کہا۔

"کس چیز کا فائر سنا ہے تم نے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"برسٹ والی رائفل ہے" انسپکٹر پورے یقین سے بولا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ ہیوی مشین گن کے فائر کو معمولی خودکار رائفل کا فائر سمجھ رہا تھا۔ اس کی یہی کم علمی اور بے خبری اسے ٹرک کے قریب لے آئی تھی۔ انسپکٹر سے باتوں کے دوران میں عقب میں بھی نگاہ دوڑا رہا تھا۔ گاڑی روشنیاں دور فاصلے پر رک گئی تھیں۔ درمیانی فاصلہ کم و بیش تین فرلانگ تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ گاڑیاں ہیڈ لائٹس آف کر کے مزید نزدیک آ چکی ہوں۔ یا دائیں بائیں کھیتوں میں رینگ رہی ہوں۔ میں نے بے حد سرد اور گمبھیر لہجے میں کہا "دیکھو انسپکٹر! تمہیں کچھ لوگوں نے یہ ٹرک رکوانے کے لیے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تمہیں کچھ پتا نہیں کہ یہ کیا چکر ہے؟"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ عقب سے خودکار گن کی تڑتڑ گونجی۔ یہ بڑا کارگر برسٹ تھا۔ ٹرک کا عقب نما آئینہ چکنا چور ہو گیا اور چوبی دروازے کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ رائفل مین جھک کر جیپ کی طرف بھاگ گیا جبکہ انسپکٹر وہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو گیا۔ برسٹ کے جواب میں زریں گل نے بھی مشین گن کا دہانہ کھول دیا۔ سماعت شکن "تڑتڑاہٹ" سے ٹرک جھنجھنا اٹھا۔ انسپکٹر زمین پر بیٹھا تھا اور ہکا بکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس کا ہاتھ تھام کر پھرتی سے اسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر میرے پاس آن بیٹھا "کون لوگ ہو تم؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن اب وہ اس کی موجودگی سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ جو کچھ بھی ہے، تمہاری سمجھ میں آنے والا نہیں۔ بس اتنا جان لو کہ ہم مجرم نہیں۔ مجرم وہ ہیں جو پیچھے آ رہے ہیں۔ لاہور کے رجال ساہی صاحب کو جانتے ہو تم؟"

"سس... ساہی صاحب! نن... نہیں... ہاں..."

"ہم ان کی طرف سے مشن پر ہیں۔ بس اب کچھ اور مت پوچھنا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تھانہ کتنی دور ہے؟ اور کتنے آدمی ہوں گے وہاں؟"

میرے لہجے نے انسپکٹر کو جیسے ہپناٹائز کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر مشین گن کے ان قہقہوں نے پوری کر دی تھی جو گاہے گاہے کیبن کی چھت سے بلند ہو رہے تھے۔ بے شک وہ دیہاتی تھانے دار تھا لیکن اتنا ضرور جان گیا کہ وہ ایک بڑے معاملے میں پھنس گیا ہے۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولا "تھانہ یہاں پاس ہی ہے۔ مشکل سے ایک میل کا فاصلہ ہے۔"

"کتنے بندے ہیں وہاں؟"

"چودہ سولہ ہوں گے۔"

"وائرلیس یا فون ہے؟"

"وائرلیس ہے۔"

"دیکھو انسپکٹر! میں جو کہہ رہا ہوں بڑے دھیان سے سنو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "میرے کہے پر چلو گے تو تمہاری ترقی ہو سکتی ہے اور بھاری انعامات بھی مل سکتے ہیں۔ ٹرک سے نکلتے ہی جیپ پکڑو اور فوراً تھانے پہنچو۔ وائرلیس پر پیغام نشر کرو کہ اردگرد جتنی بھی نفری ہے فوراً یہاں پہنچ جائے۔ اگر لاہور میں کسی افسر سے رابطہ ہو سکے تو سب سے اچھا ہے۔ ایسی صورت میں تم انہیں ساہی صاحب اور استاد جمالی کا حوالہ دے سکتے ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ ساہی صاحب اور استاد جمالی۔"

"لیکن..."

"لیکن کچھ نہیں" میں غصے سے دہاڑا۔ میں چاہ رہا تھا کہ انسپکٹر اسی رفتار سے سوچے جس رفتار سے ہم سوچ رہے ہیں لیکن وہ بھی کیا کرتا' ایکا ایکی وہ حالات کے تند ریلے میں آن گرا تھا۔ ایسا بہاؤ تھا کہ اس کی سوچ کے پاؤں ہی جمنے نہیں پا رہے تھے۔

میں نے کہا "ہمارے پاس وقت نہیں۔ جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔ جونہی وائرلیس پر بات ہو جائے تھانے کا عملہ لے کر یہاں پہنچ جاؤ... دیکھو میری طرف دیکھو' ایک بات دھیان سے سنو۔ یہ ٹرک جس پر تم بیٹھے ہو کوئی معمولی ٹرک نہیں ہے۔ تم اس کی قدروقیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ہاتھ سے نکل گیا تو سمجھو زلزلہ آ جائے گا پورے محکمے میں... کسی بھی طرح... کسی بھی طرح تمہیں یہاں مسلح نفری لانی ہے اور جلد سے جلد۔"

انسپکٹر اب بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی' فرش پر لیٹے زخمی وجیہت کو دیکھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔" وہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا "صرف جانا نہیں' آنا بھی ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ بہادر ہے اور اس صورت حال سے کنی کترانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں نے اسے ترقی اور انعامات کی جھلک بھی دکھا دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ ایک بہت بڑا اور اہم ترین معاملہ ہے۔ امید یہی تھی کہ وہ ہاتھ پاؤں مارے گا اور اسی دوران ہم مشین گن کے بل بوتے اس ٹرک کا دفاع کرتے رہیں گے۔

ٹرک سے اترتے ہی انسپکٹر نے خود کو رکوع کے بل جھکایا اور اسی حالت میں بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف گیا۔ اچانک پہلو سے ایک برسٹ آیا۔ انسپکٹر ڈگمگایا اور پھر لہراتا ہوا "چٹ" سے ٹرک کے عین سامنے گرا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس سیدھی اس کے جسم پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سر کا اگلا حصہ غائب ہے اور ریشت خون سے تر ہوتی جا رہی ہے... ایک لرزہ خیز منظر تھا... انسپکٹر مر چکا تھا۔ اسے ہلاک کرنے والے برسٹ نے سرکاری جیپ کو بھی چکنا چور کر دیا تھا اور مجھے بہت کم امید تھی کہ اس کے اندر ڈرائیور اور وائرلیس مین محفوظ رہے ہوں گے۔ آواز کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ فائرنگ بائیں جانب سے کی گئی ہے۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ دور بہت فاصلے پر درختوں میں روشن نقطے لرز رہے تھے۔ ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب تک کے تعاقب میں یہ سب سے سنگین صورت حال تھی۔ کچھ سوچنے اور دیکھنے کی مہلت نہیں تھی۔ میں نے گیئر لگایا اور ٹرک چنگھاڑتا ہوا اس خونی موڑ سے آگے بڑھ گیا۔ ہیڈ لائٹس کا زاویہ بدلا تو سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ انسپکٹر کی لاش' اس کے خون سے لال ہوتی سڑک اور سڑک کے عین درمیان کھڑی چکنا چور جیپ... سب کچھ اندھیرے کی چادر میں گم ہو گیا۔

اوپر سے صفدر کی چیختی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں صاحب' انہوں نے پولیس والے کو مار دیا ہے۔"

"ہاں میں نے دیکھا ہے" میں نے پکار کر کہا "بائیں طرف سے گولی چل رہی ہے۔ ادھر فائر کرو۔"

ایک لمحے بعد کیبن کی چھت پر مشین گن گرجنے لگی۔

جب تک فائر عقب سے ہو رہا تھا میں خود کو قطعی محفوظ محسوس کر رہا تھا مگر اب نقشہ بدل چکا تھا۔ میری بائیں جانب سے چلنے والی گولی کسی بھی وقت مجھے نشانہ بنا سکتی تھی۔ میں نے ٹرک کی رفتار حتی الامکان حد تک تیز کر دی۔ دیوہیکل مشین اچھلتی کودتی اور جھومتی آگے بڑھ رہی تھی۔ چند گولیاں ٹرک کی باڈی میں لگیں اور میری دائیں جانب کا شیشہ بھی چکنا چور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سرد ہوا کے ساتھ بارش کے چھینٹے میرے چہرے اور گردن سے ٹکرائے۔ وجیہت بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا "باؤ! مجھے تو لگتا ہے' اگلا فائر تمہارے کھوپڑے میں لگے گا اور یہ ٹرک الٹ کر کسی نالے میں جا گرے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ تم نالے میں سے تیر کر باہر نکل جانا" میں نے پوری توجہ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

"باؤ! یار تم کیسے لوگ ہو۔ لگتا ہے پاگل خانے سے چھوٹے ہوئے ہو' کچھ عقل کو ہاتھ مارو بھلے لوگو۔ یہ بلے کتے جو تمہارے پیچھے آ رہے ہیں' تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ٹرک اب بری طرح تھرتھرا رہا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ چند لمحے پہلے فائر ہونے والے برسٹ نے صرف کھڑکی ہی نہیں توڑی' دائیں جانب کے پچھلے دونوں ٹائر بھی بے کار کر دیے ہیں۔ گیلی سڑک پر ٹرک بری طرح لہرایا۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا کہ بس... الٹ گیا ہے پھر نہ جانے کس طرح میں اس پر قابو پانے میں کامیاب رہا بہرطور اس کوشش میں ہم سڑک سے اتر گئے اور درختوں کے درمیان کچی زمین پر رواں ہو گئے۔ سڑک نسبتاً بلندی پر تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر میں نے پنکچر ٹائروں کے ساتھ ٹرک کو دوبارہ سڑک پر چڑھانے کی کوشش کی تو ہمارے الٹنے میں کوئی کسر نہیں رہ جائے گی۔ ویسے بھی سڑک اب ہمارے لیے کچے راستے سے زیادہ خطرناک تھی۔

اس موقعے پر میں ٹرک کی لائٹس آف کر سکتا تو ہمارے لیے بہت سودمند تھا مگر اردگرد درخت تھے۔ اندھیرے میں ہمارے لیے رفتار سے سفر کرنا ناممکن ہو جاتا۔ لائٹس آن رکھنا ہماری مجبوری تھی اور ہمارے پیچھے آنے والے اس مجبوری سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ غیرہموار راستے اور گھٹاٹوپ تاریکی میں یہ ایک بے سمت سفر تھا۔ ٹرک ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ میں اسے بائیں جانب موڑنے کی کوشش کرتا تو وہ کچھ اور جھک جاتا اور گیلی زمین پر پھسل کر خودبخود اپنا رخ متعین کر لیتا۔ یہ ایک انہونی تھی کہ ہم ابھی تک محو سفر تھے۔ ان لمحات میں میرے ذہن میں اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ جہاں تک یہ ٹرک چلتا رہے اسے چلاتا رہوں۔ جہاں وہ کسی درخت سے ٹکرا کر یا گڑھے میں پھنس کر رک جائے وہاں ہم مورچہ بند ہو جائیں اور اس وقت تک پیچھے آنے والوں کو خود سے دور رکھیں جب تک رکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ بعد میں دیکھا اور سوچا جا سکتا تھا۔ میں نے اکثر محسوس کیا تھا کہ کامیابی اور ناکامی میں ایک قدم لکیر کا فرق ہوتا ہے۔ کوشش کرنے والا جہاں آ کر ہمت ہار دیتا ہے اور نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے' بعض اوقات منزل وہاں سے ایک قدم کی دوری پر ہوتی ہے۔ جو لوگ اس آخری قدم کو طے کر لیتے ہیں 'بامراد' کہلاتے ہیں اور دوسرے ہمیشہ بے خبر رہتے ہیں کہ وہ منزل کے کتنے قریب ہو کر پیچھے ہٹے ہیں۔ شاید اس آخری قدم کو ہی ایک آنچ کی کسر کہا جاتا ہے۔

ایک موقعے پر میں یہ سوچنے لگا تھا کہ رک جاؤں مگر پھر مخالف سوچ غالب آ گئی اور میں جیسے تیسے ٹرک کو آگے بڑھاتا رہا۔ وجیہت اب فرش سے اٹھ کر نشست پر لیٹ گیا تھا۔ زبردست دھچکوں کے سبب اس کے ہونٹوں سے بار بار کراہ نکل جاتی تھی۔ پانچ دس منٹ بعد اچانک میں نے محسوس کیا کہ تعاقب کرنے والے فاصلے پر رہ گئے ہیں۔ درختوں کی بہتات اور راستے کے پیچ و خم ہمارے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آخری رسک بھی لے لیا اور ٹرک کی تمام لائٹس آف کر دیں۔ لائٹس آف کرنے سے رفتار مزید کم کرنا پڑی۔ مگر اب رفتار اتنی اہم نہیں رہی تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم خود کو روپوش رکھیں۔

دائیں طرف کے ٹائر ٹیوب بے کار ہو چکے تھے اور ٹرک اب رموں پر چل رہا تھا۔ اسی دوران ہم نے ایک چھوٹی سی سڑک بھی کراس کی۔ میں جانتا تھا کہ جہاں کہیں ناکارہ پہیہ کسی گڑھے میں گیا' ہمارے سفر کو فل اسٹاپ لگ جائے گا اور اندھیرے میں یہ گڑھا کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں کھیتوں کے آثار نظر آئے اور پھر کچھ فاصلے پر ایک گاؤں دکھائی دیا۔ گاؤں ذرا بلندی پر تھا اور تاریکی میں اس کا ہیولا کسی ٹیلے ہی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹرک روکا جائے یا نہیں کہ ایک دھماکے کے ساتھ بائیں جانب کا اکلوتا عقبی ٹائر بھی برسٹ ہو گیا۔ ایسا بے پناہ لوڈ کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس آخری صدمے کے بعد ٹرک نے آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔

ٹرک نسبتاً خشک جگہ پر رکا تھا۔ اردگرد کیکر اور پھلاہی کے بہت سے درخت تھے۔ میں انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ صرف پتوں پر بوندیں گرنے کی مدھم آواز ابھر رہی تھی۔ دور دور تک کوئی آہٹ تھی نہ کہیں روشنی دکھائی دیتی تھی۔

"صنوبر!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جی؟" فوراً اس کی آواز ابھری۔

"کیا خیال ہے؟"

وہ گال رگڑ کر بولا "لگتا ہے۔ سؤروں کا گلہ کسی اور طرف نکل گیا ہے۔"

ہم کچھ دیر مزید سُن گُن لیتے رہے پھر میں سیڑھی چڑھ کر اوپر پہنچا۔ کیبن کی چھت پر صنوبر اور زریں گل نے باقاعدہ مورچا بنا رکھا تھا۔ گنے کے تین چار گٹھے گھسیٹ کر انہوں نے دائیں بائیں اس طرح رکھ لیے تھے کہ دونوں "اطراف" فائرنگ سے محفوظ ہو گئی تھیں۔ عقب سے انہیں کوئی ایسا خطرہ نہیں تھا۔ اوپر سے انہوں نے ترپال لے رکھا تھا۔ مجھے ترپال کے اندر سے زریں گل کی گول گول چمکدار آنکھیں نظر آئیں۔ وہ جنگلی بلے کی طرح وہاں دبکا ہوا تھا۔

"شاباش زریں گل" میں نے دل سے کہا۔

وہ بولا "شاباش تو اس بندوق کو ملنا چاہیے استاد جی! ام تو بس گھوڑا ہی دبا تا رہا ہے۔ یا پھر آپ کو ملنا چاہیے شاباش۔ آپ جس طرح اس لنگڑے ٹرک کو بھگا کر یہاں تک لایا ہے' یہ آپ ہی کا کام ہے۔"

صنوبر بولا "یہ ستائش یا بھی کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال سوچیے کہ اب کرنا کیا ہے؟"

میں نے کہا "ترپال اتار کر ذرا پیچھے دیکھو۔"

صنوبر اور زریں گل نے پیچھے دیکھا۔ انہیں بھی گاؤں کے خدوخال نظر آئے۔ صنوبر بولا "میرا خیال ہے کہ کوئی گاؤں ہے۔"

میں نے کہا "خیال آرائی کی گنجائش نہیں۔ یہ واقعی گاؤں ہے۔ ممکن ہے پولیس چوکی بھی ہو۔ اگر چوکی نہ بھی ہوئی تو کوئی ایسی سواری ضرور مل جائے گی جو ہمیں کسی چوکی یا تھانے تک پہنچا سکے۔ اس وقت ہماری سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ پولیس کے کسی ذمے دار افسر سے رابطہ ہو جائے۔"

زریں گل بولا "اور اَمارا سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ام کو ایک جوڑا خشک کپڑوں کا مل جائے۔ اَمارا قمیص اور شلوار بہت دور تک بھیگ چکا ہے اور اَمارا خیال ہے کہ سپیدو صیب کا بھی یہی حال ہوگا۔"

"اس سے بھی برا ہے" صنوبر نے کہا "منہ میں دانت بج رہے ہیں اور بہت میں آنتیں۔"

زریں گل بولا "آنتیں بجا نہیں قُل ھو اللہ پڑھتا ہے۔ ام نے تو یہی محاورہ سنا ہے۔"

صنوبر نے کہا "بھوک حد سے بڑھ جائے تو پھر آنتیں محاوروں کے چکر سے نکل جاتی ہیں۔"

صنوبر اور زریں گل واقعی بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ ہم کم و بیش تین گھنٹے کو سفر رہے تھے اور یہ تین گھنٹے کا سفر تین ماہ کے سفر سے زیادہ تھکا دینے والا تھا۔ ہم تینوں نے کیبن میں آ کر مشورہ کیا۔ اس مشورے میں فیصلہ ہوا کہ صنوبر اور زریں گل ٹرک میں رہیں جبکہ میں گاؤں جا کر حالات کا جائزہ لوں۔ خود کار رائفل ہمارے پاس موجود تھی۔ اس کا میگزین بائیس گولیوں کا تھا اور ان میں سے ابھی صرف چار گولیاں استعمال ہوئی تھیں۔ میں نے ڈیش بورڈ کے خانے میں سے ٹارچ نکال کر جیب میں اڑس لی۔ رائفل کو شولڈر اسٹریپ کے ذریعے کندھے سے لٹکایا اور اوپر سے گرم چادر لپیٹ لی۔ پھر بھی میرے اور رائفل کے بھیگنے کا خطرہ موجود تھا۔ اس مسئلے کا صنوبر نے بڑا مناسب حل نکالا۔ ٹرک کا ترپال کافی بڑا تھا۔ اس نے میرے رام پوری خنجر سے ترپال کا ایک بڑا مستطیل ٹکڑا کاٹا اور میرے سر پر ڈال دیا۔

O☆O

یخ بستہ تاریکی میں ڈوبا ہوا گاؤں بڑی خاموشی سے بھیگ رہا تھا۔ جو پہلی گلی مجھے نظر آئی' میں نے اس کے پہلے دروازے پر دستک دے دی۔ دستک کی آواز سن کر ایک بلی کہیں قریب سے نکلی اور پانی میں چپ چپ کی آواز پیدا کرتی گلی پار کر گئی۔ میری دوسری دستک پر مکان کے اندر کہیں کھٹ پٹ ہوئی اور پھر نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز ابھری "کون ہے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے ایک اور دستک دینا مناسب سمجھا۔ چند لمحے بعد دروازے کی دوسری طرف لالٹین کی روشنی چمکی اور ایک عمر رسیدہ شخص نے دروازہ کھول دیا۔ یہ گاؤں تھا ورنہ ایسی تاریک رات میں صرف دستک سے دروازہ کھلوا لینا ممکن نہیں تھا۔ عمر رسیدہ شخص کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں لالٹین تھی۔ اس نے لالٹین بلند کر کے بغور مجھے دیکھا اور ٹھیٹ پنجابی میں بولا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "چاچا! ادھر سڑک کے پاس ہمارا ٹرک خراب ہو گیا ہے۔ بڑی دیر سے ٹھیک کر رہے تھے۔ روٹی شوٹی

بھی نہیں کھا سکے۔ یہاں گاؤں میں کوئی تندور وغیرہ کھلا مل جائے گا؟"

بوڑھے نے سادگی سے کہا "میں کیا کہہ سکتا ہوں کاکا۔ ساتھ کی گلی میں ایک تندور والا ہے۔ شاید جاگ رہا ہو ابھی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بند کرنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دی۔ عین اسی وقت اندر سے ایک باریک مردانہ آواز ابھری "کون ہے؟"

بوڑھے نے کہا "ٹرک والے ہیں' ان کا ٹرک خراب ہو گیا ہے۔"

"ٹرک والے یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟" باریک آواز نے پوچھا۔

"روٹی شوٹی کھانی ہے انہوں نے۔ تندور کا پوچھ رہے ہیں۔"

ایک چھوٹے قد کا منحنی سا شخص لنگڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ وہ نوجوان تھا لیکن نوجوانوں والی کوئی بات اس میں نظر نہیں آتی تھی۔ چہرہ مدقوق' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے' بال پیشانی سے اڑے ہوئے۔ اس نے ایک کندھے سے کھیس کی بُکل مار رکھی تھی۔ لگتا تھا افیم یا چرس کے نشے میں ہے۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھے سراپا دیکھا۔ پھر ذرا نرم لہجے میں بولا "کیا بات ہے بھرا جی۔ بڑی دیر سے روٹی کا کھیال آیا ہے آپ کو۔ اب تو میرے کھیال میں دس بجنے والے ہیں۔"

"بس بھرا! پریشانی میں تھے" میں نے جواب دیا "سویرے ناشتا کیا تھا' اس کے بعد سے ٹرک کے نیچے گھسے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا۔"

"اچھا چلو اندر آ جاؤ" چرسی نوجوان میری بات کاٹ کر بولا۔

میں نے یہ پیش کش قبول کرنے میں تامل نہیں کیا۔ بوڑھا خشمگیں نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چرسی اس کا بیٹا ہے۔ گیلے صحن سے گزر کر ہم چھوٹے سے برآمدے میں پہنچے اور پھر ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ ایک عام سا دیہاتی مکان تھا۔ فضا میں گیلی مٹی اور گوبر کی بُو رچی بسی تھی۔ اشیا کی بے ترتیبی اور ماحول کی بے رونقی دیکھ کر مجھے لگا کہ اس گھر میں کوئی عورت موجود نہیں۔ بعد ازاں یہ قیافہ درست ثابت ہوا۔ اس گھر میں بس چرسی اور اس کا باپ رہتے تھے۔ چرسی مجھے جس کمرے میں لے کر آیا وہاں دیواروں پر بہت سی بھارتی اداکاراؤں کی تصویریں چسپاں تھیں۔ ان دنوں ابھی وڈیو کو عروج حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں حیران ہوا کہ یہ تصویریں کیسے حاصل کی گئی ہیں۔ ویسے بھی اس کمرے میں پہنچ کر مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ انفرادی طور پر کوئی چیز بھی غیر معمولی نہیں تھی لیکن ان چیزوں کا مجموعی تاثر مجھے چونکا رہا تھا۔ جیسے میں کسی انجانی جگہ پر آ گیا ہوں۔ شاید یہ چونکا دینے والی بات چرسی کے لباس میں تھی یا پھر بوڑھے کے لہجے میں یا اس مکان کی ساخت میں۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

عمر رسیدہ شخص لالٹین سمیت دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اب کمرے میں صرف ایک دیے کی روشنی تھی۔ چرسی نوجوان نے پوچھا "اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"ایک ڈرائیور اور ایک ہیلپر ہے۔ وہ دونوں ٹرک پر ہی ہیں۔"

"ہوا کیا ہے ٹرک کو؟" چرسی نے پوچھا۔

"ٹائی راڈ میں کوئی گڑبڑ ہے" میں نے جواب دیا۔ "اصل میں لوڈ زیادہ تھا اور ٹائر کمزور۔ ایک موڑ پر ایک طرف کے دونوں پچھلے ٹائر تباہ ہو گئے۔ ٹرک بے قابو ہو کر سڑک سے نیچے اتر گیا۔ پتا نہیں نیچے سے کیا چیز لگی ہے۔ ٹائی راڈ کا ستیاناس ہو گیا ہے۔"

"جا کہاں رہے تھے تم؟" چرسی نے پوچھا۔

یہ مشکل سوال تھا۔ ہم شیر گڑھ سے کافی آگے نکل چکے تھے اور میرے اندازے کے مطابق بارڈر کے آس پاس کہیں تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس قصبے یا مقام کا نام لوں۔ میری یہ مشکل بوڑھے کی آواز نے آسان کر دی۔ اس نے ساتھ والے کمرے سے پکار کر پوچھا "چترو! دیا جلتی رہنے دوں یا بجھا دوں؟"

چرسی نے کہا "جلتی رہنے دے بابو" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم وشنو تو نہیں ہو؟"

ایک دم میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وشنو ان ہندوؤں یا سکھوں کو کہا جاتا ہے جو گوشت انڈا وغیرہ نہیں کھاتے۔ وشنو اور باپو کے الفاظ میری سماعت میں دھماکوں کی طرح گونج رہے تھے۔ ایک دم جیسے کوئی پردہ سا میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے مدقوق چرسی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا' کمرے میں نگاہ دوڑائی اور میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "میں پاکستان میں نہیں ہوں۔ یہ مکان' یہ گاؤں' یہ زمین اور فضا۔ ان میں سے کسی چیز کا تعلق پاکستان سے نہیں تھا۔ تعاقب کی ہنگامہ خیزی میں ہم سرحد پار کر چکے تھے اور اب میں ایک بھارتی گاؤں میں ایک بھارتی کے سامنے بیٹھا تھا۔

چری سی جس کا نام بُوٹا تھا' حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے خود کو تیزی سے سنبھالا اور اقرار میں سر ہلا دیا "ہاں۔۔۔ ہاں بوٹا ہوں میں۔"

"وہ' پھر تو مشکل ہو جائے گی۔" بُوٹے نے کہا "ہم نے قیمے والے چاول پکا رکھے تھے۔ کچھ بچے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں گرم کر دیتے ہیں۔ تمہارا گزارہ ہو جائے گا۔ پھر' اب کچھ اور چارہ کرتے ہیں" پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "ہاں۔ کچھ آلو ہیں گھر میں۔ انہیں بھون لیتے ہیں۔ نمک مرچ لگا کر کھا لینا' کیا خیال ہے؟"

"جیسے تم مناسب سمجھو بھائی۔" میں اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بولا "بڑی کڑاکے دار ٹھنڈ ہے۔ ٹرک تو تمہارے لیے برف کھانہ بن جائے گا۔ میرا خیال ہے اپنے ساتھ والوں کو یہیں بلا لو۔ اور ہاں۔۔۔ ٹرک پر لادا کیا ہوا ہے؟"

"گتے ہیں۔ ابوہر سے فیروز پور لے جا رہے تھے۔ وہاں ایک شوگر مل ہے' پرپیا شوگر مل' ادھر اتارنے تھے" میں نے عجلت میں تراشا ہوا جواب سنایا۔

بُوٹے کے چہرے پر الجھن نمودار نہیں ہوئی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جواب معقول ہے۔ میں پچھلے آٹھ دس سیکنڈ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ہم فاضلکا سیکٹر کے آس پاس سے سرحد عبور کر چکے ہیں۔ اس کا مطلب تھا' ہم ابوہر' فرید کوٹ اور فاضلکا وغیرہ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ گاؤں فاضلکا ہی کی کوئی نواحی آبادی ہو۔ اس علاقے کے بارے میں میری معلومات اتنی زیادہ تو نہیں تھیں لیکن کچھ ایسی کم بھی نہیں تھیں۔

بُوٹے سے تعارف کراتے ہوئے میں نے اپنا نام نہال سنگھ اور صفدر کا وچن سنگھ بتایا اور کہا کہ ہم لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ بُوٹا جس کا پورا نام بُوٹا سنگھ تھا' کمرے کے ساتھ والی تاریک کوٹھری میں گھسا اور وہاں سے ایک بوسیدہ بوری گھسیٹ لایا۔ بوری دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ اس میں آلو ہیں۔ بوٹا سنگھ بوری میں سے مٹی سے بھرے ہوئے آلو نکالتے ہوئے بولا "جاؤ' تم اپنے ساتھیوں کو لے آؤ۔ یہاں گھر میں کون سا پردہ ہے۔ جہاں من چاہے گا سو رہنا۔ ایک دو رجائیاں (لحاف) ہیں' لکڑی بھی ہے' زیادہ ٹھنڈ لگی تو آگ جلا لینا۔"

میں نے کہا "کم از کم ایک بندے کو تو ٹرک میں رہنا ہوگا۔ اگر تم کہتے ہو تو دوسرے کو میں لے آتا ہوں۔"

وہ بولا "جی جی! ٹرک میں گتے ہی ہیں' کوئی الا تیجیاں تو نہیں جو چور لے جائیں گے۔ کھام کھاہ سردی میں جم جائے گا بے چارہ جو وہاں رہے گا۔"

"نہیں یار۔ ہمارے استاد نے پہلا سبق ہی یہ پڑھایا تھا کہ گاڑی اکیلی نہیں چھوڑنی۔ گاڑی اور زنانی میں بہت سی باتیں ایک جیسی ہوتی ہیں" وہ ہنسنے لگا' میں نے کہا "تم کہتے ہو تو میں ایک کو یہاں لے آتا ہوں۔ دوجے کے لیے تم چاول دے دو۔ وہ مسلمان ہے' کھا لے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی" بوٹے نے کہا "اگر کمبل رجائی وغیرہ کی ضرورت ہے تو وہ بھی لے جاؤ۔"

"نہیں رضائی تو ادھر ہے۔ ہاں کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اس کے۔ اگر ایک جوڑا مل جائے تو مہربانی ہے۔"

بوٹا سنگھ کی دبلی پتلی پنڈلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا اور وہاں سے ایک تہبند قمیص لے آیا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ اس کے باپو کا لباس ہے۔ اس میں پگڑی بھی تھی۔ زریں گل ان کپڑوں میں پورا آ سکتا تھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ کپڑے وصول کر لیے۔ بوٹا سنگھ نے کہا "ٹھہرو ذرا ایک منٹ میں چاول بھی لاتا ہوں۔"

وہ پھر ساتھ والے کمرے میں گیا اور ٹفن کے ایک مڑے تڑے ڈبے کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس ڈبے میں چاول تھے۔

بوندا باندی جاری تھی۔ میں نے ایک بار پھر ترپال کا ٹکڑا سر پر رکھا اور ٹرک کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے میری طرح صفدر اور زریں گل کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم سرحد پار کر چکے ہیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میری غیر موجودگی میں وہ کسی راہ گیر کے سامنے بھانڈا نہ پھوڑ چکے ہوں۔ یہ بڑی کٹھن گھڑیاں تھیں۔ اپنے ٹرک کے بے انتہا قیمتی اسباب کے ساتھ ہم ایک غیر ملک میں آ گھسے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے کہ آگے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں ٹرک پر پہنچا تو صفدر اور زریں گل' دلبیت سمیت کیبن میں موجود تھے۔ مجھے پہچان کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ میرے ہاتھ میں کپڑے اور ٹفن کا ڈبا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ اپنے مشن میں تھوڑی بہت کامیابی مجھے ہوئی ہے۔

کیبن میں تاریکی تھی۔ صفدر اور زریں کو میرے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ زریں گل نے پوچھا "بنا استاد جی؟"

"مقبوں۔ اور مقبو بھی ایسا پکا کہ دفن ہونے وا

تاقیامت ٹکریں مارتا رہے تو باہر نہ نکل سکے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"مطلب جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"مہر سی بوٹا سنگھ کے گھر۔"

"مہر سی۔۔۔ بوٹا سنگھ؟" صفدر نے حیرت سے پوچھا "یہ سکھ درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑا؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھری "سکھ درمیان میں نہیں ٹپکا۔ تم سکھوں کے درمیان ٹپکے ہو۔ یہ پاکستان نہیں ہے بھائی' انڈیا ہے۔ کنٹرول لائن پار کر چکے ہو تم اور میرا خیال ہے کہ چار پانچ میل تک دیار غیر میں گھسے بیٹھے ہو۔"

صفدر' زریں گل اور دلبیت ششدر رہ گئے۔ انہوں نے غور سے اردگرد نگاہ دوڑائی جیسے یہاں آ کر پہلی بار آنکھ کھلی ہو۔ میں نے ٹفن کا ڈبا زریں گل کی گود میں رکھتے ہوئے کہا "یہ لو بھوجن۔۔۔ اور یہ لو کپڑے۔ یہ بوٹا سنگھ کے باپو کا لباس ہے مگر خیال رہے تہبند دھیان سے باندھنا۔ ٹھیک سے نہ باندھا تو یہ بارہ بجے کے آس پاس کھل بھی سکتا ہے۔"

زریں گل کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور دلبیت بھی بہت حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بہت مشکل سے وہ دونوں اس خبر کو جذب کر پائے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ واقعی انڈیا میں ہیں تو ان کے چہروں پر پریشانی نمایاں حروف میں درج ہو گئی۔

صفدر بولا "اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "وہی جو بپھرے ہوئے شیر کے سامنے تنہا اور نہتا شکاری کرتا ہے۔ اب ہم نے کچھ نہیں کرنا بھائی' جو کچھ کرنا ہے حالات نے کرنا ہے۔ ٹرک کو حرکت میں لانے کے لیے کم از کم دو نئے ٹائروں کی ضرورت ہے جو ہمارے پاس نہیں ہیں اور نہ ہی جلد ملنے کی امید ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم ٹرک کو یہاں چھوڑ کر سرحد کی طرف لوٹ جائیں۔ آگے بڑھنا اس سے بھی خطرناک ہے۔ سرحد کی دونوں جانب بی ایس ایف (بارڈر سیکیورٹی فورس) اور ہوم گارڈز آج کل چوکس ہیں۔ یہ بھی معجزہ ہی ہے کہ ہم "ہالٹ" سنے بغیر یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔"

"تو استاد جی! ہالٹ کا کیا مطلب ہے؟" زریں گل نے پوچھا۔

"رینجرز یا فوج والے کسی کو گولی مارنے سے پہلے یہ لفظ پکارتے ہیں تاکہ متعلق کو پتا چلے کہ وہ کس کے ہاتھوں فوت ہو رہا ہے۔"

"اچھا اچھا' وہ والا ہالٹ۔ اس کا تو ام کو پتا ہے۔ کئی فلموں میں ام نے دیکھا ہے۔ وہ ریاض شاہد کا فلم نہیں تھا۔ امن۔"

"نہیں تھا' بالکل نہیں تھا" صفدر نے چڑ کر کہا "یہ وقت فلموں کی کتھا سنانے کا نہیں ہے۔ اس مختصر وقت میں کوئی نیکی کی بات سوچ لو تاکہ مشکل آسان ہو۔"

ایک بار پھر ہم نے سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ حالات گمبھیر ہو چکے تھے لہٰذا یہ مشورہ بھی خاصا طویل تھا۔ ہم دلبیت کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ وہ زخمی تھا اور اس کی وجہ سے ہم فوراً مشتبہ ٹھہر جاتے۔ دلبیت کے علاوہ ہم تینوں میں سے بھی کسی ایک کا ٹرک میں رہنا ضروری تھا۔ طے یہ ہوا کہ زریں گل دلبیت کے ساتھ ٹرک میں رہے گا جبکہ ہم دونوں بوٹا سنگھ کے گھر جائیں گے اور کوشش کریں گے کہ جلد از جلد کسی طرح ٹرک کے دو یا تین ٹائر دستیاب ہو سکیں یا پھر اگر قسمت یاوری کرے تو کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ ہم اس ٹرک کا اسباب کسی دوسری گاڑی میں منتقل کر سکیں۔

ہم نے ٹرک کو جیک لگا کر دونوں طرف کا ایک ایک برباد شدہ پہیہ کھول لیا۔ ایک فاضل ٹائر ٹرک میں موجود تھا۔ اگر ہمیں دو ٹائر یا کم از کم ایک ٹائر بھی مل جاتا تو ہم ٹرک کو حرکت میں لا سکتے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں' میں نے ٹرک کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی پچھلی نمبر پلیٹ کیچڑ کے چھینٹوں میں بالکل چھپ چکی تھی اور صرف نمبر پلیٹ ہی نہیں ٹرک کا بیشتر حصہ چھینٹوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ ٹرک کی باڈی پر جہاں جہاں گولیوں کے نشان نظر آئے ہم نے وہاں مٹی مل دی۔ تاہم یہ "میک اپ" بڑے نیچرل انداز میں کیا گیا۔ دیکھنے میں یہی لگتا تھا کہ ٹرک کے قریب سے گزرنے والی تیز رفتار گاڑیوں نے یہ گلکاری کی ہے۔ اگلی نمبر پلیٹ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مشرقی پنجاب کی سڑکوں پر اس ٹرک سے ملتے جلتے ٹرک چلتے ہیں۔ جہاں یہ ٹرک کھڑا تھا وہ جگہ سڑک سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ عام راہ گیر اس ٹرک کو دیکھ کر کسی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا بلکہ کوئی پارکھی شخص بھی جب تک خصوصی غور و خوض نہ کرتا کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

میں نے زریں گل کو تسلی دی کہ یہاں کوئی ایسا شدید خطرہ موجود نہیں' اور وہ چاہے تو کیبن میں سو بھی سکتا ہے۔ دلبیت کی لوٹی ہوئی رائفل زریں نے نشست کے نیچے رکھ لی تھی اور بوقت ضرورت اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے

علاوہ وہ ہتھیار بھی ٹرک پر موجود تھا جس کا توڑ شاید یہاں کے رینجرز اور بی ایس ایف کے پاس بھی نہیں تھا۔ جو دیگر ہدایات میں نے زریں گل کو دیں ان کے مطابق اسے اپنا نام یوسف اور ولیت کا ولیت سنگھ بتانا تھا۔ ہم چاروں ابوہر سے گنا لے کر فیروز پور کی شوگر مل میں جا رہے تھے یہاں ٹرک خراب ہو گیا۔ اب دو ساتھی ٹائر ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے اور دو ٹرک میں مقیم تھے۔ طے شدہ تفصیل کے مطابق میرا نام نہال سنگھ اور صفدر کا وچن سنگھ تھا۔ جو پگڑی فالتو آئی تھی وہ میں نے ولیت کے سر پر باندھ دی۔ اس کا لباس تو پہلے ہی سکھوں والا تھا یعنی تہبند قمیص۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی بھی تھی پگڑی باندھ کر وہ سو فیصد سکھ نظر آنے لگا۔ درد کی باقی گولیاں میری جیب میں تھیں۔ وہ میں نے ولیت کو دے دیں۔

وہ کراہتے ہوئے بولا "باؤ جی! ٹانگ کا درد تو میں سہہ لوں گا' اس درد کا علاج کرو جو میرے کلیجے کو کھا رہا ہے۔ مجھے میری بالی کا کچھ بتاؤ۔ وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔"

میں نے اسے جھوٹی تسلی دیتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو چاچا' اللہ اچھا ہی کرے گا۔"

جس دوران میں زریں گل اور ولیت سے باتیں کر رہا تھا' صفدر نے ایک بڑا اچھا کام کیا۔ وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ گنے کے بیس پچیس گٹھے ہٹانے کے بعد وہ ان چھ صندوقوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جن کے تالے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ گٹھے ہٹانے کے بعد وہ بالائی صندوق تک پہنچ گیا اور معمولی کوشش سے رسیاں وغیرہ کاٹ کر ڈھکنا کھول لیا۔ اس موقعے پر اس نے مجھے بھی آواز دے کر اوپر بلا لیا۔ ٹارچ میرے پاس تھی۔ ہم نے ٹارچ کی روشنی میں لاکھوں روپے مالیت کی "جگمگاتی اشیا" کا دیدار کیا۔ اور پھر اس سمندر میں سے ایک قطرہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے لے لیا۔ یہ قدیم طرز کا ایک طلائی گلوبند تھا۔ اس کا وزن کم و بیش چھ تولے رہا ہوگا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ یہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا تھا اور ہم اسے جزوی طور پر بھی استعمال کر سکتے تھے۔ صندوق کو دوبارہ رسیوں میں جکڑ کر ہم نے گنے کے چند گٹھے اوپر ڈال دیے اور زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ باقی کے گٹھے احتیاط سے پہلے کی طرح جوڑ دے۔ زریں گل قابل بھروسا شخص تھا۔ اگر نہ بھی ہوتا تو اس وقت ہم تینوں کی اٹل مجبوری تھی کہ ایک دوسرے پر بھروسا کریں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم زریں گل اور ولیت سے رخصت ہو کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرک کے دونوں پہیے ہمارے ساتھ تھے وہ اس قدر گٹ پٹ چکے تھے کہ انہیں اپنے ساتھ گاؤں تک لے جانا ایک مسئلہ بن گیا۔ بہرطور کسی نہ کسی طرح ہم نے یہ مسئلہ حل کیا اور گاؤں پہنچ گئے۔

ہمارے پہنچنے تک بوٹا سنگھ مٹی کی ایک بڑی انگیٹھی میں دو تین پاؤ آلو بھون چکا تھا۔ صفدر نے بوٹا سنگھ کو ست سری اکال کہا۔ جواب میں اس نے بھی اپنی مہین آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا۔ رسمی کلمات کے بعد ہم لکڑی کی چوکیوں پر بیٹھ گئے اور گرم گرم آلو چھیل کر نمک مرچ کے ساتھ کھانے لگے۔ ساتھ والے کمرے سے بوٹا سنگھ کے باپو کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ نیند میں کھانس رہا تھا۔

بوٹا سنگھ نے بتایا "ہم باپ بیٹا یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ میرا بڑا بھائی جیل میں ہے۔ اسے پولیس نے دربار صاحب سے گرفتار کیا تھا۔ الزام ہے کہ اس کے پاس سے ناجائز پستول نکلا ہے۔ واہ گورو کی مار ہو ان پر۔ اگر اس کے پاس ناجائز پستول تھا تو اس نے اس وقت کیوں نہیں چلایا جب اسی گھر کے اسی کمرے میں پولیس والے اس کی پتنی کے ساتھ بلاتکار کر رہے تھے اور اس وقت وہ پستول کیوں نہ چلا جب میری ماں کی چھاتی میں سیکیورٹی کے سپاہی نے رائفل کی سنگین اتاری تھی۔ سب بکواس ہے' سب بکواس ہے۔ یہاں قانون اسی کا ہے جو زور والا ہے' جو طاقت ور ہے۔"

اس نے اگلے دانتوں کی درز میں سے "پچ" کی آواز سے تھوک کی پچکاری نکالی اور مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

بوٹا سنگھ ایک دکھ بھرا انکشاف کر رہا تھا' میں نے پوچھا "کیا کیا تھا تم لوگوں نے؟"

وہ بولا "یہ ضروری نہیں کہ مجبور کچھ کرے تب ہی پکڑا جاتا ہے۔ مجبور تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اسے پکڑا جائے اور آلے دوالے کے طاقتور لوگوں پر اپنی طاقت کا رعب جمایا جائے۔"

اپنی تمام تر خستہ حالی کے باوجود بوٹا سنگھ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی لگتا تھا جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ اس نے ننکانے کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کر رکھا تھا' میں نے کہا "تمہاری ماں کو مارنے والوں نے آخر کوئی بہانہ تو بنایا ہوگا؟"

وہ بولا "بہانہ وہی کھالستان (خالصتان)۔ ان کو شبہ تھا کہ میرا بھائی جسونت تخریب کاروں کا ساتھی ہے۔ کئی بار اس کی گرفتاری کے لیے ہمارے گھر اور دکان پر چھاپا مار چکے تھے۔ ایک رات ایک ہندو سب انسپکٹر تلک رام اپنے چار [illegible] کے ساتھ ہمارے گھر میں گھس آیا۔ میں اور باپو اس

روز دکان کا سودا لینے لدھیانہ گئے ہوئے تھے۔ جسونت' میری بھابو اور ماں کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ جسونت نے پھرتی دکھائی۔ جب پولیس والے میری ماں اور بھابو کو مار پیٹ رہے تھے' وہ گھر کی پچھلی دیوار پھاند کر بھاگ نکلا۔ وہ ایسے ہی سردیوں کے دن تھے۔ بڑے زور کی ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ سب لوگ اپنے گھروں میں بند تھے۔ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ سب انسپکٹر نے شراب پی رکھی تھی۔ وہ پہلے تو میری بھابو کو مارتا پیٹتا رہا پھر زیادتی پر اتر آیا۔ میری ماں سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ وہ میرے باپو کی کرپان لے کر اس کتے پر چڑھ دوڑی۔ کرپان سب انسپکٹر کے بازو پر لگی۔ اس چھوٹے سے زخم کے بدلے میں ایک سپاہی نے رائفل کی سنگین میری ماں کے سینے میں اتار دی۔ یہی کمرا تھا' اس کمرے میں ایک طرف میری ماں کی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف وہ کتا میری بھابو کی عزت سے کھیل رہا تھا۔ بعد میں پولیس والوں نے خود ہی ہمارے گھر میں فائرنگ کی اور گاؤں والوں کو بتایا کہ اس گھر سے پولیس پارٹی پر حملہ ہوا ہے۔ اگلے روز ہم نے اکھبار میں پڑھا "سب انسپکٹر تلک رام مفرور جسونت سنگھ کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے لے جانا چاہتا تھا پر اس کے گھر والوں نے مسلح ہو کر پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا۔ اس پولیس مقابلے میں سب انسپکٹر سخت زخمی ہوا اور ایک عورت ہلاک ہو گئی۔ مجرم اپنے ساتھیوں سمیت بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔" پولیس نے ہمارے گھر سے دو بندوقوں کے علاوہ کھالستان کے جھنڈے' اشتہار اور پتا نہیں کیا کیا برآمد کر لیا۔ علاقے کے لوگ دانتوں میں انگلیاں دے رہے تھے کہ اکھبار والے اتنا بڑا جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ جسونت کس طرح کا بندہ تھا۔ اس بچارے کو پولیس والے شیر بنا رہے تھے اور یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہ آدم خور ہے۔" اپنی بات پر بوٹا سنگھ خود ہی ہنس دیا۔ اس ماتمی ہنسی میں دنیا جہان کا کرب اور بے بسی سمٹی ہوئی تھی۔

صفدر نے پوچھا "تمہاری بھابو کا کیا بنا؟"

وہ بولا "وہی جو ایسی عورتوں کا بنتا ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ تھا جو ضائع ہو گیا۔ وہ ایسی بستر سے لگی کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ بچی نہیں' اٹھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ پانچ چھ مہینے میں ہی گھل گھل کر ختم ہو گئی۔ جس روز اس کی ارتھی جلی تھی اسی روز جسونت امرتسر سے گرفتار ہوا۔ اسے پولیس نے ناجائز پستول کے الزام میں پکڑا تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ دربار صاحب سے نکلنے والے ایک جلوس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بعد میں پولیس کو پتا چلا کہ یہ تو وہی جسونت ہے جسے وہ چھ مہینے سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ جسونت کو گرفتار ہوئے اب ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں وہ کس جیل میں ہے' کہاں ہے۔ اور ہے بھی یا نہیں؟"

میں نے کہا "کبھی تمہارے دل میں یہ نہیں آیا کہ تمہیں انصاف ملنا چاہیے؟"

وہ بولا "انصاف کی نہیں بدلے کی بات کرو بھاجی۔ اب تو یہاں صرف بدلہ ہی بدلہ ہے۔ جس کے بازو میں زور ہے وہ لے لیتا ہے۔ دوجا رو رو کے چپ ہو جاتا ہے۔ میرے کلیجے میں بھی پانچ چھ مہینے بڑے بھانبڑ اٹھے تھے۔ بڑا رویا تڑپا تھا میں۔ سوچتا تھا اور کچھ نہیں تو اس حرامی تلک رام کو تو جان سے مار ہی دوں گا۔ بڑے دن ڈب میں چاقو لے کر پھرتا رہا تھا۔ لیکن کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ کوئی زور نہیں چلا' کوئی رستہ نہیں ملا۔ آہستہ آہستہ بھانبڑ بجھ گیا۔ پھر نشے کی لت پڑ گئی۔ پہلی بار باپو سے لے کر کھایا تھا۔ اب باپو مجھ سے لے کر کھاتا ہے۔ وہ بڑا کھش ہے کہ اس کا پتر جہاں سے بھی ہو نشہ لے آتا ہے۔ اب دونوں باپ بیٹا نشہ کرتے ہیں اور جندگی کو دھکا دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "روزگار کیا ہے؟"

وہ بولا "روج گار کیا ہونا ہے۔ نشے کا تو آپ کو پتا ہی ہے' شریر کے ساتھ ساتھ ہمت کو بھی کھا جاتا ہے۔ کچھ کرنے کو من ہی نہیں کرتا۔ باپو کھلو کا کام کرتا ہے۔ اس کی دکان بکی ہے۔ وہی رقم پاس ہے۔ جب تک گزارہ ہو رہا ہے' ہو رہا ہے' جب ختم ہوگی دیکھا جائے گا۔"

وہ مہین باریک آواز میں کافی دیر اپنی بپتا سناتا رہا۔ ہم آلو ٹھونگتے رہے' کھاتے رہے اور اس کی باتیں سنتے رہے۔ اس نے برملا کہا کہ "تیرتھ" نامی اس گاؤں کی اٹھانوے فیصد آبادی خالصتان کی حامی ہے اور وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس کے نزدیک "ہندو" اور "ظالم" دو لفظ ہونے کے باوجود ایک ہی معنی رکھتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو خالصتان کے مسئلے کو ختم نہیں کر سکتا اس لیے وہ سکھوں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ بھارتی حکومت چاہتی ہے کہ ہر وہ سکھ جو بندوق اور کرپان اٹھا سکتا ہے جیل میں سڑ جائے یا شمشان گھاٹ میں جل جائے اور جو باقی رہ جائیں وہ ننگی فلموں اور نشے کے عادی ہو جائیں۔ اس نے کہا "پنجاب میں شراب بنانے اور فروخت کرنے کی کھلی چھٹی ہے' یہاں ہر روج ہزاروں بوتل شراب بنتی ہے اور پی جاتی ہے اور فلمیں... فلموں کا تو پوچھو ہی مت۔"

میں نے کہا "اور تم یہ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی نشہ کرتے ہو اور گھر میں فلموں کے پوسٹر لگاتے ہو۔"

وہ بولا "میری بات چھوڑو جی۔ مجھ میں اب کیا رہ گیا ہے۔ کھایا پیا گیا ہوں۔ مرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ پر ایسے لوگ ہیں ہم میں جو گورنمنٹ کو تھوڑا ڈال دیے ہیں۔ جہاں موقع ملتا ہے 'مارتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر اور ان کی خبریں سن سن کر خوش ہوتے ہیں۔ ان میں لال سنگھ بھی ہے۔ کیا بتاؤں تم کو ایسا ہی وار بندہ ہے کہ ہر کوئی اس کے نام کو پرنام کرتا ہے۔ سارے علاقے میں اس کی دھوم ہے۔"

اپنی گفتگو میں بوٹا سنگھ پہلے بھی دو دفعہ اس "لال سنگھ" کا نام لے چکا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ لال سنگھ ہے کون؟"

وہ بولا "ہے ایک مائی کا لال۔ کہتے ہیں امرتسر جیل سے بھاگ کر آیا ہے۔ سنت سنگھ بھنڈرانوالے کا نام تو تم نے بھی سنا ہوگا۔ اس کے خاص بندوں میں سے ہے۔ ہر وقت چہرے پر ڈھاٹا لگائے رہتا ہے۔ واہ گورو نے اس کے باجو میں جور اور دل میں حوصلہ دے رکھا ہے۔ بڑا دو ڈالا ہوا ہے اس نے وردی والوں کو۔ ابھی پچھلے سے پچھلے منگل وار 'بارہ دری کے پاس اس نے دو پولیس والے مارے ہیں اور اس سے پانچ دس روز پہلے چھپا گڑھ کے میلے میں بڑا دھماکا کیا تھا اس نے۔ فرید کوٹ کے ہندوؤں کی پانچ چھ دکانیں جلا ڈالی تھیں اور مال بھی لوٹ کر لے گیا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید یہ بھی کوئی میرے ہی جیسا دل جلا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ اپنا بدلہ لے سکتا ہے 'اس لیے وہ دوجی ہندوؤں کی دکانیں جلاتا ہے۔ میں اپنا بدلہ نہیں لے سکتا اس لیے اپنا آپ جلاتا ہوں۔"

اس نے ہمارے سامنے ہی قمیص کی جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اسے کھول کر سرخ رنگ کے دو بڑے بڑے کیپسول ہتھیلی پر رکھے اور انہیں پانی کے ساتھ نگل گیا۔ کوئی تیز قسم کا نشہ ہی لگتا تھا۔ "تو کھاؤ تم بھی" اس نے ایک کیپسول میری طرف بڑھایا "سچ کہتا ہوں' واکنٹ ہے واکنٹ۔ پلک جھپکتے میں ساتویں آسمان پر لے جائے گا۔ ایک رات کے لیے سب کچھ بھول جاؤ گے۔"

میں نے شکریے کے ساتھ ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے مسکراتے ہوئے پڑیا پھر جیب میں رکھ لی اور بڑے والہانہ انداز میں لال سنگھ کی باتیں کرنے لگا' اس نے فلاں تھانے کی حوالات توڑی' فلاں افسر پر اپنی گھوڑی چڑھائی' فلاں۔ بلکہ فلاں تھانے دار کی وردی پھاڑی۔ اس کی باتوں سے

ظاہر ہو رہا تھا کہ لال سنگھ کو اردگرد کے دیہات میں ہیرو سمجھا جاتا ہے اور ان سرحدی دیہات میں جہاں کہیں بارڈر سیکیورٹی فورس یا سی آئی ڈی والے زیادتی کرتے ہیں لوگ توقع رکھتے ہیں کہ لال سنگھ ان کا بدلہ لے گا۔ جن علاقوں میں سیاسی کشیدگی اور ریاستی جبر پایا جاتا ہے وہاں ایسے کردار ضرور جگہ بنا لیتے ہیں۔ کہیں وہ صرف چند دیہات تک محدود رہتے ہیں اور کہیں کرتار سنگھ 'ملنگی' جبرام اور رنگاڈاکو کی طرح دور و نزدیک مشہور ہو جاتے ہیں۔ وہ یقیناً بہادر اور دلیر ہوتے ہیں لیکن اکثر ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ یہ لال سنگھ عرف لالی بھی اردگرد کے دیہات کا "مقامی ہیرو" نظر آتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی تعریفیں کرنے میں بوٹا سنگھ رسا دلی سے کام لے رہا ہے۔

دس پندرہ منٹ بعد بوٹا سنگھ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا "بھئی! تم سارے دن کے تھکے ہوئے ہو اور میں اپنی بانگر لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"

ساتھ والے کمرے میں جا کر اس نے ہمارے بستر بچھا دیے اور پھر مٹی کی انگیٹھی بھی اٹھا کر وہاں رکھ دی۔ بستر گندے اور بدبودار تھے۔ معلوم نہیں کتنے مہینوں سے انہیں دھوپ اور ہوا نے نہیں چھوا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ہم 'جو بے حساب دولت و ثروت ساتھ لیے پھرتے تھے' بچے کچے ٹکڑے کھا کر غلیظ چیتھڑوں میں استراحت کرتے تھے۔ مجبور تھے اور ابھی پتا نہیں کیا کیا کچھ دیکھنا تھا۔ بوٹا سنگھ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر رخصت ہونے لگا تو میں نے پوچھا "ہمیں نئے تانا سے تانا ٹر مل جائیں گے؟"

وہ قدرے حیرانی سے بولا "اس سے پہلے تانا نہیں گئے تم؟"

"گیا تو ہوں لیکن ٹائروں شائروں کے چکر میں کبھی نہیں گیا" میں نے عذر پیش کیا۔

وہ بولا "ابوہر جانے والی سڑک پر "ہیرے اوم چوک" میں اسپیئر پارٹس کی بہت سی دکانیں ہیں۔ مجھے پکی امید ہے وہاں سے تمہیں ٹائر مل جائیں گے۔ میرا پاؤں ٹھیک ہوتا تو میں سویرے خود تمہارے ساتھ جاتا۔ پھر بھی میں تمہیں پورا پتا سمجھا دوں گا۔ تمہیں دکانیں ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ ویسے تم نے ٹائروں کا تو بالکل کباڑہ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے ابوہر سے ہی ہوا نکلی ہوئی تھی تمہارے ٹائروں کی۔" پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا "تمہارے ٹائروں سے میرا مطلب ہے ٹرک کے ٹائروں کی۔"

ہم بھی فرمائشی ہنسی ہنسنے لگے۔ اس نے اپنے زعم میں جیسے کوئی زبردست مزاحیہ بات کہہ دی تھی۔ اس "مزاحیہ بات" پر گفتگو ختم کرتے ہوئے اس نے ہمیں "رب راکھا" کہا اور لنگڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

کمرے کے سیاہ طاق میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ کھلے دروازے سے آنے والی ہوا اس روشنی کو بجھانے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ امید نہیں تھی کہ اب صبح سے پہلے بوٹے کے ساتھ دوبارہ ملاقات ہوگی۔ وہ کیپسول کھا چکا تھا۔ نشہ چڑھنے والا تھا اور نشہ چڑھتے ہی اس نے لمبی تان کر سو جانا تھا۔ ہم نے چارپائیوں پر سے بدبودار چیتھڑے اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کر دیے۔ خودکار رائفل ہلکی پھلکی اور چھوٹی نال کی تھی۔ اسے میں نے بغل میں اس طرح دبائے رکھا تھا کہ بغل کے نیچے سے اس کا ابھار محسوس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس کوشش میں میرا بایاں کندھا اکڑ کر رہ گیا تھا۔ میں نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور رائفل چارپائی کے نیچے کھسکا دی۔ میرے سارے لباس پر خون کے دھبے تھے اور یہ دھبے ہمیں کسی بھی وقت مصیبت میں ڈال سکتے تھے مگر مجبوری تھی۔ فی الحال اس لباس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ مقصود نے بھی اپنا زخمی ہاتھ اب تک چادر میں چھپائے رکھا تھا۔ اس کی ہتھیلی خانہ بدوش کی کلہاڑی سے زخمی ہوئی تھی۔ زریں گل نے افراتفری میں جو پٹی باندھی تھی وہی اب تک بندھی ہوئی تھی۔ اب ذرا فرصت ملی تو مقصود کو اس گیلی پٹی سے نجات پانے کا خیال آیا۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر انگیٹھی کے پاس بیٹھ گیا اور پٹی کھولنے لگا۔

"مجھے تو لگتا ہے کوئی خواب دیکھ رہے ہیں ہم؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا "اگر کوئی اس وقت لاہور جا کر انجم کو بتائے کہ تمہارا ہونے والا شوہر نامدار اس وقت انڈیا میں بیٹھا ہے اور ایک ایسے ٹرک میں سوار ہو کر وہاں پہنچا ہے جس میں زر و جواہر سے بھرے ہوئے دو وزن صندوق لدے ہیں تو وہ اطلاع دینے والے کو دیوانہ سمجھے گی بلکہ میرا تو خیال ہے کہ میں خود بھی جا کر بتاؤں تو وہ مجھے "فارغ العقل" ہی جانے گی۔"

"لیکن جب تمہاری رولز رائس کار اور ہاؤس گارڈز دیکھے گی تو اسے یقین کرنا ہی پڑے گا" میں نے لقمہ دیا۔

"اور اگر یقین آگیا تو وہ فوراً شادی سے انکار کر دے گی۔ وہ ایسے شخص سے شادی کیسے کر سکتی ہے جس کے پیچھے ایک خلقت لٹھ لے کر پڑی ہوئی ہو۔ خدا کی پناہ مجھ پر اس

محاورے کی حقیقت اب کھلی ہے کہ زر' زن اور زمین فساد کی جڑ ہوتے ہیں۔ میں تو حیران ہو رہا ہوں کہ مشین گن نہ ہوتی تو کیا حشر ہوتا ہمارا۔ وہ لوگ تو پاگل ہو رہے تھے بالکل۔"

کچھ دیر ہم صورت حال پر غور کرتے رہے۔ بارڈر پار کر آنے سے کم از کم اتنا تو ہوا تھا کہ ہم ابراہیم اور قلندر زماں کے چھوڑے ہوئے خونخوار کتوں کی زد سے نکل گئے تھے مگر اب کیا ہونا تھا یہ ایک لاینحل سوال تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی "کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں ہوں بوٹا سنگھ" دوسری طرف سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔

"یہ کہاں سے آن مرا" مقصود بڑبڑایا۔

ہم بڑے "ایزی" موڈ میں بیٹھے تھے ایک دم بھگدڑ پڑ گئی۔ میں نے جلدی سے چادر کی بکل ماری۔ رائفل کو تھوڑا سا مزید چارپائی کے نیچے کھسکایا۔ مقصود نے ہاتھ کی پٹی لپیٹ کر جیب میں ڈالی اور غلیظ چیتھڑے اٹھا کر پھر چارپائیوں پر رکھ دیے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے بوٹا کھڑا تھا۔ نشہ اب اس پر پوری طرح سوار ہو چکا تھا۔ چہرہ لال بھبوکا' آنکھیں چڑھی ہوئی اور ریلی پتلی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا "تم کو نیند نہیں آ رہی اور نیند مجھ کو بھی نہیں آ رہی۔ میں نے سوچا' تم کو بتاؤں کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں اپنی ماں اور بھابو کا بدلہ نہیں لے سکتا۔ یہ غلط ہے' بالکل غلط ہے۔ میں بدلہ لیتا ہوں' میں روز بدلہ لیتا ہوں۔ آؤ میں تم کو بتاؤں کہ میں کیسے بدلہ لیتا ہوں" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جہاں ایکٹرسوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ نشیلے لہجے میں کہنے لگا "یہ دیکھو' یہ دجنتی مالا ہے۔ بڑے اونچے ہندو گھرانے کی عورت ہے۔ لوگ پتا نہیں اسے کیا سمجھتے ہیں پر یہ میری پتنی ہے۔ میں اسے پچھلے سے پچھلے سال مارچ کی انتہا میں تاریخ کو بیاہ کر لایا تھا۔ پاپتی" اس نے نفرت سے قہقہہ لگایا "یہ صرف نام کی پتنی ہے۔ میں نے کبھی اسے چھوا تک نہیں۔ یہ میرے پریم کو ترستی ہے' ترستی ہے لیکن میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ اس کے سامنے۔ ہاں اس کے سامنے دوسری عورتوں سے رنگ رلیاں مناتا ہوں۔ یہ دیکھو' یہ سلکشنا پنڈت ہے۔ اس کے ساتھ میں منگل کی رات کو سوتا ہوں۔ اس کے بال مجھے بہت پسند ہیں۔ یہ مالا سنہا ہے۔ سنیچر اور سوموار کو یہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ بڑی خوشبو ہے اس کے شریر میں۔ اسی طرح یہ

مدھوبالا ہے۔ یہ آشا پاریکھ، نندہ اور شرمیلا ٹیگور ہیں۔ یہ سب میرے لیے "پڑھی ہوئی کتابوں" کی طرح ہیں۔ ارے اچھا اچھا!" اس نے جنونی انداز میں سر ہلایا "تم سوچ رہے ہو کہ یہ مدھوبالا تو مسلمان ہے۔ اس سے پیار کس بات کا؟ بھراجی! ذرا سوچو یہاں سائرہ بانو بھی تو ہے۔ میں نے اس کا نام کیوں نہیں لیا۔ میں نے کبھی بُری نظر تک نہیں ڈالی سائرہ بانو پہ۔ پھر مدھوبالا سے پیار کیوں؟ اس کی وجہ ہے بھراجی۔ مسلمان یا سکھ ہو کر جو ہندوؤں کا نام رکھے اور ہندوؤں سے شادی بیاہ کرے وہ مسلمان اور سکھ ہوا یا ہندو؟۔۔ وہ ہندو ہوا۔ میرے نزدیک تلک رام میں اور مدھوبالا میں کوئی فرق نہیں۔ کیا خبر یہ تلک رام بھی کسی ایسی ہی مدھوبالا کی اولاد ہو۔"

وہ عجیب ترنگ میں بول رہا تھا۔ اس کی باچھوں سے رال بہہ رہی تھی اور گیلڈ آلود آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنا گریبان کھولا اور ہڈیوں بھرا سینہ عریاں کرتے ہوئے بولا "یہ دیکھو، یہ کیا لکھا ہوا ہے۔ دیکھو جرا غور سے۔"

میں نے جھک کر دیکھا۔ اس نے کسی میلے ٹھیلے میں جا کر جلد پر اَن مٹ روشنائی سے "بھابو ماں" کے الفاظ لکھوائے ہوئے تھے۔ کہنے لگا "پچھلے سے پچھلے سال میری ایک ماں نہیں دو مائیں مری تھیں۔ ایک میری ماں تھی اور دوجی بھابو ماں۔ تمہیں کیا بتاؤں وہ کتنا پیار کرتی تھی مجھ سے۔ میرا نام لے لے کر جیتی تھی۔ نام لے لے کر جیتی تھی۔" اس نے آخری فقرہ کئی بار دُہرایا پھر لہک لہک کر ایک پنجابی لوک گیت گانے لگا۔ اس گیت میں بھابی دیور کے پیار کا ذکر تھا اور ان معصوم شرارتوں کا تذکرہ تھا جو اس رشتے سے منسوب ہوتی ہیں۔ گانے کے دوران ہی وہ بدبودار بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی باریک، بے رُعب آواز کچھ اور باریک اور مدھم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا۔

○☆○

اگلی صبح بڑی ہی چمکیلی اور روشن تھی۔ کئی دنوں کے بعد آج مطلع صاف ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے نشیب و فراز نے بڑی وارفتگی سے خود کو دھوپ کے حوالے کر کے آنکھیں موندلی تھیں۔ نشے باز باپ بیٹا بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی ایسی چیز تھی ہی نہیں جس کے لیے انہیں چوکس رہنا پڑتا۔ دکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کا ذکر بوٹے نے کیا تھا لیکن ظاہر ہے یہ رقم (اگر تھی تو) کسی اور جگہ رکھی گئی تھی ورنہ وہ ہمیں اس بارے میں نہ بتاتا۔ بھوک تو ہمیں تھی لیکن ہم نے باپ بیٹے کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور ناشتا کیے بغیر شہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنے حلیے کی طرف سے ہم دونوں مطمئن تھے۔ ہمارے جیسے مونے سکھ مشرقی پنجاب کے شہروں اور دیہات میں عام نظر آجاتے ہیں۔ یہ داڑھی اور جوڑے کے بغیر ہوتے ہیں۔ اب ان میں سے بہت سے لوگ تہبند کرتے کی جگہ شلوار قمیص بھی پہننے لگے ہیں۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ ہم نے دو عدد پگڑیوں سے پوری کر لی۔ یہ میلی کچیلی بدرنگ پگڑیاں بوٹا سنگھ کے باپو کی تھیں۔ عام حالات میں شاید ہم ان سے کمرے کی جھاڑ پونچھ بھی مناسب نہ سمجھتے مگر وقت کی بات تھی۔ ہم نے یہ پگڑیاں بڑے اہتمام سے سر پر باندھیں۔ دونوں ٹائر باہر صحن میں پڑے تھے۔ وہ صبح سویرے تک میں "ٹیوبلیس" ہو چکے تھے۔ شکر تھا کہ وہ برباد ہونے سے بچ گئے تھے۔ ہم نے دن کی روشنی میں اچھی طرح ان کا جائزہ لیا، مبادا وجہ کے اس ملبے میں ابھی تک کوئی گولی اٹکی ہو۔ ٹیوبوں میں ایک دو جگہ گولیوں کے نشان نظر آئے۔ ہم نے اتنے حصے ہی کاٹ کر پھینک دیے۔ اب یہ ٹائر ہر طرح قابل ملاحظہ تھے۔

ٹائروں کو گھسیٹتے اور لڑھکاتے ہوئے ہم گاؤں کی ایک دو گلیوں سے گزرے پھر ہمیں ایک سائیکل رکشا والا نظر آگیا۔ بھارتی پنجاب میں کئی طرح کے سائیکل رکشا چلتے ہیں۔ اور ان میں لگژری ٹائپ رکشا سے لے کر "ریڑھا چھاپ رکشا" تک ہر طرح کی سواری ہوتی ہے۔ ہمیں جو رکشا نظر آیا وہ ریڑھا چھاپ تھا اور اس کے سائیکل پر بیٹھا ہوا سکھ بھی "رکشا والے" سے زیادہ کوچوان نظر آتا تھا۔

"کہاں جاؤ گے بادشاہو!" اس نے دور ہی سے ہانک لگائی۔

"شہر" میں نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں کہا۔

"تو پھر سوچتے کیا ہو؟ آجاؤ" وہ خوش دلی سے بولا۔

ہماری دلی مراد پوری ہو رہی تھی، ہم دیر کیوں لگاتے؟ فٹافٹ سوار ہو گئے۔ لکڑی کی ایک بوسیدہ سی بینچ پر بیٹھ کر ہم نے دونوں ٹائر پاؤں میں رکھ لیے۔

"میرا کھیال ہے ہرے اوم چوک میں جاؤ گے؟" اس نے قیاس آرائی کی۔

رات بوٹا سنگھ نے بھی ٹائروں کے حوالے سے ہی اوم چوک کا ذکر کیا تھا۔ میں نے فوراً ہاں میں جواب دیا۔ سائیکل رکشا والوں کے برعکس یہ شخص باتونی دکھائی دیتا تھا۔ شاید سویرے سویرے تازہ دم تھا اس لیے باتوں کے موڈ میں تھا۔

کہنے لگا "میرا نام جیون سنگھ ہے۔ اسی گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا تھا کہ تم شہری سواری ہو۔ کہاں سے آرہے ہو؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے بوٹا سنگھ اور اس کے باپو کو بتا چکا تھا، وہ بولا "اچھا۔ تو بوٹے املی کے گھر رات گزاری ہے تم نے؟"

"املی!" نشے باز کو کہا جاتا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا "بوٹا املی ہے؟"

وہ قہقہہ لگا کر بولا "او شریمان جی! ساری رات اس کے گھر گزاری اور یہ پتا نہیں چلا کہ وہ املی ہے۔ بھراجی! کوئی املی سا املی ہے۔ وہ ایسا نشہ کرتا ہے کہ تین تین دن بے سدھ پڑا رہتا ہے۔ اور باپ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مجھے تو حیرانی ہو رہی ہے کہ وہ دونوں تم کو جاگتے کیسے مل گئے۔ کوئی صبح کو ان کا دروازہ پیٹنا شروع کرے تو شام سے پہلے نہیں کھولتے۔"

پھر وہ خود ہی بوٹا سنگھ اور اس کے باپو امریک سنگھ کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ بوٹا سنگھ کی طرح اس نے بھی بوٹا سنگھ کے بڑے بھائی جسونت کو بزدل قرار دیا اور کہا کہ جب شرابی تھانے دار اس کی پتنی کی آبرو پر ہاتھ ڈال رہا تھا، وہ گھر سے بھاگ گیا۔ بعد میں وردی والوں نے نہ صرف اس کی پتنی کی عزت خراب کی بلکہ ماں کو بھی مار دیا۔ اس نے کہا "بھایا جی! یہ کھاندان ہی بھلوں کا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ بوٹا سنگھ اپنی ماں اور بھابو کا بدلہ لے گا لیکن اب اسے دیکھو وہ اپنے آپ میں ہی گھل گھل کر مر رہا ہے۔ کون سی علت ہے جو اس میں نہیں ہے۔ بھلا ایسے لوگ لے سکتے ہیں کھالستان۔ کھیر چھوڑو جی۔ کھام کھا دل جلانے والی باتیں ہیں۔ تم بتاؤ۔ تمہارا کیا کھیال ہے۔ کب تک پترا ہو جائے گا کانگریس کا؟"

وہ بغیر کسی تحقیق کے ہمیں "حکومت مخالف سکھ" سمجھ رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دیہی علاقوں میں علیحدگی پسندوں کا کتنا زور ہے۔ کچھ دیر ہم سیاست کی ہانڈی کو دیتے رہے، پھر میں نے لال سنگھ عرف لالی کا ذکر چھیڑا۔ میں نے کہا "بھایا جی! سنا ہے یہ کوئی بڑا اتھرا جوان نکلا ہے۔ آس پاس کے دیہات میں اس کی دھوم ہے۔"

وہ بولا "بالکل دھوم تو ہے جی لیکن اکیلا بندہ کچھ نہیں کر سکتا۔ لال سنگھ اکیلا نہیں ہے۔ تین چار جے "اچھلے" جوان اس کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے رنگوال پور کے ایک جٹ منڈے کو تو میں کھد بھی جانتا ہوں۔ یہ سارے منڈے مل کر کارروائیاں ڈالتے ہیں۔ ان میں کھاص بات یہ ہے کہ کارروائی کرتے ہوئے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ شاید آپ نے سنا ہی ہو۔ تھوڑے دن پہلے سات آٹھ ہندوؤں کی دکانیں جلا ڈالی ہیں انہوں نے۔ ایسا کام کیا تھا کہ پولیس بھی منہ دیکھتی رہ گئی تھی" پھر وہ سائیکل چلانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس واقعے کی تفصیلات بھی بتانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ لالی اور اس کے ساتھیوں کو اب یہ دیہات چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ پولیس اور بی ایس ایف والے ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ چکے ہیں اور انہیں پکڑنے تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

کچا راستہ طے کرنے کے بعد سائیکل رکشا اب پندرہ سولہ فٹ کی پختہ سڑک پر آچکا تھا۔ صبح سویرے کام پر نکلنے والے لوگ اور اسکولوں کو جانے والے بچے اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ ایک چھوٹے سے چوراہے میں ہمیں ٹریفک پولیس کے دو سکھ سپاہی نظر آئے جو ایک اوور لوڈ بس کے ڈرائیور سے تکرار کرنے میں مصروف تھے۔ ابھی تک ہمیں کسی نے غور سے یا مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور یہ صورت حال ہمارے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ہم اپنے لب و لہجے کے ساتھ ساتھ ظاہری حلیے کے حوالے سے بھی اس ماحول کا حصہ نظر آرہے تھے۔ ہمارے نزدیک اس وقت سب سے اہم مسئلہ کرنسی کا حصول تھا۔ رکشا والے کو کرایہ تک دینے کے لیے پیسے نہیں تھے ہمارے پاس۔ جیون سنگھ کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی ہو گئی تو میں نے اپنا مسئلہ چھیڑ دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس رقم کچھ کم پڑ رہی ہے۔ پردیس میں کسی سے ادھار ملنے کی توقع بھی نہیں۔ صرف ایک جالندھری دوست ہے جس سے مدد مل سکتی ہے لیکن اس کا ایڈریس ٹھیک سے معلوم نہیں۔

جیون سنگھ بولا "کچھ تو اتا پتا ہوگا بادشاہو۔"

میں نے کہا "وہ سُنار ہے۔ جس بازار میں اس کی دکان ہے وہاں زیورات کی اور بھی بہت سی دکانیں ہیں۔"

وہ بولا "بس جی مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ شہر میں ایک ہی تو بڑا بازار ہے جہاں جیولر شیولر بیٹھتے ہیں۔ آپ ذرا چھتری کے نیچے سانس لیں۔ میں دس منٹ میں آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔ چھیناں بازار کہتے ہیں اس کو۔"

"ہاں۔ ہاں" میں نے زور و شور سے سر ہلایا "یہی نام لیا تھا اس بھوتنی دے، خصم نے۔ بس مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ تم ہمیں سیدھا چھیناں بازار لے چلو۔"

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم دو بارونق سڑکوں سے گزر کر ایک چھوٹے سے بازار میں رک گئے۔ بیشتر دکانیں ابھی بند تھیں۔ جیون سنگھ کا اتا پتا ہمیں معلوم ہو چکا تھا لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ تاوان کے ساتھ رفو چکر ہو جائے گا۔ ہم نے اسے وہیں سائیکل رکشا کے پاس چھوڑا اور بازار کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتے رہے پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گھس گئے۔ ایسے ہوٹلوں کو ڈھابا کہا جاتا ہے اور یہاں اکثر بہت سستا کھانا مل جاتا ہے لیکن ہمارے پاس یہ سستا ترین کھانا کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ یوں ہی ایک میز پر بیٹھے اخبار دیکھتے رہے اور میلے کچیلے ملازم پر یہ ظاہر کرتے رہے کہ آرڈر "عنایت کرنے" سے پہلے ہمیں اپنے تیسرے ساتھی کا انتظار ہے۔

قریباً دس بجے جب ہم ڈھابے سے باہر نکلے تو دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ زیورات کی چند دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس گلوبند کو ٹٹولا جو چنے پل کی تاریک حویلی سے نکل کر آج ایک سکھ سنار کی دکان پر بکنے والا تھا اور جس کے عوض ایک معقول رقم ہماری جیبوں میں منتقل ہونے والی تھی۔ بہرحال یہ کوئی ایسا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ خرید و فروخت کے اس عمل کے دوران بہت ہوشیاری اور چابک دستی کی ضرورت تھی اور ہم جانتے تھے کہ ذرا سی غلطی ہمیں کہاں پہنچا سکتی ہے۔ ہم نے احتیاط سے جائزہ لے کر ایک ایسا دکاندار منتخب کیا جو صورت سے کم عقل اور ذرا لاپروا سا نظر آتا تھا۔ وہ ایک چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ ہم نے ذرا عاجزی سے اسے پرنام کیا اور سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے بھیانی لباس اور انداز کو دیکھتے ہوئے جواں سال دکان دار نے ہمیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اپنے سامنے رکھے اخبار پر نگاہ جمائے ہوئے بولا "فرماؤ بھائی جی! کیا سیوا کروں؟"

میں نے گلوبند نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ بیچنا ہے جی۔"

قدیم لیکن خوب صورت گلوبند دیکھ کر سنار چونکا۔ گلوبند کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے بولا "تمہاری پتنی کا ہے؟"

"ہاں جی" میں نے جواب دیا "میری پتنی کو میری ماتا جی نے دیا تھا۔ ان کو دہیج میں ملا تھا۔ بڑا پرانا گہنا ہے جی۔ ضرورت نہ ہوتی تو کبھی نہ بیچتے۔"

نوجوان دکاندار شوکیس میں سے کسوٹی نکال رہا تھا جب ایک صحت مند سکھ بریف کیس تھامے اندر داخل ہوا۔ اس

پیچھے اس کی بڑی بڑی اور ابھری ہوئی آنکھیں مرعوب کن تھیں۔ وہ دکان کا اصل مالک تھا۔ اس نے بریف کیس ایک طرف رکھا اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولا "یہ کیا ہے بھائی؟" اس کی نگاہ گلوبند پر تھی اور وہ کچھ چونکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

نوجوان نے جو دراصل سیلز مین تھا، دبے ہوئے لہجے میں کہا "گلوبند ہے جی۔ بیچنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ بھائی صاحب کہتے ہیں کہ ان کی پتنی کا ہے" وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

بریف کیس والے نے پہلے غور سے گلوبند کو اور پھر مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی آنکھیں اپنے ذہن میں گھستی محسوس ہوئیں اور میرے دل نے کہا کہ ہم غلط دکان پر آ گئے ہیں۔ یہ بے حد کھاگ اور چھان بین کرنے والا شخص لگتا تھا۔ اگر چند منٹ پہلے نوجوان کی جگہ یہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوتا تو ہم کبھی اس دکان کا رخ نہ کرتے۔ اس نے ہم سے ایک دو سوال پوچھے کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ گلوبند کتنے میں بکوگے وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ساتھ وہ گلوبند کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہم اس کی نظروں میں مشکوک ہو چکے ہیں۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ اگر سنار بھلا مانس ہو اور اسے زیور فروخت کرنے والے پر کسی طرح کا شک ہو جائے تو وہ زیور خریدنے سے انکار کر دیتا ہے اور مزید کسی جھمیلے میں نہیں پڑتا۔ لیکن اگر سنار لالچی ہو تو وہ زیور اونے پونے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر مہم جو ہو تو پھر بات تھانے کچہری تک بھی چلی جاتی ہے۔ یہ بریف کیس والا دکان دار تیسرے ٹائپ کا تھا۔ اس نے قانون پسند بن کر ہمیں پھنسانے کی کوشش کی اور نتیجے میں بہت نقصان اٹھایا۔

وہ اپنی دانست میں ہمیں بہلا پھسلا کر دکان کے عقبی حصے میں لے گیا اور تفتیش شروع کر دی۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ یہ زیور ہمارا نہیں اور ہم اس کے غیر قانونی مالک ہیں۔ رسید تو ظاہر ہے ہمارے پاس تھی نہیں۔ اس نے مختصی ضمانت کی بات چھیڑ دی۔ پھر ہمارا مکمل حدود اربعہ دریافت کرنے بیٹھ گیا۔ سرحدوں کے ہی اڈے پر تھے۔ مجھے مینڈک کی آنکھوں والے اس خدائی فوجدار پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ پھر اس خدائی فوجدار نے اپنے تابوت میں آخری کیل یوں ٹھونکی کہ ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر کسی پر تاب مہتا کو ٹیلی فون کرنے لگا۔ یہ پرتاب مہتا کوئی سنار تھا اور اسی بازار میں اس کی دکان تھی۔ ہمیں

دو جلدوں میں مکمل

راز دار

موت سے پنجہ کشی
کرنے والے سرفروشوں
کی دل ہلا دینے
والی داستان

ایسے مہم جوؤں کی داستان جو پہاڑوں کو
ریزہ ریزہ کرنے کا عزم رکھتے تھے

ایم اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت مکمل سیٹ
۳۲۰/-

ڈاک خرچ
۲۵/-

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰-عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ——— فون ۷۲۴۷۴۱۴

خبر رکھنے کے لیے وہ پرتاب مہتا سے انگریزی میں گفتگو فرما رہا تھا "یس آئی ایم شیور۔ ڈیئر راز سم تھنگ رانگ۔" وہ انگریزی میں ہمیں اشتعال انگیز خطابات سے نواز رہا تھا اور گووند کو چوری کا مال قرار دے رہا تھا۔ آخر میں اس نے پرتاب مہتا کو دعوت دی کہ وہ فوراً اس کی دکان پر پہنچے۔ (یہ پرتاب مہتا غالباً بازار کی یونین کا کوئی عہدے دار تھا) صفدر نے پردے کی اوٹ سے دکان کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر خالی تھا۔ نوجوان ملازم ہمارے لیے چائے لینے باہر نکلا تھا۔ مینڈک کی آنکھوں والے مہم جو کو سزا دینے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے یہ موقع بڑا مناسب تھا۔ صفدر نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر میری نگاہ کا اشارہ پا کر بجلی کی سرعت سے حرکت کی۔ اس کی آہنی کہنی دکاندار کے جھکے ہوئے سر پر لگی۔ یہ ایک انتہائی شدید ضرب تھی۔ ریسیور دکاندار کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ جھٹکے سے اگلی جانب گرا لیکن گرنے سے پہلے ہم نے اسے سنبھال لیا۔ میرا دایاں بازو اس کی گردن سے لپٹ چکا تھا۔ میں نے اپنا مخصوص داؤ اس طرح استعمال کیا کہ موٹی آنکھوں والے سنار کو آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملا اور وہ ایک دم میری بانہوں میں جھول گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اسے میز کے پاس ہی فرش پر لٹا دیا۔ یہ وہی میز تھی جس پر ٹیلی فون رکھا تھا اور چند کاغذات پڑے تھے۔ اس میز میں دو تالا بند درازیں تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ درازیں کیش وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے درازوں کی چابیاں ڈھونڈنے کے لیے سنار کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چابیاں تو مجھے نہیں ملیں لیکن نوٹوں کی ایک گڈی ہاتھ آ گئی۔ یہ سو سو کے نوٹ تھے۔ ان کے ساتھ بینک کی ڈپازٹ سلپ بھی تھی۔ غالباً یہ نوٹ بینک میں جمع کرانے کے لیے جیب میں ڈالے گئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ساڑھے آٹھ ہزار روپیہ تھا۔ میں نے نوٹ فوراً اپنی جیب میں منتقل کر لیے۔ اس دوران صفدر مضروب کی دوسری جیب سے چابیوں کا گچھا نکال چکا تھا۔ یقیناً ان میں دراز کی چابی بھی رہی ہوگی۔ ہم چاہتے تو دراز کی تلاشی بھی لے سکتے تھے لیکن ہم لٹیرے نہیں ضرورت مند تھے۔ اس سے پہلے کہ ملازم چائے لے کر یا چائے کا کہہ کر واپس لوٹتا ہم دونوں عقبی کمرے سے باہر نکل آئے۔ ہم بالکل نارمل انداز میں نمودار ہوئے اور دو تین زینے اتر کر سڑک پر آ گئے۔

جس وقت ہم درمیانی رفتار سے بازار کے کم گنجان حصے کی طرف جا رہے تھے' میں نے ایک بہت فربہ اندام سکھ کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا ہریجن بھی تھا۔ دونوں نے بہت تیزی سے سڑک پار کی اور سیدھے اسی دکان کی طرف گئے جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم نے مینڈک چشم دکاندار کو انٹا غفیل کیا تھا۔ مجھے اور صفدر کو سو فیصد یقین ہو گیا کہ یہی وہ پرتاب مہتا صاحب ہیں جنہیں ٹیلی فون پر ہمارے سلسلے میں طلب کیا گیا تھا اور "غلطی" کو راز رکھنے کے لیے انگلش بگھاری گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم جیون سنگھ تک پہنچ گئے۔ وہ رکشہ دھوپ میں کھڑا کیے رکشے کے اندر ہی لیٹا ہوا تھا۔ ہم کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد لوٹے تھے۔ جیون سنگھ کی پریشانی قدرتی بات تھی۔ ہم فوراً رکشے میں سوار ہوئے اور اسے آگے بڑھانے کی ہدایت کی "بہت دیر ہو گئی ہے یار' ذرا جلدی پیڈل چلاؤ" صفدر نے اپنی اندرونی بے چینی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "دیر میری طرف سے نہیں ہوئی اور نہ اب ہو گی۔ دیکھتے رہیں' ابھی کیسے ہوائی جہاز بنا دیتا ہوں رکشے کو۔"

اور واقعی اس نے ایسا کر دکھایا۔ تنگ سڑک سے کھلی سڑک پر آتے ہی اس کی ورزشی ٹانگیں مشین کی طرح چلنے لگیں "اب ہرے رام چوک جانا ہے نا؟" اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ دھیان ابھی تک عقب میں تھا۔ موقع واردات سے تین چار فرلانگ آگے نکلنے کے بعد ہمیں تسلی ہو گئی کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ بھارتی معاشرہ تضادات کا مجموعہ ہے۔ سیکولرازم کا دم بھرنے والے اپنے مذہب کے حوالے سے تعصب کی انتہا کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹنے والے جمہور کا گلا گھونٹتے ہیں اور سوشلزم کے ترازو میں ایک طرف موٹا تازہ مینڈک چشم سنار بیٹھا نظر آتا ہے اور دوسری طرف دبلا پتلا فاقہ زدہ جیون سنگھ۔ جیون سنگھ نے میلی کچیلی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ پیڈل چلاتے ہوئے اس کی پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں۔ میری نگاہ اس کی سوکھی سڑی سیاہ پنڈلیوں پر جم کر رہ گئی۔ مجھے لگا جیسے یہ پنڈلیاں ہمیں نہیں' انسانیت کی ارتھی کھینچ رہی ہیں۔

ہرے رام چوک سے ہم نے دو مطلوبہ ٹائر سات میں حاصل کیے۔ انہیں پرانے رموں پر چڑھوایا۔ ہوا بھروائی اور بذریعہ سائیکل رکشا واپس گاؤں روانہ ہوئے۔ راستے میں جیون سنگھ نے ایک بار پھر لالی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ لالی نے پہلی کارروائی کوئی ڈیڑھ برس

تھی۔ اس سے پہلے وہ بس جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا تھا۔ ہم سہ پہر تین بجے واپس ٹرک تک پہنچ پائے۔ جب تک ہم نے ٹرک کو صحیح سالم مقررہ جگہ پر کھڑے دیکھ نہیں لیا' ہمارے دل شدت سے دھڑکتے رہے۔ زریں گل ٹرک کے قریب ہی دھوپ میں اپنی چادر بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے سرخ نمازی چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ طمانیت کی سرخی تھی۔ ہم نے دونوں ٹائر' سائیکل رکشا سے اتروائے' جیون سنگھ نے جو کرایہ طلب کیا ہم اس سے چار پانچ گنا زیادہ دینا چاہتے تھے اور "بفضل خدا" دے بھی سکتے تھے لیکن ایسی دریا دلی ہمیں مشکوک ٹھہراتی لہٰذا جو اس نے مانگا وہ ہم نے دل پر "جبر" کر کے دے دیا۔

جیون سنگھ رخصت ہو گیا تو ہم نے زریں گل کا حال احوال پوچھا۔ اس نے بتایا "ابھی تک تو سب ٹھیک ہے۔"

صفدر نے پوچھا "کوئی بندہ بشر تو نہیں آیا اس طرف؟"

وہ بولا "صبح سویرے آیا تھا جی۔ تین چار تو ہی آیا تھا۔ پھر دو بچہ لوگ بھی گزرا تھا۔ وہ سب کا سب بڑی جلدی میں لگتا تھا۔ پیشاب کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ ایک دو نے فارغ ہونے کے بعد ام سے باتیں بھی کیا۔ اپنا یہ دلجیت چاچا تو بڑا کام کا آدمی ہے۔ سکھوں کے سامنے ایک دم سکھ لگتا ہے اور انہی کی طرح بولتا بھی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو ام کو بڑا مصیبت پڑ جاتا۔"

میرے پوچھنے پر زریں گل نے بتایا کہ دلجیت کو اب درد میں افاقہ ہے اور وہ ٹرک میں سو رہا ہے۔ ہم تینوں نے مل کر ٹرک میں ٹائر لگائے۔ یہ اسپیشل برانڈ ٹائر مضبوط اور بالکل نئے تھے۔ امید تھی کہ ٹرک کا بوجھ سہار جائیں گے۔ فالتو ٹائر کو ہم نے ابھی تک نہیں چھیڑا تھا۔ اگر راستے میں کوئی ٹائر دھوکا بھی دیتا تو ہم فالتو ٹائر استعمال کر سکتے تھے۔ اب ایک بار پھر ہم ٹرک کو رواں کر سکتے تھے۔ راستہ سامنے تھا اور گاڑی بھی تیار تھی لیکن منزل کون سی ہے یہ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ فاضلکا سے تیرتھ گاؤں واپس آتے ہوئے راستے میں صفدر اور میں سرگوشیوں میں تبادلہ خیال کرتے رہے تھے۔ یہ بات تو طے تھی کہ واپس کنٹرول لائن کی طرف جانا اپنے آپ کو اندھے کنوئیں میں پھینکنا ہے۔ ہماری سلامتی اب واپس جانے میں نہیں آگے بڑھنے میں تھی۔ [illegible] ہم جتنا دور ہو جاتے اتنا ہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر فیروز پور کی طرف نکل جائیں اور فاضلکا فیروز پور روڈ کے کنارے کسی چھوٹے سے گاؤں میں ٹھہر جائیں تو ہمارے لیے مناسب ہے۔

روانگی کے لیے ہمیں تاریکی کا انتظار کرنا تھا اور تاریکی اب کچھ ایسی دور بھی نہیں تھی۔ ساڑھے چار بج چکے تھے اور سرما کا تیز رو سورج کسی بھی وقت نگاہوں سے اوجھل ہونے والا تھا۔ ٹائر خریدنے کے بعد بھی ہمارے پاس قریباً چند سو روپے بچ رہے تھے۔ ان روپوں میں سے تیس چالیس روپے ہم نے اپنے پیٹ پر خرچ کیے تھے۔ فاضلکا سے واپس آتے ہوئے میں نے ایک ڈھابے (ہوٹل) کے سامنے رکشا رکوا کر چار آدمیوں کا کھانا پیک کروا لیا تھا۔ کام سے فرصت پاتے ہی ہم نے کیبن میں "دسترخوان" بچھا لیا اور کھانے میں جت گئے۔ دلجیت بھی ہمارے ساتھ شریک تھا۔ آٹھ تندوری روٹیاں' دو پلیٹ چاول اور چار پلیٹ سالن ہمارے لیے کافی ثابت ہوا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ ایک درجن چتری والے کیلوں نے پوری کر دی۔

شام سات بجے کے بعد ہم اپنی اس پناہ گاہ سے روانہ ہوئے۔ حسب سابق اسٹیرنگ ایک بار پھر میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس جلانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ آج مطلع صاف تھا اور درمیانی راتوں کا چاند ایک بہت بڑے روشن گلوب کی طرح مشرق سے نمودار ہو چکا تھا۔ اسی آسمانی روشنی میں ہم نے دھیمی رفتار سے ٹرک چلانا شروع کیا۔ زریں گل اور صفدر ایک بار پھر اپنے مورچے میں پہنچ چکے تھے۔ دلجیت اپنی زخمی ٹانگ ڈیش بورڈ پر چڑھائے میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہو بہو واہ گورو کا خالصہ دکھائی دے رہا تھا وہ۔ قریباً پانچ منٹ بعد ہم نے اپنے سامنے راستہ مسدود پایا اور ہمیں دائیں جانب سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے کر کے اس سڑک پر چڑھنا پڑا جسے ہم نے کل شب بے حد افراتفری کے عالم میں کراس کیا تھا۔ ہم نے اب تک جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق یہی سڑک ہمیں فیروز پور کی طرف لے جا سکتی تھی۔

اس سڑک پر اکا دکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ پہلے دو بیل گاڑیاں گزریں پھر ایک ٹریکٹر ٹرالی جس پر گوبھی لدی ہوئی تھی۔ پھر ایک بہت کھٹارا اسکوٹر جس کی دھندلی بتی خود ہی جل بجھ رہی تھی۔ ہم اس سڑک پر بمشکل چار پانچ فرلانگ گئے ہوں گے کہ مخالف سمت سے آنے والے ایک ٹریکٹر سوار نے مجھے دیکھ کر ہانک لگائی "یار جی! دھیان سے' پچھلی پر ٹاکا لگا ہوا ہے۔"

میرا پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر آ گیا۔ ٹرک روک کر میں دلجیت کی طرف اور دلجیت میری طرف دیکھنے لگا۔ ٹریکٹر

سوار نے ہماری بجھی ہوئی بتیاں دیکھ کر خیال کیا تھا کہ شاید بتیاں خراب ہیں۔ اس نے ہمیں مطلع کرنا ضروری سمجھا تھا کہ آگے پولیس گھات لگائے ہوئے ہے۔ صفدر بھی آہنی سیڑھی اتر کر نیچے آگیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ فاصلے پر ایک روشنی نظر آرہی ہے۔ شاید وہی ناکا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پیدل جائے اور جاکر دیکھے۔ صفدر نے دیہاتی انداز میں منہ سر اچھی طرح چادر میں چھپایا اور ناکے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ بڑا سخت ناکا لگا ہوا ہے۔ پولیس کے سات آٹھ بندے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور فورس کے جوان بھی ہیں۔ ایک وائرلیس والی جیپ بھی ناکے پر موجود ہے۔ صفدر کی اطلاع کے مطابق یہ ناکا عین نہر کے پل پر لگایا گیا تھا۔

ہمیں یہی اندیشہ تھا کہ نہر کے پل پر کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ رکاوٹ کا مطلب یہ تھا کہ ہم نہر پار نہیں کرسکتے اور جب تک ہم نہر پار نہ کرتے فیروز پور کی طرف نہیں بڑھ سکتے تھے۔ رکشا والے جیون سنگھ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق نہر کا دوسرا پل سات آٹھ میل مغرب کی جانب تھا اور یہ جگہ بارڈر سے بہت نزدیک تھی۔ اس طرف جانے کا مطلب نت نئے خطرات مول لینا تھا۔ ضروری تھا کہ ہم اسی پل پر سے نہر عبور کریں۔

"اب کیا کرنا ہے باؤ صاحب؟" ولیت نے پوچھا۔

"انتظار" میرے بجائے صفدر نے جواب دیا۔

واقعی انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ ناکا ساری رات نہیں رہے گا اور یہ لوگ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے تک یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم نے ٹرک کو سڑک سے اتارا اور بڑی احتیاط کے ساتھ یو ٹرن دے کر گھنے درختوں کے درمیان ایک محفوظ مقام پر لے گئے۔ تمام بتیاں بجھاکر انجن بند کردیا گیا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہم نے سخت بے چینی میں گزارا۔ کبھی درختوں میں ٹہلنے لگتے۔ کبھی پھر آکر کیبن میں بیٹھ جاتے۔ سردی میں ہر لحظہ اضافہ ہورہا تھا۔ زرین گل چھت پر تھی لہٰذا اسے سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہورہی تھی۔ قریباً نو بجے صفدر ایک بار پھر ناکے کا معائنہ کرنے روانہ ہوا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی آدھ پون گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ مایوس نظر آرہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ناکا بدستور موجود ہے۔ جیپ بھی وہیں کھڑی ہے۔ ناکا لگانے والے عملے نے ایک جگہ درختوں میں الاؤ جلا رکھا ہے اور لگتا ہے کہ وہ لوگ یہ وہاں رکیں گے۔

ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ چاندنی رات تھی اور سڑک سے گزرنے والے کسی شخص کی نگاہ بھی ٹرک پر پڑسکتی تھی۔ ایسی صورت میں ہماری پوزیشن بے حد مشکوک ہوجاتی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر رات ہی گزارنی ہے تو پھر کل والی جگہ پر واپس چلیں۔ وہ جگہ سڑک سے کافی ہٹ کر تھی اور یوں بھی درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

میں نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور جس راستے آیا تھا اسی راستے واپس پہلے والی جگہ پر پہنچ گیا۔ اب دس بج چکے تھے۔ موسم سرما کی طویل یخ بستہ شب ہمارے سر پر تھی۔ کیبن میں صرف دو افراد سو سکتے تھے۔ باقی دو کے لیے رین بسیرے کا انتظام ضروری تھا۔ فیصلہ ہوا کہ میں اور صفدر آج پھر بوٹا سنگھ ولد امریک سنگھ کی میزبانی کا لطف اٹھائیں۔ ویسے بھی ابھی ہم نے بوٹا سنگھ کی چند اشیا واپس کرنی تھیں۔ ان میں ایک جوڑا کپڑے، دو پگڑیاں اور نقش گیر کا ایک دباسا تھا۔ ہم یہ اشیا لوٹائے بغیر "راہ فرار" اختیار کررہے تھے۔ اسی لیے ہمیں پہلے قدم پر رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ زرین گل نے اپنا گیلا لباس کل ہی دھوپ میں خشک کرلیا تھا۔ اب وہ سردار جی کے تہبند کرتے کے بجائے اپنی شلوار قمیص زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اس نے سردار جی کے کپڑے تہہ کرکے ہمارے حوالے کردیے۔ ہم نے نقش کار بابی سے اور زرین گل کو ضروری ہدایات دے کر تیرتھ گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔

دوبارہ بوٹا سنگھ کے گھر جانا ہمیں کچھ مناسب تو محسوس نہیں ہورہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ رات کہیں تو گزارنی تھی۔ راستے میں ایک جواں سال سکھ ہمارے عقب سے آیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "ست سری اکال" اس نے کہا۔

ہم نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ کالا گورا شخص تھا وہ۔ "بھایا جی! ٹائم کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ساڑھے دس" میں نے کہا۔

"ساڑھے دس؟" وہ قدرے حیرانی سے بولا۔ صفدر اپنی گھڑی دیکھ کر تصدیق کی کہ ساڑھے دس ہی بجے ہیں۔ "وہ تھوڑا ہی ٹائم ہوا ہے" اس نے کہا "لگتا ہے دن چھوٹے ہورہے ہیں" ہم نے جوابی تبصرہ مناسب نہیں۔ "کسی کے گھر پرونے (مہمان) آئے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک ملنے والا ہے یہاں۔"

وہ سمجھ گیا کہ ہم تبادلہ خیال کے موڈ میں نہیں ہیں۔ قدم اٹھاتا وہ ہم سے آگے نکل گیا اور پھر ایک گلی میں اوجھل ہوگیا۔

گاؤں کے کسی کسی گھر میں روشنی نظر آرہی تھی۔ گرم چادروں میں لپٹے لپٹائے ہم بوٹا سنگھ کے گھر پہنچے اور دروازے پر دستک دی۔ رکشا والے کی بات یاد آئی اور خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں صبح تک دستک نہ دینی پڑے لیکن خیریت گزری۔ چوتھی پانچویں دستک پر بوٹا سنگھ کے باپو نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اپنے بیٹے کے برعکس داڑھی اور گیسوں والا سکھ تھا۔ لیکن جب تک وہ اپنی میلی کچیلی پگڑی اتارتا نہیں تھا اور اس کے جوڑے پر نظر نہیں پڑتی تھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر غمی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ابھرے۔ خوشی غالباً اس بات کی تھی کہ ہم لباس، پگڑیوں اور دیگر وغیرہ کے ساتھ بھاگ نہیں گئے تھے اور پریشانی اس بات کی تھی کہ ہم باقی کے آلو بھی بھون کر کھا جائیں گے۔ بوٹے کے باپو نے ایک طرف ہٹ کر ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ بوٹا برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ حسب سابق پاجامے کرتے میں تھا۔ بالائی جسم پر بوسیدہ سا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اپنی باریک آواز میں بولا "کہاں رہ گئے تھے جن جی! کچھ بتا کر تو جاتے۔ ہم نے سمجھا شاید نہیں ناراج ہوکر چلے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ تم سورہے تھے۔ ہم نے بے آرام کرنا ٹھیک نہیں سمجھا۔"

"گاڑی کا کیا بنا؟" بوٹا سنگھ نے پوچھا۔

"بس یار، تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ آشا ہے کہ سویرے چالو ہوجائے گی۔ تار وغیرہ تو لگادیے ہیں۔ بس تائی راڈ کا تھوڑا سا کام ہے۔"

"تم بتا کر جاتے تو ہم بھوجن وغیرہ کا انتجام کرچھوڑتے۔"

"بھوجن تو ہم ٹھیک ٹھاک کرکے آئے ہیں" میں نے بوٹا سنگھ کو مژدہ سنایا۔

بوٹا سنگھ ہمیں اس کمرے میں لے آیا جہاں کل رات ہم سوئے تھے۔ چارپائیوں پر ابھی تک بدبودار لحاف بے ترتیب پڑے تھے۔ ایک کونے میں بائیسکل کھڑی تھی۔ لگتا تھا مہینوں سے اس پر سواری کی گئی ہے نہ اسے صاف کیا گیا ہے۔ بوٹا سنگھ اور امریک سنگھ کے جسموں کی طرح اس بائیسکل پر بھی گرد اور میل کچیل کی تہیں جمی تھیں۔ جگہ جگہ سے زنگ بھی لگ رہا تھا۔ بائیسکل کے مڈگارڈز اور فریم پر ریگزین کی پٹی لپیٹی گئی تھی۔ اس "ریگزین" پر عریاں عورتوں کی تصویریں پرنٹ تھیں جنہیں خونخوار درندوں، شیر چیتے سانپ وغیرہ نے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ شاید سائیکل پر یہ تصویریں بھی اسی ٹوٹ پھوٹ کی علامت تھیں جو ایک سانحے سے گزرنے کے بعد بوٹا سنگھ کے اندر ہوئی تھی اور وہ ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔

بوٹا سنگھ کا باپو بے حد خاموش طبع تھا۔ وہ خاموشی سے آیا اور مٹی کی انگیٹھی میں آگ جلا کر واپس چلا گیا۔ بوٹا سنگھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ آج بھی نشے میں تھا لیکن نشے کی شدت کل سی نہیں تھی۔ خودکار رائفل کل کی طرح آج بھی میری بغل میں تھی۔ اسے بغل کے نیچے دبا کر رکھنے کی کوشش میں میرا بایاں کندھا اکڑ کر رہ گیا تھا۔ بوٹا سنگھ ہمارے واسطے باواسوں والا گڑ لینے کے لیے باہر گیا تو میں نے رائفل جلدی سے لحاف کے نیچے چھپادی۔

گڑ بھی بوٹا سنگھ کی طرح گندا اور بدبودار تھا، بہرحال اس کا دل رکھنے کے لیے ہم تھوڑا تھوڑا کھاتے رہے۔ جلد ہی بوٹا سنگھ کا باپو چارپائی پر پھیل کر خراٹے لینے لگا اور بوٹا سنگھ کی کمزور آواز بھی نیند سے بوجھل ہونے لگی۔ اچانک بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں پکارا "بوٹے۔۔۔ او بوٹے الی۔ دروازہ کھول۔ اوئے بھینی کرز دروازا کھول۔"

پکارنے والے کی آواز میں ڈرامائی عنصر تھا۔ بوٹا سنگھ گھٹنوں پر زور دے کر بمشکل اٹھا اور باہر نکلنے سے پہلے اس نے مٹی کا دیا طاق سے نکال کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ یوں کمرے کی مدھم روشنی مزید مدھم ہوگئی۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے وہ بیرونی دروازے پر پہنچا اور کنڈی کھول دی۔ میں نے کھڑکی کی درز میں سے دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر لمبا تڑنگا سکھ اندر آیا۔ اس نے کھوجنے والی نظروں سے گھر کا جائزہ لیا پھر تیز لہجے میں بولا "اوئے سور کے تخم! یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تو نے۔ کون بندے آئے ہیں تیرے گھر؟"

"کوئی بھی نہیں" بوٹا سنگھ نے لرز کر کہا۔

"تو سیکیورٹی والوں کو پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ وہ تجھ پر الجام لگارہے ہیں۔ وہاں چودھری کی حویلی میں میٹنگ ہورہی ہے تم باپ بیٹا کے خلاف۔ بس خبر منا اپنی۔ وہ لوگ پانچ دس منٹ میں آکر تیرا دروازا کھڑکانے والے ہیں۔"

"پر میں نے کیا کیا ہے" بوٹا سنگھ منمنایا۔

"مجھے نہیں معلوم تو نے کچھ کیا ہے یا نہیں۔ مگر سیکیورٹی والے کہتے ہیں کہ تیرے گھر دو مشکوک بندے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بوم گارڈ والوں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پاکستانی جاسوس ہیں۔"

"پپ۔۔۔ پاکستانی۔۔۔ جاسوس" الفاظ بوٹا سنگھ کے حلق

میں گڈمڈ ہونے لگے۔

لمبا تڑنگا سکھ جھلا کر بولا "تیرے گھر بندے ٹھہرے ہوئے ہیں یا نہیں۔؟"

"نن۔۔۔ نہیں چاچا۔۔۔ م۔۔۔ میں" یکایک بوٹا سنگھ کو خاموش ہونا پڑا۔ کہیں پاس ہی کسی گاڑی کا شور سنائی دیا تھا۔

لمبا تڑنگا سکھ جلدی سے باہر نکل گیا۔ بوٹا سنگھ حیران پریشان کھڑا رہا۔ پہلے وہ قدم چل کر دروازے کی طرف گیا۔ پھر اس کی کنڈی چڑھا کر ہماری جانب آیا۔ گاڑی عین بیرونی دروازے کے قریب آن رکی تھی۔ جونہی بوٹا سنگھ کمرے میں پہنچا' میں نے رائفل لحاف کے اندر سے نکالی اور اس کی گردن سے لگا دی۔ بوٹے کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ رائفل سیدھی کرتے وقت میری بغل کھل گئی تھی اور بوٹا میرا خون آلود لباس بھی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور سفاک لہجے میں کہا "خبردار بوٹے! کچھ نہیں بتانا کسی کو۔ صرف یہ کہنا ہے کہ کل رات وہ بندے آئے تھے' صبح سویرے چلے گئے۔"

"ٹھیک۔۔۔ لیکن وہ۔۔۔ اندر آ کر دیکھیں گے۔"

"نہیں دیکھیں گے" میں نے کہا۔

چھپنے کی جگہ میں نے اسی وقت منتخب کر لی تھی جب بوٹا سنگھ کے کسی خیر خواہ نے آکر اسے میٹنگ کی اطلاع دی تھی۔ کمرے میں ایک طرف تین چار فٹ چوڑی پڑچھتی (گیلری) سی تھی۔ یہاں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ یہاں ہم دونوں بڑے اچھے طریقے سے روپوش ہو سکتے تھے۔ میں نے دیوار کے سہارے کھڑے سائیکل کی گدی پر پاؤں رکھا اور اچک کر پڑچھتی پر پہنچ گیا۔ صفدر نے بھی ایسا ہی کیا۔ دروازے پر اب زوردار دستک ہو رہی تھی۔ کوئی بھاری بھرکم آواز میں پکار رہا تھا "او ملی۔۔۔ او ملی دے بچے۔۔۔ دروازہ کھول۔"

میں نے رائفل کی نال املی بوٹا سنگھ کی طرف سیدھی کی اور پھنکار کر کہا "چل دروازہ کھول۔ لیکن یاد رکھ' تیری زبان سے کوئی غلط لفظ بعد میں نکلے گا پہلے اس۔۔۔ رائفل کی گولی تیری کھوپڑی میں لگے گی۔"

بوٹا سنگھ نے عجیب سے انداز میں سر ہلایا پھر لڑکھڑاتا ہوا سا بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ جونہی اس نے کنڈی گرائی پانچ چھ افراد بھڑا مار کر گھس آئے۔ ان میں سے ایک سفید پوش سب سے آگے تھا۔ اس نے اندر آتے ہی بوٹا سنگھ کو زوردار دھکا دیا۔ وہ بیچارہ صحن میں بڑے بے ڈھنگے طریقے سے پھسلا اور پشت کے بل گرنے کے بعد فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

اندر آنے والے افراد پورے گھر میں پھیل گئے۔ ایک منٹ کے اندر اندر انہوں نے برآمدہ' تینوں کمرے اور کوٹھری نما اسٹور کھنگال ڈالا۔

"کوئی نہیں ہے یہاں؟" ایک بھاری بھرکم شخص نے کہا۔ سفید پوش کی طرح وہ بھی بی ایس ایف کا اہلکار نظر آتا تھا۔

سفید پوش نے املی کے منہ پر تڑاخ سے تھپڑ مارا "کہاں ہیں وہ تیری بہن کے۔۔۔؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"کس کا پوچھتے ہو مہاراج؟" بوٹا سنگھ منمنایا۔

"وہ جو ابھی ایک گھنٹا پہلے تیرے گھر میں گھسے تھے" ایک جواں سال شخص نے جواب دیا۔

اسی وقت میری نگاہ بولنے والے پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ برآمدے میں جلتی لالٹین کی روشنی میں میں نے اسے صاف پہچان لیا۔ یہ وہی گورا چٹا سکھ تھا جس نے ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے راستے میں ہم سے وقت پوچھا تھا۔ سفید پوش کی طرح وہ بھی کڑی نظروں سے بوٹا سنگھ کو گھور رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ "ہوم گارڈز" میں سے تھا۔ اور اسی کی مخبری پر بی ایس ایف والوں نے بوٹا سنگھ کے گھر میں دھاوا بولا تھا۔ ہوم گارڈز سرحدی دیہات کے مقامی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مشکوک افراد کی نگرانی کرتے ہیں اور انہیں وردی بھی مہیا کی جاتی ہے۔ بی ایس ایف والوں کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص گاؤں کا چوہدری تھا۔ سفید پوش آفیسر کی طرح چوہدری بھی پستول سے مسلح تھا۔

بوٹا سنگھ نے لجاجت سے کہا "آپ سے جھوٹ بولنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے اس لیے جو ہے اس کا سچ بتاؤں گا۔ مجھے اس کے سوا کچھ پتا نہیں کہ وہ دونوں ٹرک ڈرائیور تھے۔ خود کو سکھ بتا رہے تھے۔ ان کا ٹرک سڑک کے پاس کہیں خراب ہو گیا تھا۔ وہ کل رات ٹرک کے دو ٹائر لے کر یہاں آئے تھے۔ مجھ سے کھانا مانگنے لگے۔ میرے گھر میں آلو تھے' میں نے وہ بھون کر دے دیے۔ ان کا ایک ساتھی ٹرک میں تھا۔ اس کے لیے ایک جوڑا کپڑے اور تھوڑا سا کھانا وہ ٹرک میں لے گئے تھے۔ رات ان دونوں نے ہمارے گھر گزاری۔ صبح سویرے اٹھ کر چلے گئے۔ ابھی۔۔۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے دوبارہ آئے تھے۔ وہ دیکھیں وہ کپڑے سامنے چارپائی پر پڑے ہیں۔ واپس کر کے گئے ہیں اور یہ ٹفن کیریئر کا ڈبا بھی۔ بس دھنواد کہہ کر کھڑے کھڑے واپس چلے گئے۔ کہتے تھے' ٹرک اسٹارٹ چھوڑ آئے ہیں۔ میرا۔۔۔ میرا خیال ہے جی کہ گنگا نگر کی طرف جا رہے تھے۔"

افسر نے ایک اور تھپڑ بوٹا سنگھ کے منہ پر مارا "حرام

زادے! وہ سکھ نہیں مسلے ہیں۔ جاسوس ہیں پاکستان کے" اس نے گورے چٹے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ پال سنگھ ہے۔ اس نے ان سے بات کی ہے۔ اسے ایک سو دس فیصد وشواس ہے کہ وہ پاکستانی تھے۔"

لمبے تڑنگے چوہدری نے گرج کے کہا "کس کمرے میں ٹھہرے تھے وہ؟۔۔۔ چل اٹھ۔۔۔ بتا۔"

اس نے بوٹا سنگھ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اسے برآمدے کی طرف دھکیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بوٹے کی ماں بہن اور خاندان کی دیگر عورتوں کے ساتھ نہایت نازیبا رشتے بھی جوڑتا جا رہا تھا۔ بوٹا انہیں پھر اسی کمرے میں لے آیا جہاں میں اور صفدر کھڑکی کی پڑچھتی پر اوندھے منہ لیٹے تھے۔ بالکل بے حس و حرکت اور سانس روکے ہوئے۔ موت اور زندگی کے درمیان گزوں کا نہیں انچوں کا فاصلہ تھا۔ میری انگلی خودکار رائفل کی لبلبی پر تھی اور آنکھیں کمرے میں داخل ہونے والوں پر لگی تھیں۔ وہ پورے کمرے میں دندنا رہے تھے۔ اور ہر شے کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ ایک دو افراد نے اچک کر پڑچھتی پر بھی جھانکا۔ وہاں تاریکی تھی اور یہ تاریکی ہماری ڈھال بنی ہوئی تھی۔ بڑی اعصاب شکن گھڑیاں تھیں یہ۔ ہمیں حواس پر قابو رکھنا تھا اور آخر وقت تک انتظار کرنا تھا۔

اچانک۔۔۔ بالکل اچانک بلا ٹل گئی۔ لمبا تڑنگا چوہدری اور سفید پوش افسر' بوٹا سنگھ کو مارتے پیٹتے کمرے سے باہر لے گئے۔ اب ان کی آوازیں صحن سے آ رہی تھیں۔ ان کے باہر نکلتے ہی چونکہ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تھا اس لیے یہ آوازیں صاف طور پر ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ بوٹا سنگھ سے گالی گلوچ کر رہے ہیں اور جوتے وغیرہ مار رہے ہیں۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اس سارے ہنگامے کے دوران بوٹا سنگھ کا بابو لحاف اوڑھے گہری نیند سویا رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ تیز نشے کا اثر تھا یا وہ جان بوجھ کر آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ بیدار ہوتا تو اسے بھی جوتے پڑ رہے ہوتے۔ اچانک مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے بڑے غور سے ہاتھ میں پکڑی رائفل کو دیکھا۔ میری چھٹی حس نے میری مدد کی اور میرا ہاتھ خود بخود رائفل کے میگزین کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے میگزین رائفل سے علیحدہ کیا۔۔۔ اور بھونچکا رہ گیا۔ میگزین خالی تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے رائفل اچھی طرح چیک کی تھی۔ وہ لوڈ تھی لیکن اب میگزین میں ایک گولی بھی نہیں تھی۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میگزین بوٹا سنگھ نے خالی کیا ہے۔ میں نے رائفل لحاف کے نیچے چھپائی تھی اور وہ لحاف کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اگر یہ کام اسی کمرے میں ہوا تھا (اور ظاہر تھا کہ اسی کمرے میں ہوا ہے) تو پھر بوٹا سنگھ کے سوا کسی کا نہیں تھا۔

صفدر نے بھی خالی میگزین دیکھ لیا تھا اور اب اس کی حیرت زدہ نگاہ مجھ پر مرکوز تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا "صفدر! یہ بوٹا کوئی بڑی کچی قسم کی شے ہے۔"

صفدر منمنایا "مجھے بھی اس پر شک ہو رہا ہے۔"

ہم اپنی جگہ گم صم لیٹے اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچتے رہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہم جتنے پُراعتماد تھے اب اتنے ہی ڈانواڈول ہو رہے تھے۔ تصادم تک نوبت پہنچتی تو ہمارے پاس ایک خنجر کے سوا اب اور کچھ نہیں تھا۔

صحن سے ابھرنے والی آوازیں چند منٹ بعد اچانک معدوم ہو گئیں۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ "مہمان" جا چکے ہیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ "میزبان" کو بھی باندھ کر ساتھ لے گئے ہیں یا چھوڑ گئے ہیں۔ دو تین منٹ بعد "چرررر" کی طویل آواز سے کمرے کا دروازہ کھلا اور بوٹا سنگھ اندر آگیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ خستہ حال لباس پھٹ کر کچھ اور خستہ حال ہو گیا تھا۔ کھیس جو ہر وقت اس کے کندھوں پر رہتا تھا اب بازو پر جھول رہا تھا۔ پاؤں کی پنی بھی خون آلود تھی۔ خبر نہیں پاؤں پر کیسی چوٹ لگی ہوئی تھی اسے۔ اس نے حملہ آوروں کو ماں بہن کی غائبانہ گالیاں دیتے ہوئے کمرے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ ہم پڑچھتی کے اوپر ہی بیٹھ گئے۔ میں گہری نظروں سے بوٹا سنگھ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بظاہر بالکل معمولی اور بے کار شخص نظر آتا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کسی وقت کچھ اور ہی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ایسے لمحات میں اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں نہیں لگتی تھیں۔

وہ نحیف آواز میں بولا "نیچے آ جاؤ۔۔۔ وہ چلے گئے ہیں۔"

میں اور صفدر سائیکل پر پاؤں رکھتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ بوٹا سنگھ گھگیا کر بولا "بھائیا جی! مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم کون ہو۔ بس اب مجھ پر اتنی کرپا کرو کہ یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم بڑے مجبور لوگ ہیں۔ اس سے زیادہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "بوٹے! ویسے تو اتنا کمزور بھی نہیں۔ جتنی مار تجھے پڑی ہے کوئی اور ہوتا تو لمبا لیٹ گیا ہوتا۔ تو اب بھی اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے۔"

بوٹا بولا "تو تم چاہتے ہو کہ میں لسابلیٹ جاؤں تو پھر ساں سے جاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم تمہارے احسان مند ہیں۔"

وہ ہمارے قریب آگیا اور کرتے کے دامن سے باچھوں کا خون پونچھتے ہوئے بولا "رکھنو بھایا جی۔ میں سیدھی ساری بات کرنی چاہتا ہوں۔ ہم لوگ بھارت سرکار کے کھلاف ہیں۔ اگر تم پاکستانی ہو تو تم بھی بھارت سرکار کے کھلاف ہو۔ اس طرح ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ گرو کی سوگند' اگر میرے بس میں ہوتا تو اس سے بڑھ کر تمہاری مدد کرتا لیکن یہ چودھری رام سنگھ بڑا جالم آدمی ہے۔ بندے کو ایسی مار مارتا ہے کہ جان سے ماردیتا ہے' اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ پتا نہیں یہ میری بھُول ہے یا پھر ہر کوئی موت سے اسی طرح ڈرتا ہے۔"

میں اور صفدر ٹک ٹک بوٹا سنگھ کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس طرح کا آدمی ہے۔ اس نے لحاف کا کونا اٹھا کر اپنے باپو کو دیکھا اور اسے سوتا پاکر مطمئن انداز میں سرہلایا۔ پھر وہ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس کا جائزہ کرتے اس قدر پھٹ چکا تھا کہ اس نے اتار دینا ہی مناسب سمجھا۔ میلی کچیلی بنیان میں اس کا سوکھا سڑا جسم عجیب مضحکہ خیز منظر پیش کررہا تھا۔ تاہم بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا کہ یہ جسم سوکھا سڑا ہونے کے باوجود جلی ہوئی اینٹ کی طرح سخت ہے۔ انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر وہ دھیمے لہجے میں بولا "اگر تم پاکستانی ہو اور تمہیں یہاں مدد وغیرہ کی جرورت ہے تو تمہارے لیے سب سے اچھا اور سب سے مخفوج (محفوظ) ٹھکانا ایک ہی ہے۔ سیدھے فرید کوٹ چلے جاؤ' بابو لیاقت علی کے پاس۔"

"یہ بابو لیاقت علی کون ہے؟" ہم نے گویا اس سوال کے ساتھ ہی تسلیم کرلیا کہ ہم پاکستانی ہیں۔

"بڑا اثر رسوکھ والا بندہ ہے۔ کسی بڑی کچہری میں وکالت کرتا ہے۔ فرید کوٹ میں اس کی بیٹھک بہت مشہور ہے۔ مجھے ایک بڑے کھاص بندے نے بتایا تھا کہ بابو لیاقت کے پاس پاکستانیوں کا آنا جانا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم۔ اگر تم چاہتے ہو تو میں تمہیں اس کا پتا بھی دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "اگر ایسا ہوجائے تو بہت اچھی بات ہے۔"

بوٹا سنگھ ساتھ والے کمرے میں گیا اور ذرا ہی دیر بعد ایک چٹ کے ساتھ واپس آگیا۔ چٹ پر فرید کوٹ کا ایک ایڈریس درج تھا' اس کے علاوہ لکیریں کھینچ کر اس مقام کی نشاندہی کردی گئی تھی جہاں بابو لیاقت علی کی بیٹھک تھی۔ بوٹا سنگھ نے ہمیں زبانی بھی سمجھادیا۔ اس کے لہجے سے خلوص کی مہک آرہی تھی۔ اسے سو فی صد یقین تھا کہ ہم جو کوئی بھی ہیں اور ہمیں جیسا بھی مسئلہ درپیش ہے' بابو لیاقت علی کے پاس جاکر ہم مایوس نہیں ہوں گے۔ اور واقعی اس وقت ہمیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ہم سے بہت دور بھی نہ ہو اور جس کے پاس پہنچ کر ہم کم از کم ایک دو دن کے لیے خود کو محفوظ تصور کرسکیں۔ بوٹا سنگھ جس انداز سے بابو لیاقت علی کا ذکر کررہا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ شخص ہمارا مسئلہ حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم بوٹا سنگھ سے رخصت ہورہے تھے۔ بوٹا سنگھ کا خیال تھا کہ بیرونی دروازے سے باہر جانا ہمارے لیے مناسب نہیں کیونکہ ممکن ہے چودھری رام سنگھ ایک آدھ بندے کو مکان کی نگرانی پر چھوڑ گیا ہو۔ وہ ہمیں برآمدے میں لایا برآمدے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ یہ کھڑکی گلی میں کھلنے کے بجائے ساتھ والے مکان میں کھلتی تھی۔ اکثر دیہات میں پڑوسی ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے لیے ایسے راستے بنا چھوڑتے ہیں۔ یہ کھڑکی ہمیں جس مکان میں لائی وہ خالی پڑا تھا۔ ایک بیلے تیلے سے بے صحن میں بیری کے بے شمار پتے بکھرے تھے اور چاندنی میں چمک رہے تھے۔ ایک بلی ٹوٹے ہوئے چولہے کے پاس خاموش بیٹھی تھی۔ چولہے کے بالکل قریب سے مٹی کی سیڑھیاں چھت پر جاتی تھیں۔ بوٹا سنگھ دبی آواز میں بولا "سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر چلے جاؤ۔ کوٹھے کے پچھواڑے رُوڑی (کوڑے کا ڈھیر) ہے۔ اس پر چھلانگ لگاکر کھیتوں کی طرف نکل جانا۔ اور ایک بات پھر تم سے کہتا ہوں۔ سیدھا بابو لیاقت کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس تمہارے ہر دکھ کا دارو ہوگا۔"

"یار! تم نے بڑی مار کھائی ہے ہمارے واسطے" میں نے افسردگی سے کہا۔

"یہ مار تو ہر مجبور بندے کا مقدر ہے مجن جی۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "تم اپنا من دُکھی نہ کرو۔ اچھا رب راکھا۔"

وہ الوداعی انداز میں پہلے صفدر سے اور پھر مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اس کا سر میرے سینے پر آرہا تھا۔ جب وہ مجھ سے بغلگیر ہوا' میں نے محسوس کیا کہ کوئی چیز بڑی آہستگی کے ساتھ میری قمیص کی سائڈ پاکٹ میں پھسل گئی ہے۔ ایک لمحے میں' میں

جان گیا کہ یہ کیا شے ہے۔

"اچھا رب راکھا" میں نے بوٹے کا استخوانی شانہ تھپکا۔

میں اور صفدر سیڑھیوں کی طرف بڑھے چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد صفدر نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا۔ میں اس ٹہوکے کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں بوٹا سنگھ سے گولیوں کے متعلق پوچھنا بھول رہا ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔ مجھے سب کچھ یاد تھا۔ میں نے صفدر کا ہاتھ دباکر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر آگئے۔ بوٹا سنگھ کی اطلاع کے مطابق چھت کے عقب میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر موجود تھا۔ دیہات میں کوڑے کے ڈھیر گندگی کے ڈھیر نہیں ہوتے۔ ہم اطمینان سے اس کوڑے پر کودے اور دیواروں کے سائے سائے چلتے کھیتوں کی طرف نکل آئے۔ سرسوں کے ایک سرسبز کھیت سے گزر کر جب ہم کماد کے بلند قامت کھیتوں میں داخل ہوئے' ہمیں اطمینان ہوگیا کہ بحفاظت گاؤں سے نکل آئے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ مجھ سے معانقے کے دوران ہی بوٹا سنگھ نے جو شے میری جیب میں داخل کی ہے وہ رائفل کی گولیاں ہیں۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک موم لفافے میں لپٹی ہوئی گولیاں میرے ہاتھ میں آگئیں۔

"یہ کیا ہے؟" صفدر نے چونک کر پوچھا۔

"جس کے لیے تم مجھے ٹہوکے دے رہے تھے" میں نے کہا۔

"یہ یہ آپ کی جیب میں کیسے آگئیں؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"بوٹا سنگھ نے معانقہ کرتے ہوئے ڈال دی ہیں۔"

چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے' پھر صفدر نے کہا "بوٹا سنگھ وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "اس دنیا میں ہر شخص ایسا ہی ہے۔ ہر سینے میں کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے۔ ہر چار دیواری میں کوئی داستان لکھی جارہی ہے۔ جب ایسی تاریک راتوں میں بندہ گھر سے نکلتا ہے تو ہر قدم پر ایک افسانے سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کھیت ہی دیکھو جس میں ہم چل رہے ہیں۔ معلوم نہیں اس کھیت میں کتنی کہانیاں پلی ہیں۔ اس کھیت میں دو پگلی لڑکیاں آتی ہوں گی جنہوں نے راز و نیاز کی باتیں کی ہوں گی' دو پیار کرنے والے داخل ہوئے ہوں گے جنہوں نے ایک دوسرے کی بانہوں میں پناہ لی ہوگی' دو جوان آئے ہوں گے جنہوں نے دشمن پر ٹوٹ پڑنے کے منصوبے بنائے ہوں گے۔ پھر اس کھیت میں اس لڑکی کی سسکی گونجی ہوگی جو اپنے زخم زدہ محبوب سے آخری بار ملنے آئی ہے۔ اس کھیت میں وہ سہاگن روئی ہوگی جس کا غیرت مند شوہر عمر قید کاٹتا ہے اور ہوسکتا ہے کسی شب اس کھیت میں وہ لاش بھی دبائی گئی ہو جس کا سراغ کبھی نہیں ملا۔"

صفدر مسکرایا "آپ تو اچھے بھلے شعر لکھ سکتے ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر آپ کے کندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کچھ عجیب سی لگنے لگی ہے۔ جیسے شبنم رومانی کے ڈرائنگ روم میں حنوط شدہ شیر رکھا ہو۔ یا پھر بانسری پر جنگی ترانہ بجایا جارہا ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں آزادی ہے۔ جو چاہو سمجھ سکتے ہو۔"

"لیکن بوٹا سنگھ کے بارے میں کیا سمجھا جائے" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ بہت الجھن زدہ نظر آرہا تھا وہ۔

کھیتوں کھیتوں ایک طویل چکر کاٹ کر ہم سڑک تک پہنچے اور پھر سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ٹرک کی طرف روانہ ہوگئے۔ چاندنی میں درختوں کے سائے بڑے پُراسرار لگ رہے تھے۔ کیا کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سے کس درخت کے پیچھے کوئی دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے۔ سڑک کے کنارے ایک سنگ میل پر ہمیں لال سنگھ عرف لالی کا نام بھی لکھا نظر آیا۔ کسی من چلے نے اپنے جذبات کا اظہار چاکنگ سے کیا تھا اور لالی کے بارے میں کئی پُرجوش نعرے لکھ دیے تھے۔ کافی مانتے تھے یہاں کے لوگ لالی کو۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ بی ایس ایف والوں نے چودھری کے کارندوں کے ساتھ مل کر قرب و جوار میں ٹرک کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہو اور جب ہم ٹرک تک پہنچیں' وہاں کایا پلٹ چکی ہو۔ جوں جوں ہم اپنی منزل سے قریب ہورہے تھے' بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے اب رائفل لوڈ کرلی تھی اور فوری استعمال کے لیے اس کا سیفٹی کیچ بنا لیا تھا۔ پانچ منٹ کا راستہ ہم نے بڑے محتاط قدموں سے دس منٹ میں طے کیا۔ بالآخر ہم درختوں کے جھنڈ میں پہنچے اور کچھ فاصلے پر ہمیں ٹرک کا سامنے والا حصہ نظر آنے لگا۔ میں نے زریں گل کو دیکھا۔ اس نے ٹرک کے پاس ہی تھوڑی سی آگ جلا رکھی تھی۔ وہ آگ کے پاس کھڑا تھا۔ پھر مجھے اس کے ہاتھ میں پانی کا ڈبا نظر آیا۔ وہ اس پانی سے آگ پر چھینٹے دے رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کوئی دکھائی نہیں دیا۔

ہم درختوں کی اوٹ سے نکل کر زریں گل کے پاس پہنچ گئے۔ آگ اب مکمل طور پر بجھ چکی تھی اور ہم صرف ٹارچ کی روشنی میں ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتے تھے۔ زریں گل کے چہرے پر پریشانی تھی۔

وہ بولا "شکر ہے خدا کا آپ لوٹ آئے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" صفدر نے پوچھا۔

"کوئی گڑبڑ ہے ادھر" زریں گل نے انکشاف کیا "ابھی تھوڑا ٹائم پہلے ہم کو وہاں درختوں میں لالٹین کا روشنی نظر آیا۔ یوں لگا جیسے کوئی چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ ہم دیکھنے کے لیے گیا تو کوئی ایک دم بھاگ اٹھا۔ وہ کچھ آگے گیا تو اس کے ساتھ ایک اور شخص مل گیا پھر وہ دونوں ایک کھیت میں گم ہو گیا۔"

میں نے پوچھا "رنجیت کہاں ہے؟" زریں گل نے بتایا کہ وہ کیبن میں ہے۔ میں نے کہا "چلو فٹافٹ ٹرک میں بیٹھو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

زریں گل سمجھ گیا کہ ہم بھی کسی گڑبڑ کے نتیجے میں یہاں پہنچے ہیں ورنہ ہمیں صبح آنا تھا۔ وہ اور صفدر فوراً کیبن کی چھت پر چلے گئے۔ میں اچک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ چند ہی لمحے بعد ہمارا ٹرک اس راستے پر رواں تھا جس پر ہم رات کے پہلے پہر بھی "رواں" ہوئے تھے۔ ہماری گھڑیوں کے مطابق اب رات کے ڈھائی بجے تھے۔ اُمید کی جاسکتی تھی کہ نہر کے پل پر لگا ہوا ناکا اب کھل گیا ہوگا۔ بہرحال اب صورتِ حال مختلف ہو چکی تھی اگر ناکا نہ بھی کھلا ہوتا تو ہم واپس یہاں نہیں آسکتے تھے بلکہ اس علاقے میں بھی نہیں رک سکتے تھے۔ کسی بھی طرح ہمیں اس جگہ سے نکل جانا تھا۔ پختہ سڑک پر آنے کے بعد میں نے حسب سابق ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ بڑے محتاط انداز میں ہم اس مقام تک پہنچے جہاں رکشہ والے نے ہمیں چیکنگ سے آگاہ کیا تھا۔ ٹرک کو درختوں میں اتار کر میں نے انجن بند کر دیا اور صفدر کو ناکے کی طرف بھیجا۔

یہ بات یقینی تھی کہ بی ایس ایف والے قرب و جوار میں مشتبہ ٹرک کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ عین ممکن تھا کہ جو افراد ٹرک کو دیکھ کر واپس گاؤں کی طرف بھاگے، وہ چوہدری رام سنگھ کے لٹھ بردار کارندے ہوں۔ آگے چل کر اس سے بدتر حالات پیش آسکتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ بی ایس ایف والوں نے قرب و جوار کی چیک پوسٹس اور تھانوں کو ٹرک کے حوالے سے چوکس کر دیا ہو۔ رنجیت اب جاگ گیا تھا اور گٹھڑی لپیٹ کر میرے برابر بیٹھا تھا۔ اسے پہلو میں دیکھ کر مجھے گونا گوں تسلی ہو رہی تھی۔ ہو بہو سکھ نظر آتا تھا وہ۔

صفدر تقریباً پانچ منٹ بعد دوڑتا ہوا واپس پہنچا۔ وہ بری طرح ہانپا ہوا تھا۔

"چلیں جی۔۔۔ نکل چلیں۔ پُل خالی ہے" اس نے خوش خبری سنائی۔ میں نے فوراً ٹرک اسٹارٹ کیا اور پل کی طرف بڑھنے لگا۔

○☆○

بوٹا سنگھ کے بیان کے مطابق فرید کوٹ کا فاصلہ ساٹھ پینسٹھ کلو میٹر تھا۔ اگر ہم معمولی رفتار سے جاتے تو بھی ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے تھے لیکن اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں ہم نے فرید کوٹ کی جانب صرف بیس کلو میٹر طے کیے۔ یہ سفر سُست ہونے کے علاوہ بے حد اعصاب شکن بھی تھا۔ ہم نے ٹرک کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔ کئی مقامات پر ہم نے ٹرک کو سڑک سے نیچے اتارا اور اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد آگے بڑھے۔ کیبن کی چھت پر صفدر اور زریں گل مشین گن کے پیچھے بالکل چوکس بیٹھے تھے اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر میدانِ کارزار گرم کر سکتے تھے۔ تاہم ناکے سے بیس پچیس کلو میٹر آگے نکلنے کے بعد ہمارے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ ہمیں محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہمارے اردگرد کوئی خطرہ موجود ہی نہیں اور ہم یہ پاکستانی ٹرک اسی طرح چلاتے ہوئے میرٹھ بھی پہنچ جائیں تو کوئی ہمیں پوچھے گا نہیں۔

کچھ دیر بعد صفدر بھی نیچے کیبن میں آگیا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں، کہنے لگا "نشے باز کی بات پر اعتبار کر کے چل پڑے ہیں، خدا خیر ہی کرے" اس کا اشارہ بوٹا سنگھ کی طرف تھا۔

میں نے کہا "بوٹا سنگھ نشے باز تو ہے لیکن معمولی نشے باز نہیں ہے۔"

صفدر بولا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے چالاکی دکھائی ہو اور صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے ہمیں فرید کوٹ اور بابو لیاقت کا جھانسا دیا ہو۔"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے" میں نے تائید کی "لیکن اگر اس نے جان چھڑانے کے لیے اتنی تیزی سے ایسا بیانہ گھڑا ہے تو بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ غیر معمولی شخص ہے۔ جو نظر آتا ہے وہ ہرگز نہیں ہے۔"

"مجھے تو کسی وقت۔۔۔ ایک اور شک بھی ہوتا ہے" صفدر نے کش لے کر کہا "ہو سکتا ہے وہ ببر خالصہ یا اکالی دَل وغیرہ کا خاص بندہ ہو اور خود کو شک شبے سے بچانے کے لیے اس نے یہ الٹی والا بہروپ بھر رکھا ہو۔" پھر ایک نیا خیال صفدر کے ذہن میں آیا، کہنے لگا "جیون سنگھ رکشا والے نے

بتایا تھا کہ لال سنگھ لالی اکیلا کام نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ تین چار خاص بندے ہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے یہ بوٹا سنگھ ان خاص بندوں میں سے ہی ایک ہو۔"

میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر اور نگاہیں سڑک پر جمی تھیں، میں نے کہا "میرا خیال ہے ہم اس سے بھی آگے سوچ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب!" صفدر نے پوچھا۔

"ممکن ہے۔۔۔ یہ بوٹا سنگھ ہی۔۔۔ لال سنگھ لالی ہو۔"

صفدر سناٹے میں رہ گیا اور حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "ایک بات شاید تمہارے ذہن سے نکل گئی ہے لیکن میرے ذہن میں ابھی تک ہے۔ جیون سنگھ نے لالی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ پہلے پہل جیب تراشی کیا کرتا تھا۔۔۔ کیا تمہیں بوٹا سنگھ میں کسی جیب تراش کی جھلک نظر نہیں آئی؟ اکثر جیب تراشوں کی طرح وہ دبلے پتلے جسم کا چھریرا سا بندہ ہے۔ پھر اس نے جس صفائی سے ہماری گن خالی کی اور پھر گولیاں میری جیب میں ڈالیں، وہ کسی "ماہر فن" کا کام لگتا ہے۔ تمہاری سوچ کا تو پتا نہیں لیکن میری سوچ خود بخود لال سنگھ کی طرف جانے لگتی ہے۔"

صفدر کی نگاہوں میں غالباً بوٹا سنگھ کا مدقوق مجہول چہرہ گھوم رہا تھا، کہنے لگا "یقین نہیں آرہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یقین سے تو میں بھی نہیں کہہ رہا۔ ایک خیال سا ہے، جیسے تمہارا خیال ہے کہ بوٹا سنگھ لال سنگھ لالی کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ لال سنگھ لالی کا ساتھی بھی ہے تو یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ ان لوگوں نے مقامی پولیس اور بی ایس ایف کو رخت ڈالا ہوا ہے۔"

ہم دونوں خاموشی سے اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے۔ ظلم اور انتقام کی کہانی، عالمگیر کہانی ہے۔ کرۂ ارض میں جہاں جہاں انسان آباد ہے وہاں وہاں یہ کہانی موجود ہے۔ بوٹا سنگھ کے گھر میں بھی یہی کہانی دُہرائی گئی تھی۔ نشے میں چُور سب انسپکٹر تلک رام اس کے گھر میں گھسا تھا۔ اس نے بوٹا سنگھ کی جوان بھانجی کو زندہ درگور کیا تھا اور اس کی ماں کا سینہ چیرا تھا۔ اس کے بعد بوٹا سنگھ کے مفرور بھائی کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ "ظلم" اپنی تکمیل کو پہنچ گیا تھا لیکن انتقام کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن نہیں "انتقام" موجود تھا۔ وہ کہیں آس پاس ہی پھنکار رہا تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ وہ بوٹا سنگھ کے سوکھے سڑے جسم میں ہی پھنکار رہا ہو۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر میں تصور کی نگاہ سے ایک منظر دیکھ سکتا تھا۔ یہ منظر کسی بھی وقت وجود میں آنے والا تھا۔ یہ سب انسپکٹر تلک رام کی لاش کا منظر تھا۔ یہ مسخ لاش کسی کھیت، کسی پگڈنڈی، کسی کھالے یا پُل پر پڑی تھی اور دیکھنے والے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "لال سنگھ لالی بندو تھانیدار کو مار گیا۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی" صفدر نے کہا اور اس کی آواز سن کر میں اپنے خیال سے چونک پڑا۔

"کیسی بات؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اس ہوم گارڈ نے ہم کو پہچان کیسے لیا۔ جہاں تک شکل و صورت اور حلیے کا تعلق ہے ہم پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس شخص سے ہم نے بات بھی بالکل ٹھیٹ اور مقامی لہجے میں کی تھی۔"

صفدر کی ذہانت اسے اکسا رہی تھی کہ وہ ایک الجھے ہوئے معمے کو حل کرے۔ میں نے اسے اس الجھن سے نکالنا مناسب سمجھا۔ میں نے کہا "تمہیں یاد ہے اس شخص نے ہم سے ٹائم پوچھا تھا؟" صفدر نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "بس وہیں ہم غلطی کر گئے۔ ہم نے اسے ساڑھے دس کا وقت بتایا تھا جبکہ ساڑھے دس نہیں بجے تھے۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مطلب یہ کہ اس وقت انڈیا کی گھڑیوں کے مطابق گیارہ بجے تھے۔ ہماری گھڑیوں پر پاکستانی ٹائم تھا۔ ظاہر ہے اسے تھوڑا بہت شک تو ہم پر ہوا تھا جو وہ ہمارے پیچھے آیا تھا۔ جب ہم دونوں نے بھی اتفاقاً اسے پاکستان کا ٹائم بتا دیا تو اس کا موہوم شبہ ایک دم یقین کی حد کو چھو گیا۔"

"او گاڈ" صفدر نے پیشانی پر ہاتھ مارا "اس بھاگ دوڑ نے ذہن چکرا دیا ہے، یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔"

اچانک اسے خاموش ہونا پڑا۔ ایک موڑ پر بالکل اچانک پولیس ناکا سامنے آگیا تھا۔ پولیس والوں کی سبزی مائل وردیاں دیکھ کر میری انگلیوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یہاں پولیس جیپ بھی موجود تھی اور اہلکار بھی مسلح نظر آرہے تھے۔ یہ ناکا "عام" بھی ہو سکتا تھا اور "خاص" بھی۔ (یعنی خاص ہمارے لیے بھی) اگر یہ خاص ہمارے لیے تھا تو صورتِ حال زیادہ سنگین تھی۔ ہمارے لیے ٹرک روکنا ضروری ہو چکا تھا۔ میں نے زریں گل کو پکار کر کہا "زریں گل! جب تک ہم فائر نہ لیں تم گولی نہیں چلاؤ گے۔"

زریں گل نے کہا "بالکل نہیں چلائے گا۔ ویسے بھی ایسے سوکھے سڑے لوگوں پر اتنا مہنگا گولی چلانا بے کار ہے۔"

جونہی ہم قریب پہنچے، ایک اوور کوٹ والے سنتری نے ٹارچ کی حرکت سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ دو رائفل مین

ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ٹرک کی رفتار اس وقت چالیس کلومیٹر کے قریب تھی۔ ٹرک روکتے روکتے میں کچھ آگے لے گیا۔ ایک رائفل مین بڑے شاہانہ انداز میں ٹہلتا ہوا ٹرک تک پہنچا۔ یہ ایک فربہ اندام سکھ تھا۔ رنگ سیاہ اور رخساروں پر چیچک کے داغ تھے۔ میں نے ٹرک سے نیچے اتر کر اسے ست سری اکال کہا۔ بہت رعونت سے جواب دے کر اس نے کاغذات طلب کیے۔

پولیس والے کا انداز دیکھ کر مجھے اتنی تسلی ضرور ہوگئی کہ یہ کوئی عام ناکا ہے جہاں معمول کی چیکنگ ہو رہی ہے اور بس ٹرک وغیرہ کے ڈرائیوروں سے پیسے بٹورے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ”سرکار! کاغذات تو بالکل پورے ہیں لیکن بڑی ایمرجنسی میں جا رہا ہوں جی۔“

”کیا ایمرجنسی ہے؟ تیری بیٹی کو بچہ ہونے والا ہے؟“

”بیٹی تو ابھی واگورو نے دی ہی نہیں بادشاہو! بس ادھر اُدھر سے کام چلا رہے ہیں۔ دراصل میرا ہیلپر ہے اندر، اس کی ٹانگ میں گردے کا بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔ تڑپ تڑپ جا رہا ہے۔ دس بیس منٹ اور اسپتال نہ پہنچا تو سورگ باشی ہو جائے گا۔“

طے شدہ پروگرام کے مطابق اندر سے رجیت دلدوز آواز میں کراہا ”اوئے ربا میں مر گیا۔ اوئے میرا کچھ کرلو۔“

رائفل مین نے آگے بڑھ کر ٹرک میں جھانکا۔ رجیت اوندھے منہ نشست پر پڑا تھا۔ رائفل مین بولا ”اوئے! اس خانہ خراب کا گردہ اس کی ٹانگ میں ہے؟“

میں نے کہا ”مجھے تو ٹھیک سے پتا نہیں جی۔ ابھی دس پندرہ دن ہی ہوئے ہیں مجھے اس کے ساتھ چلتے ہوئے۔ کہتا ہے کمر سے درد اٹھتا ہے اور ٹانگ میں جاتا ہے۔“

رائفل مین نے کہا ”عجیب پاگل خانے ہو بھئی، تم دونوں۔ ہم نے تو اب تک یہی سنا تھا کہ گردے کا درد کمر میں ہوتا ہے۔“ رجیت نے ایک بار پھر دردناک انداز میں ہائے وائے کی۔ رائفل مین بولا ”بہرحال میں تمہیں اسپتال جانے سے نہیں روکتا۔ اس بندے کو کسی دوجی گاڑی میں ڈالو اور اسپتال پہنچا دو۔“

”دوجی گاڑی میں؟ وہ کس لیے؟“

”یہ گاڑی بند ہوگی“ وہ خطرناک لہجے میں بولا ”آگے پیچھے سے تمہاری کوئی نمبر پلیٹ نظر نہیں آرہی۔ یہ سائڈ کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ اوپر سے تم گولی کی رفتار سے اڑے جا رہے ہو۔ کس جگہ سے آیا ہے یہ ٹرک؟“

میں نے عاجزی سے کہا ”مہاگرو دو سرکار۔ نمبر پلیٹ ہی کیا سارا ٹرک کپڑے سے بھرا ہوا ہے۔ باقی کاغذات سارے پورے ہیں۔ ایک ایک کاغذ دکھا سکتا ہوں آپ کو۔ لیکن اتنی دیر میں یہ بندہ مر جائے گا۔“

میں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا اور جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر پولیس والے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ یوں اچھلا جیسے کرنٹ لگا ہو ”اس کی بتی بنا کر اپنے ہیلپر کو دے دے۔ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوٹنے کی تمہاری۔ یہ گاڑی تھانے میں بند ہوگی“ وہ دانت پیس کر بولا۔

بالکل وہی مکالمے تھے جو ہم لاہور، راولپنڈی اور کراچی وغیرہ کی سڑکوں پر اکثر سنتے رہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ کام بن سکتا ہے۔ پچاس پچاس کے دو اور نوٹ میں نے جیب سے کھینچے تو پولیس والے کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوگئی۔ اور یہ طوفان بلا خیز جتنی تیزی سے نمودار ہوا تھا اتنی ہی سرعت سے غائب ہوگیا۔ نوٹ جیب میں ٹھونس کر رائفل مین ایک طرف ہٹ گیا۔ جونہی وہ ناکے کی طرف واپس مڑا، میں اچک کر ٹرک میں سوار ہوا اور ٹرک آگے بڑھا دیا۔ بہت کم قیمت وصول کی تھی ان پولیس والوں نے اس ٹرک کو چھوڑنے کی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا قیمت لے کر کیا شے چھوڑ رہے ہیں تو شاید باقی کی تمام عمر افسوس میں ہاتھ ملتے رہتے۔ ناکے سے قریباً ڈیڑھ سو گز آگے جانے کے بعد ہمیں ”ویل کم“ کا ایک بڑا بورڈ نظر آیا۔ ہم بلاشبہ فرید کوٹ کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔

فاضلکا کی طرح فرید کوٹ بھی ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں سے فیروز پور تیس چالیس کلومیٹر کے قریب ہے۔ فرید کوٹ میں زیادہ آبادی سکھوں کی ہے۔ اس سے پہلے کبھی میرا فرید کوٹ آنا نہیں ہوا تھا لہٰذا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کون سی سڑک کدھر جاتی ہے۔ اندازِ وقت کے مطابق اب صبح کے چھ بج چکے تھے۔ ملگجا اُجالا دھیرے دھیرے تاریکی پر غالب آرہا تھا۔ کچے پکے راستوں پر سحر خیز افراد مثلاً اخبار فروش، دودھ فروش، قصاب اور پھل فروش آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے ہمارے ٹرک پر اچٹتی سی نظر ڈالی لیکن جو شے ٹرک کے اندر تھی اس پر کسی کی نگاہ پڑ سکتی تھی نہ اس تک کسی کا تصور پہنچ سکتا تھا۔

شہر میں داخل ہونا ہمارے لیے کسی صورت مناسب نہیں تھا۔ میں دھیمی رفتار سے جا رہا تھا اور ٹرک روکنے کے لیے کوئی مناسب جگہ بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر ایک ایسی جگہ نظر آگئی۔ سڑک سے کافی ہٹ کر یہ درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ایک پرانا سا گردوارا بھی یہاں بنا ہوا تھا۔ دور ہی سے پتا

چلتا تھا کہ گردوارا اب آباد ہے۔ میں نے ٹرک کو سڑک سے اتارا اور گردوارے کے عقب میں لے گیا۔ یہ جگہ ہماری ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ٹرک ان درختوں اور گری پڑی دیواروں میں یوں سما گیا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی۔

ٹرک روکتے ہی میں نے اس کا بونٹ اٹھا دیا اور ٹول بکس میں سے چند اوزار نکال کر یہاں وہاں بکھیر دیے۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے منور نے ٹرک کے نیچے چٹائی بچھا دی اور چٹائی پر بھی چند اوزار رکھ دیے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ہاتھ اور زریں گل کا ”منہ“ بھی کالا کر دیا۔ اب اگر یہاں کوئی بھولا بھٹکا شخص نکل بھی آتا تو اسے یہ پوچھنے یا سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے دورانِ سفر ٹرک خراب ہوگیا تھا اور وہ اس کی ”خرابی“ سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں شہر جاتا ہوں اور بابو لیاقت علی کا کھوج لگاتا ہوں۔ منور ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے خود ہی ارادہ بدل دیا۔ وہ یہ بات سمجھ گیا تھا کہ ہم دونوں میں سے ایک کا ٹرک پر رہنا بہت ضروری ہے۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ ٹرک پارک کرنے کے لیے ہمیں ایک نہایت مناسب جگہ مل گئی تھی۔ یہ زمین بے آباد اور کلری تھی۔ قرب و جوار میں کوئی کھیت نظر آتا تھا نہ راستے۔ درخت بھی بس وہ تھے جو کلری زمین پر زندہ رہ سکتے ہیں۔ شکستہ گردوارے میں تو شاید اب واہگورو بھی نہیں آتا تھا۔ بہرحال ہم کسی امکان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے منور کو سمجھا دیا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی اور انہیں ٹرک یہاں سے نکالنا پڑا تو وہ میرا انتظار کس جگہ کریں گے۔ ہم نے فاضلکا جانے والی سڑک پر فرید کوٹ کی جانب سے دسویں سنگِ میل کی نشانی رکھی۔

اس موقعے پر میں نے اپنا ڈرائیورانہ لباس منور سے تبدیل کر لیا۔ خودکار رائفل ہلکی پھلکی اور چھوٹی نال کی تھی۔ اسے بغل کے نیچے چھپانے میں مجھے حسب سابق کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نقدی میرے پاس موجود تھی اور بابو لیاقت علی کا ایڈریس بھی۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور گردوارے کے عقب سے نکل آیا۔

چار پانچ فرلانگ پیدل چلنے کے باوجود مجھے کوئی سواری نہیں ملی۔ ایک دو ٹیکسی کاریں قریب سے گزریں لیکن وہ میرے کام کی نہیں تھیں۔ ڈرائیوروں والے خستہ حلیے کے ساتھ میں ٹیکسی کار میں بیٹھتا تو مشکوک ٹھہرتا۔ میرے لیے سب سے مناسب سواری بس تھی جس میں بندہ ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی غور سے اس کی طرف دیکھتا ہے نہ گفتگو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس میں ایک خطرہ بھی پنہاں تھا۔ میں چادر تلے رائفل چھپائے ہوئے تھا اور ہجوم میں اس رائفل کا آہنی لمس کسی کو چونکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ بہرطور مجھے بس میں ہی بیٹھنا پڑا کیونکہ وہ مہیا ہوگئی تھی۔ ۳۰ پیسے کا ٹکٹ لے کر میں اسٹیشن کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ یہ شہر کا بارونق حصہ تھا۔ ساڑھے آٹھ نو کا ٹائم ہو چکا تھا لیکن جتنی رونق نظر آنی چاہیے تھی، آتی نہیں تھی۔ اکثر دکانیں بھی بند نظر آرہی تھیں۔ ایک خوش باش خوانچہ فروش سکھ سے باتوں کے دوران پتا چلا کہ آج اتوار ہے۔ درحقیقت دنوں اور تاریخوں کا حساب کتاب ہمارے ذہنوں سے بالکل نکلا ہوا تھا۔ مختلف لوگوں سے مقامی لہجے میں پوچھتا پاچھتا میں ”گاندھی اسکوائر“ پہنچا اور وہاں ایک دو گلیوں سے گزر کر بابو لیاقت کی بیٹھک پر پہنچ گیا۔ یہ شہر کا گنجان آباد حصہ تھا۔ ایک نیم تاریک گلی میں لوہے کا بڑا سا پھاٹک تھا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی کالے رنگ کا لیٹر بکس تھا۔ لیٹر بکس پر ایڈووکیٹ لیاقت علی بابو کے الفاظ درج تھے۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کو باہر سے تالا لگا ہوا ہے۔ ایک بارہ تیرہ سالہ سکھ لڑکے نے پوچھا ”کس سے ملنا ہے بھاجی؟“

میں نے بابو لیاقت کا نام لیا۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ شام کے بعد بیٹھک میں آتے ہیں لیکن آج اتوار ہے اس لیے ڈھائی تین بجے تک آجائیں گے۔

اس دوران ایک ہندو لڑکا بھی ہمارے قریب آن کھڑا ہوا۔ لڑکوں کے لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ علاقے میں بابو لیاقت کی کافی عزت ہے اور ایسے شخص کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو بابو لیاقت سے ملنے پہنچا ہو۔ بابو لیاقت کا گھر شہر کے ایک متمول علاقے میں تھا اور لڑکوں نے وہاں کا جو ایڈریس بتایا وہ بھی خاصا پیچیدہ تھا لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ بیٹھک میں ہی بابو لیاقت کا انتظار کیا جائے۔

میری گھڑی اب ساڑھے دس بجا رہی تھی۔ میں کچھ دیر یونہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ پھر ایک سینما ہال میں گھس گیا۔ بارہ سے تین کا شو چلنے والا تھا۔ بابو لیاقت کو بھی تین بجے آنا تھا لہٰذا یہ ”مصروفیت“ عین حسب حال تھی۔ فلم سازی انڈیا کی اہم ترین صنعتوں میں سے ہے۔ یہاں کے اکثر سینما ہال وسیع و عریض اور سجے سنورے ہوتے ہیں۔ میں اسٹال کا ٹکٹ لینا چاہتا تھا لیکن وہ ختم ہو چکا تھا، مجبوراً گیلری کا ٹکٹ لینا پڑا۔ یہ بھری پُری گیلری کافی بلندی پر واقع تھی۔ یہاں سے ہال میں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ کسی مینار پر چڑھے

بیٹھے ہیں۔ پچھلے دس پندرہ منٹ سے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد کچھ گڑبڑ ہے۔ جب میں نے گیلری میں آکر نشست سنبھالی اور میرے دائیں بائیں دو چینٹ کوٹ والے سردار صاحبان آکر بیٹھے تو میرا شبہ تقویت پکڑنے لگا۔ میں بے کار سے لباس میں تھا اور خوش پوش لوگ ایسے افراد کے ساتھ بیٹھنا خاص مجبوری کی حالت میں ہی پسند کرتے ہیں۔ فلم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ فلم سے پہلے سنگ تراشی کے بارے میں کوئی ڈاکومنٹری دکھائی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کے نوجوان لڑکیاں لڑکے ہندو دیومالا کے کرداروں کو مجسم کر رہے تھے۔ عریاں دیویاں، ننگے دیوتا، پھر ان کے شرمناک ملاپ کی منظر کشی۔ یہ وہ مناظر ہیں جو اہلِ مغرب "مخصوص" فلموں میں بھی سوچ سمجھ کر دکھاتے ہیں یہاں اہلِ مشرق انہیں مذہب کے نام پر دیکھ رہے تھے۔ ہندو معاشرے کی یہ کج روی قدم قدم پر نمایاں ہوتی ہے۔

جلد ہی مجھے ہال کی نیم تیرگی میں اپنے اردگرد پُراسرار نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میرا شبہ ہر گھڑی تقویت پکڑ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گرم چادر کے نیچے رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اسی دوران بائیں جانب بیٹھے سکھ نے میرے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس نے پہلی دستاویزی فلم پر مختصر سا تبصرہ کیا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کہاں سے آیا ہوں، کیوں آیا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میرے گرد حلقہ تنگ ہو رہا تھا اور میں اس "حلقے" کو صاف محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھی میں آخر وقت تک دیکھنا چاہتا تھا۔ دل کی گہرائی میں کہیں، یہ امید اب بھی موجود تھی کہ شاید میں غلط سوچ رہا ہوں۔

بائیں طرف بیٹھا سکھ عام سے انداز میں مجھ سے باتیں کر رہا تھا، دائیں طرف بیٹھے سکھ نے "عام سے انداز" میں ریوالور نکالا اور میرے پہلو سے لگا دیا "خبردار مہاشے! حرکت کی تو گولی چلا دوں گا" وہ بے حد سفاکی سے بولا۔ تاہم یہ آواز اتنی مدھم تھی کہ ساتھ کی نشست پر بیٹھا شخص بھی بہ مشکل سن سکا ہوگا۔ سارا ہال اپنے حال میں مست تھا۔ نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور "پوتر مناظر" کی دید سے دلوں میں گدگد ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہال کے بیچوں بیچ تین نشستوں پر کیا ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔ لاہور کا استاد جانی لاہور سے بہت دور ایک گرماگرم سنیما میں "فرید کوٹی" سکھوں کے زغے میں تھا۔

یکایک میں نے ریوالور پر ہاتھ مارا۔ ریوالور سکھ کے ہاتھ سے چھوٹا اور اس کے ساتھ ہی میرا دایاں مُکا بڑی شدت سے اس کے جبڑے پر لگا۔ بائیں طرف والے سکھ نے بڑے جوش کے عالم میں مجھے پکڑنا چاہا۔ میں نے نیچے جھک کر خود کو بچایا۔ وہ اپنے زور میں میری کمر پر گرا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور ایک ہی جھٹکے سے الٹا کر دوسری طرف پھینک دیا۔ میں نے اپنی طرف سے اسے "گیلری" میں ہی پٹخا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ گیلری میں نہیں گرا۔ جس رو میں ہم بیٹھے تھے اس کے بعد صرف ایک رو اور تھی۔ اور اس کے بعد ہال کی گہرائی تھی۔ قدِ مقابل پشت کے بل گیلری کے جنگلے سے ٹکرایا اور اچانک دوسری طرف لڑھک گیا۔ اس کی چیخ اور اس کے ہال میں گرنے کی آواز بڑی زوردار تھی۔

آناً فاناً سنیما میں کہرام مچ گیا۔ عقبی نشستوں سے دو افراد مجھ پر جھپٹے۔ میں نے ایک کے چہرے پر دھواں دھار ٹکر ماری، دوسرے کی ٹھوڑی پر میری رائفل کا بٹ لگا۔ بٹ کی ضرب زوردار تھی۔ مضروب اچھل کر ایک ساڑی پوش لڑکی سے ٹکرایا۔ لڑکی ہسٹریائی انداز میں چیخی اور اپنے شیر خوار بچے سمیت لڑکھڑا کر جنگلے کے پاس ڈھیر ہو گئی۔ میرے ہاتھ میں گن کی موجودگی محسوس کر کے فلم بین چلاتے ہوئے چاروں طرف بھاگے۔ میں دروازے کی طرف لپکا تو دو تین اور افراد مجھ پر جھپٹے۔ میں بے دریغ ان سے بھڑ گیا۔ پانچ دس سیکنڈ تک میرے اور ان کے درمیان زبردست جھڑپ ہوئی۔ ان میں سے دو گن کی مہلک ضربیں کھا کر دور جا گرے۔ تیسرا دیوار سے ٹکرا کر لہولہان ہو گیا اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

اسی وقت کسی نے عقب سے مجھے دبوچ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی اور جسم فولاد کی طرح سخت تھا۔ وہ غضب ناک درندے کی طرح غرا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر میرے ذہن میں برق سی لہرا گئی۔ میں نے رخ موڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک لمحے میں میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ میرے پیچھے جلال تھا۔ وہی جلال، جس کا صفدر کے ساتھ زبردست معرکہ ہوا تھا اور جس کے بارے میں ابراہیم نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ اس کی بیوی ارجمند کا "یار" ہے۔ میں نے آخری بار اسے جھنگ کی حویلی میں دیکھا تھا۔ اب وہ جھنگ اور چنیوٹ سے سیکڑوں میل دور فرید کوٹ کے اس سنیما ہال میں موجود تھا۔ وہ یہاں کیوں اور کیسے پہنچا، یہ بعد میں سوچا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر ضرورت اس امر کی تھی کہ میں اس کی جان لیوا گرفت سے نکلوں۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر سامنے سے آنے والے حملہ آور

کے منہ پر ماریں اور پھر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ خود کو آہنی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ہم دونوں اوپر نیچے فرش پر گرے۔ گرفت میری توقع سے زیادہ سخت تھی۔

ابراہیم نے بتایا تھا کہ جلال انڈین فلم انڈسٹری کا ایک مانا ہوا اسٹنٹ مین ہے، اور صفدر نے بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ ایک نہایت سخت جان فائٹر ہے اور اگر اس روز وہ نشے میں نہ ہوتا تو اسے زیر کرنا ناممکن تھا۔ آج ان بیانات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا بالائی جسم کسی شکنجے میں کسا گیا ہے۔ اگر رائفل میرے ہاتھ میں نہ ہوتی تو میرے لیے خود کو اس گرفت سے چھڑانا ناممکن تھا۔ میں نے رائفل کے کندے سے حریف کی پسلیوں میں اندھا دھند ضربیں لگائیں۔ جونہی گرفت ذرا نرم پڑی، میں نے خود کو چھڑا لیا۔ آزاد ہوتے ہی میں ایک بار پھر بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ اب ہال کی ساری بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ میں نے دیکھا، میرے پیچھے آنے والا جلال ہی تھا۔ وہ جیسے ہوا میں تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں گیلری کے کسی بھی دروازے سے باہر نکل سکتا۔ وہاں دھکم پیل ہو رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑ رہے تھے۔ گیلری کے آخر میں باکسز کی قطار تھی۔ میں نے ایک باکس میں چھلانگ لگائی اور اس کے کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جلال پوری رفتار سے میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نیچے اترنے والے زینوں پر پہنچا تو مرد و زن اور بچے چیختے پکارتے مختلف اطراف میں بھاگے۔ اس موقعے پر میں خودکار رائفل کا برسٹ مارتا تو کم از کم جلال اور اس کے ایک ساتھی کو تو ہلاک کر ہی سکتا تھا لیکن اس کوشش میں کئی اور جانیں جانے کا اندیشہ تھا اور میں کسی بے گناہ کی جان نہیں لے سکتا تھا چاہے اس کے لیے مجھے اپنی گرفتاری ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔ میں نے چند ہوائی فائر کیے اور آخری کوشش کے طور پر زینوں کی طرف بڑھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ فیصلہ کن لمحہ گزر چکا تھا۔ پہلو سے دو افراد چیلوں کی طرح مجھ پر جھپٹے۔ میں نے ان میں سے ایک کی ٹانگ میں گولی ماری لیکن دوسرا توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند مجھ سے ٹکرایا اور مجھے لیتا ہوا اچھلے ریلنگ پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی کئی افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

○☆○

مجھے گھونسوں، ٹھوکروں اور رائفل کے کندوں سے بُری طرح مارا گیا تھا۔ پھر وہ لوگ مجھے دبوچ کر ایک سرخ کار تک لائے تھے۔ میری جامہ تلاشی لے کر میرے ہاتھ پشت پر ایک ٹائی سے باندھ دیے گئے تھے۔ اور اب سرخ کار شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد ایک عالی شان مکان کے مین گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ کار پورچ میں رکی تو ایک گورکھا ٹائپ محافظ تیزی سے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں خودکار رائفل تھی اور گولیوں والا بیگ

طاہر جاوید مغل کے دِل گداز قلم سے ایک خوبصورت ناول

پرستش

قیمت: ۱۵۰ روپے

محبت کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک پُراثر کہانی
بہترین گردوپیش اور عُمدہ طباعت کے ساتھ

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۲۱۴

اپنے ہاکر یا قریبی بُک اسٹال سے طلب فرمائیں

کندھے سے لٹک رہا تھا۔ میں پچھلی نشست پر پہلو کے بل پڑا تھا۔ جلال میرے سرہانے بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں کولٹ ۴۵ پسٹل نظر آرہا تھا۔ دروازہ کھلا تو جلال نے مجھے گھسیٹ کر باہر نکالا اور پھر ایک رسہ اڑنگا لگا کر دور پھینک دیا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے، میں نے بمشکل اپنا چہرہ زخمی ہونے سے بچایا۔ جلال نے پھنکار کر کہا "ماں کا لال! کمانڈو بنتا ہے۔ ابھی نکالتے ہیں تیرا سارا کمانڈرپن۔" اس کے ہاتھ میں وہ طلائی گلوبند تھا جو میری جامہ تلاشی میں ملا تھا۔

مجھے چند گالیاں دے کر اس نے دل کی بھڑاس نکالی اور پھر بالوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیا۔ کار کی اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی باہر آگئے تھے اور اب خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کے چہرے پر میری "دھواں دھار" ٹکر لگی تھی۔ اس کی ناک پکوڑا ہو رہی تھی اور سرخ آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ مجھے اپنے پکڑے جانے اور پٹ جانے پر افسوس تو ہوا لیکن دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ہاں۔ اگر اس موقعے پر میں گن چلا کر آٹھ دس بے گناہوں کو مار دیتا اور نکل جاتا تو پھر وہ آزادی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی۔

مجھے رائفل کی نال سے دھکیلتے ہوئے وہ لوگ کوٹھی میں لائے اور ایک طویل کوریڈور سے گزار کر ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھا دیا۔ یہاں قالین بچھا ہوا تھا اور جدید فیشن کے آرام دہ صوفے رکھے تھے۔ ایک شیلف پر رام کرشن اور کالی ماتا کی مورتیاں بھی رکھی تھیں جس سے اندازہ ہو تا تھا کہ یہ کوٹھی کسی بھگوان داس یا رام پیارے کی ہے۔ جلال کے سوا باقی سب لوگ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ جلال قریب رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا "ہیلو" اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا "ہاں میڈم! پہنچ گیا ہے وہ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بمشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ کوئی تند بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ ارجمند بانو تھی۔ لیکن یہ ارجمند اس عورت سے بہت مختلف نظر آرہی تھی جو افراہیم کی بیوی تھی۔ بھاری بھرکم لباس وہ گہنے پہنتی تھی اور خود کو نوادرات کی شیدائی ظاہر کرتی تھی۔ اس وقت وہ پیراکی کے انتہائی مختصر لباس میں تھی۔ اگر اس نے اوپر سے گاؤن نہ پہنا ہوتا تو اسے دیکھ کر صد سالہ بوڑھے کا دل بھی ڈانوا ڈول ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تمتما رہا ہے اور آنکھوں میں ایک جنونی چمک ہے۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی جلال نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا اور پسٹل سونت کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ ارجمند نے جھپٹ کر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور عجب ہیجانی لہجے میں بولی "کہاں ہے زرک؟"

"کون سا زرک؟" میں نے کہا۔

"بکواس بند کرو" وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چیخی اور کسی وحشی جانور کی طرح مجھ پر پل پڑی۔ اس نے مجھے دو ہتڑ مارے اور ناخنوں سے چہرہ نوچنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے ٹانگوں سے دھکیلا اور دور پھینک دیا۔ جلال نے میرے سر کے اوپر ہوائی فائر کیا اور پسٹل کنپٹی سے لگا دیا۔

فائر کی آواز سن کر چند افراد بھاگتے ہوئے دروازے پر پہنچ گئے۔ جلال چیخ کر بولا "جاؤ۔ کوئی اس طرف نہیں آئے۔" آنے والے مختلف سمتوں میں واپس لوٹ گئے۔

ارجمند بانو نے جھپٹ کر میری گردن تھام لی اور اسے اپنی نرم و نازک کلائیوں کی پوری قوت سے دباتے ہوئے بولی "دیکھ کمینے! میں تم سے زرک کا پوچھ رہی ہوں اور تم نے زرک کے بارے میں بتانا ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ آرام سے بتاؤ یا خود کو عذاب میں ڈال کر اور میں بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں، جو حشر یہاں تمہارا ہوگا اس کا تم نے کبھی تصور نہ کیا ہوگا۔"

ارجمند بانو "بھگوان کی سوگند" کھا رہی تھی۔ اس کا مخصوص نوابی لب و لہجہ اور طمطراق بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ ایک بالکل اجنبی لڑکی نظر آرہی تھی۔ حرص و ہوس کی آگ میں تپی ہوئی، غضب ناک اور حواس باختہ۔ اس کا ریشمی گاؤن افراتفری میں کہیں سے کہیں جا رہا تھا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کے لمبے ناخن میری گردن میں پیوست تھے، دوسری جانب جلال کا پسٹل کنپٹی میں دھنسا ہوا تھا۔ میں نے چند گہرے سانس لیے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "بیگم صاحبہ! میرے ساتھیوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ وہ زرک لے کر غائب ہو گئے ہیں۔"

"کس طرح؟ کیسے غائب ہو گئے ہیں؟" جلال آدم خور شیر کی طرح دہاڑا۔

"تالا نالا کے زرک اڑانے پر انہوں نے مجھے چائے میں بے ہوشی کی دوا پلا دی۔ آنکھ کھلی تو زرک تھا نہ وہ دونوں۔"

"نہیں بانو کے تھے۔ اس کا مطلب ہے نہیں بانو کے تم۔" ارجمند مرغ۔ اُلو کی پٹھی نے بے انتہا سرد لہجے میں کہا "کچھ

وہ اوپر نیچے سہلاتی رہی۔ پھر تیز قدموں سے دروازے کی طرف گئی۔ دروازہ کھول کر اس نے خطرناک انداز میں کسی بلراج نامی شخص کو پکارا۔ چند لمحے بعد بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چاپ کے ساتھ ساتھ عجیب طرح کی پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر ایک درمیانے قد کا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک سکھ رائفل بردار تھا۔ درمیانے قد کے شخص کے ہاتھ میں ایک ایسی چیز تھی جسے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔

وہ ایک باز تھا۔ میں یہ باز پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آزاد علاقے میں میرے ہاتھوں قتل ہونے والے غلام خاں نے یہ باز اونے پونے داموں خرید کر عینی جان کو ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کیا تھا۔ اب عینی جان سے یہ باز نجانے کس طرح ارجمند بانو تک پہنچا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ باز عینی جان سے افراہیم نے خریدا تھا اور افراہیم سے ارجمند نے لے لیا تھا۔ یہ قریباً دو فٹ لمبا "ایسٹرن ہاک" ایک شاندار پرندہ تھا۔ سر گردن اور پشت سنہری مائل سلیٹی رنگ کی تھی۔ سینہ اور پیٹ بالکل سفید تھا اور ان پر آبدار خوبصورت دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت شہباز کے سر پر غلاف (اندھیاری) تھا اور اس کے پاؤں سے بندھا ہوا تسمہ درمیانے قد والے کے ہاتھ میں تھا۔

ارجمند بانو یا جو بھی اس کا اصل نام تھا، بڑے خطرناک انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ غرا کر بولی۔ "دیکھ کمینے! اس باز کو دیکھ لے۔ یہ بندے کو اپنے پنجوں سے ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے اور آنکھوں کا تو دشمن نمبر ایک ہے۔ دو سیکنڈ میں اندھا کر دیتا ہے اپنے شکار کو۔"

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ہاتھ پشت پر بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اگر یہ تربیت یافتہ باز مجھ پر چھوڑ دیا جاتا تو میں خود کو قطعی بے بس پاتا۔ مجھے معلوم تھا اس قسم کے باز بڑی پھرتی اور سفاکی سے حملہ کرتے ہیں اور اپنے شکار کو لاچار کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے بجائے بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا۔ "میں کچھ نہیں جانتا بیگم صاحب! مجھے جو معلوم تھا میں نے بتا دیا ہے۔ وہ دونوں حرام زادے زرک کے ساتھ ہی غائب ہو گئے ہیں۔ مجھے پتا نہیں کدھر گئے ہیں۔"

وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔ "تو سب جانتا ہے کمینے! اور ابھی تو بتائے گا بھی۔ اپنی اس لعنتی زبان سے بھونکے گا۔"

اس نے باز والے کو اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی جلال بھی باہر چلا گیا۔ وہ دونوں کھڑکی کی جالی میں سے اندر جھانکنے لگے۔ اب میں اور باز والا کمرے میں رہ گئے تھے۔ باز والے کا چہرہ شب تاریک کے مانند سیاہ تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ریچھ کی سی آنکھوں میں دنیا جہان کی درندگی گھلی ہوئی تھی۔ اس نے خوفناک نظروں سے مجھے گھورا پھر بے قرار باز کے سر سے غلاف یعنی اندھیاری اتار لی۔ خدا کی پناہ، بے حد خونخوار نگاہیں تھیں اس پرندے کی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پر پھڑپھڑائے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اڑان بھرتا میں نے چلا کر کہا۔ "میں بتاتا ہوں بیگم صاحب! میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

کمرے کے باہر سے ارجمند نے باز والے کو اشارہ کیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کو ایک مخصوص حرکت دی اور سیاہ کپڑے کا غلاف دوبارہ باز کے سر پر چڑھا دیا۔ باز کے پھڑپھڑاتے پر ایک دم ساکت ہو گئے۔ ارجمند بانو اور جلال ایک بار پھر دندناتے ہوئے کمرے میں آگئے۔ ارجمند بانو میرے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی۔ گاؤن کے اندر سے اس کا اُجلا جسم بادل میں لہراتی بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔ شفاف ملائم سطح پر سے چیز پھسل جاتی ہے لیکن اس کے شفاف جسم پر نگاہ پھسلنے کے بجائے اٹکی تھی۔ اس نے ہیجانی انداز میں میرے بال مٹھی میں جکڑے اور غرائی "بتاؤ کہاں ہے زرک؟"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "اگر ... میں بتا دوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا؟"

وہ بولی "بالکل چھوڑ دیا جائے گا۔ تمہیں تمہارا حصہ بھی دیا جائے گا اور جہاں تم کہو گے تمہیں پہنچا بھی دیا جائے گا۔"

میں نے ایک نگاہ بے حس و حرکت باز پر ڈال کر کہا۔ "یہ شہر میرے لیے انجان ہے۔ مجھے راستوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ منہ زبانی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ مجھے ساتھ لے چلیں تو میں آپ کو زرک تک پہنچا دیتا ہوں۔"

"ہم اُلو کے پٹھے نہیں ہیں۔" جلال نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ "ہمارا سوچیں مت کرو ہم سے۔ تم انجان ہو سکتے ہو لیکن ہم نہیں ہیں۔ اس شہر کا چپا چپا ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ تم ہمیں صرف اتنا بتاؤ کہ زرک شہر کے اندر ہے یا باہر اور اگر باہر ہے تو کتنی دور اور کس سمت میں ہے۔ باقی کا کام ہم خود کر لیں گے۔"

میں کچھ دیر پریشانی اور سوچ بچار کی اداکاری کرتا رہا۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ یہاں تک کہ ارجمند بانو کی ہانپتی ہوئی سانسوں کی آواز بھی میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ مجھے تھوڑا سا وقت درکار تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح یہ وقت مجھے مل جائے۔ میں نے ارجمند بانو اور جلال کو

بتایا کہ ٹرک شہر سے باہر پانچ چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ نشانی کے طور پر میں نے ایک نہر اور گوروں کے قبرستان کا نام لیا۔ یہ مقام فی الواقع فرید کوٹ کے نواح میں موجود تھا لیکن اس جگہ سے بہت دور اور بالکل مخالف سمت میں تھا جہاں میں ٹرک چھوڑ کر آیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میرے بیان کی تصدیق کے لیے ان لوگوں کو کم از کم ایک گھنٹا درکار ہوگا اور اس ایک گھنٹے میں میں اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ لوں گا۔ جامہ تلاشی کے باوجود خنجر ابھی تک میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا اور اس بے سروسامانی کے عالم میں میرے بہت کام آسکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میرے ہاتھ آزاد ہوں۔

جونہی میں نے ٹرک کی نشاندہی کی، جلال تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑ کر گھوڑوں کے قبرستان تک جا پہنچے گا۔ جلال کے جاتے ہی رائفل بردار سکھ دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر لگی تھیں اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس کی صورت سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ برق رفتاری سے فیصلہ کرنے والا شخص ہے۔ اگر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ارجمند یا باز والے پر جھپٹنے کی کوشش کرتا تو وہ ایک لمحے میں فائر کھول دیتا۔ مجھے جان سے مارنے کا تو شاید اسے حکم نہیں تھا لیکن میری ٹانگوں کو چھلنی کرنے میں اسے کیا تردد ہو سکتا تھا۔

ارجمند بانو نے مجھ سے مختلف سوال پوچھنے شروع کیے۔ مثلاً ہم کس راستے سے یہاں پہنچے ہیں۔ پاکستان میں ہمارا تعاقب کہاں تک کیا گیا تھا۔ پچھلے دو تین روز ٹرک کہاں رُکا رہا ہے۔ ٹرک کے سامان میں سے کیا نکالا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ان سوالات کے مناسب ترین جواب دیے اور ارجمند پر ظاہر کیا کہ ہم نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔ بس واقعات کے دھارے میں بہتے رہے ہیں۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی جلال واپس آگیا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ مجھ پر پھٹ پڑا۔ "جھوٹ بولتے ہو تم۔ بکواس کر رہے ہو۔ وہاں کچھ نہیں ہے۔ ہم نے چپا چپا دیکھ لیا ہے۔"

میرے لیے حیرت کا مقام تھا۔ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر وہ میرے بیان کی صحت جانچ چکے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے کارندے پہلے سے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جلال نے ریڈیو یا کسی اور ذریعے سے ان کے ساتھ رابطہ کیا تھا اور معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اب ایک بار پھر میں وہیں کھڑا تھا جہاں پندرہ بیس منٹ پہلے تھا بلکہ اب میری پوزیشن اور بھی نازک ہو چکی تھی۔ میں نے ارجمند بانو اور جلال کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ارجمند بانو کچھ دیر مجھے قہرناک نظروں سے گھورتی رہی، پھر اس نے باز والے کو اشارہ کیا اور اس نے باز مجھ پر چھوڑ دیا۔ ارجمند بانو جلال کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے میں پھڑپھڑاہٹ گونجی اور طاقتور باز کمان سے نکلے تیر کی طرح میری طرف آیا۔ بڑا جان لیوا نظارہ تھا یہ۔ میری نگاہ باز کی خمیدہ چونچ اور تیز نوکیلے پنجوں پر تھی۔ وہ اپنے ان مہلک ہتھیاروں کے ساتھ مجھ پر یلغار کر رہا تھا۔ اس پرندے کو چند ماہ پہلے میں نے غلام خان کے پاس ایک خوبصورت پنجرے میں دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے کب سوچا تھا کہ ایک روز یہ شاندار شکاری پرندہ مجھ پر حملہ آور ہوگا اور ایسی حالت میں کہ میں اپنے دفاع کے لیے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکوں گا۔

اضطراری طور پر میں نے اپنے سر کو نیچے جھکایا اور باز جو سیدھا میری آنکھوں پر جھپٹا تھا، میرے سر سے ٹکرایا۔ اس کے بے رحم پنجوں نے میرے سر پر ضرب لگائی، یوں لگا جیسے کسی نے موٹر سائیکل کی آہنی چین گھما کر سر پر دے ماری ہے۔ میں کرسی سے لڑھک کر اوندھے منہ زمین پر گرا۔ ہاتھ پشت پر بندھے تھے لہٰذا ٹھوڑی قالین سے ٹکرائی اور آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ باز کو واپس پلٹنے میں ایک ساعت کی تاخیر بھی نہیں ہوئی۔ پلٹ کر جھپٹنا تو اس کی فطرت تھی۔ ایک گونج دار آواز کے ساتھ وہ پھر میری طرف آیا۔ اس دفعہ اس کی چونچ نے میری گردن کو عقب سے نشانہ بنایا۔ اگر موسم گرما ہوتا اور میں نے کاٹن کی ہلکی پھلکی قمیص پہنی ہوتی تو یقیناً چھٹانک بھر بوٹی باز کی چونچ میں آجاتی لیکن موٹی جرسی اور سویٹر نما بنیان کے سبب میں شدید نقصان سے محفوظ رہا۔ اس دفعہ باز کے طاقتور پنکھ میرے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ ایک عجیب طرح کی حیوانی بو نتھنوں میں گھسی اور مجھے لگا جیسے یہ باز نہیں فرشتۂ اجل کا پر ہے۔

باز کا تیسرا حملہ پہلے دونوں حملوں سے زیادہ شدید تھا۔ اس کے پنجوں نے میرا چہرہ بائیں کان کے قریب سے زخمی کیا اور چونچ نے بڑی بے رحمی کے ساتھ سر کے بال نوچے۔ اس کے بعد جیسے کمرے میں بھونچال سا آگیا۔ وہ خونی پرندہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں اپنا چہرہ چھپانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میرا لباس دھجیوں کی صورت بکھرنے کو تھا۔ پھر میرا جسم براہِ راست باز کی زد میں آنے والا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ تصور بھی محال تھا۔ خدا نے اس پرندے کو بے پناہ طاقت دی ہے۔ یہ اپنے پنجوں اور چونچ سے سخت ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑوں میں پائے جانے والے سنہری عقاب کے بارے میں تو

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ بھیڑ بکری کے چھوٹے بچے کو اپنے پنجوں میں دبوچ کر پرواز کر جاتا ہے۔

وحشیانہ کشتی میں کمرے کی کئی قیمتی چیزیں ٹوٹ چکی تھیں۔ میں باز کو خود سے دور رکھنے کے لیے ٹانگیں چلا رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح باز کو اپنے نیچے دبا لوں، اسی کوشش اور جدوجہد میں میرا پاؤں ایک دیوار گیر الماری سے جا ٹکرایا۔ الماری "بجس" نہیں تھی۔ وہ ایک زوردار آواز سے قالین پر آگری۔ میں نے اپنا سر بمشکل اس کی زد سے بچایا۔ باز زور سے پھڑپھڑا کر دور ہٹ گیا۔ پتا نہیں "دشمنِ جاں" کے دل میں کیا آئی کہ اس نے دوبارہ مجھ پر جھپٹنے سے انکار کر دیا۔ درمیانے قد والے شخص نے حلق سے بار بار مخصوص آواز نکالی۔ ہاتھوں کی حرکات سے باز کو مشتعل کرنا چاہا لیکن وہ بدستور مجھ سے لاتعلق رہا۔ شاید اس کی تربیت میں ابھی کوئی خامی تھی یا اس کی حیوانیت اپنے مالکان کی حیوانیت سے شرما گئی تھی۔ درمیانے قد والے شخص نے آگے بڑھ کر باز کو دبوچا اور اس کے سر پر اندھیاری چڑھا کر اسے باہر لے گیا۔ اسی دوران جلال دندناتا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھ پر پل پڑا۔ چند لمحے بعد رائفل بردار سکھ بھی اس کا ہاتھ بٹانے آموجود ہوا۔ ان دونوں نے مجھے بے دریغ ٹھوکریں ماریں اور رائفل کے بٹ رسید کیے۔ پھر کھینچتے ہوئے برآمدے میں لے آئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ باز کے حوالے سے اپنی خفت مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دو افراد کی خودکار رائفلیں بدستور میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ برآمدہ طے کر کے ہم ایک بڑے دروازے پر پہنچے۔ سکھ نے تیزی سے یہ آہنی دروازہ کھولا۔ سامنے سیڑھیاں نظر آئیں۔ مجھے سیڑھیوں پر دھکا دیا گیا۔ میں نیچے ایک یخ بستہ فرش پر گرا۔ یہاں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک لمحے میں میں جان گیا کہ یہ کوئی عقوبت خانہ قسم کی جگہ ہے۔ ایک طرف سبھ میں ڈالی جانے والی دو صفیں (چٹائیاں) بچھی تھیں۔ ان صفوں پر جگہ جگہ تیل اور میل کے دھبے تھے۔ ایک طرف چھت پر لوہے کے آہنی کڑے جھول رہے تھے۔ ایک شکنجہ نما کی خوفناک شے دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ شکنجے کے پاس ہی بجلی کے تاروں کا ایک گچھا اور پلگ وغیرہ نظر آرہے تھے۔ یہ غالباً قیدیوں کو جھٹکے دینے کا انتظام تھا۔ میں نے دیکھا کمرے کے ایک گوشے میں صف پر ایک اسمارٹ سا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو رہے تھے۔ مونچھیں بلوائی اور رنگ صاف تھا۔ وہ پائجامہ قمیص پہنے تھا۔ آثار سے لگتا تھا کہ چند روز پہلے اس شخص پر بھی

باز چھوڑا گیا ہے اور دیگر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ اور گردن پر جلنے کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک آنکھ کے گرد بھی گہرا نیلا حلقہ سا تھا۔

میرے پیچھے ہی پیچھے تہ خانے میں پانچ چھ افراد گھس آئے تھے۔ ان میں جلال پیش پیش تھا۔ اس کی زبان میرے لیے مسلسل گالیاں اگل رہی تھی۔ اس کے اشارے پر اندر گھسنے والے ڈشکروں نے مجھے دبوچ لیا اور کھینچ کر دیوار تک لے گئے۔ مجھے یوں لگا کہ وہ میرے ہاتھ کھول کر ان آہنی کڑوں میں ڈالنا چاہتے ہیں جو چھت سے جھول رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مجھے جدوجہد کرنے کا ایک زبردست موقع مل سکتا تھا۔ تہ خانے کا دروازہ کھلا تھا اور اس بات کا بھی مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ فوری طور پر مجھے گولی کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ وہ مجھے صرف زخمی کر سکتے تھے اور اس مختصر جگہ میں زخمی کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھ پر چلائی ہوئی گولیاں ان کے کسی اپنے ساتھی کو بھی لہولہان کر سکتی تھیں۔ جب وہ مجھے دیوار کے قریب لائے تو میں پوری طرح چوکس ہو گیا لیکن جو توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ میرے ہاتھ کھولنے کے بجائے انہوں نے مجھے ایک کرسی نما صوفے پر دھکیلا اور پھرتی کے ساتھ رسی سے باندھ دیا۔ نائیلون کی موٹی رسی نے میرے پیٹ اور سینے کو اس طرح جکڑا کہ میں صوفے سے پیوست ہو کر رہ گیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ کرسی نما سنگل صوفہ دیوار سے منسلک تھا اور اس پر بیٹھنے والا کتنا بھی تڑپتا، پھڑکتا، صوفے کو ہلا نہیں سکتا تھا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے پکڑنے والے، شروع سے اب تک مجھے کوئی موقع دینے کو تیار نہیں ہوئے تھے اور ارجمند تو مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ میں دھواں بن کر نہ اڑ جاؤں۔ میری صورت میں ان لوگوں کو وہ پچیس عدد صندوق نظر آرہے تھے جو اپنے اندر بے حساب و بے شمار دولت سمیٹے ہوئے تھے۔ دولت جو دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ جس سے دین، ایمان، ذہن، ضمیر، حسن، محبت، عیش، آرام سب کچھ خریدا جا سکتا ہے اور جو نہیں خریدا جا سکتا اسے چھینا جا سکتا ہے اور جو چھینا نہیں جا سکتا اس کی کمی دوسرے ہزارہا طریقوں سے پوری کی جا سکتی ہے۔ اس دولت کی خواہش دیوانگی بن کر ارجمند بانو اور جلال کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔

میرے ساتھ ہونے والی کھینچا تانی میں ارجمند بانو کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن بھی اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ وہ اب سرتاپا ننگی تلوار تھی اور میرے سر پر چمک رہی تھی۔ وہ میرے بالکل

قریب چلی آئی۔ اس کے دہکتے رخساروں کی حدت میرے چہرے تک پہنچنے لگی۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی اور میری آنکھوں کے عین سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ "سنے! میں آخری بار کہہ رہی ہوں تجھ سے جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے باہر نکال دے۔ ورنہ اس کے بعد میں تجھے بلراج کے حوالے کردوں گی۔۔۔ اور تو جانتا نہیں کہ بلراج کون ہے۔"

بلراج وہی شخص تھا جس نے کچھ دیر پہلے مجھ پر باز چھوڑا تھا۔ میں نے ریساتی لہجے میں کہا۔ "بیگم جی! میں نے اسی لیے عرض کی تھی کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں ساتھ جاتا تو آپ اب تک ٹرک تک پہنچ گئے ہوتے۔"

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ارجمند نے اپنی ٹانگ پوری قوت سے میرے سینے پر ماری اور انگلش میں گالیاں بکنے لگی۔ بالکل کپڑوں سے باہر ہو رہی تھی وہ اور کپڑے تھے ہی کتنے! پورے لباس پر جتنا کپڑا خرچ ہوا تھا اس سے عالم چنا کی زخمی انگلی پر پٹی بھی نہیں باندھی جاسکتی تھی۔ غصے کی انتہا کو چھو کر وہ ایک دم بلراج کو آوازیں دینے لگی اور آوازیں دیتی ہی باہر چلی گئی۔ جلال اور دیگر افراد بھی اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔ اب صرف ایک رائفل بردار تہ خانے میں تھا لیکن وہ نہ بھی ہوتا تو میں فوری طور پر کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

رائفل بردار نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کوئی قربانی کے بکرے کو ذبح ہونے سے پہلے دیکھتا ہے۔ کہنے لگا۔ "لگتا ہے تجھے کسی کی بددعا لگ گئی ہے جو بلراج کے حوالے ہو رہا ہے۔ بلراج بندے کو ایسی موت مارتا ہے کہ اس کی آتما بھی مدت تک بوکھلائی پھرتی ہے۔ جانتے ہو کون ہے یہ؟"

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

رائفل بردار نے جواب دیا۔ "دو ڈھائی سال پہلے تک یہ پنجاب پولیس میں اے ایس آئی تھا۔ بڑے سے بڑے مجرم کو سیدھا کرنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ امرتسر اور چندی گڑھ تک مشہوری تھی اس کی۔ ضلع امرتسر کے سب سے بڑے غنڈے نارنگ کو اس نے مار مار کر جان سے مار دیا تھا اور اس کی وکیل بہن کو پانچ روز تھانے میں رکھ کر اس سے رنگ رلیاں منائی تھیں۔ اس واقعے کے بعد وہ پولیس سے نکال دیا گیا تھا لیکن اس کے قدردانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اب تم انہی قدردانوں کے شکنجے میں ہو۔ میرا مطلب میڈم صاحب سے ہے۔ بلراج، میڈم صاحب کی پالتو آفت ہے اور وہ ابھی تھوڑی دیر میں اس آفت کو تم پر چھوڑنے والی ہیں۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازے کی جانب سے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ رائفل بردار ٹھٹک کر دو رہٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ صف پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کا رنگ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا ہے۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ گم صم بیٹھا تھا اور کچھ بولا نہیں تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور بلراج اندر داخل ہوا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب طرح کی کیفیتی اور درندگی بھری ہوئی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ وہ ایذا رسانی کا کام مجبوری کے تحت نہیں شوق کے تحت کرتا ہے۔ وہ پتلون اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں فوجی طرز کے بوٹ تھے۔ اندر گھس کر اس نے تہ خانے کا دروازہ لاک کر دیا اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا میرے پاس آگیا۔ اس نے ایذا رسانی کے مختلف آلات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ بالکل جیسے کوئی ڈاکٹر یا انجینئر کام شروع کرنے سے پہلے اپنے اوزاروں کا معائنہ کرتا ہے۔ اس کا انداز دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو چکی تھی۔ دل کے اندر سے کہیں آواز آرہی تھی کہ میں ایک خطرناک صورت حال کا شکار ہو چکا ہوں۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے بہترین موقع وہ تھا جب سینما ہاؤس پر جلال وغیرہ نے مجھے گھیرا تھا۔ میں بروقت اپنی گن استعمال کرسکتا تو بچ نکلنے کے روشن امکانات تھے۔۔۔ لیکن پھر میری نگاہوں میں وہ مرد و زن گھوم گئے جو میری چاروں طرف چیختے چلاتے بھاگ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک دشمن ملک کے باشندے تھے لیکن وہ بے قصور تھے۔ ان میں مسلمان بھی ہوں گے اور معصوم بچے اور عورتیں بھی، اور ایسے لوگ بھی جن کو اس ملک اور یہاں کی سیاست سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوگا۔ میں ان میں کیسے موت کی سوغات بانٹ دیتا۔

بلراج نے دیوار پر سے ایک چرمی چپل اور زنگ آلود ہتھوڑی اتار لی۔ چرمی چپل کو تو وہ کوڑے کے طور پر استعمال کرسکتا تھا لیکن ہتھوڑی کا استعمال میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں میرے قریب فرش پر پھینکیں اور مضطرب کر دینے والی نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ کھینچا تانی اور مار پیٹ کے دوران میرے پاؤں سے گرگابی اتر چکی تھی اور اب میں ننگے پاؤں تھا۔ بلراج نیچے جھکا اور اس نے چپل کی مدد سے میرے دونوں پاؤں کس کر صوفے کے پائے سے باندھ دیے۔ یہ عمل اس نے بڑی پھرتی اور چابک دستی سے کیا۔ میرا بایاں تو پہلے ہی جکڑا ہوا تھا، اب میرے لیے ہلنا جلنا ناممکن ہو گیا۔

اس نے ذرا سی ہتھوڑی سے ایک ضرب میرے

کے ننگے انگوٹھے پر لگائی۔ درد کی شدید لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ میرا چہرہ دیکھے بغیر بہت بھاری آواز میں بولا۔ "دیکھ اوئے! جو کچھ میں تیرے ساتھ کرنے لگا ہوں وہ بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوا ہوگا اس لیے اچھائی اسی میں ہے کہ جو میڈم صاحب پوچھ رہی ہیں، بتا دے۔"

میں نے کہا۔ "میں بتا چکا ہوں کل شام ہم نے وہ ٹرک نہر کے پاس گورا قبرستان کے پچھواڑے کھڑا کیا تھا۔ تم لوگ تصدیق کرسکتے ہو۔ اگر ٹرک وہاں نہیں ہے تو اس کے ٹائروں کے نشان ضرور موجود ہوں گے۔"

وہ بولا۔ "تم جھوٹ بکتے ہو۔ وہاں سرے سے کوئی ٹرک پہنچا ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم لوگ مجھے وہاں لے جانے سے ڈرتے کیوں ہو۔ تمہارے پاس اسلحہ ہے، پاتو غنڈے ہیں۔ میں کیا بگاڑلوں گا تمہارا۔ اگر بہت احتیاط کرنا چاہتے ہو تو مجھے باندھ لو اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر کسی بند گاڑی میں ڈال لو۔"

وہ عجیب لرزہ خیز انداز میں مسکرایا۔ "نہیں میرے ہیرے! تم یہیں پر ہمیں سب کچھ بتاؤ گے اور اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ مشکل سے آدھ پون گھنٹے کا کام ہے یہ۔"

میں نے کہا۔ "جو بات مجھے معلوم ہی نہیں، وہ تم مجھ سے کیسے پوچھ لو گے؟"

وہ بولا۔ "یہی تو کمال ہے ماں صدقے۔ اس جگہ کچھ بھی ناممکن نہیں۔ تمہیں جو معلوم ہے وہ بتاؤ گے اور جو نہیں معلوم وہ تمہاری آتما بتا دے گی۔ یہاں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو میں چاہتا ہوں۔ یہ دیکھو یہ ایک نمونہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ دلیپ سنگھ صاحب ہیں۔ بڑے سیانے انجینئر ہیں۔ سڑکیں بناتے ہیں اور پل کھڑے کرتے ہیں مگر دماغ میں کیڑا ہے۔ کبھی کبھی خالصتان والوں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے جب میں انہیں یہاں لایا تھا تو انہوں نے پتلون قمیص پہنی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ "دلیپ صاحب کپڑے اتارو" فرمانے لگے۔ "مر جاؤں گا لیکن کپڑے نہیں اتاروں گا۔" اب دیکھو یہ کتنے بھلے مانس بن گئے ہیں۔" بلراج کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی۔ صف پر بیٹھے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دلیپ صاحب، ذرا مرغا بن جائیے۔"

سفید کنپٹیوں والا شخص خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اٹھا اور ایک سیکنڈ میں مرغا بن گیا۔ "اب کھڑے ہو جائیے۔" بلراج نے دوسرا حکم دیا۔ وہ شخص سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "اپنے کپڑے اتار دیجیے۔" تیسرا حکم ملا۔

وہ شخص بے چارگی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن پھر فوراً ہی اس کا ہاتھ اپنی قمیص کے بٹنوں کی طرف بڑھ گیا۔

"اچھا رہنے دیجیے۔" بلراج نے سفاک لہجے میں کہا۔

دلیپ نامی اس شخص نے بٹن دوبارہ بند کیے اور کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ بلراج کی آنکھوں میں حیوانی چمک نظر آرہی تھی۔ اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت میرے اندر جیسے ایک چنگاری سلگ اٹھی۔ بلراج جیسے بے رحم لوگوں سے مجھے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ انہیں دیکھ کر میرے اندر ایک نیلی آگ بھڑکنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہو رہی تھی لیکن اس کیفیت کا فوری اظہار میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں کوشش کر کے اپنے ہاتھوں کی بندش کافی حد تک ڈھیلی کر چکا تھا لیکن ابھی وہ اتنی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی کہ میرے ہاتھ آزاد ہو جاتے اور میں ان سے بلراج کی گردن ناپ سکتا۔ بہرحال دل ہی دل میں میں طے کر چکا تھا کہ موقع ملا تو اپنے اس نیک ارادے پر ضرور عمل کروں گا۔

ایذا رسانی ایک "سیاہ آرٹ" ہے اور بلراج جیسے لوگ اس آرٹ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ آلہ جتنا تیز دھار ہو جسم کو اتنی ہی کم تکلیف دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلیڈ سے کسی کا پیٹ بھی پھاڑ دیا جائے تو وہ بے خبر رہتا ہے لیکن اگر ہتھوڑی سے کسی کے ننگے پاؤں پر ضربیں لگائی جائیں اور انگلیوں کے ناخن کچلے جائیں تو اس اذیت کا اظہار لفظوں میں ناممکن ہے۔ بلراج مجھ پر یہی ستم ڈھانا چاہتا تھا اور اس نے میری انگلیوں پر چند ضربیں لگائیں بھی لیکن پھر قسمت نے ساتھ دیا اور ایک ضروری بلاوے پر بلراج تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ اس دوران میں مسلسل کوشش کرتا رہا تھا اور ریشمی ٹائی کی گرہ نے پھسلنا شروع کر دیا تھا۔ بلراج باہر چلا گیا تو میں نے زیادہ کھل کر کوشش کی اور اپنے ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹائی بدستور میرے ہاتھوں سے لپٹی ہوئی تھی لیکن اب بندش اتنی ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ میں معمولی کوشش سے ہاتھ کھول سکتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ پانچ دس منٹ میں بلراج واپس آجائے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ قریباً بیس منٹ بعد دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کسی نے باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا کر اس میں قفل ڈال دیا۔ میں اور دلیپ سنگھ اپنی اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی کی چہل پہل

دھیرے دھیرے کم ہو رہی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہاں سناٹا محسوس ہونے لگا۔ بس کبھی کبھار کسی دور افتادہ گوشے سے کوئی آہٹ یا آواز سنائی دے جاتی تھی۔ میں نے دلیپ سنگھ سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہا لیکن وہ اس قدر ڈرا سہما ہوا تھا کہ الفاظ اس کے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے۔ وہ گاہے گاہے دروازے کی طرف دیکھ لیتا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ابھی وہاں بلراج سوار ہو جائے گا اور اپنی گرجدار آواز میں اسے کوئی شرمناک حکم جاری کر دے گا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بمشکل صرف اتنا بتا سکا کہ اس کا نام دلیپ سنگھ ہے اور وہ بیچارہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔

میں نے گردن پشت کی طرف موڑ کر اور بازو سکوڑ کر بڑی مشکل سے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ میں ساڑھے تین بجے کے قریب سنیما سے پکڑا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا میری اسیری کو چوتھا گھنٹا شروع ہو چکا ہے۔ مارپیٹ کے دوران میری رسٹ واچ کا شیشہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس شکستہ شیشے کو دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ یہ وہی رسٹ واچ تھی جو قریباً تین ہفتے پہلے غزالہ نے میری سالگرہ پر مجھے تحفے میں دی تھی۔ اس گھڑی کے ساتھ گرم سوٹ کا کپڑا اور ٹائی وغیرہ بھی تھی۔ یہ سب کچھ وہیں مری میں رہ گیا تھا لیکن یہ گھڑی میرے ساتھ آ گئی تھی۔ شاید یہ یاد دلانے کے لیے کہ کبھی کوئی ہر گھڑی سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ ارجمند بانو کے اس عقوبت خانے میں بیٹھے بیٹھے غزالہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ بہت دکھی ہو کر مجھ سے جدا ہوئی تھی۔ وہ نگاہ جو اس نے آخری بار مجھ پر ڈالی تھی ہمیشہ کے لیے میرے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی آنکھوں کے آنسو اور اس کے لبوں کی بے بسی۔ یہ سب کچھ آسیب کی طرح میرے ذہن سے چپٹا ہوا تھا۔ کاش میں اس جدا ہونے والی کو بتا سکتا کہ میرے "پتھر دل" کے اندر اس کے لیے پیار کا کتنا بڑا آبشار چھپا ہوا ہے۔ کاش وہ ان طوفانوں کا اندازہ کر سکتی جو اس کی نسبت ہمیشہ میرے دل میں موجزن رہے تھے۔ لیکن شاید اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ تصویر کا یہ دوسرا رخ نہیں دیکھ سکی تھی ورنہ جدا راستوں پر چلنا اس کے لیے اور بھی دشوار ہو جاتا۔

میں نے ایک گہری سانس بھر کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ میرے پاؤں کی تین انگلیاں درد سے چیخ رہی تھیں۔ یہاں بدبخت بلراج نے ہتھوڑی سے ضربیں لگائی تھیں۔ جس طرح موسیقار ساز چھیڑنے سے پہلے تار وغیرہ کستا ہے بلراج نے بھی اصل مارپیٹ شروع کرنے سے پہلے مجھ سے تھوڑی سی "چھیڑ چھاڑ" کی تھی۔ اس کا اصل حملہ تو اب ہونا تھا اور مجھے یقین تھا یہ حملہ شدید ہو گا۔ اگر میں اپنا بچاؤ نہ کر سکا تو کوئی بڑی بات نہیں کہ اگلے ایک دو گھنٹے میں میرے دونوں پاؤں انگلیوں سے محروم ہو جائیں۔ انگلیوں سے اٹھنے والی ٹیسوں کے علاوہ جسم پر اور بھی کئی جگہ آگ سی دہک رہی تھی۔ یہ ایسٹرن ہاک کے پنجوں کے نشانات تھے اور وہ خراشیں تھیں جو مارپیٹ کے دوران میرے جسم پر آئی تھیں۔ اس جلن سے نجات پانے کے لیے میں نے ٹرک کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ٹرک پارک کرنے کے لیے ہمیں ایک موزوں ترین جگہ میسر آ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی بدقسمتی آڑے نہ آئی تو وہ ٹرک اس ویران گردوارے کے درختوں میں ایک دو دن تک بالکل محفوظ رہے گا اور ممکن تھا کہ ہفتوں تک اس جانب کسی کا گزر نہ ہوتا۔

مجھے صوفے سے باندھنے والی رسی کی بندش بہت مضبوط تھی اور رسی کی اکلوتی گرہ بڑی عیاری کے ساتھ صوفے کے نیچے لگائی گئی تھی۔ میرے ہاتھ اس گرہ سے اتنے ہی دور تھے جتنی بے روزگار عاشق سے شبِ وصال دور ہوتی ہے۔ بہر طور میں کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔ قریباً آٹھ بجے تھے جب دروازے سے باہر آہٹ سنائی دی اور میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ دروازے کے قفل میں چابی گھما کر دروازہ کھولا گیا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ یہ سکھ رائفل بردار تھا۔ وہ بھی جین کی نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ سرخ جرسی کے نیچے اس کی چربی دار توند ہر زینے پر تھرک تھرک جاتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹفن کیریئر تھا۔ زینے اتر کر وہ لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس آ گیا۔

"تیری قسمت اچھی ہے بھاپے۔" اس نے بازاری لہجے میں کہا۔ "پانچ چھ گھنٹے کی مہلت اور مل گئی ہے تجھے۔ اب بھی وقت ہے۔ استاد بلراج کے ہاتھوں لیر و لیر ہونا نہیں چاہتا تو زبان کا جندرہ کھول دے۔"

"کک... کہاں گیا ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں بھی گیا ہے بڑی جلدی آنے والا ہے۔ تو اس چکر میں نہ پڑ۔ بس یہ سوچ کہ تجھے کرنا کیا ہے۔ کتے کی موت مرنا ہے یا ہماری بات ماننی ہے۔"

وہ مجھ سے قریباً پانچ قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ انگلی مسلسل رائفل کے ٹریگر پر تھی اور آنکھیں میرے چہرے پر

جمی تھیں۔ اس نے دلیپ سنگھ کو حکم دیا کہ وہ میری بندشیں کھول دے۔ دلیپ کسی معمول کی طرح اٹھا اور سجدہ ریز ہو کر صوفے کے نیچے سے گرہ کھولنے لگا۔ دو تین منٹ بعد میں رسی کی بندشوں سے آزاد تھا۔ ہاتھ میرے پہلے ہی آزاد تھے لیکن رائفل بردار اس اہم حقیقت سے بے خبر تھا۔ رائفل بردار کے اشارے پر دلیپ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹفن کیریئر کھول کر ڈبے صف پر رکھنے لگا۔ دو ڈبوں میں سبزی کا سالن تھا اور ایک میں روٹیاں۔ میرا اندازہ تھا کہ رائفل بردار دلیپ کو حکم دے گا کہ وہ کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ میرے منہ میں بھی نوالے ڈالتا جائے لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب رائفل بردار نے دلیپ کو میرے ہاتھ کھولنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کے لیے دلیپ میری طرف بڑھا۔ جونہی وہ میرے اور رائفل بردار کے درمیان آیا، میرے جی میں آئی کہ اسے اچھال کر رائفل بردار پر پھینک دوں لیکن پھر میں نے کچھ دیر صبر کرنا مناسب سمجھا۔ پوزیشن از خود میرے حق میں ہو رہی تھی۔ دلیپ گھوم کر میرے عقب میں گیا اور ہاتھ کی بندشیں کھولنے لگا۔ بندشیں تو پہلے ہی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے خواہ مخواہ ٹائی کو الجھا رکھا تھا۔ یہ منظر رائفل بردار کی نظروں سے اوجھل تھا۔ دلیپ نے بھی عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور ٹائی میری کلائیوں سے جدا کرنے میں کچھ وقت لگایا۔ اس دوران رائفل بردار سیڑھیوں کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور وہ "ریڈ الرٹ" نظر آ رہا تھا۔

"چلو کھانا کھاؤ۔" اس کی آواز تہ خانے میں گونجی۔ "اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا فیصلہ بھی کرو جس کی وجہ سے یہ کھانا تمہاری زندگی کا آخری کھانا ثابت نہ ہو۔"

میں صوفے سے اٹھا تو بائیں پاؤں کی مضروب انگلیاں درد سے سنسنا اٹھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ "کچھ کرنے کے لیے" یہ سنہری موقع ہے۔ میں صوفے سے اٹھ کر اس صف کی طرف بڑھا جس پر کھانا چنا گیا تھا۔ یہ مختصر سفر طے کرتے ہوئے میں اس دیوار کے بالکل پاس سے گزرا جہاں بجلی کا سوئچ تھا۔ میرا ایک کندھا سوئچ کو قریباً چھوتے ہوئے گزرا۔ میں نے اسی لمحے سے فائدہ اٹھایا اور کندھے کے دباؤ سے سوئچ آف کر دیا۔ تہ خانے کی اکلوتی لائٹ بجھی اور گہری تاریکی چھا گئی۔

میں رائفل بردار کی پوزیشن ذہن نشین کر چکا تھا۔ نیچے جھک کر میں نے بڑی تیزی سے درمیانی فاصلہ طے کیا اور رائفل بردار پر جا پڑا۔ میرا شانہ رائفل بردار کی ناف سے ٹکرایا تھا۔ اس کے حلق سے ناقابلِ فہم آواز نکلی اور وہ پشت کے بل زینوں پر گرا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی کمر سے لپٹ چکا تھا جبکہ دوسرے نے اس کی رائفل تھام لی تھی۔ صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ میں اپنے شکار کو آواز نکالنے کا موقع نہ دوں اور میں نے یہ تقاضا پورا کیا۔ رائفل سیڑھیوں سے ٹکرانے کی مدھم آواز کے سوا کوئی صدا نہیں ابھری۔ اس سے پہلے کہ مدِمقابل منہ کھولتا اور حلق پھاڑ کر چیختا، میں نے دایاں بازو اس کی کمر کے نیچے سے نکالا اور گردن سے لپیٹ دیا۔ اپنی اس گرفت پر مجھے بے پناہ اعتماد تھا۔ ایک مخصوص جھٹکے سے میں نے مدِمقابل کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔

یہ سارا عمل دو تین سیکنڈ کے مختصر وقت میں مکمل ہوا۔ قیدی دلیپ سنگھ کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے پھنکار کر سرگوشی کی کہ وہ خاموش ہو جائے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ میں نے خودکار رائفل ہاتھ میں لے کر اس کا رخ تہ خانے کے دروازے کی طرف کر دیا۔ بڑے اعصاب شکن لمحات تھے۔ کسی بھی لمحے اس یخ بستہ تہ خانے میں موت رقص کر سکتی تھی۔ پانچ سیکنڈ گزرے پھر دس سیکنڈ، پھر قریباً ایک منٹ گزر گیا۔ دروازے کے آس پاس کوئی آہٹ نہیں ابھری۔ اپنے فرار کا پہلا مرحلہ میں نے کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ تہ خانے سے باہر کسی کو پتا نہیں چلا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔

میں دلیپ کے پاس پہنچا اور تاریکی میں ٹٹول کر اس کا شانہ دبایا۔ "یہاں سے نکلنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ پوری جان سے کانپ کر بولا۔

"چلو اٹھو۔ بزدل نہ بنو۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"نہیں... واہگرو کے لیے نہیں۔" اس نے میرے پاؤں تھام لیے۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

میں چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ پھر رائفل سنبھال کر بہ آہستگی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں نے دہلیز پر رک کر چند لمحے سن گن لی پھر دبے پاؤں باہر آ گیا۔ یہ ایک طویل برآمدہ تھا۔ آخری سرے پر روشنی ہو رہی تھی لیکن کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پورچ میں بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے مکینوں کو ہنگامی طور پر کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ میرے لیے یہ آئیڈیل سی تھی۔ میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا پورچ میں پہنچا۔ مین گیٹ پر گورکھا گارڈ نظر آ رہا تھا۔ خودکار گن اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ چال ڈھال سے ایک بے حد چوکس شخص دکھائی دیتا تھا۔ میں گارڈ کی

پانچ فٹ اونچی باڑ کے پیچھے چھپتا ہوا چاردیواری کے پاس پہنچ گیا۔ کسی قریبی گھر سے ٹیلی وژن چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ دوردرشن سے ہندی فیچر فلم دکھائی جارہی تھی۔ ایک گانے کے بول فضا میں گونج رہے تھے۔ "آگے بھی جانے نہ تو پیچھے بھی جانے نہ تو جو کچھ ہے بس یہی ایک پل ہے۔" واقعی سب کچھ یہی ایک پل تھا۔ اس ایک پل کے بعد میرے سامنے سات فٹ اونچی دیوار تھی۔ مجھے اس دیوار پر چڑھ کر اس طرح سڑک پر کودنا تھا کہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔

دیوار کے پاس مالٹے کے پودوں پر مجھے چند کپڑے نظر آئے۔ یہ دھوکر سوکھنے کے لیے پھیلائے گئے تھے۔ ان میں ایک کڑھائی دار گرم شال بھی تھی۔ یہ مردانہ شال کافی قیمتی نظر آتی تھی۔ میں نے یہ شال پودے سے کھینچ کر کمبل کی طرح جسم سے لپیٹ لی۔ چند لمحے گردونواح کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دیوار پھاندی اور باہر سڑک پر آگیا۔ یہ ایک بغلی سڑک تھی۔ کسی نے مجھے دیوار سے کودتے نہیں دیکھا۔ میں سڑک پار کرکے ایک چھوٹی سی گلی میں گھس گیا اور وہاں سے ایک دوسری سڑک پر نکل آیا۔ یہ سارا رہائشی علاقہ تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ سخت سردی کے سبب لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ جلد ہی مجھے ایک سائیکل رکشا نظر آگیا۔ میں ننگے پاؤں تھا اور زیادہ دیر پیدل چلنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں سائیکل رکشا میں بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے سرجی؟" رکشا والے نے میری قیمتی شال دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گردوارا اسٹاپ چلو۔" میرے ذہن میں فوری طور پر یہی نام آیا۔ یہ جگہ اس سنیما ہاؤس کے پاس ہی تھی جہاں سے سہ پہر کے وقت مجھے پکڑا گیا تھا۔ جوں جوں میں کوٹھی سے دور ہو رہا تھا' تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے جارہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا شک بھی دل میں پھل پھول رہا تھا۔ اس شک کی پہلی کونپل اس وقت پھوٹی تھی جب میں کوٹھی سے باہر نکلا تھا۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اتنی آسانی کے ساتھ اس جگہ سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ کہاں اتنی احتیاط کہ مجھے رائفلوں کی چھاؤں میں رکھا جارہا تھا اور کہاں یہ بے پروائی کہ ایک تنہا شخص غسل خانے میں اترا تھا اور کھانا کھلانے کے لیے میرے ہاتھ کھول ڈالے تھے۔ میں سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ پولیس والے اکثر ملزمان کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تفتیش کے دوران ملزم کو چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مخبر اس کے پیچھے لگا دیے جاتے ہیں۔ ملزم سمجھتا ہے کہ اس کی جان چھوٹ گئی ہے۔ وہ اپنے اڈے پر یا اپنے ساتھیوں تک پہنچتا ہے اور پولیس کا کام آسان کرتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ مجھے بھی جان بوجھ کر نکلنے کا موقع فراہم کیا گیا ہو اور اس امید پر میرا تعاقب کیا جارہا ہو کہ میں خراماں خراماں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں نے رکشے والے کو گردوارا اسٹاپ چلنے کو کہا تھا تو اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرف جانے والا راستہ زیادہ مصروف نہیں تھا۔ اس راستے پر میں باآسانی اپنے تعاقب کا کھوج لگا سکتا تھا۔

فیشن ایبل رہائشی علاقے سے نکل کر جب رکشا والا بڑی سڑک پر آیا تو میں نے اپنی تمام توجہ عقب میں مرکوز کردی۔ سڑک پر آمدورفت جاری تھی۔ فوری طور پر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تاہم جلد ہی میری چھٹی حس زوروشور سے اعلان کرنے لگی کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔ کچھ نادیدہ آنکھیں تھیں جو مسلسل میرے پیچھے آرہی تھیں۔ میں خاص طور پر کسی گاڑی یا شخص پر شبہ نہیں کرسکتا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ تعاقب ہو رہا ہے۔ جلد ہی میری سواری بابو بہاری گردوارا اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ وسیع و عریض گردوارے کے عین سامنے جاکر سائیکل رکشا رک گیا۔ شاید رکشے والے کا خیال تھا کہ میں یہاں ماتھا ٹیکنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کے خیال کو غلط ثابت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور دوارے کے اندر چلا گیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر زوروشور سے گرنتھ کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ جہاں سے دوارے کا صحن شروع ہوتا تھا وہاں حاضرین کے بے شمار جوتے پڑے تھے۔ میرے لیے اس وقت یہ جوتے بڑے اہم تھے۔ مجبوری کے تحت تو مُردار بھی حلال ہوجاتا ہے۔ میں تو صرف جوتا چرانا چاہ رہا تھا۔ واہ گرو سے معذرت کرکے میں نے بڑی احتیاط سے ایک جوتا منتخب کیا اور اسے پہن کر صحن کے کنارے کنارے چلتا گردوارے کے بغلی دروازے کی جانب آگیا۔

قیمتی شال نے میرا تباہ حال لباس چھپا لیا تھا۔ اب پاؤں میں نفیس قسم کا جوتا آجانے سے میری ظاہری حالت کافی بہتر ہوگئی تھی۔ بغلی دروازے کے پاس نیم گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی تھیں۔ یہاں میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا اور کنپٹی اور سر پر لگے ہوئے خون کو بھی صاف کرلیا۔ گردوارے کا بغلی دروازہ ایک تنگ سے بازار میں کھلتا تھا۔ یہاں رات کے نو بجے بھی خریدار نظر آرہے تھے۔ کسی ہوٹل سے گرما گرم کھانوں کی مہک اٹھ رہی تھی۔ مُردہ مرغ کی یخنی بیچنے والا خوانچہ فروش زوروشور سے آوازیں لگا رہا تھا اور ایک جانب

پان سگریٹ کی دکان پر درجنوں افراد کھڑے ٹیلی وژن پر فلم دیکھ رہے تھے۔ جونہی میں اس دروازے سے نکلا' مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے پیچھے آنے والے چاروں طرف موجود ہیں۔ وہ آسیبی سایوں کی طرح میرے اردگرد رینگ رہے تھے۔ وہ عام راہ گیروں میں روپوش تھے لیکن پھر بھی پہچانے جارہے تھے۔ ان کی پہچان ان کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جن میں ہزار ہا پاور کے بلب جل رہے تھے اور جو کسی قیمت پر مجھے کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ جونہی میں دروازے سے نکلا ایک سکھ نے اپنی موٹر سائیکل کو کک ماری اور میرے سامنے سے گزر کر گردوارے کے مین دروازے کی طرف چلا گیا۔ ہلکین کار کے قریب ایک شخص کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا' وہ بھی آہستگی سے کار میں بیٹھ گیا اور اسے پہلے گیئر میں ڈال کر گلی کے نکڑ پر لے گیا۔ میری چھٹی حس خبردار کررہی تھی کہ ٹیلی وژن دیکھنے والوں میں بھی کم از کم ایک شخص ایسا موجود ہے جو میری ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ اپنے اردگرد کی یہ پُراسرار سرگرمیاں دیکھ کر میں نے واپس سائیکل رکشا والے کے پاس جانا مناسب سمجھا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوچکی تھی اور جسم کے اعضا اس ہنگامے کے لیے تیار ہو رہے تھے جو فرید کوٹ کے کسی بھی گلی کوچے میں برپا ہونے والا تھا۔ اپنے تعاقب سے باخبر ہوکر بھی میں انجان بنا ہوا تھا۔ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اس مصیبت سے آگاہ ہوچکا ہوں جو ارجمند بانو کی کوٹھی سے میرا تعاقب کررہی ہے۔ دوسری طرف تعاقب کرنے والے بھی بڑی منصوبہ بندی سے میرے پیچھے آرہے تھے۔ وہ اس تعاقب کو جاری رکھنے کے لیے ہر طرح تیار تھے اور سچویشن پر پورا کنٹرول رکھے تھے بلکہ اب تو مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید یہ رکشا والا بھی ارجمند بانو ہی کا کارندہ ہے۔ میں نے اپنے طور پر اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

گردوارا اسٹاپ سے روانہ ہونے کے بعد میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے نہ ہی اس نے پوچھا تھا۔ ہم بس بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔ آخر ایک چوراہے پر پہنچ کر اسے پوچھنا پڑا۔ "اب کہاں جائیں گے سرجی۔"

میں نے اپنی نشست پر ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جہاں بھی لے چلو۔"

"کیا مطلب جی؟" اس نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کسی اچھی سی۔۔۔ موج میلے والی جگہ پر۔"

اس نے گردن گھما کر میرا جائزہ لیا۔ ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ "سرجی! جگہیں تو بہت سی ہیں۔ اب پتا نہیں آپ کدھر جانا چاہیں گے۔"

میں نے کہا "جو سب سے اچھی اور نزدیک ہے' وہاں لے چلو۔ پیسے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"جو حکم جناب۔" اس نے سائیکل رکشا چوراہے سے دائیں جانب موڑا اور اس کی ٹانگوں میں خاص قسم کی تیزی آگئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سواری شوقین مزاج ہے اور جیب میں مال شال بھی ہے۔ اسے ٹھیک ٹھاک ٹپ مل جائے گی۔ رکشا والے نے رکشا کھینچنے کے دوران ہی بیڑی سلگانے کا کرتب دکھایا اور بولا۔ "اس روڈ پر تین چار جگہیں ہیں جناب۔ مون لائٹ کلب ہے' فیروز کلب ہے اور اسٹار ہوٹل ہے۔ اسٹار ہوٹل ذرا مہنگا ہے لیکن۔۔۔ سیر و تفریح کے لیے بڑی اچھی جگہ ہے۔ آج تو ویسے بھی اتوار ہے' بڑی رونق ہوگی وہاں۔"

"تو ٹھیک ہے شہزادے' وہیں لے چلو۔" میں نے بگڑے تگڑے رئیس کی طرح کہا۔

رکشا والے نے رفتار اور تیز کردی۔ دس پندرہ منٹ بعد سائیکل رکشا 'اسٹار ہوٹل' کے سامنے رک رہا تھا۔ میں نے مسروقہ شال اچھی طرح جسم سے لپیٹ لی تھی اور کوشش کرکے خودکار رائفل کو اس طرح جسم سے چپکایا تھا کہ وہ جسم کا حصہ ہی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے رکشا سے اترتے ہوئے کہا۔ "تم کو یہیں رکنا ہے بھئی۔ آج رات تم میرے لیے بک ہو۔"

رکشا والے نے خوشدلی سے سر ہلایا۔ اسے بڑی اچھی اور عجیب و غریب سواری ملی تھی۔ اچھی اس لیے کہ گردوارے میں ماتھا ٹیک کر آئی تھی اور عجیب و غریب اس لیے کہ ماتھا ٹیک کر سیدھی عشرت کدے میں آئی تھی اور اب رات بھر کے لیے اسے بک کررہی تھی۔ یہ شہر کا فیشن ایبل علاقہ تھا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں چھوٹی بڑی بہت سی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جچے تلے قدم اٹھاتا میں ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ باوردی دربان نے دروازہ کھولا اور جھک کر نمستے کیا۔ میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ ہال آراستہ و پیراستہ تھا لیکن یہاں مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ ویٹروں کی مدد کے لیے دو تین لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ میں ایک خاص میز پر جابیٹھا اور چائے کا آرڈر دیا۔

ویٹر تعظیمی انداز میں سرہلا کر واپس چلا گیا۔ ہوٹل ائرکنڈیشنڈ تھا۔ یہاں کی خوشگوار حرارت میں اتنے اہتمام

سے تنال لپیٹے رکھنا عجیب سا لگ رہا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ ابھی مجھے بیٹھے چار پانچ منٹ ہوئے تھے کہ ہال میں ایک دو نگران چہرے نظر آنے لگے۔ اس دوران میرے سامنے ـے سرو کر دی گئی۔ میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ ایک خوش رو ویٹر آہستگی سے میرے سامنے جھکا اور بولا۔ "جناب! آپ جوائے ہال میں جانا پسند فرمائیں گے؟" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "آج اسپیشل پروگرام ہے۔ بمبئی سے ڈانس گروپ آیا ہوا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک چھپا ہوا تعارفی کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ کارڈ میں ان آئٹمز کی لسٹ تھی جو جوائے ہال کے پروگرام میں پیش کیے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ انٹری فیس بھی درج تھی۔ بھاری بھرکم فیس دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پروگرام کس نوعیت کا ہوگا۔ بمبئی کے بدمعاشوں سے طویل دنگل کے دوران ایسے بے ہودہ تماشے میں نے بہت دیکھے تھے۔

"او کے" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی دس پندرہ منٹ تک میں یہیں بیٹھوں گا۔"

وہ بولا "کوئی بات نہیں جناب۔ آپ جب چاہیں جوائن کر سکتے ہیں۔ یہ کنٹینیوس (مسلسل) شو ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر اس عشرت کدے کا انتخاب کیا تھا۔ ایسے اڈوں پر کسی شریف بندے کا گزر نہیں ہوتا۔ یہ لوفر تماش بینوں کا ہجوم تھا۔ اگر یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا ہوتا اور گولیاں وغیرہ چلتیں تو کسی معصوم بچے یا بے گناہ عورت کا خون تو نہ ہوتا۔ صرف شیطان کے چیلے مرتے اور زمین کا بوجھ کم ہوتا۔ میں نے بہت خون بہایا ہے اور کبھی کبھی سفاکی کی حد کو چھو گیا ہوں لیکن بدترین حالات میں بھی ہمیشہ میری یہی کوشش رہی ہے کہ میرے ہاتھوں کسی عام شخص کی جان نہ جائے۔ جو شخص اپنی راہ جا رہا ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ جانتا نہیں ہوں وہ میرے نزدیک عام شخص ہے اور عام شخص پاکستانی، ہندوستانی یا امریکی نہیں ہوتا، وہ صرف عام شخص ہوتا ہے۔ کسی مقدس ترین مشن کے لیے بھی اس کی جان لینا میرے نزدیک گناہ ہے۔

میں دس پندرہ منٹ اس میز پر بیٹھا رہا۔ اس دوران میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ جوائے ہال کس طرف ہے اور لوگ وہاں کس طور جا رہے ہیں۔ ہال سے ایک قالین پوش راستہ کشادہ زینوں تک جاتا تھا۔ ان زینوں پر بھی خوبصورت سرخ قالین بچھا تھا۔ زینوں کے پاس ایک فیشن ایبل بڑھیا کھڑی تھی۔ عجیب سی خباثت جھلکتی تھی اس کے چہرے سے۔

زینوں کی طرف جانے والا بڑھیا کے پاس پہنچتا تو وہ اس سے خوش آمدیدی کلمات کہتی اور ہاتھ سے زینوں کی طرف اشارہ کرتی۔ زینوں کے اختتام پر ایک بے حد جسیم تنومند اور خطرناک صورت والا شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے آگے ایک تپائی رکھی تھی۔ زینے چڑھ کر اوپر جانے والا شخص۔ "پے منٹ" کرتا اور وہ شخص ایک ٹکٹ پھاڑ کر اس کے حوالے کر دیتا۔ یقیناً یہ شو کا ٹکٹ ہوتا تھا۔ میری جیب میں اس وقت پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ ارجمند بانو کے ہرکاروں نے جیب سے نکال لیا تھا بلکہ اب تو شاید جیب بھی سلامت نہیں رہی تھی۔ جو باز مجھ پر چھوڑا گیا تھا اس نے لباس جگہ جگہ سے یوں ادھیڑا تھا کہ ناقابلِ شناخت بنا کے رکھ دیا تھا۔ شال نے میرے لباس کی پردہ داری نہ کی ہوتی تو شاید میں اسٹار ہوٹل کے سامنے سے گزر بھی نہ سکتا۔

میں اسی اُدھیڑبن میں بیٹھا تھا کہ ہال کی طرف جاؤں یا نہیں کہ سات آٹھ افراد کا ایک گروپ دکھائی دیا۔ وہ ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے رکے پھر زینوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شو میں جا رہے ہیں۔ یہ موقع میرے لیے غنیمت تھا۔ میں میز سے اٹھ کر ان میں شامل ہو گیا۔ استقبال کرنے والی بڑھیا کی صورت بندریا سے اتنی مشابہ تھی کہ اس کی دُم ڈھونڈنے کو جی چاہتا تھا۔ زینے طے کر کے ہم اوپر پہنچے۔ ٹکٹ کاٹنے والا اپنے حال میں مگن نظر آتا تھا۔ اس نے گروپ کے ارکان کو گننے کی ضرورت نہیں سمجھی اور میں بلا ٹکٹ جوائے ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال دوسری منزل پر تھا اور ہمیں وہاں پہنچنے کے لیے مزید سیڑھیاں چڑھنا پڑی تھیں۔ ہال کے اندر ایک نیم دائرے میں ڈیڑھ دو سو نشستیں موجود تھیں۔ جگہ جگہ صوفے اور میزیں بھی رکھے تھے۔ میزوں پر سامانِ ناؤ نوش موجود تھا اور بد قماش "حضرات" فاحشہ لڑکیوں سے فحش گفتگو میں مصروف تھے۔ ہر چیز موسیقی اور دھوئیں کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ سب سے ہوشربا نظارہ اس ہال کے اسٹیج کا تھا۔ یہاں چند خوبصورت لڑکیاں کھڑی روٹی کپڑے اور مکان کا رونا رو رہی تھیں۔ روٹی کی خاطر وہ اسٹیج پر آئی تھیں اور ظاہر ہے 'مکان' بھی نہیں تھا کیونکہ لڑکی کا اصل مکان اس کے سیاں کا گھر ہوتا ہے اور یہ بیبیاں لنڈوری دکھائی دیتی تھیں۔ جہاں تک کپڑے کا تعلق ہے کچھ پوچھنے یا کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لباس کے نام پر بے چاریوں کے جسم پر ایک 'تار' نہیں تھا اور اوپر سے کڑکتی سردی میں وہ ٹھنڈے یا نیم گرم پانی سے یہ عام شاور لینے پر مجبور تھیں۔

یہ شیطانی اسٹیج تھا۔ یہاں ہر شب شیطان عریاں ہو کر رقص کرتا تھا اور وہ سب کچھ کرتا تھا جو ایکس ریٹڈ فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ میں ہال کے ایک نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھا۔ بِن پوچھے ہی میرے سامنے وسکی اور بیئر رکھ دی گئی۔ اسی دوران میرے چند نگران بھی اس ہال میں داخل ہو گئے۔ اس دفعہ میں نے ان میں جلال کو بھی دیکھا۔ جلال کی آمد معنی خیز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ تعاقب میں آنے والے اپنی چال کی ناکامی سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے ان کا پھینکا ہوا دانہ نہیں چُگا۔ اب انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں میں ویسے ہی رفو چکر نہ ہو جاؤں۔ صورتِ حال اب فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ میں جان گیا کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ جلال کے ہال میں داخل ہوتے ہی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس حصے کی طرف بڑھا جہاں ٹوائلٹ اور باتھ رومز بنے ہوئے تھے۔ میں نے باتھ رومز کا جائزہ لیا اور ایک کشادہ باتھ روم میں گھس گیا۔ اس باتھ روم کی عقبی دیوار میں ایک چوکور کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ باتھ روم میں پہنچتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکی میں گرل یا جالی وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ یہ ایک تاریک سڑک تھی۔ اس سڑک کو بھی ہوٹل کی پارکنگ کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ گاڑیوں کے قریب ہی ایک مسلح پٹھان چوکیدار ٹہل رہا تھا۔ مجھے سڑک پر کودنے کے بجائے چھت پر پہنچنا زیادہ آسان نظر آیا۔ میں نے شال کو لپیٹ کر گلے میں ڈالا اور پھر کمر کے گرد بل دے کر گرہ دے دی۔ اس دوران باتھ روم کا دروازہ ایک زوردار دستک سے گونج اٹھا۔

"اس غسل خانے میں ہے جی۔" ایک شخص کی چیختی ہوئی آواز آئی۔

"دیکھو کہیں کھڑکی سے نہ نکل جائے۔" جلال کی دہاڑتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے تیز بھاگتے قدموں کی آہٹیں سنیں۔ پھر کوئی رائفل کے بٹ سے دروازہ کوٹنے لگا۔ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر پاؤں رکھا تو مضروب انگلیوں میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ دل ہی دل میں لعنتی اے ایس آئی کو کوس کر میں نے اپنا بالائی دھڑ کھڑکی سے باہر نکالا اور چھت کے آگے نکلے ہوئے چھجے کو تھام لیا۔ معمولی کوشش سے میں چھت پر پہنچ گیا۔ یہ ایک وسیع چھت تھی اور اس پر برساتی بھی موجود تھی۔ سیڑھیاں برساتی کے اندر سے اترتی تھیں۔ مجھے برساتی میں سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ کچھ لوگ برق رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آ رہے تھے۔ پس منظر میں "فن کار" لڑکیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ میں لپک کر برساتی کے دروازے پر پہنچا اور اسے بند کرنے کی کوشش کی۔ چھت کی طرف دروازے میں کنڈی موجود تھی لیکن بارش کے سبب چوبی تختے پھول گئے تھے اور کنڈی چڑھانا ناممکن ہو گیا تھا۔ دروازہ بند کرنے کی ناکام کوشش میں جو چند ثانیے ضائع ہوئے ان میں میرا اور اوپر آنے والوں کا درمیانی فاصلہ مزید کم ہو گیا۔ اب بھاگنا بے سود تھا۔ میں نے دروازہ چوپٹ کھولا اور گن کا رخ سیڑھیوں کی طرف پھیر دیا۔

سب سے آگے جلال خود تھا۔ اس کے پیچھے کم از کم چار افراد سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے آ رہے تھے۔ جلال کے ہاتھ میں سیاہ ماؤزر میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود کار رائفل کا ٹریگر دبایا۔ زبردست آواز سے سیڑھیاں گونج اٹھیں۔ کم از کم پانچ گولیاں جلال کے جسم میں لگیں۔ لیکن وہ لڑکھڑایا اور نہ رُکا۔ معمولی سی تکلیف بھی اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دی۔ میں نے ایک اور برسٹ مارا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں گولیاں نہیں صرف پٹاخے چلا رہا ہوں۔ یہ اصل گولیاں نہیں تھیں۔ میں مڑا اور حتی الامکان رفتار سے چھت کے شمالی حصے کی طرف بھاگا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس طرف دس گیارہ فٹ چوڑی گلی موجود ہے۔ میں یہ گلی پھلانگ سکتا تو دوسری چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ اس چھت کے بیچوں بیچ واٹر سپلائی کی ٹینکی تھی۔ یہ ٹینکی مجھے وقتی طور پر آڑ فراہم کر سکتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں نے پوری قوت سے چھلانگ لگائی تو گلی پار کر جاؤں گا اور نہ بھی کر سکا تو کم از کم سر کے بل نہیں گروں گا۔ بندہ بے قابو ہو کر نہ گرے تو پچیس چھبیس فٹ کی بلندی سے گر کر بھی "غازی" ہی رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں تو دوسری بات ہے۔

میں نے رفتار سے بھاگتے ہوئے ساری قوت ٹانگوں میں سمیٹی اور اندھا دھند چھلانگ لگا دی۔ بس انچوں کے فاصلے سے میں کامیاب ہوا اور دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ میرے خیال میں یہ ایک زبردست چھلانگ تھی اور میرے پیچھے آنے والوں کو مجھ تک پہنچنے کے لیے اب لمبا چکر کاٹنا تھا لیکن اس وقت مجھے دھچکا لگا جب میں نے اپنے عقب میں جلال کو کسی اسپرنگ کے مانند اچھلتے دیکھا۔ اس نے ایک شاندار جمپ لگائی اور گلی پار کر کے دوسری چھت پر آ گیا۔ پاؤں چھت سے چھوتے ہی اس نے کمانڈوز کی طرح قلابازی لگائی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

وہ بمبئی کی فلم نگری کا مانا ہوا اسٹنٹ مین تھا اور اپنی مہارت کو بڑی بے ساختگی سے بروئے کار لایا تھا۔ میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ جلال کو اپنے سامنے پایا۔ حریف کی طرف سے پھرتی اور دلیری کا ایسا مظاہرہ ہو تو مدمقابل اندر سے ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا لیکن پھر فوراً سنبھل گیا اور جلال کے مقابل آگیا۔ جلال کے ہاتھ میں ماؤزر تھا لیکن اس نے مجھ پر فائر نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی تھی۔ عین میرے سامنے پہنچ کر اس نے ماؤزر میری طرف سیدھا کیا اور غرایا "خبردار! گولی مار دوں گا۔"

شاید اس کا خیال تھا کہ میں گن پھینک کر ہاتھ اٹھا دوں گا تو اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر گن کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور جلال کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ یہ چوٹ کارگر ثابت ہوئی اور ماؤزر جلال کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے بڑے فلمی انداز میں مجھے کک مارنے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگ حرکت میں آتے ہی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ جونہی جلال کا وار خالی گیا، میں نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ میں نیچے جھک کر اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ مجھے بینڈز اپ کرانے کے شوق میں جلال ایک بات بالکل فراموش کر گیا تھا۔ وہ چھت کی منڈیر کے قریب کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا میں اسے دھکیلتا ہوا منڈیر کے عین اوپر لے گیا۔ بالکل آخری وقت پر جلال کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں اور پوری طاقت سے پینترا بدلنے کی کوشش کی لیکن فیصلہ کن لمحہ گزر چکا تھا۔ میں نے شانے کی "دھکیل" سے جلال کو چھت کی منڈیر پار کرا دی۔ وہ اپنی تمام مہارت، پھرتی اور حربی صلاحیتوں سمیت پچیس فٹ کی بلندی سے نیچے لڑھک گیا۔ ایک ساعت بعد میں نے اس کے گرنے کی زوردار آواز سنی۔ وہ کسی گاڑی کی چھت پر گرا تھا اور اس کے گرنے کے ساتھ ہی گاڑی کا شیشہ بھی چھناکا چور ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے ایک اور واقعہ رونما ہوا تھا۔ جلال کے گرتے ہوئے جسم کے راستے میں بجلی کے ہائی وولٹیج تار آئے تھے۔ وہ ان تاروں سے ٹکرایا تھا۔ ایک دھماکے کے ساتھ شعلے نکلے اور قرب و جوار کا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

یہ تاریکی میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ میں نے گن پھینک کر جلال کا گرا ہوا ماؤزر اٹھایا اور دوڑتا ہوا نیچے جانے والے زینوں پر پہنچا۔ یہ دوسری عمارت بھی ایک ریسٹورنٹ کی تھی۔ بتیاں بجھ جانے سے یہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ غالباً کوئی بڑی پارٹی ہو رہی تھی یہاں جس میں بہت سی عورتیں اور بچے بھی موجود تھے۔ ہر طرف سُریلی آوازیں گونج رہی تھیں۔ زینوں پر کئی افراد سے میرا ٹکراؤ ہوا لیکن میں نے کسی کی صورت دیکھی نہ کوئی میرا حلیہ دیکھ سکا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے باہر کا راستہ پکڑا۔ عمارت کے ایک بغلی دروازے سے نکل کر میں اس تنگ گلی میں پہنچا جسے پہلے میں نے اور پھر جلال نے بلندی سے پھلانگا تھا۔ گلی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، میں وہاں سے نکل کر عقبی سڑک پر آیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ پانچ دس منٹ بعد میں اسٹار ہوٹل سے محفوظ فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک بس اسٹاپ پر مجھے ایک بس رکتی نظر آئی۔ یہ لوکل بس تھی اور سواریوں سے لدی پھندی تھی۔ میں بھاگ کر بس کے پائیدان سے لٹک گیا۔ چند لمحے بعد بس پھر چل پڑی اور میں آہستہ آہستہ جگہ بناتا اندر کی طرف کھسکنے لگا۔

پٹاخوں والی گن تو میں ریسٹورنٹ کی چھت پر پھینک آیا تھا۔ اب میرے پاس جلال کا ماؤزر تھا۔ اس چھوٹے سائز کے ماؤزر کو لباس میں چھپانا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس نیک توقع کے ساتھ کہ ماؤزر میں "واقعی" گولیاں موجود ہوں گی، میں نے اسے اچھی طرح نیفے میں اڑس لیا تھا اور ایک ہاتھ سے مسلسل اسے ڈھانپے ہوئے تھا۔ چند منٹ بعد میں بس کے اندر پہنچ گیا اور مسافروں کے اس ریوڑ میں گھس گھسا کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ بس اس جگہ سے گزر رہی ہے جہاں چند منٹ پہلے میں ہنگامہ برپا کر چکا ہوں۔ میں نے ذرا سا جھک کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ تھوڑی دیر بعد اسٹار ہوٹل کی عمارت میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ علاقہ ابھی تک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس بڑی سست روی کے ساتھ اس مقام سے گزری جہاں جلال چھت سے گرا تھا اور بجلی کے تار ٹکرانے سے دھماکا ہوا تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ لوگ ریسٹورنٹ کی چھت پر بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک پولیس والا لوگوں کو ایک ایسی کار کے اردگرد سے ہٹا رہا تھا جس کا ونڈ اسکرین ٹوٹا ہوا تھا۔ بلاشبہ جلال اس کار پر گرا تھا۔ بس میں موجود لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کچھ نے موقعے پر موجود لوگوں سے صورت حال دریافت کی۔ ایک بڑے سکھ نے بتایا "ٹھیک سے پتا نہیں وائی۔ کہتے ہیں ڈاکو تھے۔ ایک بندے کو تو جان سے مار گئے ہیں، کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے ہیں۔"

جلد ہی بس اس مقام سے آگے نکل گئی۔ منظر پیچھے رہ گیا

لیکن منظر پر تبصرے بس میں گونجتے رہے۔ کوئی اسے ہر خالصے جوانوں کی کارروائی قرار دے رہا تھا۔ کوئی تخریب کاری کہہ رہا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ بدمعاشوں کے دو گروہوں میں جھڑپ ہوئی ہے۔ میں اپنی جگہ دبکا کھڑا یہ تبصرے سنتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ کنڈیکٹر کرایہ وصولنے کے لیے میری طرف نہ آئے۔ بس شہر کے مختلف حصوں سے گزر کر آخری اسٹاپ پر پہنچ گئی۔ سب سواریاں اتر گئیں لہٰذا مجھے بھی اترنا پڑا۔ یہ شہر کا اندرونی علاقہ تھا۔ دن کے وقت یہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہوگا لیکن اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ رونق بتدریج کم ہو رہی تھی۔ کہیں پاس ہی سے مجھے گرنتھ کے پاٹھ کی آواز آئی۔ میں نے اس آواز کو شناخت کر لیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی ہوئی یہ آواز اسی گوردوارے سے آ رہی تھی جہاں سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں نے جوتا منتخب کیا تھا۔ چوری شدہ جوتے کے ساتھ دوبارہ گوردوارے میں جانا مناسب تو نہیں تھا لیکن مجھے کوئی اور ٹھکانا بھی نظر نہیں آیا۔ بازار میں تنہا گھومنے سے بہت بہتر تھا کہ کسی ہجوم میں پناہ حاصل کی جائے۔ آواز میری بائیں جانب سے آ رہی تھی۔ آواز کا تعاقب کرتا ہوا میں چند گلیوں سے گزرا اور گوردوارا اسٹاپ پر پہنچ گیا۔

گوردوارے کے اندر اب پہلے سے زیادہ ہجوم نظر آ رہا تھا۔ بیرونی دروازے کے پاس بہت سی موٹر سائیکلیں اور چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ جوتا جہاں سے پہنا تھا وہیں اتار دیا اور آگے بڑھ کر اس مجمعے میں بیٹھ گیا جو ایک عمر رسیدہ پاٹھک کو بڑے غور و فکر سے سن رہا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ طاقوں میں خوشبوئیں سلگ رہی تھیں۔ ہال کے اندر ہی ایک جانب طویل قنات لگی ہوئی تھی۔ اس قنات کی دوسری جانب خواتین بیٹھی تھیں۔ اس زنانہ حصے کی جانب سے گاہے گاہے عورتوں کے کھانسنے اور بچوں کے رونے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس مذہبی محفل کے رنگ ڈھنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری رات چلے گی۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے کھسر پھسر کی اور میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ رت جگے کا اجتماع تھا۔ کئی گرنتھیوں نے تقاریر کرنی تھیں اور اس کے بعد دوارے کے اندرونی ہال میں انفرادی عبادات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی سازگار صورت حال تھی۔ میں نے سر گھٹنوں میں دے کر اوپر سے شال لے لی اور "دھیان" کے عالم میں آہستہ آہستہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔ تقریباً تمام حاضرین کا یہی انداز تھا۔ وہ سب جھول رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان میں سے ستر اسی فیصد پاٹھ نہیں سن رہے صرف جھول رہے ہیں اور اونگھ رہے ہیں۔ جو جاگ رہے تھے ان میں سے بھی اکثر کے ذہن اس پوتر محفل میں موجود نہیں تھے۔ مجھے اپنی والدہ کی بات یاد آ گئی۔ وہ کہا کرتی تھیں عبادت زبان سے نہیں دل سے ہوتی ہے۔ جو شخص محض رٹائی نماز پڑھتا ہے اور اس کا دماغ کہیں اور ہوتا ہے وہ اپنے خدا کو دھوکا دیتا ہے۔ مجھے اس محفل کو دیکھ کر یوں لگا کہ یہاں بھی سب لوگ واہگرو کو دھوکا دینے بیٹھے ہوئے ہیں۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ بچار میں مصروف تھا۔ میں بابو لیاقت کے پاس پہنچنے کے لیے اپنے ساتھیوں سے جدا ہوا تھا اور تقریباً اٹھارہ گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی بابو لیاقت سے میرا سامنا نہیں ہو سکا تھا۔ بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے دشمن اتنی جلدی ہمارے اردگرد منڈلانے لگیں گے۔ اگر ارجن سنگھ، بانو اور جلال، فرید کوٹ میں پائے جا سکتے تھے تو اور لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ابراہیم اور شنکر وغیرہ بھی یہاں قدم رنجہ فرما چکے ہوں اور اپنے ہرکاروں کے ساتھ ہماری تلاش میں گلی کوچوں کی خاک چھان رہے ہوں۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ میں بابو لیاقت سے ملنے اس گوردوارے سے نکلتا اور ایک بار پھر دھر لیا جاتا۔ دل میں آئی کہ بابو لیاقت کا خیال دل سے نکال کر واپس اپنے ساتھیوں تک پہنچوں اور ترک کو یہاں سے نکالنے کی سبیل کروں لیکن بات پھر وہیں پر آ جاتی تھی۔ جس طرح اس آباد گوردوارے سے نکلنے میں میرے لیے خطرات تھے، اسی طرح اس ویران گوردوارے سے نکلنے میں ترک کے لیے خطرات پوشیدہ تھے۔ سلامتی اسی میں تھی کہ ہم جہاں جہاں ہیں وہاں دبکے رہیں لیکن ایسا بھی کب تک ہو سکتا تھا۔ وقت ہمارے خلاف جا رہا تھا۔ اگر ہم دیر تک اپنی اپنی جگہ دبکے رہتے تو اس کبوتر کی پیروی کرتے جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

وہ ساری رات میں نے گوردوارے میں گزار دی۔ صبح لنگر میں دال روٹی اور حلوہ کھایا اور ایک گیلری میں دوسرے لوگوں کی طرح شال اوڑھ کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے لیکن نہیں آئی۔ آتی بھی نہیں چاہیے تھی۔ شال میرے خستہ حال لباس کا پردہ بنی ہوئی تھی اگر حالت نیند میں وہ میرے اوپر سے سرک جاتی تو شاید میرا تماشا دیکھنے والوں کا مجمع لگ جاتا اور اگر وہ ماؤزر بھی ظاہر ہو جاتا جو میں نے نیفے میں اڑس رکھا تھا تو سونے پر سہاگا تھا۔ گوردوارے کے بیرونی دروازے پر نمایاں حروف میں لکھا تھا کہ عبادت گاہ میں اسلحہ

لے جانا سخت ممنوع ہے۔ مشرقی پنجاب کے بگڑے ہوئے حالات کے سبب ایسی ہدایات کئی گوردواروں پر لکھی ہوئی تھیں۔ میں شال تان کر بالکل سیدھا لیٹا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آخر میں نے فیصلہ کرلیا کہ شام ہوتے ہی گوردوارے سے نکل کر بابو لیاقت کی بیٹھک تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

شام تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں گوردوارے میں گھومتا پھرتا رہا۔ دوپہر کو لنگر سے بھوجن کھایا اور پھر گرنتھی حضرات کو چند مذہبی رسومات ادا کرتے دیکھا۔ جونہی اندھیرا پھیلا اور گوردوارے میں بلب روشن ہوئے' میں نے اپنی قیمتی شال ایک دیہاتی کے بوسیدہ کھیس سے بدلی اور ایک جوتا "منتخب" کرکے وہاں سے نکل آیا۔

سردی عروج پر تھی۔ سہ پہر سے ہی یخ بستہ ہوا چلنے لگی تھی۔ میں نے کھیس کو دیہاتی انداز میں سر پر ڈال کر بکل ماری۔ گوردوارے سے میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق گاندھی اسکوائر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں پیدل چل کر دس پندرہ منٹ میں وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ سمت کا اندازہ تو مجھے ہوچکا تھا لہٰذا میں نے مصروف سڑک پر سفر کرنے کے بجائے گلیوں میں چلنا زیادہ مناسب سمجھا۔

گوردوارے سے ایک ڈیڑھ فرلانگ دور آنے کے بعد ایک جگہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ ایک چوراہے پر رات والے دارجی سائیکل رکشا کھینچتے نظر آئے۔ میں ان کا مقروض تھا کیونکہ اسٹار ہوٹل کے سامنے میں نے انہیں ساری رات کے لیے بک کیا تھا اور پھر کرایہ دیے بغیر ہی غائب ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے اور "سرجی" کا نعرہ لگا کر میری طرف جھپٹنے والے ہیں لیکن پھر وہ سیدھے نکل گئے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں گاندھی اسکوائر پہنچا اور وہاں سے بابو لیاقت کی بیٹھک پر آگیا۔ بیٹھک گنجان علاقے میں تھی لیکن کسی نہ کسی طرح دو تین کاریں وہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ ایک شاندار جیپ بھی نظر آرہی تھی۔ ایک ملازم صورت شخص نے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ میں نے بابو لیاقت کا نام لیا۔ ملازم نے مجھے سرتاپا گھور کر ایک طرف کرسی پر بٹھادیا۔ یہاں بابو لیاقت سے ملاقات کے لیے آنے والے چند اور افراد بھی بیٹھے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے جائزے سے میں نے اندازہ لگایا کہ میری باری دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب پہلے ملاقاتی کے باہر آتے ہی ایک لمبا تڑنگا شخص انتظار گاہ میں داخل ہوا اور اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک مختصر کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ایک الماری اور دو کرسیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک جانب دیوار پر کانگریس مخالف پارٹی کے چند بڑے لیڈروں کی تصویریں لگی تھیں۔ لمبے تڑنگے شخص نے شائستگی سے کہا۔ "اگر تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے تو اس الماری میں رکھ دو' واپسی پر لے لینا۔"

بڑی عقابی نظر تھی اس شخص کی۔ مجھے دوسرے ملاقاتیوں پر ترجیح بھی اسی لیے دی گئی تھی کہ میں ان لوگوں کی نظر میں مشکوک ٹھہر چکا تھا۔ وہ مجھے زیادہ دیر انتظار گاہ میں بٹھانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ میں نے کھیس کے نیچے سے ماؤزر نکال کر طویل القامت شخص کے حوالے کردیا۔

"اور کچھ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے انکار میں سرہلایا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہا۔ پھر ماؤزر الماری میں رکھ دیا اور مجھے لے کر ایک سفید دروازے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ سب سے پہلے ایک بارعب شخص پر پڑی۔ وہ پاجامہ کرتہ پہنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک تپائی تھی جس پر دو رنگ کے ٹیلی فون سیٹ پڑے تھے۔ اس کے علاوہ چائے کے چند خالی کپ اور سگریٹ کے پیکٹ نظر آرہے تھے۔ کمرے میں دو مزید افراد موجود تھے۔ وہ سب متجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ صوفے پر بیٹھا' لمبے سے سر والا جواں سال شخص بابو لیاقت ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

رعب دار لیکن ملائم آواز میں کہنے لگا۔ "کہاں سے آئے ہو بھائی؟ کیا بات ہے؟"

میں نے ذرا ہچکچاہٹ ظاہر کی اور دیہاتی لب و لہجے میں کہا۔ "میں' آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "تم مجھے اکیلا ہی سمجھو' جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔ ویسے مجھے لگ رہا ہے کہ تم پاکستانی ہو۔" اس کے واشگاف الفاظ نے مجھے ایک لمحے کے لیے گڑبڑا دیا۔ وہ ہاتھ سے کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ ناں بھائی۔ کھڑے کیوں ہو۔"

میں نے آگے بڑھ کر نشست سنبھال لی۔ بابو لیاقت کی تیز نگاہیں میرے بوسیدہ کھیس میں سے گزر کر میرے لباس اور میرے سینے کے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "آپ ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔ میں پاکستانی

ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں نے کہا ہے ناں برادر' جو بات بھی ہے کھل کر بتادو۔ سمجھو تم فرید کوٹ میں نہیں' لاہور میں بیٹھے ہو اور اپنے کسی ہمدرد سے اپنا مسئلہ بیان کررہے ہو۔ شاباش بولو۔ بولو جو بات بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "جناب! میں ایک معمولی ٹرک ڈرائیور ہوں۔ تین روز پہلے اوکاڑہ سے گنا لے کر شیر گڑھ کی طرف جارہا تھا۔ میرے ہمراہ دو ساتھی بھی تھے۔ رات کا وقت تھا۔ راستے میں ایک لہولہان خانہ بدوش نے ہاتھ دے کر ہمیں روکا۔ اس نے کہا کہ کچھ لوگ اسے جان سے مارنے کے لیے اس کے پیچھے آرہے ہیں' ہم اس کی مدد کریں۔ ہم نے اسے ٹرک میں سوار کرالیا۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خانہ بدوش کے پیچھے آنے والوں کے پاس گاڑیاں ہیں اور وہ اتنی دور تک ہمارا پیچھا کریں گے۔ وہ بہت خطرناک لوگ تھے۔ آٹومیٹک رائفلیں تھیں ان کے پاس۔ انہوں نے ٹرک پر بار بار فائرنگ کی۔ خانہ بدوش کے پاس بھی رائفل تھی۔ وہ ان کی فائرنگ کا جواب دیتا رہا۔ اندھیرے میں ہمیں کچھ پتا نہیں چلا' کس طرف جارہے ہیں۔ ہوش اس وقت آیا جب ہم پانچ چھ میل انڈیا کے اندر گھس آئے تھے۔ یہ نانکا سیکٹر تھا۔ ٹرک درختوں میں چھپا کر ہم قریبی گاؤں میں چلے گئے۔ ہم واپس بارڈر کی طرف جانا چاہ رہے تھے لیکن ایک ہمدرد نے مشورہ دیا کہ ایسی غلطی ہرگز نہ کریں۔ اس نے ہمیں آپ کا پتا دیا اور کہا کہ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔"

میں نے ایک پہلے سے گھڑی ہوئی کہانی بابو لیاقت کو سنادی۔ یہ روداد سننے کے دوران بابو لیاقت کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوگئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس بارے میں پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ وہ کچھ دیر غور سے مجھے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔ "اس واقعے سے کسی مس سروج کا بھی کوئی تعلق ہے؟"

"کون سروج؟" میں نے پوچھا۔

"یعنی تم اس بارے میں نہیں جانتے۔" بابو لیاقت نے کہا۔ "خیر جو کچھ تم بتارہے ہو وہ کافی سنسنی خیز ہے۔ اکا دکا افراد یا شکاریوں کی جیپیں تو کبھی کبھار راستہ بھول کر سرحد پار کر آتی ہیں لیکن ایک لوڈڈ ٹرک یوں پانچ چھ میل تک اندر گھس آئے اور کسی کو پتا نہ چلے' بڑی حیران کن بات ہے۔" ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بابو لیاقت نے پوچھا۔ "اب وہ ٹرک کہاں ہے؟"

بابو لیاقت نے کسی مس سروج کا نام لے کر مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ اب احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں ٹرک کی صحیح لوکیشن ظاہر نہ کروں۔ میں نے بابو لیاقت کے سوال کا جواب گول مول انداز میں دیا اور بتایا کہ ٹرک فرید کوٹ کے نواح میں کھڑا ہے۔ میرے جواب نے بابو لیاقت اور اس کے ساتھیوں کی حیرت میں اضافہ کردیا۔ بابو لیاقت نے کہا "آفرین ہے بھائی بی ایس ایف پر اور ہماری انتظامیہ پر۔ ایک پاکستانی ٹرک سرحد پار کرکے نانکا پہنچا اور وہاں سے فراٹے بھرتا فرید کوٹ چلا آیا۔ کسی نے اسے روکا نہ چیک کیا۔ کہیں یہ کوئی جادو کا ٹرک تو نہیں ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں کیا عرض کرسکتا ہوں جی۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس رات تیز بارش ہورہی تھی' سردی بھی انتہائی تھی۔ ہوسکتا ہے نگرانی کرنے والے افراد اپنی ڈیوٹیوں پر موجود نہ ہوں' یا پھر ہوسکتا ہے ہماری قسمت نے ساتھ دیا ہو۔"

بابو لیاقت نے پوچھا۔ "خانہ بدوش کیا بتاتا ہے اس کے پیچھے آنے والے لوگ کون تھے۔"

"وہ کہتا ہے کہ ان لوگوں نے اس کے ڈیرے کی ایک لڑکی کو اغوا کرکے قتل کیا ہے۔ بس اسی سلسلے میں ان کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے۔ دونوں طرف کے کچھ لوگ مارے گئے ہیں لیکن یہ سارا واقعہ پاکستان میں ہوا ہے۔ اس میں کسی ہندو عورت کا نام کیسے آسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے مس سروج کا نام لیا ہے۔ اس لڑکی کا اس معاملے سے کیا تعلق واسطہ ہوسکتا ہے۔"

بابو لیاقت نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے خود یہ نام پہلی بار سنا ہے۔ اس لڑکی کا فون مجھے آج سہ پہر ملا ہے۔ وہ شاید بمبئی کی رہنے والی ہے۔ یہاں فرید کوٹ میں ہمارے ایک کرم فرما تیواری لال صاحب کی کوٹھی میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ چند روز پہلے تک پاکستان میں تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ پاکستان سے ایک ٹرک ہندوستانی علاقے میں داخل ہوا ہے۔ اس پر تین بندے سوار ہیں اور وہ لوگ قتل کرکے فرار ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص کل پکڑا بھی گیا تھا لیکن وہ جل دے کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب پورے فرید کوٹ میں اس کو ڈھونڈا جارہا ہے۔" بابو لیاقت نے تپائی پر سے ایک اخبار اٹھایا اور ایک صفحہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "یہ دیکھیے۔ یہ ایک خبر بھی چھپی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس خبر کا تعلق بھی مس سروج اور ٹرک والے معاملے سے ہے۔"

میں نے آگے جھک کر خبر پڑھنا شروع کی۔ یہ اسٹار ہوٹل پر ہونے والے ہنگامے کی خبر تھی۔ اس خبر میں سب سے نمایاں نام جلال الدین کا تھا۔ رپورٹر نے لکھا تھا کہ فلموں کا مشہور اسٹنٹ مین جلال حقیقی زندگی میں بھی ایک نڈر اور بے خوف شخص ہے۔ اس نے تن تنہا ایک خطرناک ڈاکو کا پیچھا کیا اور ہیگل ریسٹورنٹ کی چھت پر اسے گھیر لیا۔ اس دوران مجرم کے کچھ اور ساتھی بھی اس کی مدد کو پہنچ گئے۔ جلال نے ان سب کے چھکے چھڑا دیے۔ تاہم بعد میں وہ خود بھی چھت سے گر کر زخمی ہو گیا۔

خبر میں اس کے علاوہ بھی بہت سی "بے خبری" کی باتیں لکھی تھیں۔ جلال کی تصویر بھی آئی تھی۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا اور ناک میں نلکی لگی ہوئی تھی۔ خبر میں کہیں بھی پاکستانی ترک یا مس سروج وغیرہ کا ذکر نہیں تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ بابو لیاقت نے اس اخباری خبر کا تعلق مس سروج اور پاکستانی ترک سے کیسے جوڑ لیا۔ بابو لیاقت نے یہ سوال میری زبان پر آنے سے پہلے ہی بوجھ لیا۔ کہنے لگا۔ "شاید تم سوچ رہے ہو کہ اس اخباری خبر کو دیکھ کر میں نے کیسے اندازہ لگایا کہ یہ پاکستانی ترک اور مس سروج والا چکر ہے۔ دراصل تیواری لال صاحب سے ہر روز میری دو تین دفعہ ملاقات ہوتی ہے۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ مس سروج کے ساتھ ہندی فلموں کا ایک مشہور اسٹنٹ مین بھی ہے اور وہ دونوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پانچ چھ روز ان کی کوٹھی میں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

اب میرے لیے یہ جاننا قطعی مشکل نہیں تھا کہ ارجند بانو ہی دراصل مس سروج ہے۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ لوگ مجھے پکڑ کر کوٹھی میں لے گئے تھے تو ارجند بانو نے بھگوان کی سوگند کھاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ بہت برا سلوک کرنے والی ہے۔ اس کے منہ سے "بھگوان کی سوگند" سنتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جو نظر آ رہی ہے اس سے بہت مختلف ہے۔

اِس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ہماری نئی مطبوعات ☆

ایم اے راحت

○ نایاب		۱۰۰/=
○ احساس		۸۰/=
○ وحشت کدہ		۱۲۰/=
○ آسیب		۱۶۰/=
○ سوکھے گلاب		۱۸۰/=
○ کھلاڑی		۲۲۵/=
○ سرفروش	(دو جلدیں)	۳۲۰/=
○ راز داں	(دو جلدیں)	۳۰۰/=
○ ساموں	(تین حصے)	۱۳۵/=
○ سمندر کا بیٹا	(تین حصے)	۱۲۰/=
○ بھرے	(تین حصے)	۱۵۰/=
○ باغی	(دو حصے)	۸۰/-
○ شہ زور	(دو حصے)	۱۰۰/=
○ ہمالیہ	(چار حصے)	۲۰۰/=
○ بساط	(چار حصے)	۲۰۰/-
○ پارس		۳۵/=
○ پرواز		۳۵/=
○ خون آشام		۵۰/=

علیم الحق حقی

○ عشق کا عین	۱۳۰/=
○ شناخت	۲۰۰/=
○ اماوس کا دیا	۱۵۰/=
○ ببول	۱۵۰/=
○ پرماتما	۱۶۰/=
○ تاش کے پتے	۱۵۰/=
○ ہٹلر کی واپسی	۱۲۰/=
○ آنکھوں میں دھنک	۸۰/=
○ میر کارواں	۸۰/=
○ کلاکار	۱۰۰/=
○ برف کے ہاتھ	۱۰۰/=
○ انسانی قیامت	۱۰۰/=
○ زندان نامہ	۱۰۰/=
○ طوفان کے بعد	۱۵۰/=

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: ۷۲۳۳۷۲۱۳

تاوان
3

ابھی بابو لیاقت کے ساتھ میری گفتگو جاری تھی کہ تپائی پر رکھے ہوئے انٹرکام کی گھنٹی بج اٹھی۔ بابو لیاقت ریسیور اٹھا کر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے ایک نگاہ گردوپیش پر ڈالی۔ یہ بڑی سجی سجائی نشست گاہ تھی۔ قالین، فرنیچر، پردے، ہر چیز اہلِ خانہ کی نفاست کا مظہر تھی۔ نشست گاہ کی دیواروں پر بڑے بڑے فریم شدہ فوٹوگراف آویزاں تھے۔ ان فوٹوگرافز کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپوزیشن پارٹی سے بابو لیاقت کی دیرینہ وابستگی ہے۔ جو دوسری بات سامنے آتی تھی وہ یہ تھی کہ اہلِ خانہ میں سے کوئی فرد فوٹوگرافی میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ چھوٹی بڑی، رنگین، بلیک اینڈ وھائٹ فریم شدہ اور بغیر فریم کے بے شمار تصاویر اس نشست گاہ میں سجی تھیں اور ان میں سے کچھ تصویریں واقعی شاہکار کہلا سکتی تھیں۔ اچانک میری توجہ انٹرکام پر ہونے والی گفتگو پر مرکوز ہو گئی۔ اس گفتگو میں مس سروج کا نام آیا تھا اور یہ نام آتے ہی بابو لیاقت کے چہرے پر تشویش کے سائے منڈلانے لگے تھے۔

اس نے جلدی سے انٹرکام بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم کہہ رہے ہو کہ مس سروج کو نہیں جانتے لیکن مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ وہ تمہیں ہی ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اسے کسی اور نام سے جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔ اب آپ نے جلال نام کے شخص کا ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے کہ خانہ بدوش بھی یہ نام لے رہا تھا۔ اس نام کے ساتھ اس نے کسی ارجمند بانو کا ذکر بھی کیا تھا۔"

"تو انھو یہاں سے۔" بابو لیاقت نے تیزی سے کہا۔ "تمہارا یہاں موجود ہونا ٹھیک نہیں۔" اس نے مجھے باقاعدہ بازو سے تھاما اور آٹھ دس قدم چلا کر نشست گاہ کے ایک بغلی دروازے پر لے آیا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے ایک مختصر سے کمرے میں دھکیلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ نشست گاہ میں "نمستے" کی نقرئی زنانہ آواز گونجی۔ میں ایک ساعت میں پہچان گیا، یہ ارجمند بانو کی آواز تھی۔ نشست گاہ سے ملی جلی آوازیں آنے لگیں، ان میں شیطان اے ایس آئی جراج کی آواز بھی تھی۔ میں جس کمرے میں بند تھا یہ بالکل تاریک تھا۔ روزن یا کھڑکی تو دور کی بات ہے، درودیوار میں کہیں جھری تک موجود نہیں تھی۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی "ڈارک روم" میں ہوں۔ یہاں ظروف کی ڈویلپنگ پرنٹنگ کے مختلف آلات رکھے تھے اور تازہ پرنٹ کی ہوئی بہت سی تصویریں ایک ڈوری سے جھول رہی تھیں۔

کمرے میں ہونے والی گفتگو میں ایک شخص زیادہ بول رہا تھا اور بہت بے تکلفی سے بول رہا تھا۔ پتا چلا کہ یہی تیواری لال ہے۔ وہ بابو لیاقت سے ارجمند بانو کا تعارف کرا رہا تھا۔ "یہ مس سروج ہیں۔ بمبئی کے سماجی حلقوں کی مشہور و معروف شخصیت، کچھ عرصہ پہلے انہوں نے ایک

پاکستانی صنعت کار سے شادی کرلی تھی اور زیادہ دو سال سے پاکستان میں ہی رہ رہی تھیں۔ آج کل ان کے شوہر کاروبار کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی دلیر خاتون ہیں۔ تن تنہا یہاں سارے کاروباری امور انجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ زمینوں کا کام بھی ہے' ان کے شوہر کا شمار خوشاب کے گنے چنے زمینداروں میں ہوتا ہے۔ دو تین ہفتے پہلے چند اوباش افراد نے انہیں مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ خاتون ہیں' دب جائیں گی لیکن انہوں نے اپنا بھرپور دفاع کیا۔ تھانے کچہری تک نوبت آگئی۔ پانچ روز پہلے ان اوباش افراد نے ارجمند صاحبہ کی نوجوان سیکریٹری کو اغوا کرنے کی کوشش کی اور مزاحمت پر گولی ماردی۔ ارجمند صاحبہ نے اپنے کارندوں کے ساتھ تانگوں کا تعاقب کیا۔ وہ سرحد پار کرکے انڈیا میں گھس آئے۔ ارجمند صاحبہ انہیں کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے انہیں سزا دینا چاہتی ہیں اور ان کی یہ خواہش ناجائز بھی نہیں ہے۔ تھانے کچہری سے کب کسی کو انصاف ملتا ہے اور اگر کسی کو ملتا بھی ہے تو اتنی قیمت پر اور اتنی دیر سے کہ وہ "انصاف" بھی ظلم بن جاتا ہے۔"

ارجمند بانو کی آواز آئی۔ "میرا مطلب یہ نہیں کہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے گولی مارنا یا پھانسی دینا چاہتی ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ ان درندوں کو پکڑ کر قانون کے حوالے کردوں اور عدالت کے سامنے وہ سارے ثبوت پیش کردوں جو ان تانگوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہیں۔"

بابو لیاقت نے کہا۔ "تیواری لال صاحب ہمارے بڑے پرانے مہربان ہیں۔ آپ ان کے ساتھ آئی ہیں۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہوگا۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

ارجمند بولی "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہر میں آپ کا اثر و رسوخ ہے۔ لوگ آپ کی بات مانتے ہیں اور ایسے بہت سے کارکن بھی آپ کے پاس ہیں جو ہر قسم کا کام کرسکتے ہیں۔ میں اس معاملے کو فی الحال پولیس میں نہیں لے جانا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ مجرموں کو "ٹریس" کرنے میں آپ ہماری مدد کریں۔ وہ لوگ یہیں فرید کوٹ میں موجود ہیں جیسا کہ میں نے اور تیواری صاحب نے آپ کو فون پر بتایا تھا' ان میں سے ایک بندہ پرسوں سہ پہر کو پکڑا بھی گیا تھا لیکن ہمارے ایک کارندے کی غلطی سے بعد میں بچ نکلا۔"

بابو لیاقت نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "اگر صرف تین چار افراد کا معاملہ ہو تو انہیں ڈھونڈنا خاصا مشکل کام ہے لیکن آپ فرما رہی ہیں کہ وہ ٹرک سمیت یہاں آئے ہیں۔ میرے خیال میں تو فرید کوٹ کے اندر یا گردونواح میں چھپائے گئے ایک ٹرک کا کھوج لگانا کچھ زیادہ دشوار کام نہیں ہے۔ ویسے اس ٹرک پر لدا کیا ہوا ہے؟"

"گنا ہے۔" تیواری لال نے جواب دیا۔

گنے کے نیچے کیا ہے؟ یہ سوال بابو لیاقت نے پوچھا نہ ارجمند بانو نے اس کا جواب دیا اور یہی وہ سوال تھا جس کے گرد باقی سارے سوالات اور ان کے ہنگامہ خیز جوابات گردش کررہے تھے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ ٹرک کے اندر کیا ہے وہ اس "علم" کو اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کررہے تھے کیونکہ یہ "علم کی دولت" نہیں تھی۔ دولت کا علم تھا' اور ایسا علم جب عام ہوجائے تو بے کار ہوجاتا ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو اس علم کو اپنے تک محدود رکھنے پر مجبور تھے۔ میں بابو لیاقت سے مدد طلب کرنے کے لیے آیا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اصل روداد کے بجائے اسے ایک گھڑی گھڑائی کہانی سنائی تھی۔ یہی وتیرہ ارجمند بانو اختیار کررہی تھی۔ وہ ہمیں قاتل بنا رہی تھی اور یہ ظاہر کررہی تھی کہ اسے ٹرک سے نہیں فقط اپنی وفادار ملازمہ کے قاتلوں سے غرض ہے۔ وہ قاتل جو "بے گناہ" تھے اور وہ ملازمہ جو مرے سے "قتل" ہی نہیں ہوئی تھی۔

بابو لیاقت نے کہا۔ "محترمہ! یہ تیواری صاحب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں' انہیں پتا ہے کہ میری ایک سیاسی حیثیت بھی ہے اس لیے میں کسی متنازعہ معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالتا لیکن آپ سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔"

ابھی بابو لیاقت کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ باہر سے دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا جیسے کسی شخص کو زدوکوب کیا جارہا ہے۔ میں نے ڈارک روم کے واحد دروازے میں بمشکل ایک جھری تلاش کی اور اس سے آنکھ لگا کر بیٹھ گیا۔ نشست گاہ کا ایک تہائی حصہ میری آنکھوں بلکہ "آنکھ" کے سامنے آگیا۔ اس حصے میں نشست گاہ کا دروازہ' ایک صوفہ اور وہ تپائی نظر آرہی تھی جس پر دو رنگوں کے ٹیلی فون سیٹ رکھے تھے۔ صوفے پر ارجمند کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں اور بہت فربہ جسم والا ایک سرخ و سپید شخص بیٹھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہی تیواری لال تھا۔ ارجمند پتلون اور جرسی میں نظر آرہی تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے' اور کندھے سے ایک نفیس قسم کا بیگ جھول رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اس بیگ میں کوئی آتشیں ہتھیار بھی موجود ہو۔ ایسے زنانہ بیگ ہوتے ہی اسلحے کے لیے ہیں۔

یہ اسلحہ ریوالور وغیرہ کی شکل میں نہ ہو تو سُرخی پاؤڈر کی شکل میں تو ضرور ہوتا ہے۔ میں نے ارجمند بانو کو گہری نظر سے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی جرسی میں بھی اس کا بھرپور شباب نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کی لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں سب سے جُدا چیز اس کی جلد کی خوبصورتی اور ملائمت تھی۔ اگر وہ واقعی اسنٹ مین جلال سے محبت کرتی تھی تو پھر کوئی بھی شخص جلال کی قسمت پر رشک کرسکتا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے نشست گاہ کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور بابو لیاقت کے کارکن ایک شخص کو مارتے دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ وہ ایک موٹا تازہ شخص تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کوٹ کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی' اور گریبان چاک ہو کر ناف تک پہنچا ہوا تھا۔ لمبے تڑنگے ملازم نے زخمی کو گریبان سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ اسے بابو لیاقت کے قدموں میں پھینکتے ہوئے بولا۔ "بابو جی! یہ حرامی بیٹھک کے باہر منڈلا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ وہ بھاگ گیا۔ یہ ریوالور نکلا ہے اس کے پاس سے۔" لمبے تڑنگے شخص نے ایک چمکتا دمکتا ریوالور تپائی پر رکھ دیا۔

"کون ہو تم؟" بابو لیاقت نے گرج کر پوچھا۔

زخمی شخص حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکالنے لگا۔ قد آور ملازم نے اس کے سر پر پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ "گونگا بن رہا ہے حرامزادہ۔"

زخمی نے اپنی انگلی سے زبان کی طرف اشارہ کیا اور انکار میں سر ہلانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی جوڑ رہا تھا اور فریادی انداز میں بار بار ہنسی نکالنے لگتا تھا۔ وہ اپنے رویے سے خود کو ایک معمولی واردایتا ظاہر کررہا تھا جو اتفاقاً پکڑا گیا تھا اور پولیس میں جانے کے خوف سے ہلکان ہو رہا تھا۔ اس کی اداکاری متاثر کن تھی۔ اگر میں اس شخص کو پہلے سے نہ جانتا ہوتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ وہ کوئی معمولی چور اچکا ہے جو اپنی شامتِ اعمال کے سبب پکڑا گیا ہے اور اب کسی بھی طرح رو پیٹ کر اور معافیاں مانگ کر اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے لیکن میں اس ہاتونی گونگے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جب ہمیں ارجمند نے پچنے پل والی حویلی سے نکال باہر کیا تھا تو راستے میں افراہیم ہمیں ملا تھا اور بڑی رازداری سے ایک پھلواری میں لے آیا تھا۔ اس پھلواری کا مالک ایک موٹا سا پست الوجود شخص سلطاناں تھا۔ یہ سلطاناں بڑا اکھڑ شخص تھا اور افراہیم کا خاص آدمی تھا۔ اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ہمیں کئی دن نرسری میں چھپائے رکھا تھا۔ اب وہ ہمارے سامنے قالین پر گرا پڑا تھا اور بابو لیاقت کی منت سماجت کررہا تھا۔ اس شخص کو پہچانتے ہی میرے ذہن میں خطرے کی اَن گنت گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ایک ایک کرکے میرے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ اس بھارتی شہر کے گلی کوچوں میں پہلے ارجمند بانو اور جلال سے ملاقات ہوئی تھی' اب افراہیم کے دیدار کے امکانات بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جو شخص نشست گاہ کے قالین پر بیٹھا خون تھوک رہا تھا' وہ افراہیم کے ان کارندوں میں سے تھا جن کے بارے میں ارجمند بانو بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ کارندہ خاص اگر فرید کوٹ میں موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ افراہیم بھی یہاں وارد نہ ہوچکا ہو۔ مجھے لگا جیسے ارجمند بانو' افراہیم' نادر زماں' بسنتی جان' شنکر اور ان کے سیکڑوں ہرکارے گوشت و پوست کے نہیں لوہے کے انسان ہیں اور میں پچنے پل کی حویلی سے دولت نہیں ایک بہت بڑا مقناطیس نکال کر لایا ہوں۔ یہ مقناطیس لوہے کے لوگوں کو چاروں جانب سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کھنچتا چلا جارہا ہے۔

بابو لیاقت کے قد آور ملازم نے ایک اور زوردار ٹھوکر زخمی کے سر پر رسید کی اور فوراً کر بولا "بابو جی' ہمارا خیال ہے یہ بندہ میڈم صاحب کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔ جب میڈم صاحب کی گاڑی بیٹھک کے دروازے پر رکی تھی اس وقت یہ بھی اسکوٹر پر گلی سے گزرا تھا۔ اس نے اسکوٹر حکیم شفیع کی دکان کے سامنے کھڑا کیا۔ اپنے ساتھی کو اسکوٹر کے پاس چھوڑا اور خود بیٹھک کے آس پاس منڈلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سکھ ساتھی بھی آگیا۔ مجھے شک ہے کہ وہ شخص فرید کوٹ کا ہی رہنے والا ہے۔"

ارجمند بانو کے خوبصورت چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ بات تھی بھی تشویش کی۔ اگر یہ شخص واقعی اس کے پیچھے آیا تھا تو پھر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اس نے اسے ایس آئی بلراج کو اشارہ کیا۔ وہ کالے رنگ کا ریلوے انجن کسی قریبی کرسی پر بیٹھا تھا' لپک کر سلطانے کے سر پر پہنچا۔ نیچے جھک کر اس نے ایک ایسا تھپڑ سلطانے کے منہ پر مارا کہ در و دیوار چناخ کی آواز سے گونج اٹھے۔ سلطاناں مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا اور منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکال کر التجائیں کررہا تھا۔ بلراج نے اسے قالین پر گرا کر اس کی گردن پر اپنا بھاری بھرکم بوٹ رکھ دیا۔ دباؤ کی وجہ سے سلطانے کا منہ خود بخود کھل گیا۔ بلراج نے اس کھلے ہوئے منہ میں زخمی کا اپنا ریوالور ہی اس طرح گھسیڑا کہ اس کی نال دور تک اُتر گئی۔ "کون ہے تو؟" اس نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

بابو لیاقت نے جلدی سے اٹھ کر سلطانے کی جان بلراج

سے چھڑا نی۔ یقینا اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ کوئی باہر کا شخص اس کی بیٹھک میں پُر تشدد کارروائی کرے اور کسی طرح کی بدنامی کا باعث ہو۔

جو بات مجھے معلوم تھی وہ اس چھت تلے اور کسی کو معلوم نہیں تھی۔ یہ شخص جو پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا' افزاہیم کا کارندہ تھا اور اس کا ایک ساتھی موقع سے فرار بھی ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر افزاہیم فرید کوٹ میں موجود ہے تو وہ کسی بھی لمحے آندھی اور طوفان کی طرح بابو لیاقت کی بیٹھک پر یلغار کرنے والا ہے۔

میری اس سوچ کی تصدیق اتنی جلدی ہوئی کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ بیٹھک کے بیرونی دروازے کے پاس گاڑیاں رکنے کی مدھم آوازیں آئیں۔ پھر ایک ملازم بھاگتا ہوا نشست گاہ میں پہنچا۔ "گن" جو تھوڑی دیر پہلے اس کے کندھے سے جھول رہی تھی' اب ہاتھ میں تھی۔ گن کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

وہ تیزی سے بولا۔ "بابو جی! کچھ بندے آئے ہیں جی۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اسی دوران دروازے کی طرف سے قد آور شخص کی بلند آواز ابھری۔ وہ کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ "میں آپ سے کہہ رہا ہوں جی آپ اسلحہ لے کر اندر نہیں جا سکتے۔"

"اندر تیرے بہنوئی نے کرفیو لگایا ہوا ہے؟" ایک دوسری آواز نے غرا کر پوچھا۔ پھر نشست گاہ کا دروازہ زور دار آواز سے کھلا اور قد آور شخص لڑکھڑاتا ہوا الٹے پاؤں اندر آگیا۔ اسے دھکیل کر اندر آنے والا افزاہیم تھا۔

افزاہیم کو آخری بار میں نے چیئرمین کی حویلی میں دیکھا تھا۔ خانہ بدوشوں نے حویلی پر بلہ بولا تھا۔ افزاہیم کا چوکیدار نشان علی میری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اترا تھا اور خود افزاہیم زخمی حالت میں حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ نکلا تھا۔ بعد میں میں نے حویلی میں خانہ بدوشوں کے للکارے سنے تھے۔ وہ ہر طرف افزاہیم کو پکارتے پھر رہے تھے۔ ان ساعتوں میں مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ میں افزاہیم کو دوبارہ زندہ دیکھ سکوں گا لیکن آج وہ ایک بار پھر سامنے تھا اور اس کی آنکھوں میں وہی وحشی چمک نظر آ رہی تھی جو زمرد اور ہیرے جواہر سے بھرا ہوا پہلا صندوق دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ابھری تھی۔ دراز قد شخص نے افزاہیم کا دھکا کھانے کے بعد اچانک قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ریوالور افزاہیم کی طرف سیدھا کرتا' افزاہیم کے ایک ساتھی نے بھی خودکار رائفل تان لی۔

نشست گاہ میں چند لمحے "اوئے۔ اوئے" کی تحکمانہ آوازیں ابھریں پھر بابو لیاقت لپک کر فریقین کے درمیان آگیا۔ اس نے اپنے دراز قد ملازم کو دھکارے کر پیچھے ہٹا دیا اور افزاہیم کے مشتعل ساتھی کی رائفل نیچے جھکا دی۔

افزاہیم کو دیکھ کر ارجمند بانو کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ افزاہیم کی نگاہوں میں طنز کی تپش اور غضب کی چنگاریاں تھیں۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ارجمند بانو کے عین سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ اس کے عقب میں اس کے مسلح کارندے تھے۔ ان کی تعداد دو سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ صورتوں سے ہی خونخوار لوگ نظر آتے تھے۔ مجھے ان میں قادر زماں کا ایک کارندہ نظر آیا' اس کے علاوہ دو سکھ بھی تھے۔

بابو لیاقت نے ارجمند اور افزاہیم کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

افزاہیم بولا "کچھ زیادہ نہیں' بس یہ ڈیڑھ دو سال میری بیوی رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں اس کا شوہر رہا ہوں۔"

ارجمند بانو جنگلی بلّی کی طرح غرائی۔ "میں تمہیں نہیں جانتی اور تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ میرا پیچھا کرو اور زبردستی کسی کی چار دیواری میں گھسو۔"

افزاہیم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "جرأتیں تو تم نے بھی بڑی بڑی کی ہیں ارجمند بیگم' اور تمہاری جرأت کا یہ تازہ ترین شاہکار زخمی حالت میں میرے سامنے پڑا ہے۔"

اس نے اپنے فربہ اندام کارندے کی طرف اشارہ کیا جو اب اپنے ایک ساتھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور غضب ناک نظروں سے بابو لیاقت کے دراز قد ملازم کو دیکھ رہا تھا۔

ارجمند بانو نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے اس کتے کو کچھ نہیں کہا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں یہ ہے کون؟"

تیواری لال نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ شخص باہر مشکوک حالت میں گھوم رہا تھا۔ لیاقت صاحب کے ملازم پکڑ کر یہاں لے آئے اور کچھ نہیں ہوا ہے اس کے ساتھ۔ باقی آپ لوگ جس طرح اس بیٹھک میں گھسے ہیں یہ کسی طور مناسب نہیں۔ ہم خاموش ہیں تو آپ اسے ہماری کمزوری نہ سمجھیں۔ ہمارے پاس بھی اسلحہ ہے' ہم بھی گولیاں چلا سکتے ہیں۔ درجنوں لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ آپ زبردستی اندر گھسے ہیں۔ ہم ایک دو کو مار بھی دیں گے تو کچھ

نہیں بگڑے گا ہمارا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اسلحے کا رُعب نہ ڈالیں۔ اگر کوئی کرنے والی بات ہے تو ہم بیٹھ کر کر سکتے ہیں۔"

ایک سکھ رائفل بردار نے رائفل کی نال تیواری لال کے سینے پر رکھ دی اور خطرناک لہجے میں بولا۔ "تو زیادہ بڑ بڑا نہ کر بھڑوے۔ چل اُدھر بیٹھ بندے کا پتر بن کے" اس نے رائفل سے ہی تیواری لال کو زوردار ٹھوکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر ارجمند بانو سے ٹکرایا اور صوفے پر جا گرا۔ ایک بار پھر نشست گاہ کی فضا میں زبردست تناؤ پیدا ہو گیا۔ چہرے تمتما اٹھے اور اعصاب تن گئے۔ یوں لگا کہ ابھی گولی چل جائے گی لیکن پھر بابو لیاقت نے بڑی ذہانت اور جرأت سے اس صورت حال پر قابو پایا۔ وہ واقعی سیاسی مزاج کا شخص تھا اور مار دھاڑ سے زیادہ ڈائیلاگ پر یقین رکھتا تھا۔ وہ یہ بات تو جان ہی چکا تھا کہ اس کی مہمان (ارجمند بانو) اور بن بلائے مہمان (افزاہیم) میں کوئی سنگین نوعیت کا تنازعہ ہے۔ اس نے ان دونوں کا اشتعال کم کرنے کی کوشش کی اور ان سے کہا۔ وہ تسلی سے ایک دوسرے کی بات سنیں۔

افزاہیم نے ارجمند سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ وہ بندہ میرے حوالے کر دو جسے تمہارے کارندوں نے شباب سینما سے پکڑا ہے۔"

ارجمند چلا کر بولی "میں نے کسی کو نہیں پکڑا اور پکڑا بھی ہوتا تو تیرے کہنے پر تیرے حوالے نہ کرتی۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

افزاہیم نے کہا۔ "صورت تو تم اس بازی گر کی دیکھنا چاہو گی جو تمہارے دل میں بسا ہوا ہے اور مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم جیسی بدکردار کو اپنی صورت دکھانے کا۔ بندہ میرے حوالے کر دو۔ میں ایک سو مرتبہ تجھ پر لعنت بھیج دوں گا۔"

کچھ دیر میاں بیوی میں تلخ کلامی جاری رہی۔ پھر وہ کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ بابو لیاقت نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے جی کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاتے ہیں۔ آپ دونوں تسلی سے بات کریں۔"

افزاہیم کو بھی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ اس نے اپنے کارندوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم لوگ تھوڑی دیر کے لیے باہر بیٹھو۔ میں ابھی پھر تمہیں بلاتا ہوں۔"

بابو لیاقت نے بھی اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ نشست گاہ سے باہر آ جائیں۔ تیواری لال نے کچھ پس و پیش سے کام لیا لیکن بابو لیاقت سمجھا بجھا کر اسے بھی باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد نشست گاہ میں صرف افزاہیم اور ارجمند رہ گئے۔ نشست گاہ کے تمام دروازے بند تھے۔ افزاہیم نے پھر بھی ایک بار دروازوں کا جائزہ لیا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ نشست گاہ میں اطمینان سے بات کی جا سکتی ہے' ارجمند بانو کے سامنے بیٹھ گیا۔ اندرونی جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ بڑے جذباتی انداز میں اس نے ارجمند کے شانے تھام لیے۔ "دیکھ ارجمند! جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جا۔ تو جانتی ہے' ہمارے لیے یہ وقت بڑا قیمتی ہے۔ اس وقت کا ایک ایک لمحہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ لمحے گزر گئے تو ساری زندگی افسوس میں ہاتھ ملنے پڑیں گے۔ وہ سب کچھ جس کی تلاش میں ہم نے دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں حرام کی ہیں' ہم حاصل کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمارے قبضے میں نہیں۔ یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔"

ارجمند نے بے حد تلخی سے کہا۔ "یہ قیامت اگر ٹوٹی ہے تو اس کا سبب تم ہو۔ ایک بے وفا اور دھوکے باز شخص ہو تم۔ جو کچھ ہوا تمہاری خود غرضی اور لالچ کے سبب ہوا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ مجھے بے خبر رکھ کر تہ خانے میں کھدائی کروائی اور صندوق نکالے۔ سب کچھ تنہا ہضم کرنا چاہتے تھے نا تم' اب کرو ہضم' ڈال لو سب کچھ اپنے پیٹ میں۔"

"خدا کے لیے ارجمند' خدا کے لیے۔۔۔ یہ طعنے دینے دلانے کا وقت نہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور غلطیاں مجھ سے ہی نہیں تم سے بھی ہوئی ہیں۔ بہرحال۔۔۔ بھول جاؤ۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔ آؤ ہم مل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں۔"

"کیا حل نکالیں؟" ارجمند بدستور غضبناک تھی۔ "ساری فہم و فراست تو تمہارے دماغ میں بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی حل ہے تمہارے پاس تو بتاؤ۔"

"حل میرے پاس نہیں! تمہارے پاس ہے۔" افزاہیم نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ "میں جانتا ہوں تم نے شباب سینما سے حسانان کو پکڑا ہے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حسانان بے خبر ہو۔ وہ ضرور جانتا ہے کہ صندوق کہاں ہیں۔ ساری دنیا بے خبر ہو سکتی ہے لیکن وہ شخص نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن حسانان میرے پاس نہیں ہے۔" ارجمند نے بیزاری سے کہا۔

"وہ ہے تمہارے پاس۔۔۔ وہ ہے۔" افزاہیم کے بظاہر نرم لہجے کے نیچے آتش فشانی لاوا کھول رہا تھا۔ "لیکن شاید تمہیں احساس نہیں کہ وہ شخص ہمارے لیے کتنا قیمتی ہے اور نہ یہ احساس ہے کہ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ دیکھو ارجمند! اگر تم حسنے کی زبان کھلوا چکی ہو تو پھر کسی طرح کی

تاخیر نہ کرو اور اگر ابھی تک وہ چپ ہے تو پھر ہمیں جلد از جلد اس کی زبان کھلوانی ہوگی۔ اگر جلد ہی ایسا نہ ہو سکا تو سب کچھ راکھ ہو جائے گا اور یہ راکھ ساری زندگی اڑ اڑ کر ہمارے سروں پر پڑتی رہے گی۔" اس نے ایک بار پھر ارجمند کے شانے تھام لیے۔ "بتاؤ کہاں ہے حسانان بتاؤ ارجمند۔"

ارجمند کے چہرے پر ابھی تک نفرت اور بے گانگی کی جھلک تھی۔ اس نے افراہیم کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور بولی۔ "وہ شخص پکڑا ضرور گیا تھا لیکن کل رات وہ تیواری صاحب کی کوٹھی سے بھاگ گیا ہے۔"

"کیسے بھاگ گیا ہے؟" افراہیم نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

"بس چکما دے گیا ہے۔"

"لیکن... کیا مطلب ہے؟"

ارجمند نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں پیشانی سے ہٹایا اور بولی۔ "تیواری صاحب کا خیال تھا کہ وہ سخت جان بندہ ہے۔ مار پیٹ سے گھبرا کر زبان نہیں کھولے گا۔ انہوں نے رائے دی کہ اسے کوٹھی سے نکلنے کا موقع دیا جائے بعد میں اس کا پیچھا کر کے نرک کے ٹھکانے کا پتا چلایا جائے۔ ہم نے اسے کوٹھی سے نکال کر اس کا تعاقب شروع کیا لیکن وہ توقع سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ کل رات اشار ہوٹل میں جو ہنگامہ ہوا اسی کے سبب ہوا تھا۔ اس نے ہمارے آدمیوں کو زخمی کیا اور بھاگ نکلا۔"

"اوہ نو... تو۔" افراہیم کو ارجمند کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جو حقیقت ہے وہ میں نے بتا دی ہے۔ اب تمہاری مرضی کہ یقین کرو یا نہیں۔"

افراہیم کچھ دیر ارجمند سے تکرار کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ اصل بات وہی ہے جو وہ بتا رہی ہے تو ایک دم اس کا پارا چڑھنا شروع ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا ہے اور آنکھیں فرطِ غضب سے پھیل رہی ہیں۔ ایک دم وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کی آواز کی نرمی اور ملائمت ہوا ہو گئی اور لہجہ دہکتے ہوئے پتھر برسانے لگا۔ وہ چیخ کر بولا۔ "حرامزادی... کتے کی بچی! جانتی ہے تو نے کیا کیا ہے۔ کچھ جانتی ہے تو؟ وہ تیری ماں کا خصم جسے تو حسانان کہہ رہی ہے۔ حسانان نہیں تھا' وہ استاد جہانی تھا۔ وہ تیرے جیسی کنجریوں اور حلال جیسے زادوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہے تو قادر زماں اور شکر جیسے پہنچے خانوں سے پوچھ۔ تو اس کا پیچھا کر کے اس کے ساتھیوں تک پہنچنے نکلی تھی؟ تو کیا شے ہے اس کے سامنے۔ شکر کر اس نے تجھے کہیں چیر پھاڑ کر نہیں پھینک دیا۔"

میری آنکھ جھری سے لگی تھی اور ارجمند بانو کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے نام کی بازگشت حیرت بن کر ٹھہری ہوئی تھی۔ سنگین ہونے کے باوجود یہ لمحات دلچسپ تھے۔ میرا ایک حریف بند کمرے کے اندر میری شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ میں سن رہا ہوں۔ ارجمند کی آنکھوں میں چھلک آنے والی حیرت اور تشویش دیکھ کر بھی مجھے لطف آیا۔ افراہیم نے جیب سے ایک اخباری تراشا نکال کر ارجمند کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور گرجا۔ "دیکھو! یہی ہے نا وہ حسانان۔ دیکھو اس کو اچھی طرح۔"

ارجمند نے اس بوسیدہ تراشے پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر برا سا منہ بنا کر بولی۔ "پاگل کتے کی طرح مت چیخو۔ مجھے الہام نہیں ہوتا تھا کہ یہ بہروپیا ہے۔ تم بھی تو کتنے ہفتے اسے حسانان ہی سمجھتے رہے ہو اور کھدائی کرواتے رہے ہو اس سے۔"

ایک لمحہ توقف کر کے اس نے باغیانہ انداز میں سر جھٹکا اور بولی۔ "ہمارے ساتھ جو ہوا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی وجہ صرف اور صرف تمہارا کمینہ پن ہے۔"

"کمینی تو خود ہے حرامزادی۔" افراہیم کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ "میں نے تجھ سے نکاح کیا تھا۔ تجھے زندگی کا شریک بنایا تھا۔ تو نے ثابت کیا کہ تو کسی بدکار ماں کی اولاد ہے۔ تو نے بمبئی سے اپنے یار کو اپنے پاس بلایا۔ میری بیوی کہلاتی رہی اور اس کے بستر پر سوتی رہی۔ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر اس بازی گر سے رنگ رلیاں مناتی رہی۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال اور ذرا سوچ تیری لعنتی زبان اس قابل ہے کہ کسی کو فریبی اور دغا باز کہہ سکے۔ بتا تیری زبان ہے اس قابل؟"

"بدکار تو خود ہے حرامی۔" ارجمند پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخی۔ "اس عمر میں بھی تیری ہوس کم نہیں ہوئی۔ مجھے گھر میں ڈال کر رنگ برنگی عورتوں پر منہ مارتا رہا ہے۔ تیرا کون سا کرتوت مجھ سے چھپا ہوا ہے۔ تیری ہر کالی رات میری آنکھوں کے سامنے ہے اور یہ بھی جانتی ہوں میں کہ خوشاب کی کس کس گلی میں تیرے حرامی بچے کھیل رہے ہیں۔"

ڈارک روم کے اندر سے میاں بیوی کی یہ جنگ دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ باکس میں بیٹھا ہوں اور باروھاڑ سے بھرپور

فلم دیکھ رہا ہوں۔ ایکا ایکی افراہیم آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے لپک کر ارجمند کا گلا دبوچا اور اسے گرا کر اس کے اوپر چڑھ بیٹھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ ارجمند کی نگاہوں میں خوف کے بجائے غضب کی چنگاریاں تھیں۔ اس نے اضطراری طور پر پہلے تو اپنی جوتی اتارنے کی کوشش کی پھر پھرتی سے اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اسی دوران نشست گاہ کا بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور بابو لیاقت سمیت کئی افراد دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ بابو لیاقت نے سب سے پہلے ارجمند بانو کا وہ ہاتھ دبوچا جو اس نے ہینڈ بیگ میں ڈال رکھا تھا۔ یقیناً وہ کوئی آتشیں ہتھیار برآمد کرنا چاہ رہی تھی۔ تیواری لال نے افراہیم کو کھینچ کر ارجمند بانو سے پیچھے ہٹا دیا۔ افراہیم غصے کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے تیواری لال کے رخسار پر کھینچ کر ایک تھپڑ مارا۔ اس تھپڑ کے ساتھ ہی وہ طوفان جو نشست گاہ میں بڑی دیر سے پل رہا تھا' بے قابو ہو گیا۔ سب سے پہلا فائر کس نے کیا؟ یہ میں نہیں دیکھ سکا کیونکہ فائر کرنے والا میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ یہ ۳۸ بور ریوالور کا فائر تھا۔ اس کے ساتھ ہی "ری پیٹر" کے دو دھماکے سنائی دیے۔ میں نے تیواری لال کو تڑپ کر تپائی پر گرتے دیکھا۔ ایکا ایکی نشست گاہ میدانِ جنگ بن گئی۔

مختصر سی جگہ میں گھمسان کا رن پڑ گیا تھا۔ میرے سامنے ڈائننگ کا ایک بہت گاندھی کی بہت بڑی فریم شدہ تصویر کو لگا اور وہ چکنا چور ہو کر قالین پر گری۔ پھر کوئی شخص زور سے چیخا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین افراد ایک دوسرے سے گتھم گتھا نشست گاہ کے دروازے سے باہر جا گرے۔ فائرنگ چند لمحے نشست گاہ میں مرکوز رہنے کے بعد اچانک پوری عمارت میں پھیل گئی۔ فریقین مختلف جگہوں پر پوزیشن لے کر گولیاں چلا رہے تھے۔ میرے کانوں میں بار بار افراہیم کی للکار گونج رہی تھی۔ "جان سے مار دو حرامزادوں کو۔ کسی کو نہ چھوڑو۔"

یہ ہنگامہ بہ مشکل ایک منٹ چلا ہوگا کہ پولیس کار کے زوردار سائرن سے در و دیوار گونج اٹھے۔ اب میرے لیے حرکت میں آنا ضروری ہو گیا تھا۔ پولیس اس بیٹھک کو گھیرے میں لے لیتی تو پھر کوئی کونا کھدرا اس سے چھپا نہیں رہتا۔ وہ اس ڈارک روم میں بھی پہنچتی اور ظاہر ہے سلیمانی ٹوپی کے بغیر میرا پوشیدہ رہنا ناممکن تھا۔ در و دیوار فائرنگ سے گونج رہے تھے لیکن نشست گاہ میں اب کوئی نہیں تھا۔ میں نے ڈارک روم کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ نشست گاہ میں دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک گیم تکیم تیواری لال کی تھی اور دوسری اے ایس آئی بلراج کی۔ یہ دوسری لاش دیکھ کر مجھے دکھ کے بجائے ایک طرح کا اطمینان ہوا۔ ایسے شخص کی موت پر کسی کا دکھی ہونا بہت مشکل ہوتا ہے اور آنسو تو ایسی لاشوں کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں۔ وہ ایک درندہ صفت تھا۔ میں کل رات سے کئی بار سوچ چکا تھا کہ اگر میں بدستور اس کے چنگل میں پھنسا رہتا اور وہ زنگ آلود ہتھوڑی کی ضربوں سے میرے پاؤں کی انگلیاں چپٹی کرتا رہتا تو میری برداشت کہاں تک ساتھ دیتی۔ شاید ایذا رسانی کا یہ طریقہ عہدِ قدیم کے رومنوں کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا ورنہ انہیں عذاب دہی کے لیے بیش قیمت آلات ایجاد نہ کرنے پڑتے۔ بس ایک ہتھوڑی ہر جلاد کو فراہم کر دی جاتی اور وہ مزے سے بیٹھا دھیرے دھیرے شاہی معتوبین کی انگلیاں کچلتا رہتا۔

ایک نگاہِ غلط انداز اے ایس آئی بلراج کی سیاہ لاش پر ڈال کر میں بغلی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس دوسرے کمرے میں ایک تنگ زینہ دیکھ چکا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ زینہ مجھے چھت پر پہنچا سکتا ہے۔ جونہی میں نے زینے پر پاؤں رکھا' مجھے خیال آیا کہ میری ایک چیز یہاں رہ گئی ہے۔ میں واپس مڑا اور اس چوبی الماری کی طرف بڑھا جس میں میرا ماؤزر رکھوایا گیا تھا۔ اس الماری کے دروازے میں اب کئی سوراخ نظر آ رہے تھے۔ دروازہ کھول کر میں نے ماؤزر نکالا اور جھک کر بھاگتا ہوا زینے طے کرنے لگا۔ میرے اردگرد فائرنگ ہو رہی تھی لیکن چھت کی طرف سکون تھا۔ تاریک چند اینٹوں کی سیڑھیاں طے کر کے میں چھت پر پہنچا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ یہ علاقہ بالکل اندرون لاہور جیسا تھا۔ مجھے لگا جیسے بھاٹی لوہاری کی کسی چھت پر کھڑا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ کبوتروں کی چھتریاں' ٹیلی وژن کے ایریل' بجلی کے تار اور کہیں کہیں برساتیوں کی ٹمٹماتی روشنیاں' جونہی میں نے چھت پر قدم رکھا' ایک سایہ سا میرے پہلو میں لہرایا۔ اس کے ساتھ ہی منڈیر کے پاس سے چنگاریاں چھوٹیں۔ یہ ڈبل نوگن کا فائر تھا۔ میں تڑپ کر پھر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اسی دوران ایک شخص جھک کر بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اس نے بلا تکلف میرا بازو تھام لیا اور تیز سرگوشی میں بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

میں پہچان گیا' یہ بابو لیاقت کی آواز تھی۔ اس نے مجھے کھینچا تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ جھک کر بھاگ رہا تھا۔ مجھے بھی جھک کر بھاگنا پڑا۔ اور یہ احتیاطی تدبیر عین ضرورت

کے مطابق تھی۔ اندھیرے میں مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے تیزی سے چند کوٹھے پھلانگے اور بیٹھک سے محفوظ دوری پر پہنچ گئے۔ بابو لیاقت نے ایک ممٹی کا دروازہ کھولا اور بلا تکلف نیچے اترنے لگا۔ ابھی ہم چند زینے ہی اترے تھے کہ چند خواتین ہم سے آ ٹکرائیں۔ وہ غالباً فائرنگ کی آواز سن کر چھت پر جا رہی تھیں۔ اچانک دو اجنبی مردوں کو روبرو پا کر ان کی چیخیں نکل گئیں لیکن پھر جلد ہی وہ بابو لیاقت کو پہچان گئیں۔ "شما کرنا ماں جی' معاف کرنا بہن جی۔" بابو لیاقت نے لجاجت سے کہا۔

اس کی آواز نے جادو کا اثر کیا۔ نہ صرف یہ کہ خواتین چپ ہو گئیں بلکہ انہوں نے ایک جانب سمٹ کر ہمیں راستہ بھی دے دیا۔ ایک بوڑھی عورت نے حیران ہو کر کہا۔ "لیاقت بیٹا تم ہے؟"

"ہاں ماتا جی! جھگڑا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس طرف سے نکلنا پڑا ہے۔ آپ گھبرائیں مت' آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

ہم سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے پہنچے اور پھر ایک ڈیوڑھی سے ہو کر گلی میں نکل آئے۔ یہ نسبتاً کشادہ گلی تھی بلکہ اسے سڑک کہنا زیادہ مناسب تھا۔ یہاں ایک طرف دیوار کے بالکل ساتھ ایک ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی کی طرف لپکے۔ میں نے دیکھا کہ کار میں ایک شخص پہلے سے موجود ہے۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی عقبی دروازہ کھول دیا۔ بابو لیاقت مجھے لے کر کار میں گھس گیا۔

"آگئی ہے؟" بابو لیاقت نے ڈرائیور سے مبہم سا سوال کیا۔

"ہاں جی۔" ڈرائیور نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو ڈرائیور کے ساتھ بھی ایک دراز قد شخص بیٹھا نظر آیا۔ یہ بابو لیاقت کا وہی ملازم تھا جس نے بیٹھک میں مجھ سے ماؤزر رکھوایا تھا۔ یہ ایک کشادہ ٹیکسی تھی۔ چھت کافی اونچی تھی پھر بھی دراز قد شخص کو گردن ٹیڑھی کر کے بیٹھنا پڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹیکسی میں بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں یہ خوشبو... کہاں سے اٹھ رہی تھی۔

عقب میں ابھی تک فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اور پولیس کار کا سائرن مسلسل شور مچا رہا تھا۔ ٹیکسی کار کے ڈرائیور نے بڑی مشاقی سے دو تین موڑ کاٹے اور کار کو بھگا کر بڑی سڑک پر لے آیا۔ "کہاں چلوں بابو جی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"کوٹھی چلو۔" بابو لیاقت نے مختصر جواب دیا۔ ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی۔ بابو لیاقت بڑبڑایا۔ "بہت برا ہوا ہے۔ دو تین آدمی تو یقینی طور پر مر گئے ہیں۔ صبح اخباروں نے اپنے صفحے کالے کر دینے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' ٹیکسی کار کے بریک چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ایک موٹر سائیکل سوار گاڑی کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے اسی کے اشارے پر گاڑی روکی تھی۔ موٹر سائیکل سوار نے جیکٹ پہن رکھی تھی اور چہرہ مفلر میں چھپا رکھا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر تیزی سے ٹیکسی کے قریب آیا اور کھڑکی میں سر ڈال کر بابو لیاقت سے بولا۔ "اس طرف گڑبڑ ہے جی۔ ایک جیپ میں چار پانچ مسلح آدمی موجود ہیں۔ آتی جاتی ہر گاڑی کا معائنہ کر رہے ہیں۔"

بابو لیاقت کے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکڑ گئے۔ وہ ڈرائیور سے بولا۔ "واپس چلو شکور! اسٹیشن کی طرف سے نکلو اور ہمیں فیکٹری پہنچاؤ۔"

ڈرائیور شکور نے مستعدی سے سر ہلایا اور گاڑی موڑ لی۔

چند چھوٹی چھوٹی گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر ہم ایک "مین روڈ" پر پہنچے اور پھر پندرہ منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ایک فیکٹری نما عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ مضافاتی علاقہ تھا۔ عمارت اچھے خاصے رقبے پر تھی۔ بیرونی چار دیواری بلند تھی۔ داخلے کے لیے ایک بڑا آہنی گیٹ تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مخصوص انداز میں ہارن بجایا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر جا کر گیراج میں رکی اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ کار میں ایک پانچواں شخص بھی موجود ہے۔ یہ کار مختصر ڈکی والی تھی۔ عقبی نشست کے پیچھے تھوڑی سی جگہ کو ڈکی کی شکل دے دی گئی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر اس مختصر جگہ میں جھانکا تو چونک گیا۔ بھینی بھینی خوشبو یہیں سے اٹھ رہی تھی۔ گیراج کی مدھم روشنی میں ڈکی کے اندر ایک قیامت محو خواب تھی۔ یہ ارجمند بانو تھی۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور خون بہہ بہہ کر اس کے نصف چہرے کو بھگو چکا تھا۔ اب آدھا حسن لہو میں ڈوبا ہوا تھا اور آدھا گیراج کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس مختصر جگہ میں وہ حسن کی ملکہ بڑے "ہتک آمیز" انداز میں مڑی تڑی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا' ایک نہایت نفیس' استری شدہ لباس کو ٹرنک بلکہ میں باندھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ بابو لیاقت نے مجھے ارجمند کو

گھورتے دیکھا تو بولا۔ "یہ زینوں سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہیں پڑی رہتی تو اب تک پار ہو گئی ہوتی۔ شکورے اور زمان نے دلیری دکھائی اور اسے نکال لائے۔"

ٹیکسی سے نکلتے ہی سب سے پہلے بے ہوش ارجمند کو ڈکی سے نکالا گیا۔ دراز قد فرمان علی نے اسے کسی گڑیا کی طرح کندھے پر ڈالا اور ڈرائیور شکور کے ہمراہ اندرونی حصے میں لے گیا۔ ایک نظر فیکٹری کا جائزہ لیتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سرامکس اور خاص طور پر ٹائل سازی کا کام ہوتا ہے۔ ایک جانب بہت بڑے شیڈ کے نیچے ناقص اور ٹوٹی پھوٹی ٹائلوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ ریل انجن کے بوائلر جیسے بڑے بڑے آہنی سلنڈر خودکار چرخیوں پر گھوم رہے تھے اور ان کے اندر سے کھڑکھڑاہٹ کی زوردار آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان سلنڈروں میں مخصوص پتھر اور دیگر مسالا جات ڈال کر انہیں رات دن متحرک رکھا جاتا ہے اور یوں وہ میٹریل وجود میں آتا ہے جس سے ٹائل اور ظروف سازی ہوتی ہے۔

اس بے پناہ شور کے درمیان سفر کرتے ہوئے ہم ایک بہت بڑے ہال نما حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں فیکٹری کی بھٹیوں سے نکلنے والا تیار شدہ مال بڑی احتیاط اور ترتیب سے جوڑا گیا تھا۔ ہال میں روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی نہایت دیدہ زیب منقش برتن اپنی قدروقیمت کا احساس دلا رہے تھے اور خوبصورت ٹائلیں جگمگا رہی تھیں۔ ہم ایک آراستہ دفتر میں داخل ہوئے اور اس دفتر میں داخل ہو کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس فیکٹری کا مالک بابو لیاقت خود ہے۔ دفتر کی دیواروں پر خوبصورت فوٹوگراف آویزاں تھے اور میز کے ایک کونے میں کانگریس مخالف پارٹی کا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔

بابو لیاقت نے کہا۔ "تم یہاں تسلی سے بیٹھو' کسی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

دفتر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ارجمند بانو کو دیکھنے گیا ہے۔ ممکن تھا کہ اسے ہوش میں لانے کے لیے کسی ڈاکٹر وغیرہ کو بلانا پڑتا۔ بوسیدہ قمیص ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ اس قمیص کے نیچے "ایسٹرن ہاک" کے چھروں سے تار تار ہونے والا لباس تھا اور اس لباس سے نیچے گوردوارے سے مستعار لیا ہوا جوتا تھا۔ اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ چار پہیوں پر حرکت کرنے والا قیامت خیز راز اپنے جلو میں ان گنت ہنگاموں کی پرورش کر رہا ہے۔ معلوم نہیں بیجنتی پل کی حویلی سے یہاں پہنچنے والے ٹرک کے پیچھے کون کون یہاں پہنچ چکا تھا اور کون کون پہنچنے والا تھا۔ پھر میرے خیالات کا دھارا ارجمند بانو کی طرف بہہ نکلا۔ اس دیارِ غیر میں مجھے سب سے پہلے "خوش آمدید" کہنے والی وہی تھی۔ اس نے بھلے مجھے تشدد کی چکی میں پیسنا چاہا تھا۔ پھر چال کھیلی تھی اور مجھے تیواری لال کی کوٹھی سے فرار ہونے کا موقع جان بوجھ کر دیا تھا۔ کوٹھی کے تہ خانے میں جو کچھ ہوا وہ سب منصوبے کے مطابق تھا۔ جان بوجھ کر ایسا تاثر دیا گیا تھا کہ کوٹھی کے سارے مکین اچانک کہیں چلے گئے ہیں۔ پھر ناشتے کے بہانے میرے ہاتھ کھولے گئے۔ ایک ایسا گن مین میرے سر پر کھڑا کیا گیا جس کی گن میں اصل کے بجائے ڈمی گولیاں تھیں۔ گن مین نے مجھے موقع دیا کہ میں اس کے ہاتھ سے گن چھین لوں۔ عین ممکن تھا کہ میں اس پر فائر کرتا تو وہ ڈرامہ بازی کرتا اور جھوٹ موٹ "جاں بحق" بھی ہو جاتا۔ بہرطور اس کی نوبت نہیں آئی تھی اور میں گن مین کے "خون سے ہاتھ رنگے بغیر" تیواری لال کی کوٹھی سے نکل آیا تھا۔ بعد ازاں اگر اسٹار ہوٹل کی چھت پر جلال سے میرا معرکہ نہ ہوتا اور میں گن استعمال نہ کرتا تو شاید مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ گن میں گولیاں نہیں پٹاخے تھے۔

گن کا خیال آتے ہی میرا دھیان اس ماؤزر کی طرف چلا گیا جو کیپٹل ریسٹورنٹ کی چھت پر جلال کے ہاتھ سے نکلا تھا اور اب میرے لباس کے نیچے موجود تھا۔ سابقہ تلخ تجربات کے پیش نظر میں نے ماؤزر نکال کر اچھی طرح چیک کیا اور دوبارہ قمیص کے نیچے رکھ لیا۔ میری رسٹ واچ رات کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا صفدر اور زریں گل سے جدا ہوئے مجھے ۳۶ گھنٹے سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں تھے۔ فرید کوٹ میں جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اور جس طرح پُراسرار لوگ ہر جگہ ٹکریں مارتے پھرتے تھے' اس کے پیش نظر یہ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ٹرک زیادہ دیر متلاشی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ میں صفدر اور زریں گل کو واضح ہدایات دے کر نہیں آیا تھا۔ انہیں جو کچھ کرنا تھا موقع کے لحاظ سے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنا تھا۔ اگر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ مزاحمت کرتے اور کچھ لوگوں کو مشین گن سے بھون ڈالتے تو پھر ان کا اپنا زندہ بچنا بھی محال تھا۔ ہم اپنے ملک میں نہیں دیارِ غیر میں تھے اور ہر طرف سے موت کے نرغے میں تھے۔

تھوڑی دیر بعد بابو لیاقت واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی کی حالت تسلی بخش ہے۔ اس کی گہری بے ہوشی ٹوٹ گئی ہے اور جلد ہی وہ آنکھیں کھول دے گی۔ بابو لیاقت کا لب

ولہجہ نرم اور رویہ دوستانہ تھا۔ وہ بات کرنے کا ڈھنگ جانتا تھا اور جب تک مخاطب کو قائل نہیں کرلیتا تھا' بات آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ اس نے کہا۔ "عزیزم' یہ بات تو اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ جس طرح تم نے مجھ سے جھوٹ بولا' اسی طرح اس لڑکی نے بھی مجھے جھوٹی کہانی سنائی جسے تم ارجمند کہہ رہے ہو اور پھر جو تیسرے حضرت مسٹر افراہیم صاحب آئے انہوں نے جھوٹ بولا نہ سچ اور سیدھے مار دھاڑ پر اتر آئے۔ ظاہر ہے' یہ سب کچھ اس ٹرک کے لیے کیا جارہا ہے جسے تم پاکستان سے ڈرائیو کرکے یہاں لائے ہو اور اب تم نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

میں نے کہا۔ "تم بولتے جاؤ' میں اپنی رائے آخر میں بیان کروں گا۔"

وہ اپنے لمبوترے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "یہ بات بھی اب طے ہے کہ وہ کوئی معمولی ٹرک نہیں۔ اس میں بے حد قیمتی چیز لدی ہوئی ہے اور اگر اس چیز کا شمار منشیات میں ہوتا ہے تو پھر ہوسکتا ہے وہ ہیروئن ہو۔" ایک لحظہ رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا جیسے اپنی بات کا ردِعمل دیکھنا چاہتا ہو۔

میں نے کہا۔ "بے شک وہ قیمتی چیز ہے لیکن منشیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ کوئی ایسی شے ہے کہ اس کی نقل و حرکت مجرمانہ فعل سمجھی جائے۔"

بابو لیاقت کی بڑی بڑی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مجھے سگریٹ پیش کیا۔ اپنے ہاتھ سے دونوں سگریٹ سلگائے اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ جس طرح یہ ٹرک معمولی نہیں' اسی طرح تم بھی وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ میری بیٹھک میں جب افراہیم' ارجمند پر چیخ چنگھاڑ رہا تھا تو اس کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ ارجمند سے کہہ رہا تھا کہ جسے وہ حسانال سمجھ رہی ہے وہ حسانال نہیں اسکندر جمالی ہے۔ میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا لیکن چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ وہ کوئی دبنگ قسم کا مار دھاڑ کرنے والا بندہ رہا ہوگا۔ اور مار دھاڑ تو تم نے بھی استارہ ہوٹل میں خوب کی ہے۔" وہ ایک بار پھر گفتگو روک کر میرا چہرہ تکنے لگا۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے' میں یہ تعارف والا معاملہ تم پر چھوڑتا ہوں۔۔۔ لیکن اس موقعے پر ایک بات میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔۔۔ میں دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں اور یہی سبب ہے کہ تمہیں کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس طرح ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے' میرا خیال ہے کہ ایک مخلص خیرخواہ سے بھی کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔"

میں نے ایک بھرپور نگاہ بابو لیاقت کے چہرے پر ڈالی' اسی ایک لمحے میں میں نے فیصلہ کرلیا کہ بابو لیاقت قابل بھروسا شخص ہے اور ایک حد تک اسے حقیقت بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ تک ہمارے درمیان بہت اہم گفتگو ہوئی۔ میں نے نہ صرف اپنا ٹھیک ٹھیک تعارف کرادیا بلکہ بابو لیاقت کو یہ بھی بتا دیا کہ پاکستان سے آنے والے ٹرک میں کچھ صندوق لدے ہیں جن میں قیمتی سامان اور نوادرات وغیرہ ہیں۔

میں نے روپے میں سے چار آنے بات بتائی تھی۔ پھر بھی بابو لیاقت کی آنکھیں حیرت سے کشادہ نظر آنے لگیں۔ اس نے مجھ سے میرے ساتھیوں کے بارے میں تفصیلات پوچھیں اور یہ دریافت کیا کہ ہم کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے اسے تمام ضروری تفصیلات فراہم کردیں لیکن ٹرک کی صحیح لوکیشن کے بارے میں نہ میں نے بتایا اور نہ اس نے پوچھ کر شرمندگی مول لی۔ اسی دوران ساتھ والے کمرے سے چیخ وپکار کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز فاصلے سے آرہی تھی لیکن پھر بھی پہچانی جارہی تھی۔ یہ ارجمند بانو کی آواز تھی۔ وہ کسی جنگلی بلی کی طرح غرا رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔

"آؤ دیکھیں کیا ہے؟" بابو لیاقت نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

ہم آگے پیچھے چلتے آفس سے نکلے اور آوازوں کی سمت بڑھے۔ ایک بند دروازے کے سامنے رک کر بابو لیاقت نے خاص انداز میں دستک دی۔ یہ آہنی دروازہ تھا۔ دوسری طرف قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ "آیئے بابو۔"

ایک شخص نے نہایت ادب سے جھک کر کہا۔ اس شخص کو میں نے آواز سے پہچانا۔ یہ وہی موٹر سائیکل سوار تھا جس نے راستے میں ہماری ٹیکسی کار روک کر ہمیں مطلع کیا تھا کہ آگے گڑبڑ ہے۔ اس اطلاع کے بعد ہم کوٹھی جانے کے بجائے اس فیکٹری میں آگئے تھے۔ اس شخص نے ابھی تک چہرے پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ یہ مفلر اس کے چہرے پر ذرا عجیب سا لگ رہا تھا جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ میں نے قیاس لگایا کہ اس شخص نے اپنی کسی بدنمائی کو پردے میں رکھنے کے لیے مفلر کا سہارا لیا ہے۔ بعد ازاں میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ اس شخص کا تین چوتھائی چہرہ آگ میں بری طرح جھلسا ہوا تھا۔

اب ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا کمرا تھا' اس کمرے کی کھڑکی میں لوہے کی گرل لگی تھی۔ آوازیں اس کمرے سے آرہی تھیں۔ میں ارجمند کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک نیم تاریک گوشے میں ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ بابو لیاقت نے میری یہ حرکت دیکھ کر حیرت ظاہر کی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بابو لیاقت کھڑکی کے پاس پہنچا تو ارجمند لپک کر اس کے سامنے آگئی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس چوڑی پٹی کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر کنپٹی کے قریب گرہ دی گئی تھی۔ کچھ خون ارجمند کی جرسی پر بھی گرا تھا۔ بلب کی روشنی میں اس کا خوبصورت چہرہ تمتمایا نظر آتا تھا اور آنکھوں میں ہیجان خیز چمک تھی۔ وہ بولی "کہاں ہے وہ؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں اس کی بوٹیاں نہ نوچ لوں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں۔ کہاں ہے وہ گندی نالی کا کیڑا۔" وہ اپنے شوہر نامدار کا ذکرِ خیر کر رہی تھی۔ وہی شوہر نامدار جسے وہ چند ہفتے پہلے تک "آپ جناب" کہہ کر بلاتی تھی اور ادا سے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتی تھی۔ آج نفرت کی دیوی نے ان دونوں کے شعلہ رنگ چہروں سے محبت کے نقاب نوچ لیے تھے اور وہ ایک دوسرے کو سرِبازار جوتے مار رہے تھے۔ پھر وہ براہِ راست ہم کو للکارنے لگی۔ "کہاں ہے کمینے' میرے سامنے آ۔ میں تجھے تیری مردانگی کی اوقات بتاؤں۔ نکال مجھے۔ نکال مجھے یہاں سے ورنہ۔۔۔" پھر وہ افراہیم کو سیدھی سیدھی میں گالیاں دینے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسی بیٹھک میں ہے جہاں افراہیم کے کارندوں سے اس کے ساتھیوں کی خونریز جھڑپ ہوئی تھی۔ اس حوالے سے وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید افراہیم بھی یہیں پر موجود ہے۔ جب وہ ہم کو للکار کر تھک گئی اور بابو لیاقت نے اسے یقین دلایا کہ نہ افراہیم یہاں موجود ہے اور نہ ہی یہ وہ بیٹھک ہے جہاں وہ بے ہوش ہونے سے پہلے موجود تھی تو اس کا جنون کسی حد تک کم ہوگیا۔ وہ بابو لیاقت سے پوچھنے لگی۔ "اگر وہ کمینہ نہیں ہے یہاں تو پھر مجھے کس نے بند کیا ہے؟"

بابو لیاقت بڑی ڈپلومیٹ آواز میں بولا۔ "بات صرف یہ ہے کہ اس دروازے کی چابی نہیں مل رہی۔ ورنہ آپ بالکل آزاد ہیں۔ ہم آپ کو بیٹھک سے بے ہوشی کی حالت میں لائے ہیں۔ آپ بے ہوش ہو کر گر گئی تھیں اور ہر طرف فائرنگ ہو رہی تھی۔ آپ کو وہاں سے نکالا نہ جاتا تو۔۔۔"

وہ بولی "تیواری صاحب اور بلراج کہاں ہیں؟"

بابو لیاقت بولا۔ "بلراج کا تو پتا نہیں لیکن تیواری صاحب کو میرے سامنے گولی لگ گئی تھی۔ پتا نہیں بچے بھی ہیں یا نہیں۔"

ارجمند کے چہرے پر کوئی نیا تاثر نہیں ابھرا۔ جیسے تیواری کو گولی لگنے کی اطلاع قطعی غیر اہم ہو۔ وہ کچھ دیر عجیب نظروں سے بابو لیاقت کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ "مسٹر لیاقت! اگر تم مجھے ٹرک تک یا ٹرک والوں تک پہنچا سکو تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دے سکتی ہوں اور یہ کام کوئی ایسا مشکل بھی نہیں' تم یہ آسانی کرسکتے ہو۔ اس شہر میں ہزاروں نوجوان ایسے ہیں جو تمہارے ایک اشارے پر یہاں کا چپا چپا چھان سکتے ہیں۔"

بابو لیاقت نے کہا۔ "میرا خیال ہے ارجمند صاحبہ' آپ نے ٹرک کے بارے میں جو پہلی بات بتائی تھی وہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک ملازمہ کے قتل سے بہت آگے کا معاملہ ہے۔ شاید کوئی بہت قیمتی شے لدی ہوئی ہے ٹرک پر۔"

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "ہاں۔۔۔ ایک قیمتی شے ہے۔ میں اس قیمتی شے تک پہنچنے کے لیے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دے سکتی ہوں۔ تم جو رقم چاہو' میں دینے کو تیار ہوں۔ سادہ کاغذ پر دستخط کرالو۔ اسٹام لکھوالو۔ کسی طرح کی ضمانت لے لو۔ ہاں' بس ایک بات ہے۔ ایک بار جب معاملہ طے ہوجائے تو پھر سب کچھ دیانت داری سے ہونا چاہیے۔۔۔ شروع سے لے کر آخر تک۔" وہ چند لمحے بابو لیاقت کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر بولی۔ "بتاؤ اس کام کا کیا معاوضہ ہوگا؟"

وہ بابو لیاقت کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے نفسیاتی حربہ استعمال کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بابو لیاقت ایک دیانت دار شخص ہے اور اگر ان دونوں کے درمیان کوئی بات طے ہوجائے تو وہ اس پر جی جان سے عمل کرے گا۔ اب وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دینے کا اعلان کر رہی تھی۔ ظاہر ہے اگر بابو لیاقت کی سوچ بہت آگے تک جاتی اور وہ اپنی طرف سے بہت بڑی چھلانگ لگا کر پچاس لاکھ یا ایک کروڑ بھی مانگ لیتا تو ارجمند بآسانی اسے دے سکتی تھی بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ ارجمند اپنے شوہر کو نیچا دکھانے اور حویلی سے برآمد ہونے والی دولت تک پہنچنے کے لیے ہر مطالبہ مان سکتی ہے۔

بابو لیاقت نے کہا۔ "میڈم! مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں اپنے ایک قریبی ساتھی سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ماہر سوداگر کی طرح بولی "نہیں مسٹر لیاقت' ہاں یا نہ میں جواب دو۔ جو طے ہونا ہے ابھی اور اسی وقت ہوجائے۔"

بولو کیا مطالبہ ہے تمہارا؟ بولو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ بابو لیاقت اس حریص عورت سے جان چھڑانا چاہ رہا ہے لیکن وہ اس سے چپٹی جا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی اور وہ سارے بیش قیمت خواب تھے جو وہ نہ جانے کتنی مدت سے دیکھ رہی تھی۔ میں ایک ایسے ستون کے عقب میں کھڑا تھا جس کے بالائی سرے پر سنگل فیس کا ایک میٹر اور مین سوئچ موجود تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہ مین سوئچ فیکٹری کے اس حصے کو روشنی وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ بابو لیاقت کی جان چھڑانے کے لیے مین سوئچ آف کر دیا جائے۔ جونہی میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنایا، قرب و جوار تاریکی میں ڈوب گئے۔ بابو لیاقت کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ارجمند سے کہہ رہا تھا کہ لائٹ کا انتظام کر کے ابھی آتا ہے۔ ارجمند اسے پکارنے لگی۔ "مسٹر لیاقت ــــ لیاقت صاحب ــــ لیاقت صاحب میری بات سنیں۔" بابو لیاقت سنی ان سنی کرتا ہوا آہنی دروازے کی طرف لوٹ آیا۔ اسی دوران کہیں پاس ہی لالٹین کی مدھم روشنی چمکی۔ کوئی شخص مین سوئچ دیکھنے کے لیے ستون کی طرف آ رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ میرے قریب پہنچ گیا۔ میں ستون کی اوٹ میں تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ وہی مفلر پوش شخص تھا جس نے ابھی میرے اور بابو لیاقت کے لیے آہنی دروازہ کھولا تھا۔ اس کا مفلر چہرے پر سے کچھ کھسکا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے لالٹین کی روشنی دنیا کی کریہہ ترین چیز پر پڑ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا چہرہ بہت بری طرح جلا ہوا تھا۔ بائیں رخسار پر لوتھڑے سے لٹک رہے تھے اور اس رخسار میں سے دانت بالکل کسی مردے کے دانتوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں ٹھیک سے اندازہ نہ کر سکا کہ لالٹین کی مدھم روشنی کے سبب مجھے اس چہرے کی "خوفناکی" کم محسوس ہو رہی ہے یا زیادہ۔ اچانک اس شخص کو ستون کے قریب میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے چہرے پر مفلر درست کیا اور مین سوئچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دس منٹ بعد فیکٹری کے آراستہ دفتر میں بابو لیاقت اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بابو لیاقت کہہ رہا تھا۔ "ابھی گاندھی اسکوائر سے میری بیوی کا ٹیلی فون آیا ہے۔ لگتا ہے اے ایس آئی بلراج کے مرنے سے شہر میں کشیدگی پھیل گئی ہے۔ ہو سکتا ہے ہندو سکھ فساد ہی ہو جائے۔"

"ہندو سکھ فساد؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ سیاسی معاملہ کیسے بن گیا۔ افراہیم کے غنڈوں نے ارجمند بانو کے غنڈوں پر حملہ کیا۔ دونوں طرف کے لوگوں کا سیاست سے دور کا تعلق بھی نظر نہیں آتا۔"

بابو لیاقت بولا "بس اتفاق ہی ہو گیا ہے۔ سابق اے ایس آئی بلراج کا ملنا جلنا ایسے لوگوں سے تھا جو علیحدگی پسند سکھوں کو کچلنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ سونے پہ سہاگا یہ ہوا کہ افراہیم جن غنڈوں کو لے کر میری بیٹھک پر حملہ آور ہوا ان کا کرتا دھرتا ایک سکھ پہلوان ڈنگا سنگھ ہے۔ اب جو بات پبلک تک پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ ڈنگا سنگھ کے آدمیوں نے بلراج کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ میری بیوی نے جو بات بتائی ہے اس کے مطابق اندرون شہر چند مشتعل ہندوؤں نے ایک سکھ کریانہ فروش کو چھرا گھونپ دیا ہے اور اس کے بعد پورے شہر میں کشیدگی پائی جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بلراج جیسے بدمعاش سے ہمدردی جتانے والوں کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

بابو لیاقت نے کہا۔ "بدمعاش کا لفظ اس شخص کے لیے بہت چھوٹا ہے۔ میں اس بدبخت کی پوری ہسٹری سے واقف ہوں۔ یہ پولیس سے نکالا اس لیے گیا تھا کہ اس نے ایک لڑکے نارنگ کو مار مار کر جان سے مار ڈالا تھا۔ بعد ازاں اس کی وکیل بہن رتی کور کو اغوا کر کے لے گیا تھا اور حوالات میں رکھ کر کئی روز اس سے منہ کالا کرتا رہا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ شہر میں ایک دم جو کشیدگی پھیلی ہے اس کا ایک سبب یہ واقعہ بھی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہندوؤں نے سمجھا ہو بلراج کو نارنگ کا بدلہ لینے کے لیے قتل کیا گیا ہے بہرطور یہ جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔"

نارنگ اور اس کی وکیل بہن والا واقعہ میں اس سے پہلے بھی ارجمند کے کزن مین کی زبانی سن چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس واقعے میں صداقت تھی۔ لوگ کہتے ہیں بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ بات کے بغیر بتنگڑ نہیں بنتا۔ میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ "اب کیا پروگرام ہے؟"

وہ میرے سوال کی اہمیت اور گہرائی کو سمجھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرا گئیں اور کشادہ پیشانی شکن شکن ہو گئی۔ اپنی بات کو [illegible] کے لیے اس نے قریباً نصف منٹ لیا اور بولا۔ "یہ بات تو [illegible] پر لکیر ہے بھا پاجی کہ جونہی ہم نے ٹرک کو اس کی جگہ سے ہلایا وہ پکڑا گیا۔ اس لحاظ سے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ

ایک گاڑی یا کسی بڑے لوڈر کا انتظام کریں۔ اس لوڈر یا گاڑی کے ساتھ رات کی تاریکی میں ٹرک تک پہنچیں اور ٹرک کا سامان اس دوسری گاڑی میں منتقل کر لیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل ٹھیک سوچ ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس کے بعد کیا ہو گا؟"

"اس کے بعد سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" بابو لیاقت نے کامل اطمینان سے کہا۔ "جو کچھ آپ پاکستان سے لائے ہیں وہ پاکستان بحفاظت پہنچانے کا انتظام میں کروں گا اور یہ سب کچھ ایسی خوش اسلوبی سے ہو گا کہ آپ فرید کوٹ کے اس خدمت گار کو مدتوں یاد رکھیں گے۔"

اچانک دروازہ کھلا اور وہی کریہہ صورت شخص اندر آیا جس کی دید تھوڑی دیر پہلے میرے رونگٹے کھڑے کر چکی تھی۔ بابو لیاقت کے بالکل قریب پہنچ کر وہ ادب سے جھک گیا اور اس کے کان میں کوئی سرگوشی کرنے لگا۔ سرگوشی سننے کے بعد بابو لیاقت نے بڑی ملائمت سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ۔ لیکن صبح ہوتے ہی پہنچ جانا اور چابیاں فرمان علی کو دے جاؤ۔"

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ مفلر پوش شخص جس کا نام پالا سنگھ تھا، بابو لیاقت کے بہت قریب تھا۔ بابو لیاقت اس کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتا تھا اور پالا سنگھ بھی ہر جگہ بلا روک ٹوک پہنچ جاتا تھا۔ بابو لیاقت نے کہا "پالا سنگھ کو بھی فکر لاحق ہو گئی ہے کہ کہیں شہر میں فساد شروع نہ ہو جائے۔ بلراج کی خبر سن کر ہندو بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ اب کریانہ فروش کے قتل نے سکھوں کو بھی بھڑکا دیا ہے۔ پالا سنگھ کے اہل خانہ لاری اڈے کے پاس رہتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ انہیں وہاں سے نکال کر قریبی گاؤں میں چھوڑ آئے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس شخص کے چہرے کو کیا ہوا ہے؟"

بابو لیاقت کے چہرے پر اداسی سی لہرا گئی۔ بولا "بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے ساتھ۔ ڈھائی تین سال پہلے بڑا خوبرو جوان تھا۔ ہماری فیکٹری میں بھٹی پر مزدوری کرتا تھا لیکن ڈیوٹی ٹائم کے بعد کوئی اسے دیکھ کر کہہ نہیں سکتا تھا کہ فیکٹری مزدور ہے۔ بڑا بن ٹھن کر رہتا تھا۔ ایک دن بھٹی میں تیل کا کنستر گر گیا اور آگ بھڑک اٹھی۔ پالا سنگھ کا چہرہ جل کر کباب ہو گیا۔ یہ ایک بڑی سنگین حقیقت ہے کہ کسی خوبصورت انسان کا چہرہ بگڑ بھی جائے تو اس کا دل، اس کی خواہشات اور اس کے احساسات وہی رہتے ہیں۔ مجھے اس شخص پر بڑا ترس آتا ہے۔"

"شادی ہو چکی ہے اس کی؟"

"نہیں۔" بابو لیاقت نے جواب دیا۔ "میں نے کئی بار کوشش کی ہے لیکن کوئی ڈھنگ کی لڑکی یا عورت نہیں ملی۔ اکثر لوگ تو اس کا چہرہ دیکھ کر اتنے خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے چائے پینا بھی محال ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل پالا سنگھ میں بھی کچھ نخرا تھا لیکن اب اس نے اپنے دل کو اپنی صورت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ سوچتا ہے کہ کوئی کالی کلوٹی، بدصورت، بھینگی، لنگڑی ہی مل جائے لیکن لگتا ہے کہ اس جنم میں تو بے چارے کی بیوی والی خواہش پوری نہیں ہو گی۔ ویسے ہے بڑا صابر انسان اور وفاداری اتنی ہے کہ ابھی میں کہوں کہ جلتی بھٹی میں کود جائے تو کود جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اب تو پلاسٹک سرجری بھی ہونے لگی ہے۔"

وہ بولا۔ "میں نے اسے ایک بار بھیجا تھا دہلی۔ وہاں ایک کلینک ہے لیکن ابھی ہمارے ہاں یہ کام اتنے اچھے طریقے سے نہیں ہو سکتا اور پالے کا چہرہ بھی حد سے بگڑا ہوا ہے۔ سرجن نے انکار کر دیا تھا۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بابو لیاقت نے ریسیور اٹھایا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں کے دوران اندرونی کمرے سے ارجمند کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ بار بار بابو لیاقت کو پکار رہی تھی۔ یہ ایک بڑی فیکٹری تھی۔ یہاں سے ارجمند کی آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ارجمند تو رہی ایک طرف، دس بیس افراد اکٹھے ہو کر بھی چیختے تو ان کی آواز فیکٹری کی مسلسل رواں "رولیٹنگ مشینوں" کے شور میں دب جاتی۔

فون پر بات ختم کر کے بابو لیاقت نے نیا سگریٹ سلگایا اور بولا "وہ ٹیکسی ڈرائیور جو ہمیں یہاں لایا ہے اس کا نام شکور ہے۔ یہ اس کا فون تھا۔ اس کی طرف سے آپ کے لیے خوشخبری ہے کہ ایک بڑے لوڈر کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس میں دس پندرہ بیس یا جتنے بھی صندوق ہیں آسانی سے آ سکیں گے۔"

"بڑی مستعدی دکھائی ہے بھئی اس شکور صاحب نے۔ کہیں یہ اس کا اپنا لوڈر ہی تو نہیں۔" (دراصل مجھے زریں گل یاد آ گیا تھا جس سے میں نے پارہ چنار میں پک اپ کا تذکرہ کیا تھا اور وہ اپنے ہی بہنوئی کی پک اپ لے آیا تھا)

بابو لیاقت نے کہا۔ "نہیں، اپنا لوڈر ہوتا تو ٹیکسی کیوں چلاتا۔ کسی کی منت سماجت کی ہو گی بے چارے نے۔ یہ اسی

کا کام ہے کہ اتنی رات گئے اور اتنی جلدی اس نے بندوبست کر دیا ہے۔ دراصل یہ ساری شوق کی بات ہے۔"

"شوق کی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

بابو لیاقت کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ وہ مجھے گہری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ "میرا خیال ہے' مجھے آپ کو بتا دینا چاہیے کہ آپ اُستاد جانی کے طور پر پہچانے جا چکے ہیں۔ درحقیقت بیٹھک میں ارجمند اور افراہیم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں اتنی زیادہ چیخ پکار شامل تھی کہ اس گفتگو کا بیشتر حصہ بیٹھک سے باہر بھی سنا گیا تھا۔ اس گفتگو میں افراہیم نے آپ کے بارے میں انکشاف کیا تھا کہ آپ حسانان نہیں اُستاد جانی ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر تو یہ نام نہیں سنا تاہم میرے کارکنوں میں سے کئی ایک اس نام سے آگاہ ہیں۔ اپنے درمیان آپ کو موجود پا کر وہ خود کو بہت پُرجوش محسوس کر رہے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور شکور بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ آپ کو اس سے پہلے بمبئی میں بھی دیکھ چکا ہے۔ یہ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس وقت آپ کچھ زیادہ ہی دُبلے پتلے تھے۔ بمبئی کے ریس کورس میں بدنام غنڈے شنکر بھارتی کے چمچوں سے آپ کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ سرِعام چاقو چلے تھے اور فائرنگ کی گئی تھی۔۔۔"

میں نے کہا "شکور صاحب نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے اور جو دیگر افراد مجھ سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں میں ان کا بھی شکرگزار ہوں لیکن ایک بات آپ بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ مجھے اس وقت مشہوری کی نہیں گمنامی کی ضرورت ہے۔ آپ کے اس مشرقی پنجاب میں میرے اَن گنت دشمن ہیں اور میں فی الحال خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا کہ وہ ساری اپنی دشمنیاں تازہ کر سکوں۔ پلیز آپ اپنے کارکنوں کو سمجھایئے کہ یہ بات پھیلائیں مت۔ یقین کریں میں پہلے ہی بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں۔ کچھ اور پھنس گیا تو پھر میرے یہ چاہنے والے ہی میرا تماشا دیکھنے والوں میں سب سے آگے ہوں گے۔"

بابو لیاقت تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ خود بھی ایک جانی پہچانی شخصیت تھا اور اسے معلوم تھا کہ مشہور ہو جانے کے کیا فائدے اور کیا نقصانات ہوتے ہیں۔

ہم پندرہ بیس منٹ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے رہے۔ شاید یہ گفتگو مزید جاری رہتی مگر پھر ہم دونوں کو آفس سے نکل کر باہر فیکٹری کے صحن میں آنا پڑا۔ دراصل کہیں قریب ہی خودکار رائفل کی تڑتڑ گونجی تھی اور پھر پولیس کاروں کے سائرن مسلسل سنائی دینے لگے تھے۔ ان آوازوں کا منبع فیکٹری سے کافی فاصلے پر تھا لیکن چونکہ رات تھی اس لیے یہ آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ بابو لیاقت نے مجھ سے کہا کہ میں آفس میں بیٹھوں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہے۔ میں آفس میں چلا گیا اور سوچ بچار کرنے لگا کہ اگر شکور واقعی تھوڑی دیر میں لوڈر لے آیا تو ہمیں اپنی "مہم" پر فوراً نکل جانا چاہیے یا کل رات تک انتظار کرنا چاہیے۔

بابو لیاقت کے واپس آنے میں کافی تاخیر ہوگئی۔ وہ بارہ بجے کے قریب نکلا تھا۔ تین بجے سے پہلے اس نے دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائی۔ اس دوران میں آفس میں بیٹھا رہا۔ تین چار بار فون کی گھنٹی بھی بجی۔ یہ فون بابو کے دراز قد ملازم فرہان نے سنے اور بات کرنے والوں کو بتایا کہ بابو صاحب کسی کام سے گئے ہیں۔ بابو لیاقت واپس آیا تو اس کی آنکھوں میں پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے انکشاف کیا کہ شہر میں دو تین جگہ خونریز ہنگامے ہوئے ہیں اور کئی علاقوں میں غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

یہ واقعی سنسنی خیز خبر تھی۔ اس خبر کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اب نہ تو لوڈر اس فیکٹری میں پہنچے گا اور نہ ہم یہاں سے نکلیں گے۔ منصور اور زریں گل تک پہنچنے کا معاملہ کچھ دیر کے لیے مؤخر ہوتا نظر آتا تھا۔ میں جس وقت بابو لیاقت سے ملنے اس کی بیٹھک میں جا رہا تھا' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں ہمارے بدترین دشمن اکٹھے ہو جائیں گے اور ایک شخص کے قتل ہو جانے کے سبب پورے شہر میں فساد کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

O☆O

اگلے روز سہ پہر کو ایک گھنٹے کے لیے کرفیو میں وقفہ دیا گیا تھا۔ بابو لیاقت خود تو کہیں نہیں گیا لیکن اس کے دو خاص آدمی شہر میں گھوم پھر کر آئے۔ یہ لوگ اشیائے خوردنی کے ساتھ ساتھ ایک اہم خبر بھی لائے۔ انہوں نے بابو لیاقت کو بتایا کہ شہر میں پُراسرار لوگوں کی نقل و حرکت ہے۔ بہت سے نامی گرامی چہرے گلی کوچوں میں نظر آ رہے ہیں اور اسٹیشن کے علاقے میں ایک ایسی کار بھی دیکھی گئی ہے جو سات آٹھ ماہ پہلے تک بمبئی کے بدنام ترین بدمعاش شنکر شکرا کے زیرِ استعمال تھی۔

اس آخری اطلاع نے میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ اگر یہ خبر درست تھی تو اس کا مطلب تھا میرا دشمن نمبر ایک' کیل کانٹے سے لیس ہو کر فرید کوٹ پہنچ چکا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ ٹرک جو میں جھنگ سے چلا کر یہاں لایا تھا' ایک طاقتور مقناطیس کی طرح تھا جو اپنے اردگرد کی ہر بڑی چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور یوں ۳۶ گھنٹے کے اندر اندر فرید کوٹ میں ہر طرف خطرے کے بھوت ناچنے لگے تھے۔ میں نے بابو کے توسط سے اس مشکوک کار کے بارے میں چند مزید باتیں پوچھیں اور میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ شنکر شکرا مری سے فرید کوٹ تک کا سفر طے کر چکا ہے۔

اگلے دو روز ہم نے اسی سرامکس فیکٹری میں مقید رہ کر گزارے۔ شہر کے حالات ابتر تھے۔ کرفیو میں وقفوں کے دوران بھی متحارب گروہوں میں جھڑپیں ہوتی تھیں۔ دوسری طرف ایک کثیر الاشاعت اخبار نے ان پُراسرار سرگرمیوں کا نوٹس لیا تھا جو کئی روز سے فرید کوٹ میں جاری تھیں۔ اخبار نے لکھا تھا کہ پچھلے چند روز میں شہر کے اندر جرائم پیشہ لوگوں کی نقل و حرکت میں اضافہ ہوا ہے اور کرفیو کے باوجود کئی جگہ وارداتیں بھی ہوئی ہیں۔

ان دو دنوں میں ارجمند کا راویا مسلسل جاری رہا تھا۔ میں ابھی تک اس کے سامنے نہیں گیا تھا لیکن بابو لیاقت کو بہرحال اس کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ کبھی تو بابو لیاقت کو دھمکیاں دیتی تھی اور کبھی منت سماجت پر اتر آتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر اس چار دیواری سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ میں اس کے دل پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ تھا۔ وہ مدفون دولت جس کی خاطر اس نے وطن چھوڑا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص سے شادی کی تھی اور دو برس تک جھنگ کے ویرانوں کی خاک چھانی تھی' اب برآمد ہو گئی تھی لیکن ارجمند کی پہنچ سے دور تھی اور ارجمند جانتی تھی کہ اب اگر وہ دولت ہاتھ سے نکل گئی تو کبھی اس کا کھوج نہیں ملے گا۔

دوسرے روز شام کو بابو لیاقت نے مجھ سے کہا۔ "وہ جان چکی ہے کہ آپ بھی اس چار دیواری میں ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس کا اشارہ ارجمند کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "اتنی حسین اور دلکش عورت سے ملنے کو کس کا دل نہیں چاہتا لیکن میرے خیال میں ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی طرح وہ مجھ پر بھی چیخے چلائے گی اور کہے گی کہ ہم اسے یہاں سے نکالیں ورنہ وہ اپنے حُسن کی بجلیاں گرا کر پورے فرید کوٹ کو بھسم کر دے گی۔"

بابو لیاقت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی اور تجویز بھی ہو۔"

بابو لیاقت کے اصرار پر میں ارجمند سے ملنے چل پڑا۔ میری دستک پر مفلر پوش بالا سنگھ نے آہنی دروازے کا قفل کھولا اور میں کمرے کی گرل دار کھڑکی کے پاس ارجمند کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کے ریشمی بال منتشر تھے اور آنکھیں رت جگے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اسی پینٹ جرسی میں تھی جس میں میں نے اسے تین روز پہلے دیکھا تھا۔ وہ بڑی بے باکی سے مجھے دیکھتی رہی پھر غیر متوقع طور پر بہت نرم لہجے میں بولی۔ "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ ہمیں جان جانا چاہیے تھا کہ کنوئیں میں اتر کر خطرناک ترین اسلحے کو ہاتھ ڈالنے والا شخص معمولی راہداتیا نہیں ہے۔ بہرحال تم سے مل کر خوشی ہوئی استاد جانی۔" اس نے اپنا سرخ و سپید ہاتھ مصافحے کے لیے گرل میں سے باہر نکال دیا۔ میں نے بے دلی سے ہاتھ تھام کر چھوڑ دیا۔ وہ بولی۔ "مجھے افسوس ہے استاد جانی کہ اے ایس آئی بلراج کی طرف سے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا لیکن یہ سب کچھ قابلِ معافی ہے کیونکہ بے خبری میں ہوا ہے۔ شاید خود بلراج کو بھی یہ جان کر افسوس ہو کہ وہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں۔ آپ جیسی "استانیوں" کے ہوتے ہوئے میں کہاں کا استاد ہوں اور پھر اوبار کے پاس بیٹھنے سے کپڑے تو جلتے ہی ہیں۔ آپ جیسے لوگوں سے واسطہ ہو تو بندے کو اچھے بُرے سلوک کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔"

ارجمند کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بلراج اور تیواری لال کی موت سے ابھی تک بے خبر ہے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ شبہ بھی اب تک برقرار تھا کہ شاید بابو لیاقت نے اسے اپنی بیٹھک کے آس پاس ہی کہیں رکھا ہوا ہے۔ وہ گفتگو کا رخ بتدریج اس موضوع کی طرف موڑنے لگی جس نے اس کے شب و روز کا چین حرام کر رکھا تھا۔ وہ مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "استاد جانی' تم نے سارے پاپڑ بیل کر دیکھے ہوئے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہوگا یہ دولت کتنی بے رحم شے ہے۔ خونی اور قریبی سے قریبی رشتے بھی اس کی کاٹ کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تم بابو لیاقت پر کس حد تک اعتبار کر رہے ہو لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ بابو قطعی ناقابلِ بھروسا شخص ہے۔ میری ایک بات پتھر پر لکیر ہے اور اس بات کو یاد رکھنا۔ بابو لیاقت چپکا نہیں بیٹھا۔ اس نے کرفیو اور افراہیم کا ہوا دکھا کر تمہیں اور مجھے اس چار دیواری میں بند کر رکھا ہے جبکہ وہ خود

بھی چکا ہو۔ ہم بہت زیادہ وقت ضائع کر چکے ہیں استاد جہانی لیکن ابھی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ بابو لیاقت کی باتوں میں مت آؤ۔ یہاں سے نکلنے کی ترکیب سوچو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے سارے کارندے تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم ہر جال توڑ کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔" ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولی۔ "ان صندوقوں تک پہنچنے کے لیے میں نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں استاد! میں اب یہ دولت یوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ان صندوقوں پر جتنا حق میرا ہے، شاید کسی کا نہ ہو لیکن ... میں یہ حق تمہارے ساتھ تقسیم کر سکتی ہوں۔ تم جو کہو گے میں ماننے کو تیار ہوں لیکن نا قدرے لوگوں کے ہاتھوں سے اس دولت کے یوں حصے بخرے نہیں ہونے چاہئیں۔"

ارجمند کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ترس آ گیا۔ طمع اور لالچ کی دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے بہا جسم کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ کسی بھی شریف، خوشحال شخص سے شادی کر کے اپنی زندگی چین سکون سے گزار سکتی تھی لیکن دولت کی ہوس اسے اندھی خواہشات کی رسی سے باندھ کر کوچہ کوچہ گھسیٹتی پھرتی تھی۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بابو لیاقت ابھی تک ایک مخلص شخص ثابت ہوا ہے اور اس کا یہ بیان سو فیصد درست ہے کہ اس فیکٹری سے باہر حالات ایسے نہیں کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔ میں نے اسے وہ اخبار بھی دکھایا جس میں کرفیو کے بارے میں دو کالمی خبر چھپی تھی اور ایک صفحے پر فرید کوٹ میں پُراسرار لوگوں کی سرگرمیوں کا ذکر تھا۔ یہ ٹھوس ثبوت دیکھنے کے باوجود ارجمند کی بے کلی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک ہیجان برپا تھا اس کے اندر اور اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر اس خدشے کا اظہار کر رہی تھیں کہ ہم اس چار دیواری میں محبوس رہ جائیں گے اور فرید کوٹ کے گرد و نواح سے وہ ٹرک تلاش کر کے غائب کر دیا جائے گا۔

ارجمند کے پاس سے کھسکنے کے لیے نجانے مجھے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑتا لیکن پالا سنگھ نے آ کر میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے بتایا کہ بابو صاحب مجھے آفس میں بلا رہے ہیں۔ پالا سنگھ کو کھڑکی کے پاس دیکھ کر ارجمند کی آنکھوں میں کراہیت آمیز خوف نمایاں ہو گیا۔ اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں بھولے سے اس کی نگاہ پالا کے چہرے پر نہ پڑ جائے۔ وہ تو خیر عورت تھی (جو ویسے بھی نازک

دیکھ نہیں سکتا تھا۔

پانچویں روز کرفیو میں خاصی نرمی کر دی گئی۔ صبح سات سے رات دس بجے تک کرفیو نہیں تھا۔ اس روز شکور احمد بھی لوڈر لے کر فیکٹری میں پہنچ گیا۔ یہ ایک "مزدا چیسس" تھی جس پر لوکل باڈی بنائی گئی تھی۔ پچھلی حصے میں صرف ایک دروازہ تھا جو پیچھے کی جانب کھلتا تھا، صندوق رکھنے اور منتقل کرنے کے لیے یہ بڑی محفوظ گاڑی تھی۔ اس انتخاب پر میں نے بے ساختہ شکورے کو شاباش دی۔ وہ خوشی سے پھول گیا۔ اس رات نو بجے کے قریب بابو لیاقت بھی فیکٹری آ گیا۔ میرے لیے دو جوڑے کپڑوں کا انتظام اس نے دو روز پہلے ہی کر لیا تھا۔ اب وہ کوٹ چادر اور جوتے وغیرہ بھی لے آیا۔ اس نے بتایا کہ گاندھی اسکوائر میں حالات اب قابو میں ہیں لیکن کشیدگی بدستور پائی جاتی ہے۔ بابو لیاقت اور شکورے سے صلاح مشورے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ٹرک تک پہنچنے کے لیے کل رات تک انتظار کر لیا جائے۔ اس فیصلے کی بنیاد اس توقع پر تھی کہ شاید کل تک رات کا کرفیو بھی اٹھا لیا جائے اور ہم دن کی روشنی میں خطرہ مول لینے کے بجائے رات کی تاریکی میں اپنا کام کر سکیں ... لیکن اسی شب ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ہمارا سارا منصوبہ درہم برہم کر دیا اور ہمیں کرفیو ختم ہوتے ہی فیکٹری سے نکلنا پڑا۔

یہ واقعہ جتنا سنسنی خیز تھا، اتنا ہی حیران کن بھی تھا اور مجھ سے زیادہ یہ بابو لیاقت کے لیے سنسنی خیز اور حیران کن تھا۔ وہ پالا سنگھ کو ایک نہایت دیانت دار اور وفادار ملازم سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا تن من دھن اس کے ایک اشارے پر قربان کر سکتا ہے لیکن اس رات پالا سنگھ ایک ایسا کام کر گیا جو کسی طرح بھی اس کی "ریپوٹیشن" کے مطابق نہیں تھا۔ یہ وہ غلطی تھی جو روزِ آفرینش سے ابن آدم کے نصیب میں لکھی گئی ہے۔ جو ہر روز ہزارہا انسانوں سے ہزارہا صورتوں میں سرزد ہوتی ہے اور شاید حشر تک ہوتی رہے۔ تاہم پالا سنگھ کے حوالے سے یہ غلطی اس لیے زیادہ تعجب خیز تھی کہ وہ ایک ایسا بدصورت مرد تھا جس کی بانہوں میں کسی عورت کا سمانا تو دور کی بات ہے کوئی آدم زادی اس کے پاس سے بھی نہیں گزرتی تھی لیکن ایک آدم زادی اس کی بانہوں میں سمائی تھی اور آدم زادی بھی ایسی جو سراپا حسن تھی ... وہ ارجمند بانو تھی۔ تاریک اور سنسان شب کے اندھیرے میں اس عورت نے اپنے پہرے دار سے ایک عجیب و غریب سودا کیا تھا۔ اس نے اپنا انتہائی حسین جسم، انتہائی بدصورت پالا سنگھ کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے بدلے میں اپنے لیے

رہائی حاصل کرنی تھی۔ رہائی جو اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال بنی ہوئی تھی۔ درحقیقت اس سودے میں دونوں فریقوں نے کچھ کھو کر کچھ پایا تھا۔ ارجمند نے اپنے دل پر ستم کے پہاڑ توڑے تھے اور خود کو ایک انتہائی کریہہ لمس کے حوالے کر کے اس چار دیواری سے آزادی حاصل کی تھی، دوسری طرف پالا سنگھ نے اپنی ساری نیک نامیاں اور وفاداریاں داؤ پر لگا کر ایک شاداب جسم سے اپنی ازلی پیاس بجھائی تھی۔

معلوم نہیں یہ سودا کب ہوا اور کیسے ہوا لیکن یہ ہو چکا تھا اور اس کے ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ علی الصباح ایک ملازم کی اطلاع پر جب ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ارجمند کو رکھا گیا تھا تو کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا پایا۔ ارجمند کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ آہنی دروازہ بھی کھلا تھا جس کی چابی ہر وقت پالا سنگھ کے پاس رہتی تھی۔ اس واقعے کے بعد پالا سنگھ کو بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن وہ بھاگا نہیں تھا۔ ہم نے اسے فیکٹری کے پچھواڑے کاٹھ کباڑ کے درمیان ایک چارپائی پر مدہوش پڑے پایا۔ اس نے بہت زیادہ شراب پی رکھی تھی۔ جب اسے ہوش میں لا کر جھنجوڑا گیا تو وہ نشے میں بڑبڑانے لگا۔ "میں گنہگار ہوں بابو جی، میں تمہارا اپرادھی ہوں۔ مجھے گولی مار دو یا کسی بھٹی میں پھنکوا دو۔ میں نے تم سے دغا کی ہے بابو جی۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ وہ خوبصورت بلا مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ میں اس سے اپنی جان نہیں چھڑا سکا۔ میں کتا ہوں، کتے سے بھی بدتر ہوں۔ میرا سر اپنے پاؤں سے کچل کر مجھ پر رحم کر دو بابو جی۔"

بابو لیاقت سچ مچ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ پالا سنگھ پر پل پڑا۔ پالا سنگھ کے چہرے سے لپٹا ہوا مفلر کھل گیا۔ اس کا بے حد کریہہ چہرہ صبح کے اُجالے میں عیاں ہو گیا۔

بابو لیاقت نے پہلے اسے بے دریغ ٹھوکریں رسید کیں پھر اٹھا اٹھا کر دیواروں سے مارنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ میں نے ان دونوں کے درمیان آ کر بمشکل پالا سنگھ کی جان بچائی۔ پالا سنگھ چیخ رہا تھا "مجھے مار ڈالو بابو جی! تم نہ مارو گے تو میں اپنے ہاتھوں سے خود کو گولی مار لوں گا۔"

دوسری طرف بابو لیاقت چلا رہا تھا۔ "ہاں ہاں ماروں گا تجھے اور کتے کی موت ماروں گا۔ تیری ٹانگیں چیر کر گاندھی چوک میں پھینکوں گا اور لوگوں کو بتاؤں گا کہ یہ وہ وفادار نوکر ہے جس نے ایک عورت کی خاطر اپنے مالک کے منہ پر تھوکا ہے۔"

میں بابو لیاقت کو بمشکل کھینچتا ہوا آفس کی جانب لے گیا۔ اس کے ملازم مدہوش پالا سنگھ کو گھسیٹ گھسیٹ کر گودام میں لے گئے۔

آفس میں پہنچ کر بابو لیاقت سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ انسان کیا ہے؟ ایک گورکھ دھندا ہے۔ اس کے اندرون جانے کیسے کیسے طوفان پلتے ہیں۔ خوبصورت چہروں کے پیچھے بھیانک چہرے ہوتے ہیں اور بھیانک چہروں کے پیچھے بھی بھیانک چہرے ہوتے ہیں۔ ایک ایسی کتاب ہے انسان بھی، اسے پڑھتے ہوئے ہر لحظہ ایک نیا انکشاف سامنے آتا ہے۔ مجھے وہ پیر صاحب یاد آ گئے جن سے جھنگ کے گرد و نواح میں ملک صاحب کے گودام میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں سلیمانی سُرمہ لگا کر بیٹھتے تھے اور دعویٰ کرتے تھے کہ بہت دور تک دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف سرحدی گاؤں کا گونگا سنگھ تھا۔ وہ لوگوں کی نظر میں ایک بے کار، نکما، بازاری اور بزدل شخص تھا لیکن اس کے اندر ایک ایسی بجلی چمکتی تھی جو ہر آنکھ سے اوجھل تھی۔ اچانک بابو لیاقت کی آواز نے مجھے اپنے خیال سے چونکا دیا۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑا ہو گیا اور اپنے لرزاں ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر بولا۔ "میرا خیال ہے، اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ عورت ہم سب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو گی۔"

"اس بارے میں دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ اب کہاں جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے پاس ایک دو ٹھکانے ہیں یہاں۔"

میں نے کہا۔ "بابو لیاقت، اگر ہمیں اس فیکٹری سے نکلنے کا خطرہ مول لینا ہی ہے تو پھر کیوں نہ ابھی ٹرک کی طرف نکل جائیں۔"

بابو لیاقت کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑتا محسوس ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بابو لیاقت ایک دلیر اور بہادر شخص ہونے کے باوجود ہنگامہ آرائی سے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ سیاسی آدمی تھا اور ایسے لوگ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے لیاقت صاحب کہ میری وجہ سے آپ بھی اس چکر میں پھنس گئے ہیں۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ "چکر تو زندگی کے ساتھ ہی ہے جہانی صاحب۔ مجھے لڑکی کے بھاگنے کا اتنا افسوس نہیں جتنا اس بدکار کی غداری کا ہے۔" بابو لیاقت کا چہرہ غم و اندوہ میں

ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "ایک بات سامنے کی ہے لیاقت صاحب۔ شہر اس وقت جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ افراہیم اور ارجمند کے آدمی تو یقینی طور پر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نجانے کون کون گھات لگائے بیٹھا ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ صرف میری تلاش میں تھے' اب ارجمند بانو کے فرار ہونے کے بعد آپ بھی مطلوبہ فرد بن گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں خود کو ایک ساتھ خطرے میں نہ ڈالیں۔ اگر آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں تو لوڈر کی چابی مجھے دے دیجئے۔ میں اپنے ساتھ شکور کو لے جاتا ہوں یا کوئی دوسرا آدمی جسے آپ مناسب سمجھیں' میرے ساتھ بھیج دیں۔ آپ نے جو ٹھکانا ذہن میں سوچ رکھا ہے' ہمیں بتا دیں' ہم رات کو صندوق لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "ٹھکانا شہر میں نہیں گاؤں میں ہے۔ بالکل سرحد کے پاس اور جب تک میں آپ کے ساتھ نہ ہوں گا' آپ وہاں تک نہ پہنچ پائیں گے۔" وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی' کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے' آپ شکور کے ساتھ لوڈر پر روانہ ہوں۔ میں شکور کو سمجھا دیتا ہوں' وہ چونگی کے پاس کچھ دیر کے لیے رک جائے گا' میں وہیں پر آپ لوگوں سے آملوں گا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے' جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

میں نے کپڑے بدل لیے تھے۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ ٹوپی کے اوپر سے مفلر لپیٹ کر میں نے اپنا چہرہ کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ ماؤزر کی پندرہ بیس گولیاں مجھے اور مل گئی تھیں۔ خنجر شروع سے میری پنڈلی کے ساتھ تھا۔ اب میں پوری طرح مسلح تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اور شکور مزدا لوڈر پر سوار فیکٹری کے مین گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ شکور ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جبکہ میں لوڈر کے عقبی حصے میں چھپ چھپا کر بیٹھا تھا۔ لوڈر کی رنگ دار شیشے والی کھڑکی میں سے میں نے نئے دن کا سورج طلوع ہوتے دیکھا۔ وہ سورج جو فرید کوٹ پر طلوع ہو رہا تھا اور ان تمام خطرناک لوگوں پر بھی جو فرید کوٹ کے گلی کوچوں میں پھیلے تھے اور ایک ٹرک کی تلاش میں ہلکان ہو رہے تھے۔

فیکٹری سے نکلتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی محفوظ مورچے سے نکل کر کھلے میدان میں آ گیا ہوں۔ ابھی کسی رائفل یا پستول کی نال سے کوئی گولی فائر ہوگی اور میری طرف روانہ ہو جائے گی۔ میرے رگ و پے میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ یہ درد میرا پرانا ساتھی تھا۔ جب ہتھیار تولے جاتے تھے' جب موت کے سائے پھیلتے تھے' جب فضاؤں میں خطرہ سنسناتا تھا تو میرے بدن میں یہ درد آپوں آپ جاگ اٹھتا تھا۔ یہ وہی درد تھا جو اپنے والدین کی موت پر مجھے تحفے میں ملا تھا اور جس نے مجھے شاہجہاں سے جانی استاد بنایا تھا۔

لوڈر کے اندر سامان تھا۔ یہ سامان گتے کے چوکور ڈبوں کی شکل میں تھا۔ ان ڈبوں میں خوب صورت آرائشی ٹائلیں "پیک" تھیں۔ میں ڈبوں کے انبار کے اندر ہی چھپ چھپا کر بیٹھا ہوا تھا۔ تازہ اخبار میرے سامنے تھا۔ ایک خبر پر آکر میری نظر ٹھہر گئی۔ یہ خبر اس تصادم کے بارے میں تھی جو چھ روز پہلے بابو لیاقت کی بیٹھک میں افراہیم اور ارجمند کے غنڈوں کے درمیان ہوا تھا۔ اخباری خبر کے مطابق اس تصادم میں تین افراد مارے گئے اور یہ تین اموات اس سنگین ہنگامے کا باعث بنی تھیں جس کے نتیجے میں فرید کوٹ اور گرد و نواح میں ہندو سکھ فساد شروع ہوا تھا اور کئی مزید جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ چونکہ اس ہنگامے کا آغاز بابو لیاقت کی بیٹھک سے ہوا تھا لہٰذا قتل ہونے والے اے ایس آئی بلراج کے کچھ ساتھی بابو لیاقت کو بھی مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ تاہم اس جھگڑے کے اصل فریق ہندو اور سکھ ہی تھے۔

لوڈر ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتا آگے بڑھ رہا تھا اور میری نظریں اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی ہم فیکٹری سے بمشکل تین چار فرلانگ ہی دور گئے ہوں گے کہ لوڈر کی رفتار آہستہ ہوئی اور وہ سڑک سے اتر کر رک گیا۔ میں نے لوڈر کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اس کھڑکی میں رنگ دار شیشہ لگا تھا اور اس طرح "جڑا" تھا کہ کھڑکی کھولی نہیں جا سکتی تھی۔ معلوم نہیں ایسا شیشہ لگائے جانے میں کیا حکمت تھی۔ رنگ دار شیشے کی دوسری جانب مجھے پولیس کے اہل کار نظر آئے اور تیزی سے دھڑکتا ہوا دل کچھ اور تیز ہو گیا۔ ایک موٹے تازے سکھ سب انسپکٹر کے ساتھ دو کانسٹیبل یا ہیڈ کانسٹیبل کھڑے تھے۔ سکھ سب انسپکٹر شکور کو لوڈر سے نیچے اتار چکا تھا اور اس سے سوال و جواب کر رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہا ہے یہ لوڈر؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"فیکٹری سے" شکور نے جواب دیا۔

"کس فیکٹری سے؟"

"سرامکس فیکٹری سے۔"

"سیدھی طرح جواب دو" سب انسپکٹر غرایا۔

"سرامکس کی ورکشاپ تو ادھر ایک ہی ہے۔ بابو لیاقت کی!"

"ہاں۔۔۔ بابو لیاقت کی ورکشاپ سے آ رہا ہوں۔" شکور نے گویا اعتراف کیا۔

"دروازہ کھولو۔" سب انسپکٹر نے نادر شاہی حکم جاری کیا۔

میں نے ماؤزر ہاتھ میں لے کر سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ میرے لئے انڈین پولیس کے ہتھے چڑھنا بھی اتنا ہی نقصان دہ تھا جتنا افراہیم یا شنکر کے نرغے میں آنا۔ اس بات کا خطرہ تو شروع سے موجود تھا کہ فیکٹری سے نکل کر میں ہنگاموں کی زد میں آ جاؤں گا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ سر منڈواتے ہی اولے پڑیں گے اور ہم فیکٹری سے چار فرلانگ بھی دور نہ جا پائیں گے کہ ناکے پر روک لئے جائیں گے۔

لوڈر کے عقب میں واقع اکلوتا دروازہ دھڑ سے کھلا اور میں نے سکھ سب انسپکٹر اور اس کے عملے کی آوازیں اپنے بالکل قریب سنیں۔ سب انسپکٹر نے شکور کو مخاطب کیا اور گتے کے ڈبوں کو ایک غلیظ گالی دے کر بولا "کیا ہے ان۔۔۔ کے اندر؟"

"غسل خانے کی ٹائلیں ہیں جی۔۔۔ مارکیٹ پہنچانی ہیں۔" شکور نے مختصر اور مناسب ترین جواب دیا۔

سب انسپکٹر نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس کی غصیلی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ڈرائیور شکور سے مخاطب تھا۔ "کچھ خبر بھی ہے تجھے کہ کدھر چلا جا رہا ہے؟ آگے جلوس نکلا ہوا ہے۔ ہنگامہ ہو رہا ہے۔ گاڑی کو آگ لگوائے گا اور خود بھی مار کھائے گا۔ اور اگر فسادیوں کو پتا چل گیا کہ یہ لوڈر بابو لیاقت کی فیکٹری سے آیا ہے تو وہ تجھے بھی لوڈر کے ساتھ ہی جلا دیں گے۔ چل واپس موڑ اس ابے کو۔ جلدی کر۔ بس ایک سیکنڈ لگا۔ جلوس اس سامنے والے موڑ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ دیکھ ٹائروں کا دھواں۔"

شکور نے بھی دیدہ دلیری سے کام لینا چاہا لیکن سب انسپکٹر نے اس پر گالیوں کی بارش کر دی اور دھکیل دھکال کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا۔ "چل اسٹارٹ کر اپنی ماں کے خصم کو۔" پھر چلا کر ایک حوالدار سے مخاطب ہوا "انت سنگھ اس کو جیپ کے آگے لگا کر چیمن صاحب کی کوٹھی میں لے چلو۔ جب تک جلوس آگے نہ نکل جائے اس کو باہر نہ نکالنا۔"

چند لمحے بعد میں نے لوڈر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کھٹارا جیپ کا انجن بھی جاگ اٹھا۔ میں نے ذرا کان لگا کر سنا تو کچھ فاصلے پر سے شور و غل ابھرتا محسوس ہوا جیسے ایک بڑا ہجوم نعرہ زنی کر رہا ہو۔ سب انسپکٹر کی اطلاع درست تھی۔ کہیں پاس ہی مشتعل ہندوؤں کا ایک بڑا گروپ ہنگامہ آرائی میں مصروف تھا۔ لوڈر نے

خون آشام

مصنف: ایم اے راحت

ایک سنگ صفت، شعلہ ساماں نوجوان کی سرگزشت

ایک سالخوردہ بوڑھا جو صدیوں سے زندہ تھا۔ وہ اُس بہادر نوجوان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا

سسپنس، خوف سے بھرپور ایک عجیب و غریب داستان

قیمت -/۵۰ ڈاک خرچ -/۲۰

— ناشر —
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اُردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

— اسٹاکسٹ —
علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۲

ریورس ہو کر اپنا رُخ تبدیل کیا اور پھر پولیس کی جیپ کے آگے آگے بغلی سڑک پر مڑ گیا۔ بند لوڈر کے اندر بھی مجھے جلے ہوئے ربر کی بُو آ رہی تھی۔ یہ جلتے ہوئے ٹائروں کی بُو تھی۔ ٹائر جو شہر شہر اور قصبہ قصبہ زندگی کو رواں رکھتے ہیں لیکن جب یہی ٹائر کسی چوراہے پر گرم جذبات سے جل اٹھتے ہیں تو تصویر کا بالکل ایک دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔

لوڈر نے درمیانی رفتار سے دو ڈھائی فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور پھر لب سڑک ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھی کے نیچے ایک وسیع تہ خانے کو پارکنگ لاٹ کی شکل دی گئی تھی۔ پارکنگ لاٹ میں پہنچتے ہی لوڈر کے اندر تیرگی چھا گئی۔ میں نے رنگ دار شیشے میں سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا یہاں دو کاریں اور ایک ٹیکسی موجود تھی۔ اچانک پارکنگ لاٹ کے بڑے بڑے شٹر گیٹ زور دار آوازوں کے ساتھ بند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی لاٹ میں گھٹا ٹوپ تاریکی کا راج ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ پولیس کا کام صرف اتنا تھا کہ لوڈر کا رخ اس راستے سے موڑ دیتی۔ جس پر جلوس آ رہا تھا۔ لوڈر کو جیپ کے آگے لگا کر اس کوٹھی میں لانا اور پھر تہ خانے میں بند کر دینا خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

بیس تیس سیکنڈ بعد میرے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ پارکنگ لاٹ کی بتیاں روشن ہو گئیں اور کھڑکی میں سے گرد و پیش کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ دائیں جانب ایک دروازے سے دو بنے گنے سردار صاحبان برآمد ہوئے۔ "نہیں صاحبان" کہنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ ڈیل ڈول، حلیے اور صورتوں سے وہ گھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اس سے پہلے وہ مجھے بابو لیاقت کی بیٹھک میں نظر آئے تھے۔ انہیں افراہیم لے کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک بدمعاش کا نام ڈنگا سنگھ تھا اور بابو لیاقت نے بتایا تھا کہ وہ بہت ہی خطرناک شخص ہے۔ میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ فیکٹری سے نکلتے ہی میں ایک بار پھر افراہیم کے چنگل میں آگیا تھا۔ جو سب انسپکٹر ہمیں اس کوٹھی میں لے کر آیا تھا، اب وہ بے تکلفی کے ساتھ ایک تحیم شحیم سکھ سے باتیں کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہی ڈنگا سنگھ تھا۔ ڈنگا سنگھ دس بارہ سال پہلے تک ایک خوب رو نوجوان رہا ہو گا لیکن اب اس کے جسم پر چربی آ چکی تھی اور کثرتِ مے نوشی سے چہرہ بھی کچھ سوجا سوجا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایک ہلال نما نشان بھی تھا۔ یہ کرپان یا کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ سب انسپکٹر نے شکور کو دھکیل کر ڈنگا سنگھ کے سامنے کیا۔ ڈنگا سنگھ نے شکور کو سرتاپا گھورا اور پوچھ گچھ کرنے لگا۔ اس کا پہلا سوال ہی میرے بارے میں تھا۔ کہنے لگا "ہمیں شبہ ہے کہ وہ بندہ جو اسٹار ہوٹل کی چھت پر ہنگامہ کر کے بھاگا تھا، بابو لیاقت کے پاس ہے۔"

شکور نے عاجزی سے کہا "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا سردار جی! کافی بڑی فیکٹری ہے۔ اگر کسی کمرے میں کوئی بندہ چھپایا گیا ہو تو کیا پتا چلتا ہے۔"

ڈنگا سنگھ نے شکور کے منہ پر زنّاٹے دار تھپڑ مارا "جس اسکول میں تیری بے بے نے تجھے داخل کرا دیا تھا اس اسکول کی ہم نے اینٹیں لگائی ہیں۔ ابھی الٹا لٹکا کر ساری ہوشیاری ناک کے راستے نکال دوں گا۔۔۔ تُو صرف ڈرائیور ہی نہیں ہے، بابو لیاقت کا خاص بندہ بھی ہے۔ اندر باہر کی ساری باتوں کا تجھے پتا ہے۔"

شکور نے کہا "میں سچ کہتا ہوں سردار جی میں نے فیکٹری میں کسی نئے بندے کو نہیں دیکھا ہے۔ بس دو تین گن مین نئے آئے ہیں اور میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

شکور کافی اعتماد سے جواب دے رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ استاد جانی کے ہوتے ہوئے اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کا ساتھ میرے لئے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ پر ایک بھاری ذمے داری عائد ہو گئی ہے اور میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو "اپنے چاہنے والے" کی توقع پر پورا اتروں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ماحول میں کام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے جہاں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ سب نفرت کرنے والے ہوں۔ کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ ایسے ماحول میں میرے اندر کی وحشت پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے اور میں خود کو ایک بدلا ہوا شخص پاتا ہوں۔

شکورے کو ماں بہن کی چند منتخب گالیاں دینے کے بعد تحیم شحیم ڈنگا سنگھ لوڈر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ لوڈر کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ یہ تلاشی صرف خانہ پُری کے لیے لینا چاہتا ہے، ورنہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مطلوبہ شخص یہاں ہو سکتا ہے۔ اس کی یہی بے پروائی اور بے فکری اس کے لیے مصیبت کا باعث بنی۔ جونہی اس نے ٹائلوں سے بھرے ہوئے چند ڈبے ایک طرف ہٹا کر خلا میں جھانکا، میں نے پھرتی سے اس کی خود رو داڑھی میں ہاتھ ڈالا اور ماؤزر کی سرد نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے ٹانگ چلا کر ٹائلوں سے بھرے ہوئے کچھ اور ڈبے فرش پر گرائے اور ڈنگا سنگھ کو نشانے پر رکھ کر لوڈر سے باہر آ گیا۔ "خبردار۔" میری آواز پارکنگ لاٹ میں گونجی۔ "کسی نے ہتھیار نکالا تو اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" پارکنگ لاٹ میں ایک دم سکوت چھا گیا۔ سب انسپکٹر اور اس کے دو کانسٹیبل سمیت کم از کم چھ افراد لاٹ میں موجود تھے۔ وہ سب حیرت ناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں ڈنگا سنگھ کو کھینچتا ہوا دیوار کے قریب لے گیا۔

"کون ہو تم؟" سب انسپکٹر نے گرج کر پوچھا۔

"جس کی تلاش میں تم کتوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہو۔"

ڈنگا سنگھ کی کھلی ہوئی آنکھیں کچھ اور کھل گئیں۔ اس نے محویت کے عالم میں میرا چہرہ دیکھا اور بولا "تم۔۔۔ تم استاد جانی ہو؟"

"کون استاد جانی؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔

ڈنگا سنگھ سوالیہ نظروں سے سب انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ ان سب کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ ایک دم ہی وہ مجھ سے مرعوب نظر آنے لگے تھے۔ ڈنگا سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا "دیکھو تجن جی! اگر تم استاد جانی ہو تو یہ ہتھیار تاننے کی تمہیں کوئی لوڑ نہیں۔ تم ہمیں دشمن مت سمجھو۔"

"بالکل! مجھے تو تم سب کو اپنا سسرالی رشتے دار سمجھنا چاہئے۔" میں نے کہا "خبردار، اگر کوئی چالاکی دکھائی تو میں لحاظ نہیں کروں گا۔"

سب انسپکٹر کا ہاتھ اپنے سرکاری ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری دھمکی نے اسے ایک دم ٹھٹکا دیا۔ میں ڈنگا سنگھ کو کھینچتا ہوا کچھ اور پیچھے لے گیا۔

ڈنگا سنگھ نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور سب انسپکٹر کو آواز دے کر بولا "ستنام! جانی صاحب کو یقین نہیں آ رہا۔ تم اپنے ہتھیار نیچے رکھ دو اور گاڑی سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

سب انسپکٹر سمیت تمام افراد نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرے سامنے چکنے فرش پر ایک ریوالور، ایک پسٹل، دو چاقو اور ایک کاربین نظر آنے لگی۔ ڈنگا سنگھ نے اپنی ڈب میں سے بھی ایک پسٹل نکال کر اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر فرش پر پھینک دیا۔ میں نے شکورے سے کہا کہ وہ یہ سارا سامان اکٹھا کر کے لوڈر میں رکھ دے۔ شکورے نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ڈنگا سنگھ دوستانہ لہجے میں بولا "مجھے پورا وشواس ہے کہ تم استاد جانی ہو۔ ہمیں تمہاری تلاش ضرور تھی لیکن کسی بُری نیت سے نہیں۔ تم یہ ماؤزر جیب میں رکھ کر بڑے آرام سے یہاں بیٹھ سکتے ہو۔ پہلے ہم چائے کے ساتھ گرما گرم پکوڑے کھاتے ہیں، پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

ڈنگا سنگھ کافی پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آئی لیکن اتنی جلدی اس پر اعتبار کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے کہا "ان لوگوں کو یہاں سے باہر بھیج دو پھر میں ماؤزر بھی جیب میں رکھ لوں گا۔"

وہ بولا "ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں بادشاہو! اندر سے بوا بند کر لیتے ہیں۔ کوئی فکر فاقے والی بات نہیں ہے۔"

میری انگلی بدستور ماؤزر کے ٹریگر پر تھی۔ میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا "چلو، کہاں چلنا ہے؟ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں گولی چلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے جانی صاحب!" وہ فراخ دلی سے بولا۔

میں نے ڈنگا سنگھ کی خود رو داڑھی چھوڑ دی اور اسے نشانے پر لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ شکور میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بغلی دروازے سے نکل کر ہم ایک چھوٹے سے ڈیوڑھی نما کمرے میں آئے اور وہاں سے ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ میں اور شکور کمرے میں داخل ہو گئے تو ڈنگا سنگھ نے مجھے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اندر سے کنڈی لگا دی جائے۔

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ دروازہ اندر سے بند کر دو۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہم صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ڈنگا سنگھ کے دوستانہ رویے میں بظاہر کوئی چال نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ماؤزر ایک جانب صوفے پر رکھتے ہوئے کہا "بولو ڈنگا سنگھ! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ کہنے لگا "بڑی ٹھنڈ ہے، اگر اجازت ہو تو چائے منگوا لوں۔"

میں نے کہا "چائے پھر آتی رہے گی، تم وہ بات کرو جو کرنے والی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "جانی صاحب! اچھے بُرے لوگوں سے تمہارا بہت واسطہ رہا ہے۔ تم جانتے ہو کہ بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ میں تم سے جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل حق سچ ہے اور اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ یہ بات سولہ آنے صحیح ہے کہ چار پانچ روز پہلے تک میں اور میرے ساتھی تمہاری تلاش میں تھے۔ ہم خوشاب کے اس عینکو "عینک والے" افراہیم کے لئے کام کر رہے تھے۔ عینکو نے ہمارے ساتھ پچیس ہزار میں معاملہ

کیا تھا۔ ہمیں ایک پاکستانی ٹرک اور اس میں موجود تین بندوں کو ڈھونڈنا تھا۔ یہ مہینے کا کام تھا۔ اس کام میں ہمیں دو ہفتے لگتے۔ تین ہفتے لگتے یا ایک دن میں کام ہو جاتا۔ ہمیں پچیس ہزار روپے ملنا تھے لیکن پھر نہ جانے کہاں سے ٹنگر شکرا صاحب اس معاملے میں کود پڑے۔ عینکو نے ہمیں بتایا کہ اس کا خاص آدمی آگیا ہے اور اب اسے ہماری ضرورت نہیں رہی۔ یہ بات تم بھی مانو گے کہ یہ اصول کی بات نہیں تھی۔ ہم مانتے ہیں کہ ٹنگر شکرا بہت بڑا بدمعاش ہے۔ ہمارا اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کے آنے پر عینکو نے آنکھیں پھیری ہیں، ہمارا دل بالکل کھٹا ہو گیا ہے۔ کل جب مجھ کو پتا چلا کہ اسٹار ہوٹل کی چھت پر ہنگامہ کرنے والا جھانی استاد تھا اور عینکو وغیرہ اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں تو میں نے اپنے دل میں سوگند کھائی کہ اگر موقع ملا تو ٹنگر شکرا نا نہیں، استاد جھانی کا ساتھ دوں گا۔"

اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی اور آگے کو جھکتے ہوئے بولا "یہ جو پولیس والے تم کو پکڑ کرلائے ہیں نا، اپنے ہی بندے ہیں۔ بلکہ ایک تو میرا سگا بھتیجا ہے۔ میں نے ان کو کہہ رکھا تھا کہ آنے والے پر اچھی طرح نظر رکھیں۔ جہاں کوئی مشکوک بندہ یا گاڑی شاڑی نظر آئے پکڑ لیں۔ تمہارے لوڈر میں ٹائیلوں والے ڈبے دیکھ کر ان لوگوں کو شک ہو گیا کہ یہ لوڈر بابو لیاقت کے کارخانے سے آیا ہے۔ یہ لوگ لوڈر کو یہاں لے آئے۔ بہرحال یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ لوڈر کے اندر سے تم یہ قلم خود نکل آؤ گے۔"

اتنے میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ ڈنگا سنگھ نے پھر اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ماؤزر ہاتھ میں لے لیا اور اسے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی کی شکل نظر آئی۔ وہ شکل و صورت سے ہی "اس" بازار کی لگتی تھی۔ بہ مشکل بیس سال عمر رہی ہوگی لیکن پیشے کی دھوپ میں جھلس کر وہ پچیس چھبیس کی دکھائی دینے لگی تھی۔ بہرطور وہ جسمانی کشش سے پوری طرح محروم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ ٹرے میں شراب، سوڈا اور گلاس تھے۔ ڈنگا سنگھ نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔ وہ ڈنگا سنگھ کے کندھے کے اوپر سے میری طرف دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں عجیب سا اشتیاق تھا۔ ڈنگا سنگھ نے کہا "کیا بات ہے! ایسے کیا تاڑتی ہے۔ دیکھنا ہے تو اندر آ کے دیکھ لے۔"

بھرے بھرے جسم کی ایک اونچی لمبی لڑکی مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ "ست سری اکال" اس نے مخصوص پنجابی لہجے میں کہا۔

میں نے سر کے اشارے سے جواب دے کر اسے سر تاپا گھورا۔ وہ گڑبڑا گئی اور مدد طلب نظروں سے ڈنگا سنگھ کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈنگا سنگھ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا "اس کا نام ہنساں ہے۔ اندرون شہر کی رہنے والی ہے۔ واہگورو نے اس کے گلے میں بڑی مٹھاس بھری ہے۔ جب ٹھمکا لگا کر فلمی گانے کا بول اٹھاتی ہے تو یار لوگ کلیجا پکڑ لیتے ہیں۔ اصل میں میرا یار مت سنگھ پرسوں جیل سے رہا ہوا ہے۔ اس کی خوشی منانے کے لئے ہم نے اسے بلایا تھا۔ دو اور لڑکیاں بھی ہیں اس کے ساتھ۔"

"ہاں جی۔۔۔ جناب! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں براہ راست ہنساں سے پوچھا۔

وہ بولی "بس جی، آپ کو دیکھنے چلی آئی ہوں۔ آپ کا نام سنا ہے۔ مت سنگھ نے بتایا کہ ابھی جو دو بندے آئے ہیں ان میں ایک جھانی استاد ہے، میں نے سوچا ایک نظر دیکھ لوں آپ کو۔"

میرا دل سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ میں خود کو جتنا گمنام رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اتنی ہی مشہوری ہو رہی تھی اور یہ مشہوری بھی نہیں تھی، بدنامی تھی۔ مشہوری تو تب ہوتی جب میں شریف اور باشعور شہریوں کے درمیان ہوتا اور وہ مجھے پہچان کر اپنائیت کا اظہار کرتے۔ مجھے پہچاننے اور شناسائی کا اظہار کرنے والے تو معاشرے کے بگڑے تگڑے بدنام لوگ تھے۔ اپنی مجبوریوں کے تحت میں ایک عرصہ ان لوگوں کے درمیان انہی جیسا بن کر رہا تھا۔ میں نے جُوا کھیلا تھا، شراب پی تھی، مار دھاڑ کی تھی۔ اب وہ ماضی میرے گلے کا ہار بن رہا تھا۔ شکور جیسے آوارہ گردوں اور ہنساں جیسی طوائفوں نے بھی مجھے پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ تصور میں یہ آواز گونجنے لگی تھی۔

یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

میں نے ہنساں کو ذرا دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں ہی استاد جھانی ہوں، ممکن ہے جھانی صاحب یہ ہوں جو سامنے بیٹھے ہیں۔" میں نے شکور کی جانب اشارہ کیا تھا۔

اس نے ایک نظر شکور کی طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ہنستے ہوئے اس کے دنداسا رنگے مسوڑے نمایاں ہو گئے۔ اپنی ہنسی سے اس نے زبان کا کام لیا تھا اور پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔

ڈنگا سنگھ بولا "اب دانت کیا نکال رہی ہے حرام زادی۔۔۔ چل پھٹ یہاں سے۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے دے۔"

ہنساں نے ایک بے باک نظر مجھ پر ڈالی اور لہرا کر باہر نکل گئی۔ یہ عام بات ہے کہ پیشہ ور عورتیں تند مزاج اور غیر جذباتی ہوتی ہیں لیکن یہ بات بھی دیکھی جاتی ہے کہ ان کا یہ رویہ عام تماش بینوں اور گاہکوں سے ہوتا ہے۔ اگر واسطہ تند و تیز اور نڈر شخص سے ہو اور طوائف یہ بات جانتی ہو کہ "بری عورت" ہونے کے باوجود کسی بھی حوالے سے اس پر حاوی نہیں ہو سکتی تو اس کی فطری نسوانیت جاگ اٹھتی ہے اور کبھی کبھی وہ وفا جو عورت نظر آنے لگتی ہے۔ ہنساں منہ پھٹ اور بازاری عورت ہونے کے باوجود میرے سامنے شرمائی لجائی نظر آئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جھانی استاد کا نام اس کے لئے مرعوب کن تھا۔ پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے دوران میرے اور ڈنگا سنگھ کے درمیان ایک بے نام سے اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے آدھ پون گھنٹے بعد یہ اعتماد مزید مستحکم ہو گیا۔ میں نے اپنا ماؤزر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ڈنگا سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو بھی ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ ان میں موٹا چکلا مت سنگھ صورت سے ہی ایک خطرناک شخص نظر آتا تھا۔ ڈنگا سنگھ نے اس کا تعارف کراتے ہوئے فخر سے بتایا کہ یہ شخص تین قتل کر چکا ہے۔ تینوں دفعہ جیل گیا ہے لیکن ہر بار دو ڈھائی سال کاٹ کر باہر آگیا ہے۔ مت سنگھ کے علاوہ ڈنگا سنگھ کے دو ساتھیوں کا تعلق مقامی بازار حسن سے تھا۔ اچھو نامی ایک بدمعاش امرتسر کا رہنے والا تھا۔ دو سال پہلے تک یہ شخص کبڈی کا زبردست کھلاڑی تھا لیکن پھر بدمعاشی میں پڑ گیا اور اب وہ دن رات "قانون" کے ساتھ "کبڈی کبڈی" کرتا تھا۔ اس طرح ایک سکھ لڑکا ہوشیار پور کا تھا۔ وہ وہاں سے ایک کھتری کو اغوا کر کے لایا ہوا تھا اور کئی ایک مقدموں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ زبردست نشانے باز ہے۔

یہ سب لوگ مجھے "استاد" کہہ رہے تھے۔ ان کی زبانوں سے یہ لفظ سن کر میرے اندر کا شاہ جہاں بی اے ایل ایل بی سینے میں سمٹا جاتا تھا لیکن میں ان کی زبانیں نہیں پکڑ سکتا تھا اور پکڑتا بھی کیسے؟ میں جھانی استاد تھا۔ پولیس کی فائلیں، اخباروں کی سرخیاں اور انڈیا کی بہت لمبی سی گواہ تھیں کہ میں جھانی استاد ہوں۔ ایک دردناک کہانی کا نتیجہ سب کے سامنے تھا لیکن کہانی اوجھل تھی۔ فرید کوٹ کے وہ بدمعاش جو ہاتھ باندھے میرے سامنے بیٹھے تھے، ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اگر میں اپنے طور پر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو کئی شرائط عائد کرتے اور گراں معاوضہ لیتے لیکن اس وقت وہ بارضا و رغبت میرے ساتھ ہر طرح کے تعاون کو تیار تھے۔ یہ بات اب ان میں سے کسی کے لئے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ میں ایک پاکستانی ٹرک میں بارڈر پار کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ وہ ٹرک میرے دو ساتھیوں سمیت کسی نامعلوم مقام پر کھڑا ہے اور بہت سے لوگ اس ٹرک تک پہنچنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اس ٹرک میں کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو یقیناً ہر ذہن میں موجود تھا لیکن ڈنگا سنگھ، مت سنگھ یا ان کے کسی ساتھی نے مجھ سے یہ سوال پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات جیسے طے شدہ تھی کہ اس ٹرک میں منشیات یا کسی دوسری بیش قیمت جنس کی صورت میں اسمگلنگ کا مال ہے۔ اس مال کی مالیت کیا ہوگی؟ یہ دوسرا سوال تھا۔ ظاہر ہے سوچنے والوں نے اس بارے میں بھی اندازے لگائے ہوں گے۔ پندرہ بیس لاکھ سے لے کر تین چار کروڑ تک کے ہندسے ان لوگوں کے ذہن میں ہو سکتے تھے لیکن اس سے زیادہ کی توقع کی جا سکتی تھی نہ کوئی سوچ سکتا تھا۔

میں نے ڈنگا سنگھ سے پوچھا "تم مجھ سے کس قسم کا تعاون کر سکتے ہو؟"

وہ بولا "جھانی صاحب! تم ہمیں اپنا ہتھیار سمجھ لو اور ہتھیار سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ وہ کیا کرے گا، بس استعمال کیا جاتا ہے اسے۔"

میں نے کہا "اور کئی موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں ہتھیار کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ بولا "ایسے موقعوں پر ہتھیار کو چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ ہتھیار تو ہتھیار ہوتا ہے۔ کسی بھی موقعے پر اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔۔۔ ویسے جھانی صاحب! یہ ایسا موقع بھی نہیں ہے کہ تم کو سرے سے ہتھیار کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لازمی بات ہے کہ تم واپس ٹرک تک پہنچنا چاہو گے اور اسے ایسی جگہ تک لے جانا چاہو گے جہاں وہ اوپرے غیرے لوگوں سے محفوظ ہو جائے۔ ٹنگر صاحب جیسے لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ بہت مشکل ہے۔"

مت سنگھ بولا "چھوٹا منہ بڑی بات ہے جھانی صاحب! لیکن میرے دماغ میں یہ بات آ رہی ہے کہ وہ ٹرک اب اس جگہ پر نہیں ہوگا جہاں آپ اسے چھوڑ کر آئے ہیں۔ دیکھیں جی۔۔۔ جس طرح اس کی تلاش ہو رہی ہے، وہ وہاں پر ہو ہی نہیں سکتا۔ یا تو وہ پکڑا جا چکا ہوگا یا پھر آپ کے ساتھی اسے

کہیں اور لے جا چکے ہیں۔"

مت سنگھ صورت سے اُجڈ نظر آنے کے باوجود کافی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ عین ممکن ہے اب ٹرک وہاں نہ ہو جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ بہرطور اس بات کا امکان بھی تیس فی صد سے زائد نہیں تھا۔ میں نے مت سنگھ کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "فرض کیا ٹرک وہاں سے نکل چکا ہے اور اسے تلاش کرنے کے لئے مجھے قابلِ اعتبار بندوں کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کتنے بندے مہیا کر سکتے ہو؟"

مت سنگھ نے کہا۔ "واہ گرو کرے آپ کو یہ سب کچھ نہ کرنا پڑے لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم آپ کی سوچ سے بڑھ کر آپ کی مدد کریں گے۔ اب اس سور کے تخم افراہیم سے ہماری کھلی لڑائی ہے۔"

ڈنگا سنگھ نے کہا۔ "جہانی صاحب! میں تو کہتا ہوں کہ یہ بھی واہ گرو کی کرپا ہی ہوئی ہے۔ ہمیں اس کتے کے لیے آپ کے خلاف کام نہیں کرنا پڑا۔"

مت سنگھ اپنی پیشانی پر سوچ کی لکیریں بچھا کر بولا۔ "جہانی صاحب! میرا خیال ہے سب سے پہلے تو آپ کو ایک بند گاڑی کی ضرورت ہے جس میں آپ ٹرک تک پہنچ سکیں لیکن جہاں تک میرا دماغ کام کرتا ہے اور میں اس شہر کو جانتا ہوں' اس کام کے لیے دن کا وقت ٹھیک نہیں ہے۔"

"مگر رات کو تو کرفیو ہو گا؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے 'آج اٹھا لیا جائے۔" مت سنگھ بولا۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ اٹھایا جائے۔" ڈنگا سنگھ نے کہا۔

میں نے مت سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مجھے رات کے وقت نکلنا چاہیے اور اس کے لیے بند گاڑی استعمال کرنی چاہیے۔ بند گاڑی میرے پاس موجود ہے اور ڈرائیور بھی ہے۔ اگر آج رات کرفیو نہ ہوا تو میں گیارہ بجے کے قریب یہاں سے نکل جاؤں گا۔ اس کے بعد دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ ٹرک مجھے مقررہ جگہ پر کھڑا مل جائے اور دوسری یہ کہ نہ ملے۔ پہلی صورت میں تو میں دوبارہ تمہیں تکلیف نہیں دوں گا لیکن دوسری صورت میں مجھے واپس یہاں آنا ہو گا۔ اس کے بعد ہم اپنا آئندہ پروگرام بنالیں گے۔"

مت سنگھ بولا۔ "جہانی صاحب! میں تھوڑی سی گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ پہلی صورت میں بھی آپ کو ہماری مدد کی ضرورت پڑے گی۔ آپ شہر کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ پورے فرید کوٹ میں شکاری پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر مشکوک شخص اور گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ خاص طور پر ٹرک یا ٹرک نما گاڑیوں کی تو کم بختی آئی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک آپ کا اس لوڈر پر نکلنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ اس کام کے لیے آپ کو کوئی چھوٹی گاڑی یا بند ویں وغیرہ استعمال کرنی ہو گی۔ جہاں تک لوڈر کا تعلق ہے وہ اس چھوٹی گاڑی کے پیچھے پیچھے جا سکتا ہے۔ میں' ڈنگا سنگھ یا ہم دونوں اسے چلا کر لے جا سکتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر آپ ہم پر بھروسا کر سکتے ہیں تو پھر کم از کم آٹھ دس مسلح بندے اپنے ساتھ لے جائیں۔ کسی بھی جگہ افراہیم یا شنکر صاحب کے بندوں سے آپ کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔"

مت سنگھ کی یہ بات قابلِ غور تھی کہ ٹرک یا ٹرک نما گاڑی بہت جلد مخالفین کی نظر میں آ سکتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ فیکٹری سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی لوڈر کو روک لیا گیا تھا۔

ان سارے مسائل پر ہمارے درمیان ڈیڑھ دو گھنٹے تک گفتگو ہوئی۔ ڈنگا سنگھ اور مت سنگھ کی باتوں سے خیراندیشی جھلکتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ رات کا انتظار کیا جائے۔ اس دوران ڈنگا سنگھ کسی ایسی معقول سواری کا انتظام کرے جس پر کم سے کم رسک لے کر شہر میں گھوما جا سکے۔ میں نے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ ڈنگا سنگھ کے ایک کارندے کے ہاتھ بابو لیاقت کو پیغام بھجوا دیا کہ میں شہر میں ایک محفوظ مقام پر ہوں اور میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں' میں آج یا کل کسی وقت از خود اس سے رابطہ کروں گا۔

سہ پہر تک ایک بار پھر ہمارا سارے کا سارا پروگرام دھرا رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ علی الصباح شہر میں نکلنے والے جلوس نے گاندھی اسکوائر میں پہنچ کر ایک بڑے ہجوم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہاں ایک مخالف ہجوم سے اس ہجوم کا تصادم ہو گیا۔ اس تصادم میں ایک شخص ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد شہر کے متاثرہ علاقوں میں ایک بار پھر کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا۔

○☆○

رات کے وقت بدمعاشوں کے اس ٹولے نے کوٹھی میں خوب موج میلہ کیا۔ یہ ایک طرح سے مت سنگھ کا "جشنِ رہائی" تھا۔ وافر مقدار میں پلاؤ زردہ اور قورمہ پکایا گیا

تھا۔ ساتھ میں ولایتی شراب کی بوتلیں تھیں جو "اچھو امرتسریا" ایک بڑی پیٹی میں بھر کر لایا تھا۔ کھانے پینے کے بعد ناچ گانے کی محفل برپا ہوئی۔ یہ کافی وسیع کوٹھی تھی۔ چاروں طرف کشادہ لان تھے۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں ہونے والا شور وغل اندر ہی رہ جاتا تھا۔ میں نے اس محفل میں شرکت نہیں کی تاہم مست قہقہے اور سُریلی آوازیں اس چھوٹے سے بیڈ روم تک پہنچتی رہیں جہاں میں بتی بجھائے لیٹا تھا۔ ڈنگا سنگھ اور اس کے ساتھی نشے میں ٹن ہو کر ایک دوسرے کو گندی گالیاں دے رہے تھے۔ للکارے مار رہے تھے اور کبھی کبھی شاید گتھم گتھا بھی ہو جاتے تھے۔ اظہارِ مسرت کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کہیں نوافل پڑھے جاتے ہیں' کہیں شیرینی بانٹی جاتی ہے' کہیں مبارک باد دی جاتی ہے اور دعوتِ طعام ہوتی ہے۔ یہ بدمعاشوں کا اظہارِ مسرت تھا۔ وہ ایک دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔ گتھم گتھا ہو رہے تھے اور ساتھ ساتھ مجرا دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی مخصوص نفسیات کے دائرے کے پابند تھے۔ اس "نفسیات" میں خوشی اور غم دونوں کیفیات میں انتہا کو چھونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غم ہو تو اتنا کہ خودکشی کو جی چاہے یا کسی کو قتل کرنے کو........ اور خوشی ہو تو اتنی کہ بندہ پاگل ہو جائے۔

رات ایک بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جیب تھپتھپا کر ماؤزر کی موجودگی کا اندازہ کیا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ڈنگا سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں لیکن لب و لہجہ قابو میں تھا۔ کہنے لگا۔ 'جہانی صاحب! یار تم نے کیا کر دیا ہے اس حرامزادی جسّاں کو۔ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔ بس تمہارا نام لے لے کر آہیں بھر رہی ہے۔ کہتی ہے آج کی رات جہانی صاحب کے لیے ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسے بتا دو کہ یہاں آئی تو جوتے کھائے گی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں نے بھی کہا تھا کہ جہانی صاحب کسی اور ٹائپ کے بندے لگتے ہیں لیکن وہ تو ہٹ ہی پکڑ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گی۔ اس سے خود بات کر لینا۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ڈنگا سنگھ! میں نے کسی سے بات نہیں کرنی۔ اسے مت بھیجنا یہاں۔"

اتنے میں چوڑیوں کی مدھم کھنکناہٹ سنائی دی۔ ڈنگا سنگھ لوفرانہ انداز میں مسکرا کر بولا۔ "لو جہانی صاحب! آ گئی ہماری میزبان۔ ہمارا تو مزہ کرکرا ہو ہی چکا ہے۔ گرو کرے تمہارا کچھ سنور جائے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد جسّاں چھم سے اندر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا نشہ تیر رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے مسوڑے نمایاں ہو جاتے تھے لیکن ان مسوڑوں کے سبب اس کی مسکراہٹ بدنما ہونے کے بجائے دلکش ہو جاتی تھی۔ ممکن ہے وہ بہت کھل کر ہنستی ہو تو یہ دلکشی' بدنمائی میں بدل جاتی ہو۔ فی الحال تو یہ مسکراہٹ جاذبِ نظر تھی۔ شاید اسی مسکراہٹ کے سبب اس کا نام جسّاں رکھا گیا تھا یا پھر نام جسّاں ہونے کے سبب وہ اس دلنشیں مسکراہٹ کی مالک بنی تھی۔

خوبصورتی کسی نہ کسی طور انسان پر اثرانداز ہوتی ہے۔ مجھ پر بھی ہوئی۔ میں جو سخت الفاظ جسّاں کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا وہ غیر محسوس طور پر نرم ہو گئے۔ "کیا بات ہے۔ کیا لینے آئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا سا وقت۔" وہ اٹھلا کر بولی اور ایک ادا سے کمرے کی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے بجنے سنورنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور اپنی طرف سے سارے تباہ کن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آئی تھی۔

"دیکھو بی بی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں اس قسم کا بندہ نہیں ہوں جس قسم کے لوگوں نے تمہیں بلایا ہے ان کے پاس جاؤ۔ میری نیند برباد مت کرو۔"

"جہانی صاحب۔ میں آپ کی نیند میں خرابی کب ڈال رہی ہوں۔ آپ سو جائیے' میں آپ کے پاس اس کرسی پر بیٹھی رہوں گی۔ میرے لیے یہی بڑی بات ہو گی کہ........" اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ایک دم میرا پارا چڑھ گیا۔ "میں تمہیں شکل سے اُلو کا پٹھا نظر آتا ہوں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے آرام کرنے دو۔"

وہ ایک دم بجھ سی گئی۔ سولہ سنگار' خوبصورت مسکراہٹ اور نشیلی چال کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز بے چارگی ابھر آئی۔ جیسے خود کو عرش پر سمجھنے والا اوندھے منہ فرش پر گرے اور دم بخود رہ جائے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کی ساتھی لڑکیاں بالکل ہی گئی گزری تھیں۔ شاید ان ہی کے سبب وہ خود کو اہم سمجھنے لگی تھی۔ اب خوش فہمی کا یہ شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ نجانے اس منظر نے میرے دل کا کون سا تار چھیڑا کہ میرا غصہ جاتا رہا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی تو میں نے کہا۔ "بیٹھ

جاؤ۔"

وہ چند لمحے ساکت رہی پھر بے جان سی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں خالی خالی تھیں۔

میں نے نرمی سے کہا "پورا نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ بولی "پورا نام ہی ہتساں ہے جی۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"گورداسپور کی۔"

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لگاوٹ کی نظروں سے دیکھا "دیکھو ہتساں بائی! خدا نا خواستہ تمہاری خوب صورتی اور جوانی میں شک نہیں ہے لیکن میں اس وقت صرف اور صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

"ہاں' جانی صاحب! سمجھ رہی ہوں..... دراصل۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"دراصل کیا.....؟" میں نے اسے کریدنا چاہا۔

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہی' پھر جی کڑا کر کے بولی "میں واپس گئی تو وہ پریما اور آشاں میرا مذاق اڑائیں گی۔" پریما اور آشاں اس کی ساتھی لڑکیوں کے نام تھے۔

"کیوں مذاق اڑائیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"بس" وہ گردن جھکا کر بولی۔

اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی "بڑا بول" بول کر آئی ہے۔ ممکن تھا کہ باقی لڑکیوں سے اس نے کوئی شرط وغیرہ بھی لگائی ہو۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "تو تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو..... اور صبح ڈنگا صاحب سے میری شکایت نہ کریں تو۔" وہ کوڑیوں کے مول بکنے والی ایک فاحشہ لڑکی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے اس کا دل توڑنے کا قصور سرزد ہوا تھا۔ اور دل' دل ہی ہوتا ہے چاہے وہ طوائف کا ہو یا شریف زادی کا۔

میں نے کہا "اچھا اگر یہاں بیٹھنا ہی ہے تو مجھے اپنی کہانی سناؤ۔"

چند ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد وہ مجھے اپنی کہانی سنانے لگی۔ اس کہانی میں ایک بھی نئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک طوائف کی "رائج الوقت" روداد تھی۔ ایک محبت کی بھوکی لڑکی' ایک دغا باز لڑکا..... لمحوں کی لرزش اور عمروں کا رونا..... اس کہانی کے دوران کسی ساتھ والے کمرے میں "جشن رہائی" جاری رہا۔ نسوانی اور مردانہ آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی رہیں۔ قہقہے گونجتے رہے اور شیشہ کھنکتا رہا۔ ہتساں نے ابھی پوری طرح ہار تسلیم نہیں کی تھی۔ گفتگو کے دوران گاہے گاہے اس کا جسم بھی بولنے لگتا تھا۔ بزبان خاموشی اس نے کئی بار مجھے بھڑکانے اور اکسانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

رات دو بجے کے قریب میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ ہتساں صوفے پر دراز ہو گئی۔ میں کمرے کی بتی بجھا دیتا تو شاید وہ جل اٹھتی لیکن میں نے بتی جلتی رہنے دی تھی اس لئے وہ بجھ گئی۔ اور چونکہ وہ بجھ گئی تھی اس لئے جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کے مدھم خراٹے سن رہا تھا۔

اگلی صبح ڈنگا سنگھ اور اس کے ساتھی دیر تک مدہوش پڑے رہے۔ ان کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں نے پوری کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگایا۔ یہ کوٹھی چھڑوں کا ڈیرا تھی اور اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہاں صرف طوائفوں کا آنا جانا ہے۔ عورت کے دم قدم سے یہ درودیوار محروم ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر یک گونہ تسلی ہوئی کہ کوٹھی کے پورچ میں ایک موٹر رکشا موجود ہے۔ یہ رکشا کسی بسکٹ بنانے والی کمپنی کا تھا اور عقب سے بالکل بند تھا۔ رکشے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ ڈنگا سنگھ نے میرے سفر کے لئے منگوایا ہے جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ انتظام کل رات کرفیو لگنے سے پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے ڈنگا سنگھ کو جگایا۔ وہ ایک صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی دھوتی کہیں سے کھسک رہی تھی اور فرش پر جانی واکر کی خالی بوتل پڑی تھی۔ ڈرائنگ روم میں مجھے مت سنگھ بھی دکھائی دیا۔ اس کا زیادہ تر چہرہ جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا۔ رخساروں کے پاس جو تھوڑی سی جگہ خالی تھی وہاں غازے اور لپ اسٹک کے نشان نظر آ رہے تھے۔ نیند میں وہ کسی بچے ہی کی طرح معصوم لگ رہا تھا۔ ایسا بچہ جو کسی جیل سے نہیں اسکول سے رہا ہو آیا تھا اور اب اپنی ماں کے زانو پر سر رکھ کر گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ مت سنگھ کی اصل شکل و صورت تھی جس پر اس نے نجانے کون کون سے خول چڑھا رکھے تھے۔ وہیں پر ایک کونے میں مجھے شکورا بھی نظر آیا۔ وہ خود کو اس محفل رنگ و طرب سے دور نہیں رکھ سکا تھا اور قالین پر مدہوش پڑا تھا۔ ڈنگا سنگھ کے بعد میں نے شکورا کو بیدار کیا اور ان دونوں کو بتایا کہ کرفیو میں آٹھ سے گیارہ بجے تک کا وقفہ ہے اور میں ہر صورت میں اس وقفے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

جتنی تاخیر ہو چکی تھی وہ کافی تھی۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کو نہایت غیر یقینی حالات میں چھوڑ کر آیا تھا اور اب چھ سات دن گزرنے کے باوجود ان تک واپس نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے ڈنگا سنگھ پر یہ واضح کر دیا کہ میں یہاں سے اکیلا جانا چاہتا ہوں۔ شکورا موٹر رکشا ڈرائیو کر سکتا تھا لہٰذا مجھے کسی نئے ڈرائیور کی ضرورت بھی نہیں تھی..... ہاں' میں نے اس بات کا ڈنگا سنگھ سے وعدہ کیا کہ اپنے ساتھیوں سے میری ملاقات ہو یا نہ ہو میں اس سے دوبارہ رابطہ ضرور قائم کروں گا۔ رکشے میں پٹرول موجود تھا' کاغذات بھی مکمل تھے۔ میرے لئے مزید سہولت فراہم کرتے ہوئے ڈنگا سنگھ نے کہیں سے شہر کا نقشہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ماؤزر میرے پاس موجود تھا اس کے باوجود ڈنگا سنگھ نے موٹر رکشا میں ایک رائفل اور اس کے ڈیڑھ سو راؤنڈ بھی رکھوا دیئے۔

ٹھیک آٹھ بجے ہم کوٹھی کے پورچ سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت تک مت سنگھ' اچھو اور ان کے تمام ساتھی سوئے پڑے تھے اور سب لوگوں کے علاوہ وہ لڑکی بھی سو رہی تھی جس نے میرے ساتھ "رات گزاری" تھی۔ میرے ساتھ رات گزارنے کو اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور میں نے بھی اس کی انا کو ٹھیس پہنچانے کی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ میں کون سا بیس سالہ لڑکا تھا جس کی منگنی ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ میں جانی استاد تھا اور میری بدنامیوں کی فہرست بہت طویل تھی۔

موٹر رکشا ایک دو ذیلی سڑکوں سے گزرنے کے بعد شہر کے بھرے پرے حصے میں آ گیا۔ کرفیو میں نرمی ہوتے ہی لوگ سڑکوں اور بازاروں میں امڈ آئے تھے۔ رکشے کے بند کیبن نما حصے میں اگلی جانب ایک جالی سی تھی۔ میں اس جالی کے راستے شکورے سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے سب سے پہلے گاندھی چوک چلنے کو کہا۔ گاندھی چوک یا گاندھی اسکوائر ہی وہ جگہ تھی جہاں سے میں واپسی کا راستہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ ہم تقریباً دس منٹ میں گاندھی اسکوائر پہنچ گئے۔ راستے میں جگہ جگہ پولیس اور نیم فوجی دستے دکھائی دیئے۔ گاندھی اسکوائر پہنچ کر میں نے وہ کشادہ سڑک ڈھونڈ لی جہاں سے میں بذریعہ بس یہاں پہنچا تھا۔ شکورا میری ہدایات کے مطابق رکشا چلا رہا تھا۔ بیس پچیس منٹ میں ہم شہری حدود سے باہر نکل آئے۔ اب درختوں سے گھرے ہوئے اس ویران گردوارے تک بہت تھوڑا سا سفر باقی رہ گیا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی اور میں خود کو ذہنی و جسمانی طور پر آنے والے حالات کے لئے تیار کر رہا تھا۔ جونہی سے دو میل آگے ہم ایک زبردست پولیس ناکے سے بخیریت گزر گئے تو مجھے امید پیدا ہو گئی کہ ہم صحیح سلامت حالت میں ٹرک تک پہنچ جائیں گے..... وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے جب ہمارا رکشا سڑک سے اتر کر گردوارے کے ویران کھنڈر کی طرف گھوما۔ ماؤزر میرے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں رکشے کی جالی سے لگی ہوئی تھیں۔ جنتر کے گھنے درختوں میں میں نے رکشا رکوا لیا اور پیدل ہی موقعے کی طرف بڑھا۔ چند لمحے بعد میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں چند روز پہلے میں ٹرک چھوڑ کر گیا تھا۔ تیل کے دھبوں والی خالی جگہ میرا منہ چڑا رہی تھی۔ نہ ٹرک کہیں نظر آ رہا تھا اور نہ صفدر اور زریں گل۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ میں نے ذرا جھک کر ان نشانات کا معائنہ کیا جو ٹرک کے پہیوں سے بنے تھے۔ ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹرک کو اس جگہ سے روانہ ہوئے کم از کم چالیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔

دھوپ نکلی ہوئی تھی اس کے باوجود سرد ہوا درختوں سے سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ میں نے گرم چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی اور تیزی سے اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا جہاں سات آٹھ روز پہلے میں نے ٹرک پارک کیا تھا۔ بغور معائنے کے باوجود میں کوئی خاص بات نوٹ نہیں کر سکا۔ نہ کہیں دھینگا مشتی کے آثار نظر آئے اور نہ کوئی ایسی شہادت ملی جس کی بنا پر کہا جا سکتا کہ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ پہنچی ہے۔ موقعے پر قدموں کے جو مدھم نشان موجود تھے انہیں میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ صفدر اور زریں گل کے نقش پا تھے۔ سگریٹ کا ایک خالی پیکٹ نظر آیا۔ یہ صفدر کا برانڈ تھا۔ اس پیکٹ کے پاس ہی ایک خون آلود پٹی پڑی تھی۔ یہ پٹی خانہ بدوش دل جیت کی ران سے اتاری گئی تھی۔ ایک جگہ چند اینٹوں کے درمیان کوئلے وغیرہ پڑے تھے' جیسے یہاں چولھا تیار کر کے کچھ پکایا گیا ہو۔

میں نے گردوارے کے ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کیکر کے ایک جھنڈ میں ایک سایہ متحرک ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرے سامنے زریں گل کھڑا تھا۔ وہ بالکل مختلف لباس میں نظر آ رہا تھا۔ یہ مقامی لباس' ڈبی دار شلوار قمیص پر مشتمل تھا۔ جوتا بھی اس لباس سے میل کھاتا تھا۔ زریں گل کو پہچان کر چادر کے نیچے ماؤزر پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ زریں گل تیز لہجے میں بولا "چلیں استاد جی! یہاں سے نکل چلیں۔ بہت خطرہ ہے ادھر..... ام جان پر کھیل کر آپ کا

انتظار کر رہا تھا۔"

"ترک اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ چلیں۔ ام ذرا بعد پہنچ کر آپ کو بتاتا ہے۔ زبردست اسٹوری ہے۔ پنجابی فلم کا مافق۔" وہ مجھے کھینچتا ہوا درختوں میں لے آیا۔

"کون سی سواری ہے تمہارے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"سواری نہیں پورا سوارا ہے" زریں گل اپنے مخصوص لہجے میں بولا "ٹریکٹر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور درختوں میں کھڑا کیا ہے ام نے۔ آپ بس ففٹی فٹ قدم اٹھائیں۔"

میں نے کہا "میں ایک موٹر رکشا پر آیا ہوں۔ ایک بندہ بھی ہے میرے ساتھ۔ وہ گردوارے کے پچھواڑے کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔"

"رکشے کو گولی ماریں استاد جی! اللہ ام کو رکشے کا کرایہ مرا یہ معاف کرے گا۔ ام سخت مصیبت میں ہے اس وقت۔ ویسے آپ ٹھہرا کہاں ہوا تھا۔ اتنی دیر لگائی آپ نے؟ ام تو انتظار کر کر کے انتظار حسین بن گیا۔"

میں نے کہا "یہاں ایک بابو لیاقت ہے۔ بڑے کام کا بندہ ہے۔ اسی کے پاس تھا۔ لیکن۔۔۔ تم اتنی جلد بازی مت کرو۔۔۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔۔۔ میرے خیال میں ٹریکٹر سے تو رکشا بہرحال بہتر ہے اور۔۔۔۔"

اچانک مجھے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اوندھے منہ زمین پر گرنا پڑا۔ زریں گل بھی چھپکلی کی طرح ہٹ سے گرا تھا۔ شاٹ گن کے دو فائر ہوئے تھے اور چھرے سنسناتے ہوئے ہمارے پاس سے گزر گئے تھے۔ زریں گل بڑے مخدوش انداز میں گرا تھا۔ فوری طور پر میں یہی سمجھا کہ وہ جہاد زندگانی میں سرخرو ہو گیا ہے لیکن یہ قیافہ غلط نکلا۔ مزید فائر ہونے سے پہلے وہ میرے ساتھ ہی اٹھا اور برق رفتاری سے کیکر کے درختوں کی طرف بھاگا۔

"خبردار۔" میں نے ایک گرجتی ہوئی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی ایک رائفل کی نال نیم کی گھنی شاخوں سے برآمد ہوئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ماؤزر سے دو فائر کیے۔ رائفل کی نال اوجھل ہو گئی اور کوئی "دھپ" سے کچی زمین پر گرا۔ میں نے زریں گل کو دیکھا' وہ بھی اپنی چادر کے نیچے سے ریوالور برآمد کر چکا تھا۔ یہ زریں گل کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی پھر گھنے درختوں میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

"زریں گل۔" میں نے دو تین بار اسے پکارا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح پکارنا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ میں حتی الامکان خاموشی سے آگے بڑھنے لگا تاکہ رکشا تک پہنچ سکوں۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ایک یا دو مسلح افراد درختوں میں موجود ہیں اور پاگلوں کی طرح مجھے کھوج رہے ہیں۔ پھر مجھے اپنے بالکل قریب سے ایک آواز سنائی دی اور میں بے طرح چونک گیا۔ یہ شیطان ابن شیطان' درندہ خصلت شنکر شکرا کی آواز تھی۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے رائفل مانگ رہا تھا۔ شنکر شکرا سے دوبدو مقابلہ کرنے اور اسے عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کی خواہش برسوں سے میرے دل میں موجزن تھی لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ موقع کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میرا اولین ٹارگٹ یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں تک پہنچوں اور چار پہیوں پر دوڑنے والے اس قیامت خیز راز کی حفاظت کا بندوبست کروں جس نے فرید کوٹ اور اس کے گردونواح میں تہلکہ مچایا ہوا تھا۔

میں بے آواز چلتا ہوا موٹر رکشا تک پہنچ گیا۔ وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شکورے نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بالکل تیار حالت میں بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ بھی فائرنگ کی آواز سن چکا تھا اور جان چکا تھا کہ "سب اچھا" نہیں ہے۔ جھک کر بھاگتا ہوا میں رکشے تک پہنچا۔ ماؤزر میرے ہاتھ میں تھا اور سامنے کی جانب سے سارا لباس مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ "چلو" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

شکورے نے لیور کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر رکشا اسٹارٹ کیا اور تیزی سے یوٹرن لے کر سڑک کی طرف بھاگا۔ رکشا ایک ایسی سواری ہے کہ ہموار سڑک پر بھی اچھل کود کے لئے مچلتا رہتا ہے اور یہاں تو سرے سے راستہ ہی نہیں تھا بس کچی پکی اونچی نیچی کلری زمین تھی۔ رکشا تیز رفتاری سے چلا تو یوں لگا جیسے کوئی ہوائی جہاز رن وے کے بجائے زیر تعمیر سڑک پر سے ٹیک آف کر رہا ہے۔ ابھی ہم سڑک سے نصف فرلانگ دور تھے کہ ایک زرد رنگ کی کار درختوں سے نکلی اور گرد و غبار کے بادل اڑاتی تیزی سے ہماری طرف بڑھی۔ یہ کار چونکہ سڑک کی جانب سے آ رہی تھی لہٰذا شکورے کو موٹر رکشے کا رخ مخالف سمت میں موڑنا پڑا۔ عام "ڈلیوری رکشا" کی طرح اس رکشا کا دروازہ بھی عقب میں تھا۔ میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ دو سرا پٹ تھوڑا سا کھول کر میں نے عقب میں آتی ہوئی زرد کار پر اوپر تلے کئی فائر کیے لیکن اس کا ٹائر برسٹ نہیں کر سکا۔ ایک تو فاصلہ زیادہ تھا۔

دوسرے رکشا سرکش گھوڑے کی چال چل رہا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد کار اور رکشے کی یہ اندھا دھند دوڑ اچانک ختم ہو گئی۔ دوڑ ختم ہونے کا سبب بڑا سیدھا سادہ تھا۔ کار سے رکشا پر ٹرپل ٹو گن سے فائر کیے گئے۔ ایک گولی رکشا کے ٹائر میں لگی اور وہ جو پہلے ہی قلابازی کھانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا' سر کے بل لڑھکتا ہوا ایک نشیبی کھیت میں جا گرا۔ چند لمحے کے لئے زمین آسمان ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ حواس بحال ہوئے تو میں نے شنکر شکرا کو دیکھا۔ وہ زرد کار میں سے برآمد ہو رہا تھا اور گرد کے بادل کو چیرتا ہوا مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو گن تھی۔ وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن نشانہ بنا دیتا تو ان صندوقوں تک کیسے پہنچتا جن کی خاطر وہ اور اس کے حواری بے حساب وقت اور بے حساب دولت خرچ کر چکے تھے۔ جن کی خاطر انہوں نے ویرانوں کی خاک چھانی تھی اور انسانی خون سے ہولی کھیلی تھی۔

میں رکشے کے کھلے دروازے سے باہر گر گیا تھا۔ اور اب توریا کے ایک کھیت میں پشت کے بل پڑا تھا۔ پانچ منٹ کی طوفانی "ریس" نے ہمیں آباد زمین سے نیم آباد زمین تک پہنچا دیا تھا۔ جس جگہ ہماری دوڑ کو فل اسٹاپ لگا تھا وہاں اکا دکا کھیت نظر آ رہے تھے اور قریب ہی ایک کنوئیں یا ٹیوب ویل کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ شنکر شکرا نے مجھ پر جست لی اور رائفل سمیت پورے وزن سے مجھ پر گرا۔ میں جو اٹھنے کی کوشش میں زمین سے بلند ہو چکا تھا' ایک بار پھر چت ہو گیا۔ رکشا کے لڑھکنے پر ضرب آئی تھی اور درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن جونہی شنکر شکرا کے نفرت انگیز لمس کا احساس ہوا' ساری جسمانی تکلیف اور رگ و پے کی ساری طاقت غیظ و غضب میں ڈھل گئی۔ جونہی شنکر میرے اوپر آیا' میں نے گھٹنے کی ایک شدید ضرب اس کی پسلیوں میں لگائی اور اچھل کر بائیں طرف پھینک دیا۔ اسی وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ رکشا سے گرتے وقت ماؤزر میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ میں نے پلٹ کر شنکر کے اوپر آنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی معمولی حریف نہیں تھا۔ اس کی طاقت سے بھی بڑھ کر اس کی عیاری اور چستی خطرناک تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے پہلو سے رائفل کا آہنی کندا میرے چہرے پر مارا۔ اس ضرب نے میرے بالائی دانت ہلا دیے اور منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ میں نے پیچھے کی طرف گرتے ہوئے ٹانگ چلائی اور میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر نے شنکر کے ہاتھ سے رائفل صاف نکال دی۔ میں نے رائفل کو کھیت کی نرم زمین پر گرتے دیکھا اور اس منظر کے "پس منظر" میں مجھے کھیت مزدوروں کے ہیولے دکھائی دیے جو بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔

توریا کے اس کھیت میں لہلہاتے پودوں کے درمیان چمکیلے سورج تلے دو تین منٹ تک میرے اور شنکر کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی' پھر اچانک میری گردن اس کے آہنی بازوؤں کے شکنجے میں آ گئی۔ یہ اس داؤ سے ملتا جلتا داؤ تھا جو میں اکثر اپنے حریفوں پر استعمال کیا کرتا تھا۔ میں یہ داؤ ایک بازو سے لگاتا تھا لیکن شنکر نے اس کے لیے دونوں بازو استعمال کیے تھے۔ میرا سر اس کے پیٹ تلے دب گیا تھا اور اس کی ٹھوڑی میری کمر پر چبھ رہی تھی۔ بڑی جان لیوا گرفت تھی یہ۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں جانتا تھا' زیادہ زور لگانے کی صورت میں میری گردن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکنی کی بات یہ تھی کہ شنکر شکرا میرے آخری حربے سے آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا' میری پنڈلی سے ہر وقت رام پوری خنجر ایک خاص تکنیک کے ساتھ بندھا رہتا ہے۔ جونہی میں نے اپنا ہاتھ خنجر کی طرف بڑھانے کی کوشش کی شنکر نے گردن کو بے رحمی سے کھینچ کر مجھے اس حرکت سے روک لیا۔

ہمارے گرد اب پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ پہلے تو انہوں نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب شنکر شکرا نے انہیں خطرناک لہجے میں دھمکیاں دیں تو وہ تماشائی بن کر رہ گئے۔ میری گردن اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ میں صرف اپنے بائیں پہلو کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ مجھے الٹے ہوئے رکشے کا منظر نظر آیا۔ چند دیہاتی افراتفری میں اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ کوئی شخص رکشے تلے دبا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ رکشے میں میرے علاوہ صرف شکورا تھا اور شکورا رکشے سے باہر آ چکا تھا۔ میں نے اسے صرف دس قدم کی دوری پر دیکھا۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں وہی رائفل دیکھی جو ڈنگا سنگھ نے احتیاطاً رکشے میں رکھوا دی تھی۔ رائفل کا رخ شنکر شکرا کی طرف تھا لیکن نجانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شکورا اس رائفل سے شنکر کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔ معلوم نہیں یہ شنکر شکرا کے نام کی دہشت تھی یا شکورے نے کبھی کسی پر گولی چلائی ہی نہیں تھی۔ کسی کو گولی مارنے کا دعویٰ کرنے اور واقعی گولی مار دینے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شکورا' شنکر کو صرف دھمکانا چاہتا ہے۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولا "چھوڑ دو شنکر صاحب! پیچھے

ہٹ جاؤ۔ ورنہ ـــــ میں فائر کردوں گا۔"

وہ قدم بہ قدم شنکر کی طرف کھسکتا آرہا تھا۔ یہ اس کی دوسری بے وقوفی تھی۔ اگر وہ گولی نہیں چلا سکتا تھا تو پھر دور ہی کھڑا رہتا۔ پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اپنے حریف کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن شکورا بے خبر تھا کہ وہ کس مصیبت کو دعوت دے رہا ہے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ جب شکورا رائفل کے زعم میں خطرناک حد تک قریب آگیا تو شنکر نے میری گردن پر گرفت ڈھیلی کیے بغیر شکورے کو ایک شدید ضرب لگائی۔ اس کی ٹانگ نے کراٹے کی "راؤنڈ ہاؤس کک" کے انداز میں حرکت کی اور وزنی بوٹ کی ضرب شکورے کے جبڑے پر پڑی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنی۔ ہیوی ویٹ باکسر کا گھونسا کھانے والے بدنصیب کی طرح شکورا لڑکھڑایا اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح کھیت میں گر گیا۔ یہ ایک ضرب ہی اس کے لئے کافی شافی ثابت ہوئی تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹے تک میں نے اس کے بدن کو دوبارہ جنبش کرتے نہیں دیکھا۔

میری بے بسی اور شکورے کا انجام دیکھ کر لوگ ہراساں ہوگئے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ شنکر شکرا مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اسی طرح میری گردن دبائے رکھے گا' یہاں تک کہ میں سب کے سامنے دم توڑ جاؤں گا۔ اور واقعی میری حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ دم سمٹ کر آنکھوں میں آچکا تھا اور کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ کیا پیش آئے گا۔ اگر میرے اور شنکر کے درمیان فری اسٹائل کشتی ہو رہی ہوتی تو یقیناً اس موقعے پر میں رنگ کے فرش پر ہاتھ مار کر اپنی پسپائی کا اعلان کردیتا لیکن یہ کشتی نہیں تھی زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ شنکر مجھ پر پوری طرح قابو پائے ہوئے تھا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اب میرا کیا کرے۔ شاید وہ اس انتظار میں مجھے جکڑے ہوئے تھا کہ اس کے ساتھی یہاں آپہنچیں اور مجھے سنبھال لیں۔

زور آزمائی کے دوران میں اور شنکر زمین پر گر گئے۔ تاہم شنکر نے اپنی گرفت برقرار رکھی۔ صورت حال "طول کھینچتی جارہی تھی۔ ایک ہمدرد بزرگ آگے بڑھا اور شنکر کو مخاطب کرکے لجاجت سے بولا۔ "چھوڑ دے پتر' بس کر۔ اس طرح گردن ٹوٹ جاتی ہے بندے کی۔"

شنکر ہانپتی کانپتی ہوئی غیر انسانی آواز میں غرایا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔"

بزرگ اور دیگر ساتھیوں نے میری۔ سفارش کرنا چاہی لیکن شنکر

لوگ تھے' اتنی ہمت ان میں نہیں تھی کہ زمین پر پڑی دو رائفلوں میں سے کوئی ایک رائفل اٹھا کر شنکر شکرا پر تان لیتے یا سب مل کر اس پر پل پڑتے۔ میری آنکھوں میں ستارے سے ناچنے شروع ہوگئے تھے اور لگتا تھا کسی بھی لمحے میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہوجاؤں گا۔ اس طرح کے مہلک داؤ میں پھنس جانے کا احوال کچھ انہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جو اس تجربے سے گزرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو دیسی کشتیاں ہوتی ہیں ان میں کبھی کبھار ایسی صورت حال پیش آجاتی ہے۔ ایسی کشتیوں میں راؤنڈ یا وقفے وغیرہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ کسی خطرناک داؤ میں پھنس جانے والا پہلوان شکست سے بچنے کے لیے تھوڑا اپنی جان پر عذاب جھیلتا رہتا ہے اور بعض اوقات موت کی سرحد کے قریب پہنچ جاتا ہے۔

بے شک میں شنکر کے چنگل میں بُری طرح پھنس گیا تھا لیکن مدافعت سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ میں مسلسل اس تاک میں تھا کہ اپنے' نیچے لٹکتے ہوئے ہاتھوں سے شنکر کے زیریں جسم پر ضرب لگا سکوں۔ شنکر بھی اس بات کو سمجھتا تھا اور وہ اپنی ٹانگیں مجھ سے دور رکھے ہوئے تھا۔ بہرحال مجھے امید تھی کہ وہ جلد یا بدیر غلطی کرے گا ـــــ میری ہر لحظہ دھندلاتی ہوئی آنکھیں اسی غلطی کے انتظار میں تھیں۔

آخر میری اُمید بر آئی۔ مجھے زمین سے اٹھانے کی کوشش میں شنکر کا زیریں جسم میرے قریب آگیا۔ میں نے اپنا بازو لمبا کیا اور بچی کھچی طاقت جمع کرکے ایک بھرپور ضرب شنکر کے جسم کے نازک حصے پر لگائی۔ وہ بُری طرح تڑپا۔ ایک ساعت کے لیے میری گردن پر اس کی آہنی گرفت نرم پڑی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑائی اور شنکر کو پیچھے دھکیلا ہوا دھول سے اٹے راستے پر گرا۔ مجھ پر جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میرے گھونسے تابڑ توڑ شنکر کے چہرے پر برس رہے تھے۔ وہ بھی جوابی ضربیں لگا رہا تھا لیکن میرا پلہ واضح طور پر بھاری تھا۔ اس نے بھاگ کر رائفل تک پہنچنا چاہا' میں نے جست لگا کر اسے راستے میں دبوچا اور دھکیلتا ہوا کئی گز پیچھے لے گیا۔ اب ہم کنوئیں کے بالکل قریب تھے۔ شنکر کے ایک طوفانی گھونسے سے اپنا چہرہ بچا کر میں نے پنڈلی سے خنجر کھینچا اور بے دریغ شنکر پر حملہ کیا۔ شنکر نے روایتی پھرتی سے یہ وار بچایا لیکن اس کی جرسی' قمیص' بنیان اور سینے کی بالائی جلد خنجر کی نوک نے چیر کر رکھ دی۔ وہ خود کو بچانے کی کوشش میں چند قدم اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں

آواز کے ساتھ بیس فٹ گہرے کنوئیں میں جا گرا۔ اس کے گرنے سے دو آوازیں پیدا ہوئی تھیں۔ پہلی آواز کنوئیں کی آہنی ٹنڈوں (پانی نکالنے والے ڈبے) سے ٹکرانے کی تھی' دوسری چھپاکے سے پانی میں گرنے کی ـــــ میں آج شنکر کا قصہ پاک کردینا چاہتا تھا۔ میں ان رائفلوں کی طرف دوڑا جو کھیت میں گر گئی تھیں۔ دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر مجھے روکنا چاہا لیکن میں انہیں دھکیلتا ہوا کھیت میں آیا' وہاں اب کوئی رائفل نہیں تھی۔ موقعے پر موجود "سیانوں" نے "دانائی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں رائفلیں موقعے سے ہٹادی تھیں۔

"رائفل کہاں ہے؟" میں نے ایک شخص کو گریبان سے جھنجوڑ کر پوچھا' وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تماشائی خوفزدہ انداز میں چاروں طرف منتشر ہو رہے تھے۔ اچانک دور فاصلے پر نشیب میں مجھے گاڑیوں کی اڑائی ہوئی دھول نظر آئی۔ کچھ نامعلوم لوگ موقعے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ شنکر شکرا کے ساتھی ہوں گے۔ ان کا یہاں پہنچ جانا میرے لیے کسی طرح سُود مند نہیں تھا۔

میں نے بے ہوش شکورے کو کندھے پر لاد کر شنکر کی زرد گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ میں نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اندازے سے سڑک کی جانب روانہ ہوگیا۔ جب میں کنوئیں کے پاس سے گزرا تو مجھے اس کی آہنی ٹنڈیں یعنی پانی کھینچنے والے ڈبے زور و شور سے ہلتے نظر آئے۔ (یہ ڈبے ایک بیضوی چکر کی صورت میں کنوئیں کے اندر لٹکتے رہتے ہیں) صاف پتا چل رہا تھا کہ شنکر ان رسیوں سے لٹک کر کنوئیں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کنوئیں کے ارد گرد کوئی شخص موجود نہیں تھا سوائے دو عدد بیلوں کے جو اس ہنگامہ خیز صورت حال سے قطعی لاتعلق سر جھکائے کھڑے تھے۔ مجھے اپنے غیر مسلح ہونے کا زندگی میں کبھی اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس وقت ہوا۔

سڑک تک پہنچنے سے پہلے مجھے قریباً ایک میل کا دشوار گزار راستہ طے کرنا پڑا۔ سڑک پر پہنچ کر میری رفتار تیز ہوجانی چاہیے تھی۔ لیکن نہیں ہوئی۔ تیز رفتاری کے لیے راستے کی ہمواری یا گاڑی کی سبک روی اتنی اہم چیز نہیں ہوتی جتنا کہ "منزل کا تعین" ہوتا ہے۔ اور میں ابھی تک یہ تعین نہیں کرسکا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ یہ شنکر کی گاڑی تھی۔ میں واپس شہر کی طرف جاتا تو شاید پہلے چوراہے پر ہی پہچان لیا جاتا۔ اور ڈنگا سنگھ کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے مجھے درجنوں چوراہوں سے گزرنا تھا۔ میری سب سے اہم

ضرورت یہ تھی کہ مجھے پھر کوئی ڈلیوری وین یا ڈلیوری رکشا جیسی سواری میسر آسکے جس کے ساتھ ایک قابل اعتماد ڈرائیور بھی ہو جو مجھے اور شکورے کو ڈنگا سنگھ کی کوٹھی تک پہنچا دے۔ اچانک مجھے کار سڑک کے کنارے روکنا پڑی۔ بائیں جانب ایک ٹرسٹ اسپتال کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ ایک بڑا سا آہنی گیٹ تھا جس کے اندر دور تک سرو کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گیٹ کے پاس ہی دو بڑے بڑے شیڈ تھے جن کے نیچے گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں وغیرہ کھڑی تھیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ شکورے کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر اس کا چہرہ سُوج کر نیلا ہونا شروع ہوگیا تھا اور نتھنوں سے مسلسل خون رس رہا تھا' بڑی تباہ کن چوٹ لگائی تھی اسے شنکر شکرا نے۔ اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور منہ عجیب سے انداز میں ٹیڑھا ہوچکا تھا۔ اسپتال کا بورڈ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ شکورے کو اندر لے جاؤں۔ اسے ایمرجنسی میں داخل کرا کے میں اس کی طرف سے فارغ ہوسکتا تھا' اس کے بعد اسپتال ہی سے کسی مناسب گاڑی کا انتظام بھی ہوسکتا تھا۔

○☆○

اسپتال میں مجھے میری توقع سے زیادہ وقت لگا پھر یہ بھی ہوا کہ اسپتال کی پارکنگ سے مجھے کوئی حسب حال گاڑی نہ مل سکی۔ ایک چوکس چوکیدار بھی وہاں موجود تھا جس کی موجودگی میں کوئی پیش چلنا مشکل تھی۔ اسی دوران کرفیو میں وقفہ ختم ہوگیا۔ اب میں کم از کم شام چھ بجے تک کے لیے اسپتال میں مقید ہوچکا تھا۔

گیارہ بجے سے شام چھ بجے تک سات گھنٹے میں نے اسپتال کے باغیچے میں بیٹھ کر اور کینٹین کے ارد گرد گھوم کر گزارے۔ ذہن بار بار زرّیں گل سے ہونے والی مختصر ملاقات کی طرف جارہا تھا۔ زرّیں گل نے حوصلہ افزا اطلاعات دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ ٹرک محفوظ ہے اور صفدر اور ربیعت بخیریت ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ میں کچھ پوچھ سکا تھا نہ وہ بتا سکا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس جگہ تھے اور انہیں "کھنڈر گرودوارے" سے نکلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ جہاں تک شنکر شکرا کا تعلق ہے' اس کی کھنڈر میں موجودگی تعجب خیز نہیں تھی۔ کم از کم میں تو اس کی موجودگی پر حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اپنے ہدف تک پہنچنے کی خداداد صلاحیت رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے میری سوچ سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے حرکت کی تھی اور کسی ایسے اہم مقام پر پایا گیا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے

دیگر لوگ تادیر سر پٹختے رہے تھے۔

شام پانچ بجے کے قریب مجھے اسپتال میں ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یہ وہی دراز قد محافظ فرمان علی تھا جس سے بابو لیاقت کی بیٹھک میں ملاقات ہوئی تھی۔ فرمان بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تاہم سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس وقت تک مجھ سے لاتعلق رہا جب تک میں نے اسے خود قریب آنے کا اشارہ نہیں کیا۔ مورپنکھ کے ایک پھیلے ہوئے پودے کے پیچھے 'پتھریلی بینچ' پر ہم دونوں کے درمیان مکالمہ ہوا۔ فرمان نے بتایا کہ ڈانگا سنگھ کی کوٹھی سے میں نے کل جو پیغام بھیجا تھا وہ بابو لیاقت کو مل گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہنگاموں کے سبب بابو صاحب نے تمام ملازموں کو چھٹی دے کر فیکٹری کو عارضی طور پر تالا لگا دیا ہے اور وہ خود کسی نامعلوم مقام پر منتقل ہو گئے ہیں۔ فرمان علی کی باتوں سے مجھے یہ اشارہ بھی ملا کہ رحمت بانو کے نکل جانے کے بعد سے بابو لیاقت سخت پریشان ہے۔

فرمان علی یہاں اپنے ایک زخمی ساتھی کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ یہ شخص بابو لیاقت کی بیٹھک میں ہونے والی فائرنگ میں زخمی ہوا تھا فرمان علی سے مل کر میرا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ فرمان علی ایک بلیکسین کار میں یہاں آیا تھا۔ یہ ڈگی والی کار تھی۔ میں ڈگی میں چھپ کر باآسانی ڈانگا سنگھ کے ڈیرے تک پہنچ سکتا تھا۔ بس ضرورت اس امر کی تھی کہ اپنے تعاقب سے ہوشیار رہا جائے۔

جونہی کرفیو میں وقفہ شروع ہوا، ہم اسپتال سے نکل آئے۔ اسپتال سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور آ کر فرمان علی نے گاڑی روکی اور اپنا کولٹ پسٹل مع تین عدد میگزین کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے ڈگی کھولی اور سٹ سمٹا کر اس میں لیٹ گیا۔۔۔ قریباً پون گھنٹا محو سفر رہنے کے بعد کار ایک جگہ رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد ڈگی کے تالے میں چابی گھومی اور فرمان نے ڈھکنا اوپر اٹھا دیا۔

شام کے سات بجنے والے تھے۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ رہائشی علاقے کی ایک تنگ سی سڑک تھی۔ پچاس ساٹھ گز دور ایک مدھم سی اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ میں نے دیکھا کہ فرمان کے چہرے پر ہیجان کے آثار ہیں۔

"کیا بات ہے؟ یہاں کیوں رک گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

فرمان کانپتی آواز میں بولا۔ "غضب ہو گیا جانی صاحب۔۔۔ بہت بری خبر ہے ہمارے لیے۔"

"کچھ بکو بھی۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"ڈانگا سنگھ، مت سنگھ اور ان کے تمام ساتھی قتل ہو گئے ہیں۔" فرمان نے دھماکا خیز انکشاف کیا۔ میں سکتے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ فرمان نے کہا۔ "ڈانگا سنگھ کی کوٹھی کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہیں۔ پولیس کی دو بڑی گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔ میرے سامنے اندر سے دو لاشیں باہر لائی گئی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ دو بندے گردوارا اسٹاپ کے قریب بھی مارے گئے ہیں۔"

جیسے سیاہ بادلوں میں بجلی کا کوندا لپکتا ہے، میرے ذہن میں شنکر شکرا کا نام چمکا اور تن بدن میں شعلے بھڑک اٹھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شنکر شکرا کا کام ہے۔ میں نے فرمان سے پوچھا۔ "کتنی دور ہے کوٹھی یہاں سے؟"

وہ بولا "ہم کوٹھی کے ساتھ والی گلی میں کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ سامنے جو اسٹریٹ لائٹ ہے اس کے پاس سے راستہ نکلے گا۔"

فرمان نے ایک کمبل نما چادر مجھے اسپتال میں ہی مہیا کر دی تھی۔ میں نے اس چادر کو سر کے اوپر سے گزار کر اس طرح لپیٹا کہ نصف چہرہ چھپ کر رہ گیا۔ بھرا ہوا کولٹ پسٹل میرے کوٹ کی جیب میں تھا۔ گاڑی کو لاک کر کے میں اور فرمان علی کوٹھی کی طرف بڑھے۔ سرد ہوا گلی کوچوں میں فراٹے بھر رہی تھی اور اعلان کر رہی تھی کہ فرید کوٹ ایک اور طویل اور یخ بستہ شب کے جنگل میں بھٹکنے والا ہے۔ تین چار منٹ میں ہم اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے جہاں کل صبح مجھے اور شکورے کو پولیس والے حفاظت کی غرض سے لائے تھے اور جہاں کل رات ڈانگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے "جشن رہائی" منایا تھا۔ آج اس کوٹھی کے سامنے بیسیوں افراد نظر آ رہے تھے۔ ہر چہرے پر سنسنی اور حیرانی تھی۔ ہمارے پہنچتے ہی ایک ایمبولنس سائرن بجاتی نمودار ہوئی اور کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ تماشائی کوٹھی کے اندر تک موجود تھے۔ ہم بھی دھکم پیل کر کے اندر پہنچ گئے۔ پورچ میں رائفل بردار سپاہی کھڑے تھے اور لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے۔ پورچ کی روشنی میں مجھے کئی جگہ خون کے دھبے نظر آئے۔ یہ دھبے داخلی دروازے کی سیڑھیوں اور پورچ کے فرش پر زیادہ نمایاں تھے۔ ہمارے سامنے ہی مت سنگھ کی لاش باہر لائی گئی۔ لاش بستر کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ مت سنگھ کے چہرے پر گولیوں کے کئی نشان تھے۔ یہ وہی مت سنگھ تھا جو کل رات بڑے جوش و خروش سے مجھے مشورے دے رہا تھا اور پُریقین تھا کہ فرید کوٹ میں شنکرا اور اس کے

ساتھیوں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ چند روز پہلے جیل سے رہا ہوا تھا اور آج "زندگی" سے رہا ہو گیا تھا۔ انسان ترقی کی منازل طے کر کے بہت دور تک دیکھنے لگا ہے لیکن مستقبل کا لمحہ اس کی نگاہ سے اسی طرح اوجھل ہے جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شنکر میری طرف سے مایوس ہونے کے بعد ڈانگا سنگھ وغیرہ پر چڑھ دوڑے گا تو میں اسے کنوئیں میں گرا کر راہ فرار کیوں اختیار کرتا۔

مت سنگھ کی لاش دیکھ کر میری نگاہوں میں ڈانگا سنگھ اور اس کے دیگر ساتھیوں کے چہرے گھوم گئے۔ ہنستے مسکراتے چہرے، جو کل تک مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلا رہے تھے، آج گولیوں سے چھلنی ہو کر پولیس سرجن کے تیز دھار نشتر کی زد میں آ گئے تھے۔ بلاشبہ وہ بدمعاش لوگ تھے۔ انہوں نے اچھے برے سبھی طرح کے کام کیے تھے لیکن انہیں جو سزا دی گئی تھی وہ بدمعاشی کی نہیں میری حمایت کرنے کی سزا تھی۔ اور سزا دینے والا منصف نہیں وہ بدترین مجرم تھا جو ایک عرصے سے خود کو خدائی فوجدار سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اس تازہ زخم نے میرے ایک اور نیم تازہ زخم سے بھی کھرنڈ اتار دیے۔ لشکر خاں کے ساتھیوں کی خونچکاں لاشیں میری نگاہوں کے سامنے ناچنے لگیں۔۔۔ ڈوبے دشت کے اس ویرانے میں لگنے والا "موت میلہ" اپنی پوری سج دھج کے ساتھ میرے تصور کی زینت بن گیا۔۔۔ اور وہ معصوم بچہ، وہ ننھی بشارت جسے زہریلے دھوئیں سے بھری ہوئی سرنگ میں ایک سانس کے لیے ترسایا گیا۔ اس کی سوال پوچھتی ننھی ننھی آنکھیں وہ زہر آلود تیروں کی طرح میرے کاسۂ سر میں پیوست ہو گئیں۔ مجھے سب یاد تھا۔ میں کچھ بھولا نہیں تھا۔ دشمنی کے رجسٹر پر ظلم اور انتقام کے کھاتوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب میرے حافظے میں تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ شنکر کی طرف سے مجھ پر بہت سا قرض چڑھ گیا ہے۔ اب حساب بے باق کرنا ضروری تھا۔۔۔ بہت ضروری تھا۔

میرا زیادہ دیر موقعے پر رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے فرمان علی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "میں واپس گاڑی میں جا رہا ہوں۔ تم تفصیل معلوم کر کے آؤ۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی چابی میرے حوالے کر دی۔ میں نے چہرے پر چادر درست کی اور کوٹھی سے نکل کر گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

نیم تاریک گلی میں مجھے تقریباً نصف گھنٹا کار میں بیٹھنا پڑا۔ آخر کار فرمان علی پہنچ گیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ وہ سردی اور جذباتی کیفیت کے سبب کپکپا رہا تھا۔ اس نے کہا "جناب! حالات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ شنکر شکرا صاحب کا کام ہے اور حملہ کرنے والوں میں شنکر صاحب خود بھی شامل تھے۔ حملہ پانچ بجے کے لگ بھگ ہوا ہے۔ حملہ آور دو گاڑیوں میں سوار یہاں پہنچے تھے۔ ایک اسٹیشن ویگن تھی اور دوسری پک اپ۔ دونوں گاڑیاں مقامی اسپتال کی تھیں اور پتا چلا ہے کہ انہیں بڑے ڈاک خانے کے پاس سے چھینا گیا تھا۔ حملہ آور خودکار رائفلوں سے مسلح تھے اور ان میں سے اکثر نے چہرے چھپا رکھے تھے۔ محلے والوں نے جو بیان دیے ہیں ان کے مطابق حملہ آور گیٹ پھاند کر اندر داخل ہوئے اور پھر چند ہی لمحے بعد فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سلسلہ مشکل سے تین چار منٹ تک جاری رہا۔ پھر حملہ آور دو افراد کو مارتے اور دھکے دیتے ہوئے باہر لائے اور انہیں ساتھ لے کر گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ لیکن گردوارا اسٹاپ کے قریب ان دونوں افراد نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ ایک ٹریفک سگنل پر وہ ایک ساتھ گاڑی سے کودے اور اسٹاپ کی طرف بھاگے مگر ابھی پندرہ بیس قدم ہی دور گئے ہوں گے کہ رائفل کے ایک ہی برسٹ نے ان دونوں کو ڈھیر کر دیا۔ اس فائرنگ میں ایک راہ گیر بھی شدید زخمی ہوا ہے۔"

میں نے آزردہ لہجے میں پوچھا۔ "ڈانگا سنگھ کے ساتھیوں میں سے کوئی بچا بھی ہے یا نہیں؟"

وہ بولا "ایک سکھ لڑکا ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ حملہ کرنے والے شنکرا اور اس کے ساتھی ہیں۔ یہ بیان اس نے پولیس کے سامنے نہیں، عام لوگوں کے سامنے دیا ہے۔ اب پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے لیکن وہ موقعے سے غائب ہو چکا ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ شنکر کو میرے اور ڈانگا سنگھ کے تعلق کی خبر اس موٹر رکشا سے ہوئی ہے جس میں شکورا اور میں گردوارے پہنچے تھے اور جو بعد میں ٹائر برسٹ ہونے سے الٹ گیا تھا لیکن بعد میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میں اس بارے میں تفصیل آگے چل کر بیان کروں گا۔۔۔ بہرطور صورت حال یوں بنی تھی کہ میرے ہاتھوں زک اٹھانے کے بعد شنکر دیوانہ ہو رہا تھا۔ جونہی اسے میرے اور ڈانگا سنگھ کے تعلق کا علم ہوا وہ آتش فشاں کی طرح کھول اٹھا تھا۔ اس نے میری تلاش میں فوراً ڈانگا سنگھ کی کوٹھی پر چڑھائی کر دی تھی۔ اسپتال میں رک جانے کے سبب میں تو کوٹھی میں نہیں پہنچ سکا تھا ہاں وہاں باقی لوگ موجود تھے۔ لہٰذا وہ شنکر کے بدنام

زمانہ قہر و غضب کا نشانہ بنے تھے۔ شنکر نے اس خیال کے تحت کہ ڈنگا سنگھ کے ساتھیوں میں سے کوئی میرے بارے میں اہم اطلاع دے سکتا ہے' دو افراد کو زندہ پکڑ لیا تھا اور اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ ان دو افراد نے شنکر کی دہشت کے سبب نکل بھاگنے کی کوشش کی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینکا۔ میری گردن سوج چکی تھی اور اسے پھیرنے میں سخت دقت ہوئی تھی۔ میں نے بامشکل فرمان علی کی طرف رخ کیا اور اس سے کہا کہ وہ ڈکی کھولے' وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "مجھے بابو لیاقت کے پاس لے چلو۔"

وہ بولا "بابو لیاقت تو اس وقت گھر پر ہوں گے اور مجھے گھر جانے کی اجازت نہیں۔" پھر ذرا رک کر بولا "میں کیا' بیٹھک میں رہنے والا کوئی بھی ملازم ان کے گھر نہیں جا سکتا۔"

"لیکن میرا بابو سے ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

فرمان علی میرے چہرے پر غضب کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ بابو لیاقت جیسے جاندیدہ شخص کا نوکر تھا۔ بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ لرزاں آواز میں بولا "کک ___ کہیں ___ آپ شنکر صاحب کی طرف تو جانا نہیں چاہتے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ چند لمحے گم صم رہا پھر کہنے لگا۔ "آپ کا اس جگہ جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے یہ بات جس انداز سے کہی تھی وہ انداز مجھے سمجھا گیا کہ فرمان علی شنکر کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ اس کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دیتا۔ میں نے پہلے اسے نرمی سے سمجھایا کہ وہ مجھے شنکر تک لے چلے لیکن جب اس نے اپنے مالک یعنی بابو لیاقت کے خوف سے پلہ چھڑانے کی کوشش کی تو میں نے اسے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ مجھے ہر صورت ہر قیمت پر شنکر تک پہنچنا ہے اور اسی وقت پہنچنا ہے۔ اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا کروں گا۔

میرے ارادے کی پختگی اور لہجے کی سختی نے فرمان علی کو سمجھا دیا کہ اگلے پانچ دس منٹ میں میں اس کی گردن پر پستول بھی رکھ سکتا ہوں اور طیش میں آ کر پستول چلا بھی سکتا ہوں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "بے وقوف بھی وہی کرتا ہے جو عقل مند کرتا ہے لیکن کئی ٹھوکریں کھانے اور بہت سا وقت ضائع کرنے کے بعد۔" فرمان علی عقل مند تھا لہٰذا اس نے خواری بسیار سے پہلے ہی سیدھا راستہ پکڑ لیا اور مجھے ناک کی سیدھ میں شنکر کے ٹھکانے پر لے گیا۔ کرفیو کا وقفہ ختم ہو چکا تھا لیکن ہم چونکہ ایسے علاقے میں سفر کر رہے تھے جہاں کرفیو نہیں تھا۔ لہٰذا راستے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میرے لئے ڈکی میں سفر کرنا بہتر تھا لیکن اس اندیشے سے کہ فرمان علی کوئی گڑبڑ نہ کرے' میں کار کے اندر ہی رہا۔

شہر کے مضافات میں پہنچ کر کار ایک درمیانے سائز کی عمارت کے سامنے رکی۔ یہ کوئی سرکاری عمارت نظر آتی تھی۔ پیشانی پر ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا "مصالحتی عدالت نمبر دو" نیچے لکھا تھا "زچہ و بچہ سینٹر' بچوں کو حفاظتی ٹیکے مفت لگوائیں" فرمان علی نے کہا "یہ دفتر اوباش کانگریسی کارکنوں کا اڈا ہے۔ سینٹر کی آڑ میں بہت سی بدمعاشیاں یہاں ہوتی رہی ہیں۔ آج کل شنکر اور اس کے ساتھی یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ پولیس کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔"

فرمان علی نے کار "سینٹر" سے تقریباً سو قدم کی دوری پر روکی تھی۔ وہ کافی ہراساں نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا "فرمان علی! میں تمہیں یا بابو لیاقت کو اس معاملے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔ جو تعاون تم نے کیا ہے اس کے لئے شکریہ۔ اب تم واپس جا سکتے ہو۔"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر بولا "نہیں' جمالی صاحب! آپ بابو صاحب کے مہمان ہیں تو ہم سب کے مہمان ہیں۔ میں آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں یہاں گاڑی میں آپ کا انتظار کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم' آپ اندر کیا کرنے جا رہے ہیں لیکن ایک بات میں آپ سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شنکر صاحب بہت خطرناک شخص ہے۔ آپ کو تن تنہا اس کے اڈے پر نہیں جانا چاہئے۔"

یہ بات فرمان علی پچھلے آدھے گھنٹے میں کئی بار کہہ چکا تھا لہٰذا میں نے اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ کوٹ کی جیب سے مشہور زمانہ کولٹ 45 نکال کر میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے دو فالتو میگزین میرے کوٹ کی بائیں جیب میں موجود تھے۔ میں نے گرم چادر اتار کر کار کی نشست پر رکھ دی اور "سینٹر" کی طرف چل پڑا۔

یہ آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ تیز ہوا بادل کھینچ کر لے آئی تھی اور آسمان گھٹا ٹوپ تاریکی میں چھپ چکا تھا۔ سینٹر کے ارد گرد کافی فاصلے تک سڑک خالی تھی۔ اس کے بعد اکا دکا مکانوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ سینٹر کا آہنی گیٹ بند

تھا۔ میں نے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے سن گن لی۔ اندر کہیں ٹیلی وژن چل رہا تھا۔ چند کھڑکیوں اور مین گیٹ کے سوا تمام عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ احاطے میں رکھوالی کا کتا بھی موجود ہے۔ لیکن چونکہ کمروں میں بند تھے لہٰذا یہ ممکن تھا کہ کتا کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔

احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں کتے کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین کر لوں لیکن میرے سینے میں جو آگ روشن تھی وہ مجھے ایک لمحہ تاخیر کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ بلکہ اس وحشت ایک تند بگولے کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور مجھے اڑائے لئے جا رہی تھی۔ میں نے جست لگا کر چھ فٹ اونچی باؤنڈری وال پھلانگی اور احاطے میں پہنچ گیا۔ میرا اندیشہ درست نکلا۔ احاطے میں کتا موجود تھا۔ وہ گھنے بالوں والا سینٹ برنارڈ کسی شیر ہی کی طرح جسیم تھا۔ وہ گیٹ کے قریب بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ بالکل پتھریلے مجسمے کی طرح۔ مجھے دیکھنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھا رہا جیسے حیران ہو کہ اس کی موجودگی میں کس کو یہ جرأت ہوئی کہ دیوار پھاند کر اندر چلا آئے۔ پھر وہ آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی دم نے دھیرے دھیرے حرکت شروع کی اور حلق سے ایک دھیمی مسلسل غراہٹ برآمد ہونے لگی۔ اب وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جست کرنے والا تھا۔

وہ ایک شاندار کتا تھا۔ اس کے سر میں دو گولیاں اتار کر مجھے افسوس ہوا' دھماکوں سے شب کا سکوت چکنا چور ہو گیا۔ کتا دو فٹ اوپر اچھلا اور پٹ سے گر کر ساکت ہو گیا۔ میں دوڑتا ہوا عمارت کے داخلی دروازے پر پہنچا۔ یہ جالی دار دروازہ تھا۔ نیم روشن راہداری میں مجھے ایک شخص دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی اسلحہ نما شے تھی اور وہ بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں داخلی دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا اور گھوم کر عمارت کے پہلو میں پہنچا۔ یہاں ایک بند دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند تھا لیکن جب ساتھ والی روشن کھڑکی کو دھکیلا تو وہ کھل گئی۔ ایک سریلی چیخ سنائی دی۔ اس چیخ کی گونج ختم ہونے تک میں چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر اندر کود چکا تھا۔

چھوٹے بلب کی روشنی میں ایک بستر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ مخمل کے گہرے نیلے لحاف میں ایک اجلا چہرہ ابھرا۔ دوسری چیخ گونجی اور چہرہ پھر لحاف میں غائب ہو گیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ یہ ہنساں کا چہرہ تھا۔ وہی چمکیلے دانتوں اور خوب صورت مسوڑوں والی ہنساں جو صرف ایک دن پہلے پوری رات میرے کمرے میں رہی تھی ___ اس وقت روڈ ڈنگا سنگھ کی چہیتی تھی' آج ڈنگا سنگھ کے قاتل شنکر کے ڈیرے پر تھی۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد ہنساں پھر لحاف میں غوطہ زن ہو گئی تھی۔ اب صرف اس کی چیخیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی۔ اس کی چیخوں کا یہ اثر ہوا کہ ملحقہ باتھ روم کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک سردار صاحب یوں اندر داخل ہوئے کہ انہوں نے الٹی بنیان پہن رکھی تھی اور دھوتی بھی پوری طرح باندھی نہیں گئی تھی۔ غالباً وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے باتھ روم میں گھسے تھے کہ یہ افتاد آن پڑی تھی۔ پہلے انہوں نے میرے پسٹل کے دو فائر سنے تھے اور پھر ہنساں کی چیخوں نے انہیں بھوزی ڈال دی تھی۔ جونہی وہ دھوپ میں نکلنے والی چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے' میں نے پسٹل کی سرد نال ان کے سر سے لگا دی۔ سردار صاحب سکتے میں رہ گئے۔ انہوں نے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور کہے سنے بغیر ہی دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

سردار صاحب کے باہر نکلنے اور ہینڈز اپ ہونے میں جو وقت صرف ہوا اس مختصر وقت سے ہنساں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لحاف سمیت بستر سے اٹھی اور باتھ روم میں گھس کر اندر سے کنڈی چڑھالی۔

میرے نشانے پر آنے والا سردار اچھا خاصا جسیم اور خطرناک صورت والا شخص تھا لیکن مجھے پہچاننے کے بعد تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اتنے میں دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ پھر ایک شخص کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "گوپا صاحب! کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں ___ انہوں نے کتا بھی مار دیا ہے۔ گوپا صاحب ___ گوپا صاحب۔"

میں نے پسٹل کی نال بے دردی سے گوپا سنگھ کی گردن میں دھنسائی اور سرگوشی میں کہا "کتے کی طرح تو بھی مرے گا۔ ورنہ جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔"

"کک ___ کیا کروں۔" وہ منمنایا۔

"اپنے بندے کو آواز دو کہ تم ابھی آ رہے ہو۔"

گوپا سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "میں ابھی آتا ہوں۔"

دروازے کے قریب سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں جن سے اندازہ ہوا کہ گوپا سنگھ کو پکارنے والے وہاں سے چلے گئے ہیں۔ باتھ روم کے اندر ہنساں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے صرف اس کا چہرہ دیکھا تھا لیکن کمرے میں اس کا بکھرا ہوا لباس دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ مخملی

لحاف ہی اس کا اوڑھنا تھا اور وہی پہناوا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ پسٹل کی نال اتنی زور سے گراہا سنگھ کی گردن میں گھسیڑوں کہ وہ جلد پھاڑ کر شہ رگ میں گھس جائے اور گراہا سنگھ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچے۔ لیکن اپنی ضرورت کے لئے میں اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھا۔ اس مختصر وقت میں یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی چکا تھا کہ ششکر شنکرا اس عمارت میں موجود نہیں ہے اور اس وقت یہ ـــــ گراہا سنگھ ہی یہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ عمارت میں داخل ہونے کے بعد میرے ہاتھوں سب سے پہلے گراہا سنگھ کے "نصیب" ہی کھلے تھے۔

میں نے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے بھی کنڈی چڑھا دی اور پسٹل کی نال سے گراہا سنگھ کو دھکیل کر بستر پر پھینک دیا۔

"شنکر کہاں ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"و ـــــ وہ یہاں نہیں ہے۔ قا ـــــ قادر زماں صاحب کے ساتھ فاضلکا گئے ہیں۔"

میرے لیے یہ اہم اطلاع تھی کہ قادر زماں بھی یہیں پایا جاتا ہے۔ میں نے پسٹل کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا "کب آئیں گے وہ؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا جمالی صاحب ـــــ مم ـــــ میرا خیال ہے کہ وہ ایک دو گھنٹے میں ـــــ"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ صرف تین گھنٹے پہلے شنکر فرید کوٹ میں تھا اور اس نے ڈنگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کیا تھا۔ اگر وہ پانچ چھ بجے کے بعد فرید کوٹ سے روانہ ہوا تھا تو صبح سے پہلے واپس نہیں آسکتا تھا۔ یا تو وہ فاضلکا گیا ہی نہیں تھا یا اسے صبح واپس آنا تھا۔

میں نے گراہا سنگھ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "دیکھو گراہا، میری بات بڑے غور سے سنو ـــــ مجھ پر خون سوار ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس چار دیواری میں موجود ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، اور تم بھی ان میں شامل ہو لیکن ایک صورت ـــــ صرف ایک صورت میں میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔"

"کیسے؟" گراہا سنگھ کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ میرا لہجہ اسے بہت تاثر دے رہا تھا اور یہی وہ لہجہ تھا جو بے حد سنگین لمحات میں میری "موت" بن جایا کرتا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تمہارا نام گراہا سنگھ ہے نا، تم سلطانی گواہ سنگھ بن جاؤ۔"

"سنگھ ـــــ کیا مطلب؟"

"جو میں پوچھتا ہوں، بتاتے جاؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں چھوڑ دوں گا۔" گراہا سنگھ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس نگاہ میں موت کی دہشت اور زندگی کی طلب تھی ـــــ گراہا سنگھ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کسی بھی شرط اور کسی بھی قیمت پر۔ ابھی نجانے کتنے لحاف تھے اسے کیے اور ریشمی لحات درکار تھے۔ ابھی وہ مزید شراب پینا چاہتا تھا، فرید کوٹ کی گلیوں میں کچھ عرصہ اور دندنانا چاہتا تھا۔ ابھی رنگین محفلوں، دل پسند فراغتوں اور سنگین ہنگاموں کے حوالے سے اس کی بھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نیم نگاہ کولٹ 45 کی خوفناک سیاہ نال پر جمی تھی اور جسم کا انگ انگ چیخ رہا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ بے زبان خاموشی کہہ رہا تھا "جمالی استاد! بے شک مجھ سے جرم سرزد ہوا ہے۔ میں نے شنکر صاحب کے ساتھ مل کر تمہارے ساتھیوں کو مارا ہے، ان کے جسم گولیوں سے چھلنی کیے ہیں، لیکن ـــــ اس یخ رات کے سنسان اندھیرے میں شنکر میری جان بچانے کے لئے موجود نہیں ہے۔ میں اس کا وفادار رہوں لیکن وفاداری کیسی بھی ہو زندگی سے بڑھ کر قیمتی نہیں اور میری زندگی تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ مجھے زندگی کی خاطر نمک حرام، غدار اور بے غیرت بننا منظور ہے۔ تم مجھے "سلطانی گواہ" کہو گے تو یہ تمہارا حسنِ کلام ہو گا۔ بہرطور تم جو کچھ پوچھو گے وہ میں بتاؤں گا، تم جو کہو گے، وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔"

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر خشک تر زبان پھیری اور مینڈک جیسی ٹرائی ہوئی آواز میں بولا "جمالی صاحب! آپ پستول جیب میں رکھ لیں۔ مم ـــــ میں آپ کو وشواس دلاتا ہوں کہ ـــــ کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔"

گراہا سنگھ کے اندر مزاحمت کی دیوار گر چکی تھی اور اس دیوار کے ملبے سے یہ فقرہ دھول کے مانند اڑ کر اس کی زبان تک آیا تھا ـــــ میں نے پسٹل کی نال جھکائی اور اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ باہر سے ابھی تک بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند لمحے بعد پھر کوئی شخص دروازے پر دستک دینے لگا۔ میں نے ایک صوفے کی آڑ لے کر گراہا سنگھ کو نشانے پر رکھ لیا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی کھول کر اپنے ساتھی کو تسلی کرا دے اور اسے کہے کہ وہ ابھی باہر نہیں آسکتا۔ گراہا کو یہ ہدایت جاری کرنے سے پہلے میں نے کمرے کی بتی بھی بجھا دی تھی۔

گراہا سنگھ نے میری ہدایت پر من و عن عمل کیا۔ وہ جانتا

تھا کہ میرا نشانہ چوکے گا نہیں اور نہ ہی میں گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر کروں گا۔ معلوم نہیں کھڑکی میں آکر گراہا سے بات کرنے والا مطمئن ہوا یا نہیں لیکن واپس چلا گیا۔ میں نے کھڑکی دوبارہ بند کروا دی۔

"اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ شنکر اور قادر زماں کہاں ہیں اور کب تک آئیں گے؟" میں نے گراہا سے پوچھا۔

اس نے کہا "وہ فاضلکا ہی گئے ہیں جی! لیکن ان کی واپسی کے بارے میں ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ آشا یہی ہے کہ وہ کل دوپہر سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔"

میں نے پوچھا "اس بلڈنگ میں کتنے بندے ہیں اور کیا کیا اسلحہ ہے ان کے پاس؟"

گراہا کی اطلاع کے مطابق عمارت میں ہنساں سمیت کُل آٹھ نفوس تھے۔ اسلحے کے بارے میں بھی تفصیل اس نے بتا دی۔

میں نے کہا "ہسپتال کی وہ گاڑیاں کہاں ہیں جن پر واردات کی گئی ہے؟"

"پچھلے احاطے میں کھڑی ہیں جی۔" گراہا سنگھ نے اعتراف کیا "ایک بڑی وین ہے اور دوسری پک اپ۔"

"تم وین میں تھے یا پک اپ میں؟" میں نے پوچھا۔

"وین میں" گراہا سنگھ نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی تسلیم کر لیا کہ وہ قاتلوں میں شامل تھا۔

میں نے پوچھا "تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ ڈنگا سنگھ سے میرا رابطہ ہے؟"

گراہا سنگھ کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن جواب تو اسے دینا ہی پڑا۔ سلطانی گواہ جو تھا۔ اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ بولا "یہ اطلاع ہنساں لے کر آئی تھی۔ وہ پیسے کی بھوکی ہے۔ جہاں سے اور جیسے بھی پیسہ ملے لے لیتی ہے۔"

"کتنے پیسے ملے تھے اسے شنکر سے؟"

"مجھے صرف پانچ ہزار کا پتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شنکر یا قادر صاحب نے بعد میں بھی دیے ہوں۔"

میں نے پوچھا "ہسپتال کی چرائی ہوئی گاڑیوں کے علاوہ بھی یہاں کوئی گاڑی موجود ہے؟"

"سینٹر کی ایک گاڑی ہے لیکن اس میں پٹرول نہیں۔"

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا "گراہا سنگھ تم سب سے پہلا کام یہ کرو کہ ہنساں کو غسل خانے سے باہر نکالو ـــــ اور اسے قتل کر دو۔"

"قق ـــــ قتل" وہ ہکلایا، کوئی گولہ سا جیسے اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔

میں نے کہا "اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ قتل کرنا تمہارے لئے کوئی نئی بات نہیں، ابھی چار گھنٹے پہلے تم نے پانچ چھ قتل کیے ہیں۔"

"لیکن ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ کیونکہ۔"

"کوئی "چونکہ چنانچہ" نہیں" میں نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔ "اگر تم میرے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتے تو تمہیں اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں مارنا ہو گا ـــــ چلو شاباش جلدی کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔" کل شب ہنساں کا کھسیانا چہرہ دیکھ کر میرے دل میں اس کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا لیکن آج پورے دل کے ساتھ ساتھ اس گوشے میں بھی نفرت بھری ہوئی تھی۔

میں نے کولٹ پسٹل ایک بار پھر ہاتھ میں لے لیا۔ گراہا سنگھ کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چند لمحے بعد وہ مری مری آواز میں بولا "لیکن وہ باہر کیسے نکلے گی۔"

"اس کا تو باپ بھی نکلے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا "تم میٹھے میٹھے لہجے میں پیار سے بلاؤ گے تو کیوں نہ آئے گی۔ اسے بتاؤ کہ جمالی استاد کو قابو کر لیا گیا ہے۔ اب کوئی ذرہ خطرہ نہیں۔ وہ آئے اور لحاف کو رونق بخشے۔"

ہم یہ باتیں سرگوشیوں میں کر رہے تھے۔ ویسے بھی باتھ روم کا دروازہ فاصلے پر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری آوازیں ہنساں کے کانوں تک نہیں پہنچ رہیں۔ میرے تیور دیکھ کر گراہا سنگھ کو اٹھنا پڑا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "خبردار کوئی آواز پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ بس گلا گھونٹو اور قصہ تمام کرو۔"

گراہا سنگھ کی آنکھوں میں ایک بار پھر التجا کا رنگ ابھر آیا۔ مجھے لگا کہ وہ ہنساں کے لئے رحم کی درخواست کرنا چاہتا ہے لیکن میری آنکھوں میں اٹل ارادے کی جھلک دیکھ کر اسے دروازے پر دستک دینا پڑی۔ اندر ہنساں رو رہی تھی۔ گراہا سنگھ نے پہلے اسے چپ کرایا اور بہلا پھسلا کر دروازہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں ایک دیوار گیر پردے کی اوٹ میں تھا اور گراہا مسلسل میرے پسٹل کی زد میں تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی لیکن جب باتھ روم کا دروازہ کھلا تو ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ ہنساں کی پنڈلیاں ننگی تھیں اور وہ ایک لمبی مردانہ قمیص میں تھی۔ یقیناً یہ گراہا سنگھ کی قمیص تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیسے پکڑا تم نے اسے؟" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

جواب میں گراہا سنگھ نے ہنساں کا گلا دبوچا اور اسے لیتے

ہوئے فرش پر گرا۔ چند لمحوں کے لئے وہ دونوں بیڈ کی اوٹ میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے صرف ہتساں کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ تڑپتے مچلتے اور اینٹھتے ہوئے پاؤں ۔۔۔ وہ پاؤں جو کل شب دعوت گناہ لے کر میرے کمرے میں پہنچے تھے' رات بھر بے سُدھ ایک صوفے پر پڑے رہے تھے اور پھر آج کسی وقت لانچ کی ڈور میں بندھ کر اس ہیلتھ سینٹر میں چلے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد پاؤں ساکت ہو گئے۔ وہ ہلکی سی خرخراہٹ اور پھڑپھڑاہٹ معدوم ہو گئی جو ہتساں کے عالم نزع کی علامت تھی۔ بیڈ کی اوٹ سے گوپا سنگھ برآمد ہوا۔ الٹی بنیان کے نیچے اس کا سینہ بُری طرح پھول پچک رہا تھا۔ اس نے اپنی دھوتی کے پلو درست کیے اور داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اسے کہا کہ وہ ہتساں کی لاش گھسیٹ کر باتھ روم میں ڈال دے۔ اس نے فوراً عمل کیا۔ ہتساں کا منتشر لباس بھی سمیٹ کر باتھ روم میں رکھ دیا۔ پانی کا نل کھول کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ ہتساں کے اونچی ایڑھی والے سرخ سینڈل دروازے کے سامنے جوڑ دیے گئے تھے۔ اب کمرے میں وارد ہونے والا کوئی نیا شخص یہی سمجھتا کہ "سینڈل والی" اشنان کرنے میں مصروف ہے۔

میں نے گوپا یعنی "سلطانی گوپا سنگھ" سے پوچھا کہ اس کے باقی چھ بندوں میں سے کتنے مسلح ہیں۔

وہ بولا "تین مسلح ہیں۔ اور باقی بھی ضرورت پڑنے پر مسلح ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "جو مسلح نہیں ہیں' ان کے نام؟" گوپا سنگھ نے نام گنوا دیے۔ میں نے حکم دیا کہ ان تینوں کو اندر بلاؤ۔

گوپا سنگھ نے کھڑکی کھول کر گوپال نامی ایک شخص کو پکارا۔ وہ آیا تو گوپا سنگھ بولا "سکھبیت اور بالے کو لے آؤ میرے پاس' فوراً۔"

گوپال واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں افراد کو کمرے میں لے آیا۔ میں دیوار گیر پردے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ تینوں افراد شکل سے جرائم پیشہ نظر آتے تھے۔ وہ کمرے میں آگئے اور گوپا نے کنڈی اندر سے بند کر دی تو میں سامنے آگیا۔ شنکر کے کارندوں نے میری صورت میں جیسے موت کا فرشتہ دیکھ لیا۔ ان کے چہروں سے خون نچڑ گیا اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"اوندھے لیٹ جاؤ۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

ان تینوں نے ایک ساتھ اپنے انچارج گوپا سنگھ کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھا اور ان کا خوف عروج پر پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد وہ یخ بستہ فرش پر اوندھے لیٹ گئے۔ میں نے گوپا سنگھ سے کہہ کر تینوں کی مشکیں کسوا دیں۔ اس مقصد کے لیے مغلر' آزاربند اور پردے کی ریشمی ڈوریاں وغیرہ استعمال کی گئیں۔

تینوں کو جکڑنے کے بعد باتھ روم میں ڈال دیا گیا اور باقی تینوں کو بلا لیا گیا۔ اس مرتبہ زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ پردے کے پیچھے میں پوری طرح چوکس تھا۔ غالباً بعد میں آنے والے تینوں افراد کو گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ ان تین افراد میں قادر زماں کا ایک بونا باڈی گارڈ بھی شامل تھا۔ سب سے پہلے وہی کمرے میں داخل ہوا۔ ننھا منا لیکن نہایت طاقتور پسٹل اس کے ہولسٹر میں موجود تھا۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ پستول اس کے ہاتھ میں پہنچ سکتا تھا۔ اس جانور نما انسان نے اندر پہنچتے ہی اپنے نتھنے عجیب انداز میں سکوڑے۔ اس کی چمکیلی زرد آنکھیں "آدم بو" پکار رہی تھیں۔ دو افراد تو کمرے کے اندر پہنچ گئے لیکن تیسرا ٹھٹک کر دروازے پر رُک گیا۔ اس کا ہاتھ خودکار رائفل پر جما ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ آئندہ چند لمحوں میں یہ شخص میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ پردے کی اوٹ سے مجھے سب کچھ نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک دم پکار کر کہا "خبردار! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

دروازے میں رک جانے والے شخص نے فوراً رائفل سیدھی کی لیکن میں اس سے بہت پہلے فائر کر چکا تھا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور وہ مُردہ چھپکلی کی طرح گوپا سنگھ کے قدموں میں گرا۔ اس کا انجام دیکھ کر باقی دونوں افراد سکتے میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا جب میں پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا تو انہوں نے ہاتھ بلند کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی ۔۔۔ معرکہ سر ہو چکا تھا۔

یہ تمام کارروائی محکمۂ صحت کے جس مرکز میں ہوئی وہ بابو لیاقت کی سرائیکس فیکٹری سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شنکر اور قادر زماں کے "گرفتار شدہ" کارندوں کو بابو کی فیکٹری میں لے جاؤں۔ گوپا سنگھ سمیت چھ افراد پر قابو پانے اور ان کی مشکیں کسنے کے بعد میں نے فرمان علی کو بھی اندر بلا لیا۔ وہ ایک عدد زنانہ لاش' ایک عدد مردانہ لاش اور چھ جکڑے ہوئے افراد کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بات تھی بھی ششدر ہونے کی۔ شنکر شکرا کے کچھار میں گھس کر میں نے یہ کارروائی تن تنہا کی تھی۔ جس بندے کو میں نے راہی عدم کیا تھا اور جن چھ افراد کو رسیوں سے جکڑا تھا وہ معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں سے ہر ایک بدمعاشی

کے میدان کا سپر اسٹار تھا اور ان سپر اسٹارز کا "چاند" گوپا سنگھ تھا۔ میں شاید گوپا سنگھ کی صحیح تصویر پیش کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ وہ ایک ایسا شخص تھا کہ اسے غصے میں دیکھ کر کسی بھی عام آدمی کی گھگی بندھ سکتی تھی لیکن مجھے اس کمرے میں دیکھ کر اسے اپنی موت اتنی یقینی نظر آنے لگی تھی کہ وہ کئی موقعوں پر بذات خود لرزے کے بخار کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ یہ سب اس نیلی آگ کا کرشمہ تھا جو میرے سینے میں روشن تھی اور جس کی تپش میرے لہجے کے راستے میرے حریفوں کے جسم میں اتری تھی اور ان کا لہو خشک کر گئی تھی۔

گوپا سنگھ کے بیان کے عین مطابق عمارت کے پچھواڑے سرکاری اسپتال کی مسروقہ گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک ویگن نما گاڑی محکمۂ صحت کے مرکز کی بھی تھی۔ میں نے گاڑی کا معائنہ کیا تو اندر سے خوشبو اڑتی محسوس ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ مرکز کے کرتا دھرتا اس گاڑی کو سیر سپاٹے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مریضوں کے بجائے یہ سرکاری گاڑی مریضانِ عشق کے استعمال میں رہتی تھی۔ عقبی نشستوں پر کچھ ڈاکٹری آلات بے ترتیب پڑے تھے۔ غالباً زچگی کے کسی ہنگامی کیس میں استعمال ہوئے تھے اور یہاں پھینک دیے گئے تھے۔ فرش پر گتے کے کچھ ڈبے رکھے تھے۔ ان میں حفاظتی ٹیکوں کی سیکڑوں شیشیاں تھیں۔ انہیں بے دردی سے یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے بہت سی ٹوٹ چکی تھیں۔ میں نے فرمان علی سے کہا کہ وہ کوئی پائپ ڈھونڈے اور اپنی گاڑی کا کچھ پیٹرول اس گاڑی میں منتقل کر دے۔

جس دوران فرمان نے اپنی کار سے ویگن میں پیٹرول منتقل کیا میں نے گرفتار شدگان کو کمرے سے گاڑی میں منتقل کروایا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم محکمۂ صحت کی اس عمارت کو "دو صحت مند" لاشیں دینے کے بعد بابو لیاقت کی فیکٹری کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ فیکٹری کی اہم چابیاں فرمان علی کے پاس موجود تھیں۔ اگر فیکٹری مکمل طور پر بند تھی تو بھی ہم وہاں داخل ہو سکتے تھے۔ فیکٹری کی طرف جانے میں خطرہ موجود تھا تاہم اس بات کا بھی روشن امکان تھا کہ یہ صرف ہمارا خیال ہو۔ گاڑی تاریک سنسان سڑک پر بھاگنے لگی اور میرا ذہن مختلف سوچوں سے الجھنے لگا۔ رہ رہ کر زریں گل کا خیال بھی آرہا تھا۔ معلوم نہیں میرے بعد اس پر کیا گزری تھی۔ وہ بچ نکلا تھا' قابو آگیا تھا اور اگر بچ نکلا تھا تو وہ اور سندر اب کہاں تھے ۔۔۔؟

دس منٹ کے سفر کے بعد بغیر کسی خاص رکاوٹ کے ہم فیکٹری پہنچ گئے۔ فیکٹری مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ چوکیدار تک نظر نہیں آرہا تھا تاہم جب ہماری گاڑیاں گیٹ پر پہنچیں تو ایک چھوٹے سے کیبن میں روشنی ہوئی اور چوکیدار نکل کر سامنے آگیا۔ فرمان علی والی کار آگے تھی۔ چوکیدار کار کی کھڑکی میں جھکا اور فرمان علی سے چند باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ فیکٹری میں چلا گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ آتے ہی اس نے وسیع و عریض گیٹ کھول دیا۔ ہم گاڑیوں کو آگے لیتے چلے گئے۔

صرف فیکٹری کے وسطی حصے میں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ یہ دھی گھومنے والی سلنڈر نما مشینیں تھیں جو ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں۔ ان کے اندر چمڑا اور اسی قسم کا دیگر میٹریل لڑھکتا رہتا تھا اور ایک پُرشور آواز پیدا ہوتی تھی۔ اگر ان مشینوں کی گڑگڑاہٹ نہ ہوتی تو یہ تاریک اور سنسان فیکٹری کسی قبرستان کا منظر پیش کر رہی ہوتی۔ ہم ان مشینوں کے قریب سے گزرے۔ وہاں کوئی نگران یا آپریٹر دکھائی نہیں دیا۔

ہم نے گاڑیاں اندرونی حصے میں روکیں۔ فرمان علی کار سے باہر نکلا اور اس نے چابیوں کی مدد سے چند کمروں کے تالے کھول دیے۔ ہم دونوں نے گرفتار شدہ غنڈوں کو اپنے کندھوں پر لاد کر اندر پہنچانا شروع کیا۔ یہ ایک لمبوترا ہال نما کمرا تھا اور میٹنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پٹھان چوکیدار ہماری مصروفیت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ شُتر کے مانند بندھے ہوئے غنڈے بے بسی کی حالت میں ننگے فرش پر پڑے تھے اور ہماری گالیاں سن رہے تھے۔ خاص طور پر بونے باڈی گارڈ کے دیدار نے چوکیدار کو حیرت زدہ کیا۔ وہ جال میں جکڑے کسی خونخوار جانور کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

میں نے سرگوشی کے لہجے میں فرمان علی سے پوچھا "چوکیدار نے گیٹ کھولنے میں اتنا وقت کیوں لگایا؟"

"اس نے بابو جی کو ٹیلی فون کیا تھا' اجازت لینے کے لئے۔" فرمان علی نے جواب دیا۔

میں نے فرمان علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے ٹیلی فون ہی کیا تھا؟"

"کیا مطلب؟" فرمان علی نے پوچھا۔

"کہیں بابو فیکٹری میں ہی تو موجود نہیں؟"

فرمان کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ بہت دھیمی آواز میں بولا "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال' جو کچھ ہے ابھی سامنے آجاتا ہے۔"

اور پھر وہی کچھ سامنے آیا جس کی میں نے توقع کی تھی۔

بابو لیاقت فیکٹری میں ہی موجود تھا لیکن اس کی موجودگی کے بارے میں صرف چند افراد کو پتا تھا۔ وہ حسب سابق پاجامہ کرتہ اور صدری پہنے ہوئے تھا۔ تاہم آج اس کی بشاشت اور خوش دلی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ آنکھوں میں رت جگا تھا اور ہونٹ سگریٹ نوشی سے سیاہ ہو رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اس کی پریشانیوں کا سبب میں اور صرف میں تھا۔

میں نے کہا۔ "لیاقت صاحب! مجھے تو فرہان نے بتایا تھا کہ آپ کسی نامعلوم مقام پر شفٹ ہوگئے ہیں۔"

"یہی ہے وہ نامعلوم مقام۔" بابو لیاقت نے افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میرے خیال میں آپ کا یہاں رہنا خطرناک ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "آپ کا یہاں آنا بھی تو خطرناک ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا اصل نشانہ تو آپ ہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ڈنگا سنگھ وغیرہ کے بارے میں پتا چلا آپ کو؟"

اس نے افسردگی سے "ہاں" میں جواب دیا اور بولا۔ "حالات بگڑتے جارہے ہیں۔ پانچ افراد کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کل تک پورے ضلع کی پولیس حرکت میں آجائے گی۔"

میں نے کہا۔ "پانچ نہیں، سات کہیئے۔ صرف ایک گھنٹا پہلے دو لاشیں میرے ہاتھوں گر چکی ہیں۔ وہ شنکر بھارتی کے ساتھی تھے اور جو باقی بچے ہیں وہ یہ آپ کے سامنے فرش پر پڑے ہیں۔"

"وہائی گاڈ۔" بابو لیاقت کے ہونٹ انتہائی تشویش کے انداز میں سکڑ گئے۔ مجھے لگا کہ وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا ہے جب میں اس کی بیٹھک میں پہنچا تھا اور اس نے فراخ دلی سے میرے ساتھ تعاون کرنے کی ہامی بھرلی تھی۔ وہ ہاتھ پیر بچا کر کام کرنے والا سیاسی مزاج شخص تھا۔ میری "مہربانیوں" سے ایک ہی ہفتے میں اس کی "ریپوٹیشن" کے کڑاکے نکل گئے تھے۔ پہلے بیٹھک کے خونی ہنگامے میں دو افراد ہلاک ہوئے۔ پھر ارجمند جیسی خطرناک عورت چکما دے کر فیکٹری سے بھاگی اور اب میں دو جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں کے قالب میں ڈھال کر چھ عدد مغویوں کے ساتھ یہاں آدھمکا تھا۔ وہ کچھ دیر فرش پر الٹے سیدھے پڑے خطرناک غنڈوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور مجھ سے بولا۔ "جمانی صاحب! میرے ساتھ آئیں میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے فرہان علی سے کہا کہ وہ وین میں سے "گرفتار شدگان" کی چادریں اور تھیلیں نکال لائے اور یہاں ہال کمرے میں ٹھہر کر چوکسی سے ان غنڈوں کا پہرا دے۔ میں نے فرہان اور چوکیدار کو خاص طور پر بونے کی طرف سے ہوشیار کیا اور کہا کہ وہ ہر گھڑی اس پر نگاہ رکھیں۔

بابو لیاقت مجھے اپنے سجے سجائے دفتر میں لے آیا۔ یہاں ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا انبار لگا تھا۔ بابو لیاقت اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ایش ٹرے کو گھورتا رہا پھر ایک نیا سگریٹ سلگا کر اس نے چند طویل کش لیے اور بولا۔ "جمانی صاحب! میرا پیشہ وکالت ہے۔ اس پیشے میں بڑے گھاگ قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑی بڑی الٹی کھوپڑی کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن یہ حرام زادی ارجمند بانو اپنی طرح کی ایک ہی نکلی ہے۔ آپ جانتے نہیں جمانی صاحب! پالا سنگھ کتنا وفادار اور قابل بھروسا شخص تھا۔ کبھی کبھی تو اس کی وفاداری خبط کی حد کو چھو جاتی تھی۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ وہ میرے ایک اشارے پر جان دے سکتا تھا' اور ــــ اور اب بھی دے سکتا ہے لیکن اس جادوگرنی نے اسے بھی شیشے میں اتار لیا۔ میں شاید اس صدمے کو عمر بھر فراموش نہ کرسکوں ــــ"

"پالا سنگھ اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ چلا گیا' ہمیشہ کے لیے اب کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی صورت نہیں دکھائے گا مجھے۔"

"کیک ــــ کیا مطلب؟" میں نے انجانے اندیشے کے تحت پوچھا۔

"نہیں ــــ وہ زندہ ہے۔" بابو لیاقت نے وضاحت کی۔ پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "پرسوں صبح اس نے بھاری مقدار میں نیلا تھوتھا کھالیا تھا۔ بس سانس باقی تھے جو بچ گیا ــــ مسلسل رو رہا تھا۔ کہتا تھا میں اپنا جیون ختم کرلوں گا' میں نے اپنے بابو کو دھوکا دیا ہے۔ میں نے گاؤں سے اس کے والدین کو بلایا اور انہیں کہا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ جو ہونا تھا' وہ ہوگیا اب وہ خودکشی کا تماشا لگا کر میرے لیے نئی مصیبت کھڑی نہ کرے۔ والدہ کے سمجھانے بجھانے سے وہ کچھ سمجھ گیا اور پرسوں شام ان کے ساتھ گاؤں واپس چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے پاگل پن سے باز آگیا ہے لیکن آج دوپہر اس کے گاؤں کا ایک شخص میرے ڈرائیور کو یہ لفافہ دے گیا ہے ــــ"

بابو لیاقت نے میز کے نیچے کسی دراز میں ہاتھ ڈال کر موٹے خاکی کاغذ کا ایک لفافہ باہر نکال لیا۔ اس لفافے میں کوئی وزنی سی شے تھی۔ میں نے لفافہ کھولا تو اندر ایک شاپنگ بیگ میں بوٹیاں سی نظر آئیں۔ میں نے شاپنگ بیگ باہر نکال کر روشنی کی جانب کیا اور سکتے میں رہ گیا۔۔۔۔ خدا کی پناہ۔ یہ خون میں لتھڑی ہوئی انسانی انگلیاں تھیں۔ انھیں کسی مشینی نوکے یا آرے وغیرہ سے کاٹا گیا تھا۔ یہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تھیں۔ ان میں انگوٹھے شامل نہیں تھے۔ میں نے شاپنگ بیگ واپس لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔

بابو بولا۔ "دیکھا آپ نے کیسا جنونیوں والا کام کیا ہے اس پالے نے۔۔۔۔ اور یہ دیکھیے، یہ خط بھی ملا ہے اس کی طرف سے۔"

بابو نے ایک تہ کیا ہوا کاغذ جیب سے نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ پالا اَن پڑھ مزدور تھا۔ ظاہر ہے یہ خط اس نے کسی اور سے لکھوایا تھا۔ عین ممکن تھا اسی شخص سے لکھوایا ہو جو یہ خاکی لفافہ بابو کے ڈرائیور کو دے کر گیا تھا۔ چند سطور میں اس خط کا مفہوم یہ تھا۔

"بابو صاحب! آپ چاہے مجھے شما کر دیں لیکن میں اپنے آپ کو شما نہیں کر سکتا۔ خبر نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کاش میں اس "نمک حرامی" سے پہلے مر جاتا۔ آپ نے مجھے زندہ رہنے کا حکم دیا ہے، میں زندہ رہنے پر مجبور ہوں لیکن میں نے سوگند کھائی ہے کہ جیون بھر آپ کو اپنی منحوس صورت نہیں دکھاؤں گا۔ میں آج ہی فرید کوٹ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں نے خود کو ایک چھوٹی سی سزا دی ہے۔ اس لفافے میں میری کٹی ہوئی انگلیاں ہیں۔ یہ انھی بدبخت ہاتھوں کی انگلیاں ہیں جنھوں نے آپ کے لگائے ہوئے تالے کھولے تھے اور اس خوبصورت بلا کو کمرے سے باہر نکالا تھا۔ واہگرو سے رات دن یہی پرارتھنا ہے کہ مجھ بدکار کی بدکاری کے سبب آپ پر کوئی بڑی مصیبت نہ آ جائے اگر ایسا ہوا تو میں آپ کا آخری حکم ٹالنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

آپ کا مجرم پالا سنگھ"

میں نے خط پڑھ کر بابو لیاقت کو واپس کر دیا۔ بابو لیاقت سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "یقین مانئے جمالی صاحب! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ پالا سنگھ نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ کچھ عجیب سا رشتہ قائم تھا میرے اور اس کے درمیان۔ یہ صدمہ ہی میرے لیے ناقابل برداشت تھا لیکن اس عورت نے اسی پر بس نہیں کی ہے۔۔۔۔ پتا ہے اس نے یہاں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلا کام کیا کیا ہے؟" میں سوالیہ نظروں سے بابو لیاقت کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر زخمی لہجے میں بولا۔ "اس نے میری ایک عزیزہ کو اغوا کرا دیا ہے اور اب فون پر مجھے دھمکیاں دے رہی ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ ارجمند بانو اس فیکٹری سے نکلنے کے بعد چپکی نہیں بیٹھے گی لیکن وہ جوابی کارروائی کے طور پر کسی عورت کو اغوا کرا لے گی یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ "کب ہوا یہ واقعہ؟"

وہ بولا۔ "پرسوں دوپہر۔ یہاں سے نکلنے کے صرف چار گھنٹے بعد اس نے یہ کام دکھا دیا۔ رحمانہ میری بیٹی تو نہیں ہے لیکن میں اسے بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتا ہوں۔ ایک یتیم بے آسرا لڑکی ہے وہ۔ میرے گھر میں رہ رہی ہے۔ بمشکل چودہ سال کی ہو گی۔ آٹھویں میں پڑھ رہی ہے۔ اسے اسکول سے واپسی پر اٹھایا گیا ہے۔ پرسوں ہاف ڈے تھا۔ اسے بارہ بجے گھر پہنچ جانا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ ساڑھے بارہ بجے ایک ٹیلی فون آ گیا۔ یہ ارجمند بانو کی طرف سے تھا۔ یہ کال میرے منیجر مجید رانا نے سنی۔ ارجمند بانو نے بتایا کہ لڑکی رحمانہ اس کی تحویل میں ہے اور اگر چھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطالبہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو حوالے کرنے کا۔" بابو نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ "وہ جیسے نیم پاگل ہو رہی تھی۔ فون پر چیخ چیخ کر دھمکیاں دے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی، رحمانہ کو صرف وارننگ کے لیے اغوا کیا ہے۔ اس کے بعد میرے بال بچوں کی باری آ سکتی ہے اور ان کے ساتھ وہی کچھ ہو سکتا ہے جس کا کسی نے تصور نہ کیا ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ جمالی صاحب میرے پاس سے جا چکے ہیں اور اب مجھے ان کا کچھ پتا نہیں۔ لیکن وہ میری ہر بات رد کر رہی تھی۔ میں نے اس سے ایک روز کی مہلت مانگی۔ کل دو بجے یہ مہلت ختم ہو گئی۔ ارجمند بانو فون پر چیخنے چنگھاڑنے لگی۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ عورت اس معاملے میں کتنی جذباتی ہے۔ وہ اپنی عزت تک اس چکر میں لٹا چکی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو گی۔ میں نے اسے باتوں میں الجھا کر مزید ایک دن کے لیے ٹالا ہے۔ ابھی تک میرے اور منیجر مجید کے سوا اس واقعے کی کسی کو خبر نہیں۔ میں نے اپنی بیوی تک کو نہیں بتایا۔ وہ بھی دیگر گھر والوں کی طرح یہی سمجھتی ہے کہ امرتسر میں رحمانہ کے

کسی رشتے دار کا سراغ ملا ہے اور وہ منیجر مجید کے ساتھ وہاں گئی ہے۔"

میں نے بابو لیاقت کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان بڑی بڑی ذہین اور خوبصورت آنکھوں میں اخلاص کی چمک تھی۔ اس شخص کو ایک نظر دیکھ کر میں نے جان لیا تھا کہ لوگ یونہی اس کی عزت نہیں کرتے۔ کچھ گن ہیں اس میں جن کے سبب وہ پورے علاقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اب یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ایک معمولی جان پہچان والے شخص کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ میں اس کے لیے معمولی جان پہچان والا شخص ہی تو تھا۔ میری وجہ سے اس کے گھر کا ایک فرد اغوا ہو چکا تھا اور دیگر اہلِ خانہ کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ میرا دفاع کر رہا تھا۔ اسے پرسوں دوپہر سے معلوم تھا کہ میں ڈنگا سنگھ کے پاس ہوں۔ وہ ارجمند کو میرے بارے میں بتا کر اپنی ہر مشکل آسان کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی زبان بند رکھے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی ضرور تھی لیکن کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک شریف الطبع لیکن بہت بہادر اور مشکل پسند شخص نظر آیا۔ ایسا شخص جو مشکلات اور مسائل کو زندگی کا حصہ سمجھتا ہے۔ ان سے آنکھیں نہیں چراتا، مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتا ہے اور ہار جیت کے لیے اپنے سینے کو کشادہ رکھتا ہے۔

میں نے اس کے سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "۔۔۔۔ پھر اب کیا پروگرام ہے۔ کچھ کھوج ملا اس کتیا کے ٹھکانے کا۔"

"کھوج تو نہیں ملا۔" بابو لیاقت نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "لیکن ابھی ایک دو گھنٹے میں ممبئی سے ایک شخص پہنچنے والا ہے یہاں۔ معلوم ہوا ہے کہ ارجمند بانو اس کی کوئی بات نہیں ٹالتی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب ارجمند بانو کا فون آئے تو میرے بجائے وہ شخص اس سے بات کرے۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔۔۔۔ ورنہ پھر۔۔۔۔ جو کچھ ہم سے بن پڑا کریں گے ہم۔"

"کون شخص ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مجذوب ہے۔ لوگ اسی سائیں عالی کے نام سے پکارتے ہیں۔ پچھلے پچیس تیس برس سے اسٹیشن کے علاقے میں ایک ریلوے پل کے نیچے رہ رہا ہے۔ عقیدت مند بڑی بڑی کاروں میں اس تک پہنچتے ہیں اور اس کے جوتوں کی خاک ماتھے پر لگاتے ہیں۔ خاص طور پر فلمی دنیا کے لوگ اس کے بڑے مداح ہیں۔ سنا ہے آدھی رات کے بعد بڑے بڑے فلم ساز، ہدایت کار اور چوٹی کے ایکٹر عام لوگوں کے بھیس میں سائیں عالی کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کے نیاز حاصل کرتے ہیں۔"

"ارجمند بانو کا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پیر اور مریدنی کا۔" بابو نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے آپ کو بھی پتا ہو گا کہ ارجمند بانو کا اصل نام سروج ہے۔ اس کا تعلق بھی بمبئی کی فلم نگری سے ہے۔ آج سے ڈھائی تین برس پہلے تک اس پر فلموں میں کام کرنے کا بھوت سوار تھا۔ ہدایت کاروں اور فلم سازوں سے اس کے مراسم تھے۔ شکل لاکھوں میں ایک تھی اور جوانی بھی ٹوٹ کر برسی تھی لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ جس لڑکی میں ایک ہیروئن کی ساری خوبیاں موجود ہوں وہ ہیروئن بھی بن جائے۔ "ہیروئن" کی منزل پانے کے لیے اور خاص طور پر ہندی فلم کی ہیروئن بننے کے لیے بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سیکڑوں ہزاروں میں سے کوئی ایک یہ "عالی مرتبہ" حاصل کر پاتی ہے لیکن اس کے بعد بھی کئی مراحل ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم مرحلہ پبلک کی پسند و ناپسند ہے۔ ارجمند بانو جیسی اَن گنت حسینائیں اس راستے کے تاریک پیچ و خم میں بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ ارجمند بانو نے پاکستانی جاگیردار ابراہیم کی بیوی بننے سے پہلے اپنی منزل پانے کے لیے بہت جتن کیے تھے۔ اسی دورِ پرآشوب میں وہ سائیں عالی کے عقیدت مندوں میں شامل ہوئی تھی۔ اسے اور اس کی سرپرست خالہ کو اکثر سائیں کے آستانے پر دیکھا جاتا تھا۔ یہ دونوں عورتیں مہینے میں ایک آدھ بار سائیں کو اپنے گھر بھی لے جاتی تھیں۔"

میں نے بابو لیاقت سے کہا۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے ڈیڑھ دو ہفتے پہلے تک سروج عرف ارجمند بانو آپ کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ پھر اتنی ڈھیر ساری معلومات آپ کو کیسے حاصل ہو گئیں۔"

"ضرورت ایجاد کی ماں ہے جی۔" وہ بولا۔ "رحمانہ کے اغوا کے بعد میں نے منیجر مجید کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ اس عورت کے بارے میں ہنگامی طور پر انفارمیشن حاصل کرے۔ ہمیں فرید کوٹ سے ایک ایسا شخص دستیاب ہو گیا جس نے پورا "ڈاٹا" فراہم کر دیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ ارجمند بانو سائیں عالی کو خدا اور بھگوان کا درجہ دیتی ہے۔ سائیں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس حکم سے روگردانی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ شخص آپ کے توصیوں کے ساتھ یہاں فرید کوٹ آجائے گا؟"

بابو لیاقت بولا۔ "منیجر مجید بہت سمجھدار شخص ہے۔ مجھے یقین ہے وہ اسے کسی نہ کسی طرح لے آئے گا۔ میں نے اسے کل سویرے ہی روانہ کردیا تھا۔ آٹھ بجے والی فلائٹ سے گیا تھا امید ہے دس بجے تک پہنچ گیا ہوگا۔ میں نے اسے فون کرنے کو کہا تھا۔ اس نے فون تو نہیں کیا لیکن شام کو گھر کے پتے پر ٹیلی گرام آیا ہے کہ کام ہوگیا ہے۔ وہ شیڈیولڈ فلائٹ سے چندی گڑھ آئے گا۔ وہاں سے بذریعہ کار یہاں پہنچے گا۔" اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی اور بولا۔ "چھ بج گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گا۔"

بابو لیاقت جہاندیدہ اور معاملہ فہم شخص تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ سائیں عالی کے آنے سے معاملہ سدھر جائے گا۔ اگر نہ سدھرتا تو وہ پھر دوسرا طریقہ بھی اختیار کرسکتا تھا۔ وہ مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اس کے اشارے پر سردھڑ کی بازی لگانے والے افراد موجود تھے۔ وہ ایک بااثر شخص تھا اور یہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔ وہ ارجمند بانو اور اس کے بگڑے بچے غنڈوں کو ناکوں چنے چبوا سکتا تھا لیکن ایک ہوشیار ڈپلومیٹ کی طرح وہ یہ معاملہ پہلے بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی قربان علی چائے اور ڈرائی فروٹس لے آیا اور ہمیں اس کی آمد پر خاموش ہونا پڑا۔ غم و غصے میں میری بھوک فنا ہوجاتی ہے۔ ایک تنکا تک اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ چائے اور اس کے لوازمات دیکھ کر مت سنگھ کی خونچکاں لاش میرے تصور میں گھومنے لگی۔ ابھی چند گھنٹے پہلے تک مت سنگھ زندہ تھا اور وہ تمام لوگ زندہ تھے جنہوں نے کل میرے ساتھ شنکر شکرا کے خلاف اتحاد کیا تھا۔ لمبے چوڑے منصوبے بنائے تھے اور ڈے داریاں بانٹی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میرے سینے پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ یہ ڈانگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی ناگہانی موت کا بوجھ تھا۔ میں جب تک ان کے خون کا حساب نہ چکا دیتا، کھل کر سانس لے سکتا تھا نہ کوئی شے اپنے حلق سے اتار سکتا تھا۔

قتل و غارت گری مجھے کبھی پسند نہیں رہی لیکن مجھے ہمیشہ اس پر مجبور کیا گیا۔ میں خوش رنگ شاموں، اجلے سویروں، پھولوں اور نغموں کا پرستار تھا لیکن میرے ہاتھ میں مہلک ہتھیار تھما کر مجھے زندہ جسموں کو چھلنی کرنے پر مجبور کیا

گیا۔ اور ایسا کرنے والا کون تھا؟ وہی شنکر شکرا۔ ابلیس اعظم جو انسان کا روپ دھارے بستی بستی قریہ قریہ گھوم رہا تھا۔

بابو لیاقت نے میرے چہرے سے میری سوچوں کو بھانپ لیا۔ چائے کے برتن ایک جانب ہٹا کر اس نے ڈرائی فروٹس کو رکابی سے ڈھانپ دیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر بولا۔ "ڈانگا سنگھ وغیرہ کی موت کا سن کر مجھے بھی زبردست شاک لگا ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی ہے کہ آپ نے اتنی جلدی بدلہ چکایا اور شنکر کے پورے گینگ کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔"

"مجھے خود معلوم نہیں، میں یہ سب کیسے کرگزرا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مت سنگھ کی لاش دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ اگر میں نے کچھ نہ کیا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی اور میں اسی جگہ گر کر ختم ہوجاؤں گا۔"

"حالات بہت سنگین ہوگئے ہیں۔" بابو لیاقت تشویش ناک انداز میں بڑبڑایا۔ غالباً اس کا دھیان ان دو لاشوں کی طرف چلا گیا تھا جو میں زچہ بچہ سینٹر میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک وکیل اور قانون پسند شہری کی حیثیت سے اسے یقیناً میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ دبے لہجے میں صرف اتنا بولا۔ "آپ ان بائی افراد کا کیا کرنا ہے؟"

میرے اندر وحشت کی ایک لہر اٹھی اور پورے بدن میں پھیل گئی۔ میں نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "سچ بتاؤں لیاقت صاحب؟"

"مجھے آپ سے جھوٹ کی توقع نہیں۔" وہ بولا۔

"میں ان سب کو قتل کردوں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحے کے لیے سناٹے میں رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گہری تشویش بھی اُمڈ آئی۔ شاید اس کے ذہن میں آیا کہ میں ان چھ افراد کو قتل کرنے کے لیے ہی یہاں لایا ہوں۔ میں نے کہا۔ "بہرحال آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں اس فیکٹری میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ پر حرف آئے۔ میں پہلے ہی بہت ناجائز فائدہ اٹھا چکا ہوں آپ کی مہربانیوں سے اور سچی بات ہے کہ آپ سے بہت شرمندہ بھی ہوں۔"

میری وضاحت سننے کے بعد بھی اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ "کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟"

"نہیں بابو لیاقت۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "

شنکر شکرا کے سرگرم ساتھی ہیں۔ بہت بے گناہوں کا خون ہے ان کی گردنوں پر۔ اب بھی اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو سمجھو ظلم اور درندگی کا ساتھ دوں گا۔۔۔۔ سوچتا ہوں، کاش میں یہ کام کچھ عرصہ پہلے کرگزرا ہوتا۔ ان ہی لوگوں نے جو آپ کے میٹنگ ہال میں بندھے پڑے ہیں، چند ماہ پہلے پاکستان کے قبائلی علاقے میں میرے دو ساتھیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ دونوں پولیس ملازم تھے۔ شنکر شکرا نے انہیں پکڑا تھا اور چاند ماری کے میدان میں ان کے سروں پر ہدف رکھ کر نشانہ بازی کی مشق کی تھی۔ اس وقت میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ اس درندگی کے ذمے دار افراد کو اسی انداز میں موت کے گھاٹ اتاروں گا لیکن پھر نجانے کیا ہوا تھا۔ میری مصروفیات تھیں۔۔۔۔ یا پھر وقت گزرنے کے ساتھ میرے جذبات ماند پڑ گئے تھے۔ میں اس بات کو ٹالتا چلا گیا، یہاں تک کہ زدِ مشت کی ایک بستی میں شنکر کے ان ہرکاروں نے ایک بار پھر موت کا بازار گرم کیا۔ وہ ایک دہشت ناک قتلِ عام تھا۔ آج تک اس خونچکاں قتل گاہ کا ہر منظر میرے ذہن پر نقش ہے۔ قتل ہونے والے ایک جشن منا رہے تھے۔ جرم کی زندگی سے تائب ہوکر انہوں نے "ٹیپو" کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور ایک نئے سفر کا آغاز کر رہے تھے لیکن ان کے سارے ارادے اور وعدے ان کے ساتھ ہی خاک و خون میں لوٹ گئے تھے۔ اس وقت میں نے ایک بار پھر اپنے عہد کی تجدید کی تھی اور قسم کھائی تھی کہ شنکر سے اس قتلِ عام کا بدلہ لوں گا لیکن پھر میں اس ٹرک والے معاملے میں الجھ گیا اور ابراہیم وغیرہ سے بچنے کی کوشش میں کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں میری انہی کوتاہیوں کا نتیجہ ڈانگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی موت کی صورت میں نکلا ہے۔"

بابو لیاقت کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ بولا۔ "میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتا کہ آپ کو مشورہ دوں لیکن یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ فی الحال ان لوگوں کو قتل کیا گیا تو بگڑے ہوئے حالات اور بگڑ جائیں گے۔"

میں نے اپنی متورم گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا ہے ناکہ آپ بے فکر رہیں۔ میں ان کو اتنی جلدی مارنے والا نہیں ہوں۔ بڑے اہتمام اور تسلی سے قتل کروں گا انہیں۔ ان کے ساتھ وہی کھیل کھیلا جائے گا جو وہ دوسروں سے کھیلتے رہے ہیں۔ میں انہیں کسی سنسان مقام پر لے جاؤں گا۔ لائن میں کھڑا کرکے ان پر نشانہ پختہ کیا جائے گا

اور۔۔۔۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں انہیں پاکستان لے جاؤں اور ان قبائلیوں کے حوالے کروں جن کے عزیزوں کو ان لوگوں نے گولیوں سے بھونا تھا اور ایک تاریک سُرنگ میں بند کرکے زہریلی گیس سے مارا تھا۔۔۔۔"

وہ شخص جس کا ہمیں انتظار تھا، ہماری توقع سے آدھ گھنٹہ پہلے آن پہنچا۔ میرا مطلب سائیں عالی سے ہے۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بابو لیاقت کے منیجر مجید نے اطلاع دی کہ دس پندرہ منٹ کے اندر وہ لوگ فیکٹری پہنچ رہے ہیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد منیجر مجید ایک دبلے پتلے باریش نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نوجوان کے بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور وہ وضع قطع سے کسی خانقاہ کا متولی لگتا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر منیجر مجید سے مخاطب ہوکر بولا۔ "ٹھیک ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے، کوئی مرد یا عورت جس نے کوئی زرد رنگ کا کپڑا پہن رکھا ہو یا اوڑھ رکھا ہو، اندر داخل نہ ہو۔"

منیجر مجید نے بابو لیاقت کو ایک طرف لے جاکر تھوڑی سی کھسر پھسر کی اور پھر باریش نوجوان کو لے کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں سائیں عالی کو لے اندر داخل ہوئے۔ سائیں عالی ایک ستراسی سالہ شخص تھا۔ اس کی لمبی جٹائیں شانوں پر جھول رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی بے ترتیب تھی اور سفید بالکل تھی۔ بھنوؤں تلے آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ سائیں عالی کے جسم پر ایک لبا سا چوغا تھا۔ پنڈلیاں اور پاؤں ننگے تھے اور میل کچیل سے سیاہ ہو رہے تھے۔ سائیں کے کندھوں پر نہایت غلیظ اور پھٹا پرانا کمبل دیکھ کر مجھے اٹک جیل کے جوؤں بھرے کمبل یاد آگئے اور یوں لگا کہ سائیں بھی کسی روپ نگری سے نہیں سیدھا اٹک جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ سائیں کے حلیے میں سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر چیز ایک زخم کا نشان تھا۔ یہ نشان اس کی نصف پیشانی سے شروع ہوکر بائیں کنپٹی تک چلا گیا تھا۔ جیسے کھنڈر سے عمارت کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، اس نشان سے زخم کی سنگینی اور گہرائی کا پتا چلتا تھا۔

بابو لیاقت نے جلدی سے ایک کرسی سائیں کو پیش کرنا چاہی لیکن منیجر مجید نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا اور بتایا کہ سائیں عالی زمین پر بیٹھیں گے۔ باریش نوجوان کے کندھے پر ایک صافہ نما کپڑا تھا۔ اس کپڑے کے ساتھ اس نے جلدی سے قالین کی گرد جھاڑی اور بیٹھنے میں فربہ اندام سائیں کی مدد کی۔ سائیں اس وقت وی آئی پی تھا اور ہم سب

ہاتھ باندھے اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ فیجر مجید اور بارلیش نوجوان سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔ سردی کا زور کم کرنے کے لیے سائیں کے قریب ایک الیکٹرک ہیٹر لگا دیا گیا۔ پینے کے لیے گرم دودھ ایک پیالہ نما ڈونگے میں لایا گیا۔ سائیں نے چند گھونٹ لیے اور ڈونگا ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اپنے اردگرد کے ہر شخص سے قطعی لاتعلق نظر آرہا تھا۔ کبھی مسکراتا تھا اور کبھی بڑبڑانے لگتا تھا۔ میں اور بابو لیاقت کمرے کے ایک گوشے میں کھڑے تھے۔ فیجر مجید ہمارے قریب آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بمشکل سائیں کو یہاں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سائیں نے جہاز کی نشست پر بیٹھنے سے انکار کردیا تھا۔ گاڑی میں بھی وہ نشست پر نہیں بیٹھا اور اسے دو نشستوں کے درمیان خالی جگہ میں بٹھا کر لانا پڑا۔ فیجر مجید نے کہا۔ "اس داڑھی والے لڑکے کا نام جامی شاہ ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ سائیں عالی سے جو بات کرنی ہے وہ خود ہی کرلے گا۔"

ہم نے دیکھا کہ جامی شاہ' سائیں عالی کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دباتے ہوئے آگے پیچھے جھولنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جارہا تھا۔ پہلے اس کی آواز دھیمی تھی پھر بلند ہوگئی۔ "سائیں جی! یہ بچی کا معاملہ ہے۔ معصوم بچی کا اگر کچھ نہ کیا گیا تو وہ مرجائے گی۔ آپ کے دو لفظ بولنے سے اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ارجمند بی بی کا ٹیلی فون آئے گا۔ آپ اس سے بات کریں۔ اسے یہاں بلا لیں۔۔۔۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹال سکتی۔"

سائیں عالی جیسے کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا ہاتھ چولے کی جیب میں ڈالتا اور خربوزے یا تربوز کے خشک بیج نکال کر چبانے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد فیجر مجید بھی بہ آہستگی اس کے قریب جا بیٹھا۔ وہ منت سماجت کے مختلف مراحل میں جامی کی مدد کرنے لگا۔

"کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ کچھ نہیں ہے۔" اچانک سائیں کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجی۔ "جاؤ۔۔۔۔ چھوڑ دو میرا پیچھا۔۔۔۔ چھوڑ دو۔ جو کچھ تھا وہ شفیع محمد لے گیا۔ لے گیا شفیع محمد۔ کچھ نہیں ہے اب۔"

وہ بڑی بے پروائی سے اٹھا اور کمرے کے ایک کونے میں جاکر بیٹھ گیا۔ انداز پیچھا چھڑانے والا ہی تھا۔ جامی شاہ اور فیجر مجید بھیک منگوں کی طرح پھر اس کے پیچھے گئے اور پاؤں کی طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد سائیں اچانک بھڑک اٹھا۔ گرج کر بولا۔ "کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ دفع ہوجاؤ' دفع ہوجاؤ۔ شفیع محمد لے گیا ہے سب کچھ۔ اس نے اردن میں سونے کا پہاڑ بنا لیا ہے' جاؤ۔۔۔۔ میں کہتا ہوں جاؤ۔"

وہ ڈنکا کس کے انہیں مارنے کے لیے بھاگا۔ جامی اور فیجر مجید الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا یہ۔ سائیں کچھ دیر انہیں گھورتا رہا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ اس کے جسم سے بُو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اپنے غلیظ ہاتھ سے اس نے میرا کندھا تھاما اور جھنجوڑ کر بولا۔ "ہاشم خاں' تُو تو میرے ساتھ تھا۔ تو نے تو شفیع محمد کو دیکھا تھا۔ تو ان حرامی کتوں کو بتاتا کیوں نہیں کہ وہ سب کچھ لے گیا ہے۔ بتاتا کیوں نہیں ان کو؟ جاتا۔"

سائیں نے مجھے جامی اور فیجر مجید کی طرف دھکیلا۔ میں سائیں کے کہنے پر فیجر اور جامی کی طرف چلا گیا۔ جامی سرگوشی میں بولا۔ "جیسے جیسے یہ کہہ رہے ہیں کرتے جائیں۔ اگر زیادہ بھڑک اٹھے تو کوئی بات نہیں مانیں گے۔"

"میں نے پوچھا۔" لیکن یہ شفیع محمد ہے کون؟"

جامی بولا "یہ آج تک کسی کو پتا نہیں چلا۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاتے ہوں گے؟"

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "کبھی کہتے ہیں کہ یہ میانوالی کا ایک جن ہے۔ اس نے شیخوپورہ میں ہرن مینار کے پاس ایک بہت بڑی مسجد بنا رکھی ہے۔ کبھی بتاتے ہیں کہ یہ میرا بھتیجا ہے' جو انگریز فوج کے ساتھ مل کر برما میں لڑتا رہا ہے۔ بس اسی طرح کی الٹ شنٹ باتیں کرتے ہیں۔"

ہماری کھسر پھسر کے دوران ہی سائیں عالی ہمارے قریب پہنچ گیا۔ جامی' فیجر مجید کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سائیں نے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ "ہاشم خاں' تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے' پتا ہے کس لیے؟"

"کس لیے سائیں جی؟"

"اس لیے کہ تو ہاشم خاں نہیں' پھر بھی ہاشم خاں ہے۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ میرا کندھا تھپتھپاتا جارہا تھا۔ "شاباش۔ بہت خوب۔ تم جیسے فرمانبردار بچے مجھے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ شاباش۔"

اچانک میری نظر سائیں عالی کے گلے میں جھولتی رنگ برنگی مالاؤں پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ ان مالاؤں کے پیچھے دو تعویذ بھی تھے۔ ایک تعویذ تو چمڑے میں منڈھا ہوا تھا لیکن دوسرا چاندی میں تھا۔۔۔۔ میری نگاہ اس دوسرے تعویذ پر جم کر رہ گئی۔۔۔۔ ذہن میں زبردست دھماکے ہونے لگے تھے۔ یہ تعویذ قدرے چھوٹا ہونے کے باوجود ہو بہو اسی شکل کا تھا جس شکل کے تعویذ میں نے چنے پل کی حویلی میں دیکھے تھے۔ کھدائی سے برآمد ہونے والی تانبے کی بھاری بھرکم

ہیلیوں کے ساتھ ایسے ہی دو تعویذ جھول رہے تھے۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ چنے پل کی حویلی سے برآمد ہونے والی دولت جس زنجیر سے منسلک ہے اس زنجیر کی کچھ کڑیاں آپس میں ملنے والی ہیں۔

مجھے شاباش دینے کے بعد سائیں عالی ایک بار پھر ہر چیز سے لاتعلق نظر آنے لگا تھا۔ وہ ہیٹر کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور چند منٹ بعد شانِ بے نیازی سے وہیں پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد جامی شاہ دبے پاؤں کمرے میں آیا اور اس کے قریب بیٹھ کر ادب کے ساتھ پنڈلیاں دبانے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد فیجر مجید نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ جامی شاہ منت سماجت کے انداز میں دھیرے دھیرے کچھ بولتا بھی جارہا تھا۔

یکایک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بابو لیاقت نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔" وہ لرزاں آواز میں بولا۔

دوسری طرف ارجمند بانو ہی تھی۔ بابو لیاقت کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ "ہاں۔۔۔۔ ہاں میں بابو بول رہا ہوں۔۔۔۔ ہاں مجھے معلوم تھا۔۔۔۔ کون۔۔۔۔؟ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" ساتھ ہی اس نے فیجر مجید کو اشارہ کیا کہ وہ سائیں عالی کو اٹھا کر بٹھائیں۔ فون کا تار لمبا تھا۔ بابو لیاقت سیٹ ہاتھ میں لے کر سائیں عالی کے پاس پہنچ گیا۔ جامی نے سائیں کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور منت کرنے لگا کہ وہ فون پر چند لفظ بول دے۔ سائیں آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا پھر اچانک نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اٹھ کر بابو کے ہاتھوں سے ریسیور جھپٹا اور چیخ کر بولا۔

"او کتے کی بچی' حرام زادی! تُو نے کیا مصیبت ڈال رکھی ہے اپنے باپ کو۔ کہاں ہے۔ بھونکتی ہے کہاں ہے تو؟ تجھے پتا بھی ہے کہ شفیع محمد سب کچھ لے گیا ہے' پھر بھی باز نہیں آتی ہے۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پھر گرجا۔ "بکواس بند کر۔ جلدی آ میری طرف۔ جلدی آ' نہیں تو۔۔۔۔"

اس نے آخر میں ارجمند بانو کو ایک شاہکار گالی دی اور ریسیور رکھا کر بابو لیاقت کے قدموں میں پھینک دیا۔ بابو لیاقت نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔۔۔۔ میں بابو بول رہا ہوں۔ سائیں جی یہاں ہمارے پاس فیکٹری میں ہیں۔ وہ یاد کررہے ہیں تمہیں۔ نہیں نہیں۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم یہاں آؤ گی تو پتا چلے گا۔" اس کے ساتھ ہی بابو لیاقت نے فون بند کردیا۔

ٹھیک نصف گھنٹے کے بعد جب گھڑی کی سوئیاں چھ کے ہندسے کے آس پاس مل رہی تھیں' فرمان علی بھاگا ہوا اندر داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ ارجمند بانو پہنچ گئی ہے۔ بابو لیاقت باہر گیا اور ارجمند بانو کو اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ ارجمند کی پیشانی پر ابھی تک ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ یہ اس زخم کی نشانی تھی جو چند روز پہلے اسے بابو کی بیٹھک میں لگا تھا۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ میرے تصور میں خود بخود پالا سنگھ کا بدہیئت چہرہ آگیا۔ کس قدر تضاد تھا ان دونوں چہروں میں۔ ایک خوبصورتی کی معراج' دوسرا بدصورتی کی انتہا۔ لیکن وہ طرفہ مجبوری دونوں چہروں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی اور پھر اندھیرے کی آنکھ نے وہ تماشا بھی دیکھا تھا کہ خوبصورتی اور بدصورتی کے درمیان ہر فاصلہ مٹ گیا تھا۔ حرص و ہوس کی قربان گاہ ایک بہت بڑی بھینٹ چڑھائی تھی ارجمند بانو نے لیکن اس بھینٹ کے صلے میں اسے کیا ملا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ حالات کے تند دھارے میں اس کا ہر ارادہ تنکے کی طرح بہہ گیا تھا اور صرف تین دن بعد آج وہ پھر اس مقام پر کھڑی تھی جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔

ارجمند بانو کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔

"کہاں ہیں سائیں جی؟" اس نے پوچھا۔

پھر اس کی نگاہ کمرے کے کونے میں سمٹے ہوئے "سائیں جی" پر پڑی۔ ہیٹر کی حرارت میں وہ بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سو گیا تھا۔ جامی شاہ نے اس کا میلا کچیلا پاؤں دبا کر اسے جگایا اور کہا۔ "سائیں عالی' بی بی آگئی ہے۔"

ارجمند بانو کو دیکھ کر سائیں عالی نے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں لیکن اپنے آسن میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ ارجمند بانو اس کے قریب پہنچ کر دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کے بال حسبِ معمول شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک اسکرٹ نما لباس میں تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھر ہم نے ایک حیرت ناک تماشا دیکھا۔ سائیں عالی نے بڑی متانت سے ہاتھ بڑھا کر جامی کے ایک پاؤں سے جوتا کھینچا۔۔۔۔ اور تڑا تڑ کئی جوتے ارجمند بانو کے سر پر دے مارے۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی' اس کے شیمپو سے دھلے ہوئے بالوں میں جوتے کی خاک بھر گئی تھی اور ایک کلپ نما شے اُچھل کر دور جا گری تھی۔ جوتے رسید کرنے کے بعد سائیں پھر چلایا۔ "کہاں ہے بکی؟ ان کے حوالے کر۔۔۔۔ جلدی کر' ورنہ کتیا کی موت مرے گی۔"

"وہ۔۔۔۔ گھر پر ہے۔" ارجمند بانو ہکلائی۔

"اسے لے کر آ۔ اس کو ابھی نہیں تو بدبختی چمٹ جائے گی

تجھ سے۔ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا تیرے۔ ایک کوڑی نہیں ملے گی۔"

"میں ابھی اسے منگواتی ہوں سائیں جی۔ بس دو گھنٹے کی مہلت دے دیں۔"

"دو گھنٹے۔" سائیں عالی گرجا۔ "دو گھنٹے میں تو شفیع محمد تیرے بخت کو اُڑا کر تل ابیب سے بھی آگے لے جائے گا۔ دو گھنٹے نہیں' بالکل نہیں۔"

"اچھا ـــــ صرف ایک گھنٹا' صرف ایک گھنٹا دے دیں۔"

"جا جلدی کر' دفع ہو جا۔"

ارجمند بانو لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ "ٹھہر۔" سائیں عالی نے اس کے اسکرٹ کا کنارہ کھینچا۔ وہ ایک بار پھر بیٹھ گئی۔ "وہ دیکھ۔ اس بندے کو دیکھ۔" سائیں عالی نے براہ راست میری طرف اشارہ کیا۔ "بس اس کے ساتھ لگ جا۔ اس کے ساتھ چمٹ جا۔ وہ تیرا نصیب ہے۔ تیری خوش قسمتی ہے اس کے پاس۔ جب دے گا دے گا' جب دے گا دے گا۔"

"بس ـــــ سائیں جی! آپ نے جیسا بھی ـــــ"

"بس چپ ہو جا اب۔" سائیں عالی نے گرج کر اس کی بات کاٹی۔ "جا ـــــ جو میں نے کہا ہے وہ کر۔ ایک گھنٹے کے اندر بچی کو یہاں لے آ۔"

ارجمند بانو اٹھی۔ اس کی آنکھیں شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ جوتے کی خاک ابھی تک اس کے سر میں تھی لیکن اس کے چہرے پر ندامت یا شرمندگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے آواز دی۔ "جلال ـــــ جلال۔"

ایک کونے میں حرکت ہوئی اور جلال سامنے آ گیا۔ اس کے ایک بازو پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ اس بازی گر سے میری آخری ملاقات نیشنل ہوٹل کی چھت پر ہوئی تھی۔ میں نے اسے دو منزلہ عمارت سے نیچے گرا دیا تھا۔ اس "حادثے کی نشانیاں" ابھی تک جلال کے جسم پر موجود تھیں۔ سخت جان تھا کہ اتنی جلدی اسپتال سے نکل آیا تھا۔ (اخباری خبروں پر جاتا تو خود کو تین چار ماہ تک مردہ ہی سمجھتا۔)

ارجمند بانو بولی۔ "جلال جاؤ اور اس لڑکی کو لے آؤ۔"

"اوکے میڈیم۔" جلال نے سر جھکایا اور مجھے خشمگیں نظروں سے گھورتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ارجمند بانو نے گھوم کر ہماری طرف دیکھا۔ میں' بابو لیاقت' فرمان علی' سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ ایک دم اس کے چہرے پر سرخی سی لپک گئی۔ وہ کیسی بھی تھی' بہرحال ایک عورت تھی۔ تین دن پہلے اس نے جو "کارنامہ" انجام دیا تھا وہ ہم سب کے ذہنوں میں تازہ تھا۔ ہم نہیں بھولے تھے تو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ ہم سے نگاہیں نہیں ملا سکتی تھی اس لیے رخ پھیر کر تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ بابو لیاقت نے نفرت سے ایک طرف تھوکا اور بڑبڑایا۔ "سرِعام سنگسار کرنے کے قابل ہے یہ عورت۔"

فرمان علی ہمارے پاس آیا اور ادب سے بولا "بابوجی! دس بجے تک کرفیو میں وقفہ ہے۔ اگر آپ کہیں تو گھر سے ناشتا لے آؤں۔"

"نہیں۔" بابو لیاقت نے دو ٹوک لہجے میں کہا "فیکٹری سے باہر کسی کو پتا نہیں کہ میں یہاں ہوں اور نہ ابھی پتا چلنا چاہیے......"

یہی وقت تھا جب نامانوس شور و غل نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ شور فیکٹری کے مین گیٹ کی طرف سے بلند ہوا تھا۔ میرا ہاتھ خود بخود پسٹل کی طرف بڑھ گیا۔ فرمان علی نے بھی رائفل کندھے سے اتار لی۔ بابو لیاقت تیز قدموں سے کھلے احاطے کی طرف گیا۔ وہاں سے اسے گیٹ کا منظر صاف نظر آنے لگا اور وہ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر محویت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ کوئی سنگین نوعیت کا معاملہ نہیں ہے۔ میں بھی دس پندرہ قدم چل کر بابو لیاقت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ فیکٹری کے تین چار ملازم ایک شخص سے الجھے ہوئے تھے۔ وہ شخص زور زور سے چلا رہا تھا لیکن گھومنے والی مشینوں کے شور میں اس کی آواز صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک میں بری طرح چونک گیا ـــــ وہ زریں گل تھا۔

کل صبح نو بجے سے میں زریں گل کے بارے میں بیسیوں مرتبہ سوچ چکا تھا لیکن یہ بات ایک بار بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ وہ یوں اس طرح بابو لیاقت کی فیکٹری میں آ جائے گا۔ میں دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف گیا۔ ایک تنومند شخص نے زریں گل کو عقب سے بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔ دو افراد اسے سامنے سے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اندھا دھند ٹانگیں چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ بول رہا تھا "حرامی کا اولاد' تم ام کو باپ کا گالی دیتا ہے۔ ام تمہارا پیٹ پھاڑ دے گا۔ زندہ نہیں چھوڑے گا تم کو۔"

وہ بار بار اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جکڑنے والے نے اس کے بازوؤں کو بھی جکڑ رکھا تھا۔ سامنے والے دو افراد بھی سمجھ گئے تھے کہ خان کے نیفے میں

کوئی شے ہے۔ وہ اس کا نیفہ دیکھنے کے لیے بار بار جھپٹتے تھے لیکن وہ ٹانگیں چلا کر انہیں پیچھے ہٹا رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے زریں گل اور اسے دبوچنے والا سکھ ملازم دونوں زمین بوس ہو گئے۔

میں نے پکار کر کہا۔ "چھوڑ دو۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

مجھے دیکھ کر دو افراد تو پیچھے ہٹ گئے لیکن زریں گل اور سکھ بدستور گتھم گتھا رہے۔

میں نے ان دونوں کو بمشکل جدا کیا۔ اس دوران بابو لیاقت اور فرمان علی بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر زریں گل کا غصہ کم ہونے کے بجائے اور تیز ہو گیا تھا۔ دوسری طرف سکھ بھی آخر "سکھ" تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گیا تھا لیکن بدستور اڑیل بھینسے کی طرح زریں گل کو گھور رہا تھا۔

زریں گل دہاڑا۔ "مرد کا بچہ ہے تو اکیلا آ ادھر ہمارے سامنے تمہارا ٹانگیں چیر کر ہاتھ میں نہ دے دے تو کہنا۔"

دیہاتی سکھ گرجا۔ "او جا کھیر کھرات نکال جا کے۔ چنگی تھی جو بچ گیا ورنہ ابھی منکا توڑ دیتا تیرا۔"

زریں گل نے ببر شیر کے انداز میں کندھوں کو حرکت دی اور جوش کھا کر پھر نیفے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں پہلے سے تیار تھا لہٰذا اس کی کلائی دبوچ لی۔ دوسری طرف بابو لیاقت نے بھی ڈانٹ ڈپٹ کر سکھ ملازم کو پیچھے ہٹا دیا۔ "کیا بات ہوئی ہے؟" اس نے تحکمانہ لہجے میں سکھ ملازم سے پوچھا۔

وہ ناک سے بہنے والا خون پونچھ کر بولا۔ "یہ پچھلے دس پندرہ منٹ سے فیکٹری کے آلے دوالے گھوم رہا تھا جی۔ پھر میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ کس کی فیکٹری ہے۔ مالک کہاں ہے؟ مجھے اس کی نیت خراب لگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ وہ کون ہے ـــــ بس الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ میرا چھک (شک) اور جیادہ ہو گیا۔ میں نے کرم الٰہی کو آواز دی۔ اس کے آنے تک یہ مجھ سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔"

زریں گل نے تند و تیز لہجے میں تردید کی اور کہا کہ اسے گالی دی گئی تھی۔ بہرحال بابو لیاقت اور دیگر لوگ جان چکے تھے کہ زریں گل میرا کوئی جاننے والا ہے۔ انہوں نے سکھ ملازم کو ڈانٹ ڈپٹ کر گیٹ کی طرف بھیج دیا۔ میں زریں گل کو لے کر بابو کے دفتر کی طرف بڑھا۔ اس موقعے پر ایک اور تماشا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مجذوب سائیں عالی بھی ہنگامے کی آواز سن کر باہر نکل آیا تھا۔ وہ ہال نما کمرے کے سامنے کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہم اس کے پاس سے گزرے' اچانک اسے نجانے کیا ہوا۔ اس نے ایک دم مُکا کسا اور زریں گل کو مارنے دوڑا۔ ابھی اس نے دو چار ہی قدم اٹھائے تھے کہ باریش نوجوان جامی شاہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ بڑی دلیری سے سائیں عالی سے بغل گیر ہو گیا اور اسے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا۔ سائیں عالی نے شور مچانے والے انداز میں کہا۔ "یہی ہے ـــــ یہی ہے۔ شفیع محمد کو حویلی سے بلاؤ ـــــ شفیع محمد ـــــ شفیع محمد۔" پتا نہیں وہ کیا کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کے تمام الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

زریں گل نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ گیٹ سے شروع ہونے والا ہنگامہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور اس پر جھپٹنے والا شخص "سکھ چوکیدار" کا ہی کوئی ساتھی ہے۔ ایکا ایکی زریں گل کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر نیفے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ میں اسے دھکیل کر قریبی کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میرا دھیان زریں گل کی قمیص کی طرف گیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ اسے دیکھ کر سائیں عالی آپے سے باہر کیوں ہوا ہے۔ شومئی قسمت زریں گل کی قمیص گہرے زرد رنگ کی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "استاد جی! ہمارے ہاتھوں سے کوئی قتل وتل نہ ہو جائے۔ ام کو تو لگتا ہے یہاں کا سب لوگ ایک دم پاگل ہے۔ پہلے اس حرامی نے ام کو گالی دیا' اب ـــــ"

"میں سب دیکھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "تم خود کو پریشان مت کرو۔ یہاں آرام سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ کہاں سے آئے ہو اور یہاں کا پتا تمہیں کیسے چلا؟"

اس نے چند گہری سانسیں لے کر اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ "استاد جی! آپ نے خود ہی تو ہم کو بتایا تھا کہ آپ فرید کوٹ کے بابو لیاقت کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ام سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مشہور بندہ ہے۔ بس ام نے پتا چلا لیا۔"

اب مجھے یاد آیا کہ مضافاتی گردوارے میں فائرنگ ہونے سے پہلے میں نے زریں گل کو بتایا تھا کہ میں بابو لیاقت نامی شخص کے پاس ٹھہرا ہوں۔ زریں گل نے ایک نظر اپنی کہنہ سال رسٹ واچ پر ڈالی اور ہانپتے لہجے میں بولا۔ "استاد جی! ام ایمرجنسی میں یہاں تک آیا ہے۔ ابھی دو ڈھائی گھنٹا پہلے صفدر صاحب نے ام سے فون پر بات کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو ام دس بجے سے پہلے پہلے آپ کو لے کر اس کے پاس پہنچ جائے۔"

میں نے پوچھا۔ "صفدر کہاں ہے؟"

وہ بولا۔ "ٹرک کے پاس ـــــ اور ٹرک گنڈا راپور کے

فارم پر کھڑا ہے۔ وہ نمبردار عشرت کا فارم ہے۔ اور اسے عشرت فارم کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو زریں گل۔ مجھے شروع سے بتاؤ۔ ورنہ نہ تم کچھ بتا سکو گے' نہ میں سمجھ سکوں گا۔"

زریں گل اور میں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زریں گل نے کہا۔ "ام کو ٹرک گردوارے سے ہٹانا پڑ گیا تھا۔ اس کی وجہ آپ کو صدر صاحب ہی بتائے گا۔ ام اس وقت بڑی نہر کے پار گنڈا را پور گاؤں میں ہے۔ وہاں کے نمبردار عشرت نے ام کو اپنے پاس پناہ دیا ہے۔ وہ بڑا عجیب و غریب بندہ ہے' آپ اس سے مل کر حیران ہوگا۔ کل گردوارے کے پاس فائرنگ کے بعد آپ غائب ہو گیا۔ ام بھی کسی نہ کسی طرح واپس گنڈا را پور گاؤں پہنچ گیا۔ صدر صاحب نے ام کو آرڈر دیا کہ ام شہر جا کر بابو لیاقت کا پتا چلائے تاکہ آپ تک پہنچا جا سکے۔ ام فوراً فارم سے شہر آگیا۔ کئی علاقوں میں کرفیو نہیں تھا لیکن جس علاقے میں بابو لیاقت کا بیٹھک ہے وہاں کرفیو تھا۔ جب شام کو کرفیو میں وقفہ ہوا' ام بابو کی بیٹھک پر پہنچا۔ وہاں سے اندازہ ہوا کہ آپ یہاں نہیں آیا۔ واپس گنڈا را پور جانے کے بجائے ام کل رات شہر میں ہی ٹھہر گیا۔ اسٹیشن کے پاس ایک بڑے بھلے مانس خان صاحب کا ہوٹل ہے۔۔۔ ماوپارہ ہوٹل۔ ام نے وہاں ایک کمرا لے لیا۔ گنڈا را پور کے عشرت فارم میں ٹیلی فون ہے۔ ام نے صدر صاحب کو فون پر بتا دیا کہ ام ماوپارہ ہوٹل میں ہے اور صبح پھر استاد صاحب کا کھوج لگانے نکلے گا۔ لیکن آج صبح سویرے ام کو آنا فانا جاگنا پڑ گیا۔" زریں گل نے ایک بار پھر رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔ "چھ بج کر بیس منٹ پر صدر صاحب نے ام کو عشرت فارم سے ٹیلی فون کیا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو ام آپ کو ڈھونڈے اور دس بجے سے پہلے پہلے آپ کو لے کر گنڈا را پور پہنچ جائے۔ ام نے اس کو بتایا کہ شہر سے باہر لیاقت بابو کا ایک فیکٹری ہے۔ ام اب وہاں جاتا ہے' ہو سکتا ہے بات بن جائے۔ وہ بولا فوراً نکل جاؤ۔ دیر ہوا تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔"

"کوئی خطرے والی بات تو نہیں تھی۔" میں نے پوچھا۔

"ام نے پوچھا تھا' لیکن وہ بولا' ایسا کوئی بات نہیں' ام اور وہ بیت خیریت سے ہے۔ تم بس جلدی آنے کا کوشش کرنا۔"

میں نے کہا۔ "کچھ اندازہ تو لگایا ہوگا تم نے؟"

وہ بولا۔ "امارا اندازہ ہے کہ نمبردار عشرت صاحب نے اپنا کوئی مجبوری ظاہر کیا ہوگا اور صدر صاحب چاہتا ہے کہ ام ٹرک کو وہاں سے کہیں اور لے جائیں۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔۔۔ غزالہ کی گھڑی پر ٹھیک نو بج رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "زریں گل' اس حساب سے تو بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ہمیں جلد نکلنا ہوگا۔"

پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ دس بجتے ہی کرفیو دوبارہ لاگو ہو جائے گا۔ میں دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

"کیا ہوا جی۔" زریں گل نے پوچھا۔

"بڑی گڑبڑ ہے یار۔" میں نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں کرفیو میں وقفہ ختم ہو جائے گا۔ ہم راستے میں دھر لیے جائیں گے۔"

زریں گل کا منہ لٹک گیا۔ اسی دوران مجھے یاد آیا کہ ٹیلی فون تو یہاں بھی ہے۔ منور سے عشرت فارم میں بات کی جا سکتی ہے۔ میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "منور کا فون نمبر کہاں ہے۔"

"کہیں بھی نہیں ہے۔۔۔ ام۔۔۔ ام کو زبانی یاد ہے۔ ڈائل تو کیجیو۔" میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور فوراً بابو لیاقت کے آفس میں پہنچا۔ زریں گل کو مطلوبہ نمبر ملانے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف سے کوئی ملازم ٹائپ شخص بولا تھا۔ زریں گل نے اس سے کہا کہ ٹرک والے وچن سنگھ کو بلا دو۔ وچن سنگھ سے اس کی مراد منور ہی تھا۔

چند لمحے بعد زریں گل سے منور کی "ہیلو ہیلو" ہوئی اور پھر زریں نے ریسیور مجھے تھما دیا۔ "ہیلو شاہ جہاں صاحب۔" منور کی جانی پہچانی آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں جوش تھا لیکن ایک طرح کی احتیاط بھی تھی۔ یہ احتیاط اس خدشے کے سبب تھی کہ کہیں فون ٹیپ نہ کیا جا رہا ہو۔

"کہاں ہو بھائی' کیسی گزر رہی ہے؟" میں نے پوچھا "لیکن جو بھی بتاؤ ذرا احتیاط سے۔"

"میں بھی یہی عرض کرنے والا تھا۔" منور نے کہا۔ پھر کھنکار کر بولا۔ "آپ کو ٹھکانے کا پتا تو چل ہی گیا ہوگا۔ دوسرا پیغام جو بھیجا ہے وہ بھی مل گیا ہوگا۔" (منور کا مطلب دس بجے تک پہنچ جانے سے تھا۔)

میں نے کہا۔ "پیغام تو مل گیا ہے لیکن اس کے مطابق عمل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ تمہیں علم ہی ہوگا شہر کے بیشتر علاقوں میں کرفیو ہے۔ جگہ جگہ چیکنگ بھی ہو رہی ہے۔"

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ "لیکن اگر بہت ضروری ہے تو میں کوشش کرتا

ہوں۔ یہ کوئی ایسا نہ ہونے والا کام بھی نہیں ہے۔"

منور نے کہا۔ "نہیں۔۔۔ پھر آپ رہنے دیں' اتنا زیادہ رسک لینے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی اب آپ بمشکل ٹائم پر پہنچ سکتے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ شام کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔ دو گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ اس میں بآسانی سب کچھ ہو سکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسا تم مناسب سمجھو۔ لیکن میں اب بھی تیار ہوں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آپ یہ کریں کہ شام کو مس نہ کریں۔"

"او کے۔" میں نے کہا۔ چند "ڈھکی چھپی" باتیں کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

زریں گل میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے عقب سے مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ مٹی جھاڑی۔ زریں گل دروازے سے باہر احاطے پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔ بولا۔ "خو یہ کانہ خراب کا بچہ جونے والا کون ہے؟" اس کا اشارہ سائیں عالی کی طرف تھا جو اب دھوپ سینکنے کے لیے باہر بھینسوں کے پاس آن بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ "وہ خانہ خراب نہیں' مجذوب ہے۔ تمہاری یہ زرد قمیص دیکھ کر بھڑک اٹھا تھا۔ اب اس کے سامنے جانے سے پہلے کسی چادر وغیرہ کی بکل مار لینا۔"

"بکل مار لینا؟ وہ کیوں جی؟"

"بس ہے کوئی بات۔" میں نے کہا۔ پھر اچانک ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے زریں گل سے پوچھا۔ "چاندی کے وہ تعویذ کہاں ہیں جو ہیلیوں سے اتارے تھے؟"

زریں گل بولا۔ "امارے پاس ہی ہے۔"

دائیں بائیں دیکھ کر اس نے اپنی کرم ٹوپی اتاری۔ ٹوپی کا اندرونی کپڑا ادھیڑ کر اس نے دونوں تعویذ ٹوپی میں ٹھسا رکھے تھے۔ فرید کوٹ پہنچنے تک یہ تعویذ میرے پاس ہی رہے تھے لیکن پھر میں نے زریں گل کو دے دیے تھے۔ زریں نے ٹوپی سے نکال کر تعویذ میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔۔۔ میں نے بغور دیکھا۔ ان تعویذوں اور سائیں عالی کے گلے میں لٹکے اس تعویذ میں سائز کے سوا قطعی کوئی فرق نہیں تھا۔ حتیٰ کہ تعویذوں کی ڈوری بھی خاص نارنجی رنگ کی تھی۔

کئی سوچیں یلغار کر کے آئیں اور میرے ذہن میں اودھم مچانے لگیں۔ سائیں عالی' ارجمند بانو کا مرشد تھا۔ اس کے گلے میں ہو بہو ویسا ہی تعویذ تھا جیسے تعویذ چنچل کی حویلی سے برآمد ہوئے تھے۔ یہ سائیں عالی پچھلے تیس برس سے بمبئی ریلوے اسٹیشن کے ایک تاریک گوشے میں پُراسرار زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے اس کی زبان سے پرانی حویلی' سونے کا پہاڑ اور قل اہب جیسے مبہم الفاظ سنے تھے لیکن نجانے کیوں مجھے ان الفاظ میں ایک خاص طرح کا ربط محسوس ہو رہا تھا۔ یہ الفاظ اپنے اصل معنی کے بجائے کسی اور معنی میں بولے جا رہے تھے۔ بولنے والا اپنے حواس میں نہیں تھا لیکن یہ لفظ اس کی زبان سے بے وجہ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

اچانک مجھے کسی ساتھ والے کمرے سے کربناک چیخ سنائی دی۔۔۔ یہ ارجمند بانو کی چیخ تھی۔ وہ ذبح ہونے والی بکری کی طرح چلائی تھی۔۔۔ اور اس نے صرف ایک چیخ پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ وہ چیختی چلی جا رہی تھی۔ یہ اتنی بلند چیخیں

ایم اے راحت
کا ایک خوبصورت ناول
سوکھے گلاب
قیمت ۱۸۰/- روپے
ڈاک خرچ ۲۰/- روپے
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۳۲۷۴۱۴

تھیں کہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے باوجود فضا کو چیرتی جا رہی تھیں۔

میں دوڑتا ہوا آواز کی سمت گیا۔ زریں گل میرے پیچھے آ رہا تھا۔ ہم اس آفس میں سے گزرے جہاں میں نے بونے باڈی گارڈ سمیت چھ افراد کو باندھ کر فرش پر ڈال رکھا تھا۔ یہ سارے افراد ننگر شکرا کے ساتھی تھے اور زچہ بچہ سینٹر والی کوٹھی سے پکڑے گئے تھے۔ میں نے ایک نگاہ ان پر ڈالی اور بری طرح چونک گیا۔ بونا باڈی گارڈ ان میں موجود نہیں تھا۔ ایک بار پھر ارجمند کی کربناک چیخ فضا میں ابھری اور دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو ایک لرزہ خیز منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ خونخوار بونا چیر پھاڑ کی طرح ارجمند کی پشت پر سوار تھا۔ اس کی سڈول ٹانگیں ارجمند کی کمر سے لپٹی ہوئی تھیں اور بازوؤں نے اس کی گردن کے گرد حلقہ بنا رکھا تھا۔ بونے کے دانت ارجمند کی گردن کے عقبی حصے میں پیوست تھے۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مجھے اپنے پیٹ کا نیلگوں ابھار یاد آ گیا۔ یہ ابھار بھی اپنے ہی ایک بونے کے بے رحم دانتوں کی یادگار تھا اور کئی دن گزرنے کے باوجود ابھی تک پوری طرح معدوم نہیں ہوا تھا۔

کمرے کے فرش پر قالین نما دری بچھی تھی اور دری پر شیشے کے بہت سے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ٹکڑے غالباً ایک سنگار میز کے شیشے کے تھے۔ ارجمند چلا رہی تھی اور بونے کو اپنی پشت سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اپنا پستول سونت کر دو قدم آگے بڑھا اور پھر مجھے وہ چمکدار شے نظر آئی جو بونے نے ارجمند کی گردن سے پیوست کر رکھی تھی۔ وہ دیکھنے میں خنجر لگتا تھا لیکن خنجر نہیں تھا۔ خنجر کے پھل جیسا وہ موٹے شیشے کا لمبا سا ٹکڑا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے بونے کی زرد آنکھوں میں جھانکا اور اندر سے لرز گیا۔ ان آنکھوں میں غیر انسانی چمک تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ایک قدم بھی بڑھایا تو یہ عجیب الخلقت درندہ ارجمند کی جان لے لے گا۔

اس موقعے پر زریں گل ہوشیاری دکھا گیا۔ بڑی پھرتی سے وہ نیچے جھکا اور اس نے وہ قالین نما دری ایک جھٹکے سے کھینچ لی جس پر ارجمند کھڑی تھی۔ ایک چیخ کے ساتھ ارجمند پشت کے بل فرش پر گری۔ ظاہر ہے بونا بھی اس کے ساتھ ہی گرا تھا۔ اس کا سر سنگار میز کے کونے سے ٹکرایا اور پھر وہ تڑپ کر ارجمند سے علیحدہ ہو گیا۔ میں اس موقعے کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا؟ میں نے جست لگائی اور بونے کو چھاپ لیا۔ وہ کسی منجھے ہوئے درندے کی طرح طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ میں اسے کوئی موقع دیتا تو یہ بڑی غلطی ہوتی۔ میں نے اسے پہلی ضرب ہی تسلی بخش لگائی۔ پستول کا بھاری بھرکم دستہ بونے کی پیشانی پر لگا اور سیاہ جلد کے نیچے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ بونے کا وہ ہاتھ جس میں شیشہ دبا ہوا تھا میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اس وقت میری نگاہ بونے کے ہونٹوں کی طرف گئی اور میں ششدر رہ گیا۔ مجھے اس کے دانتوں میں سفید سفید گوشت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ بلاشبہ یہ ارجمند بانو کی گردن کا گوشت تھا۔

میں ارجمند بانو کو اس کمرے میں لے آیا جو بابو لیاقت کے آفس کی عقبی جانب واقع تھا۔ وہ درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کی گردن کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی بوٹی نکل گئی تھی۔ وہ یہ منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ورنہ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔ میں نے بابو لیاقت کے ساتھ مل کر اسے ابتدائی طبی امداد فراہم کی۔ خون بند کرنے کے بعد زخم پر روئی رکھ کر پٹی باندھ دی گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور گردن کے سامنے والے حصے پر بھی خراشیں تھیں۔ تاہم یہ خراشیں ایسی نہیں تھیں کہ اس کی خوبصورتی کو مجروح کرتیں۔ اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔ "میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک دم وہ کھڑکی سے کود کر اندر آیا اور میری پشت پر گرا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کو اوپر سے جھٹک سکوں لیکن وہ کسی کیکڑے کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔"

اسی دوران زریں گل اندر آ گیا۔ کہنے لگا "استاد جی! وہ بن مانس کا بچہ تو بے ہوش پڑا ہے۔ بہت سا خون نکل گیا ہے اس کے سر سے" زریں گل کا اشارہ قادر زماں کے بونے باڈی گارڈ کی طرف تھا۔ اس کی پیشانی پر بہت زوردار چوٹ لگی تھی اور میں نے دائیں ابرو کے اوپر سے خون کی پچکاریاں چھوٹتے دیکھی تھیں۔

زریں گل بولا "اگر اسے اسپتال نہ پہنچایا تو خانہ خراب ادھر ہی مر جائے گا"

میں نے کہا "مرنے دو۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے"

میرے سرد لہجے نے زریں گل کو متعجب کیا۔ ابھی زریں گل کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ بونا اور اس کے دیگر ساتھی چودہ پندرہ گھنٹے پہلے کتنے سنگین جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ ان لوگوں نے ڈنگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو میرے ساتھ تعاون کرنے کی پاداش میں بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اب ان کے لئے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد زریں گل اور بابو لیاقت باہر چلے گئے تو میں ارجمند کے ساتھ کمرے میں تنہا رہ گیا۔ وہ اب اپنے حواس میں آ چکی تھی اور تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسکرٹ نما لباس کے اندر اس کا جسم نشیب و فراز سے آراستہ نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔ اس کی یہ حرکت جتنی اچانک تھی اتنی ہی حیرت انگیز بھی تھی۔ میں اس وقت کرسی پر بیٹھا تھا۔ ارجمند نے اپنے گھٹنے فرش پر ٹیک دیے تھے اور بے حد جذباتی انداز میں مجھ پر گری گئی تھی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی "استاد بالی۔ مجھے خود سے دور مت کرو۔ تم نے سب کچھ اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔ سائیں جی نے کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں اور تمہارے کہے پر عمل کروں۔ میں اب تمہارے قدموں سے دور نہیں ہوں گی۔"

میں اس اچانک افتاد پر بوکھلا سا گیا تھا۔ ارجمند بانو کا انداز اچانک ہی کسی پجارن یا مریدنی جیسا ہو گیا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے۔ میں کرسی سے کھڑا ہو گیا تو ارجمند بانو عرف الو کی پٹھی نے اچانک میرے پاؤں تھام لیے۔ "مجھے دھتکارنا مت استاد بالی! وشواس کرو کہ تم نے ایسا کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی"

میں نے بہ آہستگی اپنے پاؤں اس کی گرفت سے چھڑائے اور دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر میں نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔

"یہ سائیں عالی ہے کون؟" میں نے اس پوچھا

"یہ میرے پیر و مرشد ہیں" ارجمند بانو بلا جھجک بولی

"میں ان کے کوائف جاننا چاہ رہا ہوں"

ارجمند بانو نے ایک گہری سانس لی اور بولی "استاد بالی! سائیں جی کے حکم کے بعد میں اب تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ اگر چھپاؤں گی تو اپنے آپ پر ظلم کروں گی۔ تم جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو پوچھ سکتے ہو"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ تم بغیر پوچھے ہی سب کچھ بتا دو"

اس نے پرسوچ انداز میں انگلیاں اپنے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ بیکانیر کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا نام مدھومیتا تھا۔ میں نے بی ایس سی کر رکھا ہے۔ میرے پتا جی تھے۔ وہ ایک سفید پوش اور کام سے کام رکھنے والے شخص تھے۔ جونیئر کلرک بھرتی ہو کر وہ بیس سال کے عرصے میں ہیڈ کلرک کے عہدے تک پہنچے۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ بہنیں پانچ اور بھائی صرف ایک۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ ماتا پتا کی ان تھک پرارتھنا کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام دیپک ہے اور ابھی چند ماہ پہلے اس نے ساتویں کلاس کا امتحان دیا ہے۔ ہمارا بچپن تنگ دستی اور عسرت سے عبارت تھا۔ اکثر فاقوں تک نوبت آ جاتی تھی۔ جس گھر میں بھوک نے ڈیرا ڈال رکھا ہو وہاں عموماً بیماری کی آمد و رفت بھی ہو جاتی ہے۔ میری والدہ بھی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ان کے سارے مسائل غربت زدہ تھے لیکن بیماری امیروں والی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل کا ایک حصہ مردہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر بتاتے تھے کہ اس کا علاج انڈیا میں ممکن نہیں۔ ہماری رسائی تو روٹی تک مشکل سے ہوتی تھی۔ آسٹریا اور امریکا تک کیسے ہوتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری ماں مر گئی۔ اس وقت میں صرف دس سال کی تھی اور میں ہی سب سے بڑی تھی۔ صرف دس سال کی عمر میں ایک بچہ میری گود میں آ گیا تھا اور یہ میرا بیٹا نہیں میرا بھائی دیپک تھا۔

والدین ترکے میں اولاد کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے ہیں، میری والدہ بھی ایک چیز چھوڑ گئی اور وہ تھی دل کی بیماری۔ میرا بھائی دیپک جب تین سال کا ہوا تو پتا چلا کہ اسے بھی دل کا عارضہ لاحق ہے۔ پہلے ڈاکٹروں نے اس کے دل میں سوراخ بتایا پھر معلوم ہوا کہ یہ دل کے پٹھوں کی کوئی بیماری ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا دیپک سب سے چھوٹا تھا اور ہم کو پیارا بھی بہت تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ہماری آنکھوں کا نور اور دل کی ٹھنڈک تھا۔ والد تو اس کی معصومیت کے دیوانے تھے ہی، ہم سب بہنیں بھی اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ اس کی بیماری کا جان کر کچھ نہ پوچھئے کیا حال ہوا ہمارا لیکن یہ انتہا نہیں ابتدا تھی۔ یکے بعد دیگرے میری دو چھوٹی بہنوں کے بارے میں بھی یہی انکشاف ہوا۔ وہ بھی دل کے عارضے میں مبتلا تھیں۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ گزرنے والے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تکلیف بڑھتی جائے گی اور پچیس سال تک کسی بھی وقت ان کی زندگیوں کے چراغ گل ہو سکتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج بیرون ملک میں ممکن تھا لیکن اس کے لئے ہزاروں بلکہ شاید کروڑوں روپے درکار تھے۔ جب بیماری اور علاج کے درمیان اتنے زیادہ فاصلے ہوں تو عموماً ٹونے ٹوٹکوں، تعویذ گنڈوں اور روحانیت کے سہارے لئے جاتے ہیں۔ ہم نے بھی یہی کچھ کیا۔۔۔ اور کسی نہ کسی طور اب تک کر رہے

تھے۔

تو تیس کی عمر کو پہنچنے تک میرے اندر یہ خواہش پختہ ہو چکی تھی کہ میں اپنے گھرانے کے چہرے سے غربت اور بے بسی کی سیاہی دھو ڈالوں گی۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ہارٹ سپیشلسٹ لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ انٹر کے امتحان میں صرف چھ نمبروں کی کمی سے میری زندگی کا رخ بدل گیا۔ میں ڈاکٹر نہ بن سکی اور ایک بڑی فنکارہ بننے کے شوق میں بمبئی پہنچ گئی۔ تم دیکھ رہے ہو' میں اب بھی خوب صورت ہوں۔ اس وقت نوخیز اور کنواری بھی تھی۔ میرے لیے بمبئی درندوں سے بھرا ہوا ایک جنگل تھا۔ میں اندھی ہرنی کی طرح اس جنگل میں گھس آئی تھی۔ بمبئی کی فلم نگری کے بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ میں اپنے مضبوط ارادوں کے سہارے اپنی اور اپنے آدرشوں کی حفاظت کر سکوں گی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ کناروں سے بہاؤ کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بمبئی میری معلومات اور توقعات سے بڑھ کر خوفناک شہر نکلا۔ وہاں میرے ساتھ کیا کچھ ہوا' میں بتانے لگوں تو شاید کئی راتیں اس ہزار داستان کی نذر ہو جائیں۔ بس یوں سمجھو کہ ہر مرد نے مجھ سے میرے عورت ہونے کا خراج وصول کیا اور ہر لوٹنے والے نے مجھے حسب استطاعت لوٹا۔ میرے جسم پر پہلا ڈاکا ڈالنے والا ایک چوکیدار تھا۔ وہ ایک معمولی سا شخص تھا۔ ایسے لوگ اب میرے کتوں کو راتب ڈالتے ہیں۔ وہ گرمیوں کی حبس زدہ راتیں تھیں۔ صرف ایک روز پہلے میں نے خود کو ایک فلمی صحافی کے پنجۂ ہوس سے بچایا تھا۔ (اس صحافی نے میرا نام سروج رکھا تھا۔) اس نام نہاد صحافی کے گھر سے مجھے اس کی ماں کا بہت ہی بوسیدہ برقع مل گیا تھا۔ وہ برقع پہنے میں رات گئے تک شہر میں گھومتی رہی۔ آخر کوئی ٹھکانا نہ پا کر اور تھک ہار کر ایک دکان کے سامنے بیٹھ گئی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ دکان بند تھی۔ شٹر گرا ہوا تھا۔ میں شٹر سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگی۔ میری طرح چند اور فٹ پاتھیے بھی نشے میں چور ادھر ادھر لڑھکے ہوئے تھے۔ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے' مجھے بھی آ گئی۔ نیند میں وہ ٹوپی والا برقع میرے چہرے سے سرک گیا۔ نجانے کس وقت چوکیدار نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چوڑے چکلے سینے والا ایک ہندو کابلی تھا۔ میں جاگی تو وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی ہوس نظر آئی جو مجھے بمبئی فلم نگری میں ہر مرد کی آنکھ میں دکھائی دی تھی۔ اس نے ایک دم میری کلائی پکڑی اور غرا کر بولا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

میں نے کہا "بے آسرا ہوں۔ صبح کا انتظار کر رہی ہوں مجھے اسٹیشن جانا ہے اور وہاں سے بیکانیر والی گاڑی میں جانا ہے۔"

اس نے مجھے پیشہ ور عورت ہونے کی گالی دی اور بولا "میں تمہیں حوالۂ پولیس کروں گا"

میں نے کہا "میں بری عورت ہوتی تو یہاں اس وقت فٹ پاتھ پر نہ پڑی ہوتی"

وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے سیٹی بجا کر اپنے ایک بھوپالی ساتھی کو بھی بلا لیا۔ اس سے کہنے لگا "یہ کنجری یہاں گاہک پھانس رہی ہے"

مجھے ڈرا دھمکا کے وہ ایک قریبی کوارٹر میں لے آئے۔ میرے پاس ایک طلائی انگوٹھی اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ اپنی عزت بچانے کے لیے میں نے یہ پونجی ان کے حوالے کر دی' مگر یہ کوشش بھی بے کار رہی۔ کابلی چوکیدار نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک "بدکار" کی تحویل میں آئی ہوئی لاوارث عورت کا مقدر ہوتا ہے۔ اس شب چوکیدار ڈاکو بن گیا اور میری عزت کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔

اگلے روز میں بیکانیر کی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اسی مشہور فلمی صحافی کے پاس پہنچ گئی جس نے مجھے فلمی دنیا میں متعارف کرانے کی پیشکش کی تھی اور بعد میں اپنی پیشکش کا صلہ میرے جسم سے وصول کرنا چاہا تھا۔ اب میرے پاس بچانے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لئے میرے اندر ایک خاص قسم کی جرأت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ فلمی صحافی میری زندگی میں آنے والا دوسرا مرد تھا۔ میں کئی روز اس کے پاس رہی۔ اس کے رسالے کے سرورق پر میری رنگین تصویریں چھپنا شروع ہو گئیں۔ مجھے ایک ابھرتے ہوئے تابناک ستارے کا نام دیا گیا۔ میرے حسن کے قصیدے لکھے گئے۔ میں اس وقت اداکاری کی الف ب سے بھی واقف نہیں تھی لیکن اس فلم صحافی نے میرے فن کا موازنہ مینا کماری اور نرگس تک سے کر ڈالا۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا۔ جب میرے شریر میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگی تو اس کا قلم بھی اٹکنے لگا۔ اس کے بعد ایک معاون ہدایتکار کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ایک بار پھر وہ کھیل شروع ہو گیا جس میں فلمی دنیا کی چمک دمک دکھا کر لڑکیوں کو اندھا کیا جاتا ہے اور ان کو تاریک راستوں پر بھٹکایا جاتا ہے۔ میں نے کہا نا کہ یہ ایک بہت طویل کہانی ہے۔ کبھی موقع ملا تو اس حوالے سے ایک زبردست کتاب لکھوں گی۔ استاد جمالی! میں کھلے دل سے یہ تسلیم کرتی ہوں کہ دولت حاصل کرنے کی خواہش میرا دین دھرم بن گئی

ہے۔ اس کی خاطر میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں اور اب بھی بیل رہی ہوں۔ پچھلے چھ برسوں پر نگاہ دوڑاتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ ان برسوں کا ایک ایک پل میں نے اس مقصد کے پیچھے بھاگتے گزارا ہے۔ مجھے جاننے والے "میری حرص" سے تو آگاہ ہیں لیکن ان محرومیوں سے بے خبر ہیں جن کے سبب یہ حرص میرے خون میں شامل ہوئی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بھوک' تنگی اور بیماری کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جو زندگی باقی رہ گئی ہے' وہ بھی انہی مصیبتوں میں گزرے۔ ہاں میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں گناہ ثواب اور نیکی بدی کے تصورات سے آگے نکل چکی ہوں۔ میرا ایک ہی نصب العین ہے اور وہ ہے دولت اور شاہانہ زندگی۔ ایک ایسی لائف جس میں کوئی بھی کام پیسے کی وجہ سے نہیں رکتا اور بعض اوقات تو زندگی بھی پیسے کے زور پر خریدی جاتی ہے۔ میں نے ابھی پچھلے دنوں "دوبئی" کی ایک ڈاکٹر سے رابطہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ میری بہنوں اور بھائی کی زندگی کے لئے خطرات بتدریج بڑھ رہے ہیں۔ ان پر کسی بھی وقت اچانک بیماری کا شدید حملہ ہو سکتا ہے۔ ان کے علاج کے لیے لاکھوں ڈالر درکار ہیں۔ شاید تم یقین نہ کرو' صرف ایک مریض کا چھ مہینے کا علاج کرایا جائے تو تقریباً تین لاکھ امریکی ڈالر لاگت آتی ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے علاج مشکل اور مہنگا ہوتا جا رہا ہے اور زندگی کے امکانات معدوم ہو رہے ہیں"

ارجمند کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ وہ جذباتی انداز میں بولی "ہاں میں بھوکی ہوں پیسے کی۔ مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے بھی اور اپنے ماں جائیوں کے لیے بھی۔ عمر بھر غربی کاٹنا اور اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا میرا مقدر نہیں ہے۔"

میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا "بمبئی فلم نگری میں قسمت آزماتے آزماتے تم نے افراہیم سے شادی کیسے کر لی؟"

وہ آنسو پونچھ کر بولی "صرف دولت کے لئے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میں نے افراہیم سے کبھی محبت نہیں کی۔ لیکن اس میں دھوکا دہی والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ شادی ایک طرح سے ایک معاہدہ تھی' اور اس معاہدہ کی تمام شرائط سے افراہیم بھی آگاہ تھا"

"کیسا معاہدہ؟"

"وہ گمشدہ صندوق تلاش کرنے کا معاہدہ جو چند روز پہلے تم نے [illegible] سے نکالے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ صندوق جھنگ کے گرد و نواح میں کہیں دفن ہیں اور پرانی حویلیوں اور کھنڈرات وغیرہ کی کھدائی کر کے ان کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ میں بھارتی تھی اور میرے لئے جھنگ اور وہاں کی پرانی حویلیاں بہت دور تھیں۔ اس درمیانی فاصلے کو مٹانے کے لئے میں نے افراہیم سے شادی کی۔ وہ نہ صرف ایک بااثر زمیندار تھا بلکہ جھنگ ہی کا رہنے والا بھی تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے اپنی ہی طرح طالع آزما اور مہم جو نظر آیا۔ میں نے سارے حقائق کھول کر اس کے سامنے رکھے اور پھر اس سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے میں نے اسلام قبول کر لیا اور مولوی صاحب نے میرا نام ارجمند بانو رکھا۔"

بتدریج گمشدہ کڑیاں مل رہی تھیں۔ ایک تصویر سی نگاہوں کے سامنے مکمل ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ارجمند بانو سے پوچھا "تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ گمشدہ صندوق جھنگ میں کہیں دفن ہیں؟"

ارجمند نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم نے سائیں عالی کو دیکھا ہے؟"

"بالکل دیکھا ہے"

"وہ تمہیں کیسا لگا؟"

"جیسے عام مجذوب ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ایکٹنگ وغیرہ نہیں کر رہا۔ جیسا ہے ویسا ہی نظر آ رہا ہے"

"لیکن وہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اس کی ذہنی حالت کا سبب اس کی پیشانی کی خوفناک چوٹ ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ چوٹ نے اس کے سر کے ایک حصے کو کس طرح پچکا کر رکھ دیا ہے۔ یہ چوٹ اسے کافی عرصے پہلے لگی تھی۔ غالباً بیس پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن شروع شروع میں اس کی ذہنی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ وہ کبھی کبھار ہوش کی باتیں بھی کرنے لگتا تھا۔ جو لوگ اس زمانے میں سائیں عالی سے ملے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی گمشدہ دولت کی باتیں کرتا تھا۔ اسے جہاں کہیں زمین میں چھوٹا بڑا گڑھا نظر آتا تھا اسے فوراً مٹی سے پُر کرنے لگتا تھا اور کہتا تھا "نہ نہ' شفیع محمد کو پتا چل جائے گا۔ یہ ساری دولت میرے بیٹے کی امانت ہے۔ اس پر مٹی ڈال دو۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے" لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ وہ کیا چھپا رہا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ "صندوق چھپا رہا ہوں۔ بہت بڑے بڑے صندوق ہیں۔ سونے چاندی سے بھرے ہوئے"

جہاں کوئی شخص کھدائی کرتا نظر آتا تھا سائیں عالی اس پر پل پڑتا تھا۔ ایسے ہی اس نے ایک دفعہ محکمۂ ٹیلیفون کے

ایک ملازم کو آہنی سریے سے مار مار کر جان سے مار دیا تھا۔ بعد میں وہ تین سال بمبئی کے پاگل خانے میں رہا۔ پاگل خانے میں بھی وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہا۔ اس نے سر اور داڑھی کے بال لمبے چھوڑ دیے تھے۔ پاگل خانے کے قاعدے کے مطابق جب بھی اس کے بال مونڈنے کی کوشش کی گئی اس نے زبردست ہنگامہ مچایا اور یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ بعد ازاں مینٹل اسپتال کا ایک اعلیٰ افسر اس کا مرید بن گیا اور اس نے سائیں عالی کو مینٹل اسپتال سے رہا کرا دیا۔ یہ کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے۔ مینٹل اسپتال سے رہا ہونے کے بعد سائیں عالی نجانے کس طرح پاکستان پہنچ گیا۔ پاکستان آکر اس نے جھنگ کا رخ کیا۔ وہاں وہ چھ سات ماہ مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کی یادداشت بالکل ختم ہو چکی تھی جھنگ کے گلی کوچوں کو وہ پہچانتا تھا۔ جن لوگوں نے سائیں کو جھنگ کے گلی کوچوں میں گھومتے دیکھا وہ بتاتے ہیں کہ وہ بار بار چند گلیوں میں سے ہو کر شہر کی مشرقی جانب ایک سہ راہے پر پہنچتا تھا اور وہاں جاکر رک جاتا تھا' جیسے آگے جانے کا راستہ نہ پا رہا ہو۔ چھ سات ماہ بعد وہی اعلیٰ افسر جس نے سائیں عالی کو پاگل خانے سے چھڑایا تھا' پاکستان پہنچا اور اسے اپنے ساتھ واپس بمبئی لے گیا۔ بعد میں یہ اعلیٰ افسر ریٹائر ہو کر فلم لائن میں آگیا۔ اس شخص کے توسط سے فلم لائن میں سائیں عالی کا چرچا ہوا اور بڑے بڑے لوگ اس کے چرن چھونے بمبئی اسٹیشن پہنچنے لگے۔

انہی دنوں میں اداکار ہدایتکار دیو آنند کی ایک بڑی پروڈکشن میں اسپورٹنگ رول حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دائی نے مجھ سے کہا کہ میں سائیں عالی کے نیاز حاصل کروں۔ میں نے پہلے بھی سائیں عالی کا شہرہ سنا تھا۔ ایک شب بدفع اوڑھ کر میں ٹیکسی میں بیٹھی اور بمبئی ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ بمبئی اسٹیشن کے ایک کہنہ سال پل کے نیچے ایک کھولی نما تاریک خلا میں چھوٹی سی لالٹین جل رہی تھی۔ یہاں کاٹھ کباڑ اور بوسیدہ چیتھڑوں کے درمیان مجھے دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیں۔ یہ اس شخص کی آنکھیں تھیں جس کے پاؤں چھونے اور جھڑکیاں کھانے کے لئے بڑے بڑے لوگ ہفتوں یہاں کے چکر کاٹتے تھے۔ میں ڈرتی ڈرتی سائیں عالی کے قریب پہنچی۔ اس نے مجھے دیکھ کر حسب عادت برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ حالات سازگار دیکھ کر میں مزید آگے بڑھی اور اس کے پاؤں میں بیٹھ گئی۔ یہ سائیں عالی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کئی برس تک کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ میں نے بمبئی میں موجود ہونے کے باوجود سائیں عالی کا دیدار نہ کیا ہو۔ سائیں عالی میرے ساتھ خاص مہربانی سے پیش آتا تھا۔ کہتا تھا' تو اچھی عورت بن جا' میں تجھے اپنی بہو بناؤں گا۔ وہ اکثر میری چوٹی اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیتا اور ہولے ہولے جھٹکے دیتا رہتا۔ اس کے ساتھ وہ عجیب و غریب باتیں بھی کرتا تھا۔ ان باتوں میں کبھی سونے کے پہاڑ کا ذکر آتا' کبھی شیخ محمد کا' کہیں ان لوگوں کا جو سفید کپڑے پہن کر ہواؤں میں اڑتے پھرتے تھے اور سائیں کے پاس دور دراز کی خبریں لاتے تھے۔

سائیں کے ساتھ طویل رفاقت کے بعد مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے جو گمشدہ دولت اور سائیں عالی کے حوالے سے کہی سنی جاتی ہیں۔ میں نے ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے بارہا کوشش کی کہ سائیں کی زبان سے کوئی کام کی بات کہلوا سکوں یا کوئی مفید اشارہ مجھے مل جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تو شاید سائیں کے حافظے سے جھنگ کا لفظ بھی اتر چکا ہے۔ ایک دن مجھے پتا چلا کہ سائیں عالی نے بمبئی میں اپنے اولین دن بھنڈی بازار اور محمد علی جناح روڈ کے علاقے میں گزارے ہیں۔ میں کھوج لگاتے ہوئے بھنڈی بازار پہنچی اور وہاں کے بڑے بوڑھوں سے ملی۔ ایسے ہی ایک عمر رسیدہ خوانچہ فروش سے مجھے پتا چلا کہ شروع شروع میں سائیں عالی کی ذہنی حالت اتنی خراب نہیں تھی اور وہ کبھی کبھی سیانوں جیسی باتیں کرنے لگتا تھا۔ مگر اس کی یادداشت قریباً قریباً ختم ہو چکی تھی۔ نہ اسے اپنا نام یاد تھا نہ یہ پتا تھا کہ کہاں سے آیا ہے۔ ان دنوں وہ چند فقرے بار بار کہا کرتا تھا "پرانی حویلی کے فرش میں صندوق ہیں۔ سونے چاندی سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ سارے کے سارے میرے بچے کے ہیں۔ سارے کے سارے میرے بیٹے کے ہیں۔"

لوگ اس سے پوچھتے کون سی پرانی حویلی؟ وہ کہتا "پتا نہیں۔" لوگ پوچھتے' وہ حویلی کس شہر میں ہے۔ وہ کہتا "پتا نہیں۔" کبھی وہ ہوا میں اشارے کرتا اور ناقابل فہم الفاظ لکھتا۔ زیادہ تر لوگ اس کی باتوں کو دیوانے کا خواب سمجھتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو ہر وقت اس کی خدمت گزاری میں لگے رہتے اور امید رکھتے کہ وہ انہیں کسی بہت اہم راز سے آگاہ کرے گا۔

یہ صورت حال کوئی ڈیڑھ سال برقرار رہی پھر سائیں عالی بیمار پڑا اور اس کی ذہنی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد اس پر شگفتہ ٹیلیفون کے ایک کیبل مین کو قتل کرنے کا کیس بن گیا اور وہ پاگل خانے پہنچ گیا۔"

میں نے ارجمند بانو سے پوچھا "تمہارا سائیں عالی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولی "میں سمجھتی ہوں کہ قدرت نے اس سے ہوش و حواس چھین کر روحانیت دے دی ہے۔ اس کی نگاہ بہت دور تک دیکھ سکتی ہے اور کبھی کبھی اس کے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ہے جو حرف بہ حرف سچ ثابت ہوتی ہے۔ فلم لائن والے اسے گرو کا درجہ دیتے ہیں اور فلم والے ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ اس کے نیاز حاصل کرنے کے لیے دور دراز سے بمبئی کا رخ کرتے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے صنعت کار' زمیندار اور سیاستداں شامل ہیں۔"

میں نے کہا "تم میرا مطلب نہیں سمجھی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان صندوقوں والے معاملے سے سائیں عالی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"کوئی بہت گہرا تعلق" ارجمند نے بلاتاخیر جواب دیا۔ "میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ ان گنت راتوں کی نیند حرام کی ہے۔ اب تو خیر سب کچھ سامنے آچکا ہے۔ اس وقت بھی جب کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ سائیں کا کہا سچ ثابت ہوگا' میرا ایمان تھا کہ سائیں سچ کہہ رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ وہ صندوق موجود ہیں جن کا ذکر بارہا سائیں کی زبان پر آیا ہے۔ تمہاری طرح میں نے بھی بہت سوچا تھا کہ سائیں کا ان صندوقوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس سوال کے سیکڑوں ممکنہ جوابات تھے لیکن نجانے کیوں ایک بات میرے ذہن میں بالکل واضح تھی۔ اور اتنے برس گزرنے کے بعد آج بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ سائیں عالی کے چہرے پر نظر آنے والی چوٹ کا ان ۲۵ صندوقوں سے براہ راست تعلق ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "کیا تمہارے ذہن میں اس سے ملتی جلتی بات نہیں آتی؟"

ارجمند نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سائیں عالی کے چہرے پر زخم کا گہرا نشان دیکھ کر آپوں آپ یہ بات دل میں بیٹھ جاتی تھی کہ سائیں کی ذہنی کیفیت کا رشتہ اسی کاری زخم سے ہے اور اس زخم کے ڈانڈے کہیں ان صندوقوں سے جا ملتے ہیں جو پرانی حویلی سے برآمد ہوئے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ پچیس چھبیس سال پہلے ان صندوقوں کے سلسلے میں ہونے والی کوئی ہنگامہ آرائی ہی اس چوٹ کا سبب بنی ہو۔

میں نے ارجمند سے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے سائیں عالی تم سے مخاطب ہو کر میرے بارے میں کہہ رہا تھا' یہ تمہارا مقدر ہے' تمہارا نصیب ہے' اس سے چمٹ جاؤ' اس کے ساتھ رہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں کچھ میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

وہ بولی "سائیں کی اکثر باتیں سمجھ میں نہیں آتیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اب دیکھ لو۔ وہ تمہیں جانتا نہیں۔ تمہارے نام سے واقف نہیں۔ نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ تم وہ صندوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہو جن کے لئے نجانے کون کون لوگ کہاں کہاں کی خاک چھان چکے ہیں۔ صرف تمہارا چہرہ دیکھ کر اس نے نصیحت کر دی ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہوں اور تمہاری ہدایات پر عمل کروں۔ میرا من گواہی دیتا ہے کہ سائیں' لوگوں کے اندر بہت دور تک دیکھ لیتا ہے۔ وہ چہروں سے دل کی کیفیت بھانپ لیتا ہے اور جب کبھی موج میں ہو تو اپنی اس آگاہی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ میرے من میں بھی جھانک چکا ہے۔ اسے میری خواہشات کا علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ پیسہ میری زندگی کی پہلی اور آخری ضرورت بن چکا ہے۔"

ایک دم ارجمند پھر غمگین نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی' بولی "استاد جمالی! میں تم سے کچھ بھی چھپا نہیں رہی ہوں۔ وہ سب کچھ بھی کہہ رہی ہوں جو انسان صرف اپنے آپ سے کہتا ہے۔ غربت کی کڑی دھوپ دیکھنے کے بعد اب میں خوشحالی کی گھنی چھاؤں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس خوشحالی کی خاطر میں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ سب سے پہلی قربانی تو یہی تھی کہ میں نے درجنوں حسین اور دولتمند نوجوانوں کو ٹھکرا کر افراہیم جیسے لالچی مرد سے شادی کی۔ اس شادی کی خاطر اپنا کیریئر تباہ کیا' اپنا دھرم تبدیل کیا' اپنے وطن کو خیرباد کہا اور پھر دو برس جھنگ کے ویرانوں کی خاک چھانی۔ جھنگ میں بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں ہم نے۔ میں تفصیل بتانے بیٹھ گئی تو شاید پوری رات گزر جائے۔ جھنگ کے ارد گرد ہم نے مجموعی طور پر کھنڈروں اور حویلیوں کی شکل میں قریباً چوبیس ایکڑ زمین خریدی اور اس میں کھدائی کروائی۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ کتنا کٹھن اور صبر آزما کام تھا۔ اور ہمیں صرف "کام" ہی نہیں کرنا تھا' خود کو کچھ پوشیدہ خطرات سے بھی بچانا تھا۔ تم خود سوچو ہمیں شکر شکرا اور عیسیٰ جان جیسے خطرناک لوگوں کو گراں ترین معاوضوں پر بھرتی کرنا پڑا اور انہیں کمیشن وغیرہ کا لالچ دینا پڑا۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ ہم نے یہ کڑوی گولیاں حلق سے اتاریں۔ مجھے وشواس ہے کہ اگر ہم ان لوگوں کا تعاون حاصل نہ کرتے تو ہماری لاشیں کب کی مٹی کا رزق بن گئی ہوتیں۔"

میں نے کہا "تم کہنا کیا چاہ رہی ہو کہ تمہارے علاوہ بھی کچھ لوگ اس دفینے کی تلاش میں تھے؟"

"یقینی سی بات ہے' اور وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شکر شکرا ہی تھا جو ان سے نمٹنے میں

کامیاب رہا۔ ان لوگوں کے ساتھ ہونے والی سنگین کشمکش میں ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ میں اور افراہیم اپنی زندگی کی طرف سے قطعی ناامید ہوگئے تھے لیکن پھر تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا اور شنکر شکرا اور عیسیٰ جان نے بروقت پہنچ کر حالات کو سنبھال لیا۔ شنکر واقعی ایک کارآمد شخص ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ قابلِ بھروسا نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مثال ایک خطرناک ہتھیار کی سی ہے۔ یہ ہتھیار حفاظت کا ضامن ہوتا ہے لیکن جب دشمن کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے تو موت بن جاتا ہے"

"جیسے اب یہ ہتھیار افراہیم کے ہاتھ میں ہے" میں نے لقمہ دیا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو" ارجمند نے تائید کی۔

میں نے پوچھا "افراہیم سے تمہاری دوری کی وجہ کیا تھی؟"

وہ بولی "افراہیم کی خود غرضی۔ میں سچ کہتی ہوں' افراہیم سے شادی کے بعد میرے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے اسے دل سے اپنا شوہر مان لیا تھا اور سوچا تھا کہ جیون کا سفر ہم اکٹھے طے کریں گے لیکن وہ مجھے اپنے مقصد کے لئے سیڑھی کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ میں بتدریج اس کے قریب آرہی تھی اور وہ بتدریج مجھ سے دور ہٹتا جا رہا تھا۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم نے حویلیوں کو ڈیکوریٹ کرکے بیچنے کا کام بھی شروع کردیا تھا۔ افراہیم اس کاروبار میں لاکھوں بنا رہا تھا۔ میں اس کی پارٹنر تھی لیکن اس نے مجھے کبھی حساب کتاب سے آگاہ نہیں کیا۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے' تلاش کے آخری مراحل میں اس نے کس طرح مجھ سے دھوکا کیا۔ اس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ چنے کی والی حویلی میں کام ختم کردیا گیا ہے لیکن درونِ خانہ اس نے کھدائی جاری رکھی اور مجھے اس وقت پتا چلا جب سب کچھ افراہیم کے ہاتھ سے بھی نکل چکا تھا"

میں نے کہا "لیکن وہ تو کہتا ہے کہ تمہاری اور اس کی دوری کا سبب یہ جلال نامی شخص ہے۔ حویلی کے تہ خانے میں کھدائی کے دوران اس نے شراب پی تھی اور اپنی پرائیوٹ لائف کے بارے میں دیر تک بولتا رہا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ جلال تمہارا دیرینہ شناسا ہے اور صرف تمہاری قربت کی خاطر وہ بمبئی سے جھنگ پہنچا تھا۔"

ارجمند کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ وہ بولی "شناسائی تک تو تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس سے آگے افراہیم نے جو کچھ بتایا تھا یا تم سوچ رہے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ جلال میرا پسندیدہ خدمتگار ہے لیکن میں نے اسے کبھی "محبوب" کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔"

ارجمند اور میرے درمیان اس موضوع پر کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر انسان اندر سے غمزدہ ہے۔ بقول بابا نانک "دکھیا سب سنسار۔ ہر سینے میں محرومیوں کے انبار لگے ہیں اور ہر دل خونچکاں ارمانوں کا مدفن ہے۔ ارجمند کا مقصدِ حیات دولت تھا اور وہ اس کے حصول کے لئے بہت اذیتیں برداشت کرچکی تھی۔ اپنا کیریئر' اپنی جوانی اور جمع پونجی وہ سب کچھ اس مہم جوئی پر خرچ کر چکی تھی۔ اب طرفہ تماشا یہ تھا کہ اس کی تمام کاوشوں کا صلہ کچھ ایسے لوگوں کو مل گیا تھا' جو اس کھیل میں قطعی نووارد تھے۔ (یعنی ہم) عارضی طور پر سہی لیکن اس وقت وہ بے بہا دفینہ ہماری ملکیت تھا جس کی خاطر ارجمند نے اور پھر اس کے ساتھ افراہیم نے بھی اَن گنت راتوں کی نیند اور دنوں کا سکون برباد کیا تھا۔ سہانے خواب دیکھے تھے اور حسین و جمیل منصوبے بنائے تھے۔

میں نے اپنی شکستہ رسٹ واچ کی طرف دیکھا "گیارہ بج چکے تھے۔ "اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟" میں نے ارجمند سے پوچھا۔

وہ فوراً بولی "اب میرا کوئی ارادہ نہیں۔ سائیں عالی کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے اور میں اس حکم سے سرتابی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میں وہی کروں گی جو تم کہو گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ارجمند بانو' جو تمہارا دل چاہے کرو لیکن ایک بات ذہن نشین رکھنا' میں ہیرو نہیں ہوں جو محبوبہ کا ہاتھ تھام کر مہمات سر کرتا ہے۔ میں بہت بدنام شخص ہوں' اور لوگ یونہی بدنام نہیں ہوا کرتے!"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا' سامنے زریں گل تھا۔ وہ بولا "وہ بونا باڈی گارڈ مرگیا ہے۔"

"خس کم جہاں پاک" میں نے کہا۔

وہ بولا "خوچے وہ بابو لیاقت صاحب سخت پریشانی میں ہے۔ وہ آپ کو بلا رہا ہے"

میں ارجمند بانو سے معذرت کرکے زریں گل کے ساتھ باہر آگیا۔ بابو لیاقت باہر ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں نے کہا "مجھے افسوس ہے لیاقت صاحب' میری وجہ سے آپ کی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے"

"کیا مطلب؟" بابو لیاقت نے پوچھا۔

"یہی کہ یہ فیکٹری آپ کی روزی کا اڈا ہے۔ میری وجہ سے اب یہاں بھی خون خرابہ شروع ہوگیا ہے"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں جمالی صاحب" بابو مسکرا کر بولا۔ "مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں دوستوں کا دوست ہوں اور ساتھ نبھانے کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ مول لے لیتا ہوں۔ اگر آپ کو میں متفکر نظر آرہا ہوں تو اس کا وہ سبب نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں"

"تو پھر کیا سبب ہے؟"

بابو لیاقت نے گہرا کش لیتے ہوئے کہا "آپ نے مجھ پر جو وضع داری ڈالی ہے میں اس سے عمدہ برا ہونے کا سوچ رہا ہوں۔ جو ٹرک آپ یہاں لے کر آئے ہیں' اس کے پیچھے بہت سے خطرناک لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹرک یا اس کا سامان جلد از جلد واپس پاکستان پہنچ جائے"

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں سوچ سے زیادہ عمل کا قائل ہوں۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاکر کچھ دکھانا چاہتا ہوں لیکن ہمیں تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ارجمند کے آدمی مغوبہ بچی کو لے آئیں اور میں اسے دیکھ لوں تو پھر یہاں سے چلیں۔"

ابھی بابو لیاقت نے بات ختم کی تھی کہ فیکٹری کے مین گیٹ پر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چند لمحے بعد میں نے ایک سفید ٹویوٹا کار کو اندر آتے دیکھا۔ کار نے چند گز راستہ طے کیا اور پارکنگ میں آکر رک گئی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی موجود تھی۔ اس کی عمر قریباً چودہ سال رہی ہوگی۔ وہ بہت ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ یہی وہ بے گناہ بچی تھی جسے تین روز پہلے ارجمند نے بابو لیاقت پر دباؤ ڈالنے کے لئے اغوا کیا تھا۔ کار رکتے ہی بچی باہر نکل آئی۔ وہ ابھی تک اسکول یونیفارم میں تھی۔ بابو لیاقت بھاگ کر گیا اور اس نے بچی کو گلے سے لگالیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ فرمان علی سمیت بابو کے دیگر ملازمین بھی ان کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ بابو نے فرمان سے کہا کہ وہ فوراً گھر میں فون کرے۔ اس کے بعد وہ بچی کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

اس کی واپسی قریباً دس منٹ بعد ہوئی۔ اب وہ بہت ہشاش بشاش اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بچی کی بازیابی کے بعد ایک بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا "جمالی صاحب! ہمیں شہر سے باہر جانا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تین چار گھنٹے تک لگ جائیں۔ اب ایک بار اپنے تیدیوں کی بندشیں وغیرہ اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارے بعد پھر کوئی ہنگامہ کھڑا ہوجائے"

میں نے کہا "آپ بے فکر رہیں۔ اب ایسا کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ ہاں بونے باڈی گارڈ کی لاش کا مسئلہ ہے۔ میں چاہتا ہوں جانے سے پہلے اسے کہیں ٹھکانے لگا جاؤں۔"

وہ بولا "بے فکر رہیں۔ سمجھیں ٹھکانے لگ گئی ہے لاش" اس نے تھوڑی دور واقع بڑی بڑی بھٹیوں کی طرف اشارہ کیا اور روکھے لہجے میں کہنے لگا "ان میں سے ایک بھٹی ہم تھوڑی دیر میں دہکا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے' یہ بھٹی مرنے والے کے لئے اچھی قبر ثابت ہوگی"

میں نے چونک کر بابو لیاقت کی طرف دیکھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک جی دار شخص نظر آیا' جو بظاہر سرد مزاج نظر آتا ہے لیکن وقت پڑنے پر خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور ہر کٹھن کام کرگزرتا ہے۔ میں نے کہا "نہیں لیاقت صاحب! میں آپ کو مزید امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ پلیز آپ ان معاملات میں اور ملوث نہ ہوں"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے میرا بازو تھاما اور مجھے لے کر اپنے آفس کی طرف چل پڑا۔ کہنے لگا۔ "شاہ جہاں صاحب! ہمیں تھوڑی سی مہم جوئی کرنا پڑے گی۔ ہمیں بارڈر کی طرف جانا ہے۔ ظاہر ہے اپنے اصل حلئے میں ہم نہیں جاسکتے۔ وہ سامنے ٹریکٹر ٹرالی دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ مٹی ڈھونے والی ٹرالی ہے۔ فیکٹری میں استعمال کے لئے خاص قسم کی مٹی مجھے دور دور سے منگوانا پڑتی ہے۔ یہ ٹرالی پرسوں فاضلکا کی طرف سے مٹی لے کر آئی تھی۔ دوبارہ کرفیو لگنے کی وجہ سے یہیں کھڑی رہ گئی۔ ایک ڈرائیور اور تین مزدور بھی ٹرالی کے ساتھ ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم اپنے "اسٹیٹس" سے تھوڑا سا نیچے اتر کر اس ٹرالی میں سفر کریں تو بڑی آسانی رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ مزدوروں کے بھیس میں"

میں نے کہا "میرا اسٹیٹس تو خیر پہلے بھی کچھ ایسا بلند نہیں۔ ہاں آپ کی بات اور ہے"

وہ ہنسنے لگا "آپ کا رنگ گورا ہے۔ دھوپ میں مٹی کھودنے اور ڈھونے والے ذرا سانولے ہوجاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے آپ ڈرائیور ہی بن جائیں تو بہتر ہے"

"لیکن اگر راستے میں پوچھ گچھ ہوئی تو ڈرائیور سے ہی ہوگی" میں نے نکتہ اٹھایا۔

بابو لیاقت نے میرے اس نکتے کو تسلیم کرلیا اور اقرار [illegible]

ہم اس وقت آفس کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ بابو لیاقت نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز سن کر اس کا رنگ بدل گیا۔ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا "آپ ہی کا فون ہے۔ وہی رحمن صاحب ہیں۔ گنڈا راپور گاؤں سے" اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

"ہیلو" دوسری جانب سے منصور کی آواز صاف پہچانی جا رہی تھی۔

"ہاں بھئی' میں نہال بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے" منصور کے لہجے میں اس بار کافی سنجیدگی تھی "بس آپ کو ایک اطلاع دینی تھی؟"

"ہاں۔۔۔ کہو" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ پروگرام کے مطابق چھ سات بجے پہنچ رہے ہیں نا؟"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ واہ گرو نے چاہا تو پہنچ رہے ہیں"

وہ بولا "بس یہی یاد دہانی کرانا تھی۔ دراصل ہم زیادہ دیر سامان یہاں نہیں رکھ سکتے۔ چھ بجے تک ہمیں ٹھکانا خالی کرنا ہوگا۔ بلکہ اچھا ہی ہے آپ تھوڑی دیر پہلے ہی آجائیں"

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گا۔ ویسے خیریت تو ہے نا"

"بالکل خیریت ہے استاد' پریشانی کی کوئی بات نہیں"

"کوئی اور بات؟"

"بس میں انتظار کروں گا' رب راکھا"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بابو لیاقت میرے پاس ہی کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا۔ کہنے لگا "اب تو ہمارا جلدی نکلنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ قیدی بندھے پڑے تھے۔ ان پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے ہم آفس سے گزرے اور ساتھ والے کمرے میں آگئے۔ جہاں صوفے پر میل کچیل اور پسینے میں بسے ہوئے چند بوسیدہ کپڑے پڑے تھے۔ یہی وہ لباس تھا جسے پہن کر ہم مزدوروں کے بھیس میں ٹرالی پر سوار ہو سکتے تھے۔ دو ڈبل دھوتیاں' دو عدد بنیانیں' دو قمیصیں' ایک کمبل نما چادر اور ایک ڈھاٹا۔

پانچ دس منٹ میں ہم لباس تبدیل کر چکے تھے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ بابو لیاقت اس سارے معاملے میں کتنی دلچسپی لے رہا ہے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ سوچنے کی بات ہی تھی کہ ایک معزز وکیل' کامیاب صنعت کار اور ہردلعزیز سماجی شخصیت المعروف بابو جی' خستہ حال مزدور کے بھیس میں میرے ساتھ مٹی سے لتھڑی ہوئی ٹرالی میں بیٹھنے والا تھا اور ایک ایسے علاقے کی طرف جا رہا تھا جہاں ہمارے لئے قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ وہ اس کام کی اہمیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ جس ٹرک کے لئے استاد جمال' شنکر شنکرا' ارجمند بانو اور افراہیم جیسے لوگ سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں وہ کوئی بہت اہم ٹرک ہے۔ میں نے پہلی بار تفتیشی نگاہوں سے بابو لیاقت کی طرف دیکھا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہیں فوراً میرا انداز بھانپ گئیں۔ پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب! بڑا غور کر رہے ہیں"

میں نے اپنی ورم زدہ گردن کو سہلاتے ہوئے کہا "غور نہیں کر رہا' حیران ہو رہا ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آپ میرے لئے اتنا کچھ کر گزریں گے"

وہ بولا "اور میرے اتنا کچھ کر گزرنے نے آپ کو شک میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں آپ کو اور آپ کے ٹرک کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا ہوں"

"بلاشبہ" میں نے بھی صاف گوئی سے جواب دیا۔

وہ بڑی آہستگی سے مسکرایا "میرا خیال ہے' اب ہم دونوں کے درمیان سے یہ پردہ بھی اٹھ جانا چاہئے" میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بوسیدہ کمبل کو شانوں پر سنبھالتے ہوئے بولا "شاہجہاں صاحب! معلومات حاصل کرنے کے میرے اپنے ذرائع ہیں اور یہ سلسلہ سرحد پار تک پھیلا ہوا ہے' یہ نظام کچھ ایسا ہے کہ میں نہ بھی چاہوں تو معلومات مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ اب یہی ٹرک والا معاملہ لے لیجئے۔ یقین جانئے مجھے اس معاملے کی تفتیش میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس "عدم دلچسپی" کی بڑی وجہ یہ بھی تھا کہ آپ جلد یا بدیر خود ہی مجھے سب کچھ بتا دیں گے۔ کچھ معلومات از خود مجھ تک پہنچ گئیں اور میرا خیال ہے کہ معلومات ٹھیک ہی ہیں"

"کچھ بتانا پسند کریں گے آپ؟"

بابو لیاقت نے بوسیدہ کرتے کی جیب سے گھٹیا برانڈ سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا "جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ جھنگ کی کسی حویلی سے کوئی قدیم دفینہ برآمد ہوا ہے اور اسے گنوں سے لدے ہوئے ٹرک میں رکھ کر سرحد پار لایا گیا ہے۔ اس دفینے کی مالیت کے بارے میں تو ٹھیک نہیں بتایا جا سکتا لیکن اندازہ ہے کہ یہ غیر معمولی مالیت کا ہے۔ ممکن ہے برآمد ہونے والی اشیا کی قیمت لاکھوں

کروڑوں کے ہندسوں سے تجاوز کر کے ایک ارب کے ہندسے کو چھوتی ہو"

بابو لیاقت کے آخری الفاظ ایک سنسناہٹ کی طرح کمرے میں گونج رہے تھے۔ میں یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جو کچھ بتا رہا تھا اپنی مرضی سے بتا رہا تھا اور اس کا یہ رضاکارانہ فیصلہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود مجھ سے مخلص ہے۔

بابو لیاقت کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی تھیں "کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟" اس نے مختصر سوال کیا۔

"ہاں" میں نے مختصر ترین جواب دیا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ خاموشی زبان بن گئی تھی اور یہ زبان اعتماد اور ہم آہنگی کی ایسی فضا پروان چڑھا رہی تھی جو کبھی کبھی برسوں کی رفاقت کے بعد بھی میسر نہیں ہوتی۔

میں نے اپنے اتارے ہوئے لباس میں سے پسٹل نکال کر بوسیدہ چادر کے نیچے چھپا لیا۔ بابو لیاقت نے بھی ایک دراز سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ چند ہی لمحے بعد ہم کمرے سے نکل کر مٹی والی ٹرالی کی طرف جا رہے تھے۔

وہ ایک روشن دن تھا۔ موسم اچانک ہی بدل گیا تھا۔ دھوپ میں خاصی تمازت محسوس ہو رہی تھی۔ کرفیو میں وقفہ شروع ہو چکا تھا لہٰذا ہمیں فیکٹری سے نکلنے اور شہر سے باہر جانے والی سڑک تک پہنچنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ ٹریکٹر ٹرالی کا یہ سفر زندگی کا انوکھا تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ مٹی ڈھونے والے مزدوروں کی طرح ہم دونوں نے اپنے چہرے اور ہاتھ پاؤں خوب لتھڑ لئے تھے۔ لباس پہلے ہی لتھڑا ہوا تھا ۔۔۔ بالکل بھوت بن گئے تھے ہم۔ بابو لیاقت کی فراست کی داد ۔۔۔ کو جی چاہا۔ اس نے سفر کے لئے مٹی ڈھونے والی ٹرالی استعمال کر کے خود کو اور مجھے بہت سے خطرات سے بچا لیا ۔۔۔ ہم تھکے ہارے مزدوروں کی طرح ٹرالی کے وسط میں لیٹے ۔۔۔ قریب ہی دو کسیاں اور ٹوکریاں پڑی تھیں۔ ٹریکٹر ۔۔۔ والے سکھ ڈرائیور نے ایک کھٹارا ٹیپ ریکارڈر پر ۔۔۔ آواز میں فلمی گانے لگا رکھے تھے۔ انڈین فلم ہیر رانجھا ۔۔۔ کا تھا۔ یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں' مردانہ آواز ۔۔۔ لیکن ٹیپ سے اتنی باریک نکل رہی تھی کہ لگتا تھا ۔۔۔ گا رہی ہے۔ ہمارے دونوں اطراف ہرے بھرے ۔۔۔ تھے۔ کہیں کہیں کسان اپنے روزمرہ کے کاموں میں ۔۔۔ نظر آتے تھے یا پھر نیوب ویل کا شفاف پانی کچے ۔۔۔ میں دوڑتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ سارے مناظر دیکھ کر شیطان ابن شیطان سے اپنی آخری لڑائی یاد آگئی۔ جہاں ۔۔۔

اپنی گردن چھڑانے کے بعد میں نے شنکر شنکرا کو کنوئیں میں ۔۔۔ پھینکا تھا وہ بھی ایسی ہی جگہ تھی۔ انسان آنے والے لمحات ۔۔۔ سے کتنا دور ہوتا ہے۔ اگر مجھے اس وقت پتا چل جاتا کہ ۔۔۔ شنکرا اس کنوئیں سے نکلنے کے بعد سب سے پہلے میرے خیر ۔۔۔ خواہوں ڈنگا سنگھ اور مت سنگھ وغیرہ کو خون میں نہلائے گا تو ۔۔۔ یقیناً میں شدید خطرے میں گھرا ہونے کے باوجود اسے زندہ ۔۔۔ چھوڑ کر نہ جاتا۔

ٹریکٹر ٹرالی اپنی مخصوص رفتار سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ فساد زدہ فرید کوٹ پیچھے رہ گیا اور ہر قسم کے ہنگاموں سے بے نیاز دیہی علاقہ ایک سرسبز چادر کی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ ہم نانکا کی جانب جا رہے تھے۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر چند روز پہلے ہم ٹرک پر سوار گزرے تھے۔ جس مقام پر ہمارے ٹرک کو چیکنگ کے لئے روکا گیا تھا وہاں اب بھی ناکا لگا ہوا تھا۔ ٹرالی چند لمحوں کے لئے ناکے پر ۔۔۔ اور پھر فرحت بخش جھٹکوں کے ساتھ آگے نکلتی چلی ۔۔۔ پولیس والوں نے ٹریکٹر ڈرائیور سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں ۔۔۔ کی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ٹریکٹر ڈرائیور بھی ۔۔۔ اصلیت سے بے خبر تھا۔ اس کے نزدیک ہم مزدور ہی ۔۔۔ جنہوں نے ٹھیکیدار کے حکم پر پہلے تین مزدوروں کی جگہ ۔۔۔ تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ناکے پر کسی طرح ۔۔۔ گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تھا اور روٹین کے مطابق ۔۔۔ کر کے آگے نکل آیا تھا۔ روپ بھرنے کے لئے جہاں مجھے لباس تبدیل کرنا پڑا تھا وہاں دو اہم اشیا سے محرومی بھی برداشت کرنا پڑی تھی۔ یہ دو اشیا خنجر اور دستی گھڑی تھیں ۔۔۔ رام پوری خنجر جو ایک غلاف میں بند ہر وقت میری پنڈلی سے بندھا رہتا تھا' مجھے فیکٹری ہی میں چھوڑنا پڑا تھا۔ وجہ دھوتی تھی جو میں نے باندھی تھی۔ یہ دھوتی اتنی مختصر تھی ۔۔۔ گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے آتی تھی۔ ظاہر ہے ایک ٹرالی مزدور کی حیثیت میں میں وہ گھڑی بھی نہیں پہن سکتا تھا جو ۔۔۔ نے مجھے تحفے میں دی تھی اور جس کی قیمت میرے اندازے کے مطابق آٹھ دس ہزار سے کم نہیں تھی۔ جس طرح کلائی پر گھڑی کی جگہ ایک سفید نشان تھا اسی طرح پنڈلی پر ایک نشان بن چکا تھا۔ جو چیزیں مستقل ہمارے جسم سے جڑی رہتی ہیں وہ جدا بھی ہو جائیں تو جسم پر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی چھوڑ جاتی ہیں۔ شاید دل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ۔۔۔ دل میں بسنے والے جدا ہو بھی جائیں تو ان کے نقش دل کے نہاں خانوں میں جگمگاتے رہتے ہیں۔۔۔

نتھری ہوئی پنڈلی کو کچھ اور لتھڑ لیا اور اسی طرح کلائی کا نشان بھی کیچڑ نما مٹی سے ڈھانپ دیا۔ ٹرالی کے بے شرے نیپ پر طوفانی رفتار سے گانا بج رہا تھا' پردے میں رہنے دو' پردہ نہ اٹھاؤ۔ فریدکوٹ سے فاضلکا شہر کا راستہ کار پر ایک گھنٹے میں طے کیا جا سکتا ہے لیکن ٹریکٹر ٹرالی جس رفتار سے جا رہی تھی یقین نہیں تھی کہ ہم دو ڈھائی گھنٹے میں بھی فاضلکا کے آس پاس پہنچ سکیں گے۔ بابو لیاقت نے ابھی تک بتایا نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور ہمیں وہاں جا کر کیا کرنا ہے' میں نے اس کی خاموشی کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں میں نے عارضی طور پر اسے رہنما تسلیم کر کے اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ یعنی بقول شاعر' ہم تو چلے مرحلے رستے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرالی نے پختہ سڑک موڑ دی اور بل کھاتے ہوئے ایک کچے راستے پر ہولی۔ یہ بالعموم دیہی علاقہ تھا کہیں کہیں بے آباد زمینیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بابو لیاقت نے بتایا کہ بارڈر یہاں سے صرف دس کلو میٹر کی دوری پر ہے۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم کچے مکانوں والے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ ایک بہت بڑے جوہڑ کے کنارے ادھورے لباس والی بھیگی بھیگی عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی "مکمل" ننگے بچے شرم و حیا سے بے نیاز مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔ چارے سے لدی ہوئی ایک بیل گاڑی ان کے پاس سے گزر رہی تھی اور گاڑی کے عقب میں ایک عورت گدھے پر دو مٹکے رکھے لے جا رہی تھی۔ وہی قدیم دور کے مٹکے' وہی بیل گاڑی' وہی عریانی' صدیاں جیسے اس منظر کو چھوئے بغیر گزر گئی تھیں۔ یکایک ایک شخص کماد کے کھیت سے نکلا اور ٹرالی کے سامنے آ گیا۔ اسے زد میں دیکھ کر ٹریکٹر ڈرائیور کو بریک لگانا پڑے۔ اس سے پہلے کہ سکھ ڈرائیور ٹھیٹ پنجابی میں اسے کوئی کراری سی گالی دیتا وہ شخص گھوم کر ٹرالی کے عقب میں آ گیا اور ہاتھ اٹھا کر بابو لیاقت کو سلام کیا۔ بابو لیاقت نے سلام کا جواب دیا۔ وہ دونوں شناسا نظر آ رہے تھے۔

ڈرائیور نے تنک کر پوچھا "اوئے کون ہے تو۔ آتما ہتیا کرنی ہے تو جا ادھر بارڈر کی طرف جا کر گولی کھا لے"

بابو لیاقت نے دھیمے لہجے میں ڈرائیور کو سمجھایا کہ اپنا ہی بندہ ہے' ٹھیکیدار کا پیغام لے کر آیا ہے۔ بابو کی بات ڈرائیور کی سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ ٹھنڈا ضرور پڑ گیا۔ میں فوراً ہو کو پہچان گیا۔ یہ بابو لیاقت ہی کا ایک ملازم تھا۔ وہ سرگوشی میں بولا "کام ہو گیا ہے بابو جی۔ تین سو میں طے ہوا ہے۔ بندہ بھی بھروسے کا ہے" پھر اس نے کھیت کی طرف رخ کر کے زور زور سے آوازیں دیں "باغ علی او باغ علی"

چند لمحوں بعد ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص درختوں کے عقب میں برآمد ہوا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ شاید سلام کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارے حلیے دیکھ کر اس نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ "کتنے جانور ہیں تمہارے پاس؟" بابو لیاقت نے اس سے پوچھا۔

"چالیس کے قریب ہیں۔ چار پانچ خچر بھی ہیں" باغ علی نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے' اتنے میں کام بن جائے گا؟" بابو نے اپنے ملازم سے پوچھا

"بننا چاہئے جی' نہ بھی بنا تو باغ علی مزید جانور اپنے بھائی سے لے لے گا"

دو تین منٹ یہ گفتگو جاری رہی پھر بابو کا ملازم اور باغ علی نامی شخص واپس چلے گئے۔ سکھ ڈرائیور نے ٹرالی آگے بڑھا دی۔

قریباً تین چار فرلانگ چلنے کے بعد ٹرالی رک گئی۔ رک کیا گئی روکنی پڑی۔ آگے راستہ اتنا ناہموار اور دشوار تھا کہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں قریب ہی کھیتوں میں ہمیں ایک دو فوجی گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ بھارتی فوجی پتلونیں اور بنیانیں پہنے جنگلی بیریوں سے بیر توڑ رہے تھے۔ آثار بتا رہے تھے کہ ہم بارڈر سے کافی نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ جھوٹ کا اپنا ایک پریشر ہوتا ہے۔ ہم وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے اس لئے دھڑکنیں خواہ مخواہ تیز ہو رہی تھیں۔ میں تو خیر بارہا ایسے مراحل سے گزر چکا تھا لیکن بابو لیاقت کے لئے اس طرح کی مہم جوئی شاید بالکل نئی بات تھی۔ وہ مجھے خود یہاں لے کر آیا تھا لیکن اب خود ہی نروس نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کے لئے ایک کسی اپنے کندھے سے لٹکائی اور دوسری اس کے کندھے پر رکھ دی۔ بابو نے کچھ دیر ذہنی طور پر تیار ہونے میں لگائی لیکن جب وہ ایک بار تیار ہو گیا تو پھر اس نے مکمل طور پر ایک مزدور کی چال ڈھال اختیار کر لی۔

ہم تھکے ماندے لیکن بے فکرے مزدوروں کے انداز میں چلتے فوجیوں کے قریب سے گزر گئے۔ فضا میں مخصوص دیہاتی خوشبو رچی بسی تھی۔ کہیں قریب ہی کسی ڈیزل انجن کی "گوگو" گونج رہی تھی۔ ایک دیہاتی سکھ سائیکل کے کیریئر پر برف کی سل رکھے اڑا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کہیں قریب ہی کوئی گاؤں موجود ہے۔ ہم فوجیوں سے کافی دور نکل آئے تو بابو لیاقت کیکر کے ایک درخت تلے رک گیا۔ طویل سفر نے کافی تھکا دیا تھا۔ شفاف پانی سے بھرے ہوئے کھالے کے کنارے نرم گھاس پر بیٹھنا اچھا لگا۔

بابو لیاقت نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا۔ "شاہ جہاں صاحب! آپ کا سامان سرحد پار پہنچانے کا نوے فیصد انتظام ہو چکا ہے۔ جو دس فیصد رہ گیا ہے وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا"

میں نے کہا "کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے آپ؟"

اس نے میلے کچیلے کرتے میں سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس کی پٹی کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ پٹی کی پچھلی جانب چند لکیریں کھینچ کر ایک نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ بابو لیاقت نے ایک مقام پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم جس گاؤں میں ٹھہرے تھے وہ یہ ہے۔ اس کا نام باج پور ہے۔ باج پور تک ہم اپنا "سامان" کسی بھی گاڑی پر لا سکتے ہیں لیکن اس سے آگے گاڑی لانا خطرناک ہے۔ ایک تو راستے بے حد دشوار ہیں دوسرے چیکنگ کا شدید خطرہ ہے۔ اس مسئلے کا حل باربرداری کے لئے استعمال ہونے والے گدھے ہیں۔ ایسے لدو گدھوں اور خچروں کے مالکان آج کل اچھی خاصی دیہاڑی لگا رہے ہیں۔ کسی مقامی ٹھیکیدار نے فوجیوں کو بیس ہزار بوری ریت کی بھرتی دی ہے۔ یہ ریت قریبی ٹیک نالے سے نکال کر باہر پہنچائی جاتی ہے۔ باربرداری کا یہ کام پورا دن جاری رہتا ہے۔ باغ علی نامی جس شخص سے ہم نے بات کی ہے وہ بھی باربرداری کا کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ وہ ہمارا سامان بڑے محفوظ طریقے سے بارڈر تک پہنچا دے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا آپ' اوپر ریت اور نیچے سامان۔ ہمیں سامان کھولنے اور پار کرنے میں کچھ محنت تو کرنا پڑے گی لیکن یہی محفوظ ترین طریقہ ہے جو اس موقع پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس معاملے پر بہت سوچ بچار کی ہے۔ شاید آپ کو یہ بات عجیب سی لگے کہ پہلے ہم صندوقوں کا تمام سامان نکال کر گدھوں اور خچروں کے پالانوں میں رکھیں پھر ان پر ریت ڈالیں اور پھر انہیں ہانک کر بارڈر کی طرف لے جایا جائے لیکن آپ یقین رکھیں کہ یہ سب کچھ قابل عمل ہے اور اس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں"

میں نے کہا "یہ گدھے اور خچر بغیر وزیے کے سرحد کیسے پار کریں گے؟"

وہ میرے لفظوں میں چھپے ہوئے طنز کو نظرانداز کر کے بولا "یہ لدو جانور سرحد پار نہیں جائیں گے۔ ان کی منزل ایک سرحدی بستی ہو گی جسے نیکرا کہا جاتا ہے۔ یہ دیکھئے' یہ نیکرا" اس نے پٹی پر بنے ہوئے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "نیکرا کے ساتھ ہی بارڈر کی طرف یہ ایک بہت بڑا باغ ہے۔ اسے نوشاد کا باغ کہتے ہیں۔ یہاں نوشاد کا ڈیرہ بھی ہے۔ نوشاد علاقے کا نامی گرامی غنڈا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہیجڑا ہے۔ لوگ کمزور اور کم حوصلہ شخص کو ہیجڑے کا طعنہ دیتے ہیں لیکن آپ نوشاد کو دیکھیں گے تو تسلیم کریں گے کہ دلیری اور بے خوفی صرف مردوں سے ہی خاص نہیں ہے۔ یہی نوشاد ہمارے منصوبے کا کلیدی کردار ہے۔ اگر ہم نے اپنا سامان نوشاد کے ڈیرے تک پہنچا دیا تو سمجھیں کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ گیا۔"

"یہ نوشاد کوئی اسمگلر قسم کی چیز ہو گا" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اسمگلر بھی کہہ سکتے ہیں آپ لیکن اس کے علاوہ بھی وہ ہر طرح کے جرائم میں ملوث رہا ہے۔ اس میں ایک خاص بات ہے جو اسے اپنے ہم عصر بدمعاشوں سے ممتاز کرتی ہے"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا

بابو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "آپ نے اکثر جرائم پیشہ افراد کی زبان سے سنا ہو گا کہ جی ہم برا کام کرتے ہیں لیکن ایمانداری سے کرتے ہیں۔ نوشاد بھی یہی کہتا ہے لیکن اس کے کہنے اور دوسروں کے کہنے میں بہت فرق ہے۔ وہ واقعی قول نبھانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ میں ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دیتا ہوں۔ سال ڈیڑھ سال پہلے نوشاد نے ایک شخص سے دس ہزار روپیہ پکڑا۔ اس رقم کے عوض اس نے ایک ایسی لڑکی کو اغوا کرنا تھا جس کا بیاہ دس پندرہ روز بعد ہو رہا تھا۔ یہ ایک دیرینہ عداوت کا شاخسانہ تھا۔ رقم پکڑنے کے چند روز بعد اچانک نوشاد کا رویہ بدل گیا۔ وہ اس کام سے کچھ ہچکچانے لگا اور رقم دینے والے کو احساس ہوا کہ وہ لڑکی اغوا کرنے کے بجائے مخالف پارٹی سے اس کی صلح کرانے کے چکر میں ہے۔ یہ واقعات ایک دوست کے ذریعے میرے علم میں بھی آئے۔ جو شخص لڑکی اغوا کرا رہا تھا وہ لڑکی سے عشق کر رہا تھا۔ بلکہ یہ دو طرفہ عشق تھا۔ چند روز بعد مجھے پتا چلا کہ نوشاد نے سادھو پور گاؤں سے لڑکی کو اغوا کر لیا ہے اور اس واردات کے دوران ہونے والی اندھا دھند فائرنگ سے چند افراد زخمی بھی ہوئے ہیں۔ اس بات کا علم واردات کے بعد ہوا کہ اغوا ہونے والی لڑکی کی شادی نوشاد کے سگے بھتیجے سے ہو رہی تھی۔ اس قسم کے کئی واقعات ہیں جو علاقے کے لوگ بیان کرتے ہیں اور یہ جو لیس کے

ریکارڈ میں بھی موجود ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے دستیاب لوگوں میں سے بہترین شخص کا انتخاب کیا ہے؟"

وہ مسکرایا "بس کوشش کی ہے۔ اب جو اللہ کرے۔"

گفتگو کے دوران ہی ہم کیکر کے نیچے سے اٹھ کر چل دیے تھے۔ دھول سے اٹے ہوئے راستے پر مجھے پاؤں چلنا اور ہوا سے پھڑپھڑاتی مختصر سی دھوتی کو بار بار سنبھالنا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ آٹھ دس گھنٹے پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے لیاقت بابو کے ہمراہ کسی ایسے تجربے سے گزرنا پڑے گا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ آگے ہمیں کنکریٹ کے بنے ہوئے چند فوجی مورچے نظر آئے۔ یہاں لوڈر کھڑا تھا اور تین چار فوجی کمینگی اس کے نیچے گھسے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک فوجی طاقتور دوربین لیے ایک بلند و بالا درخت پر چڑھا بیٹھا تھا اور کسی نواحی کھیت میں مرچیں توڑتی ہوئی سکھ مٹیاروں کو تاڑ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ... بھی کرتا جا رہا تھا "او لمبی والی سوہنی دی پتر بڑی گوری ہو ... بالکل یخ کری۔ میجر صاحب کے ہتھے چڑھ جائے تو دو منٹ میں پچر پچر کر کے کھا جائیں ساری۔ اور لال دوپٹے والی تو بالکل اپنے ہاں (قد کاٹھ) کی ہے۔ بڑا سوہنا جوڑا بنایا ہے ... واہ گرو نے۔ پر بیچ میں فاصلہ بڑا ڈال دیا ہے۔ چند رہ میں کھیتوں کی دوری ہے ... ہائے ہائے ہائے مجبوری۔ یہ موسم اور یہ دوری"

ٹرک کے نیچے سے ایک لانس نائیک نے آواز لگائی "اور وہ تیری بھابی بھی آئی ہے کہ نہیں آج؟"

درخت پر بیٹھا ہوا فوجی تنک کر بولا "اوئے! وہ میری کوئی بھابی شابی نہیں۔ ایک ہی تو ذرا کھلی ڈلی کڑی ہے اور تو اسے بھی میری بھابی بنا رہا ہے۔ اتنا تو ہوشیار نہ بن۔ پوری بیس گولیاں گزار دوں گا اندر سے"

اتنے میں ایک کالے کلوٹے فوجی کی نگاہ ہم پر پڑ گئی۔ اس نے تیز نظروں سے ہمیں گھورا پھر بلا تکلف ہم دونوں کو مشترکہ گالی دے کر بولا "او ... ادھر آؤ دونوں۔" یہ نازک لمحات تھے۔ بہرحال ہم نے ثابت قدمی دکھائی اور فوجیوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ اب لوڈر کے نیچے سے نکل آئے تھے اور بونٹ وغیرہ بند کر رہے تھے۔ کالا کلوٹا فوجی جو غالباً گروپ کمانڈر تھا کرخت لہجے میں بولا "یہ تمہاری بیدی ذرا اڑی کر رہی ہے۔ اس کو ہمارے ٹینک جو کر ذرا دھکا شکا لگاؤ" یعنی یہ تمہاری باقی (گاڑی) اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ ہمارے ساتھ مل کر اس کو دھکا وغیرہ لگاؤ۔ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق ہم نے فوجیوں کے ساتھ مل کر ٹرک نما لوڈر کو دھکا لگانا شروع کیا۔ دھکا لگاتے ہوئے ہر لحظہ یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں چادر کندھوں سے کھسک نہ جائے۔ ایسا ہو جاتا تو پستول ظاہر ہو جاتا اور ہم ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر دھر لیے جاتے۔

قریباً ایک فرلانگ تک دھکا لگانے کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو ہماری جان چھوٹی اور ہم اپنا سفر جاری رکھنے کے "مجاز" ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر ایک بار پھر رنجبوٹوں اور فوجیوں سے ہمارا سامنا ہوا۔ تاہم نہ انہوں نے ہمیں چھیڑنے کی کوشش کی اور نہ ہم نے کوئی ایسی غلطی کی جس کے سبب وہ ہماری طرف متوجہ ہوتے۔ آخر ہم اس چھوٹی سی بستی میں پہنچے جسے "نیکرا" کہا جاتا تھا۔ یہ بستی ذرا بلندی پر واقع تھی۔ وہاں سے ہمیں نوشاد کا ڈیرا نظر آنے لگا۔ تین چار ایکڑ میں ایک باغ تھا۔ باغ کے بیچوں بیچ ایک نویلی نما مکان بنا ہوا تھا۔ یہی نوشاد کا ڈیرا تھا۔

دس پندرہ منٹ کے پیدل سفر کے بعد ہم اس ڈیرے پر پہنچ گئے۔ دھوپ میں کافی تپش آ چکی تھی لیکن ڈیرے کے اردگرد امرود اور بیری کے گھنے درخت کی وجہ سے خاصی ٹھنڈک تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں بھی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہماری خبر پہنچ چکی ہے۔ جونہی ہم ڈیرے کے احاطے میں داخل ہوئے الہ دین کے جن کی طرح بابو لیاقت کا ایک ملازم یہاں بھی آ حاضر ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر بابو کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور ہمیں لے کر اندر داخل ہو گیا۔ بڑی بے ڈھنگی سی عمارت تھی۔ ہر طرف تنگ و تاریک کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں چھوٹے چھوٹے بالوں والے قوی ہیکل شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں آنکھوں میں سرمہ اور انگلیوں میں جڑاؤ انگشتریاں تھیں۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال رکھی تھی اور بڑے ٹھسے سے رنگین پایوں والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں پلی ہوئی مونچھوں والا ایک تاڑ مسٹنڈا خودکار رائفل تھامے کھڑا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ چارپائی پر ہیجڑا نوشاد بیٹھا ہے۔ وہ ہماری جیتی کذائی دیکھ کر پہلے تو مسکرایا' پھر بھاری بھرکم جسم کو حرکت دے کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

اس کی آواز ہیجڑوں کی طرح چٹی چٹی تھی۔ کہنے لگا "آؤ آؤ بھگوان کی کرپا ہے کہ مجھ نمانی کے گھر میں اتنی اونچی ہستیاں آئی ہیں۔ میں تو سمجھ نہیں پا رہی کہ کس طرح سواگت کروں آپ کا۔"

اس کے بااخلاق لہجے میں طنز اور خود پسندی کی ہلکی سی لہر

موجود تھی۔ وہ بابو کو پہلے سے جانتا تھا۔ اس کے ساتھ تو باقاعدہ گلے ملا اور بڑی عزت سے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ میرے ساتھ بھی اس کا غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ بڑی ادا سے بولا "آپ کا نام پہلے بھی سن چکی ہوں میں۔۔۔ اچھا ہے کہ آج دیکھ بھی لیا۔"

وہ اپنے بھاری بھرکم جثے اور خالص مردانہ خدوخال کے باوجود اپنے لئے مونث کا صیغہ استعمال کرتا تھا تو بڑا عجیب لگتا تھا۔ چند رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد بابو لیاقت اصل موضوع کی طرف آگیا۔ اس نے کہا "نوشادو جی! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ شام سات بجے سے پہلے پہلے ہمیں فرید کوٹ واپس پہنچنا ہے۔ میں صرف انتظام دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔"

وہ بولا "انتظام ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ بس آپ تاکم پر مال یہاں پہنچا دیں پھر آپ کی یہ داسی نوشادو جانے اور اس کا کام۔"

بابو نے کہا "دوسری طرف کیا انتظام ہے؟"

وہ بولا "صدقے جاؤں کیوں پریشان ہوتے ہو۔ میں جو کہتی ہوں بس تمہارا کام مال یہاں پہنچانا ہے۔ اس کے بعد بارڈر سے آگے دس بارہ میل تک جہاں کہو گے ڈلیوری دے دوں گی۔" اس کے منہ سے انگریزی کا لفظ سن کر بڑا لطف آیا۔

نوشادو کی بھوری آنکھوں میں اعتماد کی بے پناہ چمک تھی۔ اس کے طور طریقے گواہی دے رہے تھے کہ وہ ایک بے حد گہرا اور خطرناک شخص ہے۔ اب تک بابو لیاقت نے یا خود نوشادو نے مجھے اپنے طریقہ واردات کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن نوشادو کا انداز گفتگو اور اس ڈیرے کا محل وقوع دیکھنے کے بعد میرے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں تھا کہ یہ کوئی سرنگ وغیرہ کا چکر ہے۔ بارڈر ایریا کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز اور پراسرار ہوتی ہے۔ عام طور پر سیدھے سادے بھلے مانس لوگ بارڈر کے نزدیک رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بارڈر کے نزدیک زمینیں بہت سستی مل جاتی ہیں۔ اسمگلر اور دیگر جرائم پیشہ لوگ یہاں وسیع قطعات اراضی حاصل کر کے من مانی سرگرمیاں شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ بارڈر کے نزدیک واقع حویلیوں اور ڈیروں میں بعض لوگوں نے سرنگیں بنا رکھی ہیں اور ان کے ذریعے اسمگلنگ کا مال ادھر سے ادھر کیا جاتا ہے۔ سرنگوں کے علاوہ بھی کئی ایک طریقے ہیں جن کے ذریعے کامیابی سے یہ کام جاری رکھا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نوشادو نے اٹھ کر بابو لیاقت کے گلے میں اپنا بازو ڈالا اور اسے کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا۔ دونوں پانچ دس منٹ رازداری سے باتیں کرتے رہے۔ نوشادو کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ ہاتھ نچا نچا کر بڑے موثر انداز میں بابو کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ بابو مسلسل اقرار میں سر ہلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جیسے سب کچھ طے ہو گیا۔

بابو لیاقت نے واپس آکر کہا "چلیں جمالی صاحب! اب نکل چلیں۔"

"ہائے ہائے اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" نوشادو ہاتھ نچا کر بولا "اتنی دور سے آئے ہو چائے پانی پیئے بغیر نہیں جانے دوں گی میں۔" پھر وہ اپنی پھٹی ہوئی آواز میں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ "او بہادر سنگھ، او شیر سنگھ۔"

چند لمحے بعد ایک بغلی دروازہ کھلا اور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک نہایت ہٹا کٹا شخص اندر آگیا۔ وہ شکل سے ہی خونی قاتل اور ڈاکیت نظر آتا تھا لیکن اس وقت وہ گھریلو ملازم کے معمولی لباس میں تھا اور ہیجڑے نوشادو کے سامنے بالکل بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر نوشادو کے رعب و دبدبے کا اندازہ ہوتا تھا اور اس دہشت کا سراغ ملتا تھا جو اس کی بابت دوسرے لوگوں کے دلوں میں موجود تھی۔

"مہمانوں کے لئے چائے کا انتظام کرو" نوشادو نے نادر شاہی حکم جاری کیا۔ قوی ہیکل ملازم جابر۔۔۔ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ کہیں قریب سے برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر چائے پورے لوازمات کے ساتھ ہمارے سامنے آن موجود ہوئی۔ چائے لانے والے ملازم دوسرے تھے۔ وہ بھی پہلوان نما غنڈے تھے۔ ان کے چہروں پر سب سے نمایاں چیز ان کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں لیکن یوں لگتا تھا کہ نوشادو کی جھڑکیاں سن سن کر یہ مونچھیں ازخود نیچے لٹک گئی ہیں۔ چائے پینے کے دوران نوشادو نے بابو لیاقت سے کہا "صدقے جاؤں ایک چھوٹا سا کام آپ بھی ہمارا کر دیں۔"

"تم حکم کرو" بابو لیاقت نے کہا۔

نوشادو نے ملازموں سے کہہ کر ایک ادھیڑ عمر فربہ اندام شخص اور ایک دبلی پتلی عورت کو اندر بلا لیا۔ دونوں خستہ حال لباس میں تھے اور لٹے پٹے نظر آتے تھے۔ عورت نے ایک بوسیدہ اوڑھنی سے منہ سر ڈھانپ رکھا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص اس کا گھر والا نظر آتا تھا۔ اس کے پاؤں میں ٹوٹی پھوٹی چپل تھی اور بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔

نوشادو اٹھلا کر بولا "ان دونوں مسکینوں کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور ہو سکے تو پختہ سڑک پر پہنچ کر فیروزپور

جانے والی بس پر سوار کرا دیں۔"

"کیا ان کو راستہ نہیں آتا؟" بابو لیاقت نے پوچھا۔

"راستہ تو آتا ہے لیکن یہ بارڈر ایریا ہے۔ ویسے بھی ان دنوں یہاں راہزنوں اور ڈکیتوں نے طوفان مچا رکھا ہے۔ بے چارے راستے میں لٹ نہ جائیں۔"

"ان کے پاس لٹانے کے لئے کیا رکھا ہے" بابو لیاقت نے آہستگی سے کہا۔

"صدقے جاؤں بہت کچھ ہے" نوشادو نے دبی آواز میں کہا "جانتے ہو یہ بوڑھا کون ہے؟" بابو اور میں سوالیہ نظروں سے نوشادو کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ بولا "فاضلکا کی غلہ منڈی کا سب سے بڑا آڑھتی ہے یہ۔ کروڑپتی شخص ہے یہ۔ ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ تو اب بھی اس کے پاس ہوگا۔"

ہم دونوں حیران نظروں سے ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ہماری سرگوشیوں کا موضوع جان چکا تھا۔ ہندو سیٹھوں کے مخصوص انداز میں اس نے دانت نکالے اور ہاتھ جوڑ کر ہمیں نمستے کیا۔ اس کی پتنی آدھا گھونگھٹ نکالے خاموش کھڑی رہی۔

نوشادو بولا "یہ پتی پتنی یہاں سے چند میل دور ایک گاؤں میں کسی کے بیاہ پر آئے تھے۔ واپس جا رہے تھے کہ چند داروائتیوں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ گھوڑیوں پر سوار تھے۔ پیچھا کر کے انہوں نے گاڑی چھین لی اور ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ رگوناتھ اور اس کی پتنی کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب یہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے میرے ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بہت ڈرے ہوئے ہیں اور اکیلے واپس جانا نہیں چاہتے۔ یہ پھٹا پرانا لباس انہوں نے میرے کہنے پر ہی پہنا ہے۔ میں انہیں اپنے ملازم کرتار سنگھ کے ساتھ واپس بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔ اب استاد جمالی آگیا ہے تو کرتار سنگھ کی کیا ضرورت ہے۔"

آخری الفاظ کہنے کے بعد نوشادو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک نگاہ بابو لیاقت کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں رضامندی نظر آرہی تھی۔ میں نے کہا "میں تو یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ خود بھی لیاقت صاحب کے پیچھے پیچھے چل کر آیا ہوں۔ اب جس طرح لیاقت صاحب کہتے ہیں اسی طرح کر لیتے ہیں۔"

لیاقت اور نوشادو نے تھوڑی دیر اس بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ فیصلہ ہوا کہ کروڑپتی خستہ حال جوڑا ہمارے ساتھ پختہ سڑک تک جائے گا اور وہاں ہم انہیں کسی بس پر سوار کرا دیں گے۔ نقدی اور گہنوں کی صورت میں آڑھتی

رگوناتھ کے پاس تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا۔ یہ اشیا کپڑے کے تھیلے میں لپیٹ کر رگوناتھ کی پتنی نے اپنے لباس میں چھپا لیں۔ چار بجے کے قریب نوشادو سے رخصت ہو کر ہم نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ نوشادو اور بابو لیاقت کے درمیان طے ہوا تھا کل علی الصباح چار چھ بجے کے درمیان مال ڈیرے پر پہنچنا شروع ہو جائے گا۔ نوشادو کا ہٹا کٹا ملازم شیر سنگھ ہمیں "لنگرا" گاؤں کی حدود تک چھوڑنے آیا۔ اپنے خدوخال کے باوجود وہ بالکل اللہ میاں کی گائے نظر آرہا تھا۔ میں نے دبے لہجے میں بابو لیاقت سے کہا۔ "یوں لگتا ہے کہ اپنے احساس برتری کو بڑھاوا دینے کے لئے نوشادو نے ان چوڑے چکلے زور آور مردوں کو معمولی کاموں پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ ورنہ ڈیرے پر جو کام یہ لوگ کر رہے ہیں کوئی بھی عام شخص کر سکتا ہے۔"

بابو لیاقت نے سرگوشی میں کہا "ایک بات شاید آپ کو معلوم نہیں۔ نوشادو کے ڈیرے پر گھریلو کام کرنے والے کئی ملازم مردانہ صفات سے محروم ہیں۔۔۔ اور یہ محرومی قدرتی نہیں نوشادو کی سفاکی کا نتیجہ ہے۔"

ہم نوشادو کے ڈیرے سے روانہ ہوئے تو چار بج چکے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ہر صورت سات بجے تک صفدر کے پاس کنڈارا پور گاؤں پہنچنا تھا۔ اس کا مطلب تھا ہمارے پاس بہت تھوڑا وقت تھا۔

ہم نے ٹریکٹر ٹرالی باج پور گاؤں کے قریب چھوڑی تھی۔ اب باج پور گاؤں تک ڈیڑھ دو کلو میٹر کا فاصلہ ہمیں پیدل طے کرنا تھا۔ ہم ایک پگڈنڈی پر تیزی سے قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔ سب سے آگے بابو لیاقت تھا۔ اس کے پیچھے آڑھتی رگوناتھ اور اس کی پتنی اور آخر میں میں۔ رگوناتھ کی پتنی کو رگوناتھ سے بھی عمر رسیدہ نظر آتی تھی لیکن اس کی چال میں دوشیزاؤں جیسا لوچ اور حرکات و سکنات میں تیزی تھی۔ غالباً اس کا ایک سبب اس کا چھریرا جسم بھی تھا۔ وہ اپنے بوسیدہ لباس میں ڈیڑھ لاکھ کے گہنے اور نقدی چھپائے ہوئے تھی۔ ہیجڑے نوشادو نے ہم پر مکمل بھروسا کرتے ہوئے اس پتی پتنی کو ہمارے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔

راستے میں رگوناتھ نے ہم سے بہت کم گفتگو کی۔ ہم نے بھی اسے کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بہرطور ایک سوال رہ رہ کر ذہن میں آرہا تھا کہ رگوناتھ یہاں کسی شادی میں آیا تھا تو اسے اپنے ساتھ آٹھ دس ہزار روپیہ نقد لانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر اتنے گہنے؟ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک دور دراز گاؤں میں جا رہا ہے اور وہاں سفر کے

حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ کم از کم رگوناتھ جیسے کھاگ بنئے سے ایسی بے پروائی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے گفتگو کے دوران محسوس کیا تھا کہ نوشاد بھی رگوناتھ کی کہانی سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں لیکن وہ تعلق داری کے سبب حقائق سے چشم پوشی کر رہا ہے۔

قریباً پون گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد ہم ٹرالی تک پہنچ گئے۔ راستے میں ایک دو مقام پر فوجی چھولداریاں نظر آئیں لیکن کسی فوجی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ پروگرام کے مطابق ٹرالی کا رخ موڑا جا چکا تھا اور ڈرائیور ٹرالی کے اندر ہی چادر اوڑھے محوِ خواب تھا۔ ہم نے اسے جگایا اور اچھی طرح "جگانے" کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا۔

ٹرالی ہمیں لے کر واپس روانہ ہوئی۔ لیکن ابھی دو تین فرلانگ ہی گئی ہوگی کہ ٹریکٹر کا انجن گڑگڑا کر خاموش ہو گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ اور تشویشناک ہوتی گئی۔ بعد کوشش دو ڈھائی گھنٹے میں انجن کی خرابی دور کی جا سکی۔۔۔۔ جب ہم دوبارہ سفر پر روانہ ہوئے تو چاروں طرف گہری تاریکی پھیل چکی تھی اور شام سے درختوں پر چہچہاتے پرندے خاموشی اوڑھ کر سو چکے تھے۔ باج پور سے آگے راستہ بالکل تاریک اور سنسان تھا۔ کلرٹی زمین کی وجہ سے قرب و جوار میں کھیت بھی نظر آ رہے تھے۔ اچانک مجھے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ پھر کسی کی للکارتی ہوئی آواز گونجی اور تاریکی میں دور تک گونج گئی۔

رگوناتھ کے حلق سے ڈری ڈری آواز نکلی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اسی دوران اوپر تلے کئی فائر ہوئے۔ غالباً یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ میرا ہاتھ خود بخود اپنے پسٹل تک پہنچ گیا۔ بابو لیاقت بھی پوری طرح چوکنا ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گھڑسوار درختوں سے نمودار ہو گئے۔ وہ سب کے سب مسلح نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں ٹارچیں بھی تھیں۔

ٹریکٹر کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ گھڑسوار باآسانی اسے "اوور ٹیک" کر گئے اور پھر راستہ مسدود کر کے انہوں نے ٹریکٹر کو رکنے پر مجبور کر دیا۔

ٹریکٹر کی اگلی روشنیوں میں گھڑسواروں کے حلیے نمایاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے چہروں پر چادروں اور پگڑیوں کے ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ایک لمبا تڑنگا شخص چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور اس نے آگے بڑھ کر اپنی سیون ایم ایم رائفل کی نال سے رگوناتھ کو زوردار ٹھوکا دیا۔

"حرام کے جنے! ہم سے بھاگتا ہے۔ اپنی ماتا کے پیٹ میں واپس بھی چلا گیا تو وہاں سے بھی نکال لائیں گے تجھے۔ چل نیچے اتر کنجر کی اولاد" ساتھ ہی اس نے رگوناتھ کے چربیلے رخسار پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ مارا۔ چٹاخ کی آواز سے ویرانہ گونج اٹھا۔ رگوناتھ کی پتنی پچھلے حصے میں کھڑی تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر نیچے چھلانگ لگائی گھٹنوں کے بل گری اور اٹھ کر درختوں کی طرف بھاگی لیکن اپنی کوشش میں اسے ناکامی ہوئی۔ ایک ڈھاٹا پوش ٹرالی کے پہلو سے نکل کر چیل کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے چھاپ لیا۔

"حرامجادی! تجھ پر کٹی چڑیا کی یہ مجال کہ سردار لالی کے ہاتھوں سے نکلے" وہ دانت پیس کر غرایا اور عورت کی چٹیا سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ لہراتی ہوئی ٹریکٹر کے وہیل کے پاس گری۔

سردار لالی کا نام سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ ایک دم میری نگاہوں میں تیرتھ گاؤں اور راجلی بوٹا سنگھ کے گھر کے مناظر گھوم گئے۔۔۔ سردار لالی وہ نام تھا جس نے اس علاقے میں وحشت پھیلا رکھی تھی۔ میں نے کئی افراد کی زبان سے لالی کا نام سنا تھا اور کچی دیواروں پر اس کے حق میں پُرجوش نعرے لکھے دیکھے تھے۔ چند لمحے پہلے تک میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس تاریک راستے پر کیکر اور شیشم کے درختوں تلے یوں اچانک سردار لالی کے جتھے سے ملاقات ہو جائے گی۔

رگوناتھ کی پتنی مسلسل چیخ رہی تھی۔ ایک گھڑسوار نے رگوناتھ کو کھینچ کر ٹرالی سے نیچے اتار لیا تھا اور اب اس کی پھولی ہوئی توند پر اپنے گھٹنے کی ضربیں لگا رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور رگوناتھ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میری بات سنو" میں نے مارنے والے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "تم میں سردار لالی کون ہے؟"

ڈھاٹا پوش کو شاید مجھ جیسے خستہ حال "مزدور" سے اس لب و لہجے کی توقع نہیں تھی۔ وہ طیش آمیز حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "کون ہے تُو؟" ایک شخص نے کڑک کر پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں مہمان ہوں سردار لالی کا۔ مجھے فرید کوٹ سے بابو لیاقت صاحب نے بھیجا ہے" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

چوڑے چکلے ڈھاٹا پوش نے مجھے سرتاپا گھور کر کہا "تم سردار لالی کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔ شکل سے نہیں جانتا" میں نے جواب دیا۔

"بابو لیاقت سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟"

"بہت گہرا واسطہ ہے لیکن میں اس کی تفصیل سردار لالی کو ہی بتاؤں گا"

"لیکن سردار لالی تو یہاں نہیں ہے" ایک ناٹے قد کے گھڑسوار نے جواب دیا "یہ چھوٹا سردار ہے یہاں۔۔۔ اس سے بات کر لو" ناٹے قد کے گھڑسوار کا اشارہ چوڑے چکلے گھڑسوار کی طرف تھا۔ یہی بارعب گھڑسوار تھا جس کے دائیں ہاتھ میں سیون ایم ایم تھی اور بائیں ہاتھ میں آدھی رگوناتھ کا گریبان۔

"لیکن مجھے ہدایت ہے کہ صرف سردار ہی سے بات کروں" میں نے جواب دیا۔

میرا لہجہ بااعتماد اور پڑھے لکھوں جیسا تھا۔ گھڑسواروں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میں وہ نہیں ہوں جو حلیے سے نظر آ رہا ہوں۔ وہ سب میرے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ ان کی تعداد دس سے کم نہیں تھی۔ میں رگوناتھ کو مار پیٹ سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اچانک اس نے ایک ایسی حرکت کی جس کے سبب سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔

رگوناتھ میں دولت مند بنیوں والی مخصوص عیاری موجود تھی۔ چاروں طرف سے گھرا ہونے کے باوجود اس نے چالاکی دکھائی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور ڈھاٹا پوش کو دھکا دے کر درختوں کی طرف بھاگا۔ ٹرالی سے درختوں کا درمیانی فاصلہ بمشکل دس قدم رہا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا رگوناتھ درختوں تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تاریک گنجان جھاڑیوں میں گھس جاتا تو خود کو بچانے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا لیکن بالکل آخری لمحے میں خودکار رائفل کی "تڑ تڑ" گونجی اور رگوناتھ اچھل کر ایک نشیب میں گر گیا۔ فائرنگ کرنے والا ناٹے قد کا شخص تھا۔ رگوناتھ کی پتنی چیختی ہوئی آگے آئی اور فائرنگ کرنے والے پر جھپٹ پڑی۔ فائرنگ کرنے والا اسے اپنی رائفل سے پیچھے دھکیلنے لگا۔ اسی کشمکش میں رائفل بردار کا ڈھاٹا بھی کھل گیا۔ میرے سامنے بوٹا سنگھ کھڑا تھا۔ اپلی بوٹا سنگھ جس نے چند روز پہلے تیرتھ گاؤں کے ایک ویران مکان میں ہمیں "الوداع" کہا تھا۔ اس نے عورت کے سر پر رائفل کے کندے سے ہلکی سی ضرب لگائی اور اس کے دو ساتھیوں نے عورت کو کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا۔

سب اس نشیب کی طرف لپکے جہاں رگوناتھ زخمی ہو کر گرا تھا۔ جب کہ بوٹا سنگھ ایک گھوڑے کی طرف لپکا۔ یہ گھوڑا بھی فائرنگ کی زد میں آیا تھا اور اب زخمی ہو کر اچھل کود کر رہا تھا۔ نشیب میں رگوناتھ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دو ٹارچوں کی روشنی بیک وقت اس کے جسم پر پڑی۔ اس کی پشت پر گولیوں کے کم از کم چھ سوراخ تھے۔ ایک گولی سر کے عقبی حصے میں لگی تھی اور مغز باہر نکل آیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نشیب تورگ باشی کے خون سے تر ہو گیا۔ میں اور بابو لیاقت سکتے کی کیفیت میں کھڑے تھے۔ نوشاد نے رگوناتھ اور اس کی پتنی کو ہماری حفاظت میں دیا تھا اور حفاظت میں لیے جانے کے صرف چند گھنٹے بعد رگوناتھ کا چھلنی جسم اس ویران گڑھے میں پڑا تھا لیکن میرے خیال میں اس واقعے کی زیادہ ذمے داری خود مرنے والے پر آتی تھی۔ اس نے اپنی حماقت اور جلد بازی سے کام خراب کیا تھا۔

بوٹا سنگھ اب زخمی گھوڑے کو قابو میں کر چکا تھا۔ گھوڑے کی ران میں گولی لگی تھی اور پوری ٹانگ خون میں نہائی ہوئی نظر آتی تھی۔ بوٹا سنگھ نے چہرے پر دوبارہ پگڑی لپیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے ناراض لہجے میں اس سے پوچھا۔

"جو کچھ بھی کیا ہے اُس نے کیا ہے۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔" بوٹا سنگھ نے باریک آواز میں جواب دیا۔ "سردار لالی اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اسے بھگوان کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اتنی سوکھی (آسان) موت مرا ہے۔"

"سردار لالی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سردار لالی۔ سردار لالی ہے اور کون ہے؟ وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔" بوٹا سنگھ نے روکھائی سے جواب دیا۔

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

چوڑا چکلا شخص گرج کر بولا۔ "تم زیادہ سوال جواب مت کرو۔ سوال جواب ہم کریں گے تم سے۔" پھر وہ بوٹا سنگھ سے مخاطب ہوا۔ "بوٹے! تم جانتے ہو اس کو؟"

"ہاں۔" بوٹے نے کہا۔ "یہ پاکستانی ہے۔ غیر قانونی طور پر بارڈر پار کر کے آیا ہوا ہے۔ بی ایس ایف والے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ پچھ روز پہلے دو راتیں میرے گھر بھی گزاری تھیں اس نے۔"

"یہ سردار لالی کے بارے میں بھی جانتا ہے؟" چوڑے چکلے شخص نے بوٹے سے پوچھا۔

"ہاں۔ ادھر اُدھر سے نام سن رکھا ہے اس نے۔ کہتا تھا میں سردار سے ملنا چاہتا ہوں۔"

چوڑا چکلا شخص یعنی چھوٹا سردار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اب کہاں سے آ رہے ہو تم؟" اس مرتبہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

میں نے کہا۔ "بارڈر کی طرف گئے تھے۔ وہاں نوشاد ہجرے سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے کہا کہ یہ بچی چنی میرے مہمان ہیں۔ انہیں پکی سڑک تک پہنچا دو۔ بس ہم نے ساتھ لے لیا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

چھوٹا سردار بولا۔ "معلوم کرنا چاہئے تھا تمہیں۔ شکل سے تو سمجھدار لگتے ہو پھر اتنی آسانی سے کیسے مان گئے تم؟"

بوٹا سنگھ معاملے کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "واہ گرو کا شکر کرو کہ اس حرامی ہندو سیٹھ کے ساتھ تمہیں بھی گولی شولی نہیں لگ گئی۔ یہ بڑا جالم بندہ ہے۔ بہت روج سے ہم اس کے پیچھے تھے۔ بہت بھاگا ہے ہمارے آگے آگے۔ لیکن کہاں تک بھاگ سکتا تھا۔"

بوٹا سنگھ اس وقت بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولنے والا مجہول سا نوجوان جو تیرتھ گاؤں کے کچے مکان میں ہمیں آلو بھون بھون کر کھلاتا رہا تھا اب بوٹا سنگھ کے اندر کہیں بہت گہرائی میں چھپ چکا تھا۔ مجھے پہلے سے شبہ تھا کہ بوٹا وہ نہیں جو دکھائی دیتا ہے اور عین ممکن ہے کہ لالی کے گروہ سے اس کا تعلق ہو ___ یا پھر وہ خود ہی لالی ہو۔ اب کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ لالی کے گروہ سے اس کا تعلق ہے۔ وہ لالی کے جتھے کے ساتھ تھا اور ایک ڈاکو کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔

چھوٹے سردار کا نام نرنجن سنگھ تھا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "رگو ناتھ کے پاس زیور اور نقدی کی شکل میں کافی مال تھا۔ اس کے کپڑوں کی تلاشی میں کچھ نہیں ملا۔ کہاں ہے وہ سب کچھ؟"

میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ نوشاد نے یہ ضرور بتایا تھا کہ فلاں کی فروٹ منڈی میں رگو ناتھ آڑھت کا کام کرتا ہے اور خاصا امیر شخص ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس وقت بھی اس کے پاس رقم ہے؟"

چھوٹا سردار نرنجن سنگھ مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتا رہا پھر اس نے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ "عورت کی تلاشی لو۔"

عورت ایک بار پھر چیخنے چلانے لگی لیکن وہ ایک ویرانے میں تھی اور جن کے قبضے میں تھی وہ خطرناک ڈاکو تھے۔ اس کی چیخ و پکار بے سود رہی۔ ایک شخص نے اڑنگا لگا کر اسے نیچے گرا دیا اور دوسرا جو کی "تزاوی" سے اس کی تلاشی لینے لگا۔ چند ہی لمحے بعد وہ موٹی تھیلا برآمد ہو گیا جس میں نقدی اور زیورات تھے۔ نرنجن سنگھ نے ٹارچ کی روشنی میں تھیلے کا جائزہ لینے کے بعد اسے اپنے تہبند کی ڈب میں اڑس لیا پھر اس نے بالوں سے پکڑ کر عورت کو کھینچا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ "حرامجادی! فریب کرتی ہے۔ اپنے خصموں کو دھوکا دیتی ہے۔ ابھی تیری ساری ایکٹنگ نکالتا ہوں۔"

اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ عورت کے چہرے پر تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر جھریوں کے آثار تھے اور بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ نرنجن سنگھ نے گرج کر بوٹا سنگھ سے کہا۔ "اوئے بوٹے! نکال جرا شراب میرے تھیلے سے۔"

بوٹا سنگھ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے چلتا ایک مشکی گھوڑے کی طرف گیا اور اس کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکال لایا۔ یہ ولایتی شراب تھی۔ نرنجن سنگھ نے عورت کے بال تو پہلے ہی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ اب دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن بھی پکڑ لی۔ بوٹا سنگھ نے سردار کے حکم پر شراب چلوؤں میں بھر بھر کر اس عورت کا منہ دھونا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عورت کا سانولا رنگ جھریوں سمیت غائب ہو گیا۔ اب نکھرے نکھرے رنگ والی ایک جوان عورت ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ صرف اس کے بالوں میں چاندی چمک رہی تھی۔ یقیناً یہ چاندی بھی مصنوعی تھی۔ غالباً رنگ وغیرہ لگایا گیا تھا۔ کالک یا اس قسم کی کسی چیز سے رنگ سانولا کر لینا اور انڈے کے محلول سے جلد پر جھریاں ڈال لینا زیادہ مشکل کام نہیں ہوتا۔ خاص طور پر روپ بدلنے والی عورت ہو اور اسے اوڑھنی کا سہارا بھی میسر ہو تو وہ اپنی شناخت چھپانے کی کامیاب کوشش کر سکتی ہے۔ یہ بھی کوئی نوجوان لڑکی تھی جس نے بہروپ بھر رکھا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ عورت کی چال ڈھال سے شباب کیوں جھلکتا تھا۔

نرنجن سنگھ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھ رہے ہو اس کا اصلی چہرہ۔ تھی تو یہ رگو ناتھ کی پتنی ہی لیکن پہلی نہیں تیسری۔ ابھی تین مہینے پہلے پھنسایا تھا اس حرامی نے اسے۔ پیسے کے لالچ میں جندگی برباد کر لی اس حرامجادی نے۔ دھرم بھی گیا اور دنیا بھی۔"

نرنجن سنگھ اور اس کے ساتھی روتی چیختی لڑکی کو کھینچتے ہوئے درختوں کے پاس لے گئے۔ بوٹا سنگھ بھی وہاں چلا گیا۔ پانچ دس منٹ وہ وہاں کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ وہ ہماری طرف سے بالکل غافل ہو گئے تھے۔ اگر ہم چاہتے تو

اس وقت اپنے ہتھیار برآمد کر کے انہیں آڑے ہاتھوں لے سکتے تھے لیکن میرے خیال میں اس مہم جوئی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بوٹا سنگھ کا رویّہ ہم سے دوستانہ تھا اور اس کے ساتھیوں نے بھی یہ جاننے کے بعد کہ ہم پاکستانی ہیں اور بوٹا سنگھ ہمیں پہچانتا ہے، ہم سے نرم رویّہ اختیار کر لیا تھا۔

زخمی گھوڑا ایک درخت سے بندھا تھا اور اس کی مسلسل ہنہناہٹ سے بے قراری کا اظہار ہو رہا تھا۔ گھوڑے کے قریب ہی وہ نشیب تھا جہاں رگو ناتھ کی لاش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کا جیتا جاگتا انسان اب خونچکاں لاش کی صورت اختیار کرنے کے بعد ہر خوف و خطرے سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

گھڑ سواروں کے درمیان ہونے والے تبادلۂ خیال میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ وہ رگو ناتھ کی لاش کو اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔ اس کے مُردہ جسم کو ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر ایک گھوڑے کی پشت پر ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ یہ منظر مجھے اور بابو لیاقت کو ایک بار پھر بے قرار کر گیا۔ کچھ بھی تھا بہرحال یہ عورت اور اس کا خاوند ہماری تحویل میں دیئے گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے اس نوجوان لڑکی کو مسلح افراد اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ میں نے بوٹا سنگھ کو پاس بلا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ "بادشاہو! اس کڑی کے بارے میں فکر مند ہونے کی جرورت نہیں۔ بالکل محفوج رہے گی یہ۔"

میں نے کہا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیا مطلب؟" بوٹا سنگھ نے کہا۔

"مطلب یہ کہ وہ ہندو ہے اور ہندو عورت تمہارے لئے قابلِ معافی نہیں۔ میں نے تمہارے گھر میں ہندو ایکٹریسوں کی تصویریں دیکھی ہیں جن سے تم انتقاماً "محبت" کرتے ہو۔ اب تو جیتی جاگتی عورت تم لوگوں کے قبضے میں آ گئی ہے۔ ظاہر ہے جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے یہ ساتھی بھی ہوں گے۔"

وہ بڑے تحمل سے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ گلط بات ہے کہ ہم بے گناہوں سے بدلے چکاتے ہیں۔ ہاں ___ جو قصوروار ہو گا وہ مرد ہو یا عورت ___ ہندو ہو یا اور کسی دھرم کا، ہم اس کو چھوڑیں گے نہیں۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ عورت قصوروار نہیں؟"

"ہاں ___ یہی کہنا چاہتا ہوں۔ یہ قصوروار نہیں اور ہندو بھی نہیں۔ یہ سکھ لڑکی ہے۔ گوردیپ کور نام ہے اس کا۔ بس بے وقوف لالچ میں آ کر اس بڈھے کے پلے سے بندھ گئی۔ اب جندگی بھر بیٹھ کر کسی اچھے رشتے کو روئے گی۔"

میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی۔ میں نے پوچھا۔ "اب کیا کرو گے تم لوگ اس سکھ لڑکی کا؟"

"اس کے ماتا پتا کے حوالے کریں گے، اور کیا کریں گے؟"

"کیا اس لڑکی کے لئے تم لوگ رگو ناتھ کا پیچھا کر رہے تھے؟"

"نہیں ___ یہ ایک اور چکر ہے۔ ابھی ان لوگوں کو جانے دو پھر تمہیں بتاتا ہوں۔" اس کا اشارہ اپنے ساتھیوں کی طرف تھا۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں یہ جو گھوڑا جخمی ہوا ہے۔ میرا ہی ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ چلا کر ساتھ والے گاؤں میں لے جاؤں گا۔ وہاں ایک جراح ہے۔ اگر حرام کا تخم گاؤں میں ہی ہوا تو گولی نکال دے گا اس کی۔"

میں ابھی بوٹے سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن نرنجن سنگھ نے اسے آواز دے دی اور وہ اپنی رائفل سنبھالتا ہوا اس کی طرف چلا گیا۔ اس کی ٹانگ پر ابھی تک میلی کچیلی پٹی بندھی تھی لیکن لنگراہٹ اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر بوٹا سنگھ کے تمام ساتھی رگو ناتھ کی لاش اور لڑکی سمیت گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے۔ نجانے کیوں لڑکی کے حوالے سے مجھے بوٹا سنگھ کی بات پر یقین آ گیا تھا اور یہ توقع تھی کہ وہ بحفاظت اپنے وارثوں تک پہنچ جائے گی۔ قرب و جوار ایک بار پھر اسی طرح خاموش ہو گئے جس طرح آدھ گھنٹہ پہلے تھے۔ گہری خاموشی میں بس کبھی کبھی گھوڑے کی مضطرب آواز گونج جاتی تھی۔ ٹریکٹر ٹرالی اسی جگہ ساکت کھڑی تھی جہاں رگو ناتھ کی موت سے پہلے گھڑ سواروں نے اسے روکا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ٹریکٹر ڈرائیور اپنی نشست پر موجود نہیں۔ میں نے اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ بابو لیاقت میری الجھن بھانپ کر بولا۔ "وہ رگو ناتھ پر گولی چلتے ہی غائب ہو گیا تھا۔ شاید اب تک کسی بس پر بھی سوار ہو چکا ہو۔"

اکا دکا بوندیں پڑنے لگیں۔ ہم نے ایک ساتھ آسمان کی طرف دیکھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ رات کے اندھیرے میں بادل چپکے سے آسمان کو گھیر لیتے ہیں۔ ہم جتنے

سے بچنے کے لئے درختوں تلے آ بیٹھے۔ بوٹا سنگھ بھی وہیں آ گیا۔ وہ بابو لیاقت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ یہ بھراجی آپ کے ساتھیوں میں تو نہیں تھے؟"

"نہیں۔ ان سے بعد میں ملاقات ہوئی ہے۔"

"کہاں؟"

"بابو لیاقت کی بیٹھک میں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بولا۔ "ہاں یاد آیا ___ بابو لیاقت سے بھی ملاقات ہوئی یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "میری تو ہوئی۔ تم بتاؤ تم بھی کبھی ملے ہو؟"

"بس ایک بار ایک جلسے میں دیکھا تھا۔ آمنے سامنے کبھی گل بات نہیں ہوئی۔ ویسے ان کے بارے میں مجھے پتا سب کچھ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آج تمہاری ملاقات بھی کرا دیں؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "میں سمجھا نہیں؟" اس نے کہا۔

میں نے بابو لیاقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بابو لیاقت صاحب تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔"

وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ خود بخود بابو لیاقت کے چہرے پر آ گیا تھا۔ چند لمحے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے ٹارچ نیچے جھکا لی۔

"ہاں بوٹا سنگھ۔ میں ہی لیاقت ہوں۔" بابو لیاقت نے تائید کی۔ بوٹا سنگھ کے ہاتھ خود بخود نمستے کے لئے اٹھ گئے۔ بابو لیاقت نے بھی ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ وہ دونوں چند لمحے تک رسمی کلمات کا تبادلہ کرتے رہے۔ بوٹا سنگھ بابو لیاقت کو اس حلئے میں اور اس جگہ دیکھ کر سخت حیران تھا۔ وہ یہ سمجھ چکا تھا کہ ہم کسی خاص چکر میں یہاں پہنچے ہیں۔ بہرحال اس نے ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے دن سے شبہ تھا بوٹا سنگھ کہ تم بہت گہرے بندے ہو۔ آج تمہیں جتھے داروں کے ساتھ دیکھ کر اس بات کا ثبوت مل گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "تھوڑی سی زندگی میں بڑے دکھ اٹھائے ہیں بھراجی۔ اتنے زخم کھا کر بندہ یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا پھر کسی اُلٹے سیدھے راستے پر چل پڑتا ہے۔ بھائی اور ماں کی موت نے مجھے نیم پاگل کر دیا تھا۔ سوگند کھاتا ہوں کہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میرا دم گھٹ جائے گا پھر پتا نہیں کس طرح میرے ہاتھوں میں آپوں آپ بندوق آ گئی اور میں رات کے ہنیرے میں گھوڑے پر چڑھ کر ادھر اُدھر جانے لگا۔"

بابو لیاقت نے پوچھا۔ "سردار لالی کو دیکھا ہے تم نے؟"

"بہت دفعہ۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"بڑا نام سن رکھا ہے اس کا۔ ملاقات ہو سکتی ہے اس سے؟"

"بڑی مشکل ہے بابو جی۔ آج کل وہ کسی سے نہیں مل رہا۔ بہت دنوں سے تو گھوڑے پر بھی نہیں چڑھا۔"

"کیوں خیریت ہے؟"

"خیریت ہے۔ بس اس کے موڈ کی بات ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا چھوڑو اس بات کو۔ تم رگوناتھ کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

بوٹا سنگھ نے ایک گہری سانس لے کر ٹارچ زمین پر رکھ دی۔ وہ بدستور روشن تھی۔ اس کی روشنی ایک خاص زاویے سے بولنے کے مدقوق چہرے پر پڑ رہی تھی۔ بڑا پُراسرار لگ رہا تھا وہ اس منظر میں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولا۔ "رگوناتھ پولیس کا مخبر تھا۔ اس حرامجادے نے ایک مہینہ پہلے بڑا نقصان پہنچایا ہے ہمیں۔ بابو لیاقت صاحب بھی یہاں بیٹھے ہیں۔ ان کو پتا ہی ہے کہ کھالستان کی تحریک کس طرح گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہم بھی کھالستان کے لئے کام کرتے ہیں اور وہ گرو نے چاہا تو کرتے رہیں گے۔ فاضلکا کے گلی محلوں میں ہمارے نوجوان اکثر چندا وغیرہ بھی جمع کرتے ہیں۔ یہ پیسہ ہتھیار خریدنے کے کام آتا ہے اور اس سے ان لوگوں کی مدد بھی کی جاتی ہے جو تحریک کی کھاطر قربانیاں دے رہے ہیں۔ پچھلے چھ مہینوں میں ہمارے کارکنوں نے فنڈ اکٹھا کرنے میں بڑی محنت کی تھی۔ آنہ آنہ روپیہ روپیہ جوڑ کر انہوں نے کوئی چالیس ہجار جمع کر لیا تھا۔ کوئی تیس ہجار روپیہ فیروج پور اور آلے دوالے کی کمیٹیوں نے جمع کر کے دیا تھا۔ یہ ساری رقم ہمارے ایک آگو (لیڈر) گوپال سنگھ کالیوالا کے پاس تھی۔ کالیوالا فاضلکا میں رہتا ہے۔

ایک روج پولیس کالیوالا اور اس کی بیوی بچوں کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اگر کالیوالا کی اپنی بات ہوتی تو وہ پولیس اور سیکیورٹی فورس کو ایک پیسہ نہ بتاتا لیکن اس کی پتنی اتنا حوصلہ نہ کر سکی۔ جب اس کے سامنے اس کے پتی کی دونوں ٹانگیں توڑی گئیں اور اسے ننگا کر کے الٹا لٹکایا گیا تو اس نے سب کچھ بتا دیا۔ پولیس نے چھاپا مار کر سارا فنڈ اپنے قبجے میں لے لیا اور ہمارے کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ دو تین روز بعد ہمیں پتا چلا کہ پولیس نے یہ کارروائی فروٹ مارکیٹ

آدمی رگوناتھ کی مخبری پر کی تھی۔ دوسری طرف رگوناتھ کو بھی پتا چل گیا کہ اس کی مخبری کا راج کھل گیا ہے۔ اسے اپنی جان کا خطرہ پڑا تو وہ فاضلکا سے بھاگ نکلا۔ ہمارے بندوں نے اس کا پیچھا کیا۔ ایک موقعے پر اسے گھیر بھی لیا گیا تھا لیکن وہ اپنی گاڑی اور ڈرائیور چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ ہمیں پتا تھا کہ وہ باڈر کی طرف گیا ہے۔ ہم رات دن اس کی ٹوہ میں تھے۔ ہمارے جتھے کے سارے جوانوں نے پانچ پیاروں کی سوگند اٹھائی ہوئی تھی کہ رگوناتھ کو مار کے دم لیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارے خزانچی کالیوالا کا کیا بنا؟"

وہ ذرا افسردگی سے بولا۔ "بننا کیا تھا۔ ایک مہینے سے جیل میں پڑا ہے۔ بیوی بچے دربدر بھٹک رہے ہیں ___ اصل بھراجی! ہم لوگوں میں حوصلے کی کمی نہیں ہے۔ ہم صرف ہتھیاروں اور پیسے کی وجہ سے مار کھا رہے ہیں۔ جیادہ لوگ غریب ہیں۔ ان میں ہمت تو بہت ہے مگر پیٹ میں روٹی ہے نہ ہاتھ میں ہتھیار۔ وہ کھالستان کے لئے جان "دینا" چاہتے ہیں لیکن جان "جائع" کرنا نہیں چاہتے۔"

بوٹا سنگھ ان کٹھن حالات کا ذکر کر رہا تھا جن میں کھالستان کے سرگرم حامی اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بتا رہا تھا کہ فاضلکا کے گرد و نواح میں یہ تحریک خاطر خواہ زور پکڑ سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تحریک چلانے والوں کے پاس وسائل ہوں۔

نجانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ "بوٹا سنگھ! ہزاروں کے بدلے اگر تمہیں ستر اسی لاکھ یا اس سے بھی زیادہ مل جائیں تو کیسا رہے؟"

وہ غیر یقینی انداز میں مسکرانے لگا۔ "کون دے گا اتنا پیسہ؟"

"ہم دیں گے اور کون دے گا۔"

"شاید تم مجاق کر رہے ہو۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"تو پھر بتاؤ۔ پُن کے کام میں اتنی دیری کیوں؟" وہ ہنسا۔

میں نے کہا۔ "زیادہ دیری بھی نہیں ہوگی۔ سمجھو ایک دن کی بات ہے۔"

بوٹا سنگھ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "گستاکھی معاف ___ لیکن بات جرور کروں گا بھراجی۔ ہم منشیات کا پیسہ اس کام میں نہیں لگاتے۔"

بابو لیاقت بولا۔ "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پاکستان سے یہاں پہنچے ہیں منشیات قسم کی چیز لے کر۔"

"میں یہ کہنے والا کون ہوتا ہوں جی! لیکن اگر منشیات نہیں تو اور قیمتی شے کیا ہو گی اس میں؟"

"منشیات کے علاوہ بھی بہت سی قیمتی چیزیں ہیں اس دنیا میں۔" میں نے کہا۔ "کبھی نوادرات کے بارے میں سنا ہے؟"

"نوا ___ درات؟ یہ کیا چیج ہوتی ہے؟" بوٹا سنگھ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ "وہ بہت پرانی اشیا جو کھنڈروں وغیرہ سے برآمد ہوتی ہیں اور عجائب گھروں میں رکھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں بے حد قیمتی ہوتی ہیں۔"

اب بات بوٹا سنگھ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بولا۔ "تو تمہارے ٹرک میں اس قسم کا سامان ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بوٹا سنگھ کی آنکھوں میں ایک خوشگوار سی کیفیت نظر آنے لگی۔ اس نے مجھ سے ٹرک کے سامان کے بارے میں کچھ سوالات پوچھے جن کے میں نے گول مول لیکن تسلی بخش جواب دیے۔ بوٹا سنگھ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بلا کا ذہین تھا۔ جو بات بتائی جاتی تھی وہ تو سمجھتا ہی تھا' جو چھپائی جاتی تھی وہ بھی جان لیتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ہمارے ٹرک کا سامان "غیر معمولی" ہے اور وہ اتنا قیمتی ہے کہ اگر ہم اس میں سے ستر اسی لاکھ کی اشیا بوٹا سنگھ کو دے بھی دیں تو وہ تالاب سے چلو بھر پانی نکالنے والی بات ہو گی۔

میں نے بوٹا سنگھ سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ چلے۔ معمولی پس و پیش کے بعد وہ تیار ہو گیا۔ اس کا مسئلہ زخمی گھوڑے کا تھا ___ ہم نے مل جل کر گھوڑے کو ٹرالی پر چڑھا لیا اور اس مقام سے روانہ ہو گئے جہاں تھوڑی دیر پہلے ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ بوٹا سنگھ نے فیصلہ کیا کہ وہ گھوڑے کو راستے میں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کر دے گا۔ بوندا باندی اب رک گئی تھی۔ بابو لیاقت کو راستوں سے آگاہی تھی اس لئے اس نے ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ پہلے فرید کوٹ جاتے تو گنڈا راپور گاؤں رات بارہ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکتے تھے۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ ہم براہ راست گنڈا راپور جائیں۔ وقت کی بچت کے علاوہ بھی اس میں کئی فائدے تھے۔ فرید کوٹ کی شہری حدود میں کئی جگہ پولیس ناکے موجود تھے اور ہم ان ناکوں سے حتی الامکان بچنا چاہتے تھے پھر یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ ٹیکنری ہمارے دشمنوں کی نظر میں ہو گی۔ ہم گنڈا راپور

جانے کے لئے فیکٹری سے روانہ ہوتے تو ہمارے لئے تعاقب کے خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

فرید کوٹ سے دس بارہ میل اوھر ہی ایک سڑک نہر کے ساتھ ساتھ مضافاتی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ ہم اس سڑک پر سفر کر کے گنڈا را پور گارس جا سکتے تھے۔ گنڈا را پور گاوس جہاں کسی حویلی میں سندر اور روبیت ہمارا انتظار کر رہے تھے اور چار پہیوں پر حرکت کرنے والا حیرت انگیز راز تاریکی کی چادر اوڑھے محو خواب تھا۔

بوتا سنگھ نے اپنی خود کار رائفل اور میں نے اپنا پسٹل ٹرالی میں ہی ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیے تھے۔ اب ہم چاروں لپٹے تھکے ہارے مزدوروں کی طرح ٹرالی کی ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ پچھلے چند دنوں میں موسم کی خنکی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ رات کے اس پہر بھی معمولی کپڑوں میں ہمیں کچھ زیادہ سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سفر کاٹنے کے لئے گفتگو ایک مؤثر حربہ ہے۔ ہم بھی گفتگو کرنے لگے۔ بوتا سنگھ نے ایک بار پھر اپنی زندگی کے سب سے بڑے سانحے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اپنی بھائی اور ماں کے وحشیانہ قتل کا بدلہ لینے کے لئے وہ ہر وقت ہتھیار بند رہتا تھا۔ اس کی اکثر راتیں گھر سے باہر گزرتی تھیں۔ سارا دن گھر میں مکھیاں مارنے والا اور نشے میں دھت ہو کر پڑا رہنے والا ایلی بوتا سنگھ رات ہوتے ہی ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھتا' تاریک راستے ناپتا اپنے جتھے والوں کے ساتھ "کارروائیوں" پر نکلتا۔ پولیس سے آنکھ مچولی کھیلتا اور وہ سب کچھ کرتا جو بھارتی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کرنے والے سکھ نوجوان کر رہے تھے۔ قانون نافذ کرنے والے تو رہے ایک طرف تیر تھ گارس کے رہنے والوں کو بھی ابھی تک خبر نہیں ہوئی تھی کہ بڈیوں کا ڈھانچا یہ زرد رو مدہوش لڑکا جسے ایلی کہا جاتا ہے' حقیقت میں کیا ہے۔ اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت ہی کہہ سکتا تھا کہ اتنی جلدی مجھے بوتے کی اصلیت کا علم ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی یہ "علم" مکمل نہیں تھا۔ نجانے کیوں بار بار کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا کہ ابھی بوتے کے بارے میں میری جانکاری نامکمل ہے۔ وہ جو کچھ نظر آ رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہے۔ میں نے گفتگو کا رخ سرداروں کی طرف موڑ دیا۔ جونہی ایسا ہوا بوتا سنگھ مضطرب نظر آنے لگا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے یہ موضوع پسند نہیں۔ میں نے ذرا مزاحیہ انداز میں کہا۔ "یار سنا ہے 'ڈالی کی شکل بہت کم لوگوں نے دیکھی ہے' کہیں تم خود ہی ترالی نہیں ہو؟"

وہ ایک دم قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ میرے مزاحیہ انداز جواب اس نے مزاحیہ انداز سے ہی دیا تھا۔ اگر یہ ادا کاری تھی تو اعلیٰ جواب تھی اور اگر اس نے اپنے کسی اندرونی جذبے کو چھپانے کی کوشش کی تھی تو یہ بے حد کامیاب کوشش تھی۔ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے دماغ میں یہ بات آتی۔ کیا کبھی مجھ جیسا کوئی سردار یا چوہدری دیکھا ہے ہے؟"

میں نے کہا۔ "بچپن میں ہم مار دھاڑ سے بھرپور ناول پڑھا کرتے تھے۔ ان میں ایک جاسوسی کہانی عمران سیریز نام سے ہوتی تھی۔ یہ بڑا عجیب کردار تھا۔ دیکھنے میں بے کار اور نکما تھا مگر حقیقت میں سیکرٹ سروس کا چیف اپنے ساتھیوں کے درمیان رہتا تھا لیکن اس کے ساتھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا یہی احمق ساتھی وہ چیف آفیسر ہے جس کے خوف سے ان کی روحیں فنا ہوتی ہیں۔"

وہ بولا۔ "ناولوں اور فلموں کی باتیں اور طرح کی ہیں جی۔ یہ جو زندگی ہے یہ ناولوں سے بہت زیادہ سخت ہے۔ میرے جیسا بندہ تو ہر روز مر کر جیتا ہے۔ ناولوں اور فلموں میں ان لوگوں کے ٹھاٹ باٹ دکھائے جاتے ہیں جو پولیس اور قانون سے منہ لگاتے ہیں۔ ان کا وہ حشر نشر نہیں دکھایا جاتا جو پولیس کے ہتھے چڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ تب اس بے چارے کالیوالا کو ہی دیکھ لیں۔ ان ظالموں نے پہلے اس کی ٹانگیں توڑیں اور پھر پاؤں سے رسی باندھ کر چھت سے لٹکا دیا۔ وہ چھری تلے آنے والے بکرے کی طرح چیختا چلاتا رہا اور اس کی پتنی بے بسی سے اسے دیکھتی رہی پھر جب اس نے پانی مانگا تو مٹی کے لوٹے میں پیشاب بھر کر اس کے منہ سے لگا دیا گیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ ایسا فلموں اور ناولوں میں نہیں ہوتا لیکن جو فلموں اور ناولوں میں ہوتا ہے وہ آج ہوا ہے۔ آج تم نے اس شخص کو جان سے مار ڈالا۔ تمہارے ساتھی کالیوالا کی ذلت اور تکلیف کا سبب بنا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی روز اسی طرح وہ تھانیدار تک رسائی ہو جائے۔ تمہاری داڑھ کے نیچے آ جائے جس نے تمہاری بھابی اور ماں کو قتل کیا تھا اور جس کی مہربانیوں سے تمہارا بھائی جیل میں سڑ رہا ہے۔"

بوتا سنگھ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا تو تجربہ ہے بوتا سنگھ کہ کہانیوں اور فلموں میں ہی نہیں حقیقی زندگی میں بھی حیرت انگیز اور عجیب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ میں

لفظوں میں اس کا عملی ثبوت بھی تمہیں پیش کروں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں اور تمہارے خالصتان کو جو پیشکش کی ہے وہ بڑی سنجیدگی سے کی ہے۔ عنقریب تمہیں ایک بہت بڑا فنڈ ملنے والا ہے۔ ستر اسی لاکھ روپیہ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ اس سے تم کم از کم فاضلکا میں اپنے قدم بہت مضبوطی سے جما سکتے ہو۔ رائے عامہ ہموار کر سکتے ہو' ہتھیار خرید سکتے ہو' رضا کاروں کو تربیت دے سکتے ہو اور سب کچھ کر سکتے ہو جو خالصتان کے لئے کرنا چاہتے ہو۔ یہ رقم فراہم کرنا میرا ذاتی اقدام ہے اور اگر میرے اس ذاتی اقدام سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچا تو میں ذاتی طور پر ایک بہت بڑی خوشی حاصل کروں گا۔"

اندھیرے کے سبب میں بوتا سنگھ کا چہرہ غور سے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کرنیں سی روشن ہو رہی ہیں۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "اسی لاکھ واقعی چھوٹی رقم نہیں ہے۔ اگر اتنا پیسہ ہمیں مل جائے تو واہ گرو کی سوگند فاضلکا میں ہم کانگریسی سرکار کو ناکوں چنے چبوا دیں... لیکن..."

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ پیسہ تم ہمیں کیوں دو گے؟"

"اس لئے کہ تم لوگ جو جدوجہد کر رہے ہو میں اس کے حق میں ہوں اور تمہارے ساتھ مالی تعاون کرنا چاہتا ہوں۔"

بوتا سنگھ نے گہری سانس لی۔ "واہ گرو کرے کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ پورا ہو جائے لیکن بھرا جی... بھی اور کھری بات یہ ہے کہ میں ابھی تک اس خبر کو ہضم (ہضم) نہیں کر سکا۔ پتا نہیں کیوں... بڑی ہے یا میرا ہاضمہ چھوٹا ہے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اتنے میں ٹریکٹر کا ٹیپ ریکارڈر بلند آواز سے بجنے لگا۔ وہ تو جو پون گھنٹے سے گھرر گھرر کے ناقابل فہم موسیقی چھوڑ رہا تھا۔ اب اچانک کوئی ٹیپ ریکارڈر تھا اور وہ زور و شور سے بج اٹھا تھا۔ بابو لیاقت نے اسے بند کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اس طرح وہ ٹریکٹر اور ٹرالی کے کل پرزوں سے برآمد ہونے والی ناپسندیدہ آوازوں سے بچنا چھڑانا چاہتا تھا۔ پسندیدہ آواز تو خیر اس کی بھی نہیں تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی قبول کر لی جاتی ہے' بابو لیاقت نے بھی اسی طرح کی "موسیقی" سننے کا حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ کوئی پنجابی گانا بج رہا تھا۔ یہ سوز و ساز تھا مگر لگتا تھا کہ کسی گانے والے کو گایا گیا ہے اور گانے والوں میں اشرف المخلوقات

کے علاوہ دیگر مخلوقات بھی شامل ہے۔

میرا ذہن خیالات کے تانے بانے میں الجھنے لگا۔ حالات نے عجیب تماشا دکھایا تھا۔ میں جو چند ماہ پہلے لاہور سے شنکر شکرا کا کھوج لگانے نکلا تھا' ایک ایسے دفینے تک جا پہنچا تھا جس کی تلاش گزشتہ کئی برسوں سے جاری تھی۔ یہ کروڑوں روپے کے اثاثہ جات تھے اور ان نوادرات کی قیمت کا تخمینہ بھی لگایا جاتا جو اس سامان میں شامل تھے تو معلوم نہیں اس دفینے کی مالیت کہاں تک جا پہنچتی۔ یہ بیش قیمت سامان کئی عشرے پہلے رحیم یار خان کے گرد و نواح سے اس علاقے میں بھیجا گیا تھا جو اب بھارت میں شامل ہے۔ نامعلوم مرحلوں سے گزر کر یہ سامان جھنگ کی چھ نلی والی حویلی میں جا پہنچا تھا۔ اس سامان کے اصل مالکان نجانے اب کہاں تھے۔ ان میں سے کتنے زندہ تھے اور کتنے مر چکے تھے۔ ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ امرا یا ان امرا کی اولادیں ابھی تک اپنے گمشدہ اثاثوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ بہرطور ان واقعات کو اب ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ گمان غالب یہی تھا کہ اس سامان کے اصل مالکان مر کھپ چکے ہیں اور جو چند ایک حیات ہیں وہ ہمت ہار کر بیٹھ چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بے شمار دولت لاوارث تھی۔ ایسی دولت پر "ٹریژری ایکٹ" کے تحت دریافت کرنے والے کا حق ہوتا ہے لیکن اگر زمین کسی اور شخص کی ہو اور دفینہ کوئی دوسرا شخص دریافت کرے تو اس کے لئے الگ قانونی نسخے ہوتے ہیں۔ ایسی دولت میں سے گورنمنٹ بھی اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔ بعض ممالک میں یہ حصہ دو تہائی تک ہوتا ہے۔ بعض یورپی ممالک برطانیہ' فرانس وغیرہ میں ایسے دفینوں کے حوالے سے مفصل قوانین بنائے گئے ہیں۔ (حصول تعلیم کے دوران اس نوع کی معلومات اکثر میری نظر سے گزرتی رہتی تھیں)

میں جانتا تھا کہ اس بے شمار دولت کی حیثیت اور ملکیت کے حوالے سے کئی پیچیدہ سوال سامنے آنے والے ہیں لیکن یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ اس وقت اہم سوال جو بار بار ذہن میں ابھر رہا تھا' یہ تھا کہ یہ سامان کس طرح کسی محفوظ مقام تک لے کر پہنچیں گے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی تھی کہ ہم ٹریکٹر ٹرالی پر گنڈا را پور کے عشرت فارم پہنچیں۔ وہاں سے ٹرک کا سارا سامان اس ٹرالی یا کسی دوسری گاڑی میں منتقل کریں اور راجا پور نامی اس گاؤں تک پہنچ جائیں جہاں ہم ٹرالی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ گاؤں میں کسان بابا علی بیدان عمل میں کود پڑے۔ ہم اس کے ساتھ مل کر صندوقوں کا تمام تر سامان گدھوں اور خچروں پر لاد کر...

ازاں جانوروں کے پالانوں پر کپڑے یا ٹاٹ وغیرہ کے ٹکڑے رکھ کر اوپر ریت بھر دی جائے۔ یہ "ریت" بارڈر کے پُرخطر علاقے میں سفر کرنے کے بعد بخیریت نوشاد کے ڈیرے پر پہنچ جائے۔

لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے یہ مجھ پر واضح نہیں تھا۔ خود بابو لیاقت کو بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا کہ نوشاد کے ڈیرے میں سرنگ موجود ہے یا وہ کسی اور ذریعے سے مال کو سرحد پار پہنچائے گا۔ (یا پھر وہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا) بہرطور ایک بات میرے دل میں طے تھی کہ بابو لیاقت مجھ سے مخلص ہے اور جو کچھ کر رہا ہے پوری نیک نیتی اور بے غرضی سے کر رہا ہے۔ لاشعوری طور پر اس نے میری پریشانی کو اپنی پریشانی بنا لیا تھا۔ جو ذمے داری میرے کندھوں پر تھی وہ اس نے بڑی محبت اور ملائمت سے اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لی تھی اور اب پوری تندہی کے ساتھ اس سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح کسی کے درد کو اپنا بنا لیتے ہیں۔

ٹرالی اب گنڈا راپور جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پختہ اینٹوں کی یہ سڑک بمشکل پندرہ فٹ چوڑی ہوگی۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ سڑک کی دونوں جانب کھیتوں کے لامتناہی سلسلے شب کی تیرگی میں گم تھے۔ امید تھی کہ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم اس ٹرک کے روبرو ہوں گے جس نے کئی روز سے فاضلکا اور فرید کوٹ کے گرد و نواح میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس ٹرک میں دولت تھی اور اس دولت کو چاہنے والے بھی بہت تھے۔ لیکن "مستقبل" ہر آنکھ سے پوشیدہ تھا۔ ارجمند بانو کے بقول اس نے اس دولت تک پہنچنے کے لئے بڑے کٹھن راستے طے کئے تھے اور بے شمار مصائب اٹھائے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ ان گمشدہ صندوقوں کو تلاش کرنے میں مرکزی کردار ارجمند بانو نے ہی ادا کیا تھا۔ اس کے اندر دولت کی بھوک تو شاید بچپن سے ہی تھی لیکن بھائی بہنوں کی جان لیوا بیماری اور دیگر حالات نے اس بھوک کو چکا کر انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

کسی ایسے صاحب جائیداد کی طرح جو لب گور ہونے کے سبب دنیا میں اپنی دلچسپی کھو دیتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ اپنے ورثا میں سے کس کو کیا دے گا، میں بھی بزعم خود "دولت مند بابا" بن کر بیٹھ گیا تھا اور سوچ بچار میں مصروف ہو گیا تھا کہ اس دفینے میں سے کس کو کیا دینا چاہئے۔ میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر ہم اس دولت کو محفوظ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے اور کبھی اس کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو ارجمند بانو عرف انو کی بچی کو مناسب حصہ جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کچھ فیصلے کر لئے تھے۔ مثلاً بابو لیاقت عرف خدائی خدمت گار کے لئے میرے (دل) میں ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ اپنے مسلمان بھائیوں، خاص طور پر پاکستانی دیسیوں کے لئے بابو کے اندر تعاون، خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس کا حسن سلوک صرف ہمارے ساتھ ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ پندرہ برس سے یہی کچھ کر رہا تھا اور امید تھی کہ آئندہ کرتا رہے گا۔ اسی طرح بوٹا سنگھ تھا۔ نجانے کیوں بار بار میرے ذہن میں یہ سنسنی خیز خیال آتا تھا کہ بوٹا سنگھ ہی لالی ہے۔ خیر۔ وہ لالی تھا یا نہیں۔ میں اس کے بارے ایک دو ٹوک فیصلہ کر چکا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ باج پور کو پہنچ کر جب ہم رحیم یار خان کے سوزگ باشی ساہو کار صندوق کھولیں اور سامان "باربرداری" کے جانوروں پر لادا تو میں بوٹا سنگھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دوں۔ مجھے یقین تھا صفدر اور زریں گل بھی (جو میرے ساتھ اس دفینے "متولی" بنے ہوئے تھے) بوٹا سنگھ سے مالی تعاون پر اعتراض نہیں کریں گے۔

زریں گل کے بارے میں بھی میرے ذہن میں کچھ ہی "نیک" خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ زریں گل لالچی حریص تو نہیں تھا لیکن میری اور صفدر کی طرح اتنا بے بھی نہیں تھا کہ دولت پانے کی خواہش اس کے دل میں ہوتی۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ اتنی ڈھیر ساری دولت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں حسین خواب بُنتی ہیں۔ خوشحال اور مطمئن زندگی کے خواب۔ پُرآرام شب و روز کے سپنے۔ وہ اُن تنگ دست لوگوں میں سے تھا جنہیں پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودنا پڑتا ہے اور وہ علاقے کی سنگلاخ زمین میں کنوئیں کھودتے کھودتے تھکا تھا۔

گنڈا راپور کی طرف ہمارا سفر جاری رہا اور ٹرالی کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی محو سفر رہا۔ میں آئندہ کے مختلف پلان ترتیب دیتا رہا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ایک پُل گزرتے ہوئے ٹرالی کی رفتار ایکدم کم ہو گئی۔ میں نے کر دیکھا۔ جھاڑیوں سے دو افراد نکل کر ٹرالی کے سامنے تھے۔ وہ عام دیہاتی لباس میں تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں دو نالی رائفل تھی۔ میں اور بوٹا سنگھ چوکس ہو بابو لیاقت نے ٹرالی روک دی۔ کیونکہ رائفل بردار ٹر سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ رائفل بردار کا ساتھی صحت

مونچھوں والا ایک فربہ اندام سکھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس نے ٹارچ کی روشنی بڑی بدتمیزی سے بابو لیاقت پر اور پھر ہم دونوں پر پھینکی۔ رائفل بردار بابو لیاقت سے بولا۔ "کہاں سے آ رہے ہو جوان؟"

بابو لیاقت نے کہا۔ "یہ سوال تو پولیس والے پوچھتے ہیں یا ڈاکو۔ تم کون ہو؟"

بابو کے رعب دار لہجے نے رائفل بردار کو گڑبڑا دیا۔ وہ بولا۔ "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں جوان۔ ہم کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم میں سے کوئی نہال سنگھ یا بابو لیاقت تو نہیں ہے؟"

سرحد پار کرنے کے بعد میں نے ہی نہال سنگھ کا نام اختیار کیا تھا۔ لہٰذا رائفل بردار جن دو افراد کے بارے میں پوچھ رہا تھا وہ میں اور بابو لیاقت تھے۔ بابو نے رائفل بردار سے کہا۔ "اگر بابو لیاقت میرا ہی نام ہو تو؟"

رائفل بردار بولا۔ "ہم عشرت فارم سے آئے ہیں۔ نمبردار عشرت صاحب نے بھیج رکھا ہے ہمیں۔ شام چھ بجے سے یہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں نہال سنگھ اور بابو لیاقت نام کے دو مہمانوں کو فارم پر لے جانا ہے۔"

اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ نمبردار عشرت ہی کے کارندے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ بابو لیاقت بھی ہے اور یہ کہ ہم ریکٹر ٹرالی پر آ رہے ہیں۔

رائفل بردار نے کہا۔ "میرا نام محمد خاں ہے۔ شام پانچ بجے عشرت صاحب نے بابو لیاقت کو فیکٹری میں فون کیا تھا۔ انہیں پتا چلا کہ بابو لیاقت اور نہال صاحب گیارہ بجے سے نکلے ہوئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جہاں گئے ہیں وہاں سے سیدھے عشرت فارم ہی آئیں۔"

صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ ہم نے اپنے دونوں جوانوں کو ٹریکٹر ٹرالی پر ہی سوار کر لیا۔ وہ ہمارے حلیے دیکھ کر الجھ رہے تھے لیکن ہماری بول چال سے انہیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ہم نے بھیس بدل رکھا ہے۔ محمد خاں نے ہم سے پوچھا کہ ہم نے اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ میں نے اسے ٹریکٹر "بدحرامی" کے بارے میں بتایا۔ جس جگہ ہمیں روکا گیا تھا وہاں سے عشرت فارم دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لیکن محمد خاں شارٹ کٹ استعمال کر کے ہمیں صرف پانچ منٹ میں فارم پر لے گئے۔ دور ہی سے ہمیں فارم کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ ایک مچھلی فارم تھا جو کم از کم بیس ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک ایک ایکڑ رقبے کے قریباً پندرہ تالاب تھے جن کے درمیان کشادہ راستے بنا کر بنگلے وغیرہ بنائے گئے تھے۔ فارم کی حد بندی بانس اور پاپولر کے پودوں سے کی گئی تھی۔ بڑا نگاہ نواز منظر تھا لیکن تاریکی کے سبب ہم اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکے۔ فارم کی بیرونی حد بندی کے ساتھ ہچکولے کھاتی ہماری ٹرالی ایک بلند چاردیواری کے سامنے پہنچی۔ یہاں ایک بڑا آہنی گیٹ لگا تھا۔ یہی نمبردار عشرت کا ڈیرا تھا۔ فارم کے برعکس ڈیرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ رائفل بردار محمد خاں نے ٹریکٹر سے اتر کر آہنی گیٹ پر دستک دی۔ دستک کے باوجود گیٹ نہیں کھلا تو محمد خاں نے جیب سے چابی نکال کر ایک چھوٹا دروازہ کھولا اور اسی کے راستے اندر جا کر گیٹ کھول دیا۔ ہم ٹرالی اندر لیتے چلے گئے۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا جس کے مختلف حصوں میں سبزیاں، پھول اور پھل وغیرہ کاشت کئے گئے تھے۔ قریب ہی ایک پختہ شیڈ تلے ایک جیپ اور دوسرا ٹریکٹر کھڑا تھا۔ یقیناً یہی وہ ٹریکٹر تھا جس پر چند روز پہلے زریں گل پرانے گروارے آیا تھا۔ ڈیرا ایک پُراسرار سی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ احاطے کے علاوہ اندر کی عمارت میں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔

یہ بے شمار محرابی دروں والی دو منزلہ عمارت تھی۔ تاریکی میں اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ شہری طرز کی عمارت ہے، دیہاتی طرز کی یا دونوں طرز کی۔ اچانک مونچھوں والے کی آواز نے ہمیں بری طرح چونکا دیا۔ وہ محمد خاں سے پوچھ رہا تھا۔ "ٹرک کہاں گیا چاچا؟" یہ معمولی سا سوال ہمارے لئے کسی بڑے دھماکے سے کم نہیں تھا۔

محمد خاں الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے پچھواڑے کھڑا کر دیا گیا ہو گا۔"

پھر وہ تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت کا کلاوا کاٹ کر وہ پچھواڑے کی طرف گیا اور زیادہ تیز قدموں سے واپس آ گیا۔ "ببر سنگھ! ٹرک تو وہاں بھی نہیں ہے۔" اس نے مونچھوں والے کو اطلاع دی۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں پریشانی تھی۔

میں، بوٹا سنگھ اور بابو لیاقت چھلانگیں لگا کر ٹرالی سے اترے۔ "کہاں کھڑا تھا ٹرک؟" میں نے محمد خاں سے پوچھا۔

"وہ سامنے پھلواری کی پرلی طرف۔"

"عشرت صاحب اور رجن سنگھ وغیرہ کہاں ہیں؟"

"ابھی تو کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

پھر وہ عمارت کی طرف رخ کر کے کسی ماکھا سنگھ کو آوازیں دینے لگا۔ "ماکھا سنگھ۔ او ماکھا سنگھ۔ کہاں چلے گئے

ہو تم سب۔"

جب جواب نہیں آیا تو وہ کچھ اور گھبرا گیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "منہال صاحب! مجھے لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ نمبردار صاحب کی نئی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ نہ ہی چوکیدار کا کچھ پتا ہے۔"

بوٹا سنگھ دوڑ کر زرائی کی طرف گیا اور اپنی خودکار رائفل نکال لایا۔ میں اپنا پستول پہلے ہی نکال چکا تھا۔ مونچھ والا ببر سنگھ نے آگے بڑھ کر عمارت کے بیرونی حصوں میں لائٹس آن کیں اور پھر ہم سب کو چونکنا پڑا۔ عمارت کے داخلی دروازے کے عین سامنے کوئی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ ایک جال میں لپٹا ہوا تھا اور کسی بڑی مچھلی کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر محمد خاں چیخا۔ "ناکھے... ناکھے۔"

وہ دوڑ کر اس کی طرف گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے لپکے۔ گرے ہوئے شخص کو سیدھا کیا گیا۔ اس کے ماتھے پر کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ زخم اتنا گہرا تھا کہ مضروب کو زندہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے اس پر جال پھینک کر نیچے گرایا گیا تھا پھر وار کر کے زخمی کر دیا گیا تھا۔

جونہی ہم برآمدے سے گزر کر اندرونی حصے میں پہنچے یک جالی دار دروازے کے پاس ایک ایلسیشن کتے کی جسیم لاش نظر آئی۔ اس کتے کی گردن قربان ہونے والے بکرے کی طرح کٹی ہوئی تھی۔ کتے کے جبڑے میں کسی سرخ کپڑے کی دھجی تھی اور اس کی شہ رگ سے بہنے والا خون ابھی جما تھا نہ ہی سیاہی مائل ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا ہے۔ تیس چالیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا پہلے۔ محمد خاں چلاتا سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ "نمبردار صاحب جی... نمبردار صاحب۔"

"رک جاؤ محمد خاں" میں نے بلند آواز سے کہا۔

وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کا یوں اندھا دھند سیڑھیوں پر چڑھنا خطرناک تھا۔ میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ "اوپر جانے کا اور کون سا راستہ ہے؟"

وہ بولا۔ "پچھلی جانب چھوٹی سیڑھیاں ہیں۔"

"تو میرے ساتھ۔" میں نے اس کا بازو تھاما۔

بابو لیاقت بھی میرے پیچھے تھا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ اور مونچھوں والے ببر سنگھ سے کہا کہ وہ دونوں سیڑھیوں کی پوزیشن لے لیں۔ کوئی اس طرف بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے روکیں۔ اگر کوئی اجنبی ہو تو بے شک گولی چلا دیں۔ میں اور محمد خاں بڑی احتیاط لیکن تیزی سے عمارت کے پچھواڑے پہنچے۔ یہ عمارت شہری اور دیہی طرز تعمیر کا ملا جلا نمونہ تھی۔ بالکل جیسے دھوتی کے اوپر کوٹ پہنا گیا ہو اور ٹائی کے ساتھ ساتھ سر پر پگڑی بھی باندھی ہو۔ جاگیردارانہ ماحول میں ایسی عمارتیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہم عقبی زینے پر پہنچے۔

"کوئی ہے!" محمد خاں نے دو تین مرتبہ بلند آواز سے کہا۔

کہیں آہٹ ہوئی نہ کوئی آواز آئی۔ چہار سو گہری خاموشی تھی۔ جیسے فارم کی اس عمارت میں بھی مچھلیاں رہتی ہوں جو نہ بولتی ہیں اور نہ پانی کے نیچے حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ میں نے احتیاط سے زینے چڑھنے شروع کیے۔ میرے عقب میں محمد خاں اور اس کے پہلو میں بابو لیاقت تھا۔ ہم تینوں مسلح تھے۔ ابھی نصف زینے ہی طے ہوئے تھے کہ میری چھٹی حس ایک اہم اعلان کرنے لگی۔ عمارت کی بالائی منزل پر کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ میں نے باقی زینے خاصی تیزی سے عبور کیے اور بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں گھپ تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں پھیلے ہوئے دہشت کی مہک تھی۔ محمد خاں نے آگے بڑھ کر سوئچ تلاش کیا اور لائٹ روشن ہو گئی۔ ہم ایک ہال نما کمرے میں کھڑے تھے۔ فرش پر قالین بچھا تھا اور دسترخوان لگا ہوا تھا۔ مچھلی کا سالن، فرائی ہوئی مچھلی، چاول، گنے کے رس کی کھیر اور نامعلوم کیا کچھ نظر آ رہا تھا مگر سب کچھ بری طرح اجڑا بکھرا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس دسترخوان پر انسانوں نے نہیں جانوروں نے کھانا کھایا ہے۔ روٹیوں کی چیر پھاڑ، سلاد کی بے حرمتی، سالن ضائع، برتنوں کی توڑ پھوڑ۔ ہر بے ہودگی یہاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے چائے کی ایک کیتلی کو چھوا۔ وہ ابھی نیم گرم تھی۔

ہم اس ہال نما کمرے سے آگے بڑھے تو عمارت کی نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ یہاں بھی قالین بچھا تھا اور گاؤ تکیے لگے تھے۔ اس کمرے کی آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں رقص و سرور کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہوں گی۔ کمرے میں شیشے کی ایک بڑی الماری تھی۔ اس میں شراب اور بیئر کی بوتلیں اور جگمگاتے شیشے والے جام رکھے تھے۔ الماری کا ایک بڑا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہاں سے شراب کی بوتلیں نکالی گئی ہیں۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے سوا کمرے میں اور گڑبڑ نہیں تھی لیکن ایک چیز دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یقیناً میرے علاوہ بابو لیاقت اور محمد خاں بھی چونک گئے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ شیشے کی الماری کے پاس پلائی ووڈ کے ایک دروازے میں تیر پیوست تھا۔ پلائی ووڈ کے دروازے اندر سے خالی ہوتے ہیں۔ لہٰذا تیر کی انی آرپار ہو گئی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کوئی اور قابلِ ذکر شے نظر نہیں آئی۔ اسی دوران نیچے سے مونچھوں والے ببر سنگھ نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ وہ محمد خاں کو آوازیں دے رہا تھا۔ ہم نے نشست گاہ اور طعام گاہ کے دروازے باہر سے بند کر دیے اور سامنے والے بڑے زینوں سے اتر کر نیچے آ گئے۔ ببر سنگھ سیڑھیوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ فق تھا اور ہاتھ مضبوطی سے ایک رائفل پر جمے تھے۔ محمد خاں کو دیکھتے ہی اس نے بائیں جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "چاچا! جھیمو وہاں بندھی پڑی ہے۔"

ہم محمد خاں اور ببر سنگھ کے پیچھے ایک اندرونی کمرے میں پہنچے اور لرز کر رہ گئے۔ ببر سنگھ نے بے وقوفی کی تھی۔ اس نے ایک لڑکی کو بالکل بے پردہ حالت میں دیکھا تھا اور اب ہم کو بھی یہ منظر دکھانے لے آیا تھا۔ وہ چاہتا تو کسی کپڑے یا چادر سے اس بے ہوش لڑکی کو ڈھانپ سکتا تھا۔ اس لڑکی کو بڑی بے دردی سے ایک چارپائی کی ادوائن سے باندھ کر ایک بستر پر ڈالا گیا تھا۔ خون ٹھہرنے سے بے چاری کے ہاتھ پاؤں نیلے ہو رہے تھے۔ اس کے جسم پر جابجا درندگی کے نشانات تھے۔ یوں لگا جیسے میں ایک اور اجڑا بکھرا دسترخوان دیکھ رہا ہوں۔ جیسے دسترخوان پر بھیڑیوں کی طرح حملہ کیا گیا تھا۔ اس انسانی جسم کو بھی وحشیانہ انداز میں بھنبھوڑا گیا تھا۔ میں نے بستر کی چادر سے بے ہوش لڑکی کو ڈھانپ دیا۔ محمد خاں سسکتے ہوئے بولا۔ "یہ گوگی ہے۔ نمبردار صاحب کے سب سے پرانے ملازم شریف بابا کی بیٹی ہے۔"

بابو لیاقت نے آگے بڑھ کر لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ ایک دو منٹ میں لڑکی ہوش میں آ گئی۔ وہ ہراساں نگاہوں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کے زخمی ہونٹ لرز رہے ہیں، سینے میں ایک تلاطم برپا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت دو بیضوں کی طرح ٹھہری ہوئی تھی۔

"کیا ہوا جھیمو۔ کیا ہوا؟ کچھ تو بتا۔ کہاں گئے نمبردار صاحب... اور وہ مہمان... اور باقی سب لوگ؟"

جھیمو کے ہونٹ لرزتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی چمک تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے تھے اور ہم میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ چادر ہٹا کر اس کی بندشیں کھولتا۔ اتنے میں اس کی نگاہ ببر سنگھ پر پڑی۔ وہ محمد خاں کے پیچھے کھڑا تھا۔ ببر سنگھ کو دیکھتے ہی جھیمو کے چہرے پر جیسے موت کی زردی لہرائی۔ وہ منہ کھول کر اتنے دلدوز انداز میں چیخی کہ در و دیوار کانپ گئے۔ اس پر جیسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ایک دم اس نے بستر سے اٹھنے اور اترنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دبوچ کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ چند لمحے تڑپتی مچلتی رہی، پھر اس کی آنکھیں الٹ گئیں اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔

میں نے ببر سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں نے محمد خاں سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ... میرے دوست کا بیٹا ہے۔ یہیں میرے ساتھ رہتا ہے۔ فارم پر کام بھی کرتا ہے۔"

بوٹا سنگھ اور بابو لیاقت نے بھی وہ سب کچھ دیکھا تھا جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ وہ دونوں بھی ببر سنگھ کی طرف سے چوکس ہو گئے تھے۔

یہ واقعات جس عمارت میں ہوئے تھے وہ گنڈا راپور کی اصل آبادی سے کوئی چار فرلانگ دور تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پائی تھی۔ میں نے بوٹا سنگھ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "جوان! تم یہیں رہو۔ ببر سنگھ پر خاص نگاہ رکھو۔ اس کو یہاں سے کھسکنے مت دینا... کسی بھی صورت۔"

بوٹا سنگھ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے بابو لیاقت کو ساتھ لیا اور دوڑتا ہوا مین گیٹ کی طرف آیا۔ مین گیٹ کے پاس ہی وہ پختہ شیڈ تھا جہاں ٹریکٹر اور جیپ کھڑی تھی۔ میں نے جیپ کے دروازوں پر کوشش کی۔ خوش قسمتی سے ایک دروازہ کھلا مل گیا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے تاریں جوڑ کر میں نے جیپ اسٹارٹ کر لی۔ اس میں کافی پیٹرول موجود تھا۔ میں نے جیپ کو تیزی سے موڑا اور عشرت فارم کی عمارت سے نکل آیا۔

تمام شواہد بتا رہے تھے کہ اس فارم پر جو کچھ ہوا ہے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ کچے راستے، اتنے زیادہ لوگ کے ساتھ وہ تیز رفتاری سے نہیں چل سکتا تھا۔ ہم امید کر سکتے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ میل کے دائرے میں ہو گا۔ میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس میں ٹائروں کے نشانات ڈھونڈے۔ یہ میرے اپنے فریدے ہوئے تاثر تھے۔ میں نے ان کے نشانات پہچان لیے۔ یہ نشان ٹریکٹر ٹرالی کے نشانات میں گڈمڈ ہو چکے تھے۔ بہرحال کوشش سے بچائے جا سکتے

تھے۔ ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹرک کا رخ جنوبی سمت میں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی پتا چلتا تھا کہ ٹرک کے آگے یا پیچھے ایک اور گاڑی بھی ڈیرے سے نکلی ہے۔ ڈیڑھ دو فرلانگ تک ہم ان نشانات کے سہارے چلتے رہے پھر نیم پختہ راستے پر نشانات ہم سے جدا ہو گئے۔

شاید وہ میری زندگی کی تیز ترین ڈرائیونگ تھی۔ انتہائی خراب راستے پر میں نے انتہائی رفتار سے جیپ دوڑائی اور دور تک گیا لیکن ٹرک کے آثار نظر نہیں آئے۔ بابو لیاقت نے کہا۔ "شاہ جہاں صاحب! یہاں پاس ہی میرے ایک گجراتی دوست کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ وہ سامنے گیٹ نظر آ رہا ہے اس کا۔ یہاں ٹیلیفون بھی موجود ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو کال کرتا ہوں۔ یہ وقت بے حد قیمتی ہے۔ ہمیں اپنی پوری طاقت سے ٹرک کو تلاش کرنا ہو گا۔"

بابو لیاقت نے مناسب بات کی تھی۔ میں نے اسے ریسٹ ہاؤس کے سامنے اتار دیا اور خود جیپ لے کر آگے بڑھ گیا۔ جنوبی سمت میں ناکام رہنے کے بعد میں نے دیگر اطراف میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں پختہ راستے سے اتر آیا اور ان کچے کے راستوں کو کھنگالنے لگا جو گنڈا راپور کے چاروں طرف جال کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ رک کر میں کسانوں اور راہ گیروں سے پوچھتا بھی رہا۔ ایک گھڑ سوار کسان نے مجھے ٹرک کا سراغ بھی دیا لیکن یہ سراغ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں میں نے قریباً اسی کلو میٹر جیپ چلائی۔ قرب و جوار کے کئی گاؤں دیکھے۔ کھیتوں کے درمیان واقع ڈیروں پر نگاہ دوڑائی اور ہر اس جگہ پہنچا جہاں ایک ٹرک نظر سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ یہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور رات کوئی ایک بجے میں عشرت فارم میں واپس پہنچ گیا۔ واپسی کے راستے میں مجھے دو تین گاڑیاں بھی ملیں۔ ان میں سے ایک جیپ کو میں پہچان گیا۔ وہ بابو لیاقت کی فیکٹری سے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بابو لیاقت کے کارندے بھی ٹرک کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔

عشرت فارم میں چاق و چوبند بوٹا سنگھ بڑے حوصلے سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بابو لیاقت ابھی تک واپس نہیں آیا۔ بوٹا سنگھ نے ہوشیاری دکھائی تھی اور ببر سنگھ کو محمد خان سمیت ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اس کے پاس ہمارے لئے ایک بری اطلاع بھی تھی۔ یہ "اطلاع" ایک لاش کی صورت برآمدے کے تاریک گوشے میں پڑی تھی۔ یہ اس چوکیدار کی لاش تھی جس کی پیشانی پر تیز دھار آلے کا زخم آیا تھا۔ بروقت طبی امداد نہ ملنے سے وہ جاں بحق ہو گیا تھا۔ لیکن شاید طبی امداد مل بھی جاتی تو وہ جانبر نہ ہو سکتا۔ اس کا زخم عام زخم نہیں تھا۔ میں وہ گھاؤ دیکھ کر ایک شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب میں نے ایک بار پھر روشنی میں اچھی طرح زخم کا معائنہ کیا۔ زخم کے ارد گرد جلد کا رنگ نیلگوں ہو چکا تھا اور زخم کے کنارے سفید پڑ رہے تھے۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ مقتول کو جس کلہاڑے یا برچھے وغیرہ سے زخمی کیا گیا ہے وہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ایسے زہرناک ہتھیار کا معمولی کٹ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اچھا بھلا گھاؤ تھا۔ ایل سیکشن کنے کا زخم بھی ایسے ہی شواہد پیش کر رہا تھا۔ پھر وہ تیر جو بالائی منزل کے دروازے میں پیوست تھا۔ کچھ عجیب سی نشانیاں چھوڑ گئے تھے اس فارم میں گھسنے والے اور اس انتہائی اہم واقعے کی شاید وہ بدنصیب لڑکی تھی جس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔

مجھے صفدر کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے بار بار تاکید کی تھی کہ ہم شام تک فارم میں پہنچ جائیں۔ شاید اس تاکید کے پیچھے کوئی خوف یا اندیشہ تھا پھر صفدر کا ایک فقرہ میری سماعت میں گونج اٹھا۔ نجانے کیوں یہ فقرہ میرے ذہن میں اب تک اٹکا ہوا تھا۔ اس فقرے میں صفدر نے میرے لئے پہلی بار ایک نیا لقب استعمال کیا تھا۔ میں نے صفدر سے پوچھا تھا کہ اس نے دوسری بار ٹیلیفون کیوں کیا ہے۔ گنڈا راپور میں سب ٹھیک تو ہے نا؟ صفدر نے جواب دیا تھا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں استاد جی' سب ٹھیک ہے۔"

اس نے اب تک کی رفاقت میں مجھے شاہ جہاں کے نام سے پکارا تھا۔ اس کی زبان سے "استاد جی" کا لقب مجھے عجیب لگا تھا۔ کہیں اس نے یہ لقب استعمال کر کے اپنے تسلی بخش فقرے کی نفی تو نہیں کی تھی؟ عین ممکن تھا کہ اس لقب کے ذریعے اس نے مجھے سرخ جھنڈی دکھانے کی کوشش کی ہو۔ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ یہ سوچنا بھی سوہان روح تھا کہ نامعلوم لوگ ٹرک ہمارے ہاتھوں سے نکال کر لے گئے ہیں لیکن سوچنا پڑ رہا تھا۔ آنکھ بند کر لینے کے باوجود پہاڑ اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور حقیقت جھٹلانے سے افسانہ نہیں بن جاتی۔ بہت سے سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے۔ آخر کون تھے وہ لوگ جنہوں نے یہ شب خون مارا تھا۔ شام چھ بجے سے رات دس بجے کے درمیان اس ڈیرے میں کیا واقعہ رونما ہوا تھا جس کے بعد مہمان اور ان کا سامان اس ڈیرے سے غائب ہو گیا بلکہ میزبان بھی ندارد تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یہاں ایک قتل بھی ہو چکا تھا۔ چوکیدار کی موت

زیادہ دیر راز نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دن چڑھنے سے پہلے ہی نمبردار عشرت کا کوئی ملازم یا عزیز پولیس لے کر یہاں پہنچ جاتا۔ ضروری تھا کہ ہم جتنی دیر اس فارم میں رہیں پوری طرح چوکس رہیں اور صبح ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں۔

ہماری نگاہ میں ببر سنگھ نامی نوجوان مشتبہ ٹھہر چکا تھا۔ اسے دیکھ کر جس طرح بدنصیب لڑکی نے چیخیں ماری تھیں اور ہوش کھوئے تھے وہ منظر نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ کو ساتھ لیا اور اس کمرے میں پہنچا جہاں محمد خان اور ببر سنگھ کو بند کیا گیا تھا۔ وہ دونوں غیر مسلح تھے جب کہ ہم دونوں مسلح تھے۔ میں نے ببر سنگھ کو بوٹا سنگھ کی نگرانی میں باہر بھیج دیا اور محمد خان سے پوچھ گچھ شروع کی۔ محمد خان نے بتایا کہ شام چھ بجے کے قریب وہ اور ببر سنگھ ڈیرے سے روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک کتوں والا ٹرک ڈیرے پر موجود تھا۔ ٹرک کے پاس ہی لان میں نمبردار صاحب اور روچن صاحب کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ نمبردار صاحب نے ہم سے کہا تھا کہ ہم پل پر پہنچ جائیں اور جونہی ٹریکٹر ٹرالی یا کسی دوسری گاڑی پر مہمان آئیں انہیں لے کر ڈیرے پر پہنچ جائیں۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے مہمانوں کو شناخت کیسے کرنا تھا؟"

"اس طرف بہت کم گاڑیاں آتی ہیں۔" محمد خان نے کہا۔ "شام چھ بجے سے رات دس بجے تک صرف دو ٹرالیاں اور تین دوسری گاڑیاں پل پر سے گزری تھیں۔ ہم ہر ایک کو روک کر نام پتا پوچھ لیتے تھے۔ دس بجے کے قریب ہم مایوس ہو کر واپس لوٹنے والے تھے جب آپ کی ٹریکٹر ٹرالی نظر آئی۔"

میں نے پوچھا۔ "شام چھ اور دس کے درمیان ببر سنگھ کہیں گیا تھا؟"

محمد خان کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ بولا۔ "میں جھوٹ نہیں بولوں گا جی۔ ساڑھے آٹھ نو بجے کے قریب ببر سنگھ صرف دس پندرہ منٹ کے لئے کھیتوں میں گیا تھا۔ اسے حاجت ہو رہی تھی۔ اس دوران میں پل پر ہی موجود رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "دس پندرہ منٹ کے لئے یا زیادہ؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا لگا ہو گا جی' اس سے زیادہ نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ڈیرے پر جو کچھ ہوا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے ببر سنگھ کا اس میں کیا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ "نہیں جی! ببر ایسا انسان نہیں ہے۔ وہ تو کام سے کام رکھنے والا لڑکا ہے۔ فارم میں مچھلیوں کو خوراک ڈالتا ہے۔ یہاں پندرہ سولہ تالاب ہیں۔ صبح سے شام تک کام میں جتا رہتا ہے پھر تھک ہار کر فارم پر ہی سو رہتا ہے۔ کوئی بری علت نہیں ہے اسے۔ یاری دوستی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ شادی شدہ ہے؟" اس کا جواب محمد خان نے نفی میں دیا۔ میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا ہی ہے کہ ملازمہ لڑکی اس کی صورت دیکھ کر کس طرح چیخنے چلانے لگی تھی۔"

"وہ اپنے حواس میں نہیں ہے جی۔ صدمے سے پاگل ہو رہی ہے بے چاری۔" محمد خان نے صفائی پیش کی۔

"لیکن ہم پاگل نہیں ہیں۔ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے محمد خان کو باہر بھیج کر ببر سنگھ کو اندر بلایا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی بھاری بھرکم مونچھیں اور ان کے نیچے سانولے سلونے بھدے ہونٹ تھے۔ عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا صحت مند نوجوان تھا لیکن اس وقت چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ یہ بات اب اس کے لئے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے پولیس والوں کا مخصوص حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "ببر سنگھ! چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہارے چاچے نے جو کچھ بتا دیا ہے وہ تمہیں ہتھکڑی لگوانے اور جیل پہنچانے کے لئے کافی ہے۔ بہرحال میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ کوئی رعایت کریں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ سب کچھ صاف صاف بک دو۔"

میرے انداز نے اسے گڑبڑا دیا۔ اس نے پہلے تو ہوشیار بننے کی کوشش کی لیکن پھر ذرا پھسل گیا۔ کہنے لگا۔ "یہ بات ٹھیک ہے جی کہ ہیمو مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں ایک دو بار اس سے ملا بھی ہوں لیکن اس کے ساتھ ایسی شرمناک حرکت کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر کتے "موتی" کا حشر' ٹرک کا غائب ہو جانا اور رکھا سنگھ کا قتل ۔۔۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔ "شروع شروع میں کسی مجرم کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ تمہارے چاچے کا کہنا ہے کہ تم پل پر اس کے ساتھ گئے تھے لیکن پھر کام کا بہانہ کر کے وہاں سے آ گئے اور

"تنہ بجے کے گئے ہوئے رس بجے کے لگ بھگ لوٹے"

میں نے یونہی بات کردی تھی لیکن تیر نشانے پر لگا۔ بنیر سنگھ بولا۔ "میں کھیتوں میں گیا تھا لیکن واپسی پر تھوڑی دیر کے لئے اپنے یار ربارے کے ٹیوب ویل پر رک گیا تھا۔ بلکہ اس نے زبردستی روک لیا تھا مجھے۔"

"کتنی دیر اس کے پاس بیٹھے؟"

"کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹا"

یہاں محمد خاں اور بنیر سنگھ کے بیانات میں تضاد تھا۔ محمد خاں کہہ رہا تھا کہ وہ بمشکل پندرہ بیس منٹ کے لئے گیا تھا جبکہ بنیر سنگھ اعتراف کر رہا تھا کہ وہ دو گھنٹے تک غائب رہا ہے۔ ان دو گھنٹوں میں بہت کچھ ہو سکتا تھا اور ممکن تھا کہ بنیر سنگھ نے بہت کچھ کیا بھی ہو۔ وہ ہر قسم کے موقعے سے فائدہ اٹھانے والا شخص نظر آتا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے ساتھ سختی سے پوچھ گچھ کی جائے۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی اور اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ زور دار تھا لیکن لڑائی بھڑائی میں ماہر نہیں تھا۔ میں نے پستول اپنے تہبند کی ڈب میں ڈال کر اس کو ٹھوکروں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ وہ تھوڑی دیر تو خاموشی سے مار کھاتا رہا پھر چیخنے چلانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ مار کھانے کے بعد وہ ڈھیلا پڑ جائے گا لیکن معاملہ الٹ ہوا۔ اس میں ایک عجیب سی دیہاتی خود سری آگئی۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا "مارو۔۔۔ مارو، جان سے مار دو مجھے، میں کچھ نہیں بتاؤں گا کچھ نہیں"

پھر وہ نیم جان ہو کر فرش پر گر گیا۔ اس کے منہ اور نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جب میں بنیر سنگھ سے تفتیش کرنے میں مصروف تھا، بابو لیاقت واپس عشرت فارم پر پہنچ چکا تھا اور اب وہ اور بوٹا سنگھ وغیرہ ڈیرے کے طول و عرض سے شواہد اکٹھا کر رہے تھے۔ انہوں نے آکر مجھے بتایا کہ بالائی منزل سے ایک اور تیر ملا ہے۔ یہ ایک بستر کے فوم میں گھسا ہوا تھا۔ تیر کی ساخت پہلے تیر جیسی تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسے کسی "ایرو گن" سے چلایا گیا ہے یا کمان سے۔ اس کے علاوہ قالین اور برآمدے میں خون کے دھبے موجود تھے۔ یہ دھبے اس چھتہ شیڈ تک گئے تھے جہاں نمبردار عشرت کی نئی کار کھڑی تھی۔ ٹائروں کے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹرک کے پیچھے پیچھے کار بھی ڈیرے سے نکلی ہے۔ اس کے علاوہ کسی تیسری گاڑی کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اور یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ حملہ آور کس گاڑی میں یہاں پہنچے تھے۔ جو سب سے اہم چیز بابو لیاقت کے ہاتھ میں آئی تھی وہ ایک خنجر نما ہتھیار تھا۔ یہ نہ تو خنجر تھا، نہ کرپان اور نہ چاقو۔ ان تمام ہتھیاروں کی تھوڑی تھوڑی جھلک اس میں پائی جاتی تھی۔ اس ہتھیار کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور اس پر چھوٹے چھوٹے نقطوں سے ایک کشتی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے روشنی میں غور سے خنجر نما آلے کی دھار دیکھی۔ بلاشبہ یہ بھی زہر میں بجھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کپڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیا۔

ضروری تھا کہ صبح سے پہلے پہلے ہم عشرت فارم چھوڑ جائیں۔ مشورے کے بعد رات ڈھائی بجے ہی ہم فارم سے روانہ ہو گئے۔ اپنی موجودگی کے تمام شواہد مٹانے کی ہم نے حتی الامکان کوشش کی تھی۔ واپسی کے لئے ہم نے ایک اسٹیشن ویگن استعمال کی۔ یہ ویگن بابو کا ملازم فرمان علی چلا کر یہاں لایا تھا۔ یہ نئی ویگن تھی لیکن ٹرک کی تلاش میں کئی گھنٹے کچے راستوں پر بھاگنے کے بعد ناقابل شناخت ہو رہی تھی۔ ہم نے نیم بے ہوش لڑکی سکینہ عرف جھیمو اور "ملزم" بنیر سنگھ کے علاوہ محمد خاں کو بھی ویگن میں سوار کرالیا تھا۔ بنیر سنگھ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے تاہم محمد خاں کو اس یقین دہانی پر آزاد رکھا گیا تھا کہ وہ راستے میں گڑبڑ کی کوشش نہیں کرے گا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم فیکٹری واپس پہنچ گئے۔ راستے میں اس کے سوا کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا کہ ایک موقع پر جھیمو کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نگاہ سامنے بیٹھے بنیر سنگھ پر پڑی اور وہ ایک بار پھر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ اسے بمشکل قابو کیا گیا۔ فیکٹری میں زریں گل، ارجمند بانو اور دیگر افراد کو ٹرک کی گمشدگی کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا ارجمند بانو کی آنکھیں سرخ ہیں۔ یقیناً وہ دیر تک روتی رہی تھی۔ زریں گل بھی پژمردہ نظر آرہا تھا۔ سائیں عالی اور اس کا چیلا جانی شاہ تمام ہنگاموں سے لاتعلق ایک کمرے میں فرش پر گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے درمیان جیسے خراٹوں کا پیچ ہو رہا تھا۔ سائیں عالی کے گلے میں چاندی کا قدیم تعویذ بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس تعویذ ہی کی طرح سائیں کے نیلے پیلے چہرے پر بھی ایک چمک سی تھی۔ نجانے کیوں سائیں کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔ کوئی غیر بشری طاقت یا صلاحیت۔ شاید ارجمند بانو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ سائیں ایک روحانی شخصیت ہے۔

فیکٹری میں پہنچ کر ہم نے ایک بار پھر بنیر سنگھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس دفعہ یہ کام بابو لیاقت نے اپنے ذمے لیا۔ وہ گفت و شنید میں ماہر تھا اور دوسرے کو قائل کرنے کی

خداداد صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے جھیمو نامی لڑکی کی طرف رخ کیا۔ میرے ساتھ فرمان علی بھی تھا۔ جب میں اور فرمان علی کمرے میں داخل ہوئے تو لڑکی سر پر سوتی اوڑھنی لئے مسہری پر بیٹھی تھی اور بابو لیاقت کی ایک ملازمہ دودھ میں ڈبل روٹی ڈبو ڈبو کر اسے کھلا رہی تھی۔ جھیمو نے مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں وہی کرب آمیز خجالت تھی جو ایک لٹی پٹی لڑکی کا مقدر ہوتی ہے۔ پھر لڑکی کی نگاہ فرمان علی پر پڑی۔ اچانک اس کی حالت پھر غیر ہونے لگی۔ نوالہ اس کے منہ میں اٹک کر رہ گیا اور آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف سمٹ آیا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں زور سے چیخی اور پھر چیختی چلی گئی۔ اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور خوف کے سبب دہری ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ فرمان علی ہکا بکا کبھی میری طرف اور کبھی لڑکی کی طرف دیکھتا تھا۔ میں نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی کی حالت سنبھل گئی اور وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ مگر اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور زخم زخم ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ملازمہ نے انگلی ڈال کر اس کے منہ میں اٹکا ہوا نوالہ نکال لیا۔

مجھے جھٹکا سا لگا اور ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی۔ بنیر سنگھ اور فرمان علی میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ دونوں بھاری بھرکم مونچھوں والے تھے۔ تو کیا جھیمو کے خوف کا سبب مونچھیں تھیں۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خود پر گزرنے والے سانحے کے بعد ہر مونچھ والے شخص سے خوفزدہ ہوتی ہے۔ میں نے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بنیر سنگھ پر ہمارے شک کی بنیاد ایک دم کھوکھلی ہو گئی ہے۔

اب ایک ہی راستہ تھا۔ کسی طرح گونگی لڑکی ہمیں خود پر بیتنے والے واقعات کے بارے میں کچھ بتا سکتی۔ عام گونگے افراد کی طرح لڑکی بہری بھی تھی۔ پڑھنے لکھنے سے اسے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ صرف اشاروں کی زبان میں بات کر سکتی تھی۔ اشاروں کی زبان میں اس سے کچھ پوچھ لینا ایک حرج اور صبر آزما عمل تھا، جبکہ ہمارے لئے وقت نہایت تیزی سے گزر رہا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ ہمارے خلاف اور ان نامعلوم افراد کے حق میں جا رہا تھا جنہوں نے عشرت فارم میں شب خون مارا تھا۔

سامان کو سرحد پار پہنچانے کے حوالے سے ہمارے سارے انتظامات اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ صبح کے پانچ بجے اور پلاننگ کے مطابق ہمیں اس وقت نگرا گاؤں میں "ہیجڑے بدمعاش" نوشاد کے ڈیرے پر ہونا چاہئے تھا۔

میں نے نشست سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے ذہن کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ سوچ کے گھوڑے سرپٹ دوڑ اٹھے اور سیدھے اس جانب گئے کہ جس جانب ان کے جانے کی توقع تھی۔ معلوم نہیں یہ میرا تعصب تھا، جذبۂ عداوت تھا یا سنگین تجربات کی دوائی تلخی کہ جب مجھے کوئی چرکا لگتا تھا اور میرے ارد گرد شنکر شکرا موجود ہوتا تھا تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ یہ چرکا کسی نہ کسی طور شنکر ہی کا لگایا ہوا ہے۔ بارہا میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا اور میں نے چوٹ کھا کر کمین گاہ کی طرف دیکھا تھا تو ازلی دشمن شنکر سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت بھی یہی خیال میرے ذہن میں آیا کہ شنکر شکرا کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے پر شک کرنے کا جواز ہے نہ ضرورت۔

میں نے فوری فیصلہ کیا کہ سب کام چھوڑ کر شنکر شکرا کی تلاش میں نکلوں۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔ اگر اب بھی میں مصلحتوں کو پیش نظر رکھتا تو وہ "سب کچھ" ہاتھ سے نکل جانا یقینی تھا جس کے لئے ہم نے اب تک تگ و دو کی تھی۔ ارجمند بانو کچھ دور بیٹھی امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میرے دلی جذبات کا اندازہ لگا رہی ہو۔ مجھے اس کمرے کا راستہ آتا تھا جہاں میں نے بسنتاں کو گوپال سنگھ کے ہاتھوں قتل کروایا تھا اور بعد ازاں شنکر کے چھ دشمنوں کو پکڑ کر یہاں فیکٹری میں لایا تھا۔ میں نے ارجمند بانو سے اس کی سفید گاڑی کی چابی لی اور فیکٹری کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ سفید گاڑی وہیں پر کھڑی تھی۔ اسٹنٹ مین جلال پانسر رائل بائدر گلے میں حمائل کئے گاڑی کے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے دھکیل کر گاڑی کے دروازے سے پیچھے ہٹایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں گاڑی اسٹارٹ کرتا، زریں گل کی پکارتی ہوئی آواز آئی "خوچہ استاد جی! آپ کا فون آیا ہے۔ کوئی آپ سے بات کرنے کا بولتا ہے"

میں گاڑی سے اترا اور فون سننے کے لئے بابو کے آفس میں آگیا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یہ آس بندھ گئی تھی کہ شاید صفدر یا نمبردار عشرت وغیرہ کی طرف سے کوئی اطلاع آئی ہے۔

"ہیلو" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں شنکر بول رہا ہوں" دوسری طرف سے آنے والی آواز نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا

"میں اپنے بیڈ روم سے بول رہا ہوں۔ میرے سامنے جانی واکر کی ایک بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی ـــــ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی ریسیور کسی دوسرے کو تھما دیا گیا۔

میرے کانوں میں ایک روتی بلکتی نسوانی آواز آئی اور میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ غزالہ تھی۔ غزالہ 'میری روح' میرا جسم' میری زندگی' میری بدنصیب آنکھوں کا پہلا اور آخری سپنا۔ وہ بولی "شاہ جہاں! خدا کے لئے "فار گاڈ سیک" آپ اس کتے کی کوئی بات نہیں ماننا۔ اس نے آپ کو ختم کرنے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ میری پروا نہ کرنا شاہ جہاں۔ میں پھر کہہ رہی ہوں......"

ریسیور غزالہ کے ہاتھوں سے چھین لیا گیا۔ اب اس کی صرف مدھم ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ شکرا اپنے بھاری بھرکم اور کھُردرے لہجے میں بولا "میں اسی کوٹھی سے بول رہا ہوں جانی' جہاں تم نے آج میرے آٹھ بندوں سے "محبت" کی ہے۔ میری گھڑی میں اس وقت پانچ بجے ہیں۔ میرے پاس تمہارے لئے صرف دو گھنٹے کی مہلت ہے۔ سات بجے تک ٹرک مع تمہارے اور تمہارے تین ساتھیوں کے مجھ تک پہنچ جانا چاہئے۔ دوسری صورت میں یہ لڑکی بہت عذاب جھیل کر یہاں سے رخصت ہوگی۔"

شکرا کی آواز میں وہ مخصوص درندگی تھی جو پتھر کو پانی کر دیتی تھی۔ یہ میں تھا جو اس کا لب و لہجہ جھیل جاتا تھا ورنہ اکثر لوگ اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے تھے۔ وہ غالب دشمن تھا اور مجھے اس کا اعتراف بھی تھا مگر میں نے کبھی اس کا غلبہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج بھی اس کا غلبہ تسلیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور بھاگتا ہوا آفس سے نکل آیا۔ مجھے یاد ہے ارجمند بانو' لیاقت اور زریں گل مجھے آوازیں دیتے رہ گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں کس وقت گاڑی میں بیٹھا' کب فیکٹری سے نکلا اور کب فرید کوٹ کی سڑکوں پر دندنانے لگا۔ راستے میں دو تین جگہ پولیس نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ شاید میں کرفیو والے علاقے سے بھی گزرا تھا۔ میرے عقب میں پولیس کاروں کے سائرن گونج رہے تھے۔ ٹریفک پولیس کے دو سارجنٹ بھی مجھے گاڑی کے عقب نما آئینے میں نظر آئے۔ وہ اپنی ہیوی موٹر سائیکلوں پر اُڑے چلے آ رہے تھے۔ یہ سارے مناظر میرے لئے جیسے کسی دُھند میں چھپے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے واضح منظر صرف شنکر شکرا کے چہرے کا تھا اور سماعت میں صرف اس کی آواز تھی جو صاف گونج رہی تھی ـــ میں اپنے بیڈ روم سے بول رہا ہوں۔ میرے سامنے جانی واکر کی بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی ـــ

مجھے یاد ہے میں اس وقت "راج کالونی" میں پہنچ چکا تھا۔ ایک پُرخطر موڑ کاٹ کر میں بڑی سڑک سے چھوٹی سڑک پر آیا تھا۔ اس وقت اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور میرا دایاں پاؤں بے ساختہ بریک پیڈل پر دبتا چلا گیا۔

میرے عقب میں ایک عفریت تھا۔ اس ملگجے اندھیرے میں اپنی چمکتی آنکھوں' دراز زلفوں اور دیوانے چہرے کے ساتھ وہ مجھے عفریت ہی نظر آیا۔ وہ سائیں عالی تھا۔ وہ دونوں نشستوں کے درمیانی خلا سے برآمد ہوا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک بھاری بھرکم شے نظر آئی۔ یہ وہ خاص قسم کا پتھر تھا جو سرامکس فیکٹری کی ہر دم گھومنے والی مشینوں میں مسالا بنانے کے لئے ڈالا جاتا تھا۔ پتھر کا یہ ٹکڑا کم و بیش دس کلو وزنی تھا۔ میں نے اس پتھر کو تیزی سے اپنے سر کی طرف آتے دیکھا۔ پھر اچانک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

نجانے میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا۔ چند گھنٹوں بعد' دنوں بعد یا ہفتوں بعد۔ میری آنکھ کھلی تو میں ایک ویران صحرا میں تھا۔ دور دور تک ریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ سورج جیسے سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ میں نے بمشکل تپی ہوئی ریت سے سر اٹھایا۔ زبان منہ میں خشک چمڑے کی طرح بے حرکت پڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ پیاس اور نقاہت کے سبب میرا دم آنکھوں میں ہے۔

"پانی" میں نے جسم و جان کی پوری قوت سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا لیکن یہ اظہار صرف مجھ تک ہی محدود رہا۔ آواز میرے حلق کی خشک بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے سوچا' شاید میں مر رہا ہوں' شاید اسی کیفیت کو جان کنی کا عالم کہتے ہیں۔ اسی وقت میری نگاہ اپنے پہلو کی طرف اٹھی اور میں سکتے میں رہ گیا۔ میرے بائیں ہاتھ پر کسی کا سر دھرا تھا ـــ وہ غزالہ تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر آبلے سے پڑے تھے۔ میری نگاہ اس کے ہونٹوں پر اٹک کر رہ گئی۔ ان ہونٹوں پر جمی ہوئی سفید پپڑیاں گواہ تھیں کہ کئی روز سے یہ لب پانی کو ترس رہے ہیں۔ معلوم نہیں وہ زندہ تھی یا مر چکی تھی۔ میں اٹھ کر اسے دیکھنا چاہتا تھا لیکن نہ خود میں اتنی جرأت پا رہا تھا اور نہ توانائی۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے خود سے سوال کیا۔ وہ سب خواب تھا جو میں دیکھ رہا تھا یا یہ خواب ہے جو میں دیکھ رہا

ہوں۔ شاید وہی خواب تھا۔ کیونکہ اتنے دردناک خواب کے بعد بیداری لازم ہو جاتی ہے ـــ اور واقعی ان جان لیوا لمحات میں مجھے محسوس ہوا کہ میں اب تک ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ بچپنے' پل والی حویلی' زر و جواہر سے بھرے ہوئے پیکنگ صندوق' صفدر' زریں گل' ارجمند' ابراہیم اور پھر انڈیا کی سرزمین' فاضلکا کا صراف بازار' فرید کوٹ کی کرفیو زدہ گلیاں اور وہ سائیں عالی' سب خواب تھا۔ ایک عجیب و غریب اور طویل خواب۔ اگر یہ سب خواب تھا تو پھر وہ اطلاع بھی خواب تھی جو مجھے غزالہ کے حوالے سے ٹیلیفون پر ملی تھی اور جس کے نتیجے میں دو بدنام اسمگلرز المعروف جانی استاد اور شنکر شکرا کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہونے والی تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ بمشکل غزالہ کے سر کے نیچے سے نکالا اور اسے کندھے سے تھام کر جھنجوڑا۔ وہ بے حس و حرکت رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن مدھم تھی۔ میں نے خود کو کہنیوں کے بل ریت سے چند انچ بلند کیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ریت اور دھوپ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ناتوانی کے سبب آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے خود کو دوبارہ سلگتی ریت پر پھینک دیا۔ ایسے میں میری نگاہ دور اوپر نیلے جلوائی آسمان پر پڑی ـــ وہاں گدھ منڈلا رہے تھے۔

اپنے سر پر ان مُردار خور پرندوں کو منڈلاتے دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے دس بیس منٹ یا گھنٹے بعد اس سلگتی ریت پر میری جھلسی ہوئی لاش پڑی ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو دور اوپر اُڑتے ہوئے یہ گدھ نیچی پرواز کرنے لگیں گے۔ پھر وہ ایک ایک کر کے ریت پر اتر آئیں گے۔ کچھ دیر فاصلے پر کھڑے مجھے گھورتے رہیں گے۔ تب ایک توانا اور نسبتاً دلیر گدھ آہستہ آہستہ چلتا میرے پاس پہنچ جائے گا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکے گا۔ اور اچھل کر سینے پر آ بیٹھے گا۔ اس کی چونچ میرے چہرے سے گوشت نوچنے لگے گی۔ توانا گدھ کو مصروف کار دیکھ کر دوسرے گدھ بھی اچھل اچھل کر آئیں گے اور میرے جسم پر اپنی اپنی جگہ سنبھال لیں گے۔ چند گھنٹے بعد اس تپتی ہوئی ریت پر صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچا پڑا رہ جائے گا۔ شاید اس کے بعد غزالہ کے خوبرو جسم کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو۔ چلچلاتی دوپہروں اور خنک راتوں میں یہ دو انسانی ڈھانچے یونہی بے گور و کفن پڑے رہیں گے ـــ پھر ریت کی تہیں دھیرے دھیرے ان ڈھانچوں پر دو قبریں بنا دیں گی۔ ان میں سے ایک

قبر اس شاہ جہاں کی ہوگی جو جانی اُستاد کہلاتا تھا اور جو انڈر... دنیا کے بڑے بڑے جگادری جس کے سامنے سرنگوں ہو... تھے۔ دوسری قبر اس لڑکی کی ہوگی جو اس بدنام شخص سے پیا... کرتی تھی اور بے شمار مرتبہ زک اٹھانے کے باوجود اس... زندگی سے نکلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

ایک بار پھر ہمت کر کے میں نے ریت سے سر اٹھایا... میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس پر کئی جگہ خون کے دھبے... تھے۔ ایسے ہی چند چھوٹے دھبے غزالہ کے لباس پر... بھی تھے۔ اس کا ایک رُخسار خون آلود تھا۔ معلوم نہیں یہ... خون اس کے رُخسار سے بہا تھا یا یہ میری ہتھیلی سے بہنے والا... خون تھا جو اس کے رُخسار پر لگ گیا تھا۔ گرمی کی شدت سے... یہ خون بھی ہمارے مقدر کی طرح سیاہ ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ... بے ہوش ہونے سے پہلے میں بابو لیاقت کی فیکٹری میں تھا۔ وہاں شنکر شکرا کا فون آیا تھا۔ اس کی منحوس زبان سے ادا... ہونے والا شیطانی جملہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اس نے کہا تھا "میرے سامنے شراب کی بوتل کھلی پڑی ہے اور ایک لڑکی بھی۔" پھر اس نے مجھے غزالہ کی آواز سنائی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر شنکر شکرا کے ٹھکانے کی طرف لپکا تھا۔ میں نے ایک اور کرفیو کی کئی خلاف ورزیاں کی تھیں۔ میری گاڑی کے عقب میں پولیس کی گاڑیاں تھیں اور بہت سے سائرن گونج رہے تھے پھر اچانک دو نشستوں کے درمیانی خلا سے سائیں عالی کسی آسیب کی طرح برآمد ہوا تھا اور اس نے میرے سر پر ایک وزنی پتھر سے ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ چوٹ کا خیال آتے ہی میرا ہاتھ خود بخود سر کی طرف اٹھ گیا۔ سر کے درمیانی حصے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس پٹی کو ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر کان کے قریب گرہ دے دی گئی تھی۔

یہ سب کیا ہوا ہے اور کیسے؟ میں نے ذہن پر زور دیا۔ ایک شدید ٹیس سر میں اٹھی اور میں نے بے حال ہو کر سر دوبارہ ریت پر ڈال دیا۔ آنکھوں میں اب اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ اس وقت میری سب سے اہم ضرورت پانی تھا۔ ٹھنڈا ٹھار شفاف پانی۔ جو لبوں کو تر کر کے میرے حلق میں اترتا اور جاں بہ لب جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا۔ خواب کا سماں تھا لیکن بہت وحشت ناک خواب کا سماں۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ شدید نزع کی حالت غالب آتی جا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جسم و جاں کی پوری قوت مجتمع کی اور پورے زور سے چلایا "کوئی ہے؟" حلق سے ایک آواز برآمد ہوئی لیکن یہ آواز مدھم

ہونے کے علاوہ بہت عجیب و غریب بھی تھی۔ اس آواز کا صرف یہ نتیجہ نکلا کر حلق کی خشک نالیوں نے احتجاج کیا اور مجھے کھانسی ہونے لگی۔ کھانسی کا یہ دورہ بہت شدید تھا۔ میں کہ نبض کھانسے الٹ گیا۔ جب سانس لینے کے لیے میں نے ہوا اندر کھینچی تو گرم ریت منہ اور نتھنوں میں گھس گئی۔

"میں دائمی نیند سونے والا ہوں" ایک بار پھر ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی۔ میں نے آنکھیں گھما کر غزالہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے بدن تمام اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کا زیر و بم محسوس کرنا چاہا۔ پیٹ حرکت کر رہا تھا۔ لیکن مجھے لگا کہ اب یہ حرکت ایک جنبش یا لرزش کی صورت باقی رہ گئی ہے۔ غزالہ مر رہی تھی۔ میری آنکھوں کا حسین ترین سپنا مر رہا تھا۔ نامعلوم سمت سے اڑنے والی تاریکیاں میرا سب کچھ ہڑپ کرنے والی تھیں۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوا لیکن پھر ایک دم میری ٹھوڑی کر ہر سمت سے تاریکی اور جسم کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اوندھے منہ ریت پر گرا تھا لیکن مجھے یوں لگا کہ کھڑے کھڑے ایک دم میری ٹھوڑی ریت سے جا ٹکرائی ہے۔ گرنے کا عمل کب اور کیسے ہوا مجھے بالکل خبر نہیں ہوئی۔ دوبارہ ریت پر گرنا تابوت میں ٹھونکی جانے والی آخری کیل کے مترادف تھا۔ ذہن نے گواہی دی کہ میری قوت اختیار ختم ہو چکی ہے۔ اس صحرا میں نہ جانے کب سے پڑے تھے ہم۔ آب حیات ہمارے جسموں سے اڑ گیا تھا اور بہت تونا نظر آنے والی زندگی بتدریج لب گور پہنچ گئی تھی۔ میں نے بہت کوشش کر کے اپنا ہاتھ غزالہ کے جسم پر رکھ دیا۔ معلوم نہیں یہ ہاتھ کہاں رکھا تھا لیکن اتنا اطمینان تھا کہ وہ غزالہ کے جسم پر ہے۔ ایک خنک اندھیرا سا میرے چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ میں نے کئی جگہ پڑھا اور سنا تھا کہ بہت دیر تک تڑپنے والے کے لیے موت کبھی کبھی بڑی مہرباں شکل میں آتی ہے۔ شاید یہ خنک اندھیرا ہی وہ مہرباں موت تھا۔ پھر میرے کانوں میں ایک بھڑبھڑاہٹ سی گونجی۔ دل نے گواہی دی کہ یہ وہ گدھ ہیں جو تلاش رزق میں میرے سرہانے آن وارد ہوئے ہیں۔ میں اس بھڑبھڑاہٹ کو غور سے سننے لگا۔ یہ کیسی بھڑبھڑاہٹ تھی؟ نہیں یہ پھڑپھڑاہٹ نہیں تھی، یہ کسی انجن کا شور تھا۔ ذہن میں ایک تکرار سی شروع ہو گئی۔ "پھڑپھڑاہٹ ہے۔ نہیں انجن کا شور ہے۔ نہیں پھڑپھڑاہٹ ہے۔"

وہ پھڑپھڑاہٹ تھی یا انجن کی آواز تھی، میرے بہت قریب آگئی۔ پھر کہیں بہت گہرائی سے، بہت گہرائی سے ایک انسانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "مر گئے ہیں۔"

ایک دوسری آواز آئی "نہیں زندہ ہیں۔"

پہلی آواز نے کہا "لڑکی بھی ہے۔"

تیسری آواز کسی اور زبان میں تھی۔ شاید عربی میں۔ میری سمجھ میں نہیں آئی ہاں یہ شبہ ضرور پیدا ہوا کہ شاید میں مر چکا ہوں۔

☆

میں کسی بہت ٹھنڈی جگہ پر تھا اور میرے ترسے ہوئے لب پانی کے لمس سے آشنا ہو رہے تھے۔ ٹھنڈا پانی گھونٹ گھونٹ میرے حلق میں اتر رہا تھا اور جسم کا حصہ بن کر توانائی و زندگی میں ڈھل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میں اپنے حواس میں آنے لگا اور اردگرد کے ماحول سے آشنا ہونے لگا۔ دو افراد مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک فربہ چہرے والا ہندو تھا۔ اس کے ماتھے پر قشقہ کھنچا ہوا تھا۔ دوسرا ایک گھنی مونچھوں والا سرخ و سپید شخص تھا۔ وہ کبھی کبھی عربی لہجے میں انگلش بولنے لگتا تھا۔ میں ایک نہایت شاندار جیپ نما گاڑی میں تھا۔ گاڑی ایئرکنڈیشنڈ تھی۔ بڑے بڑے شیشوں سے باہر دہکتے ہوئے صحرا کا جان لیوا منظر بہت قریب ہونے کے باوجود بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے غزالہ کا خیال آیا اور میں نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ کہنیوں پر زور دے کر میں اپنی نشست سے تھوڑا سا بلند ہوا۔ ساتھ والی نشست پر کوئی میری ہی طرح لیٹا تھا۔ ایک شخص بڑی محویت کے عالم میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لیکن وہ غزالہ نہیں تھی۔ وہ سائیں عالی تھا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اسے اس گاڑی میں اپنے ہی جیسی حالت میں پاؤں گا۔ اس کے سر کے بالوں اور داڑھی میں ریت کے ذرات چمک رہے تھے۔ سیاہ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور چہرہ صحرا کی گرمی سے جھلسا ہوا تھا۔ سائیں عالی پر جھکا ہوا شخص ایک گیلا تولیا اس کے چہرے پر پھیر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کا شانہ جھنجوڑتا جا رہا تھا۔ سائیں کی آنکھیں بند تھیں۔

غزالہ کہاں ہے؟ یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔ میں غزالہ کو دیکھنے کے لیے اٹھ بیٹھا۔ وہ اس گاڑی میں موجود نہیں تھی۔ مجھے طبی امداد دینے والوں نے میرے شانے تھام لیے اور مجھے دوبارہ لیٹنے پر مجبور کرنے لگے۔ میں اب اتنا نحیف نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے شانوں پر

ان کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"وہ لڑکی کہاں گئی ہے؟" میرے حلق سے کمزور سی آواز بلند ہوئی۔

عربی لب و لہجے والے نے انگلش میں کہا "ڈونٹ وری۔ شی از ہیئر۔"

ہندو نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ مت۔ وہ یہیں ہے۔ اس سامنے والی گاڑی میں" اس نے ونڈ اسکرین کی دوسری جانب اشارہ کیا۔ وہاں ایک شاندار لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔

"میں اپنی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو" میں نے نشست سے نیچے پاؤں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھے رہو" اس مرتبہ انگریزی بولنے والے عربی نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا اور اپنے ملازمین کو آنکھوں آنکھوں میں کوئی ہدایت جاری کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔

سائیں عالی نے اب آنکھیں کھول دی تھیں۔ تاہم وہ چت لیٹا تھا اور خالی خالی نظروں سے گاڑی کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے سرہانے بیٹھے ہوئے شخص نے پانی میں گلوکوز حل کیا اور چمچ سے اسے پلانے لگا۔ غالباً مجھے بھی یہی محلول پلایا جاتا رہا تھا۔

میں نے ذرا عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اپنے تیمارداروں سے پوچھا "میں کہاں ہوں؟ ہم یہاں کیسے پہنچے ہیں۔ میرے ساتھ اور کون کون ہے؟"

گندمی رنگ والے ایک بابو نے کہا "تم لوگوں کی گاڑی اُدھر اوپر ایک گڑھے میں پھنس کر الٹ گئی تھی۔ ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ وہ گاڑی کے نیچے آگیا تھا۔ یہ تمہارا ساتھی گاڑی کے اندر پھنسا ہوا تھا اور بے ہوش تھا۔ تم اور وہ لڑکی نیچے ریت پر پڑے تھے۔"

"تم کس گاڑی اور کون سے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "اور یہ جگہ کون سی ہے؟ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔" میں کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"بولو۔ چپ کیوں ہو گئے ہو۔ ویسے تمہاری گاڑی پر فیروزپور کی نمبر پلیٹ لگی ہے اور ڈرائیور کی جیب سے ایک رقعہ بھی ملا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ تم لوگ بیکانیر جا رہے تھے کسی سردار سرمند سنگھ کے پاس۔"

بیکانیر۔۔۔ سردار سرمند۔۔۔ فیروزپور کی گاڑی۔ یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ تاہم بیکانیر کے حوالے نے مجھے یہ سمجھا دیا کہ ہم ابھی تک بھارت میں ہیں اور غالباً راجستھان کے صحرائی علاقے میں ہیں۔

میں نے اپنے تیمارداروں سے اس خیال کی تصدیق چاہی تو معمولی تذبذب کے بعد ایک نے تصدیق کر دی، وہ بولا "ہم ناگور کے نواحی علاقے میں ہیں" مزید تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا "یہ ایک شکار پارٹی ہے۔ مہاراج رتن سنگھ اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ ہرن کے شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "ابھی یہاں جو عربی صاحب بیٹھے تھے وہ کون تھے؟"

جواب ملا "وہ بھی 'ہزہائی نس' کے ایک دوست ہیں۔ امارات سے خاص طور پر شکار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنی دوربین سے تمہیں دیکھا تھا۔ جبکہ اگر وہ نہ دیکھتے تو شاید ہم اپنے راستے پر سیدھے نکلے چلے جاتے۔ تم لوگوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔"

عرب شکاری کے ذکر نے میرے کچھ پرانے زخموں کے کھرنڈ اتار دیے۔ مجھے امارات کا وہ امیرزادہ یاد آگیا جس نے کھروڈ پکا میں میری جمی ہوئی زندگی اکھاڑ دی تھی اور نتیجے میں میرے ہاتھوں سے جہنم واصل ہوا تھا۔ میں نے شاہ جہاں سے جہانی انستاد تک کا جو طویل سفر طے کیا تھا اس میں امارات کا وہ امیرزادہ راشد بن راشد سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں جاں بہ لب تھا لیکن گلوکوز ملا پانی جسم میں اترنے کے بعد جیسے تمام امراض اور ولدر دور ہو گئے تھے۔ بس ایک نقاہت سی باقی تھی جو بتدریج کم ہو رہی تھی۔ میرے تیمارداروں کی نگاہ بار بار میرے سر کی پٹی کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ میرے سر پر پہلے سے زخم موجود تھا۔ آخر سانولے رنگ والے شخص نے اس زخم کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ زخم دو تین روز پرانا ہے۔ میرے ادھورے جواب نے ان دونوں کے تجسس کو ہوا دی اور وہ میرے بارے میں مزید جاننے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ میں سخت مشکل میں تھا۔ میں انہیں اپنے اصل حالات سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جو بھی بیان دیتا وہ من گھڑت ہوتا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ غزالہ ہوش میں آکر کیا بیان دے گی اور غزالہ کے علاوہ اور کون کون شخص یہاں موجود ہے جو میرے بیان کی تردید کر سکتا ہے۔ میں سخت گومگو میں تھا جب ایک آواز نے میری مشکل آسان کر دی۔ یہ اسی سرخ و سپید عربی کی آواز تھی جو خاکی قمیص اور

پتلون میں ملبوس تھا۔ جیپ کا اگلا دروازہ کھول کر اس نے سانولے شخص کو نرائن کہہ کر مخاطب کیا اور انگریزی میں اس سے کہا کہ جیپ سے باہر آجائے۔

نرائن باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے لڑکھڑاتا ہوا باہر آگیا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ جسم پر کئی جگہ چوٹیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور احساس بھی ہوا۔ میرے سر میں عجیب طرح کا بھاری پن موجود تھا۔ شک گزرا کہ مجھے خواب آور انجکشن لگایا جاتا رہا ہے یا پھر کوئی ایسی ہی دوا پلائی جاتی رہی ہے۔ میرا دھیان اچانک رسٹ واچ کی طرف گیا اور میں بُری طرح چونک گیا۔ اٹھائیس تاریخ تھی اور دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا میں تقریباً اڑتالیس گھنٹے بے ہوش رہا ہوں۔ ظاہر ہے اتنی طویل بے ہوشی کسی خواب آور دوا کی ہی مرہونِ منت تھی۔

جیپ سے نکلتے ہی ایک بار پھر صحرا کی گرم ہوا نے جسم پر تازیانے برسانے شروع کر دیے۔ نرائن نامی شخص عربی کے پیچھے چلتا ہوا ایک ڈھلوان طے کرنے لگا۔ میں بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔ اس ریتیلی ڈھلوان پر غزالہ اور میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوئے تھے۔ ہموار ریت پر اب قدموں کے بہت سے نشان نمودار ہو چکے تھے لیکن ہمارے جسموں اور ہاتھ پاؤں کے نقوش ابھی تک پہچانے جا رہے تھے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم دونوں بلندی سے لڑھکے تھے اور قریباً بیس گز لڑھکنے کے بعد نسبتاً ہموار جگہ پر رک گئے تھے۔ میں جہاں گرا تھا وہیں بے سُدھ پڑا رہ گیا تھا لیکن غزالہ گرنے کے بعد بھی ہوش میں تھی۔ وہ پانچ دس قدم کا فاصلہ طے کر کے میرے پاس آن کر لیٹ گئی تھی یا گر گئی تھی اور پھر آخری وقت تک وہیں پڑی رہی تھی۔ غزالہ کا ایک سینڈل ابھی تک موقعے پر پڑا تھا جس جگہ ہم نامعلوم وقت تک بے سُدھ پڑے رہے تھے وہاں گرم ریت پر خون کے آثار بھی تھے۔ میرے اپنے جسم پر تو کوئی ایسا خونچکاں زخم نہیں تھا۔ ممکن تھا یہ غزالہ کے لہو کے دھبے ہوں۔ میں اسے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ وہ شاندار وسیع و عریض جیپ قریب ہی کھڑی تھی جس میں غزالہ کو طبی امداد دی گئی تھی۔ ایک کھڑکی کا نیلا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس پردے میں سے جھانکوں لیکن اس سے پہلے کہ میں جیپ کی طرف بڑھتا اس کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ایک ملازم صورت شخص ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے لیے باہر نکلا۔ میری نگاہ اس کے عقب میں غزالہ پر پڑی۔ وہ نشست سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ ایک خوبرو لڑکی جس نے عنابی لباس پہن رکھا تھا، غزالہ کے قریب بیٹھی تھی اور اس کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے غزالہ نے خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے آثار ابھرے لیکن اس سے پہلے کہ یہ آثار واضح ہوتے، میں نے اپنے چہرے پر اجنبیت سجالی۔ میرے اس انداز کو غزالہ نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی لیکن منہ سے کچھ بولا نہیں۔ میں نے رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔ میری نگاہ بلندی کی طرف اٹھی اور جم کر رہ گئی۔ وہاں کسی گاڑی کے پہیے نظر آ رہے تھے۔ چھت سے پہلے گاڑی کے پہیے دکھائی دے رہے تھے یعنی وہ اُلٹی ہوئی تھی۔ ہم نے چند قدم مزید فاصلہ طے کیا تو مکمل منظر نگاہ کے سامنے آگیا اور یہ کوئی ایسا خوش کُن منظر نہیں تھا۔ پرانے ماڈل کی ایک بڑی لینڈ کروزر جیپ اُلٹی پڑی تھی۔ اس کے انجن سے بہنے والا موبل آئل ریت پر دور تک بکھرا تھا۔ جیپ کے پاس ہی پانی کے دو گیلن لڑھکے ہوئے تھے۔ کینوس کے ایک بیگ کا تھوڑا سا حصہ جیپ کے نیچے سے نظر آ رہا تھا۔ اس بیگ میں سے ایک شکستہ ٹارچ جھانک رہی تھی۔ سب سے روح فرسا منظر ایک انسانی لاش کا تھا۔ یہ لاش ناف تک جیپ تلے دبی تھی۔ لاش کا چہرہ پھول کر کُپّا ہو گیا تھا اور وحشت ناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس لاش کو اس بلا خیز گرمی میں پڑے کم و بیش ۳۶ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ بگڑے ہوئے چہرے کے باوجود میں متوفی کو پہچان گیا۔ وہ سائیں عالی کا چیلا جامی شاہ تھا۔ وہ جواں سال تھا۔ اس کے گھونگریالے بال ابھی تک تیل سے چمک رہے تھے۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ یہ داڑھی خون اور ریت میں لتھڑی ہوئی تھی۔ جیپ کے ارد گرد چار پانچ افراد موجود تھے۔ وہ سب کے سب شکاری لباس میں تھے۔ ان میں سے دو کے کاندھوں پر طاقتور رائفلیں بھی جھول رہی تھیں۔ فربہ جسم والا رعب دار سا شخص مہاراج رتن سنگھ تھا۔ گلے میں چھوٹی سی الیکٹرک دوربین لٹکائے وہ تحقیقی انداز میں جیپ کے چاروں طرف چکرا رہا تھا۔ شکاری لباس اس کے جسم پر کسی تھیلے کے مانند نظر آتا تھا۔ اس نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ گلے میں ایک بیش قیمت مالا تھی۔ یہ لوگ جیپ کو سیدھا کرنا چاہ رہے تھے لیکن بھاری بھرکم جیپ الٹنے کے بعد ریت میں بُری طرح دھنس گئی تھی۔ چند لمحے بعد میں اور نرائن وغیرہ بھی جیپ

سیدھا کرنے کی کوشش میں شریک ہو گئے۔ اس مرتبہ یہ کوشش کارگر رہی اور ہم نے ایک ساتھ زور لگا کر سبز جیپ کو پہلو کے بل الٹا دیا۔ جامی شاہ کا زیریں جسم بُری طرح کچلا گیا تھا اور پھٹی ہوئی قمیص تلے سے انتڑیاں جھانک رہی تھیں۔ چند سائے سے لاش پر لہرائے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بلندی پر چکراتے ہوئے گدھ اب بہت نیچے آ گئے تھے۔ ان کی حسِ شامہ انہیں زمین کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن زندہ انسانوں کی موجودگی کے سبب وہ لاش سے دور رہنے پر مجبور تھے۔

لاش پر چادر ڈال دی گئی اور دو افراد جیپ کی تلاشی لینے لگے۔ ڈیش بورڈ میں سے چند بے کار اشیا کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ مہاراج رتن سنگھ اور عربی مہمان ایک طرف کھڑے ہو کر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ نرائن بھی مؤدب انداز میں ان کے قریب موجود تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ رتن سنگھ کا داہنا شکاری یا منتظمِ شکار تھا۔ وہ ایک خاندانی شکاری تھا۔ اس کے باپ دادا انگریزوں کو شکار کھلاتے رہے تھے۔ نرائن نے "راجستھان میں شکار" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رکھی تھی۔ اس نے مہاراج اور عربی مہمان کی ترجمانی کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آ رہے تھے؟

میں اب ذہنی طور پر ان سوالات کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ سائیں عالی اور غزالہ کے سوا میرے ساتھ اور کوئی موجود نہیں۔ سائیں عالی تو کوئی بھی بیان دینے سے قاصر تھا، اگر دیتا بھی تو اسے قابلِ غور نہ جانا جاتا۔ بات صرف غزالہ کی تھی لیکن غزالہ کو کچھ علم نہیں تھا کہ میں کن حالات میں اس تک پہنچا ہوں۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کن حالات میں مجھ تک پہنچی ہے۔ لہٰذا مناسب تھا کہ ہم اپنے اپنے بارے میں بیان دیں اور ایک دوسرے کے متعلق لاعلمی ظاہر کریں۔ یوں ہمارے بیانات میں تضاد کا خدشہ ختم ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں غزالہ پر ظاہر کر چکا تھا کہ ہم دونوں ایک دوجے کے لیے اجنبی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ اس نے میرا مافی الضمیر سمجھا ہو گا اور اب اسی کے مطابق عمل کرے گی۔

میں نے نرائن کو بتایا "میرا نام نہال سنگھ ہے۔ میں پیشے کے لحاظ سے کارپینٹر ہوں۔ میں نے لکڑی کی پٹیوں پر پھول بوٹے کاڑھنے والی مشین بنائی ہے۔ اس طرح کی "کاروِنگ مشین" پورے ملک میں شاید دو تین ہی ہوں گی۔ عرصہ دس سال سے میں کلکتہ میں کام کر رہا ہوں۔ پنجاب میں میرے چند سسرالی عزیز رہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میرا کام یہاں بھی بہت اچھی طرح چل سکتا ہے۔ انہی کی دعوت پر میں پچھلے ماہ فرید کوٹ آیا تھا لیکن تلاش کے باوجود وہ لوگ مجھے یہاں مل نہیں سکے۔ وہ مکان چھوڑ کر جا چکے ہیں اور یہ بھی پتا نہیں کہ کدھر گئے ہیں۔ میں بس یونہی یہاں وہاں بھٹک رہا ہوں۔ منگل کے روز میں ماتھا ٹیکنے دربار صاحب جا رہا تھا۔ میرے پاس ایک کرائے کی گاڑی تھی۔ ابھی میں فرید کوٹ سے نکلا بھی نہیں تھا کہ اچانک میری نشست کے پیچھے سے یہ پاگل سا شخص برآمد ہوا جو اب آپ کی جیپ میں لیٹا ہے۔ اس نے میرے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی، میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد کا کچھ پتا نہیں۔ ہوش آیا تو میں گرم ریت پر تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ پیاس اور نقاہت سے دم نکلا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی خواب آور انجکشن بھی لگایا جاتا رہا ہے۔ میرے بازو پر انجکشن کے دو نشان صاف دکھائی دے رہے ہیں۔"

میں نے اپنی قمیص کی آستین اُلٹ کر نرائن کو انجکشن کے نشانات دکھائے۔ ان نشانات کا علم مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوا تھا۔

نرائن نے پوچھا "متوفی کو جانتے ہو؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" مہاراج رتن نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ راجستھانی تھا اور آواز رعب دار تھی۔

"یہ لڑکی بھی میرے لیے اجنبی ہے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ میں اپنی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں" مہاراج نے نکتہ اٹھایا۔

"جناب! میں نے کہا ہے نا کہ آپ کے پہنچنے سے پہلے میں ہوش میں آگیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس کا رُخسار میرے ہاتھ پر تھا اور یہ بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ شاید مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے کرتے خود بھی بے ہوش ہوئی تھی۔"

مہاراج رتن سنگھ کی تیز نظریں میرے آر پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نرائن کالا کی طرح اس کا رنگ بھی سانولا تھا لیکن لباس اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے وہ بہت رعب دار نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اقتدار اور طاقت کا نشہ تھا اور شاید شراب کا نشہ بھی۔ مجھے پہلی نگاہ میں ہی وہ اچھا شخص نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں نرائن

کاکا کو چند ہدایات دیں۔ غالباً یہ ہدایات جاجی شاہ کی لاش کے بارے میں تھیں۔ پھر وہ عربی شکاری کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہو گیا۔

میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں جیپ کو حادثہ پیش آیا تھا۔ جیپ سے پندرہ بیس گز پیچھے ریت میں ایک گڑھا سا تھا۔ میں ایسے گڑھوں کو بخوبی پہچانتا تھا۔ صحرا میں شکار کھیلنے والے اکثر ایسے گڑھے کھودتے ہیں اور انہیں گھات لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ماضی میں یہ گڑھا بھی کسی شکاری نے کھودا تھا مگر اسے کھودنے والے گڑھے میں وہ خود نہیں گرا تھا' کوئی دوسرا گر گیا تھا۔ ڈرائیور کی بے پروائی سے جیپ کا بایاں اگلا پہیا گڑھے میں گیا تھا اور وہ دو تین قلابازیاں کھا گئی تھی۔ دروازے کھل جانے کے سبب میں اور غزالہ ڈھلوان پر لڑھک گئے تھے جبکہ سائیں عالی اور جاجی شاہ اندر پھنس گئے تھے۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ جیپوں میں سوار ہوئے اور نامعلوم منزل کی طرف چل دیے۔ میں اسی جیپ میں تھا جس میں مجھے پانی وغیرہ پلا کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ سائیں عالی ابھی تک پچھلی نشست پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کا بازو دو جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ جیپ میں نرائن کے علاوہ ایک موٹے گلوں والا بھدا سا شخص بھی تھا۔ مہاراج اور عربی مہمان دوسری جیپ میں تھے۔ غزالہ بھی وہیں تھی۔

دہکتے ہوئے صحرا میں قریباً ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے نخلستان میں پہنچ گئے۔ یہاں کھجور' بیری اور ناگ پھنی کے علاوہ کئی صحرائی پودے اور درخت نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے عین درمیان بے حد نفیس قسم کے خیمے استادہ تھے۔ ان رنگ برنگے خیموں کی تعداد پانچ تھی۔ خیموں کے عقب میں ایک لگژری کوچ کھڑی تھی۔ اس کی چھت پر ٹی وی ایریل نظر آ رہا تھا۔ دو تین بے حد شاندار جیپیں درختوں کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ جونہی ہم جیپ سے باہر نکلے' بھنے ہوئے گوشت کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی جنریٹر کی مسلسل "گھوں گھوں" کانوں میں پڑنے لگی۔ یہ شکار پارٹی بڑے زبردست انتظامات کے ساتھ شکار کھیل رہی تھی۔ مجھے' غزالہ اور سائیں عالی کو جیپوں سے اترتے دیکھ کر موقعے پر موجود تمام افراد ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر صورتوں سے ہی ملازم پیشہ نظر آ رہے تھے۔ کچھ جانوروں کا ہانکا کرنے والے دیہاتی تھے۔ صرف دو افراد ایسے تھے جنہیں مہاراج کا ساتھی یا مہمان تصور کیا جا سکتا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمام صورتِ حال واضح ہو گئی۔ ہمیں جس جگہ لایا گیا تھا' وہ اس شکار پارٹی کا بیس کیمپ تھا۔ یہ جگہ ناگور اور بیکانیر کے درمیان صحرائی علاقے میں واقع تھی۔ مہاراج کی اپنی اسٹیٹ کا نام ناندل تھا۔ ناگور کی مغربی جانب ایک کافی بڑا رقبہ اس اسٹیٹ کی حدود میں شامل تھا۔ جو بور نامی ایک بڑا قصبہ اس اسٹیٹ کا مرکز تھا۔

اس شکار پارٹی میں مہاراج رتن' اس کے دو ہم نوالہ و ہم پیالہ دوستوں پریم کمار اور کمار بشن سنگھ کے علاوہ دو عربی مہمان بھی شامل تھے۔ ایک مہمان کا تعلق امارات سے تھا' اس کا نام شیخ اسد تھا۔ دوسرا مہمان مصری' باسط بن ریحان تھا۔ وہ تربوز کا ایک بہت بڑا کاشتکار تھا۔ ان کل پانچ افراد پر مشتمل شکار پارٹی کے لیے نوکروں' خدمت گاروں اور معاونین کی ایک فوج ظفر موج موجود تھی۔ چار شاندار جیپیں' ایک کوچ' پانی کا ایک ٹینکر' تازی گھوڑوں کا ایک دستہ اور دو تین دوسری گاڑیاں اس کے علاوہ تھیں۔ یہ شکاری حضرات' جدید ترین شکاری آلات سے لیس تھے اور پچھلے دو روز میں قریباً تین درجن ہرنوں اور ایک چیتے کے علاوہ بے شمار جانوروں اور پرندوں کو عدم آباد روانہ کر چکے تھے۔ وہ صرف ممنوعہ اور غیر ممنوعہ بور کے اسلحے سے ہی شکار نہیں کھیل رہے تھے' ان کے پاس شکاری پرندے' باز اور شکرا وغیرہ بھی تھے۔ تاہم داروغہ شکار نرائن کاکا کا کہنا تھا کہ ناموافق موسم کے سبب ابھی تک شکاری پرندوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا ہے۔

غزالہ کے حوالے سے مجھے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی۔ ہم جب سے یہاں پہنچے تھے میں صرف ایک مرتبہ اس کی صورت دیکھ سکا تھا۔ وہ اس اسپیشل کوچ میں تھی جس میں صرف مہاراج رتن یا اس کا مصری مہمان جا سکتے تھے۔ مہاراج رتن اکثر کوچ میں گھسا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی نیت میں فتور سا لگتا تھا۔ میں اس صورتِ حال پر معترض بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں خود ہی غزالہ سے لاتعلقی کا اعلان کر چکا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ غزالہ نے میرے اور اپنے بارے میں کیا بیان دیا ہے۔ بہرحال اس کی فراست سے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے شناسائی کا اقرار کرے گی۔

اگلا روز بے حد ہنگامہ خیز تھا۔ مہاراج رتن سنگھ اور اس کے دونوں عربی مہمانوں نے تازی گھوڑوں پر سوار ہو کر

سؤر کا شکار کھیلا۔ نرائن کاکا نے مجھے بتایا کہ پولو کے کھیل کی طرح سؤر کا شکار بھی یہاں بہت مقبول ہے۔ مہاراج نے گھوڑوں کی ٹریننگ کے لیے باقاعدہ ایک "سؤر گڑھ" بنا رکھی ہے۔ وہاں سیکڑوں کی تعداد میں جنگلی سؤر دیکھے جا سکتے ہیں۔ واقعی وہ ایک پرجوش اور دلیرانہ کھیل تھا۔ اس میں جانور اور شکاری کے لیے یکساں مواقع تھے۔ نیزہ بردار شکاری گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک مقررہ جگہ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہانکا کرنے والے سؤر کو جھاڑیوں سے نکالتے تھے۔ جانور کو باہر کھلی جگہ پر نکالنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ جونہی جانور کھلی جگہ پر آتا تھا' نیزہ بردار شکاری اس کے تعاقب میں گھوڑے دوڑاتے تھے۔ یہ منظر دیدنی ہوتا تھا۔ ہر شکاری کی خواہش ہوتی تھی کہ جانور کو پہلا زخم وہ لگائے۔ گھوڑے اور سؤر سرپٹ بھاگتے اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ شکاریوں اور سؤر میں لہو گرما دینے والی یہ دوڑ کسی وقت طول بھی کھینچ جاتی تھی۔ تین چار دفعہ ایسا ہوا کہ سؤر کو ہانکے کے مقام سے کئی میل دور جا کر مارا گیا۔ یہ نہایت پُرخطر کھیل تھا۔ بپھرا ہوا سؤر نہایت خطرناک جانور سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بعض اوقات چیتے اور شیر تک کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کی دنبالی سمجھی جاتی ہے۔ اس تیز دھار دندانی کے ذریعے وہ پلک جھپکنے میں مدِمقابل کے جسم میں شگاف ڈال دیتا ہے۔

اس روز میری آنکھوں کے سامنے کئی سنسنی خیز واقعات رونما ہوئے۔ شکاری بھاگتے گھوڑے سے سؤر کو نیزے کے ذریعے کاری ضرب لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کوشش میں کبھی نیزہ ٹوٹ جاتا تھا' کبھی وار اوچھا پڑتا تھا اور کبھی جانور مشتعل ہو کر پلٹ پڑتا تھا۔ سب سے دلچسپ اور سنگین صورتِ حال وہ ہوتی تھی جب جانور مشتعل ہو کر شکاری پر پلٹتا اور وہ براہِ راست گھوڑے کے پیٹ پر حملہ کرتا تھا۔ اس روز میں نے اپنی آنکھوں سے دو نہایت قیمتی گھوڑوں کی آنتیں زمین پر لٹکتے دیکھیں۔ اسی طرح ایک مقامی شکاری گھوڑے سے گر گیا۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا اور گھوڑا اسے دور تک گھسیٹتا چلا گیا۔ نتیجے میں شکاری کے جسم پر کئی زخم آئے۔ اس طرح کے حادثوں سے اکثر شکاریوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ مہاراج اور اس کے مہمان بھی بدستور مصروفِ عمل رہے۔ ایک ہانکے میں سؤر کے بجائے جھاڑیوں سے دو بھیڑیے نکل آئے۔ شام کو وہ گرتے دکھائی دے رہے تھے لیکن شکاریوں کے چہرے کی ہیجانی کیفیت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بھیڑیے ہیں۔ مہاراج رتن اور اس کے ساتھی شکاری اپنی جدید رائفلوں سے پلک جھپکنے میں انہیں ہلاک کر سکتے تھے لیکن وہ کھیل کے موڈ میں تھے۔ نیزہ برداروں نے تیز رفتار گھوڑوں پر جانوروں کا پیچھا کیا اور ڈیڑھ دو میل آگے ایک تنگ گھاٹی میں انہیں ہلاک کر دیا۔

اس روز سہ پہر کو شکار کا پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ معلوم نہیں پروگرام ہی اتنا تھا یا شکاری نڈھال ہو کر پروگرام مختصر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بیس کیمپ اکھاڑ دیا گیا۔ خیموں سمیت پڑاؤ کا تمام سامان ایک بڑے لوڈر میں لاد دیا گیا۔ مجھے اور سائیں عالی کو بھی سامان ہی کی طرح ایک گاڑی میں لوڈ کر دیا گیا۔ سائیں عالی تو خیر اپنی مرضی بتانے سے قاصر تھا ہی' مجھ سے بھی میری مرضی نہیں پوچھی گئی۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگنے لگتا تھا کہ شاید ہماری حیثیت قیدیوں کی سی ہے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس حادثے کے سبب ہماری مڈبھیڑ اس شکار پارٹی سے ہوئی تھی اس حادثے کے حوالے سے ابھی تک کسی نے مجھ سے تفتیشی بات نہیں کی تھی۔ جیپ کا کیا کیا جائے گا؟ متوفی جاجی شاہ کی لاش کہاں ہے؟ اس کی موت کے بارے میں پولیس کو رپورٹ کی گئی ہے یا نہیں؟ کوئی بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ ایک دن نرائن نے بس اتنا بتایا تھا کہ متوفی کی لاش جو بور پہنچا دی گئی ہے۔ یہ لوگ ہمیں کوئی گری پڑی شے سمجھ رہے تھے' اور کسی وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ اپنے موج میلے میں ہمیں بھول ہی چکے ہیں۔ ہماری واپسی ایک شاندار عمارت میں ہوئی۔ یہ عمارت جیسلمیر جانے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے قصبے میں واقع تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس قصبے کا نام ہی "جو بور" تھا اور یہ ایک اسٹیٹ ناندل کا مرکز تھا۔ عمارت کیا تھی' ایک شاندار محل تھا جو کم و بیش چھ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس عمارت کو "پیلس" کا نام دیا گیا تھا۔ ہز ہائی نس رتن سنگھ جی کے منتظم شکار نرائن کاکا سے پتا چلا کہ اس پیلس میں بہت شاندار قسم کی تقریبات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات مہمانوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی ہے۔ ان میں بڑے بڑے اُمرا رؤسا اور سوسائٹی کے گنے چنے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

یہ پیلس (محل) واقعی کسی نو وارد کو مرعوب کرنے کے لیے کافی تھا۔ باغات' فوارے' پھلواریاں' سبز قالین جیسے لان' سوئمنگ پول' بلند و بالا چھتیں' منقش در و دیوار' باوردی ملازم اور بیش قیمت گاڑیاں' ہر شے سے امارت اور شان و

شوکت شپکتی تھی۔ غزالہ کا تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اس محل میں آکر میں خود کو ایک دم بونا محسوس کرنے لگا تھا۔

محل یا پیرس میں بوس نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے میرے سر کی بہترین مرہم پٹی کی۔ میں ابھی تک اسی خون آلود اور پھٹے پرانے لباس میں تھا جس میں مجھے حادثہ پیش آیا تھا۔ مجھے میری پسند کے مطابق نیا لباس اور جوتے مہیا کیے گئے۔ میں اس وقت ایک پر تکلف لنچ لینے کے بعد دل کی شکل والے ایک سوئمنگ پول کے کنارے ٹہل رہا تھا جب نرائن کاکا ایک شاندار سفاری سوٹ میں ملبوس میری طرف بڑھا۔ اس نے ملائمت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "مسٹر نہال سنگھ! ہم نے بہت کوشش کی ہے لیکن جیپ کے نیچے آکر مرنے والے شخص کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ نہ ہی یہ خبر ہو سکی ہے کہ جس گاڑی میں تم یہاں پہنچے ہو وہ کس کی ملکیت ہے؟ گاڑی پر لگی ہوئی نمبر پلیٹ جعلی ثابت ہوئی ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ لڑکی کیا کہتی ہے جو جیپ پر تمہارے ساتھ سوار تھی۔"

نرائن کاکا بولا "اس نے تو چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ جب سے آئی ہے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ کبھی تو لگتا ہے کہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے اور اپنا نام پتا نہیں بتانا چاہتی۔ رہا وہ ملنگ۔ تو اسے اپنا ہوش نہیں' وہ یہ الجھی ہوئی تھی کیا سلجھائے گا۔ اب تو ایک ہی راستہ ہے۔"

"وہ کیا جی؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی ملنگ اور اس کے چیلے کا تعلق تمہارے علاقے سے ہو۔ وہ کسی چکر میں تمہارے پیچھے لگے ہوں یا کسی نے انہیں لگایا ہو۔ یا پھر تمہارے پیشے کے حوالے سے کوئی تم سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تم نے پھول کاڑھنے والی جو مشین بنائی ہے وہ تمہارا "کاروباری سیکرٹ" ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اس مشین کے پیچھے ہی لگا ہو۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب تو ایک ہی طریقہ ہے۔ کسی کو کلکتہ بھیجا جائے اور وہ وہاں جا کر کھوج لگائے کہ یہ لڑکی کون ہے اور یہ دیگر دو افراد کون ہیں جو تمہارے ساتھ پائے گئے ہیں۔ یا پھر فرید کوٹ میں تمہارے سسرالی رشتے داروں کو ڈھونڈا جائے اور ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بے سود ہے" میں نے نرائن کاکا

کا تعلق میرے آس پاس سے نہیں ہے۔"

نرائن کاکا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کے نئے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ یہ کم و بیش تیس نوٹ تھے۔ وہ بولا "یہ روپے ہز ہائی نس نے تمہارے علاج معالجے اور راستے کے خرچ کے لیے دیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔"

"اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

"تو پھر جب تک چاہو یہاں ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔ اس میں ہمارے لیے آسانی رہے گی۔ ظاہر ہے پولیس نے اس حادثے کی تفتیش کرنی ہے۔ جو کچھ تم پولیس کو بتا سکتے ہو' وہ ہم نہیں بتا سکتے۔ متوفی کی لاش سرد خانے میں پڑی ہے۔ ہز ہائی نس آج اسے پولیس کی تحویل میں دے دیں گے اور ساتھ ہی رپورٹ بھی لکھوا دیں گے۔"

میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کی۔ نرائن کاکا براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "ہز ہائی نس تو تمہاری بھلائی سوچ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پولیس کے چکر بڑے بے رحم اور جان لیوا ہوتے ہیں۔ شریف بندہ تفتیش کی چکی میں پس کر رہ جاتا ہے۔ جب پولیس آئے گی تو وہ بہت کچھ پوچھے گی۔ ملنگ تو کسی گنتی میں نہیں آتا۔ سارا بوجھ تمہی پر پڑتا ہے۔ گاڑی کی چوری اور لڑکی کا اغوا یہ دو ایسے جرائم ہیں جن کے لیے پولیس کو بہرحال "مجرم" تلاش کرنا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جیپ کے حادثے کو بھی سازش کا رنگ دینے کی کوشش کی جائے۔"

یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ نرائن کاکا مجھے ہراساں کر کے یہاں سے بھگانے کے چکر میں ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ان لوگوں نے سائیں عالی اور غزالہ وغیرہ کا اتا پتا معلوم کرنے کے لیے فیروز پور' فرید کوٹ اور فاضلکا میں نیم دلانہ سی کوشش کی تھی اور اتمام حجت کر کے اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں' ہز ہائی نس رتن سنگھ جی کے چوہے بھی سیانے تھے۔ انہیں خبر ہو چکا تھا کہ ہز ہائی نس نے حادثے میں بچ رہنے والی لڑکی کو سنبھال رکھا ہے۔ اب انہیں کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ جانا بوجھ میں ڈال کر لڑکی کے وارثوں کو تلاش کرتے۔ مہاراج رتن سنگھ صورت سے ہی بد نیت اور عیاش نظر آتا تھا۔ ایک خوبرو لڑکی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آگری تھی' وہ کیوں اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ مجھے نہیں پتا کہ غزالہ نے مہاراج رتن سنگھ کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے تاہم یہ امر یقینی تھا کہ اس نے جو کچھ بھی بتایا ہے'

مہاراج رتن سنگھ کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوا ہے۔

میں نے مہاراج کی بخشش لینے سے تو انکار کر دیا لیکن جو پور چھوڑنے سے انکار نہ کر سکا۔ انکار کر بھی نہیں سکتا تھا۔ میزبان نے گئی لپٹی رکھے بغیر بتا دیا تھا کہ میرا اب یہاں کوئی کام نہیں۔ اگر اب بھی میں محل نشین رہنے پر اصرار کرتا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا' دال میں کچھ کالا ہے اور میں وہ نہیں جو خود کو ظاہر کر رہا ہوں۔ ایک معمولی سے کاروباری شخص کی بھلا کیا بساط تھی کہ وہ جانتے بوجھتے خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کرتا اور تھانے کچہری کے مصائب سے پناہ نہ مانگتا۔ اس صورت میں مہاراج اور اس کے گماشتے مجھے آڑے ہاتھوں لے سکتے تھے۔ ایسے تمام لوگوں کے پاس سرلیمن والی ڈکشنری ہوتی ہے اور اس میں "ناممکن" کا لفظ نہیں ہوتا۔

میں نے نرائن کاکا کو سمجھا دیا کہ جس اس کی پڑھائی ہوئی ہی پڑھ گیا ہوں اور اس معاملے سے جان چھڑا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میں نے اس "معصوم خواہش" کا اظہار بھی کیا کہ میں اپنے ساتھ حادثے کا شکار ہونے والی لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔

نرائن نے کہا "تم اس کی طرف سے شانت رہو۔ ہم لگاتار کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے ورثا کے بارے میں کچھ بتا دے۔ ظاہر ہے اب پولیس بھی اس کوشش میں شریک ہو جائے گی۔ بلکہ ایک طرح سے اب یہ پولیس کا معاملہ ہی ہے۔ ممکن ہے کہ لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے یا پھر عارضی طور پر ہز ہائی نس اسے اپنی حفاظت میں رکھیں۔"

میں نے سعادت مندی سے نرائن کی ہاں میں ہاں ملائی اور اپنے کامل اطمینان کا اظہار کیا۔ نرائن نے مجھے قانونی نکتے سمجھاتے ہوئے کہا "کسی کو کیا خبر ہے کہ جیپ میں کتنے بندے تھے۔ تم نکل جاؤ گے تو کسی کے باپ کو بھی خبر نہیں ہو سکے گی۔ اگر لڑکی نے کوئی الٹا سیدھا بیان دیا بھی تو وہ پولیس کو تمہارا صرف حلیہ ہی بتا سکے گی اور ہماری پولیس بھی اتنی لائق نہیں ہوئی کہ حلیے کی مدد سے کسی شخص تک پہنچ جائے۔"

نرائن دیر تک مجھ سے مصروف گفتگو رہا۔ غالباً وہ یہ جانتا تھا کہ میں نے اپنے بارے میں بہت سے حقائق چھپائے ہیں لیکن وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا' اس کا سارا زور بیان اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ میں لڑکی اور سائیں عالی کو ٹینشن میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں نے نیم رضامندی پہلے ہی

ظاہر کر دی تھی۔ اب رضامندی بھی ظاہر کر دی۔ اسی شب میری روانگی کا انتظام کر دیا گیا۔ مجھے قصبے سے بڑی سڑک تک پہنچنے کے لیے تقریباً پندرہ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ سڑک سے بس پکڑ کر ناگور کے ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا اور وہاں سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر عازم پنجاب ہو جانا تھا لیکن یہ دکھاوے کی روانگی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں غزالہ کو اس جال میں اور اس حال میں چھوڑ کر چلا جاتا۔

معلوم نہیں اگلے روز کیا ہوتا۔ میں کتنے بجے ناگور اسٹیشن پہنچتا۔ کون سی گاڑی پکڑتا؟ پھر کس مقام پر اور کس روپ میں گاڑی سے اتر کر واپس مہاراج رتن سنگھ جی کے محل میں پہنچتا مگر صبح ہونے سے پہلے ہی حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔

مجھے "پیرس" کے مہمان خانے میں رکھا گیا تھا۔ مہمان خانے بھی دو تھے۔ ایک خاص اور دوسرا عام۔ میں عام تھا اس لیے عام مہمان خانے میں تھا لیکن یہ بھی بڑے بڑے خاص مہمان خانوں سے بڑھ کر تھا۔ صاف شفاف چکنے فرش' وسیع کمرے اور آبنوسی فرنیچر' ایک خادم ہمہ وقت میرے ارد گرد موجود رہتا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ خادم کے علاوہ محافظ کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ اس رات نو بجے کے بعد وہ نہ جانے کہاں اوجھل ہو گیا۔ اس کی غیر موجودگی نے مجھے شہ دی اور میں نے تھوڑی سی آوارہ گردی کرنے کی ٹھانی۔ درحقیقت غزالہ کے حوالے سے میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ اسی پرشکوہ عمارت میں تھی لیکن ابھی تک میں اس کی جھلک نہیں دیکھ پایا تھا اور نہ ہی یہ جان سکا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنے ملازم کو ڈھونڈنے کے بہانے مہمان خانے سے نکلا اور چھپتا چھپاتا اس وسیع حوض کی طرف آگیا جس میں اعلیٰ نسل کی بطخیں تیر رہی تھیں اور زیر آب رنگ برنگی روشنیوں کا عکس فواروں کی پھوار پر پڑ کر عجب نظارہ پیش کرتا تھا۔ اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ جونہی میں ایک ستون کی اوٹ سے نکلا' سامنے ایک تپائی کے گرد مہاراج رتن سنگھ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ تپائی پر چاندی کے منقش برتنوں میں چائے یا قہوہ قسم کی چیز رکھی تھی۔ رتن سنگھ کے دونوں ساتھیوں کا انداز مؤدبانہ تھا۔ وہ آگے کو جھکے ہوئے ایک اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ رتن سنگھ بھی اسی اخبار پر جھکا ہوا تھا۔ میری آہٹ سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ جب تک وہ مجھے دیکھتے میں خود کو پوری طرح سنبھال چکا تھا۔ رتن سنگھ نے مجھے دیکھ کر اپنی طرف بلا لیا۔ میں پوری طرح الرٹ ہو گیا۔ عین ممکن تھا کہ

رتن سنگھ مجھ سے اس بے محل چہل قدمی کا سبب پوچھتا۔ اس سوال کا میرے پاس گھڑا گھڑایا جواب یہ تھا کہ میں ملازم سجاول کو ڈھونڈنے نکلا ہوں۔ تاہم اس دروغ گوئی کی نوبت نہیں آئی۔ رتن سنگھ نے مجھ سے پوچھا "اے مسٹر! کیا نام ہے تمہارا؟ تم بھی تو فرید کوٹ سے آئے ہو۔ یہ گاندھی چوک کس جگہ کا نام ہے؟ کوئی بازار وغیرہ ہے یا رہائشی علاقہ ہے؟"

میں نے کہا "جناب! میں کچھ زیادہ دن تو وہاں نہیں رکا۔ ہاں گاندھی چوک کا نام میں نے بھی سنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اندرون شہر کا بارونق بازار ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "کوئی خاص بات ہے جناب؟"

رتن سنگھ نے اخبار کے بیرونی صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دو گروہوں میں جھگڑا ہوا ہے وہاں۔۔۔ بہت فائرنگ ہوئی ہے۔ پانچ افراد مارے گئے ہیں۔ لکھا ہے کہ کسی ٹرک وغیرہ کا چکر ہے۔ اس میں بہت سا مال و اسباب پاکستان سے لایا گیا ہے۔"

رتن سنگھ کا انداز خود کلامی والا تھا اور اس "منوہ" کے لیے ہی اس نے مجھ سے ہم کلام ہونے کی زحمت گوارا کی تھی۔

میں نے مئودب لہجے میں کہا "کسی ٹرک وغیرہ کا ذکر تو میں نے بھی سنا تھا جناب! کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ فرید کوٹ میں جو ہندو سکھ فساد ہوا ہے اس کے پیچھے بھی یہ ٹرک والا معاملہ ہی تھا۔ سنا ہے اس ٹرک میں ہیرے جواہرات لدے ہیں اور بہت سے خطرناک لوگ اس ٹرک کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

باتوں کے دوران میں نے ایک اچٹتی ہوئی سی نظر اخبار پر بھی ڈالی تھی۔ یہ بیکانیر سے نکلنے والا ایک شام کا اخبار تھا۔ اس کے فرنٹ پیج پر ایک تین کالمی سُرخی لگی ہوئی تھی۔

"فرید کوٹ میں مزید ہنگامے۔۔۔ پُراسرار لوگوں کی فائرنگ میں پانچ افراد ہلاک۔۔۔ مرنے والوں میں دو راہ گیر بھی شامل ہیں"

رتن سنگھ نے مجھ سے فرید کوٹ اور وہاں کے حالات کے بارے میں چند باتیں اور پوچھیں۔ میں نے گھڑے گھڑائے ان سوالوں کے جواب دیے۔ اتنے میں ملازم سجاول مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک راکھ دانی کی قسم کی چیز تھی۔ یہ چیز اس نے بڑے مئودب انداز میں جھک کر رتن سنگھ کے ہاتھ میں تھمادی۔ رتن سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کی اجازت "مرحمت" فرمائی۔ میں خود بھی وہاں سے کھسکنا چاہتا تھا۔ رتن سنگھ کا اشارہ ملتے ہی میں جانے کے لیے واپس مڑا اور اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ مجھے "متحن" نظر آیا تھا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جو اس سے پہلے شیخ راشد بن ارشد کی جھپٹ گیری کر چکا تھا۔ جن دنوں میں راشد بن ارشد کو تلاش کر رہا تھا، متحن بار بار میرے آڑے آیا تھا اور مال روڈ لاہور کے ایک معروف چوراہے میں متحن اور میرے درمیان ایک زبردست جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ میں ان واقعات کا مختصر ذکر روداد کے شروع میں کر چکا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میری اور متحن کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہراتا محسوس کیا یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا رُخ پھیرا اور مہمان خانے کی طرف نکل گیا۔ متحن دفتر کی طرف چلا گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ متحن کو میں نے آج تقریباً دو سال بعد دیکھا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی منحوس صورت اور خطرناک نظر آتا تھا جتنا آج سے دو سال پہلے تھا۔ اس کی یہاں موجودگی ذہن میں ان گنت اندیشوں کو راہ دے رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ مہاراج کے عرب مہمانوں کا تعلق راشد بن ارشد کے خاندان سے ہو یا پھر وہ کسی حوالے سے راشد بن ارشد اور اس کے انجام کے بارے میں جانتے ہوں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر متحن مجھے دیکھ کر پہچان چکا ہے تو پھر میرا ایک پل بھی یہاں رُکنا مناسب نہیں۔ اگر میرے اندیشے درست تھے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک خوابیدہ آتش فشاں انگڑائی لے کر بیدار ہو سکتا تھا۔ کشت و خون کا ایک نیا باب کھل سکتا تھا اور یہ اب دشمن میرے مقابل آ سکتے تھے، میں جن کی شکلیں دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

بعض دفعہ واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوتے ہیں اور خدشات اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھارتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ جونہی میں نے ملازم سجاول کو آواز دی اور اسے اپنا مختصر سامان پیک کرنے کو کہا، نرائن کاکا مہمان خانے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے کھڑکی میں سے دیکھا۔ اس کی چال میں عجب سی بے قراری اور تیزی تھی۔ تاہم چند لمحے بعد جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اس چھوٹے سے سفری بیگ پر ڈالی جس میں سجاول میرے پرانے کپڑے، جوتے اور ٹارچ وغیرہ ٹھونس رہا تھا۔

"کیا بات ہے، تم جا رہے ہو؟" نرائن کاکا نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں نے سوچا ہے کہ صبح نکلا تو پھر شام سات بجے تک گاڑی کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک گاڑی تو صبح

سویرے چار بجے نکلتی ہے۔ اب چلا جاؤں تو وہ گاڑی پکڑ لوں گا۔"

نرائن نے ہاتھ اٹھا کر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی "لیکن اب تو دس بجنے والے ہیں۔۔۔ ناگور جانے والی آخری بس تو نکل چکی ہوگی۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں جی۔ ٹریفک تو ساری رات چلتا رہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی۔"

نرائن کاکا مجھ سے متفق نظر نہیں آتا تھا، کہنے لگا "لیکن بڑی سڑک تک کیسے جاؤ گے۔ اس وقت تو یہاں کوئی گاڑی بھی نہیں ہے۔"

نرائن کے ارادے واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک مجھے یہاں سے "دھکے" دے رہا تھا، اب ہر صورت مجھے روکنے کی فکر میں تھا۔ محل کے پارکنگ لاٹ میں گاڑیاں موجود تھیں لیکن اسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اگر میں "دکھانے" کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ یہ خراب ہیں یا ان کے ڈرائیور موجود نہیں وغیرہ وغیرہ۔ پنجابی کا محاورہ ہے کہ من حرامی تے حجتاں ڈھیر۔ یعنی کسی کام کے کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اس کے لیے سو بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ نرائن بھی دو تین بہانے تراش چکا تھا اور ضرورت پڑنے پر مزید تراش سکتا تھا۔ میرے تجزیے کو درست ثابت کرتے ہوئے وہ بولا "دو گاڑیاں تو کھڑی ہیں لیکن ان کے ڈرائیور چھٹی کر کے جا چکے ہیں۔ صرف ہز ہائی نس کا ذاتی ڈرائیور موجود ہے لیکن ہز ہائی نس کو کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ان کی ہدایت ہے کہ کم از کم ایک ڈرائیور ہر وقت محل میں موجود ہونا چاہیے۔"

میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہا "ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں لیکن پھر کل صبح جانے کے بجائے میں بارہ ایک بجے نکلوں گا تاکہ اسٹیشن پر گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔"

نرائن کاکا نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے پوچھا "فرید کوٹ میں تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

میں نے کہا "کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ چار پانچ ہوٹل بدلے ہیں۔ اب پیسے بچانے کے لیے اسٹیشن کے پاس ہی ایک درمیانے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس وقت نام یاد نہیں آ رہا اس کا۔"

نرائن مجھے تفتیشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ان عزیزوں کے بارے میں چند سوالات پوچھے جنہیں میں اپنے بقول فرید کوٹ میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے بدلحاظ ان سوالات کے جواب دیے۔ میں جان چکا تھا کہ

آسیب

آسیب خوف دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۰ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۲۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال۔ لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

حالات کس رُخ پر جارہے ہیں۔ اب خود کو چھپانے کی کوشش کارگر ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد نرائن میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور اس کے فوراً بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے خدمت گار سجارل کی جگہ ایک دوسرے شخص نے لے لی ہے۔ بظاہر یہ شخص بھی خدمت گار ہی تھا لیکن اسے دیکھتے ہی میں تاڑ گیا کہ وہ بدمعاشوں کے کسی خطرناک قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور میری خبر گیری کرنے کے لیے پوری طرح مسلح ہے۔ پانچ دس منٹ بعد ایک ایسا ہی شخص مجھے مہمان خانے کے صدر دروازے پر بھی نظر آیا اور میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر نرم کے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ جن خدشوں نے ذہن میں سر اٹھایا تھا وہ حقیقت کے قالب میں ڈھل گئے تھے۔ میں بطور اُستاد جہانی پہچانا جا چکا تھا اور مجھے پہچاننے والا "ایک ایسا شخص تھا جو راشد بن ارشد کے واقعۂ قتل کا "چشم دید گواہ" تھا۔ تقریباً سات برس پہلے جب میں نے جام پور کی ایک شاندار حویلی میں شیخ راشد بن ارشد پر اپنا پسٹول خالی کیا تھا‘ محسن مجھ سے چند گز کی دوری پر موجود تھا۔ اس وقت جن افراد نے مجھ پر ہوائی فائرنگ کی تھی ان میں محسن بھی شامل تھے۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر مہاراج رتن سنگھ کے عربی مہمانوں اور شیخ راشد بن ارشد میں کوئی دور کا تعلق بھی موجود ہے تو میرے لیے ایک بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ چند روز پہلے تک یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ایک بیش قیمت ٹرک کی خاطر فرید کوٹ اور قانِلکا کے گلی کوچوں میں گھومتے گھومتے میں اچانک راجستھان کے اس دور دراز علاقے میں جا پہنچوں گا اور یہاں مہاراج رتن سنگھ کے دولت کدے میں کچھ ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہو جائے گی جو مجھے راشد بن ارشد کے قاتل کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہوں گے۔

وہ رات میں نے سخت بے چینی کے عالم میں گزاری۔ میرے چاروں طرف تاریکی تھی۔ حالات کی گتھی کچھ اس طرح اُلجھی ہوئی تھی کہ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ تھا کہ ٹرک کہاں گیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ نمبردار عشرت کے فارم سے جو شہادتیں ملی تھیں‘ ان سے یہی پتا چلتا تھا کہ شام کے وقت وہاں کوئی سنگین حادثہ رونما ہوا ہے اور اس حادثے کے فوراً بعد ٹرک کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔ مجھے وہ زہر میں بجھے تیر یاد آئے جو جائے واردات سے ملے تھے اور وہ عجیب وضع کا خنجر نما ہتھیار جس کے دستے پر بادبانی کشتی کی شبیہ تھی۔ دوسرا اہم سوال نزالہ کے بارے میں تھا۔ وہ شنکر شکرا کے چنگل میں کیسے پھنسی اور کیسے نکلی۔ پھر وہ میرے ساتھ اس جیپ میں کیسے سوار ہوئی جسے فرید کوٹ سے سیکڑوں میل دور ایک دہکتے ہوئے ریگزار میں حادثے کا شکار ہونا تھا اور جائی شاہ کی موت کا سبب بننا تھا۔ بے شمار سوال ذہن پر یلغار کر رہے تھے اور مہاراج رتن سنگھ کے وسیع و عریض راج محل سے باہر راجستھان کی وہ خنک رات جیسے ایک جگہ ٹھہری گئی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں نے اپنے نئے "خدمت گار" سے کہا کہ میں نرائن کاکا سے ملنا چاہتا ہوں۔ خدمت گار نے تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا کہ میرا پیغام نرائن کاکا تک پہنچا دیا گیا ہے‘ وہ کسی کام میں مصروف ہیں‘ کچھ دیر بعد فارغ ہو کر آتے ہیں۔ انتظار کرتے کرتے گیارہ بج گئے لیکن نرائن کاکا آیا اور نہ اس کا کوئی سندیسہ۔ میں نے دو تین بار پیغام بھیجا‘ ہر بار یہی جواب آیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ آخر بارہ بجے کے لگ بھگ بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ نرائن کاکا‘ ہزہائی نس کے ساتھ کسی تقریب میں شرکت کے لیے ناگور چلے گئے ہیں اور ان کی واپسی تک مجھے لیرس میں جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ اطلاع دینے والے نے لیرس تو محاورتاً ہی کہہ دیا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ میں مہمان خانے سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ دو بجے کے قریب مہمان خانے کے بیرونی دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا اور میں عملاً اس چار دیواری میں قید ہو گیا۔

★

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ رات گیارہ بارہ بجے کا عمل تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھ کھل گئی۔ میں مہمان خانے کے اسی وسیع کمرے میں تھا جو اب میرے لیے قید خانے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا۔ انگلش بولی جا رہی تھی لیکن لب و لہجہ عربی تھا۔ میں نے اس آواز پر غور کیا اور جیسے ایک ساتھ سماعت میں سیکڑوں بم پھٹ گئے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین آ رہا تھا نہ اپنے حواس پر۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوری توجہ سے وہ آواز سننے لگا۔ میں اس آواز کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اس آواز کا ہر زیر و بم اور ہر ارتعاش میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ کیا سراب تھا‘ یہ کیسی طلسم کاری تھی؟ دوسرے کمرے میں شیخ راشد بن ارشد بول رہا تھا۔ وہی شخص جو سات برس پہلے میرے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ وہی آواز۔ وہی لہجہ‘ وہی انداز۔

میں بے اختیار بستر سے نیچے اُتر آیا اور چکنے فرش پر ننگے

پاؤں چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ تاہم مجھے مزید زحمت نہیں کرنی پڑی۔ آوازیں حرکت کر کے میری طرف بڑھیں اور دوسرے کمرے میں بولنے والے میرے سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی خواب گاہ کی تمام روشنیاں جل اٹھیں۔ میں نے چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھا‘ میرے سامنے مہاراج رتن سنگھ جی آف ناندل اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ موجود تھے۔ گارڈز کے علاوہ ان کے ساتھ نرائن کاکا اور دو عربی مہمان نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک مہمان تو وہی شیخ اسد تھا جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ دوسرا چوڑے شانوں والا ایک دراز قد شخص تھا‘ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے مقتول شیخ راشد بن ارشد کا کوئی قریبی عزیز ہے۔

اس کے خدوخال راشد بن ارشد سے ملتے تھے لیکن آواز کی مماثلت تو حیران کن تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ چہروں کی ہی نہیں آوازوں کی بھی ایک صورت ہوتی ہے اور جس طرح قریبی عزیزوں کے چہرے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس طرح آوازیں بھی "ہم شکل" ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے صداکاروں اور گلوکاروں کی آوازوں پر غور کیا جائے تو حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے۔ مہدی حسن‘ مکیش اور عالم لوہار کے بیٹے جب گاتے ہیں تو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ بیٹا گا رہا ہے یا باپ؟

نووارد شخص بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے آگ دہک رہی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ اس نے سرخ دھاری دار عمامہ باندھ رکھا تھا مگر اسے اطراف میں لٹکانے کے بجائے تہ کر کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ عمر تقریباً پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ وہ چہرے مہرے سے بے حد مضبوط اعصاب کا مالک ایک سخت گیر شخص نظر آتا تھا۔

وہ بڑے بارُعب انداز میں مجھے گھورتا رہا پھر عجیب ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "تو تم ہو شاہ جہاں؟"

اس نے یہ فقرہ انگریزی میں بولا تھا۔ میں جانتے بوجھتے خاموش کھڑا رہا۔ کمرے میں چند لمحے نہایت بوجھل قسم کی خاموشی طاری رہی۔ پھر نووارد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کہنے لگا "شاہ جہاں عرف جہالی اُستاد... میں دبئی میں بہت سے کام چھوڑ کر تم سے ملنے یہاں پہنچا ہوں۔ پہلے کار کا سفر پھر دبئی سے جودھپور تک کا جہاز کا طویل سفر اور پھر جیپ کا سفر میں ہزہائی نس کی رہائش گاہ تک رسائی۔ کوئی دس گھنٹے صرف ہوئے ہیں میرے۔ اور تم ہو کہ مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں تمہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض سفید فاموں کی طرح تم بھی تعارف کے بغیر کسی سے کلام نہیں کرتے ہو"

نووارد شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اس کے لہجے میں روانی تھی۔ میں اب کسی حد تک اپنے حواس میں آ چکا تھا‘ ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "میرے خیال میں اگر تعارف ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں" مجھے انگریزی بولتے سن کر نرائن کاکا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

نووارد نے کہا "میرا نام عاصم بن ارشد ہے۔ میں اس شخص کا چھوٹا بھائی ہوں جسے آج سے سات سال اور آٹھ ماہ پہلے فروری کی دس تاریخ کو شام چھ بجے تم نے گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے نووارد کے لہجے میں ایک دہشت سی عود کر آئی تھی۔

اس کے لہجے نے ایک دم میرے اندر بھی ایک چنگاری کو بھڑکا کر شعلہ بنا دیا۔ میں نے نخوت لہجے میں کہا "مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کے چھوٹے یا بڑے بھائی ہو۔ ہر انسان کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ اگر تم اچھے ہو تو میں بھی تمہارے لیے اچھا ہوں۔ ورنہ جو سلوک تمہارے بھائی کے ساتھ ہوا اس سے بڑھ کر تمہارے ساتھ ہو سکتا ہے۔"

میرے اس فقرے نے وہی کام کیا جو بھڑوں کے چھتے میں لگنے والا پتھر کرتا ہے۔ سب سے پہلے عاصم بن ارشد کے چہرے کا رنگ بدلا اور وہ کسی جنونی کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ پھر مہاراج رتن سنگھ نے کھڑے کھڑے ایک زوردار ٹانگ میری پسلیوں پر جمائی۔ مہاراج کو غضب میں دیکھ کر اس کے گماشتے پلک جھپکتے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ تعداد میں چار سے کم نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ مجھ پر ہلا بولا۔ شیخ عاصم نے میرا گریبان تھام رکھا تھا اور فرطِ غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ مجھے گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھے اور اس وقت تک میرا گلا دبائے رکھے جب تک میرے سانس کی ڈور ٹوٹ نہیں جاتی۔ مہاراج رتن سنگھ میرے پہلو میں ایک "شاہانہ" ٹھوکر مارنے کے بعد ایک کونے میں جا کھڑا ہوا تھا اور اب چیخ رہا تھا "یا شیخ! آپ چھوڑ دیں اسے۔ آپ پیچھے ہٹ جائیں‘ ہمارے آدمی کافی ہیں اس کے لیے۔"

کمرے میں ایک دم ہی طوفان برپا ہو گیا تھا۔ مجھے زدوکوب کرنے والے چار تھے لیکن ان میں ایک کے سوا کوئی بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں ذرا چستی دکھاتا تو ان کے نرغے سے نکلنے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں کوشش کرتا عقب سے ایک شخص نے میرے سر پر سیمون ایم ایم کا کندا اتنے زور سے مارا کہ

میں چکرا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ سر پہلے ہی زخمی تھا۔ درد کی ایک شدید لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

میں درجن افراد کے نرغے میں تھا۔ زدوکوب کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک تنگ و تاریک کمرے میں لے آئے اور آہنی سلاخوں والا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ میں مہمان خانے سے سو ڈیڑھ سو گز دور ایک جیل نما چار دیواری میں تھا۔ جس کوٹھری میں مجھے پھینکا گیا تھا وہ بعینہٖ کسی جیل کی کوٹھری نظر آتی تھی۔ پہلے لاہور جیل اور پھر اٹک جیل میں میں نے پھانسی پانے والے قیدیوں کو ایسی ہی منحوس کوٹھریوں میں تصویرِ یاس بنے دیکھا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کی طرف سے بخشا جانے والا میرا نیا نکور لباس تار تار ہو چکا تھا۔ شلوار کا ایک پائنچہ ادھڑ کر گھٹنے تک پہنچ گیا تھا۔ بنیان دھجیوں کی صورت گلے میں جھول رہی تھی اور قمیص کا کیا ذکر، وہ تن پر رہی ہی نہیں تھی۔ میں نے بنیان کی دھجیاں گلے سے نوچ کر سر سے بہنے والا خون صاف کیا اور بے دم سا ہو کر ٹھنڈے فرش پر لیٹ گیا۔

دوپہر تک کسی نے میری خبر لی نہ ہی کوئی آدم زاد اس تاریک کوٹھری کے آس پاس نظر آیا۔ میرے سر سے بہنے والا خون بہہ بہہ کر خود ہی بند ہو گیا تھا۔ پھٹی ہوئی بنیان سفید سے سرخ رنگ اختیار کر چکی تھی۔ صبح کے وقت تو کوٹھری ٹھنڈی تھی لیکن جوں جوں راجستھان کی دھوپ جوبن پر آتی گئی تھی، کوٹھری بھی گرم ہوتی گئی تھی اور اب تنور کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بارہ بجے کے لگ بھگ ایک باوردی شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے جیل کے لٹھ برداروں کی طرح سفید شلوار قمیص پر سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں نے نیرس میں مہاراج رتن سنگھ کی ذاتی فورس دیکھی تھی۔ وہ سب خاکی قمیص اور سرمئی پتلون پہنتے تھے لیکن یہ شلوار قمیص اور سرخ ٹوپی والا عملہ پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔ سرخ ٹوپی والے کے ہاتھ میں ایک جگ تھا اور بغل میں کپڑوں کی تھوڑی سی دبی ہوئی تھی۔ اس نے جگ کو دروازے کی آہنی سلاخوں میں سے گزار کر کوٹھری میں رکھ دیا پھر کپڑوں کا ایک جوڑا میری طرف پھینکتے ہوئے بولا "اسے پہن لو۔"

یہ ایک قیدیوں والا شلوار قمیص تھی۔ صرف رنگ کا فرق تھا ورنہ یہ ویسا ہی لباس تھا جیسا میں لاہور اور اٹک جیل میں پہنتا رہا تھا۔ لباس پر باقاعدہ نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ تیرہ نمبر تھا۔ میں نے لباس ایک طرف پھینک دیا اور سرخ ٹوپی والے سے مخاطب ہو کر کہا "جاؤ! اپنے مالک کو بھیجو میرے پاس یا اس کتے نرائن کو۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں" سرخ ٹوپی والا جواباً غرایا "یہ جیل ہے اور تو قیدی ہے۔ یہاں وہی ہو گا جو ہم چاہیں گے۔"

اچانک بیرونی دروازے کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ کچھ بچے رو رہے تھے اور عورتیں چیخ چلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی تحکمانہ غراہٹیں اور مار پیٹ کی آوازیں ابھریں پھر میں نے ننگ دھڑنگ افراد کا ایک گروہ دیکھا۔ ان میں پانچ مرد، اتنی ہی عورتیں اور چھ سات بچے شامل تھے۔ ایک شیر خوار بچہ تھا اور دو اتنے کم سن تھے کہ بمشکل چل سکتے تھے۔ مردوں کے جسموں پر صرف دھوتیاں تھیں جنہیں انہوں نے لپیٹ لپاٹ کر لنگوٹیوں کی شکل دے رکھی تھی۔ بچے ننگ دھڑنگ تھے یا صرف قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ عورتیں مقامی لباس میں تھیں لیکن یہ لباس کہیں تھا، کہیں نہیں تھا۔ سرخ ٹوپیوں والے تقریباً ایک درجن افراد ان غریب صورت لوگوں کو جوتوں، ڈنڈوں اور ہنٹروں سے بے طرح پیٹ رہے تھے اور کال کوٹھریوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ تمام مرد و زن کے ہاتھ سامنے کی طرف رسیوں سے بندھے ہوئے تھے اور ان کے گلے میں مُردہ جانوروں کی لاشیں تھیں۔ ان خونچکاں لاشوں کو رسیوں میں پرو کر قیدیوں کے گلے میں حمائل کر دیا گیا تھا۔ کسی کے گلے میں گیدڑ کی لاش تھی۔ کسی کے گلے میں لومڑی کی۔ ایک نوعمر لڑکے کے گلے میں دو جنگلی خرگوش جھول رہے تھے اور ایک بوڑھا بہت سے تیتروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ جنگلی جانوروں کی خشک کی ہوئی کھالیں بھی تھیں۔ یہ کھالیں ایک موٹے تگڑے پہرے دار نے کندھے پر ڈال رکھی تھیں۔ میں نے ایک جواں سال عورت کی بے بسی کا منظر دیکھا۔ اس نے ایک شیر خوار بچہ اٹھا رکھا تھا اور گلے میں ایک تنومند لومڑی کی لاش تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور وہ بار بار لڑکھڑا کر گر جاتی تھی مگر پہرے دار اس کی منت سماجت کی پروا کیے بغیر اسے مار رہے تھے اور کوٹھریوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جلد ہی مہاراج رتن سنگھ آف تاندل کے یہ مجرم میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور صرف ان کی چیخ پکار میری سماعت میں باقی رہ گئی۔

یہ لوگ شکل و صورت سے خانہ بدوش نظر آ رہے تھے اور میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہوں نے مہاراج کی کسی شکار گاہ میں گھس کر شکار چرانے کی جسارت کی ہے۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد مسروقہ جانور ان کے گلے میں ڈال دیے گئے ہیں اور یہاں لا کر بند کر دیا گیا

ہے۔ اس روز رات گئے تک میں قریبی کوٹھریوں سے "ملزمان" کی دلدوز چیخیں سنتا رہا۔ بلا تفریق مرد و زن انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ان کے بچے رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے لیکن نہ کسی کو بچوں پر ترس آیا تھا اور نہ ان کے بڑوں پر۔ ان آٹھ دس گھنٹوں میں خشک مزاج پہرے دار کے سوا کسی سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ پہرے دار دو دفعہ میرے لیے کھانا لے کر آیا لیکن میں نے دونوں دفعہ انکار کر دیا۔ ہاں پانی کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ گرمی اور حبس کے سبب جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا اور ہر پندرہ بیس منٹ بعد منہ سوکھ کر کڑوا ہو جاتا تھا۔

رات نو بجے کے بعد گرمی کا زور ٹوٹنے لگا اور دھیرے دھیرے کوٹھری کا درجۂ حرارت اعتدال پر آ گیا۔ اس وقت گیارہ بجے ہوں گے جب بیرونی دروازے کی جانب سے چند آہٹیں سنائی دیں۔ سرخ ٹوپیوں والے دو نگران ایک بیش قیمت صوفہ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ یہ سنگل صوفہ انہوں نے میری کوٹھری کے عین سامنے سلاخ دار دروازے کے پاس رکھ دیا۔ عقب میں نگران خوب صورت تپائی اٹھائے ہوئے تھا۔ تپائی صوفے کے مقابل ڈال دی گئی۔ ایک اور شخص نے بڑے سلیقے سے تپائی پر کچھ سامان چن دیا۔ اس سامان میں جو چیزیں شامل تھیں، ان میں بیئر کی ایک نہایت قیمتی بوتل اور گلاس کے علاوہ امپورٹڈ سگریٹ کا ایک پیکٹ، ایک طلائی لائٹر اور ایک چھوٹا سا جاپانی ریڈیو بھی تھا۔ یہ انتظام ہو چکا تو امارات کا امیرزادہ شیخ عاصم بڑے کروفر سے اندر داخل ہوا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس کے اندر آتے ہی جیل کا وہ گوشہ خادمین اور محافظین سے خالی ہو گیا۔ شب کے خنک سناٹے میں، میں اور شیخ عاصم ایک دوسرے کے سامنے تنہا رہ گئے۔ خانہ بدوشوں کی جان اب عارضی طور پر چھوٹ چکی تھی اور کبھی کبھی کسی زخمی مرد یا عورت کی کراہ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شیخ عاصم سگریٹ سلگا کر خوابیدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "جانی! میں نے تمہارے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہارے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تمہارا کوئی قریبی عزیز جانتا ہو گا تو یہ غلط نہ ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سی خوبیوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے باوجود تم ایک بدقسمت شخص ہو۔ تمہاری سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ غلط وقت پر تمہارے ماں باپ تم سے جدا ہو گئے اور تمہیں اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا پڑی۔ تمہاری دوسری بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ تم نے شیخ راشد بن ارشد جیسے بااثر شخص سے ٹکر لی اور اس کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ اس کے بعد کسی اور بدقسمتی کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن بدقسمتی قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیتی رہی۔ تمہارے لیے بہت بہتر ہوتا کہ تم اٹک جیل میں خود پر ہونے والے قاتلانہ حملوں میں قتل ہو جاتے لیکن ہر بار تمہاری بدبختی آڑے آتی رہی۔ سنا ہے ایک بار جیل کی بالائی منزل سے تم پر کنکریٹ سے بھری ہوئی کڑاہی پھینکی گئی لیکن تم بچ گئے۔ تم نے زہریلے کھانے سے آنے والی موت کو بھی جھٹکا دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک ساتھی کو عدم آباد روانہ کر دیا۔ اس کے بعد شاید لوہے کا وہ تار ہی تمہاری مشکل آسان کر دیتا جو تمہاری گردن کے گرد لپیٹا گیا تھا لیکن وہ سنہری موقع بھی تم نے گنوا دیا۔"

میں نے کہا "تم اسے بدبختی کہتے ہو تو پھر خوش قسمتی کیا ہوتی ہے؟"

وہ بولا "خوش قسمتی یہ ہوتی ہے کہ مرنے والا جلدی سے مر جائے۔ اسے مرنے کا احساس اس وقت ہو جب موت اس پر وارد ہو چکی ہو۔ یہ عذاب جھیل کر اور سسک سسک کر مرنا بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے!" وہ بڑی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔

میں نے کہا "کس نے کب مرنا ہے اور کس طرح؟ یہ سب کاتبِ تقدیر نے لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ تم مجھے وردناک موت سے ڈرانے کی کوشش کر کے قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کر رہے ہو۔"

وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا "تقدیر انسان خود بناتا ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے طرزِ عمل سے اپنی تقدیر پر بدقسمتی کی مہر لگا لیتے ہیں۔ تمہارے مقدر پر بھی مہر لگ چکی ہے اور یہ "تکلیف دہ موت" کی مہر ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں یہ سمجھوں کہ اس سے پہلے میری موت کو آسان کرنے کی کوشش بھی تم ہی کرتے رہے ہو۔"

میرا مطلب اٹک جیل والے واقعات سے تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔ خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ان خالی نگاہوں کی تہہ میں قہر کی بجلیاں لپک رہی تھیں۔ چند لمحے کے توقف سے کہنے لگا "تمہیں مارنا میرا شوق نہیں اور نہ ہی تمہاری موت سے میری کسی ذاتی خواہش کی تسکین ہو گی۔ یہ میری مجبوری ہے۔ تم میرے بھائی کے قاتل ہو اور جب تک میں تمہیں کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا لوں گا میرا خاندان قرار کی دولت سے محروم رہے گا۔ تم خود سوچو ایک معمولی سا

شخص اپنے بھائی کے قاتل کو زندہ سلامت زمین پر چلتے پھرتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں کیسے دیکھ سکتا ہوں! ہم دونوں کے درمیان فاصلے ضرور تھے لیکن ہم رشتے کے رشتے میں بہت مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے تمہاری تلاش میں بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ اب تک کم از کم آٹھ لاکھ امریکن ڈالر میں تمہاری تلاش اور تمہاری سزا پر خرچ کرچکا ہوں۔ آج سے چار پانچ برس پہلے ایک موقع ایسا آیا تھا جب میرے آدمی تمہارے گرد اپنا گھیرا بہت تنگ کرچکے تھے۔ بس چند گھنٹوں میں تمہیں بمبئی اور وہاں سے بذریعہ لانچ ریاض پہنچایا جانے والا تھا لیکن اس وقت تم اچانک منظر سے غائب ہوگئے۔ ہمیں ڈھائی تین سال بعد پتا چل سکا کہ تم نے پاکستان جاکر خود کو بڑی رازداری سے قانون کے حوالے کردیا تھا اور اب تمام خلافے کی ایک دور افتادہ جیل میں بارہ سال قید کی سزا کاٹ رہے ہو۔"

"لہٰذا۔ تم نے ررلت کے ذریعے جیل میں اپنے آدمی داخل کردیے اور انہوں نے مجھے آسان موت مارنے کے لیے فی سبیل اللہ جدوجہد شروع کردی۔"

شیخ عاصم میرے گستاخانہ لہجے کو خاطر میں لائے بغیر بولا "میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ تمہیں مارنا میری مجبوری ہے۔ یوں سمجھو لوگ اس قطعۂ زمین پر تم رہ گئے ہوئے ہو۔"

بہت رعب دار لیکن خطرناک لہجہ تھا شیخ عاصم بن احمد کا اور اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ وہ میرے گستاخانہ کلام کو برداشت کررہا تھا۔ ایسے لوگ اپنے سے کمزور فرد کا گستاخانہ طرزِ کلام اسی وقت برداشت کرتے ہیں جب وہ اسے نہایت سخت سزا دینے کا فیصلہ کرچکے ہوتے ہیں اور انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ معتوب اس سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

میں نے کہا "ظاہر ہے اس میں انتخاب کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے ہی یہ قطعۂ ارض چھوڑنا ہوگا لیکن تم مجھے بار بار دردناک موت کا مژدہ سنا رہے ہو۔ کیا اس حوالے سے کچھ وضاحت کرنا پسند کروگے؟"

شیخ عاصم نشیلے انداز میں مسکرایا "میرا خیال ہے کہ میں نے دردناک موت کا لفظ استعمال کرکے تمہیں کسی بڑی غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے دوست! میں تو صرف اچانک آنے والی اور بتدریج آنے والی موت کا موازنہ کررہا تھا۔ جیل میں تمہاری بدبختی آڑے نہ آتی تو تم اچانک مرجاتے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں قصہ پاک ہوجاتا۔ اب دو تین روز تک تم موت کو اپنی طرف سرکتا دیکھوگے۔ پل پل مروگے اور جیوگے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ وہ فاصلہ جو ایک قیدی کال کوٹھری سے پھانسی گھاٹ تک طے کرتا ہے، دنیا کا طویل اور کٹھن ترین فاصلہ ہوتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے جسم میں سرد لہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ میں نے شیخ عاصم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "تو تم مجھے پھانسی لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وہ مسکرایا "شاہ جہاں عرف جہانی! تم ایل اے، ایل ایل بی ہو۔ یہ بات تو ایک ان پڑھ بھی جانتا ہے کہ قاتل کو سزا دینے کا قانونی اور شریفانہ طریقہ پھانسی ہی ہے لیکن گھبراؤ مت۔ میں تمہاری پھانسی کا اعلان نہیں کررہا ہوں۔ یہ تو توہینِ عدالت کے مترادف ہوگا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نس کی عدالت اس سے کم سزا تمہارے لیے تجویز نہیں کرے گی۔"

میں نے کہا "ہز ہائی نس کون ہوتا ہے مجھ پر مقدمہ چلانے والا اور سزا دینے والا۔ انڈین لا کے مطابق۔"

"بکواس مت" اچانک شیخ عاصم بڑے زور سے دہاڑا "ہز ہائی نس سزا دینے کا مجاز نہیں تو تم کیسے مجاز ہوگئے تھے میرے بھائی کو گولیوں سے اڑانے کے؟ کیا اس وقت انڈیا اور پاکستان میں قانون کی عملداری نہیں تھی۔ کیا عدالتوں کے دروازے بند تھے اس وقت؟"

"وہ ظالم تھا" میں بھی جواباً غرایا "اس نے مجھ پر انصاف طلب کرنے اور شرافت سے زندہ رہنے کے تمام دروازے بند کردیے تھے۔ اسے مار کر میرا سر فخر سے بلند ہوگیا تھا اور آج بھی بلند ہے۔"

"بلند رکھو اس سر کو" شیخ عاصم دہاڑا "کل پرسوں تک یہ سر تمہارے کندھوں سے ایک فٹ اور بلند ہوجائے گا۔"

اس کی دہاڑ سن کر سرخ ٹوپیوں والے دو نگران بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے تھے۔ شیخ عاصم اٹھا اور نگرانوں کے سامنے سے گزر کر دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

اگلے روز مجھے آہنی ہتھکڑی لگاکر جیل خانے کے ہی ایک کشادہ کمرے میں لے جایا گیا۔ بڑا مضحکہ خیز حلیہ تھا میرا۔ جسم پر صرف ایک شلوار تھی اور پاؤں میں قینچی چپل۔ سر سے بہنے والا خون ابھی تک کندھے اور پشت پر جما ہوا تھا۔ کشادہ کمرے میں فرش پر قالین نما دری بچھی تھی۔ کھڑکیوں پر پردے تھے اور ایک دیوار پر مہاراج رتن سنگھ کی ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کے عین نیچے ایک تین فٹ اونچے چبوترے پر آبنوسی میز کے گرد تین کرسیاں رکھی تھیں۔ درمیان والی کرسی زیادہ آرام دہ اور پرتکلف تھی۔ میز پر ایک فائل سبز ربن سے بندھی ہوئی تھی اور پاس ہی ڈیڑھ فٹ مربع کا ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔

کمرے میں چار اور افراد بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک مہاراج کا پرسنل سیکریٹری کمار جگجیت سنگھ تھا۔ دوسرا نرائن کاکا اور تیسرا محسن تھا۔ چوتھے شخص کا تعلق مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک سے تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اس نے بہترین تراش کا تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ شخص شیخ عاصم بن احمد کا ایک دستِ راست تھا اور راجہ جانی کی اس خود ساختہ عدالت میں شیخ عاصم کی نمائندگی کررہا تھا۔

سرخ ٹوپی والے مسلح گارڈز نے مجھے ایک کرسی پر لاکر بٹھادیا اور دائیں بائیں چوکس کھڑے ہوگئے۔ ایک شخص نے میرے کندھوں پر چادر ڈال کر بالائی جسم کو ڈھانپ دیا۔ بمشکل ایک منٹ گزرا تھا کہ بغلی دروازے سے ایک عمر رسیدہ شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی بھنویں سفید تھیں اور آنکھوں پر بے حد موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ وہ انگریزی سوٹ میں تھا۔ اس کے پیچھے دو اور افراد اسی لباس میں اندر آئے اور پہلے شخص کے دائیں نشستیں سنبھال لیں۔ یہ بات مجھے تیسرے روز معلوم ہوئی کہ سفید بھنوؤں والا جودھ پور کا ایک ریٹائرڈ جج تھا اور اس اسٹیٹ میں مہاراج کی خصوصی عدالت میں منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ایک ایسا شخص جسے اپنے لعابِ دہن پر بھی قابو نہیں تھا جج کی نشست پر بیٹھا تھا اور انصاف کا بول بالا کرنے چلا تھا۔

خود ساختہ عدالت کی بے معنی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے جج نے اپنی عینک کے پیچھے سے بے نور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرا جائزہ لیا اور بولا "شاہ جہاں ولد وقار احمد! تم پر الزام ہے کہ قریباً ساڑھے سات سال پہلے تم نے جام پورہ کے مقام پر امارات سے آئے ہوئے ایک معزز مہمان شیخ راشد بن ارشد کو ذاتی عداوت کی بنا پر سرِعام فائرنگ کرکے قتل کردیا تھا۔ کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے ترت جواب دیا "میں تو اپنی صفائی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنی صفائی میں ضرور کچھ کہنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی عدالت ہے جس میں مجھے بطور ملزم پیش ہوتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ کیا آپ کو جج کی نشست پر بیٹھ کر شرم نہیں آرہی؟"

"بکواس بند کرو" جیوری کا ایک ممبر گرج کر بولا۔ اس کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو وہ ابھی اٹھ کر میری ٹھکائی کرنے لگتے۔

جج نے ہاتھ کے اشارے سے جیوری ممبر کو خاموش کیا اور بولا "عدالت نے تم سے صفائی مانگی ہے۔ اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "بہتر ہے بڑے میاں کہ آپ یہ ڈراما نہ کریں۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی طے کرچکے ہیں۔ خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت ضائع کریں گے آپ۔"

جج کے مستقل ساتھی کا چہرہ ایک بار پھر لال بھبوکا ہوگیا لیکن اس مرتبہ اس نے بولنے سے پرہیز کیا۔ بوڑھے جج نے میرے ریمارکس کو نظرانداز کرتے ہوئے فائل کے ایک صفحے پر نظریں دوڑائیں اور بولا "یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ریاست کی حدود میں داخل ہونے کے بعد تم نے اپنی شناخت چھپائی۔ تم نے اپنا نام نہال سنگھ بتایا تھا اور یہ بیان دیا تھا کہ تم گلگنہ کے رہنے والے ہو۔ کیا تم بتانا پسند کروگے کہ یہ غلط بیانی تم نے کیوں کی؟"

"نہیں۔ میں یہ بتانا پسند نہیں کروں گا" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے اس تماشے سے چڑ سی ہورہی تھی۔

جج نے تھری پیس سوٹ والے عرب سے مخاطب ہوکر کہا "مسٹر صادق! آپ کی حیثیت وکیلِ استغاثہ کی ہے۔ آپ اس کیس کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

جواب میں صادق نامی اس شخص نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور آدھ گھنٹا دورانیے کی ایک دھواں دھار تقریر کرڈالی۔ اس تقریر میں نہ صرف مجھے راشد بن ارشد کا قاتل قرار دیا گیا بلکہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش اور درندہ صفت لٹیرا ثابت

کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ وکیل استغاثہ نے ایک نہایت "معزز شہری" یعنی ہسٹری شیٹر مسٹمن کو چشم دید گواہ کے طور پر پیش کیا اور مسٹمن نے حق نمک ادا کرتے ہوئے مجھے ر صدی کا سب سے خطرناک اور بے رحم قاتل ثابت کر دیا۔

یہ یک طرفہ کارروائی تقریباً ڈیڑھ گھنٹا جاری رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ بے سود زحمت کیوں کی جا رہی ہے؟ یہاں مہاراج رتن سنگھ کو من مانیوں سے روکنے والا کون تھا۔ وہ تفریح طبع کے لیے وس بیس راہ گیروں کو پکڑ کر اپنے پالتو سوروں کے آگے ڈال دیتا تو بھی کوئی احتجاج نہیں کر سکتا تھا اور جہاں تک اس کارروائی کی اہمیت کا تعلق تھا، وہ اس امر سے واضح ہو جاتی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ تو ایک طرف رہا، مدعی بن عاصم نے بھی اس کینگرو کورٹ میں آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یہ "ڈرامائی" کارروائی دو گھنٹے میں مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ جج نے ریاستی قواعد کے تحت مجھے سزائے موت کا حکم سنایا اور اپنے فیصلے پر شرمندگی سمیٹتے ہوئے باہر چلا گیا۔

***

مجھے ایک بار پھر کال کوٹھری پہنچا دیا گیا۔ کال کوٹھری جانے کے لیے ہم جس راستے سے گزرے وہ جیل کے پھانسی گھاٹ کے قریب سے گزرتا تھا۔ معلوم نہیں اتفاقاً ایسا ہوا تھا یا میرا "خون خشک" کرنے کے لیے قصداً مجھے اس راستے سے لے جایا گیا تھا۔ وہ واقعی ایک پھانسی گھاٹ تھا۔ جلی ہوئی سیاہ اینٹوں سے تعمیر شدہ یہ ایک کنواں نما جگہ تھی۔ لیکن یہ کنواں زمین کے اندر نہیں زمین کے اوپر تھا۔ ایک طرف اندر جانے کے لیے در سا بنا ہوا تھا۔ عقب میں سیڑھیاں تھیں۔ یہ سیڑھیاں ایک بڑے چوبی تختے تک پہنچتی تھیں۔ اس تختے کے اندر ہی وہ دروازہ سا تھا جو پھانسی پانے والے کے پاؤں تلے سے کھلتا تھا اور وہ کنوئیں میں جھول جاتا تھا۔ کنوئیں کے اوپر پھندا لٹکانے کے لیے جگہ بھی بنائی گئی تھی۔ مجھے یہ انتظام دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ظاہر ہے یہ پھانسی گھاٹ خاص میرے لیے تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کب سے اس جگہ موجود تھا اور بڑائی کس کے معتوبین کو نگل رہا تھا۔ درحقیقت یہ ایک مکمل جیل تھی جس میں مشقت خانہ، کال کوٹھریوں اور پھانسی گھاٹ سمیت ہر چیز موجود تھی۔ پھانسی گھاٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ان مرد و زن پر پڑی جنھیں کل شکار چوری کرنے کے جرم میں پکڑ کر جیل میں لایا گیا تھا۔ اب انھیں "عدالت" میں لے

جایا جا رہا تھا۔ مردہ جانور بدستور ان کے گلے میں جھول رہے تھے۔ کل کے تشدد نے ان سب کی بُری حالت کر رکھی تھی۔ وہ جیل کے عقوبت خانے سے یوں برآمد ہوئے تھے جیسے گنا چلنے والی مشین سے گنا نکلتا ہے۔ مردوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور عورتوں کے لباس تار تار تھے۔ مجھے ایک دراز قد کی عورت ان میں نظر نہیں آرہی تھی۔

کال کوٹھری میں پہنچنے کے بعد بھی میری ہتھکڑی کھولی نہیں گئی۔ صورت حال سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ کوٹھری کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر میں نے پہلی بار سوچا "کیا یہ سرخ ٹوپیوں والے خر دماغ زشکرے مجھے واقعی پھانسی لگا دیں گے؟ جہانی استاد جو ان گنت صورتوں میں آنے والی موت کو ان گنت مرتبہ جھکاوے دے چکا تھا اس منحوس عمارت کے کہنہ سال پھانسی گھاٹ میں لٹک کر جان دے دے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اگر ہو سکتا تھا تو مجھے اسے "ہونے" سے روکنا تھا۔

جو بات شروع میں بعید از قیاس نظر آتی تھی۔ نہ جانے کیوں حقیقت کے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں شیخ عاصم بن ارشد کے علاوہ بڑائی کس اور اس کے حواریوں کی نگاہوں میں بھی اپنے لیے بے پناہ نفرت پڑھ چکا تھا۔ میں محو خیال رہا اور کسی قریبی کوٹھری سے کسی عورت کے زور زور سے بولنے اور چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ آوازیں اس چار دیواری کی وحشت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس رات نرائن کاکا پھر میرے پاس آدھمکا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ شروع سے ہمدردانہ تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم کے جذبات دیکھے۔ عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی اس کے چہرے پر۔ وہ بولا "مجھے تمہارے حالات پر بہت افسوس ہو رہا ہے شاہ جہاں۔"

"لیکن مجھے تو اپنے حالات پر کوئی افسوس نہیں۔"

وہ ناگواری سے بولا "شاید تم اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ تمھیں پھانسی کے ذکر سے صرف ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ بے وقوف وہ سچ مچ تمھیں پھانسی دینے والے ہیں۔ یہاں جلاد سے لے کر پھانسی گھاٹ تک پورا انتظام ہے ان کے پاس اور مجھے کوئی ایسی صورت بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی چمتکار ہو جائے اور تم بچ جاؤ۔"

"تم مجھے یہاں سے نکال سکتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا "لیکن تمہاری جگہ مجھے اپنی گردن دینا پڑے گی۔ مہاراج معاف کرنا نہیں جانتے ہیں اور غداروں کو

تو وہ کسی صورت نہیں بخشتے۔ یہ چیخیں سن رہے ہو تم، یہ اس عورت کی ہیں جسے کل شکار چور ساتھیوں کے ساتھ پکڑ کر جیل میں لایا گیا تھا۔ دوسرے ملزمان کو آج عدالت میں پیش کیا گیا تھا "انھیں قید اور کوڑوں وغیرہ کی سزا سنائی گئی ہے لیکن اس عورت کو ایسے خطرناک قیدیوں کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے جنھوں نے پچھلے چار چار پانچ پانچ سال سے عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ انھیں کھلی چھٹی دے دی گئی ہے، اب تم خود سوچ لو صبح تک اس پر کیا نہیں گزر جائے گی لیکن اس کے باوجود اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لنگڑے ہو جانے والے گھوڑے کی طرح اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ امتیازی سلوک اس عورت سے اس لیے کیا جا رہا ہے کہ چند ماہ پہلے وہ مہاراج کے محل میں خادمہ رہ چکی ہے۔ اس حوالے سے اسے مجرم کے بجائے غدار ٹھہرایا گیا ہے اور غداری کی سزا دی جا رہی ہے۔ مہاراج اپنے ملازمین کے لیے جتنے مہربان ہیں اتنے ہی قہرمان بھی ہیں۔ میری ایک بھولی بھالی پتنی اور تین معصوم بچے ہیں۔ میں تمہاری زنجیریں کاٹ کر ان کی اور اپنی زندگیاں اجیرن کیوں کروں گا اور میرے خیال میں میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ مہاراج کے گھرانے سے وفاداری میرے خون میں کئی نسلوں سے پروان چڑھ رہی ہے اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔"

"فطرت ثانیہ بن چکی ہے تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے اسے تاؤ دلایا۔

وہ بولا "تمہاری دلیری سے میں متاثر ہوا ہوں۔۔۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ یہ دلیری نہیں بے وقوفی ہے یا پھر تمہارا کوئی پیچ ڈھیلا ہے جو اس صورتِ حال کی اصل سنگینی کا احساس نہیں کر رہے ہو۔"

"چلو احساس کر لیا" میں نے کہا "اب بتاؤ کیا کروں، روؤں، پیٹوں یا واویلا کروں۔"

وہ بولا "رونے پیٹنے یا واویلا کرنے سے کچھ فائدہ ہوتا تو میں تمھیں اس کا مشورہ ضرور دیتا۔ تمہارے پاس تو رحم کی اپیل کرنے کی رعایت بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیوں میرا دماغ چاٹ رہے ہو۔ جاؤ، جا کر پتنی کی بغل میں گھس کر سو جاؤ۔"

میں رُخ دوسری جانب پھیر کر لیٹ گیا۔ نرائن کی بے وقت آمد اور بے مقصد گفتگو نے مجھے واقعی جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اس وقت یکسوئی سے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ کوئی راستہ نکلنے کا، کوئی حل اس گمبھیر مسئلے کا۔

عدالتی کارروائی کے دوران یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ مسٹمن کی اطلاع پر ہی مجھے مہمان خانے میں پابند کیا گیا تھا۔ اس وقت اس محل میں موجود دونوں عرب شکاریوں کا تعلق بھی دبئی سے تھا۔ انہوں نے مسٹمن کے ساتھ پورا تعاون کیا تھا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر ٹیلی فون پر مسٹمن کا رابطہ شیخ عاصم سے کرا دیا گیا تھا۔ ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو میں ترجمانی کے فرائض نرائن کاکا نے انجام دیے تھے۔ مسٹمن نے شیخ عاصم پر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ وہ اُستاد جہانی جو برسوں سے انھیں مطلوب ہے اس وقت ریاست نانڈل کے مہاراج رتن سنگھ کے محل میں موجود ہے۔ مسٹمن، شیخ کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کی اطلاع پر شیخ کے پَر لگ گئے تھے اور وہ چند گھنٹوں کے اندر اندر دبئی سے اُڑ کر پہنچ گیا تھا۔

***

اگلے چوبیس گھنٹے میں میرا اضطراب بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ مجھ سے بالکل وہی سلوک کیا جا رہا تھا جو جیلوں میں تختۂ دار کے مسافر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری کوٹھری کی روشنی سارا دن اور ساری رات جلتی رہی۔ مجھے ایک مصلّیٰ اور قرآن شریف مہیا کر دیا گیا تھا۔ چند سادہ کاغذ اور ایک قلم بھی دیا گیا۔ کھانا بڑے اہتمام کے ساتھ لیکن ہلکا پھلکا دیا جا رہا تھا۔ پہرے داروں کی نگاہوں میں میرے لیے پہلے جیسی وحشت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آ گھستا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جان بوجھ کر ایسا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ میں پل پل موت کو اپنی طرف بڑھتا دیکھوں۔ مجھے یوں لگا کہ یہ کیفیت برقرار رہی تو میرے اعصاب ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہو جائیں گے۔ مشکل یہ تھی کہ میں اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تن تنہا تھا۔ باہر سے کسی مدد کی اُمید نہیں تھی۔ صفدر اور زریں گل نہ جانے کس حال میں تھے اور تھے بھی یا نہیں؟ رہی غزالہ تو وہ خود گرفتارِ بلا تھی۔ میں نے کئی بار کوٹھری کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ کہیں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آئی تھی جو میرے نقطۂ نظر سے "خوبی" ہوتی اور مجھے باہر نکلنے میں مدد دے سکتی۔ کوٹھری میں آمد و رفت کا واحد راستہ ایک سلاخ دار دروازہ تھا اور اس میں بہت بھاری قفل جھول رہا تھا۔ پہرے دار ان سلاخوں میں سے ہی میرے استعمال کی اشیا اندر رکھ دیتے تھے۔

سخت بے چینی اور حبس کے باوجود اگلے روز دوپہر کے فوراً بعد مجھے نیند آ گئی۔ نیند کی مہربان دیوی مجھے نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی رہی۔ آنکھ کھلی تو میں پھر اسی قفس میں تھا۔ ایک موٹے تازے پہرے دار نے جو اپنے ڈیل ڈول

جیل کا وارڈن نظر آتا تھا۔ اپنے پستول کا دستہ آہنی سلاخوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر مسلسل آواز پیدا کی تھی اور مجھے جگا دیا تھا۔ اس نے سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی نظر آئی۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے کاغذ دیکھے بغیر پوچھا۔

"حکم نامہ ہے۔ ہز ہائی نس کی مہر کے ساتھ جاری ہوا ہے۔ تم اسے بلیک وارنٹ بھی کہہ سکتے ہو" پہرے دار نے کسی روبوٹ کی طرح بالکل غیر جذباتی لہجے میں کہا "کل صبح پانچ بجے تمہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ اگر کوئی خواہش ہے تو تم بیان کر سکتے ہو۔"

یہ تماشا بہت طول پکڑتا جا رہا تھا۔ مجھے اس سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اپنی اندرونی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے میں نے پوچھا "خواہش سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میری سب سے بڑی خواہش تو یہی ہے کہ تم میری یہ ہتھکڑیاں کھولو اور مجھے یہاں سے نکال دو۔"

وہ بولا "تم جانتے ہو کہ یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "شیخ عاصم یا تمہارے ہز ہائی نس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"یہ بھی ناممکن ہے" وہ بولا "ہز ہائی نس اور معزز مہمان اس وقت اسٹیٹ میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی واپسی رات گئے ہوگی اور اس وقت انہیں تم سے ملانا ممکن نہیں ہوگا۔"

"پھر لتا منگیشکر کا ایک گانا سنوا دو یا ہیما مالنی کی ایک ویڈیو لا دو" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

وہ ناگواری سے بولا "اس کا مطلب ہے، تمہاری کوئی خواہش نہیں ہے؟"

میں نے کہا "آخر کس قسم کی خواہش تم مجھ سے بیان کروانا چاہتے ہو؟"

وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا "مثلاً تم اپنی محبوبہ سے آخری ملاقات کر سکتے ہو۔"

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ میں حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا "کون محبوبہ؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ جیپ میں سفر کر رہی تھی۔ غزالہ نام ہے اس کا۔ تمہاری اس کی بہت پرانی یارانہ ہے۔"

فربہ اندام وارڈن نے مجھے ایک کامیاب سرپرائز دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ غزالہ کی شناخت چھپی نہیں رہ سکی۔ معلوم نہیں اسے کسی نے پہچانا تھا یا پھر وہ خود ہی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ کہیں اس پر تشدد تو نہیں کیا گیا؟ یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح میرے ذہن میں پیوست ہو گیا۔ میں لاکھ انکار کرتا لیکن وہ میری محبت تھی۔ میرے دل کی تختی پر اس کا نام انمٹ روشنائی سے لکھا تھا۔ اس کی بابت خدشات میرے ذہن میں ابھرے تو میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

میں نے وارڈن سے پوچھا "کہاں ہے وہ؟"

وہ زیرلب مسکرایا اور بولا "یہیں لیبر میں ہے۔ اگر تم چاہو تو اسے یہاں لایا جا سکتا ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ہاں... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ شام... شام غم تھی جو دھیرے دھیرے ایک تاریک صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماحول ہر شخص پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ مجھ پر بھی ہو رہا تھا لیکن میں نے ماحول کے اثر کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک بھروسا تھا مجھے کہ پھانسی گھاٹ کے تاریک کنوئیں میں بے بسی سے جھولنا میرا مقدر نہیں ہے۔ میں دروازے کی آہنی سلاخوں سے لگا ہوا تھا اور اس راہداری کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے غزالہ کو برآمد ہونا تھا۔ میرا انتظار طویل ضرور ثابت ہوا لیکن رائیگاں نہیں گیا۔ قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس کا جانا پہچانا سراپا میرے سامنے آ گیا۔ ہلکے براؤن رنگ کی ایک چادر نے اسے سرتاپا چھپا رکھا تھا۔ وہ چند پہرے داروں کے ساتھ کوٹھری کے سامنے پہنچی اور ساکت کھڑی ہو گئی۔ اسے روبرو پا کر اپنے دلی جذبات چھپانا بہت مشکل ہوتا تھا لیکن اب مجھے اس کام کی مشق ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے کی دھوپ، زلفوں کی چھاؤں، آنکھوں کی چمک... بہت سے جانے پہچانے رنگ میرے سامنے تھے۔ میں نے دیکھ لیا، اس کی سرخ آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا ایک سیلاب تھما ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آ گئی اور سرسراتے لہجے میں بولی "یہ لوگ کہہ رہے ہیں... یہ کیوں کر رہے ہیں ایسی باتیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایک دم آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسل گئے۔ وہ کراہی "میری زبان ساتھ نہیں دے رہی... لیکن آپ سب جانتے ہیں۔ آپ کہہ کیوں نہیں دیتے یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بکواس ہے۔"

میں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہاں... یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی پھانسی نہیں لگا رہا مجھے۔ یہ صرف... صرف ہمیں خوف زدہ کرنے اور ہمارے اعصاب کو توڑنے کا منصوبہ ہے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ کچھ نہیں ہونے والا مجھے... اور ایک بات ذہن میں رکھو" میں نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا "ممکن ہے یہاں قریب ہی کوئی موجود ہو یا ہماری آواز ریکارڈ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات؟" غزالہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ مجھے حوصلہ مند دیکھ کر اس کے ہیجان اور ہراس میں بھی کمی واقع ہوئی تھی۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا "تم یہاں کیسے پہنچی ہو؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو غزالہ کو ایک طویل تمہید باندھنا پڑتی لیکن اس وقت وہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے پاس مختصر وقت ہے۔ وہ بولی "مجھے قادر زماں کی بیوی کو دیکھنے کے لیے جھنگ جانا پڑا تھا۔ ابھی اس کی ڈلیوری میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ مگر اتفاقاً اس نے بچے کو جنم دے دیا۔ قادر زماں کے ذاتی اسپتال میں ناکافی سامان کے ساتھ وہ آپریشن میں نے جن مشکلوں سے کیا وہ میں ہی جانتی ہوں۔ زچہ و بچہ دونوں کی جان بچ گئی۔ قادر زماں ایک خوب صورت بچی کا باپ بن گیا۔ طوطا چشمی اور مطلب پرستی کی انتہا یہ ہے کہ باپ بننے کے صرف ایک گھنٹے بعد اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا جس سے ہمیں ترنم زماں بار بار خبردار کرتی رہی ہے۔ میں جب لاہور واپس جانے کے لیے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی، قادر زماں کے کارندوں نے مجھے روک لیا اور واپس حویلی میں پہنچا دیا۔ دس پندرہ منٹ پہلے مجھے کافی میں ملا کر کوئی خواب آور دوا پلائی جا چکی تھی۔ واپس حویلی پہنچنے کے چند منٹ بعد میں ایک صوفے پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ دوبارہ میری آنکھ تقریباً دس گھنٹے بعد کھلی۔ میں نے ایک بند کمرے میں خود کو شنکر شنکرا کے روبرو پایا۔ کمرے میں بہت سی شرمناک تصویریں لگی تھیں۔ شنکر بے تحاشا شراب پی رہا تھا اور خونی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے سینے پر تیزدھار آلے کا ایک تازہ زخم تھا۔ مجھے وہ زخم دکھا کر کہنے لگا..." بولتے بولتے غزالہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے کو شرم کی سرخی نے ڈھانپ لیا۔

"کیا کہا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "اس نے میرے اور آپ کے بارے میں نازیبا بات کہی اور کہنے لگا کہ چند گھنٹے پہلے یہ زخم آپ نے اسے لگایا ہے۔ وہ اس زخم کا بدلہ مجھ سے لینے کی باتیں کر رہا تھا اور غلیظ دھمکیاں دے رہا تھا" غزالہ کی خوب صورت آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو ٹپکنے لگے۔

"اس نے تمہیں کوئی جسمانی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟" میں نے پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" غزالہ نے جواب دیا "اس نے مجھے بتایا کہ میں پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہوں اور یہاں کوئی میری مدد کو نہیں پہنچنے والا۔ پھر اس نے فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں آپ سے بات کروں۔ ابھی میں نے بمشکل آپ کی آواز ہی پہچانی تھی کہ اس نے ریسیور مجھ سے چھین لیا۔ آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میرا شکار پندرہ بیس منٹ بعد خود چل کر یہاں پہنچ رہا ہے پھر میں تمہیں ایک یادگار تماشا دکھاؤں گا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ کر شراب پیتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ پورا کمرا دھوئیں سے بھر دیا تھا اس نے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اچانک باہر سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ شنکر جلدی سے اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بولٹ گرا کر دروازہ کھولتا، میں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ یقین کریں مجھے اب تک اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ کمرے کی ایک کھڑکی زوردار آواز سے ٹوٹ گئی یا کھل گئی۔ ایک دیوانہ سا شخص جست لگا کر اندر آیا۔ یہ الجھی ہوئی داڑھی اور لمبے بالوں والا وہی شخص تھا جو بعد میں ہمارے ساتھ جیپ میں سوار ہوا اور حادثے کا شکار ہوا۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں وہ کسی جن ہی کے مانند نمودار ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک وزنی پتھر تھا۔ وہ کسی درندے کی طرح شنکر شنکرا پر جھپٹا۔ شنکر شنکرا نے اپنا پستول نکالنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی ملنگ نما شخص نے پتھر سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ یہ بڑی زوردار ضرب تھی۔ میں نے شنکر کو لہرا کر اس تپائی پر گرتے دیکھا جہاں اس نے بوتلیں اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ اس کے بعد مجھے کسی نے عقب سے دھکا دیا۔ میں چکرا کر کسی چیز سے ٹکرائی اور بے ہوش ہو گئی۔ تاہم یہ بے ہوشی بہت گہری نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے اردگرد کے ماحول کا احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں کسی شخص کی بہت بھاری آواز سن رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ ملنگ نما شخص میرے سرہانے کھڑا ہے اور کسی سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے اس کے گلے میں پڑی ہوئی مالاؤں کے آپس میں ٹکرانے کی آوازیں سنیں۔ کسی نے میری آستین کھینچ کر اوپر چڑھائی اور مجھے انجکشن لگا دیا۔ اس انجکشن کے بعد میں گہری بے ہوشی میں چلی گئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد میرے حواس نے دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ میں سخت تپش محسوس کر رہی تھی اور کسی گاڑی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ آنکھیں کھول سکوں اور اپنے اردگرد دیکھ سکوں۔ کچھ دیر بعد اچانک گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے خود کو گرم ریت پر پایا۔ بہت کوشش کرکے میں اٹھ بیٹھی۔ میرے ایک پاؤں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور سر سے خون بہہ کر رخسار تک پہنچ رہا تھا۔ پھر میری نگاہ آپ پر پڑی۔ آپ ریت پر بے سدھ پڑے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں کے بل چلتی آپ تک پہنچی۔ بہت دیر تک آپ کو جگانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بے دم ہوکر لیٹ گئی۔ آپ بہت گہری بے ہوشی میں تھے۔ میں نے آپ کا بازو دیکھا۔ آپ کو تین انجکشن لگائے گئے تھے بلکہ میرے بازو پر صرف ایک انجکشن کا نشان تھا۔ جلد ہی شام ہوگئی۔ وہ رات میں نے بڑی تکلیف میں گزاری۔ بھوک پیاس سے جان لبوں پر آئی ہوئی تھی۔ رہی سہی کسر بازو کی موچ اور سر کی چوٹ نے پوری کردی تھی۔ دور تک ریت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اگلے روز جب دھوپ نے شدت پکڑی تو مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی پھر آہستہ آہستہ سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔"

غزالہ نے اپنی روداد مکمل سنادی تھی۔ میں نے بھی مختصر الفاظ میں اسے اپنے چیدہ چیدہ حالات سے آگاہ کیا تاہم جنگل میں حویلی سے برآمد ہونے والے دفینے اور گمشدہ لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ فی الحال غزالہ کو یہ باتیں بتانا مناسب نہیں تھا نہ ہی ان باتوں سے آگاہی اس کے لیے سود مند تھی۔

باتوں کے دوران غزالہ کی نگاہ اس کاغذ پر پڑ گئی جو میں نے بے پروائی سے فرش پر پھینک دیا تھا۔ یہ وہ حکم نامہ تھا جسے ذرے اندام پہرے دار نے بلیک وارنٹ کا نام دیا تھا۔ میں نے غزالہ کی نگاہیں کاغذ پر جمی دیکھیں تو کاغذ کو جلدی سے اٹھاکر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ چونک کر بولی۔

"تمہارے مطلب کی چیز نہیں" میں نے بے رخی سے کہا۔

اس کی آنکھوں کے کنارے اور ناک کی پھننگی سرخ ہوتی جارہی تھی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ گلوگیر آواز میں بولی "شاہ جہاں! آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس کوٹھری سے بو آرہی ہے۔ یہ لوگ آپ کو پیشاب وغیرہ کے لیے بھی باہر نہیں نکالتے ہیں۔ کوٹھری کے اندر ہی آپ کو حاجت کرنی پڑ رہی ہے۔ یہ کیوں کررہے ہیں ایسا؟ کون لوگ ہیں یہ؟"

میں نے کہا "مجھ سے زیادہ تمہیں معلوم ہوگا۔ میں پہلے مہمان خانے میں تھا اب اس سرکاری مہمان خانے میں ہوں۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر ناگواری کی لکیریں پھیل گئیں بولی "یہ مہاراج رتن سنگھ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا۔ بہ ظاہر بااخلاق بنتا ہے لیکن اس کے اخلاق کے پیچھے واہیات چھپی ہوئی ہے۔ ہر وقت گھورتا رہتا ہے، مجھے اس کے دیکھنے کے انداز سے نفرت ہے۔"

میں نے کہا "تم سے پوچھ گچھ نہیں کی گئی؟"

"کی گئی تھی۔ میں نے کچھ بھی بتانے سے انکار کردیا۔ مہاراج رتن سنگھ منہ ٹیڑھا کرکے بولا "نہ بتائیے، ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔ یہاں جو کچھ ہوگا آپ کی مرضی سے ہوگا۔" وہ خبیث بہت ڈھکی چھپی باتیں کرتا ہے۔ دو تین روز تک اس نے مجھ سے بالکل بازپرس نہیں کی لیکن دو روز پہلے جب اسے یہ پتا چلا کہ آپ نہال سنگھ نہیں شاہ جہاں ہیں اور میرا نام پتا بھی معلوم ہوا تو وہ میرے پاس آیا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ ہم دونوں کس چکر میں یہاں پہنچے ہیں۔ اس وقت گھنی مونچھوں والا ایک دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ غیر ملکی لگتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر زبان بند رکھی۔ غیر ملکی مجھے وحشت نظروں سے دیکھنے لگا تاہم مہاراج رتن سنگھ ٹال مٹول کرکے اسے باہر لے گیا۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایک دم لوگ ہمارے اصل ناموں سے کیسے واقف ہوگئے؟ کہیں۔۔۔" وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا "نہیں۔۔۔ میں نے کچھ نہیں بتایا انہیں۔"

غزالہ کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی۔ میں مشتمن کے بارے میں بتاکر اس کی یہ الجھن دور کرسکتا تھا لیکن اس الجھن کی دوری سے بہت مہنگی پڑنا تھی۔ اسے مشتمن کے بارے میں پتا چل جاتا تو یہ بھی پتا چل جاتا کہ مجھے اس کوٹھری میں بند کرنے والے کون ہیں۔ دبئی کے باشندوں کی موجودگی میں اس کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ یہ دبئی کے راشد بن ارشد والا پرانا خونی جھگڑا ہے۔ وہ پہلے ہی اندیشوں سے ہلکان ہورہی تھی، اصل بات کا پتا چل جاتا تو رونا دھونا شروع کردیتی۔

ہم سرگوشیوں میں بات کرنے کے لیے ایک دوسرے

کے بہت قریب آگئے تھے۔ اس کی مشکی سانسیں میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جھیل سی شفاف آنکھیں اس قدر نزدیک تھیں کہ میں ان میں تیرتے ہوئے ڈوروں کے پیچ و خم دیکھ سکتا تھا۔ ابتلا کے اس موڑ پر ہم نے ماضی قریب کے پُرسرور لمحات یکسر فراموش کردیے تھے جو طویل جدائیوں کے بعد ہم پر بن کر آئے تھے۔ مری کی جی پی او کے سہ راہے پر غزالہ اداس کی تصویر بنی کھڑی رہ گئی تھی اور میں کوشش کے باوجود اس کی اشک شوئی نہیں کرسکا تھا لیکن آج حالات کا دھارا ہمیں بہاکر پھر ایک دوسرے کے سامنے لے آیا تھا۔ وہ بھی میرے پاس آنے کی زحمت سے بچ گئی تھی اور میں اسے منانے کی شرمندگی سے محفوظ رہا تھا۔

میں نے بہت دھیمے لہجے میں غزالہ سے پوچھا کہ وہ کیسی کس جگہ مقیم ہے۔ اردگرد کتنے ملازم یا نگران ہیں اور یہاں سے نکل بھاگنے کے کیا امکانات ہیں؟ غزالہ نے مجھے سوالات کے جواب تفصیل سے دیے۔ صورت حال ایسی ناممکن نہیں تھی۔ میں نے غزالہ سے کہا "آج رات دس اور گیارہ بجے کے دوران میں اس کوٹھری سے نکل جاؤں گا۔ تم ان اوقات میں تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ ہم دونوں یہاں سے نکلیں گے لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا تو بھی پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔"

وہ بے قرار ہوکر بولی "نہیں شاہ جہاں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے یہاں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں۔ میرے چکر میں پڑکر آپ اپنے لیے خطرات اور بڑھالیں گے۔ بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔ بے شک آپ چھپاتے رہیں لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی زندگی کے لیے یہاں سخت خطرہ ہے لیکن آپ۔۔۔ آپ یہاں سے نکلیں گے کیسے؟"

میں نے خشک لہجے میں کہا "ان سوالوں کے لیے اپنے آپ کو پریشان مت کرو۔ جو تم سے کہہ رہا ہوں وہ کرو۔" وہ مزید کوئی سوال پوچھتی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں ایک جھلک نظر آنے لگتی تھی اور یہ "جھلک" ایسی تھی کہ میرے اندر ایک پل میں انگارے دہکا دیتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کرلوں یا غزالہ کے چہرے پر اس طرح نظریں ڈالوں کہ اس کا رخ دوسری طرف پھر جائے۔

میں غزالہ کو چند ہدایات مزید دینا چاہتا تھا لیکن باہر کسی کی کرخت آواز نے بات پوری نہیں ہونے دی۔ وہ کہہ رہا تھا "ٹائم ختم ہوگیا ہے بی بی! اب آپ اٹھ جائیں۔" غزالہ

نے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا اور پھر پہرے دار کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ لانے والے اسے مجھ سے آخری ملاقات کے لیے یہاں لائے تھے۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے مجھے خدا حافظ کہہ کر کیسے چلی جاتی۔ وہ روتی چلاتی، دروازے کی آہنی سلاخوں سے لپٹ جاتی، پہرے داروں سے الجھتی، انہیں رحم کے واسطے دیتی، وہ اسے گھسیٹ کر یہاں سے لے جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بے ہوش ہی ہوجاتی۔ اس منظر کا تصور کرکے نہ جانے کیوں ایک انگریزی ڈرامے کا پُردرد انجام میری نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس ڈرامے میں مصنف پھانسی کے ایک قیدی سے اس کی ماں کی آخری ملاقات کا ذکر بڑے دردناک انداز میں کرتا ہے۔ حکومت کا باغی بیٹا پھانسی پارہا ہے، ماں اس سے آخری ملاقات کررہی ہے۔ یہ ملاقات طویل تر ہوتی جارہی ہے۔ آخر پہرے دار ماں سے دوٹوک لہجے میں کہتے ہیں "وقت ختم ہوا، اب اسے جانا ہوگا۔" وہ پہرے داروں پر چلاتی ہے "ایک ماں سے کہتے ہو کہ وہ اپنے زندہ بیٹے کو چھوڑ کر چلی جائے اور کل اس کا مرا ہوا چہرہ دیکھے۔ تم کیسے انسان ہو؟ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ماں اپنے بچے کو مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ تم بتاؤ کیا تمہاری مائیں ایسا کرسکتی ہیں؟ جاؤ ان سے جاکر پوچھو، انہوں نے کس طرح اپنا لہو پلا پلا کر تمہیں پالا ہے۔ ایک ایک پور بڑھتے پھولتے دیکھا ہے۔" وہ سلاخوں سے لپٹ جاتی ہے اور اس شدت سے لپٹتی ہے کہ اس کی کلائیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس طویل اور اندوہناک منظر کا اصل مقصد ان پریشان حال لوگوں کی بے بسی کا نقشہ کھینچنا تھا جن کے کسی قریبی عزیز کو اگلے روز پھانسی دی جارہی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے سر کو جھٹک کر یاس بھرے یہ خیالات ذہن سے نکالے اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔ گھڑی میرے پاس نہیں تھی لیکن غزالہ سے مجھے وقت معلوم ہوگیا تھا۔ سہ پہر کے پانچ بجے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد شام کے سائے دراز ہوجاتے۔ ڈھانچے والے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر رات دس گیارہ بجے تک میں کوئی کارکردگی نہ دکھاسکا تو کلی طور پر حالات کے رحم و کرم پر رہ جاؤں گا۔

کوٹھری سے نکلنے کا میرے پاس واحد راستہ یہی تھا کہ میں کسی طرح پہرے داروں کو دروازہ کھول کر اندر آنے پر مجبور کردوں، وہ اندر آئیں تو ان سے بھڑ جاؤں اور کسی طور نکل بھاگنے کی کوشش کروں۔ پہرے داروں کو اندر بلانے کا

طرف سے اچانک شدید خطرہ لاحق ہوجائے۔ وہ نتائج پر زیادہ غور کیے بغیر اندر گھس آئیں اور مجھے اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کا موقع فراہم کریں۔ کم از کم پانچ پہرے دار میرے اردگرد موجود تھے۔ ان میں فربہ اندام وارڈن بھی تھا۔ وارڈن کے پاس پستول تھا جبکہ باقی افراد میں سے دو آٹومیٹک رائفلوں سے مسلح تھے۔ یہ وہ افراد تھے جو مجھے نظر آرہے تھے' جو نظر نہیں آرہے تھے ظاہر ہے وہ بھی دوست اور خیرخواہ تو نہیں تھے۔ میں نے بہت سوچ بچار کی لیکن خود کو تکلیف میں ظاہر کرکے پہرے داروں کو اندر بلانے کا طریقہ قابل عمل محسوس نہیں ہوا۔ ایک تو یہ گھسا پٹا طریقہ تھا' دوسرے پہرے دار بھی خاص طور سے محتاط تھے۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ انہیں کسی بھی صورت اندر نہ جانے کی خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میری نگاہ اس بلب پر جاکر ٹک گئی جو کوٹھری کی چھت پر روشن تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' یہ بلب پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے بجھایا نہیں گیا تھا۔ اس بلب کا سوئچ کوٹھری کے باہر تھا اگر میں اس بلب کو توڑ دیتا تو نیا بلب لگانے کے لیے پہرے داروں کو اندر آنا پڑتا۔ اسی خیال کے تحت میں نے اندھیرا چھاتے ہی بلب کو "شہید" کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں' جیل میں پھانسی کی کوٹھریوں کو روشن رکھنے کے لیے جو لائٹ لگائی جاتی ہے' وہ کوٹھری سے باہر ہوتی ہے۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ قیدی کہیں لائٹ کا شیشہ توڑ کر اس سے خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے لیکن مہاراج کی اس جیل میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی تھی۔

میں نے پہلے تو ایک پہرے دار سے ڈانٹ ڈپٹ کی اور اسے کہا کہ وہ کوٹھری کی لائٹ آف کردے۔ ظاہر ہے وہ ایسا کرنے سے معذور تھا۔ جب اس نے بات نہیں مانی تو میں نے کھانے کی خالی ٹرے اچھال کر بلب توڑ دیا۔ کوٹھری میں گہری تاریکی چھاگئی۔ پہرے دار نے فوراً ایک ٹارچ روشن کرلی اور دوسرے پہرے دار کو آوازیں دینے لگا۔ میں پوری طرح چوکس ہوگیا۔ یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ کوٹھری کو روشن رکھنے کے لیے اور نیا بلب لگانے کے لیے کوٹھری کا دروازہ کھولنا پڑے گا لیکن میری امیدوں پر اس وقت اوس پڑگئی جب نیا بلب کوٹھری کے اندر لگانے کے بجائے کوٹھری سے باہر برآمدے میں لگادیا گیا۔ ایک پہرے دار اسٹول پر چڑھ گیا' دوسرے نے ٹارچ کی روشنی چھت پر ڈال کر ہولڈر تلاش کیا اور اس میں بلب اڑس دیا۔ اچانک میرے جسم میں بجلی سی کوندگئی۔ یہ عمل کا وقت تھا۔ بلب لگانے کے لیے اسٹول پر چڑھا ہوا پہرے دار مجھ سے تقریباً تین فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے کندھے سے سیون ایم ایم جھول رہی تھی۔ یہ برسٹ مارنے والی شاندار گن تھی۔

اس سے پہلے کہ برآمدے کا بلب روشن کیا جاتا اور پہرے دار اسٹول سے اترتا میں نے اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکالے اور قمیص کے اوپر سے اس کے پیٹ پر ہاتھ ڈالا ایک اچانک اور نہایت شدید جھٹکے کے ساتھ میں نے اسے اپنی جانب کھینچا۔ وہ آہنی سلاخوں سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے ایک بھیانک آواز نکل گئی۔ میں نے پھرتی سے گن اندر کھینچ لی۔ جونہی میں نے رائفل والے کا پیٹ چھوڑا وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر جاگرا۔ آہنی دروازے کی ضرب اس کے لیے کافی شافی ثابت ہوئی تھی۔

دوسرے پہرے دار نے اپنا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھایا "خبردار" میں نے چلاکر کہا "گولی چلادوں گا۔"

پہرے دار ٹھٹک گیا۔ دو پہرے دار جو خالی ہاتھ تھے' سرپٹ مخالف سمت میں بھاگے۔ ان کے جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس منحوس کوٹھری کی چابی اسی پہرے دار کے پاس ہے جو اس وقت میری رائفل کی زد پر ہے نہ زندوں میں ہے اور نہ مردوں میں "خبردار۔ چالاکی نہ دکھانا۔ ایک سیکنڈ میں چھلنی کردوں گا۔"

میں نے اسے تحکمانہ دھمکی دی "اپنی رائفل فرش پر' اور دروازے کا تالا کھولو۔"

میرے لہجے میں وہی خداداد حرارت عود کر آئی تھی جو میرے مخالف کو مبہوت کردیتی تھی۔ ایک لمحہ شدید تذبذب میں رہنے کے بعد پہرے دار نے وزنی رائفل فرش پر رکھ دی "چلو تالا کھولو۔ جلدی کرو" میں نے بے تاب ہوکر کہا۔ پہرے دار اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ نہیں کرپارہا تھا۔ اس نے دو قدم دروازے کی طرف بڑھائے پھر اچانک پینترا بدلا اور برآمدے کے متوازی بھاگ کھڑا ہوا۔ "رک جاؤ" میں نے کہا اور ساتھ ہی ٹریگر دبادیا۔ رائفل کی نال سے دھماکوں سے شعلے اگلے۔ پہرے دار لہراتا ہوا ایک ستون سے ٹکرایا۔ نیم تاریک برآمدے میں وہ مجھے ایک ہیولے کی طرح نظر آرہا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

جیل کے بیرونی دروازے پر اب شوروغل مچا ہوا تھا۔ پہرے دار ایک دوسرے کو پکار رہے تھے اور چوکس تھے۔ برآمدے کا بلب روشن ہونے سے پہلے ہی پہرے دار پر ہاتھ ڈال دیا تھا لہٰذا میری کوٹھری اور بر

آمدے والا حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بات میرے حق میں جارہی تھی۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ میں تاریکی میں تھا۔ اور پھانسی کا قیدی تھا۔ پہرے دار میرے قریب آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ بے شک وہ مہاراج کے وفادار تھے لیکن انہیں اپنی زندگیاں بھی پیاری تھیں۔ وہ مارے جاتے تو مہاراج ان کے یتیم بچوں کی پرورش کا انتظام کردیتا۔ ان کی بیواؤں کو زمین الاٹ کردی جاتی۔ لواحقین کو تعریفی سرٹیفکیٹ یا اسناد وغیرہ مل جاتیں لیکن اس سے کیا ہوتا' ان کی زندگیاں تو واپس نہ آتیں اور زندگی سے بڑھ کر قیمتی چیز اور کوئی نہیں۔ لہٰذا وہ کترا رہے تھے' اتنی جلدی "شہادت" کا رتبہ پانا نہیں چاہتے تھے۔

پہرے دار کا بے حرکت جسم مجھ سے تقریباً پچیس فٹ دوری پر تھا۔ اس کی جیب میں چابیوں کا وہ گچھا تھا جو اس زندان کو کھول کر مجھے زندگی کی طرف جانے کا راستہ دے سکتا تھا۔ لیکن پچیس فٹ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ میرا دھیان سیون ایم ایم کی طرف چلا گیا۔ میں اس کی فائرنگ سے وزنی تالا توڑنے کی کامیاب کوشش کرسکتا تھا' لیکن پھر رائفل خالی رہ جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟" ذہن کے کسی گوشے سے سوال ابھرا تھا وہیں سے جواب ابھرا۔ جو بھی ہو موت سے بڑھ کر کیا ہوگا اور موت تو یہاں ہر طرف تھی۔ شیخ عاصم بن راشد کی آنکھوں میں' مہاراج رتن سنگھ کی زہریلی مسکراہٹ میں۔ اس کوٹھری میں' پھانسی گھاٹ پر' راجدھانی میں۔ "یس۔ آئی ول گو" میں نے خود کو تیار کیا اور رائفل سونت کر آہنی دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں تالے کی صحیح لوکیشن جانتا اور رائفل کو ایکشن میں کرتا' میری کوٹھری اور برآمدے کا ایک حصہ روشن ہوگیا۔ یہ کافی تیز روشنی تھی اور کسی سرچ لائٹ سے پھوٹی تھی۔ روشنی کرنے والوں نے یہ عقلمندی کی تھی کہ سرچ لائٹ کو اوٹ میں رکھا تھا ورنہ میرے لیے ایک دو گولیاں ضائع کرکے اسے ناکارہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

چند لمحے بعد محسن کی پھنکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "جمالی! رائفل پھینک دو۔ تمہاری رائفلوں کے نشانے پر ہے۔"

محسن کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ یہ اعتماد قابل فہم تھا۔ کوٹھری روشن ہونے کے بعد میں ایک طرح نشانے پر تھا۔ اگر میں کہیں آڑ لینا چاہتا تو ایک نواڑی جوڑے کے سوا کوئی جگہ میسر نہیں تھی۔ اور یہ ستون مجھے بچانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے برعکس میرے مدمقابل افراد محفوظ جگہوں پر پوزیشنیں لے چکے تھے اور ان میں محسن بھی شامل تھا۔ مجھے اس کی آواز دائیں جانب دس پندرہ گز کی دوری سے آرہی تھی لیکن وہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک دھماکوں سے کئی گولیاں کوٹھری کی سلاخوں سے ٹکرائیں اور فرش پر چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ اس فائرنگ کے ذریعے محسن نے اپنے دعوے کی حقیقت ثابت کی تھی۔ وہ پکار کر بولا "جمالی! اس کے بعد چلنے والی گولیاں تمہیں لکیر دیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ رائفل کوٹھری سے باہر پھینک دو۔"

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ یہ لوگ میرے گلے میں رسے کا پھندا ڈالنا چاہتے تھے لیکن ایسی بات بھی نہیں تھی کہ پھندا ڈالے بغیر ان کا گزارا نہیں تھا۔ اصل مقصد تو میری جان لینا تھا اور جان اس کوٹھری میں بھی لی جاسکتی تھی۔ اگر وہ سمجھتے کہ مجھے ڈھیل دینے سے ایک دو افراد کی جانیں جاسکتی ہیں تو وہ اسی وقت مجھے شوٹ کرسکتے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ فی الوقت ان کی بات مان لی جائے۔ میں نے رائفل نیچے پھینک دی پھر اسے پاؤں سے دھکیل کر کوٹھری سے باہر کردیا۔ تاہم اسے سلاخوں سے زیادہ دور نہیں کیا۔ دوسری احتیاط یہ کی کہ دستہ اپنی جانب رکھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو میں ایک لمحے میں اسے دوبارہ ہاتھ میں کرسکتا تھا۔

ایک شخص محتاط قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے برآمدے کا بلب روشن کردیا اردگرد کے دو اور بلب بھی روشن کردیے گئے۔ گردونواح روشن ہوئے تو سرچ لائٹ بجھادی گئی۔ دیواروں پر سائے سے لہرائے اور پانچ چھ افراد مختلف اطراف سے نکل کر میرے سامنے آگئے۔ ان میں محسن کے علاوہ مہاراج رتن سنگھ خود بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھ گولی والی طاقت ور "ریوالور" تھی اور عقب میں ایک خوفناک بلڈاگ۔ وہ سخت طیش میں نظر آتا تھا۔ پھر مجھے شیخ عاصم بھی نظر آیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا مہاراج رتن سنگھ کے پاس آن کھڑا ہوا۔ سرخ نوپیوں والے دو اس شخص کو اٹھاکر باہر لے گئے جو میری فائرنگ کا شکار ہوا تھا۔ اس کی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ صرف اس کی ٹانگیں زخمی ہوئی ہیں اور وہ پوری طرح ہوش میں ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جسے میں نے صرف سلاخوں سے ٹکرایا تھا۔ ابھی تک لمبا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کے سر اور پیشانی پر دو جگہ گہری چوٹیں آئی تھیں اور ان چوٹوں نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔

شیخ عاصم بن راشد اور مہاراج سمیت ہر شخص مشتعل نظر آرہا تھا۔ مجھے تو لگا کہ وہ مجھے نہلائے دھلائے بغیر ابھی

نجانے کس گھاٹ کی طرف لے جائیں گے اور جلاد کی جگہ مہاراج رتن سنگھ خود اپنے ہاتھوں سے میری گردن میں پھندا ڈال کر اپنی آتما کو شانت کرے گا یا پھر وہ لمبے چکروں میں پڑنے کے بجائے ابھی سات آٹھ سو گرام پگھلا ہوا سیسہ میرے جسم میں سے گزار دیں گے۔

اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں ٹھن رہ گیا۔ وہ شخص بھی یک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص قبائلی ڈاکو عیسیٰ جان کا ایک ساتھی خناب آفریدی تھا۔ آزاد علاقے میں جب عیسیٰ جان نے غلام خاں سے ایک باز خریدا تھا تو باز کو جانچنے پرکھنے میں خناب نے ہی عیسیٰ جان کی مدد کی تھی۔ بعد میں وہ باز عیسیٰ جان سے افراہیم اور ارجمند بانو کے پاس آگیا تھا۔ فرید کوٹ میں ارجمند بانو کے کارندوں نے میری زبان کھلوانے کے لیے وہ باز مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔۔۔ بات دوسری طرف نکل گئی' میں خناب کی بات کر رہا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے خناب کو میں نے پہچانا ہے ایسے ہی اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے۔ پھر اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ خناب آفریدی نے ایک طرف جا کر نرائن کاکا سے کوئی بات کی۔ نرائن کاکا حیرانی کے عالم میں سنتا رہا پھر فوراً مہاراج رتن سنگھ کی طرف بڑھ گیا۔

میں حیران ہو رہا تھا۔ میں عیسیٰ جان کو پاکستان میں چھوڑ کر آیا تھا لیکن اس کے ساتھی آزادانہ یہاں گھوم رہے تھے اور عیسیٰ جان کے ساتھیوں پر ہی کیا موقوف' افراہیم' ارجمند بانو' شنکر سب یہاں دندنا رہے تھے' یوں لگتا تھا' ان لوگوں کے لیے پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحد نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ جب چاہا اُدھر چلے گئے' جب چاہا اِدھر آ گئے۔ یہ لوگ جس طرح چند گھنٹوں میں غزالہ کو جھنگ سے اغوا کر کے فرید کوٹ لے آئے تھے' محسوس ہوتا تھا کہ وہ ویزے وغیرہ کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔

نرائن کاکا' مہاراج رتن سنگھ اور شیخ عاصم وغیرہ سے بات کر چکا تو ان کے تاثرات یکدم بدلے ہوئے نظر آنے لگے۔ مہاراج رتن سنگھ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

★

تقریباً دس منٹ بعد مجھے ایک بجے سجائے شاندار کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ فرش پر دبیز قالین تھا' کھڑکیوں پر بھاری پردے' ایک بے آواز ائرکنڈیشنر نے کمرے میں خوشگوار خنکی مہیا کر رکھی تھی۔ فریج' ٹی وی' اٹیچ باتھ ہر سہولت یہاں موجود تھی۔ جس زدہ' بدبودار کال کوٹھری سے نکل کر اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچنا' جہنم سے جنت میں آنا تھا۔ جہنم کی صرف ایک نشانی میرے ساتھ تھی اور یہ وہ ہتھکڑی تھی جو پچھلے دو روز سے مسلسل میری کلائیوں کو جکڑے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر بعد جیل خانے کا فربہ اندام افسر اور نرائن کاکا کمرے میں داخل ہوئے۔ فربہ اندام افسر کے ہاتھ میں ہتھکڑی کی چابی تھی۔ وہ ملائمت سے بولا "ہز ہائی نس کے خصوصی آرڈر پر میں آپ کی ہتھکڑی کھولنے آیا ہوں۔"

میں نے کہا "اور وہ بلیک وارنٹ جو سہ پہر کو تم نے مجھے دیا تھا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ اس بلیک وارنٹ پر عمل نہیں کیا جا رہا" موٹے افسر نے کہا اور ہتھکڑی میں چابی گھما کر میرے ہاتھ آزاد کر دیے۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے داروغہ جی" میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "میں تو پوری تیاری کر چکا تھا۔ ویسے تو بہت گنہگار بندہ ہوں لیکن یقین تھا کہ ہز ہائی نس کے ہاتھوں بے وجہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جاؤں گا۔ اُف۔۔۔ سارے ارمان دل میں رہ گئے۔ پھلوں سے لدے ہوئے باغات' ٹھنڈی ہوائیں اور حورانِ بار وفا"

نرائن کاکا نے ائرکنڈیشنر کو "ہائی" پر سیٹ کرتے ہوئے کہا "یہ لو ٹھنڈی ہوائیں اور حوروں کا انتظام یہاں بھی ہو سکتا ہے۔"

"واہ واہ" میں نے ٹانگیں پھیلا کر شیشے کی تپائی پر رکھ لیں

"نرائن کاکا تمہاری اس اسٹیٹ سے گنگا گزرتی تو شاید وہ بھی الٹی بہتی۔ ہر بات نرالی ہے یہاں۔ جو منت سماجت کرتے ہیں اور بے گناہی کی دہائی دیتے ہیں ان پر بھوکے درندے چھوڑے جاتے ہیں۔ جو تمہارا اسلحہ چھینے اور تمہارے ایک دو بندے زخمی کر دے' اسے جنت نشین کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہاں لطف و کرم اسی شرط پر ہوتا ہے تو خدا کی قسم میں پہاڑ خون کی ندیاں بہانے کو تیار ہوں۔"

نرائن کاکا نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا

"اس کا جواب تمہیں ہز ہائی نس ہی دے سکتے ہیں۔ بہرحال میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ ان کے سامنے اس قسم کی طنزیہ گفتگو مت کرنا۔ وہ بہت تلون مزاج ہیں۔ فیصلہ بدلتے دیر نہیں لگاتے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں ان سے اس قسم کی طنزیہ گفتگو نہیں کروں گا۔ میں انہیں سیدھی سیدھی گالیاں دینا شروع کر دوں گا۔ مثلاً یہ کہ آپ کتے کے بچے ہیں' آپ کی اولاد ہیں' آپ کی ماں۔۔۔"

"خاموش!" فربہ اندام افسر چیخا "ہم گستاخی کرنے والے کی زبان کھینچ لیتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اس کی توند میں انگلی چبھوئی "یار! تم زبان کی بات کرتے ہو' میں تو گردن کٹوانے کو تیار ہوں۔ یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لو۔"

موٹے افسر کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔ شاید وہ مجھ پر جھپٹ ہی پڑتا لیکن نرائن کاکا نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر مجھ سے سرد لہجے میں بولا "تم دلیر کم اور بے وقوف زیادہ ہو۔ مجھے لگتا ہے' تم اپنے حالات پھر ویسے ہی کر لو گے جیسے تھوڑی دیر پہلے تھے۔۔۔ بہرحال وہ سامنے باتھ روم کا دروازہ ہے۔ وہاں تمہارے لیے لباس وغیرہ موجود ہے۔ تیار ہو کر کپڑے بدل لو۔ شاید ابھی تھوڑی دیر میں ہز ہائی نس تم سے ملاقات کریں۔"

باہر جانے سے پہلے اس نے بڑی تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آنکھوں آنکھوں میں موٹے افسر سے کوئی بات کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے تو میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور گھوم پھر کر اپنے اس نئے مسکن کا جائزہ لیا۔ یہ ایک سوئٹ تھا۔ اس میں دو کمرے' ایک چھوٹا سا اسٹڈی روم اور ایک بڑا سا باتھ روم تھا۔ اس سوئٹ میں دروازے کے علاوہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ نیم تاریکی بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے۔ باہر سے گرم ہوا کا جھونکا اندر گھس آیا۔ کھڑکی میں جالی تھی اور جالی کی دوسری جانب آہنی گرل تھی۔

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ لیکن دل کو زیادہ دھچکا اس وقت لگا جب میری نگاہ کھڑکی کے نیچے نظر آنے والے خوبصورت باغیچے پر پڑی۔ راجستھان کی "تنگ مزاج" زمین میں اتنا سرسبز باغ اگانا دولت ہی کا کرشمہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں گلبرگ لاہور کی کسی شاندار کوٹھی میں کھڑا ہوں لیکن اس خوش نما باغ کے بیچوں بیچ ایک کریہہ منظر مجھے گھائل کر رہا تھا۔ ناگ پھنی کے ایک درخت سے ایک خونچکاں لاش لٹک رہی تھی۔ کہیں قریب سے آنے والی روشنی میں لاش کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی۔ لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہی سانولی عورت ہے جس پر ایک روز پہلے بے تحاشا ستم ڈھایا جا رہا تھا۔ عورت کے ایک پاؤں سے رسی باندھ کر الٹا لٹکایا گیا تھا۔ اس کی دوسری ٹانگ عجب بے ڈھنگے انداز سے ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بوسیدہ بال زمین سے چھو رہے تھے۔ میں یہ "نظارہ" دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ مجھے لگا جیسے میں مہاراج رتن سنگھ جی کے تاریک دل کے اندر جھانک رہا ہوں' نہیں' کسی آسیب زدہ محل میں ہوں اور وہاں ارواحِ خبیثہ انسانوں کا روپ دھار کر ہولناک تماشے کر رہی ہیں۔ حیرت ناک بات تھی۔ کسی جانور کی لاش بھی یوں لٹکی ہوتی تو یہ ایک ناخوشگوار منظر ہوتا کہاں یہ کہ ایک انسان کی لاش سرعام جھول رہی تھی۔ پھر ایک سایہ سا لہرایا اور ایک مسلح پہرے دار گشت کے انداز میں کھڑکی کے بالکل قریب سے گزر گیا۔ میں نے کھڑکی بند کر کے پردہ برابر کر دیا۔ عین ممکن تھا کہ یہ لاش ابھی ابھی میری ہی نگاہ نوازی کے لیے یہاں لٹکائی گئی ہو۔۔۔ کہ دیکھو استاد جانی! اور عبرت پکڑو۔ مہاراج سے دغا کرو گے تو تمہاری بھی ایک ٹانگ سے رسا باندھ دیا جائے گا۔

"خوب صورت" باغیچے کے منظر نے میرے سر میں انگارے سے بھر دیے تھے۔ ان انگاروں پر پانی ڈالنے کے لیے میں باتھ روم میں گھس گیا۔ بڑا پر تکلف باتھ روم تھا۔ بارہ ضرب بارہ فٹ سے کم کیا سائز ہو گا اس کا۔ وارڈ روب' باتھ ٹب' فون بائیں بر سہولت یہاں موجود تھی۔ میں نے وارڈ روب کھول کر دیکھی۔ مختلف سائز اور انداز کے کم از کم تین درجن لباس یہاں موجود تھے۔ میں نے قد آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور دیکھتا رہ گیا۔ واقعی جیل نے کافی تبدیلی پیدا کی تھی میں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ بال الجھے ہوئے' داڑھی بڑھی ہوئی۔ جسم پر صرف ایک شلوار اور وہ بھی شکستہ تھی۔ سر سے بہہ کر جم جانے والے خون نے بالوں کو برش سی بنا دی تھی۔ میں نے پہلے شیو کی پھر اچھی طرح نہا دھو کر کھلی کی کھلی آستینوں والی قمیص اور لٹھے کی شلوار پہن لی۔ سر کے زخم کو حسب توفیق دوائی وغیرہ لگا کر میں باہر نکل آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے برق سی لہرا گئی۔ کمرا ایک دم بدلا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس تبدیلی کی وجہ غزالہ تھی۔ وہ سبز رنگ کی بھودار لان کا بے حد نفیس تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ پاؤں میں میچنگ سینڈل تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھی ایک انگلش میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ کر اس نے میگزین ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسرت آمیز اطمینان جھلک رہا تھا۔

"تم یہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ بولی "مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"کس لیے؟"

اس کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی "یہ بھیجنے والوں سے پوچھیے۔"

رات کے وقت ایک بند کمرے میں تنہا مرد کے پاس ایک لڑکی کو بھیجے جانے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا اور لڑکی بھی وہ جسے اس مرد کی محبوبہ سمجھا جا رہا ہو۔ مجھے اپنے سوال کے بے مقصد ہونے کا احساس ہوا۔

مجھے یاد آیا کہ باتھ روم میں گھسنے سے پہلے میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے کھول دیا تھا۔ میرے "اشنان" کے دوران غزالہ خاموشی سے آکر یہاں بیٹھ گئی تھی۔ میری غیر موجودگی میں ہی کمرے میں کچھ اور لوازمات بھی رکھ دیے گئے تھے۔ مثلاً رسالے، معدنی پانی، وسکی اور بیئر کی دو بوتلیں۔ غزالہ کے ساتھ ساتھ ناؤ نوش کا سامان دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اپنی ذہنیت اور ماحول کے مطابق ان لوگوں نے "محبوبہ" کے ساتھ میری ملاقات کا خوب خوب انتظام کیا تھا۔ انہیں اس رشتے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا جو میرے اور غزالہ کے درمیان استوار تھا۔ یہ جسم کا رشتہ نہیں تھا، بلکہ زبان اور آنکھوں کا بھی نہیں تھا۔ یہ تو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کسی موتی کی طرح چھپا ہوا ایک انمول جذبہ تھا۔ غزالہ اپنے موتی کی چمک مجھے دکھا چکی تھی لیکن میں نے اپنے دل کا موتی کیچڑ اور خس و خاشاک میں لپیٹ کر کہیں بہت دور رکھ چھوڑا تھا۔ کبھی کبھی خواہشات کی لہریں بہت زور مارتی تھیں اور اس موتی کو اچھال کر غزالہ کے سامنے لے آنا چاہتی تھیں مگر ایسے میں وہ نحس صورت میری آنکھوں میں گھوم جاتی تھی جس نے میرے اور میری بہن کے لیے اس دنیا کو جہنم بنایا تھا۔ وہ میری چچی فاخرہ کی صورت تھی۔ اپنے باپ کا پھولوں سے ڈھکا ہوا نیلگوں چہرہ میرے تصور میں آتا تھا اور کانوں میں وہ صدا گونجنے لگتی تھی "یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے' افسوس ہم نہ ہوں گے"۔۔۔ اور میں غزالہ کے لیے بے حد سفاک ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ چچی فاخرہ' غزالہ کے روپ میں میرے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔

"کچھ ٹھنڈ سی نہیں ہو گئی؟" غزالہ کی مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں" میں نے چونک کر کہا۔

غزالہ اٹھی اور بڑی دلکشی سے چلتی ائر کنڈیشنر پر جھک گئی۔ ائر کنڈیشنر کو آف کر کے اس نے کھڑکی کھولنا چاہی۔ یکایک مجھے وہ لاش یاد آگئی جو کھڑکی سے باہر جھول رہی تھی۔ میں نے غزالہ کو کھڑکی کھولنے سے منع کر دیا۔

"کیوں۔۔۔ کوئی خاص بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ یونہی' تھوڑی سی ٹھنڈ اچھی لگتی ہے۔"

میں نے سامان ناؤ نوش تپائی سے ہٹا کر کمرے کے اکلوتے بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔ غزالہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے رویے میں ایک تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ تبدیلی "مری" والے واقعے کے بعد رونما ہوئی تھی۔ غزالہ نے جیسے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے گی اور "ذاتی معاملات" پر مجھ سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ یوں لگتا تھا کہ کئی برسوں سے جاری کشمکش نے آخر اسے تھکا دیا ہے۔

میں نے موجودہ حالات پر بات کرتے ہوئے کہا "تمہاری سمجھ میں کچھ آ رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولی "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"یہی کہ پہلے مجھے پکڑا گیا اور پھانسی کی دھمکیاں دی گئیں۔ پھر چھوڑ دیا گیا اور جان بخشی کے ساتھ ساتھ یہ تمام آرام آسائش مہیا کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی میرے پاس بھیج دیا گیا ہے حالانکہ مہاراج رتن سنگھ کے خیالات مجھے تمہارے بارے میں کچھ اچھے نہیں لگتے تھے اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ تمہارے سلسلے میں کہیں روایتی جاگیردار نہ بن جائے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں" وہ بولی "لیکن یہاں اور بھی بہت کچھ ایسا ہو رہا ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں پرسوں اوپر بالکونی میں کھڑی تھی۔ نیچے حوض کے کنارے رتن سنگھ چند افراد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ سب صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ کسی گاڑی کو تلاش کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گاڑی پنجاب کے شہر فرید کوٹ سے اس علاقے میں لائی گئی ہے۔ وہ کوئی بہت اہم گاڑی تھی۔ غالباً ٹرک یا اسی قسم کی کوئی اور باربردار سواری تھی۔ کل بھی میں نے اسی قسم کی گفتگو سنی۔ رتن سنگھ ریاست کشن گڑھ کے سابق والی مدن سنگھ جی کے کسی پوتے سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک عربی بھی اس وقت اس کے پاس بیٹھا تھا۔ رتن سنگھ کو ذرا اونچی آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "گاڑی کے نمبر کا پتا نہیں چل سکا اور نمبر کے چکر میں تم پڑو بھی مت۔ بس یہ سمجھو کہ یہ اس صدی کا سب سے بڑا شکار ہے جو راجستھان میں کھیلا جائے گا۔ اور تمہیں پتا ہے یادگار شکار کے لیے مصیبت تو اٹھانی ہی پڑتی ہے" پھر وہ ایک اخبار کا تذکرہ کرنے لگا جس نے بڑی تفصیل سے اس بارے میں لکھا تھا اور جس کا رپورٹر فرید کوٹ جا کر اس سلسلے میں مزید معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کی آواز میں جوش و خروش تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ

اور اس کے ساتھی اس ٹرک والے معاملے میں بے حد دلچسپی لے رہے ہیں۔"

غزالہ کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ میں نے ذرا غور کیا تو ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور ایک سلسلے کی چند گمشدہ کڑیاں آپس میں مل گئیں۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ اور شیخ عاصم وغیرہ کے رویے میں تبدیلی جناب آفریدی سے ملنے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ جناب آفریدی' عیسیٰ جان کا ساتھی تھا اور اس حوالے سے قادر زماں وغیرہ کا بھی ساتھی تھا۔ قادر زماں کو معلوم ہو چکا تھا کہ چنے پل کی حویلی سے ٹرک نکالنے والا میں ہوں اور میں ہی اسے لے کر انڈیا پہنچا ہوں۔ یہ بات جناب کو بھی معلوم تھی۔ وہ کسی سلسلے میں مہاراج رتن سنگھ سے ملنے یہاں راجستھان آ دھمکا تھا۔ یہاں اس نے مجھے جیل کی کوٹھری میں دیکھا تھا اور پہچان لیا تھا۔ یہ اتفاق میرے لیے جاں افزا ثابت ہوا تھا۔ جناب آفریدی نے مہاراج رتن سنگھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا تھا کہ آج کل جس گمشدہ ٹرک کے چرچے ہیں اس کا مرکزی کردار تو ان کے قبضے میں ہے۔ اس انکشاف کے بعد میری کوٹھری کا دروازہ کھل گیا تھا اور مجھے بڑی حفاظت کے ساتھ اس جنت نظیر کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں میرے بیشتر اندازے درست ثابت ہو گئے اور یہ بھی پتا چل گیا کہ جناب آفریدی اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا تھا۔ دراصل عیسیٰ جان ڈاکا زنی کے علاوہ ایک بزنس بھی کرتا تھا۔ یہ شکاری پرندوں کی فروخت کا بزنس تھا۔ وہ مقامی لوگوں کے پکڑے ہوئے شکاری پرندے باز' شاہین اور عقاب وغیرہ اونے پونے داموں خریدتا تھا اور انہیں عربی اور دوسرے غیر ملکی شکاریوں کے ہاتھوں نہایت گراں قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ اس وقت بھی جناب آفریدی' عیسیٰ جان کے دو نہایت قیمتی باز لے کر یہاں آیا ہوا تھا۔

ہم بہت دیر تک موجودہ صورت حال پر غور کرتے رہے۔ میں نے غزالہ سے لاہور کے حالات بھی دریافت کیے۔ اس نے بتایا کہ جنگ جانے سے صرف تین چار گھنٹے پہلے اس نے سائیں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ سائیں صاحب نے بتایا تھا کہ شفق اور انجم بالکل خیریت سے ہیں۔ سائیں صاحب نے انہیں ایک محفوظ مقام پر رکھا ہوا ہے اور ان کے سوا کسی کو بھی اس جگہ کا علم نہیں ہے۔ غزالہ نے شوکت فریال کا ذکر بھی کیا اور کہا "وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ کہتی ہے اگر آپ دو ہفتے کے اندر اندر لاہور واپس نہ آئے تو وہ آپ کے بارے میں تلاش گمشدہ کے اشتہار چھپوانا شروع کر دے گی اور اگر آپ پھر بھی واپس نہ آئے تو وہ ان اشتہاروں میں "ذہنی توازن" والے فقرے کا اضافہ کرا دے گی اور بھی بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں اس نے آپ کے لیے جمع کر کے رکھی ہوئی ہیں۔"

ہم رات ڈیڑھ دو بجے تک گفتگو کرتے رہے۔ کسی نے ہمیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ اس دوران میں نے ایک دو بار کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ لاش بدستور درخت سے جھول رہی تھی۔ کھڑکی کے آس پاس کم از کم دو مسلح پہرے دار موجود تھے۔ آخر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کمرے میں صرف ایک ڈبل بیڈ موجود تھا۔ میں ساتھ والے کمرے میں جا کر صوفے پر لیٹ گیا۔ غزالہ بیڈ پر دراز ہو گئی۔ اس نے نائٹ بلب روشن رہنے دیا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر ان کمروں میں جیسے اس کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ یہ وہ خوشبو تھی جس کا میں بچپن سے عاشق تھا لیکن اب اس خوشبو کے اور میرے درمیان نفرت کی ایک لہر بھی حائل ہو چکی تھی۔ خوشبو اور نفرت کی لہروں کے درمیان ایک جنگ سی تھی جو مدت سے جاری تھی۔ اس رات بھی میرے اندر یہ جنگ ملوی ہوتی رہی۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک شب مجھے ایسی بھی گزارنی پڑے گی جب ایک بند کمرے میں میرے اور غزالہ کے سوا اور کوئی نہ ہو گا۔

نہ جانے کس گھڑی مجھے نیند آ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ غزالہ میرے بالکل پاس موجود تھی۔ وہ مجھے شانے سے تھام کر جھنجوڑ رہی تھی "اٹھیں۔۔۔۔ میری بات سنیں۔۔۔ اٹھیں۔"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ہاتھ خود بخود کمر پر آیا لیکن ریوالور یا پستول نام کی کوئی شے میرے پاس نہیں تھی۔ کمرے سے باہر ایک مسلسل جھنکار سی گونج رہی تھی۔ کھڑکیاں دروازے دھڑ دھڑ بج رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ باہر نہایت شدید قسم کا طوفان آیا ہوا ہے۔ نائٹ بلب بھی اس طوفان کے سبب چلی گئی تھی۔ میرے پاس تو ماچس بھی نہیں تھی کہ روشنی کر سکتا۔ اچانک کہیں نزدیک سے کوئی بہت بھاری چیز ہوا کے زور سے لڑھک کر فرش پر گری اور کچھ شیشے چھناکوں سے ٹوٹ گئے۔

"مجھے۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے" غزالہ سنسنائی "اس نے میرا شانہ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ میں نے اسے اپنے قریب صوفے پر بٹھا لیا۔ صحرائی علاقوں میں ریتیلی آندھیوں کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی زوردار آندھی تھی۔ مجھے یہاں کے ملازمین پر تاؤ آ رہا تھا۔ انہیں

چاہیے تھا کہ ہماری خبر گیری کرتے یا پھر اس کمرے میں روشنی کا کوئی متبادل انتظام موجود ہوتا۔ یہ ائر کنڈیشنڈ کمرا بالکل بند تھا پھر بھی سرکش جھکڑوں کا شور یہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں اس ڈر سے دروازہ نہیں کھول رہا تھا کہ ہوا کو ایک بار رستہ ملا تو نہ جانے کتنے کلوگرام ریت اندر گھس آئے گی۔

دس پندرہ منٹ ہم اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ طوفان کی شدت میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ ہاں مختلف اشیا کے گرنے کا شور اور کھڑکیاں دروازے بجنے کی آوازیں کم ہو گئی تھیں۔ اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز کمرے کی واحد کھڑکی کی جانب سے آئی تھی۔ میں نے پوری توجہ کھڑکی پر مبذول کر دی۔ آواز ایک دفعہ پھر آئی۔ میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ یہ ویلڈنگ پلانٹ کی آواز تھی۔ اس طوفانی شب کے ہولناک اندھیرے میں یہ کون تھا جو یہاں ویلڈنگ پلانٹ لیے بیٹھا تھا۔ ویسے بھی یہ الیکٹرک پلانٹ کی آواز تھی اور بجلی بند تھی۔ کھڑکی پر ہونے والی آوازوں نے غزالہ کو کچھ اور ہراساں کر دیا۔ وہ مضبوط اعصاب کی مالک ایک ہنرمند ڈاکٹر تھی لیکن اس اجنبی ماحول اور ان وحشت ناک واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ صوفے پر بیٹھی بیٹھی وہ میرے ساتھ لگ گئی۔ اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ یہی لرزش اس کی "گرفت" میں بھی تھی جو اس نے میرے شانے پر قائم کر رکھی تھی۔

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے ان آوازوں کو سنتے رہے۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی اس کھڑکی کی گرل کو کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کاٹنے والا کون ہے؟ یہ سوال بہت اہم تھا اور اس کا جواب ہمیں جلد سے جلد درکار تھا۔ تین صورتیں ہو سکتی تھیں۔ گرل کاٹنے والا ہمارا ہمدرد تھا' ہمارا کوئی دشمن تھا یا پھر کوئی غیر متعلق شخص تھا۔ دشمن ہونے کی صورت میں بھی یہ بات وضاحت طلب تھی کہ وہ ہمارے لیے "میزبانوں" سے زیادہ خطرناک ہے یا کم۔ اگر کم خطرناک تھا تو پھر اس سے رابطہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ باقی دونوں صورتوں میں بھی اس سے رابطہ کرنا ہمارے لیے سودمند تھا۔ میں نے سرگوشی میں غزالہ سے کہا "تم یہیں جمو۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟"

اس نے لرز مضطربی سے مجھے تھام لیا۔ میں نے اپنا بازو اس سے چھڑایا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "اگر انہوں نے گولی وغیرہ چلا دی تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا" میں نے بے رخی سے کہا۔

میں دبے قدموں سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ طوفان کے شور میں ویلڈنگ پلانٹ کی آواز نہ ہونے کے برابر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر چٹخنی ڈھونڈی لیکن اس سے پہلے کہ میں چٹخنی گراتا' ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ اگر یہ گرل کاٹنے والے ہمارے بدخواہ تھے یا غیر متعلق لوگ تھے یعنی نقب زن وغیرہ تو پھر اس مرحلے میں انہیں ٹوکنا ٹھیک نہیں تھا۔ ظاہر ہے جونہی انہیں پتا چلتا کہ کمرے کے مکین جاگ گئے ہیں وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر رفوچکر ہو جاتے۔ بہتر تھا کہ ان سے رابطہ اس وقت کیا جائے جب وہ گرل کاٹ چکیں اور بند کھڑکی پر طبع آزمائی شروع کریں۔ ایسے میں اگر وہ بھاگ بھی نکلتے تو ہمیں کمرے سے نکلنے کا موقع مل جاتا۔

یہ سوچ کر میں واپس صوفے پر آ بیٹھا۔ غزالہ نے ایک بار پھر میرا بازو تھام لیا۔ میں نے اسے سرگوشیوں میں سمجھایا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ گرل کاٹنے والوں نے پندرہ بیس منٹ میں اپنا کام مکمل کر لیا۔ اب فیصلہ کن لمحہ آنے والا تھا جونہی کھڑکی کے تختوں پر کھٹ پٹ شروع ہوئی' میں ایک بار پھر آہستگی سے کھڑکی پر پہنچ گیا۔

کھڑکی سے منہ لگا کر میں نے پوچھا "کون ہے؟" باہر ایک دم سکوت سا چھا گیا۔ پھر کسی نے کھڑکی کے تختے پر ہاتھ کی پشت سے مدھم دستک دی۔ "کون ہے؟" میں نے ذرا بلند آواز سے پوچھا۔

"جہانگیر صاحب! کھڑکی کھولیں" کسی نے گمبھیر لہجے میں کہا "ہم آپ کے لیے آئے ہیں۔"

"آپ کے لیے آئے ہیں؟ کیا مطلب؟"

"آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔ آپ ہمیں دوست سمجھ سکتے ہیں۔"

"یہاں سارے ہی دوست ہیں۔ تم اپنا تعارف کراؤ" میں نے کہا۔

"آپ وقت ضائع کر رہے ہیں جہانگیر صاحب ہمارا تعارف یہی ہے کہ ہم جان پر کھیل کر آپ کو ان خطرناک لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں۔"

ایک دلیل بہت واضح طور پر میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس وقت شیخ عاصم بن ارشد سے بڑھ کر میرے خون کا پیاسا اور کوئی نہیں تھا۔ جو شخص مجھے اس کی دسترس سے نکال رہا تھا' وہ کتنا بھی برا تھا لیکن میرے لیے آسانیاں پیدا کر رہا تھا۔ میں نے چند لمحوں کے اندر اندر فیصلہ کیا اور چٹخنی گرا کر پٹ وا کر دیا۔ ریتیلی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اندر گھس آئی۔ میں نے اپنے سامنے دو ڈھاٹا پوش افراد کو دیکھا۔ وہ سیاہ پتلون قمیص میں ملبوس تھے۔ ایک اور ایسا ہی ہیولا مجھے کچھ فاصلے پر نظر آیا۔ جو شخص سب سے آگے تھا' اس کے ہاتھ میں ایک نہایت جدید قسم کی ہلکی پھلکی ویلڈنگ مشین تھی۔ کھڑکی کی گرل اسی مشین سے کاٹی گئی تھی۔

"آپ کی ساتھی کہاں ہیں؟" مجھ سے ہم کلام ہونے والے نے تیزی سے پوچھا۔

میں نے غزالہ کو بلانے سے پہلے ڈھاٹا پوش سے پوچھا کہ ہمیں یہاں سے کیسے نکلنا ہے اور اگر مزاحمت ہوئی تو اس سے نمٹنے کا کیا انتظام ہے ان کے پاس؟

ڈھاٹا پوش نے بڑے اعتماد سے ان سوالات کے واضح لیکن مختصر جواب دیے۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ گھر کے بھیدی ہیں اور یہاں کی ہر اونچ نیچ سے واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ریت کا طوفان بھی ان کا مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ پیرس کے طول و عرض میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ رکھوالی کے کتے بھی نہ جانے کن کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ مشین بردار ڈھاٹا پوش نے اپنی پتلون کی عقبی جیب سے ایک چھوٹا لیکن طاقتور پستول نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پستول لوڈ تھا۔ میں نے تسلی کرنے کے بعد غزالہ کو آواز دی۔ وہ فوراً کھڑکی پر آ گئی۔ گرل میں سے تقریباً ڈھائی فٹ مربع کا ٹکڑا کاٹا گیا تھا۔ اس میں سے نکلنا مشکل نہیں تھا۔ ڈھاٹا پوش نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم اپنے چہرے کپڑوں میں چھپا لیں ورنہ ریتیلی ہوا میں چلنا دشوار ہو جائے گا۔ میں نے ایک میز پوش کو ڈھاٹے کے طور پر استعمال کیا۔ غزالہ کے پاس اوڑھنی تھی لیکن اس نے صرف ڈاکٹری پڑھی تھی' ڈھاٹا لگانا نہیں سیکھا تھا۔ میں نے اسے بھی ڈھاٹا لگایا۔ پہلے میں خلا میں سے نکلا پھر سہارا دے کر غزالہ کو بھی نکال لیا۔

ڈھاٹا پوش ہمیں لے کر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ میں نے ایک پہرے دار کا بے حرکت جسم پھولوں کی کیاری میں پڑے دیکھا۔ بائیں طرف گردن گھما کر میں نے خانہ بدوش عورت کی عبرت ناک لاش دیکھنا چاہی لیکن تاریکی اور آندھی میں ڈیڑھ دو گز دور کی شے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب سے آگے ڈھاٹا پوشوں کا لیڈر تھا۔ اس کے پیچھے غزالہ' غزالہ کے پیچھے میں اور میرے عقب میں باقی دونوں ڈھاٹا پوش تھے۔ دیوار کے بالکل ساتھ ساتھ چلتے ہم واٹر سپلائی کی ایک بلند و بالا ٹینکی کے قریب سے گزرے اور ایک اصطبل میں داخل ہو گئے۔ پہلے تو مجھے یہی شک ہوا کہ ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر کاؤ بوائز کی طرح یہاں سے فرار ہوں گے لیکن پھر یہ شک غلط ثابت ہوا۔ بہت سے بدبودار گھوڑوں کے درمیان سے گزر کر ہم ایک تنگ راہداری میں داخل ہو گئے۔ یہاں گھٹا ٹوپ تیرگی تھی۔ ہم ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھے اور تقریباً سو گز چلنے کے بعد اچانک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ بیرونی چار دیواری کا ہیولا ہمارے بالکل سامنے تھا۔ ایک چھوٹے سے دروازے پر مخنی سا شخص منہ سر لپیٹے کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آندھی نے ذرا زور پکڑا تو وہ "ہوا ہم سفر" ہو جائے گا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔

چار دیواری سے نکل کر ہم نے خود کو ایک وسیع میدان میں پایا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ پیرس کی عقبی سمت تھی۔ کھلی جگہ پر آتے ہی ہوا کی شدت حد سے زیادہ محسوس ہونے لگی۔ ڈھاٹا پوش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ چہرے ننگے ہوتے تو "ریت کی مار" ہمارا برا حال کر دیتی۔ اب بھی جسم کے ننگے حصوں ہاتھوں اور گردن وغیرہ پر سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا جیسے واقعی چند سوئیاں کھال میں اتر گئی ہیں۔ کچھ فاصلے پر کھجور کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ جھنڈ کے عقب میں ایک بند جیپ کھڑی تھی۔ جونہی ہم جیپ کے نزدیک پہنچے اس کا انجن جاگ اٹھا۔ ہوا کے شور میں انجن کی آواز مدھم سرسراہٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ جیپ پر کینوس منڈھا ہوا تھا۔ ایک ڈھاٹا پوش نے آگے بڑھ کر جیپ کا عقبی کینوس ہٹایا اور ہمیں اندر بٹھا دیا۔ چند لمحوں کے اندر اندر باقی افراد نے بھی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ ہیڈ لائٹس روشن کیے بغیر جیپ متحرک ہوئی اور ہوا کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے تک جیپ بلا رکے چلتی رہی۔ طوفان کا زور اب کم ہو گیا تھا۔ جیپ چونکہ ہوا کی مخالف سمت میں جا رہی تھی لہٰذا اس کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ راستہ ناہموار اور ریتیلا تھا۔ بس کہیں کہیں درختوں کا کوئی جھنڈ یا ویران ٹیلا نظر آ جاتا تھا۔ غزالہ کی گھڑی صبح چار بجے کا وقت بتا رہی تھی۔

اب تک کا سفر تقریباً خاموشی میں ہی طے ہوا تھا۔ میرے استفسار پر لیڈر ڈھاٹا پوش نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ہم ساڑھے چار بجے سے پہلے پہلے منزل پر پہنچ جائیں گے۔ اس نے بتایا تھا کہ ہم ایک ریسٹ ہاؤس میں جا رہے ہیں اور ریسٹ ہاؤس میں وہ شخص ہم سے ملاقات کرے گا جس نے ڈھاٹا پوشوں کو ہمیں "پیرس" سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا۔ ڈھاٹا پوش اس سے زیادہ بتانے پر آمادہ نہیں تھے لہٰذا میں نے

بھی انہیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

ہم مغرب سے مشرق کی سمت سفر کر رہے تھے اور جس علاقے کی طرف جا رہے تھے وہ نسبتاً کم ریتیلا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی نظر آ جاتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم درختوں کے ایک ایسے ہی بڑے جھنڈ کے قریب پہنچے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہاں ایک عمارت بھی موجود ہے۔ جیپ کھجور اور بانس کے بہت سے درختوں میں سے گزرنے کے بعد ایک تاریک عمارت کے سامنے جا رکی۔ جیپ کے رکتے ہی عمارت کی ایک دو کھڑکیوں سے روشنی جھلکنے لگی۔ یہ لالٹین یا گیس کی نہیں' بلب کی روشنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس دور افتادہ عمارت میں بجلی موجود ہے۔

ہم جیپ سے نکل آئے۔ تند و تیز طوفان اب ہوا کی صورت باقی رہ گیا تھا۔ ریت بھی بہت کم اڑ رہی تھی۔ عمارت کے اندر سے ایک راکفل بردار رسالی برآمد ہوا۔ لیڈر ڈھاٹا پوش نے اس سے چند باتیں کیں پھر وہ لوگ ہمیں لے کر اندر آ گئے۔ یہ بلند و بالا چھتوں' موٹی دیواروں اور دیو ہیکل دروازوں والا ایک قدیم ریسٹ ہاؤس تھا۔ یقیناً کسی انگریز گورنر نے سیر و شکار کی سہولتوں کے لیے تعمیر کرایا ہوگا۔ ریسٹ ہاؤس میں قدیم عمارتوں کی مخصوص بو رچی بسی تھی لیکن اپنی تمام تر قدامت کے باوجود وہ صاف ستھرا اور مزین نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں اکثر شکاری حضرات کی آمد و رفت رہتی ہے۔

ہمیں ایک کشادہ کمرے میں پہنچایا گیا۔ کمرے میں شطرنج کے خانوں جیسی سیاہ و سفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ کمرا اچھی قسم کے بھاری بھرکم فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہاں پہنچ کر لیڈر ڈھاٹا پوش نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہ ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ شکل صورت سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ پر ایک خوب صورت تل تھا۔ اس نے کہا "میرا نام عتیق خان ہے۔ یہاں آپ کی تمام ضروریات کا خیال رکھنا میرے ذمے ہے۔ یہاں آپ کے بیڈ کے ساتھ گھنٹی موجود ہے۔ میں ساتھ والے کمرے میں موجود رہوں گا۔ آپ جب چاہیں مجھے بلا سکتے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بس یہ سمجھ لو کہ میں نے تمہیں بلا لیا ہے۔"

"جی فرمائیے؟" اس نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "اور یہ سمجھو کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اس لیے [illegible] آرام کرنا [illegible] لیے ممکن نہیں ہوگا۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے اور لانے والا کون ہے' ہماری بے چینی برقرار رہے گی اور بندہ بے چین ہو تو پھولوں کے بستر پر بھی نیند نہیں آتی۔"

وہ بولا "پچھلے چند دنوں میں ہم نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ دلچسپ باتیں بھی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں آپ سے باتیں کرنے کا خوب موقع ملے گا لیکن فی الحال مجھے ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں اس لیے آپ سے معذرت چاہوں گا۔ باقی رہا اصل میزبان سے ملاقات کا سوال تو آپ فکرمند نہ ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس گیارہ بجے تک آپ ان سے مل سکیں گے۔ اگر آپ کچھ دیر لیٹنا چاہتے ہیں تو لیٹ جائیں ورنہ غسل کا انتظام موجود ہے' غسل کرلیں۔ میں آپ کے لیے چائے وغیرہ بھجواتا ہوں۔"

عتیق خاں کی دوسری تجویز مجھے پسند آئی۔ عجب کسلمندی سی محسوس ہو رہی تھی۔ غسل اور ایک کپ گرما گرم چائے کا تصور فرحت بخش تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے تم آدھ گھنٹے تک ہم دونوں کے لیے چائے بھجوا دو۔"

اس نے اطاعت مندی سے سر جھکایا اور باہر جانے کے لیے مڑا "ٹھہرو" غزالہ نے آواز دی۔

وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا

"استری ہوگی تمہارے پاس؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ آپ حکم دیجئے" عتیق خاں نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ بس استری بھجوا دو۔" غزالہ نے کہا۔

وہ "بہت اچھا" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ "استری کیا کرنی ہے؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

"آپ کے پاس دوسرا لباس ہے؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔"

"تو پھر یہ شکن شکن لباس اچھا لگے گا؟" اس نے میرے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کپڑے گو صاف ستھرے تھے لیکن رات سو جانے کی وجہ سے [illegible] ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ [illegible] بردار [illegible] الیکٹرک آئرن لے کر پہنچ گیا۔ غزالہ بولی "آپ شاور لیں' میں اتنی دیر میں کپڑے پریس کر دیتی ہوں۔" ایک دلگداز سی اپنائیت تھی اس کے لہجے میں اور اس کے [illegible] ایک خوب صورت [illegible]

غسل کرکے اور استری شدہ کپڑے پہن کر میں باہر نکلا تو میری [illegible] سے باتھ روم کے دروازے پر

رکھی تھی' اسے کسی کپڑے یا برش سے خوب چمکا دیا گیا تھا۔ طوفان اب گزر چکا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور بادِ صبا کے جھونکے پرندوں کی چہچہاہٹ لے کر اندر آ رہے تھے۔ ایک کھڑکی کے بالکل پاس ایک خوب صورت تپائی پر چائے کے برتن رکھے تھے اور غزالہ کرسی پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے واش بیسن سے منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لیے تھے اور اب صبح نو ہی کی طرح اجلی اور تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پاکیزگی کی چمک تھی۔ یہ وہ چمک تھی جس کا خوب صورت خدوخال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ چمک انسان کے چہرے پر راست بازی اور نیکی کے صلے میں نمودار ہوتی ہے۔ جب انسان کا ضمیر گناہوں پر دراتوں کو شکست دیتا ہے' جب بند کمروں میں بھی نفسانی خواہشات کو قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا تو یہ دلنواز روشنی چپکے سے چہروں پر طلوع ہو جاتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا اگر خدانخواستہ گزرنے والی رات ایسے نہ گزری ہوتی جیسے گزری ہے تو غزالہ کے چہرے پر یہ دلنواز روشنی نظر آتی؟ اس کی آنکھوں میں دوشیزگی کا بانکپن اور میری نگاہ میں اعتماد کی طاقت ہوتی؟ ہرگز نہیں۔

مشرق کی جانب کھلنے والی اس کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر طلوعِ سحر کا منظر دیکھنا اور چائے پینا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ میری سوچ کے بند سوتے کھل گئے تھے اور ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آخر یہ کون لوگ تھے جو اتنی دیدہ دلیری سے ہمیں مساوان جیسے باثر شخص کی زد سے نکال لائے تھے۔ نیرس سے روانہ ہوتے وقت میں نے سرخ ٹوپی والے ایک پہرے دار کو باغیچے میں بے حرکت پڑے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ اور پہرے داروں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا ہو۔ یقیناً یہ کسی بااعتماد اور بلند حوصلہ شخص کا کام تھا۔ نیرس سے نکلنے کے بعد ہم نے بیس پچیس کلومیٹر کا سفر کیا تھا۔ میرے خیال میں تو ہم ابھی تک نانڈل اسٹیٹ میں ہی تھے۔ اسٹیٹ ہی میں رہ کر ہزہائی نس کے منہ سے سونے کا نوالہ چھین لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

ان فضاؤں میں حسن تھا لیکن اس کے ساتھ ایک طرح کی وحشت بھی رچی بسی تھی۔ پھول نظر آتے تھے لیکن ہر پھول کے ساتھ کانٹوں کا التزام تھا۔ نیرس میں میں نے ایک رنگا رنگ باغیچہ دیکھا تھا مگر اس باغیچے کے بیچوں بیچ ایک ادھ مرا مورت کی ناک میں جھول رہی تھی۔ اب اس پُرسکون کھڑکی کا حسن ہمیں متاثر کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک دلخراش پینٹنگ بھی نگاہ کو گھائل کر رہی تھی۔ یہ پینٹنگ (جو یقیناً کئی لوگوں کے لیے قابلِ دید ہوگی) سامنے کی دیوار پر لگی تھی۔ کتوں کے ذریعے نیل گائے کے شکار کا منظر تھا۔ دو گھڑ سوار اور سات آٹھ گرے ہاؤنڈ کتے نظر آ رہے تھے۔ یہ کتے خوب صورت نیل گائے سے جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ کسی نے ٹانگ دبوچ رکھی تھی' کسی نے گردن میں دانت پیوست کر رکھے تھے۔ کوئی پشت پر سوار تھا۔ نیل گائے کی آنکھیں باہر ابلی ہوئی تھیں جیسے اسے اپنا دردناک انجام صاف نظر آ رہا ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ غزالہ اس تصویر سے نگاہ بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر کسی وقت بے دھیانی میں نگاہ پڑ جاتی تھی تو ایک کرب سا اس کے چہرے پر لہرا جاتا تھا۔ یہ نازک اندام' نرم دل' نفیس ڈاکٹر ایک سنگلاخ ماحول میں آن پھنسی تھی۔ شاید اسی خوب صورت نیل گائے کی طرح جو بھٹک کر گرے ہاؤنڈز کے جبڑوں میں آ گئی تھی۔ میرا دل اندر سے کانپ گیا۔ ایسا بھیانک خیال کیوں میرے ذہن میں آیا تھا؟ ایسا خیال میرے ذہن میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ خدا نہ کرے غزالہ کا انجام اس نیل گائے جیسا ہو۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اس ریسٹ ہاؤس میں آزاد ہیں یا قید' تاہم وہ پسٹل ابھی تک میرے پاس تھا جو نیرس سے روانگی کے وقت عتیق خاں نے مجھے دیا تھا۔ اس میں پوری چھ گولیاں موجود تھیں۔۔۔ آٹھ بجے کے قریب ہمیں پُرتکلف ناشتا دیا گیا۔ ناشتا دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہم مغربی راجستھان کے اس دور افتادہ ریسٹ ہاؤس میں نہیں لاہور یا کراچی کے کسی اچھے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ انڈے' جام' ڈبل روٹی' تیتر کے گوشت کا اچار' مکھن' دودھ بہت کچھ موجود تھا۔ ناشتے کے بعد گرما گرم کافی سے تواضع کی گئی۔

اس کے بعد ہم نے گھوم پھر کر ریسٹ ہاؤس دیکھا۔ یہاں کم و بیش پانچ ملازم اور چھ گن مین موجود تھے۔ وہ جیپ یہیں کھڑی تھی جس میں ہمیں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک شیورلیٹ کار بھی کھڑی تھی۔ خبر نہیں یہ پہلے سے یہاں تھی یا ہمارے بعد کوئی یہاں آیا تھا۔ دھوپ کی تمازت کا مقابلہ کرنے کے لیے ریسٹ ہاؤس کے اردگرد خوب شجرکاری کی گئی تھی اور صرف شجرکاری ہی نہیں کی گئی تھی' شجر [illegible] بھی جاری تھی۔ [illegible] ہم واپس اپنے کمرے میں آئے۔ غزالہ تھکی ہوئی تھی۔ ایک آرام کرسی پر بیٹھی بیٹھی سو گئی۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور موجودہ صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ اس وقت دس بجے تھے جب عتیق خاں تیز قدموں سے

اندر داخل ہوا۔ غزالہ کو سوتا پا کر اس نے دبے لہجے میں کہا "جہانی صاحب! چلئے... آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ غزالہ کو جگا دیا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ وہ میرے اچانک جانے پر پریشان تو ہوئی لیکن عتیق خاں کے سامنے اس نے اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ میں اور عتیق خاں ایک طویل راہداری میں آگے پیچھے چلتے ریسٹ ہاؤس کی مشرقی جانب بڑھے۔ میری نظر ریسٹ ہاؤس کے پورچ پر پڑی۔ یہاں اب ایک اور شاندار جیپ کھڑی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب میں یہ نہ دیکھ سکا کہ یہ کون سی جیپ ہے۔ چند قدم آگے ایک پالش شدہ منقش دروازے کے سامنے دو گن مین چوکسی سے پہرا دے رہے تھے۔ عتیق خاں مجھے ساتھ لے کر اس دروازے میں داخل ہوا۔ یہاں فرش پر مشینی کارپٹ تھا۔ کارپٹ پر چلتے ہوئے ہم ایک نسبتاً چھوٹے دروازے کے سامنے رُک گئے۔ عتیق خاں نے یہاں نہایت مؤدب انداز میں دستک دی۔

"یس کم ان" اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

عتیق خاں مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ یہ وسیع کمرا شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ کمرے میں خواب ناک سی روشنی تھی۔ میری نگاہ سب سے پہلے ایک شاندار صوفے پر پڑی۔ اس صوفے پر تنومند جسم والا ایک شخص صرف ایک مختصر نیکر پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کا گلاس تھا' سامنے رنگین ٹیلی وژن چل رہا تھا اور ایک نیم عریاں خوبرو لڑکی صوفے کے عقب میں کھڑی اپنے دودھیا ہاتھوں سے اس کے کندھوں کی مالش کر رہی تھی۔ میں اس شخص کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اسی کے چنگل سے نکل کر یہاں آیا تھا۔ وہ مہاراج رتن سنگھ تھا۔ اس نے چند لمحے میری حیرت سے لطف اندوز ہونے میں صرف کیے۔ پھر رُعب دار آواز میں بولا "بیٹھو برہمائی استھر! ہم خود بھی تمہاری حیرت دور کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے اپنے بالمقابل ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنے تحیر پر قابو پایا اور مستحکم قدموں سے چلتا صوفے پر جا بیٹھا۔ مہاراج رتن سنگھ نے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ میرے قریب کھڑا عتیق خاں اُلٹے قدموں چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی خوبرو لڑکی نے مہاراج کے بھدے شانوں پر ایک جھاڑی سائز تولیا رکھا اور مؤدب انداز میں مہاراج پر جھک گئی۔ مہاراج نے سرگوشی میں اس سے کوئی بات کہی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور اُلٹے قدموں چلتی باہر نکل گئی۔

اب مہاراج رتن سنگھ اور میں کمرے میں تنہا تھے۔ ٹی وی پر سفید فام پہلوان اپنے داؤ پیچ دکھا رہے تھے۔ مہاراج نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کر دیا۔ کمرے میں کچھ دیر بوجھل خاموشی طاری رہی پھر مہاراج اپنے گلاس سے ایک بڑا گھونٹ لے کر بولا۔

"تمہیں یہاں پہنچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔ بہت آرام سے پہنچا ہوں" میں نے جواب دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری تکلیف کا پوچھ کر رتن سنگھ نے مجھے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اب معلوم نہیں میرا یہ احساس غلط تھا یا درست؟

مہاراج رتن سنگھ نے کہا "دیکھو جہانی! کسی بھی حوالے سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ چلتا ہے۔ تم بھی جنگ لڑ رہے تھے اس لیے کل رات تمہیں ہماری قید سے رہائی پانے کا موقع ملا تو تم نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ہم بھی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے ہم نے تمہیں اپنی ہی قید سے رہائی دلائی۔"

میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ ساری زحمت کیوں کی آپ نے؟"

"ہم جانتے تھے کہ تمہارا اگلا سوال یہی ہوگا۔ اس سوال کا سچا کھرا جواب یہ ہے کہ ہم تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے جس نظر سے ہمارے کچھ مہمان دیکھ رہے تھے۔ ہمیں آشا ہے کہ تم ہمارا اشارہ سمجھ گئے ہو گے۔"

"آپ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی بات کر رہے ہیں؟"

"تم ایک ذہین شخص ہو" مہاراج نے تعریف کی۔

"آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میں شیخ عاصم وغیرہ کی نظر میں مجرم تھا لیکن آپ کی نظر میں مجرم نہیں ہوں؟"

وہ بولا "ہم تمہارے مجرم ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں کر رہے۔ تمہارے قتل معاف ہونے یا نہ ہونے کی بات کر رہے ہیں" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک پُرفریب چمک نظر آ رہی تھی۔

ایکا ایکی بہت سی باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔ یقیناً شیخ عاصم اور مہاراج رتن سنگھ میں میرے حوالے سے کوئی اختلاف ہوا تھا۔ شیخ عاصم میری سزا پر عمل درآمد چاہتا ہوگا جبکہ مہاراج رتن سنگھ کی آنکھوں میں کچھ دوسری طرح کے خواب اتر آئے ہوں گے۔ بہت سے دوسرے طالع آزماؤں

کی طرح وہ بھی ترک کے شکاریوں میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ سنسنی خیز اطلاع ملنے کے بعد کہ گمشدہ ترک سے میرا براہِ راست تعلق رہا ہے' رتن سنگھ کے لیے ممکن نہیں رہا ہوگا کہ وہ "انصاف کے تقاضے" پورے کرتا اور مجھے مار کر اپنی تقدیر پھوڑ لیتا۔ اس نے میری سزا کو ٹالنا چاہا تھا مگر شیخ عاصم راستے کی دیوار تھا۔ آخر مہاراج نے ایک ایسی چال چلی تھی کہ سانپ مر گیا تھا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی تھی یعنی مہاراج نے بلا نقصان اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اپنے ہی کارندوں کے ذریعے مجھے اپنے محل سے نکالا تھا اور اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے اپنے ایک آدھ وفادار کو عدم آباد بھی روانہ کر دیا ہو۔ اب شیخ عاصم کہیں کسی مقام پر رانت کچکچا رہا تھا اور مہاراج اس خفیہ ٹھکانے پر میری "صحبت" سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں زر کی نیرنگی اور یہی دنیا کا وہ مہلک ترین جادو ہے جو ہر خاص و عام کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

اچانک مجھے اپنے خیالات سے چونکنا پڑا۔ مہاراج کے عقب میں واقع دروازہ کھلا اور ایک قیامت اندر آ گئی۔ یقیناً وہ قیامت ہی تھی کیونکہ اس کے آتے ہی سورج جیسے سوا نیزے پر آ گیا اور نشست گاہ کے ننگوں لمحوں میں ... ختم ہو گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ بے حد حسین اور متناسب جسم کی مالک۔ اس کا لباس مختصر تھا اور جتنا تھوڑا بہت تھا وہ اس کی عریانی چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے ترشے ہوئے بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ گلے میں نہایت قیمتی پھولوں کی مالائیں تھیں۔ جلد ملائم' آنکھیں روشن' ہونٹ گداز' شانے ہموار اور شانوں سے نیچے تک سانچے میں ڈھلی ایک مجسم قیامت۔ وہ ایک ادا سے چلی تو جیسے در و بام جھوم اُٹھے۔

ایک شاہانہ طمطراق تھا اس کی چال میں۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

جیل جانے سے پہلے تین سال کے مختصر عرصے میں میں نے ایک دنیا دیکھ لی تھی۔ لاہور کا بازارِ حسن اور وہاں کے جھلملاتے فلم اسٹوڈیوز' بمبئی کے نائٹ کلب اور فائیو اسٹار ہوٹل' دہلی کے مے خانے اور ان مے خانوں میں تھرکتی ہوئی حسینائیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک پری زاد میری نگاہوں کے سامنے آئی تھی۔ ایک سے ایک حسین چہرہ وہ بصارت پر دستک دے چکا تھا لیکن یہ حسینہ جو ابھی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی کسی اور ہی سج دھج کی مالک تھی' وہ حسین تھی اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کا حسن چاندنی کی طرح ٹھنڈک بخش نہیں سورج کی طرح پُرحرارت تھا۔ یہ حسن دل و نگاہ کو مشتعل کرتا تھا اور ایک طرح کی آگ سینے میں جگا دیتا تھا۔ وہ سراپا عورت تھی اور ہر مرد کی نگاہ سے تقاضا کرتی تھی کہ وہ اسے "مردانہ وار" دیکھے۔ شاید کسی ایسی ہی فتنہ ساماں کو دیکھ کر کسی زبان داں نے "توبہ شکن" اور "غارت گرِ ایمان" جیسے لفظ ایجاد کیے ہوں گے۔ اس نے اپنے جگمگاتے ہاتھ جوڑ کر بڑی ادا سے مجھے نمستے کہا اور معنی خیز بے باکی سے میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ مہاراج رتن سنگھ زیرِ لب مسکرایا اور بولا۔

"اس کا نام بِنتا ہے۔ یہ ہمارے خاص الخاص "میزبانوں" میں سے ہے۔ جب تک تم یہاں ہو یہ تمہاری سیوا پر مامور رہے گی۔"

"سیوا" کے لفظ میں مہاراج نے اپنے لہجے کی مدد سے وسیع تر معانی بھر دیے تھے۔ وہ کسی ریڈیو آرٹسٹ کی طرح اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے عام الفاظ کو خاص لباس پہنانے کا فن جانتا تھا۔ کوئی پتھر کا شخص بھی ہوتا تو یہ فقرہ سن کر اور اپنے پہلو میں کسی قیامت کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ضرور جی اٹھتا۔ میرے سینے میں بھی ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔

وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے تک مہاراج کے کندھوں کو سہلا رہی تھی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نہایت دیدہ زیب ٹرے تھی۔ ٹرے میں حلال مشروبات کے ساتھ ساتھ پھل بھی تھے۔ یہ پھل ابھی ابھی فریج سے نکال کر لائے گئے تھے۔ کیلے' سرخ سیب اور انگور کے خوشنما گچھے۔ میں انہیں چکھے بغیر جان سکتا تھا کہ وہ بے حد شیریں اور سرد ہیں۔ ٹرے تپائی پر رکھ دی گئی۔ میرے پہلو میں بیٹھی "قیامت" متحرک ہوئی اور اس نے جھک کر ٹرے سے چھری اٹھائی۔ یقیناً اس نے یہ چھری کسی بُری نیت سے نہیں اٹھائی تھی کیونکہ وہ کسی کو زخمی یا قتل کرنا چاہتی تو اس کے لیے اس کی نگاہ ہی کافی تھی۔ اس نے اپنے مرمریں ہاتھوں میں ایک سیب تھاما اور بڑی نفاست سے اسے چھیلنے لگی۔

مساج کرنے والی لڑکی ٹرے رکھ کر واپس چلی گئی تو مہاراج نے اپنے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ "پچھلے دو تین روز میں ہمیں تمہارے بارے میں کافی جانکاری ہوئی ہے۔ پرنتو! سچ بات یہ ہے کہ ہم تم سے متاثر ہوئے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم تمہیں "شیرس" کے مشکل حالات سے نکال

کر یہاں لے آئے ہیں۔ جیون لینے اور دینے والا تو بھگوان ہے لیکن ایسے کاموں کے لیے وسیلے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ بھگوان نے ہمیں تمہارا جیون بچانے کے لیے وسیلہ بنایا ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ایسا دو مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب تم ریگستان میں جاں بہ لب تھے اور ہم نے تمہیں اپنی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا تھا اور دوسری مرتبہ اب جبکہ تم نیرس سے یہاں پہنچائے گئے ہو اور ہم کو لگ رہا ہے کہ ہمارے ذریعے تم پر بھگوان کی یہ کرپا ابھی جاری رہے گی۔ ماسوائے اس کے کہ تم خود ہی کوئی ایسی غلطی کر بیٹھو جس کے کارن ہمارا تمہارا ساتھ ختم ہو جائے۔"

میں نے ادب سے کہا۔ "میں یور ہائی نس کی بات کی وضاحت چاہوں گا۔"

مہاراج نے اپنے بالوں سے بھرے سینے کو بھدی انگلیوں سے سہلایا اور بولا۔ "ہم تم سے صاف سیدھے انداز میں بات کرنا چاہتے ہیں اور تمہاری بدھی (ذہانت) سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ تم ہماری کسی بات کو غلط مطلب نہیں پہناؤ گے۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "یہ بات ہمارے لیے ڈھکی چھپی نہیں کہ کچھ روز پہلے ابراہیم نامی ایک پاکستانی نے کسی مقام پر کھدائی کی ہے اور اس کھدائی کے نتیجے میں نہایت قیمتی سامان سے بھرے ہوئے پچیس صندوق برآمد ہوئے ہیں۔ اتفاقاً وہ صندوق ایک ٹرک میں لدے ہوئے تھے اور وہ ٹرک تمہارے ساتھیوں سمیت ایک فرید کوٹی زمیندار کے فارم پر موجود تھا لیکن پھر ٹرک وہاں سے غائب ہو گیا۔ ہم نے اب تک جو کہا ہے اس میں کچھ غلط تو نہیں؟"

میں نے کہا۔ "آپ کہتے جائیں۔ میں اپنی گزارشات آخر میں کروں گا۔"

مہاراج نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "ہمیں وشواس ہے کہ وہ ٹرک اور اس کا اسباب جہاں کہیں بھی ہے تم اس سے باخبر ہو۔ اور اس وقت تمہاری سب سے بڑی ترجیح یہ ہے کہ اس ٹرک کو جو غلطی سے سرحد پار کر آیا ہے، واپس پاکستان لے جاؤ اور اس کے اسباب کو کسی محفوظ مقام پر پہنچاؤ۔ ہم اس بارے میں ٹھیک سے نہیں جانتے کہ تم ٹرک کو پاکستان واپس کیوں لے جانا چاہتے ہو۔ ممکن ہے تمہارے ذہن میں قانون پسندی کا کیڑا کلبلا رہا ہو اور تمہارا ارادہ ہو کہ اس دفینے میں سے حکومت کو مقررہ حصہ دیا جائے یا پھر اس سامان کو ٹھکانے لگانے کے لیے پاکستان میں تمہارے پاس کوئی بہت محفوظ جگہ ہو، یا پھر۔ خیر جو کچھ بھی ہے، تم اس ٹرک کو پاکستان واپس لے جانا چاہتے ہو لیکن تمہیں جانکاری ہونی چاہیے کہ یہ کام اب اتنا سہل نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اور دھن کی مشک تو وہ ہے جو حضرت انسان سو کوس دور سے سونگھ لیتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس ٹرک تک پہنچنے کے لیے بے شمار لوگ بھاگ دوڑ کر رہے ہیں اور فرید کوٹ اس وقت جرائم پیشہ قسمت آزماؤں کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ان حالات میں تم آسانی سے اپنے مقاصد حاصل کر سکو گے۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "یور ہائی نس! گستاخی پر بہت شرمندہ ہوں لیکن میں اپنی رائے آخر میں ظاہر کروں گا۔"

مہاراج نے سیب کی ایک قاش کاٹنے کی دو تین انگلی اور منہ میں رکھ لی۔ مجھے بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ بہت شیریں سیب تھا۔ معلوم نہیں پہلے سے ایسا تھا یا جگمگاتے ہاتھوں نے اسے چھو کر شیریں تر کر دیا تھا۔ بے حد نفاست سے کاٹی اور چھیلی ہوئی قاشیں تھیں۔ ان دیدہ زیب قاشوں کو دیکھ کر میں بے ساختہ جگمگاتے ہاتھوں کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک "شاہکارِ کل" کا "شاہکارِ جز" تھے وہ ہاتھ۔ میرا زاویۂ نگاہ دیکھ کر مہاراج کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "جہانی استاد! ہم جانتے ہیں کہ تم حوصلہ مند اور باتدبیر ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم اس وقت ایک غیر دیش میں غیر لوگوں کے درمیان ہو۔ وہ دھن جو تمہارے پاس ہے تمہارے بہت سے بدخواہ اور دروغی پیدا کر چکا ہے اور ان سب دروغیوں سے بڑا دروغی وہ شخص بھی یہاں موجود ہے جس کا نام شنکر شکرا ہے اور جو اپنے دو جنوں کا رندوں سمیت تمہارے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے مچل رہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان حالات میں ٹرک کو بحفاظت یہاں سے نکال کر لے جاؤ گے؟ میرے خیال میں اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ ایسے بااختیار لوگوں کی جو اس کٹھنائی میں تمہارا ساتھ دے سکیں۔ ہماری طرف سے تمہیں پُرخلوص پیشکش ہے کہ جس طرح کی مدد تمہیں درکار ہے ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ یہ ایک پُرخلوص پیشکش ہے۔ اس میں کسی قسم کا لوبھ لالچ شامل نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں اب دھن دولت کی طلب بھی نہیں ہے۔ بھگوان نے اتنا کچھ دیا ہے کہ سنبھالنا مشکل ہے۔ یہ بار، زمین، حویلیاں، نوکر چاکر اور بے حد عزت دینے والے لوگ۔ ہمیں کچھ اور چاہیے بھی نہیں۔"

مہاراج رتن سنگھ خود کو سیر چشم درویش صفت ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس کی سیر چشمی کے بارے میں پُریقین نہیں تھا۔ مجھے غزالہ نے بتایا تھا کہ مہاراج گمشدہ ٹرک میں بے حد دلچسپی لے رہا ہے اور اسے ایک یادگار شکار کا نام دے رہا ہے۔ پھر میں اپنے اردگرد جو لہو و لعب دیکھ رہا تھا وہ مہاراج کی درویشی پر نہیں عیش کوشی پر دلالت کرتا تھا۔ دولت کی فراوانی کسی طرح بھی اس چیز کو ثابت نہیں کرتی کہ دولتمند کو اب مزید دولت کی ضرورت نہیں۔ اکثر و بیشتر صورتِ حال برعکس ہوتی ہے۔ جوں جوں دولت بڑھتی ہے اس کی ہوس بھی بڑھتی ہے۔

میں نے مہاراج سے اجازت طلب کر کے اپنے پسندیدہ برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر کہا۔ "یور ہائی نس! میں آپ کی باخبری کو کسی طرح چیلنج نہیں کر سکتا۔ آپ نے میرے اور گمشدہ ٹرک کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے وہ بہت حد تک درست ہے۔ سوائے اس بات کے کہ میں ٹرک کے موجودہ ٹھکانے سے آگاہ ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ ہمیں دو ٹوک اور واضح بات کرنی چاہیے۔ آپ کی اس رعایت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا۔"

"کہو، میں سن رہا ہوں۔" مہاراج نے کہا۔

"جناب! یہ حقیقت ہے کہ مجھے تعاون کی ضرورت ہے اور آپ جیسے بارسوخ اور ہمدرد شخص کا تعاون حاصل کر لینا میرے لیے بہت بڑی بات ہو گی لیکن یہ بات آپ بھی تسلیم کریں گے کہ اس دنیا میں کچھ بھی بے قیمت حاصل نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی حوالے سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا مول چکانا ہی پڑتا ہے۔ کم از کم میری جہاں گردی کا نچوڑ تو یہی ہے۔"

مہاراج مسکرایا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ ہمارا واسطہ ایک پریکٹیکل اور حقیقت پسند شخص سے ہے۔ تم نے جو کہا وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن کوئی بھی قانون ہر کسی پر من و عن لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ عام لوگوں کی بھیڑ میں کہیں کہیں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو کھیلے سچے اصولوں سے ہٹ کر چلتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ہمیں اس دولت سے کوئی دلچسپی نہیں جو تم جھنگ کی کسی قدیم حویلی سے نکال کر لائے ہو۔ ہاں یہ بات تم کہہ سکتے ہو کہ ۔۔۔"

کچھ کہتے کہتے مہاراج رتن سنگھ ایکدم خاموش ہو گیا۔ لگتا تھا کہ جھجک گیا ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میرا تجسس

لہو کا سُراغ
محمود احمد مودی
قیمت -/150 ڈاک خرچ -/20
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

بڑھانے کے لیے اس نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑی ہو۔ میری سوالیہ نگاہیں مہاراج رتن کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ بالکل خالی نگاہوں سے اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا جس کا نام اس نے رشنا بتایا تھا اور جو میرے بازو سے لگی بیٹھی تھی۔ چند سیکنڈ کے توقف سے وہ بولا۔ "نوادرات سے ہماری دلچسپی بہت پرانی ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق جو صندوق تم نے جھنگ کی حویلی سے نکالے ہیں ان میں قدیم دور کے چند نوادرات بھی ہیں۔ ہم ان نوادرات پر اپنی رال ضرور ٹپکائیں گے کیونکہ اس کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے۔ اگر تم نے ان نوادرات کو بیچنا چاہا اور وہ ہماری پسند کے مطابق بھی ہوئے تو ہم ان کے پہلے خریدار ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دفینے کے بارے میں آپ کافی کچھ جانتے ہیں۔"

"کافی کچھ تو نہیں لیکن تھوڑی بہت جانکاری ہمیں حاصل ہے۔"

"یعنی آپ شیور ہیں کہ ان صندوقوں میں نوادرات وغیرہ بھی ہیں؟"

"بالکل ہونے چاہئیں۔ اگر کھدائی سے برآمد ہونے کے بعد وہ صندوق تمہارے پاس ہی ہیں اور انہیں کھولا نہیں گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ بہت سی نایاب اشیا ان میں نہ پائی جائیں۔ اس ناتے سے چند قدیم جنگی ہتھیاروں کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے لندن کے ایک معروف ہفت روزہ میں ان قدیم ہتھیاروں کے بارے میں ایک لمبا چوڑا فیچر چھپا تھا۔ اس کے بعد دو ملکی پرچوں میں بھی اس سلسلے میں تفصیلات آئی تھیں۔ قابلِ ذکر تصاویر وغیرہ بھی

چھپی تھیں۔"

میرے اندر ایک دم تجسس کا دریا بہہ نکلا۔ "کس قسم کے ہتھیار تھے یہ؟"

مہاراج رتن سنگھ مسکراتا ہوا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آج شام جودھ پور سے کیپٹن آر کے بھوانی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ان سے تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ فی الحال تو ذرا باہر چلتے ہیں۔ تمہیں اس جنگل کی سیر کراتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک "کال بیل" کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے بعد دروازے پر ایک باوردی ملازم نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ مہاراج تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "ہری سنگھ! ماشو سے کہو ہمارے گھوڑے کے ساتھ ایک اور گھوڑا تیار کرے۔ ہم تھوڑی دیر میں باہر جا رہے ہیں۔"

باوردی ملازم سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ مہاراج نے مسکراتی نگاہوں سے میرے آباد پہلو کو دیکھا اور بولا۔ "تم زینا کے ساتھ یہاں بیٹھو۔ ہم دس منٹ میں تیار ہو کر آتے ہیں۔"

وہ کھڑا ہونے کے بعد اور بھی بدوضع نظر آنے لگا تھا۔ توند مزید نمایاں ہو گئی تھی۔ پورا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ فربہ ہونے کے ساتھ توانا اور قوی بھی نظر آتا تھا۔ اس نے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے نیکر کے الاسٹک میں ڈالے اور اسے اوپر کی طرف کھینچ کر اپنی نصف توند ڈھانپ لی۔ اس کے بعد مست چال چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی خود کار دروازہ بند ہو گیا تھا۔ نشست گاہ کی خوابناک تنہائی میں "زینا" اور میں ایک دوجے کے پہلو میں بیٹھے رہ گئے۔ وہ بڑی بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ نسوانی کشش ان آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی انگلش کی بات کرے گی لیکن وہ "بولی" کے بجائے "انگ بولی" کی قائل نکلی۔ زبان کو زحمت دینے کے بجائے اس نے اپنے جسم کو زبان بنایا اور اشتعال انگیز خاموشی سے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ مجھے ایسے بھونڈے پن کی توقع نہیں تھی۔ بالکل بازاری سا انداز تھا یہ۔ یا پھر اس کی ہدایات ہی ایسی تھیں۔ اسے سمجھایا گیا تھا کہ کم وقت میں اسے زیادہ سے زیادہ "کارکردگی" دکھانی ہے۔ ایک بجلی تھی جو اس کی بانہوں میں سرایت کرنے کے بعد مجھ پر گر رہی تھی۔ ایک ہی لمحے میں اس گرم مشین نے اپنے جسم کا تمام تر گداز میرے پہلو میں منتقل کر دیا۔ اس کے لرزتے لب سراپا دعوت تھے۔

اس دعوت کو ٹھکرانا بہت دل گردے کا کام تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے خود سے دور ہٹایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ "یس کم ان۔" میں نے کہا۔

وہی مساج کرنے والی لڑکی اندر آئی۔ اب اس نے اپنے مختصر ترین لباس پر ایک تاول گاؤن پہن لیا تھا۔ اس کے ایک بازو پر کوئی لباس جھول رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں چم چم کرتے شکاری بوٹ تھے۔ اس نے بوٹ بڑی آہستگی کے ساتھ باتھ روم کے دروازے پر رکھ دیے اور لباس لے کر اندر چلی گئی۔ چند لمحے بعد نکلی اور مسکرا کر بولی۔ "ہز ہائی نس کا کہنا ہے کہ آپ بھی لباس بدل لیں۔"

میں ابھی تک کاٹن کے اسی ہلکے پھلکے لباس میں تھا جسے صبح غزالہ نے دوبارہ استری کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لباس گھڑ سواری اور جنگل نوردی کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد باتھ روم کا رخ کیا۔ کمرے کی طرح باتھ روم بھی بے حد سجا سنورا تھا اور یقین نہیں آتا تھا کہ یہ ایک گمنام سال ریسٹ ہاؤس کا حصہ ہے۔ میں نے شکاری لباس پہن لیا۔ یہ میرے جسم پر بالکل پورا تھا۔ کہیں انیس بیس کا فرق بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں باہر نکلا تو زینا شکاری بوٹ ہاتھوں میں لیے کھڑی تھی۔ "بیٹھیے میں پہنا دوں۔" وہ بولی تو کمرے میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

ایسے خوبصورت ہونٹوں سے ایسی شیریں آواز ہی برآمد ہونی چاہیے تھی۔ وہ میری خدمت پر تلی ہوئی تھی اور مجھے اپنی عاقبت شدید خطرے میں نظر آرہی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ شیخ راشد بن ارشد کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں نے جو دھواں دھار تین برس گزارے ان میں شراب کے ساتھ ساتھ عورت بھی میری زندگی میں در آئی تھی لیکن بعد میں میں نے اپنی پیاری بہن شفقا کے پیار کے سامنے ہتھیار پھینکے اور خود کو قانون کے سپرد کیا تو ان سب گناہوں سے بھی توبہ کی جو مجھ سے سرزد ہو چکے تھے۔ اب میری زندگی میں شراب کا دور دور پتا نہیں تھا اور عورت کے حوالے سے بھی میں اب تک ثابت قدم رہا تھا۔ مگر آج جو آفت مجھ سے چمٹی تھی وہ سراپا بارود تھی اور اپنے اندر ہر انسانی ارادے کو جلا کر خاکستر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد بوٹ اس کے ہاتھوں سے لینا چاہے لیکن وہ بڑی ادا سے پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں جناب! اس داسی کے ہوتے ہوئے آپ یہ کشٹ کیوں اٹھائیں گے۔" وہ قالین پر دوزانو بیٹھ گئی اور مجھے بوٹ

پہنانے لگی۔

پانچ منٹ بعد میں اور مہاراج رتن سنگھ آف ناندل دو شاندار تازی گھوڑوں پر سوار اس گمنام سال ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل رہے تھے۔ ریسٹ ہاؤس چھوڑنے سے پہلے میں نے غزالہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ بھی یہ جان کر ششدر رہ گئی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ اس ریسٹ ہاؤس میں موجود ہے اور اسی کے کارندے ہمیں نیرس سے نکال کر اس ویرانے میں لائے ہیں۔ میں نے غزالہ کو بتا دیا تھا کہ میں مہاراج رتن سنگھ کے ساتھ باہر جا رہا ہوں اور دوپہر کے کھانے تک واپس آجاؤں گا۔ غزالہ بے حد فکرمند نظر آئی تھی۔ پہلے اس نے اصرار کیا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن پھر میرا موڈ دیکھ کر وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دوپہر ایک بجے تک لوٹ آؤں گا۔

قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ سورج اب خاصی بلندی پر آ گیا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گھوڑوں کو دُلکی چال چلاتے ہم ریسٹ ہاؤس سے قریباً دو فرلانگ کی دوری پر آ گئے۔ یہاں سے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ریتیلے علاقے میں ان جھاڑ جھنکاڑ درختوں کا وجود غنیمت تھا۔ ہم قریباً ایک گھنٹا یونہی ادھر اُدھر گھوڑے دوڑاتے رہے۔ ہمارے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ہر قسم کا شکار ملتا ہے۔ بڑ کے ایک درخت پر کسی پرانی مچان کی باقیات نظر آئیں۔ کئی درختوں پر گولیوں کے نشانات موجود تھے۔ ایک مقام پر ناگ پھنی کے درخت تلے پختہ قبر سی بنی ہوئی تھی۔ قبر دیکھ کر یہی خیال آیا کہ یہ کوئی "شکاری حضرت" ہوں گے لیکن خود شکار ہو گئے ہوں گے اور انہیں سپرد خاک کر دیا گیا ہو گا یا پھر کوئی درویش ملنگ ہو گا۔ مگر مہاراج رتن سنگھ نے بتایا کہ یہ ایک خوبصورت مور کی قبر ہے۔ کوئی چار سال پہلے سردیوں کے موسم میں وہ کار پر سوار یہاں سے گزر رہے تھے کہ یہ جنگلی مور کار کے ونڈ اسکرین سے ٹکرا کر مر گیا تھا۔ مہاراج کی اہلیہ بھی ہمراہ تھیں۔ انہیں اس خوبرو کی موت کا اتنا افسوس ہوا کہ زار و قطار رونے لگیں۔ نتیجے میں مہاراج نے شکار کا پروگرام منسوخ کر دیا اور اس مور کی تجہیز و تکفین میں لگ گئے۔ یہ قبر اسی واقعے کی یادگار تھی۔ اس قسم کی نجانے کتنی یادگاریں اس جنگل میں بکھری ہوئی تھیں۔ مہاراج نے مجھے ایک نادر درخت دکھایا۔ اس درخت پر ایک پتھریلی تختی نصب تھی۔ تختی پر لکھا تھا۔ "یہ وہ درخت ہے جس پر مچان لگا کر ہز ہائی نس مہاراج رتن سنگھ آف ناندل نے خطرناک چیتے "باگھے" کا شکار کیا تھا۔" نیچے وہ تاریخ اور وقت بھی درج تھا جب وہ نامعقول چیتا مہاراج کی بندوق کا نشانہ بنا۔

میں یوں تو مہاراج کے ساتھ گھوم رہا تھا اور اس کی باتیں بھی سن رہا تھا لیکن میرا ذہن کسی اور ہی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں فرید کوٹ سے یہاں راجستھان کے صحرائی علاقے میں کیونکر پہنچا ہوں اور اب حالات مجھے کس رخ پر لے جارہے ہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا اور اس کے بعد جو کچھ مجھے غزالہ نے بتایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فرید کوٹ میں غزالہ کو شنکر شکرا کے چنگل سے نکالنے والا اور ہمیں فرید کوٹ سے راجستھانی علاقے کی طرف لانے والا سائیں عالی ہی ہے۔ اس کام میں اس کے ساتھ اس کا چیلا جانی شاہ بھی شریک تھا۔ انہوں نے کسی طرح ایک جیپ حاصل کی تھی اور ہمیں بے ہوشی کی حالت میں اس میں ڈال کر فرید کوٹ سے روانہ ہو گئے تھے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں جا رہے تھے اور کس کے پاس؟ جس جگہ جیپ کو حادثہ پیش آیا وہاں سے کئی سمتوں میں سفر کیا جا سکتا تھا۔ ناندل، جودھ پور، اجمیر، لونی یا پھر اس سے آگے ماروار وغیرہ کو بھی منزل مقصود قرار دیا جا سکتا تھا۔ دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ سائیں عالی ہمیں وہاں کیوں لے جا رہا تھا؟ اس کے دو جوابات قرین قیاس تھے۔ پہلا تو یہ کہ وہ ہمیں صرف شنکر شکرا سے بچانے کے لیے یہاں لایا تھا۔ ممکن تھا کہ اس علاقے میں سائیں کا کوئی خاص مرید موجود ہو اور اس کے ہاں ہمیں پناہ مل سکتی۔ دوسرا قیاس یہ تھا کہ سائیں عالی کچھ نہایت اہم معلومات تک رسائی حاصل کر چکا تھا اور اس کی رو سے وہ جانتا تھا کہ وہ ٹرک جو ۲۲ مارچ کی شب گنڈارا پور گاؤں کے نشرت فارم سے غائب ہوا ہے راجستھان کی طرف لایا گیا ہے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ ٹرک کے ٹھکانے سے بھی آگاہ ہو چکا ہو۔ اس صورت میں یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ سے سینکڑوں میل دور کیوں چلا آیا تھا۔ سائیں عالی میرے لیے ابھی تک ایک معما بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ مجذوب ہے، دیوانہ ہے یا فرزانہ۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی عقل سمجھ سے کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل ایک وجدانی کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حادثے کا شکار ہونے کے بعد سائیں عالی ہمارے ساتھ ہی جودھ پور پہنچا تھا اور ابھی تک وہیں تھا۔ میرے ساتھ اس کی آخری ملاقات کوئی تین روز پہلے ہوئی تھی۔

جنگل میں آوارہ گردی کے بعد ہم ایک بجے ریسٹ ہاؤس واپس پہنچ گئے۔ لنچ تیار تھا۔ کھانے کے کمرے میں پہنچے تو بیس پاس سے اُمڈتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے معدے میں اچھل سی مچا دی۔ غزالہ بھی ابھی ابھی ڈائننگ روم میں پہنچی تھی۔ اس نے نہا کر لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لباس اسے ریسٹ ہاؤس ہی سے مہیا کیا گیا تھا۔ گلابی شلوار قمیص اور ہم رنگ دوپٹے میں رو نکھری نکھری نظر آ رہی تھی لیکن اس کا سارا حسن اور نکھار ایک زبردست امتحان سے دوچار تھا۔ نشا دیوی بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ یوں لگتا تھا کہ غزالہ کا چاند نشا کے سورج کے سامنے آ گیا ہے اور اچانک اپنی آب و تاب کھو بیٹھا ہے۔ کچھ ایسی ہی چکا چوند نشا کے حسن میں کہ اس کے اردگرد کی ہر شے دھندلا جاتی تھی مگر ایک بات اپنی جگہ حقیقت تھی 'چاند کا دھیما پن' اس کی سادگی اور ٹھنڈک سورج کو نصیب نہیں ہوتی۔ سورج کتنا بھی تابناک ہو اور کسی بھی موسم میں چمکے اس کی طرف دیکھنا آنکھوں کے لیے زحمت ہوتا ہے۔

کھانے میں دیگر لوازمات کے علاوہ دیسی مرغ کا کڑاہی گوشت بھی تھا۔ اس خصوصی ڈش کا لطف دوبالا کرنے کے لیے دنیا کی نمکین انی بھی موجود تھی۔ بھوک چمکی ہوئی تھی۔ ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے دوران نشا میرے اردگرد ہی چکراتی رہی تھی۔ غزالہ اسے گاہے گاہے کن انکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔ انہی لمحات میں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مہاراج رتن سنگھ نے ابھی تک غزالہ کو اپنے نشانے پر بٹھایا نہیں ہے۔ غزالہ کو دیکھ کر اس کی بھوکی نگاہ میں ایک چمک سی نمودار ہو جاتی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں میرے اردگرد نشا کی موجودگی بھی تو اسی سلسلے کی کڑی نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ مہاراج رتن سنگھ نشا کے چکتے دمکتے حسن سے میری آنکھیں چندھیا کر ایک بار پھر غزالہ کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا ہو۔ بہرطور ابھی اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جو کچھ تھا پیش آمدہ ساعتوں کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ غزالہ کھانے کی میز ہی سے واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔ شاید مہاراج رتن سنگھ کی نگاہوں کی تپش سے بچنا چاہتی تھی۔

مہاراج نے کہا۔ "اب ہمیں واپس جودھپور جانا ہو گا۔ آج شام کیپٹن آر کے بھوانی جودھپور سے آ رہا ہے اور ہمیں اس کے سواگت کے لیے وہیں موجود ہونا چاہیے۔ تم یہاں بالکل بے فکر ہو کر رہو۔ عتیق خاں یہیں ہے۔ کسی قسم کی ضرورت ہو تو اسے بتانا۔ ہمارا خیال ہے کہ کل تک شیخ عاصم واپس چلا جائے گا۔ اس کے جاتے ہی ہم اور کیپٹن بھوانی یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد ٹرک کے سلسلے میں تفصیلی بات ہو گی۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں اور وہ بولا۔ "کیا خیال ہے کیا ہم اس سلسلے میں کل تک کی تاخیر برداشت کر سکتے ہیں؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ٹرک کے سلسلے میں۔" وہ بولا۔

میں نے کش لیتے ہوئے کہا۔ "یور ہائی نس! سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت ٹرک کے بارے میں میں بھی وہی کچھ جانتا ہوں جو آپ جانتے ہیں۔ میرے ساتھی ٹرک کو گنڈارا پوار گارڈن لے گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا اور گنڈارا پور آنے کو کہا۔ جب میں گنڈارا پور پہنچا تو ٹرک وہاں موجود نہیں تھا۔"

"اور تمہارے ساتھی؟" مہاراج رتن نے پوچھا۔

"ان میں سے ایک تو ٹرک کے ساتھ ہے اور دوسرا فرار کوٹ میں۔"

مہاراج کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میرے موقف کو نوے فیصد جھوٹ سمجھ رہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں طویل بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس وقت کم تھا۔ کہنے لگا۔ "ہم صرف یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ایک دن کی تاخیر سے کوئی زیادہ فرق تو نہیں پڑے گا؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ جہاں اتنے روز گزر گئے ہیں ایک روز اور گزر جائے تو کیا ہو گا۔"

مہاراج معنی خیز لہجے میں بولا۔ "یہ ایک روز کی تاخیر بھی اس لیے ہو رہی ہے کہ ہم شیخ عاصم کی طرف سے فارغ ہو جانا چاہتے ہیں۔ وہ جب تک یہاں ہے 'تمہاری آزادی اور جان' خطرے میں رہے گی۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ یہ صورت حال برقرار رہے۔ تمہاری اور شیخ عاصم کی ساری کتھا ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔ تمہارے مقتول شیخ راشد بن ارشد کا نام بھی ہوا۔ اب ہم نے بڑی دلچسپ اور سنگین کہانی سنی ہے۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ "یس کم ان۔" مہاراج نے کہا۔

خوبرو عتیق خاں اندر داخل ہوا اور ادب سے بولا۔

"یور ہائی نس! گاڑی تیار ہے۔"

مہاراج رتن سنگھ مجھے گڈبائی کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب ایک بار پھر میں اور نشا کمرے میں تنہا تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر ہم دونوں کو بار بار تنہائی فراہم کی جا رہی ہے۔

"آپ کی سیر کیسی رہی؟" نشا نے بے حد شیریں لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک رہی۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"رام رام! اتنی لمبی سیر اور ایسا مختصر جواب۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"میں لمبی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

"آپ کو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ کی تو آنکھیں بولتی ہیں۔" اس نے مسکا لگایا اور ایک دم نزدیک آ گئی۔ غالباً اپنے سحر کار شباب پر بہت بھروسا تھا اسے۔ یوں بے دھڑک تیر دہی چلاتا ہے جس کا نشانہ بے خطا ہو' اور اپنے بارے میں اس کے اندازے کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ اس کی دعوت ٹھکرانے کے لیے پتھر کا دل اور سمندر کا ظرف درکار تھا اور میں ایسے دل اور ایسے ظرف کا دعویدار نہیں تھا۔ لہٰذا حالات بگڑنے سے بہت پہلے میں نے اس خوبصورت بلا کی پیش قدمی روکی اور کمرے سے نکل آیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"اپنے کمرے میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

کمرے میں پہنچا تو غزالہ بیڈ پر دراز تھی۔ اس نے اپنا ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے بغور اس کی سانسوں کا زیروبم دیکھا۔ لگتا تھا سو رہی ہے۔ میں نے اسے پکارا۔ یہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ اسے سوتے سے جگا دیتی اور نہ ہی اتنی مدھم تھی کہ وہ سن نہ سکتی۔ وہ بے حرکت پڑی رہی۔ میں اس کے تکیے تلے ایک چھوٹا سا اُبھار محسوس کر سکتا تھا۔ یہ وہ پسٹل تھا جو آج صبح میں نے اسے دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر وہ پسٹل چلا سکتی ہے یا نہیں۔ بہرحال تحفظ کا ایک احساس تو اسے میسر آ گیا تھا۔

میں بھی قیلولے کی غرض سے صوفے پر دراز ہو گیا۔ ستانے کے لیے لیٹا تھا مگر نیند آ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو شام کے چھ بجنے والے تھے۔ پتا نہیں یہ گہری نیند رت جگے کا نتیجہ تھی یا اس گاڑھی لسی کا جو میں نے لنچ میں کئی گلاس پی لیا تھا۔ غزالہ مجھ سے پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی اور آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ جاگنے کے بعد میں خود کو تازہ دم اور ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ ایک عجیب ترنگ سی رگ و پے میں اُتری ہوئی تھی۔ کمرے سے نکل کر میں برآمدے میں پہنچا۔ سورج اپنی تمازت کھو کر مغرب میں غوطہ زن تھا۔ اُفق پر سُرخ کناروں والے سفید بادل چمک رہے تھے۔ ہوا میں نامعلوم نباتات کی مہک تھی اور وہ تازگی بھی جو آلودگی سے پاک فضاؤں کا خاصہ ہوتی ہے۔ میں نے منہ کھول کر چند گہرے سانس لیے اور اس کیاری کے قریب جا کھڑا ہوا جس میں سفید اور سیاہ گلاب کی چھوٹی بڑی کلیاں مہک رہی تھیں۔ وہ شاندار گاڑی اب پورچ میں موجود نہیں تھی جس میں مہاراج رتن سنگھ اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ واپس جودھپور جا چکا ہے۔ میں نے ڈوبتے سورج پر نگاہ ڈالی اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ جودھپور کس رُخ پر واقع ہے۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا کہ کتنے گھوڑے ہیں' بہرحال وہ سرپٹ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان کا رُخ جنوب سے شمال کی طرف تھا۔ یعنی آج دوپہر ہم جس جنگل میں گھومتے رہے تھے وہ اس جانب سے نمودار ہوئے تھے اور جودھپور کی طرف جا رہے تھے۔ پھر گھوڑوں کی ٹاپوں میں کسی انجن کا شور بھی شامل ہو گیا۔ میں دوڑ کر ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلا اور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔ جنگل کی جانب سے مجھے گرد اُڑتی دکھائی دی۔ یقیناً یہ کوئی جیپ تھی۔ یہ جیپ گھوڑوں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے تھی۔ گھوڑے تو میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے لیکن چند لمحے بعد میں نے سیاہ جیپ کو دیکھ لیا۔ وہ ناہموار راستے پر تیزی سے اُچھلتی کودتی جنوب کی سمت بڑھ رہی تھی۔ یکایک ایک فائر ہوا اور فضا میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ شکاری بندوق کا فائر نہیں تھا اور نہ ہی کسی شکاری نے کیا تھا۔ یہ کوئی اور چکر لگتا تھا۔ فائر سن کر ریسٹ ہاؤس کے ملازمین بھی بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ان میں عتیق خاں سب سے آگے تھا۔ غالباً وہ چھت پر سے اُترا تھا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید سو رہا تھا۔

"جناب! یہ کیسی آوازیں ہیں؟" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میرے جواب دینے سے قبل ہی ایک بار پھر خودکار رائفل کی "تڑتڑ" سے فضا گونج اُٹھی۔ اس مرتبہ مسلسل سات آٹھ فائر کیے گئے تھے اور یہ فائر دو مختلف اطراف سے ہوئے تھے۔ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جیپ گھڑ سواروں

کے تعاقب میں ہے' اور تعاقب کرنے والے اور بھاگنے والے ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ انجن کا شور اب معدوم ہو چکا تھا لیکن گرد کا بادل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ گرد ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہری گئی تھی۔ ہم منتظر رہے کہ شاید مزید فائر ہوں لیکن جنگل پہلے کی طرح خاموش تھا۔ انسانوں کا برپا کیا ہوا شور ختم گیا تھا۔ اب ایک بار پھر صرف فطرت ہی دکھائی اور سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "آر عتیق خاں! دیکھیں یہ کیا چکر ہے؟"

وہ پہلے تو متذبذب ہوا پھر میرے ساتھ جیپ کی طرف بڑھا۔ یہ وہ جیپ تھی جس میں ہم علی الصباح یہاں پہنچے تھے۔ وہ مسلح افراد سمیت ہم تیزی سے جیپ میں داخل ہوئے اور جنگل کی طرف بڑھے۔ عتیق ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ قریباً ایک میل آگے جانے کے بعد اچانک ہمیں رک جانا پڑا۔ ایک تحیر خیز منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک ہانپتا ہوا گھوڑا خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی چند باوردی گارڈز کے ہاتھوں دو غریب صورت افراد کی زبردست ٹھکائی ہو رہی تھی۔ ان پر رائفلوں کے بٹ برسائے جا رہے تھے اور وہ جان بخشی کی التجائیں کر رہے تھے۔ پھر میں نے وہ سیاہ جیپ دیکھی جس کی جھلک تھوڑی دیر پہلے درختوں میں نظر آئی تھی۔ جیپ کے قریب ایک نہایت بارعب خوش پوش شخص کھڑا تھا۔ بہت سرخ و سپید رنگت' براؤنش بال' براؤنش مونچھیں اور گہری بادامی آنکھیں' اس کے ایک ہاتھ میں دھوپ کا چشمہ تھا اور وہ جیپ کے بونٹ پر کہنی ٹکائے اطمینان سے کھڑا تھا۔ یقیناً چند لمحے پہلے تک وہ گھڑ سواروں کی پٹائی ہوتے دیکھ رہا تھا لیکن اب اس کی ساری توجہ ہماری طرف تھی۔ بڑے ٹھاٹ سے چلتا ہوا وہ ہمارے قریب پہنچا۔ عتیق خاں نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی۔ "یہی کیپٹن آر کے بھوانی ہیں۔"

پھر وہ جلدی سے نیچے اترا اور ماتھے پر ہاتھ لے جا کر کیپٹن بھوانی کو سلام کیا۔ کیپٹن بھوانی بھی اسے دیکھ کر قدرے حیران نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تم رتن سنگھ صاحب کے ملازم ہو نا؟"

عتیق خاں نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی ہاں! میرا نام عتیق ہے۔"

اس دوران گھڑ سواروں سے مارپیٹ کرنے والے انہیں مردہ جانوروں کی طرح گھسیٹتے ہوئے کیپٹن آر کے بھوانی کے قدموں میں لے آئے۔ وہ دونوں لہولہان تھے اور تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں راجا صاحب۔" عتیق خاں نے کیپٹن بھوانی کو راجا کہہ کر مخاطب کیا۔

"ابھی سارا پتا چل جاتا ہے۔" کیپٹن بھوانی نے بارعب آواز میں کہا۔ پھر ہماری جیپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

عتیق خاں نے کہا۔ "یہاں قریب ہی ایک ریسٹ ہاؤس ہے جناب۔ ہز ہائی نس اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔"

کیپٹن بھوانی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "ویس' آئی ری ممبر۔ میں رتن صاحب کے ساتھ ایک دفعہ اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر چکا ہوں۔ یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے وہ جگہ؟"

عتیق خاں نے پنجوں کے بل کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے جھنڈ کی دوسری طرف پانی کا ٹینک نظر آ رہا ہے۔ وہ ریسٹ ہاؤس کی چھت ہے۔"

کیپٹن بھوانی نے عتیق خاں کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور ریسٹ ہاؤس کے آثار دیکھ لیے۔ اس نے چٹکی بجاتے ہوئے اپنے باوردی کارندوں کو حکم دیا۔ "چلو ان دونوں کتوں کو جیپ میں ڈالو۔ ان سے ریسٹ ہاؤس میں چل کر بات کریں گے۔"

"تری ٹو۔" رائفلوں والے باوردی ملازموں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور روتے بلکتے دیہاتیوں کو اٹھا اٹھا کر سیاہ جیپ کے عقبی حصے میں پھینک دیا۔ بعد ازاں ان کی مشکیں بھی کس دی گئیں۔ اسی جیپ کی اگلی نشست پر ایک موٹا تازہ بلڈاگ بھی موجود تھا اور دھیمی آواز میں مسلسل غرا رہا تھا۔ ریت پر تڑپتا ہوا گھوڑا اب راہی عدم ہو چکا تھا۔ اس کی ایک پچھلی ٹانگ اور پیٹ میں گولیاں لگی تھیں۔ ایک دوسرا گھوڑا یونہی ادھر ادھر چکرا رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی کے ترمیوں نے اسے بھی گھیر کر پکڑ لیا۔ اس دوران ایک اور شاندار گاڑی بھی موقعے پر پہنچ گئی۔ یہ کسی نامعلوم کمپنی اور ماڈل کی گاڑی تھی۔ جیپ کی طرح اس گاڑی پر بھی کیپٹن بھوانی کے مصاحب اور محافظ سوار تھے۔ غالباً جیپ اور گھوڑوں کی دوڑ میں یہ گاڑی پیچھے رہ گئی تھی۔ کیپٹن بھوانی نے کار میں سوار ایک ہٹے کٹے جلاد نما شخص سے کہا۔ "کاکڑ وہ حرام کا تخم تیرا بندہ بھاگ گیا ہے۔ میرا خیال ہے انہی درختوں میں کہیں چھپا ہوگا۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اسے تلاش کرو۔ وہاں سامنے ایک ریسٹ ہاؤس ہے ہم وہاں جا رہے ہیں۔ فارغ ہو کر تم بھی وہاں آ جاؤ؟"

جس شخص کو کاکڑ کہا گیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر

مستعدی سے سر جھکایا اور فوجی انداز میں گھوم کر کار کی جانب بڑھ گیا۔ کیپٹن بھوانی جیپ میں بیٹھ گیا۔ میں اور عتیق خاں اپنی جیپ میں سوار ہو گئے۔

پندرہ منٹ بعد ہم ریسٹ ہاؤس کی پُرآسائش نشست گاہ میں کیپٹن بھوانی کے سامنے کھڑے تھے۔ کیپٹن بھوانی شاہانہ انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا اور اس کے مسلح باڈی گارڈز دائیں بائیں کھڑے تھے۔

عتیق خاں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جناب! ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ آپ آج شام جوبلہ پہنچنے والے ہیں۔"

"ٹھیک اطلاع ملی تھی۔" کیپٹن آر کے بھوانی نے کہا۔ "لیکن راستے میں ایک مسئلہ پیش آ گیا تھا۔" ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں اظہار خیال کرنے والا ہے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اپنا بھاری بھرکم پاؤں شیشے کی نازک تپائی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "رتن صاحب کہاں ہیں؟"

عتیق خاں نے کہا۔ "دوپہر تک تو یہیں تھے لیکن پھر جوپور چلے گئے۔ وہ آپ کو خود ریسیو کرنا چاہتے تھے۔"

"جوپور کا فاصلہ یہاں سے کتنا ہے؟" کیپٹن بھوانی نے پوچھا۔

"پچیس چھبیس میل کے قریب ہے۔"

کیپٹن بھوانی کی سرخ و سپید پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں ابھریں۔ چند لمحے کے توقف سے بولا۔ "تم کسی بندے کو فوراً جوپور روانہ کرو۔ رتن صاحب کو سندیسا دو کہ وہ یہاں چلے آئیں۔ بلکہ ٹھہرو۔ میں تمہیں ان کے لیے رقعہ لکھ دیتا ہوں۔"

اس نے قمیص کی "چیسٹ پاکٹ" میں ہاتھ ڈال کر ایک خوبصورت گولڈن قلم برآمد کیا۔ عتیق خاں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک رائٹنگ پیڈ تپائی پر رکھ دیا۔ کیپٹن بھوانی نے انگریزی میں چند سطور لکھیں اور کاغذ تہہ کر کے عتیق خاں کو سونپ دیا۔ "میں نے اس میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔" وہ فوجی لب و لہجے میں بولا۔ "تم فوراً اسے جوپور پہنچاؤ۔ اگر تمہاری جیپ ٹھیک ہے تو لے جاؤ۔ ورنہ میں اپنے ڈرائیور کو کہہ دیتا ہوں۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں۔ جناب۔" عتیق خاں نے کہا۔ "میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔"

ریسٹ ہاؤس کے ایک دوسرے کمرے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ دونوں گرفتار شدہ افراد کو بے دردی سے مارا جا رہا تھا۔ وہ ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح چلا رہے تھے اور رحم کی درخواستیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن بھوانی بھی اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو کس جرم میں پکڑا گیا تھا اور اب کیوں تشدد کی چکی میں پیسا جا رہا تھا۔

بیس پچیس منٹ بعد عتیق خاں نے مجھے آ کر بتایا کہ وہ کیپٹن راجا بھوانی صاحب کا پیغام لے کر خود ہز ہائی نس کے پاس جا رہا ہے' امید ہے کہ صبح تک واپسی ہو جائے گی۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بلا تکلف ملازمین سے کہہ سکتا ہوں۔ ابھی میں اور عتیق خاں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کیپٹن آر کے بھوانی کی جیپ کے ہمراہ آنے والی نامعلوم ماڈل کی کار بھی ریسٹ ہاؤس پہنچ گئی۔ کار میں کیپٹن بھوانی کے محافظ تھے۔ عقب میں وہ گھوڑا چلا آ رہا تھا جس کا بدنصیب سوار ایک قریبی کمرے میں ماں بہن کی غلیظ گالیاں سن رہا تھا اور گدھے کی طرح مار کھا رہا تھا۔ اس گھوڑے کو کیپٹن بھوانی کا ایک باوردی ملازم لے کر آیا تھا۔ جلاد نما شخص جسے کیپٹن بھوانی نے کاکڑ کہا تھا' گاڑی سے اترا۔ چند لمحے اپنے ساتھیوں سے باتیں کرتا رہا پھر مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں تشدد کا بازار گرم تھا۔ جب کاکڑ کمرے میں داخل ہوا' میری نگاہ آدھ کھلے دروازے سے کمرے میں گئی۔ میں نے ایک دیہاتی کو سر تا پا برہنہ دیکھا۔ اس کے دونوں بازو مروڑ کر اسے زبردستی فرش پر لٹایا جا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ بند ہو گیا اور یہ شرمناک منظر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

عتیق خاں نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے توقع ہے کہ آپ اس معاملے سے الگ تھلگ رہیں گے۔ یہ بندے جو پکڑے گئے ہیں' عادی جرائم پیشہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ راجا صاحب نے انہیں کوئی سنگین واردات کرتے دیکھا ہے۔ بہرحال صبح تک ساری بات واضح ہو جائے گی۔ ہز ہائی نس بھی آ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ کوئی خاص معاملہ ہوگا۔"

اپنی دانست میں مجھے سمجھانے بجھانے کے بعد وہ جیپ پر جوپور روانہ ہو گیا۔ تاہم جاتے جاتے وہ اپنے ترمیوں کو پوری طرح چوکس کر گیا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ میری نگران آنکھوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے اور وہ ہر گھڑی مجھے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ ایک طرح سے اس ریسٹ ہاؤس میں میری حیثیت آزاد قیدی کی تھی۔ ایک طرف مجھے اپنی حفاظت کے لیے پسٹل فراہم کر دیا گیا تھا اور دوسری طرف خودکار رائفلوں والے افراد میرے اردگرد

تعینات کر دیے گئے تھے۔

○☆○

وہ رات میں نے غزالہ کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کے اسی ہوا دار کمرے میں گزاری۔ اس کمرے کو اپنے قیام کے قابل بنانے کے لیے ہم نے اس میں دو تبدیلیاں کیں۔ ایک تو اس میں دوسرا بستر لگوایا جس پر مجھے سونا تھا۔ دوسرے وہ تصویر دیوار سے اُتار دی جس میں گورے باؤنڈ کتوں کی مدد سے شکار کا ایک وحشت ناک منظر دکھایا گیا تھا تاہم یہ تصویر اُتارنے کے باوجود ماحول کی وحشت ناکی کم نہیں ہوئی۔ کیپٹن بھوانی کے خوفناک "بلڈاگ" کتے کی غراہٹیں ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں گونجتی رہیں اور ان غراہٹوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی غراتے اور گرجتے برستے رہے جو ایک قریبی کمرے میں گرفتار شدگان پر عرصۂ حیات تنگ کر رہے تھے۔ نو بجے کے بعد دیہاتیوں کی چیخ و پکار بند ہو گئی تھی اور میں نے سمجھا تھا کہ شاید صبح تک کے لیے ان کی جان چھوٹ گئی ہے لیکن رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے پھر مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کھڑکی میں سے ایک شخص کو دیکھا جو کسی درخت کی ایک موٹی شاخ کو خنجر سے تراش کر ڈنڈے کی شکل دے رہا تھا۔ یقیناً یہ اہتمام بھی ایذا رسانی کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ غزالہ بے حد سہمی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے لہولہان دیہاتیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب وہ ان کی چیخ و پکار سن رہی تھی اور صرف چیخ و پکار ہی نہیں مار پیٹ کی آوازیں اور گالی گلوچ بھی اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے تمام کھڑکیاں اور دونوں دروازے بند کر دیے مگر آوازیں بدستور ہماری سماعت تک راستہ بناتی رہیں۔ آخر غزالہ منمنائی۔ "آپ ان سے جا کر کہہ نہیں سکتے کہ یہ مار پیٹ بند کر دیں۔ وہ پہلے ہی زخمی ہیں۔ کیا اب انہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہم اس معاملے میں بالکل بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ واقعی قصوروار ہوں۔"

وہ بولی۔ "قصوروار ہیں تو انہیں پولیس میں دے دیں۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے اس طرح تشدد کرنے کا۔"

میں نے کہا۔ "پولیس بھی انہیں کرسی تو پیش نہیں کرے گی۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اس سے بھی ہولناک ہے۔ غریب، بے سہارا آدمی ہر جگہ پستا ہے۔"

"تو کیا ہم اس طرح خاموش بیٹھے رہیں گے؟"

"مجبوری ہے۔ کم از کم مہاراج رتن سنگھ کے آنے تک خاموش ہی رہنا ہوگا۔ تمیتی خاں مجھ سے خاص طور پر کہہ کر گیا ہے کہ ہم اس چکر سے دور رہیں۔"

اتنے میں ایک دیہاتی دلدوز انداز میں چیخا۔ اس کی آواز بند در و بام کی رکاوٹیں عبور کرتی ہم تک پہنچی۔ یوں لگا کہ انسان کے بجائے کوئی ایسا جانور چیخا ہے جسے بے حد کند چھری سے آہستہ آہستہ ذبح کیا جا رہا ہے۔

میرے لیے اس نوع کی آوازیں نئی نہیں تھیں لیکن غزالہ کے لیے یہ سب کچھ برداشت سے باہر تھا۔ وہ ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے بھاگ کر باتھ روم میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ کافی دیر بعد وہ باہر آئی تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ تھیں لیکن گرجنے برسنے اور رونے پیٹنے والی صداؤں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کمرے میں ایک ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ میں نے اسے لگا دیا اور آواز پوری کی پوری کھول دی۔ بند کمرے کے اندر ایک انڈین گانا زور شور سے بجنے لگا۔

بول میری تقدیر میں کیا ہے، میرے ہم سفر یہ تو بتا
جیون کے دو پہلو ہیں ہریالی اور راستہ

کبھی کبھی شور بھی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کے شور میں غزالہ کو اونگھ سی آنے لگی۔ پہلے وہ نیم دراز ہوئی پھر دس پندرہ منٹ بعد سو گئی۔ میں بھی دوسرے بستر پر دراز ہو گیا۔ شاید نیند آ بھی جاتی لیکن ایک چھوٹے سے واقعے نے یہ امکان بالکل معدوم کر دیا۔ ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ مجھے ریسٹ ہاؤس کی عقبی جانب کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ میں دبے پاؤں باہر نکلا۔ عقب میں چند خودرو جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دو ٹیوب لائٹس کی مدد سے اس جگہ کو روشن رکھا گیا تھا۔ میں نے تین افراد کو بھاگ کر درختوں میں روپوش ہوتے دیکھا۔ وہ خاص انداز کی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ ان پگڑیوں میں خاکستری رنگ کی ایک پٹی بہت نمایاں تھی۔ میرے علاوہ دو پہریداروں نے بھی ان افراد کو درختوں کی طرف لپکتے دیکھ لیا تھا۔ ایک پہریدار نے پھرتی سے اپنی بندوق سیدھی کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ نشانہ لیتا، تو وارد اوجھل ہو گئے تھے۔ دونوں پہریدار اضطراری طور پر ان کے پیچھے بھاگے لیکن پندرہ بیس قدم بھاگ کر رک گئے۔ وہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ایک پہریدار کا اُڑتا ہوا سا فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔ "ان غیرت مندوں کا انتظام بھی اب کرنا ہی پڑے گا۔"

صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی پرانا چکر ہے اور راہِ فرار اختیار کرنے والوں سے پہلے بھی پہریداروں کا واسطہ پڑتا رہا ہے۔

مہاراج رتن سنگھ اپنے چار عدد محافظوں اور ایک ڈرائیور کے ساتھ علی الصباح ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ تمیتی خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ رانی پرم بھی تھی۔ پرم مہاراج کی پتنی تھی۔ دیکھنے میں کوئی سیدھی سادی کالج گرل نظر آتی تھی۔ زرق برق لباس اور بھاری بھرکم گہنوں نے اس کی معصومیت کو بُری طرح مجروح کر رکھا تھا۔ وہ بے حد خاموش طبع تھی۔ اس کے ساتھ ایک گول مٹول سا چار پانچ سالہ بچہ بھی تھا۔ بچے نے رانی کی انگلی تھام رکھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ رانی کا سوتیلا بیٹا تھا۔ اس بچے کے تین بہن بھائی اور بھی تھے جو "جودھپور" والے محل میں تھے۔

مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن آر کے بھوانی کے درمیان ایک علیحدہ کمرے میں طویل میٹنگ ہوئی۔ پھر وہ لوگ اس عقوبت خانے میں چلے گئے جہاں کل رات گئے تک دونوں دیہاتیوں کی خاطر تواضع کی جاتی رہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور دونوں افراد کو باہر لایا گیا۔ ان کے جسموں پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشان تھے اور بے چاروں کے لیے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرے کی عمر پچیس تیس کے درمیان تھی۔ برآمدے میں انہیں کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ مہاراج رتن سنگھ کے ساتھ آئے ہوئے افراد نے ان کی مرہم پٹی کی اور درد کش گولیاں دیں۔ مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کا رویہ بھی اب ان دونوں کے ساتھ نرم تھا۔ میں نے سوچا شاید انہوں نے کوئی اقبالی بیان دے دیا ہے یا پھر یہ لوگ کسی حوالے سے مہاراج کے شناسا نکل آئے ہیں۔

میرے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مہاراج رتن سنگھ نے مجھے ایک جانب کھڑے دیکھا تو میری طرف آ گیا۔ کہنے لگا۔ "ہمارا خیال ہے کہ تمہارا ایک معما تو حل ہو گیا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں یورہائی نس؟"

مہاراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم اس ملنگ نما شخص سے ناواقف ہو جو تمہیں راجستھان میں لے کر آیا ہے اور یہ بھی نہیں جانتے ہو کہ وہ تمہیں یہاں کیوں لایا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے اعتماد سے جواب دیا۔

"اس کا نام سائیں عالی ہے اور وہ بمبئی کا رہنے والا ہے۔" مہاراج رتن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ تمہیں اس طرف کیوں لایا تھا۔"

میری سوالیہ نگاہیں مہاراج کے چہرے پر جمی تھیں۔

میں واقعی جاننا چاہتا تھا کہ سائیں عالی مجھے فرید کوٹ سے اٹھا کر راجستھان کی چلچلاتی دھوپ اور ریتیلی آندھیوں میں کیوں لے آیا ہے۔

مہاراج رتن سنگھ نے کہا۔ "یہ سائیں عالی تمہیں کیپٹن راجا آر کے بھوانی صاحب کے پاس جودھپور لے جا رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی کا شمار سائیں عالی کے مریدوں میں ہوتا ہے اور سائیں عالی چار پانچ سال پہلے بھی یہاں کیپٹن بھوانی کے پاس آ چکا ہے۔ بلکہ کیپٹن بھوانی خود ہی اسے بمبئی سے لے کر آیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایک جہاز چارٹر کیا گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کیپٹن بھوانی کے پتا "بڑے راجا صاحب" بستر مرگ پر تھے۔"

یہ اطلاع میرے لیے انکشاف انگیز تھی کہ سائیں عالی مجھے اور غزالہ کو شنکر شکرا کے چنگل سے نکالنے کے بعد شمالی راجستھان کے ایک نہایت بااثر شخص کے پاس لے جا رہا تھا۔ میں نے مہاراج سے پوچھا۔ "لیکن کیپٹن صاحب کو کیسے پتا چلا کہ سائیں عالی یہاں آپ کے پاس موجود ہے۔" جواب میں مہاراج رتن سنگھ نے جو کچھ بتایا اس سے ساری صورت حال واضح ہو گئی اور یہ بھی پتا چل گیا کہ کل پکڑے جانے والے دونوں دیہاتیوں نے کیا جرم کیا ہے۔

دراصل جودھپور میں کیپٹن بھوانی کو ایک ملازم کی زبانی اطلاع مل گئی تھی کہ سائیں عالی اپنے تین ہمراہیوں کے ساتھ چند روز پہلے فرید کوٹ سے جودھپور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے دن گزرنے کے باوجود سائیں عالی جودھپور کیوں نہیں پہنچ سکا۔ اس نے اپنے کارندے فرید کوٹ، فاضلکا، فیروز پور اور امرتسر تک دوڑائے لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ اس سلسلے میں سخت پریشان تھا۔ اس بات کی تصدیق بھی ہو چکی تھی کہ قابل احترام مرشد چھ روز پہلے فرید کوٹ سے جودھپور جانے کے لیے فلاں نمبر جیپ پر نکلے تھے۔ یہ جیپ سائیں کے ایک پارسی عقیدت مند کی تھی اور وہ پارسی بھی حیران تھا کہ جیپ اور مرشد کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ کیپٹن بھوانی نے بمبئی سے پتا کروایا۔ معلوم ہوا کہ کچھ روز پہلے فرید کوٹ سے دو افراد آئے تھے۔ وہ سائیں عالی کے خدمت گار جامی شاہ کے جاننے والے تھے۔ وہ سائیں عالی اور جامی شاہ کو کچھ دنوں کے لیے فرید کوٹ لے گئے تھے۔

اس دوران کیپٹن آر کے بھوانی کو مہاراج رتن کی طرف سے ماندل اسٹیٹ آنے کا پیغام ملا اور کیپٹن بھوانی مہاراج رتن سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک ویران

مقام پر انھیں ایک جیپ نظر آئی۔ یہ جیپ اپنے پہلو کے بل ریت میں دھنسی ہوئی تھی اور چند دیہاتی اسے رسے وغیرہ باندھ کر کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیپٹن بھوانی اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ کر دیہاتی لپکے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ کیپٹن بھوانی کی نگاہ سبز جیپ کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ وہی جیپ ہے جس کے ذریعے چند روز پہلے سائیں عالی جودھ پور کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا کہ مفرور گھڑسواروں کا تعاقب کیا جائے۔ ڈرائیور نے جیپ گھوڑوں کے تعاقب میں دوڑا دی۔ یہ ہموار گزار علاقہ تھا۔ کہیں ریتیلے ٹیلے تھے اور کہیں درختوں کے جھنڈ راستہ مسدود کیے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال گھڑسواروں کے لیے سازگار تھی۔ بہرطور کیپٹن بھوانی کا ڈرائیور بھی اپنے کام میں ماہر تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور گھوڑوں کا پیچھا جاری رکھا۔ دو گھڑسوار تو کسی اور جانب نکل گئے لیکن باقی تین کو کیپٹن بھوانی کے ڈرائیور نے جالیا۔ گھوڑوں اور جیپوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو گھڑسواروں کو وارننگ دینے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی۔ جواب میں انہوں نے بھی ہوائی فائرنگ کر کے بتایا کہ وہ مسلح ہیں۔ آخر یہ دوڑ اس مقام تک پہنچی جہاں ایک ٹیلے کے دامن میں مہاراج رتن سنگھ کا ریسٹ ہاؤس واقع تھا۔ کیپٹن بھوانی جانتا تھا کہ گھڑسوار ان درختوں میں داخل ہو گئے تو ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس نے "سیدھی فائرنگ" کا حکم دیا۔ جواب میں گھڑسواروں نے بھی اپنی دیسی ساخت کی بندوقوں سے چند فائر کیے۔ اس فائرنگ میں ایک گھوڑا شدید زخمی ہو کر گر گیا۔ اس کے سوار کو بچانے کے لیے ایک دوسرے گھڑسوار نے اپنا گھوڑا واپس موڑ لیا۔ اس دوران جیپ سر پر پہنچ گئی اور کیپٹن بھوانی کے گارڈز نے دونوں دیہاتیوں کو گرفتار کر لیا۔ تیسرا شخص بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیپٹن بھوانی کو معلوم نہیں تھا کہ جیپ حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ وہ یہی سمجھا کہ مسلح افراد نے لوٹ مار کی غرض سے جیپ پر حملہ کیا ہے۔ وہ غضب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں افراد کو پکڑ کر اس ریسٹ ہاؤس میں لے آیا اور ان کی زبان کھلوانے کے لیے تشدد شروع کر دیا۔ وہ ان سے سائیں عالی کا اتا پتا دریافت کر رہا تھا جبکہ وہ لاعلم تھے۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ ویرانے میں پڑی ہوئی ایک قابل استعمال گاڑی دیکھ کر اپنی نیتوں پر قابو نہ رکھ سکے اور اسے وہاں سے لے جانا چاہا۔ اس کے سوا وہ کسی واقعے میں ملوث نہیں تھے اور نہ کچھ جانتے تھے۔

دونوں دیہاتیوں کی مرہم پٹی کرنے کے بعد انھیں دودھ وغیرہ پلایا گیا اور پھر ریسٹ ہاؤس سے روانہ کر دیا گیا۔ ان کا گھوڑا بھی واپس کر دیا گیا تھا' جس بندوق سے جوابی فائرنگ کی گئی تھی وہ اس تیسرے دیہاتی کے پاس تھی جو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ممکن تھا کہ دونوں مضروبین کی اشک شوئی کے لیے انھیں کچھ رقم وغیرہ بھی دی گئی ہو۔ نہ بھی دی گئی ہو تو وہ خوش نظر آتے تھے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے' خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ "حادثہ شدہ جیپ" چرانے نکلے تھے' ایک گھوڑے سے بھی ہاتھ دھوئے اور جو یادگار درگت بنی وہ علیحدہ تھی۔ ممکن تھا کہ ان کے دلوں کے نہاں گہرائی میں انتقام کا خیال موجود ہو مگر کمزور کے دل میں انتقام کا خیال شمع کے شعلے کے مانند ہوتا ہے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہانپتے ہوئے سینے میں یہ شعلہ بہت جلد بجھ جاتا ہے اور جب اس شعلے کو بجھانے کے لیے جبر اور طاقت کی تند و تیز آندھی بھی چل رہی ہو تو بھلا کتنی دیر روشن رہ سکتا ہے۔ ان زخم زخم دیہاتیوں کو بھی چند روز میں بھول جانا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ کے ریسٹ ہاؤس میں ان دونوں پر کیا بیتی تھی۔ وہ ساری اذیت' رسوائی اور شرمندگی فراموش ہو جانا تھی جو اس وقت ان کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ اگر روح و جسم پر لگنے والے زخموں کی اذیت ہمیشہ جوں کی توں رہے تو شاید کوئی ذی روح بھی زندہ نہ رہ سکے۔

جس وقت زخموں سے چُور دونوں افراد ریسٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے اس وقت ایک نئی نویلی روسی جیپ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی۔ جیپ کی دو پچھلی نشستیں نکال دی گئی تھیں۔ وہاں فوم بچھا کر ایک بستر سا تیار کیا گیا تھا۔ اس بستر پر سائیں عالی بدبودار چیتھڑے پہنے بڑے ٹھاٹ سے نیم دراز تھا۔ جیپ رکی تو دو باوردی ملازم تیزی سے آگے بڑھے اور سائیں کو تزک و احتشام کے ساتھ باہر نکالا۔ وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی بے حسی طاری رہتی تھی اس پر۔ کیپٹن بھوانی نے اسے بازو سے تھام کر نشست گاہ کی طرف لے جانا چاہا لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر مخالف سمت میں چل دیا۔ یہاں کھجور کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے طلوع آفتاب کا سہانا منظر نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر محویت سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھٹکا اور کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیپٹن بھوانی' مہاراج رتن سنگھ' متقی خان اور تمام باوردی و سادہ پوش محافظ سائیں عالی کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ سائیں عالی کی خاموشی میں ایک

جلال کی سی کیفیت تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے یا کرے۔

اچانک سائیں عالی کے ہونٹوں نے حرکت کی اور وہ بلند آواز میں بولا۔ "تلاش کرو۔۔۔ تلاش کے بنا کچھ نہیں ملتا۔ حرکت میں برکت ہے۔ سفر وسیلۂ ظفر ہے' ڈھونڈنے والے کو بھگوان ملتا ہے' سونے کا پہاڑ ملتا ہے' گل ایب کا محل ملتا ہے اور تو اور شفیع محمد بھی ملتا ہے۔۔۔ کھوج لگاؤ' غور کرو' سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔۔۔" پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ زور سے بولا۔ "اوئے شفیع! ادھر آ۔۔۔ ادھر آ میرے پاس۔"

انداز تحکمانہ تھا' میں ڈرا کہ شاید ارجمند بانو کی طرح میرے سر پر بھی جوتا پڑنے والا ہے لیکن خیریت گزری۔ میں سائیں کے قریب پہنچ کر بیٹھا تو اس نے میرا کان پکڑ لیا۔۔۔ پھر موڑ کر زور سے کھینچا۔ اندازہ ہوا کہ وہ کان کھینچ کر مجھے اپنے قریب کر رہا ہے۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ اپنے ہونٹ سرگوشی کے انداز میں ہلانے لگا لیکن ہونٹوں سے آواز بالکل نہیں نکلی۔ چند لمحے بعد اس نے میرے کندھے پر تھپکی دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سائیں جی۔" میں نے کہا۔

"جاؤ۔" وہ گرج کر بولا۔ "بس اب جاؤ۔"

"واپس آجاؤ۔" کیپٹن بھوانی نے میرے عقب سے تیز سرگوشی کی۔ میں الٹے قدموں واپس آ گیا۔ سب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ سائیں عالی کچھ دیر کھجور کے پتوں کو تکتا رہا پھر وہیں ایک موٹے تنے کے قریب دراز ہو گیا اور ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔

مہاراج رتن سنگھ کے کہنے پر سب افراد سائیں کے اردگرد سے چھٹ گئے۔ صرف دو باوردی محافظ دس پندرہ قدم کی دوری پر کھڑے رہ گئے۔ میں بھی مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کے پیچھے چلتا نشست گاہ میں آ گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اب تک سائیں عالی کے مریدان باصفا میں سے جو دو مرید سامنے آئے تھے وہ دونوں گمشدہ ٹرک میں دلچسپی رکھتے تھے یعنی ارجمند بانو اور کیپٹن آر کے بھوانی جو کہ ریاست جودھ پور کے سابق والی کا پوتا بتایا جاتا تھا۔ خاص طور پر ارجمند بانو کی دلچسپی تو انتہا کو چھو رہی تھی۔ وہ اس دولت تک پہنچنے کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے پر تیار بیٹھی تھی۔ اب یہ کیپٹن بھوانی سامنے آیا تھا۔ وہ مہاراج رتن سنگھ سے کم عمر ہونے کے باوجود اس کے ہم نوالہ و پیالہ دوستوں میں سے تھا۔ گمشدہ ٹرک کے بارے میں مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن بھوانی کا علم اب تک اخباری خبروں تک محدود تھا لیکن اچانک انہیں میری صورت میں ایک زبردست سراغ ہاتھ لگ گیا تھا۔ وہ ٹرک کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف مجھے شیخ عاصم بن ارشد جیسے غضب ناک اور جابر دشمن کے چنگل سے نکالا تھا بلکہ اب مجھے ہر قسم کی سہولت اور تعاون کی پیشکش کر رہے تھے۔ میرے خیال میں ان کی پلاننگ یہ تھی کہ پہلے گھی سیدھی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کی جائے' اگر نہ نکلے تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کر لی جائیں۔ میں جانتا تھا میری جان مہاراج رتن سنگھ اور کیپٹن بھوانی وغیرہ سے بآسانی چھوٹنے والی نہیں۔ وہ بے حد بااثر لوگ تھے۔ پھر غزالہ ان کی مٹھی میں تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ غزالہ میرے لیے کس قدر اہم ہے۔ درحقیقت میرے ساتھ "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا" والا معاملہ ہوا تھا۔ مجھے شیخ عاصم بن ارشد کے بے رحم چنگل سے نکالنے والوں نے ایک ناممکن کام کو ممکن کیا تھا لیکن اب میں اس "احسان" کے بدلے ان کے چنگل میں تھا۔

نشست گاہ میں پہنچتے ہی مہاراج رتن سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔ "سائیں صاحب نے تم سے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ صرف ہونٹ ہلاتے رہے۔ ایک لفظ بھی نہیں بولا انہوں نے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" کیپٹن بھوانی مسکرایا۔ "ہم نے خود انہیں باتیں کرتے دیکھا ہے۔"

"آپ نے دیکھا ہے لیکن سنا نہیں ہے۔ میں نے بھی صرف دیکھا ہے۔"

"کوئی ایک آدھ لفظ تو سمجھ میں آیا ہوگا؟" مہاراج رتن نے پوچھا۔

"یور ہائی نس! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا۔"

رتن سنگھ سہلا کر رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ میری بہت سی باتوں کی طرح اس بات پر بھی یقین نہیں کیا گیا لیکن مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ میں نے مہاراج رتن سنگھ سے کہا۔ "یور ہائی نس! آپ نے کل ذکر کیا تھا کہ کھدائی سے برآمد ہونے والے سامان میں کچھ نادر جنگی ہتھیار بھی شامل ہیں اور ان کی تفصیل محترم کیپٹن بھوانی صاحب کو معلوم ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ہم نے کہا تھا۔" پھر وہ کیپٹن بھوانی سے

مخاطب ہو کر بولا۔ "بھوانی صاحب! آپ اسے ذرا اس آرٹیکل کے بارے میں بتائیے جو لندن کے ہفت روزہ میں چھپا تھا۔"

"وہ آرٹیکل تو اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے جو میں ساتھ ہی لے آیا ہوں۔" کیپٹن بھوانی نے جواب دیا۔

اس نے اپنے سیکریٹری کو آواز دی اور اسے بریف کیس لانے کو کہا۔ بریف کیس قریب ہی ایک الماری میں پڑا تھا۔ سیکریٹری نے بریف کیس کیپٹن بھوانی کے سامنے رکھ دیا۔ کیپٹن بھوانی نے اس میں سے ایک چھوٹی سی فائل نکال لی۔

"انگلش پڑھ سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں گزارا کر لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے فائل میں سے چند کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ ایک برطانوی اور دو انڈین جریدوں کے تراشے تھے۔ میں نے پہلے غیر ملکی جریدے کا تراشا دیکھا۔ جوں جوں پڑھتا گیا آنکھیں حیرت سے کھلتی گئیں۔ یوں لگا جیسے آرٹیکل میرے سوالات کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ دفینے کے حوالے سے اپنی بہت سی اُلجھنوں کا حل مجھے اس آرٹیکل میں نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک مفصل تحریر تھی اور میرے بہت سے اندازوں کی تصدیق کرتی تھی۔ دو صفحات پر پھیلے ہوئے تقریباً تین ہزار الفاظ تھے۔ میں یہاں اس تحریر کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

▪ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ایک انگریز مصنف رچرڈ لسٹن نے راجستھان میں اپنے ایک دیرینہ دوست نواب نادر علی خاں کے ہاں قیام کیا۔ رچرڈ لندن سے سیرو سیاحت کے دورے پر آیا تھا۔ دراصل وہ راجستھان جیسے پسماندہ علاقے میں بنیادی انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کی حالتِ زار کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ راجستھان میں قیام کے دوران اسے ایک عمر رسیدہ شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اپنے کلیم کے سلسلے میں بیکانیر آیا ہوا تھا۔ اس ہندو مہاجر کا کلیم بہت بڑا تھا۔ وہ رحیم یار خاں میں قریباً دس مربع زمین چھوڑ کر آیا تھا۔ اسی طرح ساز و سامان کی شکل میں بھی اسے اپنی بے شمار دولت سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس شخص سے مصنف کو سراغ ملا کہ تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ پہلے رحیم یار خاں کے علاقے سے تعلق رکھنے والے کچھ نہایت بااثر افراد ایک زبردست المیے سے دوچار ہوئے تھے۔ ان افراد میں چند بڑے زمیندار، ساہوکار اور کارخانے دار شامل تھے۔ یہ تمام افراد ہندو تھے اور انہوں نے بگڑتے ہوئے ملکی حالات کے پیشِ نظر اپنی اپنی جمع پونجی ایک جگہ اکٹھی کرنے کے بعد انڈین علاقے میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مقصد کے لیے دو گاڑیاں استعمال کی گئی تھیں۔ ان گاڑیوں کی حفاظت کے لیے ایک تیسری گاڑی میں قریباً نصف درجن مسلح افراد بھی موجود تھے۔ ۲ جولائی ۱۹۴۷ء کی شب یہ تینوں گاڑیاں رحیم یار خاں سے براستہ بجنوٹ روانہ ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں کو اپنے بیش قیمت ساز و سامان سمیت چار جولائی کو رات گیارہ بارہ بجے تک بیکانیر پہنچ جانا تھا لیکن وہ نہیں پہنچیں۔ چھ جولائی کو گاڑی کے ساتھ جانے والے محافظوں میں سے چار کی لاشیں نہر بیکانیر کے کنارے ایک ویران بیلے سے ملیں۔ ان محافظوں کے علاوہ گاڑیوں کے ساتھ جانے والے دو زمیندار بھی موت کے گھاٹ اُتار کر اسی بیلے میں پھینک دیے گئے تھے۔ اس تہلکہ خیز واردات کی اطلاع پولیس میں نہیں دی گئی۔ اس وقت مقامی حالات اتنے ابتر تھے کہ اکثر مقامات پر انتظامیہ اور حکومت کا وجود ہی نظر نہیں آتا تھا۔ اس واقعے کی پہلی ایف آئی آر وقوعہ کے قریباً پانچ ماہ بعد بیکانیر کے مرکزی تھانے میں درج ہوئی۔ تاہم اس دوران متاثرہ افراد اپنے اپنے طور پر گمشدہ ساز و سامان کا سراغ لگانے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے تھے۔ اس واقعے کے متاثرین میں رحیم یار خاں شہر کے دو ممتاز ترین ٹھاکر خاندان بھی تھے۔ ان دونوں خاندانوں کی آپس میں رشتے داری تھی۔ ان لوگوں کے پاس قدیم جنگی ہتھیاروں کا نایاب "کولیکشن" تھا۔ یہ بے بہا نوادرات بھی دیگر سامان کے ساتھ ہی بیکانیر روانہ کیے گئے تھے۔ اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے صوبائی برٹش گورنمنٹ نے یہ نوادرات اپنی تحویل میں لینے کے لیے دونوں ٹھاکر خاندانوں سے بات کی تھی اور اس سلسلے میں بھاری رقوم بھی آفر کی گئی تھیں۔ ابھی یہ بات چیت کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ مالکان ان نوادرات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میں سے کچھ نوادر قریباً ۵۰۰ سال پرانے تھے اور ان کا تعلق منگولوں کے شاہی خاندان سے تھا۔ ایک تلوار اور کچھ خنجر اس سے بھی پہلے دور کے تھے۔ وکٹوریہ عہد سے تعلق رکھنے والی کچھ اشیا اس ذخیرے کا جوہرِ خاص تھیں اور برٹش گورنمنٹ کی ان پر خصوصی نگاہ تھی۔ مصنف کو ان میں سے کچھ اشیا کی تصاویر بھی دستیاب ہوگئی تھیں اور وہ اس نے اپنے آرٹیکل کے ساتھ شائع کرا دی تھیں۔

اس آرٹیکل کی اشاعت کے بعد دو انڈین جرائد نے بھی اس حوالے سے مضامین شائع کیے تھے۔ ان میں سے

آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر پروفیسر محمد نوشاد دہلوی کا مضمون قابلِ ذکر تھا۔ اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ گم ہونے والے زر و جواہر کی مالیت لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں تھی اور اگر کسی طرح ٹھیک ٹھیک حساب لگایا جا سکے تو اس واردات کو اس علاقے میں ہونے والی "ریکارڈ واردات" قرار دیا جا سکتا ہے لیکن شاید درست اعداد و شمار کبھی بھی سامنے نہ آ سکیں کیونکہ ورثا میں سے اکثر حضرات اب اس دنیا میں نہیں اور جو ہیں وہ بھی نجانے کہاں کہاں ہیں۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں ان دونوں ٹھاکر خاندانوں کا ذکر بھی کیا تھا جن کے مجموعی نقصان کا تخمینہ قریباً چھ کروڑ روپے تھا۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ ٹھاکر خاندانوں کے سامان میں جنگی ہتھیاروں کے علاوہ کئی بیش قیمت ہیرے اور طلائی ظروف شامل تھے۔ اس دولت کی گمشدگی کے بعد ان دونوں خاندانوں پر اچانک زوال آیا۔ ایک خاندان کا سربراہ ٹھاکر وجے آنند چھ جولائی ۱۹۵۵ء کو دل کا دورہ پڑنے سے سورگ باشی ہوا۔ بعد ازاں بچی کھچی جائیداد کے تنازعے نے اس کے وارثوں کو آپس میں لڑا کر تباہ و برباد کر دیا۔ دوسرا خاندان لٹ پٹ کر بیکانیر پہنچا۔ ان لوگوں نے اپنے ذرائع سے گمشدہ اثاثوں کی تلاش شروع کی۔ اس تلاش کے دوران ایک صحرائی قبیلے سے اُن کی اَن بن ہوئی اور چند افراد قتل ہو گئے۔ دشمنی اور مقدمے بازی کا ایسا سلسلہ چلا کہ دو تین برسوں میں ہی یہ لوگ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے اور پھر نجانے کہاں کہاں بکھر گئے۔

جرائد کے ان تراشوں کے علاوہ بھی بہت سے کاغذات فائل میں موجود تھے۔ ظاہر ہے ان میں اس گمشدہ دولت کے حوالے سے تفصیلات ہوں گی لیکن کیپٹن بھوانی نے ان تراشوں کے سوا مجھے اور کچھ نہیں دکھایا۔ اس نے تراشے بریف کیس میں رکھ کر اس کے اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھولتا چلا گیا۔ یہ ایک جہازی سائز کا نقشہ تھا۔ اس نے نقشہ دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اس میں بھارت کے مشرقی پنجاب اور شمالی راجستھان کے علاقے دکھائے گئے تھے۔ فیروزپور، فرید کوٹ، سُورت گڑھ، راج گڑھ، ناگور وغیرہ کے شہر موٹے حروف میں نظر آ رہے تھے۔ اس نقشے پر کئی جگہ سرخ پنسل سے نشانات لگائے گئے تھے۔ فرید کوٹ کے نواح میں گنڈارا پور گاؤں تک کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایک لائن کے ذریعے وہ راستہ دکھایا گیا تھا جس پر ہم سفر کر کے نادل ٹیوٹ پہنچے تھے۔ جہاں ہماری جیپ کو حادثہ پیش آیا وہاں سرخ دائرہ کھینچا گیا تھا۔

کچھ دیر اس نقشے پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یور ہائی نس! گستاخی معاف۔ میں اس نقشے کو فی الحال ضروری نہیں سمجھتا۔ میری مؤدبانہ رائے ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس جگہ پہنچنا چاہیے جہاں ٹرک کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ میرا مطلب گنڈارا پور گاؤں کے عشرت فارم سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو پتا چل گیا ہوگا، وہاں ایک قتل بھی ہوا ہے۔ یقیناً مقامی پولیس اس قتل کی تفتیش کر رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کوئی اہم کھوج مل چکا ہو یا پھر ہم ہی وہاں سے کوئی سراغ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

مہاراج نے پوچھا۔ "تو تم چاہتے ہو کہ فرید کوٹ جایا جائے؟"

"میری ناچیز رائے تو یہی ہے جناب۔"

"لیکن تمہارے اور مس غزالہ کے لیے وہاں بے حد خطرات ہیں۔" رتن سنگھ نے کہا۔

"یہ بات میں جانتا ہوں جناب لیکن ہم جتنی تاخیر کریں گے گمشدہ ٹرک تک پہنچنے کے امکانات اتنے ہی معدوم ہوتے جائیں گے۔"

"پھر ایک رائے ہماری بھی ہے۔" رتن سنگھ نے کہا۔ "تم اپنی ساتھی کو ان خطرات میں مت جھونکو۔ اسے ہم ادھر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ تم سے ہمارا وعدہ ہے کہ وہ ہماری واپسی تک یہاں بالکل سُکھ اور شانتی سے رہے گی۔"

میں جانتا تھا کہ مہاراج رتن کے منہ سے جلد یا بدیر یہ بات نکلنے والی ہے۔ مہاراج چاہے کچھ بھی کہتا لیکن یہ حقیقت تھی کہ غزالہ کو یہاں یرغمال بنایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں بحث و تکرار کرنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، جیسے آپ مناسب سمجھیں لیکن ہمیں روانہ کب ہونا ہے؟"

"ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر۔ ہمیں کون سا لمبا چوڑا انتظام کرنا ہے۔"

اب میرے سامنے غزالہ کو مطمئن کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ تو میرا کمرے سے باہر نکلنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی کہاں یہ کہ مجھے فرید کوٹ جانا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار اور دلیر لڑکی تھی لیکن یہاں کے ماحول اور یہاں پیش آنے والے پے در پے واقعات نے اسے سخت ہراساں کر رکھا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ غزالہ سے کیسے بات کروں اور اسے کس طرح سمجھاؤں کہ وہ چند روز تنہا اس ریسٹ ہاؤس میں گزارنے پر آمادہ ہو جائے کہ کچھ آوازوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کوئی بلند آواز میں واویلا کر رہا تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ خناب آفریدی کی آواز تھی۔ محسنی جان کا

وہی خوبرو ساتھی جو یہاں باز فروخت کرنے آیا تھا اور جس نے مہاراج رتن وغیرہ کو بتایا تھا کہ پاکستانی ٹرک والے معاملے سے میرا براہ راست تعلق ہے۔ خناب کے واویلے کی آوازیں کسی قریبی کمرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ میں تجسس سے مجبور ہو کر کمرے سے نکلا اور سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر پہنچ گیا۔

آوازیں ایک گیلری نما کمرے سے آ رہی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر ایک باوردی محافظ کمر سے پستول لٹکائے ٹہل رہا تھا اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔ میں نے ایک ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا اور دیکھتا رہ گیا۔ خناب آفریدی جو دیکھنے میں ایک سنجیدہ اور رعب دار شخص نظر آتا تھا نشے میں دُھت ہو کر مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا۔ ایک انڈرویئر کے سوا اس نے سارے کپڑے اتار کر پھینک رہے تھے اور اب سر پر ولایتی شراب کی بوتل رکھے ناچ رہا تھا۔ غالباً کچھ دیر پہلے اس نے شراب سے نہانے کی کوشش بھی کی تھی۔ فرش پر شراب کی کئی خالی بوتلیں لڑھکی ہوئی تھیں اور سارا قالین گیلا ہو رہا تھا۔ اس کمرے کے اندر ایک الماری میں نیچے سے اوپر تک بوتلیں بھری ہوئی تھیں۔

جن دنوں میں عیشی جان کے ساتھ تھا مجھے معلوم ہوا تھا کہ خناب آفریدی شراب کا رسیا ہے اور اچھی شراب کی ایک بوتل کی خاطر جان تک قربان کر سکتا ہے۔ آج یہ حقیقت واضح ہو رہی تھی۔ وہ شراب میں غرق تھا اور سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ وہ بوتل سر پر رکھے تھوڑی دیر ٹھمکے لگاتا رہا پھر کوئی بے ہنگم گیت گانے لگا۔ تب اس کی نگاہ دیوار پر آویزاں ایک تصویر پر پڑی۔ یہ بالی وڈ کی ساحرہ واکیل وہیم کی ایک نیم عریاں تصویر تھی۔ خناب ایک کرسی پر چڑھ کر تصویر سے لپٹ گیا اور "ماں ۔۔۔ ماں ۔۔۔" پکارنے لگا۔ "تو میری ماں ہے مجھے چھوڑ کر مت جانا۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ پھر وہ دوڑ کر ایک کپڑا اٹھا لایا اور اس سے واکیل وہیم کا جسم ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ واجستان کے اس دور دراز علاقے میں باز فروخت کرنے آیا تھا لیکن اپنی ایک غلطی کے سبب سنگین مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی تھی جسے سننے کے بعد مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی اسے واپس جانے کی اجازت دے ہی نہیں سکتے تھے۔ بالکل سیدھی سادی بات تھی۔ خناب آفریدی واپس چلا جاتا تو فوراً عیشی جان وغیرہ کو بتاتا کہ جانی استاد تاندل اسٹیٹ کے محل میں ہے۔ عیشی جان اور شمشیرا اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تاندل اسٹیٹ پہنچتے اور مہاراج رتن سے کہتے کہ فرمایئے جناب کہاں ہے "ہمارا" جانی استاد۔ ہم تو اس کی جدائی میں ہلکان ہو رہے ہیں' بھاگ بھاگ کر ٹانگیں جواب دے گئی ہیں اور زبانیں باہر نکل آئی ہیں۔ لہٰذا اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے مہاراج رتن سنگھ نے خناب آفریدی کو جھاپ لیا تھا اور اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے چاروں طرف شراب کی دیوار چُن دی تھی۔ اوّل تو اسے شراب سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اگر مل بھی جاتی تو ریسٹ ہاؤس میں مہاراج کے واقعی بہادر و نمک خوار موجود تھے' وہ اسے یہاں سے نکلنے نہ دیتے۔ دوسرے الفاظ میں خناب آفریدی بھی میری ہی طرح اس وقت تک یہاں "مہمان بالجبر" تھا جب تک ٹرک والا معاملہ کسی اختتام تک نہ پہنچتا۔

اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ غزالہ اس ریسٹ ہاؤس میں بالکل محفوظ رہے گی تو میں کبھی اسے وہاں چھوڑ کر نہ جاتا لیکن مجھے کامل یقین تھا کہ مہاراج وتن اس کی مکمل حفاظت کا انتظام کر کے یہاں سے جائے گا۔ میں نے تنہائی میں غزالہ کے ساتھ تفصیلی بات کی اور اسے یہ باور کرانے میں کامیاب رہا کہ میرے ساتھ فرید کوٹ جانے سے اس کا یہاں ریسٹ ہاؤس میں رہنا زیادہ مفید اور حفاظت بخش ہے۔ اس وقت نو بجنے میں ابھی دس پندرہ منٹ باقی تھے جب ہم ریسٹ ہاؤس سے فرید کوٹ کے طویل سفر پر روانہ ہونے کے لیے جیپوں پر سوار ہوئے۔ مگر اس سفر کو بالکل آغاز ہی میں بریک لگ گئے۔ ابھی گاڑیاں اسٹارٹ ہی ہو رہی تھیں کہ مہاراج وتن کا ایک گھڑ سوار محافظ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اس نے مہاراج کو یہ سنسنی خیز اطلاع پہنچائی کہ اس نے پچاس کے قریب سانڈنی سواروں اور گھڑ سواروں کو ریسٹ ہاؤس کی جانب بڑھتے دیکھا ہے۔ محافظ نے کہا۔ "حضور! ابھی فاصلہ زیادہ تھا۔ میں انھیں ٹھیک سے پہچان نہیں سکا۔ لیکن ان کی برچھیاں' کلہاڑیاں وغیرہ دور سے بھی چمک رہی ہیں۔ وہ بہت غصے میں دکھائی دیتے ہیں اور سیدھا اسی طرف آ رہے ہیں۔"

میرا ذہن فوراً ان دو ساتھیوں کی طرف چلا گیا جو تھوڑی دیر پہلے یہاں سے زبردست درگت بنوا کر گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط نکلا ہو اور وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ چکانے کے لیے یہاں آپہنچے ہوں۔ بعض اوقات لوگوں کے ایک گروہ میں سے کسی ایک کی ذلت و رسوائی سب کے لیے اشتعال کا باعث بن جاتی ہے اور وہ فردِ واحد کی طرح ذمے

دار شخص یا اشخاص کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ ممکن تھا کہ دونوں گمشدہ دیہاتیوں کو ڈھونڈنے کے لیے پہلے ہی کچھ لوگ نکلے ہوئے ہوں۔ اپنے لہولہان اور زخم زخم ساتھیوں کو دیکھ کر ان کے غم و غصے میں اضافہ ہوا ہو اور وہ مہاراج سے حساب بے باق کرنے کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

میں نے دیکھا کہ مہاراج وتن سنگھ کا سانولا چہرہ خون کے دباؤ سے کچھ اور سانولا ہو گیا ہے۔ آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی تھیں۔ اس نے چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دور نگاہ دوڑائی۔ جنوب مغرب کی طرف گرد کا بادل سا نظر آ رہا تھا۔ اس دم بہ دم بلند ہوتی اور پھیلتی گرد کا رُخ ریسٹ ہاؤس ہی کی طرف تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ریسٹ ہاؤس میں مہاراج وتن اور کیپٹن بھوانی کے کم و بیش پندرہ مسلح محافظ موجود ہیں۔ چالیس پچاس برچھی برداروں سے نمٹنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ اگر آنے والوں کے پاس چند ایک رائفلیں بھی ہوتیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور ابھی تو یہ طے ہونا بھی باقی تھا کہ وہ لوگ ریسٹ ہاؤس کی طرف جھگڑا مول لینے کے لیے آ رہے ہیں یا کسی اور غرض سے۔۔۔ دور دراز علاقوں میں جہاں انتظامیہ کی گرفت کمزور تر ہوتی ہے' اس قسم کے واقعات رونما ہوا ہی کرتے ہیں۔ اکثر اوقات جوشیلے لوگ اپنے تنازعات خود حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انصاف طلبی کے لیے پولیس کے پاس جانا بزدلی سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر میں جس قسم کے مادر پدر آزاد علاقے میں تھا وہاں اس قسم کی آندھیاں اکثر چلتی رہتی ہیں لیکن یہاں حیرت کی بات یہ تھی کہ کچھ بے سروسامان قسم کے دیہاتی مہاراج رتن سنگھ آف تاندل جیسے شخص سے لڑائی مول لینا چاہ رہے تھے۔ کم از کم اطلاع دینے والا تو یہی اطلاع دے رہا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد گھوڑوں کی ٹاپیں صاف سنائی دینے لگیں اور پھر ایک ڈھلوان کے بالائی کنارے پر گھڑ سوار نظر آئے۔ وہ ایک غضب ناک جتھے کے مانند نمودار ہوئے اور ڈھلوان کے عرضی رُخ پر دور تک پھیل گئے۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا اور مجھ پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ وہ دیہاتی نظر آنے کے باوجود عام دیہاتی نہیں تھے۔ ان کی بھاری بھرکم پگڑیوں اور ڈھالوں میں ایک خاکستری رنگ کی چوڑی پٹی صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ ملتے جلتے لباس پہنے ہوئے تھے اور ان میں سے اکثر کے ہتھیار بھی ایک جیسے تھے۔ بانس کے دستے والی لمبوتری برچھیاں اور چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں۔ لیکن وہ آتشیں اسلحے سے یکسر محروم نہیں تھے۔ درمیان میں کافی فاصلہ ہونے کے باوجود مجھے کئی افراد کے ہاتھوں میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ میرا ذہن فوراً اس واقعے کی طرف چلا گیا جب میں نے ریسٹ ہاؤس کے عقب سے کچھ پگڑی پوش افراد کو بھاگتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی مجھے یہ معاملہ پُراسرار محسوس ہوا تھا۔ اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں مہاراج وتن کے باوردی محافظ نے کہا تھا کہ اب ان غیرت مندوں کا سدِباب کرنا ہی پڑے گا۔

یہ بات وضاحت طلب تھی کہ ان "غیرت مندوں" نے کس بات پر غیرت دکھائی ہے۔ اور وہ مہاراج وتن جیسے شخص سے ٹکرا کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گھڑ سوار اور سانڈنی سوار ایک جگہ آکر رک گئے تھے۔ نہ آگے بڑھ رہے تھے نہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ جیسے تذبذب میں ہوں کہ کیا کریں۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے تو مہاراج رتن سنگھ نے گرج کر عتیق خاں کو آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور اٹین شن کھڑا ہو گیا۔ مہاراج نے کہا۔ "ہمارا خیال ہے عتیق خاں' ان لوگوں کو سبق سکھانے کے لیے یہ بہت مناسب موقع ہے لیکن پہلے ان کی نیت معلوم ہو جانی چاہیے۔ تم جاؤ اور پوچھو ان سے کہ کیا چاہتے ہیں۔"

عتیق خاں نے ادب سے سر جھکایا اور دوڑ کر اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ جیپ کے اوپر سے کینوس کی چھت ہٹائی جا چکی تھی۔ اب وہ ایک کھلی جیپ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ دور سے دیکھنے والا بھی جان سکتا تھا کہ جیپ میں کتنے سوار ہیں۔ عتیق خاں کی جیپ دھول اُڑاتی اور ہچکولے کھاتی گھڑ سواروں کے قریب جا رُکی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب گفتگو سننا یا چہروں کے تاثرات دیکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ تاہم گفتگو کے انداز اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی متنازع موضوع پر بات ہو رہی ہے۔ قریباً دس منٹ بعد عتیق خاں جیپ دوڑاتا واپس آیا۔ اب اس کا چہرہ بھی لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے مہاراج وتن سنگھ اور کیپٹن بھوانی کے قریب جا کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ اس مختصر گفتگو کے بعد مہاراج وتن سنگھ اور بھی مشتعل نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے اور کیپٹن بھوانی کے تمام گارڈز اور کارندوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کی مجموعی تعداد بائیس تھی۔ گاڑیوں کے ڈرائیور اور دیگر ملازم بھی اس میں شامل تھے۔ تین چار کے سوا وہ سب کے سب آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

مہاراج رتن نے غرا کر کہا۔ "ان کتوں کو ٹھیک ٹھاک سبق سکھانا ہے۔ آٹھ دس مر بھی جائیں تو کوئی بات نہیں۔"

کیپٹن بھوانی نے قہقہہ لگا کر اپنے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کیا اور بولا۔ "رتن جی آپ چنتا نہ کریں۔ بھگوان نے چاہا تو بندے مارنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں اتنی دور سے جانچ رہا ہوں' رام قسم یہ سب کے سب بھگوڑے ہیں۔ پتا نہیں کس کے بہکاوے میں آکر یہاں چلے آتے ہیں۔ آپ آٹھ دس فائر نکال کر دیکھیں۔ ابھی تتر بتر ہونے لگیں گے۔"

پھر اس نے قریب کھڑے ایک گارڈ سے جرمن ایم جی ۴۲ لی۔ یہ طاقتور گن "ری کوائل سسٹم" کے تحت کام کرتی ہے اور زبردست گھن گرج کے ساتھ چلتی ہے۔ کیپٹن بھوانی نے گن کی نال آسمان کی طرف کر کے ٹریگر دبایا اور دو وقفوں کے ساتھ قریباً دو درجن راؤنڈ فائر کیے۔ خوفناک تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار گونج اٹھے اور اس کے ساتھ ہی فاصلے پر کھڑے دیہاتی تتر بتر ہونے لگے۔ وہ درمیان سے کائی کی طرح پھٹ گئے تھے۔ کچھ پیچھے ہٹ کر ڈھلوان کی دوسری طرف اوجھل ہو گئے اور کچھ بائیں جانب کھجوروں کے ایک جھنڈ کے قریب سمٹ گئے۔ کیپٹن بھوانی مسکرانے لگا۔ اس کے ایک بالائی دانت کا تھوڑا سا کونا ٹوٹا ہوا تھا لیکن یہ شکستہ دانت اس کی مسکراہٹ کو بدصورت بنانے کے بجائے جاذبِ نظر بنا دیتا تھا۔ اس نے گن بڑی رعونت سے واپس گارڈ کی سمت اچھال دی اور بولا۔ "رتن جی! میری تو رائے ہے کہ ان بھیڑوں کو مارنے کے بجائے گھیر کر پکڑ لیں اور باندھ کر یہاں لے آئیں۔ جو ان میں کچھ خاص قسم کے بندے ہیں ان کو گارڈز کے حوالے کر دیں۔ ایک گھنٹے کے اندر سب آپ کے پاؤں نہ چاٹنے لگیں تو میرا نام بدل دیں۔"

کیپٹن بھوانی کی باتوں نے مہاراج رتن سنگھ کے جارحانہ عزائم کو ہوا دی اور اس کی شکل سے نظر آنے لگا کہ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ اس نے پانچ گارڈز کی ایک ٹولی کو دوسرے گارڈز سے علیحدہ کیا اور انہیں خصوصی ہدایات دینے لگا۔ کچھ دیر بعد یہ گارڈز ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے اور عمارت کی عقبی جانب سے نکل کر درختوں میں روپوش ہو گئے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ اپنے تربیت یافتہ مسلح گارڈز کے ذریعے دیہاتیوں کو گھیرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اسی دوران دو تین بھاری گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ یہ شور ہمارے بائیں پہلو سے ابھرا تھا۔ ٹیلوں کے عقب سے گرد کے بادل بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے مہاراج رتن سنگھ کے ایک گارڈ کو قیاس آرائی کرتے سنا کہ شاید پولیس پہنچ گئی ہے مگر اگلے چند سیکنڈ میں یہ قیاس غلط ثابت ہو گیا۔ آنے والی گاڑیاں پرائیویٹ تھیں۔ ان کی تعداد تین تھی۔ دو ٹرک تھے اور ایک ٹریکٹر ٹرالی۔ ٹرالی کے اوپر سایہ رکھنے کے لیے ایک چھپر سا بنا ہوا تھا۔ ٹرک خستہ حال تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ مقامی طور پر انہیں 'ریت وغیرہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جونہی یہ تینوں گاڑیاں رکیں' ان میں سے دیہاتی چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اترنے لگے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ کئی ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان لوگوں کا تعلق اسی مسلح جتھے سے ہے جو پہلے سے یہاں خم ٹھونک کے کھڑا ہے۔

گاڑیوں سے اترنے والوں کی تعداد حیران کن حد تک زیادہ تھی۔ وہ کم و بیش ڈھائی سو افراد تھے۔ جوان 'لڑکے' بوڑھے' ان میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ اکثر افراد کے سروں پر خاکستری پٹی والی پگڑیاں تھیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ لوگ پگڑی کو ایک خاص انداز سے باندھتے تھے۔ پگڑی نیچے سے پھیلی ہوئی اور اوپر سے بہت گھٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کا طویل پلو سامنے کی طرف لٹکتا رہتا تھا یا اسے منہ پر لپیٹ کر منڈاسے کی شکل دے دی جاتی تھی۔ تینوں گاڑیوں کے ساتھ چند گھوڑے اور خچر بھی تھے۔ اور اس پر بس نہیں ہو گیا تھا۔ ابھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں پیدل اور سوار لوگ موقعے پر پہنچ رہے تھے۔

میں نے مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر جوش و خروش کی جگہ اب پریشانی اور ہراس نے لے لی تھی۔ کیپٹن بھوانی نے مہاراج سے مخاطب ہو کر پرتشویش لہجے میں کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے رتن جی۔ یہ مورکھ کہاں سے اُڈے چلے آ رہے ہیں؟"

مہاراج رتن کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں اُمڈ آئیں۔ "یہ کوئی گہری سازش لگ رہی ہے کیپٹن۔"

گاڑیوں سے برآمد ہونے والوں نے پہلے سے موجود مسلح افراد کے ساتھ مل کر ریسٹ ہاؤس کو تین اطراف سے گھیر لیا تھا۔ چوتھی جانب ٹیلے تھے اور عین ممکن تھا کہ ان کے عقب میں بھی افراد موجود ہوں۔ یکایک مجھے صورتِ حال کی اصل سنگینی کا احساس ہوا۔ مہاراج رتن سنگھ آف نانڈل اور کیپٹن بھوانی علاقے کے دو نہایت بااثر اور طاقت ور اشخاص ہونے کے باوجود اپنے چند کارندوں کے ساتھ اس الگ تھلگ ریسٹ ہاؤس میں پھنس گئے تھے۔ ان کے چاروں طرف مشتعل دیہاتی تھے اور ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا

تھا۔ مشکلات اور حوادث کو ہمیشہ میرے ساتھ ربط رہا ہے۔ اب یہ جو واقعہ رونما ہوا تھا' نجانے کب سے اس کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ یہ واقعہ چند روز پہلے یا بعد میں بھی رونما ہو سکتا تھا مگر یہ آج ہوا تھا اور اس ریسٹ ہاؤس میں موجود تمام دوسرے لوگوں کی طرح میری اور غزالہ کی زندگی کو بھی خطرات لاحق ہو گئے تھے۔

مہاراج رتن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ریسٹ ہاؤس کو گھیرنے والے کون تھے اور کہاں سے آئے تھے' یہ حقیقت تھی کہ اس ریسٹ ہاؤس کا گھیراؤ بے حد منظم طریقے سے اور بڑے مناسب موقعے پر کیا گیا تھا۔ یہ بات قرینِ قیاس تھی کہ ریسٹ ہاؤس میں ہی حملہ آوروں کا کوئی مخبر موجود ہو اور اس نے گھیراؤ کے سلسلے میں حملہ آوروں کی مدد کی ہو۔ اس ریسٹ ہاؤس میں ٹیلیفون تھا نہ کوئی اور ایسا ذریعہ جس سے جودھ پور میں رابطہ قائم کیا جا سکتا۔ چاروں طرف جنگل تھا یا اونچے نیچے ریتیلے ٹیلے تھے۔ یہاں پر کچھ بھی ہو جاتا' کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونا تھی۔ بے شک گارڈز کے پاس جدید رائفلیں موجود تھیں لیکن یہ چند رائفلیں بپھرے ہوئے لوگوں کے جمِ غفیر کو کب تک فاصلے پر رکھ سکتی تھیں۔ ان حوصلہ شکن حقائق کا عکس اب مہاراج کے ساتھ ساتھ کیپٹن بھوانی کے چہرے پر بھی نمایاں نظر آنے لگا تھا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک بھیڑوں کو زندہ پکڑنے اور اُلٹا لٹکانے کی باتیں کر رہا تھا' اب بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھنے پر مجبور تھا۔ یہ حالات کی نیرنگی کا ادنیٰ سا نمونہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جارحانہ عزائم رکھنے والوں کو اب مدافعت بھی مشکل نظر آ رہی تھی۔

اتنے میں دو گھوڑے تیزی سے ریسٹ ہاؤس کی طرف آتے دکھائی دیے۔ ان میں ایک مشکی تھا۔ مشکی گھوڑے پر ایک دراز قد نوجوان سوار تھا۔ وہ نمایاں اس لیے بھی نظر آ رہا تھا کہ اس کی داڑھی نہیں تھی۔ اس کی کمر سے گولیوں کی پیٹیاں بندھی تھیں اور کندھے پر رائفل جھول رہی تھی۔ دونوں گھڑ سوار مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کے روبرو جا رکے۔ کیپٹن بھوانی کا کتا' اجنبیوں کی بو پا کر زور و شور سے بھونکنے لگا تھا۔ دراز قد نوجوان اچھی شکل و صورت اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ گلے میں ایک خوبصورت اور وزنی طلائی زنجیر تھی۔ اس کی آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ حلیے اور خدوخال سے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد لگتا تھا۔

علیم الحق حقی
کا ایک ناقابلِ فراموش ناول
[illegible]
قیمت: ۱۵۰/- روپے
آبِ حیات کی
تلاش میں نکلنے والوں کی
عبرت انگیز کہانی
[illegible]
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔ فون: [illegible]

وہ بڑی بے باکی سے بولا۔ "راجا صاحب! مجھے تراخاں نے بھیجا ہے۔ میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

نوجوان کے گستاخانہ لب و لہجے نے مہاراج رتن کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں نے دیکھا کہ غصہ پینے کی کوشش میں اس کا چہرہ تاریک تر ہو گیا ہے۔ وہ غرا کر بولا۔ "ہمیں تم سے کوئی "پرائیویٹ ٹاک" نہیں کرنی ہے اور نہ تم اس قابل ہو کہ ہمارے برابر بیٹھ کر بات کر سکو۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے سب کے سامنے کہو ہمیں کسی سے کچھ نہیں چھپانا ہے۔"

نوجوان نے سینہ تان کر دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "پرم کو ہمارے حوالے کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تیواری لال کو بھی۔"

مہاراج رتن کے پہلو میں کھڑا کیپٹن بھوانی آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ پلک جھپکنے میں نوجوان کو شوٹ کر دے گا لیکن مہاراج رتن نے بروقت اسے سنبھال لیا۔ "نہیں کیپٹن۔ نہیں۔" وہ چیخ کر بولا۔ "ہمیں اس کتے سے بات کرنے دو۔"

صورت حال بگڑتی دیکھ کر مسلح گارڈز نے ایک دم اپنا گھیرا تنگ کر دیا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ دور ڈھلوان پر کھڑے مسلح افراد میں بھی ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ کیپٹن بھوانی کو پیچھے ہٹانے کے بعد مہاراج رتن سنگھ نوجوان کے عین سامنے جا کھڑا ہوا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ "تم بھاگوان ہو کہ اتنی بڑی بات کہنے کے بعد بھی زندہ کھڑے ہو۔ جاؤ جا کر اپنے تراخاں سے کہہ دو کہ وہ جس کا نام لے رہا ہے وہ ہماری دھرم پتنی ہے اور اس تک کسی کا ہاتھ تب پہنچے گا جب ہم میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہے گا۔"

"اور وہ تیواری لال؟" نوجوان ڈھٹائی سے بولا۔

"وہ تمہارا نہیں ہمارا مجرم ہے اور ہم نے اسے سزا دی ہے۔ ہم تمہاری پلید زبانوں پر اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کریں گے۔"

نوجوان کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ لگامیں جھٹک کر اس نے گھوڑے کا رخ پھیرا اور واپس روانہ ہو گیا۔ دوسرا گھڑ سوار بھی اس کے ساتھ تھا۔ مہاراج رتن سنگھ نے ہاتھ پشت پر باندھے اور بے قراری سے اپنی گاڑی کے آس پاس ٹہلنے لگا۔

پرم کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ مہارانی پرم مہاراج رتن سنگھ کی دھرم پتنی تھی۔ جودھپور میں غزالہ اس سے کئی بار مل چکی تھی اور آج صبح سویرے میں نے بھی اس کے درشن کر لیے تھے۔ آثار سے پتا چلتا تھا کہ اس کی شادی حال ہی میں ہوئی ہے۔ وہ بھاری بھرکم لباس اور گہنوں کے باوجود کارگرل ہی نظر آ رہی تھی اور بہت کم گو دکھائی دیتی تھی۔ چند لمحے پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سارا ہنگامہ اسی لڑکی کے لیے ہوگا۔ اب یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ ریسٹ ہاؤس کا گھیراؤ کرنے والوں کا تعلق رانی پرم سے ہے۔ وہ لوگ رانی پرم کے علاوہ کسی تیواری لال نامی شخص کو مہاراج رتن سنگھ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر یہاں آئے ہیں لیکن اپنے مطلب کے لیے وہ کس حد تک جا سکتے ہیں یہ بات ابھی واضح نہیں تھی۔ مہاراج رتن سنگھ نے انہیں دو ٹوک جواب دیا تھا۔ اب یہ سوال ذہن میں شدت سے ابھر رہا تھا کہ کیا وہ واقعی ریسٹ ہاؤس پر ہلا بول دیں گے۔

مجھے احساس تھا کہ غزالہ سخت بے چین ہو گی۔ میں اسے تسلی دینے کے لیے اندر چلا آیا۔ وہ کھڑکی سے لگی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے شمار سوالات ابھر آئے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا۔ "آپ ابھی تک گئے کیوں نہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں۔ کیا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟" اس نے ایک ساتھ تین سوال جڑ دیے تھے۔

میں نے کہا۔ "جھگڑا ہی سمجھو۔" میرے مختصر جواب سے اس کی تشفی نہیں ہوئی اور اس کی خوبصورت آنکھیں سوالیہ انداز میں مجھ پر جمی رہیں۔ میں نے کہا۔ "رانی پرم کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

وہ بولی۔ "کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن میں بس دو تین بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مہاراج کی تیسری بیوی ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہو گئی تھی۔ دوسری اڑھائی تین برس پہلے مر گئی۔ دوسری بیوی سے مہاراج کے چار بچے ہیں۔ رانی پرم ان بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ مہاراج رتن سنگھ نے یہ تیسری شادی صرف رسم نبھانے کے لیے کی ہے ورنہ اسے اپنے لیے عورتوں کی کیا کمی تھی۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے غزالہ کے چہرے پر حیا کی سرخی لہرا گئی۔ اس نے سر پر دوپٹا درست کیا اور بولی۔ "راجا مہاراج کے خاندان میں یہ بہت پرانی رسم چلی آ رہی ہے۔ راجا غیر شادی شدہ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے سو سال کا ضعیف العمر ہو اس کی کم از کم ایک پتنی ضرور موجود ہونا چاہیے۔ مہاراج رتن کے ساتھ بھی اسی قسم کا مسئلہ تھا۔ دوسری بیوی کی موت کے بعد ایک مقررہ میعاد کے اندر اندر

اسے تیسرا بیاہ کرنا تھا لیکن وہ اپنے بچوں سے بھی بہت چاہت رکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے سروں پر سوتیلی ماں آ جائے۔ میں نے سنا ہے کہ مہاراج نے قریباً ایک برس تک کشمکش میں رہنے کے بعد یہ شادی کی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ بھی رسم تھی کہ وہ کسی نو عمر لڑکی کی زندگی ہی برباد کرے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اپنی عمر کے مطابق کسی پختہ عمر عورت سے بھی شادی کر سکتا تھا۔"

"ضرور کر سکتا تھا۔" غزالہ نے کہا۔ "مہاراج کے چھوٹے بھائی ہیمونت سنگھ نے ایک بیوہ سے شادی کر رکھی ہے۔ اب پڑھے لکھے ہندوؤں میں پختہ عمر کی کنواریوں یا بیوہ عورتوں کو ایسا اچھوت نہیں سمجھا جاتا جیسا پہلے سمجھا جاتا تھا۔"

واقعی یہ سوچنے کی بات تھی۔ اگر مہاراج نے یہ شادی صرف خانہ پری کے لیے کی تھی تو وہ ایک بالکل نو عمر ناسمجھ لڑکی کو گھر کیوں لے آیا تھا اور کچھ نہیں تو بیس پچیس سال خاتون ہوتی۔ مہاراج کے ساتھ چلتی پھرتی بھی اتنی بری نہ لگتی اور باشعور ہونے کے سبب اس کے بچوں کی دیکھ بھال بھی اچھے طریقے سے کرتی۔ لگتا تھا کہ پتنی کا چناؤ کرتے ہوئے ایک بار پھر مہاراج کی عیش پرستی عود کر آئی تھی اور اس کی نگاہِ انتخاب مہکتے پھولوں کو چھوڑ کر ایک ایسی کچی کلی پر ٹھہری تھی جس نے ابھی ٹھیک سے رنگ بھی نہیں پکڑے تھے۔

میں نے غزالہ سے پوچھا۔ "رانی پرم والے معاملے سے تیواری لال نامی شخص کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہ نام میں پہلی بار سن رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ریسٹ ہاؤس کے باہر جو جھگڑا چل رہا ہے اس میں رانی پرم کے ساتھ ساتھ کسی تیواری لال کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ مسلح ہو کر یہاں پہنچے ہیں اور مہاراج رتن سنگھ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ رانی پرم اور تیواری لال کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔"

غزالہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آنے لگی۔ بات تھی بھی حیرت کی۔ کسی معمولی شخص سے بھی ایسا مطالبہ کیا جائے تو مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ مہاراج تو یہاں کا ان داتا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ یہ سیکڑوں لوگ کون ہیں جو خیال کر رہے ہیں کہ رانی پرم پر ان کا حق مہاراج سے زیادہ ہے اور وہ کون سا جذبہ ہے جس نے ان سب کو فردِ واحد کے مہاراج کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

ریسٹ ہاؤس کا گھیراؤ پونے نو بجے کے قریب کیا گیا تھا۔

شام تک صورت حال جوں کی توں رہی۔ گھیرا ڈالنے والے پیچھے ہٹے نہ آگے آئے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رات کا انتظار کر رہے ہیں یا پھر انہیں کچھ مزید ساتھیوں کا انتظار ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خون خرابے سے بچنے کے لیے مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی کو سوچنے کا موقع دینا چاہتے ہوں۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ ویرانہ میدانِ جنگ ہے اور ایک فوج صفیں باندھے کسی قلعے پر حملے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ فضا میں عجیب سی سنسنی رچی ہوئی تھی اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس سنسنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

رات کا کھانا سب لوگوں نے ریسٹ ہاؤس کے اندر ہی کھایا۔ مہاراج رتن سنگھ، کیپٹن بھوانی اور رانی پرم کے لیے ڈائننگ روم میں کھانا چنا گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ڈائننگ روم سے بلند لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کیپٹن بھوانی بہت طیش میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعداد میں بہت ہونے کے باوجود یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بزدلوں کا جم غفیر ہے۔ اس نے مثال دیتے ہوئے کہا۔ "رتن جی! آپ دس ہزار صفر بھی جمع کر لیں تو جواب صفر ہی آئے گا۔"

مہاراج رتن کی آواز آئی۔ "لیکن کیپٹن! اس میں خطرہ ہے۔ ہم تمہیں ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔"

"آپ خواہ مخواہ چنتا کر رہے ہیں رتن جی۔" کیپٹن بھوانی نے بھڑک کر کہا۔ "میں پورے وشواس سے کہتا ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو ہمت ہی نہیں پڑے گی ہمیں روکنے کی اور جب تک ہمت پڑے گی۔ ہم دور نکل چکے ہوں گے۔ میری جیپ آپ نے چلا کر دیکھی ہوئی ہے۔ خراب سے خراب راستے پر بھی وہ تیس چالیس کی رفتار سے تو بھاگ ہی سکتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایسی کون سی سواری ہے جس پر ہمارا پیچھا کر سکیں گے۔۔۔ اور پہلی بات تو یہ ہے کہ ہو سکتا ہے پیچھا کرنے کی نوبت ہی نہ آئے، ہم بغیر کسی کی نگاہ میں آئے یہاں سے نکل جائیں۔"

رانی پرم کی آواز آئی۔ اس نے نسبتاً مدھم لہجے میں کچھ کہا تھا۔ اس کے الفاظ سنائی نہیں دیے۔ جواب میں کیپٹن بھوانی جھنجلا کر بولا۔ "ہم اسی طرح سوچ وچار کرتے رہیں گے اور یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ مجھے جانے دیں جو کچھ بھی ہوگا اس کا ذمے دار میں خود ہوں گا۔"

کرسیاں گھسیٹے جانے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیپٹن بھوانی دندناتا ہوا ڈائننگ روم سے باہر نکل آیا۔ جلاد صورت کاکڑ رائفل بدست اس کے پیچھے تھا۔ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے

ہوئے ریسٹ ہاؤس سے نکلے اور گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

کیپٹن بھوانی کے مسلح محافظ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ ان سے باتیں کرنے لگا۔ صورت حال کچھ کچھ واضح ہو گئی تھی۔ کیپٹن بھوانی ریسٹ ہاؤس کے ارد گرد موجود لوگوں کا گھیرا توڑ کر یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیلوں کی جانب راستہ کھلا ملے گا یا بہت معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تاریکی اور دشوار گزار راستے کا فائدہ اٹھا کر اگر وہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو جودھ پور سے کمک لے کر یہاں پہنچ سکتا تھا یا کسی بھی نزدیکی آبادی سے سینکڑوں افراد اکٹھے کر سکتا تھا۔

تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے اطراف میں جگنو سے ٹمٹما رہے تھے۔ یہ محاصرہ کرنے والوں کی ٹارچیں تھیں یا پھر وہ آگ تھی جو انہوں نے جگہ جگہ جلا رکھی تھی۔ گاہے گاہے گھوڑوں کے ہنہنانے اور سانڈنیوں کی آوازیں بھی ریسٹ ہاؤس تک پہنچ رہی تھیں۔

کیپٹن بھوانی نے اپنی جیپ کو دھکا لگوا کر اس کا رخ ٹیلوں کی جانب کیا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ نہیں کیا گیا تھا اور نہ بتیاں روشن کی گئی تھیں۔ کیپٹن بھوانی کے پانچ چھ گارڈز جیپ کو دھکا لگاتے ہوئے ٹیلوں کی طرف لے گئے اور ڈھلوان راستہ طے کر کے بلندی پر پہنچ گئے۔ یہ سارا عمل بڑی خاموشی سے مکمل ہوا تھا۔ جیپ کو بلندی پر پہنچا کر چھ میں سے تین گارڈز واپس آ گئے۔ اب کیپٹن آر کے بھوانی کے علاوہ جیپ میں کاکڑ اور تین مسلح محافظ موجود تھے۔

کیپٹن بھوانی کی اس مہم جوئی کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ لہٰذا ریسٹ ہاؤس میں موجود اکثر افراد اپنے آپ کو ذہنی طور پر بدتر حالات کے لیے تیار کر رہے تھے۔ میں غزالہ سے قریب رہنے کے لیے کمرے میں چلا گیا اور اس سے چھوٹا پسٹل لے کر جیب میں رکھ لیا۔

ٹیلوں کی جانب سے جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر وہ گرجتی ہوئی مخالف سمت میں بڑھی۔ بمشکل چار پانچ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ "تڑتڑ" کی خوفناک آوازوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے غزالہ کو دروازے کے قریب رہنے کی ہدایت کی اور بھاگتا ہوا برآمدے میں پہنچا ایک چوکور ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر میں نے ٹیلوں کی جانب نگاہ دوڑائی۔ فائرنگ کی آوازیں اسی سمت سے آ رہی تھیں لیکن ٹیلوں کی اٹھان کے سبب سب کچھ نگاہوں سے اوجھل تھا۔ خودکار رائفلوں کے علاوہ سب مشین گن بھی چل رہی تھی۔ یہ سب مشین گن کیپٹن بھوانی کے محافظِ خاص کاکڑ کے ہاتھوں میں تھی۔

یکایک فائرنگ تھم گئی۔ چند لمحے بعد میں نے انجن کا شور سنا۔ یہ کیپٹن بھوانی ہی کی جیپ تھی۔ وہ تیزی سے ریسٹ ہاؤس کی جانب واپس آ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد جیپ کی روشنیاں ٹیلوں کے اوپر چمکیں۔ وہ تیزی سے اچھلتی کودتی ڈگمگاتی ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ جونہی وہ ریسٹ ہاؤس کے مین دروازے کے سامنے پہنچی مہاراج رتن سنگھ سمیت کئی افراد اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں میں بھی تھا۔ جیپ کا ونڈ اسکرین ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ ایک ہیڈلائٹ بھی چکنا چور تھی۔ گولیوں کے قریباً نصف درجن سوراخ ڈرائیور والے دروازے پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر کیپٹن بھوانی اپنے ایک پہلو پر ڈھلکا ہوا تھا۔ گولی اس کے گھٹنے میں لگی تھی اور وہ درد کی شدت سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ بھرا ہوا پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور گود میں ونڈ اسکرین کے بے شمار ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

عقبی نشست پر کاکڑ نظر آیا۔ اس کا نچلا دھڑ دو نشستوں کے درمیانی خلا میں تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ کسی نے جیپ کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے اس پر برچھی کا وار کیا تھا اور یہ برچھی اس کے پہلو میں دور تک گھس گئی تھی۔ اگر کاکڑ کو صرف برچھی لگی ہوتی تو شاید وہ اب تک زندہ ہوتا لیکن اسے آتشیں ہتھیاروں نے بھی نشانہ بنایا تھا۔ اس کی پشت پر نیلی قمیص میں گولیوں کے سوراخ اور خون کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ صرف تین یا چار منٹ پہلے یہ شخص زندہ سلامت اس جیپ میں سوار ہوا تھا اور اب بے جان لاشے کی صورت دو نشستوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔

کیپٹن بھوانی بمشکل دروازہ کھول کر باہر نکلا اور گھوم کر کاکڑ کی طرف آ گیا۔ "کاکڑ.... کاکڑ۔" اس نے اسے کاندھے تھام کر جھنجوڑ ڈالا۔ شاید اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ کاکڑ راہیِ عدم ہو چکا ہے یا پھر وہ ابھی تک اس کی حالت سے بے خبر تھا۔ کاکڑ کو جھنجوڑتے ہوئے وہ اچانک خود بھی لڑکھڑا گیا اور تیورا کر جیپ کے پائیدان پر گر گیا۔ مہاراج رتن سنگھ بے قرار ہو کر آگے بڑھا۔ دیگر افراد نے بھی کیپٹن بھوانی کو سہارا دیا اور اٹھا کر اندر لے گئے۔ خون کی ایک لکیر کیپٹن بھوانی کے پیچھے ہی پیچھے اندر تک گئی۔

عتیق خاں نے محافظوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے؟

ایک محافظ ہیجانی لہجے میں بولا۔ "وہ حرامزادے ٹیلوں کے پیچھے بھی گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے

اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ ڈرائیور خوشحال خاں نے دلیری دکھائی جو جیپ کو ریورس گیئر میں ہی بھگا کر پیچھے لے آیا ورنہ شاید وہ سب کو چھلنی کر دیتے۔"

"تم نے فائر نہیں کیا؟" عتیق خاں نے پوچھا۔

"میں نے دو تین برسٹ مارے ہیں۔ اس سے زیادہ کا انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ تو اندھا دھند جیپ کے اوپر چڑھے چلے آ رہے تھے۔" محافظ نے جواب دیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ محافظ تو تین تھے۔ جیپ سے دو اترے تھے، تیسرا کہاں گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یہ سوال پوچھتا، ڈرائیور خوشحال خاں خود ہی بول اٹھا۔ "نشاط علی بھی ادھر ہی رہ گیا ہے۔ وہ پچھلے دروازے پر تھا۔ زور سے جھٹکا لگا تو اچھل کر نیچے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، چار پانچ بندوں نے اسے دبوچ لیا۔"

بے حد ناکام اور حوصلہ شکن "مشن" ثابت ہوا تھا یہ۔ کاکڑ کی خونچکاں لاش کو بمشکل کھینچ تان کر جیپ میں سے نکالا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ریسٹ ہاؤس میں لے گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ریسٹ ہاؤس کے ارد گرد تاریکی میں ہلچل سی نظر آ رہی ہے۔ شاید محاصرہ کرنے والے متحرک ہو رہے تھے۔ یہ بڑا روح فرسا خیال تھا۔ تین ساڑھے تین سو افراد کے آگے ریسٹ ہاؤس کے چند مکینوں کی کیا حیثیت تھی۔ وہ مشتعل ہو کر حملہ کر دیتے تو یہاں کٹی پھٹی لاشوں کے سوا کچھ باقی نہ بچتا۔ اطراف میں ہلچل دیکھنے کے بعد میں بھاگتا ہوا اندر پہنچا۔ ایک کمرے کا صاف شفاف بستر کیپٹن بھوانی کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی پہلو کے بل لیٹا تھا اور مہاراج رتن سنگھ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اس پر جھکا ہوا تھا۔ فوری طور پر گولی نکالنا تو ممکن نہیں تھا لیکن خون کا مسلسل اخراج روکنا ضروری تھا اور مہاراج رتن اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کیپٹن بھوانی کے سرہانے سائیں عالی گم صم کھڑا تھا۔

میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "یور ہائی نس! مداخلت پر شرمندہ ہوں۔ دراصل اطراف میں گڑبڑ نظر آ رہی ہے۔ لیے وہ لوگ ہلا بولنے والے ہیں۔"

مہاراج سمیت موقعے پر موجود ہر فرد کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ مہاراج نے اپنے خون آلود ہاتھ رومال سے پونچھتے ہوئے عتیق خاں سے کہا۔ "عتیق! تم اپنے ساتھیوں کو لے کر چھت پر چلے جاؤ اور جہاں جہاں میں نے کہا پوزیشن سنبھال لو۔"

عتیق خاں تعظیم پیش کر کے فوراً باہر نکل گیا۔ مہاراج باقی افراد کے ساتھ بیڈ روم سے نکلا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ متحرک روشنیاں اب قریب آ گئی تھیں اور محاصرہ کرنے والوں کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ بہت پرجوش دکھائی دیتے تھے اور ناقابلِ فہم للکارے بلند کر رہے تھے۔ ایک حد تک آگے بڑھنے کے بعد وہ لوگ پھر رک گئے۔ چند منٹ تک کوئی نقل و حرکت نہیں ہوئی، پھر دو تین مشعل بردار گھڑ سوار آگے بڑھتے دکھائی دیے لیکن وہ بھی تھوڑے آگے بڑھنے کے بعد ٹھہر گئے۔ مہاراج رتن سنگھ بغور صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان لمحات میں کچھ کہنا مشکل تھا کہ اگر محاصرہ کرنے والوں نے ریسٹ ہاؤس پر حملہ کر دیا تو مہاراج رتن اور اس کے گارڈز کا ردِعمل کیا ہوگا، بہرحال وہ سب کے سب پوری طرح چوکس تھے۔

اچانک تاریکی میں سے ایک سایہ نمودار ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا سا ہماری طرف بڑھا۔ مہاراج کے ذاتی ڈرائیور چندو جان نے گاڑی کی تند تیز روشنیاں سائے پر پھینکیں، وہ اپنا ہی آدمی نکلا۔ یہ وہی گارڈ تھا جسے تھوڑی دیر پہلے محاصرہ کرنے والوں نے پکڑ لیا تھا۔ ڈرائیور نے اس کا نام نشاط علی بتایا تھا۔ غالباً اس کی ایک ٹانگ پر چوٹ لگی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ رائفل ندارد تھی اور قمیص بھی سامنے سے پھٹی ہوئی تھی۔ مہاراج کے سامنے پہنچ کر اس نے سر پر ٹوپی رکھی اور سلیوٹ کرنے کے بعد ایک کاغذ مہاراج کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" مہاراج نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے دیا ہے مہاراج۔" وہ لرزاں آواز میں بولا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے مار پیٹ کی گئی ہے اور وہ ابھی تک اپنے اعصاب پر قابو نہیں پا سکا۔

مہاراج نے کاغذ پر نگاہ دوڑائی اور اس کے غیظ و غضب میں اضافہ ہو گیا۔ وہ غرایا۔ "سن آف بچ۔ اس کی یہ مجال کہ ہمیں دھمکیاں دے۔" اس نے کاغذ کے پرزے کر دیے اور ہاتھ پشت پر باندھ کر ایک بار پھر گاڑی کے ارد گرد چکرانے لگا۔ وہ غصے سے نیم دیوانہ ہو رہا تھا لیکن پھر بتدریج اس کا تنا ہوا چہرہ نرم پڑ گیا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ریسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر یہ بات ریسٹ ہاؤس میں سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ محاصرہ کرنے والوں نے مہاراج رتن اور اس کے ساتھیوں کو صبح پانچ بجے تک کی مہلت دی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر پانچ بجے تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو وہ کارروائی پر مجبور ہو جائیں گے۔ مزید براں

انہوں نے اپنے مطالبات میں ایک مطالبے کا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی لکھ کر دیں کہ یہاں جو جانی یا مالی نقصان ہوا ہے اس کے ذمے دار وہ خود ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا حق نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ کسی جرگے میں کسی طرح کا دعویٰ کریں گے۔

وہ رات بے حد تاریک اور پرسکون تھی لیکن اس تاریک اور پرسکون رات کے بطن میں ایک خونی ہنگامہ پرورش پا رہا تھا۔ وہ گھڑی جو غزالہ نے مجھے تحفے میں دی تھی اور جو پھانسی کی کوٹھڑی میں مجھ سے جدا ہو گئی تھی اب پھر میرے پاس آ گئی تھی۔ مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ غزالہ کی موجودگی میں میں اس گھڑی کو کلائی پر باندھتا میں نے اسے جیب میں ڈال رکھا تھا اور بوقت ضرورت نکال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ میں نے وقت دیکھا شب کے بارہ بج رہے تھے۔ پانچ بجنے میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ میں ریسٹ ہاؤس سے نکلا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ان ٹیلوں کی جانب بڑھا جن کے عقب میں کیپٹن بھوانی اور محاصرہ کرنے والوں کے درمیان جان لیوا جھڑپ ہوئی تھی۔ ٹیلے کے دامن میں تین گارڈز نے پرانی اینٹوں سے ایک چھوٹی سی دیوار چن کر مورچا بنایا ہوا تھا اور اب اس "مورچے" میں بیٹھے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ یقیناً یہ ہلکی پھلکی سرگوشیاں نہیں تھیں۔ اس گمبھیر فضا میں ہلکی پھلکی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ میں ان گارڈز کے پاس سے گزرتا ہوا جنوب کی طرف آ گیا اور ایک ہموار جگہ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ ریت کی شبنم بھور خنکی نے بدن میں تازگی کی لہر دوڑا دی۔ اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کوئی میرے بالکل قریب موجود تھا۔ میرا ہاتھ خود بخود پتلون کی جیب میں چلا گیا۔ یہاں پستول موجود تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا میری طرف آ رہا تھا۔ وہ کوئی لڑکی تھی کیونکہ اس کی ساڑی یا اوڑھنی کا پلو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نشا تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور میرے قریب ریت پر گر سی گئی۔ بہت مضمحل نظر آ رہی تھی۔ اس نے چمکیلے تاروں والی ساڑی پہن رکھی تھی۔ بال آزاد تھے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے نقرئی آویزے تھے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں وہ کوئی اپسرا ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے ہی میرے پیچھے آ رہی ہے۔

"خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

"بات تو تم نے ٹھیک کی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا نراش ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے صبح تک کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔"

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" وہ بے دلی سے مسکرائی۔ چند لمحے ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی پھر وہ بولی۔ "میں ابھی مرنا نہیں چاہتی ہوں جمالی صاحب۔ مجھے بڑا ڈر آتا ہے موت سے۔ شاید اس لیے کہ گناہ گار ہوں۔ یا شاید اس لیے کہ انسان ہوں اور موت کا ڈر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی ہو۔"

"جی ہاں۔ میں نے گجرات یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا تھا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن گھریلو حالات نے نوکری پر مجبور کر دیا۔ میرے پتا جی نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ گھر میں میری ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا تھا جو اکثر بھیک منگوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ میں نے نوکری کا ارادہ ظاہر کیا تو پتا جی نے یہ پرچار نہیں کیا کہ میں نوکری پر کیوں مجبور ہو رہی ہوں۔ وہ حسب عادت اپنی دانائی بگھارنے اور پیش گوئیاں کرنے بیٹھ گئے۔ نوکری کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اگر کہیں عزت کی نوکری ملے گی تو وہاں خون پسینہ ایک کرنا پڑے گا۔ چار دن میں پتا چل جائے گا کہ محنت کی کمائی کسے کہتے ہیں۔ اور میری ایک بات لکھ لو۔ عزت کی نوکری تمہیں ملے گی بھی نہیں۔ تم جیسی لڑکیوں کو لوگ قابلیت دیکھ کر نہیں خوبصورتی دیکھ کر نوکری دیتے ہیں اور جو خوبصورتی دیکھ کر نوکری دیتے ہیں وہ صرف دیکھنے تک نہیں رہتے۔ نوکری کے پہلے دن سے ان کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ پتا جی کی نصیحتوں اور ان کے زہر آلود لہجے سے مجھے چڑ تھی۔ میں ہمیشہ ان کی ہدایتوں کے برخلاف چلتی تھی۔ میں نے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نوکری کر لی۔ وہیں پر مجھے ماڈلنگ کی پیشکش ہوئی اور میں نے ماڈلنگ شروع کر دی۔ ٹی وی پر میرے تین چار کمرشلز بہت پاپولر ہوئے۔ ان دنوں میرے بہت سے پرستار پیدا ہو گئے تھے۔ ایسا ہی ایک پرستار کیپٹن بھوانی بھی تھا۔ وہ حسن کا شکاری ہے اور اچھے شکار کی کھوج میں اس کے ہرکارے دور دور تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ میں کیپٹن بھوانی کے بچھائے ہوئے خوبصورت جال میں پھنس کر جودھ پور پہنچ گئی۔ جودھ پور میں میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جس کی پیش گوئی پتا جی

نے کی تھی۔ میرے شریر سے دوشیزگی کی مہر اتاری گئی۔ میں نے سوچا اب کون سا منہ لے کر گھر واپس جاؤں گی۔ پتا جی کا شعلہ بار چہرہ ہمیشہ کی طرح اپنی دانائی کی فتح پر سرشار نظر آئے گا۔ میں نے واپسی کے راستے پر اس راستے کو ترجیح دی جس پر میں چل نکلی تھی۔ ایک آزاد پنچھی کی طرح میں نے دل پسند فضاؤں میں اڑنا شروع کر دیا۔ تین چار ماہ تک میں نے کیپٹن بھوانی کی کمپنی انجوائے کی پھر کیپٹن بھوانی کے ایک مسلمان دوست سالار احمد کے ساتھ بمبئی چلی گئی۔ وہ ہیروں کا ایک بہت بڑا تاجر ہے۔ سالار احمد کے ساتھ میں نے قریباً ایک سال گزارا پھر ایک نیوی آفیسر راکیش رائے کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑ گئی۔ اس کے ساتھ میں نے سنگاپور کا ایک طویل اور پرلطف تفریحی دورہ کیا۔ راکیش رائے سے جب میں واپس کیپٹن بھوانی کے پاس آئی تو میں بیمار تھی۔ میرے پیٹ میں ایک چھوٹی سی رسولی کا آپریشن ہونے والا تھا۔ عیاش امیرزادوں کی خصلت کے عین مطابق کیپٹن بھوانی میرے ساتھ رکھائی سے پیش آیا۔۔۔ لیکن بھگوان جانتا ہے مجھے اس کے رویے کا ذرہ بھر دکھ نہیں ہوا۔ مجھے ان امیرزادوں کے ساتھ "ڈیل" کرنا آیا ہے۔ میں ان کے بدلتے ہوئے رویوں کے لیے پہلے سے تیار رہتی ہوں۔ مجھے اپنی قدر و قیمت کا بھی پتا ہے اور اپنی حدود کا بھی۔ کیپٹن بھوانی کے پاس میں کیول آٹھ دس روز ہی رہی تھی کہ مہاراج رتن سنگھ مجھے اپنے ساتھ تاندل اسٹیٹ لے آئے۔ یہاں میرا کامیاب آپریشن ہوا اور ایک ماہ کے اندر اندر میں صحت یاب ہو گئی۔ اس واقعے کو قریباً چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اس وقت سے میں مہاراج رتن کے پاس ہی ہوں۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "نشا! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں لیکن پتا نہیں تم سچ بتاؤ گی یا نہیں۔"

وہ بولی۔ "اگر بات بتانے والی ہوئی تو بتا دوں گی۔ ورنہ چپ رہوں گی۔"

میں نے پوچھا "یہ مہاراج رتن سنگھ کیسا شخص ہے؟"

وہ بے تکلفی سے ریت پر نیم دراز ہو گئی اور بولی۔ "جیسے عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں برائیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ کبھی وہ بہت برا لگتا ہے اور کبھی بہت اچھا۔ میرے خیال میں اس کی خوبیاں اس لیے قابل تعریف ہیں کہ ایسے لوگوں میں اکثر یہ خوبیاں نہیں ہوتیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مہاراج رتن سنگھ نے اپنے لیے کچھ قاعدے ضابطے بنا رکھے ہیں۔ دوسرے شبدوں میں اسے مہاراج کا "اپنا ضابطہ اخلاق" بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس ضابطہ اخلاق سے ذرا بھی روگردانی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر آپ اپنی پھانسی کا معاملہ ہی لیں۔ شیخ عاصم بن ارشد آپ کی جان لینا چاہتا تھا۔ مہاراج کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ شیخ عاصم خون کا بدلہ خون مانگ رہا ہے لیکن اسٹیٹ کے قانون کے مطابق آپ کی جان لینے کے لیے تمام قانونی تقاضے پورے کیے گئے۔ اسٹیٹ کی عدالت میں آپ پر مقدمہ چلا اور آپ کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ اس طرح ہر معاملے میں مہاراج اپنے قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قاعدے قابل تعریف بھی ہیں۔ مہاراج اپنے جیسے دیگر امرا کی طرح رنگین مزاج ہیں۔ عورتوں کی بھی انہیں کوئی کمی نہیں ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی عورت کو اس کی منشا کے خلاف حاصل نہیں کیا۔ دوسرے راجاؤں کی طرح انہیں نت نئے بیاہ رچانے کا بھی کوئی چاؤ نہیں۔ پہلی پتنی کے ساتھ ان کا مزاج نہیں ملا۔ انہوں نے اسے طلاق دے دی۔ دوسری پتنی کے ساتھ انہیں بے حد پریم تھا۔ اس کی موجودگی میں انہوں نے دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ بے حد سندر اور نیک خاتون تھیں۔ رحم دل اتنی کہ کسی کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔ مہاراج مجرموں کو سزائیں دینے میں شروع میں بہت سخت رہے ہیں۔ اس عورت کے جیون کو اس غم نے کھا لیا کہ اس کے پتی کے ہاتھوں لوگ اذیت ناک موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آپ پرسوں جنگل کی سیر کو گئے تھے۔ وہاں آپ نے ایک قبر دیکھی ہو گی اور میرا خیال ہے کہ وہ کہانی بھی سنی ہو گی جو اس قبر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے۔" میں نے اقرار میں جواب دیا۔ نشا بولی۔ "یہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے ایسی بے شمار کہانیاں رانی چندرا سے وابستہ ہیں۔ شاید میں آپ کو رانی کا نام بتانا بھول گئی۔ ان کا نام چندرا کماری تھا۔"

میں نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق رانی چندرا قریباً چار برس قبل انتقال کر گئی تھیں۔ ریاستی قانون کے مطابق مہاراج کا تیسرا بیاہ جلد ہونا چاہیے تھا لیکن انہوں نے صرف چند ماہ پہلے بیاہ کیا ہے۔"

نشا نے کہا۔ "یہ بیاہ بھی جس طرح ہوا ہے، مجھے معلوم ہے۔ مہاراج کو چندرا کماری کے چاروں بچوں سے بے پناہ پریم ہے۔ وہ تیسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے لیکن مجبور تھے۔ ان کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ راج پاٹ سے علیحدہ ہو کر اپنے کسی بھائی کو گدی پر بٹھا دیں یا شادی کر لیں۔ آخر انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے مشیر خاص تیواری لال کو بلایا اور اسے اپنے لیے کسی اچھے

خاندان سے رشتہ تلاش کرنے کا کہا۔ مہاراج کی بڑی بیٹی کی عمر تقریباً چودہ سال ہے۔ مہاراج نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی بیاہ لائیں جو اپنی بیٹی کی بڑی بہن لگے اور ناتجربہ کار ہونے کے سبب اپنے سوتیلے بچوں کے لیے بھی مشکلات کا باعث بنے۔ انہوں نے تیواری لال سے کہا کہ ان کی ہونے والی پتنی کی عمر چھبیس ستائیس برس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے منشا سے ایک خاص پابندی بھی قبول کرنا ہوگی اور وہ پابندی یہ ہے کہ وہ کبھی بچہ پیدا نہیں کرے گی۔ اس پابندی کی ظاہری وجہ تو یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مہاراج آنے والے بچوں میں اپنا پریم اور اپنی وراثت تقسیم کرنا نہیں چاہتے تھے۔

شرائط کڑی تھیں لیکن ناندل اسٹیٹ کے حکمران کے لیے کسی بھی قسم کا رشتہ ملنا مشکل نہیں تھا۔ تیواری لال نیک نیتی سے کوشش کرتا تو یقیناً مہاراج کو خواہش کے مطابق رشتہ مل جاتا لیکن تیواری لال نے کمینگی دکھائی۔ اس نے مہاراج کی شادی کی آڑ میں اپنا ایک پرانا بدلہ چکایا۔ مواش قبیلے کے ایک نہایت خوشحال زمیندار سنگھے نے کسی موقعے پر تیواری لال کی بے عزتی کی تھی۔ اب سنگھے سورگ باشی ہو چکا ہے اور اس کی ودھوا (بیوہ) زمینداری چلاتی تھی۔ سنگھے کی ایک نوعمر لڑکی پرم تھی۔ وہی پرم جو اب مہاراج کی پتنی ہے۔ تیواری لال مہاراج کے لیے رشتہ کھوجنے نکلا تو سیدھا سنگھے کی حویلی واقع کشن گڑھ میں جا پہنچا۔ اس نے اپنی چرب زبانی سے پرم کی والدہ کو اس بری طرح جال میں پھنسایا کہ وہ اپنی پھول سی نوعمر بچی کا رشتہ پچاس سالہ مہاراج رتن سنگھ سے کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ مہاراج رتن سنگھ کی خواہش کے مطابق جس خاموشی سے یہ رشتہ ڈھونڈا گیا تھا، اسی خاموشی سے بیاہ کی رسم ادا ہوگئی۔ سہاگ کی رات جب مہاراج نے دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھایا تو انہیں سخت دھچکا لگا۔ وہ ان کی بیٹی سے بمشکل دو تین سال بڑی ہوگی۔ پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تیواری لال نے یہ رشتہ کس طرح گردن پر پاؤں رکھ کر حاصل کیا ہے۔ انہیں جہاں لڑکی پر ترس آیا وہاں تیواری لال پر بھی بے حد غصہ آیا۔ جہاں تک میرے علم میں بات آئی ہے مہاراج نے اسی رات رانی کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ ان سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ رانی پرم خاندانی لڑکی ہے۔ شرافت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ رونے لگی۔ اس نے مہاراج سے کہا کہ اب اس کا جیون ان سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کا مرنا جینا ان کے سنگ ہے۔ وہ کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔ مہاراج نے اسے دو ہفتے کی مہلت دی اور کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلے۔ وہ اسے طلاق دینے اور اس کے منشا سے اس کو بیاہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ (دراصل مہاراج کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ رانی پرم اپنے ہی خاندان کے ایک لڑکے سے پریم کرتی تھی۔)

دو ہفتے کی مدت ختم ہونے پر جب مہاراج نے رانی سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے وہی جواب دیا جو پہلے روز دیا تھا۔ اس نے کہا کہ دھرم نے انہیں جس بندھن میں باندھ دیا ہے وہ اٹوٹ ہے۔ اب میں آپ کی پتنی ہی نہیں آپ کے بچوں کی ماں بھی ہوں۔ نہ میں اپنے پتی سے جدا ہو سکتی ہوں اور نہ اپنے بچوں سے۔

مہاراج رتن سنگھ کو اپنے مشیر خاص تیواری لال پر سخت غصہ تھا۔ انہوں نے ریاست کی عدالت میں تیواری لال پر مقدمہ چلوایا اور اسے پانچ سال قید سخت کی سزا ہوگئی لیکن اسی دوران مواش قبیلے میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو چکا تھا۔ مہاراج رتن سنگھ کے بدخواہوں نے یہ بات مشہور کردی کہ مہاراج رتن نے سنگھے کی نوعمر بیٹی کو زبردستی محل میں ڈال رکھا ہے۔ اس کی ودھوا ماں کو درپردہ دھمکیاں دی گئی ہیں اور اسے ڈرایا گیا ہے کہ اگر اس نے مہاراج رتن کو داماد کے طور پر قبول نہ کیا تو اس کی زمینوں پر ٹریکٹر دوڑا دیے جائیں گے۔ کچھ لوگوں نے یہاں تک کہنا شروع کردیا کہ پرم مہاراج کی پتنی نہیں باندی ہے اور ان کی حبس بے جا میں ہے۔ اس فتنے کو بڑھاوا دینے میں وہ لڑکا بھی پیش پیش تھا جس کا کہنا ہے کہ پرم اس سے پریم کرتی تھی اور ان دونوں کا بیاہ ہونے والا تھا۔ اس کا نام منوج ہے۔ رات پہلے پہر آپ نے اس لڑکے کو دیکھا بھی تھا۔ وہ قبیلے کے سردار رزا خاں کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ لمبے قد والا جس نے گلے میں سونے کی موٹی زنجیر پہن رکھی تھی۔"

میری نگاہوں میں اس نوجوان کی شبیہہ گھوم گئی جس نے مہاراج رتن سے اکھڑ لہجے میں بات چیت کی تھی اور طیش میں بھرا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ اب یہ گتھی کافی حد تک سلجھ گئی تھی کہ اس ریسٹ ہاؤس کا محاصرہ کن لوگوں نے کیا ہے اور وہ کیا چاہ رہے ہیں۔ رانی پرم کے ساتھ ساتھ تیواری نام کے شخص کو حوالے کرنے کا مطالبہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج کے کردار کا ایک بالکل مختلف روپ بھی سامنے آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے لیے ایک رنگین مزاج، مغرور اور ظالم راجا تھا مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں کچھ برعکس صفات بھی موجود ہیں۔ ان صفات میں سب سے نمایاں صفت اصول پسندی تھی۔ اس نے کچھ اصول بنا رکھے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اصول کس حد تک مفید ہیں، وہ ان کی مکمل پاسداری کرتا تھا۔ غزالہ کے سلسلے میں بھی غالباً اس کی یہی اصول پسندی کارفرما تھی۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ وہ غزالہ پر "آنکھ رکھ چکا ہے" اور ہر جوان خوبصورت عورت سے مستفیض ہونے کی فطری خواہش اس کے اندر جوش مار رہی ہے لیکن غزالہ کے ساتھ اس کا رویہ بدستور معذبانہ تھا۔ وہ ایک طرف غزالہ سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری طرف مجھے بنتا کی جادو اثر خوبصورتی میں الجھا رہا تھا۔ عشق و محبت کے یہ داؤ پیچ پرانے اور عامیانہ تھے لیکن انسانی شائستگی اور ندرت کے ساتھ استعمال کیے جا رہے تھے۔ مہاراج کے بارے میں سوچتے ہوئے بنتا کا یہ فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ "مہاراج رتن عام انسانوں جیسا ہے۔ اس میں برائیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ کبھی بہت اچھا نظر آتا ہے، کبھی بہت برا۔"

بنتا کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ "کس سوچ میں کھو گئے ہیں؟" اس کے لہجے میں تشویش کے بھنور تھے۔

"کچھ نہیں۔ مہاراج رتن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "مہاراج کے بارے میں پھر سوچ لیجیے۔ اس مصیبت کے بارے میں سوچیے جو منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آخر جہانی استاد ہیں آپ۔ کوئی بات تو ہوگی جو بڑے بڑے پھنے خاں اور خناب آفریدی جیسے جگادری آپ کو استاد کہتے ہیں۔ میں نے جب پہلی بار آپ کا نام سنا تو سوچا کہ آپ چالیس پینتالیس برس کے کوئی خوفناک شخص ہوں گے لیکن آپ بالکل مختلف نکلے۔ جو اس عمر میں استاد کہلاتا ہے وہ بڑا فن کار بندہ ہوتا ہے۔" وہ میرے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی اور جتنا جانتی تھی اس سے زیادہ پر یقین رکھتی تھی۔

میں نے پینترا بدلا۔ "اچھا تم ہی بتاؤ۔ میں اس موجودہ صورت حال میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن ۔۔۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ تم پر نثار کیا جائے۔ تمہارے ان بازوؤں پر، تمہارے کشادہ سینے پر، تمہاری روشن آنکھوں پر۔ بھگوان جانے کیوں میں اس کٹھن گھڑی میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔"

وہ ایکدم تب سے تم پر آ گئی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ جیسے اب تک مصنوعی لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کا سچا اور کھرا لہجہ یہی تھا جس میں اس نے مجھے اب پکارا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں کہیں سے دو سلیمانی ٹوپیاں مہیا کروں اور انہیں پہن کر ہم یہاں سے نکل جائیں۔"

وہ پہلی بار مسکرائی۔ "اگر سلیمانی ٹوپیوں کی بات ہے تو پھر دو نہیں تین درکار ہوں گی۔ تم مس غزالہ کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بہ آہستگی اس کی سیاہ چادر کھینچ لی۔ یہ چادر اس نے ساڑی کے اوپر سے اوڑھ رکھی تھی۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ ویسے غلط فہمی کا شکار اسے ہونا تو نہیں چاہیے تھا۔ جو شخص بند کمرے کی شرانگیز تنہائی میں اس سے دور رہا تھا اب قریب کیسے آ سکتا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، میں کوئی فلمی سین نہیں کرنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے اس چادر کی ضرورت ہے۔ میں ذرا آگے جا رہا ہوں۔ تم واپس ریسٹ ہاؤس میں جاؤ۔"

"کیا کرنے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تین سلیمانی ٹوپیاں تلاش کرنے۔ تم نے میرے بازوؤں اور کشادہ سینے کی تعریفیں کر کے مجھے کچھ جذباتی کر دیا ہے۔ دل چاہتا ہے کچھ کر کے دکھایا جائے۔ میرے نانا مرحوم ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ خوبصورت عورت اچھے بھلے امن پسند شخص کو زبردست جنگجو بنا سکتی ہے۔"

"لیکن ۔۔۔ کرو گے کیا تم؟" وہ الجھن سے بولی۔

"جو کچھ کر سکتا ہوں اس سے زیادہ کروں گا۔ بس تم اتنا کرنا کہ اگر میں واپس نہ آیا تو مس غزالہ کی سرپرست بن کر کسی اچھی نیک مسلمان فیملی میں اس کا رشتہ کرا دینا۔ بھگوان تمہیں اس کا صلہ دے گا۔"

وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ میں نے چادر کی بکل ماری اور مخالف سمت میں چل دیا۔ میری پتلون پہلے ہی سیاہ مائل تھی، اب کالی چادر اوڑھ کر میں سیاہ پوش بن گیا تھا۔ ٹیلے کے دامن میں چلتا میں ان درختوں کی جانب بڑھنے لگا جہاں اب روشنیاں بہت کم دکھائی دے رہی تھیں۔ سرشام مواش قبیلے کے افراد نے جگہ جگہ جو آگ جلائی تھی وہ اب بجھ چکی تھی بس کہیں کہیں کسی ٹارچ کی روشنی ٹمٹما جاتی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس تاریک شب میں ان جھاڑ جھنکاڑ درختوں اور جھاڑیوں میں سے ایک دو افراد کا راہ فرار اختیار کر جانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

چالیس پچاس گز چلنے کے بعد میں ریت پر اوندھا لیٹ گیا اور احتیاط سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں سے روشنیاں بمشکل سو قدم کے فاصلے پر تھیں۔ دو ٹیلوں کے درمیان ایک خشک نالا سا تھا۔ نالے کے بیس پچیس گز چوڑے پاٹ میں مکمل تاریکی تھی۔ میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اسی نالے کی طرف کھسکنے لگا۔ ریت پر یوں "کرالنگ" کرنا بے حد آسان ثابت ہو رہا تھا۔ بھرا ہوا پستول میری جیب میں تھا اور میں اسے آناً فاناً ہاتھ میں کر سکتا تھا۔ نالے کے کنارے پہنچ کر اچانک میں ٹھٹک گیا۔ کہیں بالکل قریب سے انسانی آواز ابھری تھی۔ یہ آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ شاید میں دو تین گز بھی آگے گیا ہوتا تو بولنے والے کی نگاہ میں آجاتا۔ بولنے والا نالے کے نشیب میں تھا اور میری نگاہ سے مکمل طور پر اوجھل تھا۔ وہ دوبارہ بولا تو میں اس کی آواز صاف پہچان گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

یہ وہی لڑکا تھا جس کا نام زنتا نے منوج بتایا تھا اور انکشاف کیا تھا کہ وہ رانی پریم کا پریمی ہونے کا دعوے دار ہے۔ رات پہلے پہر میں نے منوج کو مہاراج رتن سنگھ سے مکالمہ کرتے بھی سنا تھا۔ اس وقت گھٹاٹوپ تیرگی میں منوج خشک نالے کے اندر کھڑا تھا اور اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باٹ دار آواز ابھری۔ "تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے مدن! بات چیت کی نوبت آسکتی ہے لیکن اگر بات چیت کے لیے جانا ہوا تو تراخاں مجھے ہرگز ساتھ نہیں لے جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ میں جوشیلا ہوں، میری ضرورت لڑائی میں ہوتی ہے، صلح صفائی میں نہیں۔"

منوج کا ساتھی بولا۔ "بات واقعی سوچنے کی ہے جی! اگر آمنے سامنے ہونے والی گفتگو میں صلح صفائی کا چکر چل گیا تو پھر۔۔۔؟"

"کھوتے کے پتر! تو کس مرض کی دوا ہے۔" منوج نے ملن کے جسم پر دھول جما کر کہا۔ "اگر تراخاں بات چیت کے لیے جاتا ہے تو تو بھی اس کے ساتھ جائے گا۔ میں نے دو تین بندوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ وہ صلح صفائی کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔ اگر کوئی ایسی بات بن بھی گئی تو تو اپنا کام دکھا دینا۔ ایسے نازک موقعوں پر ایک گولی بھی کافی ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کس نے چلائی ہے اور کس پر چلائی ہے۔ سمجھ رہا ہے نا میری بات؟" یقیناً منوج کے مخاطب نے اثبات میں سر ہلایا ہوگا لیکن میں دیکھ نہیں سکا۔

منوج کی آواز دوبارہ ابھری۔ "یہ لے۔ یہ چھوٹا پستول ہے لیکن ہے زوردار۔ واسکٹ میں رکھ لینا۔ جیب کے اندر سے ہی کام ہو جائے گا۔"

میں اس سنگین منصوبے کا ایک ایک لفظ اتنی وضاحت سے سن رہا تھا کہ لگتا تھا سینما ہال میں بیٹھا ہوں اور فلمی کرداروں کو باتیں کرتے سن رہا ہوں۔ نجانے یہ گفتگو کرنے والوں کی چھٹی حس تھی یا کوئی اور بات کہ کچھ دیر بعد ان کی آوازیں دھیمی ہو گئیں۔ دو تین منٹ یہ کھسر پھسر جاری رہی پھر نشیب سے دو قدِ آدم ہیولے برآمد ہوئے اور مخالف سمت میں چل دیئے۔ دراز قامت منوج صاف پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص تھا، وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

دس پندرہ قدم چلنے کے بعد منوج نے ٹارچ روشن کرلی۔ ٹارچ کا دائرہ نالے کے نشیب و فراز میں گردش کرنے لگا۔ یہاں چند گھوڑے بندھے ہوئے تھے اور آثار سے نظر آرہا تھا کہ محاصرہ کرنے والے نالے کے قرب و جوار میں موجود ہیں۔ میں کچھ دیر ٹھنڈی ریت پر پیٹ کے بل لیٹا سوچتا رہا پھر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا۔

حالات انسانی ارادوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ کیپٹن آر کے بھوانی جو سرِشام بے فکری سے قہقہے لگا رہا تھا اور محاصرہ کرنے والوں کو بھیڑوں کی طرح الٹا لٹکانے کی باتیں کر رہا تھا۔ اب ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اسی طرح مہاراج رتن سنگھ جو صوائش قبیلے کے نمائندوں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا اور جسے منوج کے گستاخانہ لب و لہجے نے آگ بگولا کردیا تھا، اب ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ساڑھے چار بجنے کے قریب جب سپیدۂ سحر تاریکی پر غالب آنا شروع ہوا اور محاصرہ کرنے والوں کی صفوں میں اضطرابی کیفیت نمودار ہونے لگی تو میں ریسٹ ہاؤس میں مہاراج رتن سنگھ کے قریب ہی موجود تھا۔ مہاراج کے ساتھی لڑنے مرنے پر تیار تھے اور اپنی حرکات و سکنات اور اپنی زبانوں سے اپنے ارادوں کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ تاہم مہاراج انہیں موت کے منہ میں جھونکنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جانتا تھا سخت خون خرابہ ہوگا اور اس خون خرابے کے باوجود محاصرہ کرنے والوں کو روکا نہیں جا سکے گا۔ دوسری طرف "مطالبات" مان لینا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ گھڑی کی سوئیاں مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ابھی وقت پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب عتیق خاں روتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ایک مسلح باڈی گارڈ اس کے پیچھے تھا۔ عتیق خاں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یور ہائی نس! ہم

پوزیشن سنبھال لینی چاہیے۔ وہ لوگ آگے بڑھ آئے ہیں اور کسی بھی وقت فائرنگ شروع کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ کوئی گولی نہیں چلائے گا۔" مہاراج نے گرج کر کہا۔ اس نے بے قراری سے پندرہ بیس قدم کمرے کے اندر ہی چہل قدمی کی۔ پھر ایک جگہ رُک گیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "عتیق خاں! تم جاؤ اور تراخاں سے کہو کہ ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"لل۔۔۔ لیکن۔" عتیق خاں ہکلایا۔

"کچھ نہیں۔" مہاراج ہاتھ اٹھا کر گرجا۔ "جو ہم کہہ رہے ہیں وہی کرو۔"

عتیق خاں نے سر جھکایا اور الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

"ٹھہرو" مہاراج نے اسے پکارا۔ وہ ٹھٹک کر پھر اندر آگیا۔ مہاراج نے کہا۔ "اس سے پوچھ کر آؤ کہ وہ یہاں آکر بات کرے گا یا ہم اس کے پاس آئیں۔"

عتیق خاں نے ایک بار پھر تعظیم پیش کی اور باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ تراخاں نے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنے دو بنیادی مطالبوں سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔

مہاراج رتن سنگھ نے عتیق خاں اور اپنے دوسرے گارڈز کو ضروری ہدایات دیں۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں غزال کے پاس جاؤں۔ وہ پریشان ہوگی۔ میں نے کہا۔ "آپ فکرمند نہ ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ریسٹ ہاؤس کے بیرونی دروازے پر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ سردار تراخاں اور اس کے ساتھی پہنچ گئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے قریب تھی۔ سردار تراخاں عام جسامت اور شکل و صورت کا شخص تھا لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ داڑھی کے بال سفید تھے۔ قبیلے کے باقی افراد کی طرح اس نے خاکستری پی دار پگڑی مخصوص انداز میں لپیٹ رکھی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے افراد میں میری نگاہ سب سے پہلے اس شخص پر پڑی جو لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہ بھدی سی ناک والا ایک کرخت چہرہ شخص تھا۔ اس نے رنگ دار سوتی چادر کی بُکل مار رکھی تھی۔ سردار تراخاں نے آگے بڑھ کر مہاراج رتن سنگھ سے مصافحہ کیا پھر دونوں حضرات نے نشستیں سنبھال لیں۔ دونوں اطراف کے آٹھ دس معززین بھی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ باقی افراد دائیں بائیں کھڑے رہے۔ نشست گاہ مسلح افراد سے کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ کم و بیش چھتیس رائفلیں اور پستول وغیرہ اس کمرے میں موجود تھے۔ ماحول میں زبردست قسم کا تناؤ تھا۔ چہرے تمتمائے ہوئے، اعصاب کشیدہ اور آنکھیں متحرک۔

مہاراج رتن اور تراخاں بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے اصل موضوع پر آگئے۔ تراخاں نے کہا۔ "راجا صاحب! ہمارے جرگے کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سنگھے کی بیٹی پریم سے آپ کا بیاہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں۔ آپ کے لوگوں نے یہ رشتہ حاصل کرنے کے لیے لڑکی کے وارثوں پر ناجائز دباؤ ڈالا، دھمکیاں دیں، ہر قسم کے غلط ہتھکنڈے استعمال کیے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود جب ناکامی ہوئی تو لڑکی کو زبردستی پھیرے کروائے اور موٹر میں ڈال کر لے گئے۔"

مہاراج رتن نے یہ الزامات تحمل سے سنے اور پُرسکون آواز میں کہا۔ "وہ عورت کہاں ہے جسے بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے ڈرایا دھمکایا گیا اور بلیک میل کیا گیا؟"

ایک شخص تراخاں کے عقب سے چلایا۔ "وہ عورت تم سے خوفزدہ ہے اور اتنی خوفزدہ ہے کہ نیم پاگل ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔"

ایک دم نشست گاہ میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ تمتمائے چہرے کچھ اور تمتما گئے۔ ہتھیاروں پر گرفت سخت ہو گئی۔ تراخاں نے گھوم کر اپنے بندے کو ڈانٹا۔ "خاموش رہو! تم سے کس نے بولنے کو کہا ہے؟" قبیلے کے تین چار افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ نشستوں پر بیٹھے معززین نے ان لوگوں کو بمشکل چپ کرایا۔ تراخاں نے کہا۔ "راجا صاحب! ہم نے بہت کوشش کی ہے لیکن سنگھے کی بیوہ آپ کے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ اس نے جرگے کے روبرو حلفیہ بیان دیا ہے کہ اس کی بیٹی کو زبردستی اس سے چھینا گیا ہے اور اس کے علاوہ زمین کے کاغذات پر بھی بزور دستخط کرائے گئے ہیں۔"

مہاراج رتن سنگھ نے کہا۔ "اگر رانی پریم خود یہ بیان دے کہ اس پر اور اس کے اہل خانہ پر کوئی زور جبر نہیں کیا گیا تو پھر؟"

تراخاں بولا۔ "وہ جب تک آپ کی تحویل میں ہے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ ماں بیٹی اتنی خوفزدہ ہیں کہ وہ آپ کے خلاف زبان کھول ہی نہیں سکتیں۔"

مہاراج نے کہا۔ "تراخاں! میرے خیال میں تم اتنے بدھی وان تو ہو کہ کھوٹے کھرے میں پہچان کر سکتے ہو۔ ا

تمہاری نیت صحیح ہے تو میں پورے وشواس سے کہتا ہوں کہ پرم کا بیان تمہاری تسلی کردے گا۔ اگر تم چاہو تو اس سے اکیلے میں بات کرسکتے ہو۔"

ترا خاں کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک فربہ اندام شخص بھڑک کر بولا۔ "ہمیں باتوں میں مت اُلجھاؤ راجا صاحب! باتیں بہت بنی ہیں ہم نے۔ تم ہماری لڑکی ہمارے حوالے کرو اور اس کٹنے تیواری لال کو بھی۔ وہ تمہارا مجرم نہیں تمہارا ساتھی ہے۔ تم اسے سزا کیا دو گے۔ اسے سزا ہم دیں گے اور سارا جگ دیکھے گا۔"

"ترا خاں! اپنے بندوں کو بولنے کی تمیز سکھاؤ۔" عتیق خاں نے گرج کر کہا اور رائفل کندھے سے اتاری۔ ایک دم بیچ بچاؤ کرنے والے افراد کھڑے ہوگئے اور انہوں نے عتیق خاں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ اتنے میں نشست گاہ کا اندرونی دروازہ کھلا اور سب کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔ رانی پرم نشست گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے سر پہ سفید چادر تھی۔ اس کی کم عمری، اس کی سنجیدگی اور اس کے باوقار انداز کے عقب میں جا چھپی تھی۔ قریباً چار برس کا بچہ اس کی انگلی تھامے ہوئے تھا۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا اور اس نے رانی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر ایک دوسرے شخص نے آگے بڑھ کر اسے پیار دیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ دونوں حضرات رانی پرم کے چچا اور ماموں تھے۔

"کیسی ہو میری پُتری؟" رانی پرم کے چچا نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ اور آپ کو یہی بتانے آئی ہوں۔" وہ بے حد مستحکم لہجے میں بولی۔ چند قدم چل کر وہ سردار ترا خاں کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ سردار ترا خاں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "سردار! آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے آپ کو مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔ بہرحال میں آپ سب کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ یہ شادی میری ماں کی مرضی اور خوشی سے ہوئی تھی اور اب میں اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے پتی کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ نہ مجھ پر کوئی روک ہے اور نہ کسی طرح کا جبر۔ مجھے نہیں خبر کہ آپ لوگ کس کے بہکاوے میں آکر میرا گھر اُجاڑنے چلے آئے ہیں لیکن میں بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں کہ اگر ایسا کچھ ہوا تو یہاں سے میں نہیں میرا بے جان شریر جائے گا۔"

نشست گاہ کا سناٹا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا اور اس سناٹے میں صرف رانی پرم کی آواز گونج رہی تھی۔ میں حاضرین کے درمیان راستہ بناتا ہوا اس لنگڑے شخص کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا جو ترا خاں کے عقب میں ایک الماری سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میری نگاہ ہر گھڑی اس کا جائزہ لے رہی تھی اور میں اس کی طرف سے کسی بھی ایسی ویسی حرکت کے لیے تیار تھا۔ نالے کے کنارے میں نے جو گفتگو سنی تھی وہ اس قدر واضح اور دو ٹوک تھی کہ لنگڑے پر شک نہ کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی۔

ترا خاں کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ رانی پرم سے مخاطب تھا۔ "دیکھو بیٹی! اس طرح کسی بات کا بھی فیصلہ نہیں ہوسکے گا۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی اور تمہاری ماتا جو کچھ کر رہی ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے تو تمہیں ایک مرتبہ جرگے کے سامنے پیش ہونا پڑے گا اور۔۔۔"

"میں ہر جگہ پیش ہونے کو تیار ہوں۔" رانی پرم ترا خاں کی بات کاٹ کر بولی۔ "جہاں چاہتے ہو مجھے لے جاؤ۔ میرا بیان وہی رہے گا جو اس وقت ہے۔"

ترا خاں کے جوشیلے ساتھیوں کے چہرے لٹک گئے تھے۔ رانی پرم کا چچا جو بہت اکڑ کر کھڑا تھا، اب ہوا نکلے غبارے کی طرح ایک نشست پر لڑھکا ہوا تھا۔ مہاراج رتن اب خاموش ہوگیا تھا۔ اسے اب بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ترا خاں کے ہر سوال کا جواب رانی پرم خود دے رہی تھی اور بڑے منہ توڑ انداز میں دیے رہی تھی۔ اس کے اندر ایک پتی پرست عورت کی روح تھی اور وہ مشرقیت تھی جو نسل در نسل سیکڑوں برس سے اس کے خون میں سفر کررہی تھی۔

اچانک میرے اندر کلبلانے والا اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا۔ میری نگاہ شاید ایک سیکنڈ کے لیے لنگڑے "مدن" کی طرف سے ہٹی تھی۔ دوبارہ میں نے اس کی طرف دیکھا تو بدن سنسنا اٹھا۔ چادر کے نیچے مدن کا ہاتھ حرکت کررہا تھا۔ پھر میں نے چادر کے نیچے پستول کا ابھار صاف محسوس کیا، کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس نشست گاہ میں طبلِ جنگ بجنے والا تھا۔ میری نگاہ میں فرید کوٹ والا واقعہ گھوم گیا۔ بابو لیاقت کی بیٹھک میں اس سے ملتی جلتی صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ صلح صفائی کی گفتگو کے دوران اچانک جذبات بھڑک اٹھے تھے اور پہلی گولی چلتے ہی کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ اس واقعے میں ایک سابق پولیس آفیسر سمیت دو افراد

ہلاک ہوئے تھے۔

جونہی مجھے یقین ہو گیا کہ رنگ دار چادر کے نیچے مدن کے ہاتھ میں آتشیں ہتھیار ہے، میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپک کر اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرا دایاں ہاتھ اس کے پستول پر آیا تھا جب کہ بائیں بازو نے اس کے دونوں بازوؤں کو کہنیوں پر سے جکڑ لیا تھا۔ مدن پہلے تو بوکھلا گیا پھر اس نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک دم زور لگایا۔ میں نے اسے زمین سے چند انچ اوپر اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ نشست گاہ میں ایک دم کھلبلی سی مچ گئی۔ میں نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر مدن کی گرفت سے پستول چھینا اور سردار ترا خاں کو تھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟" ترا خاں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کا یہ ساتھی گولی چلا رہا تھا۔ پوچھیں اس سے کہ یہ کیوں کر رہا تھا ایسا۔"

مدن اس بری طرح بوکھلا گیا تھا کہ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ترا خاں کی عقابی نگاہیں ایک ہی لمحے میں بات کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس نے پستول کو بغور دیکھ کر کہا۔ "یہ تمہارا پستول تو نہیں ہے مدن لال؟"

"ج۔۔۔ جی۔۔۔ وہ" مدن ہکلایا۔

اسی دوران ایک شخص نے عقب سے میری گردن پر مُکا مارا۔ مُکا مارنے والے کو عتیق خاں نے دھکا دے کر کرسیوں پر گرا دیا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ خون ریز ہنگامہ شروع ہو جائے گا مگر پھر ترا خاں نے دانشمندی کا ثبوت دیا اور لپک کر جھگڑا کرنے والوں کے درمیان آگیا۔ اس نے فریقین کو ایک دوسرے سے دور ہٹایا اور مجھ سے کہا کہ میں مدن کو چھوڑ دوں۔ میں نے اجازت طلب نظروں سے مہاراج رتن سنگھ کی طرف دیکھا اور اشارہ پا کر مدن کو چھوڑ دیا۔ اس کے ناک منہ سے خون رس رہا تھا اور اکلوتی ٹانگ کانپتی چلی جارہی تھی۔

ترا خاں نے جھک کر مہاراج رتن سے کوئی سرگوشی کی۔ پھر بلند آواز میں اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ مہاراج رتن سنگھ نے بھی اپنے باڈی گارڈز کو باہر بھیج دیا۔ مجھے بھی سب کے ساتھ باہر آنا پڑا۔ ریسٹ ہاؤس کو گھیرے میں لینے والے اب بالکل قریب آچکے تھے۔ ان کی برچھیاں، کلہاڑیاں اور بندوقیں چلچلاتی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ ان میں سے کئی گروہ نعرہ زنی بھی کر رہے تھے۔ یہ بڑے غضب ناک قسم کے نعرے تھے۔ جلانے گرانے اور

ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے وہ لوگ بہت عجلت میں نظر آتے تھے۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ مہاراج رتن سنگھ بات چیت کو طول دے کر انہیں کسی جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گا اور ان کا اندیشہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ ان کے نقطۂ نظر سے "مقاصد حاصل" کرنے کے لیے یہ بے حد سنہری موقع تھا۔ اس ریسٹ ہاؤس میں مہاراج رتن کا دورہ بالکل خفیہ تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی اس وقت کس مصیبت میں ہیں۔ وہ مکمل طور پر محاصرہ کرنے والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ تاہم یہ صورتِ حال تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی بھی وقت اس محاصرے کی خبر عام ہوسکتی تھی۔

کچھ دیر بعد مہاراج رتن سنگھ نشست گاہ سے باہر آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر مجھے تلاش کیا اور پھر اپنے پاس بُلا لیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ مہاراج نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے ترا خاں کے ساتھی کو کیوں دبوچا تھا اور مجھے قبل از وقت کیسے پتا چل گیا کہ وہ گولی چلانے والا ہے۔

میں نے دو گھنٹے پہلے پیش آنے والا واقعہ تفصیل سے مہاراج کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے بتایا کہ جھاڑیوں میں مدن اور منوج نامی نوجوان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔۔۔ مہاراج دھیان سے سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ مجھے اس کی نگاہوں میں اپنے لیے تعریفی جذبات نظر آئے۔ مجھے پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ نشست گاہ میں واپس چلا گیا۔ آثار سے نظر آرہا تھا کہ یہ معاملہ صلح صفائی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا اچانک اور آناً فاناً تھا کہ حواس پر بھروسا نہیں ہوا۔ مواشی قبیلے کے ایک فرد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ تیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔ "میرے ساتھ آئیے۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں لے آیا۔ یہاں مواشی قبیلے کے بہت سے افراد کھڑے تھے اور نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے وہ پولنگ اسٹیشن پر ہوں اور اندر ایک کانٹے دار مقابلے میں ووٹوں کی گنتی ہو رہی ہو۔ مہاراج رتن کے چند باڈی گارڈز بھی یہاں وہاں کھڑے تھے۔ مواشی قبیلے کا فرد مجھے ایک کونے میں سائیں عالی کے پاس لے گیا۔ سائیں عالی حسبِ عادت زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور لمبے ناخنوں سے

پاؤں تھما رہا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والے نے سائیں کے سامنے جھک کر آہستگی سے کہا۔ "سائیں جی! یہی ہے نا!"
سائیں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سارے دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اثبات میں سر بھی ہلا رہا تھا۔ وہ شخص میری طرف گھوما اور بے حد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "آپ کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟"
"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"
اس نے اپنی آواز کچھ اور مدھم کی اور کہا۔ "میں سائیں جی کے عقیدت مندوں میں سے ہوں۔ انہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ سائیں جی نے آپ کا اور آپ کی ساتھی ایک لڑکی کا نام لیا ہے۔ غالباً وہ چاہتے ہیں کہ آپ دونوں کو بھی یہاں سے نکالا جائے۔"
"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔
اس کی آنکھوں میں "سنسنی" کسی برقی لہریے کی طرح کوند گئی۔ آہستہ سے بولا۔ "تین چار منٹ میں یہاں سب کچھ ملیا میٹ ہونے والا ہے۔ ہمارے لوگ ہر صورت میں مہاراج اور اس کے ساتھیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جونہی سردار ترا خاں اور دوسرے لوگ ریسٹ ہاؤس سے نکلیں گے، ریسٹ ہاؤس پر ہلّا بول دیا جائے گا۔ وقت بہت کم ہے۔ میں اپنی بات دہرا نہیں سکتا۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں بہت غور سے سنیں۔ آپ یہیں برآمدے میں کھڑے ہیں۔ جونہی آپ دیکھیں کہ سامنے ٹیلوں پر کھڑے لوگ ایک ساتھ نیچے اتر رہے ہیں۔ یعنی سب کے سب ایک دم تیزی سے اتر رہے ہیں تو آپ اپنی ساتھی لڑکی اور سائیں عالی کو لے کر ریسٹ ہاؤس کے کسی بھی عقبی دروازے سے باہر نکل آئیں۔ سرخ رنگ کی ایک لاری آپ کو کھجوروں کے پاس کھڑی نظر آئے گی۔ وہ خالی ہو یا اس میں لوگ ہوں، آپ بے دھڑک اس کی طرف آئیں اور اندر گھس جائیں۔ نشستوں کے عقب میں جو جگہ خالی ہے وہ آپ کے لیے زیادہ محفوظ رہے گی۔ بہتر ہے کہ فرش پر لیٹے رہیں۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس لاری کے سوا آپ کے لیے محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہوگی۔"
میں نے کہا۔ "لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ مہاراج نے ہر بات ترا خاں کے سامنے کھول دی ہے۔ لڑکی نے خود سامنے آ کر تفصیل سے بیان دے دیا ہے۔ اب ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟"
وہ شخص "آپ" سے "تم" پر آ گیا۔ درکھائی سے بولا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"
وہ مجھے قبیلے کی کوئی اہم شخصیت نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ "دیکھو بھائی! اگر تم اپنے پیر و مرشد کے لیے سوچ رہے ہو تو اپنے پیر بھائیوں کے لیے بھی سوچو۔ کیپٹن بھوانی جو اندر زخمی حالت میں پڑے ہیں سائیں جی کے مرید خاص ہیں۔ سائیں جی انہی سے ملنے بستی سے یہاں آئے ہیں اور ان کے دوست مہاراج رتن بھی سائیں جی سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔"
وہ بولا۔ "میری معلومات ان لوگوں کے بارے میں تم سے بہت زیادہ ہیں۔ تم مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔"
اس شخص کا لہجہ سچائی میں رچا بسا ہوا تھا اور بھیانک اندیشوں کو جنم دے رہا تھا۔ میں اندر سے کانپ گیا۔ "کیا تصادم رک نہیں سکتا؟ مم... میرا مطلب ہے اگر مہاراج مطالبات مان لیں تو...؟"
"مطالبات کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بہت گہرا چکر ہے تم نہیں سمجھو گے۔"
گھمر پٹر کی آوازوں نے قرب و جوار کے لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس شخص نے اپنا بازو میری گرفت سے چھڑایا۔ اور نگاہوں نگاہوں میں سائیں عالی کو سلام کرتا آگے نکل گیا۔ میں اپنی جگہ مبہوت کھڑا تھا۔ سائیں ایکدم اٹھ کر ناچنے لگا۔ اس کا جسم حرکت میں آیا تو گلے میں جھولتی ہوئی بے شمار مالائیں اور ننھی منی گھنٹیاں چھنا چھن بجنے لگیں۔ وہ ناچنے کے ساتھ ساتھ "حق ہُو" کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ برآمدے میں موجود سب لوگ اس کے گرد ہو گئے۔ سائیں کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ اس کے ناچ میں ایک خاص قسم کی موسیقی اور ایک ناقابلِ بیان کشش تھی۔ میں اس موقع کا فائدہ اٹھا کر غزالہ کے پاس پہنچا اور اسے جوتی پہننے اور چادر لینے کو کہا۔ میرا اضطراب دیکھ کر اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہیں ہم؟"
میں نے کہا۔ "ابھی کچھ معلوم نہیں فی الحال یہاں سے نکلنا ہے۔"
اچانک مجھے نشا کا خیال آیا۔ وہ موت سے ڈری ہوئی لڑکی جو نجانے کیوں مجھے اپنی ڈھال سمجھنے لگی تھی۔ غزالہ کو کمرے میں چھوڑ کر میں ریسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے کی طرف لپکا۔ زینوں پر مجھے خناب آفریدی دکھائی دیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بوتلیں تھیں اور وہ جھومتا ہوا آ رہا تھا۔ زینوں کے ساتھ والے کمرے میں میں نشا کو

ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا برآمدے کی طرف لے چلا۔ "ہائے رام! یہ کیا کر رہے ہو۔ کدھر لے جا رہے ہو مجھے؟" وہ چلائی۔
میں سنی ان سنی کرتا ہوا اسے اس کمرے میں لے آیا جہاں غزالہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا میری نگاہ مشرق جانب کھلنے والی کھڑکی میں گئی۔ ترا خاں، مہاراج رتن سنگھ سے بات چیت کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے واضح تھا کہ بات چیت نتیجہ خیز رہی ہے۔ ترا خاں کے پیچھے ہی پیچھے اس کے ڈیڑھ درجن مسلح ساتھی بھی ریسٹ ہاؤس سے باہر آ گئے۔ میں لپک کر برآمدے میں آیا۔ میری چھٹی حس نے اعلان کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر میری نظر ٹیلوں کی طرف گئی۔ رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ بہت سے گھڑسوار اور پیدل افراد ایک بڑے جلوس کی طرح ریسٹ ہاؤس کی جانب آ رہے تھے۔ اب سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے غزالہ کا ہاتھ تھاما اور نشا سے کہا۔ "چلو آؤ میرے پیچھے۔"
اچانک زوردار فائرنگ ہونے لگی۔ سائیں عالی کا رقص دیکھنے والے صحن کی طرف لپکے۔ سائیں عالی نے ایک فلک شگاف نعرۂ مستانہ بلند کیا اور لپک کر نشا کا بازو تھام لیا۔ نشا گھبرا کر چیخی مگر سائیں عالی اسے بے پناہ قوت سے ریسٹ ہاؤس کے عقبی دروازے کی طرف کھینچتا چلا گیا۔ میں اور غزالہ نشا کے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نشا کو پیچھے سے دھکیل رہا تھا لہٰذا وہ سمجھ گئی کہ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں جہاں سائیں عالی جا رہا ہے۔
ریسٹ ہاؤس کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہی مجھے وہ سرخ کھٹارا بس نظر آئی جو ابھی ابھی کھجور کے درختوں میں رکی تھی۔ بس کے دونوں دروازوں سے مسلح افراد کود کود کر باہر نکل رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور چیخ کر بولا۔ "آ جاؤ۔"
یہ وہی شخص تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بات ہوئی تھی۔ اب اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں سیٹیاں بجاتی محوِ پرواز تھیں۔ ہم جھک کر بھاگتے ہوئے بس میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک بس خالی ہو چکی تھی۔ اپنے محسن کی ہدایت کے مطابق ہم نشستوں کے درمیانی راستے سے گزر کر بس کے عقبی حصے میں چلے گئے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور ہر آنے والی آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے میں پوری طرح تیار تھا۔
ریسٹ ہاؤس کو مسلح افراد نے یوں گھیر لیا تھا جیسے مصری

پُر اسرار کہانیوں کے شوقین حضرات کے لئے خاص کہانی
ابنِ آدم
کے قلم کی زبانی

قیمت -/۱۰۰ روپے

کے چھوٹے سے ٹکڑے کو چیونٹیاں گھیر لیتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اندر سے شدید مزاحمت ہوگی لیکن صورتحال برعکس نکلی۔ ابتدا میں سیون ایم ایم اور سب مشین گن کے چند مختصر اور طویل برسٹ مارے گئے لیکن پھر ایک دم مزاحمت دم توڑ گئی۔ میں نے ریسٹ ہاؤس کی چھت پر مہاراج رتن کے جاں نثار محافظوں اور حملہ آوروں میں دوبدو لڑائی ہوتے دیکھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو محافظوں کو کلہاڑیوں سے شدید زخمی کر کے چھت سے نیچے پھینکا گیا۔ پھر کیپٹن بھوانی کا ایک گارڈ جو بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑا مشین پسٹل سے فائرنگ کر رہا تھا گولیوں سے چھلنی ہو کر ریسٹ ہاؤس کے صحن میں گرا۔ ریسٹ ہاؤس کے اندرونی حصوں سے خودکار رائفلوں کے تڑتڑاہٹ مسلسل سنائی دے رہے تھے۔ تب میری آنکھوں نے ایک ناقابلِ فراموش منظر دیکھا۔ ریسٹ ہاؤس کے عقبی دروازے سے چند افراد جانیں بچا کر بھاگے۔ ان میں کیپٹن بھوانی بھی تھا۔ وہی کیپٹن بھوانی جو تھوڑی دیر پہلے تک بستر پر پڑا تھا اور دو ذرا سا ہلتا بھی تھا تو کراہ اٹھتا تھا۔ اب اپنی جان بچانے کے لیے نہ صرف بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا بلکہ باقاعدہ بھاگ رہا تھا۔ اس کا رخ اپنی سیاہ جیپ کی طرف تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ بلٹ پروف جیپ میں داخل ہو کر وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔
لیکن جو جان کے درپے تھے وہ اتنے غافل نہیں تھے۔

تین گھڑ سوار کیپٹن بھوانی کے پیچھے لپکے۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھوں میں برق سی لہرائی۔ کچھ روز پہلے بھی میں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اس وقت کیپٹن بھوانی کی جگہ ایک زخمی سور تھا جو جان بچانے کے لیے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ کیپٹن بھوانی گھوڑے پر سوار تھا اور اس کا بانس کے دستے والا نیزہ چڑھتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ کتنی جلدی اس منظر میں کیسی ہولناک تبدیلی آگئی تھی۔ ایک ساعت کے لیے میرے دل میں آئی کہ باہر نکلوں اور زخمی کیپٹن بھوانی کی مدد کروں۔ لیکن دل کی آواز پر ذہن کی آواز غالب آگئی۔ یہ بہادری نہیں 'خودکشی' تھی۔ خود کو سیکڑوں افراد کے مشترکہ غضب کے جبڑوں میں پھینکنا پرلے درجے کی بیوقوفی تھی۔ معلوم نہیں یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا اسے اب ہو کر رہنا تھا۔ زیر وانہ لوڑے آوٹے۔

کیپٹن بھوانی قتل ہوا لیکن میری آنکھوں کے سامنے نہیں۔ وہ گھڑ سواروں کے آگے لنگڑی روڑ دوڑتا درختوں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ تین چار منٹ بعد میں نے اس کی خونچکاں لاش دیکھی۔ دو افراد اسے بازوؤں سے گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔ یقیناً اس وقت تک وہ مر چکا تھا۔

میں نے دیکھا' تین افراد بس کے دروازوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس کے کہنے پر ہم بس میں آئے تھے۔ یہ لوگ گاہے گاہے ہوائی فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ غزالہ اور بشا' کانوں میں انگلیاں ٹھونسے گھٹنوں میں سر دیے بے حس و حرکت بیٹھی تھیں۔ جبکہ سائیں عالی ہر چیز سے بے پروا مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ وہ جیسے کچھ بھی دیکھ اور سن نہیں رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک رہا تھا اور رال سینے تک بہہ رہی تھی۔

ہمارے سروں پر ابھی راجستھان کا آگ برساتا سورج نمودار نہیں ہوا تھا پھر بھی بس کے اندر حبس تھا اور چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنا شروع ہو گیا تھا۔

یکایک میری نگاہوں کے سامنے ایک اور لرزہ خیز منظر آیا۔ میں نے رانی پرم کو دیکھا' اس کے سر سے چادر غائب تھی۔ دو بٹے کٹے افراد اسے کھینچتے ہوئے لاری کی طرف لا رہے تھے۔ وہ چلا رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے کھینچنے والوں میں سے ایک منوج تھا۔ میں نے اسے گلے کی چمکتی دمکتی طلائی زنجیر سے پہچانا۔ لاری کے نزدیک پہنچ کر دوسرا شخص پیچھے ہٹ گیا اور منوج تنہا ہی پرم کو کھینچتا ہوا بس کے دروازے تک پہنچ گیا۔ بس پر پہرا دینے والوں میں سے سائیں عالی کا مُرید آگے بڑھا۔ اس نے منوج کے ساتھ کوئی مکالمہ کیا۔ انداز ہو رہا تھا کہ وہ منوج کو بس میں سوار ہونے سے روکنا چاہتا ہے اور کچھ فاصلے پر کھڑے ایک ٹرک کی طرف اشارہ کر رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ اس ٹرک میں سوار ہو جاؤ۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا سائیں عالی کا مُرید نہیں چاہتا تھا کہ منوج لاری میں سوار ہو اور لاری میں ہماری "موجودگی" افشا ہو جائے۔ مگر منوج اپنی بات منوانے میں کامیاب رہا۔ وہ پرم کو کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ "مجھے چھوڑ دے پاپی۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھے میرے پتی کے پاس جانے دو۔" ساتھ ساتھ وہ منوج کے صندوق جیسے سینے پر دوہتڑ بھی مار رہی تھی۔ اس کی چوڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔

منوج نے اندر پہنچ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ لاری کے وسط میں ایک نشست پر جا گری۔ غیظ و غضب کی زیادتی سے منوج کی صورت بگڑی ہوئی تھی۔ قطعی غیر انسانی شکل اختیار کر چکے تھے اس کے خدوخال۔ وہ چنگھاڑا۔ "حرامجادی' ستی ساوتری بنتی ہے۔ ایسی کی تیسی تیری اور تیرے پتی کی۔ دس برس پرانے یار کو بھول گئی اور چھ مہینے پہلے کا پتی یاد رہا۔ ابھی نکالتا ہوں تیری ساری شوہر پرستی۔"

وہ کسی عفریت کی طرح پرم پر جھپٹا۔ اس کی دیوانگی اپنے ہزار ہا ہاتھوں سے اپنے شکار کو نوچنے کھسوٹنے لگی۔ پرم کی دلدوز چیخوں سے بس گونج اٹھی۔ میرا خیال تھا کہ ان چیخوں کو سن کر کوئی پرم کو بچانے آئے گا لیکن بس سے باہر تو کوئی اور ہی منظر نظر آ رہا تھا۔ بے شمار افراد بس کے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں لڑکے' جوان' بوڑھے سبھی شامل تھے لیکن سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ بس کے ارد گرد کھڑے وہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے' برچھیاں لہرا رہے تھے اور نعرہ زن تھے جیسے پرم کی چیخ و پکار کو نقار خانے میں طوطی کی آواز بنا دینا چاہتے ہوں۔

زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان کبھی کبھی کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر ایک روتی چلاتی عورت سے ناقابلِ بیان سلوک کیا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا اور میری انگلی کی ایک جنبش ظالم کا خاتمہ کر سکتی تھی لیکن میں انگلی کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے گولی داغ دی تو ان دو لڑکیوں کو بچانا مشکل ہو جائے گا جو خوف و ہراس کی انتہا کو

پہنچ رہی ہیں اور اپنی شرم و حیا اور نسوانیت کو یکسر فراموش کر کے میرے جسم سے پیوست ہوتی جا رہی ہیں۔

میں خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ غزالہ اور بشا کی طرح میں آنکھیں بند کر سکتا تھا نہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس سکتا تھا۔ مجھے کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ بس کے اندر جیسے بھونچال آیا ہوا تھا۔ شیطان محوِ رقص تھا اور ایک مجبور و بے بس لڑکی کی مزاحمت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ وہاں وہ سب کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ میں چند گز کی دوری پر ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔ بے چارگی سی بے چارگی تھی۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور انگلی لبلبی پر تھی۔ شدید خواہش کے باوجود میں گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ زندگی میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں۔ جب انسان کی ساری فہم و فراست' اس کی ساری دلیری اور بہادری' اس کے تمام زور اور سارا رعب و دبدبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ وہ حالات کی بلند و بالا لہروں کے سامنے ایک حقیر تنکے کی مانند بہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید قدرت کبھی کبھی ایسے حالات پیدا کر کے ان لوگوں کو جھنجوڑتی ہے جو مخلوق کو خدائی کا درجہ دینے لگتے ہیں۔ کسی اپنے جیسے بندے کے بارے میں ان کے مثبت جذبات اس نہج پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ "جسے چاہتے ہیں" وہ اسمِ اعظم کا مالک ہے اور ہر ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے جب [illegible] تھی۔ نجانے وہ مجھے کیا سمجھتی تھی۔ کیا کیا توقعات اس نے مجھ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ وہ میرے لیے میں الف لیلوی کہانیوں کا وہ شہزادہ ہوں جو سیاہ و سفید کا مالک ہے' اور اپنی قوت بازو سے دن کو رات اور رات کو زندگی میں بدل سکتا ہے' ہر طوفان سے ٹکرا سکتا ہے' ہر مرحلے سے سرخرو نکل سکتا ہے۔ لیکن آج وہ دیکھ رہی تھی کہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک لڑکی پامال ہو رہی ہے' مدد کے لیے بلا رہی ہے لیکن میں عضوِ معطل بنا بیٹھا ہوں۔

وہ حشر کی گھڑیاں تھیں۔ لہٰذا مختصر ہونے کے باوجود بے طول تھیں۔ جب حشر بپا ہو چکا تو منوج' پرم کو گھسیٹتا ہوا نیچے لے گیا۔ میں نے محتاط انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ریسٹ ہاؤس کے مختلف حصوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ شعلوں کا رنگ و روپ بتا رہا تھا کہ یہ آگ پیٹرول ڈال کر لگائی گئی ہے۔ مسلح افراد کی طرف سے ہوائی فائرنگ کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ کیپٹن آر کے بھوانی اور اس کے محافظ کی لاشیں بس کے عین سامنے کھلے آسمان تلے پڑی تھیں۔ خاص طور پر کیپٹن آر کے بھوانی کی لاش تو بس باڈی کے بالکل قریب تھی۔ میں اس کے ادھ کھلے منہ میں سے جھانکتے ہوئے چمکیلے دانت دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ایک دانت کا کونا ٹوٹا ہوا تھا اور یہ شکستہ دانت اس کی مسکراہٹ کو خوبصورت بنا دیتا تھا۔ اپنی تمام خوبصورتی' خوش پوشی اور اعلیٰ نسبی سمیت کیپٹن آر کے بھوانی فرشِ خاک پر بے سدھ پڑا تھا۔ مجھے کیپٹن آر کے بھوانی کا وہ بریف کیس یاد آیا جس میں سے اس نے پرانے پرچوں کے تراشے نکالے تھے۔ یقیناً اس بریف کیس میں اور اہم کاغذات بھی موجود تھے۔ معلوم نہیں اب وہ بریف کیس کہاں تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ افراد نے بھوانی اور اس کے محافظ کی لاشوں پر پیٹرول انڈیلا اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے ریسٹ ہاؤس کے شعلوں میں پھینک دیا۔

پرجوش دیہاتیوں کے ایک ٹولے میں مجھے سردار ترا خان بھی نظر آیا۔ میری نگاہ اسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں ہونے والے کشت و خون اور لوٹ مار کے دوران ترا خان کا کردار کیا رہا ہے۔ لیکن اگر میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے لڑتا جھگڑتا نظر آئے گا۔ یا اس نے انہیں اس درندگی سے روکنے کی کوشش کی ہوگی جس کا مظاہرہ تھوڑی دیر پہلے اس لاری میں ہوا تھا تو یہ غلط تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سردار جی غیظ و غضب اور جوش کے ریلے میں بہہ گیا ہے۔ بعض مہاراج کے ساتھیوں اور پرم وغیرہ پر جو کچھ بیتی تھی وہ ترا خان اور دوسرے بڑے بوڑھوں کی موجودگی میں بیتی تھی اور اس سانحے کا یہی پہلو زیادہ تکلیف دہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے مواش قبیلے کے لوگوں کو ٹرکوں اور دوسری گاڑیوں پر سوار ہوتے دیکھا۔ کچھ لوگ بھڑا مار کر سرخ لاری میں بھی گھس آئے۔ اندر آنے والوں میں سائیں عالی کا مرید سب سے آگے تھا۔ اس نے ہمیں جلدی سے اگلی نشستوں پر بٹھایا۔ سائیں عالی کے سوا ہم سب نشستوں پر بیٹھ گئے۔

"یہ کون ہیں؟" ایک بٹے کٹے شخص نے ہمیں دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا

سائیں عالی کے مرید نے کہا۔ "انہیں میں لے کر آیا ہوں۔ یہ ریسٹ ہاؤس میں مہاراج کے قیدی تھے۔ مہاراج کے کرمیوں نے بڑی مار پیٹ کی ہے ان سے... یہ سائیں صاحب بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ میں انہیں بہت پہلے سے

جانتا ہوں۔ یہ بے چارے بھی یہاں پھنسے ہوئے تھے۔"

اس گفتگو کے دوران ہمیں یہ پتا بھی چلا کہ سائیں عالی کے مرید کا نام سفیر احمد ہے اور وہ کسی بڑے پولیس افسر کا بھائی ہے۔ لاری میں موجود سب لوگ اب بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ غزالہ اور رنشا نے اپنے چہرے چادروں میں چھپا لیے تھے اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ کچھ دیر ہمارے ارد گرد کھسر پھسر جاری رہی پھر سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کسی نے لاری کے باہر سے نفرت انگیز نعرہ بلند کیا "مہاراج کتا"

بس کی سواریوں نے گونج دار آواز میں "ہائے ہائے" کہا۔

دوسری بار نعرہ بلند ہوا تو ساتھ ہی ہوائی فائرنگ بھی ہونے لگی۔ غزالہ اور رنشا کچھ اور سہم سکڑ گئیں۔ ایک بار پھر مجھے بریف کیس کا خیال آیا۔ میں نے سفیر احمد کو بلایا اور اس سے کہا کہ تھوڑی دیر پہلے قتل ہونے والے کیپٹن بھوانی کے پاس ایک بہت خاص بریف کیس تھا۔ وہ بریف کیس ضائع ہو گیا تو بہت نقصان ہوگا۔

سفیر احمد نے اپنی آنکھوں سے ایک معنی خیز اشارہ کیا۔ اس اشارے سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ وہ اس بریف کیس کے بارے میں جانتا ہے۔ تاہم فی الوقت مجھے اس موضوع پر خاموش رہنا چاہیے۔

مہاراج رتن سنگھ کے خلاف نفرت انگیز نعرہ بار بار بلند ہو رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے شعلے بہت اوپر تک جا رہے تھے۔ گہرے سیاہ دھوئیں میں اڑنے والی چنگاریاں لاری تک پہنچ رہی تھیں۔ اس بہت بڑے الاؤ کے گرد مسلح گھڑ سوار اور ساندنی سوار رقص کرنے والے انداز میں چکرا رہے تھے۔ میں نے چند افراد کو دیکھا جو جلتے ہوئے کمروں کے اندر سے رنگین ٹی وی، فریج اور قالین وغیرہ اٹھا کر لا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد کوچ کا حکم ہوا اور یہ حملہ آور جتھا تیز رفتاری سے مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔

○☆○

مہوانش قبیلے کی زیادہ تر آبادی "کاشانی" نام کی بستی میں رہتی تھی۔ یہ بستی تاندل اسٹیٹ کی جنوبی زمینوں سے ملحق تھی۔ قریباً آٹھ سو مکانات ہوں گے۔ ان میں تین چوتھائی مکان کچے یا نیم پختہ تھے۔ بستی کے مرکز میں بہت سی حویلی نما پختہ عمارتیں تھیں۔ یہ سب کی سب حال ہی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ بستی کے نواح میں ایک سڑک بھی زیرِ تعمیر تھی جس کے متعلق پتا چلا کہ وہ پندرہ بیس کلومیٹر آگے جا کر پکا نیر روڈ سے مل جائے گی۔ سائیں عالی کے مرید سفیر احمد نے ہمیں اپنی حویلی میں اُتارا۔ یہ حویلی بہت وسیع و عریض تو نہیں تھی مگر جتنی بھی تھی خوب سجی سنوری تھی۔ اس حویلی میں سفیر احمد اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ غزالہ اور رنشا کو زنانے میں پہنچا دیا گیا جب کہ میں اور سائیں عالی مہمان خانے میں ٹھہرے۔ سفیر احمد سائیں عالی کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ سائیں عالی کے لیے گاؤ تکیے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بستی میں بجلی موجود تھی لیکن "گئی" ہوئی تھی۔ دو افراد ہمیں بڑے بڑے پنکھوں سے ہوا دینے میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے سامنے تپائی پر ٹھنڈے مشروبات سجا دیے گئے۔

تھوڑی دیر بعد دوپہر کا کھانا آ گیا۔ کھانا ہماری آمد سے پہلے ہی تیار رکھا تھا اس کے باوجود پر تکلف تھا۔ دو تین قسم کا گوشت، چاول، خمیری روٹی، رائتہ، سلاد سبھی کچھ دسترخوان پر سجا ہوا تھا مگر ماحول کا اثر ذہن کے ساتھ ساتھ معدے پر بھی ہوا تھا اور ریسٹ ہاؤس کے وحشت ناک مناظر دیکھنے کے بعد بھوک مر سی گئی تھی۔ میں نے بے دلی سے چند لقمے لیے۔ ہاں سائیں عالی نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ وہ براہِ راست ہاتھوں سے کھاتا تھا اور جتنا کھاتا تھا اس سے بہت زیادہ گرا دیتا تھا۔ کھاتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں کہیں کھوئی رہتی تھیں اور وہ سوچتے سوچتے خود ہی مسکرانے لگتا تھا۔ حد میلے کچیلے ہاتھوں سے اسے شوربے میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر کھاتے دیکھنا بھی ایک انوکھا تجربہ تھا۔

یوں تو سفیر احمد دل جمعی سے ہماری آؤ بھگت کر رہا تھا، اس کی اندرونی پریشانی اس کی آنکھوں سے مترشح تھی اور یہ پریشانی صرف سفیر کی آنکھوں سے ہی نہیں یہاں موجود ہر شخص کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ بستی کی فضا میں ہیجان سا برپا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو اور اس "ہونی" کے خدشے نے ہر شخص کے لہو میں اضطراب کا زہر ٹپکا دیا ہو۔ شام پانچ بجے کے قریب مجھے حویلی کے کسی حصے سے گرمی بحث کی آوازیں آئیں۔ ان میں سردار ترا خان اور منوج کی آوازیں صاف پہچانی جاتی تھیں۔ ترا خان بپھرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "جوش سے کام لیا ہے تو اب ہوش بھی۔۔۔ یوں منہ چھپا کر نکل جاؤ گے تو زندگی بھر کے لیے بزدلی کی مہر لگ جائے گی۔ جدھر سے گزرو گے لوگ کہیں گے، یہ نامردوں کا ٹولا جا رہا ہے۔"

منوج بولا "سردار! یہ بزدلی نہیں۔ بزدلی کہتے ہیں میدان سے بھاگنے کو۔ ہم بھاگ نہیں رہے۔ ہم بچاؤ کے لیے وقتی طور پر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔"

سردار بولا "تم تو وقتی طور پر پیچھے ہٹ جاؤ گے اور بستی میں بچوں بوڑھوں کو ذبح کر جائیں گے۔ اس کا ذمہ

کون دار ہو گا؟"

سفیر احمد کی آواز آئی۔ "سردار! وہ نہتے لوگوں کو ماریں گے تو پھر ان کے نیتے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ اور یہ بات ان کو بھی معلوم ہے۔ ہم نے ان کی کسی عورت اور بچے پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ اٹھائیں گے تو پھر ہم بھی دیکھ لیں گے۔"

سردار گرجا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ جتنی تمہاری عمر ہے اتنا میرا تجربہ ہے۔ بہت لڑائیاں دیکھی ہیں میں نے۔ میں جانتا ہوں لڑائیوں میں کیا ہوتا ہے اور کس طرح لوگ انسانوں سے جانور بنتے ہیں۔۔۔ سب جانتا ہوں میں۔" ایک لحہ خاموشی رہی پھر سردار نے کہا۔ "میرے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے۔ میں مہاراج کو سندیسا بھجواتا ہوں کہ ڈال گری کے ریسٹ ہاؤس میں جو کچھ ہوا میری مرضی کے خلاف ہوا اور حملہ کرنے والے گروہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ تاندل اسٹیٹ والے ان کے خلاف جو بھی کارروائی کریں گے میں اس میں غیر جانبدار رہوں گا۔"

منوج نے کہا۔ "ٹھیک ہے سردار! جو تمہاری سمجھ میں آتا ہے کرو۔ ہم اپنی لڑائی لڑ سکتے ہیں اور لڑ کر دکھائیں گے لیکن تمہیں ہمارے گھر بار کی حفاظت کرنا ہو گی۔"

"اپنا گھر بار تم اپنے ساتھ لے کر جاؤ" سردار بے حد تلخی سے بولا۔ "جب میں تم سے اپنا تعلق ختم کروں گا تو پھر کسی چیز کا ذمے دار نہیں ہوں گا۔۔۔ تم لوگوں نے جو کچھ کیا ہے میں دل سے اس کے خلاف ہوں۔ اگر میں تمہیں پکڑ کر سزا نہیں دے رہا یا تاندل والوں کے حوالے نہیں کر رہا تو اسے میری رعایت سمجھو۔ اور اہل و عیال سمیت یہاں سے نکل جاؤ۔"

سفیر نے محتاط لہجے میں کہا "سردار! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اگر ہم۔۔۔" ایک دم آواز آنا بند ہو گئی۔ کسی نے درمیانی دروازہ بند کر دیا تھا جس کے راستے یہ گفتگو مجھ تک پہنچ رہی تھی۔

میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اکیلا ہوتا تو ان تشویشناک حالات میں بھی لمبی تان کر سو سکتا تھا لیکن میرے ساتھ دو لڑکیاں تھیں اور مجھے بہرصورت ان کے محافظ کا کردار بھی ادا کرنا تھا۔ یہی کردار تھا جس کے سبب اس لاری کے اندر بھی ایک شیطان کو جہنم واصل نہیں کر سکا تھا۔ بڑی کڑی آزمائش تھی وہ۔ ایک طرف ایک بے بس عورت کی چیخ و پکار تھی اور دوسری طرف میری مصلحتیں۔ آخر میں نے مصلحتوں کا دامن تھام کر ایک تلخ حقیقت کے سامنے گردن جھکا دی تھی۔۔۔ اگر کوئی خیال اس بار کی تگنی کو کم کر رہا تھا تو صرف یہ کہ میں نے وہ سب کچھ اپنے لیے نہیں کسی دوسرے کے لیے کیا تھا۔ غزالہ اور رنشا کے لیے کیا تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ اب کیا ہو گا۔ یہ حقیقت تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ ریسٹ ہاؤس کے خونریز ہنگامے سے مہاراج رتن سنگھ کسی طور بچ نکلا ہے۔ یقیناً وہ سیدھا اپنی راجدھانی جودھ پور پہنچا ہو گا۔ اس کے جودھ پور پہنچتے ہی مہوانش قبیلے کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہو گی اور یہ آگ صرف تاندل اسٹیٹ میں ہی نہیں بھڑکی ہو گی۔ اس کے شعلے جودھ پور سے بھی بلند ہوئے ہوں گے۔ کیپٹن آر کے بھوانی ان دنوں جودھ پور میں رہتا تھا۔ تاہم اس کا اصل تعلق کشن گڑھ سے تھا۔ اس حوالے سے لازم تھا کہ کشن گڑھ میں بھی طوفان آ گیا ہو گا اور اب کوئی دم جاتا تھا کہ مہوانش قبیلے کے دشمن آندھی اور طوفان کی طرح اس بستی پر وارد ہونے والے تھے۔ یہی سبب تھا جو ہر آنکھ میں اضطراب کروٹ لے رہا تھا اور کچھ بہت زیادہ مضطرب لوگ بستی سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھے۔

میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ جونہی بستی کے در و بام کو تیرگی نے ڈھانپا، سفیر احمد میرے پاس آیا۔ سائیں عالی اس وقت قالین پر اوندھا پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ سفیر احمد نے دبی آواز میں کہا۔ "تم سائیں جی کو جگاؤ۔ ہمیں ابھی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

"لیکن کہاں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں بستی میں ہمارے لیے سخت خطرہ ہے۔ تم فوراً تیار ہو جاؤ۔"

وہ ہانپتا ہوا سا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے سائیں عالی کا شانہ جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے جگایا۔ وہ گہری سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر "حق ہو" کا نعرہ بلند کر کے اٹھ بیٹھا۔ فوراً اپنی گدڑی سمیٹتے ہوئے بولا "چلو چلو۔۔۔ اٹھو۔ بھاگو یہاں سے۔۔۔ بڑا خطرہ ہے۔ چلو جلدی کرو۔"

کسی وقت سائیں عالی اسی طرح بڑے پتے کی بات کرتا تھا۔ ہمارے اٹھتے اٹھتے سفیر احمد زنان خانے سے غزالہ اور رنشا کو لے آیا۔ دونوں سر تا پا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ نئی چادریں انہوں نے ہمیں سے حاصل کی تھیں۔ سفیر احمد کے ہاتھ میں مجھے ایک بڑی خاص شے نظر آئی۔ یہ وہی بریف کیس تھا جس کا ذکر میں نے سفیر احمد سے لاری میں کیا تھا اور اس نے اشارتاً مجھے بتایا تھا کہ بریف کیس محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ سفیر احمد نے اندر آتے ہی کہا۔ "چلیں" "کیں جی باہر

۔گاڑی ہمارا انتظار کررہی ہے۔"

سائیں عالی پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آئے۔ یہاں ایک چوراہے میں رہی سرخ لاری موجود تھی۔ لاری میں پچیس تیس افراد بیٹھے تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوا وہ سب جوان یا درمیانی عمر کے مرد تھے۔ سائیں عالی لاری کے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکا تھا۔ ہم بھی سفیر احمد کے ساتھ اندر داخل ہوگئے۔ ابھی لاری چلی نہیں تھی کہ بستی کے کسی حصے میں فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں نے لاری میں موجود افراد کا جائزہ لیا' ان کے چہرے پرسکون تھے۔ اندازہ ہوا کہ یہ ہوائی فائرنگ ہے۔ بعد ازاں اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ فائرنگ تقریباً تین چار منٹ جاری رہی پھر ایک گلی سے دس بارہ گھڑ سوار برآمد ہوئے اور بستی سے نکل کر زیرِ تعمیر سڑک کی طرف چل دیے۔ لاری بھی اسٹارٹ ہوکر ان کے پیچھے روانہ ہوگئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لاری میں سبھی سائیں عالی کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ غالباً سفیر احمد نے ان سے سائیں کا تعارف بڑے اچھے الفاظ میں کرایا تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہماری منزل کہاں ہے۔ بس اتنا پتا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ کے حملے کا خوف کچھ لوگوں کو بستی چھوڑنے پر مجبور کررہا ہے' اور ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ محوِ سفر ہیں۔ آدھ پون گھنٹے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ لاری میں غزالہ اور ریتا کے علاوہ جو تیسری عورت سوار ہے وہ پریم ہے۔ میں نے اسے اس کے براؤن سینڈل سے پہچانا ورنہ اس کا سراپا بھی غزالہ اور ریتا کی طرح ایک طویل چادر میں چھپا ہوا تھا۔ یہ طویل چادر یہاں کے مقامی لباس کا جزوِ خاص تھی۔ اکثر خواتین مجھے اس چادر کے پیچھے اوجھل نظر آتی تھیں۔ میں نے سوچا اگر پریم لاری میں موجود ہے تو یقیناً منوج بھی ہوگا۔ میں نے لاری میں اچھی طرح دیکھا۔ منوج لاری میں نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھڑ سواروں میں شامل ہے۔ کچھ دیر بعد میرے اس اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ لاری کی ہیڈ لائٹس میں میں نے منوج کو دیکھا۔ وہ ایک تازی گھوڑے پر سوار تھا۔ خاکستری پگڑی سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اسے اس کے ڈیل ڈول اور گلے کی طلائی "چین" سے پہچانا۔

رات کی تاریکی میں ہمارا یہ کٹھن سفر تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ایک بار ٹائر تبدیل کرنا پڑا جب کہ دو بار انجن میں کوئی خرابی پیدا ہوئی۔ گھڑ سوار لاری کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں۔ لاری اونچے نیچے راستے پر بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ مختصر نشست پر میں' غزالہ اور ریتا ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھے تھے۔ غزالہ میرے اور ریتا کے درمیان تھی۔ اس کا گداز جسم میرے پہلو سے پیوست تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس کے لیے جسم چرانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

اونچے نیچے ٹیلوں اور جھاڑیوں کے درمیان کچھوے کی رفتار سے رینگتی ہوئی گاڑی ایک ڈھلوان پر پہنچ کر رک گئی۔ سب لوگ نیچے اتر گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس قافلے کا سربراہ منوج خود ہے۔ وہی تمام افراد کو ہدایات جاری کررہا تھا۔ سفیر احمد کی حیثیت منوج کے مشیرِ خاص کی تھی۔ اس قافلے میں کل پچاس افراد شامل تھے۔ غزالہ' ریتا اور پریم کماری کے سوا کوئی عورت یا بچہ قافلے میں شامل نہیں تھا۔ مجھے وہ مکالمہ یاد آیا جو چند گھنٹے پہلے بستی میں سردار ترا خان اور منوج کے درمیان ہوا تھا۔ سردار ترا خان نے منوج کو ہدایت کی تھی کہ وہ اور بستی چھوڑنے والے تمام افراد اپنے اہلِ خانہ کو ساتھ لے جائیں کیونکہ ان کی حفاظت کی ذمے داری قبول نہیں کی جائے گی۔ سردار کی اس ہدایت کے برعکس تمام مسلح افراد اہلِ خانہ کے بغیر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس سلسلے میں سردار اور منوج کے درمیان کسی طرح کی مفاہمت ہوچکی ہے۔

جس جگہ لاری رکی وہاں سے پیدل سفر شروع ہوا۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ لہٰذا کئی جگہوں پر گھڑ سواروں کو پیدل چلنا پڑا۔ منوج کے ایک کارندے نے اپنے گھوڑے پر ایک بہت بڑا "کین" لاد رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس میں پیٹرول ہے' فوری طور پر اس پیٹرول کا استعمال میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی دشوار مسافت کے بعد ہم ایک گھاٹی میں پہنچے۔ یہ جگہ پڑاؤ اور پناہ کے لیے بہت مناسب تھی۔ تین اطراف گھنے درختوں اور ٹیلوں کے سبب محفوظ تھیں۔ چوتھی جانب ایک کئی چھٹی ڈھلوان دور تک چلی گئی تھی۔ ہم چونکہ بلندی پر تھے لہٰذا فاصلے تک نگاہ رکھ سکتے تھے۔ اگر کوئی کاشانی کی بستی سے یہاں تک کا سفر طے کرکے ہم سے دو دو ہاتھ کرنے آتا تو ہم اسے دور ہی سے دیکھ لیتے۔

منوج کی ہدایت یہ تھی کہ آج شب آگ بالکل نہ جلائی جائے گی۔ روشنی کا واحد ذریعہ ٹارچیں تھیں۔ ٹارچوں کی مدد سے پڑاؤ کے لیے جگہ چن لی گئی۔ عارضی بندوبست کے طور پر چھ سات خیمے کھڑے کردیے گئے

افراد نے کھوہ نما مقامات پر ڈیرا جمالیا۔ سائیں عالی کے طفیل مجھے اور غزالہ وغیرہ کو بھی ایک آرام دہ خیمے میں جگہ مل گئی۔ یہ خیمہ ہموار زمین پر نصب تھا۔ زمین پر معمولی دری بچھی تھی اور اس پر ایک اجلی چادر پھیلا دی گئی تھی۔

سفیر احمد نے کہا کہ ہم آرام کریں' اب ڈر فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے سفیر احمد سے کہا "جہاں تک میں سمجھا ہوں' تم لوگ مہاراج رتن کی جوابی کارروائی کے ڈر سے یہاں آئے ہو۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم لوگوں کا غصہ بستی کے نہتے افراد پر اتارا جائے۔ ان میں تمہارے اہل و عیال بھی شامل ہوں گے۔"

وہ بولا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں مطمئن ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "سردار ترا خان سب کچھ سنبھال لے گا۔ بستی سے روانہ ہوتے وقت تم نے فائرنگ کی آواز سنی تھی؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "اس فائرنگ کا مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے اور سردار ترا خان کے درمیان جھڑپ ہوئی ہے۔ اس نے ہمیں بستی میں روکنا چاہا ہے لیکن ہم مار دھاڑ کرکے نکل بھاگے ہیں۔"

بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ غالباً یہ منصوبہ سفیر احمد ہی کا بنایا ہوا تھا۔ بستی چھوڑنے والے مسلح افراد نے خود کو "باغی گروہ" ظاہر کیا تھا اور ایک نورا لڑائی کے بعد کاشانی سے نکل آئے تھے۔

اس شب آرام ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔ انجانے خدشات نے ذہن کو گھیر رکھا تھا۔ کان ہر گھڑی بیرونی آہٹوں پر لگے تھے' اس کے علاوہ ایک انجانی اور تیرہ و تاریک جگہ پر اس کا خوف بھی تھا۔ یہاں حشرات الارض کی بھرمار تھی اور خیمے کی دیواروں پر رینگتے نظر آتے تھے۔ یقیناً یہاں زہریلے حشرات بھی ہوں گے۔ وہ شب ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ ریتا بہت خاموش اور گم صم تھی اور ریتا پر ہی کیا موقوف ہم سب خاموش تھے۔ میری نگاہوں میں رہ رہ کر کیپٹن آر کے بھوانی کی جلی لاش گھوم جاتی تھی۔ ایک نہایت بااثر و بارسوخ شخص نہایت بے بسی کی موت مرا تھا اور اس کی موت کا سبب ایک ایسا واقعہ تھا جس سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ پریم سے شادی مہاراج رتن نے کی تھی بلکہ بات بھی کہاں کی تھی تیواری لال نے کرائی تھی۔ اس نے گھرانے سے پرانا بدلہ چکانے کے لیے پریم کی ماں کو اس جنجال میں پھنسایا تھا۔ اس لحاظ سے سواش قبیلے کا اصل نشانہ تیواری لال ہونا چاہیے تھا لیکن وہی بچ گیا تھا۔

جھاڑ جھنکار سے اٹی ہوئی اس تنگ گھاٹی میں ہم نے پورے تین روز گزار دیے۔ پہلے ۳۶ گھنٹے تو ہر شخص زبردست اعصابی تناؤ کا شکار رہا تھا لیکن پھر دھیرے دھیرے یہ کیفیت ختم ہوگئی تھی۔ اب بیشتر افراد کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ مہاراج رتن اور کیپٹن آر کے بھوانی کے ورثا ان تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسرا بڑا خطرہ حشرات الارض اور جنگلی جانوروں کا تھا۔ لیکن اب چونکہ آگ جلائی جا رہی تھی لہٰذا پڑاؤ کافی حد تک محفوظ ہوگیا تھا۔ ویسے بھی جہاں حضرتِ انسان کی چہل پہل ہوجائے وہاں جنگلی حیات کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

اب گھاٹی میں مختلف جگہوں پر چار پانچ چھولداریاں مزید لگائی جاچکی تھیں۔ یوں خیموں اور چھولداریوں کی تعداد ایک درجن ہوگئی تھی۔ بحیثیت قافلہ سالار منوج کمار اپنی سابق محبوبہ اور موجودہ "قیدی" کے ہمراہ سب سے بڑے خیمے میں قیام پذیر تھا۔ میرے تجزیے کی مطابق وہ ایک بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ ممکن ہے کسی وقت وہ پریم سے محبت کرتا ہو لیکن اب اس کے دل میں اس لڑکی کے لیے نفرت اور انتقام کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ غالباً یہ جذبہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب منوج نے دیکھا تھا کہ پریم نے اپنے حالات سے بغاوت نہیں کی اور اپنی ماں کی مرضی کے مطابق چپ چاپ مہاراج رتن کے زنانے میں بیٹھ گئی ہے۔ جب بعد میں پریم اپنے پتا دیو کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی اور اس نے پتا دیو کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار دینا شروع کیا تو منوج کے رقیبانہ جذبات اور بھڑکے' پریم کی بے رخی' پارسائی اور شوہر پرستی کے سانپ اس کے سینے پر لوٹنے لگے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وقت کا بہاؤ روک کر اسے الٹا چلنے پر مجبور کرے گا اور اپنی شکست کو فتح میں بدل دے گا۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور عیاری کے بل بوتے پر اپنے قبیلے میں مہاراج رتن سنگھ کے بارے میں مخالفانہ جذبات بھڑکائے اور نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ سواش قبیلے کے بہت سے لوگ مہاراج رتن کے جانی دشمن بن گئے۔

ہم جب سے یہاں آئے تھے میں نے پریم کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ زیادہ وقت اپنے خیمے میں رہتی تھی۔ کسی وقت ان کے خیمے سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ یہ تیسری شب کا واقعہ ہے۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا' ایک بار پھر منوج کے خیمے سے لڑائی جھگڑے کا شور سنائی دینے لگا۔ اس مرتبہ یہ شور کافی بلند تھا۔ پریم چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی

تھی۔ جواب میں منوج کی دہاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ سائیں عالی ان آوازوں کو سن کر قہقہے لگانے لگا۔ جیسے وہ کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہا ہو۔ میں غزالہ اور رنشا کو خیمے میں چھوڑ کر باہر نکلا۔ ہمارے سامنے والے خیمے کے مکین بھی باہر کھڑے تھے اور جھگڑے کی آوازیں سن رہے تھے۔

پرم چلا رہی تھی۔ "نہیں کروں گی۔ میں کہہ رہی ہوں' نہیں کروں گی دستخط ــــ میں جانتا ہوں' میرے پتا ابھی زندہ ہیں۔"

زوردار تھپڑ کی آواز آئی۔ منوج گرجا "ابھی تک کا بھوت تیرے سر سے اترا نہیں ہے۔ یاد رکھ میں جتنا نرم ہوں اتنا سخت بھی ہوں۔ ایسی موت ماروں گا تجھے کہ تیری آتما بھی چیخیں چلاتی پھرے گی۔" پھر وہ بیچ بیچ پرم کو کسی لکڑی سے مارنے لگا۔

دھاچوکڑی کی آوازوں میں اضافہ ہوا تو سفیر احمد بھی بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے خیمے کے اندر جانا چاہا لیکن پردے کی ڈوری اندر سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ خیمے میں نہیں گھس سکا۔

"منوج! کیا کر رہے ہو؟ منوج میری بات سنو" وہ باہر ہی سے چلانے لگا۔

منوج پر ان آوازوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پرم پر چیخ رہا تھا۔ "سندر چڑیل! میں تجھے اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ کسی کو شکل دکھا سکے۔ جھلسا کر رکھ دوں گا تیری اس گوری چمڑی کو"

یک لخت مجھ پر انکشاف ہوا کہ خیمے کے اندر صورت حال سنگین تر ہو گئی ہے۔ چیخ و پکار سے ظاہر ہو رہا تھا کہ منوج کے ہاتھ میں تیزاب ہے اور وہ پرم کا چہرہ جھلسانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ "اس کاغذ پر دستخط کر" وہ چلایا "پکڑ یہ قلم اور نام لکھ اپنا"

"نہیں لکھوں گی" پرم جواباً گرجی "تم سے جو بن پڑتا ہے کر لو۔ میں نہیں کروں گی دستخط"

پرم کے لہجے میں عجب سا ہیجان تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ڈر خوف کی ہر حد سے گزر چکی ہے۔ منوج کی خطرناک آواز ابھری "پتا کی بچی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ تیزاب تیرے منہ پر پھینک دوں گا۔ بھگوان کی سوگند' پھینک دوں گا۔"

پرم دہاڑی "تو تو جب پھینکے گا' تب پھینکے گا' میں ــــ خود پھینک دیتی ہوں اب"

ایک دم خیمے میں دھینگا مشتی عروج پر پہنچ گئی۔ خیمے کے [illegible]۔ سفیر احمد حلق کی پوری قوت سے منوج کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک لشکری کی پیٹی سے خنجر کھینچا اور لپک کر خیمے کی دیوار چاک کر دی۔ میں اور سفیر آگے پیچھے خیمے میں داخل ہو گئے۔ لالٹین کی روشنی میں وحشت انگیز منظر نظر آیا۔ پرم اور منوج گتھم گتھا تھے۔ منوج کے ہاتھوں میں ایک کھلے منہ کی بوتل تھی۔ پرم یہ بوتل اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ منوج کا رنگ زرد ہو رہا تھا' جب کہ پرم بھوکی شیرنی بنی ہوئی تھی۔ حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا تھا۔ صرف چند سیکنڈ قبل منوج شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا اور پرم کو دھمکا رہا تھا کہ بوتل کا تیزاب اس کے چہرے پر پھینک دے گا' اب پرم خود یہ اقدام کرنا چاہتی تھی اور منوج کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے روکنا چاہ رہا تھا' اس خوبصورتی کو بچانا چاہ رہا تھا جس کے بغیر پرم اس کے کسی کام کی نہیں تھی۔ ان دونوں کے قریب جاتے ہی مجھے تیزاب کی تیز بو محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا۔ تیزاب کے قطرے پرم کے مرمریں رخسار پر چمک رہے ہیں۔ اس کی گردن بھی تیزاب سے بھیگی ہوئی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور تیزاب اچھل کر اس کے چہرے پر گرا۔ وہ چیخی نہ چلائی' نہ درد سے بے تاب ہوئی۔ بس منوج کے ہاتھ سے بوتل چھیننے کی کوشش کرتی رہی۔ اس دیوانہ وار کوشش کے نتیجے میں تیزاب مسلسل چھلک رہا تھا اور اس کے چھینٹے منوج پر بھی پڑ رہے تھے۔ منوج کے چہرے پر ابھرتی ہوئی اذیت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ زمین پر وہ طلائی زنجیر ٹوٹی پڑی تھی۔ جو منوج کے گلے میں نظر آتی تھی اور اس کے پاس ایک اسٹامپ پیپر تھا۔

(جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس پیپر پر پرم کی طرف سے اعتراف نامہ لکھا گیا تھا کہ مہاراج رتن سنگھ سے اس بیاہ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں' کیونکہ اس بیاہ کے سلسلے میں اس پر زبردستی کی گئی تھی اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں) پرم اور منوج کی دھینگا مشتی کے دوران اچانک بوتل منوج کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پرم بوتل سمیت دری پر گری۔ بوتل اس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔ میں نے لپک کر اس کی دائیں کلائی پر پاؤں رکھ دیا۔ سفیر آگے آیا اور اس نے اپنی پگڑی بوتل پر پھینک کر اسے پرم سے چھین لیا۔

یہ جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ منوج سکتے میں رہ گیا تھا۔ منوج کے ساتھ وہ سب اسی کیفیت سے دوچار تھے جنہوں نے یہ تماشا دیکھا تھا۔ پرم کا چہرہ بری طرح جھلس چکا تھا۔ میں نے ایک کپڑے سے اس کی پیشانی پونچھنا چاہی تو [illegible]

بالوں سمیت علیحدہ ہو گئی۔ یہ ایک اندوہناک منظر تھا۔ خیمے میں موجود ہر آنکھ دہشت زدہ رہ گئی۔ لیکن پرم مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسرت آمیز دیوانگی کی چمک تھی۔ میں باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں ایک گوشے میں مجھے شیشے کی چند بوتلیں نظر آئیں۔ یہ ایک ہی سائز اور ساخت کی تھیں۔ ان میں سے کچھ کے اندر سفید مائع بھرا ہوا تھا۔ بو سے اندازہ ہوا کہ یہ پٹرول ہے۔ قریب ہی وہ کین پڑا تھا جس میں پٹرول یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بارودی فلیتے کا ایک گچھا اور کارک وغیرہ بھی تھے۔ میں ایک لمحے میں جان گیا کہ یہ "پٹرول بم" بنانے کا اہتمام ہے۔

○☆○

پرم والے اندوہناک واقعے کے بعد تین روز پڑاؤ میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا' فرید کوٹ پہنچنے میں جتنی تاخیر ہو گی' ترک کو ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ مجھے فرید کوٹ اور اپنے ساتھیوں سے جدا ہوئے اب قریباً تین ہفتے ہو چلے تھے۔ میں اس وقت سے مکمل تاریکی میں تھا اور یہ تاریکی اب میرے لیے شدید الجھن بنتی جا رہی تھی۔ اس موقع پر ایک بار پھر سائیں عالی کی زبان سے کچھ ایسی باتیں نکلیں جنہوں نے میری مشکل آسان کر دی۔ ایک روز شام کو اس نے سفیر احمد کو اپنے پاس بلایا۔ سفیر احمد خیمے میں داخل ہوا اور بڑی عقیدت سے سائیں کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی پنڈلیاں دبانے لگا۔ "جی سائیں فرمائیں۔" اس نے عاجزی سے پوچھا۔

سائیں مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسنے لگا اور ساتھ ساتھ سفیر احمد کو گدگدانے لگا' جیسے ہنسانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے علاوہ غزالہ اور رنشا بھی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ سفیر احمد کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سائیں عالی کے گدگدانے پر ہنسے یا سنجیدہ صورت بنائے بیٹھا رہے۔ سائیں اپنے عقیدت مندوں کو اچانک ایسی ہی مشکل سے دوچار کر دیا کرتا تھا۔

کچھ دیر سفیر کو گدگدانے کے بعد سائیں نے اسے گھوڑا بنا لیا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ منہ سے ہنہنانے کی آواز نکال کر بولا۔ "چل اوئے فرید کوٹ' اوئے میں کہتا ہوں' چل فرید کوٹ"

اس نے سفیر احمد کی باچھوں میں ایک ایک انگلی ڈال رکھی تھی اور ان سے لگام کا کام لے رہا تھا۔ احساس شرمندگی سے سفیر احمد کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا لیکن وہ بلا چون و چرا سائیں عالی کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ یہ قابلِ دید منظر تھا۔ سنگین صورت سفیر احمد گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ سائیں عالی اسے کبھی دائیں طرف موڑ دیتا کبھی بائیں طرف' ایک پاؤں سے وہ سفیر کو باقاعدہ ایڑ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں وہ دو تین مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ یہ منظر مضحکہ خیز تھے لیکن اس مضحکہ خیزی میں مسکراہٹ کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک طرح کی سراسیمگی تھی جو ہمیں گھیرے ہوئے تھی۔ خاص طور پر غزالہ اور رنشا تو خاصی خوفزدہ نظر آ رہی تھیں۔ بار بار ایڑ لگانے کے باوجود جب سفیر احمد گھوڑے کی طرح نہیں دوڑ سکا تو سائیں عالی نے اتر کر اس کی پیٹھ پر لات جمائی اور غرا کر بولا "جا ــــ کوئی دوسرا گھوڑا لے کر آ' بہت لمبا سا گھوڑا ... سفید رنگ کا ہو۔ ہم ... ہم چاروں اس پر سوار ہونا چاہتے ہیں ــــ جلدی کر حرامی ... فٹافٹ جا۔ نہیں تو شفیع محمد فرید کوٹ میں ہمارا رو پیچھے جائے گا۔"

پھر وہ اپنی ترنگ میں کسی نامعلوم شفیع کو گالیاں دینے لگا۔ ان کلاسیکل گالیوں کو سن کر غزالہ اور رنشا کے لیے خیمے میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ باہر نکل گئیں۔ کچھ دیر بعد میں اور سفیر احمد بھی باہر آ گئے۔ سائیں عالی بدستور شفیع کے قریبی عزیزوں سے نازیبا رشتے جوڑتا رہا۔ سفیر احمد نے خیمے سے باہر آ کر پیشانی سے پسینہ پونچھا اور دبے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے' سائیں جی واپس فرید کوٹ جانا چاہ رہے ہیں۔"

"یقیناً یہی بات ہے۔" میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ میں تو خود یہاں سے نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"لیکن وہ تو سفید گھوڑے کا ذکر کر رہے ہیں' اور سفید گھوڑا ہمارے پاس ایک بھی نہیں" سفیر نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ اچھا بھلا سمجھدار شخص فرطِ عقیدت میں گھن چکر بنا ہوا تھا۔

میں نے کہا "یہ تو فقیروں کی رمزیں ہوتی ہیں۔ دانا کہتے ہیں' فقیروں کی جو رمز سمجھ میں نہ آئے اس پر زیادہ سوچ بچار نہیں کرنی چاہیے۔ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ سائیں عالی ہمیں ساتھ لے کر یہاں سے جانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے گھوڑوں کی ضرورت ہے۔"

کچھ دیر ہم اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ سفیر احمد کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں سائیں عالی اور دونوں لڑکیوں کو لے کر فرید کوٹ چلا جاؤں لیکن وہ خود بھی ہمارے ساتھ جانا چاہ رہا تھا۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے

ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ گفتگو کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ سفیر احمد گمشدہ ٹرک کے حوالے سے سب کچھ جان چکا ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ اس ٹرک سے میرا اور سائیں عالی کا گہرا تعلق ہے۔ سفیر احمد تک یہ معلومات کیسے پہنچیں؟ یہ بہت اہم سوال تھا۔ اس سوال کا جواب بھی مجھے سفیر احمد نے ہی دے دیا۔ وہ بولا۔ "مہاراج رتن کے ملازمین میں ہمارا ایک مخبر موجود تھا۔ اس کے ذریعے پل پل کی خبریں ہم تک پہنچتی تھیں۔ اسی مخبر کے ذریعے ہمیں پتا چلا تھا کہ مہاراج رتن اپنی پتنی پریم کماری سمیت "ڈال گری" والے ریسٹ ہاؤس میں موجود ہے اور وہاں اس سے دو دو ہاتھ کیے جا سکتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے محاصرے کے دوران بھی وہ مخبر ہمیں پل پل کی خبریں پہنچا رہا ہے۔ جانتے ہو وہ کون تھا؟" میری سوالیہ نگاہیں سفیر احمد کے چہرے پر جمی تھیں۔ سفیر نے کہا۔ "وہ عتیق خان تھا۔ وہی گورا چٹا نوجوان جو مہاراج کے خاص محافظوں میں شامل ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عتیق خان کی شبیہ میری نگاہوں میں گھومی ــــ یہ اندازہ تو مجھے شروع سے تھا کہ مہاراج کے ساتھیوں میں کوئی کالی بھیڑ ہے لیکن وہ بھیڑ عتیق خان ہو گا" میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیسے کیسے چہروں کے پیچھے کیسے کیسے لوگ چھپے رہتے ہیں۔ نگاہیں ہر مقام پر دھوکا کھاتی ہیں اور مشاہدات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

سفیر احمد کی گفتگو سے نتیجہ نکلا کہ اسے میرے بارے میں بتانے والا اور گمشدہ ٹرک کے معاملات سے آگاہ کرنے والا عتیق خان ہی تھا۔ بعد میں سفیر احمد نے وہ بریف کیس بھی کھول کر دیکھ لیا جس میں کیپٹن بھوانی کے کاغذات تھے اور جسے میرے کہنے پر سفیر احمد اپنے ساتھ ہی یہاں لے آیا تھا۔ سفیر احمد ایک پڑھا لکھا زیرک شخص تھا۔ کاغذات دیکھنے کے بعد اس کے لیے بات کی تہ تک پہنچنا مشکل نہیں رہا تھا۔ بے حساب دولت کی کشش نے اس پر بھی اثر کیا تھا اور اب ــــ وہ ہمارے ساتھ فرید کوٹ جانے پر مصر تھا۔ اس نے اپنی نیت کا اظہار کھلے الفاظ میں تو نہیں کیا لیکن جو کچھ اس نے کہا اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے ریسٹ ہاؤس کے معرکے میں ہماری جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور اب اس احسان کے بدلے وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ سفیر احمد ایک اعلیٰ پولیس افسر کا بھائی تھا اور اسی حوالے سے اسے ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا یہ اثر و رسوخ ہمارے کام آ سکتا تھا۔ راجستھان کے اس دور دراز علاقے سے فرید کوٹ پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ راستے میں بہت سے اندیشے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ اگر سفیر احمد جیسا شخص ہمارے ساتھ ہوتا تو کئی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے سفیر احمد کی شرط قبول کر لی۔

فیصلہ ہوا کہ ہم اتوار کی شب یعنی قریباً ۳۶ گھنٹے بعد پڑاؤ سے روانہ ہو جائیں گے۔ اس سلسلے میں سفیر احمد نے قافلہ سالار منوج سے بھی اجازت لے لی تھی۔ ہم چاہتے تو ہم کچھ پہلے یعنی ہفتے کی شب بھی روانہ ہو سکتے تھے لیکن میں نے جان بوجھ کر اتوار کا انتخاب کیا تھا۔ درحقیقت میں پڑاؤ چھوڑنے سے پہلے ایک اہم کام نمٹانا چاہتا تھا ــــ یہ کام بہت ضروری تو نہیں تھا اور میں چاہتا تو اسے پس پشت بھی ڈال سکتا تھا لیکن نجانے کیوں پس پشت ڈالنے کو میرا ذہن نہیں مان رہا تھا۔ ایک عجیب سی گرہ پڑی ہوئی تھی دل میں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں دل و دماغ سے یہ بوجھ اتارے بغیر چلا گیا تو دیر تک اپنے ضمیر کے کچوکے سہتا رہوں گا۔ میں نے جو کچھ لاری میں دیکھا تھا" یا یوں کہیے کہ جو کچھ دیکھنے پر مجبور ہوا تھا وہ کسی آسیب کی طرح میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کی بے بسی' ایک وحشی کا شیطانی رقص اور پسٹل کی لبلبی پر کانپتی ہوئی میری انگلی" ان بے رحم لمحات کو میں تاحیات فراموش نہیں کر سکتا تھا ــــ میں تہیہ کر چکا تھا کہ یہ پڑاؤ چھوڑنے سے پہلے منوج کو جہنم واصل کر دوں گا۔ بے شک یہ ایک قتل تھا لیکن ایسے قتل میں نے پہلے بھی کیے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے ایسے قاتلوں کو قتل کر کے دلی راحت ہوتی تھی۔ شاید یہ اسی قسم کی راحت تھی جو مہاراج رتن اور کیپٹن بھوانی جیسے شکاری خطرناک جنگلی جانوروں سے دوبدو مقابلہ کر کے حاصل کرتے تھے۔

پچھلے تین روز میں میرے ذہن نے چپکے چپکے ایک منصوبہ بنا ڈالا تھا۔ یہ منوج کے قتل کا منصوبہ تھا۔ تین روز پہلے جب پریم اور منوج کی لڑائی کے دوران ہم خیمے میں داخل ہوئے تھے تو مجھے وہاں پٹرول سے بھری ہوئی پانچ چھ بوتلیں نظر آئی تھیں۔ یہ پیٹرول بم تھے۔ چند مزید بموں کا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ منوج کے خیمے میں کم از کم ایک درجن ایسے بم موجود ہیں۔ وہ ایک خطرناک کام کر رہا تھا اور بہت بے احتیاطی سے کر رہا تھا۔ اسے کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ سگریٹ کا ایک ٹکڑا یا جلتی ماچس کی ایک چنگاری اس کے خیمے کو بھک سے اڑا سکتی تھی۔ منوج کا خیمہ دوسرے خیموں سے قدرے ہٹ کر تھا۔ ہمارے خیمے سے اس کا فاصلہ دس بارہ گز کے قریب تھا۔ میرے لیے یہ

مشکل نہیں تھا کہ رات کے وقت پہرے داروں کی نگاہ بچا کر اس کے خیمے میں داخل ہو جاؤں اور کسی تیز دھار آلے سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالوں" بعد ازاں اس کے خیمے کو آگ دکھا کر "واردات" کا نام و نشان مٹایا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ قاتلانہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ اس منصوبے پر عمل درآمد سے چوبیس گھنٹے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا کہ ہمیں فوری طور پر اور بہت افراتفری میں پڑاؤ چھوڑنا پڑا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ سائیں عالی سمیت ہم سب اپنے آرام دہ خیمے میں تھے۔ غزالہ اور نشا آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ سائیں عالی آنکھیں بند کیے جسم کو آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ لگتا تھا کہ گہرے مراقبے میں ہے۔ میں سفیر احمد سے پریم کماری کا احوال پوچھ رہا تھا۔ سفیر احمد نے بتایا "وہ پرسوں سے نیم بے ہوش پڑی ہے۔ تو را چہرہ بری طرح جھلس گیا ہے' ایک ہاتھ کو بھی نقصان پہنچا ہے۔"

میں نے کہا "ہاتھ تو منوج کا بھی جل گیا تھا۔"

سفیر نے میرے اس خیال کی تصدیق کی اور بولا "اس کی گردن پر بھی چھینٹے پڑے تھے۔ اب وہاں زخم بن گئے ہیں۔ بہت تیز قسم کا تیزاب تھا۔"

اچانک مجھے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ گھوڑے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر باندھے گئے تھے۔ حیرانی ہوئی کہ یہ کس کا گھوڑا یہاں پہنچ آیا ہے۔ میں نے خیمے کے روزن سے باہر جھانکا۔ الاؤ کے پاس تین افراد گھوڑوں سے اتر رہے تھے۔ ان میں سے دو مقامی لباس شلوار قمیص اور پگڑی میں تھے۔ تیسرے نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور سکتے میں رہ گیا۔ وہ دشمن تھا۔ وہی پرانا دشمنِ جاں جس سے مہاراج کے عالیشان ٹیرس میں مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔ اس مڈھ بھیڑ کا نتیجہ شیخ عاصم بن ارشد کی ہندوستان آمد کی صورت میں نکلا تھا ــــ اب وہ بدبخت اس پڑاؤ میں نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بج اٹھیں۔ نگاہوں میں شیخ عاصم بن ارشد کا کرخت چہرہ گھومنے لگا ــــ بے شک مہاراج رتن شیخ کے چنگل سے نکال کر "ڈال گری" کے ریسٹ ہاؤس میں لے آیا تھا لیکن میری چھٹی حس مجھے مسلسل خبردار کر رہی تھی کہ میں خود کو شیخ کے چنگل سے آزاد نہ سمجھوں۔ ذہن یہ بات مانتا ہی نہیں تھا کہ شیخ عاصم جیسا شخص اتنی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑ کر واپس دبئی چلا جائے گا۔ اور اب اسی امر کا جیتا جاگتا ثبوت میں دشمن کی صورت اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ بدروح کیسے اور کیوں کر یہاں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ اور کون کون سی ارواحِ خبیثہ تھیں" بہرحال حقیقت میرے سامنے تھی۔

دشمن اور اس کے ساتھیوں کے گرد بہت سے افراد جمع ہو گئے پھر میں نے انہیں منوج کے سرخ خیمے کی طرف جاتے دیکھا۔ سفیر احمد بھی روزن میں سے میرے ساتھ ہی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ "کیا بات ہے استاد جمالی؟"

میں نے اس کا کندھا تھاما اور اندرونی ہیجان کو چھپاتے ہوئے کہا "سفیر احمد! ہمیں کل کے بجائے ابھی یہاں سے نکلنا ہو گا۔ اسی وقت ــــ ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"لیکن ــــ بات کیا ہے؟" سفیر نے پوچھا۔

"یہ لوگ جو یہاں آئے ہیں ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہمارے سارے پروگرام پر پانی پھرنے والا ہے۔"

"لیکن؟"

"لیکن کچھ نہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ سائیں عالی اور ہم تینوں کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ہم یہاں سے نکل کر بحفاظت فرید کوٹ پہنچیں تو پھر ایک سیکنڈ کی تاخیر نہ کرو۔" میں اسے کھینچتا ہوا دروازے پر لے آیا۔

غزالہ اور نشا کے لیے دو بوسیدہ لباسوں اور پھٹی پرانی چادروں کا انتظام سفیر احمد نے صبح ہی کر لیا تھا۔ میرے کہنے پر غزالہ اور نشا نے لباس تبدیل کر لیے۔ قمیص آدھی آستین والی تھی۔ مقامی رواج کے مطابق انہوں نے بازوؤں پر پلاسٹک کے بنے ہوئے درجن درجن کڑے چڑھا لیے۔ ناک میں بڑی بڑی نتھلیاں اور پاؤں میں چپلیں تھیں۔ ان کے سروں پر دو دو گھڑے رکھ دیے جاتے تو وہ ہو بہو دیہاتی عورتیں نظر آتیں۔

صرف دس منٹ بعد ہم" غزالہ' نشا اور سائیں عالی گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ سفیر احمد اور اس کا ایک ساتھی ہمارے ساتھ تھا۔ سامان کے نام پر ہمارے پاس فقط ایک بریف کیس تھا ــــ وہی بریف کیس تھا جس پر کیپٹن آر کے بھوانی کا نام بڑے خوبصورت حروف میں درج تھا۔ سفیر احمد اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ہمیں محفوظ اور نسبتاً کم رو راستوں پر چلاتا رات ڈیڑھ بجے پختہ سڑک پر لے آیا۔ سفیر احمد کی اطلاع کے مطابق یہ باڑمیر روڈ تھی۔ دن کے وقت "ٹریفک" چلتا تھا۔ [illegible] باڑمیر روڈ جیسلمیر سے بیکانیر جانے والی بڑی سڑک سے مل

جاتی تھی۔ حساب کتاب جو ذکر سفیر نے اندازہ لگایا تھا کہ پہلی بس جو صبح چار بجے کے قریب "نکوریا" نامی قصبے سے روانہ ہوتی ہے۔ پانچ بجے کے لگ بھگ اس مقام سے گزرے گی۔ ہم اس پر سوار ہو کر نو دس بجے بیکانیر پہنچ سکتے تھے۔

اس مقام سے سفیر احمد نے گھوڑے واپس روانہ کر دیے۔ سفیر احمد کے ساتھ آنے ہوئے شخص نے گھوڑوں کی لگامیں ایک دوسرے سے باندھیں اور سب سے اگلے گھوڑے پر خود سوار ہو کر تاریکی میں او جھل ہو گیا۔ ہم سڑک سے کچھ ہٹ کر جنتر اور ببول کی گھنی جھاڑیوں میں بیٹھ گئے اور بس کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور سفیر احمد کے "حساب کتاب" کے عین مطابق پانچ بجے مشرقی جانب سے بس کی روشنیاں ظاہر ہوئیں۔ سفیر احمد اور میں سڑک کے اوپر جا کھڑے ہوئے اور ہاتھ دے کر بس روک لی۔ یہ لوکل روٹ پر چلنے والی کھٹارا بس تھی۔ رش اتنا تھا کہ چھت پر بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سا ساز و سامان تھا جو انبار کی صورت بس کی چھت پر پڑا تھا۔ میلے کچیلے کنڈیکٹر نے بے رخی سے کہا کہ اگر ہم ضرور سوار ہونا چاہتے ہیں تو پھر چھت پر چڑھنا ہو گا۔ اگلی بس تین چار گھنٹے بعد آنا تھی۔ لہٰذا مجبوراً یہ شرط ماننا پڑی۔ میں اور سفیر' سائیں عالی کو سہارا دے کر چھت پر لے گئے۔ نزالہ اور بنتا کو صنف نازک ہونے کی رعایت دی گئی اور کنڈیکٹر نے انہیں کسی نہ کسی طرح بس میں گھسیڑ دیا۔ اکثر کنڈیکٹر حضرات ایسے کاموں میں ماہر ہوتے ہیں۔ خاص طور پر خواتین کے لیے جگہ بنانے میں انہیں کمال حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی وہاں وہ پوری پوری خواتین دھر دیتے ہیں اور پھر اسی مختصر ترین جگہ میں خود بھی گھس کر دکھا دیتے ہیں۔ ایسے کنڈیکٹر حضرات کو کچھ اور آتا ہو یا نہ' وجود زن سے بس میں رنگ بھرنا ضرور آتا ہے۔

بس کی چھت پر سفر کرتے ہوئے اس سفر کی یاد تازہ ہو گئی جو ہم نے جھنگ سے فانسکا کے نواح تک بذریعہ ٹرک کیا تھا۔ مجھے وہ خوفناک مشین گن یاد آئی جو ایک منٹ میں قریباً 600 راؤنڈ فائر کرتی تھی اور ایک میل کے دائرے میں ہر شے کا صفایا کر دیتی تھی۔ اور پھر زوبی گل یاد آیا جس نے اس مشین گن کی مدد سے جھنگ سے فانسکا تک اپنا اور ہم سب کا زبردست دفاع کیا تھا۔

اس ٹرک کی چھت اور مسافر بس کی چھت میں بہت فرق تھا لیکن محسوسات ایک ہی طرح کے تھے۔ وہی سامنے سے ٹکراتی ہوئی تیز ہوا' لکڑی کی "باڈی" سے ابھرنے والی

چوں چراں کی آوازیں' دور دور تک دکھائی دیتے ہوئے مناظر۔ ہمارے ساتھ چھت پر سواری کرنے والوں میں کسی سائیکل فیکٹری کے دس بارہ ملازم تھے۔ کچھ دودھ فروش اپنے بڑے بڑے برتنوں کے قریب بیٹھے تھے۔ کچھ سبزی فروش تھے جو تازہ سبزی لے کر بیکانیر جا رہے تھے۔ آپس میں گفتگو اور جنسی مذاق بھی جاری تھا۔ باتوں باتوں میں ایک دودھ فروش نے ایک ایسا موضوع چھیڑا کہ ہماری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ یہ دودھ فروش نکوریا سے آیا تھا۔ نکوریا سے مواش قبیلے کی بستی "کاشائی" دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ دودھ فروش نے بتایا کہ ایک روز پہلے کاشائی میں زبردست ہنگامہ ہوا ہے' سنا ہے کہ چھ سات آدمی مارے بھی گئے ہیں۔

ایک دوسرے دودھ فروش نے اس خبر کی تصدیق کی اور پُرجوش لہجے میں بتایا کہ اس کا سگا بھائی ہنگامے کے وقت کاشائی کے ساتھ والے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ اس نے کہا "اس گاؤں کا نام داس پور ہے۔ وہاں بھی مواش قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔ جس وقت ہنگامہ ہوا' داس پور سے بھی پچاس ساٹھ بندے ٹریکٹر ٹرالیوں پر سوار ہو کر "کاشائی" گئے تھے لیکن وہ راستے سے ہی واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ کاشائی کو پولیس کی درجنوں گاڑیوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ماندل اسٹیٹ کے مہاراج رتن سنگھ کی ذاتی فورس اور کشن گڑھ سے آئے ہوئے بہت سے لوگ بھی کاشائی میں موجود ہیں..... شام کے وقت پتا چلا کہ بستی میں سات آٹھ بندے مارے گئے ہیں' اس کے علاوہ پولیس قریباً ایک سو بندوں کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔"

بعد ازاں اس خبر پر گرما گرم تبصرے شروع ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ زمین کا جھگڑا ہے' کسی نے کہا لڑکی کا معاملہ ہے' کسی کے خیال میں یہ پرانی رقابت تھی۔ صحیح بات کا ابھی تک کسی کو بھی نہیں تھا۔ صرف ایک شخص نے قدرے معقول بات کی۔ اس نے کہا "مہاراج رتن سنگھ کی نئی مواش ہے۔ ہو سکتا ہے' وہی اس جھگڑے کا سبب بنی ہو۔"

اس کا مطلب تھا سردار ترا خان کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ ریسٹ ہاؤس والے واقعے کے اصل ذمے دار بستی چھوڑ چکے تھے' سات آٹھ افراد پولیس مقابلے کے بہانے مار دیے گئے تھے اور افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ ان خبروں میں مبالغہ آرائی ہو لیکن انہیں سرے سے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

اس کھٹارا بس نے سست رفتاری کے نئے ریکارڈ

کرتے ہوئے ہمیں قریباً بارہ بجے بیکانیر پہنچایا۔ بیکانیر سے ہم نے دوسری بس پکڑی اور سورت نگر روانہ ہو گئے۔ سورت نگر سے فرید کوٹ تک کا باقی ماندہ سفر ہم نے پورے چوبیس گھنٹے میں طے کیا۔ یہ ایک دشوار اور پُرخطر سفر تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دشمن ہر جگہ گھات لگائے ہوئے ہیں۔ اور وہ کوئی معمولی دشمن نہیں تھے۔ ان میں شنکر شکرا جیسے قاتل' بینی جان جیسے ڈاکو اور آغا قادر زماں جیسے سفاک جاگیردار تھے۔ وہ سب دولت کی ہوس میں دیوانے ہو رہے تھے اور میں اتفاقی طور پر ان کے نشانے پر آ گیا تھا..... اور پھر میرا دھیان شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ ایک اور گھونسا دل پر پڑا۔ میں شیخ کو کیوں فراموش کر رہا تھا۔ اب وہ بھی تو میرے شکاریوں میں شامل ہو گیا تھا اور وہ اس لحاظ سے خطرناک ترین شکاری تھا کہ اسے کسی دفینے کی نہیں میری لاش کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بغیر کسی سوال جواب کے گولی سے اڑا سکتا تھا۔ ایک مدت سے میرے خون کا پیاسا تھا۔ گزرنے والے ہر دن اور ہر پل کے ساتھ اس کی پیاس میں شدت آئی تھی اور اب وہ مجھے اپنے نوکیلے پنجوں اور تیز دانتوں سے پھاڑنے کے لیے بے قراری کی انتہا کو چھو رہا تھا۔

مختصر الفاظ میں بیکانیر سے فرید کوٹ تک کا ہمارا وہ سفر پل صراط کا سفر تھا۔ ہم تلوار سے تیز اور بال سے باریک راستے پر چل رہے تھے اور کوئی بھی لغزش ہمیں کاٹ کر دو زخ کی گہرائی میں پھینک سکتی تھی۔ میں نے سکھوں کی طرح پگڑی باندھ رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا سستا سا چشمہ تھا۔ ایک بڑی چادر میں نے پگڑی کے اوپر سے گزار کر یوں کندھے پر ڈال رکھی تھی کہ چہرے کا زیریں حصہ چھپ کر رہ گیا تھا۔

دوران سفر سفیر احمد نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا' اس سے پتا چلا کہ وہ پنجاب ہی کا رہنے والا ہے۔ اس کے بڑے بھائی حاجی نذیر احمد فیروز پور کے ایس ایس پی تھے۔ بڑے دھانسو قسم کے آفیسر تھے اور پولیس لائن میں انہیں حاجی بادشاہ کہا جاتا تھا۔ حاجی بادشاہ کے جہاں دوست بہت تھے وہاں دشمن بھی بہت تھے۔ ایک برس پہلے ایس ایس پی حاجی بادشاہ جب ایک جنازے میں شرکت کے لیے اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے تو کچھ لوگوں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں حاجی بادشاہ تو معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ تاہم سفیر احمد کے ہاتھوں مخالف فریق کا ایک نوجوان قتل ہو گیا۔ سفیر احمد پر قانون کے مطابق کیس چلا' دو چار پیشیوں میں ہی اس کی ضمانت ہو گئی۔ اس ضمانت نے مخالفین کی جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ سفیر احمد کی تاک میں رہنے لگے۔ دو ماہ

پہلے قلیل عرصے میں سفیر پر تین مرتبہ حملہ ہوا۔ حاجی بادشاہ نے خطرہ بھانپ کر سفیر کو چپکے سے راجستھان بھیج دیا۔ مواش قبیلے کے سردار ترا خان کا شمار حاجی بادشاہ کے دوستوں میں ہوتا تھا۔ اس نے سفیر احمد کو خوش آمدید کہا اور تاکید کی کہ جب تک فیروز پور میں حالات ٹھیک نہیں ہوتے وہ ان ہی کے پاس قیام کرے۔ پچھلے چھ ماہ میں سفیر احمد صرف چھوٹی اور بڑی عید کے موقعے پر فیروز پور گیا تھا لیکن دونوں مرتبہ حاجی بادشاہ نے اسے تین چار دن سے زیادہ وہاں نہیں رہنے دیا تھا۔

سفیر احمد میرے لیے "کام کا آدمی" ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حاجی بادشاہ اسے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتا ہے کیونکہ اس کے سوا حاجی بادشاہ کا کوئی قریبی عزیز اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا تھا۔ اگر سفیر احمد میرے ساتھ چلنے کا عزم کر لیتا تو مجھے حاجی بادشاہ کی اعانت و حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔

سورت نگر سے فرید کوٹ تک ہم نے ٹرین میں سفر کیا۔ اس سفر کے دوران میں نے سفیر احمد کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ ٹرک اور ٹرک کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں وہ پہلے بھی بہت کچھ جانتا تھا' میں نے اسے کچھ مزید تفصیلات بتائیں۔ عشرت فارم سے ٹرک کی پُراسرار گمشدگی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے اسے بتایا کہ وہاں ایک قتل بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی گونگی لڑکی ملی ہے جس کی عصمت دری کی گئی ہے۔ وہ بدنصیب ذہنی مریضہ نظر آنے لگی ہے اور گھنی مونچھوں والے ہر شخص کو دیکھ کر ہیجانی انداز میں چیخنے لگتی ہے۔ میں نے سفیر احمد کو ان عجیب شواہد کے بارے میں بھی بتایا جو موقعے سے ملے تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیروں اور پُراسرار خنجر کے بارے میں سن کر وہ بھی حیران ہوا۔ میں نے سفیر احمد سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس پولیس آفیسر سے ہمارا رابطہ ہو جائے جو اس واردات کی تفتیش کر رہا ہے۔ یقیناً اس حوالے سے کچھ نہ کچھ پیش رفت تو اس نے کی ہو گی۔"

سفیر احمد نے کہا۔ "پولیس آفیسر کا نام تم جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں نے بتایا ہے نا کہ واردات کے صرف آٹھ گھنٹے بعد میرے ساتھ سائیں عالی والا واقعہ پیش آ گیا تھا۔ سائیں نے میرے سر پر پتھر مار کر مجھے بے ہوش کر دیا' دوبارہ ہوش آیا تو میں جودھ پور کے نواح میں تھا۔"

سفیر احمد نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "پہلے

ہمیں اس افسر کا نام معلوم کرنا ہوگا جو تفتیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد بھائی صاحب سے بات کرلیں گے۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات ٹالیں گے نہیں۔" ایک لمحہ رک کر اس نے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹرک کا کھوج لگ چکا ہو اور وہ اب پولیس یا بی ایس ایف کی تحویل میں ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن نہیں بھی ہو سکتا۔ مہاراج رتن وغیرہ اس حوالے سے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کے رویے سے اندازہ نہیں لگایا کہ ٹرک کا کھوج لگ چکا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تم سب سے پہلے اپنے ساتھیوں سے ملو۔ میرا مطلب ہے کہ بابو لیاقت اور وہ دوسرا کیا نام بتایا تھا تم نے۔۔۔ ہاں۔۔۔ زریں گل۔"

"مجھے امید نہیں کہ ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ وہ لوگ اگر ٹنگرو وغیرہ کی زد میں نہیں آئے تو یقیناً کہیں روپوش ہو چکے ہوں گے۔ بہرحال اگر تم چاہو تو بابو لیاقت کی سرامکس فیکٹری سے پتا کروا سکتے ہو۔ سرامکس فیکٹری کا تمہیں پتا ہے نا؟"

"سرامکس فیکٹری کا اچھی طرح پتا ہے اور بابو لیاقت کا بھی۔ وہ بڑا نرم آدمی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو شخص فرید کوٹ میں بابو لیاقت کی مخالفت کرتا ہے یا اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے وہ حلال کا تخم ہی نہیں۔ بابو لیاقت جیسے لوگ جس شہر میں رہتے ہیں اس شہر کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ اللہ اسے ہمیشہ شاد آباد رکھے۔"

باتوں کے دوران ہمارے طویل سفر کا آخری مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ جس وقت ہم فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے، رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سفیر احمد ہمیں سیدھا اپنے ایک قریبی عزیز کے گھر لے گیا۔ ایک بہت بڑے مکان میں صرف ایک اکیلا نوجوان رہتا تھا۔ سی آئی اے اسٹاف میں بھرتی کے لیے کوئی تربیتی کورس کر رہا تھا۔ صبح کا گیا رات گئے گھر آتا تھا۔ منصور علی نام تھا اس کا۔ اس کے دبلے پتلے چہرے پر نوعمری کا شرمیلا پن تھا۔ غزالہ اور نشا کو دیکھ کر یہ شرمیلا پن مزید نمایاں ہو جاتا تھا۔ اس کے طور اطوار گواہی دیتے تھے کہ وہ پولیس لائن میں چل نہیں سکے گا۔

فرید کوٹ پہنچ کر سفیر احمد نے کافی پھرتی دکھائی اور صرف دو دن میں مطلوبہ معلومات حاصل کرلیں۔ ان میں دو معلومات زیادہ اہم تھیں۔ پہلی یہ کہ ٹرک کی گمشدگی کنفرم ہو چکی تھی اور ثابت ہو گیا تھا کہ ابھی تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ دوسری یہ کہ اس انسپکٹر کا نام معلوم ہو گیا تھا جو اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ وہ اسپیشل برانچ کا انسپکٹر دربار سنگھ تھا۔ سفیر احمد بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا "اب بھائی صاحب کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ دربار سنگھ میرے لیے انجان نہیں۔ ٹھیک ٹھاک جان پہچان ہے ہم دونوں میں۔ میں نے اسے آج شام گھر بلا لیا ہے۔ کھل کھلا کر باتیں ہوں گی یہاں۔۔۔ جو جی چاہے کہنا، جو جی چاہے سننا۔"

میں نے کہا "ضروری تو نہیں کہ وہ ہمیں سب کچھ بتا ہی دے۔ تمہارے ساتھ تو ہو سکتا ہے اس کی بے تکلفی ہو لیکن میں تو بہرحال اس کے لیے اجنبی ہوں۔"

"نہیں تم اجنبی نہیں ہو۔" سفیر احمد نے کہا۔ "وہ تمہیں بہت پہلے سے جانتا ہے اور تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر سیلیوٹ کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ تم بہرحال اس سے سینئر ہو۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

سفیر احمد مسکرایا۔ "تم اس سے ڈی ایس پی گرورت کے روپ میں ملو گے۔ گرورت دہلی پولیس کی اسپیشل برانچ کا آفیسر ہے۔ پچھلے ایک برس سے اس کا بہت چرچا ہے۔ اس وقت اسے تفتیش میں ماہر ترین شخص تسلیم کیا جاتا ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلے اس نے چٹکی بجاتے حل کیے ہیں۔ پچھلے سال ستمبر تک وہ اے ایس آئی تھا، اب ڈی ایس پی ہے۔ اس کی ترقی کی رفتار کا تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے بھی گرورت کا نام سنا ہوا ہے لیکن شکل سے اسے پہچانتا نہیں۔ جب میں اسے یہ بتاؤں گا کہ تم ڈی ایس پی گرورت ہو تو وہ فوراً یقین کر لے گا۔ میں دربار سے کہوں گا کہ تم اس کیس میں دلچسپی لے رہے ہو اور اس کی مدد کرنا چاہتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے کچھ چھپائے گا نہیں۔"

"لیکن اگر بعد میں اسے پتا چلا کہ تم نے جھوٹ بولا تھا؟"

"تو میں اسے ہنس کر دکھا دوں گا۔" سفیر احمد نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اگر تمہارے ساتھ دربار سنگھ کی اتنی بے تکلفی ہے تو پھر سیدھے سیدھے اس سے پوچھ لو کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے اور اب کس رخ پر جا رہی ہے۔"

وہ بولا "میں اس معاملے کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ جو کچھ تمہیں گرورت سمجھ کر بتا رہے گا، وہ مجھے ہرگز نہیں بتائے گا۔"

پھر سفیر احمد مجھے گرورت کے ضروری کوائف سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے وہ تمام اہم باتیں میرے گوش گزار کر دیں جو اس بہروپ کے دوران میرے لیے ضروری تھیں۔ میں نے سب کچھ ذہن نشین کر لیا اور ڈی ایس پی

گرورت کے روپ میں انسپکٹر دربار سنگھ سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سفیر احمد نے میرے لیے ایک شوخ رنگ کی قمیص اور سیاہ پتلون کا انتظام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ نشا کو بھی ایک جھلملاتی ساری لا دی تھی۔ نشا کو بھی اس ڈرامے میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔ یہ کردار میری محبوبہ کا تھا۔ ایک مشہور ہندی اخبار کی رپورٹر شاردا نندن ڈی ایس پی گرورت کی محبوبہ تھی۔ دونوں چونکہ بے حد آزاد خیال تھے اس لیے شادی کے بغیر ہی ایک گھر میں رہتے تھے۔ سرِعام بوس و کنار کرتے تھے اور دوسروں کو بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ وہ آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔

شام سات بجے کے لگ بھگ حسبِ وعدہ انسپکٹر دربار سنگھ پہنچ گیا۔ میں اس وقت ڈرائنگ روم کے آرام دہ صوفے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دربار سنگھ نے اندر آتے ہی مجھے سیلوٹ کیا۔ میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سفیر احمد بھی ساتھ تھا۔ ہم تینوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ رسمی باتیں شروع ہوئیں۔ حسبِ توقع دربار سنگھ مجھ سے کافی مرعوب نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمبا چوڑا وجیہ سکھ تھا۔ بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں ذہانت اور معاندانہ سی تیز چمک تھی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے ایک عرصے سے غائبانہ جانتا ہے اور میرے پرستاروں میں شامل ہے۔ اس کی خوش قسمتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے مجھ سے ملاقات کا بہانہ بن گیا ہے۔ غالباً وہ سفیر احمد پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور اسے ذرہ بھر شک نہیں تھا کہ سفیر اسے الو بنا رہا ہے اور میں وہ نہیں جو بتایا گیا ہے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تکلف سے آلودہ فضا قدرے صاف ہو گئی۔ دربار سنگھ ہماری کمپنی میں خود کو خاصا "ایزی" محسوس کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران ہی ایک مرتبہ نشا بھی کمرے میں آئی۔ اس کی چکا چوند خوبصورتی دیکھ کر دربار سنگھ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کچھ دیر میرے پہلو میں بیٹھ کر اور ہنسی مذاق کی باتیں کرکے نشا واپس چلی گئی لیکن دربار سنگھ کے حواس دیر تک بحال نہیں ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اس "دور" کے دوران ہی ہم اصل موضوع پر بھی آ گئے۔ سفیر انسپکٹر دربار سنگھ کو بتا چکا تھا کہ میں گمشدہ ٹرک کے معاملے میں دلچسپی لے رہا ہوں اور اس حوالے سے دربار سنگھ کی بے لوث مشاورت کرنا چاہتا ہوں۔ بہرحال دربار سنگھ بھی ایک گھاگ تھانے دار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جہاں دولت کی بات ہوتی ہے وہاں لالچ، طمع اور حرص کی بات ہوتی ہے "بے لوثی" کی بات نہیں ہوتی۔ وہ بڑی ہوشیاری اور روانی سے گفتگو کو اس نہج پر لے آیا کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے اور کھل گئے۔ دربار سنگھ نے کہا۔ "دت صاحب! یہ اتنی دولت ہے کہ میں اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کتنے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ میں تو پاگل ہو گیا ہوں اس چکر میں پڑ کر۔ لگتا ہے یہ فرید کوٹ نہیں ہے، جرائم پیشہ لوگوں کا ایک بہت بڑا اڈا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ اگر ٹرک کا کھوج لگ بھی گیا تو کیا بنے گا۔ اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے لوگ تو گدھوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"بہت زبردست فساد ہو گا" سفیر احمد نے خیال آرائی کی۔

میں نے کہا۔ "مزے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے خزانے میں کچھ نہیں جانے والا۔ نہ بھارت کے خزانے میں اور نہ پاکستان کے خزانے میں۔ سب کچھ اوپر ہی اوپر صاف ہو جاتا ہے۔"

دربار سنگھ نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں جی کہ اعلیٰ افسروں میں ابھی سے بندر بانٹ شروع ہے۔ میں اسے "غائبانہ بندر بانٹ" کہتا ہوں۔ یعنی مال ابھی برآمد نہیں ہوا اور حصے بخرے پہلے ہو چکے ہیں۔"

گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دربار سنگھ کی اپنی نیت بھی صاف نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ خیال چل رہا ہو کہ بھاڑ میں جائے فرض شناسی اور دیانت داری۔ اگر "مال" ہاتھ لگ جائے تو سب کچھ تیاگ دو۔ یہ بھاری بھرکم وردی، یہ دن رات کی بے آرامی، یہ ملزموں سے چیخ چیخ اور رشوت لینے اور چھپانے کے جھمیلے۔۔۔ سب جنجال اتار پھینکو۔ کسی یورپی دیس میں جا بسو اور باقی کی زندگی عیش و آرام سے گزارو۔ مثل ہے کہ کانے کو کانا نظر آتا ہے۔ وہ مجھے بھی ہم خیال سمجھ رہا تھا اور اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے تیار تھا۔

اس نے ایک بوسیدہ نوٹ بک کھولتے ہوئے کچھ اندراجات پڑھے اور بولا "اس واردات کی رپورٹ ۲۲ مارچ کو صبح نو بجے گنڈا پور کے تھانے میں درج ہوئی۔ وہاں کا ایس ایچ او سب انسپکٹر دیپ سنگھ موقع پر جا کر ابتدائی تفتیش کی اور چند گواہوں کے بیانات قلمبند کیے۔ اس تفتیش کے مطابق عشرت فارم میں قتل کی واردات رات گیارہ اور تین بجے کے درمیان ہوئی۔ واردات کا علم سب سے پہلے رمضان نامی ایک شخص کو ہوا۔ وہ مچھلی فارم پر ملازم ہے اور ایک قریبی منڈی سے سبزی

سبزی لے کر فارم پر پہنچا تھا۔ یہ گلی سڑی سبزی مچھلیوں کو خوراک کے طور پر ڈالی جاتی ہے۔ رمضان نے بتایا کہ ڈیرے پر ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا۔ سیڑھیوں کے پاس چوکیدار رکھا سنگھ کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سر پر کسی تیز دھار آلے سے زخم لگایا گیا تھا۔ لاش کے پاس ہی ایک کتا بھی مرا پڑا تھا۔ اس کی گردن خوفناک انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ نمبردار عشرت اور اس کے ملازمین میں سے کوئی بھی ڈیرے پر نظر نہیں آیا۔ رمضان کے بقول ایک رات پہلے ڈیرے پر گنوں سے لدا ہوا ٹرک موجود تھا اور نمبردار صاحب کی نئی ٹریکٹر کار بھی ڈیرے پر کھڑی تھی۔ وہ دونوں گاڑیاں ڈیرے پر نظر نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ اندرونی کمرے میں ایک دو الماریوں کے تالے بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک الماری میں سے سترانی ہزار کے زیورات اور دس ہزار روپیہ نقد نکال لیا گیا۔ رمضان علی سے پوچھا گیا کہ وہ اس واردات کے سلسلے میں کس پر شک کر سکتا ہے۔ اس نے ایک پڑوسی زمیندار کا نام لے دیا۔ اس زمیندار کی نمبردار عشرت سے عداوت چلی آ رہی ہے اور کئی مرتبہ دونوں پارٹیوں میں سر پھٹول بھی ہو چکی ہے۔ واردات سے چند روز پہلے اس زمیندار کی کچھ بھینسیں مچھلی فارم کی حد بندی توڑ کر تالاب میں گھس آئی تھیں۔ یہ بھینسیں نمبردار عشرت کے کارندوں نے ابھی تک واپس نہیں کی تھیں۔

انسپکٹر دربار سنگھ نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک ایک سگریٹ مجھے اور سفیر احمد کو پیش کیا پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "اسی دوران ہمارے ایس پی صاحب کو ایک فون کال ملی اور اس میں بتایا گیا کہ گنڈارا پور کے عشرت فارم میں ہونے والی قتل کی واردات کوئی معمولی واردات نہیں ہے۔ وہ ٹرک غیر معمولی ہے جو فارم سے غائب ہوا ہے۔ یہ وہی پاکستانی ٹرک ہے جس میں صندوق لدے ہوئے ہیں اور جس کے پیچھے پورے ضلعے کی پولیس پاگل ہو رہی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی صورت حال ایک دم بدل گئی۔ ایس پی اور ڈی ایس پی سمیت کئی افسر گنڈارا پور گاؤں پہنچ گئے اور کیس کی تفتیش تبدیل کر کے میرے سپرد کر دی گئی۔۔۔۔ میں نے ایک ہی روز میں اندازہ لگا لیا کہ اس سے پہلے برائے نام تفتیش ہوئی ہے اور جتنی ہوئی ہے وہ بھی غلط انداز میں ہوئی ہے۔ میں نے نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔ جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ عشرت فارم پر آنے والا ٹرک وہی ٹرک تھا جس پر گنوں کے نیچے صندوق لدے ہوئے ہیں اور جسے تین افراد پاکستان سے چلا کر یہاں لائے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہی شاہ جہاں عرف استاد جہانی ہے جس کے بارے میں لوگ کافی کچھ جانتے بوجھتے ہیں۔ دوسرے کا نام صفدر ہے اور تیسرے کا زریں گل بتایا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے انڈیا میں داخل ہونے کے بعد مختلف ناموں سے سفر کیا ہے لیکن ان کے اصل نام یہی ہیں۔ ایک چوتھا شخص بھی ان کے ساتھ شامل ہے تاہم اس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ زخمی ہے اور غالب امکان یہ ہے کہ راستے میں کہیں ان کے ساتھ شامل ہوا ہے۔ ٹرک کے ساتھ تین افراد عشرت فارم میں آئے تھے۔ یعنی صفدر، زریں گل اور ان کا زخمی ساتھی۔ استاد جہانی اس وقت فرید کوٹ میں بابو لیاقت نامی وکیل کے ساتھ تھا۔ بعد میں زریں گل بھی استاد جہانی کے پاس چلا گیا۔ یہاں تک تو معاملہ صاف ہے۔ اس کے بعد تھوڑی سی الجھن ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ عشرت فارم پر نمبردار عشرت نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ شاید نمبردار نے جہانی کے ساتھیوں کو قتل کر کے ٹرک پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ اس طرح کی کوئی اور حرکت اس سے ہوئی۔ جہانی کو اس منصوبے کا بروقت علم ہو گیا۔ وہ بابو لیاقت اور زریں گل وغیرہ کے ساتھ مسلح ہو کر عشرت فارم پہنچا۔ ان لوگوں نے نہ صرف ٹرک وہاں سے نکال لیا بلکہ نمبردار کو بھی اغوا کر کے ساتھ لے گئے۔ اس کارروائی میں ایک شخص موقعے پر ہلاک ہوا اور تین ابھی تک لاپتا ہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے سفیر احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرح سنجیدہ صورت بنائے بیٹھا اور انسپکٹر دربار سنگھ کی بے خبری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے دربار سنگھ سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ استاد جہانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ فارم میں آیا تھا؟"

دربار سنگھ نے کہا۔ "اس کام کے لیے ہم نے کھوجیوں سے مدد حاصل کی ہے جناب۔ یہ کھوجی خاص طور پر ہوشیار پور سے بلائے گئے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک شخص کا کھرا اٹھایا جو ایک پاؤں دبا کر چلتا تھا۔ میرا دھیان فوراً بابو لیاقت کے باڈی گارڈز کی طرف گیا۔ ان میں ایک لنگڑا سلطان چاچا کے نام سے مشہور ہے۔ ہم نے سلطان چاچا کی گرفتاری کے لیے چھاپا مارا لیکن وہ چھاپے سے پہلے ہی روپوش ہو گیا۔ بعد ازاں بابو کے ایک اور قریبی ساتھی نادر شاہ کی گرفتاری کی کوشش کی گئی۔ وہ بھی روپوش تھا۔ اعلیٰ افسران سے مشورے کے بعد ہم نے پہلے بابو کی رہائش گاہ اور پھر فیکٹری پر دھاوا بولا۔ دونوں جگہوں سے بابو ہاتھ نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ چھاپوں سے کئی گھنٹے پہلے بابو فرار ہو چکا تھا۔

بابو کی فیکٹری سے ہمیں ایک بونے کی لاش ملی۔ یہ آغا قادر زماں کا باڈی گارڈ تھا اور اسے پانچ دوسرے افراد کے ساتھ استاد جہانی نے شنکر شکرا کے ٹھکانے سے اغوا کیا تھا۔ ہمارے کھوجیوں نے فیکٹری میں بھی سخت محنت کی اور کئی اہم کھرے اٹھائے۔ ان میں استاد جہانی کا کھرا بھی تھا۔"

میں نے پوچھا "اب تمہارا کیا خیال ہے؟ استاد جہانی کہاں ہے اور نمبردار عشرت وغیرہ کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہے۔"

وہ بولا۔ "مجھے وشواس ہے جی کہ استاد جہانی، بابو لیاقت اور اس کے تمام قریبی ساتھی زیر زمین جا چکے ہیں اور انہیں ان کی پناہ گاہوں سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ جہاں تک نمبردار عشرت کا تعلق ہے، ممکن ہے اسے سودے بازی کے لیے یرغمال بنا لیا گیا ہو۔ نمبردار عشرت کے علاوہ ایک گونگی لڑکی چھیمو اور دو ملازم بھی موقعے سے غائب ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ بھی بابو لیاقت اور استاد جہانی کی حبس بے جا میں ہوں۔ درحقیقت یہی تین چار افراد تھے جو 22 مارچ کی رات عشرت فارم میں موجود تھے۔ ان میں سے چوکیدار رکھا سنگھ تو موقع پر ہلاک ہو گیا تھا باقی تینوں کو حملہ آور باندھ کر اپنے ساتھ لے گئے تاکہ واردات کا کھوج کھرا مٹایا جا سکے۔"

میں دربار سنگھ پر دل ہی دل میں لعنت بھیج رہا تھا۔ وہ بہت عیار اور گھاگ شخص نظر آتا تھا لیکن اس معاملے میں بری طرح مات کھا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بابو لیاقت جیسا با اثر شخص اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت صرف اس کے خوف سے روپوش ہو گیا ہے حالانکہ صورت حال مختلف تھی۔ میں بہت پہلے سے بھانپ چکا تھا کہ ارجمند بانو، بابو لیاقت اور زریں گل وغیرہ اب اپنے پرانے ٹھکانے پر نظر نہیں آئیں گے۔ اور واقعی وہ غائب تھے۔ لیکن ان کی روپوشی کی وجہ قانونی کارروائی کا خوف نہیں شنکر شکرا کی شیطانیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شیطان ابن شیطان اپنی اصلیت پر اتر آیا ہے اور اب وہ جتنی بھی نحوست پھیلائے کم ہے۔ انہوں نے بہتر جانا تھا کہ عارضی طور پر منظر سے ہٹ جائیں۔

میں نے انسپکٹر دربار سنگھ سے پوچھا۔ "کیا تم مجھے موقع واردات دکھا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں جناب! آپ سے کیا چھپا ہے۔ حکم ہو تو ابھی چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو چلو۔۔۔ میں صرف پانچ منٹ میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد میں اور سفیر احمد انسپکٹر دربار سنگھ کے ساتھ ایک جیپ میں سوار گنڈارا پور گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے شلوار قمیص پہن کر اوپر سے سوتی چادر لے لی تھی اور اس چادر کے پلو سے چہرہ اس طرح چھپایا تھا کہ پہلی نگاہ میں مجھے پہچانا جانا ممکن نہیں تھا۔ گنڈارا پور گاؤں کا فاصلہ تقریباً پندرہ میل تھا لیکن رات کا وقت تھا اور سڑکیں خالی تھیں۔ ہم صرف آدھ گھنٹے میں گنڈارا پور پہنچ گئے۔ 22 مارچ کی رات بھی تقریباً یہی وقت تھا۔ جب میں، زریں گل اور بابو لیاقت ٹریکٹر ٹرالی پر سوار یہاں پہنچے تھے۔ اس تاریک رات میں پیش آنے والے تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ چوکیدار کی لاش اور اس کے دونیم سر سے بہتا ہوا سیاہی مائل خون اور زہر میں بجھے ہوئے تیر۔ اُجڑا اُجڑا دسترخوان اور ایک اُجڑی بچھڑی بے زبان لڑکی۔ ہم صفدر کے بلانے پر عشرت فارم پہنچے تھے لیکن وہاں نہ صفدر تھا نہ دلجیت اور نہ ٹرک۔ اس رات ہم نے عشرت فارم کے گردونواح میں ٹرک کو بہت تلاش کیا تھا لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ آخر علی الصباح ہم واپس فرید کوٹ روانہ ہو گئے تھے۔ آج ٹھیک بائیس روز بعد میں پھر عشرت فارم کا رخ کر رہا تھا۔

ہم ڈیرے پر پہنچے تو دو مسلح کانسٹیبلوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈیرے کے اندرونی دروازوں کو تالے لگے ہوئے تھے۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے ایک تالا کھولا اور ہمیں اندر لے آیا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھئے جناب! یہ جگہ ہے جہاں چوکیدار رکھا سنگھ کی لاش پائی گئی تھی۔ اس کے سر پر کسی وزنی کلہاڑے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کلہاڑے کا پھل زہر میں بجھا ہوا تھا۔ جس تیز دھار آلے سے السیشن کتے کو ذبح کیا گیا وہ بھی زہر میں بجھا ہوا تھا۔" پھر وہ ہمیں ایک بغلی کمرے میں لایا۔ اور بولا "یہاں ایک چارپائی ملی تھی جس کے قریب ادوائن کی رسی پڑی تھی۔ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کسی عورت کو باندھا گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ وہ چھیمو ہی ہو۔"

وہ ہمیں کوٹھی نما حویلی کے مختلف حصوں میں گھماتا رہا اور ساتھ ساتھ "کمنٹری" کرتا رہا۔ "یہاں سے کھرا اٹھایا گیا تھا، یہاں خون کے دھبے ملے تھے، یہاں شراب کی بوتلیں ٹوٹی پڑی تھیں" میں اس کی باتیں سنتا رہا لیکن میرا دھیان اور کہیں تھا۔ جو کچھ دربار سنگھ بتا رہا تھا وہ تو میں بہت پہلے

سے جانتا تھا، میں کوئی نیا سراغ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا منظر جو اب تک نگاہ سے پوشیدہ ہو اور جس سے تفتیش کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکے۔ پوری عمارت سنسان تھی۔ در و دیوار سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے احاطے کے بیچوں بیچ اس گھنے برگد کو دیکھا جس کی شاخیں مچھلی فارم کی حد بندی کو چھو رہی تھیں۔ زریں گل اور محمد خان کے بقول ٹرک اسی برگد تلے پارک کیا گیا تھا۔ اب وہ جگہ خالی تھی۔ برگد خاموش کھڑا تھا جیسے اپنے اندر کوئی بے حد اہم راز چھپائے ہوئے ہو۔

قریباً ایک گھنٹا عشرت فارم میں گزارنے کے بعد ہم فرید کوٹ واپس آ گئے۔ راستے میں بھی انسپکٹر دربار سنگھ سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ انسپکٹر دربار نے بتایا کہ وہ تین لائنوں پر تفتیش کر رہا ہے۔ پہلی "لائن" تو وہی تھی جس کا تذکرہ وہ پہلے کر چکا تھا۔ یعنی اس کا خیال تھا کہ لیاقت علی اور "استاد جہانی" اپنے ساتھیوں کے ساتھ فارم میں داخل ہوئے اور ٹرک کے ساتھ ساتھ یہاں کے مکینوں کو بھی بطور یرغمال لے گئے ہیں۔ تفتیش کی دوسری لائن یہ تھی کہ یہ کارروائی اس زمیندار نے کرائے کے بدمعاشوں سے کروائی ہے جس کے ساتھ نمبردار عشرت کا پرانا جھگڑا چل رہا تھا اور جس کے کچھ مویشی نمبردار کے کارندوں نے پکڑ رکھے تھے۔ تفتیش کا تیسرا رخ قدرے مختلف تھا۔ تفتیشی ٹیم کے ایک ایس آئی کا خیال تھا کہ یہ ڈکیتی کی عام واردات ہے۔ ڈاکا مارنے والے اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ وہ دیگر سامان کے علاوہ جو ٹرک یہاں سے لے جا رہے ہیں اس میں انتہائی بیش قیمت سامان لدا ہے۔ انہوں نے ٹرک کو صرف فرار ہونے کے لیے استعمال کیا کیونکہ اس وقت فارم پر کوئی ایسی گاڑی نہیں تھی جسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا۔ یہ دلیل بھی کافی وزنی تھی۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ فارم میں گھسنے والوں کو افراتفری میں یہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ انہوں نے دسترخوان پر کھانا ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ جہاں ٹرک کھڑا تھا وہاں زمین پر ٹائر گھسنے کے نشانات تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ ٹرک بہت تیزی کے ساتھ نکلا ہے۔ پھر جو سب سے اہم چیز اس دلیل کے حق میں جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اگر ٹرک کو یہاں سے لے جانے والے اس کی قدر و قیمت سے آگاہ تھے تو پھر انہیں ستر اسی ہزار کے زیورات اور نقدی وغیرہ پر ہاتھ صاف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

فرید کوٹ میں ہمیں ہمارے ٹھکانے پر پہنچا کر انسپکٹر دربار سنگھ واپس چلا گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا اور اس وقت تک مجھ سے چپٹا رہتا جب تک میں اسے یہ کیس "حل" نہ کرا دیتا۔ بے حد مرعوب نظر آ رہا تھا وہ مجھ سے اور اسے توقع تھی کہ ایک آدھ روز میں، میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر کوئی ایسی موشگافی کروں گا کہ سارے عقدے کھل جائیں گے۔

حسب معمول وہ اگلی رات پھر آ دھمکا۔ اس مرتبہ وہ کیس فائل بھی ساتھ لے آیا تھا۔ ایک بار پھر کیس کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال شروع ہوا۔ دربار سنگھ کا زیادہ زور اس بات پر تھا کہ 22 مارچ کی رات ہونے والی واردات میں بابو لیاقت اور استاد جہانی ملوث ہیں۔ خاص طور پر "استاد جہانی" کی طرف سے وہ بے حد بدظن تھا اور اسے ایک نہایت خطرناک ملزم قرار دے رہا تھا۔ اس نے مجھ پر "انکشافات" کی بارش کرتے ہوئے بتایا کہ استاد جہانی ایک جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے اور اپنے پرانے حریف شنکر شکرا سے اس کا ایک زوردار تصادم فرید کوٹ کے مضافاتی علاقے میں ہو چکا ہے۔ (اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس تصادم میں شنکر شکرا ایک گہرے کنوئیں میں گر گیا تھا) اس نے "استاد جہانی" کی کئی سرگرمیوں سے پردہ ہٹایا اور یہ بڑھک بھی ماری کہ استاد جہانی کتنا بھی چھپے اس کی عقابی نظروں سے بچ نہیں سکے گا۔ کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں جناب، کہ اس خبیث پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک وہ پکڑا نہیں جاتا فرید کوٹ میں امن و امان کی فضا خراب ہی رہے گی۔ وہ جڑ ہے اس سارے فساد کی۔"

میں نے کہا "اور شنکر شکرا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "شنکر شکرا بھی کوئی شریف بندہ نہیں ہے۔ مگر وہ دنگا فساد کرنے پاکستان نہیں گیا، استاد جہانی پاکستان سے یہاں آیا ہے۔"

گفت و شنید کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ تکلف کے ایک دو پردے مزید اٹھ گئے تھے۔ اب دربار سنگھ میرے سامنے سگریٹ سلگا کر بیٹھا تھا اور گاہے گاہے ایک گلاس سے بیئر کی چسکی بھی لے لیتا تھا۔ تھوڑا سا نشہ چڑھا تو وہ مسکرا کر بولا

"شما کرنا سر جی! آپ کی فرینڈ بڑی سندر ہے۔ بالکل کھوئے ملائی کی طرح۔ بھگوان کرے آپ دونوں کی جوڑی رہے۔ ایسی فرینڈ کے ساتھ بندہ سوئٹزرلینڈ چلا جائے اور کسی خوبصورت وادی کے کنارے خوبصورت سا مکان لے کر دل پشوری کرتا رہے۔ جیون میں بھلا اس سے بڑا سواد اور کیا

ہو گا۔ لیکن بات تو پیسے کی ہے جی۔ پیسہ ہو تو فرید کوٹ بھی سوئٹزرلینڈ ہے ورنہ بندہ پیرس میں بھی رگڑے کھاتا ہے۔"

"تو پیسہ پیدا کرو نا" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے سے تو کچھ نہیں ملے گا۔"

میرے لب و لہجے نے دربار سنگھ کی حوصلہ افزائی کی اور اس نے کھل کر تسلیم کر لیا کہ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی آنکھیں بھی ان پچیس عدد صندوقوں کے خواب دیکھنے لگی ہیں جو ایک ٹرک پر لدے ہیں اور کہیں فرید کوٹ کے گرد و نواح میں موجود ہیں۔

اچانک کچھ آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ نامانوس آوازیں کوٹھی کے گیراج کی سمت سے آئی تھیں۔ سفیر احمد جلدی سے اٹھ کر باہر گیا۔ انسپکٹر دربار سنگھ بھی چونکتا نظر آنے لگا۔ یکا یک دھینگا مشتی کی آوازیں ابھریں۔ پھر کوئی دھڑام سے آہنی گیٹ کے ساتھ ٹکرایا۔ انسپکٹر دربار نے اپنی قمیص کے نیچے سے پستول برآمد کیا اور تیزی سے آوازوں کی سمت لپکا۔ یقیناً کوئی سنگین قسم کی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ یوں لگا کہ چند افراد زبردستی کوٹھی میں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے سفیر کو پکڑ لیا ہے اور اب اندرونی حصے کی طرف آ رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا اور ایک قد آدم الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ کمرے کے اندر چھپنے کے لیے یہ جگہ موزوں ترین تھی۔ ابھی میں نے بمشکل اپنی پوزیشن سنبھالی ہی تھی کہ تین افراد انسپکٹر دربار سنگھ کو مارتے اور دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ پستول انسپکٹر دربار سنگھ سے چھینا جا چکا تھا اور اس کا ایک رخسار گہرا سرخ ہو رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس رخسار پر ایک حملہ آور نے دھواں دھار ٹکر رسید کی تھی۔ انسپکٹر دربار کی قمیص پھٹ چکی تھی اور نیچے سے اس کی جالی دار بنیان نظر آ رہی تھی۔ اندر آنے والوں میں سے دو افراد نے اپنے چہرے پگڑیوں میں چھپا رکھے تھے جب کہ تیسرے نوجوان نے منہ پر رومال باندھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا جب کہ دونوں پگڑی پوش ریوالوروں سے مسلح تھے۔

پگڑی والے ایک شخص نے انسپکٹر دربار کا گریبان پکڑا اور میرے سامنے ایک اور خوفناک ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ انسپکٹر لڑکھڑا کر میز پر گرا اور وہ گلاس چکنا چور ہو گیا جس سے تھوڑی دیر پہلے وہ بیئر کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ٹکر لگنے اور گرنے کے عمل کے دوران انسپکٹر دربار سنگھ کی پگڑی کھل گئی تھی اور اس کا ایک طویل پلو زمین سے چھونے لگا تھا۔ ٹکر مارنے والے نے انسپکٹر کے کیس مٹھی میں جکڑے اور بڑی دلیری کے ساتھ ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ "بتا حرامجادے۔۔۔ کہاں ہے بابو جی کی ماں۔ بتا کہاں رکھا ہے انہیں؟" پگڑی پوش نے چلا کر کہا۔

اس کی آواز سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اسے سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ بوٹا سنگھ کی آواز تھی۔ وہی بوٹا سنگھ جو لالی کے گروہ میں شامل تھا اور جس سے میری آخری ملاقات بابو لیاقت کی فیکٹری میں ہوئی تھی۔ اچانک انسپکٹر دربار سنگھ نے جوابی وار کیا۔ نجانے کس وقت اس نے اپنے لباس میں سے ایک کمانی دار چاقو نکال لیا تھا۔ چاقو جس پھرتی سے نکالا گیا تھا اسی پھرتی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے بڑے خطرناک انداز میں بوٹا سنگھ کی ناف کو نشانہ بنایا۔ یہ بڑا کارگر وار تھا۔ بوٹا کی آنکھیں باہر آ سکتی تھیں لیکن اس نے اپنے مختصر جسم کو بجلی کی طرح حرکت دے کر خود کو بچا لیا۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر ہاتھ کو معکوس حرکت دے کر دوسری بار بوٹا سنگھ کے پیٹ کو نشانہ بناتا، دوسرے پگڑی پوش نے پہلو سے ایک بھرپور ٹانگ انسپکٹر کے کولہے پر جمائی۔ وہ اچھل کر اس الماری کے عین سامنے آ گرا جہاں میں چھپا کھڑا تھا۔

دوسرے پگڑی پوش کے انداز نے مجھے ایک لمحے میں سمجھا دیا کہ وہ زریں گل ہے۔ مزید تصدیق زریں گل کی پہاڑی چپل سے ہو رہی تھی۔ جونہی انسپکٹر نیچے گرا، زریں گل نے کسی جنگلی بلے کی طرح اس پر چڑھائی کر دی۔ مکے، ٹھوکریں، ٹکریں، آدھے منٹ میں اس نے انسپکٹر کو دھنک کر رکھ دیا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے پشتو اور اردو کی منتخب گالیوں سے بھی نواز رہا تھا۔ انسپکٹر دربار سنگھ مار کھانے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہا تھا۔ غالباً اس چیخ و پکار کے ذریعے وہ مجھے متوجہ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں کہیں آس پاس موجود ہوں اور اس کی مدد کے لیے میدان میں کود دوں گا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے انسپکٹر کی دھنائی میں کوئی مداخلت نہیں کی اور جب اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا اور انسپکٹری کی تن فن دم توڑ گئی تو میں الماری کی اوٹ سے نکل آیا۔

دیکھتے ساتھ ہی بوٹا سنگھ اور زریں گل نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے یہاں دیکھ کر انہیں بھی اتنی ہی حیرت ہوئی جتنی مجھے انہیں دیکھ کر ہوئی تھی۔ زریں گل کی پگڑی زور آزمائی اور مار کٹائی کے دوران ہی کھل گئی تھی، بوٹا سنگھ نے بھی مجھے دیکھ کر چہرے سے پلو ہٹا لیا۔ زریں گل نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "استاد! یہ ہم کیا دیکھ رہا ہے۔ آپ یہاں کیسے" میں نے نیچے جھک کر انسپکٹر دربار سنگھ کا کمانی دار چاقو اٹھایا اور کہا "یہی سوال میں بھی تم دونوں سے پوچھ سکتا

چیئرز دربار بھی اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ زریں گل نے میرے لیے استاد کا لقب استعمال کر کے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ "وہ دوسرا بندہ کہاں ہے؟" میں نے زریں گل سے پوچھا۔

"اس کے بارے میں فکر مت کرو۔ ام نے اس کا کھوپڑا توڑ کر ساتھ والے کمرے میں پھینک دیا ہے۔"

"اوئے تمہارا بیڑا غرق زریں گل" میں نے گھبرا کر کہا۔ "وہ بہت بڑے پولیس افسر کا سگا بھائی ہے۔ مر گیا تو پولیس والے تمہاری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔۔۔ اور ویسے بھی وہ اپنا بندہ ہے۔ یہ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

بوتا سنگھ بولا "اس نے کچھ نہیں کیا جی۔ میں نے ہی اس کے سر پر پستول مارا ہے۔ پر ہاتھ ہولا رکھا ہے۔ وہ مرے شرے گا نہیں۔"

"ہاں جی' مرے شرے گا نہیں" زریں گل نے تصدیق کی۔

میں نے زریں گل کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے میں رہے اور انسپکٹر دربار سنگھ پر نگاہ رکھے پھر میں بوتا سنگھ کے ساتھ بھاگم بھاگ کوٹھی کے گیراج میں پہنچا۔ وہاں ایک جانب لکڑی کا سادہ سا دروازہ تھا یہ اسٹور میں کھلتا تھا۔ بوتا سنگھ نے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ کنڈی اُتار کر ہم اندر داخل ہوئے' یہاں فرش پر سفیر احمد نیم بے ہوش پڑا تھا۔

وہ کراہ رہا تھا اور اس کے سر سے بہنے والا خون اس کی قمیص اور فرش پر دھبوں کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے سہارا دے کر اس کمرے میں لے آئے جہاں زریں گل بڑے فلمی انداز میں اعشاریہ پچیس کا ریوالور تھامے انسپکٹر کا پہرا دے رہا تھا۔ دونوں میں تند و تیز مکالمہ چل رہا تھا۔ انسپکٹر اپنی انسپکٹری کے زعم میں زریں گل کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا جب کہ زریں گل دعویٰ کر رہا تھا کہ وہ بندے کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتا ہے اور اگر اسے "استاد جانی" حکم دیں تو وہ ابھی اسے بھی مسل کر دکھا دے گا۔

سفیر احمد کو دیکھ کر انسپکٹر دربار دہاڑا "یہ سب کیا ہے سفیرے! تم تو کہتے تھے یہ دہلی کا ڈی ایس پی گرووت ہے۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔"

"یہ تو تیرا بہنوئی نکل آیا ہے" میں نے انسپکٹر دربار سنگھ کی بات مکمل کی۔ انسپکٹر دربار سنگھ کے چہرے پر سرخی سی لہرائی لیکن وہ منہ سے بولا کچھ نہیں۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقعے پر کیا کہے اور کس سے کہے۔ وہ مجھے ڈی ایس پی گرووت سمجھ کر ڈینگیں مارتا رہا تھا' یہ دعوے کرتا رہا تھا کہ استاد جہانی اور بابو لیاقت جیسے لوگ اس کی تفتیش سے خوفزدہ ہو کر روپوش ہو گئے ہیں اور وہ ہتھکڑیاں لے کر انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اب یکایک مجھے اپنے روبرو دیکھ کر وہ جیسے حواس کھو بیٹھا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ اس وسیع و عریض کوٹھی سے اس کی چیخ و پکار باہر نہیں جائے گی اور نہ کوئی اس کی مدد کو یہاں پہنچے گا' وہ بدستور اکڑ خان بنا ہوا تھا اور تھانے داری لہجے میں ہمیں دھمکا رہا تھا۔

زریں گل ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ انسپکٹر پر جھپٹا اور ایک بار پھر اس پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ میں نے آگے بڑھ کر بمشکل اسے پیچھے ہٹایا۔ وہ غرا رہا تھا "ام کو چھوڑ دو استاد جی۔ ام اس حرامی کا قیمہ بنائے گا۔ اس نے بابو جی کی والدہ صاحب کو دو ہفتے سے حوالات میں رکھا ہوا ہے۔ ان کو گندی گالیاں دیتا ہے اور ٹھوکریں مارتا ہے۔ ام اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے زریں گل کو بمشکل کمرے سے باہر دھکیلا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ باہر کھڑا ہو کر بڑبڑانے لگا۔ غور سے سننے پر اندازہ ہوا کہ اپنی مادری زبان میں انسپکٹر دربار سنگھ کی ماں بہن ایک کر رہا ہے۔ میں نے بوتا سنگھ سے پوچھا۔

"یہ کیا چکر ہے؟"

بوتا سنگھ اپنی باریک آواز میں بولا "جہانی صاحب! یہ انسپکٹر دربار سنگھ ہے۔ ہم تین چار دن سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ شاید آپ کو پتا ہو کہ یہی حرامجادہ ہے جو عشرت فارم پر ہونے والے قتل کا کھوج لگا رہا ہے۔ اس نے آپ سمیت ہم سب کی تلاش میں چھاپے شاپے بھی مارے ہیں۔ یہ بالکل پاگل ہوا پھرتا ہے اس چکر میں۔ رو پتے نکل اس نے بابو لیاقت صاحب کو سامنے لانے کے لیے ان کی بوڑھی ماتا جی کو پکڑ لیا۔ ان پر جھوٹے الجامات لگا کر حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ حرام کا تخم سمجھتا ہے کہ ایک بوڑھی عورت پر جلم کر کے بڑا تیر مار رہا ہے۔ آج ہم نے اس کو مزہ نہ چکھا دیا تو ہمارا نام نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے لگا کہ بوتا سنگھ بھی بے قابو ہو کر انسپکٹر دربار سنگھ پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا اور صرف ایک دو گالیاں نکالنے پر اکتفا کیا۔ اب بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ انسپکٹر دربار سنگھ کی تفتیش کی بنیاد ہی یہ تھی کہ عشرت فارم پر ہونے والی واردات میں بابو لیاقت اور میں ملوث ہیں۔ ہم دونوں روپوش تھے۔ لہٰذا پرانا

تھانے داری ہتھکنڈا استعمال کرتے ہوئے انسپکٹر دربار سنگھ نے بابو کی والدہ کو حوالات میں بند کر دیا تھا۔

میں زخمی سفیر احمد کو سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آیا۔ باہر زریں گل زخمی چیتے کی طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کمرے میں جائے اور انسپکٹر دربار سنگھ پر نگاہ رکھے لیکن ساتھ ہی سختی سے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اور بوتا سنگھ فی الحال انسپکٹر سے الجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

سفیر احمد کی کنپٹی پر ایک بڑا سا گومڑ نکل آیا تھا۔ اسی گومڑ کے سبب اسے ابھی تک چکر آ رہے تھے اور وہ بار بار پیشانی تھام لیتا تھا۔ کوٹھی کے ایک کمرے میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا' میں اس کمرے کی جانب آیا تو برآمدے میں بنا اور غزالہ سے ملاقات ہو گئی۔ شور و غل کی آوازوں نے انہیں جگا دیا تھا اور وہ ڈری سہمی اس جگہ کھڑی تھیں۔ سفیر احمد کے سر سے بہتے خون کو دیکھ کر وہ اور گھبرا گئیں۔ "کیا ہوا انہیں؟" غزالہ نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

"چوٹ لگ گئی ہے' تم ذرا دیکھ کر پٹی کر دو۔"

ایک دم غزالہ کے اندر کی ڈاکٹر اس کے خوف و ہراس پر غالب آ گئی۔ اس نے سفیر کو بازو سے تھاما اور اپنے ساتھ اس کمرے میں لے آئی جہاں فرسٹ ایڈ کا سامان پڑا تھا۔ جب وہ سر کی "بینڈیج" کرنے کے بعد درد کا انجکشن تیار کر رہی تھی تو میں نے سفیر احمد سے کہا۔ "اس الو کے پٹھے انسپکٹر کو سمجھاؤ' ورنہ بہت برا حشر ہونے والا ہے اس کا۔ اسے سمجھاؤ کہ بابو لیاقت کی والدہ کو چھوڑ دے اور ان سب لوگوں کو بھی جنہیں وہ بابو کے ساتھی قرار دے رہا ہے اور ان پر تشدد کر رہا ہے۔"

سفیر احمد نے کراہتے ہوئے کہا "میں کوشش کرتا ہوں۔ لیکن یہ بات میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ دربار سنگھ بہت کائیاں ہے۔ اس کے مزاج کی خاص بات یہ ہے کہ اپنے اختیارات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔ بے شک وہ میرا دوست ہے لیکن دفتری معاملات میں میرے ساتھ بھی بہت کم بات کرتا ہے۔ اگر اس نے تمہیں عشرت فارم کیس کی تفصیلات بتائی ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ تمہیں ڈی ایس پی گرووت سمجھ رہا تھا۔ میں لاکھ کوشش کرتا لیکن اس سے کچھ اگلوا نہیں سکتا تھا۔"

میں نے کہا "تم میں اور ہم میں بہت فرق ہے' ہم جب کچھ اگلوانے یا منوانے پر آئیں گے تو دربار سنگھ کو نانی یاد آ جائے گی۔ ویسے بھی وہ اب ہمارے سامنے ننگا ہو چکا ہے' میرا خیال ہے کہ تمہاری بات ماننے میں زیادہ دلچسپی نہیں کرے گا۔"

جب میں نے سفیر احمد کو سمجھا بجھا کر اس کمرے میں بھیج دیا جہاں انسپکٹر دربار سنگھ پٹے ہوئے مرغے کی طرح لہولہان بیٹھا تھا۔ سفیر احمد نے اندر جا کر زریں گل اور بوتا سنگھ کو باہر بھیج دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ چند ہی لمحے بعد اندر سے انسپکٹر دربار سنگھ کے گرجنے برسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سفیر احمد سے کہہ رہا تھا۔ "یہ سب تمہاری سازش ہے' تم ملے ہوئے ہو ان لوگوں سے۔ اگر تم جانتے تھے کہ یہ ڈی ایس پی گرووت نہیں تو پھر کیوں تم نے مجھے دھوکا دیا؟"

سفیر احمد نے کہا "میرا وشواس کرو دربارے! تمہاری طرح میں بھی بے خبر تھا۔ مجھ سے بھی دھوکا ہوا ہے۔ لیکن اب ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں۔ اب ہمارے اور استاد جہانی کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ خاص طور پر میں نے تو استاد کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے لیکن قول کا پکا ہے اور اس کے ساتھی اس کے حکم کے خلاف ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔"

"صاف سیدھی بات کرو۔ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

سفیر احمد نے کہا "یہی کہ ہمیں استاد جہانی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ فرید کوٹ میں اس وقت جتنے بھی لوگ ٹرک کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ان میں استاد جہانی کی کامیابی کے امکانات سب سے روشن ہیں۔ وہ اس معاملے میں شروع سے ملوث ہے اور ہر اونچ نیچ کو سمجھتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرک اس وقت بھی جہانی کے ساتھیوں کی تحویل میں ہو۔"

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی پھر انسپکٹر دربار سنگھ کی مدھم آواز اُبھری "لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ مطلب نکل جانے پر استاد ہمیں ٹھینگا نہیں دکھا دے گا۔"

"بھجی' میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ وہ وچن کا پکا شخص ہے۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ اگر ہماری نیتیں ٹھیک رہیں تو ہم اس سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔"

"فائدے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ ہمارا حصہ وغیرہ مقرر کر دے گا؟"

"ضرور کر دے گا۔ اس بارے میں اس سے کھل کر بات کر لیتے ہیں۔"

گفتگو میں سوچ بچار کا مختصر وقفہ آیا۔ پھر انسپکٹر کی آواز دوبارہ اُبھری۔ اس نے اپنا لہجہ کچھ اور دھیما کر لیا تھا۔ "میرے پاس کچھ ایسی اطلاعات ہیں جو ٹرک کی تلاش میں

بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر استاد جہانی سے ہمارا معاملہ طے ہو جاتا ہے تو پھر میں اسے ان معلومات میں شریک کر سکتا ہوں۔"

جوں جوں گفتگو کی نوعیت خاص ہو رہی تھی' آوازیں دھیمی ہوتی جا رہی تھیں۔ حتیٰ کہ بند دروازے کے پیچھے صرف کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔ میں دروازے سے ہٹ کر زریں گل اور بوٹا سنگھ کے پاس آگیا۔ ان دونوں کے ساتھ آنے والا نوجوان باغیچے کی گھاس پر بیٹھا ہوا تھا۔ زریں گل اور بوٹا یہ جاننے کے لیے بے قرار نظر آتے تھے کہ میں بائیس روز پہلے میں انہیں سرائکس فیکٹری میں چھوڑ کر اچانک کہاں چلا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "بھائیو! یہ آرام سے بیٹھ کر کرنے والی باتیں ہیں۔ میں سب کچھ تمہارے گوش گزار کر دوں گا لیکن کچھ دیر چھری تلے سانس لو۔"

زریں گل بولا "اگر آپ نے نہیں بتانا تو ام سے ہی پوچھ لیں کہ ام پر کیا بیتی ہے؟"

میں نے کہا "اگر جلدی ہے تو بڑے شوق سے بتا سکتے ہو۔"

وہ بولا۔ "خو چہ جلدی تو واقعی ہے۔ آپ کے پاؤں میں چکر ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ملتا ہے پھر کہیں نکل جاتا ہے۔ کیا معلوم ابھی پھر غائب ہو جائے اور ام منہ تکتا رہ جائے۔"

"ہاں تو پھر کہو نا۔ کیا بات ہے؟"

وہ بولا "آپ کے جانے کے بعد امارا جان ایک دم مصیبت میں آگیا۔ بالکل جیسے فلم "دولت اور دنیا" میں وحید مراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ بابو لیاقت صاحب کے ایک مخبر نے بتایا کہ شنکر شکرا اور اس کا غنڈا لوگ سخت غصے میں ہے اور بابو کی فیکٹری کو گھیرے میں لینے والا ہے۔ بابو صاحب بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ خطرے کو دس کوس دور سے دیکھ لیتا ہے۔ اس نے شہر میں دو تین جگہ فون کیا اور اپنے خاص آدمیوں سے بولا کہ وہ لوگ چند دن کے لیے روپوش ہو جائیں۔ اس کے بعد فیکٹری میں موجود سب لوگ بھی ایک بڑی لاری میں بیٹھ گیا۔ شنکر کا وہ تمام ساتھی بھی لاری میں بٹھا لیا گیا جنہیں آپ شنکر کے ٹھکانے سے پکڑ کر لایا تھا۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا "اس کے بعد کا بات آپ کو یار بوٹا سنگھ بتائے گا۔ کیونکہ بعد میں جو کچھ کیا اسی نے کیا۔"

بوٹا سنگھ نے کہا۔ "بات کوئی جیادہ لمبی نہیں ہے جی۔ بس جریں گل یہ حاچڑھا کرتا رہا ہے۔ جب مجھ کو پتا چلا کہ بابو لیاقت کو کسی خفیہ ٹھکانے کی لوڑ ہے تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کو اپنے ٹھکانے پر لے جاتا ہوں۔ ہم لاری میں بیٹھے اور سیدھے ڈوگر گاؤں پہنچ گئے۔ یہ جگہ فرید کوٹ سے پندرہ بیس میل فاضلکا کی طرف ہے۔ یہاں ہمارے سردار لالی کا بڑا محفوظ ٹھکانا ہے۔ دریا کا کنارہ ہے۔ چاروں طرف بڑے گھنے درخت ہیں۔ عام بندہ دن دیہاڑے بھی اس طرف آتے گھبراتا ہے۔ رات کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں ایک پرانا ڈاک بنگلا تھا۔ دریا کے کٹاؤ میں آکر بالکل برباد ہو چکا ہے۔ اس بنگلے کے نیچے بڑا لمبا چوڑا تہ خانہ ہے۔ یہ تہ خانہ مدت سے ویران پڑا تھا' اندر سانپوں اور چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک برس پہلے سردار لالی نے یہ تہ خانہ صاف کروایا تھا۔ اس وقت سے ہم کبھی کبھی اس جگہ کو اپنے کام میں لے آتے ہیں۔ میں بابو لیاقت صاحب کو لے کر سیدھا اس بنگلے میں چلا گیا۔ بعد میں میں نے سردار لالی سے اس بات کی آگیا لے لی کہ بابو جی اور ان کے ساتھی چند ہفتے وہاں بسیرا کر لیں۔ آج کل ہم اسی ٹھکانے پر ہیں۔ پانچ چھ روز پہلے ہم کو پتا چلا کہ عشرت فارم میں ہونے والے قتل کی تفتیش میں بابو صاحب کی ماتا جی کو بٹھا لیا گیا ہے اور ان پر سختی کی جا رہی ہے۔ میں نے بابو صاحب سے کہا کہ اگر ان کا حکم ہو تو ہم اس انسپکٹر کی طبیعت صاف ستھری کر دیتے ہیں۔ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کوئی غلط شلط کام کرنا نہیں چاہتے لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ ماں کی مصیبت پر ان کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں نے زریں گل سے مشورہ کیا اور ہم دونوں انسپکٹر دربار سنگھ سے دو دو ہاتھ کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ چار پانچ روز سے ہم اچھے موقعے کی کھوج میں تھے۔ آخر آج یہ موقع مل گیا۔ ہم تھانے سے ہی دربار سنگھ کے پیچھے تھے۔ پہلے ہم نے اس کوٹھی کا جائجا (جائزہ) لیا۔ پھر اچھی طرح وشواس کر کے کہ کام بن سکتا ہے ہم اندر گھس آئے۔"

میں نے پوچھا۔ "ارجمند بانو بھی تمہارے ساتھ ہی فیکٹری سے گئی تھی؟"

بوٹا سنگھ سے پہلے زریں گل بول اٹھا "بالکل جناب' وہ بھی ساتھ ہی ہے۔ ام نے میڈم صاحب کا بہت خیال رکھا ہے جی۔ میڈم صاحب بہت پریشان تھا۔ رات دن روتا رہتا تھا۔ سوتے میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا تھا اور کہتا تھا۔ "بچاؤ۔ بچاؤ" دراصل جی اس کے دل پر اس حبشی بونے کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ جو اس کے کندھے پر سوار ہو گیا تھا۔ کئی دن تو را بخار میں تپتا رہا ہے۔ اب بخار اترا ہے تو پیلا پڑ گیا ہے۔

بہت کمزوری محسوس کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے۔ خوبصورت عورتوں کی طبیعت کے بارے میں تمہیں بڑی اطلاع رہتی ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ سنبھل کر بولا۔ "دراصل جی۔ میڈم صاحب ہندو سے مسلمان ہوا ہے۔ ابھی پکا مسلمان تو نہیں ہے نا۔ کیا پتا وہ پھر "کافری" کی طرف چلا جائے۔ ایسے بندے کی دلجوئی کرنا تو بہت ضروری ہوتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے' وہ آپ کو بڑا یاد کرتا ہے۔ دن رات یہی کہتا ہے "استاد جہانی صاحب کہاں ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی کام کا نہیں ہے۔" ایک دن ام نے پوچھا۔ "استاد جہانی کے بغیر تم کسی کام کا کیوں نہیں۔" وہ بولا "اس لیے کہ ام کو سائیں صاحب نے فرمایا ہے۔ امارا جینا مرنا اب استاد جہانی کے ساتھ ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران ہی سفیر احمد اور انسپکٹر دربار سنگھ کمرے سے باہر نکل آئے۔ سفیر احمد مجھے صحن کے ایک گوشے میں لے گیا۔ اس نے کہا۔ "جہانی صاحب' بات بن گئی ہے۔ انسپکٹر کہتا ہے کہ وہ صبح تک بابو لیاقت صاحب کی والدہ کو رہا کر دے گا۔ اس کے علاوہ ایک دو روز میں وہ سارے افراد بھی چھوڑ دیے جائیں گے جنہیں شبے میں پکڑا گیا ہے۔ آئندہ بھی وہ ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہے لیکن اس تعاون کے لیے وہ صلہ مانگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سے روٹوک بات کر لی جائے اور برآمد ہونے والے مال میں اس کا حصہ مقرر کر دیا جائے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ دولت کی ہوس نے اچھے بھلے ذہنوں کو مفلوج کر رکھا تھا۔ پتا نہیں کتنے لوگ تھے جنہوں نے ان دیکھی دولت میں سے اپنے اپنے حصے مقرر کیے ہوئے تھے۔ نہ انہوں نے ابھی تک وہ ٹرک دیکھا تھا اور نہ اس میں لدے ہوئے صندوق' بس وہ اتنا جانتے تھے کہ اس ٹرک میں بے انتہا دولت ہے اور اس دولت کا کوئی حقیقی وارث نہیں۔ بس وہ سب کے سب اس کے حقدار بنے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف تھے' ابراہیم' ارجمند بانو' قادر زماں' شنکر شکرا' مہاراج رتن سنگھ' انور عشرت' انسپکٹر دربار سنگھ' یہ صرف وہ نام تھے جو میرے علم میں تھے۔ ان افراد کی فہرست بہت طویل تھی جو میری نگاہوں سے اوجھل تھے لیکن جو باؤلے کتوں کی طرح فرید کوٹ کی گلیوں میں چکرا رہے تھے اور گمشدہ ٹرک کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔

میں نے سفیر احمد سے کہا۔ "میرے لیے تو انسپکٹر دربار سنگھ اجنبی ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس کی زبان پر جو ہے وہی اس کے دل میں ہے تو پھر اس سے بات کر لو۔ وہ دو دن کے اندر اندر تمام گرفتار شدہ افراد کو رہا کر دے اور اپنی "تفتیشی توپ" کا رخ ہماری طرف سے موڑ دے۔ اس کے بعد ہم اس سے معاملہ طے کر لیں گے۔"

سفیر احمد نے کہا۔ "اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس کسی کے حوالے سے کچھ اہم اطلاعات ہیں جو اس نے اب تک چھپا رکھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ معاملہ طے ہو جائے تو ہمیں ان اطلاعات سے آگاہ کر دے گا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "سچی بات یہ ہے سفیر احمد کہ میں اتنی جلدی انسپکٹر دربار سنگھ پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ وہ ایک خرانٹ شخص ہے' اور میرا خیال ہے کہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

سفیر احمد سوچ میں پڑ گیا۔ "تو پھر کیا کیا جائے؟"

میں نے کہا "یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ لیکن اتنی بات میری سمجھ میں بھی آ رہی ہے کہ انسپکٹر کو اتنی جلدی یہاں سے جانے کی آزادی نہیں ملنی چاہیے۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور ہے تو وہ ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر واپس آکر ہمیں اس کوٹھی میں گھیر لے گا۔ ہمارے ساتھ سائیں جائی ہے اور عورتیں بھی ہیں۔ تنہا نہیں ہیں ہم کہ پولیس کے نرغے سے نکل بھاگیں گے۔"

سفیر احمد نے کہا "کیوں نہ ایک بار تم بھی اس سے بات کر کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔ "اس میں برائی تو کوئی نہیں لیکن اس سے بات کیا کروں گا؟"

وہ بولا۔ "وہی باتیں جو میں اور تم کرتے رہے ہیں۔ اصل مقصد تو اس کے تاثرات دیکھنا ہے۔"

میں سفیر احمد کے ساتھ ہو لیا۔ انسپکٹر دربار کوٹھی کے ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور بیئر کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کا حلیہ اب پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا تھا اور ہونٹوں سے بہنے والے خون کو کسی طور روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر گہری نیلی ہو گئی تھی' اس ورم زدہ آنکھ کے سبب اس کی صورت پر کچھ اور خباثت جھلکنے لگی تھی۔

میں نے دس پندرہ منٹ اس سے گفتگو کی۔ بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی پیشکش میں مخلص ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ خیر سگالی کے طور پر وہ بابو لیاقت کی والدہ سمیت تمام

متعلقہ حوالاتیوں کو رہا کر دیتا ہے اور تفتیش کا رخ ایسی سمت میں موڑ دیتا ہے کہ بابو لیاقت اور اس کے ساتھیوں کے لیے مشکلات کم سے کم ہو جائیں۔ اس کے بعد معاملہ طے کر لیا جائے گا اور ٹرک کی تلاش کا کام حل کر کیا جائے گا۔ تاہم باتوں کے دوران کہیں کہیں اس کے منہ سے ایسی باتیں بھی نکلیں جنہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ مثلاً یہ کہ باہر مطلع ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ فی الفور یہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ پھر اس نے بوٹا سنگھ اور زریں گل کے بارے میں ٹوہ لیا اور یہ پوچھا کہ اس کوٹھی میں میرا کوئی اور ساتھی تو موجود نہیں۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا اور اپنے مخاطب کو بڑے غیر محسوس طریقے سے الجھا لیتا تھا۔ بارش بتدریج شدت اختیار کر رہی تھی۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "دربار سنگھ تمہارے پاس کھلی جیپ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ دو تین گھنٹے یہیں آرام کر لو۔ صبح سویرے نکل جانا۔"

اس نے پس و پیش کیا۔ لیکن جب محسوس کیا کہ میں اسے صبح تک کے لیے یہاں روکنا چاہ رہا ہوں اور اگر اس نے اصرار کیا تو میں شک میں پڑ جاؤں گا تو وہ نیم رضامند ہو گیا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔ "ٹھیک ہے جمالی صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔ ہم تو وشواس کرنے والے اور وشواس دینے والے لوگ ہیں۔ ایک بار جس کے ساتھ چل پڑے سو چل پڑے۔ راستہ کتنا بھی کٹھن ہو پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔"

میں نے کہا۔ "پیچھے ہٹنے والا تو میں بھی نہیں ہوں۔ باقی بندے کی پہچان تو وقت پڑنے پر ہوتی ہے' پہلے تو خالی خولی باتیں ہوتی ہیں۔"

بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ جوں جوں بارش تیز ہو رہی تھی دربار سنگھ کے پینے کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ کم نشے والی بیئر پی رہا تھا' لہٰذا آنکھوں میں ہلکی سی سرخی کے سوا خمار کے کوئی آثار نہیں تھے۔ کہنے لگا۔ "جمالی صاحب! ویسے آپ کی گرل فرینڈ بڑی سندر ہے۔ بالکل۔۔۔ کھوئے ملائی والی قلفی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لگتا ہے' تمہیں کچھ زیادہ ہی اچھی لگی ہے۔"

میرے لہجے نے دربار سنگھ کی حوصلہ افزائی کی' دانت نکال کر بولا "چیز ہی ایسی پیاری ہے آپ نے جو دیکھے گا کلیجے کو پکڑ لے گا۔ داد دینی پڑتی ہے آپ کی نظر کی۔"

اس انداز میں اس شے کی تعریف کی جاتی ہے جسے للچائی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں خوشی ہوتی ہے کہ یہ چیز ہمیں مل جائے بار ے ری جائے۔ نشا کو دیکھ کر دربار سنگھ کی آنکھوں سے پہلے بھی رال ٹپکی تھی لیکن تب اس کے لیے ڈی ایس پی گروورت کی محبوبہ تھی اس لیے وہ زیادہ کھل کر نہیں بولا تھا۔ میں نے اس کی منشا سمجھتے ہوئے کہا۔ "بھئی گرل فرینڈ تو وہ میری ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ جو اس کی طرف دیکھے میں اس کی آنکھیں نکال لوں۔ تم اسے جی بھر کر دیکھ سکتے ہو۔ اس کی تعریف کر سکتے ہو۔ بلکہ تعریفوں کے پل باندھ سکتے ہو۔۔۔ اور اگر وہ تمہاری تعریفوں کا "عملی شکریہ" ادا کرنا چاہے تو بھی ہم پیچھے بھی ہٹ سکتے ہیں' یہ گرل فرینڈز کی چیزیں تو ہوتی ہی ایسے کاموں کے لیے ہیں۔"

دربار سنگھ مسکرایا تو اس کی سوجی ہوئی آنکھ بالکل ہو گئی۔ خباثت بھرے لہجے میں بولا۔ "ویسے آپ آدمی عجیب ہیں۔ اپنے ہی قبیلے کے لگتے ہیں۔"

"قبیلے دو ہی ہیں بھئی" میں نے فلسفہ بگھارا "ایک وہ زندگی کو پرسکون بنانا چاہتے ہیں' اور ہر قسم کی لذت سے منہ موڑے بیٹھے رہتے ہیں' دوسرے وہ جن کے نزدیک سکون موت کا دوسرا نام ہے۔ وہ زندگی کو زندگی سمجھ کر گزارتے ہیں۔ تکلیفیں جھیلتے ہیں اور خوشیاں بھی سمیٹتے ہیں۔ اور بات یہ ہے کہ انہی لوگوں کو جینے کا حق ہے جو کسی مُردہ خواب کے لیے زندگی کو ضائع نہیں کرتے۔"

"ارے باپ رے۔ آپ تو جوگیوں اور سادھوؤں کی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ کا روپ بھی بہروپ نہ نکلے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ پہلے آپ ڈی ایس پی گروورت تھے۔ پھر پتا چلا کہ آپ گروورت نہیں استاد جمالی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چلے گا کہ آپ استاد جمالی بھی نہیں' بڑے گرودوارے کی کوئی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔"

کچھ دیر انسپکٹر دربار سنگھ سے ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہی پھر سفیر احمد نے آ کر دربار سنگھ کو بتایا کہ اس کا بستر لگا دیا ہے۔ اگر وہ آرام کرنا چاہے تو اپنے کمرے میں جا سکتا ہے۔

انسپکٹر دربار سنگھ اٹھتے ہوئے بولا "اچھا جمالی صاحب! اب 'گیا ود' باتیں تو اب ہوتی ہی رہیں گی اور کبھی ملاقاتیں بھی۔" وہ اٹھا تو منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی ساتھ ہی ہاتھ دائیں کولہے پر چلا گیا۔ یہ وہی کولہا تھا جو زریں گل نے زوردار ٹانگ جمائی تھی۔

میں نے کہا۔ "دربار سنگھ' جو کچھ بھی یہاں ہوا ہوا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سفیر احمد کو بھی چوٹ

ہیں۔ بہرحال مجھے اس پر افسوس ہے۔ میں صبح اپنے ساتھیوں سے کہوں گا کہ وہ تم سے معافی مانگیں۔"

وہ خوش دلی سے بولا "معافی کی معافی ہے جمالی صاحب! جب ایک ساتھ چلنا ہو تو دل و دماغ کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ ہم روز تین چار بندوں کی چمڑی ادھیڑ کر سوتے ہیں۔ آج خود کو تھوڑی سی چھینٹیں لگ گئی تو کون سی قیامت آ گئی اور پھر دیکھیں جی' میں نے بھی تو بے خبری میں آپ کے خلاف آپ ہی کے سامنے بہت الٹی سیدھی باتیں کی ہیں۔ لہٰذا سمجھیں کہ حساب برابر ہو گیا۔۔۔ اچھا جی' باقی گل بات کل ہو گی۔۔۔ رب راکھا۔"

انسپکٹر سونے کے لیے بالائی کمرے میں چلا گیا تو میں صوفے پر ہی لیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ کافی گہرا شخص تھا انسپکٹر دربار سنگھ۔۔۔ ابھی تک میں اس کے ذہن میں نہیں جھانک سکا تھا۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ آج کی شب اسے اپنا مہمان رکھ کر ہم نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ کل صبح تک ٹھنڈے دل سے سوچے اور اس کی نیت میں کوئی خرابی ہے بھی تو ٹھیک ہو جائے۔ لیکن اگر خرابی ٹھیک نہ ہوئی تو پھر کیا ہو گا؟ یہ کافی اہم سوال تھا۔ اگر وہ ہمارے خلاف کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کرتا تو میرے خیال میں اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ پولیس فورس جمع کر کے اس کوٹھی پر آئے اور ہمیں پکڑ کر باقاعدہ گرفتاری ڈال دے۔ اس کے بعد ہم سے "عشرت فارم قتل کیس" اور دوسرے الزامات کے سلسلے میں پوچھ گچھ شروع کر دی جائے۔ لیکن اس کام سے انسپکٹر دربار سنگھ جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ شاباشی یا ترقی تھی۔ انسپکٹر دربار سنگھ کی نگاہیں اس سے بہت آگے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ٹرک پر لدے زر و جواہر تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ ہم کو "باقاعدہ" ہاتھ نہ ڈالے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ہم پر قابو پانے کے لیے ذاتی ذرائع استعمال کرے۔ اس جیسے شخص کے لیے مشکل نہیں تھا کہ دس بیس مسلح غنڈے جمع کر لے یا اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ ساتھیوں کے تعاون سے ہم پر چڑھ دوڑے۔ وہ ہمیں اپنی ذاتی تحویل میں رکھ کر ہم سے پوچھ گچھ کر سکتا تھا اور مجبور کر سکتا تھا کہ ہم ٹرک کی تلاش میں اس کی مدد کریں۔

اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ کوٹھی کے شمالی حصے سے چیخ و پکار سنائی دی۔ چیخنے والی عورتیں تھیں اور یقیناً غزالہ و نشا تھیں۔ میں اٹھا اور ایک طویل راہداری سے گزر کر اس خوابگاہ کے سامنے پہنچا جو غزالہ اور نشا کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے وہ دونوں خوابگاہ سے باہر نظر آئیں۔ موسلا دھار بارش کی پروا کیے بغیر وہ صحن میں کھڑی تھیں اور خوابگاہ کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ مجھے خوابگاہ کے اندر سے دھما چوکڑی کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کوئی توپ کے گولے کی مانند دروازے سے نکلا اور صحن کی طرف بھاگا۔ وہ زریں گل تھا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ شلوار کے اوپر اس کا بالائی جسم ننگا تھا۔ زریں گل کے پیچھے ہی پیچھے سائیں جلال خوابگاہ سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی آہنی راڈ تھی۔ یہ وہ بار تھی جو ویٹ لفٹنگ میں پلیٹوں کے درمیان استعمال ہوتی ہے۔ سائیں جلال نے یہ بار دونوں ہاتھوں میں تھام کر سر سے بلند کر رکھی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا کہ زریں گل کے نزدیک پہنچتے ہی اس کا کھوپڑا توڑ دے گا۔ ایک سیکنڈ میں ان دونوں نے وسیع صحن عبور کیا اور کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف چلے گئے۔ میں بھاگتا ہوا ان کے پیچھے گیا۔ بارش کی بوچھار نے ایک لمحے میں مجھے شرابور کر دیا۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں پہنچا تو بوٹا سنگھ نظر آیا۔ وہ بڑی حیرانی سے سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ زریں گل اور سائیں جلال اوپر چلے گئے ہیں۔ میں بھی دو دو زینے پھلانگتا چھت کی طرف لپکا۔ پہلی منزل کے دروازے پر میرا ٹکراؤ انسپکٹر دربار سنگھ سے ہوا۔ اس نے پگڑی اتار رکھی تھی' غالباً بستر سے نکلا تھا۔ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ میں جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

چھت پر پہنچا تو مضحکہ خیز منظر نظر آیا۔ سائیں جلال اور زریں گل میں زبردست کشمکش ہو رہی تھی۔ زریں گل جھکائیاں دے دے کر سائیں جلال کی زد سے نکل رہا تھا اور سائیں جلال اسے گھیرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ پھر زریں گل پھرتی کا مظاہرہ کر کے برساتی پر چڑھ گیا۔ سائیں جلال نے بھی ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی اور برساتی پر پہنچ گیا۔ برساتی پر سے زریں گل کا پاؤں پھسلا اور وہ ہاتھ پاؤں چلاتا نشیب میں گر گیا۔ یہ کوٹھی کا پچھواڑا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ سیدھا پختہ سڑک پر گرے گا اور گرتے ساتھ ہی اپنے آباؤ اجداد کے پاس پہنچ جائے گا لیکن پھر میری ڈھارس بندھی' زریں گل راستے ہی میں کہیں اٹک گیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا' یہ ایک گیلری کی چھت تھی جو بالکونی کی چھت سے تقریباً پندرہ فٹ کی گہرائی پر تھی۔ چھت پر گرتے ہی زریں گل اٹھا اور لنگڑاتا ہوا میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ سائیں جلال نے

ہیجان ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہ برساتی کے کنارے کھڑا ہو کر قہقہے لگانے لگا۔ اس کا انداز تمسخر اڑانے والا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے آہنی بار ایک طرف پھینک دی اور خود بھی برساتی کی چھت سے گیلری کی چھت پر چھلانگ لگا دی۔ لمبے بالوں اور کھلی آستینوں والے لبادے کے ساتھ اس کا برساتی سے گیلری پر چھلانگ لگاتا ہوا آسیب زدہ سا منظر تھا۔ گیلری کی چھت پر پہنچنے سے پہلے وہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ یا شاید جھول سا گیا۔ پھر "پٹاخ" کی آواز آئی اور وہ گیلری کی چھت پر گرا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے گھٹنوں پر معمولی چوٹ آئی تھی لیکن اپنی وجدانی کیفیت میں اس نے چوٹ کی پروا نہیں کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ "پٹاخ" کی آواز کوئی تار ٹوٹنے کی آواز تھی۔ ظاہر ہے وہ بجلی کا تار نہیں تھا ورنہ سائیں عالی کو نقصان پہنچتا یا کم از کم چنگاری چھوٹتی نظر آتی۔ سائیں عالی کچھ دیر گیلری کی چھت پر کھڑا "حق ہو" کے نعرے لگاتا رہا پھر زینے تلاش کر کے نیچے اتر گیا۔

سفیر احمد اور انسپکٹر دربار سنگھ کے علاوہ گھر کے دو ملازم بھی چھت پر پہنچ چکے تھے۔ وہ سب پُر تجسس نظروں سے گیلری کی چھت کی طرف دیکھ رہے تھے اور بارش میں بھیگ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ زریں گل اور سائیں عالی دونوں نیچے چلے گئے ہیں۔ زریں گل کو میں نے بیرونی گیٹ سے باہر نکلتے دیکھ لیا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ وہ سائیں عالی کی یورش سے محفوظ ہو گیا ہے۔ ہم بڑی سیڑھیوں سے نیچے اترے اور سائیں عالی کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ غزالہ نے آکر بتایا کہ سائیں واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا ہے اور چادر اوڑھ کر سکون سے لیٹا ہے۔

انسپکٹر دربار سنگھ بہت حیران نظر آ رہا تھا۔ پوچھنے لگا "کون ہے یہ ملنگ؟ مجھے تو کوئی بڑا خطرناک شخص لگتا ہے۔"

سفیر احمد نے بتایا۔ "یہ پیر و مرشد ہیں۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا بھی تھا۔ بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ سائیں عالی نام ہے ان کا۔"

انسپکٹر دربار سنگھ کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "یہ وہی ہیں جن کے پاس ایکٹریس آتی ہیں۔ ان کے پاؤں دباتی ہیں اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں؟"

سفیر بولا "صرف ایکٹریس اور ایکٹر ہی نہیں بہت بڑے بڑے فنکار اور شہر کے جانے پہچانے لوگ ان کی چوکھٹ پر حاضری دیتے ہیں اور ان کے چرن چھونا اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔"

انسپکٹر دربار سنگھ اب قدرے مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ تاہم اس کے چہرے پر اُلجھن اب بھی باقی تھی۔ پوچھنے لگا۔ "لیکن سائیں صاحب اتنے غصے میں کیوں آ گئے تھے۔ اس موٹے کے پیچھے یوں بھاگ رہے تھے جیسے مار چھوڑیں گے۔"

غزالہ اور رشا دور برآمدے میں کھڑی تھیں اور سنگین صورت حال کے باوجود مسکرا رہی تھیں، مجھے شک ہوا کہ وہ اصل بات سے آگاہ ہیں۔ میں انسپکٹر اور سفیر وغیرہ کو مصروف گفتگو چھوڑ کر ان کے پاس پہنچا۔ غزالہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب ہم اس بیڈ روم میں نہیں سوئیں گی۔ یہ سائیں عالی بہت خطرناک شخص ہے۔ پتا نہیں کس وقت کیا کر دے۔"

"اس نے تمہیں کچھ کہا ہے؟" میں نے غزالہ اور رشا سے ایک ساتھ پوچھا۔

غزالہ نے کہا۔ "ابھی تو صرف اتنا ہی کیا ہے کہ ہمارے بیڈ روم میں گھسا ہے اور ہماری نیند برباد کی ہے۔ اس کے بعد کیا کرے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ دو قدم کے فاصلے پر تو اس کا کمرا ہے۔ اس کے خراٹے تک ہمیں سنائی دیتے ہیں۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

غزالہ بولی "ہمیں تو کچھ خبر نہیں۔ ہم سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اچانک سائیں عالی کی آواز آئی۔ وہ کھڑکی کے عین سامنے آپ کے پٹھان ساتھی سے جھگڑ رہا تھا۔ قمیص کا کوئی چکر تھا، کہہ رہا تھا کہ اس نے اس رنگ کی قمیص کیوں پہنی ہے، پھر ایک دم وہ مشتعل ہو گیا۔ پٹھان کو مارنے کے لیے بھاگا۔ اس سامنے والے برآمدے میں کچھ دیر وہ آگے پیچھے بھاگتے رہے، پھر آپ کا پٹھان ساتھی جان بچانے کے لیے ہمارے بیڈ روم کی طرف آ گیا۔ پتا نہیں اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے بیڈ روم کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اس نے کھڑکی کو دھکا دیا اور اندر آ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کھڑکی بند کرتا، سائیں عالی بھی کسی چھلاوے کی مانند اندر گھس آیا۔ بڑا خطرناک نظر آ رہا تھا وہ۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ خان کو مارنا نہیں صرف ڈرانا چاہتا تھا، اگر وہ مارنا چاہتا تو مختصر سے بیڈ روم میں ایک نہ ایک ضرب خان کو ضرور لگتی اور اس آہنی راڈ کی ایک ضرب بھی بہت تھی۔ ہم چیختی چلاتی بیڈ روم سے باہر نکل آئیں۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خان نے اپنی زرد قمیص اُتار کر پھینک دی ہے لیکن سائیں عالی نے پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور جھپٹ جھپٹ کر اسے مارنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر وہ دونوں آگے پیچھے بھاگتے باہر نکل آئے۔"

رشا نے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر مجھے اندر کا نقشہ دکھایا۔ کافی نقصان ہوا تھا۔ ایک قد آدم آئینہ ٹوٹ گیا تھا۔ کارنس پر رکھے ڈیکوریشن پیس چکنا چور ہو گئے تھے۔ آہنی بار کی ایک بھرپور ضرب نے الماری کا بالائی دروازہ برباد کر دیا تھا۔ ایک کونے میں زریں گل کا وہ زرد کرتہ پڑا تھا جو اس نے سائیں کی مار سے بچنے کے لیے اُتار کر پھینک دیا تھا۔ زریں گل کی ہیئت کذائی یاد کر کے مجھے ہنسی آ گئی۔ میرے خیال میں غلطی زریں گل ہی کی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ بابو لیاقت کی فیکٹری میں بھی ہو چکا تھا۔ زریں گل کی یہی زرد قمیص دیکھ کر سائیں آپے سے باہر ہو گیا تھا اور اسے بمشکل سنبھالا گیا تھا۔ اس وقت میں نے زریں گل کو بتایا تھا کہ سائیں عالی زرد رنگ دیکھ کر اشتعال میں آ جاتا ہے، لہٰذا آئندہ وہ احتیاط کرے۔ غالباً زریں گل کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی اور نتیجے کے طور پر اسے موسلا دھار بارش میں اچھی بھلی ورزش کرنی پڑی تھی۔ یہ "ورزش" بے حد سنگین بھی ثابت ہو سکتی تھی اگر زریں گل برساتی کی چھت سے پھسلنے کے بعد سر کے بل گیلری پر گرتا اور منکا تڑوا بیٹھتا۔

بیڈ روم کی روشنی میں، میں نے غزالہ کو دیکھا اور بے اختیار دوسری بار دیکھنے پر مجبور ہوا۔ بارش میں بھیگنے کے بعد اس کا ہلکا پھلکا لباس جسم ہی کا حصہ بن گیا تھا۔ لمبے گیسو گردن اور چہرے سے چپکے ہوئے تھے۔ دوپٹا اس کے سر پر تھا لیکن اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ مرد کی نگاہ کو "سرگرم عمل" دیکھ کر عورت کی چھٹی حس بڑی سرعت سے کام کرتی ہے۔ میری آنکھوں کی صرف ایک غیر ضروری جنبش نے غزالہ کو سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ غیر محسوس طور پر رشا کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر کئی برس پہلے کی غزالہ میرے تصور میں آن کھڑی ہوئی۔ ایسی ہی بارشوں میں اپنے گھر کی بوسیدہ چھت پر کھڑے ہو کر میں غزالہ کے خوشنما صحن میں جھانکا کرتا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھریرے جسم کی مالک تھی لیکن اس کے بال ایسے ہی لمبے تھے اور اس کے سرخ رخساروں پر ایسے ہی دیپ جلتے تھے۔ میں ان شعلوں پر لب رکھنے کو کتنا ترستا تھا اور میری انگلیاں ان ریشمی بالوں میں سرسرانے کو کیسے مچلا کرتی تھیں۔ آج یہ سب کچھ میری دسترس میں تھا لیکن میرے دل میں ایک ایسی گرہ پڑ چکی تھی جو کھولے نہیں کھلتی تھی۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی مجبور تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ بارش کا زور کم ہو گیا تھا لیکن وہ رکی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد زریں گل بھی واپس آ گیا۔ اس نے اپنی اور سائیں عالی کی زبردست بھاگ دوڑ کے بارے میں وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے غزالہ ہمیں بتا چکی تھی۔ سائیں عالی کے اشتعال کا سبب وہی زرد قمیص بنی تھی جو اس سے پہلے بھی ایک دفعہ سائیں کو بھڑکا چکی تھی۔

میں نے سفیر احمد سے مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ زریں گل بیرونی گیٹ پر پہرا دے گا جب کہ بوٹا سنگھ اور ادریس نامی ایک ملازم بالائی منزل پر موجود رہیں گے۔ سفیر احمد چاہتا تھا کہ صبح تک ہر طرح خیریت رہے۔ علی الصباح انسپکٹر دربار سنگھ کے یہاں سے جاتے ہی وہ ہم کو اپنے ایک دوست کے گھر منتقل کر سکتا تھا۔ اگر انسپکٹر دربار سنگھ تھانے واپس پہنچ کر کوئی چکر چلانے کی کوشش کرتا بھی تو ہم اسے اس کوٹھی میں نہ ملتے۔

میں اس کمرے میں آکر لیٹ گیا جہاں روز ہی سوتا تھا۔ لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اُٹھ کر سگریٹ سلگا لیا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد چہل قدمی سے بھی اُکتا گیا۔ زریں گل بیرونی گیٹ پر موجود تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے اپنے پاس بلا لیا کہ گفتگو کے ذریعے وقت کاٹنے کی کوشش کی جائے۔ میں زریں گل سے کوچی لڑکی اور ان دو ملازمین کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ جنہیں ہم عشرت فارم سے اپنے ساتھ بابو کی فیکٹری میں لے آئے تھے۔ زریں گل سے باتیں کرتے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک میں چونک گیا۔ یوں لگا کہ اپنی بے قراری کا سبب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ بالائی منزل پر ایک ٹیلی فون سیٹ موجود ہے۔ وہ چالو حالت میں تھا۔ اگر انسپکٹر دربار سنگھ کی نیت واقعی خراب ہوتی اور وہ کسی طرح اس ٹیلی فون تک رسائی حاصل کر لیتا تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا تھا۔ ہم سے ایک سنگین غلطی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی نم آلود پتلون ٹٹول کر پستول کی موجودگی کا یقین کیا اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا "استاد صاحب، کدھر جاتا ہے؟" زریں گل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم گیٹ پر پہنچو، میں ابھی آ رہا ہوں" میں نے تیزی سے کہا اور باہر نکل آیا۔

سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں بالائی منزل پر پہنچا۔ ایک کمرے میں بوٹا سنگھ صوفے پر نیم دراز تھا اور باریک آواز میں کوئی پنجابی لوک گیت گنگنا رہا تھا۔ اس کے سامنے ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس راہداری کی طرف بڑھا جو اندرونی کمروں

کی سمت جاتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ٹیلی فون جس کمرے میں رکھا تھا اس کے عین سامنے والا کمرا انسپکٹر دربار سنگھ بیڈ روم کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ٹیلی فون والا کمرا مقفل تھا۔ اگر دربار سنگھ فون والے کمرے میں گھسنا چاہتا تو اس کے لیے تالا توڑنا ضروری تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا انسپکٹر دربار سنگھ کے کمرے کے سامنے سے گزرا اور ٹیلی فون والے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہاں روشنی بہت مدھم تھی' میں نے نیچے جھک کر تالے کا جائزہ لیا اور سناٹے میں رہ گیا۔ تمام تر اندیشے ایک ہی پل میں درست ثابت ہو گئے تھے۔ تالا اپنی جگہ موجود تھا لیکن جس کنڈی میں وہ لگا ہوا تھا اسے پیچ کھول کر اکھاڑ لیا گیا تھا۔ یہ کام اسکریو ڈرائیور کے ساتھ مہارت اور طاقت سے کیا گیا تھا۔ میں نے اپنا لوڈڈ پستول ہاتھ میں لے لیا اور کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر تاریکی تھی' کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہیں دی۔ میں نے بہ آہستگی دروازے پر دباؤ ڈالا اور اسے کھولتے ہوئے اندر چلا گیا۔

ایک دو لمحوں کے لیے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی ہے لیکن پھر یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ کمرا مکمل طور پر خالی تھا۔ صحن کی جانب سے آنے والی روشنی میں کمرے کے خدوخال پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ میں محتاط قدموں سے ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔ ٹیلی فون کے ڈائل پر ایک چھوٹا سا خوبصورت تالا لگا تھا۔ یہ تالا بھی کھلا پڑا تھا۔ اسے چابی سے نہیں کھولا گیا تھا۔ کیونکہ تالے کا میکنزم اس طرح کا تھا کہ تالا کھلنے کے بعد چابی اس میں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تالے کو کھولنے کے لیے کوئی تار یا پن وغیرہ استعمال کی گئی تھی۔ اب اس بات میں شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے انسپکٹر دربار سنگھ یہاں داخل ہوا ہے ور اس نے فون کیا ہے۔ صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکی پر آہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ادریس نامی ملازم اندر جھانک رہا ہے۔ اس کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی جسے بارش سے بچانے کے لیے اس نے پولی تھین سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی میں سے اس نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور مجھے پہچان لیا۔

"کیا بات ہے صاحب؟" اس نے دبے لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ تم ہوشیاری سے پہرا دو۔ کسی کو کوٹھی سے نکلنا چاہیے اور نہ اندر آنا چاہیے۔"

"بہتر صاحب" اس نے سراسیمہ لہجے میں کہا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ اگر دربار سنگھ فون کر چکا تھا تو عنقریب ہم سب سخت مصیبت سے دوچار ہونے والے تھے۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور فون سننا چاہا۔ ایک دم آنکھوں کے سامنے اُمید کی کرن طلوع ہوئی۔ ذہن میں سر اٹھانے والے مہیب خدشات پس منظر میں چلے گئے۔ میں نے تین چار بار کریڈل دبایا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ فون "ڈیڈ" ہے۔ یہ بے حد خوش آئند صورت حال تھی۔ فون تک پہنچ جانے کے باوجود انسپکٹر اسے استعمال کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اسے ایک خوبصورت اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا۔ صرف سات آٹھ گھنٹے پہلے میں نے خود یہ فون استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ بالکل ٹھیک تھا۔ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر جھولتے ہوئے ایک ... پڑی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا' یہ ٹیلی فون کا تار تھا جو ... کی چھت سے ٹوٹ کر نیچے لٹک رہا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب سائیں عالی نے برساتی کی چھت سے چھلانگ لگائی تھی اور ایک تار کو توڑتا ہوا نیچے آیا تھا۔ یقیناً وہ یہی تار تھا۔ میں کچھ دیر حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ سائیں عالی کی ہر حرکت اور بات کے پیچھے کوئی حکمت پوشیدہ ہے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا نادانستہ کرتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے اکثر افعال میں معنی و مقصد ہوتا تھا۔ جیسے کوئی پراسرار قوت اس کے سنگ سنگ چلتی ہو اور اس سے کرشمہ سازیاں کرواتی ہو۔ میں فطرتاً حقیقت پسند ہوں اور زندگی کے ٹھوس پہلوؤں پر یقین رکھتا ہوں۔ بالفاظ دیگر ہر معاملے میں میرا نقطۂ نظر سائنسی ہوتا ہے لیکن نجانے کیوں سائیں عالی کو دیکھ کر میں ایک عجیب سی کشمکش کا شکار ہو جاتا تھا۔ اب یہ تار والا معاملہ بھی غور و فکر کا تقاضا کرتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ صرف ایک اتفاق ہی ہو لیکن اگر اتفاق بھی تھا تو بہت حیرت انگیز تھا۔

میں چند لمحے "مرحوم ٹیلی فون" کے قریب کھڑا سوچتا رہا پھر دبے پاؤں چلتا کمرے سے نکلا اور اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جو آج رات انسپکٹر کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

چند لمحے بعد دروازے کے بالکل قریب سے انسپکٹر دربار سنگھ کی کھانسی سنائی دی اور دروازہ کھول دیا گیا۔ انسپکٹر دربار سامنے کھڑا تھا۔ اس کی بدنیتی ثابت ہو چکی تھی۔ اب اس سے رعایت کی کوئی گنجائش تھی نہ ضرورت۔ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ اچھل کر بیڈ پر گرا اور لڑھک کر دوسری طرف نکل گیا۔ اس کا پستول زریں گل اور بوٹا سنگھ نے رات پہلے پہری چھین لیا تھا' اب وہ نہتا تھا۔ میں نے بھی

اپنا پستول لاک کر کے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور خم ٹھونک کر انسپکٹر دربار سنگھ کے سامنے آ گیا۔ اسے اپنے کرتوت کا علم تھا لہٰذا وہ میرے رویے پر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ قالین پر گرتے ہی وہ اسپرنگ کی مانند اچھل کر کھڑا ہوا اور بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ اگر مجھے اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو دربار سنگھ کا ہیوی ویٹ مکا مجھے شب تاریک میں خورشید کا دیدار کرا دیتا۔ وار خالی گیا تو دربار سنگھ اپنے ہی زور میں سائیڈ ٹیبل سے جا ٹکرایا۔ ٹیبل پر رکھی ہوئی شیشے کی ایک خوبصورت مورتی کا تصادم دیوار سے ہوا اور مورتی دو نیم ہو گئی۔ مورتی کا قریباً ایک فٹ لمبا ٹکڑا دربار سنگھ کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ ٹکڑا آگے سے برچھی کی طرح نوکیلا اور سخت تھا' بے حد جنونی انداز میں دربار سنگھ نے اس "برچھی" سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے دو وار بمشکل بچائے اور تیسرا وار ایک تکیے پر روک کر دربار سنگھ کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ گرا لیکن مورتی کا خطرناک ٹکڑا بدستور اس کے ہاتھ میں رہا۔ بیلجئم کی بنی ہوئی یہ حسین مورتی میں نے اس کمرے میں دو تین دفعہ دیکھی تھی۔ ایک ہندوستانی دوشیزہ کو مجسم کیا گیا تھا۔ وہ نہایت مہین لباس پہنے کولھے پر پانی کا گھڑا ٹکائے کھڑی تھی۔ مجسمہ ساز نے بڑی بے باکی سے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو قیامت بنا دیا تھا۔ ایسے سراپا کو شاعر لوگ "قاتل" کہتے ہیں۔ اس وقت یہ سراپا میرے لیے حقیقی معنوں میں "قاتل" بنا ہوا تھا۔ اس بلوری برچھی کی ایک بچی تلی ضرب کسی بھی شخص کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔ قالین پر گرتے ہی دربار سنگھ نے پھرتی سے کروٹ لی اور اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا۔ میں اس لمحے کی قدر و قیمت کو سمجھتا تھا۔ دو قدم بھاگ کر میں نے جست کی اور ڈبل بیڈ کے اوپر سے ہوتا ہوا یوں انسپکٹر پر گرا جیسے "پیراک" سوئمنگ پول میں گرتا ہے۔ دربار سنگھ اٹھتا اٹھتا پھر "قالین بوس" ہو گیا۔ میرے وزن اور "مومینٹم" نے اسے اچھا خاصا نقصان پہنچایا۔ اس کا سر بیڈ کے کنارے سے ٹکرایا اور اس کے جوڑے میں سرخ پھول کھل اٹھا۔ دربار سنگھ کے ہونٹوں سے مغلظات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ میرے نیچے دبا ہونے کے باوجود وہ اندھا دھند مزاحمت کرنے لگا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے مورتی کا ٹکڑا چھڑوایا پھر گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ شور و غل نے کوٹھی کے سارے مکینوں کو اس کمرے میں کھینچ لیا تھا اور اب وہ انسپکٹر دربار سنگھ کی درگت بنتے دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر ایک خطرناک مدمقابل تھا۔ مجھے اس کے پہلے وار ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر میں نے اسے ذرا سی بھی مہلت دی تو کھیل بگڑ جائے گا۔ میں نے پہلی فرصت میں اسے ناک آؤٹ کیا اور زریں گل کے ساتھ مل کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ ہاتھ باندھنے کے لیے وہ پگڑی استعمال کی گئی جس میں زریں گل اپنا سرخ رومال چھپا کر یہاں پہنچا تھا۔

انسپکٹر دربار سنگھ کا منہ ایک گٹر کا دہانہ تھا جس میں سے غلاظت گالیوں کی شکل میں اُبل رہی تھی۔ وہ ہم سب کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ پہلے سفیر احمد کو للکارتا رہا کہ اس نے دوست ہو کر اس سے دھوکا کیا ہے' پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تو بڑا استاد بنا پھرتا ہے۔ ہمارے لیے کل کا بچہ ہے تو۔ تیری ساری استادی ناک کے راستے نہ نکال دی تو اپنے باپ کا نہیں میں۔ پتا نہیں تیرا واسطہ اب تک کن پولیس والوں سے پڑتا رہا ہے۔ میں بھاگنے والا ہیجڑا تھانے دار نہیں ہوں' ٹانگیں چیر کر پھینک دینے والا تھانے دار ہوں۔ ہم لوگ تین نسلوں سے پولیس میں ہیں اور تیرے جیسے گھمنڈیوں سے اپنے جوتے چٹوا رہے ہیں۔"

انسپکٹر دربار سنگھ کی زبانی بڑھکوں کا مجھ پر کیا اثر ہونا تھا۔ ایسی بہت بڑھکیں سن رکھی تھیں میں نے۔ پنچھی جب پنجرے میں آتا ہے تو کچھ دیر بہت پھڑپھڑاتا ہے چوں چراں کرتا ہے پھر نڈھال ہو جاتا ہے اور سر ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ انسپکٹر دربار سنگھ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی ہے اور وہ بُری طرح پھنس گیا ہے۔ یہ شور و غل جو وہ مچا رہا تھا' شور و غل نہیں تھا' وہ ماتم تھا اس بدبختی کا جو اس سیاہ شب کی بطن سے اس کے لیے پھوٹی تھی اور امربیل کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔

صبح کے تین بجنے والے تھے۔ دربار سنگھ کی گالیاں سن سن کر مجھ پر عجب سی وحشت طاری ہو چکی تھی۔ میں نے زریں گل اور ملازم ادریس کے سوا سب کو کمرے سے نکال دیا ـــــ ہم نے دربار سنگھ پر صرف آدھ گھنٹا صرف کیا۔ یہ بہت تھوڑا وقت تھا لیکن بڑی دلجمعی اور توجہ سے لگایا گیا تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے اندر دربار سنگھ کے رگ و پے میں "تین نسلوں" سے بسی ہوئی ساری اکڑ فوں پانی کی طرح بہہ گئی۔ مسلسل غلاظت اگلنے والا گٹر بند ہو گیا اور اس کی شعلہ فشاں آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔ اس کایا پلٹ کی قیمت صرف ڈھائی انگلیاں تھیں۔ ڈیڑھ بائیں ہاتھ کی اور ایک دائیں ہاتھ کی۔ یہ انسپکٹر دربار سنگھ کی

انگلیاں تھیں جو میں نے اسے اوندھا لٹا کر بوٹا سنگھ کی تیز دھار کرپان سے کاٹی تھیں۔ دوسروں پر تشدد کی انتہا کرنے والا اور انھیں تھرڈ ڈگری کی چکی میں پیسنے والا جب خود اذیت کے شکنجے میں کسا گیا تھا تو تھوڑی ہی دیر میں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ انسان لاکھ حساس اور زود فہم ہو لیکن کسی کیفیت کا صحیح ادراک اس وقت تک نہیں ہوپاتا جب تک وہ کیفیت خود پر نہ گزرے۔ دربار سنگھ کو بھی آج احساس ہوا تھا کہ اذیت کسے کہتے ہیں اور اس کی بلند و بالا لہروں کے سامنے تین نسل پرانا "پھلیا" کس طرح گھٹنے ٹیکتا ہے۔

دربار سنگھ کے ہاتھوں سے بہتا خون روکنے کے لیے بوٹا سنگھ کی پگڑی استعمال کی گئی تھی۔ پھر اسی پگڑی کی پٹیاں پھاڑ کر اس کی انگلیوں پر باندھ دی گئی تھیں۔ اب دربار سنگھ کے دونوں ہاتھ دو بڑی پٹیوں کے ذریعے گردن میں جھول رہے تھے اور تھر تھر کانپتے جارہے تھے۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد تھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے خون آلود قالین پر بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

میں نے کرسی اس کے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔

"وہ چیچ کس کہاں ہے جس سے تم نے کنڈی اکھاڑی؟"

اس نے آنکھوں سے اس تکیے کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک گھنٹا پہلے میں نے دربار سنگھ کا ایک جان لیوا وار روکا تھا۔ وہ پھٹا ہوا تکیہ اب بیرونی دروازے کے پاس پڑا تھا۔ میرے اشارے پر زریں گل آگے بڑھا اور اس نے تکیے کے غلاف میں سے پیچ کس نکال لیا۔ میں نے پوچھا۔ "ٹیلی فون کا تالا کیسے کھولا؟"

"کمرے کے اندر سے ہی لوہے کا تار مل گیا تھا۔" دربار سنگھ نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں اس نے جو لرزہ خیز چیخ و پکار کی تھی اس کے سبب اس کی آواز بالکل بیٹھ گئی تھی۔

"تم کہتے ہو کہ فون ڈیڈ تھا پھر تمہیں تالا کھولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے بعد میں پتا چلا کہ فون ڈیڈ ہے" دربار سنگھ نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے" زریں گل نے لقمہ دیا۔ "ہمارا خیال ہے کہ دو بارہ بجے کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ اور بارہ بجے تو ۔۔۔ ایسے ہی کام ہو سکتے ہیں"

میں نے خون آلود کرپان دربار سنگھ ہی کے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم یہ فون تھانے میں تمہیں اپنے گہنت نامی دوست کو کر رہے تھے' اسے یہاں بلانے سے کیا مقصد تھا؟"

دربار سنگھ نے کرپان سے نظریں چراتے ہوئے کہا "میں ۔۔۔ تمہیں ذاتی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا' لہٰذا میں نے سوچا کہ تم لوگوں کو میلے کی مدد سے گرفتار نہ کروں۔"

"ذاتی تحویل میں رکھ کر تم کیا کرتے؟"

"تم سے ٹرک کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا۔ اور ۔۔۔ اور کوشش کرتا کہ تم لوگ ۔۔۔ میرے ساتھ مل کر ٹرک تلاش کرو۔"

"تمہارے ساتھ مل کر تو ہم کر رہے تھے اور رات پہلے پہر کی بات ہوئی تھی۔"

"لیکن مجھے وشواس نہیں تھا۔ میرا وچار تھا کہ مجھ سے دھوکا ہوگا۔"

میں نے دو سگریٹ سلگا کر ایک اس کے ہونٹوں سے لگایا اور کہا "تم نے اعتراف کیا ہے کہ ٹرک کے حوالے سے تمہارے پاس کچھ ایسی معلومات ہیں جن کا ذکر تم نے اپنی تفتیشی رپورٹ میں کہیں نہیں کیا۔"

وہ بولا "میں نے یہ بات ٹرک کے بارے میں نہیں' 22 مارچ والی واردات کے بارے میں کہی تھی۔"

"چلو' واردات کے بارے میں ہی سہی ۔ کیا معلومات ہیں وہ؟"

وہ بولا "میں اپنے من میں کوئی بھی کھوٹ لائے بغیر تمہیں وہ معلومات دینے کو تیار ہوں اور یہ وشواس بھی دلاتا ہوں کہ جو جانکاری میں دوں گا وہ تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی لیکن اس کے بدلے مجھے کیا ملے گا؟"

میں نے زریں گل سے کہا۔ "لگتا ہے' اس کی ایک آدھ انگلی اور کاٹنا پڑے گی" میری بات سن کر دربار سنگھ کا زرد رنگ کچھ اور زرد پڑ گیا۔ تاہم وہ منہ سے بولا کچھ نہیں۔ میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ "دربار سنگھ! تو اس وقت کوئی شرط نہ رکھ' ورنہ میرا دماغ پھر الٹ جائے گا۔"

زریں گل نے لقمہ دیا "تیرے لیے سودے بازی کا وقت گزر چکا ہے خوچے ۔۔۔ اب جو ہمارا استاد صاحب پوچھتا ہے وہ چپ چاپ بتاتا جا۔ چل شاباش ۔۔۔ اللہ تجھے حج کرائے گا۔"

دربار سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پہلو بدل کر بولا۔ "میں اپنی جان چھڑانے کے لیے تمہیں غلط ملط بھی بتا سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی' میرا بھرپور تھپڑ اس کے

گال پر پڑا اور رخسار پر پنجاب کا نقشہ بن گیا۔ "تو غلط بتا کر دیکھ۔ الٹا لٹکا کر موسیائی نہ نکال دوں تو کہنا۔ تو تین نسلوں سے تھانے دار ہے تو میں نے بھی بڑی بڑی تیز می نسل کے کتوں کی دُم سیدھی کی ہے۔"

ایک جھٹکے کے ساتھ میں نے اس کے دائیں ہاتھ سے پٹی اتار کر پھینکی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی اور کٹی ہوئی انگلی کے نصف انچ لمبے ٹنڈ سے گاڑھا خون بہنے لگا۔ دربار سنگھ نے بے ساختہ اپنا ہاتھ عقب میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے کی زردی اب انتہا کو چھو رہی تھی۔ کسی ایسے مردے سا چہرہ تھا جس کا سارا لہو اس کے زخموں کے راستے بہہ گیا ہو۔ میں نے کرپان سنبھالی اور زریں گل سے کہا "زریں! ذرا بچھاؤ اس پانے خاں کو قالین پر۔" اس جملے میں ایک ذلت آمیز گالی بھی شامل تھی۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ دربار سنگھ اپنی رہی سہی ہمت جمع کرکے مجھ پر ٹوٹ پڑے گا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں بھڑکنے والی چنگاری شعلہ بنے بغیر بجھ گئی۔

وہ منمنایا "کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "وہی' جو تمہیں 22 مارچ والی واردات کے حوالے سے معلوم ہے ۔۔۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھو' کانٹھ کے الو نہیں ہیں ہم۔ جو کچھ تمہاری گندی زبان سے ادا ہوگا' ہم اس کی پوری تصدیق کریں گے' اس کے بعد ہی تمہیں رہا کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سوچا جائے گا۔"

دربار سنگھ نے راہ راست پر آنے میں تین چار منٹ مزید صرف کیے۔ آخر وہ بات اس کی زبان پر آ گئی جسے وہ نہ جانے کب سے چھپائے پھرتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالات کی مدد سے جو کچھ پوچھا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ "قریباً پندرہ روز پہلے فرید کوٹ تھانے کے ایڈریس پر انسپکٹر دربار سنگھ کو ایک خط موصول ہوا تھا۔ ڈاک کے ذریعے آنے والا یہ خط ایک گمنام عورت کی طرف سے تھا۔ عورت پڑھی لکھی محسوس ہوتی تھی اور اس نے مناسب الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا۔ اپنے خط میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس شخص کو جانتی ہے جو اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ 22 مارچ کی شب عشرت فارم میں داخل ہوا اور لوٹ مار کی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک دو روز میں خود پولیس اسٹیشن آکر ساری بات بتائے گی' لیکن اس شرط پر کہ اس کا نام صیغہ راز میں رکھا جائے اور اس سارے معاملے میں مکمل رازداری برتی جائے۔ یہ خط 27 مارچ کو لکھا گیا تھا لیکن ٹھیک دو روز بعد اطلاع دینے والی نے نامعلوم وجہ سے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا تھا اور دوسرا خط انسپکٹر دربار سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر بھی فیروز پور کے ایک نواحی ڈاک خانے کی مہر لگی تھی۔ تحریر پہلے خط کی طرح شکستہ تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والی نے اپنی "تحریر" تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس خط میں کہا گیا تھا کہ اپنی مجبوریوں کے سبب وہ پولیس اسٹیشن نہیں آسکتی اور نہ ہی کسی اور طریقے سے انسپکٹر دربار کے ساتھ رابطہ کر سکتی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ جس شخص کے متعلق اطلاع دینا چاہتی ہے وہ پیر لنگر شاہ کے میلے میں آئے گا اور میلے کے آخری روز تانگوں کی دوڑ میں شرکت کرے گا۔ اطلاع دینے والی نے اس شخص کا نام پتا نہیں لکھا تھا۔ لیکن اس کی اتنی واضح نشانیاں بتا دی تھیں کہ اسے ان نشانیوں کی مدد سے پہچاننا بہت آسان تھا۔ اس نے پورے یقین سے لکھا تھا کہ میلے کے آخری روز وہ شخص سرخ تہبند قمیص اور مشری واسکٹ میں آئے گا۔ اس کے سر پر ریشمی تاروں والی سرخ پگڑی ہوگی۔ وہ تیس بتیس سال کا لمبا چوڑا شخص ہے' بال چھوٹے' مونچھیں گھنی اور رنگ سرخ و سپید ہے۔ مزید بتایا گیا تھا کہ اس کے پاس کرپان یا لاٹھی ہوگی لیکن اس کا اصل اسلحہ وہ ماؤزر ہوگا جو اکثر اس کے لباس میں چھپا رہتا ہے۔ خط کے آخر میں پھر لکھا گیا تھا کہ اس تحریر کو مذاق نہ سمجھا جائے ۔۔۔ وہ شخص آخری روز میلے میں ضرور آئے گا اور وہی اس واردات کا اصل مجرم ہے۔ ان دونوں خطوط کی موصولی کے بعد انسپکٹر دربار سنگھ نے کھوج لگانے کی کوشش کی تھی کہ خط کس نے لکھے ہیں اور کس کے بارے میں لیکن اسے مکمل ناکامی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے جس شخص کے بارے میں مخبری کی گئی ہے وہ ہر سال تانگوں اور ریڑھوں کی دوڑ میں حصہ لیتا ہو۔ اس نے میلے کے منتظمین سے رابطہ کیا تھا اور کھوج لگانے کی کوشش کی تھی مگر یہاں بھی تفتیش آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

یہ میلہ ہر سال اپریل کے شروع میں فرید کوٹ کے ایک نواحی گاؤں لنگر وال میں ہوتا تھا۔ مویشیوں کی ایک بڑی منڈی بھی لگتی تھی۔ رسہ کشی اور تانگا ریس اس میلے کے دو اہم آئٹم تصور کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کھیل تماشے اور رنگا رنگ دلچسپیاں اس میلے کا خاصہ تھیں۔ اس دفعہ یہ میلہ ۱۷ سے ۲۲ تاریخ تک لگ رہا تھا۔ اس حساب سے میلے کی اصل گہما گہمی شروع ہونے میں ابھی سات آٹھ روز باقی تھے۔"

یہ ساری باتیں بتانے کے بعد انسپکٹر دربار سنگھ نے مجھے وہ دونوں خطوط بھی دکھا دیے جو اسے گمنام عورت کی طرف

سے موصول ہوئے تھے۔ کاپی سائز کے صفحے پر بال پوائنٹ سے لکھا گیا تھا۔ الفاظ اس قفل کی مانند دکھائی دیتے تھے جو بے حد تیز ہوا کے سبب کھیت میں گرتی نظر آرہی ہو۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر ہینڈ رائٹنگ بگاڑی گئی ہے۔ انسپکٹر دربار سنگھ نے دونوں خطوط تعویذوں کی طرح موڑ کر اپنے جوتے کی ایک خفیہ تہ میں چھپا رکھے تھے۔ میں نے پڑھنے کے بعد یہ خطوط اپنے پاس رکھ لیے۔

دربار سنگھ میرے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو زیادہ سے زیادہ فائدہ اس سے حاصل کیا جاسکتا ہے کرلیا جائے۔ وہ ایک بدمعاش تھانے دار تھا اور شرافت کے ساتھ اس پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ میں نے اس سے چند سادہ کاغذات پر دستخط کرالیے پھر ایک ایسے ہی کاغذ پر اس سے ایک رقعہ لکھوایا۔ یہ رقعہ اس کے سب انسپکٹر کے نام تھا۔ رقعے میں لکھا گیا تھا کہ فلاں فلاں حوالاتیوں کو شخصی ضمانتوں پر چھوڑ دیا جائے اور تاحکم ثانی ان کو کسی طرح تنگ نہ کیا جائے۔ ان حوالاتیوں میں بابو لیاقت کی والدہ، اس کا ایک بھائی، دو برادر نسبتی اور چند قریبی ساتھی شامل تھے۔ رقعے میں انسپکٹر دربار سنگھ کی طرف سے یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اسے تفتیش کے سلسلے میں فوری طور پر فرید کوٹ سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ دو تین روز لگ جائیں۔

یہ رقعہ میں نے علی الصباح اس نوجوان کے ہاتھ تھانے بھیج دیا جس نے رات بوٹا سنگھ اور زریں گل کے ساتھ مل کر کوٹھی پر دھاوا بولا تھا۔ یہ نوجوان ابھی تک پولیس کے لیے اجنبی تھا۔ رقعہ بھیجنے کے پندرہ بیس منٹ بعد میں نے انسپکٹر دربار سنگھ سے تھانے میں فون بھی کروا دیا۔ فون پر بھی مختصراً وہی باتیں کہی گئیں جو رقعے میں لکھی گئی تھیں۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ نہ صرف بابو کی والدہ اور خیر خواہ رہا ہو جائیں گے بلکہ ایک دو دن انسپکٹر دربار سنگھ کی گمشدگی کا نوٹس بھی نہیں لیا جائے گا۔ انسپکٹر کی جیپ ابھی تک باہر پورچ میں کھڑی تھی۔ میں نے جیپ ایک گیراج میں بند کروا کے باہر سے تالا لگوا دیا۔ ان کاموں سے فارغ ہوکر میں نے غزالہ سے دربار سنگھ کے زخمی ہاتھوں کی مرہم پٹی کروائی۔ غزالہ حیران تھی کہ زخمی کی انگلیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس نے زریں گل کے ہاتھوں سے ایک تیز دھار کرپان چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس جواب سے غزالہ کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ بینڈیج کرتے ہوئے گاہے گاہے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی، تاہم اتنی ہمت اسے نہیں ہوئی کہ مجھ سے سوال جواب کرتی۔

○☆○

سر کی چوٹ کے سبب صبح تک سفیر احمد کا چہرہ سوج چکا تھا۔ وہ کچھ متفکر بھی نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے فکر اسی بات کی تھی کہ میں نے ایک تن ذیوٹی پولیس انسپکٹر کو بری طرح مار پیٹ کر اور زخمی کرکے "مہمانِ بالجبر" بنالیا تھا۔ یہ ایک طرح سے مقامی پولیس کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ سفیر احمد نے انسپکٹر دربار سنگھ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ پوری فیملی پولیس لائن میں ہے۔ کوئی انسپکٹر ہے کوئی ڈی ایس پی۔ بہت سخت لوگ تھے یہ۔ ایک بار جس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اسے قبر کی دیواروں تک پہنچاتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ باتیں ایک ایسا شخص کر رہا تھا جس کا اپنا بھائی (حاجی بادشاہ) پولیس کا ایک معروف اور وہنگ افسر تھا۔

ناشتے کے بعد میں، زریں گل اور بوٹا سنگھ کے ساتھ علیحدہ کمرے میں جا بیٹھا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ ۲۲ مارچ کو ہونے والی واردات کی اکلوتی گواہ وہ گونگی لڑکی تھی جسے ہم عشرت فارم سے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ گونگی بہری ہونے کے علاوہ وہ اَن پڑھ بھی تھی۔ ایسے شخص سے کچھ پوچھ لینا کار دارد ہوتا ہے اور پھر وہ لڑکی تو نیم پاگل بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ وہ گھنی مونچھوں والے کسی شخص کو دیکھ کر کیسے روتی چلاتی تھی۔

میرے پوچھنے پر زریں گل نے بتایا "لڑکی کا حالت اب کافی سنبھل گیا ہے۔ وہ امارے ساتھ ہی ڈاک بنگلے کے تہ خانے میں رہ رہا ہے۔ وہ دونوں آدمی بھی ساتھ ہے جسے ام عشرت فارم سے پکڑ کر لایا تھا۔ ان میں سے ہیر سنگھ کو ایک روز بابو لیاقت نے کافی تھپڑ بھی مارا تھا لیکن وہ یہی کہتا رہا ہے کہ اسے واردات کا کچھ پتا نہیں۔ بابو لیاقت گونگی لڑکی سے بھی پوچھ گچھ کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی ہاتھوں کے اشاروں اور "غوں غاں" کی آوازوں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جلد ہی رونے لگ جاتا ہے۔"

بوٹا سنگھ نے اپنے میلے کچیلے کُرتے سے آنکھوں کی گیڈ صاف کرتے ہوئے کہا "بڑی عجیب گزری ہے جی۔ لڑکی کیا ہے ڈراسیاپا ہے۔ کوئی ڈانٹے تو بھی روتی ہے، پریم سے بات کرے تو بھی روتی ہے اور خود کچھ کہنے کا جتن کرے تو بھی اس کا رونا نکل جاتا ہے۔ بابو لیاقت صاحب نے بڑا مغز کھپایا ہے اس سے۔۔۔ لیکن لگتا ہے کوئی کام کی بات انہیں بھی معلوم نہیں ہوسکی۔"

میں نے کہا "اس لڑکے ہیر سنگھ اور اس کے چاچے نے

کیا بتایا ہے؟"

بوٹا سنگھ اپنی باریک آواز میں بولا "وہ دونوں وہی کہہ رہے ہیں جو پہلے روز کہا تھا۔ یعنی وہ قتل کی رات شام چھ بجے سے رات بارہ بجے تک ٹیلی پر رہے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ ان کے بعد ڈیرے پر کیا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ گونگی ہی کچھ بتا سکتی ہے لیکن ابھی اس کے حواس ٹھیک نہیں۔ اس کے ہوش حواس ٹھکانے آنے تک انتظار کرنا ہوگا۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اچانک ایک خیال آگیا تھا۔ دربار سنگھ کو مخبری کرنے والی عورت نے اپنے خط میں اس شخص کا حلیہ لکھا تھا جو اس کے نزدیک ۲۲ مارچ کی واردات کا ذمے دار تھا۔ اس حلیے میں سرخ تہبند قمیص اور پگڑی کے علاوہ گھنی اور بڑی بڑی "مونچھوں" کا ذکر بھی آیا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا واقعی گونگی لڑکی اور گمنام خطوط میں کوئی تعلق تھا۔ میرا ذہن سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار خطوط کے الفاظ گھومنے لگے۔ میں نے دیوار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ یہ ۳ تاریخ تھی۔ نڑوال گاؤں میں پیر لنگر شاہ کا میلہ شروع ہونے میں ابھی آٹھ دن باقی تھے۔

یہ آٹھ روز ہم نے اسی کوٹھی میں گزارے۔ انسپکٹر دربار سنگھ اس کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں مقید تھا اور سارا سارا دن لمبی تان کر سو رہا تھا۔ سائیں عالی اور زریں گل میں آنکھ مچولی جاری رہتی تھی۔ زریں گل نے اس روز سے کوئی زرد کپڑا پہننے سے توبہ کرلی تھی تاہم سائیں عالی اب بھی اسے دیکھ کر جلال میں آجاتا تھا۔ غزالہ اور ریشاں دو مختلف مزاج اور کردار کی لڑکیاں تھیں لیکن وقت کی مجبوری تھی۔ ان دونوں کو ہروقت ایک ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ نجانے ریشاں سے کب اس نے کہہ دیا تھا کہ میرے اور غزالہ کے درمیان کوئی رومانی تعلق تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شوخی سی ابھر آتی تھی اور وہ بہانے بہانے سے غزالہ کا ذکر کرنے لگتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہہ ہی دیا "جہانی جی! اتنی سندر اور اچھی جیون ساتھی آپ کو بیس جنم میں بھی نہیں ملے گی۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ وہ آپ سے پیار کرتی ہے۔ میں کہتی ہوں اسے جلدی سے شادی کی انگوٹھی پہنا کر دل کے کتاب میں بند کرلیجیے۔"

میں نے اس شوخ بات کا جواب سرد مہری سے دیا تو ریشاں سمجھ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے اور آئندہ کے لیے محتاط ہوگئی۔

ان آٹھ دس دنوں میں مجھے جس فکر نے سب سے زیادہ تنگ کیا وہ "مستمن" کی فکر تھی۔ اس کا منحوس چہرہ بار بار میری نگاہوں میں آتا تھا اور اس کے ساتھ شیخ عاصم کی کرخت صورت بھی نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ میں نے مستمن کو "تلوبڑ" کے نواحی پڑاؤ میں دیکھا تھا اور اس کے فوراً بعد میں نے پڑاؤ چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ شیخ عاصم کے اس ہرکارے نے کہاں تک میرا پیچھا کیا ہے۔ ظاہر تھا کہ پڑاؤ سے اسے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ میں اور غزالہ پڑاؤ میں رہائش پذیر رہے ہیں اور وہاں سے سفیر احمد کے ساتھ نکلے ہیں۔ سفیر احمد کے حوالے سے مستمن فیروز پور پہنچ سکتا تھا اور وہاں سے ٹوہ لگاتا ہوا فرید کوٹ اور پھر اس کوٹھی تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ مستمن کے اس کوٹھی تک پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شخص بھی یہاں پہنچ گیا ہے جس نے پچھلے چند برسوں میں میری تلاش پر کروڑوں روپے خرچ کیے ہیں اور مجھے اذیت ناک موت دینا جس کی زندگی کا اولین مقصد بنا ہوا ہے۔

ایک روز میں نے سفیر احمد کو ٹوہ لینے کے لیے فیروز پور بھیجا۔ سفیر احمد اور اس کے بھائی حاجی بادشاہ کی رہائش فیروز پور میں تھی، اور یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر مستمن مجھے "ٹریس" کرتا ہوا پنجاب آیا ہے تو فیروز پور میں سفیر احمد کے گھر ضرور پہنچے گا۔ سفیر احمد چونکہ خود بھی دشمنی دار تھا، وہ کوٹھی سے باہر نکلنے میں بہت محتاط رہتا تھا اور فیروز پور جاتے ہوئے تو اس کے لیے خصوصی احتیاط لازم تھی۔

وہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ساتھ رات کے وقت نکلا اور ایک دن فیروز پور میں رہ کر رات ہی کو واپس آگیا۔ اس نے خیریت کی اطلاع دی اور کہا کہ ایسے کوئی آثار نہیں ملے جن سے اندیشہ پیدا ہو کہ راجستھان سے کوئی ہمارا تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ اس نے کہا "میں اپنے ایک خاص بندے کی ڈیوٹی لگا آیا ہوں۔ وہ میرے ملنے جلنے والوں پر نگاہ رکھے گا اور کہیں کوئی مشکوک بندہ نظر آیا تو فوراً اطلاع دے گا۔"

فیروز پور سے سفیر احمد ایک اہم اطلاع بھی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ "تلوبڑ" کے نواح میں ہم جس پڑاؤ کو چھوڑ کر آئے تھے وہاں مہاراج رتن سنگھ کے آدمیوں اور منوج کمار کے ساتھیوں میں شدید جھڑپ ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلسل چھ گھنٹے فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک و زخمی ہوئے ہیں تاہم منوج کمار کے اکثر ساتھی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ منوج کمار خود بھی

شدید زخمی ہوا ہے۔ اس کی آنکھ میں گولی لگی ہے اور وہ بیکانیر کے اسپتال میں زیر علاج ہے۔ اس کی سابق محبوبہ اور مہاراج رتن کی دھرم پتنی پرم کماری کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئی ہے۔

میری نگاہ میں پرم کا جلا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ کتنا عبرتناک انجام ہوا تھا اس خوبرو لڑکی کی کتھا کہانی کا۔ اس نے پیار کیا لیکن جب افسانے کو انجام تک پہنچانا ممکن نہ ہوا تو اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا چاہا۔ اپنے پیار کی قربانی دے کر وہ خاموشی سے اس ڈولے میں بیٹھ گئی جس میں اسے بٹھایا گیا۔ اس نے اپنے پتی دیو کو اپنا سب کچھ جان لیا اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا چاہنے والا اس سے سچی محبت کرتا ہے اور اب ماضی کا آئینہ لے کر کبھی اس کے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ اس کی رسوائی کو اپنی رسوائی سمجھے گا اور ان رسوائیوں سے بچنے کے لیے ہمیشہ کے لیے اس کی دنیا سے نکل جائے گا۔ لیکن یہاں کہانی متوجہ فلمی کہانیوں سے مختلف ہو گئی تھی۔ پیار میں چوٹ کھا کر منوج زہریلا سانپ بن گیا تھا۔ اس نے نہ صرف پرم کی ازدواجی زندگی کو ڈسا تھا بلکہ خود بھی تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ اس روداد میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا جب منوج کی منظورِ نظر اس کے سامنے تھی' اس کی دسترس میں تھی لیکن وہ اس سے دور رہنے پر مجبور تھا' اس کے جلے ہوئے چہرے پر نگاہ ڈالنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اور کہانی کا یہی موڑ زیادہ اثر انگیز تھا۔

آخر وہ دن آ گیا جس کا انتظار تھا۔ میرا مطلب لنگر والی میں لگنے والے میلے کے آخری روز سے ہے۔ یوں تو میلہ پانچ چھ روز پہلے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن آج اس کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ہم فرید کوٹ سے صبح سویرے چل نکلے تھے اس لیے دس بجے کے قریب میلے میں پہنچ گئے۔ خالص دیہاتی میلہ تھا۔ گرد دور ہی سے اڑتی نظر آ رہی تھی۔ کھیتوں کے درمیان کچے راستوں پر بچے بوڑھے رنگ برنگ لباس پہنے میلے کی طرف جاتے نظر آتے تھے' ایک دو ٹولیاں ڈھول بجاتی نظر آئیں۔ یہ من چلے ایک بہت بڑی سبز چادر میں چندہ بھی جمع کرتے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ تانگوں اور بیل گاڑیوں پر سوار تھے۔ دور دور گندم کے پکے ہوئے کھیتوں میں بھی لال پیلے آنچل لہرا رہے تھے۔ میلے میں لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکرز کی آوازیں پورے علاقے میں گونج رہی تھیں۔ مویشیوں کی منڈی میلے کے اصل مقام سے کچھ ہٹ کر تھی لیکن اژدحام کے سبب سب کچھ گڈمڈ ہو چکا تھا۔ انسان مویشیوں میں اور مویشی بازاروں میں گھسے ہوئے تھے۔ ایسا بھرپور دیہاتی میلہ دیکھنے کا بہت عرصے بعد اتفاق ہوا تھا۔ سفیر احمد کے علاوہ زریں گل اور بوٹا سنگھ بھی میرے ساتھ تھے۔ زریں گل خاص طور پر اس پنجابی میلے کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

ہم دیر تک میلے کی گہما گہمی میں بھٹکتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے میلوں ٹھیلوں میں پولیس کے سادہ پوش گھومتے رہتے ہیں اور مشکوک افراد پر کڑی نظر رکھتے ہیں لہٰذا میں نے زریں گل اور بوٹا سنگھ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے لوگ خاص طور پر ان کی طرف متوجہ ہوں' اس کے باوجود زریں گل نے ایک جگہ جھگڑا مول لینے کی کوشش کی۔ تاہم بوٹا سنگھ نے بڑی ذہانت سے معاملہ سنبھال لیا۔ موٹے تازے لڑکوں کی ایک شوخ ٹولی سامنے سے آ رہی تھی۔ بوسکی کے کڑھائی دار کرتے۔ گلے میں موتیے کے ہار' منہ میں پان دبائے ہوئے۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک چوڑے چکلے لڑکے نے مدقوق بوٹا سنگھ کو یوں کندھا مارا کہ وہ دودھ کے ایک بڑے کڑاہے میں گرتے گرتے بچا۔ اس کا ایک ہاتھ دودھ میں گیا لیکن دودھ ٹھنڈا تھا اس لیے بچاؤ ہو گیا۔ زریں گل نے بھی لڑکے کی حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ تیر کی طرح اس کے پیچھے لپکا اور اس کا گریبان تھام لیا۔ "اوئے ہاتھی کا بچہ' تم کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ بہت بڑی پہلوان ہے تم؟" اس نے لڑکے کو زور سے جھنجوڑا۔ لڑکے کے جھگڑالو ساتھی "الرٹ" ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ دنگا ہو جاتا۔ بوٹا سنگھ ان کے بیچ آ گیا۔

اپنی مسکین آواز میں بولا۔ "نہیں بھراجی! جھگڑنا نہیں۔ نہیں نہیں یہ کام نہیں کرنا۔" پھر زریں گل سے مخاطب ہو کر بولا "خان یار! غلطی میری تھی۔ میں دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔"

اس نے زور لگا کر جٹ لڑکے کا گریبان زریں گل سے چھڑا دیا اور لڑکے کو دھکیل کر دور لے گیا۔ میں نے زریں گل کو ڈانٹا اور اسے پیچھے ہٹا دیا۔ یوں یہ مصیبت ٹل گئی۔ سنگھ کے بارے میں میں نے جو اندازے لگائے تھے وہ ایک ایک کر کے درست ثابت ہو رہے تھے۔ بظاہر معمولی نظر آنے کے باوجود وہ معمولی نہیں تھا۔ بہت گہرائی تھی اس شخص کے اندر۔ ایک بہت بڑے آسمانی جھولے کے قریب سے گزر کر ہم ایک خیمہ بازار میں داخل ہوئے۔ یہاں زیادہ تر "عورتوں کی دلچسپی" کا سامان تھا۔ بہت سستی چیزیں تھیں لیکن یہ سستی اشیا خریدنے والی دیہاتنوں کے چہرے پر جو مسرت دکھائی دی وہ دبئی' پیرس' ہانگ کانگ اور لندن

نگ سینٹرز میں شاپنگ کرتی ہوئی بیگمات کے چہرے پر دکھائی ں دی۔ غریب آنکھوں کی معصوم معصوم سی خوشیاں ں۔ کانچ کی چوڑیاں' پیتل کے زیورات' پلاسٹک کے ن اسی کے ڈیکوریشن پیس۔

اس "پُرمسرت" بازار میں سے گزر کر ہم ایک سرکس پچھواڑے پہنچ گئے۔ یہاں ہاتھیوں کی ایک جوڑی اپنا ری بھرکم ناچ کر رہی تھی اور لوگ دلچسپی سے اسے دیکھ رہے ۔ اچانک ایک شخص نے سفیر احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ اور اس سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ وہ سفیر احمد کا شناسا نظر اتا تاہم اس سے مل کر سفیر احمد کو کوئی خاص خوشی نہیں ۔ وہ سانولے رنگ کا تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ وں سے عیاری عیاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ سفیر احمد چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ اب وہ بہت توجہ سے لے شخص کی بات سن رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد یہ گفتگو ہوئی اور سفیر احمد نے الجھے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا ذرا مزار تک چلتے ہیں۔"

ہم چاروں' سانولے شخص کے ساتھ ہو لیے۔ تاہم کچھ ے جا کر میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ ہم سے علیحدہ ئے اور ارد گرد نظر رکھے۔ میلے کے شمالی حصے میں ہلکے سبز کا گنبد نظر آ رہا تھا' یہیں پر لنگر شاہ کا مزار تھا۔ مزار کے ائے چھوٹے بڑے خیمے تھے اور جھگیاں سی بنی ہوئی ۔ بہت دھواں دھار اور میلا کچیلا ماحول تھا۔ تیل والی یوں کی خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ سانولا شخص ہمیں کے قریب ہی ایک تہ خانے میں لے گیا۔ تہ خانے میں ل ہونے کے لیے ایک تنگ سا راستہ تھا۔ اس راستے پر بنا کٹا شخص پہرا دینے والے انداز میں کھڑا تھا۔ اندر ماں "ترائی" بچھی ہوئی تھی۔ بہت سے بے فکرے یہاں بیٹھے سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ سگریٹ کے یں میں چرس کی بو رچی بسی تھی۔ کچھ لوگ بھنگ گھوٹنے مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں لمبے لمبے چوغوں والے نما ملنگ بھی تھے۔

سانولا ہمیں لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ ہم نے کا حصہ نظر آنے کے لیے سگریٹ سلگا لیے۔ سفیر نے لے شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ اے ایس تقیانہ ہے۔ اسی تھانے میں کام کرتا ہے جہاں انسپکٹر سنگھ ایس ایچ او ہے۔ یہ اے ایس آئی تقیانہ ایک بار چالاک شخص تھا اور اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا بہت باخبر بھی ہے۔ باتوں کے دوران وہ مسلسل چرس کے "سوٹے" لگا رہا تھا اور باوجود اس کے کہ آنکھیں نشے سے سرخ ہو رہی تھیں' ملاوٹی چرس بیچنے والوں کو ماں بہن کی گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ اپنی باخبری ثابت کرنے کے لیے اس نے ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اس نے کہا "سفیر صاحب! ہمارا تھانہ' تھانہ نہیں گندگی کا ڈھیر ہے۔ ہر جرم وہاں ہوتا ہے۔ رشوت میں نمبر ایک ہے' جوئے کا اڈا وہاں ہے' شراب نوشی وہاں ہوتی ہے' کوئی ہی رات جاتی ہوگی جب وہاں کسی عورت کو خراب نہیں کیا جاتا۔ انسپکٹر دربار اور سب انسپکٹر گوپال ایسے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی آپس میں بھی ٹھنی رہتی ہے۔ دونوں کا کلہ مضبوط ہے۔ انسپکٹر دربار سنگھ کی تو پوری فیملی پولیس لائن میں ہے۔ اس محکمے میں یہ لوگ بہت پرانے ہیں۔ دوسری طرف سب انسپکٹر گوپال بھی آئی جی کا سالا ہے۔" اس نے بتایا "انسپکٹر پچھلے آٹھ دس روز سے غائب ہے لگتا ہے کسی خاص چکر میں ہے۔ یہ بات اب بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ انسپکٹر دربار سنگھ کے جرائم پیشہ لوگوں سے گہرے رابطے ہیں۔ ٹرک والے معاملے کا تو آپ کو بھی پتا ہوگا۔ اس میں چھ اور لوگوں کے علاوہ استاد جانی کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ استاد جانی جرائم پیشہ لوگوں کے ایک نہایت خطرناک گروہ کا سرغنہ ہے۔ چند ماہ پہلے پاکستان سے جیل توڑ کر بھاگا ہے اور اب فرید کوٹ کے آس پاس کہیں موجود ہے۔ یہ ایک معتبر اطلاع ہے کہ انسپکٹر دربار نے استاد جانی کو پکڑوانے کے لیے کسی گروہ سے پچاس لاکھ میں سودا کیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سودا شنکرا کے گروہ سے ہوا ہے۔"

میں یہ باتیں سن رہا تھا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس شخص کی باتوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے فوراً یقین آ گیا کہ اس شخص نے "پچاس لاکھ" کی جو بات کی ہے وہ صحیح رہی ہوگی۔ اپنے ابتدائی بیانات میں انسپکٹر دربار سنگھ نے یہ کہا تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر اپنی ذاتی تحویل میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ٹرک کی تلاش میں مجھ سے مدد لے سکے۔ یہ بات اس وقت بھی میرے دل کو نہیں لگی تھی اور مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید دربار سنگھ لمبی منصوبہ بندی کے بجائے فوری منافع کو ترجیح دے اور میری گرفتاری کو کسی "ضرورت مند" سے کیش کروا لے۔

اس دھواں دھواں چنڈو خانے میں بیٹھ کر اے ایس آئی تقیانہ نے جو دوسرا انکشاف کیا وہ زیادہ سنسنی خیز اور حیرت ناک تھا۔ اس "انکشاف" سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا کہ

گمنام خطوں والے جس معاملے کو ہم "ٹاپ سیکرٹ" سمجھ رہے تھے وہ "ٹاپ سیکرٹ" نہیں رہا۔ کسی امتحانی پرچے کی مانند یہ راز بھی آؤٹ ہو گیا تھا اور اسے آؤٹ کرنے والا وہی سب انسپکٹر گوپال تھا جس کی انسپکٹر دربار سے دشمنی رہتی تھی۔

فتیانہ نے بتایا "سب انسپکٹر کو کسی طرح دوسرے خط کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ اس نے سوچا' جب انسپکٹر دربار سنگھ اپنی جانکاریوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو وہ کیوں پیچھے رہے۔ اس نے فرید کوٹ میں موجود ایک شخص سے رابطہ کیا اور اس سے کافی رقم لے کر یہ "جانکاری" دے دی۔۔۔ بعد میں شنکر شکرا کے گروہ کو بھی کسی طرح پتا چل گیا۔"

"یعنی۔۔۔ اب وہ لوگ یہاں موجود ہیں؟" سفیر احمد نے ہکلا کر پوچھا۔

"بالکل موجود ہیں" فتیانہ نے پورے یقین سے جواب دیا۔ "میرا وچار ہے کہ اس وقت مختلف گروہوں کے کم از کم سو مسلح افراد میلے میں موجود ہیں اور وہ سب کے سب نہایت خطرناک لوگ ہیں۔ وہ سب اس "کلیو" کی تلاش میں ہیں جو گمنام چٹھی کے ذریعے انسپکٹر دربار سنگھ کو ملا تھا۔۔۔ عین ممکن ہے کہ ان لوگوں میں شنکر شکرا اور استاد جمالی بھی شامل ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میلہ ایک خونریز ہنگامے کی نذر ہونے والا ہے۔"

"اور پولیس کیا کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

فتیانہ چرس کی گولی کو تمباکو میں مسلتا ہوا بولا۔ "پولیس بے بس تماشائی ہے۔ آج سویرے تک تو انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ صورت حال کتنی سنگین ہے' اب وہ کچھ الرٹ ہوئے ہیں۔ مگر کیا کر لیں گے؟ وہ آٹے میں نمک کی طرح ہیں۔"

اچانک مجھے زریں گل کی صورت نظر آئی۔ وہ اس [illegible] خانے کے دروازے پر کھڑا تھا' مجھ سے نگاہ ملتے ہی اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز چونکا دینے والا تھا۔ میں نے سفیر احمد اور بوٹا سنگھ کو فتیانہ سے باتیں کرتے چھوڑا اور خود باہر آ گیا۔ مجھ سے بات کیے بغیر زریں گل ایک طرف جا رہا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں اس سے تعلق ظاہر کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے آؤں۔

ایک بڑے تھیٹر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ تھیٹر سے باہر ٹکٹ بیچنے والا ایک اونچے مچان پر بیٹھا تھا۔ اسی مچان کے ایک حصے پر دو لڑکیاں اور لڑکے رقص کر رہے تھے۔ ایک جوڑا دیہاتی لباس میں تھا اور دوسرا شہری میں۔ بیک میں گانا بج رہا تھا۔ "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی' چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا" ناچنے والے جوڑے واقعی اس گانے کا حق ادا کر رہے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھوں "آوارگی" دیدنی تھی اور لڑکیاں اپنے جسموں کو ربڑ کی طرح توڑ موڑ رہی تھیں۔ یہ حرکات سرعام اور علی الاعلان ہو رہی تھیں اور پولیس والے بھی آس پاس ہی گھوم رہے تھے' ظاہر ہے ان کی جیبیں گرم تھیں۔

زریں گل تماشائیوں کے درمیان جا کھڑا ہوا اور سر اٹھا کر رنگا رنگ ناچ گانا دیکھنے لگا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ صرف یہ بیہودگی دکھانے کے لیے یہاں لایا ہے۔۔۔ لیکن میری نگاہ لکڑی کے مچان تلے ایک شے پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ فتیانہ کے۔۔۔ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے' اس نے کہا تھا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ یہ میلہ ایک خونریز ہنگامے کی نذر ہونے والا ہے۔" اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

مچان کے عین نیچے مجھے چند بونے نظر آئے۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھے تھے اور ارد گرد کے ہنگامے سے قطعی بے نیاز ہو کر تاش کھیل رہے تھے۔ میں ان میں سے ایک بونے کو دیکھ کر چونکا۔ وہ دوسرے بونوں سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا' رنگ سیاہ' آنکھیں زرد اور چہرے پر کرختگی' میں پہلی نگاہ میں اسے پہچان گیا۔ وہ کسی سرکس یا تماشے کا بونا نہیں' قادر زماں کا خوفناک باڈی گارڈ تھا۔ انتہائی مہلک اور سفاک' اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بکل میں کوئی آتشیں ہتھیار بھی موجود ہو۔ اس باڈی گارڈ کی یہاں موجودگی ثابت کرتی تھی کہ قادر زماں بھی بنفس نفیس یہاں موجود ہوگا۔ وہی قادر زماں جسے مروت و احسان مندی چھو کر نہیں گزری تھی اور جس نے اپنا مطلب نکلتے ہی غزالہ کو شکرا کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس مہربان ڈاکٹر کو ایک درندے کے حوالے کر رہا ہے جس نے شب و روز ایک کر کے اس کی بیوی کی جان بچائی ہے اور اسے ایک بچے کا باپ بنایا ہے۔

میں نے سوچا' اگر قادر زماں اور شنکر شکرا جیسے لوگ یہاں موجود ہیں تو پھر اس میلے کی رونقیں بہت جلد دم توڑنے والی ہیں۔ میں شلوار قمیص میں تھا' کندھے پر ایک بڑا سفید رومال تھا۔ اسے پنجابی میں "صافہ" کہتے ہیں۔ میں نے صافہ سر کے اوپر سے گزار کے منہ پر لپیٹ رکھا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میلے کے گرد و غبار سے بچنے کے لیے ڈھانپ رکھا ہو۔ قادر زماں کے کینیا امپورٹڈ بونے کو دیکھ کر میں نے صافے کو چہرے پر تھوڑا سا مزید چڑھا لیا۔ مجھے بونے کا دیدار کرانے کے بعد زریں گل دوبارہ چنڈو خانے میں آیا۔ یہاں تمباکو کا دھواں اب کچھ اور دبیز ہو گیا تھا۔ چرس

انجی کی بو اتنی زیادہ تھی کہ سانس لینا دشوار تھا۔ ایک نشے باز ترنگ میں آ کر ٹھمکا لگا رہا تھا۔ اس کے چند ساتھی گلاس و چمچ وغیرہ بجا کر رقص کو ساز فراہم کر رہے تھے۔ نشے باز نے رقص کرتے کرتے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور ایک لمبی تان اٹھائی۔ اس تان کا اختتام "ہاہو" کی ملی جلی ترانوں پر ہوا۔ نشے باز ٹھیٹ پنجابی میں ٹپے کے بول گانے لگا۔ اس ٹپے میں ان سندر ناریوں کا ذکر تھا جو گندل سے زیادہ نرم اور کستوری سے زیادہ خوشبودار ہیں' جو بن سنور کر میلے میں آتی ہیں۔ جدھر سے گزرتی ہیں' دلوں پر پاؤں رکھتی جاتی ہیں اور خوش قسمت بھیڑ بھاڑ میں ان سے ٹکرا جاتا ہے اسے بغیر کسی خرچ کے رس ملائی اور جلیبی کا سواد آ جاتا ہے۔

چنڈو خانے کی دھواں دھواں فضا میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سفیر احمد اور اے ایس آئی فتیانہ سے کہا کہ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ شاید خود بھی یہی چاہتے تھے' میرے کہنے پر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی تنگ سے رستے میں سے پہرے دار کے سامنے سے گزر کر ہم پانچوں باہر آ گئے۔ ناچ گانا دکھانے والے تھیٹر پر ٹکٹ بدستور فروخت ہو رہے تھے۔ اب لاؤڈ اسپیکر پر آواز لگانے والا لڑکا کن انداز میں چیخ رہا تھا "مہربان' قدردان! شو شروع ہونے والا ہے' آخری ٹکٹ ہیں۔ جلدی آیئے جلدی کیجیے۔۔۔ زندہ ناچ گانا دیکھیں' فلم کو بھول جائیں۔۔۔ بمبئی کی گول گپے کڑکتی بجلیاں' سانپ کے ساتھ کوبرا ڈانس۔۔۔ کیجیے مہمان شو شروع ہونے والا ہے۔"

"کیا خیال ہے' تھیٹر میں چل کر بیٹھیں" فتیانہ نے پیش کش کی۔

اس وقت ہمارا باہر گھومنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ویسے بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے کہیں تو بیٹھنا تھا۔ میں نے تجویز کی تائید کی۔ سفیر احمد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فتیانہ نے آگے بڑھ کر مچان پر بیٹھے شخص سے چار ٹکٹ لیے اور زریں گل کو باہر چھوڑ کر ہم چاروں تھیٹر میں چلے گئے۔ گول شامیانے کے دائرے میں بہت بڑا پنڈال تھا۔ بے شمار لوگ دریوں پر بیٹھے تھے۔ کچھ کرسیوں پر تھے۔ پنڈال کے ایک حصے کو "وی آئی پی" بنایا گیا تھا۔ یہاں میلے کچیلے غلافوں والے صوفے رکھے تھے۔ جگہ جگہ ہینڈ سٹل فین لگے ہوئے تھے۔ ہمارا ٹکٹ بھی انہی صوفوں کا تھا۔۔۔ ہمیں بیٹھے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسٹیج روشن ہو گیا اور سامنے سے رنگین پردہ ہٹ گیا۔ دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے بڑے تماشائیوں نے سیٹیاں بجا کر اور للکارے مار کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ زندہ ناچ گانے کا پروگرام شروع ہو گیا۔ گھٹیا فلمی گانوں پر نوجوان لڑکیاں لڑکے بھونڈے انداز میں اچھل کود کرنے لگے۔ میں سفیر اور فتیانہ کے درمیان بیٹھا تھا۔ سفیر اور فتیانہ دونوں میری طرف جھکے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ فتیانہ کو مکمل یقین تھا کہ جونہی سرخ تہبند قمیص اور سنہری واسکٹ والا شخص میلے میں داخل ہوا غدر مچ جائے گا۔ وہ کہنے لگا۔ "مجھے تو لگتا ہے بادشاہو کہ اس کے آٹھ دس ٹکڑے ہو جائیں گے اور ہر پارٹی اپنا اپنا ٹکڑا لے کر بھاگ جائے گی۔"

میں نے کہا "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ میلے میں آئے ہی نہیں۔"

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے جی" فتیانہ نے جواب دیا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چٹھ (خط) ہی جھوٹے ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ کسی نے مذاق شذاق کر دیا ہو۔ پولیس والوں کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال اگر یہ جھوٹ بھی ہے تو بڑا سیانے والا جھوٹ ہے۔ ایک ہفتے سے اس جھوٹ نے تو تھلی مچا رکھی ہے۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "فتیانہ صاحب! اگر واقعی اس میلے میں سو کے قریب مسلح بندے صرف "لال کپڑوں والے" کا انتظار کر رہے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے میلے تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ ظاہر ہے گھات لگانے والے دور دور تک پھیلے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' انہوں نے میلے کو آنے والے رستوں کی ناکا بندی کر رکھی ہو۔"

فتیانہ نے کہا۔ "سجن جی! بات تو تم نے ٹھیک کی ہے۔ میرا اپنا وچار بھی یہی ہے کہ میلے کو آنے والے رستوں پر ہتھیار بند لوگ کھڑے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس بندے کو میلے سے باہر ہی چھاپ لیا جائے۔"

سفیر احمد نے کہا "یہ معاملہ بڑا مشکل ہو گیا ہے۔۔۔ سارا کام چھوٹے اور بڑے تھانے دار کی لڑائی نے خراب کیا ہے۔ ایک دوسرے کی ضد میں انہوں نے بدمعاشوں کی پوری فوج یہاں اکٹھی کر لی ہے۔"

اسٹیج پر ایک بونا اور بونی مزاحیہ گانے پر ایکٹنگ کر رہے تھے۔ تماشائی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ اس میلے کی فضا میں کتنا تناؤ ہے

اور کیسے کیسے خطرناک لوگ یہاں کیسے وحشت ناک ارادوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مزاحیہ گانے کے بعد ایک نوجوان جسے دھرمیندر کا خطاب دیا گیا' دھوتی کرتہ پہنے اسٹیج پر آیا اور ڈانس کرنے لگا' تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی مالا سنہا کا روپ دھار کر اسٹیج پر آئی اور اچھل کود میں شریک ہو گئی۔ دونوں گانا گانے لگے اور وہی حرکات کرنے لگے جو اس سے پہلے پنڈال سے باہر مچان پر کر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ان حرکات میں شدت آتی گئی۔ تماشائیوں کی سیٹیوں اور للکاروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ حیرت ہوئی کہ ایک دیہی میلے میں ایسی مادر پدر آزادی کے مظاہرے کیے جا رہے ہیں۔ اچانک پنڈال کے باہر سے بلند ہونے والی چند آوازوں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ یہ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ پنڈال کے بالکل پاس ہی خودکار رائفل کی "تڑ تڑ" گونجی تھی۔ ابھی اس آواز کی بازگشت باقی تھی کہ تھری ناٹ تھری گن کے مسلسل دھماکے سنائی دیے۔ اس کے ساتھ ہی بھگدڑ اور چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔

دھرمیندر اور مالا سنہا اپنے چونچلے چھوڑ کر بھاگے اور چھلانگیں لگا کر اسٹیج کے عقب میں روپوش ہو گئے۔ ان کی پھرتی دیکھ کر تماشائیوں کو بھی جوش آیا۔ انہوں نے دوگنی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور دروازوں کی طرف لپکے (حالانکہ فائرنگ باہر ہو رہی تھی اور پنڈال میں وہ خاصے محفوظ تھے) ایک دم بھگدڑ مچی تو ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ سفیر احمد نے سرسراتے لہجے میں کہا "شاید کام شروع ہو گیا ہے"

ہم دروازے کے پاس ہی تھے لہٰذا باہر نکلنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ باہر نکلتے ہی میری نگاہ سب سے پہلے دو خیموں پر پڑی۔ وہ دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ یہ مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ ہر طرف مٹھائی بکھری ہوئی تھی۔ ایک جلتی ہوئی بھٹی الٹ گئی تھی جس کی وجہ سے آگ بھڑکی تھی۔ میں نے سیاہ دھوئیں کے مرغولے میں سے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ اپنا زخمی بازو تھامے بھاگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔۔۔ اور بھاگنے والا وہ شخص اکیلا نہیں تھا۔ میلے میں موجود ہر ذی نفس بھاگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ سرکس کے پاس بندھا ہوا ہاتھیوں کا جوڑا بھی سخت مضطرب تھا۔ لوگ اتنی افراتفری میں دوڑے تھے کہ ان کی مختلف اشیا' جوتے' سائیکلیں اور چادریں وغیرہ موقع پر بکھری رہ گئی تھیں۔ فائرنگ کی آواز مزار کی طرف سے آ رہی تھی۔ پھر یکایک ہمارے عین سامنے آسمانی جھولوں کے پاس بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ہم نے بھاگ کر ایک چبوترے کی اوٹ لی۔ فائرنگ سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ایک سے زائد گروہ آپس میں گتھ گئے ہیں۔ آسمانی جھولوں پر بیٹھے ہوئے مرد و زن اور بچے دلدوز انداز میں چیخ رہے تھے۔ ان میں سے جو کم بلندی پر تھے وہ تو کود کر بھاگ گئے تھے' باقی واویلا کر رہے تھے۔ چند گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے سروں کے اوپر سے گزریں' میں نے ایک رائفل بردار کو بھاگ کر دو خیموں کے درمیان گزرتے دیکھا۔ پھر ایک تیز رفتار شخص عین ہمارے سامنے گولی کھا کر گرا اور تڑپنے لگا۔

"وہ دیکھو جی" اچانک بوٹا سنگھ ایک طرف اشارہ کر کے چیخا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ رتنا کشی میدان کے قریب گہرے سیاہ دھوئیں کے اندر سے میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ سرخ تہبند اور قمیص میں تھا۔ اس نے سنہری واسکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ پگڑی اس کے سر پر تھی یا شاید گر چکی تھی۔ وہ اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ دو سیاہ پوشوں نے اس کے دونوں بازو پکڑ رکھے تھے اور پورا زور لگا کر خیموں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ سرخ تہبند قمیص والا زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک پوشے کے بازو پر گولی لگی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹا سا چمکیلا پستول گر گیا۔ اس نے جھک کر پستول اٹھایا اور تڑپ کر ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ دوسرا پوشا بھی کسی نامعلوم جگہ پر پوزیشن لے چکا تھا۔ تہبند قمیص والا بے سدھ پڑا تھا' ہر سنگامے اور خوف انداز گولیاں اور چھرّے سنسناتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک عورت کو دیکھا۔ وہ کسی طرف سے نکلی اور چیختی چلاتی سرخ کپڑوں والے پر گر پڑی۔ جواں سال تھی۔ اس نے چمکدار سرخ کپڑے پہن رکھے تھے۔ لگتا تھا بن ٹھن کر میلے میں آئی ہے۔ وہ بے سدھ شخص کو جھنجوڑنے لگی اور دہائی دینے لگی "بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ خدا کے لیے بچاؤ۔ ہائے ظالمو! یہ کیا کیا تم نے۔ ہائے ربا میں کیا کروں۔۔۔ ہائے میرے سر کا سایہ اٹھ گیا"

اندھی گولیاں محوِ پرواز تھیں۔ میلے کے بیچوں بیچ اس ماتم کناں عورت کو کسی بھی وقت گولی لگ سکتی تھی۔ اس کے لیے بہتر تھا کہ لیٹ جاتی یا موقع سے ہٹ جاتی۔ میں نے چاہا کہ اسے بچانے کی کوشش کروں۔ لیکن ابھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت ہی کی تھی کہ اسے گولی لگ گئی۔ وہ ریت کی بوری کی طرح ایک طرف ڈھے گئی اور پھر اس طرح بے حرکت ہو گئی جیسے کبھی حرکت ہی نہ کی ہو۔

مٹھائی کی دکانوں میں لگی ہوئی آگ اب دوسرے خیموں تک پھیل گئی تھی۔ دھواں دور دور تک

رہے تھے لیکن قریب کوئی نہیں آ رہا تھا۔ آگ بڑی تیزی سے اس مقام کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں آسمانی جھولوں پر لوگ لٹکے رہ گئے تھے۔ انہیں آگ سے کوئی ایسا خطرہ تو نہیں تھا مگر وحشت کے سبب وہ بری طرح رو پیٹ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہنگامہ صرف میلے کے اسی حصے تک محدود نہیں۔ کم از کم تین مقامات سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں مگر دھواں اتنا پھیل گیا تھا کہ قرب و جوار کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص رائفل بدست دو خیموں کے بیچ سے گزرا تھا وہ ایک بار پھر نظر آیا۔ وہ رکوع کے انداز میں جھک کر بھاگتا ہوا ہمارے بالکل سامنے سے گزرا۔ اب میں نے اسے زیادہ وضاحت سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم تھی۔ کندھے سے گولیوں والی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا۔ وہ قادر زماں کے خاص کارندوں میں سے تھا۔ جیل کی گاڑی سے اغوا ہونے کے بعد میں نے قادر زماں کی ہیبت ناک حویلی میں جو چند ہفتے گزارے تھے وہ مجھے بھولے نہیں تھے۔ وہاں کا ایک ایک منظر میرے ذہن پر نقش تھا۔ یہ صورت بھی کسی ایسے ہی منظر کا حصہ تھی۔ گولیوں کی رینج سے نکل کر وہ شخص ایک کچی دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پہلے کھانستا رہا پھر پشت دیوار کے ساتھ ٹیک کر سانسیں درست کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے اپنی رائفل کا میگزین بھی تبدیل کر لیا۔

قادر زماں کے خاص کارندے کو دیکھ کر میرے لیے چپکے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں پوری طرح چوکس ہو گیا۔ اس شخص نے شاید ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ یا دیکھا تھا تو غیر متعلق جان کر اور یہ سمجھ کر کہ ہم فائرنگ کے ڈر سے سہمے بیٹھے ہیں' نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر دیوار کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کے پاس ایمونیشن ختم ہو گیا ہے یا وہ یونہی لڑائی سے پیچھے ہٹ آیا ہے۔ چند لمحے بعد میں نے دیکھا کہ وہ جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف جا رہا ہے۔ میں نے سفیر احمد سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس شخص کے پیچھے ہو لیا۔ میرا چہرہ صافے میں چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ شخص میلے سے باہر نکلا اور ایک چکر کاٹ کر مزار کی طرف آ گیا۔ یہاں لنگر کے لیے دیگیں پک رہی تھیں' تاہم پکانے والے دیگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہاں دیگوں کے پاس ہی ایک کھلی جیپ کھڑی تھی۔ رائفل بردار شخص جیپ کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ میری نگاہ جیپ میں گئی اور جسم لرز گیا۔ اس جیپ کے اسٹیئرنگ پر قادر زماں بنفسِ نفیس موجود تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سرحد سے

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بُک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:-
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:- ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون:- ۷۲۲۳۸۵۳

سیکڑوں میل دور بھکر میں واقع جھوک خاصن کی عظیم الشان حویلی میں بیٹھ کر حکم چلانے والا جاگیردار قادر زماں یہاں موجود تھا اور گولیوں کی چھاؤں میں گرد آلود دھواں پھانک رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو افراہیم کو خبطی اور جنونی کا خطاب دے رہا تھا اور کہتا رہا تھا کہ وہ دفینے کی تلاش میں اپنا روپیہ اور وقت برباد کر رہا ہے۔ آج وہ معترف ہو گیا تھا کہ "دفینے کی بات" دیوانے کا خواب نہیں۔ جو خیالات کل تک افسانوی نظر آتے تھے' آج ٹھوس حقیقت بن چکے تھے' پچیس عدد صندوقوں کی صورت میں انہیں دیکھا اور چھوا جا سکتا تھا۔۔۔ آج انہی بیش بہا صندوقوں کی خاطر قادر زماں یہاں موجود تھا اور اپنی جان کے لیے شدید ترین خطرات مول لے رہا تھا۔

قادر زماں شلوار قمیص میں تھا۔ اس کا سرخ و سپید رنگ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا چوہدری یا جاگیردار قسم کی شے ہے۔ جیپ میں ایک بونے سمیت قادر زماں کے تین ساتھی موجود تھے۔ میلے سے یہاں پہنچنے والے رائفل بردار نے قادر زماں سے کچھ کہا پھر خود بھی کود کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ جیپ کا انجن جاگا اور وہ ایک جھٹکے سے کھیتوں کی جانب روانہ ہو گئی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ مجھے اس جیپ کے پیچھے جانا چاہیے۔ لیکن کیسے؟ میرے ارد گرد کوئی سواری موجود نہیں تھی۔ میں دل مسوس کر رہ جاتا لیکن اچانک بوٹا سنگھ فرشتۂ رحمت بن کر آیا۔ وہ ایک اسکوٹر پر سوار تھا۔ معلوم نہیں یہ اسکوٹر اسے کہاں سے ملا اور کیسے پتا چلا اسے کہ مجھے سواری کی ضرورت ہے۔ بہر طور مجھے آموں سے سروکار تھا پیڑ گننے سے نہیں۔ میں بوٹا سنگھ کے عقب میں بیٹھ گیا اور اسے کہا کہ جیپ کے پیچھے چلو۔ اس نے فوراً عمل کیا۔ بوٹا سنگھ کی مجہول صورت دیکھ کر کوئی سوچتا کہ شاید اسے سائیکل چلانا بھی نہ آتی ہو مگر وہ بڑی مہارت سے اسکوٹر چلا رہا تھا۔ اس نے اپنی میلی کچیلی دھوتی کے دونوں پلو بڑے سلیقے سے رانوں تلے دبا رکھے تھے تاکہ ہوا کی وجہ سے پھڑپھڑانے نہ لگیں۔ جیپ کچے راستے پر چل رہی تھی اور دھول کے سبب ہماری نگاہ سے اوجھل تھی۔ ایک طرح سے ہم جیپ کا نہیں دھول کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس دھول میں دم تو گھٹ رہا تھا لیکن یہ ہمارے حق میں مفید تھی۔ درختوں کے نیچے اور کھیتوں میں لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے ہراساں نظروں سے میلے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے گاہے گاہے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اور دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ کچھ بال بچے دار بہت افراتفری میں تانگوں اور ریڑھوں پر بیٹھ کر اپنی اپنی راہ لے رہے تھے۔

قریباً دو فرلانگ جانے کے بعد جیپ نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ایک بہت بڑی پختہ چار دیواری کا کلاوا کاٹ کر درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو گئی۔ جھنڈ سے ساٹھ ستر گز دور ہم نے اسکوٹر چھوڑ دیا اور پیدل ہی جھنڈ کی طرف بڑھے۔ جیپ جھنڈ کے اندر ہی رکی تھی کیونکہ اب انجن کا شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ درختوں میں پہنچ کر ہم مزید محتاط ہو گئے اور بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے آگے بڑھنے لگے۔ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز کہیں پاس ہی سے ابھری تھی اور صاف سنائی دی تھی۔ میں اس آواز کو سیکڑوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ جاگیردار قادر زماں کی آواز تھی۔ وہی آواز جو جاگیر کی بلند و بالا حویلی میں گونجتی تھی اور قرب و جوار میں موجود ہر ذی نفس کو سہمائے رکھتی تھی۔ یہ جاگیردار کا خاص انداز تھا۔ وہ جس قدر طیش میں ہوتا' اس کا لہجہ اتنا ہی ملائم اور شائستہ ہوتا جاتا تھا۔ اس نے بہت مہربان لہجے میں کسی سے کہا "بیٹھ جاؤ جان جی! بیٹھ جاؤ میرے بادشاہو' میں آپ کے صدقے اب اور نہ ستاؤ ہم کو۔"

جواباً کوئی ٹھیٹ پنجابی میں گرجا "وے نہیں بیٹھوں گا میں' میں تمہارا چوہدری نہیں ہوں۔ تم ہوتے کون۔۔۔۔۔"

ابھی فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ "چٹاخ" سے ایک تھپڑ بولنے والے کے گال پر پڑا' پھر کئی افراد بولنے والے پر پل پڑے۔ میں اور بوٹا سنگھ احتیاط سے چند قدم مزید آگے گئے اور تب گھنے درختوں کے درمیان کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ تہبند اور قمیص والا ایک صحت مند شخص قادر زماں اور اس کے کارندوں کے نرغے میں تھا۔ بونے سمیت یہ کل پانچ کارندے تھے۔ وہ اسے جیپ پر چڑھا رہے تھے جب کہ وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ اس مزاحمت کے نتیجے میں اس کی سرخ پگڑی کھل چکی تھی۔ قمیص تار تار تھی اور دھوتی اس نے بمشکل سنبھال رکھی تھی۔ قادر زماں کے ایک پہلوان نما کارندے نے اس کی رانوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور بے دردی سے جیپ میں پٹخ دیا۔ وہ گالیاں بکتا ہوا پھرتی سے اٹھا لیکن عقب سے ایک اور شخص نے اس کی گردن پر رائفل کا بٹ مارا' وہ لڑکھڑا کر اگلی نشستوں پر گرا۔ بونے سمیت چاروں افراد نے اسے بری طرح دبوچ لیا۔

یہ گورکھ دھندا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سرخ دھوتی قمیص والا ایک شخص میلے کے بیچوں بیچ بے ہوش یا مردہ پڑا تھا۔ یہ دوسرا شخص جھنڈ میں تھا اور قادر زماں کے کارندے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ غالباً وہ شخص جو میلے میں مارا گیا یا زخمی ہوا اصل شخص نہیں تھا۔ وہ بدقسمتی سے کسی دھوکے کا شکار ہوا تھا۔ اصل شخص یہی تھا جسے قادر زماں کے

کارندوں نے میلے تک پہنچنے سے پہلے ہی دھر لیا تھا اور اب جیپ میں ڈال کر لے جا رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ بوٹا سنگھ کے ہڈیوں بھرے زرد چہرے پر جوش کی چمک تھی۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں مجھے ایک بار پھر وہی بجلی نظر آئی جو اسے غیر معمولی شخص ظاہر کرتی تھی۔ وہ میرے شانے سے شانہ ملا کر لڑنے اور سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے پوری طرح آمادہ نظر آتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ قادر زماں کے کارندے سرخ لباس والے کو اوندھا گرا کر اس کی مشکیں کسنے میں مصروف ہیں۔ وہ چلا رہا تھا اور انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اس موقعے پر قادر زماں اور اس کے کارندوں پر ہماری یلغار ٹھیک نہیں تھی۔ ہم قادر زماں کے کارندوں سے الجھ جاتے تو سرخ لباس والے کو بھاگنے کا موقع مل جاتا۔ بہتر تھا کہ پہلے وہ لوگ اسے باندھ لیں اس کے بعد ہم ہلا بولیں۔ جونہی اس کی مشکیں کسی گئیں۔ بوٹا سنگھ نے میرے کان میں سرگوشی کی "جمالی صاحب! میں چکر کاٹ کر دوسری طرف جاتا ہوں۔ دو طرف سے فیر ہو گا تو ان کی مت ماری جائے گی۔"

میں نے سر کے اشارے سے اسے ایسا کرنے کی اجازت دی۔ اس نے اپنا ریوالور چیک کیا اور کسی سانپ کے مانند گھنے درختوں میں رینگ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی چستی عود کر آئی تھی۔ بمشکل نصف منٹ گزرا ہو گا کہ میرے عین سامنے سے فائر کی آواز آئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا' یہ بوٹا سنگھ کا ریوالور چل رہا تھا۔ گولی اسی پہلوان نما شخص کو لگی جس نے سرخ لباس والے کو جیپ میں پٹخا تھا۔ اس شخص نے اپنا داہنا بازو تھاما اور کراہتا ہوا ایک پہلو پر جھک گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے شاٹ گن گرتے اور لمبی گھاس میں اوجھل ہوتے دیکھی۔ دوسرا فائر جیپ کی باڈی میں کہیں لگا۔ قادر زماں اور اس کے ساتھیوں نے فوراً جیپ کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ اب ان سب کی پشت میری طرف تھی اور میں انہیں باآسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ تیزی سے آگے بڑھوں اور کسی درخت کی اوٹ لے کر انہیں ہینڈز اپ کرا دوں۔ لیکن اس صورت میں یہ خطرہ بھی تھا کہ ہینڈز اپ ہونے کے بجائے وہ لوگ پلٹ کر حملہ کر دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہرحال ان کا پلڑا بھاری تھا۔ میرے پاس صرف ایک پسٹل تھا۔ جب کہ وہ دو پسٹل اور دو گنوں سے مسلح تھے۔ ان میں سے ایک گن گھاس میں گر چکی تھی لیکن باقی تینوں ہتھیار ان کے قبضے میں تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ان پر بے دریغ گولیاں چلا دوں اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی پوزیشن بدل سکیں انہیں زندگی کے جھمیلوں سے آزاد کر دوں۔

میں نے تیزی سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے۔ قادر زماں اور اس کے دو ساتھیوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ میری دھمکی کا احترام کریں گے اور اندھی گولی سے بچنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا دیں گے۔ خطرہ ان کے ساتھی بونے اور پہلوان نما شخص سے تھا۔ خاص طور پر بونے کو کوئی مہلت دینا خود کو آزمائش میں ڈالنا تھا۔ اپنے سابق تجربات کی روشنی میں' میں جانتا تھا کہ یہ انتہائی نڈر اور جنگ جو قسم کی مخلوق ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے آواز پر نشانہ لگاتے تھے اور حیرت انگیز تیزی سے حرکت کرتے تھے۔ جنے پل والی حویلی میں میں ان درندہ نما انسانوں سے دو بدو لڑ چکا تھا اور دیکھ چکا تھا کہ یہ بونے فولاد سے ڈھلی ہوئی ایسی لڑاکا مشینیں ہیں جو اپنے شکار کو لمحوں میں پارہ پارہ کر سکتی ہیں۔

میں نے سب سے پہلے بونے کے سر کے عقبی حصے کا نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ درمیانی فاصلہ پندرہ گز سے زائد نہیں تھا۔ طاقتور کولٹ پسٹل کی گولی عین نشانے پر لگی۔ بونا پھڑک کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ دوسری گولی پہلوان نما شخص کی پشت پر لگی۔ اس کا بھاری بھرکم جسم پہلے جیپ سے ٹکرایا پھر گھاس پر لڑھک گیا۔ قادر زماں اور اس کے باقی ماندہ تینوں ساتھی بیک وقت مڑے۔ "ہینڈز اپ" میں نے گرج کر کہا اور اس کے ساتھ ہی تیسرا فائر کر دیا۔ یہ ہوائی فائر تھا اور قادر زماں کے سر کو چھوتا ہوا گزرا تھا۔ وہ لوگ میرے نشانے پر تھے اور میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ قادر زماں نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور فوراً ریوالور پھینک دیا۔ اس کے کارندوں نے بھی تقلید کی۔ لیکن ہاتھ کسی نے اوپر نہیں اٹھائے۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ" میں نے چلا کر کہا اور اس کے ساتھ ہی پھر ہوائی فائر کیا۔ ایک ہوائی فائر عقبی درختوں سے بوٹا سنگھ نے بھی کر دیا۔ قادر زماں ایک لمحے کے لیے کشمکش میں نظر آیا پھر اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک پھنے خاں جاگیردار کو یوں بے بسی کے عالم میں ہاتھ اٹھائے دیکھنا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ وہ شخص جس کا تعاقب کر کے میں میلے سے قادر زماں کی جیپ تک پہنچا تھا ایک شخص کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ شاید ایک ساعت کے لیے میری نگاہ اس کی جانب سے ہٹ ہو گئی اس نے پھرتی دکھائی اور جھک کر وہ شاٹ گن اٹھانا چاہی جو پہلوان کے ہاتھوں سے لمبی گھاس میں گر گئی تھی۔ جونہی وہ جھکا' بوٹا سنگھ بجلی کی طرح عقبی درختوں سے برآمد ہوا۔ اس نے جھکے ہوئے شخص کی پیٹھ پر اتنے زور سے ٹانگ جمائی کہ وہ لڑھکتا ہوا کئی

گز کا فاصلہ طے کر گیا اور میرے عین سامنے گرا۔ کوئی اور ہوتا تو جہاں گرا تھا وہیں پڑا رہ جاتا۔ لیکن وہ قادر زماں کا کارندہ تھا۔ منتخب، تربیت یافتہ اور پختہ کار، خدا جانے اب تک کتنے قتل کر چکا تھا۔ اوندھے منہ زمین پر گرتے ہی اس نے اپنا ہاتھ اپنی اپ کی طرف بڑھایا اور ایک چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ خنجر کی اولین جھلک دیکھتے ہی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور آگے بڑھ کر ایک بھرپور ٹھوکر اس کے ہاتھ پر لگائی۔ میرے پاؤں میں بھاری بھرکم دیسی جوتی تھی۔ یوں بھی ابھی خنجر پر اس شخص کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں بلند ہو گیا۔ میری دوسری ٹھوکر نے اس کے کئی دانت توڑ دیے۔ وہ ڈکراتا ہوا اپنے ولی نعمت جاگیردار قادر زماں کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

جاگیردار قادر زماں کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تمتما رہا تھا جیسے ایک سو پانچ ڈگری بخار میں تپ رہا ہو۔ اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور پہچان کر حیران رہ گیا۔ "شاہ جہاں تم؟" اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں۔ میں یہاں نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے خوں بار نظروں سے اپنے مُردہ ہونے کی لاش دیکھی اور جسم کا سارا لہو جیسے اس کے سر کو چڑھ گیا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی میں آتش فشاں گرج رہے تھے۔

بوٹا سنگھ نے بگڑ کر کہا۔ "ادھر کیا کھڑے ہو کھمبے کی طرح، وہاں چلو جنتر کے نیچے" اس نے قادر زماں کو باقاعدہ دھکیل کر جیپ سے دور ہٹا دیا۔ قادر زماں کا غضب انتہا کو چھو گیا۔ بات تھی بھی غضب ناک ہونے والی۔ ایک مدقوق سا لاغر شخص جو صورت سے ہی بھک منگا نظر آتا تھا اتنے بااثر جاگیردار کو دھکیل کر پیچھے ہٹا رہا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے اور یہ "وقت" چاہے کتنا ہی مختصر تھا لیکن قادر زماں کے خلاف تھا۔ جاگیردار خالی ہاتھ تھا اور بھیک منگے کے ہاتھ میں موت اگلنے والا آلہ تھا جو جاگیردار کے سارے اثر و رسوخ، رعب و داب اور اختیار کو ایک دھماکے کی آواز میں غرق کر سکتا تھا۔ بوٹا سنگھ کے ہاتھوں قادر زماں کو دھکا کھاتے دیکھ کر اس کے کارندے بھی لال پیلے ہو گئے تھے لیکن قادر زماں کی طرح انہیں بھی خاموش رہنا پڑا۔ وہ سب کے سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ میں کسی سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔

بوٹا سنگھ کی ہدایت پر قادر زماں اور اس کے تینوں کارندے جیپ کے پاس سے ہٹ گئے تو بوٹا سنگھ نے ان کے پھینکے ہوئے ہتھیار سمیٹے اور جیپ میں رکھ دیے۔ پھر اس نے پھرتی سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گزرنے والے لمحے کے ساتھ بوٹا سنگھ کی کوئی نئی صلاحیت سامنے آ جاتی تھی۔ اس کی صورت و بدحالی دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ مخنس اسکوٹر یا گاڑی ڈرائیو کر سکتا ہے۔ بوٹے نے جیپ کو یوٹرن دیا اور میرے قریب آن کر رک گیا۔ "بیٹھیں جہانی صاحب" اس نے اپنی باریک آواز میں کہا۔

لیکن وہ ایک چیز بھول رہا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے سارا اسلحہ جمع کر لیا لیکن وہ دوسری شاٹ گن ابھی تک وہیں تھی جو سب سے پہلے پہلوان نما شخص کے ہاتھ سے نکلی تھی اور گھاس میں گری تھی۔ میں نے موقع پر پہنچ کر وہ گن لمبی گھاس میں سے ڈھونڈی اور جیپ میں آ بیٹھا۔ جاگیردار قادر زماں کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ہمیں درختوں سے باندھ کر زندہ جلا دیتا۔ یا پھر اپنے علاقے کی قدیم رسم کے مطابق نیزہ بردار گھڑ سوار ہمارے پیچھے لگا دیتا اور وہ اس گھنے جنگل میں دوڑا دوڑا کر ہمیں ٹکڑے کر دیتے۔ میں نے پسٹل جیب میں رکھ کر اب سیون ایم ایم اٹھا لی تھی اور چاروں افراد کو اس کے نشانے پر لے رکھا تھا۔ ٹریگر پر رکھی ہوئی میری انگلی کا ہلکا سا دباؤ جاگیردار قادر زماں کے جسم کو چھلنی کر سکتا تھا۔ اس دیارِ غیر میں درختوں کے اس نیم تاریک جھنڈ کے اندر جاگیردار کی لاش کو جو قبر نصیب ہوتی، نہ کوئی اس پر فاتحہ پڑھتا اور نہ یہ راز کھلتا کہ وہ کیوں اور کس کے ہاتھوں چھلنی ہوا۔ لیکن میں نے ایک بار پھر اس کی جان بخشی کی۔ کبھی کبھی قادر زماں جیسے دشمنوں کو پالنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں انہیں اپنی عداوت کا سوم رس پینے کی کھلی چھٹی دیتا ہوں۔ وہ پی پی کر اتنے صحت مند ہو جاتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں۔ یا پھر خوب پھولے ہوئے غبارے کی طرح سوئی کی ہلکی سی چھیڑ بھی انہیں نابود کر دیتی ہے۔ ایک دفعہ چنے پل رائی حویلی میں میں نے قادر زماں کی نیند کو ابدی نیند میں نہیں بدلا تھا، دوسری دفعہ آج پھر میں نے درختوں کے جھنڈ میں اسے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے دیا۔ بوٹا سنگھ نے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ قادر زماں اور اس کے ساتھی اپنی جگہ مجسموں کی طرح ساکت و جامد رہ گئے۔

سرخ لباس والے کی مشکیں تو کسی تھیں لیکن منہ کھلا تھا۔ اس کھلے منہ سے وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔ میں نے جیپ کے فرش پر پڑا ایک پرانا کپڑا اٹھایا اور اس کے منہ میں ٹھونس کر اوپر سے اپنا صافہ باندھ دیا۔ موقعے سے چار پانچ فرلانگ آگے آنے کے بعد میں نے بوٹا سنگھ سے پوچھا۔

"اب کہاں چلنا ہے بھئی؟"

وہ بولا "ڈیرے پر ہی چلتے ہیں جی۔ اب واپس فرید کوٹ جانا بڑے کھترے (خطرے) والی بات ہے۔"

"ڈیرا کتنی دور ہے؟" میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

"یہاں سے تو آٹھ دس میل ہی ہوگا۔" اس نے کہا اور بڑی مشاقی سے اسٹیرنگ گھما کر جیپ کو کھیتوں سے ایک نیم پختہ راستے پر لے آیا۔ وہ باکمال ڈرائیور تھا، یہاں کے چور راستوں سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ایسی صورت حال میں مجھے اس سے اچھا ساتھی نہیں مل سکتا تھا۔

جیپ اونچے نیچے راستوں پر اڑی چلی جا رہی تھی اور میری نگاہ دور عقب میں دیکھ رہی تھی۔ تعاقب کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خودکار رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور اس کے میگزین میں دس بارہ گولیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ "مالِ غنیمت" میں حاصل ہونے والے دو عدد پستول اور ایک شاٹ گن بھی جیپ میں موجود تھی۔ دوسرے لفظوں میں اسلحے کے حوالے سے ہمیں کوئی "فکر فاقہ" نہیں تھا۔

اگلے بیس تیس منٹ بے حد خیریت سے گزرے، نہ کوئی ہمارے تعاقب میں آیا اور نہ جیپ نے کسی طرح کا دھوکا دیا۔ بوٹا سنگھ جیپ کو حتی الامکان رفتار سے بھگا رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ "شارٹ کٹ" بھی استعمال کر لیتا تھا۔ لیکن جب حویلی کے آثار قریب نظر آ رہے تھے تو بوٹا سنگھ نے جیپ اچانک روک لی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ اپنی بائیں ران دباتے ہوئے بولا۔ "پٹھا چڑھ گیا ہے حرامجادہ، کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔" اس کے منہ سے پٹھا چڑھنے والی بات بالکل قابلِ یقین لگتی تھی۔ اس کی صحت ہی ایسی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "جیپ چلا سکو گے؟"

"شاید نہیں" وہ ران مسلتے ہوئے بولا۔

وہ ساتھ والی نشست پر چلا گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ مجھے راستہ بتاتا گیا، میں اس کی ہدایت کے مطابق چلاتا رہا۔ گاہے گاہے بوٹا سنگھ کن انکھیوں سے پچھلی نشست پر بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہاں سرخ پوش بندھا پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر بوٹا سنگھ کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو جاتی تھی۔ راستے میں قادر زماں اور اس کے بوتوں کا ذکر بھی ہوا۔ بوٹا سنگھ نے کہا۔ "جہانی صاحب! مجھ کو اندازا ہوتا ہے کہ اس سؤر کے پتر کو آپ پہلے بھی جانتے بوجھتے ہیں" سؤر کے پتر کا اشارہ قادر زماں کی طرف تھا۔

میں نے اس بات کا جواب گول مول انداز میں دیا اور بوٹے کو بتایا کہ ایک دفعہ جنگ میں اس شخص سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد ہم اس کھنڈر ڈاک بنگلے تک پہنچ گئے جس کی چھت پر بے تحاشا گھاس اگی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں دروازے ندارد تھے اور کئی جگہ عمارت کے بجائے صرف ملبے کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ کی آواز سن کر ایک تاریک گوشے میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک سایہ سا لہرا گیا۔

"راما ہنسا ـــ او راما ہنسا" بوٹا سنگھ نے اپنی باریک آواز میں گروہ کے کسی شخص کو پکارا۔

یک لخت ایک سایہ سامنے آ گیا۔ وہ پچیس چھبیس سالہ گبرو سکھ تھا۔ کندھے سے کرپان لٹک رہی تھی اور ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کی شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب ہیجڑے نوشاد کے ڈیرے سے واپس آتے ہوئے بوٹا سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھیرا تھا تو یہ شخص بھی جتھے میں شامل تھا۔ بوٹا سنگھ کے ساتھ مجھے اور بندھے ہوئے شخص کو دیکھ کر رائفل بردار حیران ہوا۔ اتنے میں تین چار اور افراد بھی ڈاک بنگلے کے کونوں کھدروں سے نکل آئے۔ ان میں بابو لیاقت کو دیکھ کر میرے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ بابو لیاقت نے بھی مجھے پہچان لیا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ بھاگ کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس کا لمس ایک سچے دوست کا لمس تھا، ایسا دوست جو اچھے وقت سے زیادہ برے وقت کا ساتھی ہوتا ہے۔ میں ابھی ایک گھنٹا پہلے ایک خونی ہنگامے سے گزر کر آیا تھا۔ خود میرے پسٹل سے میرے ہاتھوں دو افراد موت کے منہ میں گئے تھے۔ ان واقعات کا ناخوشگوار اثر میرے ذہن و اعصاب پر تھا۔ لیکن بابو لیاقت سے مل کر یوں لگا جیسے نصف بوجھ ذہن سے ہٹ گیا ہے۔

"شاہ جہاں صاحب! آپ نے تو حد کر دی" وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "ایسے غائب ہوئے کہ بس سبحان اللہ۔ بندۂ خدا، یہ تو سوچا ہوتا کہ ہم پر کیا گزرے گی۔ خدا گواہ ہے ایک ایک پل گن کر کاٹا ہے۔" اس نے مجھے کندھوں سے تھام کر پیچھے ہٹایا اور غور سے صورت دیکھی، پھر دوبارہ گلے لگا لیا۔ تہ خانے میں جانے کے لیے ملبے کے ایک ڈھیر میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس ڈھیر میں ایک خلا تھا۔ سکڑ سمٹ کر بڑی مشکل سے ہم اس سوراخ میں سے گزرے۔ سامنے ایک بڑا ہال نظر آیا۔ یہاں دن کے وقت بھی لالٹینیں روشن تھیں۔ فرش پر پرالی (چاولوں کی چھال) بچھی ہوئی تھی۔ پرالی پر چادریں ڈال کر آرام دہ بستر بنا لیے گئے تھے۔ اس بڑے ہال کی پارٹیشن کی گئی تھی۔ لیکن یہ پارٹیشن لکڑی یا ہارڈ بورڈ وغیرہ کی نہیں،

پڑے کی تھی۔ رسیاں باندھ کر چادریں لٹکا دی گئی تھیں۔ جمند بھی یہاں موجود تھی لیکن وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ چہرے سے کئی ہفتے کی بیمار لگتی تھی۔ بابو لیاقت نے بتایا کہ بک کے ملنے اور دوبارہ کھو جانے کا اس کے دماغ پر بے حد اثر ہوا ہے۔ وہ مسلسل بے خوابی کا شکار ہے اور کسی وقت دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی ہے۔ اس نے بتایا کہ فی الحال وہ خواب آور دوا کے زیر اثر سو رہی ہے۔ یہیں ایک کونے میں مجھے وہ گونگی لڑکی جیسو بھی نظر آئی جو اب تک کی تفتیش کے مطابق عشرت فارم پر ہونے والی واردات کی اکلوتی گواہ تھی۔ اس کے ساتھ پکڑے جانے والے دونوں ملازم تہہ خانے کے مردانہ حصے میں بیٹھے تھے۔

بوٹا سنگھ دیگر افراد کے ساتھ مل کر سرخ لباس والے کو اندر لے آیا تھا۔ اس کی سرخ قمیص گردن میں دو دھجیوں کی صورت لٹک رہی تھی۔ واسکٹ کا بھی کہیں پتا نہیں تھا۔ پگڑی بھی گر چکی تھی۔ وہ ہندو تھا یا موٹا سکھ۔ کیونکہ اس کے سر پر جوڑا نہیں تھا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے بابو سے کہا کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم جتنی جلدی اس شخص کی زبان کھلوا سکیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

بابو لیاقت نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور ہمیں لے کر ایک حجرہ نما مقام پر آ گیا۔ مغلیہ دور کی اکثر تاریخی عمارتوں کی چار دیواری کے ساتھ ایسے ہی حجرے قطار اندر قطار نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے حجروں میں شاہی خادمین قیام کرتے تھے۔ آج کل ان حجروں میں جوا ہوتا ہے، نشے کے سگریٹ پیے جاتے ہیں، محبت ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو تفریحی و تاریخی مقامات پر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ حجرہ بھی ان حجروں سے ملتا جلتا تھا۔ بے حد موٹی دیواریں، نہ کھڑکی نہ روزن، بس ایک ساڑھے پانچ فٹ کا دروازہ تھا جس میں سے ہم سب جھک کر (سوائے بوٹا سنگھ کے) داخل ہوئے تھے۔ بابو لیاقت نے ماچس جلائی اور طاق میں رکھا ہوا مٹی کا دیا روشن کر دیا۔

اس بند کوٹھڑی میں بابو لیاقت، بوٹا سنگھ اور میں نے سرخ لباس والے سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے رہنے دیے گئے تھے، صرف منہ سے کپڑا نکالا گیا تھا۔ وہ ہم سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ ہم نے اس کے سامنے قادر زماں کے دو کارندوں کو جہنم واصل کیا تھا اور بقیہ تین کو "ہینڈز اپ" کرا کے صاف نکل آئے تھے۔ تاہم مرعوب ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں اکھڑپن موجود تھا۔ وہ ہم سے استفسار کرنے لگا کہ ہم کون

کے کانوں سے نیچے رگیں پھول سی جاتی تھیں۔ ایسے میں وہ ایک بے حد غصیلا شخص نظر آنے لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ تاؤ آتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ اس کے مسلسل بک بک کرتے منہ میں مٹی بھروا دی جائے۔

جب ہم اس کے سوالات کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے تو وہ بھڑک اٹھا۔ حالانکہ دوران سفر اس کی آنکھیں کھلی رہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ ہم اسے ایک ویران سنسان جگہ لے آئے ہیں لیکن پھر بھی وہ "ہاں ہاں" کر رہا تھا۔ جیسے امید رکھتا ہو کہ یہ شور سن کر کچھ لوگ اس کی مدد کو آ جائیں گے۔ بابو لیاقت کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ نرمی سے پوچھ گچھ کی جائے اور مار پیٹ سے گریز کیا جائے۔ بابو لیاقت ایک سیاسی شخص تھا اور تصادم سے زیادہ مذاکرات پر یقین رکھتا تھا۔ یہ بری عادت نہیں تھی لیکن اس وقت ہم مذاکرات میں وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ فی الحال تو ہمیں ہٹلر کے خیالات سے استفادہ کرنا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو کام گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے مہینوں میں انجام پاتا ہے وہ میں طاقت کے مناسب اور ماہرانہ استعمال سے گھنٹوں میں کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے آنجہانی ہٹلر کے الفاظ مختلف رہے ہوں لیکن مفہوم اس سے ملتا جلتا تھا۔

میں نے بابو لیاقت کو تو کہہ سن کر باہر بھیج دیا اور خود آستین چڑھا کر سرخ پوش کے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر رخسار اور دائیں آنکھ کے قریب چوٹوں کے نشان موجود تھے۔ یہ چوٹیں اس دھینگا مشتی کی نشانی تھیں جو درختوں کے جھنڈ میں قادر زماں کے کارندوں اور سرخ پوش کے درمیان ہوئی تھی اور جس دھینگا مشتی کے نتیجے میں سرخ پوش کو باندھ کر جیپ میں ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے اس کی ایک چوٹ پر بے دردی سے ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا اٹھا اور گالیاں بکنے لگا۔ میں نے کہا "گالیاں دینے کی تمہیں کھلی آزادی ہے کیونکہ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ تم یہ گالیاں ہمیں نہیں اپنے قریبی عزیزوں کو دے رہے ہو لیکن جو کچھ ہم پوچھ رہے ہیں وہ تمہیں بتانا پڑے گا ورنہ تمہارے ساتھ وہ کچھ ہو جائے گا کہ کسی کے سامنے ذکر کرتے ہوئے بھی شرماؤ گے اور اگر مر گئے تو تمہاری آتما نرک میں ساتھی آتماؤں سے نظر چرائی پھرے گی۔"

وہ بولا۔ "میں کہتا ہوں، مجھے دھمکیاں مت دو۔ تم چوہوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں میں۔ آٹھ سال پولیس کی نوکری کی ہے۔ بڑے بڑے پاٹے خانوں کو ناک سے پانی پلایا ہے۔"

"..... تو پولیس میں ....." میں نے کہا۔ "

تمہاری چمڑی پر ہمارا حق اور بھی زیادہ بنتا ہے۔ پولیس والے بڑے پسند ہیں ہمیں۔ جب تک کھانے کے ساتھ دو تین پولیس والے نہ کھائیں لگتا ہے کہ کچھ کھایا ہی نہیں۔ ویسے بائی دی وے، پولیس میں کیا کرتے تھے تم۔ میرا مطلب ہے، بھونکنے اور حرام کھانے کے علاوہ۔"

وہ بولا "میرا وچار ہے کہ رام پانڈے کا نام تم نے نہیں سنا ہوا؟"

"بالکل نہیں" میں نے پورے یقین سے نفی میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ "تو بس گرہ میں باندھ لو۔ یہ نام اب تمہیں زندگی بھر نہیں بھولے گا۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم جس طرح تڑپ تڑپ کر مرو گے وہ نظارہ ناقابل فراموش ہوگا۔"

میرے پُرسکون اور پُراعتماد لہجے نے اسے ٹھٹکا دیا۔ غالباً وہ اب تک خود کو یہی تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم عام قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں، جو اسے کوئی امیر کبیر ہستی سمجھ کر اٹھا لائے ہیں اور اب اس کی رہائی کے بدلے مالی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یا پھر اس کے خیال میں کوئی ماضی کی دشمنی اس اغوا کا سبب بنی تھی۔ عموماً تند مزاج پولیس والوں کے ساتھ اسی قسم کے "ہاتھ" ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب میرے انتہائی سنگین لہجے نے اسے اندر سے ہلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور بوٹا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ پھر نسبتاً دھیمے لہجے میں بولا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ میرے بارے میں تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کر سکتا ہوں لیکن پہلے تمہیں میرے یہ جکڑ بند کھولنے ہوں گے۔"

بوٹا سنگھ بولا۔ "بھجن جی! یہ جکڑ بند تو اب تمہاری چتا میں جل کر ہی کھلیں گے اور اگر چاہتے ہو کہ چتا سے پہلے کھل جائیں تو جو ہم پوچھ رہے ہیں، فرفر بتاتے جاؤ بالکل جیسے دونی کا پہاڑا سناتے ہیں۔"

سرخ پوش کو اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ اپنے ہی جیسے سرپھرے لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ اس تہ خانے میں موجود اسلحے کی مقدار اور افراد کی تعداد بھی متاثر کن تھی۔ ہمارے دم بدم بگڑتے تیور دیکھ کر اس نے ایک دم اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور دوستانہ انداز میں بولا "ایک سگریٹ مل سکے گا؟"

بوٹا سنگھ نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بوٹا سنگھ کے غلیظ ہونٹوں سے نکلا ہوا سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دباتے ہوئے سرخ پوش کو کراہت محسوس ہوئی۔ مگر بہت سی دوسری ناپسندیدہ اور اشتعال انگیز باتوں کی طرح اس نے یہ کراہت بھی برداشت کر لی۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں۔۔۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"رام پانڈے۔" سرخ پوش نے جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"فاضلکا کا۔ لیکن جب سے نوکری چھوڑی ہے فیروز پور میں ہوں۔"

"فیروز پور شہر میں؟"

"نہیں۔ نواحی گاؤں رت پور میں۔"

"رت پور میں تمہارا کون ہے؟"

"وہاں میرا گھر ہے، گھر والی ہے اور ماتا ہے۔ تھوڑی سی زمین ہے، اس سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"نوکری کیوں چھوڑی تم نے؟"

"بس محکمے میں ایک بڑے افسر سے خار بازی ہو گئی تھی۔ اس نے لائن حاضر کرا دیا۔ ابھی انکوائری چل رہی تھی کہ میں نے استعفیٰ دے دیا۔"

میں نے پولیس والوں کے انداز میں اچانک پوچھا۔ "نمبردار عشرت کو کب سے جانتے ہو؟"

"کک۔۔۔ کون نمبردار؟" رام پانڈے گڑبڑا گیا۔

"وہی جس کے فارم پر 22 مارچ کی رات ڈاکا پڑا اور ایک قتل ہوا تھا۔"

میں نے صاف محسوس کیا کہ رام پانڈے کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا ہے۔ وہ بولا۔ "میں کسی نمبردار کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔ "یہی وہ موڑ ہے، جس پر ہمارے تمہارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ ہمیں قصائی بننا پڑے گا اور تمہیں بکری۔ ہم تمہاری کھال کھینچیں گے اور تکبیر بعد میں پڑھیں گے۔۔۔ اور تکبیر بھی ایک ہی بار نہیں پھیریں گے۔ اس کی چار پانچ قسطیں کریں گے اور ہر قسط کے درمیان ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔"

اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ منہ سے "تھو" کی آواز نکال کر اس نے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا اور بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "مجھے باندھ کر کتے کی طرح بھونک رہے ہو، کھول کر دیکھو ابھی پتا چل جاتا ہے کہ کون قصائی ہے اور کون بکری۔۔۔ میں تمہارا حوالاتی نہیں ہوں کہ ہر سوال کا جواب دیتا جاؤں۔ میں نے بگاڑا کیا ہے تمہارا۔۔۔ کیا کیا ہے

میں نے۔"

میں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "تم نے وہی کیا ہے جو اکثر پولیس والے رات کے اندھیرے میں کرتے ہیں۔ تم نے ڈاکہ ڈالا ہے عشرت فارم میں۔ وہاں ایک چوکیدار کو قتل کیا ہے۔ ایک بے زبان لڑکی کی عزت خراب کی ہے اور ایک ٹرک سمیت تین افراد کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے ہو۔"

رام پانڈے کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ میں یہاں سے جیون بچا کر نہیں نکلوں گا۔ کیوں کہ میں پاگلوں کے نرغے میں ہوں اور پاگل کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

بوٹا سنگھ بولا۔ "کھوتے کے پتر! یہ بات تو ہم نے تمہیں پہلے بتا دی ہے کہ ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بار بار ایک ہی بات کرنے سے کیا فائدہ؟"

میں نے بوٹا سنگھ کی کمر سے کرپان کھینچ لی اور سفاک لہجے میں کہا۔ "بوٹا سنگھ! میرا خیال ہے' اس پر بھی انسپکٹر دربار سنگھ والی ترکیب استعمال کرنا پڑے گی۔ پولیس والا ہے نا' اسی کی طرح ٹیڑھا ہے۔ لٹاؤ اس حرامی کو الٹا۔"

بوٹا سنگھ نے فوراً عمل کیا۔ بندھے ہوئے رام پانڈے کو اوندھا کرنے میں اسے خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ رام پانڈے کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے' خون رُکنے کے سبب اس کی انگلیاں نیلی ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک گھٹنا اس کی پشت پر رکھا اور دائیں ہاتھ کی ایک انگلی اپنی گرفت میں لے لی۔ بوٹا سنگھ نے کسی تجربہ کار نرس کی طرح پانڈے کا باقی دھڑ اپنی گرفت میں لے لیا تاکہ وہ زیادہ تڑپے مچلے نہیں۔

رام پانڈے بہت سخت جان تھا لیکن دربار سنگھ سے زیادہ سیانا نکلا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کتنی بھی قوت برداشت کا مظاہرہ کرے' آخر اسے گھٹنے ٹیکنے ہی ہیں۔ تو کیوں نہ شدید جسمانی نقصان اٹھانے سے پہلے ہار مان لی جائے۔ ابھی میں نے اس کی صرف دو انگلیوں پر ہی کرپان کی دھار آزمائی تھی کہ وہ چلّا اٹھا "بس کرو۔ بھگوان کے لیے بس کرو۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں' اتر جاؤ میرے اوپر سے۔"

اس نے مچھلی کی طرح تڑپ کر مجھے اپنے اوپر سے جھٹکنا چاہا۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کی گردن بوٹا سنگھ کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے سر گرا کر اپنی کٹی ہوئی انگلیوں پر نظر ڈالنا چاہی لیکن میں نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنا لہولہان ہاتھ نہ دیکھ سکے بلکہ اس لیے کہ اس کا خوف و ہراس برقرار رہے۔ دراصل میں نے اس کی انگلیاں کاٹی نہیں تھیں' صرف زخمی کی تھیں' لیکن اس پر یہی ظاہر کیا گیا تھا کہ انگلیاں علیحدہ کر دی گئی ہیں۔ شوخ میں میں نے دربار سنگھ کی انگلیاں بھی نہیں کاٹی تھیں' صرف ظاہر کیا تھا کہ انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ ہاتھ سلامت رہے اور وہ زبان بھی کھول دے مگر وہ ڈھیٹ نکلا تھا اور انگلیاں کٹوا کر ہی راہ راست پر آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے نفسیاتی اثر قبول کرنے کے بجائے خالص جسمانی اثر قبول کرنے کو ترجیح دی تھی۔

میں نے تڑپتے پھڑکتے رام پانڈے کو اپنی رانوں میں دبائے رکھا اور اسی حالت میں اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ رام پانڈے میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہمیں گالیاں دے لہٰذا وہ خود کو گالیاں دے رہا تھا اور ہائے وائے کر رہا تھا۔ اسی حالت میں اس نے رک رک کر جو کچھ بتایا اور میں نے اپنے سوالات کے ذریعے جو کچھ معلوم کیا اس کا لب لباب یہ ہے۔

رام پانڈے نے تسلیم کیا کہ چند ہفتے پہلے وہ عشرت فارم میں ہونے والی واردات میں ملوث رہا ہے اور 22 مارچ کی رات جو پانچ افراد عشرت فارم میں گھسے تھے۔ وہ ان میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ گنڈا رام پور گاؤں سے چھ سات میل شمال کی طرف بڑی نہر کے کنارے خانہ بدوشوں کی ایک بستی ہے۔ یہاں گگڑے رہتے ہیں' سانسی خانہ بدوشوں کی طرح وہ بھی بے حد جھگڑالو لوگ ہیں' چوریاں' ڈکیتیاں کرتے ہیں اور ہر طرح کا شکار' بلی' گیدڑ' لومڑ وغیرہ مار کر کھا جاتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ سانپ بھی پالتے ہیں اور ان کا تماشا دکھا کر روزی کماتے ہیں۔ اس بستی کے چند گھرانے چوری ڈکیتی میں نامی گرامی ہیں۔ وہ اکثر ہتھیار بند ہو کر واردات کرتے ہیں اور خطرے کے وقت بھاگنے کے بجائے مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ ان لوگوں نے سانپ کے زہر کو ایک خطرناک زرعی دوا میں ملا کر ایک تیز قسم کا زہر تیار کر رکھا ہے۔ اس زہر کو چانکی کہتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ گگڑے اپنی کلہاڑیوں اور برچھیوں وغیرہ کے پھل اس زہر میں بجھا لیتے ہیں اور ان ہتھیاروں کا گھائل کیا ہوا چند منٹ میں سُورگ باشی ہو جاتا ہے۔ اس بستی کا شیرا منگی نامی ایک شخص بہت تیز طرار مشہور ہے۔ عشرت فارم کی واردات اسی شیرے نے اپنے چار ساتھیوں سے مل کر کی تھی۔

میں نے کہا۔ "لیکن تم مان چکے ہو کہ اس واردات میں تم بھی شریک تھے۔"

"میں انکار کہاں کر رہا ہوں۔" رام پانڈے نے کہا۔ "جو جرم میں نے کیا ہے' وہ تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکن جو

نہیں کیا۔۔۔ وہ نہیں کیا۔ دو انگلیاں چھوڑ میرا سر بھی ہر کا ٹ دو گے تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

رام پانڈے نے کہا۔ "شیرا منگی پرانے وقت سے میرا شناسا تھا۔ ایک دو دفعہ میرا اس سے ٹاکرا بھی ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے پر گولی بھی چلائی لیکن پھر وہ میرا یار بیلی بن گیا۔ اس نے مجھے وچن دیا تھا کہ جس تھانے میں میری ڈیوٹی ہو گی وہ وہاں واردات نہیں کرے گا۔ جب تک میں پولیس میں رہا اس نے اپنا وچن نبھایا۔ پچھلے مہینے ۲۰ تاریخ کو وہ رات کے وقت مجھ سے ملنے میرے گاؤں آیا۔ اس نے کہا کہ گنڈا را پور گاؤں کے نمبردار عشرت پر اس کی بہت عرصے سے نظر ہے لیکن عشرت فارم چونکہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ اس لیے وہ نمبردار کو بخشتا رہا ہے۔ اب میں اس تھانے میں نہیں رہا بلکہ پولیس ہی میں نہیں رہا اس لیے وہ نمبردار سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔ ہم دونوں بیٹھے دارو (شراب) پیتے رہے اور نمبردار عشرت کی باتیں کرتے رہے۔ شیرے کا خیال تھا کہ نمبردار بہت موٹی مرغی ہے اور اس کے "سیف" میں سے چار پانچ لاکھ کا دھن نکل آنا معمولی بات ہو گی۔ پھر اس کے پاس چار پانچ مہنگے گھوڑے بھی تھے۔ ان میں سے دو گھوڑوں کی قیمت ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ شیرے نے مجھ سے کہا کہ میں بھی اس واردات میں شریک ہو جاؤں۔ میں ترنگ میں تھا اس لیے ہامی بھر لی۔

بعد میں میں نے سوچا بھی کہ یہ ٹھیک نہیں ہوا لیکن ہامی بھری تھی اس لیے پیچھے ہٹنا مشکل تھا۔ ۲۲ مارچ کی رات شیرا اور اس کے چار ساتھی گھوڑیوں پر سوار ہو کر میرے گاؤں آ گئے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور گنڈا را پور پہنچ گئے۔ میرے پاس ریوالور تھا جب کہ شیرا اور اس کے ساتھی اپنے دیسی ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ دو کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور دو کے پاس برچھیاں۔ خود شیرے کے پاس کلہاڑی کے علاوہ ایک بڑی سخت قسم کی کمان تھی۔ اس کمان میں چلنے والے بہت سے تیر اس نے پلاسٹک کے ایک پائپ میں ڈال کر کندھے سے لٹکا رکھے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان سب تیروں پر چانکی لگی ہوئی ہے۔ جو نشانہ بنے گا پھڑک کر مر جائے گا۔ نہ شعلہ' نہ دھماکا نہ بندوق جام ہونے کا ڈر' بس زہ کھینچا اور بندہ پار۔

ہم رات پورے آٹھ بجے چلے تھے' رات دس بجے کے لگ بھگ عشرت فارم پہنچ گئے۔ عشرت فارم سے کچھ فاصلے پر ہم نے گھوڑیاں چھوڑ دیں۔ شیرے کا ایک ساتھی بھی گھوڑیوں کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ ہم سب نے دارو پی رکھی تھی۔ نشے کی وجہ سے ہر طرح کا خوف ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ پہلے ہم نے فارم کا ایک چکر لگایا پھر باہر کی دیوار پھاند کر اندر گھس گئے۔ یہاں بس ایک دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے پاس نمبردار عشرت کے چوکیدار نے ہمارا راستہ روکا۔ وہ ابھی بندوق ہی سیدھی کر رہا تھا کہ شیرے کے ایک ساتھی نے کلہاڑی کا زوردار ہاتھ مارا۔ پھل چوکیدار کے منہ پر لگا اور وہ الٹ کر سیڑھیوں کے پاس جا گرا۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی دوسرا وار اس کے سر پر لگا اور سر دو ٹکڑے ہو گیا۔ چوکیدار کو گرانے کے بعد ہم اندر گھس گئے۔ ایک کمرے میں ایک اونچا لمبا جوان سویا پڑا تھا۔ بعد میں اس کا نام رجن سنگھ (صفدر) معلوم ہوا۔ اس کا پستول دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ ہم نے وہ پستول قبضے میں لیا اور دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے بعد ہم نے اوپر کی منزل پر جا کر نمبردار عشرت کو قابو کیا۔ وہ رسوئی میں تھا اور اپنی نگرانی میں کھانا پکوا رہا تھا۔ اس نے قابو آنے سے پہلے کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن آخر پکڑا گیا۔ بعد میں اسے بھی رجن سنگھ کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا۔ اس کمرے میں دروازے کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا اور ہمیں وشواس تھا کہ وہ دونوں وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس دوران شیرے کے بندوں نے ایک چوتھے شخص کو بھی پکڑ لیا۔ وہ احاطے میں کھڑے ٹرک پر سویا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام پریت بتایا۔ وہ بھی کوئی خانہ بدوش لگتا تھا۔ اس کی ران پر گہرا گھاؤ تھا اور چلنا پھرنا بھی اس کے لیے کٹھن ہو رہا تھا۔ شیرے نے اس کی تلاشی لے کر نچلی منزل کے اسٹور میں بند کر دیا۔ اس کے بعد ڈیرا ہمارے قبضے میں تھا اور صبح تک کوئی فکر فاقہ نہیں تھا۔ ہم نے سب سے پہلے نمبردار عشرت کا آہنی سیف کھولا اور اس میں سے نقدی اور زیور نکالے۔ یہ کل ستر اسی ہزار کا مال تھا اور شیرے کے اندازوں سے بہت کم تھا۔ شیرے نے نمبردار عشرت کو مارا پیٹا اور پوچھا کہ باقی مال اس نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ اس نے کہا۔ "کہیں نہیں چھپایا' چند روز پہلے اس نے نئی گاڑی لی ہے۔ جو باہر ڈیوڑھی میں کھڑی ہے۔" دوسری اور کھٹنا یہ ہوئی کہ نمبردار کے گھوڑے بھی طویلے میں نہ ملے۔ انہیں صرف ایک دن پہلے شہر بھیج دیا گیا تھا۔

شیرے اور اس کے ساتھیوں نے ڈیرے کی تلاشی لی' پھر اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ یہاں انہوں نے ایک الماری توڑ

کر ولایتی رانڈو کی بوتلیں نکالیں اور پینے پلانے میں لگ گئے۔"

یہاں تک بتا کر رام پانڈے کچھ اٹک گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گونگی لڑکی چھیمو والے واقعے سے کنی کترا رہا ہے۔ میں نے خود چھیمو کا ذکر چھیڑ دیا اور رام پانڈے سے پوچھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ پہلے تو پانڈے نے ادھر اُدھر کی ہانکی لیکن جب میں نے اصرار کیا تو اسے یہ گناہ بھی قبول کرنا پڑا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی جوان تھی اور وہ نشے میں تھا۔ پھر وہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا۔ لڑکی رو رہی تھی۔ اور ان سب کی منت سماجت کر رہی تھی۔ وہ اسے پچھلے کمرے میں لے آیا اور اسے اشاروں سے سمجھایا کہ یہ خانہ بدوش بہت خطرناک قسم کے لوگ ہیں، اسے کچا کھا جانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ بہتر ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہے اور اس کی بات مانے۔ لڑکی نے رونا چلانا شروع کر دیا اور باہر کی طرف بھاگنے لگی۔ مجبوراً اسے رسّی سے باندھنا پڑا۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہم لیعنی میں، بوتا سنگھ اور بابو لیاقت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ جس طرح بالا کی منزل پر ایک خوبصورت دسترخوان اُجاڑا گیا تھا اسی طرح ایک لڑکی کو بھی اجاڑ دیا گیا تھا۔

رام پانڈے نے بتایا۔ "وہ مستی کی رات تھی۔ ولایتی دارو نے ہم سب کے میٹر گھما رکھے تھے۔ شیرے کا خیال تھا کہ ڈیرے پر ایک بندہ مار کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آیا اس لیے یہ ڈاکا ناکام ثابت ہوا ہے۔ میں نے پوچھا "کامیاب کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ چوہدری کرم چند کو لے آئیں، پتے کھیلنے کے لیے۔ میں اس کی بات سمجھ گیا۔ چوہدری کرم چند بہت مالدار اسامی ہے۔ وہ اکثر جوا بھی کھیلتا ہے۔ جوئے کی یہ محفلیں عشرت فارم پر ہی جمتی تھیں۔ جب بھی نمبردار عشرت کھیلنے کے موڈ میں ہوتا تھا، وہ اپنی گاڑی بھجوا کر چوہدری کرم چند کو بلوا لیتا تھا۔ نمبردار عشرت اناڑی تھا اس لیے کرم چند بھاگا بھاگا آتا تھا اور ایک ہی پھیرے میں اکثر چالیس پچاس ہزار جیت کر چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ نشے باز کی سمجھ میں نشے باز کی بات فوراً آجاتی ہے۔ میں نے اسی وقت نمبردار عشرت کی نئی نکور گاڑی نکالی اور کرم چند کو لینے فرید کوٹ روانہ ہو گیا۔ اس وقت ڈیرے سے نکلتے ہوئے میری نظر ٹرک پر بھی پڑی تھی۔ اس پر گتے لدے تھے اور اگلے حصے کو ایک ترپال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس ٹرک پر کروڑوں روپے کے ہیرے جواہرات اور زیور لدے ہیں۔ میں نے گاڑی کا کیسٹ پلیئر اونچی آواز میں لگا دیا اور اسے فرید کوٹ کی طرف بھگاتا چلا گیا۔ اس وقت میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ڈیرے پر ایک بندے کی لاش پڑی ہے اور تین بندے ہم نے کمروں میں بند کر رکھے ہیں۔ نہ ہی یہ سوچا کہ کرم چند جیسے ٹھاکے میرے ساتھ جوا کھیلنے کے لیے کیسے چل پڑے گا اور اگر آ بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ جیب میں ڈال کر ہی نکلے۔ بس یہی ذہن میں تھا کہ کرم چند کو نمبردار عشرت کے ڈیرے پر لے جانا ہے اور اس سے رقم جیتنی ہے یا پھر چھین لینی ہے۔ بعد میں کیا ہوتا یہ بعد میں دیکھا جاتا۔

ابھی میں گنڈا راپور سے بمشکل چار پانچ میل دور ہی گیا تھا کہ اندھیرے اور مدہوشی کے کارن کار پر قابو نہ رکھ سکا۔ بجائے اس کے کہ میں پل پر سے نہر پار کرتا میں نے ایسی جگہ سے نہر پار کرنے کی کوشش کی جہاں پل نہیں تھا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ میں کار سمیت چودہ فٹ گہری نہر میں گرا۔ ابھی جیون باقی تھا کہ سخت چوٹیں لگنے کے باوجود میں بے ہوش نہیں ہوا اور ڈوبتی ہوئی کار میں سے نکل کر باہر آ گیا۔ نہر کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ کنارہ پکڑنے میں مجھے ایشوریا و آ گیا۔ ایک ٹخنا بری طرح گھائل ہو گیا۔ ہاتھ اور سر پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب یہ چوٹیں ٹھنڈی ہو گئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ عشرت فارم واپس جانا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں وہیں ایک کھیت میں چھپ چھپا کر بیٹھ گیا۔ صبح ایک کسان کی مدد لے کر میں تحصیل اسپتال پہنچا اور وہاں سے مرہم پٹی کروا کے اپنے گاؤں رت پور واپس چلا گیا۔ دو روز تک میں گھر سے باہر نکلا نہ مجھے یہ پتا چلا کہ گنڈا راپور میں کیا ہوا ہے۔ تیسرے روز دوپہر کو ایک شخص نے بتایا کہ نمبردار عشرت اپنے چھ کارندوں سمیت ڈیرے سے غائب ہے۔ اس کے چوکیدار کو قتل کر دیا گیا ہے۔ کتا مار ڈالا گیا ہے اور اس کی نئی گاڑی بھی ڈیرے پر موجود نہیں۔ اس شخص نے جو سب سے اہم جانکاری مجھے دی وہ یہ تھی کہ نمبردار کے ڈیرے سے گتوں سے لدا ہوا ایک ٹرک غائب ہو گیا ہے اور یہی وہ ٹرک ہے جس کا چرچا کئی دنوں سے سنا جا رہا ہے۔"

اپنی روداد کو اختتام تک پہنچا کر رام پانڈے خاموش ہو گیا۔ میرے اشارے پر بوتا سنگھ نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ میں نے اس کی کمر اپنی ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کر دی۔ وہ زرد رنگا کر پہلو کے بل ہو گیا۔ اس کی زرد پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ سب سے پہلے اس نے گردن موڑ کر اپنی انگلیاں دیکھیں، انہیں باتھوں سے منسلک پا کر اس کے

چہرے سے حیرت آمیز اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "ہمگن لو۔ انگلیاں ابھی پوری ہیں اور اس طرح تعاون کرتے رہو گے تو پوری ہی رہیں گی۔"

اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس فراڈ پر ہمیں کوسے یا ہمارا شکریہ ادا کرے۔ وہ کچھ دیر بڑی گہری نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر بولا "بڑی غلط قسم کی چیزیں ہو تم دونوں۔"

میں نے کہا "اسی لیے تمہاری انگلیاں سلامت ہیں۔"

اس نے کہنیوں پر زور دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ بوتا سنگھ باہر گیا اور ایک میلی سی پٹی لے آیا۔ ساتھ میں چولہے کی راکھ بھی تھی۔ راکھ سے اس نے رام پانڈے کی انگلیوں سے رسنے والا خون بند کیا اور پٹی باندھ دی۔ یوں تو وہ رام پانڈے کی تیمارداری کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں پانڈے کے لیے بدستور نفرت کی چنگاریاں تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ پانڈے سے کچھ زیادہ ہی خار کھا رہا ہے۔

انگلیاں کٹ جانے کا نفسیاتی اثر تھا کہ رام پانڈے کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے۔ کہنے لگا "تم نے جو چاہا مجھ سے پوچھا۔ کیا میں بھی کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "فی الوقت پوچھنے کا حق صرف ہمیں ہے۔ بہرحال کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں تم لوگ مکھیوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے ہو۔ مجھے وشواس ہے تمہارا ناتا پولیس سے نہیں۔ پھر مجھ سے یہ کھینچا تانی اور پوچھ کچھ کیوں ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس بارے میں تمہارا اپنا کیا وچار ہے؟"

وہ بولا "مجھے پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔"

"میرا خیال ہے تم بھولے بن رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ اس علاقے میں چپے چپے پر گمشدہ ٹرک کی تلاش ہو رہی ہے۔ ٹرک ۲۲ مارچ کی واردات میں غائب ہوا اور تم اس واردات میں شریک تھے۔ اس حوالے سے ٹرک کے ساتھ تمہارا گہرا سمبندھ ہے۔ حیرت کی بات یہ نہیں کہ تم پکڑے گئے ہو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تم اب تک آزاد پھر رہے تھے۔"

وہ کہنے لگا۔ "واردات سے میرا سمبندھ ضرور ہے لیکن ٹرک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔ "جس طرح تم نے واردات کے بارے بتایا ہے اسی طرح ٹرک کے بارے میں بھی بتاؤ گے اور نہ صرف بتاؤ گے بلکہ ٹرک برآمد بھی کرواؤ گے۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ اب تم اپنا وقت اور میری انگلیاں ضائع کرو گے۔"

اس کی ہنسی میں ایسی قطعیت تھی کہ میری آنکھوں میں امید کی کرنیں بجھنے لگیں۔ میرے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ "اب یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم اس سے اور کچھ نہیں اگلوا سکو گے۔"

اگلے تو ڈیڑھ گھنٹے میں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہو گیا۔ رام پانڈے سے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مزید کچھ جانتا ہی نہیں۔ بقول اس کے وہ خود حیرت میں غرق تھا کہ واردات کی رات اس کے جانے کے بعد عشرت فارم پر کیا صورت حال پیش آئی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ تمہیں اس "جھونپڑا بستی" لے جاؤں جہاں سے شیرا اور اس کے ساتھی گھوڑیوں پر سوار ہو کر آئے تھے، لیکن وہاں سے بھی تمہیں کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیران ہو کہ واردات کے بعد ان خانہ بدوشوں میں سے کوئی بھی اپنے جھونپڑے میں واپس نہیں لوٹا۔ سوائے اس شخص کے جو گھوڑیاں لے کر فارم سے باہر کھڑا تھا اور اگلی صبح دیر تک انتظار کرنے کے بعد بستی واپس پہنچا۔"

اچانک ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ باہر سے کچھ ملی جلی آوازیں آئی تھیں۔ میں نے تنگ و تاریک کوٹھری سے باہر نکل کر دیکھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے غزالہ پر پڑی۔ وہ راجستھانی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ چہرہ چادر کے پلو نے ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ خوبصورت شربتی آنکھیں جو دیکھنے والے کے تصور سے چپک کر رہ جاتی تھیں۔ غزالہ کے ساتھ نشا تھی۔ نشا کے عقب میں سائیں عالی تھا اور ان تینوں کو یہاں لانے والا زریں گل تھا۔ زریں نے خود بھی ایک چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس چادر کے نشیب و فراز سے اندازہ ہوتا تھا کہ بکل میں رائفل بھی چھپی ہوئی ہے۔ ان سب کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ تھکے ماندے ہیں اور طویل سفر کر کے آئے ہیں۔

سلام دعا کے بعد زریں گل نے یہ انکشاف کیا کہ انسپکٹر دربار سنگھ بھاگ نکلا ہے اور اس کے بھاگنے کے بعد وہ سب فرید کوٹ والی کوٹھی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دربار سنگھ اسی کوٹھی میں مقیم تھا جہاں ہمارے میزبان سفیر احمد نے ہمیں ٹھہرا رکھا تھا۔ یہ کوٹھی سفیر کے ایک قریبی عزیز کی تھی۔ ہم نے دربار سنگھ پر سختی کر کے اس کی زبان کھلوائی تھی اور اس

نے ہمیں گمنام خطوط کے ساتھ ساتھ لنگروال کے میلے اور سرخ لباس والے شخص کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا تھا۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم نے اسے نچلی منزل کے ایک اندرونی کمرے میں بند کردیا تھا۔ اس کمرے میں ملحقہ باتھ موجود تھا۔ دربار سنگھ کی دیگر ضروریات بھی اسی کمرے کے اندر پوری کردی جاتی تھیں لیکن اب۔۔۔ وہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگا تھا۔ اس واقعے کے بعد زریں گل اور سفیر احمد نے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ زریں گل نے سامیں علی اور دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا تھا اور اس کوٹھی سے نکل آیا تھا۔ اسے اس ٹھکانے کا اچھی طرح علم تھا لہٰذا وہ بذریعہ بس فرید کوٹ روانہ ہوا تھا اور تین چار میل پیدل چلنے کے بعد اس ٹھکانے تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے زریں گل سے پوچھا۔ "جب دربار فرار ہوا تم کہاں تھے؟"

وہ قدرے ندامت سے بولا۔ "ام گھری میں تھا۔ میلے میں سفیر صاحب اور ام نے ڈھائی گھنٹا آپ کا انتظار کیا۔ آپ نہیں آیا تو ام فرید کوٹ کی طرف چل پڑا۔ شاید آپ کو ابھی پتا نہیں ہے کہ میلے میں چار بندے قتل ہوا ہے اور زخمی ہونے والا تو دو درجن سے کم نہیں ہوگا۔ پندرہ بیس دکانیں بھی جل گیا ہے۔ پولیس نے میلے کی جگہ کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ امارا وہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس لیے آپ کو خدا کے سپرد کرکے ام برادر سفیر صاحب کے ساتھ فرید کوٹ واپس آگیا۔ ابھی ام کو آئے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ بیگم صاحب (غزالہ) نے شور مچا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ابھی ایک بندہ دیوار پر چڑھ کر باہر کودا ہے۔ ام نے دائیں بائیں دیکھا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اتنے میں برادر سفیر صاحب نے بتایا کہ وہ حرامی انسپکٹر نکل بھاگا ہے۔ اس خانہ خراب نے ایک روشندان کا جالی کاٹ کر وہاں سے چند اینٹیں اکھاڑا تھا اور نکل گیا تھا۔ بس ام سمجھ گیا کہ اب امارا یہاں رہنا سخت بیوقوفی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "سفیر صاحب کہاں ہیں؟"

نشا بولی "انہوں نے ہمیں دو فون نمبر دیے ہیں اور کہا ہے کہ ہم جب مناسب سمجھیں ان نمبروں پر ان سے رابطہ کرلیں۔"

دربار سنگھ کے بھاگنے کا مجھے افسوس تو ہوا تھا لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ ہم اس سے جو فائدہ حاصل کرسکتے تھے وہ کرچکے تھے۔ باقی رہی اس کی انتقامی کارروائی تو اس کا "علاج" بھی میرے پاس موجود تھا۔ میں نے اس سے کئی سادہ اور تحریر شدہ کاغذات پر دستخط کرائے تھے۔ ان کاغذات کی موجودگی میں وہ بے طرح بندھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بابو لیاقت کی والدہ یا قریبی احباب کو دوبارہ حراست میں لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اطلاعات کے مطابق اس نے مجھے پکڑوانے کا سودا شنکر شکرا گروپ سے پچاس لاکھ میں طے کیا تھا لیکن اگر میں اس کے دستخط شدہ کاغذات بابو لیاقت جیسے کسی وکیل کے حوالے کردیتا اور وہ انہیں دربار سنگھ کے خلاف استعمال کرنے پر تل جاتا تو دربار سنگھ کو دن میں تارے نظر آسکتے تھے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ اس اُجاڑ مقام پر ایک تما کھنڈر تلے جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ یہ تہ خانہ قریباً بیس فٹ چوڑا اور چالیس فٹ لمبا تھا۔ اس مختصر جگہ پر کم و بیش دو درجن افراد موجود تھے۔ تہ خانے کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ سردار لالی اور اس کے ساتھی یہاں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق اس تہ خانے میں کئی تبدیلیاں کررکھی تھیں۔ اندر ہی کھانا پکانے کے لیے دو پختہ چولھے بنائے گئے تھے۔ چمنی کی ضرورت ایک سوراخ سے پوری کی گئی تھی۔ یہ سوراخ ڈاک بنگلے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں کھلتا تھا۔ تہ خانے میں اترنے کے لیے مٹی کے زینے بنائے گئے تھے۔ زینوں کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں بنے ہوئے پانچ چھ ماہ ہوچکے ہیں۔ ہماری حیثیت یہاں سردار لالی کے مہمانوں کی تھی لیکن وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بابو لیاقت نے بتایا کہ اب تک وہ صرف ایک بار اس تہ خانے میں آیا ہے۔ اس نے منہ سر پگڑی میں لپیٹ رکھا تھا۔ درمیانے قد کا شخص ہے لیکن آواز بہت رعب دار ہے۔ چند منٹ رک کر اور اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے کر وہ واپس چلا گیا تھا۔

میں نے بابو لیاقت سے پوچھا۔ "اس کے کتنے ساتھی ہیں یہاں؟"

وہ بولا۔ "آٹھ ہیں۔ ان میں سے دو ہر وقت باہر پہرے پر رہتے ہیں۔ چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹیاں بانٹ رکھی ہیں انہوں نے۔"

"کھانا وغیرہ کہاں سے آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

بابو لیاقت نے کہا "بڑا زبردست انتظام ہے۔ جس کمرے میں آپ نے رام پانڈے سے پوچھ گچھ کی ہے وہاں ایک کمرا وہ سامنے بھی ہے۔ وہاں کم از کم دو مہینے کا راشن موجود ہے۔ سردار لالی کے آدمی پکاتے ہیں۔ خود کھاتے ہیں اور ہمیں بھی کھلاتے ہیں۔ بڑے آزاد منش اور خوش طبع

قسم کے لوگ ہیں۔ خالصتان کے قیام تک اکٹھے جینے مرنے کی قسمیں کھا رکھی ہیں ان لوگوں نے۔ وہ دیکھیں سامنے دیوار پر نعرے لکھے ہوئے ہیں۔ ہندی میں ہیں اس لیے آپ نہیں پڑھ سکیں گے۔ اوپر لکھا ہے "بچہ بچہ کٹ جائے گا، پر ہندوستان بٹ جائے گا۔" نیچے لکھا ہے۔ "سچے خالصے کی اک پہچان۔ لب پر اس کے خالصتان۔" وہ سب سے نیچے انڈین سرکار کے لیے گالیاں لکھی ہیں۔"

غزالہ اور نشا تہ خانے کے "زنانے حصے" میں جا بیٹھی تھیں۔ یہاں زرد رو ارجمند گہری نیند سو رہی تھی اور گوگی جھیمو بیٹھی ماش اور بچے کی رال صاف کررہی تھی۔ فضا میں پرانے باسمتی چاول کی خوشبو رچی بسی تھی۔ یہ چاول دو بڑے دیگچوں میں ڈال کر چولھوں پر رکھے گئے تھے اور سردار لالی کے دو ساتھی بڑے خوشگوار موڈ میں ان کی دیکھ بھال کررہے تھے۔ ڈاکو اور جرائم پیشہ ہونے کے باوجود مجھے ان نوجوانوں کی آنکھوں میں حیا نظر آئی۔ نشا کی خوبصورتی ایسی تھی کہ راہ چلتے لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ "پری پیکر" اور گزرتی ہر نگاہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ مگر ان لوگوں نے ایک دو بار دیکھنے کے بعد خود کو نشا اور غزالہ کی موجودگی سے لاتعلق سا کرلیا تھا۔

زریں گل یہ جاننے کے لیے سخت بے قرار نظر آرہا تھا کہ میلے سے پکڑے جانے والے سرخ پوش نے ہمیں کیا بتایا ہے اور ٹرک کی تلاش کس مرحلے میں پہنچی ہے۔ میں مختصر الفاظ میں اسے اب تک کی پیش رفت سے آگاہ کرنے لگا۔

اس دوران ایک دلدوز چیخ نے ہم سب کو بری طرح ٹھٹکا دیا۔ چاول پکاتے ہوئے نوجوانوں نے جھپٹ کر اپنی رائفلیں اٹھائیں۔ میرا ہاتھ بھی سیدھا اپنے پسٹل پر گیا۔ گھوم کر دیکھا تو جھیمو نظر آئی۔ وہ تہ خانے کے تنگ راستے میں سے رینگ کر نکلنے کی کوشش کررہی تھی اور ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ زریں گل نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ جھیمو اس کے سر پر دو ہتڑ مارنے لگی اور ناخنوں سے چہرہ نوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہم سب نے زریں گل کی مدد کی اور جھیمو پر قابو پالیا۔ یک دم لڑکی کی آنکھیں الٹ گئیں۔ دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جم گئے اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ ایسے دورے پہلے بھی پڑ چکے تھے لیکن یہ دورہ بے حد شدید تھا۔ کوٹھری کا نیم کھلا دروازہ دیکھ کر اس دورے کی وجہ بھی جلد سمجھ میں آگئی۔ ہماری گفتگو کے دوران جھیمو کسی کام سے کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہاں وہ شخص "پرکش نیں" بند ہے جو چند ہفتے پہلے اسے درندگی کا نشانہ بنا چکا ہے اور جس کی خوفناک جھلک وہ کسی بھی چہرے میں دیکھ کر دہشت سے چلا اٹھتی ہے۔ اس نے کوٹھری کے فرش پر رام پانڈے کو دیکھا تھا اور ہوش کھو بیٹھی تھی۔

○☆○

رام پانڈے گوگی جھیمو کو یہاں دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔ میں نے اسے یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ جھیمو اور دیگر دو ملازموں کو ہم ہی عشرت فارم سے لے کر آئے تھے اور اب وہ ہمارے ساتھ اس تہ خانے میں موجود ہیں۔۔۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہم نے رام پانڈے سے پوچھ گچھ جاری رکھی لیکن کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ رام پانڈے کی سوئی اس جگہ پر آکر اٹک گئی تھی کہ نمبردار عشرت کی نئی گاڑی لے کر ڈیرے سے نکل گیا تھا اور بعد میں کیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں۔

میں نے پوچھا۔ "تم کچھ اندازہ تو لگا سکتے ہو۔"

وہ بولا۔ "اندازے تو بہت لگائے ہیں لیکن کوئی اندازہ دل کو لگے تب ہے نا۔"

"کوئی ایک ایسا اندازہ بتاؤ جو تمہیں زیادہ قریب معلوم ہوتا ہو۔"

اس نے اپنے بندھے ہاتھوں سے ٹھوڑی کھجائی (اب ہم نے اس کے ہاتھ سامنے کی طرف باندھ دیے تھے) کچھ دیر سوچ میں گم رہ کر بولا "یوں لگتا ہے کہ کسی کارن ڈیرے پر ایک دم افراتفری مچ گئی تھی۔ میں نے اخبار میں ایک جگہ پڑھا ہے کہ بھاگنے والے کھانا ادھورا چھوڑ کر بھاگے ہیں اور ان کے دو جوتے بھی موقعے سے ملے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بھاگنے والوں نے ٹرک کو صرف سواری کے طور پر استعمال کیا ہو۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ ٹرک میں تھانوں کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیرا اور اس کے ساتھی افراتفری میں بھاگے تو پھر نمبردار عشرت اور باقی دو افراد کو زبردستی اپنے ساتھ کیسے لے گئے۔ کل رات سوچتے سوچتے ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی طرح نمبردار عشرت اور رتن سنگھ (صفدر) کمرے کا دروازہ توڑ کر نکل گئے ہوں۔ ان کے فرار ہوجانے سے شیرے اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں اور انہوں نے نکل بھاگنے میں خیریت سمجھی ہو۔ ڈیرے پر سواری کے طور پر صرف ٹرک موجود تھا لہٰذا وہ اسے ہی لے اڑے ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارا یہ اندازہ اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ اگر نمبردار عشرت رتن کے ساتھ علیحدہ فرار ہوا ہے اور

شیرا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ علیحدہ بھاگا ہے تو پھر وہ سارے ایک ساتھ لاپتا کیوں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تو کوئی انہونا واقعہ پیش آسکتا ہے لیکن دونوں کے ساتھ نہیں۔"

رام پانڈے ایک دم خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھنیں لرز رہی تھیں۔ ہر رنگ اور ہر ڈھنگ کی الجھنیں۔ ان الجھنوں کا تعلق ماضی کے علاوہ حال سے بھی تھا۔ حال کے حوالے سے اس کی سب سے بڑی الجھن شاید یہ تھی کہ اس کی مخبری کرنے والا کون ہے اور کون ہے جس نے اسے اس دلدل میں پھنسایا ہے؟ وہ کتنے ٹھاٹ سے سج سنور کر لنگر والی کا میلہ دیکھنے نکلا تھا اور اب قفسیوں کے حال رسیوں میں جکڑا اس سیلن زدہ فرش پر پڑا تھا۔

رام پانڈے کو اس کی الجھنوں میں چھوڑ کر میں باہر بابو لیاقت کے پاس آبیٹھا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "لیاقت صاحب! سب سے پہلے تو ہمیں رام پانڈے کے بیانات کی صحت جانچنی ہوگی۔ اس حوالے سے ہمیں دو کام کرنے ہیں۔ نمبر ایک اس گاڑی کا کھوج لگانا ہے جو رام پانڈے کے بقول نہر میں گری ہے اور اب تک وہیں ہے۔ نمبر دو خانہ بدوشوں کی بستی میں جاکر حالات دیکھنے ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ واقعی شیرا منگی نام کا کوئی بندہ بستی سے غائب ہے۔ اگر شیرا اور اس کے ساتھی بستی سے غائب ہیں تو ان کے وارثوں نے ان کی تلاش میں کیا کیا ہے۔"

بابو لیاقت نے کہا "یہاں ایک اور نکتہ بھی ہے' ممکن ہے واردات پر جانے والوں میں سے کوئی ایک آدھ واپس بھی آگیا ہو لیکن پولیس یا کسی دشمن کے خوف سے چھپا ہوا ہو۔ جو لوگ اس طرح چھپ جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اپنے وارثوں کو اپنی خیر خیریت سے ضرورت آگاہ کردیتے ہیں۔"

"بجا کہا آپ نے" میں نے تائید کی۔ "مجھے امید ہے کہ اگر رام پانڈے نے خانہ بدوشوں کے بارے میں صحیح بیان دیا ہے تو اس بستی سے ہمیں کوئی نہ کوئی سراغ ضرور ہاتھ لگے گا۔"

بابو لیاقت نے کہا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے آدمی چٹکی بجاتے میں یہ دونوں کام کردیں گے۔" اس نے اسی وقت سعید نامی ایک شخص کو آواز دی۔

"جی بابو جی" وہ ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

بابو لیاقت نے جیب سے ایک قلم نکالا اور سگریٹ کا پیکٹ پھاڑ کر اس پر کسی کے نام رقعہ لکھنے لگا۔

بابو لیاقت کے تمام ساتھی اس پر جان چھڑکنے والے تھے۔ ہمہ وقت اس کے پسینے پر خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ بابو لیاقت نے جو کام ان کے ذمے لگائے تھے وہ انہوں نے بلا کی رفتار سے کئے۔ صرف دس گھنٹے بعد ہمیں یہ رپورٹ مل گئی کہ گنڈارا پور کے قریب بڑی نہر میں پل کے عین نیچے ایک کار موجود ہے۔ وہ بارہ فٹ گہرے پانی میں ڈوبی ہوئی اور جھاڑ جھنکاڑ میں اس طرح الجھ چکی ہے کہ بہاؤ کے رخ حرکت نہیں کرسکتی۔

اس کار کو نہر سے نکالنا چھیڑنا یا بکس کھولنے کے مترادف تھا۔ ہم نے کار کو جہاں کا تہاں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جس شخص کو تلنگوں کی بستی میں بھیجا گیا تھا اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اپنی رپورٹ ڈاک بنگلے تک دی۔ یاد رہے کہ یہ رپورٹ کم و بیش چالیس میل کا سفر کرکے آئی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق تلنگوں کی بستی میں شیرا منگی نامی شخص رہتا تھا۔ وہ پرانا واردیا تھا۔ پچھلے تین ہفتے سے وہ غائب تھا۔ اس کے چند ساتھی بھی لاپتا تھے۔ بستی میں عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ لوگ کسی واردات کے چکر میں دور نکل گئے ہیں۔ شاید [illegible] کی طرف گئے ہیں اور وہاں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ چھان بین کرنے والے نے یہ رپورٹ اپنے ایک ساتھی کے ذریعے بھیجی تھی۔ اس نے بابو لیاقت کو پیغام دیا تھا کہ اس نے بستی کے ایک شخص سے دوستی گانٹھ لی ہے اور اس کے جھونپڑے میں ہے۔ وہ ایک دو روز مزید بستی میں رہے گا اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ رام پانڈے کے دونوں بیانات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ میرے ذہن میں بار بار بات آرہی تھی کہ ہوسکتا ہے' بابو لیاقت کا بیان کردہ درست ہو۔ شیرا منگی یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی واپس آچکا ہو لیکن خوف کے سبب سامنے نہ آرہا ہو۔ ایسی بات تھی تو بابو لیاقت کا رپورٹر اگلے دو روز میں اہم انکشاف کرسکتا تھا۔

اپنی اسی دور دراز پناہ گاہ میں ہم نے تین دن "اطلاع" کا شدت سے انتظار کیا لیکن اطلاع آئی نہ اطلاع لانے والا۔ بابو لیاقت بہت بے چینی محسوس کررہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے ساتھی کوتاہی یا سستی کرنے والے نہیں۔ جب چوتھا دن بھی گزر گیا تو بابو لیاقت کی بے چینی گہرے اندیشے میں ڈھل گئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "شاہ صاحب! مجھے لگ رہا ہے کہ تلنگوں کی بستی میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ جو بندہ وہاں گیا ہے وہ اتنی دیر لگانے والا نہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

وہ سگریٹ سلگا کر بولا۔ "میرا تو دل چاہتا ہے' میں ایک چکر خود وہاں کا لگا آؤں۔"

میں نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ہم دونوں جائیں گے۔ بلکہ یہی ہم دونوں کو چاہئے۔ یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ ممکن ہے بستی سے ہمیں کوئی کھوج کھرا مل جائے۔"

کچھ بحث و تمحیص کے بعد دونوں میں طے پایا کہ ہم آج رات تلنگوں کی بستی کے لئے روانہ ہوں گے۔ جس جیپ پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ ابھی تک یہیں تھی۔ بوٹا سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد اسے ڈاک بنگلے کے عقب میں گھنے درختوں کے اندر چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس جیپ پر سفر کرنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ فیصلہ ہوا کہ ہم گھوڑوں پر جائیں گے۔ گھوڑوں پر سفر کئی طرح سے مفید تھا۔ "پٹرول" وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پھر ہم عام راستوں سے ہٹ کر کھیتوں کھلیانوں میں سفر کرسکتے تھے۔ یوں کئی جگہ شارٹ کٹ لگائے جاسکتے تھے اور پولیس ناکوں سے بھی بچا جاسکتا تھا۔ بوٹا سنگھ نے ہمارے لئے تین گھوڑے منتخب کئے۔ دو گھوڑوں پر بیٹھنے کے لئے کھیس وغیرہ ڈال دیئے گئے۔ تیسرا گھوڑا ہنگامی ضرورت کے لئے تھا۔ ہم نے اس پر گھاس کے گٹھے لاد لئے اور سرِ شام جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ ہمارے حلئے خالص دیہاتیوں والے تھے۔ اس حلئے میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ پگڑی کو ڈھاٹے کے طور پر استعمال کرکے چہرہ چھپایا جاسکتا تھا۔ بوٹا سنگھ نے دو قسم کی لاٹھیاں اور ایک لالٹین بھی ہمیں مہیا کی۔ میں نے اس علاقے میں دیکھا تھا کہ رات کے وقت سفر کرنے والے عموماً ٹارچ یا لالٹین ساتھ رکھتے تھے۔ بوٹا سنگھ اور زریں گل کو ضروری ہدایات دیں اور ہم روانگی کے لئے تیار ہوگئے۔ غزالہ کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح پریشان تھیں۔ وہ ہر گھڑی میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی لیکن جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں۔ ہم روانہ ہونے لگے تو وہ کوئی بات کہنے کے لئے میرے قریب چلی آئی غالباً وہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے۔ میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں۔ اپنا خیال رکھوں' وغیرہ وغیرہ۔ وہ میرے پاس آئی' ایک کونے میں خاموش بیٹھا سائیں عالی کسی چیل کے مانند جھپٹا اور ہم دونوں کے درمیان آکر بولا "ہٹ جا۔ پیچھے ہٹ جا بیوقوف' میں کہتا ہوں

دور ہو جا۔" وہ غزالہ کو دھکیلتا ہوا چلایا۔ "تیرا اس سے کوئی واسطہ نہیں' اس کا واسطہ کسی اور سے ہے' وہ دیکھ' وہ بیٹھی ہے۔ وہ دیکھ" اس نے انگلی سے باقاعدہ ارجمند بانو کی طرف اشارہ کیا' جو خواب آور دوا کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی۔ غزالہ کے چہرے پر بوکھلاہٹ تھی۔ وہ بے بسی سے کبھی مجھے اور کبھی سائیں عالی کو دیکھتی تھی' سائیں عالی نے اسے ایک اور دھکا دیا اور گرجا "کیا لگتا ہے یہ تیرا؟ کچھ نہیں' تجھے منہ نہیں لگاتا ہے اور تو اس کے پیچھے ماری ماری پھرتی ہے۔ کیا چاہتی ہے تو اس سے۔ تیرے اور اس کے راستے علیحدہ ہیں۔ جا چھوڑ دے پیچھا اس کا۔ ورنہ بہت ذلیل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں بہت ذلیل ہوگی۔"

غزالہ غصے اور شرم سے زمین میں گڑی جارہی تھی۔ شاید زندگی میں کبھی اسے ایسی شرمندگی کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔ "سائیں جی! میری بات سنیے۔ آپ کیا کررہے ہیں۔" میں نے سائیں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دم مجھ پر چڑھ دوڑا' سینے پر دو ہتڑ مارنے لگا اور بیرونی راستے کی طرف دھکیلنے لگا۔

"چل تو نکل یہاں سے۔ خواہ مخواہ صفائیاں پیش کررہا ہے۔ میں کہتا ہوں چل یہاں سے۔"

غزالہ کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ بدحواسی کی جگہ اب جھنجلاہٹ نے لے لی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر تیزی سے زنانے حصے کی طرف مڑ گئی۔ میں کچھ دیر کشمکش میں کھڑا رہا پھر دل ہی دل میں سائیں عالی کو کوستا ہوا تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ باہر بابو لیاقت گھوڑوں کے پاس میرا انتظار کررہا تھا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ خطرے کے احساس نے دل میں ہلکا ہلکا جوش پیدا کردیا تھا۔ خطرہ کئی طرح کا تھا۔ تاریک جنگل کا' پولیس کا' مسلح ٹکراؤ کا اور کسی انجانے دشمن کا' جب تک ہم اپنا کام انجام دے کر واپس ڈاک بنگلے نہ پہنچتے خود کو محفوظ تصور نہیں کرسکتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ لاٹھیوں پر لوہے کی میخیں اور پیتل کی شامیں تھیں۔ ان میخوں اور شاموں کی وجہ سے لاٹھیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں لیکن ہمارے اصل ہتھیار ہمارے لباس میں پوشیدہ تھے۔ میرے پاس کولٹ پسٹل تھا جب کہ بابو لیاقت دس گول والے ماؤزر سے مسلح تھا۔ دونوں ہتھیاروں کے کم از کم سو راؤنڈ ہمارے پاس موجود تھے۔

بابو لیاقت کی ساری عمر اسی علاقے میں گزری تھی۔ وہ راستوں اور مقامات سے بخوبی واقف تھا۔ کچھ معلومات اس نے بوٹا سنگھ سے بھی حاصل کرلی تھیں۔ ہم نے کھیتوں اور

پگڈنڈیوں پر اپنا سفر جاری رکھا اور اس ایک گھنٹے میں نصف سے زائد فاصلہ طے کر لیا۔ اب ہم فرید کوٹ کے نواحی علاقے سے گزر رہے تھے لہٰذا مزید محتاط ہو گئے۔ ہم فرید کوٹ کے بالکل قریب سے ہو کر نکلے تھے۔ جس جگہ چند روز پہلے ایک بارونق محلہ تھا وہاں ویرانی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جلی ہوئی دکانوں اور جھونپڑیوں کا بے کار ملبا ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ کوڑے کرکٹ پر آوارہ کتوں کے غول گردش کر رہے تھے۔ اچانک مجھے اس شخص کا خیال آیا جس نے رام پانڈے کی طرح سرخ لباس پہن رکھا تھا اور اتفاقاً قادر زماں کے خطرناک یونوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں اس کا بے حس و حرکت جسم پڑا تھا اور ایک جوان عورت اس پر بین کر رہی تھی۔ پھر وہ بدقسمت خود بھی گولی کھا کر سرخ لباس والے کے اوپر گر گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ دونوں زندہ بچے تھے یا اس خونی ہنگامے کا لقمہ بن گئے تھے۔ مجھے زریں گل سے اس بارے میں پوچھنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اب میں نے بابو لیاقت سے اس واقعے کا ذکر کیا تو وہ بولا۔ "ہاں۔۔۔ پرسوں زریں گل نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سرخ لباس والے کا نام بخت احمد تھا۔ وہ لنگر وال ہی کا رہنے والا تھا۔ صرف پانچ چھ ماہ پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ میں تھری ناٹ تھری کی گولی لگی تھی۔ وہیں موقع پر پڑے پڑے اس نے دم توڑ دیا تھا۔ اس سے لپٹ کر رونے والی اس کی بیوی تھی۔ وہ بھی زخمی ہوئی تھی لیکن اسے بچا لیا گیا۔"

میں سوچنے لگا جب وہ نوجوان بخت احمد گھر سے نکلنے کے لیے سرخ کپڑے اور سنہری واسکٹ پہن رہا ہوگا' اسے کیا خبر ہوگی کہ وہ خود کو ایک ناگہانی موت کے لیے تیار کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کا روپ دے رہا ہے خود کو' جو سنگین ترین حادثوں کی زد میں ہے۔ اگر وہ اپنے لباس میں کچھ تبدیلی کر لیتا' کسی اور رنگ کی واسکٹ پہن لیتا' کسی اور طرح کی پگڑی باندھ لیتا تو شاید بچ جاتا۔۔۔ لیکن سب بخت کی بات ہے' اور وہ بخت احمد ہونے کے باوجود اپنے بخت سے ہار گیا تھا۔

ہمارا باقی کا سفر بھی خیریت سے طے ہوا اور نو بجے کے لگ بھگ ہم فیروز پور کی اس بہت بڑی بستی کے نواح میں پہنچ گئے جو ایک چٹیل میدان میں شمالاً جنوباً دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بستی کی ٹمٹماتی روشنیاں ہمیں دور ہی سے نظر آنے لگیں۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر خانہ بدوشوں کے نوبلی کتوں کی غرائیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ ابھی ہم بستی سے دو ڈھائی فرلانگ دور ہی تھے کہ ایک گھڑ سوار تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گزرا۔ وہ اسی طرف جا رہا تھا جس طرف سے ہم آ رہے تھے۔ ہمیں کراس کرنے کے فوراً بعد وہ رک گیا اور گھوڑا موڑ کر ہمارے پیچھے آیا۔ ہم نے بھی گھوڑے آہستہ کر لیے۔ نو وارد کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی۔ اکثر دیہاتی گھڑ سواروں کی طرح اس نے بھی چہرہ پگڑی سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے ٹارچ کی روشنی ہمارے چہروں پر پھینکی اور اپنے چہرے سے پگڑی ہٹا دی۔

"السلام علیکم بابو جی۔" اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر بابو لیاقت کو سلام کیا۔

بابو لیاقت نے بھی پگڑی کا پلو چہرے سے ہٹا دیا۔ "سلیمان! ابھی بہت پریشان کیا ہے تم نے۔" بابو نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔ "ہمیں تو خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ تم کسی مشکل میں پھنس گئے ہو۔"

وہ بولا "مشکل ہی سمجھے بابو جی! یہاں بستی کے آس پاس آوارہ کتوں کا بہت زور ہے۔ پچھلے دنوں دو تین کتے ساتھ باؤلے ہو گئے۔ انہوں نے کئی بندوں کو کاٹ کھایا ہے۔ بھیڑ بکریاں بھی زخمی ہوئی ہیں۔ کل اور پرسوں بستی میں کرفیو لگا رہا ہے۔ دو کتے کل مرے تھے' ایک آج مرا ہے' اس کے بعد ہی سردار نے کسی کو گھر سے باہر جانے دیا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے قریبی درختوں میں پہنچے۔ یہاں سے نہری پانی کا چھوٹا سا کھالا گزرتا تھا۔ کھالا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ ہم نے گھوڑے ٹاہلی کے تنے سے باندھ دیے اور کنارے کی سبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ شخص گہرے سانولے رنگ کا تھا۔ اس کے نام سے ہی دیہاتی لگتا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھی کوئی خانہ بدوش ہی نظر آتا تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ میلوں ٹھیلوں میں جاتا ہے اور اس نے چگوڑے وغیرہ بھی پال رکھے ہیں۔ بستی میں ایک شخص اس کا پرانا یار بیلی تھا۔ وہ پچھلے دس دن سے اسی کے جھونپڑے میں قیام پذیر تھا۔ سلیمان کی کوششوں کا نتیجہ ابھی تک صفر تھا۔ وہ اتنا ہی معلوم کر سکا تھا کہ شیرا منگی اور اس کے تین ساتھی پراسرار طور پر غائب ہیں اور بستی میں ان کے ورثا سخت پریشان ہیں۔ سلیمان بولا "مجھے کل پتا چلا تھا کہ رت پور کے پاس بھی کچھ ایک جھونپڑیاں ہیں۔ آج بعد دوپہر میں رت پور گیا۔ وہاں سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔"

رت پور کا نام سن کر میں چونکا۔ پانچ روز پہلے رام پانڈے نے یہ بتایا تھا کہ وہ رت پور گاؤں کا رہنے والا ہے۔ وہاں اس کا آبائی گھر ہے اور وہ اپنی پتنی اور والدہ کے ساتھ وہاں رہتا ہے۔ اس سارے گورکھ دھندے میں رام پانڈے کی پتنی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ رام پانڈے کے بارے میں گمنام خطوط لکھنے والی اس کی پتنی ہی ہے۔ میں نے سوچا جب ہم یہاں آ گئے ہی ہوئے ہیں تو کیوں نہ اس عورت سے بھی ملاقات کر جائیں جس نے اپنے پتی کے خلاف گواہی دی تھی اور اسے عدالت کے کٹہرے میں لانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سلیمان نامی اس شخص سے پوچھا کہ رت پور یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔

وہ بولا "زیادہ دور نہیں جناب! اس کھالے کے ساتھ ساتھ چلتے جائیں تو پہلا گاؤں رت پور ہی آئے گا۔ مشکل سے ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہو گا۔"

میں نے بابو لیاقت سے کہا۔ "لیاقت صاحب! میرا خیال ہے کہ ہمیں گمنام خطوں والی کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہیے۔"

بابو لیاقت میری بات سمجھ گیا۔ اسے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہم نے سلیمان سے کچھ مزید معلومات حاصل کیں اور اسے ساتھ لے کر رت پور کی طرف چل دیے۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں رت پور گاؤں کی ایک تاریک گلی میں کھڑا تھا اور ایک نیم پختہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ بابو لیاقت مجھ سے چند قدم پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ سلیمان کو ہم گھوڑوں سمیت گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر چھوڑ آئے تھے۔ میری تیسری چوتھی دستک پر دروازے کی دوسری جانب آہٹ سنائی دی اور کسی ڈری ہوئی سی آواز نے پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے رام پانڈے کی پتنی سے ملنا ہے۔"

نسوانی آواز نے پوچھا۔ "لیکن تم ہو کون؟"

میں نے کہا۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم رام پانڈے کی پتنی ہو؟"

وہ بولی "ہاں پتنی ہوں۔۔۔ لیکن کون ہو تم اور کیا کہنا ہے مجھ سے؟" آواز میں شکوک اور بے رخی تھی۔

میں نے دروازے کے ساتھ منہ لگایا اور دھیمے لہجے میں کہا "میں انسپکٹر دربار سنگھ ہوں۔۔۔ رام پانڈے کے بارے میں تم سے بہت اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے بااعتماد لہجے نے اثر دکھایا اور چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک اونچی لمبی خوبرو لڑکی کانے گھونگھٹ کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لالٹین اس کے قدموں میں رکھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ گھونگھٹ پر اور دوسرا دروازے کے پٹ پر تھا۔ کانے گھونگھٹ کی طرح اس نے دروازہ بھی "کانا" ہی کھول رکھا تھا اور لگتا تھا کہ میرے منہ سے ایک بھی غلط بات نکلی تو وہ "کانے" کو اندھا کر دے گی۔

میں نے کہا۔ "میرے ساتھ میرا اسسٹنٹ انسپکٹر رب نواز ہے۔ ہم تمہارا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ بس دس پندرہ منٹ کی بات ہے۔" لڑکی کشمکش میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "ہم یہیں کھڑے کھڑے بھی بات کر سکتے ہیں لیکن گلی میں کسی آتے جاتے نے دیکھ لیا تو پریشانی ہوگی۔"

میرے اس آخری جملے نے فوری اثر کیا اور لڑکی نے سامنے سے ہٹ کر ہمیں اندر آنے کی اجازت دی۔ قریباً ایک کینال پر یہ اچھا خاصا مکان تھا۔ احاطے میں ہی ایک طرف چند گائے بھینسیں بندھی تھیں۔ ایک سائبان تلے ٹوٹا پھوٹا تھریشر پڑا تھا اور کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والی چند دیگر اشیا نظر آ رہی تھیں۔ رام پانڈے نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ گاؤں میں اس کی زمین ہے اور وہ پولیس سے استعفیٰ دینے کے بعد کھیتی باڑی کر رہا ہے۔ مکان میں دو عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایک تو ٹنگن ٹنگن ریشمی کپڑوں والی یہی خوبرو لڑکی تھی جس نے دروازہ کھولا تھا' دوسری ایک لمبی چوڑی قوی ہیکل عورت تھی جو ایک کمرے میں پلنگ پر بھینسے کی طرح پھیل کر سوئی ہوئی تھی اور گونجدار خراٹے لے رہی تھی۔ یہ لڑکی کی ساس اور رام پانڈے کی ماں تھی۔ اس کا جثہ اور کرخت صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لڑائی بھڑائی میں وہ تنہا ہی ایک دو مردوں پر بھاری ہوتی ہوگی۔

لڑکی اپنی ساس کے پاس سے دبے پاؤں گزری۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ہماری طرف دیکھا' جیسے ہمیں بھی محتاط رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔ بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے ہم لڑکی کے پیچھے ہی پیچھے ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں رام پانڈے کی ایک دو تصویریں بھی موجود تھیں' ان تصویروں میں وہ باوردی نظر آ رہا تھا۔

لڑکی مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے یقین کر لیا کہ میں ہی انسپکٹر دربار سنگھ ہوں۔ وہ بولی۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

میں نے کہا۔ "ان خطوں کے بارے میں پوچھنا ہے جو رام پانڈے کے متعلق ہمیں ملے ہیں۔"

لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ہمیں اندر بلا کر وہ یہ

بات تقریباً تسلیم کر چکی تھی کہ خطوط لکھنے والی وہ خود ہی ہے۔ اب صرف رسمی اقرار باقی تھا۔ وہ منمناتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ "کون ہے پتر؟"

میں نے بااعتماد لہجے میں کہا۔ "بی بی! میں چاہتا ہوں کہ ہم ٹائم ضائع نہ کریں۔ یہ بات تم جانتی ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ پرچے تم نے لکھے ہیں۔ اب اس بات پر بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں اور اسی لئے یہاں آیا ہوں۔ یہ مدد اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

گھونگھٹ کی اوٹ میں چند لمحے بوجھل خاموشی طاری رہی' پھر لڑکی نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے لکھا بھی تھا کہ میں اس معاملے سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے آشا تھی کہ آپ مجھ تک پہنچنے اور مجھے اس چکر میں گھسیٹنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن آپ نے مجھے نراش کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں بی بی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں بہت رازداری سے کر رہے ہیں اور تمہیں وچن دیتے ہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر اس کیس میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

وہ گھوگیر آواز میں بولی۔ "اگر ایسا ہو گیا تو میرے لئے آتما ہتیا کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔"

"تم بالکل بے فکر رہو۔" بابو لیاقت نے کہا۔ "سمجھو کہ تم نے ابھی کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر لرزتے گھونگھٹ کی اوٹ سے دبی دبی آواز ابھری "وہ اب کہاں ہے؟" اس کا اشارہ اپنے پتی کی طرف تھا۔

میں نے کہا "وہ بڑی محفوظ جگہ پر ہے۔ آنے والے دنوں میں تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ ہم نے اسے تھانے میں جمع کر رکھا ہے' اور وہاں سے اس کی جان جلد ہی چھوٹنے والی نہیں ہے۔"

یہ جان کر کہ اس کا پتی گرفتار ہو چکا ہے' لڑکی کی بے چینی اچانک ماند پڑ گئی۔ اس نے گھونگھٹ تھوڑا سا اوپر سرکا دیا اور اپنی بڑی بڑی شفاف آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ شکل و صورت سے شہری لگتی تھی۔ عمر بمشکل بائیس برس رہی ہو گی۔ وہ ایک سابق پولیس انسپکٹر کی بیوی تھی اور نجانے اس پر کیا آفتاد پڑی تھی کہ وہ ایک حاضر سروس انسپکٹر (یعنی ربار سنگھ) سے مدد لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اس حوالے سے کریدنا چاہا۔ میرے سوالات نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہنے لگی۔ "بس جی۔ میرے دماغ پر بوجھ تھا۔ میں نے اپنے پتی کو شیرے خانہ بدوش سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ نمبردار عشرت کے ڈیرے پر ہونے والی واردات میرے پتی نے کی ہے۔ بس میں نے پولیس کو بتانا اپنا فرض جانا۔"

میں نے کہا "بی بی! یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن آخر ہم بھی پولیس والے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب تک کسی عورت کا گھر نرک نہ بن گیا ہو وہ اپنے پتی دیو کے خلاف اس حد تک نہیں جا سکتی۔ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ تمہاری صورت بتاتی ہے کہ اس گھر میں تم پر بہت کچھ بیت چکا ہے۔"

کافی کوشش کر کے پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس عورت کو اپنے ڈھب پر لا سکے۔ کچھ دیر تک سسکیاں بھرنے اور رو رو کے آنسو پونچھنے کے بعد اس نے جو روداد سنائی وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے۔

"میرا نام رتنا ساہنی ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میرے پتا ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہیں۔ فرید کوٹ میں میرے پتا کا ذاتی مکان ہے۔ میرے پتا جس محکمے میں کرتے ہیں اس میں ایک لڑکا نریندر کمار بھی ملازم تھا۔ پتا جی کا ماتحت تھا۔ کبھی کبھی کسی کام کے سلسلے میں ہمارے گھر بھی آجاتا تھا۔ اونچا لمبا شکل صورت والا نوجوان تھا۔ چپ رہتا تھا لیکن جب بھی بات کرتا تھا بہت پتے کی کرتا۔ میں ان دنوں کالج میں پڑھ رہی تھی اور وہ مجھ میں دلچسپی لینے لگا۔ دھیرے دھیرے میں بھی اس سے پریم کرنے لگی۔ ہمارے میل جول کا پتا چل گیا لیکن وہ جانتے تھے کہ نریندر اچھا لڑکا ہے اور آئندہ ترقی بھی کرے گا۔ انہوں نے سو[چا] اچھا ہوا لڑکی نے انہیں رشتہ ڈھونڈنے کی مشکل سے [بچا لیا] ہے۔ یہ نریندر کمار پانڈے میرے موجودہ پتی سب ا[نسپکٹر] رام پانڈے کا چھوٹا بھائی تھا۔ رام پانڈے نے اگر جیو[ن میں] کسی سے پریم کیا ہے تو وہ بھی اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ [دونوں] بھائیوں کے پتا بچپن میں ہی سورگ باشی ہو گئے تھے۔ [ان کے] سوا اور کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ اس لئے [رام] پانڈے کا سارا پریم اور توجہ نریندر کے لئے تھی۔ جگ [ظاہر] ہے کہ رام پانڈے ایک بہت کرخت مزاج اور بدلحاظ [آدمی] ہے لیکن اپنے بھائی کے لئے وہ اتنا ہی نرم اور رحم دل [تھا۔] اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے اسے اچھی [تعلیم] دلائی تھی اور اپنا رسوخ استعمال کر کے اچھے محکمے [میں بھرتی] کرایا تھا۔ اسے وشواس تھا کہ وہ ترقی کرے گا اور [بڑا آدمی] بنے گا۔

رام پانڈے سے میری ملاقات نریندر کمار سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ جب رام پانڈے بھائی کو نوکر کرانے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا وہ اکثر میرے پتا جی سے ملنے ہمارے گھر آتا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے مل کر خوش ہوتا ہے اور اس کے چہرے پر کرختگی کی جگہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے۔ بعد میں جب نریندر کمار کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تو سب انسپکٹر رام پانڈے خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

ایک طرح سے اس نے اپنے بھائی کے لئے اپنے پریم کا بلیدان دیا تھا۔ لیکن یہ بلیدان اسے ہضم نہیں ہوا۔ سب انسپکٹر رام پانڈے قدم بڑھا کر پیچھے ہٹنے والے لوگوں میں سے نہیں۔ ایسے لوگ جس چیز کو پسند کر لیتے ہیں اسے اپنانا ان کے لئے زندگی موت کا سوال بن جاتا ہے۔ اپنے چھوٹے لاڈلے بھائی کی خاطر رام پانڈے پیچھے تو ہٹ گیا تھا لیکن اس کے اندر ہر وقت انگارے سلگتے رہتے تھے ۔۔۔ آخر وہ موقع آیا جب میرے اور نریندر کے بیاہ کی بات چیت شروع ہوئی۔ دونوں گھروں کے صلاح مشورے سے پہلے منگنی ہوئی اور پھر بیاہ کے دن مقرر کر دیئے گئے ۔۔۔ میں وہ دن جیون بھر نہیں بھول سکتی۔ وہ دسمبر کی چودہ تاریخ تھی۔ میں دلہن بنی بیٹھی تھی اور میرے گھر والے میری برات کا انتظار کر رہے تھے۔ رام اور نریندر یوں تو فرید کوٹ ہی میں رہتے تھے لیکن برات گاؤں سے تیار ہو کر آنی تھی۔ یہاں اسی گھر سے نریندر نے سہرا باندھ کر میری ڈولی لینے کے لئے جانا تھا۔ برات ٹرین پر روانہ ہوئی ۔۔۔ لیکن ایک گھنٹے کا یہ سفر کئی جنم سے بھی لمبا ہو گیا۔ نریندر چلتی ٹرین کے دروازے میں کھڑا ہو کر باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ اچانک وہ نیچے گر گیا۔ پہلے اس کا سر ایک کھمبے سے ٹکرایا پھر وہ لائن پر گرا اور درجنوں پہیے اس کے جسم پر سے گزر گئے۔

شہنائیوں کی گونج ماتم کی چیخوں میں بدل گئی۔ نریندر کے جسم پر شادی کے لباس کی جگہ چتا کی لکڑیاں سج گئیں۔ کئی ماہ تک میں سوگ میں ڈوبی آنسو بہاتی رہی۔ مجھے لگتا تھا کہ جیون اب ایک بے کار شے ہے ۔۔۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ میرے زخم بھی دھیرے دھیرے سمے کے مرہم سے بھرنے لگے۔ قریباً دو برس بعد میرے لئے سب انسپکٹر رام پانڈے کا رشتہ آیا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اقرار کروں یا انکار۔ لگتا تھا جیسے یہ بیاہ نہیں' میرے جیون کی کتاب میں مجبوراً ایک خانہ پری کی جا رہی ہے۔ ماتا پتا کے کہنے سننے پر میں نے "ہاں" کہہ دی اور سب انسپکٹر رام پانڈے کی پتنی بن کر اس کے گھر آ گئی ۔۔۔ میرا مطلب فرید کوٹ والے گھر سے ہے۔

سب انسپکٹر رام پانڈے نے شروع شروع میں مجھ سے بے حد پریم کیا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ شراب' عورت' گالم گلوچ' اس نے میری خاطر بہت سی چیزیں چھوڑ دیں۔ ان دنوں وہ کہتا تھا۔ رتنا! تمہیں پا کر میں نے سنسار میں سب کچھ پا لیا ہے۔ اب کوئی حسرت نہیں ہے۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ اپنی اصل جون میں آنے لگا۔ بات بے بات جھگڑا شروع کر دیا۔ تھانے داروں کی طرح میری حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنے لگا۔ اگر میں کہیں جاتی تو گھنٹوں تفتیش کرتا رہتا۔ کہاں گئی تھی؟ کیوں گئی تھی ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے لئے جو سب سے اذیت ناک بات تھی' وہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے نریندر کمار کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا' مثلاً میں سب سے پہلے اسے کہاں ملی تھی؟ ہم اکیلے میں کتنی بار ملے؟ وہ مجھے اب بھی یاد آتا ہے یا نہیں؟

میں ان سوالوں سے زچ ہو جاتی تھی اور وہ جان بوجھ کر مجھے زچ کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔ میرا اور نریندر کا پریم ماضی کا قصہ بن چکا تھا مگر وہ اب بھی اس کے دماغ پر سوار تھا ۔۔۔ پھر ایک روز میرے بدترین اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ مجھے پہلے ہی شک پڑنے لگا تھا کہ نریندر کی موت میں رام پانڈے کا ہاتھ ہے۔ اس رات رام پانڈے نے اپنے منہ سے سب کچھ بک دیا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر سویا تھا۔ آدھی رات کو چیخنے چلانے لگا۔ میں نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔ سخت سردی میں اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے نریندر کی ہتیا نہیں کی۔ میں نے نریندر کی ہتیا نہیں کی ۔۔۔ کچھ دیر اول فول بک کر وہ پھر بستر پر گر گیا۔ میرا شک وشواس میں بدل چکا تھا کہ نریندر مرا نہیں اس کی ہتیا کی گئی ہے۔ میں نے اپنے طور پر رام پانڈے کے ملنے جلنے والوں سے ٹوہ لگائی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت نریندر چلتی ٹرین سے گرا اس کے قریب صرف رام پانڈے تھا۔ دروازہ بیت الخلا کی اوٹ میں تھا اس لئے ڈبے میں موجود کوئی شخص نہیں دیکھ سکا کہ دروازے پر کیا ہوا ہے۔ نریندر کے قریب کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کسی شک کی گنجائش نکل سکتی تھی لیکن رام پانڈے کے بارے میں تو کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کا لاڈلا بھائی تھا۔ اس کے

سرخ سہرے کے پھول دیکھنے کے لئے رو گئی مہینوں سے بے قرار تھی۔ اپنے دُلہا بنے بھائی کو وہ کیسا کر موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا۔ پولیس نے اس واقعے کی تفتیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔"

رتنا نے ریشمی دوپٹے کے پلو سے اپنی بہتی آنکھیں صاف کیں اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "انسپکٹر صاحب! جو کچھ میرے من میں تھا وہ آج میں نے آپ کو بتادیا ہے۔ پچھلے پانچ چھ مہینوں میں مجھے پورا وشواس ہو چکا ہے کہ نریندر گرا نہیں تھا' اسے چلتی ٹرین سے دھکا دیا گیا تھا۔ اور دھکا دینے والا کیول رام پانڈے تھا ۔۔۔ جیسے جیسے یہ وشواس پکا ہوا ہے' میرے اندر رام پانڈے کے خلاف نفرت بھی بڑھتی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم پتی پتنی کے تعلقات جو پہلے ہی خراب تھے' اب اور خراب ہو گئے ہیں۔ پہلے تو رام پانڈے گالی گلوچ پر بس کر دیتا تھا' اب مارنے پیٹنے بھی لگا ہے۔ نوکری چھوٹ جانے کے بعد وہ مجھے یہاں گارس میں لے آیا ہے۔ ادھر تو اسے روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں۔ ایک ساس ہے' وہ بیٹے سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس گھر میں میری چوکیداری کرے اور بیٹھی مجھ پر حکم چلاتی رہے۔ میرے ماتا پتا اور بھائی بہنوں کا اس گھر میں آنا جانا میرے پتی نے چار پانچ ماہ پہلے ہی بند کر دیا تھا' مجھے بھی ان کے پاس جانے کی آگیا نہیں ہے۔ یوں یہ گھر میرے لئے جیل بن کر رہ گیا ہے۔ سوچتی ہوں کسی دن ایسے ہی گھٹ کر مر جاؤں گی اور نہ مری تو رام پانڈے کسی بہانے مار دے گا۔ اس کی آنکھوں کی نفرت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ لگتا ہے' وہ کسی ایسے جانور کی آنکھیں ہیں جو مجھے مارنے کے لئے موقع ڈھونڈ رہا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے رتنا کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ریشمی کپڑوں میں لپٹا ہوا کومل بدن جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ مت بہن! اپنے پتی کے خلاف اطلاع دے کر تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ اب وہ قانون کے شکنجے سے بچ نہیں سکے گا۔ اس نے عشرت فارم میں جو کچھ کیا ہے وہ اسے پانچ چھ برس کی جیل کرانے کے لئے کافی ہے' اور مجھے آشا ہے کہ ابھی وہ اور بھی بہت کچھ کرے گا۔ اس کے علاوہ اگر اس پر بھائی کے قتل کا الزام بھی ثابت ہو گیا تو پھانسی اس کا مقدر ہے۔"

وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آپ سے پھر پرارتھنا کرتی ہوں کہ اس سارے معاملے میں میرا نام نہ آئے۔ ورنہ میں آتما ہتیا پر مجبور ہو جاؤں گی۔ آپ جانتے نہیں یہ رام پانڈے کتنا کینہ پرور ہے۔ وہ جیل میں رہ کر بھی مجھے انتقام کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آئے گا۔ اور وہ کچھ نہ کرے تو اس کی ماتا ہی میرے جیون کو موت سے بدتر بنانے کے لئے کافی ہے۔ بڑی سخت دل عورت ہے وہ۔ مردوں سے مردوں کی طرح لڑائی جھگڑے کرتی ہے۔ رات کو اپنے سرہانے کے نیچے کرپان رکھ کر سوتی ہے۔"

بابو لیاقت اور میں نے ایک بار پھر رتنا ساہنی کی ڈھارس بندھائی ۔۔۔ کچھ دیر اس سے رام پانڈے کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ پھر اسے تسلی تشفی دے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے گھوڑے ایک بار پھر چاندنی کے سنہری سمندر میں بہتے واپس فرید کوٹ کی طرف جا رہے تھے۔ گرد آلود راستے پر گھوڑوں کے پاؤں پڑتے تھے تو ایک سنہری غبار سا اطراف میں پھیل جاتا تھا۔ چاند جو پہلے دائیں جانب تھا اب واپسی پر عین ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ اس کی کرنیں اونچے نیچے کھیتوں کو جگمگاتی ہوئی دور کسی گارس کے در و دیوار کو چھو رہی تھیں' گاؤں جہاں زندگی بے حد خاموشی سے سو رہی تھی' اس راز کی طرح جو عشرت فارم کی چار دیواری میں دبیز تیرگی اوڑھے محو خواب تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تفتیش جہاں سے بھی شروع ہوتی تھی ایک مقام پر آ کر رُک جاتی تھی۔ کھوج کا ہر راستہ ایک سپاٹ دیوار تک پہنچ کر مسدود ہو جاتا تھا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ رات گیارہ بجے تک ٹرک عشرت فارم پر موجود تھا۔ اس کے علاوہ صفدر' رجیت' نمبردار عشرت اور جھیمو بھی فارم پر تھے۔ (چوکیدار رکھا سنگھ بھی موجود تھا۔ لیکن لاش کی صورت میں) رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس کے بعد صرف جھیمو وہاں رہ گئی تھی' باقی تینوں افراد ٹرک سمیت غائب ہو گئے تھے یا کر دیئے گئے تھے۔

پروگرام کے مطابق بابو لیاقت کا ساتھی سلیمان تو فرید کوٹ چلا گیا تاہم ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ہم قریباً گیارہ بجے رت پور سے روانہ ہوئے تھے۔ کھیتوں اور چھوٹی چھوٹی رکھوں کے اندر سفر کرتے ہوئے ہم رات پچھلے پہر تین بجے واپس ڈاک بنگلے تک پہنچ گئے۔ ڈاک بنگلے کا بیابان کھنڈر چاندنی میں پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ باہر سے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں پندرہ بیس افراد رہائش رکھے ہوئے ہیں۔ جونہی ہم ایک مخصوص مقام پر پہنچے پہرے پر موجود دونوں افراد سامنے آ گئے۔ ان کے چہرے حسب معمول

پگڑیوں میں چھپے تھے۔ ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی ڈالنے کے بعد انہوں نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم نے گھوڑے ان کے حوالے کر دیئے۔

تہ خانے میں داخل ہوتے ہی ہمارا استقبال بوٹا سنگھ نے کیا۔ باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ بوٹا سنگھ کے علاوہ زریں گل جاگ رہا تھا یا وہ گونگی لڑکی جھیمو۔ وہ دونوں راشن والی کوٹھڑی میں آٹے کی بوریوں اور دال چاول والے کنستروں کے درمیان بیٹھے تھے۔ زریں گل نے ایک بوری سے ٹیک لگا رکھی تھی اور بڑی بے تکلفی سے اشاروں کنایوں میں جھیمو سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جھیمو کبھی کبھار جوابی اشارے سے کسی بات کا جواب دے دیتی تھی۔ آج پہلی دفعہ میں نے جھیمو کو نارمل محسوس کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی عزت کا ہتھیارا رسیوں میں جکڑا کال کوٹھری میں پڑا تھا اور اسے دیکھ کر جھیمو کو یقین آ گیا تھا کہ وہ ہمارے ہاتھوں اپنے کئے کی سزا پائے گا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ایک بیضوی شکل بنا کر زریں گل کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنی شہادت کی دونوں انگلیوں سے دو دائرے بنا کر آنکھوں سے لگاتی اور دائیں ہاتھ کو یوں حرکت دینے لگتی جیسے چکی چلا رہی ہو۔ زریں گل کبھی زور زور سے اقرار میں سر ہلانے لگتا' کبھی اس کے چہرے سے الجھن کے آثار ہویدا ہو جاتے۔

ہم بھی ان دونوں کے پاس جا بیٹھے۔ زریں گل نے کہا۔ "جمالی صاحب' ام نے اس کو اپنا بہن بنا لیا ہے۔ اس کا باتیں کچھ کچھ امارا سمجھ میں آنے لگا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ یہ ام کو فارم کی واردات کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ یہ بار بار کسی بہت موٹے شخص کا بات کر رہا ہے جس نے عینک بھی لگا رکھا تھا ۔۔۔ یا پھر یہ ہے کہ ۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑی اور اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

بوٹا سنگھ نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "یار جریں گل! تین گھنٹے ہو گئے ہیں تجھے متھا مارتے ہوئے' اب صبح ہونے والی ہے۔ کچھ دیر سو جا' باقی سویرے دیکھا جائے گا۔"

زریں گل ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔ بوٹا سنگھ کچھ اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت دیر تک ہمارے کان کھائے گا اور جاننا چاہے گا کہ ہمارا دورہ کیسا رہا ہے۔ لیکن اس نے تو یہ موضوع چھیڑا تک نہیں تھا۔ نجانے کیوں مجھے یہاں کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی یہاں جو پہلے نہیں تھی۔

میں نے زریں گل سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ جھیمو کے ساتھ اشاراتی رابطہ استوار کرنے میں اتنا منہمک تھا کہ میں اسے ڈسٹرب نہ کر سکا۔ میں اٹھ کر اس مقام پر چلا آیا جہاں روز سوتا تھا۔ بابو لیاقت بھی بہت تھکا ماندہ نظر آ رہا تھا' وہ مجھ سے پہلے ہی اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ مزید کوئی بات کئے بغیر ہم گہری نیند سو گئے۔

میری آنکھ دوبارہ صبح سات بجے کے قریب کھلی۔ بوٹا سنگھ کے سوا ابھی کوئی نہیں جاگا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ رات سویا ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹ سگریٹ نوشی سے سیاہی مائل نظر آتے تھے۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید اسی نے مجھے ٹھوکا دے کر جگایا ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سے ایک سگریٹ لے کر سلگایا اور اپنے ذہن سے غنودگی کی دھند صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔۔۔ زریں گل میرے پاؤں کے قریب چت پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بابو لیاقت بھی محو خواب تھا۔ بوٹا سنگھ نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور مخمور لہجے میں بولا۔ "جمالی صاحب! چار پانچ روز سے میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت اپنی ماتا کا چہرہ گھومتا رہتا ہے۔ بس ایک ہی بات دماغ میں رہتی ہے۔ بی ایس ایف کے گورکھے سپاہی نے جب میری ماتا کے سینے میں سنگین گھونپی ہو گی تو ان کے منہ سے کیا نکلا ہو گا۔ وہ کس طرح گری ہوں گی اور کیسے اپنے ہی لہو میں ڈوب کر دم دیا ہو گا انہوں نے۔ پتہ نہیں اپنے آخری وقت میں وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔ مجھے وشواس ہے' مجھے جرور یاد کیا ہو گا انہوں نے۔ میرا نام پکارا ہو گا۔ مجھے آواج دی ہو گی۔ ان کو بڑا کھیال رہتا تھا میرا۔ سب سے چھوٹا بچہ تھا ان کا۔ اور چھوٹے بہت لاڈلے ہوتے ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔ وہ میری بھابو۔ جو میرے لئے ماتا سے بھی بڑھ کر تھی۔ اس پر کیا قیامت ٹوٹی ہو گی۔ اس کے پیٹ میں تین ماہ کا بچہ تھا۔ وہ جالم تھانے دار' وہ حرام کا جنا' اس پر بھوکے کتے کی طرح ٹوٹ پڑا تھا ۔۔۔ کتنا روئی چلائی ہو گی' کتنے ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے اس نے ۔۔۔ ذرا وہ نقشہ اپنے دماغ میں لاؤ جمالی صاحب! اس کمرے میں ایک طرف میری ماتا کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش پڑی تھی اور دوسری طرف وہ جناور میری بھابو کی عجت برباد کر رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے۔ جمالی صاحب! آج بھی میری بھابو کی آواج میرے کانوں میں چیخ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے' بوٹے تو کہاں ہے ۔۔۔ بوٹے تو کہاں ہے۔"

بوٹا سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نے ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ چہرے کی گندمی کھال یوں تنی ہوئی تھی جیسے ہلکی سی چھیڑ سے پھٹ جائے گی۔ مجھے اس کا رویہ کل رات سے بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "بوٹا سنگھ! کیا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آج یہ باتیں کیوں چھیڑ دی ہیں تم نے؟"

اس نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کر دی۔ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جمالی صاحب! تقدیر میرے دشمن کو میرے سامنے لے آئی ہے۔۔۔ میں چاہتا ہوں آج اس کا حساب چکتا کر دوں۔" میں نے دیکھا کرپان بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں چمک رہی تھی۔ وہ بے دھیانی میں اس کی دھار پر انگلیاں پھیر رہا تھا اور اس کی نگاہیں عین سامنے ایک نقطے پر مرکوز تھیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے تمہارا دشمن۔ کس کی بات کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "جمالی صاحب' آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"وہی سب انسپکٹر تلک رام؟" میں نے پوچھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ "ہاں' وہی انسپکٹر تلک رام۔۔۔ اس کا پورا نام تلک رام پانڈے ہے۔ اور ہم نے اسے اس سامنے والی کوٹھری میں بند کر رکھا ہے۔"

یہ انکشاف سن کر میں ہکّے میں رہ گیا۔ میری نگاہیں بھی بوٹا سنگھ کی طرح کوٹھری کے دروازے پر جم گئیں۔ چند لمحے ہم دونوں کے درمیان سنسنی خیز خاموشی طاری رہی' پھر میں نے بوٹے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم رام پانڈے کی بات کر رہے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں نے دیکھا کہ اس کی داہنی آنکھ سے ایک آنسو لڑھک کر اس کی بوسیدہ داڑھی میں کہیں گم ہو گیا ہے۔

"تم۔۔۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہی وہ شخص ہے" میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

"اب جو بتا رہا ہوں۔" وہ خوفناک آواز میں بولا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ رام پانڈے کو دیکھ کر بوٹا سنگھ کی آنکھوں میں نفرت کا آتش فشاں کیوں بھڑک اٹھتا تھا۔ میں نے کئی بار یہ بات نوٹ کی تھی کہ رام پانڈے کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بوٹے کے چہرے پر ایک خاص تاثر ابھر آتا تھا۔ اس وقت میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہی وہ پولیس والا ہے جو کچھ عرصہ پہلے بوٹا سنگھ کا ہنستا بستا گھر برباد کر چکا ہے۔ رام پانڈے کے بارے میں یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ وہ کچھ عرصہ پہلے تک پولیس میں تھا اور کہیں تاندلا کے آس پاس تعینات تھا۔ یقیناً تیرتھو گاؤں کا علاقہ اسی کی عمل داری میں آتا ہوگا۔

میں نے بوٹا سنگھ کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "اب کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

وہ بولا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ آپ میرے ہتھ میں کرپان دیکھ رہے ہیں اور میرا دشمن اس سامنے والے دروازے کے پیچھے ہے۔"

اس نے باقاعدہ انگلی سے کوٹھری کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے میں تالا لگا تھا اور اس کی چابی میرے پاس رہتی تھی۔

"لیکن جلدی ٹھیک نہیں۔" میں نے تیز سرگوشی کی۔ "ابھی ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ اور پھر۔۔۔"

"اور کچھ نہیں" اس نے میری بات کاٹی "نہ اب ہم اس سے کچھ پوچھ سکتے ہیں اور نہ وہ بتائے گا۔ سارا کھیل بگڑ چکا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بوٹا سنگھ کی آواز مزید دھیمی اور پُراسرار ہو گئی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بولا۔ "آپ کا پستول کہاں ہے؟"

"تکیے کے نیچے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اب وہ بے کار اور فضول ہے آپ کے لئے۔ اس میں سے ساری گولیاں نکالی جا چکی ہیں۔۔۔ مگر ٹھہریں۔ پستول دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ لوگ ہم کو تاڑ رہے ہیں۔"

بوٹا بڑی پُراسرار باتیں کر رہا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے سرگوشی کی۔

"آپ کے جانے کے بعد یہاں بہت کچھ بدل گیا ہے۔" بوٹے نے مرتعش آواز میں کہا۔ "اس وقت ہم سب نہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے شکنجے میں ہیں۔"

"دوسرے لوگ۔۔۔ کون دوسرے لوگ؟"

"آہستہ بولو جی" اس نے تنبیہہ کی۔ پھر سر جھکا کے کہنے لگا۔ "کل رات سے کچھ لوگ اس جگہ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں اندر بھی موجود ہیں۔ وہ دیکھیں' چولہوں کے پاس جو چار بندے جاگ رہے ہیں' وہ چاروں باہر کے ہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس وقت تہ خانے میں ہم دونوں کے علاوہ صرف وہی چار افراد بیدار تھے۔ خودکار رائفلیں ان کے کندھوں پر تھیں۔ وہ چولہے پر شاید چائے وغیرہ بنا رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ اس تہ خانے میں پہلے موجود نہیں تھے۔ ان میں سے دو شلوار قمیص میں تھے اور انہوں نے صاف ستھری پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔

"لیکن۔۔۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا؟"

"آپ کی ساتھی لڑکی کی وجہ سے۔ شاید نجالہ نام ہے اس کا۔"

"غزالہ؟ کیا کیا تھا غزالہ نے؟"

"اس بے چاری نے تو کچھ نہیں کیا۔ مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد ہم ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گئے۔"

"کیا مطلب؟" میرے ذہن میں یکایک اندیشوں کے دیو چنگھاڑنے لگے۔

وہ بدستور سرگوشی میں بولا۔ "کل رات آپ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر روتی رہی' پھر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل گئی۔ کسی ایک کو بھی نہیں بتایا اس نے۔ باہر کھڑے پہرے داروں کو بھی چکما دے گئی۔ لیکن یہاں سے ایک فرلانگ آگے جا کر پکڑی گئی۔ اپنے بندے پکڑ لیتے تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن پکڑنے والے غیر تھے۔ یہ کوئی بڑے خطرناک قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے پاس دو تین جیپیں ہیں۔ وائرلیس سیٹ ہیں اور ایسا زبردست اسلحہ ہے جو بڑے امیر کبیر لوگوں کے پاس ہوتا ہے۔ انہوں نے نجالہ بی بی کو رات سے یرغمال بنا رکھا ہے۔ بڑے ظالم لوگ ہیں' اس کی ٹانگ سے بم باندھ دیا ہے۔ یہ کنٹرول سے چلنے والا بم ہے۔ ہمیں خود دکھایا ہے ایک بندے نے یہ بم۔ سگریٹ کی ڈبی جتنا ہے۔ تسمے سے بندھا ہوا ہے بی بی کی داہنی پنڈلی سے۔ یہاں آتے ہی ان لوگوں نے ہمیں دھمکایا کہ اگر ہتھیار نہ پھینکے تو سب سے پہلے اس لڑکی کی جان جائے گی۔ جمالی صاحب! سردار لالی کے شیر اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں لیکن مسئلہ نجالہ بی بی کا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ نجالہ بی بی کی جندگی آپ کے لئے کتنی قیمتی ہے۔ میں نے سوچا اگر جندگی نہ بچا سکا تو کچھ نہ بچا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی رائفل نیچے پھینکی۔ اس کے بعد میرے ساتھیوں نے بھی ہتھیار پھینک دیئے۔"

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنا اہم واقعہ اتنی خاموشی اور رازداری سے ہو گیا تھا۔ مجھے ایک دم محسوس ہوا کہ میں ایک اجنبی مقام پر بیٹھا ہوں اور پہلی بار گردن اٹھا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہوں۔ درحقیقت رات یہاں آتے ہی مجھے کچھ عجیب اور نیا سا محسوس ہوا تھا۔ تہ خانے سے باہر پہرے داروں کا انداز۔ تہ خانے کے اندر کی نامانوس خاموشی' بوٹا سنگھ کا بدلا بدلا رویہ۔۔۔ شاید میں رات کو اس حوالے سے مزید کچھ سوچتا لیکن سخت تکان کے سبب میں بھی بابو لیاقت کی طرح بستر پر گرتے ہی سو گیا تھا' اب صبح بیدار ہوا تھا تو بوٹا سنگھ نے اپنی باتوں میں الجھا لیا تھا۔ میں نے پہلی بار غور سے تہ خانے میں محو خواب افراد کو دیکھا۔ ساجی عالی اور زریں گل سمیت وہ سب گہری نیند میں تھے اور دن چڑھ آنے کے باوجود بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے بوٹا سنگھ سے پوچھا۔ "انہیں کچھ کھلا دیا گیا ہے؟"

"ہاں" بوٹے کا جواب اثبات میں تھا۔ "چائے میں کوئی نشہ آور دوا ملا دی گئی ہے۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھا موٹا سور کہہ رہا تھا کہ دوپہر سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔"

"لیکن زریں گل تو رات' بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا' اسے خبر نہیں کہ یہاں کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ وہ آپ کے جاتے ہی گونگی جھیمو کے ساتھ اناج والی کوٹھری میں چلا گیا تھا اور آپ کے آنے تک اس سے باتوں میں لگا رہا تھا۔ اسے اب بھی کچھ پتا نہیں۔"

"اور اس کا ریوالور؟"

"وہ بھی دوسرے ہتھیاروں کی طرح ان لوگوں نے قبضے میں لے لیا ہے۔ جریں گل نے اسے اپنے تکیے کے غلاف میں چھپا رکھا تھا۔ میرا وچار ہے کہ رات سونے تک جریں کو پتا نہیں چلا تھا کہ ریوالور غائب ہے۔"

"کیا اس نے چائے نہیں پی تھی؟"

"نہیں۔ منہ میں نسوار رکھی ہوئی تھی اس نے۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ گونگی جھیمو میری طرح ویسے ہی چائے کو منہ نہیں لگاتی۔"

"ارجمند بانو اور رنشا وغیرہ کو پتا ہے کہ کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔" بوٹا سنگھ نے جواب دیا۔ "جریں گل اور جھیمو کی طرح وہ بھی بے خبر ہیں۔"

میں سخت الجھن میں تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو یہ شک بھی گزرا کہ شاید بوٹا سنگھ کوئی ڈرامہ لگا رہا ہے' لیکن پھر یہ خیال ذہن سے جھٹکنا پڑا۔ بوٹا سنگھ اب تک ہر طرح با اعتماد ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "غزالہ کہاں ہے؟"

بوٹے نے بتایا۔ "وہ زنانے حصے میں ارجمند اور رنشا کے ساتھ سو رہی ہے۔ سوئی بھی کیا ہوگی' چپ چاپ پڑی' نسو بہا

رہی ہوگی۔"

بے قراری کی ایک لہر سی میرے اندر اٹھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس سے کوئی سختی تو نہیں کی گئی۔"

بوٹا سنگھ بولا۔ "میرے سامنے تو اسے کسی نے انگلی تک نہیں لگائی۔ جنگل میں شاید کچھ کھینچا تانی ہوئی ہو اس سے۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا معمولی سا نشان ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک لگا دی۔ ذہن میں ایک ساتھ کئی نام گونج رہے تھے۔ قادر زماں، شنکر شکرا، شیخ عاصم بن ارشد، معلوم نہیں ہمارے دشمنان جرار میں سے کس دشمن نے یہ شب خون مارا تھا اور کس ارادے سے مارا تھا۔ اگر بوٹا سنگھ نے کہا تھا کہ میرے سونے کے بعد میرا ہٹل خالی کر دیا گیا ہے تو یقیناً ٹھیک کہا ہوگا اور یقینی بات تھی کہ بابو لیاقت کے ماہزور کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہوگا۔

ایکا ایکی میرا ذہن پھر بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں پکڑی کرپان اور تلک رام پانڈے کی طرف چلا گیا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ بوٹا سنگھ نے یہ کیوں کہا ہے کہ نہ اب ہم تلک رام سے کچھ پوچھ سکیں گے اور نہ وہ بتائے گا۔ واقعی سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ سب کچھ تہ و بالا ہو گیا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والی گھڑیوں میں یہاں کیا ہونے والا ہے۔ دمن رہے گا یا لڑائی ہوگی، کون غالب رہے گا اور کون مغلوب، کون مارا جائے گا اور کون مار دے گا؟ بوٹا سنگھ نے بہتر سمجھا تھا کہ کسی نئے ہنگامے کا ڈول پڑنے سے پہلے وہ اپنے دل کی حسرت نکال لے۔ حالات نے اس کے دیرینہ دشمن کو باندھ کر اس کے سامنے ڈال رکھا تھا۔ وہ دشمن اس حالت میں رہنے کے بعد بھی زندہ بچ کر نکل جاتا تو یہ بوٹا سنگھ کی بہت بڑی بدقسمتی تھی۔ بوٹا سنگھ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بدقسمتی کا راستہ مسدود کر دے گا۔ اس کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی اور کرپان کے دستے پر گرفت مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ معلوم نہیں اس نے یہ کرپان تہ خانے کی سخت تلاشی میں کیوں کر بچائی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے بھی بوٹا سنگھ کی تمام تر توجہ اس بند دروازے کی طرف رہی ہے جس کے پیچھے تلک رام بندھا پڑا تھا۔

میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لئے کہا "تمہارے خیال میں کتنے بندے ہیں یہاں؟"

"پانچ تہ خانے میں ہیں۔ کم از کم پچیس باہر ہوں گے۔ سب کے پاس بڑی جبردست رائفلیں ہیں۔ انہوں نے چاروں طرف سے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ ان کے پاس تین جیپیں تھیں۔ یہ بہت بڑی بڑی جیپیں ہیں۔ دو جیپیں تو پیچھے جنتر کی جھاڑیوں میں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ایک ڈھائی بجے کے قریب واپس چلی گئی تھی۔"

"تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی بوٹا سنگھ۔ اگر وہ لوگ ہمیں پوری طرح بے بس کر چکے ہیں تو اب کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ باہر گھات لگائے کیوں بیٹھے ہیں؟"

بوٹا بولا۔ "میرا وچار ہے جی کہ یہ لوگ آپ کو اور نجمالہ بی بی کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح آپ کو اور نجمالہ بی بی کو پہچانتا نہیں، اور نہ یہ جانکاری رکھتا ہے کہ آپ کو پکڑنے کے بعد آپ سے کیا سلوک کرنا ہے۔ اب وہ لوگ اپنے کسی جتھے دار یا سردار کو لینے گئے ہیں تاکہ وہ آ کر کوئی فیصلہ کر سکے۔" میں نے ایک بار پھر دھیان سے ان افراد کو دیکھا جو چولھے کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے وہ شنکر شکرا کے ساتھی نہیں لگے۔ نہ ہی ان میں سے کسی کو میں نے قادر زماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ ویسے بھی شنکر اور قادر زماں کے قریباً تمام ماتحت مجھے پہچانتے تھے۔ اچانک ذہن میں آیا، کہیں یہ لوگ شیخ عاصم بن ارشد کے ہرکارے نہ ہوں۔ ان کی جدید و قیمتی رائفلیں "ہموار" تھیں کہ ان کا تعلق کسی معمولی شخص سے نہیں۔ اور پھر وہ زبردست جیپیں جن کا ذکر بوٹا سنگھ کر رہا تھا۔ میرا دھیان آپوں آپ شیخ عاصم بن ارشد کی طرف جانے لگا۔

بوٹا سنگھ کی آواز نے مجھے خیال سے چونکایا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف پھیلا رکھا تھا، بڑے گمبھیر اور رہجے لہجے میں بولا۔ "جہانی صاحب! کوٹھری کی چابی مجھے دے دیں۔"

"تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں"

"اگر میں انکار کردوں؟"

مجھے وشواس ہے آپ انکار نہیں کریں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کس کی ہتیا کرنے جا رہا ہوں اور کیوں۔"

بوٹا سنگھ نے یہ بات غیر معمولی لہجے میں غیر معمولی اعتماد سے کہی تھی ۔۔۔۔ اور اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے انڈیا میں داخل ہونے کے بعد اب تک رام پانڈے کے بارے میں جو کچھ جانا اور محسوس کیا تھا اسے ایک فقرے میں سمویا جاتا تو یوں تھا "وہ ایک ایسا درندہ تھا جس نے قانون کی وردی پہن رکھی تھی اور جس کے منہ کو بے بس لوگوں کی عزت و آبرو کا خون لگا ہوا تھا۔" بوٹا سنگھ اور اس کے گھرانے کی بربادی کچھ کم لرزہ خیز نہیں تھی اب دو اور داستانیں بھی تلک رام کے نامۂ اعمال میں بحروف سیاہ چمکنے لگی تھیں۔ ایک داستان مختصر تھی اور دوسری طویل۔ مختصر داستان گوگی جھمو کی تھی جسے تلک رام پانڈے نے عشرت فارم کی چار دیواری میں بے آبرو کیا۔ طویل داستان رتنا ساہنی کی تھی جسے حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے چہیتے بھائی کی جان تک سے کھیل گیا تھا۔ اس نے اپنے لاڈلے بھائی کو اس وقت قتل کیا جب وہ دولہا بنا اپنی محبوبہ کو بیاہنے جا رہا تھا۔ بھائی کو قتل کر کے تلک رام نے رتنا ساہنی سے شادی کی۔ لیکن پھر نفرت کا زہریلا پلا کر اس "ازدواجی رشتے" کو بھی قتل کر ڈالا ۔۔۔۔ اور اب رتنا ساہنی اس کی چار دیواری میں ایک زر خرید لونڈی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ تو دو داستانیں تھیں، نجانے ایسی کتنی طویل اور مختصر داستانیں تلک رام کے نامۂ اعمال میں درج تھیں۔ اگر بوٹا سنگھ اسے قتل کرنا چاہ رہا تھا تو یہ عین "مکافاتِ عمل" تھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ ان حالات میں اور اس جگہ تلک رام کو جہنم واصل کیا جانا مناسب ہے یا نہیں۔ بوٹا سنگھ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی یہ مہم جوئی نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں بوٹا سنگھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر ایک دم مجھے خاموش ہونا پڑا۔ تہ خانے سے باہر کچھ فاصلے پر جیپ کی آواز سنائی دی تھی۔ میرے ساتھ ہی بوٹا سنگھ کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ بڑے غور سے یہ ڈوبتی ابھرتی آواز سننے لگا۔ اچانک اس کے چہرے کی ہیجانی کیفیت عروج پر پہنچ گئی۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا۔ "جہانی صاحب! میرا وچار ہے، وہ لوگ آ گئے ہیں۔ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو شاید بہت عرصے تک پچھتانا پڑے۔ آپ مجھے کوٹھری کی چابی دے دیں۔"

نجانے کیا بات نظر آئی مجھے بوٹا سنگھ کی نمناک آنکھوں میں کہ میرا ہاتھ خود بخود قمیص کی اندرونی جیب کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے چابی نکالی اور بوٹا سنگھ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں جانتا تھا یہ چابی نہیں ہے۔ سب انسپکٹر تلک رام کی موت کا پروانہ ہے جو میں بوٹے کے ہاتھ میں تھما رہا ہوں۔ پروانہ جاری ہوتے ہی تلک رام اور اس کی موت کے درمیان آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی تھی۔

بوٹا سنگھ نے کن انکھیوں سے ان نگرانوں کی طرف دیکھا جو چولھے کے قریب بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے، پھر چمکدار کرپان تہبند میں اڑسی اور مجرمانہ کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بڑی احتیاط لیکن تیزی سے اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔ اندر گھستے ہی اس نے دروازے کو کنڈی لگا لی ۔۔۔۔ چند لمحے بعد اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ پھر تلک رام پانڈے کی دلدوز چیخوں سے کوٹھری گونج اٹھی۔ وہ یوں ڈکرا رہا تھا جیسے اچانک بے شمار زہریلے سانپ اس سے لپٹ گئے ہیں اور جسم کے ہر حصے پر ڈنک رسید کر رہے ہیں۔ کوٹھری میں کہرام مچا تو چولھوں کے پاس بیٹھے شلوار قمیص والے دو افراد رائفلیں تھام کر لپکے۔ "کون ہے ۔۔۔۔ کون ہے یہاں" موٹا شور چلایا۔

میں اپنی جگہ لاتعلق بیٹھا تھا۔ موٹے نے کوٹھری کے چوبی دروازے پر ٹانگ چلائی۔ مختصر لیکن بھاری بھرکم دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اندر تلک رام سخت مصیبت میں تھا۔ موٹے نے چوکھٹ کے ساتھ کندھا لگا کر ۲۲۲ رائفل کا ترچھا برسٹ دروازے کے بالائی حصے پر مارا۔ زبردست دھماکوں سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ دھوئیں کے ساتھ ہی بارود کی مہک چاروں طرف پھیل گئی۔ دروازے کا ایک بالائی تختہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ فربہ اندام شخص نے خلا میں ہاتھ ڈال کر کنڈی گرائی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک خوفناک منظر نظر آیا۔ کوٹھری کے بیچوں بیچ ننگے فرش پر تلک رام کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں کربناک انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں کرپان تھی اور وہ کرپان کا خون آلود پھل اپنی دھوتی کے پلو سے پونچھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی دھوتی اور قمیص پر خون کے بے شمار چھینٹے ہیں۔ فربہ اندام شخص رائفل تانے ہوئے آگے بڑھا اور نال بوٹا سنگھ کی کنپٹی سے لگا دی۔ بوٹا سنگھ کا سکون و اطمینان دیدنی تھا۔ اس نے بڑے عام سے انداز میں کرپان فرش پر پھینک دی۔ جسے دوسرے رائفل بردار نے جھک کر اٹھا لیا۔ بوٹا سنگھ نے منہ بھر کر دانتوں سے "پرچ" کی آواز نکالی اور تلک رام پر تھوک دیا۔ بے حد باغیانہ انداز تھا اس کا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ صرف تلک رام پانڈے پر نہیں خالصتان کے ہر مخالف کی لاش پر تھوک رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہر اس ناانصافی پر تھوک رہا ہے جو آزادی کے متوالے سکھوں سے روا رکھی جا رہی ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر تلک رام کو دیکھا ۔۔۔۔ خدا کی پناہ ۔۔۔۔ اس کے جسم پر خنجر کے کم و بیش پچیس زخم تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا بوٹے نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اندھا دھند وار کئے ہیں۔ اس کی ناف سے نیچے ٹانگوں کے درمیان بھی زخم تھے اور یہاں سے ابلنے والے خون نے اس کے سرخ رنگ کی تہبند کو سرخ تر کر دکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے تلک رام

کے تنومند جسم نے چند شدید جھٹکے کھائے اور بالکل ساکت ہو گیا۔

اتنا ہنگامہ ہونے کے باوجود تہ خانے میں موجود اکثر افراد سوئے رہے تھے۔ صرف زریں گل اور بوٹا سنگھ کا ایک ساتھی بیدار ہوئے تھے اور بھونچکوں کی طرح منہ پھاڑے کوٹھری میں "ملاش" کا منظر دیکھ رہے تھے۔ تلک رام کے جسم پر وہ بندشیں ابھی موجود تھیں جن میں اسے پانچ چھ روز پہلے جکڑا گیا تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ جب وہ ملیٹے سے اغوا ہوا اس کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ اب اس کے ہاتھ ذرا ڈھیلے، سامنے کی طرف بندھے تھے اور منہ میں کپڑا بھی نہیں تھا۔ بوٹا سنگھ نے ایک بندھے ہوئے شخص کو موت کے گھاٹ اتارا تھا لیکن ایسا اس نے بزدلی کے سبب نہیں مجبوری کے تحت کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ تلک رام کو آزاد کر کے اس سے دو بدو مقابلہ کرتا۔۔۔ اور وہ اس قابل تھا کہ پھر بھی اس کو جہنم واصل کر سکتا۔ میں اب اسے کچھ کچھ جاننے لگا تھا۔ وہ بہت گہرا شخص تھا اور بے حد غیر معمولی بھی۔۔۔

بوٹا سنگھ سے ہٹ کر میری نگاہ ایک بار پھر تلک رام پانڈے کی خونچکاں لاش پر جم گئی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوا کہ میرا کیا ہوا ایک وعدہ، بغیر میری کوشش کے کتنی جلدی ایفا ہوا ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے میں نے رت پور کے ایک مکان میں رتنا ساہنی سے اس کی غم ناک کہانی سنی تھی اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے شیطان صفت "پتی" کو قرار واقعی سزا دلواؤں گا۔ وعدہ کرتے وقت میرے ذہن میں اس "سزا" کے لئے کوئی واضح پلان نہیں تھا۔ صرف ایک وعدہ تھا جو فوری ضرورت کے تحت کرنا پڑا تھا۔ اب یہ وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ وہ رکھتی ہوئی زنجیر اچانک بوٹا سنگھ کے ہاتھوں ٹوٹ چکی تھی جس نے اس کومل بدن کو سرتاپا جکڑ رکھا تھا۔ رتنا ساہنی تلک رام پانڈے کے خوف سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکی تھی۔

جیپ کی گھوں گھوں اب تہ خانے سے بالکل نزدیک پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ چند لمحے بعد ہم نے ڈاک بنگلے کے فرش پر بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ تہ خانے میں موجود تمام مسلح افراد پوری طرح چوکس ہو گئے تھے۔ کم از کم چار رائفلوں کے بیرل ہماری طرف اٹھے ہوئے تھے۔ فربہ اندام شخص نے ترک کر ہمیں "ہینڈز اپ" کا حکم دیا۔ ہم نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ تہ خانے کے افراد بوٹا سنگھ کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوٹے جیسا نحیف و نزار بڈھا بھی کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ لیکن وہ یقین کرنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے سبھی کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ہمیں ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ دو مسلح افراد باہر چلے گئے اور تین ہمارے عقب میں رہے۔ ہمیں ایک ایک کر کے باہر نکالا گیا۔ تہ خانے سے باہر دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ نئے دن کا سورج ابھی ابھی نمودار ہوا تھا اور اس کی رو پہلی کرنیں درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھیں۔ میری نگاہ اس جیپ پر پڑی جو ابھی ابھی یہاں آ کر رکی تھی۔ جیپ دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ اس میں کون یہاں پہنچا ہو گا۔ یہ شیخ عاصم بن ارشد کی جیپ تھی اور وہ بڑے اطمینان سے جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر سمن تھا اور عقب میں کم و بیش دس مسلح افراد۔۔۔

میں اپنی جگہ گم صم کھڑا رہ گیا۔۔۔ گوبڑ کے نواحی پڑاؤ میں سمن کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد نے ابھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ دبئی واپس گیا ہے۔ یہ بات ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی کہ جو شخص پچھلے چار پانچ برس سے میری تلاش میں ہے اور مسلسل ناکامیوں کے باوجود اپنی کوشش سے باز نہیں آیا، وہ کامیابی سے اس قدر نزدیک پہنچ کر باز آ جائے گا۔ ماڈل اسٹیٹ چھوڑنے کے بعد مجھے ہر دم محسوس ہوتا رہا تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح میرے اردگرد منڈلا رہا ہے اور اب یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا تھا۔

میرے اردگرد بہت سے دشمن چکرا رہے تھے لیکن شیخ عاصم اس لحاظ سے خطرناک ترین تھا کہ اسے صرف میری "جان" درکار تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بھون سکتا تھا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ میں مر گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ اس کے برعکس باقی تمام مخالفین میری فوری موت کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ انہیں یہ بدگمانی تھی کہ میں گمشدہ نیک کے ٹھکانے سے آگاہ ہوں اور انہیں وہاں تک پہنچا سکتا ہوں اور اگر پہنچا نہیں سکتا تو ایسی معلومات ضرور دے سکتا ہوں جو مقصد کے حصول میں مددگار ثابت ہوں۔

شیخ عاصم بن ارشد نے اپنا وزن ایک ٹانگ پر منتقل کیا اور بڑے تضحیک آمیز انداز میں مجھے گھورا پھر انگریزی میں بولا۔ "انسان اپنی موت سے کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "پانچ سال پہلے کی بات میں نے تیرے بدکردار بھائی سے کہی تھی لیکن اس نے نہیں مانی تھی۔ اپنے گرد سمن جیسے کتوں کو جمع کر لیا تھا اور بلٹ پروف گاڑی میں بیٹھ کر سوچتا تھا کہ موت اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔"

شیخ عاصم غرایا۔ "تیری زبان بہت چلتی ہے۔ میں سب سے پہلے تیری اس زبان کو چپ کراؤں گا۔" اس نے زمین پر تھوک کر اپنا غصہ نیچے لانے کی کوشش کی۔ پھر سمن سے مخاطب ہو کر بولا۔ "لڑکی کہاں ہے؟"

سمن نے یہی سوال اردو میں فربہ اندام شخص سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اندر چار لڑکیاں موجود ہیں، آپ خود چل کر ملاحظہ کر لیں۔

سمن فربہ اندام شخص کے ساتھ تہ خانے میں چلا گیا۔ اس دوران کم و بیش دس مزید افراد درختوں کی اوٹ سے نکل کر موقع پر پہنچ گئے۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش اور قاتل نظر آتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ ان میں سے بیشتر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ بے خوابی کی سرخی تھی۔ یہ لوگ رات بھر اس ڈاک بنگلے کی چوکیداری کرتے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سمن، غزالہ کو بالوں سے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ وہ رو رہی تھی اور خود کو سمن کی آہنی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان خاصا واضح تھا۔ غزالہ کی بے چارگی دیکھ کر اچانک میرا خون کھول اٹھا۔ میری انگلیوں کی پوروں میں وہی سنسناہٹ جاگ اٹھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کرتی تھی اور میرے جسم میں ایک ایسی آگ بھڑکاتی تھی جس سے میرا رواں رواں دہک اٹھتا تھا۔ ڈاک بنگلے کی شکستہ سیڑھیوں پر غزالہ گر گئی۔ سمن اسے قریباً گھسیٹتا ہوا جیپ تک لایا۔ اس بدبخت کو کچھ معلوم نہیں تھا، وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ غزالہ کو یوں تکلیف پہنچا کر اپنی موت پر مہر تصدیق ثبت کر رہا تھا۔ غزالہ میرے لئے کیا ہے، یہ صرف مجھے معلوم تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا، غزالہ بھی نہیں جانتی تھی۔ میری ساری بے رخی و سرد مہری اپنی جگہ لیکن میرے دل کے نہاں خانوں میں اس کے لئے جو محبت و حرارت تھی وہ کسی کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ میری گردن بخشے جانے کے عوض غزالہ کو ایک کانٹا چبھنے کی تکلیف ہو، کہاں یہ کہ اسے بالوں سے کھینچا جائے اور زمین پر گھسیٹا جائے۔

شیخ عاصم نے غزالہ کو خونخوار نظروں سے گھورا پھر اس کی نگاہ بوٹا سنگھ کے خون آلود کپڑوں پر پڑی۔ اس نے سمن سے اس بارے میں پوچھا۔ سمن نے بتایا کہ تہ خانے میں ایک لاش پڑی ہے اور پتا چلا ہے کہ یہ قتل اسی شخص نے کیا ہے۔

شیخ عاصم نے بھی بوٹا سنگھ کو حیران نظروں سے دیکھا، جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو کہ بوٹا سنگھ جیسا شخص قتل کر سکتا ہے۔ سمن نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مرنے والا کوئی مقامی شخص ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا کوئی ذاتی معاملہ ہے۔"

اس موضوع پر کچھ دیر شیخ عاصم اور سمن میں کھسر پھسر ہوئی پھر سمن، بوٹا سنگھ کو ایک جانب لے گیا اور پوچھ گچھ والے انداز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران تہ خانے میں موجود باقی افراد کو بھی باہر نکال لیا گیا۔ ان میں بوٹا سنگھ کے ساتھیوں کے علاوہ سائیں عالی، بابو لیاقت، ارجمند بانو، نشا، چھیمو اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ وہ سب ابھی ابھی بیدار ہوئے تھے اور حواس باختہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ صرف سائیں عالی تھا جو ہمیشہ کی طرح ہر چیز سے لاتعلق اور بے خبر نظر آ رہا تھا۔ وہ گریبان میں ہاتھ ڈال کر بار بار اپنا سینہ کھجاتا تھا اور جمائیاں لینے لگتا تھا۔ کبھی وہ کسی رائفل بردار کو دیکھ کر ناقابل فہم اشارے کرنے لگتا۔ ارجمند بانو کا چہرہ زرد تھا اور وہ خواب آور دوا کے زیر اثر یوں جھوم رہی تھی جیسے ابھی گر پڑے گی۔ بابو لیاقت نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا۔

شیخ عاصم بن ارشد سے کھسر پھسر کرنے کے بعد سمن نے باآواز بلند درشت لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں سے ہمیں کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ تم واپس کھنڈر میں جا سکتے ہو۔ لیکن اگر کسی نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی یا ہمارے جانے کے بعد پولیس کو اطلاع دی تو اس کا انجام بہت دردناک ہو گا۔"

سمن کا فقرہ ختم ہوتے ہوتے دو رائفل بردار میری طرف بڑھے اور مجھے رائفل کی نال سے دھکیلتے ہوئے غزالہ کے پاس لے آئے۔ سمن گرجا۔ "باقی سب لوگ واپس جائیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے رائفل کا رخ موڑا اور گولی چلا دی۔ "رٹ لیٹ" کی سماعت شکن آواز کے ساتھ ہی بوٹا سنگھ کا ایک ساتھی اچھل کر ڈاک بنگلے کی بیرونی دیوار کے پاس گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کے جسم میں گولیوں کے کئی سوراخ ہو چکے تھے۔ نشا اور غزالہ بے اختیار چیخ کر چلا اٹھیں۔

سمن کی فائرنگ کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید ہلاک ہونے والے شخص نے کوئی "چالاکی" دکھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن چالاکی کی "نوعیت" کیا تھی؟ مقتول نہتا تھا اور اس کے آس پاس کوئی ایسا ہتھیار بھی نہیں تھا جس پر وہ جھپٹنے

کی کوشش کرتا۔ غالباً متھن نے صرف دہشت بٹھانے کے لئے دو۔ بتانے کے لئے کہ انسانی جان ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی، یہ قتل کیا تھا۔

"چلو۔۔۔ سب لوگ واپس۔" متھن حلق کے بل غرایا۔

سب پیچھے ہٹنے لگے لیکن بشا اپنی جگہ کھڑی رہی۔ "کیا بات ہے؟" متھن کاٹ کھانے والے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں جائے گی کتیا۔" متھن دہاڑا اور رائفل اس کی طرف پھیرا۔

"میں شاہ جہاں صاحب کے ساتھ جاؤں گی۔"

متھن کے تیور بگڑ گئے۔ یوں لگا جیسے وہ گولی چلا دے گا یا بہت خوفناک قسم کی گالیوں کی بوچھار کر دے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا۔ شیخ عاصم بن ارشد نے انگریزی میں پوچھا "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

متھن نے بگڑی تگڑی انگریزی میں جواب دیا۔ "یہ ساتھ جانا چاہتی ہے۔"

کہتے ہیں حسن اپنی سفارش آپ ہوتا ہے۔ غالباً یہاں بھی کسی حوالے سے اس "زوردار سفارش" نے کام کیا۔ شیخ عاصم ایک لمحے کے لئے متذبذب نظر آیا پھر اس نے کہا "بٹھاؤ اس کو بھی۔"

متھن مجھے رائفل پوائنٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔ "چلو بیٹھو جیپ میں۔"

میں نے دیکھا جیپ کے دونوں دروازے کھولے جا چکے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شیخ عاصم کا چاق و چوبند ڈرائیور براجمان تھا۔ وہ انجن اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب ہمیں بٹھائے جانے کا منتظر تھا۔ ایک رائفل بردار نے مجھے دھکیلا۔ دوسرے نے ۲۲۲ رائفل کی نالی غزالہ کی کمر سے لگا دی۔ غزالہ نے اپنی جھکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، بتاؤ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ ہمیں گولی کھا کر مر جانا ہے یا گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس جنبش کا کوئی واضح مطلب تو نہیں تھا لیکن میرا خیال ہے کہ غزالہ میرا مافی الضمیر سمجھ گئی اور اس نے مزاحمت ترک کر کے گاڑی میں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بشا نے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہی لیکن متھن نے اس کے سر پر زور سے رائفل کی نالی رسید کی اور پیچھے ہٹا دیا۔ میری نگاہ غزالہ کی گلابی شلوار پر جمی تھی۔ پنڈلی پر شلوار کے نیچے ایک ابھار صاف نظر آ رہا تھا۔ بوتا سنگھ کی اطلاع سو فیصد درست تھی۔ غزالہ کی ٹانگ سے ٹخنے کے نزدیک بم باندھا گیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والا اصلی بم تھا یا صرف بوتا سنگھ وغیرہ کو دھمکایا گیا تھا۔ اس قسم کے بم حجم میں چھوٹے ہونے کے باوجود ٹی این ٹی سے بھرپور ہوتے ہیں اور عموماً کافی فاصلے سے بھی آپریٹ کئے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ اصلی بم تھا اور اس کا کنٹرول متھن کے کسی ساتھی کے پاس موجود تھا تو انگلی کی ہلکی سی جنبش اس جسم کے چیتھڑے اڑا سکتی تھی جو میرے لئے دنیا میں محبوب ترین تھا۔ اس بم کی موجودگی میں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیپ میں سوار ہوتے وقت یا سوار ہونے کے بعد کسی طرح کی مہم جوئی کروں۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور غیر ارادی تھا کہ خود میں بھی حیران رہ گیا۔

جس وقت میں جیپ پر سوار ہوا، بشا پچھلی نشست پر بیٹھ چکی تھی اور غزالہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے پائیدان پر پاؤں رکھ رہی تھی۔ پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے غزالہ نے اپنا پائنچہ غیر محسوس طور پر اوپر کھسکا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ میں اس کی ٹانگ سے بندھا ہوا بم دیکھ لوں اور کوئی ایسی حرکت نہ کروں جو سب کے لئے جان لیوا ثابت ہو۔ مجھے پکڑنے والے اس بات سے بے خبر تھے کہ میری ٹانگ کے ساتھ ایک خنجر خاص تکنیک سے بندھا رہتا ہے اور میں چشم زدن میں اس پر گرفت کر سکتا ہوں۔ شاید متھن کو یہ بات معلوم تھی لیکن طاقت و خود سری کے نشے میں وہ بھی بھولا ہوا تھا۔ جونہی مجھے غزالہ کے مرمریں ٹخنے سے بندھا ہوا بم نظر آیا میں جھکا۔ ایک ہی حرکت میں میں نے نہ صرف خنجر نکالا بلکہ تسمہ بھی کاٹ دیا جس نے ڈبیا نما ساخت کے بم کو ٹخنے سے منسلک کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے ڈرائیور کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا اور میری طرف جھکا۔ اس سے پیشتر کہ اس کے حلق سے آواز نکلتی، میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل تک پہنچ چکا تھا جہاں سے ڈرائیور سوار ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور دائیں کندھے کی ایک طوفانی ضرب سے اسے باہر لڑھکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے بائیں ہاتھ نے حرکت کی اور ڈبیا نما بم دور جھاڑیوں میں جا گرا۔

پچھلی نشست پر ایک رائفل بردار بشا کے پہلو میں بیٹھ چکا تھا۔ ڈرائیور کو باہر لڑھکتے دیکھ کر اس نے پھرتی سے رائفل سیدھی کی مگر بشا نے کمال کی پھرتی سے بیلا دیا۔ میں نے پلٹ کر خنجر کا بھرپور وار کیا۔ نوکیلا خنجر رائفل بردار کے دل میں گھس گیا۔ بشا نے اپنی دروازے سے لگائی اور دونوں ٹانگیں جوڑ کر رائفل

بردار کے کندھے پر رسید کیں۔ اس نے ابھی دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ کھلے دروازے سے لڑھک کر وہ دور جا گرا۔ تاہم اس سے پہلے ہم نے دو اشیا اس کے جسم سے علیحدہ کر لی تھیں۔ میں نے اپنا خنجر اور بشا نے وہ رائفل جس کا بیرل اس نے آخر وقت تک بے حد مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ میں نے بشا کے ہاتھ سے رائفل لی۔ اسی وقت خوفناک تڑتڑاہٹ سے کچھ گولیاں جیپ کی باڈی اور شیشوں پر لگیں۔ اور یہ برسٹ مارنے والا متھن تھا۔ میں نے اسے دوسرے برسٹ کا موقع نہیں دیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی خودکار رائفل نے آگ اگلی اور متھن گیند کی طرح اچھل کر شیخ عاصم کے قریب گرا۔ میں نے پختہ ارادے کے ساتھ اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا لیکن گولیاں اس کی گردن اور کندھے پر لگیں۔ ۲۲۲ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ غزالہ پھرتی سے اپنی جانب والا دروازہ بند کر چکی تھی۔ جیپ اسٹارٹ تھی۔ میں نے اپنی جانب والا دروازہ بند کیا اور رائفل غزالہ کی گود میں پھینک کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

یہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ میں جانتا تھا، اب ایک ساتھ کئی برسٹ گاڑی میں لگیں گے۔ اگر کوئی گولی کسی ٹائر کا مزاج پوچھ لیتی تو پرواز سے پہلے ہی ہمارے پر کٹ سکتے تھے۔ پھر جیپ کے عقب میں پٹرول کا کین بھی تھا، کوئی شعلہ اس میں جا گھستا تو پوری جیپ آگ کی لپیٹ میں آ سکتی تھی۔ جونہی میں نے پہلا گیئر لگا کر کلچ چھوڑا جیپ کی پوری باڈی جھنجھنا اٹھی۔ توقع کے عین مطابق کئی برسٹ گاڑی میں لگے تھے۔ غزالہ اور بشا چلاتی ہوئی نیچے جھک گئیں۔ انہیں ابھی پتا نہیں چلا تھا کہ یہ شاندار جیپ بلٹ پروف ہے اور دروازے بند ہو جانے کے بعد ہم فائرنگ سے محفوظ ہو چکے ہیں۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا جیپ کے پیچھے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ مجھے شیخ عاصم کا ایک محافظ نظر آیا، وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ چکا تھا اور بڑی احتیاط سے جیپ کا نشانہ لے رہا تھا۔ اس کی رائفل کا رخ بتا رہا تھا کہ وہ پچھلے ٹائروں کو نشانہ بنا رہا ہے۔ اور یہی وہ کارروائی تھی جو ہمارے نقطہ نظر سے سنگین ترین تھی۔ میں نے اپنی سی کوشش کرتے ہوئے جیپ دائیں سے بائیں لہرایا لیکن اس سے پہلے کہ محافظ کی رائفل آگ اگلتی، دھماکا ہوا اور عقب میں غبار سا پھیل گیا۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، پھر اندازہ ہوا کہ یہ اسی ڈبیا نما بم کا دھماکا ہے جو تھوڑی دیر پہلے غزالہ کے ٹخنے سے بندھا ہوا تھا۔ ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر کسی "چارہ گر" نے آخری حربہ آزمایا تھا اور ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا تھا۔ وہ اس امر سے بے خبر تھا کہ بم کہاں پڑا ہے اور کس کی جان لے گا۔ دھماکا عین اس جگہ ہوا تھا جہاں میں نے گن مین کو گھٹنا زمین پر ٹیکتے ہوئے دیکھا تھا۔ بہت کم امکان تھا کہ وہ اس بلاسٹ سے بچ نکلا ہو گا۔ بعد میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ جیپ کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش میں گن مین کا اپنا جسم برسٹ ہو گیا تھا اور وہ موقع پر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا تھا۔ اس کا نام کرشنا تھا اور وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔

جیپ کمان سے نکلے تیر کی طرح کچے راستے پر آگے بڑھی۔ میں اس راستے سے دو دفعہ گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب ہم سورگ باشی تلک رام پانڈے کو لنگر وال کے میلے سے باندھ کر یہاں لائے تھے۔ دوسری بار اس وقت جب میں اور بابو لیاقت چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار ہو کر لنگڑوں کی بستی کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ میں جیپ کو پہلے سیدھا بھگاتا چلا گیا۔ پھر اسے راستے سے اتار کر درختوں میں موڑ دیا۔

ہم بمشکل دو تین فرلانگ گئے ہوں گے کہ عقب میں باقی دونوں جیپیں نمودار ہو گئیں۔ وہ خاصی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ کسی نے شکاری کتے سے پوچھا تھا، مالک تجھے اتنا کھلاتا پلاتا ہے۔ تیری کتنی ٹہل سیوا کرتا ہے، پھر بھی چھوٹا سا خرگوش تجھ سے جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔ شکاری کتے نے کہا تھا، میں اپنے مالک کے لئے بھاگتا ہوں لیکن خرگوش اپنے لئے بھاگتا ہے، اس لئے نکل جاتا ہے۔ ہم بھی اپنے لئے بھاگ رہے تھے لہٰذا ہماری رفتار شیخ عاصم کے تنخواہ دار کتوں سے تیز تھی۔ میں چھوٹی موٹی کھائیوں اور گڑھوں کو پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔ کئی جگہ جیپ دو درختوں کے درمیان سے یوں گزری جیسے کوئی کرتب دکھا رہی ہو۔ ایسے موقعوں پر غزالہ اور بشا بے اختیار چیخ اٹھتی تھیں۔

بشا مسلسل عقب میں نگاہ رکھے ہوئے تھی اور مجھے بتاتی جا رہی تھی کہ آنے والے کتنے فاصلے پر ہیں اور کس رخ سے آ رہے ہیں۔ اس کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ جب شیخ عاصم کے کارندوں نے ہمیں تہ خانے سے نکالا تھا اور جیپ میں بٹھانا چاہا تھا تو بشا نے اصرار کیا تھا کہ وہ بھی جیپ میں بیٹھے گی۔ اس وقت مجھے اس کی ضد بے جا محسوس ہوئی تھی اور اس پر غصہ بھی آیا تھا۔ بات تھی بھی غصے والی۔ وہ کیوں خواہ مخواہ خود کو مشکل میں ڈال رہی تھی اور میری مصیبت میں بھی اضافہ کر رہی تھی۔ لیکن اب اس کی دلیری اور ذہانت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مشکل وقت میں ایک اچھا ساتھی ثابت

ہو سکتی ہے۔ غالباً رنگ رنگ کے لوگوں کے ساتھ بلو برداشتہ رہ کر اس نے تھوڑے عرصے میں زمانے کا بہت نشیب و فراز دیکھ لیا تھا۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی پختگی اور بے خوفی تھی۔ جس طرح اس نے جیپ کے اندر دشمن کے کارندے سے رائفل چھینی تھی اور اسے ٹانگیں رسید کر کے جیپ سے باہر لڑھکایا تھا وہ ایک قابل دید منظر تھا۔

میں نے جیپ ڈرائیو کرتے کرتے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ پُرعزم نظر آتی تھی' دور تک ــــ اور دیر تک ہمارا ساتھ نبھانے پر آمادہ تھی۔ دوسری طرف غزالہ نے بھی ابتدائی خوف کو ذہن سے جھٹک دیا تھا اور اب کسی چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم نظر آتی تھی۔ میں نے غزالہ میں یہ بہت خاص بات نوٹ کی تھی۔ کسی بھی مشکل یا افتاد کے آغاز میں وہ گھبرا جاتی تھی لیکن پھر بہت جلد سنبھل جاتی تھی اور سر اٹھا کر حالات کا مقابلہ کرتی تھی۔ ہم نے قریباً پندرہ منٹ تک شیخ عاصم کے کارندوں کو ان نشیب و فراز میں خوب بھگایا' اور ایک موقعے پر تو یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید ہم ان کی زد سے نکل آئے ہیں۔ لیکن دو تین منٹ بعد ایک پہلو سے سرخ رنگ کی لینڈ کروزر دوبارہ نمودار ہو گئی۔ وہ لوگ اِکا دُکا فائر بھی کر رہے تھے مگر درختوں کی کثرت اور زمین کی ناہمواری کے سبب یہ فائر کارگر نہیں تھے۔ نشا نے بتایا کہ سرخ لینڈ کروزر بہت تیزی سے قریب آ رہی ہے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ ڈرائیور نے واقعی سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دوسری جیپ جس میں شیخ عاصم بن ارشد بھی سوار تھا ایک درخت سے ٹکرا کر پہلو کے بل الٹ گئی تھی اور اس میں کئی افراد کے سر پھٹ گئے تھے اور انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اسی جیپ کو حادثہ پیش آتے دیکھ کر سرخ جیپ والوں کے غضب نے جوش مارا تھا اور انہوں نے ہم تک پہنچنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگائی تھی۔ اس جیپ نے پندرہ بیس گز کی دوری سے ہم پر جو تین فائر کئے ان میں سے ایک جیپ کے اگلے پہیے میں لگا۔ جیپ اپنے راستے پر چلتے چلتے یوں گھومی جیسے اچانک کسی طرح دار پتنگ کا کاغذ پھٹ جائے اور وہ ہوا میں ایک طرف کو جھپٹتی چلی جائے۔ میرے بہت سنبھالنے کے باوجود جیپ بے قابو ہوئی اور چند نحیف و نزار درختوں کو توڑنے کے بعد چالیس کے زاویے سے ایک گڑھے میں جا گھسی۔

گڑھے میں ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ اس گرد و غبار میں غزالہ اور نشا کی مدھم چیخیں ایک ساتھ گونجیں۔ جیپ کے غیر متحرک ہونے سے پہلے پہلے میں اپنی جانب والا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے غزالہ کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ نشا بھی پچھلا دروازہ کھول چکی تھی۔ جونہی وہ نیچے اتری ہم گھنے درختوں کی طرف لپکے ــــ لیکن دو قدم اٹھا کر نشا ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ اس کا دوپٹا جیپ کے دروازے میں کہیں پھنس گیا تھا۔ بہتر ہوتا کہ وہ دوپٹا گلے سے اتار پھینکتی لیکن غیر ارادی طور پر وہ دوپٹا چھڑانے کے لئے واپس مڑی۔ یہ لمحے بے حد قیمتی تھے "نشا" میں نے رُک کر اسے پکارا۔

ابھی میری آواز کی بازگشت فضا میں تھی کہ سیون ایم ایم کا ایک برسٹ آیا۔ میں اور غزالہ زمین پر گر گئے۔ نشا براہ راست برسٹ کی زد میں تھی۔ میں نے اسے لڑکھڑا کر گرتے دیکھا' یہی لگا کہ وہ دہشت کے سبب ڈگمگا گئی ہے۔ میں نے خود کو زمین پر رول کیا اور گڑھے میں گرا۔ میں نشا کو گڑھے سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ نشا کے سر کا ایک حصہ صاف اُڑ چکا ہے۔ اس کے مغز کا کچھ حصہ جیپ کے سیاہ ٹائر سے چپکا ہوا تھا۔ اس کا حسین پیکر یوں ساکت تھا جیسے اس میں کبھی زندگی کی لہر دوڑی ہی نہیں تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ خوبصورتی عروج بدصورتی کی انتہا میں ڈھل چکا تھا۔ اس مسخ چہرے کو نظر بھر کر دیکھنا میرے جیسے شخص کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ بارود ایسا ہی بے رحم ہوتا ہے۔ اسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ انسان سے اپنے ایجاد کئے جانے کا' بدصورت انتقام لیتا ہے۔ نشا کی ناگہانی موت نے ایک لمحے کے لئے مبہوت کر دیا۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا اور جھک کر گڑھے سے باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا' سرخ جیپ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر رُک گئی ہے اور اس میں سے مسلح افراد چھلانگیں لگا لگا کر نیچے اُتر رہے ہیں۔ میں نے غزالہ کا بازو تھاما اور جھک کر دوڑتا ہوا گھنے درختوں میں گھس گیا۔

"نشا کو کیوں چھوڑ دیا؟" غزالہ بھاگتے بھاگتے چیخی۔

"وہ زخمی ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' عقب سے ایک برسٹ آیا۔ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے شاخیں توڑتی گزر گئیں۔ سیون ایم ایم میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر چند سنگل فائر کئے۔ گن کے راؤنڈ میرے پاس نہیں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اب گن میں بمشکل پانچ چھ گولیاں ہوں گی۔ دوران جھاڑیوں اور در

کا وہ سلسلہ ایک آڑی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم مسلسل بھاگتے چلے جا رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کہاں جانا ہے۔ عقب میں للکارتی ہوئی آوازیں تھیں اور خودکار رائفلوں کی تڑتڑاہٹ تھی۔ میرا ہاتھ مضبوطی سے غزالہ کے ہاتھ میں پیوست تھا اور میرے ہاتھ کے سہارے وہ ممکنہ رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اس کا ایک سینڈل جیپ سے اترتے ہوئے گر گیا تھا۔ دوسرا اس نے بھاگتے بھاگتے اتار دیا تھا۔ اب وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا کھل گیا تھا اور بال' درختوں سے چھن کر آنے والی سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ عام حالات میں یہ ایک دلکش منظر ہوتا لیکن فی الوقت اس منظر کی تمام دلکشی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کسی بھی وقت کوئی گولی اس منظر کو چاٹ سکتی تھی اور کسی بھی لمحے دستِ اجل اس دلکشی کو لہولہان کر سکتا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ لمحات ہم دونوں پر بہت بھاری ہیں ــــ ہماری یہ ساری بھاگ دوڑ بے کار جانے والی ہے' ہم دونوں کے ساتھ یا ہم میں سے کسی ایک کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ معلوم نہیں یہ چھٹی حس کی پکار تھی یا نشا کی لاش کا جانکاہ تصور ایک وہم کی پرورش کر رہا تھا۔ میں حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ غزالہ لڑکھڑا کر گرنے نہ پائے اور نہ ہی اس کی رفتار اتنی سُست پڑے کہ ہم رائفل برداروں کے گھیرے میں آ جائیں۔ وہ میرے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ ننگے پاؤں ہے اور اس کے نازک تلوے زخمی ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ زخم ان زخموں کی نسبت بہت معمولی تھے جو پگھلا ہوا سیسہ ہمارے جسموں کو دے سکتے تھے۔

اگلے تین چار منٹ میں میں نے اپنی رائفل کے آخری بچے راؤنڈ بھی فائر کر دیئے شاید ان میں سے ایک آدھ گولی نے کسی تعاقب کرنے والے کو زخمی بھی کیا ہو لیکن مجموعی طور پر یہ فائرنگ بے اثر ہی رہی۔ اب رائفل میرے ہاتھ میں ایک لاٹھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرا واحد ہتھیار وہ خنجر تھا جو میں نے جیپ میں استعمال کرنے کے بعد اپنی پنڈلی سے لگا لیا تھا۔ لیکن یہ خنجر بھی اس مسلح ہجوم کے سامنے کیا کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کم و بیش پندرہ افراد ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ارد گرد کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ کہیں کوئی مکان نہ آبادی' نہ چرند نہ انسان۔ بس چاروں طرف درخت تھے اور ہمارے لہو کی پیاسی آوازیں ــــ ہم بُری طرح ہانپ رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ ان مصیبت زدہ جانوروں کی طرح جو شکاری کتوں کے نرغے میں ہوں اور دوڑ رہے ہوں۔ نجانے کیوں اس وقت میرے ذہن میں وہ تصویر در آئی جو میں نے زال گری کے ریسٹ ہاؤس میں دیکھی تھی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت نیل گائے پر گرے ہاؤنڈز کتے جھپٹ رہے تھے میں یہ سوچ کر لرز گیا تھا کہ کہیں غزالہ کے ساتھ اس نیل گائے جیسا سلوک نہ ہو' بعد میں اپنے اس تصور پر میں نے خود کو ملامت بھی کی تھی۔ لیکن آج ان درختوں میں اندھا دُھند بھاگتے ہوئے معلوم نہیں کیوں وہ تصویر پھر میرے تصور میں گھس آئی۔

اچانک میری نگاہ ایک گڑھے میں پڑی۔ یہاں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ جمع تھا۔ اس جھاڑ جھنکاڑ میں سے خاکستری رنگ کا ایک جنگلی بلا نکل کر بھاگا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی سوراخ یا کھوہ میں سے نکلا ہے۔ سوراخ بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔ گڑھا بمشکل چار فٹ گہرا تھا۔ میں نے اس میں چھلانگ لگائی۔ جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان مجھے ایک بہت پرانے پائپ کا دہانہ نظر آیا۔ سیمنٹ کا یہ پائپ قریباً ڈھائی فٹ قطر کا تھا۔ غالباً برسوں پہلے سیم یا برساتی پانی کے نکاس کے لئے یہ راستہ بنایا گیا تھا۔ ممکن ہے کوئی طول طویل منصوبہ ہو لیکن آغاز ہی میں ٹھپ ہو گیا ہو ــــ اب یہ پائپ کسی ادھوری خواہش کی طرح زمین کے سینے میں دبا رہ گیا تھا۔ ان سنگین ترین لمحات میں یہ تنگ و تاریک پائپ مجھے "جائے پناہ" نظر آیا۔ سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ للکارتی آوازیں دم بدم قریب آ رہی تھیں۔ میں نے پائپ کے دہانے سے جھاڑ جھنکاڑ ہٹایا' پھر غزالہ کو پائپ میں گھسنے کا اشارہ کیا۔ شاید عام حالات میں وہ اس تنگ و تاریک اور انجانے خلا میں جھانکنا بھی گوارا نہ کرتی مگر وقت کا تقاضا نبھاتے ہوئے وہ فوراً زمین پر بیٹھی' اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر پائپ میں داخل کیں اور اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ پائپ ہم دونوں کے لئے کافی تھا (لیکن بس اتنا کہ ہم سانس لے سکتے تھے) پائپ میں گھستے ہی میں نے جنتر اور کیکر کی خشک ٹہنیاں کھینچ کر دہانہ ڈھانپ دیا۔

یہ سب کچھ چار پانچ سیکنڈ کے اندر ہوا اور عین وقت پر ہوا کیونکہ اگلے ہی لمحے تعاقب کرنے والے گڑھے تک پہنچ گئے۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گالیاں بکنے کے ساتھ ساتھ تلاش کے حوالے سے ایک دوسرے کو مشورے بھی دیئے جا رہے تھے۔ "اوئے باتو خان! تو گلاب سنگھ کے ساتھ رہ ــــ بھگت رام! تم ذرا اور پیچھے ہٹ جاؤ ــــ اوئے نشلے! اپنے بندے لے کر آگے نکل جا۔" ہانپتی ہوئی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ تعاقب کرنے

والوں کا انداز ہمارے لئے خوش آئند تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہمیں رُکتے اور چھپتے نہیں دیکھ سکے' نہ ہی گڑھے سے باہر انہیں کوئی ایسی شہادت نظر آئی ہے جو ان کی رفتار میں خلل ڈالتی۔ اگر وہ اسی رفتار سے آگے بڑھ جاتے تو اگلے تین چار منٹ بعد ہم خود کو آزاد تصور کر سکتے تھے۔

ہم اپنی جگہ گم صم لیٹے آوازوں پر غور کرتے رہے۔ آوازیں ہم سے دور چلی گئیں لیکن نجانے کیوں معدوم نہیں ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سو ڈیڑھ سو گز دور جانے کے بعد ہمارا تعاقب کرنے والے ٹھہر گئے ہیں۔ اب بجائے آگے بڑھنے کے وہ اطراف میں پھیل گئے تھے اور ہمیں کھوج رہے تھے۔ غالباً انہیں شک ہو گیا تھا کہ ہم مزید آگے نہیں گئے اور یہیں کہیں رُک گئے ہیں۔ ہم اپنی جگہ دم سادھے پڑے رہے۔ آوازیں ہمارے قریب نہیں آئیں اور یہی اطمینان ہمارے لئے کافی تھا۔ یوں لگا کہ سنگین ترین لمحے گزر گئے اور اب جلد ہی ہم خطرے سے باہر ہو جائیں گے۔ پریشانی ذرا کم ہوئی تو دھیان اپنی طرف گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈھائی فٹ قطر کے پائپ میں غزالہ اور میں بُری طرح مقید ہیں۔ جیسے ہم کسی سرکس کی توپ میں ہوں اور ابھی ہمیں داغا جانے والا ہو۔ یہ انتہائی قربت تھی۔۔۔ اس قربت کو محسوس کر کے میں چند لمحوں کے لئے سن رہ گیا۔ کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کوئی ایسا موقع آئے گا۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ ناپید تھا۔ غزالہ اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی لیکن تنگیٔ مکاں کے سبب اس نے ڈال رکھی تھیں۔ وہ میرے سینے سے لگنا نہیں چاہتی تھی لیکن لگی ہوئی تھی۔ اس کا گداز جسم میرے جسم کی تختی سے ہم کلام ہونا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ ہم کلام تھا۔ اس کی زلفیں میرے چہرے پر پریشان ہونا نہیں چاہتی تھیں لیکن پریشان تھیں۔ وہ سب کچھ تھا جو نہیں ہونا چاہئے تھا اور ہم اسے ہونے سے روک نہیں سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں گریز ناممکن تھا اور جہاں پہنچ کر "بُعد" حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا تھا۔

میں ششدر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ ساری ایک سازش ہے' اور یہ سازش کرنے والی خود غزالہ ہے' وہ کئی برس سے شب و روز اس سازش پر کام کرتی رہی ہے۔ بڑی چالاکی اور مستقل مزاجی سے مجھے اس مقام کی طرف کھینچتی رہی ہے جہاں میں آج موجود ہوں' یہ گندہ سا پائپ غزالہ کی منزلِ مقصود ہے' وہ آج مجھے اس منزل پر لے آئی ہے اور سراپا مجھ سے پیوست ہونے کے بعد پوچھ رہی ہے' اب بتاؤ اس قربت کو فاصلے میں کیسے بدل سکتے ہو؟ اس لمس سے خود کو کیسے بچا سکتے ہو؟

لیکن یہ سوچیں "آوارگیٔ خیال" کے زمرے میں آتی تھیں۔ میں جانتا تھا اس "سچویشن" کی ذمے دار غزالہ نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ وہ تو خود ایک کڑی آزمائش سے دوچار ہو گئی تھی۔

اچانک میرے تصور میں ثنا کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی در آئی اور میں کچھ دیر کے لئے غزالہ سے بہت دور ہو گیا۔ وہ منظر ناقابلِ فراموش تھا۔ کتنے طویل ارادے جھلک رہے تھے ثنا کی آنکھوں سے اور کتنی جلدی وہ آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ حیات اسی ناہمواری' بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا نام ہے۔ ثنا کی موت میں میرے لئے صرف ایک چیز اطمینان بخش تھی اور وہ تھی ثنا کا طرزِ مرگ۔ وہ بڑی جلدی مری تھی اور بڑی آسانی سے۔ کسی اذیت ناک زخم کا شکار ہو کر تڑپنے سسکنے سے محفوظ رہی تھی وہ۔۔۔ کم از کم نظر تو ایسا ہی آتا تھا۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ اس کی روح بھی اسی شتابی سے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ہو۔

غزالہ نے اپنے بازوؤں کو حرکت دی۔ اس کی بلوری چوڑیاں میرے کانوں میں کھنک گئیں۔ اس نے کسمسا کر مجھ سے دور ہٹنا چاہا مگر یہ کوشش لاحاصل تھی۔ بلکہ اس تنگی میں تو یہ اندازہ لگانا بھی دشوار تھا کہ اس نے کب کوشش کی اور کب ترک کی۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سیلن زدہ پائپ تھا۔ اس کے اندر جالے سے لگے ہوئے تھے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے کے لئے بے حد ناگوار جگہ تھی لیکن غزالہ کی موجودگی نے ناگواری کو اپنی مہک اور چکا چوند سے یوں ڈھانپا تھا کہ کر دیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے۔۔۔ صرف ایک لمحے کے لئے میرے دل و دماغ نے غزالہ کی قربت کو محسوس کیا لیکن ایک تند آندھی نے اس احساس کو خشک پتے کی طرح اڑا کر ہزاروں میل کے فاصلے پر پھینک دیا۔ میرے اندر سے پکار کر کہا۔ "جس راہ پر چلنا نہیں اسے کیوں پوچھنا' جس قربت کا "طے شدہ" انجام دوری ہو' اس قربت کو محسوس کیوں کرنا؟ یہ جذباتی لڑکی ہے' نادانی کے ریلے میں بہہ رہی ہے۔۔۔ لیکن آخر کب تک۔ ایک دن اسے سنبھلنا ہو گا۔ بدنام استاد جہانی کا بھتیجا چھوڑ نیک نام سے ناتا جوڑنا ہو گا۔۔۔ وہ دن دور نہیں' جب گھر بسائے گی' اپنے بچوں کے منہ چومے گی پھر یہ نگاہوں میں دھندلانے لگے گا۔ شاہ جہاں صرف استاد

چہرہ وقت کی تختی سے مٹنے لگے گا۔ تین چار برس میں وہ سبھی کچھ بھول جائے گی۔ پھر اسے اندازہ ہو گا کہ اس کی زندگی کتنی خوفناک ڈگر اختیار کرنے سے بچ گئی ہے۔" مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوتا ہے۔۔۔ اور ہو کر رہے گا۔ خاص طور پر مری والے واقعے کے بعد میں غزالہ کی آنکھوں میں 'پیش آنے والے حالات کی ہلکی سی پرچھائیں دیکھ چکا تھا۔ اور یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ عنقریب یہ پرچھائیں مجسم حقیقت بن جائے گی۔

غزالہ کے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا دم گھٹ رہا تھا یا سانس لینے میں حیا مانع تھی۔ میں نے اس کے لئے آسانی پیدا کرنا چاہی۔ بازو آہستگی سے نیچے رکھ دوں میں نے ہتھیلیاں پائپ کی اندرونی سطح پر ٹکائیں اور پشت کو حرکت دے کر نیچے کی طرف کھسکنے لگا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ تاہم ایک ایک انچ سرک کر میں قریباً ایک فٹ نیچے چلا گیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ اس سے آگے جانا ناممکن ہے' پائپ مسدود تھا۔ اسے مسدود کرنے والی کیا چیز تھی؟ میں نے اپنے پاؤں سے اس شے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ یہ شے سخت نہیں تھی۔ یوں لگا جیسے آٹے یا ریت سے بھری ہوئی بوری ہے۔ گردن جھکا کر نیچے دیکھنا ناممکن تھا' ویسے بھی اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر اس شے کو پاؤں سے دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا پھر تھک گیا۔

ہمیں تلاش کرنے والوں کی آوازیں اب کافی نزدیک آ رہی تھیں۔ میں غزالہ کے جسم میں ایک مدھم سی لرزش محسوس کر رہا تھا۔ خود میری دھڑکنیں بھی رفتار پکڑ چکی تھیں۔ ایک موقع ایسا آیا کہ شیخ عاصم کے چند کارندے گڑھے کے عین کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ حسب سابق گالیاں دے رہے تھے اور ایک دوسرے کو بے تکلف ناموں سے پکار رہے تھے۔ پچھلے پانچ دس منٹ میں ان کے لہجے میں بس اتنا فرق آیا تھا کہ اب وہ ہانپ نہیں رہے تھے۔ چند سیکنڈ گڑھے کے کنارے رُک کر وہ آگے بڑھ گئے۔

ہم نے اپنی پناہ گاہ سے نکلنے میں جلدی نہیں کی۔ جب سناٹا آہٹ سنتے ہوئے قریباً گھنٹا گزر چکا تو میں رینگ کر دہانے کی طرف آیا۔ پہلے جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے میں نے دیکھا پھر باہر نکل آیا۔ گڑھے سے باہر دور تک سناٹا تھا۔ دھوپ میں ہوا کی سرسراہٹ اور نباتات کی بُو گھل مل گئی تھی جیسے علیحدہ سے تینوں کا کوئی وجود نہ ہو۔ اطمینان کرنے کے بعد میں نے غزالہ کو بھی باہر نکال لیا۔ اس کا لباس مٹی میں لتھڑ چکا تھا۔ ایک رُخسار پر سرخ خراشیں تھیں۔ میں نے اسے گڑھے میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی تو میں سر کے بل پائپ میں گھسا۔ مقصد یہ دیکھنا تھا کہ میرے پاؤں سے ٹکرانے والی وہ بوری نما چیز کیا تھی؟ چند فٹ آگے جا کر میں نے کُرتے کی جیب سے اپنا سستا سا لائٹر نکالا اور اس کی روشنی پائپ کے دوسرے سرے پر پھینکی۔ روشنی ہوتے ہی کئی کیڑے مکوڑے تیزی سے اپنی پناہ گاہوں میں گھس گئے۔ میری نگاہ ایک منظر پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔

نجانے یہ کیسا دن طلوع ہوا تھا کہ ہر نیا منظر نگاہ کا عذاب ثابت ہو رہا تھا۔ پہلے ڈاک بنگلے کے تہ خانے میں ٹھگ رام پانڈے کی لاش' پھر ثنا کا بے جان جسم اور اب یہ روح فرسا نظارہ۔ کتنی ہی دیر میں پلک تک نہ جھپک سکا۔ میرے سامنے ایک انسانی لاش پڑی تھی۔ کیچڑ و خون میں لتھڑی ہوئی اور تنگ غار میں گٹھڑی بنی ہوئی۔ یہ تر و تازہ لاش ایک ایسے شخص کی تھی جسے میں یہاں اور اس حالت میں دیکھنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں کسی تاریک ترین نہاں خانے میں بھی یہ خیال موجود نہیں تھا کہ میں اس شخص کو یہاں اور اس حال میں پاؤں گا۔

وہ سفیر احمد تھا' ایک باہمت ساتھی' ایک خوبرو جوان' مجھے نانڈل اسٹیٹ سے واپس فرید کوٹ لانے میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ سفیر احمد کی ایک کلائی کے ساتھ وہی بریف کیس منسلک تھا جس پر آر کے بھوانی کا نام بڑے خوبصورت حروف میں لکھا گیا تھا اور جس میں "گمشدہ اثاثہ جات" کے حوالے سے بہت اہم معلومات موجود تھیں۔

باہر سے غزالہ کی آواز آئی "کیا بات ہے' کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

میں جلدی سے رینگ کر باہر آ گیا۔ غزالہ اپنے سوال کا جواب میرے چہرے پر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے خود کو حتی الامکان پُرسکون رکھا۔ وہ پہلے ہی بہت ہراساں تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ پائپ کے اندر صرف دو گز کے فاصلے پر ایک انسانی لاش موجود ہے تو شاید وہ خوف سے چیخنا چلانا شروع کر دیتی۔ میں اسے لے کر گڑھے سے باہر نکل آیا۔ کیچڑ نے ہمیں بھوت بنا رکھا تھا۔ اس حالت میں کوئی دیہاتی ہمیں دیکھ لیتا تو یقیناً ڈر کر بھاگ جاتا۔

میں نے غزالہ سے کہا "ابھی ہمارا یہاں سے دور جانا ٹھیک نہیں۔ ممکن ہے' وہ لوگ کہیں آس پاس ہی موجود ہوں۔"

"لیکن یہاں رہے تو چھپیں گے کہاں؟" وہ منمنائی۔

"کوئی کونا کھدرا ڈھونڈ ہی لیں گے۔" میں نے کہا۔

"کہیں اور جانا ہے تو پھر۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔

میں جانتا تھا' وہ کیا کہنے جا رہی تھی اور کیوں چپ ہوئی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر کوئی اور جگہ ڈھونڈنی ہے تو پھر یہیں کیوں نہیں پڑے رہتے لیکن چپ اس لیے ہوئی تھی کہ اس "پناہ گاہ" کی بے پناہ تنگی اس کے ذہن میں آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اور میری بے انتہا قربت کے تصور نے اس کی زبان کو تالا لگا دیا تھا۔

میں اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ میرے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ میں بظاہر غزالہ سے ہم کلام تھا لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ سفیر احمد کی خونچکاں لاش کا تصور نگاہوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کن حالات میں قتل ہوا اور کیسے یہاں پہنچا تھا۔ میں غزالہ کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنے کے بعد دوبارہ یہاں آنا چاہتا تھا تاکہ اطمینان سے لاش کا معائنہ کر سکوں لیکن محفوظ جگہ یہاں کون سی ہو سکتی تھی۔ اردگرد کوئی بستی تھی نہ کھیت کھلیان نظر آتا تھا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ چلنے کے بعد درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ یہاں بکثرت جنگلی گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں نے غزالہ کو اس جھنڈ میں چھپا دیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہو کر واپس گڑھے کی طرف چل دیا جہاں ایک تنگ و تاریک پائپ میں سفیر احمد کا جسد خاکی ایک لاینحل سوال کی صورت پڑا تھا۔

ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ میں نے حتی الامکان تیزی اور احتیاط سے طے کیا اور دوبارہ گڑھے میں پہنچ گیا۔ جھاڑ جھنکاڑ کے اندر شکستہ پائپ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ پائپ میں گھس کر میں نے سفیر احمد کی لاش باہر کھینچی لیکن اسے مکمل طور پر پائپ سے باہر نہیں نکالا۔ سفیر احمد کے جسم پر سامنے کی طرف کسی تیز دھار آلے کے دو گہرے زخم موجود تھے۔ ایک زخم پیٹ پر تھا اور دوسرا عین دل کے مقام پر۔ سفیر احمد کی سلیٹی شلوار قمیص اس کے اپنے ہی لہو میں رنگین ہو چکی تھی۔ اس کے پارس بجھے تھے۔ میں نے بریف کیس دیکھا۔ اس کی دونوں جانب گہرے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یہ نشانات واضح طور پر کلہاڑی کے تھے۔ غالباً سفیر احمد کو قتل کرنے والوں نے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ناکام ہو کر انہوں نے اسے توڑنا چاہا تھا لیکن وہ اس کام پر زیادہ وقت صرف نہیں کر سکے تھے اور لاش یہاں پھینک کر رفو چکر ہو گئے تھے۔ بریف کیس ایک چھوٹی سی زنجیر اور ہتھکڑی نما لاک کے ذریعے سفیر کی کلائی سے منسلک تھا۔ اسے سفیر کی کلائی سے منسلک پا کر نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ سفیر کے قتل کا تعلق "ٹرک" والے معاملے سے نہیں۔ دھیان خود بخود اس دیرینہ دشمنی کی طرف جا رہا تھا جس کا ذکر سفیر احمد نے مجھ سے کیا تھا اور جس دشمنی کی آنچ سے بچنے کے لیے وہ کافی عرصے سے راجستھان میں قیام پذیر تھا۔ یہ بات بالکل سامنے کی تھی۔ اگر سفیر احمد کی جان سے کھیلنے والا کوئی ایسا شخص ہوتا جسے ٹرک کی تلاش تھی تو وہ سفیر احمد کی کلائی سے منسلک بریف کیس کو یونہی چھوڑ کر نہ جاتا۔ کچھ اور بن نہ پڑتا تو وہ اس کی کلائی کاٹ کر ہی بریف کیس اپنے ساتھ لے جاتا۔ بریف کیس کو دیکھنے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بے دلی سے توڑنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعد ازاں سفیر احمد کے ساتھ ہی اسے پائپ کی تاریکی میں پھینک دیا گیا ہے۔

یہ بریف کیس "نمبر کمبی نیشن" سے کھلتا تھا۔ "نمبر کمبی نیشن" مجھے معلوم نہیں تھا اور عین ممکن تھا کہ سفیر کو بھی ابھی تک پتا نہ چلا ہو۔ اگر میرے پاس پستول ہوتا یا سیون ایم ایم رائفل میں ہی ایک آدھ گولی بچی ہوتی تو بریف کیس کا لاک توڑنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن میں ان چیزوں سے محروم تھا۔ میں اسی الجھن میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ پاؤں کے قریب ایک [illegible] گارے اور مٹی میں لتھڑا ہوا ایک ریوالور تھا۔ میں نے جھک کر یہ ریوالور اٹھایا اور پہلی نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ سفیر احمد کا ریوالور تھا۔ جب میں نے سفیر کی لاش پائپ سے کھینچی تو یہ اس کے ساتھ ہی لڑھک کر گڑھے میں گر پڑا [illegible] میں نے قمیص کے دامن سے ریوالور کی کچھ صفائی کی اور دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ چیمبر میں تین سنہری گولیاں [illegible] رہی ہیں۔ یہ ریوالور سفیر احمد کے لباس میں کہیں موجود [illegible] ہو سکتا ہے' سفیر احمد کو قتل کرنے والوں نے ریوالور بھی [illegible] میں پھینک دیا ہو' بہرحال یہ ریوالور اس وقت میرے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔

میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس کی نال بریف کیس کے تالے پر رکھ دی۔ فائر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے [illegible] کیے۔ بریف کیس کا سامنے والا حصہ درمیان سے ٹوٹ گیا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا تو وہ پہلی کوشش میں اٹھ گیا۔ بریف کیس میں ایک فائل موجود تھی۔ اس کے علاوہ کاغذات اور تراشے بے ترتیب پڑے تھے۔ میں نے

کاغذات فائل میں رکھے اور فائل بڑی احتیاط سے اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی۔ سفیر احمد کی لاش کو دوبارہ پائپ میں دھکیل دیا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس لاش کے بارے میں مقامی پولیس کو اطلاع دی جائے۔ اگر ایک دو دن میں لاش یہاں سے نہ ہٹائی جاتی تو جنگلی جانور اس کی چیر پھاڑ شروع کر دیتے۔۔۔۔ میں خود تو تھانے میں پیش ہو کر یہ اطلاع دے نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیے جانے کی ضرورت تھی جس میں مجھے سامنے نہ آنا پڑتا۔ ابھی میں اسی ادھیڑبن میں کھڑا تھا کہ بالکل قریب سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے اپنا ریوالور سیدھا کیا لیکن اچھا ہوا کہ میں نے اسے استعمال نہیں کیا ورنہ جو برسٹ میرے سر کے اوپر سے گزرا تھا وہ میرے جسم میں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا' گڑھے سے باہر دو افراد خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے عقب میں بھی چند افراد نمودار ہو گئے۔

"ریوالور نیچے پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" ایک آواز نے گرج کر کہا۔

یہ وہی موٹا سور تھا جس نے ڈاک بنگلے میں موجود افراد کو نشہ آور چائے پلائی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر فیصلہ کرنا تھا۔ مزاحمت کرنا تھی یا نہیں کرنا تھی۔ میں ریوالور سے فائر کر کے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا تھا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کو ڈھیر کر دیتا لیکن میری طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں اور وہ سب برسٹ مارنے والی تھیں۔ ایک فائر کے جواب میں مجھ پر پچاس گولیاں چل سکتی تھیں۔ میں نے ریوالور گڑھے سے باہر پھینک دیا۔ ایک شخص نے چیل کی طرح جھپٹ کر ریوالور دبوچا اور جست لگا کر گڑھے میں آ گیا۔ اس کی رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رائفل "شولڈر سٹریپ" سے منسلک تھی لہٰذا رائفل بردار کو یہ خدشہ نہیں تھا کہ میں جھپٹ کر اسے غیر مسلح کر دوں گا۔ پھر بھی وہ بے حد محتاط نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جسمانی احتار کے نام کی شے ہے۔ رائفل بردار نے ایک ہاتھ سے میری واجبی سی تلاشی لی اور پھر بڑے رعب سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں گڑھے سے نکل آیا۔

"لڑکی کہاں ہے؟" سور نے غرا کر پوچھا۔

"اسی کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تمہارے ساتھ تھی!" سور کے ایک ساتھی نے

"بھاگ دوڑ میں بچھڑ گئی ہے اور اگر تمہارے ہتھے نہیں چڑھی تو پھر اسی گڑھے کے اردگرد کہیں ہو گی۔"

"تم نے فائر کیوں کیا تھا؟"

"لڑکی کو متوجہ کرنے کے لیے۔ وہ اس ریوالور کی آواز پہچانتی ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے بجائے تم یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

موٹے سور کے اشارے پر ایک بندہ گڑھے میں اتر گیا اور اچٹتی نظر سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسے جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا پائپ کا دہانہ نظر نہیں آیا۔ خود رو پودوں نے اس دہانے کو زبردست طریقے سے "کیموفلاج" کر رکھا تھا۔ سور نما چربی دار شخص نے اپنی خودکار رائفل میری طرف یوں تان رکھی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ ذرا سا چوکا تو میں بھاپ بن کر اڑ جاؤں گا۔ اور صرف وہی نہیں' باقی دونوں رائفل بردار بھی پلک جھپکے بغیر مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر تھیں اور رگ پٹھے تنے ہوئے تھے۔ وہ مجھ پر پوری طرح حاوی تھے پھر بھی ان کی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔ وہ میرے نام سے آگاہ ہو چکے تھے اور تھوڑی دیر پہلے میرا طرز مزاحمت بھی ملاحظہ کر چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ میں نے کس طرح "ان کا گھیرا" توڑا ہے اور بے دست و پا ہوتے ہوئے بھی کیسے ان کے چھکے چھڑائے ہیں۔ ان کے بڑوں نے انہیں میرے بارے میں محتاط اور ہوشیار رہنے کی جو ہدایات دے رکھی تھیں وہ ان کی ذری ذری آنکھوں میں صاف پڑھی جا رہی تھیں۔

"چلو گاڑی کی طرف۔" سور نما شخص نے گن کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل دیا۔ میرا تجربہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا شخص جس نے مجھ پر رائفل تان رکھی ہے اور جو مجھ سے بے حد خوفزدہ بھی ہے' میری ذرا سی غلط جنبش پر مجھے گولیوں سے بھون سکتا ہے' لہٰذا وہ میرے لیے کسی بھی شخص سے بڑھ کر خطرناک ہے۔ میں بلا چوں چرا تینوں افراد کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان میں سے دو میرے دائیں بائیں چل رہے تھے جب کہ ایک عقب میں تھا۔ وہ اچھی شکل سے ماہر کھلاڑی نظر آتے تھے لیکن مجھے "کور" کرنے میں انہوں نے اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا۔ شاید یہ بھی ان کی حد سے بڑھی ہوئی تشویش کا نتیجہ تھا۔ وہ "کور" کرنے کا بنیادی اصول فراموش کر رہے تھے۔ کور کرنے والے ایسا زاویہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے فائر کی زد میں نہ ہوں لیکن یہاں میرے دائیں بائیں چلنے والے دونوں افراد مجھے مارنے

…ی کوشش میں ایک دلدوز چیخ کو بھون سکتے تھے۔

ان کی اس کوتاہی کو بوجوہ معاف کرتے ہوئے میں سیدھا چلتا رہا۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے گھنے درختوں کے اندر ایک سرخ جیپ کھڑی تھی۔ یہ وہی لینڈ کروزر تھی جس کے اندر سے فائر کرکے نیشا کو ابدی نیند سلایا گیا تھا۔ جیپ گرد و غبار میں اٹی ہوئی تھی اور اس کی ایک سائیڈ پر گولیوں کے نشان موجود تھے۔ سؤر نما شخص نے جیپ کے اندر سے ایک واکی ٹاکی برآمد کیا اور دھیمے لہجے میں کسی سے بات کرنے لگا۔ اس شخص کی شکل و صورت میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ایک خرخراتے سؤر کا تصور ذہن میں آجاتا تھا۔ واکی ٹاکی پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بدستور مجھ پر جمی تھیں اور رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص نے دوسری جیپ میں موجود افراد سے رابطہ کیا ہے اور انہیں یہاں بلا رہا ہے۔ اگلے پانچ منٹ میں یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ دور سے کسی گاڑی کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک شخص نے سرخ لینڈ کروزر کا ہارن بجا بجا کر آنے والی گاڑی کو متوجہ کیا۔ چند سیکنڈ بعد یہ گاڑی دھول اڑاتی موقع پر پہنچ گئی۔ یہ بھی ایک شاندار بلٹ پروف جیپ تھی لیکن کسی درخت سے ٹکرانے اور زمین پر دو تین قلابازیاں کھانے کے بعد اس کا ستیاناس ہو چکا تھا۔ ایک دروازہ پچک کر اندر گھس گیا تھا۔ ایک کھڑکی کا شیشہ اپنے فریم میں سے نکل چکا تھا۔ بونٹ تڑمڑ گیا تھا اور اسٹیل کا بمپر ایک جانب زمین پر گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔

اس جیپ میں پانچ [illegible] افراد کے علاوہ شیخ عاصم بھی سوار تھا۔ شیخ عاصم کے ماتھے پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی کسی جُبّے کو پھاڑ کر بنائی گئی تھی۔ اس پٹی پر تین جگہ خون کی آلائش نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص کے دانت ٹوٹ چکے تھے اور وہ اپنے ہونٹوں سے بہنے والے لہو کو مسلسل قمیص کی آستین سے پونچھ رہا تھا۔ جیپ میں موجود قریباً ہر شخص کو چھوٹی موٹی چوٹ آئی تھی۔ شیخ عاصم کی دلی کیفیت اس کی خون بار آنکھوں سے عیاں تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور یہیں اس جنگلی گھاس پر گرا کر میری تکا بوٹی کر دے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنے اعصاب پر کنٹرول رکھنا ہے ورنہ میں کسی بھی وقت پاسا اپنے حق میں پلٹ سکتا ہوں۔

شیخ عاصم کے کارندوں میں سے صرف مترجم اس کی زبان سمجھتا تھا اور مترجم میری فائرنگ سے شدید زخمی ہو کر ڈاک بنگلے کے سامنے گر گیا تھا۔ اب شیخ عاصم اپنی بات صرف اشاروں کنایوں میں سمجھا سکتا تھا۔ اس نے فربہ اندام شخص کو اشارہ کیا کہ مجھے آہنی ہتھکڑی لگا دی جائے۔ فربہ اندام شخص نے سرخ جیپ کے اندر سے چمکدار اسٹیل کی ہتھکڑی نکال لی۔ شیخ عاصم نے اشارے سے فربہ اندام کو اپنے پاس بلایا اور اس کی رائفل اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور وہ بالکل تیار حالت میں تھی۔ شیخ عاصم نہایت سفاک لہجے میں بولا۔ "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں جانی! گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ چاہے اس کی زد میں میرا اپنا آدمی ہی کیوں نہ آجائے۔ چپ چاپ ہتھکڑی لگوالو۔۔۔ ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس پر عمل بھی کرے گا۔ اگر ہتھکڑی لگواتے وقت میں نے فربہ اندام شخص کو ڈھال بنانے کی کوشش کی یا کوئی اور حربہ آزمایا تو وہ ہم دونوں کو چھلنی کر دے گا۔ برسوں کے تجربے نے مجھے اتنا تو سمجھا ہی دیا تھا کہ کس دھمکی کے پیچھے ارادہ ہوتا ہے اور کون سی دھمکی صرف دھمکی ہوتی ہے۔ میں نے مزاحمت کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ ہتھکڑی کی چابی فربہ اندام شخص نے شیخ عاصم کو تھما دی۔

میرے ہاتھ بندھ جانے کے بعد شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی نگاہوں میں گہری تشویش کے سائے قدرے کم ہو گئے۔ رائفل بردار درمیانی فاصلہ کم کر کے میرے عین عقب میں آگئے اور ٹھوکے دے کر مجھے جیپ میں بٹھا دیا۔ ایک رائفل بردار چوکس حالت میں میرے سرہانے کھڑا رہا۔ شیخ عاصم کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور شیخ عاصم اشاروں کنایوں میں انہیں ہدایات دینے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا یہ ہدایات غزالہ کی تلاش کے بارے میں ہیں۔

○○

شیخ عاصم کے کارندوں کو غزالہ ملی یا نہیں اس بارے میں مجھے ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا۔ بہرحال بذریعہ جیپ قریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شاندار عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ بوقتِ رخصت میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی لہٰذا مجھے پتا نہیں چل سکا کہ میں کہاں سے گزرا اور کس جگہ پہنچا ہوں۔ میری پٹی عمارت کے اندر جا کر گئی تھی۔ عمارت کے خدوخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ہندو سیٹھ کی رہائش گاہ ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہندو سیٹھ

مذہبی قسم کا شخص ہو۔ عمارت کے احاطے میں بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹا سا خوبصورت مندر تعمیر کیا گیا تھا۔ جگہ جگہ چبوتروں اور طاق دانوں میں درگا دیوی، کالی ماتا اور رام کرشن کی مورتیاں نصب تھیں۔ مسلح رائفل بردار مجھے ایک طویل راہداری سے گزار کر کشادہ کمرے میں لے آئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اس عمارت کے مہمان خانے کا حصہ تھا۔ یہاں بھی ایک گوشے میں رام کرشن کی خیالی تصاویر آویزاں تھیں۔ کمرے کا ساز و سامان ایک پلنگ، دو کرسیوں اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ مجھے یہاں بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ دو دروازوں کے علاوہ کمرے میں ایک کھڑکی اور دو روشن دان بھی تھے۔ تاہم ان تینوں راستوں پر باہر کی طرف آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ مجھے قوی امید تھی کہ مسلح افراد اس کمرے سے باہر پوری طرح چوکس ہوں گے اور اس بات کا دھیان رکھیں گے کہ چڑیا بھی اندر سے باہر اور باہر سے اندر نہ جا سکے۔ مجھے اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر چکا ہے اور اب وہ اس سلسلے میں کوئی لمبا چوڑا بکھیڑا پالنا بھی نہیں چاہتا۔ میں بجا طور پر توقع کر سکتا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلے گا اور شیخ عاصم ایک لفظ کا تبادلہ کیے بغیر مجھ پر اپنی رائفل خالی کر دے گا۔ میں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے کم از کم ان کاغذات کا مطالعہ تو کر لینا چاہیے جو تارکے بھوانی کے بریف کیس سے نکلے ہیں۔ ایک تو سفرِ آخرت پر روانگی سے پہلے تھوڑا سا ٹائم پاس ہو جائے گا، دوسرے عالمِ بالا میں پہنچ کر یہ حسرت نہ رہے گی کہ تارکے بھوانی کے کاغذات بھی نہ دیکھے۔

میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ کھڑکی وغیرہ پہلے ہی اندر سے بند تھی۔۔۔ روشندان میں سے کس نے جھانکنا تھا۔ میں نے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر قمیص کے نیچے سے فائل نکالی اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ تلاشی لینے والے نے میری تلاشی بڑے ڈرے سہمے انداز میں لی تھی۔ نہ صرف فائل میرے پاس رہ گئی تھی بلکہ خنجر بھی ابھی تک پنڈلی سے لگا تھا۔ تاہم آہنی ہتھکڑی لگ جانے کے بعد یہ خنجر میرے لیے قریباً بے کار ہو گیا تھا۔ فائل نکالنے کے بعد میں نے اسے کھولا اور گردن پشت کی طرف موڑ کر ورق گردانی کرنے لگا۔ مطالعے کا یہ انداز عجیب و غریب تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں امتحان کے کمرے میں ہوں اور ممتحن کی نگاہ بچا کر نقل کر رہا ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی تو فائل کو ایک صوفے کے نیچے چھپا دوں گا (فائل کو دوبارہ قمیص میں اُڑسنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا) لیکن اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کسی نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا اور میں اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔ اس فائل میں ایک اہم شے تو وہ تراشے تھے جو مجھے تارکے بھوانی نے مہاراج رتن کی موجودگی میں دکھائے تھے۔ ان میں سے ایک تراشا برطانوی جریدے کا تھا اور اس میں ان گمشدہ ہتھیاروں کی تصاویر بھی تھیں جو دیگر ساز و سامان کے ساتھ ہی ٹھاکروں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اس کے علاوہ مقامی اخبارات کی کچھ خبریں اور مضامین تھے۔ ان تحریروں میں ہندو اُمرا کے گمشدہ اثاثوں کا تذکرہ تھا اور ان کوششوں کا احوال تھا جو وہ لوگ ان اثاثوں کی تلاش میں وقتاً فوقتاً کرتے رہے تھے۔ زر و جواہر اور انتہائی قیمتی سامان سے بھری ہوئی دو گاڑیاں ۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو رحیم یار خان سے براستہ بجنوٹ بیکانیر روانہ ہوئی تھیں لیکن وہ منزل تک نہیں پہنچی تھیں۔ ان دونوں گاڑیوں کے ساتھ جانے والے محافظوں کی لاشیں بیکانیر نہر کے کنارے پائی گئی تھیں۔ ان لاشوں کے حوالے سے پولیس نے لمبی چوڑی تفتیش کی تھی۔ اس تفتیش کا احوال بھی ان کاغذات میں موجود تھا۔ ان کاغذات کے مطالعے سے مجھے گراں قدر معلومات ضرور حاصل ہوئیں مگر ان تمام معلومات کا تعلق ماضی سے تھا۔ یعنی اس دور سے جب یہ بیش قیمت ساز و سامان پہلی بار لاپتا ہوا تھا ۔۔۔ اب اس ساز و سامان کے ساتھ دوسری مرتبہ یہ "حادثہ" پیش آچکا تھا لہٰذا پرانی باتوں میں سر کھپانا سانپ کی لکیر پیٹنے کے مترادف تھا۔ میں نے فائل کو بند کیا اور پروگرام کے مطابق اسے ایک صوفے کے نیچے گھسا دیا۔

رات نو بجے تک کسی نے میری خبر نہیں لی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے یہاں بند کر کے بھول چکے ہیں۔ عمارت میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ کھٹ پٹ کے ساتھ کبھی کبھی کوئی انسانی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی بلکہ ایک دو بار تو بچوں کی چہکاریں بھی سنائی دیں۔ پھر عمارت کے اندر واقع مندر میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ ان گھنٹیوں کی صدا مدھم پڑی تو کسی پنڈت پجاری کی بھاری بھرکم آواز سنائی دینے لگی۔ کبھی یہ آواز دھیمی پڑ جاتی، کبھی بلند ہو جاتی۔ میں نے الفاظ پر غور کیا تو پتا چلا کہ یہ مذہبی اشلوک ہیں یا بھاگوت کی کتھا قسم کی کوئی چیز سنائی جا رہی ہے۔ بولنے والے کی آواز میں سوز تھا اور وہ کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے لہجے کو ڈرامائی رنگ دیتا جاتا تھا۔ یہ کتھا رات دس بجے کے لگ بھگ ختم ہوئی۔ کچھ دیر بعد کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی اور ایک ادھیڑ

عمر شخص ہاتھ میں کھانے کا تھال لیے اندر داخل ہوا۔ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں تین چار قسم کی ترکاری اور دال تھی۔ ساتھ میں چھوٹے چھوٹے پھلکے تھے۔ کھانا لانے والے کے عقب میں ایک رائفل بردار پوری طرح چوکس کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے میری الٹی ہتھکڑی کھولنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ادھیڑ عمر شخص میرے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور پہلا نوالہ بنا کر میرے منہ کی طرف بڑھایا۔ میں نے کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں بھوک کا نہ لگنا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ پھر کھلانے والا بھی ایک غلیظ ناپاک سا شخص تھا۔ اگر تھوڑی بہت خواہش تھی بھی تو مرگئی۔ ان لوگوں نے بھی زیادہ تکلف نہیں کیا اور تھال اٹھا کر چل دیے۔ میں نے رائفل بردار سے پوچھا "لڑکی کا کچھ پتا چلا؟" میرا اشارہ غزالہ کی طرف تھا۔

رائفل بردار نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سنی ان سنی کرکے باہر نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سن رہا تھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں موند کر گزشتہ دن کی مصروفیات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بہت ہنگامہ خیز دن ثابت ہوا تھا۔ ڈاک بنگلے میں صبح سویرے مدقوق بوٹا سنگھ نے دیکھتے دیکھتے تلک رام کا "بولو رام" کردیا تھا۔ تلک رام کی زخم زخم لاش ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ بوٹا سنگھ کے دبلے پتلے بازو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ بکری بھی ذبح نہیں کرسکتا مگر اس نے انہی بازوؤں سے تلک رام کا تیا پانچا کردیا تھا۔ خبر نہیں اتنی قوت اس کے منحنی جسم میں کہاں چھپی ہوئی تھی۔ شاعر نے کہا تھا "دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے" مگر بوٹا سنگھ نے یہ قتل بازو کے زور سے نہیں اپنے انتقام کی طاقت سے کیا تھا۔ پھر میری نگاہ میں نشا کی خونچکاں لاش آئی۔ وہ مبہوت کردینے والے حسن کی مالک تھی۔ پتا نہیں کب سے دیکھنے والوں کو مبہوت کررہی تھی۔ اس نے آخر وقت تک یہ شغل جاری رکھا اور عجب ڈھنگ سے مرکر مجھے اور غزالہ کو مبہوت کرگئی۔ پھر سفیر احمد کا مرا ہوا خونچکاں جسم میرے تصور کو زخمی کرنے لگا۔ میں اس کی لاش کو محفوظ ہاتھوں تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن بہت سی ناتمام خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ میں مجبور ہوگیا تھا کہ سفیر احمد کے بے جان جسم کو اسی ویران گڑھے میں چھوڑ آؤں اور اس کے ساتھ ساتھ غزالہ کو بھی غیر یقینی حالات کے سپرد کر آؤں۔ میرے ارد گرد کے حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ ان کا ساتھ دینے کی کوشش

میں دماغ لٹو کی طرح گھومنے لگا تھا۔ غزالہ کمزور لڑکی نہیں تھی۔ خاص طور پر جب مصیبت اس کے سر پر پڑجاتی تھی تو اس کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوجاتی تھیں۔ ایسے میں وہ ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خود کو شیخ عاصم کے کارندوں سے چھپانے میں کامیاب رہے گی اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جائے گی۔

اچانک میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا کہ کہیں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کمرے میں بند ہوئے قریباً آٹھ گھنٹے ہوچکے تھے۔ اس دوران تین چار دفعہ لگا تھا کہ کوئی اس بند دروازے کے آس پاس موجود ہے جو عمارت کے اندرونی حصے میں کھلتا ہے۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا۔ چوبی تختوں میں ایک دو باریک درزیں موجود تھیں۔ ممکن تھا کہ انہی میں سے کوئی مجھے تاڑ رہا ہو۔ میں نے درز میں آنکھ لگائی۔ دوسری جانب مکمل تاریکی تھی۔ میں نے دانتوں سے کھینچ کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور سر کی مدد سے لائٹ کا سوئچ آف کرکے بستر پر لیٹ گیا۔

اگلا پہر بھی تقریباً جی بھر نے اسی کمرے میں گزارا۔ فربہ اندام رائفل بردار اور ادھیڑ عمر ملازم کے سوا کسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ فربہ اندام شخص کا نام مانجھی رام تھا اور عام ہندوؤں کی طرح وہ دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے تمام خدوخال انسانی تھے۔ انسانوں جیسی ناک، انسانوں جیسے ہونٹ، کان، آنکھیں اور لب لیکن ان اعضا کو جب بحیثیت مجموعی دیکھا جاتا تھا تو نجانے کیوں ایک جنگلی سؤر کی شبیہہ نگاہ میں ابھر آتی تھی۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا کہ میری فائرنگ سے زخمی ہونے والا شخص دہلی کے اسپتال میں ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔ میں نے اس سے غزالہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے غزالہ کو فحش گالی دی اور بولا کہ وہ ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ اگر چڑھ گئی تو میرے سامنے اس کی ایسی کم تیسی کی جائے گی۔

میں نے یہ گالیاں صبر و سکون سے برداشت کیں۔ برداشت کرنے اور ہضم کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں ان گالیوں کو ہضم نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ یہ اس ہستی کو دی گئی تھیں جو میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں مرمریں چبوترے پر مقدس ہیولے کی طرح براجمان رہتی تھی۔ میں نے یہ گالیاں اپنے حافظے کی کتاب میں درج کرلیں اور دل ہی دل میں "سؤر نما" سے وعدہ کیا کہ اسے اس بدزبانی کی سزا دوں گا۔

میں اب تک کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شیخ عاصم کو غزالہ کے پکڑے جانے کا انتظار ہے۔ غالباً وہ چاہتا

تھا کہ میری اور غزالہ کی سزا پر ایک ساتھ عمل درآمد کیا جائے۔ یا پھر وہ غزالہ کو میری سزا کا منظر دکھانے کا خواہش مند تھا۔ اپنی "سزا" کے بارے میں تو مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں تھا۔ شیخ عاصم کے نزدیک میری کم از کم سزا موت تھی۔ ہاں غزالہ کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غزالہ نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا۔ جو شیخ عاصم کو اس کے خلاف اکسا سکتا۔ وہ میرے ساتھ تاندل سے فرار ضرور ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ شیخ عاصم کی نہیں مہاراج رتن کی تحویل میں تھی اور مہاراج رتن خود بھی شیخ عاصم سے بے وفائی کرچکا تھا۔

اگلی شب دس گیارہ بجے کے قریب ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ کمرے کے اس دروازے پر دستک ہوئی جو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا۔ پھر کسی نے بے حد آہستگی سے دروازے کے قفل میں چابی گھمائی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی، قرب و جوار میں مکمل سناٹا تھا۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ بے آواز کھلا اور نیلگوں روشنی کی ایک کرن سی اندر آگئی۔

میں نے اپنے سامنے ایک قبول صورت لڑکی دیکھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ یوں لگا جیسے میں ہزار داستان کا کوئی کردار ہوں اور ایک ریشمی رات کے مخملی گداز میں رزب ابھر رہا ہوں۔ وہ لڑکی سراپا شباب تھی اور ہر طرح آراستہ و پیراستہ نظر آتی تھی۔ ہونٹوں پر لالی، رخساروں پر چمک، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں دل آویز بندے، وہ سرخ جھلملاتی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ میں نے دیکھا، اس کی کلائیوں پر رنگین چوڑیوں کے اوپر موتیے کے گجرے لپٹے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دلہن ہے یا پھر ایک ایسی لڑکی ہے جو چند روز پہلے دلہن بنی ہے۔ اس کی شربتی آنکھوں میں ایک خمار کی سی کیفیت تھی۔ وہ چند سیکنڈ یک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔" اس کی آواز میں ترنم کے ساتھ ایک طرح کی دعوت بھی تھی۔

میں نے دو تین لمحے سوچنے میں صرف کیے پھر اس کی طرف بڑھ گیا۔ نیلگوں روشنی ایک چھوٹے بلب سے پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک مختصر کمرا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ایشور کی آبنوسی مورتی کھڑی تھی۔ پاس ہی ایک الماری میں بہت سی بوسیدہ کتابیں رکھی تھیں۔ ایک طرف ماتھا ٹیکنے کی جگہ

بھی بنی ہوئی تھی۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ پوجا پاٹھ کا کمرا ہے۔ ایسی جگہوں پر ننگے پاؤں آیا جاتا ہے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ لڑکی جوتے سمیت تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے بھی چپل اتارنا ضروری نہیں سمجھا۔ کمرے سے گزر کر ہم ایک طویل راہداری میں آگئے۔ راہداری کی دونوں طرف پتھر کی جالیاں تھیں جن میں سے خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچے۔ یہاں بہت گداز قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت موٹا ہندو سیٹھ بے خبر سو رہا تھا۔ ہلکے خراٹوں کی لے پر اس کی توند پھول پچک رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر قشقہ تھا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے۔ لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ میرے باپو ہیں۔ انہوں نے تین دن سے برت رکھا ہوا ہے۔"

میں نے سوچا، تین دن کے برت کے بعد جس شخص کی توند اتنی توانا ہے وہ پیٹ بھر کر کھائے گا تو بات کہاں پہنچے گی۔ ہم دونوں اس کمرے سے دبے پاؤں گزرے۔ اگلا کمرا کسی زنانہ خواب گاہ سے مشابہ تھا۔ در و دیوار میں خوشبو رچی بسی تھی۔ آدھ کھلے وارڈروب میں زنانہ لباس دکھائی دے رہے تھے۔ بستر کے پاس اونچی ایڑی کے سینڈل پڑے تھے۔ اس خوابگاہ میں پہنچ کر میرے اندیشے حقائق کے قالب میں ڈھلنے لگے۔ رات کے اس پہر ایک بنی سنوری لڑکی مجھے نہایت خاموشی کے ساتھ "بندی خانے" سے نکال کر اس رنگین خلوت میں لے آئی تھی۔ کہانیوں اور ناولوں میں یہ بہت پرانا "دستور" ہے کہ قیدی حضرات کو حسین و جمیل لڑکیاں اپنا تعاون پیش کرتی ہیں۔ اس پچویشن میں قیدی عموماً نوجوان ہوتا ہے اور لڑکی کا تعلق انہی لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے نوجوان کو پابہ زنجیر کر رکھا ہوتا ہے۔ اس واقعے کے بعد اکثر ایک زبردست قسم کا ایڈونچر شروع ہوجاتا ہے جس میں تھوڑا تھوڑا رومانس بھی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا تھا۔ اگر نہیں ہونے والا تھا تو یہ فتنہ سامان، غارت گر دین و ایمان مجھے یہاں کیوں لے کر آئی تھی۔

"بیٹھ جایئے" اس نے بڑی نرمی سے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی پیشکش قبول یا رد کرتا، اس نے اندر سے دروازے کو مقفل کردیا۔

مجھے اپنے کانوں میں شیطان لعین کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دینے لگی لیکن بیٹھنا تو بہرحال تھا۔ میں ایک کرسی پر براجمان ہوگیا۔ لڑکی ایک ادائے بے نیازی سے

میرے سامنے بستر پر بیٹھ گئی۔ "کیا پئیں گے؟ ٹھنڈا یا گرم؟"

"کچھ پینے کی طلب نہیں" میں نے کہا۔ "آپ صرف یہ فرمائیے کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔"

"ہائے رام' ایسی بے قراری" وہ ادا سے بولی۔ "کیا رفتہ جاتا ہے آپ کو؟"

"دیکھیں... آپ نے برہمچاری کا لفظ تو سنا ہوگا؟"

میں نے اس کے پچھن دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل سنا" اس نے الھڑپن سے کہا۔ "بلکہ میرے بڑے جیجا جی بھی پچھلے چار پانچ برس سے برہمچاری ہیں۔"

"بس تو یہ سمجھ لیں کہ میں بھی آپ کا بڑا جیجا جی ہوں۔"

وہ اٹھلائی۔ "بڑے ڈرپوک اور محتاط ہیں آپ۔ لیکن بے فکر رہیں' میں آپ کے برہمچار کو زیادہ ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب فرمائیے۔ ان بندھے ہاتھوں سے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

"سیوا تو میں آپ سے ضرور کرواؤں گی لیکن پہلے آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"کس بارے میں؟"

"ایک لڑکی کے بارے میں۔ اس کا نام گریتا ہے اور وہ اسی گھر میں میرے ساتھ رہتی ہے۔"

"جی...!"

میرے سامنے بیٹھی چلبلی لڑکی ایک دم اُداس ہو گئی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کی ایک لٹ کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "گریتا اس گھر کی بہو ہے۔ اس کی شادی آج سے پانچ برس پہلے ہوئی تھی۔ شادی کے صرف دو ہفتے بعد اس کا ڈاکٹر شوہر ٹریفک کے ایک حادثے میں زخمی ہوا اور اس کا آدھا جسم عمر بھر کے لیے مفلوج ہو گیا۔ وہ چھ ماہ تک گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے کی طرح بستر پر پڑا رہا۔ آخر اس نے آتما ہتیا کر لی۔ ایک جوان و خوبرو لڑکی کو صرف اور صرف دو ہفتے اپنے پتی کی قربت حاصل ہو سکی۔ اب اس کے سامنے پہاڑ سی زندگی تھی۔ وہ ہندو جاتی سے تھی اور جس سماج میں رہتی تھی وہاں اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ دوجا بیاہ کر سکتی۔ دوجا بیاہ تو دور کی بات ہے' اس کا اب گھر سے نکلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ سفید کپڑوں میں لپٹی کسی اچھوت کی طرح گھر کے ایک کونے میں پڑی رہتی تھی۔ اس کے ساس سسر اور نندیں اس پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ جیسے وہ ایک خطرناک قیدی ہو اور موقع ملتے ہی دیواریں پھاند کر نکل جائے گی۔ یوں لگتا تھا کہ اس خاندان کی ساری عزت مریادا اس ودھوا کے چال چلن سے مشروط ہو گئی ہے۔ اگر یہ ودھوا "بیوگی" کے کڑے بندھن اصولوں پر چلتی رہی تو ٹھیک ورنہ یہ خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔" ایک لمحہ توقف کرکے وہ بولی "میں نہیں جانتی' آپ ہندو ہیں یا مسلمان' سکھ ہیں یا عیسائی۔ صرف ایک انسان ہونے کے ناتے میں آپ سے ایک سوال پوچھ رہی ہوں۔ مجھے بتائیں' کیا یہی دھرم کی سکھشا ہے۔ بھگوان نے انسان کے اندر جو مانگیں رکھی ہیں ان مانگوں کو پورا کرنے کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔ پیاس کے لیے پانی' آنکھ کے لیے روشنی' کان کے لیے آواز' زبان کے لیے ذائقہ' اسی طرح مرد اور عورت کو بھی ایک دوجے کے لیے پیدا کیا گیا ہے' اگر ان پر ناروا پہرے بٹھائے جائیں گے تو کیا یہ فطرت سے جنگ نہیں ہوگی؟ یقیناً یہ جنگ ہوگی اور گریتا اسی جنگ کا ایک دردناک انجام ہے۔ وہ ابھی پاگل نہیں ہوئی لیکن مجھے وشواس ہے کہ ہو جائے گی۔ یا پھر اسی گھر کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر اور تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ وہ دھرم اور سماج کے نام پر آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی وہ بدنصیب آتما ہے جس پر جتنا بھی ترس کھایا جائے کم ہے۔"

میں نے پوچھا "تمہارا گریتا سے کیا تعلق ہے؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "بہت گہرا تعلق ہے۔ ہم دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ ایک ہی شکل' ایک سا قد کاٹھ' ایک جیسے طور اطوار' سرِمو فرق نہیں ہے ہم میں۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ میں اپنے من کی بات زبان پر لا سکتی ہوں۔ اپنے وچاروں کا اظہار کر سکتی ہوں۔ میں سماج کی انگلی نہیں تھامتی' اپنا راستہ خود چلتی ہوں اور اس پر سر اُٹھا کر چلتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

وہ بولی۔ "میرا نام بھی گریتا ہے۔ ہے نا مزے کی بات؟"

"دو بہنوں کا ایک ہی نام؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ پھر لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کا نقطۂ نظر میری سمجھ میں آگیا۔ دراصل وہ گھما پھرا کر بات کر رہی تھی۔ وہ خود ہی گریتا تھی۔ اس نے گریتا کے جتنے مصائب کا تذکرہ کیا تھا وہ سب اس کے اپنے مصائب تھے۔ میں نے پوچھا "تو تم اس گھر کی بہو ہو؟" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "سامنے کون ہیں' جو بڑے کمرے میں سو رہے ہیں؟"

"میرے سسر ہیں۔ میں انہیں باپو کہتی ہوں۔ ان کا نام رام داس ہے۔"

"تمہارے ڈاکٹر شوہر کا کیا نام تھا؟"

"پرکاش... پرکاش مہتا" اس نے کہا اور اس کی آنکھیں کسی گہرے دکھ سے دھندلا گئیں۔

لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا۔ فوراً ہی یہ دکھ کسی نہاں خانے میں اوجھل ہو گیا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر خوابیدہ ستاروں کی طرح روشن ہو گئیں۔ اس نے بازو اپنے چہرے کے قریب لا کر موتیے کا گجرا سونگھا اور بولی۔ "کیسی لگتی ہوں میں تمہیں؟"

یہ سوال غیر متوقع تھا۔ ایسے اچانک سوال پولیس والے ملزموں سے پوچھ گچھ کے دوران کرتے ہیں۔ مقصد ملزم کو گڑبڑانا ہوتا ہے۔ میں ملزم تو نہیں تھا پھر بھی گڑبڑا گیا۔ یہ خوشبو میں بسی ہوئی خوابگاہ' یہ کافر تنہائی' یہ بھیگی ہوئی خاموش رات اور ایک فتنہ سامان لڑکی جو اپنے اندر برپا شور سے خود ہی خوفزدہ تھی۔ بڑے بڑے شگون تھے یہ سارے۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "تم سندر ہو۔"

وہ بولی۔ "ہائے رام۔ اتنا مختصر جواب۔ اس سے تو بہتر تھا کہ آپ چُپ رہتے۔ کم از کم میری خوش فہمی تو برقرار رہتی۔"

میں نے کہا۔ "مختصر بات کا اپنا ایک حُسن ہوتا ہے۔"

وہ بولی۔ "طویل بات کا بھی تو اپنا ایک حُسن ہوتا ہے۔ میری سنگار میز کا آئینہ مجھ سے بہت لمبی لمبی باتیں کرتا ہے اور یہ باتیں مجھے اچھی بھی لگتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہارے آئینے سے پوری طرح متفق ہوں۔"

اس دوسری مختصر بات پر وہ خوش ہو گئی اور اس خوشی کا دلربا اظہار اس نے یہ کیا کہ کمال بے تکلفی سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کا دراز ہونا ایک قیامت کا برپا ہونا تھا۔ ساری اس کے جسم پر کہیں بہت مضبوطی سے کسی ہوئی تھی کہیں ڈھیلی ڈھالی تھی اور کہیں بالکل نہیں تھی۔ وہ عجیب جذباتی سے لہجے میں بولی۔ "میں بہت عجیب لڑکی ہوں مسٹر۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عجیب ہو گئی ہوں۔ تم مجھے دن کے اُجالے میں اس خوابگاہ سے باہر دیکھتے تو میرا اور ہی روپ ہوتا۔ سراپا سفید سوتی ساری میں لپٹی ہوئی کلائیاں چوڑیوں سے عاری' مانگ ویران اور ایک لمبا گھونگھٹ ہر گھڑی چہرے پر جھولتا ہوا۔ اس وقت تم میرا جو روپ دیکھ رہے ہو وہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا اور ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بہت کچھ دیکھو گے تم ابھی۔ میں ایک نیک چلن' بوڑھ اور ستی ساوتری لڑکی تھی لیکن میرے ابھاگے نے مجھے بد چلن' پاپی اور نجانے کیا کیا بنا ڈالا ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ میں اچھے بُرے کی تمیز نہیں رکھتی۔ میری باتوں سے تم نے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا' ہر اونچ نیچ سمجھتی ہوں میں۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ کرتی ہوں جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ اس بے رحم سماج کے گھیرے میں' ان اونچی دیواروں کے اندر مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں اس موقعے سے فائدہ اٹھا لیتی ہوں۔ اگر کھلے الفاظ میں سننا پسند کرتے ہو تو کہوں گی کہ تم اس ودھوا کی ویران خوابگاہ کو رونق بخشنے والے پہلے مرد نہیں ہو۔ تم سے پہلے بھی چند خوبرو مرد مہمان خانے کی بے رونق تاریکی سے نکل کر اس خوابگاہ میں داخل ہو چکے ہیں۔" میں ان انکشافات پر اور انکشافات کرنے والی کے بے باک لب و لہجے پر ششدر تھا۔ وہ بڑے نازک معاملات پر بڑی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔ مجھے گھورتے پا کر کہنے لگی۔ "کیا دیکھ رہے ہو اس طرح۔ میں پاگل نہیں ہوں نہ ہی نشے میں ہوں۔ جو کچھ کہہ رہی ہوں' پورے ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں۔ اگر مجھ میں کچھ انوکھا پن ہے تو وہ میرا اپنا نہیں' ان حالات کا دیا ہوا ہے جن سے میں گزر رہی ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہم فراغت کی یہ خوبصورت گھڑیاں ضائع کیوں کریں۔ ایسا کرتے ہیں' اس ملاقات کو یادگار بنانے کے لیے پہلے ہم چلتے ہیں سینما۔ بڑی شاندار ہندی فلم لگی ہوئی ہے..... "کٹی پتنگ" راجیش کھنہ اور آشا پاریکھ نے کام کیا ہے۔ یہ بھی میرے ہی جیسی ایک ودھوا کی کہانی ہے۔ بڑے دھانسو قسم کے سین ہیں اس میں۔ فلم کے بعد ہم چلیں گے ہوٹل۔ میرا خیال ہے' چائنیز کھانے تو تمہیں بھی پسند ہوں گے۔ اگر نہ بھی ہوئے تو انڈین ڈشز بھی مل جاتی ہیں۔ کھانے سے پہلے رقص کا پروگرام بھی ہوتا ہے۔ ہائے رام... تمہارے سینے سے لگ کر ناچنے کے تصور نے ابھی سے میرے شریر میں پھریری دوڑا دی ہے۔ ہاں تو رقص کے بعد کھانا ہوگا۔ اگر تم ڈرنک کرتے ہو تو ایک دو جام بھی لے لینا لیکن اس سے زیادہ نہیں کیونکہ بعد میں تمہیں ڈرائیونگ بھی کرنا ہوگی۔ ہم نہر کے کنارے آہستگی سے گاڑی چلاتے اور میوزک سنتے ہوئے واپس گھر آئیں گے۔ اس وقت شب خوابی کا ہلکا پھلکا لباس پہننے اور دھپ سے بستر پر گرنے میں جو لطف آئے گا وہ یادگار ہوگا۔"

میں نے کہا "لیکن اس سارے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے تمہیں میری ہتھکڑی کھولنا ہوگی۔ اس کی چابی ہے تمہارے پاس؟"

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں چابی تو نہیں ہے۔"

"پھر یہ سب کیسے ہوگا؟"

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں سچ مچ تمہیں اس کمرے سے باہر لے جاؤں گی۔ نو مسٹر۔ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ میں چاہوں بھی تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ اس گھر کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ میں گھر کی دہلیز پر قدم رکھوں تو نگران نگاہیں چوکس ہو جاتی ہیں۔ میں ستا خاندان کی عزت ہوں۔ مجھے سات پردوں میں چھپا کر باہر نکالا جاتا ہے اور جب تک باہر رہتی ہوں، میرے ساس سسر کی جان سکتے میں آئی رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو وہ فلم ـــ وہ ہوٹل ـــ اور رقص وغیرہ؟"

وہ مسکرائی "وہ سب انتظام اسی کمرے میں ہے۔ یہ دیکھو، اس الماری میں یہ چھوٹا سا پروجیکٹر پڑا ہے اور اس ڈبے میں مکمل فلم ہے۔ کچن میں ہمارا لنچ تیار پڑا ہے اور یہ دیکھو یہ ہے "اوون" میں گرم گرم کھانا ابھی تمہارے سامنے سرو کروں گی۔ میوزک، رقص، ہپ شپ سب کچھ یہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔ اگر اصل نہیں ـــ تو اصل کی جھلک ہی سہی۔ ہم یہ سب کچھ اسی کمرے میں کریں گے اور تصور یہ کریں گے کہ فرید کوٹ میں آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں۔"

ثریا کی بات سے مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ میں ابھی تک فرید کوٹ میں ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ فرید کوٹ کا کون سا علاقہ ہے اور میں درحقیقت کس شخص کی تحویل میں ہوں۔

وہ بولی۔ "مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ یہ سیٹھ نگر ہے اور تم میرے سسر سیٹھ رام داس جی کی کوٹھی میں ہو۔"

عجب گورکھ دھندا سی لڑکی تھی۔ پہلے لگتا تھا، اس کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے لیکن اب چاروں خانے فٹ نظر آتی تھی۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور اس کی آنکھوں میں نشے کا دریا بہنے لگا۔ دلنشیں انداز میں مسکرا کر بولی۔ "تو چلیں پھر سینما گھر؟"

میں نے کہا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سسر کا قیدی ہوں اور بہو کے رحم و کرم پر ہوں۔"

وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھی اور پروجیکٹر نکال کر اسے ایک میز پر ایڈجسٹ کرنے لگی۔ اس کام میں وہ خاصی ماہر لگتی تھی۔ دو چار منٹ میں اس نے سب کچھ تیار کر لیا۔ پروجیکٹر آن کرنے کے بعد زیرو پاور کا بلب بھی بجھا دیا گیا۔

سامنے سفید سپاٹ دیوار پر تین فٹ ضرب دو فٹ کی شاندار تصویر نمودار ہو چکی تھی۔ یہ امپورٹڈ پروجیکٹر تھا۔ بے آواز چلتا تھا اور تصویر بہت واضح تھی۔ وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور فلم دیکھنے لگی۔ اس کے گداز بدن سے اٹھنے والی مہک موتیے کی خوشبو سے مل کر ایک جادوئی اثر کی حامل ہو گئی تھی۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا اور جو ثریا نے مجھے اس خاندان کے بارے میں بتایا تھا، اس کے مطابق یہ کٹر قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ بہو بیٹیوں کو سات پردوں میں رکھنے والے تھے اور خود بھی سرتاپا کہنہ عقائد کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن اس خاندان کی ایک بہو نے تمام تر پابندیوں کے باوجود ایک آزاد جیون تک رسائی حاصل کی تھی۔ مختلف ثبوت میرے سامنے تھے۔ اس کا گھرانا سبزی خور تھا لیکن اس نے اپنے لیے چکن کارن سوپ اور ڈرم اسٹکس کا اہتمام کر رکھا تھا.. اس کے کمرے میں ایک پروجیکٹر تھا جس پر رومان انگیز ہندی فلم چل رہی تھی اور وہ ایک اجنبی شخص کے پہلو سے چپکی بیٹھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نجانے کون کون سی آزادیاں تھیں جو اس نے اپنے لیے ان سات پردوں کے اندر مہیا کر لی تھیں۔ سچ ہے دریا کے آگے ریت کے بند نہیں باندھے جا سکتے اور نہ پو پھٹنے کے بعد سورج کو چمکنے سے روکا جا سکتا ہے۔

○☆○

خوابگاہ کی تاریکی میں فلم رواں دواں رہی۔ ثریا نے آواز بہت دھیمی کر رکھی تھی۔ جب کوئی گانا آتا یا بلند آہنگ میں مکالمے بولے جاتے تو وہ آواز کچھ اور دھیمی کر دیتی۔ بہ حال شب کے سناٹے میں یہ مدھم آواز بھی ہمارے لیے کافی تھی۔ اچانک کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ پروجیکٹر کے ساتھ ساتھ پنکھا بھی بند ہو گیا۔

"اوہ گاڈ" ثریا کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ "اس لائٹ کو بھی اب ہی جانا تھا۔" ہم تاریکی میں غرقاب اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ ایک دو منٹ کے اندر اندر کمرے میں حبس محسوس ہونے لگا۔ موسم گرم تھا۔ بند کمرے میں پنکھے کے بغیر مساموں سے پسینہ پھوٹنا شروع ہو گیا۔ گھر کے دوسرے حصوں میں سوئے ہوئے افراد بھی نیم بیدار ہو گئے تھے۔ کسی قریبی کمرے سے مسلسل کھٹ پٹ کی آواز آ رہی تھی۔ جس وسیع کمرے سے گزر کر ہم اس بیڈروم میں پہنچے تھے وہاں سے بھی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا گنبد نما توند والا سیٹھ بھی جاگ گیا ہے۔

"ہائے رام" ثریا کے منہ سے دبی دبی آواز نکلی

"ارے بھگتو رام، کہاں مر گیا ہے تو؟ ماچس کہاں ہے؟" سیٹھ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ پھر کوئی دھیرے دھیرے لکڑی کی کھڑاؤں پر چلتا راہداری کی طرف بڑھا۔

ثریا نے مجھے کمرے میں ہی ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اپنے سسر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کوشش میں اسے کہیں ٹھوکر بھی لگی اور اس کے منہ سے "اُف" کی آواز نکل گئی۔ اس کی واپسی پانچ دس سیکنڈ بعد ہوئی۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھاما اور ہانپتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔ "دھماکے کی آواز آئی تھی، میرا خیال ہے کہ ٹرانسفارمر اڑ گیا ہے۔ ویسے بھی سب جاگ گئے ہیں۔ ہمیں اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔ آؤ... میں تمہیں واپس چھوڑ آتی ہوں۔"

اس نے میرا بازو کندھے کے پاس سے تھام لیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں بہت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اگر کہیں ٹھوکر لگتی تو میں منہ کے بل گرتا۔ سیٹھ رام داس غالباً ماچس ڈھونڈنے کمرے سے نکلا ہوا تھا۔ اس کی چوبی کھڑاؤں کی آواز کچھ فاصلے سے آ رہی تھی۔ ثریا نے مجھے ہال نما کمرے سے گزارا اور راہداری میں لے آئی۔ پتھریلی جالیوں والی یہ راہداری کسی وسیع لان کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چند لمحے بعد ہم پوجا پاٹھ کے مختصر کمرے سے گزرے اور اس دروازے کے سامنے پہنچ گئے جو میرے "بندی خانے" میں کھلتا تھا۔ مجھے "بندی خانے" میں دھکیل کر ثریا نے زنان خانے کی طرف کھلنے والا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

وہ ساری رات میں نے مہمان خانے کے اس بند کمرے میں پیچ و تاب کھاتے گزاری۔ ثریا کے اندازے کے عین مطابق بجلی تمام رات نہیں آئی۔ پسینہ دھاروں کی صورت جسم سے بہتا رہا۔ صبح دس بجے کے قریب پنکھے میں حرکت پیدا ہوئی۔ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی حرارت اور تپش کی ایک تند و بالا لہر بھی آئی۔ یہ لہر شیخ عاصم بن ارشد کی صورت میں تھی۔ اس نے قریباً اڑتالیس گھنٹے بعد مجھے اپنی صورت دکھائی تھی۔ اس کی پیشانی اور ایک ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ چوٹیں اسی حادثے کی نشانیاں تھیں جو اسے ہمارے تعاقب کے دوران میں پیش آیا تھا۔ شیخ عاصم کے بال منتشر، چہرہ گرد آلود اور آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ آثار بتا رہے تھے کہ وہ اب تک پوری تندہی سے غزالہ کی تلاش میں رہا ہے۔ وہ جھنجلایا ہوا بھی تھا اور اس جھنجلاہٹ سے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب تھا کہ وہ اپنی تلاش میں ناکام رہا ہے۔ اس کی ناکامی کو محسوس کر کے میرے رگ و پے میں عجیب طرح کی طمانیت دوڑ گئی۔

شیخ عاصم شکاری لباس میں تھا۔ اس کے عقب میں "ہنا کتا" ماکھی رام رائفل تھامے چوکس کھڑا تھا۔ اس کا زوردار دھکا کھا کر میں اوندھے منہ فرش پر گر گیا۔ اس کے بعد جیسے مجھ پر وزنی ٹھوکروں، مکوں اور گالیوں کی بارش ہو گئی۔ شیخ بھی بڑی وحشت کے ساتھ اور بے دریغ مار رہا تھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے، یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے مار مار کر جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ یعنی پنجابی میں کہا جائے تو کہیں گے کہ "تھاں مار دینا" چاہتا تھا۔ میں حتی الامکان اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مرنے سے انکار نہیں تھا لیکن بدشکل ہو کر مرنے والا آئیڈیا کچھ دل کو نہیں لگ رہا تھا۔ شیخ عاصم کی انگریزی غراہٹیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان غراہٹوں میں پچھلے سات برسوں کے اندر جمع ہونے والی تمام تلخی، نفرت اور کدورت موجود تھی۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل چکا تھا۔ دائیں جانب کی پسلیوں میں بغل کے نیچے جیسے انگارے سے بھرے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا، شاید ایک دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ یہ بات واضح تھی کہ اگر میں نے مزاحمت نہ کی تو شیخ عاصم کے غضب کا چڑھا ہوا دریا مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا جائے گا۔ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوتے میں نے اچانک اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور میری ٹانگ بھرپور طریقے سے شیخ عاصم کی ایڑیوں سے ٹکرائی۔ کراٹے کی اصطلاح میں اس ضرب کو "سویپ" کہا جاتا ہے۔ ٹائمنگ درست ہو اور ضرب نشانے پر لگے تو مدمقابل کے پاؤں تلے سے سچ مچ زمین نکل جاتی ہے۔ شیخ عاصم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ چکنے فرش پر کھڑا تھا۔ سویپ لگی تو اس کی ٹانگیں ہوا میں بلند ہو گئیں اور وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔ گرنے کا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز تھا۔ شیخ کو سخت چوٹ بھی لگی تھی۔ ایک دو لمحوں کے لیے وہ سکتے میں رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا یا دروازے پر کھڑا ماکھی رام اپنے مسلح ہونے کا حق ادا کرتا، میں تڑپ کر شیخ عاصم کے اوپر گرا۔ میری ٹانگیں اس کی کمر سے لپٹ چکی تھیں۔ ماکھی رام نے رائفل سیدھی کی مگر وہ فائر کھولتا تو میرے ساتھ شیخ عاصم بھی پار ہو جاتا۔ وہ بھونچکا سا کھڑا تھا جب کوٹھی کے بیرونی گیٹ کے پاس پولیس کاروں کے تیز ہارن سنائی دیے۔ مجھ سمیت کمرے میں موجود ہر فرد ٹھٹک گیا۔ شیخ عاصم نے ایک جھٹکے سے خود کو میری ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ پھر اپنی خجالت کم کرنے کے لیے ایک زوردار ٹھوکر میری کمر پر رسید کی اور غراتا ہوا دروازے...

طرف بڑھا۔ ماگھی رام اس سے پہلے ہی صورت حال جاننے کے لیے باہر نکل چکا تھا۔ اب کمرے میں صرف ایک شخص موجود تھا۔ ماگھی رام کے باہر نکلتے ہی اس نے جیب سے پستول نکال کر مجھے کور کر لیا تھا۔ چند لمحے بعد شیخ عاصم دوبارہ کمرے کے دروازے پر نظر آیا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے ماگھی رام سے اشاروں میں کہا کہ وہ دروازہ اندر سے بند کر لے اور مجھے اپنی گن کے نشانے پر رکھے۔ ماگھی رام نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ وہ دروازہ اندر سے بند کر کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ نزیل تو رائفل کی نال میرے سینے کی جانب اٹھی تھی۔ ماگھی رام کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے شوٹ کرنے سے پہلے زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا۔

"خبردار" وہ نہایت کرخت آواز میں بولا "کوئی آواز نکالی تو رام قسم ڈھیر کر دوں گا۔"

دروازے پر باہر بھاری بوٹوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ مختلف آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس کی بھاری جمعیت کوٹھی میں گھس آئی ہے۔ ان پولیس والوں کے ساتھ ایک اسسٹنٹ کمشنر بنفس نفیس موجود تھا اور وہ اہل خانہ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ یہ بات چیت اس کمرے کے عین سامنے ہو رہی تھی جہاں ماگھی رام مجھے رائفل کے نشانے پر لیے کھڑا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر کے ساتھ بات کرنے والا وہی فربہ اندام سیٹھ تھا جسے میں نے کل رات چھپ کر کمرے میں سوتے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں ثریا نے بتایا تھا کہ اس کا نام سیٹھ رام داس ہے اور وہ بدقسمتی سے اس کا شوہر ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر نے بارعب لہجے میں کہا۔ "رام داس جی! ہماری لسٹ کے مطابق آپ کے پاس تین رائفلوں اور دو ریوالوروں کے لائسنس ہیں۔ دو لائسنس آپ کے نام ہیں جب کہ تین آپ کے بیٹوں کے نام۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"درست کہہ رہے ہیں آپ" سیٹھ نہایت برہم آواز میں بولا۔ "لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ یوں میرے گھر پہ چھاپا مارنے اور لائسنس یافتہ ہتھیاروں کی پڑتال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے آپ کو؟"

اسسٹنٹ کمشنر نے خشک لہجے میں کہا۔ "آپ کی برہمی بجا ہے لیکن ہم بھی مجبور ہیں۔ آپ سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ہندو سکھ فساد فرید کوٹ میں اب تک تین درجن انسانی جانیں لے چکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اعلیٰ حکام کو شبہ ہے کہ سرکردہ افراد کا لائسنس یافتہ اسلحہ فسادیوں کے استعمال میں آ رہا ہے۔ ہمیں آرڈرز آئے ہیں کہ فرید کوٹ میں لائسنس یافتہ اسلحہ چیک کیا جائے۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق آپ کے پاس پانچ ہتھیار ہیں۔ آپ صرف اتنا کشٹ کریں کہ ہمیں یہ ہتھیار ملاحظہ کرا دیں۔"

سیٹھ رام داس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "بھلے مانس شہریوں کو تنگ کرنے کے لیے یہ اچھا ڈھونگ رچایا ہے آپ لوگوں نے۔ میں اس سلسلے میں چپ نہیں رہوں گا۔ میں اپنی شکایت گورنر صاحب تک پہنچاؤں گا۔"

اے سی نے اس دھمکی کا اثر قبول کیے بغیر کہا۔ "آپ شکایت کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ بہرحال ہم اپنے فرض سے مجبور ہیں۔ آپ کرپا کر کے اپنا اسلحہ چیک کرا دیں۔"

سیٹھ نے بلند آواز میں کسی بدری پرشاد کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ صاحب بہادر کو لائسنس یافتہ اسلحہ چیک کرا دے۔ بدری پرشاد گیا اور تھوڑی دیر بعد اسلحہ لے آیا۔ کھٹ پٹ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اے سی صاحب اور پولیس انسپکٹر ان اسلحے کی پڑتال کر رہے ہیں۔

"ایک نزیل تو رائفل ان میں نہیں ہے؟" اے سی کی بھاری بھرکم آواز آئی۔

"وہ۔۔۔ وہ خراب تھی۔ مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے۔" سیٹھ رام داس نے بہانہ تراشا۔ میں جانتا تھا یہ بہانہ ہے کیونکہ رائفل میری آنکھوں کے سامنے ماگھی رام کے ہاتھ میں تھی۔

اے سی نے کہا۔ "اگر مرمت کے لیے گئی ہے تو یقیناً آپ کے پاس رسید ہو گی۔ رسید نہیں ہے تو اس ورکشاپ کا پتا بتائیے جہاں مرمت ہو رہی ہے، ہم ابھی پتا کروائے لیتے ہیں۔"

سیٹھ نے مزید برہم ہو کر کہا۔ "آپ بال کی کھال اتار رہے ہیں۔"

اے سی بولا۔ "ہمیں کھال اتارنا پڑتی ہے۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے یہاں سے دو فرلانگ دور ہم نے چوہدری ست نرائن سنگھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا ہے۔ ان کی دو رائفلیں بھی "مرمت" کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ وہ مرمت طلب رائفلیں ہم کل رات دو سکھ فسادیوں سے برآمد کر چکے ہیں۔ کیا سمجھے آپ؟ اگر آپ لوگ اسی طرح اسلحہ دے دے کر سر پھرے غنڈوں کو آپس میں لڑاتے رہیں گے تو بات کہاں پہنچے گی۔"

سیٹھ نے کہا "آپ لوگ ایک شریف شہری پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔"

اے سی بھی ترکی بہ ترکی بولا۔ "دیکھو سیٹھ جی۔ بحث سننا کورٹ کا کام ہے، میرا نہیں اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے۔ آپ رائفل ملاحظہ کرا دیں یا پھر آپ کے خلاف

ڈز مز ایکٹ کے تحت کیس درج ہو گا۔"

بحث نے طول پکڑا تو سیٹھ ڈھیلا پڑنے لگا۔ اس نے ملازم بدری پرشاد سے پوچھا کہ چوکیدار پیارے لال کہاں ہے۔ وہ اے سی پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رائفل کے بارے میں اصل معلومات چوکیدار کے پاس ہی ہیں اور عین ممکن ہے کہ رائفل مرمت ہو کر واپس آ چکی ہو۔ بدری پرشاد اپنے سیٹھ کی ہدایت پر چوکیدار کو ڈھونڈنے نکل گیا۔ سیٹھ رام داس نے اے سی (اسسٹنٹ کمشنر) سے کہا "چلیں نشست گاہ میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ سیٹھ کا ارادہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اے سی اور پولیس والے یہاں سے ٹل جائیں تو ماگھی رام رائفل لے کر باہر آ جائے۔ یہ رائفل نشست گاہ میں جا کر اے سی کو ملاحظہ کرا دی جائے۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ میں اس موقع پر کوشش کرتا تو باہر کھڑی پولیس کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا لیکن پولیس کو متوجہ کر لینا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ شیخ عاصم میرا محسن تھا تو انڈین پولیس بھی کچھ بجن نہیں تھی۔ وہ لوگ فرید کوٹ کے گلی کوچوں میں باؤلے کتوں کی طرح اُستاد جہانی کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے جو زر و جواہر سے بھرا ٹرک لے کر ہندوستانی علاقے میں داخل ہوا تھا اور فرید کوٹ میں خونریز فساد کا سبب بن گیا تھا۔ ابھی میں اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ کمرے کے دروازے کے باہر ایک لرزہ خیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ اسی دروازے سے سنائی دی تھی جو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا اور جس میں سے گزار کر کل رات ثریا مجھے اپنی رنگین خلوت میں لے کر گئی تھی۔ چیخ کی نواز اور خاص طور سے نسوانی چیخ کی آواز بہت تیز اور باریک ہوتی ہے۔ اس آواز کی شناخت اکثر مشکل ہوتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ چیخنے والی ثریا ہی ہو مگر میں پہچان نہیں سکا۔ چیخ بلند ہوتے ہی ماگھی رام کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے ہراساں نظروں سے پہلے اندرونی دروازے کی طرف اور پھر بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ یقیناً باہر کھڑے پولیس والے بھی چوکنا ہو چکے تھے۔ اے سی نے بارعب لہجے میں کہا۔ "یہاں کون بند ہے سیٹھ صاحب؟"

"کک۔۔۔ کوئی نہیں۔ معلوم نہیں کون چیخا ہے۔" سیٹھ نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

"شاید کوئی نوکرانی ہے" بدری پرشاد کی الجھن زدہ آواز آئی۔

"اس کمرے کا دروازہ کھلوائیں سیٹھ صاحب" کسی پولیس آفیسر نے تحکم سے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں" یہ شیخ عاصم کی آواز تھی۔ وہ بڑی طرحدار انگلش میں گویا ہوا تھا۔ اس کی آواز اور میرے مقتول راشد بن ارشد کی آواز میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔

"آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں؟" اے سی نے انگلش ہی میں شیخ عاصم سے دریافت کیا۔

"میں سیٹھ صاحب کا مہمان ہوں اور نہ بھی ہوتا تو تم لوگوں کا یہ توہین آمیز رویہ برداشت نہ کر سکتا۔"

بحث طول کھینچ رہی تھی اور تمام آوازیں کمرے میں سنائی دے رہی تھیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس کی بھاری جمعیت کوٹھی میں موجود ہے اور شیخ عاصم و سیٹھ رام داس بے حد برہم ہونے کے باوجود محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ آخر پولیس والوں نے کمرے پر چڑھائی کر دی۔ دروازے کو چند زوردار دھکے دیے گئے۔ دروازے کو صرف چٹخنی چڑھائی گئی تھی۔ وہ اکھڑ گئی اور پولیس والے دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان میں انسپکٹروں کے علاوہ چند کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل بھی تھے۔ ماگھی رام کو رائفل بدست اور مجھے لہولہان دیکھ کر پولیس والوں نے بھی اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ ایک انسپکٹر نے آگے بڑھ کر اپنے ریوالور کی نال ماگھی رام کی کنپٹی سے لگا دی اور اس کے ہاتھوں سے نزیل تو گن چھین لی۔ اتنے میں اے سی صاحب بھی اندر آ گئے۔ وہ درمیانے قد کے گورے چٹے صاحب تھے۔ عمر

چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور پوچھنے لگے۔ "لڑکی کہاں ہے؟" ان کا اشارہ چیخنے والی لڑکی یا عورت کی طرف تھا۔

میں نے کہا "وہ شاید اس ساتھ والے کمرے میں ہے۔"

اے سی صاحب اور پولیس انسپکٹران کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چند کانسٹیبل مجھے بازوؤں سے پکڑ کر باہر لے آئے۔ میرے ہاتھ بدستور ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ کرتے کا گریبان پھٹ چکا تھا۔ ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور ایک جانب کی پسلیوں میں انگارے سے بھرے ہوئے تھے۔ شیخ عاصم کی پرانی چوٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ اس نے پولیس کی آمد سے قبل مجھے اتنے جوش و خروش سے زدوکوب کیا تھا کہ اپنے زخموں کے بخیے بھی ادھیڑ لیے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ اسی طرح مجھے جان سے مار دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

پولیس والوں کے درمیان کچھ دیر کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مجھے بطور استاد جہانی پہچان لیا گیا ہے۔ ایک موٹا تازہ پولیس افسر جس کے کندھے پر انسپکٹر کے پھول لگے تھے، میرے قریب آیا اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "چلو استاد جہانی صاحب" گاڑی میں بیٹھو۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اے سی سمیت پولیس کا تمام عملہ مجھے حیرت آمیز دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پابند تھے اس کے باوجود دو کانسٹیبلوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور کوٹھی کے گیٹ کی طرف لے چلے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ ایک دم باقی ساری باتیں بھول گئے ہیں۔ گمشدہ و اغوا شدہ لڑکی کی چیخ اسیلہ رام داس کی دروغ گوئی، شیخ عاصم کی مداخلت بے جا انہیں کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ میرے اطراف میں رائفلوں کی کھڑکھڑاہٹ اور وزنی بوٹوں کی کھٹ کھٹ تھی۔ بیس تیس قدم چل کر میں اس کوٹھی سے باہر نکل آیا جہاں دین دھرم اور شرافت کے سات پردوں کے اندر ایک گناہ گار لڑکی رہتی تھی۔ معلوم نہیں اسے گناہ گار کہنا درست بھی تھا یا نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں نے کل رات صرف ایک خواب ہی دیکھا ہو لیکن نہیں...... وہ خواب نہیں تھا اور نہ ہی وہ چیخ خواب تھی جو تھوڑی دیر پہلے مجھے سنائی دی تھی۔ میں اس چیخ کے بارے میں کبھی نہ جان سکا کہ وہ کس کی تھی اور کیوں ابھری تھی لیکن ایک یقین سا ہے کہ وہ گرتا ہی کی چیخ تھی۔ وہ کسی کو نے کھدرے سے

سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ پولیس والے معتوب قیدی کو (یعنی مجھے) اس کے حال پر چھوڑ کر نشست گاہ کی طرف چلے جائیں گے تو اس نے عورت ہونے کے حوالے سے چیخ مارنے کا "حق" استعمال کیا اور پولیس والوں کو سرخ جھنڈی دکھا دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک لڑکی کی نہیں "فطرت" کی چیخ تھی۔ فطرت جو کسی حال پر پابند نہیں ہوتی اور ظلم و جبر کے خلاف ہر دور میں بغاوتوں کی پرورش کرتی ہے۔

مجھے پولیس کی ایک بند وین میں بٹھا دیا گیا۔ میرے اِرد گرد رائفلوں کا پہرا تھا۔ ایک جیپ میں اے سی صاحب اور دو انسپکٹران براجمان ہو گئے۔ وین کے عقب میں پولیس کی ایک اور گاڑی موجود تھی۔ انڈیا میں داخل ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں انڈین پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ میں عرصہ پانچ سال سے کئی مقدمات میں ان لوگوں کو مطلوب تھا۔ یقیناً ان میں سے کئی مقدموں میں مجھے اشتہاری بھی قرار دیا جا چکا ہوگا۔ پھر تازہ بہ تازہ مقدمے بھی موجود تھے جن میں اہم ترین اور حیرت ناک مقدمہ اس جادوئی ٹرک کا تھا جو اپنے پیٹ میں ہفت اقلیم کی دولت سمیٹے چالیس چوروں کی کسی پُراسرار غار میں روپوش تھا۔ ان لوگوں کی موج تھی۔ اب ان میں سے بیشتر کی تعریفی اسناد اور ترقیاں کنفرم تھیں۔

وین کی کھڑکیوں پر بلنگوں پردے کھنچے تھے۔ کچھ پتا چل رہا تھا کہ ہم فرید کوٹ کے کس حصے کی طرف جا رہے ہیں۔ ٹریفک کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی ہم کسی بارونق علاقے میں داخل نہیں ہوئے۔ اچانک وین کی رفتار آہستہ ہوئی اور وہ سڑک کے کنارے رُک گئی۔ اردگرد بیٹھے پولیس والے الرٹ نظر آنے لگے۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ونڈ اسکرین کی دوسری جانب سے منظر نظر آ رہا تھا اور یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ وین کے آگے جانے والی جیپ کا راستہ ایک مرسیڈیز کار نے روک رکھا تھا۔ کار سے تین مسلح پولیس والے برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید خودکار رائفلیں تھیں۔ ان کے عقب میں ایک سفید پوش نظر آتے تھے اور وہ بھی مسلح تھے۔ ایک باوردی پولیس والا اسسٹنٹ کمشنر کی جیپ کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس سے بات کرنے لگا۔ پولیس والے کے تیوروں سے لگ رہا تھا کہ وہ ایس پی ہے۔ کسی بات پر ایس پی اور اسسٹنٹ کمشنر میں تلخ کلامی ہوئی۔ اسسٹنٹ کمشنر ایس پی سے بات کرنے کے لیے باہر نکلنا چاہ رہا تھا جب اچانک ایس

وردی والے شخص نے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ یہ بڑا سنسنی خیز منظر تھا۔ ایک سرکاری اہلکار دوسرے اہلکار پر اسلحہ تان رہا تھا لیکن ابھی میں یہ منظر پوری طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اسسٹنٹ کمشنر کی جیپ سے خودکار رائفل کا فائر ہوا۔ ایس پی کی وردی والا لڑکھڑا کر سڑک پر گرا۔ اسی دوران میں مرسیڈیز گاڑی کی ایک کھڑکی سے تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ اسسٹنٹ کمشنر خود کو بمشکل اس فائرنگ سے بچا سکا۔ مرسیڈیز سے نکلنے والے افراد نے حالات سنگین ہوتے دیکھے تو پھرتی سے واپس گاڑی میں گھس گئے۔ مرسیڈیز کے پہیے چرچرائے اور وہ بڑی تیزی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ مرسیڈیز میں سوار افراد جعلی پولیس والے تھے۔ پولیس پارٹی کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر انہوں نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی اور زبردست مزاحمت کا سامنا کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ایس پی کی وردی والا سڑک پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ ہماری وین کے پیچھے آنے والی جیپ دائیں جانب مڑ گئی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ مرسیڈیز کے پیچھے گئی ہے۔ اے سی صاحب والی گاڑی اپنے سابق راستے پر متحرک ہو گئی۔ ہماری وین بھی اس کے پیچھے چل دی۔

دونوں گاڑیوں نے بڑی تیز رفتاری سے ڈھائی تین میل کا فیصلہ طے کیا اور "بائی وے" کو طے کر کے ایک بارونق علاقے میں داخل ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ ہماری منزل کوئی پولیس اسٹیشن ہوگی جہاں پہنچ کر مجھے لاک اپ میں جھونک دیا جائے گا اور مقامی پولیس کے سخت زین گرگے مجھے آڑے ہاتھوں لے لیں گے لیکن یہ اندازے غلط ثابت ہوئے۔ تھانے کے بجائے مجھے ایک کوٹھی میں پہنچایا گیا اور حوالات کے بجائے ایک آرام دہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرے میں ایک وسیع و عریض کھڑکی موجود تھی۔ اس میں جالی اور لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ گرل میں سے میں برآمدے کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ اسسٹنٹ کمشنر اور انسپکٹروں سمیت وہاں تمام عملہ موجود تھا۔ وہ سب خوش نظر آ رہے تھے۔ موٹے تازے انسپکٹر نے اپنی ٹوپی اتار کر ہوا میں اچھالی اور اسسٹنٹ کمشنر کی کمر پر دھول جماتے ہوئے بولا۔ "واہ جا بزّی! ایک سگریٹ تو پلا ولایتی برانڈ کا"

اسسٹنٹ کمشنر نے کہا۔ "پیارے، سگریٹ تو کیا جان بھی حاضر ہے۔ آج تو تیری کارکردگی پر قربان ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔"

موٹے انسپکٹر نے گردن گھمائی اور مجھے گھورتے ہوئے

بولا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو جہانی صاحب، ہمارے سر پر سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔"

میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں جنہیں اصلی پولیس والے سمجھ رہا تھا وہ جعلی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جنہیں میں جعلی سمجھ رہا تھا وہ اصلی تھے۔ میری نگاہ میں وہ منظر گھوم گیا جب ایس پی لب سڑک تڑپ رہا تھا اور اس کے ساتھی دفاعی فائرنگ کرتے ہوئے مرسیڈیز میں گھس رہے تھے۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عجیب کھلبلی سی مچی ہوئی تھی میرے اردگرد جیسے میں "استاد جہانی" نہ تھا، کسی کھیل میں استعمال ہونے والی گیند تھا جس پر برق رفتار کھلاڑی جھپٹ رہے تھے، ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ معلوم نہیں "اب" میں کس ٹیم کے ہاتھ میں تھا۔ اچانک میری یہ مشکل آسان ہو گئی۔ میں نے ایک بونے کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ٹرے لیے ایک جانب سے برآمد ہوا اور بڑی چستی سے چلتا "پولیس والوں" کے قریب پہنچ گیا۔ ٹرے میں شراب کی بوتلیں اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ کینیا سے درآمد شدہ خوفناک بونے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ مجھے کس پارٹی کی "مہمانی" کا شرف حاصل ہوا ہے۔ لنگر والے میلے میں مجھے کھونے کے بعد قادر زماں نے میرا پیچھا جاری رکھا تھا اور ایک بار پھر میں اس کے آہنی پنجوں میں تھا۔ قادر زماں کے پنجوں میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے خونخوار ترین دشمن شنکر شکرا کے علاوہ ابراہیم اور عیسیٰ جان وغیرہ سے بھی میری "ملاقات" ہونے والی ہے۔ ان نحس چہروں کو یاد کر کے میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میں نے تقریباً تین گھنٹے اسی کمرے میں گزار دیے۔ ہر گھڑی میں توقع کرتا رہا کہ ابھی دروازہ کھلے گا اور ضلع جھنگ کے سفاک ترین جاگیردار قادر زماں کا بگھاڑ میں بنا ہوا چہرہ میرے سامنے آ جائے گا لیکن قادر زماں وہاں نہیں آیا۔ ہاں ایک واتغل برداروں کے زیر سایہ ایک منحنی سا شخص ضرور اندر داخل ہوا۔ اس نے میری مرہم پٹی کی اور بڑی احتیاط کے ساتھ میری جامہ تلاشی لی۔ اس جامہ تلاشی میں وہ خنجر بھی برآمد ہو گیا جو اب تک میری پنڈلی سے پیوست تھا۔

شام سے تھوڑی دیر بعد مجھے کھانا دیا گیا۔ کھانے میں چاول، سبزی اور گوشت کے علاوہ دودھ بھی تھا۔ کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ غنودگی بے وقت اور غیر متوقع تھی۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ کھانے میں خواب آور دوا دی گئی ہے۔ ذہن بڑی سرعت سے ایک دھندلکے میں لپٹتا جا رہا تھا۔ جب کسی شخص کو یہ پتا

چلتا ہے کہ اسے دھوکے سے کچھ کھلا پلا دیا گیا ہے تو ایک عجب سی وحشت دل و دماغ کو گھیرنے لگتی ہے۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آتا ہے کہ اب ایک بار آنکھیں بند ہوگئیں تو شاید پھر کبھی نہ کھل سکیں۔ مجھ پر بھی ایک بار بمبئی ائرپورٹ پر یہ کیفیت گزر چکی تھی۔ یہ بہت پرانا واقعہ ہے اور اس روداد میں اس کا کوئی ذکر نہیں لیکن قادر زماں کے گماشتوں کے ہاتھوں خواب آور دوا کھانے کے بعد مجھے کسی طرح کی تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا' اس غنودگی کے نتیجے میں' میں سو سکتا ہوں' بے ہوش ہو سکتا ہوں لیکن مر نہیں سکتا۔ قادر زماں یا اس کے کارندے سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ مجھے کوئی مہلک شے کھلائیں گے۔ میری زندگی ان سب کے نزدیک ان کی اپنی زندگیوں سے بھی زیادہ عزیز ہو چکی تھی۔ میں مر جاتا تو انہیں اس دولت کا پتا کون بتاتا جو جھنگ کی حویلی سے نکلی تھی اور اپنے پیچھے ہنگاموں کا غبار چھوڑتی کسی نامعلوم تاریکی میں گم ہو گئی تھی۔ ان کے نزدیک میری حیثیت اس کنجی کی تھی جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولتی تھی اور ان پر زمانہ میں جنت کے در وا کر سکتی تھی۔ وہ اس کنجی سے محروم ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ میں کامل اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور خود کو ہر دم پھیلتی اور گہری ہوتی تاریک دھند کے سپرد کر دیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک جہازی سائز کی مسہری پر پایا۔ بدن میں عجب سی نقاہت اتری ہوئی تھی۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ میں کافی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں نے اپنے لباس پر نگاہ دوڑائی۔ یہ وہ لباس نہیں تھا جو میں نے پہلے پہن رکھا تھا۔ وہ لباس خون آلود ہو چکا تھا اور قمیص بھی شیخ عاصم کے غیظ و غضب کی زد میں آکر پھٹ گئی تھی۔ اس لباس کی جگہ اب میں ایک آرام دہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ سولہ تاریخ تھی اور گھڑی نو بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ پورے اڑتالیس گھنٹے بعد آنکھ کھل رہی تھی میری۔ مجھے یہ کمرا کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ ایک مانوس خوشبو اٹھ رہی تھی در و دیوار کے اندر سے۔ میرے عین سامنے ایک کھڑکی تھی۔ اس میں مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ اچانک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شدید حیرت کے عالم میں' میں اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ میں ایک جانی پہچانی جگہ پر تھا۔ اٹک جیل میں زخمی ہونے اور جاگیردار قادر زماں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد میں اسی کمرے میں پہنچا تھا۔ ہاں یہی کمرا تھا جس میں سیاہ رنگت والی بیگی چیکے نجو سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والا پہلوان شہباز اسی کمرے کے ارد گرد رائفل بدست دندنایا کرتا تھا۔ میں نے اس کمرے میں کئی ہفتے گزارے تھے اور پھر صحت یاب ہو کر ایس پی ساہی صاحب کو قتل کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔۔۔ ایک دم مجھے یہ خوشگوار احساس ہوا کہ میں پھر پاکستان میں ہوں۔ جیسے کسی دیوزاد نے مجھے نیند کی حالت میں ہتھیلی پر اٹھا لیا تھا اور پلک جھپکتے میں فرید کوٹ سے کوسوں دور "جھنگ" کی اس عالیشان حویلی میں پہنچا دیا تھا۔ شاید میں نے اپنی آنکھیں ملنے کے لیے ہی ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی تھی لیکن ہاتھوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا اور اسی وقت مجھے پتا چلا کہ ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے ہیں لیکن اب ان میں ہتھکڑی کی جگہ نائیلون کی مضبوط رسی تھی۔ اسی رسی کی ایک مضبوط بندش میرے پاؤں میں بھی نظر آ رہی تھی۔ رسی کو کئی بل دے کر بڑی مہارت سے گرہ لگائی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا منہ غیر معمولی طور پر کھلا ہوا ہے۔ میں خود کو اس مقام پر پا کر حیران ضرور تھا مگر میرے منہ کے کھلا ہونے کا میری حیرت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے منہ میں کپڑا رومال قسم کی شے ٹھنسی ہوئی تھی اور اسے منہ کے اندر رکھنے کے لیے اوپر سے ایک پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میں اپنے سر کو تکیے کے اوپر گھسنا شروع کر دیا۔ جلد ہی گرہ کھسک گئی اور میرے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھل گئی۔ میں نے زبان کو حرکت دے کر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر نکال دیا۔ میرے کانوں میں کچھ ملی جلی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا کہ بہت سے لوگ یہاں وہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ برتن کھنک رہے ہیں اور سُریلے قہقہے ڈوب ابھر رہے ہیں۔ شاید حویلی میں کوئی تقریب برپا تھی۔

کمرے کی واحد کھڑکی پر پردہ کھنچا تھا اور یقینی بات تھی کہ دروازہ بھی اندر سے بند ہوگا۔ اچانک مجھے غزالہ کا خیال آیا اور رگ و پے میں کرب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک اذیت ناک سوال ذہن میں ابھرا۔ کیا میں غزالہ کو ہندوستان میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ میری پناہ اور میری حفاظت میں تھی۔ میں اسے درختوں کے جھنڈ میں چھوڑ کر سفیر احمد کی لاش دیکھنے کے لیے پائپ کے دہانے کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ میرے اختیار سے باہر ہو گیا تھا اور میں شیخ عاصم کے چنگل سے ہو کر سیٹھو رام داس کی کوٹھی میں پہنچ گیا تھا۔

میں نے بستر پر لوٹ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فراگ جمپ کے انداز میں اچھلتا ہوا میں کھڑکی تک پہنچا۔ کھڑکی کے قریب ہی سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے کندھے کی مدد سے لائٹ کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں جلتا ہوا زیرو پاور کا نیلگوں بلب بجھ گیا اور تاریکی چھا گئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ دانتوں سے پکڑ کر بہ آہستگی کھینچا۔ باہر کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس منظر کی چمک دمک دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ میری حالت اس گول آنکھوں والے شب بیدار پرندے کی سی تھی جسے پکڑ کر اچانک دھوپ میں بٹھا دیا گیا ہو۔ کمرے سے باہر برآمدے کا ایک حصہ نظر آتا تھا اور اس سے آگے مہمان خانے کے وسیع و عریض احاطے پر نگاہ پڑتی تھی۔ یہ احاطہ ایک سبزہ زار کی شکل میں تھا۔ اس وقت یہ سبزہ زار سیکڑوں ہزاروں چھوٹے چھوٹے قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ سبزے کے مخملی تختوں پر کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ ان میزوں پر خورد و نوش کے لوازمات تھے اور کرسیوں پر حسین و جمیل لوگ زرق برق لباس پہنے براجمان تھے۔ ان باجمال و خوش لباس مہمانوں کے درمیان سفید بے داغ وردیوں والے بیرے خدمت گار چکراتے پھر رہے تھے۔ سبزہ زار کا جو حصہ میری نگاہوں کے سامنے تھا اس پر کم و بیش ایک سو مہمان موجود تھے۔ یقیناً ابھی بہت سے لوگ میری نگاہ سے اوجھل تھے۔ اچانک میری نگاہ قادر زماں پر پڑی۔ وہ ایک شاندار سفید شیروانی میں ملبوس تھا۔ شیروانی کی جیب میں سرخ رومال لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی قیمتی انگشتریاں اتنے فاصلے سے بھی اپنی لپک جھپک دکھا رہی تھیں۔ سلیم شاہی جوتا ایسا تھا کہ لگتا تھا' پاؤں سے دو سورج لپٹے ہوئے ہیں۔ اس سج دھج نے اس کی بارعب شخصیت کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔ پھر مجھے قادر زماں کے پہلو میں ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ جیسے سراپا چاندی میں لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی زبردست "میچنگ" تھی اس کے لباس اور بناؤ سنگار میں۔ اس نے ایک سفید ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس پر نقرئی تاروں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سفید جوتی' سفید دوپٹا اور آب دار موتیوں کا نقرئی زیور۔ اپنے سیاہ بالوں اور سرخ ہونٹوں کے سوا وہ سفید ہی سفید نظر آ رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ یہ چھوٹا سا بچہ غالباً چند ہفتے کا تھا۔ ارد گرد موجود مہمان بڑی دلچسپی اور محبت سے بچے کو دیکھنے لگے۔ کسی نے اس کے ہونٹ چھوئے' کسی نے گال چوما۔ کسی نے مسخرہ پن کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔ ایک لمبے تڑنگے چودھری نما شخص نے واسکٹ کی جیب سے سو سو کے بہت سے نئے نوٹ نکالے اور بچے کے سر پر گھما کر ایک غریب صورت بڑھیا کے حوالے کر دیے۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یاد آیا کہ غزالہ نے مجھے قادر زماں کے باپ بننے کی خبر سنائی تھی۔ قادر زماں کی سب سے چھوٹی بیوی ترنم کا سنگین کیس غزالہ نے ڈیل کیا تھا اور اپنی شبانہ روز توجہ اور لگن سے زچہ و بچہ کو موت کے منہ سے چھینا تھا۔ اس احسان کا بدلہ قادر زماں نے یوں چکایا تھا کہ غزالہ کو شنکر شکرا کے حوالے کر دیا تھا۔ یقیناً یہ قادر زماں کے بچے کا جشن ولادت تھا۔ وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس کے راج پاٹ کو وارث مل گیا تھا۔ اس جاگیر کو "جاگیردار" نصیب ہو گیا تھا۔ یہ مسرت کا موقع نجانے کتنے برسوں کے بعد آیا تھا۔ جاگیردار قادر زماں مہمانوں کے پاؤں تلے نوٹوں کا فرش بچھاتا' ان کو سونے کے نوالے کھلاتا اور آب حیات سے ان کی تواضع کرتا تو بھی کم تھا۔ پھر میری نگاہوں کے "فریم" میں چند خوبرو لڑکیاں داخل ہوئیں۔ وہ حلیے سے رقاصائیں نظر آتی تھیں لیکن جب وہ بولیں تو پتا چلا کہ ہیجڑے ہیں۔ انہوں نے اپنی پھٹی ہوئی آوازوں میں ودھائیہ گیت گانا شروع کیا اور آگے بڑھ بڑھ کر بچے کی بلائیں لینے لگیں۔ لمبے تڑنگے چودھری نما شخص نے ایک بار پھر واسکٹ میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے درجنوں نوٹ ہیجڑوں پر نچھاور کر دیے۔

اتنے میں دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ میں قالین پر بے آواز اچھلتا ہوا واپس آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کھٹ پٹ کچھ دیر بعد معدوم ہو گئی۔ میں وہیں بستر پر پڑا موسیقی اور شور و غل کی ملی جلی آوازیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد وقفے وقفے سے زوردار قہقہے بلند ہونے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کسی ورائٹی شو کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ غالباً کوئی کامیڈین اپنا "آئٹم" پیش کر رہا تھا۔ میں ایک بار پھر بستر سے اٹھا اور اچھلتا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔ سبزہ زار کا اسٹیج میری نگاہوں سے اوجھل تھا لہٰذا میں وہاں کا منظر دیکھنے سے محروم رہا۔ کھڑکی کے بالکل قریب برآمدے میں بھی چند میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تنہائی پسند جوڑا ایک ایسی ہی میز پر بیٹھا راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔ اس عالیشان حویلی کے جاگیردارانہ ماحول میں اس جوڑے کو بے جوڑ ہونے کے باوجود جوڑا کہنا ہی مناسب لگتا تھا۔ اس تقریب کے میزبان اعلیٰ کی طرح اس ادھیڑ عمر کی پارٹنر بھی ایک نوخیز لڑکی تھی۔ غالباً نئی نئی شادی ہوئی تھی دونوں کی۔ ادھیڑ عمر مہمان وہی لمبا تڑنگا چودھری تھا جو کچھ دیر پہلے اپنی واسکٹ میں سے سو سو کے کرارے نوٹ نکال رہا

تھا۔ دونوں سندھی بول رہے تھے اور شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں ان کی باتیں سمجھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے ازراہ تجسس کھڑکی سے کان لگا دیے۔ چوہدری ہنستے ہوئے بولا "قسم سے 'باپ پر تو بالکل نہیں گیا۔ قادر زماں کی ناک اونچی ہے اور رنگ بھی سرخ و سپید ہے۔ مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔"

لڑکی مصنوعی ناراضگی سے بولی۔ "ہٹیے بھی چوہدری جی! کس طرح کی بات کرتے ہیں۔ کسی نے سن لیا تو کیا سوچے گا؟"

"وہی سوچے گا جو ہم سوچ رہے ہیں" چوہدری نے ٹھٹھے سے کہا۔ "دیکھا میری سوہنی! نہ قادر زماں کی ناک چوڑی نہ اس کی بیگم کی 'پھر یہ چوڑی ناک والا بچہ کہاں سے آگیا؟"

لڑکی بولی۔ "ہائے ــــ ہائے خدا کا خوف کریں چوہدری جی۔ جاگیردارنی سے ملی ہوں میں۔ اللہ نہ کرے 'وہ کوئی بدمعاش تو نہیں ہے۔ اچھی بھلی 'شرم و حیا والی لگتی ہے۔"

"لگنے کی بات چھوڑ میری سوہنی" چوہدری نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "ایسے بنجر مردوں کے پلے بندھ جانے والی عورتوں کو جب آگے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا تو بڑا کچھ کر جاتی ہیں۔ وہ نادر سولنگی کی بہو کا پتا نہیں تجھ کو ـــــ"

"توبہ ہے اللہ۔ آپ کے دماغ میں تو گند بھرا ہے۔" لڑکی نے اوپر عمر شوہر کی بات کاٹی اور اٹھ کر چھم چھم کرتی ایک طرف چلی گئی۔

چوہدری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کے طویل کش لینے لگا۔

یہ شخص یقیناً قادر زماں کا کوئی قریبی دوست تھا اسی لیے تو اتنی فراخدلی سے نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ یقیناً ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ترنم کو بھابی اور اس کے نومولود بچے کو بھتیجے کے خطابات سے نوازا ہوگا۔ اپنی بھابی اور بھتیجے کے بارے میں اس نے جو ریمارکس پاس کیے تھے وہ قادر زماں تک پہنچتے تو وہ "خوشی سے پھولا نہ سماتا" سیروں خون بڑھ جاتا اس کا اپنے دوستوں کے "نیک" خیالات جان کر۔ بدکار اور فریبی لوگوں کا حلقۂ احباب بھی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے ثبوت ہمیں اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں۔

اچانک میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ جاگیردار قادر زماں لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا خوش پوش و بارعب شخص مجتبیٰ کنور تھا۔ وہی مجتبیٰ کنور جو برسراقتدار پارٹی کا اہم رہنما تھا اور صوبے کا طاقتور ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کے چاہنے والے اور اس سے نفرت کرنے والے بے شمار تھے۔ وہ ایک متنازعہ شخصیت تھا۔ بعض اسے بہت اچھا سمجھتے تھے اور بعض بہت برا۔ وہ ایک پیدائشی جاگیردار تھا اور سیاست میں قدم رکھنے کے بعد اسے جوانی میں ہی وہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا جس کی تمنا میں لوگ سال ہا سال اس خار زار میں بھٹکتے ہیں۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں قادر زماں کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ ان کے عقب میں بونے باڈی گارڈز تھے اور کچھ سفید پوش محافظ بھی۔ میں جلدی سے واپس آیا اور مسہری پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ قفل کھلا اور کچھ لوگ اندر آگئے۔ میں نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا۔ جاگیردار قادر زماں اور مجتبیٰ کنور میرے سرہانے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں ایک رائفل بردار محافظ بالکل چوکس حالت میں تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرا شانہ جھنجوڑا۔ میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں بہت گہری نیند کی اداکاری کر رہا تھا لہٰذا سانسیں بھی بہت گہری لے رہا تھا۔ مجھے تھوڑا ہلانے جلانے کے بعد سمجھ لیا گیا کہ میں ابھی تک بے ہوش یا نیم بے ہوش ہوں۔

"بندہ تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے" مجتبیٰ کنور کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ تبصرہ ایسے لہجے میں کیا گیا تھا جیسے کسی انسان کی نہیں پالتو جانور کی بات کی جارہی ہے۔

جاگیردار قادر زماں نے کہا۔ "جی لمبی چوڑی ہسٹری ہے جی اس کی۔ کبھی آپ فرصت نکال کر تشریف لائیں تو بتاؤں گا بلکہ اس کی زبانی سنواؤں گا۔"

حویلی کے ڈاکٹر رحمان کی جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں آئی۔ "اگر آپ بات کرنا پسند فرمائیں تو میں اسے انجکشن دے دیتا ہوں۔ ابھی دو تین منٹ کے اندر ہوش میں آجائے گا۔"

"نہیں ــــ فی الحال رہنے دیں۔" مجتبیٰ کنور نے جلدی سے کہا اور چند لمحے کمرے میں ٹھہرنے کے بعد جاگیردار قادر زماں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ کمرے کی بتی بجھانے سے پہلے کسی ملازم نے میرا منہ کھول کر اس میں پھر بدبودار کپڑا ٹھونس دیا اور اوپر سے پٹی باندھ دی۔ شاید اس نے خیال کیا تھا کہ کپڑا خود بخود باہر نکل گیا ہے۔ دروازے کے لاک میں چابی گھما کر کمرا بند کر دیا گیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی کا پردہ برابر کیا جا چکا تھا اور کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ آثار سے نظر آرہا تھا کہ اب تادیر کوئی میری مزاج پرسی کے لیے نہیں آئے گا۔ میں ایک بار پھر بستر سے اٹھ کر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ دانتوں کی مدد سے پردہ کھسکایا تو قادر زماں اور مجتبیٰ کنور اسی میز کے گرد بیٹھے نظر

آئے جہاں تھوڑی دیر پہلے قادر زماں کا معزز مہمان اور اس کی بیٹی کی ہم عمر دلہن بیٹھی تھی۔ غالباً یہ میز راز و نیاز کی باتیں کرنے کے لیے موزوں ترین تھی اس لیے اسے بار بار رونق بخشی جارہی تھی۔ قادر زماں اور مجتبیٰ کنور کسی خاص معاملے پر بات کر رہے تھے۔ قادر زماں کے بونے باڈی گارڈ تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے تھے اور دوسرے محافظ بھی کافی فاصلے پر نظر آرہے تھے۔ مجتبیٰ کنور نے اپنے سامنے رکھے انتہائی خوبصورت پیالے میں سے شیری کا ایک گھونٹ لیا اور ہنس کر بولا۔ "خدا کا نام لو قادر زماں! کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ کوئی ٹھوس کام کرو تجن جی۔ ایسے کاموں میں وقت اور پیسے کی بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ صندوقوں شندوقوں والی بات ویسے ہی جھوٹ ہے اور اگر سچ بھی ہے تو اس دولت تک پہنچتے پہنچتے تمہاری اپنی گرہ سے اتنی دولت خرچ ہو جائے گی کہ تم سب کچھ پا کر بھی گھاٹے میں رہو گے۔"

قادر زماں نے کہا۔ "کنور صاحب! آج سے دو ماہ پہلے میرے خیالات بھی بالکل وہی تھے جو آپ کے ہیں۔ میں نے اس حرامی افرائیم سے یہی الفاظ کہے تھے جو آج آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں 'میں کاروباری شخص ہوں اور اس طرح کے چکروں میں مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میں جوا بھی اس لیے نہیں کھیلتا کہ اس میں بندہ ہمت کے بجائے مقدر کے چکر میں پڑ جاتا ہے لیکن یہ ایک بالکل دوسرا معاملہ ثابت ہوا ہے کنور صاحب 'یقین کریں میں چکرا کر رہ گیا ہوں۔"

مجتبیٰ کنور نے قہقہہ لگایا۔ "چکرائے تو تم ہر وقت رہتے ہو۔ اس میں کون سی نئی بات ہے۔"

قادر زماں بولا۔ "کنور صاحب! میں افرائیم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں 'وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ ابھی انڈیا میں ہی ہے لیکن دو چار روز تک آجائے گا۔ میں آپ کو اس سے ملواؤں گا۔ وہ اس سارے تجربے سے خود گزرا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے کھدائی کی ہے اور وہ دو وزنی صندوق نکالے ہیں جو نیچے سے اوپر تک زر و جواہرات اور قیمتی پتھروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ تو جینے بھی برباد ہے اس دولت کے پیچھے۔ اور صرف افرائیم ہی کی بات نہیں ہے 'میں نے فرید کوٹ میں ایسے ایسے تماشے دیکھے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ پورے ہندوستان کے جرائم پیشہ گروہ فرید کوٹ میں اکٹھے ہو گئے ہیں اور ٹرک کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

مجتبیٰ کنور نے بہت گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ "کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات میں بہت فرق ہوتا ہے قادر زماں اور پھر اس قسم کے معاملوں میں تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہمارے ایک ملازم نے سانگھڑ سے ایک مچھلی پکڑی۔ کافی بڑی مچھلی تھی 'بارہ چودہ کلو وزن ہوگا۔ مگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس مچھلی کا وزن چودہ کلو سے تیس کلو ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ کانوں کان وزن کلو ڈیڑھ کلو بڑھتا رہا۔ تیسرے روز اخبار میں جو خبر چھپی وہ اس طرح تھی کہ کنور صاحب کے ملازمین نے ہفتے کے روز ایک بہت بڑی مچھلی پکڑی۔ اس کا وزن ڈیڑھ من کے قریب بتایا جاتا ہے۔ اس نسل کی مچھلی پہلے کبھی اس علاقے میں نہیں دیکھی گئی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے صندوقوں والی بات میں سچائی ہو لیکن اس سچائی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا ہوگا۔ فرض کریں 'ان صندوقوں میں چند کروڑ کی مالیت کا سامان ہے بھی تو وہ سارے کا سارا تو ڈھونڈنے والے کو نہیں مل جائے گا۔ ان میں سے وہ اشیا جو نوادرات کے زمرے میں آتی ہیں 'آثار قدیمہ والے اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ باقی سامان میں گورنمنٹ سمیت کئی حصے دار ہوں گے اور پھر تم ان لوگوں کو کیوں بھول رہے ہو جو اس سامان کے حقیقی وارث ہیں۔ درست ہے کہ اس حادثے کو گزرے ایک عرصہ بیت گیا ہے اور وہ لوگ ادھر ادھر بکھر چکے ہیں مگر ابھی ان میں سے کئی بقید حیات ہوں گے یا ان کی اولادیں اس بارے میں معلومات رکھتی ہوں گی۔ وہ سب لوگ چین سکون سے نہیں بیٹھے رہیں گے۔"

مجتبیٰ کنور اور قادر زماں کی گفتگو جاری رہی لیکن اسٹیج پر چونکہ تہلکہ خیز قسم کا میوزک شروع ہو گیا تھا لہٰذا ان کی آوازیں دب کر رہ گئیں۔ میں کان کھڑکی سے لگائے بیٹھا رہا لیکن آٹھ دس منٹ تک کچھ سنائی نہیں دیا۔ میوزک ختم ہوا تو میری سماعت پھر آوازوں تک رسائی حاصل کرنے لگی۔ مجتبیٰ کنور کہہ رہا تھا۔ "لیکن جمالی کو پکڑ کر یہاں لانے کا مقصد؟"

قادر زماں نے کہا۔ "وہ ٹرک تو غائب ہو ہی چکا ہے اور اس کے جلد ملنے کے آثار بھی نظر نہیں آرہے۔ ٹرک کے بعد جو قیمتی شے ہمارے پاس پہنچ سکتی ہے وہ جمالی ہے کیونکہ ٹرک کے بارے میں وہ کسی بھی شخص سے زیادہ جانتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر جمالی کو وہاں رکھا جاتا تو وہ کسی بھی وقت کسی کے ہتھے چڑھ جاتا۔ تلاش کرنے والے جتنی محنت

رک کو کھوجتے رہے ہیں' اب اسی محنت سے جمالی اور بابو لیاقت کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"اچھا یار' چھوڑو ان باتوں کو" مجتبیٰ کنور نے کہا۔ "اس پیپر مل کا کیا بنا جو تم جھنگ میں لگا رہے تھے۔"

قادر زماں نے بادلِ ناخواستہ مجتبیٰ کنور کو اپنی زیرِ تعمیر پیپر مل کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور دونوں باتیں کرتے کرتے اٹھ کر سبزہ زار کے مرکزی حصے کی طرف چلے گئے۔

رات تقریباً بارہ ایک بجے تک محفل زور پر رہی پھر یہ ہنگامہ ماند پڑنے لگا۔ قریبی علاقوں سے آئے ہوئے مہمان واپس جانا شروع ہو گئے۔ وسیع و عریض پورچ کی طرف سے گاڑیوں کے اسٹارٹ اور روانہ ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ جن مہمانوں کو رات یہیں گزارنا تھی وہ ابھی تک رقص و سرود اور کھانے پینے میں مگن تھے۔ گاہے گاہے قہقہے گونجتے تھے اور نشے میں ڈوبی ہوئی آوازیں رات کی جھیل میں بڑے بڑے پتھر پھینک دیتی تھیں۔ میں اپنے بستر پر دراز بھوک اور بے خوابی سے نبرد آزما تھا۔ اپنے آپ سے لڑتے اور پیش آمدہ ساعتوں کے بارے سوچتے سوچتے نجانے کس وقت اونگھ آگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو دروازے کے آہنی قفل میں چابی گھوم رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا اندر آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی گول سی تربوز نما شے تھی۔ یہ شے اس نے دروازے کے قریب رکھی اور آہستگی سے میرے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے شانہ جھنجوڑ کر مجھے جگایا۔ "جمالی صاحب اٹھیے۔۔۔ اٹھیے جمالی صاحب۔"

اس کا لہجہ رازدارانہ تھا اور انداز میں دوستی کی جھلک تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنا منہ میرے کان سے قریب تر کر کے بولا۔ "میں آپ کو یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔"

"کون ہو تم؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"میرا نام بشیر احمد ہے۔ مجھے بی بی جی نے بھیجا ہے۔"

"کون بی بی جی؟"

"بی بی ترنم صاحبہ نے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکال دوں۔ یہ دیکھیں۔۔۔ یہ انہوں نے پیسے دیے ہیں آپ کے لیے اور یہ کپڑے ہیں۔ ذرا جلدی سے یہ کپڑے پہن لیں آپ۔" اس نے کپڑے اور پیسے میرے پائنتی پر رکھ دیے۔

میں حیرانی کے عالم میں ادھیڑ عمر شخص کی باتیں سن رہا تھا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ترنم کے رویے کے متعلق میں پہلے سے جانتا تھا۔ وہ ایک عرصے سے غزالہ کے زیرِ علاج تھی اور اس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا۔ اس خط میں اس نے مجھے اپنے شوہر نامدار کے ارادوں سے خبردار کیا تھا اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں غزالہ اور انجم کو لے کر یہاں سے کہیں دور نکل جاؤں۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس کے شوہر نے غزالہ پر یا مجھ پر کوئی زیادتی کی تو اس کا وبال اس کے بچے پر پڑے گا اور خدانخواستہ اسے کچھ ہو جائے گا یا پھر کوئی اور ایسا نقصان ہو جائے گا جس کے لیے میاں بیوی کو تاعمر پچھتانا پڑے گا۔

ادھیڑ عمر شخص نے کسی کونے کھدرے سے ایک موم بتی ڈھونڈ نکالی تھی۔ موم بتی روشن کر کے اس نے میرے ہاتھوں کی بندش کو جلانا شروع کیا۔ نائیلون کی رسی تھی' ذرا سی دیر میں جل گئی۔ میرے ہاتھ آزاد ہوئے تو یوں لگا کہ جیسے اپنے جسم پر بلکہ اس سارے ماحول پر اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ میرا مددگار چاہتا تو رسی کو موم بتی سے جلانے کے بجائے اس کی گرہ بھی کھول سکتا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ میرے فرار کی کہانی میں سے اپنا کردار حذف کرنا چاہتا ہے۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں نے پاؤں کی رسیاں بھی کھول لیں۔ بشیر نامی اس شخص نے لباس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کسی ملازم کی شلوار قمیص تھی۔ بشیر نے موم بتی بجھا دی۔ میں نے اندھیرے میں لباس تبدیل کر لیا اور پائنتی سے روپے اٹھا کر جیب میں رکھ لیے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ہزار پندرہ سو کی رقم تھی۔ بشیر نے ایک چابی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بولا۔ "میں آپ کو زنان خانے کی طرف سے لے جاؤں گا۔ حویلی کے عقبی دروازے کے باہر ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ یہ اسی کی چابی ہے۔ اور یہ لیجیے ہیلمٹ۔" اس نے دروازے کے پاس سے تربوز نما چیز اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ "اسے پہن لیجیے اور چند قدم کا فاصلہ چھوڑ کر خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔"

میں نے ان ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کی اور ہیلمٹ پہن کر کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بشیر نے بے آوازی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحے بعد ہم آگے پیچھے چلتے حویلی کی اندرونی عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ چاند کے رخ اور مقام سے اندازہ ہوا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ میں نے وقت دیکھنے کے لیے کلائی اٹھائی۔ غزالہ کی دی ہوئی رسٹ واچ چار بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ بادِ صبا چلنا شروع ہو گئی

تھی۔ حویلی کے وسیع سبزہ زار میں سرو اور اریکیریا کے بوٹے ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ باوردی بونے اور بقیہ گھریلو ملازم ابھی تک مصروف تھے۔ وہ برتن اٹھا رہے تھے۔ میزیں سنبھال رہے تھے اور گھاس کے مخملی تختوں پر بکھری ہوئی بوتلیں سمیٹ رہے تھے۔

ہم ان لوگوں کے قریب سے گزر کر زنان خانے کی طرف چلے گئے۔ میں حویلی کے اکثر پیچ و خم سے آگاہ تھا لیکن زنان خانے کی طرف آنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ بڑی بنی سنوری جگہ تھی۔ زنان خانے کا لان علیحدہ تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا تالاب بھی موجود تھا۔ تالاب کی تہ میں چھوٹی چھوٹی نیلی روشنیاں لگی ہوئی تھیں اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ لان سے آگے گول ستونوں والا برآمدہ تھا۔ پھر ایک کشادہ راہداری تھی جس میں مشینی قالین بچھا ہوا تھا۔ زنان خانے کے کسی کمرے سے بلند آواز میں بولنے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ دو تین افراد نشے میں واویلا کر رہے ہیں۔ یہ آوازیں سن کر بشیر احمد کے قدم اچانک سست پڑ گئے۔ اس نے ایک بغلی راہداری میں جھانکا اور چانک پیچھے ہٹ آیا۔ وہ سخت الجھن میں نظر آ رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بولا۔ "گڑبڑ ہے' جہاں سے گزر کر جانا ہے وہاں وہ دلمزادے بیٹھے ہیں۔"

"کون ہیں؟"

"مہمان ہی ہیں جاگیردار صاحب کے فیملی کے ساتھ ہیں اس لیے جاگیردار صاحب نے انہیں یہاں ٹھہرایا ہے۔ اب وہ راہداری میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ بالکل مدہوش ہو رہے ہیں۔ بدبخت۔"

"پھر۔۔۔؟ کوئی اور راستہ نہیں؟"

"ہوتا تو مشکل کیا تھی" بشیر احمد نے ہونٹ کاٹے۔

میں نے دبے پاؤں آگے جا کر راہداری میں جھانکا۔ وہ دو مرد تھے اور دو عورتیں۔ چاروں نے صرف زیر جامے پہن رکھے تھے اور راہداری کے براؤن قالین پر الٹے سیدھے پڑے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑے کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ وہی حکیم حکیم چوہدری اور اس کی نوجوان بیوی تھی جو تقریب کے دوران سب سے الگ تھلگ بیٹھے تھے اور اپنے میزبان کی شان میں "قصیدے" پڑھنے لگے تھے۔ وہاں جو کچھ انہوں نے قادر زماں کی مردانگی اور بیگم قادر زماں کی شرافت کے بارے میں کہا تھا' ان دونوں کے کانوں میں پہنچ جاتا تو اس وقت ان "نیم ننگوں" کو جوتے مار کر باہر نکال دیتے۔

لوفروں کی یہ مدہوش پارٹی اس طرح راہ روکے بیٹھی تھی کہ جب تک رستہ صاف نہ ہوتا ہم وہاں سے گزر نہیں سکتے تھے۔ بشیر مجھے لے کر ایک اسٹور نما کمرے میں گھس گیا۔ کہنے لگا۔ "آپ یہاں بیٹھیں۔ میں دروازہ باہر سے بند کر دیتا ہوں۔ جیسے ہی یہ حرامی آگے پیچھے ہوتے ہیں' میں آپ کو یہاں سے نکال دوں گا۔"

بشیر احمد مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ راہداری سے شور و غل کی آوازیں مسلسل بلند ہوتی رہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شور و غل کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا ہے۔ شاید ایک آدھ اور مسٹنڈا بھی اس چنڈال پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ اسٹور نما کمرے میں مجھے تقریباً دس منٹ گزرے ہوں گے جب اچانک کہیں پاس سے لرزہ خیز چیخیں سنائی دیں۔ یہ نسوانی چیخیں راہداری کے آخری سرے سے بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ بشیر احمد پاس ہی موجود تھا' اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ چیخوں کی آواز نے اسے بھی حواس باختہ کر رکھا تھا۔ ابھی ہم صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ راہداری کے موڑ سے ایک عورت شب خوابی کے لباس میں برآمد ہوئی۔ اس کی گود میں بچہ تھا۔ وہ چیختی چلاتی باہر کی طرف بھاگی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ بدحواسی کے عالم میں "چوکیدار" کو پکار رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا' وہ ترنم تھی۔ ترنم کے پیچھے ہی پیچھے وہی حکیم حکیم چوہدری راہداری کے موڑ سے برآمد ہوا جو تھوڑی دیر پہلے راہداری میں بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ چوہدری کے جسم پر صرف انڈروئیر اور بنیان تھا۔ اپنے بالوں بھرے جسم اور پر فربہ توند کے ساتھ وہ اس حلیے میں خوفناک لگ رہا تھا۔ "ترنم جی! ہماری بات تو سنو" اس نے پکار کر کہا اور قالین کے کنارے سے الجھنے کے سبب گرتے گرتے بچا۔

میں غیر ارادی طور پر ترنم کے پیچھے لپکا۔ وہ راہداری سے نکل کر لان میں پہنچ چکی تھی۔ کوچا۔ میں نے ایک وحشت خیز منظر دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے ترنم نے مڑ کر دیکھا' اسی اثنا میں وہ لڑکھڑائی اور بچہ اس کی بانہوں سے اچھل کر تالاب میں جا گرا۔۔۔ بدنوا ماں کی وہ چیخ لرزہ خیز تھی۔ وہ چیخ حویلی کے در و دیوار میں گونجی اور شب کے سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ اپنے بچے کے پیچھے ہی تالاب میں چھلانگ لگا دے گی لیکن عین کنارے پر وہ ٹھٹھک گئی۔ "بچاؤ۔۔۔ بچاؤ" وہ حلق کے پورے زور سے چیخی

اور اپنی رانیں پیٹنے لگی۔

میں جیکٹ اتار کر بے اختیار تالاب کی طرف بھاگا۔ یہ سوچنے اور تجزیہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو چیز ترنم کی بانہوں سے اچھل کر پانی میں گری تھی یقیناً وہ بچہ ہی تھا اور اگر وہ بچہ تھا تو ایک ایک ساعت قیمتی تھی۔ میں نے رُکے بغیر پانی میں چھلانگ لگائی اور تہ میں اترتا چلا گیا۔ پانی کے سرد لمس نے مجھے ڈھانپ لیا اور کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ ... میں نے بچے کو گرتے دیکھا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس مقام پر گرا ہے۔ میں نے تاریک پانی میں دیوانہ وار ہاتھ چلائے لیکن پانی کے سوا کسی شے کا لمس محسوس نہیں ہوا۔ قریباً دس سیکنڈ پانی میں رہ کر میں سطح آب پر ابھرا۔ کناروں پر کہرام مچا ہوا تھا۔ ترنم ہسٹریائی انداز میں چلا رہی تھی۔ کسی نے اس کو بازوؤں میں جکڑ رکھا تھا۔ سبزہ زار میں کام کرنے والے بونے اور ملازم بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے تالاب میں چھلانگیں بھی لگا دی تھیں اور تاریک سطح پر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ میں نے سانس اندر کی طرح کھینچ کر پھیپھڑوں میں پوری گنجائش کے مطابق ہوا بھری اور ایک بار پھر پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔ یہ احساس جانکاہ تھا کہ میرے آس پاس ہی کہیں وہ معصوم بچہ موت سے ہمکنار ہو رہا ہے جو تھوڑی دیر پہلے ایک پُرمسرت تقریب کا دولہا تھا اور اپنی ماں کی بانہوں میں بڑی شان سے ہمک رہا تھا۔ میں جانتا تھا، میری یہ دوسری کوشش آخری کوشش ہے۔ اگر اب بھی بچہ نہیں ملا تو پھر وہ ایک لاش کی شکل میں ملے گا۔

میرا دم سینے میں گھٹ رہا تھا لیکن میں سطح آب پر خالی ہاتھ ابھرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں پانی کے اندر کچھ اور گہرائی میں چلا گیا۔ یہ میں چمکنے والی نیلگوں روشنی اداس نظر آ رہی تھی جیسے وہ کسی قبر پر جلتا ہوا دیا ہو۔ میں نے دیر تک ہاتھ پاؤں چلائے لیکن پھر دم ٹوٹنے لگا۔ مجھے یوں لگا کہ ہونٹ بے اختیار کھل جائیں گے اور کئی لیٹر پانی میرے پھیپھڑوں میں گھس جائے گا۔ میں ہاتھ چلا کر سطح آب پر آ گیا۔ ترنم کی بھٹی ہوئی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں کی تاب کوئی گوشت پوست کا انسان نہیں لا سکتا تھا۔ میں بھی نہیں لا سکا۔ مجھے یوں لگا کہ دل سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا ہے اور میں پانی پر اپنا توازن کھو کر تہ میں اتر جاؤں گا۔ یکایک میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے سانس روکی اور تڑپ کر ایک بار پھر پانی میں گھس گیا۔ میں نے چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس مرتبہ میرے ہاتھ میں بچے کی ننھی منی ٹانگ آ گئی۔ میں نے اسے کھینچا اور پانی سے باہر نکال لیا۔

بچہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ اس نومولود میں جان ہی کتنی تھی اور وہ قریباً دو منٹ تک پانی میں رہا تھا۔ میں نے اسے "گارڈن لائٹ" کی روشنی میں شبنم آلود گھاس پر لٹا دیا اور ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ اس کام میں دو اور افراد بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ معلوم نہیں، وہ مہمانوں میں سے تھے یا گھر کے افراد تھے۔ ہم نے بچے کو اوندھا لٹا کر اس کے پیٹ سے پانی نکالا۔ میں نے اس کے ننھے سینے سے کان لگایا۔ دھڑکن خاموش تھی، سانس کا زیر و بم معدوم تھا۔ بظاہر وہ مر چکا تھا۔ میرے جسم میں شدید صدمے کی لہر دوڑ گئی۔ میرے کانوں میں ترنم کی آہ و بکا گونج رہی تھی۔ جھنگ کے سب سے بڑے جاگیردار کی بیوی کسی فقیرنی کی طرح جھولی پھیلا کر خدا سے اپنے بچے کی زندگی مانگ رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا، جاگیردار صاحب کو جگاؤ، کوئی چلا رہا تھا گاڑی نکالو۔ کوئی حویلی کے ڈاکٹر رحمان کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے بچے کے منہ سے منہ لگا کر اس کا تنفس بحال کرنے کی کوشش کی۔ بار بار اس کے سینے کو دبایا تاکہ دل میں جنبش پیدا ہو لیکن کوئی ترکیب کارگر نہیں ہوئی۔۔۔ وہ مر چکا تھا اور اگر مرا نہیں تھا تو نہ ہونے کے برابر زندہ تھا۔

اچانک میں نے ایک حیرت خیز منظر دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ مجمع میں سے ایک شخص راستہ بناتے ہوئے آگے آیا۔ وہ سائیں نالی تھا۔ وہی سائیں نالی جسے میں چار روز پہلے یہاں سے سیکڑوں میل دور فرید کوٹ کے نواح میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھا۔ جسم پر وہی میلا کچیلا لبادہ تھا جس میں، میں اسے اب تک دیکھتا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کا سایہ بچے کے جسم پر پڑا۔ ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا۔ پھر وہ ایک دم جیسے ذرا پیچھے ہٹ گیا اور بچے کا جسم "گارڈن لائٹ" کی روشنی میں دوبارہ دکھائی دینے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بچے کے پنکھڑی جیسے ہونٹوں میں معمولی جنبش پیدا ہوئی ہے۔ معلوم نہیں، یہ میرا وہم تھا یا واقعی جنبش ہوئی تھی۔ میں ایک بار پھر بچے کو "ماؤتھ ٹو ماؤتھ ٹریٹ منٹ" دینے لگا۔ اس مرتبہ یہ کوشش کارگر رہی۔ بچے نے ہچکی لی اور بہت سا پانی پیٹ سے باہر نکال دیا۔ وہ تھوڑی دیر کسمساتا رہا پھر اپنی باریک مہین آواز میں زور زور سے رونے لگا۔ یہ زندگی کا اعلان تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ موت پسپا ہو گئی ہے۔ ماں دیوانہ وار بچے کی طرف بڑھی، اسے اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور چومنے چاٹنے لگی۔

میں پانی میں شرابور اٹھ کھڑا ہوا۔ بچے کے رونے کی

آواز اس وقت دنیا کی حسین ترین آواز محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا موقع پر جمع ہو جانے والے مہمانوں میں مجتبیٰ کنور بھی موجود ہے۔ وہ میری طرف تعریفی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی حیرت بھی تھی۔ اس حیرت کا سبب یقیناً یہ تھا کہ اس نے ابھی چند گھنٹے پہلے مجھے مہمان خانے میں پابہ زنجیر اور گہری نیند سوئے ہوئے پایا تھا۔ اچانک میری نگاہ اس تجیم شحیم چوہدری پر پڑی جس سے ڈر کر ترنم بھاگی تھی۔ وہ مجتبیٰ کنور کے عقب میں کھڑا تھا اور نشے میں ڈول رہا تھا۔ میں لپک کر گیا اور اس کا بنیان کھینچ کر ایک زوردار مُکا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ وہ لاش کی لاش تیورا کر دو دجا گرا۔ مجھ میں ایک دم سنسنی دوڑ گئی۔ ایک جانب سے دو افراد نکلے اور مجھ پر جھپٹ پڑے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ تجیم شحیم چوہدری کے باڈی گارڈز تھے۔ اگر انہیں خبر ہوتی کہ جمالی استاد کے سامنے جا رہے ہیں تو ایسا کرنے سے پہلے سو بار سوچتے لیکن وہ بے خبری میں مار کھا گئے۔ ایک باڈی گارڈ نے میرا گریبان پکڑنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ میری قمیص سے چھوتا' ایک زبردست ٹانگ اس کے سینے پر پڑی۔ یہ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ ہوا میں اڑتا ہوا چھپاکے سے تالاب میں جا گرا۔ دوسرا باڈی گارڈ قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک طوفانی مُکا کھا کر وہ بھی دور لڑھک گیا۔

قادر زماں کے کارندوں نے مجھے تین اطراف سے دبوچ لیا۔ وہ مجھے پہچان چکے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے مار پیٹ شروع کر دیتے یا کوئی اور کارروائی ڈالتے' مجتبیٰ کنور آگے بڑھا اور اس نے رُعب دار آواز میں انہیں پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ترنم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا ہوا تھا مسز قادر زماں؟"

ترنم نے ہچکیاں لیتے ہوئے تجیم شحیم چوہدری کی طرف انگلی اٹھائی اور بے پناہ طیش سے بولی۔ "یہ کمینہ میرے بیڈ روم میں گھس آیا تھا۔ یہ ــــ یہ" وہ اس سے آگے کچھ کہہ نہ پائی اور رونے لگی۔

جاگیردار قادر زماں خود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' وہ نشے میں دھت سو رہا تھا اور اسے جگانے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد ہی ترنم چیخیں مارتی ہوئی خوابگاہ سے بھاگی تھی۔ مجتبیٰ کنور نے تحکمانہ لہجے میں حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانے پر جائیں۔ مجمع کائی کی طرف پھٹنے لگا۔ بالآخر میرے اور ترنم کے علاوہ قادر زماں کے تین مسلح باڈی گارڈز ہی موقعے پر رہ گئے یا پھر تجیم شحیم چوہدری تھا جو جہاں گرا تھا وہیں گرا رہ گیا تھا اور اپنا گولا تھام کر "ہائے وائے" کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ گرنے سے اس کی کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہے۔ پھٹے ہوئے بنیان اور انڈرویئر کے ساتھ گھاس پر پڑا وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کے ذاتی باڈی گارڈز نے اسے اٹھانا چاہا تو اس کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ مجتبیٰ کنور نے بے حد نفرت سے اسے گھورا اور بونے باڈی گارڈز کو حکم دیا کہ وہ اس روتی بلکتی "لاش" کا کوئی انتظام کریں۔

میری نگاہیں سائیں عالی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مجھے میں نظر آیا تھا نہ کہیں آس پاس۔ بس ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا تھا۔ کہیں مجھے وہم تو نہیں ہوا؟ میرے ذہن میں بے اختیار یہ سوال ابھرا۔ لیکن نہیں۔ میں نے اسے کھلی آنکھوں سے۔ قائمی ہوش و حواس دیکھا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" مجتبیٰ کنور نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ٹھٹک کر کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ مجھے اور ترنم کو لے کر زنان خانے کی طرف آ گیا۔

زنان خانے میں پہنچ کر ترنم نے ساری بات تفصیل سے بتائی۔ اس نے کہا "میں سو رہی تھی۔ اچانک آنکھ کھلی تو چوہدری صرف بنیان اور انڈرویئر پہنے سرہانے کھڑا تھا۔ بچے کی طرف اشارہ کر کے شرابی لہجے میں کہنے لگا۔ "سچ بتا شہزادی ــــ یہ کس کا بچہ ہے؟"

میں نے چلا کر کہا کہ وہ یہاں سے دفع ہو جائے۔ کہنے لگا۔ "دفع ہو جاؤں گا لیکن یہ جان کر کہ بچہ کس کا ہے اور نہیں بتائے گی تو اس کا جرمانہ دینا ہو گا' ابھی اور اسی وقت۔"

میں نے اپنے شوہر کو اٹھانا چاہا۔ وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ خبیث مجھ سے ہاتھا پائی کرنے لگا' میں نے بچے کو اٹھایا اور بیڈ روم سے بھاگ نکلی۔"

کنور کچھ دیر تک اس سے تفصیلات پوچھتا رہا۔ وہ ہچکیاں لیتی رہی اور بتاتی رہی۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے میری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ بظاہر وہ میری طرف سے لاتعلق نظر آ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آشنائی' محبت اور احسان مندی کے اشارے میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ روتے روتے مجھ سے کہنے لگی۔ "بھائی صاحب' میں نہیں جانتی' آپ کون ہیں لیکن جو بھی ہیں میرے لیے فرشتہ رحمت بن کر آئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کن لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

میں نے کہا "آپ شرمندہ کر رہی ہیں بہن۔ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا' بچے کو ڈوبتے دیکھ کر کنارے پر کھڑا نہ رہتا۔"

بچہ مسلسل چیخ و پکار کر رہا تھا۔ ترنم اسے لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجتبیٰ کنور بھی اس کے پیچھے باہر چلا گیا۔ میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں اکیلا رہ گیا لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ اکیلا ہونے کے باوجود میں اکیلا نہیں ہوں۔ جاگیردار قادر زماں کے بونے محافظ میری طرف سے پوری طرح چوکس تھے اور اگر میں کمرے سے کھسکنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً مجھے جھاپ لیتے۔

مجتبیٰ کنور کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ اس کمرے کا معائنہ کر کے آیا تھا جہاں مجھے پابند کیا گیا تھا۔ اس کے چہرے سے حیرت جھلک رہی تھی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا "چلو' یہ تو ہم مان گئے کہ تم نے موم بتی سے اپنے ہاتھوں کی رسیاں جلا لیں لیکن قفل کیسے کھولا تم نے؟"

میں نے کہا۔ "تھوڑے بہت گُر آتے ہیں قفل کھولنے کے۔ وہیں کمرے سے لوہے کا ایک تار مل گیا تھا۔ اسے سوراخ میں گھماتا رہا۔ آخر کامیاب رہا۔"

"اور یہ لباس' ہیلمٹ وغیرہ؟ ــــ اور وہ موٹر سائیکل جو حویلی کے ایک پچھلے دروازے کے پاس کھڑی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موٹر سائیکل کی چابی بھی تمہارے پاس ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ لباس اور ہیلمٹ تو مجھے ایک کمرے سے مل گئے تھے۔ موٹر سائیکل کی مجھے خبر نہیں۔ پتا نہیں آپ کس موٹر سائیکل کی بات کر رہے ہیں۔"

"اچھا اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟" اس نے ایک دم موضوع بدلا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آیا لیکن وہ خواہ مخواہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

میں نے کہا۔ "قیدی بے چارے کا ارادہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح قید سے رہا ہو جائے۔"

اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ اس کی بلوائی آنکھوں میں ایک نایاب قسم کی فولادی سرد مہری تھی۔ مسکراتے لہجے میں بولا۔ "تم تھوڑی دیر کے لیے مجھے بادشاہ سلامت تسلیم کر لو اور یہ سمجھو کہ میں نے تم سے تمہارا ایک سوال پورا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ بولو کیا سوال کرتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "میں سوال نہیں کرتا۔"

میرے فقرے کی بازگشت چند لمحے تک کمرے میں گونجی۔ اس گونج میں مجتبیٰ کنور کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی خوبصورت آنکھوں سے یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا' پھر بولا "میرے ساتھ چلو گے؟"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میرے گھر"

میں نے کہا۔ "میں قیدی ہوں' آپ جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں۔"

O☆O

قریباً چوبیس گھنٹے بعد میں جنوبی لاہور کی ایک وسیع و عریض محل نما عمارت میں موجود تھا۔ یہ مجتبیٰ کنور کی نجی رہائش گاہ تھی۔ یہاں وہ اپنی بے حد خوبرو بیوی زلیخا اور کوئی چار درجن ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک محل میں پائی جانے والی ہر آسائش اور آرائش اس عمارت میں موجود تھی۔ دبیز قالین' بیش قیمت فرنیچر' جہازی سائز کے غالیچے' منقش در و دیوار اور بڑی بڑی الماریوں میں طلائی و نقرئی ظروف۔ رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے علاوہ جاگیردارانہ بود و باش کی علامتیں بھی اس محل میں بکثرت نظر آ رہی تھیں۔ نئے ماڈل کی بے داغ گاڑیاں' اعلیٰ نسل کے کتے اور وسیع نشست گاہ میں اسلحے کی نمائش اور جانوروں کے سروں کی بے شمار ٹرافیاں۔ یہ محل دلنواز مناظر سے سجی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا تھا اور مجتبیٰ کنور کی حیثیت یہاں ایک مطلق العنان حکمران کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا' مجتبیٰ کنور نے مجھے قادر زماں کے چنگل سے کیسے نکالا ہے اور مشروط طور پر نکالا ہے یا غیر مشروط طور پر۔ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ مجھے فرار میں مدد دینے والے پر کیا گزری ہے اور یہ راز کھلا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے علم میں نہیں تھی کہ صوبے کا یہ اہم ترین شخص مجھ پر کیوں مہربان ہو رہا ہے۔ میری حیثیت اس محل میں ایک معزز شاہی مہمان کی تھی اور شاہ کی خادمائیں اور خادمین میرے قدموں میں بچھے جا رہے تھے۔ اپنی آمد کے تھوڑی دیر بعد میں نہانے کے لیے ایک لق و دق اور سجے سنورے باتھ روم میں داخل ہوا اور اسی وقت میری قمیص کی جیب میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکل کر مرمریں فرش پر گر گیا۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ ایک خط تھا اور ترنم زماں کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ ترنم زماں کا ایک خط مجھے غزالہ کی معرفت چند ماہ پہلے ملا تھا لہٰذا تحریر پہچاننے میں مجھے قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ میں جھوک ضامن کی خون

آشام حویلی میں صرف دو روز رہا تھا۔ یہ خط اس مختصر قیام کے دوران لکھا گیا تھا اور میری جیب میں پہنچایا گیا تھا۔

میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔ "شاہ جہاں صاحب' میں غزالہ سے اور آپ سے اتنی شرمندہ ہوں کہ اپنے آپ میں مری جارہی ہوں۔ غزالہ نے جس طرح دن رات ایک کرکے میرا علاج کیا اور میری جان بچانے کے لیے اپنا تن من داؤ پر لگایا' میں زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتی۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں گی میرے منہ سے اس کے حق میں دعائے خیر نکلتی رہے گی۔ کاش ــــ کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسانوں کا تھوڑا سا بوجھ ہی کم کرسکتی۔

میرے دل میں آپ کی عزت پہلے بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن کل رات آپ نے میرے بچے کی زندگی بچا کر مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ مجھے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ کاش میں آپ کو اور غزالہ کو اپنی دلی کیفیت سے آگاہ کرسکتی۔ کل رات جب میرے شوہر کے کارندوں نے آپ سے کھینچا تانی کی تو بخدا مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرے کلیجے پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ یہ سوچ کر سرتاپا لرز جاتی ہوں کہ کل کلاں غزالہ یا آپ کے ساتھ کسی طرح کا ناروا سلوک ہوا تو کیسے برداشت کرپاؤں گی۔ میں دل کی گہرائی سے دعا کرتی ہوں کہ خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آیا تو مجھے موت آجائے۔

بھائی صاحب! میں نے آپ سے پہلے بھی درخواست کی تھی اور اب پھر دست بستہ عرض کرتی ہوں کہ جاگیردار صاحب اور ان کے حواریوں کی پہنچ سے بہت دور نکل جائیں۔ آج نہیں تو کل یہ لوگ آپ کو شدید نقصان پہنچا کر رہیں گے۔ میں جاگیردار صاحب کی بیوی ہوں۔ انہیں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے مشورے پر بہت سنجیدگی سے غور کریں۔ ایک بالکل ذاتی نوعیت کی بات بھی آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ یہ بات غزالہ کے حوالے سے ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ غزالہ آپ کی محبت میں ضبط کی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ وہ اب خود کو ایک ہاری ہوئی شکست خوردہ عورت تصور کررہی ہے۔ ایک ایسی عورت جو اپنے پیار کو پانے کے لیے وہ سب کچھ کرچکی ہے جو کرسکتی تھی اور اب بے دم ہوکر بیٹھ گئی ہے۔ اس کی یہ مایوسی دیکھ کر جہاں مجھے ترس آتا ہے وہاں عجیب طرح کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے ــــ خدا نہ کرے کبھی آپ دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہوں۔ ایک ہمدرد بہن کی حیثیت سے آپ سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب غزالہ کی پُرخلوص چاہتوں کی اور آزمائش نہ کریں۔ وہ بکھر رہی ہے اسے سمیٹ لیں' اپنا بنالیں کیونکہ یہ کیے بغیر نہ آپ مکمل رہ سکتے ہیں اور نہ وہ ــــ خیراندیش"

میں نے بغور پڑھنے کے بعد خط پھاڑ دیا اور اس کے پرزے فلش میں بہا دیے۔ طبیعت پر عجب گرفتگی سی طاری ہوگئی تھی۔ غزالہ کا تصور تو پہلے ہی ذہن سے محو نہیں ہوا تھا اور شدت سے دو خیال پر دستک دینے لگا تھا۔ میں اسے سرحد پار نہایت غیر یقینی حالات میں چھوڑ آیا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد میں نے ایک ہلکی پھلکی شلوار قمیص پہن لی اور بالوں کو تولیے سے رگڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ میری نگاہ مجتبیٰ کنور پر پڑی۔ وہ بڑی شان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ایک صوفے پر براجمان تھا۔ اس نے کسی نہایت قیمتی کپڑے کا ہلکا پھلکا لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ خوشبو بھی بہت خاص قسم کی تھی۔

"آؤ بیٹھو شاہ جہاں" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرکے بڑی شائستگی سے کہا۔

میں تولیا کندھوں پر رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے سگار تراش سے سگار کو تراشا اور ایک طلائی لائٹر سے سلگا کر کش لینے لگا۔ مجتبیٰ کنور کے اعلیٰ ذوق اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی خوش لباسی کا اندازہ مجھے اس محل نما عمارت میں آتے ہی ہوگیا تھا۔ کنور اپنی غیر سرکاری حیثیت میں چند روز کے لیے لندن جارہا تھا۔ اس کی خوبرو بیوی بھی ہمراہ تھی۔ جہاں وہ لوگ جارہے تھے وہاں سردی تھی لہٰذا گرم ملبوسات بھی ساتھ جارہے تھے۔ ان ملبوسات کو دھوپ دکھانے کے لیے ایک وسیع لان میں پھیلایا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے نہایت قیمتی اور نایاب ملبوسات کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ مجتبیٰ کنور کے درجنوں کوٹ' ایپسوں' جیکٹس اور ان گنت گرم سوٹ بڑی نفاست سے ہینگروں پر جھول رہے تھے۔ ان میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور سستے سے سستا لباس بھی دس بارہ ہزار سے کم قیمت کا نہیں تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال تھی اس طرز زندگی کی جو مجتبیٰ کنور اختیار کیے ہوئے تھا۔

مجتبیٰ کنور نے سگار کا گہرا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے کہا "شاہ جہاں' تم کوئی معمولی شخص نہیں ہو۔ اپنی صلاحیتوں کو معمولی اور بے کار کاموں میں ضائع مت کرو۔ یہ نوادرات اور ہیرے جواہرات کا چکر چھوڑو' ایسے کاموں میں آج تک کسی کو کچھ نہیں ملا۔ اگر بندے میں ہمت ہو اور دیکھنے والی آنکھ بھی ہو تو ہیرے جواہرات کے ڈھیر ہر جگہ پڑے ہوئے ہیں۔ سرکاری دفتروں میں' فیکٹریوں میں' شاملات زمینوں میں' بڑے بڑے ٹھیکوں میں ــــ کوئی ٹھوس کام کرو بھئی۔ زندگی اتنی لمبی نہیں ہے کہ اسے افراہیم جیسے خبطیوں کے پیچھے گنوا دیا جائے۔ میں کل شام کی فلائٹ سے لندن جارہا ہوں۔ پانچ چھ روز تک واپسی ہوجائے گی۔ اس دوران میں تم یہاں رہو' آرام کرو اور خود کو اس "دفینے" وغیرہ کے چکر سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میں نے تمہارے لیے ایک بہت اہم اور بڑا کام سوچا ہے۔ یہ کام ہوگیا تو شاید پھر کبھی تمہیں دولت کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے کہا۔ "آپ کی باتیں بالکل بجا ہیں جناب اور ان پر نہایت سنجیدگی سے غور نہ کرنا بیوقوفی ہے لیکن میں اتنا پریشان ہوں کہ ڈھنگ سے کوئی بات سوچ ہی نہیں پا رہا۔ شنکر شنکرا کا نام یقیناً آپ نے بھی سنا ہوگا۔ جاگیردار قادر زماں سے اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ میری ایک دوست ڈاکٹر غزالہ ہے۔ پچھلے دنوں شنکر شنکرا نے اسے جھوک ضامن کی حویلی سے اغوا کیا اور انڈیا لے گیا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح اسے شنکر کے چنگل سے نکال لیا لیکن ایک ہفتے پہلے وہ ایک بار پھر فرید کوٹ کے نواح میں مجھ سے بچھڑ گئی۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں جب تک اس کی خیریت سے آگاہ نہیں ہوجاؤں گا اور اسے واپس پاکستان نہیں لے آؤں گا' مجھے اور کچھ نہیں سوجھے گا۔"

کنور مسکرایا۔ "بس اتنی سی بات ہے۔ بھئی اب تم کنور کے مہمان ہو۔ ایسی معمولی باتوں پر فکرمند ہونا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمہاری گرل فرینڈ تمہارے پاس پہنچ جائے گی ــــ اور یہ تو ایک معمولی بات ہے' میں تمہیں دکھاؤں گا کہ مسئلے کیسے حل ہوتے ہیں۔ فاصلے کیسے گھٹتے ہیں اور انہونیاں' ہونیاں کیسے بن جاتی ہیں۔ بے شک تم نے ایک دنیا دیکھی ہے شاہ جہاں لیکن ابھی کچھ نہیں دیکھا۔"

میں نے حیرانی سے مجتبیٰ کنور کی طرف دیکھا۔ وہ غزالہ کو واپس لانے کی بات اتنے اعتماد اور یقین سے کررہا تھا جیسے وہ انڈیا میں نہ ہو بلکہ اندرونی لاہور کے کسی محلے میں ہو اور مجتبیٰ کنور ابھی ابھی اس سے مل کر آرہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ شک بھی ہوا کہ کہیں غزالہ پھر سے قادر زماں یا شنکر شنکرا کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی لیکن پھر یہ خیال مجھے ذہن سے نکالنا پڑا۔ ابھی تک مجھے کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ غزالہ کے ساتھ کوئی ایسی بات ہوئی ہے۔

مجتبیٰ کنور نے مجھ سے پوچھا کہ غزالہ کہاں اور کن حالات میں مجھ سے جدا ہوئی۔ میں نے اسے ضروری تفصیلات سے آگاہ کردیا۔ اس نے پوچھا۔ "لڑکی کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا "خیر کوئی بات نہیں۔ اس کا انتظام بھی ہوجائے گا۔ لاہور میں لڑکی کے پتے ٹھکانے سے آگاہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "جناب! میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی وجہ سے لڑکی پر کوئی حرف آئے یا اس کے انڈیا پہنچنے اور لاپتا ہونے کا احوال لوگوں کو معلوم ہو۔ میں نے ــــ"

"تم بے فکر رہو شاہ جہاں" مجتبیٰ کنور نے میری بات کاٹی۔ اس کے لہجے میں تحکم کے ساتھ ساتھ ایسا غیر متزلزل اعتماد تھا کہ سننے والا لاجواب ہوجاتا تھا۔ سگار کا کش لے کر بولا۔ "تم کچھ نہ بھی کہو تو میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ تم اپنے تھکے ہوئے ذہن کو تکلیف مت دو اور آرام کرو۔" پھر اس نے اپنی بیش قیمت گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔ "کل آٹھ بجے سے پہلے پہلے لڑکی تم تک پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "میرے دو قریبی ساتھی صفدر اور ذرین گل بھی ابھی تک انڈیا میں پھنسے ہوئے ہیں' میں ان کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" مجتبیٰ کنور نے اس موضوع میں دلچسپی لی۔ ہم دس پندرہ منٹ اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔

وہ اٹھنے کی تیاریاں کررہا تھا۔ میں نے کہا "جناب' ایک اور سوال پریشان کررہا ہے مجھے ــــ کل رات جاگیردار صاحب کی حویلی میں' میں نے ایک ملنگ دیکھا تھا۔ اس کا نام سائیں عالی ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک ہفتے پہلے انڈیا میں اس سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ میں حیران ہوں کہ وہ یہاں پاکستان میں اور جاگیردار قادر زماں صاحب کی حویلی میں کیسے پہنچ گیا؟"

کنور نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں کل صبح اس بارے میں معلوم کرکے تمہیں بتادوں گا ــــ اور کوئی مسئلہ؟"

"نہیں بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

کنور اٹھا اور بڑی شان سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز گیارہ بجے دوپہر کے لگ بھگ مجھے غزالہ کے بارے میں اطلاع مل گئی۔ اطلاع پہنچانے والا تیکھے نقوش والا ایک تیز و طرار شخص تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ چار روز

پہلے غزالہ صاحبہ اپنے گھر واقع گلبرگ تھری میں واپس پہنچ گئی ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہیں۔ صرف پیشانی پر ایک چھوٹی سی چوٹ کا نشان ہے۔

اطلاع دینے والے نے یہ بھی کہا کہ غزالہ کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لیے انہیں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ انڈیا جانے سے پہلے ابھی وہ لوگ ابتدائی معلومات ہی حاصل کررہے تھے کہ اس بات کا پتا چل گیا کہ ڈاکٹر غزالہ واپس آچکی ہیں اور اپنے گھر میں ہیں۔ آخر میں اطلاع دینے والے نے کہا "ہم اس بات کا پتا چلانے کی کوشش کررہے ہیں کہ ڈاکٹر غزالہ انڈیا سے کیوں کر واپس یہاں پہنچ سکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے دونوں ساتھیوں کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش بھی کی جارہی ہے۔"

یہ اطلاعات میرے لیے جہاں سنسنی خیز تھیں وہاں اطمینان بخش بھی تھیں۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ میں غزالہ کے بارے میں اتنی جلدی اور اتنی اچھی خبریں سن سکوں گا۔ غزالہ یہاں کیسے پہنچی یہ بعد میں بھی جانا جاسکتا تھا۔ فی الوقت یہی بات اہم تھی کہ غزالہ بخیر و عافیت لوٹ آئی تھی۔ مجھے اطلاع دینے والے تیز طرار شخص کا نام خدا بخش تھا۔ اس کی وساطت سے مجتبیٰ کنور نے مجھے میرے دوسرے سوال کا جواب بھی پہنچادیا۔ یہ سوال سائیں عالی کے بارے میں تھا۔ خدا بخش نے کہا کہ سائیں عالی نامی وہ شخص قادر زماں کی حویلی میں موجود ہے۔ وہ کچھ دوسرے محتاجوں و فقیروں کے ساتھ جشن ولادت والی پارٹی میں نذر و نیاز سمیٹنے کے لیے شامل ہوا تھا لیکن اس کی قلندرانہ باتوں سے متاثر ہوکر جاگیردار صاحب نے اسے حویلی میں مہمان ٹھہرالیا ہے اور وہ ابھی تک وہیں ہے۔

سائیں عالی ایک آسیب کے مانند ہر جگہ پہنچ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے اس سارے معاملے کو اپنی مرضی سے چلا رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ابھی سائیں عالی کی کچھ اور غیر معمولی صلاحیتیں سامنے آئیں گی۔

○☆○

کنور لندن چلا گیا۔ میں اس کی محل نما رہائش گاہ میں "قابو اسٹار خدمات" کی زد میں تھا۔ ایک دن میں نے الماری کی ایک دراز کھولی تو اس میں پانچ لاکھ روپے یوں پڑے تھے جیسے ردی کاغذ پڑے ہوں۔ ساتھ ہی کنور کی جانب سے ایک چٹ تھی۔ "شاہ جہاں! یہ رقم تمہارے استعمال کے لیے ہے۔ اگر تم کہیں آنا جانا چاہو تو میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ میرے آنے تک تم یہیں قیام کرو۔ مجھے امید ہے کہ واپسی پر میں تمہیں کچھ اچھی خبریں سناؤں گا۔ یہاں تمہیں کسی بھی قسم کی ضرورت ہو یا کام ہو تو میں ایک الہ دین کا جن تمہارے پاس چھوڑے جارہا ہوں۔ اس کا نام خدا بخش ہے۔ تمہاری ایک گھنٹی پر یہ تمہارے پاس حاضر ہوجائے گا۔"

کمرے میں ٹیلی فون، ٹیلی وژن، وی سی آر، ائرکنڈیشنر اور فریج سمیت ہر بہترین سہولت موجود تھی۔ قد آدم فریج فرانس اور انگلینڈ کی بہترین شرابوں سے بھرا ہوا تھا۔ روم سروس کے لیے ایک خادمہ موجود تھی لیکن اسے خادمہ کہنا اور بطور خادمہ استعمال کرنا ایسے ہی تھا جیسے بہترین قسم کی شراب کو پانی کہا جائے اور اس سے ہاتھ دھونے کا کام لیا جائے یا سات زبانیں بولنے والی مینا کو صرف ایک پرندہ سمجھا جائے اور پکا کر کھالیا جائے۔ وہ سراپا تہلکہ تھی اور یہ تہلکہ دن میں کئی بار میرے کمرے میں برپا ہوتا تھا اور یہ کوئی اکیلی لڑکی دعوتِ گناہ بن کر یہاں نہیں چکرا آتی تھی۔ اس سے ملتی جلتی کئی تھیں۔ میں جانتا تھا، وہ میری ایک جنبشِ ابرو کی منتظر رہتی ہیں لہٰذا میں اپنی جنبشِ ابرو کا بہت دھیان رکھتا تھا۔

اس چند روزہ قیام کے دوران میں میرا دسترخوان انواع و اقسام کی لذتوں سے بھرا رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ مجتبیٰ کنور جاتے جاتے اپنے ایک درجن باورچیوں میں مقابلۂ حسنِ کارکردگی کا انعقاد کرکے مجھے اس مقابلے کا جج بناگیا ہے۔ اب وہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بہترین کھانے پکا رہے ہیں اور مجھ سے داد حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مٹن اور فش کے جتنے پکوان میں نے ان پانچ دنوں میں کھائے، پچھلے آٹھ سال میں نہیں کھائے تھے۔ چائنیز کھانے چکن، ویجی ٹیبل اور پینسلک وغیرہ بھی یہاں باقاعدگی سے پکتے تھے۔

یہ اپنے قیام کے پانچویں روز کی بات ہے، میں نے سوچا کہ غزالہ کی خیریت معلوم کرنی چاہیے۔ اس کا ٹیلی فون نمبر مجھے معلوم نہیں تھا، ہوتا بھی تو اسے فون کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ جب بھی میں نے کبھی کسی ایسے اقدام سوچا تھا، میرے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی تھی۔ درمیان ساہی صاحب کی شوخ و شنگ صاحبزادی فریال کی طرف چلا گیا۔ اسے غزالہ کے بارے میں پل پل کی خبر تھی۔ یقینی بات تھی کہ اب بھی وہ غزالہ کی آمد اور اس کی مصروفیات سے پوری طرح باخبر ہوگی۔ میں نے اسے فون کرنے کی ٹھانی۔ فون نمبر میرے پاس موجود تھا۔ ساہی صاحب کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے میرے ذہن میں فریال کا ہنستا مسکراتا شریر چہرہ گھوم رہا تھا۔ شام کے چھ بجے تھے۔ وہ شام کے وقت بڑی باقاعدگی سے ہاکی گراؤنڈ میں پریکٹس کرنے جاتی تھی۔ اس کی واپسی ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ ہوا کرتی تھی۔ میں نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا، وہ ٹینس شوز اور چست نیکر پہنے گھر میں دندناتی پھر رہی تھی۔ مرد نوکروں کی موجودگی میں اپنے پُرشباب جسم کے خطرناک اشاروں سے بے پروا قلانچیں بھرتی ہوئی کبھی کسی صوفے پر گرتی تھی، کبھی کسی قالین پر لڑھکتی تھی۔۔۔ پھر دور کہیں گھنٹی بجی۔ دو بار۔۔۔ تین بار۔۔۔ چوتھی گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو کون؟" کسی ملازم کی آواز آئی۔

"ساہی صاحب گھر پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"فریال ہیں؟"

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتا، سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ فریال ہیں؟"

چند لمحے بعد آواز آئی "وہ اسپتال میں ہیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بڑے صاحب اور بیگم صاحب بھی اسپتال گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے ملازم کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا ہے فریال کو۔ کیوں لے گئے ہیں اسپتال؟" میرے لہجے میں ان گنت اندیشے سمٹ آئے تھے۔

"بس جی ایک دم ہی بیمار ہوگئی تھیں۔ کوئی دورہ سا پڑا ہے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔"

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پریشانی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ فریال بڑی پیاری، بڑی ہمدرد اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرا دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے سوچا، مجھے اسپتال جانا چاہیے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ لیکن اسپتال کا تو میں نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ ایک بار پھر رنگ کرکے اسپتال کا نام اور وارڈ کا پتا ٹھکانا پوچھا۔ اس کے بعد لباس تبدیل کیا اور فریال سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے پاکستان واپس پہنچے ہوئے اب قریباً آٹھ روز ہوچلے تھے لیکن ساہی صاحب سمیت کسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میں واپس پاکستان پہنچ چکا ہوں اور نہ میں جانتا تھا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ پچھلے سات آٹھ روز میں، میں کئی بار شفقا کے بارے میں بھی سوچ چکا تھا۔ ساہی صاحب سے میری آخری بات چیت میں شفقا کا ذکر بھی تفصیل سے ہوا تھا۔ یہ ملاقات لاہور کے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ہوئی تھی۔ ساہی صاحب نے پہلے تو مجھ سے یہ کہا تھا کہ مجھے اس خوفناک چکر میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایک خوبصورت معصوم سی لڑکی میری بہن ہے اور میں دنیا میں اس کا واحد سہارا ہوں لیکن جب میں نے اپنا مصمم اور حتمی ارادہ ظاہر کردیا تھا تو انہوں نے شفقا کی حفاظت کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی اور بادل ناخواستہ مجھے بچنے پل کی حویلی میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

لباس کے طور پر میں نے پتلون قمیص استعمال کی۔ خدا بخش نے فوراً ایک ٹویوٹا کار میرے لیے فراہم کردی لیکن میں نے کار کے بجائے موٹر سائیکل کے استعمال کو ترجیح دی۔ موٹر سائیکل کے استعمال میں یہ حکمت تھی کہ ہیلمٹ استعمال ہوسکتا تھا اور فل ہیلمٹ اپنی شناخت چھپانے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر سفر کرتا میں مزنگ چونگی پہنچا اور وہاں سے براستہ جیل روڈ "یو سی ایچ" کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسپتال پہنچ کر مطلوبہ وارڈ ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ فریال خصوصی نگہداشت کے وارڈ میں تھی۔ وارڈ سے باہر کچھ دوسرے افراد کے علاوہ ساہی صاحب اور بیگم ساہی صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے چہرے پریشانیوں کی آماجگاہ تھے۔ ساہی صاحب پہلے تو مجھے پہچان نہیں سکے۔ میں عینک اُتار کر ان کے قریب پہنچا تو وہ بُری طرح چونک گئے۔ کچھ دیر حیران پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے رہے پھر گلے سے لگالیا۔ ان کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

پوچھنے لگے۔ "شاہ جہاں بیٹے! کہاں تھے تم؟ ہم بہت پریشان تھے تمہاری طرف سے۔ اب کہاں سے آرہے ہو؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" انہوں نے ایک ساتھ بہت سے سوال جڑ دیے۔

میں نے کہا۔ "جناب آپ کے سب سوالوں کے جواب دوں گا لیکن اس کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ اس وقت تو میں فریال کی طبیعت پوچھنے آیا ہوں۔"

فریال کے ذکر پر ان کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ گہری سانس لے کر بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں ان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگے۔ "اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔ کل صبح تو ہم ڈر ہی گئے تھے۔ ایک دم اس کے سر میں درد ہوا۔ اتنا شدید درد تھا کہ تڑپ تڑپ جاتی تھی۔ کسی انجکشن یا دوا سے آرام نہیں آرہا تھا۔ فوراً اسپتال لے آئے۔ قریباً دس گھنٹے بعد اب

حالت سنبھلی ہے۔ مگر بڑے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر بروقت علاج نہ کیا جاتا تو دماغ کی نس پھٹ سکتی تھی۔"

"کیا میں ایک نظر اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"میں ڈاکٹرز سے بات کرتا ہوں۔" ساہی صاحب نے کہا۔ "ویسے اب وہ کافی بہتر محسوس کر رہی ہے۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں اسے کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں کچھ دیر انتظار کر لیتا ہوں۔"

لیکن میرے منع کرنے کے باوجود ساہی صاحب ڈاکٹرز سے پوچھنے چلے گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد آ کر مجھے فریال کے پاس لے گئے۔ فریال سینے تک چادر کھینچے چت لیٹی تھی۔ اس کا ہر دم دمکتا چہرہ سرسوں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کوئی رونق نظر نہیں آئی۔ بس آنکھوں میں ایک رنگ سا لہرا کر اوجھل ہو گیا اور اپنے پیچھے آنسوؤں کی نمی چھوڑ گیا۔

"کیا حال ہے فریال؟" میں نے اس کا نرم ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں" وہ برف جیسی سرد اور ٹھوس آواز میں بولی۔

"کیا بات ہے۔ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"ناراض ہونے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے؟" وہ گہرے دکھ سے بولی۔ اور اس کے حساس نتھنے بے تاب ہو کر پھڑکنے لگے۔

ساہی صاحب مجھے فریال کے پاس چھوڑ کر باہر جا چکے تھے۔ میں پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ فریال کے لب و لہجے نے مجھے ایک دم پریشان کر دیا تھا۔ اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ فریال کی بیماری اور پریشانی کا میرے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ کوئی ایسا حوالہ موجود ہے جس کے سبب وہ میرے ساتھ یوں بے رُخی برت رہی ہے۔

میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "کیا بات ہے فریال! کچھ بتاؤ گی نہیں۔ کیا مجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

وہ ایک دم رونے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے اُمڈ کر شفاف رُخساروں پر بہنے لگے۔ کچھ دیر اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی پھر دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "شاہ جہاں صاحب! میں نے زندگی میں صرف ایک خواہش کی تھی۔ آپ نے میری وہ خواہش بھی پوری نہیں ہونے دی۔۔۔ میں آپ کو اور غزالہ جی کو ایک ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنی مدت سے کتنے ارمان تھے میرے دل میں۔ کیا کیا سپنے دیکھ رکھے تھے میں نے۔ آپ نے میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا۔"

"ہوا کیا ہے؟" میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ غزالہ جی کی شادی ہو رہی ہے۔ کل ان کی منگنی ہوئی ہے اور شاید اس ماہ نکاح بھی ہو جائے" اس نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک سنسنی خیز خواب دیکھ رہا ہوں اور ابھی جاگ جاؤں گا۔ ایک عرصے سے میں توقع کر رہا تھا کہ کسی روز مجھے اس طرح کی دھماکا خیز خبر ملے گی اور میں خود کو ذہنی طور پر ایسی خبر کے لیے تیار بھی کرتا رہا تھا لیکن آج اس خبر کو سن کر یوں لگا تھا جیسے اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر میرے سر پر وزنی ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ذہن میں بڑی شدت سے یہ سوال ابھرا کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دو ہفتے پہلے تک غزالہ فرید کوٹ میں تھی۔ دو ہفتے میں وہ وہاں سے آ بھی گئی اور اس کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔

میں نے اپنے لہجے کے ہیجان اور کرب کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے فریال سے پوچھا۔ "تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا ہے؟"

وہ روتے روتے بولی۔ "میں کئی دنوں سے اس طرح کی باتیں سن رہی تھی۔ دو تین مرتبہ غزالہ جی کے گھر فون کیا لیکن میری آواز سن کر فون بند کر دیا جاتا تھا۔ کل میں غزالہ جی سے ملنے ان کے گھر چلی گئی۔ وہیں پر مجھے اس منحوس خبر کا پتا چلا ہے۔ ان کے خاندان کا ہی کوئی لڑکا ہے۔ کینیڈا سے آیا ہے۔ شادی کے بعد فوراً واپس جانا چاہتا ہے۔"

میں حیران نظروں سے فریال کا زرد چہرہ تک رہا تھا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ اس خبر کو سننے کے بعد میرا اپنا چہرہ بھی فریال کا ہم رنگ ہو گیا۔ اب فریال کی اچانک علالت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کی متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کل ساری رات جاگتی اور روتی رہی ہے۔ اس رت جگے کے نتیجے میں ہی وہ اسپتال پہنچی تھی۔

ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے آ کر نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "پلیز۔۔۔ ان کی حالت ابھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آپ انہیں آرام کرنے دیں۔"

میں اٹھا اور جیسے خواب میں چلتا ہوا انتہائی نگہداشت کے وارڈ سے باہر آ گیا۔ ساہی صاحب مجھ سے کچھ پوچھتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فریال کو دیکھنے کے بعد میں

سے ان کے پاس بیٹھوں گا اور حالات سے آگاہ کروں گا لیکن جو کچھ میں سن کر آیا تھا اس نے میرے اندر تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ میں ساہی صاحب سے معذرت کر کے اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے اسپتال سے باہر آ گیا۔ جلد ہی میری موٹر سائیکل نہر پر پہنچی اور اس کے کنارے کنارے شاہراہ قائداعظم کی طرف بڑھنے لگی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ روشنیوں اور رنگوں کا شہر لاہور جگمگا رہا تھا۔ سڑکیں بارونق تھیں۔ لوگ اپنے حال میں مگن اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں تھے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ میرے دل میں کیا جہنم دہاڑ مچی ہوئی ہے۔ ایک سویا ہوا آتش فشاں تھا جو پھٹ گیا تھا اور اس کی زہریلی آگ میرے رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔ غزالہ کی شادی کی خبر سن کر تحیر کا جو شدید حملہ ہوا تھا اس کا اثر زائل ہو چکا تھا اور اس تحیر کی جگہ اب ایک شدید قسم کی نفرت اور غصے نے لے لی تھی۔ میں غزالہ کا حسین سراپا بار بار تصور میں لاتا تھا۔ اس پر نفرت کی بجلی گراتا تھا اور جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔ ایک خود کلامی کی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ میں اس کو کوس رہا تھا، لعنت ملامت کر رہا تھا۔ "تو کیا سمجھتی ہے خود کو۔۔۔ تو ہے کیا چیز؟ تیرا خیال ہے کہ میں تیری جدائی پر آنسو بہاؤں گا؟ کسی نوخیز عاشق کی طرح کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں نکل جاؤں گا؟ اپنے رویے پر پچھتاؤں گا اور گزرے دنوں کا ماتم کروں گا؟ نہیں کچھ نہیں ہو گا ایسا۔ میں۔۔۔ تھوکتا ہوں تجھ پر اور لعنت بھیجتا ہوں تیرے غم پر۔ مجھے نہ کبھی تیری پروا تھی اور نہ ہو گی۔"

میرا دماغ ہانڈی کی طرح کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ غزالہ اور اس کی منحوس ماں میرے سامنے ہوں اور دونوں کے چیتھڑے اڑا دوں۔ نجانے کیوں غیظ و غضب کے ان لمحات میں غزالہ کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کا تصور بھی میرے ذہن میں در آیا تھا۔ درحقیقت غزالہ سے میری نفرت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ چچی فاخرہ کی بیٹی تھی۔ پچھلے آٹھ دس برسوں میں غزالہ نے خود کو بہت بدلا تھا اور اس کی سیرت ماں کی خصلت سے بالکل جدا ہو گئی تھی لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں مجھے اس میں چچی فاخرہ کی کوئی جھلک نظر آتی تھی۔ اس انتہائی خرانٹ اور بدباطن عورت کا تصور میرے تن بدن میں آگ لگا دیتا تھا اور میں غزالہ کے لیے بے حد اجنبی اور بہت بے حس ہو جاتا تھا۔

میں یونہی بے مقصد لاہور کی سڑکوں پر موٹر سائیکل بھگاتا رہا اور اپنے اندر مچی کھلبلی سے نمٹنے کی کوشش کرتا رہا۔ قریباً ایک گھنٹے کی سڑک پیمائی کے بعد میری موٹر سائیکل گرجتی ہوئی اس عظیم الشان کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوئی جہاں میں قیام پذیر تھا۔ موٹر سائیکل سے اترتے ہی میں اپنے کمرے میں پہنچا اور شاور لینے کے لیے باتھ میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کا غسل عموماً میرے اندرونی ہیجان کے لیے سود مند ثابت ہوتا ہے لیکن اس روز پانی کی پھوار بھی آگ کی پھوار تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شعلوں سے نہا رہا ہوں۔

اس روز خواب آور گولیاں کھائے بغیر مجھے نیند نہیں آئی۔ صبح دس گیارہ بجے تک سویا رہا۔ رات کے واقعات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ کاش وہ سب ایک خواب ہی ہوتا۔ رات فریال سے میری ملاقات خواب میں ہی ہوئی ہوتی اور خواب میں ہی اس نے مجھے بتایا ہوتا کہ غزالہ کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ یہ خواب نہیں تھا۔ وہ واقعہ ظہور پذیر ہو گیا تھا جس کی توقع میں پچھلے کئی ماہ سے کر رہا تھا۔ یقیناً اس واقعے کی داغ بیل اسی دن پڑ گئی تھی جب ایک دھواں دھواں شام کو میں صنوبر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور غزالہ مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد مری کے چوراہے میں خاموش کھڑی رہ گئی تھی۔

بے قراری تو اب بھی تھی لیکن رات جیسی وحشت نہیں تھی۔ میں بستر پر چت لیٹ گیا اور ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا۔ ایک نہ ایک دن تو یہ سب کچھ ہونا تھا۔۔۔ اور میں خود چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے، اب ہو گیا تھا تو افسوس کس بات کا تھا۔ اس کی جان، میری گناہ گار بدنام زندگی سے چھوٹ گئی تھی اور میری جان اس ماضی سے چھوٹ گئی تھی جو غزالہ کے سامنے آتے ہی میرے دل پر کچوکے لگانے لگتا تھا۔ اب وہ اپنے ہونے والے شریکِ حیات کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کرے گی اور میں اس ندامت سے چھٹکارا پا جاؤں گا کہ کسی کی مسلسل چاہتوں کا جواب میں مسلسل سرد مہری سے دے کر خود کو بے رحم ثابت کر رہا ہوں۔

میں بہت دیر تک اس موضوع پر سوچتا رہا۔ دھیرے دھیرے دل کو قرار سا آنے لگا، پھر ذہن کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ ابھی صرف منگنی ہی ہوئی ہے، شادی تو نہیں ہوئی۔ شادی تک حالات نہ جانے کیا رُخ اختیار کریں گے۔ شادی ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ ایسا سوچتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں دو حصوں میں بٹ گیا ہوں۔ ایک حصہ چاہتا کہ غزالہ کی شادی کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ دوسرا حصہ چاہتا تھا کہ نہیں، کوئی اڑچن پڑ جائے۔

ایسا کچھ نہ ہو جائے کہ یہ شادی اتنی جلدی نہ ہو۔

تیسرے روز مجتبیٰ کنور لندن کے ٹور سے واپس آ گیا۔ شام کو اس نے مجھ سے ملاقات کی اور حال احوال پوچھا۔ وہ مجھے میری توقع سے بڑھ کر اہمیت دے رہا تھا۔ بڑی نرمی سے پوچھنے لگا۔ "کیا بات ہے شاہ جہاں! کچھ کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔"

"نہیں جناب۔ میں یہاں بہت آرام سے رہ رہا ہوں بلکہ اتنا آرام ہے کہ بے آرامی ہو رہی ہے۔ فارغ بیٹھے بیٹھے بوریت محسوس کرنے لگا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ "بہت خشک مزاج ہو ورنہ بوریت کی شکایت نہ کرتے۔ بہرحال ایک دو دن میں تمہاری یہ بوریت دور ہو جائے گی اور ایسے ڈھنگ سے ہوگی کہ اش اش کرو گے"

پھر وہ مجھ سے غزالہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ خدا بخش نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے اور غزالہ کا پتا چل گیا ہے۔ وہ بحفاظت اپنے گھر پہنچ گئی ہے۔

کنور نے پوچھا۔ "لیکن پہنچی کیسے ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ابھی پتا نہیں چلا۔"

وہ بولا۔ "پھر خدا بخش نے خوش اسلوبی سے کیا کیا ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ مکمل معلومات فراہم کرتا۔ میں ابھی اس کے کان کھینچتا ہوں۔"

مجتبیٰ کنور سے باتوں کے دوران ہی مجھے یہ خیال آیا کہ غزالہ کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنا چاہیے۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ انڈیا سے کن حالات میں واپس آئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ کچھ لوگ اب بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ شیخ ناجیم کو تو اس کی تلاش تھی ہی، ہو سکتا تھا کہ فرید کوٹ میں ترک کے سلسلے میں قسمت آزمائی کرنے والا کوئی گروہ بھی اس کے پیچھے لگ گیا ہو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ساہی صاحب کو غزالہ کے بارے میں فون کر دوں۔

کنور کے جاتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور فون کی طرف بڑھا۔ غزالہ کے علاوہ میں ساہی صاحب سے شفقت اور انجم کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ساہی صاحب کی حفاظت میں تھیں اور ساہی صاحب نے اپنے پروگرام کے مطابق انہیں کسی خفیہ مقام پر رکھا ہوا تھا۔ اس مقام کی اطلاع ساہی صاحب کے سوا اور کسی کو نہیں تھی اور انہوں نے عندیہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مجھے بھی اس بارے میں بے خبر رکھیں گے۔ میں نے ساہی صاحب کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف ان کی بیمار اہلیہ نے فون اٹھایا۔ وہ میری آواز نہیں پہچان سکیں۔ میں نے تعارف کرایا اور سلام دعا کے بعد ساہی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں ساہی صاحب کی اہلیہ نے جو کچھ کہا وہ زہریلے تیروں کے مانند سنسناتا ہوا میرے کانوں میں گھس گیا۔ انہوں نے بڑے عام سے لہجے میں کہا۔ "بیٹے! وہ کل جلیس احمد کی بیٹی کی شادی تھی نا' وہیں پر گئے ہوئے تھے۔ رخصتی رات دیر سے ہوئی اس لیے وہیں رہ گئے۔ میرا خیال ہے ابھی ایک آدھ گھنٹے تک آ جائیں گے۔"

چچا جلیس کی بیٹی کی شادی۔ یہ الفاظ تھے یا بم تھے جنہوں نے میری سماعت کے پرخچے اڑا دیے۔ میں اپنی جگہ سکتے کی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ ایک پل میں صدیوں کا کرب مجھ پر وارد ہوا اور مجھے روندتا ہوا گزر گیا۔ ساہی صاحب کی اہلیہ کی آواز مجھے کہیں دور بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی... پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ شاید غزالہ کے دکھ کی بات کر رہی تھیں۔ "اس کی والدہ بہت بیمار تھیں۔ کسی بھی وقت آنکھیں بند کر سکتی تھیں۔ وہ بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں اس لیے فوراً بیاہ ہوا۔۔۔" وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میری غیر حاضری کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ ساہی صاحب کے بارے میں بتا رہی تھیں لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خبر نہیں میں نے ان سے الوداعی کلمات بھی کہے یا نہیں اور فون بند کر دیا۔ مٹی کے ایک ڈھیر کی طرح میں بستر پر آ گرا۔ اس ڈھیر میں صرف میرا دماغ زندہ تھا اور تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی سوچیں تھیں اور ان کا سفر دائرے کا سفر تھا۔ بیتے ہوئے پل اور شب و روز ایک ترتیب کے ساتھ بار بار نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کتنا طویل سفر تھا یادوں کا' یہ کوئی دو تین ماہ یا برس کی بات نہیں تھی۔ قریباً سولہ سال ہو چکے تھے اس ناتے کو۔ یہ بچپن کی محبت تھی' بہار کے ایک خوشگوار سویرے میں یہ محبت کسی کرنپل کی طرح میرے دل میں پھوٹی تھی۔ ساون کی بے شمار بارشیں بیتی تھیں اس محبت پر' ان گنت چاندنی راتوں نے اسے چھوا تھا۔ صبحوں کے اجالے اور شاموں کے دھندلکے اپنے آنسوؤں سے سینچتے رہتے تھے اور موسم بہاروں کو ہونٹوں سے چومتے رہتے تھے۔ اب اس محبت کی جڑیں میری ہستی میں بہت دور تک پھیل چکی تھیں اور وہ ایک تناور درخت کا روپ دھار چکی تھی لیکن اس درخت کی قسمت میں باقی رہنا نہیں تھا۔ اسے کٹنا تھا' آج نہیں تو کل' آج یہ کٹ گیا تھا۔

پتا نہیں میں کب تک یونہی سکتے کی حالت میں بستر پر بیٹھا رہا۔ اس ضربے کے بے پناہ اندوہ کو اپنے اندر جذب کرنے

کی کوشش کرتا رہا۔ مجتبیٰ کنور کا ملازم خاص خدا بخش دو تین بار آیا اور مجھے گم صم بیٹھے دیکھ کر چلا گیا۔ دوپہر کے کھانے سے تھوڑی دیر قبل مجتبیٰ کنور میرے پاس چلا آیا۔ کہنے لگا۔ "کیا بات ہے شاہ جہاں' بہت اداس نظر آ رہے ہو؟"

"کوئی بات نہیں جناب' یونہی طبیعت مضمحل سی ہے۔"

وہ بولا "کہیں اس لڑکی کا تو کوئی معاملہ نہیں جس کا نام تم نے غزالہ بتایا تھا"

"نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں" میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور رعب دار لہجے میں بولا "تم چھپا رہے ہو شاہ جہاں! میں نے سب کچھ معلوم کرا لیا ہے۔ کل اس لڑکی کی شادی ہو گئی ہے اور مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایس پی رجال ساہی کے گھر سے اس بارے میں اطلاع ملی ہے۔"

میں مجتبیٰ کنور کی باخبری اور ان ذرائع کی تیز رفتاری پر حیران رہ گیا جن سے اس نے یہ خبر حاصل کی تھی۔ اس نے خدا بخش کو الٰہ دین کے چراغ کا جن کہا تھا اور یہ بات کچھ ایسی غلط نہیں تھی۔

میں نے بے روح لہجے میں کہا۔ "نہیں جناب! میری پریشانی کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔"

وہ لب بھینچے مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم مجھے نہیں اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہے ہو۔ سگار کو ایش ٹرے میں مسل کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں ایک کھڑکی کے شیشے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک خوبصورت صوفے پر شاہانہ انداز میں بیٹھ کر اس نے ایک نیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نمبر ڈائل کر کے کسی سے باتیں کرنے لگا۔ آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ صرف ہونٹوں کی حرکت دکھائی دے رہی تھی۔

گفتگو ختم کر کے اس نے نئے سگار کو تراشا۔ قریب کھڑے خدا بخش نے جلدی سے جھک کر اسے لائٹر روشن کیا اور سگار کو آگ دکھائی۔ اتنے میں چار عدد بے ڈھنگے افراد جو صورتوں سے ہی خطرناک جرائم پیشہ لگتے تھے' اندر آئے اور ہاتھ باندھ کر مجتبیٰ کنور کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کی قمیضیں' پتلونیں' برجیس اور ہاتھ نہایت مؤدب انداز میں ناف پر دھرے تھے۔ مجتبیٰ کنور نے ان سے کچھ باتیں کیں۔ وہ الٹے قدموں چلتے باہر نکل گئے۔ مجتبیٰ کنور سگار پھونکتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

کہنے لگا۔ "شاہ جہاں! تم مجتبیٰ کنور کے مہمان ہو۔ شاید انہیں نہیں ہو کہ اس وقت تمہارا کیا مرتبہ ہے' کہاں تک رسائی ہے تمہاری' وہ کون سی چیز ہے جو اس وقت تمہاری دسترس میں نہیں۔ تم صرف اشارہ کرو' سب کچھ تمہارے قدموں میں آ جائے گا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں جناب" میں نے کہا۔

وہ بولا "یہ بالکل صاف سیدھی بات ہے۔ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔ بس' اس کے سوا جو کچھ ہے وہ جھوٹ ہے' فریب ہے یا بزدلی" اس نے بڑے اسٹائل سے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور بولا۔ "آخری اطلاعات کے مطابق وہ لڑکی اپنے سسرالی رشتے داروں کے ہاں راولپنڈی میں ہے۔ اگر وہ راولپنڈی میں ہی ہے تو چھ سات گھنٹے کے اندر اندر یہاں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ تمہیں میرے اس اقدام پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

میں حیرانی سے مجتبیٰ کنور کا چہرہ تک رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہیں۔ وہ ایک قد آور سیاسی لیڈر تھا۔ ایک عوامی شخصیت تھا' ایک بااختیار حکمران تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے ہونٹوں سے ایسی چھوٹی بات نکلے گی۔ میں نے کہا "نہیں جناب! بہت معذرت کے ساتھ میں آپ سے اختلاف کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ میری ہرگز خواہش نہیں ہے کہ اس کو بدلنے کی کوشش کی جائے بلکہ مجھے ایک طرح سے خوشی ہوئی ہے۔ میری یہی آرزو تھی کہ وہ لڑکی میرا پنڈ چھوڑ کر شرافت کی زندگی گزارے۔"

"واہ! پھر وہی رومانس ازم" مجتبیٰ کنور نے میرا مضحکہ اڑایا۔ "پتا نہیں کیوں کچھ لوگ پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنا پسند کرتے ہیں۔ بھائی میرے' زندگی ٹھوس شے ہے۔ کسی شاعر کی نظم یا مصور کی تصویر نہیں ہے۔ اسے معمہ نہ بناؤ۔ جو کچھ مل رہا ہے' اسے حاصل کرو۔ اسے چھوڑو' اس سے لطف اندوز ہو۔ جو نہیں مل رہا اسے بھول جاؤ۔۔۔"

میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "جناب! میں بے حد شرمندہ ہوں آپ سے لیکن اس لڑکی کے بارے میں اس طرح کی کوئی کارروائی کرانا نہیں چاہتا' پلیز۔۔۔ اگر آپ نے اس مقصد سے کسی کو بھیج دیا ہے تو اسے واپس بلا لیجئے۔"

کنور نے بہت گہری نظروں سے میرا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں کا سرد فولاد کسی برمے کی طرح متحرک ہوا اور میرے ذہن تک رسائی حاصل کر گیا۔ ایک پل سے بھی مختصر وقت میں وہ جان گیا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔

"او کے۔۔۔ جو تم چاہتے ہو وہی ہوگا۔" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

○☆○

وقت مرہم ہوتا ہے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وقت کا یہ مرہم مجھ پر بے اثر ہو گیا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرا غم گہرا اور وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ غزالہ کی موہنی صورت ہر وقت نگاہوں میں رہتی تھی۔ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ـــ مجھے قوی یقین تھا کہ یہ کیفیت تا دیر برقرار نہیں رہے گی۔ جہاں اتنے بڑے بڑے غم اپنی شدت کھو بیٹھے، اتنے المناک حادثے گزرے اور فراموش ہو گئے وہاں اس دکھ کی دھار بھی کُند ہونے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ہونے لگا۔ میں کوئی جوشیلا نوجوان نہیں تھا نہ ہی کوئی دل پھینک عاشق تھا۔ ہر اونچ نیچ سمجھتا تھا اور جذباتی گھاتوں سے پوری طرح آگاہ تھا، پھر بھی اپنے دل و دماغ پر میری گرفت کمزور پڑنے لگی۔ ایک دن غزالہ کی رکی ہوئی گھڑی میں نے اتنے زور سے فرش پر پٹخی کہ وہ درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ـــ پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک طویل ـــ بہت طویل عرصے کے بعد میں نے شراب کو ہاتھ لگایا۔ اور پھر اتنی پی کہ مدہوش ہو گیا۔ تجبنی کنور کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے مجھے سرخ چہرے اور انگارا آنکھوں کے ساتھ ساغر و مینا سے کھیلتے دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ میرے ایک خدمتگار سے بولا۔ "خان محمد! آج تمہارے صاحب موڈ میں ہیں۔ ان کے پاس رہو اور جو یہ مانگتے ہیں دو۔"

خان محمد نے بڑھ چڑھ کر ان ہدایات پر عمل کیا اور میرے بن مانگے ہی بہترین فرانسیسی وسکی کی ایک بوتل میرے سامنے سجا دی۔ میں غزالہ کے غم کو آتشیں سیال میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جتنا ڈبو رہا تھا وہ اتنا ہی ابھرتا جا رہا تھا۔ میری خدمت پر مامور لڑکی کسی کام سے اندر آئی تو وہ مجھے معمول سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر لگی۔ میں جانتا تھا، میرے ذہن پر شراب کا اثر ہے۔ ویسے میں کوئی چھوٹی گزری "بھی ہوتی تو مونا لیزا لگتی۔ یہ تو پھر چلتا پھرتا شعلہ تھی اور اس چار دیواری میں یہ صرف ایک شعلہ رقصاں نہیں تھا۔ بہت سے شعلے میرے ارد گرد ناچ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی شعلہ میرے اُجلے دامن میں آگ جگا سکتا تھا۔ مجھے اس ماحول سے خوف آنے لگا۔ میں نے سر پر ہیلمٹ جمایا۔ آٹھ ہارس پاور کی بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل پکڑی اور نکل کھڑا ہوا۔ میں خمار کے عالم میں ہواؤں میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ نجانے میری موٹر سائیکل کب تک یونہی سڑکوں پر دندناتی رہی۔ شاید ایک دو جگہ میں نے معمولی قسم کے حادثات بھی کیے۔ ربار چوک میں سرخ اشارے پر میں گولی کی رفتار سے [illegible]

شاہی محلے کے ایک معروف چوک میں پایا۔ موٹر سائیکل کی تھن گرج سن کر بازارِ حسن کے رنگین دریچے کھلنے لگے۔ میں نے ہیلمٹ اتار کر نشست پر رکھا اور بھاری قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میں اٹک جیل کا قیدی تھا اور پیرول پر رہا ہوا تھا۔ میرے پیرول کے کاغذات پر ساہیوال صاحب کی سفارش تھی اور چند اعلیٰ افسران کی تائید تھی لیکن یہ کاغذات نہ بھی ہوتے تو تجبنی کنور کے ہوتے ہوئے مجھے کسی سے کوئی خوف خطرہ نہیں تھا۔ ایسے موقعوں کے لیے پنجابی میں کہا جاتا ہے "ساری خدائی اک پاسے، میرا ڈھولن ماہی اک پاسے"

میں جانتا تھا کہ اس وقت بھی میں تنہا نہیں ہوں۔ میری حفاظت کی غرض سے تجبنی کنور کے کارندے مسلسل میرے ارد گرد موجود تھے۔ وہ کوٹھی سے ہی میرے ساتھ آ رہے تھے۔ بظاہر وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر کسی بھی مشکل میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ چار پانچ برس پہلے بازارِ حسن میرے لیے ایک جانی پہچانی جگہ تھی۔ کئی لوگوں نے مجھے شناخت کر لیا۔ کئی آنکھوں میں مجھے حیرت، مسرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات نظر آئے۔ بازار کے اِس سرے سے اُس سرے تک سنسنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ کئی لوگوں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ انجان لوگوں کو سرگوشیوں میں بتایا کہ میں کون ہوں۔

چالیس پچاس قدم آگے دودھ فروشوں کا ایک ریڑھا سڑک کے عین درمیان کھڑا تھا۔ ایک تنومند شخص ریڑھے پر پھیل کر بیٹھا تھا اور ایک کھڑکی سے جھانکنے والی مرلی سی لڑکی کو فحش اشارے کر رہا تھا۔ اس کے دو ساتھی دودھ کے برتن اتار کر شیر فروش کی دکان پر رکھ رہے تھے۔ نجانے طبیعت میں کیسی تلخی بھری ہوئی تھی کہ میں خواہ مخواہ ریڑھا بان سے الجھ گیا۔ میں نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا کہ اس نے خوشی میں یہ چھکڑا سڑک کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے۔ گالی کھا کر ریڑھا بان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ وہ جست لگا کر ریڑھے سے اترا جیسے پاؤں میں اسپرنگ ہوں۔ اس کے ہاتھ میں موٹی ڈنڈی کا چابک تھا۔ چابک نے پوری طاقت سے میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں بالکل تیار تھا۔ وار خالی دے کر میں نے ٹانگ کی ضرب اس کے سینے پر لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر گھوڑے کے قدموں میں گرا۔ گھوڑا بدک کر اچھلا اور زیادہ وزن کے سبب ٹانگوں پر الف ہو گیا۔ ریڑھے پر لدے دودھ کے برتن آوازوں سے سڑک پر لڑھکے اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر جیسے "دودھ" کا دریا بہہ نکلا۔ دودھ فروش نے اپنی ڈب

کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس سے پہلے ہی اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ اس کے پیٹ میں لگنے والی ایک چوٹ بے حد شدید تھی۔ وہ اوندھے منہ سڑک پر گرا اور تڑپنے لگا۔ دودھ فروش کا ایک ساتھی پنجابی فلموں کے جانے پہچانے انداز میں بڑھک مار کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے جھکائی دے کر بڑی آسانی سے اسے کندھے پر اٹھا لیا پھر چند قدم بھاگ کر ایک دکان کے پختہ تھڑے پر دے مارا۔ تھڑے کا کنارا اس شخص کی پشت پر لگا اور اس کے حلق سے بلند چیخ نکل گئی۔ دودھ فروش کا تیسرا ساتھی یہ مناظر دیکھ کر سمجھ گیا کہ مزاحمت کرنا خطرناک ہے۔ باعزت پسپائی کا معروف طریقہ یہی تھا کہ وہ مجھے دھمکیاں دیتا ہوا بھاگ جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور ایک بار دودھ میں تر سڑک پر پھسلنے کے بعد بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ گشتی پولیس کی ایک پارٹی دندناتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ پیٹ پر چوٹ کھانے والا تنومند شخص بے ہوش ہو چکا تھا جب کہ اس کا ساتھی دکان کے تھڑے پر پڑا تھا اور ہاتھ کمر پر رکھے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ایک اے ایس آئی باز پرس کے لیے میری طرف بڑھا لیکن راستے ہی میں ایک شخص نے اسے روک لیا اور کان میں کچھ کہہ کر ایک طرف لے گیا۔ میں جانتا تھا، اے ایس آئی کو صوبے کی سب سے بااثر شخصیت کا حوالہ دیا جائے گا اور اس حوالے کو سن کر کئی گھنٹے تک بے چارے کی گھگی بندھی رہے گی۔

میرے قریب ہی ایک مکروہ صورت دلّال کھڑا تھا۔ میں نے دودھ فروش کا چابک اٹھا کر اسے تھمایا اور کہا کہ وہ ریڑھے کو یہاں سے ہٹا لے جائے۔ دلال نے کسی معمول کی طرح میری ہدایت پر عمل کیا اور چند افراد کے ساتھ مل کر ریڑھے کو "بیلنس" کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا، اب دو تین ہفتے تک کوئی اس سڑک پر اس انداز میں ریڑھا کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ پتلون کی جیب سے میں نے رات 69 کی کوارٹر بوتل نکالی اور چند گھونٹ لے کر ایک چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میری آمد سے چوبارے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ جہاندیدہ نائیکہ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ رقاصائیں چشم براہ نظر آنے لگیں۔ اس چوبارے کے مکین بازارِ حسن کے شرفا میں شمار ہوتے تھے اس لیے نہیں کہ وہ گورنمنٹ کے جاری کردہ لائسنس کے مطابق صرف ناچ گانے تک محدود تھے بلکہ اس لیے کہ وہ قانون کی خلاف ورزی بڑی احتیاط سے اور صرف خاص خاص لوگوں سے بھاری "خرچیاں" لے کر کرتے تھے۔ میں اندر جا کر ایک آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔ لال گلابی چھوں اور کاسمیٹکس کی خوشبوؤں نے مجھے گھیر لیا۔ اس نائیکہ سے میری جان پہچان اپنے دورِ پُرآشوب میں ہوئی تھی۔ اسے جان بائی کہا جاتا تھا۔ جان بائی کے اشارے پر چند سازندے اندر آئے اور اپنے سازوں سمیت صاف اُجلی چاندنی پر چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ نائیکہ صاف ستھری اردو بولتی تھی۔ اس نے لجاجت سے کہا "جہانی صاحب! بڑے لمبے عرصے بعد تشریف لائے ہیں آپ ـــ بندی کی تو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ زہے نصیب اس کوٹھے کو آپ کے قدم نصیب ہوئے۔ فرمائیے کیا خدمت کی جائے آپ کی؟"

"کچھ نہیں" میں نے ہاتھ لہرا کر کہا "میں کچھ سننے نہیں آیا اور نہ ہی خدمت کرانے آیا ہوں۔ بس تمہارے ہاتھ کا ایک پان کھانا ہے۔ وہی الائچی، سپاری، سونف اور قوام والا۔ اس پان کا ذائقہ آج تک میرے منہ میں گھلا ہوا ہے۔"

تعریف نے جان بائی کو باغ باغ کر دیا۔ اس کے حکم پر لڑکیوں نے چاندی کا ایک بڑا پاندان لا کر قالین پر رکھ دیا۔ پان لگانے اور بنانے میں نائیکہ جان بائی کو واقعی کمال حاصل تھا اور وہ اس سلسلے میں زبردست اہتمام بھی کرتی تھی۔ کتھا، چونا، سپاری، خوشبو، غرض ہر شے تازہ اور بہترین کوالٹی کی۔ وہ ایک خانہ ساز قوام استعمال کرتی تھی جو اپنی مثال آپ تھا۔ جان بائی کو پان کاٹتے اور لگاتے دیکھنا ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ آخر میں وہ پان کو چاندی کے ورق پر رکھ کر ایک نقرئی طشتری میں سجاتی تھی اور بڑے رکھ رکھاؤ سے پیش کرتی تھی۔

دو خر دماغ دودھ فروشوں کی پھینٹی لگانے کے بعد میرا ٹمپریچر تھوڑا نیچے آ گیا تھا، میں صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور جان بائی کے رس گلے جیسے پان کو منہ میں رولنے لگا۔ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر چوبارے کی رقاصائیں اور گانے والیاں بھی قریب ہو بیٹھیں۔ وہ کچھ دیر تو جھجکتی رہیں پھر ادھر اُدھر کی ہانکنے لگیں۔ ایک بولی "جہانی! بڑی زوردار خبریں مل رہی ہیں آپ کے بارے میں۔ سنا ہے جھنگ کی کسی حویلی سے بہت سارے صندوق ملے ہیں آپ کو۔"

میں نے کہا "ملے نہیں شہزادی! ملے تھے۔ جیسے ملے تھے ویسے ہی کھو گئے۔ سمجھو بھاپ بن کر اڑ گئے۔"

عقب سے ایک بولی "ہائے ہائے جہانی صاحب! ہم نے آپ سے کچھ مانگ تو نہیں لینا۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے" پھر ذرا توقف سے بولی۔ "سنا ہے ان صندوقوں میں پرانے زیور اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ کروڑوں کی دولت ہے۔"

"ہو گی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے" میں

نے گول مول جواب دیا۔

لڑکیاں اس سلسلے میں بڑے تجسس کا اظہار کر رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا پھر ایک دم میرا دل اس ماحول سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ مجتبیٰ کنور کے دیے ہوئے نوٹوں کا کچھ حصہ میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے پانچ سو کے آٹھ دس نوٹ نکال کر تانیکا کی جھولی میں پھینکے اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ چار پانچ ہزار روپے میں ایک پان کھانے والے کے لیے پھرتی سے دروازہ کھولا گیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر سڑک پر پہنچا اور ایک بار پھر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر سڑکوں پر دندنانے لگا۔ غم شدید کی مکھیوں کی طرح میرے تعاقب میں تھا۔ کسی جگہ اس سے امان نہیں تھی' کسی ڈھنگ اس سے چھٹکارا نہیں تھا۔ رات دو بجے کے قریب میں واپس مجتبیٰ کنور کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ مجتبیٰ کنور کی شاندار لیموزین پورچ میں نہیں تھی۔ میں سیدھا اپنے بیڈ روم میں پہنچا۔ بدن میں انگارے سلگ رہے تھے۔ باتھ روم میں داخل ہو کر میں کپڑوں سمیت شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ درد و کرب کی بے پناہ شدت سے سولہ برس بعد پہلی بار میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ پہلے میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں لیتا رہا پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔۔۔۔ دل سے آواز آئی "جی بھر کر رو لو شاہ جہاں' یہاں کون ہے جو تمہیں عورتوں کی طرح روتے ہوئے دیکھے گا۔ نہ تمہاری آواز کسی کے کانوں تک پہنچے گی اور نہ کوئی تمہارا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھے گا۔ آج کھل کر اپنی بربادیوں کا ماتم کر لو۔ اتنے آنسو بہاؤ' اتنا گریہ کرو کہ دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔" ماتم کے ان لمحوں میں مجھے اپنی غمگسار بہن شگفتہ یاد آئی۔ ہم ایک دوسرے کے راز داں تھے۔ ایک دوسرے کا ہر دکھ سمجھتے تھے۔ مجھے اپنے آنسوؤں کے لیے اس کے شانے کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس ہوئی کہ دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگیں۔

میں مسلسل رو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی یہ آنسو تمہیں گے بھی یا نہیں۔ میں غزالہ سے محبت کرتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی جدائی مجھے تکلیف دے گی لیکن یہ تکلیف اتنی ہولناک اور مسلسل ہو گی میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے آج تک اپنے اور غزالہ کے بارے میں جتنے اندازے لگائے تھے وہ سب غلط تھے۔ میں اس جذبے کی گہرائی اور وسعت سے قطعی بے خبر تھا جو برسوں سے میرے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ "پچھتاوا" اس کیفیت کے لیے ایک معمولی اور حقیر لفظ تھا جو میرے دل و دماغ پر طاری تھی۔ ماضی کی فلم ٹکڑوں کی صورت میرے پردۂ تصور پر چل رہی تھی۔ غزالہ کی جرأتیں اور رفاقتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ کوششیں یاد آ رہی تھیں جو اس نے ایک عورت ہونے کے باوجود مجھے متوجہ کرنے کے لیے کی تھیں۔ کتنے مواقع تھے جب وہ دیوانہ وار میرے پیچھے لپکی تھی' جب اس نے میری منتیں سماجتیں کی تھیں اور ٹھکرائے جانے کے باوجود بار بار میرے بازوؤں کی پناہ طلب کی تھی۔ یہ داستان کئی برسوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ آج اس داستان کا ہر ہر منظر میری نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔

"غزالہ! میری کج رویوں کی یہ کیسی سزا دے دی تم نے" بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلا اور میں بے دم سا ہو کر گھٹنوں کے بل باتھ روم کے چکنے فرش پر گر گیا۔

نجانے کتنی دیر میں یونہی بیٹھا رہا۔ پھر کمرے سے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ بہت دیر بجنے کے بعد گھنٹی بند ہوئی لیکن ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد دوبارہ بجنے لگی۔ میں پانی میں شرابور باتھ روم سے نکلا اور لڑکھڑاتا ہوا فون کی طرف بڑھا۔ زندگی میں پہلی بار دل میں یہ انوکھی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش دوسری طرف غزالہ ہو۔ شاید انہونیوں کی خواہش کرنا اور "نارسا" تک رسائی کی تمنا پالنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔۔۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔۔۔ دوسری طرف مجتبیٰ کنور تھا۔ وہ کسی کلب یا ایسی ہی بارونق جگہ سے بول رہا تھا۔ اس کی آواز کے ساتھ ساتھ میوزک کا شور اور مردانہ و نسوانی قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ اس نے بارعب آواز میں کہا۔ "شاہ جہاں! کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں جی۔ آرام کر رہا ہوں۔" میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ "تم سستی اور بے کاری کی شکایت کر رہے تھے نا۔۔۔ میں نے تمہاری یہ شکایت دور کر دی اور یوں دور کی ہے کہ تم ایک مدت تک یاد رکھو گے۔ تمہارے کمرے کی وارڈ روب میں دائیں طرف جو سب سے پہلا لباس جھول رہا ہے وہ پہن لو۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد خدا بخش تمہارے پاس پہنچے گا۔ اس کے ساتھ چلے آؤ۔۔۔ اوکے؟"

"اوکے" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

فون بند ہو گیا تو میں وارڈ روب کی طرف بڑھا۔ عالیشان وارڈ روب کھول کر میں نے بہترین امپورٹڈ لباسوں پر ایک نگاہ دوڑائی۔ دائیں جانب کا پہلا لباس دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

یہ ایک بے حد قیمتی تھری پیس سوٹ تھا۔ نفیس ترین کپڑا' بہترین تراش۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ سوٹ مجھے

بالکل فٹ آئے گا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سوٹ کے ساتھ ہی ایک بلٹ پروف جیکٹ بھی وارڈ روب میں جھول رہی تھی۔ یہ بے حد مضبوط فیبر کی بنی ہوئی جدید ترین جیکٹ تھی۔ اس جیکٹ میں سینے کے زیادہ نازک حصوں کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام تھا۔ عام بلٹ پروف جیکٹوں کی نسبت بہت ہلکی پھلکی بھی تھی۔ یہ دونوں اشیا یعنی جیکٹ اور سوٹ میری غیر موجودگی میں یہاں رکھی گئی تھیں۔ کنور صاحب کے حکم کے مطابق میں نے یہ دونوں اشیا زیب تن کر لیں۔ ایک شاندار امریکن ریوالور "بیلم ماڈل" میرے پاس پہلے سے موجود تھا' یہ ریوالور میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

عین اسی وقت مجتبیٰ کنور کا فون دوبارہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ اسے ایک ضروری کام کے سلسلے میں گورنر ہاؤس جانا پڑ رہا ہے لہٰذا اب میں آرام کروں' صبح ملاقات ہو گی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ میں نے کپڑے پھر تبدیل کیے اور بستر پر گر گیا۔

سونے سے پہلے میں نے نیند کی گولیاں کھائی تھیں لہٰذا دیر تک پڑا سویا رہا۔ ناشتا اور لنچ دونوں ہی نیند کی نذر ہو گئے۔ ایک بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ ملازمہ نے بتایا کہ خدا بخش کمرے کے کئی چکر لگا چکا ہے۔ میں نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا۔ کھانے کے نام پر چند لقمے زہر مار کیے۔ اخبار دیکھ رہا تھا کہ خدا بخش پھر آ دھمکا۔ اس نے کہا کہ مجتبیٰ صاحب نئی کوٹھی میں مجھے یاد کر رہے ہیں۔ میں لباس تبدیل کر لوں اور اس کے ساتھ چلوں۔ لباس سے اس کی مراد وہی تھری پیس سوٹ اور بلٹ پروف جیکٹ تھی۔

میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلا تو خدا بخش بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میری سرخ اور سوجی ہوئی آنکھوں کا سبب کیا ہے۔ غالباً اس نے اس سرخی و سوجن کو شراب نوشی پر محمول کیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ کل رات شاہ جہاں عرف جہانی استاد جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فولادی اعصاب کا مالک ہے' باتھ روم کی تنہائی میں بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا ہے۔۔۔۔ کبھی کبھی ہمارے ظاہر و باطن میں کس قدر تضاد ہوتا ہے۔

"چلیے صاحب" خدا بخش نے مجھے تیار دیکھ کر کہا۔

میں خاموشی سے خدا بخش کے ساتھ چل دیا۔ باہر مجتبیٰ کنور کی شاندار مرسیڈیز موجود تھی۔ باوردی ڈرائیور بالکل تیار کھڑا تھا۔ میں خدا بخش کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا اور گاڑی ہموار راستے پر پھسلتی ہوئی بڑی سڑک پر آ گئی۔۔۔۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم ایک شاندار عمارت میں پہنچے۔ عمارت کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ابھی حال ہی میں کثیر لاگت سے تعمیر کی گئی ہے۔ درختوں سے ڈھکی ہوئی نہر بالکل قریب سے گزر رہی تھی۔ عمارت کے اندر اور باہر بھی بے شمار پودے اور درخت لہلہا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کی آمد کی تیاریاں ہیں۔ خاکروب بھاگے پھر رہے تھے۔ در و دیوار کی جھاڑ پونچھ ہو رہی تھی۔ قریباً ایک درجن مالی گھاس اور پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھے۔ پورچ میں کم و بیش دو درجن شاندار گاڑیاں موجود تھیں۔ خدا بخش مجھے لے کر ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ یہاں ہم سے پہلے ہی بہت سے افراد جمع تھے۔ ان میں چار پانچ اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔ کچھ سیٹھ قسم کے اور زیادہ تر سیاستداں ٹائپ حضرات تھے۔ دو خوش لباس اور خوشنما خواتین بھی یہاں موجود تھیں۔ مجتبیٰ کنور حاکمانہ انداز میں ایک صوفے پر براجمان تھا اور حاضرین کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ جونہی میری آنکھیں اس سے چار ہوئیں' میں نے سلام کیا۔ وہ گفتگو منقطع کر کے بولا "آؤ شاہ جہاں' یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں نے پچھلی صف میں ایک طویل صوفے پر جگہ سنبھال لی۔ مجتبیٰ کنور سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ نصف آستین میں سے اس کے بالوں بھرے بازو بہت نمایاں نظر آ رہے تھے۔ گفتگو کے دوران میں وہ بڑے اسٹائلش انداز میں سگار کے کش بھی لیتا جا رہا تھا۔ وہاں کمرے میں ہونے والی گفتگو سے پتا چلا کہ آج رات دس بجے کی فلائٹ سے کوئی بہت اہم غیر ملکی شخصیت نیویارک سے لاہور پہنچ رہی ہے۔ مجتبیٰ کنور کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اس شخصیت کو یہاں اس عمارت میں قیام کرنا ہے۔ یہ سب تیاریاں اسی سلسلے کی کڑی تھیں۔

میں نے دیکھا' مجتبیٰ بڑی روانی اور تفصیل سے فرداً فرداً ہر شخص کو اس کی ڈیوٹی سونپ رہا تھا۔ "ڈی سی صاحب! آپ ائرپورٹ کے انتظام کی نگرانی کریں۔ روٹ میں نے ایس پی ٹریفک کو دے دیا ہے۔ وہ رش ٹائم ہو گا لہٰذا خاص احتیاط رکھیں کہ راستے میں کہیں ٹریفک جام نہ ہو۔ مسٹر نذر' طعام اور قیام کا سارا بندوبست آپ نے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو جس طرح کی مدد چاہیے' خدا بخش سے لے لیں لیکن معزز مہمانوں کو کوئی شکایت نہ ہو" پھر وہ ایک فربہ اندام دیہاتی سے مخاطب ہو کر بولا "چوہدری شفقت' ہو سکتا ہے کہ مہمان لوکل کھانوں کی فرمائش کریں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ لوازمات تمہیں فراہم کرنا ہوں گے۔ میرا مطلب ہے ساگ'

یکھی کی روئی اچھا چھو اور جو بھی الم غلم ہو تا ہے۔"

چوہدری نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ مجتبیٰ نے قریب بیٹھی خوبرو لڑکی کو مخاطب کیا۔ "مس نائیلہ"

"یس سر" وہ فوراً احترام میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"جب تک مہمان یہاں ہیں، تمہیں چوبیں گھنٹے یہیں رہنا ہو گا۔ مس سائرہ تمہارا ساتھ دیں گی۔ مس سائرہ کی ڈیوٹی فون پر ہو گی۔ تم مہمان کو سرو کرو گی۔"

"یس سر" نائیلہ نے جھک کر کہا۔

حاضرین کو چند مزید ہدایات دینے کے بعد مجتبیٰ کنور نے میری طرف دیکھا۔ ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا "مسٹر شاہ جہاں، تم میرے ساتھ آؤ" اس نے مجھے اور خدا بخش کو ایک ساتھ اشارہ کیا تھا۔

ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے چلتے نشست گاہ سے باہر نکل گئے۔ سرسبز لان پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چوکور کیاریوں میں نیلے پیلے پھول مدھم ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔ مجتبیٰ نے ایک نظر لان کا جائزہ لیا۔ وہ ہر شے کو بہت باریک بینی سے دیکھنے کا عادی محسوس ہوتا تھا۔ ایک گلاب کے پودے کے ساتھ چند خشک ٹہنیاں پیوست رہ گئی تھیں۔ مجتبیٰ نے ہیڈ مالی کو اشارے سے قریب بلایا اور ان ٹہنیوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "شاہ جہاں، میرا خیال ہے کہ تمہیں پتا چل گیا ہو گا، آج رات دس بجے کی فلائٹ سے جی کلارک نامی ایک صاحب نیویارک سے یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ وہ بہت مشہور و معروف تاجر ہیں۔ امریکا کے گنے چنے امرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کا یہ دورہ بالکل نجی نوعیت کا ہے۔ نشست گاہ میں موجود افراد کے سوا کسی کو اس بارے میں علم نہیں۔ وہ یہاں قریباً دو ہفتے قیام کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے قیام کے دوران میں تم ان کی محافظت کے فرائض انجام دو۔ تمہیں اس "ذمے داری" پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

مجتبیٰ کنور ہر بات فیصلہ کن انداز میں کرتا تھا۔ حالانکہ وہ میری رائے پوچھ رہا تھا لیکن لہجے میں قطعیت تھی اور اس قطعیت سے فرار خاصا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "جناب! اگر آپ نے مجھے اس اہم ذمے داری کے لیے موزوں سمجھا ہے تو یقیناً ٹھیک ہی سمجھا ہو گا۔ مجھے یہ ڈیوٹی انجام دے کر خوشی ہو گی لیکن ــــــ"

"لیکن کچھ نہیں" مجتبیٰ نے میری بات اچکی "میں جانتا ہوں، تم پریشان ہو مگر اس وقت میری نظر میں ایسا کوئی شخص نہیں جو اس اہم ترین ذمے داری کے لیے تم سے بہتر ہو۔"

اس دوران میں برآمدے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ خدا بخش نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ "جی میڈم ــــ جی میڈم" اس نے بے حد مؤدب لہجے میں کہا۔ پھر مجتبیٰ کنور سے بولا۔ "بیگم صاحب کا فون ہے۔ آپ کو پوچھ رہی ہیں۔"

مجتبیٰ کنور نے فون ریسیو کیا۔ "ہاں کیا بات ہے؟" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "نہیں ــــ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تم پانچ بجے تک تیار رہنا ــــ ہاں میں خود آؤں گا۔"

وہ ہماری موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنی مسز سے حاکمانہ لہجے میں بات کر رہا تھا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا، میں نے تین چار دفعہ یہ بات نوٹ کی تھی۔ زلیخا، مجتبیٰ کی بیوی تھی۔ پڑھی لکھی، خوبصورت اور طرحدار لیکن مجتبیٰ کے سامنے وہ کسی نو عمر بچی کی طرح ڈری سہمی رہتی تھی۔ ہر کام مجتبیٰ سے پوچھ کر کرنا اور اس کی ہاں میں ہاں ملانا زلیخا کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ ٹیلی فون پر مجتبیٰ سے دریافت کر رہی تھی کہ وہ مہمانوں کو ریسیو کرنے کے لیے کون سا لباس پہنے اور مجتبیٰ بڑے ماہرانہ انداز میں اسے ہدایات دے رہا تھا۔ وہ ہر فن مولا شخص تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد باخبر بھی۔ اپنے اردگرد کی ہر شے پر گہری نظر رکھتا تھا۔ تمام جزئیات و تفصیلات اس کے علم میں رہتی تھیں۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد وہ پھر میرے پاس لان میں آ گیا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟" اس نے انگلی سے اپنا ماتھا ٹھوک کر پوچھا۔ "ــــ ہاں یاد آیا۔ شاہ جہاں! تم مسٹر جی کلارک کی حفاظت کے لیے ان کے ساتھ رہو گے۔ ان کو یہاں پاکستان میں کچھ اہم امور نمٹانے ہیں۔ وہ جہاں جائیں گے تمہیں ان کے ساتھ جانا ہو گا۔ تمہاری معاونت کے لیے کچھ اور لوگ بھی موجود ہوں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں خدا بخش تمہیں ان سے ملوا دے گا۔"

اسی طرح کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد مجتبیٰ کنور واپس نشست گاہ میں چلا گیا۔ خدا بخش نے مجھے مجتبیٰ کے چند ذاتی محافظوں سے ملوایا۔ یہ تین ہٹے کٹے افراد تھے۔ صورتوں سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش اور لڑائی بھڑائی کے ماہر نظر آتے تھے۔ چوتھا شخص ان میں قدرے مختلف تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا اور میانے قد کا فرد تھا۔ اسے مارشل آرٹس کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ کراچی میں مارشل آرٹ کی ایک بڑی تربیت گاہ چلا رہا تھا۔ اخبار و رسائل میں اکثر اس شخص کا ذکر آتا رہتا تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس شخص کو یہ بات

ناگوار گزری تھی کہ مجتبیٰ صاحب مجھے اس ٹیم کا سربراہ بنا چکے ہیں جسے معزز مہمان کی سکیورٹی کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اس شخص کا نام جلیل احمد کانڈو تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن اس کے تاثرات دل میں چھپی ہوئی خاصمت کی جھلک دکھا رہے تھے۔

پرواز کی آمد سے دو گھنٹے قبل ہی ہم ائرپورٹ روانہ ہو گئے۔ خدا بخش ہمارے ساتھ تھا۔ وہ خود بھی ایک پسٹل سے مسلح تھا۔ معزز مہمان کی سکیورٹی کے سلسلے میں کیا جانے والا اہتمام دیکھ کر شک گزرتا تھا کہ کسی لمبی چوڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہے لیکن جب دیگر انتظامات پر نظر ڈالی جاتی تو وہاں بھی یہی خصوصی اہتمام نظر آ رہا تھا۔ مہمان کو ائرپورٹ سے قیام گاہ تک لانے کے لیے ایک شاندار لیموزین، وی آئی پی گیٹ کے عین سامنے کھڑی کی گئی تھی۔ یہ "لائٹ اسٹریچ لیموزین" قریباً ۴۰ فٹ لمبی تھی۔ اس لگژری کار کے چھ دروازے تھے۔ دو گارڈز سمیت ایک باوردی ڈرائیور بڑے چوکس انداز میں اس لیموزین کے قریب موجود تھا۔ لیموزین کے علاوہ ایک ایمبولینس، پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک وائرلیس سے لیس جیپ بھی موقعے پر موجود تھی۔ وی آئی پی لاؤنج میں کھوجی کتوں کی مدد سے تلاشی لی جا رہی تھی۔ سادہ لباس میں پولیس کے ارکان ہوائی اڈے میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں جو ایک مفرور قیدی تھا، مجتبیٰ کنور کے سایۂ عاطفت میں آنے کے بعد قانون کی گرفت سے سیکڑوں میل دور چلا گیا تھا۔ میں ناجائز ریوالور سے مسلح کھلے بندوں پھر رہا تھا لیکن کسی مائی کے لال میں جرأت نہیں تھی کہ میری طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھتا۔ سادہ پوش پولیس والوں میں چند شناسا چہرے بھی تھے اور ان میں ایک چہرہ تو خاص طور پر جانا پہچانا تھا۔ یہ ایس پی برکت کا چہرہ تھا۔ وہی برکت صاحب جن میں ایک دیہاتی پولیس افسر کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں اور "ہبھو تی را" جن کا جانا پہچانا تکیہ کلام تھا۔ وہ بھی مجھے پہچان چکے تھے لیکن نہ تو انھوں نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی اور نہ قریب آئے۔ شاید اس گریز کا سبب یہ تھا کہ میں مجتبیٰ کنور کے خصوصی آدمی کی حیثیت سے ان کے سامنے آیا تھا۔ وہ مجھے دور دور سے یوں دیکھتے رہے جیسے کسی عجوبے کو دیکھ رہے ہوں۔

میرے علاوہ وہ چاروں افراد بھی یہاں موجود تھے جن سے خدا بخش نے میرا تعارف کرایا تھا۔ میں نے ان میں سے لڑکی ڈیوٹی لیموزین پر لگا دی تھی۔ مارشل آرٹ کا ماہر جلیل کمانڈر اور اس کا چوتھا ساتھی میرے ساتھ تھے۔ میری طرح ان تمام افراد کو بھی بلٹ پروف جیکٹس مہیا کی گئی تھیں۔ فلائٹ ٹائم سے ایک گھنٹا پیشتر ان لوگوں کی آمد شروع ہوئی جنھوں نے معزز مہمان کا استقبال کرنا تھا۔ ان لوگوں کو شہر کی "کریم" کہا جا سکتا تھا۔ چند چوٹی کے صنعت کار اور ان کی بیگمات، کچھ اعلیٰ افسر اور ان کی "افسریاں" کچھ سیاستدان اور ان کی خوبصورت "سیاستدانیاں" یہ سب لوگ بڑی بڑی کاروں میں طمطراق سے پہنچ رہے تھے اور انتظار گاہ میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ پھر مجھے مجتبیٰ کنور کی حسین و جمیل بیوی زلیخا نظر آئی۔ چند ماہ کا خوبصورت بچہ مع آیا اس کے ساتھ تھا۔ مجتبیٰ کنور ٹھیک ساڑھے نو بجے پہنچا۔ وہ ایک شاندار تھری پیس سوٹ میں تھا۔ سرخ ٹائی، سرخ رومال، پاؤں میں شارک اسکن جوتے۔ وہ اپنے اردگرد کی ہر شے کو تحکمانہ غرور سے دیکھتا ہوا انتظار گاہ میں چلا گیا۔

جہاز عین وقت پر پہنچ گیا۔ اناؤنس منٹ ہوتے ہی وی آئی پی لاؤنج میں سنسنی سی پھیل گئی۔ سادہ پوش ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ مجتبیٰ کنور اپنے ساتھیوں کے ساتھ استقبالیہ دروازے کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں اس وقت مجتبیٰ کنور کے بالکل قریب موجود تھا۔ سب نگاہیں جہاز کی سمت لگی تھیں لیکن پھر ایک غیر متوقع خبر آئی اور ساری سنسنی خیزی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ معلوم ہوا کہ معزز مہمان اس فلائٹ سے تشریف نہیں لائے۔ بالکل عین وقت پر ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور ڈاکٹروں نے انھیں سفر سے منع کر دیا تھا۔

وی آئی پی لاؤنج میں موجود اکثر افراد کے چہرے لٹک گئے۔ مایوس ہونے والوں میں مجتبیٰ کنور پیش پیش تھا۔ اس کے رُخِ روشن پر جھنجلاہٹ صاف پڑھی جاتی تھی۔ جھنجلاہٹ یقیناً اس بات کی تھی کہ پروگرام کی تبدیلی سے اسے آگاہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ معزز مہمان کے ساتھ چار افراد اور آ رہے تھے۔ ان میں دو خواتین اور دو مرد تھے۔ یہ لوگ حسب پروگرام پہنچے تھے۔ مجتبیٰ کنور اور اس کے ساتھیوں نے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر ان کا استقبال کیا۔ رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ پھر سب لوگ گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

"یہ کیا چکر ہے؟" میں نے سرگوشی کے لہجے میں خدا بخش سے پوچھا۔

وہ بولا "بڑے لوگوں کے رنگ نرالے ہوتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب کو پہلے ہی اندیشہ تھا کہ کہیں عین وقت پر

پروگرام بدل نہ جائے۔ بندہ جتنا دولت مند ہوتا ہے اتنا ہی خطرے میں رہتا ہے۔ ہر قدم اسے پھونک کر اٹھانا پڑتا ہے۔ جی کلارک صاحب بھی اپنی سکیورٹی کے سلسلے میں بے حد محتاط رہتے ہیں۔ ممکن ہے پروگرام کی یہ تبدیلی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہو۔"

مہمانوں کو ان کی قیام گاہ پر چھوڑ کر مجتبیٰ کنور اور اس کی بیگم رات ڈیڑھ بجے مجتبیٰ پیلس واپس آگئے۔ ہم بھی ان کے ساتھ تھے۔ استقبال کے لیے آنے والوں میں کچھ تو مایوسی کے عالم میں ائرپورٹ سے ہی رخصت ہوگئے تھے۔ کچھ نسر والی رہائش گاہ تک گئے لیکن جلد ہی پنڈ چھڑا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مجتبیٰ کنور گم صم تھا اور جب وہ گم صم ہوتا تھا تو ارد گرد کی ہر شے سہم جاتی تھی۔ تاریک رات کے بطن میں مجتبیٰ پیلس خاموش تھا اور مجتبیٰ پیلس کے بطن میں ہر شے خاموش تھی۔ میں تھکا ماندہ بیڈ پر آکر گر گیا۔ جونہی ذرا فرصت ملی، غزالہ کا تصور اپنی تمام تر کرب ناکی کے ساتھ ذہن میں آوارد ہوا۔ جی چاہا ایک بار پھر باہر نکل جاؤں اور بے سمت چلنا شروع کردوں۔ چلتا رہوں، چلتا رہوں، یہاں تک کہ نڈھال ہو کر گر جاؤں ___ اور ایسا گروں کہ پھر کبھی اٹھنا نصیب نہ ہو۔ پورے بدن میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی اور تشویشناک بات یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس آگ کی شدت کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ خود بخود اس الماری کی طرف چلا گیا جہاں خدا بخش نے امپورٹڈ وسکی کی کئی بوتلیں چنوا رکھی تھیں۔

ابھی میں الماری کو کھول ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ گرجتی برستی آواز مجتبیٰ کنور کی تھی اور عمارت کے رہائشی حصے کی طرف سے آئی تھی۔ وہ کسی پر برس رہا تھا۔ میں نے آواز بہتر طور پر سننے کے لیے کمرے کی ایک کھڑکی کھول دی۔ "حرامزادی، کتے کی بچی، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" مجتبیٰ کسی کو الٹا اٹھا کر پیٹ رہا تھا۔

یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے دستِ ستم کا نشانہ بننے والی اس کی بیوی زلیخا ہے۔ بیگم زلیخا کنور جو سوسائٹی کے اعلیٰ حلقوں میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ جس کی خوشنودی کی خاطر لوگ قدموں میں بچھے جاتے تھے۔ جو ہر جگہ وی آئی پی سمجھی جاتی تھی۔ وہی زلیخا اپنے شوہر کے ہاتھوں گدھے کی طرح پٹ رہی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ کنور اس صورتِ حال کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ اتنی بڑی عمارت تھی۔ وہ چاہتا تو کسی اندرونی کمرے میں جا کر بیوی کی "عزت افزائی" کر سکتا تھا۔ یقیناً یہاں ایسی بہت سی جگہیں ہوں گی جہاں برپا ہونے والا شور و غل کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچتا مگر کنور کو اس کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ "میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ کتے کی بچی، الو کی بچی، پاگل ہو گئی ہے تو۔ تیرا ٹھکانا پاگل خانہ ہے۔"

پھر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹی۔ مسز زلیخا کنور کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔

میں کھڑکی میں کھڑا رہ کر بغور سنتا رہا۔ یہ ہنگامہ تقریباً دس منٹ جاری رہا۔ پھر ایک دم سکوت چھا گیا۔ اس دوران میں میں نے ایک دو ملازموں کو برآمدے میں آتے جاتے دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق نظر آرہے تھے۔ ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس قسم کی مار دھاڑ مجتبیٰ پیلس کی چار دیواری میں کوئی انوکھی یا نئی بات نہیں۔ مجتبیٰ کنور کی باوقار اور شاندار شخصیت کا یہ پہلو میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ میں نے رات کا باقی مختصر حصہ اسی ہنگامے کے بارے میں سوچتے گزار دیا۔ اس سوچ بچار کا یہ فائدہ ہوا کہ غزالہ کا جانکاہ تصور میرے ذہن پر شدید ترین حملے نہ کر سکا۔ صبح سویرے اتفاقاً میری نگاہ زلیخا کنور پر پڑ گئی۔ وہ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی۔ بالوں میں "رولرز" لگے تھے۔ میک اپ اترا ہوا تھا۔ شاید اس حلیے میں بھی وہ خوبصورت ہی نظر آتی مگر رات کی مارپیٹ نے اس بے چاری کا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ ایک آنکھ سوج کر کپا ہو گئی تھی۔ دائیں رخسار پر گہرے نیل تھے۔ ایک ہاتھ پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کچھ سے نکل کر انگریزی تیا کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ بس اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا میں۔ تاہم یہ ایک جھلک بہت سب کچھ دکھانے اور سمجھانے کے لیے کافی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی، شوہر کے ستم سہنا جن کا معمول ہوتا ہے۔ وہ تختۂ مشق بن کر یوں روز مرہ کے کاموں میں مشغول ہو جاتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن اس کیس میں حیرت کا مقام یہ تھا کہ پٹنے والی کوئی سیدھی سادی اَن پڑھ عورت نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی ماڈرن، بے باک اور بوجھ والی بیگم صاحبہ تھیں لیکن جیسے اونٹ پہاڑ تلے آتا ہے، وہ بھی ایک جابر زمین کے شکنجے میں تھی۔

خدا بخش اب مجھ سے کھل کر بات کرنے لگا تھا۔ جب میں نے اس سے رات کی مار کٹائی کے متعلق پوچھا تو وہ بولا۔ "مجتبیٰ کنور اس وقت گھر سے باہر تھا اور جب وہ باہر تھا، خدا بخش اور دیگر ملازمین خود کو خاصا "ایزی" محسوس کرتے تھے۔ کہنے لگا "بس جی! جب صاحب کا پارا چڑھتا

ہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ جھنجلاہٹ تو ان پر اسی وقت سوار ہو گئی تھی جب پتا چلا تھا کہ مسٹر کلارک نہیں آئیں گے اور پھر بیگم صاحب سے بھی ایک غلطی ہو گئی۔ انہوں نے باقی تو سب کچھ پوچھ لیا لیکن بچے کے بارے میں پوچھنا بھول گئیں۔ اپنی عادت کے مطابق وہ بچے کو اپنے ساتھ ہوائی اڈے لے گئی تھیں۔ اس بات پر صاحب مشتعل ہو گئے۔ یہ تو خیر ایک واقعہ تھا، بعض اوقات وہ اس سے بھی معمولی باتوں پر آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ چند دن پہلے ایک ملازم کو صرف اس بات پر ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا گیا کہ اس نے صاحب کی میز پر پانی کا گلاس ڈھک کر نہیں رکھا تھا۔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دی تھی لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ صاحب ہر وقت مار دھاڑ پر اترے رہتے ہیں یا ان میں نرمی نہیں۔ عام حالات میں وہ بے حد نرم خو بھی اور مہربان ہیں۔ کسی کا احسان یا بھلائی یاد رکھنے کے سلسلے میں ان کا حافظہ بے حد تیز ہے۔ اپنے وفاداروں کو کسی بھی حالت میں بھولتے نہیں ہیں۔ اگر یہ خوبیاں ان میں نہ ہوتیں تو آج اس مقام پر نہ ہوتے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ ایک ٹویوٹا جیپ پورچ میں داخل ہوئی۔ اس کے شیشے رنگین تھے۔ یہ مجتبیٰ پیلس کی جیپ تھی لہٰذا خدا بخش میرے قریب مطمئن کھڑا رہا۔ چند لمحے بعد جیپ کے دروازے کھلے۔ پہلے دو مسلح افراد نیچے اترے پھر میں نے یکے بعد دیگرے زریں گل اور بوٹا سنگھ کو اترتے دیکھا۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے پتا تھا کہ مجتبیٰ کنور کے آدمی سرحد پار بوٹا سنگھ اور زریں گل کا کھوج لگا رہے ہیں لیکن یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ اتنی جلدی انہیں نہ صرف ڈھونڈ لیا جائے گا بلکہ وہ میرے پاس بھی پہنچ جائیں گے۔

زریں گل اور بوٹا سنگھ دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ پٹیاں تھیں۔ زریں گل کے چہرے پر ایک دو چوٹیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا گریبان چاک تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں پہنچنے سے پہلے اس نے مجتبیٰ کنور کے آدمیوں سے ہاتھا پائی کی ہے۔ وہ اب بھی مشتعل نظر آرہا تھا۔ وہ اصیل مرغ کی طرح سینہ پھلا کر جیپ سے اترا اور غرانے لگا۔ "خوچے ام بار بار ہے نہیں ڈرتا اور مار لو۔ اپنا سارا ارمان نکال لو لیکن قسم خدا کا ام بھی تم کو چھوڑے گا نہیں۔"

وہ بار بار سر جھٹک کر آنکھوں سے پٹی اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے برعکس بوٹا سنگھ خاموش کھڑا تھا۔ زریں گل کی طرح بوٹا سنگھ بھی اسی لباس میں تھا جس میں میں نے اسے فرید کوٹ کے نواحی ڈاک بنگلے میں چھوڑا تھا۔ خدا بخش کا اشارہ پا کر کنور کے آدمیوں نے بوٹا اور زریں کی آنکھوں سے سیاہ پٹیاں اتار دیں۔ وہ دونوں کچھ دیر چندھیائی آنکھوں سے ارد گرد دیکھتے رہے پھر زریں گل کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کا منہ ایک دم حیرت سے کھل گیا۔ اس کی نگاہ کا تعاقب کر کے بوٹا سنگھ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ مجتبیٰ کنور کے ایک کارندے نے چاقو کی مدد سے وہ رسیاں کاٹ دیں جنہوں نے بوٹا اور زریں کے ہاتھ پشت پر جکڑ رکھے تھے۔ وہ دونوں لپک کر میری طرف آئے۔ پہلے زریں گل بغلگیر ہوا پھر بوٹا سنگھ نے ست سری اکال کہہ کے معانقہ کیا۔

خدا بخش کا اشارہ پا کر زریں گل اور بوٹا سنگھ کو لانے والے خاموشی سے واپس چلے گئے۔ زریں گل بولا۔ "استاد جی، یہ بہت اچھا ہوا کہ ام نے ان لوگوں میں سے ایک آدھ کو قتل نہیں کر ڈالا۔ ام سمجھتا تھا کہ یہ ام سے جھوٹ بول رہا ہے کہ ام کو آپ کے پاس لے کر آئے گا۔ ام نے ان میں سے ایک بندے سے پستول چھین لیا تھا۔ بس ایک سیکنڈ اور کرل جاتا تو ام اس کے بھیجے میں گولی اتار دیتا۔ ام سلام کرتا ہے بوٹا سنگھ کو۔ اس نے امارا ہاتھ روک لیا۔ اس وقت ام کو اس پر بڑا غصہ آیا تھا۔ بات ہی غصہ آنے والا تھا۔ اس نے ام کو گولی چلانے سے روک دیا اور وہ سب کا سب ام پر چڑھ دوڑا۔ انہوں نے ٹھیک ٹھاک چھینٹی لگایا ام کو لیکن اب اس چھینٹی کا ام کو کوئی غم نہیں ہے۔ ام نے آپ کو دیکھ لیا۔ امارا آنکھیں ٹھنڈا ہو گیا۔ دل جگر سینہ سب ٹھنڈا ہو گیا۔"

خدا بخش نے کہا۔ "آپ لوگ اندر چل کر باتیں کریں۔ میں مجتبیٰ صاحب کو بتا آؤں کہ بندے پہنچ گئے ہیں۔ وہ کل سے کئی بار اس بارے میں پوچھ چکے ہیں۔"

میں زریں اور بوٹا سنگھ کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ بوٹا سنگھ نے کہا۔ "یہ بہت بڑی جگہ ہے۔ لگتا ہے کسی راجے مہاراجے کی کوٹھی میں آگئے ہیں اور یہاں نوکیں والے بھی آ جا رہے ہیں۔" بات کرتے کرتے وہ اچانک خاموش ہو گیا اور غور سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "جہانی صاحب، گلتی ماف! آپ کچھ نراش نجر آرہے ہیں۔ آنکھیں بھی سوجی سوجی ہیں۔ میرا مطلب ہے یہاں سب کھیریت تو ہے نا؟"

اس سوال کا سچا جواب تو یہ تھا کہ خیریت بالکل نہیں۔ مجھ پر قیامت گزر چکی ہے۔ کوئی میری زندگی لوٹ کر چلتا بنا ہے اور مجھے کانٹوں کی سیج پر زندہ لاش کی صورت پھینک گیا ہے لیکن یہ جواب میری زبان پر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے بصد

کوشش مسکرا کر کہا "بالکل ٹھیک ہے۔ تم دونوں سناؤ۔ کیسے اور کب پاکستان پہنچے اور باقی لوگ کہاں ہیں؟"

جواب میں زریں گل اور بوٹا سنگھ نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مجھے غزالہ اور رشا کو شیخ عاصم کے اُجرتی غنڈوں نے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد تینوں گاڑیاں آگے پیچھے روڈی غائب ہو گئی تھیں۔ ہمارے جانے کے بعد بوٹا سنگھ نے اپنے جتھے والوں کے ساتھ مل کر ہماری تلاش شروع کی۔ بابو لیاقت اور زریں گل وغیرہ بھی اس تلاش میں شریک تھے۔ اس روز سہ پہر کے وقت گھنے درختوں سے رشا کی لاش مل گئی تھی۔ خود کار رائفل کا ایک برسٹ اس کے سر میں لگا تھا اور اس کا خون خشک پتوں پر دور تک بکھرا ہوا تھا۔ یہ لاش بابو لیاقت کے کارکن اپنے ساتھ فرید کوٹ لے گئے اور اسے وارثوں تک پہنچا دیا۔۔۔۔ میری اور غزالہ کی تلاش بدستور جاری رہی۔ بابو لیاقت نے چار پارٹیاں بنائیں اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کر دیا۔ زریں گل اور بوٹا سنگھ ایک ہی پارٹی میں تھے۔ اس پارٹی کا تیسرا رکن بوٹا سنگھ کا ایک ساتھی منوہر سنگھ تھا۔ تینوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ زریں گل اور بوٹا سنگھ کے پاس ریوالور تھے جب کہ منوہر سنگھ کرپان سے مسلح تھا۔ وہ ڈاک بنگلے سے تقریباً پندرہ میل شمال کی طرف نکل گئے۔ یہاں ان کی مڈھ بھیڑ شنکر شکرا کے آدمیوں سے ہو گئی۔ وہ تعداد میں سات آٹھ کے قریب تھے۔ ان کے سرغنہ نے زریں اور بوٹا سنگھ سے کہا کہ پاکستان میں استاد جہانی صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں' ہم تمہیں پاکستان لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ زریں گل کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے ان لوگوں سے الجھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں اس نے ہاتھا پائی کر کے ایک شخص کا ریوالور چھین لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کر دیتا' بوٹا سنگھ نے ہاتھ مار کر ریوالور گرا دیا۔ شنکر شکرا کے آدمیوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا اور ایک بند گاڑی میں ڈال کر فرید کوٹ پہنچا دیا۔ رات کو دونوں ایک کمرے میں سوئے تھے لیکن صبح آنکھ کھلی تو اس جیپ میں تھے جو انہیں مجتبٰی پیلس لائی۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔۔۔۔ زریں گل اور بوٹا سنگھ کی روداد ختم ہوئی تو میں نے ان سے ارجمند بانو اور گونگی لڑکی جھمو کے بارے میں پوچھا۔

زریں گل بولا۔ "وہ دونوں ڈاک بنگلے والے خانے میں ہی تھیں۔ اس اُلو کی پٹھی ارجمند بانو کا تو ہم کو کوئی فکر نہیں' وہ بدکردار عورت ہے' جنگل میں رہے یا منگل میں اس کے لیے برابر ہے۔ لیکن وہ جھمو بڑی بھولی بھالی ہے۔ بالکل اللہ میاں کی گائے ہے۔ ہم نے اس کو بہن بولا ہے۔ ہم کو اس کی طرف سے بہت فکر ہے۔ اگر ہماری طرح بابو لیاقت وغیرہ بھی قابو آ گیا ہے تو پھر وہ بے چاری اکیلی رہ گئی ہو گی۔"

بوٹا سنگھ نے کہا۔ "جہانی صاحب! آپ نے ہم سے تو سب کچھ پوچھ لیا ہے۔ اپنے بارے میں ابھی کوئی گل بات نہیں بتائی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں اور کیا سچ مچ آپ کے ہی کہنے پر ہمیں انڈیا سے لایا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجتبٰی کنور کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟"

زریں گل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں' اخباروں میں کئی بار پڑھا ہے۔ مجتبٰی کنور نے یوں کر دیا' مجتبٰی کنور نے ووں کر دیا۔ شاید اس خانہ خراب کا فوٹو موٹو بھی دیکھا ہے ام نے۔"

"آہستہ بولو" میں نے کہا۔ "ہم اسی خانہ خراب کے مہمان ہیں۔ یہ پنجاب کا طاقتور ترین شخص ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پنجاب کا اصل گورنر یہی ہے۔ جو شخص گورنر ہاؤس میں بیٹھا ہے وہ صرف "ڈمی" ہے۔ مجتبٰی کنور کا تعلق قادر زماں سے بھی ہے اور یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عیسٰی جان' شنکر شکرا' افراہیم سب مجتبٰی کنور کے دھڑے سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شنکر شکرا کے کارندوں نے تمہیں پکڑنے کے بعد سیدھا یہاں پارسل کر دیا ہے۔"

"لیکن آپ یہاں کیسے پارسل ہوا؟" زریں گل نے حیرانی سے پوچھا۔

"قادر زماں کی معرفت" میں نے جواب دیا اور مختصر الفاظ میں ان دونوں کو بتایا کہ کس طرح قادر زماں مجھے پاکستان لے کر آیا اور کیسے میں جھوک ضامن کی حویلی سے لاہور میں مجتبٰی پیلس پہنچا۔ آخر میں میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ غزالہ یہاں پہنچ چکی ہے۔

غزالہ کی پاکستان آمد کا سن کر وہ ایک دم خوش نظر آنے لگے جیسے کوئی بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ درحقیقت میری روداد سے انہیں یہی پتا چلا تھا کہ غزالہ انڈیا میں رہ گئی ہے۔ وہ اس بات پر پشیمانی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے رشا کی لاش تو ڈھونڈ نکالی لیکن غزالہ کا سراغ نہ لگا سکے۔

ابھی زریں اور بوٹا سے میری گفتگو جاری تھی کہ مجتبٰی کنور کا بلاوا آ گیا۔ بلاوا لانے والا ایک ملازم سکندر تھا۔ اس نے صرف یہ بتایا کہ صاحب نشست گاہ میں ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نشست گاہ میں پہنچا تو مجتبٰی کنور چینٹ رث

پہنے' پھولدار ٹائی لگائے کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں سگار تھا۔ بے حد پرسکون اور خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ' اس کا موڈ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ رات یہی شخص اپنی بیوی پر درندے کی طرح جھپٹ رہا تھا اور اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجتبٰی نے بغیر کسی تمہید کے کہا "تمہیں میرے ساتھ گارڈن ٹاؤن تک چلنا ہے۔ میں ڈاٹسن کار پر جاؤں گا' تم علیحدہ گاڑی میں جاؤ گے۔ میرے پیچھے پیچھے ڈرائیو کرتے رہنا۔ کوٹھی نمبر ایچ اے ۴۲ کے سامنے میں گاڑی روک لوں گا' تم سیدھا آگے نکلتے چلے جانا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے مین روڈ کے سنگم پر ایک پوسٹ آفس ہے۔ اس کے سامنے گاڑی روک لینا۔ میں جب تک واپس نہ آؤں تمہیں اسی جگہ رُکنا ہے۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے سگار کا کش لیا اور بولا "تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ اگر سیاہ رنگ کی ایک مارک ٹو ایل پی ۴۲ مین روڈ سے ذیلی سڑک پر مڑتی نظر آئے تو مجھے فوراً اطلاع دو۔ اس اطلاع کے لیے واکی ٹاکی استعمال ہو گا۔ واکی ٹاکی کا ایک سیٹ تمہاری گاڑی میں رکھوا دیا گیا ہے۔ یہ دوسرا سیٹ میرے پاس ہے۔"

مجتبٰی نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا انگشِ واکی ٹاکی نکال کر مجھے دکھایا۔ واکی ٹاکی کا طریقہ کار سمجھانے کے بعد اس نے اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔ پھر بولا "ریوالور تو تمہارے پاس موجود ہے نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "ٹھیک ہے۔ کپڑے بدل لو۔ باقی ہدایات میں تمہیں روانگی سے پہلے دوں گا۔"

میں نے مؤدب انداز میں سر جھکایا اور باہر نکال آیا۔ مجتبٰی کنور ایک منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا پس منظر جاگیردارانہ تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ تحکم اس کی طبع کا جزوِ خاص تھا۔ اس کے لیے یہ امر طے شدہ تھا کہ وہ کہے گا اور لوگ سنیں گے' وہ حکم دے گا اور لوگ عمل کریں گے۔ وہ فیصلہ کرے گا اور اس فیصلے کو تسلیم کیا جائے گا۔ میری مرضی جانے بغیر وہ مجھے ایک کارندے کی طرح استعمال کر رہا تھا اور پُریقین تھا کہ میں اپنی اس حیثیت سے بہت خوش ہوں۔ اس نے پانچ لاکھ کے نوٹ معمولی اسٹیشنری کی طرح میری الماری میں رکھوا دیے تھے۔ ابھی میں ان کا پچاسواں حصہ بھی خرچ نہیں کر پایا تھا لیکن خدا بخش کئی بار پوچھ چکا تھا کہ مجھے رقم کی ضرورت تو نہیں اور صرف دولت ہی نہیں زندگی کی ہر آسائش اور عیش اس چار دیواری میں موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک میں نے ان "سہولتوں" سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجتبٰی کے سایۂ عاطفت میں آنے کے بعد میں قانون کے لیے ایک ایک "مقدس گائے" بن گیا تھا۔ میری آزادی سراسر غیر قانونی تھی لیکن پولیس میرا منہ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ قانونی کارروائی تو رہی ایک طرف' ابھی تک میرے سلسلے میں کوئی خانہ پُری کی کارروائی بھی نہیں کی گئی تھی۔

○☆○

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اور عزت مآب مجتبٰی کنور صاحب آگے پیچھے لاہور کی سڑکوں پر رواں تھے۔ اس وقت تک دن کے بارہ بج چکے تھے۔ زندگی اپنی پوری رفتار سے متحرک تھی۔ مجتبٰی کنور بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری پروٹوکول کے جا رہا تھا۔ وہ گاڑی بھی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی کے شیشوں پر پردے پڑے تھے۔ مجتبٰی نے اپنا حلیہ بھی تھوڑا بہت تبدیل کیا تھا۔ سیاہ شیشوں والی عینک لگا کر اس نے ایک پی کیپ پہن لی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس پرانے ماڈل کی چھوٹی سی گاڑی میں مجتبٰی کنور جا رہا ہے۔ دونوں گاڑیاں گارڈن ٹاؤن کے علاقے میں داخل ہوئیں اور مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد اس بغلی سڑک پر مڑ گئیں جہاں کوٹھی نمبر ایچ اے ۴۲ واقع تھی۔ پوسٹ آفس کے سامنے اِکا دُکا گاڑیاں اور موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ میں نے گاڑی کو مناسب رُخ پر پارک کیا اور سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔

ذہن بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ مجتبٰی بڑے پُراسرار انداز میں یہاں پہنچا تھا۔ یقیناً اسے کچھ لوگوں سے خطرہ بھی تھا۔ اس نے مجھے یہ تاکید خاص طور پر کی تھی کہ اپنا ریوالور ساتھ رکھوں۔ اس کے علاوہ اس نے ریوالور کے فالتو راؤنڈ بھی مہیا کر دیے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کوئی خفیہ سیاسی میٹنگ رہی ہو گی۔ سیاسی رہنما جوڑ توڑ کے لیے ایسی ملاقاتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔

مجتبٰی کا دیا ہوا واکی ٹاکی میری گود میں پڑا تھا۔ اچانک واکی ٹاکی کا ننھا سرخ بلب روشن ہوا اور "بپ بپ" کی آواز آئی۔ میں نے آواز ریسیو کرنے کے لیے بٹن دبایا۔ دوسری طرف مجتبٰی تھا۔ "ہیلو شاہ جہاں' پوسٹ آفس پہنچ گئے ہو؟ اوور"

"جی جناب! آپ کی بتائی ہوئی جگہ پر گاڑی کھڑی کی ہے۔ اوور"

"ٹھیک ہے۔ ہوشیاری سے۔ ممکن ہے مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے۔ پریشان نہیں ہونا اوور۔"

"بہت بہتر جناب' آپ فکر مت کریں اوور"

"او کے۔ اوور اینڈ آل"

وائی ٹاکی خاموش ہو گیا۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا اور میری نگاہیں اس سیاہ سڑک پر جمی رہیں جس پر ہر قسم کی تیز رفتار گاڑیاں فراٹے بھر رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں دو تین بار سیاہ مارک نو بھی دکھائی دی۔ ایسے موقعوں پر میرے اعصاب تن گئے لیکن یہ گاڑیاں تیز رفتاری سے سیدھی نکلتی چلی گئیں۔ مجتبیٰ نے ایک گھنٹے کا کہا تھا لیکن ڈھائی گھنٹے گزرنے کے باوجود وہ خود نظر آیا نہ ہی وائی ٹاکی پر اس کی آواز ابھری۔ بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ سی آنے لگی تھی۔ شاید یہ رات بھر کی بیداری کا نتیجہ تھا۔ رات ایک پل کے لیے بھی میری آنکھ نہیں لگی تھی اور یہ کل رات ہی کی بات نہیں تھی۔ بہت راتوں سے میری نیند مجھ سے خفا تھی۔ کبھی آنکھ لگتی تھی تو فرزانہ کی ابدی جدائی کا تصور بڑی بے رحمی سے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیتا تھا۔

نشست سے ٹیک لگائے لگائے آنکھیں بند ہونے لگیں تو میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میری غفلت مجتبیٰ کنور کے لیے کسی بہت بڑی مشکل کا باعث بن سکتی تھی۔ نیا سگریٹ سلگانے کے لیے میں جیب سے لائٹر نکال رہا تھا جب اچانک میری نگاہ سیاہ مارک نو گاڑی پر پڑی۔ وہ ٹریفک کے ازدحام میں درمیانی رفتار سے وزرا ہے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کا دایاں "انڈی کیٹر" آن تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا تاہم میں نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی نمبر پلیٹ دیکھ لی۔ یہ وہی گاڑی تھی جس کی طرف سے مجتبیٰ نے مجھے خبردار کیا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے وائی ٹاکی آن کیا۔ سرخ بلب جل کر بجھ گیا۔ میں نے یار بار بٹن آن آف کیا لیکن وائی ٹاکی خاموش رہا۔ اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وائی ٹاکی کام نہیں کر رہا۔ یہ بڑے تشویشناک لمحات تھے۔ گاڑی لحہ بہ لمحہ قریب پہنچ رہی تھی' وہ میرے سامنے سے گزر کر کوٹھی کی طرف بڑھ جاتی تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا۔ میں نے گاڑی اس بغلی سڑک پر موڑی جہاں سے سیاہ مارک نو کو گزرنا تھا۔ میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے گاڑی کو بغلی سڑک پر موڑ کر ریورس کرنا چاہتا ہوں۔ جونہی گاڑی سڑک پر آڑی ہوئی' میں نے فیوز کھینچ کر انجن بند کر دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ سیاہ مارک نو وہاں تک پہنچتی' میں بھاگنے والے انداز میں چلتا ہوا چلڈرن پارک میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں میں نے گاڑی بند کی تھی وہاں پہلے سے ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں نے مل کر رستہ مسدود کر دیا تھا۔ اب ممکن نہیں تھا کہ سیاہ مارک نو یا کوئی دوسری گاڑی وہاں سے آگے بڑھ سکتی۔ پارک میں داخل ہوتے ہی میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے عقب میں سیاہ مارک نو کا مسلسل ہارن سنائی دے رہا تھا۔ تقریباً ایک منٹ تک مسلسل بھاگ کر میں کوٹھی نمبر ایچ اے ۴۴ کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ شاندار کوٹھی ٹو سائیڈ اوپن تھی یعنی اس کو دو طرف سے سڑک لگتی تھی۔ تاہم میں اس گیٹ پر پہنچا تھا جہاں سے مجتبیٰ کنور اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے بلا تکلف کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ گیٹ پر کوئی ملازم نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ کوٹھی کے اندر بھی کوئی ملازم نہیں کیونکہ کال بیل کے جواب میں ایک خوبرو لڑکی باہر نکلی تھی۔ اس نے ایک اندرونی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ مجھ سے تقریباً تیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی' پھر بھی میں اس کے چہرے پر پریشانی کے شواہد دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی خوشنما لڑکی تھی۔ لمبے بال چہرے اور کندھوں پر منتشر تھے۔ اس کے باہر نکلتے ہی ایک چھوٹا سا سفید کتا بھی کمرے سے نکل آیا اور تیزی سے اس کے اردگرد چکرانے لگا۔ لڑکی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے کیا کہوں۔ معلوم نہیں اس کے سامنے مجتبیٰ کا نام لینا مناسب تھا بھی یا نہیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ مشکل آسان ہو گئی۔ ایک کھڑکی کا پٹ کھول کر مجتبیٰ نے مجھے اپنا دیدار کرایا اور دور ہی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس کے بال منتشر تھے اور لڑکی کی طرح وہ بھی میرے دخل در معقولات پر نروس سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "جناب! گاڑی آ رہی ہے"

مجتبیٰ کے چہرے نے یقیناً رنگ بدلا ہو گا تاہم میں دور سے اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ وہ تیزی سے بولا۔ "تم خود کیوں آئے؟"

"وائی ٹاکی نے کام نہیں کیا۔" میں نے بھی تیزی سے جواب دیا۔

"اوکے۔ تم جاؤ" وہ افراتفری میں بولا۔

گیٹ چھوڑنے سے پہلے میں نے دیکھا۔ خوبرو لڑکی کتے سمیت فوراً اندر چلی گئی تھی۔ میں واپس گاڑی کی طرف جانے کے بجائے سیدھا نکلتا چلا گیا۔ سیلف کا فیوز میری جیب میں پڑا تھا۔ یقیناً گاڑی کو دھکا لگا کر ہی راستے سے ہٹایا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا' اب تک وہاں ٹریفک جام ہو چکا ہو۔ میں واپس جا کر تماشا بننا نہیں چاہتا تھا۔ گاڑی کا کیا تھا وہ پھر بھی آ سکتی تھی۔ مجتبیٰ کے کسی ملازم کا ملازم بھی ایک اشارہ کرتا تو ٹریفک پولیس والے خود گاڑی مطلوبہ مقام پر پہنچا دیتے۔

میں فیروز پور روڈ پر واقع ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ لگانا میرے لیے ہرگز مشکل نہیں رہا تھا کہ مجتبیٰ کنور آج صبح سے کسی خاص مہم پر نکلا ہوا ہے۔ بے حد عجیب بات تھی کہ مجتبیٰ جیسا ذمے دار اور بااختیار شخص کسی کالجیٹ لڑکے کے سے انداز میں معاشقہ لڑا رہا تھا۔ یہ سوچ کر شرمندگی سی ہونے لگی کہ وہ اپنی محبوبہ کے گھر گیا تھا اور مجھے اپنے پہرے پر کھڑا کر گیا تھا۔ یہ ذمے داری اُستاد جہانی کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا کڑھتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ سیاہ گاڑی کس کی تھی جس کے "استقبال" کے لیے مجھے پوسٹ آفس کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو بغلی سڑک کی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس میں صرف ایک شخص تھا۔ فاصلہ کافی تھا۔ میں ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن وہ کوئی نوجوان شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجتبیٰ کنور کی محبوبہ کا بھائی یا شوہر ہو۔ شوہر کے امکانات زیادہ تھے کیونکہ وہ لڑکی اپنے لباس اور طور اطوار سے شادی شدہ لگی تھی۔ یہ میں کس چکر میں پھنس گیا تھا۔ میرا ٹارگٹ شیطان ابن شیطان منگر شکرا تھا اور وہ لوگ تھے جو اس کے ساتھ مل کر ایک جیتی بہادو فنیے کو اُڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس دفینے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ دولت اتنی زیادہ ہے کہ بے شمار بھوکے ننگے' ضرورت مند انسانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اگر اس دولت کو استعمال ہی ہونا تھا تو پھر محفوظ ہاتھوں میں کیوں نہ پہنچتی اور اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیوں نہ ہوتی' کیوں وہ عیاش مہم جوؤں کی تجوریوں میں بھری جاتی اور سیاہ کاریوں میں اُڑا دی جاتی۔

گمشدہ ٹرک کا تصور پوری جزئیات کے ساتھ میرے تصور میں چمک اٹھا۔ وہ ٹرک اپنے مال و اسباب سمیت ہوا میں تحلیل نہیں ہوا تھا۔ یقیناً وہ ہمارے اردگرد ہی کہیں موجود تھا۔ سرحد کی اس جانب یا اُس جانب۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ اسے تلاش کیا جائے اور بات صرف ٹرک ہی کی نہیں تھی' صفدر کی بھی تھی۔ صفدر جو اپنے چند روزہ ساتھ میں میرے دل پر اپنی دوستی اور محبت کے انمٹ نقوش چھوڑ گیا تھا۔ وہ ٹرک کے ساتھ ہی لاپتا ہو گیا تھا۔ اس کا تصور ہر وقت میرے ذہن سے چپکا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انجم کی سوال پوچھتی آنکھوں کا تصور بھی ــــ صفدر انجم کی محبت ہی نہیں اس کی زندگی بھی تھا۔

مجتبیٰ کنور کسی اور ٹائپ کا شخص تھا۔ وہ اپنے ہر فیصلے کو حرفِ آخر سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہی طرزِ عمل ٹھیک ہے جو اس کے نزدیک ٹھیک ہے۔ ایسے شخص کو دلیل اور منطق سے اپنا ہم خیال بنانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میں مجتبیٰ کے مزاج کی اس گرہ کو اچھی طرح دیکھ اور پرکھ چکا تھا ــــ اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ چھنا چھن کی آواز آئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ سائیں عالی لمبے چوغے میں ملبوس اپنے ننگے پاؤں کو حرکت دیتا میری سمت چلا آ رہا تھا۔ حسبِ معمول اس کے بال جٹاؤں کی صورت کندھوں پر بکھرے تھے۔ گلے میں آویزاں' بے شمار مالاؤں اور گھنگھروؤں میں سے چھنا چھن کی آواز آ رہی تھی۔ سائیں کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز بھیانک زخم کا پرانا نشان تھا۔

ایک بیرا تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ "معاف کرو بابا جی! باہر چلو"

سائیں عالی لجاجت سے دانت نکالنے کے بجائے حلق کے بل دہاڑا۔ "ترخان ہو جا مردود۔ پیچھے ہٹ۔ ہمیں اپنے یار سے بات کرنے دے۔"

سائیں عالی کے لب و لہجے کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف بیرے سہم گئے بلکہ موٹا توندوالا منیجر بھی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے بیٹھے سائیں کے جاہ و جلال کا معترف ہو گیا۔ سائیں عالی شانِ بے نیازی سے میزوں کے درمیان سے گزرا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اپنی بے حد چمکیلی آنکھوں سے میری حیرانی ملاحظہ کرتا رہا پھر بغیر کسی تمہید کے بولا "بیٹا! جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہے۔ وہ ہے جو نظر نہیں آتا ہے۔ جس راستے پر چل رہے ہو چلتے رہو۔ تم وہیں پہنچو گے جہاں پہنچنا چاہتے ہو۔ ہاں ہاں' چلتے رہو ــــ مجتبیٰ کنور کے پیچھے۔ اسے خود پتا نہیں وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ وہیں جا رہا ہے جہاں تم جانا چاہ رہے ہو۔"

"مم ــــ میں کچھ سمجھا نہیں سائیں" میں نے کہا۔

"سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں" وہ بولا "بس تمہیں کہہ رہا ہوں ناکہ مجتبیٰ کے پیچھے چلتے جاؤ۔ ہاں چلتے جاؤ اس بے خبر کے پیچھے۔"

"لیکن آپ یہاں کیسے پہنچے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"بس بس زیادہ سوال مت کرو۔ ورنہ میں شفیع محمد کو بلوا لوں گا۔" وہ تحکم سے بولا۔

اس نے "حق ہو" کے چند فلک شگاف نعرے لگا کر

ریستوران میں سنسنی کی لہر دوڑائی اور جیسے اچانک آیا تھا ویسے ہی باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ ریستوران میں موجود لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں خود بھی حیران تھا کہ یہ سائیں عالی وقتاً فوقتاً ایک دم کہاں سے آٹپکتا ہے۔ وہ کسی سائے کی طرح میرے تعاقب میں تھا اور میرے معمولات کی اسے پوری اطلاع رہتی تھی۔ کبھی کبھی میرے دل سے صدا اٹھتی تھی کہ یہ شخص گوشت و پوست کا ہونے کے باوجود گوشت و پوست کے انسانوں سے بہت مختلف ہے۔

سائیں عالی ذو معنی باتیں کرکے گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں مجتبیٰ کنور کے ساتھ لگا رہوں۔ نجانے کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ جب تک کوئی دوسری اچھی تجویز ذہن میں نہیں آتی' میں سائیں عالی کی ہدایت پر ہی عمل کرلوں۔ میں ریستوران سے اٹھا اور اسی ارادے کے ساتھ واپس مجتبیٰ پیلس کی طرف چل دیا کہ اگلے چند روز وہیں پر قیام کروں گا۔

○☆○

میں مجتبیٰ پیلس واپس پہنچا تو مجتبیٰ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے نیلے پردوں والی سٹرا ؤل رائسن پورچ میں کھڑی دیکھی۔ انیکسی کے لان میں زریں گل اور بوٹا سنگھ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور شام کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ زریں گل کے چہرے پر دنیا جہان کا تفکر سمٹا ہوا تھا جیسے دنیا کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالا دینے کی تمام تر ذمے داری اسی پر عائد ہوتی ہو۔ میں نے جب بھی اسے اخبار پڑھتے دیکھا' یہی پریشانی اور تشویش اس کے چہرے پر دکھائی دی۔ حتیٰ کہ جمعہ میگزین یا فلمی صفحہ پڑھتے ہوئے بھی اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اخبار ہاتھ میں لیتے ہی چہرے پر "تشویش" سجالینی چاہیے۔

اس سے قبل کہ میں بوٹا سنگھ اور زریں گل کو مخاطب کرتا' وہ میری طرف متوجہ ہوتے' ایک جانب سے خدا بخش عرف الٰہ دین کے چراغ کا جن نمودار ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ مجتبیٰ صاحب کافی دیر سے میری راہ دیکھ رہے ہیں۔

میں نے خدا بخش کو بتایا کہ جس کرولا گاڑی پر میں گارڈن ٹاؤن گیا تھا' وہاں ایک بغلی سڑک پر بند پڑی ہے' اسے وہاں سے منگوالیا جائے۔ خدا بخش نے کہا "بہت بہتر جی" میں نے گاڑی کی چابی اسے دے دی اور خود مجتبیٰ صاحب سے ملنے کے لیے نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ مجتبیٰ ایک بانکا ڈھیلا لباس پہنے ہوئے صوفے پر نیم دراز تھا اور سگار پھونک رہا تھا۔ اس نے بے تکلف لہجے میں میرے سلام کا جواب دیا اور سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ محبوبہ سے ملنے کے بعد اس کا موڈ بحال تھا اور ہونٹ خوشگوار انداز میں بھنچے ہوئے تھے۔ پوچھنے لگا "کیا بات ہوئی تھی۔ واکی ٹاکی کیوں استعمال نہ کیا؟"

"آپ خود ہی دیکھ لیں جی" میں نے واکی ٹاکی جیب سے نکال کر اسے تھما دیا۔

وہ کچھ دیر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا "واقعی یہ تو کام نہیں کررہا ہے..... بہرحال ڈیل ڈن۔ تم نے بروقت فیصلہ کیا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے گاڑی ترچھی کرکے سڑک پر بند کردی تھی؟"

"اس کے سوا مجھے کچھ سُوجھا ہی نہیں" میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرایا "حاضر دماغی مجھے اچھی لگتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو میں ایسے لوگوں کا دیوانہ ہوں لیکن ایک بات پر میں حیران ہوں۔ تم جیسے حاضر دماغ اور ہوشیار شخص کی محبوبہ تم سے کیسے چھین لی گئی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے یہ غم جان بوجھ کر گلے لگایا ہے..... وہ جیسے پرانے زمانے کی روتی دھوتی فلموں میں دلیپ کمار کیا کرتا تھا' وہ سب کچھ کرتا ہے مگر محبوبہ سے شادی نہیں کرتی۔ اگر شادی ہو بھی رہی ہو تو خود ہی اس کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ اور پھر اٹھارہ اٹھارہ گانے ایک فلم میں گاکر آخر میں موت کو گلے لگالیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان فلموں نے ایک طرح کی خود اذیتی کو رواج دیا تھا اور یہ رواج کسی نہ کسی طور آج تک چل رہا ہے"

میں نے کہا۔ "شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ میں نے یہ شادی جان بوجھ کر نہیں کی ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں میں جس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں اس میں گھر گرہستی کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ ایک بھلی مانس شریف لڑکی کو اپنے ساتھ خراب کرنے کے بجائے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے کوئی دوسرا راستہ چننے دوں۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔" مجتبیٰ نے بیزاری سے سگار ایش ٹرے میں مسلا "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ جو دوسرا راستہ اس نے چُنا ہے وہ خرابی کا نہیں ہوگا..... بہرحال میں اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتا لیکن تمہارے لیے میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ تم صرف ایک بار "ہاں" کہہ دو۔ وہ لڑکی جہاں اور جس حال میں بھی ہوگی تم تک پہنچ جائے گی۔"

میں نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔ "جناب' میں آپ کی مہربانیوں کا بہت ممنون ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔"

"اوکے" مجتبیٰ نے سگار بکس سے نیا سگار نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے دونوں ساتھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی موجودگی میں تم خود کو یہاں زیادہ "ایزی" محسوس کروگے۔ باقی کسی بھی قسم کی ضرورت ہو' خدا بخش سے کہو۔ خدا بخش نہ ہو تو سکندر ہے۔ سکندر چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں مجتبیٰ کنور سے رخصت ہوکر انیکسی میں واپس آگیا۔ آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں مجتبیٰ نے سیاہ مارک ٹو کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی' نہ ہی کوٹھی نمبر ایچ اے ۲۲ کے حوالے سے کوئی وضاحت کی تھی اور میں تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ از خود یہ موضوع چھیڑتا۔

بوٹا سنگھ اور نیں گھ زریں کی موجودگی میں مجتبیٰ پیلس کا قیام ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوتا لیکن میں جس ذہنی کرب سے دوچار تھا اس نے مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیا۔ میں نے اب تک زریں اور بوٹا کو غزالہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن وہ میرے رویے سے بھانپ چکے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی سانحہ مجھ پر گزر چکا ہے۔ اگلے چار پانچ روز میں مجھ پر کچھ اہم انکشافات ہوئے۔ ان انکشافات کا تعلق مجتبیٰ کی نجی زندگی سے تھا۔ مجتبیٰ ایک دل پھینک شخص مشہور تھا۔ آج کل اس کا معاشقہ سلمان آذر نامی ایک جواں سال بینکر کی خوبرو بیوی ناہید سے چل رہا تھا۔ ناہید آذر ایک بچے کی ماں تھی اور اُمرا کے حلقوں میں "پریٹی گرل" کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور عمومی طور پر اس فیملی کو بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ درحقیقت یہ حکمران پارٹی کے ایک نوجوان رومانی سیاستدان اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ماڈرن لڑکی کا معاشقہ تھا۔ دونوں شادی شدہ اور بال بچے دار تھے۔ اپنی جگہ دونوں کی بہت سی مجبوریاں تھیں اور ان گنت سماجی بندھنوں نے دونوں کو جکڑ رکھا تھا مگر وہ بڑی خاموشی سے ایک اسکینڈل کو پروان چڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ مجتبیٰ ایک بے خوف اور دلیر شخص تھا۔ اقتدار و اثر و رسوخ نے اس کی دلیری کو دو آتشہ کردیا تھا اور جب مرد دلیر و بااختیار ہو تو اس کی عورت کو شکار کرنے کی صلاحیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ابھی مجتبیٰ و ناہید کے پیار کا قصہ عام نہیں ہوا تھا اور گنے چنے افراد کو ہی اس بارے میں پتا تھا لیکن یہ بات تادیر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

تین روز بعد ہفتہ وار چھٹی تھی۔ ہفتے کی رات کو مجتبیٰ نے اپنی ۳۶ ویں سالگرہ کا کیک کاٹا۔ یہ کیک ایک شاندار تقریب میں کاٹا گیا۔ ہائی جنٹری کے تقریباً چھ درجن خواتین و حضرات اس تقریب میں موجود تھے۔ صاحبان زر مُوٹی موٹی انگلیوں میں سگار و پائپ دبائے پھر رہے تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں جام بھی نظر آرہے تھے۔ خواتین جدید ترین فیشن کے کپڑوں میں ملبوس اپنے اپنے ہیئر اسٹائل اور میک اپ پر نازاں ٹولیوں کی صورت میں کھڑی مصروف گفتگو تھیں۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں کوک کے گلاس تھے اور کچھ نے سگریٹ بھی سُلگا رکھے تھے۔ وہ بڑی روانی سے گاڑیوں کے نئے ماڈلز' نئی فلموں اور نئے اسکینڈلز کی باتیں کررہی تھیں۔ گاہے گاہے سُریلے قہقہوں کا جلترنگ بج اٹھتا تھا۔ مجھے اس گہما گہمی میں ناہید بھی نظر آئی۔ اپنے چھریرے بدن اور لمبے ریشمی بالوں کی وجہ سے وہ بہت ممتاز نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک جھلملاتی ساری پہن رکھی تھی۔ گلے میں سچے موتیوں کا ہار تھا۔ ناہید کے ساتھ اس کا شوہر آذر بھی تھا۔ وہ درمیانے قد کا ایک قبول صورت شخص تھا۔ رنگ سفید اور ہونٹ ضرورت سے زیادہ سرخ تھے جیسے ان پر سرخی لگائی گئی ہو' پیشانی سے بال اُڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی بے تکلفی سے مجتبیٰ کے قریب کھڑا ہے' دونوں ہنس ہنس کر باتیں کررہے ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ اپنی بیوی اور مجتبیٰ کے "پھلتے پھولتے" تعلقات کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ پیار کرنے والوں کی دنیا جُدا ہوتی ہے۔ وہ بھری محفل میں بھی ہوں تو تنہائی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہیں لہٰذا اردگرد سے بالکل بے خبر ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں اکثر ان سے ایسی حرکتیں بھی سرزد ہوجاتی ہیں جو دوسروں کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ میں اس تقریب میں اسی ساری تھیوری کو پریکٹیکل کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ مجتبیٰ اور ناہید کی نگاہیں بار بار ملتی تھیں اور ان نگاہوں کے ملنے سے ایک شرارہ سا چھوٹ جاتا تھا۔ معلوم نہیں اس شرارے کو اور کتنے لوگ دیکھ رہے تھے بہرحال میں بخوبی دیکھ رہا تھا۔ بھری پُری محفل میں نگاہوں اور مسکراتے ہونٹوں کی جنبش سے ایک دلچسپ کھیل کھیلا جارہا تھا۔ ایک نادیدہ ڈوری سی تھی جو میزبان اور خوبصورت مہمان کے درمیان تنی ہوئی تھی۔

کیک کٹ جانے کے بعد رقص کا دور چلا۔ رقص گاہ کے چمکیلے سیاہ فرش پر روشنیوں اور رنگوں کا سیلاب سا آگیا۔ آرکسٹرا "چاچاچا" کی دھن بکھیرنے لگا۔ خوشنما جوڑے باہوں میں ہاتھ ڈال کر اور جسم سے جسم ملا کر محو رقص ہوگئے۔

آرکسٹرا نے کئی دھنیں بجائیں اور وقفے وقفے سے رقص کے تین دور ہوئے۔ اس دوران میں پارٹنر بھی بدلے جاتے رہے۔ ایک موقعے پر میں نے مجتبیٰ کو ناہید کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس موقعے پر میری نگاہوں نے آذر کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس تقریب میں جاگیردار قادر زماں بھی اپنے دو ہونے باڈی گارڈز سمیت موجود تھا۔ دو تین بار اس سے میری آنکھیں چار ہوئیں لیکن حیرت انگیز طور پر وہ لاتعلق رہا۔ بالکل بے گانہ نظر آرہا تھا وہ۔ نہ اس کے چہرے پر مجھے دوستی نظر آئی اور نہ دشمنی۔ ساری حالات کی بات تھی۔ کسی عام شخص نے معمولی سی غلطی بھی کی ہوتی تو قادر زماں اپنے عقوبت خانے میں لے جا کر اس کی کھال کھینچ لیتا۔ میں نے ڈنکے کی چوٹ پر اس سے ٹکر لی تھی۔ اس پر راتفل تان کر اسے ہینڈز اپ کرایا تھا اور دو نہایت قیمتی بونوں سے اسے محروم کیا تھا لیکن وہ نہ تو مجھ پر بجلی بن کر گرا تھا اور نہ اس نے میری کھال کھینچنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ سب اس لیے تھا کہ میں مجتبیٰ کنور کا منظور نظر بن کر اس کے سایۂ عاطفت میں آگیا تھا۔

ڈنر کے بعد مہمانوں نے ساغر و مینا سے جی بھر کر دل بہلایا۔ یہ محفل نشاط و طرب رات ڈھائی بجے تک برپا رہی۔ پھر مہمان جانا شروع ہوگئے۔ کچھ پاؤں پر چل کر گئے اور کچھ کو ان کے ڈرائیوروں اور گارڈز وغیرہ نے سہارا دے کر گاڑیوں تک پہنچایا۔ ایک مشہور و معروف صنعت کار کو باقاعدہ گود میں بھر کر پارکنگ لاٹ تک پہنچانا پڑا۔ اتنا طفیلی ہونے والوں میں ناہید کا شوہر نامدار سلمان آذر بھی شامل تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ از خود گاڑی ڈرائیو کر کے گھر پہنچ سکتا۔ مجتبیٰ کنور نے اپنے ذاتی ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ مسٹر اور مسز آذر کو مرسیڈیز میں ان کے گھر تک پہنچا دے۔ مجھے حفاظت کی غرض سے ان دونوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ یوں تو مجتبیٰ کنور عموماً مہذب و شائستہ لہجے میں بات کرتا ہی تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ناہید کی موجودگی میں اس کی تہذیب اور شائستگی انتہا کو چھو رہی ہے۔

گاڑی مجتبیٰ پیلس سے روانہ ہو کر نیم تاریک سنسان سڑکوں پر پھسلنے لگی۔ ناہید اپنے شوہر کے ساتھ پچھلی نشست پر تھی جب کہ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آذر ترنگ میں الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا۔ کسی وقت پچھلی نشست سے پچ پچ کی آواز آتی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ گاڑی میں ہی بیوی سے محبت جتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی وقت وہ لمبی لمبی سرد آہیں بھرنے لگتا۔ پھر وہ مجتبیٰ کنور کی شان میں قصیدے پڑھنے لگا۔ "مجتبیٰ صاحب بڑے اچھے ہیں۔ بڑے بڑے بڑے ہی اچھے ہیں۔ ہیں نا ناہید؟ دیکھو کتنے مہربان ہیں۔ ہمیں اپنی گاڑی میں بھیج دیا ہے۔ کہتے تھے، میں تمہیں اپنے ساتھ امریکا کے دورے پر بھی لے جاؤں گا۔ ہا! امریکا 'واشنگٹن ڈی سی' وہائٹ ہاؤس گوری گوری پنڈلیوں والی گوری گوری میمیں"

آذر اور ناہید کو گارڈن ٹاؤن میں ان کے گھر اتار کر ہم مجتبیٰ پیلس واپس روانہ ہوگئے۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں بلاحظہ فرمائیں۔

تاوان
4

تاوان

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت

اس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا۔ وہ پیدا ہوا تو اس کا نام شاہ جہاں رکھا گیا مگر دنیا نے اسے جہانی استاد کے نام سے پہچانا۔ کڑی ہوتی گئی تو منزلیں اس کے روبرو خم ہوتی رہیں۔ جرم کی دنیا کے بڑے بڑے روشن نام اس کے ساتھ تھے۔ قانون کے محافظوں کے لیے وہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کے لیے اس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔ لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی مصروبیں اس کا مقدر بنیں لیکن گردشِ حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ زندگی جہانی استاد سے مزید تاوان کی طلبگار تھی۔ حالات کی ایک منہ زور کروٹ اسے کچھ نئے اور انجانے راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادلِ ناخواستہ اس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

اس واقعے کے بعد کاروان ٹاؤن کے اس خوشنما بنگلے میں میرا کئی دفعہ آنا ہوا۔ مجتبیٰ کی سالگرہ کے ایک ہی ہفتے بعد آذر کسی دفتری کام سے بیرون ملک چلا گیا تھا۔ اسے پہلے تھائی لینڈ جانا تھا اور وہاں سے ہانگ کانگ۔ یہ دن مجتبیٰ کنور کے لیے غنیمت تھے۔ وہ اکثر دن کے کسی حصے میں اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالتا اور ناہید کو ٹیلی فون کرنے بیٹھ جاتا۔ میرے علم کے مطابق ایسی ٹیلی فون کالز بہت طویل اور قہقہوں و سرگوشیوں سے معمور ہوتی تھیں۔ اس دوران میں دو تین دفعہ مجتبیٰ رات کے اندھیرے میں کاروان ٹاؤن بھی گیا۔ وہ پرانے ماڈل کی پردوں والی ڈاٹسن پر بڑی رازداری سے نکلتا تھا۔ اس "مہم" پر روانہ ہوتے وقت وہ سیاہ شیشوں والی عینک اور پی کیپ بڑے اہتمام سے پہنتا تھا۔ حفاظت کے نقطۂ نظر سے وہ مجھے اپنے ساتھ لے لیتا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرنے کی ذمے داری بھی میری ہوتی تھی۔ ہم نو اور دس بجے کے درمیان کاروان ٹاؤن پہنچتے۔ کوٹھی نمبر ایچ اے ۴۲ کا گیٹ ہمیں کھلا ملتا۔ میں گاڑی سے اتر کر گیٹ کو دھکیل کر راستہ بناتا اور گاڑی اندر لے جاتا۔ گھر میں ناہید کے علاوہ اس کی ایک عزیزہ فرزانہ بھی قیام پذیر تھی۔ وہ ایک تیز و طرار نوخیز لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر ملازم بھی تھا لیکن وہ معلوم نہیں کوٹھی کے کس حصے میں رہتا تھا۔ ہم نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ بس کبھی کبھار اس کے کھانسنے کی مدھم آواز آجاتی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے ہی مجتبیٰ کنور عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چلا جاتا، میں سجے سجائے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھتا۔ ناہید کی عزیزہ آتے جاتے مجھے کن انکھیوں سے دیکھتی رہتی۔ اس کی آنکھوں میں میرے اور مجتبیٰ کے لیے ناپسندیدگی کی پرچھائیاں تیرتی رہتی تھیں تاہم اس نے کبھی زبان سے اظہار نہیں کیا۔ جب مجتبیٰ ناہید کے ساتھ کمرے میں ہوتا، وہ بچے کو وھیل چیئر پر لے کر لان یا برآمدے میں ٹہلتی رہتی۔ جوانی اس پر ٹوٹ کر برسی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے فیشن ایبل لباس میں سرکش موجوں کے ریلے کو سنبھالے پھرتی ہے۔ مجتبیٰ ہی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ وہ آذر کی کزن ہے اور اس رشتے سے اسے ناہید کی نند بھی کہا جاسکتا ہے تاہم ناہید کے ساتھ بھی اس کے گہرے مراسم ہیں کیونکہ وہ دونوں راولپنڈی کی ایک ہی کالونی کی رہنے والی ہیں۔ (دونوں کے والد گہرے دوست تھے) ایک روز رات نو بجے کے قریب جب میں اور مجتبیٰ ڈاٹسن میں کاروان ٹاؤن کی طرف آرہے تھے تو مجتبیٰ نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔ اس کا لہجہ حسبِ معمول تحکمانہ تھا لیکن اس تحکم میں پہلی بار مجھے بے تکلفی کی ہلکی سی آمیزش بھی محسوس ہوئی، کہنے لگا۔ "شاہ جہاں! ایک کام کرو۔ اس دوسری لڑکی کو ذرا ہاتھ میں کرلو۔"

"کک ۔۔۔ کون سی لڑکی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی آذر کی کزن فرزانہ ۔۔۔ میرا مطلب ہے تم بیٹھے بور ہوتے رہتے ہو۔ تمہارا وقت اچھا کٹ جایا کرے گا۔"

میری حیرت دوچند ہوگئی۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی مشکل بات کہہ رہا تھا۔ ایک نامور سیاستداں، حکمران پارٹی کا ایک نہایت اہم فرد جس کے کندھوں پر بسا اوقات ملک و قوم کی بہتری سے متعلق اہم ترین ذمے داریاں ڈال دی جاتی تھیں،

کتنی گھٹیا اور پوچ بات کر رہا تھا۔ وہ جواں سال ہونے کے باوجود ایک رُعب دار شخصیت کا مالک تھا لیکن اس وقت اس کے منہ سے بے رُعب بات نکلی تھی۔ میں جانتا تھا' وہ مشورہ نہیں دیتا' صرف حکم دیتا ہے۔ اس وقت بھی وہ حکم دے رہا تھا لہٰذا میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس نے میری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور زیرِ لب مسکرانے لگا۔ میں نے اس کی یہ مدھم مسکراہٹ عقب نما آئینے میں دیکھی۔

میں مجتبیٰ کے حکم نما مشورے کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ یقیناً اسے خدشہ تھا کہ فرزانہ کہیں ان ملاقاتوں کا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ وہ اسے بے دست و پا کرنے کے لیے میرے ساتھ نتھی کرنا چاہ رہا تھا۔ خدشات کی پیش بندی کا یہ انداز گھٹیا ہونے کے باوجود بہت عیارانہ تھا۔ اس روز ہم کوٹھی پہنچے تو ناہید کے علاوہ فرزانہ بھی ڈرائنگ روم ہی میں موجود تھی۔ مجتبیٰ نے جان بوجھ کر میری موجودگی میں فرزانہ کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کیں' پھر فرزانہ کو یہ ہدایت دے کر کہ مجھے بہت اچھی سی چائے پلائے' ناہید کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

فرزانہ بدستور ناراض ناراض دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کھٹ پٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ملازموں کا داخلہ کوٹھی کے اس حصے میں ممنوع تھا لہٰذا فرزانہ کو خود ہی چائے والی ٹرالی دھکیل کر لانا پڑی۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ فرزانہ سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ کم از کم وہ میرے ساتھ ہنسنے بولنے لگے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کوشش کی۔ پہلے تو اس نے کسی بات کا سیدھے منہ جواب نہیں دیا پھر وہ تھوڑا تھوڑا کھلنے لگی۔ ڈیڑھ پون گھنٹے کے بعد وہ اچانک مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ کچھ لڑکیاں ایسی ہی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ کہاں تو یہ کہ سیدھے منہ بات نہیں کرتیں اور کہاں یہ کہ ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے۔ میں صرف عشق محبت کے معاملات کی بات نہیں کر رہا۔ عام حالات میں بھی کچھ لڑکیاں ایسے ہی رویے کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ وہ خود کو پامسٹ بھی سمجھتی تھی۔ پہلی ہی فرصت میں میرا ہاتھ دیکھنے بیٹھ گئی۔

"لائیے ہاتھ ادھر لائیے" وہ بڑی ادا سے بولی۔ "دیکھیں اس سے پہلے کیا کیا گل کھلائے ہیں آپ نے" بہت ذومعنی فقرہ تھا۔ یعنی وہ برملا کہہ رہی تھی کہ میں یہاں بھی کوئی گل کھلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر چونک گئی۔ "ارے آپ کو تو سخت بخار ہے۔" اس نے اپنے سرد ملائم ہاتھ سے میرا ماتھا چھوا اور پھر میز کی دراز سے تھرمامیٹر نکال لائی۔ اس کی اطلاع پر میں بھی چونک گیا۔ واقعی مجھے بخار تھا اور میں کئی روز سے محسوس بھی کر رہا تھا لیکن کبھی اس کیفیت پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ غزالہ کا غم ایک آگ کی طرح میرے لہو میں سرایت کر گیا تھا اور ہر وقت رگ رگ کو جلاتا رہتا تھا۔ مجھے یاد آیا' میری بہن شگفتہ میری ذرا سی تکلیف کو میری آنکھوں سے بھانپ لیا کرتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہوتی تو میری یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھتی۔ کیا مجال تھی میری کہ میں بستر سے پاؤں بھی نیچے اتار سکتا۔ وہ میرے لیے گھر پر ڈاکٹر بلاتی اور پھر مستقل طور پر میری پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ کھانا پینا' ہاتھ منہ دھونا' لباس تبدیل کرنا' سب کچھ بستر پر ہی ہوتا۔ وہ ایسی ہی خبطی تھی میرے حوالے سے۔ اب کون تھا جو میرا خیال رکھتا؟ میں خود بھی اپنا خیال رکھنے کے لیے اپنے مقام پر موجود نہیں تھا۔

کسی کے بے رحم فیصلے نے ابدی جدائی کی سزا سنا کر مجھے اس سے دور کر دیا تھا۔ اب حالات کی ستم ظریف آندھی تھی اور میں اس میں بے سمت اُڑا چلا جا رہا تھا۔

فرزانہ میرا ہاتھ دیکھ رہی تھی اور میرے بارے میں بہت سی پیش گوئیاں کر رہی تھی لیکن اس کی پہلی پیش گوئی سننے کے بعد میں نے کسی اور پیش گوئی کو قابلِ غور ہی نہیں جانا۔ اس نے کہا تھا۔ "آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ جسے ٹوٹ کر چاہیں گے' اسے پا لیں گے۔"

اس رات مجتبیٰ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا۔ ہم دس بجے وہاں پہنچے تھے۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ مجتبیٰ عینک اور ٹوپا پہنتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا' مجھے اور فرزانہ کو اکٹھے بیٹھے دیکھ کر اس کے باریک ہونٹوں پر پھر ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈاٹسن میں بیٹھے مجتبیٰ پیلس کی طرف رواں تھے۔ مجتبیٰ پیلس پہنچ کر مجتبیٰ حسبِ معمول پورچ میں اتر گیا' میں گاڑی کو گیراج کی طرف لے گیا۔ گیراج پورچ سے کافی فاصلے پر کوٹھی کے ایک نیم تاریک حصے میں تھے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی۔ میں ڈاٹسن کو بند کر کے شٹر گرا رہا تھا جب اچانک پیڑوں کے عقب سے کچھ سائے برآمد ہوئے اور مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے انداز میں اپنے چہرے ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے۔ یہ کل تین افراد تھے۔ دو شلوار قمیص میں اور ایک پتلون بشرٹ میں تھا۔ ایک شلوار قمیص والے نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا اور دوسرے نے سامنے سے چہرے پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ دو زوردار مکے کھا کر میں نے

بھی سنبھالا لیا اور دونوں ٹانگیں ایک ساتھ چلا کر سامنے والے شخص کو کئی گز کی دوری پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر کا عقبی حصہ اس شخص کی ناک سے ٹکرایا جس نے مجھے پیچھے سے دبوچ رکھا تھا۔ یہ ضرب لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو پیچھے والا شخص ہوشیار ہو چکا تھا۔ اس لمحے کی سبقت کا فائدہ میں نے اٹھایا اور وہ شخص ایک کراہ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ میں گھوم کر اس کے سینے پر لات رسید کرنا چاہ ہی رہا تھا لیکن پتلون والا بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور اس نے میری متحرک ٹانگ کو اپنی ٹانگ کی ضرب سے روک دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے پناہ پھرتی سے ایڑی پر گھوما اور اس کے پاؤں کی چوٹ میرے جبڑے پر پڑی۔ یہ آنکھوں میں تارے نچا دینے والی چوٹ تھی۔ میں لڑکھڑا کر ایک درخت سے ٹکرایا۔ عین اسی وقت میں نے مدِمقابل کو ایک بار پھر ایڑی پر گھومتے دیکھا۔ ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو میرا جبڑا ایک بار پھر نشانہ بنتا اور اس مرتبہ یقیناً ناک نقشے کا بگڑنا ہی جاتا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا اور تڑپ کر مدِمقابل کی زد سے دور نکل گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔ دو مرتبہ مجھے اپنی خطرناک کک کا نشانہ بنانے والا یقیناً جلیل کمانڈو یا اس کا کوئی ہونہار شاگرد تھا۔ باقی دو افراد بھی مجتبیٰ کے سیکورٹی گارڈز میں تھے۔ ان کے دلوں میں پلنے والی رقابت اس تاریک و سنسان رات میں انہیں میرے سامنے لے آئی تھی۔ ایک ایک چوٹ کھا کر شلوار قمیص والے دونوں افراد تو پیچھے ہٹ گئے' اب پتلون شرٹ والا میرے سامنے تھا۔ ہم دونوں ہاتھ پھیلائے یوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے جیسے یہ مجتبیٰ پیلس کا نیم تاریک گوشہ نہ ہو' کوئی اسٹیج ہو اور ہم چاروں طرف بیٹھے ہوئے سیکڑوں تماشائیوں کو دنگل دکھانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہیں بتایا ہے' میں نے تمام مارشل آرٹس کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھا ہے اور ان کے بنیادی قاعدوں کے بارے میں جانتا ہوں لیکن میں نے ان میں سے کسی آرٹ کو باقاعدہ اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ہنگامہ خیز زندگی کی تیز رفتاری میں مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔ جیسے بہت بھوکا شخص چھری کانٹے کا تکلف کیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے' ایسی ہی ضرورت کے تحت میں بھی دیوانہ وار اپنے دشمنوں سے لڑتا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ میں کیا مار رہا ہوں اور کیا کھا رہا ہوں۔ دھیرے دھیرے میرا یہ فری اسٹائل پختہ ہو گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے مجھے اسٹریٹ فائٹر کہا اور میری لڑائی کو اسٹریٹ فائٹ کا نام دیا۔ یہ اسٹریٹ فائٹ تھی یا کوئی اور فائٹ تھی' میرے لیے بس یہی بات اہم تھی کہ میں اپنے اس فریبانہ اسٹائل کے ذریعے اپنا دفاع کرنے میں کامیاب رہتا تھا۔ جوڈو' کراٹے اور کنگ فو وغیرہ کے بہت سے مستند ماہرین کے چھکے میں نے اپنے اسی "نیچرل اسٹائل" سے چھڑائے تھے۔

میرا مدِمقابل کراٹے کا ماہر تھا لہٰذا میں نے اپنی نگاہیں اس کے پاؤں پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ جونہی اس نے مجھے "اِتمام" رسید کرنے کے لیے اپنے جسم کا وزن بائیں پاؤں پر منتقل کیا' میں تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کی لہراتی ہوئی دائیں ٹانگ کے نیچے سے نکل کر ایک زوردار ٹھوکر اس کی پشت پر جمائی۔ جس وقت یہ ٹھوکر لگی' مدِمقابل کی دائیں ٹانگ ہوا میں حرکت کر رہی تھی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ پایا اور دو قلابازیاں کھا کر گیراج کے نیم وا شٹر سے ٹکرایا۔ میں

ایم۔اے راحت کے قلم سے ایک نیا دھماکہ خیز ناول
عصرِ حاضر کی عکاسی
سرفروش
دو جلدوں میں مکمل
جرم و سزا کی ایسی داستان جو
معاشرے کی کمزور روایات کی
بھرپور عکاسی کرتی ہے۔
اپنے قریبی بک اسٹال سے خریدیں یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں
قیمت ۳۰/- روپے ۔۔۔ ڈاک خرچ ۲۵/- روپے
مکمل سیٹ۔ رقم بذریعہ منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ معاف
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۔۔۔ فون ۷۲۲۷۳۱۳

نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جست کی اور اس کے اوپر گرا۔ کراٹے کے کھلاڑی زیادہ تر ٹانگوں کا استعمال کرتے ہیں لہٰذا نیچے گر جانے کی صورت میں وہ زیادہ خطرناک نہیں رہتے۔۔۔ قریباً نصف منٹ تک ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہے۔ میرا مدمقابل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں ہر بار یہ کوشش ناکام بنا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اس کے آہنی گھونسوں اور کہنی کی ضربوں سے اپنا چہرہ بھی بچا رہا تھا۔ اسی کشمکش کے دوران میں مدمقابل کا ڈھاٹا کھل چکا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ جلیل کمانڈر ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے' اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ دانتوں سے میری گردن ادھیڑ دیتا۔۔۔ میں جلیل کمانڈر کے دونوں ساتھیوں سے چند لمحے کے لیے غافل ہوا تو یہ غفلت میرے سر پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی۔ جلیل کے ایک ساتھی نے عقب سے میرے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی تھی۔ بخار کی شدت سے سر پہلے ہی گھوم رہا تھا۔ اوپر سے یہ افتاد پڑی تو آنکھوں میں جگنو سے لپک گئے۔ یوں لگا کہ میں بے ہوش ہو کر ڈھے جاؤں گا لیکن پھر میرے اندر کی "فائٹنگ اسپرٹ" مجھے اس کیفیت سے نکالنے میں کامیاب رہی۔ میں نے پنڈلی سے اپنا رام پوری خنجر جدا کر لیا تھا۔ جونہی شلوار قمیص والا دوسری مرتبہ مجھے ضرب لگانے کے لیے آگے بڑھا' میں نے بے دریغ خنجر گھمایا۔ خنجر اس کی ران پر لگا اور وہ تڑپ کر دور جا گرا۔ جلیل کمانڈر بدستور میری گرفت میں تھا۔ میں دوسرا وار شاید اس کے جسم پر کرتا لیکن ایک آواز نے مجھے بُری طرح ٹھٹکا دیا۔ یہ مجتبیٰ کنور کی آواز تھی۔ وہ قریبی درختوں سے بالکل غیر متوقع طور پر نمودار ہوا تھا۔

"رک جاؤ شاہ جہاں" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ اس فائٹ کو کافی دیر سے ملاحظہ کر رہا ہے۔۔۔ اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھ پر یہ شب خون جلیل کمانڈر اور اس کے ساتھیوں کا ذاتی فعل نہیں تھا۔ میرا یہ قیافہ بالکل غلط تھا کہ ذاتی رقابت کی بنا پر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حملہ مجتبیٰ کے ایما پر کیا گیا تھا اور مجتبیٰ نے بھی یہ حملہ کسی عداوت یا رنجش کی بنا پر نہیں کروایا تھا۔۔۔ یہ صرف ایک کھیل تھا۔ اس کھیل کے ذریعے مجتبیٰ نے جلیل کمانڈر وغیرہ کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ مجھے بلاوجہ خصوصی اہمیت نہیں دے رہا۔ میں ان تینوں سے برتر ہوں بلکہ اس قابل ہوں کہ ایک ساتھ ان تینوں سے نمٹ سکتا ہوں۔

جلیل کمانڈر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی کھسیانے سے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی شلوار خون سے رنگین ہو چکی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے اپنی ران دبائے ہوئے تھا۔ مجتبیٰ کے اشارے پر جلیل کمانڈر نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور آہستگی سے بولا "ویل ڈن مسٹر شاہ جہاں"

مجتبیٰ نے زخمی باڈی گارڈ کو جلیل کمانڈر کے ساتھ مرہم پٹی کے لیے بھیج دیا۔ مجتبیٰ پیلس کے مین گیٹ پر موجود دو پٹھان چوکیدار بھی بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے تھے اور اب ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے کبھی مجتبیٰ اور کبھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجتبیٰ نے انہیں بھی واپس جانے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں اس گوشے میں اکیلے رہ گئے تو مجتبیٰ نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور حاکمانہ لہجے میں بولا "شاباش شاہ جہاں' تم نے خود کو اس مقام کا اہل ثابت کیا ہے۔ میں چاہتا تو جلیل کمانڈر اور تمہارے درمیان باقاعدہ مقابلے کا اہتمام بھی کرا سکتا تھا مگر پھر تمہارا یہ قدرتی انداز دیکھنے کو نہ ملتا۔"

میں نے کہا "جناب! آپ کا کہنا بالکل بجا ہے لیکن۔۔۔ مجھے بے حد افسوس ہوتا اگر اس سے کسی کو کوئی شدید نقصان پہنچ جاتا۔" میرا اشارہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی طرف تھا۔

وہ مسکرایا "ڈرامے کا یہ پارٹ واقعی ڈرامائی ثابت ہوا۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ تمہارے پاس یہ ڈراؤنی شے موجود ہے اور تم اسے اتنی شتابی سے استعمال بھی کر جاؤ گے۔۔۔ بہرحال آؤ میرے ساتھ' میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا ہوں۔"

وہ رخ موڑ کر نشست گاہ کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنی پتلون سے گرد جھاڑی۔ خنجر کو دوبارہ اس کے محفوظ ترین مقام پر لگایا اور مجتبیٰ کے پیچھے چل دیا۔ میری پسلیوں کے نیچے سے پھر شدید درد اٹھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ درد اس ضرب کی نشانی ہے جو بپھرے ہوئے شیخ عاصم نے مجھے اپنے وزنی بوٹ سے لگائی تھی۔ فرید کوٹ میں سیٹھ رام داس کی کوٹھی میں شیخ عاصم جنونیوں کی طرح مجھ پر پل پڑا تھا۔ لڑائی کے دوران میں مجھے سینے میں شدید درد محسوس ہوا تھا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کا کوئی اور سبب ہو۔ بخار کی کیفیت شدید ہوتی تھی تو یہ درد بھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر مجتبیٰ کنور نے اپنے لیے "ریڈ وائن" کا ایک جام بھرا اور پہلی بار مجھے بھی اشارہ کیا کہ

میں اپنے لیے ایک جام لوں۔ جلیل کمانڈر یا اس کے ہم کاروں میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجتبیٰ کنور کے سامنے بیٹھ کر ڈرنک کرے گا۔ میرا خیال تھا کہ شاید مجتبیٰ مجھ سے ناہید کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ آج کل اس کا معاشقہ بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا اور کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ مجتبیٰ کو ناہید کو پٹانے اور پھسلانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ اپنے مال اور قرب و جوار پر مجتبیٰ کی عقابی نظر رہتی تھی۔ وہ ہر معاملے کو اس کے "میرٹ" پر توجہ دینے کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اس نے گفتگو شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ان غیر ملکی مہمانوں کی بات چھیڑ رہا ہے جو ڈھائی تین ہفتے سے مجتبیٰ کی نہروالی کوٹھی میں مقیم تھے۔ وہ لوگ پندرہ دن کے دورے پر آئے تھے لیکن تین ہفتے گزرنے کے باوجود ابھی ان کے جانے کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے۔ مجتبیٰ دن میں کم از کم ایک بار نہروالی کوٹھی ضرور جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ابھی تک مسٹر کلارک کا انتظار کر رہے ہیں۔

سگار کا ایک بے حد گہرا کش لے کر مجتبیٰ بولا "تمہارے ساتھیوں میں سے ایک پٹھان ہے۔ اس کا کیا نام ہے؟"

"زریں گل" میں نے جواب دیا۔

"وہ بہت کام کا آدمی نظر آتا ہے' ہمارے لیے مفید ثابت ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "جناب! آپ دوسرے کے بارے میں بھی اس انداز میں سوچ سکتے ہیں۔ وہ مریل سا نشے باز ضرور نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بڑا طاقتور اور ذہین فطین شخص چھپا ہوا ہے اس کے اندر۔"

مجتبیٰ نے کہا۔ "بہرحال' میں مسٹر جی کلارک صاحب کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ وہ یہاں ایک بہت ضروری کام نمٹانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں پشاور جانا ہو گا۔ میں تمہیں اور تمہارے پٹھان ساتھی کو ان کے ساتھ بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں حتمی طور پر میں تمہیں کل شام تک بتا دوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "جی کلارک صاحب پاکستان کب پہنچ رہے ہیں؟"

وہ سگار کا دھواں چھوڑ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔۔۔ "جی کلارک صاحب تشریف لا چکے ہیں۔"

"کب؟" میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

"تین ہفتے پہلے۔ اسی روز جب ہم مہمانوں کو ائرپورٹ سے لے کر آئے تھے۔"

"میں۔۔۔ کچھ سمجھا نہیں"

مجتبیٰ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "جی کلارک صاحب انہی چار مہمانوں میں شامل تھے۔ وہ سرخ کوٹ والا فربہ اندام شخص جس کی کنپٹیاں بالکل سفید تھیں وہی جی کلارک تھا۔ جی کلارک صاحب ہمیشہ اسی طرح رازداری سے سفر کرتے ہیں۔"

"او گاڈ" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے وہ انتہائی سبز آنکھوں والا سرخ و سپید امریکی یاد آیا جو اکثر کوئی چیونگم قسم کی چیز چباتا رہتا تھا۔

دس پندرہ منٹ مجتبیٰ کنور مجھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر اس کے سیکرٹری نے بتایا کہ پروگرام کے مطابق چھوٹے تاجروں کا ایک وفد اس سے ملاقات کے لیے آ چکا ہے اور میٹنگ روم میں بیٹھا ہے۔ مجتبیٰ نے گھڑی دیکھی اور جلدی سے جانے کے لیے اٹھ گیا۔

اگلے روز خدا بخش نے مجھے اور زریں گل کو نہروالی کوٹھی میں پہنچا دیا۔ کوٹھی میں نوکروں چاکروں کی بہتات تھی۔ دونوں مہمان خواتین ایک سرسبز لان میں ٹینس سے دل بہلا رہی تھیں۔ ان میں ایک بڑی عمر کی سنہری بالوں والی بڑی بی تھیں۔ دوسری جواں سال تھی اور اس کی چھوٹی سی قدرے گول ناک اور چوڑی ٹھوڑی اس بات کی غماز تھی کہ اس کی رگوں میں خالص انگلش خون دوڑ رہا ہے۔ دونوں خواتین نیکرز میں تھیں لہٰذا انہیں دیکھ کر زریں گل نے بڑے بڑے منہ بنائے لیکن چور آنکھوں سے انہیں دیکھتا بھی رہا۔ یہیں پر مجھے دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی نظر آیا۔ یہ چینی یا جاپانی خدوخال والی ایک خاتون تھی لیکن اس کا قد کسی طرح بھی ساڑھے چھ' پونے سات فٹ سے کم نہیں تھا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ بے ڈھنگی نظر نہیں آتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جسم کا وزن قد کے مطابق تھا۔ وہ اپنے تراشیدہ سیاہ بال شانوں پر پھیلائے' ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے طمطراق سے ایک ایزی چیئر پر بیٹھی تھی اور انگلش اخبار پڑھ رہی تھی۔ قریب ہی تپائی پر چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔

زریں گل زیر لب بڑبڑایا۔ "استاد جی! یہ جاپانی بی بی کتنا لمبا ہے۔ اس کو درمیان میں سے کاٹو تو دو بابا شریف بن جائے گا۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ اگر اس نے سن لیا تو سر پر گھونسا مار کر زمین میں گاڑ دے گی۔"

لمبی تڑنگی عورت کے قریب ہی مجھے ایک اور چہرہ دکھائی

دیا اور میں بڑی طرح چونک گیا۔ یہ مجتبیٰ کا رقیب روسیاہ اور نابیہ کا شوہر نامدار سلمان آزر تھا۔ وہ بھی ایک ایزی چیئر پر بیٹھا اخبار کھنگال رہا تھا۔

میں نے سرگوشی میں خدا بخش سے پوچھا۔ "یہ وہی صاحب ہیں نا جو مجتبیٰ صاحب کی سالگرہ میں زیادہ چڑھا گئے تھے اور میں انہیں گھر چھوڑ کر آیا تھا۔"

"ہاں۔ سلمان آزر نام ہے ان کا۔ مسز نابیہ آزر کے شوہر نامدار ہیں۔ کیا سمجھے؟" خدا بخش معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

"لیکن یہ یہاں؟"

"ہانگ کانگ گئے ہوئے تھے۔ مجتبیٰ صاحب نے ہی بھیجا ہوا تھا۔ وہاں سے یہ طول طویل تحفہ لے کر آئے ہیں جو سامنے کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ لمبی لڑکی؟"

خدا بخش نے اقرار میں جواب دیا۔ "معلوم نہیں کیا معاملہ ہے۔ بہرحال سلمان آزر صاحب ہانگ کانگ سے اس لڑکی کے سوا اور کچھ نہیں لائے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے لان کے سامنے سے گزر گئے۔ وہاں پر موجود افراد میں سے کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی۔ برآمدے میں دو جسیم السیشن کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ مجتبیٰ پیلس کے ملازمین میں سے کئی جانے پہچانے چہرے بھی اس کوٹھی میں نظر آئے۔ مجتبیٰ مسٹر جی کلارک کو ہمارے بارے میں فون پر اطلاع دے چکا تھا لہٰذا ہمیں جلد ہی اندر بلا لیا گیا۔ مسٹر جی کلارک شب خوابی کا لباس پہنے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ دیکھنے میں ایک عام سا شخص نظر آتا تھا لیکن بغور دیکھنے اور بات چیت کرنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر ایک بھاری بھرکم اور بڑے دل و دماغ والی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ دیکھنے میں پچپن ساٹھ کا تھا لیکن اس کی اصل عمر اس اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے ایک ہی نظر میں ہم تینوں کا بغور جائزہ لے لیا اور میری طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "آئی تھنک یو آر مسٹر شاہ جہاں"

میں نے "ہاں" میں جواب دیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور زریں گل اور خدا بخش کو باہر بھیج دیا۔ وہ شستہ انگریزی میں بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کرتا تھا۔ کہنے لگا "مسٹر شاہ جہاں' میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجتبیٰ صاحب نے تمہیں کافی کچھ بتا دیا ہوگا۔ ہمیں آج رات گیارہ بجے پشاور کے لیے روانہ ہونا ہے۔ یہ روانگی مکمل رازداری سے ہوگی۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے لیکن ہم سفر علیحدہ علیحدہ کریں گے۔ پشاور میں بھی فی الحال ہمارا قیام علیحدہ ہوگا۔ پشاور میں ایک درمیانہ سا ہوٹل ہے۔ غالباً حبیب ہوٹل نام ہے اس کا۔ وہاں ہمارے لیے روم بک ہیں لیکن تمہارے لیے بہتر ہے کہ ہوٹل میں نہ ٹھہرو۔ کسی متوسط آبادی میں کرائے کا مکان لینا تمہارے لیے زیادہ مناسب رہے گا۔ مکان ملتے ہی تم حبیب ہوٹل کے کمرا نمبر ۲ میں مجھ سے رابطہ کرو گے۔ رابطہ ہونے کے بعد میں تمہیں آئندہ ہدایات دوں گا لیکن ایک بات یاد رہے ہم سب فرضی ناموں سے سفر اور قیام کریں گے۔ تاہم تم اور تمہارا ساتھی اپنے اصلی نام برقرار رکھ سکتے ہو۔ فرضی ناموں کی تفصیل تمہیں ابھی میرا اسسٹنٹ فراہم کردے گا۔"

میں نے پوچھا "میرے ساتھی زریں گل کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

وہ بولا "زریں گل مکان ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کرے گا اور پہلے دو تین روز تمہارے ساتھ ہی رہے گا۔ اس کے بعد ہم اسے ہوٹل میں بلالیں گے۔"

میں وہی کچھ جان سکتا تھا جو جی کلارک صاحب مجھے خود بتاتے اور وہ اتنی ہی بات بتا رہے تھے جو میرے لیے جاننا بس ضروری تھی۔ تاہم یہ بات ظاہر تھی کہ یہ کوئی بہت گمبھیر چکر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسٹر جی کلارک جیسا ارب پتی اپنی بے پناہ مصروفیات چھوڑ کر تین ہفتوں سے اس چار دیواری میں مقیم نہ ہوتا۔ وہ شخص جو اپنے ذاتی طیاروں میں سفر کرتا تھا، دنیا کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں جس کے لیے سوئٹ ریزرو رہتے تھے' وہ ایک معمولی کار پر لاہور سے پشاور تک کا سفر کر رہا تھا اور ایک عام سے گمنام ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا۔

حسب پروگرام ٹھیک گیارہ بجے ہم مجتبیٰ کنور کی اس کوٹھی سے پشاور کے لیے روانہ ہوگئے۔ مسٹر جی کلارک اور ان کے ساتھی کار پر روانہ ہوئے تھے جب کہ مجھے اور زریں گل کو خدا بخش ایک سوزوکی پک اپ پر بٹھا کر اسٹیشن چھوڑ آیا۔ موسم اب سرد ہونا شروع ہوگیا تھا۔ خاص طور پر رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ ان دنوں ائرکنڈیشنڈ و نیلی ریڈ وی سی آر سے آراستہ لگژری کوچ کا رواج نہیں ہوا تھا۔ جی ٹی ایس کی جس بس میں بیٹھے اس میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے اتنے ہی راستے تھے جتنے چھاننی میں چھید ہوتے ہیں۔ نشستوں کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ زریں گل جیسا کوتاہ قد تو سمٹ سمٹا کر بیٹھ سکتا تھا لیکن عام قامت کے شخص کی ٹانگیں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں یوں پھنسی تھیں کہ ہر جھٹکے پر گھٹنے "رگڑے پر رگڑا" سہتے تھے۔

زریں گل شروع میں تو خوش تھا لیکن جب بس نے ی کا پل پار کرکے رفتار پکڑی اور سرد ہوا نے سواریوں کا ج پوچھنا شروع کیا تو وہ بڑبڑانے لگا۔ "ہم بخت خود تو کار چلا گیا اور ام کو اس چھکڑے پر بٹھا گیا۔ یہ انگریز ہوتا ہی ایمان ہے۔ ایک دم کافر کا بچہ۔"

میں نے کہا۔ "لیکن یہ صاحب انگریز نہیں' امریکی ہیں۔"

وہ بولا۔ "امریکی ہوں یا روسی' ہیں تو انگریز۔ ان کے ن میں یہ کیڑا لگا ہوا ہے کہ ام آسمان سے نازل ہوا ہے ب کہ باقی مخلوق زمین سے اگا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اپنے میر صاحب نے اپنی فلموں میں ان فرنگیوں سے جو کچھ کیا ل ٹھیک کیا۔ ہر فلم میں مار مار کر بھرکس نکالا ہے ان بہن ، چھکنوں کا۔ آخا خا خا "بائی" "کار سین جب وہ جیل ے بھاگتا ہے اور پہاڑ پر سے فائرنگ کرتا ہے۔ آپ نے ھا ہوگا کہ فرنگی سپاہی کیسے ڈالس کر کر کے مرتا ہے۔ لاشوں ڈھیر لگا رہا تھا میر نے اور ۔۔۔ اور "عجب خان" کا وہ سین ب وہ گوری میم کو چھین کر لے جاتا ہے۔ قسم خدا کا' رے جیسے بے ایمان کا بھی ایمان تازہ ہوگیا تھا۔ اما را جی با تھا شد میر صاحب فرنگیوں کے سارے بدلے اس میم ے چکا دے لیکن وہ ایسا غیرت والا ہے کہ دشمن کی عورت طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور یہ صرف شد میر احب کا بات ہی نہیں ہے' ام نے اور بھی بہت سا فلم دیکھا ہے۔ محمد علی' یوسف خان' اکمل' مستوش' کون سا ہیرو ہے س کا فلم ام نے نہیں دیکھا۔ آپ ام کو کوئی ایک فلم بتا دیں س میں امارے ہیرو نے کسی فرنگی مرد یا عورت سے کسی ح کا زیادتی کیا ہو۔ امارا بے شمار احسان ہے ان لوگوں پر ن یہ ہے کہ مان کر نہیں دیتا۔ ام کو ہمیشہ چھکڑے میں بٹھاتا ہے اور خود ٹی گاڑی میں زوں کر کے نکل جاتا ہے۔"

منہ سے "زوں" کی آواز نکال کر جب زریں گل نے بڑھے ہاتھ کو گاڑی کے انداز میں حرکت دی تو وہ اگلی نست پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کے سر سے جا ٹکرایا۔ اس نے گھوم کر زریں گل کو گھورا۔ زریں گل جلدی سے میری رف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "ہاں انگریز ہے تو احسان فراموش ہی۔ اپنے اسے سارا ہندوستان دے دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ جتنی دیر چاہے ہماری نشانی سے حکومت کرے۔ پورے دو سو سال لوں نے یہاں گزارے اور جھوٹے منہ سے ایک بار بھی ہیں کہا' چلو یار تم بھی سال دو سال ہمارے ملک پر حکومت کرکے دیکھ لو۔ بڑا گورا ہے یہ انگریز۔"

زریں گل نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "حکومت کی بات تو بہت دور کی ہے جی' یہ معمولی سی بات ہی لے لیں۔ بندہ پوچھے' ابھی تم اپنے امیر کبیر شخص ہو۔ اپنے ملک سے لاکھوں روپے کرایہ خرچ کر کے یہاں آگئے ہو۔ یہاں سے تین چار ہزار روپیہ کرایہ خرچ کرکے ہوائی جہاز سے پشاور نہیں جاسکتا تھا۔ نہ صرف خود جاتا بلکہ ام کو بھی ساتھ لے کے جاتا۔ ام کہتے' ہاں بھئی کسی کھاتے پیتے بندے کے ساتھ پشاور جا رہے ہیں۔"

زریں گل کا خیال غالباً یہ تھا کہ جی کلارک صاحب نے کرایے کی بچت کے لیے "بائی روڈ" پشاور جانا بہتر سمجھا ہے اور ہمیں اس کھٹارا گاڑی کا ایندھن بنایا ہے۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس شخص کو کوس رہا ہے وہ لاہور سے پشاور تو کیا' زمین سے چاند پر جانے کا کرایہ بھی ادا کرسکتا ہے۔

زریں گل کی فلسفیانہ تقریر یقیناً کچھ دیر مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں گفتگو کرتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک بار پھر سامنے والے صاحب سے جا ٹکرایا۔ اس مرتبہ ان کی ٹوپی گرتے گرتے بچی۔ وہ تیزی سے گھومے اور زریں گل پر پشتو کی بوچھار کردی۔ زریں گل پہلے تو کھسیانی ہنسی ہنستا رہا پھر اس نے بھی اکھڑی اکھڑی پشتو میں چند جملے کہے۔ چند لمحے بعد دونوں پشتو دان خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اس جھڑپ کے بعد زریں گل کا سارا موڈ غارت ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دیر چپکا بیٹھا رہا پھر جھوم جھوم کر کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکرانے لگا۔ وہ سو چکا تھا۔

پشاور میں زریں گل واقعی کارآمد ثابت ہوا۔ وہ مجھے شہر کے ایک متوسط علاقے میں لے گیا۔ یہاں وہ چند پرانی ڈبلروں سے ملا۔ ایک دو جگہ قہوہ پیا' دو تین جگہ فر فر پشتو بولی اور دو کمرے کا ایک چھوٹا سا مکان ڈبگری بازار کے عقب میں حاصل کرلیا۔ مکان کے لیے ہمیں پانچ ہزار سکیورٹی ادا کرنی پڑی۔ زریں گل کے نزدیک یہ بہت بڑی رقم تھی لیکن اس خیال سے اسے تسلی تھی کہ رقم چھوٹی ہے یا بڑی لیکن ادا تو فرنگی کی جیب سے ہو رہی ہے۔

مکان لینے کے بعد ہم نے حسب ہدایت چوبیس گھنٹے آرام کیا۔ پھر جی کلارک صاحب کے دیے ہوئے فون نمبر پر ان سے رابطہ کیا۔ فون ان کے اسسٹنٹ ڈیوڈ نے سنا اور کہا کہ صاحب ابھی سو رہے ہیں' میں آدھ گھنٹے بعد دوبارہ رنگ کروں۔ آدھ گھنٹے بعد دوبارہ رنگ کیا تو جی کلارک صاحب نے مجھ سے میرا مکمل ایڈریس دریافت کیا اور مجھے "اسٹینڈ بائی"

رہنے کی ہدایت کی۔ اسی رات دس گیارہ بجے کے قریب ایک شخص نے ہمارے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک بند لفافہ دے کر خاموشی سے چلا گیا۔ وہ سرتاپا ایک گرم چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ چادر کی لپیٹ سے باہر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ چہرہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ لفافے پر "حبیب ہوٹل" کے الفاظ نمایاں تھے لہٰذا میں نے نامہ بر سے سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

لفافے میں سے ایک ٹائپ شدہ کاغذ برآمد ہوا۔ یہ تحریر مسٹر جی کلارک کی طرف سے تھی جو حبیب ہوٹل میں مسٹر البرٹ فورڈ کے نام سے قیام پذیر تھے۔ تحریر پر ان کے دستخط بھی موجود تھے۔ اس پیغام میں میرے لیے چند اہم ہدایات درج تھیں۔ بیس بائیس سطور پر بڑی وضاحت سے مجھے میرا کام سمجھایا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ کام مکمل ہونے پر میں فون پر اطلاع دوں۔ کام یہ تھا کہ مجھے اگلے روز سہ پہر تین بجے تک جناح گارڈن پہنچنا تھا' اور کم از کم چھ بجے تک وہاں رہنا تھا۔ اس عرصے میں مجھے وہاں صرف گھومنا پھرنا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ سفید پتلون قمیص پہنوں اور ٹائی آف وھائٹ ہو۔ جوتوں کا سیاہ ہونا ضروری تھا۔ ہدایات میں بتایا گیا تھا کہ سہ پہر تین سے چھ بجے کے درمیان ایک لڑکی مجھے ملے گی۔ اس کا رویّہ ایسا ہی ہوگا جیسے وہ اپنے کسی آشنا سے ملنے آئی ہے۔ مجھے بھی یہی رول کرنا ہوگا۔ وہ لڑکی مجھے جو چیز سونپے گی وہ مجھے پوری احتیاط اور رازداری سے گھر لانی ہوگی اور فون پر "حبیب ہوٹل" اطلاع پہنچانی ہوگی۔ ہدایات میں درج تھا کہ اگر وہ لڑکی کل مجھ سے ملنے نہیں آئی تو پھر میں پرسوں مقررہ ٹائم پر دوبارہ جناح گارڈن جاؤں گا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لڑکی سے ملاقات نہیں ہو جاتی یا مجھے یہ کوشش ترک کرنے کے لیے نہیں کہا جاتا۔ زریں گل کے بارے میں ہدایت کی گئی تھی کہ میں پرسوں اسے حبیب ہوٹل روانہ کر دوں۔

میری جیب میں کافی رقم موجود تھی لہٰذا مطلوبہ لباس حاصل کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ رات کو میں اور زریں گل "اپنے" گھر کے نیچی چھت والے خستہ حال کمرے میں کھری چارپائیوں پر نیم دراز ہو کر مونگ پھلی ٹھونگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ مجنی کنور اور اس کا یہ امریکی مہمان کس چکر میں ہیں اور پشاور میں کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ بالکل جاسوسی ناولوں کے سے حالات تھے۔ ایک مخصوص لباس پہن کر مجھے مقررہ اوقات میں جناح گارڈن میں گھومنا پھرنا تھا اور ایک پُراسرار لڑکی سے ملاقات کرنا تھی۔ معلوم نہیں یہ ملاقات کب ہونی تھی اور ہونا بھی تھی یا نہیں۔

رات بھر مجھے شدید بخار رہا۔ پسلیوں کے نیچے ہلکا ہلکا درد کبھی تیز ہو جاتا تھا کبھی تھم سا جاتا۔ شب کے وسط میں شاید ایک دو گھنٹے کے لیے نیند آئی ہو مگر وہ نیند بھی بیداری سے مختلف نہیں تھی۔ میں نیم غنودگی کی سی حالت میں غزالہ کے ساتھ لاہور کے پارکوں' باغوں اور سڑکوں پر پھرتا رہا۔ وہ میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھی۔ کبھی اس کا آنچل لہرا کر میرے چہرے سے چھو جاتا تھا۔ کبھی وہ میری کسی بات پر ہنس ہنس کر دُہری ہو جاتی تھی۔ میں نے اس کو کسی پھلواری سے پھول چنتے دیکھا۔ پھر وہ کسی نہر میں پاؤں ڈبو کر بیٹھی نظر آئی۔ بے شمار مناظر تھے اور ہر منظر غزالہ سے شروع ہو کر غزالہ پر ختم ہو جاتا تھا۔ پھر میرا خواب اپنے آبائی گھر کی چھت پر جا ٹھہر گیا۔ آسمان پر شفق کی سُرخی پھیلی تھی۔ چل کوٹ کے در و دیوار آہستہ آہستہ شام کے رنگ میں ڈوب رہے تھے۔ غزالہ چھت کی اونچی منڈیر سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ غزالہ! تمہاری تو شادی ہو گئی تھی؟"

وہ ہنسی اور اس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے' اس کی آواز کہیں دور بجنے والی نقرئی گھنٹیوں کی طرح سنائی دی۔ "میری شادی سے آپ کو کیا مطلب؟ آپ تو مجھ سے محبت نہیں کرتے۔"

میری آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ "نہیں غزالہ' ایسا مت کہو۔ تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو؟ خدا کی قسم تمہیں کچھ نہیں پتا۔"

"یعنی آپ محبت کرتے ہیں مجھ سے؟" اس کی شوخ شرمیلی آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست تھیں۔

"ہاں ہاں۔۔۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے۔"

"تو پھر آپ کو مجھ پر بھروسا بھی کرنا چاہیے تھا۔ یہ کیسے سمجھ لیا آپ نے کہ میں آپ کو چھوڑ جاؤں گی۔"

"تو۔۔۔ تو وہ شادی؟"

وہ ہنسی۔ سینے پر ریشمی آنچل پھیلایا اور پلکیں جھکا کر بولی۔ "وہ سب ایک مذاق تھا۔"

"سچ غزالہ" میں نے سرتاپا لرز کر کہا۔۔۔ اور بے اختیار اسے بانہوں میں بھر لیا لیکن بانہوں میں ایک خلا کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ حالتِ نیند میں ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ کرب کی ایک ناقابلِ برداشت لہر پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

ساتھ والی چارپائی پر زریں گل بے خبر سو رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے وہ گٹھڑی بنا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے رات کو تیز بخار ہو جاتا ہے لہٰذا اس نے اپنا کمبل بھی مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں نے کمبل واپس اس پر ڈال دیا اور اپنے کمبل کو بکل کی طرح لپیٹ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ شب گجر سے اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اگلے روز میں نے قریباً ایک ہفتے بعد شیو کی۔ نہا دھو کر وہ لباس پہنا جو کل میں اور زریں گل مارکیٹ سے لے کر آئے تھے۔ میں نے احتیاطاً زریں گل کو بھی ساتھ لے لیا لیکن اسے ہدایت کر دی کہ وہ کسی بھی صورت میرے قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ڈبگری بازار سے ہم نے ایک رکشا لیا اور مقررہ وقت سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی جناح گارڈن پہنچ گئے۔ رکشا ہم نے جناح گارڈن سے کچھ فاصلے پر ہی رکوا لیا تھا۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ جناح گارڈن میں داخل ہوئے۔ اس وقت گارڈن میں رونق تھی۔ ایک گوشے میں بچوں کے لیے جھولے اور سلائیڈز وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ اس مقام پر رش تھا۔ گھاس کے قطعوں کے درمیان صاف شفاف پختہ راستوں پر خوش لباس لوگ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ موسم بھی اچھا تھا۔ کئی دنوں بعد دھوپ نکلی تھی اور اس کی تمازت بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک روش پر ٹہلتا ہوا گارڈن کے وسطی حصے کی طرف جانے لگا۔

گارڈن میں گھومتے پھرتے ابھی مجھے مشکل سے ایک گھنٹا ہی ہوا تھا کہ میرے پہلو سے ایک سُریلی آواز ابھری اور ایک خوشنما لڑکی مسکراتی ہوئی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ مقامی رواج کے مطابق ایک وسیع و عریض "آف وھائٹ" چادر میں تھی۔ کندھے سے ایک چرمی بیگ جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے ٹوکرا بھر ریشمی بال بمشکل چادر میں سمیٹ رکھے تھے۔ اس نے شرماتے لجاتے ہوئے کہا۔ "السلام علیکم کیا حال ہے۔"

"تمہیں دیکھ کر ایک دم فرسٹ کلاس ہو گیا ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں رومانی جوڑے کے انداز میں ہنستے مسکراتے اور سرگوشیاں کرتے ایک سنگی بینچ پر جا بیٹھے۔ بظاہر ہم رومانی گفتگو کر رہے تھے لیکن درحقیقت میں لڑکی سے مطلب کی بات کر رہا تھا۔ لڑکی نے اپنا نام نادیہ بتایا۔ ظاہر ہے یہ فرضی نام ہوگا۔ میں نے بھی اپنا نام احسان الٰہی بتایا۔ اس نے پوچھا۔ "زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟"

میں نے کہا۔ "انتظار تو کرنا پڑا لیکن جتنا میں نے سمجھا تھا اتنا نہیں۔"

وہ بولی "ہم تھوڑی دیر یہاں بیٹھیں گے۔ اس کے بعد کینٹین کی طرف چلیں گے۔ کینٹین کے عقب میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔"

اس نے یہ نہیں بتایا کہ "بہت کم" لوگوں کی موجودگی میں وہ کیا کہنا یا کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔ تھوڑی دیر میں خود ہی سب کچھ سامنے آ جانا تھا۔ وہ اپنے ہینڈ بیگ کو بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی۔ یہ غیر ارادی انداز تھا۔ شاید خود لڑکی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہینڈ بیگ پر اس کی انگلیاں کس قدر مضبوطی سے جمی ہوئی ہیں۔ میں نے دیکھا' اس کے سرخ ناخنوں پر زردی حائل ہو رہی تھی۔ یہ زردی اس بات کا ثبوت تھی کہ ہینڈ بیگ پر اس کی گرفت بے حد سخت ہے۔۔۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم اٹھ کر کینٹین کی طرف چل دیے۔ نادیہ نے محبوبانہ انداز میں میرا بازو تھام رکھا تھا۔ کینٹین کے سامنے پہنچے تو ایک لڑکا بھاگ کر ہمارے سامنے آیا "کون آئس کریم کھائیں گے صاحب؟" اس نے لجاجت سے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے کھلنڈرے انداز میں پیشانی پر جھولنے والے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا اور بولی "ہاں۔۔۔ دو ویلا لے آؤ۔" غالباً وہ بھی رومانی ملاقات کے ڈرامے میں رنگ بھرنا چاہتی تھی۔

ہاتھوں میں آئس کریم کونیں تھامے ہم کینٹین کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ اسی وقت ایک ایسا واقعہ ہوا جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔۔۔ میں نے فریال کو دیکھا۔ وہ حسبِ عادت جینز اور جرسی میں تھی۔ پاؤں میں سفید ٹینس شوز تھے۔ وہ ایک چوڑی روش پار کر کے تیزی سے میری طرف آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجان نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا' اس نے میرے سینے پر زور سے دوہتڑ مارا۔ دوہتڑ تو شاید مجھ پر زیادہ اثرانداز نہ ہوتا لیکن حیرت کی شدت نے مجھے لڑکھڑا دیا۔ کون آئس کریم میرے ہاتھ سے اُچھل کر دور جا گری۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' اس نے چلّا کر مجھے ایک اور دھکا دیا۔ میں نے اس کے دونوں بازو کلائیوں پر سے تھام لیے۔ وہ ورزشی جسم کی مالک' ہاکی کی ایک نامور کھلاڑی تھی۔ غضب کی شدت نے اس کی توانائی کو دو چند کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کلائیاں چھڑانے کے لیے زور مارا۔ میں بمشکل اسے سنبھالنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے بے دریغ ٹانگ چلائی جو نادیہ (یا جو بھی اس کا نام تھا) کی

ناف میں لگی۔ وہ کراہ کر دُہری ہو گئی۔ فریال مجھ پر چلانے لگی۔ "دھوکے باز ہیں آپ ___ فریبی ہیں۔ آپ نے کسی کی زندگی برباد کر دی ہے اور خود گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہیں۔ شرم آنی چاہیے آپ کو ___ ڈوب مرنا چاہیے۔"

وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ میں اس کے ہاتھ چھوڑ دیتا تو شاید وہ مجھے نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیتی۔ میں کچھ دیر اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس کا ہیجان کم کرنے کے لیے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ اتنے میں ایک لمبا چوڑا ادھیڑ عمر شخص بھاگتا ہوا آیا اور اس نے فریال کو عقب سے تھام کر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اپنے سرخ گال پر ہاتھ رکھے ہچکیوں سے رونے لگی۔ ہمارے ارد گرد لوگوں کا اژدحام ہو چکا تھا۔ مرد و زن، بچے بوڑھے سب جمع ہو گئے تھے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ نادیہ موقعے سے غائب ہے۔ مجھے بالکل خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ کس وقت میرے پہلو سے کھسک گئی ہے۔ کینٹین کے قریب موجود میلی ڈھالی وردیوں والے دو سنتری بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ وہ فریال کے ساتھی ادھیڑ عمر شخص سے دریافت کرنے لگے کہ کیا معاملہ ہوا ہے۔

ان کا خیال یہ تھا کہ میں نے لڑکی سے کسی طرح کی بدتمیزی کی ہے اور وہ چونکہ قانون کے محافظ ہیں اس لیے مجھے میری غنڈا گردی کا مزہ چکھانا ان کا فرض بن گیا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کئی طرح سے ہو سکتی تھی۔ اگر میں کوئی بے آسرا شخص ہوتا تو وہ مجھے رکشے میں ڈال کر تھانے لے جاتے اور راستے میں میری جیب صاف کر سکتے تھے۔ تھانے میں مجھے ڈرائنگ روم کی سیر کروائی جا سکتی تھی اور ایک دو کیس مجھ پر ڈال کر لمبا مال بنایا جا سکتا تھا' یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجمع چھٹ جاتا تو اسی باغ کے کسی گوشے میں مجھ کو میری گھڑی اور نقدی وغیرہ کے بوجھ سے آزاد کر دیا جاتا۔

لیکن سنتری حضرات کی یہ امید بر نہیں آئیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہجوم کو بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ فریال نے روتے روتے اچانک چیخ کر کہا۔ "آپ لوگ جائیں۔ آپ سب لوگ جائیں۔ یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔"

مجمع میں دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ لوگ چھٹنے لگے۔ تاہم سنتریوں نے آپس میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فریال ایک جھٹکے سے مڑی اور روتی ہوئی ایک طرف چل دی۔ چند قدم آگے جا کر وہ بھاگنے لگی اور کینٹین کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی۔ ادھیڑ عمر شخص تذبذب کے عالم میں کبھی فریال کی جانب دیکھ رہا تھا کبھی مجھے گھور رہا تھا۔ آخر وہ بھی فریال کے پیچھے چلا گیا۔ اس نے ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں ٹینس شوز تھے۔ اس کے سر کے بال قریباً سفید ہو چکے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ فریال کا کوچ تھا۔ فریال اسے انکل کہتی تھی۔ چونکہ فریال دو ہفتے بیمار رہی تھی لہٰذا وہ اس کی صحت کی طرف سے بہت فکر مند رہتا تھا۔ وہی اسے تبدیلیٔ آب و ہوا کے لیے لاہور سے پشاور لایا تھا۔ یہاں فریال اپنے ماموں کے گھر مقیم تھی اور روزانہ شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتی تھی۔

میں خود کو بہت تھکا ہوا اور شکستہ حال محسوس کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر باغ میں نادیہ نامی اس لڑکی کو تلاش کرتا رہا پھر ایک سنگی بینچ پر جا کر لیٹ گیا۔ ٹھیک چھ بجے میں جناح گارڈن سے واپس گھر گیا ___ بخار ایک بار پھر شدت اختیار کر گیا تھا۔ پورا جسم جیسے پھنک رہا تھا۔ میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ پسلیوں کے نیچے ہونے والا درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ابھی زریں گل آئے گا تو اس سے کوئی "پین کلر" دوا منگوالوں گا لیکن اس بھلے مانس کو نہیں آنا تھا نہ آیا۔ میں بہت دیر اس کا انتظار کرتا رہا پھر آنکھ سی لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو رات کے دس بج رہے تھے۔ زریں گل اب بھی نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا۔ میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ سینے میں پسلیوں کے درمیان جیسے ایک دہکتا ہوا خنجر پیوست تھا۔ میں نے اٹھ کر پانی پیا پھر یاد آیا کہ شاید جیکٹ کی جیب میں اسپرین کی ایک دو ٹکیاں موجود ہوں۔ جیکٹ کی جیبیں کھنگالنے سے ٹکیاں تو نہیں ملیں۔ ہاں وہ خط ضرور مل گیا جو کچھ روز پہلے جاگیردار قادر زماں کی اہلیہ ترنم نے مجھے لکھا تھا اور جس میں غزالہ کے حوالے سے انجانے خدشوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ میں نے اس خط کی تہیں کھولیں اور بلب کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ ترنم نے کتنی فراست سے حالات کا اندازہ لگایا تھا اور کتنی سچی پیش گوئیاں کی تھیں۔

اس نے لکھا تھا۔ "شاہ جہاں صاحب! ایک عورت دوسری عورت کے دل کا حال زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ غزالہ آپ کی محبت میں ضبط کی آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ وہ اب خود کو ایک ہاری ہوئی شکست خوردہ عورت تصور کر رہی ہے۔ اس کی مایوسی دیکھ کر جہاں مجھے ترس آتا ہے وہاں عجیب طرح کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے ___ خدا نہ کرے کبھی آپ دونوں کے درمیان فاصلے پیدا ہوں۔"

وہ فاصلے اب پیدا ہو چکے تھے اور انہیں مٹانا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا ___ غزالہ کا غم پوری شدت سے میرے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگا اور یہ شدت اتنی بڑھ گئی کہ

سینے کی تکلیف ہیچ محسوس ہونے لگی۔ ذہنی کرب دوا بن گیا اور جسمانی تکلیف کے لیے اسپرین کی ضرورت نہ رہی۔ درد اتنا بڑھا کہ دوا ہو گیا۔ میں نڈھال سا ہو کر بستر پر جا لیٹا۔ نگاہوں میں آتشیں مناظر گھومنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ غزالہ زرق برق لباس پہنے اپنے دولہے کے ساتھ ماہِ عسل کی سیر و تفریح میں مصروف ہے ___ پھر تصور بھٹک کر فریال کی طرف چلا گیا۔ اس کا غضب ناک لہجہ میری سماعت کو مجروح کرنے لگا۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں شفقت کے ساتھ ساتھ فریال کو بھی کئی بار یاد کیا تھا۔ غم و اندوہ کے گرداب میں انسان انہی کو یاد کرتا ہے جنہیں وہ اپنا سمجھتا ہے۔ اسے توقع ہوتی ہے کہ وہ اس کے آنسو پونچھیں گے۔ اس کے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیں گے اور اس کے زخموں پر مرہم رکھیں گے مگر فریال نے مجھے دھکے دیے تھے' میرا منہ نوچنا چاہا تھا۔ بے شک یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا تھا لیکن ہوا تو تھا۔ فریال نے مجھے نادیہ نام کی اس لڑکی کے ساتھ چہل قدمی کرتے دیکھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ میں یہاں خوش فعلیوں میں مصروف ہوں۔ اس نے میرے اندر نہیں جھانکا تھا اور نہ ان زخموں کو دیکھا تھا جنہوں نے میرا سینہ داغ داغ کر رکھا تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ نیند تو نہیں تھی۔ غنودگی کی سی کیفیت تھی جس کے زیر اثر میں بہت دیر تک ساکت پڑا رہا۔ اچانک ایک لمس نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں۔ کوئی میرے سامنے بیٹھا تھا اور اپنے نرم ملائم ہاتھ سے میری پیشانی سہلا رہا تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ فریال تھی۔ اس کی ناک رونے سے سرخ نظر آ رہی تھی اور دھلی دھلائی سی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

"تم ___ تم یہاں؟" میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں' میں زریں گل کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ آپ کے لیے کھانا لینے بازار تک گیا ہے۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ فریال یہاں کیسے پہنچی ہے اور زریں گل اب تک کہاں گم تھا۔ جس وقت فریال نے مجھ پر چڑھائی کی اور سرِعام ہنگامہ کھڑا کیا' زریں گل پاس ہی موجود تھا۔ وہ فریال کا پیچھا کر کے اس کے ٹھکانے تک پہنچا تھا اور اب اسے یہاں لے آیا تھا۔

فریال نے میرا جلتا ہوا ہاتھ اپنے سرد ملائم ہاتھوں میں تھام لیا اور نرم آواز میں بولی۔ "مجھے معاف کر دیں شاہ جہاں صاحب! میں نے بڑی زیادتی کی ہے آپ سے۔ زریں گل نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "معاف تو اسے کیا جاتا ہے جس سے کوئی ناراضگی ہو۔ مجھے تم سے کوئی ناراضگی نہیں۔ تم ہمیشہ ایسی ہی بچکانہ حرکات کرتی ہو' خود تماشا بنتی ہو اور دوسروں کو بھی بناتی ہو۔"

وہ ایک دم اداس ہو گئی "شاید آپ مجھے ہمیشہ بچی ہی سمجھتے رہے ہیں اس لیے کبھی میری باتوں پر غور نہیں کیا ___ اور اب وہ سب کچھ ہو چکا ہے جس کے اندیشے میرے دماغ میں پلتے رہتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ غزالہ جی نے جو کچھ کیا' بہت مجبور ہو کر کیا۔ وہ خود کو روند کر اور مار کر اس فیصلے تک پہنچی ہوں گی۔ وہ آپ سے کتنا پیار کرتی تھیں یہ مجھ سے زیادہ اور کون جانے گا۔ آپ کو کیا پتا کیا کیا سپنے دیکھتی تھیں ان کی آنکھیں۔"

وہ ایک دم سسک اٹھی۔ کچھ دیر سر جھکا کر ناک سے "سُوں سُوں" کی آواز نکالتی رہی پھر بولی۔ "ان کی محبت بڑی عجیب تھی شاہ جہاں صاحب' ایک دفعہ اتفاقاً مجھے ان کی ڈائری دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ شاید آپ سن کر حیران ہوں اور آپ کو یہ بات عجیب سی لگے کہ وہ جو کچھ کماتی تھیں اس کا آدھا حصہ بڑی خاموشی سے آپ کے نام پر خیرات کر دیتی تھیں۔ پچھلے آٹھ برس سے وہ ہر ہفتے ایک نفلی روزہ آپ کے نام پر رکھتی تھیں۔ ان کی ہر دعا میں آپ کا نام شامل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ سے محبت نہیں کرتی تھیں ___ پوجتی تھیں آپ کو" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

اس دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی "دروازہ اندر سے بند ہے؟" میں نے فریال سے پوچھا۔ اس نے روتے روتے نفی میں جواب دیا۔

دروازہ کھلا تھا تو پھر آنے والا زریں گل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کمبل ہٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں جناح گارڈن گیا تھا۔ استری شدہ سفید پتلون قمیص چرمر ہو چکی تھی۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ میں نے ٹائی اتار کر ایک طرف پھینکی۔ بے ترتیب لباس کو چھپانے کے لیے ایک گرم چادر کی بکل ماری۔ 6.35 کیلی بر کا ننھا پستول پتلون کی جیب میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر وہی پُراسرار سا چادر پوش شخص موجود تھا جو کل رات مجھے مسٹر جی کلارک کا خط دے کر گیا تھا۔ اس کی تیز چمکیلی آنکھیں تاریکی میں انگاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ ایک بار پھر مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ آنکھیں

میں نے کہیں دیکھ رکھی ہیں۔ آج اس کے ہاتھ میں کوئی لفافہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"اب کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے اپنے سر سے چادر ہٹائی اور پھر اس پلو کو بھی نیچے گرا دیا جس نے اس کا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں بکتے میں رہ گیا۔ بخار کی وجہ سے دماغ تو پہلے ہی چکرا رہا تھا' اب نگاہ بھی چکراتی ہوئی محسوس ہوئی۔۔۔ میرے سامنے عیسیٰ جان کھڑا تھا۔ وہی خونخوار درندہ جو آزاد قبائلی علاقوں میں آسیب کی طرح چکراتا تھا اور جس نے زوئے مشت کے ویرانے میں لشکر جان کے درجنوں ساتھیوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ عرف عام میں اسے ڈاکو کہا جاتا تھا لیکن "ڈاکو" کا لفظ اس حیوان کی حیوانیت کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ میرا ہاتھ چادر تلے بے اختیار اپنے پستول کی طرف سرک گیا۔

وہ وحشت ناک انداز میں مسکرایا۔ "گھبرانے کا ضرورت نہیں برادر! اب ام دشمن نہیں دوست ہے۔ ام دونوں اب ایک ہی شخص کے لیے کام کر رہا ہے اور اس شخص کا نام مجتبیٰ کنور ہے۔"

"کیسے آئے ہو؟" میں نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"اس وقت ام کو کلارک بہادر صاحب نے بھیجا ہے۔ تم سے کچھ پوچھنا تھا ام کو۔"

"پوچھو کیا پوچھنا ہے ؟" میں نے حیرت کے شدید حملے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"خو تم کیسا بات کرتا ہے" عیسیٰ جان نے مونچھوں کو بل دے کر کہا۔ "یہ کوئی ایسا ویسا بات نہیں ہے کہ ام دروازے میں کھڑا ہو کر کرے۔"

وہ مجھے قریباً دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کی کمبل نما چادر کے نیچے یقیناً چھوٹی نال کی خودکار رائفل موجود تھی۔ وہ چھوٹے قد کا شخص تھا لیکن شانے بے حد چوڑے اور جسم فولاد میں ڈھلا ہوا تھا۔ میں اس سے پنجہ آزمائی کر چکا تھا اور اس کے رگ و پے میں پوشیدہ حیوانی قوت کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"ٹھہرو" میں نے سختی سے کہا۔

وہ رک گیا۔ میں نے اندر جا کر فریال سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے پچھلے کمرے میں چلی جائے۔

"کیا بات ہے؟" وہ میرا چہرہ دیکھ کر ہراساں لہجے میں بولی۔

"ایک شخص ملنے آیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چلا جاتا ہے۔"

وہ صحن میں جھانکنے کی کوشش کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے ہرگز گوارا نہیں تھا کہ عیسیٰ خان جیسے عورت باز کی نگاہ بھی فریال پر پڑے۔ "آجاؤ" میں نے عیسیٰ خان سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا۔ وہ کسی جنگلی بھینسے کی طرح جھومتا ہوا اندر آ گیا۔ اندر آ کر اس نے اپنی گھنی مونچھوں کو پھڑکایا اور اس کے نتھنے غیر محسوس انداز میں سکڑ گئے۔ مجھے یوں لگا کہ وہ جیسے اس کمرے میں فریال کی "موجودگی" سونگھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عیسیٰ جان سے میری ملاقات کئی مہینوں کے بعد ہوئی تھی لیکن اس تمام عرصے میں اس کا تصور گھناؤنی یادوں کی صورت میرے ذہن سے چپکا رہا تھا۔

عیسیٰ جان نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔ "یہاں کوئی اور تو نہیں؟"

میں نے کہا "کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جو کہنا چاہو' اس کمرے میں پوری تسلی سے کہہ سکتے ہو۔"

وہ [illegible] کرسی پر پھیلتے ہوئے بولا۔ "کلارک بہادر صاحب نے تم کو ہدایت کیا تھا کہ چھوکری سے ملاقات ہونے کے فوراً بعد ٹیلی فون پر ان کو اطلاع دینا ہے لیکن سات آٹھ گھنٹے گزرنے کے باوجود تم نے ابھی تک اطلاع نہیں دیا۔"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں سمجھا تم نے ضرورت؟"

"اس لیے کہ ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کلارک صاحب نے اپنے خط میں اشارہ دیا تھا کہ وہ لڑکی مجھے کوئی چیز سونپے گی لیکن۔۔۔ ابھی ہم ٹھیک سے کہیں بیٹھے بھی نہ تھے کہ وہ ہنگامہ ہو گیا۔"

"خو تمہارا مطلب ہے کہ اس چھوکری نے تم کو کوئی چیز نہیں دیا ہے ؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس کی خون بار آنکھوں کی سفاکی چند لمحوں کے لیے کسی پردے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ وہ قدرے نرمی سے بولا۔ "اگر تمہارا اجازت ہو تو ام تمہارا وہ کپڑا دیکھ سکتا ہے جو تم اس وقت پہنا ہوا تھا؟"

میں نے کہا۔ "یہی کپڑے پہنے ہوئے تھا میں۔"

اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ خود بخود پتلون کی جیبوں کی طرف سرک گئے۔ پتلون کی ایک جیب میں میرا ہاتھ

چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اس "چیز" کو باہر نکالا۔ یہ کاغذ کی ایک پڑیا تھی اور اتنی چھوٹی کہ اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھی تھی۔ گئے وقتوں میں ڈاکٹر حضرات دوا کی جو چھوٹی چھوٹی پڑیاں دیتے تھے وہ ان سے بھی چھوٹی تھی۔ عیسیٰ جان نے پھرتی سے وہ پڑیا میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ تجسس کے عالم میں اس نے پڑیا کو کھولا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس میں چنے کی دال کے تین چار دانے ہیں' یا پھر وہ زرد رنگ کی دوا کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تھیں۔ عیسیٰ جان نے پڑیا لباس میں رکھ لی اور مسکرایا "ام سمجھتا ہے کہ اس چھوکری سے تمہارا ملاقات ادھورا نہیں رہا۔ وہ جانے سے پہلے یہ چھوٹا سا پڑیا تمہاری جیب میں ڈال گیا تھا۔ کلارک بہادر صاحب نے ام کو بولا تھا کہ وہ چھوکری اپنے کام میں بڑا ماہر ہے۔ ایک دم نمبرون ہے۔"

"لیکن اس پڑیا میں ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کلارک بہادر صاحب جانتا ہے یا خدا کو معلوم ہے۔ امارا تمہارا کام بس اتنا تھا کہ یہ پڑیا اس چھوکری سے کلارک بہادر صاحب تک پہنچ جائے۔"

"تو اسے تم لے کر جاؤ گے؟"

"بالکل"

"لیکن مجھ کو تو ایسی کوئی ہدایت نہیں کی گئی۔ کلارک صاحب کے دستخطوں والا جو خط مجھے موصول ہوا تھا اس میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ لڑکی سے ملاقات کرنے کے بعد میں فون پر حبیب ہوٹل اطلاع دوں۔"

"لیکن تم نے اطلاع نہیں دیا' اسی لیے ام کو بھیجا گیا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی اتنی جلدی میرا اعتبار نہ کرتے۔"

"پھر کیا چاہتا ہے تم' ام کلارک بہادر صاحب سے اسٹامپ لکھوا کر لائے؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں لیکن میں ٹیلی فون پر تصدیق کرنا ضرور چاہوں گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں میرا ساتھی آجاتا ہے۔ وہ بازار سے حبیب ہوٹل میں ٹیلی فون کرے گا۔ اس کے بعد تم جانے کے لیے آزاد ہو گے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اب ام قید ہے؟"

"میں نے ایسا کب کہا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ تم اسی عزے سے تعلق رکھتے ہو جس کا کرتا دھرتا قادر زماں ہے اور قادر زماں کے ڈانڈے مجتبیٰ کنور صاحب سے ملتے ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں ایک ہی شخص کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن احتیاط بہرحال ضروری ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ کسی بندے کے دل کا حال کسی کو پتا نہیں ہوتا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" عیسیٰ جان نے کہا اور عجیب جنونی سے انداز میں چادر ہٹا کر خودکار رائفل میری طرف سیدھی کرلی۔ میں نے دیکھا' سیون ایم ایم کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے اور عیسیٰ جان کی انگلی لبلبی پر ہے۔ میرا ہاتھ پتلون کی پھولی ہوئی جیب کی طرف بڑھا۔ "خبردار" عیسیٰ جان غرایا "کوئی چالاکی بالاکی دکھایا تو بھون کر رکھ دے گا۔" اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ جیب سے دور کر لیا۔ وہ کڑک کر بولا "اپنا چادر اتار کر ایک طرف رکھ دو۔"

میں نے چادر اتار دی۔ اس نے ٹانگ چلا کر کمرے کا اندرونی دروازہ کھول دیا۔ فریال اس کمرے میں موجود تھی۔ جالنبار دروازے کے ساتھ لگی اندر ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا تو وہ لڑکھڑا کر ایک کرسی سے جا ٹکرائی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کے سپید چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے ہراساں نگاہوں سے پہلے میری طرف اور پھر عیسیٰ جان کے ہاتھوں میں چمکنے والی سیاہ رائفل کی طرف دیکھا۔۔۔ میں نے کئی بار نوٹ کیا تھا' خوبصورت لڑکی یا عورت کو دیکھ کر عیسیٰ جان کی نگاہوں میں وہی چمک ابھرتی تھی جو شکار کو دیکھ کر ماہر شکاری کی نگاہوں میں ابھرتی ہے۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "ام کو پہلے ہی شبہ تھا کہ یہاں کوئی چھوکری موکری موجود ہے۔ چلو باہر آؤ۔۔۔ چلو شاباش۔۔۔" اس نے فریال کو پچکارا۔

فریال نے کمرے سے نکلنے کے لیے جونہی دروازے میں قدم رکھا' عیسیٰ جان نے بے حد پھرتی سے رائفل کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ "خبردار! یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔" وہ پھنکارا۔

اس کی نگاہیں بدستور مجھ پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں میں موجیں مارتی ہوئی سفاکی ہر لحظہ خطرناک تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سرتاپا خون آشام بھیڑیا نظر آنے لگا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "استاد جانی! ام سے کسی رعایت کا توقع مت رکھنا۔ ام اپنے ان ساتھیوں کو بھولا نہیں ہے جنہیں تم نے اور لشکر خان نے زوئے مشت میں گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ وہ بہادری کا جنگ نہیں تھا۔ تم نے رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح حملہ کیا تھا۔ خو تم جانتا تھا کہ ام اپنے لشکریوں میں موجود نہیں ہے۔ تم نے شب خون مارا اور اپنی جھوٹی فتح کے ڈنکے بجائے۔ تم نے امارے جن دو ساتھیوں کو گھوڑوں سے باندھ کر [illegible] تھا ان کا قبرستان۔۔۔ یہاں ہمارے دل

میں ہے" اس نے زور زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

میں نے کہا "عیسیٰ جان! چوروں کی طرح حملہ ہم نے نہیں کیا تھا' ہم نے کھلے میدان میں جنگ کی تھی۔ چور اور بزدل تم ہو۔ تم نے پکا خیلہ میں لشکر خان کے ساتھیوں کو نشہ آور چائے پلائی اور جب تمہیں یقین ہو گیا کہ ایک گولی بھی تمہارے خلاف نہیں چلے گی تو تم سو پچوں کو تاؤ دے کر آگئے اور قتل عام کر دیا۔"

وہ جنونی انداز میں ہنسا "تم اس کو قتل عام کہتا ہے۔ وہ تو ایک چھوٹا سا جھٹکا تھا' تمہارے اور لشکر خان کے لیے۔ تم کو پتا نہیں امارے دل میں کتنا بڑا زلزلہ چھپا ہوا ہے۔ ام تم کو بتائے گا کہ عیسیٰ جان کیا ہے اور اس سے ٹکر لینے کا مطلب کیا ہے۔" اس نے فریال کی پسلیوں میں بے دردی سے رائفل کا ٹھوکا دیا۔ اس کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی اور چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے۔ اسے تکلیف میں دیکھ کر عیسیٰ جان کو فرحت محسوس ہوئی۔ اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا "ام جانتا ہے تمہاری ٹانگ سے خنجر بندھا رہتا ہے۔ خنجر اتار کر سامنے میز پر رکھ دو۔ ورنہ اس چھوکری کا سانسیں اور مختصر ہو جائے گا۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ جلدی کرو۔"

میں نے جھک کر پتلون کا پائنچہ اٹھایا اور باریک تسموں سے بندھا ہوا خنجر غلاف سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"جیب سے پستول بھی نکال دو" عیسیٰ جان نے دوسرا حکم دیا۔

پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ فریال عیسیٰ جان کے نشانے پر نہ ہوتی تو میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا لیکن اب میں رسک لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے پستول نکال کر میز پر پھینک دیا۔ عیسیٰ جان نے آگے بڑھ کر یہ دونوں ہتھیار اپنی تحویل میں لیے اور میری جیب سے برآمد ہونے والی پڑیا کو بھی بے حد احتیاط سے بٹوے میں رکھ لیا۔ پڑیا کے سلسلے میں اس کی احتیاط اور توجہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی بے حد اہم چیز ہے اور اس کے حوالے سے کوئی معمولی سا خطرہ بھی مول نہیں لیا جا سکتا۔

میں نے عیسیٰ جان کو کریدنے کی کوشش کی کہ پڑیا میں بند چنے کی دال جیسے دانے کیا بلا ہیں؟ عیسیٰ جان نے میرے سوالات پر کان نہیں دھرے مجھے توقع بھی نہیں تھی کہ وہ کان دھرے گا۔ میں تو صرف اس امید پر وقت گزارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید کہیں سے زریں گل آ ٹپکے مگر وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ عیسیٰ جان نے مجھے اور فریال کو باہر چلنے کا حکم دیا۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک کے لیے بھی فریال کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کی رائفل بدستور فریال کے جسم سے چھو رہی تھی اور انگلی بھی تیار تھی۔ ہم تینوں اس طرح باہر نکلے کہ میں سب سے آگے تھا۔ میرے عقب میں فریال اور فریال کے پیچھے عیسیٰ جان تھا۔ فریال ہراساں ضرور تھی لیکن خود کو سنبھالے ہوئے تھی اور با حوصلہ نظر آ رہی تھی۔۔۔ آخر ایس پی صاحب کی بیٹی تھی جنہوں نے تمام عمر کسی قانون شکن کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ پھر شاید فریال کو یہ حوصلہ بھی تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ اس کے ذہن میں میرا "امیج" ایک دلیر اور طاقتور شخص کا تھا جو ہر آفت کا مقابلہ کر سکتا ہے اور کسی بھی طرح کے کٹھن حالات سے سرخرو ہو کر نکل سکتا ہے۔ وہ کئی بار اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ مجھے کسی مشکل سے نبرد آزما دیکھنا چاہتی ہے۔ ایک دفعہ اس نے بڑے شوخ انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ آپ کسی غنڈے سے لڑتے کیوں نہیں' میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ آپ کو دھاڑ کرتے دیکھوں۔

ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے' آج وہ مشکل وقت" بھی آ گیا تھا جس کی وہ تمنا کرتی تھی۔ اس سے بڑی مشکل اور کیا ہو سکتی تھی کہ ہم دونوں اس شخص کے قبضے میں تھے جسے قبائلی علاقوں کا آسیب کہا جاتا تھا۔۔۔۔ وہ ہمیں مکان سے باہر لایا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے اپنی خوفناک رائفل چادر میں چھپا لی تھی۔ بہرحال رائفل کا رخ اب بھی فریال ہی کی طرف تھا۔ مکان سے قریباً ایک فرلانگ دور سبز رنگ کی جیپ کھڑی نظر آئی۔ اس میں ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ ہمیں جیپ کی طرف آتے دیکھ کر وہ شخص نیچے اترا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔

اس وقت تک رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شدید خنکی تھی۔ یہ ڈبگری بازار کا عقبی علاقہ تھا۔ گلی کوچوں کی رونقیں شام سات آٹھ بجے ہی دم توڑ چکی تھیں۔ اب گئے اِکا دُکا افراد ہی نظر آتے تھے۔ ہمارے ساتھ فریال نہ ہوتی تو شاید کوئی ہماری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھتا لیکن فیشن ایبل خوبرو لڑکی کو چادر پوش مردوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھتے دیکھ کر قریب موجود دو افراد گہری دلچسپی لینے لگے۔ یہ بے سود قسم کی دلچسپی تھی۔ ان دونوں افراد کے وہم میں بھی نہیں تھا کہ رائفل کے زور پر ہمیں زبردستی جیپ میں بٹھایا جا رہا ہے۔

یہ پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر جیپ تھی۔ کم از کم

افراد کے بیٹھنے کی گنجائش اس میں تھی۔ عیسیٰ جان نے مجھے اور فریال کو اگلی نشستوں پر بٹھایا جب کہ خود اس عقبی حصے میں بیٹھا جہاں عرضی رخ پر دو نشستیں لگی تھیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور سیاہ رات کی خنکی کو چیرتی چلی گئی۔

○☆○

پشاور کی میونسپل حدود سے نکلنے کے بعد ہم نے قریباً آدھ گھنٹا سفر کیا اور گھنے درختوں سے گھری ہوئی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ اگر عیسیٰ جان واقعی مجھے قتل کرنا چاہتا تھا تو پھر اس کام کے لیے یہ بڑی مناسب جگہ تھی۔ جیپ چند پیچ دار راستوں سے گزرنے کے بعد ایک ہموار چٹان کے دامن میں جا کر رک گئی۔ جونہی جیپ رکی' میں نے دائیں کھڑکی کے قریب ایک سایہ سا لہراتے دیکھا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے یہ جیپ ایک بس ہو اور اس کی چھت پر سے کسی سواری کا بستر لڑھک کر درختوں میں جا گرا ہو۔

میں نے کن انکھیوں سے عیسیٰ جان کی طرف دیکھا۔ غالباً یہ منظر اس کی نگاہ سے اوجھل رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی میں جھانکا لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ ڈرائیور نے جیپ کی ہیڈ لائٹس جلتی رہنے دی تھیں۔ چٹان کے دامن میں دو بڑے پتھروں کے درمیان ایک قدرتی مستطیل سا بنا ہوا تھا۔ کسی شخص نے اس مستطیل پر موٹے ترپال کی چھت ڈال کر کمرا بنا لیا تھا۔ ترپال کے وسط میں ایک گول شہتیر نما لکڑی بھی نظر آ رہی تھی۔

ہیڈ لائٹس میں مجھے ایک چوڑا چکلا شخص نظر آیا۔ وہ غالباً جیپ کی آواز سن کر اس کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس کے کندھے سے آٹومیٹک رائفل جھول رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو میں نے اسے شناخت کر لیا۔ اس کا نام بہروز خان تھا اور وہ عیسیٰ جان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس نے جھک کر عیسیٰ جان کو سلام کیا اور اٹین شین کھڑا ہو گیا۔ عیسیٰ جان نے اسے آگ جلانے کا حکم دیا اور ہمیں لے کر ترپال کی چھت والے مستطیل کمرے میں آ گیا۔ اس جھونپڑا نما کمرے میں سگریٹ کا دھواں تھا اور الکحل کی بو رچی ہوئی تھی۔ ایک میلی سی لالٹین کی روشنی میں ایک میلا کچیلا بستر نظر آ رہا تھا۔ ایک پتھریلی دیوار پر کھونٹی کے سہارے چند کپڑوں کے علاوہ گولیوں والی بیلٹ بھی جھول رہی تھی۔ عیسیٰ جان میری طرف سے بے حد محتاط تھا۔ اس نے اب تک ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نگاہ میرے چہرے سے ہٹائی تھی نہ اپنی رائفل فریال کی پشت سے۔ وہ بخوبی جان چکا تھا کہ میں فریال کی جان کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔

بہروز خان نے کمرے کے ایک گوشے میں انگیٹھی روشن کر دی اور عیسیٰ جان کے اشارے پر باہر چلا گیا۔ ڈرائیور نے جیپ میں سے ولایتی وہسکی کی ایک بوتل نکالی اور عیسیٰ جان کے سامنے رکھ دی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بوتل کی سیل توڑ کر ڈھکن دور پھینکا اور منہ سے لگا کر غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ فریال خاموش تھی اور اپنے خشک ہونٹوں پر مسلسل زبان پھیر رہی تھی۔ عیسیٰ جان نے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائی اور بہت اطمینان بھرے لہجے میں بولا "ہاں تو استاد جانی' کس طرح سے مرنا پسند کرے گا تم؟" میں نے دیکھا اس کے لہجے کی بے پناہ سفاکی نے فریال کو سرتاپا لرزا دیا ہے۔ خود مجھے بھی اپنے جسم میں پھریری سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ ہم دونوں مجتبیٰ کنور کے لیے کام کر رہے ہیں لہٰذا ہمیں ایک ساتھ چلنا ہو گا۔۔۔۔ لیکن اب مجھے مارنے کی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے مار دو گے تو مجتبیٰ کو کیا جواب دو گے؟"

وہ مسکرایا "اچھا سوال کیا ہے تم نے' ایک گھنٹا پہلے تک امارے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ اس لیے ام تم کو مارنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اب امارے پاس جواب ہے۔ اور یہ جواب تم نے خود ہی دیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہی پڑیا" اس نے اپنی جیب تھپتھپائی۔ "اس چھوکری نے جناح گارڈن میں تمہیں یہ پڑیا دیا لیکن تمہارا بدقسمتی کہ تمہیں اس کا پتا نہیں چلا۔ تم نے بے خبری میں یہ پڑیا سات آٹھ گھنٹے تک اپنے پاس رکھا۔۔۔۔ بولو رکھا کہ نہیں۔۔۔۔؟ تم کو جو ہدایت کیا گیا تھا اس کے مطابق تم ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ چھوکری سے ملنے کے بعد تم کو ایک دم کلارک بہادر صاحب کو اطلاع دینا تھا۔ تم نے یہ اطلاع نہیں دیا۔ کلارک بہادر صاحب نے ام کو تمہاری طرف بھیجا کہ ام پتا چلائے کیا معاملہ ہے۔۔۔۔ اب اکرام واپس حبیب ہوٹل جا کر یہ بولے گا کہ تمہارا نیت خراب ہو گیا تھا اور تم اس پڑیا کے ساتھ رفو چکر ہو رہا تھا تو کون کافر یقین نہیں کرے گا۔ بولو! کون یقین نہیں کرے گا؟ ام تم کو اس لیے اس جنگل میں لایا ہے کہ تمہارا لاش اس جگہ سے ملے تو پتا چلے کہ تم بھاگ کر کہیں جا رہا تھا' ام نے تم کو خلاص کر دیا۔"

فریال نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "کیا مل جائے گا تمہیں خون میں ہاتھ رنگ کر۔"

عیسیٰ جان نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ ہنستے ہنستے اس نے مخمور انداز میں بہروز کو آواز دی۔ "اوئے بہروز خاناں! اِدھر آ ذرا___ اِدھر اندر آ___ یہ دیکھ یہ چھوکری کیا بولتا ہے___ یہ بولتا ہے کہ جہانی کو مار کر ام کو کیا ملے گا___" بہروز خان لپک کر اندر آگیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ عیسیٰ جان ہنس ہنس کر بے حال ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ وہ بہروز سے مخاطب ہو کر بولا "دیکھ اس چھوکری کو' بچوں کے مافق بات کرتی ہے۔ بولتی ہے جہانی کا جان لے کر ام کو کیا ملے گا۔" اس نے فریال کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ ایک جھٹکے سے اپنی طرف کیا۔ پھر اپنی قمیص پیٹ پر سے اوپر اٹھا دی۔ قمیص کے نیچے اس نے ایک اور قمیص پہن رکھی تھی۔ اس قمیص پر بڑے بڑے سیاہی مائل دھبے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یہ قمیص خون آلود ہوئی ہوگی۔ عیسیٰ جان نے سیون ایم ایم رائفل کی نال فریال کی نرم و نازک گردن میں دھنسائی اور پھنکار کر بولا۔

"یہ دیکھ چھوکری' یہ وہ خون آلود قمیص ہے جس کو ام نے کئی مہینوں سے نہیں اتارا' یہ قمیص دن رات امارے بدن پر رہتا ہے۔ تو جانتی ہے اس قمیص پر کس کا خون لگا ہے۔ نہیں تو نہیں جانتی۔ اگر جانتی ہوتی تو ام سے ایسا سوال نہ کرتی۔ اس پر امارے سگے بھائی کا خون ہے اور امارے ان ساتھیوں کا خون ہے جو سگے بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ ان سب کو تیرے اس استاد جہانی نے ایک غدار لشکر خان کے ساتھ مل کر قتل کیا تھا۔ ام نے قسم کھا رکھا ہے کہ جب تک لشکر خان اور جہانی کو مار نہیں لے گا یہ قمیص جسم سے جدا نہیں کرے گا___ آج ام تمہاری آنکھوں کے سامنے اس استاد جہانی کا وہ حشر کرے گا کہ جو سنے گا' اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔"

عیسیٰ جان کی گھن گرج سن کر اور اس کی آنکھوں میں لہراتی ہوئی درندگی دیکھ کر فریال رونے لگی۔ وہ بہت دیر سے ضبط کیے ہوئے تھی لیکن آخر گوشت پوست کی نوعمر لڑکی تھی۔ کوئی پتھر کا شخص بھی ہوتا تو عیسیٰ جان کے غضب کا بھونچال اسے ٹکڑے کر دیتا۔ عیسیٰ جان ایک ہیبت ناک انسان تھا اور اپنی تمام ہیبت ناکی سمیت آگ اگلنے والا بے رحم دیو نظر آ رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ ایک موقع پر غزالہ نے مجھے عیسیٰ جان کے خون آلود کپڑوں اور اس قسم کے بارے میں بتایا تھا جو عیسیٰ نے جوش انتقام میں کھا رکھی تھی___ غزالہ شاید قادر زماں کی حویلی میں اس کی اہلیہ ترنم کا معائنہ کرنے گئی تھی۔ عیسیٰ جان بھی اپنے دو ساتھیوں کو لے کر وہاں آگیا تھا۔ غزالہ نے دروازے کے پیچھے سے عیسیٰ جان اور قادر زماں وغیرہ کی باتیں سنی تھیں۔ اس وقت تک عیسیٰ جان اپنے ساتھیوں کے بدلے میں لشکر خاں کے درجنوں افراد کو قتل کر چکا تھا اور بہت سے لوگوں کو اس نے سرنگ میں بند کر کے ہلاک کروا دیا تھا' پھر بھی اس کی آتشِ انتقام سرد ہونے کے بجائے بھڑکتی چلی جا رہی تھی___ اس نے قادر زماں کو بتایا تھا کہ مجھے' اور لشکر خاں کو ختم کرنے تک وہ اپنا خون آلود لباس نہیں اتارے گا___ اس واقعے کو کئی مہینے گزر چکے تھے اور وہ لباس آج بھی عیسیٰ جان کے جسم پر تھا۔

روتی ہوئی فریال کو عیسیٰ جان نے اپنی رائفل سے ٹھوکا دیا اور زہرخند سے بولا "کیوں رو رہی ہے تو؟ چپ کر___ ابھی ام تم کو رونے کا بہت موقع فراہم کرے گا۔"

اچانک کمرے کے باہر سے ایک دھم آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو۔ پھر ایک کربناک کراہ گونجی۔ کوئی دھم سے پختہ زمین پر گرا۔ عیسیٰ جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بوتل ایک طرف پھینک کر تیزی سے اٹھا اور باہر کی طرف لپکا۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے اس کی رائفل کا رخ بدستور فریال کی طرف رہا تھا۔ جونہی وہ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچا' دروازہ ایک دم کھلا۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ کمرے کی چھت کی طرح دروازہ بھی ترپال کا تھا۔ ایک بھاری بھرکم پردہ سا تھا جسے اوپر کی طرف اٹھا کر کمرے میں آنے جانے کا راستہ بنایا جاتا تھا۔ جونہی عیسیٰ جان دروازے کے پاس پہنچا' کوئی تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور دنگ رہ گیا۔ وہ زریں گل تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی رائفل تھی جو تھوڑی دیر پہلے بہروز خان کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی زریں گل نے رائفل سیدھی کی لیکن اس کی بدقسمتی کہ عیسیٰ جان اس وقت تک اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ عیسیٰ جان نے پورے زور سے اپنی رائفل زریں گل کی رائفل پر ماری۔ اس ضرب سے نہ صرف زریں گل کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل نیچے جھک گئی بلکہ اس کا خم دار میگزین بھی جدا ہو کر فرش پر جا گرا۔ عیسیٰ جان نے میگزین گرتے دیکھ لیا تھا لہٰذا اس نے زریں گل کے جسم کو نشانہ بنانے کے بجائے اس کے پاؤں کے قریب فرش پر گولیاں چلائیں۔ [illegible] ہی خوفناک دھماکوں سے زریں گل کے پاؤں میں چنگاریاں بکھر گئیں۔ وہ اچھل کر دور ہٹ گیا۔ یہ سب کچھ

ایک سیکنڈ کے مختصر وقفے میں ہوا۔ میرا اور عیسیٰ جان کا فاصلہ کافی زیادہ تھا' ورنہ یہ موقع میرے لیے سنہری ثابت ہوتا۔ جونہی میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا' عیسیٰ جان نے تڑپ کر رائفل میری طرف سیدھی کرلی۔

"خبردار!" وہ حلق کی پوری گنجائش سے چیخا۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ عیسیٰ جان کا ڈرائیور توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند کمرے میں داخل ہوا اور زریں گل سے لپٹ گیا۔ زریں گل بھی بپھرا ہوا تھا۔ دونوں پوری شدت سے گتھم گتھا ہوگئے۔ عیسیٰ جان ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ بغیر رخ پھیرے زریں گل اور مجھ پر گولی چلا سکتا تھا' فریال مجھ سے لپٹی ہوئی تھی لہٰذا وہ بھی عیسیٰ کے نشانے پر تھی۔

عیسیٰ جان کا ڈرائیور ایک تنومند شخص تھا لیکن بپھرے ہوئے زریں گل نے ٹکریں مار مار کر اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا۔ پھر وہ ایک پہلوانی داؤ لگا کر بڑی پھرتی سے ڈرائیور کے اوپر آگیا۔ عیسیٰ جان نے اپنے بندے کو مات کھاتے دیکھا تو اپنی رائفل کا آہنی کندا گھما کر زریں گل کی کنپٹی پر مارا۔ یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی۔ زریں گل چند لمحوں کے لیے چکرا سا گیا تھا۔ ڈرائیور نے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا اور ایک بار پھر زریں گل کے اوپر آگیا۔ اس نے زریں گل کے دونوں بازو مروڑ کر پشت پر لگا دیے۔ عیسیٰ جان نے آگے بڑھ کر چند زوردار ٹھوکریں زریں گل کے خون آلود چہرے پر لگائیں۔ اس دوران میں عیسیٰ کا ایک تیسرا ساتھی بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ چھریرے بدن کا ایک دراز قد شخص تھا۔ میں نے اسے یہاں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کہیں دور سے بھاگا ہوا آیا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی زریں گل سے لپٹ گیا۔ ان دونوں نے مل کر زریں گل کے ہاتھ پشت پر ایک رسی سے باندھ دیے۔

زریں گل کے منہ اور سر سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے دم خم میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ عیسیٰ کے ساتھیوں کی گرفت میں مچل رہا تھا اور پشتو اور اردو میں تابڑ توڑ گالیاں دے رہا تھا۔ بازوؤں کے بعد زریں گل کے پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔ اس مقصد کے لیے دراز قد شخص کی پگڑی استعمال کی گئی۔ زریں گل کو پوری طرح پابند کرنے کے بعد دونوں افراد باہر چلے گئے اور ایک شخص کو ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لے آئے۔ یہ بہروز خان تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' زریں گل نے اس کے سر پر ایک وزنی پتھر سے ضرب لگائی تھی۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور زریں گل اس کی خودکار رائفل پکڑ کر اندر گھس آیا تھا۔

بہروز کو انگیٹھی کے پاس میلے سے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی لیکن خون نہیں بہا تھا۔ اس کی بے ہوشی بھی خطرناک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا رنگ روپ اور سانسوں کا زیر و بم دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی ہوش میں آجائے گا۔

زریں گل' عیسیٰ جان کو صورت سے پہچان چکا تھا لیکن وہ مرعوب ہوا تھا نہ اس کے چہرے پر کوئی اندیشہ نظر آتا تھا۔ وہ جی دار شخص تھا۔ عیسیٰ جان زیادہ سے زیادہ اسے مار ہی سکتا تھا اور موت کی زریں گل کو زیادہ پروا نہیں تھی۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا "استاد جی! ام کو مرنے کا غم نہیں لیکن ام چاہتا ہے کہ جب بھی مرے' ہیرو کی طرح مرے جیسے لالہ سدھیر مرتا ہے۔ محمد علی مرتا ہے' بدر منیر مرتا ہے۔ ام کو بزدلی کا موت پسند نہیں۔ ایسی موت سے تو بہتر ہے کہ بندہ زندہ ہی رہے۔"

وہ سینہ پھلا پھلا کر عیسیٰ جان کو للکار رہا تھا۔ یہ بڑھکیں پشتو میں لگائی جا رہی تھیں لہٰذا میں مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ عیسیٰ جان کو کوس رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اگر مرد میدان ہو تو اکیلے سے اکیلا آؤ۔

فریال نے بڑی مضبوطی سے میرا بازو تھام رکھا تھا اور روتی جا رہی تھی۔ میں نے دبے لہجے میں کہا۔ "اب کیوں روتی ہو۔ تمہاری دیرینہ تمنا پوری ہوگئی ہے۔ ہم سخت مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں اور قتل و غارت کا امکان بھی ہے۔"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "مذاق مت کریں شاہ جہاں صاحب! یہ عیسیٰ جان مجھے بے حد خطرناک شخص لگتا ہے۔ یہ___ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پلیز آپ اس سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر یہ ہمیں ڈرا دھمکا کر کوئی سودے بازی کرنا چاہتا ہے تو اس کی بات مان لیں۔"

میں نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا "عجب تماشا ہو تم۔ مجھے لڑتے بھڑتے دیکھنا تمہاری دلی آرزو تھی۔ اب کہہ رہی ہو کہ میں چپ چاپ ہار مان لوں___ ویسے بھی یہاں ہمارے ہار ماننے یا نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ عیسیٰ جان مجھے نقصان پہنچانے کا یہ موقع ہاتھ سے گنوائے گا نہیں۔"

"گھسر پھسر مت کرو۔ دور ہٹ جاؤ ایک دوسرے سے۔" عیسیٰ جان رائفل لہرا کر دہاڑا۔ فریال سہم کر دور چلی گئی۔

عیسیٰ جان ایک بار پھر زریں گل سے محو گفتگو ہوگیا۔ دونوں تند و تیز پشتو میں باتیں کر رہے تھے۔ عیسیٰ جان یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ زریں گل میرا ساتھی ہے اور میری مدد

کرنے یہاں پہنچا ہے لیکن اس کی سمجھ میں شاید یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں تک پہنچ کیسے پایا ہے؟ یہ واقعی ایک اہم سوال تھا۔ جب جیپ یہاں آ کر رکی تھی تو میں نے کھڑکی میں ایک سایہ سا لہراتے دیکھا تھا۔ یوں لگا تھا کہ کوئی چیز چھت سے پھسل کر جھاڑیوں میں جا گری ہے۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ زریں گل کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں تصدیق بھی ہوئی۔ وہ زریں گل ہی تھا۔ اس نے بے حد دلیری کا ثبوت دیا تھا۔ جس وقت عیسیٰ جان مجھے اور فریال کو لے کر ڈبگری بازار والے مکان سے روانہ ہوا' زریں گل بھی کھانا لے کر پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھے اور فریال کو مشکوک حالت میں ایک کوتاہ قد چادر پوش کے ساتھ جیپ کی سمت جاتے دیکھا اور بڑی خاموشی سے ہمارے پیچھے ہو لیا۔ جب دیو ہیکل جیپ ہمیں لے کر ڈبگری بازار سے روانہ ہوئی تو زریں گل بڑی ہوشیاری سے اس کے پیچھے لٹک گیا اور پھر آہستگی سے چھت پر رینگ گیا۔ جیپ نے چونکہ تاریک اور سنسان راستے پر سفر کیا تھا لہٰذا وہ راہ گیروں کی نظروں میں آئے بغیر ہمارے ساتھ سفر کرتا رہا اور آخر اس ویران جنگل میں پہنچ گیا۔

وہ یہاں آ کر اپنے مقصد میں شاید کامیاب ہی ہو جاتا لیکن عیسیٰ جیسے شخص پر غالب آنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوا تھا اور اب وہ بھی ہماری طرح اس مستطیل کمرے میں بے دست و پا پڑا تھا۔ وہ زخمی تھا اور میرے سامنے زخمی ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن ابھی تک عیسیٰ پر "چارج کرنے کا" کوئی موقع مجھے نہیں ملا تھا۔ وہ دو رائفلیں مسلسل میری اور فریال کی جانب اٹھی ہوئی تھیں اور رائفل بردار ہمیں کوئی موقع دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے___ تھوڑی دیر زریں گل سے تکرار کرنے کے بعد عیسیٰ جان میرے سامنے آ بیٹھا۔ وہ پہلے بھی پُر اعتماد تھا۔ اب اپنے تیسرے آدمی کے آ جانے کے بعد زیادہ پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فریال اس کے نشانے پر ہے اور جب تک فریال نشانے پر ہے' میں اس کا ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ اور یہ بات حقیقت تھی۔ میں فریال کی جانب سے خوفزدہ ہونے کی حد تک پریشان تھا۔ شاید یہ بشا والے حادثے کا اثر تھا۔ وہ صرف میری وجہ سے اندوہناک موت کا شکار ہوئی تھی۔ خدانخواستہ___ خدانخواستہ اگر یہاں فریال کے ساتھ بھی کچھ ہو جاتا تو میرے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا۔ وہ ہنستے مسکراتے چہرے والی نوخیز کلی جسے دیکھ کر زندگی پر اعتبار آتا تھا اور جس کی الھڑ مہک مُردہ دلوں میں جان ڈال دیتی تھی' بے رحم خوانو کی زد میں تھی۔ وہ خوانو جسے عرفِ عام میں اسلحہ کہا جاتا ہے اور جو ایک اشارے پر موت کی بارش کر دیتا ہے___ کاش فریال میری تیمارداری کے لیے وہاں نہ آ پہنچتی اور اگر پہنچ ہی گئی تھی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو اب ہوا تھا لیکن ہونے' نہ ہونے پر کسی کا کیا اختیار ہے۔ وہی دستِ قدرت واقعات کی بساط بچھاتا ہے اور انسانوں کو مہروں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑاتا ہے۔ اگر فریال جناح گارڈن پہنچ کر ہنگامہ کھڑا نہ کرتی تو یقیناً میری اور نذیر کی ملاقات کا اختتام مختلف ہوتا۔ وہ یوں خاموشی سے میری جیب میں وہ پُراسرار پُڑیا ڈال کر غائب نہ ہوتی اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو میں پُڑیا وصول کرتے ہی مسٹر جی کلارک کو حبیب ہوٹل میں اطلاع دیتا۔ مسٹر جی کلارک کو ضرورت ہی نہ پڑتی کہ وہ عیسیٰ جان کو میری طرف بھیجیں۔ نہ ہی عیسیٰ جان کو یہ موقع فراہم ہوتا کہ وہ مجھ پر بدنیتی کا الزام لگا کر مجھے اس تاریک ویرانے میں قتل کرنے کے لیے آتا۔

عیسیٰ جان کی ہدایت پر ڈرائیور کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے میں گھسا اور وہاں سے کینوس کا ایک بڑا تھیلا لا کر عیسیٰ جان کے سامنے رکھ دیا۔ عیسیٰ جان نے تھیلے میں سے ایک گول تھالی نما آہنی چیز نکالی اور بڑی احتیاط سے فرش پر رکھ دی۔ میں نے لالٹین کی مدھم روشنی میں غور سے اس شے کو دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔ میں اس ہلاکت خیز شے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ ایک بارودی سُرنگ تھی۔ اس جیسی کوئی درجن سُرنگیں ہم نے چنے گل والی حویلی میں کھدائی کے دوران میں نکالی تھیں۔ یہ ٹینک شکن سُرنگیں تھیں۔ وزن قریباً ۲۰ پاؤنڈ' قطر اٹھارہ انیس انچ' ہر سُرنگ میں قریباً ۱۲ پاؤنڈ انتہائی مہلک دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب چنے گل والی حویلی میں میں نے آخری بار عیسیٰ جان کو دیکھا تھا تو اس کے ہاتھ میں ایک ایسی ہی سُرنگ تھی۔ وہ بڑی توجہ سے سُرنگ کا معائنہ کر رہا تھا اور افراسیاب سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا___ آج کئی ماہ بعد میں پھر اس منحوس شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ عیسیٰ جان کچھ دیر اپنی خوں بار نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر بڑبڑاتے لہجے میں بولا "تم جانتا ہے' ام تم کو کیسے قتل کرے گا؟" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار میں جواب دیا۔ وہ بولا "تم کو اس چھت کے شہتیر سے لٹکائے گا۔ شہتیر میں وہ لوہے کا کنڈا دیکھ رہے ہو نا؟"

"بالکل دیکھ رہا ہوں" میں نے کہا۔

"ام اس میں تمہارے لیے رسّی ڈالے گا۔ جیسے قربانی کے بکرے کے لیے ڈالا جاتا ہے لیکن بکرے کو الٹا لٹکایا جاتا

ہے' ام تمہارا عزت کرے گا' تم کو سیدھا لٹکائے گا۔ رسّی کا لمبائی اتنا ہو گا کہ تم اپنے پاؤں زمین پر ٹیک سکے گا لیکن ام کو یقین ہے کہ تم اپنا پاؤں زمین پر نہیں لگائے گا۔" وہ مسکرانے لگا۔ پھر فریال سے مخاطب ہو کر بولا "اوئے چھوکری! تمہارا سمجھ دانی میں گھسا ہے کہ یہ اپنا پاؤں زمین پر کیوں نہیں لگائے گا؟"

فریال کوئی جواب دینے کے بجائے اور شدت سے سسکیاں لینے لگی۔ وہ اس طرح کی سنگین صورتِ حال سے زندگی میں پہلی بار گزر رہی تھی۔

عیسیٰ جان نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا "ام اس کے دونوں پاؤں باندھے گا اور بندھے ہوئے پاؤں کے ساتھ یہ بارودی سُرنگ باندھے گا۔ تم انگریزی اسکول کا چھوکری ہے' تم کو پتا ہو گا' اس کو مائن کہا جاتا ہے۔ یہ دیکھو___ یہ اس کا پلیٹ ہے' جب اس پر وزن پڑتا ہے تو یہ پھٹ جاتا ہے اور اتنے زور سے پھٹتا ہے کہ تمہارے جیسا نازک چھوکری کہیں پاس سے اس کی آواز سن لے تو اس کا دل پھٹ جائے___ خو سچ' یہ ٹینک کو توڑنے والا بارودی سُرنگ ہے اسی لیے اس کا یہ پلیٹ بہت سخت رکھا گیا ہے۔ جب تک اس پر چار پانچ من وزن نہ پڑے یہ پھٹتا نہیں ہے۔ ام نے اس میں تھوڑا سا تبدیلی کیا ہے۔ اس کا پلیٹ کھول کر اس کے سخت اسپرنگ کو ڈھیلا کر دیا ہے۔ اب یہ لچک دار ہو گیا ہے۔ بالکل تمہاری کمر کے مافق۔ اس پر ذرا سا وزن پڑے گا' یہ پھٹ جائے گا۔"

زریں گل زمین پر پڑے پڑے چلایا۔ "اُستاد صاحب! یہ حرامی شکر کا بچہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کو صرف دھمکا رہا ہے' اگر یہ آپ کو مارے گا تو شکر اور قادر زماں کو ٹرک کا پتا کون بتائے گا۔ وہ دونوں حرامی اس کا ٹانگیں چیر کر یادگار چوک میں لٹکا دے گا___ یہ زیادہ سے زیادہ ام کو مار سکتا ہے اور ام مرنے کے لیے ابھی تیار ہے۔" پھر وہ براہِ راست عیسیٰ جان سے مخاطب ہوا "اوئے خنزیر کا بچہ! امارا سینہ کھلا ہے۔ چلاؤ گولی ام پر۔ ام تم کو بتائے گا کہ اپنے بزرگوں پر جان کیسے قربان کیا جاتا ہے۔"

عیسیٰ جان نے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر کہا "ام تمہارا خواہش کو سر آنکھوں پر رکھتا ہے لیکن تم کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا___ ابھی ام تمہارے استاد کو یہاں لٹکائے گا۔ چھت سے ترپال اٹھوائے گا اور وہاں جیپ میں جا کر بیٹھے گا۔ امارا خیال ہے ام کو وہاں ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدھ پون گھنٹے میں ہی شو ختم ہو جائے۔ پاؤں سے دس بارہ سیر کا بارودی سُرنگ بندھا ہو گا تو تمہارا استاد زیادہ دیر یہ وزن برداشت نہیں کر پائے گا۔ جلد ہی اس کا ہمت جواب دے جائے گا اور اس کا تھکا ہوا ٹانگیں زمین پر ٹک جائے گا۔ ایک دھماکا ہو گا اور تمہارے استاد کا لال لال ٹکڑا دیواروں سے چپک جائے گا___ پھر بھی وہ جتنا ٹائم زندہ رہے گا' خوب تماشا کرے گا۔ کبھی اپنا ٹانگیں سکیڑے گا' کبھی زور لگا کر اپنے گندے جسم کو اوپر کی طرف اٹھائے گا۔ کبھی روئے گا' کبھی چلائے گا۔ جب یہ خلاص ہو جائے گا تو ام تم سے کہے گا کہ اپنے استاد کا تمام ٹکڑا اکٹھا کر کے باہر پھینکو اور امارے لیے کمرے کو بالکل شیشے کا مافق صاف کر دو۔ پھر ام ترپال دوبارہ چھت پر ڈال دے گا___ یہ چھوکری بُری طرح رو رہا ہو گا۔ ہم اس کو چپ کرائے گا۔ اس کا دل بہلائے گا اور تم دیکھے گا کہ عورت کا "دل بہلانا" ام کو کتنی اچھی طرح آتا ہے۔ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اس کے بعد ام تمہارا مرنے کا خواہش بھی پورا کر دے گا لیکن___ اس کا کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ ام سیلانی آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے امارا ارادہ بدل جائے اور ام تم کو بار بار ذلیل کرنے کے لیے باندھ کر اپنے ساتھ لے جائے۔"

زریں گل دہاڑا "لعنت ہے تم جیسے ڈاکو پر۔ تم خود کو زکیت کہتا ہے' ام کہتا ہے تم مرد ہی نہیں ہے۔ اگر مرد ہے تو اس لڑکی کو درمیان سے نکال اور ام کو کھول کر دیکھ۔ ام تمہاری گردن پر منہ رکھ کر تمہارا خون نہ پی جائے تو امارا نام نہیں۔"

زریں گل کے اندر کسی جنگجو فلمی ہیرو کی روح حلول کر چکی تھی اور وہ بڑے سے بڑے فساد کے لیے آمادہ نظر آتا تھا۔ فرطِ غضب میں وہ یہ بھی بھولا ہوا تھا کہ وہ ٹیڑھی میڑھی اردو کے بجائے عیسیٰ جان سے رواں پشتو میں بھی بات کر سکتا ہے___ عیسیٰ جان نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ باہر کھڑی جیپ کے اندر سے ایک موٹا رسّا لے آیا۔ قریباً پانچ گز لمبا یہ رسّا کسی ہنگامی ضرورت کے لیے رکھا گیا تھا۔ عیسیٰ جان نے اپنے لباس سے ایک خنجر نکالا اور اس کی مدد سے رسّے کے تین چار فٹ لمبے ٹکڑے کرنے لگا۔ یہ وہی خنجر تھا جو اس نے ڈبگری بازار والے مکان میں میری پنڈلی سے اتروایا تھا۔

ابھی اس نے دو تین ٹکڑے ہی کیے تھے کہ ٹھٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہم بھی ٹھٹک گئے تھے۔ کمرے سے باہر نشیب کی طرف سے کچھ آہٹیں سنائی دی تھیں۔ عیسیٰ جان سیون ایم ایم رائفل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے مسلح ساتھی بھی

ایک رم جوکس نظر آنے لگے۔ عیسیٰ جان نے دراز قد شخص کو اشارہ کیا۔ وہ رائفل بدست کمرے کے نیم تاریک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ ریوالور بردار ڈرائیور نے آمدورفت کے راستے پر سے ترپال ہٹا کر باہر جھانکا۔ پندرہ بیس گز کی دوری پر چند متحرک روشنیاں نظر آئیں۔ یہ ٹارچیں تھیں۔ ٹارچ بردار تیزی سے اس مقام کی طرف آ رہے تھے۔ ریوالور بردار ڈرائیور نے آنے والوں کو بے حد غور سے دیکھا۔ پھر عیسیٰ جان کی طرف مڑا اور سرسراتے لہجے میں بولا۔ "سردار! مجتبیٰ کنور صاحب آ رہے ہیں۔"

یہ اطلاع ہم سب کے لیے بم کا دھماکا ثابت ہوئی۔ مجھے عیسیٰ جان کے چہرے پر پہلی بار سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ تاہم ان اعصاب شکن لمحات میں بھی وہ بدبخت فریال اور میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھا اور ایک لمحے میں ہمیں گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ ریوالور سونتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد باہر سے مجتبیٰ کنور کی رعب دار آواز میرے کانوں میں پڑی "کیا بات ہے؟ کون ہے اندر؟ پیچھے ہٹو"

ڈرائیور پوٹھوہاری لہجے میں بولا۔ "میں معافی چاہتا ہوں سرکار۔ آپ اندر نہیں جا سکتے۔ سردار صاحب نے۔۔۔"

"اوئے کون سردار۔۔۔ پیچھے ہٹ تو" مجتبیٰ نے جھلا کر کہا اور ڈرائیور کو ایک طرف دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ سفید بے داغ شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں تھا۔ اس کے "ماتھے تک نکلے ہوئے بال" لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی چمک اٹھے تھے۔ اس کے اندر داخل ہونے تک عیسیٰ جان ایک دیوار کے ساتھ پوزیشن لے چکا تھا۔ اس کی رائفل کا رخ اب دروازے کی طرف تھا۔ بظاہر یہ میرے لیے حرکت میں آنے کا بہترین موقع تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے یہ غلطی کی تو اس کی سزا موت سے کم نہیں ہوگی۔ میں اس دراز قد شخص کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جسے عیسیٰ جان نے نیم تاریک گوشے میں کھڑا کیا تھا اور جس کے ہاتھ میں برسٹ مارنے والی مہلک رائفل تھی۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ اس نے مجھے اور فریال کو نشانے پر لے رکھا تھا۔

مجتبیٰ کنور نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ عیسیٰ جان نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "نہیں سرکار! ام آپ کو آگے آنے کا اجازت نہیں دے سکتا۔ آپ جہاں ہے وہاں کھڑا رہے۔ ام آپ کا بڑا عزت کرتا ہے لیکن آپ کو آگے نہیں آنے دے گا۔"

"لیکن کیوں؟" مجتبیٰ نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ غدار ہے۔ امارا بھی دشمن ہے اور آپ کا بھی۔ ام نے اس کو کسی صورت نہیں چھوڑنا ہے۔ ام آپ سے کہتا ہے "آپ پیچھے ہٹ جائے۔"

اس وقت میں نے دیکھا کہ چند اور افراد بھی دروازے پر آن کھڑے ہوئے ہیں اور ڈری ڈری نظروں سے کمرے میں دیکھ رہے ہیں۔ ان میں مجتبیٰ کی منکوحہ نظر ناہید 'سلمان آذر اور خدا بخش سب سے نمایاں تھے۔ مجتبیٰ کی بیوی زلیخا بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ کافی پیچھے تھی۔ مجتبیٰ نے کہا۔ "یہ تو کیا کہہ رہا ہے عیسیٰ۔ یہ ہمارا بندہ ہے۔ اسے ہم نے یہاں بھیجا تھا۔ میں تمہیں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنے دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی مجتبیٰ نے قدم آگے بڑھایا۔

عیسیٰ جان دہشت سے چلایا۔ "نہیں سردار' رک جاؤ۔ ام گولی چلانے پر مجبور ہو جائے گا۔"

مجتبیٰ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تذبذب نظر آیا لیکن پھر اس کیفیت کو ایک قائدانہ دلیری نے ڈھانپ لیا۔ وہ مستحکم قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کی شخصیت کا یہ جاندار پہلو میری نظر میں پہلی بار آ رہا تھا۔ عیسیٰ جان نے رائفل سیدھی کر لی۔ دروازے میں نظر آنے والے افراد ہراساں ہو کر دائیں بائیں ہٹ گئے۔ میں نے ناہید یا۔۔۔ زلیخا کی سریلی چیخ بھی سنی۔

"رک جاؤ سرکار!" عیسیٰ جان غرایا۔

لیکن اس وقت تک مجتبیٰ کنور اس کی رائفل پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ "چھوڑ دو اسے' میں کہتا ہوں چھوڑ دو۔" وہ تحکم سے بولا۔

عیسیٰ بے بس نظر آ رہا تھا۔ مجتبیٰ نے ایک جھٹکے کے ساتھ رائفل اس سے چھڑا لی۔ عیسیٰ بھنا کر کمرے کے نیم تاریک گوشے کی طرف لپکا۔ اس کے انداز سے اس کا ارادہ بالکل عیاں تھا۔ وہ دراز قد شخص سے رائفل لے کر مجھے اور فریال کو چھلنی کر دینا چاہتا تھا۔۔۔ اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اسے دراز قد شخص کے ہاتھ سے رائفل تھامتے دیکھا۔ یہی لمحہ تھا جس کے لیے میں بہت دیر سے' بڑے صبر کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔۔۔ اس "لمحے" رائفل نہ دراز قد شخص کے ہاتھ میں تھی اور نہ عیسیٰ جان کے ہاتھ میں۔ اس ایک لمحے میں وہ مہلک ترین ہتھیار ہم دونوں کے لیے بالکل بے ضرر تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ بہت دیر سے میرے ذہن میں جو لاوا کھول رہا تھا' وہ پھٹ پڑا اور ریق کی

رفتار سے میرے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ میں جھک کر بھاگا اور پوری قوت سے عیسیٰ جان کے ساتھ جا ٹکرایا۔ یہ ایک شدید تصادم تھا۔ عیسیٰ جان اچھل کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا پھر اوندھے منہ کمرے کے وسط میں جا گرا۔ رائفل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے رائفل کو ٹھوکر ماری۔ وہ ناہموار فرش پر پھسلتی ہوئی ترپال کے نیچے سے باہر چلی گئی۔ عیسیٰ جان نے گرتے گرتے پھرتی سے میری ٹانگ کھینچی۔ میں پہلو کے بل گرا۔ میرا سر فریال کے پاؤں سے ٹکرایا تھا۔ وہ چیختی ہوئی دروازے کی طرف بھاگی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ کمرے سے نکل گئی ہے۔ زمین پر گرتے ہی میرا ہاتھ ایک جانی پہچانی شے سے ٹکرایا اور میرے بدن میں توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی۔۔۔ میں اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عقب سے مجھے دراز قد شخص نے دبوچ لیا۔ وہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود کسی کیکڑے کی طرح سخت جان تھا۔ میں نے اپنے سر کا عقبی حصہ اس کی ناک سے ٹکرانا چاہا لیکن عیسیٰ نے پھرتی سے میری پیشانی کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ اس کا طوفانی مکا میری ٹھوڑی سے نیچے پڑا اور آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ اسی دوران میں ڈرائیور بھی مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میری مدد کرنے کے لیے مجتبیٰ کنور تنہا تھا۔ وہ رائفل ہاتھ میں تھامے گرج رہا تھا۔ "چھوڑ دو اسے۔۔۔ میں کہتا ہوں' پیچھے ہٹ جاؤ۔"

اگر وہ گولی چلا دیتا تو حملہ آوروں کے علاوہ میرے زخمی ہونے کا خطرہ بھی تھا۔ مجتبیٰ کے ساتھ آنے والوں میں سے ابھی تک کسی نے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ذرہیں گل میری نگاہ سے اوجھل تھا لیکن ظاہر تھا کہ مجھے نرغے میں رکھ کر وہ بے طرح پیچ و تاب کھا رہا ہے۔۔۔ حملہ آور میرے ٹکڑے کر دینے کے موڈ میں تھے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ میری مٹھی میں وہی مہلک خنجر دبا ہوا ہے جو اب تک نجانے کتنے خدائی فوجداروں کا مول چکا ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے فرش پر میرا ہاتھ جس جانی پہچانی شے سے ٹکرایا تھا وہ یہی رام پوری خنجر تھا۔ رستے کے ٹکڑے کرتے کرتے عیسیٰ جان نے یہ خنجر فرش پر ہی پھینک دیا تھا۔ میں جھکا ہوا تھا اس لیے یہ خنجر ابھی تک عیسیٰ جان اور اس کے ساتھیوں کو نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ میں نے سب سے پہلے موٹے تازے ڈرائیور کو نشانہ بنایا۔ میں نے پہلا وار اس کی داہنی پسلیوں پر کیا۔ "کچ" کی آواز سے نو انچ لمبے پھل کا دو تہائی حصہ اس کی پسلیوں کے درمیانی خلا میں گھس گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے خنجر نکالا اور دوسرا افقی وار اس کے پیٹ پر کیا۔ اس کا پیٹ کٹ گیا اور وہ تڑپ کر دور جا گرا۔ عیسیٰ جان کی عقابی نگاہوں نے میرے ہاتھ کو دائیں سے بائیں حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ یہی بات اس کی جان بچا گئی۔ جو وار میں نے کو تاہ قد عیسیٰ جان کے سینے پر کیا تھا وہ طویل قامت شخص کے پیٹ میں لگا۔ وہ وار بھی تھا' خنجر دور تک گھس گیا۔ دراز قد شخص نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھاما اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔ میں نے سینے پر ایک لات جما کر اسے دور پھینک دیا۔ عیسیٰ جان کی خوش بختی تھی کہ دراز قد شخص لالٹین پر گرا۔ کمرے میں ایک دم تاریکی چھا گئی۔ میں نے اندازے سے عیسیٰ جان پر وار کیا۔ خنجر اس کی ٹانگوں پر کہیں لگا۔ اس کے منہ سے ایک کراہ گالی سمیت ابھری' پھر بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ مجتبیٰ کنور نے ایک ہوائی برسٹ مارا۔ تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار لرز گئے۔ مجتبیٰ کنور چلایا "ٹارچ لاؤ۔"

دو ٹارچیں تیزی سے ہماری طرف بڑھیں۔ کمرے میں روشنی ہوئی۔ فرش پر دراز قد ذبح ہو جانے والے بکرے کے مانند پھڑک رہا تھا۔ ڈرائیور آخری ہچکی لے چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور بال اپنے ہی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ عیسیٰ جان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فریال اور ناہید بھاگ کر اندر آئیں۔ ناہید نے بے قراری سے مجتبیٰ کنور کو ٹٹولا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔" وہ تیزی سے بولا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شاہ جہاں! جناح کاروان والی لڑکی نے تمہیں کوئی چیز تو نہیں دی تھی؟"

"ایک پڑیا سی تھی۔ چھوٹے چھوٹے دانے تھے اس میں۔ وہ اب عیسیٰ جان کے پاس ہے۔"

"اوگاڈ" مجتبیٰ بڑبڑایا۔ "ہمیں اس خبیث کا پیچھا کرنا ہوگا۔"

وہ رائفل تھامے جلدی سے باہر نکلا۔ میں اس کے پیچھے آیا۔ عیسیٰ کا دور دور پتا نہیں تھا۔ اس کی ویو ہیکل کھٹارا جیپ دس پندرہ گز کی دوری پر کھڑی تھی۔ افراتفری میں عیسیٰ کو اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ جیپ میں بیٹھ کر نکل سکتا جاتا کیونکہ اس کی چابی ڈرائیور نے میرے سامنے عیسیٰ کو دی تھی۔

مجتبیٰ نے پوچھا۔ "یہ کس کی جیپ ہے؟"

"عیسیٰ کی" میں نے جواب دیا۔ "چابی بھی اس کے پاس ہے۔"

"چلو آؤ۔ ہم دوسری گاڑی تک پہنچتے ہیں۔" مجتبیٰ نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔ مجتبیٰ کے ساتھ آنے والے افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان میں

زلیخا اور ناہید کے علاوہ پانچ عدد مرد حضرات بھی تھے۔ ان میں سے ایک رضاکارانہ طور پر زریں گل کو کھولنے میں مصروف ہو گیا تھا' باقی سب ہمارے ساتھ لپکے چلے آ رہے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں بھاگتے ہوئے طے کیا۔ آخر مجھے دو گاڑیاں نظر آئیں۔ ان میں ایک اسٹیشن ویگن تھی اور دوسری جیپ۔ دونوں ایک ڈھلوان پر آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔ ابھی ہم گاڑیوں میں بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ بالکل پاس سے ایک آہٹ سنائی دی۔ کوئی درختوں میں چھپا ہوا تھا اور ایک دم نکل بھاگا تھا۔ اس ویرانے میں یہ عیسٰی جان کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں اور خدا بخش اس شخص کے پیچھے بھاگے ___ ٹرپل ٹو رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ سارا علاقہ جھاڑ جھنکاڑ اور چھوٹے بڑے پتھروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک درجن افراد بھی کہیں روپوش ہو جاتے تو آسانی سے ڈھونڈے نہ جاتے' وہ تو پھر بھی تنہا شخص تھا۔

میں اور خدا بخش کچھ فاصلے تک جا کر واپس آ گئے۔ مجتبٰی کنور کی قائدانہ صلاحیتیں پوری شدت سے بیدار تھیں۔ وہ بولا۔ "بھاگنے والا عیسٰی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ زیادہ دور بھی نہیں گیا۔ یہیں کہیں چھپا ہو گا۔ ہم طریقے سے تلاش کریں تو اس کا ملنا مشکل نہیں۔"

تین خواتین کو نکال کر کل سات افراد مجتبٰی کے اردگرد موجود تھے۔ (زریں گل اور مجتبٰی کا ساتھی بھی موقعے پر پہنچ چکے تھے) مجتبٰی نے ایک شخص کو خواتین کے قریب چھوڑا۔ باقی افراد کی تین ٹولیاں بنائیں اور انہیں یہ ہدایت کی کہ وہ مختلف اطراف میں عیسٰی جان کو تلاش کریں ___ ہر ٹولی کے پاس ایک ایک ٹارچ تھی۔ یخ بستہ رات کی خطرناک تیرگی میں ہم نے قریباً ایک گھنٹا جنگل پیمائی کی لیکن عیسٰی جان کا کھوج نہیں ملا۔ رات دو بجے کے لگ بھگ ہم گاڑیوں کی طرف واپس آ گئے۔ تینوں خواتین اسٹیشن ویگن میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں۔ میرا مطلب زلیخا کنور' ناہید تور اور فریال سے ہے۔ تینوں سہمی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے فریال۔ اس نے لڑائی بھڑائی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

مجتبٰی کنور نے مجھے بتایا بلکہ انکشاف کیا کہ وہ مسٹر جی کلارک کے ساتھ ہی پشاور ..... آیا ہوا ہے۔ چند احباب بھی اس کے ساتھ ہیں لیکن کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے وہ ہائی کنگ کر رہے ہیں اور اس وقت انہوں نے کچھ فاصلے پر پشاور روڈ کے کنارے کیمپ لگایا ہوا ہے۔ بظاہر مسٹر جی کلارک سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔

اس نے کہا "آج شام خدا بخش مسٹر جی کلارک سے ملنے حبیب ہوٹل گیا تھا۔ وہاں اسے پتا چلا کہ سہ پہر کے وقت جناح گارڈن میں تمہاری ملاقات اس نادیہ نامی لڑکی سے ہو چکی ہے لیکن ملاقات کے باوجود تم نے ابھی تک حبیب ہوٹل میں ٹیلی فون نہیں کیا ہے۔ خدا بخش اپنے طور پر تمہارا پتا کرنے کے لیے ڈبگری بازار والے مکان پر پہنچا۔ مکان خالی تھا اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ لوگوں نے خدا بخش کو بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ دو افراد ایک لڑکی کو لے کر بلیک جیپ میں یہاں سے گئے ہیں۔ ایک شخص نے جیپ کا پیچھا کیا ہے اور دوڑ کر جیپ کے پیچھے لٹک گیا ہے۔ خدا بخش نے مجھے یہ اطلاع کیمپ میں پہنچائی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جیپ اسی علاقے میں کہیں آئی ہے۔ ہم گاڑیوں میں بیٹھے اور تلاش کرنے لگے ___ اسی دوران میں ہمیں برسٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ اسی سیون ایم ایم گن کا برسٹ تھا جو عیسٰی کے ہاتھ میں تھی۔ ہم اس آواز کا کھوج لگاتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔"

مجتبٰی بڑے اسٹائلش انداز میں گفتگو کرتا تھا۔ دوران گفتگو میں اس کی آنکھوں کی جنبش اور ہاتھوں کی حرکات اس کی زبان کا پورا ساتھ دیتی تھیں۔ غالباً ناہید کی موجودگی کے سبب اس کی گفتگو میں دلکشی کا عنصر نمایاں تر ہو گیا تھا۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ناہید کی موجودگی میں مجتبٰی کی تمام صلاحیتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں اور وہ ایک بدلا ہوا شخص نظر آنے لگتا ہے ___ ترپال والے کمرے میں عیسٰی جان کے دھمکانے کے باوجود وہ جس دلیری سے آگے بڑھا تھا وہ قابل ستائش تھی' تاہم اس دلیری میں تھوڑا بہت ہاتھ یقیناً ناہید کی موجودگی کا بھی تھا۔

روشنی کے لیے دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جلا دی گئی تھیں۔ سب افراد مجتبٰی کے گرد ہالہ بنائے کھڑے تھے اور غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ لوگ مجتبٰی کے قریبی حلقۂ احباب میں تھے۔ سب بے حد دولت مند اور ماڈرن لوگ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ مجتبٰی سے مخلص بھی ہوں لیکن اکثر اس سے مالی و سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ یہ مرد و زن کا ایک ایسا گینگ تھا جو ہر فنکشن اور پارٹی میں چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ لوگ ہر وقت مجتبٰی کی خوشنودی حاصل کرنے کے چکر میں رہتے تھے۔ اس وقت بھی یہ لوگ ہائی کنگ پر نکلے ہوئے تھے۔ یقیناً اس گروپ میں کچھ اور بیگمات و صاحبان بھی ہوں

گے لیکن ان دو گاڑیوں میں یہی سات آٹھ افراد یہاں پہنچے تھے۔

دوران گفتگو میں ناہید کی نگاہ مجتبٰی کے پاؤں پر پڑ گئی "ہائے میں مر گئی" وہ سُریلی آواز میں چیخی "آپ ___ آپ کا پاؤں زخمی ہے۔"

سب نے چونک کر دیکھا۔ مجتبٰی کی سفید شلوار ٹخنے کے قریب سے رنگین نظر آ رہی تھی۔ زلیخا نے جلدی سے اس کا پائنچہ اٹھایا۔ مجتبٰی نے ٹخنے پر اپنا رومال کس کے باندھ رکھا تھا' تاہم یہ رومال بھی سرخ نظر آ رہا تھا "کچھ نہیں' معمولی چوٹ ہے" مجتبٰی نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" مجتبٰی کی اہلیہ زلیخا نے لہجے میں پریشانی سمیٹ کر کہا۔

"وہیں گڑبڑ مار کٹائی کے دوران میں کوئی شے لگ گئی تھی" مجتبٰی نے جواب دیا۔

زلیخا نے رومال کھول دیا۔ "او گاڈ" ناہید اور زلیخا نے ایک ساتھ کہا۔ ٹخنے سے ذرا اوپر گہرا کٹ نظر آ رہا تھا۔ غالباً کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ ذرا ذرا خون اب بھی رس رہا تھا۔ ناہید لپک کر گئی اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے کوئی دوا لے آئی۔ ساتھ میں چپکنے والی پٹی اور کاٹن بھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ متذبذب نظر آئی جیسے سوچ رہی ہو کہ مجتبٰی کے زخم پر خود مرہم رکھے یا زلیخا سے کہے جو اس کی بیوی ہے اور جس کا حق اس سے زیادہ ہے ___ پھر اس نے زلیخا کے حق میں فیصلہ کیا اور فرسٹ ایڈ کی اشیا اس کے ہاتھ میں تھما دیں۔ زلیخا نے مجتبٰی کا بوٹ اور جراب وغیرہ اتار کر اس کا پاؤں اسٹیشن ویگن کے عقبی بمپر پر رکھا اور جیپ کی روشنی میں اس کی بینڈیج کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ کانپ جا رہے تھے۔ مجتبٰی سے کچھ ایسی ہی مرعوب رہا کرتی تھی وہ۔ ناہید اس کے پیچھے کھڑی تھی اور بینڈیج کے بارے میں ہدایات دیے رہی تھی۔ "زلیخا یوں کرو ___ یوں نہ کرو" اس کی ہدایات نے زلیخا کو کچھ اور "پزل" کر رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ زلیخا ایک دبّو عورت ہے اور بے حد ماڈرن ہونے کے باوجود چوہدری ٹائپ مجتبٰی کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتی ہے اسی لیے وہ مجتبٰی کی نگاہ میں بے وقعت ہو چکی ہے اور مار کھاتی رہتی ہے۔ جب کہ ناہید کی طبع میں ایک خاص قسم کی مزاحمت اور اٹھان ہے۔ وہ مجتبٰی کنور سے برابری کی سطح پر بات کرتی ہے۔ اس کی یہی ادا مجتبٰی کنور کو ترغیب دے رہی ہے کہ وہ اس عورت کو فتح کرے۔

بینڈیج ہو چکی تو سب ہی لوگ گاڑیوں میں آ بیٹھے۔

پروگرام واپس موقع واردات پر جانے کا تھا۔ وہاں دو عدد لاشیں مع ایک بے ہوش شخص کے بے یار و مددگار پڑی تھیں۔ تینوں خواتین' زریں گل' خدا بخش اور میں اسٹیشن ویگن میں بیٹھے۔ مجتبٰی کنور پہلے ہمارے ساتھ بیٹھنے لگا' پھر دل میں نجانے کیا آئی کہ سلمان آذر اور دیگر افراد کے ہمراہ جیپ میں جا بیٹھا۔ اسٹیشن ویگن پہلے اسٹارٹ ہو گئی۔ ڈرائیور نے یوٹرن لے کر اس کا رُخ پھیرا۔ اس وقت تک جیپ بھی اسٹارٹ ہو چکی تھی ___ لیکن اپنی جگہ سے اس نے حرکت نہیں کی تھی۔ اسٹیشن ویگن کی ہیڈ لائٹس براہ راست جیپ پر پڑ رہی تھیں۔ پوری جیپ روشنی میں نہا سی گئی تھی۔

اچانک میری نگاہ جیپ کے دائیں پچھلے پہیے پر پڑی۔ پہیے کے بالکل پاس مجھے ایک شے نظر آئی۔ میں نے نگاہیں سکوڑ کر اس شے کو بغور دیکھا۔ میرے بدن کی ہر حس سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔ یوں لگا جیسے ایک لمحے میں کسی نے جسم سے لہو کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے ___ پہیے کے بالکل ساتھ جو گول سیاہ چیز پڑی تھی وہ ٹینک شکن مائن تھی۔ وہی مائن جو دو گھنٹے پہلے عیسٰی جان نے کینوس کے ایک خاکی تھیلے سے نکالی تھی ___ جیپ اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس کا پہیا حرکت میں آنے والا تھا۔ پہیا حرکت میں آنے کا مطلب کیا ہے؟ یہ میں بہت اچھی طرح جانتا تھا ___

میں نے اپنا بالائی دھڑ ویگن کی کھڑکی میں سے باہر نکالا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چیخا "ٹھہر جاؤ" میری صدا ویرانے میں دور تک گونجی لیکن میرے بولنے سے پہلے ہی جیپ حرکت میں آ چکی تھی۔ ڈرائیور کے کلچ پر رکھے ہوئے پاؤں کی ہلکی سی حرکت چھ کلو "ٹی این ٹی" کو چنگاری دکھا چکی تھی ___ بصارت زائل کر دینے والی چمک کے ساتھ ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور میں نے جیپ کو کھلونے کی طرح ہوا میں اچھلتے دیکھا۔

اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھول کر جیپ کی طرف بھاگنے والا پہلا شخص میں تھا۔ سماعت شکن دھماکے کی گونج ابھی تک فضا میں باقی تھی۔ میں نے جیپ کو ہوا میں اچھلتے اور دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر نشیب میں لڑھک گیا تھا جب کہ پچھلا حصہ بیس گز کی دوری پر اوندھا پڑا تھا اور دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ زریں گل اور خدا بخش میرے پیچھے بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں خوفزدہ لڑکیوں کی چیخ و پکار تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر ایک سربریدہ لاش شعلوں

میں گھری پائی۔ یہ جیپ کا ڈرائیور عنایت اللہ تھا۔ فضا میں بارود کی بو کے ساتھ اب گوشت کی سڑاند بھی شامل ہو رہی تھی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ مڑا تڑا لوہا' ربڑ' انسانی گوشت' آگ سب کچھ یکجا ہو گیا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے نشیب میں گئے۔ میں نے ایک شخص کو جیپ کے اگلے ڈھانچے میں سے نکلتے دیکھا۔ یہ سلمان آزر تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں چلا رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ جیپ کے اس حصے میں بھی ایک دو جگہ شعلے نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا مجتبیٰ کنور ایک الٹی ہوئی نشست اور ڈیش بورڈ کے درمیانی خلا میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور خود کو اس شکنجے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے زریں گل کے ساتھ مل کر دروازے کے مڑے تڑے فریم کو پوری قوت سے باہر کی جانب کھینچا اور مجتبیٰ کنور کو باہر نکالنے کے لیے راستہ بنایا۔ مسئلہ مجتبیٰ کنور کی ٹانگوں کا تھا۔ وہ بے طرح الجھی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خدا بخش ٹارچ لینے کے لیے اسٹیشن ویگن کی طرف بھاگا۔ میں نے اندھوں کی طرح تاریک خلا میں ہاتھ چلایا اور مجتبیٰ کنور کو باہر کھینچنا چاہا۔ اس کوشش کے نتیجے میں مجتبیٰ تو باہر نہیں نکلا لیکن ایک انسانی بازو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ کندھے پر سے کٹا ہوا خونچکاں بازو میرے ہاتھ میں تھا۔ زندگی میں سیکڑوں بار انسانی بازو کو چھوا اور تھاما تھا لیکن اس بازو کو چھونا اور اس کے وزن کو محسوس کرنا ایک لرزا خیز تجربہ تھا۔ میری انگلیاں جیسے ہزاروں وولٹ کے جھٹکے مار رہے جھوٹی تھیں۔ میں نے جلدی سے بازو نیچے پھینک دیا۔ زریں گل نے بھی بازو دیکھ لیا تھا۔

"او خدایا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ترحم آمیز نظروں سے مجتبیٰ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مجتبیٰ کنور کا بازو ہے۔ لیکن اگلے چند سیکنڈ میں یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ یہ مجتبیٰ کنور کا بازو نہیں تھا۔

مجتبیٰ کنور نے اپنا دماغ حاضر رکھا ہوا تھا اور خود بھی مڑے تڑے ڈھانچے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازے کا ٹیڑھا فریم سیدھا ہو جانے سے اس کے لیے کافی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم نے مل کر زور لگایا تو اس کی ٹانگیں نشستوں کے نیچے سے نکل آئیں۔ خدا بخش نے ٹارچ کی لرزتی روشنی مجتبیٰ کنور پر ڈالی۔ اس کی ایک ٹانگ خون سے تر بتر تھی۔ شلوار ران پر سے پھٹ چکی تھی اور اندر سے سفید سفید گوشت جھانک رہا تھا۔ یہ وہی ٹانگ تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے ٹخنے کے قریب چوٹ لگی تھی۔ اب اس بڑی چوٹ نے چھوٹی چوٹ کو قطعی غیر اہم کر دیا تھا۔ شاید ہماری عام زندگی میں بھی یہی اصول کار فرما رہتا ہے۔ کوئی الیہ بھی بڑا ہوتا' وہ صرف بڑا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کا موازنہ کسی بڑے المیے سے کریں اور تھوڑی دیر کے لیے تصور کر لیں کہ خدا نخواستہ وہ بڑا المیہ ہم پر وارد ہو چکا ہوتا تو ہم ہر مصیبت پر خدا کا شکر ادا کر سکتے ہیں۔

مجتبیٰ کنور کو نکالنے کے بعد ہم ایک بار پھر جیپ کے جلتے ہوئے حصے کی طرف لپکے لیکن وہاں ہمارے کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم ہراساں چہروں اور دھندلائی نگاہوں سے صرف شعلوں کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ آناً واحد میں تین افراد موت کی آغوش میں چلے گئے تھے جب کہ دو شدید زخمی تھے۔ ہلاک ہونے والے تینوں بدنصیب مجتبیٰ کنور کے دوست تھے اور یہ تینوں جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ مجتبیٰ کنور کو ران پر گہرا زخم آیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی جگہ چوٹ اور جلنے کے معمولی نشانات تھے۔ سلمان حیرت انگیز طور پر قطعی محفوظ رہا تھا۔ اتنے خوفناک حادثے میں زندہ بچ جانا بھی معجزے سے کم نہیں تھا۔ کہاں یہ کہ خراش تک نہ آتی ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بارودی سرنگ جیپ کے پچھلے پہیے تلے پھٹی تھی اور اس کے نتیجے میں جیپ کا اگلا حصہ ٹوٹ کر کئی گز دور جا گرا تھا۔ مجتبیٰ کنور اور سلمان اسی حصے میں تھے۔

مجتبیٰ کنور کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا جانا ضروری تھا۔ اس کی ٹانگ پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں تاہم خون مسلسل خارج ہو رہا تھا۔ زلیخا چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ناہید اور فریال کا بھی برا حال تھا۔ دوستوں کی ناگہانی موت کا دکھ مجتبیٰ کے چہرے پر سیاہ بارش کی طرح برس رہا تھا۔ تاہم اس اذیت انگیز اور اذیت ناک لمحات میں بھی وہ اپنے حواس پر پوری طرح قابو رکھے ہوئے تھا۔ خدا بخش کے سہارے وین میں بیٹھتے ہی اس نے وائرلیس آن کیا اور ایس پی پشاور سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس "لوکیشن" کی تفصیل سمجھانے کے بعد ایس پی کو ہدایت کی کہ وہ معقول نفری کے ساتھ جلد سے جلد موقعے پر پہنچے۔

زلیخا' ناہید اور فریال بھی وین میں بیٹھ چکی تھیں۔ کچھ لمحے بعد وین اسٹارٹ ہو کر موقعے سے روانہ ہو گئی۔ میں اور زریں گل اس منحوس جگہ پر اکیلے کھڑے رہ گئے۔ جیپ کے پچھلے حصے میں ابھی تک شعلے بھڑک رہے تھے۔ جونہی وین کے انجن کا مدھم شور تاریکی میں مدغم ہوا' قرب و جوار کے سناٹے میں ڈوب گئے۔ زریں گل نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"استاد صیب! یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

میں نے کہا "جو کچھ ہوا ہے تمہارے سامنے ہوا ہے۔ عیسیٰ جان ترپال والے کمرے سے بارودی سرنگ لے کر نکلا تھا۔ یہاں سے گزرتے گزرتے وہ سرنگ کو جیپ کے نیچے رکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم انہی گاڑیوں پر اس کا پیچھا کریں گے۔ ایک گاڑی دھماکے سے اڑ جائے گی تو دوسری گاڑی والے تعاقب بھول کر لاشوں کو سنبھالنے میں لگ جائیں گے اور یوں وہ دور نکل جائے گا لیکن ہم گاڑیوں میں بیٹھنے کے بجائے پیدل ہی اس کے تعاقب میں نکل گئے۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ تو پھر بھی ہوا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی تاخیر کے ساتھ ہی سہی۔"

زریں گل نے اپنی زخمی کنپٹی کو چادر کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "خو استاد جی! ہو سکتا ہے وہ حرامی کا بچہ اب بھی یہیں کہیں چھپا ہو۔ ام کو اکیلے دیکھ کر اچانک کہیں سے نکل آئے۔"

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ لفافے میں بند جو شے اس کے قبضے میں ہے وہ بہت اہم ہے۔ وہ اس کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔" (یہ وہی پڑیا جو میری جیب سے نکلی تھی اور اب عیسیٰ جان کے قبضے میں تھی' درحقیقت ایک مڑا تڑا لفافہ ہی تھی۔ کاغذ کے اس گلابی لفافے کو تہ کر کے پڑیا کی شکل دے دی گئی تھی)

زریں گل نے کہا۔ "پھر بھی استاد جی! ام کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ وہ آپ کے خون کا پیاسا ہے۔ امارے منہ میں خاک آپ کا جان لینے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ہم کھلی جگہ سے ہٹ کر چند پتھروں کی اوٹ میں چلے گئے۔ ابھی بمشکل بیس پچیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پولیس کی دو جیپیں سائرن بجاتی موقع پر پہنچ گئیں۔ شہر کے مرکزی تھانے سے ایس پی صاحب اتنی جلدی یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یقیناً انہوں نے وائرلیس پر کسی مضافاتی تھانے کو واقعہ کی اطلاع دی تھی اور اس تھانے کا عملہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ عملہ ایک انسپکٹر' ایک اے ایس آئی اور چھ کانسٹیبلوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ایس پی صاحب اپنے عملے کے ساتھ ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔

گاڑیوں کی روشنی میں لاشوں کو تلاش کیا گیا۔ تینوں افراد جل کر کوئلہ ہو چکے تھے۔ ایک شخص کا بازو غائب تھا' دوسرے کا سر دو نیم ہو چکا تھا۔ ان لاشوں کو چادروں میں لپیٹ کر موبائل گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ ایک کانسٹیبل نے بارودی سرنگ کے چند فولادی ٹکڑے بھی موقعے سے ڈھونڈ لیے۔ انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے' آپ کا نام شاہ جہاں ہے۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "یہ سب کیسے ہوا؟"

زریں گل جل کر بولا۔ "آپ لوگ ہمیشہ دیر سے پہنچتا ہے اور پھر پوچھتا ہے یہ سب کیسے ہوا۔ حالانکہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بھی آپ ہی کا ڈیوٹی ہوتا ہے۔ یارا! ہمارا' آپ کا ڈیوٹی ہوتا ہے یا نہیں؟"

انسپکٹر جانتا تھا کہ ہمارا تعلق کسی نہ کسی طور پنجاب کی اہم شخصیت مجتبیٰ کنور سے ہے' لہٰذا وہ ہم سے بے حد مرعوب تھا۔ اندھیرے میں ویسے بھی اسے زریں گل کی شکل و صورت دکھائی نہیں دی۔ وہ ادب سے بولا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! لیکن آپ دیکھئے کہ جیسے ہی ہمیں اطلاع ملی ہم یہاں پہنچ گئے۔"

"سر" کے خطاب نے زریں گل کو کچھ اور پھُلا دیا۔ وہ تنک کر بولا۔ "آپ لوگوں کا کام جرم کا کھوج لگانا ہی نہیں ہے' جرم کو ہونے سے روکنا بھی ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران ہی ایس پی صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان کا نام جاذب خان تھا۔ وہ جیپ پر پہنچے تھے۔ عملے کے تین ارکان ان کے ساتھ تھے۔ باقی "پولیس ٹرک" میں پیچھے آ رہے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر موقع واردات پر چہل پہل نظر آنے لگی۔ ایس پی جاذب صاحب اپنے ساتھ سرچ لائٹس بھی لائے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی ٹارچیں بھی تھیں۔ ان کا سارا عملہ مسلح تھا اور پوری طرح چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد ایس پی صاحب نے عملے کو چار گروپس میں تقسیم کیا اور ان گروپس کو تمام علاقے میں پھیلا دیا۔ میں ایس پی کے ساتھ ترپال کی چھت والے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک پورٹ ایبل لائٹ کے ذریعے کمرے میں روشنی کی گئی۔ یہاں ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ابتری اس جدوجہد کا نتیجہ تھی جو رونما ہونے سے پہلے میرے اور عیسیٰ جان کے ساتھیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ لالٹین ٹوٹی پڑی تھی۔ زمین پر دور تک خون بکھرا ہوا تھا۔ میرے خنجر سے ہلاک ہونے والے دونوں افراد اسی جگہ پڑے تھے جہاں میں انہیں چھوڑ گیا تھا۔ ان کا لہو پتھریلی زمین پر لوتھڑوں کی صورت جما ہوا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف گولیوں کے خول بکھرے تھے۔ ایس پی صاحب کے ساتھ آئے ہوئے فوٹو گرافر اور نقشہ نویس موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ میں ایس پی

صاحب کو واردات کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ میں نے صرف وہ باتیں بتائیں جن کی وجہ سے "عالی مرتبت" مجتبیٰ کنور پر کسی طرح کا حرف نہیں آسکتا تھا۔ ایس پی بھی جانتا تھا کہ میں اس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہوں مگر وہ خاموش رہا۔

صبح تک پہاڑیوں میں عیسیٰ جان کی تلاش جاری رہی مگر اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ دوپہر سے ذرا قبل ہم پشاور واپس آگئے۔ مجتبیٰ کنور نے ایس پی کے ذریعے مجھے ہدایت بھجوائی تھی کہ میں ڈبگری بازار والے مکان میں واپس چلا جاؤں اور اگلے حکم کا انتظار کروں۔ میں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور ڈبگری بازار واپس آگیا۔ زریں گل کو چہرے پر خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ خاص طور پر کنپٹی کی ایک چوٹ تکلیف دہ تھی۔ میں نے ایک ڈاکٹر کے پاس جاکر اچھی طرح اس کی مرہم پٹی کروائی۔ یہیں کلینک پر میں نے تازہ اخبار بھی دیکھا۔ اخبار میں کل رات پیش آنے والے سانحے کی خبر موجود تھی لیکن اس انداز میں کہ میں ششدر رہ گیا۔ خبر میں مجتبیٰ کنور یا عیسیٰ جان کا نام تک نہیں تھا۔ نہ ہی کہیں بارودی سرنگ کا ذکر تھا۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ پنجاب سے شکار کھیلنے کے لیے آئے ہوئے چند نوجوان پشاور روڈ کے مضافاتی علاقے میں حادثے کا شکار ہوگئے۔ ان کی تیز رفتار جیپ بے قابو ہو کر پتھروں سے جا ٹکرائی اور بری طرح تباہ ہوگئی۔ آگ بھڑک اٹھنے سے تین افراد جل کر ہلاک ہوگئے۔

خبر کو حیران کن طریقے سے توڑا موڑا گیا تھا۔ سب اثر و رسوخ کی بات تھی۔ اگر یہ خبر مجتبیٰ کنور کے بجائے کسی عام شخص سے متعلق ہوتی تو رائی کا پہاڑ بنانے والے اس پہاڑ کو کوہ ہمالیہ ثابت کرکے بھی مطمئن نہ ہوتے۔ تین افراد کی ہلاکت کو دو جنوں افراد کے ہلاک و زخمی ہونے سے تعبیر کیا جاتا۔ جیپ کی جگہ لاری اور بارودی سرنگ کی جگہ ہزار واٹ کا ہلاکت خیز بم لے لیا جاتا۔

میں اور زریں گل اس خبر پر سر دھنتے ہوئے اپنے نیچی چھت والے غریب کدے میں واپس پہنچے تو چند محلے دار ہمارے دروازے پر جمع تھے۔ وہ کل رات والے واقعے کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ ایک خوبصورت لڑکی اور اجنبی شخص کے ساتھ رات گئے میرا گھر سے نکلنا اور جیپ میں سوار ہونا پُراسرار واقعہ تھا۔ اس واقعے کو مزید پُراسرار بنانے میں زریں گل نے بھی بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ جب جیپ ہمیں لے کر یہاں سے روانہ ہوئی تو وہ اس کے پیچھے

لٹک گیا۔ اب ہم قریباً سولہ گھنٹے بعد واپس آئے تھے اور اس حال میں کہ زریں گل کا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اہل محلہ تشویش میں مبتلا نہ ہوتے تو اور کیا کرتے۔ ہم دونوں ان کی نگاہوں میں مشکوک ٹھہر گئے تھے۔ ایسی ناز بیا حرکت اختیار کرنے والوں کو محلے میں کون رہنے دیتا ہے۔ محلے داروں کے تیور دیکھ کر میں نے ضروری سمجھا کہ انہیں منہ کھولنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ ان میں سے معزز ترین شخص کو میں ایک جانب لے گیا اور اسے بتایا کہ ہم دونوں کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے اور ایک مجرم کا سراغ لگانے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

وہ ایک دم مرعوب ہوگیا اور نرمی سے بولا۔ "کیا ہمارے علاقے کے تھانے دار امیر شاہ خان کو آپ جانتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اسے نہیں جانتا لیکن وہ مجھے جانتا ہوگا۔ اگر وہ جاننے سے انکاری ہو تو اسے یہاں لے آنا۔ میں اسے بتادوں گا۔"

میرے اس دلیرانہ دعوے کے بعد محلے داروں کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس چلے گئے۔ جونہی میں اور زریں گل گھر میں داخل ہوئے الٰہ دین سے ملاقات ہوئی۔ وہ برآمدے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ لہٰذا وہ ہماری غیر موجودگی میں اندر آگیا تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب (وہ مجتبیٰ کنور کو اکثر صاحب ہی کہتا تھا) اپنے ایک جاننے والے کی رہائش گاہ پر ہیں۔ رہائش گاہ پر ان کی مرہم پٹی ہوئی ہے۔ زخم ٹھیک ہونے لگے ہیں۔ اب وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "عیسیٰ جان کا کوئی سراغ لگا؟"

وہ بولا۔ "ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اطلاع آئی ہے کہ عیسیٰ جان کو ٹریس کرلیا گیا ہے۔ وہ گلنار کالونی کی ایک کوٹھی میں ہے۔ پولیس نے کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔"

یہ اطلاع میرے لیے دھماکا خیز تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میں وہاں جاسکتا ہوں؟"

وہ بولا۔ "آپ کے جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ شام سے پہلے وہ خبیث گرفتار ہو چکا ہوگا۔"

"شام سے پہلے پہلے کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل وہ اندر ہتھیار بند ہو کر بیٹھا ہے۔"

جواب دے دیا۔ "اس کے چودہ پندرہ ساتھی بھی ہیں۔ یہ سب کے سب مسلح ہیں۔ ٹیلی فون پر اس نے دھمکی دی ہے کہ اس کے پاس راکٹ لانچر ہیں۔ اگر پولیس کوٹھی کے قریب آئی تو وہ راکٹ ماریں گے۔"

"راکٹ لانچر نظر بھی آیا ہے یا بس باتیں ہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔" خدا بخش نے کہا۔ "لیکن وہ جس قسم کا شخص ہے اس کے پاس سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ ایس پی صاحب نے پولیس کو ڈائریکٹ ایکشن سے روک رکھا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے جھنگ سے جاگیردار قادر زمان صاحب کو بلایا ہے۔ شکر صاحب کی طرح قادر زماں صاحب کے بھی عیسیٰ کی گاڑھی چھنتی ہے۔ غالباً قادر زماں صاحب سے کہا جائے گا کہ وہ عیسیٰ کو گرفتاری دینے پر راضی کریں۔"

"تو مجتبیٰ صاحب اسے گرفتار کرنا چاہتا ہے؟" زریں گل نے پوچھا۔

"بالکل۔ وہ اسے معاف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس نے ان کے تین قریبی دوستوں کی جان لی ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ عیسیٰ کا بستر گول ہونے والا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مجتبیٰ صاحب نے ہمارے لیے کوئی ہدایت دی ہے؟"

"نہیں" خدا بخش نے کہا۔ "آپ فی الحال آرام کریں۔ میں آپ کو وقتاً فوقتاً تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتا رہوں گا۔"

میں نے خدا بخش سے فریال کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ "بی بی صاحب کے بارے میں آپ بے فکر رہیں۔ انہیں گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ وہ رات گھر سے باہر رہی ہیں اور کتنے بڑے حادثے کی زد میں آتے آتے بچی ہیں۔ ہاں یاد آیا۔ ان کی طرف سے آپ کے لیے ایک پیغام بھی ہے۔" اس نے اپنی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور ایک تہ شدہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کاغذ کی تہیں کھول کر دیکھا۔ فریال نے انگلش میں لکھا تھا۔ "میں آپ کی طرف سے بے حد پریشان ہوں۔ پتا نہیں آپ کیسے لوگوں میں گھر گئے ہیں۔ ادھر سے آپ کی صحت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ہو سکے تو آج تھوڑا سا وقت نکال کر مجھے اس نمبر پر رنگ

پرواز
ایک محبتِ وطن کی انوکھی اور دلچسپ داستان۔ جو نہ جانے کیا کیا خواب لیکر اپنے وطن آیا مگر؟
قیمت ۵۰/-
ڈاک خرچ ۲۰/-

کرلیں۔" نیچے پشاور چھاؤنی کے علاقے کا ایک نمبر درج تھا۔

خدا بخش تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کی واپسی اگلے روز دس بجے سے پہلے نہیں ہوئی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے سے عیاں تھا کہ ہمیں سنانے کے لیے اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ وہ ہمارے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سردی آج ایک دم زیادہ ہوگئی تھی۔ زریں گل نے دونوں چارپائیوں کی درمیانی جگہ پر انگیٹھی دہکا رکھی تھی۔ خدا بخش اپنے ہاتھ انگیٹھی پر سینکتے ہوئے بولا۔ "بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جناب! میں ابھی گلنار کالونی سے ہی آرہا ہوں۔"

"وہ حرامی بھاگ تو نہیں گیا؟" میرا اشارہ عیسیٰ جان کی طرف تھا۔

"نہیں وہ تو نہیں بھاگا لیکن ہمیں بھاگنا پڑ رہا ہے" خدا بخش نے جواب دیا۔ پھر گولڈ لیف کے سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ "بہت خبیث نکلا ہے وہ۔"

"کیوں کیا ہوا؟" زریں گل نے دریافت کیا۔

"جاگیردار قادر زماں صاحب کل تین بجے والی فلائٹ سے پشاور پہنچے تھے" خدا بخش نے کہنا شروع کیا۔ "انہیں فوری طور پر گلنار کالونی پہنچایا گیا۔ یہ کالونی ابھی آباد نہیں ہوئی۔ بس اکا دکا کوٹھیاں ہی بنی ہوئی ہیں۔ جس کوٹھی میں عیسیٰ جان گھسا ہوا ہے وہ بالکل الگ تھلگ ہے۔ چاروں طرف فاصلے تک جگہ خالی ہے۔ کہیں اتنی آڑ بھی نہیں ہے کہ پولیس والے پوزیشن ہی لے سکیں۔ ان کو کافی فاصلے پر رہنا پڑ رہا ہے۔ ایس پی صاحب خود بھی موقع پر موجود ہیں۔ انہوں نے ہی قادر زماں صاحب کو اندر بھیجا تھا۔ قادر زماں صاحب قریباً دو گھنٹے اندر رہے۔ بات چیت طویل ہوگئی تھی لہٰذا امید تھی کہ عیسیٰ جان گرفتاری پیش کردے گا لیکن نتیجہ مختلف نکلا۔ قادر زماں صاحب باہر آئے تو خاصے افسردہ تھے۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ کوٹھی میں عیسیٰ جان اکیلا نہیں۔ اس نے کچھ خواتین کو یرغمال بھی بنا رکھا ہے۔ انہی یرغمال خواتین کے سبب اس کا حوصلہ بلند ہے اور وہ پولیس والوں سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کر رہا ہے۔ قادر زماں

صاحب نے بتایا ہے کہ یرغمالی خواتین کی تعداد چھ ہے۔ وہ سب کی سب خوبرو جوان لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے تین ائر ہوسٹس ہیں۔ شاید آپ نے کچھ عرصہ پہلے یہ سنسنی خیز خبر سنی ہو۔ قبائلی ڈاکوؤں نے ایک ایسی گاڑی اغوا کی تھی جو ائر ہوسٹس کو لے کر ائرپورٹ جا رہی تھی۔ ان ڈاکوؤں کا سرغنہ یہی عیسٰی جان تھا۔ یہ واقعہ پنڈی میں ہوا تھا۔ اخباروں میں کافی عرصہ اس خبر کا چرچا رہا تھا۔ بعد میں لوگوں نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ڈاکوؤں نے لڑکیوں کو افغان علاقے میں لے جا کر فروخت کر دیا ہے۔ لیکن اب یہ انکشاف ہوا ہے کہ لڑکیاں یہیں پشاور میں ہیں۔ انہیں اب تک نجانے کہاں کہاں رکھا گیا ہے۔ بہرحال اب وہ گلنار کالونی کی اس کوٹھی میں ہیں جہاں عیسٰی جان نے اپنے پندرہ ساتھیوں سمیت پناہ لے رکھی ہے۔"

یہ اطلاع حیران کن تھی۔ ائر ہوسٹس کے اغوا کے بارے میں میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ یہ واقعہ کئی ماہ پہلے پیش آیا تھا اور اخبارات کی زینت بنا رہا تھا۔ اگر واقعی اغوا شدہ ائر ہوسٹس زندہ تھیں اور گلنار کالونی کی کوٹھی میں موجود تھیں تو کل علی الصباح پورے ملک کے اخبار چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھانے والے تھے۔ میں نے خدا بخش سے پوچھا۔ "قادر زماں نے ان لڑکیوں کو خود دیکھا ہے؟"

"قادر زماں صاحب کہتے تو یہی ہیں۔" خدا بخش نے جواب دیا۔ "انہوں نے بتایا ہے کہ عیسٰی جان نے لڑکیوں کو ایک ہی کمرے میں جمع کر رکھا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ اگر پولیس نے کوٹھی پر "ریڈ" کیا تو سب سے پہلے لڑکیوں کی جان جائے گی۔ قادر زماں صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ کوٹھی میں چھ عدد طاقتور راکٹ لانچر موجود ہیں۔"

زریں گل جھنجلایا۔ "او خدا ئی خوار! اللہ تمہارا بیڑا غرق فرمائے۔ ام کو پہلے ہی شک تھا کہ یہ عیسٰی جان مرد کا بچہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص ہر جگہ عورت ذات کے کندھے پر رکھ کر رائفل چلائے وہ مرد نہیں چوہا ہے۔ شاید آپ نے کبھی دیکھا ہو بدر منیر نے ایک فلم میں ایک ایسے ہی چوہے کو اپنے ہاتھ سے پھانسی دیا تھا۔ اور پھر بعد میں وہ اپنے ساتھیوں کو...."

"ہاں۔۔ ہاں' میں نے سب دیکھا ہوا ہے" میں نے زریں گل کی بات کاٹی۔

خدا بخش بولا۔ "مجبوراً پولیس کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ ورنہ ایس پی صاحب کا ارادہ تھا کہ قادر زماں صاحب کی بات چیت کامیاب ہو یا ناکام' آج اندھیرا ہونے سے پہلے کوٹھی پر ہلا بول دیا جائے گا۔"

میں نے پوچھا "مجتبٰی صاحب اس بارے میں کیا کر رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "یہی تو سخت گڑبڑ ہوتی ہے۔ صاحب کو تین دن آرام کی ضرورت تھی لیکن آج صبح انہیں ہنگامی طور پر اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ سنا ہے وہاں کوئی اعلٰی سطح کی میٹنگ تھی۔ اس میٹنگ کے فوراً بعد انہیں کسی سرکاری کام سے ماسکو بھیج دیا گیا ہے۔ صاحب درد دور کرنے والے انجکشن لگوا کر روانہ ہوئے ہیں۔ بہت پریشان تھے وہ۔ دو رفقا بھی ان کے ساتھ گئے ہیں۔ خدشہ ہے کہ صاحب کو واپسی میں دو ہفتے لگ جائیں گے۔ ان کی غیر موجودگی میں معاملے کو ہینڈل کرنے کی ساری ذمے داری جاگیردار زماں صاحب اور مجھ پر آ گئی ہے۔"

"ہوں۔۔ تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"سوچ سوچ کر تو عقل خبط ہو گئی ہے۔" خدا بخش نے کہا۔ "صاحب کہہ گئے ہیں کہ عیسٰی جان کو نہ صرف گرفتار کرنا ہے بلکہ اس سے وہ گلابی لفافہ بھی برآمد کرنا ہے جو آپ نے جناح گاروان میں لڑکی سے وصول کیا تھا۔ کلارک صاحب کا اصرار ہے کہ لفافہ برآمد کرنے والا کام ہر صورت بارہ گھنٹے کے اندر اندر ہونا چاہیے۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے حبیب ہوٹل سے پھر ان کا فون آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا بے حد نقصان ہو رہا ہے۔ صاحب کو ایسے موقعے پر ملک سے باہر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے کلارک صاحب کو سمجھایا ہے کہ "صاحب اپنی مرضی سے نہیں گئے۔ وہ تو سخت زخمی تھے لیکن بہت اوپر سے حکم ملا تھا اس لیے وہ ٹال نہیں سکے۔"

میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "خدا بخش! تمہاری سمجھ میں کچھ آ رہا ہے کہ گلابی لفافے میں کیا چیز ہو سکتی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں جی! نہ صاحب نے بتایا تھا اور نہ قادر زماں صاحب بتا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی قادر زماں صاحب کو خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ لفافے والا چکر کیا ہے۔"

میں نے خدا بخش کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن نہیں ہو سکا کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا۔ جب اسی کمرے میں عیسٰی جان نے لفافے کی پڑیا میرے ہاتھ سے جھپٹی تھی اور اسے کھولا تھا۔ وہ زرد رنگ کے دانے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دال کے دانے ہیں لیکن وہ کسی دوا کی زرد ٹکیاں بھی ہو سکتی تھیں۔ یا پھر تحقیق جیسی کوئی شے۔ میں نے خدا بخش سے پوچھا۔ "قادر زماں اب کہاں ہے؟"

"وہیں گلنار کالونی میں ہے۔ ہم نے قریب کی دو کوٹھیاں خالی کرا رکھی ہیں۔ پولیس نے انہی کوٹھیوں میں ڈیرا جما رکھا ہے۔"

"کیا میں قادر زماں سے مل سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے' اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"لیکن مجتبٰی صاحب کا خیال اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔"

"صاحب مجھ سے کہہ گئے ہیں کہ موقع محل دیکھ کر میں اپنے طور پر فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ چلو آؤ گلنار کالونی چلتے ہیں۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"استاد جی! کہاں جاتا ہے آپ؟" زریں گل نے احتجاج کیا۔ "آپ کو بخار ہے۔ دیکھیں چہرہ کیسے آگ کے مافق تپ رہا ہے۔ اتنی سردی ہے باہر۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"زریں گل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "دیکھیں۔۔ کیسے گرم ہو رہا ہے آپ کا ہاتھ۔"

پھر وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولا۔ "استاد صیب! ایک منٹ امارے ساتھ آئیں۔ ام آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہے۔" پھر وہ خدا بخش سے مخاطب ہو کر بولا۔ "خو چہ ام مانی جاتا ہے۔ بس ایک منٹ میں واپس آتا ہے۔"

وہ مجھے لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا۔ دل گرفتہ سے لہجے میں بولا۔ "خو استاد جی! خود پر اتنا ظلم مت کرو۔ دیکھو آپ کا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقہ پڑ گیا ہے۔ چہرے کا ہڈی باہر نکل رہا ہے۔ یوں لگتا ہے مہینوں کا بیمار ہے آپ۔ ام آپ کے غم کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ام جانتا ہے غزالہ بی بی کے بغیر آپ کے لیے جینا مشکل ہو رہا ہے۔ استاد جی! ام بڑا ماہول کی بات نہیں کرے گا۔ لیکن ام کو اوپر والے کا قسم' آپ کو دیکھ کر ام کا سینے میں دل بہت دکھا ہے۔ آپ ام کو حکم دے' ام آپ کا غم دور کرنے کے لیے کیا کرے۔ آپ صرف ایک بار امارے سے کہہ دے' ام آپ کا خوشی لوٹانے کے لیے اپنا جان قربان نہ کر دے تو غیرت خان کا بیٹا نہیں ہے۔"

میں نے زریں گل کی نمناک آنکھوں میں دیکھا اور زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ "زریں گل تم بہت جذباتی شخص ہو۔ جو تم سمجھ رہے ہو وہ نہیں ہے۔ غزالہ کی شادی والے واقعے کا مجھے دکھ ضرور ہے لیکن اتنا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ امید ہے چار چھ ہفتوں میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔ جہاں تک طبیعت کی خرابی کی بات ہے تو ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولا۔ "نہیں استاد صیب۔۔ نہیں۔۔ ام جانتا ہے۔ ام اچھی طرح جانتا ہے آپ غزالہ بی بی کو کبھی نہیں بھول سکے گا۔ نہ چار چھ ہفتوں میں نہ چار چھ سالوں میں۔ آپ ام سے جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ رات دن بی بی کو یاد کرتا ہے۔ آپ نیند میں بھی اس سے باتیں کرتا ہے۔ پرسوں ام نے آپ کو دیکھا تھا آپ تیز بخار میں بے سدھ پڑا تھا۔ آپ کے خشک ہونٹ بی بی کا نام لے رہے تھے۔ ام نے اپنے ان کانوں سے سنا ہے جی۔ ام سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ آپ ام کو اتنا بیوقوف مت سمجھو۔ ام اتنا بیوقوف نہیں ہے۔" زریں گل کی آنکھوں سے اب باقاعدہ آنسو بہہ نکلے تھے اس نے چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ام سے اب اور برداشت نہیں ہوتا استاد جی۔ یا ام کو چھٹی دو یا ام کو اپنے دکھ درد میں شریک کرو۔"

زریں گل کا یہ ہمدردانہ روپ میرے لیے نیا تھا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "زریں گل تم اس بات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ یقین کرو' جو کچھ ہوا مجھے اس کی پہلے سے خبر تھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ اس کی کہیں شادی ہو جائے۔ تم سنو۔۔"

"آپ ام کو بہلانے کا کوشش مت کرو۔" زریں گل نے میری بات کاٹی۔ پھر دو ٹوک لہجے میں بولا۔ "ام نے ایک فیصلہ کر لیا ہے استاد جی! ام فریال صاحبہ سے غزالہ بی بی کا پتا پوچھے گا اور ان کے پاس جائے گا۔ ان کو بتائے گا کہ آپ پر کیا بیت رہی ہے اور ان سے پوچھے گا کہ یہ سب کچھ انہوں نے کیوں کیا؟ آپ بے شک ام سے ناراض ہو یا ام کو مارے پیٹے۔ لیکن ام ایک بار غزالہ بی بی سے ضرور ملے گا۔"

"نہیں زریں گل" میں نے اس کے دونوں شانے تھام کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم حوصلہ رکھو۔ میں چند دن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"ام کو یقین نہیں ہے" وہ بولا۔

"تم یقین کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔" میں نے اس کا

شانہ دبا کر کہا۔

زریں گل چونکہ زخمی تھا لہٰذا میں نے اسے گھر ہی میں رہنے دیا اور خدا بخش کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ خدا بخش ایک ہرفن مولا اور مشکل پسند شخص تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی لباس یعنی سفید شلوار قمیص میں ملبوس رہتا تھا۔ موسم کافی سرد ہو چکا تھا پھر بھی اس کے جسم پر یہی کپڑے تھے۔ وہ مجتبیٰ کنور کا ملازم خاص الخاص تھا۔ مجتبیٰ اسے چراغ کا جن کہتا تھا اور یہ لقب کوئی ایسا غلط نہیں تھا۔ میں نے خدا بخش کو ہر کٹھن گھاٹی لمحوں میں سر کرتے دیکھا تھا۔ ہمارے خستہ حال مکان سے قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر خدا بخش کی شاندار پجارو گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور چوکس بیٹھا تھا۔ ہم گاڑی میں سوار ہوئے اور گلنار کالونی روانہ ہو گئے۔

خدا بخش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ کالونی ابھی غیر آباد تھی۔ سڑکیں سیوریج بجلی سب کچھ موجود تھا لیکن کوٹھیاں خال خال نظر آتی تھیں۔ جس وسیع و عریض کوٹھی میں پولیس نے ہنگامی مرکز قائم کر رکھا تھا وہ بھی ابھی زیرِ تکمیل تھی۔ چھت پر پولیس کے مسلح جوان گھوم رہے تھے۔ وائرلیس سے لیس دو جیپیں کوٹھی کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں کوٹھی کے پچھواڑے چند ایمبولینس گاڑیاں بھی دیکھ چکا تھا۔ انہی گاڑیوں کے قریب مجھے سیاہ رنگ کی ایک شاندار امپالا نظر آئی تھی۔ اس امپالا کے قریب ایک مسلح ہوتا پہرے پر کھڑا تھا۔ ہونے کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ اس گاڑی پر جھوک ضامن کا بے تاج بادشاہ جاگیردار قادر زماں یہاں پہنچا ہے۔ خدا بخش مجھے کوٹھی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں رنگ و روغن ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی فرنیچر وغیرہ نہیں لگایا گیا تھا۔ فرش بھی قالین سے محروم تھا۔ یہاں نشست و برخاست کے لیے پولیس نے عارضی سا انتظام کر رکھا تھا۔ مجھے ایک صوفے پر جاگیردار قادر زماں بیٹھا نظر آیا۔ حسبِ معمول دو باوردی ہونے اس کے پیچھے مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ قادر زماں کے بال الجھے ہوئے تھے اور تمتمایا ہوا سرخ چہرہ کچھ اور بھی تمتمایا نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے ایش ٹرے میں سگار کے بہت سے آدھ جلے ٹکڑے موجود تھے۔

خلافِ توقع اس نے میرے سلام کا جواب شائستگی سے دیا اور اپنے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ ڈرائنگ روم کی دیوار گیر کھڑکی میں بڑے بڑے شیشے لگے تھے ان شیشوں میں سے دور ایک دو منزلہ کوٹھی کا منظر نظر آ رہا تھا۔ قادر زماں نے کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جان جی! یہی وہ مکان ہے جہاں عیسیٰ جان مورچا جمائے بیٹھا ہے۔ دیکھو وہ چھت پر برساتی کے قریب راکٹ لانچر کا اگلا حصہ نظر آ رہا ہے۔" میں نے قادر زماں کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ واقعی چھت پر راکٹ لانچر موجود تھا۔ لانچر کے قریب ہی متحرک ہیولے سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس سارے علاقے کو باوردی اور سادہ پوش پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا ورنہ مورچا بندی اور صف آرائی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے سیکڑوں افراد یہاں جمع ہو گئے ہوتے۔

"اندر کتنے افراد ہوں گے؟" میں نے قادر زماں سے پوچھا۔

"میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اندازہ ہے کافی بندے ہوں گے۔"

مجھے جھٹکا سا لگا۔ قادر زماں نے خدا بخش کو بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ اندر چودہ پندرہ افراد ہیں جب کہ مجھے بتا رہا تھا کہ ٹھیک سے پتا نہیں۔ نجانے کیوں میرا یہ شبہ تقویت پکڑنے لگا کہ قادر زماں اندر کے حالات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ شاید اس طرح وہ عیسیٰ جان کی پوزیشن بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کوٹھی میں سات راکٹ لانچر اور بہت سا اسلحہ موجود ہے لیکن چھت پر صرف ایک لانچر نظر آ رہا تھا۔ ممکن تھا کہ افراد کی طرح اسلحے کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہو۔ بہرطور اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

قادر زماں نے سگار کا طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ "ان ہوسٹیجوں کی وجہ سے بڑا مسئلہ کھڑا ہے۔ یہ پکی بات ہے کہ عیسیٰ جان کو اپنی جان خطرے میں نظر آئی تو وہ ان لڑکیوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اس سے کھل کر بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لڑکیاں ہمارے حوالے کرنے کو تیار ہے لیکن اسے یہاں سے نکل جانے کی ضمانت دی جائے۔"

"کیسی ضمانت؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ انہیں آزاد علاقے میں لے جا کر ہمارے حوالے کر دے گا۔ لیکن مجتبیٰ صاحب یہ فرما گئے ہیں کہ عیسیٰ کو ہر صورت گرفتار کرنا ہے۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ہم مجتبیٰ صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کال بُک کرائی تھی۔ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "عیسیٰ اور اس کے ساتھیوں نے ابھی تک کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں مانگی؟"

"نہیں جان جی" قادر زماں نے جواب دیا۔ "میرا اندازہ ہے کہ کوٹھی میں وافر راشن اور پانی وغیرہ موجود ہے۔ ویسے بھی ابھی محاصرہ کیے ہوئے صرف چوبیس گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔"

خدا بخش نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "عیسیٰ جان بے حد محتاط شخص ہے۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو خوراک میں کچھ ملا کر دیا جا سکتا ہے تو یہ بے حد مشکل کام ہے۔"

"مشکل نہیں، ناممکن کہو جان جی" قادر زماں نے لقمہ دیا۔

"کوٹھی پر "ریڈ" کیا جائے تو کیا چانسز ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"قریباً صفر" قادر زماں کا جواب تھا۔ "تم دیکھ ہی رہے ہو جان جی، چاروں طرف کوئی اوٹ نہیں ہے۔ جونہی کوئی کوٹھی کی طرف بڑھتا ہے، عیسیٰ جان کے کارندے ہوائی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ کوٹھی کی بناوٹ ایسی ہے کہ کسی کو چکما دے کر اندر گھسنا ناممکن ہے۔ رات ان لوگوں نے کوٹھی کی ساری باہر کی بتیاں جلا دی تھیں۔ کافی فاصلے تک روشنی جا رہی تھی۔ تین چار بڑی بڑی سرچ لائٹس بھی ہیں ان کے پاس۔"

"قادر زماں صاحب! اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں جان جی! کیوں نہیں۔ یہ مسئلہ ہم کو مل جل کر ہی حل کرنا ہے۔"

"قادر صاحب! آپ کی ذاتی رائے کیا ہے اس بارے میں؟"

"میری ذاتی رائے تو یہی ہے کہ فی الحال عیسیٰ کی گرفتاری پر اصرار کرنا خطرناک ہے۔ اگر ہم عیسیٰ سے وہ کلینٹ اور لڑکیاں ہی برآمد کر لیں تو بڑی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "قادر صاحب! کیوں نہ رات کے وقت کوٹھی میں گھسنے کی کوشش کی جائے۔ میں اس کام کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کر سکتا ہوں۔"

قادر زماں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کے تاثرات کو کوئی خاص مفہوم نہ پہنا سکا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "جہاں تک کوٹھی کی روشنیوں اور سرچ لائٹس کا تعلق ہے تو ان سے چھٹکارا پانے کے لیے کوٹھی کی بتی رو منقطع کی جا سکتی ہے۔"

قادر زماں پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "یہ کوشش عیسیٰ جان کو مشتعل کر دے گی۔"

میں نے کہا "ہم صرف کوٹھی کی بتی رو منقطع نہیں کریں گے بلکہ پورے علاقے کی بجلی بند کر دیں گے۔ عیسیٰ جان کے لیے شک کی گنجائش نہیں رہے گی۔" قادر زماں تائید کے انداز میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔ "کوٹھی میں گھسنے کی کوشش رات کے پچھلے پہر کی جائے۔ یقیناً عیسیٰ کے ساتھیوں میں سے کئی سو رہے ہوں گے۔ کارروائی کے وقت عیسیٰ جان کو ٹیلی فون پر مشغول رکھا جا سکتا ہے۔"

قادر زماں نے پیشانی پر الجھن کی لکیریں سجالیں۔ "شاہ جہاں، تمہاری تجویز دلیرانہ ہے۔ لیکن مسئلہ پھر لڑکیوں کا ہے۔ تمہیں تو ان اخباری نمائندوں کا پتا ہی ہے کہ کس طرح خبروں کی بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن لڑکیوں والی خبر پھر بھی آؤٹ ہو گئی۔ اب اخباروں کے دفاتر میں بڑی بڑی سرخیوں کی کتابت ہو رہی ہو گی۔ ان لڑکیوں کا کھوج ہی نہ لگتا تو اور بات تھی۔ اب کھوج لگنے کے بعد انہیں کچھ ہو گیا تو ربّا آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔"

قادر زماں کی ہر بات سے یہ حقیقت ثابت ہو رہی تھی کہ وہ عیسیٰ جان کو رعایت دینے کے حق میں ہے۔ اس نے پولیس والوں کو بھی بہت حد تک بد دل بلکہ مایوس کر رکھا تھا۔ ایس پی صاحب اور ان کے ساتھی کسی طرح کی جدوجہد کرنے سے پہلے ہی ہارے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ قادر زماں بڑے ڈھکے چھپے انداز میں کوشاں تھا کہ عیسیٰ جان گرفتاری سے بچ جائے۔ مجتبیٰ کنور پاکستان میں موجود نہیں تھا لہٰذا قادر زماں اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے میں آسانی محسوس کر رہا تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب اطلاع دی گئی کہ ماسکو میں مجتبیٰ صاحب سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے۔ قادر زماں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اتنے میں ایس ایس پی جاذب خان بھی موقعے پر پہنچ گئے۔ قادر زماں سے مشورے کے بعد ایس پی جاذب نے فیصلہ کیا کہ عیسیٰ جان سے بات چیت کا ایک دور اور کیا جائے۔

قادر زماں، عیسیٰ سے ملنے چلا گیا اور پولیس کے افسران ایک علیحدہ کمرے میں میٹنگ کرنے لگے۔ میں گھوم پھر کر کوٹھی کا جائزہ لینے لگا۔ پولیس والوں نے اچھی خاصی مورچا بندی کر رکھی تھی۔ ایک خصوصی چھاپا مار دستہ بھی تیار حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس دستے میں جلیل کمانڈر بھی شامل

تھا۔ مجھے پہلی بار انکشاف ہوا کہ جلیس کمانڈر کا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ وہ پولیس کے جوانوں کو مارشل آرٹس کی تربیت دیتا تھا۔ اس کا عہدہ انسپکٹر کا تھا۔ یہ چھاپہ مار دستے بلٹ پروف جیکٹس پہنے ہوئے تھے اور سروں پر آہنی خود تھے۔ ان سب کے پاس چھوٹی نال کی خودکار رائفلیں تھیں۔ اس دستے کے جوانوں کی کل تعداد آٹھ تھی۔ جلیس کمانڈر نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ اس کے تربیت یافتہ ہیں اور اس سے پہلے کئی چھاپہ مار کارروائیوں میں کامیابی سے حصہ لے چکے ہیں۔

قادر زماں کی واپسی نصف گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے ایس پی جاذب کو بتایا۔ "ایس پی صاحب! عیسیٰ کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ بہت غصے میں نظر آتا ہے وہ۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم لوگ ٹائم پاس کر رہے ہیں۔ اس نے دو گھنٹوں کی مہلت دی ہے۔ کہتا ہے کہ آٹھ بجے تک اسے دو چھوٹی گاڑیاں یا ایک بڑی گاڑی مہیا کی جائے۔ وہ کرم ایجنسی جانا چاہتا ہے۔ اگر آٹھ بجے تک گاڑی نہیں دی گئی تو وہ ایک مغویہ کو قتل کر کے باہر پھینک دے گا۔"

ایس پی جاذب صاحب خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ اس تنازعے کے حوالے سے ان پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ قادر زماں نے کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ "خلیلی صاحب نے اس موقع پر باہر جا کر ٹھیک نہیں کیا۔ وہ یہاں ہوتے تو معاملہ بہتر طریقے سے نمٹایا جا سکتا تھا۔"

ایس پی صاحب نے پیشانی مسلتے ہوئے قادر زماں سے پوچھا۔ "اگر اسے گاڑی فراہم کر دی جائے تو وہ کوٹھی چھوڑنے سے پہلے لڑکیاں ہمارے حوالے کر دے گا؟"

"اب تو وہ خبیث اس سے بھی مکر رہا ہے۔" قادر زماں نے جواب دیا۔ "اس کا کہنا ہے کہ وہ لڑکیوں کو بھی ساتھ ہی کرم ایجنسی جا کر ہمارے حوالے کرے گا۔"

ایس پی کے چہرے پر خون کی سرخی نے یورش کی۔ شاید ایک دو لمحوں کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر عیسیٰ جان کو سبق سکھا دیں لیکن پھر فوراً ہی اس دلیری کے انجام کا سوچ کر وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ میں نے کہا۔ "قادر زماں صاحب ایسا لگ رہا ہے کہ ہم عیسیٰ پر قابو پانے میں جتنی تاخیر سے کام لے رہے ہیں وہ اتنا ہی سخت رویہ اختیار کرتا جا رہا ہے۔"

اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک عمر رسیدہ شخص سنتریوں کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ معزز گھرانے کا پڑھا لکھا فرد نظر آتا تھا۔ قادر زماں اور ایس پی جاذب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "خدا کے لیے آفیسرا ہم پر رحم کریں۔ ایک مدت سے ہمارے جگر کے ٹکڑے ہم سے جدا ہیں۔ اب اگر خدا نے ہمیں ان سے ملا دیا ہے تو ہمیں ان سے دور مت رکھیں۔"

ایک انسپکٹر نے بڑی بدتمیزی سے بوڑھے کو دبوچا اور دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ دروازے پر کھڑے سنتریوں نے بھی انسپکٹر کی مدد کی اور بوڑھے کو کھینچتے دھکیلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ بوڑھا مسلسل فریاد کناں تھا۔ "کوئی مجھے میری بچی کی شکل دکھا دے۔ ایک بار صرف ایک بار پھر مجھے مرنا بھی قبول ہے۔ مجھ پر رحم کریں سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ مجھ پر رحم کریں۔"

میں اس بوڑھے کی چیخ و پکار کا تعاقب کرتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ یہاں ایک ہال نما کمرے میں کوئی درجن بھر مرد و زن جمع تھے۔ خدا بخش نے بتایا کہ یہ سب ان دوشیزاؤں کے لواحقین ہیں جو عیسیٰ جان کی تحویل میں ہیں۔ ابھی اخبار چھپے تھے اور نہ ریڈیو، ٹی وی پر کوئی ایسی خبر نشر ہوئی پھر بھی معلوم نہیں کس طرح سارے شہر کو پتا چل گیا تھا کہ سال سوا سال پہلے اغوا ہونے والی دوشیزاؤں کا کھوج مل گیا ہے اور پشاور پولیس انہیں اغوا کنندگان کے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں نے دیکھا، ہال نما کمرے میں جمع ہونے والے زیادہ تر افراد عمر رسیدہ تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔ دو تین نورانی صورت والی عورتیں مسلسل سسک رہی تھیں۔ ایک بوڑھا جو کسی مغویہ کا دادا یا نانا تھا، ایک گوشے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ طویل، نہ ختم ہونے والے سجدے میں گرا ہوا تھا۔ یہ سب پڑھے لکھے افراد تھے اور خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس وقت فقیروں کے حال میں فرش پر تھے اور ان کے چہروں پر بے چارگی کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بچیاں ڈاکوؤں کے قبضے میں ہیں اور ایک دو دن یا دو چار ہفتوں سے نہیں مہینوں سے ہیں۔ انہیں اچھی طرح خبر تھی کہ ان پر وہ سب بیت چکا ہے جو اغوا ہونے والی لڑکیوں کا مقدر ہوتا ہے۔ اب وہ آبرو باختہ، کچلی مسلی ہوئی عورتیں تھیں لیکن پھر بھی ان کی اولاد تھیں۔ ان کی آنکھیں اپنی اولاد کی صورت کو ترس رہی تھیں اور ان کی باہیں انہیں سمیٹنے کے لیے بے تاب تھیں۔

وہ غم سے نڈھال بوڑھا جو اپنی مغویہ بیٹی کے لیے رو پیٹ رہا تھا، مجھے بھی کوئی پولیس والا سمجھا اور بھاگ کر میرے بازو سے لپٹ گیا۔ "ہماری مدد کرو میاں!" اس نے پوری جان سے کانپتے ہوئے کہا "ہم بڑی امیدیں لے کر یہاں آئے ہیں۔ ہماری بچیاں اس سامنے والے مکان میں ہیں لیکن ہمیں ان سے ملنے نہیں دیا جا رہا۔ اپنے آفیسرز کو سمجھاؤ میاں! انسان کی جان سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جو مانگتے ہیں انہیں دے دو لیکن ہماری بچیوں کو بچاؤ۔"

میں نے اسے دلاسا دیا "باباجی! حوصلہ رکھیں۔ ہم سب اسی لیے یہاں جمع ہیں۔ اگر خدا نے آپ کو یہ خبر سنائی ہے کہ بچیاں صحیح سلامت یہاں موجود ہیں تو ان شاء اللہ یہ خبر بھی آپ سنیں گے کہ وہ آزاد ہو گئی ہیں۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ خدا تمہیں زندگی دے" بوڑھا میری بلائیں لینے لگا۔ چند اور افراد بھی میرے گرد جمع ہو گئے۔ وہ سب آبدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک عورت نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "بیٹا! کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔ اندر ہو کیا رہا ہے؟ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اگر وہ پیسے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم اپنا آپ بیچ کر بھی پیسے دینے کو تیار ہیں۔ ہمیں کچھ بتاؤ تو سہی۔"

میں نے کہا۔ "ماں جی! میں پولیس والا نہیں ہوں اور نہ مجھے کچھ معلوم ہے۔ بس آپ حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری وضاحت کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں تنہائی میں کچھ سوچنا چاہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہاں ایک سازش ہو رہی ہے۔ عیسیٰ جان کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا اور ایسی صورتِ حال پیدا کی جا رہی تھی کہ عیسیٰ نہ صرف بچ کر نکل جائے بلکہ لڑکیوں کو بھی ساتھ لے جائے۔

شام سات بجے تک گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور سہ پہر سے یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ میں اس یخ بستہ ہوا میں چھت پر کھڑا اس کوٹھی کا جائزہ لے رہا تھا جہاں عیسیٰ جان اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ مورچہ بند تھا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں اعلیٰ افسران کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس میٹنگ میں قادر زماں بھی شریک تھا۔ رات پونے آٹھ بجے جب عیسیٰ کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے، یہ فیصلہ ہوا کہ عیسیٰ کو یہاں سے بلا رکاوٹ نکلنے دیا جائے اور اس مقصد کے لیے اسے گاڑی فراہم کر دی جائے۔ ایک طرح سے یہ مکمل پسپائی کا اعلان تھا۔ عیسیٰ جان کو فراہم کرنے کے لیے ایک منی کوچ پہلے ہی یہاں لا کر کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس کوچ پر پشاور کا نمبر تھا۔ کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ عیسیٰ جان کی ہدایت کے مطابق کوچ کی ڈیزل ٹنکی فل کر دی گئی تھی۔ کوچ کے قریب دو کانسٹیبل ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے تھے۔ وہ کوچ کا پہرا دے رہے تھے۔ میں چھت سے نیچے اترا اور ٹہلنے والے انداز میں کوچ کی طرف چلا گیا۔ میرے بدن میں ایک عجیب سی سنسناہٹ جاگی ہوئی تھی۔ یہ سنسناہٹ مجھے ہر اندیشے سے بے نیاز کر رہی تھی اور اکسا رہی تھی کہ میں اپنے طور پر کچھ کر گزروں۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ لمحہ بہ لمحہ ایک بے رحمی سی میرے اندر پروان چڑھ رہی تھی۔ کوچ کی دائیں جانب مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس جانب کوئی نگران بھی نظر نہیں آتا تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں سیدھا چلتا چلتا اچانک کوچ کی طرف مڑا اور جلدی سے اس کے نیچے گھس گیا۔ میں کچھ دیر کوچ کے نیچے بے حس و حرکت لیٹا رہا پھر میں نے تاریکی میں غور کر کے دو ایسی جگہیں منتخب کر لیں جہاں مضبوطی سے ہاتھ جمائے جا سکتے تھے۔ پاؤں اٹکانے کے لیے بھی ایک مناسب سی جگہ میں نے تلاش کر لی۔

مجھے زیادہ دیر کوچ کے زیرِ سایہ نہیں لیٹنا پڑا۔ بمشکل پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو افراد کوچ کی طرف بڑھے۔ میں نے ان کی آوازوں سے اندازہ لگایا کہ ایک پولیس انسپکٹر جام علی ہے اور دوسرا عیسیٰ جان کا کوئی ساتھی۔ عیسیٰ جان کے ساتھی نے کوچ میں گھس کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ یقیناً اس نے چیک کیا تھا کہ کوئی کوچ کے اندر تو مورچہ جمائے نہیں بیٹھا۔ اس موقع پر میں نے بہتر جانا کہ زمین پر لیٹے رہنے کے بجائے کوچ کے نچلے حصے سے چپک جاؤں۔ میں نے اس ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ اب اگر کوئی نیچے جھک کر دیکھ بھی لیتا تو آسانی سے میرا سراغ نہیں پا سکتا تھا۔

اس طرح کلائیوں اور پاؤں کے زور پر کوچ کے پیندے سے چپکے رہنا آسان کام نہیں تھا۔ بہرحال یہ کام مجھے کرنا تھا اور میں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور ایک فرحت بخش جھرجھری کے ساتھ کوچ اسٹارٹ ہو گئی۔ میں پوری طرح مستعد ہو گیا۔ کوچ نے چند ہچکولے کھائے اور پھر اسکیم کی ہموار سڑک پر آ گئی۔ سوا ڈیڑھ

سو گز فاصلہ طے کرکے کوچ کے نیچے فرش پر رکی تو میں جان گیا کہ ہم اس کوٹھی کے اندر پہنچ چکے ہیں جہاں عیسیٰ جان اور لڑکیاں موجود ہیں۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ میں تن تنہا دشمن کے بیچ آ گھسا تھا لیکن یہ "رسک" میں نے کسی کے کہنے پر نہیں اپنی مرضی سے لیا تھا۔ لہٰذا مجھے مزہ آ رہا تھا۔ ایک میٹھا میٹھا جوش سا رگ و پے میں بھر گیا تھا۔ یہی جوش اور ولولہ تھا جس کے لیے میں جیل کی چار دیواری میں چار سال ترستا رہا تھا۔ یہی پُرخطر روز و شب تھے جن کی یاد مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی۔ جونہی جیپ کا انجن بند ہوا، اس کی ہیڈ لائٹس بھی بجھ گئیں۔

کہیں قریب سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس روشنی میں مجھے ایک گراسی لان نظر آیا۔ کچھ لوگ دھیمے قدموں سے کوچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں صرف ان کے نچلے دھڑ دیکھ سکتا تھا۔ پھر مجھے کوچ کے ڈرائیور کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ ابھی ابھی ڈرائیونگ نشست سے نیچے اترا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے کوچ اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس کا معائنہ کیا تھا۔ گراسی لان کی طرف سے آنے والے افراد کچھ دیر کوچ کو ٹھونک بجا کر دیکھتے رہے پھر کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

میں نے آہستگی اپنی پشت فرش سے الگ کی اور کھسکتا ہوا کوچ تلے سے نکل آیا۔ میرا عزیز ترین ہتھیار یعنی رام پوری خنجر میری پنڈلی سے لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ 6.35 کیلی بر کا بریٹا پستول تھا جو میں نے ہولسٹر میں رکھ کر کمر سے باندھا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر تک تاریک گھاس پر اوندھا پڑا رہا۔ عمارت کے مختلف حصوں سے آہٹیں ابھر کر میری سماعت سے ٹکراتی رہیں اور میں ان آہٹوں کو ترتیب دے کر ذہن میں کوئی نقشہ اجاگر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوٹھی کا زیریں حصہ تقریباً اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ زیادہ چہل پہل بالائی منزل پر ہی نظر آتی تھی۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کسی لڑکی سے کسی کے بولنے کی صدا بھی آ جاتی تھی۔ میں نے گاروینا کی ایک پانچ فٹ اونچی باڑ کی آڑ لی اور رکوع کے بل چلتا ہوا عمارت کے پہلو میں پہنچ گیا۔ یہاں مجھے ایک چھوٹا زینہ نظر آیا۔ زینے کے قریب ہی ایک چار دیواری شخص موجود تھا۔ اس کے سر پر گرم اونی ٹوپی تھی۔ سردی کے سبب اس کے منہ سے بھاپ خارج ہو رہی تھی۔ میں اس شخص کے کندھے پر لٹکی رائفل صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً عیسیٰ جان کا کوئی خونخوار ساتھی تھا۔ میں دیوار کے ساتھ چپکا اس شخص کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور اسے آگ دکھانے کے لیے جیب سے ماچس نکال لی۔ اس نے دو دیا سلائیاں ضائع کیں۔ تیز ہوا کے سبب سگریٹ آگ نہیں پکڑ رہا تھا۔ اس نے ہوا سے بچنے کے لیے اپنا رخ پھیرا اور چند قدم دور ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

یہ لمحے میرے لیے قیمتی تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بے آواز بھاگتا ہوا زینوں میں داخل ہو گیا۔ یہ زینے بل کھاتے ہوئے بالائی منزل کی چھت پر پہنچتے تھے۔ میں بالائی منزل پر رکنے کے بجائے سیدھا اوپر چلا گیا اور چھت پر پہنچ گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض چھت تھی۔ چاروں طرف چار فٹ اونچا آہنی جنگلا لگا ہوا تھا۔ ایک برساتی نما کمرے کے سوا یہاں اور کوئی تعمیر نظر نہیں آتی تھی۔ دس پندرہ قدم کی دوری پر مجھے وہ بڑے سائز کا راکٹ لانچر نظر آیا جو میں نے کچھ دیر پہلے زیرِ تعمیر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں سے دیکھا تھا۔ لانچر کو ایک "پورٹ ایبل اسٹینڈ" پر رکھا گیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک چوڑا چکلا افغانی اکڑوں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سرخ رنگ کے خوفناک راکٹ کا رخ اس زیرِ تعمیر کوٹھی کی طرف تھا جہاں پولیس کی بھاری نفری نے مورچہ جما رکھا تھا۔

مجھے چھت پر نہ تو کوئی دوسرا راکٹ لانچر نظر آیا اور کوئی شخص۔۔۔ راکٹ لانچر والے پر قابو پانے کا یہ بے حد سنہری موقع تھا۔ میں جھک کر تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے کوئی آواز پیدا نہیں کی تھی لیکن معلوم نہیں یہ چھٹی حس کا کرشمہ تھا یا اور کوئی بات۔۔۔ ابھی میں افغانی سے چند قدم دور ہی تھا کہ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ حیران کن پھرتی سے اس نے ریوالور نکال لیا۔ میں نے افغانی پر جست لگانے کے لیے اپنے جسم کو سمیٹا۔ جسم کا سارا وزن پاؤں کی انگلیوں پر منتقل ہو چکا تھا۔ عین اسی لمحے یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ اگر میں افغانی کو لے کر دھڑام سے چھت پر گرا تو یہ شور نیچے موجود افراد کو چوکنا کر دے گا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں میں نے چھلانگ لگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ٹانگ کی ایک بھرپور ضرب افغانی کے ریوالور والے ہاتھ پر لگائی۔ ریوالور اس شخص کے ہاتھ سے چھوٹا اور کسی چڑیا کی طرح تاریک فضا میں پرواز کر گیا۔۔۔ وہ ایک ساعت کے لیے ٹھٹکا پھر کسی جنگلی بھینسے کی طرح سر جھکا کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ برساتی سے چھوٹنے والی مدھم روشنی میں مجھے اس کے چہرے پر جنون کے آثار نظر آ رہے تھے۔

میں نے بروقت حرکت کر کے خود کو حملہ آور کی زد سے

نکالا اور تیزی سے گھوم کر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی۔ اب میں اس کی پشت پر تھا۔ وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے بُری طرح مچلا۔ میں نے گردن پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا۔ مدِمقابل کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی کراہ نکلی اور وہ یک لخت میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ تین گھنٹوں سے پہلے وہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ میں اسے بانہوں میں بھر کر برساتی کے اندر لے گیا اور ایک تاریک گوشے میں چھپا دیا۔ اس کی بھاری بھرکم پگڑی اور چادر چھت پر ہی گری رہ گئی تھیں۔ یہ دونوں چیزیں میں نے اپنے لباس کا حصہ بنا لیں۔ اس کام کے بعد میں راکٹ لانچر کی طرف متوجہ ہوا۔ راکٹ کا قطر ساڑھے چار انچ سے کم نہیں تھا۔ اس کا لانچر المونیم کا تھا۔ میں نے بآسانی راکٹ کو لانچر سے علیحدہ کر لیا۔ پاس ہی سے ایک ہتھوڑی نما ٹول ملا۔ میں نے اس آلے کی ضربوں سے لانچر کے ایک مخصوص حصے کو ٹیڑھا کر دیا۔ اب کم از کم یہ راکٹ لانچر عیسیٰ اور اس کے ساتھیوں کے لیے تو بے کار ہو چکا تھا۔ چھت ہی سے مجھے دوسرا راکٹ لانچر بھی نظر آ گیا۔ یہ لانچر کوٹھی کے سامنے والے حصے میں ایک بالکونی پر رکھا گیا تھا۔ میں نے چھت کے جنگلے پر سے جھک کر نیچے دیکھا تو لانچر کے قریب موجود دو افراد کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ ان میں سے ایک نے پشتو میں مجھ سے کچھ کہا۔ غالباً مذاق میں کوئی بات کہی تھی۔ پگڑی اور چادر کی وجہ سے اسے مجھ پر اپنے ساتھی کا دھوکا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ لہرا کر اور سر ہلا کر یہ ظاہر کیا کہ میں نے اس کی ساری بات سمجھ لی ہے۔

تاریک زینے اتر کر میں عمارت کی بالائی منزل پر آ گیا۔ پستول میں نے ہاتھ میں کر لیا تھا اور اسے کسی بھی وقت استعمال کر سکتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ عیسیٰ جان نے مغویہ لڑکیوں کو کہاں رکھا ہوا ہے اور جو مورچہ بندی اس عمارت میں کی گئی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔۔۔ غیر متوقع طور پر مجھے اپنے یہ دونوں مقاصد بہت جلدی حاصل ہو گئے۔ ایک دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ یہ بڑی مترنم سی آواز تھی۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک راہداری تھی۔ میرے سر کے عین اوپر ساٹھ یا سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اپنے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بلب چھت سے اتار لیا۔ راہداری اندھیرے میں ڈوب گئی۔ میں چند لمحے کسی ردِعمل کا انتظار کرتا رہا۔ جب کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تو میں نے مطمئن ہو کر اپنی آنکھ دروازے کے "کی ہول" سے لگا دی۔ کمرے کا جزوی منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ منظر بیک وقت ہوشربا اور دل گرفتہ کر دینے والا تھا۔ میں نے دو لڑکیوں کو دیکھا۔ لباس کے نام پر ان کے جسموں کو صرف دو دو دھجیاں میسر تھیں۔ وہ قبول صورت لڑکیاں تھیں لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ اپنی ظاہری شکل و صورت پر کوئی توجہ نہیں دے سکیں۔ بال الجھے ہوئے، رنگ روپ اجڑا ہوا، آنکھیں ویران اور جسم سانولائے ہوئے۔ سخت سردی میں انہیں اتنے مختصر لباس میں دیکھ کر ترس آیا۔ ایک کھڑکی کے قریب مجھے عیسیٰ جان نظر آیا۔ اس کا ایک ساتھی بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ عیسیٰ جان تھری ایم ایم کی رائفل گود میں رکھے کھانا کھا رہا تھا۔ قریباً ایک تہائی چپاتی کا ایک ہی نوالہ اس نے میرے سامنے گال میں ٹھونسا اور دو تین بار جبڑا چلا کر حلق سے نیچے اتار لیا۔ ایک تیسری لڑکی ہاتھ میں چائے کی ٹرے اٹھائے میری نگاہ کے فریم میں داخل ہوئی۔ وہ بھی اسی مختصر ترین لباس میں تھی۔ اس نے نیچے بیٹھ کر چائے عیسیٰ جان کے سامنے رکھی تو اس کا جسم ایک نئے زاویے کے ساتھ بلب کی روشنی میں دمک گیا۔ دونوں دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی اپنی عریانی پر بے حد خجل نظر آتی تھی۔ کسی نادیدہ قوت کے زیرِ اثر جیسے اس کا جسم سکڑ سمٹ گیا تھا۔ کسی مرد کے لیے یہ بے حد توجہ طلب منظر تھا لیکن عیسیٰ جان اور اس کے قریب بیٹھا ہوا شخص بالکل لاتعلق نظر آ رہے تھے جیسے ان کے لیے یہ ایک گھسا پٹا منظر تھا۔ غالباً ایک برقع پوش لڑکی اور اس "کھلی کتاب جیسی لڑکی" کے درمیان ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ان کتابوں کا ہر ورق پڑھ چکے تھے۔۔۔ عیسیٰ جان اور اس کا ساتھی دھیمی آواز میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ تاہم ان کی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پہنچ بھی جاتی تو اس کا کچھ خاص فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ یقیناً پشتو بول رہے تھے۔

اگلے پانچ منٹ کے اندر اس کمرے کی تمام صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ اس کمرے میں عیسیٰ جان سمیت کُل پانچ افراد تھے۔ ان میں تین لڑکیاں اور دو مرد تھے۔ لڑکیاں یقیناً انہی ایئر ہوسٹسز میں سے تھیں۔ جنہیں چودہ پندرہ ماہ قبل اغوا کیا گیا تھا۔ ان چودہ پندرہ ماہ میں بدنصیب لڑکیوں پر جو جو مظالم ٹوٹ چکے تھے وہ پردۂ راز میں تھے۔ تاہم ان مظالم کی ایک مبہم سی تصویر ان لڑکیوں کا سراپا دیکھ کر ذہن میں ابھر آئی تھی۔ کسی وقت وہ خوبصورت، شوخ و چنچل اور زندگی سے بھرپور ہوں گی۔ اب اُجڑی بکھری پژمردہ اور داغدار تھیں۔

ان کی روح پر جو داغ لگے وہ تو نگاہوں سے اوجھل تھے۔ ہاں ان کے جسموں پر صعوبتوں کے نشان دیکھے جا سکتے تھے۔ کہیں سگریٹ سے داغے جانے کا نشان' کہیں کسی بے رحم خراش کا انمٹ ثبوت' کہیں کسی تیز دھار آلے کا زخم۔ ایک لڑکی کا بازو ٹوٹا ہوا تھا اور ہڈی جوڑنے کے لیے کلائی پر سیدھی کھپچیاں رکھ کر میلی سی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ کمرے میں ایک بڑا ہیٹر بھی لگا ہوا تھا۔ اس الیکٹرک ہیٹر کی وجہ سے لڑکیاں ناکافی لباس کے باوجود زیادہ سردی محسوس نہیں کر رہی تھیں۔

کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میں تاریک راہداری میں احتیاط سے چلتا آگے بڑھ گیا۔ دو تین مزید کمروں میں بھی روشنی ہو رہی تھی لیکن وہاں کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ جان کر مجھے حیرانی ہوئی کہ اس وسیع کوٹھی کے اندر تین لڑکیوں کے علاوہ صرف پانچ یا چھ افراد موجود تھے اور ان میں سے بھی ایک کو میں چھت پر اپنا غفیل کر چکا تھا۔ قادر زماں کی یہ اطلاع بھی سراسر جھوٹ تھی کہ کوٹھی میں سات آٹھ راکٹ لانچر موجود ہیں۔ میں نے صرف دو لانچر دیکھے تھے اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ دو ہی ہیں۔ لڑکیوں کے بارے میں بھی غلط اطلاعات گردش کر رہی تھیں۔ ابھی تک کوٹھی میں صرف تین لڑکیوں کی موجودگی کا ثبوت ملا تھا۔ چلو لڑکیوں کے بارے میں تو سوچا جا سکتا تھا کہ انہیں کسی اندرونی کمرے یا تہ خانے وغیرہ میں بند رکھا گیا ہوگا لیکن اگر کوٹھی میں عیسٰی جان کے مزید ساتھی اور اسلحہ موجود تھا تو ان نازک لمحات میں وہ سب بچہ کہاں تھا۔

میں چھوٹے زینوں سے نیچے اترنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا' وہاں پہریدار موجود ہے۔ میں ایک کھڑکی کے راستے بیرونی شیڈ پر اترا اور وہاں سے پانی کے پائپ کے سہارے نیچے اتر آیا۔ یہ روشنی سے بچا ہوا حصہ تھا۔ میں ایک تاریک گوشے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کوٹھی سے باہر نکلنا آسان نہیں تھا۔ کوٹھی کے چاروں طرف روشنی تھی اور اب تو سرچ لائٹس بھی آن کر دی گئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ عیسٰی کے ساتھیوں نے باؤنڈری پر گہری نگاہ رکھی ہوگی۔ اگر اتفاقاً مجھے مرزا کوچ کی سہولت میسر نہ آتی تو میں کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اندر آنا مشکل تھا اسی طرح باہر نکلنا بھی دشوار تھا۔ کوٹھی کے اندرونی حالات جاننے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اگر کسی طرح میں عیسٰی اور اس کے ساتھی پر قابو پا سکتا تو لڑکیوں کی زندگی بچائی جا سکتی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ دونوں خودکار رائفلوں سے مسلح تھے اور میرے پاس پستول تھا۔ عیسٰی جان جیسے شخص کو ایک لمحے کی مہلت دینے کا مطلب یہ تھا کہ "فتح" تھالی میں رکھ کر اسے پیش کر دی جائے۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اگر میں کوئی چھوٹی نال کی برسٹ مارنے والی گن اپنے ساتھ لے آتا تو صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ٹھوس فرش کے بجائے کسی جنبش کرنے والی چیز پر کھڑا ہوں۔ میں نے جھک کر دیکھا' یہ سیوریج کا آہنی ڈھکنا تھا۔ میں نے ڈھکنا اٹھایا۔ کسی طرح کی بدبو کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سیوریج ابھی چالو نہیں ہوا۔ پائپ وغیرہ ڈال دیے گئے تھے لیکن ابھی انہیں "مین لائن" سے ملایا نہیں گیا تھا۔ میں نے ڈھکنا بہ آہستگی ایک طرف رکھا اور اندر گھس گیا۔ کسی طرف سے ہوا کا جھونکا آیا اور مجھے چھوتا ہوا ہول سے نکل گیا۔ ڈھکنے کو دوبارہ ہول پر جمانے کے بعد میں نے اپنا لائٹر جلایا' پائپ میں دور تک روشنی ہو گئی۔ یہ بالکل صاف شفاف پائپ تھا۔ قطر قریباً تین فٹ رہا ہوگا۔ کہیں کہیں اینٹوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے اور ریت بکھری ہوئی تھی۔ میں پاؤں کے بل پائپ میں بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ ہوا کا جو جھونکا ابھی تھوڑی دیر قبل مجھے چھو کر گزرا تھا اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ کہیں پاس ہی اس سیوریج لائن کا دوسرا راستہ موجود ہے۔ قریباً بیس گز آگے یہ پائپ ایک نسبتاً بڑے پائپ سے منسلک ہو گیا۔ اس پائپ میں آگے بڑھنا میرے لیے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ لائٹر کا ننھا سا شعلہ میری رہنمائی کر رہا تھا۔ چار پانچ منٹ بعد میں نے خود کو ایک مین ہول کے نیچے پایا۔ مین ہول کا ڈھکنا موجود نہیں تھا۔ معلوم نہیں چرا لیا گیا تھا یا ابھی رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس زیرِ تعمیر کوٹھی کے قریب پہنچ چکا ہوں جہاں قادر زماں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پولیس نے بھی ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ مین ہول میں آمد و رفت کے لیے ایک چھوٹی سی آہنی سیڑھی فرش میں گاڑی گئی تھی۔ میں نے لائٹر بجھا کر جیب میں ڈالا اور سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

چند ہی لمحے بعد میں مین ہول سے باہر تھا۔ میں زیرِ تعمیر کوٹھی کے قریب سے نکلا تھا۔ صرف بیس پچیس قدم کے فاصلے پر جاگیردار قادر زماں اپنی امپالا گاڑی کے قریب کھڑا ایک ڈی ایس پی سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈی ایس پی کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے مین ہول سے نکلتے دیکھ کر وہ بے طرح چونکا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ پستول نکالنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اس کے تاثرات دیکھ کر جاگیردار قادر زماں بھی

میری طرف گھوم گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دونوں بونے باڈی گارڈز بھی جو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔ ڈی ایس پی نے ایک طاقتور ٹارچ کی روشنی مجھ پر ڈالی۔

"شاہ جہاں! تم؟" قادر زماں کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"جی جناب" میں نے اپنے سر سے گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ "میں عیسٰی جان کی پناہ گاہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

"کک ۔ کیا مطلب؟" قادر زماں گڑبڑا گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ "میں مرزا کوچ کے نیچے چھپ کر کوٹھی میں چلا گیا تھا۔ کوٹھی کا پورا پورا سروے کیا ہے میں نے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں عیسٰی جان کا کوئی مطالبہ نہیں ماننا چاہیے۔ ہم اس پر باآسانی قابو پا سکتے ہیں۔ بلکہ میں اکیلا اندر جا کر اس کا تیا پانچا کر سکتا ہوں۔ شاید میں یہ کام کر کے ہی واپس آتا لیکن میرے پاس معقول ہتھیار نہیں تھا۔ آپ مجھے صرف ایک رائفل اور دو بندے دے دیں۔ میں ابھی اس حرامی کو باندھ کر آپ کے پاس لے آتا ہوں۔"

باتیں کرتے ہوئے میری نگاہ بغور قادر زماں کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ پھیکا پڑ رہا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے سگار کا کش لیا اور بولا۔ "شاہ جہاں! تم نے بہت خطرناک کام کیا ہے کہ بغیر کسی مشورے کے کوٹھی میں چلے گئے ہو۔ اگر تمہاری اس مہم جوئی کا نتیجہ کسی حادثے کی صورت میں نکل آتا تو ساری ذمے داری مجھ پر آتی تھی۔"

میں نے اعتماد سے کہا۔ "قادر زماں صاحب' ایسے کاموں میں رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ہم یہاں رسک نہیں لیں گے تو سفر کے دوران لیں گے' سفر کے دوران نہیں لیں گے تو ترمزا ایجنسی جا کر لیں گے۔ یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عیسٰی جان پکا حرامی ہے۔ وہ آسانی سے گرفتاری پیش کرے گا نہ افغانی اور لڑکیاں ہمارے حوالے کرے گا۔ تو پھر جب رسک لینا ہی ہے تو کیوں نہ ایسے وقت لے لیا جائے جب کامیابی کے امکانات روشن ہوں۔"

قادر زماں کا چہرہ غصے سے انگارا ہو گیا۔ اپنے غصے کے اظہار کے لیے اس نے حسبِ عادت بہت دھیما اور طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ کہنے لگا۔ "محترم شاہ جہاں صاحب! آپ کس ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ آپ کی خیر ہو۔ ذرا عقل شریف کو ہاتھ ماریں۔ ہم اس فکر میں ہیں کہ کسی طرح افغانی اور لڑکیاں عیسٰی کے قبضے سے نکال لیں۔ اور آپ ہیں کہ اس کی گرفتاری کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "منصوبے اس لیے باندھ رہا ہوں جناب کہ یہ منصوبے کامیاب ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی بہت لمبے چوڑے منصوبے نہیں ہیں۔ میں نے آپ سے عرض کیا ہے ناکہ مجھے ایک رائفل اور دو بندوں کی ضرورت ہے' میں اس کتے کے بچے کو ابھی گھسیٹ کر آپ کے سامنے لے آؤں گا۔"

عیسٰی جان کے لیے قادر زماں کے دل میں چھپی ہوئی ہمدردی' جھنجلاہٹ کی سرخی بن کر اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگی۔ وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں جان جی۔ ذرا تم اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔ جو مشورہ تم عنایت کر رہے ہو وہ خدانخواستہ ہم مان لیں تو کل پبلک ہمارے سروں پر اتنی چھترول کرے گی کہ جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بھرا جی! وہ عیسٰی جان ایک سیکنڈ نہیں لگائے گا لڑکیوں کو چھلنی کرنے میں اور وہ خصم کھانیاں مر گئیں تو پھر سوچ لو کیا ہوگا؟"

ہماری باتوں کے دوران ہی ایس پی جاذب خان صاحب دو دوسرے افسران کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ جاگیردار قادر زماں نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں افسران کو بتایا کہ میں ابھی ابھی اس سامنے والے مین ہول سے برآمد ہوا ہوں اور انہیں یہ بتا رہا ہوں کہ کوٹھی میں ڈر خطرے والی کوئی بات نہیں اور ہم باآسانی اندر جا کر عیسٰی جان کی گردن ناپ سکتے ہیں۔

ایس پی جاذب خان نے قادر زماں کے طنزیہ لہجے کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھ سے سوالات پوچھے۔ میں نے ان سوالات کے جواب دیتے ہوئے پوری کہانی افسران کے گوش گزار کر دی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا ایس پی جاذب کے ساتھ آنے والے دو بارعب افسران میں سے ایک اسسٹنٹ کمشنر پنار تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں تعریفی اور دوستانہ جذبات کی جھلک نظر آئی اور جب ایس پی جاذب نے انہیں یہ بتایا کہ میرا نام شاہ جہاں ہے اور اس وقت میری حیثیت مجتبٰی کنور صاحب کے خاص ... کی ہے تو وہ میری باتوں کو زیادہ توجہ سے سننے لگے۔

میں نے کہا۔ "میں قادر زماں صاحب سے بہت معذرت ... ساتھ عرض کرتا ہوں کہ کوٹھی کے اندر عیسٰی جان کے پاس اتنے بندے اور اسلحہ نہیں ہے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق کوٹھی میں کل سات

آدمی ہیں جن میں سے ایک میرے ہاتھوں دو تین گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو چکا ہے۔ کوٹھی میں صرف ایک راکٹ لانچر ہے جو فائر ہو سکتا ہے' دوسرے لانچر کو میں ناقابل استعمال بنا آیا ہوں۔" میں نے جیب سے لانچر کا ایک بولٹ نکال کر ایس پی اور اے سی صاحب کو دکھایا۔ وہ متحیر نظر آنے لگے میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "کوٹھی میں صرف تین لڑکیاں ہیں اور میرے اندازے کے مطابق یہ تینوں اب بھی یہیں ہیں۔ انھیں نیم برہنہ رکھا گیا ہے کہ وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں ہیں۔ عیسیٰ جان بھی وہیں ہے۔ میں نے یہ سب کچھ کمرے کے "کی ہول" سے دیکھا ہے۔ یہ بالکل بند کمرا ہے۔ صرف ایک کھڑکی ہے جس میں دانے دار شیشہ لگا ہے۔ اگر "ایل ایم جی" یا جی تھری کے ذریعے اس کھڑکی کے راستے برسٹ مارا جائے تو عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی کا قصہ پاک ہو سکتا ہے۔"

میری باتیں افسران کے دل کو لگ رہی تھیں۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ قادر زماں بظاہر خاموش تھا اور میری باتیں توجہ سے سن رہا تھا لیکن میں جانتا تھا اس کے سینے میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ میں نے چند منٹ کے اندر اندر پولیس افسران اور اے سی صاحب کے سامنے چھاپا مار ایکشن کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ سب سے بڑا مسئلہ کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا تھا۔ سیور یج والا راستہ ملنے سے یہ مسئلہ بہت بہتر طریقے سے حل ہو گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کوٹھی کے اندر گھسنے کے لیے ایک کھدی کھدائی تیار شدہ سرنگ ہمیں مل گئی تھی۔ دشمن کے ٹھکانے اور اس کی اصل قوت کا بھی ٹھیک ٹھیک پتا چل گیا تھا۔ ان معلومات سے فائدہ نہ اٹھانا اور عیسیٰ جان کے مطالبے کے سامنے سرنگوں ہو جانا بے وقوفی تھی۔

قادر زماں بے حد ہوشیاری سے اس صورت حال کو ہینڈل کر رہا تھا۔ وہ میرے اس پلان میں دلچسپی ظاہر کرنے لگا تھا لیکن ساتھ ساتھ اس میں خامیاں بھی نکال رہا تھا۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ خود موقع محل دیکھ کر آیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس ایکشن میں لڑکیوں کی جان جانے کے نوے فیصد امکانات ہیں۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا "جان جی! تینوں لڑکیاں گن پوائنٹ پر ہیں۔ ہم کتنی بھی تیزی دکھائیں گے عیسیٰ اور اس کے ساتھی میں سے ایک تو برسٹ مار ہی دے گا۔"

اس کا یہ خیال بھی تھا کہ دو تین اور لڑکیاں کوٹھی میں موجود ہیں اور انھیں عیسیٰ جان کے ساتھیوں نے کسی دوسرے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ اپنے اس نکتے کے حق میں اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ یہی دیکھ لیں کہ عیسیٰ جان نے دو چھوٹی گاڑیاں یا ایک بڑی گاڑی مانگی تھی۔ اگر کوٹھی کے اندر لڑکیوں سمیت نو دس افراد ہی ہوتے تو اسے دو گاڑیاں مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو اب بھی یقین ہے کہ کوٹھی کے اندر پندرہ کے قریب افراد موجود ہیں۔ بیرونی دیواروں کے پاس موجود چار پانچ افراد اور لڑکیوں کو شامل کر کے کل افراد کی تعداد اکیس بائیس بنتی ہے۔"

میں نے کہا "جاگیردار صاحب! میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری معلومات کے مطابق کوٹھی کے اندر لڑکیوں سمیت دس افراد ہیں۔ بیرونی حصے میں موجود افراد کو شامل کر کے یہ تعداد تیرہ بنتی ہے۔ جہاں تک عیسیٰ جان کی طرف سے دو گاڑیاں مانگنے کا تعلق ہے' مجھے شروع سے یقین تھا کہ یہ ہمیں افراد کی تعداد کے بارے میں بھٹکانے کی کوشش ہے۔"

اے سی صاحب نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔ "اندر اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟"

میں نے کہا۔ "جناب! میں ڈی ایس پی صاحب سے عرض کر چکا ہوں کہ عیسیٰ جان کے پاس آٹھ ایم ایم رائفل ہے جب کہ اس کا ساتھی ایل ایم جی سے مسلح ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بڑی گن کوٹھی کے اندر موجود نہیں۔ کم از کم مجھے دکھائی نہیں دی۔ ایک راکٹ لانچر کو میں ناکارہ کر آیا ہوں' دوسرا بالکونی میں نصب ہے۔"

اے سی صاحب نے ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں جا کر ایس پی جاذب سے کچھ کھسر پھسر کی۔ ایس پی جاذب کے چہرے پر دباد باجوش نظر آنے لگا تھا۔ پھر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئے اور چند لمحے بعد جلیل کمانڈر کو لیے اندر داخل ہوئے۔ جلیل کمانڈر کی آنکھوں میں عقابی چمک نمایاں تھی۔ غالباً وہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ کوٹھی پر "ریڈ" کرنے کا پروگرام بن رہا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مسٹر شاہ جہاں! اگر ہم ریڈ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں میرا خیال ہے کہ جلیل تمھارا بہترین ساتھی ثابت ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں جناب! میں جلیل صاحب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کچھی جیلس میں کافی وقت اکٹھے گزار چکے ہیں۔"

قادر زماں اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ جان چکا تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوں'

اسسٹنٹ کمشنر اور ایس پی صاحب قائل ہو چکے ہیں کہ عیسیٰ جان پر دھاوا بول دینا چاہیے۔ اب اس فیصلے کا بس رسمی اعلان ہونا باقی تھا۔ وہ سگار کا ایک طویل کش لے کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے اٹھتے ہی عقب میں کھڑے ہوئے باڈی گارڈ بالکل الرٹ نظر آنے لگے۔ ایس پی صاحب سوالیہ نظروں سے جاگیردار قادر زماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جاگیردار نے شہادت کی انگلی سے اپنی گھنی مونچھوں کا سہلایا اور بولا۔ "محترم جناب! اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں چاہتا ہوں کہ عیسیٰ جان سے ایک مرتبہ بات کر کے دیکھی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خون خرابے سے بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

ایس پی نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ اب وہ اور زیادہ اکڑ خانی دکھائے گا۔ پہلے ہم نے اسے سواری مہیا نہیں کی تھی۔ اب تو سواری بھی اس کے پاس ہے۔"

"پھر بھی ایس پی صاحب! ہمیں ایک کوشش اور ضرور کرنی چاہیے۔" قادر زماں نے اصرار کیا۔

قادر زماں کے رویے میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی اور میں اس تبدیلی کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ دانا کہتے ہیں کہ جنگ کی تیاری ہی سلامتی کی ضامن ہوتی ہے اور جو لوگ دل سے لڑنے پر آمادہ ہوتے ہیں وہی مخالفین کو جارحیت سے باز رکھ سکتے ہیں۔ قادر زماں نے محسوس کر لیا تھا کہ کوٹھی پر کامیاب چڑھائی ہو سکتی ہے لہٰذا وہ عیسیٰ جان کو ہلاکت و ہزیمت سے بچانے کے لیے حرکت میں آ گیا تھا۔

گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ قادر زماں "ریڈ" سے پہلے عیسیٰ جان کو سمجھانے بجھانے کی ایک اور کوشش کرے۔ جس دوران قادر زماں' عیسیٰ جان سے بات چیت کر رہا ہو ہم کوٹھی پر دھاوا بولنے کی تیاری مکمل کر لیں۔

قادر زماں کوٹھی میں چلا گیا۔ ہم بے چینی سے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ بات طے تھی کہ اگر عیسیٰ جان ایک بار اس کوٹھی سے نکل گیا تو پھر گلابی لفافہ ہی ہاتھ آئے گا نہ لڑکیوں کے بچ نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہو گی۔ جوں جوں یہ خبر شہر میں پھیل رہی تھی' قرب و جوار کے لوگ جوق در جوق دیشا پر پہنچ رہے تھے۔ پولیس اور سکیورٹی فورس کے جوان انھیں ان تین کوٹھیوں سے دور رکھے ہوئے تھے۔ تاہم اخبار نویسوں اور رپورٹرز کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بحث تکرار کر کے آگے بڑھ آئے تھے اور اب موقعے پر ان کا جم غفیر ہو چکا تھا۔

قادر زماں کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ ہم نے اسے کوٹھی کے مین گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ انھی تین لڑکیوں میں سے تھی جنھیں میں تھوڑی دیر پہلے عیسیٰ جان کی تحویل میں دیکھ چکا تھا۔ لڑکی نے اپنے جسم کے گرد کسی بستر کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ قادر زماں نے بڑی شفقت سے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ دو تین منٹ میں وہ دونوں ہمارے نزدیک پہنچ گئے۔ قادر زماں کا چہرہ کھلا کھلا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی وہی تھی جس کا بازو فریکچر تھا۔ اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ لیڈی پولیس کی دو ارکان بھی وہاں موجود تھیں' وہ لڑکی کو فوراً ایک اندرونی کمرے میں لے گئیں۔ جاگیردار قادر زماں نے خوشخبری سنائی کہ عیسیٰ جان نے نہ صرف اس بیمار لڑکی کو رہا کر دیا ہے بلکہ گلابی لفافہ بھی اس کے حوالے کر دیا ہے۔ اب صرف تین چار لڑکیاں اس کی تحویل میں ہیں اور وہ کہتا ہے کہ کرتم ایجنسی میں پہنچ کر وہ یہ لڑکیاں بھی چھوڑ دے گا۔

قادر زماں نے افسران کی موجودگی میں گلابی لفافہ اپنی واسکٹ کی جیب سے نکالا اور اسے کھولا۔ ہر آنکھ میں تجسس کی چمک تھی۔ قادر زماں کے سرخ و سپید ہاتھوں نے لفافے کو کھولا۔ لفافے میں چنے کی دال کے چار پانچ دانے تھے۔ اس دفعہ میں نے بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ چنے کی دال ہی تھی۔ چنے کی دال کے پانچ دانوں کے لیے اتنی تگ و دو' اتنا بڑا ہنگامہ؟ یقیناً یہ دال کے معمولی دانے کسی خاص اہمیت کے حامل تھے۔ جاسوسی کہانیوں کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ بلکہ نئے ڈھنگ کی جاسوسی کہانیوں میں بھی اس قسم کے "پیچ" اب کم کم ہی آتے ہیں۔ گلابی لفافے سے نکلنے والے دال کے پانچ عدد دانے ایس پی جاذب خان صاحب کی ہتھیلی پر دھرے تھے اور ہم حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے' جیسے ابھی ان دانوں میں سے پودے نمودار ہوں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پورے قد کاٹھ کو پہنچ جائیں گے۔

اے سی صاحب نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "قادر زماں صاحب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجرم نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہو۔ یہ چنے کی دال ہے اور ایسی دال کسی بھی کچن میں موجود ہو سکتی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب" قادر زماں نے پورے یقین سے کہا "پھر بھی آپ کہتے ہیں تو ہم ابھی دس پندرہ منٹ میں تصدیق کر لیتے ہیں۔"

اس نے اپنے باڈی گارڈز کو ساتھ لیا اور فوراً اپنی سیاہ

امپالا میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ اسے ہی یا ایس پی صاحب کو اتنی جرات نہیں ہوئی کہ وہ اس سے پوچھیں کہ وہ کہاں اور کس سے تصدیق کرانے جارہا ہے۔ اور مجھے یقین تھا کہ کوئی اس کی گاڑی کا تعاقب کرنے کی ہمت بھی نہیں کرے گا۔ یہ سب قتیبی کنور کی سحرکار اور بارسوخ شخصیت کا کرشمہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ قادر زماں کہاں گیا ہے۔ وہ عجیب ہوٹل میں مسٹر بی کلارک صاحب کے پاس گیا تھا۔ عجیب ہوٹل یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور میرا اندازہ تھا کہ وہ بیس پچیس منٹ کے اندر واپس آجائے گا۔ میرا دھیان مسٹر بی کلارک صاحب کی طرف چلا گیا۔ ایک ارب پتی امریکی اپنا سارا دھندا چھوڑ کر ہفتوں سے یہاں بیٹھا ہوا تھا اور ایک ایسے گلاب کو اٹھانے کے لیے ماہی بے آب کی طرح بے قرار تھا جس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی حسینہ کا خط تک نہیں تھا۔

جونہی قادر زماں کی امپالا گاڑی موقع سے روانہ ہوئی میں درخواست کرکے ایس پی جاذب خان صاحب کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ قادر زماں کا ایک خونخوار رہا تیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ مجھے کچا کھا جانا چاہتا ہے۔ میں اس کے انداز کو خاطر میں لائے بغیر ایس پی صاحب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "جناب! میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا۔ اتنا وقت ہی نہیں ہے۔ میں آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ یہ بات صرف اور صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔"

ایس پی اور میری رفاقت کی عمر دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس مختصر مدت میں ہی ہمارے درمیان ایک خاص قسم کا اعتماد پروان چڑھ چکا تھا۔ ایس پی نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر اپنا سگریٹ سلگایا اور طویل کش لے کر بولے۔ "ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے گی ہمیشہ۔"

میں نے کہا۔ "جناب! حقیقت یہ ہے کہ قادر زماں صاحب قتیبی صاحب کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر عیسیٰ جان کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں کوٹھی کے اندر جو کچھ دیکھ کر آیا ہوں وہ اس صورت حال سے بالکل مختلف ہے جس کا نقشہ جناب زماں صاحب نے کھینچا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ قادر زماں صاحب عیسیٰ کے ساتھ حق دوستی ادا کر رہے ہیں۔"

ایس پی صاحب نے کہا "تم لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اور ایک دوسرے کے بارے میں بہتر رائے قائم کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "جاذب صاحب! آپ مجھے "رسک" کی اجازت دیں۔ مجھے یقین ہے کہ قادر زماں صاحب کی آمد سے پہلے پہلے ہم اپنا کام کامیابی سے مکمل کرلیں گے۔" میرے سنسنی خیز لہجے نے ایس پی صاحب کو سرتاپا ہلا دیا۔ ان کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا پھر تذبذب کے آثار ابھرے۔ میں نے کہا۔ "مجھے اس میں کسی طرح کا لالچ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں میرا کوئی مفاد ہے۔ میں صرف قادر زماں کی چالبازی کو ناکام کرنا چاہتا ہوں۔ عیسیٰ جان کو آپ بھی جانتے ہوں گے۔ یہ وہ درندہ ہے جس نے سارے قبائلی علاقے میں وحشت مچا رکھی ہے۔ یہ شخص جیسا آج پھنسا ہے پہلے کبھی نہیں پھنسا ہوگا۔ اگر ہم نے یہ موقع ہاتھ سے گنوا دیا تو اس تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا۔"

ایس پی جاذب کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ لمحوں کے اندر ان کی آنکھوں میں کئی رنگ ابھرے۔ وہ ایک جہاندیدہ اور زیرک آفیسر تھے۔ اپنا نفع نقصان بھی انہیں اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ قبائلی لڑکیاں اور عیسیٰ جان پکڑا گیا تو اس کا سب سے بڑا "کریڈٹ" انہیں ملے گا۔ اس وقت وہ یہاں کے انچارج اور سچویشن کو سپروائز کررہے تھے۔ میری باتوں پر انہیں شروع سے اعتماد تھا۔ اب اس اعتماد میں مزید اضافہ ہوا تھا وہ بچشم خود دیکھ چکے تھے کہ میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کوٹھی کے اندر کامیاب "کارروائی" کی ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں قادر زماں کے رویے میں تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ ان کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ فیصلے کر رہا تھا۔ آخر انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے شاہ جہاں! میرے ساتھ آؤ۔"

ہم دونوں تیز قدموں سے آگے پیچھے چلتے ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک الماری میں کچھ بلٹ پروف جیکٹس رکھی تھیں۔ ایس پی صاحب نے مجھے ایک بلٹ پروف جیکٹ دی۔ ان کی ہدایت پر ایک اے ایس آئی "جی تھری" رائفل لے آیا۔ رائفل کے ساتھ چار فالتو میگزین بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک واکی ٹاکی تھا جسے ریگزین کے غلاف میں رکھا گیا تھا۔

میں نے ایس پی سے کہا۔ "میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں چاہتا۔ آپ مجھے صرف دو بندے دے دیں۔ ایک تو

جلیل کمانڈر ہوگا۔ دوسرا ایک چوکس سا بندہ آپ خود منتخب کردیں۔ مجھے امید ہے زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے اندر میں اپنی کارروائی مکمل کرلوں گا۔ اگر میں اپنی رائفل کے ذریعے اوپر تلے چار سگنل شاٹ فائر کروں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لڑکیاں محفوظ ہوچکی ہیں۔ آپ کوٹھی پر ہلہ بول سکتے ہیں۔"

ایس پی صاحب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے "میرا خیال ہے کہ یہ کوٹھی ہمیں خالی کروا لینی چاہیے۔ اندر آپریشن کیا گیا تو یہی کوٹھی نشانہ بنے گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن ان لوگوں کو کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ ہماری کارروائی میں "سرپرائز" کا عنصر ختم ہوجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کا عملہ عقبی دیوار پھلانگ کر نکل جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"نہیں۔ دیوار پھلانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایس پی نے کہا۔ "وہاں ایک چھوٹا دروازہ موجود ہے۔" پھر انہوں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی اور بولے۔ "یہ کوچ کے اگنیشن کی چابی ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں ضرورت پڑ جائے۔"

میں نے سوچا اس کی کیا ضرورت ہوگی؟ لیکن پھر احتیاطاً میں نے چابی لے لی۔ بعد ازاں یہ احتیاط بے حد مفید ثابت ہوئی۔

جلیل کمانڈر کے علاوہ جو تیسرا شخص میرے ساتھ منتخب ہوا وہ بھی قتیبی کنور کے خصوصی محافظوں میں سے تھا۔ اس کا نام مراد تھا۔ ایس پی نے قادر زماں کے محافظ بونوں کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ وہ ایسی کارروائیوں کے لیے زبردست قسم کی "کمانڈو ٹریننگ" رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان بونوں میں سے بھی ایک دو کو اس کارروائی میں شریک کرلیا جائے لیکن میں نے معذرت کے ساتھ انکار کردیا۔ میں عیسیٰ جان کے بارے میں قادر زماں کے ہمدردانہ رویے کو دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ قادر زماں کے محافظ اس کارروائی میں کسی طرح بھی سودمند ثابت نہیں ہوں گے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ مطلع شام سے ہی ابر آلود تھا۔ اب بوندا باندی بھی ہونے لگی تھی۔ اس بوندا باندی کے سبب سردی کی شدت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تھا۔ میرے اور جلیل کمانڈر کے پاس رائفلیں تھیں جب کہ مراد دس گولیوں والے ماؤزر سے مسلح تھا۔ ہم تینوں کے پاس ٹارچیں بھی موجود تھیں۔ ہم بڑی احتیاط سے اس کھلے مین ہول تک پہنچے جہاں سے پون گھنٹا پہلے میں برآمد ہوا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے جاذب صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹھیک پانچ منٹ بعد عیسیٰ جان کو ٹیلی فون کریں گے اور اسے باتوں میں مشغول رکھیں گے۔

آہنی سیڑھی کے ذریعے سب سے پہلے میں نیچے اترا۔ میرے پیچھے جلیل اور آخر میں مراد بھی اندر آگیا۔ میں نے اپنی ٹارچ روشن کرلی۔ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا لہٰذا زمین کے نیچے ہی نیچے سفر کرکے کوٹھی تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے بہت آہستگی سے آہنی ڈھکنا اٹھا کر ایک طرف رکھا اور قرب و جوار کا جائزہ لے کر ہولے سے باہر نکل آیا۔ ہاتھ بڑھا کر پہلے میں نے جلیل کو باہر نکالا اور پھر مراد کو۔ باہر نکلتے ہی وہ دونوں تاریک دیوار کے ساتھ جھک کر کھڑے ہوگئے تھے۔ ڈھکنا واپس ہول پر رکھ کر میں بھی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ رائفلیں اب ہمارے ہاتھ میں تھیں اور ایک اشارے پر آگ کی بارش کرسکتی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتے ہوئے ہم ان چھوٹے زینوں کی طرف بڑھے جہاں سے میں کچھ دیر پہلے چھت پر پہنچا تھا۔ اس وقت یہاں ایک مسلح شخص موجود تھا۔ ممکن تھا کہ اب بھی موجود ہو مگر اس کا سامنا کیے بغیر اب چارہ نہیں تھا۔ (پائپ کے راستے دوسری منزل سے اترنے کی کوشش تو کی جاسکتی تھی لیکن چڑھنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمیں بہرصورت زینے ہی استعمال کرنا تھا) میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ وہ چادر پوش شخص زینوں کے قریب موجود نہ ہو۔ میری یہ خواہش پوری ہوئی۔ ہم زینوں کے قریب پہنچے تو وہ خالی نظر آئے لیکن ہمارے زینوں پر چڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اچانک بالائی سرے سے کچھ آہٹیں ابھریں اور پھر زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ لوگ دوسری منزل پر زینوں کے سامنے موجود تھے۔ میں نے عیسیٰ جان کی آواز صاف پہچانی۔ اس نے ایک روتی بلکتی لڑکی کو فحش گالی دی اور کڑک کر بولا۔ "نیچے اتر۔ ورنہ ابھی یہ رائفل چلا کر تیرا کھوپڑا کھول دے گا۔"

"نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" لڑکی روتے ہوئے بولی۔

"جائے گا کیوں نہیں۔ تیرا تو والد صاحب بھی جائے گا۔" عیسیٰ جان دانت پیس کر غرایا۔ پھر اس نے غالباً لڑکی کو زینوں سے دھکا دے دیا تھا۔ گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ لڑکی چار پانچ زینے نیچے لڑھک گئی۔ پھر مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ ظاہر ہے مارنے والا عیسیٰ جان اور پٹنے والی وہی لڑکی تھی۔ جو چند ماہ پہلے بہار کی ایک خوبصورت صبح کو اجلی اجلی یونیفارم پہن کر ماتھے پر اپنی پیاری ماں کے بوسے سجا کر

ائرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکل رہی۔ ان گنت روز و شب گزر چکے تھے۔ وہ ائرپورٹ پہنچی تھی اور نہ واپس اپنے گھر۔ وہ نوشگفتہ کلی بے رحم موسموں کی زد میں تھی اور پل پل زندگی سے محروم ہو رہی تھی۔ پھر مجھے دوسری لڑکی کی آواز سنائی دی۔ اپنی ساتھی کی دُرگت بنتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھی۔

ایک لمحے کے مختصر دورانیے میں یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی لڑکیوں سمیت کوچ کی طرف آرہے ہیں۔ وہ اس کوٹھی سے روانہ ہو رہے تھے۔ عیسیٰ جان کو کمرے کے اندر ہی قابو کرلینے کا جو پلان میرے ذہن میں تھا وہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ اور ایسا صرف قادر زماں کے تاخیری حربوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ پیچھے ہٹ آیا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہم کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف آگئے۔ میں نے مزدا کوچ کو دیکھا۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی جہاں میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں نے مُراد کو گارڈینیا کی ایک باڑ کے عقب میں چھپا دیا اور خود جلیل کمانڈر کے ساتھ تیزی سے کوچ کی طرف بڑھا۔ کوچ کے ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ لیکن یہ صورت حال تادیر برقرار رہنے والی نہیں تھی۔ میں گھوم کر کوچ کے پہلو میں آیا۔ دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ مقفل تھا۔ ہم چکر کاٹ کر مخالف سمت میں چلے گئے۔ یہاں ایک دو کھڑکیاں جزوی طور پر کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کے شیشے کو دھکیل کر راستہ بنایا اور بازوؤں کے بل اُچھل کر خود کو اندر لے گیا۔ اگلے ہی لمحے جلیل بھی کوچ کے اندر تھا۔ شیشہ برابر کر کے ہم دروازے کے قریب آگئے۔ میں نے سرگوشی میں جلیل سے پوچھا۔ "گاڑی چلانا پڑی تو چلا لو گے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے گاڑی کی چابی اسے دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ! اگنیشن میں چابی لگا کر دیکھو۔ لیکن اسٹارٹ نہیں کرنا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا گیا۔ میں نے بغور دروازے کا جائزہ لیا اور اسے اپنی کارروائی کے لیے موزوں پایا۔ جلیل اگنیشن کا جائزہ لے کر واپس میرے پاس آگیا۔ اسی دوران عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی نمودار ہوگئے۔ وہ برآمدے کی طرف سے کوٹھی کے صحن میں داخل ہوئے تھے۔ برآمدے کی روشنی میں مجھے دونوں لڑکیاں دکھائی دیں۔ ایک لڑکی نے اپنا جسم چادر سے ڈھانپ رکھا تھا جب کہ دوسری اسی برائے نام لباس میں تھی جس میں میں اسے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ غالباً زیادتی ہونے والی مارپیٹ میں لڑکی کی چادر جسم سے علیحدہ ہوگئی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے اور وہ رو رہی تھی۔ عقب میں عیسیٰ جان تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹھ ایم ایم رائفل تھی۔ وہ رائفل کے کندے سے بار بار لڑکی کو ٹھوکا دے رہا تھا۔ عیسیٰ کے چار ساتھی اس کے عقب میں تھے۔ کچھ ابھی تک ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ عیسیٰ جان کو اب تک وہ بندہ مل گیا ہوگا جسے میں بے ہوش کر کے بیسمنٹ میں پھینک آیا تھا۔ اس واقعے سے باخبر ہونے کے بعد عیسیٰ اور اس کے ساتھیوں کا بے حد محتاط ہونا لازمی تھا۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ محتاط نظر آرہے تھے۔ وہ ہر کونے کھدرے میں جھانکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکیاں گن پوائنٹ پر آگے آگے چل رہی تھیں۔ میں نے جلیل کمانڈر کے کان میں سرگوشی کی۔ "تم ڈرائیونگ سیٹ کے قریب والی سیٹ میں چھپ جاؤ۔ اگر عیسیٰ کا کوئی ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر گیا تو تم اس کے سر سے رائفل لگا دینا اور جونہی میں اشارہ کروں اس سے کہنا کہ گاڑی بھگا لے جائے لیکن اگر میرے اشارہ کرنے تک ڈرائیور نے نشست نہ سنبھالی تو پھر تم ڈرائیور کی نشست پر آجانا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

جلیل کمانڈر ایک چوکس شخص تھا۔ وہ میری بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کر وہ رکوع کے انداز میں جھکا اور نشستوں کے درمیانی راستے سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ کے عین عقب میں چھپ گیا۔ ادھر کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اپنی تمام توجہ عیسیٰ جان اور لڑکیوں پر مرکوز کردی۔ وہ لوگ اب صرف پندرہ بیس قدم دوری پر تھے۔ آثار بتا رہے تھے کہ سب سے پہلے دونوں لڑکیاں کوچ میں قدم رکھیں گی۔ ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ میں دروازے کے بالکل ساتھ لگا کھڑا تھا۔ رائفل میرے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ انتظار کے وہ چند لمحے بڑے بھاری تھے۔ پھر مجھے دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ عیسیٰ جان کی غراہٹوں کے ساتھ ساتھ ایک کے رونے بلکنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ دروازہ باہر سے سنائی دینے والی مدھم آوازیں واضح ہوگئیں۔ عیسیٰ جان کسی لڑکی کو سرد لہجے میں پچکار کر بولا۔ "چل لالہ جان! چل بیٹھ جا اوپر۔ ورنہ تیرا سسکنے والا تماشا میں ختم کرے گا۔"

ایک لڑکی لرزتی کانپتی اوپر آئی۔ پھر دوسری۔ یہ لمحے کا منظر تھا۔ لڑکیوں کے پیچھے آنے والے شخص کا

ابھی پائیدان پر رکھا ہی گیا تھا کہ میں تیزی سے حرکت میں آیا۔ ایک اندھا دھند جھٹکے سے میں نے کوچ کا دروازہ بند کردیا۔ نہ صرف بند کردیا بلکہ اندر سے کھٹکا گھما کر لاک بھی کردیا۔ دونوں لڑکیاں بیک وقت چیخیں "نیچے لیٹ جاؤ" میں نے چلا کر دونوں کو حکم دیا۔ انہوں نے کوچ کی نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے پیٹ کے بل فرش پر گر گئیں۔ ایک ہی لمحے میں کوچ سے باہر زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ چند جنگلی بھینسے مشتعل ہو کر کوچ کے دروازے کو ٹکریں رسید کر رہے ہیں۔ میں نے چلا کر جلیل کمانڈر سے کہا۔ "گاڑی چلاؤ۔"

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ جونہی میں نے گاڑی چلانے کا کہا اس نے جھک کر اگنیشن میں چابی لگا دی۔ جھرجھری لے کر کوچ کا انجن اسٹارٹ ہوا۔ یہی وقت تھا جب کوچ پر پہلا برسٹ مارا گیا۔ یہ عیسیٰ جان کے ہاتھ میں پکڑی آٹھ ایم ایم رائفل کا فائر تھا۔ بے شمار گولیاں کوچ کی باڈی میں پیوست ہوگئیں اور کچھ شیشوں کو توڑتی ہوئی نکل گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فل میگزین برسٹ تھا۔ یعنی دوبارہ فائر کرنے کے لیے عیسیٰ جان کو نیا میگزین چینج کرنا تھا۔ میں نے دروازے کی اوٹ چھوڑ کر شیشے میں سے جھانکا۔ عیسیٰ جان کے پیچھے آنے والا شخص اپنی ایل ایم جی سیدھی کر رہا تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے ایک بار پھر نیچے جھک گیا۔ میرا یہ غوطہ بروقت ثابت ہوا۔ اگلے ہی لمحے دھماکے سے شیشہ ٹوٹا اور کئی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئیں۔ لڑکیاں فرش پر پڑی چلا رہی تھیں۔ یہ ہسٹریائی چیخ و پکار تھی۔ جلیل کمانڈر کوچ کو حرکت میں لا چکا تھا۔ میں نے ایل ایم جی کے دوسرے برسٹ کا انتظار کیا۔ جونہی برسٹ فائر ہوا میں نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں جھانکا۔ طاقتور رائفل میرے کندھے سے لگی تھی۔ میں نے عیسیٰ جان کو دیکھا۔ وہ رائفل سے نیا میگزین چینج کر چکا تھا لیکن ابھی اس نے رائفل فائرنگ پوزیشن میں نہیں کی تھی۔ عیسیٰ کے ساتھی کی ایل ایم جی خالی ہو چکی تھی۔ باقی رائفل بردار بھاگتے ہوئے کوچ کی طرف آرہے تھے لیکن ابھی فاصلوں پر تھے۔ یہ بہت قیمتی لمحہ تھا۔ قیمتی اور نایاب۔ قبائلی علاقوں کا آسیب میری رائفل کی زد پر تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے پکا خیلہ میں معصوم بشارت کو قتل کیا تھا اور اس کے ساتھ درجنوں افراد کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ اب تک نبیلہ اور کرن جیسی ان گنت عورتیں اس کے بستر ہوس پر روندی جا چکی تھیں اور بے شمار اس کے ہاتھوں قتل ہوئی تھیں۔ وہ قادر زماں اور ہنٹر شنکرا جیسے شیطانوں کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا۔ میں نے بے دریغ اس پر گولی چلائی۔ اس نے پھرتی سے زمین پر لیٹنا چاہا لیکن اس سے پہلے کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو چکی تھیں۔ جی تھری کے جان لیوا برسٹ نے عیسیٰ جان کے ساتھ ساتھ ایل ایم جی والے کو بھی نشانہ بنایا تھا۔ اس کے جسم کو زوردار جھٹکے لگے اور وہ عیسیٰ جان کے پہلو میں گرا۔ اسی دوران کسی جانب سے ایک برسٹ آیا۔ کوچ کی عقبی اسکرین ایک مہیب دھماکے سے فرش پر بکھر گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری پشت پر چند گولیاں لگ گئی ہیں۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر فرش کے بوسیدہ قالین پر گرا۔

یہ بڑے کربناک لمحات تھے۔ میں نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ گولیاں جیکٹ پر ہی لگی ہوں۔ میں ایک سے زائد بار گولی لگنے کے تجربے سے گزر چکا ہوں۔ یہ بڑا عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ کسی وقت تو ایک معمولی چبھن کے سوا کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ جب بندہ اپنے جسم کو خون سے تربتر دیکھتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ گولی لگ چکی ہے۔ عین ممکن تھا کہ میرا لباس بھی پشت پر کہیں سے لہولہو ہو رہا ہو۔ میں نے اوندھے منہ فرش پر پڑے پڑے رائفل کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور اوپر تلے چار فائر کردیے۔ گولیاں ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے پرواز کر گئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ پیغام بھی پرواز کر گیا جو میں ایس پی صاحب کو دینا چاہتا تھا۔ لڑکیاں محفوظ ہو چکی تھیں اور اب قانون نافذ کرنے والے کوٹھی پر بلا بولنے کے لیے آزاد تھے۔

جلیل کمانڈر نے دوسرے گیئر میں ہی گاڑی کی رفتار پچیس تیس میل فی گھنٹا تک پہنچا دی تھی۔ کوٹھی کا ایک بیرونی گیٹ کھلا تھا۔ گاڑی کوٹھی سے نکلی اور اسکیم کی ہموار سڑک پر آگئی۔ اس دوران دو طرفہ فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ دو تین گاڑیوں کی آڑ لے کر پولیس والے کوٹھی کے بالکل سامنے پہنچ چکے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ مجرموں کو گھیر لیا جائے۔ کوچ اس دو طرفہ فائرنگ کے درمیان سے گزری تھی۔ لہٰذا اس کی باڈی میں کئی اور گولیاں لگیں اور اس کے دونوں پچھلے ٹائر بھی برسٹ ہوگئے۔ برسٹ ٹائروں والی گاڑی میں ہچکولے کھاتے ہوئے مجھے وہ ٹرک یاد آگیا جو اس سارے ہنگامے کا موجب تھا اور جس پر ہم نے جھنگ سے انڈین گاؤں تیرتھ تک کا سنسنی خیز سفر کیا تھا۔

اچانک ایک خوفناک دھماکے نے فضا کو دہلا دیا۔

دھماکے کے ساتھ ہی ایک زبردست چمک اُبھری تھی۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ زیرِ تعمیر کوٹھی کے قریب شعلے بھڑک رہے تھے۔ عیسٰی کے ساتھیوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ یہ راکٹ کا دھماکا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راکٹ کوٹھی کے اندر نہیں بلکہ اس کے پہلو میں پھٹا ہے۔

جلیل کمانڈر گاڑی کو سیدھا لیتا چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کوئی مزید راکٹ فائر نہیں ہوگا پھر بھی ہم نے احتیاط کی اور گاڑی کو ایک محفوظ فاصلے پر لے جا کر کھڑا کیا۔ میرے لباس میں دائیں کندھے کے نیچے اوپر تلے دو سوراخ تھے۔ اگر جیکٹ نہ ہوتی تو ایسے ہی سوراخ میرے سینے کے آر پار بھی نظر آتے۔ جلیل کمانڈر اس فائرنگ میں محفوظ رہا تھا۔ صرف شیشے کی اڑتی ہوئی کرچیاں لگنے سے اس کی ٹھوڑی پر دو زخم آئے تھے اور ان زخموں کی نشاندہی کرنے کے لیے اس کی تراشیدہ داڑھی دو مقامات سے سرخ ہو رہی تھی۔

لڑکیاں ابھی تک دہشت زدہ تھیں اور نشستوں کے درمیان سکڑی سمٹی پڑی تھیں۔ ان کے حلقوم سے گھٹی گھٹی چیخیں ابھی تک برآمد ہو رہی تھیں۔ میں نے کوچ کی اندرونی روشنیاں جلائیں اور سہارا دے کر انہیں نشستوں پر بٹھایا۔ ایک دم ہی وہ اپنی برہنگی کو محسوس کرنے لگیں۔ ایک لڑکی کی کمبل نما چادر کوچ کے قالین پر پڑی تھی۔ وہ اس نے جلدی سے اپنے جسم پر ڈال لی۔ یہ ایک فطری اور کسی حد تک معصومانہ ردِعمل تھا۔ وہ اب بھی اس جسم کو سراپا چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں جو ایک عرصے سے کھلی کتاب کی طرح پڑا رہا تھا اور ہر آتا جاتا اس کی ورق گردانی کرتا رہا تھا۔ وہ قابلِ رحم انداز میں کسی معمول کی طرح سر جھکائے میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ آنکھوں کی چمک' دوشیزگی کا بانکپن'... پارسائی کا غرور' حسن کا مان' کچھ بھی نہیں تھا ان کے پاس' وہ بالکل تہی دست' عاجز اور خالی الذہن نظر آرہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے وہ کسی دیہاتی مسافر کی مرغیاں ہیں جن کے پاؤں باندھ کر اس گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مرغیوں کے پاؤں رسی سے باندھے جاتے ہیں جب کہ ان لڑکیوں کے پاؤں "برہنگی" سے باندھے گئے تھے۔

دور فاصلے پر فائرنگ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ زیرِ تعمیر کوٹھی اور عیسٰی جان والی کوٹھی کے درمیان برق رفتار جگنو اُڑ رہے تھے۔ گاہے گاہے کسی طویل برسٹ کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ تین چار منٹ بعد فائرنگ بالکل تھم گئی۔ ایک موبائل سائرن بجاتی ہمارے قریب چلی آئی۔ اس میں ایس پی جاذب خان بنفسِ نفیس سوار تھے۔ انہوں نے احتیاط کا پہلو پیشِ نظر رکھا اور فوراً گاڑی سے باہر نہیں آئے۔ ایک میگافون کے ذریعے انہوں نے بلند آواز سے کہا۔ "مسٹر جہاں! مجرموں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں' آپ لوگ باہر آجائیں۔"

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ ایس پی صاحب بھی موبائل گاڑی سے اُتر آئے۔ سرکاری پستول ان کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے پہچان کر انہوں نے پستول واپس ہولسٹر میں لگایا۔ ان کے لب بھنچے ہوئے تھے اور سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ بہ زبانِ خاموشی وہ مجھ سے لڑکیوں کی سلامتی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "دونوں لڑکیاں بالکل محفوظ ہیں سر۔"

وہ بے ساختہ مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ جلیل کمانڈر دونوں لڑکیوں کو لے کر کوچ سے باہر نکل آیا۔ ان دونوں کو موبائل میں منتقل کیا گیا۔ کوچ کے پچھلے ٹائر چونکہ برسٹ ہو چکے تھے لہٰذا ہم بھی موبائل ہی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ایس پی جاذب سے پوچھا "عیسٰی جان کا کیا بنا؟"

وہ بولے۔ "اس کے پیٹ میں کئی گولیاں لگی ہیں مشکل سے بچے گا۔"

اسی دوران دو ایمبولینس گاڑیاں سائرن بجاتی بڑی تیزی سے ہمیں کراس کر گئیں۔ ایس پی صاحب نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ عیسٰی اور اس کے ساتھیوں کو لے جایا جا رہا ہے۔ دو رائفل والے تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ چار نے گرفتاری دے دی ہے۔"

"اپنا تو کوئی نقصان نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"صرف قادر زماں صاحب کے ایک گارڈ کی ٹانگ [illegible] زخم آیا۔ تاہم مالی نقصان کافی ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"قادر زماں صاحب کی امپالا کار تباہ ہو گئی ہے۔ راکٹ اس کے پاس ہی گرا تھا۔ پرخچے اڑ گئے ہیں بے چاری کے۔"

پولیس موبائل اب زیرِ تعمیر کوٹھی کے پاس پہنچ [illegible] تھی۔ قادر زماں کی شاندار امپالا واقعی نیست و نابود ہو [illegible] تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ پر ۵۵۵ درج تھا اور قریباً ۵۵۵ گاڑی کے ٹکڑے ہوئے تھے۔ صرف نمبر پلیٹ محفوظ تھی اور مین گیٹ کے نزدیک ایک پھولدار جھاڑی میں اٹکی ہوئی تھی۔ قادر زماں اندر برآمدے میں خاموش کھڑا

ایس پی جاذب نے مجھے بتایا کہ قادر زماں صاحب نے ابھی واپس آ کر گاڑی کھڑی ہی کی تھی کہ راکٹ پھٹ گیا۔ اگر یہ دھماکا آٹھ دس سیکنڈ پہلے ہو جاتا تو قادر زماں صاحب کا بچنا بھی محال تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راکٹ چلانے والے کو کوسا اور ایس پی کے ساتھ اندر کوٹھی میں آگیا۔ دونوں لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ پولیس کا عملہ متجسس انداز میں ہمارے گرد اکٹھا ہونے لگا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب کوٹھی سے کافی فاصلے پر اپنی جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں آپریشن کی کامیابی کی اطلاع بھجوائی گئی۔ وہ بھاگے بھاگے پہنچے۔ ایس پی صاحب سے تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ میں نے جو کچھ ایس پی صاحب کو بتایا تھا وہ انہوں نے اسسٹنٹ کمشنر صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب خوش نظر آرہے تھے۔ وہی کیا موقع پر موجود ہر شخص اس ڈراپ سین پر مطمئن اور خوش تھا۔ یہاں تک کہ جاگیردار قادر زماں نے بھی اپنی گھنی مونچھوں تلے پُرسکون مسکراہٹ سجا رکھی تھی۔ تاہم یہ میں ہی جانتا تھا کہ اس پُرسکون مسکراہٹ کی تہ میں کیا چھپا ہے اور قادر زماں کے دل پر کیسے آرے چل رہے ہیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے گولیوں سے چھلنی کرتا اور پھر اپنے آدم خور کتوں کو میری لاش کی چیر پھاڑ کی کھلی چھٹی دے دیتا۔

وقت کا تقاضا نبھاتے ہوئے اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے شاباشی دی۔ میں نے کہا۔ "بہت افسوس ہے زماں صاحب! آپ کا گارڈ زخمی ہوا اور گاڑی تباہ ہو گئی۔"

وہ فراخدلی سے بولا "یہ کوئی نقصان نہیں ہے جان جی۔ خدا کا شکر ہے کہ بچیاں بچ گئیں اور کسی بے گناہ کی جان نہیں گئی۔"

میں نے پوچھا "عیسٰی جان کی حالت کیسی تھی؟"

وہ بولا "کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہت زخمی ہوا ہے۔ میرا خیال ہے لمبا چوڑا آپریشن ہوگا۔"

عیسٰی جان کے گرفتار شدہ ساتھیوں کو اُلٹی ہتھکڑیاں لگا کر برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بٹھایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک دو معمولی زخمی بھی تھے۔ وہ سب خوں بار نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجرموں کی پناہ گاہ کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ وہاں سے برآمد ہونے والی رائفلیں' شراب کی بوتلیں' ایمونیشن' مالِ مسروقہ' سب کچھ ایک ڈھیر کی صورت برآمدے میں جمع کیا جا رہا تھا۔ اس سامان میں وہ راکٹ لانچر بھی تھا جسے میں آپریشن سے کچھ دیر قبل ناکارہ بنا آیا تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ کوٹھی عیسٰی جان کے خفیہ ٹھکانوں میں سے ایک تھی۔ اسے حال ہی میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس پر کسی ایڈووکیٹ نعیم شاہ کے نام کی جعلی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مغویہ لڑکیاں پچھلے تین ماہ سے اسی کوٹھی میں تھیں۔ عیسٰی اور اس کے ساتھی وقتاً فوقتاً انہیں ہوس کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ بقول شخصے لڑکیوں کا سودا ایک افغان بردہ فروش سے طے ہو چکا تھا۔ عیسٰی جان بیعانہ وصول کر چکا تھا۔ "مال" پہنچانے کی ذمے داری عیسٰی جان کی تھی اور خریدار کئی بار اصرار کر چکا تھا کہ لڑکیاں اس کے حوالے کی جائیں لیکن عیسٰی جان ٹال مٹول کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ فی الحال لڑکیوں کو اس کوٹھی سے نکال کر بارڈر پر پہنچانے کا رسک نہیں لے سکتا۔

بارش میں گھومنے پھرنے سے میرا لباس بُری طرح بھیگ چکا تھا۔ بخار کی شکایت بھی تھی لہٰذا کپکپی سی چھوٹنے لگی تھی۔ ویسے بھی اب میرا یہاں زیادہ کام نہیں تھا۔ ایس پی کے روبرو اپنا بیان قلمبند کرانے کے بعد میں نے ان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے والی ٹاکی میرے پاس رہنے دیا اور رائفل بھی۔ ان کا خیال تھا کہ مجھے ان چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

رات بارہ بجے کے قریب میں اپنے ٹھکانے واقع ڈگری بازار واپس پہنچا۔ زریں گل بند کمرے میں گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ میں نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا۔ آخر دیوار پھاند کر صحن میں کودنا پڑا۔ کمرے کا دروازہ بھی زور زور سے بجانا پڑا۔ آخر زریں گل کی آنکھ کھلی۔ "خو آپ کدھر چلا گیا تھا؟" وہ غنودگی میں بڑبڑایا۔ "فریال بھی آپ کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر ابھی واپس گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ نو بجے بھی آپ کا پوچھنے کے لیے آیا تھا۔"

میں اس اوٹ پٹانگ لڑکی کی دلیری پر حیران ہوا۔ وہ رات بارہ ایک بجے تک گھر سے باہر گُڈ گڑے لگاتی پھرتی تھی۔

"کیا کہتی ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"خو اس نے ام کو بتایا کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ آپ کے بارے میں بڑا فکر مند ہے۔ وہ ام سے بہت دیر باتیں کرتا رہا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکی ہے۔ اس کا دل بہت صاف ہے' بالکل شیشے کا مافق۔"

میں نے کمرے کی روشنی گُل کر کے اپنے بھیگے کپڑے اتارے' تولیے سے جسم خشک کر کے دوسرا جوڑا پہنا اور چادر لے کر انگیٹھی کے قریب بیٹھ گیا۔ زریں گل بولا۔ "فریال..."

بی بی نے ام سے بہت باتیں کیا ہے۔ آپ کے بارے میں اپنے بارے میں اور غزالہ بی بی کے بارے میں بھی۔ وہ کہتا ہے کہ آپ غزالہ بی بی کی محبت کا جواب نفرت سے دیتا رہا ہے اور یوں اُن سے بہت بڑا زیادتی کرتا رہا ہے لیکن اب جو غزالہ بی بی نے کیا ہے وہ بھی بہت بڑا زیادتی ہے۔ انہوں نے آپ کو ایک آخری موقع دیے بغیر ایک دم شادی بنالیا۔ آپ کا زندگی ویران کردیا۔"

میں نے کہا "زریں گل کوئی اور بات کرو۔ مجھے اس ذکر سے سخت اُلجھن ہوتی ہے۔"

زریں گل نے آرھ بجھی انگیٹھی میں ہی آگ جگادی۔ بخار تیز ہورہا تھا۔ میں نے اسپرین ڈھونڈنے کے لیے تپائی کی طرف نگاہ دوڑائی تو وہاں چند دوائیں پڑی تھیں۔ زریں گل نے کہا۔ "یہ فریال بی بی آپ کے لیے لے کر آیا تھا۔ بخار کا دوائی علیحدہ ہے۔ درد کا علیحدہ ایک کیپسول ہے' بالکل توپ کے گولے جیسا۔ وہ ضرور کھانا ہے۔ بی بی تاکید کرکے گیا ہے۔"

میں نے دیکھا' میرا بستر بڑے سلیقے سے بچھا ہوا تھا۔ رات کو پہننے والی شلوار قمیص کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ تولیا' صابن' شیو کا سامان سب کچھ اپنی جگہ ترتیب سے رکھا تھا۔ زریں گل میرے جیسا چھڑا چھانٹ اور آوارہ گرد تھا۔ اس میں اتنا سلیقہ کہاں تھا۔ یقیناً یہ سب کچھ فریال کرکے گئی تھی۔ میں نے تپائی سے دوا والی بوتلیں اُٹھائیں۔ بڑی مہنگی دوائیں تھیں۔ بوتلوں کے اوپر ہی فریال اپنے ہاتھ سے خوراک اور وقت وغیرہ لکھ گئی تھی۔ میں نے ان ہدایات کے مطابق دوا کھائی اور کچھ دیر انگیٹھی پر ہاتھ تاپ کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں جانتا تھا کہ آج میں عیسیٰ جان اور قادر زماں وغیرہ کو زبردست زک پہنچا کر آیا ہوں۔ میرے دشمن زخمی سانپوں کی طرح بل کھول رہے تھے۔ ان کی طرف سے غافل رہنا زبردست بے وقوفی تھی۔ ایس پی صاحب نے اچھا کیا تھا کہ رائفل میرے ساتھ رہنے دی تھی۔ اس کے فالتو راؤنڈ بھی میری جیکٹ کی جیبوں میں بھرے ہوئے تھے۔ میں نے رائفل کو اپنے ساتھ ہی بستر پر لٹا لیا۔ زریں گل گلنار کالونی کی تازہ خبریں سننے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے اسے مختصراً وہاں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ بڑی دلچسپی اور حیرانی کے عالم میں سنتا رہا۔ میری قمیص اور جیکٹ میں دو عدد سوراخ دیکھ کر اس کے ہونٹ تشویشناک انداز میں سکڑ گئے۔ تاہم ان "سوراخوں" کا غم ایک دوسری خبر نے غلط کردیا۔ قادر زماں کی نئی نویلی اسپالا کی تباہی کا سن کر زریں گل کو دلی مسرت ہوئی پھر جب میں نے اسے عیسیٰ جان کی گرفتاری کی خبر سنائی تو وہ بالکل باغ باغ ہوگیا۔

بولا۔ "خوا استاد جی! آپ کا کارگزاری سن کر امارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اب ام اپنا جھولی پھیلا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ عیسیٰ جان کو جیل جانے سے بچالے۔"

"ہائیں۔۔۔ وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ام چاہتا ہے کہ جیل جانے سے پہلے ہی اس کا سانس پورا ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ اس بدبخت کے بوجھ سے اس زمین کو آزاد کردے۔"

میں نے کہا "کچھ بھی ہے' فی الحال تو وہ زندہ ہے۔ اس کے آدمی اس کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کررہے ہوں گے۔ قانون یہی کہتا ہے کہ قاتل کو پھانسی بھی دینی ہو تو پہلے اسے بحال کرو۔"

"قانون کا بات چھوڑو جی" زریں گل نے بُرا سا منہ بنایا۔ "قانون کا بات ام کو کبھی اچھا نہیں لگا۔ یہ ہمیشہ الٹی چھری والا بات ہوتا ہے۔ ام تو کہتا ہے کہ جس سچ کو ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑے اس سچ پر ایک ہزار بار لعنت' ام باغی ہے ایسے سچ اور قانون کا۔"

میں نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر لالہ شدمیر کی روح حلول کرگئی ہے۔ تم بات کرتے ہو تو لگتا ہے کہ شدمیر مکالمے بول رہا ہے۔"

زریں گل نے کہا۔ "آپ کیسا بات کرتا ہے استاد صاحب' لالہ شدمیر ابھی زندہ ہے۔ اس کا روح ام میں کیسے حلول کرسکتا ہے۔ اللہ اُس کا عمر دراز کرے۔ ابھی تو وہ جوان ہے۔ فلم لائن میں ہیرو آیا ہوا ہے۔ امارا یہ پکا ایمان ہے کہ لالہ شدمیر سدا بہار ہیرو ہے۔ وہ جب تک ہے اور اس کا سانس چلتا ہے کوئی مائی کا لال اسے فلم میں ہیرو آنے سے نہیں روک سکتا۔"

میں نے زریں گل سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ خدشہ تھا کہ اصل بات وہیں رہ جائے گی اور پاکستان کے جنگجو فلمی ہیروز کے بارے میں ایک ایسی فلم چلے گی جو صبح تک "دی اینڈ" نہیں کرے گا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "زریں گل! تمہارے پاس پستول ہے؟"

"بالکل جناب! یہ دیکھیں ام نے تکیے کے نیچے رکھا ہے۔ ساتھ میں مسرت شاہین کا فوٹو بھی ہے۔ اگر کوئی سلطان راہی قسم کا فلمی پٹھان ہوگا تو یہ فوٹو دیکھ کر ہی مرجائے گا۔ ورنہ اپنے پستول سے کام چلائے گا۔"

"بس لحاف ہے۔ زرا ہوشیار ہوکر سونا۔ عیسیٰ کے ساتھی زخم چاٹ رہے ہیں۔ کہیں کوئی بے قرار ہوکر ہمارے غریب خانے کو دلہن بنانے نہ چلا آئے۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب! ام نے اپنا نیند پورا کرلیا ہے۔ اب اگر آپ آرام کرنا چاہتا ہے تو تسلی سے کرے۔"

تھکاوٹ کے زور تھا یا شاید دوا کی غنودگی' رات کا باقی حصہ میں نے گہری نیند میں گزار دیا۔ نہ بخار کا احساس ہوا اور نہ سینے کی تکلیف نے بے چین کیا۔ لیکن جب نیند ٹوٹنا شروع ہوئی تو درد کی لہریں آکٹوپس کی طرح آگے بڑھیں اور مجھے اپنے لہراتے بازوؤں میں جکڑنے لگیں۔ سینے کی تکلیف دم بہ دم بڑھتی چلی جارہی تھی۔ بخار کے سبب منہ خشک ہوگیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جسم کسی الاؤ میں دھرا ہے۔ میں جاگتے ہوئے بھی جیسے خواب میں تھا۔ میں نے پانی پیا تھا۔ شاید خود پیا تھا یا زریں گل نے پلایا تھا۔ پھر میں نے پچھ کے بغیر ہی تھوڑی تھوڑی سی کی حلق میں انڈیلی تھی۔ کیپسول کا یاد نہیں کہ کھایا تھا یا نہیں۔ گاہے گاہے زریں گل کا ہاتھ میرے ماتھے پر آتا تھا۔ کبھی میں اسے اپنے پاؤں دباتے پاتا۔ کبھی وہ میرے منع کرنے کے باوجود میرے سینے کی مالش کرنے لگتا۔

پھر مجھے لگا کہ غزالہ اپنے شوہر کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے داخل ہوتے ہی کمرا کاسمیٹکس کی خوشبو سے مہک اُٹھا۔ وہ زرق برق لباس میں تھی۔ میں نے اس کا گداز بازو اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ اس کے ہاتھوں میں شاید طلائی کنگن کھنکے تھے۔ اس کا شوہر قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی صورت ٹھیک سے نظر نہیں آرہی تھی۔ زریں گل کی دور افتادہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے منع کرنے کے باوجود رات بارش میں بھیگتے رہے ہیں اس لیے طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔"

غزالہ کا ہاتھ میرے سینے پر تھا اور میں نے اسے تھام رکھا تھا۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ تمام زندگی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ غزالہ اپنی آواز میں نہیں فریال کی آواز میں بول رہی ہے۔ دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ میرے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی غزالہ نہیں فریال ہے۔ میں نے سر جھٹک کر ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کیا اور پوری آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ ہاں۔۔۔ وہ فریال ہی تھی۔ جس شخص کو میں غزالہ کا شوہر تصور کررہا تھا وہ فریال کے ڈیڈی ایس پی ساہی صاحب تھے۔ کرسی پر بیٹھے وہ بڑی تشویش سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میرے ذہن پر چھائی ہوئی غنودگی اب چھٹ چکی تھی۔ میں اٹھا اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایس پی صاحب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولے "شاد جہاں! تمہیں سب کام چھوڑ کر میرے ساتھ اسپتال چلنا ہوگا۔ ابھی اور اسی وقت۔ تم بے حد بے پروا اور غیر ذمے دار شخص ہو۔ درد کش دوائیں کسی تکلیف کا علاج نہیں ہوتی ہیں۔ ان دواؤں پر کب تک چلو گے۔ اگر آئینہ ہے تو اس میں اپنی صورت دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ خود کو مشکل سے پہچان سکو گے تم۔"

میں نے کہا "ایسی بات نہیں ساہی صاحب! طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ بس رات کو بارش میں بھیگنے والی غلطی ہوگئی۔ اگر۔۔۔"

میں نے بہت ٹالنا چاہا لیکن فریال اور ساہی صاحب نے میری ایک نہیں سنی۔ سڑک پر ساہی صاحب کی ذاتی کار موجود تھی۔ وہ اس کار پر کل رات ہی لاہور سے پشاور پہنچے تھے۔ وہ مجھے سیدھے ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے گئے۔ بہت مہنگا اور بڑا اسپتال تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میرے دو تین ٹیسٹ ہوئے۔ پہلے ایکسرے' پھر الٹرا ساؤنڈ پھر ای سی جی اور یورین ٹیسٹ وغیرہ۔ یہیں اسپتال کے استقبالیے میں میں نے تازہ اخبار بھی دیکھا۔ پشاور کی گلنار کالونی میں ہونے والے معرکے کی خبر جلی سرخیوں میں موجود تھی۔ زخمی عیسیٰ جان کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ ایک تصویر اس کے دو مُردہ ساتھیوں کی تھی۔ نیوز رپورٹر نے ان دو انڑہو سٹسوں کی تصویر کھینچنے کی کوشش بھی کی تھی جنہیں میں اور جلیل کمانڈر کوچ سمیت عیسیٰ کے چنگل سے نکال لائے تھے۔ کیمرے کی آنکھ سے بچنے کے لیے دونوں لڑکیوں نے چہرے چادروں میں چھپا لیے تھے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ پولیس کمانڈوز نے بروقت ایکشن کرکے بدنام زمانہ ڈاکو عیسیٰ جان کے چنگل سے مغویہ لڑکیاں آزاد کرالیں۔ ایکشن کی تفصیلات بھی مرچ مسالے کے ساتھ بیان کی گئی تھیں۔ ایک باکس میں لکھا گیا تھا کہ اس کارروائی میں ڈاکوؤں کی طرف سے آزادانہ راکٹ لانچر استعمال کیے گئے۔ ایس پی جاذب کی تصویر اخبار کی زینت بنی تھی تاہم میرا یا جلیل کمانڈر کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ مجھے ذرا ملال نہیں ہوا تھا کہ ایس پی جاذب نے سارا کریڈٹ خود لینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ یہ کریڈٹ لے سکتے ہیں۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ لڑکیوں کے غمزدہ ورثا کی اشک شوئی ہوگئی ہے اور وہ بوڑھے ہاتھ جو دعاؤں کے لیے اُٹھے ہوئے تھے' نامراد واپس نہیں آئے۔

میرے نمونوں کی رپورٹیں ملنے میں یقیناً آٹھ دس گھنٹے لگ جاتے مگر ساہی صاحب کی وجہ سے یہ کام بھی ارجنٹ ہوا۔ اسپتال پہنچنے کے دو گھنٹے بعد میرے مرض کی تشخیص مکمل ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ میری پسلیوں کے نیچے چوٹ کے اثرات ہیں۔ پسلیوں اور پھیپھڑوں کی درمیان والی جھلی میں شدید ورم تھا۔ اس ورم کی وجہ سے گاہے گاہے مجھے ہلکے اور تیز بخار کی شکایت ہو جاتی تھی۔ ایک سینئر ڈاکٹر صاحب نے چند دوائیں اور انجکشن وغیرہ لکھ کے دیے۔ اس کے علاوہ دو ہفتے کے لیے مکمل "بیڈ ریسٹ" کی تاکید کی۔ فریال مطمئن نظر آنے لگی۔ وہ بضد تھی کہ میں وہ خستہ حال مکان چھوڑ کر اس کے ساتھ چلوں اور کسی اچھے ہوٹل میں قیام کرلوں، لیکن میرے لیے یہ ناممکن تھا۔ مجتبیٰ کنور اور ڈی آئی جی کلارک صاحب نے مجھے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ بچگانہ انداز میں ضد کرنے لگی۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ ان کے سمجھانے پر وہ بمشکل مانی۔ ساہی صاحب نے مجھے اس کے ساتھ واپس ڈنگری بازار بھیج دیا۔ وہ خود ایک سرکاری جیپ میں بیٹھ کر ہیڈ کوارٹر چلے گئے تھے۔ فریال مجھے ایسے "ٹریٹ" کر رہی تھی۔ جیسے کسی شدید بیمار شخص کو کیا جاتا ہے۔ وہ مجھے بہ آہستگی چلاتے ہوئے گاڑی تک لائی۔ میرے لیے دروازہ کھولا، بند کیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ "دیکھیں شاہ جہاں صاحب! دو ہفتے آپ نے بستر سے پاؤں بھی نیچے اتارا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ وائی رب دی۔ اتنا شدید انفیکشن ہے آپ کے سینے میں پھر بھی آپ قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں۔ شفقت باجی کو پتا چل جائے کہ آپ ہمارے ہوتے سوتے اس طرح کی بے پروائی برت رہے ہیں تو وہ کیا سوچیں گی ہمارے بارے میں۔ خبردار، اب آپ کو ہر کام مجھ سے پوچھ کر کرنا ہوگا۔"

وہ بڑی تیز ڈرائیور تھی لیکن میری بیماری کے خیال سے آہستہ چل رہی تھی۔ رفتار کی یہ کمی اس کی زبان پوری کر رہی تھی۔ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے بول رہی تھی وہ۔ دائیں طرف کی کھڑکی کھلی تھی۔ اس کا آنچل بار بار اڑ کر میرے چہرے کو ڈھانپ لیتا تھا۔ میں اسے ہٹاتا، وہ پھر اٹکھیلیاں کرنے لگتا۔ آخر میں نے اسے فریال کے گلے میں لپیٹ دیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے اسے اپنے آنچل کی سرمستیوں کا اب تک احساس ہی نہیں تھا اور یہ صرف آنچل ہی کی بات نہیں تھی وہ اپنے زہد شکن شباب سے بھی ایسی ہی بے خبر تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ تعاقب کرنے والی ایک سرخ کرونا گاڑی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو میل سے مسلسل پیچھے آ رہی تھی۔ یہاں تک تو خیریت تھی۔ لیکن جب ہم "دینٹ" کی ایک نیم سنسان سڑک پر پہنچے اور سرخ گاڑی نے ہمیں اوورٹیک کرنے کی کوشش کی تو میں سمجھ گیا کہ میری بحالی صحت کے سلسلے میں فریال کی تمام منصوبہ بندیاں ناکام ہونے والی ہیں۔ فریال سرخ گاڑی کے ارادوں سے قطعی بے خبر تھی لہٰذا جب گاڑی نے دوسری مرتبہ ہمیں اوورٹیک کرنے کی کوشش کی تو فریال نے اسے راستہ دے دیا۔ میری نظر گاڑی کے اندر گئی اور تمام اندیشے حقیقت کے قالب میں ڈھل گئے۔ گاڑی میں پانچ افراد سوار تھے۔ وہ صورتوں سے ہی خطرناک مجرم نظر آتے تھے۔ میں انہیں پہچانتا نہیں تھا لیکن بغیر پہچانے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ منتخب قسم کے پیشہ ور قاتل ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان کا تعلق قادر زماں کی منحوس حویلی سے ہو۔ جونہی سرخ گاڑی ہمارے برابر پہنچی، میں نے ایک آٹھ ایم ایم رائفل کو حرکت میں دیکھا۔ اس کی بے رحم فولادی نال ہماری طرف گھوم رہی تھی۔ یہ لمحوں اور ساعتوں کا کھیل تھا۔ ایک انگلی حرکت میں آنے والی تھی اور ہم دونوں موت کی آگ میں نہانے والے تھے۔ میں نے فریال کی گردن اپنے دائیں بازو میں لی اور اسے پوری قوت سے نیچے کی طرف کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی میں خود بھی نیچے جھک گیا تھا۔ مجھے یاد ہے، میرا سر دروازے کے نچلے حصے کو چھونے لگا تھا۔ یکایک خوفناک تڑتڑاہٹ سے ہماری گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ شیشے کی کرچیاں میرے سر کے پچھلے حصے اور گردن پر گر رہی ہیں۔ گاڑی بڑے خطرناک انداز میں لہرا کر بائیں طرف مڑ گئی تھی اور مڑتی چلی جا رہی تھی۔ میرے کانوں میں فریال کی ایک طویل چیخ گونج رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اسٹیرنگ سنبھالنا چاہا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی گو اپنے ٹائروں پر رہی لیکن دو بار لٹو کی طرح گھوم گئی اور پھر چند نازک پودوں کو توڑ کر پہلو کے بل الٹ گئی۔ گاڑی بائیں سمت الٹی تھی لہٰذا چیختی چلاتی فریال میرے اوپر لد گئی تھی۔ اس کا گھٹنا میرے پیٹ میں دھنسا ہوا تھا اور اس کے پیٹ نے میرا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ گاڑی جس انداز سے الٹی تھی وہ خاصا حوصلہ افزا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح فریال بھی شدید چوٹوں سے محفوظ رہی ہوگی۔ میں فریال کے نیچے سے نکل کر کھڑا ہوا اور جسم کو زور سے آگے کی طرف جھلایا۔ میری پہلی کوشش ہی کامیاب رہی اور گاڑی ایک شدید دھکے کے ساتھ اپنے

ٹانگوں پر آ گئی۔ میں نے دیکھا، سرخ کرونا کار ہم سے پندرہ بیس گز کی دوری پر رک گئی ہے۔ اس میں سے ایک رائفل بردار نکل کر تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرا ایک ڈبل دار مفلر میں اس طرح چھپا رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی اور انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں دیکھتے ہی شوٹ کر دے گا۔ میں گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر نیچے دبک گیا۔ میرے کان آنے والے کے قدموں کی آواز پر لگے تھے۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اپنا پستول جیکٹ میں سے نکالا اور بائیں ہاتھ سے بہ آہستگی دروازہ ان لاک کر دیا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی ہم دونوں کی موت کا سامان کر سکتی تھی۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ جونہی مجھے محسوس ہوا کہ آنے والا دروازے کے پاس ہے اور اب کسی بھی وقت ہمیں دیکھ سکتا ہے، میں نے ایک شدید جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ کھلتے ہوئے دروازے کی ضرب حملہ آور کی ناف میں لگی تھی۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ میں اس پر فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ حملہ آور کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی ہے تو میں نے ارادہ بدل کر رائفل پر جست لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اس کی آٹھ ایم ایم رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت ناچ گئی۔ تاہم میں نے اسے نشانہ بنانے میں وقت صرف نہیں کیا۔ میں جانتا تھا اسے نشانہ بنانے میں میرا جو ایک سیکنڈ صرف ہوگا اس ایک سیکنڈ میں سرخ کار والے مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی میں نے پھر چھلانگ لگائی۔ اس چھلانگ کا انداز وہی تھا جو پانی میں ڈائیو کرنے کا ہوتا ہے۔ میں ایک شکستہ دیوار کی اوٹ میں گرا۔ کسی پلاٹ کا احاطہ کرنے والی یہ دیوار چار پانچ فٹ اونچی تھی اور مجھے مکمل اوٹ فراہم کر رہی تھی۔ میں بری طرح زمین پر گرا تھا لیکن پیٹ کے بل گرا تھا لہٰذا پسلیوں کے نیچے درد کی شدید ٹیسیں اٹھی تھیں۔ میں نے رائفل سرخ کار کی طرف سیدھی کی اور بے دریغ ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی گاڑی میں کھلبلی نظر آئی۔ پھر جوابی فائر ہوا اور شکستہ دیوار گولیوں کی چوٹ سے لرز اٹھی۔ جونہی مفلر پوش کی رائفل میرے ہاتھ میں آئی تھی، سرخ گاڑی حرکت میں آ گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے رفتار پکڑی اور سڑک پر چرچراتی ہوئی قریبی موڑ پر اوجھل ہو گئی۔

جس شخص سے میں نے رائفل چھینی تھی وہ کھیتوں میں بھاگا جا رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا، اس لیے راہ گیروں نے اسے پکڑ لیا۔ سڑک پر بھی بہت سی چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی ہو چکی تھیں۔ کہیں پٹاخا بھی چل جائے تو لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو پھر فائرنگ ہوئی تھی اور صرف فائرنگ ہی نہیں ہوئی تھی، ایک خوبرو لڑکی بھی موقع پر موجود تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ہمارے گرد اژدحام ہو گیا۔ فریال کی گاڑی پر سبز نمبر پلیٹ تھی لہٰذا لوگ مرعوب نظر آ رہے تھے۔ کچھ افراد بھگوڑے حملہ آور کو مارتے پیٹتے ہمارے پاس لے آئے۔ وہ حرامی ذرا پریشان نہیں تھا۔ بڑی ڈھٹائی سے مار کھا رہا تھا۔ اتنے میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ ایس پی جاذب خان کو دیکھ کر فریال کی جان میں جان آئی۔ میں نے بھی یک گونہ اطمینان محسوس کیا۔ جاذب صاحب موقع پر پہنچنے سے پہلے ہی صورت حال کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے فوراً سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رش بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ فریال کو یوں دیکھ رہے تھے۔ جیسے زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہے۔ بھیڑ میں سے کسی من چلے نے کہا۔ "اوئے یہ تو ہاکی بھی کھیلتی ہے۔"

جاذب صاحب نے مجھے اور فریال کو ایک پٹرولنگ کار میں موقعے سے روانہ کر دیا اور خود چشم دید گواہوں کے بیانات لینے میں مصروف ہو گئے۔

○☆○

اس شب ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ میں، فریال اور زریں گل، ڈنگری بازار والے تنگ و تاریک مکان میں بیٹھے تھے۔ ساہی صاحب ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس سے اٹھ کر گئے تھے۔ وہ میری طرف سے فکر مند تھے۔ وہ بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ مجھ پر ہونے والا حملہ عینی جان کے ساتھیوں یا خیر خواہوں کا کام ہے۔ موقعے سے پکڑا جانے والا شخص کرائے کا بدمعاش ثابت ہوا تھا اور ابھی اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔

ساہی صاحب کا کہنا تھا کہ اگر مجھ پر ایک حملہ ہوا ہے تو مزید بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس مکان کے گرد کوئی نصف درجن پولیس والے سادہ لباس میں تعینات کر دیے تھے۔ فریال ساہی صاحب کے جانے کے بعد بھی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا نادر شاہی حکم تھا کہ میں بستر سے پاؤں نیچے نہیں اتاروں گا۔ میری دوائیں ترتیب سے تپائی پر رکھی تھیں۔ کھانا فریال نے میرے اور زریں کے لیے اس گھر سے منگوایا تھا جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ ایک جہازی سائز کے ٹفن کیریئر میں یہ کھانا فریال کا ڈرائیور لایا تھا۔ کھانے میں چپاتی، سبزی کا سالن، مرغ کی یخنی، کارن سوپ اور پتا نہیں کیا کچھ شامل تھا۔ فریال نے فتویٰ دیا تھا کہ جب تک میں

ٹھیک نہیں ہوتا' ہوٹل کا کھانا مجھ پر حرام ہے۔ اس نے ایک گھنٹے کی عرق ریزی سے مجھے ایک ٹائم ٹیبل بنا کر دیا تھا۔ اس میں چہل قدمی' آرام' نیند' کھانے اور تفریح کے لیے اوقات مقرر تھے۔ اس ٹائم ٹیبل کے اوپر انگریزی میں یہ جملہ تھا "ڈیئر شاہ جہاں صاحب کے لیے جو اپنی بے پروائی' بے قاعدگی اور اندھا دھند مصروفیت سے اپنی اور ہماری زندگی اجیرن کررہے ہیں۔"

مجھے بھوک لگی تھی لیکن اس ٹائم ٹیبل کے مطابق رات کا کھانا نو بجے کھایا جاتا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ میرے علاوہ زریں گل بھی اس ٹائم ٹیبل کو کوس رہا ہوگا۔ اسے سخت بھوک لگی تھی اور اس کی للچائی نظریں بار بار ٹفن کیریئر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ زریں گل کی پیشانی اور کنپٹی پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ تاہم آنکھوں کی سوجن کافی کم ہوگئی تھی۔ فریال نے زریں گل کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے پوچھا۔ "زریں گل! تمہارے پاس نسوار کا ڈبا ہوگا۔"

وہ بولا "کیوں نہیں بی بی جی! ڈبیا تو ہمارا پہچان ہے' جیسے پاکستان کا پہچان مینار پاکستان ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھتا ہے' کہیں آپ نسوار تو نہیں کھاتا؟"

"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟" فریال نے اسے گھورا۔

"دراصل آپ ہاکی کا کھلاڑی ہے نا۔ ہم کو پتا چلا تھا... کہ کچھ کھلاڑی لوگ نشہ وشہ بھی کرلیتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" فریال نے کہا۔ "میں تمہاری ڈبیا سے تمہیں ہی ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔"

زریں گل نے ڈبیا نکالی۔ فریال نے کہا۔ "خود ذرا اس کے شیشے میں اپنا صورت دیکھو۔ تمہارا سوجا سوجا آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم تاتاریوں کا جاسوس ہے اور بھیس بدل کر شاہ جہاں صاحب کے ساتھ گھوم رہا ہے۔"

زریں گل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ فریال خود بھی ہنسنے لگی۔ زریں گل نے کہا۔ "ہم نے چنگیز خاں کا انگریزی فلم دیکھا تھا اس میں عمر شریف نے کام کیا تھا۔ عمر شریف کو فرنگی لوگ بہت بڑا اداکار بولتا ہے۔ ہم دعوے سے کہتا ہے کہ وہ ہمارے اداکاروں کے سامنے پانی بھرتا ہے۔ آپ ذرا انصاف سے بتائیں' کیا وہ ہمارے محمد علی اور بدر منیر کے مقابلے میں بڑھک مار سکتا ہے۔ اور محمد علی اور بدر منیر تو دور کا بات ہے' وہ مسرت شاہین کے سامنے بڑھک مار کر دکھاوے تو ہم اپنا مونچھ کٹا دے۔ ہم نے ایک دفعہ جنگ اخبار میں خط بھی لکھا تھا اور اس خط کے ذریعے عمر شریف اور گریگری پیک کو چیلنج کیا تھا۔ ہم نے لکھا تھا' تم فرنگی لوگ خود کو بڑا فنکار سمجھتا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے ہیرو سے مقابلہ تو دور کا بات ہے' تم کل کے بچے غلام محی الدین سے مقابلہ کرکے دکھو لو۔ گھڑ سواری' تلوار بازی' ہوا میں الٹا جمپ' پانی میں سیدھی چھلانگ کسی میدان میں آجاؤ۔ ہمارا ایمان ہے کہ اکیلا غلام محی الدین ہی تمہارا بیڑا غرق فرمائے گا۔"

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ غالباً فریال چاہتی بھی یہی تھی۔ اس نے میرا موڈ بحال کرنے کے لیے ہی زریں گل کو چھیڑا تھا۔ جہاں تک اس کے اپنے موڈ کا تعلق تھا' میں جانتا تھا کہ وہ کتنی "خوش" ہے۔ وہ اندر ہی اندر خون کے آنسو روتی رہتی تھی۔ غزالہ کی شادی والے واقعے کے بعد میں نے ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں کچی خوشی نہیں دیکھی تھی۔

زریں گل کافی دیر الٹی سیدھی ہانک کر ماحول کو خوشگوار بناتا رہا۔ گھڑی نے نو بجائے تو فریال نے کمال مہربانی سے بستر پر ہی نیم گرم پانی سے میرے ہاتھ دھلوائے اور انگیٹھی پر گرم کیا ہوا کھانا تپائی پر چننے لگی۔ اس کا سارا زور اس بات پر تھا کہ میں خود کو سردی اور مشقت سے بچاؤں۔ سہ پہر سے میں خود کو کافی بہتر محسوس کررہا تھا۔ نس میں لگنے والے انجکشن سے کافی فائدہ ہوا تھا۔ یہ انجکشن ہر چوبیس گھنٹے بعد لگتا تھا۔ میں نے میز پر کھانا چنتی ہوئی فریال کو دیکھا اور یوں لگا جیسے پچھلے چند ہفتوں میں وہ ایک دم ہی دو تین سال بڑی ہوگئی ہے۔ کوئی خاص تبدیلی سی مجھے اس میں محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اس تبدیلی کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا' مگر وہ تبدیلی موجود تھی۔

ابھی ہم نے کھانا شروع نہیں کیا تھا کہ اچانک میری جیکٹ کی جیب سے بیپ بیپ کی آواز آنے لگی۔ یہ اس واکی ٹاکی کی آواز تھی جو مجھے ایس پی جاوید نے کوٹھی پر "ریڈ" کے وقت فراہم کیا تھا۔ چرمی جیکٹ کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ میں نے اٹھ کر جیکٹ کی طرف بڑھنا چاہا لیکن فریال نے لپک کر خود ہی واکی ٹاکی نکال لیا۔ اس واکی ٹاکی کا سائز سگریٹ کی ڈبیا سے دوگنا تھا۔ اسے ریگزین کے کور سے محفوظ کیا گیا تھا۔ مائیک کی جگہ پر کور میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ سگنل کی آواز کے ساتھ ساتھ واکی ٹاکی پر ایک ننھا سرخ بلب بھی اسپارک کررہا تھا۔ یہ سیٹ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت طاقتور تھا اور اس کی رینج پانچ چھ میل تک تھی۔ میں نے ایریل باہر کھینچ کر آواز مہیا کرنے والا بٹن دبایا۔ دوسری جانب مسٹر جی کلارک کا اسسٹنٹ ڈیوڈ بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ' مسٹر جی کلارک صاحب حبیب ہوٹل میں موجود ہیں۔ انہوں

کے بعد یہ بادشاہی حکم صادر کیا کہ میں فوراً حبیب ہوٹل پہنچوں۔ حکم کے مطابق مجھے پوری طرح مسلح ہوکر اور "جیکٹ" وغیرہ پہن کر آنا تھا۔ گھر سے مجھے پیدل روانہ ہونا تھا۔ مین سڑک پر پہنچ کر کوئی ٹیکسی لینا تھی اور اس بات کا اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ میرا تعاقب نہیں کیا جارہا' دس بجے تک حبیب ہوٹل آجانا تھا لیکن ہوٹل کے اندر داخل نہیں ہونا تھا۔ ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مجھے بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوجانا تھا۔ اسسٹنٹ ڈیوڈ نے مجھے بتایا کہ ایک گرے کلر مرسیڈیز گاڑی مجھے بس اسٹینڈ پر پہنچنے سے پہلے پہلے "پک" کرلے گی۔

پیغام وصول کرنے کے بعد میں نے واکی ٹاکی بند کیا تو فریال کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے۔ "کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ کیا کوئی نیا پھڈا ہے؟" اس نے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

میں نے کہا "وہ رزق کا فرشتہ تھا اور مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ یہ کھانا جو تمہارے سامنے تپائی پر چنا ہوا ہے تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔"

"کیا؟" فریال نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں۔ یہ پیغام مجتبیٰ کنور صاحب کے ایک انتہائی معزز مہمان کی طرف سے تھا۔ مجھے ابھی اور اسی وقت بلایا گیا ہے۔"

فریال کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر نے بستر چھوڑنے سے منع کیا ہے اور آپ اس ٹھنڈ میں رات کے وقت سڑکیں ناپیں گے۔ ہرگز نہیں۔ میں آپ کو یہاں سے ہلنے نہیں دوں گی۔" اس نے تپائی میرے سامنے کردی اور لحاف پھر میرے کندھوں پر ڈال دیا۔

میں نے لجاجت سے کہا۔ "فریال! بچکانہ بات مت کرو۔ مجھے جانا ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ میں دوا کھا لیتا ہوں' گرم کپڑے پہن لیتا ہوں اور پھر کون سا گھوڑے پر جانا ہے' بس سڑک سے ٹیکسی مل جائے گی۔ میرا خیال ہے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

"خبردار۔" اس نے آستینیں چڑھالیں۔ "میں... لڑوں گی آپ سے۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مان جائے لیکن وہ اڑی رہی۔ یہاں تک کہ سچ مچ زور آزمائی کرنے لگی۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے مجھے بازوؤں میں بھر کر دوبارہ بستر پر گرا دیا۔ شاید وہ اس سے بھی آگے بڑھتی اور باقاعدہ مجھ سے کشتی کرنے لگتی لیکن اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ یہ ہاتھاپائی میرے سینے کی تکلیف کو بڑھا سکتی ہے۔ وہ اچانک مجھ سے الگ ہوگئی۔ بے حد خفا نظر آرہی تھی وہ کچھ دیر چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

فریال کے یوں جانے سے زریں گل بھی ملول نظر آرہا تھا تاہم وہ میری مجبوری سمجھتا تھا۔ میں نے اٹھ کر لباس تبدیل کیا' بلٹ پروف جیکٹ پہنی "۳۵ کیلی بر" کا پستول ہولسٹر میں لگا کر کمر سے باندھا۔ اوپر سے چرمی جیکٹ زیب تن کی اور نیم گرم کمرے سے نکل کر یخ بستہ تاریکی میں آگیا۔ یہ نومبر کا آغاز تھا۔ ابھی سرد موسم کی شروعات نہیں ہوئی تھی لیکن سردی کی یہ لہر سرد ترین موسم کی یاد دلا رہی تھی۔ میں ڈھکی بازار کی تنگ سی منڈی میں سے گزر کر خاصے بارونق علاقے میں آگیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ایک ٹیکسی میں سوار پشاور کی نیم خوابیدہ سڑکوں پر رواں تھا۔

○☆○

سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا۔ تعاقب کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں حبیب ہوٹل کے قریب اترا اور پیدل ہی بس اسٹینڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ تقریباً چار پانچ منٹ بعد عقب سے ایک گرے مرسیڈیز آئی اور میرے قریب آرکی۔ مرسیڈیز کا پچھلا دروازہ کھلا' میں جلدی سے اندر بیٹھ گیا۔ نیم گرم آرام دہ مرسیڈیز میں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ مسٹر جی کلارک بنفس نفیس موجود تھے۔ انہوں نے ایک بے حد نفیس اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ پچھلی نشست پر دائیں جانب وہی طویل قامت حسینہ پینٹ اور سویٹر پہنے بیٹھی تھی جسے میں نے مجتبیٰ کنور کی نہروالی کوٹھی میں دیکھا تھا اور دانتوں میں انگلی دبائی تھی۔ اس حسینہ کے ساتھ مجتبیٰ کنور کا منظور نظر ناہید کا شوہر سلمان تور بیٹھا تھا۔

"گڈ ایوننگ سر" میں نے مسٹر جی کلارک سے مخاطب ہوکر کہا۔

سر کے اشارے سے سلام کا جواب ملا اور گاڑی ایک خفیف جھٹکے سے پھر روانہ ہوگئی۔ ہمارا رخ جلد ہی کوہاٹ کی طرف ہوگیا۔ یہ ایک تنگ سڑک تھی۔ دو گاڑیاں آمنے سامنے سے آتی تھیں تو بمشکل ایک دوسرے کو کراس کرپاتی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس گاڑی میں میری حیثیت بازی کا ڈگی کی ہے۔ مجھے میری حربی صلاحیتوں کے پیش نظر ساتھ لے جایا جارہا تھا۔ میرا مقصد گاڑی میں موجود افراد کو

تحفظ فراہم کرتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اپنے جسم کو ڈھال بنا کر ان کی جانیں بچالیتا تھیں۔ باڈی گارڈ ایک انسانی ڈھال ہی تو ہوتا ہے جسے زوردار اور باحیثیت لوگ وردی نما کفن پہنا کر اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ جو شخص جتنا باحیثیت ہوتا ہے۔ اتنی مضبوط اور قابلِ اعتماد ڈھال خریدتا ہے۔ مسٹر جی کلارک ایک امریکی ارب پتی تھا لہٰذا اسے استار جانی بطور ڈھال میسّر ہو گیا تھا۔

مرسیڈیز گاڑی تقریباً دو گھنٹے تک شب کی تاریکی کو چیرتی رہی۔ ہم مین سڑک سے ایک برانچ سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک اور بھی تنگ و خستہ حال تھی۔ ڈرائیور کو جگہ جگہ گاڑی سڑک سے نیچے پر اتارنا پڑی۔ ہمارے اطراف میں مہیب چٹانیں تھیں اور بلند و بالا پہاڑ سیاہ فام جنات کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ایک بلند پہاڑی سلسلے کے دامن میں پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ یہ بالکل ویران اور تاریک جگہ تھی۔ پہاڑ بلند و بالا لیکن خشک تھے۔ جونہی ہم گاڑی سے نکلے کہیں قریب سے دو سائے برآمد ہوئے اور ہمارے قریب پہنچ گئے۔ سلمان انہیں پہچانتا تھا۔ اس نے ایک طرف جا کر دونوں افراد سے کھسر پھسر کی۔ وہ مودبانہ انداز میں سر جھکا کر واپس چلے گئے۔ یوں لگا جیسے وہ تاریکی کا حصہ تھے اور ایک جھلک دکھا کر دوبارہ تاریکی میں مدغم ہو گئے ہیں۔ میں ان کے بارے میں صرف یہی اندازہ قائم کر سکا کہ وہ مقامی افراد تھے۔ سلمان نے انہیں کوئی کام سونپ رکھا تھا جسے پورا کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے ہیں۔ دراز قد لڑکی ابھی تک گاڑی میں بیٹھی تھی۔ مسٹر جی کلارک کے حکم پر اسے گاڑی سے نکالا گیا۔ اس نے ایک گرم شال نہایت مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔ پھر بھی اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ "سی سی" کی آواز نکلتی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑ کر ہم چاروں پہاڑ کی طرف بڑھے۔ سلمان کے ہاتھ میں ایک طاقتور ٹارچ تھی۔ ایک ایسی ہی ٹارچ اس نے مجھے بھی تھما دی۔ ان دو ٹارچوں کی روشنی میں ہم آہستہ آہستہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چڑھنے لگے۔ سلمان تزور کے کہنے پر میں نے ٹرپل ٹو رائفل اپنے ہاتھ میں کر لی تھی اور قرب و جوار پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ آدھ پون گھنٹے کی جاں گسل چڑھائی کے بعد ہم پہاڑ کی چوٹی سے قریب تر ہو گئے۔ میرے اندازوں کے عین مطابق مسٹر جی کلارک ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود کسی جوان رعنا کی طرح مضبوط اور باہمت تھا۔ وہ مسلسل چیونگم چبا رہا تھا اور کسی خاص تھکاوٹ کا اظہار کیے بغیر چڑھائی چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہاں سلمان تزور اور دراز قامت حسینہ جس کا نام فینگ چی معلوم ہوا تھا، تھک گئے تھے۔ خاص طور پر فینگ چی بُری طرح ہانپ کانپ رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ڈھیر ہونے کے قریب ہے۔ بالآخر ہم چوٹی پر پہنچ گئے۔ تند و تیز ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ پہاڑ کی دوسری جانب کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک بستی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ گھر ہوں گے۔ بستی سے تھوڑا سا ہٹ کر ایک الگ تھلگ چوٹی پر کسی عمارت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ بستی کی طرح اس عمارت میں بھی بجلی موجود تھی اور کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہم اس عمارت کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچے تو عمارت کے خد و خال واضح ہو گئے۔ عمارت کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔ چھتیں مخروطی تھیں۔ اس کوٹھی نما عمارت کے وسیع گیٹ کی دوسری جانب چوکیدار موجود تھا۔ وہ فوراً ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی۔

"کس سے ملنا ہے؟" اس نے مقامی لہجے میں پوچھا۔ اس کے منہ سے نکلتے ہوئے بخارات بھاپ کی صورت میں خارج ہو رہے تھے۔

سلمان تزور نے کہا۔ "مسٹر شاؤ سے۔ انہیں اطلاع دو کہ پشاور سے کچھ مہمان آئے ہیں۔"

چوکیدار تذبذب میں نظر آ رہا تھا۔ غالباً کوئی اکیلا بندہ ہوتا تو وہ اسے گیٹ سے ہی ٹال دیتا۔ لیکن ہم چار تھے اور ہمارے ساتھ ایک فلک بوس حسینہ بھی تھی۔ اس نے ہمارا نام پتہ، حسب نسب، وجۂ آمد سب کچھ دریافت کیا اور پھر گیٹ سے ہٹ کر عمارت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اس کے ہٹ جانے سے گیٹ خالی نہیں ہو گیا تھا۔ وہاں ایک تخیم شخیم سینٹ برنارڈ کتا موجود تھا اور غرا غرا کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ چوکیدار کی واپسی کم و بیش دس منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ صفاچٹ سر والا ایک فربہ اندام شخص تھا۔ بعد از گفتگو یہ راز کھلا کہ یہ شخص مسٹر شاؤ نہیں بلکہ اس کا سیکرٹری یا اس قسم کی کوئی اور چیز ہے۔ اس نے ایک بار پھر سلمان تزور اور مسٹر جی کلارک سے لمبا چوڑا انٹرویو لیا۔ مسٹر جی کلارک کے ساتھ اس نے انگریزی میں بھی بات چیت کی۔ مسٹر کلارک نے اسے اپنا اصل نام تو نہیں بتایا لیکن یہ ضرور جتا دیا کہ وہ امیر کبیر صنعت کار ہیں اور امریکا سے صرف مسٹر شاؤ سے ملنے ہی پاکستان آئے ہیں۔

گنجے سر والا شخص قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ مسٹر جی کلارک کے لب و لہجے سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوا تھا۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک بھاری بھرکم شخصیت سے مخاطب

ہے۔ "انٹرویو" لے کر وہ بھی چوکیدار کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گیا۔ ہم یخ بستہ ہوا میں ناپسندیدہ مہمانوں کی طرح گیٹ سے باہر کھڑے رہے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال ابھر رہے تھے۔ مثلاً مسٹر جی کلارک جیسا ارب پتی اتنے کٹھن سفر کے بعد اس بند دروازے کے سامنے کیسے اور کیوں کر پہنچا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اس ویران عمارت میں کون رہتا ہے؟ ایک دراز قامت حسینہ کو یہاں کس مقصد سے لایا گیا ہے۔ اور کیا وہ گلابی لفافہ بھی اس گورکھ دھندے سے مربوط ہے جس کے حصول کے لیے گلنار کالونی میں میرے اور عیشی جان کے درمیان ایک خونریز معرکہ ہو چکا ہے؟

صفاچٹ سر والے شخص کی واپسی بھی دس منٹ سے پہلے نہیں ہوئی۔ اس کی ہدایت پر ہمارے لیے آہنی گیٹ کھولا گیا۔ ہم اس کے ساتھ عمارت کے ڈرائیو وے پر آ گئے۔ اصل عمارت درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہمارا راہبر ہمیں دو تین راہداریوں سے گزار کر ایک نشست گاہ میں لے گیا۔ نشست گاہ خوب آراستہ تھی۔ دیوار گیر الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور مختلف جگہوں پر شکار کیے ہوئے جانوروں کی ٹرافیاں سجی تھیں۔ ایک دیوار پر بڑے اہتمام سے رائل بنگال ٹائیگر کی کھال سجائی گئی تھی۔ اس کھال کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے تھے کہ ہمارا میزبان "شیر مار خان" ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نشست گاہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ واقعی "شیر مار خان" لگتا تھا۔ اس کا قد سات اور ساڑھے سات فٹ کے درمیان تھا۔ جسم مضبوط اور توانا، بال گھنے اور موٹے، اس کی نوکدار مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں یوں لگا جیسے دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لینے والا کوئی دیو قامت کرنل یا بریگیڈیئر اپنے اسٹڈی روم سے اٹھ کر ہم سے ملنے چلا آیا ہے۔ لیکن ایسا دراز قامت شخص فوج میں کیسے بھرتی ہو سکتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ فوج میں کم سے کم قد کی طرح زیادہ سے زیادہ قد کی حد بھی مقرر ہو۔ اگر مقرر نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔

"جی فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" آنے والے نے سرد خشک لہجے میں مسٹر جی کلارک سے سوال کیا۔ وہ ایشیائی لہجے میں انگریزی بولا تھا۔

جی کلارک کو ایسے لہجے کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ گڑبڑا سے گئے پھر سنبھل کر بولے۔ "مسٹر شاؤ! میں آپ کو بے وقت ڈسٹرب کر رہا ہوں، اس کے لیے ایک بار پھر بہت معذرت۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ کیا ہم کہیں اکیلے میں بات کر سکتے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ شاؤ کوئی جواب دیتا، اس کی نگاہ پہلی بار فینگ چی پر پڑی۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھا۔ وہ واضح طور پر چونکا اور محویت سے فینگ چی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے درشت خد و خال کو ایک پھوار جیسی نرمی نے ڈھانپ لیا۔ فینگ چی کے روشن چہرے سے بمشکل نگاہیں ہٹا کر اس نے مسٹر جی کلارک کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے نشست گاہ کے ایک بند دروازے میں داخل ہو گئے۔ وہ دونوں ایک خوبصورت کیبن نما کمرے میں پہنچے تھے۔ اس کیبن کو نشست گاہ سے جدا کرنے والی دیوار شیشے کی تھی۔ کیبن میں دودھیا لائٹ جل رہی تھی۔ مسٹر جی کلارک اور مسٹر شاؤ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان شیشے کی تپائی پر شیشے کی ایش ٹرے جگمگا رہی تھی۔

مسٹر جی کلارک اور میزبان کے درمیان ایک طویل گفتگو کا آغاز ہو گیا۔ ہم لاتعلقی سے نشست گاہ کے صوفوں پر بیٹھے رہے۔ ایک چاق و چوبند جاپانی ملازم نے ہمارے سامنے چائے اور دیگر لوازمات رکھ دیے۔ یہ جاپانی ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بولتا تھا اور گاہے گاہے تین الفاظ کی تکرار کر رہا تھا۔ "اور کوئی چیز۔ اور کوئی چیز" اسی ملازم نے شیشے کے کیبن میں بھی چائے پہنچا دی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر جی کلارک سے باتیں کرتے ہوئے کسی وقت مسٹر شاؤ کی نگاہ نشست گاہ میں بیٹھی فینگ چی پر پڑتی ہے تو اس کے چہرے پر چمک سی نمودار ہو جاتی ہے۔ مسٹر شاؤ کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی تاہم فار ایسٹ کے عام باشندوں کی طرح اس کے قویٰ مضبوط تھے اور آنکھوں میں زندگی کی لپک تھی۔ یقیناً وہ ڈرنک بھی کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا اور آنکھوں سے نیچے واضح اُبھار دکھائی دیتے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ مہمان و میزبان کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی اہم موڑ پر پہنچ گئی ہے۔ مسٹر جی کلارک نے اپنے اوور کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی احتیاط سے گلابی لفافے والی پڑیا نکال لی۔ پڑیا کھول کر انہوں نے چنے کی دال کا ایک دانہ نکالا اور مسٹر شاؤ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دونوں حضرات بڑی توجہ سے اس دانے کو دیکھ رہے تھے جیسے یہ دال کا دانہ نہ ہو، دانۂ گندم ہو اور خاص اسی دانے کو کھانے

کی پاداش میں آدم و حوا جنت بدر کیے گئے ہوں۔ اب یہ دونوں حضرات سوچ رہے ہیں کہ اس دانے کو کہاں اور کس قیمت پر نیلام کیا جائے۔ لیکن بات یقیناً کچھ اور تھی۔ دونوں دانا اس "دانے" پر سر جوڑے بیٹھے تھے اور بہت سنجیدہ قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ مسٹر جی کلارک صاحب نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر کوٹ کی جیب میں ڈالا اور وہاں سے ایک محدب عدسہ برآمد کر لیا۔ یہ ویسا ہی عدسہ تھا جیسا گھڑی ساز حضرات گھڑی کا معائنہ کرتے ہوئے آنکھ پر چڑھا لیتے ہیں۔

مسٹر شاؤ نے عدسہ اپنی آنکھ پر لگایا۔ ایسا کرنے میں مسٹر جی کلارک صاحب نے بھی ان کی مدد کی۔ عدسہ لگا کر مسٹر شاؤ بغور دال کے دانے کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر اب دلچسپی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ان کی محویت دیکھ کر مسٹر کلارک صاحب کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔

مسٹر شاؤ نے انٹرکام پر ملازم کو بلایا۔ وہی صفاچٹ سر والا شخص جو میزبان کے سیکرٹری یا اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیتا تھا' ایک رائٹنگ پیڈ لیے ہوئے شیشے کے کیبن میں داخل ہوا۔ پیڈ میز پر رکھ کر وہ خاموشی سے باہر آ گیا۔ مسٹر شاؤ نے اب زیادہ غور سے دال کے دانے کا معائنہ شروع کیا اور معائنے کے ساتھ ساتھ رائٹنگ پیڈ پر کچھ لکھتے بھی گئے۔ پہلے دانے کے بعد دوسرے کی باری آئی۔ پھر تیسرے کی اور اسی طرح تمام دانوں کی تحریر شاؤ کے قلم سے کاغذ پر منتقل ہو گئی۔ میرے لیے اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دال کے ان دانوں پر منی ایچر کے انداز میں کوئی خاص تحریر لکھی گئی ہے۔ MINIATURE مصوری کی ایک معروف صنف ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں بہت چھوٹی چھوٹی اشیا پر کوئی شبیہ بنائی جاتی ہے یا خطاطی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض فن کار اس مقصد کے لیے گلہری کی دم کے باریک ترین بال بطور برش استعمال کرتے ہیں۔

تحریر مکمل ہو چکی تو مسٹر شاؤ نے تحریر والا کاغذ سامنے رکھا اور اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ایک دوسرے کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نے محدب عدسے سے نظر آنے والی تحریر کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے والا کاغذ اس نے مسٹر جی کلارک کے حوالے کیا تو ان کے چہرے پر ہلچل کے آثار نظر آنے لگے۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے تاثرات پر قابو پانے میں ناکام ہو رہے تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اسی کوٹھی میں گزارا۔ بڑا افسانوی اور رومان پرور سا ماحول تھا۔ کھڑکیوں سے باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ کمروں میں آتش دان دہک رہے تھے اور بلند و بالا چھتوں کے نیچے ایک سناٹا سا گونجتا محسوس ہوتا تھا۔ میرے لیے اب اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ طویل قامت فینگ جی کو صرف اور صرف مسٹر شاؤ کی خوشنودی کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی حیثیت ایک تحفے کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جی کلارک صاحب اپنے میزبان یعنی مسٹر شاؤ کی خشک مزاجی و بد دماغی سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے مسٹر شاؤ کو فینگ جی کا تحفہ دے کر اپنا کام نکلوایا تھا۔ کام کی نوعیت بھی اب میرے سامنے آ گئی تھی۔ جیسے کہ دال کے دانوں پر منی ایچر کے اسٹائل میں کوئی تحریر لکھی گئی تھی۔ مسٹر جی کلارک اس تحریر سے آگاہ تھے لیکن وہ کسی ایسی زبان میں تھی جسے پڑھنا ان کے لیے مشکل یا ناممکن تھا۔ ان کے لیے یہ کام مسٹر شاؤ نے کیا تھا۔ مسٹر جی کلارک کے لیے دوسری منزل پر خصوصی بیڈ روم مخصوص کیا گیا تھا۔ سلمان آذر کا کمرا پہلی منزل پر میرے ساتھ ہی تھا۔ فینگ جی کے لیے کوئی کمرا نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ مسٹر شاؤ کی خوابگاہ میں ہی شب بسر کرے گی۔ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو معلوم ہوا کہ مجھے بھی اپنا بیڈ روم مسٹر شاؤ کی طرح کسی کے ساتھ "شیئر" کرنا ہے' لیکن میرا پارٹنر فینگ جی کی طرح حسین و جمیل نہیں تھا۔ وہ مرسڈیز گاڑی کا مسٹنڈ ڈرائیور ساوات خان تھا جس کے جسم میں نسوار کی بُو اور سگریٹ کا دھواں رچا بسا تھا۔

ہمیں علی الصباح بیدار کر دیا گیا۔ رات کافی دیر سے سوئے تھے یوں صبح سویرے بیدار کیا جانا کچھ اچھا نہیں لگا۔ مسٹر شاؤ کے ایک ملازم نے بتایا کہ مالک آپ کو کچھ دکھانا چاہتے ہیں' ظاہر ہے مالک سے اس کی مراد "مسٹر شاؤ" ہی تھی۔ میں اور ڈرائیور ساوات خان بیڈ روم سے نکل کر کوٹھی کی دوسری منزل پر آ گئے۔ مسٹر شاؤ کا ملازم ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ یہاں ایک ہال نما کمرے میں مسٹر جی کلارک' سلمان آذر اور شاؤ پہلے سے موجود تھے۔ ان کے علاوہ ایک چینی یا جاپانی عورت بھی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ عورت بھی فینگ جی کی طرح غیر معمولی طور پر لمبی ہے۔ وہ بڑے نفیس لباس میں تھی۔ شیشے کی خوبصورت میز پر چائے کے برتن رکھے تھے اور وہ لوگ چائے سے شغل کر رہے تھے۔ اس ہال نما کمرے کی ایک پوری دیوار میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ ان شیشوں سے دور تک رازی اور پہاڑوں کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ واقعی یہ ایک خوبصورت جگہ تھی۔ ارد گرد کے پہاڑ خشک تھے لیکن وادی میں دور تک سبزہ نظر

آتا تھا۔ وادی کے درمیان سے ایک آبی گزرگاہ گزرتی تھی جو بلندی سے ٹیڑھی میڑھی سفید لکیر کی طرح نظر آتی تھی۔ اس جگہ کا حسن "مناظر" سے زیادہ "تنہائی" میں تھا۔

سلمان آذر نے ہمیں بتایا کہ میزبان ہمیں طلوع آفتاب کا دلچسپ منظر دکھانے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ ہم بھی ایک طرف بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے پہاڑوں کے عقب میں سرخ روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ خورشید آب دار کسی بھی وقت طلوع ہوا چاہتا ہے۔ اتنے میں فینگ جی بھی اس نظارہ گاہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک چکیلے اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے سیاہ بال ایک آبشار کی صورت اس کے دائیں کندھے پر گر رہے تھے۔ اس کا "طول طویل" حسن بہت نکھرا نکھرا نظر آتا تھا۔ "تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ" والا معاملہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر مسٹر شاؤ جلدی سے تعظیماً کھڑا ہو گیا اور بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ کافی بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کا تمام کھردرا پن اور تلخ مزاجی ایک قابل قبول سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔

چند منٹ بعد سورج نمودار ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کا بالائی کنارہ پہاڑ کی چوٹی سے نمودار ہوا اور کرنیں کسی اچانک چھوٹ جانے والے فوارے کی طرح چاروں طرف پھیل گئیں۔ پھر ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ وادی کی تہ میں بہنے والی سفید آب جو اپنا رنگ بدلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل سنہری ہو گئی اور صرف آب جو ہی نہیں اردگرد کا سبزہ اور جھو وغیرہ بھی بدلے بدلے سے نظر آنے لگے جیسے ان میں سنہرا یا خاکستری رنگ گھل مل گیا ہو۔ بڑا خوبصورت منظر تھا یہ۔ ہم محویت سے دیکھتے رہے۔ تین چار منٹ بعد سورج اس مخصوص مقام سے آگے بڑھ گیا اور وادی کی تہ میں نظر آنے والے مناظر اپنے اصل رنگ روپ میں آ گئے۔ درحقیقت اس مختصر وادی کے مغربی کنارے پر سرخی مائل بھوری چٹانیں تھیں۔ ان چٹانوں کا رخ اور زاویہ کچھ ایسا تھا کہ طلوع ہوتے سورج کی کرنیں براہ راست ان چٹانوں پر پڑتی تھیں اور منعکس ہو کر آبی گزرگاہ کو "سنہری مائل" کر دیتی تھیں۔ پہاڑی اور صحرائی علاقوں میں سورج کی وجہ سے اس قسم کے بصری تماشے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔

مسٹر جی کلارک کا موڈ پہلے بھی خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ یہ خوبصورت منظر دیکھ کر وہ اور بھی خوش ہو گئے۔ ان کا جبڑا مخصوص رفتار سے چیونگم چبا رہا تھا اور وہ بڑی روانی سے مسٹر شاؤ کے ساتھ باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ ہم نے ناشتا کوٹھی کے آراستہ ڈائننگ ہال میں کیا۔ دیگر حضرات پہلے ہی ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ جاپانی ملازم' خانساماں بھی تھا۔ اپنے ناشتے کی وساطت سے اس نے "اصیل جاپانی" ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ اپنی ناساز طبیعت کے باوجود میں نے رغبت سے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد میزبان شاؤ' مسٹر جی کلارک کو اپنی کوٹھی دکھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں بھی بحیثیت باڈی گارڈ جی کلارک صاحب کے ساتھ تھا۔ تقریباً چار کینال میں پھیلی ہوئی یہ ایک وسیع عمارت تھی۔ بہت سے ایسے کمرے جو استعمال میں نہیں آتے تھے' مقفل کر دیے گئے تھے۔ عمارت میں ایک کافی بڑا کتب خانہ تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ صاحب خانہ کو شکار کے ساتھ ساتھ مطالعے سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ دونوں شوق یوں یکجا ہو گئے تھے کہ کتب خانے میں دو جہازی سائز کی الماریاں صرف "وائلڈ لائف" سے متعلق کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔

کتب خانے سے نکل کر جب ہم عمارت کی دوسری منزل پر جا رہے تھے' تو میں نے ایک ہال کمرے کو خالص شاہانہ انداز میں سجے پایا۔ منقش طلائی پتروں والی کرسیاں' زرنگار پردے' قدیم طرز کے محرابی دروازے اور فانوس' یوں لگا جیسے ہم زریں خاندان کے کسی شاہی محل میں کھڑے ہیں۔ یہاں مسٹر شاؤ اور جی کلارک صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مسٹر شاؤ کا شجرۂ نسب جاپان کے قدیم شاہی خاندان سے ملتا ہے اور اس کا پرداوا ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔

جس وقت جی کلارک اور مسٹر شاؤ کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی' میری نگاہ ادھ کھلے دروازے سے دوسری منزل کی ایک بالکونی پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ رات بھی مجھے اس بالکونی میں ایک سایہ سا لہراتا نظر آیا تھا۔ لیکن اب تو میں نے اس شخص کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ پہچان بھی لیا تھا۔ اور اسے پہچانتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ میری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ کئی ماہ بعد ایک قریبی ساتھی سے میری ملاقات ہونے والی تھی۔ لیکن وہ مجھے اپنی جھلک دکھا کر چھپ کیوں گیا تھا۔ یقیناً بین السطور کوئی بات تھی۔

کوٹھی کی سیر آدھ پون گھنٹے میں ختم ہوئی۔ اسی دوران میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ مسٹر جی کلارک نے رات یہیں گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسلام آباد سے مجتبیٰ صاحب کو بھی بلا لیا گیا ہے (وہ غیر متوقع طور پر بیرونی دورے سے جلدی لوٹ

آئے تھے) شام کو کوٹھی میں مسٹر جی کلارک صاحب کی طرف سے ڈنر دیا جائے گا۔ جس میں ایک معروف مقامی رقص "جاگوت" پیش کیا جائے گا۔ اگلی صبح مسٹر جی کلارک ایک بار پھر طلوع آفتاب کا منظر دیکھیں گے۔ اس وقت ان کے ساتھ مجتبیٰ کنور صاحب بھی ہوں گے۔ کل ناشتے کے بعد ہماری واپسی پشاور ہوگی۔

ہمارے پاس اب خاصا وقت تھا۔ میں نے مسٹر جی کلارک سے اجازت طلب کی اور اردگرد کا علاقہ دیکھنے کے لیے کوٹھی سے باہر آ گیا۔ ڈرائیور سادات خان بھی ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ میرا مقصد صرف سیر کرنا نہیں تھا' اس شخص سے ملنا بھی تھا جو دوبار مجھے اپنی جھلک دکھا چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے کوٹھی میں نہ ملنا چاہتا ہو' اب تنہا دیکھ کر پاس چلا آئے۔ میرا یہ قیاس سو فیصد درست نکلا۔ میں کوٹھی کے نواحی نشیب و فراز میں گھوم رہا تھا۔ ایک ڈھلوان پر چڑھنے کے لیے میں جونہی رکوع کے بل جھکا' مجھے اپنی دائیں جانب بلندی پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' وہ کبیر شاہ تھا۔ کبیر شاہ جسے میں نے کئی ماہ پہلے آخری بار چکا خیلہ میں دیکھا۔ ہم دونوں نائیکا ثریا باجی کے ساتھ چکا خیلہ پہنچے تھے۔ بعد میں عیسیٰ جان نے جشن کے موقع پر لشکر خان کے ساتھیوں کا قتل عام کر دیا تھا۔ لشکر خان تو مجھے شدید زخمی حالت میں مل گیا تھا۔ لیکن کبیر شاہ کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ اس کے کتے کچھ دن میرے پاس بطور امانت رہے تھے پھر میں نے انہیں پشاور بھیج دیا تھا۔ بعد ازاں ہم نے زویئے مشت میں کبیر شاہ کو بہت تلاش کیا تھا لیکن اس کا کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔

کبیر شاہ بھاگ کر ڈھلوان سے اترا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ہم کافی دیر ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔ کہنے اور سننے کے لیے ہم دونوں کے پاس بہت سی باتیں تھیں لیکن ان باتوں کے لیے وقت چاہیے تھا اور اس جگہ ہم باتیں کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کام پھر کسی وقت کے لیے اٹھا کر ہم دونوں ضروری گفتگو تک محدود رہے۔ حال احوال پوچھنے کے بعد میں نے کبیر شاہ سے دریافت کیا کہ اس کے کتوں کا غول کہاں ہے؟

وہ مسکرایا۔ "کتوں کے بغیر تو ام بالکل بے کار ہے۔ ایک ہم ناکارہ' امارا کتا وہاں کوٹھی کے پچھواڑے بند ہے۔ ان میں وہ سلوکی ہاؤنڈ بھی ہے جس کا ام نے علاج معالجہ کیا تھا۔ دراصل مسٹر شاڈ شکار کا بہت شوقین ہے۔ اس کے پاس اپنے کتے بھی ہیں۔ کبھی کبھار وہ ام کو شکار کے لیے یہاں بلا لیتا ہے۔ ام پچھلے چھ سات روز سے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ویسے یہ مسٹر شاڈ بہت موڈی بندہ ہے۔ ایک دم آگ کے گا گرم ہے۔ خدا نے کا لوگ اس کی عزت تو کرتا ہے پر اس سے ڈرتا بھی بہت ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ایک ہموار چٹان پر بیٹھ گئے تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی تاہم پھیکی پھیکی دھوپ کے باعث خوشگوار تمازت موجود تھی۔ میں نے کبیر شاہ سے پوچھا "لگتا ہے آپ کافی عرصے سے مسٹر شاڈ کو جانتے ہیں۔ یہ کون؟ اور کہاں سے آیا ہے۔"

میرے سوال کا تسلی بخش جواب کبیر شاہ کے پاس موجود تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں کچھ یوں ہے۔ شاڈ جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو کا باشندہ تھا۔ وہاں اس کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ پانچ چھ برس پہلے اس کا دل اچانک کی ہنگامہ پرور زندگی سے اچاٹ ہو گیا۔ ایک روز وہ ٹوکیو کے نواح میں واقع اپنے محل نما مکان سے نکلا اور دنیا کی سیاحت پر نکل کھڑا ہوا۔ پورا ایک برس وہ مختلف ملکوں کے علاقوں میں گھومتا رہا۔ پھر وہ پاکستان آ گیا۔ اسے شمالی علاقوں کے پرسکون اور خوبصورت مناظر بہت پسند آئے۔ وہ رہائش کے لیے کوئی اچھی اور سنسان جگہ ڈھونڈنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر معلوم نہیں وہ کیسے اس جگہ تک گیا۔ اس نے یہاں پہاڑ کی چوٹی پر یہ وسیع کوٹھی بنوائی اور رہائش اختیار کر لی۔ نشیب میں جو بستی مجھے نظر آئی تھی وہ جھونپڑا بستی تھی۔ شاڈ نے اپنے خرچ پر لوگوں کو پختہ مکان بنوا کر دیے اور وہاں بجلی پہنچائی۔ اردگرد کے لوگوں کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ وہاں کہاں سے آیا ہے اور کیا ہے؟ وہ ان کی بہتری کے کام کرتا رہتا تھا لہٰذا وہ اس کی عزت کرتے تھے اور اسے "ملک" کا خطاب دیتے تھے۔ اس "ملک" کی تین بیویاں اس کے ساتھ جاپان سے ہی آئی تھیں۔ وہ سب دراز قد عورتیں تھیں' ان میں سے ایک عورت میں نے نظارہ گاہ میں شاڈ کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہاں آنے کے بعد شاڈ نے اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے مطلق رابطہ نہیں رکھا تھا۔ کبیر شاہ کا خیال تھا کہ شاید ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ مسٹر شاڈ وطن سے ہزاروں میل دور پاکستان کے ایک دور افتادہ پہاڑی قصبے میں زندگی گزار رہا ہے۔ شاڈ کے دو ہی شوق تھے' شکار اور مطالعہ۔ اس کے علاوہ وہ عورتوں میں بھی دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس سلسلے میں اس کا ایک معیار تھا۔ اسے صرف اپنی ہم قوم عورتوں میں دلچسپی تھی' غیر معمولی قامت کی عورتوں کو پسند کرتا تھا کیونکہ وہ خود

غیر معمولی قامت کا مالک تھا۔ جاپانی نسل کی عورتوں میں "درازی عمر" تو ہوتی ہے۔ لیکن درازی قامت خال خال ہی پائی جاتی ہے اور پھر درازی قامت بھی ایسی کہ پاؤں زمین پر ہوں تو سر ناز آسمان کو چھوئے۔ معلوم نہیں مسٹر شاڈ نے اپنے لیے یہ تین عدد بی بیاں کن کن دقتوں کا سامنا کر کے اکٹھی کی تھیں۔ پھر بھی اس کے حرم میں ایک بھی ایسی نہیں تھی جو طوالت اور خوش اندامی میں فینگ جی کا مقابلہ کرتی۔

کبیر شاہ نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ مسٹر جی کلارک صاحب کون ذات شریف ہیں؟" میں نے مختصر اور محتاط انداز میں جی کلارک صاحب کا تعارف کرایا۔ کبیر شاہ بولا "کچھ بھی ہے' اس کلارک صاحب کے بہت ہوشیار چالاک ہونے میں کسی طرح کا شک نہیں ہے۔ یہ مسٹر شاڈ بہت بددماغ شخص ہے۔ کوئی وزیر امیر بھی یہاں آ جائے تو اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ اور اس سے کوئی کام لے لینا تو بہت ہی دشوار کام ہے۔ مگر کلارک صاحب نے بھی ایسا داؤ مارا کہ بھائی جی کو چاروں شانے چت کر ڈالا۔ امارا مطلب اس لمبی لڑکی سے ہے۔ پتا نہیں اتنا لمبا جاپانی لڑکی انہوں نے کہاں سے اور کیسے ڈھونڈا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ جاپان سے نہیں ہانگ کانگ سے آئی ہے۔"

وہ بولا "ہانگ کانگ سے آئی ہے یا جیکا سے' مسٹر شاڈ کو پسند تو آ گئی ہے نا۔ کل سارا رات مسٹر شاڈ نے اس لڑکی کے ساتھ رنگ رلی منایا ہے۔ وہ بے شک پندرہ سال ٹوکیو میں رہا ہے مگر اس کی رگوں میں وہی پرانا شاہی خون جوش مارتا ہے۔ ایسا جاگیردار قسم کا لوگ ایک آدھ عورت پر گزارا نہیں کر سکتا۔ پورا ریوڑ چاہیے ہوتا ہے ان کو۔ امارا خیال ہے کہ یہ ہانگ کانگ کا لڑکی مسٹر شاڈ کا چوتھا بیوی ثابت ہوگا۔"

"کیا یہ بہت پڑھا لکھا شخص ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ لوگ کہتا ہے کہ اس کو دنیا میں بولا جانے والا اکثر زبان آتا ہے۔ آپ نے کوٹھی میں اس کا لائبریری دیکھا ہوگا۔ اس میں بہت سی زبانوں کا کتابیں پڑا ہوا ہے۔ ام کو ایک کوہستانی نے بتایا ہے کہ پچھلے برس مصر سے کچھ لوگ اس کے پاس آیا تھا۔ وہ پتھر کی دو سلیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان پر کچھ لکھا ہوا تھا جو کسی سے پڑھا نہیں جاتا تھا۔ شاڈ نے وہ تحریر پڑھ لیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی وہ بہت مشکلوں اور نخروں سے راضی ہوا تھا۔"

ہماری گفتگو شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر کوٹھی کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ شکاری کتوں کی آوازیں تھیں اور یقیناً یہ وہی غول تھا جس کے ساتھ کبیر شاہ یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ کبیر شاہ نے بتایا کہ کتوں کے راتب کا وقت ہو گیا ہے اس لیے وہ بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مجھے ابھی کبیر شاہ اور اس کے کتوں کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ میں یہ قصہ چھیڑ سکتا۔ کبیر شاہ تیز قدموں سے کوٹھی کی طرف لوٹ گیا۔ میں کچھ دیر یونہی ادھر ادھر گھومتا رہا پھر کوٹھی میں واپس آ گیا۔

○☆○

سنسان پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اس کوٹھی میں وہ شام بہت بارونق اور رنگین تھی۔ تقریب کے لیے وہی ہال نما کمرا چنا گیا تھا جسے شاڈ نے قدیم طرز سے آراستہ کر رکھا تھا۔ مجتبیٰ کنور اپنی بیوی زلیخا اور محبوبہ ناہید آذر سمیت یہاں پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ تین چار اور خواتین و حضرات بھی اس کے ساتھ تھے۔ سلمان آذر اس بات پر ناخوش نظر آتا تھا کہ اس کی گھر والی اس کی اجازت کے بغیر یہاں چلی آئی ہے۔ تاہم اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کھل کر نہیں کیا۔ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ناہید اور مجتبیٰ کی بڑھتی ہوئی بے باکیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے ہیں۔ مجتبیٰ اور ناہید جو کھیل کھیل رہے تھے وہ اندھے کو بھی نظر آ سکتا تھا' یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ سلمان اب اس سے بے خبر ہوتا۔ مجتبیٰ کے ساتھ ناہید کی آمد پر وہ لہو کے گھونٹ بھر رہا تھا اور ناہید بڑی ہوشیاری سے اپنے شوہر کا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بچہ اس کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے بچہ شوہر کی آغوش میں ڈالا کہ شاید اس کے ساتھ باتوں میں لگ کر اس کا موڈ بدل جائے۔ لیکن سلمان آذر بدستور بجھا رہا۔ میرے سامنے ناہید اور سلمان آذر کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ کچھ اس طرح تھا۔

ناہید نے کہا "اوڈارلنگ! میں بہت مس کر رہی تھی تم کو۔ مجتبیٰ صاحب نے فون کیا' میں کوہاٹ جا رہا ہوں۔ سلمان بھی وہیں ہے۔ آنا چاہو تو آ جاؤ۔ بس میں چل دی۔"

سلمان نے بے رخی سے کہا۔ "ایک دن کی تو بات تھی' کل ہم واپس اسلام آباد پہنچ رہے تھے۔"

وہ بولی "لیکن انہوں نے کچھ اس طرح کہا کہ میں انکار نہ کر سکی۔ وہ بتا رہے تھے کہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں "ڈان" کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن مجھے تو یہاں کوئی خاص خوبصورتی نظر نہیں آ رہی۔"

"تو پھر یوں کہو ناکہ تم یہ جگہ دیکھنے آئی ہو۔"
ناہید کھنک کر بولی۔ "آزری! تم تو بال کی کھال اُتارنے لگتے ہو۔"

اتنے میں مجتبیٰ کنور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آتا دکھائی دیا۔ آزر نے فوراً اپنے چہرے کی شکنیں دور کرلیں اور خوش دلی سے مجتبیٰ کنور کو خوش آمدید کہا۔ مجتبیٰ تھری پیس سوٹ اور سفید بے داغ قمیص میں بہت نفیس دکھائی دے رہا تھا۔ امپورٹڈ سگار حسب معمول اس کی انگلیوں میں دبا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ لنگڑاہٹ اس زخم کی وجہ سے تھی جو چند روز پہلے اس کی پنڈلی پر لگا تھا۔ وہ مسٹر جی کلارک اور آزر سے مل کر سیدھا میری طرف آیا۔

"ہیلو شاہ جہاں!" اس نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپکا "ویل ڈن۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ آئی تھنک 'بھیکی کی گرفتاری' کا سارا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ وہ چور کا چتر ایس پی جاذب خان خواہ مخواہ نمبر بنا رہا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔"

وہ موقع پر موجود افراد کے ساتھ مکمل گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ اس کے اندر فطری صلاحیت تھی کہ وہ کسی محفل میں قرب و جوار کے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا تھا اور نہ صرف متوجہ کرتا تھا بلکہ باتوں کے سحر میں بھی گرفتار کرلیتا تھا۔ اپنے تین دوستوں کی موت کا غم اس کے ذہن میں ابھی تازہ تھا لہٰذا وہ زیادہ چہک نہیں رہا تھا، پھر بھی ناہید کی موجودگی میں اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے جب اس کی نگاہ بے خیالی میں ناہید کے سراپا سے ٹکراتی تھی تو ایک خود رو بھوک کسی قدرتی آفت کی طرح اس کی آنکھوں میں اُبھر آتی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یاد آنے لگے جب سلمان آزر بیرونی دورے پر تھا اور مجتبیٰ کنور شب کی تاریکی میں ہر دوسرے تیسرے روز ناہید کے پاس جا دھمکتا تھا۔ وہ دو دو گھنٹے کمرے میں بند رہتے تھے۔ معلوم نہیں وہ "انڈر اسٹینڈنگ" اور محبت کے کتنے مراحل طے کرچکے تھے تاہم مجھے یقین سا تھا کہ ناہید نے مجتبیٰ کنور کو آخری حدود سے گزرنے نہیں دیا۔ کچھ بھی تھا وہ ایک پڑھی لکھی اور جہاندیدہ لڑکی تھی۔ ایک ماہر سوداگر کی طرح وہ ہر چیز کو تولنے پرکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی، حالات کے ایک پلڑے میں اس کا حُسن، اس کا جسم اور اس کی جمی جمائی ازدواجی زندگی ہے، دوسرے پلڑے میں مجتبیٰ کنور تھا اور خوشحال ترین زندگی کے وہ لامحدود مواقع تھے جو مجتبیٰ کنور کے ساتھ منسلک تھے۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مجتبیٰ کنور کی ترغیب کے دھارے میں بہتی بھی جا رہی تھی۔

پہاڑ کی چوٹی پر اس کوٹھی میں وہ شام اپنے جلو میں مسکراہٹیں، روشنیاں اور موسیقی لے کر آئی تھی۔ خاص طور پر مسٹر جی کلارک تو بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ اندرونی جوش و انبساط ان کے چہرے سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ "منی ایکچز" کا عقدہ حل کرکے انہیں بہت بڑی اور اہم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اسی تقریب میں مجھے مسٹر شاؤ کی تینوں بیویاں ایک ساتھ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے دو چھوٹی بیویاں دراز قد ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اندام بھی تھیں۔ وہ اپنے فیشن کے روایتی بے حد قیمتی لباس میں تھیں۔ یہ لباس چوغہ نما تھے اور ان کے عقب میں بہت سی شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس لباس میں عورتیں اس قدیم طرز میں سجے ہوئے کمرے کا حصہ ہی ہوتی تھیں۔ وہ اس بات پر بالکل ملول نظر نہیں آتی تھیں کہ ان کا شوہر نامدار اپنی دل بستگی کے لیے ایک اور لڑکی ڈیوڑھی میں لے آیا ہے۔ تقریب میں ان لمبی گردنوں والی خوشنما لڑکیوں کو گھومتے پھرتے دیکھ کر یوں لگتا تھا جانوروں کے درمیان نازک اندام زرافے گھوم رہے ہیں۔ بالکل افسانوی سا ماحول ہوگیا تھا۔ اس افسانویت میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہوگیا جب چند مقامی ڈانسرز نے مہمانوں کے سامنے "جاکوت" نامی ناچ پیش کیا۔ یہ ناچ اس علاقے کی خاص چیز تھا۔ ناچنے والوں میں تین مرد شامل تھے، ان میں ایک نوخیز لڑکا تھا جو زنانہ کردار ادا کررہا تھا۔ مردانہ رقاصوں نے جسم کے ہر حصے سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایک ایک شخص کے جسم پر قریباً سو سو گھنٹیاں تھیں۔ ایسی ہی گھنٹیاں جمع کرکے ایک تاج سا بنایا گیا تھا۔ یہ تاج زنانہ لباس والے کے سر پر تھا۔ اس رقص کو موسیقی فراہم کرنے کے لیے دس بارہ سازندے بھی تھے۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹی بڑی گھنٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی گھنٹی جو سازندے استعمال کررہے تھے قریباً ایک فٹ قطر کی تھی۔ اس کا وزن پانچ کلوگرام سے کم نہیں تھا۔

جونہی رقص شروع ہوا، ہال کمرے کی بیشتر روشنیاں گل کردی گئیں۔ ایک خوابناک سے ماحول میں پہلے تو چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں "ردھم" فراہم کرتی رہیں پھر سب گھنٹیاں بول اٹھیں۔ ایک خوبصورت جھنکار سی اٹھا اور صرف گہرا ہی نہیں کوٹھی کے تمام در و دیوار محسوس ہوئے۔ تینوں رقاص بڑے دلنواز انداز میں

ہوگئے۔ رقص اور جھنکار کا آہنگ سامعین کو اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ یہ میلو کے انداز کا رقص تھا۔ رقص کی وساطت سے ایک کہانی بیان کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ایک حسین دوشیزہ کے دو چاہنے والے اس سے کھینچا تانی کررہے تھے اور اپنے ناز و انداز دکھا کر اسے رجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے لگا جیسے یہ بھی سلمان آزر، ناہید اور مجتبیٰ کنور کی کہانی ہے۔ مجتبیٰ کنور، سلمان سے اس کی حسین و جمیل بیوی چھیننے کی کوشش کررہا تھا۔ سب کے سامنے سب کے روبرو بڑی ڈھٹائی اور دلیری سے یہ کھیل کھیلا جارہا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہورہا تھا کہ کیا ناہید نہیں جانتی کہ مجتبیٰ کنور اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کررہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیسی بے رحمی سے پیش آتا ہے اور کس طرح اس کی برین واشنگ کرکے اسے اپنا "معمول" بنا چکا ہے۔ کیا خود زلیخا بھی اسے کچھ نہیں بتاتی تھی۔

رقص جاری رہا اور دھیرے دھیرے کلائمیکس پر پہنچ گیا۔ رقاصوں کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے پاؤں زمین سے لگتے نظر نہیں آتے تھے۔ گھنٹیاں بجانے والے بڑی مشاقی سے ان کے پینتروں کا ساتھ دے رہے تھے۔ میں باڈی گارڈ کی حیثیت سے مسٹر جی کلارک کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ان کے صوفے کے عین پیچھے میری نشست تھی۔ مسٹر جی کلارک رقص دیکھنے کے ساتھ ساتھ مجتبیٰ کنور سے باتیں بھی کرتے جارہے تھے۔ مجتبیٰ کنور بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور کسی وقت زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی زبردست منصوبہ پروان چڑھ رہا ہے، کوئی تہلکہ خیز قسم کی مہم درپیش ہے۔ اس منصوبے اور اس مہم کا تعلق یقیناً چنے کی دال کے ان چند دانوں سے تھا جو ایک گلابی لفافے میں بند ہوکر یہاں پہنچے تھے اور جن پر لکھی ہوئی تحریر کو مسٹر شاؤ نے معانی کا لباس پہنایا تھا۔

کبیر شاہ بھی اس محفل میں موجود تھا۔ میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ ایک کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ بری طرح چونکا۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور میری نگاہ بھی کھڑکی پر جم گئی۔ کھڑکی کا پٹ بلند آواز سے کھلا تھا۔

اب وہاں ایک مسلح شخص کھڑا نظر آرہا تھا۔ وہ کوٹھی کے ملازمین یا مجتبیٰ کنور کے محافظوں میں سے ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اس کی خودکار رائفل کو حرکت میں آتے دیکھا۔ رائفل کا رخ مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کی طرف تھا۔

یکایک رقص ختم ہوگیا اور ایک ساتھ کئی چیخیں اُبھریں۔ میں جانتا تھا اب اگلی آواز دھماکے کی ہوگی۔ دھماکا جس کے ساتھ ہی پگھلا ہوا سیسہ مسٹر جی کلارک یا مجتبیٰ کنور کی طرف روانہ ہوجائے گا۔ بحیثیت باڈی گارڈ یہ میرے لیے کڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔

ایم اے راحت کے قلم سے
پرواز
ایڈونچر سے بھرپور ایک خوبصورت کہانی
اُس نوجوان کی سرگزشت جس کی رگوں میں
وطن کی محبت دوڑ رہی تھی مگر وطن نے اُسے کیا دیا
★
وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہربان
ہوئے تو وہ اندر سے ٹوٹ گیا۔ لیکن فتح اُسکا مقدر تھی
قارئین پر
اپنی گرفت سخت کرتی ہوئی داستان
قیمت -/50
ڈاک خرچ -/10
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اُردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

میرا اور رائفل بردار کا درمیانی فاصلہ دس گز سے کم نہیں تھا۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں بھاگ کر اس پر چھلانگ لگا سکتا۔ اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ میں ہولسٹر سے اپنا پستول نکالتا اور حملہ آور کو نشانہ بناتا۔ بالکل بے بسی کا عالم تھا۔ مجھے تو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ حملہ آور نے مجتبیٰ کنور اور جی کلارک صاحب میں سے کس کو نشانہ بنانا ہے۔ عین ممکن تھا کہ میں مجتبیٰ کنور کو دھکا دے کر نیچے گراتا اور حملہ آور جی کلارک صاحب کو گولی سے اڑا دیتا۔ یہی صورت مجتبیٰ کنور کے ساتھ بھی پیش آسکتی تھی۔ یہ سیکنڈ کے دسویں حصے کی سوچ بچار تھی۔ رائفل کی نال اٹھی ہوئی تھی اور حملہ آور کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ مجھے اس کی شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کا بدن تو روشنی میں تھا لیکن چہرے پر روشنی مناسب زاویے سے نہیں پڑ رہی تھی۔ ذہن میں بجلی کی طرح کوند جانے والے ایک خیال کے تحت میں نے پشت سے مسٹر جی کلارک صاحب کو دھکا دیا اور انہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا دبیز قالین پر گرا۔ عین اسی وقت دھماکا ہوا۔ میں نے مجتبیٰ کنور کے قریب کھڑے ایک شخص کو اچھل کر صوفے پر گرتے دیکھا، ہال کمرے میں چیخیں گونج رہی تھیں۔ رقاصوں نے اپنے جسم سے سیکڑوں گھنٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ وہ بھاگے تو ہر طرف جھنکار پھیل گئی۔ جی کلارک صاحب کو قالین پر چھوڑ کر میں حملہ آور پر جھپٹا۔ وہ اب رخ پھیر کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب اس کا پورا سراپا میری نگاہوں میں آیا۔ ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔۔۔ وہ سائیں عالی تھا۔

اس نے گرم چادر اپنے چہرے سے یوں لپیٹ رکھی تھی کہ پیشانی اور آنکھوں کے سوا سب کچھ چھپ گیا تھا۔ لیکن جب وہ مڑ کر بھاگا تو چادر اس کے چہرے سے کھسک گئی۔ مجھے اس کے چہرے پر دیوانگی کی جھلک نظر آئی۔ برآمدے میں پہنچتے ہی اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور عمارت کے عقبی حصے کی طرف دوڑا۔ وہ بڑے عجیب انداز سے دوڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی سیاہ چمگادڑ پھڑپھڑاتی ہوئی جا رہی ہو۔ میں سائیں عالی کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ سائیں عالی یہاں کیسے پہنچا تھا اور اس نے عمارت میں داخل ہو کر گولی کیوں چلائی تھی؟

جونہی سائیں عالی بھاگتا ہوا کھلی جگہ پہنچا میرے لیے ممکن ہو گیا کہ اسے عقب سے نشانہ بنا سکوں لیکن ایسا کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے یونہی دکھاوے کے لیے ایک فائر کیا۔ گولی سائیں عالی کے قریب سے گزر گئی۔ سائیں کا رخ بیرونی دیوار کی طرف تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ دیوار پھاند کر نکل جانا چاہتا ہے۔ دیوار کی اونچائی آٹھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ حفاظت کی غرض سے اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بلب لگائے گئے تھے۔

ابھی سائیں دیوار سے بیس تیس گز دور ہی تھا کہ دیوار کے بالکل قریب درختوں میں ہلچل ہوئی اور ایک پہریدار سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس کی سرخ ٹوپی نزدیکی بلب کی زرد روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس نے رائفل سائیں عالی کی طرف سیدھی کی۔ یہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ سائیں عالی جاپانی پہریدار کی گولی کا نشانہ بن رہا تھا۔ وہ "نان اسٹاپ" بھاگ رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اس کے سامنے اینٹوں کی نہیں دھوئیں کی دیوار ہے اور وہ ہوا کی طرح اس میں سے گزر جائے گا۔ جاپانی پہریدار نے چلا کر کچھ کہا۔ پھر رائفل سیدھی کی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے دو فائر کیے۔ ان میں سے ایک گولی جاپانی پہریدار کے بازو میں لگی اور وہ فائر کرنے سے پہلے ہی کلائی تھام کر دوہرا ہو گیا۔ دیوار کے بالکل پاس ہی ایک ڈرم پڑا تھا۔ سائیں عالی نے بھاگتے بھاگتے اچک کر ڈرم پر پاؤں رکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ میں نے سائیں عالی پر دو فائر مزید کیے لیکن ظاہر ہے یہ فائر سائیں عالی پر نہیں تھے۔ ورنہ وہ پٹ سے نیچے پتھریلی زمین پر گرتا۔ میرے عقب سے بھی اعشاریہ ۳۸ کے ریوالور کا ایک فائر ہوا لیکن سائیں اس کی مار سے بچ نکلا۔ وہ دیوار سے دوسری جانب کود گیا۔ دیوار سے آگے اونچی نیچی گھاٹیاں اور درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ میں بھی ڈرم پر چڑھ کر دیوار پر آیا اور باہر کود گیا۔ سائیں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

○☆○

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک مسٹر شاؤ کی رہائش گاہ میں کھلبلی رہی۔ سائیں عالی کی گولی سے زخمی ہونے والا شخص مجتبیٰ کا ایک قریبی ملازم آصف تھا۔ وہ مجتبیٰ کے ساتھ ہی اسلام آباد سے یہاں پہنچا تھا اور راگ رنگ کی محفل سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سائیں عالی بلائے ناگہانی کی طرح ایک کاری زخم دے کر چلا گیا تھا۔ اس آصف نامی ملازم کو مجتبیٰ کی ذاتی جیپ پر فوراً پشاور روانہ کر دیا گیا۔ مسٹر شاؤ اور مجتبیٰ کے آدمی مل جل کر حملہ آور کو نواحی جنگل میں تلاش کرنے لگے۔ میں بھی تلاش کرنے والوں میں شامل تھا۔ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ یہ تلاش رائیگاں جائے۔ کہتے ہیں کہ نیم شب اور آخر شب کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ بھی نیم شب تھی اور تاریک بھی بہت۔ اس پہر

ہی۔ اس کٹھن وقت میں مانگی ہوئی دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی اور ہم رات ایک بجے کے قریب بے نیل و مرام واپس لوٹ آئے۔

میرے سوا سائیں عالی کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا مسٹر شاؤ کی رہائش گاہ میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ مسٹر شاؤ کا کہنا تھا کہ وہ کوئی مقامی شخص ہرگز نہیں۔ ارد گرد کے لوگ اس کی بے پناہ عزت کرتے ہیں اور کسی ایسی کارروائی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایک عمر رسیدہ ملازم کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ کارروائی قریبی گاؤں نوری آباد کے کسی نے کروائی ہو۔ وہ سخت مذہبی قسم کا شخص تھا اور ناچ گانے کی محفلوں کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ مسٹر شاؤ کی ایک بلند و بالا بیوی جاپانی زبان میں "چوں چاں چیں" کر رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کسی پر اپنے شک کا اظہار کر رہی تھی۔

سائیں عالی دیوار پھلانگتے ہوئے اپنی رائفل وہیں پھینک گیا تھا۔ رائفل پر بیس گولیوں کا میگزین چڑھا ہوا تھا۔ ان میں سے صرف ایک گولی استعمال ہوئی تھی۔ یہی گولی تھی جس نے آصف کو نشانہ بنایا تھا۔ میں نے آصف کو زخمی حالت میں نہیں دیکھا تھا تاہم مجتبیٰ کنور بتا رہا تھا کہ گولی اس کا کالربون کو توڑتی ہوئی سینے میں گھس گئی ہے اور اس کی حالت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک جاپانی پہریدار میری گولی سے بھی زخمی ہوا تھا۔ گولی اس کی کلائی کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس واقعے کو سب ایک اتفاق ہی سمجھ رہے تھے، کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پہریدار کو زخمی کرنے والی گولی میں نے پوری توجہ سے نشانہ لے کر چلائی تھی۔

رقص کا پروگرام تو رات پہلے پہر ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ اگلی صبح طلوع آفتاب کا نظارہ بھی نہ کیا جا سکا۔ صبح دم آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مہمان اور میزبان نظارہ گاہ میں جمع تو ہوئے لیکن مطلع ابر آلود دیکھ کر واپس چلے گئے۔ مسٹر شاؤ کو ان دونوں واقعات نے افسردہ سا کر رکھا تھا تاہم اس افسردگی کو کم کرنے کے لیے مس فینگ چی اس کے آس پاس موجود تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مسٹر جی کلارک نے میزبان شاؤ کو کل رات ہی بتا دیا تھا کہ یہ دراز قد حسینہ اب اس کی ملکیت ہے اور وہ جب تک چاہے اس کے شباب سے اپنی راتیں چمکا سکتا ہے۔ فینگ چی بھی یہاں آکر مطمئن نظر آرہی تھی۔ بے شک اس کی تین عدد سوتنیں یہاں پہلے سے موجود تھیں لیکن شاؤ کی شان و شوکت اور دولت بھی نظر انداز کرنے والی چیز نہیں تھی۔

مسٹر شاؤ کی رہائش گاہ چھوڑنے سے قبل مسٹر جی کلارک نے تولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجتبیٰ کنور کے ساتھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مجتبیٰ کنور میرے پاس آیا اور چہکتے ہوئے بولا۔ "تیار ہو جاؤ جوان۔ تم ایڈونچر کے شوقین ہو اور تمہارا یہ شوق پورا ہونے والا ہے۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اتنے میں قریب کھڑی ناہید نے اسے "مجتبیٰ صاحب" کہہ کر آواز دی۔ ناہید کی آواز سن کر مجتبیٰ کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ کھڑا رہتا۔ مقناطیس کی طرح وہ اس کی طرف کھنچا چلا گیا۔ وہ بڑے بڑے زرد پھولوں والے سیاہ سوٹ میں ملبوس تھی اور ایک آفت لگ رہی تھی۔ مجتبیٰ اس کے قریب پہنچا اور ہنس ہنس کر بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ اس کے ہر انداز سے محبت چھلکی پڑ رہی تھی۔ میں یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ یہی شخص ہے جو اپنی بیوی کے لیے جلاد ثابت ہوتا ہے اور مار مار کر اس کا جسم نیلا کر دیتا ہے لیکن یہاں وہ سراپا محبت تھا۔ یہ تضاد بہت واضح تھا، ہر شخص کو نظر آسکتا تھا لیکن مجتبیٰ کو نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اس کی منظور نظر کو۔ پانچ دس منٹ بعد ہم دراز قد مسٹر شاؤ اور اس کی بلند و بالا بیویوں سے رخصت ہو کر پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔ یہاں ہماری گاڑیاں ہمیں اسلام آباد لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

○☆○

رات نو بجے کا وقت تھا۔ میں اور زریں گل ڈنگری بازار والے مکان میں بیٹھے تھے۔ میں ابھی ابھی زریں گل کو اپنے پچھلے دو روز کی کارگزاری سنا کر فارغ ہوا تھا۔ میں نے اسے مسٹر شاؤ کے بارے میں بتایا تھا اور پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اس وسیع عمارت کے بارے میں بھی جہاں دراز قد شاؤ اپنی دراز قد بیویوں کے ساتھ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ زریں گل یہ سب کچھ سن سن کر حیران ہوتا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے پیٹ پر بھی ہاتھ پھیرتا رہا تھا۔ اسے ڈوروں کی بھوک لگی تھی۔ بھوک تو اسے پہلے بھی بہت لگتی تھی مگر پچھلے دو روز سے اس کی بھوک میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ اس کا سبب وہ انواع و اقسام کے کھانے تھے جن سے وہ میری غیر موجودگی میں دو دو ہاتھ کرتا رہا تھا۔ یہ کھانے فریال کا ڈرائیور لے کر آتا تھا۔

فریال پرسوں مجھ سے ناراض ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے میرے سامنے کھانا چنا تھا لیکن اسی دوران مسٹر جی کلارک کا بلاوا آگیا تھا اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل گیا

تھا اس ناراضگی کے سبب فریال خود تو نہیں آتی تھی مگر حسبِ وعدہ ڈرائیور کے ہاتھ کھانا بھیج دیتی تھی۔ یہ کم از کم چار آدمیوں کا کھانا ہوتا تھا۔ لہٰذا زریں گل کی موج ہو گئی تھی۔ وہ جی بھر کر کھاتا تھا اور کھا کھا کر جی بھرتا تھا۔ زیادہ کھانے سے بھوک بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ زریں گل کی بھوک بھی بڑھ گئی تھی اور اب وہ سرِ شام ہی کھانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ دس منٹ بعد ہی مکان کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ڈرائیور کھانے والا ٹفن کیریئر لے کر پہنچ گیا۔

زریں گل ٹفن کیریئر کی طرف یوں لپکا جیسے میدانِ جنگ میں "چارج" کرنے والا سپاہی دشمن مورچے کی طرف لپکتا ہے۔ پلک جھپکتے میں اس نے بڑی مشاقی سے ٹفن کیریئر کھول کر اس کے حصے بکھرے کر دیے۔ کمرے میں مختلف کھانوں کی خوشبو پھیل گئی۔ حسبِ معمول بڑا پُر تکلف اور مقوی کھانا تھا۔ بھنا ہوا چھوٹا قیمہ جس میں ہرا مسالہ ڈالا گیا تھا۔ مرغ کا قورمہ، یخنی، ہلکی مرچ والی حلیم اور سلاد وغیرہ۔ اتنا کچھ دیکھ کر میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ ہم دونوں کھانے میں جت گئے اور ڈرائیور قریب بیٹھ کر اخبار دیکھنے لگا۔ وہ در اصل فریال کے ماموں ہی کا ڈرائیور تھا لیکن آج کل فریال کی ڈیوٹی پر تھا۔ اس کا نام امانت علی تھا۔ بہت خوش باش اور روتی بندہ تھا۔ زریں گل سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔

میں نے امانت علی سے پوچھا۔ "تمہاری بی بی جی کا کیا حال ہے؟" بی بی جی سے میری مراد فریال تھی۔

وہ بولا۔ "بس جی ٹھیک ہے۔ مگر کچھ چپ چپ سی ہیں۔ شاید طبیعت ناساز ہے۔" میں طبیعت کی اس ناسازی کی وجہ سمجھتا تھا۔ وہ بہت غصے میں یہاں سے گئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی اُمید نہیں تھی کہ وہ کھانا بھیجے گی۔ لیکن کھانا وہ بہرحال بھیج رہی تھی۔ ہم کھاتے رہے اور گفتگو بھی کرتے رہے۔

زریں گل نے امانت سے کہا "یارا! تمہارا بی بی ایک دم بہت اچھا عورت ہے۔ جو عورت ایسا کھانا پکاتا ہے اس کا شوہر اس سے بہت خوش رہتا ہے۔ بس ہر وقت بیوی کا نا رہتا ہے۔ اکیلے نہ جاتا۔ ام کو چھوڑ کر تم تمہارے بنا ام بھلا کیا جئے گا۔ ام کو پکا پکا یقین ہے بی بی فریال کو بہت اچھا شوہر ملے گا۔"

امانت علی ہنسا "بھائی صاحب یہ کھانا بی بی خود نہیں پکاتی ہے۔ اسے کیا پتا کھانا کیسے پکایا جاتا ہے۔ وہ تو کھلاڑی ہے۔ پینٹنگ کار نر اور پینلٹی اسٹروک سے آگے اسے کچھ نہیں آتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آج کل وہ باورچی کے سر پر کھڑی

رہتی ہے۔ اپنے سامنے سب کچھ تیار کرواتی ہے۔ سب سے زیادہ فکر اسی بات کی ہوتی ہے کہ کھانا ...
پہنچے۔ نہ اتنا جلدی کہ اس میں تازگی نہ رہے اور نہ ...
ہے کہ ٹائم ٹیبل خراب ہو جائے۔ اب بھی ہم افرا تفر...
یہاں پہنچے ہیں کیونکہ تو بجنے والے تھے۔"

روانی میں امانت علی "ہم" کا لفظ استعمال کر گیا تھا۔ شبہ ہوا کہ وہ کھانا لے کر اکیلا نہیں آیا۔ اس کے سا...
دوسرا تھا جسے وہ گاڑی میں چھوڑ آیا تھا۔ عین ممکن ...
فریال ہی ہو۔ ابھی زریں گل کھانے میں جتا ہوا تھا...
نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ہاتھ دھونے کے بہا...
آگیا۔ صحن میں پہنچ کر میں تیزی سے بیرونی دروازے ...
بڑھا اور گلی میں نکل آیا۔ گاڑی تیس چالیس قدم دور ...
سرے پر کھڑی تھی۔ وہ تاریکی میں تاریکی کا حصہ ہی ...
دے رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر گاڑی کے اندر ...
میرے اندازے درست ثابت ہوئے فریال پچھلی ...
وہی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم چونکی پھر بے ...
دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ ...
مقصد یہی تھا کہ وہ شیشہ نیچے گرائے اور میں اس ...
کر سکوں۔ اس نے شیشہ گرانے کے بجائے دروازہ ...
سے لاک کر لیا۔ روٹھنے کا یہ بڑا چنچل سا انداز تھا ...
گاڑی کے چاروں دروازے چیک کیے۔ ایک اگلا ...
مجھے کھلا مل گیا۔ میں دروازہ کھول کر گاڑی کے اند...

اندرونی بتی جلا کر فریال کا چہرہ دیکھا۔ اس کے شفاف ...
آنسو بہہ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "فریال! تمہاری آنکھیں صرف ...
ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ انہیں رونے کی سزا کیوں د...
ہو۔" وہ رخ پھیر کر کھڑکی کی طرف دیکھتی رہی اور ...
رہی۔ میں نے کہا۔ "ارے بھئی کچھ تو بولو۔ بہت ...
پیٹ میں رہے تو بندہ پھٹ بھی جاتا ہے۔"

وہ ترخ کر بولی۔ "آپ کو کیا۔ کوئی جئے یا مر...
صرف اپنی مرضی کرتے رہیے۔ غزالہ جی نے کیا کیا ...
سے آپ کے لیے، بدلے میں آپ نے انہیں ...
رُلایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ...
شادی کا پھندا ڈال لیا۔ اگر آپ نے ان کی قدر ...
میں کیا شے ہوں۔ میرا آپ کا رشتہ ہی کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے اور میرے درمیان ...
رشتہ ہے۔ یہ دوستی اور پُر خلوص محبت کا رشتہ ہے ...
رشتے کو کبھی آنچ نہیں آئے گی۔ چلو اب یہ آنسو پو...

ہر میرے ساتھ۔ مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلاؤ اور اپنا بنایا ہوا ٹائم ٹیبل ذرا ایک بار پھر مجھے ذہن نشین کرا دو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب۔"

"بس بس زیادہ باتیں نہ بنائیں" وہ بدستور خفا تھی۔ "مجھے نہیں عمل کرانا کسی ٹائم ٹیبل پر۔ آپ نے ہمیشہ اپنے ٹائم ٹیبل پر عمل کیا ہے اور آئندہ بھی کریں گے۔ میں ہی پاگل تھی جو آج تک آپ کے اور غزالہ جی کے بارے میں سوچتی رہی۔ امیدیں باندھتی رہی اور خواب دیکھتی رہی۔ آپ نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب جو جی میں آئے کرتے رہیے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آئی ایم ساری فریال! میں بہت غمزدہ ہوں۔ مجھے تمہارے پُر خلوص سہارے کی ضرورت ہے۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ اگر کسی وقت میں تمہاری کسی توقع پر پورا نہ اتر سکوں تو پلیز درگزر کر دیا کرو۔"

میرے سنجیدہ لہجے نے اسے ایک دم نرم کر دیا۔ وہ کچھ دیر ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتی رہی۔ پھر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "اچھا اب زیادہ باتیں نہ بنائیں۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اگر ڈرائیور فارغ ہو گیا ہے تو اسے فوراً بھیج دیجیے۔"

میں نے کہا۔ "دیر کہاں ہوئی۔ ابھی تو ساڑھے نو ہی بجے ہیں۔ بارہ ایک بجے تک تو تمہارے لیے شام ہی ہوتی ہے۔"

وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "دیکھا۔ پھر شروع ہو گئے ناں۔ بس اب میں ایک منٹ یہاں نہیں رکوں گی۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں نہ رکو۔ فوراً نکلو گاڑی سے اور چلو میرے ساتھ کوارٹر میں۔ جب تک زریں گل کو ہماری "صلح" کا ثبوت نہیں مل جائے گا وہ بدستور بھوک ہڑتال جاری رکھے گا۔ پرسوں سے ایک لقمہ نہیں کھایا ہے بے چارے نے۔"

"لیکن۔ لیکن ٹفن تو روز خالی آتا رہا ہے۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"بس تمہارا دل رکھنے کے لیے ادھر اُدھر پھینک دیتا ہوگا۔"

"اوہ مائی گاڈ۔ بے حد جھوٹے ہیں آپ دونوں" فریال نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے۔ "مجھے سب پتا ہے۔ دو تین بار تو امانت کے سامنے زریں گل نے ٹفن صاف کیا۔"

فریال کا تین چوتھائی غصہ اب کافور ہو چکا تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش مزید کی تو وہ میرے ساتھ کوارٹر میں چلی آئی۔ یہاں زریں گل کھانے کو شکست فاش دے چکا تھا اور اب مطمئن انداز میں اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ فریال کو دیکھ کر وہ پہلے چونکا پھر خوش ہو گیا۔ مخصوص انداز میں بولا۔ "فریال بی بی! آپ نے یہاں آکر امارا دل ٹھنڈا کر دیا۔ ام کو بہت فکر تھا آپ کی طرف سے کہ آپ ناراض ہو کر گیا ہے پتا نہیں آئے گا بھی کہ نہیں۔ خدا کا قسم آپ کو دیکھا تو آپ کے کھانے کا مزا دوگنا ہو گیا۔ لیکن۔ لیکن آپ یہاں تشریف کیسے لایا۔ ڈرائیور صیب تو اکیلا آیا تھا نا۔"

فریال بولی۔ "میں باہر گاڑی میں بیٹھی تھی۔ لیکن ایک بات مجھے بھی بتاؤ۔ تمہارے استادِ محترم تو فرماتے ہیں کہ تم تین روز سے بھوک ہڑتال پر ہو جب کہ یہاں کھا کھا کر تمہارا پیٹ پھٹ رہا ہے۔ اب کس کی بات سچ جانی جائے۔"

زریں گل نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا۔ پھر سر کھجا کر بولا۔ "استادِ محترم کا بات سچ ہے۔ ام بھوک ہڑتال کا بھول ہی گیا تھا۔ ام نے جو کچھ کھایا غلطی سے کھایا ہے۔ اور غلطی سے کھایا پیا معاف ہوتا ہے بلکہ خدا اپنے بندے پر خوش ہوتا ہے کہ دیکھو میرے بندے نے بھوک ہڑتال کیا ہے لیکن غلطی سے کھا پی رہا ہے۔"

"خدا نے یہ بات بھوک ہڑتال کے لیے نہیں روزے کے لیے کہہ رکھی ہے۔" فریال نے فوراً جواب دیا۔ "ویسے بھی غلطی ایک دو نوالے یا گھونٹ کی لگتی ہے۔ تم تو یہاں غلطی سے پورا ٹفن کیریئر ہی صاف کر گئے ہو۔"

زریں گل مسکرایا۔ "ام خان ہے نا۔ ام کو غلطی کے بجائے غلطا لگ گیا ہے۔ بہرحال چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ یہاں تشریف لے آیا، یہ بہت خوشی کا مقام ہے۔ ایسے ہی موقعے پر ایک فلم میں وحید مراد صاحب نے گایا تھا۔ اے ابرِ کرم آج اتنا برس۔ اتنا برس کہ بی بی لوگ یہاں سے جا نہ سکے۔ اس فلم میں بی بی لوگ میڈم شبنم تھا۔ آج امارے سامنے آپ ہے۔ لیجیے اب آپ کو دیکھ کر ام نے اپنا بھوک ہڑتال بالکل ختم کر دیا۔" زریں گل نے ہاتھ بڑھایا اور ایک پلیٹ میں پڑی ہوئی مرغ کی آخری بوٹی بھی ہڑپ کر گیا۔

فریال کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ڈرائیور امانت بھی ہنسنے لگا تھا۔ کمرے کا ماحول خوشگوار سا ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور امانت سے کہا کہ وہ قریبی ہوٹل سے بی بی جی کے لیے گرم گرم چائے لے کر آئے۔ امانت چلا گیا تو فریال نے پوچھا کہ میں دو روز کہاں غائب رہا ہوں اور آئندہ میرا کیا پروگرام ہے۔

میں نے کہا۔ "دو روز تو مجتبیٰ کنور کے مہمان خصوصی کے ساتھ رہا ہوں۔ آئندہ لگ رہا ہے کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں حیدر آباد جانا پڑے گا۔"

"حیدر آباد؟ کون سے حیدر آباد؟"

"انڈین حیدر آباد۔"

"ہائے اللہ۔ لیکن وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔"

"ابھی ٹھیک سے پتا نہیں۔"

زریں گل بولا۔ "ام آپ کو بتاتا ہے جی' یہ کیا بتائیں گے۔ یہ کوئی بہت خاص الخاص معاملہ ہے جی۔ آپ کو ان دال کے دانوں کا تو پتا ہی ہے جو وہ حرامی عیسٰی جان لے بھاگا تھا۔ استاد صیب بتاتا ہے کہ ان دال کے دانوں پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ مجتبیٰ کنور کا فرنگی مہمان اس تحریر کو پڑھوانے کا کوشش کر رہا تھا۔ اب وہ کامیاب ہو گیا ہے۔ بس اس کا سارا کا سارا دانت نکل آیا ہے اور وہ خوشی سے قندھاری انار کے مافق سرخ ہو رہا ہے۔ کچھ یہی حال مجتبیٰ کنور کا بھی ہے۔ اب وہ دونوں حیدر آباد جانے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔ پکا بات ہے کہ وہ کچھ آدمی بھی اپنے ساتھ لے جائے گا اور ان آدمیوں میں امارا استاد صیب بھی ضرور ہو گا۔ ام بہت پریشان ہے فریال بی بی۔ امارا خیال ہے کہ استاد کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔ ام یہ نہیں کہتا کہ استاد صیب عورت کے مافق گھر بیٹھا رہے لیکن ام کو یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ وہ "حرام خور فرنگی" کا مدد کرے۔ فرنگی تو سانپ کی مافق ہے۔ خو لالہ سُندھیر کی طرح امارا بھی یہ قول ہے کہ فرنگی جہاں ملے اس کا سر کچل دو۔"

"چاہے بعد میں پتا چلے کہ وہ فرنگی نہیں تھا' گورا چٹا پاکستانی تھا۔" میں نے لقمہ دیا۔

فریال مسکرا دی۔ زریں گل کا منہ بن گیا لیکن جلد ہی فریال کی مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی۔ وہ کڑی نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ "اس کا مطلب ہے آپ پھر پر پھڑپھڑا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "گھبراؤ مت۔ پر ہی پھڑپھڑا رہا ہوں پرواز نہیں کر رہا۔ ابھی صرف پروگرام ہی بن رہا ہے۔ اگر ہم گئے بھی تو وس پندرہ روز سے پہلے نہیں جائیں گے اور اس وقت تک ڈاکٹر صاحب نے جو "بیڈ ریسٹ" تجویز کر رکھی ہے وہ پوری ہو چکی ہو گی۔"

کہنے کو تو میں یہ بات کہہ رہا تھا لیکن مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ مجتبیٰ کنور کا پروگرام کیا ہے۔ ممکن تھا کہ وہ کل ہی حیدر آباد روانگی کا حکم دے دیتا۔

کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھ کر فریال' ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں درد سے بے تاب ہو کر بستر پر جا پڑا۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے سے مجھے شدید درد ہو رہا تھا لیکن فریال کی وجہ سے میں نے ضبط کر رکھا تھا۔ درد دوبارہ شروع ہونے کا سبب میری بے احتیاطی ہی تھی۔ پچھلے دو روز سے میں نہ صرف بھاگ دوڑ کر رہا تھا بلکہ دوا کے نزدیک بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنی غفلت کو خود ہی کوسا اور دوا کھا کر لحاف میں گھس گیا۔ ابھی مشکل سے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ جیکٹ کی جیب میں پڑا ہوا واکی ٹاکی ایک بار پھر جاگ پڑا۔ "بیپ بیپ" کی مسلسل آواز نے زریں گل کو بھی چونکا دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر واکی ٹاکی نکالا۔ اس کا ایریل باہر کھینچا اور آواز موصول کرنے والا بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف مسٹر جی کلارک کا اسسٹنٹ مسٹر ڈیوڈ تھا۔ حسب معمول اس کی آواز میں تیزی اور روکھا پن تھا۔ لمبی چوڑی تمہید باندھے بغیر اس نے مجھ سے کہا کہ میں تیاری کر لوں۔ ہمیں پرسوں علی الصباح پشاور سے لاہور روانہ ہونا ہے۔ اور اسی شام براستہ واہگہ بارڈر انڈیا میں داخل ہونا ہے۔ ڈیوڈ نے بتایا کہ ہماری منزل مقصود حیدر آباد ہو گی۔ اور گمان ہے کہ ہمیں وہاں دو تین ہفتے رکنا پڑے گا۔

اس نادر شاہی حکم نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ دیا۔ راجوں مہاراجوں اور نوابوں کی سرزمین حیدر آباد دیکھنے کا شوق تو دل میں تھا اور یہ خواہش بھی تھی کہ وہاں کے ان دیکھے ماحول میں کھو کر اس غم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کروں جو شہد کی مکھی کی طرح میرے تعاقب میں رہتا ہے لیکن سینے کی تکلیف نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہمت آدھی رہ گئی ہے۔ مجھے خاموش پا کر ڈیوڈ نے کہا۔ "کیا بات ہے مسٹر شاہ جہاں' تم چپ ہو گئے ہو۔ کچھ کہنا ہے تو بے دھڑک کہو۔"

میں نے کہا "نو سر! کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس سینے میں تھوڑی سی تکلیف تھی۔ امید ہے پرسوں تک طبیعت سنبھل جائے گی۔"

وہ تشویش سے بولا۔ "اگر زیادہ تکلیف ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ سرد موسم میں سینے کی تکلیف بڑھ بھی سکتی ہے۔ تمہارا حیدر آباد جانا بہت ضروری ہے۔ بلکہ سب سے پہلے تو تم ہی جا رہے ہو۔ باقی لوگ بعد میں پہنچیں گے۔ تم نے وہاں جا کر حالات کا جائزہ لینا ہے اور رپورٹ بھیجنی ہے۔ اسی رپورٹ پر آئندہ پروگرام کا دارومدار ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ کلارک صاحب مجھے

اس قابل سمجھ رہے ہیں لیکن حیدر آباد میرے لیے بالکل نئی جگہ ہے۔"

ڈیوڈ نے کہا۔ "مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور صاحب نے باہمی صلاح مشورے کے بعد فیصلہ کیا ہے' یقیناً ٹھیک ہی کیا ہو گا۔ ابھی اس کام کی نوعیت سامنے نہیں آئی جو وہ تم سے لینا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نوعیت کا پتا چلے تو تم بھی اس فیصلے کو مناسب ہی جانو۔ ویسے تم سے پہلے اس کام کے لیے مجتبیٰ صاحب کے ایک اور ساتھی کا انتخاب ہوا تھا۔ غالباً زوگار آصوف نام تھا اس کا (زوگار آصوف کے نام سے مجھے یوں لگا جیسے یہ کوئی روسی ہو لیکن اصل میں یہ ذوکر آصف تھا۔ ڈیوڈ چونکہ انگلش میں بات کر رہا تھا لہٰذا اس نے آصف کو آصوف بنا دیا تھا) اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ڈیوڈ بولا۔ "یہ زوگار آصوف کل رات مسز شاہ کی کوٹھی پر ہونے والے حملے میں زخمی ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب حیدر آباد کا قرعۂ فال تمہارے نام نکلا ہے۔"

"او کے سر!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اللہ نے چاہا تو میں آپ سب کی توقعات پر پورا اتروں گا۔"

"ویل ڈن" ڈیوڈ نے کہا اور چند ضروری ہدایات دینے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں دھپ سے بستر پر گر گیا۔ زریں گل اپنے نچلے ہونٹ میں نسوار رکھتے ہوئے بولا۔ "استاد صیب! وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ اب آپ کا اور فریال بی بی کا لڑائی تو پکا ہے۔"

میں نے زریں گل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن سائیں عالی میں الجھا ہوا تھا۔ ایک نہ سمجھ میں آنے والا شخص تھا وہ۔ وہ اس جیتی جاگتی دنیا میں ایک ایسے افسانوی کردار کی طرح تھا جو کسی قدیم کتاب سے برآمد ہوا تھا اور گوشت پوست کے انسانوں کے درمیان گھومنے پھرنے لگا تھا۔ وہ کسی سائے کی طرح ہر جگہ میرے تعاقب میں تھا۔ کل رات اس نے جو کچھ کیا وہ حیرت انگیز تھا۔ کل رات سے میں کئی بار سوچ چکا تھا کہ سائیں عالی نے ایسی بے سروپا حرکت کیوں کی۔ وہ بے مقصد انداز میں گولی چلا کر بھاگ اٹھا تھا اور تلاش بسیار کے باوجود ہاتھ نہیں آیا تھا۔ لیکن آج اچانک اس کی بے مقصد کارروائی کی ایک وجہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ معلوم نہیں واقعی ایسا تھا یا یہ بھی میرا وہم ہی تھا۔ بہرحال یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ اگر کل رات ذوکر آصف نامی شخص زخمی نہ ہوتا تو مجتبیٰ کنور مجھے حیدر آباد نہیں بھیجتا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ذوکر آصف کے زخمی ہونے سے ہی میرے حیدر آباد جانے کا راستہ صاف ہوا تھا۔ پہلے بھی سائیں عالی سے ایسی کئی "بامعنی" حرکتیں سرزد ہو چکی تھیں لہٰذا خیال کیا جا سکتا تھا کہ کل رات بھی اس نے ایک "بامعنی" حرکت کی ہے۔

رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک میں اور زریں گل باتوں میں مصروف رہے پھر دھیرے دھیرے حواس پر نیند نے غلبہ پا لیا۔ رات آخری پہر میں ایک کراہ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ کمرے میں بلب روشن تھا۔ زریں گل بے خبر سو رہا تھا۔ میری نگاہوں میں ابھی تک غزالہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ خواب ٹھیک سے یاد نہیں تھا لیکن وہ غزالہ ہی کا خواب تھا۔ وہی تپتے صحرا کی دھوپ جیسا خواب جس میں پیاس' جلن اور اداسیاں یکجا ہوتی ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خواب میں بہت دیر اور بہت دور تک غزالہ کو ڈھونڈتا رہا ہوں۔ میں تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ماؤزر کا پستول میرے پہلو میں رکھا تھا اور بلب کی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔ میری نگاہیں پستول پر جمی تھیں اور ذہن کہیں بہت دور بھٹک رہا تھا۔ کوئی میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ آخر شب کے سناٹے میں اس کی آواز ہر طرف گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "غزالہ! تو کہاں ہے۔ ایک بار' صرف ایک بار مجھے اپنی شکل دکھا دے۔ صرف ایک بار میں دیکھ سکوں کہ تو کس حال میں ہے۔"

میں اگلے روز حیدر آباد کے دور دراز سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ معلوم نہیں وہاں کتنا عرصہ لگنا تھا۔ چند روز' چند ہفتے یا چند مہینے۔ اور معلوم نہیں وہاں سے مجھے واپس بھی آنا تھا یا نہیں۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کل سے انجانے خطروں کے سندیسے دے رہی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس نئے سفر سے جلد ہی واپس آنا نصیب نہیں ہو گا۔ میں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا' میرا دل چاہنے لگا کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار' صرف ایک بار غزالہ کی صورت دیکھوں۔ یہ معلوم کروں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ بے شک اس سے ملاقات نہ ہو' بات نہ ہو لیکن یہ تو پتا چلے کہ وہ کیسی ہے۔ شاید میری اس خواہش کے پیچھے ایک امید بھی چھپی ہوئی تھی۔ دل کے کسی دور دراز نہاں خانے میں گھات لگا کر بیٹھی ہوئی یہ امید کا ہے کا ہے کسی آسیب کی طرح میرے دل و دماغ کو جکڑ لیتی تھی۔ میں سوچنے لگتا تھا' شاید غزالہ نے مجھے جھنجھوڑنے کے لیے کوئی کھیل ہی کھیلا ہو۔ اس کی شادی نہ ہوئی ہو صرف شادی کا ڈراما ہوا ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

صرف فریال نے مجھے بتایا تھا کہ غزالہ کی شادی ہو گئی ہے' جس میں بوجہ بیماری وہ خود بھی شریک نہیں ہو سکی یا پھر فریال کی والدہ نے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ کل غزالہ کی رخصتی تھی اور سای صاحب وہاں گئے ہوئے تھے۔ ٹیلی فون پر سنائی دینے والی آواز فریال کی والدہ ہی کی تھی' میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ انہیں بھی اصل حقیقت کا علم نہ ہو۔ جہاں تک فریال کا تعلق تھا وہ بڑے سے بڑا جھوٹ اس انداز سے بول سکتی تھی کہ اس پر یقین آجائے۔

میں نے ابھی تک فریال سے غزالہ اور اس کی شادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی یہ پوچھا تھا کہ میاں بیوی کینیڈا جا چکے ہیں یا نہیں اور اگر جا چکے ہیں تو جانے سے پہلے فریال ان سے ملی ہے یا نہیں۔ درحقیقت ہم دونوں نے جان بوجھ کر اس شادی کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ زریں گل کو یقین تھا کہ فریال کے پاس غزالہ کا موجودہ ایڈریس ہوگا۔ (وہ ایک بار یہ اعلان بھی کر چکا تھا کہ فریال سے ایڈریس لے کر غزالہ بی بی سے ملنے جائے گا لیکن پھر میرے کہنے پر رک گیا تھا)۔ بیٹھے بیٹھے اچانک میں نے فیصلہ کر لیا کہ فریال سے غزالہ کا ایڈریس معلوم کروں اور دیکھوں کہ وہ کس حال میں ہے۔

صبح تک میں بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ مجھے شدت سے فریال کا انتظار تھا۔ امید تھی کہ وہ ناشتا خود لے کر آئے گی۔ لیکن کسی وجہ سے وہ نہ آسکی۔ اس کا ڈرائیور امانت علی آیا اور ناشتا دے کر چلا گیا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے فریال کو ٹیلی فون کرنے کی ٹھانی۔ اس کا نمبر میرے پاس موجود تھا' قریبی بازار سے ایک روپے میں فون ہو سکتا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جوتے ڈھونڈنے کے لیے میں جونہی چارپائی کی طرف جھکا میری نگاہ ایک ہینڈ بیگ پر پڑی۔ یہ براؤن چرمی ہینڈ بیگ فریال کا تھا۔ رات وہ اس ہینڈ بیگ کے ساتھ ہی گاڑی سے یہاں آئی تھی۔ جاتے وقت اسے یاد نہیں رہا تھا اور ہینڈ بیگ اب تک یہیں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اندر بہت سا الم غلم موجود تھا۔ رومال' برش' لپ اسٹک' ٹشو پیپرز' رسٹ بینڈز' کاغذات اور ان سب چیزوں کے درمیان ایک وڈیو کیسٹ بھی پڑی تھی۔

وڈیو کیسٹ ان دنوں ایک بالکل نئی چیز تھی۔ عام لوگ تو ابھی اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ کچھ خاص گھرانوں میں اس چیز کا تذکرہ شروع ہوا تھا۔ ان دنوں فلمیں کے بنائے ہوئے بڑے بڑے وڈیو آتے تھے۔ مثلاً "ہوسو" اور "ہوسو" وغیرہ "پیناسونک" ان کے بعد آنا شروع ہوا تھا۔ ان وڈیوز میں ایک پاکستانی یا انڈین فلم دیکھنے کے لیے عموماً تین کیسٹ ڈالنے پڑتے تھے۔ یہ کیسٹ بھی مختلف ساخت کی ہوتی تھیں۔ میں نے کیسٹ اٹھا کر دیکھی اور بری طرح چونک گیا۔ اس پر انگلش میں "میرج آف غزالہ جلیس" لکھا تھا۔ میں پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ یہ غزالہ کی شادی کی وڈیو کیسٹ تھی۔ بدن میں ایک سرد لہر سی دوڑنے لگی۔ کئی دنوں سے غم کی بیکراں تیرگی میں آس کی جو ایک کرن سی چمک رہی تھی خاموشی سے بجھ گئی۔ نجانے میں کتنی دیر یونہی کیسٹ تھامے کھڑا رہا۔ زریں گل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "استاد صیب کیا ہوا۔ آپ تو ٹیلی فون کرنے جا رہا تھا۔"

"اب جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا اور بے دم سا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"فلم ہے۔ وڈیو پر چلتی ہے۔"

"وڈیو! یہ کیا ہوتی ہے۔"

"ہوتی نہیں ہوتا ہے۔ بڑی سی مشین' جس میں یہ کیسٹ ڈالتے ہیں تو ٹیلی وژن پر تصویر آتی ہے۔"

"او خدا کا مار" زریں نے ماتھے پر ہاتھ مارا" سیدھی طرح ری سی آر کو نا استاد صیب۔ ام نے یہ مشین دیکھا ہوا ہے۔ ادھر مل میں گلریز بادشاہ کے ڈیرے پر ام نے کئی بار اس مشین پر انڈیا کا فلم دیکھا ہے۔ گلریز بادشاہ امارے ہی گاؤں کا رہنے والا ہے' ادھر مل میں لکڑی کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کا بھائی آفتاب خان پشاور میں کسٹم کا بڑا بابو ہے' وہی یہ وی سی آر لے کر آیا تھا۔ اور اب یہ وی سی آر کوئی بہت بڑا راز کا بات نہیں رہا ہے۔ بہت سا لوگ اس پر فلمیں دیکھ چکا ہے اور تو اور اماری والدہ صاحبہ نے اس پر بقلم خود ہیر رانجھا دیکھی تھی۔ وہ اردو نہیں جانتی نہ ہی پنجابی کا پتا ہے۔ لیکن پنجابی فلم دیکھا اور سارا کا سارا سمجھ گیا۔ لیکن یہ جو فلم آپ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے یہ کون سا ہے اور اس فلم کا باقی کیسٹ کدھر ہے۔"

میں نے افسردگی سے کہا۔ "اس میں ہمارا جانا پہچانا ستارہ ایک ہی ہے اور وہ ہے تمہاری غزالہ بی بی۔ یہ غزالہ بی بی ...کی شادی کی فلم ہے۔ فریال کے ہینڈ بیگ میں سے نکلی ہے۔"

زریں گل ایک دم بجھ گیا۔ غزالہ کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں وہی دکھ تیرنے لگا تھا جو میں کئی بار پہلے بھی اس

کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔

وہ سارا دن میں نے گھر میں گزارا۔ سینے کے درد میں رات سے افاقہ تھا۔ غالباً باقاعدگی سے دوا کھانے کا اثر تھا۔ میں نے دوپہر کے کھانے میں صرف چند لقمے لیے اور لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ تین چار بجے کے لگ بھگ مجھے زریں گل نے جگایا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے تپائی پر ایک ۱۴ انچ کا رنگین ٹیلی وژن پڑا تھا ایک دوسری میز پر جہازی سائز کا وی سی آر رکھا ہوا تھا۔ سب کچھ تیار تھا صرف بٹن دبانے کی ضرورت تھی۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیا؟"

وہ بولا۔ "استاد صیب! ایانا لوگ کہتا ہے کہ رونے دھونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ام نے بھی اپنے دل کا بوجھ آج اچھی طرح ہلکا کیا ہے۔ خو ابھی جب آپ سو رہا تھا ام غزالہ بی بی والا فلم چلا کر دیکھتا رہا ہے۔"

میں نے دیکھا زریں گل کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"لیکن۔۔۔ یہ وی سی آر تمہیں کہاں سے ملا؟"

"ڈھونڈنے سے ہر چیز مل جاتا ہے۔ اور پھر یہ وی سی آر کچھ ایسا دور بھی نہیں تھا۔ جن خان صاحب سے ام نے مکان لیا ہے وہ امارا پکا پکا دوست بن چکا ہے۔ یہ اس کے داماد کا وی سی آر ہے خاص خاص لوگوں کو کرائے پر بھی دے دیتا ہے۔ بس ام لے آیا۔ آپ صبح کہہ رہے تھے نا کہ پاکستان چھوڑنے سے پہلے ایک بار غزالہ بی بی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ بس آپ کے دل کا مراد پورا ہو گیا۔ اب آپ یہ فلم دیکھیں' ام حجامت بنوا کر اور نہا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آجاتا ہے۔"

اس نے وی سی آر آن کر دیا اور اپنے استری شدہ کپڑے سنبھال کر باہر نکل گیا۔

ٹیلی وژن کی اسکرین پر ابھرنے والے مناظر میری آنکھوں کے لیے عذاب تھے لیکن میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ شاید ہر انسان تھوڑا بہت "خود اذیتی" کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ اب یہ خود اذیتی ہی تو تھی کہ میں غزالہ کے دلہن بننے کا نظارہ کر رہا تھا۔ آن واحد میں میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو گئیں۔ غزالہ زرد کپڑے پہنے سہیلیوں کے درمیان سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اسے مہندی لگائی جا رہی تھی۔ زرد کپڑوں کی طرح اس کا رنگ بھی زرد ہو رہا تھا۔ ریشمی بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر جھول رہی تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ کوئی تاثر نہیں تھا اس کے چہرے پر' نہ غم نہ خوشی' نہ آس نہ مایوسی' شوق نہ گریز' اس چہرے سے جیسے کسی نے زندگی نچوڑ لی تھی۔ پھر بھی وہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ سہیلیاں اس سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ وہ کبھی کبھی مسکراتی تھی لیکن یوں جیسے دل پر ہزار ستم توڑ رہی ہو۔ مہندی کی یہ سادہ سی تقریب جلد ہی ختم ہو گئی۔ پھر شادی کے دن کی فلم چلنے لگی۔ وہ چہرہ کسی دوسرے کے لیے سجایا جا رہا تھا جو بچپن سے میرے دل کا داغ تھا۔ ان آنکھوں میں کاجل لگایا جا رہا تھا جن کے خوابوں سے میری نیندیں سجی رہتی تھیں۔ وہ رخسار' وہ ہونٹ' وہ گیسو اور وہ ہاتھ جو میری امانت تھے آج کسی اور کے حوالے کیے جا رہے تھے۔ وہ لوگوں کے جھرمٹ میں تھی۔ مجھ سے بہت دور بے حد دور۔ آج میرے اور اس کے درمیان ایک ایسی لکیر کھینچی جانے والی تھی' جسے کوئی عبور نہیں کر سکتا' میرا دل چاہا وقت کو یہاں روک لوں۔ لمحوں کی طنابیں کھینچ کر گردش ایام کو قیامت تک کے لیے یہاں جامد کر دوں۔ میں ایسا کر سکتا تھا لیکن صرف ٹی وی کی اسکرین پر "اسٹل" کا بٹن دبا کر میں فلم کو آگے بڑھنے سے روک سکتا تھا لیکن کاتب تقدیر نے جو فلم چلا دی تھی اسے روکنا یا ری وائنڈ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ دنیا بھر کا سرمایہ' اختیار اور طاقت استعمال کر لی جاتی لیکن جو وقت گزر چکا تھا وہ گزر چکا تھا۔ پھر بارات کی آمد ہوئی۔ میں نے درمیانے قد کے اس خوش پوش شخص کو دیکھا جس سے غزالہ کی زندگی وابستہ ہونے والی تھی۔ وہ سرخ و سپید رنگ کا مالک تیس بتیس سالہ شخص تھا۔ آنکھوں سے ذہانت اور سنجیدگی جھانکتی تھی۔ وہ سنہری شیروانی پر اونچے شملے کی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اسے ایک نفیس جواں سال دولہا کہا جا سکتا تھا۔ میرے سامنے ہی قبول و ایجاب اور نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ غزالہ کے حنائی ہاتھ نے نکاح کے فارم پر دستخط کیے اور مبارک باد کا شور بلند ہوا۔ پھر میرے سامنے ہی رخصتی کا منظر اپنی پوری حشر سامانی کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے پرانی زندگی کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پورا دور تھا۔ جو وہ اس آنگن میں چھوڑے جا رہی تھی۔ بچپن کی شرارتیں' لڑکپن کی امنگیں' جوانی کے سپنے۔۔۔ اور ایک بد نصیب محبت کی یادیں۔۔۔ غزالہ جیسی پڑھی لکھی نئی روشنی کی لڑکیاں ایسے موقعوں پر زیادہ روتی دھوتی نہیں لیکن میں نے دیکھا کہ غزالہ اپنی ماں سے لپٹ کر بہت دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ شاید اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں کچھ آنسو میرے حصے کے بھی تھے جو وہ آج ہی بہا کر ختم کر دینا چاہتی تھی۔۔۔ ایک مختصر وقفے کے بعد جب غزالہ کے حجلہ عروسی کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا اور

میں نے ان پھولوں کو دیکھا جو میری خاموش محبت کی تربت پر سجائے گئے تھے تو میں اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر میں نے ٹی وی کا سوئچ آف کر دیا۔

O☆O

اگلے روز علی الصباح ہم لاہور روانہ ہو گئے۔ یہ سفر ہم نے پہلے کی طرح بس پر کیا اور جب کنڈکٹر بس نے جگہ جگہ رک کر اور ہر اسٹاپ سے سواریاں اٹھا کر ہمارا ناک میں دم کیا تو زریں گل نے ایک بار پھر کنجوس فرنگیوں کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ ہماری رہائش وسیع و عریض مجتبیٰ پیلس میں ہوئی۔ یہاں بوٹا سنگھ بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ڈیگری بازار کے خستہ حال مکان میں کئی روز گزارنے کے بعد مجتبیٰ پیلس کا پرسکون آرام دہ ماحول اچھا لگا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ آرام سکون صرف ایک دن کے لیے ہے۔ کل مجھے پھر سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔

مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک صاحب ہوائی جہاز کے ذریعے ہم سے پہلے ہی لاہور پہنچ چکے تھے۔ حسب توقع شام کے فوراً بعد مجتبیٰ کنور نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں تھا اور بڑے ایزی موڈ میں بیٹھا تھا۔ شیشے کی منقش تپائی پر بوتل و پیمانہ رکھ رہے تھے۔ مسز زلیخا مجتبیٰ صوفے کے ہتھے پر ہتھیلیاں ٹکائے جھکی ہوئی تھی اور مجتبیٰ سے کوئی بات کر رہی تھی۔ میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ مجتبیٰ نے سر کے اشارے سے مجھے اندر بلا لیا اور بیوی سے مخاطب ہو کر سرد مہری سے بولا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے تم جاؤ۔ بعد میں بات کریں گے۔"

زلیخا خاموشی سے باہر نکل گئی۔ وہ مجتبیٰ کے سامنے ایسے ہی بھیگی بلی بنی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجتبیٰ اسے سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا۔ مجتبیٰ نے مجھے قریب بٹھا لیا اور اشارے سے کہا کہ میں بھی اپنے لیے گلاس لے لوں۔ ان دنوں "گلاس" کے سلسلے میں میری توبہ ٹوٹ چکی تھی۔ میں اپنے آپ سے بہت شرمندہ تھا لیکن جو غم مجھ پر ٹوٹا تھا اس نے مجھے یوں چاروں شانے چت کیا تھا کہ مزاحمت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ میں خود پر بہت جبر کرتا تھا لیکن پھر بھی انگور کی بیٹی کو سامنے دیکھ کر میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ میں نے ایک گلاس میں آتشیں سیال اپنے لیے انڈیل لیا۔

مجتبیٰ نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ بہتر ہے۔ شاید اس لیے کہ دوا باقاعدگی سے کھا رہا ہوں۔ دوا چھوڑوں گا تو پتا چلے گا۔"

وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کل تمہیں حیدر آباد کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اگر چاہو تو اپنے دوست بوٹا سنگھ کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو۔ وہ انڈین ہے لہٰذا انڈیا میں تمہارا مددگار ثابت ہو گا۔"

میں نے کہا "جیسا آپ کا حکم۔"

وہ بولا "تمہارے ذہن میں اب یقیناً یہ سوال ہو گا کہ ہم تمہیں حیدر آباد کے دور دراز سفر پر کیوں بھیج رہے ہیں۔ میں نے اسی سوال کا تفصیلی جواب دینے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ یہ ایک بہت اہم معاملہ ہے۔ اس کا تعلق انہی "منی ایچرز" سے ہے جو تم نے پشاور کے جناح گارڈن میں ماریہ نامی لڑکی سے موصول کیے تھے۔ رال کے دانوں پر بنے ہوئے ان منی ایچرز کا پتا سب سے پہلے پچھلے مہینے کے وسط میں لگا تھا۔ سرحد کا ایک نامی گرامی اسمگلر سرتاج پاشا ہے۔ وہ ایک عرصے سے اپنے قریبی ساتھیوں سمیت روپوش ہے۔ اس کی ایک لڑکی ہے جو باپ کے ساتھ ہی رہتی ہے اور کئی مقدموں میں پولیس کو مطلوب ہے۔ سرتاج پاشا کے آدمیوں نے پچھلے مہینے رات کے وقت پشاور روڈ پر کوئی واردات کرنے کے لیے ایک کار چھینی۔ ٹویوٹا کار کے مالک کو زخمی کر کے کار کی ڈکی میں ہی بند کر دیا گیا تھا۔ اپنی منزل پر پہنچ کر جب ان لوگوں نے ڈکی کھولی تو کار کا مالک زیادہ خون بہنے کی وجہ سے مر چکا تھا۔ وہ کوئی غیر ملکی باشندہ تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا تعلق ایران یا عراق وغیرہ سے ہے۔ اس شخص کی گاڑی سے کانسی کا ایک چھوٹا سا مجسمہ برآمد ہوا۔ یہ مجسمہ لکڑی کے ایک ڈبے میں بند تھا۔ اسی ڈبے میں وہ چھوٹا سا گلابی لفافہ بھی تھا جس میں چنے کی دال کے چند دانے تھے۔ سرتاج پاشا کے آدمیوں نے یہ دونوں اشیا سرتاج پاشا کو دکھائیں۔ مجسمے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ یہ مجسمہ گندھارا آرٹ کا ایک نادر نمونہ تھا اور نوادرات کے ایک بیش قیمت ذخیرے کا حصہ تھا۔ [illegible] کے لگ بھگ استنبول میں اس ذخیرے کی نمائش و نیلامی ہوئی تھی اور ترکی کے ایک بہت بڑے لینڈ لارڈ نے یہ نوادرات خرید لیے تھے۔ اس کے بعد سے اس ذخیرے کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ سرتاج پاشا بین الاقوامی مجرم ہے۔ گئے وقتوں میں بڑے زور شور سے نوادرات کی اسمگلنگ بھی کرتا رہا ہے۔ وہ اس مجسمے کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس کا دھیان فوری طور پر دوسرے گندھارا نوادرات کی طرف بھی گیا۔ عین ممکن تھا کہ جہاں سے کانسی

کا یہ مجسمہ لایا گیا ہے وہیں پر دیگر نوادرات بھی موجود ہوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جس غیر ملکی سے یہ مجسمہ برآمد ہوا اس کا کوئی پتا ٹھکانا معلوم نہیں ہو سکا۔ نہ تو اس کے پاس سے کوئی شناختی کاغذ برآمد ہوا اور نہ ہی کوئی دوسری ایسی شے ملی جس سے اس کے آگے پیچھے کا پتا چلتا۔ جس گاڑی پر وہ جا رہا تھا وہ بھی چوری کی تھی۔ سرتاج پاشا نے بہت سر پٹخا لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا دھیان بار بار رال کے ان دانوں کی طرف جا رہا تھا جو چوبی ڈبے سے مجسمے کے ساتھ ہی برآمد ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ان دانوں کو نوادرات میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ اس چوبی ڈبے سے کیوں برآمد ہوئے تھے۔ شاید کوئی دوسرا شخص ہوتا تو تھک ہار کر بیٹھ جاتا اور ان معمولی دانوں کی اصل حقیقت کبھی نہ کھل سکتی لیکن وہ پاشا تھا۔ وہ مسلسل ٹوہ میں لگا رہا۔ آخر ایک روز اس پر یہ انکشاف ہوا کہ رال کے ان دانوں پر ایک تحریر موجود ہے۔ یہ تحریر پاشا ایک محدب عدسے سے دیکھ پایا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ تحریر کسی نامعلوم زبان میں تھی۔ پاشا ایک بار پھر وہیں کھڑا تھا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن تحریر اس کے پلے نہیں پڑی نہ ہی کوئی دوسرا بتا سکا کہ یہ کیا لکھا ہے اور کس زبان میں ہے۔

سرتاج پاشا بہت جہاندیدہ شخص ہے۔ بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ مجسمے اور اس کے ساتھ ملنے والی تحریر سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی کئی مجبوریاں تھیں۔ جن میں سب سے بڑی مجبوری تو یہی تھی کہ پولیس اس کے پیچھے تھی اور وہ آزادانہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس پراسرار تحریر کو فروخت کر دے گا۔ اسے امریکا اور یورپ کے کئی ایسے افراد کا پتا تھا جو نوادرات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مسٹر جی کلارک کا نام ان میں سے اہم ترین ہے۔ سرتاج پاشا نے مسٹر جی کلارک کے اسسٹنٹ ڈیوز سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ اس کے پاس مسٹر جی کلارک کو فروخت کرنے کے لیے ایک بہت اہم چیز موجود ہے۔ جب مسٹر جی کلارک کی طرف سے دلچسپی ظاہر کی گئی تو سرتاج پاشا نے مجسمے کی تصویر اور اس کے ساتھ برآمد ہونے والے رال کے دانوں میں سے دو دانے نمونے کے طور پر مسٹر جی کلارک کو بھجوا دیے۔

چند دن کے اندر مسٹر جی کلارک صاحب کے ساتھ سرتاج پاشا کا معاملہ طے ہو گیا۔ ایک معقول رقم کے عوض مسٹر جی کلارک نے وہ تحریر پاشا سے خرید لی جو رال کے دانوں پر منی ایچرز کی شکل میں لکھی گئی تھی۔ تاہم کانسی کا وہ ننھا سا مجسمہ سرتاج پاشا نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اس معاملے میں گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے مسٹر جی کلارک پاکستان پہنچ گئے۔ جیسے کہ تم جانتے ہو' مجھے مسٹر جی کلارک صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ جی کلارک صاحب مجھے بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں تین چار دفعہ ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ بہت نائس آدمی ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر تمہیں اندازہ ہو گا کہ ان کے اندر کتنے بڑے دل و دماغ کا آدمی چھپا ہوا ہے۔"

چند لمحے توقف کر کے مجتبیٰ کنور نے نیا سگار سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "جیسا کہ میں نے بتایا ہے سرتاج پاشا مفرور ہے' اس کے لیے ضروری تھا کہ احتیاط سے کام لیتا۔ وہ اس سودے میں ایک بار بھی سامنے نہیں آیا۔ اس نے جس احتیاط سے رقم وصول کی اسی احتیاط سے منی ایچرز والی تحریر بھی مسٹر جی کلارک کے حوالے کی۔ رال کے کل دانوں کی تعداد سات ہے۔ ان پر باقاعدہ نمبرز لگے ہوئے ہیں۔ دو دانے تو سرتاج پاشا پہلے ہی نمونے کے طور پر جی کلارک صاحب کو بھیج چکا تھا۔ باقی کے پانچ دانے تم نے جناح گارڈن میں جا کر وصول کیے۔ سرتاج پاشا کی ہدایات تھیں کہ ہمارا آدمی مقررہ لباس اور مقررہ اوقات میں جناح گارڈن کے اندر گھومتا رہے۔ مناسب موقع دیکھ کر رال کے دانوں والا گلابی لفافہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ ماریہ نامی جس لڑکی نے گلابی لفافہ تم تک پہنچایا وہ سرتاج پاشا کی بیٹی ہے۔ اس کا اصل نام لالہ رخ ہے۔ وہ بہت آفت لڑکی ہے۔ اس کی ہوشیاری کا تھوڑا سا اندازہ تمہیں جناح گارڈن میں ہی ہو گیا ہو گا۔ جب تمہارے گرد لوگوں کا ہجوم ہو گیا تو وہ بڑی چابک دستی سے گلابی لفافہ تمہاری جیب میں ڈال کر غائب ہو گئی تھی۔ خیر اس لڑکی کا ذکر چھیڑا تو بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ میں منی ایچرز کی شکل میں لکھی گئی تحریر کا ذکر کر رہا تھا۔ مسٹر جی کلارک کے رابطے اور وسائل لامحدود ہیں۔ ان کے پاس تندہی سے کام کرنے والوں کا ایسا "نیٹ ورک" ہے کہ ایک مقررہ وقت میں بڑے سے بڑا ٹارگٹ حاصل کرنا بھی ان کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ ان کے کارندوں نے چند روز کے اندر معلوم کر لیا کہ وہ کون سا شخص ہے جو منی ایچرز کی ناقابل فہم تحریر پڑھنے میں ان کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ جاپان کا مسٹر شارٹ تھا۔ جب مسٹر شارٹ کو کھوجا گیا تو پتا چلا کہ وہ تو پاکستان میں شفٹ ہو چکا ہے اور کسی الگ تھلگ پہاڑی مقام پر رہائش رکھے ہوئے ہے۔

مسٹر جی کلارک نے پاکستان آنے سے قبل ہی میرے ذمے یہ کام لگا دیا تھا کہ مسٹر شاذ کا کھوج لگاؤں اور معلوم کروں کہ اس آتش مزاج مولوی بڈھے سے کس طرح مطلب نکالا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ساری بات سمجھ میں آ گئی ہو گی اور یہ بھی پتا چل گیا ہو گا کہ اس رات مسٹر جی کلارک تمہیں اور سلطان آذر کو لے کر مسٹر شاذ کے پاس کیوں کر پہنچے تھے۔ درحقیقت ان سے منی ایچرز والی تحریر پڑھوائی گئی ہے۔ یہ تحریر فارسی اور روسی سے ملتی جلتی کسی زبان میں ہے۔ مسٹر جی کلارک کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ان دونوں زبانوں کی کوئی بگڑی ہوئی شکل ہو اور بحیرۂ کیسپئن کے کسی ساحلی علاقے میں بولی جاتی ہو۔ بہر حال اس زبان پر اس فارسی کا رنگ غالب ہے جو ایران کے انتہائی شمال میں بولی جاتی ہے۔ لہٰذا سوچا جا سکتا ہے کہ اس تحریر کی منزل ایران ہی کا کوئی علاقہ ہو۔ یہ کوئی ایسی معروف زبان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرتاج پاشا اسے پڑھوانے میں ناکام رہا تھا اور سرتاج پاشا ہی نہیں شروع میں جی کلارک کو بھی ناکامی ہوئی تھی۔ وہ تو کسی طرح انہیں مسٹر شاذ کے بارے میں معلوم ہو گیا اور وہ قسمت آزمائی کے لیے پاکستان پہنچ گئے۔ مسٹر شاذ بہت پڑھا لکھا شخص ہے 'مختلف زبانیں سیکھنا اور ان کے بارے میں معلومات رکھنا مسٹر شاذ کا بہت پرانا مشغلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تیس کے قریب زبانیں جانتا ہے اور دنیا میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کے بارے میں اسے معلومات حاصل ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر شاذ واقعی بہت ذہین شخص نظر آتے ہیں۔ جب وہ منی ایچرز والی تحریر پڑھ رہے تھے' میں نے انہیں دیکھا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر انہوں نے تمام الفاظ کا ترجمہ کر کے کاغذ پر لکھ دیا تھا۔"

مجتبیٰ کنور نے کہا۔ "وہ تحریر صرف تین فقروں پر مشتمل ہے اور یوں ہے" شوریز! میگاسی کے تمام کے تمام ۳۴۸ نوادر ہندوستان کے شہر حیدر آباد میں نواب شہریار جنگ کی رہائش گاہ میں موجود ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ جلد پہنچو۔ گو ناب راحدی" یہ کل تیس کے قریب لفظ ہیں۔ والی کے بروانے پر اوسطاً چار پانچ لفظ ہیں' ہر دانے پر ایک نمبر لکھا ہوا ہے یوں ان دانوں کو ترتیب کے ساتھ پڑھنے سے تحریر سمجھ میں آ جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "جناب! شوریز نامی یہ شخص کون ہو سکتا ہے۔ نام سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایران یا عراق کے علاقے کا ہی باشندہ ہو گا۔"

مجتبیٰ نے گلاس سے چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ باتیں وضاحت طلب ہیں۔ قیاس یہی ہے کہ کار کی زد میں مرنے والا شخص کانسی کا مجسمہ اور منی ایچرز والا پیغام لے کر حیدر آباد سے اس شوریز نامی شخص کے پاس ایران جا رہا تھا۔ پاکستان سے گزرتے ہوئے وہ شومیٔ قسمت سرتاج پاشا کے ہتھے چڑھ گیا اور یوں وہ پیغام جو کسی شوریز نامی شخص کے پاس پہنچنا تھا بھٹک کر مسٹر جی کلارک کے پاس جا پہنچا۔" ایک لمحہ توقف کر کے مجتبیٰ کنور نے کش لیا اور صوفے پر قریباً نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "شاہ جہاں! کہتے ہیں شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے۔ تم دیکھتے اور سونے چاندی کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یہ بھی اس سے ملتا جلتا معاملہ نکل آیا ہے لیکن وہ ایک چھوٹا سا کھیل تھا' زیادہ سے زیادہ چند کروڑ کی بات ہو گی یہ کروڑوں سے آگے کی بات ہے۔ بے حساب مال ہے اس چکر میں۔ نوادرات کے شوقینوں کے لیے "میگاسی کے نوادر" ایک جانا پہچانا نام ہے۔ میں تمہیں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ اس ذخیرے میں تانبے کی ایک منقش صراحی ہے جس کے ساتھ تانبے کا ہی ایک گلاس زنجیر کے ذریعے منسلک ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے استنبول میں اس "سیٹ" کی قیمت بیس ہزار پونڈ لگی تھی۔"

اس موضوع پر میرے اور مجتبیٰ کنور کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران یہ بھی واضح ہو گیا کہ مجتبیٰ کنور مجھ سے کیا کام لینا چاہ رہا ہے۔ مسٹر جی کلارک جلد از جلد حیدر آباد پہنچنا چاہ رہے تھے لیکن ان کی روانگی سے قبل مجھے ہراول دستے کے طور پر وہاں بھیجا جا رہا تھا۔ میرے ذمے یہ کام تھا کہ نواب شہریار جنگ کا پورا "ڈاٹا" معلوم کروں۔ اس شخص کے مزاج' حلقۂ احباب' کاروبار اور دیگر مصروفیات کے بارے میں کم سے کم وقت میں جتنی بھی زیادہ سے زیادہ معلومات مل سکیں حاصل کروں اور ایک ہفتے کے اندر اندر رپورٹ دوں۔

میں نے سوچا کہ اس کام کے لیے مجتبیٰ کنور بدنام زمانہ شنکر شکرا یا اس کے کسی ساتھی کو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ وہ لوگ اس لحاظ سے زیادہ موزوں تھے کہ بھارت ہی کے رہنے والے تھے اور انہیں اپنے کام کے سلسلے میں آسانیاں میسر ہو سکتی تھیں۔ غالباً مجتبیٰ کنور نے شنکر شکرا یا اس کے کسی ساتھی کو اس لیے زحمت نہیں دی تھی کہ عیسیٰ جان والے واقعے کے بعد وہ قادر زماں اور شنکر وغیرہ کی طرف سے محتاط ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ قادر زماں' عیسیٰ اور شنکر شکرا کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جس طرح

قادر زماں نے گلنار کالونی والے واقعے میں عیسیٰ جان کو زمیل دینے کی کوشش کی تھی اسی طرح شنکر شکرا کی وفاداری بھی کسی موقعے پر ڈانواں ڈول ہو سکتی تھی۔ (جیسا کہ آنے والے دنوں میں معلوم ہوا عیسیٰ جان والے واقعے نے مجتبیٰ کنور اور قادر زماں و شنکر شکرا کے تعلقات میں پہلے جیسی گرمجوشی باقی نہیں رہنے دی تھی) ویسے بھی عیسیٰ جان والا واقعہ اتنا شرمناک ثابت ہوا تھا کہ کوئی باہوش سیاست داں کسی بھی حیثیت سے اس میں ملوث ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ متویہ ایئر ہوسٹسز نے لرزہ خیز بیانات دیے تھے۔ ان بیانات کے مطابق عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی ان کے ساتھ نہ صرف بدترین سلوک کرتے رہے تھے بلکہ اس سلوک کی رنگین تصویریں بھی کھینچا کرتے تھے۔ ایک ماہر انگریز فوٹو گرافر اسی کام سے یہاں آیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دل ہلا دینے والے انکشافات تھے جو ان لڑکیوں نے کیے تھے۔ اس کیس کی سماعت ابھی جاری تھی۔

میرے اور بوٹا سنگھ کے تمام کاغذات تیار تھے۔ ہمیں فرضی ناموں سے سفر کرنا تھا۔ ہمارے پاسپورٹوں پر ویزے لگ چکے تھے۔ فارن ایکسچینج کا اندراج ہو چکا تھا۔ لاہور سے دہلی تک کے ہوائی ٹکٹ بھی کنفرم تھے۔ کسی وجہ سے سابقہ پروگرام منسوخ کر دیا گیا تھا۔ اب ہمیں بذریعہ سڑک اٹاری واہگہ سے بھارت میں داخل ہونے کے بجائے بائی ایئر لاہور سے دہلی جانا تھا۔ دہلی سے آگے میں اپنا لائحۂ عمل تیار کرنے کے لیے آزاد تھا۔ مجتبیٰ کنور یا مسٹر جی کلارک کی طرف سے مجھ پر کسی طرح کی پابندی نہیں لگائی گئی تھی اور نہ ہی ہدایت جاری کی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے میری ذات پر اعتبار کا اظہار تھا۔

حیدر آباد روانگی سے پہلے میں ایک مرتبہ شفتا سے ملنا چاہتا تھا۔ جونہی مجتبیٰ کنور نے مجھے فارغ کیا' میں نے گیراج سے وہی دیوہیکل "بی ایم ڈبلیو" موٹر سائیکل نکالی جو پشاور جانے سے پہلے میرے زیر استعمال رہی تھی۔ میں پینٹ قمیص میں تھا۔ قمیص پر جیکٹ اور سر پر فل ہیلمٹ تھا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی۔ میں مجتبیٰ پیلس سے نکلا اور کشادہ سڑکوں کو روندتا ہوا "گلبرگ" کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساہی صاحب کی کوٹھی اسی علاقے میں تھی۔ جب میں فیروز پور روڈ سے گزر رہا تھا تو ایک ٹریفک سارجنٹ نے باقاعدہ مجھے سلام کیا۔ غالباً وہ مجتبیٰ پیلس کی اس شاندار چمکتی دمکتی موٹر سائیکل کو پہچانتا تھا۔ نہر کے کنارے سے شارٹ کٹ لگا کر میں تھوڑی ہی دیر میں رجال ساہی صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ رہائش گاہ کے پہلو سے گزرتے ہوئے ایک پرانا زخم اچانک تازہ ہو گیا۔ یہی نیم تاریک سڑک تھی جہاں سے ایک مرتبہ غزالہ مجھے نیلی اسٹیشن ویگن میں ڈال کر لے گئی تھی اور کئی روز مری کے ایک کاٹیج میں ہم دونوں اکیلے رہے تھے۔ میرا دل نرم کرنے کی وہ غالباً آخری کوششیں تھیں جو غزالہ نے کی تھیں۔

میں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع اندر پہنچائی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نشست گاہ میں فریال کے سامنے بیٹھا تھا۔ میری آمد پر فریال کی آنکھوں سے خوشی چھلکنے لگی تھی۔ غالباً وہ یہی سمجھی تھی کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے اس کی یہ خوش فہمی برقرار رہنے دی۔ تاہم باتوں باتوں میں یہ بھی دریافت کر لیا کہ ساہی صاحب کہاں ہیں اور اگر میں شفتا اور انجم سے ملنا چاہوں تو اس کا کیا طریقہ ہے۔ فریال نے صاف گوئی سے کہا۔ "شفتا اور انجم سے تو آپ کو پاپا ہی ملا سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں ان کے سوا کسی کو کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ پاپا مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتے لیکن اس سلسلے میں انہوں نے مجھے بھی بے خبر رکھا ہوا ہے۔ ممی کی طبیعت ان دنوں کچھ سنبھلی ہوئی ہے۔ پاپا انہیں لے کر کراچی گئے ہیں۔ وہاں انہوں نے ایک شادی میں بھی شرکت کرنی ہے۔ وہ کل شام تک آ جائیں گے۔"

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ کل شام آ بھی جاتے تو کیا فائدہ تھا۔ لاہور سے سہ پہر تین بجے ہماری فلائٹ تھی۔ فریال نے میرے چہرے پر مایوسی دیکھی تو فوراً بولی۔ "کیا بات ہے۔ آپ کا چہرا ایک دم بجھ سا گیا ہے۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا اور دل ہی دل میں اس کی معاملہ فہمی کو کوسا۔

وہ کچھ دیر تیز نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "مایوسی کی کیا بات ہے۔ شفتا سے ہی ملنا ہے نا۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں ایک آدھ دن مزید کر لیں۔۔۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کہیں جا رہے ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں" میں نے فوراً نودرو شور سے تردید کی۔ معلوم نہیں اسے یقین آیا یا نہیں تاہم اس دوران اس کی نگاہ اپنے پرس پر پڑ گئی جو اس نے تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ پرس کھول کر اس نے اندر سے ایک کاغذ نکال لیا۔ بولی "میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر افتخار رندھاوا صاحب کے پاس سے آ رہی ہوں۔ امراض سینہ میں اس وقت پاکستان کے نمبر ون ڈاکٹر ہیں۔ کل ساڑھے آٹھ بجے رات ہمارا ان سے ٹائم

ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تسلی کے لیے آپ ایک بار انہیں بھی دکھالیں۔"

اس کے بعد وہ میرے لیے آرام اور اچھی خوراک کی اہمیت پر لمبا چوڑا لیکچر دینے لگی۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ دو تین ہفتے تک میں صرف چارپائی اور روٹیاں توڑوں، میرے حصے کے اگر کوئی ضروری کام ہیں تو وہ فریال خود کرے گی یا دوسروں سے کروادے گی۔ اس موقعے پر اگر میں اپنی شامت اعمال کے نتیجے میں بتا بیٹھتا کہ کل سہ پہر میں دہلی اور دہلی سے حیدر آباد روانہ ہو رہا ہوں تو وہ مجھے گولی مار دیتی یا فرطِ غضب میں اپنی جان لے لیتی۔ میرے دل کے کسی کونے کھدرے میں اگر یہ خیال تھا بھی کہ میں فریال کو اپنی روانگی سے آگاہ کردوں تو اس کی باتیں سن کر میں نے توبہ کرلی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ اپنی بے پناہ اپنائیت اور پُرخلوص رویے کے ساتھ دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی تھی۔ اس کی بے ساختگی مجھے شروع سے اچھی لگتی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اب کچھ دنوں سے اس بے ساختگی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس کے رویے میں ایک جھجک اور شرم سی راہ پا رہی تھی۔ اس کے گریبان کے بالائی بٹن جو اکثر کھلے رہتے تھے آج بند تھے دوپٹا جو اس کے پاؤں میں پڑا رہتا تھا اب گاہے گاہے سینے پر نظر آ رہا تھا۔ مجھے چھوتے ہوئے وہ ایک ساعت کے لیے ٹھٹک سی جاتی تھی۔

مجھ سے پوچھنے لگی۔ "کل شام آپ نے کہیں جانا تو نہیں؟"

"ہُن۔۔۔ نہیں" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

وہ بولی۔ "ٹھیک ہے۔ پھر ایسا کرتے ہیں میں چھ بجے کے لگ بھگ گاڑی لے کر مجتبیٰ پیلس آجاؤں گی۔ میں آپ کو اپنی ایک سہیلی سے ملوانا چاہتی ہوں۔ بہت دنوں سے اصرار کر رہی ہے وہ۔ اس کے ہاں اکٹھے چائے پئیں گے پھر وہیں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف نکل چلیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سہیلی صاحبہ کیوں ملنا چاہتی ہیں مجھ سے؟ ضرور تم نے میری تعریفیں کی ہوں گی۔ وہ غائبانہ پرستار ہو گئی ہو گی۔"

"بہت خوش فہمیاں ہیں آپ کو اپنے بارے میں" وہ شوخی سے بولی۔ "کوئی ایسی رومانسو قسم کی چیز نہیں ہیں آپ۔ بس جیسے عام لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی ہیں۔"

"اور عام لوگ کیسے ہوتے ہیں۔"

"جیسے آپ ہیں۔" وہ شوخی سے بولی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا رہا تھا۔ یہ رنگ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

"کوئی اور بات کرنی ہے یا میں چلوں؟" میں نے پو

"توبہ ہے۔ ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے آپ کو۔ ایک ہی موقع پر سستی دکھائی ہے آپ نے" وہ معنی میں بولی۔

وہ بات کا رُخ پھر فریال کے کربناک ذکر کی طرف رہی تھی۔ میرا دل ایک دم بجھ سا گیا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔" میں نے اپنی جگہ سے ہوئے کہا۔

اس نے جہاندیدہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھا اور کیفیت بھانپ کر بولی۔ "کیا ہوا؟ پھر ایک دم آپ کی گئی ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا بابا۔۔۔ سوری" اس نے بے تکلفی سے ہا دیے۔

میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر کہا۔ "اب میں چلوں؟"

وہ بولی۔ "ضرور چلے جائیے لیکن کل پانچ بجے تک بالکل تیار رہنا ہے۔ ہوسکتا ہے میں پانچ بجے سے پہ آجاؤں۔ ٹھیک ہے؟"

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آئی کہ اس صاف کہہ دوں۔ اسے بتا دوں کل پانچ بجے میں دہلی میں گا لیکن اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو ہمت نہیں ہوئی۔ میں سوچا کل ٹیلی فون پر اسے آگاہ کردوں گا۔ لیکن اگلے ر مصروف وقت گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ چار بجے کے بھگ جب ہمارا جہاز لاہور ائرپورٹ سے فضا میں بلن اور لاہور کے بام و در نظر آئے تو مجھے یاد آیا کہ میں نے کو اطلاع دینا تھی۔ مجھے لگا جیسے میں بے حس سا ہو گیا ہو۔ شاید یہ اس چوٹ کا اثر تھا جو فریال کے سبب میرے د لگی تھی اور جس کی شدت نے مجھے سُن کر دیا تھا، ورنہ ایسا تو نہیں تھا کہ فریال جیسی ہمدرد و غمگسار لڑکی کو یوں نظرانداز کر دیتا۔ اس نے میرے لیے کیا نہیں کیا تھا کیا کچھ نہیں کر رہی تھی لیکن میں نے ملک چھوڑتے ہو اسے آگاہ تک نہیں کیا تھا۔

پانچ بجے ہم دہلی ائرپورٹ پر تھے۔ میں نے اپنے چہرے پر معمولی سی تبدیلیاں کی تھیں یہ تبدیلیاں پلاسٹک سرجری میک اپ وغیرہ کی مرہون منت نہیں تھیں۔ بالکل سیدھے سادے آسان طریقے سے کوئی بھی شخص اپنے خدوخال ایسی تبدیلیاں کر سکتا ہے اور اپنے جان پہچان والے لوگوں

ن میں ڈال سکتا ہے۔ بازار سے ایسے کیمیکل باآسانی مل جاتے ہیں جن سے بالوں کا رنگ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ناک کے نتھنوں میں چھوٹے چھوٹے اسپرنگ پھنسا دیے جائیں تو اس کے ساتھ ساتھ پورے چہرے کی بناوٹ تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک کاپی سائز کے کاغذ کو مسلسل تہ کر کے قریباً ایک مربع کی گدی کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ایسی دو گدیاں لوں میں دبائی جاتی ہیں۔ اس سے چہرہ موٹا نظر آنے ہے۔ ایسی ہی ایک گدی کے دو ٹکڑے کیے جاتے ہیں انھیں بالائی ہونٹ کے نیچے مسوڑھوں کے ساتھ چپکا لیا ہے۔ یہ گدیاں بول چال میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں یں۔ ان معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اگر عینک لگا لی جائے بالوں کا اسٹائل بدل لیا جائے تو قریبی جاننے والا بھی ل میں پڑ سکتا ہے۔ میں نے بھی چند ایسے ہی نسخوں سے ے میں تبدیلی پیدا کر رکھی تھی۔ بوٹا سنگھ اپنے اصلی خدوخال میں تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے ۔۔۔ غالباً ۔۔۔ کئی ماہ بعد منہ ہاتھ دھونے کی زحمت کی تھی اور صاف کپڑے ے تھے۔ یہ کپڑے، دھوتی، کرتا، واسکٹ اور پگڑی پر مشتمل تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم ائرپورٹ پر اترتے ہی ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئے اور رات دس بجے کے لگ بھگ اس ٹرین پر بیٹھ گئے جس نے براستہ آگرہ، بھوپال و پور ہمیں حیدر آباد پہنچانا تھا۔ یہ وسطی بھارت کا ایک طویل صبر آزما سفر تھا۔ ٹرین نے کافی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا پھر ی ہم پچاس گھنٹے میں حیدر آباد پہنچ سکے۔ ہمیں پر تو ہل گئے تھے مزا بوٹا سنگھ تو بھوپال سے ایسا سویا کہ حیدر آباد کے قرب و ار میں جا کر اٹھا۔ یقیناً یہ ان سرخ کیپسولوں کا کرشمہ تھا جو ہ گاہے گاہے کھاتا رہتا تھا۔

ہم دوپہر کے وقت حیدر آباد کے وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن سے برآمد ہوئے تو یوں لگا کہ ریل میں عمر قید کی سزا اٹ کر نکلے ہیں۔ حیدر آباد کا عظیم الشان شہر ہمارے روبرو تھا۔ تہذیب و تمدن کا گہوارا۔ ایک پرشکوہ ماضی کا وارث، ایک شہر ہزار داستان۔ یہاں کے در و دیوار میں لازوال کہانیاں گندھی ہوئی تھیں۔ اپنی ساڑھے چار سو سالہ تاریخ میں اس شہر نے بہت سے حوادث کا مقابلہ کیا تھا۔ کبھی فرانسیسیوں کی ریشہ دوانیاں، کبھی انگریزوں کی یورش، کبھی اندرونی سازشیں اور پھر انگریزوں سے آزادی کے بعد کانگریس کا غاصبانہ تسلط۔ حیدر آباد نے یہ سب کچھ جھیلا تھا اور "حیدر آباد" ہی رہا تھا۔ زندگی اور رعنائی سے معمور، محبت اور وضع داری سے بھرپور، قدامت اور جدت کے حسین رنگوں سے سجا ہوا۔ میں نے دیکھا حیدر آباد شہر کے آسمان پر اب بھی رنگین پتنگیں اڑ رہی تھیں، کبوتر محو پرواز تھے اور بالکونیوں میں وہ حسین آنچل لہرا رہے تھے جو شعر و ادب کے خاکوں میں رنگ بھرتے ہیں۔

ریل میں ہی ہماری ملاقات میر عثمان علی نامی ایک خوش پوش شخص سے ہو گئی تھی۔ کڑھائی دار پاجامہ، قمیص اور حیدر آبادی ٹوپی والا وہ ایک درمیانی عمر کا دفتری ملازم تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں اور گھنٹوں کی رفاقت میں برسوں کی شناسائی پیدا کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر دوران سفر ایسے لوگ بڑی "فارم" میں نظر آتے ہیں۔ میر عثمان آگرہ کے اسٹیشن سے ریل میں سوار ہوا تھا۔ حیدر آباد تک اس سے قریباً تیس گھنٹے ہمارا ساتھ رہا۔ ان تیس گھنٹوں میں ہی میر عثمان نے اپنا پورا ماضی حال اور مستقبل ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ مجھے اور بوٹا سنگھ کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہم اس شخص کو جنم جنم سے جانتے ہیں اور اسے ہی نہیں اس کے رشتے داروں کو ان کی اولادوں کو اولادوں کے مشاغل کو اور ان کی مصروفیات و دلچسپیوں کو بھی جانتے ہیں۔

میر عثمان "افضل گنج" کے علاقے میں اپنے پانچ مرلے کے مکان میں دو بیویوں اور پانچ بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہمیں ریلوے اسٹیشن سے سیدھا اپنے گھر ہی لے گیا۔ میں نے اپنا تعارف اخبار نویس کی حیثیت سے کرایا تھا اور میر عثمان کو بتایا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس میں ان خونی واقعات کا ذکر ہوگا جو حیدر آباد میں ۱۹۴۸ میں پیش آئے۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ لوگوں سے ملنا ہے اور انٹرویو وغیرہ بھی لینے ہیں۔

میر عثمان نے ذرا حیران ہو کر کہا تھا۔ "آپ نے عجیب سی باتاں کی ہے۔ یہ اخبار والا لوگاں تو دبلا پتلا دھان پان ہوتیں ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ تگڑا آدمی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تگڑے اور دبلے پتلے دونوں قسم کے لوگ اخبار میں ہوتے ہیں۔ میں دونوں طرح کا نمونہ لے کر آیا ہوں۔ یہ بوٹا سنگھ ہے۔ اس کو دیکھ لو، یہ بھی اخبار میں ہی ہے۔"

"یہ تو بہت اچ کمزور ہیں۔" میر عثمان نے معترف ہو کر کہا تھا۔ "حضت (حضرت) یہ اخبار میں کیا کرتے ہوئیں گے۔ یہ تو میری طرح زیادہ پڑھے لکھے بھی نظر نہیں آتے۔"

"یہ اسٹور کیپر ہیں۔" میں نے جان چھڑائی تھی۔

میر عثمان کا گھر میر عثمان ہی کی طرح صاف ستھرا تھا۔ وہ

پیروں والے گھر کو اتنا صاف ستھرا اور پرسکون دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ بوٹا سنگھ کو شک گزرا کہ میزبان کی دوسری بیوی ضرور اپنے بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوگی۔ رات کو میر عثمان نے ہمیں اپنی ہمت کے مطابق پُر تکلف کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد خوشبودار چائے کا دور ہوا۔ میر عثمان سے نواب شہریار جنگ کا تذکرہ میں نے سفر کے دوران ہی کر دیا تھا۔ میر عثمان نواب شہریار جنگ کو جانتا تھا۔ تاہم اس نے یہ وضاحت کی کہ نواب شہریار حیدر آباد شہر میں نہیں مضافاتی علاقے میں رہتے ہیں۔ بڑی نہر کے ساتھ ساتھ ان کی بہت سی زمینیں ہیں اور کئی بڑے بڑے فارم ہیں۔ چائے کے دور کے دوران میں نے باتوں باتوں میں پھر نواب شہریار کی بات چھیڑ دی۔

میر عثمان نے حیدر آبادی لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے کہ آپ سب سے پہلے نواب شہریار سے اچ ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ضروری تو نہیں لیکن نواب صاحب کا نام پہلے بھی سنا ہوا ہے اور میرے ایڈیٹر نے بتایا تھا کہ نواب صاحب کے والد نے سقوط حیدر آباد کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لہٰذا ان سے ملنے کا شوق بھی ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کل اچ چلتے ہیں۔ دفتر میں ابھی دو دن کا چھٹی باقی ہے۔ ہور نہ بھی ہوتا تو آپ کا میزبانی تو کرنا ہے۔ ہم جیسے لوگاں کے لیے میزبانی عبادتاں سے کم نہیں ہوتا۔"

میں نے نواب شہریار کے بارے میں مزید کچھ لینے کی کوشش کی۔ میر عثمان نے بتایا کہ نواب بے حد امیر کبیر آدمی ہے۔ سنا ہے کہ وہ ایک لباس دوسری بار نہیں پہنتا۔ اس کے پاس بہترین گھوڑے ہیں' اور شکاری کتے ہیں جن کو مچھلیاں کھلایا جاتا ہے اور بادام پلائے جاتے ہیں۔ اس کی زمینیں بہت زرخیز ہیں۔ کھیتوں اور باغات میں سیکڑوں لوگ کام کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عام طور پر پولیس نواب شہریار جنگ کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی اور نواب کی جاگیر میں جو دیہات شامل ہیں وہاں کے لوگوں کے فیصلے وہ خود کرتا ہے۔

میر عثمان نے کہا۔ "میں نے دو تین بار نواب شہریار کو حیدر آباد کی سڑکوں سے گزرتے دیکھا ہے۔ اس کی سواری کا ٹھاٹھ باٹھ اچ اور ہوتا ہے۔ لگتا ہے نواب نہیں جا رہا چیف منسٹر جا رہا ہے۔ آگے پیچھے موٹر سائیکل ہوئیں گا۔ موٹر سائیکل پر وردی والا گارڈ۔ یہ نہیں ہاتھاں لمبی کار۔ سب سے آگے ایک بے چھت کی گاڑی جو سائرن بجاتی جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہ انگریز کے وقت کی گاڑی ہے اور نواب صاحب کے والد مرحوم کو سر والا نے تحفے میں دی تھی۔"

رات ہم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میر عثمان کی باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ وہ ہمارے تو بچھا چلا جا رہا تھا۔ رات گئے اس نے ہمیں چائے کی ایک آخری پیالی پلائی۔ سونف سپاری اور حیدر آبادی سفوف ہمیں چبوایا اور بمشکل سونے کی دی۔ بہت باتونی شخص تھا وہ اور بات بھی اونچے سُر کرتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ گلے میں لاؤڈ اسپیکر فٹ بھی گیا تھا مگر لگ رہا تھا ابھی تک بول رہا ہے۔ اس کی تیکھی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔

ابھی مجھے اور بوٹا سنگھ کو بستر پر لیٹے ہوئے پانچ ہی منٹ ہوئے تھے کہ بیرونی دروازے کی طرف سے تیز کی آوازیں آئیں۔ پھر یوں لگا کہ کچھ لوگ زبردستی گھس آئے ہیں۔ میر عثمان ان کی مزاحمت کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گھر میں گھسنے والوں کا تعلق پولیس سے ہے۔ میرے اور بوٹا سنگھ کے لیے یہ شدید خطرے کی گھنٹی تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار تکیے کے نیچے رینگ گیا جہاں "بریٹا" کا پستول موجود تھا۔ بوٹا سنگھ کے پاس بھی ایک تھا۔ صحن سے بلند ہونے والا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شور میں کسی عورت کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔ یہ میر عثمان کی بیوی تھی پھر کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم دونوں اچھل کر بستروں سے نیچے اتر آئے۔ بوٹا سنگھ کے پتلے کمزور جسم میں جیسے اچانک ہی بجلیاں بھر گئیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں انگارے دہک رہی تھیں۔ دروازے کی دوسری جانب میر عثمان تھا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم دروازہ کھول دیں۔ دروازہ کھولنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے کنڈی گرا دی۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اور بوٹا سنگھ نے ہتھیار چھپا لیے تھے۔ سامنے میر عثمان کے علاوہ چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کی وردی میں تھا۔ چاروں ہٹے کٹے اور شکلوں سے خطرناک نظر آتے تھے۔ پولیس والے کے ہاتھ میں ۳۸ بور کا ریوالور تھا۔ لگتا تھا کہ باقی افراد بھی مسلح ہیں تاہم انھوں نے اپنے ہتھیار ظاہر نہیں کیے تھے۔

میر عثمان نے پولیس آفیسر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "صاحب دیکھ لو' صحیح سے دیکھ لو۔ بس یہ دو صحافی ہیں۔ کوئی چور ڈاکو نہیں ہے۔ ہور نہ اچ ہم نے یہاں کچھ چھپا رکھا ہے۔"

پولیس والا جو انسپکٹر تھا تفتیشی نظروں سے

"کون ہو تم دونوں اور کہاں سے آئے ہو؟" اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

"ہم اخبار نویس ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "دہلی کے ہفت روزہ 'سیاست' میں کام کرتے ہیں۔ میں کالم نگار ہوں' میرا نام ولی جوشی ہے۔ یہ میرا ساتھی ہرنام سنگھ ہے۔"

ہم دونوں نے "پریس کارڈ" نکال کر انسپکٹر کو دکھائے۔ دیگر کاغذات کی طرح یہ کارڈ بھی جعلی تھے اور یہ بھی چراغ کے جن خدا بخش نے ہمیں مہیا کیے تھے۔ توقع کے برعکس انسپکٹر کارڈ دیکھ کر ذرا مرعوب نہیں ہوا۔ دشمن گرج سے بولا۔ "تم دونوں کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ مجھے یہ کارڈ جعلی معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔ ہم معزز شہری ہیں اور صحافت کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیب کترے نہیں ہیں کہ آپ اس طرح آدھی رات کو اٹھا کر تھانے لے جائیں۔"

"کسی کی پیشانی پر کچھ نہیں لکھا ہوتا۔" انسپکٹر نے طنز سے کہا۔ پھر "پریس" والوں کو ایک مشترکہ گالی دے کر بولا۔ "ایسے کاوڈا تو چماروں کے لونڈے بھی اٹھائے پھرتے ہیں۔ جیسی چماروں کے لونڈوں میں اور ہم میں تمھیں کوئی فرق نہیں آتا۔"

"بکو مت۔ چلو آگے لگو۔" انسپکٹر کے تیور اب بدلے نظر آتے تھے۔ ایک شلوار قمیص والا آگے بڑھا اور اس نے بوٹا سنگھ کو گدی سے تھام لیا۔ بوٹا سنگھ نے کمال پھرتی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ یک لخت کمرے کی فضا سنگین تر ہو گئی۔ یوں لگا کہ انسپکٹر اور اس کے ساتھی ابھی ہم پر پل پڑیں گے۔

میر عثمان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے میرا بازو تھاما اور مجھے ایک طرف لے گیا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ مجھے کسی فساد سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا اور کہے گا کہ ہمیں ان کے ساتھ تھانے چلے جانا چاہیے لیکن اس نے ایک عجیب سی بات کی۔ آہستگی سے بولا۔ "بھائی صاحب! مجھے یہ معاملہ خطرناک چکر لگ رہا ہے۔ مجھے شک (شک) پڑتا ہے کہ یہ پولیس والا نہیں ہے۔ میں نے اس بندے کی صورتاں پہلے کبھی نہیں دیکھی ہے۔"

میر عثمان کی بات نے ایک دم میرے اندرونی شبے کی تصدیق کر دی۔ انسپکٹر کی شکل و صورت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے پولیس کی وردی اس کے جسم پر اجنبی سی نظر آتی تھی۔ اس کے بال بھی عام پولیس والوں کی نسبت لمبے تھے اور ٹوپی اس کے سر پر پھنسی ہوئی تھی۔ سب سے خاص شے اس کا ریوالور تھا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ امریکی ساخت کا ریوالور ہے۔ جہاں تک میری معلومات تھیں اس قسم کے ریوالور انڈین پولیس کے استعمال میں نہیں تھے۔

انسپکٹر نے مجھے میر عثمان سے کھسر پھسر کرتے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھا اور میرے بازو کو بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔ گالی دے کر بولا۔ "۔۔۔ تیری کانفرنس سننے کے لیے ہم یہاں نہیں آئے۔" میرا الٹا ہاتھ گھوما اور چٹاخ سے وردی والے کے رخسار پر پڑا۔ وہ اس واقعے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ لڑکھڑا کر اپنے ایک ساتھی پر گرا اور دونوں سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے لکڑی کی ایک چوکی پر جا گرے۔ ایک دم ہی جیسے کمرے میں بھونچال سا آ گیا۔ ایک شخص مجھ سے اور دوسرا بوٹا سنگھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اپنے مدمقابل کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور جونہی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ بوٹا سنگھ سے لپٹنے والے شخص کا انجام زیادہ خراب ہوا۔ دراصل بوٹا سنگھ کی جسمانی بناوٹ اسے زبردست فائدہ پہنچاتی تھی۔ اس کا مدمقابل اسے ایک کمزور و منحنی شخص جان کر زیادہ قوت سے ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر ہوتا تھا کہ اس دھان پان نحیف الوجود شخص کے اندر کیسی بجلی کوند رہی ہے۔ یہاں بھی اسی "بجلی" نے بوٹا سنگھ کے مدمقابل کو کرنٹ مارا اور میں نے اسے فرش پر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ بوٹا سنگھ نے کوئی ایسا داؤ مارا تھا کہ اس کی گردن کی ہڈی چٹخ گئی تھی اور وہ پلک جھپکنے میں جاں بلب ہو گیا تھا۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر انسپکٹر کی وردی والے نے جوش کھایا اور اپنا ریوالور بوٹا سنگھ کی طرف سیدھا کیا لیکن اسی وقت میری ٹانگ کام کر گئی۔ پاؤں کی ضرب نے ریوالور وردی والے کے ہاتھ سے نکال دیا۔

اس وقت تک وردی والے کا چوتھا ساتھی اپنی قمیص کے نیچے سے کمانی دار چاقو برآمد کر چکا تھا۔ چاقو کھلنے کی خوفناک کڑکڑاہٹ کمرے میں گونجی اور اہل خانہ میں سے ایک دبلی پتلی عورت چیختی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ چاقو باز نے بڑی مہارت سے چاقو کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں کیا اور مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یہ بے حد خطرناک چھلانگ تھی۔ میں ایک مسلک وار سے بال بال بچا۔ چاقو کا پھل کندھے کے پاس سے میری جرسی اور قمیص کو ادھیڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ چاقو باز کو گہرا صدمہ پہنچا۔ ایک تو

اس کا وار خالی گیا دوسرے بوٹا سنگھ کی طوفانی ٹکر اس کے چہرے پر پڑی اور اس کے دو تین دانتوں کو منہ کی قید سے آزاد کر گئی۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کے بعد اچانک ہمارے ستارے گردش میں آگئے۔ ایکا ایکی دھا چوکڑی کی آوازیں آئیں اور کم و بیش آٹھ مزید افراد گھر میں گھس آئے۔ ان میں دو تین پولیس کی وردی میں تھے۔ ایک شخص نے عقب سے میرے سر پر کسی وزنی شے سے ضرب لگائی۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ ایک ساتھ کئی افراد مجھ پر پل پڑے۔ پستول میری کیمض کے نیچے سے نکل چکا تھا۔ اب صرف رام پوری خنجر تھا جو میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو توڑ موڑ کر دایاں ہاتھ پنڈلی تک پہنچانا چاہا لیکن اسی دوران چند مزید ضربیں میرے سر پر لگیں اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

کچھ دیر بعد حواس دوبارہ بحال ہوئے تو میں نے خود کو کسی گاڑی کے ٹھنڈے فرش پر پایا۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جس وقت ہنگامہ شروع ہوا میں بستر سے نکلا تھا۔ لہٰذا پاؤں ابھی تک ننگے تھے۔ بوٹا سنگھ کے ساتھ بھی میرے جیسا ہی سلوک ہوا تھا۔ میں نے فرش پر پڑے پڑے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ بوٹا سنگھ میرے پاس ہی اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ وہ پار ہی نہ ہو گیا ہو۔ یہ ایک ٹرک نما گاڑی تھی۔ چھت پر ترپال پڑا ہوا تھا۔ دونوں اطراف لکڑی کی بینچیں تھیں اور ان پر کم و بیش چھ سات مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔

میرے قریب بیٹھے ایک شخص کو اندازہ ہو گیا کہ میں ہوش میں آگیا ہوں۔ اس نے میری پسلیوں میں ایک ٹھوکر لگائی اور غرا کر بولا "خبردار چپکے لیٹے رہنا ورنہ سر پر ایک دو اور گومڑ بنانے پڑیں گے۔" میں نے پہچان لیا یہ اسی پولیس انسپکٹر کی آواز تھی جس نے ہمارے ساتھ سوال و جواب کیے تھے۔ اب وہ سادہ کپڑوں میں نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس نے سادہ کپڑوں کے اوپر ہی وردی پہن رکھی تھی۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وردی کی آڑ میں چند غنڈوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے اور کیوں حیدر آباد میں داخل ہوتے ہی ہم سے آ ٹکرائے تھے۔

خنک رات میں نامعلوم راستوں پر وہ ایک طویل سفر ثابت ہوا۔ جس گاڑی میں ہمیں لے جایا جا رہا تھا یہ ایک "موزدا" تھی۔ اس میں دودھ کے بہت سے برتن بھی رکھے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ گاڑی مضافاتی علاقے سے دودھ، مکھن اور کریم وغیرہ شہر میں لانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ہمیں لے جانے والے مسلح افراد آپس میں کم بات چیت کر رہے تھے لہٰذا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ تیس چالیس میل دور آنے کے بعد ایک ویران مقام پر ٹائر پنکچر ہو گیا۔ جب ٹائر بدلا جا رہا تھا، ایک شخص نے اندرونی بتی جلا دی اور ایک تھرماس میں سے چائے نکال کر سب کو دینے لگا۔ اس شخص کو دیکھ کر مجھے اس کی صورت میری جانی پہچانی لگی۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ اور پرسوں اس شخص نے ہمارے ساتھ ہی ٹرین میں سفر کیا تھا۔ وہ ہمارے ہی ڈبے میں تھا اور اس کی نشست ہمارے پیچھے تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رات کو جب میں لیٹا تھا تو وہ میرے پہلو میں لیٹا تھا اور اس کی بیڑی کا دھواں مجھے دیر تک پریشان کرتا رہا تھا۔ تو کیا یہ لوگ پیچھے سے ہمارے تعاقب میں تھے؟ شاید یہ تعاقب کراچی سے ہی ہو رہا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر مجھے تھوڑی تسلی ہوئی کہ یہ شخص جو اس وقت میرے سامنے تھا، راستے کے کسی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوا تھا۔ غالباً گوالیار سے۔

روشنی ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر غور سے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا۔ سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ وہ سلامت تھا۔ صرف پیشانی پر ایک چوٹ کا نشان تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہم مین روڈ سے اتر کر ایک چھوٹی سڑک پر سفر کرنے لگے۔ یہاں ٹریفک کا شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ خنکی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کھیتوں والے خالص دیہی علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔ سوا ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک بہت بڑے احاطے میں ہمیں ٹرک سے اتارا گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یوں لگا جیسے ہم مغلیہ دور کی کسی عمارت میں آگئے ہیں۔ احاطے میں بے شمار روشیں، فوارے اور گھاس کے قطعے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک پرشکوہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ عمارت کے سامنے پانچ چھ کاریں کھڑی تھیں جو ٹیوب لائٹس کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ ہمیں عمارت کی طرف لے جانے کے بجائے احاطے کے ایک گوشے کی طرف لے جایا گیا اور اونچی دیواروں والی ایک ایسی عمارت میں پہنچا دیا گیا جو باہر سے دیکھنے پر کسی قلعے سے مشابہ نظر آتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کا رقبہ زیادہ نہیں تھا لیکن یہ عمارت بمشکل ایک ایکڑ پر واقع تھی۔

عمارت کے اندر داخل ہوئے تو پتا چلا کہ یہ ایک چھوٹی سی جیل ہے۔ اس میں باقاعدہ کئی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں اور مسلح افراد پہرا دے رہے تھے۔ چند تنگ و تاریک راہداریوں سے گزار کر ہمیں ایک ہال نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے کے واحد دروازے پر آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں لانے والے ہمیں ٹھنڈے ٹھار فرش پر چھوڑ کر باہر نکل گئے اور دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ ہمیں بند کرنے سے پہلے ہمارے حال پر صرف اتنی مہربانی کی گئی تھی کہ ہمارے منہ سے پٹیاں ہٹا کر کپڑے نکال لیے گئے تھے۔

میں نے اپنے اکڑے ہوئے جبڑے کو دائیں بائیں ہلا کر آرام کیا اور بوٹا سنگھ سے کہا۔ "سجن جی! یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہوئی ہے۔"

بوٹا سنگھ نے "پچ" کی آواز نکال کر دانتوں کی درمیانی درز سے تھوک پھینکا اور بولا۔ "بڑے حرام کے تخم ہیں۔ پتا نہیں ہمیں کہاں لے آئے ہیں۔"

کچھ دیر ہم کھسر پھسر کرتے رہے پھر چپ ہو گئے۔ راہداری سے بھاری قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ایک یارعی بھرکم خطرناک صورت شخص ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے ایک رخسار پر بدنما زخم کا پرانا نشان تھا۔ وہ پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا۔ کمر سے پستول جھول رہا تھا۔ چار مسلح افراد اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سیاہ ہونٹوں والا وہ شخص بھی تھا جسے میں نے ٹرین میں دیکھا تھا۔ بدنما زخم والے شخص نے کمال بے تکلفی سے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور میرا چہرہ بلب کی طرف کر کے غور سے صورت دیکھنے لگا۔ اس کی بدبودار سانس میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ دانت پیس کر بولا۔ "کون ہو تم، کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کہا "میں بتا چکا ہوں۔" ابھی میرا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک زوردار گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا اور میں الٹ کر فرش پر جا گرا۔ یوں لگا تھا جیسے مکے کے بجائے ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ غالباً تھوڑی سی قوت مزید صرف کی جاتی تو میرا جبڑا ٹوٹ گیا ہوتا۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم محسوس کر رہا تھا کہ میری ٹھوڑی سے کھال چھل گئی ہے اور خون بہہ نکلا ہے۔ میں نے گھونسا مارنے والے کا ہاتھ دیکھا اور گھونسے کی "شدت" میری سمجھ میں آگئی اس شخص نے ہاتھ پر فولادی مکہ چڑھا رکھا تھا۔

بہت بے پروائی سے اس نے میری گردن پر پاؤں رکھ دیا اور خوفناک لہجے میں بولا۔ "میں بندے کو بھوت بنا دیتا ہوں۔ میری مار کھا کر لوگ عمر بھر شیشہ نہیں دیکھتے۔ اگر چاہتے ہو کہ دوبارہ اپنی صورت دیکھ سکو تو جو پوچھتا ہوں فٹ فٹ بتاتے جاؤ۔"

میری گردن سے پاؤں ہٹا کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دیوار کے سہارے بیٹھا دیا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون کے قطرے ٹپ ٹپ میری جھولی میں گرنے لگے۔ میں نے کہا "مجھے لگ رہا ہے کہ تم لوگوں کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

وہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ "ابھی ایک گھنٹے بعد میں شیشہ تمہارے سامنے کروں گا تو تمہیں بھی ایسی ہی غلط فہمی ہو گی۔ تم سمجھو گے کہ تمہاری جگہ کوئی بھوت کھڑا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں، تمہارے تھوبڑے کی ایک انچ جگہ بھی کھال باقی نہیں ہو گی۔" پھر اس نے بوٹا سنگھ کے سر پر ایک ٹھوکر لگائی اور فرمایا "تم بتاؤ چوہے کی اولاد! نواب شہریار صاحب کی ٹوہ کیوں لگا رہے ہو تم؟"

میرے ساتھ ساتھ بوٹا سنگھ بھی سناٹے میں رہ گیا۔ ایک لمحے میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ ہم ٹرین میں کی جانے والی گفتگو کی وجہ سے پکڑے گئے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں میر عثمان کو کوسا۔ وہ بہت اونچے لہجے میں بات کرتا تھا۔ ٹرین میں بھی یوں بولتا رہا تھا جیسے باغ میں چہل قدمی کر رہا ہو اور مخاطب کے سوا ارد گرد کوئی نہ ہو۔ میں نے یونہی احتیاطاً ایک دوبار اسے ٹوکا بھی تھا لیکن وہ اپنے اسٹائل سے ہی بولتا رہا تھا۔ بدنما زخم والے نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جس نے ٹرین میں ہمارے ساتھ سفر کیا تھا اور بولا "اسے پہچانتے ہو؟ اس کا نام حسابی ہے۔ یہ اور اس کے دو ساتھی ٹرین پر تمہارے ساتھ ہی گوالیار سے یہاں پہنچے ہیں۔ جو کچھ تم ٹرین میں بولتے رہے ہو وہ سب کچھ اس کے دماغ کے ٹیپ ریکارڈ میں بند ہے تم ایک لفظ سے بھی انکار نہیں کر سکتے ہو اور اگر کرو گے تو پگلا کھائے ہوئے کتوں کی طرح بلک بلک کر مرو گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں اس سے بالکل انکار نہیں کہ ہم نواب صاحب سے ملنا چاہتے تھے اور صرف نواب صاحب ہی نہیں علاقے کے اور بھی بہت سے اہم لوگوں سے ہمیں ملنا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ اتنی سی بات پر تم لوگ اتنا بڑا ہنگامہ کیوں کھڑا کر رہے ہو۔ کیا نواب صاحب سے ملنے کی خواہش کر کے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے ہم نے جو تم یوں آسمان سر پر اٹھا رہے ہو۔ اگر تمہیں کوئی شبہ ہے تو دہلی میں

ہمارے دفتر سے رابطہ کرو۔"

اس نے دانت نکوس کر میری نقل اتاری "دہلی میں ہمارے دفتر سے رابطہ کرو" پھر میرے بال مٹھی میں جکڑ کر بولا۔ "تیرے دفتر میں رابطہ کرکے ہی تجھ سے بات کر رہا ہوں۔ جس پرچے کا کارڈ ہے تیرے پاس اس میں کوئی حرامی راہول جوشی یا ہرنام سنگھ کام نہیں کرتا اور تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ پرچا پچھلے تین مہینے سے ویسے ہی بند پڑا ہے۔"

اگر یہ شخص سچ بول رہا تھا تو بہت تیزی دکھائی تھی اس نے ہمیں اس بیرک نما کمرے میں بند ہوئے بمشکل ایک گھنٹا ہوا تھا۔ اس مختصر وقت میں دہلی کے ہفت روزہ "سیاست" تک رسائی حاصل کرلی گئی تھی اور وہ بھی رات کے آخری پہر۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ میرے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر بولا۔ "کیا سوچ رہا ہے۔۔۔ میں تیری طرح جھوٹ نہیں بک رہا ہوں۔ ابھی دس منٹ پہلے پرچے کا ایڈیٹر رام نرائن ٹیلی فون پر خود مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے اس کا پیشاب دھوتی میں خطا ہوگیا ہوگا۔ نواب شہریار جنگ کا حوالہ معمولی حوالہ نہیں ہے۔ بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوجاتا ہے اس نام سے۔"

میرے ذہن میں پنپنے والا ایک شک فوراً یقین کی حد کو چھوگیا۔ میں نے فولادی کلے والے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہو تم۔۔۔ اور یہ کونسی جگہ ہے۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکا اور مزاحیہ انداز میں بولا "میں نواب صاحب کا ادنیٰ خادم قلی قطب ہوں اور تم کو یہ شرف حاصل ہے کہ تم اس وقت نواب صاحب کے مہمان خانے میں ہو۔"

میں نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کے باریک ہونٹ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں اس نے ان ہونٹوں کے پیچھے غصہ چھپا رکھا تھا یا مسکراہٹ۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔ بہر حال یہ بات طے تھی کہ وہ آہنی اعصاب کا مالک ہے اور کسی قسم کے حالات سے بھی خوف نہیں کھاتا۔ یقیناً میری طرح وہ بھی یہ جان کر محظوظ ہو رہا تھا کہ ہم جہاں پہنچنا چاہ رہے تھے وہاں آپوں آپ پہنچ گئے ہیں۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ ہم سیدھے ایک عقوبت خانے میں پہنچے تھے۔۔۔ اور بہر حال یہ ایک بڑا فرق تھا۔

تجسیم قلی قطب نے بوٹا سنگھ کی ڈیل ڈول گردن پکڑی اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگادیا۔ بے حد سخت لہجے میں بولا۔ "میرے ہاتھوں ضائع ہونے سے بہتر ہے اصلیت بتادو۔" بوٹا سنگھ نے اپنی بکری جیسی آواز میں جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ قلی قطب کچھ دیر بوٹا سنگھ کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر کہنے لگا "میں تمہیں آج دوپہر کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں ہوں گی تم فرفر ہر سوال کا جواب دیتے جاؤ گے یا میں پاگل ہوکر اور گھونسے مار مار کر تم دونوں کے ناریل چٹخادوں گا۔"

اس نے اپنے مسلح آدمیوں سے کچھ کہا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ راکفل بردار افراد نے حیدر آبادی لہجے میں ہمیں اٹھنے کا حکم دیا اور گن پوائنٹ پر راہداری میں لے آئے۔ یہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند روز پہلے یہاں آتشزدگی ہوئی ہے۔ چند دروازے، چوکھٹیں جزوی طور پر جلی ہوئی تھیں۔ دیواروں کی کالک چھپانے کے لیے کئی جگہ سفیدی پھیری گئی تھی۔ احاطے میں ایک دو جلے ہوئے شہتیر پڑے تھے۔ راہداری میں ایک مقام پر کشادہ زینے نیچے اترتے تھے۔ چند زینے عبور کرکے ہم ایک چھوٹے سے آہنی دروازے پر پہنچے۔ دروازے کی دوسری جانب ایک طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کی دونوں جانب کوٹھریاں تھیں۔ ان کوٹھریوں کی تعداد بیس سے کم نہیں ہوگی۔ کوٹھریوں میں سامنے کی طرف سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بالکل کسی جیل کا منظر تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اس لیے کوٹھریوں میں بند افراد سو رہے تھے۔ ان میں لڑکے، نوجوان، بوڑھے ہر عمر کے مرد شامل تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی، بال منتشر، سیاہ رنگ کے لباس جو جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ننگے سر ننگے پاؤں تھے۔ ہر کوٹھری میں اوسطاً پانچ افراد تھے جو پرال کے بستروں پر بے خبر پڑے تھے۔

طویل برآمدے سے گزر کر ہمیں بھی ایک کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ قریباً دس ضرب سولہ کی اس کوٹھری میں پرال کے بستر اور دو عدد کمبلوں کے سوا اور کوئی شے نہیں تھی۔

میر عثمان نے بتایا تھا کہ نواب شہریار جنگ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی جاگیر کی حدود میں پولیس بھی اجازت لے کر داخل ہوتی ہے اور وہ اپنے علاقے کے فیصلے خود ہی کرتا ہے۔ یہ جیل اور یہاں پر بند افراد دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ میر عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں اور بوٹا سنگھ پرال بچھا کر اکڑوں بیٹھ گئے اور صورتحال حاضرہ پر غور فرمانے لگے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ابھی ابھی جس ریچھ نما شخص سے ہمارا واسطہ پڑا ہے وہ اس جیل کا انچارج قسم کی شے ہے۔ اس کے تیور بے حد خطرناک

تھے لیکن پھر اس نے اچانک ہمیں دوپہر تک کی مہلت دے دی تھی۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا تھا۔

جوں جوں دن چڑھتا گیا اس زمین دوز جیل میں چہل پہل بڑھتی گئی۔ قیدی اپنی اپنی کوٹھریوں میں بیدار ہوگئے۔ مسلح پہریدار ادھر ادھر گھومنے لگے۔ پہریداروں کی کوئی مخصوص وردی نہیں تھی۔ کسی نے پاجامہ قمیص پہن رکھی تھی، کوئی پینٹ شرٹ میں تھا اور کسی نے شلوار قمیص پر چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ بہر طور دو چیزیں ان سب میں مشترکہ تھیں۔ سب کے سر پر ایک کالی ٹوپی تھی اور سب خطرناک صورتوں والے بگڑے ہوئے افراد تھے۔ قیدیوں کو کوٹھریوں میں ناشتا دیا گیا لیکن ناشتے کے بعد کوٹھریوں کے دروازے کھول دیے گئے۔ قیدی ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ان میں سے کچھ لوہے کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک طویل گیلری میں چلے گئے کچھ ایک ہال نما کمرے میں اکٹھے ہوگئے اور ٹولیوں کی شکل میں جمع ہوکر باتیں کرنے لگے۔ ان میں مقامی و غیر مقامی دونوں طرح کے افراد شامل تھے۔ ہم دونوں بدستور کوٹھری میں بند تھے۔ ویسے بھی ہم نووارد تھے لہٰذا ہر کوئی ہمیں دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دو قیدیوں نے ہم سے بے ضرر قسم کے سوالات بھی پوچھے۔ مثلاً ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کس جرم میں آئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں چونکنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ مقامی شخص نہیں تھا بلکہ ہندوستانی بھی نہیں لگتا تھا۔ ستواں ناک گھنگریالے بال اور سرخ و سپید رنگت۔ اسے دیکھتے ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ ایرانی یا عراقی نژاد ہے۔ اس کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ پیشانی پر تفکر کی لکیریں اور آنکھوں پر عینک نظر آرہی تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی وہ سوچ میں غرق رہنے والا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ اس جیل کی چار دیواری میں وہ ایک عرصہ گزار چکا ہے۔ ایک قدرتی سی بات تھی کہ اس غیر ملکی کو دیکھ کر میرا دھیان ان واقعات کی طرف چلا گیا جو چند روز پہلے پشاور اور لاہور میں پیش آچکے تھے۔ مسٹر جی کلارک کی پاکستان میں آمد اور یہاں ان کی ذہنی چھپی سرگرمیاں، پھر منی ایچرز کی تحریر اور گندھارا کے نوادرات، منی ایچرز کی تحریر کسی گوتاب واحدی نامی شخص نے حیدر آباد سے لکھی تھی۔ یہ تحریر شوریز نامی شخص کے نام تھی اور غالب امکان یہ تھا کہ شوریز کا تعلق ایران یا عراق سے ہے۔ میرے ذہن میں بڑی سرعت سے یہ خیال آیا کہ اس شخص سے بات کرنی چاہیے۔ اگر وہ انگریزی جانتا تھا تو ہم اس سے مفید گفتگو کرسکتے تھے۔ وہ ایک ستون کے پاس کھڑا بیڑی سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے "ہیلو" کہہ کر آواز دی اور اشارے سے قریب بلایا۔ اس نے بڑے غور سے ہمیں دیکھا۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو پھر آہستگی سے چل کر ہمارے پاس آگیا۔ قریب سے وہ زیادہ بارعب اور سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"ایکسکیوزمی جناب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ کہو میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔" اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ اس کی نگاہیں میری زخمی ٹھوڑی پر تھیں۔

میں نے یونہی بات چھیڑنے کے لیے کہا "مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔"

"یہ تین سال پہلے کی بات ہوگی۔ کیونکہ تین سال سے میں یہاں ہوں۔" اس نے ناک پر عینک درست کرکے کہا۔ پھر پوچھنے لگا۔ "تم کہاں سے آئے ہو؟"

"دہلی سے۔ میرا تعلق ہفت روزہ سیاست سے ہے۔ نواب صاحب کے کارندوں نے کسی غلط فہمی کے سبب ہمیں دھر لیا ہے۔"

"اوہ" میرے مخاطب نے ہونٹ سکوڑے "یہ کوئی چھوٹی موٹی غلط فہمی نہیں ہوگی کیونکہ تمہیں خاص قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ قلی قطب کون ہے؟"

وہ بولا "انچارج ہے اس قید خانے کا۔ بہت بے رحم شخص ہے۔ چند سال پہلے تک انڈیا کا قومی باکسر رہا ہے۔"

مجھے وہ گھونسا یاد آگیا جو چند گھنٹے پہلے میری ٹھوڑی پر پڑا تھا۔ میں نے ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "معلوم نہیں اب وہ خبیث ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہمیں دوپہر بارہ بجے تک کی مہلت دی ہے۔ کہتا ہے اس کے بعد بہت بُرا حشر کروں گا۔"

مخاطب نے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ قطب نے مہلت والی بات یونہی کردی ہوگی۔ دراصل اس کا اپنا اختیار تو اتنا نہیں ہے کہ تم سے مار پیٹ کرسکے۔ اس کے لیے اسے نواب سے اجازت لینا ہوگی، اور نواب کو کل رات اچانک کہیں جانا پڑگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی پھر نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے یونہی ہوا میں تیر چلا دیا۔

میں نے کہا۔ "کہیں آپ کا نام۔۔۔ گوناب تو نہیں؟"

مخاطب کے چہرے پر وہی اثر ہوا جو کہیں پاس ہی بم پھٹنے سے ہو سکتا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ تاہم بہت جلد اس نے اپنے تاثرات پر قابو پالیا اور مجھے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "کون ہو تم؟"

میں دیکھ چکا تھا کہ میرے مختصر جملے نے مخاطب کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ یقیناً وہ گوناب واحدی ہی تھا اور اسی نے منی ایچرز کے انداز میں لکھی ہوئی وہ اہم تحریر کسی شوریز نامی شخص کو ارسال کی تھی۔ امید نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی منزل مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ بلکہ "منزل" کی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا "محترم! مجھے لگتا ہے کہ میں آپ ہی کی تلاش میں یہاں پہنچا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ۔۔۔"

میرا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ میرا مخاطب گھبرا کر اپنی دائیں جانب دیکھنے لگا تھا۔ ایک پہریدار کندھے پر خود کار رائفل لٹکائے بڑے فلمی انداز میں ہماری طرف آرہا تھا۔ مخاطب نے زیر لب کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ رات کو ملاقات ہوگی۔"

گھبرائے ہوئے سے قدموں کے ساتھ وہ رخ پھیر کر نلوں کی طرف چلا گیا۔ بوٹا سنگھ انگریزی ٹھیک سے نہیں سمجھتا تھا لہٰذا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ اسے بہرحال ہو چکا تھا کہ میرے اور اجنبی کے درمیان کوئی نہایت اہم بات ہوئی ہے۔

ایرانی نژاد گوناب واحدی کی یہ بات درست معلوم ہوتی تھی کہ دوپہر تک کی مہلت کا ذکر قلی قطب نے یونہی کردیا تھا۔ درحقیقت ان لوگوں کو نواب شہریار جنگ کی آمد کا انتظار تھا۔ دوپہر گزر گئی اور پھر سہ پہر ہوگئی۔ زیر زمین کوٹھڑیوں میں آکر کسی نے ہماری خبر نہیں لی۔ سہ پہر تین بجے جب تمام قیدیوں کو پھر کوٹھڑیوں میں بند کیا جا رہا تھا' ایرانی نژاد گوناب واحدی چپکے سے میرے پاس آیا اور بولا "میں رات کو آؤں گا۔"

شام ساڑھے چار بجے سب قیدیوں کو کوٹھڑیوں کے اندر ہی کھانا دیا گیا۔ اس مرتبہ ہمیں بھی کھانا دیا گیا تھا۔ یہ کھانا سبزی دال اور چپاتی پر مشتمل تھا۔ سخت روٹی چباتے ہوئے میری ایک کنپٹی میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ یہ ٹیسیں ان ضربوں کا نتیجہ تھیں جو افضل گنج والے مکان میں میرے سر پر لگی تھیں۔۔۔

O☆O

رات تقریباً بارہ بجے جب کوٹھڑیوں میں قیدیوں کے خراٹے گونج رہے تھے اور راہداری میں چکراتے ہوئے دونوں پہریدار بھی اونگھنے لگے تھے' ہماری کوٹھڑی کے باہر مدھم سی آہٹ ہوئی۔ میں نے لیٹے لیٹے چہرہ پھیر کر دیکھا۔ گوناب واحدی ایک پہریدار کے ہمراہ ہماری کوٹھڑی کی طرف آرہا تھا۔ پہریدار نے بہ آہستگی تالے میں چابی گھما کر دروازہ کھولا اور گوناب واحدی کو اندر بھیج دیا۔ دروازے کو پھر سے دوبارہ قفل لگا دیا گیا۔ گوناب واحدی نے کمبل کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کا کمبل ہمارے کمبلوں سے بہتر اور صاف ستھرا تھا۔ ہم تینوں کوٹھڑی کے نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔ گوناب واحدی نے اپنی جیب سے تین بیڑیاں نکالیں۔ ایک بیڑی ہمیں دی اور تیسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر سلگا لی۔ وہ ایک نفیس شخص تھا۔ شاید گھٹیا درجے کے سگریٹ بھی پیتا ہو لیکن اس جیل میں وہ بڑے شوق سے سستی بیڑی کا کش لے رہا تھا۔

کہنے لگا "میں اس جیل کے پرانے قیدیوں میں سے ہوں۔ یہ پہریدار میرے شناسا ہو چکے ہیں۔ تھوڑی بہت رعایت میرے ساتھ کر دیتے ہیں۔ ورنہ ایک کوٹھڑی سے دوسری میں جانا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اس نے جیب سے ایک ٹرانسسٹر ریڈیو نکالا۔ اس پر ایران کا کوئی دور دراز اسٹیشن لگایا۔ وہاں سے فارسی نغمے آرہے تھے۔ گوناب نے ریڈیو کی آواز اونچی کی اور اسے کچھ فاصلے پر رکھ دیا۔ یہ عقلمندی کا کام تھا۔ رات کے سناٹے میں مدھم آوازیں بھی دیواروں کے اندر گونجتی تھیں۔ خطرہ تھا کہ ہماری آوازیں پہریداروں کے کانوں تک پہنچیں گی۔ اب ریڈیو کے شور نے ہمیں اس اندیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے بولا "گوناب کا نام تم نے کیوں لیا؟"

میں نے اس سوال کا جواب دوپہر سے سوچ رکھا تھا۔ وہ سب کچھ بھی سوچ رکھا تھا جو مجھے گوناب واحدی سے کہنا تھا۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ آپ ہی کا نام ہے؟ یہ نام مجھے مسٹر شوریز نے بتایا تھا۔"

یہ دوسرا دھماکا تھا جو میں نے اس کے سر پر کیا۔ ایک لمحے میں اس کا چہرہ کئی رنگ بدل گیا۔ کہنے لگا۔ "تم شوریز کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "وہی شوریز صاحب جنہیں آپ نے حیدر آباد آنے کا پیغام بھیجا ہے۔"

اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ بولا "تم کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں شوریز نے بھیجا ہے؟"

"بالکل جناب۔ مسٹر شوریز نے ہمارے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ ہم حیدر آباد پہنچیں اور چار پانچ روز کے اندر یہ رپورٹ دیں کہ نواب شہریار کون ہے اور کس قسم کا آدمی ہے۔"

"شوریز خود کہاں ہے؟"

"مجھے زیادہ معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں۔"

"تم کہتے ہو کہ چار پانچ روز کے اندر تم نے شوریز کو رپورٹ دینا تھی۔ رپورٹ دینے کے لیے تمہارے پاس کیا رابطہ تھا۔"

"ہم کو ہدایت کی گئی تھی کہ ہم یہاں زیشان ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ مسٹر شوریز یا ان کے آدمیوں کو خود ہم سے رابطہ کرنا تھا۔"

گوناب واحدی ابھی تک مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے کالر کی تہہ میں چھپایا ہوا ایک کاغذ نکالا۔ یہ ایک تصویر کا فوٹو اسٹیٹ تھا۔ یہ اسی "فرگن" مجسمے کی تصویر تھی جو گلابی لفافے کے ساتھ "کارکی ڈکیتی" میں ہلاک ہونے والے ایرانی کے قبضے سے نکلا تھا۔ "فرگن" دراصل ایک خیالی جانور کو کہا جاتا ہے جس کے مجسمے قدیم نوادرات میں ملتے ہیں۔ اس خیالی جانور کا بدن شیر کا ہوتا ہے' منہ عقاب کی چونچ جیسا اور کبھی کبھی اسے پر بھی لگا دیے جاتے ہیں۔

سرتاج پاشا نے مجسمے کی تصویر کھینچ کر مسٹر جی کلارک کو اپنی آفر کے ساتھ امریکا ارسال کی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ نمونے کے طور پر چنے کی دال کے دو دانے بھی بھیجے گئے تھے۔ فوٹو اسٹیٹ کی پشت پر میں نے اپنے ہاتھ سے انگریزی میں ان الفاظ کا ترجمہ لکھ رکھا تھا جو منی ایچرز پر درج تھا۔ اب شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ گوناب واحدی کو یقین کرنا پڑا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے اور ہمیں شوریز نے ہی یہاں بھیجا ہے۔ تاہم ابھی وہ مزید تصدیق کرنا بھی چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ شوریز سے میرا کیا تعلق ہے اور میرا ساتھی یعنی بوٹا سنگھ کس حیثیت سے میرے ساتھ ہے۔ میں نے ان سوالات کے جواب پہلے سے تراش رکھے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے کالج کی یونین کا صدر تھا۔ بعد میں عملی زندگی میں

لوگوں نے مجھے زبردستی سیاست میں گھسیٹ لیا۔ سیاست کے خارزار میں بھٹکتے بھٹکتے میری دوستی اسمگلروں کے ایک گروہ سے چل نکلی۔ میں کسی خطرناک تصادم سے بچنے کے لیے ایران چلا گیا۔ میں پچھلے کئی برس سے کرمان شاہ میں ہوں۔ وہاں میں قاسم شیرازی نام کے ایک شخص کے پاس کام کرتا ہوں۔ قاسم شیرازی میرا گہرا دوست بھی ہے اور مجھ پر اندھا اعتماد بھی کرتا ہے۔ وہ کرمان شاہ میں ایک بڑا ہوٹل چلا رہا ہے۔ اس کے تعلقات مسٹر شوریز سے بھی ہیں۔ پچھلے دنوں اس نے مجھے بتایا کہ میرے لیے ایک چھوٹی سی مہم ہے۔ مجھے حیدر آباد جانا ہوگا اور ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ یہ کام مسٹر شوریز کرانا چاہ رہے تھے اور اس کا معاوضہ تین ہزار ڈالر آفر کر رہے تھے۔ میں پہلے بھی چند ایسے کام کامیابی سے کر چکا ہوں لہٰذا ہامی بھرلی۔ بعد میں ہوٹل ہی کے ایک اپارٹمنٹ میں مسٹر شوریز نے مجھ سے ملاقات کی اور کام کی تفصیلات سمجھائیں۔ مجھے یہاں نواب شہریار جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں اور ایک ہفتے کے اندر اندر رپورٹ دینا تھی۔ مجھے چنے کی دال کے وہ دانے بھی دکھائے گئے جن پر منی ایچرز کی شکل میں تحریر درج تھی۔ مسٹر شوریز نے مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن میرا اپنا اندازہ تھا کہ حیدر آباد میں نواب شہریار جنگ کے آس پاس آپ سے بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ کے نام سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ آپ بھی ایرانی ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آپ کو دیکھ کر میں آپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا نام شاہ جہاں ہے تاہم میں راہول جوشی کے فرضی نام سے سفر کر رہا ہوں۔ یہ میرا ساتھی بوٹا سنگھ ہے اور یہ ہرنام سنگھ کے نام سے میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں ہفتے کے روز تہران سے دہلی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ ٹرین حیدر آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک حیدر آبادی میر عثمان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں بوٹا سنگھ نے اس سے نواب شہریار کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ نواب کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا تھا۔ مگر ایک سنگین اتفاق یہ ہوا کہ وہیں ٹرین میں ایک حسابی نام کا شخص بھی سفر کر رہا تھا' وہ حیدر آباد تک ہمارا ہم سفر رہا۔ کسی نہ کسی حوالے سے اس کا تعلق نواب شہریار جنگ سے ہے۔ اب اسی کی مخبری پر نواب کے کارندے ہمیں یہاں اٹھا لائے ہیں۔

گوناب واحدی بڑے دھیان سے میری باتیں سنتا رہا۔ گاہے گاہے اس نے سوالات بھی کیے۔ وہ ایک زیرک اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اسے مطمئن کرنے میں مجھے بہت

دشواری پیش آرہی تھی لیکن چونکہ میں نے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی لہٰذا اس کے سوالوں کے جواب دیتا جا رہا تھا۔ اپنے اور مسٹر شوریز کے درمیان میں نے جو قاسم شیرزائی کا فرضی کردار ڈالا تھا اس سے بہت بچت ہو گئی تھی۔ اب گوناب واحدی 'مسٹر شوریز' کے بارے میں تفصیلات پوچھ کر مجھے مشکل میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ رات آخری پہر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ گوناب واحدی مجھے کچھ بتانے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ اس موقع پر صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔ اگر میں ذرا بھی بے صبری کا مظاہرہ کرتا تو وہ اپنے خول میں واپس چھپ سکتا تھا۔

رات کے قریباً تین بج چکے تھے اور گوناب واحدی کے پاس صرف تین بیڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ یعنی ہم تینوں ایک ایک آخری بیڑی پی سکتے تھے۔ یہ حیدر آبادی بیڑیاں اتنی بُری نہیں تھیں جتنی شکل و صورت سے لگتی تھیں۔ سگریٹ سے جُدا ایک خاص قسم کا لطف تھا ان میں۔ ہم بیڑیاں سلگا چکے تو گوناب واحدی نے ایک گہرا کش لے کر کہا "کل شام پہریدار جو باتیں کر رہے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب شہریار کسی مرگ پر عالم پور گیا ہے اور آج صبح واپس آجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے آتے ہی تمہیں یہاں سے نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد معلوم نہیں تمہیں کہاں رکھا جائے۔ یہاں واپس بھی لایا جائے یا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کچھ ضروری باتیں بتا دوں۔ ممکن ہے تم کسی طرح یہاں سے نکل سکو۔ اگر ایسا ہو گیا تو شوریز کو ان باتوں سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ گوناب واحدی نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "جیسا کہ تم جان ہی چکے ہو یہاں نواب شہریار جنگ کے پاس قیمتی نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس ذخیرے کو میگاسی کا ذخیرہ کہا جاتا ہے۔ گندھارا آرٹ کے قریباً ۲۳۸ نادر نمونے اس ذخیرے میں موجود ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک حادثے کے سبب ہو گیا تھا۔ قریباً دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ مجھے اس جیل سے فرار ہونے کا ایک سنہری موقع ملا تھا۔ اس رات کوئی تہوار منایا جا رہا تھا۔ اسے غالباً دیوالی کہتے ہیں اور یہ ہندوؤں کا تہوار ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی یہ تہوار جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ آتش بازی ہوتی ہے اور چراغاں کیا جاتا ہے۔ اس رات شام سے ہی حویلی میں مہمان جمع تھے اور زبردست آتش بازی کی جا رہی تھی۔ لگتا ہے کہ اس جیل کے در و دیوار زوردار دھماکوں سے گونج اٹھتے تھے۔ رات گیارہ بارہ بجے کا عمل ہو جب ایک ہوائی اس جیل کے صدر دروازے کے پاس گری اور وہاں پرال کے ایک ڈھیر میں آگ بھڑک اٹھی۔ چشم زدن میں یہ آگ اس قریبی عمارت تک پہنچ گئی۔ جہاں جیل انچارج تلی قطب بیٹھا ہے۔ میرا خیال ہے تم نے یہاں آتے ہوئے آتشزدگی کے آثار دیکھے ہوں گے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ گوناب واحدی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آگ بھڑکی تو پہریداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ سب باہر دوڑ گئے۔ قیدی کوٹھڑیوں میں بند تھے لہٰذا ان کی طرف سے پہریداروں کو کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ان دنوں میرے مثانے میں تکلیف تھی اور پیشاب کے لیے مجھے بار بار ٹوائلٹ میں جانا پڑتا تھا۔ پہریدار نے مجھ سے خاص رعایت کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ قسمت آزمانے کا یہ ایک سنہری موقع ہے۔ میں کمرے سے نکل کر اور جانے پہچانے راستوں سے گزر کر صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ یہاں مجھے ایک غسل خانے کی شکستہ کھڑکی میں سے باہر کودنے کا موقع مل گیا۔ آگ کی وجہ سے پہریداروں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہائشی عمارت کی طرف چلا گیا۔ میں نے پچھلے تین برسوں میں جو کچھ دیکھا تھا اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ یہاں سے فرار ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ رہائشی عمارت کی چھت سے کوشش کی جائے۔ چھت کے قریب سے دس ہزار کے وی کے بجلی تار گزرتے تھے۔ ظاہر ہے 'کسی ایک تار کو پکڑ کر لٹک جانے سے بندے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے تار سے لٹک کر صرف دس پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کر لیا تو کھمبے تک پہنچ جاؤں گا اور یہ کھمبا ایک سیڑھی کی طرح سہارا دے کر مجھے نیچے پہنچا دے گا لیکن جب میں کئی رکاوٹیں عبور کرنے کے بعد عمارت کی چھت پر پہنچا تو اندازہ ہوا کہ منصوبہ بنانے اور عمل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جن تاروں کو میں پچھلے تین سال سے دیکھتا رہا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ وہ چھت سے تین چار فٹ کے فاصلے سے گزرتے ہیں وہ دس بارہ فٹ کے فاصلے سے گزر رہے تھے اور کافی بلند تھے۔ میں کسی طور ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مایوسی کے عالم میں میں نے واپسی کا راستہ اختیار کیا لیکن اسی دوران پہریداروں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کی نگاہ سے بچنے کی کوشش میں میں ان خاص کمروں میں جا نکلا جہاں نواب صاحب کی رہائش

تھی۔ یہ دوسری منزل کے کمرے ہیں اور اس وسیع و عریض ہال کے عین اوپر واقع ہیں جہاں نواب صاحب کی بیٹی نے "جمنازیم" بنا رکھا ہے۔ ان کمروں میں سے ایک مستطیل کمرے میں داخل ہو کر میں دنگ رہ گیا۔ یہاں فرش پر گداز قالین تھا۔ کھڑکیوں پر بے حد دبیز پردے تھے اور خوابناک روشنی میں کمرے کے اندر ان گنت نوادرات جگمگا رہے تھے۔ نوادرات اور آثار قدیمہ سے میری دلچسپی بہت پرانی ہے۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ میں اس وقت نوادرات کے اس نایاب ذخیرے کے سامنے کھڑا ہوں جسے میگاسی کا ذخیرہ کہا جاتا ہے۔ میں حیرت زدہ نگاہوں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مٹی چونے اور پتھر کی مورتیاں' کانسی کے بنے ہوئے جنگی ہتھیار' برتن' ٹائلیں' چند مٹی کے چراغ اور آرائشی تختیاں' یہ سونا چاندی نہیں تھا لیکن سونے چاندی سے بہت قیمتی تھا۔ ہیرے جواہرات بھی اس کی قدر و قیمت کے سامنے ہیچ تھے۔ پہریدار کہیں آس پاس ہی گھوم رہے تھے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کانسی کا ایک چھوٹا سا فرگن اٹھایا اور اپنی جراب میں اڑس لیا۔ یہ وہی فرگن ہے جس کی تصویر کا ٹوٹا اسٹیٹ تم ساتھ لے کر آئے ہو۔ پہریداروں سے نظر بچا کر میں رہائشی عمارت سے باہر نکلا۔ فرار کا خواب اب بکھر چکا تھا۔ میں جانتا تھا یہاں سے نکلنے کا اب اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تم دیکھ ہی چکے ہو۔ بیرونی چار دیواری بہت اونچی ہے' اسے سیڑھی کے بغیر عبور کرنا ممکن نہیں ہے۔ بڑے گیٹ پر ہر وقت خونناک کتے اور ان سے زیادہ خونناک پہریدار موجود رہتے ہیں۔ اگر جیل کے صدر دروازے پر لگی ہوئی آگ مکمل طور پر بجھ جاتی اور پہریدار اپنے اپنے مقامات پر واپس لوٹ جاتے تو میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ میں نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور غسل خانے کی جس شکستہ کھڑکی سے باہر نکلا تھا اُسی کے راستے واپس اندر چلا گیا۔ قسمت نے ساتھ دیا اور میں رازداری سے واپس کمرے تک پہنچ گیا۔ فرگن بدستور میری جراب میں اڑسا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے کے اندر ہی ایک ایسی جگہ پر چھپا دیا کہ آسانی سے ڈھونڈا نہ جا سکے۔

اس واقعے کے دس بارہ روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ تین برس پہلے میرے ساتھ ہی قید ہونے والا ایک شخص جعفر رہا ہو کر واپس جا رہا ہے۔ میری طرح جعفر بھی ایرانی ہے۔"

میں نے کہا "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں مسٹر گوناب! اگر آپ اس موقع پر اپنے بارے میں تھوڑا سا بتا دیں تو بات سمجھنے میں آسانی رہے گی۔"

گوناب واحدی نے کہا۔ "یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ بہرحال بتانے میں ایسا حرج بھی نہیں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ جس شخص پر شوریز نے اعتماد کیا ہے' اس پر مجھے بھی اعتماد کر لینا چاہیے۔"

"بہت نوازش ہے آپ کی" میں نے کہا۔

گوناب واحدی بولا۔ "میں آج سے قریباً تین برس پہلے نواب شہریار جنگ کی دعوت پر ہی ایران سے یہاں حیدر آباد آیا تھا۔ نواب نے میرے علاوہ دو اور ایرانی مہمانوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ میری طرح وہ دونوں بھی مصور تھے۔ ان میں سے ایک جعفر ہے۔ یہ تبریز کا رہنے والا ہے۔ تیسرے کا نام جمشید تھا اس کا تعلق مشہد سے تھا۔ ہم تینوں کو چار پانچ ماہ کے اندر قریباً چالیس پینٹنگز بنانی تھیں۔ یہ نواب شہریار کے بزرگوں کی پینٹنگز تھیں۔ نواب کے والد مرحوم کے صد سالہ جشن ولادت پر یہ پینٹنگز حویلی کے وسیع و عریض مہمان خانے میں آویزاں کی جانی تھیں۔ اس کام کے لیے نواب نے میرے ساتھ چالیس ہزار روپے معاوضہ طے کیا تھا دیگر دو مصوروں کو بھی پچیس پچیس ہزار ملنا تھا۔ ہم تینوں تندہی سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کام بھی آخری مراحل میں تھا۔ ایک "ویک اینڈ" پر ہم تینوں مضافاتی علاقے میں سیر کے لیے نکل گئے۔ واپسی پر ہمیں رات ہو گئی۔ وہ ایک ابر آلود رات تھی۔ ابھی ہم اپنے ٹھکانے سے بہت دور تھے کہ طوفان باد و باراں نے ہمیں آلیا۔ ژالہ باری شروع ہو گئی اور ایسے وزنی اولے پڑے کہ کبھی زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ ہم پناہ کی غرض سے ایک مندر میں گھس گئے۔ بڑی نہر کے کنارے یہ مندر درختوں میں گھرا ہوا تھا اور عام راستے سے کافی ہٹ کر تھا۔ یہاں ایک بوڑھے پجاری اور تین دیوداسیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ایک داسی پچیس تیس سال کی تھی جب کہ دو بالکل نوخیز لڑکیاں تھیں۔ ایسے ویران مقام پر نوجوان خوبصورت لڑکیوں کو تنہا دیکھ کر ہمیں بہت عجیب لگا۔ درحقیقت ہندوستان آنے کے بعد ہمیں گھومنے پھرنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ مندروں میں اکثر ایسی کنواری پجارنیں موجود ہوتی ہیں' وہ مندر کے لیے وقف ہوتی ہیں لہٰذا کوئی مرد ان کے قریب جانے کا نہیں سوچتا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ لڑکیاں یہاں پوجا پاٹ کے لیے آئی ہوں گی اور خراب موسم کے سبب رک گئی ہیں یا پھر ہماری ہی طرح راہگیر ہوں گی۔ نہ وہ ہماری زبان جانتی تھیں' نہ ہم ان کی زبان جانتے تھے۔ رہا بوڑھا پجاری تو وہ کسی قسم

کے نشے میں وحشت بے خبر پڑا تھا۔ رات نو دس بجے تیز بارش کے سبب نہر کی پشتی ٹوٹ گئی اور مندر کے چاروں طرف پانی ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اب کم از کم ایک رات کے لیے ہم مندر میں محصور ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اچانک ہوا۔ سب سے پہلے ہمارے ساتھی جمشید پر ہی شیطان نے غلبہ پایا تھا۔ وہ ایک لڑکی سے زبردستی کرنے لگا۔ یہ وہی دیوداسی تھی جو باقی دونوں سے عمر میں بڑی تھی۔ اگر وہ چیختی چلاتی اور شدید قسم کی مزاحمت کرتی تو شاید یہ معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھتا لیکن ہم نے دیکھا کہ دیوداسی نے مزاحمت یوں کی جیسے کوئی قرض ادا کیا جاتا ہے یا کوئی ذمہ داری نبھائی جاتی ہے۔ جب ہم نے جمشید کو بہت زیادہ کوشش کے بغیر کامیاب ہوتے دیکھا اور یہ بھی جان لیا کہ یہاں باہر سے کوئی مداخلت کرنے نہیں آئے گا تو ہماری شیطنت بھی بیدار ہو گئی۔ ایک دم ہی وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے اس میں زیادہ قصور ہم تینوں کا ہی تھا۔ وہ گناہ کی رات تھی اور بے حد طوفانی۔ مندر کے اندر کا موسم بھی ویسا ہی ہو گیا جیسا باہر کا تھا اور جب طوفان تھما تو تینوں لڑکیاں بال بکھیرے ہچکیوں سے رو رہی تھیں اور بوڑھا پجاری اپنا مدقوق سینہ کوٹ کوٹ کر دہائی دے رہا تھا۔

یہ واقعہ راز نہ رہ سکا اور اگلے روز ہر طرف دیوداسیوں سے ہونے والے سلوک کے چرچے ہو گئے۔ "موقعۂ واردات" نواب کی جاگیر میں شامل تھا لہٰذا پولیس سے زیادہ یہ نواب کی ذمہ داری تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے کرے۔ ہم تینوں نواب کی جاگیر سے راہِ فرار اختیار کر چکے تھے لیکن "عالم پور" کے نزدیک نواب کے کارندوں نے ہمیں پکڑ لیا اور واپس نواب کی زمینوں پر لے آئے۔ حالات ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر سنگین تھے۔ مقامی ہندو بپھرے ہوئے تھے۔ وہ ہماری تکا بوٹی کر دینا چاہتے تھے لیکن نواب کی وجہ سے وہ چپ تھے۔ ہمیں اس وقت اندازہ ہوا کہ نواب اپنے علاقے میں کتنے اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ وہ نہ صرف پولیس سے بلکہ مشتعل ہندوؤں سے بھی ہماری جان بچانے میں کامیاب رہا۔ اس نے مشتعل افراد کو یہ سمجھایا کہ مجرم غیر ملکی ہیں۔ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آئے ہیں۔ نہ یہاں کی زبان جانتے ہیں اور نہ رسم و رواج سے آگاہ ہیں۔ بے شک انہوں نے جرم کیا ہے لیکن وہ اس جرم کی سنگینی سے باخبر نہیں تھے۔ نواب کی کوششوں سے یہ ہوا کہ اس واقعے کا چرچا ایک خاص علاقے تک محدود رہا۔ معززین بیچ میں پڑ گئے اور انہوں نے ہماری سزا تجویز کرنے کا اختیار نواب کو دے دیا۔

یہاں کے رواج کے مطابق نواب نے باقاعدہ عدالت کے فرائض ادا کیے اور ہم تینوں کو مجموعی طور پر سولہ سال کی سزا دی۔ سب سے زیادہ سزا جمشید کے حصے میں آئی یعنی آٹھ سال قید۔ وہ اس جرم میں ہمارا لیڈر تھا اور اس کے ہاتھ سے ایک لڑکی کا پاؤں بھی ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے اور جعفر کو چار چار سال قید کی سزا ہوئی۔ یہ کافی سخت سزا تھی مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں ہمارے کالے کرتوتوں کا پھل ملا تھا۔ سچی بات ہے کہ ہم تینوں ہی آوارہ گرد اور رنگین مزاج قسم کے افراد تھے۔ ایسے لوگ کسی نہ کسی موقعے پر تو پھنستے ہی ہیں سو پھنس گئے تھے۔ اس جیل میں آنے کے پانچ چھ ماہ بعد جمشید بیمار پڑا۔ اسے شدید قسم کا یرقان ہو گیا تھا۔ اس کا علاج تو کروایا گیا لیکن پیچیدگی بڑھ گئی۔ درحقیقت اس کے سانس ہی پورے ہو چکے تھے۔ وہ مر گیا۔ مقامی ہندوؤں نے یقیناً موت کو جھٹکا قرار دیا ہو گا اور سوچا ہو گا کہ مرنے والے کو دیوداسی کی عزت برباد کرنے کی سزا ملی ہے۔ بہرحال ہم دونوں اپنی اپنی سزا بھگتتے رہے۔ نواب شہریار جنگ مجھے مجرم سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود میرے فن کا قدردان ہے۔ اس نے جیل کے عملے کو ہدایت کر رکھی ہے کہ میرے ساتھ رعایتی سلوک کیا جائے۔ ان کوٹھریوں کے عقب میں چند کمرے ہیں ان ہی میں سے ایک کمرے میں میں رہتا ہوں۔ وہاں مجھے بستر، کرسی میز اور ریڈیو وغیرہ کی سہولت حاصل ہے۔ یہاں کوئی بھی مجھے گوناب کے نام سے نہیں بلاتا بلکہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ مجھے ماسٹر گون کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تم نے کل گوناب کا نام لیا تو میں بری طرح چونک گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ تمہارا تعلق ایران سے نہیں ہے۔ بہرحال میں اپنا اور جعفر کا ذکر کر رہا تھا۔ جعفر بھی میری طرح چھڑا چھانٹ ہے۔ والدہ کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ پچھلے دنوں جعفر کے آبائی شہر تبریز سے خبر آئی کہ اس کی والدہ سخت بیمار رہنے کے بعد مر گئی ہے۔ معلوم نہیں جعفر کو اس خبر سے صدمہ ہوا یا نہیں لیکن نواب شہریار جنگ کو شدید صدمہ ہوا۔ اس نے مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے جعفر کو قید میں ایک سال کی رعایت دے دی۔ جب مجھے پتا چلا کہ جعفر رہا ہو کر واپس جا رہا ہے تو میرے ذہن میں فوراً وہ نوادرات والی بات آ گئی۔

جعفر عام قیدیوں کے ساتھ جیل کے دوسرے حصے میں رہتا تھا۔ ان تین برسوں میں میری اس کی ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نواب شہریار جنگ کو ایک

تحریری درخواست دی کہ رہائی سے پہلے جعفر کو صرف ایک بار مجھ سے ملا دیا جائے۔ یہ درخواست مشروط طور پر منظور کر لی گئی۔ جیل کے انچارج قلی قطب نے مجھے اطلاع دی کہ قید کے آخری روز جعفر کو مجھ سے ملا دیا جائے گا۔ میں جعفر کے ہاتھ اپنے دوست شوریز کو یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا کہ میگاسی کے نوادرات اس وقت نواب شہریار جنگ کی حویلی میں موجود ہیں لیکن جعفر پر اعتبار کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک بے حد چالو شخص ہے۔ مشہور پینٹنگز کی حیران کن نقلیں تیار کرنے کے علاوہ وہ کئی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ اس اہم راز کو پانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شوریز کے نام اپنا پیغام تحریری طور پر بھیجوں اور تحریر بھی ایسی ہو جس کا علم خود جعفر کو بھی نہ ہو۔ مصوری میرا روزگار ہی نہیں شوق بھی رہا ہے۔ مجھے اس جیل میں بھی نواب شہریار نے اپنا شغل جاری رکھنے کی رعایت دے رکھی ہے۔ میری پینٹنگ کٹ میں ہر قسم کی مصوری اور خطاطی کا سامان موجود ہے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور دس بارہ روز کے اندر چنے کی دال کے دانوں پر وہ تحریر لکھ دی جس کا ترجمہ تم اپنے ساتھ لائے ہو۔ یہ تحریر ایک قبائلی زبان میں ہے ایسی کچھ زبانیں ایران کے شمالی ساحل پر بولی جاتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو شوریز مسعدی کے سوا یہ تحریر کوئی اور نہ پڑھ سکے گا۔ ہم دونوں اس سے پہلے بھی ایک سے زائد موقعوں پر پیغام رسانی کے لیے یہ منی ایچرز والا کلیہ استعمال کر چکے تھے لہٰذا کسی قسم کی الجھن پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

رہائی کے روز جعفر کو میری ملاقات کے لیے لایا گیا۔ وہ ایک بے حس اور بدمزاج شخص ہے۔ تین سال بعد بھی اسے مجھ سے ملنے اور مجھے دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ مجھ سے ملنے یوں آیا جیسے کوئی ناگوار فریضہ ادا کر رہا ہو۔ بہرحال میں اس کا مزاج آشنا تھا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ اگر ایک بار اس نے مجھ سے معاملہ طے کر لیا تو جو ذمہ داری میں اس پر ڈالوں گا وہ ضرور نبھائے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے میرا ایک کام کرنا ہے اور اس کے لیے اسے معقول معاوضہ ملے گا۔

وہ بولا "کیسا کام اور کیسا معاوضہ؟"

میں نے پہرے داروں کی نظر بچا کر کانسی کا فرگن اسے دکھایا اور بتایا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کی قیمت ہزاروں ڈالر ہے۔ وہ ایک دم نرم پڑ گیا اور پوچھنے لگا کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔ میں نے چنے کی دال والا گلابی لفافہ نکالا اور اس سے کہا کہ وہ یہ لفافہ میرے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا دے۔

اس نے پوچھا کہ لفافے میں کیا ہے۔

میں نے جھوٹ بولا کہ یہ دال کے چند دانے ہیں۔ یہ دانے چونے کی ایک بہت پرانی مورتی میں سے برآمد ہوئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میرے دوست شوریز مسعدی کے لیے اہم ثابت ہوں گے۔

معلوم نہیں جعفر کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں بہرحال وہ میرا یہ کام کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس نے فرگن کا مجسمہ اور گلابی لفافہ مجھ سے لے لیا اور اپنے لبادے میں چھپا لیا تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھ سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ ان واقعات کو اب کم و بیش چھ ہفتے گزر چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میرا پیغام شوریز تک پہنچ پایا ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ جعفر یہاں سے روانہ بھی ہوا ہے یا نہیں۔"

میں نے اپنے دل میں سوچا "روانہ تو وہ ہو چکا ہے۔ یہاں سے بھی۔۔۔ اور دنیا سے بھی۔ انسان کتنا بھی ہوشمند ہو بے خبری کا پردہ چاک نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے پرال پر بیٹھا ہوا گوناب واحدی عرف ماسٹر گون بھی اس بات سے بے خبر تھا کہ جعفر نے یہاں سے رہا ہونے کے بعد کیا گل کھلایا ہے۔ اس نے پشاور سے ایک کار اغوا کی تھی اور پھر اس کار پر کہیں جا رہا تھا کہ خود بھی اغوا ہو گیا تھا۔ بعد ازاں اس کی لاش کار کی ڈکی میں پڑی رہ گئی تھی اور کانسی کا فرگن گلابی لفافے سمیت سرتاج پاشا نامی اسمگلر کے پاس پہنچ گیا تھا۔"

گوناب واحدی اپنی روئیداد سنا کر چپ ہو گیا تھا۔ کوٹھری میں کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی میں قیدیوں کے خراٹے گونج رہے تھے یا پھر کبھی برآمدے میں کسی اونگھتے ہوئے پہرے دار کی کھانسی۔ ٹرانسسٹر ریڈیو سے بھی اب "شاں شاں" کے سوا کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اب ہمیں کیا کرنا چاہیے مسٹر گوناب؟"

وہ بولا۔ "سب سے پہلے تو اس فوٹو اسٹیٹ کے ٹکڑے کرو جو تم ساتھ لے آئے ہو۔ شکر کرو کہ یہ کاغذ کسی کے ہتھے نہیں چڑھ گیا۔"

کاغذ بوٹا سنگھ کے پاس تھا۔ میرے اشارے پر اس نے کاغذ کے چند ٹکڑے کیے اور انہیں منہ میں ڈال کر نگل گیا۔

گوناب واحدی نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "شوریز معاملہ فہم شخص ہے لیکن مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس نے تمہیں کچے انتظام کے ساتھ یہاں بھیج دیا ہے۔ تم نے یہاں اپنا تعلق

دہلی کے ہفت روزہ سے بتایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو اس بات کی تصدیق کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا کہ تمہارا بیان سراسر جھوٹ ہے اور تمہارے شناختی کارڈ وغیرہ بھی جعلی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس بدبخت قلی قطب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ تصدیق کرچکا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہفت روزہ.... "سیاست" کے ایڈیٹر نے ٹیلی فون پر اس سے بات کی ہے۔"

گوناب بولا۔ "ممکن ہے کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہو۔ ان لوگوں کے ہاتھ ہماری توقع سے زیادہ لمبے ہیں۔ بہر حال۔ اب اس مشکل سے نکلنے کے لیے تمہیں بڑی منصوبہ بندی سے کام لینا ہوگا۔ میرے ذہن میں ایک راستہ آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہی بہترین راستہ ہے۔"

میں سوالیہ نظروں سے گوناب واحدی کی طرف دیکھنے لگا۔ بوٹا سنگھ کو گفتگو کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بہرحال وہ چٹا ان پڑھ بھی نہیں تھا۔ اس نے میٹرک کر رکھا تھا۔ کہیں کہیں الفاظ اس کے پلے پڑ جاتے تھے اور اسے موضوع کا پتا چل جاتا تھا۔ گوناب واحدی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تم سے پوچھ گچھ ہو تو تم یہ تسلیم کرلو کہ کسی اخبار وغیرہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں اور اب تک تم نے جھوٹ بولا ہے۔"

میں نے کہا "ہمیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ قلی قطب کو پورا یقین ہے کہ ہم پیدائشی جھوٹے ہیں۔"

"اب ایک اور جھوٹ تمہیں بولنا ہوگا۔" گوناب واحدی نے کہا "اور مجھے یقین ہے کہ یہ جھوٹ زیادہ معتبر اور قابل قبول ہوگا۔ نواب کا ایک بیٹا ہے۔ فیروز جنگ نام ہے اس کا۔ وہ پچھلے پانچ چھ ماہ سے بیمار ہے۔ کافی علاج معالجہ ہوا ہے لیکن وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوتا۔ قدرتی بات ہے کہ جب بیماری طول پکڑ جائے تو اچھے بھلے روشن خیال لوگ بھی جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے کی طرف رجوع کرجاتے ہیں۔ آج کل چھوٹے نواب کی والدہ بھی یہی کچھ کررہی ہیں۔ پچھلے دنوں تو انہوں نے حد ہی کردی۔ بنارس سے کوئی ہندو عامل بلا لیا۔ روحانی علاج کے نام پر اس عامل نے تین روز حویلی میں خوب ہڑبونگ مچایا۔ دھونیاں دیں، طبلے بجائے، رقص کیا اور عجیب و غریب نعرے بلند کرتا رہا۔

چوتھے روز شاید اتفاقاً چھوٹے نواب خود کو کچھ بہتر محسوس کرنے لگے۔ عامل کا "روحانی عمل" بھی ختم ہوچکا تھا، وہ چھوٹے نواب کی والدہ سے قریباً دس ہزار روپیہ بطور انعام پاکر چلا گیا۔ اس واقعے کی خبر چند روز اکتوبر کے ہند سماچار میں بھی چھپی تھی۔ اس خبر کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے اگر تم اس پر عمل کرسکو تو۔"

"جی فرمائیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے کہا۔

گوناب واحدی بولا۔ "اگر تم بھی کسی طرح خود کو اس روحانی علاج والے چکر میں ملوث کرلو تو بہتری کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ کسی طرح یہ بات ثابت ہوجائے کہ تم نے ہند سماچار میں دس ہزار روپے انعام والی خبر پڑھی اور تمہارے دل میں بھی لالچ پیدا ہوگیا۔ روحانی علاج کا ڈھونگ رچا کر مال بٹورنے کے لیے تم یہاں پہنچ گئے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

گوناب واحدی بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ایک بہت بڑے الزام سے بچنے کے لیے تم ایک چھوٹا جرم قبول کرلو۔ تم دونوں جو اس بری طرح پھنسے ہو تو اس کی وجہ نوادرات ہیں۔ حویلی میں نوادرات کی موجودگی کی وجہ سے نواب شہریار اور اس کے کارندے بے حد "الرٹ" ہیں۔ اگر نوادرات والا معاملہ بیچ میں نہ ہوتا تو نواب کے کارندے اس بری طرح ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے نہ پڑتے۔ وہ بجا طور پر یہ شک کررہے ہوں گے کہ تمہارا تعلق کہیں نوادرات والے معاملے سے نہ ہو۔ اگر یہ تعلق ثابت ہوگیا تو سمجھ لو کہ اس چار دیواری میں تم پر بہت سخت مصیبت آنے والی ہے لیکن اگر کوئی دوسرا الزام ثابت ہوتا ہے تو پھر رہائی کے امکانات روشن ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی تجویز ہے کہ ہم خود کو پیری فقیری کے معاملے میں ملوث کرلیں؟"

"بالکل۔۔ لیکن یہ کام ایسے ہو کہ کہیں بناوٹ کا رنگ نہ آئے۔ یوں محسوس ہو کہ تم سے واقعی اقبالِ جرم کرایا ہے۔ سمجھو۔۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

گوناب واحدی نے اٹھ کر ریڈیو کی سوئی ادھر ادھر گھمائی اور اسے کسی ایسے اسٹیشن پر سیٹ کردیا جہاں رات کے اس آخری پہر بھی پُرہنگام موسیقی نشر ہورہی تھی۔ پھر وہ کیبل سمیٹ کر ہمارے بالکل قریب بیٹھ گیا اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔

O☆O

منظر اسی حوالات نما کمرے کا تھا جہاں کل رات قطب سے ہماری ناخوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ اب دن چڑھ چکا تھا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا۔ ناشتا کرانے

ہمیں پہرے دار یہاں لے آئے تھے۔ بالکل جیسے قربانی کے بکرے کو دانہ کھلا کر اور پانی پلا کر قسائی کے پاس لے جاتے ہیں۔ قلی قطب بھی ہمیں انہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن سے قسائی جانوروں کو دیکھتا ہے۔ کوٹھری میں سے نکالتے وقت ہمارے ہاتھ آگے کی طرف باندھ دیے گئے تھے۔ باقی رہے پاؤں تو وہ ہم دونوں کے رات ہی سے ننگے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد ایک دراز قد شخص حوالات نما کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا بارعب شخص تھا۔ بال کنپٹیوں پر سے سفید ہوچکے تھے۔ اس نے سفید مخمل کا ایک نہایت نفیس کرتہ پہن رکھا تھا۔ انگرکھے کی طرز کا یہ کرتہ کڑھائی دار تھا اور سینے پر ایک طرف طلائی بٹن لگے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ شخص نواب شہریار جنگ ہے۔ نواب کے ہاتھوں میں نہایت قیمتی نگینوں والی انگشتریاں تھیں۔ پائجامے کے نیچے اس کے جوتے میں بھی بہت سے قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ رئیس ابنِ رئیس اور نواب ابنِ نواب ہے۔ وہ اپنی بڑی بڑی رعب دار آنکھوں سے یک ٹک مجھے دیکھتا رہا پھر اپنی مخملی چادر کو کندھے پر سنبھالتے ہوئے گونجدار آواز میں بولا۔ "تم دونوں کے جھوٹ کا پول تو کھل ہی گیا ہے۔ اگر چمڑی بچانے کا ارادہ ہو تو ہر بات صاف صاف بتادو۔"

ہم دونوں نے پھر وہی رٹا لگانا شروع کردیا جو اس سے پہلے قلی قطب کے سامنے لگا چکے تھے۔ نواب شہریار جنگ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ تم کا بیان جھوٹا ثابت ہوگیا ہے۔ ہفت روزہ سیاست کا ایڈیٹر ٹیلی فون پر خود ساری باتاں بتا چکا ہے۔ وہ تم کو جانتا ہے ہور نہ تمہارے ساتھی کو۔"

میں نے لجاجت سے کہا۔ "نواب حضور، اگر آپ فرما رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہی فرما رہے ہوں گے لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ٹیلی فون پر کسی اور نے بات کی ہو اور قطب کی بات کا جواب مذاق میں دیا ہو۔"

"مذاق ہے۔ مذاق تو تم ہم سے کرتے ہو۔ ہور اس مذاق کا بڑا یادگار سبک (سبق) تم کو ملنے والا ہے۔" نواب نے بہت سخت لہجے میں کہا۔

کچھ دیر سوالاً جواباً اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر نواب کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لہٰذا مزاحمت لاحاصل تھی۔ دو پہلوان نما افراد نے پہلے ہی ریلے میں مجھے نیچے گرایا اور بے دریغ پیٹنے لگے۔ گھونسے، ٹھوکریں، رائفل کے بٹ، مختلف قسم کی ضربوں سے جسم جھنجھنا اٹھا۔ اس عالم میں مجھے یونہی فریال کا خیال آگیا اور فریال کے ساتھ ساتھ ان ڈاکٹر صاحب کا بھی، جنہوں نے بے حد تاکید کے ساتھ مجھے بستر پر رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ دونوں مجھے اس حالت میں پٹتے ہوئے دیکھتے تو میری "سعادت مندی" پر یقیناً خوش ہوتے۔ دفعتاً بوٹا سنگھ زور زور سے چلانے لگا۔ "ٹھہرو۔۔ ٹھہرو میری بات سنو۔ میں بتاتا ہوں سب کچھ۔ اوئے میں مرگیا۔ اوئے میری ہڈی ٹوٹ گئی۔"

مجھے بوٹا سنگھ سے ایسی "کم دلی" کی توقع نہیں تھی۔ بے حد سخت جان تھا وہ، بالکل جلی ہوئی اینٹ کی طرح۔۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بن رہا ہے۔ اسے کمزور پڑتے دیکھ کر پیٹنے والوں نے کچھ اور بے رحمی دکھائی۔ بوٹا سنگھ باقاعدہ رونے لگا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگنے لگا۔ نواب شہیار کے اشارے پر مارپیٹ کرنے والوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ بوٹا سنگھ کی صورت دیدنی تھی۔ اس کی دال بننے لگی تھی، جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور ناک سے خون چھوٹ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی لگا کہ واقعی اس کا پتا پانی ہوگیا ہے۔ وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولا "نواب صاحب، ہم سے غلطی ہوگئی۔ ہم کو ماف کردیں۔ جو کچھ آپ پوچھیں گے میں بتاؤں گا۔ واہگرو کی سوگند بتاؤں گا۔"

اس نے کہنیاں پیٹ سے لگا رکھی تھیں اور بندھے ہوئے ہاتھ اپنے چہرے کے بالکل سامنے کر رکھے تھے۔ نواب شہیار کے اشارے پر قلی قطب نے بوٹا سنگھ کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور اسے پینے کے لیے پانی دیا۔ ایک دوسرے شخص نے گندا سا ایک کپڑا بوٹا سنگھ کی ناک پر رکھ کر دبا دیا تاکہ اس کا خون رک سکے۔ نواب شہیار نے بڑی کرخت آواز میں مجھے مخاطب کرکے پوچھا کہ میرے کیا ارادے ہیں؟ میں نے بھی سہم جانے کا ڈراما کیا اور نواب کے سامنے سر تسلیم خم کردیا۔ نواب نے مطمئن ہونے کے بعد ہمارے ہاتھ کھلوا دیے اور مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ ہمارے چاروں طرف مسلح افراد موجود تھے۔ ہمیں مسلسل خوفزدہ رکھنے کے لیے قلی قطب نے ۳۸ بور کا ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ گاہے گاہے ریوالور کو دھمکی آمیز انداز میں حرکت دیتا اور ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک لذت آمیز سفاکی ابھر آتی۔

رائفلوں کے سائے اور دھمکیوں کی گونج میں ہم نے اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں جو کچھ نواب شہریار کو بتایا اس کا خلاصہ یہ

ہے۔

ہم دونوں نے اپنے درست نام پتے بتائے اور یہ بتایا کہ چند ہفتے پہلے ہند سماچار میں دیکھی ہوئی ایک خبر کی وجہ سے ہم لالچ کے پھندے میں پھنس گئے۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ حیدر آباد کے نواب شہریار جنگ کا صاحبزادہ بیمار ہے اور وہ اس کی صحت یابی کے لیے عاملوں اور ٹونے ٹوٹکے والوں کے پاس مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پچھلے دنوں نواب صاحب کی بیگم نے بنارس سے ایک ہندو عامل کو بلایا تھا اور یہ عامل بوقتِ رخصت نواب صاحب سے دس ہزار روپے انعام پا کر گیا ہے۔ ہم دونوں نے ایک منصوبہ بنایا اور اس کے تحت یہاں آ گئے۔

اس منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے میں نے نواب شہریار سے کہا "میرا کام یہ تھا کہ میں ایک تجربہ کار اخبار نویس کی حیثیت سے آپ سے ملوں اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کے حوالے سے کتاب لکھنے کے بہانے آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔ اس دوران آپ کی نجی زندگی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتا رہوں۔ پھر موقع محل دیکھ کر آپ کو یا بیگم صاحبہ کو بتاؤں کہ آپ عاملوں فقیروں کے چکر میں دور دور بھاگے کیوں پھر رہے ہیں۔ یہیں حیدر آباد میں خدا کا ایک نیک بندہ موجود ہے۔ جو اس کے پاس جاتا ہے بامراد لوٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یوں میں آپ کو اپنے ساتھ بوٹا سنگھ کے پاس لے جاؤں۔ بوٹا سنگھ آپ کو دیکھتے ہی آپ کا نام پتا، حسب نسب، آپ کے مسائل اور پریشانیاں سب کچھ بتا دے اور یوں آپ پر اس کی دھاک بیٹھ جائے۔ ہمیں زیادہ امید بیگم صاحبہ کی طرف سے تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر ہمیں بیگم صاحبہ سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے ہم مشرقی پنجاب میں بھی ایک دو امیر گھرانوں میں اس طرح کی وارداتیں کر چکے ہیں اور ہمیں توقع تھی کہ یہ تجربہ یہاں ہمارے کام آئے گا۔"

نواب اور اس کے جہاندیدہ گرگوں کو چکر دینا آسان نہیں تھا لیکن حالات کچھ ایسے بنے کہ ہماری باتیں وزنی محسوس ہو رہی تھیں اور انہیں سنجیدگی سے سنا جا رہا تھا۔ میں نے خلاصہ بیان کیا ہے، یہ خاصی طویل گفتگو تھی۔ درمیان میں نواب شہریار اور قلی قطب سوالات بھی کرتے جا رہے تھے۔ ایک ایک نکتے پر بحث کی گئی۔ قریباً دو گھنٹے بال کی کھال اتاری گئی۔ ہمیں تسلی تھی کہ اگر ہمارے دیے ہوئے نام پتوں سے تصدیق بھی کی گئی تو جھوٹ برآمد نہیں ہو سکے گا۔ فرید کوٹ سے بوٹا سنگھ کے نام کی تصدیق ہو جائے گی اور لاہور سے میرے نام کی۔

کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ نواب اور قلی قطب کو ہمارے "اقبالی بیان" پر کتنے فیصد بھروسا ہوا ہے۔ بہر حال ایک کامیابی ہمیں حاصل ہوئی تھی۔ یہ کامیابی ہماری جاندار اداکاری کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی اور نواب کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا نتیجہ بھی اور وہ کامیابی یہ تھی کہ نواب ہمیں معمولی شے سمجھنے لگا تھا، دوسرے لفظوں میں "انڈر اسٹیمیٹ" کرنے لگا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کر رہا تھا جو دیہاتی تھانیدار کسی عاجز مسکین حوالاتی سے کرتا ہے۔ ہماری پوری کتھا سننے کے بعد اس نے ہمیں کرسیوں سے اٹھنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ ذرا اپنی ٹانگیں کھولنے کے لیے ہم احاطے کے تین چکر دوڑ کر لگائیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، وہ احاطہ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا ایک چکر بھی کارِ دشوار تھا کجا کہ تین چکروں کا حکم ہو رہا تھا اور وہ بھی سزا کے طور پر۔ میں نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھا۔ بوٹا سنگھ نے عاجزی سے کہا۔ "معاف کر دیں سرکار! ہم سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے لیکن ہم نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔"

"معاف کر دیں گے۔ کیوں نہیں کریں گے معاف۔ لیکن سزا کے بغیر بھی تو گزارا نہیں ہو گا۔" نواب نے رعونت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

قلی قطب نے ایک زوردار جھانپڑ بوٹا سنگھ کی گردن پر رسید کیا اور گرج کر بولا "چل اٹھ کنجر کی اولاد، ورنہ مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔"

زوردار ہاتھ تھا۔ بوٹا سنگھ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ میں جھانپڑ کھائے بغیر ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ بیرونی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ہم پہلو بہ پہلو بھاگ رہے تھے۔ حویلی کے مسلح محافظ اور دیگر ملازم مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ رہائشی عمارت کے قریب سے گزرے تو بالکونی پر ایک گوری چٹی خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ وہ نائٹ سوٹ میں تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور تالی بجا کر بولی۔ "شاباش، اور تیز بھاگو، ورنہ قلی قطب پیچھے کتا لگا دے گا۔"

مجھے یاد آیا کہ جیل میں گوناب واحدی نے نواب شہریار کی بیٹی کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس نے حویلی کے ایک ہال نما کمرے کو جمنازیم کی شکل دے رکھی تھی۔ یقیناً یہ وہی لڑکی تھی۔ ہم نے ہانپتے ہوئے احاطے کا ایک چکر مکمل کیا اور دوسرے

لیے دوڑ پڑے۔ نواب شہریار بھی اب کھلی جگہ پر آ گیا تھا اور ایک شاندار کرسی پر ٹھاٹ سے بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ہماری طرف سے وہ جیسے بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ قلی قطب اور اس کا ایک ساتھی احاطے کے وسط میں کھڑے ہو گئے تھے اور ہمیں تیز بھاگنے کے لیے دھمکا رہے تھے۔ تیسرا چکر واقعی دشوار ثابت ہوا۔ ہم نے مشکل سے یہ فاصلہ طے کیا اور نواب کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

اس نے اخبار سے سر اٹھا کر کہا۔ "کیوں بھئی طبیعت میں کچھ فرق پڑا ہے؟" ہم خاموش کھڑے رہے۔ وہ بولا "یہ تو صرف "وارم اپ" تھا۔ ابھی اصل ورزش تو ہو گی۔"

اس نے قلی قطب کو اشارہ کیا۔ وہ کڑک کر بولا۔ "چلو دونوں اوندھے لیٹ جاؤ اور ڈنٹر پیلو۔"

میں نے زبان کھولتے ہوئے کہا۔ "جناب! بہت ہو چکی ہے ہم سے، اب معافی دے دیں۔ ہم اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہیں۔ جو قسم چاہے لے لیں۔ ہم آئندہ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔"

نواب بولا۔ "ہم کب کہہ رہے ہیں تم آئندہ ادھر کا رخ کرو گے۔ تمہاری تو ہوا بھی ادھر سے نہیں گزرے گی۔ مگر جو اب کچھ تم کر چکے ہو اس کی سزا تو بھگتنا ہو گی۔ وہاں افضل گنج میں تو تم بڑے پھنے خاں بنے تھے۔ ہمارے ایک بندے کی گردن کا کڑاکا نکال دیا۔ اب بکری کے جیسے "میں، میں" کر رہے ہو۔"

قلی قطب نے پیچھے سے ایک زوردار دو ہتڑ میری کمر پر مارا اور گالی دے کر بولا۔ "۔۔۔ چل ڈنٹر پیل۔"

میں نے چہرے پر مُردنی طاری کر رکھی تھی لیکن دل میں کوئی ملال نہیں تھا۔ جو بے عزتی ہماری ہو رہی تھی یہ ہماری اپنی مرضی و منشا سے ہو رہی تھی۔ ورنہ ان کتوں کی اتنی مجال کہاں تھی کہ ہمیں یوں نچا رکھا سکتے۔ ان سے کہیں بڑے بڑے سورماؤں نے پلک جھپکنے میں ہمارے سامنے زمین چاٹی تھی۔ یہ تو ایک ڈراما تھا۔ اس ڈرامے میں ہمارے کردار دو معمولی وارداتیوں کے تھے۔ ان کرداروں میں رنگ بھرنے کے لیے ہم سب کچھ برداشت کرتے جا رہے تھے۔ نواب شہریار بڑی رعونت سے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بات اس کے سان گمان میں بھی نہ ہو گی کہ میری پنڈلی سے اس وقت بھی ایک تیز دھار خنجر بندھا ہوا ہے۔ یہ خنجر پلک جھپکنے میں میرے ہاتھ میں آ سکتا تھا اور اس سے پہلے کہ نواب کے دو ٹکوں والے کتے اپنی جگہ سے حرکت بھی کرتے میں نواب کو نشست سے دبوچ کر یہ خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ سکتا تھا۔ یہ سارا عمل میرا جانا بوجھا ہوا تھا اور ایک لمحے میں مکمل ہو سکتا تھا لیکن ہماری ترجیح تھی کہ ہم بغیر کسی خونی ہنگامے کے یہاں سے نکل سکیں۔

قلی قطب نے دوبارہ گرج کر کہا تو ہم نے ڈنٹر پیلنے شروع کر دیے۔ بالکونی میں کھڑی حسینہ بھی تماشا دیکھنے کے لیے نواب شہریار کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ ہم نے قریباً پندرہ پندرہ ڈنٹر ہی پیلے ہوں گے کہ نواب شہریار کو ترس آ گیا۔ اس نے ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ ہم کھڑے ہو گئے۔ وہ کچھ دیر فخریہ نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا پھر قلی قطب سے بولا۔ "ان دونوں کو لے جاؤ۔ ان کا فیصلہ ہم پھر کریں گے۔"

قلی قطب نے ہمیں لے جا کر پھر زنداں کے حوالے کر دیا۔

یہ تیسرے دن صبح آٹھ نو بجے کا ذکر ہے۔ ہمیں کوٹھری سے نکال کر دوبارہ نواب شہریار جنگ کے حضور پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ ہماری پیشی رہائشی عمارت کے ایک کمرے میں ہوئی۔ یہ نشست گاہ کی طرز کا کمرا تھا اور خاص حیدر آبادی انداز میں سجا ہوا تھا۔ دبیز پردے، قالین، جھاڑ فانوس، دروازوں اور دریچوں پر لکڑی میں کندہ کیے ہوئے خوبصورت نقش و نگار تھے۔ کمرے کی سجاوٹ میں سب سے خاص چیز وہ جالی دار کٹہرے تھے جنہیں دکنی کلچر میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ نواب شہریار جنگ آج شیروانی میں تھا۔ یہ شیروانی کچھ کچھ لکھنوی طرز کی تھی کیونکہ اس کے گریبان کو چمکیلی گوٹ لگا کر نمایاں کیا گیا تھا۔ تنگ موہری کا پاجامہ اور سلیم شاہی جوتا پہنے نواب بڑے ٹھاٹ سے منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ آج اس کے چہرے پر ہمیں مہربانی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنی "اوقات" کے پیش نظر ہم قالین پر ہی دو زانو بیٹھ گئے۔ نواب نے ہمارے ساتھ آنے والے دونوں مسلح افراد کو باہر بھیج دیا۔ کچھ دیر گہری نظروں سے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا "ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں لیکن یہ کام پوری رازداری سے کرنا ہو گا اور پوری ذمے داری سے بھی۔ اگر اس میں کوئی غلطی ہوئی تو پھر اپنی رہائی کا معاملہ ختم سمجھو۔"

"آپ حکم فرمائیں جناب! ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔" میں نے مرعوب لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ "سر دھڑ کی بازی نہیں لگانی۔ بس وہی کام کرنا ہو گا جو تم کرنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ ہمارا مطلب

ہے پیری فقیری والا ناٹک۔ لیکن اس مرتبہ یہ ناٹک تمہیں ہماری مرضی کے مطابق کرنا ہوئیں گا۔"

بوٹا سنگھ بولا۔ "آپ جو کہیں گے ہم کریں گے بادشاہو۔"

نواب نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ ہم نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ ظاہر کرنے کے بعد حکم کی تعمیل کی۔ نواب نے کہا۔ "ہم تمہیں چھوٹے نواب کے پاس پہنچا دیں گے۔ تم نے ان کا روحانی علاج کرنا ہوئیں گا' ہمارا مطلب ہے جو بھی جھاڑ پھونک تم کرتے ہو۔ اس علاج کے لیے تم چھ سات دن یا جتنے بھی دن چاہو لے سکتے ہو۔ جب بھی تم چھوٹے نواب کے پاس جاؤ گے ان کی والدہ تمہیں بستر کے آس پاس ہی ملیں گی۔ تم نے بڑی سمجھداری سے ان کے ذہن میں یہ بات ڈالنا ہوئیں گا کہ چھوٹے نواب کا اصل پائیدار علاج یہی ہے کہ ان کی شادی کر دی جائے اور شادی بھی وہیں ہو جہاں ان کی منگنی ہو چکی ہے۔ ہماری باتاں تمہاری سمجھ میں آرہی ہیں ناں؟"

"بالکل سمجھ میں آرہی ہیں سرکار۔ میرا کھیال ہے کہ کسی وجہ سے چھوٹے نواب اس جگہ شادی نہیں کرنا چاہتے جہاں ان کی منگنی ہوئی تھی۔ بیگم صاحبہ بھی ان کی حمایت کررہی ہیں۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ۔۔۔"

"بالکل یہی باتاں ہے" نواب نے بوٹا سنگھ کی بات کاٹی "تم دونوں سمجھدار ہو۔ اب تمہارے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا ہوئیں گا کہ چھوٹے نواب شادی سے دامن کیوں چھڑا رہے ہیں ہم تمہیں اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔ یہ جواب تم کو آتا ہوئیں گا تو تم زیادہ آسانی سے بیگم صاحبہ کو غائل (قائل) کرلیں گا۔"

اس کے بعد نواب شہریار جنگ نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ نوابوں اور راجوں مہاراجوں کی حویلیوں کی طرح اس وسیع و عریض حویلی میں بھی نوکروں چاکروں اور خدمتگاروں کی ایک فوج ظفر موج موجود تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی' عورتوں میں بوڑھیاں بھی تھیں اور نوجوان لڑکیاں بھی۔ لڑکیوں میں عام صورت کی بھی تھیں اور خوبصورت بھی۔ ایسی ہی ایک لڑکی جمیلہ نے چھوٹے نواب پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ وہی انارکلی اور شہزادہ سلیم والا ڈراما ہوا تھا' لیکن بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ اکبر بادشاہ یعنی نواب شہریار جنگ کو پتا چل گیا اور اس نے دانشمندانہ پیش بندی کرتے ہوئے صاحب زادے کی منگنی کردی۔ یہ منگنی خاندان کی ہی ایک حسین و جمیل نواب زادی سے ہوئی تھی اور نواب شہریار جنگ جلد سے جلد یہ شادی کردینا چاہتے تھے مگر حالات کو ان ارادوں کے ساتھ ہمیشہ بیر رہا ہے۔ یہاں بھی یہ ہوا تھا' پچھلے پانچ چھ ماہ سے چھوٹے نواب فیروز جنگ بستر علالت تھے اور شادی مؤخر ہو رہی تھی۔ نواب شہریار جنگ کی نظر میں ان کی بیگم ایک توہم پرست عورت تھی۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فیروز جنگ کی بیماری کی وجہ اس کی منگنی ہے اور وہ اسی وقت صحت یاب ہوگا جب اس کی شادی اس کی اپنی مرضی سے طے ہوگی۔ غالباً اس کے دماغ میں حویلی کے پرانے ملازم "عبداللہ" کی جمیلہ نامی بیٹی کا خیال گھسا رہتا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ فیروز جنگ رہیں شاد کرلے۔

دلچسپ صورت حال تھی' ہم جو گندھارا آرٹ کے نمونوں کی ٹوہ میں یہاں پہنچے تھے۔ اپنے ہی بہروپ کا شکار ہوکر ایک روحانی چکر میں پھنس رہے تھے۔ ابھی بوٹا سنگھ کو نواب شہریار کی ہدایات جاری ہی تھیں کہ نواب صاحب زادی لشتی مٹکتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی اور اس حیدر آبادی ماحول میں قطعی فٹ نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی بول چال میں بھی دکنی رنگ نہیں تھا۔ مجھے شک گزرا تھا کہ وہ ایک عرصہ ملک سے باہر رہ کر آئی ہے۔ اس کا نام شاہین تھا اور یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا تھا کہ کل جب ہم حوالات میں ڈنڈ پیل رہے تھے تو نواب نے اسے شاہین کہہ کر بلایا تھا۔

نواب بیٹی کو دیکھ کر ذرا سا چونکا پھر فوراً لہجہ بدل کر بولا "ارے بھئی ہم لوگاں تو دھوکے میں لگ رہے۔ یہ تو بڑے پہنچے ہوئے بندے نکلے ہیں۔ سچ مانو ہم کو تو شرمندگی ہو رہی ہے اپنے کل والے رویے سے۔"

شاہین نے حیرت سے آنکھیں نچائیں۔ "کیوں پاپا! کیا ہوا؟"

نواب نے چرب زبانی کا مظاہرہ کرکے دو منٹ میں بیٹی کو یقین دلا دیا کہ کل اس نے ہم سے ٹکر لگوا کر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ ہمارے اندر سے بڑی برگزیدہ ہستیاں برآمد ہوئی ہیں۔ خاص طور سے بوٹا سنگھ کے بارے میں تو رطب اللسان ہوگیا اور اس کے رتبے کو بانس پر چڑھا کر نانک چند کے برابر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ شاہین کو ان باتوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ حیرت سے بوٹا سنگھ کو دیکھتی رہی۔ جو اپنی غلیظ آنکھیں اپنے کالے بھجنگ بالوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں چھپائے بیٹھا تھا اور ہڈیوں کا شکستہ ڈھانچا نظر آرہا تھا۔ وہ بابا سے گاڑی کی چابی لینے آئی تھی' چابی لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد نواب شہریار ایک بار پھر بوٹا سنگھ کو اہم ہدایات دینے میں مصروف ہوگیا۔

○☆○

رات نو بجے کا عمل تھا۔ میں نیچی چھت والے ایک مختصر کمرے میں بستر پر دراز تھا۔ یہ کمرا حویلی کی وسیع چار دیواری کے اندر ہی واقع تھا اور کمروں و برآمدوں کی ایک طویل قطار کا حصہ تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے مکانات حویلی کے خدمتگاروں کے لیے مخصوص تھے۔ بعض اوقات ہمارے جیسے "کم درجہ" مہمانوں کو بھی یہاں ٹھہرا دیا جاتا تھا۔ ہم جیل سے رہائی پانے کے بعد یہاں منتقل ہوئے تھے اور اب پچھلے تین روز سے یہیں قیام پذیر تھے۔ بوٹا سنگھ روزانہ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ عامل کے روپ میں حویلی کے رہائشی حصے میں جاتا تھا اور چھوٹے نواب فیروز جنگ کو جھاڑ پھونک کرکے نو بجے کے قریب واپس آجاتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ فیروز جنگ ایک چوبیس پچیس سالہ خوبرو نوجوان ہے۔ ایک عرصہ برطانیہ میں گزار کر یہاں آیا ہے۔ وہ اپنی ماں اور باپ کے درمیان ہونے والی کھینچا تانی کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کس کی بات مانے۔ اس کی ماں کی خواہش ہے کہ اس کی منگنی ٹوٹ جائے اور وہ اپنی مرضی سے شادی کرے۔ جب کہ باپ بضد ہے کہ شادی وہیں ہو جہاں منگنی ہوئی ہے۔ اگر فیروز جنگ کسی ایک پلڑے میں اپنا وزن ڈال دے تو یقیناً فیصلہ ہو جائے لیکن یوں لگتا ہے کہ وہ بھی کشمکش کا شکار ہے۔ نہ وہ باپ کی طرفداری کرتا ہے اور نہ کھل کر یہ کہتا ہے کہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ درحقیقت اس کی خاموشی ہی کی وجہ سے باپ کو شہ ملی ہوئی ہے اور وہ زور دے کر کہتا ہے کہ فیروز کی شادی وہیں ہوگی جہاں اس کی منگنی ہوئی ہے۔

میں اس عجیب و غریب معاملے پر غور کرتا رہا تھا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر فیروز جنگ خود بھی اس بات پر شدید اصرار نہیں کررہا کہ اس کی شادی کسی ملازم کی لڑکی سے ہو تو پھر اس کی والدہ کیوں اس چکر میں الجھ رہی ہے۔۔۔ ترجیح اپنی جگہ لیکن یہ بیٹے کی پوری زندگی کا سوال تھا۔ وہ کتنا ایک غیر معمولی فیصلے پر اصرار کررہی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹا اپنے خیالوں میں الجھا رہا اور بوٹا سنگھ کا انتظار کرتا رہا۔ ہمیں لاہور سے روانہ ہوئے اب نو دس دن ہو چکے تھے مجھی بات تھی کہ مجتبیٰ پیلس میں مجتبیٰ اور مسٹر کلارک شدت سے ہماری رپورٹ کا انتظار کررہے ہوں گے۔ رپورٹ تو ہمارے پاس ٹھیک ٹھاک موجود تھی لیکن ہم سے یہ اختیار چھنا ہوا تھا کہ ہم یہ رپورٹ مجتبیٰ پیلس تک پہنچا سکیں۔ یہ سوچ کر میں سنسنی محسوس کررہا تھا کہ ہم اس شخص کا سراغ لگا چکے ہیں جس نے پچھلے کی دال کے سات راتوں پر ایک گراں قدر تحریر لکھی تھی اور وہ شخص اسی چار دیواری میں ہمارے ساتھ موجود ہے اور بات صرف اس شخص کی ہی نہیں تھی عین ممکن تھا کہ اب تک گندھارا آرٹ کا وہ نادر ذخیرہ بھی اسی چار دیواری میں ہو جس کی قیمت بے حد و حساب تھی۔ اس ذخیرے میں سے چرائے جانے والے صرف ایک فریکن کی قیمت گوتاب واحدی نے قریباً بیس ہزار امریکی ڈالر بتائی تھی اور وہ فریکن اس ذخیرے کا ایک ناقابل ذکر حصہ تھا۔ اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس سے بھاگ کر گزرا ہو۔ کمرے کی خاموش فضا میں ایک دم سنسنی سی بھر گئی۔ یہ کون تھا جو سائے کی طرح لپک کر کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا تھا۔ میرا دھیان ایک دم ایک جانے پہچانے چہرے کی طرف چلا گیا۔ نجانے آج کل ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ جب بھی کوئی انہونی سی بات ہوتی تھی سائیں عالی کا سراپا میری نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ درحقیقت پشاور سے آنے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی سائیں عالی کا خیال مجھ سے جدا نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں عالی ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ ہر گھڑی مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ کسی بھی وقت کسی کونے کھدرے سے برآمد ہوکر مجھے ششدر کردے گا۔ میں نے یونہی اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھولے اور باہر جھانکا۔ مدھم چاندنی میں درخت اور پودے خاموش کھڑے نظر آتے تھے۔ جیسے اپنے اپنے سینے میں اس حویلی کے ان گنت راز چھپائے سربلب ہوں۔ یہاں کسی متنفس کا نشان نظر نہ آیا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ بند کردیے۔

اسی دوران بوٹا سنگھ بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ آج قریباً آدھ گھنٹا لیٹ ہوگیا تھا۔ عامل کا روپ بھرنے کے لیے اس نے اپنے گلے میں بس دو چار مالائیں اور تعویذوں کا اضافہ کرلیا تھا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص خبر ہے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "آج میں نے چھوٹے نواب کی والدہ سے کہا کہ میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے ایک تنگ برآمدے سے گزار کر ایک گھٹے گھٹے کمرے میں لے گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بیٹے کا بیاہ کردے اور اسی

گڑی سے کرے جس سے اس کی منگنی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ ان دونوں کے ستارے ملتے ہیں اور ان کے ملنے سے چھوٹے نواب کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑے گا۔ مائی کا چہرہ اتر گیا۔ ایک دم سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔ گرو جی! آپ بڑی گہری نظر والے ہیں۔ جو ہم نہیں دیکھ سکتے وہ بھی آپ دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کو ایک بڑی خاص بات بتانا چاہتی ہوں گرو جی! بات یہ ہے کہ میرا بیٹا ایک لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ میں ان دونوں کی محبت کی گواہ ہوں۔ وہ لڑکی ہمارے ملازم عبداللہ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ عبداللہ ہماری زمینوں کی پیداوار کا حساب کتاب رکھتا ہے اور بڑا وفادار ملازم ہے۔ اس کی بیٹی کا نام جمیلہ ہے۔ وہ بارہ جماعت پاس ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ بے شک وہ ہمارے ملازم کی بیٹی ہے اور ہمارا جوڑ نہیں ہے لیکن اس کے سوا اس میں کوئی اور خرابی نہیں ہے۔ حد درجے کی سلیقہ مند، سمجھ دار اور پیاری لڑکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرا بیٹا اسے پسند بھی کرتا ہے۔ میرا تو یہ سوچ کر دل ہول جاتا ہے کہ کہیں میرے بیٹے کی وجہ سے اس کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ میں نے کہا۔ بیگم جی! میں نے تو جو کچھ ستاروں کے حساب سے دیکھا تھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اب آگے آپ کی منشا ہے۔

ویسے میرا خیال ہے کہ اب مائی اس بارے میں سوچ وچار ضرور کرے گی۔"

بوٹا سنگھ نے اپنا طویل بیان ختم کیا اور حسب عادت دانتوں کی درمیانی درز سے تھوک کی پچکاری نکال کر اپنے میلے میلے پاس کھجانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "بوٹے! تمہارا اپنا خیال کیا ہے فیروز جنگ کے بارے میں ... میرا مطلب ہے کہ وہ جمیلہ سے شادی کرنا چاہتا بھی ہے یا نہیں۔"

بوٹا سنگھ نے کہا۔ "لگتا ہے کہ وہ بھی چکر میں پڑا ہوا ہے۔ کبھی ایک طرف کی بات سوچتا ہے کبھی دوسری طرف کی۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ جو ور دے کر بات کرے تو اس کی شادی اس کی مرضی سے ہو سکتی ہے۔"

ہم کافی دیر حویلی اور حویلی کے مکینوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں سینے کے درد کی دوا اپنے ساتھ لایا تھا اور باقاعدگی سے کھا رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ افاقہ تھا لیکن پھر بھی جب دن بھر کی مصروفیت ہوتی تھی اور رات کو سونے کے لیے لیٹتا تھا تو اندازہ ہوتا کہ دائیں پسلیوں کے نیچے "درد" اور "درد کی

اگلی شب جب بوٹا سنگھ جھاڑ پھونک کے لیے گیا ہوا تھا اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک ہندی اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا، مجھے پھر محسوس ہوا کہ کھڑکی کے پاس کوئی موجود ہے۔ آج کھڑکی کے پٹ کھلے تھے اور یقینی بات تھی کہ باہر سے اندر کا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک لڑکی نظر آئی۔ مجھے کھڑکی میں دیکھ کر اس نے ایک دم رخ پھیر لیا۔ اپنے کام میں مصروف نظر آنے لگی۔ اس نے قریبی اور ... اور پھولدار جھاڑیوں پر سوکھنے کے لیے ڈالے گئے بہت کپڑے ایک ڈھیر کی صورت میں گھاس پر جمع کر رکھے تھے۔ اب ان کی گٹھڑی باندھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یقیناً وہ سرونٹ کوارٹروں میں رہنے والی کوئی لڑکی تھی۔ مجھے گمان گزرا کہ اس سے پہلے بھی وہی کھڑکی کے گرد منڈلاتی ... میں کمرے سے نکلا اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ... کوارٹر کے عقب میں پہنچ گیا۔ لڑکی نے اب گٹھڑی باندھ لی تھی اور جانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ تاریکی میں اس کی صورت ٹھیک سے نظر نہیں آ رہی تھی ... سراپا پرکشش تھا۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور کرتہ پہنے تھی۔ سر پر شوخ اوڑھنی تھی جس نے اس کا نصف سے ... چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اوڑھنی کی سفید جھالر کھڑکی سے آنے ... روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر سر ... درست کیا تو کلائیوں میں بلوری چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

"السلام علیکم جی" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام" میں نے کہا "کہاں سے آئی ہو تم؟"

"ہم آپ کے مکان سے تین مکان چھوڑ کر رہتے ... دوپہر کو کپڑے سوکھنے کے لیے ڈالے تھے۔ وہی سمیٹنے آئی ہوں۔"

وہ اب سیدھی کھڑی تھی اور براہ راست میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک خوبصورت لڑکی تھی وہ۔ اس کے ... میں چاندی کی حیدر آبادی چکریاں چمک رہی تھیں ... لگا جیسے وہ میرے خدوخال میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش ... ہے۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا جھجک کر بولی۔ "آپ پاکستان سے آئے ہیں"

میں ٹھٹک گیا۔ "تم کیسے جانتی ہو؟"

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے میں اور بھی بہت کچھ ... ہوں۔ ساہیوال کے آس پاس ایک قصبہ جل کوٹ ...

اور وہ قصبے کے بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔" میں حیرت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری حیرتوں میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کی ایک چھوٹی سی پیاری سی بہن بھی تھی، مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ ایک آپ کی چچا زاد بہن تھی، اس کا نام غزالہ تھا۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول اور کلاس میں پڑھتی تھیں۔"

اب اس بات میں شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اس لڑکی کا تعلق بھی جل کوٹ سے رہا ہے۔ میں بڑے دھیان سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ بولی "مجھے رانی کہتے ہیں۔ شروع میں ہم بھی جل کوٹ میں رہتے تھے۔ لیکن وہاں ہمارا اور کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ سب لوگ یہاں ہندوستان میں تھے۔ صرف میں اور ابا جی پاکستان میں تھے۔ جلد ہی ہم بھی یہاں ہندوستان آ گئے۔"

اب مجھے اس لڑکی کے خدوخال میں جان پہچان کی ایک جھلک سی نظر آنے لگی۔ تصور کے پردے پر ایک بہت دھندلی سی شبیہہ ابھری۔ غالباً یہ لڑکی جل کوٹ میں ہمارے ہی محلے کی رہنے والی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد تھا اور نہ شکل و صورت، بس ایک "احساس" سا ہو رہا تھا کہ ماضی کے شب و روز میں میں اس چہرے کو کہیں دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "حیرانی ہے کہ اتنے عرصے بعد بھی تم نے مجھے پہچان لیا۔"

وہ بولی۔ "میں نے تین چار روز پہلے آپ کو حویلی میں دیکھا تھا اور اسی دن مجھے شک ہو گیا تھا کہ آپ انکل وقار کے بیٹے ہیں۔ مجھے آپ کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن کل ذہن پر زور دیا تو نام بھی یاد آ گیا۔ آپ کا نام شاہ جہان ہے نا؟" میں نے مسکرا کر اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ "میرے ابا جی کا نام عبداللہ ہے۔ وہ جل کوٹ کے ہائی اسکول میں پڑھاتے تھے۔ یہاں وہ نواب صاحب کی زمینوں کا حساب وغیرہ رکھتے ہیں۔"

عبداللہ کا نام سن کر میں چونکا۔ میں نے پوچھا "رانی تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "رانی مجھے گھر میں کہتے ہیں۔ اصل نام جمیلہ ہے۔"

میں ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگا ... تو یہ وہ لڑکی تھی جس نے اس حویلی کی چار دیواری میں ایک طوفان کو جنم دیا تھا۔ وہ ایک پرکشش لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں ایک دل موہ لینے والی سلونی اور سوگواری تھی۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ سی اس کے سراپے سے پھوٹتی تھی اور دیکھنے والے کے دل میں ایک گداز جگا رہی تھی۔ واقعی وہ اس قابل تھی کہ کوئی دل والا

اسے دل و جان سے چاہے۔

میں نے کہا۔ "دل چاہتا ہے کہ تم سے اور تمہارے ابا جی سے بہت سی باتیں کی جائیں۔ اس وقت کہاں ہیں تمہارے ابا جی؟"

وہ بولی۔ "گھر ہی میں ہیں؟"

"اور کون ہے گھر میں؟"

"میری دادی اماں ہیں۔ بہت بوڑھی ہیں بیچاری"

میں نے کہا۔ "تمہارے ابا جی سے مل سکتا ہوں؟"

وہ بولی۔ "کیوں نہیں" اور مجھے ساتھ لے کر اپنے گھر آ گئی۔ کپڑوں کی وزنی گٹھڑی کو ایک طرف سے میں نے اور دوسری طرف سے اس نے تھام رکھا تھا۔ گھر کے برآمدے میں جمیلہ کے والد سے ملاقات ہوئی۔ کھچڑی بالوں اور موٹے شیشوں کی عینک والا وہ ایک بے حد خاموش طبع شخص تھا۔ وہ مجھے خوش اخلاقی سے ملا اور پھر میرے بارے میں جان کر حیران بھی بہت ہوا۔ اس سے باتیں کرنے کے بعد مجھے بھی یاد آ گیا کہ میں اس شخص کو جل کوٹ میں دیکھ چکا ہوں۔ جمیلہ نے مجھ سے جل کوٹ کے باسیوں کے بارے میں سوالات کیے۔ وہ خاص طور پر غزالہ کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ وہ لوگ کافی عرصہ پہلے لاہور چلے گئے تھے اور چونکہ دونوں گھرانوں کے تعلقات اتنے اچھے نہیں رہے تھے لہٰذا مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ مختصر گفتگو کے بعد میں واپس آ گیا کیونکہ چاچے عبداللہ کو بڑے نواب صاحب کی طرف سے بلاوا آیا تھا اور وہ ایک موٹا رجسٹر سنبھالے حویلی جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔

اگلے روز شام کو میں چاچے عبداللہ سے ملنے پھر ان کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ چاچا عبداللہ گھر میں نہیں ہے۔ اسے نواب صاحب نے کل رات ہی حیدر آباد بھیج دیا تھا۔ وہاں سے اس کی واپسی کل شام متوقع تھی۔ گھر میں جمیلہ اور اس کی دادی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے واپس آنا چاہا لیکن جمیلہ نے زبردستی بٹھا لیا اور چائے کا اہتمام کر ڈالا۔ اس سے گفتگو کرنا ایک اچھا تجربہ تھا۔ وہ تھوڑا بولتی تھی لیکن بہت ذہانت آمیز باتیں کرتی تھی۔ اس کی گفتگو سے کئی دوسری باتوں کے علاوہ یہ پتا بھی چلا کہ اس کے ابا جی نواب صاحب کی ملازمت چھوڑنے والے ہیں اور ہو سکتا ہے اگلے مہینے وہ لوگ یہاں سے نظام آباد چلے جائیں۔

اگلے روز میں نے بہت سا وقت جمیلہ کے بارے میں سوچتے گزارا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی لیکن بیٹے تکلیف دہ

حالات کا شکار تھی۔ اس کا نام چھوٹے نواب کے ساتھ آچکا تھا اور اس کے بعد اس غریب گھرانے کے ساتھ جو کچھ بھی ہوجاتا کم تھا۔ اس روز چاچا عبداللہ حیدر آباد سے واپس آگیا۔ میں نے دوپہر کے وقت اسے گلی سے گزرتے دیکھا تو لہٰذا شام کے وقت میں اس سے ملنے چلا گیا۔ وہ گھر میں کہیں دکھائی نہیں دیا۔ برآمدے میں ایک جھلنگا چارپائی پر جمیلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا" اور جلدی سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ وہ رو رہی تھی۔ سینے پر اوڑھنی درست کر کے وہ کھڑی ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ "چاچا کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "آج دوپہر کو آئے تھے۔ دو تین گھنٹے رہ کر پھر چلے گئے کہتے تھے ابھی تھوڑا سا کام باقی ہے کل شام تک آجاؤں گا۔"

میں نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ جمیلہ کے رخسار پر تھپڑوں کے نشان ہیں اور چوڑیاں ٹوٹنے سے ایک کلائی بھی زخمی ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے جمیلہ؟"

"کچھ نہیں" وہ سر جھکا کر بولی۔ "میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔"

"نہیں آج چائے کی طلب نہیں" میں نے کہا۔ "بس تم بیٹھ جاؤ۔"

وہ ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد قریب رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بے حد نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے جمیلہ۔ تمہاری کلائی زخمی ہو رہی ہے۔"

اس نے غیر ارادی طور پر کلائی اوڑھنی کی اوٹ میں کرلی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا پھر میں نے دیکھا کہ موتی جیسے چمکیلے آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ غالباً یہ میرے ہمدردانہ لہجے کا رد عمل تھا۔

وہ کچھ دیر سسکیوں سے روتی رہی۔ اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ جیسے کوئی خزاں رسیدہ پتا طوفان کی زد میں ہو۔ میں خاموش بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے تو بات کروں۔ یکایک اسے ابکائی آئی اور وہ منہ ہاتھ سے ڈھانپ کر قریبی غسل خانے کی طرف لپکی۔ اپنے پیچھے اس نے غسل خانے کا دروازہ زور سے بند کردیا تھا۔ بند دروازے کی طرف سے جو مدھم آوازیں ابھریں ان سے اندازہ ہوا کہ وہ اُلٹیاں کر رہی ہے۔ مجھے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

قریباً پانچ منٹ بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو میں اپنی جگہ جما بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چائے کا پوچھا۔ میں نے انکار کیا تو وہ مجبوراً میرے پاس بیٹھ گئی۔ گردن حسب معمول جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "جمیلہ! یہ کس نے مارا پیٹا ہے تم سے؟"

وہ بولی۔ "دادی جان نے۔"

"لیکن کیوں؟"

"میں اسی قابل ہوں۔" وہ زخمی لہجے میں بولی اور ایک بار پھر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے دیکھا اس کی دادی سر لپیٹے ایک کمرے میں پرانی سی کھاٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سو رہی تھی۔ اگر جاگ بھی رہی ہوتی تو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہماری باتیں سن لے گی۔ اس کی سماعت قریباً ختم تھی۔ بینائی بھی بس اتنی ہی تھی کہ وہ نزدیک سے چہرہ پہچان سکتی تھی۔ میں نے جمیلہ سے کہا کہ کسی ہمدرد کو بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی ہے تو بتائے کہ کیا بوجھ سینے پر اٹھائے پھرتی ہے۔ اس نے اپنے نازک ہونٹ اور مضبوطی سے بھینچ لیے لیکن میں جانتا تھا کہ ان بند ہونٹوں کے انکار کے پیچھے اقرار کا اشارہ چھپا ہوا ہے۔ میں کوشش میں مصروف رہا۔ آدھ پون گھنٹا لگ گیا لیکن آخر بند زبان کی گرہ کھل گئی۔ ایک بار یہ گرہ کھلی تو پھر ہر گرہ کھلتی چلی گئی۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان جمیلہ نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ میرے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

نوابزادہ فیروز جنگ اور اس کی بہن شاہین بچپن میں تعلیم کے لیے اپنے چچا کے پاس لندن چلے گئے تھے۔ قریباً بارہ برس گزار کر وہ ایک سال پہلے انڈیا واپس آئے تھے۔ فیروز جنگ مردانہ وجاہت کا شاہکار ایک بانکا جوان تھا۔ حیدر آباد کی بے شمار حسیناؤں کے دل اس کی طرف کھنچے لیکن وہ سنجیدگی سے کسی کی طرف مائل ہوا تو وہ جمیلہ تھی۔ جمیلہ کے حسنِ سادہ نے اس کے دل پر ایسا جادو چلایا کہ وہ دیس بدیس کی سب دوستوں کی قربتیں بھلا بیٹھا۔ جمیلہ ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ اپنی حیثیت جانتی تھی اور چھوٹے نواب کا مرتبہ بھی۔ اس نے چھوٹے نواب کی نگاہوں کے جال سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ چھوٹے نواب کی محبت ایک تند و تیز ریلے کی طرح تھی۔ اس ریلے میں جمیلہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ نواب کی من چاہی راستوں پر اس کے ساتھ بہنے لگی۔ نواب نے کہا کہ وہ زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکا ہے اب جمیلہ کو دیکھنے کے بعد اسے کچھ اور دیکھنے کی حسرت نہیں۔ اس نے جمیلہ سے

کہا کہ وہ اس سے شادی کرے گا اور پوری شان و شوکت سے سہاگ کے سرخ جوڑے میں لپیٹ کر اسے سہاگ کی سیج پر بٹھائے گا۔ جمیلہ کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی خواب دیکھنے لگیں۔ اس نے سوچا انہونیاں بھی تو اسی جگ میں ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کا محبوب واقعی اس کا سرتاج بھی بن جائے۔ وہ ایک باوفا لڑکی تھی۔ اسے نواب کی جاہ و حشمت سے نہیں اس کی ذات سے سروکار تھا۔ نواب اس کی پہلی اور آخری محبت تھا اور وہ اس کے لیے سب کچھ قربان کرسکتی تھی۔ شروع میں تو نواب بے حد پُرجوش تھا لیکن جب باپ نے اس کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کیں تو وہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ تاہم اس نے اپنی کیفیت کا اظہار جمیلہ پر نہیں ہونے دیا۔ وہ اسی طرح حویلی کے رومان پرور گوشوں میں اس سے ملتا رہا اور اسے بانہوں میں بھر کر اس سے انمٹ محبت کی باتیں کرتا رہا۔

پھر ایک روز ایسے ہی سحر انگیز لمحات میں وہ دونوں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھے۔ وہ نواب جس نے جمیلہ کو سہاگ کا زرتار جوڑا پہنانے کا وعدہ کر رکھا تھا اسے اس کے سوتی لباس سے بھی محروم کردیا۔ وہ لڑکی جو نواب کو اپنا سب کچھ سمجھ چکی تھی اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھلتی چلی گئی۔ نواب فیروز جنگ رک رک کر... سرک سرک کر ہر حد پار کرگیا اور جمیلہ کی کمزور مزاحمتیں ایک ان چاہی خود سپردگی میں ڈھل گئیں...

اس شب جمیلہ نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا لیکن اس کا دل ملال سے خالی تھا۔ وہ اپنے تن من کو محبوب کی امانت سمجھتی تھی پھر اس واقعے پر ملول کیوں ہوتی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ نواب اسے ضرور اپنائے گا۔ اس پہلے واقعے کے بعد چھوٹے نواب نے اپنی کئی راتوں کے اندھیرے جمیلہ کے مہکتے وجود سے چمکائے۔ وہ اس سے کھیلتا رہا اور وہ سادہ دل خود کو کھلونے کی طرح پیش کرتی رہی۔ چھوٹے نواب کا کہنا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے والد سے کھل کر بات کرے گا۔ جمیلہ منتظر رہی کہ کب یہ بات ہو اور کب نواب اپنی بانہوں میں بھر کر اسے یہ خوشخبری سنائے لیکن انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ چھوٹے نواب جیسے اس بات کو بھول ہی چکے تھے۔ وہ خود بھی انہیں یاد دلانا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی محبت کی توہین تھی۔ اس اعتماد اور یقین کی شکست تھی جو اس نے اپنے محبوب پر کیا تھا۔ وہ خاموش رہی اور اس کا محبوب بھی خاموش رہا۔ ایک اجنبی خلیج ان دونوں کے درمیان حائل ہونے لگی۔ نواب نے انکار کیا تھا اور نہ اقرار بس جمیلہ کو انتظار کی سُولی پر لٹکا چھوڑا تھا۔ پھر ایک روز جمیلہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ نواب کی منگنی ہو رہی ہے۔ وہ دو دن سکتے کی کیفیت میں رہی۔ اس کا ایمان اپنی سماعت پر سے اٹھ گیا تھا۔ لیکن حقیقت اٹل تھی اور سامنے نظر آرہی تھی۔ حویلی میں منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ جمیلہ رانی جسے سچ مچ کی رانی بن کر نواب کی سہاگ سیج پر بیٹھنا تھا معمولی خدمتگار کی طرح اس کی منگنی کی تیاریوں میں شریک ہوگئی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن دل میں آنسوؤں کے دریا بہتے رہتے تھے۔ منگنی کے بعد نواب فیروز جنگ پھر اس سے ملا تھا۔ اس نے کہا تھا، یہ منگنی اس نے اپنے باپ کی بے پناہ ضد سے مجبور ہو کر کروائی ہے لیکن شادی کی منزل بہت دور ہے اور یہ منزل کبھی نہیں آئے گی۔ اس کی شادی جب بھی ہوگی جمیلہ سے ہوگی۔ جمیلہ نے بڑی خاموشی سے اس طفل تسلی کو سنا تھا اور ایک لفظ نہیں بولی تھی۔ وہ کیوں بولتی؟ کیا وہ اس کے دل کی باتیں نہیں سمجھتا تھا... اس واقعے کے چند ہی روز بعد نواب فیروز بیمار پڑ گیا تھا اور اپنا زیادہ وقت حویلی کے رہائشی

ابنِ حسن عثمان آبادی کا ایک شاہکار ناول

تحیر، تجسس اور رومان سے بھرپور

ایک چونکا دینے والا ناول

راستوں کے اندھیرے دُور کرنے والے اُن بدنصیب چراغوں کی داستان جن کے پاس اپنے لیے صرف اور صرف اندھیرے تھے کیونکہ صدیوں سے ایک بددُعا اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔

اُن نوابوں کی کہانی جن کی قسمت میں جوان ہونے کے بعد راتوں میں جاگنا اور رونا لکھا تھا۔

ایڈونچر سے بھرپور ناول

قیمت -/۱۰۰ روپے

ڈاک خرچ -/۲۰ روپے

علی میاں پبلی کیشنز

حصے میں گزارنے لگا تھا۔ اسے ڈھائی تین ماہ مسلسل بخار رہا تھا۔ اب بخار کا تو آرام تھا لیکن نقاہت دور نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے سر میں شدید درد ہونے لگتا تھا۔

صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا تھا کہ نواب فیروز واقعی دو غلے پن کا شکار ہے۔ اس نے خاموشی اسی لیے اختیار کرلی تھی کہ وہ جمیلہ سے دور رہ کر اطمینان سے حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ بے شک وہ جمیلہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن اس محبت میں اب وہ پہلے جیسی کشش اور اتفاطولی کیفیت نہیں رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جمیلہ سے وہ سب کچھ حاصل کرچکا تھا جس کی کوئی مرد تمنا کرتا ہے۔ اب اسے مصلحتیں یاد آنے لگی تھیں۔ کبھی وہ اپنی منگنی کے بارے میں سوچتا تھا کبھی اسے اپنے باپ کا رباؤ یاد آتا تھا جو ہر لحظہ بڑھتا جارہا تھا۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر آگیا تھا جہاں سے جمیلہ دور اور منگیتر نزدیک نظر آنے لگی تھی۔

اس کشمکش کا چوتھا کردار نواب فیروز کی والدہ تھی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ وہ اپنے بیٹے کے کرتوت سے آگاہ ہوچکی ہے اور اسی سبب یہ خوف اس کے دل میں جاگزیں ہوگیا ہے کہ بیماری کی شکل میں قدرت کی طرف سے اس کے بیٹے کو سزا مل رہی ہے۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ اپنی حیثیت سے قطع نظر جمیلہ لاکھوں میں ایک لڑکی ہے اور اس لائق ہے کہ حویلی کی بہو بن سکے۔ بقول بوٹا سنگھ وہ اپنی زبان سے جمیلہ کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ یہ ساری باتیں مل کر اسے مجبور کررہی تھیں کہ وہ اپنے شوہر نواب شہریار جنگ کی مخالفت کرے اور اسے مجبور کرے کہ وہ بیٹے کی منگنی توڑ دیں۔ یہ اس روئیداد کا ایک نازک موڑ تھا۔ اس موقع پر اگر نواب فیروز تھوڑا سا بھی زور لگاتا تو اس کی شادی جمیلہ سے ہوسکتی تھی لیکن لگتا تھا کہ اس کی نیت حرام ہوچکی ہے۔ وہ ایک ایسی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا جسے مجرمانہ خاموشی کے سوا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

اپنی روئیداد ختم کرنے کے بعد جمیلہ گم صم میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس میں کہیں کہیں ایسے مقامات بھی آئے تھے جہاں شرم و حیا کے سبب جمیلہ کی زبان بند ہوگئی تھی۔ ان خالی جگہوں کو میں نے اپنے خیالات سے پُر کیا ہے۔ مثلاً جمیلہ نے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ چھوٹے نواب کی مہربانیوں سے اس کا پاؤں بھاری ہوچکا ہے لیکن یہ بات اس کے بتائے بغیر ہی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ آج دادی نے اس سے مار پیٹ بھی اسی لیے کی تھی کہ دادی نے پوتی کے جسم میں نئی زندگی کا سراغ لگالیا تھا۔ اب یہ انکشاف جمیلہ کے باپ پر اور دیگر عزیز و اقارب پر ہونے والا تھا۔ پھر بہت جلد یہ خبر ہر کس و ناکس تک پہنچنے والی تھی۔

رات قریباً گیارہ بجے میں دل پر بھاری بوجھ لے کر جمیلہ کے گھر سے واپس اپنے مکان پر پہنچ گیا۔

○☆○

یہ نواب شہریار جنگ کی حویلی میں ہمارے قیام کا ساتواں روز تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ سے کہا۔ "یار آج مجھے بھی چھوٹے نواب کے پاس لے چلو۔ اس کا اتنا ذکر سنا ہے کہ اب دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

بوٹا سنگھ کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنے چیلے یا خدمتگار کی حیثیت سے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ ہم دونوں تیار ہوگئے۔ میرے دل میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ چھوٹے نواب کو دیکھتے ہی سارے اندیشے بھول کر اس کا گریبان تھام لوں۔ اسے زور سے جھنجھوڑوں اور پوچھوں کہ وہ ایسی خاموشی کیوں اختیار کیے ہوئے ہے جو ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کرنے والی ہے۔ شام کے بعد میں اور بوٹا سنگھ اپنے کوارٹر نما مکان سے نکلے اور حویلی کے رہائشی حصے کی طرف چل دیے۔ ابھی ہم نے نصف احاطہ ہی طے کیا تھا کہ باجے گاجے کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک چھوٹا سا جلوس رہائشی عمارت کی طرف سے برآمد ہوا۔ جلوس میں شریک مرد و زن نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سب سے آگے جوان خدمتگاروں کی دو قطاریں تھیں۔ ان خدمتگاروں نے مٹی کے بہت سے گھڑے اٹھا رکھے تھے۔ ان گھڑوں پر رنگوں سے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ کچھ خادموں نے سروں پر طشت رکھے ہوئے تھے۔ ان میں خوبصورت زنانہ جوڑے اور آرائش کا سامان دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ جلوس کے درمیان دو افراد نے رنگین کاغذ اور ابرق سے بنے ہوئے پھولدار پودے اٹھا رکھے تھے۔ ہم اب جلوس کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا۔ "حضت! چھوٹے نواب صاحب کی شادی کی تاریخیں طے ہوگئی ہے۔ یہ سانچق (ساچق) کا جلوس ہے جو بری کا سامان لے کر دلہن صاحب کی کوٹھی پر جارہا ہے۔"

کوئی چیز چھناکے سے میرے سینے میں ٹوٹ گئی۔

میں اور بوٹا سنگھ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ جلوس ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا حویلی کے بلند و بالا آہنی گیٹ کی طرف چلا گیا۔ ہم دونوں کے لیے یہ خبر حیران کن تھی کہ چھوٹے نواب فیروز جنگ نے شادی پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔

بوٹا سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اس بیچاری جمیلہ کا قصہ تو پاک ہوا۔"

"ہاں۔ بظاہر تو یہی لگ رہا ہے" میں نے ہنکارا بھرا۔

ہم دونوں حویلی کے رہائشی حصے کی طرف چل دیے۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ ابھی کل رات میں نے جمیلہ سے اس کی درد بھری طویل کہانی سنی تھی۔ آج اس کہانی کا غم ناک انجام بھی میرے سامنے آگیا تھا۔ زمانے کو محبت سے ہمیشہ عداوت رہی ہے۔ محبت کانچ کی طرح نازک ہوتی ہے اور زمانہ پتھر کی طرح سخت۔ تندا پار کرنے والے اکثر زخم کھاتے ہیں۔ محبتیں اکثر برباد ہوتی ہیں۔

ہم حویلی کے رہائشی حصے میں داخل ہوئے تو گویا کسی محل میں داخل ہوئے۔ بلند چھتیں محرابی دروازے اور دروازوں پر جھولتے ہوئے ریشمی پردے۔ ہر سمت گداز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ان قالینوں پر چلتے ہوئے بوٹا سنگھ کچھ اور بھی میلا کچیلا اور غلیظ نظر آتا تھا۔ رہائشی حصے کا مسلح دربان بوٹا سنگھ کو جانتا تھا لہٰذا ہمیں اس وسیع کمرے تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ جہاں ایک شاندار صوفے پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا اپنے ناخن تراش رہا تھا۔ شیشے کی ایک نہایت قیمتی ایش ٹرے اس کی گود میں رکھی تھی اور کٹے ہوئے ناخن اس میں گرتے جارہے تھے۔ اس نے سفید براق پاجامہ قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے پاؤں ایک تپائی پر تھے۔ ایک خادم صورت شخص قالین پر دو زانو بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ میں دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ نواب فیروز جنگ ہے۔

ہمیں دیکھ کر فیروز جنگ کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ کچھ بیزار سا نظر آنے لگا۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بوٹا سنگھ سے پوچھا۔ "سائیں! یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"بس ایک اللہ کا بندہ ہے۔ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ کہتا تھا چھوٹے نواب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

چھوٹے نواب نے مجھے سرتاپا گھورا۔ پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "تم بھی یہ بزنس کرتے ہو یا ابھی صرف داؤ پیچ ہی سیکھ رہے ہو۔"

"جی میں سمجھا نہیں" میں نے بونقوں کے انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" نواب عجیب انداز سے مسکرایا۔

اس دوران بوٹا سنگھ اپنے عمل کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ اس نے لکڑی کی ایک چوکور چوکی کے گرد تین اگربتیاں جلائیں پھر چوکی کے نیچے سے مٹی کا ایک کورا پیالہ نکالا اور خادم سے کہا کہ وہ اس میں پانی بھر کر لائے۔ خادم نے سوالیہ نظروں سے چھوٹے نواب کی طرف دیکھا۔ چھوٹے نواب کی بیزاری اب عروج پر نظر آرہی تھی۔ اگربتیوں کے دھوئیں نے اس کے برہم مزاج کو مزید برہم کردیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ "بس کرو سائیں جی! بہت ہوچکا ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پلیز اب تم یہ تماشا ختم کرو۔"

بوٹا سنگھ نے انکسار سے کہا۔ "لیکن چھوٹے نواب؟ آپ کو پتا ہے کہ یہ عمل پورے سات روز ہونا ہے۔ اگر ادھورا رہ گیا تو الٹا نقصان ہوگا۔ بیگم صاحبہ کا تو کہنا ہے کہ سات کی بجائے بھی دس روز کیا جائے تاکہ کوئی کسر باقی نہ رہے۔"

"کوئی کسر باقی نہیں رہی ہے۔" نواب نے طنز سے کہا۔ "میرے دماغ کی ساری چولیں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔ براہِ مہربانی تم نے جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرلو کل مجھے اپنی صورت مت دکھانا۔"

اتنے میں ایک ملازم نے اندر آکر ادب سے کہا۔ "چھوٹے نواب! بیگم حضور تشریف لارہی ہیں۔"

نواب فیروز جنگ چونکا اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ایک باوقار کشیدہ قامت خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک نہایت قیمتی شال ان کے کندھوں پر تھی اور اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بغور مجھے دیکھا پھر اپنی سوالیہ نگاہیں بوٹا سنگھ کی طرف اٹھادیں۔ بوٹا سنگھ نے بیگم صاحبہ سے بھی میرا مختصر تعارف کرادیا۔ چھوٹے نواب نے چہرے پر خوشگوار تاثرات سجالیے تھے۔ بیگم صاحبہ بڑی خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرا اترا ہوا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک زار و قطار روتی رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی موجودگی سے بوٹا سنگھ کو شہہ ملی اور اس نے پوری دلجمعی سے اپنا عمل شروع کردیا۔ مٹی کے پیالے میں پانی بھر کر لکڑی کی چوکی پر سجادیا گیا۔ بوٹا سنگھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور آگے پیچھے جھول کر منہ میں کچھ بدبدانے لگا۔ بدبدانے کے ساتھ ساتھ وہ پیالے کے پانی سے انگلیاں بھگوتا اور ان کے چھینٹے چھوٹے نواب کی طرف اڑاتا رہا۔

میں نے چھوٹے نواب کی بیماری کا بہت چرچا سنا تھا لیکن یا تو بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا یا پھر اب اس کی صحت بحال ہوچکی تھی۔ وہ بہت صحت مند نہیں تو بیمار بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہاں اس کی والدہ ضرور برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید اس کی وجہ وہ صدمہ تھا جس کا سراغ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جلوس کی صورت میں ملا تھا۔ بیگم صاحبہ کی خواہش تھی کہ بیٹے کی منگنی توڑ کر اس کی شادی اپنے پرانے ملازم عبداللہ کی بیٹی جمیلہ سے کردیں۔ لیکن سب کچھ الٹ ہوگیا تھا۔ بیٹے کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہورہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے سانچق کا جلوس دیکھا تھا۔ پرانی رسوم کے مطابق سانچق کے جلوس کے ساتھ ہی شادی کی تقریبات کا آغاز ہوجاتا تھا۔

بوٹا سنگھ نے اپنا "عمل" چند ہی منٹ میں مکمل کرلیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے چھوٹے نواب اور بیگم صاحبہ کو فرشی سلام

گئے اور واپس لوٹ گئے۔

اپنے کوارٹر میں واپس آکر بھی ہم کافی دیر چھوٹے نواب کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ شخص مکاری سے کام لے رہا ہے۔ درحقیقت اب اس کا دل جمیلہ کی طرف سے بھر چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک پڑھی ہوئی کتاب کو دوبارہ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ ایک نئی نویلی تحریر پڑھی جائے۔ پچھلے ان دیکھے صفحات پر نظر دوڑائی جائے۔ وہ ظاہر تو یہ کر رہا تھا کہ جیسے اپنے باپ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے لیکن اصل میں اس کے اپنے دل کی مرضی بھی اب یہی تھی۔ اس نے جمیلہ کے بارے میں ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی تھی اور باپ سے کہا تھا کہ وہ جہاں چاہے اس کی شادی کر دے۔

اگلے روز رات کو جمیلہ اور اس کا باپ عبداللہ بڑی خاموشی کے ساتھ حویلی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ جمیلہ سر تا پا ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ بوڑھے عبداللہ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی تھا۔ میرا دل چاہا کہ ان دونوں سے بات کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس ملاقات سے ان دونوں کو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ رات کی تاریکی کو اپنا پردہ بنا کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے مناسب نہیں تھا کہ ان کا پردہ چاک کیا جاتا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا ان باپ بیٹی کو دیکھتا رہا جو امیروں کی اس حویلی سے شرمندگیاں اور ذلتیں سمیٹ کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ایک عجیب سی لڑکھڑاہٹ اور درماندگی تھی جمیلہ کی چال میں۔ جلد ہی اس کی پتلی لڑکھڑاتی سی لڑکی کو باغ کی تاریکی نے نگل لیا اور کھڑکی کے فریم میں درختوں کے ہیولوں کے سوا کوئی منظر باقی نہ رہا۔

صبح میں نے اس کوارٹر میں تالا پڑا دیکھا جہاں اس حویلی کی "انارکلی" اپنے بوڑھے باپ اور دادی کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک شخص نے بتایا کہ عبداللہ نے اپنے گھر کا مختصر سامان کل صبح ہی بھیج دیا تھا۔ جمیلہ کی دادی بھی سامان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ رات عبداللہ اور جمیلہ بھی چلے گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ نظام آباد میں اپنے رشتے داروں کے پاس جا رہے ہیں۔ لیکن کسی بتانے والے نے بتایا ہے کہ وہ نظام آباد نہیں گئے ہیں۔

میں سارا دن اپنے کمرے میں افسردہ پڑا رہا۔ جمیلہ کی محبت کو برباد ہوتے دیکھ کر میرے اپنے زخم بھی شدت سے رسنے لگے تھے۔ کاتبِ تقدیر نے نجانے کیوں محبت کی قسمت میں بربادیاں لکھ رکھی ہیں۔ مدتوں ایک دوسرے کو چاہنے والے اور ایک دوسرے کو پانے کی آس میں جینے والے کسی موڑ پر اچانک یوں جدا ہوتے ہیں کہ پھر زندگی بھر صورت دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ کبھی ان کی جدائی کا سبب دنیا ہوتی ہے، کبھی حالات اور کبھی وہ خود ہی اپنے راستے کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ میری مثال بھی ایسی ہی تھی۔ میں

خود اپنے راستے کی رکاوٹ بنا تھا۔ میں نے کسی موقعے پر خود میں لچک پیدا نہیں کی تھی۔ کسی موقع پر تنہا بیٹھ کر یہ نہیں سوچا تھا کہ میرے پیچھے پھرنے والی، مجھ سے محبت کی بھیک مانگنے والی کسی روز اچانک مایوس بھی ہو سکتی ہے، مجھ سے بہت دور بھی جا سکتی ہے۔ بس پتھر کا بت بنا رہا تھا اور اب ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

نواب شہریار جنگ کی عظیم الشان حویلی میں اس کے اکلوتے فرزند فیروز جنگ کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ فیروز جنگ ولایت پلٹ نوجوان تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کی شادی حیدرآباد کے قدیم رسم و رواج کے مطابق بالکل روایتی انداز میں ہو۔ فیروز جنگ کی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کے باپ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔

"مانجھے" کی رسم تو دلہن والوں کے ہاں ادا ہوئی لہٰذا ہم دیکھنے سے محروم رہے۔ تاہم اگلی رات جب دلہن والے دولہا کو مہندی لگانے کے لئے حویلی میں آئے تو وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک بہت بڑا جلوس تھا، جس میں سب سے آگے ایک سجا سجایا ہاتھی جھومتا ہوا آ رہا تھا۔ اس ہاتھی کے دائیں بائیں آتش بازی کی جا رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہوائیاں چھوٹتیں اور آسمان پر رنگ بکھر جاتے تھے۔ ہاتھی کے پیچھے باوردی لوگ تھے۔ ان کا تعلق محکمۂ پولیس کے بینڈ باجے سے تھا۔ وہ خاص قسم کی شہنائیاں بجا رہے تھے۔ اس کے بعد کچھ وہ میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں تھیں اور وہ پرجوش رقص کر رہے تھے۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے بہت سی خواتین بھی اس جلوس میں شامل تھیں۔ انہوں نے سروں پر مہندی اور شیرینی کے تھال اٹھا رکھے تھے۔

شادی کے روز جو جلوس حویلی سے دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس میں کم و بیش ایک ہزار افراد، چھ ہاتھی اور بیس پچیس گھوڑے شامل تھے۔ ایک مقامی شخص نے بتایا کہ اس جلوس کو "شب گشت" کہا جاتا ہے۔ نواب فیروز جنگ جس ہاتھی پر سوار تھا وہ ایک زرتار ریشمی کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسے سونے اور چاندی کے مختلف زیور بھی پہنائے گئے تھے۔ دولہا کے ہاتھی کے پیچھے دو ہاتھیوں پر بڑے بڑے حودے بنے ہوئے تھے۔ ان حودوں میں چار چار نقارچی بیٹھے زور و شور سے نقارے پیٹ رہے تھے۔ اس جلوس میں بہت سی طوائفیں بھی شامل تھیں جو مسلسل گا رہی تھیں اور رقص کر رہی تھیں۔ اتنی زبردست آتش بازی ہو رہی تھی کہ رات میں دن کا سماں بندھ گیا تھا۔ رنگ و روشنی کے اس سیلاب کو دیکھ کر مجھے وہ بے زبان جمیلہ یاد آئی جو چند روز پہلے ایک چادر اوڑھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ اس حویلی سے نکل گئی تھی۔ نہ اس نے آہ بھری تھی، نہ احتجاج کیا تھا، نہ اپنی عزت لوٹنے والے ڈاکو کا گریبان پکڑا تھا۔ اس کم ظرف مرد نے تو یہ بھی گوارا نہیں کیا تھا کہ ایک بار، صرف ایک بار اپنے محبوب کو اس

وعدہ ہی یاد دلا دے۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ...... وہی بے تمنا جو لب پہ نہ آئے۔

بارات کے اس جلوس میں میں نے شوخ و چنچل شاہین کو بھی دیکھا۔ وہ بھائی کی شادی پر بے حد مسرور تھی۔ اس نے بہت بھڑکیلا اور چست لباس پہن رکھا تھا اور وہ ہر طرف تتلی کی مانند اڑتی پھر رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی حیدرآبادی نواب کی بیٹی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی کاؤ بوائے ہے جس نے جوئے میں بہت سی رقم جیتی ہے اور اس رقم سے اپنے لئے چمکیلی پتلون قمیص اور سرخاب کے پروں والا قیمتی ہیٹ خرید لیا ہے۔ اس کی جوتی بھی بالکل کاؤ بوائے طرز کی تھی۔ اونچی ایڑی والی اس جوتی میں چند اور نگینے لگے ہوئے تھے۔ درحقیقت فیروز جنگ اور اس کی بہن شاہین بالکل مغربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اگر فیروز جنگ اپنی شادی پرانے انداز میں کرا رہا تھا تو یہ بھی ایک طرح کا فیشن ہی تھا۔ جیسے امیر کبیر مالدار لوگ کبھی کبھی گاؤں میں جا کر مکئی کی روٹی اور ساگ کھانا پسند کرتے ہیں، یا پھر اپنے جدید فیشن کے ڈرائنگ روم میں رنگین پنکھے، چرخے اور چنگیر وغیرہ سجا کر خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے روایت سے ناطہ جوڑ رکھا ہے۔

نواب فیروز جنگ کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ رات پچھلے پہر ایک چاند سی لڑکی دلہن بن کر حویلی میں آ گئی۔ ہم بارات کے ساتھ نہیں گئے تھے لہٰذا معلوم نہیں وہاں کیا کچھ ہوا بہرحال دلہن بیاہ کر لانے کے بعد بھی حویلی میں درجنوں رسمیں اور خرافات انجام دی گئیں اور یہ ہنگامۂ محشر صبح تک برپا رہا۔

دولہا فیروز جنگ اب چنگا بھلا تھا۔ اسے نہ کسی روحانی علاج کی ضرورت تھی اور نہ جسمانی علاج کی۔ ہم اب نواب شہریار جنگ سے جانے کی اجازت لینا چاہتے تھے لیکن وہ بیٹے کی شادی کے بکھیڑے میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کہیں دکھائی ہی نہیں پڑتا تھا۔ یہ خوشی کا موقع تھا۔ امید تھی کہ وہ ہمیں آزاد کرنے میں زیادہ پس و پیش نہیں کرے گا لیکن وہ کہیں ملتا ہی نہیں تھا۔ شادی کے دو تین روز بعد حویلی میں ایک بار پھر ہنگامہ آرائی شروع ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی ایک آخری رسم ہونا باقی ہے۔ اس کو غالباً چوتھی کی رسم کہا جاتا تھا۔ یہ رسم اصولی طور پر نکاح کے دوسرے روز ادا ہوتی تھی لیکن کسی وجہ سے نواب شہریار جنگ کی حویلی میں یہ رسم تیسرے چوتھے روز ادا ہو رہی تھی۔ اس رسم کے مطابق دولہا اپنی دلہن کے ساتھ اپنے سسرال جاتا ہے۔ اس کے چند قریبی دوست بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں ایک یا دو راتیں گزارتے ہیں۔

پروگرام کے مطابق دولہا دلہن کو شام کے وقت حویلی سے روانہ ہونا تھا۔ سہ پہر سے تھوڑی دیر پہلے میں نے نواب فیروز جنگ کی بہن شاہین کو دیکھا وہ اپنے والد کی لینڈ کروزر جیپ پر سوار حویلی کے مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ایک دوسری عورت بھی اس کے ساتھ تھی اور اگلی سیٹ پر لمبا سا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ فیروز جنگ کی نو بیاہتا بیوی ہے۔ جب گاڑی سرونٹ کوارٹرز کے قریب سے گزری تو شاہین کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے ایک دم بریک لگائے اور کھڑکی سے منہ نکال کر بولی۔ "ارے نسامیں کے چیلے ادھر تو آ۔"

میں نے گھبرانے کی اداکاری کی پھر جلدی سے قدم اٹھا کر گاڑی تک پہنچ گیا۔ اس نے کوئی بٹن دبا کر جیپ کا عقبی دروازہ کھول دیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "بیٹھ جاؤ، تمہاری ضرورت ہے۔"

اعتراض کی گنجائش نہیں تھی، نہ ہی کوئی ضرورت تھی۔ میں عقب میں کھلنے والے دروازے سے چڑھ کر گاڑی کی سب سے پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مجھے گاڑی میں داخل ہوتے دیکھ کر رونا سنگھ بھی کوارٹر سے باہر نکل آیا تھا۔ شاہین نے دیکھا تو اسے بھی گاڑی میں بلا لیا۔ نہ کچھ بتایا اور نہ پوچھا، بس تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی..... پلک جھپکتے میں ہم حویلی کے مین گیٹ سے باہر تھے۔ شاہین بہت تیز ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں وہ جیپ اڑا کر بڑی سڑک پر پہنچ گئی۔ وہ حسبِ معمول پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ لمبے بال کھلے تھے اور ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ جیسے لہجے میں اپنی بھاوج کے ساتھ باتیں کرتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ جیسے ہم جیتے جاگتے انسان نہ ہوں، وہ بے جان اشیاء ہوں جنہیں نواب زادی نے کسی ضرورت کے تحت اٹھا کر گاڑی میں رکھ لیا ہو۔ دو زرخرید غلاموں کی طرح ہم عقبی نشستوں پر گم صم بیٹھے تھے۔

فرار ہونے کے لئے یہ بہترین موقع تھا۔ ان دو نازک اندام لڑکیوں میں اتنی سکت کہاں تھی کہ ہمیں ہمارے ارادوں سے باز رکھ سکیں۔ فرار ہونا تو ایک آسان سا کام تھا، ہم ان لڑکیوں اور اس گاڑی کے ساتھ جو چاہتے سلوک کر سکتے تھے۔ ہم دونوں سے احاطے کے چکر لگوا کر اور ہم سے ورزش کروا کر شاہین کے پاپا نے سمجھا تھا کہ اس نے ہمیں سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ شاہین کے خیالات بھی اس سے ملتے جلتے تھے۔ وہ ہمیں بالکل "بے ضرر" سمجھ کر اپنے ساتھ لے آئی تھی اور اب معلوم نہیں کہاں لے جا رہی تھی۔ جیپ نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کیا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم حیدرآباد شہر پہنچ گئے۔ جیپ ایک فیشن ایبل علاقے میں پہنچی اور ایک بہت بڑے بیوٹی پارلر کے سامنے جا کر رک گئی۔ ہمیں پالتو جانور کی طرح جیپ کے اندر ہی لاک کر کے شاہین اور اس کی بھاوج بیوٹی پارلر کی طرف بڑھ گئیں۔ باوردی دربان نے دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

ان کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ شاہین نے اپنے بال سیٹ کروائے تھے۔ یقیناً اس کی بھاوج نے بھی کروائے ہوں گے لیکن اوڑھنی کے سبب نظر نہیں آ رہے تھے۔ دونوں لڑکیوں نے

دلکش میک اپ بھی کروایا تھا۔ بیوٹی پارلر سے فارغ ہو کر ہم سیدھی ایک شاپنگ سینٹر میں پہنچیں۔ یہ تین منزلہ شاپنگ سینٹر دنیا جہان کی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ ان دونوں نے بوٹا سنگھ کو تو گاڑی ہی میں چھوڑا اور مجھے ساتھ لے کر شاپنگ سینٹر کی تیسری منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے انہوں نے ایک بہت بڑے سائز کا ریکارڈ پلیئر خریدا۔ غالباً یہ ریکارڈ پلیئر پہلے ہی خریدا جا چکا تھا۔ کیونکہ ڈبے میں بند پڑا تھا۔ شاہین نے صرف "پے منٹ" کی اور ڈبہ مجھے تھما دیا۔ یہ وزنی ڈبہ تیسری منزل سے نیچے لانے میں کافی مشکل پیش آئی۔ ڈبہ جیپ میں لاد کر ہم آگے روانہ ہو گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ اور "وزنی" قسم کی شاپنگ ہونا باقی ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو مجھے اور بوٹا سنگھ کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ جیپ نے یو ٹرن لیا اور بڑی مارکیٹ کی طرف گھوم گئی۔ لیکن ابھی پچاس ساٹھ گز ہی دور گئی تھی کہ بری طرح لہرائی اور پھر جھٹکے سے رک گئی۔ ایک شخص اچانک دونوں ہاتھ پھیلا کر جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ جونہی جیپ رکی ایک شخص پہلو سے برآمد ہوا۔ اس نے گول ٹوپی پہن رکھی تھی اور صورت چھپانے کے لئے منہ پر رومال باندھ رکھا تھا۔ بجلی کی پھرتی سے اس نے جیپ کا بائیں جانب کا دروازہ کھولا۔ اسی دروازے کے ساتھ فیروز جنگ کی نئی نویلی بیوی بیٹھی تھی۔ نقاب پوش شخص نے اس کا بازو تھاما اور گھسیٹ کر جیپ سے باہر پھینک دیا۔ میں نے اس نازک اندام نواب زادی کو پختہ سڑک پر گرتے اور لڑھکتے دیکھا۔ اس کا مرمریں بٹوہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہین کچھ سمجھ پاتی نقاب پوش اس کے برابر والی نشست سنبھال چکا تھا۔ اس نے اپنی چادر کے نیچے سے چھوٹی نال کی خودکار رائفل نکالی اور اس کی نال شاہین کی سمن بدن گردن سے لگا دی۔

میرا ہاتھ اپنی پنڈلی سے بندھے ہوئے خنجر تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ خنجر نکالوں یا نہیں۔ اس ایک لمحے کی تاخیر نے صورت حال کو یکسر بدل دیا۔ جیپ کا دائیں جانب کا دروازہ بھی جھٹکے سے کھلا اور ایک تیسرا حملہ آور کود کر اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھی رومال اور ہاتھ میں سیاہ نال کی خوفناک رائفل تھی۔ یہ رائفل ہم دونوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ "خبردار حرکت کی تو جان سے مار دوں گا۔" وہ غرا کر بولا۔

شاہین کی حالت سخت بگڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ حملہ آور شاہین کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے ہیں تو وہ چیختی ہوئی ان کی طرف لپکی۔ اس کی یہ دلیری اس کے لئے بہت مہنگی ثابت ہوئی۔ گاڑی کی دائیں جانب سے اندر گھسنے والے حملہ آور نے رائفل کی نال اس کی طرف موڑی اور اوپر تلے دو فائر کھولے۔ دونوں گولیاں نواب زادی کے پیٹ میں لگیں اور وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر گئی۔ شاہین زور زور سے چلانے لگی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے رائفل کا بٹ پوری قوت سے اس کے سر پر مارا اور اسے گاڑی چلانے کا حکم دیا۔ گاڑی چلانے کی بجائے شاہین نے دروازہ کھول کر باہر کودنے کی کوشش کی۔ حملہ آور نے اسے سر کے بالوں سے جکڑ لیا اور رائفل سے ایک ہوائی فائر کیا۔ یہ ہوائی برسٹ تھا۔ قریباً ایک درجن گولیاں جیپ کی چھت توڑتی ہوئی نکل گئیں۔ "گاڑی چلاؤ" حملہ آور حلق کی پوری قوت سے دہاڑا۔

شاہین کانپی اور اس نے سہم کر اپنے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ دیئے۔ حملہ آور نے رائفل کی نال پھر شاہین کی نازک گردن سے لگا دی۔ گاڑی نے چند ہچکولے کھائے اور چلتی سڑک پر پھسلنے لگی۔ قرب و جوار میں درجنوں لوگ موجود تھے۔ بہت سی گاڑیاں بھی یہ منظر دیکھ کر رک چکی تھیں لیکن کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ حملہ آوروں سے لڑنے یا انہیں روکنے کی کوشش کرتا۔ سب پتھر کے بت بن کر رہ گئے تھے۔ "گاڑی تیز چلا نواب کی بچی" اگلی نشست پر بیٹھے حملہ آور نے رائفل کی نال اس کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

نواب کی بچی خوف کے عالم میں ایکسیلیٹر دباتی چلی گئی۔

O☆O

اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے تیس چالیس میل فاصلہ طے کیا اور حیدر آباد شہر سے خاصی دور درختوں سے گھرے ہوئے ایک علاقے میں پہنچ گئے۔ ڈرائیونگ کی ذمہ داری بدستور شاہین پر تھی۔ وہ بہت اچھی اور تیز ڈرائیونگ کرتی تھی لیکن مسلح افراد کے نرغے میں اور خودکار رائفل کے نشانے پر ڈرائیونگ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے کانپ کانپ جاتی تھی۔ ایسے میں گاڑی دائیں بائیں ڈولنے لگتی۔ اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا شخص غصے سے دہاڑتا اور شاہین کے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جم جاتے۔ دوسرا شخص ہمیں "کور" کئے ہوئے تھا۔ شروع میں وہ بے حد محتاط نظر آیا تھا لیکن ہماری حالت اور ہمارے ایکشن دیکھ کر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہماری طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ وقتاً فوقتاً ہمیں گھور کر بھی دیکھ لیتا تھا۔

گاڑی پختہ سڑک سے اتر کر جب کچے راستے پر بڑھنا شروع ہوئی تو شاہین ایک بار پھر حملہ آوروں کو سنگین نتائج سے آگاہ کرنے لگی۔ وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی "تمہیں کچھ پتا ہے میرے پاپا کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ وہ تمہیں زمین کی ساتویں تہہ سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ جو تمہارا انجام ہوگا اس کا تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔"

"ہم سب کچھ سوچ چکے ہیں اور یہ بھی ثابت کر دیں گے کہ تمہارا پاپا تمہیں زمین کی پہلی تہہ سے بھی نہیں ڈھونڈ سکتا۔" اگلی

نشست پر بیٹھے شخص نے خطرناک لہجے میں کہا۔ اس کے طور اطوار و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس "گروہ" کا سرغنہ ہے۔ ابھی تک گروہ کے صرف تین ارکان ہمارے سامنے آئے تھے۔ ایک وہ جس نے سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر جیپ روکی تھی۔ دوسرا وہ جو ہمیں نشانے پر لئے بیٹھا تھا اور تیسرا خود سرغنہ۔ جیپ روکنے والا شخص دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ لیکن ممکن تھا کہ وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔

ہم کچے راستے پر تین چار میل گئے ہوں گے کہ ایک قلعہ نما جگہ نظر آئی۔ بہت پرانا بے آباد قلعہ تھا۔ فصیل زیادہ بڑی نہیں تھی اور جو تھی وہ بھی کئی جگہ سے منہدم ہو چکی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ اور نوکیلے پتوں والی جنگلی گھاس نے قلعے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے دل میں خیال گزرا کہ شاید یہی قلعہ ہماری منزل ہے۔ لیکن جیپ قلعے کے پہلو سے آگے نکلتی چلی گئی۔ قریباً دو فرلانگ آگے جا کر ہم گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں رکے۔ یہاں کچی زمین پر ٹائروں کے نشانات موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ گاڑیاں یہاں تک آتی جاتی ہیں۔ جیپ برگد کے ایک بلند و بالا درخت تلے رک گئی۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ جیپ کے رکتے ہی گھنے درختوں کے اندر سے دو مسلح افراد نکل آئے تھے۔ وہ شکل و صورت سے مقامی غنڈے نظر آتے تھے انہوں نے سرغنہ کو ادب سے سلام کیا اور آگے بڑھ کر شاہین کو دبوچ لیا۔ وہ بے بس چڑیا کی طرح ان بے کسے افراد کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگی۔ "اندر لے چلو ان تینوں کو" سرغنہ نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں بڑی گہرائی اور ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ تھا۔

میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا کہ وہ اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ درحقیقت وہ ایک ایسا شخص تھا جسے دیکھتے ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ حکم چلانے اور بات منوانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اونچا قد' چوڑے شانے' بڑا سر' بے حد مضبوط ہاتھ پاؤں اور آنکھوں میں موجیں مارتی ہوئی ایک خاموش ذہانت۔ وہ اپنے چہرے کو ڈھانپنے والا رومال اب کھول چکا تھا اور اس کا پورا چہرا ہمارے سامنے تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ رنگ گندمی' بال سیدھے اور ملائم۔ وہ درمیانی شکل و صورت کا مالک تھا۔ ہم اس کے ساتھ درختوں میں گھسے۔ یہاں زمین میں ایک خلا سا نظر آیا۔ خلا میں اترنے کے لئے زمین کو ڈھلوان کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہم نے ڈھلوان طے کی تو خود کو ایک طویل سرنگ میں پایا۔ نانک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی یہ سرنگ اندر سے خوب صاف ستھری تھی لیکن یہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ مسلح افراد نے ٹارچیں روشن کر لی تھیں اور ہم انہی کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شاہین کی حالت قابل رحم تھی۔ اس نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو منتوں ساجتوں پر اتر آتی۔ لیکن اس نے اس حالت میں بھی اپنی نوابی شان برقرار رکھی ہوئی تھی۔ اس کے رونے میں بھی ایک طنطنے کا طمطراق تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سرنگ درحقیقت اسی قلعے کا ایک حصہ ہے۔ ذرا تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا تھا۔ سو دو سو گز آگے جانے کے بعد سرنگ روشن نظر آنے لگی۔ یہاں گیس لیمپس کا انتظام کیا گیا تھا۔ فرش پر بہت سی پرال بچھی ہوئی تھی اور اس پرال پر ایک دو جگہ بستر بھی نظر آ رہے تھے۔ یہاں سات آٹھ مزید افراد موجود تھے۔ سرغنہ کو دیکھ کر وہ سب مؤدب نظر آنے لگے لیکن اس "ادب" کے باوجود وہ شاہین کو للچائی ہوئی نظروں سے بھی دیکھ رہے تھے۔ سرغنہ نے اپنا اسلحہ اتار کر ایک طرف رکھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک میلا سا گاؤ تکیہ لگا تھا اور چٹائی بچھی تھی۔ سرغنہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بڑے انہماک سے شاہین کی جدوجہد دیکھنے لگا۔ وہ خود کو مسلسل چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بازو تو جکڑے ہوئے تھے لیکن اس کی ٹانگیں آزاد تھیں۔ وہ گاہے گاہے اپنی اونچی ایڑی والے جوتے کی ٹھوکر "خندہ صورت" افراد کی ٹانگوں پر رسید کرتی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے۔

وہ شعلہ فشاں لہجے میں چیخی "کون ہو تم؟ آخر کیوں لائے ہو مجھ کو یہاں۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔"

سرغنہ اطمینان سے بولا "تم نے نہیں' تمہارے بھائی نے بگاڑا ہے۔ اور تم جانتی ہی ہو کہ اکثر بدکردار بھائی اپنی بہنوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔"

"م۔۔۔ میرا بھائی۔ کیا کیا ہے اس نے؟" وہ ہکلائی۔

"اتنی بھولی مت بنو۔ تم اور تمہارا پاپا سب کچھ جانتے ہیں۔ تم نے جانتے بوجھتے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں۔"

شاہین روہانسی آواز میں بولی۔ "مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم"

سرغنہ نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں وہ سب کے سب سرنگ کے کسی دوسرے حصے میں چلے گئے۔ اب صرف وہ دو افراد ہمارے سامنے تھے جنہوں نے شاہین کو بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا یا پھر سرغنہ تھا جو بڑے ٹھاٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کی پاکٹ سے ایک مہنگے برانڈ کا سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ "کیا نبیلا کو نہیں جانتی ہو تم؟"

شاہین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ہم دونوں کو بھی چونکنا پڑا۔ شاہین ہکلا کر بولی۔ "ک۔ کون نبیلہ۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

وہ تڑخ کر بولا۔ "وہی نبیلہ جس کے ساتھ تیرے بھائی فیروز جنگ نے موت کا کھیل کھیلا۔ اس کی عزت برباد کی۔ اس کے جسم کو نوچا کھسوٹا اور پھر بیکار شے سمجھ کر حویلی کے ایک کونے میں پھینک

دیا۔" شاہین کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ شاید وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے حلق سے برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ سرغنہ گرجا "کیا سمجھا تھا تیرے بھائی نے؟ کوئی نہیں آئے گا اس کمزور بے آسرا لڑکی کے پیچھے؟ کوئی اس کی عزت کا حساب نہیں مانگے گا؟ وہ یونہی اپنی گردن اکڑا کر حیدرآباد میں دندناتا پھرے گا؟ اگر اس نے ایسا سمجھا تھا تو یہ غلط فہمی تھی اس کی۔ میں.... ہاں میں بتاؤں گا اس کو کہ برباد عزتوں کا حساب کیسے مانگا جاتا ہے اور فخر سے اکڑی ہوئی گردنیں کیسے جھکائی جاتی ہیں.... میرا نام سلجوق ہے اور آج کے بعد یہ نام نواب شہریار کے خاندان سے یوں نتھی ہو گا کہ نسلوں تک جدا نہیں ہو سکے گا۔"

شاہین ایک بار پھر چیخ چلانے لگی۔ "مجھے کچھ پتا نہیں میرے بھائی نے کیا کیا ہے۔ اگر اس نے کچھ کیا بھی ہے تو میرا کیا گناہ ہے۔ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو.... یاد رکھو.... میں اپنی جان دے دوں گی۔ لیکن.... لیکن خود پر کوئی ظلم نہیں ہونے دوں گی۔"

"ہاہا" سرغنہ نے قہقہہ لگایا "جان دے دوں گی.... جان دینا اتنا آسان نہیں نواب زادی۔ اور تم جیسے بے غیرت امیروں کے لئے تو یہ کام اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ لے خنجر.... اور مار لے اپنے پیٹ میں" اس نے بیٹھے بیٹھے اپنی قمیص کے نیچے سے ایک چمکدار چھرا نکال کر شاہین کے قدموں میں پھینک دیا۔ اس کے اشارے پر دونوں غنڈوں نے اس کے بازو چھوڑ دیئے اور اپنی رائفلوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ خنجر نما چھرا شاہین کے قدموں پر پڑا تھا اور گیس لیمپ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ شاہین اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ ایک دم ہی جیسے اس کی تمام ہمتیں اور جراتیں جواب دے گئی تھیں۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے سرغنہ دہاڑا "اٹھاؤ خنجر اٹھاتی کیوں نہیں ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ہم میں سے کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔"

چند لمحے سرنگ میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی میں صرف نواب زادی کی دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ آخر سرغنہ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ تمہیں برسوں سوچنے کی مہلت بھی دی جائے تو تم مرنے کا فیصلہ نہیں کر سکو گی۔ مرنا تو دور کی بات ہے خود کو اس خنجر سے چھوٹا سا زخم بھی نہیں لگا سکتی ہو تم۔" پھر وہ ہم دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں بھئی۔ تم دونوں بتاؤ۔ یہ تمہاری نواب زادی بے عزتی سے بچنے کے لئے خود کشی کر سکتی ہے؟"

جواب آسان تھا لہٰذا میں نے فوراً دیا۔ "نہیں جناب۔"

میری شتابی پر دونوں مسلح افراد مسکرانے لگے۔ سرغنہ نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ "یہ زندگی کی بھیک مانگنے والے لوگ ہیں۔ موت کو گلے لگانا پڑے تو یہ لوگ موت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔"

اس نے اپنے کارندے کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر چھرا شاہین کے قدموں سے اٹھا لیا۔ سرغنہ جس نے اپنا نام سلجوق بتایا تھا اب بڑے غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں ناف پر ہاتھ باندھے سرنگ کی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ میرے کپڑے میلے کچیلے تھے اور بال الجھے ہوئے۔ ایک چپل کا تسمہ ٹوٹ چکا تھا اور اسے میں نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ بوٹا سنگھ کی حالت تو پہلے بھی دگرگوں رہتی تھی۔ وہ ترچ پہلے سے زیادہ میلا کچیلا نظر آ رہا تھا۔ ایک خستہ حال بیمار چوہے کی طرح وہ خاموش کھڑا تھا اور "حالات کی بلی" کے خوف سے سہما ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سلجوق نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم دونوں اس نواب زادی کے باپ کے ملازم ہو۔"

"آپ کہہ سکتے ہیں جی" میں نے جواب دیا۔

"کہہ سکتے ہیں؟ کیا مطلب؟" سلجوق نے پوچھا۔

میں نے ایک ڈری ہوئی سی نگاہ نواب زادی پر ڈالی اور دبے لہجے میں کہا۔ "جناب اصل میں ہم روزگار کی تلاش میں تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ نواب شہریار جنگ کا بیٹا بیمار ہے اور وہ اس کا علاج کروانے کے لئے جھاڑ پھونک کرنے والوں کو حویلی میں بلاتا رہتا ہے۔ قسمت خراب تھی کہ ہم بھی لالچ میں آ گئے اور عاملوں کا بہروپ دھار لیا۔ کسی طرح نواب شہریار جنگ تک پہنچنے کے لئے ہم دہلی سے حیدرآباد روانہ ہوئے۔ اتفاقاً ٹرین کے سفر کے دوران نواب شہریار کے ایک کارندے کو ہم پر شبہ ہو گیا۔ جونہی ہم حیدرآباد پہنچے اس نے ہمیں پکڑوا دیا۔ نواب کے غنڈے ہم دونوں کو پکڑ کر حویلی میں لے آئے اور بری طرح مارا پیٹا۔ اب حویلی میں ہماری حیثیت قیدیوں کی سی تھی۔ نواب کے کارندے ہم سے زرخرید غلاموں کا سا سلوک کر رہے تھے.... آپ میرے چہرے پر چوٹوں کے نشان دیکھ رہے ہوں گے' یہ نواب کے کارندوں کی مار پیٹ کا نتیجہ ہیں۔"

سلجوق کھوئی کھوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ جیسے کوئی اچھوتا خیال اس کے ذہن میں آیا ہو۔ اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں پیشانی سے ہٹایا اور گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز سا ہو گیا۔ وہ بظاہر ہمیں دیکھ رہا تھا لیکن اس کا خیال کہیں اور سفر کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بے حد سنجیدہ اور سوچ میں گم رہنے والا شخص ہے۔ بے شک وہ مجرمانہ زندگی گزار رہا تھا اور ایک خطرناک گروہ کا سرغنہ تھا لیکن اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے اس قسم کے دوسرے لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ لگتا تھا کوئی گہرا گھاؤ ہے اس کے سینے میں۔ اس گھاؤ کے کرب نے اس کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ نواب زادی کو کوٹھڑی میں بند کر دیں' وہ اس کے بارے میں کل فیصلہ کرے گا۔ پھر وہ ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم بھی جاؤ' لیکن

یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو بیچ بچ کمال اتنا اگر اس میں پڑا.... میں بھرا ہوا دوں گا۔"

سلجوق کا ایک کارندہ ہمیں ساتھ لے کر سرنگ کے اس حصے میں آ گیا جو قلعے سے ملحق تھا۔ یہاں سرنگ کی دونوں اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے سے بنے ہوئے تھے۔ نانک پنڈی اینٹوں کے بنے قدیم حجرے بمشکل دس ضرب دس فٹ کے ہوں گے۔ ان میں سے چند حجروں کے در لکڑی کے دروازوں سے بند کر دیئے گئے تھے۔ ہمیں بھی ایک ایسے ہی حجرے میں ٹھہرا دیا گیا۔ یہاں فرش پر روئی کے گدے بچھے تھے اور لحاف وغیرہ رکھے تھے۔ ایک طرف بڑا سا ٹرنک اوندھا پڑا تھا۔

ہم نے وہ رات اسی حجرے میں گزاری۔ یہ بالکل ویران علاقہ تھا۔ رات کو قلعے کی جانب سے کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ حجرے میں لالٹین کا انتظام تھا۔ رات کسی پہر تیل ختم ہونے کی وجہ سے لالٹین بجھ گئی۔ ہم دن چڑھے تک حجرے میں ہی لیٹے رہے۔ اگلے روز ہمیں حجرے میں ہی کھانا دیا گیا۔ شاہین کے بارے میں ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ کل شام سے ہمیں اس کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی کہیں دکھائی دی تھی۔ یہ بات اب بالکل واضح ہو چکی تھی کہ شاہین کے اغوا کئے جانے کا تعلق جمیلہ والے معاملے سے ہے۔ شاہین کے بھائی نے جو کچھ غریب عبداللہ کی بیٹی سے کیا تھا اس کا انتقام لینے کے لئے کچھ لوگ شاہین کو اس ویران قلعے میں لے آئے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ یہ سوال حل طلب تھا۔ سرغنہ سلجوق حیدرآبادی لہجے میں بات نہیں کرتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق مشرقی پنجاب کے علاقے سے ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم تھا جمیلہ کا تعلق بھی مشرقی پنجاب سے تھا۔ ہو سکتا تھا کہ جمیلہ کے ساتھ سلجوق کی کوئی رشتے داری ہو۔ غیرت کھا کر اس نے نواب شہریار کی بیٹی کو اٹھا لیا ہو....

دس بجے کے لگ بھگ سلجوق کے کارندوں نے ہمیں حجرے سے نکالا اور سلجوق کے پاس پہنچا دیا۔ وہ اسی جگہ موجود تھا جہاں ہم نے رات کل دیکھا تھا۔ وہ چٹائی پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا اور اپنی رائفل صاف کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک تھالی میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک سگریٹ اب بھی اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پچھلے چند گھنٹوں سے مسلسل سگریٹ نوشی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے ہم دونوں کو گھورا اور بولا "اگر تمہیں نواب شہریار سے انتقام لینے کا موقع ملے تو لو گے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "نہیں جناب۔ ہم معمولی لوگ ہیں۔ نواب شہریار جنگ تو بس اپنی بھوک اور ضرورتوں سے ہوتی ہے۔ ہم کسی سے لڑنے یا انتقام لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"لیکن عزت تو ہر بندے کی ہوتی ہے۔" سلجوق نے کہا۔

"اور جب اس کی عزت مٹی میں ملائی جاتی ہے تو اسے دکھ بھی ہوتا ہے۔ یہ دکھ اور انتقام کی خواہش دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں خود بھی پتا نہ ہو کہ تم نواب شہریار اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے کتنے خلاف ہو اور موقع ملنے پر ان کا کیا حشر کر سکتے ہو۔"

میں اور بوٹا سنگھ خاموش رہے۔ اس بات کا جواب بھلا خاموشی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ سلجوق نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اگر نواب زادی کو ایک رات کے لئے تمہارے حوالے کر دیا جائے تو....؟"

میں اور بوٹا سنگھ حیرت کے عالم میں سلجوق کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں ایک برق سی کوند رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "جناب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم.... اور.... نواب زادی...."

"ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔" سلجوق نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "یہ نواب اور رئیس ہم جیسے لوگوں کو قریب بٹھانا بھی گوارا نہیں کرتے۔ انہیں دس گز کے فاصلے سے ہمارے پسینے کی بو پریشان کرنے لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج رات یہ نواب زادی تم دونوں کی بانہوں میں رہے۔ تمہارے ہاتھوں اس کی عزت اس طرح خاک میں ملے جس طرح اس کے بھائی کے ہاتھوں ایک غریب ملازم کی آبرو خاک میں ملی ہے۔ بولو.... تم یہ سب کچھ کرو گے" ہم دونوں سرجھکائے خاموش کھڑے رہے۔ وہ بولا "ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ نواب شہریار کی ہوا بھی تمہیں نہیں چھو سکے گی۔ میں تمہاری حفاظت کی پوری ذمے داری لیتا ہوں۔"

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ سلجوق جو گھناؤنا کام ہمارے سپرد کر رہا تھا وہ کسی کے سپرد بھی کیا جا سکتا تھا اور اگر وہ کام کسی دوسرے کے سپرد کر دیا جاتا تو نواب زادی اپنی زندگی کے بدترین عذاب سے دوچار ہو جاتی۔ میں نے کوئی اعتراض کرنے یا شک اٹھانے کی بجائے نیم رضامندی کی نگاہوں سے سلجوق کی طرف دیکھا۔ اس نے ہماری خاموشی کو نیم رضامندی جانا اور اس کی گھنی مونچھوں تلے ایک سفاک مسکراہٹ نمودار ہو کر اوجھل ہو گئی۔

○☆○

اسی رات نواب زادی شاہین کو سچ مچ ہمارے حوالے کر دیا گیا۔ یہ وہی حجرہ تھا جس میں ہم نے کل رات قیام کیا تھا۔ نواب زادی ہر طرح ہماری دسترس میں تھی۔ یہاں کوئی اس کی مدد کو آنے والا نہیں تھا نہ ہی کسی نے اس کی چیخ و پکار سننا تھی۔ اس صورت حال پر کسی شاعر کا یہ مصرعہ صادق آ رہا تھا.... دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ یہی نواب زادی تھی جو چند روز پہلے اپنے باپ کی حویلی میں ہماری بے عزتی کا تماشا دیکھ رہی تھی اور نخرے بکھیر رہی تھی۔ جب نواب شہریار جنگ نے حویلی کے احاطے میں ہماری درگت بنوائی تھی اور بعد میں ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ بے حد محظوظ ہوئی

تھی اور موقع پر موجود رہ کر فقرے چست کرتی رہی تھی۔ ہم اس کی نگاہ میں دو حقیر کیڑے مکوڑے تھے جو اس کے سامنے زمین پر رینگ رہے تھے اور جان بچانے کے لئے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے تھے۔ آج حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہی کیڑے مکوڑے اس کے جسم و جاں کے مالک بن گئے تھے اور اس امر کا اختیار رکھتے تھے کہ اس سے بدترین سلوک کر سکیں۔ ہمیں اپنے ساتھ حجرے میں تنہا پا کر نواب زادی کا ماتھا ٹھنکا۔ "تم دونوں کو میرے ساتھ کیوں بند کیا گیا ہے؟" وہ طمطراق سے بولی۔

بوٹا سنگھ نے اپنی باریک مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "یہ تو آپ بند کرنے والوں سے پوچھیں۔ اس وقت آپ ان کے شکنجے میں ہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو آپ کے ساتھ ڈھور ڈنگر بند کر دیں۔"

اس کے چہرے پر نفرت اور کراہت کے تاثرات ابھرے۔ اس حال میں بھی اس کی نخوت کم نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ لباس شکن شکن تھا اور آنکھیں بھی رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں مگر وہ ایک دم چوکس اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوٹا سنگھ کے لہجے پر وہ تلملا اٹھی۔ "یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو باسٹرڈ۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ میرا مذاق اڑاؤ۔"

بوٹا سنگھ نے کہا۔ "بی بی جی! آپ اتنی سی بات پر ناراض ہو گئی ہیں۔ کوئی بڑی بات ہو گئی تو آپ کیا کریں گی۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ کرنی تو آپ کر نہیں سکتیں۔"

"تک... کیا مطلب ہے تمہارا" نواب زادی شاہین آنکھیں نکال کر چیخی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "بی بی جی۔ آپ ادھر چارپائی پر بیٹھیں' آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔"

میں نے اسے چارپائی پر بٹھانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"خبردار! پیچھے رکھو اپنا منحوس ہاتھ.... اور یہ بی بی جی۔۔ بی بی جی کیا لگا رکھی ہے۔ میڈم کہہ کر بات کرو" وہ غرائی۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میڈم جی! اصل میں حالات آپ کی توقع سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ میں بڑے افسوس اور شرمندگی کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ کل سلجوق نام کے اس شخص نے جو کچھ آپ سے کہا تھا' وہ "خالی خولی دھمکی" نہیں تھا۔ وہ واقعی آپ کے بارے میں بہت برے ارادے رکھتا ہے۔ اس وقت ہمیں آپ کے ساتھ یونہی بند نہیں کیا گیا ہے۔ وہ خبیث شخص آپ کو ذلت سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔۔ اور اس کام کے لئے ہمارا انتخاب کیا گیا ہے۔"

شاہین آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے تک تو اسے میری بات سمجھ میں ہی نہیں آئی اور جب سمجھ میں آئی تو اس کے چہرے پر زلزلہ سا طاری ہوا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ چہرے پر برسنے والی حقارت اور کراہت ایک دم گہری ہو گئی تھی۔ وہ سرسراتی ہوئی شعلہ فشاں آواز میں بولی: "چلے جاؤ۔۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

بوٹا سنگھ نے اطمینان سے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہوش کی بات کرو میڈم جی۔ ہم یہاں اپنی مرضی سے آئے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے جا سکتے ہیں۔"

اپنے باپ کے "حضور بندی" کو یوں اپنے سامنے بولتے دیکھ کر شاہین آپے سے باہر ہو گئی۔ دانت پیس کر بولی۔ "نائی کا... تمہاری گردن دبا دوں گی' یا اپنے دانتوں سے تمہارا نرخرہ ادھیڑ دوں گی۔ مجھے اس حد تک مت لے جاؤ کہ میں مرنے مارنے پر اتر آؤں۔"

بوٹا سنگھ مسکرایا۔ "میڈم! نہ تم مرو گی نہ کسی کو مارو گی۔ تمہارا جگرا تو ہم نے کل ہی دیکھ لیا تھا اور نہ بھی دیکھا ہوتا تو ہمیں یقین ہے کہ فیروز جنگ جیسے بھائیوں کی بہنیں اور شہریار جنگ جیسے باپوں کی بیٹیاں اتنی بہادر نہیں ہوتیں۔ تم کچھ نہیں کر سکتی ہو... تمہیں چڑیا کی طرح دبوچ لیں گے۔ زیادہ ہاتھ پاؤں چلاؤ گی تو سلجوق کے بندوں کو مدد کے لئے بلا لیں گے۔ تمہیں اس چارپائی کے ساتھ یوں باندھ دیں گے کہ حرکت بھی نہ کر سکو گی... لیکن نہیں... ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ ہم ایسا کرنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔"

بوٹا سنگھ بڑے اعتماد سے بول رہا تھا۔ شاہین دیوار سے لگی اور حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ یہ خاتون زدہ جو ہے جیسا شخص اتنی دلیری سے بات کیسے کر رہا ہے۔ میں نے نرمی سے کہا۔ "میڈم جی! آپ کو ہماری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں ہماری سچائی کا یہی ثبوت بہت کافی ہے کہ آپ کوئی نقصان اٹھائے بغیر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اللہ نے چاہا تو باقی کی رات بھی اسی طرح گزر جائے گی لیکن اس کے لئے ہمیں تھوڑا ڈرامہ کرنا ہو گا۔ میرا مطلب ہے تھوڑی سی دھینگا مشتی' چیخ و پکار' آپ کہیں کہیں سے اپنا لباس بھی پھاڑ لیں تو بہتر ہو گا۔ یقیناً آپ میری بات سمجھ رہی ہوں گی۔"

شاہین کی خوبصورت آنکھوں سے عیاں نظر آنے لگا کہ وہ نہ صرف میری بات سمجھ رہی ہے بلکہ اس پر یقین بھی کر رہی ہے لیکن وہ اپنا اور ہمارا درمیانی فاصلہ بدستور برقرار رکھے ہوئے تھی اور اس نے اپنے دم خم میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔ اس نے مجھے گھورنے والی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "اس میں کوئی چال تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کو قسم کھانے سے یقین آتا ہے تو اس نیک کام کے لئے ہر قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

وہ بولی۔ "کیا.... تمہیں یقین ہے کہ یہ لوگ اس کمرے سے باہر والے کسی دراز سے کو تاڑ نہیں لیں گے۔"

"کیوں نہیں تاڑیں گے" میں نے کہا۔ "ہم دونوں کو

والد حضور نے زبردستی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ سب کے سامنے ہی بے عزتی کی گئی تھی اور ہمیں مارا پیٹا گیا تھا۔ اب ہمیں بدلہ لینے کا ایک سنہری موقع ملا ہے۔ ہم اس سے فائدہ اٹھائیں تو یہ بعد میں آنے والی بات ہو گی۔"

شاہین کے چہرے پر خجالت کی سرخی نمودار ہو گئی۔ غالباً اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے آخری سوال پوچھ کر غلطی کی ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اسے ہماری بات مان لینی چاہئے لیکن اس کی انا اور اس کا نوابی طمطراق آڑے آ رہا تھا۔ وہ ہماری بات مان کر ہماری برتری تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بہر طور میرے سمجھانے بجھانے سے وہ آمادہ ہو گئی۔ اس نے وہی کیا جو میں نے اس سے کہا تھا۔ اس نے بال بکھیر لئے۔ لباس کہیں کہیں سے ادھیڑ لیا اور کہیں سے پھاڑ لیا۔ حسب ضرورت چیخ و پکار بھی کی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس چیخ و پکار نے سلجوق کو محظوظ کیا ہو گا۔ وہ رات ہم نے اسی جھونپڑا نما کوٹھڑی میں گزاری۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ سلجوق سے ملاقات ہوئی۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ بغیر کسی تمہید کے پوچھنے لگا "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ بولا "میں تمہیں صورت سے بیوقوف یا پاگل نظر آتا ہوں۔"

"لیکن بات کیا ہوئی ہے جناب" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اس نے کھڑے کھڑے ایک دم حرکت کی۔ اس کی زوردار لات میرے سینے پر پڑی۔ یہ ضرب بالکل اچانک تھی۔ میں سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ آتشیں لہجے میں بولا۔ "اگر وہ تم دونوں کی بہن تھی تو مجھے کل شام کیوں نہ بتایا۔ کیا ضرورت تھی یہ ناٹک کرنے کی۔"

"ناٹک... کون سا ناٹک" میں نے پوچھا۔

وہ میرے قریب آیا۔ میرا گریبان پوری طاقت سے پکڑا اور میری آنکھوں کے سامنے انگلی لہرا کر بولا۔ "میں فریبی لوگوں سے جتنی نفرت کرتا ہوں دنیا میں کسی سے نہیں کرتا۔ میرا خون کھول جاتا ہے ایسے لوگوں کی صورت دیکھ کر۔" پھر اس نے گرج کر اپنے کسی ماتحت کارندے کو بلایا اور اس سے کہنے لگا۔ "ان دونوں کے ہاتھ باندھ دو۔ اب ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

سلجوق کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی اس کے دو کارندوں نے اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھ میں لے لیں۔ وہ ہماری طرف سے پوری طرح چوکس نظر آنے لگے تھے۔ طفیل نامی دو نمبریا ایک کوٹھڑی میں گھسا اور چند لمحے بعد ہتھکڑیوں کے دو جوڑے لے آیا۔ یہ بالکل ویسی ہی ہتھکڑیاں تھیں جو پولیس استعمال کرتی ہے بلکہ پولیس کے مقابلے میں یہ ہتھکڑیاں چمکتی ہوئی تھیں۔ طفیل نے انتہائی مستعدی اور بڑی چابک دستی سے میرے اور بوٹا سنگھ کے ہاتھ سامنے کی طرف ہتھکڑیوں میں جکڑ دیئے۔ سلجوق بولا "حق تو یہ تھا کہ رات والی فریب کاری پر تمہیں کڑی سزا دی جائے لیکن نجانے کیوں تمہیں رعایت دینے کو جی چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ توقع بھی کرتا ہوں کہ آپ نواب زادی سے بھی رعایت کا معاملہ کریں گے۔ بے شک اس کے بھائی نے ظلم توڑا ہے لیکن نواب زادی اس ظلم میں شریک نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ...."

"خاموش" سلجوق نے میری بات کاٹی "میں اس سلسلے میں ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کروں گا۔ نواب زادی کے ساتھ وہی کچھ ہو گا جو طے ہو چکا ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ نواب زادی کی لاش تین روز کے اندر اندر نواب شہریار کی دہلیز پر پھینکواؤں گا۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ سلجوق کا لہجہ تشویشناک حد تک فیصلہ کن تھا۔ یہ ایک سخت گیر شخص کا بے لچک لہجہ تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میں تم دونوں کو ایک موقع اور دیتا ہوں۔ آج کی رات سوچ لو۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں تمہیں اس پر عمل کرنا ہو گا۔ دوسری صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کی لاشیں بھی نواب زادی کی لاش کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوں۔" پھر اس نے طفیل کو اشارہ کیا۔ وہ ہمیں رائفل کے کندے سے دھکیلتا ہوا حجرے کی طرف لے گیا۔

ہمیں حجرے میں بند کر کے اس نے باہر سے تالا لگا لیا اور سلاخ دار کھڑکی کے سامنے رک کر دھیمی آواز میں بولا۔ "پاگل مت بنو۔ عیش اور زندگی کو ایک ساتھ لات مار رہے ہو تم۔ مرغ کے اذان نہ دینے سے رات ٹھہر نہیں جاتی۔ تمہارے انکار سے بھی نواب زادی کی عزت اور جان نہیں بچے گی۔ کیا سمجھے؟" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ شخص اپنے خباثت بھرے چہرے کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ گیا۔

صورت حال گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ سلجوق میری توقع سے بڑھ کر ہوشیار اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ کل تک میرا اندازہ تھا کہ سرنگ میں پندرہ بیس افراد ہوں گے لیکن آج کئی نئے چہرے بھی دکھائی دیئے تھے۔ ان میں سے اکثر افراد خود کار رائفلوں سے مسلح تھے اور یہ سارے لوگ شوقیہ نہیں بلکہ پیشہ ور بدمعاش تھے۔ ان کی صورتیں بتا رہی تھیں کہ وہ گرگ باراں دیدہ اور لڑنے مرنے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کے سرغنہ سلجوق کا تعلق دکن سے نہیں تھا مگر ان میں سے اکثر حیدر آبادی تھے۔ وہ خاص لہجے میں اردو بولتے تھے اور ان کے لباس میں بھی دکن کے کلچر کا رنگ نظر آتا تھا۔ میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ نواب زادی شاہین یہاں شدید خطرے میں ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

شام کے وقت کسی قریبی کوٹھڑی سے مجھے اس کی چیخیں سنائی دیں۔ وہ مسلسل ایک ہی انداز میں چلا رہی تھی اور کبھی انگلش اور کبھی

اندر میں سلجوق کو دھمکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ بھی تھا بہر حال وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کے اعصاب ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ بوٹا سنگھ کوٹھڑی کے فرش پر خاموش لیٹا تھا۔ میں نے اس سے صلاح مشورہ کرنا چاہا لیکن وہ بیزار نظر آیا۔ درحقیقت پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس کا نشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی جیب میں سرخ کیپسولوں کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ کیپسول اس کی سب سے بڑی اور واحد کمزوری ہیں۔ ان کے بغیر وہ نڈھال ہو جاتا تھا۔ بوٹا سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں ذہنی خیالات کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ نواب زادی کا اغوا ایک سنگین واقعہ تھا۔ یقینی بات تھی کہ علاقے کی پولیس اور نواب شہریار کے سیکڑوں کارندے ہر جگہ نواب زادی کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ مگر وہ قریب ہونے کے باوجود وہاں سے بہت دور تھی۔ ویران قلعے کے اندر سلجوق کا یہ خفیہ ٹھکانا ایسا نہیں تھا کہ مخبری کے بغیر آسانی سے تلاش کیا جا سکتا۔

رات سونے سے پہلے مجھے اور بوٹا سنگھ کو باری باری پیشاب کے لئے باہر لے جایا گیا۔ پہلے میں گیا پھر بوٹا سنگھ کی باری آئی۔ بوٹا سنگھ کی طرف سے وہ لوگ خاصے لاپروا تھے۔ اس کی حالت ہی ایسی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بڑی مشکل سے اپنا جسم گھسیٹتا پھر رہا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ بوٹا سنگھ پیشاب کر کے واپس آیا تو مجھے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی۔ یوں لگا کہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بوٹا سنگھ کے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں تھے لہٰذا رائفل بردار ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ ایکا ایکی رائفل بردار کی غفلت اس کے لئے قیامت بن گئی۔ بوٹا سنگھ کے ڈھانچے میں چھپی ہوئی بجلی جاگی اور اس نے تڑپ کر رائفل بردار کی گردن بانہوں میں جکڑ لی۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار کچھ سمجھتا اس کا سر پتھریلی دیوار سے ٹکرایا اور وہ لہرا کر بوٹا سنگھ کی بانہوں میں جھول گیا۔ بوٹا سنگھ نے اسے آہستگی سے فرش پر رکھا اور اس کی رائفل پکڑ لی۔ کہیں قریب سے بھاگتے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً رائفل بردار کا سر دیوار سے ٹکرانے کی آواز سن لی گئی تھی۔ بوٹا سنگھ پتھریلی دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ جونہی ایک شخص بھاگتا ہوا سرنگ کے خم سے برآمد ہوا بوٹا سنگھ نے تاک کر رائفل کا کندا اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ رائفل بردار مردہ چھپکلی کی طرح پیٹ کے بل فرش پر گرا اور بظاہر یہی لگا کہ راہیٔ عدم ہو گیا ہے۔ بوٹا سنگھ نے پہلے شخص کی جیب سے حجرہ نما کوٹھڑی کی چابی نکالی اور تالا کھول دیا۔

"آؤ جی میرے ساتھ" وہ دوسرے پہرے دار کی سیون ایم ایم رائفل مجھے تھماتے ہوئے بولا۔ ہم دونوں آگے پیچھے تہ خانے کی مخالف سمت میں بھاگے۔ کل اسی راستے سے گزر کر ہم یہاں پہنچے تھے۔ جونہی ہم دہانے کے نزدیک پہنچے تاریکی سے ہم پر دو فائر ہوئے۔ ان میں سے ایک گولی بوٹا سنگھ کو لگی اور وہ کراہ کر فرش پر گرا۔

"بوٹا سنگھ" میں نے چلا کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ٹٹول کر اس کا بازو اور اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا بازو خون سے تر تھا۔ کوشش کر کے گھٹنوں کے بل اٹھا لیکن پھر گر گیا۔ اب ہمارے عقب میں بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "بوٹا سنگھ" میں نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ کراہ کر بولا۔ "میری چنتا نہ کریں۔ آپ نکلیں یہاں سے ورنہ دونوں پکڑے جائیں گے اور کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس بھاگ دوڑ کا۔" اس نے مجھے دھکیلا۔ میں نے جھک کر اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ بالکل ہلکا پھلکا تھا۔ میں اس کے ساتھ دہانے کی طرف دوڑا۔ ابھی چند قدم ہی دوڑ پایا تھا کہ تاریکی میں کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور اوندھے منہ گرا۔ بوٹا سنگھ پر میری گرفت ختم ہو گئی۔ وہ اندھیرے میں کہیں لڑھک گیا تھا۔ دہانے کی طرف سے تاریکی میں چند شعلے لپکے اور گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر کے اوپر سے گزریں۔ میں نے بوٹا سنگھ کو ڈھونڈنے کے لئے تاریکی میں ہاتھ چلائے لیکن وہ میرے ہاتھ نہ لگا اور نہ اس نے میری پکار کا جواب دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ رینگ کر کسی کونے کھدرے میں کھسک گیا ہے۔ دوسرے معنوں میں اس نے میرے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا کہ میں اس کے بغیر ہی سرنگ سے باہر جاؤں۔ تعاقب میں آنے والے اب بالکل سر پر تھے۔ میں نے ٹٹول کر رائفل اٹھائی اور ایک بار پھر دہانے کی طرف بڑھا۔

اچانک کسی نے تاریکی میں میرا بازو تھاما اور دوستانہ انداز میں دہانے کی طرف کھینچنے لگا۔ "بوٹا سنگھ کدھر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اسے گولی لگی ہے" میں نے جواب دیا۔

"بچ گیا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چلا۔"

"اچھا تم باہر نکلو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔"

میرا بازو تھامنے والے نے مجھے سرنگ کے دہانے پر پہنچایا اور واپس لوٹ گیا۔ لیکن دو تین سیکنڈ بعد وہ پھر باہر آ گیا۔ وہ غالباً سمجھ گیا تھا کہ اب سرنگ میں گھسنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بوٹا سنگھ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکا تھا جو کوٹھڑیوں کے پاس سے ہمارے پیچھے آئے تھے۔ میرے مددگار نے میرا بازو تھاما اور سرنگ کے دہانے سے دور بھاگتا چلا گیا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ مطلع صاف اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سرنگ سے نکلتے ہی احساس ہوا کہ سرد ہوا چل رہی ہے۔ میں نے بھاگتے بھاگتے کن انکھیوں سے اپنے مددگار کو دیکھا۔ وہ ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ اس نے ... طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ وہ اسرار سے پوری طرح واقف تھا۔ چند گھنے درختوں کے درمیان سے گزار کر وہ مجھے ایک ہموار رستے پر لے آیا۔ ہم پوری رفتار سے بھاگتے رہے اور تھوڑی دیر بعد قلعے سے ڈیڑھ دو میل

آگے ایک چوڑے پاٹ کا ڈیک نالہ تھا۔ نالے کے کنارے درختوں میں ایک خستہ حال جھونپڑی ہمارا مسکن ٹھہری۔ میرے مددگار نے جیب سے ماچس نکال کر روشنی کی۔ جھونپڑی میں ایک چٹائی اور چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی فقیر منش یہاں رہتا ہے جو کسی وجہ سے آج رات جھونپڑی سے باہر ہے۔ جھونپڑی میں مٹی کے دو دیے موجود تھے۔ میرے مددگار نے ایک دیا روشن کر دیا۔ ہم بری طرح ہانپ رہے تھے۔ وہیں چٹائی پر گر کر سانس درست کرنے لگے۔

میرے مددگار کا لباس حیدر آبادی تھا لیکن اس کی صورت سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ پنجابی یا راجستھانی ہے۔ کہنے لگا "مجھے بوٹا سنگھ کی طرف سے بڑی فکر ہے۔ اللہ کرے وہ بچ گیا ہو" کچھ دیر ہم بوٹا سنگھ کے بارے میں بات کرتے رہے پھر وہ کہنے لگا "ہمیں کم از کم گھنٹے یہیں پر گزارنے ہیں۔ اس وقت نو بجے ہیں۔ کیا وہ بے پرواز کشتی لے کر اس کنارے پر آئے گا۔ اس کے آنے سے پہلے ہم ڈیک نالہ پار نہیں کر سکتے۔ دو تین روز سے نالہ بہت چڑھا ہوا ہے۔"

"یہ پیر فراز کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جس کی یہ جھونپڑی ہے" وہ بولا "اللہ لوک بندہ ہے۔ اس کے پاس دس پندرہ سال پرانی ایک کشتی ہے۔ جن دنوں ڈیک نالے میں پانی ہوتا ہے وہ لوگوں کو فی سبیل اللہ ایک کنارے سے دوسرے پہنچاتا ہے۔ اب بھی وہ اسی کام پر گیا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

وہ بولا "میرا نام نادر ہے۔ میں فرید کوٹ کا رہنے والا ہوں۔"

"تم شکل سے بھلے آدمی نظر آتے ہو۔ سلجوق جیسے خطرناک شخص سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"شکل سے تو تم بھی بھلے نظر آتے ہو لیکن پتا چلا ہے کہ تم جھوٹے مالی بن کر نواب شہریار کی حویلی میں گھسے تھے۔"

میں نے کہا۔ "میرے بارے میں تمہاری معلومات ناکافی ہیں۔"

وہ بولا۔ "میرے بارے میں بھی تمہاری معلومات ناکافی ہیں۔"

"کچھ بتانا پسند کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "کیا بتاؤں۔ میرا دھیان بوٹا سنگھ میں اٹکا ہوا ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا گزری ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"لگتا ہے بوٹا سنگھ سے تمہاری پرانی شناسائی ہے۔"

"نہیں کچھ زیادہ پرانی نہیں۔ لیکن ہمارا دکھ ایک جیسا تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔"

"کیسا دکھ؟" میں نے پوچھا۔

"سب انسپکٹر تلک رام پانڈے کا دکھ" نادر نے روانی سے جواب دیا۔ "سب انسپکٹر تلک رام ہم دونوں کا مشترکہ دشمن تھا۔ اس نے جس طرح بوٹا سنگھ کی بھابی کی عزت لوٹی اور اس کی ماں کے سینے میں سنگین اتاری اسی طرح اس نے میرے سینے پر بھی ایک نہ مٹنے والا زخم لگایا تھا۔" چند لمحے توقف کر کے نادر نے اپنے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو آگ دکھائی اور بولا۔ "وہ میرے باپ کا قاتل تھا۔ اس نے میرے باپ کو ایک جھگڑے میں گرفتار کیا تھا۔ یہ زمین کا جھگڑا تھا۔ میں تو گرفتاری سے پہلے روپوش ہو گیا لیکن میرا باپ گھر پر تھا وہ پکڑا گیا۔ سب انسپکٹر تلک رام نے مخالف پارٹی سے پیسے کھائے اور حوالات میں میرے باپ پر بری طرح تشدد کیا۔ وہ اس سے ناجائز بندوق برآمد کروانا چاہتا تھا۔ وہ بندوق جو سرے سے تھی ہی نہیں میرا باپ کیسے برآمد کروا دیتا۔ پھر ایک روز تلک رام نے میری ماں اور دو جوان بہنوں کو بھی تھانے بلا لیا۔ عورتوں کے بارے میں سب انسپکٹر تلک رام کی شہرت بہت بری تھی۔ میرے باپ کے سامنے اس نے میرے گھر کی عورتوں کو گندی گالیاں دیں اور فحش مذاق کئے۔ پھر وہ میری جوان بہنوں کے بارے میں شرمناک دھمکیاں دینے لگا۔ وہ میرا صابر باپ جو کئی روز کے تشدد کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اسے دل کا دورہ پڑا اور اس نے حوالات میں ہی جان دے دی۔ اپنے بے گناہ باپ کی حسرت ناک موت نے میرے دل میں جو محشر جگا دیے۔ میں قانون شکنی کے راستے پر چل نکلا۔ میری تمنا تھی کہ میں سب انسپکٹر تلک رام کو انجام تک پہنچاؤں لیکن اس تمنا کا پورا ہونا آسان نہیں تھا۔ میں کئی بار کامیابی کے قریب پہنچ کر ناکام ہوا۔ پھر یوں ہوا کہ میں "ہسٹری شیٹر" بن گیا۔ علاقے بھر کے تھانوں میں میری تصویر لگ گئی۔ میرے لئے پنجاب میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ میں پہلے کچھ عرصہ روپوش رہا پھر حیدر آباد آ گیا۔ یہاں میری ملاقات سردار سلجوق سے ہوئی اور میں اس کے ساتھ کام کرنے لگا۔ سب انسپکٹر تلک رام سے دور ہوا تو اس کے قتل کی خواہش بھی دم توڑنے لگی۔ میں کبھی کبھی بڑی مایوسی کی حالت میں سوچتا تھا شاید تلک رام کی زندگی سے پہلے میری اپنی زندگی کا سفر ختم ہو جائے گا یا پھر میں قانون کے ہتھے چڑھ کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤں گا۔ لیکن چند ماہ پہلے ایک روز مجھے یہ خبر ملی کہ بوٹا سنگھ نے سب انسپکٹر تلک رام کو قتل کر دیا ہے۔ یہ واقعہ فرید کوٹ سے کچھ دور ایک ویران ڈاک بنگلے کے تہ خانے میں ہوا تھا۔ بوٹا سنگھ نے سب انسپکٹر تلک رام پانڈے پر خنجر سے حملہ کیا تھا اور اس کے جسم پر درجنوں وار کر کے موقعے پر ہلاک کر دیا تھا۔ اس وقت میں نے بوٹا سنگھ پر آفرین بھیجی تھی اور مجھے یوں لگا تھا کہ مدتوں کے [illegible] اور قاتل سب انسپکٹر تلک رام کو قتل کر کے بوٹا سنگھ نے میری گردن سے ایک بہت بھاری بوجھ اتار پھینکا ہے.... اور مجھے یقین ہے کہ اور بھی بہت سے لوگوں نے میری ہی طرح سوچا ہوگا اور بوٹا سنگھ کے لئے لمبی عمر کی دعائیں کی ہوں گی۔"

میں نے نادر سے پوچھا۔ "سرنگ میں بوٹا سنگھ سے تمہاری

ملاقات کب ہوئی؟"

وہ بولا۔ "صرف آدھ پون گھنٹا پہلے جب ایک بندہ اسے پیشاب کرانے کے لئے کوٹھڑی سے باہر لایا تھا۔ بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بوٹا سنگھ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ جب وہ پیشاب خانے میں گھسا تو میں ساتھ والے پیشاب خانے میں گھس گیا اور اس سے باتیں کیں۔ میں نے بوٹا سنگھ کو بتایا کہ میری ڈیوٹی یہاں دہانے پر ہے۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائے۔ اس نے کہا خدمت یہی ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے۔ میں نے کہا 'اگر ایسی بات ہے تو آج کی رات اس کام کے لئے بہترین ہے کیونکہ سردار سنجون کے بہت سے ساتھی ڈیرے (سرنگ) میں موجود نہیں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ بوٹا سنگھ اتنی جلدی اپنے ارادے پر عمل کرے گا۔ پیشاب کرکے وہ واپس کوٹھڑی کی طرف گیا ہی تھا کہ دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے دہانے کی طرف آرہے ہیں۔ میں نے روکنے کے لئے ہوائی فائرنگ شروع کردی۔"

نادر کی بات سننے کے بعد مجھے پتا چل گیا کہ بوٹا سنگھ نے اچانک ہنگامے کا آغاز کیوں کردیا تھا۔ نادر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور نادر نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ بوٹا سنگھ نے سوچا تھا کہ اگر وہ کوٹھڑی میں بند ہوگیا تو پھر دشواری پیش آئے گی لہٰذا اس نے بند ہونے سے پہلے ہی کارروائی شروع کردی تھی۔ بدقسمتی سے دہانے تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے گولی لگ گئی اور اب معلوم نہیں وہ کہاں تھا۔ میں نے نادر سے پوچھا کہ اب اس کا کیا پروگرام ہے؟

وہ بولا۔ "میں تمہیں نالہ پار کرواؤں گا۔ پار کے گاؤں رکھ پور سے تمہارے لئے خچر یا گھوڑے کا انتظام کروں گا۔ اس کے بعد تم جہاں جی چاہے نکل جانا۔ میں واپس ڈیرے پر (سرنگ میں) پہنچ جاؤں گا۔ میں سردار کو بتادوں گا کہ میں نے بھاگنے والے شخص کا پیچھا کیا لیکن اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا ہوں۔ ابھی تک میرا ریکارڈ بے داغ ہے۔ امید ہے کہ سردار مجھ پر شک نہیں کرے گا۔"

ابھی نادر نے بمشکل فقرہ مکمل کیا تھا کہ کہیں بالکل قریب سے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ چند لوگ ہمارے بالکل نزدیک موجود ہیں۔ میرے اور نادر کے ہاتھ ایک ساتھ رائفلوں کی طرف بڑھے۔ پہلے نادر باہر نکلا۔ اس کے عقب میں میں تھا۔ مجھے اپنے دائیں بائیں درختوں میں بہت سی ٹارچیں ہلتی نظر آئیں۔ نادر نے سرسراتے لہجے میں کہا "بھاگو"

ہم آگے پیچھے ایک نالے کی طرف دوڑے۔ ہمارے دوڑتے ہی ٹارچوں کی روشنیاں متحرک ہوئیں اور بہت سی ملی جلی انسانی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی فائر شروع ہوگیا۔ یہ ماؤزر' آٹھ ایم ایم اور ایل ایم جی کی فائرنگ تھی۔ درختوں کی کثرت کے سبب ہم محفوظ رہے ورنہ پہلے ہی ہلے میں چند گولیاں ہماری ہڈی کرلیتیں۔ بھاگتے بھاگتے ہم نے بھی مڑکر دس پندرہ راؤنڈ فائر کئے۔ اچانک نادر کے منہ سے کراہ نکلی' وہ اوندھے منہ میرے قدموں میں گرا۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا تو اس کے سینے کی بائیں جانب ایک گہرا گھاؤ نظر آیا۔ گولی اس کی پشت میں لگی تھی اور گھاؤ سینے پر تھا۔ یعنی "موت" اس کا دل جگر چیرتی ہوئی سامنے نکل گئی تھی۔ یہ آٹھ ایم ایم ایسی ہی ظالم ہوتی ہے۔ مجھے کراچی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ دو طرفہ فائرنگ کے دوران ایک سالہ بچے نے پاپولر کے ایک درخت کے پیچھے پناہ لی۔ آٹھ ایم ایم کی گولی درخت اور بچے دونوں میں سے گزر گئی تھی۔ یہ گولی کھا کر نادر بھی ہر قسم کی امداد اور توجہ سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ میں نے اب جان بازو چھوڑا اور اکا دکا فائر کرتا ہوا نالے کی طرف بھاگا۔ واقعی تیزی پر تھا۔ کنارے سے پانی کا مدھم شور سنائی دیتا تھا۔ میں نے رائفل کے آخری راؤنڈ فائر کئے اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ سرد پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا میں تقریباً بیس گز آگے نکل آیا۔ سطح آب پر ابھر کر دیکھا۔ کنارے کے ساتھ ساتھ اور پانی پر ٹارچوں کے روشن دائرے حرکت کررہے تھے۔ رائفل اب بیکار ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ ایک بار پھر ڈبکی لگائی اور نیچے ہی نیچے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ غیرمعمولی کام تھا۔ تیرنے والے جانتے ہیں کہ پانی کے نیچے تیرنے کے لئے دونوں ہاتھوں کو آزادانہ حرکت دینا پڑتی ہے۔ لیکن میرے ہاتھ ہتھکڑی میں تھے۔ بہاؤ بھی تیز تھا۔ مجھے سخت مشکل پیش تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ میری قمیص کسی شے میں الجھ گئی۔ جھاڑی تھی یا زیر آب زمین میں پیوست تھی۔ میں نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ یہ بہت نازک لمحے تھے۔ میری سانس تقریباً ٹوٹ چکی تھی' ہاتھ پابند تھے۔ اب اس افتاد نے مجھے تقریباً نیم جان کردیا۔ یہی لمحے تھے جب مجھے چپوؤں کی چپ چپ سنائی دی۔ یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ کشتی والا بوڑھا ملنگ اس جانب آرہا ہے۔ میں نے سر پانی سے باہر نکالا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کشتی زیادہ دور نہیں تھی۔ "بابا جی" میں نے آواز دی۔ یہ آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ کنارے تک پہنچ سکتی۔ مدھم بھی نہیں تھی کہ ملنگ تک نہ پہنچ سکے۔ کشتی تیزی سے قریب آگئی۔ میں نے کشتی کا کنارہ تھاما۔ وہ بہاؤ کے رخ تھی لہٰذا اس کی حرکت میں طاقت تھی۔ یہ طاقت میرے استعمال میں آئی اور زیر آب جھاڑی سے میری قمیص چھوٹ گئی۔ یہ واقعہ اس مقام سے کافی فاصلے پر ہوا جہاں ٹارچیں حرکت کررہی تھیں۔ کشتی سوار بوڑھے نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ نہ میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ کشتی کھیتا ہوا کنارے تک

سوار نہیں ہوا تھا صرف اس کے سہارے تیر رہا تھا۔

کشتی کنارے پہنچی تو میں نے بغور کشتی سوار کی صورت دیکھی۔ وہ ساٹھ ستر برس کی عمر کا باریش شخص تھا۔ گلے میں بہت سی مالائیں تھیں۔ گھنگھروؤں والا لباس تھا۔ کہنے لگا "پتر کون ہو تم؟ اور یہ تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بزرگوار پردیسی ہوں۔ یہ لوگ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے گولیوں کی آواز سنی ہی ہوگی۔ انہوں نے میرے ایک ساتھی کو جان سے ماردیا ہے۔"

کشتی راں کچھ دیر خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ تاریکی کے سبب میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنی چادر میرے حوالے کی اور سرسراتی آواز میں بولا "یہ تمہارے لئے خطرناک جگہ ہے۔ جلدی سے نکل جاؤ۔ یہاں قریب ہی رکھ پور گاؤں ہے۔ وہاں پولیس چوکی بھی ہے۔"

"بہت بہتر بزرگوار۔۔۔ لیکن یہ چادر؟"

"ہاں۔ یہ رکھ لو۔ چادر بڑے کام کی چیز ہے پتر۔ بڑا پردہ ہوتا ہے اس میں۔ بس اب تم جاؤ یہاں سے۔"

کشتی راں نے کشتی بہاؤ کی طرف آگے بڑھا دی تھی۔ کسی الف لیلوی کردار کی طرح وہ جیسے اچانک نمودار ہوا تھا ویسے ہی آگے بڑھ گیا۔ میں بھی چادر کی بکل مارتا ہوا گھنے درختوں کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دور جاکر نجانے کیوں میرے قدم رک گئے۔ ایک عجیب سا خیال ذہن میں آیا تھا۔ جی چاہا کہ جاکر پھر کشتی والے کی صورت دیکھوں۔ کہیں یہ۔۔۔ کہیں وہ سائیں عالی تو نہیں تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنا خیال مضحکہ خیز محسوس ہوا۔ وہ سائیں عالی کی آواز نہیں تھی اور نہ ہی سائیں عالی کا قد کاٹھ تھا۔ پھر یہ شخص ایک مدت سے اس ویران نالے کے کنارے موجود تھا۔ یہ سائیں عالی کیونکر ہوسکتا تھا۔ درحقیقت سائیں عالی اپنے پُراسرار وجود سمیت میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ وہ میرے آس پاس موجود ہے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں میں ایک گاؤں کے نواح میں پہنچ گیا۔ یقیناً یہ رکھ پور تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس وقت یہاں سے کوئی سواری ملنا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی میری جیب خالی تھی۔ رہی سہی کسر ہتھکڑی نے پوری کردی تھی۔ لباس ایک نالے کے کنارے پانی میں نچڑا ہوا تھا۔ بالائی جسم پر ایک لمبی کھلی چادر اور کلائیوں میں پولیس کی ہتھکڑی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ گاؤں کی حدود میں جانے کی بجائے نیم پختہ راستے پر چلتا رہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی ٹریکٹر ٹرالی یا تانگہ بان کا گزر ہوتا اور وہ رحم کھا کر مجھے پختہ سڑک تک پہنچا دیتا۔ لیکن ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ مجھے سکھوں کے اثرورسوخ سے باخبر رہنا تھا۔ وہ میری تلاش میں تھے اور کسی بھی وقت مجھے بھانپ سکتے تھے۔ میں نہ صرف غیرمسلح تھا بلکہ ہتھکڑی میں تھا۔ ایسے میں یہ بات یقینی تھی کہ میں ان کے لئے تر نوالہ ثابت ہوں گا۔ (ترلقمہ اس لحاظ سے بھی کہ میں سرتاپا بھیگا ہوا تھا) میں نیم پختہ راستے پر چلنے کی بجائے درختوں میں چلنے لگا' تاہم میری نگاہ راستے پر ہی رہی۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں دو تانگہ بان' ایک ریڑھا بان اور دو ٹریکٹر ٹرالی والے مجھے ملے لیکن میرے مشکوک حلیے کے سبب کسی سے بھی لفٹ لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اتنے میں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہیڈ لائٹس کے ہچکولوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی لگژری ٹائپ لمبی چوڑی کار ہے۔ جہاں ریڑھا بانوں سے لفٹ نہیں مل رہی تھی وہاں لگژری کار والا مجھے کب قابل توجہ جانتا۔ بہرطور قسمت آزمانے کے لئے میں نے راستے پر آکر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں کے لئے میں گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں نہایا' پھر گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور وہ رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے بغور مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے حیدرآبادی لہجے میں پوچھا۔

میں نے لجاجت سے کہا "پکی سڑک تک لفٹ چاہئے۔"

حیران کن طور پر اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میرے گیلے کپڑے اب جسم کی حرارت سے تقریباً خشک ہوچکے تھے' پھر بھی شاندار نشست پر بیٹھتے ہوئے احساس ہوا کہ میں نشست کا ستیاناس کررہا ہوں۔ بہرحال یہ میرے سوچنے کی نہیں کار والے کے سوچنے کی بات تھی۔ گاڑی ایک فرحت بخش جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ۹۲ ماڈل کی شیورلیٹ تھی۔ انڈیا میں ایسی گاڑیاں کم کم ہی نظر آتی ہیں اور جن لوگوں کے پاس ہوتی ہیں وہ امیر کبیر سمجھے جاتے ہیں۔

"کہاں جارہے ہو بھئی؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نہ تو بہت پڑھا لکھا ہے اور نہ ہی کوئی ذہین فطین قسم کا شخص ہے۔ سچ کہتے ہیں گفتگو شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ بندہ جب تک چپ رہتا ہے اس کی ہر نادانی اور کجی خاموشی کے پردے میں چھپی رہتی ہے۔ بولنے والے کے صرف ایک فقرے نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ خوش پوش ہونے کے باوجود اس کار کا مالک نہیں بلکہ ڈرائیور قسم کی کوئی شے ہے۔ اگلے چند منٹ میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ کون ہو تم اور اتنی رات گئے اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟" اس شخص نے پھر دریافت کیا۔

میں نے کہا۔ "یہاں قریب کے گاؤں رکھ پور میں رہتا ہوں جی۔ کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ میری گھروالی بچہ جننے کے لئے حیدرآباد اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ ابھی عشاء کے وقت ایک بندے نے اطلاع دی ہے کہ وہ سخت بیمار ہے۔ اسی کو دیکھنے نکلا ہوں۔"

"بیوی سے بہت محبت کرتے ہو" اس نے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا "ارے شکل کر باتاں کرے بارا میں کوئی سیٹھ دیکھو نہیں ہوں۔ تمہارے ایچ طرح کا سیدھا سادا مزدور ہوں۔

ڈرائیور رہوں اس گاڑی کا۔ شاہ محمد نام ہے میرا"
میں نے ذرا شرماتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ پہلا پہلا بچہ ہے نا' اس لئے بہت فکر ہے۔"
"بچے کی یا بچے کی ماں کی۔"
"دونوں کی۔"
وہ بولا "مجھے بھی بیوی سے بہت پیار ہے۔ تمہیں تو پھر سال دو سال ہو چکا ہوگا' مجھے تو بس تین دن ہوا ہے شوہر بنے ہوئے۔ آج ہماری شادی کی تیسری رات ہے۔ چھوٹا سا گھر ہے۔ پہلی دو راتیں تو مہمانوں نے کچھ کرنے نہیں دیا۔ آج پکا پروگرام تھا کہ شوہر ہونے کا حق (حق) استعمال کروں گا لیکن آج حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ ہو گیا۔ میرے صاحب نے حکم دیا کہ آج تم گھر نہیں جاؤ گے۔ میرے ساتھ ایک مریض کو دیکھنے جاؤ گے۔"
"تمہارا صاحب ڈاکٹر ہے؟"
"ہاں یار! ڈاکٹر ہونا ایک مصیبت ہے اور ڈاکٹر کا نوکر ہونا اس سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ دن رات کسی بھی وقت چین نہیں ہے۔ شام آٹھ بجے کلینک بند ہو رہا تھا کہ فون آگیا۔ ڈاکٹر صارخ (صادق) صاحب مجھے لے کر فوراً مریض کی طرف روانہ ہو گئے۔ ریک نالے کے اس پار یہاں سے دس بارہ میل دور نواب شہریار کی حویلی ہے۔ علاقے کا بڑا مشہور قریبی ہے۔ شاید تم بھی جانتے ہو گے۔ دو دن پہلے اس کی نواسی ہو قتل ہوئی ہے اور نوجوان بیٹی غائب ہے۔ تمہیں پتا ہے اس واقعے (واقعہ) کا؟" میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا اور کوشش کی کہ چہرے پر کوئی تاثر ابھرنے نہ پائے۔ ڈرائیور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "خیر۔ لمبا قصہ ہے۔ جب سے یہ حادثہ ہوا ہے نواب صاحب کی بیگم کو مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صارخ صاحب کو اسی لئے حویلی بلایا گیا تھا۔ وہ ساڑھے نو بجے سے مریضہ کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب انہوں نے مجھے ایک انجکشن لانے کے لئے شہر دوڑا دیا ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے سے کم کا سفر نہیں ہو گا۔ قریباً پون گھنٹا انجکشن ڈھونڈنے میں لگے گا' ڈیڑھ گھنٹا واپسی میں۔ میری تیسری رات بھی برابر ہو جائے گی۔ خیر جو اللہ کو منظور۔ بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ انتظار میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔"
میں نے دیکھا شاہ محمد کے ہاتھوں پر مہندی رچی تھی اور ایک انگلی میں شادی کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ وہ ایک زندہ دل نوجوان تھا۔ اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنی رات گئے اپنی کار روک کر اور مجھ خستہ حال کو گاڑی میں لفٹ دیتا۔ اس نے ایسا کر کے جہاں اپنی سادگی کا ثبوت دیا تھا وہاں یہ بھی ثابت کیا تھا کہ وہ ایک خوش اطوار اور درد مند شخص تھا۔ اس نے بے خبری میں مجھے ایک نہایت اہم اطلاع بھی فراہم کی تھی۔ پرسوں سے میں کئی مرتبہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ چکا تھا جسے سلجوق نے جیپ سے کو سڑک پر پھینکا تھا اور اس کے ساتھی نے اسے گولی ماری تھی کم از کم گولیاں اس کے پیٹ میں لگی تھیں۔ مجھے امید نہیں وہ بچ جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے شہریار کی حویلی دیکھی۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ نواب شہریار بیمار نظر آ رہا تھا۔ باوقار چہرے والی بیگم حضور پچھاڑیں کھا رہی تھی اور اس سارے فساد کی جڑ چھوٹا نواب فیروز جنگ میں غرق ہو کر ان صدموں کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی نے کہا ہے 'ہر فرعون را موسیٰ' فیروز جنگ نے بھی فرعونیت کی تھی۔ مکافات عمل کے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک موسیٰ اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ میں اور شاہ محمد ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے شیو رلیٹ جھکولے کھاتی پختہ سڑک پر پہنچی اور حیدر آباد کی طرف رواں ہو گئی۔ شاہ محمد نے گاڑی کا ڈیک آن کر دیا۔ فلموں کے گانے بجنے لگے۔ جب یہ گانا لگا۔ "دو ستاروں کا ہے ملن آج کی رات" تو شاہ محمد کے چہرے پر ایک انجانی مسکان پھیل گئی۔ وہ اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ مار مار کر گانے میں اپنی خوشی ظاہر کرنے لگا۔ میں نے سوچا یہ سادہ لوح شخص کیا جانتا ہے کہ اس نے مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے کر کن حادثوں کو دعوت دی ہے۔ غلطی میری تھی یا اس کی۔ بہرحال اس وقت یہ ہنستا مسکراتا نوجوان بھی میرے ساتھ ساتھ موت کی زد میں تھا۔ جی چاہا ایک دم اسے گاڑی سے اتر جاؤں۔ اسے بتا دوں کہ میں اس تاریک رات کا آفت نصیب مارا ہوں جس کی قربت میں جا کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کی حسین زندگی پر اپنا سایہ بھی ڈالوں۔ لیکن یہ خواہش عمل کا روپ نہ دھار سکی۔ یہ گاڑی میرے لئے اس وقت ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں نے سوچا کہ حیدر آباد کی حدود میں داخل ہوتے ہی شاہ محمد کو سب کچھ بتا دوں گا۔ اس سے کہہ دوں گا کہ نواب کی مفرور بیٹی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لہٰذا وہ انجکشن لے کر فوراً واپس حویلی پہنچے تاکہ لڑکی کو چھڑانے کا انتظام کیا جا سکے۔
ہم شہر میں داخل ہوئے تو رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ سینماؤں کے آخری شو ختم ہوئے تھے لہٰذا سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ہماری گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی تو میں ایک کار دیکھ کر چونک گیا۔ یہ کار ہمارے پندرہ بیس منٹ ساتھ ساتھ چلی ہوئی تھی۔ دونوں گاڑیاں رک گئی تھیں لہٰذا میں نے دوسری کار میں جھانکا۔ اس میں تین افراد بیٹھے تھے اور انہوں نے چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں۔ میری چھٹی حس جو پیچھے سے تشویش میں مبتلا تھی اچانک ایک خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ یہ تینوں لوگ میرے اردگرد موجود تھے۔ میں ان کی نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ ابھی تک وہ دوسرا کار نظر آئی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے یقین ہونے لگا

اور لوگ بھی آس پاس ہیں۔ یہ کون ہو سکتے تھے۔ پچانوے فیصد امکان تھا کہ وہ سلجوق اور اس کے کارندے ہوں گے۔ بہرحال دیگر امکانات بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہ پولیس کے سادہ پوش بھی ہو سکتے تھے۔ نواب شہریار کے کارندے بھی ہو سکتے تھے۔ شیخ ہاشم بن ارشد کے ہرکارے بھی ہو سکتے تھے اور ان تمام گروہوں میں سے کوئی گروہ بھی ہو سکتا تھا جو گمشدہ ٹرک کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے..... مگر ایک بات اور میرے ذہن میں آئی۔ ہمیں لاڑ سے حیدر آباد آئے اب قریباً تین گھنٹے ہو چلے تھے۔ ابھی تک ہم تجنئی کور اور مسٹری کلارک کے ساتھ رابطہ کر سکے تھے اور نہ نوادرات کے حوالے سے انہیں کوئی رپورٹ دے سکے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ ہمارا انتظار کر کر کے بالآخر وہ لوگ خود ہی یہاں پہنچ چکے ہوں۔
میں نے عقب نما آئینے میں اس خوش رو اور سادہ دل نوجوان کو دیکھا جس نے مجھے اس کار میں لفٹ دی تھی اور نادانستگی میں ان گنت خطرات مول لے لئے تھے۔ یہ ارمانوں بھرے دل والا نوجوان موت کا نہیں زندگی کا حق دار تھا۔ آج اس کی شادی کی تیسری رات تھی اور اس کی دلہن اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگلے چوراہے پر مجھے اتار دینا۔"
اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ "لیکن میاں! تم تو کہتے تھے بڑے ڈاک خانے پر اترنا ہے؟"
"بس اب ارادہ بدل رہا ہے۔ یہاں میرا سالا پٹرول پمپ پر کام کرتا ہے اسے ساتھ لینا چاہوں گا۔"
"جیسے تمہاری مرضی" شاہ محمد نے کہا اور چوراہے پر گاڑی روک دی۔ "اچھا میاں' خدا حافظ" اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
چادر کے نیچے میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی میں تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے ہاتھ آگے بڑھائے لیکن پھر بھی ہتھکڑی کھنک گئی۔ مصافحہ کر کے شاہ محمد نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوف کے تاثرات ابھر رہے تھے۔ غالباً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں گاڑی سے اتر چکا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر میں سڑک پار کر گیا۔
یہ شہر کا ایک بارونق علاقہ تھا۔ سڑک پر ابھی تک ٹریفک رواں تھا۔ اکا دکا دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے تیز رفتاری سے سڑک پار کی اور ایک نیم تاریک تنگ گلی میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا پیچھا کرنے والے گاڑیوں پر سوار ہیں لہٰذا تنگ گلیوں میں میرے پیچھے آنا ان کے لئے دشوار ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانات تھے۔ کہیں کہیں کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی اور ٹیلی ویژن چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دو مقامات پر پان سگریٹ اور دودھ دہی کی دکانیں بھی کھلی نظر آئیں۔ میں نے سوچا کہ اگر تعاقب کرنے والوں کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا تو ایک ٹیکسی پکڑوں گا اور سیدھا نواب شہریار کی حویلی کا رخ کروں گا۔ بے شک نواب شہریار نے ہمارے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا اور وہ اب بھی دو اچھا آدمی ثابت نہیں ہوا تھا لیکن یہ ایک لڑکی کی زندگی کا معاملہ تھا۔ اسے موت کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کرنا میرا فرض تھا' اس فرض کی خاطر ہو تا تنگ سے بھی کوئی کمائی تھی اور اس کے شناسا بلور علی نے جان سے ہاتھ دھوئے تھے۔ بلور علی کی سینہ زگار لاش کا منظر ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی چند لمحے پہلے میں نے اس کا بے جان بازو اپنے ہاتھوں سے چھوڑا ہے اور اس پر آخری نگاہ ڈالی ہے۔
موجودہ صورت حال میں میرا کام صرف اتنا تھا کہ نواب شہریار کو سلجوق کے خفیہ ٹھکانے سے آگاہ کر دوں۔ اس کے بعد شاہین کو سلجوق سے رہائی دلانا نواب شہریار کا کام تھا۔ اور اس جیسے با حیثیت شخص کے لئے کوئی کام بھی ناممکن نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ طاقت کے استعمال سے بیٹی کو چھڑا لیتا۔ دوسری صورت میں وہ بیٹی کی زندگی کے لئے تاوان بھی ادا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری صورت بھی نکل سکتی تھی۔
شیطان کی آنت جیسی ایک طویل گلی سے کئی شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں ایک نیم تاریک شاخ میں داخل ہو گیا۔ اس گلی کے آخری سرے پر مجھے تیز رفتار روشنیاں نظر آتی تھیں۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ گلی کا اختتام کسی سڑک پر ہو گا۔ لیکن ابھی میں بیس قدم ہی گیا ہوں گا کہ سنگین صورت حال کے اشارے ملنے لگے۔ دو سائے لپکتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے۔ ان کے عقب سے کسی نے پکار کر کچھ کہا۔ سائے ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے پھر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ میں نے ایک گھر کی چار دیواری پھاندی اور صحن میں اتر گیا۔ گیراج میں گھومتا ہوا چھوٹا سا روسی کتا حق نمک ادا کرنے کے لئے مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بے رحمی سے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی' وہ کئی قلابازیاں کھا کر ایک کیاری میں گرا اور جارحانہ انداز ترک کر کے رفاعی انداز میں بھونکنے لگا۔ میں نے چھوٹا سا صحن برق رفتاری سے پار کیا اور دوسری جانب کی دیوار پھاند کر نکل گیا۔ قریباً پندرہ فٹ چوڑی گلی میرے سامنے تھی۔ میں تیزی سے بھاگتا چلا گیا۔ سو ڈیڑھ سو گز آگے گلی بند ہو گئی۔ یہاں شامیانے لگے تھے اور قنات کی دوسری جانب تیز دودھیا روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ٹھٹک کر عقب میں دیکھا۔ گلی خالی نہیں تھی۔ ایک شخص دوڑتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے بھی چند افراد ہوں گے۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ قنات کی ایک جانب مختصر راستہ موجود تھا۔ میں یہاں سے گزر کر شامیانے کے اندر چلا گیا۔ شامیانے میں زبردست

محفل جمی ہوئی تھی۔ یہاں کم و بیش تین درجن گیس لالٹینیں لگی تھیں۔ ان لالٹینوں کی روشنی میں ڈیڑھ دو سو افراد کرسیوں پر براجمان تھے۔ سامنے ایک کشادہ و سیع تھا اسٹیج پر کرسیوں کی بجائے دو تین قالین بچھے تھے۔ ان قالینوں پر گاؤ تکیے رکھے تھے اور چند خوش پوش حضرات ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی مشاعرہ برپا ہے۔ یہ کوئی معمولی مشاعرہ نہیں تھا۔ سامعین کی اگلی صف میں پولیس کے دو اعلیٰ افسران موجود تھے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں وہاں مسلح پولیس مین کھڑے نظر آتے۔ ان انتظامات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی منسٹر یا چیف منسٹر قسم کی "ہستی" بھی یہاں موجود ہے۔ میں نے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر پنڈال کا جائزہ لیا اور پھر ایک خالی کرسی دیکھ کر بیٹھ گیا۔ کشنی راج ملک کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا "پرجی! چادر میں بڑا پردہ ہوتا ہے" واقعی چادر میرا پردہ بنی ہوئی تھی۔ نالے کے اندر شاخوں سے الجھنے کے سبب میری قمیص کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ گردن پر تازہ خراشوں کے نشان تھے۔ ہاتھ بھی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ سارے عیب چادر نے ڈھانپ لئے تھے اور میں معزز سامعین کے ساتھ بیٹھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ مشاعرے کی شمع ایک دھان پان شاعر کے سامنے تھی اور وہ بڑے پرسوز ترنم میں اپنی غزل سنا رہا تھا۔ اس شاعر کو دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد کا کردار مرزا ظاہر دار بیگ یاد آگیا۔ مرزا ظاہر دار کی طرح یہ شاعر بھی انگرکھا پہنے ہوئے تھا۔ سر پر کامدار ٹوپی تھی۔ ریشمی کپڑے کا چوڑی دار پاجامہ دودھیا روشنی میں جھلمل کر رہا تھا۔ وہ بڑے پُرتکلف انداز میں پڑھ رہا تھا۔ سامعین مصرعے اٹھا رہے تھے اور خود بھی اچھل اچھل کر داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔

میں کن انکھیوں سے پنڈال کے اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے میں داخل ہوا تھا۔ بمشکل تین چار منٹ گزرے ہوں گے کہ خطرناک صورتوں والے تین بچے کھچے افراد پنڈال میں چلے آئے۔ ان میں سے دو وہی تھے جنہیں میں نے اس سے پہلے ڈاٹسن کار میں دیکھا تھا۔ وہ میری ہی طرح چادروں کی بکل مارے ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نے چادر کے نیچے اپنی خستہ حالی اور ہتھکڑی چھپا رکھی تھی۔ جب کہ انہوں نے تفنگ چھپا رکھے تھے۔ چادر پوشوں کے ساتھ جو تیسرا شخص اندر داخل ہوا تھا اس کے سر پر ٹوپی تھی اور ایک بڑے مفلر نما کپڑے سے اس نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا ایک پہلو کچھ بھاری نظر آرہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی قمیص کے نیچے پستول ریوالور وغیرہ موجود ہے۔ میں نے اس شخص کے لباس پر غور کیا اور مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ یہ شخص سلجوق ہے۔ فاصلہ زیادہ تھا میں پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن قد کاٹھ لباس اور انداز سلجوق ہی کا تھا۔ ایک دم ہی مجھے فضا میں دشمنی اور خونخواری کی بو محسوس ہونے لگی۔ پنڈال میں داخل ہونے والے تینوں افراد نے سب سے پچھلی قطار میں کرسیاں سنبھالیں اور بظاہر مشاعرہ سننے میں مصروف ہو گئے۔ ممکن ہے کہ وہ دوسرے سامعین کی طرح داد وغیرہ بھی دے رہے ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کتنے باذوق اور سخن شناس ہیں۔ ان کا ذوق قتل و غارت اور سخن فہمی گالی گلوچ تک محدود تھی۔ اگر وہ اب تک مجھ سے دور تھے تو اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ پنڈال میں مسلح پولیس موجود تھی۔ وہ مجھ پر ہاتھ ڈال کر خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جب تک مشاعرہ چلتا رہے گا میں محفوظ رہوں گا۔ لیکن مشاعرے کو کب تک چلنا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مشکل سے تین شاعر باقی ہوں گے۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ترنم سے پڑھنے والے شاعر نے اپنا کلام ختم کیا تو اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دینے والے شاعر نے اعلان کیا "خواتین و حضرات! اب میں اس محفلِ مشاعرہ کے صدر اردو کے بے حد محترم شاعر جناب قاسم بیدل کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور ہمیں اپنے کلام سے نوازیں۔"

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں جانتا تھا کہ مشاعرہ کے صاحبِ صدر کو سب سے آخر میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ محفل اب اختتام کے قریب ہے۔ شمع اب ایک گول مٹول بزرگ شاعر کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ انہوں نے آنکھوں پر عینک جما کر ایک طویل غزل شروع کی۔ غزل کتنی بھی طویل تھی بہرحال غزل تھی۔ آخر اسے ختم ہونا تھا۔ میں خود کو ایک بار پھر بھاگ دوڑ کے لئے تیار کرنے لگا۔ اچانک میں نے اسٹیج پر ایک شخص کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک ہی لمحے میں ساری توانائی سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔ یہ شخص بزرگ شاعر کو پانی پلانے اسٹیج پر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریشمی رومال سے ڈھکا ہوا گلاس تھا۔ میں اس شخص کو یہاں اور اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عبداللہ تھا۔ نواب شہریار کا منشی اور جمیلہ کا باپ۔ آج سے نو دس روز پہلے وہ [illegible] سے حویلی چھوڑ گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں [illegible] عبداللہ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ اگر عبداللہ یہاں موجود ہے تو جمیلہ بھی کہیں ہو گی۔ ان باپ بیٹی کے لئے ہی سلجوق نے نواب کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔ یک بیک میرے ذہن میں آیا کہ نواب شہریار کے پاس جانے کی بجائے میں کیوں نہ عبداللہ اور جمیلہ سے رابطہ کروں۔ موجودہ صورت حال سے نکالنے میں وہ نواب شہریار سے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب [illegible] بخشوانے میں بھی میں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ کچھ بھی تھا بہرحال جمیلہ ایک عورت تھی۔ وہ کبھی یہ برداشت نہ کرتی کہ اس کے بدلے ایک اور لڑکی کی آبرو لوٹی جائے یا اسے زندگی سے محروم کیا جائے۔ میں نے غور کیا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا یہ فیصلہ درست ثابت ہوگا۔ جونہی عبداللہ گول مٹول بزرگ شاعر

کو پانی پلا کر اسٹیج سے نیچے اترا میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ عبداللہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"تت... تم یہاں" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میں تمہارے ہر سوال کا جواب تفصیل سے دوں گا۔ اس وقت میں خطرے میں ہوں۔ تم سے ایک بہت ضروری سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا میں امید کروں کہ تم اس سوال کا درست جواب دو گے۔"

عبداللہ بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ نہ جائے۔ میں نے اسے بازو سے تھام لیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "تم سلجوق نام کے کسی شخص کو جانتے ہو۔"

"سل... سلجوق" کوئی گولا سا عبداللہ کے حلق میں اٹک گیا اور اس کی آنکھیں حیرت کے سبب کچھ کھل گئیں۔

میں نے کہا۔ "ہاں' سلجوق' میں اس کے بارے میں تمہیں ایک نہایت اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"کیسی اطلاع؟"

"سلجوق یہاں موجود ہے۔"

عبداللہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے بازو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ مناسب نہیں کہ ہم یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہیں۔"

عبداللہ نے چند لمحے کشمکش میں گزارے' پھر آہستگی سے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ"

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے پنڈال سے نکلے۔ ہمارے حرکت میں آتے ہی دونوں چادر پوش اپنے ساتھی سمیت اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں عبداللہ کے ساتھ چلتا ایک وسیع احاطے میں پہنچا۔ یہاں محفل مشاعرہ میں شرکت کے لئے آنے والوں کی بہت سی گاڑیاں' موٹر سائیکلیں وغیرہ کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک جیپ کسی وفاقی وزیر کی تھی۔ جیپ پر جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس کے قریب مسلح پولیس والے موجود تھے۔ ہم ایک گلی میں داخل ہوئے۔ عبداللہ نے ایک بند دروازے پر دستک دی۔ دوسری' تیسری دستک پر دروازہ کھلا اور میں نے جمیلہ کو اپنے سامنے پایا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی سخت حیران ہوئی۔ اگر اس کا باپ ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً وہ دروازہ بند کر لیتی۔ عبداللہ مجھے لیتا ہوا اندر آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خستہ حال مکان تھا۔ مختصر صحن' دو کمرے اور بالکونی' جمیلہ کی ماں برآمدے میں چارپائی پر سو رہی تھی۔ جمیلہ بھی غالباً نیند ہی سے بیدار ہوئی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال منتشر تھے۔ دوپٹہ زمین پر گھسٹ رہا تھا اور پاؤں ننگے تھے۔ اپنی خوبصورت حیدر آبادی چوڑیوں کے بغیر اس کے کان سونے سونے لگ رہے تھے اور وہ بھی ادھوری سی محسوس ہوتی تھی۔

ابھی ہم بمشکل برآمدے تک ہی پہنچے تھے کہ دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ جمیلہ اور عبداللہ نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر عبداللہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی مفلر پوش شخص کھڑا تھا۔ اب مفلر اس کے چہرے سے سرکا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا' وہ سلجوق تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ مجھ پر جھپٹا' اس نے قمیص کے نیچے سے سیاہ نال کا خوفناک ریوالور نکال لیا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ میں نے تیزی سے حرکت کر کے اس کا پستول والا بازو تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی گھٹنے کی بھرپور ضرب اس کی ناف میں لگائی۔ وہ ایک سخت جان شخص ثابت ہوا۔ شدید بھاؤ دینے والی چوٹ کھا کر بھی اس نے میرے سینے میں ٹکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دوسری ضرب بھی پہلے والے مقام پر لگائی۔ اس مرتبہ وہ تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ میں نے بازو مروڑ کر اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا اور اپنا بایاں پاؤں اس کے کندھے کے جوڑ پر رکھ دیا۔ یہ ایک کارگر داؤ تھا۔ اب اگر سلجوق ذرا بھی ہلنے کی کوشش کرتا تو اس کا کندھا اکھڑ سکتا تھا۔ جمیلہ چیخ کر اندر بھاگ گئی تھی۔ عبداللہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ سلجوق جیسا شخص یوں آناً فاناً میرے ہاتھوں زیر ہو جائے گا۔

بیرونی دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ یکایک ایک تنومند شخص تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا اور مجھ پر جھپٹا۔ عبداللہ سکتے کی کیفیت سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ "نفیسو" وہ پکار کر بولا۔ "کیا کر رہے ہو تم لوگ... کیوں تُلے ہوئے ہو اس پر؟"

اس نے حملہ آور کے چہرے پر ایک زناٹے کا تھپڑ مارا اور اسے دھکیل کر پیچھے لے گیا۔ دوسری طرف میں نے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہونے کے باوجود سلجوق کو بے بس کر رکھا تھا۔ عبداللہ تنومند چادر پوش کو پیچھے ہٹا کر ہم دونوں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے فرش پر گرا ہوا پستول اٹھایا اور اسے جمیلہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ سلجوق کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ میرے داؤ میں پھنس کر سلجوق بے بس ہو چکا ہے تو میں نے اس کا بازو آزاد کر کے پاؤں ہٹا لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ سلجوق اٹھ کھڑا ہوا اور خونخوار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ تاہم اس نے مجھ پر دوبارہ جھپٹنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں غضب کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی حیرت بھی نظر آ رہی ہے۔

عبداللہ نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو سلجوق۔ کیا جھگڑا ہے تم دونوں میں۔"

سلجوق غرایا۔ "جھگڑا بھی بتا دوں گا۔ پہلے اس کا دماغ درست کر لوں۔" وہ اسی انداز میں پھر میری طرف بڑھا۔ عبداللہ ہم دونوں کے درمیان آ گیا۔ اتنے میں اندر سے جمیلہ کی آواز آئی۔

"بابا! سلجوق بھائی کو اندر لے آئیں۔"

جمیلہ کی آواز سن کر سلجوق کو جھٹکا سا لگا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔ ایک عجیب سا رنگ لہرا گیا تھا اس کے چہرے پر۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے تنے ہوئے رگ پٹھے ایک دم ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ جمیلہ کمرے کے اندر تھی اور کھڑکی میں کھڑی تھی۔ سلجوق خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں لگا کہ ایک خون آشام ڈاکو پس منظر میں چلا گیا ہے اور اس کے اندر سویا ہوا ایک نرم خو بھلا مانس نوجوان بیدار ہو کر سامنے آگیا ہے۔ عبداللہ نے سلجوق کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد اس نے مجھے بھی اندر بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو سلجوق چارپائی پر بیٹھا تھا۔ فرش پر اوندھے منہ گرنے سے اس کی ٹھوڑی زخمی ہوئی تھی۔ خون روکنے کے لئے وہ بار بار اپنے مفلر کا پلو ٹھوڑی پر دبا رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ جمیلہ کے سامنے وہ بہت بے بس نظر آ رہا ہے۔

جمیلہ نے مجھ سے کہا۔ "شاہ جہاں بھائی! میرا تو سر چکرا رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ آپ دونوں یہاں کیسے پہنچے اور کیوں اس طرح لڑ جھگڑ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "بہتر ہے کہ تم یہ سوال سلجوق سے پوچھو۔"

سلجوق زہریلے لہجے میں بولا۔ "یہ شخص میرے دو کارندوں کو زخمی کر کے بھاگا ہے۔ تیسرا لاپتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور جو بندے زخمی ہوئے ہیں وہ اپنی کارستانی کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ انہیں کیا حق تھا ہمیں باندھ کر رکھنے کا۔"

"کس نے باندھ رکھا تھا تمہیں؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"یہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے باندھنے والا۔" میں نے سلجوق کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے پوچھیں کہ کیا قصور تھا ہمارا۔"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نواب شہریار کے کارندے ہو۔ تم ہرکارے ہو اس شیطان کے۔ میرے ہاتھوں کوئی نہیں بچے گا۔ نہ نواب نہ اس کا کوئی کارندہ۔"

میں نے کہا۔ "تم بات کو پلٹ رہے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نواب کے کارندے نہیں اس کے قیدی تھے۔ جس طرح نواب تمہارا دشمن ہے اسی طرح ہمارا بھی ہے۔ میرے تمہارے جھگڑے کی وجہ کوئی اور ہے اور تم وہ وجہ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں وجہ چھپانے کی اور نہ میں کسی سے ڈرتا ہوں۔" سلجوق نے تیوری چڑھا کر کہا۔ پھر وہ عبداللہ سے مخاطب ہوا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "چاچا میں نے تیری اور جمیلہ کی بے عزتی کا بدلہ نواب شہریار سے لے لیا ہے۔ نواب کی بیٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

عبداللہ اور جمیلہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ "یہ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟" جمیلہ لرزاں آواز میں بولی۔

"ہاں، میں نے اغوا کیا ہے اس کی بیٹی کو اور ڈنکے کی چوٹ کیا ہے۔۔۔۔" پھر سلجوق نے یہ سارا واقعہ عبداللہ اور جمیلہ کے گوش گزار کر دیا۔ وہ دونوں تعجب سے سنتے رہے۔ میں نے یہ بتا کر ان کے تعجب میں اضافہ کر دیا کہ سلجوق کی فائرنگ سے زخمی ہونے والی لڑکی اسپتال میں چل بسی ہے۔ سلجوق نے یہ بات سن کر کسی رنج کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم وہ اس خبر سے آگاہ تھا۔

جمیلہ اٹھ کر باہر جا چکی تھی۔ بوڑھے عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ سلجوق کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا "نہیں بیٹا ہمیں کسی سے بدلہ نہیں لینا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ تم ہماری خاطر کام کر کے ہمیں اور رسوا نہ کرو۔ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔ ابھی اسی وقت چھوڑ دو اسے۔"

"نہیں چاچا" سلجوق نے فیصلہ کن انداز میں انکار کیا "نواب نے تمہاری عزت کا جنازہ اٹھایا ہے۔ میں اس کی عزت کا جنازہ اٹھا کے چھوڑوں گا۔ میں نے بہت بڑی قسم کھا رکھی ہے۔ نواب سے بدلہ لئے بغیر نہیں رہوں گا۔"

عبداللہ نے کہا۔ "بیٹا! پھر ہم میں اور ان بے رحم درندوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ایسا مت کرو۔ بلکہ ایسا سوچو بھی مت۔ ایک شریف ماں کے بیٹے ہو۔ تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔۔۔ سوچو اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہ تمہیں اس کے بارے میں کیا مشورہ دیتی؟"

"مجھے باتوں میں مت الجھا چاچا۔" سلجوق بے حد بیزاری سے بولا۔ "میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ پتھر کی لکیر ہے۔ اگر میں مر گیا تو اور بات ہے۔ ورنہ وہی کروں گا جو سوچ چکا ہوں۔"

"تو پھر ہمارا تمہارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔" عبداللہ بھڑک کر بولا۔ "تو ہمارے لئے مر چکا اور ہم تیرے لئے۔ اور یاد رکھ اگر عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا تو تیرے خلاف سب سے پہلے گواہی میں دوں گا۔"

"جو تیرے جی میں آئے کرنا چاچا۔" سلجوق نے کہا اور چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور جمیلہ پھر اندر آ گئی۔ اب اس نے سر پر موٹی اوڑھنی رکھ لی تھی۔ باہر میں بھی بولی آ رہی تھی۔ تاہم وہ دروازے سے ہماری ساری گفتگو سنتی رہی تھی۔ سلجوق کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "سلجوق بھائی مت کرو ایسا۔ ہماری مشکلوں کو اور مت بڑھاؤ۔ رحم کرو ہمارے حال پر۔" جمیلہ کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

اس آواز نے سلجوق پر وہی اثر کیا جو بھڑکتے شعلوں پر پانی پھوار کرتی ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ جیسے ذہن سے قوت فیصلہ اور ٹانگوں سے توانائی رخصت

ہو۔ میں نے دیکھا جمیلہ کا سر جھکا ہوا تھا اور رخساروں پر آنسو پھسل رہے تھے۔ سلجوق نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ اسے نرم پڑتا دیکھ کر عبداللہ نے اس کا بازو تھام لیا اور روتے ہوئے بولا۔ "میری سفید داڑھی کی شرم رکھ لو بیٹا۔۔۔ نوابوں کو جتنی سزا مل چکی اتنی ہی کافی ہے، اب اس بے گناہ لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سلجوق تم ایک بہادر شخص ہو، اور بہادر کمزور عورتوں سے بدلے نہیں لیتے۔ تم کھلے میدان میں نواب کو للکارو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا اور بہت سے دوسرے لوگ تمہارا ساتھ دیں گے۔"

سلجوق تڑخ کر بولا "تمہیں کچھ پتا نہیں، تم اس معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ جس لڑکی کو تم بے گناہ اور بے قصور کہہ رہے ہو وہ اس جرم میں پوری طرح ملوث ہے۔۔۔۔ میری بات پر یقین نہیں تو جمیلہ سے پوچھ کر دیکھ لو۔ وہ لڑکی اپنے بھائی کی ہر حرکت سے واقف تھی۔ بلکہ وہ اپنے بھائی کے خط جمیلہ تک پہنچاتی رہی ہے اور اس کے پیغام لے کر آتی رہی ہے۔ پوچھ لو جمیلہ سے۔ وہ جمیلہ کو اپنی سہیلی کہنے لگی تھی۔ اور جب بھائی نے سہیلی سے ایسا شرمناک دھوکا کیا تو وہ چپ چاپ تماشا دیکھتی رہی۔ ان رئیس لوگوں کے لئے ہماری عزت دو کوڑی کی نہیں ہوتی۔ کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں ہم ان کی نظروں میں۔۔۔"

عبداللہ نے کھینچ تان کر سلجوق کو دوبارہ چارپائی پر بٹھا دیا اور جمیلہ سے بولا کہ وہ چائے تیار کرے۔ سلجوق کے جذبات واقعی بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ وہ جس قدر غصے کا اظہار کر رہا تھا اس سے پچاس گنا غصہ اس کے اندر موجود تھا اور غالباً یہ بات بھی صحیح تھی کہ وہ نواب سے خوفناک انتقام لینے کی کوئی بہت بڑی قسم کھا چکا تھا۔ عبداللہ کے سمجھانے بجھانے سے وہ قدرے دھیما تو نظر آنے لگا مگر اس کے دل میں پوشیدہ ارادے اتنی جلدی بدلنے والے نہیں تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عبداللہ اور جمیلہ کی تسلی کے لئے اپنے غیظ و غضب پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

تھوڑی دیر بعد جمیلہ چائے لے آئی۔ جس وقت عبداللہ اور سلجوق چائے کی پیالیاں سامنے رکھے باتیں کر رہے تھے میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ جمیلہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا "جمیلہ! میں نہیں جانتا سلجوق سے تم لوگوں کا کیا رشتہ ہے اور وہ کہاں تک تمہاری بات مان سکتا ہے، بہرحال جیسے بھی ہو اسے روکنے کی کوشش کرو۔ اس کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ واپس اپنے ڈیرے پر پہنچتے ہی شاہین کو گولی مار دے گا۔ اس کی باتوں پر مت جاؤ۔ وہ صرف تم لوگوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے ظاہر کر رہا ہے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔"

جمیلہ بولی۔ "میں بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ سلجوق بھائی اتنی جلدی پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ وہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہی کریں گے جو انہوں نے طے کر رکھا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ انہیں زبردستی روک لیں۔"

"یہ کام اتنا آسان نہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے کم از کم آٹھ دس ساتھی اس مکان کے ارد گرد موجود ہیں۔ بہرحال موقع محل دیکھ کر کوشش کی جا سکتی ہے۔"

جمیلہ کی خوبصورت پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور ایک شیشی اٹھائے ہوئے باہر نکل آئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے شیشی مجھے تھمائی اور بولی۔ "یہ کسی کام آ سکتی ہے۔"

میں نے لیبل پر نگاہ دوڑائی۔ یہ خواب آور گولیاں تھیں۔ بڑی تیز قسم کی دوا تھی۔ ایک چھوٹی سی گولی بندے کو آٹھ دس گھنٹے کے لئے گہری نیند سلا سکتی تھی۔ میں نے جمیلہ سے پوچھا۔ "تمہارے پاس یہ دوا کہاں سے آئی۔"

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ "دادی جان کو نیند نہیں آتی تھی۔ ڈاکٹر نے لکھ کر دی تھیں۔"

جواب معقول تھا لیکن نجانے کیوں مجھے اس میں سے جھوٹ کی بو آئی۔ یہ دوا غالباً جمیلہ اپنے استعمال کے لئے لائی تھی۔۔۔ اور پھر ایک دم میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کہیں اس دوا کا تعلق ان حالات سے تو نہیں تھا جن سے جمیلہ گزر رہی تھی۔ وہ نواب فیروز جنگ کی "مہربانیوں" کے سبب امید سے تھی۔ عین ممکن تھا کہ مایوسی کی انتہا کو پہنچ کر اس نے اپنی زندگی کے خاتمے کا ارادہ کیا ہو اور اس ارادے کی تکمیل کے لئے یہ دوا حاصل کی ہو۔ لیکن پھر اس کی اچھی فطرت نے اسے حرام موت مرنے سے بچا لیا ہو۔ بہرحال اس وقت یہ باتیں سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ خواب آور دوا میرے ہاتھ میں تھی اور جمیلہ کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میں ان نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے شیشی واپس اسے تھماتے ہوئے کہا۔ "اس کا استعمال مجھ سے بہتر تم کر سکتی ہو۔ بلکہ تمہیں ہی کرنا چاہئے۔ تھوڑی دیر بعد چائے کا ایک اور دور چلا دو۔ سلجوق کے کپ میں تین چار گولیاں ڈال دینا۔ یہ بے ذائقہ دوا ہے۔ اسے بالکل شک نہیں ہو گا۔"

جمیلہ نے پروگرام کے مطابق عمل کیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب ہماری گفتگو اختتام پذیر تھی اور سلجوق اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا، جمیلہ پھر چائے لے آئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے کپ ہمارے سامنے رکھے اور اوڑھنی درست کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ سلجوق کی نگاہوں نے بے اختیار اس کا تعاقب کیا۔ نجانے کیوں مجھے شک ہو رہا تھا کہ سلجوق اور جمیلہ کے درمیان کسی طرح کا روحانی تعلق موجود ہے۔ نواب زادی شاہین کے بارے میں سلجوق کا رویہ کچھ نرم محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہ عندیہ ظاہر کر رہا تھا کہ فی الحال اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن وہ یرغمالی کے طور پر اس کے

پاس رہے گی۔

اب حقیقت کیا تھی؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کسی شاعر نے کہا تھا "دل دریا سمندروں ڈونگے۔ کون دلاں دیاں جانے ہو۔" عین ممکن تھا کہ یہاں سے جاتے ہی سلجوق اپنے اصل روپ میں آجاتا اور اپنی قسم پوری کرنے کے لئے شاہین کو گولیوں سے چھلنی کرکے اس کے باپ کی زمینوں پر پھنکوا دیتا۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی سلجوق پر سستی طاری ہونے لگی۔ وہ بالکل سیدھا بیٹھا تھا پھر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دو تین جمائیاں لیں بعد ازاں جو کچھ ہوا بہت تیزی سے ہوا۔ اسے چکر سا آیا۔ اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھڑایا اور چارپائی پر گر گیا۔ چند ہی لمحے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ بہت گہری سانسیں لینے لگا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ سلجوق کی بے ہوشی کا عمل اس انداز سے اور اتنی تیزی سے مکمل ہوگا۔ ایک ہنستا کھیلتا شخص لمحوں میں اتنا ثقیل ہوگیا تھا۔

میں نے عبداللہ کی مدد سے سلجوق کو چارپائی پر سیدھا کر کے لٹایا۔ اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھا، جسم پر کمبل ڈالا اور کمرے کی بتی بجھا دی۔ میں نے جمیلہ اور عبداللہ سے بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ جائیں اور خود کو سویا ہوا ظاہر کریں۔ میں بھی برآمدے میں ایک چارپائی پر کمبل لے کر لیٹ گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ اگر سلجوق کے ساتھیوں میں سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو عبداللہ دروازہ کھولے گا اور اسے بتائے گا کہ سلجوق نے رات یہیں رہنا ہے۔ لیکن کسی نے دروازہ نہ کھٹکھٹایا اور نہ عبداللہ کو چارپائی سے اٹھنا پڑا۔ دو تین گھنٹے بعد صبح ہوگئی۔ میں جاگتا رہا تھا اور مسلسل سوچتا رہا تھا۔ شاہین کو بچانے کے لئے یہ وقت بڑا اہم تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یقینی بات تھی کہ جونہی سلجوق بیدار ہوگا ایک بار پھر شاہین کے حوالے سے کسی المیے کے لئے کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو جائے گا۔ میرے خیال میں صرف جمیلہ ہی وہ ہستی تھی جو سلجوق کو اس کے خطرناک ارادے سے باز رکھ سکتی تھی۔ اگر وہ سلجوق سے پرزور درخواست کرتی تو ممکن تھا کہ سلجوق شاہین کو چھوڑ دیتا۔ شاہین کو چھڑانے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سلجوق کو اس مکان میں پابند رکھا جاتا اور میں واپس اس قلعے تک پہنچتا جس کی سرنگ میں سلجوق نے اپنی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ پھر کسی طریقے سے میں شاہین کو اس جان لیوا سرنگ سے باہر لانے کی کوشش کرتا۔ بہرحال اس میں رسک تھا اور شدید قسم کا رسک تھا۔

میں جب بستر سے اٹھا، اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ جمیلہ چند گز کے فاصلے پر باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ بھی ایک پل کے لئے نہیں سوئی۔ میں اسے پاس بلانا چاہ رہا تھا وہ خود ہی چلی آئی۔ کہنے لگی۔ "بھائی جان! میں بڑی دیر سے آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "میں سو نہیں رہا تھا، یونہی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟"

وہ بولی۔ "مجھے لگتا ہے، سلجوق بھائی کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ انہوں نے سوتے میں قے کی ہے۔ رنگ بھی زرد ہو رہا ہے۔"

میں چونک کر اٹھا اور جمیلہ کے ساتھ کمرے میں پہنچا۔ سلجوق چت لیٹا تھا اور بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا چہرا دیکھتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ بہت دھیمی چل رہی تھی۔ سانس کا زیروبم بھی تشویشناک حد تک سست تھا۔ وہ بے حد گہری بے ہوشی میں تھا۔ میں نے جمیلہ سے پوچھا۔ "کتنی گولیاں ڈالی تھیں تم نے؟"

وہ بولی "ٹھیک سے یاد نہیں۔ پانچ چھ ہوں گی۔"

"پانچ بھی زیادہ تھیں لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے جلدی میں اس سے بھی زیادہ ڈال دی ہیں۔ یہ تو بالکل بے ہوش پڑا ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔"

"ہائے اللہ" جمیلہ نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے سلجوق کے سر کے نیچے سے تکیہ نکال دیا۔ اس کی سانس جو گلے میں اٹک سی رہی تھی قدرے رواں ہوگئی۔ سامنے ہی عبداللہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ سلجوق کی حالت دیکھ کر اسے بھی سخت تشویش ہوئی۔ میں نے عبداللہ سے کہا "سلجوق کو اسپتال لے جانا ہوگا یا اس کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرنا ہوگا۔ دوسری صورت میں اس کی زندگی کو خطرہ ہے۔"

عبداللہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں۔ مالک مکان کا بھتیجا ڈاکٹر ہے۔ یہیں پاس ہی رہتا ہے۔"

وہ جلدی سے گیا اور پانچ دس منٹ بعد ایک نوجوان کو لے کر میں داخل ہوا۔ نوجوان ڈاکٹر نے سلجوق کو دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا پھر عبداللہ کو چند دوائیں لانے کے لیے بھیجا۔ جب تک عبداللہ دوائیں لایا اس نے سلجوق کو ایک انجکشن دیا۔ معلوم نہیں انجکشن کا اثر تھا یا کوئی اور بات، کچھ دیر بعد سلجوق کو قے آنا شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر نے ڈیڑھ دو گھنٹے تک سخت کوشش کی اور سلجوق کی حالت سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ درحقیقت یہ اسپتال میں ہونے والا کام تھا جو ڈاکٹر نے کوشش کر کے گھر ہی میں انجام دے دیا تھا۔ قریباً دس بجے وہ سلجوق کو گلوکوز وغیرہ لگا کر چلا گیا۔ اس نے بتایا کہ دوپہر تک وہ ہوش میں آجائے گا۔

اس افتاد نے جمیلہ کو بے حد ہراساں کر رکھا تھا۔ وہ سلجوق کی حالت کے لئے خود کو قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ جس وقت سلجوق کی حالت زیادہ خراب تھی، مجھے لگ رہا تھا کہ صدمے کے سبب وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ میری ہتھکڑی گھر والوں پر اسی وقت ظاہر ہو گئی تھی جب کل رات میری اور سلجوق کی جھڑپ ہوئی تھی۔ آج میں کافی دیر دونوں کڑیوں کی درمیانی زنجیر توڑنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر ناکام ہوا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا تھا کہ

سلجوق کے لباس میں اس ہتھکڑی کی چابی موجود ہو تاہم لباس کی تلاشی پر یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دوپہر تک سلجوق کو ہوش آجائے گا لیکن شام پانچ بجے تک بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ پانچ بجے عبداللہ پھر ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ اس نے احتیاط سے سلجوق کا معائنہ کیا اور تسلی دے کر چلا گیا۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی سلجوق کے دو ساتھی پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک وہی طفیل نامی شخص تھا جس سے سرنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ دونوں افراد سلجوق کے لیے بہت پریشان تھے اور ڈیرے پر دیر تک اس کا انتظار کر کے یہاں پہنچے تھے۔ عبداللہ نے انہیں بتایا کہ پریشانی کی بات نہیں۔ رات سلجوق کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ پہلے سے بہتر ہے اور ہوسکتا ہے کل شام تک اپنے ڈیرے پر پہنچ جائے۔ طفیل اور اس کا ساتھی منہ سے تو کچھ نہیں بولے لیکن ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ وہ شک میں مبتلا ہیں۔ واپس جانے کی بجائے انہوں نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ یہیں شہر میں رہیں گے اور کل صبح پھر سلجوق کی خیریت دریافت کرنے آئیں گے۔

سلجوق کی مسلسل بے ہوشی نے عبداللہ کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے بے چینی مترشح تھی۔ وہ بار بار حقہ تازہ کرتا تھا اور بے قراری سے گڑگڑانے لگتا تھا۔ ہم دونوں سلجوق سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "چاچا! میں پوچھ سکتا ہوں کہ سلجوق تمہارا کیا لگتا ہے؟"

وہ بولا "کچھ نہیں اور بہت کچھ بھی۔ تمہارا خیال ہوگا کہ میری اس سے کوئی رشتے داری ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل ہم لوگ ڈھائی تین سال تک حیدرآباد میں پڑوسی رہے ہیں۔ معظم جاہی مارکیٹ میں ہمارے گھروں کی دیوار سانجھی تھی۔ سلجوق کی والدہ اللہ بخشے بڑی نیک اور ہمدرد عورت تھیں۔ سلجوق کی بہنیں جمیلہ کی دوپٹہ بدل بہنیں بنی ہوئی تھیں۔ سلجوق کے والد کی میرے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں گھرانے ایک دوسرے میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے کہ ایک ہی گھرانہ لگتا تھا۔ حیدرآباد شہر میں وہ ہمارے بڑے سنہری دن تھے۔ بعد میں سلجوق کی والدہ اچانک فوت ہوگئیں۔ اس کے والد بچوں کو لے کر نظام آباد اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلے گئے۔ ہم نے بھی کرائے کا وہ مکان چھوڑ دیا۔ یوں ایک ہی گھرانے کی طرح رہنے والے اور آپس میں بے حد محبت کرنے والے افراد تتر بتر ہو گئے۔ بس کبھی کبھار کسی سے ملاقات ہو جاتی تھی یا خط وغیرہ آجاتا تھا۔ سلجوق حیدرآباد میں ہی تھا لہٰذا ہفتے دو ہفتے بعد اپنی صورت دکھا جاتا تھا۔ پھر سنا کہ اس نے کسی بندے سے جھگڑا کیا ہے اور جیل چلا گیا ہے۔ جیل سے دو سال بعد وہ باہر آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ لڑائی فساد اور مار کٹائی اس کا ہر روز کا کام ہو گیا۔ آئے دن اس کے بارے میں الٹی سیدھی خبریں ملنے لگیں۔ پھر ایک روز یہ خبر سنی کہ اس نے اپنا گروہ بنا لیا ہے اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتا ہے۔"

میں نے کہا "چاچا! ایک سوال تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ذرا نازک سا سوال ہے کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔"

وہ بولا "نہیں بیٹا! تم پوچھو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر بات کرنے والے کی نیت ٹھیک ہو تو کوئی بات بھی بری نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "چاچا! کہیں ایسا تو نہیں کہ گئے دنوں میں سلجوق تمہاری بیٹی جمیلہ کو پسند کرتا ہو۔ میرا مطلب ہے اس سے شادی وغیرہ کرنا چاہتا ہو۔"

عبداللہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ حقہ گڑگڑا کر بولا۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ تمہارا یہ اندازہ درست ہے کہ سلجوق، جمیلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے ذکر بھی کر دیا تھا۔ اس وقت وہ بھلا چنگا شریف لڑکا تھا۔ ویلڈنگ کا کام کرتا تھا اور تین چار سو روپے ہفتہ کما لیتا تھا۔ خوش شکل اور اخلاق والا بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر جمیلہ سے اس کی شادی ہو جائے تو کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔ میں نے جمیلہ کی پھوپی سے کہا کہ وہ جمیلہ کی رائے لے۔ اس نے رائے لی تو پتا چلا کہ جمیلہ کو سلجوق پسند نہیں ہے۔ وہ اسے سلجوق بھائی کہتی تھی اور بھائی ہی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ یوں یہ بات ختم ہو گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سلجوق کے دل سے یہ بات کبھی بھی نہیں نکلی ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے جیل جانے سے پہلے وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا اور ہمارے ہر دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ مگر جب اس نے مار دھاڑ والے کام شروع کر دیے تو میں نے خود ہی اس سے کہہ دیا کہ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔"

میں نے کہا۔ "چاچا! اب تمہارے لیے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی کہ سلجوق نے جمیلہ کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے نواب زادی کو اغوا کیا ہے۔ اس لحاظ سے تم پر اور جمیلہ پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

عبداللہ بولا۔ "پتر جی! یہ تو بعد کی بات ہے۔ اب تو یہ فکر ہے کہ سلجوق ہوش میں بھی آئے گا یا نہیں۔ اس کے دو بندے جو تھوڑی دیر پہلے آئے تھے واپس نہیں گئے۔ وہ باہر گلی میں موجود ہیں اور بڑے فکرمند نظر آرہے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔"

"اس بات کی فکر نہ کرو چاچا! سلجوق کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ دیر ہوسکتی ہے لیکن وہ آج ہی رات ہوش میں آجائے گا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے۔"

عبداللہ بولا۔ "ہم لوگ بڑی رازداری سے یہاں پہنچے تھے۔ ارادہ تھا کہ چند مہینے بڑی خاموشی سے اس اجنبی جگہ پر گزاریں گے لیکن تم نے سب کچھ درہم برہم کر دیا۔"

اس دوران جمیلہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ سلجوق کی مسلسل بے ہوشی اس کی جان کھائے جا رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں۔۔۔ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

O☆O

رات دس بجے سلجوق نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر تک سرخ سرخ آنکھوں سے ہمارے چہرے تکتا رہا پھر ہونٹوں میں کچھ بڑبڑایا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحے بعد وہ پھر گہری نیند سو گیا۔ وہ شخص جو اس چارپائی پر گرنے سے پہلے ایک خونخوار مجرم تھا' اب بالکل بے سدھ پڑا تھا اور اس کے چہرے پر معصومیت برس رہی تھی۔ عبداللہ نے باہر جا کر سلجوق کے ساتھیوں کو یہ خوشخبری سنائی کہ سلجوق ہوش میں آ گیا ہے۔ وہ دونوں اندر آ کر دیکھنا چاہتے تھے لیکن عبداللہ انہیں ٹالنے میں کامیاب رہا۔ وہ صبح آنے کا کہہ کر واپس چلے گئے۔ میں کل رات کا جاگا ہوا تھا۔ جمیلہ یا اس کا باپ مجھ پر ایک لحاف ڈال گئے تھے۔ سردی کم کرنے کے لیے برآمدے کی چقیں بھی گرا دی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا قریب ہی ایک۔۔۔ چارپائی پر عبداللہ دنیا و مافیہا سے بے خبر خراٹے لے رہا تھا۔ جمیلہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید باورچی خانے کے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ ہتھکڑی سے میں نے رات پہلے پہر ہی نجات حاصل کر لی تھی۔ لیکن صرف اس حد تک کہ دونوں ہتھکڑیوں کی درمیانی زنجیر کٹ گئی تھی۔ کڑے بدستور میری کلائیوں میں موجود تھے۔ میں بستر سے اٹھا' رات کو مچھلی کھائی تھی۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ کسی کو جگانا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے خود ہی باورچی خانے میں جا کر پانی پیا۔ تاریکی میں جھک کر میں نے اپنی پنڈلی ٹٹولی۔ خنجر اپنی جگہ موجود تھا۔ اس وقت یہی میرا واحد ہتھیار تھا' لہٰذا اس کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔ جس وقت میں خنجر ٹٹولنے کے لیے جھکا میرا سر باورچی خانے کی بند کھڑکی کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے کھڑکی کی دوسری جانب مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یہ جمیلہ اور کسی مرد کی آوازیں تھیں۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی جلد ہی مجھے آنکھ چپکانے کے لیے ایک درز نظر آ گئی۔ میں نے اس درز سے جھانکا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں پر کل سے سلجوق بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دیکھا سلجوق بستر پر دراز تھا اور جمیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ اس کے سرہانے سر نہوڑائے کھڑی تھی۔ اس کے سر پر گلابی اوڑھنی تھی اور اوڑھنی میں سے پھسل نکلنے والی چند ریشمی لٹیں اس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "کچھ بھی ہے سلجوق بھائی! غلطی میری ہی تھی۔ آپ کو کل رات سے جتنی تکلیف پہنچی ہے وہ صرف میری وجہ سے پہنچی ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔"

سلجوق نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور نقاہت بھرے انداز میں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہ تم کیا کہتی ہو جمیلہ! تمہاری دل ہوئی تکلیف مجھے دنیا کی ہر خوشی سے زیادہ پیاری ہے کاش میری جان نکل جاتی۔۔۔ میں کبھی ہوش میں نہ آتا۔"

جمیلہ نے لرز کر کہا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو سلجوق بھائی۔ آپ کو کیا پتا کل سے میں کتنا روئی ہوں' کتنی دعائیں مانگی ہیں آپ کے لیے۔"

سلجوق نے کراہتے ہوئے کہا۔ "جمیلہ! میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ یوں لگتا ہے ایک زمانہ بیت گیا ہے تمہیں دیکھے ہوئے۔"

جمیلہ کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار ابھرے اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کمزور سی کوشش کی پھر محتاط نظروں سے ساتھ والے کمرے میں دیکھا۔ یقیناً وہاں اس کی دلوں سوئی ہوئی تھیں۔ چند لمحے کشمکش میں رہنے کے بعد وہ چارپائی کے بازو پر بیٹھ گئی۔

"جمیلہ" سلجوق کے ہونٹ لرزے "میرا امتحان کبھی ختم بھی ہو گا یا نہیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ نے خود کو امتحان میں کیوں ڈال رکھا ہے۔ یقین کریں۔۔۔ یقین کریں میں نے کبھی آپ کو۔۔۔ اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں۔ آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔ آپ کی خیر خواہی چاہتی ہوں لیکن۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔ الفاظ اس کی زبان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"لیکن کیا جمیلہ؟ بولو نا۔۔۔ چپ کیوں ہو گئی ہو۔ تم جانتی ہو' میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ محبت اتنی شدید ہے کہ تمہارے بغیر میرا ہر پل انگاروں پر لوٹنے گزرتا ہے۔ پھر تم مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کیوں نہیں کر دیتی ہو۔ کیوں برسوں سے میرا تماشا دیکھ رہی ہو۔"

"مجھے معاف کر دو سلجوق بھائی۔" جمیلہ روہانسی ہو کر بولی۔ "میں آپ کی گناہ گار ہوں۔ لیکن اپنے دل پر میرا بس نہیں۔ جس طرح آپ کا بس اپنے دل پر نہیں اور اب تو میں بھی آپ کے قابل نہیں۔ میں سب کچھ کھو چکی ہوں' لٹ چکی ہوں۔ میرے اندر گناہ پل رہا ہے۔ مجھے تو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں' کہاں یہ کہ آپ مجھ سے محبت جتائیں۔"

سلجوق کراہ کر بولا۔ "تمہیں کچھ پتا نہیں جمیلہ کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ خدا کی قسم تم میرے لیے اب بھی وہی چھ برس پہلے والی رانی ہو جو سفید کپڑوں پر گلابی دوپٹہ اوڑھ کر کالج جاتی تھی اور اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر میری بہنوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ میری محبت میں ایک ذرہ بھر فرق نہیں آیا ہے جمیلہ اور نہ آئے گا۔"

سلجوق کے لہجے میں عجیب سی دلیری اور بے باکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے سینے میں برسوں سے بھرا ہوا غبار آج نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ جمیلہ سے آج وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے جو آج تک

نہیں کہہ سکا۔ جمیلہ کا چہرا دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے کسمسا کر اپنا ہاتھ سلجوق کے ہاتھ سے چھڑایا اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے اس نے برآمدے والے دروازے سے نکلنا چاہا لیکن یہ سوچ کر کہ وہاں میں اور اس کا باپ سو رہے ہیں' وہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔ میں نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑی اور لپک کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

رات بھر میں گہری نیند سویا۔ صبح اٹھا تو طبیعت میں تازگی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لے کر میں نے پاؤں چارپائی سے اتار دیے۔ وہ صبح بھی کافی نکھری ہوئی اور تر و تازہ تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ کی تمازت خوشگوار محسوس ہوتی تھی۔ میں نے جمیلہ کو دیکھا۔ وہ بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھے ناشتہ بنانے میں مصروف تھی۔ اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور گورے گورے سڈول بازو تیزی سے حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے رات والے واقعے کا ردعمل اس کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن چہرا بالکل سپاٹ تھا۔ اس کی دادی پاس ہی لکڑی کی چوکی پر بیٹھی تھی۔ وہ دادی سے عام سے لہجے میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی چند گھنٹے پہلے اپنے چاہنے والے کے ساتھ نہایت سنجیدہ قسم کی گفتگو کر رہی تھی۔ انسان ایک گورکھ دھندا ہے اور عورت کے احساسات تو خاص طور سے بے حد پیچیدہ اور ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ پراٹھا پکاتے پکاتے جمیلہ نے پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ جلدی سے سر پر اوڑھنی درست کر کے بولی۔ "آپ نہانا چاہتے ہیں تو نہا لیجئے' میں نے غسل خانے میں پانی رکھ رہا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ بہت شکریہ' میں صرف منہ ہاتھ دھوؤں گا۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ غسل خانے کے دروازے میں کھونٹی کی جگہ دو میخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میخوں پر میرا وہ لباس جو ڈیک نالے کے پانی سے سرخی مائل ہو گیا تھا' دھلا اور استری کیا ہوا لٹکا تھا۔ ساتھ میں وہ چادر بھی تھی جو کشتی راں ملنگ نے مجھے دی تھی۔ یہ چادر بھی دھلی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار غور سے اس چادر کو دیکھا اور میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ یہ چادر۔۔۔ یہ چادر میں نے اس سے پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔۔۔ ہاں یہ سائیں مالی کی چادر تھی۔ وہی رنگ' وہی کپڑا' وہی روئیدگی ہو بہو جو چادر کے کناروں پر لگے تھے۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی اور نہ میری یادداشت کوئی فریب دے رہی تھی۔ یہ سائیں مالی کی چادر تھی۔۔۔ سائیں مالی کی یہ چادر اس کشتی راں ملنگ کے پاس کیسے آئی؟ ایک بار پھر میرے ذہن میں وہی شبہ رینگنے لگا جو ملنگ کو خدا حافظ کہتے وقت میرے ذہن میں رینگا تھا۔ میرا دل چاہا تھا کہ میں قریب جا کر اچھی طرح اپنے محسن کی صورت دیکھوں۔۔۔ کہیں وہ۔۔۔ سائیں مالی نہ ہو۔

میری نگاہ چادر پر تھی اور میں غسل خانے کے دروازے میں ساکت کھڑا تھا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے سراپے میں دوڑ رہی تھی۔ یہ سائیں مالی گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ پُر اسرار اور ناقابل فہم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا اور یہ احساس اتنا قوی تھا کہ مجھ جیسا حقیقت پسند شخص بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا رہا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں نے چاچے عبداللہ کے کم ناپ کپڑے اتارے اور اپنے پہن لیے۔ چادر کی بکل مار کر میں کھویا کھویا سا برآمدے میں آ گیا۔ جمیلہ نے چارپائی کے سامنے تپائی رکھ دی تھی اور اس پر میرے اور عبداللہ کے لیے ناشتہ چن دیا تھا۔ ہم حیدر آباد میں تھے لیکن یہ ناشتہ لاہوری تھا۔ پراٹھے' انڈے کا خاگینہ البتہ جس میں پیاز ڈالی گئی تھی اور سوجی کا حلوہ' ناشتہ کرنے کے بعد میں سلجوق کے پاس جا بیٹھا۔ ڈاکٹر صبح سویرے اسے پھر گلوکوز کی ڈرپ لگا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی اور اسے کم از کم دو روز آرام کرنا چاہیے۔ سلجوق کا رنگ واقعی لیموں کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ اور وہ برسوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ آج اس کی طبیعت میں تیزی اور بدبدی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ نواب زادہ شاہین کے بارے میں بھی اپنے ارادوں پر نظر ثانی کر چکا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ صبح منہ اندھیرے طفیل اور گلاب سنگھ اس کی مزاج پرسی کے لیے آئے تھے۔ اس نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نواب زادی کو چھوڑ دیا جائے اور بحفاظت اس کے باپ کی جاگیر تک پہنچا دیا جائے۔

میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ سلجوق کے رویے میں یہ تبدیلی جمیلہ کے کہنے سننے سے آئی ہے۔ رات میں نے انہیں باتیں کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ ان کے درمیان یہ گفتگو میرے جاگنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ غالباً میں گفتگو کا وہ حصہ نہیں سن سکا تھا جس میں جمیلہ نے سلجوق کو نواب زادی کے حوالے سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے سلجوق سے بوٹا سنگھ کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ بوٹا سنگھ کی دائیں ران میں "ری پیٹر" میں چلنے والے کارتوس کے دو چھرے لگے تھے۔ ایک چھرا تو طفیل رنبیر نے پرسوں رات ہی نکال دیا تھا' دوسرا چھرا ابھی اندر موجود ہے اس کی وجہ سے وہ قدرے تکلیف میں ہے۔ بہرطور آج شام تک طفیل کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ حل کر لے گا۔

میں نے سلجوق سے بلدرنجی کے بارے میں بھی بات کی۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے اس کی لاش تمہیں مل چکی ہو گی۔" سلجوق نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "کیا اب بھی تمہارا خیال ہے کہ اسے میں نے قتل کیا ہے۔"

سلجوق نے تسلیم کیا کہ بلدرنجی کو تھری ایم ایم کی گولی لگی تھی اور سرنگ سے فرار ہوتے وقت میرے پاس تھری ایم ایم نہیں

تھی۔

اس روز سلجوق مجھ سے دیر تک بات کرتا رہا۔ اس نے مجھے اپنے مجرم بننے کی کہانی سنائی۔ یہ وہی کہانی ہے جو ہم اکثر سنتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کہانی میں مرکزی کردار بدعنوان پولیس اور بااثر لوگوں کا ہوتا ہے۔ سلجوق کی کہانی بھی ملتی جلتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اب قانون شکنی کی اس زندگی سے اکتا چکا ہے۔ اس نے ایک دوست کی مدد سے ڈنمارک کا ویزا لگوالیا ہے اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جائے گا۔ وہ میرے بارے میں بھی کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا۔ کہنے لگا۔ "تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ جس وقت ہم نے تمہیں اور نواب زادی کو پکڑا تم جیپ کی پچھلی سیٹوں پر "بھیگی بلیاں" بنے بیٹھے تھے لیکن ڈیرے سے فرار ہوتے وقت تمہارے تیور اور ہو گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "بھیگی بلی جب دھوپ میں بیٹھی رہے تو سوکھ جاتی ہے۔ ہم دونوں بھی سوکھ گئے تھے اس لیے ڈیرے سے بھاگ نکلے۔"

سلجوق کو میرے بارے میں زبردست کرید پیدا ہو چکی تھی۔ دراصل وہ میرے ساتھ جھڑپ کر کے دیکھ چکا تھا۔ میں نے اسے زیر کرنے اور بے بس کرنے میں دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگائے تھے۔ وہ لڑائی بھڑائی کا ماہر شخص تھا۔ یہ بات باآسانی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ میں نے اسے کسی اتفاق کے تحت نہیں مہارت کے ساتھ زیر کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی کمتری اور میری برتری تسلیم کر چکا تھا۔ اب جاننا چاہ رہا تھا کہ میں حقیقت میں کون ہوں اور پنجاب سے حیدرآباد کیونکر پہنچا ہوں۔ میں نے اس کی باتوں کے گول مول جواب دیے۔ ہماری باتوں کے دوران دو مرتبہ جمیلہ بھی کمرے میں آئی۔ ایک مرتبہ سلجوق کو دلیہ اور دودھ دینے' دوسری مرتبہ خالی برتن اٹھانے۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ سلجوق کے سامنے آ کر اس کے سنجیدہ چہرے پر شرم کی مدھم سی سرخی لہرا جاتی تھی۔

وہ ایک سو فیصد دلکش لڑکی تھی۔ اگر نواب فیروز جنگ اس پر بری طرح فریفتہ ہوا تھا تو اس نے کچھ ایسا غلط نہیں کیا تھا۔ غلط اس نے یہ کیا تھا کہ ایسی دل موہ لینے والی لڑکی کو فوم کی کچی پلیٹ کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا تھا۔ اب وہ اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی اور کسی بھی وقت کسی راہ گیر کا وزنی پاؤں اس کے ٹکڑے کر سکتا تھا۔

شاید میں اسی روز چاچے عبداللہ کا گھر چھوڑ جاتا اور سلجوق کے ڈیرے پر (سرنگ میں) پہنچ کر اپنے زخمی یار ریوا سنگھ کی خبر لیتا لیکن دوپہر کے فوراً بعد گہرے بادل گھر آئے اور موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ جوں جوں دن ڈھلتا گیا طوفان باد و باراں شدت اختیار کرتا گیا۔ حیدرآباد شہر کا آسمان جس پر مجھے اب تک رنگ برنگی پتنگیں اور کبوتر ہی اڑتے نظر آئے تھے' طوفانی بادلوں سے ڈھک کر چنگھاڑنے لگا اور بجلیاں گرانے لگا۔ رات آٹھ نو بجے تک میں موسم بہتر ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن باد و باراں کا زور نہیں ٹوٹا۔ شاید اس خراب موسم کے باوجود بھی میں چلا ہی جاتا لیکن ذہن میں ابھرنے والے ایک موہوم تجسس نے میرا ارادہ ڈانواں ڈول کر دیا۔ میں اس کہانی کا انجام دیکھنا چاہ رہا تھا جو گزشتہ تین روز سے چپکے چپکے اس چار دیواری میں پنپ رہی تھی۔ سلجوق اور جمیلہ کی کہانی تھی۔ وہ دونوں ایک نادیدہ کشمکش میں الجھے ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بہت جلد اس کشمکش کا انجام ہونے والا ہے۔ وہ دونوں ایک ہونے والے ہیں یا ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والے ہیں۔

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا اور مٹی کی چھت پر تڑاتڑ برستی بارش کی آواز سنتا رہا۔ رات ابتداً ایک بجے کا عمل ہو گا جب میں نے ایک مدھم آواز سنی۔ یہ سلجوق کی آواز تھی۔ وہ جمیلہ کو آواز دے رہا تھا۔ وہ بستر علالت پر تھا۔ کسی بھی ضرورت کے لیے وہ جمیلہ یا عبداللہ کو آواز دے سکتا تھا۔ چند لمحے بعد باورچی خانے میں کھٹ پٹ سنائی دی۔ میں نے برآمدے میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ باورچی خانے کی چھوٹی بتی روشن تھی اور جمیلہ رکوع کے انداز میں جھکی ہوئی گھڑے سے پانی لے رہی تھی۔ غالباً سلجوق نے پانی مانگا تھا۔ پانی کا گلاس لے کر جمیلہ نے بتی بجھائی اور باورچی خانے سے نکل گئی۔ اس کا رخ سلجوق والے کمرے کی طرف تھا۔ میں بستر پر لیٹا آہٹیں لیتا رہا۔ چار پانچ منٹ بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ننگے پاؤں چلتا باورچی خانے میں پہنچ گیا۔ کل اسی جگہ سے میں نے کمرے میں جھانکا تھا اور سلجوق اور جمیلہ کی باتیں سنی تھیں۔ آج پھر میں نے کھڑکی کی درز سے آنکھ چپکا لی۔ ایک ہوشربا منظر میرے سامنے آیا۔ سلجوق نے جذبات سے بے قابو ہو کر جمیلہ کو اپنے بازوؤں میں بھر رکھا تھا۔ اس کا چہرا لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ دیوانہ وار جمیلہ کے چہرے اور گردن پر بوسے ثبت کر رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں منتشر تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ غصہ نہ پیار۔ نہ نفرت نہ محبت۔ بس ایک خود سپردگی سی تھی جو جمیلہ نے خود پر طاری کر رکھی تھی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ صرف دو تین منٹ بعد جمیلہ کمرے سے نکل آئی۔ اس نے محتاط انداز میں برآمدے کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر اس کمرے میں واپس چلی گئی جہاں وہ دادی کے پاس سوتی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے جمیلہ کو دیکھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ پانی کے قطرے اس کی ٹھوڑی سے ٹپک رہے تھے۔ غسل خانے سے نکلتے ہوئے اس نے کوئی شے بڑی لاپروائی سے کوڑے کرکٹ والے ڈبے میں پھینک دی۔ یہ ایک عام سی حرکت تھی' اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن جب تھوڑی دیر بعد میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں

گیا اور میری نگاہ کوڑے کے ڈبے میں گئی تو میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے کوڑے کے ڈبے میں ایک چمکدار شے نظر آئی تھی۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر اس شے کو پہچانا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ گردش دوراں تھم گئی ہے اور میں زمین و آسمان کے درمیان معلق ہوں۔ نہ چاہنے کے باوجود میری نگاہ اس چمکیلی شے پر گڑی ہوئی تھی اور میں ہر احتیاط کو نظر انداز کر کے اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ جو شے مجھے کوڑے کے ڈبے میں نظر آئی تھی وہ چاندی کا ایک کڑا تھا۔ اس کڑے پر ہر نصف انچ کے فاصلے سے نیلے نگ جڑے تھے اور چار مقامات پر چھوٹے چھوٹے جڑاؤ پھندنے منسلک تھے۔ اس کڑے کو ہتھوڑے یا کسی دوسری وزنی چیز کی ضربات سے توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔

کوئی دوسرا اس کڑے کو دیکھتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ یہ بازار سے چار پانچ روپے میں ملنے والا آرائشی کنگن ہے' جسے پرانا ہونے پر کوڑے میں پھینک دیا گیا ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں سمجھ سکتا تھا..... ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں اس گہنے کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے..... میری آنکھ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے یہ نقرئی کڑا ان پچیس عدد صندوقوں میں سے ایک صندوق میں دیکھا تھا جو چنے پل والی حویلی کے تہہ خانے سے برآمد ہوئے تھے اور انڈیا کے شہر فرید کوٹ پہنچ کر لاپتا ہوئے تھے..... یہ کڑا یہاں جمیلہ کے پاس کیسے پہنچا اور پھر جمیلہ کے پاس سے کوڑے کے اس ڈبے میں کیوں آیا؟ یہ بے حد حیرت ناک سوالات تھے۔ ان سوالات کی حیرت کو جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوا میں غسل خانے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

سب سے پہلی بات میرے ذہن میں یہی آئی کہ یہ نقرئی کڑا جمیلہ کو کسی نے تحفے میں دیا تھا۔ اس بے چاری کی اپنی حیثیت اتنی نہیں تھی کہ وہ ایسی چیز خرید سکتی..... پھر فوراً دوسرا سوال ذہن میں ابھرا۔ جمیلہ کو یہ تحفہ دینے والا کون تھا؟ جس تیزی سے سوال ابھرا تھا اسی تیزی سے جواب ابھرا۔ ہو نہ ہو یہ کڑا جمیلہ کو چھوٹے نواب فیروز جنگ سے ملا تھا۔ ایک دم ذہن میں کھڑکی سی کھل گئی۔ اس سے آگے کی بات خودبخود سمجھ میں آنے لگی۔ نواب فیروز جنگ نے جمیلہ کو برباد کیا تھا۔ بے شک وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لائی تھی لیکن اس دغاباز کا دیا ہوا تحفہ وہ اپنے جسم پر کیسے سجا سکتی تھی۔ اس نے اسے توڑ پھوڑ کر ایک بے کار شے کی طرح کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔ میرے لیے یہ بات اہم نہیں تھی کہ فیروز جنگ نے یہ کنگن نما کڑا جمیلہ کو کب دیا اور اس نے کیوں اسے توڑ پھوڑ کر کوڑے میں پھینکا' میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ یہ کڑا اگر نواب فیروز جنگ کی ملکیت تھا تو اس کے پاس کہاں سے آیا؟ کہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں تھا کہ فرید کوٹ کی حدود میں جو ڈاکہ ہوا اس میں تحلیل ہو گیا تھا وہ یہاں حیدرآباد آ پہنچا ہو۔ اس کے ساتھ ہی "گندھارا آرٹ کا ذخیرہ" میرے تصور میں آ چمکا۔ کڑی سے کڑی مربوط ہوتی جا رہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ گندھارا نوادرات کا وہ ذخیرہ بھی دراصل اسی دفینے کا ایک حصہ ہو جو میں چنے پل والی حویلی سے نکال کر لایا تھا۔ یہ خیال اتنا سنسنی خیز تھا کہ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں سائیں عالی کی دور افتادہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے ایک ریستوران میں مجھ سے کہا تھا کہ میں مجتبیٰ کنور کا ساتھ نہ چھوڑوں اور وہ مجھے جس راستے پر چلا رہا ہے اس پر چلتا رہوں' کیونکہ یہ راستہ بھی مجھے اسی منزل پر لے جائے گا جہاں پہنچنا چاہ رہا ہوں..... اگر وہ ٹرک نواب شہریار جنگ کی حویلی میں پہنچا تھا تو اس کا مطلب تھا میرا دوست' میرا یار غار صفدر بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ وہ جس کی صورت دیکھے ہوئے مجھے اب مہینوں گزر چکے تھے' جس کی یاد ایک روگ کی طرح میرے دل سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ انہی گلی کوچوں میں کہیں موجود تھا' انہی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ میرا خون رگوں میں جوش مارنے لگا۔ میں چہرے پر پانی کے چند چھینٹے مار کر غسل خانے سے باہر نکلا۔ محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کوڑے کے ڈبے میں سے نقرئی کڑا اٹھایا اور جیب میں رکھ لیا۔

اب میری بے قرار نگاہیں جمیلہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں نہیں تھی۔ سلجوق والے کمرے میں بھی نہیں تھی۔ عبداللہ بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید ناشتے کا سامان لینے گیا تھا۔ میرے لیے اب ایک پل کا انتظار بھی مشکل تھا۔ میں دندناتا ہوا اس کمرے میں گھس گیا جہاں جمیلہ اپنی دادی کے ساتھ سوتی تھی۔ وہ وہیں تھی۔ اپنا بستر سنبھال رہی تھی۔ مجھے اچانک کمرے میں دیکھ کر وہ بوکھلا سی گئی۔ اس کی دادی صبح کی نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز پر ہی لیٹ جاتی تھی۔ اب بھی وہ جائے نماز پر تھی اور ہاتھ میں تسبیح پکڑے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی دادی کی طرف دیکھا اور پھر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ میرے دروازہ بند کرنے سے جمیلہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"کیا بات ہے شاہ جہاں بھائی؟" اس نے پوچھا۔

"میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ک۔۔۔ کیسی بات بھائی جان؟"

میں نے جیب سے مڑا تڑا کڑا نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملا تھا جمیلہ؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

جمیلہ نروس ہو گئی۔ "یہ۔۔۔ یہ ایک سہیلی نے دیا تھا لیکن آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟"

"جمیلہ" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ یہ ایک بہت اہم معاملہ ہے۔ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی' اور

میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں... وقت ضائع نہ کرو۔" میرے لب و لہجے نے جمیلہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے ہونٹوں کو حرکت دی لیکن کوشش کے باوجود کچھ بول نہ سکی۔ میں نے گمبھیر انداز میں پوچھا۔ "کیا یہ کڑا تمہیں نواب فیروز جنگ نے دیا تھا؟" جمیلہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کے پاس اس طرح کے کچھ اور زیور بھی تھے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"تمہیں معلوم ہے فیروز جنگ کے پاس یہ کڑا کہاں سے آیا؟" جمیلہ نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے پوچھا۔ "فیروز جنگ نے یہ کڑا دیتے وقت کوئی بات کہی تھی میرا مطلب ہے اس کڑے کے متعلق ذکر کیا تھا کہ یہ کتنا پرانا ہے' کس دھات کا ہے یا کہاں سے آیا ہے ان کے پاس؟"

جمیلہ کی خوبصورت پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔ بولی "اس نے کہا تھا یہ چاندی کا کنگن ہے لیکن بڑا قیمتی ہے۔ اگر یہ نیا ہوتا اور اس میں چمک دمک ہوتی تو اس کی اتنی قیمت نہ ہوتی۔ میرا خیال ہے کوئی ایسی ہی بات کہی تھی اس نے۔"

جمیلہ کی دادی آرام سے سو رہی تھی۔ نظر کے علاوہ اس کی سماعت بھی بہت کمزور تھی اور مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ ہماری سرگوشیاں سن کر جاگ جائے گی۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جمیلہ! میری بات دھیان سے سنو اور جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب بہت سوچ سمجھ کر اور ٹھیک ٹھیک دینا..."

جمیلہ نے ایک بار پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "آج سے بارہ چودہ روز پہلے تک تم اور چاچا عبداللہ' نواب شہریار کی حویلی میں تھے۔ جن سرونٹ کوارٹروں میں تم رہتے تھے وہ حویلی کے مین گیٹ کے بالکل پاس ہیں۔ حویلی میں آنے جانے والی گاڑیوں کے بارے میں تمہیں پتا رہتا ہوگا... کیا پچھلے آٹھ دس مہینوں میں کوئی ٹرک بھی حویلی میں آیا ہے؟"

وہ بولی۔ "بڑے نواب حویلی کے پچھواڑے باغ لگوا رہے ہیں۔ وہاں کچھ روشیں' محرابیں اور فوارے بنائے جا رہے ہیں۔ ٹرک بجری سیمنٹ وغیرہ لے کر آتے رہتے ہیں' پتا نہیں آپ کس ٹرک کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس ٹرک کے بونٹ کا رنگ سرخ تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے اوپر سبز رنگ کا ایک بڑا ترپال بھی ڈالا گیا ہو۔"

جمیلہ کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں برقرار تھیں۔ وہ عام سے لہجے میں بولی "کوئی آٹھ ماہ پہلے شام کے وقت میں نے ایک ٹرک کو حویلی کے گودام کے سامنے کھڑے دیکھا تھا۔ اس میں سے کچھ صندوق وغیرہ اتارے جا رہے تھے... لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ چاندی کے اس کنگن کا ٹرک سے کیا تعلق ہے۔"

میرے ذہن میں زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔ میں نے لپک کر جمیلہ کے شانے تھام لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے چارپائی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "جمیلہ... مجھے بتاؤ اس ٹرک کے بارے میں... تم نے اور کیا دیکھا تھا' مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔"

جمیلہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میری ذہنی حالت پر شک کر رہی ہو۔ اس نے رک رک کر جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔ کوئی آٹھ ماہ پہلے کی بات تھی' بیگم حضور کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ انہوں نے جمیلہ کو بلایا کہ وہ آکر ان کے سر میں کنگھی کی مالش کرے۔ اس سے پہلے بھی بیگم حضور یہ کام اسی سے کرواتی تھیں۔ وہ جب بیگم حضور کے بلاوے پر حویلی کے رہائشی حصے میں پہنچی' اس نے گودام کے سامنے ایک ٹرک کھڑے دیکھا۔ نواب شہریار بھی ٹرک کے قریب موجود تھے۔ نواب صاحب کے کچھ کارندے ٹرک سے صندوق اتار کر گودام میں لے جا رہے تھے۔ انداز سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں کئی صندوق دھات کے بنے ہوئے ہیں' وہ کافی وزنی بھی محسوس ہوتے تھے۔ ٹرک کی چھوٹی بتیاں روشن نظر آ رہی تھیں... قریباً ایک گھنٹے بعد جب جمیلہ فارغ ہو کر واپس آئی تو ٹرک موجود نہیں تھا۔ گودام کا شٹر بند تھا۔

میرا دل پکار پکار کر گواہی دینے لگا کہ بالآخر میں نے ٹرک کا سراغ لگا لیا ہے اور ٹرک کے ساتھ ساتھ اپنے اس بچھڑے دوست کا بھی جس سے چند گھنٹوں کی رخصت لے کر میں فورڈ کوٹ سے گیا تھا اور پھر یہ چند گھنٹوں کی جدائی ہفتوں اور مہینوں تک پھیل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اڑ کر نواب کی حویلی تک پہنچ جاتا۔ میں جمیلہ کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکلا اور بے قراری سے برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ عبداللہ بازار سے ڈبل روٹی انڈے وغیرہ لے آیا تھا۔ میری بے چینی کو اس نے بھی محسوس کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتا یا میں خود ہی اس کے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب دیتا' بیرونی دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ عبداللہ نے دروازے پر جا کر دستک دینے والے کا نام پوچھا اور کنڈی گرائی۔ آنے والا سلجوق کا ساتھی طفیل تھا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھی اور اندر آتے ہی سیدھا اس کمرے کی طرف لپکا جہاں سلجوق ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ کوئی خاص خبر لے کر آیا تھا اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔ میں اور عبداللہ اس کے پیچھے ہی پیچھے سلجوق کے کمرے میں گئے۔ ہمیں دیکھ کر طفیل ایک دم خاموش ہو گیا۔

سلجوق نے کہا۔ "ان سے کوئی پردہ نہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔"

طفیل نے کہا۔ "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے جی... میرا خیال ہے کہ آپ سب کو فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ نواب شہریار کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ چاچا عبداللہ اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں حیدرآباد میں موجود ہے۔ وہ لوگ بڑی تیاری کے ساتھ یہاں آ رہے ہیں۔ میرے منہ میں خاک' بڑے برے ارادے ہیں ان لوگوں کے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی بہو اور بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا ذمہ دار چاچا عبداللہ ہے۔ چاچے عبداللہ نے ہی آپ کو بلا کر ان کی بہو کو قتل اور بیٹی کو اغوا کروایا ہے۔"

سلجوق پریشان نظر آنے لگا۔ "نواب زادی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کے حکم کے مطابق اسے ہم نے کل رات ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے واپس پہنچنے کے بعد ہی نوابوں کو دلیری سوجھی ہے۔"

میں نے دیکھا' عبداللہ خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ جمیلہ بھی سہمی ہوئی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ سلجوق کے چہرے پر شدید الجھن کا آثار تھے غالباً ہم سب کی طرح وہ بھی سوچ رہا تھا کہ نواب شہریار کو چاچے عبداللہ کی اس گمنام رہائش گاہ کا پتا کیسے چلا۔ میں نے طفیل سے پوچھا کہ نواب شہریار کے یہاں آنے کی خبر کس نے دی ہے۔

وہ کہنے لگا۔ "حویلی میں ہمارا ایک بندہ موجود ہے۔ آپ اسے مخبر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ نواب اور اس کے کارندے دو گاڑیوں پر سوار حویلی سے نکلے ہیں۔ اور سیدھے حیدرآباد آ رہے ہیں۔ ان کے پاس خودکار رائفلیں اور ریوالور وغیرہ ہیں۔ نواب کا بالتو کتا "قطب" بھی ساتھ ہے۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے سلجوق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ کبھی وہ غصے سے بپھرا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی اس کی آنکھوں میں سوچ بچار نظر آنے لگتی تھی۔ پھر وہ بستر سے نیچے اترا اور اپنا ہولسٹر کمر سے باندھنے لگا۔ ابھی اس نے بمشکل ہولسٹر ہی باندھا تھا کہ کہیں پاس ہی گلی میں گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ طفیل کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سن گن لینے کے لیے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ اس نے کنڈی گرا کر دروازہ کھولا۔ لیکن فوراً ہی دوبارہ بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلاتا ہوا برآمدے کی طرف بھاگا "وہ آ گئے ہیں جی" اس نے پکار کر کہا اور ڈبگل کے اندر سے اپنی 222 رائفل نکال لی۔ اس کا بھاگ کر اندر آنا اور رائفل نکالنا ایک وحشت ناک منظر تھا۔ جمیلہ نے دلدوز چیخیں لیں اور عقبی کمرے میں گھس گئی۔ سلجوق کا زرد چہرا خطرے کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بھی اپنا پستول نکال لیا اور بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ عبداللہ نے ایک الماری کھولی اور اندر سے بارہ بور کی ڈبل بیرل رائفل نکال کر مجھے دے دی۔

یہی وقت تھا جب بیرونی دروازے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ یوں لگا جیسے کئی افراد نے مل کر اسے ٹکر ماری ہے۔ دروازے کا ایک پٹ ٹوٹ کر دور جا گرا اور میں نے دو مسلح افراد کی جھلک دیکھی۔ ابھی انہوں نے اندر قدم ہی رکھا تھا کہ ایک ستون کی اوٹ سے طفیل نے اپنی 222 فائر کی۔ اوپر تلے تین گولیاں چلی تھیں۔ ایک گولی ایک حملہ آور کے بازو میں لگی اور وہ تڑپ کر دروازے سے باہر جا گرا۔ دوسرا حملہ آور بھی پیچھے ہٹ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ یکایک زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ آور سامنے والے مکان کی چھت پر چڑھ گئے ہیں اور وہاں سے وہ صحن میں چھپے ہوئے کسی بھی شخص کو باآسانی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ مجھے چاچے عبداللہ کی طرف سے خطرہ محسوس ہوا۔ وہ برآمدے کی ایک چھوٹی سی دیوار کے ستب میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے پکار کر کہا۔ "چاچا! پیچھے آ جاؤ۔"

شاید دھماکوں کے شور میں اس نے سنا نہیں یا پھر دہشت کے سبب وہ اپنی پوزیشن چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے دو تین بار پکارا۔ اس دوران دو گولیاں میرے بالکل پاس سے گزر کر کمرے کی کھڑکی میں لگیں اور اس کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ میں نے ایک تنومند شخص کو سامنے والے مکان کی چھت پر کودتے دیکھا۔ میں نے بارہ بور رائفل سے اس پر فائر کیے۔ وہ ایک دم اوجھل ہو گیا۔ معلوم نہیں اسے گولی لگی تھی یا وہ فائرنگ سے بچنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ رائفل دوبارہ لوڈ کرتے ہوئے میں نے چاچے عبداللہ کی طرف دیکھا اور دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے پشت کے بل زمین پر گر رہا تھا۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔ یکایک کمرے کے اندر سے جمیلہ کی بلند چیخ سنائی دی۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی اور صحن کی طرف لپکی۔ اس نے باپ کو گولی کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ وہ چیخی "چھوڑ دو مجھے... ہائے میرے ابا جی۔"

میں نے ایک بازو میں اس کی گردن جکڑ لی اور فائر کرتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ جمیلہ خود کو چھڑانے کے لیے مسلسل مچل رہی تھی۔ لیکن اسے چھوڑنا موت کے منہ میں دھکیلنا تھا۔ میں جانتا تھا وہ صحن کی طرف بھاگے گی اور صحن میں پہنچتے ہی گولی کا نشانہ بن جائے گی... دوسری طرف سلجوق نے اب ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں پوزیشن لے لی تھی اور دونوں ہاتھوں میں پستول تھامے تاک تاک کر نشانے لگا رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ مکان پر حملہ آور ہونے والوں کی طاقت ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے پاس برسٹ مارنے والی رائفلیں بھی تھیں اور وہ تعداد میں بھی ہم سے کہیں زیادہ تھے۔ ہماری ایک گولی کے جواب میں وہ کم از کم چار گولیاں چلا رہے تھے۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ اگلے ایک دو منٹ میں وہ لوگ مکان کے اندر ہوں گے۔ میں نے سلجوق سے کہا "سلجوق میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

وہ غالباً خود بھی مجھ سے یہی بات کہنے والا تھا۔ ہم اکا دکا فائر کرتے ہوئے پیچھے ہٹے اور مکان کے عقبی کمرے میں پہنچ گئے۔ اس نیم تاریک کمرے کی ایک کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ کھڑکی میں جالی یا گرل وغیرہ نہیں تھی۔ سلجوق کھڑکی پر چڑھ کر باہر گلی میں

کو گیا۔ میں نے روتی مچلتی جمیلہ کو اس کے حوالے کیا۔ اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر کھڑکی سے نکال لیا۔ اس دوران طفیل بھی کاؤنٹر فائر کرتا ہوا کھڑکی تک پہنچ گیا۔ چند لمحے بعد ہم دونوں بھی کھڑکی سے باہر تھے۔ طفیل نے گلی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔
"وہ ہماری گاڑی کھڑی ہے۔"

سلجوق جمیلہ کو لے کر گاڑی کی طرف دوڑا۔ طفیل اس کے پیچھے تھا۔ حملہ آور اب مکان میں داخل ہو چکے تھے۔ میں برآمدے میں ان کے بیچ لے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان کی پیش قدمی روکنے کے لیے آخری دو فائر کیے اور پلٹ کر گاڑی کی طرف بھاگا لیکن ابھی میں نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ بغلی گلی سے ایک شخص بلائے ناگہانی کی طرح برآمد ہوا۔ وہ قلی قطب تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میری ٹانگوں کی طرف فائر کیا لیکن ریوالور سے "ٹرچ" کی آواز نکل کر رہ گئی۔ ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ اب میری باری تھی لیکن میری رائفل بھی خالی تھی۔ میں نے رائفل تھما کر اس کی کنپٹی پر رسید کرنا چاہی۔ وہ جھکا اور رائفل اس کے سر سے ٹکراتی ہوئی نکل گئی۔ میں جانتا تھا اب وہ ٹکر رسید کرے گا۔ وہی ٹکر جس کی طوفانی ضرب میں ایک مرتبہ نواب کی حویلی میں سہہ چکا تھا۔ یہ ایک خونخوار ہوئی دھت اکسر کا ٹکر تھا اور اسے مزید تباہ کن بنانے کے لیے قلی قطب اس پر آہنی خول چڑھائے رہتا تھا۔ میرا اندیشہ درست نکلا۔ قلی قطب کا ٹکر بجلی کی رفتار سے میرے جبڑے کی طرف آیا۔ میں نے بروقت حرکت کر کے اپنا چہرا بچایا اور "فوراً سے پہلے" رائفل کی دوسری ضرب قلی کے سر پر لگائی۔ یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی اور قلی قطب لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ میرے لیے چند ساعت کی مہلت کافی تھی۔ میں دوڑ کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ طفیل اس وقت تک جیپ کو حرکت میں لا چکا تھا۔ جیپ نے رفتار پکڑی اور بڑی سڑک کی طرف لپکتی چلی گئی۔ جمیلہ رو رہی تھی "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے ابا جی کے پاس جانے دو۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔"

میں نے سرگوشی میں سلجوق سے پوچھا۔ "کیا ہوا چاچے کا؟"

اس نے مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بچ نہیں سکا۔ اس کے گرنے کا انداز بے حد تشویشناک تھا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ جان لیوا طور پر زخمی ہوا ہے۔

زبردست فائرنگ کی آواز نے علاقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ موقعۂ واردات سے ایک فرلانگ دور تک لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے "موقعے" کی طرف جا رہے تھے۔ طفیل اب ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے تنگ گلیوں کے اندر سے جیپ بڑی مہارت اور تیزی کے ساتھ گزاری۔ دو منٹ کے اندر ہم بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ جونہی ہم بڑی سڑک پر آئے ایک گلی سے زرد رنگ کی ہلمین کار چرچراتی ہوئی برآمد ہوئی اور ہمارے پیچھے لگ گئی۔ میں اس کار کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ نواب شہریار کی حویلی کی کار تھی۔ غالباً نواب کے منیجر کے استعمال میں رہتی تھی۔ کار لہراتی ہوئی بڑی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھی۔ کار والوں کے ارادے خطرناک نظر آتے تھے۔ طفیل کی 222 رائفل نشست پر پڑی تھی۔ گولیوں والی بیلٹ بھی ساتھ تھی۔ میں نے بارہ بور کی رائفل رکھ کر یہ رائفل اٹھالی۔ جیپ بڑی طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ ایسے میں عقب میں آنے والی ہلمین کے ٹائر کو نشانہ بنانا آسان نہیں تھا۔ یوں بھی سڑک پر ہلمین کے علاوہ بہت سی گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ میری چلائی ہوئی گولی کسی کے لیے بھی پیامِ اجل بن سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فائر اسی وقت کروں گا جب اس کے سوا چارہ نہ رہے گا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی بہت جلد بارونق علاقے پیچھے چھوڑ گئیں۔ جونہی ہلمین کار کو کھلا راستہ ملا اس کی رفتار بڑھ گئی۔ طفیل نے بھی اسپیڈو میٹر کی سوئی ۱۰۰ کے ہندسے پر پہنچا دی۔ دس پندرہ منٹ تک یہ دوڑ جاری رہی پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائر ہلمین کار سے ہی ہو رہے تھے۔ جواباً سلجوق اور میں نے بھی فائر شروع کر دیے۔ اچانک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا طفیل چلایا۔ "پٹرول ختم ہو رہا ہے جی۔"

میں نے انجن کی آواز پر غور کیا تو طفیل کی اطلاع کی صداقت ثابت ہو گئی۔ انجن گڑگڑا رہا تھا۔ پھر تین چار دھچکے لے کر انجن خاموش ہو گیا۔ جیپ اپنے ہلکورے کی وجہ سے کچھ دور تک بڑھی چلی گئی پھر رک گئی۔ ہلمین کار بھی محفوظ دوری پر ٹھہر گئی۔ خالف میں آنے والے شاید اسے ہماری کوئی چال سمجھ رہے تھے۔ حیدرآباد سے آنے والی برانچ روڈ پر جہاں ہمارا سفر رکا تھا، مضافاتی علاقہ تھا۔ ایک نہری تنگ پل پار کرنے کے فوراً بعد ہم رک گئے تھے۔ ہلمین پل کے دوسرے سرے پر قدرے عقب میں کھڑی تھی۔ نہر کے دونوں اطراف دور دور تک چاول اور گنے کے کھیت نظر آ رہے تھے۔

جیپ کے ساتھ ڈیزل کا فالتو ٹینک موجود تھا۔ سلجوق نے طفیل کو ہدایت کی کہ وہ فوراً تیل بھرے۔ جمیلہ کو درختوں کے خلا میں لٹا دیا گیا۔ سلجوق اور میں نے پل کی پختہ منڈیر کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ جیپ ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ خالف سمت سے آنے والے اس کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بھی جیپ کی طرف فائر کرنے لگے۔ ہم نے جوابی فائر کیے۔ اس دوران دو اور تیز رفتار گاڑیاں بھی پل پر پہنچ گئیں۔ یہ گاڑیاں افراد سے لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک وہی ڈاٹسن تھی جو ہم نے بدھ کی رات اپنے تعاقب میں دیکھی تھی اور جس میں چادر پوش افراد تھے۔ گاڑیوں سے اترنے والے افراد نے پل کے دونوں طرف درختوں کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ وہ آپس میں بلند آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر ایک اور گاڑی موقعے پر پہنچ گئی۔

یہ جگوار تھی۔ یہ نواب شہریار کی ذاتی گاڑی تھی اور یقینی بات تھی کہ اس وقت گاڑی میں وہ بھی موجود ہو گا۔ جگوار پل کے قریب نہیں آئی بلکہ دور ہی درختوں کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ یک بیک مجھے اندازہ ہونے لگا کہ حالات ہمارے لیے شدید سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں۔ گاڑی میں ڈیزل بھرنے کے بعد طفیل بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب آٹھ ایم ایم رائفل تھی۔ یہ رائفل وہ جیپ میں سے لے کر آیا تھا۔ گولیوں سے بھرے ہوئے دو پلاسٹک بیگ بھی ساتھ تھے۔ رائفل اور اس کا ایمونیشن دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ اس اسلحے کے ساتھ ہم آدھ پون گھنٹا نواب کے کارندوں کو روک سکتے تھے۔ میں نے سلجوق سے کہا "سلجوق تم جمیلہ کو لے کر نکلو۔ ہم انہیں یہاں پل پر روکتے ہیں۔"

سلجوق نے کہا "نہیں، میں تمہیں اکیلا پھنسا کر نہیں جاؤں گا۔"

"تم فلمی ہیرو نہ بنو" میں نے پھنکار کر کہا "اور نہ ہی تمہیں اپنی بہادری ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس لڑکی کی جان بچا سکتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ تم نکل جاؤ یہاں سے، ورنہ ہم سب کا انجام ایک جیسا ہو گا۔"

سلجوق چند لمحے مجھے گھور کر دیکھتا رہا پھر بولا "اور تم!"

میں نے کہا "یہ پکی سڑک ہے۔ امید ہے کہ جلدی پولیس ادھر یہاں پہنچ جائے گی اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہم کھیتوں میں گھس کر نکلنے کی کوشش کریں گے۔"

طفیل نے بھی جذباتی لہجے میں سلجوق سے کہا "آپ نکل جائیں جی یہاں سے۔ بی بی کی جان بچائیں۔"

سلجوق کا چہرا بتا رہا تھا کہ جمیلہ کی زندگی بچانے کی خواہش اس کے دل میں بھی زور مار رہی ہے.... جمیلہ — جو اس کی محبت تھی۔ جسے پانے کے لیے وہ ایک زمانے سے ترس رہا تھا۔ وہ اسے کھو چکا تھا لیکن گردشِ دوراں نے اسے ایک اور موقع دیا تھا کہ وہ اپنے آنسو پونچھ سکے۔ وہ برستی گولیوں میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔ پھر اس نے الوداعی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ جذباتی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور جیپ کی طرف بھاگا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا کہ تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں۔ وہ جھکا اور پوری رفتار سے بھاگتا ہوا جیپ میں پہنچ گیا۔ جونہی جیپ حرکت میں آئی۔ پل کے دوسرے سرے پر کھڑی گاڑیاں بھی حرکت میں آ گئیں۔ میں نے آٹھ ایم ایم رائفل طفیل کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ یہ برسٹ اڑانے والی رائفل تھی۔ میں نے کامل سکون کے ساتھ انتظار کیا۔ جونہی دو اگلی گاڑیاں پل پر پہنچیں۔ میں نے فائر کھول دیا۔ توقع کے عین مطابق اگلی گاڑی کے ٹائر برسٹ ہو گئے۔ وہ ڈگمگائی، تیز رفتار پکڑ چکی تھی۔ ایک دم بے قابو ہوئی اور پل کے آہنی جنگلے سے جا ٹکرائی۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں کے لیے راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ رک گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے نہر کا وہ مختصر پل میدانِ جنگ بن گیا۔ دونوں طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ سلجوق کی جیپ گرد اڑاتی دور پہنچ چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب سلجوق نواب کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ ماہر کھلاڑی تھا۔ ایسے کھلاڑی کے لیے ایک چانس بہت ہوتا ہے... اور یہ چانس اسے مل گیا تھا۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ اگر وہ جمیلہ کو اپنانے میں کامیاب ہو گیا تو دونوں ایک خوش گوار زندگی گزار سکیں گے۔ مجھے سلجوق کی محبت میں ایک ایسی غیر مشروط شدت نظر آئی تھی جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

جیسا کہ سلجوق نے کہا تھا کہ وہ اپنی دشمنیاں اور یہ ملک چھوڑ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے اپنے لیے ڈنمارک کا ویزا لگوا رکھا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ جمیلہ کا ویزا بھی لگوا لیتا اور اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ان دونوں کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ یہ سارے خیالات دو تین سیکنڈ کے اندر میرے ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ تڑخ کی آواز آئی اور ایک برسٹ میرے سر سے چند انچ اوپر پل کی اینٹوں میں لگا۔ اینٹوں کے پرخچے اڑ کر دور تک بکھر گئے۔ اس وقت میری نگاہ اپنے دائیں رخ پر اٹھی۔ تقریباً دو سو گز دور نہر میں ایک کشتی نظر آ رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کنارے پر لگی اور اس میں سے سات آٹھ افراد تیزی سے اتر کر درختوں میں اوجھل ہو گئے۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ نہر پار کر کے آنے والے یقیناً نواب شہریار کے کارندے تھے، ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ پل ہمارے لیے ایک چھوٹا سا "واٹرلو" ثابت ہو سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ ہم فوراً گنے کے کھیتوں کی طرف پسپا ہو جائیں۔ میں نے طفیل سے کہا "طفیل! ہمیں پیچھے ہٹنا ہو گا... میں فل میگزین برسٹ ماروں گا، تم بھی مسلسل فائر کرنا۔ اس کے فوراً بعد ہم کھیت کی طرف دوڑیں گے... اوکے؟"

طفیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ایک پلاسٹک بیگ سے بھرا ہوا میگزین نکال کر رائفل میں جوڑا لیکن اس سے پہلے کہ میں فائر کرتا، انجن کے شور نے مجھے اور طفیل کو ٹھٹکا دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ گھوم کر دیکھا۔ کھیتوں کے عقب سے ایک جیپ برآمد ہوئی تھی اور ہم سے صرف بیس تیس قدم کی دوری پر رک گئی تھی۔ یہ وہی جیپ تھی جس میں پانچ دن پہلے شاہین اغوا ہوئی تھی۔ جیپ خستہ حال تھی اور اس کی چھت میں گولیوں کے سوراخ بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ جیپ کو سلجوق کا ایک کارندہ چلا رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اگلی نشست پر تجمل کنور اور زریں گل بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ سخت مصیبت میں ہیں....!

ڈرائیور کی طرف والا دروازہ کھلا اور ایک شخص نے جیپ سے نیچے اترنا چاہا۔ میں نے چلا کر اس سے کہا کہ یہاں گولی چل رہی ہے' وہ ادھر آنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ شخص ٹھٹک کر دوبارہ جیپ میں گھس گیا۔ میں اور طفیل اندھا دھند فائر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ طفیل پل سے بیس پچیس قدم پیچھے ہٹنے کے بعد رک گیا تاہم میں نے پسپائی جاری رکھی اور جیپ تک پہنچ گیا۔ جیپ نشیب میں تھی لہٰذا پل کی دوسری جانب سے ہونے والی فائرنگ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ جیپ کو کچھ اور پیچھے لے جائے۔ یہاں ایک کھیت کے درمیان کچا کوٹھا سا بنا ہوا تھا۔ کوٹھے کے عقب میں پہنچ کر جیپ بالکل محفوظ ہو گئی۔ اگر کوئی ہمارے عقب سے حملہ نہ کرتا تو اس کچے کوٹھے کی آڑ ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میرے اشارے پر طفیل بھی الٹے قدموں پیچھے ہٹتا کوٹھے کے عقب میں پہنچ گیا۔

سلجوق کے کارندے اب جیپ سے نکل آئے تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ دو کے پاس رائفلیں اور دو کے پاس ریوالور تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان لوگوں نے زریں گل اور مجتبیٰ کنور کے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے ہیں۔ میں نے مجتبیٰ کنور اور زریں گل کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھ سے کسی طرح کی جان پہچان ظاہر نہیں کی موجودہ حالات میں یہ ضروری تھا کہ ہم اپنا باہمی تعلق سلجوق کے کارندوں پر ظاہر نہ کریں۔ کم از کم اس وقت تک کہ صورت حال پوری طرح واضح نہ ہو جائے طفیل نے جیپ کے ڈرائیور سے پوچھا۔ "پربت سنگھ یہ کون لوگ ہیں؟"

پربت سنگھ جوش سے بولا۔ "مہمان ہیں نواب شہریار جنگ کے۔ اس کی دعوت پر یہاں آئے ہیں۔ راستے میں مل گئے تھے۔ ہم نے جکڑ لیا۔"

"واہ بھئی واہ" طفیل نے خوشی کا اظہار کیا۔ "لیکن تم لوگ آ کہاں سے رہے ہو؟"

"ڈیرے سے" پربت سنگھ نامی شخص نے جواب دیا۔ "سردار سلجوق نے کل رات ہی آرڈر دے دیا تھا کہ ڈیرہ چھوڑ دینا ہے۔"

"کیا مطلب۔ بالکل ہی چھوڑ رہا ہے۔" طفیل نے پوچھا۔ پربت سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا چکر ہے؟" میں نے طفیل کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھا۔

وہ مجھے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "یہ دونوں جو جیپ میں بیٹھے ہیں نواب شہریار کے دوست یا عزیز ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب نواب سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہم انہیں یرغمال بنائیں گے۔"

"کیوں نہیں جی۔ یہ کھلی جنگ ہے اور جنگ میں سب کچھ چلتا ہے۔"

وقفے وقفے سے دھماکوں کے ساتھ چند گولیاں ہمارے سروں پر سے گزریں اور قریب کے درخت میں پیوست ہو گئیں۔ یہ اچھا شگون نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نواب کے کارندے پل پار کر رہے ہیں یا پھر جن لوگوں نے کشتی پر نہر عبور کی ہے وہ ہمیں بائیں طرف سے گھیر رہے ہیں۔ میں نے اوٹ سے سر نکال کر دیکھا۔ نواب کے کارندوں نے ابھی پل پار نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ شدید مزاحمت ہی تھی۔ یہ مزاحمت وہ دونوں رائفل بردار کر رہے تھے جو ابھی چند منٹ پہلے جیپ پر یہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے ریت اور درختوں کی اوٹ میں پناہ لے رکھی تھی اور مسلسل پل کی جانب فائر کر رہے تھے۔ جیپ میں اندر والا ایک مسلح شخص اپنے ریوالور سمیت مجتبیٰ اور زریں گل کے سر پر کھڑا تھا۔ جب ہم پر بائیں طرف سے بھی فائر ہونے لگا تو مجھے اور طفیل کو فوراً رائفل سنبھالنا پڑی۔ ہم کچے کوٹھے کی دیوار کے ساتھ زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور نادیدہ حملہ آوروں کی نادیدہ فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ ہوئی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے تھری ایم ایم کے تقریباً پچاس راؤنڈ فائر کیے۔ دوسری طرف سے بھی لگاتار فائر آتے رہے۔ چند برسٹ کوٹھے کی منڈیر میں لگے اور منڈیر کا بہت سا حصہ ٹوٹ کر چھت پر آ گرا۔

ہماری بھرپور مزاحمت نے بائیں جانب سے حملہ آور ہونے والوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ فائرنگ کا زور ٹوٹ گیا ہے تو میں طفیل کو برسرِ پیکار چھوڑ کر اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا جیپ میں پہنچ گیا۔ اس وقت جیپ کے پاس سلجوق کا صرف ایک آدمی موجود تھا۔ یہ ریوالور بردار تھا اور مجتبیٰ و زریں گل کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس شخص کو زخمی یا مقتول کر کے جیپ کو مجتبیٰ اور زریں گل سمیت اڑا لے جانا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جیپ کی چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی اور کھڑکی سے صاف نظر آ رہی تھی۔ بہرحال میں کسی طرح کی جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

زریں گل حسب معمول شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے سر پر گول افغانی ٹوپی تھی اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ مجتبیٰ کنور نے بلیک جینز پر ہری گلے کا سبز سویٹر پہن رکھا تھا۔ قمیص سفید تھی اور پھولدار ٹائی لگائے ہوئے تھا۔ زریں گل کی طرح اس کے ہاتھ بھی کسی رسی نما شے سے مضبوطی کے ساتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر تازہ چوٹوں اور خراشوں کے نشانات تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ سلجوق کے ہرکاروں نے زریں گل اور مجتبیٰ کنور کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ زریں گل ایک معمولی آوارہ گرد ہے جب کہ مجتبیٰ کنور سیاسی اور حکومتی حوالے سے پاکستان کی ایک قد آور اور طاقتور شخصیت ہے۔ یہ وہ شخص تھا جس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے انڈیا کی گورنمنٹ کو بھی سو بار

سوچنا پڑتا۔ یہ "بے خبری" کا اعجاز تھا کہ چند گمنام بدمعاشوں نے اسے باندھ کر اس جیپ میں ڈال لیا تھا۔ مجتبیٰ کنور کے چہرے سے محسوس ہوا کہ وہ زریں گل کی طرح اس صورت حال سے خوفزدہ نہیں۔ ہاں وہ جھلایا ہوا ضرور نظر آ رہا تھا۔ جھلاہٹ یا غصے میں اس کی بادامی آنکھوں میں ایک فولادی سختی عود کر آتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کے تیز برمے سے اردگرد کی ہر شے کو چھید کر رکھ دے گا۔ اس وقت بھی یہی برمہ حرکت میں محسوس ہوتا تھا۔

وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "کون ہو تم لوگ اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے بھی ریوالور بردار کی موجودگی کے سبب اجنبی لہجے میں کہا۔ "تمہیں نظر نہیں آ رہا' فائرنگ ہو رہی ہے۔ یہ نواب شہریار اور اس کے کارندے ہیں۔ سارے کتے کے بچے مل کر ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"لیکن ہمارا کیا تعلق ہے تمہاری اس لڑائی سے۔ ہم نے تو اس سے پہلے نواب کو دیکھا بھی نہیں۔ ہم یہاں سیر اور شکار کے لیے آئے ہیں۔ نواب کے ایک دوست نے ہمیں نواب کا ایڈریس دیا تھا۔ بس اتنا تعلق ہے ہمارے اور نواب کے درمیان۔"

میں نے کہا۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ ہم اس وقت مشکل میں ہیں اور تمہارا نواب کے ساتھ معمولی تعلق بھی ہمارے لیے نظر انداز کرنے والی چیز نہیں۔ ہم تمہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر نواب کا گھیرا توڑنے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے' یہ نیکی کا کام ہے۔ اس میں اگر تمہاری جان بھی چلی گئی تو رائیگاں نہیں جائے گی۔ یہاں نہیں تو اگلے جہان میں تمہیں اس کا صلہ ضرور ملے گا۔"

میں نے باتوں باتوں میں مجتبیٰ اور زریں گل کو یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجتبیٰ نے بھی کسی حد تک اپنی "شانِ نزول" کی وضاحت کر دی تھی۔ اسی دوران سلجوق کے ایک کارندے کو گولی لگ گئی۔ وہ درخت کی اوٹ سے نکل کر کچے کوٹھے کی طرف دوڑا تھا۔ مگر راستے میں ہی کرا' کراہ کر اوندھے منہ گرا۔ اس کا ایک ہاتھ بے اختیار اپنے کولہے پر آیا تھا۔ جیپ کے قریب موجود ریوالور بردار نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے اس کی طرف لپکا۔ پہلے اسے اٹھانے کی کوشش کی پھر زمین پر گھسیٹتا ہوا کچے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ مجتبیٰ اور زریں کے پاس اب میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان دونوں سے کھل کر بات کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ میں نے تیزی سے کہا۔ "پوزیشن خطرناک ہے جناب! نواب کے کارندے مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں تو کریں' ورنہ دونوں طرف سے اکٹھے دس بندے یہاں ضرور پھڑک جائیں گے۔"

"لیکن جھگڑا کس بات کا ہے؟"

"جھگڑا بہت لمبا ہے۔ سلجوق نام کا ایک غنڈہ ہے یہاں۔ بدھ کے روز اس نے نواب کی بہو کو گولی مار دی ہے۔ بس اسی قتل کا بدلہ لینے کے لیے نواب نے ہلا بولا ہے۔ لیکن نواب کا اصل شکار سلجوق تو نکل گیا ہے۔ یہ لوگ جو فائرنگ کرتے نظر آ رہے ہیں' سلجوق کے چیلے چانٹے ہیں۔"

مجتبیٰ نے کہا۔ "یہ تو خاصا سنگین واقعہ محسوس ہوتا ہے۔"

فائرنگ کے دھماکوں سے قرب و جوار گونج رہے تھے۔ اردگرد کے کھیتوں میں لوگ یا تو موجود ہی نہیں تھے یا بھاگ گئے تھے۔ سچویشن ہر لحاظ سے پریشان کن تھی۔ اگر مجتبیٰ کنور اور زریں گل یہاں نہ پہنچتے تو میرے لیے یہ آسان تھا کہ کھیتوں میں گھس کر نکل جاتا۔ لیکن اب زریں گل اور مجتبیٰ بھی اس معرکہ کارزار میں آ پہنچے تھے۔ میں انہیں چھوڑ کر نکل جاتا تو وہ سلجوق کے کارندوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ مطلب یہ تھا کہ اس خونی جھڑپ میں دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی غالب رہتا ہمارے حق میں برا ہی تھا۔ نواب کے کارندے غالب رہتے تو میں مصیبت میں پھنس جاتا۔ سلجوق کے ہرکارے فتح کا جھنڈا لہراتے تو مجتبیٰ اور زریں گل کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ اس صورت حال میں بہتر یہی تھا کہ ہم اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر جیپ سمیت نکل جائیں۔ لیکن یہ اقدام بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔ اندھا دھند گولی چل رہی تھی۔ جیپ حرکت میں آتے ہی کسی فریق کی گولی ہماری طرف پرواز کر سکتی تھی۔

یہ ساری باتیں دو تین سیکنڈ کے اندر میرے ذہن میں آ گئیں۔ میری نگاہ اگنیشن میں جھولتی چابی پر جمی تھی اور میں ایک سیکنڈ کے اندر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال سکتا تھا۔ میری اور مجتبیٰ کی نگاہیں ٹکرائیں۔ میری آنکھوں نے اس کی آنکھوں سے ایک اشارہ وصول کیا۔ اگلے ہی لمحے میں جیپ کے اندر تھا اور میری رائفل گولیوں والے بیگ سمیت مجتبیٰ کی گود میں۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور ریورس گیئر لگا کر گاڑی کو بھگا دیا۔ اگر میں گاڑی روک کر پہلا گیئر لگاتا اور اسے موڑنے کی کوشش کرتا تو اس میں بہت دیر ہو جاتی۔ میں نے ریورس گیئر میں ہی ایکسیلیریٹر آخری حد تک دبا دیا۔ گاڑی چاول کے ایک کھیت میں گھسی تھی۔ وہ اچھلتی کودتی ڈگمگاتی' دوڑتی چلی گئی کئی بار تو یوں محسوس ہوا کہ الٹ جائے گی۔ انجام کار میں اسے سنبھالنے اور خطرے کی حدود سے نکالنے میں کامیاب رہا۔ کھیتوں کے درمیان ایک نیم پختہ راستے پر پہنچتے ہی میں نے گاڑی کو یو ٹرن دیا اور نہر کی مخالف سمت میں بڑھا۔

"واہ سبحان اللہ آستاد جی" زریں گل چہکا۔ "قسم خدا کا آپ نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ ورنہ ام تو سمجھا تھا بس آج کوئی نہ کوئی گولی ام سے "محبت فرما" جائے گا اور ام اپنے بندھے ہاتھوں کے ساتھ اس جیپ سے سیدھا خدا کے حضور پیش ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تمہاری چوٹی کے امکانات موجود ہیں۔"

اس سے پہلے کہ زریں گل کوئی جواب دیتا مجتبیٰ نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی چاقو وغیرہ ہے؟"

اس کا سوال معنی خیز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میری پنڈلی سے رام پوری خنجر بندھا رہتا ہے۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اپنی پنڈلی سے خنجر جدا کیا اور اس کی مدد سے مجتبیٰ کنور کی بندشیں کاٹنے لگا۔ چلتی گاڑی میں یہ کام خاصا دشوار تھا۔ بہر طور کسی نہ کسی طرح میں نے نائیلون کی رسی کاٹ ڈالی۔ مجتبیٰ کے ہاتھ کھل گئے تو اس نے زریں گل کی بندش بھی کھول دی۔ میرے ہاتھوں میں ابھی تک ہتھکڑی موجود تھی۔ ہتھکڑی کی موجودگی نے مجتبیٰ اور زریں دونوں کو حیران کیا۔

پھر زریں گل نے دیدے پھاڑ کر پوچھا۔ "استاد صیب! کیا آپ پولیس میں پکڑا گیا تھا۔"

میں نے کہا "نہیں پکڑا تو کسی اور نے تھا۔۔۔ ہاں یہ ہتھکڑی پولیس والی ہی ہے۔"

وہ دبے لہجے میں بولا۔ "استاد صیب! اس ہتھکڑی کے ساتھ ایک دم ہیرو لگتا ہے آپ۔ یہ ہتھکڑی تو زیور ہوتا ہے مرد کا۔"

مجتبیٰ نے پوچھا۔ "یہ کیا گھسر پھسر کر رہے ہو تم؟"

زریں بوکھلا کر بولا۔ "کچھ نہیں جی۔ ام استاد صیب سے تاریخ پوچھ رہا تھا۔"

جب اب موقع واردات سے زیادہ دو میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ رستہ سخت ناہموار تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی کی آمدورفت سے جگہ جگہ میب گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک جگہ رستہ بالکل مسدود ہو گیا۔ یہاں سڑک بیٹھ گئی تھی اور سڑک کی جگہ برساتی پانی کی چھوٹی سی جھیل نظر آ رہی تھی۔ ہم نے جیپ کو دھان کے کھیتوں میں سے گزارنا چاہا مگر ایک مقام پر وہ اس بری طرح پھنسی کہ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے دونوں دائیں پہیے سیم زدہ زمین میں دھنس گئے تھے۔ میں نے جتنا زور لگوایا جیپ اتنی ہی پھنستی چلی گئی۔ اب اسے وہاں سے نکالنے کے لیے کرین کی ضرورت تھی یا پھر دس بیس آدمیوں کی جو اسے اٹھا کر لے جاتے۔ یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں تھیں لہٰذا ہم نے جیپ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جیپ کی تلاشی لی تو اس میں سے ایک شاٹ گن اور بیس پچیس راؤنڈ برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک ماؤزر، ایک گراری دار چاقو اور تھوڑی سی نقدی بھی ملی۔ شارٹ گن مجتبیٰ کنور نے پکڑی۔ ماؤزر اور گراری دار چاقو زریں گل نے سنبھال لیا۔ ابھی ہم جیپ کی تلاشی ہی لے رہے تھے کہ چند دیہاتی دکھائی دیے۔ وہ کھیتوں کی منڈیر تیزی سے پھلانگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے تین چار کے ہاتھ میں چمکدار لاٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ قریب پہنچے تو ان میں سے ایک چوہدری ٹائپ شخص نے مدائی لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "آپ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "کیا یہ بتانا بہت ضروری ہے؟"

وہ بولا۔ "ہاں بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے گاؤں کی حد ہے اور ہم آپ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ آپ نے کھیت میں گاڑی دوڑا کر ہمارے ترے کھیت کا ستیاناس کر دیا ہے۔"

وہ اجڈ شخص ہم سے، ہمارے اسلحے اور ہماری شاندار جیپ سے قطعی مرعوب نہیں تھا۔ میں نے مسکرا کر کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ "چوہدری اگر زیادہ نقصان ہو گیا ہے تو ہم پیسے دے دیتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "پیسے ہمارے پاس بہت ہیں، اور ہم پردیسیوں سے پیسے لیتے بھی نہیں ہیں لیکن یہ پوچھنے کا حق تو رکھتے ہیں کہ آپ کون لوگ ہیں اور یہ کس کی گاڑی ہے۔"

ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص برہمی سے بولا۔ "چھوڑو چوہدری۔ ان لوگوں سے سیدھی طرح بات کرو۔" پھر براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو میاں! ہم کو اس گاڑی پر شک ہو رہا ہے۔ ایک ایسی ہی گاڑی پانچ چھ دن پہلے چوری ہوئی ہے۔ اخباروں میں اس واردات کی خبر بھی آ چکی ہے۔ آپ تینوں کو ہمارے ساتھ گاؤں چلنا ہو گا۔ گاڑی کے کاغذات بھی ساتھ لے چلیں۔ وہاں تھانیدار صاحب کو کاغذ دکھانے کے بعد آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"

ہماری گفتگو کے دوران ہی آٹھ دس مزید افراد موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر کھیت مزدور تھے۔ کچھ نے کسیاں کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی کھیتوں میں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے اور وہ سب کے سب تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ غالباً پاس ہی کوئی دیہہ تھا اور وہاں آناً فاناً یہ خبر پھیل گئی تھی کہ کھیتوں میں کوئی مشکوک گاڑی کھڑی ہے۔ چار پانچ منٹ کے اندر ہمارے گرد مجمع لگ گیا۔ سب لوگ مشتعل تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجتبیٰ کنور کی "تبدیلی" مدعا بیدار ہوئی وہ مشتعل لوگوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا "گھبراؤ نہیں شاہ جہاں! میرے ساتھ چلے آؤ۔ میں دیکھتا ہوں یہ لوگ ہمیں کیسے روک سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "جناب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن اس طرح بات کہیں بگڑ نہ جائے۔"

"میں ایسے لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" مجتبیٰ جاگیردارانہ لہجے میں غرایا۔ "یہ لاٹھی گولی کی زبان سمجھنے والے لوگ ہیں۔ ڈونٹ وری۔ کم آن۔"

ہماری باتوں کے دوران ہی کچھ سیٹھنے ہمارے سامنے آ گئے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اتنی آسانی سے ہمیں جانے نہیں دیں گے۔

ان کے تیور دیکھ کر مجتبیٰ ذرا سا ڈھیلا پڑا تو مجھے موقع مل گیا۔ میں نے چوہدری ٹائپ شخص کو مخاطب کر کے کہا۔ "آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں؟"

وہ خطرناک لہجے میں بولا۔ "یہ نواب شہریار صاحب کی گاڑی ہے۔ ہم نے بہت اچھی طرح پہچان لیا ہے، یہ دیکھو چھت پر ابھی تک گولیوں کے نشان ہیں۔ نواب صاحب کی بھورانی کو قتل اور بیٹی صاحبہ کو اغوا کرنے والے اسی گاڑی پر فرار ہوئے تھے۔۔۔"

میں نے دھیرج سے کہا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ یہ نواب صاحب کی گاڑی نہیں ہے اور واردات کرنے والے اس پر فرار نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہی گاڑی ہے اور پچھلے چار روز سے ہم نواب صاحب کے حکم پر اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے نہر کے کنارے ہم نے کچھ بدمعاشوں سے یہ گاڑی برآمد کی ہے۔"

چوہدری نے پوچھا۔ "یعنی تم نواب کے بندے ہو؟"

میں نے کہا۔ "بندے تو اللہ کے ہیں۔ ہاں نواب صاحب کے لیے کام ضرور کر رہے ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے یہ۔" مجمع میں سے کوئی چیخا۔ "ہم نے نواب صاحب کے بندے نیاد یکھے نہیں ہوئے۔"

کوئی دوسرا شخص چلایا۔ "پکڑو ان کو۔ جانے نہ پائیں۔"

ایک تیسری آواز آئی۔ "تھانے لے کر چلو ان کو۔"

مجمع میں ہلچل پیدا ہوئی۔ چڑھی ہوئی تیوریاں کچھ اور چڑھ گئیں۔ یک لخت پیچھے ہٹ کر میں نے پشت جیب سے لگا دی اور اپنی آٹھ ایم ایم کا سیفٹی کیچ ہٹا کر انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ "خبردار جو کسی نے قدم بڑھایا" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

اچانک کچھ فاصلے پر فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دو گاڑیاں دھول اڑاتی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھیں۔ ان پر مسلح افراد تھے۔ انہوں نے رائفلوں کے پھل کھڑکیوں میں سے نکال رکھے تھے اور ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ یہ نواب شہریار کی گاڑیاں تھیں۔ ان کے پیچھے نواب کی ذاتی جیگوار بھی چلی آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نہر کے کنارے پر ہونے والا معرکہ نواب کے کارندوں نے سر کر لیا ہے اور وہاں موجود افراد کو مار کر یا بھگا کر وہ ہمارے پیچھے آ گئے ہیں۔ ہمارے اردگرد موجود لوگوں میں سے بہت سے افراد نواب شہریار کی سرخ جیگوار کو پہچانتے تھے۔ اسے قریب آتے دیکھ کر وہ کائی کی طرح پھٹ گئے اور اطراف میں سمٹ گئے۔ جیگوار عین ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ نواب شہریار ایک باڈی گارڈ کے ہمراہ نیچے اترا اور مجھے پہچانتے ہی سیدھا میری طرف آیا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی تھی۔ باڈی گارڈ نے نواب کے تیور دیکھتے ہی اپنے ہاتھ میں پکڑی خوفناک گن کا رخ میری طرف کر لیا تھا۔ یہ ایل ایم جی قسم کی کوئی شے تھی اور اس کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ یہاں موجود تمام آتشیں اسلحے میں سے خطرناک ترین ہے۔ نواب کو میری طرف بڑھتے دیکھ کر مجتبیٰ ہم دونوں کے درمیان آ گیا۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم؟" نواب نے مجتبیٰ سے پوچھا۔

"آپ کا خیرخواہ اور دوست، میرا نام کنور احمد ہے۔" مجتبیٰ نے کہا۔

"کنور احمد" نواب نے زیرلب دہرایا اور پھر اس کا تنا ہوا چہرا ایک دم ڈھیلا پڑنے لگا۔ اس نے غور سے مجتبیٰ کو دیکھا۔ مجتبیٰ نے زریں گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا گارڈ ہے۔ میرا غیرملکی دوست بھی میرے ساتھ آیا ہے۔ دو گھنٹے پہلے تک وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ پھر کچھ بدمعاشوں سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی افراتفری میں وہ ہم سے بچھڑ گیا۔"

"کون بدمعاش۔" نواب کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"وہی جن سے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کی جھڑپ ہوئی ہے۔" مجتبیٰ نے کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اگر یہ خدا کا بندہ ہماری مدد نہ کرتا تو خیر نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بڑی ہوشیاری سے ہمیں جیپ سمیت بھگا کر یہاں لے آیا ہے۔"

نواب اب الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ بولا "ہم کچھ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو کل شام آج آنا تھا۔ ہم بہت دیر آپ کا انتظار کرتے رہے ہیں۔"

مجتبیٰ نے کہا۔ "میرا خیال ہے، ہمیں کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنی چاہیے۔"

نواب جیسے اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ اس نے مجھے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ "تم اپنی یہ رائفل ہمارے حوالے کر دو۔ ابھی ہم تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کا منشا بھی یہی تھا کہ میں رائفل سے دستبردار ہو جاؤں۔ موجودہ صورت حال میں یہ فیصلہ ایسا برا نہیں تھا ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ نواب کے کارندوں اور دیہاتیوں سمیت کم و بیش پچاس افراد ہمارے گرد موجود تھے۔ میں اپنی رائفل سے آٹھ دس بندے پار بھی کر دیتا تو ہم یہاں سے بچ کر نہیں نکل سکتے تھے۔ میں نے بڑی خوش دلی سے رائفل نواب کی طرف بڑھا دی۔ جونہی میں نے رائفل چھوڑی نواب کے دو ریوالور بردار شکروں نے گردن کے پیچھے سے میرا کالر پکڑا اور دھکیلتے ہوئے ایک گاڑی کی طرف لے چلے۔

مجتبیٰ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ زیادتی ہے نواب صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ یہ شخص جان پر کھیل کر ہماری مدد کر چکا ہے۔"

نواب نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا انہوں نے میرا کالر چھوڑ دیا، تاہم ریوالور بدستور اپنے ہاتھ میں رکھے۔ نواب نے جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "محترم کنور صاحب آپ فکرمند مت ہوئیں۔

اگر یہ بے قصور ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ہم ابھی آپ کے سامنے اس سے بات کرتے ہیں۔"

نواب مجھے اور مجتبیٰ کنور کو لے کر اپنی جیگوار میں آ بیٹھا۔ میں پچھلی نشست پر تھا دونوں ریوالور بردار رشکر میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

نواب نے مجتبیٰ سے پوچھا۔ "محترم! آپ اس شخص کو پہلے سے جانتے ہیں؟"

مجتبیٰ نے کہا۔ "نہیں۔ لیکن آپ سے ملاقات ہونے سے پہلے مجھے پختہ یقین تھا کہ یہ آپ کے جاں نثاروں میں سے ہوگا۔ جس لمحے اسے پتا چلا کہ ہم آپ کے مہمان ہیں اس نے فوراً ہماری جان بچانے کے لیے قدم اٹھایا اور جیپ میں گھس کر اسے بھگا لے آیا۔ قریباً ایک فرلانگ تک اس نے ریورس گیئر میں بڑی تیزی سے جیپ دوڑائی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ اسے اس کی حاضر دماغی پر داد دوں۔"

نواب نے کہا۔ "آپ بجا کہتے ہوں گے۔ میں آپ کو جھٹلانا نہیں چاہتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے تک یہ بندہ ہمارے دشمنوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نواب حضور! میں بے حد معذرت سے عرض کرتا ہوں کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

نواب تلخی سے بولا۔ "کیسی غلط فہمی۔ تم اس شخص کے گھر میں موجود تھے جس نے ہمیں خون کے آنسو رلائے ہیں۔ ہماری بے گناہ بہو کے لہو سے ہاتھ رنگے ہیں اور ہماری بیٹی کو اسلحے کے زور پر اغوا کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کا اشارہ اپنے ملازم عبداللہ کی طرف ہے۔"

"اور کس کی طرف ہوئیں گا۔" نواب نے بھڑک کر کہا۔ "وہی اس ساری سازش کا کرتا دھرتا تھا۔ کاش... کاش ہمارے بس میں ہوتا اور ہم اسے اتنی آسان موت مرنے نہ دیتے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے بہت جلد آپ کو عبداللہ کے قتل پر شرمندگی ہوگی۔ وہ بے گناہ تھا۔ آپ کے کارندوں نے بلاوجہ اس کے لہو میں ہاتھ رنگے ہیں۔"

"تم اسے بے گناہ نہیں کہیں گا تو اور کون کہیں گا۔ تم، سلجوخ اور عبداللہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم اور سلجوخ عبداللہ کے گھر میں موجود تھے۔ تم نے عبداللہ کے گھر میں میرے بندوں پر سیدھی فائرنگ کی ہے اور وہاں سے بھاگ نکلے۔ رفعت علی خطاب (قلی خطاب) سے تمہاری جو لڑائی ہوئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نہر کے پل پر ہم نے خود تمہیں آٹھ ایم ایم سے اپنے بندوں پر گولی چلاتے دیکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں نے گولی ضرور چلائی ہے لیکن اپنے دفاع میں۔ میری فائرنگ سے آپ کا کوئی بندہ معمولی زخمی تو شاید ہو گیا ہو لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کی جان نہیں گئی۔ جو کچھ ہوا ہے بالکل اچانک ہوا ہے۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ آپ کو صورت حال سے آگاہ کر سکتا۔"

نواب نے کہا۔ "یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم ہماری بیٹی شاہین کے ساتھ ہی سلجوخ کے ہتھے چڑھے تھے لیکن ہماری بیٹی کو سلجوخ کے اڈے پر رکھا گیا جب کہ تم یہاں عبداللہ کے گھر میں موج اڑاتے رہے۔"

"میں عبداللہ کے گھر دو دن پہلے آیا ہوں۔ اس سے پہلے میں بھی اڈے پر تھا۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں وہاں سلجوق کے بندوں کو زخمی کر کے بھاگا تھا۔ بھاگنے کی کوشش میں میرا ساتھی زخمی ہوا ہے اور غالباً ابھی تک اڈے پر ہی ہے۔" نواب چند لمحے کے لیے ڈھیلا پڑتا نظر آیا۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ اصل حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ شاید ابھی تک آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کی صاحبزادی سلجوق کے چنگل سے کیسے نکلی ہیں۔"

"کیسے نکلی ہے؟" نواب نے چڑ کر کہا۔ "اسے چھوڑا ہے سلجوخ نے۔ اسے چھوڑنا پڑا ہے۔ وہ جانتا تھا پولیس رفتہ رفتہ اس کی بو سونگھ رہی ہے۔ اس کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور وہ کتے کی موت مرنے والا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہت معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں، یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ سلجوق کے اڈے تک پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ مجھے توقع ہے کہ اگر سلجوق کے کسی بندے نے غداری نہیں کی تو آپ ابھی تک اس کے ٹھکانے کا کھوج نہیں لگا سکے ہوں گے۔"

نواب کے چہرے پر ابھرنے والے تاثر سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی ابھی اس سرنگ تک نہیں پہنچ سکا جہاں سلجوق نے ہمیں بند رکھا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور میرا اندازہ ہے کہ آپ نے ابھی تک اپنی صاحبزادی سے بھی بات نہیں کی۔ ان سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیسے رہا ہوئیں اور قید کے دوران میرا اور میرے ساتھی کا سلوک ان کے ساتھ کیسا رہا؟"

نواب اس بار بھی خاموش رہا لیکن اس کا چہرا بتا رہا تھا کہ میرا یہ قیافہ بھی درست ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ ابھی تک شاہین سے ملا ہی نہیں تھا۔ وہ جب سے رہا ہوئی تھی اس نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا تھا اور رو دھو رہی تھی نواب بھی اپنی بھاگ دوڑ کے سبب اس سے ملاقات کے لیے زنان خانے میں نہیں جا سکا تھا۔ میں نے کہا۔ "نواب صاحب! آپ اپنی صاحب زادی سے ملیں گے تو وہ آپ کو بتائیں گی کہ ہم آپ کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں اور وہ یہ بھی بتائیں گی تو ملاقات اور انعامات کو ابھی رہیں گے۔ سچائی چھپانے سے چھپ نہیں سکتی ہے۔ سلجوق اپنے اڈے پر ہمیں ہر رعایت دینے کو تیار تھا لیکن ہمارا مقصد نواب زادی صاحبہ کی عزت اور جان بچانا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہم نے خود کو خطرے

میں ڈال کر سلجوق کے چنگل سے نکلنا چاہا۔ اس کوشش میں میرا ساتھی شدید زخمی ہوا۔ اور میں گولیوں کی بوچھاڑ میں بچ نکلا۔"

نواب بولا۔ "اگر یہ سچ ہے جو تم بتا رہے ہو تو پھر تمہیں سیدھا ہمارے پاس حویلی پہنچنا چاہیے تھا۔"

"میں حویلی پہنچنے کے لیے ہی نکلا تھا لیکن سلجوق کے کارندے میرے تعاقب میں تھے۔ مجھے راستے میں اس ڈاکٹر کا ڈرائیور ملا جو آپ کی بیگم صاحبہ کا علاج کر رہا ہے۔ اس سے لفٹ لے کر میں شہر پہنچا۔ یہاں سلجوق کے کارندوں نے میرے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا میں ایک مشاعرے میں جا گھسا۔ اس مشاعرے میں میری نگاہ عبداللہ پر پڑ گئی۔ میں جانتا تھا کہ عبداللہ بے قصور ہے اور آپ کا وفادار بھی۔ چھوٹے نواب نے اس کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہے لیکن اس ستم کے باوجود بھی وہ آپ کو مالک اور خود کو نوکر ہی سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ سلجوق سے نواب زادی کی جان اور عزت بچانے میں میری مدد کرے گا۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کے پاس حویلی پہنچنے کا رسک نہ لوں اور عبداللہ سے مدد طلب کروں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا۔ عبداللہ نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اس نے اور اس کی بیٹی نے نواب زادی صاحبہ کو سلجوق کی حبسِ بے جا سے چھڑانے میں اہم کردار ادا کیا۔"

نواب شہریار کو میری بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن وہ اپنے تاثرات پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ میں نے اس آٹھ ایم ایم رائفل کی طرف اشارہ کیا جو میں نے ابھی ابھی نواب شہریار کے حوالے کی تھی اور کہا۔ "یہ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ پل پر میں سیدھی فائرنگ کرتا تو آپ کے پانچ چھ بندے ضرور پار ہو جاتے لیکن میں نے گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنایا اور یہی کوشش کی کہ میرے ہاتھوں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اسی دوران سلجوق کے کارندے آپ کے ان دونوں مہمانوں کو پکڑ کر لے آئے۔ وہ انہیں نقصان پہنچانا چاہ رہے تھے، میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔"

نواب کے چہرے کے تناؤ میں نمایاں کمی واقع ہو چکی تھی۔ مجتبیٰ کنور نے کہا۔ "ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ میری رائے ہے کہ باقی باتیں ہمیں حویلی میں جا کر کرنی چاہئیں۔"

نواب نے گاڑی سے باہر دیکھا۔ تماشائیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ جیسے سب کے سب سوالیہ نظروں سے نواب کو دیکھ رہے تھے اور بے زبان خاموشی کہہ رہے تھے۔ "ہم آپ کے نمک خوار ہیں صاحب اگر یہ بندہ آپ کا دشمن ہے تو ہمیں حکم دیں کہ ہم اس کی تکہ بوٹی کر کے اپنے تبرک بنائیں اور کرپانوں کو لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو سکیں۔" نواب کے ماتھے پر چند لمحے کے لیے سوچ کی لکیریں ابھریں پھر اس نے اپنے کارندوں سے کہا کہ وہ گاڑیوں میں بیٹھیں اور موقعے سے روانہ ہوں۔

نواب کی ہدایت پر گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔ ان میں نواب کی وہ مسروقہ لینڈ کروزر بھی تھی جس میں ہم یہاں پہنچے تھے اور جس کی چھت میں گولیوں کے سوراخ صاف دکھائی دیتے تھے۔ یہ سوراخ اس وقت بنے تھے جب سلجوق نے نواب زادی شاہین کو بازار سے اغوا کیا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرنے میں ہچکچا رہی تھی۔ سلجوق نے اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک ہوائی برسٹ مارا تھا۔ یہ برسٹ لینڈ کروزر کی چھت توڑتا ہوا نکل گیا تھا۔

ہماری گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوئیں تو لوگ اطراف میں سمٹنے لگے۔ نیم پختہ راستے پر پہنچ کر گاڑیوں کی رفتار نسبتاً تیز ہو گئی۔ جیگوار سب سے آگے تھی۔ غالباً اس لیے کہ گرد و غبار سے محفوظ رہے۔ قریباً ایک میل آگے آنے کے بعد گاڑیاں ٹھہر گئیں۔ ہم ایک سہ راہے پر کھڑے تھے۔ نواب شہریار نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور کھوجنے والی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر پہلو بدل کر بولا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم ہمارے خیر خواہ اور وفادار رہو۔ اگر ہم اس دعوے کا ثبوت مانگیں تو دے سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں جناب! آپ کون سا ثبوت مانگ رہے ہیں۔ آپ میری نشاندہی پر سلجوق کے ڈیرے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔" نواب نے کہا۔

"تو چلیے میں حاضر ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ آپ کے پاس مناسب مقدار میں نفری اور اسلحہ موجود ہے۔ سلجوق کا وہ ڈیرہ اچھی خاصی فوجی چھاؤنی ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں ہم کمبل کو چھوڑیں لیکن کمبل ہمیں نہ چھوڑے۔"

"ہم بلا سوچے سمجھے بات کرنے کے عادی نہیں ہیں۔" نواب نے قدرے تلخی سے کہا۔ "تم دیکھ رہے ہو تیس آدمی اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ موبائل فون پر مزید طلب کیے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ یہاں سے گاڑی بائیں طرف موڑ لیجیے۔"

نواب کی ہدایت پر باوردی ڈرائیور نے جیگوار بائیں طرف موڑی اس کے ساتھ ہی پورا کانوائے بائیں طرف مڑ گیا۔ یہ راستہ آگے جا کر اس کشادہ سڑک سے مل جاتا تھا جو قلعہ کی طرف جاتی تھی۔ قریباً دس میل کا سفر تھا۔ گاڑیوں نے حتی الامکان تیز رفتاری سے سفر شروع کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سلجوق کے کارندے آج صبح سرنگ میں واقع اپنا ڈیرہ خالی کر چکے ہیں لہٰذا نواب کے اسلحہ برداروں سے ان کے تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ (سلجوق کا ڈیرہ خالی ہو جانے کے بارے میں اطلاع مجھے تھوڑی دیر پہلے سلجوق کے کارندوں سے ہی ملی تھی)

میرا تجزیہ درست نکلا۔ جب ہم خفیہ راستے کے ذریعے سرنگ میں پہنچے تو وہ بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ آثار سے صاف ظاہر تھا کہ کم از کم بارہ گھنٹے پیشتر یہاں کے مکین نقل مکانی کر چکے ہیں۔ میرو

نے نواب شہریار کو سرنگ کی دیواروں پر گولیوں کے نشانات دکھائے اور وہ جگہ بھی دکھائی جہاں ہمیں اور شاہین کو قید رکھا گیا تھا۔ پانچ چھ روز پہلے رہائی کے قریب جہاں بوٹا سنگھ زخمی ہو کر گرا تھا ابھی تک وہاں خون کے دھبے موجود تھے۔ نواب کے کارندوں نے ٹارچوں کی روشنی میں بڑے غور سے ان دھبوں کو دیکھا۔ مجتبیٰ کنور اور زریں گل بھی سرنگ کے اندر داخل ہونے والوں میں شامل تھے۔ زریں گل بہت بے تاب نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی ہے وہ مجھ سے "تابڑ توڑ" باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن حالات کے سبب خاموش رہنے پر مجبور ہے۔

سرنگ کا خالی ملنا نواب کے لیے تکلیف دہ تھا۔ وہ اپنے اندر ہی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ قلعے سے ہم حویلی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک سہ پہر کے ڈھائی بج چکے تھے۔

○☆○

منظر نواب شہریار کی عالی شان حویلی کا تھا۔ ہم سب مہمان خانے کی وسیع و عریض نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اس نشست گاہ میں آ چکا تھا۔ اس نشست گاہ کے خوبصورت منقش محرابی دروازے اور فانوس دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ آج بھی یہ نشست گاہ حسب سابق جگمگا رہی تھی اور باوردی خدام دبیز قالینوں پر بے آواز چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے لیکن اس منظر میں ایک سوگواری سی داخل ہو چکی تھی۔ اور یہ سوگواری صرف اسی منظر میں نہیں تھی پوری حویلی پر اسی کیفیت کا سایہ تھا۔ میری نگاہ میں وہ منظر گھوم گیا جب چند روز پہلے یہ حویلی جگمگ نور بنی ہوئی شادیانوں سے گونج رہی تھی اور ایک لڑکی سرتاپا سونے اور مخمل سے دمکتی ہوئی "بہو" بن کر یہاں داخل ہوئی تھی۔ اب وہ لڑکی منوں مٹی تلے سو چکی تھی اور اسے بیاہ کر لانے والے کونے کھدروں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ مجھے لگا کہ یہ نحوست اور سوگواری اسی ایک ستم گر لمحے کی دین ہے جب چھوٹے نواب نے غریب عبداللہ کی بیٹی کو اپنی ہوس کا چارہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

زریں گل نشست گاہ میں میرے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اس سے باتیں شروع کیں لیکن گفتگو کا انداز ایسا ہی تھا جیسے دو اجنبی مخاطب ہوں۔ کوئی ہمارے تاثرات دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ جان پہچان بڑھانے کے لیے ہم ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بڑی خاص قسم کی گفتگو تھی۔

میں نے زریں گل سے پوچھا۔ "کیا حالات ہیں لاہور میں؟"

وہ بولا۔ "سب ٹھیک ہے استاد صیب! پر آپ نے انتظار بہت کرایا۔ مجتبیٰ صاحب اور کیا نام ہے اس فرنگی کے بچے کا... کلارک صاحب دونوں بہت پریشان تھا۔ ان دونوں کو خطرہ تھا کہ حیدرآباد جا کر آپ کہیں قابو آ گیا ہے۔ لیکن ام جانتا ہے امارا استاد صیب اتنی جلدی قابو آنے والا نہیں۔ جو فرانس پی ایل کے قابو نہیں آیا وہ کسی اور کے قابو کیا آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ مذاق کا موقع نہیں ہے زریں گل۔ مجھے بتاؤ کہ نواب شہریار کے مہمان کیسے بن گئے تم؟"

"ام کہاں مہمان ہے جی۔ مہمان تو مجتبیٰ صاحب اور وہ... ہے۔ ام تو مجتبیٰ صاحب کا باڈی گارڈ بن کر آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلو باڈی گارڈ ہی سہی۔ لیکن مجتبیٰ اور کلارک کی میزبانی کیسے قبول کی نواب شہریار نے؟"

زریں گل نے اپنی گول ٹوپی کے نیچے شہادت کی انگلی ڈال کر سر کھجایا اور بولا۔ "بڑا مزیدار چکر ہے جی۔ ادھر حیدرآباد میں خفیہ میلہ لگتا ہے۔ زبردست کھیل تماشا ہوتا ہے اس میں۔"

"خفیہ میلہ" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ یہ میلہ کوئی تین چار سال سے لگ رہا ہے۔ اس میں ریچھ اور کتوں کو لڑانے والا لوگ جمع ہوتا ہے۔ بڑی شرطیں لگتی ہیں۔"

"لیکن تمہیں اس بات کا پتا کیسے چلا؟"

"پتا چلانے والا مجتبیٰ صاحب جو ہے۔" زریں گل نے جواب دیا۔ "مجتبیٰ صاحب کا ہاتھ بہت لمبا ہے۔ وہ ہر بات کا پتا چلا لیتا اور اس کا نظر بہت دور تک کام کرتا ہے۔ ادھر لاہور میں وہ کافی آپ کی رپورٹ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنے طور پر کوشش شروع کر دیا۔ اسی دوران اسے پتا چلا کہ ملتان کا ایک زمیندار ... رشتہ داروں سے ملنے کے بہانے حیدرآباد گیا ہوا ہے۔ ... حیدرآباد شہر میں کسی خفیہ جگہ پر ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے ہیں اور وہاں لاکھوں روپے کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ مجتبیٰ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ تمام مقابلے جن بڑے لوگوں کی نگرانی ہوتا ہے ان میں سے ایک کا نام نواب شہریار بھی ہے۔ مجتبیٰ صاحب کو فوراً راستہ مل گیا۔ اس نے نواب شہریار سے رابطہ کیا۔

اس نے نواب شہریار کو اپنا اصل نام اور حیثیت نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا کہ وہ ایک بڑا زمیندار ہے اور اپنے ایک غیر ملکی دوست کے ساتھ "مقابلے" دیکھنا چاہتا ہے۔ بھارتی سفارت خانے کے ایک افسر نے ہی مجتبیٰ کی ضمانت بھی دے دیا۔ یوں مجتبیٰ صاحب مجھے اور مسٹر جی کلارک صاحب کو لے کر ادھر آ گیا۔ مجتبیٰ صاحب اور کلارک صاحب نے جھوٹے ناموں سے سفر کیا۔ مسٹر جی کلارک صاحب کا نام وہی ہے جو پشاور میں تھا یعنی البرٹ فورڈ۔ مجتبیٰ صاحب نے کنور احمد کے نام سے سفر کیا ہے۔"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ راستے میں مجتبیٰ نے اپنے جس غیر ملکی ساتھی کا ذکر کیا ہے وہ جی کلارک ہی ہے۔ مجتبیٰ نے نواب شہریار کو بتایا تھا کہ حیدرآباد آتے ہوئے اس کا ایک غیر ملکی ساتھی ... ہے۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے زریں گل سے پوچھا کہ کلارک صاحب اب کہاں ہیں۔ جواب میں زریں گل نے سرگوشیوں میں جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ مجتبیٰ، کلارک اور زریں گل ایک ٹیکسی پر سوار ہو کر حیدرآباد سے نواب کی حویلی

لیے جا رہے تھے۔ شہر سے بیس بائیس میل دور آنے کے بعد ان کی مڈبھیڑ سلجوق کے کارندوں سے ہو گئی۔ یہ وہی کارندے تھے جو اپنا قلعے والا ڈیرہ چھوڑ کر کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل ہو رہے تھے۔ انہوں نے ٹیکسی کو صرف نقدی اور گھڑیاں وغیرہ لوٹنے کے لیے روکا تھا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ ٹیکسی میں سوار افراد نواب شہریار کے مہمان ہیں تو ان کی نیت بدل گئی۔ انہوں نے مسٹر جی کلارک کے سر سے بندوق کی نال لگا دی اور ان تینوں کو ٹیکسی سے اتار کر اپنی لینڈ کروزر میں اٹھا لیا۔ اس موقع پر مجتبیٰ کنور نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور اس گن مین پر جھپٹ پڑا جس نے جی کلارک کو نشانے پر لے رکھا تھا۔ دوسری طرف زریں گل نے بھی ایک شخص کو دو تین رسید کر کے جیپ سے باہر پھینک دیا۔ قریباً ایک منٹ تک جیپ میں زبردست کشمکش ہوئی۔ اس کشمکش کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ مسٹر جی کلارک کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ مجتبیٰ اور زریں گل کو سلجوق کے کارندوں نے دوبارہ دبوچ لیا۔ مجتبیٰ سلجوق کے کارندوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا اور وہ غالب آ جانے کے باوجود مجتبیٰ سے سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے عین ممکن تھا کہ مجتبیٰ انہیں ہراساں کر کے کوئی رعایت حاصل کر لیتا مگر اسی دوران حملہ آوروں کا ایک گراں ڈیل ساتھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے دلیری کا مظاہرہ کر کے زریں گل کے ساتھ ساتھ مجتبیٰ کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے۔ بعد ازاں یہی شخص انہیں لے کر اس پل پر آ گیا جہاں ہمارے اور نواب کے کارندوں کے درمیان فائرنگ ہو رہی تھی۔

جس دوران میں اور زریں گل سرگوشیوں میں مصروف تھے نواب شہریار جنگ اور مجتبیٰ کنور اس مسئلے پر غور کرتے رہے تھے کہ مسٹر جی کلارک کو کیسے تلاش کیا جائے۔ ہماری سرگوشیاں ختم ہونے تک نواب شہریار نے تین تلاشی پارٹیاں ترتیب دیں اور خود بھی مجتبیٰ کنور کے ہمراہ مسٹر جی کلارک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جہاں مسٹر کلارک کی گمشدگی کا واقعہ رونما ہوا وہ مقام نواب کی زمینوں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پورا علاقہ اور علاقے کا ہر مکین نواب کے کارندوں کا دیکھا بھالا تھا۔ امید تھی کہ وہ لوگ جلد ہی مسٹر کلارک کو ڈھونڈ نکالیں گے۔

توقع کے مطابق اسی رات دس گیارہ بجے کے لگ بھگ مسٹر جی کلارک کو ایک خانقاہ میں تلاش کر لیا گیا۔ اسے خانقاہ کے تنگ و تاریک حجرے میں پناہ دینے والا ایک اپاہج بھک منگا تھا۔ یہ ایک دلچسپ تضاد تھا۔ ایک ارب پتی کی مدد ایک کنگال اپاہج نے کی تھی۔ [illegible] کہتے ہیں۔ اس کارخانۂ قدرت میں ہر شے کا چاہے وہ کتنی بھی حقیر ہو اپنا ایک جواز اور اہمیت ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے مجھے نواب کی حویلی میں ہی گزارنے۔ صبح سویرے میں نے اپنی ہتھکڑی سے بھی مکمل طور پر نجات حاصل کر لی تھی۔ نواب کی ہدایت پر ایک ماہر قفل ساز نے ہتھکڑی کے قفل کھول دیے تھے۔

میری رہائش مہمان خانے ہی کے ایک حصے میں تھی۔ میں سرونٹ کوارٹر سے مہمان خانے میں آ گیا تھا۔ "ہوسٹیلیٹی" میں یہ تبدیلی اس امر کی نشاندہی کرتی تھی کہ نواب شہریار تھوڑا بہت میری کاوشوں کا معترف ضرور ہو گیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے شاہین سے بھی بات کر لی ہو اور اس نے بتایا ہو کہ عرصۂ قید و بند کے دوران ہمارا سلوک اس سے کیا رہا ہے۔

مجھے بوٹا سنگھ کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ سلجوق کے کارندے اسے قلعے سے اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ وہ شدید زخمی تھا اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ یہ سوچ کر میں دل گرفتہ ہو گیا کہ صفدر کے بعد اب بوٹا سنگھ بھی مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔

اگلے روز معلوم ہوا کہ نواب فیروز جنگ، مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کہیں جا رہے ہیں۔ دو چم چم کرتی کاریں پورچ میں کھڑی تھیں اور ان کے باوردی ڈرائیور گاڑی میں بیٹھنے کے لیے اشارے کے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر بعد نواب فیروز جنگ پورچ میں نظر آیا۔ اس نے نیلی جینز پر بند گلے کا سرخ سوئٹر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں جوگر تھے۔ اسے دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ شخص چند ہی روز پہلے رنڈوا ہوا ہے اور اس نے اپنی نوبیاہتا بیوی کو شادی کے صرف چار روز بعد لحد میں اتارا ہے۔ وہ بالکل نارمل نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ مجتبیٰ اور کلارک کے علاوہ چار اجنبی افراد تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مجتبیٰ اور کلارک کی طرح وہ بھی اس حویلی میں مہمان ہیں اور کہیں سیر سپاٹے کے لیے جا رہے ہیں۔

میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجتبیٰ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں اسے سلام کیا۔ وہ بولا۔ "چلو یار۔ تمہیں بھی تماشا دکھا لائیں۔"

مجتبیٰ کی اس پیشکش پر نواب فیروز کی پیشانی پر ناگواری کی لکیر ابھری لیکن فوراً غائب ہو گئی۔ وہ خوشدلی سے بولا۔ "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ آ جاؤ تم بھی۔"

میں نے رسمی طور پر انکار کیا لیکن پھر مجتبیٰ کے کہنے پر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مجتبیٰ کے باڈی گارڈ کی حیثیت سے زریں گل بھی اس گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ زریں گل نے میرے کان کے نزدیک سرگوشی کی۔ "ریچھ اور کتوں کا تماشا دیکھنے کے لیے جا رہا ہے ام سب۔"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی حویلی سے روانہ ہوئیں اور نیم پختہ راستے پر آ گئیں اس وقت دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں کافی دور جانا ہو گا لیکن بمشکل دو ڈھائی میل کا فاصلہ طے کر کے گاڑیاں ایک کچی چار دیواری تک پہنچ گئیں...... بھوسے اور گارے سے بنی ہوئی اس چار دیواری نے کم و بیش چار ایکڑ زمین کا احاطہ کر رکھا تھا۔ چار دیواری کا پھاٹک لکڑی کا تھا اور اس

پھاٹک کے نزدیک جگہ بہت سی گاڑیاں تانگے اور شکرم وغیرہ کھڑی نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ سواری کے بہت سے گھوڑے اور خچر وغیرہ بھی ادھر اُدھر درختوں سے بندھے ہوئے تھے۔ پھاٹک کے نزدیک چہل پہل نظر آرہی تھی۔ میں نے بڑے بڑے سنہری بالوں والے ایک مداری کو دیکھا جو اپنے خونخوار ریچھ کے ساتھ ایک بیل گاڑی سے اتر رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب ہی مجھے ایک ریچھ اور چند کتے نظر آئے۔ درختوں سے گھری ہوئی اس ویران سنسان جگہ پر یہ چہل پہل معنی خیز تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ چار دیواری نواب شہریار کے گھوڑی پال مربع کا ایک حصہ تھی اور پچھلے دو برس سے ریچھ اور کتوں کے مقابلے اسی چار دیواری میں ہو رہے تھے۔

ہماری گاڑیاں چوبی پھاٹک سے گزر کر اندر داخل ہوئیں تو ایک وسیع منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک دائرے کی شکل میں بے شمار دیہاتی تماشائی بیٹھے تھے اور تماشا شروع ہونے کے منتظر تھے۔ ایک جانب چند شامیانے لگے تھے اور ان کے نیچے صوفوں اور پُرتکلف نشستوں پر علاقے کے معززین اور مہمان وغیرہ تشریف فرما تھے۔ معزز حضرات کے باڈی گارڈز اور ملازمین وغیرہ بھی ایک شامیانے کے نیچے موجود تھے اور تماشا شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں گاڑیاں ہمیں تماشا گاہ میں چھوڑ کر واپس چلی گئیں۔ ہم شامیانوں کے نیچے پہنچے تو چھوٹے نواب فیروز جنگ کے استقبال کے لیے بہت سے لوگ نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب فیروز جنگ اور اس کے مہمانوں کے لیے مخصوص نشستیں خالی پڑی تھیں۔ انہوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ میں اور زریں گل اس شامیانے کے نیچے جا کھڑے ہوئے جو ملازمین کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں غالباً نواب فیروز جنگ کا انتظار ہی ہو رہا تھا۔ اسے پہنچے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ مقابلے شروع ہوگئے۔ ہمارے بالکل پاس سے ہمالیہ کا ایک بھورا ریچھ اپنے مداری کے ساتھ گزرا۔ اس کا نمبر ریچھ کے پیچھے ہی پیچھے ایک "ڈاگ ٹیمر" اپنے تین عدد بل ٹیریر کتوں کے ساتھ میدان میں پہنچا۔ مجمعے میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میدان کے بیچوں بیچ کھڑے ایک شخص نے قواعد و ضوابط کا اعلان کیا۔ اس نے بتایا کہ ہر مقابلہ تین منٹ کا ہوگا۔ اس مقابلے میں دو کتے اور ایک ریچھ حصہ لے گا۔ اگر کتے تین منٹ کے اندر ریچھ کو گرانے اور تین منٹ تک دبائے رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ جیت جائیں گے۔ دوسری صورت میں ریچھ فاتح قرار پائے گا۔ اگر مقابلے کے دوران کسی جانور کا مالک اپنے جانور کو مقابلے سے دست بردار کرانا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔

ریچھ اور کتے میدان میں پہنچ چکے تھے۔ تماشائیوں نے ان کی جسامت اور چال ڈھال دیکھ کر شرطیں بدنی شروع کر دیں۔ کچھ تماشائی پہلے ہی شرطیں لگا چکے تھے اور اپنے اپنے جانور کے حق میں نعرے تحسین بلند کر رہے تھے۔ جو بھورا ریچھ میدان میں تھا اسے شہزادے کے نام سے پکارا جا رہا تھا۔ اسی طرح کتوں کے بھی نام تھے مثلاً چیتا، جاڑا وغیرہ۔ منصف کے فرائض انجام دینے والے شخص نے وسل دی تو جانوروں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ تربیت یافتہ ٹیریر لپکتے ہوئے ریچھ پر آئے۔ ریچھ پچھلے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اور اس نے دو ہتھڑ مار کر کتوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ تماشائیوں نے نعرے بلند کیے۔ دوسری مرتبہ کتوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور دائیں بائیں سے ریچھ پر حملہ آور ہوئے۔ ایک کتا جو قد آور تھا بندر کی طرح اپنے پچھلے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور اس نے ریچھ کی نازک تھوتھنی پر دانت آزمانے کی کوشش کی۔ ریچھ نے بڑی تیزی اور اعتماد سے اپنی تھوتھنی بچائی۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ یہ اس کے جسم کا نازک ترین حصہ ہے اور اس کے قابو میں آنے کا مطلب یقینی شکست ہے۔ دوسرے کتے نے ریچھ کے پیٹ میں دانت گاڑ دیے تھے اور وہاں سے پاؤ بھر بوٹی نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ درد سے بے تاب ہو کر ریچھ نے حلق سے عجیب سی آواز نکالی اور ایک بھرپور پنجہ کتے کے تھوبڑے پر رسید کیا۔ یہ ضرب کاری ثابت ہوئی اور کتے کے چہرے کے ایک حصے سے سرخ سرخ کھال نچ گئی۔ کتا پیچھے ہٹا۔ چند لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ شدید زخمی ہونے کے بعد وہ لڑائی سے دستبردار ہو گیا ہے۔ لیکن پھر وہ گولی کی طرح ریچھ پر آیا اور اس سے لپٹ گیا۔ لڑائی ایک دم ہی شدت اختیار کر گئی۔ تینوں جانور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر زمین پر گر گئے اور ان کی چیخ پکار تماشائیوں کی چیخ پکار میں ڈوبنے ابھرنے لگی۔ ریچھ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تربیت یافتہ ٹیریر اس کی ہر کوشش ناکام بنا رہے تھے۔ آخر تین منٹ پورے ہوئے۔ منصف نے وسل بجا کر ریچھ کی شکست کا اعلان کر دیا۔ وہ لوگ جو کتوں کی جیت کے خواہش مند تھے اٹھ کر اچھلنے کودنے لگے۔ ریچھ اور دونوں کتوں کے جسموں سے جا بجا خون رس رہا تھا۔

میں اور زریں گل حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ قریب کھڑے ایک شخص کو اندازہ ہوا کہ ہم یہ تماشا پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ وہ رضاکارانہ طور پر ہمارے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس نے بتایا کہ یہ مقابلے ہر سال ہوتے ہیں اور بڑے جوش و خروش سے ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ ان مقابلوں کی دھوم دھام کچھ کم ہے کیونکہ چند ہی روز پہلے نواب شہریار صاحب کی بہو قتل ہوئی ہے۔ اس نے ہماری اطلاع کے لیے یہ بھی بتایا کہ نواب صاحب اس مرتبہ ان مقابلوں کے مہمانِ خصوصی تھے لیکن وہ خود نہیں آسکے۔ ان کی نمائندگی ان کا بیٹا نواب فیروز جنگ کر رہا ہے۔ قریب کھڑے ایک شخص نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "یار لیکن نواب صاحب تو بہت بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ کل میں نے انہیں مسجد میں دیکھا تھا۔ سر پر باقاعدہ رومال باندھے نماز پڑھ رہے

تھے۔ لگتا ہے کہ بہو کی موت سے بہت اثر لیا ہے انہوں نے۔"

"کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی۔" پہلے شخص نے کہا۔ "بہو قتل ہوئی اور بیٹی اغوا ہوئی۔ جو اغوا ہوئی وہ بھی سمجھو قتل ہی ہوگئی۔ جو لڑکی تین راتیں بدمعاشوں کے قبضے میں رہے اس کے ساتھ کیا نہیں ہو جاتا۔"

میں نے بھی دیکھا تھا کہ نواب شہریار جنگ کی شیو بڑھی ہوئی ہے۔ مجھے شک گزرا تھا کہ کہیں وہ داڑھی تو نہیں رکھنے لگا۔ اب ان افراد کی باتیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاید اس نے واقعی داڑھی رکھ لی ہو۔ ہماری گفتگو کے دوران ہی اگلا مقابلہ شروع ہوگیا۔ اس دفعہ خونخوار بل ٹیریئر کتوں کا مدمقابل سیاہ رنگ کا ہمالیائی ریچھ تھا۔ تماشائیوں کے ردعمل سے اندازہ ہوا کہ یہ ریچھ کافی مقبول ہے اور اس کے جیتنے کے روشن امکانات ہیں۔ ریچھ کے ٹرینر نے کتوں کے مقابل پہنچ کر ریچھ کی نتھ اتار دی اور پیچھے ہٹ گیا۔ بپھرے ہوئے دونوں کتے خوفناک آوازوں میں غراتے اور پلک جھپکنے میں ریچھ پر جا پڑے۔ ریچھ نے پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو کر ان کا مقابلہ کیا۔ اس ریچھ کا انداز دفاعی کی بجائے جارحانہ تھا۔ ہمارے "رضاکار گائیڈ" نے بتایا کہ یہ ریچھ نواب شہریار کے ایک بھتیجے کی ملکیت ہے۔ اس ریچھ کا نام "سانول" ہے اور جو دونوں کتے سانول کے مقابل ہیں وہ ایک مقامی جاگیردار تاور خان کے ہیں۔ پچھلے سال بھی ان کتوں اور سانول کے درمیان زوردار مقابلہ ہوا تھا لیکن پھر منصفی پر جھگڑا ہوگیا۔ دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ گولی چلتے چلتے رہ گئی۔ اس مرتبہ پھر ان میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ لوگوں نے ہزاروں روپے کی شرطیں لگا رکھی ہیں۔

یہ مقابلہ واقعی کانٹے کا ثابت ہوا۔ دو ڈھائی منٹ تک فریقوں نے پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے پر حملہ کیا اور لہو لہان ہوگئے۔ پھر اچانک ایک کتے نے ریچھ کی پچھلی ٹانگ کھینچی اور اسے پشت کے بل گرا دیا۔ دونوں کتے بڑی مہارت سے اس پر سوار ہوگئے اور اسے بے بس کر دیا۔ منصف بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ تماشائیوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ آثار سے لگ رہا تھا کہ کتے جیت جائیں گے۔ مگر پھر ایک کتے کا رکھوالا تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے کتے کی ٹانگ پکڑ کر اسے ریچھ کے اوپر سے کھینچنے لگا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اپنے کتوں کو اس مقابلے سے دستبردار کروانا چاہتا ہے۔ کم از کم ہماری سمجھ میں تو فوری طور پر یہ بات نہیں آئی کہ وہ اپنی فتح کو شکست میں کیوں بدلنا چاہ رہا ہے۔ لیکن جب کتا ریچھ سے جدا ہوا تو پتا چلا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ ریچھ کا پنجہ لگنے سے اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور آنتیں زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔ یہ ایک اذیت ناک نظارہ تھا مگر موقع پر موجود لوگوں میں سے بہت کم نے اس دہشت ناکی کو محسوس کیا۔ جن لوگوں نے ریچھ کے حق میں شرطیں لگا رکھی تھیں وہ اٹھ کر ناچنے کودنے لگے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ریچھ اب فاتحانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی خطرناک آنکھوں سے حاضرین کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں زمانہ قدیم کے کسی رومن اکھاڑے کے کنارے کھڑا ہوں۔ اکھاڑے میں ایک شکست خوردہ زخمی جسم آخری ہچکیاں لے رہا ہے اور اس کے گرد کھڑے لوگ اس کے منہ میں پانی ٹپکانے کی بجائے وفورِ مسرت میں رقص کر رہے ہیں۔

ریچھ اور زندہ کتے کے ساتھ ساتھ مُردہ کتے کو بھی اکھاڑے سے ہٹا لیا گیا۔ جہاں جہاں مُردہ کتے کا لہو گرا تھا وہاں وہاں مٹی ڈال دی گئی۔ کچھ دیر مجمع میں ہلچل موجود رہی پھر لوگ ایک نئے مقابلے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ نگاہوں میں وہی ذوق و شوق نظر آنے لگا جو تھوڑی دیر پہلے تھا۔ یہ تیسرا مقابلہ جاری ہی تھا جب میں نے دو افراد کو بڑی تیزی سے شامیانوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان دونوں افراد کا تعلق نواب شہریار جنگ کی حویلی سے تھا۔ مجھے شک گزرا کہ یہ لوگ چھوٹے نواب فیروز جنگ کے لیے کوئی اطلاع لے کر آئے ہیں۔ میری نگاہوں نے ان دونوں افراد کا تعاقب کیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق یہ افراد نواب فیروز کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ایک نے جھک کر نواب کے کان میں کوئی بات کہی۔ نواب کا چہرا متغیر ہوگیا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ کچھ دیر نواب اور اس کے مہمانوں میں کھسر پھسر ہوئی پھر وہ سب لوگ شامیانے سے نکل کر پھاٹک کی طرف بڑھ گئے۔ مجھے اور زریں گل کو بھی اپنی جگہ چھوڑنا پڑی۔ حویلی کی دونوں گاڑیاں پھاٹک کے عین سامنے لائی جا چکی تھیں۔ ہم ان میں سوار ہوئے اور تیز رفتاری سے حویلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ اندازہ تو ہمیں پہلے ہی ہو چکا تھا کہ حویلی سے کوئی تشویشناک خبر آئی ہے' راستے میں یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ خبر کس کے متعلق ہے۔ نواب شہریار جنگ حویلی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک ٹیوب ویل پر گیا تھا' وہاں سے واپس آرہا تھا کہ کھیتوں میں چھپے ہوئے کچھ افراد نے اسے زخمی کر دیا تھا۔

دونوں گاڑیاں حویلی جانے کی بجائے سیدھا موقعہ واردات پر گئیں۔ یہ جگہ حویلی کی بیرونی چار دیواری سے قریباً تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہاں ایک ٹیوب ویل تھا۔ آٹھ دس کچے پکے مکانات تھے اور ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ ٹیوب ویل سے ایک دس بارہ فٹ چوڑا کچا راستہ حویلی کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کی دونوں جانب گنے اور چارے کے کھیت تھے۔ واردات اسی راستے کے ایک خم پر ہوئی تھی۔ یہاں کسی گاڑی کے پہیوں کے نشانات تھے۔ ایک جگہ تھوڑا سا خون گرا ہوا تھا۔ خون کے پاس ہی چابیوں کا ایک گچھا پڑا تھا۔ کچی زمین پر موجود نشانات دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں چند افراد کے درمیان جدوجہد بھی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی تھی۔ نواب فیروز کو سیدھا حویلی جانا چاہیے تھا تاکہ وہ مضروب باپ کی خیریت دریافت کرتا۔ اس کی بجائے وہ یہاں جائے وقوعہ پر آگیا تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ نواب

فیروز جنگ اور حویلی کے کارندے مسلسل کانا پھوسی کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم پر انکشاف ہوا کہ یہ واردات ہماری اطلاع سے زیادہ سنگین ہے۔ نواب شہریار جنگ صرف زخمی نہیں ہوا تھا' غائب بھی تھا۔ ابھی تو وہ پون گھنٹا پہلے کھیتوں میں چھپے ہوئے تین مسلح افراد نے اس پر حملہ کیا تھا اور وہ ایک کار میں بٹھا کر لے گئے تھے۔

یہ حیرت انگیز خبر تھی۔ مجرم جو کوئی بھی تھے انہوں نے غیر معمولی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک طرح سے وہ نواب شہریار جنگ کے گھر میں گھس کر اسے اٹھا لے گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ نواب فیملی کے ستارے آناً فاناً گردش میں آ گئے ہیں۔ پہلے اس کی بہو قتل ہوئی' پھر بیٹی اغوا ہوئی اور اب وہ خود غائب تھا۔ میرا دھیان سیدھا سلجوق کی طرف گیا۔ ایسی دلیری اور بے خوفی کا مظاہرہ ایک سکہ بند ڈکیت اور مفرور کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ مگر یہ بات بھی سوچنے کی تھی کہ اگر یہ کام سلجوق نے کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟ وہ گمشدہ ٹرک یا نوادرات والے چکر میں نہیں تھا۔ اس کی دشمنی نواب شہریار کی فیملی سے تھی اور وہ بھی اس لیے کہ نواب کے انگلینڈ پلٹ بیٹے نے اس لڑکی کو برباد کیا تھا جو سلجوق کے دل و دماغ کی بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ اب سلجوق اس لڑکی کا بدلہ نواب کی بہو اور اس کی بیٹی سے لے چکا تھا۔ وہ لڑکی یعنی جمیلہ بھی سلجوق کو مل چکی تھی۔ وہ ہر طرح فائدے میں رہا تھا۔ پھر اسے پلٹ کر آنے اور نواب شہریار کے اغوا جیسا خطرناک ترین کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نواب کے اغوا کی خبر ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ تاہم آثار بتا رہے تھے کہ یہ ایک دھماکہ خیز اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے والی خبر ثابت ہوگی۔ پورے ضلع کی پولیس حرکت میں آ جائے گی اور لمبی چوڑی پکڑ دھکڑ ہوگی۔ موقع پر ہونے والی گفتگو سے پتا چلا کہ نواب حویلی سے یہاں پیدل پہنچا تھا۔ غالباً وہ چہل قدمی کرنے کے موڈ میں تھا۔ اکثر ایک باڈی گارڈ اس کے ساتھ رہتا تھا لیکن واردات کے وقت باڈی گارڈ موجود نہیں تھا۔ ٹیوب ویل کے قریب واقع مسجد ایک عرصے سے بند پڑی تھی۔ دراصل مسجد کے امام صاحب کا نواب کے کارندوں سے جھگڑا ہوا تھا اور وہ مسجد چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ دو روز پہلے نواب کے کارندے نواب کے حکم پر امام صاحب کو ڈھونڈ لائے تھے اور انہوں نے مسجد کھولی تھی۔ آج نواب امام صاحب سے ملنے اور مسجد دیکھنے ہی یہاں ٹیوب ویل پر آیا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹا مسجد میں رہا۔ پھر ٹیوب ویل پر آ گیا۔ وہاں اپنے کارندوں سے کچھ دیر باتیں کیں' پھر پیدل ہی حویلی کی طرف چل دیا۔ نواب کے اغوا کا چشم دید گواہ مسجد کا نوجوان مؤذن اصغر علی تھا۔ وہ ایک بلب فٹ کرنے مسجد کے چھوٹے سے مینار پر چڑھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تین افراد نواب شہریار سے کھینچا تانی کر رہے ہیں اور اسے رائفل کے بٹ مار رہے ہیں۔ وہ مینار کے اوپر ہی سے چیخنے لگا اور ٹیوب ویل پر موجود افراد کو بتانے لگا کہ نواب صاحب کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ٹیوب ویل پر موجود افراد لاٹھیاں لے کر موقعے کی طرف دوڑے لیکن ان کے پہنچنے تک حملہ آور نواب کو گاڑی میں ڈال کر فرار ہو چکے تھے۔

جس وقت ہم موقعے پر پہنچے ہیں پچیس افراد وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد مقامی پولیس کے اہلکار بھی ہانپتے کانپتے ہوئے موقعہ پر پہنچ گئے۔ نواب فیروز جنگ ان پر گرجنے برسنے لگا۔ اہلکار جیسے آئے تھے ویسے ہی سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر نواب شہریار کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ نواب فیروز نے اپنے کارندوں کو کچھ ہدایات دیں اور خود بھی گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

○☆○

اگلے چوبیس گھنٹوں میں نواب کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ حویلی کے ایک ٹیلی فون کو اس امید پر ہر گھڑی فارغ رکھا جا رہا تھا کہ شاید نواب کو اغوا کرنے والے "اہلِ خانہ" سے رابطہ قائم کریں۔ معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر ڈی آئی جی بنفسِ نفیس حویلی میں ڈیرا ڈال چکا تھا اور کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ مقامی پولیس کے علاوہ نواب کے کارندے بھی درجنوں گاڑیوں پر سوار نواب کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ پولیس کا زیادہ تر نزلہ ان لوگوں پر گر رہا تھا جن کا کسی بھی حوالے سے سلجوق کے ساتھ تعلق ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً ایک ایسے حجام کو بھی گرفتار کر لیا گیا جس نے تین چار ماہ پہلے ایک مرتبہ سلجوق کی شیو بنائی تھی۔ بہت سے بے گناہ لوگ گرفتاریوں کے ڈر سے روپوش بھی ہو گئے تھے اور یوں انہوں نے بے گناہی کے باوجود اپنی بدبختی پر مہر لگا دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس پورے علاقے کو خوف و ہراس کے عفریت نے اپنے سیاہ پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔

وہ ایک سیاہ اور سرد رات تھی۔ میں حویلی کے مہمان خانے میں اپنے آرام دہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ نسواری کمبل میرے پیٹ تک کھینچا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ قمیص کی بغلی جیب میں تھا اور انگلیاں اس مڑے تڑے کنگن کو چھو رہی تھیں جو چند روز پہلے جمیلہ نے بڑی نفرت کے ساتھ کوڑے کے ڈبے میں پھینکا تھا اور میں نے بڑی احتیاط سے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ یہ کنگن ایک نہایت اہم اور سنسنی خیز راز کا امین تھا۔ وہ راز جو اس حویلی کی بوجھل دیواروں میں کہیں اسرار کی چادر اوڑھے محو خواب تھا۔ وہ دفینہ جو چند ماہ پہلے چنے پل والی حویلی سے نکالا گیا تھا اور جس کے ایک چھوٹے سے حصے نے ہی کلارک اور بھٹی جیسے بے پرواہ لوگوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ پورے کا پورا اس حویلی میں موجود تھا۔ میری انگلیوں سے چھوتا ہوا نقرئی کنگن اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ دفینہ اس حویلی میں موجود ہے یا حویلی کے مکین جانتے ہیں کہ وہ کہاں رکھا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے سے باہر کھڑکی کے پاس کوئی موجود ہے۔ میں چند سیکنڈ تک بستر پر ہی لیٹا سن گن لیتا رہا پھر لوٹ لگا کر بستر سے اترا اور رکوع کے بل چل کر باتھ روم میں گھس گیا۔ میرے پاؤں ننگے تھے کمرے کے قالین پر تو ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوا لیکن باتھ روم کے فرش پر پہنچتے ہی تلوے سنسنا اٹھے۔ یہ باتھ روم دو کمروں سے اٹیچ تھا۔ دوسرا کمرا خالی پڑا تھا میں نے دروازہ کھولا اور دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں گہری تاریکی تھی۔ تاہم باتھ روم کی لائٹ نے مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ دکھا دیا۔ میری توقع کے مطابق یہ دروازہ باہر سے مقفل نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بہ آہستگی راہداری میں آگیا۔ راہداری میں آتے ہی میرا یہ احساس قوی ہو گیا کہ میرے کمرے کے آس پاس کوئی شخص پراسرار نقل و حرکت کر رہا ہے۔ میرے اعصاب تن گئے ہتھیار کے طور پر رام پوری خنجر میری پنڈلی کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ میں تیزی سے گھوم کر کھڑکیوں کی طرف آیا۔ اس طویل راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا اور دونوں جانب کمروں کے دروازے تھے۔ راہداری کی مدھم روشنی میں میں نے ایک ملازمہ کو دیکھا۔ وہ میرے کمرے کے دروازے کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور کی ہول میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ اس کا جوان گداز جسم ایک دھاری دار ریشمی قمیص میں پھنسا ہوا تھا۔ کمر پتلی اور شانے پرکشش تھے۔ میں نے اسے ملازمہ کہا ہے۔ دراصل وہ جس دھاری دار قمیص میں تھی وہ یہاں کی خادماؤں کا مخصوص لباس تھا۔ ملازمہ کے قریب ہی قالین پر ایک ٹرے رکھی تھی۔ اس میں چائے کے خالی برتن تھے۔ غالباً وہ کسی کمرے سے خالی برتن لے کر یہاں سے گزر رہی تھی کہ مناسب موقع جان کر اس نے تاکا جھانکی شروع کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ اپنے عقب میں میری موجودگی محسوس کر کے وہ پلٹتی، میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ ویسے تو اس اچانک افتاد پر حیران ہونا ہی تھا۔ میں بھی ششدر رہ گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی اور چیخ کے بعد منہ کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر پوری توجہ سے اس کی صورت دیکھی۔ یہ چہرا میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ارجمند بانو کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو "ترفینے" کے فراق میں ہلکان ہو رہے تھے اور ارجمند بانو تو "گمشدہ ترک" کے عشق میں اس حد تک جا چکی تھی کہ مخبوط الحواس ہو چکی تھی۔ یعنی رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی۔ مجھے یاد تھا فرید کوٹ میں اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ ترک تک پہنچنے کی دوڑ میں سب سے آگے رہنے کے لئے اس نے ایک مکروہ صورت شخص کے سامنے اپنے حسن کے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ لیکن یہ سودا اس کے لئے مہنگا ہی ثابت ہوا تھا اس سے پہلے کہ ارجمند بانو کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ترک عشرت فارم کی چار دیواری سے بھاپ بن کر اڑ گیا تھا اور آج تک ناپید تھا۔

یہ سارے خیالات ایک لمحے کے اندر میرے ذہن سے گزرے۔ میرا ایک ہاتھ بدستور ارجمند کی نرم و ملائم زلفوں میں الجھا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ارجمند کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹانگ سے دھکیل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ عمل بمشکل دو سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں نے جھک کر اپنی پنڈلی سے خوف ناک خنجر کھینچا اور بڑی محبت سے ارجمند کی نرم و نازک شہ رگ پر رکھ دیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اور آنکھوں میں خوف ٹھاٹھیں مار رہا تھا "تم باز نہیں آئے ارجمند مرزا، آلو کی پٹھی۔" میں نے دانت پیس کر کہا "ورنہ عید قربان سے پہلے ہی قربانیاں شروع ہو جائیں گی۔"

اس نے خوف کے مارے اپنا سانس تک روک لیا جیسے ڈر رہی ہو کر سانس کی آمد و رفت کی سرسراہٹ کو بھی آواز قرار دے کر میں اس کی گردن پر تکبیر نہ پھیر دوں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ حواس میں آگئی ہے اور چیخنے چلانے کی حماقت نہیں کرے گی تو میں نے خنجر والا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹا کر دروازہ کھولا اور ٹرے اندر کھینچ کر دروازہ مقفل کر لیا۔

ارجمند بانو نے اپنے خوف پر بڑی تیزی سے قابو پایا اور دوم سے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی "اف گاڈ! تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔"

میں نے کہا "میں تمہاری "جان" سے بالکل متفق ہوں اسے نکل ہی جانا چاہئے تھا۔ تم ایک شریف آدمی کے کمرے میں تاک جھانک کرتے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو اور مجھے سو فیصد یقین ہے، اس تاک جھانک کے محرکات نہایت سنگین نوعیت کے ہوں گے۔"

وہ بولی "محرکات بھی میں بتا دوں گی۔ پہلے اس منحوس شے کو اپنی ٹانگ سے لگاؤ۔" اس کا اشارہ میرے خنجر کی طرف تھا۔

میں نے کہا "جب تک تم انسان کی بچی بن کر بیٹھی رہو گی تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ لیکن انسان کی بچی تو تم ہو ہی نہیں ورنہ اس حال تک کیوں پہنچتیں۔ سکون سے کسی گھر کی رانی بن کر بیٹھتیں اور چھوٹے چھوٹے راجا پیدا کرتیں۔ تم کوئی بے چین روح ہو جو سائیں عالی کے کندھے پر چڑھ کر قریہ قریہ گھوم رہی ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ میں نے تمہیں آخری بار فرید کوٹ والے ڈاک بنگلے میں دیکھا تھا۔ تمہاری حالت تم دار سے بدتر ہو رہی تھی اور سوتے جاگتے تمہیں "ترک" کے خواب نظر آتے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ تم جلد ہی پاگل ہونے والی ہو لیکن اب تم ملازمہ کے بھیس میں یہاں دندنا رہی ہو۔ میں تمہارے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عین ممکن ہے کہ ابھی تم ملازمہ سے ارجمند کا روپ دھار لو اور میری شہ رگ سے چمٹ جاؤ۔ لہٰذا دست بستہ

عرض کرتا ہوں کہ یہ خنجر تسلی کی غرض سے میرے ہاتھ ہی میں رہنے دیجئے اور اگر اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہیں تو بتایئے۔"

وہ بڑے نارمل انداز میں مسکرائی اور بولی "اپنے سوال کا جواب تو تم نے خود ہی ڈھونڈ لیا ہے۔ میں سائیں جی کے کندھے پر سوار ہو کر یہاں آئی ہوں۔ وہ جہاں جائیں گے میں خود بخود وہاں پہنچ جاؤں گی۔ وہ جو کہیں گے میں کروں گی۔ اور پتا ہے انہوں نے کیا کرنے کو کہا ہے؟" اس کی آنکھوں میں ایکدم ہی تخیلی سی کیفیت نمودار ہو گئی "انہوں نے کہا ہے کہ میں ہر گھڑی تمہارے ساتھ رہوں۔ تمہاری خدمت کروں۔ جیسے ایک خدمت گار بیوی اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ تمہیں یاد ہی ہو گا سائیں جی نے اس بارے میں کیا کہا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں وہ الفاظ دہرا سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "بہت مہربانی بڑی نوازش۔ الفاظ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ اگر میں اس کو خدمت بھول کر تم میری کوئی خدمت نہ کرو تو تمہیں یہاں سے چلتا کرنے کے لئے مجھے تمہاری خدمت میں کیا عرض کرنا ہو گا۔"

وہ اٹھلا کے بولی "یہ لازمی سروس ہے۔ میرے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی۔ تم اس سے بھاگنا چاہو بھی تو نہیں بھاگ سکتے ہو کیونکہ سائیں جی ہر جگہ ہمارے ساتھ ہیں اور سچ کہہ رہی ہوں شاہ جان! تمہیں بھاگنا چاہئے بھی نہیں اور کچھ نہیں تو سائیں جی کا حکم سمجھ کر مجھے اپنے ساتھ رہنے دو۔ جس طرح تمہیں یہ یقین ہے کہ کل سورج مشرق سے نکلے گا مجھے یہ یقین ہے کہ سائیں جی کے حکم میں ہم دونوں کا فائدہ ہو گا۔ بے شک یہ فائدہ نظر نہیں آرہا لیکن یہ فائدہ موجود ہے۔ اس لئے کہ اس کا وعدہ اس شخص نے کیا ہے جس کا نام سائیں عالی ہے اور جو مستقبل میں جھانک سکتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ مستقبل میں جھانک سکتا ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ ترک کہاں ہے؟"

وہ بولی "سائیں عالی وہ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھتے۔ تم ایسی باتیں کر کے میرے جذبات مجروح نہ کرو۔"

میں نے پوچھا "سائیں عالی کہاں ہے؟"

وہ بولی "ہمارے آس پاس ہمارے بے حد نزدیک۔" [illegible] "تمہیں یہاں [illegible] لا دی ہے۔" [illegible] وہ صرف راستہ دکھاتے ہیں اس راستے پر چلنا مجھے خود ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا نواب صاحب کی بیگم کچھ روز سے بیمار ہیں ان کی تیمارداری و دیکھ بھال کے لئے کسی پڑھی لکھی [illegible] کی ضرورت تھی جو میڈیسن کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی ہو۔ یہ [illegible] لہٰذا میں یہاں بھرتی ہو گئی۔"

"[illegible] دن سے ہو تم یہاں؟"

اس نے انگلیوں پر حساب جوڑا "پورے بارہ دن سے۔"

"[illegible] کے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہو گا تم نے؟"

"بہت کچھ تو نہیں لیکن کچھ نہ کچھ ضرور جان لیا ہے۔" وہ ایک ادا سے کہنیوں کے بل نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے ترشے ہوئے ملائم بال ایک کندھے پر آبشار کی صورت گر رہے تھے وہ اپنی خاص خاص جسمانی خوبیوں سے پوری طرح آگاہ تھی اور اپنی حرکات و سکنات سے ان کو اجاگر کرنے کا فن جانتی تھی۔

"مثلاً کیا معلوم کیا ہے تم نے؟" میں نے دریافت کیا۔ لہجہ نرم ہی تھا۔

وہ بولی "تمہاری اس کج ادائی کو میں کیا سمجھوں۔ لہجہ دوستانہ ہے اور ہاتھ میں خنجر بھی ہے معلوم نہیں لہجہ جھوٹا ہے یا خنجر لکڑی کا ہے۔"

میں نے خنجر دوبارہ پنڈلی سے لگا لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ مدبرانہ انداز میں بولی "میں تمہارے ساتھ چلنا چاہتی ہوں اور مجھے چلنا ہے تمہارے ساتھ۔ اور جو شریک سفر ہو اسے ہمراز بھی ہونا چاہئے۔ لہٰذا میں نے جو کچھ معلوم کیا ہے وہ تمہیں بتا رہی ہوں۔" اس نے کہنیوں کے بل لیٹے لیٹے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑیں اور ذرا [illegible] لہجے میں بولی "نواب شہریار کو دور دور تلاش کیا جا رہا ہے لیکن وہ اغوا نہیں ہوا۔ اسی حویلی میں موجود ہے وہ۔"

اطلاع واقعی دھماکہ خیز تھی "تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"آواز دھیمی رکھو۔" اس نے کہا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی "میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بند ہے اسے نواب فیروز نے رسیوں کے ساتھ ایک صوفے سے جکڑا ہوا ہے۔"

"نواب فیروز نے جکڑا ہوا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہوا ہے۔ نواب شہریار کو اس کے اپنے بیٹے نے ہی اغوا کیا ہے اور اس کے پیچھے کوئی گہری سازش ہے۔"

"کیا سازش ہو سکتی ہے۔ باپ بیٹے کی تو ایک رائے تھی۔ بہت تال میل تھا دونوں میں۔"

"لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔" ارجمند نے کہا "بہو کی موت اور بیٹی کے اغوا کے بعد ایک دم نواب کی کایا پلٹ ہو گئی ہے تم نے دیکھا ہی ہو گا کہ وہ سر پر ٹوپی رکھتا تھا اور باقاعدہ نماز پڑھنے لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی معاملے میں اس نے دیانتداری سے کام لینے کی کوشش کی ہو اور اس بات پر باپ بیٹے میں شدید اختلاف ہو گیا ہو۔"

ارجمند کی باتوں میں وزن تھا۔ اس جیسی ہوشیار لڑکی کسی چھت کے نیچے ایک گھنٹہ بھی رہ جاتی تو بہت کچھ جان لیتی۔ وہ تو یہاں بارہ روز سے مقیم تھی اور کونے کھدرے سونگھ رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ "ترک" کی یہاں آمد کے بارے میں کیا جانتی ہے اور کچھ جانتی بھی ہے یا نہیں لہٰذا میں کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری ہچکچاہٹ کو تاڑ رہی تھی۔ کہنے لگی "ایک اور ایک

گیارہ ہوتے ہیں استاد جمالی اور سائیں جی یہی چاہتے ہیں کہ ہم گیارہ ہو جائیں۔"

میں نے بے زاری سے کہا "یہ گیارہ اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ تو ہمارے بچے ہوں۔"

وہ ذرا سا شرما کر بولی "نہیں گیارہ اس طرح ہو سکتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے رازدار بن جائیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو جائیں۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ارجمند اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اندر آنے والا کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ شرجیلی کنور تی کلارک یا پھر خود نواب فیروز جنگ۔ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو میں اسے اندر آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ ارجمند کہیں چھپ جاتی۔ اس مقصد کے لئے باتھ روم ہی واحد جگہ تھی۔ میں نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ میں نے خالی برتنوں والی ٹرے بیڈ کے نیچے کھسکا دی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ڈوبی گل کھڑا تھا۔ سرگوشی میں کہنے لگا "استاد صیب! ایک بڑا گڑبڑ ہو گیا ہے جب ام لاہور سے روانہ ہوا تو فریال بی بی ام سے ملا تھا۔ اس نے ام سے وعدہ لیا تھا کہ ام جہاں اور جب آپ سے ملے گا آپ کو یاد دلائے گا کہ آپ نے اپنے سینے کے درد کا دوائی باقاعدگی سے کھانا ہے اور ڈاکٹر کو چیک کراتے رہنا ہے۔ ام وعدے کا بہت پکا ہے۔ لیکن یادداشت کا بالکل کچا ہے یہاں آکر ام بھول گیا۔ ابھی ام سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو یہ بات یاد آیا۔"

میں نے کہا "بھائی میرے اتنی پھوڑی والی کون سی بات تھی۔ صبح بتا دیتے۔"

"نہیں استاد صیب پہلے یادداشت کا مجبوری تھا لیکن اب وعدہ خلافی ہوتا۔ فرشتے رات بھر ام پر لعنت بھیجتے رہتے۔"

میں نے کہا "لعنت تو وہ اب بھی بھیجتے رہیں گے کیونکہ تم نے ایک شریف آدمی کی نیند خراب کی ہے۔"

وہ بولا "لعنت لعنت میں بھی تو فرق ہوتا ہے استاد صیب۔ آپ نے فلم کھڑا چن دو کا تو دیکھا ہو گا۔۔۔ اس میں بھی ایک ایسا ہی چکر ہے۔"

"میں نے نہیں دیکھا کھڑا چن دو کا اور نہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانا۔ اگر کچھ بتانا ہی ہے تو فریال کے بارے میں بتا دو۔ اسے میرے انڈیا جانے کی خبر نہیں تھی میرے بعد وہ زیادہ خفا تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں جی! ام نے خفا ہونے ہی نہیں دیا۔ فریال بی بی کو۔ ام نے اسے بتایا کہ ساہیوال میں استاد صیب کا ایک پھوپھی فوت ہو گیا ہے۔ اسی کے سلسلے میں اچانک ساہیوال چلا گیا ہے۔ امید ہے کہ اب پھوپھی کا چہلم کر کے واپس آئے گا۔ وہ ساہیوال جانے اور آپ کی پھوپھی کا منہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ ام نے اسے سمجھایا کہ وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں جائیداد کا کوئی پھڈا ہوا ہے۔ خدشہ ہے کہ پھوپھی کو دفنانے کے فوراً بعد وہاں زبردست جھگڑا پڑ جائے گا۔ ممکن ہے کہ گولی وغیرہ چل جائے۔ معلوم نہیں اس کو ہماری باتوں کا یقین آیا یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ آپ کے غائب ہو جانے کے بارے میں اس کا پریشانی قدرے کم ہو گیا۔ ام سے کہنے لگا ام کو ایک ٹورنامنٹ کے لئے کچھ دنوں کے لئے باہر جانا پڑ رہا ہے ام کوشش کرے گا کہ جلدی وہاں سے آ جائے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب تم اپنی بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" میں نے ڈوبی کو ٹالا۔

وہ ٹلنے والا تو نہیں تھا مگر شاید اسے بھی نیند آ رہی تھی ٹل گیا۔ اس کے جاتے ہی ارجمند بانو باتھ روم میں سے نکل آئی۔ اس کا حلیہ عجیب ہو رہا تھا۔ افراتفری میں اس نے شیمپو کی بڑی بوتل خود پر گرا لی تھی اور قمیص داغدار کر لی تھی۔ کہنے لگی "سارے کپڑوں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ اُف گاڈ اس حلیے میں واپس گئی تو نواب کی بیگم سے زبردست ڈانٹ پڑے گی۔ میرا خیال ہے سر میں شیمپو تو لگ ہی گیا ہے اب نہا لوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ شڑاپ سے دوبارہ غسل خانے میں گھس گئی۔ کپڑے اتار کر اس نے دھوئے اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر مجھے تھما دیئے تاکہ میں انہیں استری کر دوں۔ خود وہ نہانے دھونے میں لگ گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے پہلے ان کپڑوں کی نمی کم کی پھر انہیں استری کر دیا۔ ان میں جامے اور زیر جامے دونوں قسم کے کپڑے شامل تھے۔ کپڑے استری کرنے کے بعد میں نے اسے تھما دیئے۔ باتھ روم کے ادھ کھلے دروازے میں سے ایک بھیگا ہوا مرمریں بازو نکلا اور کپڑے دبوچ کر شڑاپ سے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کپڑوں والی خود بھی باہر نکل آئی۔ سراپا قیامت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہی ارجمند بانو تھی جو کوٹ میں مجھے پکڑ کر لے گئی تھی اور خونخوار بلی کی طرح مجھ پر جھپٹتی رہی تھی اس نے ایک سو جانے ہوئے عذاب کے ذریعے مجھے اندھا کرنے کی کوشش کی تھی اور کئی روز تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اب وہی ارجمند ریشم کی طرح ملائم نظر آ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں شہد کی مٹھاس اور چہرے پر پھولوں کی شگفتگی تھی۔ یہ لوگ کیسے کیسے روپ بدل کر دھوکا دینے کی بازی گری کرتے ہیں۔

اس نے اپنی نیلی دھاری دار قمیص کے گریبان کے بٹن جان بوجھ کر کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جلد ہی ارجمند نے تصدیق کر دی کہ یہ گھنٹیاں یونہی نہیں بج رہی تھیں اس نے اپنی پشت میری طرف موڑی اور کہا "پلیز ذرا یہ ہک تو لگا دیں۔" عقب سے اس کا بے داغ بدن روشن کی مانند عیاں تھا۔ میں جانتا تھا وہ مجھے ہک لگانے کے لئے نہیں کہہ رہی

صرف یہ کہہ رہی ہے کہ دیکھو احمق میں نے یہ ہک کھلا چھوڑ رکھا ہے۔

"سوری" میں نے سرد لہجے میں کہا "یہ کام تم کسی اور سے کروا لینا۔"

"اوہ نو" وہ مرتعش آواز میں منمنائی "یہ کام تم ہی کو کرنا ہے۔" وہ تڑپ کر میری آغوش میں گر پڑی تھی۔ اس کے جسم کا گداز میری استقامت کو للکار رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں بے بس ہو گیا لیکن پھر میں نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

"نہیں ارجمند بانو۔ تم ہر جگہ اپنے حسن کی سوغات پیش کر کے اپنا کام نہیں نکال سکتی ہو۔"

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرا ایک دم ہی بگڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سانس کی دھونکنی کا زیروبم بھی ماند پڑ گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے موڑ کر اپنا ہک لگایا۔ دوپٹہ کھینچ کر قمیص برابر کی اور تھمے ہوئے انداز میں چلتی صوفے پر جا بیٹھی "اوکے شاہ جہاں" اس نے کہا "آئی ایگری ود یو۔ ناؤ واٹ ڈو یو وانٹ؟"

میں نے کہا "میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

وہ عجیب سے انداز میں بولی "سوچ لو"

میں نے کہا "سوچ لیا۔"

وہ بولی "غزالہ سے ملنا بھی نہیں چاہتے؟"

میں اندر سے ہل گیا "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ زیر لب مسکرائی اور ایک بار پھر کنپٹیوں کے بل نیم دراز ہو گئی "میں تمہیں غزالہ سے ملوا سکتی ہوں اور وہ سارے بیتے دن بھی لوٹا سکتی ہوں جن کی یاد تمہیں ہر پل تڑپاتی ہے۔"

میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا "میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے غزالہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور میں الہ دین کے جن کی طرح اسے تمہارے سامنے حاضر کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہی پیشکش تم سے پہلے بھی ایک شخص کر چکا ہے اس کا نام بجلی کنور ہے لیکن میں نے یہ پیشکش ٹھکرا دی تھی۔"

وہ بولی "تم جو چاہے کہو لیکن میں جانتی ہوں تم اسے بھول نہیں سکتے۔ وہ تمہاری رگ رگ میں سما چکی ہے۔ تمہارے دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے جو نام اس طرح روح میں بس جاتے ہیں وہ آسانی سے فراموش نہیں ہوتے۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھو اور کسی پیارے کی قسم کھا کر بتاؤ کیا تم ایک پل کے لئے بھی اسے بھلا سکے ہو۔ بے شک وہ اب شادی شدہ ہے۔ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ ہے مگر کیا وہ تمہارے دل کا زخم نہیں ہے؟ کیا تم اس کے لئے دن رات نہیں تڑپتے ہو؟ کیا تمہارے دل کے کسی نہاں گوشے میں یہ امید پوشیدہ نہیں کہ ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی حیلے سے وہ واپس تمہاری بانہوں میں آئے گی۔ بولو۔۔۔ اپنے دل کی گہرائی میں جھانکو اور بتاؤ کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

میرے جسم میں کرب کی ایک لہر سی دوڑنے لگی۔ یہ لہر اس بات کا ثبوت تھی کہ ارجمند کی باتوں میں کسی نہ کسی حد تک سچائی موجود ہے۔ قریب تھا کہ میں جھلاہٹ کے عالم میں ارجمند کو دھکیل کر کمرے سے نکال دیتا لیکن پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جب یہ عورت غیر مشروط طور پر میرے ساتھ تعاون کرنے پر تلی ہوئی ہے تو میں کیوں اس کی پیشکش سے فائدہ نہ اٹھاؤں۔ غزالہ کے حوالے سے نہ سہی۔ گمشدہ ٹرک کے حوالے سے سہی۔ وہ کئی روز سے اس حویلی میں موجود تھی اور یقینی بات تھی کہ اس نے اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا ہو گا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور بہت ہوشیار بھی۔ وہ کئی طریقے سے اپنا کام نکالنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا "کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟"

وہ مسکرا کر بولی "مجھے یہاں سے نکالنے کے علاوہ تم جس موضوع پر بات کرو گے میں خوش دلی سے سنوں گی۔"

میں نے کہا "ابھی تم نے کہا ہے کہ نواب شریار جنگ اس حویلی کے ایک بالائی کمرے میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے اس کے بیٹے نے چھپا رکھا ہے تو بڑی رازداری اور احتیاط سے چھپا رکھا ہو گا۔ اس کمرے تک تمہاری رسائی کیسے ہو گئی؟"

وہ بولی "تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اسے بڑی احتیاط اور رازداری کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ وہ کمرا بالائی منزل پر حویلی کے ایک ایسے حصے میں ہے جہاں پرندہ بھی پر نہیں مارتا چھوٹے نواب فیروز جنگ کے دو بہت قریبی ساتھی اس کمرے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میں نواب شریار کو کھوجتے وہاں نہیں گئی تھی۔ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ میرے مقصد سے تم بھی اچھی طرح آگاہ ہو۔"

"کیا مقصد؟"

"وہی میگاسی کے نوادرات والا۔ تمہاری طرح یہ بات میرے علم میں بھی ہے کہ میگاسی کے نوادرات اس حویلی میں موجود ہیں۔ پورے کا پورا ذخیرہ ہے یہاں۔"

میں نے کہا "لیکن تمہارا ٹارگٹ تو کچھ اور تھا۔ تم پچھلے تین چار برس سے اس دفینے کے لئے ہلکان ہو رہی ہو جو چنے پل والی حویلی سے نکلا ہے۔"

وہ اطمینان سے بولی "اس سوال کا جواب تمہارے پاس موجود ہے۔ تمہیں یہ جواب سائیں جی نے دیا تھا۔ تم نے ان سے کہا تھا کہ بجلی کنور تمہیں کسی اور چکر میں گھسیٹ رہا ہے۔ سائیں جی نے کہا تھا کہ بجلی تمہیں جس راستے پر چلا رہا ہے اس پر چلتے رہو یہ راستہ بھی اسی منزل کی طرف لے جائے گا جہاں تم جانا چاہ رہے ہو۔ مجھے بھی سائیں جی نے یہی بات کہی تھی۔ انہی کے حکم

اور تعاون سے میں اس حویلی میں پہنچی ہوں۔"

میں نے ارجمند کی آنکھوں میں جھانکا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کتنا چھپا رہی ہے۔ میری چھٹی حس نے اعلان کیا کہ وہ واقعی اس بات سے بے خبر ہے کہ سائیں عالی کی پیش گوئی سچ ثابت ہو چکی ہے اور چیتے پل والے عظیم الشان دفینے کی کڑیاں گندھارا آرٹ کے نوادرات سے جا ملی ہیں۔ ان کڑیوں کے مل جانے کا ثبوت وہ نقرئی کنگن تھا جو میری جیب میں پڑا تھا اور جیلہ کا وہ چشم کشا بیان تھا جس میں اس نے بتایا تھا کہ کچھ عرصے پہلے اس نے حویلی کے گودام میں ایک ٹرک سے کچھ صندوق اترتے دیکھے تھے۔

ارجمند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "حویلی میں اپنے قیام کے دوران میں نے نچلی منزل کا چپہ چپہ دیکھ مارا ہے۔ یہ تین چار روز پہلے کی بات ہے جب میں نے بالائی منزل کا رخ کیا۔ وہ ابر آلود تاریک رات تھی۔ نواب کی بیگم حسب معمول گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سو گئی' بارہ بجے کے لگ بھگ میں بیگم کی خواب گاہ سے نکلی اور زنان خانے کی پرپیچ سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالائی منزل پر آ گئی۔ بالائی منزل بالکل بے آباد ہے۔ تین چار کمروں کے سوا یہاں گھٹا ٹوپ تاریکی رہتی ہے۔ رات تو رات دن کے وقت بھی ملازمین ان آسیب زدہ غلام گردشوں اور بڑے بڑے ہال نما کمروں میں جاتے ہوئے کتراتے ہیں۔ ایک پنسل ٹارچ اور لیڈیز پسٹل کے علاوہ میرے پاس اور کوئی شے نہیں تھی۔ میں موٹی موٹی دیواروں میں اور اونچی چھتوں کے نیچے چکراتی پھر رہی تھی جب ایک طویل غلام گردش کے آخری سرے پر مجھے ایک کمرے میں زندگی کے آثار نظر آئے۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھی۔ یہاں دو پراسرار سائے خاموشی سے پہرہ دے رہے تھے۔ ان کی نظروں سے بچ کر میں اس نیم روشن کمرے کی پشت پر واقع ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں ایک کھڑکی کی درز سے میں نے آنکھ چپکائی اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ نواب شہریار جنہیں حیدر آباد کے طول و عرض میں تلاش کیا جا رہا ہے اپنی ہی عظیم الشان حویلی کے ایک کمرے میں بند ہیں۔ انہیں پرانی طرز کے ایک بھاری بھرکم صوفے کے ساتھ رسیوں کے ذریعے باندھا گیا تھا۔ پھر ان رسیوں کو ایک گول ستون کے گرد لپیٹ کر گرہیں دے دی گئی تھیں۔ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر نواب شہریار نیم بے ہوش پڑے تھے۔ کمرے کے گرد آلود فرش پر مجھے پاؤں کے چند نشان نظر آئے ان میں سے ایک نشان بالکل مختلف اور واضح تھا۔ میں ایک لمحے میں پہچان گئی۔ یہ نواب فیروز جنگ کے جوگر نما جوتے کا نشان تھا۔ یقینی بات تھی کہ نواب فیروز کچھ دیر پہلے تک اس کمرے میں موجود رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں سناٹے میں رہ گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک خطرناک جگہ پر کھڑی ہوں اگر کسی نے مجھے یہاں پکڑ لیا تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں خاموشی سے واپس پلٹی اور بالائی منزل کی تاریک بھول بھلیوں سے گزرتی ہوئی واپس آ گئی۔"

میں نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے نواب شہریار ابھی تک بالائی منزل کے اس کمرے میں موجود ہوگا۔"

وہ بولی "کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ نواب فیروز کے ارادے بہت خطرناک لگتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اب تک باپ کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہو اور اس کی لاش کبھی دستیاب نہ ہونے کے لئے دریا کے کسی پاٹ کی گہرائی میں دفن ہو چکی ہو۔" کچھ کہتے کہتے ارجمند ایک دم چپ ہو گئی اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر کر غائب ہو گئیں اور وہ بولی "تمہارا کیا خیال ہے شاد جمال! کہیں یہ دو گندھاری نوادرات والا چکر تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ نوادرات کی ملکیت کے سلسلے میں باپ بیٹے کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہو۔"

میں نے کہا "یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ فیروز جنگ باپ کا واحد نرینہ اولاد ہے جو چیز باپ کی ہے آخر وہ بیٹے ہی کو ملنی ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ نواب شہریار نے زندگی ہی میں بیٹے کو بہت سے اختیارات دے رکھے ہیں ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" ارجمند نے مجھے سوچ میں غرق دیکھ کر بے قراری سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ نواب شہریار جنگ اچانک مذہب کی طرف مائل ہو گیا ہے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے طور اطوار بدل گئے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ اپنے گناہ آلود ماضی کے حوالے سے بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اپنے گناہوں کی تلافی کے لئے وہ ہر حد پار کرنے پر تل جاتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ نواب شہریار جنگ نے بھی اچانک کوئی ایسا فیصلہ کر لیا ہو۔ مثلاً اس نے سوچا ہو کہ حرام کے کالے دھن سے چھٹکارا پا لے گا۔ یا وہ زمینیں جو اس نے بزور بازو اپنی جاگیر میں شامل کی ہیں واپس لوٹا دے گا۔ فیروز غیور بیٹے نے باپ کی فاتر العقلی دیکھتے ہوئے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہو۔ چونکہ وہ علی الاعلان ایسا کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا لہٰذا اس نے خفیہ کارروائی کی اور باپ کو اپنے وفادار کارندوں کے ہاتھوں اٹھوا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس واقعے کے بعد ہر شخص کا دھیان سلجوق کی طرف جائے گا اور وہ خود صاف بچ نکلے گا کیونکہ باپ کے ساتھ اس کا کوئی اختلاف کبھی منظر عام پر نہیں آیا۔"

"لیکن اگر نواب شہریار کو اٹھانے والے فیروز جنگ ہی کے کارندے تھے تو موذن نے یا مسجد کے باہر موجود دوسرے لوگوں نے انہیں کیوں نہیں پہچانا اور پھر واردات میں استعمال ہونے والی گاڑی بھی پہلے کبھی اس علاقے میں نہیں دیکھی گئی۔"

میں نے کہا "فیروز جنگ بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے ضرور باقاعدہ انتظام کیا ہوگا۔ گاڑی شہر سے لائی گئی ہوگی اور کرائے کے غنڈے بھی ڈھیروں کے حساب سے مل جاتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ عین واردات کے وقت فیروز جنگ جو دیکھو اور

مقابلے دیکھنے پہنچ گیا تھا وہ بھی پلاننگ کا ایک حصہ تھا۔ اس نے پینکڑوں افراد کے سامنے موقعۂ واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کی۔"

"اب تمہاری کیا رائے ہے؟" ارجمند نے پوچھا "ہمیں نواب شہریار کی مدد کے لئے آگے بڑھنا چاہئے یا خاموشی سے تیل کی دھار دیکھنی چاہئے۔"

میں نے کہا "فی الحال تو دھار دیکھنی چاہئے۔"

یکایک ارجمند چونک سی گئی۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولی "اف گاڈ! اس بڑھیا کی دوا کا وقت ہو گیا۔ ایک دم واویلا کرنے لگے گی۔ بہو کی موت نے اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہنے دیا ہے۔ میں کل پھر اسی وقت آؤں گی اور اس غزالہ کے بارے میں بھی تم سے بات کروں گی۔"

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات کا جواب دیتا۔ وہ لپک کر دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازے کو نیم وا کر کے وہ کچھ دیر باہر جھانکتی رہی پھر اس نے خالی برتنوں والی ٹرے اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

O☆O

اگلے چار پانچ روز تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ایک شام مہمان خانے کے کاریڈور میں مجتبیٰ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کہا "ہم بھی کسی طرح کا رسک لینے کی ضرورت نہیں۔ حویلی کے ملازم اور چوکیدار نواب کے اغوا کی وجہ سے بہت ہوشیار ہیں۔ جب کام شروع کرنا ہو گا میں خود تمہیں گرین سگنل دوں گا۔"

کام سے مجتبیٰ کی مراد حویلی میں نوادرات کا کھوج لگانا تھا۔ میں نے کہا "جناب لیکن اب میرے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ نہ اب میں قیدی ہوں اور نہ مہمان۔"

"جواز ہے" مجتبیٰ نے زور دے کر کہا "تمہارا ساتھی نواب زادی کی عزت بچانے کی کوشش کرتا ہوا شدید زخمی ہوا ہے اور ابھی تک سلجوق رحیمو کے قبضے میں ہے۔ تم اس کے بغیر یہاں سے کیسے جا سکتے ہو۔ کیا سمجھے؟ ویسے بھی میں نے فیروز جنگ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک سلجوق اور اس کے ساتھی پکڑے نہیں جاتے تمہیں حویلی سے باہر نہ بھیجا جائے۔ ورنہ وہ لوگ جو نواب صاحب کو نقصان پہنچا سکتے ہیں تمہیں بھی نہیں بخشیں گے۔"

میں نے کہا "آپ کو نواب صاحب کے بارے میں پتا ہے کہ وہ کہاں ہیں؟"

مجتبیٰ نے ایک آنکھ میچی "اس لڑکی نے۔ کیا نام ہے اس کا۔ ارجمند۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ بہرحال یہ ان لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہمیں فی الحال اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں نوادرات سے غرض ہے۔ اگر وہ یہاں ہیں تو ہم یہاں رہیں گے اور انہیں برآمد کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ دوسری صورت میں وہاں چلے جائیں گے جہاں نوادرات گئے ہیں۔"

میں نے کہا "لیکن جناب! آپ تو یہاں ریچھ اور کتوں کے مقابلے دیکھنے کے بہانے آئے تھے۔ مقابلے تو اب ختم ہو گئے اب آپ یہاں کس بہانے مقیم ہیں۔"

مجتبیٰ نے ایک بار پھر آنکھ میچی "بھئی ہمارے میزبان کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے اغوا کر لیا ہے اس کا ناتجربہ کار نوجوان بیٹا جنگلوں، صحراؤں اور دریاؤں میں باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے برے وقت میں ہم اس یتیم شہزادے کے کام نہیں آئیں گے تو کب آئیں گے۔ ہم اس کے ساتھ مل کر سلجوق اور اس کے گماشتوں کو ڈھونڈ رہے ہیں اور پھر بھئی۔ سلجوق سے ہماری ذاتی دشمنی بھی تو ہے۔ اس کے بندوں نے ہمارے ساتھ مار پیٹ کی تھی اور ہمارے ہاتھ باندھ کر ہمیں جیپ میں ڈال لیا تھا۔"

اتنے میں نواب کا خادم خاص قلی قطب بڑے ادب سے چلا ہمارے پاس آیا اس کے نمودار ہوتے ہی مجتبیٰ کنور خاموش ہو گیا تھا۔ قلی قطب نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی پھر عاجزانہ انداز میں مجتبیٰ کنور سے مخاطب ہوا "جناب! ایک مشکوک بندہ پکڑا گیا ہے۔ چھوٹے نواب اس سے پوچھ تاچھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

مجتبیٰ بگڑ کر بولا "وہ تمہارے کتوں پر چلنے والے حرامی پہلے پھر کسی بے گناہ کو پکڑ لائے ہوں گے۔ بالکل مغز نہیں ہے ان کے سروں میں۔ بہرحال چلو ہم دیکھتے ہیں۔"

وہ بڑے باوقار انداز میں قدم اٹھاتا نشست گاہ کی طرف چل دیا۔ قلی قطب کتے کی طرح دُم ہلاتا اس کے پیچھے تھا۔ میں حویلی کے معاملات میں مجتبیٰ کے عمل دخل اور اس کے رعب داب سے متاثر ہوا۔ مجتبیٰ میں اجنبی لوگوں سے اپنا آپ منوانے اور ان پر غالب آنے کی قدرتی صلاحیت موجود تھی۔ وہ اس صلاحیت کو گاہے اچھے اور گاہے برے مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ میرا دھیان ناہید کی طرف چلا گیا جو ایک شادی شدہ عورت ہونے کے باوجود مجتبیٰ کی جادوئی نظر کا شکار رہی تھی اور اپنے شوہر سے بیزار ہو کر آمادہ ہو چکی تھی۔ مجتبیٰ اور ناہید کی کہانی معلوم نہیں ان دونوں کی اسٹیج پر تھی۔ میں نے آخری بار ان دونوں کو ماہر لسانیات مسٹر شاد کی گول نما کوٹھی میں اکٹھے دیکھا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں لاہور اور وہاں سے حیدر آباد چلا آیا تھا۔

مجتبیٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ حویلی میں کسی بھی قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے وہ مجھے اشارہ دے گا۔ لیکن میں اس اشارے کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ میں وہ کچھ جانتا تھا جو مجتبیٰ اور مسٹرجی کلارک نہیں جانتے تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس گمشدہ ٹرک کا ایک بڑا اسباب بھی اس حویلی میں موجود ہے جس کی تلاش میں ایک خلقت پاگل ہو رہی ہے انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجسمہ عادل

آرٹ کے جس ذخیرے کے لئے رال ٹپکا رہے ہیں اور قریہ قریہ بھٹک رہے ہیں وہ اس گمشدہ ٹرک کے اسباب کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

مجتبیٰ نے مجھ پر تو یہی ظاہر کیا تھا کہ فی الحال وہ نواب فیروز جنگ کے ساتھ مل کر بڑے نواب شہریار کی "تلاش" میں لگے ہوئے ہیں اور نوادرات کھوجنے کے لئے کوئی کارروائی شروع نہیں کی گئی لیکن یہ ممکن تھا کہ یہ بھی چال ہو۔ مجھے بے خبر رکھ کر مجتبیٰ اور مسٹرجی کلارک اپنے کام میں مصروف ہو گئے ہوں اور کسی دن خاموشی سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچ جائیں۔ یہ دولت کا معاملہ تھا۔ اس میں کوئی کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجتبیٰ اور مسٹرجی کلارک نے شنکر شکرا پر بھروسا نہیں کیا تھا حالانکہ وہ اس کام کے لئے بے حد موزوں تھا جو میرے ذمے لگا کر مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اب یہ ممکن تھا کہ میں بھی مجتبیٰ وغیرہ کے اعتماد کے قابل نہ رہا ہوں۔ اسی طرح ارجمند بانو تھی میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا تھا اور اس بات کی ہوا بھی اسے نہیں لگنے دی تھی کہ گمشدہ ٹرک اس حویلی میں پہنچا ہے۔ یقینی بات تھی کہ ارجمند نے بھی مجھ سے بہت سی باتیں چھپائی ہوں گی۔ اس کا رویہ شروع سے آخر تک عیارانہ رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ وہ باتھ روم میں گھس کر نکلی تھی تو اپنے کپڑوں پر شیمپو گرا آئی تھی۔ یقیناً وہ بھی ایک ڈرامہ تھا کچھ دیر اور میرے کمرے میں رہنے کے لئے اور مجھے شیشے میں اتارنے کے لئے۔ ایسی چھوٹی بڑی بہت سی عیاریاں میں نے اس کے رویے میں نوٹ کی تھیں۔

پہلی ملاقات کے بعد ارجمند دوبارہ مہمان خانے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ یہ پانچویں چھٹے روز کا واقعہ ہے میں حویلی کے پائیں باغ میں گھومنے کے بعد واپس آ رہا تھا کہ میں نے شاہین کو دیکھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی اور ایک مرد کے ساتھ جوگنگ کر رہی تھی۔ مرد درمیانی عمر کا تھا اور اس نے بھی ٹریک سوٹ پہن رکھا تھا۔ میری طرف دونوں کی پشت تھی۔ وہ معمولی رفتار سے ایک روش پر دوڑے جا رہے تھے۔ روش کے آخری سرے پر پہنچ کر انہوں نے یو ٹرن لیا اور واپس مڑے۔ ان کے چہرے میرے سامنے آ گئے۔ شاہین کے ساتھی کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ گوہاب واحدی تھا۔ وہی گوہاب واحدی جس سے چند روز پیشتر حویلی کے بندی خانے میں میری ایک مختصر اور ایک طویل ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ وہ ماہر فن آرٹسٹ تھا جس نے رال کے دانوں پر مبنی ایکجز کے اسٹاک میں ایک انتہائی اہم تحریر لکھ کر ایران بھیجی تھی بعد ازاں یہ تحریر راستے میں "ہائی جیک" ہو کر ہمارے پاس پہنچ گئی تھی۔

جاگیر کے بے لچک قانون کے مطابق گوہاب واحدی جاگیر کا قیدی تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق ابھی اس کی ایک سال کی سزا باقی تھی۔ اسے آزاد دیکھ کر اور شاہین کے ساتھ جوگنگ میں مصروف پا کر مجھے ازحد حیرت ہوئی۔ تاہم میں نے اس حیرت کو چہرے پر نمودار نہیں ہونے دیا۔ گوہاب واحدی بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا تھا۔ مگر ٹھٹھکنے کے باوجود اس نے جوگنگ جاری رکھی۔ شاہین نے حسب معمول ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہاں جھٹک کر چہرا پھیر لیا۔ دوبارہ حویلی میں آنے کے بعد چار پانچ دفعہ شاہین سے میرا آمنا سامنا ہو چکا تھا لیکن اس نے کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں اب بھی اس کے لئے ایک بے معنی سی چیز ہوں۔ ان بے شمار کیڑے مکوڑوں میں سے ایک جو انسانی شکل میں اس کے ارد گرد رینگتے تھے۔ آتے جاتے اسے سلام کرتے تھے۔ اس کے جوتے پالش کرتے تھے اس کے سامنے کھانا چنتے تھے اس کے کتوں کو ٹہلاتے تھے اور جن کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر وہ اپنے اصیل گھوڑوں پر سوار ہوتی تھی۔ میں اس کا "شکریہ" وصول کرنے کا خواہش مند نہیں تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے انعام واکرام اور اعزازات سے نوازے لیکن اسے کم از کم ایک بار مجھ سے ملنا تو چاہئے تھا۔ منہ سے میرا اور ریوتا کا شکریہ ادا نہ کرتی اپنے رویے سے ہی ظاہر کر دیتی کہ ہم نے اس کی عزت اور جان بچانے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ ان کی قدر کرتی ہے مگر اپنائیت تو دور کی بات ہے اس کی نگاہ ناز میں تو شناسائی کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

گوہاب واحدی اور شاہین پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے حویلی کے رہائشی حصے کی طرف نکل گئے میں مہمان خانے کی طرف آ گیا۔ ابھی مجھے اپنے کمرے میں آئے بمشکل آدھ گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں یہی سمجھا ذریں گل ہو گا لیکن دروازہ کھولا تو سامنے گوہاب واحدی کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک ٹریک سوٹ میں تھا اور گردن سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا اور خود ہی دروازہ بند کر دیا۔

"شاہ جہاں! تم ابھی تک یہیں ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مجبوری ہے۔ ابھی تک باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا۔"

"یعنی تمہاری حیثیت اب بھی قیدی کی ہے؟" اس نے شستہ انگریزی میں پوچھا۔

"ہاں لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب جیل میں میری فرسٹ کلاس ہے۔"

"شوریدہ وغیرہ سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟"

"جی ہاں لیکن یہ لمبی کہانی ہے۔ فرصت ہے تو بیٹھ جایئے میں تفصیل سے بتاتا ہوں۔" میں اندازہ لگا چکا تھا کہ گوہاب کے پاس فرصت نہیں ہے۔ وہ بہت افراتفری میں یہاں پہنچا تھا بصورت دیگر میں اسے کبھی تفصیل بتانے کی پیشکش نہ کرتا۔ تفصیل تھی ہی نہیں بلکہ سرے سے کوئی کہانی ہی نہیں تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ شوریدہ کس چڑیا کا نام ہے اور وہ ایران میں کہاں پائی جاتی ہے۔

میری توقع کے عین مطابق گوتاپ نے کہا "نہیں اس وقت تو بہت جلدی میں آیا ہوں۔ کل رات دس بجے کے بعد میرا انتظار کرنا۔"

میں نے کہا "لیکن یہ تو بتاتے جائیے کہ آپ کیسے چھوٹے۔"

وہ جاتے جاتے رک گیا کہنے لگا "رازداری کی بات ہے کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ چھوٹے نواب نے تین چار روز پہلے جیل کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے بڑے نواب کے بچھڑے ہوئے بہت سے قیدیوں کی سزاؤں میں دو دو سال کی کمی کر دی ہے اس رعایت کے سبب بہت سے قیدی رہا ہو گئے ہیں۔ ان میں میں بھی شامل ہوں کیونکہ میری صرف ایک سال کی سزا باقی تھی۔"

"لیکن آپ تو نواب زادی کے ساتھ جوگنگ فرما رہے تھے۔"

"نواب زادہ اور نواب زادی دونوں میرے "فین" ہیں انہوں نے میری بہت سی تصویریں دیکھ رکھی ہیں۔ نواب زادی اپنے والد کی گمشدگی کے سبب ڈپریشن کا شکار ہے۔ نواب زادے (چھوٹے نواب) نے کہا ہے کہ میں شاہین کا دھیان بٹانے کے لئے اسے پینٹنگ سکھاؤں۔ پینٹنگ سکھائے جانے والی چیز تو نہیں بہرحال حکم حاکم مرگ مفاجات۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی یاد رکھنا کل رات دس بجے کے بعد۔"

اپنے رومال سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں اپنے اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گیا جو میں پچھلے کئی روز سے ترتیب دے رہا تھا۔ اس وسیع و عریض حویلی میں قیام کے دوران میں یہاں کے ہر کونے کھدرے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ بلاشبہ اس وسیع عمارت میں اتنی گنجائش تھی کہ یہاں دس ٹرکوں کا سامان بھی اس طرح چھپایا جاتا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی چھپا دی جاتی ہے لیکن میرا یہ تجزیہ تھا کہ اگر ہمارے ٹرک پر لدا ہوا سامان یہاں حویلی کی نچلی منزل پر رکھا گیا ہے تو اس کے لئے گودام سے مناسب جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ گودام تھا بھی کسی چھوٹی موٹی حویلی سے کم نہیں تھا۔ احاطے کے شمالی کنارے پر جہاں ایک دس فٹ چوڑا پختہ راستہ سرونٹ کوارٹرز سے حویلی کے زنان خانے کی سمت جاتا تھا۔ شیشم، نیم اور دھریک کے گھنے درختوں کے درمیان گودام کا بلند و بالا آہنی گیٹ تھا۔ یہ گودام تقریباً ایک ایکڑ رقبے میں تھا۔ فلم اسٹوڈیوز کے فلورز کی طرح بڑے بڑے ہال تھے جن پر آہنی چادر کی گول چھتیں تھیں۔ ارجمند بانو دعویٰ کر رہی تھی کہ اس نے گراؤنڈ فلور کا چپہ چپہ چھان مارا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ کم از کم گودام کی حد تک اس کا دعویٰ باطل ہی ہے۔ تن تنہا گودام میں گھسنا اور وہاں کا جائزہ لینا ارجمند کے بس کا روگ نہیں تھا۔ جائزہ لینا تو دور کی بات ہے گودام میں گھسنا ہی کارِ دارد تھا۔ گودام میں داخل ہونے والے کی کم از کم دو جگہ تلاشی ہوتی تھی اسی طرح گودام میں آنے جانے والی گاڑیوں کی بھی بہت اچھی طرح پڑتال کی جاتی تھی۔

پچھلے چند روز کے جائزے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ گودام میں گھسنے کے لئے چار دیواری پھلانگوں گا۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ چار دیواری پھلانگنا آسان تھا۔ وہ کم و بیش چودہ فٹ اونچی سپاٹ دیوار تھی۔ بالائی کنارے پر سیمنٹ کے ساتھ شیشے کے بے شمار ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے پچاس سال کے اندر حویلی میں جتنی بھی شراب پی جاتی رہی تھی اس کی خالی بوتلوں کے ٹکڑے گودام کی چار دیواری پر لگا دیئے گئے ہیں۔ اتنی احتیاط کے باوجود حویلی کے مکینوں سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ گودام کی چار دیواری کے ساتھ لکڑیوں اور ملبے کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ جلی ہوئی لکڑیاں اور ملبا اسی آتش زدگی کی نشانی تھا جو کچھ عرصہ پہلے حویلی میں ہوئی تھی کئی ماہ گزر چکے تھے لیکن ملبے کا ڈھیر وہیں پڑا تھا۔ جو چیز ایک ہی جگہ پڑی رہے اور جسے دیکھنا معمول بن جائے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ ملبے کا یہ ڈھیر بھی حویلی کے مکینوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اگر وہ واقعی اسے دیکھتے تو یہ بات ان کے ذہن میں ضرور آتی کہ کوئی اس ڈھیر پر چڑھ کر باآسانی گودام میں داخل ہو سکتا ہے۔

اس رات میں نے اپنی تھیوری کو پریکٹیکل میں بدل دیا۔ ملبے کے ڈھیر پر چڑھ کر گودام میں گھسنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ہتھیار کے طور پر میرے پاس خنجر کے علاوہ ۳۸ بور کا ایک ریوالور تھا۔ میرے لئے اس ریوالور کا بندوبست زریں گل نے کیا تھا۔ بیس کے قریب گولیاں بھی ریوالور کے ساتھ تھیں۔ گودام کے اندر پہنچ کر مجھے اس کی وسعت اور پیچیدگی کا احساس زیادہ شدت سے ہوا۔ چار سو تاریکی تھی بس کہیں کہیں ہال نما کمروں کے اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ ایک طرف تین چار ٹرک قطار میں کھڑے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا کہ کہیں مطلوبہ ٹرک بھی تو ان ٹرکوں میں شامل نہیں لیکن یہ خام خیالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ٹرکوں کے قریب ہی ایک طرف بے شمار بوریاں کھلے آسمان تلے پڑی تھیں انہیں بڑے بڑے ترپالوں سے ڈھانپا گیا تھا۔ غالباً یہ نواب کی زمینوں پر اگنے والی کوئی سستی قسم کی جنس تھی۔

میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور بے حد محتاط قدموں سے چلتا آگے بڑھنے لگا نجانے کیوں میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میرا یارِ غار صنوبر یہیں کہیں ان دیواروں میں موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ پچیس صندوق بھی جنہوں نے ایک خلقت کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ میں ایک سائے کی طرح گودام کے نشیب و فراز میں بھٹکتا رہا اور کوئی ایسا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا جو مجھے ہال نما کمروں کے اندر لے جا سکے۔ زیادہ تر ہال کمرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لہٰذا مجھے امید تھی کہ اگر میں کسی ایک کمرے میں داخل ہو گیا تو تمام ہال کمروں اور گوداموں کا جائزہ لینا میرے لئے ممکن ہو جائے گا۔ آخر مجھے

کامیابی کی کرن دکھائی دی ایک گودام کے بلند و بالا چوبی پھاٹک میں قفل لگا ہونے کے باوجود اتنی گنجائش موجود تھی کہ جسم پھنسا کر پٹ تک کی درزوں سے اندر داخل ہوا جا سکتا۔ میں نے کوشش کی اور اندر گھسنے میں کامیاب رہا۔ یہاں ہر طرف تیل کے ڈرم پڑے تھے۔ ان میں ڈیزل بھی تھا اور پٹرول بھی۔ یہ تیل نواب کی زمینوں پر چلنے والے ٹریکٹروں اور دیگر زرعی مشینوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس گودام میں مشینوں کے ٹوٹے پھوٹے حصے ناکارہ مشینیں اور ٹریکٹروں کے بیکار ٹائر بکثرت نظر آ رہے تھے ایک جانب دو نئے ٹریکٹر کھڑے تھے غالباً ابھی انہیں کھیت میں بھی نہیں لے جایا گیا تھا۔

اس گودام میں دو تین جنگلی دروازے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنے کندھے پر رکھا ہوا بڑا رومال اتارا اور اسے ڈھاٹے کی طرح نہایت مضبوطی کے ساتھ چہرے پر لپیٹ لیا۔ ساتھ والے گودام میں داخل ہونے کے سلسلے میں جنگلی دروازوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میرے آس پاس کوئی موجود تھا "کون ہے؟" ایک بھاری بھرکم آواز گودام میں گونجی اور میں کھڑا ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی ٹرچ کی آواز آئی اور اس بہت بڑے ہال نما کمرے کا ایک حصہ ٹیوب لائٹ سے روشن ہو گیا۔ میں نے جلدی سے ایک تھریشر مشین کی آڑ لی۔ چند افراد کی ملی جلی آوازیں آئیں پھر میں نے قلی قطب کو دیکھا اس کے ہاتھ میں لوہے کی کوئی لٹھ نما شے تھی اور وہ بڑے چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے دو مزید افراد نظر آئے۔ وہ دونوں بھی قلی قطب کی طرح ایک پرانے ٹریکٹر کی اوٹ سے برآمد ہوئے تھے۔ قلی قطب کی نگاہ سے بچنے کے لئے میں تھریشر کے عقب میں کچھ اور سمٹ گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میری کہنی کسی چیز سے ٹکرائی اور زور کا کھٹکا ہوا۔ قلی قطب زخمی چیتے کی طرح چوکنا تھا لپک کر میری طرف آیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اپنی جگہ بدل سکتا جونہی قلی میرے سامنے پہنچا میں نے ایک جچا تلا مکہ اس کے جبڑے پر رسید کیا مکہ خاصی ٹیکنیک کے ساتھ مارا گیا تھا اور اچانک مارا گیا تھا لہٰذا اکسر ہونے کے باوجود قلی کو گودام کے اندر ہی تارے نظر آگئے اور ایک کراہ کے ساتھ پشت کے بل گر گیا۔ اسے یوں گرتے دیکھ کر مجھے بڑی راحت نصیب ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر وہ لڑاکا روح بیدار ہوئی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر کے میرے لئے خونریز لڑائی کو ایک کھیل بنا دیتی تھی۔ میں جست لگا کر تھریشر کی اوٹ سے نکلا اور سیدھا تین خونمند حریفوں کے روبرو آ گیا۔ قلی قطب سمیت وہ تینوں بنا تعال ڈھال سے مانے ہوئے کھلاڑی نظر آتے تھے۔ قلی قطب کے ہاتھ میں آہنی لٹھ تھی۔ ایک شخص کے ہاتھ میں گراری دار اوزار اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک بڑی ہتھوڑی تھی جو اس نے کسی ضرورت کے تحت کہیں سے اٹھائی تھی۔

میرا مکہ کھا کر قلی قطب کے زمین بوس ہو جانے نے قلی قطب کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو سمجھا دیا تھا کہ مدمقابل معمولی نہیں ہے اور انہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ بے حد احتیاط کرتے ہوئے انہوں نے مجھے تین طرف سے گھیر لیا تھا۔ مجھے خنجر اور لٹھ سے زیادہ آہنی ہتھوڑی کی طرف سے خطرہ تھا۔ ہتھوڑی کی ضرب بے انتہا مہلک ہوتی ہے۔ جسم پر اور خاص طور پر سر پر لگنے والی یہ ضرب بندے کو آناً فاناً موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ میری خوش قسمتی کہ سب سے پہلے ہتھوڑی والے نے ہی وار کیا۔ وہ طیش میں تھا۔ بے حد قوت سے اس نے ہتھوڑی گھمائی۔ میں نے اپنا سر بچایا تو ہتھوڑی قلی قطب کے سینے پر پڑی۔ وہ ابھی ابھی میرا مکہ کھا کر سنبھلا تھا۔ ہتھوڑی کی ضرب نے اسے پھر زمین بوس کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے آہنی لٹھ گر گئی اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ میں نے اچھل کر خنجر والے کے سینے پر لات جمائی۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا خنجر سمیت ایک الٹی قلابازی کھا کر اس پرانے ٹریکٹر کے انجن سے جا ٹکرایا جس کے عقب سے ابھی ابھی یہ تینوں افراد برآمد ہوئے تھے۔ ٹریکٹر کے ساتھ اس کے تصادم سے زوردار آواز پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور ایک نیم برہنہ لڑکی نے خوفزدہ نظروں سے ٹریکٹر کے عقب سے جھانکا۔ اب صورت حال ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ یہ تینوں افراد گودام کی اس تنہائی میں موج میلہ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ شریک لڑکی کوئی ملازمہ بھی ہو سکتی تھی یا کوئی بے کس لڑکی جسے ذرا دھمکا کر قابو کر لیا گیا تھا یا پھر کوئی تھرڈ کلاس طوائف بہرطور یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ خنجر بردار بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹ رہا تھا میں نے پینترا بدل کر اس کا وار خالی دیا اور جھک کر اپنی پنڈلی سے خنجر نکال لیا۔ خنجر کی جھلک دیکھتے ہی ہتھوڑی بردار ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔ اس کی ہچکچاہٹ کی سزا اسے ایک زبردست ٹھوکر کی صورت میں منہ پر جھیلنی پڑی۔ قلی قطب نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھی کا بدلہ چکایا اور اپنا ہیوی ویٹ طوفانی مکہ میرے چہرے پر رسید کیا۔ حالانکہ مکے پر آہنی خول نہیں تھا پھر بھی میری آنکھوں میں شرارے سے اڑ گئے۔ میں نے ہٹ کر رامپوری خنجر کو حرکت دی۔ یہ افقی حرکت تھی میرا مقصد قلی قطب کو سینے کے قریب سے زخمی کرنا تھا۔ یہ زخم زیادہ سنگین نہیں ہوتا۔ صرف پسلیوں کے اوپر سے کھال کٹتی ہے۔ لیکن عین وقت پر قلی قطب نے پھرتی دکھائی اور اچھل کر پیچھے ہٹنا چاہا۔ وہ اچھلا تو اس کا پیٹ خنجر کی قاتل نوک کے روبرو آ گیا وہ کراہ کر پہلو کے بل گرا۔ اسے احساس تک نہیں ہوا کہ اس کا پیٹ چاک ہو چکا ہے۔ اس کے کسی ساتھی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ قلی قطب نے کتنا مہلک زخم کھایا ہے۔ اس کا ہتھوڑی بردار ساتھی مجھ پر جھپٹا۔ میں نے نیچے جھک کر اسے اٹھایا اور تیل کے ڈرموں پر پٹخ دیا۔ اس وقت میری نگاہ گودام کے ادھ کھلے پھاٹک پر پڑی۔ وہاں سے نواب کے مسلح کارندے لپک لپک کر اندر آ رہے تھے۔ اب میرا یہاں رکنا ٹھیک

نہیں تھا۔ میں نے ایک مدمقابل کو الوداعی لات رسید کی اور کاٹھ کباڑ کے درمیان راستہ بناتا ہوا پھاٹک کی طرف لپکا۔ چند ہی لمحے بعد میں مسلح افراد کو غچہ دے کر گودام سے باہر تھا۔

گودام کا بیرونی پھاٹک جو کہ کم و بیش چودہ فٹ اونچا اور بیس فٹ چوڑا تھا، کھلا تھا اور دو مسلح افراد دوڑتے ہوئے اندر گھس رہے تھے۔ میں نیم تاریک چار دیواری کے ساتھ چپک گیا۔ جونہی مسلح چوکیدار نے پھاٹک بند کرنا چاہا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کی گردن اپنے بازو کے آہنی شکنجے میں کس لی۔ مرحوم کو آواز نکالنے کی بھی حسرت رہی۔ یا تو اس کی گردن میری توقع سے زیادہ کمزور تھی یا ہیجان کے سبب میری گرفت سخت تھی، میں نے اس کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنی میں نے اسے چھوڑا اجل سے آزاد کیا تو وہ مُردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے پھاٹک کے وسط میں گرا میں ادھ کھلے پھاٹک سے گزر کر حویلی کے رہائشی حصے کی طرف دوڑا۔ اس وقت مجھے اپنے عقب میں تڑتڑ کی بھیانک آواز سنائی دی۔ یہ فائرنگ حویلی کے اندر ہوئی تھی اور غالباً ہوائی فائرنگ تھی یا پھر کسی حواس باختہ "مجاہد" نے کسی متحرک شے کو ٹارگٹ جان کر میگزین خالی کر دیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں رہائشی حصے تک پہنچ گیا تو میرے بچنے کے امکانات نوّے پرسنٹ سے بڑھ جائیں گے۔ میں نے جسم پر ایک سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی، چہرا ڈھاٹے میں پوشیدہ تھا۔ میں ڈھاٹے اور چادر کو کہیں چھپا کر واپس مہمان خانے میں چلا جاتا تو اس امر کے روشن امکانات تھے کہ واردات کے حوالے سے کسی کا دھیان میری طرف نہیں جائے گا۔ واردات کی تفتیش میں سب سے زیادہ اہمیت پاؤں کے نشانات اور فنگر پرنٹس کی ہوتی ہے۔ فنگر پرنٹس تو ملنے بہت مشکل تھے، ہاں میرے پاؤں کے نشانات مجھے مشکل میں ڈال سکتے تھے۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا تھا کہ اپنے جوتے استعمال نہیں کیے تھے۔ میری فرمائش پر زریں گل نے مجھے کہیں سے ایک پرانا جوتا لا دیا تھا۔ میں نے اس کو کھینچ تان کر پہن لیا تھا۔ بہرحال اگر میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا تو پھر یہ سبھی تدبیریں بیکار تھیں۔

میں رہائشی حصے میں داخل ہوا تو راہداری میں میرے عین سامنے ایک شخص سرپٹ بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ کافی فاصلے سے بھی میں اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا خوفناک ریوالور صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس سے بچنے کے لیے میں ایک چھوٹی راہداری میں داخل ہو گیا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میں چوہے دان میں پھنس گیا ہوں۔ یہ راہداری آگے سے بند تھی۔ میرے عقب میں بھاگ دوڑ اور چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں تمام خدشات کو بالائے طاق رکھ کر میں نے ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اندر گھس گیا۔ بے حد سجا سجایا اور معطر کمرا تھا۔ سامنے ایک شاندار سنگار میز پر رعنا جمال کا سامانِ آرائش پڑا نظر آتا۔ جونہی

میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ باہر کا شور و غل معدوم ہو گیا۔ دفعتاً میری نگاہ ڈبل بیڈ کی طرف اٹھی اور جم کر رہ گئی۔ ایک گول بدن دوشیزہ بڑے توبہ شکن انداز میں بستر پر منہ کے بل پڑی تھی۔ اس کے جسم پر صرف بو شرٹ اور نیکر تھی۔ پارس میں جو گر شوز تھے۔ میں نے چہرا دیکھے بغیر اسے پہچان لیا۔ وہ نوابزادی شاہین تھی اور میں اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی کے سبب نوابزادی کے بیڈ روم میں آ دھمکا تھا۔ اس نے میرے قدموں کی آہٹ سنی اور مجھے دیکھے بغیر بولی۔ "آیوڈیکس لے آئی ہو؟" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "میری شرٹ اٹھا دو اور کمر پر بالکل آہستہ آہستہ لگاؤ، اوپر سے نیچے کی طرف۔"

میں بالکل الجھ کر رہ گیا۔ غالباً شاہین نے اپنی کسی ملازمہ کو دوا لانے کو کہا تھا اور اب اسے مساج کے لیے کہہ رہی تھی۔ شاہین کو دھوکے میں رکھ کر چند منٹ گزارے جا سکتے تھے لیکن یہ بھی اندیشہ تھا کہ ابھی اصل ملازمہ آیوڈیکس لے کر آ ٹپکے گی اور مجھے نوابزادی کے سرہانے کھڑے پا کر اور اس کی مالش کرتے دیکھ کر ایسی دلدوز چیخ مارے گی کہ حویلی لرز اٹھے گی۔ میں نے بہتر جانا کہ کوئی ڈرامائی سین کرنے کی بجائے محترمہ نواب زادی صاحبہ کو اپنی موجودگی سے مطلع کروں۔ میں نے آہستہ سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نواب زادی تڑپ کر سیدھی ہوئی اور پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی حیرت زدہ نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا تھا۔

"تت..... تم یہاں کیسے؟"

میں نے کہا۔ "آپ دھیرج رکھیں۔ خدانخواستہ میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ در..... دراصل مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیسی مدد؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا خوف ایک دم دھیما پڑ گیا ہے۔

میں نے کہا۔ "حویلی ہی کے کچھ بندے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا لیکن....."

میرا فقرہ ادھورا رہ گیا کیونکہ راہداری میں اچانک ہی بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کوئی شخص چیخ کر بولا پھر ساتھ والے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر شاہین کو دکھایا۔ "یہ دیکھیں میرے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے اگر میں چاہوں تو آپ کو اپنے قبضے میں کر کے اپنی جان بچا سکتا ہوں لیکن بخدا میں ایسا کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی کروں گا۔"

نوابزادی کی حسین و جمیل پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔ چند لمحے ساکت کھڑی رہی پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے کمرے کے آخری سرے پر لائی یہاں ڈھائی فٹ کا ایک بغلی دروازہ تھا۔ اس کے اشارے پر میں

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ یہ کمرہ ضرب سولہ کا لمبوترا سا کمرا تھا۔ ایک دیوار میں بڑے بڑے ایگزاسٹ فین لگے ہوئے تھے۔ قالین پر جدید قسم کا آرائشی سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایک گوشے میں ایک بڑے آئینے کے سامنے نہایت قیمتی ایکسرسائز سائیکل رکھی تھی۔ بظاہر یہ ورزش کا کمرا تھا لیکن ولایت پلٹ شاہین نے یہاں ہر قسم کا سامان بھر رکھا تھا۔ انگلش میگزین اور کتابیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک جدید ساز کا ریکارڈ پلیئر اور بہت سی کیسٹس۔ اسی ریکارڈ پلیئر کو دیکھ کر مجھے شاہین کی بھابھی کا خون میں نہایا ہوا جسم یاد آگیا۔ یہی منحوس مشین خریدنے کے لیے دونوں لڑکیاں حویلی سے حیدرآباد شہر گئی تھیں اور حادثے کا شکار ہوئی تھیں۔

مجھے اس سائیڈ روم میں بند کرنے سے پہلے شاہین نے نوابی انداز میں مجھے دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ "جب تک میں نہ کہوں آواز دینے یا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے دروازہ باہر سے مقفل کردیا۔ اسی لمحے کمرے کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ یقیناً میرے پیچھے آنے والے نوابزادی کے بیڈروم تک آپہنچے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر نوابزادی مجھے بچانا چاہتی ہے تو پھر نواب کا کوئی کارندہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا چاہے انہوں نے مجھے نوابزادی کے کمرے میں گھستے دیکھ ہی کیوں نہ لیا ہو۔ آخر وہ نوابزادی تھی اگر وہ رات کو دن کہتی تو اس کے ملازموں کو تسلیم کرنا تھا کہ یہ دن ہی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ یہ جان کر بھی مجھے بچائے گی کہ میں ایک شخص کو شدید زخمی کر کے اور دوسرے کو جان سے مار کر یہاں آیا ہوں۔ اس کا لب و لہجہ بہت سخت تھا اور رویے میں بھی کوئی لچک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے اس پر اعتماد کر کے اس کمرے میں منتقل نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر یہ اعتماد کیا تھا۔ کبھی کبھی بندہ جانتے بوجھتے بھی خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اس مختصر کمرے میں قریباً آٹھ دس منٹ انتظار کیا۔ کبھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی، کبھی دو تین افراد آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ تین چار منٹ مزید گزر گئے تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ کمرا میرے لیے چوہے دان ثابت ہوگا۔ بیٹھے بیٹھے میری نگاہ ٹیبل کے نیچے گئی تو وہاں چند مڑے تڑے کاغذ نظر آئے جیسے کسی نے کچھ لکھنے کی کوشش کی ہو لیکن ناکام ہو کر کاغذوں کے گولے بنا کر نیچے پھینک دیے ہوں۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور یونہی ایک کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ تحریر پر میری نگاہ پڑی تو میں بری طرح چونک گیا۔ یہ تحریر نوابزادی شاہین کی تھی اور میرے نام تھی۔ تحریر پر دو دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔ نیچے لکھا تھا۔ "مسٹر راہول (میرا فرضی نام) میں کئی روز سے آپ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری جان بچائی یہ ایسا احسان ہے۔"

فقرہ ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا اور پھر سارے فقرے پر لائن پھیر دی گئی تھی۔ غالباً نوابزادی کو احساس ہوا تھا کہ وہ "زیادہ" انکساری اور احسان مندی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس نے انداز بدل کر دوبارہ مضمون بنانے کی کوشش کی تھی۔ "مسٹر راہول! تم نے مشکل وقت میں میری مدد کی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی۔ میں تمہارا اور تمہارے ساتھی کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور یہ چاہتی ہوں کہ......"

یہاں تک لکھ کر ایک بار پھر سارے فقرے پر لائن پھیر دی گئی تھی۔ میں نے ایک دوسرا مڑا تڑا کاغذ اٹھایا اس پر انداز تحریر یوں تھا۔ "مسٹر راہول! ہم تم سے خوش ہیں کہ تم نے اور تمہارے ساتھی نے مشکل وقت میں جرأت اور دلیری سے کام کیا۔ ہم ایسے لوگوں کے قدر دان ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر......"

اس کے بعد شاید مناسب الفاظ نہیں سوجھے تھے اور نوابزادی نے اس کاغذ کو بھی گول کر کے پھینک دیا تھا۔ اس طرح کئی کاغذات پر مختلف انداز میں ایک ہی بات لکھنے کی کوشش کی گئی تھی مگر کسی طرح بھی خط کا آغاز نہیں ہو سکا تھا۔ ہوتا بھی کیسے جب انسان کے ظاہر و باطن میں اس قدر فرق ہو تو اظہار خیال میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نوابزادی اپنی انا کے خول میں بند تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم نے اس پر احسان کیا ہے لیکن اس کی نظروں میں ہمارا مرتبہ ایسا نہیں تھا کہ وہ ہم سے شکریے کے دو بول ہی کہہ سکتی۔ سب کے سامنے تو کیا وہ رازداری سے بھی ہمارا شکریہ ادا نہیں کر سکی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی نظروں سے گرتی تھی اور اس کی ناک نیچی ہوتی تھی۔ دوسری طرف اس کا ضمیر بھی ملامت کر رہا تھا۔ وہ مجھے اور یونا سنگھ کو بذریعہ تحریر اپنے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اس کے پھینکے ہوئے کاغذوں میں سے ایک کاغذ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر ضرور لگی لیکن آخر دروازہ کھل گیا۔ شاہین میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ خاصی پریشان نظر آتی تھی۔ تیز لہجے میں بولی۔ "راہول! یہ تم نے کیا کیا ہے۔ وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ حویلی میں دو بندے قتل ہو گئے ہیں۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں نوابزادی حضور! میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں شور کی آواز سن کر گودام کی طرف چلا گیا تھا۔ ابھی میں بڑے پھاٹک کے پاس پہنچا تھا کہ اندھیرے میں سے ایک پہلوان سا بندہ نکلا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اس سے جان چھڑا کر بھاگا تو دو اور بندے میرے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے مجھ پر گولی بھی چلائی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن تین چار گولیاں انہوں نے ضرور چلائی ہیں۔"

"تم نے کسی کو چاقو وغیرہ تو نہیں مارا ہے؟" شاہین نے بے حد تشویش سے پوچھا۔

"نہیں بی بی جی" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ "اس ریوالور کے سوا میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں اور آپ دیکھ لیں..... اس کے چیمبر میں پوری گولیاں موجود ہیں۔"

"تمہیں کسی نے پہچانا تو نہیں تھا؟"

"نہیں بی بی جی! وہاں اندھیرا تھا۔ اندھیرے ہی کی وجہ سے تو گڑبڑ ہوئی ہے ورنہ میری یہاں کسی سے کیا دشمنی ہے۔"

وہ کچھ دیر سخت الجھن کے عالم میں کھڑی رہی پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر بارعب لہجے میں بولی۔ "تمہاری یہ سیاہ چادر ان لوگوں کی نظر میں آئی ہے۔ اسے اتار کر یہیں چھپا دو۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ جوتے بھی اتار دو۔"

میں نے نوابزادی کی ہدایت پر عمل کیا۔ نوابزادی نے ایک بار پھر مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اب وہ نیکر کی بجائے پتلون میں تھی۔ میں اس کے پیچھے چلتا ایک بغلی دروازے میں داخل ہوا۔ پتلون شرٹ والی ملازمہ نوابزادی نے مجھے سرخ قالین سے ڈھکی ہوئی چند راہداریوں سے گزار کر مہمان خانے کی طرف نکال دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ "واپس اپنے کمرے میں پہنچ جاؤ ورنہ مشکوک ہو جاؤ گے۔"

میں نے مہمان خانے تک کا چالیس پچاس گز کا فاصلہ شتابی سے طے کیا اور اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں جاتے ہوئے دروازے کو مقفل کر گیا تھا سو دروازہ اندر سے بند کر کے میں بستر پر گر گیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ رات کے دو بج چکے تھے لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا کہ حویلی میں موجود ہر فرد جاگ رہا ہے۔ بیشتر کمروں کی بتیاں روشن تھیں اور مسلح محافظ ادھر سے ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک ملازم کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ حویلی میں دو قتل ہو گئے ہیں۔ قتل ہونے والوں میں قلی قطب بھی ہے۔ اسے خنجر گھونپا گیا ہے۔ شدید زخمی حالت میں اسے اسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ وہ راستے میں دم توڑ گیا۔ ملازم نے یہ بھی بتایا کہ پولیس اور نواب کے مسلح محافظوں نے پوری حویلی کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ نہ کسی کو باہر جانے دیا جا رہا ہے نہ اندر آنے دیا جا رہا ہے۔

ملازم کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر دروازہ مقفل کیا ایک گلاس ٹھنڈا پانی کا پیا اور بستر پر لیٹ کر سوچ بچار کرنے لگا۔ حویلی میں درجنوں افراد موجود تھے۔ ان میں اہلِ خانہ کے علاوہ مرد ملازمین اور مسلح محافظ بھی تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے نواب کے چند نوجوان مہمان بھی حویلی میں مقیم تھے۔ ان بے شمار افراد میں سے کسی ایک پر شبہ کرنا اور اسے اس دوہرے قتل کی واردات کا ذمہ دار قرار دینا آسان نہیں تھا۔ ملازم سے گفتگو کرنے کے بعد میں خود کو خاصا مطمئن محسوس کرنے لگا۔ "واردات" کے حوالے سے پریشانی کم ہوئی تو میرا دھیان آپوں آپ گوتاب واحدی کی طرف جانے لگا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ انکشاف ہوا تھا کہ اب وہ ایک آزاد شخص ہے۔ اگر وہ آزاد شخص تھا تو پھر جلد وہ اس حقیقت سے آگاہ ہونے والا تھا کہ میں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ نہ میں ایران سے آیا ہوں اور نہ ہی میری ملاقات اس کے دوست شوریز سے ہوئی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گوتاب واحدی نے کسی تیز رفتار رابطے کے ذریعے شوریز سے بات کر لی ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً اس شوریز نامی شخص نے گوتاب کو یہ "فرحت بخش" اطلاع دے دی ہوگی کہ اسے گوتاب کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا اور نہ اس نے کسی پاکستانی کو حیدرآباد بھیجا ہے۔ اگر ایسا تھا تو گوتاب واحدی کسی بھی وقت آنکھوں میں خون کی لالی لے کر میرے روبرو آ سکتا تھا۔

فرض محال وہ اپنے شوریز نامی دوست سے رابطہ نہ بھی کرتا تو اس کی آزادی میں ہمارے لیے خطرات پوشیدہ تھے۔ مجتبیٰ، مسٹر جی کلارک اور میری طرح اسے بھی علم تھا کہ حویلی میں میکا ہی کے نوادرات موجود ہیں۔ وہ اب آزادانہ حویلی میں گھوم پھر سکتا تھا اور نوادرات کی ٹوہ لے سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کرتا اس کا انتظام کیا جانا ضروری تھا۔ اچانک میرے خیالوں کا سلسلہ دروازے پر ہونے والی دستک سے ٹوٹ گیا۔ میں نے قمیص کی جیب تھپتھپا کر ریوالور کا اندازہ کیا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے گوتاب واحدی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا آٹومیٹک ریوالور میرے سینے سے لگا دیا۔ "خبردار" وہ کسی زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا اور مجھے دھکیلتے ہوئے اندر آگیا۔

اس کے مدقوق جسم اور چہرے پر چند روزہ آزادی کی "برکت" سے قدرے رونق آچکی تھی۔ عینک کے عقب سے اس نے بے حد سفاک نظروں سے مجھے گھورا اور غرا کر بولا۔ "اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے رکھو اور سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو۔"

وہ آج ایک اجنبی شخص نظر آ رہا تھا۔ بے حد غصیلا اور بے رحم۔ ایک مصور سے اس قسم کے رویے کا اظہار توقع کے خلاف تھا۔ لیکن دولت، دولت ہوتی ہے۔ وہ ہر آنکھ پر لالچ کی پٹی باندھنے کی قدرت رکھتی ہے۔ آج اس مصور کی آنکھ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس نے پالٹ اور برش چھوڑ کر ہاتھ میں ریوالور تھام لیا تھا۔

وہ کمزور جان تھا۔ میرے ایک یا دو گھونسوں کی مار تھا لیکن اس کے ہاتھ میں آتشیں ہتھیار تھا۔ اور آتشیں ہتھیار زمانۂ جدید کا وہ فسوں ہے جو میدانِ جنگ میں ایک دیوہیکل جنگجو اور ایک کمزور و لاغر شخص کو مساوی حیثیت دے دیتا ہے۔ میں نے گوتاب واحدی کے اشارے پر حرکت کی اور الٹے قدموں چل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ میں نے گردن کی پشت پر رکھ لیے تھے۔

گوناب واحدی نے ادھ جلی بیڑی ایش ٹرے میں مسلی اور مجھے حکم دیا کہ میں بے حد آہستگی کے ساتھ اپنا ہاتھ جیب میں لے جاؤں اور اپنے ریوالور کو نال کی طرف سے پکڑ کر قالین پر پھینک دوں۔ وہ بے حد چوکس تھا اور مرنے مارنے پر آمادہ بھی۔ مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔ گوناب نے میرا ریوالور قبضے میں لے لیا اور گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد وہ لمبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ ٹھوکر لگا کر اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور "ادھر آؤ" کہہ کر کسی کو مدھم آواز میں پکارا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ باتھ روم دو کمروں سے اٹیچ تھا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں پھر یوں محسوس ہوا کہ کسی کو گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے۔ چند لمحے بعد میں نے ارجمند کو دیکھا۔ وہ عجب حیثیت کذائی میں تھی۔ بدن پر وہی دھاریوں والی نیلی قمیص تھی جو حویلی کی تمام ملازمائیں پہنتی تھیں۔ سفید شلوار باتھ روم کے گیلے فرش پر گھسٹنے سے داغدار ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر بندھے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے دوپٹہ باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا اور قمیص کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اسے گھسیٹ کر لانے والا شخص گھونگریالے بالوں والا ایک سرخ و سپید نوجوان تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بھی ایرانی ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک درمیانے سائز کا چاقو نظر آیا۔ ارجمند بانو اس سے کافی سہمی ہوئی تھی۔

"خوش آمدید" میں نے زیر لب مسکرا کر ارجمند سے کہا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن چپ رہی۔ ظاہر ہے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، اسے چپ ہی رہنا تھا۔ گوناب واحدی کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہو گیا تھا۔

گوناب واحدی کے اشارے پر سرخ و سپید نوجوان نے ارجمند کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ لیکن لب آزاد ہونے کے باوجود وہ بولی نہیں۔ گوناب واحدی بڑے اطمینان سے میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں نے انگلش میں کہا۔ "گوناب صاحب! میں تو آپ کو باذوق شخص سمجھا تھا۔ بھلے مانس اگر اغوا ہی کرنا تھا تو کسی خوبصورت لڑکی کو کرتے۔ یہ کس چیپ ملازمہ کو اٹھا لائے ہو۔"

ارجمند انگریزی جانتی تھی لہٰذا بے حد پریشان ہونے کے باوجود وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ بھنا کر بولی۔ "میرے سامنے میری ذات کے بارے میں رائے دینے کی اجازت تمہیں کس نے دی ہے۔"

میں نے مصنوعی بوکھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ "اوہ۔۔۔ساری۔ ویری ویری ساری۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم۔۔۔میرا مطلب ہے کہ تم انگریزی جانتی ہو۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اگر مجھے انگریزی نہ آتی ہوتی تو پھر تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں۔۔۔ لیکن پھر میں ذرا بہتر الفاظ استعمال کرتا۔"

"باسٹرڈ" وہ بڑبڑائی۔ "پتا نہیں کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے باسٹرڈ کہہ کے تم نے اپنے سائیں جی کی حکم عدولی کی ہے اور یہ کوئی چھوٹی موٹی حکم عدولی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں پتا چل گیا تو وہ تمہاری ننڈ فرماویں گے اور وہ بھی استرے سے نہیں جوتوں سے۔ ایک بال نہیں چھوڑیں گے سر پر۔"

"یہ تم نے کیا اپنی بکواس شروع کر دی ہے۔" گوناب بھنا کر بولا۔

میں نے کہا۔ "یہ ہماری ذاتی بکواس نہیں آپ بھی بصد خوشی اس میں شرکت فرما سکتے ہیں۔"

گوناب واحدی نے بیٹھے بیٹھے میز کو پاؤں کے ساتھ زور سے دھکیلا۔ میز کا اگلا کنارہ میرے گھٹنے سے لگا۔ سخت چوٹ آئی لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ گوناب واحدی گویا مجھے سزا دینے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم؟ اور کس کے کہنے پر یہاں آئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں عاقل نہیں تو کم از کم بالغ مرد ضرور ہوں۔ لازمی نہیں ہے کہ میں کسی کے کہنے پر چلوں۔"

"ہوشیار بننے کی کوشش مت کرو۔" وہ غرایا۔ "میں تم دونوں کو گولی مار کر ٹھنڈا کر دوں گا اور قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قیامت تک کوئی ثابت نہیں کر سکے گا کہ تمہیں میں نے جہنم واصل کیا ہے۔ جان بچانا چاہتے ہو تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ جعفر کہاں ہے اور وہ فرگن اور منی لیجرز کہاں ہیں جو تمہیں اس سے حاصل ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لگتا ہے آپ کی بیٹی میں کسی نے وسوسہ ڈال دیا ہے۔ وسوسہ سمجھتے ہیں نا آپ؟ یہ ایک بہت تیز قسم کی نجس چیز ہوتی ہے ایک دم دماغ کو چڑھ جاتی ہے۔ میں نے جیل میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ میں شوریز صاحب کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتا اور میں نے آپ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ شوریز صاحب سے میری صرف ایک ملاقات ہوئی ہے۔"

"لیکن شوریز تو کہتا ہے کہ سرے سے اس کے پاس کوئی پیغام نہیں پہنچا اور نہ وہ تمہیں جانتا ہے۔"

میں نے الجھن سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شوریز صاحب آپ سے یہ جھوٹ کیوں بول رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی چال چل رہے ہوں۔ بیشک وہ آپ کے لنگوٹیے ہیں لیکن دولت تو انسان کو لنگوٹ سے بھی عزیز ہوتی ہے۔ ارجمند بانو سے پوچھ لیجئے۔"

ارجمند بانو غصے سے سرخ ہو گئی لیکن پھر شاید اسے سائیں جی کے وہ فرمودات یاد آ گئے تھے جو انہوں نے میرے بارے میں ارشاد فرما رکھے تھے۔ وہ اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اردو میں بولی۔ "تم خواہ مخواہ بات کو مذاق میں کیوں ٹال رہے ہو۔ اس شخص کے ہاتھ میں کھلونا ریوالور نہیں ہے۔ ذرا ٹریگر دبائے گا تو میری یا تمہاری جان جائے گی۔ کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے حویلی میں جو دو بندے مارے گئے ہیں، وہ بھی انہوں نے ہی مارے ہیں۔"

"بے شک، لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔ لیکن گھبراؤ مت۔ وہ تمہیں نہیں ماریں گے، اتنے بدذوق نہیں ہیں وہ۔"

"تم الٹی سیدھی ہانکتے رہنا اور وقت نکل جائے گا۔ دیکھو یہ میز پر جو ابھی عینک والے نے تمہیں دی ہے، اسے تم اپنے پاس سے عینک والے پر الٹا سکتے ہو۔"

گوتاب نے کڑک کر مداخلت کی۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم دونوں؟ کیا کہہ رہی ہے یہ لڑکی؟"

میں نے کہا۔ "یہ تمہاری تعریف کر رہی ہے۔ کہہ رہی ہے مجھے ایسے مرد پسند ہیں جو شکل سے سمجھدار نظر آئیں لیکن اتنے سمجھدار نہ ہوں۔"

"وہاٹ نان سینس۔" گوتاب راحدی نے دانت پیسے۔ "میں تمہاری لاف زنی سننے نہیں آیا۔ مجھے بتاؤ کہ "جعفر" کہاں ہے اور اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تعلق سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

وہ بولا "یہ رات کو چھپ کر تم سے ملنے آئی تھی اور کوئی گھنٹہ بھر تمہارے ساتھ رہی تھی۔"

"اور جب واپس گئی تھی تو اس کے بال بھیگے بھیگے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ نہا کر آئی ہے۔ ہیں نا؟" میں نے لقمہ دیا۔ گوتاب خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "تب اس میں پوچھنے کی کون سی بات رہ گئی ہے۔"

ارجمند کا چہرا ایک بار پھر سرخ ہو گیا لیکن حسب سابق وہ بولی کچھ نہیں۔ "او کے تل رائٹ" گوتاب راحدی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں بتاؤ گے کچھ نہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے، تم یکطرفہ طور پر جو چاہے سوچ سکتے ہو۔"

میں نے دیکھا گوتاب راحدی بار بار کن انکھیوں سے اس گلاس کا جائزہ لے رہا تھا جو تپائی پر پڑا تھا اور جس میں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے پانی پیا تھا۔ وہ گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں بولا۔ "ابھی تم نے جو پانی پیا تھا اس میں ایک نارکوٹک پوائزن ملا ہوا تھا۔ یہ زہر بیس سے چالیس منٹ کے اندر انسانی جسم پر اثر کرتا ہے۔ بہت جلد تم پر غنودگی طاری ہونے والی ہے۔ یہ غنودگی تمہارے لیے ابدی نیند کا پیغام لے کر آئے گی۔ تمہارے لیے بھی اور اس لڑکی کے لیے بھی۔"

کمرے کے سناٹے میں جیسے کوئی شے زبردست چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس اطلاع کو سن کر میرے اندر کی دلیری اور خوش باشی ایک دم رخصت ہو گئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ گوتاب جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں حقیقت ہو ہے۔ پچھلے پانچ دس منٹ سے میں طبیعت میں عجیب سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ بھاری پن بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر ہوش باش نظر آتی تھی لیکن غور کرنے سے آنکھوں میں ایک بوجھل سا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ گوتاب راحدی نے لائٹر کی مدد سے بیڑی سلگانے کے بعد جیب سے ایک چھوٹا سا داکس (ڈبیہ) نکالا اور بولا۔ "جو زہر تم پی چکے ہو اس کا تریاق بھی میرے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ تریاق تمہیں اسی وقت مل سکتا ہے جب جعفر کا پتا بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ تمہیں یہاں بھیجنے والا کون ہے۔"

میں نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا اب لیموں کی طرح زرد تھا۔ اپنے بے حد خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر وہ بولی۔ "یہ کیا ہو گا جانی؟"

میں نے بھی اردو میں پوچھا۔ "تم نے کوئی چیز پی تھی؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔۔۔ گھونگھریالے بالوں والے نے مجھے پانی پلایا تھا۔"

"پھر اپنی زبان میں بھونکنے لگے ہو" گوتاب نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز کچھ فاصلے سے آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک گونج سی تھی اس کی آواز میں۔ "کیا زہر اثر کرنے لگا ہے؟" میں نے بے حد تشویش کے عالم میں سوچا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو خود ہی تسلی دی۔ نہیں! نفسیاتی اثر ہے۔ ابھی ایک دو منٹ پہلے تو میں بھلا چنگا تھا۔

میرے اور گوتاب راحدی کے درمیان تین چار منٹ تک مکالمہ ہوا اور پھر اچانک میرا ذہن ان چاہے راستے پر سرکنے لگا۔ کمرے کا ماحول اچانک ہی خوابناک سا ہو گیا تھا۔ دیواریں نیلگوں سی۔ آوازیں دور سے آتی ہوئی، چہرے دھندلے سے۔ ایک تیز رو نقاہت سی جسم و جاں میں بھرنے لگی۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اگر اب بھی میں گوتاب کے ریوالور کے "احترام" میں بیٹھا رہتا اور کوئی رسک نہیں لیتا تو پھر سب کچھ بس سے باہر ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنے خوابیدہ ذہن کو سمیٹتے ہوئے جسم کو حرکت دینا چاہی لیکن اسی وقت ایک رسی سی اچھل کر میرے سینے پر آ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گوتاب راحدی کا نوجوان ساتھی میرے عقب میں تھا اور رسی کے ساتھ مجھے صوفے کی پشت کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مہارت اور چابک دستی سے اس نے مجھے صوفے سے باندھ دیا۔ اس دوران گوتاب راحدی ریوالور سونتے میرے سر پر کھڑا رہا۔

میں نے ارجمند کی طرف دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ اس کا سر فرش کے قالین سے ٹک گیا تھا اور وہ بے سدھ پڑی تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں گوتاب سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان خشک ہو کر تالو سے چپک چکی تھی۔ میرا دھیان بار بار اپنی قمیص کی بغلی جیب کی طرف بھی جا رہا تھا۔ یہاں وہ مڑا تڑا کنگن پڑا تھا جو گوتاب پر ایک نہایت اہم راز فاش کر سکتا تھا۔

یکایک ایک اور تحیر خیز منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک ہیوی ٹائپ مقامی نوجوان اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال اس نے احتیاطاً نیچے کر رکھی تھی۔ اس نے انگلش میں گوتاب راحدی سے کہا۔ "سر! غضب ہو گیا۔ مندر کا بڑا پجاری اپنے سینکڑوں ساتھیوں کے ساتھ حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ وہ لوگ آپ کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں اور بے حد غصے میں نظر آتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ یہ اطلاع سن کر گوتاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ اس کی توجہ میری طرف سے مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔ لیکن اب ہلنے بولنے کی نہ تو مجھ میں طاقت تھی اور نہ وہ رسی اجازت دیتی تھی جس نے مجھے سینے کے پاس سے جکڑ رکھا تھا۔ گوتاب راحدی اور اس کے دونوں ساتھی باتھ روم کے دروازے میں کھڑے ہو کر کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ ان کے قدموں کی چاپ مجھے دور کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے کوئی کسی بہت بڑی پتھریلی سرنگ میں چل رہا ہو اور اس کے قدموں کی گونج ہواؤں کے دوش پر ڈوب ابھر رہی ہو۔

میں نے کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہا لیکن بنجر حلق اور زبان کے ساتھ ایسا کرنا ممکن نہ ہوا۔ پکارنے کی کوشش میں حلق سے بس ایک بھدی سی آواز نکل کر رہ گئی۔ رسی کی گرفت کافی سخت تھی لیکن اگر کوشش کی جاتی تو اس سے چھٹکارا ممکن تھا۔ میں نے جسم کو دائیں بائیں حرکت دینا چاہی تو رسی کے بل گوشت میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوا کہ میری بچی کھچی طاقت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ ذہن غنودگی کی دبیز دھند میں ڈوبتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سوچ بھی رہا تھا۔ گوتاب کے نوجوان ساتھی کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مندر کا بڑا پجاری اپنے سینکڑوں ساتھیوں کے ساتھ حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔

یہ بھڑکے ہوئے ہندو کیوں پہنچے تھے یہاں؟ جونہی یہ سوال ذہن میں ابھرا، خیال نے زقند لگائی اور ماضی قریب میں پہنچ گیا۔ غنودگی میں گوتاب راحدی نے مجھے بتایا تھا کہ تین برس پہلے ایک طوفانی رات کو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک مندر میں ... اور کم علمی کی وجہ سے وہاں موجود تین دیوداسیوں کی عزت خراب کر دی تھی۔ اسی جرم کی سزا میں گوتاب راحدی چند روز پہلے تک نواب کی جیل میں بند تھا۔ یہ بات فوراً میرے ذہن میں آئی کہ چھوٹے نواب نے گوتاب کو آزاد کر کے اور اسے حویلی میں مہمان کا درجہ دے کر ہندوؤں کو مشتعل کر دیا ہے۔ ان کے زخم تازہ ہو گئے ہیں اور وہ بھڑک کر حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔

دفعتاً مجھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پہلے سنگل فائر ہوئے پھر اوپر تلے تین چار برسٹ مارے گئے۔ بڑھتی ہوئی غنودگی کے سبب میں فائرنگ کی سمت کا ٹھیک ٹھیک تعین تو نہیں کر سکا تاہم اندازہ یہی ہوا کہ حویلی کے صدر گیٹ کی طرف گولی چلی ہے۔ دو تین منٹ خاموشی رہی پھر بہت سی ملی جلی انسانی آوازیں آنے لگیں۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی یہ آوازیں یا تو واقعی فاصلے سے آ رہی تھیں یا پھر مجھے فاصلے سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایکا ایکی زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ حویلی کے مین گیٹ پر شروع ہونے والا ہنگامہ، مہمان خانے کے سامنے آ پہنچا ہے اور اچانک اس میں بے حد شدت پیدا ہو گئی ہے۔ میرے سوچتے ہی سوچتے ایک برسٹ کمرے کے روشندان میں لگا اور روشندان کے پرخچے اڑ کر بے سدھ پڑی ارجمند پر آ گرے۔ اب مجھے چیخ پکار کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ میں نے رہی سہی طاقت جمع کر کے زور لگایا اور رسی ڈھیلی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ صوفے سے اٹھ کر میں جب ارجمند کی طرف بڑھا تو بری طرح لڑکھڑا گیا۔ ایک دیوار کا سہارا لے کر میں نے سر کو چند بار زور سے دائیں بائیں جھٹکا اور ہمت کر کے پھر ارجمند کی طرف بڑھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ سانس بے حد دھیمی چل رہی تھی۔ ارجمند کا اصل نام سروج تھا۔ بلکہ سروج دیوی تھا کیونکہ وہ ہندو تھی۔ میں نے پھٹی ہوئی ناقابل شناخت آواز میں اسے پکارا "سروج... سروج" اور شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ وہ مر رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت نیند کی آغوش میں جانا موت کی آغوش میں جانے کے مترادف ہے۔ لیکن میں ارجمند کو کیسے جگاتا؟ میں تو خود غنودگی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ غنودگی کسی بھی لمحے مجھے ہڑپ کر سکتی تھی۔ میں گرتا پڑتا دیواروں کا سہارا لیتا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے قفل کھولنا چاہا۔ چابی ابھی قفل کے اندر ہی لگی تھی اور قفل کھولنا زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن پھر میں رک گیا۔ دھماکوں اور چیخ پکار سے ظاہر تھا کہ حویلی کے طول و عرض میں ایک خونریز ہنگامہ ہو رہا ہے۔ ممکن تھا کہ میں اور ارجمند اس کمرے سے باہر نکلتے تو غضبناک ہندو ہمارے نام پوچھے بغیر ہمیں لہو میں نہلا دیتے۔ اندر اگر موت کا خطرہ تھا تو باہر یہ خطرہ دو چند ہو جاتا تھا۔ میں چند لمحے دروازے پر کھڑا سوچتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا واپس آیا اور باتھ روم کا دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔

اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ حواس جواب دیتے جا رہے ہیں اور میں کسی بھی وقت کبھی نہ اٹھنے کے لیے گر سکتا ہوں۔ اور پھر سوچتے ہی سوچتے میں گر گیا۔ میری ٹھوڑی بڑے زور سے صوفے کے ہتھے سے ٹکرائی تھی۔ قلی قطب کے گھونسے سے آنے والا زخم ابھی تک ٹھوڑی پر موجود تھا اس نئی چوٹ نے زخم تازہ کر دیا اور مجھے لہو کے قطرے اپنی جھولی میں گرتے نظر آئے۔ شاید اسی چوٹ کے سبب میں گرنے کے باوجود بے ہوش ہونے سے بچ گیا تھا۔ یہ سارا قوتِ ارادی اور مزاحمت کا کھیل تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر کسی طرح میں نے اپنی منوں وزنی پلکوں کو اٹھائے رکھا تو زندگی کا دامن میرے ہاتھ میں رہے گا اور زندہ رہنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ مجھے بھی تھی حالانکہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں زندہ رہنے کا مجاز نہیں رہا تھا۔ غزالہ مجھ سے چھن چکی تھی۔ وہ چھو مجھ سے چھن چکا تھا جو میری راتوں کا چاند تھا اور میرے دنوں کا آفتاب تھا۔ وہ خوشبو مجھ سے چھن گئی تھی جو میری تنہائیوں کو مہکاتی تھی اور میری محفلوں کو سجاتی تھی۔ وہ خواب مجھ سے روٹھ گئے تھے جنہیں شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انسان زندگی کا زہر پیتا ہے اور سانسوں کی برچھیاں سینے پر جھیلتا ہے۔ لیکن پھر بھی میں زندہ رہنا چاہ رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اپنی بہن شبنا کے لیے، اپنے بچھڑے ہوئے دوست سندر کے لیے یا شاید وہ بات بھی سچ تھی جو چند روز پہلے ارجمند نے اسی کمرے میں مجھ سے کہی تھی۔ اس نے کہا تھا جو نام روح کی گہرائیوں میں بس جاتے ہیں وہ اتنی آسانی سے فراموش نہیں ہوتے۔ تمہارے دل میں بھی کہیں بہت گہرائی کے اندر غزالہ کو پھر پانے کی تمنا موجود ہے۔ کیا واقعی اس نے سچ کہا تھا۔

اچانک میں چونک گیا، کمرے کی چھت پر دھماچوکڑی کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ کئی افراد آپس میں گتھم گتھا ہیں پھر "سلی پیلر" کے دھماکے ہونے لگے۔ اسی دوران میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں یہ بات آئی کہ خود کو تکلیف میں مبتلا کر کے جاگنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ الماری کے چوبی دروازے کی طرف بڑھایا اور اس کے چوکھٹ میں انگلیاں پھنسا کر دروازے کو بھینچ دیا۔ درد و کرب کی ایک بلند و بالا لہر انگلیوں کی پوروں سے اٹھی اور اس نے پورے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ناخن ایک دم نیلے ہو گئے تھے اور ایک انگلی سے خون رسنے لگا تھا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند ذرا چھٹی تو میں ایک بار پھر ارجمند کی طرف بڑھا۔

"سنو جی... سنو... ارجمند" میں نے اسے جھنجھوڑا پھر اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرنے لگا۔ چند زوردار تھپڑ کھانے کے بعد اس کی سانسوں کا ردھم ٹوٹا اور پلکوں میں معمولی جنبش پیدا ہوئی۔ "ارجمند ہوش کرو، آنکھیں کھولو۔" میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر [illegible]

کھولیں۔ میں نے کہا "ارجمند تم جانتی ہو، ہمیں زہر دے دیا گیا ہے۔ ہم سو گئے تو پھر نہیں اٹھ سکیں گے۔ سونا نہیں، دیکھو میں پھر کہتا ہوں سونا نہیں۔"

ارجمند نے جسم و جاں کی ساری قوت اپنی پلکوں میں سمیٹ لی اور انہیں اپنی آنکھوں سے اوپر اٹھانا چاہا۔ یہ نازک سی پلکیں ارزاں کے پودے جسم سے زیادہ بھاری ہو چکی تھیں، وہ ذرا سا اٹھیں اور پھر گر گئیں۔ خود میں بھی ایک بار پھر غنودگی کی زد میں تھا۔ جیسے کسی نے نیزہ سا اتار رکھا تھا۔ میں ارجمند کو اسی کے حال پر چھوڑ کر لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم میں داخل ہوا۔ باتھ روم کا دروازہ متصل تھا۔ میں کپڑوں سمیت "شاور" کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ سر پر مسلسل پانی کی پھوار پڑی تو ذہن میں بھرا ہوا دھواں چھٹنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ کسی بھی قسم کی زہر خورانی کی صورت میں متاثرہ شخص کو بے تحاشا پانی پینا چاہیے۔ میں نے ٹونٹی سے منہ لگا دیا اور ایک لیٹر سے زائد پانی پی گیا۔ فوارے کی پھوار مسلسل میرے سر پر پڑ رہی تھی۔ غنودگی ذرا کم ہوئی تو میں لپک کر ارجمند کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پہلو کے بل لیٹی تھی۔ ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا، وہ بہت گہری نیند میں تھی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ نیلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ نیلاہٹ موت کی پیامبر تھی۔ یہ اشارہ کرتی تھی کہ خون کو ضرورت کے مطابق آکسیجن نہیں مل رہی۔ میں نے ایک بار پھر سوچا دروازہ کھول کر کسی سے مدد طلب کروں۔ لیکن کس سے؟ باہر تو موت تھی۔ میں موت کے خلاف موت سے کیا تعاون چاہتا۔ حویلی کے طول و عرض میں فائرنگ ہو رہی تھی اور چیخ و پکار کی صدائیں مسلسل سمع خراشی کر رہی تھیں۔ ایک دو بار کمرے کے دروازے پر بھی شدید ہلہ بولا گیا تھا۔ لیکن دروازہ مضبوط تھا۔ وہ ہمارے اور اُس طوفان کے درمیان حائل رہا تھا جس نے حویلی میں مچا رکھا تھا۔

میں نے قوت صرف کی اور ارجمند کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کی گردن میرے بازو پر ڈھلک رہی تھی۔ "ارجمند ہوش کرو۔" میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا پھر بازوؤں کے نیچے سے گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گیا۔ شاور کے نیچے لا کر میں نے پورا کھول دیا۔ سرد پھوار اس کے جسم کو سرتاپا بھگونے لگی۔ اس کے بدن میں جنبش پیدا ہوئی اور چہرے پر کسمساہٹ نظر آنے لگی۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے حد غنودگی کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اسے زندہ رہنے کے لیے جاگنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اسے ایک بار پھر اٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کی گردن کبھی دائیں جانب ڈھلکتی تھی کبھی بائیں جانب۔ وہ بڑبڑا بھی رہی تھی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ غزالہ کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھی یا [illegible]

نارکوٹک پوائزنز ہمیشہ اعصابی نظام کو متاثر کرتے ہیں۔ ان میں بیلاڈونا، ٹرپن ٹن اور ادیم یعنی افیون وغیرہ سے بنائے جانے والے زہر شامل ہوتے ہیں۔ ایسے بیشتر زہر زود اثر ہوتے ہیں۔ مریض سو جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ختم ہو جائے گا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ ارجمند پر زہر کا اثر مجھ سے زیادہ ہے۔ پانی کی پھوار کے باوجود اس کے ہونٹ خشک دکھائی دے رہے تھے اور پلکیں بار بار بند ہو جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب پانی کی ٹھنڈک اس پر اثر کھونے لگی ہے۔ "چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو مجھے اب سونے دو پلیز۔" وہ منمنائی اور میرے ہاتھوں میں مچلنے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اسے شرم و حیا سے دوچار کر دوں۔ شاید ذہنی کوفت اس کی غنودگی کا راستہ روک سکے۔ میں نے گریبان میں ہاتھ دے کر اس کی نیلی دھاری دار قمیص پھاڑ دی۔ اس کے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ اس پر بہت تھوڑا اثر ہوا۔ وہ ایک دو بار کسمسائی اور پھر ڈھلکنے لگی۔ غنودگی۔ جان لیوا غنودگی اسے کسی عفریت کی طرح ہڑپ کر رہی تھی۔ میں اسے بچانا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ غزالہ کے بارے میں کوئی اہم بات جانتی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایک انسان تھی اور اسے بچانا میرا فرض تھا۔ اس کا میرا ساتھ رہا تھا۔ کبھی دوستی کا، کبھی دشمنی کا۔ وہ ہمارے سنگ سنگ چلتی رہی تھی۔

میں اسے گھسیٹ کر پھر کمرے میں لے آیا۔ میری زخمی انگلیوں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور شاید یہی ٹیسیں تھیں جو غنودگی کی مزاحمت کر کے مجھے "زہر" کے مہلک وار سے بچا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں آیا کہ ارجمند کو بھی اذیت میں مبتلا کر دوں۔ اسے جسمانی تکلیف پہنچاؤں تاکہ اس کا ذہن جاگتا رہے۔ منہ پر طمانچے اب اثر نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی سر کے بالوں کو دیے جانے والے شدید جھٹکے کارگر ہو رہے تھے۔ میری نگاہ سامنے ایش ٹرے پر پڑی۔ وہاں بیڑی کے دو آدھ جلے ٹکڑے موجود تھے جو نواب واصری چھوڑ گیا تھا۔ ماچس قریب ہی پڑی تھی۔ میں نے لرزتی انگلیوں سے بیڑی سلگائی اور ارجمند کی ایک پنڈلی کو عقب سے داغ دیا۔ وہ کراہی اور اس کا جسم مچلنے لگا۔

"ہوش کرو ارجمند، ہمیں زہر دیا گیا ہے۔ ہمیں سونا نہیں ہے۔" میں نے پکار کر کہا۔ میری آواز اب قدرے صاف نکل رہی تھی۔ ارجمند تکلیف کے سبب سسکاریاں بھرنے لگی۔ جلن اور اذیت اس کے لیے زندگی کا پیام تھی۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا، ہر ممکن طریقے سے اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ زیر لب کبھی اپنی ماں کو پکارتی تھی، کبھی میرا نام لینے لگتی تھی۔ ذرا دیر بعد اور جب ایک بار پھر اس پر غنودگی کا حملہ ہوا تو میں نے جبر کر کے اس کی پنڈلی کو دوسری جگہ سے داغ دیا۔ وہ تڑپی اور سسکیاں لینے لگی۔ میں نے خود سے دیکھا اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے لیکن ناگواری نہیں تھی۔ یعنی مدہوشی کے باوجود وہ جانتی تھی کہ میں اس کا بھلا چاہ رہا ہوں۔

جلن نے ارجمند کی منہ زور غنودگی کے سامنے بند باندھ دیا۔ اس کی پلکوں میں مسلسل جنبش پیدا ہو گئی۔ دفعتاً دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں دو تین دفعہ دستک ہوئی تھی لیکن یہ دستک شدید تر تھی۔ پھر کوئی فرطِ غضب میں دروازے کو ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟ دروازہ کھولو ورنہ ہم تم اندر ہی جلا کر بھسم کر دیں گے۔" دروازہ جیسے کسی طوفان کی زد میں تھا۔ پھر ایل ایم جی کا ایک برسٹ چلا اور دروازے کا قفل والا حصہ اکھڑ کر دور جا گرا۔ دروازے کے پٹ کھلے اور دس پندرہ مشعل بردار بلوائی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ ان میں سب سے آگے گھنی مونچھوں اور موٹی کھال والا ایک تنومند شخص تھا۔ میں نے لپک کر ایک بستر کی چادر ارجمند کے جسم پر ڈال دی تھی۔ تنومند مشعل بردار نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ ارجمند کے چہرے پر جم گئی۔ وہ کچھ دیر خوابیدہ ارجمند کو گھورتا رہا پھر سرسراتی آواز میں بولا "یہ تو بھیگی قلم آرٹسٹ مس سورج ہے۔"

اندر گھسنے والے افراد میں سے ایک اور شخص نے بھی ارجمند کو مس سورج کے طور پر پہچان لیا تھا۔ بلوائیوں نے ارجمند کی حالت دیکھی پھر شک آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

"کون ہے بے تو؟" تنومند شخص نے مجھے دھکا دے کر پوچھا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ ایک دوسرا شخص بولا "نشے میں ہے سالا۔" دو تین افراد نے مجھے دبوچ لیا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے آئے۔ ریوالور میری جیب میں تھا۔ وہ فوراً ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ کمرے سے باہر مجھے جو چند مناظر نظر آئے وہ بہت سنگین تھے۔ راہداری کے قالین پر کسی کے خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ برآمدے کی طرف دو لاشیں پڑی تھیں اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ ان میں ایک لاش نواب کے خاص ملازم اباِلے کی تھی، دوسرا حویلی کا ایک مسلح محافظ تھا وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر یوں پڑا تھا کہ ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہو گیا تھا۔ مہمان خانے سے کچھ فاصلے پر حویلی کے ایک حصے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ قریب ہی ایک جلی ہوئی کار کا ڈھانچا لٹک رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حویلی پر مکمل طور پر بلوائیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور وہ فتح کے نشے میں سرشار ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔

چند لمحے بعد تنومند مشعل بردار شخص کمرے سے بھنایا ہوا نکلا اور اس نے ایک غلیظ گالی دے کر میری پسلیوں میں ٹھوکر لگائی۔ یہ وہی پسلیاں تھیں جن میں اکثر درد رہتا تھا۔ میں تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ تنومند شخص غرا کر بولا "اس راکشس نے بلاتکار کیا ہے اس لڑکی سے۔ اس بے چاری کے شریر (جسم) کو سگریٹوں سے جلا آیا [illegible]

ہے۔"

دو تین ہندو مجھ پر پل پڑے اور بُری طرح پیٹنے لگے۔ شاید وہ اسی جگہ مجھے جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ تومند شخص آگے آیا اور اس نے مارنے والوں کے ہاتھ روک لیے۔ لیکن مجھے بچانے میں کسی ہمدردی کا عمل دخل نہیں تھا۔ وہ شخص میری شناخت چاہتا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے میرے بھیگے ہوئے بال مٹھی میں جکڑے۔

زبان ایک بار پھر میرے حلق میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ میں نے بمشکل تھوک نگل کر کہا "میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ مجھے ... اور اس لڑکی کو زہر دیا گیا ہے۔ اور زہر دینے والا وہی گورناب واحدی ہے۔ جس کی تلاش میں تم یہاں آئے ہو۔"

"بھونکتا ہے یہ" ایک پنڈت قسم کا شخص چلایا۔ اس کے ماتھے پر بڑا سا قشقہ تھا "یہ ہندو ناری پر ظلم توڑتا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اس کے پاپ کی سزا کیول موت ہے۔"

تومند شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا "لڑکی کی جان خطرے میں ہے۔ اسے کسی طرح اسپتال پہنچاؤ۔ اس کی سزا کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

چند افراد مجھے کھینچتے اور دھکیلتے ہوئے ایک جیپ تک لائے اور اس میں پھینک دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھ پر غنودگی کا شدید ترین حملہ پسپا ہو چکا ہے اور اب میں کوشش کرکے خود کو بیدار رکھ سکتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جیپ حرکت میں آئی اور نواب کی حویلی سے نکل کر نامعلوم سمت میں روانہ ہو گئی۔ راستے میں مجھے متلی شروع ہوئی۔ جو زہر سارا پانی پیا تھا وہ دو تین بار قے کی صورت میں معدے سے نکل گیا۔ میں خود کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔ ارجمند کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا تاہم اس کے حوالے سے مجھے ایک اطمینان ضرور تھا۔ اس کی جان بچانے کی میں نے پوری کوشش کی تھی۔ خود تکلیف میں ہونے کے باوجود میں نے اس کی تکلیف سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں اور آخر وقت تک اسے زندگی کی طرف کھینچتا رہا تھا۔

جیپ ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی رہی۔ ایک مسلح شخص میرے پاؤں کی طرف بیٹھا تھا۔ میں لیٹے لیٹے بھی اسے دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً جیپ میں کچھ مزید افراد بھی ہوں گے لیکن ابھی میری جسمانی و ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں شمار کرنے یا ان کی پوزیشن دیکھنے کی کوشش کرتا۔

ایک جگہ جیپ رک گئی۔ میں نے بمشکل سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ ایک مندر کا بیرونی حصہ تھا۔ جیپ میں سے تومند شخص اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ہمراہ نیچے اترا۔ ایک دبلا پتلا شخص جس نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ بھاگتا ہوا آیا اور مؤدب لہجے میں تومند شخص سے بولا "صاحب جی! آپ کی کال ہے۔"

"کون ہے؟" تومند شخص نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

"اسپتال سے ڈاکٹر پرشاد جی ہیں جی۔ آپ کو بے ہوش لڑکی کے بارے میں کوئی خاص اطلاع دینا چاہتے ہیں۔"

بے ہوش لڑکی سے اطلاع دینے والے کی مراد یقیناً ارجمند ہی تھی۔ تومند شخص جلدی سے ٹوپی والے کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرے چکراتے ہوئے ذہن میں ارجمند کی شبیہہ ابھر کر رہ جاتی تھی۔ میں جس صورت حال میں جکڑا گیا ہوں اس میں ارجمند کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہو گئی ہے۔ صرف وہی بتا سکتی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایک کمرے میں کیوں بند تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ کر رہا تھا کیوں کر رہا تھا؟ اگر وہ اسپتال میں مر جاتی تو میرے لیے ان جنونی ہندوؤں سے جان بچانا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں تومند شخص کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ دل جیسے میرے کانوں اور کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

تین چار منٹ بعد مجھے تومند شخص کی صورت نظر آئی۔ وہ مندر کی عمارت سے کال سن کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے سیاہی مائل چہرے پر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

وہ میرے قریب آیا اور میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر تیزابی لہجے میں بولا "اس لڑکی کی حالت نازک ہے۔ اگر وہ مر گئی تو ایسی موت ماروں گا تجھے کہ دھرتی کانپ جائے گی۔"

میں نے کہا "میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں نے اس پر کوئی ظلم نہیں توڑا۔ ہم دونوں کو گورناب واحدی نے زہر دے دیا تھا۔ میں اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اگر سو جاتی تو اب تک مر گئی ہوتی۔ میں نے صرف اسے جاگتا رکھنے کے لیے مارا پیٹا اور سگریٹ لگائے۔"

تومند شخص نے ایک طوفانی گھونسا میرے منہ پر مارا اور ننگی گالی دے کر بولا "ہم سب تجھے اُلو کے پٹھے نظر آتے ہیں۔ ہمیں پاگل کتے نے کاٹا ہے جو تیری بکواس کا وشواس کریں گے۔"

پنڈت نما شخص بولا "گوپال ٹھاکرے! اس کتے سے بات کرکے اپنی زبان پلید مت کر۔ لے جا اس کو تہ خانے میں اور وہاں زنجیروں سے باندھ دے۔"

تومند شخص نے جسے پنڈت نے گوپال ٹھاکرے کہا تھا اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ اور ڈنڈا ڈولی کرکے جیپ سے اتار لیا۔ پھر ایک گرانڈیل شخص نے مجھے اپنے چوڑے چکلے کندھے پر لادا اور ایک طرف لے چلا۔ زہر کا اثر کم ضرور ہو گیا تھا مگر زائل نہیں ہوا تھا۔ اتنی جلدی ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے بار بار اندھیرے کی چادر تن رہی تھی۔ میں سر کو جھٹک کر بار بار یہ چادر آنکھوں کے سامنے سے ہٹاتا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنی پشت کے نیچے ٹھنڈے پتھریلے فرش کا لمس محسوس ہوا اور آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑیں۔ میں نے

اندازہ لگایا کہ مندر کی عمارت میں ہوں اور مجھے بیدردی سے کسی تہ خانے کے فرش پر پٹخ دیا گیا ہے۔ میرے ارد گرد کچھ افراد موجود تھے۔ ان کی آوازیں مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ہاتھ مجھے سر کے بالوں یا ٹھوڑی سے پکڑ کر جھنجوڑ بھی دیتا تھا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر اس کیفیت میں رہا۔ معدہ خالی ہونے کے بعد بدن کی اینٹھن میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

○☆○

میری آنکھ ایک زبردست جھٹکے سے کھلی تھی۔ اندازہ ہوا کہ میرے کولہے پر کوئی ضرب لگائی گئی تھی جس کے سبب میری ٹانگ متحرک ہوئی تھی اور اس کی ٹھوکر سے تپائی پر رکھا ہوا ایک مرتبان نما برتن فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، میرے ارد گرد کم و بیش چار افراد موجود تھے۔ ان میں وہ سیاہ رُخ تومند شخص بھی تھا جسے پنڈت نے ٹھاکرے کہا تھا۔ یہ لوگ مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ ٹھاکرے کا پورا نام گوپال ٹھاکرے تھا۔ اس نے میرے گریبان میں ہاتھ دے کر مجھے اٹھایا اور بٹھا کر دوبارہ فرش پر پٹخ دیا۔ اس کے ساتھ ہی دو افراد مجھ پر پل پڑے۔ وہ مجھے بے دردی سے مار رہے تھے۔ اچانک ایک آواز نے ان کے ہاتھ روک لیے۔ وہ مڑ کر تہ خانے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ دروازے سے وہی پنڈت نما شخص اندر داخل ہو رہا تھا جس کے حکم پر مجھے اس تہ خانے میں پہنچایا گیا تھا۔ وہ سفید دھوتی اور قمیص میں تھا۔ ماتھے پر بہت بڑا قشقہ تھا۔ اس کے لمبے بال پیچھے کی طرف کنگھی کیے گئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہی ہو گی۔ اس کی شخصیت کی سب سے اہم چیز اس کی غلافی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کی وجہ سے وہ ایک بارُعب اور حسین شخص نظر آتا تھا۔

"مت مارو اس مورکھ کو" وہ پاٹ دار آواز میں بولا "ہمارا دھرم کسی سے ناانصافی کی آگیا نہیں دیتا۔ اسے اپنے کرموں کی سزا ملے گی اور ضرور ملے گی لیکن پہلے ہمیں اس کے جرم کی چھان بین کرنا ہے۔"

مجھے پیٹنے والے ایک دم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اب وہ دیوار کے ساتھ قطار بنائے، ہاتھ ناف پر باندھے کھڑے تھے۔ ان سب کی نگاہیں زمین سے پیوست تھیں۔ پنڈت نپے تلے قدموں سے چلتا لکڑی کی ایک چوکی پر جا بیٹھا۔ ایک شخص نے جلدی سے آگے بڑھ کر موٹے دانوں والی ایک مالا اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر گوپال ٹھاکرے کی طرف متوجہ ہو کر بولا "بچی کا کیا ہوا؟"

گوپال ٹھاکرے نے کہا "مہاراج! وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر پرشاد اس کے جیون کی طرف سے نراش ہیں۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"انہوں نے کہا تو کچھ نہیں لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچے گی نہیں۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ جیون اور موت کی ڈور بھگوان کے ہاتھ میں ہے اور اس نے سب کچھ منش کی آنکھ سے اوجھل رکھا ہوا ہے۔ جو اتنے وشواس سے کسی کی موت کا اعلان کرے، ہمارے نزدیک وہ مہاپاپی ہے۔ تم اسی وقت اس لڑکی کو اسپتال سے ڈسچارج کراؤ اور یہاں ہمارے پاس لے آؤ۔"

"جیسے آپ کا حکم مہاراج" گوپال ٹھاکرے نے ادب سے سر جھکایا۔

میں نے پنڈت سے کہا "آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس لڑکی کو اسپتال سے لا کر آپ اس کی زندگی کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ یہ اس لڑکی کے ساتھ ہی نہیں میرے ساتھ بھی زیادتی ہے۔"

"تمہارے ساتھ کیوں زیادتی ہے" پنڈت نے پوچھا "تمہیں تو خوشی ہو گی کہ تمہارے کرتوتوں کا پردہ چاک کرنے والی موت کے پردے میں چھپ گئی ہے۔"

"یہی تو آپ لوگوں کو غلط فہمی ہے" میں نے کراہتے ہوئے کہا

رازداں

موت سے پنجہ کشی
کرنے والے سرفروشوں
کی دل ہلا دینے
والی داستان

ایسے مُہم جوؤں کی داستان جو پہاڑوں کو
ریزہ ریزہ کرنے کا عزم رکھتے تھے

ایم اے راحت کا ایک شاہکار ناول

قیمت ‎-/۲۲۰‎
ڈاک خرچ ‎-/۲۰‎

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

اشاعت: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۳

"وہ میرے کرتوتوں کا پردہ چاک کرنے والی نہیں۔ میری بے گناہی کی سب سے بڑی گواہ ہے۔"

پنڈت نے کہا "تم چرب زبان ہو اور ہمارا تجربہ ہے کہ تم جیسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "پنڈت جی! مجھے یقین ہے کہ سروج (ارجمند) کا علاج کرنے والے ڈاکٹرز بھی میری بے گناہی کی تصدیق کریں گے۔ سروج کو زہر دیا گیا ہے۔ وہی زہر مجھے بھی دیا گیا ہے۔ آپ میرا چیک اپ کرائیں۔ آپ کو ناقابلِ تردید ثبوت مل جائے گا۔"

"مگر تمہیں زہر دیا گیا ہوتا تو تم بھی اس بچی کے ساتھ اسپتال میں ہوتے۔ تم نے صرف نشہ کر رکھا تھا۔ رات بھر سونے کے بعد تمہارا نشہ اُتر گیا ہے۔"

"اس کا فیصلہ ڈاکٹرز بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ آپ مجھے ڈاکٹرز کے پاس لے چلیں یا کسی ڈاکٹر کو یہاں بلالیں۔"

پنڈت بولا "ہم نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اس کے بعد کسی ڈاکٹر کو کشٹ دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ بچی موت کے چنگل سے نکل آئی تو تمہارے پاپوں کا گھڑا ضرور پھوڑے گی۔"

میں نے کہا "آپ سب کچھ لڑکی کی زندگی سے مشروط کر رہے ہیں حالانکہ حقیقت جاننے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ گوتاب واحدی نے اپنے ساتھی سے مل کر سروج کو باندھا تھا۔ جب اسے میرے کمرے میں لایا گیا تو اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور اسے زہر بھی دیا جا چکا تھا۔ آپ کو حویلی سے اس واقعے کے کئی ثبوت مل جائیں گے۔ اگر آپ کو شبہ ہے کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کی تصدیق بھی لڑکی کے طبی معائنے سے ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو" پنڈت برہمی سے بولا "ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

پنڈت کے اشارے پر گوپال ٹھاکرے نے مجھے بازو سے تھاما اور تہ خانے کے ایک دوسرے حصے میں لے آیا۔ ایک رائفل بردار ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور انگلی لبلبی پر۔ وہ بہت چوکس نظر آتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس موقعے پر کسی قسم کی مہم جوئی مناسب نہیں ہے۔ تقریباً چھ ضرب بارہ کے ایک مختصر کمرے میں مجھے بند کرنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ یہ عجیب طرز کا کمرا تھا' بالکل کسی کال کوٹھڑی کی طرح۔ بیت الخلا بھی اسی مختصر کمرے کے ایک حصے میں تھا۔ ہاں یہ بات تھی کہ بدبو بالکل نہیں تھی اور ہر چیز صاف ستھری اور دُھلی دُھلائی نظر آتی تھی۔ میں ننگے فرش پر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ آہنی سلاخوں والے دروازے کی دوسری جانب ایک بہت بڑا "سلائیڈنگ ڈور" نظر آ رہا تھا۔ پلائی ووڈ کا یہ جہازی سائز دروازہ پالش شدہ تھا اور ٹیوب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

کچھ خبر نہیں تھی کہ حویلی میں کیا ہوا ہے۔ کون بچا ہے اور کون ہنگامے کی نذر ہوا ہے۔ جس وقت ہندو بلوائیوں نے حویلی پر یلغار کی' بختی کنور اور مسٹری کلاوک بھی وہیں موجود تھے۔ اس کے علاوہ نزہیں گل بھی تھا۔ مجھے ان تینوں کی کچھ خبر نہیں تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہندو بلوائیوں کا اصل نشانہ گوتاب واحدی تھا مگر ہو سکتا تھا کہ گوتاب واحدی کے ساتھ ساتھ بلوائیوں نے چھوٹے نواب کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہو۔

میں نے نیچے جھک کر اپنی پنڈلی ٹٹولی۔ میری جلد کا ہم رنگ پلاسٹک کور پنڈلی کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور اس میں میرا لوٹ اگم رام پوری خنجر موجود تھا۔ خنجر کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد میرا دھیان ایک بار پھر ارجمند یعنی سروج کی طرف چلا گیا۔

پنڈت اور اس کے چیلے ہٹ دھرمی کا ثبوت دے رہے تھے وہ ارجمند کو اسپتال سے نکال لائے تو اس کی زندگی کے لیے خطرات مزید بڑھ جانا تھے۔ ارجمند کو کچھ ہو جاتا تو میری بے گناہی پر کس نے اعتبار کرنا تھا؟ ایک عجیب صورت حال میں پھنس چکا تھا میں۔ دفعتاً مجھے اس فقرئی کڑے کا خیال آیا جو میں اپنی جیب میں لیے پھرتا تھا۔ میں نے جلدی سے جیب پر ہاتھ مارا۔ کڑا موجود تھا۔ میری تلاشی تو یقیناً لی گئی ہوگی لیکن کڑے کو بے کار شے سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ یہ کڑا میرے لیے اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے کتنا قیمتی ہے۔

سروج عرف ارجمند عرف اَلو کی پٹھی اسی روز شام کو مندر کے تہ خانے میں پہنچا دی گئی۔ مجھے اس بات کا علم اس پہریدار سے ہوا جو میرے لیے رات کا کھانا لے کر کوٹھڑی میں آیا۔ یہ کوئی نچلی ذات کا ہندو تھا۔ میرے لیے اس کے لہجے میں قدرے اُنس اور ہمدردی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ بے ہوش لڑکی کو تہ خانے میں پہنچایا گیا ہے۔ وہ قریب المرگ ہے۔ تاہم پنڈت مہاراج جو وید اور جوتش کا علم بھی جانتے ہیں' اپنے طریقے سے اس کا علاج کر رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پنڈت مہاراج کے ہاتھ میں جادو ہے اور موت کے سوا ہر مرض کا علاج ان کے پاس ہے۔ اس نے مجھے ایک دو واقعات بھی سنائے کہ کس طرح پنڈت مہاراج نے اپنی شکتی کے ذریعے لب گور لوگوں کو موت کے منہ سے چھینا۔ اس شخص کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ پنڈت کے ماننے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ یہ سب لوگ راسخ العقیدہ قسم کے ہندو ہیں اور پنڈت کے ایک اشارے پر جان دینے اور لینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

ارجمند کی حالت کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے بھی تھا۔ آخری مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ نیم بے ہوش تھی جیسے موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہو اور کسی بھی سمت سفر کر سکتی ہو۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گزر جانے کے بعد میری حالت تیزی سے سنبھلی تھی اور مجھے امید پیدا ہو گئی تھی کہ ارجمند بھی صحت یاب ہو جائے گی لیکن اب اس کے بارے میں مسلسل تشویش ناک خبریں آ رہی

تھیں۔ رات کسی پہر مجھے اپنی کوٹھڑی میں نامانوس قسم کی خوشبو چکراتی محسوس ہوئی۔ اس خوشبو کے ساتھ ہلکا سا دھواں بھی تھا۔ یوں لگا جیسے کہیں پاس ہی کسی کو دھونی دی جا رہی ہے۔ اسی دوران میں کچھ کراہیں سنائی دیں۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ ارجمند کی آواز تھی۔ وہ کراہ رہی تھی اور اس کا کراہنا خوش آئند تھا۔ وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ ہوش میں تھی۔

اگلے روز اسی پہریدار رام داس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ پنڈت جی رات بھر لڑکی کے علاج معالجے میں مصروف رہے ہیں اور وہ ہوش میں آ گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر پرشاد بھی صبح سویرے لڑکی کو دیکھ کر گیا ہے۔ وہ حیران ہے کہ اس مُردے میں جان کیسے پڑی ہے۔

ارجمند کا زندہ بچ جانا میرے لیے نیک فال تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب پنڈت اور اس کے حواریوں کو میری بے گناہی کا اعتبار کرنا پڑے گا۔ میرے اگلے دو تین روز اسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گزر گئے۔ آہنی سلاخوں سے باہر پہریدار کا کبھی کبھار چکر لگتا نظر آ جاتا تھا۔ وہ اب مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ غالباً اسے تنبیہ کر دی گئی تھی۔ وہ دن میں تین بار مجھے خاموشی سے کھانا پہنچاتا اور خالی یا نیم خالی برتن اٹھا کر لے جاتا۔ میرے بدن پر ابھی تک وہی لباس تھا جس میں میں یہاں لایا گیا تھا۔ تہ خانہ سرد تھا اور ایک ہلکے پھلکے سوئٹر میں میں رات کے وقت کافی خنکی محسوس کرتا تھا۔ زہر خورانی والا حادثہ گزرے اب تین روز گزر چکے تھے پھر بھی طبیعت میں ایک کسلمندی موجود تھی۔ پہلے دن کے بعد پنڈت نے اپنی صورت نہیں دکھائی تھی نہ ہی کہیں گوپال ٹھاکرے نظر آیا تھا۔

یہ چوتھے روز کا واقعہ ہے' علی الصباح گوپال ٹھاکرے دو غنڈا صورت افراد کے ساتھ میری کوٹھڑی میں گھس آیا۔ بغیر کوئی بات کہے یہ تینوں افراد مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے مجھے گھونسوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ چند ضربیں کھانے کے بعد میں ایک دم پلٹ پڑا۔ گوپال ٹھاکرے کا مُکا خالی دے کر میں نے ایک زبردست ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر کوٹھڑی سے باہر جا گرا۔ باقی دو افراد نے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا۔ انہیں مجھ سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے دن کی طرح میں آج بھی خاموشی سے پٹتا رہوں گا مگر آج میں ہوش و حواس میں تھا نہ سر میں غنودگی کا سیاہ غبار تھا اور نہ اعضا نقاہت کے شکنجے میں تھے۔ آج وہ اُستاد جہانی پوری طرح بیدار تھا جو خطرناک دشمنوں میں گھر کر خود بھی خطرناک ہو جاتا تھا۔ گوپال ٹھاکرے کا حشر دیکھ کر ایک شخص نے اپنی بارہ بور رائفل سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ اس کی انگلی لبلبی تک پہنچتی' میری ٹھوکر رائفل کے بیرل پر پڑی۔ وزنی رائفل جھٹکے سے رائفل بردار کے چہرے پر لگی۔ وہ تیورا کر ایک تپائی پر گرا اور اسے توڑتا ہوا نیم بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور رائفل پر گرفت مضبوط کر لی۔ اب لبلبی پر دو انگلیاں تھیں۔ ایک میری' دوسری رائفل بردار کی۔ جونہی تیسرا شخص مجھ پر جھپٹا' میں نے زور لگا کر رائفل کا رُخ تبدیل کیا اور گولی داغ دی۔ دھماکے سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ گولی حملہ آور کی ٹانگ میں لگی اور وہ تڑپ کر نیچے گرا۔ میں رائفل بردار سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا جب بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور دو مزید رائفل بردار اندر گھس آئے۔ اپنے زخمی ساتھی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خطرناک چمک ابھر آئی اور انہوں نے اپنی رائفلیں میرے جسم سے لگا دیں۔ آہنی نالیوں کا وحشیانہ دباؤ گواہی دے رہا تھا کہ وہ گولی چلانے میں ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے رائفل پر سے اپنی گرفت ختم کر دی اور رائفل بردار کے اوپر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلح افراد کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی بھوکے کتوں کی طرح مجھ پر لوٹ پڑیں گے اور بوٹی بوٹی کر ڈالیں گے لیکن پھر پنڈت کی صورت دروازے پر نظر آئی اور ان کے تنے ہوئے رگ پٹھے ڈھیلے پڑ گئے۔

پنڈت کے چہرے پر آج واضح طور پر طیش اور نفرت کے آثار تھے۔ وہ کرخت لہجے میں بولا "تو مہاپاپی ہے۔ تیرے تشدد کی وجہ سے وہ پھول کے سمان لڑکی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ پاگل ہو گئی ہے وہ۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ "کیا ہوا سروج (ارجمند) کو؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

پنڈت نے گوپال ٹھاکرے سے کہا "دکھاؤ اسے اس مورکھ کو کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔"

گوپال ٹھاکرے آگے بڑھا۔ اس نے کوٹھڑی کے عین سامنے دس بارہ گز کے فاصلے پر واقع سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' یہ کافی بڑا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے ایک خوابگاہ کا منظر نظر آیا۔ ارجمند یعنی سروج ایک آرام دہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس کے بال منتشر تھے اور رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ برسوں کی بیمار نظر آتی تھی وہ۔ نہ بولتی تھی نہ حرکت کرتی تھی۔ بس پتھرائی نظروں سے ہمیں دیکھتی جا رہی تھی۔ یقیناً اس کے دماغ پر اثر ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے پنڈت کے چیلوں نے مجھ سے جو مار پیٹ کی ہے اس کی وجہ ارجمند کی تشویش ناک حالت ہی ہے۔

پنڈت نے بے حد تلخ لہجے میں کہا۔ "اس لڑکی کی اس حالت کا کارن تم اور صرف تم ہو۔"

"ارجمند! میری بات سنو۔ میری بات سنو ارجمند" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ گوپال ٹھاکرے نے آگے بڑھ کر مجھے روک دیا اور دھکیل کر واپس کوٹھڑی میں لے گیا۔ میں نے پنڈت سے مخاطب ہو کر کہا

آخر آپ لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔ میں نے اس لڑکی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لیے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں اس لڑکی کے لیے زندگی کا وسیلہ بنا ہوں۔ اگر یہ ہوش میں ہوتی تو آپ کی آنکھیں کھول دیتی۔"

پنڈت نے کہا "ہماری آنکھیں بند نہیں ہیں۔ اگر بند ہوتیں تو نواب کی حویلی میں آج بھی دیوداسیوں کی عزت کا ہتھیارا بنتا رہا ہوتا اور تم جیسے پلید بند کمروں میں مجبور عورتوں کی آبرو کو کھلونا بنا رہے ہوتے۔"

میں نے کہا "پنڈت جی! مجھے معلوم نہیں کہ حویلی کے نواب کس کردار کے مالک ہیں اور حویلی میں ہندو ناریوں سے کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے لیکن ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ اس لڑکی کے بارے میں۔ آپ اس لڑکی کے حوالے سے جو الزامات لگا رہے ہیں وہ شدید غلط فہمی پر مبنی ہیں۔"

پنڈت بولا "تمہارے بارے میں ہمیں اتنی جانکاری کافی ہے کہ تم مسلمان ہو اور اس ابرار علی کے مہمان ہو جسے لوگ چھوٹے نواب کہتے ہیں' جہاں تک لڑکی کی بات ہے' اس کے متعلق بھی ہم اندھیرے میں نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "اگر آپ اس کے بارے میں جانتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں یہ بات ضرور آئی ہوگی کہ یہ امیر کبیر برہمن لڑکی ایک ملازمہ کے روپ میں اس حویلی میں کیوں پائی گئی ہے۔"

"اسے یقیناً حبس بے جا میں رکھا گیا ہوگا۔ ایک معمولی کنیز کی طرح اس سے حویلی میں سیوا کرائی جاتی ہوگی اور گاہے گاہے نواب کے ہرکارے اس سے منہ بھی کالا کرتے ہوں گے۔"

"پنڈت جی' آپ ہر بات کو اپنے ہی ڈھنگ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کی سوچ غلط ہے۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ خود میں بھی ابھی تک اس بکھیڑے کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مس سروج اپنی مرضی سے نواب کی حویلی میں مقیم تھی۔ اس نے خود مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ یہاں تک کہ...."

"ہم بات کو الجھا کر اپنے انجام سے نہیں بچ سکتے" ٹھاکرے نے غرا کر میری بات کاٹی۔ اس کے انداز سے یوں لگا کہ وہ ابھی مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔

پنڈت نے ہاتھ کے مدبرانہ اشارے سے اسے روکا۔ وہ بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک طرح کا اسرار اور گہرائی تھی۔ پلکوں کے نیچے اس کی روشن پتلیاں جیسے میرے اندر تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دھیمی آواز میں بولا "ہم کسی سے ناانصافی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمہارے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔ ہمیں حقیقت کھوجنے میں کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن ناکامی نہیں ہوگی۔ اگر تم نردوش ثابت ہوئے تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔ ہمارا دھرم ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ دشمن سے بھی رواداری کا سلوک کرو۔"

پنڈت کا نرم رویہ اس کے ساتھیوں کے لیے تکلیف کا باعث تھا لیکن پنڈت کے سامنے ان کے لب سلے ہوئے تھے اور آنکھیں زمین میں گڑی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پنڈت کی ہر بات کو دل و جان سے قبول کرنے کے عادی ہیں۔

پنڈت کے اشارے پر سلائیڈنگ ڈور بند ہو گیا اور گم صم ذہنی ارجمند میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ پنڈت کچھ دیر مجھ سے انٹرویو کرتا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں پنڈت کے چیلے پھر مجھ پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ پچھلی جھڑپ میں تو خیریت گزری تھی لیکن اس مرتبہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ انہیں آڑے ہاتھوں لوں گا۔ پنڈلی سے لگا ہوا خنجر میری دسترس میں تھا اور میں اسے کسی بھی وقت استعمال میں لا سکتا تھا۔ بہرحال خیریت گزری۔ پنڈت کے چیلوں نے مجھے صرف گھورنے پر اکتفا کیا اور ایک ایک کر کے اپنی صورتیں گم کر گئے۔

میں مندر کے تہ خانے میں بند تھا۔ باہر کی دنیا کے بارے میں مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اگر میرے ہاتھ پر گھڑی نہ ہوتی تو یہ بھی پتا نہ چلتا کہ کب صبح ہوتی ہے اور کب دن ڈھلتا ہے۔ چوتھے روز کی مار پیٹ کے بعد مجھ سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا گیا۔ کھانا وقت پر پہنچایا جاتا رہا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی سردی کے پیش نظر مجھے ایک گدیلا اور کمبل بھی فراہم کر دیا گیا تھا۔ پہریدار بھی کبھی کبھی مجھ سے ہنس بول لیتا تھا۔ تاہم اسے اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ مجھ سے کسی نازک موضوع پر بات نہیں کرے گا۔ میں نے کئی بار اسے کریدنے کی کوشش کی تاکہ تہ خانے سے باہر کی صورت حال اور حویلی کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر یہ سوچ کر کہ ہنسنے بولنے کا یہ واحد سہارا بھی مجھ سے جدا نہ ہو جائے میں نے یہ کوشش ترک کر دی۔

میں جانتا تھا کہ ارجمند اس تہ خانے میں ہے اور پنڈت مہاراج اپنے طریقۂ علاج کے مطابق اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تہ خانے میں میرے خلاف بھی کوئی خطرناک قسم کی پلاننگ ہو رہی تھی' ظاہر ہے اس "پلاننگ" کا تعلق میرے "سنگین جرم" اور عبرتناک سزا سے تھا۔ میں ہندوؤں کے قبضے میں تھا۔ اگر ارجمند ہوش میں نہ آتی تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ارجمند کو ہوش میں کیسے لایا جا سکتا ہے....؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر زریں گل یہاں ہوتا تو موجودہ صورت حال سے بہت لطف اندوز ہوتا۔ وہ فلمیا کا مریض تھا اور یہ خالص فلمی قسم کی صورت حال تھی۔ ایک خوبصورت لڑکی شدید صدمے سے دوچار ہونے کے بعد اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اس موقعے پر

زریں گل کو کئی فلمی کہانیاں اور ان کے چیدہ چیدہ سین یاد آجاتے۔ اسے تو یہاں تک یاد آجاتا تھا کہ کس ہیروئن نے کتنی فلموں میں یادداشت کھوئی ہے اور وہ کون کون سا فلمی اداکار ہے جو یادداشت گنوانے میں "ماسٹر" سمجھا جاتا ہے۔

یہ میری حبس بے جا کا ساتواں یا آٹھواں روز تھا۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر اپنے پہریدار رام داس پر پڑی۔ وہ کوٹھڑی کے آہنی جنگلے سے باہر ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بہت افسردہ نظر آرہا تھا وہ۔ میں نے افسردگی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا لیکن اس ٹال مٹول میں نیم رضامندی کی کیفیت بھی شامل تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں اصرار کروں تو وہ اپنی خاموشی برقرار نہیں رکھے گا۔ میں نے کوشش کی اور ٹھیک دس منٹ میں اس نے اپنی چپ توڑ دی۔ سب سے پہلے اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ وہ سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس کی آنکھیں شفاف تھیں۔ ان میں جھلملاتے ہوئے آنسو بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ گلوگیر آواز میں کہنے لگا "چندرن تمہارے ساتھ برا ہوا' بڑا گھور سا ہو گیا ہے تمہارے ساتھ۔ اس بات پر نراش ہوں کہ یہاں تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہونے والا۔"

"میں سمجھا نہیں" میں نے کہا۔

وہ بولا "تمہیں دوشی ٹھہرایا گیا ہے اور ایک لڑکی کی عزت لوٹنے کے جرم میں تمہیں کڑی سزا دی جانے والی ہے۔"

"لیکن پنڈت جی نے تو کہا تھا کہ پوری تحقیق کی جائے گی۔"

"تحقیق تو انہوں نے ضرور کی ہوگی ورنہ پانچ چھ دن انتظار کیوں کیا جاتا۔ پہلے روز ہی تمہیں مرہٹے کے سپرد کیوں نہ کر دیتے۔"

"یہ مرہٹہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت خطرناک بندہ ہے۔ اس کا نام تو وشوا ناتھ ہے لیکن سب اسے "مرہٹہ مرہٹہ" کہتے ہیں۔ ہر ہندو مسلم فساد میں وہ آگے آگے ہوتا ہے۔ اس نے مندر کے پچھواڑے رام جی کے باغ میں چھوٹا سا اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ کہنے کو تو وہاں کشتیاں ہوتی ہیں لیکن اصل میں وہ بلوائیوں کا اڈا ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ بندوق' پستول' لائٹ مشین گن وہاں چھپایا گیا ہے۔ مرہٹہ وہاں بکھرے چھوکروں کو جمع کرتا ہے اور انہیں لڑائی مار کٹائی کے طریقے بتاتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ارد گرد کے سب لوگوں کو اس بات کا پتا ہے اور تو اور' پولیس کو بھی پتا ہے لیکن وہ بے خبر بنی ہوئی ہے۔ یہ مرہٹہ سن سینتالیس میں پاکستان بننے کے وقت گورداسپور سے دو جوان مسلمان لڑکیاں اٹھا لایا تھا۔ اس نے علی الاعلان انہیں گھر میں رکھا ہوا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے ان سے بیاہ کر رکھا ہے۔ دو تین سال بعد اس نے وہ لڑکیاں کسی اور کو بیچ ڈالی تھیں۔ اب مرہٹہ بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اس وقت کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ تم کو پتا ہے کہ اس علاقے میں ہندو بھی رہتے ہیں اور مسلمان بھی۔ مرہٹے کی باتیں سننے والوں میں مسلمان بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایسی بے شرمی کی باتیں سن سن کر ان کا خون کھولتا رہتا ہے۔ مرہٹہ چاہتا بھی یہی ہے کہ ان کا خون کھولے۔ پچھلے برس دیوالی سے دو دن پہلے ایک عجیب بات ہوئی۔ چند مسلمان لونڈے مرہٹے کو اس کے تانگے سمیت پکڑ کر لے گئے۔ تانگے میں تانگا بان منوج بھی تھا۔ منوج مرہٹے کا ذاتی ملازم تھا۔ مسلمان لڑکوں نے جنگل میں لے کر جا کر مرہٹے اور اس کے ملازم منوج کی خوب مرمت کی۔ مرہٹہ تو کسی طرح جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا لیکن تانگا بان منوج نہ نکل سکا۔ مسلمان لڑکوں سے بھی کچھ زیادتی ہو گئی۔ انہوں نے منوج کو جنگل میں تکلیفیں دے دے کر مار ڈالا۔ اس کی لاش دیوالی سے آٹھ دس روز بعد عالم پور کے قریب برساتی نالے میں سے ملی تھی۔ اس کی ہڈیوں میں کئی جگہ لوہے کی کیلیں گڑی ہوئی تھیں۔

مرہٹہ تو جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنے ہرکارے چاروں طرف دوڑا دیے کہ لڑکوں کو تلاش کریں۔ پولیس بھی سب کام چھوڑ چھاڑ کر لڑکوں کی تلاش میں لگ گئی۔ بڑی کوشش کے بعد ان میں سے ایک لڑکا عرفان مرہٹے کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ کالج اسٹوڈنٹ تھا' شاید بی اے میں پڑھتا تھا۔ مرہٹے کے کارندے اسے پکڑ کر ڈیرے میں لے آئے' یہاں پتا نہیں اسے کیسے تڑپا تڑپا کر مارتے لیکن وہ سیانا نکلا۔ معلوم نہیں کیسے اس نے ڈیرے پر پہنچتے ہی آتما ہتیا کر لی۔ کہتے ہیں اس نے اپنے لمبے بالوں میں بلیڈ چھپا رکھا تھا۔ اس نے یہ بلیڈ اپنے گلے پر اس طرح پھیرا کہ شہ رگ بھی کٹ گئی۔ وہ چند منٹ میں ختم ہو گیا۔ مرہٹے نے اس کی لاش ویرانے میں پھنکوا دی۔ پولیس بہت دن تفتیش کرتی رہی۔ مرہٹے کے ایک دو ساتھی گرفتار بھی ہوئے لیکن کوئی "ثبوت" نہیں ملا اور کیس ٹھنڈے لائن لگ گیا۔ بعد میں سنا گیا کہ عرفان کے باقی دو ساتھی کویت بھاگ گئے ہیں۔

مرہٹہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس کا انتقام ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ وہ علی الاعلان کہتا پھر رہا تھا کہ جب تک کسی مُسلے کو اس طرح نہیں مارے گا جس طرح اس کے ملازم کو مارا گیا' اسے شانتی نہیں ملے گی۔ وہ تو شاید کسی بھی بندے کو پکڑ کر لے آتا لیکن پنڈت جی نے اسے منع کیا اور کہا کہ وہ اپنے انتقام کی اگنی بجھانے کے لیے کسی نردوش کا خون نہ بہائے۔ پنڈت جی کے سمجھانے بجھانے سے وہ کچھ رام ہو گیا۔ مگر اب ایک بار پھر اس کا جوالا مکھی بھڑک اٹھا ہے۔" رام داس نے یہاں تک کہہ کے ایک گہری سانس لی اور محتاط نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لیا جیسے ڈر رہا ہو کہ کوئی اسے میرے ساتھ راز و نیاز کرتے نہ دیکھ لے۔ چند لمحے بعد سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے وہ بولا۔ "مرہٹے نے پنڈت جی سے پرارتھنا کی ہے کہ اگر تم نردوش ثابت نہ ہوئے تو تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔ پنڈت جی کے قریبی ساتھی ٹھاکرے نے تو اس بات سے

اتفاق کرلیا ہے۔ یکی بات ہے کہ وہ پنڈت جی کو بھی راضی کرلے گا۔ اگر ایسا ہوگیا تو آج شام یا کل کا دن تمہارے لیے شانتی کا آخری دن ہوگا' ہوسکتا ہے کہ پھر تم موت مانگو اور تمہیں وہ بھی نہ ملے۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے رام داس کا لہجہ بے حد گمبھیر ہوگیا تھا۔ اس لہجے میں میرے لیے بے حد خوفناک اطلاعات چھپی ہوئی تھیں لیکن یہ صورت حال میرے لیے نئی نہیں تھی۔ جان لیوا خطرات کو تو میں نے اپنی مرضی سے سینے لگا رکھا تھا۔ موت کی سرگوشی میرے کانوں میں اس موسیقی کی طرح گونجتی تھی جو روح کی غذا سمجھی جاتی ہے۔ شاید حوادث کا مقابلہ کرتے کرتے میں اتنا بے حس ہوچکا تھا کہ زندہ رہنے اور خود کو تکلیف سے بچانے کی جبلت میرے اندر دم توڑ چکی تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر میں کیوں ہر جگہ اوکھلی میں سر دیتا تھا اور سنگین ترین خطرات سے لذت کشید کرتا تھا۔ یہ کیفیت یقیناً پہلے بھی موجود تھی لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ... غزالہ سے جدا ہونے کے بعد اس کیفیت میں شدت پیدا ہوئی ہے۔ زندگی اور موت کا فاصلہ میرے لیے پہلے بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں تھا' اب وہ اور بھی کم ہوگیا تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا "اس سے مطلب ہے کہ پنڈت جی کی تفتیش مکمل ہوچکی ہے اور اس بے کار تفتیش کے نتیجے میں میں مجرم ٹھہر چکا ہوں۔"

رام داس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نمناک آنکھیں سوچ میں ڈوبی تھیں اور ذہن تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ پُرسوچ لہجے میں بولا "اگر تم نردوش ہو تو پھر کسی طرح اس لڑکی کو زبان کھولنے پر مجبور کرو۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک دفعہ پنڈت مہاراج سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ وہ تمہیں ایک دو مرتبہ لڑکی سے ملاقات کرنے دیں۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں سامنے دیکھ کر اور تم سے باتیں کرکے اس کا دماغ ٹھکانے آجائے۔ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ ہمارے بھی گاؤں کا ایک بندہ غوب دلی کے بیچ میں آگیا تھا۔ بڑی چوٹیں لگی تھیں اس کے سر پر۔ سب کچھ بھول گیا تھا لیکن جب اسپتال سے واپس آیا تھا اور اپنے لوگوں سے ملا جلا تھا تو جلدی ٹھیک ہوگیا تھا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کررہے تھے کہ تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ رام داس ایک دم خاموش ہوگیا اور مجھ سے دور سرک گیا۔ سیڑھیوں کی جانب سے آنے والی آواز پنڈت کی کھڑاؤں کی تھی۔ چند لمحے بعد مجھے دروازے پر اس کی صورت نظر آئی۔ "ہری اوم ہری اوم" پکارتا ہوا وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ حسب معمول وہ سفید دھوتی قمیص میں تھا۔ ہاتھ میں موٹے دانوں کی مالا گردش کررہی تھی۔ اس کے عقب میں تین چار چیلے ہاتھ باندھے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے دو چیلے مسلح تھے اور ان کے کندھوں سے جدید قسم کی رائفلیں جھول رہی تھیں۔ پنڈت کچھ دیر مجھے خاموشی سے گھورتا رہا پھر فیصلہ سنانے والے انداز میں بولا "اپنی ہمت اور وسائل کے مطابق ہم نے پوری طرح چھان بین کی ہے۔ نواب شہریار جنگ کی حویلی میں تمہاری آمد چند ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ ایک ساتھی بھی تھا تمہارا۔ تم نے اس کا نام ہربنس سنگھ اور اپنا راہول جوشی بتایا تھا۔ تم دونوں نواب کے بیمار بیٹے کے علاج کا ناٹک رچانے حویلی میں گھسے تھے لیکن پکڑے گئے۔ نواب نے تمہیں حویلی میں ہی رکھ لیا۔ بعد میں جب سلجوق نام کے بدمعاش نے نواب کی بیٹی اور بہو کو اغوا کیا تو تم بھی ساتھ ہی دھرے گئے۔ تمہارے کردار سے ثابت ہوتا ہے کہ تم ایک چالباز اپرادھی ہو اور حیدرآباد آنے کے بعد اب تک تم نے اپنے ذاتی فائدے کا کوئی موقع ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ خود نواب شہریار جنگ کی رائے بھی تمہارے خلاف جاتی ہے۔ تمام حالات دیکھنے اور حویلی کے ملازموں کے بیان سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ واردات کی رات تم مس سروج کو زبردستی اپنے کمرے میں لائے۔ پہلے اس سے مارپیٹ کی پھر اس کے ہاتھ باندھے اور اس سے بلادکار کیا۔"

میں نے پنڈت کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بے شک میں نے مس سروج کو تھپڑ مارے۔ اس کے کپڑے پھاڑے اور اسے دو مرتبہ سگریٹ سے داغا لیکن یہ سب کچھ اس کے بھلے کے لیے کیا گیا ہے۔ میں ایک سے زائد مرتبہ اس بارے میں تفصیل بتا چکا ہوں۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ مس سروج کی زبان بند ہے" ایک لمحہ توقف کرکے میں نے کہا "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ مجھے مس سروج سے بات کرنے کا موقع دیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے مس سروج کی حالت میں کوئی بہتری پیدا ہوجائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ مس سروج (ارجمند) کے لیے کیا ہے اس کے بعد اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں اس سے اپنی معصیت بیان کروں اور بتاؤں کہ اس کی خاموشی کے سبب میری زندگی خطرے میں ہے تو اس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع ہوجائے۔"

پنڈت کی غلافی آنکھیں ایک دم سوچ میں ڈوب گئیں۔ وہ چند لمحے بے خیالی میں مجھے گھورتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے! میں تمہاری اس درخواست کو تمہاری آخری خواہش سمجھتے ہوئے قبول کرتا ہوں۔ تاہم خیال رہے کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم کل شام تک دو مرتبہ ایک ایک گھنٹے کے لیے مس سروج سے مل سکتے ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ ملاقات اکیلے میں ہوگی؟"

پنڈت نے زہرخند انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا "کیا تم اب بھی خود کو اس قابل سمجھتے ہو کہ تم پر اس طرح کا بھروسا کیا جائے۔"

میں نے کہا "میں خود کو اس قابل سمجھتا ہوں اور آپ کو بھی

سمجھنا چاہیے کیونکہ ابھی تک مجھ پر جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ بہر حال اگر آپ کا تعصب آپ کو اجازت نہیں دیتا تو آپ احتیاطی تدبیر کر سکتے ہیں۔ کمرے سے باہر اپنے مسلح فوجی کھڑے کر دیجیے۔ وہ مجھے نشانے پر رکھیں لیکن سامنے نہ آئیں۔"

گوپال ٹھاکرے بولا "اس کے باوجود تم مس سروج کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہو۔ اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ تم اسے ڈھال بنا کر ہمیں دھمکانے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"غیر مسلح آدمی کسی کو ڈھال کیا بنائے گا۔۔۔ تم چاہو تو میرے ہاتھ بھی باندھ سکتے ہو۔"

پنڈت نے گوپال ٹھاکرے سے مخاطب ہو کر کہا "میرا وچار ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پر بندھوا دو لیکن اس طرح کہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ بہتر ہے کہ یہ اوپر سے چادر کی بکل مار لے۔ دو آدمی کمرے سے باہر چوکس حالت میں رہیں۔ اگر یہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرے تو کوئی ڈھیل نہ دیں۔"

گوپال ٹھاکرے نے تعظیم سے سر جھکایا اور کینہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ غالباً اسے میرے لیے اپنے گرو کی یہ رعایت بھی پسند نہیں آئی تھی۔

اس روز دوپہر کے وقت مجھے سروج یعنی ارجمند سے ملانے کے لیے لے جایا گیا۔ میرے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے پشت پر بندھے تھے اور میں جانتا تھا کہ کمرے سے باہر مندر کے دو مسلح سیوک بالکل چوکس کھڑے ہیں۔ سروج ایک صوفہ نما کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس میلا اور بال منتشر تھے۔ یہ لباس مندر کی کسی خادمہ کا تھا اور سروج کے متناسب بدن پر کافی ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اس کے سامنے ایک انگلش میگزین پڑا تھا۔ وہ بے خیالی میں اس میگزین کو گھورے چلی جا رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بھی اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"ارجمند، میری طرف دیکھو۔ میں شاہ جہاں ہوں" میں نے سرگوشی کی۔ اس نے جیسے کچھ سنا نہیں۔ اجنبی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا "تمہیں یاد ہونا چاہیے۔ تمہیں زہر دیا گیا تھا۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم نے وہ پانی پیا تھا جس میں کچھ ملایا گیا تھا۔ پھر تمہارے ہاتھ باندھ کر تمہیں میرے کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ عینک والا گوتاپ واصدی اور اس کا ساتھی تم سے مار پیٹ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے مجھ پر بھی پستول تان رکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا۔"

سروج کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ بس ویرانی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کا انداز دل میں خوف ابھارنے والا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی نگاہوں کے عین سامنے کرتے ہوئے پوچھا "تم مجھے پہچانتی نہیں ہو؟ تم پہچانتی ہو، یاد کرو سائیں عالی نے تمہیں میرے بارے میں کیا کہا تھا؟"

یوں لگا جیسے وہ ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ پھر اس نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "دیکھو سروج، اگر تم نے زبان بند رکھی تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں پورا یقین ہے کہ تمہاری اس حالت کا ذمے دار صرف اور صرف میں ہوں۔ انہوں نے مجھے صرف چند گھنٹوں کی مہلت دی ہے۔ یہ آخری مہلت ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے قتل کر کے لاش کسی ویرانے میں پھنکوا دیں گے۔" سروج سے کچھ اور نزدیک ہوتے ہوئے میں نے آہستگی سے کہا "سائیں عالی کی پیش گوئی یاد کرو۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر کوئی گمشدہ دفینے تک پہنچ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔ جب میں نہ رہوں گا تو اس پیش گوئی کا کیا ہو گا اور اس ساری دوڑ دھوپ کا کیا ہو گا جو تم کئی برسوں سے کر رہی ہو۔ بولو، جواب دو۔"

"چھوڑ دو۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو" سروج منمنائی "تمہاری باتوں سے۔۔۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کون ہو تم۔ مجھے۔۔۔ کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"سروج۔۔۔ ذہن پر زور دو" میں نے التجا کی۔

اس کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچی اور وہ یکدم پھٹ پڑی "چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ بھگوان کے لیے نکل جاؤ یہاں سے۔"

اس نے باقاعدہ مجھ پر چڑھائی کر دی اور دھکے دینے لگی۔ مندر کے مسلح سیوک لپک کر اندر آئے اور انہوں نے سروج کو سنبھال لیا۔ اندر آنے والوں میں گوپال ٹھاکرے بھی شامل تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں حقارت اور نفرت تھی۔ ہمارے باہر نکلتے ہی خراب کار کا سلائیڈنگ ڈور مدھم سرسراہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ گوپال ٹھاکرے مجھے دھکیلتا ہوا کوٹھڑی میں لے آیا اور سلاخوں والا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ غالباً اسے پنڈت مہاراج کی طرف سے منع کیا جا چکا تھا ورنہ اس موقع پر وہ مجھے طعن و تشنیع کا نشانہ ضرور بناتا۔

وہ رات میں نے سخت کشمکش میں گزاری۔ تہ خانے کی اس نیم تاریک کوٹھڑی میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آج پہریدار رام داس کی منحوس صورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی جگہ ایک صفاچٹ ٹنڈ والا شخص ڈیوٹی پر تھا۔ اس کی چمکدار ٹنڈ پر ایک جانب لمبی سی بودی لٹک رہی تھی۔

کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں کیا ہونے والا ہے۔ رام داس نے "مرہٹہ" نامی شخص کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک انتہائی خطرناک شخص ہے اور اگر میں اس کے ہتھے "چڑھا دیا گیا" تو وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اس کے ملازم منوج کے ساتھ چند نامعلوم لڑکوں نے کیا تھا۔۔۔ لیکن میرے لیے مرہٹے کے حوالے سے بہتری کی صورت بھی نکل سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ مرہٹے کے حوالے کرنے کے لیے

مجھے تہ خانے سے نکالنا ضروری تھا۔ اس چوہے دان جیسے تہ خانے میں جہاں بہت سے مسلح افراد موجود تھے میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ تہ خانے سے نکل کر میں آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار سکتا تھا اور ممکن تھا کہ کامیاب بھی ہو جاتا۔ تہ خانے سے نکل کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے، راستے میں یا مرہٹے کے ٹھکانے پر پہنچ کر کسی بھی وقت میرا داؤ چل سکتا تھا لیکن یہ سارے امکانات اسی بات سے مشروط تھے کہ میں ہوش میں ہوتا۔ اگر مرہٹے کے حوالے کرنے سے پہلے مجھے بے ہوش کر دیا جاتا یا بُری طرح جکڑ دیا جاتا تو "جدوجہد" کی خواہش دل ہی میں رہ جاتی تھی۔

پنڈت مہاراج نے مجھے دو مرتبہ سروج سے ملاقات کی اجازت دی تھی۔ اگلے روز میں نے اس دوسرے موقعے سے بھی فائدہ اٹھایا لیکن نتیجہ کامیابی کی صورت میں نہیں نکلا۔ سروج بالکل گم صم بیٹھی رہی۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں کھو چکی تھی۔ میں بے نیل و مرام اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ جونہی میں گھوم کر دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سروج کی آواز میرے کانوں میں گونجی "ٹھہرو" میں ٹھٹک کر پلٹا اور دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بے حد دھیمے لیکن بدلے ہوئے لہجے میں بولی "کیوں مسٹر شاہ جہاں، آ گئے راہ پر، کا بھاؤ معلوم ہو گیا نا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہم دونوں ساتھ چلیں گے تو دونوں فائدے میں رہیں گے ورنہ دونوں کا نقصان ہو گا۔"

"تت۔۔۔ تم ٹھیک ہو ارجمند" میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

"آہستہ بولو" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "مندر کے سیوک ہماری ایک ایک حرکت دیکھ رہے ہوں گے اور سن بھی رہے ہوں گے سب کچھ۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کہیں ڈکٹا فون لگا رکھا ہو۔ ان لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔"

میں معترف ہو گیا۔ سروج کمال کی اداکارہ تھی۔ وہ سپاٹ لہجے میں سکتہ زدہ چہرے کے ساتھ بول رہی تھی لیکن بہت اہم باتیں کر رہی تھی۔ نہ تو لہجے کی چنچل کھاتا تھا اور نہ لہجے سے چہرے کے تاثرات کا تعلق ثابت ہوتا تھا۔ مجھے حیرانی ہونے لگی کہ ایسی با کمال اداکارہ انڈین فلم انڈسٹری میں فلاپ کیسے ہو گئی۔ کوئی فن شناس ہدایت کار ہوتا تو آشا پاریکھ، مالا سنہا اور شرمیلا ٹیگور جیسی اداکاراؤں کو ایک قطار میں بٹھا دیتا اور سروج کو ان پر اتالیق مقرر کر دیتا۔ بلکہ وہ تو اس قابل تھی کہ اسے پونا فلم انسٹی ٹیوٹ کی پرنسپل بنا دیا جاتا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ وہ کتنی مشاقی سے یہاں موجود سب افراد کو جھول میں رکھے ہوئے ہیں ٹالتی رہی ہے۔

"یہ سب کیا ہے سروج؟" میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا "یہ ڈھونگ کیوں رچا رکھا ہے تم نے؟"

وہ بولی "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"میں خاموش رہنے کا حق رکھتی ہوں اور یہ قانونی حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ بھی نہیں چھین سکتے جو مجھے یہاں لائے ہیں۔ بلکہ وہ تو اس انداز میں سوچ ہی نہیں سکتے۔ انہیں پورا وشواس ہے کہ میں ذہنی توازن کھو چکی ہوں۔ تم بے شک جتنا مرضی واویلا کرو، کوئی تمہاری بات پر وشواس نہیں کرے گا۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ اپنا جیون بچانے کی خاطر تم الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے ان جنونیوں کے ہاتھوں مروانا چاہتی ہو۔"

"نہیں۔ میں کچھ اور چاہتی ہوں" وہ پُراسرار انداز میں بہت دھیرے سے مسکرائی۔ اس کا چہرہ میری اوٹ میں تھا اور رنگ دار شیشوں والی کھڑکیوں کے عقب میں کوئی موجود بھی تھا تو اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بات آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولی "میں چاہتی ہوں کہ تم پہلے میرے ساتھ رہو۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں اور اس منزل تک پہنچیں جس کی نوید ہمیں سائیں جی نے دی ہے۔۔۔ شاہ جہاں، میں صاف سیدھی بات کرتی ہوں۔ آج تمہیں مجھ سے ایک سودا کرنا ہو گا۔ یہ ایک شاندار سودا ہے۔ اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔۔۔ تمہارا۔"

"کیسا سودا؟"

"میرے ہو جاؤ اور مجھے اپنا کر لو۔ اپنا سب کچھ مجھے سونپ دو اور میرا سب کچھ تم لے لو۔ کیا میں سُندر نہیں ہوں؟ جوان نہیں ہوں؟ کیا میرا دل خوبصورت نہیں ہے۔ کیا کمی ہے مجھ میں۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں سونپنا چاہتی ہوں اور کس کے بدلے؟ تمہاری زندگی کے بدلے۔ یعنی تمہیں زندگی بھی دے رہی ہوں اور اپنا آپ بھی۔ تم مجھے قبول کر لو۔ میں ابھی پنڈت جی کے سامنے یہ بیان دے دیتی ہوں کہ تم نردوش ہو۔ تم میرے دشمن نہیں محسن ہو۔۔۔"

"بے حد کمینی عورت ہو تم" میں نے زہریلی سرگوشی کی۔ "ناگن کو سالہا سال دودھ پلایا جائے تو بھی وہ ناگن ہی رہتی ہے۔"

"کم از کم اس وقت تو تم مجھے ناگن مت کہو۔ میں تمہارے لیے ایک نئے جیون کا وسیلہ بن رہی ہوں اور اس کے علاوہ۔۔۔"

اسے یکدم چپ ہونا پڑا۔ ہماری مسلسل گفتگو نے کمرے سے باہر موجود نگرانوں کو بے چین کر دیا تھا۔ ٹھاکرے نے دروازہ کھولا اور کھوجتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری آنکھ کے اشارے پر وہ فوراً باہر نکل گیا۔ سروج بولی "تمہارے پاس وقت بہت کم ہے شاہ جہاں! ایک بار یہ لوگ تمہیں یہاں سے لے گئے تو پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ بہت دردناک حال کریں گے یہ تمہارا۔"

میں نے گہری سانس بھر کر کہا "ٹھیک ہے سروج! مجھے تمہاری یہ

شریا منظور ہے۔"

وہ بولی "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہاں سے چھوٹ جانے کے بعد تم اپنی پرانی ڈگر پر نہیں آ جاؤ گے۔"

"تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ میں تمہیں کیا ضمانت دے سکتا ہوں۔"

وہ نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر بولی "دغا باز ہو پھر بھی تم پر اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بہرحال کوئی چھوٹا موٹا ثبوت تو تمہیں دینا ہی ہوگا۔"

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً یہ کہ مجھے اپنی بانہوں میں بھر لو" یہ کہتے کہتے وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے سٹپٹا کر اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔ چند لمحے بعد وہ جدا ہوئی اور اپنے بے ترتیب سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بولی "میں اب یہ ظاہر کروں گی کہ آہستہ آہستہ میرے ہوش ٹھکانے آ رہے ہیں۔ اگر پنڈت جی یہاں آئے تو ان سے کہوں گی کہ تمہیں میرے پاس ہی رہنے دیں۔ اگر وہ مان گئے تو آج رات ہم آرام شانتی سے بات چیت کریں گے اور آئندہ کا پروگرام طے کرلیں گے۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "تم اب جاؤ۔ ٹھاکرے سے بس اتنا کہہ دینا کہ سروج کی حالت سنبھل رہی ہے۔ باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گی۔"

وہ "کمانڈنگ پوزیشن" میں تھی اور بڑے اعتماد سے بول رہی تھی۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور تھوڑی دیر بعد اس کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی اور بڑے جذباتی انداز میں اپنا چہرہ میری ٹھوڑی کے نیچے چھپا لیا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا اور جدا ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔ گوپال ٹھاکرے اور دوسرے نگران کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرح کی مایوسی بھی جھلک رہی تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ آئندہ حالات کیا رُخ اختیار کرنے والے ہیں۔ ان کے خیال میں میں وہ برف پگھلانے میں کامیاب رہا تھا جس نے سروج کے حواس منجمد کر رکھے تھے اور سروج کے حواس بحال ہونے کا نتیجہ میرے حق میں نکلا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے "مرہٹے" کے حوالے کرنے اور اذیت ناک موت مروانے کی جو خواہش ان کے دلوں میں مچل رہی تھی وہ اب پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے گوپال ٹھاکرے کی مایوسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "لڑکی کی یادداشت واپس آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کل تک بیان دینے کے قابل ہو جائے گی۔"

ٹھاکرے نے بُرا سا منہ بنایا اور مجھے دھکیلتا ہوا واپس کوٹھڑی میں لے آیا۔

سروج کی اداکارانہ صلاحیتوں نے مجھے حیران کردیا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک جہاندیدہ اور ذہانت لڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ موجودہ حالات کا رُخ با آسانی اپنے حق میں موڑ لے گی۔

رات گیارہ بجے مندر کے دو خدمت گاروں نے میری کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے ایک بار پھر سروج عرف ارجمند کے پاس پہنچا دیا گیا۔ سروج بہت خوش اور توانا نظر آ رہی تھی۔ اس نے مبارکباد دینے والے انداز میں مجھ سے کہا۔ "ایزا! اب تمہارے جیون کو کوئی خطرہ نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پنڈت مہاراج سے میری بات ہوئی ہے۔ میں نے ان کے من کے شکوک کافی حد تک دور کردیے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ تم نے بتایا ہے کہ زہر دینے والا کون تھا؟"

"نہیں" وہ چالاکی سے مسکرائی "اتنی جلدی بتادوں گی تو سارا ڈراما فلاپ ہو جائے گا۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کیا ہے کہ میری حالت آہستہ آہستہ سنبھل رہی ہے۔ آخری روز پہلے کے واقعات بتدریج یاد آ رہے ہیں اور بہت جلد میری زبان کا بند تالا کھل جائے گا۔"

"کیا تم نے خود مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"نہیں ڈیئر" وہ دھیرے سے مسکرائی "میں نے نہیں بلایا لیکن.... بلایا بھی ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بات زبان سے ہی کہی جائے۔ میں نے اشاروں کنایوں میں پنڈت جی پر واضح کردیا ہے کہ میری حالت میں جو بہتری واقع ہوئی ہے اس کا سبب تم ہو۔ تمہارے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کے بعد ہی میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنی شروع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں پھر میرے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ میں مکمل طور پر ہوش و حواس میں آسکوں۔"

میں سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا لیکن سروج نارمل انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے کہا "تم نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کی جائے گی۔"

وہ بولی "اندیشہ اب دور ہو چکا ہے۔ میں نے اطمینان کرلیا ہے 'خفیہ مائیکروفون' قسم کی کوئی شے یہاں موجود نہیں ہے۔ اب تو کمرے سے باہر پہریدار بھی موجود نہیں ہیں۔ اب ہم یہاں پوری شانتی سے بات کرسکتے ہیں بلکہ جو من چاہے کرسکتے ہیں" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں معنی خیز چمک اُبھر آئی تھی۔

میں نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا "نواب واحدی کے بارے میں کچھ پتا ہے تمہیں؟"

"بالکل پتا ہے" وہ آنکھیں نچا کر بولی "اس کی لاش پورے تین دن تک اس مندر کے پچھواڑے واقع کھیت میں سڑتی رہی ہے۔ کسی مسلمان یا ہندو کو ہمت نہیں ہوئی کہ اسے ٹھکانے لگائے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک تو اسے کتے اور چیل کوے نوچ کر کھا چکے ہوں گے۔"

"او گاڈ" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اس کا مطلب ؟

انہوں نے اسے قتل کردیا۔"

"نہ صرف وہ قتل ہوا بلکہ اس کے ساتھ چھوٹے نواب کے [illegible] بھی مارے گئے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد دو سے اوپر تھی۔ حملہ کرنے والوں نے حویلی کے ایک حصے کو آگ لگادی تھی۔ چھوٹے نواب کی قسمت اچھی تھی جو وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ حملہ کرنے والوں نے دوسری منزل کے کمرے سے بڑے نواب کو بھی برآمد کرلیا۔ وہ رسیوں میں جکڑا ہوا اور بھوک پیاس کے سبب قریب المرگ تھا۔ سنا ہے کہ رہائی پانے کے بعد چھوٹے نواب کے وفاداروں کو اپنے ہاتھ [illegible] ہے۔ اب وہ ایک بار پھر حویلی اور جاگیر کا مختار کل ہے۔"

میں نے اپنی بے پناہ حیرت کو جذب کرتے ہوئے پوچھا "یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟"

وہ بولی "اس تہ خانے میں موجود ہر شخص نے تھوڑا تھوڑا بتایا۔ دراصل مجھے پگلی سمجھ کر یہ لوگ میرے اردگرد آزادانہ گفتگو کرتے رہے ہیں.... مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب شہریار جنگ کی نظر میں چھوٹے نواب کی حیثیت اب ایک باغی اور غدار کی سی ہے۔ پنڈت مہاراج کے چیلوں کے علاوہ نواب شہریار کے کارندے بھی اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟"

وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے تاخیر کی تو جیون بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا چاہیے اور چھوٹے نواب فیروز کی تلاش میں لگ جانا چاہیے۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ صندوق اس وقت فیروز جنگ کے پاس ہیں؟"

"اس مرحلے میں وثوق سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا مگر [illegible] سکتی ہے کہ صندوق فیروز جنگ کے پاس ہیں اور وہ انہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچا چکا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ فیروز جنگ اور اس کے باپ میں ٹکراؤ کی وجہ بھی یہی صندوق بنے ہوں۔"

میں نے چونک کر سروج کی طرف دیکھا۔ اس کی بات نے میرے ذاتی خیالات کی تصدیق کی تھی۔ پچھلے کئی روز سے میرے دماغ میں بھی یہ خیال سرسرا رہا تھا کہ نواب شہریار اور اس کے بیٹے کے مابین تنازعہ وہی صندوق ہیں جو چند ماہ پہلے پنج آب والی حویلی سے غائب ہوئے ہیں اور طوفانی رفتار سے سازشوں کی پرورش کرتے جنگل سے سیکڑوں میل دور حیدرآباد دکن آ پہنچے ہیں۔ میں نے [illegible] والی نگاہوں سے سروج کو دیکھا اور پوچھا "تم یہ کیسے کہہ [illegible] ہو کہ نواب شہریار اور اس کے بیٹے میں جھگڑے کی وجہ یہی ہے؟"

وہ کسی ماہر سراغ رساں کی طرح بولی۔ "اگر غور کریں تو کڑی سے کڑی ملتی نظر آتی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ بہو کی موت کے بعد نواب شہریار میں آناً فاناً تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس کا رجحان ایکدم دھرم کی طرف ہو گیا تھا اور وہ ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس نے ان قیمتی صندوقوں کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ کرلیا ہو جو فیروز جنگ کو پسند نہ آیا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ساری دولت نواب شہریار کی نہیں تھی اور اس کے پاس کسی ناجائز ذریعے سے ہی آئی تھی لہٰذا اس نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ سارا دھن حقدار کو لوٹا دیا جائے یا پھر حکومت کے خزانے میں جمع کرا دیا جائے۔ چھوٹے نواب فیروز جنگ نے اس بات سے شدید اختلاف کیا' یہاں تک کہ باپ کے خلاف بغاوت کردی۔ اس نے باپ کے اغوا کا ڈراما رچایا اور اپنے ہی وفادار کارندوں کے ہاتھوں اسے اغوا کرا کر حویلی کی بالائی منزل پر ایک الگ تھلگ کمرے میں بند کروا دیا۔ یقیناً وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہتا لیکن مکافات عمل کا قانون حرکت میں آیا اور فیروز جنگ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی جس نے اسے عرش سے فرش پر لا پھینکا۔ اس نے جہاں باپ کے دوسرے قیدیوں کو رہا کیا وہاں نواب واحدی کو بھی رہا کیا اور بطور مہمان حویلی میں ٹھہرا لیا۔ یہ خبر جب جذباتی قسم کے ہندوؤں تک پہنچی تو وہ مشتعل ہو گئے اور انہوں نے بڑے نواب کے وفاداروں کے ساتھ مل کر چھوٹے نواب کا تختہ اُلٹ دیا۔ چھوٹے نواب بچ نکلنے میں کامیاب ہوا اور یوں وہ صندوق اسی کی تحویل میں رہے جو نو ماہ پہلے ایک تاریک رات کو حویلی پہنچے تھے۔"

سروج نے بات ختم کی اور تعریف طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بہت خوب!" میں نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو شرلاک ہومز کو مات کردیا ہے۔ بہت باریک نظر ہے تمہاری... اور نظر سے بڑھ کر دماغ تیز ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ تم نے اتنی آسانی سے زہر کیسے پی لیا۔"

میرے آخری الفاظ نے تعریف کا مزا کرکرا کر دیا تھا لہٰذا سروج نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ بولی۔ "زہر تو تم نے بھی بڑی رغبت سے پی لیا تھا حالانکہ تم جہاں اُستاد ہو۔ جرم کی دنیا میں بڑا نام ہے تمہارا۔ سنا ہے اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم دونوں اپنی "بیوقوفی" تسلیم کرلیں۔" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی وہ زہر بالکل بے ذائقہ اور بے رنگ تھا۔"

"تمہاری طرح۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"میں زہر ہوں تو پھر پینے کی کوشش مت کرو۔ اوٹ پٹانگ خیالات ذہن سے نکالو اور یہ سوچو کہ فیروز جنگ تک جلد سے جلد

کیسے پہنچا جائے۔"

"دیکھو میں عورت ہوں۔ سوچنا اور فیصلہ کرنا مرد کا کام ہوتا ہے۔ میں تو تمہارے حکم کی تابع ہوں۔ جو کہو گے کروں گی۔ جہاں لے چلو گے چلوں گی۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "تمہارے جیسی دس بیس عورتیں اس ملک میں مزید پیدا ہو جائیں تو یہاں عورت راج نافذ ہو جائے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کتنی تابعدار ہو۔ تمہاری تابعداری' محبت اور وفا صرف دولت سے مشروط ہے لہٰذا فضول باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہارے خبیث ذہن میں اب کیا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔"

خلاف توقع اس نے میرے "ریمارکس" کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ آلتی پالتی مار کر بستر پر بیٹھ گئی اور اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر ٹکا کر بولی۔ "شاہجہاں' میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔ یہ جو فیروز جنگ ہے نا' انگلینڈ میں انگلش کھانے کھاتا رہا ہے۔ اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ اب وہ صرف انگلش کھانا کھاتا ہے۔ یہی حال اس کی بہن شاہین کا ہے۔ دونوں بہن بھائی انگلینڈ سے اپنا خانساماں ساتھ لے کر آئے ہوئے ہیں۔ نتالیا مائیکل نام ہے اس کا ... کلاسیکل اور پورا انگریزی کھانوں کا ماہر ہے وہ ... یقینی بات ہے کہ حویلی سے فرار ہوتے وقت فیروز جنگ اپنا خانساماں ساتھ نہیں لے جا سکا ہو گا۔ اگر وہ حیدر آباد میں ہے تو اس نے کہیں نہ کہیں سے انگلش خانساماں کا انتظام ضرور کیا ہو گا یا پھر وہ کسی ایسے ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں جاتا ہو گا جہاں مطلوبہ معیار کے انگریزی کھانے ملتے ہوں گے ... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے کہا۔ "تم یہ سمجھانا چاہ رہی ہو کہ ہم فیروز جنگ کا سراغ اس کی اس کمزوری کے حوالے سے لگائیں کہ وہ صرف انگریزی کھانے کھاتا ہے؟"

"بالکل۔ میں یہی کہنا چاہ رہی ہوں۔ اس طریقہ کار میں کامیابی کے امکانات موجود ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھ کوئی مناسب "کلیو" آ گیا تو عین ممکن ہے کہ ہم پنڈت مہاراج اور نواب شہریار جنگ سے بہت پہلے فیروز جنگ تک پہنچ جائیں۔"

سروج کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ حالات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فیروز جنگ کو ڈھونڈنے والے آٹھ نو روز کی سرتوڑ کوشش کے باوجود ابھی اس تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ایسے میں سروج کی تجویز اندھیرے میں روشنی کی کرن تھی۔

اگلے روز دوپہر تک سروج عرف ارجمند نے تمام معاملات درست کر لیے۔ علی الصباح اس نے پنڈت مہاراج کو ایک تفصیلی بیان دیا جس میں بتایا کہ اسے زہر دینے والا گوتاب راعدی تھا جو ایک بہت پرانا بدلہ چکانا چاہ رہا تھا۔ اگر میں بند کمرے میں اس کی مدد نہ کرتا اور سرتوڑ کوشش کر کے اسے جگائے نہ رکھتا تو اس کا زندہ بچنا محال تھا۔ سروج نے پنڈت کو یہ بھی بتایا کہ چھوٹے نواب نے گوتاب راعدی کو حویلی میں معزز مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی اور وہ دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ بن گئے تھے۔ بعد ازاں سروج نے پنڈت کو پیشکش کی کہ چھوٹے نواب کو ڈھونڈنے میں وہ ان کی مدد کر سکتی ہے۔ یہ غیر مشروط مدد قبول کرنے میں پنڈت کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے سروج کو ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا اور ہم دونوں کو مندر کے تہ خانے سے جانے کی اجازت دے دی۔

ہم دونوں کو ہماری مرضی کے مطابق لباس فراہم کر دیے گئے۔ میں نے اپنے لیے پتلون قمیص اور جیکٹ منتخب کی۔ سروج نے شلوار قمیص اور جرسی کے علاوہ مقامی طرز کا ایک دوپٹہ بھی منگوایا۔ روانگی سے پہلے پنڈت مہاراج نے ہم سے ملاقات کی۔ اس نے مجھے شاہ جہاں کے نام سے مخاطب کیا اور بڑی فراخدلی سے اس بات پر معذرت کی کہ اس تہ خانے میں میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا اور مجھ پر کئی طرح کے شک کیے گئے ہیں۔ پنڈت کی ہدایت پر گوپال ٹھاکرے نے بھی مجھ سے معافی مانگی۔ اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ "میں آپ سے چھما چاہتا ہوں بابو جی۔ ہماری بیوقوفی تھی کہ ہم بنا سوچے سمجھے آپ پر شک کرتے رہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں مندر کا ایک سیوک زخمی ہو گیا۔ میں اس کے لئے بہت شرمندہ ہوں۔"

وقت رخصت پنڈت مہاراج نے ٹھاکرے کو حکم دیا کہ ہمارے لئے سواری اور نقدی کا انتظام کر دیا جائے۔ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ٹھاکرے نے تھوڑی دیر بعد نئے نوٹوں کی ایک گڈی میری جیب میں ٹھونس دی۔ اس کے علاوہ ایک چابی بھی مجھے تھما دی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ٹھاکرے کی طرف دیکھا۔ ٹھاکرے کے بجائے سروج نے کہا۔ "یہ ہلمین کار کی چابی ہے۔ پنڈت مہاراج نے یہ کار ہمارے استعمال میں دی ہے۔"

معلوم نہیں اس حرافہ نے پنڈت جیسے جہاندیدہ شخص کو کیسے شیشے میں اتار لیا تھا۔ سروج کو "بیٹی بیٹی" کہتے اس کا منہ سوکھ رہا تھا اور وہ اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر رہا تھا۔ پنڈت مہاراج کی بہت بہت آشیرباد لے کر ہم مندر کے وسیع تہ خانے سے باہر نکلے تو دوپہر کا وقت تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور مندر کے طویل برآمدوں میں پوجا پاٹھ کرنے والے ننگے پاؤں آ جا رہے تھے۔ کہیں قریب ہی کورس کے انداز میں بھجن گایا جا رہا تھا۔ ٹھاکرے ہمیں دو تین برآمدوں سے گزار کر وسیع صحن میں لایا اور پھر ایک بغلی دروازے سے گزار کر باہر موٹر کار تک لے آیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی' برقع پوش سروج میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم تیز رفتاری سے حیدر آباد شہر کی طرف جا رہے تھے۔ مندر سے حیدر آباد شہر کا فاصلہ قریباً پون گھنٹے کا تھا۔

سروج اس ملک میں میری طرح پردیسی نہیں تھی۔ حیدر آباد شہر بھی اس کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا ساتھ میرے لئے بہت ...

سمو تجسس ہوا کر رہا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے شہر کے وسطی حصے کے ایک بارونق علاقے میں ہوٹل شالیمار تک رسائی حاصل کی۔ اس فور اسٹار ہوٹل میں میاں بیوی کی حیثیت سے ہم نے ایک کمرا کرائے پر حاصل کر لیا۔ ایک دن کے قیام اور آرام کے بعد اصل کام شروع ہوا۔ ہم نے شہر کے ان فور اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کے نام پتے معلوم کئے جو انگلش کھانے مہیا کرنے میں شہرت رکھتے تھے۔ یہ کل دس ہوٹل تھے۔ ہم نے ان میں سے سات ہوٹلوں کا انتخاب کیا۔ اس موقعے پر سروج نے بذریعہ ٹیلیفون گوپال ٹھاکرے سے رابطہ قائم کیا اور اس سے کہا کہ وہ شام تک کم از کم پانچ آدمی ہوٹل شالیمار کے کمرا نمبر ۲۰ میں بھیج دے۔ اس نے مزید کہا کہ یہ پانچوں آدمی چھوٹے نواب کی صورت سے آشنا ہونے چاہئیں۔

گوپال ٹھاکرے نے سروج کی ہدایت پر عمل کیا۔ شام چھ بجے کے لگ بھگ تین افراد کی پہلی ٹولی ہمارے پاس پہنچ گئی۔ سروج نے ان تین افراد کو تین منتخب ہوٹلوں کے پتے دیے اور وہاں نگرانی کے لئے بھیج دیا۔ ان افراد کو اطلاع ملتے ہی نگرانی پر رہنا تھا اور جونہی نواب فیروز جنگ یا اس کے کسی ساتھی کی صورت نظر آتی ہمیں ہوٹل کے فون پر اطلاع دینا تھی۔ یہ افراد رخصت ہوئے ہی تھے کہ دو افراد کی دوسری ٹولی پہنچ گئی۔ سروج نے انہیں بھی وہی ہدایات دیں اور دو مختلف ہوٹلوں میں نگرانی کے لئے بھیج دیا۔ اب دو ہوٹل باقی تھے۔ وہ دونوں پہلو بہ پہلو واقع تھے اور ایک فرد بھی ان کے مین دروازوں کی نگرانی کر سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سروج ان دو ہوٹلوں کی نگرانی مجھ سے کروانا چاہے گی اور خود ہوٹل میں آرام کرے گی لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ چہک کر بولی۔ "چلو جان! اب ہم دونوں چلتے ہیں اپنی ڈیوٹی پر۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آکاش ہوٹل اور شوبرا ہوٹل کی مشترکہ نگرانی۔ آکاش ہوٹل کی پارکنگ بڑی خوبصورت ہے۔ ہم وہاں گاڑی پارک کریں گے۔ ڈیک پر انگلش میوزک لگائیں گے۔ پھر میں تمہارے شانے سے سر ٹکاؤں گی۔ تم میرے بالوں میں انگلیاں پھیرو گے اور پتا ہی نہیں چلے گا کہ کب رات کے بارہ بج گئے۔ اس وقت تک اگر نواب فیروز جنگ نے ہمیں اپنی من موہنی صورت دکھا دی تو سو بسم اللہ ورنہ شانتی سے سنسان سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اور اگر اس دوران تمہارے ہرکاروں میں سے کسی خوش قسمت نے کسی ہوٹل میں نواب فیروز جنگ کی من موہنی صورت دیکھ لی اور اس نے ہوٹل کے نمبر پر فون کر کے تمہیں بتانا چاہا تو وہ کیا کرے گا؟"

"او گاڈ!" سروج نے سر پر ہاتھ رکھا۔ "یہ سامنے کی بات تو میں بھول ہی گئی تھی۔ نہیں بھئی ایسا تو نہیں چلے گا۔ ہم دونوں میں سے ایک کو یہاں رہنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے' میں ہی رہ لیتی ہوں۔"

بن رہی تھی یا واقعی ٹیلیفون ریسیو کرنے والی بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ بہرطور میں نے گاڑی پکڑی اور آکاش ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹریفک کے اژدحام میں سے راستہ بناتا میں آٹھ بجے ہوٹل پہنچ پایا۔ حسب پروگرام پارکنگ میں میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے دونوں ہوٹلوں کے بیرونی دروازے نظر آ رہے تھے۔ نشست سے ٹیک لگا کر میں نے سگریٹ سلگایا اور میوزک سننے لگا۔ بعض دفعہ انسان کی حسیات کسی طرح تیز ہو جاتی ہیں۔ میرے کان میوزک پر تھے۔ دماغ خیالات کے تانے بانے میں الجھا تھا اور آنکھیں سڑک پر لگی ہوئی تھیں۔ چھلاوے شکاری کی طرح گھات لگا کر نگرانی کرنا بھی ایک انتہائی وقت طلب، صبر آزما کام ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں میری بوریت عروج پر تھی۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ شوبرا ہوٹل کے گیٹ پر مجھے ایک بڑی جانی پہچانی صورت نظر آئی تھی۔۔۔ یہ زریں گل تھا۔ وہ گھیردار شلوار اور کڑھائی والی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ وہ بڑی شان سے ایک ٹیکسی میں سے اترا۔ بل ادا کیا اور جھوم جھوم کر چلتا ہوا آکاش ہوٹل کی طرف آ گیا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کوئی اور ہے یا نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا ضروری تھا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ میں نشست پر کچھ نیچے کو دبک کر بیٹھ گیا اور ایک اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ زریں گل سیدھا میری گاڑی کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس نے اطمینان سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور "السلام علیکم" کہتا ہوا میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "اوئے تکوڑی کے بند و تو یہاں کیسے؟ اور تو یہاں ہے بھی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کہیں تیری روح سے ملاقات کا شرف تو حاصل نہیں ہو رہا۔ میں نے تو بیٹھے بیٹھے میں کئی بار تیرے ٹکڑے تصور کر کے آنسو بہائے ہیں۔"

"آپ کا وہ سب آنسو رائیگاں گیا استاد صیب' جب تک آپ جیسا رعا گو امارے ساتھ ہے 'موت امارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ام لمبا لمبا تو دور کا بات ہے' امارا تو تم تک نہیں لے سکتی موت۔"

میں نے دردناک لہجے میں کہا۔ "حویلی پر جب بلوائیوں نے دھاوا بولا اور آگ لگی تو میں نے ایسی آواز سنی جیسے کوئی بکرا ذبح ہو رہا ہو۔ مجھے لگا کہ ہو نہ ہو یہ تمہاری آواز ہے۔ کچھ پوچھو کیا گزر رہی دل پر۔"

"استاد صیب' آپ تو مذاق کرتا ہے۔ آپ جانتا ہے' ام بچہ ہے' مر سکتا ہے لیکن ورد سے چیخ نہیں سکتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایک تو بچے ہو اور پھر لالہ مند جبر کے شاگرد ہو۔ بس میں اتنا گھبرا گیا تھا کہ دماغ نے کام ہی نہیں کیا' میں سمجھا کہ یہ تمہاری آخری آواز جو میں نے سنی ہے۔ میرا دل بھر آیا۔ میں نے سوچا' اب میں

تمہاری چیخ نہیں سن سکوں گا۔۔۔ کبھی نہیں۔"

زریں گل بولا۔ "ام جانتا ہے' آپ ام کو مذاق فرما رہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ام جواب میں آپ کو مذاق نہیں فرما سکتا۔ آپ امارا استاد صیب ہے۔ بے شک آپ نے ام کو کچھ نہیں سکھایا لیکن ام آپ کو دیکھ دیکھ کر بہت کچھ سیکھ رہا ہے۔ جب آپ لڑائی بھڑائی کرتا ہے تو ام آپ پر بہت غور کرتا ہے۔ جیسے کرکٹ دیکھنے سے نہیں دیکھنے سے آتا ہے ایسے ہی لڑائی بھڑائی دیکھنے سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔ ادھر ادھر کی باتیں مت ہانکو۔ یہ بتاؤ کہ کس شاخ سے ٹپک کر یہاں گرے ہو؟"

وہ بولا۔ "ام کو نواب صاحب کے ایک ملازم نے بتایا کہ امارا ٹیلیفون ہے۔ ام نے فون اٹھایا تو دوسری طرف الو کا پٹھی تھا۔ وہ بولا کہ تمہارا استاد جانی صاحب اس وقت آکاش ہوٹل کی پارکنگ میں کالے رنگ کی ہلیمن کار میں بیٹھا بری طرح بور ہو رہا ہے۔ اس کے پاس جا کر اس کا بوریت دور کرو۔ آپ کا نام سن کر امارا تمام فکر دور ہو گیا۔ ام نے فوراً نواب صاحب سے اجازت لیا اور آپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔"

میں نے زریں گل سے حویلی کے حالات پوچھے اور یہ دریافت کیا کہ ہنگامے کی شب اس پر کیا گزری۔ نیز مجتبیٰ کنور اور وحی کلارک صاحب کس حال میں ہیں۔ جواب میں زریں گل نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔ ہنگامے کی شب مجتبیٰ کنور نے بہت سیاسی چال کھیلی تھی۔ اس کی تیز نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ حویلی پر دھاوا بولنے والے طاقت اور تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور وہ چھوٹے نواب کو نیچا دکھا کر چھوڑیں گے لہٰذا حویلی پر باقاعدہ حملے جانے سے پہلے ہی مجتبیٰ کنور نے چھوٹے نواب کا ساتھ چھوڑ دیا اور بڑی خاموشی سے احاطہ پار کر کے مین گیٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے پنڈت مہاراج سے رابطہ کیا اور اسے اپنی حمایت و اعانت کا یقین دلایا۔ اس نے پنڈت مہاراج کو یہ بھی بتا دیا کہ حویلی میں نواب فیروز جنگ کے آدمیوں کی دفاعی پوزیشن کیا ہے اور کس جانب سے حملہ کیا جانا مفید ہے۔ لڑائی میں مجتبیٰ نے عملی حصہ تو نہ لیا تاہم اس کے مشوروں نے بلوائیوں کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں جب چھوٹے نواب اپنے قریبی ساتھیوں سمیت حویلی چھوڑ کر بھاگ گیا تو پنڈت مہاراج کے چیلوں نے حویلی کی بالائی منزل سے بڑے نواب شہریار جنگ کو برآمد کر لیا۔ وہ بیچارہ بری طرح نڈھال نظر آتا تھا۔ پنڈت مہاراج نے بڑے نواب کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کیا اور اسے حتی الامکان سہولت دی۔ اس نے بڑے نواب سے کہا کہ انہوں نے چھوٹے نواب کو سزا دینے کے لئے حویلی پر چڑھائی کی تھی اور اس بات پر بہت خوشی ہے کہ اس چڑھائی کے نتیجے میں بڑے نواب کو اپنے بیٹے کی قید سے رہائی مل گئی ہے۔ بڑے نواب نے بھی پنڈت مہاراج کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر پنڈت مہاراج نے بڑے نواب سے مجتبیٰ کنور کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ اس شخص نے چھوٹے نواب کے خلاف کامیاب کارروائی کرنے میں بہت مدد کی ہے۔

زریں گل کی باتوں سے مزید یہ معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد سے چھوٹے نواب کی تلاش زور و شور سے جاری تھی۔ اس تلاش میں نواب کے درجنوں کارندوں کے علاوہ پنڈت مہاراج کے آدمی بھی حصہ لے رہے تھے۔ مجتبیٰ کنور' زریں گل اور مسٹر جی کلارک حویلی ہی میں مقیم تھے۔ وہ تینوں میری گمشدگی پر بے حد فکر مند تھے۔ مجتبیٰ کنور قریباً روزانہ بڑے نواب کو یہ یاد دہانی کراتا تھا کہ میری تلاش کے کام میں تیزی آنی چاہیے۔ پانچ چھ روز پہلے بڑے نواب نے یہ انکشاف کیا کہ میں پنڈت مہاراج کی تحویل میں ہوں اور وہ مجھ پر لگائے جانے والے کسی الزام کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اگر یہ الزام غلط ثابت ہو گیا تو مجھے کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا اور رہا کر دیا جائے گا۔ آج پانچ بجے کے قریب پنڈت مہاراج کی طرف سے نواب شہریار کو پیغام ملا کہ مجھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سروج کا ٹیلیفون آ گیا اور اس نے زریں گل کو بتایا کہ میں آکاش ہوٹل کی پارکنگ میں موجود ہوں۔

تمام حالات بتانے کے بعد زریں گل کہیں جانے کے لئے پر تولنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے' اب پھر کہیں غائب ہونے کا ارادہ ہے؟"

وہ بولا۔ "آپ کے ہوتے ہوئے ام کہاں غائب ہو سکتا ہے۔ امارا تو دل چاہتا ہے کہ ہر وقت آپ کا دم چھلا بن کے آپ سے چپکا رہے۔ بس ایک منٹ کے اندر ام واپس آتا ہے۔ جہاز کے ہائی جانے کا اور راکٹ کے ہائی واپس آئے گا۔ دراصل مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک صاحب آپ کے بارے میں بہت پریشان ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جونہی آپ سے ملاقات ہو' ام فوراً فون پر ان کو اطلاع پہنچائے۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے زریں گل کار سے اتر گیا۔ اس کی واپسی میری توقع سے بھی جلد ہو گئی۔ تین چار منٹ میں فون کر کے واپس آ گیا۔ واپس آتے ہوئے وہ بہت سی مونگ پھلی بھی لے آیا تھا۔ ہم مونگ پھلی کھانے لگے اور باتیں کرنے لگے۔ زریں گل کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ پچھلے آٹھ دس روز میں اس نے جو کچھ سوچا اور کیا تھا سب میرے گوش گزار کر دینا چاہتا تھا۔ اس گفتگو کے درمیان وہ حسب عادت مختلف فلموں کے حوالے بھی دیتا جا رہا تھا۔ رات قریباً بارہ بجے تک ہم اپنی پوسٹ پر رہے پھر واپس روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں ڈیک پر گانا بج رہا تھا۔ "بابا مجھ کو معاف کرنا۔ میں نشے میں ہوں۔"

زریں گل بولا۔ "انڈیا کی پرانی فلموں کا ہیرو بالکل پھس پھسا رہتا ہے' بات بات پر معافی مانگتا ہے۔ یہ کوئی ہیرو ہے؟ ہیرو کا کیا

لالے سد جبر کا مثال دے گا تو آپ مذاق اڑائے گا۔ امارے پاس اور بھی بہت سا مثال ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں لہٰذا مثالیں سنے بغیر ہی تمہاری بات پر ایمان لاتا ہوں۔"

زریں گل بولا۔ "معافی کی بات سے ام کو یاد آیا استاد صیب! ایک بات پر ام کو بھی آپ سے معافی مانگنا ہے۔ دراصل.... لاہور سے یہاں آنے کے بعد ام سے ایک غلطی ہو گیا ہے۔ کافی بڑا غلطی ہے مگر امید ہے کہ آپ ام کو معاف کر دے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "ہوا کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "خو یہ ام آپ کو نہیں بتائے گا۔ بس آپ ام کو ویسے ہی معاف کر دے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی جب تک غلطی کا پتا نہ چلے، میں معافی کیسے دے سکتا ہوں۔ کیا پتا کہ وہ کتنی بڑی یا کتنی چھوٹی غلطی ہے۔"

وہ بولا۔ "استاد صیب! یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کوئی چیز سامنے ہی ہو تو بندہ اس پر کارروائی کر سکتا ہے۔ اب دیکھیں ام لوگ غائبانہ نماز جنازہ پڑھاتے ہیں یا نہیں حالانکہ میت امارے سامنے نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بہت بری مثال دی ہے تم نے۔۔۔ ایسی مثال سننے کے بعد تو میں تم کو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

شاید ہماری یہ گفتگو مزید چلتی مگر ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔

میں نے زریں گل کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور اس ہوٹل کی زیریں منزل میں ایک سنگل کمرا کرائے پر لے لیا جس کی دوسری منزل پر میں اور سروج قیام پذیر تھے۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال میں نواب شہریار سے ملاقات نہ کروں اور مجتبیٰ کنور و مسٹر کلارک صاحب سے بھی دور رہوں۔

اگلے تین روز میں کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں اور زریں گل حسب سابق نگرانی کے لیے آکاش ہوٹل جاتے رہے۔ اسی طرح دیگر پنج ہوٹلوں کی نگرانی بھی جاری رہی۔ یہ چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں زریں گل کے ساتھ ہوٹل واپس پہنچا۔ سروج سے ملاقات ہوئی تو وہ خاصی مسرور نظر آئی۔ تنہائی ملتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بازوؤں میں بھینچ کر بولی۔ "شاہ جہاں! میں نہ کہتی تھی یہ تدبیر کارگر رہے گی۔ فیروز جنگ کا پتا لگ گیا ہے۔"

"کیسے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ پانچ سے زیادہ نگرانوں میں سے کسی نے سروج کو مثبت رپورٹ دی ہے۔ یعنی اس نے چھوٹے نواب کو یا اس کے کسی قریبی ساتھی کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا ہے اور تعاقب کر کے چھوٹے نواب کا ٹھکانا دریافت کر لیا ہے مگر یہ خیال غلط تھا۔ سروج نے بتایا کہ پونم ہوٹل کا ایک جیمس نامی انگلش بٹلر پچھلے دس بارہ روز سے لاپتا تھا۔ اب اس نے ہوٹل کی انتظامیہ کو اطلاع دی ہے کہ وہ شمس نگار کے علاقے میں سیٹھ عبدالکریم مرزا نامی ایک شخص کے پاس ہے اور اپنی مرضی سے اس کے پاس کام کر رہا ہے۔ سروج نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "یہ اطلاع ملنے کے فوراً بعد میں نے دو آدمیوں کو شمس آباد روانہ کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ سیٹھ عبدالکریم مرزا کا کھوج لگائیں۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر مجھے اطلاع ملی ہے کہ نہ صرف سیٹھ کا سراغ لگ گیا ہے بلکہ اس کے زرعی فارم پر چھوٹے نواب فیروز جنگ کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی ہے۔ فارم پر ایک ایسی چیز دیکھی گئی ہے جس کا تعلق نواب کی حویلی سے ہے۔ میرے بھیجے ہوئے آدمیوں نے اس چیز کو دوری سے پہچان لیا ہے۔"

"کوئی بہت خاص چیز ہے وہ؟"

"نہیں بہت عام ہے۔" سروج چہکی۔ "کپڑے کا ایک غلاف ہے جو گاڑی پر ڈالا جاتا ہے۔ فیروز جنگ نے اپنی گاڑی چھپانے کے لئے یہ غلاف ڈالا ہوگا۔ گاڑی تو چھپ گئی لیکن غلاف نے بھانڈا پھوڑ دیا کیونکہ وہ عام غلافوں سے بہت مختلف ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ ثبوت تمہارے خیال میں کافی ہے؟"

وہ بولی "کافی یا ناکافی کا تو پتا نہیں لیکن مجھے وشواس ہے کہ ہم صبح تک چھوٹے نواب کی گردن ناپنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

میں نے پوچھا "اس کی گردن ناپنے کے لئے پنڈت مہاراج کے چیلوں کو بھیجو گی؟"

"نہیں" اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا "یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ اس کے لئے ہم اور تم جائیں گے۔ سوامی جی کا فرمان یاد کرو۔ انہوں نے کہا تھا کامیابی کیول اسی وقت ہمارے چرن چھوئے گی جب ہم دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھیں گے۔ سو آج رات ہم دونوں اکٹھے نکلیں گے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ایک دو بندے ساتھ لے لیں گے لیکن اصل ذمے داری ہم دونوں کے کندھوں پر ہوگی۔"

وہ بڑی خود اعتمادی سے بول رہی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی سے بول رہی تھی۔ مجھے بھی اس کا فیصلہ کچھ برا یا ناگوار نہیں لگا تھا لیکن جان بوجھ کر چپ تھا اور [illegible] دیا جا رہا تھا۔ "پھر اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے ذرا [illegible] سے تکیہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی "آج رات [illegible] تک مت لگاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں آدھ گھنٹے کے اندر اندر شمس آباد روانہ ہونا ہے۔"

میں نے کہا "تیاری میں بیشتر عورتیں زیادہ وقت صرف کرتی ہیں۔ میں اب بھی تیار ہوں۔"

"تو پھر چلو اٹھو۔ ایک ایک چائے کا کپ پیتے ہیں اور چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "مرنے سے پہلے میرا آخری خوراک چائے ہو، مجھے ہرگز پسند نہیں۔ اگر چلنا ہے تو چائے کے بغیر ہی چلو۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ کا وقت بتا رہی تھیں۔

O☆O

ہم بذریعہ کار شمس آباد پہنچے۔ سروج نے بڑے اہتمام سے اپنا بھیس بدل لیا تھا۔ اس سفر میں زریں گل کے علاوہ پنڈت مہاراج کا ایک دلیر چیلا انیل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم چاروں مسلح تھے۔ انیل کے پاس خودکار رائفل تھی جب کہ ہم تینوں کے پاس ریوالور اور پستول تھے۔ انیل قفل کھولنے میں ماہر تھا۔ یہ مہارت استعمال میں لانے کے لئے اس نے چابیوں کا ایک بڑا گچھا اور چند مڑے تڑے تار بھی ساتھ لے لیے تھے۔ (بہرحال ان اشیا کے استعمال کی نوبت کہیں نہیں آئی) جو دیگر سامان ہمارے ساتھ تھا اس میں دو ٹارچوں اور نائیلون کی دو مضبوط رسیوں کے علاوہ ٹفن کیریئر کا ایک بڑا ڈبا تھا۔ اس ڈبے میں گوشت کے پارچے تھے۔ سروج نے ان پارچوں پر کوئی خاص قسم کا کیمیکل لگوایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر عمارت کے احاطے میں کتے موجود ہوئے تو وہ مقناطیس کی طرح ان پارچوں کی طرف کھنچے چلے آئیں گے اور کھاتے ساتھ ہی دو تین گھنٹے کے لئے اتنا غفیل ہو جائیں گے۔

ہوٹل شالیمار سے شمس آباد تک تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ تاہم رات ہونے کے سبب سڑکیں سنسان تھیں۔ ہم نے تیز رفتاری سے سفر کیا اور آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ زرعی فارم تک پہنچنے میں ہمیں پانچ دس منٹ مزید لگ گئے۔ یہ درختوں اور کھیتوں میں گھری ہوئی الگ تھلگ جگہ تھی مگر اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مالک شہری ذہن رکھتے ہیں اور انہوں نے اس فارم کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک نیم پختہ سڑک فارم کے اندر تک جاتی تھی۔ فارم کی ایک جانب نہری پانی کا چوڑا کھالا تھا۔ دوسری طرف کوئی پرانا شمشان گھاٹ تھا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں تھا۔ میں نے کار کا انجن دوری سے بند کر دیا اور روشنیاں بجھا دیں۔ کار خاموشی سے رینگتی ہوئی شمشان گھاٹ کے اندر جا رکی۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ سروج اس خطرناک کام میں حصہ ہی نہ لیتی۔ اب وہ آ گئی تھی تو میں چاہتا تھا کہ وہ گاڑی میں رہے اور فارم کے اندر گھسنے اور چھوٹے نواب کو تلاش کرنے کا کام ہم پر چھوڑ دے لیکن وہ ہر معاملے میں پیش پیش رہنا چاہتی تھی۔ جیسے اسے خطرہ ہو کہ اگر وہ پیچھے رہ گئی تو صندوقوں کی "دولت" میں سے اس کا حصہ کم ہو جائے گا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ وہ گاڑی میں رہے لیکن وہ مجھ سے پہلے ہی نیچے اتر آئی۔ وہ پوری طرح چوکس تھی اور صحیح معنوں میں ایک لڑاکا عورت نظر آتی تھی۔ اس نے برقع گاڑی کے اندر ہی اتار دیا تھا۔ برقعے کے نیچے اس کا لباس پتلون اور چرمی جیکٹ پر مشتمل تھا۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی تھوڑی دیر پہلے نقاب میں چہرہ چھپائے لجائی شرمائی میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکا کر بغور چار دیواری کا جائزہ لیا اور بولی "میرا خیال ہے شاہ جہاں! اندر گھسنے کے لئے یہی سمت ٹھیک رہے گی۔ روشنی بھی کم ہے اور دیکھو ان درختوں کے پاس چار دیواری کافی نیچی بھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اتنی نیچی نہیں جتنی یہاں سے نظر آ رہی ہے۔ بہرحال چلو دیکھتے ہیں۔"

وہ زریں گل سے مخاطب ہو کر تحکمانہ انداز میں بولی۔ "خان! تم ادھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ گاڑی کو بالکل تیار حالت میں رکھنا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ایمرجنسی میں یہاں سے نکلنا پڑے۔"

زریں گل کو سروج کا بارعب لہجہ بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عورت حکم منوانے کے لئے نہیں ماننے کے لئے ہوتی ہے۔ اس معاملے میں تو وہ مسز شاہین تک کو رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنا چاہ رہا ہے لیکن جب سروج نے کہا تو وہ صاف مکر گیا۔ خشک لہجے میں بولا۔ "میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے جی۔ کھول ہی نہیں جا رہی۔"

سروج نے بُرا سا منہ بنا کر رائفل بردار انیل کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ فارم کی بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھی۔ میں جانتا تھا کہ اس نازک موقعے پر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ہے لیکن وہ اپنی دلی کیفیت کامیابی کے ساتھ مجھ سے چھپائے ہوئے تھی۔ شمشان گھاٹ کی پُراسرار فضا میں دھیرے دھیرے چلتے ہم زرعی فارم کی دیوار تک پہنچ گئے۔ یہ دیوار کہیں سے سات اور کہیں سے آٹھ فٹ بلند تھی۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ میں کسی وقت بٹن دبا کر اسے روشن کر لیتا تھا۔ اچانک ٹارچ کا روشن دائرہ کسی جانور کے فضلے پر پڑا۔ یہ گائے بھینس کا فضلہ تو نہیں تھا۔ میں نے ذرا دھیان سے دیکھا۔ فضلہ تین چار روز پرانا تھا۔ کتے یا گیدڑ کا بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ کھیتی باڑی کا علاقہ تھا۔ یہاں تک گیدڑ وغیرہ کا آنا محال تھا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے خشک فضلے کو لڑھکایا۔ سروج نے ناک چڑھا کر سرگوشی کی "یہ کیا گند بکھیر رہے ہو۔ چلو آگے چلو۔"

رفعتاً ایک نہایت مدھم غراہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ غراہٹ دیوار کی دوسری جانب سے ابھری تھی اور کتے کی ہرگز نہیں تھی۔ میں نے اپنے کان دیوار کی دوسری جانب لگائے رکھے لیکن آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ "کیا سن رہے ہو؟" سروج نے جھنجلاتے لہجے میں پوچھا۔

"ہم [illegible] گا رہی ہے۔ تمہیں آواز نہیں آ رہی؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ" اس نے مجھے کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر قدرے حیران

کہ اس نے اپنا خوبصورت لیڈی پسٹل ہاتھ میں لے لیا ہے اور اسے استعمال کرنے پر بالکل آمادہ نظر آتی ہے۔ وہ مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ میں نے عقب سے ایک دم اس کی گردن دبوچی۔ مخصوص نس پر دباؤ پڑتے ہی وہ یک لخت میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ اسے مطلق پتا نہیں چلا تھا کہ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔ اس کا لیڈی پسٹل نیچے گر گیا تھا' میں نے وہ اٹھا کر اپنی پاکٹ میں ٹھونسا پھر اسے بھی پھول کی طرح اٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ واپس جا کر میں نے سروج کو کار میں لٹایا تو زریں گل اور انیل حیران نظر آنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں سوالات تھے۔ میں نے کہا کہ میں ابھی واپس آ کر انہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ اور واپس فارم کی طرف چلا گیا۔ کتوں کا بندوبست کرنے والا ڈبا میرے ہاتھ میں تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ یہ ڈبا یہاں کارگر نہیں ہوگا۔ نجانے کیوں مجھے شک ہو رہا تھا کہ چار دیواری کے اندر کتوں کے بجائے کوئی اور جانور موجود ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ چوہدری اور جاگیردار قسم کے لوگ بعض اوقات جدت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور رات کے وقت اپنی کوٹھیوں اور حویلیوں کے بیرونی احاطوں میں خونخوار قسم کے جانور چھوڑ دیتے ہیں۔ میں ڈیرہ غازی خان کے ایک ایسے سابق ایم پی اے سے واقف تھا جس نے رکھوالی کے لئے تین خون آشام بھیڑیے پال رکھے تھے۔ اسی طرح بمبئی میں ایک کوٹھی چیتوں والی کوٹھی کے نام سے مشہور تھی۔ انڈین سلور اسکرین کا ایک مشہور اداکار رات کو اپنی کوٹھی میں دو چیتے کھلے چھوڑ رہا تھا۔ اس شخص اور اس کے چیتوں کا ذکر اسی روداد میں آگے چل کر آئے گا۔ تو میں ذکر کر رہا تھا اپنے اس شک کا کہ فارم میں کتوں کے بجائے کوئی اور جانور موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ فارم میں ہماری توقع سے بڑھ کر خطرات درپیش ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سروج کو ناک آؤٹ کر کے گاڑی میں لٹا دیا تھا۔ ویسے بھی سروج کی مدد سے یا اس کے ساتھ مل کر چھوٹے نواب کو پکڑنا میرے لئے سود مند نہیں تھا۔ اگر چھوٹے نواب سے بچ بچ نوادرات و زیورات والے تمام صندوق برآمد ہو جانے تو سروج نے خود کو کم از کم۔۔۔ کم از کم نصف کا حقدار تو سمجھنا ہی تھا لہٰذا بہتر تھا کہ نیم گرم گاڑی کے اندر اسے تھوڑی سی نیند فراہم کر دی جاتی۔

چار دیواری کے ساتھ لگ کر میں کچھ دیر سن گن لیتا رہا۔ پھر ڈبے کا ڈھکن کھولا اور تجرباتی طور پر گوشت کے چند ٹکڑے احاطے میں پھینکے۔ کوئی آہٹ یا آواز نہیں ابھری۔ آٹھ دس گز آگے جا کر میں نے چند ٹکڑے مزید پھینکے۔ نتیجہ اس مرتبہ بھی مختلف نہیں نکلا۔ میں اچک کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ احاطے کے عین بیچوں بیچ ایک عمارت تھی۔ اندرونی کمروں میں بلب وغیرہ جل رہے تھے۔ احاطے میں کوئی کتا موجود ہوتا تو اب تک میری بو سونگھ چکا ہوتا اور پھر اس کا چپ رہنا بے معنی تھا۔ اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ایسا کچھ نہیں ہوا لہٰذا میں ریوالور سونتے دبے قدموں ایک روشن کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے چند گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک گاڑی پر گلابی پیراشوٹ کا غلاف تھا۔ اس غلاف پر بہت سے ستارے سجے ہوئے تھے اور نمایاں نظر آتے تھے۔ یقیناً یہی نواب فیروز کی ڈاٹسن گاڑی تھی۔ یک لخت میرے قدم زمین نے پکڑ لیے۔ یوں لگا جیسے میں اپنی جگہ پتھر بن کر رہ گیا ہوں اور اپنا دفاع تو دور کی بات ہے اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے صرف دس فٹ کی دوری پر ایک بہت بڑا سیاہ ریچھ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں سے چھننے والی روشنی میں اس کی چھوٹی چھوٹی قاتل آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نجانے کیسے میں نے اس ریچھ کو پہچان لیا۔ یہ وہی خونخوار چوپایہ تھا جسے میں نے چند روز پہلے نواب شہریار جنگ کے ڈیرے پر کتوں سے نبرد آزما دیکھا تھا۔ اس ریچھ کا نام سانول لیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ خون آشامی میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ آج میں اسی ریچھ کے روبرو ایک دشمن کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ ریچھ نے دانت نکوس کر حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ یہ حملہ کرنے کا انداز تھا۔ میرے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ ایکا ایکی مجھے خیال آیا کہ میں غیر مسلح نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ میں 38 بور کا طاقتور ریوالور دبا ہے اور انگلی ٹریگر پر رکھی ہے۔ انگلی کا ایک ہلکا سا دباؤ میرے اور اس قاتل کے درمیان موت کی لکیر کھینچ سکتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں ریچھ کا جارحانہ انداز دیکھ کر فائر کرتا' عقب سے دھپ دھپ کی نامانوس آواز ابھری۔ میں تڑپ کر گھوما۔ ایک بھورا ریچھ مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ پھر پنجے کی ایک آہنی ضرب میرے کندھے پر لگی اور مجھے یوں لگا جیسے کئی افراد نے مل کر مجھے دھکا دے دیا ہو۔ میرے پاؤں زمین سے اکھڑے اور میں لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ صرف ایک ساعت بعد میں نے سیاہ ریچھ کو اپنے اوپر دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ وہ ایک روح فرسا تجربہ تھا۔ بدبو دار گوشت کا ایک پہاڑ سا مجھ پر ڈھے گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ ریچھ کے سینے کی نرم فر میں دھنسا ہوا تھا اور اس کی تھوتھنی سے برآمد ہونے والی گرم اور ناگوار پھنکاریں میری گردن سے ٹکرا رہی ہیں۔ ابھی کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ اپنا قاتل پنجہ یا نوکیلے دانت میرے جسم میں پیوست کرنے والا تھا۔ یہ عذاب جھیلنے سے پہلے ہی میرے جسم کے ہر حصے میں درد جاگ اٹھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اپنی عادت کے عین مطابق جونہی مجھے نہتا ہونے کا احساس ہوا' میرا دھیان اپنی پنڈلی کے خنجر کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے ریچھ کی تھوتھنی کو اپنی گردن سے دور کیا اور دوسرے ہاتھ سے پنڈلی سے خنجر کھینچ لیا۔ چند لمحے کی تاخیر مزید ہوتی تو ریچھ کی حیوانی طاقت مجھے پیس کر رکھ دیتی۔ میں نے زور لگا کر اپنا دایاں شانہ زمین سے اٹھایا۔ یوں میرے لئے ممکن ہو گیا کہ

میں دائیں ہاتھ کو آزادی اور تیزی سے حرکت دے سکوں۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس صرف ایک وار کرنے کی مہلت ہے۔ اگر یہ وار اوچھا پڑتا یا خطا جاتا تو درندہ مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا جاتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ریچھ کا سینہ جہاں فربہت کم تھی اور جو بہت نازک بھی تھا' میرے خنجر کا بہترین ہدف ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے پوری شدت سے وار کیا۔ خنجر دستے تک ریچھ کے سینے میں گھس گیا۔ اس کے جسم نے ایک زبردست جھٹکا کھایا۔ اگر میں نے دستے کو بہت مضبوطی سے تھام نہ رکھا ہوتا تو خنجر میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ گرفت مضبوط تھی لہٰذا جانور تڑپا تو خنجر خود بخود باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی لہو کی ایک موٹی دھار گراں ڈیل ریچھ کے جسم سے برآمد ہوئی اور میری پتلون کو بھگو گئی۔ شاید میں ریچھ پر دوسرا وار بھی کرتا مگر وہ لڑھک کر دور چلا گیا۔ اب بھورا ریچھ میرے سر پر کھڑا تھا۔ وہ کوشش کرتا تو میں ایک بار پھر زمین بوس ہو سکتا تھا اور شاید ایسا زمین بوس ہوتا کہ پھر اٹھنے کا نام نہ لیتا مگر ریچھ ایک سست الوجود جانور ہے۔ اس کے حملے میں بلی' کتے یا چیتے جیسی تیزی نہیں ہوتی اور پھر یہ بھورا ریچھ ویسے بھی زیادہ تربیت یافتہ نہیں تھا۔ کتوں سے لڑائی کرنے میں تو وہ شاید ماہر ہو مگر محافظ کتوں کے انداز میں انسانوں پر حملہ کرنے کی خصوصی تربیت اسے حاصل نہیں تھی۔ (یا مکمل نہیں ہوئی تھی) وہ تذبذب میں تھا۔ کبھی ایک قدم آگے بڑھاتا تھا' کبھی ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ میں نے لپک کر اپنا ریوالور اٹھایا اور واپس چار دیواری کی طرف دوڑا۔ میرا واپس پلٹ جانا ہی مناسب تھا۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ اس عمارت میں ہماری توقع سے زیادہ افراد موجود ہیں اور یہاں کا دفاع بھی ہماری توقع سے زیادہ مضبوط ہے۔ میں نے پورچ میں کم از کم چار گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں۔ جو زیادہ تشویشناک بات تھی اس کا تعلق عمارت کی چھت سے تھا۔ چھت پر ایک دم سے تین سرچ لائٹس روشن ہو گئی تھیں اور اب ان کے روشن حلقے تیزی سے عمارت کے نشیب و فراز میں گردش کر رہے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک زرعی فارم کی چھت پر اس قسم کا حفاظتی انتظام ہوگا۔ یہاں دال میں ضرور کچھ کالا تھا بلکہ "کالا سیاہ" تھا' میرے پاس وقت ہوتا تو میں اطمینان سے اس بارے میں سوچتا لیکن فی الحال تو جان بچانے کی فکر تھی۔ زخمی ریچھ زمین پر تڑپ رہا تھا اور حلق سے ناقابل فہم آوازیں برآمد کر رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ کرہناک آوازیں دور تک جا رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ ابھی تک چھت پر موجود افراد کو گڑبڑ کی صحیح سمت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ان کی سرچ لائٹس عمارت کے اس حصے میں گردش کر رہی تھیں جو کمینوں سے ملحق تھا۔

میں تیز رفتاری سے چار دیواری کی طرف بڑھا اور پھلانگ کر باہر آ گیا۔ اسی دوران میں عمارت کے کسی حصے میں فائرنگ بھی ہوئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ میں دوڑتا ہوا کار تک آیا۔ انیل کی جگہ زریں گل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ جب میں دروازہ کھول کر عقبی نشست پر بیٹھا تو گاڑی رینگنا شروع ہو چکی تھی۔

"کیا بنا استاد صیب" زریں گل نے پوچھا۔

"مقبوبنا ہے۔ اس میں تمہارے پھوپڑ کو دفن کر کے آیا ہوں۔"

"پھوپڑ؟ یہ کیا ہوتی ہے؟"

"یہ ہوتی نہیں ہوتا ہے۔ پھوپی کا شوہر۔ بڑا شہ زور تھا۔ سالا' میرا کندھا توڑ کے رکھ دیا ہے۔ ایک من سے کیا کم وزنی ہاتھ ہوگا حرامی کا" میں نے کندھا دباتے ہوئے کہا۔

زریں گل نے مڑ کر دیکھا اور میرے لباس پر خون کے چھینٹے دیکھ کر چونک گیا۔ پتلون تو تر بتر تھی لیکن جیکٹ پر بھی چھینٹے موجود تھے "او خدایا۔ یہ کس کو ذبح کر دیا آپ نے؟"

"بتاؤں گا۔۔۔ بتاؤں گا۔ فی الحال اپنا دھیان ڈرائیونگ کی طرف رکھو۔ سیدھا چلتے رہو۔ یہاں سے تین چار میل دور میں نے ایک ٹیلی گراف آفس دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں سے ہم ٹیلی فون کر سکیں گے۔"

انیل نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہاں وہاں سے فون ہو جائے گا۔"

زریں گل نے پوچھا "لیکن فون کرنا کسے ہے؟"

"پنڈت جی کو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے پھوپڑ کی آخری رسومات وہی ادا کریں۔"

"ام ادا خیال ہے کہ آپ بتانا نہیں چاہتا۔ زیادہ بھروسا نہیں کرتا ہے آپ ام پر لیکن کوئی بات نہیں' ام نے تو ہر صورت آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ وہ ایک پنجابی فلم میں نور جہاں بیگم نے گایا ہے۔ "تیرے نال نال وے میں رہنا۔"

میں نے کہا "میں بھی چاہتا ہوں کہ تم میرے نال نال رہو۔ اس لئے زیادہ باتوں سے منع کرتا ہوں۔"

سروج عرف ارجمند آڑھی ترچھی میرے قریب ہی پڑی تھی۔ بال نشست پر بکھرے ہوئے تھے۔ گاڑی کے ہچکولوں نے اس کے سیماب بدن میں زلزلہ سا بپا کر رکھا تھا۔ میں نے اس کی نرم ملائم گردن پر ہاتھ پھیرا۔ ایک رگ پھولی ہوئی تھی۔ یہ وہی مقام تھا جہاں میں نے دباؤ ڈال کر اسے تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کار میں سفر کے دوران میں تھوڑی سی فرصت نصیب ہوئی تو میرا دھیان ایک بار پھر سیاہ ریچھ اور اس سے ہونے والی خونریز لڑائی کی طرف چلا گیا۔ اس سانول نامی ریچھ کے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ نواب شہریار کے کسی بھتیجے کی ملکیت ہے۔ میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ عبدالکریم مرزا دراصل نواب کے بھتیجے کا ہی نام ہے اور یہ زرعی فارم بھی اسی کا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ نواب فیروز اپنے کسی چچا زاد کے پاس پناہ لئے ہوئے ہے۔

دس منٹ کے اندر گاڑی اس ویران ٹیلی گراف آفس تک پہنچ گئی۔ سرخ دیواروں اور زرد دروازوں والی اس مختصر سی عمارت میں روشنی ہو رہی تھی۔ توقع تھی کہ وہاں کوئی نہ کوئی ہماری داد رسی کے لئے موجود ہوگا۔ میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ گاڑی آگے لے جا کر درختوں میں چھپا دے اور پوری طرح چوکس رہے۔ اگر فارم سے کوئی ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے اور ٹیلی گراف آفس کے سامنے پہنچ کر رک جائے تو زریں گل ہوائی فائر کر کے مجھے خبردار کر دے۔

زریں گل کو ہدایات دے کر میں آفس میں آیا۔ چھوٹے سے کمرے کے فرش پر مونگ پھلی اور چلغوزے کے بے شمار چھلکے پڑے تھے۔ ایک شخص کاؤنٹر کے پیچھے فرش پر لحاف کی بکل مارے بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ میں نے دو تین بار زور سے آواز دی۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اٹھنے کے بجائے بالکل ہی لیٹ گیا۔ چہرے کو لحاف سے ڈھانپ کر اس نے بات چیت کا ہر "دروازہ" بند کر دیا تھا۔ وہ صورت سے ہی ایک کرخت اور ہٹ دھرم شخص نظر آتا تھا۔ معمولی ملازم تھا لیکن نخوت کسی دیہاتی ایس ایچ او جیسا تھا۔ میں نے زور زور سے کاؤنٹر بجایا تو وہ ایک دم بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ خالص حیدرآبادی لہجے میں بولا "ابے اتی سمجھ نئیں ہے تجھ کو کہ یہ کام کا وخت نکو ہے۔ ایک بار کہہ جو دیا ہے کہ ٹیلی فون خراب ہے اور ٹیلی گرام بھی سویرے سے پہلے نہیں جا سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "کس حرامزادے نے تجھ سے یہ کہا ہے کہ ٹیلی فون خراب ہے اور کوئی کر بھی کیسے سکتا ہے۔ یہ سرکاری دفتر ہے اور تم ملازم ہو۔ اگر کام کا وقت نہیں ہے تو یہاں کس لیے بیٹھے ہو۔ جاؤ۔۔۔ گھر جاؤ اور بیوی کی بغل میں گھس کر سو جاؤ۔"

گنجے سیاہ رو شخص کو مجھ سے اس لہجے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس نے پہلے تو منہ پھاڑ کر میری طرف دیکھا پھر ایک غلیظ گالی دیتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔ وہ کاؤنٹر کی دوسری طرف سے میرا گریبان پکڑنا چاہ رہا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے اس کے بال پکڑے اور ایک شدید جھٹکے سے اسے کاؤنٹر سے باہر لا پھینکا۔ بہت سے رجسٹر، بہی کھاتے اور ٹیلی فون سیٹ وغیرہ اس کے ساتھ ہی فرش پر آ پڑے۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک دھواں دھار مکا ناک پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر دوبارہ کاؤنٹر کی دوسری طرف جا گرا اور وہیں اس مقام پر گرا جہاں اسے میری آمد سے قبل بیٹھا ہونا چاہیے تھا۔ یعنی اپنی ٹیڑھی ٹانگوں والی کرسی پر۔ میں نے نیچے گرا ہوا ٹیلی فون سیٹ اٹھایا۔ وہ بند تھا اور یقیناً گرنے سے پہلے ہی بند تھا کیونکہ کلرک بادشاہ نے بڑے اعتماد سے اس کے خراب ہونے کا اعلان کیا تھا۔

میں نے ٹیلی فون اس کے سامنے پٹخا اور کہا "وہ دوسرا سیٹ کہاں ہے جو تو نے اپنی بہن کے جہیز میں دینے کے لئے چھپا رکھا ہے؟"

وہ پھرتی سے نیچے جھکا اور کسی زیریں دراز میں رکھا ہوا سیٹ نکال کر میرے سامنے کاؤنٹر پر سجا دیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور زخمی ناک میں سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے کاؤنٹر کے قریب ہی گر رہے تھے۔ وہ اب میری خون میں بھیگی ہوئی پتلون اور قمیص بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوف منجمد ہو چکا تھا۔ میں نے اطمینان سے پنڈت مہاراج کے نمبر ڈائل کئے۔ میں جانتا تھا اس نمبر کا ٹیلی فون اسی مندر کے تہ خانے میں لگا ہے جہاں مجھے قریباً بارہ روز ملزم کی حیثیت سے گرفتار رکھا گیا تھا۔ کہیں دور گھنٹی بجی پھر نیند میں ڈوبی ہوئی ایک آواز آئی "ہالو۔۔۔ کون؟"

"تمہارا چچا زاد بھائی دیال ٹھاکرے" میں نے گوپال ٹھاکرے کی آواز پہچان کر کہا۔

اس نے بھی حیرت انگیز سرعت سے میری آواز پہچان لی۔ ہوشیار ہو کر بولا "اوہ یہ تم ہو۔ اس وقت اتنی رات گئے۔ کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "وہیں سے بول رہا ہوں، جہاں پہنچنے کے لئے پنڈت مہاراج نے بارہ روز سے تمہاری دوڑ لگوا رکھی تھی۔ بندے کا کھوج لگ گیا ہے۔ پنڈت مہاراج کو بلاؤ فوراً"

"اوہ بھگوان۔۔۔ کیا واقعی؟"

"میرا خیال ہے کہ ابھی میری تمہاری اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی کہ میں آدھی رات کو ٹیلی فون کر کے تمہیں لطیفے سناؤں۔"

ٹھاکرے بولا "تم۔۔۔ تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔ مہاراج سو رہے ہیں، میں ابھی انہیں جگاتا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ ٹھاکرے نے ایک منٹ کی مہلت محاورتاً مانگی ہے مگر وہ واقعی ایک منٹ بعد مہاراج کو فون پر لے آیا۔ پنڈت مہاراج نے حسب عادت ملائم و مہربان لہجے میں کہا "کیا بات ہے بیٹا؟"

میں نے کہا "پنڈت جی! چھوٹے نواب کا کھوج لگ گیا ہے۔ وہ یہاں خمس آباد میں ایک ڈیری فارم پر ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ڈیری فارم پر دس پندرہ مسلح افراد موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم چھوٹے نواب کو بچ نکلنے کا چھوٹا سا موقع بھی فراہم نہ کریں۔ میں آپ کو مکمل ایڈریس سمجھا رہا ہوں۔ آپ پچیس تیس افراد کا انتظام کر کے یہاں پہنچ جائیں تو بہت بہتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم فارم کی عمارت کو گھیرے میں لے کر نواب کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"کیا تمہیں وشواس ہے کہ چھوٹے نواب وہیں پر ہے؟"

"سو فیصد۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی گاڑی پورچ میں کھڑی دیکھی ہے۔"

"میرا وچار ہے بیٹا۔۔۔ کہ ہم بڑے نواب صاحب کو بھی اطلاع کر دیں۔"

"نہیں مہاراج، یہ غضب نہ کیجئے گا" میں نے جلدی سے کہا "میں خود بھی انہیں اطلاع دے سکتا تھا لیکن نہیں دی اور اس وجہ سے نہیں دی کہ بڑے نواب کے قریبی کارندوں میں دو تین خطرناک قسم کی کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ یہ لوگ سارا کھیل خراب کر سکتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ آپ میری بات پر بھروسا کریں۔ میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے اور اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے آپ یہاں پہنچ جائیں۔"

میں نے پنڈت جی کو مکمل اتا پتا سمجھا دیا اور پھر گوپال ٹھاکرے کو ضروری ہدایات دینے کے بعد فون بند کر دیا۔ اس دوران میں میں نے گنجے سیاہ رو سرکاری ملازم پر مطلق توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بھی بھیگی بلی بنا بیٹھا رہا بلکہ اسے خون سے بھیگی بلی کہنا چاہیے۔ میری گفتگو کے دوران ہی اس کا ایک منحنی سا ساتھی بھی اندر آ گیا تھا۔ وہ غالباً جونیئر ملازم تھا۔ اپنے سے سینئر صحت مند اور دبنگ شخص کا حشر دیکھ کر اس کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس پھڈے میں ٹانگ اڑاتا۔ وہ سہم کر ایک کونے میں کھڑا تھا۔ میں نے قریب بلا کر ایک زوردار جھانپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹکرا کر زمین پر گرا اور اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ میں نے گنجے شخص سے کہا "اب میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تم دونوں کو ایک جیسا کر دیا ہے۔ اب یہ چوہا صبح تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکے گا کہ رات تمہاری پٹائی ہوئی ہے۔ دونوں باہمی مشورے سے کوئی اچھا سا بہانہ بنا لینا" ٹھگنا شخص بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "چلو شکریہ ادا کرو میرا۔"

وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ چہرے پر خجالت پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ چلو شکریہ بولو" اس کے ہونٹ تھرتھرائے لیکن وہ کچھ بول نہیں سکا۔ میں نے جھک کر پنڈلی سے خون آلود خنجر کھینچ لیا "گنجے کے بچے شکریہ بول، ورنہ ابھی کھال کھینچ لوں گا تیری۔"

گنجے شخص نے جلدی سے "شکریہ" کہا۔

میں نے خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "یہاں ہونے والی گفتگو کسی تک پہنچانے کی کوشش کی تو اسی دفتر میں بند کر کے زندہ جلا دوں گا۔ ابھی چھ قتل کر کے آ رہا ہوں۔ دو اور کروں گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ دونوں جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگے۔ احتیاطاً میں نے ٹیلی فون کے تار کھینچ دیئے۔

آفس سے نکل کر میں درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا جہاں زریں گل نے گاڑی چھپائی تھی۔ زریں گل اور انیل گاڑی سے باہر کھڑے تھے۔ سروج اسی طرح پچھلی نشست پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔۔۔ ہمیں وہاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جتنی دیر میں میں نے زریں گل کو فارم میں پیش آنے والے واقعات سنائے اور یہ بتایا کہ میرے کپڑے خون سے رنگین کیسے ہوئے ہیں، پنڈت مہاراج کے آدمی موقع پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے دو گاڑیاں آئیں۔ ایک کار تھی اور دوسری جیپ۔ میں نے پنڈت مہاراج کو ٹیلی گراف آفس کا مکمل پتا سمجھا دیا تھا۔ گاڑیاں آفس کے عین سامنے رکیں۔ گوپال ٹھاکرے کو پہچان کر میں درختوں کے جھنڈ سے باہر آ گیا۔

میں نے پوچھا "مہاراج کہاں ہیں؟"

وہ بولا "وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔"

"کتنے آدمی ہیں ساتھ؟"

"کافی ہیں۔ مہاراج کے لیے جاں نثاروں کی کمی کبھی نہیں رہی۔"

قریباً دس منٹ بعد پنڈت جی بھی موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ میری توقع سے کہیں زیادہ آدمی تھے۔ کسی دھرم شالا کی سرخ اور زرد بس تھی۔ جو ٹھونس ٹھونس کر مسلح افراد سے بھری ہوئی تھی۔ یہ سب افراد مذہبی ٹائپ کے تھے۔ ان میں سے اکثر نے ماتھے پر سفید تلک کھینچ رکھے تھے۔ کئی ایک کے سر پر لمبی بودیاں تھیں۔ ان میں مندر کے سیوکوں اور دھرم شالا کے طالب علموں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ جس شخص کو پکڑنے ہم جا رہے تھے وہ مسلمان تھا لیکن اس نے جس فارم میں پناہ لے رکھی تھی وہ ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ وہاں موجود ملازمین کی اکثریت بھی ہندو تھی یعنی یہ کسی طرح بھی ہندو مسلم لڑائی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ مذہبی معاملہ نہیں تھا۔ پھر بھی پنڈت مہاراج اور اس کے چیلے بڑے جوش و خروش سے اس "کار خیر" میں حصہ لے رہے تھے۔ چھوٹے نواب میں ایسی بہت سی برائیاں تھیں جن کے خاتمے کے لیے اس پر چڑھائی کی جا سکتی تھی لیکن پنڈت مہاراج اور اس کے آدمی صرف اس لیے اسے نیچا دکھانا چاہتے تھے کہ اس نے گوتاب راحدی کو اغوا کر کے اپنی حویلی میں مہمان کی حیثیت دے رکھی تھی، وہ گوتاب راحدی جس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر دیوداسیوں کی عزت لوٹی تھی۔

بہرطور یہ وقت کی بساط تھی۔ اس پر دوستی دشمنی محبت نفرت قربت اور دوری بڑی تیزی سے اپنے خانے بدلتی رہتی ہیں۔ بے شک پنڈت مہاراج اور اس کے ساتھیوں کے لیے میرے دل میں کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر وقت کا تقاضا تھا کہ چھوٹے نواب پر قابو پانے کے لیے میں ان کے کندھے سے کندھا ملا کر چلوں۔

پنڈت مہاراج کے جاں نثار چیلوں میں سے چند افراد بہت تربیت یافتہ اور گوریلا قسم کے لڑاکے تھے۔ ان میں سے اکثر کے پاس نہایت جدید قسم کا اسلحہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان میں سے کم از کم پانچ افراد نے اپنے لباس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹس بھی پہن رکھی ہیں۔ ایسے افراد کی موجودگی میں میرے لیے کچھ زیادہ کام نہیں بچتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ کم سے کم وقت خراب کر کے

چھوٹے نواب کو فارم میں سے باہر نکال لیں گے۔

میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ پنڈت مہاراج کے آدمیوں نے بڑی ہوشیاری اور مہارت سے فارم میں واقع عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ ٹیلی فون کے تار اور بجلی کی سپلائی کاٹ دی گئی۔ پورچ میں موجود گاڑیوں کے ٹائر برسٹ کردیے گئے اور عمارت کے مکینوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایک حصے میں پٹرول پھینک کر آگ لگا دی گئی۔ اندر سے چند فائر ہوئے لیکن جب جواب میں گولیاں مینہ کی طرح برسیں اور دس پندرہ سیکنڈ میں عمارت کے بیشتر شیشے چکنا چور ہو گئے تو عمارت کے مکینوں کو صورت حال کی اصل سنگینی اور حملہ آوروں کی طاقت اور کثرت کا اندازہ ہوا۔ یہ فارم وسیع و عریض کھیتوں کے درمیان الگ تھلگ مقام پر واقع تھا۔ یہاں محصورین کی مدد کے لیے کون آسکتا تھا۔ ٹیلی فون کا رابطہ بھی منقطع ہوچکا تھا اور بجلی کی رو کٹ جانے سے عمارت میں اندھیرا چھا چکا تھا۔ بہرطور وہ لوگ ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھے۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ گولی چلی۔ پھر نجانے کیا ہوا کہ عمارت کے اندر سے ہونے والی مزاحمت ایکا ایکی دم توڑ گئی۔ پنڈت مہاراج نے بھی فوراً فائرنگ روکنے کا حکم دے دیا۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بلا ضرورت کسی کی جان لینا نہیں چاہتا۔ یا شاید وہ جان بوجھ کر ایسا کررہا تھا تاکہ اس کے معتقدین اس کی انسان دوستی کے قائل ہوسکیں۔

پنڈت مہاراج کے آدمیوں نے فائرنگ بند کی تو پانچ چھ آدمی ہاتھ اٹھائے باہر نکل آئے۔ ان میں ایک چوڑا چکلا شخص سب سے آگے تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ گاڑیوں کی ہیڈلائٹس میں خون کے قطرے ٹپکتے صاف نظر آرہے تھے۔ گوپال ٹھاکرے نے آگے بڑھ کر تمام افراد کی تلاشی لی۔ پھر چوڑے چکلے شخص سے پوچھا "تمہارا نام؟"

"راجیش"

"فارم کا مالک کون ہے؟"

"سیٹھ عبدالکریم۔ وہ حیدرآباد کے نواب شہریار صاحب کے بھائی کا بیٹا ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت فارم پر موجود نہیں ہے۔ اپن کا انچارج منگا سنگھ ہے۔ ہم تو کرائے کا آدمی ہے جی..... پیسہ لے کر کام کرتا ہے۔"

"منگا سنگھ کہاں ہے؟"

"وہ چھت پر تھا۔ ابھی آپ کی گولی سے شدید زخمی ہوگیا ہے۔ اپن تو اسی کے کہنے پر لڑ رہا تھا۔ ڈزی جب وہ گر گیا تو اپن کاہے کو لڑتا اور کیسے لڑتا؟"

میں نے پوچھا "یہاں نواب فیروز جنگ بھی تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"اپن کو زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ یہاں ایک مہمان تو ٹھہرا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہی نواب ہو۔ وہ کمرا ہے اس کا موڑ جس پر گلابی رنگ کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔"

راجیش نامی اس غنڈے نے اس گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا جس کے سبب اس فارم میں چھوٹے نواب کا سراغ لگ سکا تھا۔ میں نے پوچھا "کہاں ٹھہرا ہوا ہے وہ مہمان؟"

راجیش نے بالائی منزل کی ایک ادھ کھلی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "کہیں چھوٹے نواب بھاگ تو نہیں گیا؟" یہ خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ اس قدر ہنگامے کے باوجود وہ ابھی تک کمرے میں بند کیسے رہ سکتا تھا۔ میں بھاگتا ہوا ان سیڑھیوں کی طرف گیا جو پورچ کے قریب سے بالائی منزل کی طرف جاتی تھیں۔ ریوالور میں نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سیڑھیوں میں اس آگ کا دھواں بھرا ہوا تھا جو پنڈت کے آدمیوں نے مکینوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے عمارت کے صدر دروازے کی طرف لگائی تھی۔ میں نے رومال نکال کر منہ پر رکھا اور بھاگتا ہوا بالائی منزل کی راہداری میں پہنچا۔ راہداری خوب آراستہ تھی۔ دونوں طرف کمرے تھے۔ میں نے قیافے سے اس کمرے کا دروازہ کھولا جس کی کھڑکی مجھے راجیش نے دکھائی تھی۔ قیافہ درست ثابت ہوا۔ میں مطلوبہ کمرے میں پہنچا تھا۔ پورے کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ایک خوبصورت ڈبل بیڈ پر چھوٹے نواب اسی حالت میں پڑا تھا جس میں ماں نے اسے پیدا کیا تھا۔ اس کے قریب ہی بستر پر کسی بنت حوا کا لباس بکھرا ہوا تھا۔ بنت حوا موجود نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ یہاں عیاشی کے لیے لائی گئی ایک لڑکی تھی۔ جس وقت عمارت پر بلّہ بولا گیا وہ اور فیروز جنگ محو خواب تھے۔ کمرے میں دھواں بھرنا شروع ہوا تو لڑکی چیختی ہوئی جاگ گئی۔ اس نے نواب فیروز جنگ کو جھنجوڑ کر جگانا چاہا۔ نواب بدمستی کی نیند سو رہا تھا۔ ایک بار جھنجوڑنے سے بیدار نہیں ہوا۔ دوسری بار جھنجوڑنے کی لڑکی نے ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ کون سی اس کی قریبی رشتے دار تھی۔ بس ایک رات کا ساتھ تھا اور وہ رات بھی آدھی سے زیادہ ختم ہوچکی تھی۔ لڑکی کھانستی اور گرتی پڑتی کھڑکی کھول کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ نواب کے دماغ کو دھواں چڑھ گیا اور وہ ادھر ہی بے سُدھ پڑا رہا۔ اسے کمرے سے نکالنے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر ہوجاتی تو شاید وہ اپنے گناہوں کی گٹھڑی سر پر اٹھائے خدا کے حضور حاضر ہو جاتا۔ بہرحال میں اسے کندھے پر لاد کر نیچے لایا۔ گوپال ٹھاکرے نے اسے باتھ روم میں لٹایا اور گاڑی میں لے جا کر چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ عمارت کی بالائی منزل سے دو شدید زخمی افراد کو نیچے لایا جاچکا تھا۔ ان میں ایک وہی منگا سنگھ تھا جس کے زخمی ہونے کے بعد اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے چہرے اور کندھے پر دو گولیاں لگی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ انگریز خانساماں جیمس بھی "برآمد" ہوا تھا جسے نواب کی لذت کام و دہن کے لیے زبردستی یہاں لایا گیا تھا۔

منگا سنگھ کے کل ساتھیوں کی تعداد دس تھی۔ وہ سب کے سب کرائے کے بدمعاش تھے۔ ان پر تھوڑی سی سختی کی گئی تو وہ بکنے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ اس عمارت کے تہ خانے میں تین پرنٹنگ مشینیں لگی ہوئی ہیں اور ایک طویل عرصے سے یہاں جعلسازی کا کام ہو رہا ہے۔ کرائے کے ان بدمعاشوں کی نشاندہی پر ہم تہ خانے میں پہنچے۔ وہاں سے کئی ہزار کے جعلی نوٹ، پرائز بانڈز اور پاسپورٹ وغیرہ برآمد ہوئے۔ یہ سب کچھ ان مشینوں پر پرنٹ کیا جاتا تھا۔ جعلی نوٹوں اور پرائز بانڈز میں استعمال ہونے والا بے شمار کاغذ بھی یہاں موجود تھا۔

اتفاقاً ہم جعلسازوں کے ایک بڑے گینگ کا سراغ لگانے میں کامیاب رہے تھے۔ یہ سارا کاروبار نواب کے ایک بھتیجے عبدالکریم مرزا صاحب کی زیر نگرانی چل رہا تھا۔ اسی راز کی پردہ داری تھی جس کی خاطر چھت پر سرچ لائٹس نصب کی گئی تھیں اور محافظوں کی فوج بھرتی کی گئی تھی۔ جرائم پیشہ افراد کے اکثر اڈوں کی طرح یہاں عیاشی کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک کمرے سے شراب کے چار کریٹ اور شباب کے دو کریٹ (دو لڑکیاں) برآمد ہوئے۔ ان میں ایک لڑکی وہی تھی جو نواب کو دھواں دھواں کمرے میں چھوڑ کر بھاگی تھی۔ اس عمارت میں نوابوں کے گھرانے کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ وہ شہ زور دربچھ جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھوں زخمی ہوا تھا، دم توڑ چکا تھا۔ اس کی مجسم خنجر لاش عمارت کے صدر دروازے پر پڑی تھی۔

مجھے شک تھا کہ ہوسکتا ہے، چھوٹے نواب فیروز جنگ نے صندوق اسی عمارت میں کہیں چھپائے ہوں، میں چاہتا تھا کہ عمارت کی مکمل تلاشی لی جائے لیکن گوپال ٹھاکرے اور پنڈت مہاراج کے دیگر ساتھی اس "تفصیلی تلاشی" کو اتنا ضروری نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوٹے نواب کو برآمد کرنے کے بعد اس کارروائی کا مقصد حاصل ہوگیا ہے لہٰذا اب اس فارم میں مزید وقت گزار کر کسی طرح کا رسک نہیں لینا چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد نواب فیروز جنگ ہوش میں آگیا۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے لباس پہنایا جاچکا تھا لہٰذا اسے اپنا ستر چھپانے کی تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمارا احسان مند ہوتا، اس نے حواس بحال ہوتے ہی ہم سب کو ڈرانا دھمکانا شروع کردیا۔ وہ ہماری دیدہ دلیری کے حوالے سے ہمیں انتہائی خطرناک نتائج کی دھمکی دے رہا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کرائے کے جن بدمعاشوں کے بل بوتے پر اکڑ رہا ہے وہ مٹی کے مادھو ثابت ہوئے ہیں اور اپنی جان بچانے کے لیے ہماری منت سماجت کررہے ہیں تو اس کے غبارے کی ہوا نکل گئی۔ وہ بے حد مایوس اور جھلاہٹ کا شکار نظر آنے لگا۔

رات تقریباً تین بجے ہم اس زہری فارم سے روانہ ہوئے۔ میری خواہش تھی کہ چھوٹے نواب کو میری گاڑی میں بٹھایا جائے۔ یعنی اس گاڑی میں جس میں میں، سروج اور زریں گل یہاں پہنچے تھے اگر ایسا ہو جاتا تو چھوٹے نواب کو راستے ہی میں اڑا لے جانا میرے لیے آسان ہو جاتا لیکن معلوم نہیں کہ یہ حرامی ٹھاکرے کی چھٹی حس تھی یا کوئی اور بات کہ اس نے چھوٹے نواب کو اپنی اوپل کار میں بٹھایا۔ پنڈت مہاراج بھی اسی کار میں بیٹھے تھے۔ چھوٹے نواب کی مشکیں بڑی احتیاط سے کس دی گئی تھیں۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیانی خلا میں ڈال دیا گیا تھا۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ وقت کی نیرنگی تھی کہ جو ولایت پلٹ امیرزادہ چند دن پہلے تک نواب شہریار جنگ کی آنکھ کا تارا تھا اب ایک "باغی شہزادے" کی حیثیت سے پابہ زنجیر غضب ناک باپ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ مجھے سروج نے بتایا تھا کہ نواب شہریار جنگ نے بیٹے کے دو قریبی ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نواب شہریار جنگ انتہائی حد تک غضب ناک ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ بیٹے کے بارے میں بھی کوئی ایسا ہی بے رحمانہ فیصلہ کرتا۔ وہ اس جاگیر کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے علاقے میں پولیس اور قانون کا عمل دخل صرف دکھاوے کی حد تک تھا۔ ورنہ ہوتا وہی تھا جو کچھ وہ خود چاہتا تھا۔

میں اور زریں گل بہت تیزی سے سوچ رہے تھے۔ ہماری خواہش یہی تھی کہ مندر پہنچنے سے پہلے پہلے نواب فیروز جنگ کو پنڈت مہاراج اور اس کے چیلوں کی تحویل سے نکال لیا جائے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا بلکہ اس کام سے زیادہ مشکل تھا کہ ہم نواب فیروز جنگ کو زہری فارم پر سے اڑا لے جاتے۔ زہری فارم پر زیادہ سے زیادہ ایک درجن افراد موجود تھے مگر یہاں پنڈت مہاراج کے قریباً ایک سو جاں نثار ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم مندر کے تہ خانے میں واپس پہنچ گئے۔ پنڈت مہاراج اپنے آدمیوں کو یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ نافرمان باغی بیٹے کو اس کے باپ کے پاس حویلی پہنچا دیا جائے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یقیناً اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہوں گی لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے حویلی میں موجود چند کالی بھیڑوں کا ذکر کر کے پنڈت کو محتاط کردیا تھا۔ ابھی ہمیں تہ خانے میں پہنچے ہمیں پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی جانب سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی عورت چلا چلا کر بول رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سروج (عرف ارجمند) تھی۔ وہ کسی مرد سے جھگڑ رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا غور کیا تو مرد کو بھی پہچان لیا۔ وہ مرد زریں گل تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ چکی ہے یا پہنچنے والی ہے۔ میں بھاگم بھاگ موقعے پر پہنچا۔ سروج ہوش میں آچکی تھی بلکہ جوش میں بھی آچکی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور آنکھیں غصے سے پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف زریں گل

کے منہ سے بھی جھاگ اڑ رہے تھے۔ وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ "ہمارا ہاتھ اس لیے رکا ہوا ہے کہ تو عورت ذات ہے ورنہ خدا کا قسم، ابھی تیرے سر کا کھوپڑا توڑ کر سارا گندا پانی نکال دیتا۔"

سوج نے اسے مارنے کے لیے جوتی اتاری۔ "حرامی، کمینے، پاجی۔ میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔"

میں نے لپک کر اس کی کلائی تھام لی۔ زریں گل چیخا "چھوڑ دو استاد، چھوڑ دو اس کو۔ آج یہ شوق بھی پورا کر لینے دو۔ ام نے بھی اس کو درمیان سے ورنہ کر دیا تو ہمارا نام نہیں۔"

سوج نے دوری سے زریں گل کو جوتی مارنے کی کوشش کی۔ وہ بھٹک کر ایک ایسے سیوک کے سینے پر لگی جو بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ سوج زخمی بلی کی طرح غرائی "تم پیچھے ہٹ جاؤ شاہ جہاں! میں آج تمہارے اس منہ چڑھے کا دماغ ٹھکانے لگا کر رہوں گی۔"

میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور غصے سے کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو سوج! کیوں تماشا بنا رہی ہو؟"

وہ جیسے ایک دم ہوش میں آ گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ دوسری طرف گوپال ٹھاکرے کے اشارے پر کچھ مستعد سیوک زریں گل کو کھینچ تان کر ایک گوشے میں لے گئے۔ میں نے سوج سے پوچھا "آخر ہوا کیا ہے؟"

وہ ہیجانی انداز میں بولی۔ "اس حرامزادے نے مجھے "ہیجے کی لومڑی" کہا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں دی ہیں۔ اب یا یہ تمہارے ساتھ رہے گا یا میں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس سے پوچھا تھا، تمہارے استاد صیب کہاں ہیں۔ یہ پشتو میں بڑبڑانے لگا۔ کہنے لگا۔ استاد صیب تمہاری ماں کی ارتھی جلانے گیا ہے۔ ہر وقت بولتی رہتی ہے استاد صیب کہاں ہے؟ استاد صیب کہاں ہے.... اس کا خیال تھا کہ یہاں حیدر آباد میں پشتو صرف اسے ہی آتی ہے۔ کمینے کا بچہ، حرامی، کمینی ذات کا۔"

میں نے سوج کو بمشکل رام کیا اور اسے کمرے میں بند کر کے زریں گل کی طرف آ گیا۔ یہاں وہ بھی فل ایکشن میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ گدھیر، بدرمنیر اور سلطان راہی کی روحیں بیک وقت اس کے اندر گھس گئی ہیں۔ اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ "بس استاد صیب! ہمارا تمہارا ساتھ ختم ہوا۔ جب تک یہ بدکار کمینہ عورت آپ کے ساتھ ہے ام آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ عورت تو پاؤں کا جوتی ہوتا ہے اور یہ ایسا عورت ہے کہ پاؤں سے جوتی اتارتا ہے اور سر پر مارنے کا کوشش کرتا ہے۔ ام کو خدا کا قسم ام نے آپ کا لحاظ کیا ورنہ ام اس کا ایسا چہرا فرق کرتا کہ یہ ساری عمر رو کر رہتا اور کہتا رہتا کہ کسی خان سے شامت لگا ہے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو زریں گل۔ ایک تو تم نے غلطی کی اوپر سے زیادتی بھی کر رہے ہو۔ وہ کہتی ہے کہ تم نے اسے پشتو میں گالیاں دیں اور اس کی ماں کی ارتھی کا ذکر کیا۔"

"ہاں ام نے کیا، لیکن پشتو میں کیا۔"

"لیکن وہ پشتو سمجھتی ہے۔"

"سمجھتی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا پھر ہٹ دھرمی کے انداز میں بولا۔ "سمجھتی ہے تو یہ اس کا قصور ہے، ہمارا نہیں ہے اور.... اور اگر ام نے کچھ بھی دیا تو کون سا ظلم کا پہاڑ توڑا... وہ بے غیرت آپ کا نام ایسے لیتا ہے جیسے آپ زرخرید غلام ہو اس کا۔ یہاں تہ خانے میں آ کر آنکھ کھلا ہی تھا کہ آپ کو پکارنا شروع کر دیا "شاہ جہاں، او شاہ جہاں۔" ام نے کہا بی بی ذرا تمیز سے بلاؤ۔ وہ ہمارا استاد صیب ہے۔ ہمارا عزت کی جگہ ہے۔ ویسے بھی آپ سے بڑا ہے۔ بس وہ پاگل کتیا کی مافق ہمارے پیچھے پڑ گیا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا اب زیادہ مت بڑھاؤ اس بات کو.... اور وہ جیسے مجھے پکارتی ہے پکارنے دو۔ میں خود سمجھ لوں گا اس سے۔"

وہ لرزتے ہاتھوں سے اپنے ہونٹ میں نسوار کا چٹکا رکھتے ہوئے بولا۔ "اس نے ام کو بہن کا گالی دیا ہے جی۔ ام ہر بات بھول جائے گا لیکن یہ گالی نہیں بھولے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں دل کو لگانے والی کون سی بات ہے۔ اس نے تمہیں گالیاں دی ہیں تو تم نے بھی چن چن کر دی ہیں۔"

وہ بولا۔ "ہاں ام نے دیا ہے چن چن کر.... لیکن بہن کا گالی ام کو لگا ہے اس کو نہیں لگا۔ ہمارا بہن ہے لیکن اس کا نہیں ہے۔ ام کو پتا ہے اس کا نہیں ہے۔"

"پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ام خان بچہ ہے، جب تک اس کو بہن کا سچا گالی دے کر حساب برابر نہیں کرے گا اس بات کو بھولے گا نہیں۔"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "پھر اب اس مسئلے کا حل کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔ ام انتظار کرے گا۔ اللہ اس عورت کو زندگانی دے اور ام کو بھی۔ ام کو معلوم ہے کہ اس کا باپ ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ بچہ پیدا نہ کر سکے۔ کیا پتا کہ کل کلاں کو اس کا بہن دنیا میں آ جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ام اس کو گالی دے گا اور اپنا کلیجا ٹھنڈا کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی لمبی سوچ ہے۔ تم اس چڑیل کو کوئی اور مناسب سی گالی دے کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لو۔"

زریں گل کا آدھا غصہ اب کافور ہو چکا تھا تاہم مجھے دکھانے کے لیے وہ اب بھی تیوری چڑھائے ہوئے تھا۔ "ہرگز نہیں استاد صیب! ام گالی دے گا تو اس کی بہن کو دے گا۔ چاہے اس کی بہن کو دنیا میں لانے کے لیے ام کو اس کی ماں سے شادی ہی کیوں نہ بنانا

میں نے بمشکل ہنسی روک کر کہا۔ "پھر تو تم اس کی بہن کے بجائے اپنی بیٹی کو گالی دو گے۔"

زریں گل گڑبڑا کر رہ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی الٹا سیدھا جواب دیتا، میری نگاہ ایک چیز پر پڑی اور میں چونک سا گیا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ ایک قد آدم چوبی الماری تھی۔ غالباً صفائی کرنے والی عورت نے فرش دھونے کے لیے اس الماری کو مقررہ جگہ سے تھوڑا سا کھسکا دیا تھا۔ یوں الماری کے عقب میں واقع چھوٹی چھوٹی چوکور ٹائیلوں والی دیوار کا کچھ حصہ ننگا ہو گیا تھا۔ اس جگہ کی ٹائیلیں نسبتاً سفید تھیں۔ ان ہی سفید ٹائیلوں میں مجھے ایک ٹائیل کی بیرونی درز قدرے نمایاں نظر آئی۔ جیسے اس ٹائیل کو بعد میں یہاں لگایا گیا ہو۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے اس ٹائیل کی اہمیت سے آگاہ کرنے لگی۔ عمارتوں میں موجود چور راستوں کو کھولنے اور بند کرنے کے لیے عموماً دیواروں میں ہی آلات نصب کیے جاتے ہیں۔ میں ایک سے زائد مرتبہ اس قسم کے میکنزم کا کھوج لگا چکا تھا۔

زریں گل محسوس کر چکا تھا کہ میں نے کمرے کی دیوار میں کوئی خاص چیز نوٹ کی ہے۔ اب وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ کمرے کا دروازہ بند کر دے۔ اس نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا تو میں دیوار کی طرف بڑھا۔ ٹائیل کو دبایا تو اس میں جنبش پیدا ہوئی۔ بہرحال وہ اپنی جگہ پر موجود رہی۔ میں کچھ دیر ٹائیل کو اس کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کرتا رہا، پھر زریں گل سے جیبی چاقو مانگا اور اس کی باریک نوک سے ٹائیل کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ اچانک ٹائیل کے پیچھے واقع ایک طاقتور اسپرنگ نے کام کیا اور کار کی پیٹرول ٹنکی کے ڈھکن کی طرح ٹائیل ایک کھٹکے سے کھل گئی۔ زریں گل کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹائیل کے عقب میں ایک طاق سا نظر آ رہا تھا۔ یہ طاق گرد آلود تھا اور اس میں پیتل کا ایک سیاہی مائل کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے ٹائیل کو دبا کر دیوار کے برابر کر دیا اور زریں گل سے کہا کہ وہ کمرے کا دروازہ کھول دے.... اب صبح کے چھ بج چکے تھے اور تہ خانے میں چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ میرے خیال میں اس وقت کسی طرح کی مہم جوئی ٹھیک نہیں تھی۔

○☆○

میں نے اور زریں گل نے وہ سارا دن آرام کرتے گزار دیا۔ اب میری حیثیت اس تہ خانے میں قیدی کی نہیں تھی۔ دوپہر کے وقت میں اور زریں گل دو دفعہ تہ خانے سے باہر گئے۔ کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ چند روز پہلے خود کو زہر کے اثر سے آزاد رکھنے کے لیے میں نے اپنی انگلیاں دروازے میں بھینچ کر زخمی کر لی تھیں۔ اب یہ زخم ٹھیک تھے اور سیاہ ناخنوں کے سوا اس چوٹ کی کوئی واضح نشانی باقی نہیں رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کسی وقت پنڈت مہاراج چھوٹے نواب کو نواب شہریار جنگ کے حوالے کر دیں گے اور ایسا کرنے سے پہلے وہ ایک بار مجھ سے ملاقات بھی کریں گے۔ اس ملاقات کی ضرورت اس لیے تھی کہ میں نے پنڈت مہاراج کو حویلی میں موجود کچھ غدار ملازمین کی موجودگی سے آگاہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں مہاراج کو ان ملازمین کے بارے میں تفصیل سے بتاؤں گا لیکن نہ تو یہ ثابت ہوا کہ چھوٹے نواب کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا گیا ہے اور نہ ہی پنڈت مہاراج نے مجھ سے رابطہ کیا۔ مجھے حیرانی ہونے لگی۔ کہاں تو پنڈت مہاراج اور ان کے ساتھی چھوٹے نواب کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے بے تاب تھے اور کہاں یہ کہ سترہ اٹھارہ گھنٹے گزر جانے کے باوجود اسے نواب شہریار کے حوالے نہیں کیا گیا تھا اور وہ مہمان کی حیثیت سے اس تہ خانے میں موجود تھا۔ مجھے شک گزرنے لگا کہ کہیں پنڈت اور چھوٹے نواب کے درمیان کوئی "خفیہ سمجھوتا" تو نہیں ہو گیا۔ بظاہر تو پنڈت ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا لیکن انسان کے اندر کا احوال تو خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ تہ خانے کے مختلف حصوں سے ابھرنے والی آوازیں تقریباً معدوم ہو چکی تھیں۔ جب اوپر مندر میں پوجا پاٹھ کے لیے آنے والوں کا رش ہوتا تھا تو تہ خانے کی چھت سے دھما دھم کی مدھم آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اب یہ آوازیں بھی ناپید تھیں۔ میں زریں گل کو ضروری ہدایات دے کر اپنے بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں صبح میں نے چور دروازے کے آثار دریافت کیے تھے۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے مقفل کیا اور ٹائیل کو اس کی جگہ سے ہٹا کر پیتل کے کڑے کو حرکت دی۔ ایک تیز سرسراہٹ کے ساتھ کمرے کی ایک دیوار میں مستطیل خلا پیدا ہو گیا۔ یہ خلا دو فٹ چوڑا اور قریباً تین فٹ اونچا تھا۔ مجھے اپنے سامنے گرد آلود سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور آہستگی سے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ خلا کے اندر بھی ایک دیوار کے ساتھ چور راستے کا ویسا ہی میکنزم موجود ہے۔ بہرحال میں نے اس میکنزم کو استعمال کرنے کا رسک نہیں لیا اور محتاط قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ یاد رہے کہ میں پہلے ہی تہ خانے میں تھا، اب تہ خانے کے تہ خانے میں جا رہا تھا۔ یعنی دو منزلہ عمارت کی طرح یہ دو منزلہ تہ خانہ تھا۔ سیڑھیوں کے خم پر پہنچ کر میں نے ٹارچ پھیرا تو ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ سیڑھیاں اس دروازے تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی تھیں بلکہ دروازے کے پاس سے ہو کر آگے نکل جاتی تھیں۔ میں نے دروازے کے تختوں پر دباؤ ڈالا تو وہ ایک کھٹکے سے کھل گیا۔ خاموشی میں کھٹکے کی آواز کافی بلند محسوس ہوئی۔ میں اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک ساعت بعد کسی نے دروازے میں سے سیڑھیوں کا

جائزہ لیا۔ یہ نسو کیپ والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختا یا جلدی سے دروازے کی اوٹ میں غائب ہو جاتا' میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ میرے بازو نے گردن کے مخصوص حصوں پر دباؤ ڈالا اور نسو کیپ والا سہاسا بغیر کوئی آواز نکالے بے ہوش ہو گیا۔ جو کچھ ہوا' بہت تیزی سے ہوا۔ میں کشمکش و پیچ میں تھا کہ معلوم نہیں مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔ ساملے کو بہ آہستگی سیڑھیوں پر لٹا کر میں نے نیچے گری ہوئی نسو کیپ اس کے سر پر رکھ دی۔ ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ دروازے کی دوسری طرف سے مزید کوئی آواز نہیں ابھری تو میں اندر داخل ہو گیا۔ یہاں بڑا آرام دہ اور صاف ستھرا ماحول تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ دیواریں روغن سے آراستہ تھیں۔ چھوٹے چھوٹے طاق دانوں میں رام کرشن اور درگا دیوی کی مورتیاں سجی ہوئی تھیں۔ میں اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا میں ایک دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ کہیں بالکل پاس سے پنڈت مہاراج کی آواز آئی تھی۔ وہ گیتا کا پاٹھ کر رہے تھے۔ میں نے آواز کا ماخذ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ یہ آواز ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے آ رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا' اندر سرخ رنگ کا نفیس پردہ تھا۔ تاہم یہ پردہ کچھ کھسکا ہوا تھا اور میں مختصر خلا سے ایک راستہ براہ راست کمرے کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ پنڈت مہاراج ایک منقش چوکی پر بیٹھے بڑے انہماک سے پاٹھ میں مصروف تھے۔ ان کے سوئے سوئے چہرے پر عجیب سی متانت نظر آ رہی تھی۔ چند لمحے بعد انہوں نے کتاب بند کر دی۔ پھر آنکھیں موندیں اور ہاتھ جوڑ کر آگے پیچھے جھولنے لگے۔ ظاہر ہے' یہ بھی کسی قسم کی پرارتھنا تھی۔ جونہی یہ پرارتھنا ختم ہوئی' دروازہ کھلا اور ٹھاکرے کی صورت نظر آئی۔ اس نے جھک کر پنڈت مہاراج سے کہا کہ نواب فیروز جنگ آگیا ہے۔ پنڈت مہاراج نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے بعد ٹھاکرے نواب فیروز کو لیے اندر داخل ہوا۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھا جو اسے زری فارم پر پہنایا گیا تھا۔ نواب فیروز کو چھوڑ کر ٹھاکرے باہر نکل گیا۔ نواب فیروز اور پنڈت آمنے سامنے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

نواب فیروز نے کہا "میں پھر کہہ رہا ہوں جناب! یہ کوئی نہایت خطرناک شخص ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پتا کروایا ہے۔ مکمل رپورٹ تو ابھی نہیں آئی لیکن جو کچھ بھی معلوم ہوا ہے' وہ تشویشناک ہے۔ اسی نام اور حلیے کا ایک شخص پنجاب اور بمبئی وغیرہ میں بہت جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس شخص کو ایک جج کے قتل کے الزام میں طویل سزا ہو چکی تھی۔ یہ شخص اٹک جیل سے فرار ہوا ہے اور ایک بار پھر قتل و غارت کا بازار گرم کر چکا ہے۔ چند ماہ پہلے اسے پشاور میں سرحد کے ایک بہت نامی گرامی ڈاکو عیسیٰ جان کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ وہاں اس نے دو افراد کو موت کے گھاٹ بھی اتارا ہے۔"

"ہم کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔" پنڈت مہاراج نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی "وہ کیا ہے اور کیا کرتا رہا ہے یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ اس نے ایک ایسی ہندو ناری کا جیون بچایا جس کو تمہارے لاڈلے مہمان نے جان سے مارنے کی کوشش کی۔ اب بھی ہم تمہیں اسی کی کوششوں سے ڈھونڈ پائے ہیں اور ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کس کے ساتھ ہمیں کیسا بیوہار کرنا ہے۔"

نواب فیروز نے پینترا بدلتے ہوئے کہا "مہاراج! کیا آپ نے سوچا ہے کہ یہ خطرناک شخص اور اس کے ساتھی پنجاب سے زیادہ دو ہزار میل دور یہاں اندرون حیدر آباد میں کیوں موجود ہیں؟"

"ہم نے کہہ دیا نا کہ ہمیں اس جانکاری کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے یہ جانکاری بہت ہے کہ وہ ہمارا مددگار رہا ہے۔"

فیروز جنگ نے عجیب نظروں سے پنڈت مہاراج کی طرف دیکھا پھر قدرے سنسنی خیز لہجے میں بولا "پنڈت مہاراج' بڑی معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کو اس معاملے کا کچھ پتا نہیں۔ یہ آپ کی توقع اور اندازوں سے کہیں گہرا چکر ہے۔ شاید میں آپ کو بتاؤں اور آپ یقین نہ کریں لیکن حقیقت آپ کے یقین نہ کرنے سے بدل نہیں جائے گی۔" پنڈت مہاراج نے قدرے چونک کر نواب فیروز کی طرف دیکھا۔ نواب فیروز نے کہا "کیا ہم اس کمرے میں رازداری سے بات کر سکتے ہیں۔"

پنڈت مہاراج بولے "تم اس تہ خانے میں ہر جگہ رازداری سے بات کر سکتے ہو۔"

نواب فیروز نے پنڈت کی طرف جھکتے ہوئے کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ اور جو کہوں گا اس میں میرا فائدہ تو ہے ہی' آپ بھی کروڑوں کے نفعے میں رہیں گے۔"

پھر نواب فیروز نے بڑے رازدارانہ اور سنسنی خیز لہجے میں پنڈت مہاراج کو بتایا کہ اس کا باپ یعنی نواب شہریار جنگ اس وقت کئی ارب روپے کے زر و جواہر اور نوادرات کا مالک ہے۔ یہ ساری دولت چند ماہ پہلے اسے ایک خاص ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ یہی دولت ہے جس کے حصول کے لیے کچھ پراسرار لوگ حویلی میں اور حویلی کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔ انہی لوگوں میں شہزاد عرف استاد جمالی... بھی شامل ہے۔

نواب فیروز نے ان چوبیس عدد صندوقوں اور ان میں موجود ساز و سامان کا نقشہ کچھ ایسے پرفریب انداز میں کھینچا کہ پنڈت مہاراج کے سنجیدہ چہرے پر ایک عجیب سی چمک نمودار ہونے لگی۔ نواب فیروز نے جوشیلے لہجے میں کہا "پنڈت جی! آپ کے پاس اسلحہ اور رفتار کارندے ہیں' جب کہ میرے پاس وہ نہایت اہم معلومات

ہیں جن کی مدد سے ہم وہ دولت والد صاحب کے قبضے سے نکال سکتے ہیں۔ بائی گاڈ' میں آپ سے بالکل کھری بات کر رہا ہوں۔ آپ میری طرف تعاون کا ہاتھ بڑھائیں۔ ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہوگا اس میں سے ایک تہائی آپ کا ہوگا۔ اور میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ یہ ایک تہائی نصف ارب سے کم نہیں ہوگا۔"

میں نے مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے ورنہ نواب فیروز کی گفتگو کافی طویل تھی۔ اس طویل گفتگو سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ اب تک ہم غلط انداز میں سوچتے رہے ہیں۔ صندوق نواب فیروز کے پاس نہیں' ابھی تک نواب شہریار کے پاس ہی تھے۔ بیٹا اپنے باپ سے وہ بے بہا دولت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہوا تھا کیونکہ جہاندیدہ نواب نے بیٹے کے خطرناک تیور دیکھ کر وہ سارا سامان کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیا تھا۔

پنڈت مہاراج بڑی گہری نظروں سے نواب فیروز کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جس پنڈت مہاراج کو میں جانتا ہوں وہ ایک سیاہ دھند میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ ایک اور شخص نمودار ہو رہا ہے' ایک ایسا شخص جس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں وہ تمام خواہشات چھپی ہوئی ہیں جو ایک لالچی' خود غرض اور موقع پرست شخص کا خاصہ ہوتی ہیں۔ میں بے حد حیرانی سے پنڈت مہاراج کے اس نئے روپ کو دیکھتے گیا۔ وہ اب نواب فیروز کی باتوں میں پوری دلچسپی ظاہر کر رہا تھا اور بیچ میں سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ پھر پنڈت مہاراج نے بڑے محتاط انداز میں نواب فیروز کو یقین دلا دیا کہ اگر وہ اپنی پیشکش کے مطابق عمل کرے تو اس کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے۔

نواب فیروز کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اس نے کہا "مہاراج! سب سے پہلے تو ہمیں شاہ جہاں اور اس کی ساتھی لڑکی سوج سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا اور اس کام کے لیے یہ موقع بہترین ہے۔ وہ دونوں آپ کی تحویل میں ہیں۔ آپ ان کے ساتھ جو بھی کر جائیں کسی کو ہوا تک نہیں لگے گی۔ یہاں حیدر آباد میں ان دونوں کے علاوہ بھی اس دولت کے کچھ حصے دار موجود ہیں۔ میرا مطلب والد صاحب کے ان دو مہمانوں سے ہے جو چند روز پہلے ریچھ اور کتوں کے مقابلے دیکھنے حیدر آباد پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک تو غیر ملکی ہے' دوسرے کا نام کنور احمد ہے اور وہ ایک بے حد عیار و چالباز شخص ہے۔ ہمیں جلد از جلد ان کا قصہ بھی پاک کرنا ہوگا۔ یہ سب جرائم پیشہ لوگ ہیں اور انہیں جہنم رسید کرتے ہوئے میرے یا آپ کے ضمیر پر کسی طرح کا بوجھ نہیں ہونا چاہیے۔"

پنڈت مہاراج نے دبے دبے لہجے میں کہا "اگر کسی کے خون سے ہاتھ رنگے بغیر کام چل سکتا ہے تو ہمیں چلا لینا چاہیے۔ ہمارا مطلب سوج اور اس دوسرے شخص سے ہے جسے تم شاہ جہاں کہہ رہے ہو۔ ہم ان دونوں کو اس تہ خانے میں یوں بند رکھ سکتے ہیں کہ برسوں کسی کو خبر نہ ہو۔ ہمارا رچا رہے گا..."

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" نواب فیروز نے تیزی سے پنڈت کی بات کاٹی "لیکن میں جو کہہ رہا ہوں' نہایت ٹھوس اطلاعات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ شاہ جہاں بے حد خطرناک اور ناقابل اعتبار شخص کا نام ہے۔ اسے زندہ رکھ کر ہم آغاز ہی میں اپنی ناکامی پر مہر ثبت کر لیں گے۔"

پنڈت مہاراج کی جہاندیدہ آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تذبذب کے آثار نظر آئے پھر وہ بولا "ٹھیک ہے۔ جیسے تم مناسب سمجھو لیکن ایک بات تمہارے ذہن میں رہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں میری ایک جدا حیثیت ہے۔ وہ مجھ سے پریم کرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی موڑ پر میرے نام پر کوئی حرف آئے۔ میں اس سارے معاملے میں پیچھے رہنا چاہتا ہوں۔ میں گوپال ٹھاکرے سے کہہ دوں گا۔ وہ ہر طرح وشواس کے قابل شخص ہے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور تمہاری ہدایات پر عمل کرے گا۔"

نواب فیروز نے ہنستے ہوئے کہا "پنڈت جی! آپ بھی کن چکروں میں پڑ رہے ہیں۔ نام پر حرف آنے کا اندیشہ آپ کو نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ آپ نہیں دیکھ رہے۔ خدا کی قسم میں آپ کو ایک ارب پتی کے روپ میں دیکھ رہا ہوں اور ارب پتی کی بلا سے کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ جب آپ کے پاس دولت ہوگی تو آپ اس مندر کے اس مختصر تہ خانے میں نہیں رہیں گے۔ آپ فرانس' برطانیہ یا امریکا کے کسی خوبصورت شہر میں مقیم ہوں گے اور آپ کا سرمایہ سوئٹزرلینڈ کے کسی بینک میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے گا۔"

میرا خیال تھا کہ پنڈت مہاراج' نواب فیروز کے انداز تخاطب اور لہجے کا برا منائے گا لیکن وہ ہوس زر کے ہاتھوں فروخت ہو چکا تھا اور جو فروخت ہو چکا ہو اس کی عزت نفس اتنی جلدی مجروح نہیں ہوا کرتی۔ پنڈت نے عام سے لہجے میں کہا "یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ بھگوان ہی جانتا ہے کہ مستقبل کے پردے میں کیا چھپا ہے۔ بہر طور اگر میرے پاس کچھ دھن آئے گا بھی تو وہ میں دھرم کے کاموں کے لیے ہی استعمال کروں گا۔"

نواب فیروز کے لبوں پر غیر محسوس مسکراہٹ تھی۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا "پنڈت جی! جتنی بھی جلدی ہو سکے آپ اس بدبخت جمالی کا بندوبست کریں بلکہ جمالی اور سوج دونوں کا بندوبست ہونا چاہیے۔"

پنڈت نے کہا "اس بچی کے بارے میں تو مجھے کچھ سوچنے دو... ہاں جمالی کا بندوبست آج ہی رات ہو جائے گا۔"

دفعتاً مجھے کہیں قریب سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے کھڑکی چھوڑ کر سیڑھیوں کے نیچے واقع ایک نیم تاریک خلا میں گھس گیا۔ چند لمحے بعد میں نے گوپال ٹھاکرے کو دیکھا۔ اس نے بوسکی کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھے سے سیاہ اسٹریپ

رالی سیاد ایل ایم جی جھول رہی تھی۔ وہ تاریک خلا کے عین سامنے ٹھہر گیا اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آواز دی "موہن لال۔۔۔ کہاں ہو موہن لال۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ موہن لال وہی نمو کیپ والا چھچھوندر ہے جسے میں سیڑھیوں میں لمبا لٹا آیا ہوں۔ ٹھاکرے کی تین چار آوازوں کے باوجود موہن لال برآمد نہیں ہوا تو ٹھاکرے وہیں سیڑھیوں کے پاس رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک چوڑے شانوں والا تاتل بھی وہیں پہنچ گیا۔ یہ شخص بھی مسلح تھا۔ دونوں کھسر پھسر کے انداز میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی کبھی ان کا کوئی فقرہ میرے کانوں تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ وہ کل رات والے واقعے پر گفتگو کر رہے تھے۔ ڈیری فارم پر اندھادھند ہونے والی فائرنگ سے بات شروع ہوئی اور نواب فیروز جنگ کی برآمدگی تک پہنچی۔ نواب فیروز بالکل عریاں حالت میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے کمرے اور بستر سے جو شواہد ملے تھے ان سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک کن "مصروفیات" میں اُلجھا رہا ہے۔ یہ "دلچسپ" موضوع شروع ہوا تو ٹھاکرے اور تاتل پہریدار کی گفتگو طوالت اختیار کر گئی۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس زیریں تہ خانے میں زیادہ افراد موجود نہیں اور جو چند گنے چنے ہیں وہ پنڈت کے خاص الخاص تری ہیں۔۔۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ٹھاکرے اور اس کا ساتھی وہاں سے ٹلے تو میں ایک بار پھر کھڑکی تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں اُٹھتا چھن چھن کی مدھم آواز آئی۔ جیسے کوئی دیہاتن مُٹیار جھانجریں پہنے اور توڑے سے گھنگھرو لگائے دبے پاؤں چلی آ رہی ہو۔ میں پھر نیم تاریک خلا میں دبک گیا۔ چند لمحے بعد ایک خوبصورت حیدرآبادی لڑکی میرے سامنے سے گزری۔ اس کا رنگ تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔ پاؤں میں جھانجریں اور کُہنیوں تک سفید کڑے تھے۔ جامنی مخمل کے چوڑی پاجامے پر جامنی کرتہ اور اس پر سنہری انگرکھا' رہی سہی کسر سلیم شاہی جوتی نے پوری کر دی تھی اور وہ سراپا حُسن طارق کی اسرارِ جان ارا نظر آنے لگی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے سامنے سے گزر کر پنڈت مہاراج کے کمرے میں داخل ہو گئی ہے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں کھڑکی کی طرف بڑھا لیکن وہ اب بند ہو چکی تھی۔ شیشے کی دوسری جانب سرخ پردہ تنا تھا۔ غالباً نواب فیروز بھی اب وہاں موجود نہیں تھا۔ اچانک مجھے مترنم نسوانی ہنسی سنائی دی۔ یقیناً یہ اسی لڑکی کی ہنسی تھی جو ابھی چھم چھم چلتی یہاں سے گزری تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی اسے گدگداتا چلا جا رہا ہے اور وہ لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔ اس فوارے کے مانند پھوٹنے والی چنچل ہنسی میں کبھی کبھی پنڈت مہاراج کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ پنڈت کے ظاہر و باطن کا یہ فرق ششدر کر دینے والا تھا۔ اب تک یہی محسوس ہوتا رہا تھا کہ پنڈت ایک مضبوط کردار کا مالک تجوری پسند شخص ہے لیکن اب یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو باکردار نہیں ہوتے صرف محتاط ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ عیاش بھی ہوتے ہیں' عیاش بھی اور غدار بھی لیکن وہ یہ سلسلہ کم نہایت اعلیٰ سطح پر اور دیکھ بھال کر کرتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اگر پنڈت کو کہیں سے ایسا بریف کیس مل جاتا جس میں دو ڈھائی لاکھ روپے ہوتے تو وہ دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بریف کیس واپس لوٹا دیتا لیکن جب اس کے سامنے صنفِ ادب کی بات کی گئی تھی تو وہ اپنے ہاتھ سے اپنی پارسائی کا نقاب نوچ کر سامنے آ گیا تھا۔ اب اسے میری اور سورج کی کوئی فکر نہیں رہی تھی اور ہم پر رہے ایک طرف' وہ نواب شہریار سے ٹکر لینے کے لیے بھی آمادہ تھا۔

مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ اگر میں آج کی رات اس بُرجیت خانے میں رہا تو پھر کبھی نیلا آسمان اور سورج نہیں دیکھ سکوں گا۔ مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور بہت جلد۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک میری اس "سرِاغ رسانی" کا راز فاش نہیں ہوا تھا۔ میں جس طرح یہاں آیا تھا اسی طرح سیڑھیوں اور مستطیل خلا سے گزر کر واپس کمرے میں پہنچ گیا۔ طاقدان میں نصب میکنزم کو استعمال کر کے میں نے مستطیل خلا بند کر دیا اور دروازہ کھول کر واپس اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہاں زریں گل بستر پر اکڑوں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر عجیب طرح کا ہیجان نظر آیا جیسے کوئی دھماکا خیز اطلاع اس کے سینے میں تڑپ مچل رہی ہو۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید میری مہم جوئی کا راز فاش ہو چکا ہے لیکن پھر میں نے اپنے اس خیال کو خود ہی رد کر دیا۔ یقیناً بات کچھ اور تھی۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا زریں گل نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ "کیا بات ہے زریں گل؟" میں نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

زریں گل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگلا۔ اس دوران میں اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں ڈبیا کھول کر نسوار کی چٹکی بھر چکے تھے۔ وہ لرزتے لہجے میں بولا "استاد صیب! ام نے آپ سے کہا تھا کہ ام سے ایک بات آپ کا مرضی کے خلاف ہوا ہے اور ام نے اس بات پر آپ سے پیشگی معافی بھی مانگا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ میں نے تمہیں معاف نہیں کیا تھا۔" میں نے جواب دیا

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "ام سے واقعی غلطی ہوا تھا اور بہت بڑا غلطی ہوا تھا۔ ام کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خوامخواہ ہماری بیوقوفی کی وجہ سے ام نے آپ کی مصیبتوں میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے جاؤ گے۔"

وہ بولا "ابھی آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ام اوپر مندر کے احاطے میں گیا تھا۔ وہاں۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"بھئی یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" میں نے اسے ڈانٹا۔

وہ بولا "مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ مجھے ماریں گے۔"

میں نے کہا "اگر کچھ بتانا نہیں تھا تو بات کیوں شروع کی تھی؟"

"کیونکہ ابھی میں نے مندر کے احاطے میں فریال بی بی کو دیکھا ہے۔"

میرے سر پر جیسے کسی نے دستی بم پھینک دیا تھا۔ میں حیران نظروں سے زریں گل کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کانوں پر یقین نہیں آیا تھا "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ گردن ڈال کر بولا "واقعی ہمارا دماغ چل گیا تھا' ورنہ۔۔۔ فریال بی بی یہاں کیسے پہنچتا۔"

میں نے پوچھا "یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ کہاں ہے فریال؟"

"ام نے آپ کو بتایا تو ہے۔ وہ اوپر مندر میں ہے اور آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ کہاں لاہور اور کہاں حیدرآباد دکن۔ کہیں زریں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا لیکن پھر فوراً ذہن میں خیال آیا کہ فریال جیسی عجیب و غریب لڑکی سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ وہ ہاکی کے مقابلوں کے سلسلے میں پاکستان کے اندر دور دراز کا سفر کرتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ کوئی ٹورنامنٹ دیکھنے کے لیے تن تنہا ملائشیا بھی جا پہنچی تھی۔ یہ سارے خیالات ایک لمحے کے اندر میرے ذہن میں آ گئے۔ زریں گل یوں میرے سامنے بیٹھا تھا جیسے کوئی مہاپاپی اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے لیے پادری کے سامنے بیٹھتا ہے' وہ لرزاں آواز میں بولا "استاد صیب! جب ام مجتبیٰ صاحب اور رجی کلارک صاحب کے ساتھ لاہور سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو رہا تھا' فریال بی بی نے ام کو ایک بہت بڑا قسم دے کر ام سے وعدہ لے لیا تھا کہ جونہی ام کو آپ کے بارے میں پتا چلا' ام فوراً سے پہلے ٹیلی فون یا ٹیلی گرام یا خط کے ذریعے ان کو آپ کے پتے سے آگاہ کر دے گا۔ بس استاد صیب! ام اپنی قسم کے ہاتھوں مجبور تھا' ام نے دس پندرہ روز پہلے ایک خط کے ذریعے فریال بی بی کو بتا دیا کہ ام اور آپ حیدرآباد میں نواب شہریار جنگ کی حویلی میں ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ "آفت لڑکی" اتنی دور سے آپ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائے گی۔"

مجھے ابھی تک زریں گل کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا "تم نے تو بتایا تھا کہ تم نے فریال سے جھوٹ بولا ہے اور اسے صرف اتنا پتا ہے کہ میں اپنی کسی پھوپی کی مرگ پر ساہیوال گیا ہوا ہوں۔"

زریں گل بولا "ہاں یہ بات تو یہی تھا استاد صیب! لیکن آخری وقت میں اس کو شک ہو چکا تھا۔ آپ کو معلوم ہے' وہ کتنا چالاک ہے' آنکھوں سے دل کا بات پڑھتا ہے۔ اس نے ام کو ایک دم مصلے پر کھڑا کر کے آپ کا قسم دے دیا تھا۔ بولو ام کیا کرتا؟"

میں نے جھلا کر کہا "کسی دن تمہیں کوئی مصلے پر کھڑا کر کے یہ کہہ دے کہ دس آدمیوں کو قتل کر دو تو بس کر دینا قتل۔"

زریں گل پریشانی اور خجالت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ فریال یہاں کیسے پہنچی ہے اور یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیوں پہنچی ہے۔ لاہور میں قیام کے دوران میں ہی میں نے اس کے رویے میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بے حد ناراض ہو گی کیونکہ میں اسے بتائے بغیر ہی لاہور سے حیدرآباد چلا آیا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے اطمینان ہوا تھا کہ شاید میری یہ بے رُخی اس کے لیے بہتر ثابت ہو۔ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ یوں ڈھونڈتی ہوئی یہاں چلی آئے گی۔۔۔ اور ایسے وقت آئے گی جب میرے گرد سنگین خطرات منڈلا رہے ہوں گے۔

میں نے زریں گل سے پوچھا "تہ خانے سے نکلتے اور واپس آتے وقت تمہیں کسی نے روکا تو نہیں؟"

زریں گل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی پنڈت نے میرے اور زریں گل کے بارے میں اپنے آدمیوں کو

محیُ الدّین نواب کے قلم سے ایک
دِل گداز داستان
شارٹ کٹ
قیمت: ۱۲۵ روپے
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

تھی" ہدایات نہیں دیں۔ اس لحاظ سے یہ بڑے قیمتی لمحات تھے۔ ہمیں موقعے سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے زریں گل سے کہا کہ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ خطرناک صورت حال سے زریں گل بھی لطف اندوز ہوتا تھا اور اس کی یہ بات مجھے پسند تھی۔ اس نے فوراً تازہ نسوار ہونٹ میں رکھی اور ریوالور کا معائنہ کر کے تہ خانے سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے زریں گل سے کہا کہ ہم اکٹھے نہیں نکلیں گے تاکہ پہریداروں کو شک نہ ہو۔ زریں گل نے اصرار کیا کہ وہ بعد میں آئے گا۔ میں نے تہ خانے کی داخلی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ داخلی راستے پر دو مسلح افراد موجود تھے۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ میں نپے تلے قدم اٹھاتا سیڑھیوں تک پہنچا اور باہر نکل آیا۔ چند منٹ بعد زریں گل بھی تہ خانے سے باہر تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس سے پوچھا کہ کہاں ہے فریال۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اب رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ مندر کے احاطے اور برآمدوں میں اِکا دُکا شب بیدار زائرین اور سیوکوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ ہم محرابی دروازوں والی ایک طویل راہداری سے گزر کر صحن کے جنوبی گوشے میں پہنچے۔ میری نگاہوں میں شوخ و چنچل فریال کی صورت گھوم رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی زبردست ڈراما کرے گی۔ شدید قسم کی ناراضگی ظاہر کر کے چپ سادھ لے گی۔ یا پھر کوئی حیران کن واقعہ سنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گی کہ اس کا پاکستان سے انڈیا پہنچنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی بے وزن بات کو اپنی دلیلوں کے ساتھ وزنی اور قابلِ اعتبار بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ بہرحال کچھ بھی تھا میں اس کا یہ بچکانہ پن معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں اندر سے کھول رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سلام دعا کے فوراً بعد وہ مجھ سے ڈانٹ کھائے گی۔

میں اور زریں گل آگے پیچھے چلتے کالی دیوی کی ایک بلند و بالا مورتی کے سامنے پہنچے۔ اس مورتی کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ بارہ دری پر پہنچ کر زریں گل ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ فریال کو یہیں رُکنے کا کہہ کر گیا تھا۔

"پتا نہیں کدھر چلا گیا؟" وہ بڑبڑایا۔

ہم وہیں مورتی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر فریال کا انتظار کرنے لگے۔ ممکن تھا کہ وہ کسی وجہ سے دائیں بائیں ہو گئی ہو۔ تین چار منٹ تک وہ نہیں آئی تو زریں گل اس کی تلاش میں نکلا۔ میں وہیں مورتی کی اوٹ میں کھڑا سوچ کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ دفعتاً میری نگاہ برآمدوں کی طرف اٹھی اور میں ٹھٹک گیا۔ گوپال ٹھاکرے اور نواب فیروز جنگ اندرونی حصے سے صحن کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے کم و بیش بیس مسلح افراد تھے۔ ان لوگوں نے عبادت گاہ کے اندر اپنا اسلحہ چھپا کر رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اپنی خودکار رائفلیں اور دہاڑ ز دو فیہو ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے جیسے یہ کوئی مندر نہ ہو، فوجی قلعہ ہو اور یہ لوگ کہیں حملہ کرنے جا رہے ہوں۔ منطقی طور پر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ لوگ میری اور زریں گل کی تلاش میں نکلے ہیں لیکن جب وہ کوئی ایک لمحہ رکے بغیر مندر سے باہر نکل گئے تو میرے ذہن میں جیسے بجلی سی لپک گئی۔ میں سمجھ گیا کہ آج کی شب نواب شہریار جنگ پر بہت بھاری ہے۔ وہ دفینہ جو چند ماہ پہلے چٹے پُل کی حویلی سے برآمد ہوا تھا آج ایک اور طوفان اٹھانے جا رہا تھا۔ آج اس طوفان کے نشانے پر حیدرآباد کا ایک وضع دار اور دولت مند نوابی گھرانا تھا۔ دولت کی کھینچی ہوئی خونی لکیر کی ایک طرف وہ باپ کھڑا تھا جس کا دل خدا نے پھیر دیا تھا اور جو مالِ حرام کی نحوست سے بچنا چاہتا تھا، دوسری طرف وہ بیٹا کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک تھی اور مستقبل کے سہانے خواب تھے۔ دونوں لڑنے اور لڑ مرنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ دفینہ ایک عفریت ہے جو جہاں پہنچتا ہے، تباہی پھیلا دیتا ہے۔ ہر جذبے، عقیدے، قدر اور رشتے کو نگلتا چلا جاتا ہے۔

میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اپنے مجرمے بار مندر اور گمشدہ صندوقوں تک پہنچنے کے لیے یہ لمحات بے حد قیمتی اور اہم ہیں۔ اگر اس موڑ پر میں پیچھے رہ گیا تو بہت پیچھے رہ جاؤں گا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ میں اس مسلح جتھے کے حویلی پہنچنے سے پہلے حویلی پہنچ جاؤں اور اگر ایسا نہ کر سکوں تو مجتبیٰ کنور یا مسز کلارک کو ٹیلی فون پر مطلع کر دوں کہ حویلی کا باغی شہزادہ اپنے باپ کے سب سے بڑے خیر خواہ پنڈت مہاراج کو اپنے ساتھ ملا کر حویلی پر چڑھائی کے لیے آ رہا ہے۔ میں نے مندر سے باہر پروردنوں گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حویلی کا رُخ کرنے والوں کی اصل تعداد میری توقعات سے کئی گنا زیادہ ہے۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فریال کو کوسا اور زریں گل کو چند موٹی موٹی گالیاں دیں....

دفعتاً میری نگاہ سنگِ سرخ کے نیم تاریک فرش پر پڑی۔ یوں لگا جیسے فرش پر کبوتر جیسا کوئی پرندہ مُردہ پڑا ہے لیکن یہ پرندہ نہیں تھا۔ یہ ایک زنانہ جوتی تھی۔ سنہری نقل اور ریشمی دوال والی۔ میں نے اس جوتی کو بڑے دھیان سے دیکھا اور پہچان گیا.... یہ فریال کی جوتی تھی۔ یک لخت مجھے اندازہ ہوا کہ اس مندر کے اس نیم اندھیرے گوشے میں کالی دیوی کی مورتی کے عین پیچھے فریال کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر سر کو چڑھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی زندگی کے مشکل ترین دوراہے پر آن کھڑا ہوا ہوں۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے متحرک تھیں اور مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنا رُخ نواب شہریار کی حویلی کی طرف کروں یا اس پاگل لڑکی کو ڈھونڈوں جو ابھی چند منٹ پہلے اس مندر میں کسی المیے کا شکار ہو گئی ہے۔

میں فیصلے کی سُولی پر لٹک رہا تھا۔ فریال کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تو وہ قیمتی گھڑیاں ہاتھ سے نکل جاتیں جن کے حصول کے لیے ہم مہینوں سے سرگرداں تھے اور اگر ان گھڑیوں پر قابو پاتا تو فریال اس کی تہ خانوں والے مندر کی اتھاہ تاریکی میں گم ہو سکتی تھی۔ آخر فیصلہ فریال کے حق میں ہوا۔ میں نے ساری مصلحتیں پسِ پشت ڈالیں اور فریال کو ڈھونڈنے کے لیے مندر کے طویل برآمدوں کی طرف بڑھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور حواس ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی تیار تھے۔ ابھی میں کالی دیوی کی مورتی کے عقب سے نکل کر چند قدم ہی چلا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے سامنے فریال کھڑی تھی۔ وہ ایک مخمل ساڑی میں تھی۔ ماتھے پر بندیا اور مانگ میں سیندور تھا۔ وہ سو فیصد ہندو ناری نظر آتی تھی وہ۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی بھونچکا سی کھڑی رہ گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس نے بغل میں کوئی چیز داب رکھی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور مسکراتے لہجے میں بولی "نمستے۔"

میں نے پوچھا "کہاں چلی گئی تھیں تم؟"

اس نے اطمینان سے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی "میں آپ کو زریں گل کے پاس چھوڑ کر گھر گئی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ کل شام پانچ بجے ملاقات ہو گی لیکن آپ رات آٹھ بجے تک بھی نہ پہنچے۔ پھر پتا چلا کہ آپ تو اپنی پھوپی کی مرگ پر ساہیوال چلے گئے ہیں۔"

میں نے غصے کا گھونٹ بھر کر کہا "میں پوچھ رہا ہوں کہ ابھی دو منٹ پہلے تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"اچھا" وہ ایکٹنگ کرتے ہوئے بولی "میں نے سمجھا آپ پچھلے مہینے کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل میں وہاں اس مورتی کے پیچھے کھڑی تھی کہ ایک مسٹنڈا آ گیا۔"

"مسٹنڈا! کون مسٹنڈا؟"

"میرا خیال ہے کہ اس طرح نہ میں کچھ بتا سکوں گی، نہ آپ سن سکیں گے۔ چلیں کہیں اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"یہ تمہارے پاپا کا ڈرائنگ روم نہیں ہے" میں نے اسے جھاڑا "ہم سخت مصیبت میں ہیں اور تمہیں چٹکلے سوجھ رہے ہیں۔ چلو میرے ساتھ، ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔"

"اوکے۔ میں سو فیصد تیار ہوں لیکن.... ایک سیکنڈ ٹھہریں۔ ذرا اپنی جوتی لے لوں۔"

وہ دیوی کی مورتی کی طرف بڑھی۔ میں نے اسے روکتے ہوئے کہا "ایک جوتی تو میرے پاس ہے۔"

اس نے جھٹ بغل میں دابی ہوئی دوسری جوتی نکالی اور بولی "دوسری میرے پاس ہے۔"

"پھر بھلا کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی میں نے بتایا ہے ناکہ ابھی ایک مسٹنڈا ملا تھا مجھے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ فی الحال تم نکلو یہاں سے۔ ورنہ ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔"

خوش قسمتی سے عین اسی وقت مجھے زریں گل بھی نظر آ گیا۔ وہ گمشدہ بھینس کی طرح برآمدے میں گھوم رہا تھا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ فریال کو تلاش کر رہا ہے۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔

میں نے کہا "چلو زریں گل، یہاں سے نکلیں۔"

ہم آگے پیچھے چلتے مندر کے صدر دروازے کی طرف آئے۔ دروازے کے پاس کھڑے دو دربان نما افراد نے ہمیں کھوجنے والی نظروں سے دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔ چند ہی لمحے بعد ہم مندر سے باہر تھے۔

رات کے اس پہر بھی مندر سے باہر دو تین موٹر رکشا موجود تھے۔ ہم تینوں بغیر کچھ کہے سنے ایک موٹر رکشا میں گھس گئے۔ رکشا والا ایک دبلا پتلا بابو ٹائپ شخص تھا۔ خالص لکھنوی انداز میں بولا "کہاں جائیے گا صاحب؟"

فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس جگہ کا نام لوں۔ منہ میں جو آیا میں نے کہہ دیا "رام گلی چلو۔"

"رام گلی؟ یہ کون سی جگہ ہے حضت؟" رکشا والے نے رکھ رکھاؤ سے پوچھا۔

میں نے کہا "ابھی سیدھا چلتے رہو۔ آگے جا کر بتاتا ہوں۔"

رکشا اسٹارٹ ہوا اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ فریال اور زریں گل میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ جگہ کم تھی لہٰذا ہم ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ زریں گل نے میرے کان میں سرگوشی کی "جانا کہاں ہے جناب؟"

"حویلی" میں نے جواب دیا "وہاں کوئی زبردست گڑبڑ ہونے والی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا، ابھی سات آٹھ گاڑیاں یہاں سے روانہ ہوئی ہیں۔"

زریں گل بولا "آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ ام نے دوسرے لوگوں کے علاوہ نواب فیروز اور ٹھاکرے کو بھی دیکھا ہے۔ وہ دونوں سرخ رنگ کی ایک لمبی جیپ میں بیٹھ کر گیا ہے۔ ان کا ارادہ بہت خطرناک نظر آتا ہے۔"

رکشا کے شور کی وجہ سے ہماری سرگوشیاں رکشا ڈرائیور کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں بلکہ فریال کے کانوں تک بھی نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ ہمہ تن متوجہ تھی اور ہماری گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس سے نہیں رہا گیا۔ کہنے لگی "کیا بات ہے، مجھے کچھ نہیں بتائیں گے؟"

مجھے فریال پر کچھ کچھ غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر چِڑانے والے انداز میں بولی "اوہ.... جو آپ تو بلے (بڑے) ملاج (ناراض) نظر

آتے ہیں۔"

میں نے خشک لہجے میں کہا "جتنا نظر آرہا ہوں اس سے کہیں زیادہ ناراض ہوں لیکن فی الحال اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"توبہ یا اللہ۔ غصہ رکھنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ اپنے وطن سے اتنی دور تو کوئی دشمن بھی مل جائے تو لوگ اسے دوست کی طرح گلے لگا لیتے ہیں' آپ ہیں کہ سیدھے منہ بات نہیں کررہے۔"

شاید غصے میں میرے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل جاتی لیکن زریں گل فوراً بول پڑا "فریال بی بی! استاد صیب ناراض نہیں پریشان ہے اور سچ پوچھو تو ام بھی آپ کو دیکھ کر بڑا پریشان ہوا ہے۔"

رکشا اب مندر سے دو تین فرلانگ دور آچکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو رکنے کی ہدایت کی' وہ رک گیا اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس کی جھلک تھی۔ غالباً اس کا یہ شک یقین میں بدل چکا تھا کہ اس نے مندر سے کوئی غلط قسم کی سواری اٹھائی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "یہاں سے نواب شہریار جنگ کی حویلی کتنی دور ہے؟"

وہ بولا "حویلی تو فاروق گھر میں ہے جناب عالی۔ اور فاروق گھر یہاں سے چودہ پندرہ میل دور ہے۔"

"تو ٹھیک ہے' چلو فاروق گھر۔"

"نہیں حضت" وہ لجاجت سے بولا "اتی دور کی سواری ہم نہیں اٹھا سکتا۔ آپ کو فاروق گھر جانا تھا تو ہمیں بول دینا چاہیے تھا۔"

"کیوں نہیں جاسکتا تم؟" زریں گل نے آنکھیں نکالیں۔

"ہمارا انجن کمزور ہے حضت۔ راستے میں گڑبڑی کریں گا اور اس وقت گڑبڑی کریں گا تو ہم اور آپ دونوں مصیبت میں پھنسیں گا۔"

"کوئی گڑبڑی نہیں ہوگی حضت" میں نے اسے ڈانٹ پلائی "ہاں۔۔۔ اگر تم نے جانے سے انکار کیا تو پھر گڑبڑی ہوگی" میں نے چٹکی سے خنجر کھینچ کر رکشا ڈرائیور کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

اچانک اس کی گھگی بندھ گئی "ہم بال بچے دار ہیں جناب عالی۔"

میں نے کہا "اور میں چاہتا ہوں جناب عالی کہ تمہارے بچوں کے سر پر تمہارا سایہ قائم رہے۔ چلو شاباش' آگے بڑھو۔ رام بھلی کرے گا۔"

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد رکشا ڈرائیور نے سر تسلیم خم کردیا۔ رکشا آگے بڑھا اور ایک بار پھر سنسان سڑک پر فراٹے بھرنے لگا۔ زریں گل کے دریافت کرنے پر فریال نے بتایا کہ میں

مورتی کے پیچھے کھڑی آپ لوگوں کا انتظار کررہی تھی کہ ایک سناچٹ مریل سا مسٹنڈا میرے آس پاس گھومنے لگا۔ پہلے تو میں سمجھی کہ ٹل جائے گا لیکن وہ بالکل سر پر ہی ہوگیا۔ جب اس نے چھیڑ خانی کی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے اپنی جوتیوں میں سے ایک اٹھائی اور تڑاخ سے اس کے سر پر دے ماری۔ وہ جوتی کھا کر بھاگا تو میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے والے برآمدوں میں چلا گیا۔ یہاں فرش کی دھلائی کی گئی تھی۔ وہ پھسلا اور بری طرح لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ خبیث کی پسلیوں میں کہیں چوٹ آئی تھی۔ سانس ہی نہیں آرہا تھا۔ مجھے تو یوں لگا کہ ابھی اس کا یہاں رام ہوجائے گا۔ آس پاس کوئی بندہ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا یہ "اسپورٹس مین شپ" نہیں کہ اپنے حریف کو اس طرح چھوڑ کر چلی جاؤں۔ وہاں قریب ہی نل لگے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے پانی لاکر پلایا۔ سینے کی مالش کی۔ اتنے میں مندر کے دو سیوک بھی وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔ اسے ان سیوکوں کے حوالے کرکے میں اوپر آگئی۔ یہاں پتا چلا کہ آپ دونوں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔"

زریں اور فریال باتیں کرتے رہے اور رکشا سنسان سڑک پر فراٹے بھرتا رہا۔ آدھ گھنٹے بعد اس نے ہمیں فاروق گھر پہنچا دیا۔ راستے میں صرف ایک دو بار انجن نے "بسنگ" کی۔ ممکن ہے کہ یہ بھی ڈرائیور کی چالاکی ہو اور اس نے اپنے عذر کی سچائی ثابت کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہو۔ میں نے حویلی سے تقریباً دو فرلانگ دور گھنے درختوں میں رکشا رکوا دیا۔ ابھی ہم رکشے سے اترے ہی تھے کہ حویلی کی جانب سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں سن کر رکشا ڈرائیور راجو کا رنگ ایک دم پیلا پڑگیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جونہی ہم اس کی آنکھ سے اوجھل ہوئے وہ کرائے پر لعنت بھیج کر یہاں سے بھاگ نکلے گا۔ اسے راہ فرار اختیار کرنے سے روکنے کے لیے میں نے نہ صرف رکشے کی چابی لے لی بلکہ زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ انجن کا پلگ بھی کھول کر اپنے پاس رکھ لے۔

فائرنگ کی آواز میں یکدم شدت پیدا ہوگئی۔ ہلکی اور بھاری رائفلیں استعمال ہورہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی باقاعدہ چھوٹا سا محاذ کھل گیا ہے۔ میں نے دیکھا' دور درختوں کے اس پار تاریکی میں چنگاریاں سی اُڑ رہی ہیں۔ یہ اس پگھلے ہوئے سیسے کی پرواز تھی جو آتشیں اسلحے سے برآمد ہوکر "زندگی" کا متضاد ہوجاتا ہے۔ ہم حویلی سے کافی فاصلے پر تھے پھر بھی فائرنگ کی آواز اور رخ سے پتا چلتا تھا کہ حویلی پر صدر دروازے کی طرف سے حملہ کیا گیا ہے اور حویلی کے محافظ مورچا بند ہوکر زبردست مقابلہ کررہے ہیں۔ میں نے جو کچھ مندر میں دیکھا تھا اس کے بعد اس امر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ حویلی پر حملہ کرنے والے پنڈت مہاراج کے کارندے ہیں اور نواب فیروز اور

ٹھاکرے ان کی قیادت کررہے ہیں۔

میں فریال کو اپنے ساتھ حویلی کی طرف لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس گھنے جنگل اور تاریکی میں اسے چھوڑ جانا بھی کسی طور مناسب نہیں تھا۔ مجبوراً ہم نے اسے ساتھ لے لیا۔ میرے اور زریں گل کے پاس ریوالور موجود تھا۔ ریوالور کی کم وبیش دو درجن گولیاں بھی میری جیبوں میں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی ٹارچ بھی میری جیب میں موجود تھی۔ ہم نے درختوں اور کھیتوں کے درمیان سے بالکل سیدھا راستہ اختیار کیا اور جلد ہی حویلی سے نزدیک تر ہوگئے۔ میرے ذہن میں کوئی واضح پلان نہیں تھا کہ حویلی کے نزدیک پہنچ کر مجھے کیا کرنا ہے۔ صرف یہی خیال ذہن میں جاگزیں تھا کہ دفینے کے حوالے سے یہ گھڑیاں بڑی فیصلہ کن ہیں۔ اگر نواب فیروز اور پنڈت مہاراج کے سیکڑوں کارندے حویلی پر قبضہ جمالیتے تو یقیناً آج کی رات بڑے نواب شہریار اور اس کے قریبی ساتھیوں پر بے حد سخت ہوتی۔ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلتا تو نواب شہریار کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور معلوم کیا جاتا کہ اس نے صندوق کہاں چھپا رکھے ہیں اور اگر نواب شہریار اپنے محافظوں کی مدد سے حویلی کا دفاع کرنے میں کامیاب رہتا تو بھی میرے لیے ضروری ہوجاتا کہ جلد از جلد حویلی پہنچوں اور اس سے پہلے کہ نواب شہریار اپنے نیک ارادوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے تمام دولت فی سبیل اللہ حکومت ہندوستان کے حوالے کردے' اس کا راستہ روکوں۔

ہم فائرنگ کی "رینج" میں داخل ہوچکے تھے اور ضروری ہوگیا تھا کہ یہاں درختوں کی آڑ میں رک جائیں۔ گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ پگھلا ہوا سیسہ درختوں کی شاخوں اور تنوں سے ٹکرا کر ایک ہولناک آواز پیدا کرتا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے فریال کی طرف دیکھا۔ وہ میرے بازو سے لگی کھڑی تھی اور قطعی خوف زدہ نہیں تھی۔ خوف کے بجائے اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا جوش اور ولولہ کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ مجھے جنگ وجدل کرتے دیکھ کر اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ غالباً آج بھی اسے اپنی یہی خواہش پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔ اس حوالے سے فریال کا رویہ بہت الجھا ہوا سا تھا۔ وہ غزالہ اور میری بہن شگفتہ کی طرح میری زندگی کی طرف سے متفکر بھی رہتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں استاد جمالی کے روپ میں مار دھاڑ کرتا اور گولیاں برساتا نظر آؤں۔ اسے ایک شوخ وچنچل لڑکی کی لاابالی خواہش ہی کہا جاسکتا تھا۔

حویلی کے اردگرد زبردست لڑائی جاری تھی۔ اچانک کچھ فاصلے پر انجن کا شور سنائی دیا۔ پھر دھماکا ہوا اور یوں لگا جیسے کوئی تناور درخت گاڑی کی ضرب سے ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ میں نے ریوالور نکالا اور زریں گل کو فریال کے پاس چھوڑ کر آواز کی سمت بھاگا۔ کسی شخص کے چیخنے کی آواز آئی۔ پھر دو تین افراد بڑی عجلت میں بولنے لگے۔ میں نے درختوں کی اوٹ سے دیکھا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں مجھے ایک سفید کار نظر آئی۔ توقع کے عین مطابق کار کچے راستے سے پھسل کر ایک درخت سے ٹکرائی تھی اور جھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔ تین چار ہیولے کسی کو کھینچ کر کار سے باہر نکال رہے تھے۔ کم روشنی کے سبب میں صورتیں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا کہ یہ پنڈت مہاراج کے ہی کارندے ہیں۔ غالباً یہ سفید کار بھی میں مندر سے باہر کھڑی دیکھ چکا تھا۔ جس زخمی شخص کو اٹھا کر گاڑی سے باہر نکالا گیا وہ کراہا تو میں نے پہچان لیا۔ وہ گوپال ٹھاکرے تھا۔ اس کے جسم کے زیریں حصے میں کہیں گولی لگی تھی۔ اس دوران میں ایک ڈبل جیپ کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور وہ لہراتی بل کھاتی موقعے پر آرکی۔ ٹھاکرے کے ساتھیوں نے افراتفری میں ٹھاکرے کو اس جیپ میں لٹایا اور تیزی سے روانہ ہوگئے۔ میں نے آواز دے کر زریں گل اور فریال کو اپنے پاس بلالیا۔ درخت میں دھنسی ہوئی کار کو دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ ہم کچھ دیر درختوں کی اوٹ سے ہی جائزہ لیتے رہے پھر کار کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس کے دروازے کھلے تھے۔ ایک ہیڈلائٹ اور ایک ٹیل لائٹ روشن تھی۔ پنڈت مہاراج کے ساتھی افراتفری میں ایک "گن بیلٹ" بھی پچھلی نشست پر ہی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے ٹارچ روشن کرکے دیکھا' پچھلی نشست پر خون کے دھبے موجود تھے۔ اچانک زریں گل نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا "استاد صیب! کوئی اس طرف آرہا ہے۔"

میں نے غور کیا' کچھ فاصلے پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ بھاگنے والے کم ازکم دو افراد تھے۔ وہ ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں اور زریں گل تباہ شدہ کار کی اوٹ میں ہوگئے۔ فریال پہلے ہی ایک تناور کیکر کی اوٹ لیے کھڑی تھی۔ چند لمحے بعد کچے راستے پر دو ہیولے نمودار ہوئے۔ وہ دوڑنے کی رفتار سے دوڑے چلے آرہے تھے۔ میں نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے انہیں للکارا "خبردار! وہیں رک جاؤ۔"

وہ ٹھٹک کر رکے اور اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں خودکار رائفل ہے۔ اس نے رخ پھیرتے ہی بے دریغ ٹریگر دبادیا۔ تاریکی میں شعلے سے لپکے اور دھماکوں سے کئی گولیاں سفید کار کی باڈی میں پیوست ہوگئیں۔ میں نے تاک کر جوابی فائر کیا۔ ریوالور نے گولیاں اگلیں اور رائفل بردار تڑپ کر ایک خاردار جھاڑی میں جاگرا۔ دوسرا شخص ایک لمحے کے لیے بھونچکا کھڑا رہا پھر وہ اپنے زخمی ساتھی کی رائفل سنبھالنے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں' میں بھی حرکت میں آچکا تھا۔ چھ سات قدم بھاگ کر میں نے زخمی شخص پر چھلانگ لگائی اور اس کے ساتھی سے ایک لمحہ قبل اس تک پہنچ گیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی رائفل پر آیا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور زور سے اس کے منہ پر لگا۔ اس دوران میں اس کے ساتھی نے مجھے دبوچنے

کی کوشش کی مگر سینے پر ٹانگ کھا کر دور جا گرا۔ زریں گل چوکس کھڑا تھا۔ وہ بلا کی طرح اس سے لپٹ گیا اور چار پانچ سیکنڈ میں ٹکریں مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ ہم دونوں افراد کو گھسیٹ کر گھنے درختوں میں لے آئے۔ ٹارچ کی روشنی میں چہرے دیکھے تو دونوں پنڈت مہاراج کے چیلے نکلے۔ وہ دونوں اس وقت بہ زبانِ حال پکار رہے تھے 'میں تو آتا تا بھاگ آیا ہوں میدانِ جنگ سے۔'

جس شخص پر میں نے فائر کیے تھے اس کی ٹانگیں زخمی ہو گئی تھیں اور وہ زخموں کی شدت سے نیم بے ہوش تھا۔ دوسرا شخص جس کی درگت زریں گل نے بنائی تھی، ہوش میں تھا۔ میں نے اسے گریبان سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "نواب فیروز کہاں ہے؟"

وہ کراہا "مجھے کچھ معلوم نہیں" میں نے اس کے چہرے پر تین چار تھپڑ رسید کیے تو اس نے بک دیا، کہنے لگا "فائرنگ سے چھوٹے نواب کی سرخ جیپ میں آگ لگ گئی تھی لیکن میرا وچار ہے کہ وہ بچ نکلے ہیں۔"

"کیا تمہاری طرح وہ بھی بھاگ گیا ہے؟"

"نواب صاحب بھاگے نہیں اور نہ ہی ہم بھاگ رہے تھے۔ ہمارا ایمونیشن ختم ہو گیا تھا۔"

زریں گل نے کہا "تو ادھر جھاڑیوں میں تمہارے پتا جی نے ایمونیشن ڈپو بنا رکھا ہے؟"

حویلی کی طرف سے فائرنگ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑائی جاری ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ شدید مزاحمت کی وجہ سے نواب فیروز اور اس کے ساتھی پسپا ہو رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس کہیں کار یا جیپ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی بلکہ یہ ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ نواب فیروز اور اس کے ساتھی بھاگ نکلنے کی فکر میں ہیں۔ فائرنگ کی آواز اب تین مختلف اطراف سے آ رہی تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ حویلی کا دفاع کرنے والے کس طرف ہیں اور دھاوا بولنے والے کس جانب؟ گھمسان کی اس لڑائی میں ہمارا الگ رہنا ہی مناسب تھا۔

چار پانچ منٹ کے اندر اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ نواب فیروز اور پنڈت مہاراج کے چیلے بھاگ کھڑے ہوئے ہیں اور بڑے نواب کے کارندے بوگیر کنوں کی مدد سے ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یکلخت کہیں قریب سے ایک للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں ایک پل میں پہچان گیا۔ یہ گرج دار و بارعب آواز مجتبیٰ کنور کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔ سیاسی جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کرنے والا یہ شخص عام زندگی میں بھی ایسے ہی بولتا تھا جیسے اپنے سیاسی و غیر سیاسی حریفوں کو رگید رہا ہو۔ ایک خاص قسم کا تحکم تھا اس شخص کی آواز میں۔

میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور تیر کی طرح آواز کی سمت بھاگا۔ پندرہ بیس قدم دور میں نے مجتبیٰ کنور کو دیکھا۔ وہ ریوالور بدست ایک بڑی جیپ کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ بڑے نواب کا ایک خاص کارندہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر مجتبیٰ کنور ششدر رہ گیا۔ لپک کر میری طرف آیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں لے گیا۔ میں نے دیکھا، اس کی ایک آستین پر خون کے چھینٹے تھے اور جیکٹ کی جیب پاکٹ میں ریوالور کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ بڑے نواب کی طرف سے اس لڑائی میں بھرپور حصہ لیتا رہا ہے۔ میں دیکھ چکا تھا کہ موقعے اور ضرورت کے تحت وفاداریاں اور دوستیاں بدلنے میں مجتبیٰ کنور کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ وقت سے پہلے حالات کا رخ جانچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب بڑے نواب پر چھوٹے نواب کا پلڑا بھاری تھا تو وہ چھوٹے نواب کا خیر خواہ بن کر بڑے نواب کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، بڑے نواب صاحب کو چھوٹے نواب نے ہی حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ پھر جب پنڈت مہاراج نے بازی بڑے نواب کے حق میں پلٹ دی تھی تو وہ فوراً سے پیشتر بڑے نواب کا خیر خواہ بن گیا تھا۔

اکیلے میں جا کر مجتبیٰ سرگوشی میں بولا "تم خیریت سے تو ہو نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ کہنے لگا "تم سے بہت لمبی چوڑی بات کرنی ہے لیکن اس کے لیے فرصت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم حویلی چل کر بات کریں گے۔"

"میں تو تیار ہوں جناب لیکن بڑے نواب صاحب کہیں مجھے مخالف کیمپ کا بندہ نہ سمجھ لیں۔ میرا مطلب ہے کہ پنڈت مہاراج چھوٹے نواب کے ساتھ ہاتھ ملا چکا ہے اور میں اب تک پنڈت مہاراج کے ساتھ ہی تھا۔"

"نہیں۔ نواب شہریار ایسا نہیں کرے گا" مجتبیٰ نے پورے یقین سے کہا "پنڈت نے غداری کی ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ تم اس کے لیے ذمے دار کیسے ہو سکتے ہو۔ کیا تم نے پنڈت کی طرف سے اس لڑائی میں حصہ لیا ہے؟"

"ہرگز نہیں جناب۔ مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا تھا۔ میں تو خود بڑی مشکل سے جان بچا کر مندر سے نکلا ہوں۔ پنڈت نے نواب فیروز سے گٹھ جوڑ کرتے ہی سب سے پہلے مجھے مارنے کا حکم جاری کیا تھا۔ میں بروقت جان گیا اور زریں گل کے ساتھ مندر سے نکل بھاگا۔ مندر سے نکلتے وقت مجھے علم ہوا کہ نواب فیروز اور پنڈت کے درجنوں مسلح کارندے خطرناک ارادے سے حویلی کا رخ کر رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن اطلاع پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لہٰذا ہم نے ایک رکشے والے کو قابو کیا اور اس کی مدد سے یہاں پہنچ گئے۔"

"اوکے آل رائٹ" مجتبیٰ کنور نے کہا "آؤ میرے ساتھ جیپ میں لیکن وہ تمہارا ساتھی؟"

"وہ بھی یہیں ہے، بلکہ ایک لڑکی بھی ہے۔ غالباً آپ اسے پہچانتے ہیں اور دیکھ کر حیران ہوں گے۔"

میں مجتبیٰ کو لے کر زریں گل اور فریال کے پاس پہنچا۔ فریال مجتبیٰ کنور کو پہچانتی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حکمران پارٹی کے ایک سرکردہ لیڈر اور نہایت اہم سیاسی شخصیت سے ساتھ وطن سے سیکڑوں میل دور حیدر آباد کے اس نواحی ویرانے میں ملاقات ہو گی اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ چاروں طرف بارود کی بو اور خودکار رائفلوں کی "تڑتڑ" ہو گی۔ وہ چند لمحوں کے اندر اندر جی بھر کر حیران ہوئی۔ مجتبیٰ نے پوچھا "یہ ایس پی ساہی کی بیٹی تو نہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو فریال کی زبان قینچی کی طرح چل پڑتی لیکن مجتبیٰ کنور کا لحاظ کرتے ہوئے وہ چپ رہی۔ مجتبیٰ کنور نے بارعب لہجے میں پوچھا "تم یہاں... اور یہ [illegible]؟"

"دراصل سر... وہ میں نے دراصل..."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" مجتبیٰ نے اس کی بات کاٹی "تفصیل میں حویلی میں جا کر معلوم کروں گا۔"

ہم تینوں اس گاڑی میں جا بیٹھے جس میں مجتبیٰ یہاں پہنچا تھا۔ گاڑی کے اندر بھی بارود کی بو تھی اور گولیوں کے خول بکھرے پڑے تھے۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہو چکی تھی اور اس امر کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ حویلی کے اندر اور باہر دونوں فریقوں میں زبردست لڑائی ہوئی ہے۔ لڑائی کا زور اب ٹوٹ چکا تھا تاہم کافی فاصلے پر اکا دکا گولیاں چل رہی تھیں۔ ہم مجتبیٰ کنور کے ساتھ حویلی کی طرف روانہ ہو گئے... تاہم روانہ ہونے سے پہلے میں نے حویلی کے ایک کارندے کو رکشے کا بلک، چابی اور کرایہ دے کر رکشا رنچھور داہو کی طرف بھیج دیا تھا۔ حویلی تک کے راستے میں کوئی اہم بات نہیں ہوئی۔ صرف مجتبیٰ نے یہ اطلاع دی کہ دو دن پہلے نواب شہریار نے اپنی خود ساختہ جیل ختم کر دی ہے۔

○○

حویلی کی اونچی دیواروں پر بنی ہوئی برجیوں میں نواب شہریار کے مسلح کارندے اب بھی مورچا بند تھے۔ جھڑپ ختم ہو چکی تھی پھر بھی ماحول میں تناؤ کی کیفیت باقی تھی۔ نواب شہریار پوری شان اور دبدبے کے ساتھ حویلی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ وہ نیلا اچکن اور مخملی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں رت جگے کی جلن تھی۔ ویسے بھی وہ جب سے بیٹے کے ہاتھوں قید تنہائی کا شکار ہوا تھا اس کی بینائی یکدم کمزور ہو گئی تھی اور آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا۔ اس نے مجھ پر سرسری نگاہ ڈالی تاہم مجتبیٰ کنور کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس کامیابی پر مبارک باد دی اور تھوڑی دیر راز و نیاز میں مصروف رہے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ زمانہ ساز مجتبیٰ کنور نے مختصر عرصے میں حویلی کے اندر غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہے۔ وہ نواب کے کارندوں کو یوں ہدایات دے رہا تھا جیسے وہ اس کے اپنے کارندے ہوں اور وہ حیدر آباد میں نہیں لاہور میں لب نہر اپنی کوٹھی میں جلوہ افروز ہو۔ ان دونوں کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ حویلی پر حملہ متوقع تھا اور اس حملے کا دفاع کرنے کی تمام تر حکمت عملی مجتبیٰ کنور نے تیار کی تھی۔ کچھ دیر بعد مجتبیٰ کنور مجھے اپنے شاندار بیڈ روم میں لے گیا۔ اس بیڈ روم کے علاوہ اب مجتبیٰ کو ایک نشست گاہ اور چھوٹے سے ٹیرس کی سہولت بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اپنی اس قیام گاہ میں بھی اس نوجوان جاگیردار نے عیش و عشرت کے وہ تمام لوازمات اکٹھے کر لیے تھے جو اسے لاہور میں اپنے امیر خانے میں میسر تھے۔ ایک دیوار گیر الماری انواع و اقسام کی جھلملاتی شرابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک انتہائی خوب صورت، نرم و نازک اور سبک اندام حیدر آبادی حسینہ تتلی کی طرح اس وی آئی پی سوئٹ میں منڈلاتی پھرتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پُرآسائش ماحول کی مجتبیٰ کے اردگرد وہی حیثیت ہے جو مچھلی کے اردگرد پانی کی ہوتی ہے۔ وہ کسی دوسرے ماحول میں ایک دم بیزار ہو جاتا تھا۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ مجتبیٰ ماڈرن پڑھی لکھی شہری لڑکیوں کو شکار کرنے میں زیادہ دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود دیہاتی تھا اور طبقاتی فرق کا احساس اس کے شوق کو مہمیز کرتا تھا۔ یہ لڑکی بھی جو اس کمرے میں موجود تھی، ایک مکمل شہری لڑکی نظر آتی تھی۔

کرسی سنبھالتے ہی مجتبیٰ نے ناؤ نوش کا سلسلہ شروع کیا۔ میں نے مجتبیٰ سے مسٹر جی کلارک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ موسم کی اچانک تبدیلی کے سبب بیمار ہیں اور ڈاکٹر نے انہیں دو تین روز مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔ کچھ دیر ہمارے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر مجتبیٰ بولا "میں نے بہت کم موقعوں پر شکست قبول کی ہے لیکن آج جی چاہ رہا ہے کہ نہ صرف شکست قبول کروں بلکہ اسے تسلیم بھی کروں" میں نے محسوس کیا کہ مجتبیٰ کی آواز اندرونی جوش کے زیر اثر لرز رہی ہے۔ ایک گھونٹ بھر کر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک عرصہ تک میں قادر زماں سے یہی کہتا رہا کہ وہ اور اس کے ساتھی ایک بے کار اور لا حاصل کام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کھنڈرات کی خرید و فروخت اور دفینے وغیرہ کے چکر سے ان لوگوں کو کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ بعد میں تم سے ملاقات ہوئی اور تم سے بھی میں نے یہی بات کی۔ میں چاہتا تھا کہ تمہارے جیسا باصلاحیت شخص کوئی ٹھوس اور اہم کام کرے۔ مجھے مسٹر جی کلارک صاحب بتا چکے تھے کہ میگاسی کے انتہائی قیمتی نوادرات کا سراغ ملا ہے اور امکان ہے کہ وہ پاکستان یا ہندوستان میں کسی جگہ موجود ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان نوادرات کی دلچسپ اور فائدہ بخش تلاش کا کام کرنے والے افراد میں تمہیں شامل کر دیا جائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میگاسی کے یہ نوادرات اس دفینے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں جسے تم لوگ ڈھونڈ رہے ہو۔ رنگیلی شاہ جہاں! میں بہت

امپریس ہوا ہوں اس انکشاف سے اور اس کے ساتھ مجھے کھلے دل سے یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ تم لوگوں نے اس سلسلے میں گراں قدر کام کیا ہے۔ میں تو اس دوڑ میں بہت دیر سے شریک ہوا ہوں۔ تم لوگ صحیح معنوں میں اس جدوجہد کے بانی ہو۔ خاص طور پر وہ لڑکی ارجمند۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دفینے کے سلسلے میں ہمیں اس کی کوششوں کو ہرگز نظرانداز نہیں کرنا چاہیے" ایک دم مجتبیٰ کو ارجمند کا خیال آیا۔ وہ بولا "اب کہاں ہے وہ لڑکی؟"

میں نے کہا "مندر میں۔ پنڈت مہاراج کے پاس۔"

اگر مجتبیٰ کو واقعی ارجمند سے ہمدردی تھی تو پھر اسے فکرمند ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے ارجمند کے بارے میں صرف پہلے سوال پر اکتفا کیا۔ میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اس کی زبان پر جو باتیں ہیں وہ دل میں نہیں۔

مجتبیٰ نے ایک ہی گھونٹ میں ایک تہائی گلاس خالی کیا اور جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا "شاہ جہاں! دفینے تک پہنچے اور اسے حاصل کرنے کے حوالے سے یہ لمحے ہمارے لیے بڑے قیمتی ہیں۔ یہ بات تو تمہیں بھی معلوم ہو چکی ہوگی کہ دفینے کے تمام صندوق اس وقت بڑے نواب کی تحویل میں ہیں۔ کہاں ہیں؟ یہ اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ نہ ہی وہ کسی کو بتاتا ہے۔ بالکل خبطی ہو گیا ہے یہ شخص۔ اپنے آپ پر بھی شک کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ شخص ضرور کوئی گل کھلا دے گا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب؟"

مجتبیٰ بولا "آج کل نواب پکا مولوی بنا ہوا ہے اور تمہیں پتا ہی ہے مولوی حضرات جب کرنے پر آئیں تو سب کچھ کر جاتے ہیں۔ نواب کا خیال ہے کہ وہ دفینہ ناجائز دولت کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی صحیح حق دار حکومت وقت ہے۔ یہ دیکھنا بھی حکومت وقت اور عدالتوں کا کام ہے کہ اس دولت کے اصل وارث کون ہیں اور ان سے کیسے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ وہ سارا ساز و سامان گورنمنٹ کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟"

"چاہنے کی بات نہیں ہے۔ وہ حوالے کر رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ متعلقہ محکمے سے رابطہ کر چکا ہے اور محکمے کا کوئی ذمے دار شخص آج یا کل یہاں پہنچنے والا ہے۔"

میں نے سوچ کے گھوڑے دوڑا کر کہا "یعنی اس شخص کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے ہمیں نواب سے سب کچھ اگلوانا ہوگا؟"

"چاہتا تو میں یہی ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ یہ نواب بڑا کریک شخص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولوی بننے کے بعد ایسا ہو گیا ہو۔ یہ ہمیں کچھ بتا کر نہیں دے گا۔ کوئی بتا کتنا نوجوان بھی نہیں ہے کہ زیادہ تشدد برداشت کر سکے۔ بہت سختی کی تو جان سے چلا جائے گا۔ اور مر گیا تو ہر کھون اپنے ساتھ ہی قبر میں لے کر اتر جائے گا۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اس کے کسی

رازدار ساتھی کو پکڑا جائے لیکن رازدار ساتھی کون ہے؟ یہ جاننا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں لگتا ہے کہ نواب نے دفینے کے سلسلے میں اپنے سوا کسی پر اعتبار کیا ہی نہیں ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اس کے قریبی ساتھی بھی بے خبر ہیں؟"

"بالکل۔ یہ دولت چیز ہی ایسی ہے۔ بندہ اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔" میں نے دل میں سوچا کہ تم تو مجھ پر اعتبار کر رہے ہو۔ مجتبیٰ کنور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر ایک بار نواب شہریار اور انڈین گورنمنٹ کے کسی ذمے دار شخص میں رابطہ ہو گیا تو ہمارا کام بے حد مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ رابطہ نہ ہو سکے۔ یعنی ہمیں دو طرفہ کوشش کرنی ہوگی۔ ایک تو یہ کہ نواب شہریار اور گورنمنٹ میں رابطہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ہمیں اس مقام کا پتا چلے جہاں دفینے کے صندوق رکھے گئے ہیں۔"

میں نے فرمانبرداری سے کہا "آپ جو بھی کام میرے ذمے لگائیں گے میں خوش اسلوبی سے انجام دینے کی کوشش کروں گا۔"

وہ پُرسوچ لہجے میں بولا "میری اطلاعات کے مطابق مرکزی حکومت کا ایک اعلیٰ افسر آج رات کسی وقت اپنی ائیر دہلی سے حیدر آباد پہنچ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ائیرپورٹ پر اتر کر سیدھا یہاں حویلی پہنچے اور آج ہی رات نواب شہریار سے اس کی ملاقات ہو جائے۔ یہ وہی شخص ہے جسے نواب دفینے کے سلسلے میں باخبر کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم کسی طرح نواب اور اس شخص کے درمیان ہونے والی ملاقات کو روک لیں تو تھوڑی مہلت ہمیں اور مل سکتی ہے۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس شخص کو اغوا کر لیا جائے؟"

"کچھ بھی کیا جائے لیکن یہ ملاقات نہیں ہونی چاہیے" مجتبیٰ نے روانی سے کہا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ شخص کون ہے اور کس وقت حیدر آباد پہنچے گا۔ یہاں اس کے پروگرام کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اگر اس نے رات ہی کو حویلی آنا چاہا اور اس مقصد کے لیے کار وغیرہ میں اکیلے سفر کیا تو ہمارے لیے اسے روکنا بہت آسان ہو جائے گا۔"

مجتبیٰ نے کہا "میں نے اس سلسلے میں ایک خاص بندے کو زحمت دی ہے۔ وہ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں ساری رپورٹ دے گا۔"

میں حیران ہوا کہ مجتبیٰ نے حویلی کے اندر سے اپنے وفادار بھی ڈھونڈ نکالے ہیں۔ معلوم نہیں کون سی گیدڑ سنگی تھی اس کے پاس!

ہم وہاں تقریباً ایک گھنٹا مصروف گفتگو رہے۔ نازلی اندا

تتلی ہمارے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ تاہم وہ جانتی تھی کہ ہم اہم قسم کی گفتگو میں مصروف ہیں' وہ ہمارے قریب نہیں آئی۔ ہماری گفتگو کا موضوع چھپکلی والی حویلی تھی اور وہاں سے برآمد ہونے والا وہ دفینہ تھا جس کی قدر و قیمت کا ابھی تک ہم حساب نہیں لگا سکے تھے۔ مجتبیٰ کنور کھوجنے والے انداز میں ایک ایک بات پوچھ رہا تھا۔ اس نے اصرار کر کے مجھ سے وہ تمام واقعات سنے جو فرید کوٹ میں پیش آئے تھے۔ پھر وہ حیدر آباد کے حالات کے بارے میں ٹوہ لینے لگا۔ وہ ہر واقعے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں اس کی بادامی آنکھوں میں اضطراب کروٹیں لیتا رہا اور لہجے میں چھپا ہوا جوش اپنی جھلک دکھاتا رہا۔ ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ وہ رپورٹ بھی پہنچ گئی جس کا مجتبیٰ کو انتظار تھا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رپورٹ لانے والا قلی قطب تھا۔ وہی بے رحم باکسر جس کی حیثیت نواب کی خودساختہ جیل میں جیلر کی تھی۔ قلی قطب میرے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد زخمی ہوا تھا۔ بعد ازاں نواب زادی شاہین نے بتایا تھا کہ وہ جانبر نہیں ہو سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس رات کا نقشہ گھوم گیا۔ قلی قطب اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ گودام میں ایک خوف زدہ آنکھوں والی لڑکی سے رنگ رلیاں منا رہا تھا جب میرے اور اس کے درمیان جھڑپ ہو گئی تھی اور میں نے رام پوری خنجر کے وار سے اس کا پیٹ چاک کر دیا تھا' بعد ازاں مجھے معلوم ہوا تھا کہ زخموں کی تاب نہ لا کر وہ اناللہ ہو گیا ہے۔ اب وہی شخص زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھا۔ گویا فرشتہ اجل نے اسے کسی خاص رعایت کا مستحق سمجھ کر اپنے شکنجے سے آزاد کر دیا تھا۔ یہی حیرت میرے لیے کچھ کم نہیں تھی مگر اس حیرت میں اضافے کے لیے یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ قلی قطب جو نواب کے خاص آدمیوں میں شمار ہوتا تھا' مجتبیٰ کے لیے مخبر کا کردار ادا کر رہا ہے۔ معلوم نہیں مجتبیٰ نے اپنی چالبازی سے یہاں کس کس کو غدار بنا کر اس کی عاقبت خراب کی تھی۔ مجھے کمرے میں موجود پا کر قلی قطب کی آنکھوں میں اسی نفرت نے ہلکورا لیا جو پہلے روز سے مجھے اس کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ یہ سرخ رنگ کی جلتی "گرانٹ" قسم کی نفرت تھی اور پہلے روز سے بے زبان خاموشی مجھے یقین دلا رہی تھی کہ وہ میرے لیے کسی موقعے پر جان لیوا ثابت ہوگی۔

مجتبیٰ اٹھا اور قلی قطب کے ساتھ بغلی دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اس ریچھ نما باکسر سے پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ واپس آیا تو مجھ سے کہنے لگا "شاہ جہاں' بندے کا نام پتا معلوم ہو گیا ہے۔"

میں بندے کا نام پتا جاننے سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ بدبخت قلی قطب بچ کیسے گیا ہے لیکن مجتبیٰ کی قطع کلامی ہوئی تھی لہٰذا چپ رہا۔

مجتبیٰ دھم سے میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا

"مرکزی حکومت کے وزیر برائے اطلاعات و نشریات و ثقافت مسٹر راجندر سنگھ بنجی تمہیں یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بڑے سخت گیر اور نیک نام قسم کے وزیر شمار ہوتے ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے سی آئی اے میں اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور پرائیویٹ سیکرٹری رام لال کے ساتھ آج رات نو بجے کی فلائٹ سے حیدر آباد پہنچ رہے ہیں۔ وہ بڑی خاموشی سے آ رہے ہیں۔ نواب شہریار کی طبیعت چونکہ ٹھیک نہیں لہٰذا ائیرپورٹ پر نواب شہریار کا منیجر عبداللہ غازی گاڑی اور ڈرائیور کے ساتھ وزیر صاحب کو ریسیو کرنے کے لیے موجود ہوگا۔ ائیرپورٹ سے وزیر کو سیدھا حویلی لایا جائے گا۔"

میں نے کہا "فیڈرل منسٹر کی آمد سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملے کو قرار واقعی اہمیت دی جا رہی ہے لیکن اس طرح کے آفیشل ٹور میں منسٹر کی بیوی کا ساتھ ہونا عجیب سا لگتا ہے۔"

مجتبیٰ نے کہا "ممکن ہے کہ نئی نئی شادی ہوئی ہو اور "منسٹری" کو حیدر آباد دیکھنے کا شوق ہو۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ایک بات ہے مجتبیٰ صاحب! اگر منسٹر کو ائیرپورٹ سے لانے کے لیے واقعی صرف ایک گاڑی جا رہی ہے تو ہم ائیرپورٹ اور حویلی کے درمیانی راستے میں بآسانی اس گاڑی پر شب خون مار سکتے ہیں۔"

"یہ کام بہت صفائی سے کرنا ہوگا" مجتبیٰ نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم نواب کے منیجر اور ڈرائیور کو مہمانوں سمیت کم از کم تین چار دن کے لیے کہیں غائب کر دو۔ اس واقعے کے بعد نواب اور اس کے کارندوں کی ساری توجہ مہمانوں کو ڈھونڈنے میں صرف ہوگی۔ ہمیں موقع مل جائے گا کہ نواب کے کسی رازدار ساتھی کو پکڑ کر اس سے صندوقوں کے بارے میں کچھ اگلوا سکیں۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نواب کے جس رازدار ساتھی کی تلاش میں ہیں' وہ منیجر عبداللہ غازی ہی نکلے۔ ایسی صورت میں ہمارا کام خاصا آسان ہو جائے گا۔"

"لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ ہم منسٹر کی ملاقات نواب سے ہو لینے دیں اور اس کے اغوا کا کام اس ملاقات کے بعد کیا جائے' میرا مطلب ہے کہ منسٹر کو اس وقت پکڑا جائے جب وہ نواب کا شریک راز ہو چکا ہو۔"

"یہ بات میں نے بھی سوچی تھی۔" مجتبیٰ نے کہا "لیکن اس میں رسک بہت زیادہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ نواب سے بات چیت کے فوراً بعد منسٹر ٹیلیفون پر مرکزی یا صوبائی حکومت سے رابطہ قائم کر لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو تم دیکھنا کہ چند گھنٹوں میں یہاں اعلیٰ افسران کی گاڑیوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔ اعلیٰ افسران آئیں گے تو پولیس کے دستے بھی پہنچیں گے۔ ایسے میں سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

میں نے کہا "لیکن یہ بات آپ بھی مانیں گے کہ یہ ایک

مفروضہ ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔"

وہ مسکرایا "اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ سوچ رہے ہیں اس سے بہت زیادہ ہو۔ قلی قطب تو یہاں تک کہہ رہا ہے کہ نواب شہریار منسٹر سے ملاقات کے فوراً بعد ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کر رہا ہے۔ اس کانفرنس میں نوادرات اور دیگر ساز و سامان کے بارے میں تمام تفصیلات پریس کو بتاری جائیں گی۔"

میں نے کہا "ہمیں ایک اور پہلو سے بھی سوچنا ہو گا۔ ممکن ہے کہ بظاہر تو نیجر تن تنہا وزیر صاحب کو ریسیو کرنے جائے لیکن اس کے ارد گرد سادہ پوش محافظ موجود ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ باپ بیٹے میں کشمکش عروج پر ہے۔ نواب شہریار اپنے مہمانوں کی حفاظت کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا۔"

"بالکل اسے اسی انداز میں سوچنا چاہیے اور ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ محافظوں کی فوج کے باوجود ہم دہلی سے آنے والے مہمان کو نواب شہریار سے دور کیسے رکھ سکتے ہیں؟"

"اس صورت میں تو جناب کافی خون خرابہ کرنا پڑے گا۔"

مجتبیٰ عجیب انداز سے مسکرایا "خون خرابہ تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے اور سچ پوچھو تو یہی تمہاری پہچان ہے۔ تم زندگی لینے کا حوصلہ رکھتے ہو اور زندگی لینے کا حوصلہ وہی رکھتا ہے جو جان دینے پر آمادہ رہتا ہو۔ شاید اسی کا نام دلیری ہے۔ آج سے کئی برس پہلے امارات کے ایک فرعون صفت شخص نے تمہاری بہن پر بری نگاہ ڈالی تھی۔ اس وقت یہی دلیری تھی جس نے تمہیں سر اٹھانے اور خون بہانے کا حوصلہ دیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ موڑ ہے جس نے تمہاری زندگی کو ایک رنگین رستگین رخ دیا۔ گلیوں میں انسانوں کی صورت رینگنے والے ہزاروں لاکھوں حشرات الارض میں شامل ہونے کے بجائے تم نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ وقت کی طنابیں تمہارے ہاتھ میں آگئیں اور تم نے دنیا کو ایک ملائم کاغذ کی طرح تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں نے کہا "میں آپ سے اختلاف کی جسارت نہیں کر سکتا۔ ہاں حیران ضرور ہوں کہ آپ میری نجی زندگی کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں" مجتبیٰ نے کہا "اس لیے کہ مجھے تمہارے کیریکٹر میں دلچسپی ہے۔ میں یہ بھی بخوبی جانتا ہوں کہ کئی برس پہلے چولستان کے ریگزار سے جو کہانی شروع ہوئی تھی وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ جس اوباش شیخ کو تم نے ہلاک کیا تھا اس کا بھائی انتقام کی غرض سے تمہیں کھوجتا پھر رہا ہے اور جلد یا بدیر تمہارا اس سے زبردست ٹکراؤ ہونے والا ہے۔"

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن قدموں کی چاپ سن کر خاموش ہو گیا۔ اندر آنے والا قلی قطب تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجتبیٰ کی طرف دیکھنے لگا۔ مجتبیٰ نے کہا "شاہ جہاں اپنا آدمی ہے۔ تم جو کہنا چاہتے ہو اس کے سامنے کہہ سکتے ہو۔"

قلی قطب بولا "میں نے سارا پتا کر لیا ہے جناب۔ جو گاڑی مہمان کو لینے ایئرپورٹ جائے گی اس میں نیجر کے سوا اور کوئی نہیں ہو گا۔ نواب صاحب نے ڈرائیونگ کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔ مہمانوں کو بڑی رازداری کے ساتھ یہاں لایا جائے گا۔ جو گاڑی ایئرپورٹ جا رہی ہے وہ بھی حویلی کی نہیں۔ یہ ایک ٹویوٹا جیپ ہے جس پر بھوپال کا نمبر ہے اور یہ گاڑی میں نے آج پہلی بار حویلی میں دیکھی ہے۔"

"بہت خوب" مجتبیٰ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

قلی قطب نے اس سلسلے میں جو دیگر تفصیلات بتائیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔ منسٹر راجندر سنگھ چھتیس سینتیس برس کا ایک جواں سال اور جواں ہمت شخص تھا۔ وفاقی کابینہ میں اس کی شہرت ایک نیک نام و سخت گیر شخص کی تھی۔ اس نے صرف دو تین سال پہلے ایک انگریز ناشر کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ منسٹر کا پی اے رام لال سنہا بھی اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ رام لال حیدر آباد ہی کا رہنے والا تھا اور نواب شہریار جنگ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ تاہم منسٹر راجندر سنگھ اور نواب شہریار ایک عرصے سے پہلی بار مل رہے تھے۔ ان مہمانوں کو آج صبح ہی آٹھ بجے والی فلائٹ سے حیدر آباد آ جانا تھا لیکن روانگی سے تھوڑی دیر قبل منسٹر راجندر سنگھ صاحب کو ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اپنے بیڈ روم میں ان کا پاؤں قالین کے کنارے سے الجھ گیا تھا اور گرنے سے چہرے کے ایک حصے پر سخت چوٹ آئی تھی۔ نتیجے کے طور پر ان کی روانگی رات تک ملتوی کر دی گئی تھی۔

○☆○

شام سات بجے میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور نواب شہریار کی حویلی سے نکل آیا۔ ہم دونوں ایک اسکوڈا کار پر سوار تھے۔ یہ کار یہاں مجتبیٰ کنور کے استعمال میں تھی' اب مجتبیٰ کنور نے میرے استعمال میں دے رکھی تھی۔ ایک وقت تھا کہ جب میں اس حویلی میں پابہ زنجیر تھا اور کھلا آسمان بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب حالات نے رخ بدلا تھا اور مجتبیٰ نے یہاں اثر و رسوخ حاصل کیا تھا تو حویلی ہمارے لیے "خالہ جی کا گھر" بن گئی تھی۔

میرے پاس دس گولی والا ماؤزر اور ما ؤزر کے تین چار سو راؤنڈ تھے۔ پچاس کے قریب راؤنڈ میں نے جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے جبکہ باقی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں تھے۔ وہ ریوالور جو اب تک میرے زیر استعمال تھا' میں نے زریں گل کو دے دیا تھا۔ اس نے جذباتی انداز میں ریوالور کے دو تین بوسے لیے تھے اور پیار سے اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب اس کے پاس دو ریوالور ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہو کہ اب فلمی اسٹائل میں دو دو ریوالوروں سے فائرنگ کر سکے گا۔

ہماری منزل حویلی سے بیس بارہ میل دور دوہڑی شریف نام کا ایک گاؤں تھی۔ گاؤں کے نواح میں اینٹوں کا ایک مسمار شدہ بھٹا تھا۔ یہ بھٹا لب سڑک واقع تھا اور یہاں گھات لگا کر ہم با آسانی اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے۔

موقعے پر جا کر تمام تفصیلات ہم نے دوسرے تحمل ہی سے طے کر لی تھیں۔ بھٹے کے نزدیک سے سڑک بل کھا کر گزرتی تھی۔ ارد گرد کا علاقہ سنسان تھا۔ یہاں کسی گاڑی کو روکنا اور اس میں سوار افراد کے خلاف کارروائی کرنا آسان تھا۔ فرض محال مہمان کی حفاظت کے لیے مسلح افراد موجود ہوتے تو یہی گھات لگا کر ان کو نئی مصیبت میں مبتلا کیا جا سکتا تھا۔ ابھی ہم حویلی سے ایک ڈیڑھ میل ہی دور آئے تھے کہ ایک آواز نے ہم دونوں کو بے طرح اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ "السلام علیکم" یہ فریال کی آواز تھی۔ وہ عقبی نشست کے پیچھے سے برآمد ہوئی اور پھلانگ کر میرے برابر آ بیٹھی۔ زریں گل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ فریال کی آواز پر وہ اس قدر بوکھلایا کہ گاڑی درختوں میں گھستے گھستے بچی۔

"ارے فریال بی بی" آپ یہاں؟"

"ہاں زریں گل! ام نے سوچا کہ آپ ام کو اپنی مرضی سے تو ساتھ نہیں لے جائے گا لہٰذا خاموشی سے گاڑی میں گھس گیا۔" وہ زریں گل کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

"لیکن استاد صیب آپ سے بہت ناراض ہو گا" وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ کر بولا۔

وہ بولی "استاد صاحب تو پہلے ہی بہت ناراض ہے' اب اور ناراض کیسے ہو گا۔ دیکھو نا پانی میں پہلے ہی بہت زیادہ نمک گھلا ہوا ہو تو پھر اور نمک نہیں گھل سکتا۔"

"آپ کا لیکن میں بہت وزن ہے بی بی صاحب۔ وہ ڈھائی من سے کم وزن کیا ہو گا..... لیکن آپ دیکھ رہا ہے کہ استاد صیب ابھی تک خاموشی سے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایکدم بہت ناراض ہے۔"

"لگ تو ام کو بھی یہی رہا ہے زریں گل۔ مگر ام نے سوچ لیا ہے کہ تمہارے استاد صیب کی دی ہوئی ہر سزا کو خوش دلی سے قبول کر لے گا۔ ویسے تمہارا استاد صیب غصے کا اتنا برا نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ اندر سے یہ بالکل نرم نرم ہے' روئی کے مافق۔ یہ جو غصہ ہے نا ایک طرح کا لاڈ ہے' کچھ لوگوں کو بچپن میں لاڈ کھانے کی عادت پڑی ہے تو پھر بڑھاپے تک نہیں چھوٹتی۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت غیر سنجیدہ گفتگو کے موڈ میں نہیں۔"

فریال نے منہ سے "چچ چچ" کی آواز نکالی اور پچکارنے والے انداز میں بولی "ہائے میں مرجاواں' اتنا خشا پیالا پیالا سا منہ لال ہو گیا ہے غصے میں۔"

زریں گل نے منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ میں نے کڑی سنجیدگی سے فریال کو گھورا تو اس نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔ زریں گل نے میری سنجیدگی محسوس کی تو خود بھی سنجیدہ ہو گیا' بولا "ویسے فریال بی بی! آپ کو یہ ذرا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی تو آپ یہ صفائی بھی پیش نہیں کر سکا کہ انڈیا کیوں اور کیسے آیا؟ اب آپ نے یہ ایک اور کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اگر آپ حویلی میں رہتا تو یہ بہت اچھا بات تھا۔ ام کیسی سیر و تفریح کے لیے تو نہیں جا رہا کہ آپ بھی امارے ساتھ جانے کو بے قرار ہو گیا۔"

فریال نے زریں گل کے لہجے میں کہا "زریں گل! آپ کے استاد صیب کو ایکشن میں دیکھنے کے لیے تو ام یہاں پہنچا ہے۔ اگر کمرے میں گھس کر بیٹھنا تھا تو ام وہاں لاہور میں ہاکی کھیلتا کیا برا تھا؟"

"ماشاء اللہ یعنی آپ جانتا ہے کہ ام ایک خطرناک کام پر جا رہے ہیں پھر بھی آپ امارے ساتھ ہے۔ اس کو کہتے ہیں کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔"

فریال اور زریں گل میں ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہی۔ بظاہر فریال زریں گل سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ سنا مجھے بھی رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں ناگپور میں اس کی ایک سہیلی مہتاب کور ہے۔ وہ انڈر نائن ٹین میں ہاکی کھیلتی ہے اور فریال کی "ہاکی بدولت" بہن بنی ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ مہتاب کور سے فریال کی ملاقات ملائشیا میں ہونے والے ایک ٹورنامنٹ میں ہوئی تھی مہتاب کور اکثر فریال کو ناگپور آنے کی دعوت دیتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مہتاب کور کے پاپا پاکستان آئے تھے تو انہوں نے بھی ساہی صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ فریال کو لے کر انڈیا آئیں..... مختلف مصروفیات کے سبب فریال نہیں آسکی تھی لیکن اب اچانک "سہیلی کی محبت" نے جوش مارا تھا اور وہ پاپا کی اجازت سے انڈیا چلی آئی تھی..... تین روز پہلے وہ اپنی سہیلی مہتاب کور اور ایک گھریلو ملازم نریندر کے ساتھ حیدر آباد چلی آئی تھی۔ بہانہ سیر و تفریح کا بنایا گیا تھا۔ وہ زریں گل کے دیے ہوئے ایڈریس پر نواب شہریار کی حویلی پہنچی تھی۔ وہاں اسے میرا سراغ نہیں ملا تھا لیکن بڑی چالاکی و ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے ٹوہ لگالی تھی کہ پنڈت مہاراج کے مندر سے میرا کھوج مل سکتا ہے۔

اسکوڈا کار دوہڑی شریف کی طرف فراٹے بھرتی رہی اور اسی رفتار سے فریال کی زبان بھی چلتی رہی۔ ہم آٹھ بجے کے لگ بھگ دوہڑی شریف پہنچ گئے۔ شام کا دھندلکا گہری تاریکی میں بدل چکا تھا۔ بھٹے کے چاروں طرف بے آباد زمین تھی۔ کہیں کہیں مٹی کھودنے سے نشیبی قطعے بن گئے تھے۔ کھیت بھٹے سے کافی ہٹ کر تھے' ہاں سڑک کی جانب کیکر اور پھلاہی رنگیرو کے درخت موجود تھے۔ ہم نے گاڑی درختوں کے درمیان ایک محفوظ مقام پر پارک کی اور اپنے شکار کا انتظار کرنے لگے۔

اگر فلائٹ ٹھیک وقت پر پہنچ جاتی تو ایئرپورٹ سے اس مقام

تک جیپ پر قریباً آدھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دہلی کے مہمان سے ہماری ملاقات دس بجے کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ قیاف درست نکلا۔ اس وقت میری رسٹ واچ ٹھیک پونے دس کا وقت بتا رہی تھی جب مطلوبہ گاڑی مطلوبہ افراد سمیت مطلوبہ مقام پر پہنچی۔ ہم کارروائی کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ فریال بھاگ کر گئی اور اس نے سڑک کے عین درمیان پہنچ کر گاڑی کا راستہ روک لیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ گاڑی کے بریک چرچرائے اور وہ ذرا سا لہرا کر درختوں کے پاس رک گئی۔ جیپ کا بائیں جانب والا اگلا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ضخیم تجسم منیجر عبداللہ غازی باہر نکلا۔ وہ حیرت کے عالم میں خوبرو فریال کی طرف دیکھ رہا تھا جب زریں گل نے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر نہایت جچا تلا ہاتھ اس کی گردن پر رسید کیا۔ منیجر منہ کے بل ٹویوٹا جیپ کے بونٹ پر گرا۔ زریں گل نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ریوالور کے دستے سے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی۔ یہ ضرب فیصلہ کن ثابت ہوئی اور منیجر برفانی تودے کی طرح بونٹ سے پھسل کر سڑک پر آگرا۔ وہ بے ہوش نہیں تو نیم بے ہوش ضرور ہو گیا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی جیپ میں پھینکی۔ پچھلی نشست پر ایک سرخ و سپید رعب دار شخص کی صورت نظر آئی۔ وہ چلا چلا کر ذرا تیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے گاڑی بھگا لے جانے کا مشورہ دے رہا ہے لیکن ڈرائیور گاڑی کیوں بھگاتا۔ وہ قلی قطب تھا اور اس کی ڈور ہمارے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ یہ چند لمحے کی مہلت بہت تھی۔ جیپ کی پچھلی نشستوں پر موجود افراد کی تمام تر توجہ زریں گل اور فریال کی طرف تھی۔ میں دوسری طرف سے آیا اور ماؤزر کی نال اوھ کھلی کھڑکی سے اندر گھسا دی۔ "خبردار! اگر کسی نے حرکت کی" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

ایک خوب صورت لڑکی بے تحاشا منہ کھول کر چیخی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کے حلق کا کوا تک مجھے نظر آیا۔ لڑکی سمیت پچھلی نشستوں پر تین افراد براجمان تھے۔ تینوں کی آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ جیپ پر قبضہ جمانے اور اس کی سواریوں کو بے بس کرنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ قلی قطب ڈرائیونگ سیٹ پر جیٹھا تھا۔ بظاہر وہ جیپ میں سوار دوسرے افراد کی طرح ہراساں نظر آتا تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ہماری اس کارروائی پر شدید حیرت ہوئی ہے لیکن وہ سب کچھ پہلے سے جانتا تھا۔ بلکہ اگر ضرورت پڑ جاتی تو وہ اس کارروائی کو انجام تک پہنچانے میں ہمارا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ نیم بے ہوش منیجر عبداللہ غازی کو زریں گل اور فریال نے اٹھا کر ٹویوٹا جیپ میں ڈال لیا جبکہ میں ماؤزر دست قلی قطب کی ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ہماری اطلاعات کے عین مطابق دہلی سے آنے والے افراد کی تعداد تین تھی۔ راجندر سنگھ چوپڑا اس کی ولایتی بیوی جو سکھ مذہب اپنا چکی تھی اور جس کا نام سلوچنا تھا اور راجندر کا پی اے رام لال۔ راجندر چوپڑا ادھیڑ عمر لمبا جواں سال شخص تھا۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں نے اس کے چہرے کا نصف حصہ یوں ڈھانپ رکھا تھا کہ باقی کے سوا کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ باقی جو نصف رہ گیا تھا وہ بھی کم کم ہی نظر آتا تھا۔ پیشانی تو پگڑی میں اوجھل تھی۔ ایک رخسار اور کنپٹی کے کچھ حصے کو سفید پٹی اور میڈیکل ٹیپ نے ڈھانپ لیا تھا۔ یقیناً یہ اسی چوٹ کی نشانی تھی جو راجندر سنگھ صاحب کو حیدر آباد روانگی سے قبل لگی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ راجندر صاحب اتنی رات گئے بھی دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھے۔ ان کو پتلون قمیص اور دھوپ کے چشمے میں دیکھ کر مجھے امرتسر کا ایک خوبرو ڈی ایس پی یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی طرح شب و روز دھوپ کا چشمہ لگائے رکھتا تھا۔ راجندر سنگھ کی انگریز بی بی ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھی۔ اس کا رنگ برف کے مانند سفید ہو رہا تھا۔ دہشت زدہ آنکھیں میرے ماؤزر کی نال پر جمی ہوئی تھیں۔ راجندر سنگھ کا پی اے رام لال درمیانی عمر کا ایک بابو ٹائپ شخص تھا۔ صورتِ حال دیکھ کر اس کی بھی گھگی بندھی ہوئی تھی۔

راجندر سنگھ اپنی افسرانہ شان برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "فی الحال صرف اتنا کہ خاموشی سے بیٹھے رہو اور اپنی دھرم پتنی سے بھی کہو کہ چیخنے چلانے کی کوشش نہ کرے۔"

راجندر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے خشک حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ میں نے گرج کر قلی قطب سے کہا "گاڑی چلا کتے۔۔۔ ورنہ بھون دوں گا۔"

قلی قطب پہلے ہی اشارے کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً جیپ آگے بڑھا دی۔ زریں گل بھی اسکوڈا کار پر ہمارے عقب میں چل پڑا۔ اپنے ٹھکانے کا چناؤ ہم پہلے ہی کر چکے تھے۔ یہ چناؤ اور انتظام قلی قطب نے ہی کیا تھا۔ مسمار شدہ بھٹے کا ایک چکر کاٹ کر ہم ایک چھوٹے سے کوارٹر نما مکان میں پہنچ گئے۔ یہ مکان جلی ہوئی گندم اینٹوں سے بنایا گیا تھا اور اس کے حدود اربعہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ ماضی میں جب یہ بھٹا آباد ہو گا، یہاں ملازمین رہائش رکھتے ہوں گے۔ گاڑیاں اس کوارٹر کے پچھواڑے روک دی گئیں۔ کوارٹر میں سے چھوٹے قد کا ایک سیاہ فام دیہاتی برآمد ہوا اور ہمیں اپنی رہنمائی میں کوارٹر کے اندر لے گیا۔ تینوں مہمان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میں نے دونوں مرد حضرات کی تلاشی لے لی تھی جبکہ فریال نے احتیاطاً انگریز خاتون کو ٹٹول کر دیکھ لیا تھا۔ اب وہ تینوں میرے ماؤزر کے نشانے پر تھے اور لڑکھڑاتے قدموں سے کوارٹر کا برآمدہ پار کر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ پی اے رام لال مجھے بڑی خاص نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

"تمہارے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟" راجندر سنگھ کرب میں پہنچ کر لرزتی کانپتی آواز میں بولا۔ وہ بے حد غصے میں تھا۔

میں نے کہا "مجبوری ہے۔۔۔ ہمیں راہ چلتے لوگوں کو زبردستی

مہمان بنانے کا شوق ہے۔ انہیں کھلاتے پلاتے ہیں، آرام دہ کمرے میں رکھتے ہیں۔ انہیں بڑی اچھی کمپنی فراہم کرتے ہیں پھر تین چار روز بعد انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

تین چار روز کی بات سن کر پی اے رام لال کے تاریک چہرے پر تاریک تر سائے لہرا گئے۔ ممکن ہے کہ ایسے سائے راجندر سنگھ کے چہرے پر بھی لہرائے ہوں لیکن اس کا بیشتر چہرہ تو داڑھی، عینک اور پٹی وغیرہ میں چھپا ہوا تھا۔ سائے کہاں سے نظر آتے۔ باقی رہی انگریز بی بی تو اس کی سمجھ میں شاید میری بات آئی ہی نہیں تھی۔ انگریز بی بی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی اور اس کے چھاج بھر ریشمی بال شیفون کے دوپٹے سے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ راجندر سنگھ کی طرح وہ بھی قد کاٹھ والی اسمارٹ خاتون تھی اور اس کے ساتھ خوب جچ رہی تھی۔

راجندر سنگھ نے اپنے لہجے میں حاکمانہ شان سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ بات جانتے ہو کہ تم نے کس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے؟"

میں نے کہا "ہم سب کچھ جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تم نواب شہریار کے مہمان ہو اور یہ بھی جانتے ہیں کہ نواب شہریار کتنی بڑی چیز ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم اس وقت نواب کی جاگیر میں ہیں پھر بھی تمہیں ہمارے انجام کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

انگریز خاتون نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا اور لرزیدہ آواز میں بولی "اگر تم نے یہ سب کچھ روپے کے لیے کیا تو ہم تم کو روپیہ دیں گا۔ ہم۔۔۔ ہم کوئی ایکشن نہیں لیں گا تمہارے خلاف۔ تم ہم کو جانے دو۔"

"ڈونٹ بی سلی" راجندر سنگھ نے اپنی شریکِ حیات کو جھاڑا اور انگریزی میں اس سے کہا کہ اسے ہم جیسے معمولی بدمعاشوں سے رحم کی بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ باقاعدہ سسکیوں سے رونے لگی۔ کہنے کو تو راجندر سنگھ نے ہمیں معمولی بدمعاش کہا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ہم سے اور خاص طور پر مجھ سے ہراساں ہے۔ سیاہ شیشوں کے پیچھے سے اس نے بغور مجھے دیکھا اور بولا "کہیں تمہارا تعلق نواب صاحب کے بیٹے نواب فیروز سے تو نہیں؟"

یہ معنی خیز سوال تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ راجندر سنگھ اس سرد اور گرم لڑائی سے بخوبی آگاہ ہے جو اس جاگیر میں باپ بیٹے کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ میں نے کہا "اگر میں کہوں کہ میرا تعلق نواب فیروز ہی سے ہے تو پھر؟"

وہ بولا "پھر میں نواب فیروز سے ملنا چاہوں گا۔ اسے سمجھاؤں گا کہ وہ اپنے فرشتہ صفت پتا کی نافرمانی کر کے اپنی دنیا و آخرت خراب کیوں کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "یہ سمجھانے بجھانے کا دور نہیں ہے راجندر صاحب۔ اگر میں تم کو سمجھاؤں کہ تم اپنی اور اپنی دھرم پتنی کی بھلائی کے لیے میرے ساتھ تعاون کرو تو کیا تم سمجھ جاؤ گے۔ ہرگز نہیں۔ میں ایڑی چوٹی کا زور لگا لوں تو بھی تم نہیں بتاؤ گے کہ وہ کیا مسئلہ ہے جسے حل کرنے کے لیے تم دہلی سے چل کر یہاں آئے ہو، اور وہ کیا الجھن ہے جسے سلجھانے کے لیے نواب شہریار حویلی میں بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن جب میں تمہیں سمجھانے بجھانے کا ارادہ ترک کر دوں گا اور گھونسے لات کی زبان میں بات کروں گا تو پھر تم فرفر بولو گے۔ میرے ہر سوال کا جواب دولی کے پہاڑے کی طرح تمہاری زبان پر جاری ہو جائے گا۔"

میرے لب و لہجے نے راجندر اور رام لال کو سہما کر رکھ دیا۔ انگریز خاتون سلوچنا زور زور سے رونے لگی "خاموش" زریں گل ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے دہاڑا "فرنگیوں کے لیے امارے دل میں رحم کا کوئی جگہ نہیں۔ ام بہت برا بیر آتا ہے فرنگیوں سے۔"

"اور خاص طور پر ایسی فرنگی لڑکیوں سے جو روتی دھوتی ہیں" میں نے تائید کی۔

راجندر سنگھ کے اندر کا سکھ بھڑک کر بولا "دیکھو۔۔۔ مرد بچوں کی طرح اسلحہ پکڑ رکھا ہے تو مردوں والی بات کرو۔ زنانیوں کو بیچ میں لاؤ گے تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"اوئے۔۔۔ بکواس بند کرو تم" زریں گل لال پیلا ہو گیا "تم ام کو مردانگی کا سبق دیتا ہے؟ ام کو پتا ہے کہ مردوں کی لڑائی میں زنانیوں کو نہیں گھسیٹنا چاہیے۔ ارے خدائی خوار چپ رہو۔۔۔ چپ رہو۔ امارا زبان مت کھلواؤ۔ ام سب جانتا ہے تمہارے بارے میں۔ پچیس تیس برس گزر جانے سے ایسا باتیں بھول نہیں جاتا ہے۔"

زریں گل کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ راجندر سنگھ گڑبڑا کر رہ گیا۔ معلوم نہیں بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی یا وہ گھگھی کے بعد چپ ہوا تھا۔ زریں گل کے آتشیں لہجے کی تپش نے سلوچنا کو ایک بار پھر ہلکان کر دیا تھا لیکن سسکیاں روکنے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر رکھے تھے "خبردار۔۔۔ خبردار۔ اگر آواز نکالا تو" زریں گل نے اس پر مزید پریشر ڈالا۔ پھر فریال سے مخاطب ہو کر بولا "فریال بی بی! آپ ذرا اس فرنگن کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا جاؤ۔۔۔ یہ گوری چمڑی والا جب تک امارے سامنے رہے گا امارا خون دریائے کابل کے پانی کے مانند اچھلتا رہے گا۔"

فریال نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے بتایا کہ زریں گل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ سلوچنا کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ فریال نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ راجندر سنگھ نے بڑے گمبھیر لہجے میں وارننگ دی کہ اس کی دھرم پتنی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔

راجندر سنگھ سے بات کرتے ہوئے مجھے شک گزرنے لگا کہ راجندر سنگھ نے اپنی اصل شکل و صورت چھپانے کے لیے بہروپ بھر رکھا ہے۔ اس کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کی داڑھی مونچھ کھینچ کر دیکھوں لیکن اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ راجندر سنگھ مجھ سے صرف پانچ فٹ کی دوری پر بلب کے عین نیچے بیٹھا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس کی داڑھی مونچھوں کے بال جلد کے اندر سے پھوٹتے ہوئے صاف نظر آتے تھے۔ اس کی اصل شکل و صورت یہی تھی جس میں وہ نظر آ رہا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں قلی قطب بالکل خاموش کھڑا رہا تھا۔ راجندر سنگھ اور اس کے پی اے نے کئی مرتبہ کن انکھیوں سے قلی قطب کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے انہیں امید ہو کہ یہ ہٹا کٹا شرمن ٹینک جیسا شخص حرکت میں آئے گا اور انہیں اس مصیبت سے نکالنے کی کوشش کرے گا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس ریوڑیکل ٹینک کا کنٹرول ہٹلر کے قبضے سے نکل کر دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے اور اب یہ اتحادیوں کے لیے بجائے ہمارے لیے قطعی بے ضرر ہے۔ درحقیقت یہ سارا انتظام و انصرام قلی قطب کا ہی مرہون منت تھا۔ یہ کوارٹر اس کے کسی جاننے والے کا تھا۔ کوارٹر چونکہ نشیبی زمین پر بنایا گیا تھا لہٰذا اس کی نچلی منزل تہ خانے کی شکل میں تھی۔ دہلی کے مہمانوں کو اس تہ خانے میں تین چار روز تک محبوس رکھنے کے مکمل انتظامات موجود تھے۔ کہنے کو تو فریال، سلوچنا کو "ساتھ والے کمرے" میں لے کر گئی تھی لیکن درحقیقت وہ اسے تہ خانے میں لے کر گئی تھی۔

بیٹھے بیٹھے اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں نے بڑے دھیان سے اور غور کے ساتھ راجندر سنگھ کو دیکھا اور میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اگر میں راجندر سنگھ کی طرح داڑھی مونچھ لگا لیتا، سر پر پگڑی باندھ کر آنکھوں پر چشمہ چڑھا لیتا اور ایک پٹی اپنے رخسار اور کنپٹی پر اس طرح چپکا لیتا کہ چہرے کا بچا کھچا حصہ بھی چھپ جاتا تو نواب شہریار کے لیے مجھے پہچاننا مشکل تھا۔ میرے اور راجندر سنگھ کے قد کاٹھ میں ضرور فرق تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق نواب نے اس سے پہلے راجندر سنگھ کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں آواز بدل کر خود کو راجندر سنگھ کے طور پر پیش کرتا تو کم از کم نواب شہریار کے لیے مجھے شناخت کرنا خاصا دشوار تھا۔ میں نے "کم از کم" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ "حسنِ اتفاق" کے طور پر نواب شہریار قید و بند میں رہنے کے بعد بینائی کی شدید کمی کا شکار تھا اور جب چند گھنٹے پہلے ہم حویلی سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت بھی ایک مسلمان ڈاکٹر نواب کی نظر کے معائنے کے لیے حویلی میں موجود تھا۔ اگر میں حویلی میں موجود دوسرے افراد کا زیادہ سامنا نہ کرتا اور حویلی میں قیام کے دوران میں خود کو نواب شہریار تک محدود رکھتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ میرا بہروپ کامیاب رہے۔

اپنا حلیہ بدل کر خود کو کسی دوسرے شخص کے روپ میں پیش کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ ڈراموں اور فلم کے بہترین میک اپ مین بھی پلاسٹک سرجری کے بغیر کسی چہرے کو اس انداز میں نہیں بدل سکتے کہ وہ ایک عام چہرہ نظر آئے اور دیکھنے والے کو اس پر شک نہ ہو۔ خاص طور پر جب کسی ایسے شخص کا چہرہ بدلا جاتا ہے جسے آپ پہلے سے جانتے پہچانتے ہیں تو پول کھلنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اس قسم کی مہم جوئی سے باز رہنے کی کوشش کی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص کا عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا روپ دھار لوں اور اس بہروپ کے ذریعے ایک ایسا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کروں جس کا حصول بصورت دیگر بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ اگر میں راجندر سنگھ کے روپ میں نواب شہریار سے ملتا اور راجندر سنگھ کا پی اے رام لال نواب کے سامنے یہ تصدیق کر دیتا کہ میں ہی راجندر ہوں تو میرے اور نواب کے درمیان سے بہت سے پردے اٹھ جاتے تھے اور مجھے امید تھی کہ یہ پردے اٹھنے کے بعد مجھے دفینے کے پچیس عدد صندوق اپنے سامنے پڑے نظر آئیں گے۔

میں نے زریں گل سے مخاطب ہو کر کہا "ہم صاحب اور صاحب کے پی اے کو نشانے پر رکھو۔ میں ذرا صاحب کے ڈرائیور کا انٹرویو لے لوں" میرا اشارہ قلی قطب کی طرف تھا۔

زریں گل نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور کہا "آپ فکر ہی نہ کرو استاد۔ ام فرنگی کا دشمن ہے اور ان لوگوں کا بھی دشمن ہے جو فرنگیوں سے یاری کرتا ہے۔ خدا کا پناہ! ام نے دو سو سال میں بڑی مشکل سے ان سفید بندروں کو یہاں سے نکالا۔ اب یہ بہانے بہانے سے پھر انہیں یہاں لا رہا ہے۔ آپ فکر ہی نہ کرو۔ ام اس فرنگن کو بیوہ کرنے میں ایک سیکنڈ کا دیر نہیں لگائے گا۔ ادھر اس لاٹ صیب نے چالاکی ماں کی رکھا ہوا؟ ادھر ام نے تھامیں سے کھلا راتا۔"

"چل اوئے موٹے آگے لگ" میں نے قلی قطب کو ماؤزر کی نال سے دروازے کی طرف دھکیلا۔ چند ہی لمحے بعد میں اور قلی قطب تہ خانے میں اترنے والی مختصر سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے۔ قلی قطب کی آنکھوں میں میرے لیے اب بھی عداوت اور نفرت کی جھلک تھی اور کیوں نہ ہوتی، میرا لگایا ہوا زخم ابھی اس کے جسم پر تازہ تھا۔

میں نے کہا "قلی! پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ [illegible] صاحب نے اب ہمیں ایک کشتی میں سوار کر دیا ہے۔" وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ شرمن ٹینک کے "چہرے" پر بھلا کیا تاثر ہو سکتا تھا۔ بہرطور اس کی آنکھوں میں چمکنے والی عداوت ایک دھند کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ میں نے کہا

"قلی! کہیں سے "آرٹی فیشل" داڑھی مونچھ مل سکتی ہے؟"

"ضرور مل جائے گی" وہ اطمینان سے بولا۔

میں نے کہا "بہت نفیس قسم کی چیز ہونی چاہیے۔ بالکل اصل کے مانند ہو، قیمت کی پروا نہیں ہے۔"

وہ بولا "قیمت چکانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ سامان میرے اپنے پاس موجود ہے لیکن اس کے لیے مجھے حویلی جانا ہوگا۔"

میں نے کہا "حویلی تو تم جا نہیں سکتے۔ یہ چیزیں مجھے ابھی چاہئیں اور اگر تم ان کے لیے حویلی چلے گئے تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ نواب تم سے پوچھے گا کہ وہ حرامی... کیا نام ہے اس کا، غیر نازی کہاں ہے؟ اور دہلی سے آنے والے مہمان کہاں ہیں؟"

"ہاں یہ بات تو ہے" قلی قطب نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا "کیا ہم زریں گل کو نہیں بھیج سکتے یا میں خود چلا جاؤں؟"

"بالکل ایسا کر لیں، میں آپ کو ٹھکانا بتا دیتا ہوں۔ آپ خود چلے جائیں یا کسی کو بھیج دیں۔"

قلی قطب نے مجھے بتا دیا کہ داڑھی مونچھ اور ریڈی میڈ میک اپ کا دیگر چھوٹا موٹا سامان حویلی کے کس کمرے میں کس جگہ موجود ہے اور کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ضروری ہدایات دے کر زریں گل کو بھیجا اور وہ کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک گھنٹے میں یہ اشیا لے آیا۔ یہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس تھا جس میں داڑھی مونچھ، رنگ اور مسوں وغیرہ کے علاوہ اور کئی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دو تین قسم کے لوشن، کریمیں، ناک میں پھنسانے والے چھوٹے چھوٹے اسپرنگ، گالوں کے نیچے دبانے والے فوم کے پیڈ۔ ریڈی میڈ میک اپ میں شامل ان اشیا کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ زریں گل کی آمد سے قبل میں نے راجندر کی بیوی سلوچنا اور راجندر کے پی اے رام لال کی خوب برین واشنگ کر دی تھی۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں ان کے مانند بطور راجندر سنگھ حویلی جا رہا ہوں۔ وہاں حویلی میں حسب پروگرام ہمارا قیام کل شام چار بجے تک ہوگا۔ اس دوران میں اگر ان دونوں میں سے کسی نے مہم جوئی کی کوشش کی یا ان کے رویے کی وجہ سے نواب شہریار کو شک گزر گیا کہ میں راجندر سنگھ نہیں ہوں تو وہ بڑے دردناک قسم کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ میں نے ان دونوں کو خالی خولی دھمکی ہی نہیں دی تھی بلکہ ان دونوں کی ٹانگ کے ساتھ ایک ایک بم بھی باندھ دیا تھا اور انہیں بتا دیا تھا کہ یہ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والا بم ہے اور میری جیکٹ کی جیب میں پڑے ہوئے کنٹرول کے ہلکے سے اشارے پر ان کے جسم چیتھڑوں کی شکل اختیار کر جائیں گے۔ یہ بم درحقیقت چھوٹے سائز کے ہینڈ گرینیڈ تھے جو قلی قطب کے ساتھی نے فراہم کیے تھے۔ ریموٹ کنٹرول سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اور جو ریموٹ کنٹرول میں نے سلوچنا اور رام لال کو دکھایا تھا وہ ایک عدد ٹیلی وژن کا کنٹرول تھا۔ بہرطور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا اور جتنی دہشت میں ان پر بٹھانا چاہتا تھا اس سے سہ گنا دہشت ان پر بیٹھ چکی تھی۔ اس دہشت کا تعلق بموں اور ریموٹ کنٹرول سے اتنا نہیں تھا جتنا کہ میری ذات سے تھا۔ ایک نہایت سازگار اور حسب حال اتفاق یہ ہوا تھا کہ راجندر سنگھ کے پی اے مسمی رام لال نے مجھے بطور استاد جمالی پہچان لیا تھا۔ اس کا تعلق بمبئی سے تھا۔ چند سال پہلے اس نے مجھے وہاں دیکھا تھا یا پھر اخبار وغیرہ میں میری تصویر پر اس کی نظر پڑی تھی اور میری شباہت اس کے ذہن میں محفوظ ہو چکی تھی۔ یہی آشنائی تھی جس کی وجہ سے وہ اب تک گاہے گاہے مجھے بڑے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ اگر وہ اس جان پہچان کو اپنے تک محدود رکھتا تو بہتر تھا مگر اس نے بودے پن کا ثبوت دیتے ہوئے سلوچنا کو بھی بتا دیا تھا کہ انہیں اغوا کرنے والا اور ان کے جسموں سے بم باندھنے والا ماضی کا نامی گرامی مجرم اور خطرناک قاتل استاد جمالی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطلاع سے سلوچنا کو بڑی "مسرت" ہوئی ہوگی اور اس کی ٹھیک ٹھاک "ڈھارس" بندھی ہوگی۔ میں نے تو صرف اتنا دیکھا تھا کہ اس کا رنگ کورے لٹھے جیسا سفید ہو گیا تھا جیسے فرشتۂ اجل کا دیدار کرنے کے بعد سکتے میں چلی گئی ہو۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں منتر الٹا نہ پڑ جائے یعنی یہ عورت اتنا نہ ڈر جائے کہ اس کے ڈر کی وجہ سے بھید کھل جائے لہٰذا میں اس کے ساتھ ملائمت سے پیش آیا اور اسے بڑی توجہ سے یہ بات سمجھائی کہ اگر وہ میرے کہنے کے مطابق عمل کرے گی تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا اور کل شام چار بجے وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسی طرح صحیح سلامت ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گی جیسے آج ایئرپورٹ سے یہاں آئی ہے۔ اپنی نسوانی کم ہمتی اور کمزوری سے قطع نظر وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے میری باتوں کو دھیان سے سنا اور بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی اور اس کے شوہر کی جان کا دشمن نہیں ہوں اور اگر وہ میری ہدایات پر عمل کرے گی تو میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا بلکہ کسی دیگر خطرے سے بھی اس کی حفاظت کروں گا۔

بعد ازاں میں نے رام لال کو بھی اسی انداز میں سمجھا بجھا دیا اور اس کے خوف کو ایسے درجے پر لے آیا جہاں رام لال مکمل طور پر میرے قابو میں رہے۔ نہ تو اتنا سہم جائے کہ حویلی جا کر اس کے رویے کی وجہ سے بھانڈا پھوٹ جائے اور نہ اتنا دلیر ہو جائے کہ کوئی چال چلنے کی کوشش کرے۔ ہم مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہمیں روانہ ہونے میں دس پندرہ منٹ کی تاخیر اور ہو جاتی تو نواب شہریار کے کارندوں کو تشویش میں مبتلا ہو جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایئرپورٹ کی فلائٹ انکوائری سے بذریعہ فون معلومات حاصل کرتے اور پھر ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

میں نے راجندر سنگھ کو تو زریں گل اور فریال کی تحویل میں چھوڑا اور خود ضروری تیاری کے بعد سلوچنا اور رام لال کے ساتھ بطور راجندر سنگھ حویلی روانہ ہو گیا۔ مجھے کیس تو راجندر سنگھ ہی کی آگئی تھی۔ پگڑی اور عینک بھی راجندر سنگھ کی تھی اور وہ سفید پٹی بھی جس نے اس کے رخسار اور کنپٹی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پتلون میری اپنی تھی اور میں نے یہ رسک لے لیا تھا کہ اسی پتلون کے ساتھ حویلی چلا جاؤں۔ داڑھی مونچھ چپکا کر اور ناک کے نتھنوں میں چھوٹے چھوٹے مخصوص اسپرنگ پھنسانے کے بعد میں نے آئینہ دیکھا تو خود کو پہچان نہ سکا۔ پہچانا تو اس وقت جاتا ہے جب چہرہ نظر آرہا ہو۔ یہاں تو پانچ بٹا چھ حصہ چھپا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ میں نواب شہریار کو دھوکا دینے میں کامیاب رہوں گا۔

O☆O

رات کے ٹھیک دس بجے ہم حویلی کے عظیم الشان صدر دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر قلی قطب تھا۔ قلی قطب کے ساتھ پی اے ٹو فیڈرل منسٹر رام لال بیٹھا تھا۔ عقبی نشست پر میں اور میری "زخمی" بیوی سلوچنا تھے۔ سلوچنا اور رام لال مجھ سے بری طرح مرعوب ہو چکے تھے۔ مجھے ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے تعاون نہیں کریں گے۔ قلی قطب کو پہچان کر محافظوں نے دروازہ کھول دیا۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی پورچ میں جا رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے سے پہلے عمارت کا اندرونی دروازہ کھلا اور نواب شہریار مع اپنی بیمار بیگم کے ہمارے استقبال کے لیے آموجود ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر پی اے رام لال سے مصافحہ کیا اور آخر میں سلوچنا کو ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ سلوچنا نے بھی خالص مشرقی انداز میں سلام کا جواب دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ نواب اپنے منیجر کی غیر موجودگی کے بارے میں پوچھے گا۔ اس سوال کا جواب بھی قلی قطب پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے کہنا تھا کہ منیجر صاحب گیٹ کے پاس اتر گئے ہیں۔ وہاں ان کا کوئی ملنے والا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ تاہم اس "سوال جواب" کی نوبت نہیں آئی۔ نواب شہریار نے منیجر کو نظر انداز کر دیا۔ صرف اتنا کہا "آپ لوگوں نے بہت دیر لگا دی۔ ائرپورٹ سے بمشکل ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہو گا۔"

قلی قطب نے ادب سے کہا "گاڑی کا ٹائر دو دفعہ پنکچر ہو گیا تھا جی۔"

"اوہ ویری سیڈ" نواب نے افسوس کا اظہار کیا "آپ کو راستے کے وقت اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ ویسے تو حویلی میں دو درجن گاڑیاں کھڑی ہیں لیکن ہم نے جان بوجھ کر آپ کو اس گاڑی میں منگوایا۔ یہ حویلی کی گاڑی نہیں ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ آپ بڑی رازداری سے یہاں پہنچیں۔ آپ جانتے ہی ہوں گے، ہماری [illegible] ہم آپ کو لینے ائرپورٹ آتے۔"

میں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا "آپ کی بہت مہربانی نواب صاحب کہ آپ نے اپنی مصروف زندگی میں سے ہمارے لیے وقت نکالا۔ دل گدگد جاتا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ لوگوں سے مل کر۔"

"اللہ نے چاہا تو یہ ملاقاتیں آئندہ بھی ہوتی رہیں گی" نواب نے کہا۔

"ضرور ضرور" میں نے زور و شور سے تائید کی۔

نواب کی آنکھوں سے اب بھی پانی بہہ رہا تھا۔ اس نے پانی پونچھنے کے لیے مٹھی میں ٹشو پیپر دبا رکھا تھا۔ ہم حویلی کے رنگا رنگ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ نواب اور اس کی بیگم سے بات کر کے میرا اعتماد ایک دم بحال ہو گیا تھا اور یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں پہچانا نہیں جاؤں گا۔ نواب نے تاسف بھرے لہجے میں کہا "ہمیں افسوس ہوا آپ کے حادثے کا سن کر۔ ہم تو آپ کو ٹیلی فون کرنا چاہتے تھے کہ آپ تشریف نہ لائیں۔ ایک دو روز بعد کا پروگرام رکھ لیں گے لیکن ہم کو پتا چلا کہ آپ تو ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک مجھے لگنے والی چوٹ کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو میں پی اے رام لال نے بھی حسب توفیق حصہ لیا۔ نواب اور رام لال کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ نواب شہریار نے سلوچنا سے مخاطب ہو کر کہا "مسز راجندرا! آپ بہت خاموش ہیں۔ خیریت! طبیعت تو ناساز نہیں آپ کی۔"

سلوچنا نے نفی میں سر ہلایا اور زبردستی مسکراتے ہوئے انگریزی میں بولی "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل راجندر جی کو پیش آنے والے حادثے کے سبب میں خود کو رنجیدہ محسوس کر رہی ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ اسے رنجیدہ کرنے والی چیز کیا ہے۔ یہ وہ ننھا بم تھا جو فریال نے زبردستی سلوچنا کے لباس کے نیچے اس کی ران پر ایک پلاسٹک بینڈ کے ذریعے باندھا تھا۔ میں اس بم کا چھوٹا سا ابھار اب بھی سلوچنا کی آغوش میں محسوس کر سکتا تھا۔ ایسا ہی ایک ابھار رام لال کی سیاہ پتلون میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ نواب شہریار نے رام لال سے کچھ پرانے واقعات کا تذکرہ شروع کر دیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مصروف رہیں تاکہ مجھے کم سے کم بولنا پڑے اور کم سے کم نواب کی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑے۔ نواب کی بیگم کچھ دیر ہمیں کمپنی دینے کے بعد معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی کہ وہ ڈنر کی تیاری کر رہی ہے۔ اس کے چلے جانے سے میں خود کو زیادہ "بری" محسوس کرنے لگا۔ اب مجھے صرف نواب زادی شاہین کی طرف سے اندیشہ تھا۔ اسے اپنے باپ کے ساتھ خاص بے تکلفی تھی اور وہ ہر جگہ بلا روک ٹوک آ جا سکتی تھی۔ اگر وہ یہاں چلی آتی تھی۔ اگر وہ یہاں آ نکلتی تو اس کی تیز نگاہوں

سے بھرم رکھنا ایک خاصا دشوار عمل ثابت ہوتا۔ بہرطور یہاں بھی بہت گزری۔ ہم تقریباً پون گھنٹا ڈرائنگ روم میں بیٹھے لیکن نواب زادی کی صورت نظر نہیں آئی۔ اس سے پہلے بھی حویلی میں میری نگاہیں اسے کھوجتی رہی تھیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔

ڈنر میں ہم تینوں کے علاوہ صرف نواب اور اس کی بیگم شریک تھے۔ اس سے پہلے میں نے ایک دو مرتبہ نواب کو کھانے کی میز پر دیکھا تھا۔ ام الخبائث المعروف "انگور کی بیٹی" بڑے اہتمام سے اس کے دستر خوان پر سجائی جاتی تھی لیکن آج کہیں اس کا نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ نواب کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے غرض ہر انداز میں اسلامی رنگ جھلکتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد جب ہم ڈرائنگ روم کی طرف واپس لوٹ رہے تھے، مجھے کسی قریبی راہداری سے مجنی کنور کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی نوکر کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجنی کنور اس وقت بری طرح پیچ و تاب کھا رہا ہو گا۔ اس نے میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں ہر قیمت پر وہ ملاقات روکوں گا جو آج رات نواب شہریار جنگ اور فیڈرل منسٹر راجندر سنگھ کے درمیان ہونے والی ہے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں یہ ڈیوٹی نبھاؤں گا لیکن اپنے وعدے کے برعکس "فیڈرل منسٹر راجندر سنگھ" اس وقت اپنے ساتھیوں سمیت حویلی میں موجود تھا اور نواب شہریار سے راز و نیاز کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں چائے کا مختصر دور چلا۔ بالآخر خصوصی بات چیت کا وہ مرحلہ آگیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ یہ بات چیت صرف نواب شہریار اور میرے درمیان ہوئی۔ حویلی کا یہ مختصر ساؤنڈ پروف کمرا غالباً ایسی ہی اہم میٹنگز کے لیے بنایا گیا تھا۔ نواب شہریار نے ایک چھوٹے سے کیس بریف کیس میں سے ایک نیلی فائل نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ ایک بے حد گہری سانس لے کر اس نے تمہیدی انداز میں کہا "راجندر صاحب! پچھلے ماہ کی اٹھارہ تاریخ کو چیف منسٹر صاحب سے ہماری باتیں ہوئی تھیں۔ ہم نے ان سے عرض کیا تھا کہ ہم ہر چھ ماہ ان کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں ہماری سینٹرل گورنمنٹ کے واسطے قریباً دو سو کروڑ روپے کا فائدہ ہے۔ اور یہ "امانت" ہم بے حد احتیاط کے ساتھ سنبھال رہے ہیں۔ پہلے تو منسٹر صاحب کو یقین ہی نہیں آیا تھا لیکن جب ہمارے درمیان تفصیلی بات ہو گئی تو انہوں نے فرمایا کہ وہ مرکز سے اپنے ایک ذمے دار ساتھی کو آپ کے پاس بھیج رہے ہیں۔ ہم کو بے حد خوشی ہے کہ آپ جیسا سوجھ بوجھ والا شخص اس معاملے کو ہینڈل کرنے کے واسطے یہاں آیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ نواب صاحب کی عنایت ہے کہ وہ مجھے اس لائق سمجھ رہے ہیں۔"

نواب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "راجندر صاحب! اس معاملے کی شروعات آج سے تقریباً آٹھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ ہمارے تین چار کارندے جن میں قلی قطب (قلی قطب) بھی شامل تھا حیدرآباد شہر میں سینما دیکھ کر حویلی واپس آرہے تھے۔ وہ ایک اوپل کار میں سوار تھے۔ شام کوئی سات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ وہ دیر تک ایک ٹرک کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس نے راستہ ہی نہیں دیا۔ یہ ٹرک بڑی تیزی سے جا رہا تھا اور اس پر پیاز سے بھری ہوئی بوریاں لدی تھیں۔ ایک جگہ ہمارے کارندوں نے کار کچے میں اتار کر ٹرک کو اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی لیکن ٹرک والے نے کار کو سائیڈ مار دی۔ کار بمشکل الٹنے سے بچی۔ تاہم اس کا اچھا خاصا نقصان ہوا اور ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ گئی۔ ہمارے کارندوں نے ٹرک کا پیچھا کیا۔ سلطانہ روڈ پر پہنچ کر ٹرک سواروں نے اچانک اوپل کار پر فائرنگ شروع کر دی۔ ہمارے آدمی بھی نہتے نہیں تھے۔ انہوں نے جوابی فائرنگ کی اور ٹرک کا ٹائر برسٹ کر دیا۔ سلطانہ روڈ پر گوروں کے قبرستان کے نزدیک دونوں پارٹیوں میں اچھی خاصی فائرنگ ہوئی۔ پھر ٹرک والے ٹرک چھوڑ کر اندھیرے میں نکل گئے۔ ہمارے کارندوں نے ٹرک کا ٹائر بدلا اور اسے تھانے میں جمع کرانے کے لیے چل دیے۔ اگر تھانے کا ایس ایچ او ٹرک اپنے قبضے میں لے لیتا تو یہ چکر ہی شروع نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایس ایچ او نے کہا کہ یہ میرے تھانے کا کیس ہی نہیں ہے۔ دوسرے تھانے سے رابطہ کیا گیا تو وہاں بھی کوئی ذمے دار شخص نہیں ملا۔ ہمارے کارندے ٹرک کو حویلی لے آئے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ گاڑی کا کافی زیادہ نقصان ہو گیا ہے، چلو بیس پچیس بوری پیاز کی بیچ کر یہ نقصان پورا کر لیں گے لیکن حویلی پہنچ کر جب ٹرک سے پیاز اتاری گئی تو یہ ایک اور ہی معاملہ نکل آیا۔ ٹرک پر پیاز کی بوریوں کے نیچے صندوق چھپائے گئے تھے۔ ہمارے کارندوں نے ہمیں اطلاع دی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ کوئی خاص ہی معاملہ ہے اور ہمارے کارندوں اور ٹرک والوں میں جو لڑائی ہوئی ہے وہ ضد بازی کی وجہ سے نہیں بلکہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ٹرک والوں کے دل میں چور ہو گا۔ انہوں نے سمجھا ہو گا کہ کار ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ انہوں نے کار کو اوور ٹیک نہیں کرنے دیا ہو گا۔ اس بات پر لڑائی بڑھ گئی ہو گی۔ ہم نے سب فالتو آدمیوں کو باہر بھیجنے کے بعد ٹرک کے ایک صندوق کا معائنہ کیا تو ششدر رہ گئے۔ وہ نہایت قیمتی قسم کے نوادرات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسرا صندوق کھولا تو اس میں ہیروں جڑے زیورات اور اسی طرح کا نہایت بیش قیمت سامان تھا۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ وہ پچیس صندوق تھے۔"

نواب نے آخری فقرہ ڈرامائی انداز میں ادا کیا تھا اور ردعمل جانچنے کے لیے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ چہرے پر زیادہ سے زیادہ حیرت طاری کر لوں۔ چہرہ تو خیر نظر ہی نہیں آرہا تھا، میں نے منہ کھول کر اپنی حیرت و دلچسپی کا اظہار کیا

اور پھر تن نواب شہریار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نواب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "راجندر صاحب' وہ تمام صندوق انتہائی قیمتی سامان سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اس سامان میں بیشتر حصہ نایاب قسم کے نوادرات کا ہے۔ شاید آپ نے میگاسی کے ذخیرے کے بارے میں سنا ہو؟"

"میگاسی کا ذخیرہ!" میں نے زیرلب دہرایا۔ چند لمحے "سوچ بچار" میں صرف کئے پھر لپکپاتے لہجے میں کہا "کہیں آپ گندھارا آرٹ کے اس کولیکشن کا ذکر تو نہیں کر رہے جو کافی عرصہ پہلے ترکی کے کسی شہر سے چرا لیا گیا تھا یا شاید لاپتہ ہو گیا تھا؟"

"بالکل ــــ بالکل وہی" نواب نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

"لیکن اس کولیکشن کا ذکر یہاں کیسے آگیا؟"

"وہ کولیکشن بھی ان نوادرات میں موجود ہے" نواب نے لرزاں آواز میں کہا "بلکہ ــــ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کولیکشن ان نوادرات اور ساز و سامان کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جو صندوقوں سے برآمد ہوئے ہیں۔"

"او گاڈ!" میں صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں نواب صاحب ــــ میری تو عقل خبط ہو رہی ہے۔ میں میگاسی کے نوادرات کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن اتنا تو مجھے بھی علم ہے کہ یہ نوادرات دو ڈھائی سو سے کم نہیں ہیں اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے بھی ان کی قیمت کروڑوں ڈالر تھی۔ اگر وہ اصلی نوادرات ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے آثارِ قدیمہ کی ہسٹری میں ایک نئے باب کی تخلیق کی ہے۔"

نواب نے فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "ہم اپنے طور پر تصدیق کر چکے ہیں راجندر صاحب' میگاسی کے نوادرات اصلی ہیں' بلکہ ہمارے بیٹے نے جتنے بھی نوادرات کی جانچ کرائی ہے وہ اصلی ثابت ہوئے ہیں" میں نے خود پر حیرت طاری کر رکھی تھی اور خاموشی سے نواب شہریار کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ نواب نے اپنی نوزائیدہ داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "ــ یقیناً اب آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہو گا کہ یہ سارا ساز و سامان اب کہاں ہے؟ اور ہم اس ساز و سامان کے بارے میں اب کیا ارادہ رکھتے ہیں ...؟ شاید ہمارے ارادے کے بارے میں تھوڑا بہت اندازہ بھی آپ نے لگا لیا ہو ـــ محترم منسٹر صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے چند مہینوں میں ہم پر اوپر تلے چند حادثے ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ہمارے مزاج اور ہماری خواہشات کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اگر آپ کھلے لفظوں میں سننا پسند کرتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ دولت اور دنیا کے جھمیلوں سے ہمارا دل اُچاٹ ہو گیا ہے۔ ہم اب ایک اور طرح کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ سادہ' پرسکون اور ہر طرح کی الجھنوں سے پاک ـــ یہ دولت جو ایک اتفاق کے تحت ہم تک پہنچی' بے شک اس وقت ہماری تحویل میں ہے اور ہم اسے اپنی تحویل میں رکھ سکتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ یہ دولت ہماری نہیں ہے۔ ہمارے اندر کے انسان نے ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دی کہ ہم اسے اپنے پاس رکھیں لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ سب کچھ گورنمنٹ کے سپرد کر دیں گے۔ آپ کو یہاں بلانے کا مقصد (مقصد) بھی یہی ہے کہ اس سلسلے میں تفصیلات طے کر لی جائیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "نواب صاحب! آپ نے ایک بہت بڑے کام کا ارادہ کیا ہے۔ وا ہگرو آپ کو اس ارادے میں کامیاب کرے ـــ آپ کی باتیں سننے کے بعد بھی مجھے اپنے کانوں پر وشواس نہیں ہو رہا۔ میں کیا میری جگہ کوئی بھی ہوتا' اتنی جلدی اس حیرت کو اپنے اندر جذب نہ کر پاتا ـــ میرا دھیان اب چند ماہ پہلے کے اخبارات کی طرف جا رہا ہے۔ ان اخبارات میں فرید کوٹ کے حوالے سے کچھ واقعات کا ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ وہاں بھی کسی ایسے ٹرک کا چکر رہا ہے جس پر بہت سا قیمتی ساز و سامان لدا ہے۔ نواب صاحب! کہیں یہ وہی معاملہ تو نہیں؟"

نواب شہریار نے کہا "ان واقعات کی بازگشت یہاں حیدر آباد میں بھی سنی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرک میں صندوقوں کا کھوج لگتے ہی ہمارا دھیان فوراً اخباری خبروں کی طرف چلا گیا تھا۔"

"پھر کیا نتیجہ نکالا آپ نے؟"

"یہی کہ یہ وہی ٹرک ہے۔"

میں نے کہا "حیرت ہے کہ یہ ٹرک فرید کوٹ سے چل کر یہاں حیدر آباد آ پہنچا۔ جبکہ پنجاب اور مغربی اتر پردیش میں اس ٹرک کو چپے چپے پر تلاش کیا جا رہا تھا۔"

نواب نے کہا "جس ٹرک کو تلاش کیا جا رہا تھا' اس پر گنے لدے ہوئے تھے۔ ہو رائس کا رنگ' اُس کی نمبر پلیٹ اور باڈی کا ڈیزائن بھی دوسرا تھا۔ دراصل ٹرک کو سڑک پر لانے سے پہلے اس میں بہت زیادہ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ٹرک کی وہ نمبر پلیٹ بھی ٹرک کے اندر سے برآمد ہوئی ہے جس پر جھنگ پاکستان کا نمبر لکھا ہوا ہے۔ بعد میں ہم نے ٹرک کے رنگ کو کھرچا تو نیچے سے دوسرا رنگ نکل آیا۔ ٹرک کی باڈی پر بھی بعد میں فالتو لکڑیاں جوڑ کر اس کے ڈیزائن میں تبدیلی کی گئی ہے۔"

میں نے کہا "نواب صاحب! یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ ایک ایسا ٹرک جس کی تلاش میں ایک صوبے کی پوری انتظامیہ پاگل ہو رہی تھی اور خطرناک مجرموں کے گروہ جس کے کھوج میں ٹکریں مارتے پھر رہے تھے' آپ کے کارندوں نے اتنی آسانی سے اپنی تحویل میں لے لیا' اور نہ صرف تحویل میں لے لیا بلکہ اسے تھانے میں جمع کرانے کے لیے گھومتے رہے۔ مجھے وشواس ہے کہ اگر یہ ٹرک کسی عیار پولیس افسر کے ہتھے چڑھ جاتا تو ایک بار پھر معمّا بن جاتا ـــ بہرحال سوچنے کی کچھ اور بھی باتیں ہیں' تاہم باتیں کرنے سے پہلے میں آپ کی "آفر" سے وہ ٹرک اور اس کا ساز و سامان دیکھنا چاہوں گا۔ سچی بات یہ ہے نواب صاحب کہ ...

سلسلے میں میرا اشتیاق اب عروج پر پہنچ گیا ہے اور مجھ سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔"

میری ہیجانی کیفیت محسوس کر کے نواب دھیرے سے مسکرایا اور بولا "ہمیں افسوس ہے مسٹر صاحب! آپ کو تھوڑا سا انتظار مزید کرنا ہو گیں گا۔ دانش مندوں نے ٹھیک کہا ہے' دولت اور خوب صورتی اپنی دشمن آپ ہوتی ہے۔ یہ چیزیں جہاں پہنچتی ہیں' اپنے شکاری پیدا کر لیتی ہیں۔ یہاں بھی اس دولت کے غیر مجاز شکاری پیدا ہو چکے ہیں۔ ان کی لپکتی زبانیں دیکھنے کے بعد آج سے چند ہفتے پہلے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سامان کو حویلی میں نہیں رکھیں گے۔"

"بہت خوب! یہ بڑا اچھا فیصلہ ہے" میں نے نواب کی تعریف کی لیکن دل میں اس کی احتیاط پسندی کو کوسا۔

نواب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "داناؤں نے زر کو آگ سے تشبیہ دی ہے۔ ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ دولت واقعی آگ ہے۔ اس آگ نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارا بیٹا جلا دیا ہے۔ جو نافرمان ہو گیا۔ اپنے باپ کے خون کا پیاسا ہو گیا' وہ جل ہی گیا نا مسٹر صاحب۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں نواب صاحب!"

وہ کربناک انداز میں مسکرایا "مسٹر صاحب ہم نے ابھی جن شکاریوں کا ذکر کیا ہے ان میں سب سے بڑا شکاری ہمارا بیٹا ہے۔ سونے اور ہیرے جواہرات کی چمک نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ ہمیں کا دامن اٹھائیں گے تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہو گیں گا۔ ہم آپ کو کیا بتائیں' پچھلے چند ہفتوں میں ہمارے بیٹے کے ہاتھوں ہم پر کیا کیا گزری ہے۔ ابھی آپ کی آمد سے ایک دن پہلے وہ شیطان پوری فوج لے کر حویلی پر چڑھ آیا تھا۔ یہ تو باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم کو پہلے سے اطلاع ہو گئی اور ہم نے اپنا انتظام کر لیا ورنہ خبر نہیں کیا ہو جاتا۔ دولت کے لالچ میں نہ جانے کیسے کیسے خونخوار لوگ اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بردہ فروش جنت کا نام بھی اس میں آتا ہے۔ لوگ اسے دیوتا سمان سمجھتے ہیں لیکن اندر سے وہ بھی ایک نمبر کا بدمعاش نکلا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کل ہونے والی پریس کانفرنس میں نہ صرف وہ صندوق سب کے سامنے پیش کیے جائیں بلکہ ان لوگوں کے چہرے سے بھی نقاب اٹھائیں جائیں جنہیں ان کے لالچ نے غداروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یہ سب کچھ سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ خاص طور پر آپ کے بیٹے کے بارے میں۔ آپ جیسے باپ کا دل دکھا کر وہ یقیناً اپنے لیے نرک کی آگ اکٹھی کر رہا ہے۔"

ہمدردی کے بول سن کر نواب کا دل بھر آیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھیں۔ معلوم نہیں یہ آنسو جہنم کا پانی تھا یا آنسوؤں کا۔ وہ دل گیر آواز میں بولا "مسٹر صاحب! جب ہمارا بیٹا انگلستان سے واپس آئے تھے تو ہماری اس حویلی میں

رنگ اور نور کا سیلاب آ گیا تھا اور حویلی میں ہی نہیں ایسا سیلاب ہمارے دل میں بھی تھا۔ ہم اتنا خوش تھے کہ لفظ بیان سے عاجز ہیں لیکن آج محض ڈیڑھ سال بعد ہم اتنے دکھی ہیں کہ لفظ بیان سے قاصر ہیں۔ ہم یکسر اکیلے اور بے آسرا ہو گئے ہیں۔ جان سے پیارا بیٹا جان کا دشمن بن چکا ہے اور لاڈلی بیٹی یہاں کے حالات سے بددل ہو کر واپس انگلستان سدھار چکی ہے۔ شاید کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ یقین کریں مسٹر صاحب! کبھی کبھی تو ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی طرف نکل جائیں۔"

نواب کی بات سن کر میری سمجھ میں آیا کہ نواب زادی شاہین مجھے حویلی میں دکھائی کیوں نہیں دی۔ وہ باپ اور اپنے بدکار بھائی کے درمیان بھڑکنے والی آگ سے دامن بچا کر یہاں سے جا چکی تھی۔ مجھے اس کی وہ ادھوری تحریریں یاد آ گئیں جو اس نے میرے نام لکھی تھیں اور پھر پھاڑ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی تھیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے لیے اپنے دل میں کوئی "خاص" جذبہ رکھتی ہے۔ ہاں یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ میری احسان مند و ممنون ہے۔ وہ اپنی ممنونیت اور اپنی نیک خواہشات مجھ تک پہنچانا چاہتی تھی لیکن کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ نہ جانے ایسی کتنی ان کہی باتیں دلوں کی گہرائیوں میں دفن رہ جاتی ہیں۔ کتنے ہی محبت نامے ایسے لکھے جاتے ہیں جنہیں کبھی محبوب تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔ کتنے ہی خوب صورت فقرے کبھی ادا نہ ہونے کے لیے زبانوں پر منجمد ہو جاتے ہیں اور کتنے ہی پیغام منتظر کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہواؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ خیالات کی رو بہکی تو غزالہ کی طرف چلی گئی۔ شاید میرا اور غزالہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کتنے ہی موقعے ایسے آئے تھے جب میں اس کی وارفتگی کی زد میں آ کر اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ میری بے قراریاں سارے شکوے بھول کر اسے سمیٹنے کے لیے بڑھی تھیں لیکن کمال پر صرف ایک آنچ۔ صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی۔ انکار اور ان کہی کے درمیان ایک مدھم لکیر کا فاصلہ تھا جو مجھ سے طے نہیں ہوا تھا۔

اچانک کمرے میں رکھے ہوئے انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میرے ساتھ ساتھ نواب شہریار بھی چونک گیا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا۔ پھر غور سے بات سننے لگا "نہیں۔۔۔ نہیں' ہم مصروف ہیں" اس نے الجھن سے کہا۔ دوسری طرف سے اصرار کیا گیا۔ نواب چند لمحے تذبذب میں رہا پھر بیزار لہجے میں بولا "اچھا۔۔۔ بھیجو۔"

چند لمحے بعد ساؤنڈ پروف کمرے کا دروازہ "کلک" کی مدھم آواز سے کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ بالائی جسم پر اس نے گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ یہ چادر اوڑھنی کی طرح اس کے سر پر بھی تھی۔ اس چادر کی وجہ سے نووارد کا حلیہ

پراسرار سا ہو گیا تھا۔ اس کے اندر آنے کے بعد دروازہ خود بند ہو گیا تھا۔ نووارد نے رخ ہماری طرف پھیرا تو میرے ساتھ نواب شہریار جنگ بھی بری طرح چونک گیا۔ وہ نواب فیروز تھا۔ اس کے ہاتھ میں جرمن پستول اور آنکھوں میں خون کی تھی۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ نواب فیروز یہاں کیسے پہنچا۔ وہ جیسے بھی پہنچا تھا' ہمارے سامنے تھا اور اس کی آنکھوں کی جنونی چمک بتا رہی تھی کہ وہ گولی چلانے میں ایک پل کی دیر نہیں کرے گا۔

نواب شہریار نے جلدی سے قریبی دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو فیروز دھاڑا۔ "نواب فیروز کر جاتیں میں گولی چلا دوں گا۔"

اس کی آواز میں کوئی ایسی بات تھی کہ نواب کا ہاتھ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ نواب فیروز نے اپنی پشت دیوار کے ساتھ لگا لی اور ہم دونوں کو نشانے پر لے کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا نواب شہریار غصے اور ہیجان کے سبب لرز رہا تھا۔ وہ غرا کر بولا "تمہیں۔۔۔ یہاں اسلحہ لانے کی جرأت کیسے ہوئی اور کس حرام زادے نے تجھے یہاں گھسنے دیا ہے؟"

فیروز جنگ بے باکی سے بولا "دیکھو ڈیڈ! اگر تم اپنے مخالفوں کو حرام زادہ کہتے ہو تو پھر مجھ سمیت اس حویلی میں بیشتر لوگ حرام زادے ہیں۔ ویسے بہتر ہے کہ آپ اپنی زبان قابو میں رکھیں اور بات اس حد تک نہ لے جائیں کہ میں آپ کی کھال کھینچنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

باپ کے لیے ایک بیٹے کا یہ طرز کلام سن کر میں حیران رہ گیا۔ معلوم نہیں یہ خون کا فساد تھا' تربیت کا اثر تھا یا کوئی اور بات؟ بے عزتی کے شدید احساس سے نواب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک پل کے لیے یوں لگا کہ وہ پستول کی پروا کیے بغیر نواب فیروز پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر کسی طرح اس نے خود پر قابو پا لیا۔

"کیا چاہتے ہو تم ہم سے؟" نواب ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ بات آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں جو چیز حاصل کرنا چاہتا ہوں' وہ حاصل کیے بغیر ٹلتا نہیں ہوں۔"

"اور تم بھی یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو گے کہ ہم انکار کر چکے ہیں اور تم ہماری جان تو لے سکتے ہو' ہمارے ارادے نہیں بدل سکتے۔"

"بہت خوب۔۔۔ واٹ اے اسٹیٹمنٹ" نواب فیروز طنز سے بولا۔ "ویسے کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ ان صندوقوں کا کیا بنے گا؟"

"تم ان کا مستقبل اچھی طرح جانتے ہو' ہم وہ تمام صندوق مع سازوسامان انڈین گورنمنٹ کے حوالے کر رہے ہیں۔"

"گورنمنٹ کا یہ نمائندہ آپ کے سامنے بیٹھا ہے"

"ہاں۔۔۔ یہ فیڈرل منسٹر راجندر سنگھ صاحب ہیں۔ ہم ان کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر چکے ہیں۔"

نواب فیروز نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکال کر تاسف کا اظہار کیا اور بولا "بیچاری تو گئی ہی تھی' میرا خیال ہے کہ آپ کے دماغ کا بھی چل چلاؤ ہو گیا ہے۔ میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ اب آپ کو ریٹائر کر کے کسی حجرے میں محفوظ کر دینا چاہیے۔"

نواب شہریار سراپا لرز کر بولا "بدبخت! ابھی ہم میں اتنی طاقت ہے کہ تیرے جیسے دو تین سنپولوں کا سر اپنے پاؤں سے کچل سکیں۔ تو ہمیں زیادہ سے زیادہ گولی ہی مار دے گا نا۔ مار دے گولی' ہم نے بھی تیری پھانسی کا پورا پورا انتظام کر دیا ہے۔"

نواب فیروز نے جیسے باپ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اور بے حد گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے یا پہچان چکا ہے۔ اس کے باریک ہونٹوں پر بے حد زہریلی مسکراہٹ تھی۔ باپ سے مخاطب ہو کر بولا "ڈیڈ! جسے آپ منسٹر راجندر سنگھ سمجھ رہے ہو وہ منسٹر نہیں' کوئی بہروپیا ہے۔ میں صرف ایک ہفتہ پہلے منسٹر راجندر کی تصویر دہلی کے ایک انگریزی روزنامے میں دیکھ چکا ہوں۔ جہاں تک میری نگاہ کام کر رہی ہے' اس شخص کی داڑھی مونچھ بھی مشکوک ہے۔"

"یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے۔ میں تمہیں بہروپیا نظر آ رہا ہوں" میں نے گرج کے کہا۔

"خبردار!" نواب فیروز چلایا "اپنا ہاتھ جیب سے دور رکھو۔ باقی گا تمہیں گولی مار دوں گا۔"

اب اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی اور ٹانگوں میں تھوڑا سا خم تھا۔ یہ فائر کرنے کی آئیڈیل پوزیشن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بیرون ملک قیام کے دوران میں شوٹنگ کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی ہے لیکن "تربیت یافتہ" پستول بردار ایک بات سے بے خبر تھا۔ میری ایک ٹانگ سامنے رکھی ہوئی مختصر تپائی کے نیچے پہنچ چکی تھی۔ تپائی اور پستول کا درمیانی فاصلہ تین گز سے زائد نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں ایک کارگر وار کرنے میں کامیاب رہوں گا۔

جونہی فیروز جنگ کی توجہ باپ کی طرف مبذول ہوئی۔ میری ٹانگ نے حرکت کی' مختصر تپائی اڑتی ہوئی فیروز جنگ کی چھاتی پر لگی۔ تپائی کی "ٹاپ" کے بلوری ٹکڑے ہوا میں اڑتے نظر آئے فیروز جنگ کا سر عقبی دیوار سے ٹکرایا پھر وہ پہلو کے بل نیچے قالین پر گرا۔ میں نے جست لگائی اور اسے جا لیا۔ تپائی پستول والے ہاتھ پر لگی تھی تاہم پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے کلائی موڑ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس موقعے پر

پہلے کہ میں پسٹل اپنے ہاتھ میں لیتا' اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے ایک صوفے کے نیچے پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دائیں ہاتھ کا زوردار مکا میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے ایک طرف جھک کر یہ وار بچایا لیکن اس کوشش میں میں فیروز جنگ کے اوپر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا' اس نے ایکدم زور لگایا اور مجھے اپنے اوپر سے جھٹکنے میں کامیاب رہا۔

میرا تاریک چشمہ اتر کر دور جا گرا تھا۔ اس کامیابی نے فیروز کا حوصلہ بڑھایا اور اس نے اٹھ کر نواب شہریار کی طرف بڑھنا چاہا جو دراز سے اپنا ریوالور نکالنے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے فیروز جنگ کو اڑنگا لگایا اور منہ کے بل گرا دیا۔ فیروز جنگ کے منہ سے اردو و انگریزی مغلظات کا سیلاب امڈ پڑا۔ اس کے بعد میں نے چھوٹے نواب کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ میرے گھونسوں اور ٹھوکروں نے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا۔ اس کے اندر جیسے کوئی بدروح بسی ہوئی تھی۔ وہ میری ہر ضرب پر غضب ناک انداز میں چنگھاڑ رہا تھا۔ غالباً یہ مار کھانے کا انگلش اسٹائل تھا۔ نواب فیروز کی چنگھاڑ نما چیخیں میرے کانوں کو بھلی لگ رہی تھیں۔ شاید ان چیخوں سے میرے اس جذبے کی تسکین ہو رہی تھی جو حرماں نصیب جمیلہ کی حالت زار دیکھ کر میرے دل میں نواب فیروز کے خلاف پیدا ہوا تھا۔ جمیلہ کے کومل جسم پر نواب فیروز کی ہوس نے جو ستم ڈھائے تھے ان کا مداوا تو ناممکن تھا لیکن میرے گھونسے نواب فیروز کے جسم سے کچھ نہ کچھ خراج ضرور وصول کر رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ نواب شہریار ہاتھ میں ریوالور تھامے ایک کونے میں کھڑا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس موقعے پر کیا کردار ادا کرے۔ یہ ساؤنڈ پروف کمرا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ آواز تو باہر گئی ہی ہو گی۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص ریوالور بدست اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر نواب شہریار جنگ کی نگاہوں میں خوف اور نفرت کے تاثرات ابھرے۔ میں ایک ساعت میں جان گیا کہ یہ شخص نواب کے وفاداروں میں شامل نہیں۔ نواب کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور نووارد لڑکھڑا کر ٹوٹی ہوئی تپائی کے قریب گرا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ میں نے سمجھا کہ نواب شہریار نے دوسرا فائر کیا ہے لیکن یہ فائر نواب نے نہیں نووارد نے کیا تھا... اور اس کی چلائی ہوئی گولی نواب شہریار کی عین پیشانی پر لگی تھی۔ قریباً اسی جگہ جہاں ہندو بندیا لگاتے ہیں۔ پیشانی پر گولی کھانے والا عموماً فوراً مر جاتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا۔ میں نے نواب شہریار کو لڑکھڑاتے اور پھر تڑپ کر قالین پر گرتے دیکھا۔

میں نواب فیروز کو ادھ موا چھوڑ کر بے اختیار نواب شہریار کی طرف لپکا۔ خون اس کے چہرے کو رنگین کر چکا تھا اور اب چکنی چکنی سرخ لکیریں اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں گھس رہی تھیں۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ مصنوعی داڑھی "ٹھوڑی اور ایک کان" سے اترنے کے بعد نیچے لٹک رہی ہے۔ غالباً نواب شہریار جنگ کی آنکھوں نے جو آخری منظر دیکھا وہ میرے چہرے کا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اس کی آشوب زدہ آنکھیں پتھرائیں تو ان میں ایک طرح کی حیرت بھی منجمد تھی۔ یہ سارا واقعہ بہت مختصر وقت میں رونما ہوا تھا۔ نووارد کے اندر گھسنے اور دو لاشیں گرنے کے درمیان بمشکل تیس سیکنڈ کا فرق رہا ہو گا۔ میرے سینے میں پسلیوں کے نیچے ہلکی ہلکی ٹیس اٹھ رہی تھی غالباً لڑائی مار کٹائی کے سبب سویا ہوا درد جاگا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ نواب فیروز فرار ہو رہا ہے مگر کہاں سے؟ ساؤنڈ پروف کمرے کا خود کار دروازہ تو بند تھا... لیکن نہیں۔ اس کمرے میں ایک اور دروازہ بھی موجود تھا۔ یہ چھوٹا سا چور دروازہ کسی "میکنزم" کے ذریعے میرے عقب میں کھلا تھا۔ صرف دو تین سیکنڈ پہلے نواب فیروز اسی دروازے سے نکل کر گیا تھا۔ وہ ایک عرصے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ یہاں کا "ہیر پھیر" اسے معلوم تھا۔ آج اس کٹھن وقت میں اس نے ان معلومات سے فائدہ اٹھایا تھا اور نکل بھاگا تھا۔ یہ دروازہ نواب شہریار نے نہ جانے کب اور کس مقصد کے لیے بنوایا ہو گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اس کا بیٹا اسے قتل کروائے گا اور پھر اسی چور دروازے کے ذریعے راہ فرار اختیار کرے گا۔

میں نے نواب شہریار جنگ کی بے جان مٹھی میں سے ریوالور کھینچا اور کارندے کی لاش پھلانگ کر نواب فیروز کے پیچھے لپکا۔ یہ دروازہ ایک سرنگ نما طویل راستے میں کھلا تھا۔ سرنگ اندر سے پلستر شدہ تھی اور چھت پر نصب لائٹس روشنی بکھیر رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان لائٹس کا کنکشن براہ راست "چور دروازے" سے تھا۔ دروازہ کھلتے ہی یہ لائٹس روشن ہو جاتی تھیں۔ سرنگ نما راستے میں میرے بھاگتے قدموں کی چاپ دور تک گونج رہی تھی۔ میں نے ایک لحہ رک کر فیروز جنگ کے قدموں کی چاپ سننے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ وہ مجھ سے چالیس پچاس گز کی دوری پر موجود تھا۔ میں ایک بار پھر پوری رفتار سے اس کے پیچھے لپکا۔ مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ فیروز جنگ پلٹ کر مجھ پر فائر کر دے گا۔ اگر اس کے پاس پسٹل یا ریوالور ہوتا تو وہ کمرے سے بھاگتا ہی کیوں؟ غالباً اس نے افراتفری میں اپنا پسٹل ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ صوفے کے نیچے کہیں گھس چکا تھا۔ اس کے ہلاک ہونے والے کارندے کا ریوالور اس کے بے جان جسم کے نیچے ہی دب گیا تھا لہٰذا وہ بھی فیروز جنگ کو نظر نہیں آیا تھا۔ اب وہ خالی ہاتھ خوف زدگی کے عالم میں میرے آگے بھاگ رہا تھا۔ جلد ہی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ سرپٹ بھاگ رہا تھا اور ایک دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کیا [illegible] وہ بری طرح اچھلا اور اگلے ہی لمحے [illegible] نکل گیا۔

میں جب دوڑتا ہوا دروازے پر پہنچا تو نواب فیروز کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لوہے کا یہ چھوٹا سا دروازہ ایک ٹیوب ویل کے کمرے میں کھلا تھا۔ نیچی چھت والے اس کمرے میں ٹیوب ویل کے ڈرم اور ...بل وغیرہ پڑی تھی۔ ٹیوب ویل بند تھا۔ اس کمرے کا بیرونی دروازہ لکڑی کا تھا اور وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس دوسرے دروازے میں سے بھی گزر گیا۔

میرے سامنے دور دور تک کھیت اور درخت تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ غالباً ایک بجے کا وقت تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ نواب فیروز کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیے۔ اسے ڈھونڈنا اب کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں کسی بھی کھیت میں چھپ کر بیٹھ سکتا تھا یا کماد کی اونچی فصل میں گھس کر دور نکل سکتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر نواب شہریار کا ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اصولی طور پر مجھے اتنا جلدی "ریلیکسڈ" نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرا حریف کہیں پاس ہی چھپا ہو اور حملہ کرنے کی کوشش کرے لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ نواب فیروز جس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا وہ واپس پلٹ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا میرے طوفانی مکوں کی دھمک وہ ابھی تک سر میں محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا ہو گا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

میں نے دیکھا سامنے کچھ فاصلے پر اسی مسجد کا مینار نظر آ رہا تھا جس کے پاس سے چند روز پہلے نواب شہریار کو اس کے ناخلف فرزند فیروز جنگ نے اغوا کیا تھا۔ پختہ سڑک مسجد کے قریب ہی سے گزرتی تھی۔ میں تیزی سے سڑک کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اب میرے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد حویلی سے بلکہ اس جاگیر سے نکل جاؤں' نواب شہریار جنگ قتل ہو چکا تھا اور جلد ہی پورے علاقے کی پولیس حویلی پر یلغار کرنے والی تھی۔ معلوم نہیں کس کس پر "تفتیش کی آفت" آنی تھی اور کس کس کو قاتل ٹھہرایا جانا تھا۔ یہ جو خاموشی قرب و جوار میں نظر آ رہی تھی یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔

میں کھیتوں کے درمیان سے راستہ بناتا پختہ سڑک پر پہنچا۔ مجھے کسی سواری کی تلاش تھی جو مجھے جلد از جلد اس خطرناک علاقے سے دور لے جا سکے۔ کار' جیپ' ٹریکٹر ٹرالی' موٹر سائیکل' اس وقت کچھ بھی مل جانا غنیمت تھا' زریں گل اور فریال دو بجے گھڑیال کے بجنے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے سب سے پہلے ان تک پہنچنا تھا اور پھر آئندہ لائحہ عمل بنانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ اتنی جلدی گاڑی کا نظر آ جانا "محال" تھا۔ میں چوکس ہو گیا لیکن جب گاڑی نزدیک پہنچی تو میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ گاڑی میرے پاس سے گزری اور دس بیس گز آگے جا کر رک گئی۔ میرے دل میں سنسنی سی لہر دوڑ گئی۔ گاڑی ریورس ہو کر میرے پاس پہنچی اور اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر نے تھانے داری لہجے میں پوچھا "اوئے! کون ہو تم؟ ادھر آؤ۔"

یہ گشتی پولیس تھی اور ان لوگوں کو مجھ پر شک ہو چکا تھا۔ نواب کے قتل کی خبر اتنی جلدی پولیس تک پہنچ جاتی یہ تو ناممکن تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ پولیس والے معمول کی گشت پر تھے اور رات کے اس پہر مجھے تنہا گزرتے دیکھ کر "مال پانی" کے چکر میں رک گئے تھے۔ یہ اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ میں پولیس جیپ کے قریب پہنچا تو موٹی گردن والے کرخت چہرہ سب انسپکٹر نے مجھے سرتاپا گھورا اور بولا "کہاں سے آ رہے ہو سردار جی؟"

اس نے مجھے سردار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ مسٹر راجندر سنگھ والی پگڑی ابھی تک میرے سر پر موجود تھی۔ میں نے کہا "کرنول سے آیا ہوں۔ یہاں حیدر آباد میں میرے ایک دوست کی شادی ہے۔ چار پانچ میل پیچھے میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اس وقت کوئی مکینک بھی نہیں مل رہا۔ سخت مصیبت میں ہوں۔"

سب انسپکٹر نے کہا "مکینک ڈھونڈنے تمہیں بڑی سڑک پر جانا تھا یا یہاں کھیتوں میں مکینک ڈھونڈ رہا تھا؟"

میں نے کہا "کسی نے بتایا ہے جی کہ یہاں کسی نواب صاحب کی حویلی ہے۔ ان کے پاس ایک پرانا ڈرائیور ہے جو مکینک کا کام بھی کرتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ترلا کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"

"گاڑی کی چابی کہاں ہے؟" سب انسپکٹر نے ایک نہایت برمحل اور بروقت سوال کیا۔

میں ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ میں قلق قلب کے ساتھ ٹویوٹا جیپ میں حویلی پہنچا تھا۔ جس اسکوڈا کار پر ہم بدھیڑی شریف گاؤں پہنچے تھے اس کی ڈرائیونگ زریں گل نے کی تھی لہٰذا اس کی چابی زریں گل کے پاس تھی۔ میری جیب میں گاڑی کی کیا کسی نے کی چابی بھی نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں تھانے دار کی ذہانت کو کوسا اور پھر فوراً بگڑ کر کہا "کیا بات ہے انسپکٹر! میں تمہیں شکل سے چور ڈاکو نظر آ رہا ہوں جو اس طرح مجھے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے۔ میں باعزت شہری ہوں اور اتنا باحیثیت بھی ہوں کہ ٹیڑھے میڑھے بندوں کو سیدھا کر سکتا ہوں۔"

دھمکی کارگر نہ ہوئی۔ سب انسپکٹر جارحانہ انداز میں جیپ سے اتر آیا "تم تو جب سیدھا کرو گے... تب کرو گے' اگر تم نے اپنی شناخت نہ کروائی تو میں ابھی تمہیں سیدھا کر دوں گا۔" پھر اس نے غور سے میرے رخسار اور کنپٹی پر چپکی ہوئی سفید پٹی کو دیکھا اور بولا "یہاں کیا ہوا ہے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "شہد کی مکھیوں نے کاٹا ہے۔"

دو رائفل بردار ہیڈ کانسٹیبل بھی جیپ سے اتر آئے۔ ان میں سے ایک بولا "سر' یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تھانے لے جا کر اس کی خاطر تواضع کرنی پڑے گی۔"

تھانے دار نے مجھے سرتاپا گھورا اور ہیڈ کانسٹیبل سے بولا "بٹھاؤ اس کو گاڑی میں۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے غصیلے انداز میں مجھے رائفل سے ٹھوکا دیا اور بولا "چل اوئے حیدر خان بیٹھ جیپ میں۔ باقی کا دکھ سکھ تھانے میں چل کر کریں گے۔"

میں اس وقت دنگے فساد میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ ان تین عدد پولیس والوں سے دو عدد رائفلیں چھین کر انہیں مرغا بنانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میری جیب میں چھ سات سو روپے کی رقم موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ ان کتوں کے منہ میں ہڈی دے کر اپنا وقت بچاؤں۔ پھر شاید میں ایسا کر بھی گزرتا مگر اسی اثنا میں سب انسپکٹر کی نگاہ میری پتلون کی پھولی ہوئی جیب پر پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے جیب کو چھوا اور ریوالور کی سختی محسوس کر کے بولا "اوئے! یہ تیری جیب میں کیا ہے؟"

میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے کہا "اگر چپ چاپ جیپ میں بیٹھ کر کھسکتے بن جاؤ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ورنہ ریوالور ہے اور اس میں ابھی چار گولیاں باقی ہیں۔ تم تینوں کو سورگ باشی کرنے کے بعد ایک پھر بھی بچ جائے گی۔"

میرے بدلے ہوئے لہجے نے سب انسپکٹر کو ٹھٹکا دیا۔ وہ چونکنا لہجے میں بولا "دھمکی دیتا ہے؟"

میں نے اسے ایک شاندار گالی سے نوازنے کے بعد کہا "دھمکی وہی دیتا ہے جو کچھ کر سکتا ہے۔ ورنہ تم جیسوں کے آگے تو لوگ ہاتھ جوڑتے ہیں اور پاؤں پڑتے ہیں۔"

ہیڈ کانسٹیبل رائفل سیدھی کر رہا تھا جب میں نے لپک کر رائفل کا بیرل تھاما اور ایک زوردار ٹانگ اس کے سینے پر جمائی۔ دبلا پتلا کیلے کے چھلکے جیسا لیکن بے حد غصیلا کانسٹیبل اچھل کر دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں نے رائفل دوسرے کانسٹیبل اور تھانے دار کی طرف سیدھی کی۔ کانسٹیبل نے بھی اپنی رائفل میری طرف سیدھی کر لی تھی اور یہی نہیں تھانے دار نے بھی کمال پھرتی سے اپنا سرکاری ریوالور مجھ پر تان لیا تھا۔ کرکٹ کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ میرے زبردست چوکے کے بعد میچ "ٹائی" ہو گیا تھا۔ پولیس والے ہی نہیں میں بھی نشانے پر تھا۔

پولیس والے میری توقع سے زیادہ پھرتیلے اور ڈھیٹ ثابت ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ بدبخت آسانی سے میری جان نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے چہرے خوف سے دھواں دھواں تو ہو رہے تھے لیکن آنکھوں میں یہ تہیہ بھی تھا کہ ٹھیک ہے ' دیکھتے ہیں تم کس حد تک جاتے ہو' ان کی آنکھوں میں یہ "تہیہ" دیکھ کر مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ ابھی کچھ نہیں ہوا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ میرے ہاتھوں زبردست نقصان اٹھائیں گے اور پھر ایک اسٹیج ایسا آئے گا جب یہ روئیں بلکیں گے اور مجھ سے جان بخشی کی اپیلیں کریں گے۔ وہ بے خبری میں میرے اندر کے سفاک جہانگیر کو بیدار کر چکے تھے۔

یکایک ایک کار کی ہیڈ لائٹس ہم پر پڑیں اور ہم جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔ زرد رنگ کی ایک شاندار مرسڈیز فراٹے بھرتی ہمارے قریب رکی اور اس میں سے مسٹر جی کلارک ایک بارعب شخص سمیت برآمد ہوئے۔

"وحاٹ از دس۔ وحاٹ از گوئنگ آن ہیئر" مسٹر جی کلارک نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

یہی سوال مسٹر جی کلارک کے ایڈین ساتھی نے اردو میں تھانے دار سے پوچھا۔ تھانے دار کا ریوالور والا ہاتھ خودبخود نیچے ہو گیا۔ اسے دیکھ کر ہیڈ کانسٹیبل نے بھی اپنی رائفل جھکا لی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تھانے دار مسٹر جی کلارک کے ساتھ آنے والے بارعب ایڈین کے سامنے مؤدب نظر آنے لگا ہے۔ بارعب ایڈین اور خوردماغ تھانے دار کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ ایڈین کسی مجسٹریٹ کا سگا بھائی ہے اور مسٹر جی کلارک کا جاننے والا ہے۔ اس نے سب انسپکٹر کو اس بات پر بری طرح لتاڑا کہ وہ ایک شریف شہری کو بے جا طور پر روک کے کھڑا ہے اور اسے کے زور پر اسے تھانے لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے میری ضمانت دیتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور میرے حوالے سے ہر طرح کی ذمے داری لیتا ہے۔ تھانے دار نے پولیس والوں کی مخصوص ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مجھے اس طرح نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ میں نے پولیس پارٹی پر باقاعدہ حملہ کیا ہے اور اہلکار سے سرکاری رائفل چھینی ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ناجائز پستول بھی موجود ہے۔

مجسٹریٹ کے بھائی اور تھانے دار میں تھوڑی دیر تکرار ہوئی۔ پھر تھانے دار ڈھیلا پڑ گیا۔ مجسٹریٹ کا بھائی اسے ایک طرف لے گیا اور تھوڑی دیر "گٹ مٹ" کی۔ اس گٹ مٹ میں غالباً اعلیٰ غیر ملکی شخصیت (مسٹر جی کلارک) کا ذرا ذرا بھی دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس والوں نے اپنی چھینی ہوئی سیون ایم ایم واپس لینے کے بعد اپنی راہ لی اور مسٹر جی کلارک مجھے لے کر شاندار مرسڈیز میں آ بیٹھے۔ مرسڈیز میں ڈرائیور کے علاوہ ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ وہ شخص ایک چادر اوڑھے ہوئے تھا اور نشست پر بیٹھنے کے بجائے دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ سفر کرنے کا یہ خاص انداز سائیں عالی ہی اختیار کیا کرتا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ سائیں عالی ہی تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا اور پہلے سے زیادہ پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ یہ شخص بالکل اچانک سامنے آتا تھا اور حیران کرتا تھا۔ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس ٹھٹھری ہوئی شب میں اس نیم گرم مرسڈیز کے اندر سائیں عالی سے ملاقات ہو جائے گی۔

مسٹر جی کلارک سائیں عالی کے پاس پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مجسٹریٹ کا بھائی جس کا نام عبدالعزیز تھا' ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ مرسڈیز ایک فرحت بخش ہچکولے کے ساتھ حرکت میں آئی اور غیر معمولی رفتار سے اس بڑی سڑک کی جانب بڑھنے لگی جو حیدرآباد جاتی تھی۔ جب ہم بڑی اور چھوٹی سڑک کے سنگم پر پہنچے تو پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ پھر چند گاڑیاں بگٹٹ رفتار سے حویلی کی طرف جاتی نظر آئیں۔ حویلی جہاں اس علاقے کے سب سے بڑے نواب اور اس جاگیر کے مالک شہار جنگ کی لاش پڑی تھی۔ چند روز پہلے اس نے اپنی جیل ختم کر کے قیدیوں کو رہائی دی تھی' آج وہ خود بھی قید زندگی سے رہائی پا گیا تھا۔

جونہی ہم بڑی سڑک پر پہنچے' مسٹر جی کلارک نے رخ میری طرف پھیرا اور کار کے اندر چھائی ہوئی بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "مسٹر شاہ جہاں! آتی قلب کی زبانی مجھے اور مجھی کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ نواب شہار تمہارے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔"

"نواب میرے ہاتھوں نہیں' اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوا ہے" میں نے فوراً جی کلارک کو ٹوکا۔

وہ بے پروائی سے بولا "چلو یہ بھی ٹھیک ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے ہاتھ نواب کے خون سے محفوظ رہے۔ بہرحال میں اس وقت جو بات کہنا چاہ رہا ہوں وہ دوسری نوعیت کی ہے۔ اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہے بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ تمہاری سلامتی سے ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مسٹر جی کلارک کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش ہے اور وہ اس کوشش میں الفاظ چبا چبا کر ادا کر رہے ہیں کہ میں ان کی بات کو قرار واقعی اہمیت دوں' میں نے کہا "آپ فرمائیے' میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

امریکی ادب چی نے سلسلۂ کلام جوڑنے سے پہلے اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرا تو اس کی کلائی پر دنیا کی مہنگی ترین رسٹ واچ دمک رہی تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مسٹر شاہ جہاں! میں تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہ رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری زندگی اس وقت شدید خطرے میں ہے۔"

میں نے مطمئن انداز میں کہا "جناب! خطرہ تو آپ کسی وقت دوست جُدا نہیں ہوتا۔"

وہ بولا "شنکر بھارتی نام کے شخص کو جانتے ہو تم؟"

میرے رگ و پے میں ایک سیال آگ سی دوڑ گئی۔ دل پوری قوت سے دھڑکا اور جسم میں سوئی ہوئی کوئی ایسی خفتہ قوت بیدار ہو گئی جو صرف اور صرف میرے ازلی دشمن کے لیے میری رگ و پے میں محفوظ رہتی تھی۔ میں نے مسٹر جی کلارک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "کہاں ہے شنکر بھارتی؟"

"تمہارے بہت قریب۔ وہ تمہارے آس پاس پہنچ چکا ہے" مسٹر جی کلارک نے لرزاں آواز میں جواب دیا "اور وہ اکیلا نہیں ہے' تمہارا ایک بہت خاص اور بہت خطرناک دشمن اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کا نام لوں گا اور تم فوراً پہچان جاؤ گے۔"

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا "شیخ عاصم بن الرشد۔"

وہ بولا "تم درست نتیجے پر پہنچے ہو۔"

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ شیخ عاصم عرصہ سات سال سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور اس بدلے کی خاطر وہ اب تک بے شمار دولت اور وقت خرچ کر چکا تھا۔ اسے میری خوش قسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ میں نے چار سال جیل میں گزارے تھے ورنہ اب تک شیخ اور اس کے گماشتے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ اب شیخ عاصم نے نئی حکمت عملی اختیار کی تھی' اس نے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل کی تھیں جو پہلے ہی میرے خون کا پیاسا تھا اور جس کے بارے میں میں یہ تسلیم کرتا تھا کہ وہ مجھ سے بہتر نہیں تو کمتر بھی نہیں۔ وہ ایک ایسا حریف تھا جس کا سامنا مجھے اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی کئی بار مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میں اس سے مبارزت کا حق ادا نہیں کر پایا۔

میں نے مسٹر جی کلارک سے پوچھا "آپ نے شنکر بھارتی کو کہاں دیکھا ہے؟"

وہ بولا "شنکر کو حیدرآباد میں دیکھا گیا ہے۔ وہ جس ہوٹل میں قیام پذیر ہے وہاں شیخ عاصم بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق شنکر کے کم و بیش دو درجن قریبی ساتھی بھی حیدرآباد میں موجود ہیں اور فرضی ناموں سے مختلف ہوٹلوں میں مقیم ہیں۔ ان سب لوگوں کا آپس میں رابطہ ہے اور وہ ہر جگہ تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

ہمارے درمیان یہ ساری گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔ سائیں عالی بالکل لاتعلق بیٹھا تھا۔ گفتگو تو دور کی بات ہے اس نے میری موجودگی کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔ میں نے مسٹر جی کلارک سے کہا "اگر آپ مجھے شنکر شکرا سے بچانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں معذرت چاہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ جس روز میں نے اس شخص سے بچنے کی کوشش کی اسی روز مارا جاؤں گا۔ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ اگر وہ خود یہاں پہنچ گیا ہے تو یہ بڑا سنہری موقع ہے اس سے فیصلہ کرنے کا۔"

مسٹر جی کلارک نے کہا "فیصلہ تو اس وقت ہوتا ہے جب کھلے میدان میں ایک شخص کا مقابلہ ایک شخص سے ہو۔ مگر یہ لوگ تو نہایت خطرناک قاتلوں کی پوری فوج لے کر تم پر چڑھ دوڑے ہیں۔ یہ بہادری نہیں بدترین قسم کی چالبازی ہے۔ میں تمہیں اس

چالبازی کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔ ہم آج اور اسی وقت حیدر آباد چھوڑ رہے ہیں۔"

"کہاں جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"بھوپال" مسٹر جی کلارک نے جواب دیا "وہاں میرا ذاتی ہوٹل موجود ہے۔ میں نے تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے رہنے کا انتظام کرلیا ہے۔"

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ مسٹر جی کلارک میرے بارے میں بڑے فکرمند ہیں۔ ایسی فکرمندی تو مسٹر کلارک جیسے لوگ اپنے قریبی عزیزوں کے لیے بھی محسوس نہیں کرتے۔ پھر مجھ پر یہ عنایت خاص کیوں تھی؟ کیا اس میں سائیں عالی کی کوئی کرشمہ کاری تھی؟ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔

حویلی سے سات آٹھ میل دور آنے کے بعد ہمیں ایک ایمبولینس اور پولیس کی چند اور گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ میرے تصور میں بار بار نواب شہریار جنگ کی لاش آرہی تھی اور کانوں میں وہ ماتمی چیخ و پکار گونج رہی تھی جو آج حویلی سے بلند ہو رہی تھی۔ طبیعت میں عجیب بے چینی سی تھی۔ ساؤنڈ پروف کمرے میں لڑائی کے دوران میں سینے میں جو ٹیس اٹھی تھی وہ ہلکے ہلکے درد میں بدل چکی تھی۔ شاید یہ منحوس درد ایک بار پھر مجھے شکنجے میں لینے والا تھا۔

مسٹر جی کلارک نے پوچھا کہ میرے ساتھی کہاں ہیں؟ میں نے ڈرائیور کو چودھری شریف والے بنگلے کا پتا بتا دیا۔ ڈرائیور مقامی تھا۔ وہ ہمیں سیدھا بنگلے پر لے گیا۔ یہاں جلی ہوئی اینٹوں والے مکان میں فریال اور زریں گل بے قراری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے ساتھ مسٹر جی کلارک اور سائیں عالی کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ ہم نے انہیں بھی مرسیڈیز میں ساتھ ہی بٹھا لیا۔ منسٹر راجندر سنگھ کی مشکیں کس کر اسے تہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ میں نے منسٹر کے بارے میں قلی قطب کے ساتھی کو ہدایت کی کہ وہ منسٹر کو (مشکیں کھولے بغیر) پورے پروٹوکول کے ساتھ اسکوڈا کار میں ڈالے اور بنگلے سے تین چار میل دور کھیتوں میں چھوڑ آئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دیا کہ کار چھوڑنے سے پہلے کار کے اندر اور باہر انگلیوں وغیرہ کے نشانات صاف کردیے جائیں۔

مرسیڈیز صرف ایک گھنٹے میں محبوب آباد پہنچ گئی۔ محبوب آباد سے آگے سڑک کی حالت اچھی تھی اور وہ کشادہ بھی تھی پھر رات کا آخری پہر تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈرائیور نے سبک گام گاڑی کو "ہوائی جہاز" بنادیا۔ حیدر آباد سے قریباً ساٹھ میل شمال کی طرف آنے کے بعد گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی ایک اسٹیشن ویگن کے پاس رکی۔ اسٹیشن ویگن کے شیشے تاریک تھے۔ تاریک شیشوں کے پیچھے سے مجتبیٰ کنور برآمد ہوا اور مرسیڈیز میں بیٹھ گیا۔ ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا جگر ہید کا بھائی اسٹیشن ویگن میں منتقل ہوگیا۔ بھوپال کی طرف ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔ دس گیارہ گھنٹے کی طویل مسافت میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا

اور ہم دو بجے سہ پہر بھوپال پہنچ گئے۔ میرا یہ خیال غلط نکلا کر مسٹر جی کلارک ہمیں اسی ہوٹل میں ٹھہرائیں گے جس کے بارے میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ وہ ان کا اپنا ہوٹل ہے۔ مرسیڈیز کینٹ کے علاقے میں ایک شاندار رہائشی عمارت کے سامنے رکی۔ یہ عمارت اپنے جیسی بہت سی دوسری شاندار عمارتوں میں گھری ہوئی تھی۔ پہلے ہم ایک وسیع و عریض اور نہایت آراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچے پھر اپنے اپنے بیڈ روم میں منتقل ہوگئے۔ یہیں پر ہم نے شام کا اخبار دیکھا جس میں نواب شہریار جنگ کے قتل کی خبر شہ سرخیوں سے شائع ہوئی تھی۔ تفصیل میں لکھا گیا تھا کہ کل رات بارہ اور دو بجے کے درمیان نواب شہریار جنگ کو ان کی قیام گاہ میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ ان کا ایک ملازم بھی جاں بحق ہوا۔ حملہ آور موقع سے فرار ہوگئے۔ اس قتل کے سلسلے میں نواب کے بیٹے فیروز جنگ اور اس کے ساتھیوں پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ تاہم اس کے علاوہ بھی پولیس کئی سمتوں میں تفتیش کررہی تھی۔ میں نے اخبار کو اچھی طرح کھنگالا لیکن اس میں منسٹر کے اغوا اور رات بے جا میں رکھے جانے کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی' نہ ہی ان بموں کا ذکر تھا جو منسٹر کی پتنی اور پی اے کی ٹانگوں سے باندھے گئے تھے۔

ہم سب الگ الگ بیڈ رومز میں مقیم تھے۔ جہازی سائز کے یہ بیڈ روم شاہانہ طرزِ رہائش کا بہترین نمونہ تھے۔ سروس کے لیے بہترین تربیت یافتہ مردانہ زنانہ عملہ موجود تھا۔ وہ رات ہم نے اپنے اپنے کمرے میں سو کر گزاری۔ اگلے روز علی الصباح زریں گل میرے کمرے میں آن دھمکا۔

"استاد صیب! ام آپ کے پاس فریال بی بی کی سفارش لے کر آیا ہے۔ آپ ان سے ناراضگی ختم کردیں۔ ورنہ فریال بی بی کے ساتھ ساتھ امارا دل بھی سخت پریشان رہے گا۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا "تم دونوں کے چہروں سے تو نہیں لگتا کہ تم پریشان ہو۔"

زریں گل بولا "آپ امارے چہرے کا بات مت کریں۔ امارا چہرہ تو ہے ہی بے ڈھنگا۔ امارے منہ میں نسوار ہے' ام جھوٹ نہیں بولے گا۔ ام ساری رات ایک دم پریشان رہا ہے بلکہ ساری رات گنگناتا رہا ہے' ستارو تم تو سو جاؤ' کم بختو' پریشاں رات ساری ہے۔"

میں نے کہا "گانے میں کم بختو کا لفظ تمہارا ایجاد کردہ ہے۔"

وہ بولا "اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ ام کتنا پریشان ہے۔ فریال بی بی دل کا برا لڑکی نہیں ہے۔ بس ذرا آزاد خیال اور شوخ ہے۔ کھلاڑی ہے نا۔ اور کھلاڑی لوگ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیچارہ کبھی وہ کتنی دور سے آپ کے لیے چل کر یہاں آیا ہے۔ ام تو سمجھتا ہے کہ ...."

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "زیادہ وکالت کی ضرورت نہیں' اسے ذرا میرے پاس لے کر آؤ۔"

دروازہ کھلا اور فریال دھاکے سے اندر آگئی "ہمیں حاضر ہوں صاحب جی۔ میرا مطلب ہے استاد صیب۔ دراصل میں ناراض تھی۔ مجھے پتا تھا کہ آپ مجھے یاد کریں گے۔ فرمایئے کس طرح ناراضگی دور کرسکتی ہوں آپ کی؟"

میں نے کہا "مختو مین چھوڑ کر اور آرام سے یہاں بیٹھ کر اور بتا کر کہ تمہارا کون سا ٹانکا ڈھیلا ہے جسے کسا جاسکے۔"

وہ ادا سے مسکرائی "توبہ اللہ کتنے شرارتی ہیں آپ۔ مجھے پتا کون سا ٹانکا ڈھیلا ہے تو خود نہ کس لیتی؟"

میں نے کہا "دیکھو فریال! تم حد سے تجاوز کررہی ہو۔ اگر صاحب کو پتا چلے کہ تم نے سیکی سے ملنے کا صرف بہانہ بنایا یہ بھی پتا چلے کہ تم اس وقت کتنے خطرات کو دعوت دے تو انہیں کس قدر صدمہ پہنچے گا؟"

بولی "آپ فکرمند نہ ہوں۔ ساہی صاحب میرے والد ہیں نہیں۔ میں انہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں کبھی ان سے جھوٹ تو بول لیتی ہوں لیکن ان کے اعتماد اور کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میرے جھوٹ برداشت کرلیتے ہیں۔"

تمہاری سیکی اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ حیدر آباد ہی میں ہے۔ میں نے اسے فون کردیا تھا۔ وہ روز وہاں سیر سپاٹا کرے گی۔ میں اتنی دیر آپ کے ساتھ لوں گی۔"

گل نے کہا "یہ سیر سپاٹا نہیں فریال بی بی! آگ اور خون ہے۔ آپ بالکل پھول کے مافق نرم و نازک ہے۔ استاد طرح ام بھی نہیں چاہتا کہ آپ اس آگ کے قریب

اللہ میں مرجاؤں "اتنی محبت۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اس قدر چاہتے ہیں۔ اب تو میں بالکل ہی آپ کا ساتھ سکتی۔" وہ تالی بجا کر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ آنکھیں پٹ پٹا کر بولی "توبہ کا کلو رہ بنایا ہے کسی نے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ غلط کام کرتے ہیں اور اوپر سے رعب بھی جھاڑتے ہیں۔ ذرا' کتنے دن دوائی کھائی ہے آپ نے پاکستان سے ایسی چکر نہیں چلاتا ہے' بالکل ٹھیک بتاتا ہے۔"

نے کہا "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے تم اس میں دخل مت

نے آنکھیں پھاڑیں "جی نہیں۔ یہ کوئی آپ کا ذاتی تماشا ہے۔ جب بندے کے منہ سے تکلیف کی وجہ سے "ہائے" تو پھر یہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں رہتا۔ میں جانتی ہوں' بہاں آکر ایک دن بھی دوائی نہیں کھائی ہے اور یہ بھی کہ آپ کا ذہن اس وقت کوئی معقول سا بہانہ سوچ رہا

ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ بہانہ پھر بہانہ ہوتا ہے۔ اور ...."

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور فریال کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان رک گئی۔ فون کمرے کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ زریں گل فون سننے گیا تو فریال قدرے سنجیدگی سے بولی "شاہ جہاں صاحب! مجھے پتا چل گیا ہے کہ جی کلارک صاحب ہمارے لیے اور خاص طور پر آپ کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سائیں عالی کے مرید بن گئے ہیں" فریال نے جواب دیا "میں نے خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کل رات وہ سائیں عالی کے ساتھ قالین پر بیٹھے تھے اور بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ مجتبیٰ کنور صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ وہ سائیں عالی کی باتوں کا انگریزی میں ترجمہ کررہے تھے۔"

"کیا باتیں ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"اف اللہ۔ آپ کتنے پیارے لگ رہے ہیں اس طرح سرگوشیوں میں بات کرتے ہوئے۔ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ پتا نہیں کیا باتیں ہو رہی ہیں لڑکی لڑکے میں۔"

"تم پھر پٹری سے اتر رہی ہو" میں نے ڈانٹا۔

"ہاں۔ کیا سوال پوچھا تھا آپ نے مجھ سے" وہ بولی۔ پھر خود ہی ماتھا ٹھونک کر کہنے لگی "ان کی باتیں تو میں نہیں سن سکی لیکن اتنا پتا ضرور چل رہا تھا کہ سائیں عالی نے مسٹر کلارک پر اپنا جادو چلا دیا ہے۔"

"کیسا جادو؟"

وہ چند لمحوں کے لیے کہیں کھو گئی۔ بالکل ساہی صاحب کے انداز میں۔ جیسے کوئی پیچیدہ گتھی سلجھا رہی ہو۔ اس کے ماتھے پر اب بندیا نہیں تھی اور نہ ہی مانگ میں سیندور تھا۔ اب وہ لباس بھی مسلمان لڑکیوں جیسا پہنے ہوئے تھی۔ چند لمحے بعد بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "دیکھیں نا۔ سائیں عالی کئی بار یہ کہہ چکا ہے کہ چھتے پل والی حویلی سے جو دفینہ نکلا ہے اس تک کوئی پہنچ سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ اس نے ارجمند بانو سے یہی بات کہی تھی جس کی وجہ سے وہ آپ کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اب اس نے یہی بات مسٹر جی کلارک کے ذہن میں بٹھادی ہوگی۔ مسٹر جی کلارک نے فوراً سوچا ہوگا کہ آپ پر قابو پایا جائے۔ بس وہ آپ کو اور ہمیں یہاں لے آیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ شنکر شکرا کی آمد والی بات جھوٹ ہے؟"

"ہوسکتا ہے کہ جھوٹی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سچ ہو۔ بہرحال یہ بات اب طے ہے کہ مسٹر جی کلارک آپ کی دیکھ بھال اور حفاظت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ دولت اور وسائل کی ان کے پاس کوئی کمی نہیں۔ وہ آپ کی حفاظت کے لیے بندوقیں' پستول ہی نہیں ٹینک' توا کا طیارے اور بحری جہاز تک

مہیا کر سکتے ہیں۔"

فریال جب سنجیدگی سے بولتی تھی تو بہت درست بولتی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی رہی باتیں میرے اپنے ذہن میں بھی جگہ بنا رہی تھیں۔ سائیں عالی کے سامنے مسٹر جی کلارک کا مؤدبانہ رویّہ میں نے سفر کے دوران میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ اب فریال کے بیان کے بعد اس امر میں شک وشبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مسٹر جی کلارک صاحب سائیں عالی کی روحانیت سے متاثر ہو گئے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد مجھے پھر درد شروع ہو گیا۔ فریال کی موجودگی میں اگر میرے چہرے پر درد کے تاثرات ابھرتے تو وہ شور مچانا شروع کر دیتی لہٰذا میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دو تین گولیاں ڈسپرین کی بغیر پانی کے نگلیں اور لیٹ گیا۔ نہ جانے کبھی کبھی کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ سینے میں پسلیوں کے نیچے کچھ ہے۔ پچھلے دو ہفتے میں یہ سنسنی خیز خیال بھی چند بار ذہن میں آیا تھا کہ کہیں میری بے خبری میں میرے سینے کے اندر کوئی آلہ وغیرہ تو نہیں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اس سائنٹیفک دور میں آپریشن کے ذریعے انسانی یا حیوانی جسم میں مختلف نوعیت کے آلات رکھنا معمول کی بات ہے۔ ممکن تھا کہ میرے ساتھ بھی کسی موقعے پر ایسی کارروائی کر دی گئی ہو۔ میں اپنے بدخواہوں میں گھرا ہوا تھا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے کہ جب میں بے ہوش بھی رہا تھا۔ اس بے ہوشی کے دوران میں ایسی کارروائی با آسانی کی جا سکتی تھی لیکن یہاں دو سوال ابھرتے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر میرا آپریشن کیا گیا تھا تو آپریشن کا نشان کہاں تھا۔ دوسرا یہ کہ پشاور میں جب فریال نے میرے ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو ایکسرے یا الٹرا ساؤنڈ میں وہ آلہ نظر کیوں نہیں آیا؟

ڈسپرین نے درد کو رہا کر کم کیا تو میرا دھیان ایک بار پھر اسی غم کے دشت میں چلا گیا جو کئی ماہ سے مجھے جھلسا رہا تھا۔ میرا دوست، میرا غمگسار صفدر کہاں تھا۔ کیوں اس کی جدائی طویل تر ہوتی جا رہی تھی جیسے اس کے پاس پہنچ کر بھی اس سے دور ہو جاتا تھا۔ نواب شہریار کی ناگہانی موت سے پہلے میری آس بندھ چکی تھی کہ شاید میں ایک آدھ دن میں بچھڑے ہوئے دوست کی صورت دیکھ سکوں لیکن لبِ بام کے نزدیک کمند پھر ٹوٹ گئی تھی۔ نواب کی موت کے ساتھ ہی دفینہ اور دو لینے کے ساتھ ہی صفدر مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ صفدر کی یاد میں میرا دل ڈوبنے سا لگا۔ اس کے مسکراتے ہونٹ، روشن آنکھیں، ذہین پیشانی، غرض چہرے کا ہر ہر زاویہ میرے تصور میں چمکا۔ وہ کیوں مجھے اتنا اپنا سا لگتا تھا۔ وہ میری زندگی میں آندھی کی رفتار سے آیا تھا اور نکل گیا تھا۔ بقول ناصر کاظمی۔

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ

عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

صفدر کے بارے میں سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو فریال شب خوابی کا گاؤن پہنے میرے سرہانے کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نیند کی حالت میں کراہ رہا ہوں۔ دراصل ڈسپرین کھائے ڈھائی تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ دوا کا اثر ختم ہونے پر درد پھر جاگ اٹھا تھا اور میں سوتے میں آہیں بھرتا رہا تھا۔ میری آواز سن کر ہی فریال میرے کمرے میں آئی تھی۔ میں نے وال کلاک دیکھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

فریال شکوہ کناں لہجے میں بولی "دیکھ رہے ہیں نا اپنی بے احتیاطی کا نتیجہ؟"

میں منہ پھیر کر رہ گیا۔ اس نے مزید کچھ کہنے سے پرہیز کیا اور دوسرے کمرے میں جا کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لائی۔ اس بیگ میں وہ تمام ادویات موجود تھیں جو اسپیشلسٹ نے میرے لیے تجویز کی تھیں اور میں لاہور میں استعمال کرتا رہا تھا۔ فریال نے مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلائی۔ پھر میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے دیکھنے لگی۔ دوا کھانے کے باوجود درد بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بولی "میں مجتبیٰ صاحب سے کہتی ہوں کہ وہ ڈاکٹر کو بلا لیں۔"

میں نے سختی سے منع کر دیا۔ درد میں مزید اضافہ ہوا تو فریال نے میری شرٹ کے بٹن کھول کر سینہ ننگا کر دیا اور ایک "آئنٹمنٹ" سے مالش کرنے لگی۔ اس کے نرم وملائم ہاتھ میرے سینے کے بالوں پر سرسرانے لگے۔ بے حد خلوص اور محبت تھی ان ہاتھوں میں۔ گداز ہتھیلیاں جیسے میری جلد کے نیچے سے درد کھینچ رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے افاقہ محسوس ہوا۔ میں نے اسے مالش سے منع کیا لیکن وہ اپنے کام میں جتی رہی۔ ان لمحات میں وہ ایک جوان بھرپور دوشیزہ کے بجائے ایک نو عمر بچی لگ رہی تھی۔ اپنے جسم اور اپنے ہاتھوں کے بھرپور لمس سے غافل، بے خبر۔ مشقت کے سبب اس کی پیشانی نم آلود تھی اور گلابی رخساروں پر تراشیدہ زلفیں جھول رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہ میری طرف اٹھی۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر وہ یکلخت جھجک گئی۔ جیسے اب تک کسی خواب میں رہی ہو۔ اس نے سینہ زحمانپ لیا اور میرے سینے پہ اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جھجک سی نمودار ہو گئی۔

"بس اب رہنے دو" میں نے کہا۔

اس مرتبہ اس نے میری پیش کش فوراً قبول کر لی۔ میں نے شرٹ کے بٹن بند کیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف سے پھیر کر اپنے ہینڈ بیگ کی دوائیں میری الماری میں رکھ رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ بالکل اجنبی اور بدلی بدلی سی نظر آئی۔ تقریباً کرنے والی شوخ لڑکی ایک سنجیدہ دوشیزہ کے پیچھے اوجھل تھی۔

"تو چلو اب میں جاؤں؟" اس نے میری طرف دیکھ کر اجازت طلب کی۔

"ٹھیک ہے۔ آرام کرو تم" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف قدم بڑھاتی، دھما[illegible] آواز آئی اور ہم دونوں بری طرح چونک گئے۔ یہ آواز بیہانی

کی طرف سے آئی تھی۔ میں دوڑ کر اس کھڑکی کے پاس پہنچا جو کوٹھی کے وسیع وعریض گراسی لان میں کھلتی تھی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو ایک سنسنی خیز منظر نظر آیا۔ ایک شیورلیٹ کار گیٹ کو توڑتی ہوئی اندر گھس آئی تھی۔ دھماکے کی خوفناک آواز گاڑی اور گیٹ کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی۔ ڈرائیو وے پر ٹیوب لائٹس کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں میں نے شیورلیٹ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا تو اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ خدشات حقیقت میں ڈھل گئے۔ مسٹر جی کلارک کی دی ہوئی منحوس اطلاع حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ شنکر شکرا۔۔۔ شیطان ابن شیطان اپنی تمام تر درندگی اور حشر سامانی کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ اس کے سپاٹ پھیلے چہرے پر وہی بے حسی اور کرختگی تھی جو بے رحم ترین قاتلوں کی صورتوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ پلک جھپکنے میں وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلا۔ گیٹ کی جانب سے مسلح چوکیدار شنکر شکرا کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ چوکیدار کے ہاتھ میں ڈبل نور رائفل تھی اور یہ رائفل اس نے شنکر شکرا کی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ مجھے لگا جیسے بدنصیب چوکیدار شنکر کی طرف نہیں اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو اڑ کر چوکیدار تک پہنچتا اور اسے شنکر کے سامنے سے ہٹا دیتا لیکن یہ سارا تو ایک یا دو لمحوں کا کھیل تھا۔ جونہی پٹھان چوکیدار نے قریب پہنچ کر شنکر کو للکارا۔ وہ برق کی رفتار سے گھوما اور اس کے قاتل ہاتھوں سے نکلنے والے دو شعلوں نے چوکیدار کو رائفل سمیت گارڈنیا کی باڑ میں پھینک دیا۔ اسی دوران میں پورچ میں سے نکل کر ایک اور لمبا تڑنگا شخص شنکر سے لپٹ گیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو حیدرآباد سے مرسیڈیز کو چلا کر یہاں لایا تھا۔ بے حد سخت جان اور لڑائی بھڑائی کا ماہر شخص تھا یہ۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت تین چار تنومندوں سے تنہا ہی نمٹ سکتا ہے لیکن اس وقت وہ بے خبری میں ایک ایسے شخص کے سامنے آ گیا تھا جو انسان کے روپ میں عفریت اور گوشت پوست کے قالب میں قتل کرنے والی فولادی مشین تھا۔ شنکر شکرا نے چیتے کے مانند پلٹ کر اس پر حملہ کیا۔ اس کی کسی حجیم تحیم ڈرائیور کے سر پر پڑی، ڈرائیور لڑکھڑایا اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن شنکر کے فولادی بازو میں جکڑی گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ گردن ٹوٹ جانے کے بعد ہی آزاد ہو گی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور کھینچا اور صحن کی طرف لپکا۔ راہداری میں مجھے دو افراد نظر آئے۔ یہ دونوں کوٹھی کے ملازم تھے اور ڈرائیور کی مدد کے لیے صحن کی طرف جا رہے تھے۔

"رک جاؤ" میں نے چیخ کر کہا۔ ان کے دوڑتے ہوئے قدم ٹھہر گئے۔ میں نے انہیں واپس راہداری کی طرف دھکیلا "خبردار، کوئی باہر نہ نکلے" وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

انہیں حیران چھوڑ کر میں عمارت کے اندرونی دروازے پر گیا۔ یہاں سے پورچ اور گراسی لان کا بیشتر حصہ نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا، قوی ہیکل ڈرائیور جاں کنی کے عالم میں فرش پر تڑپ رہا تھا اور شنکر شکرا بھاگ کر ایک ستون کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے شیورلیٹ کا پچھلا دروازہ کھلا اور دروازے کی اوٹ سے ایک شخص بالائی حصے کی کھڑکیوں پر فائرنگ کرنے لگا۔ وہ ایم جی سے مسلح تھا اور گولیاں اس کی رائفل کے بیرل سے پانی کی دھار کی طرح نکل رہی تھیں۔ "تڑتڑ" کی زبردست آوازوں سے جیسے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ میری تمام تر توجہ اس ستون پر تھی جس کے پیچھے شنکر شکرا اوجھل ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر اس ستون کے پیچھے نہیں رہے گا۔ بھاگ کر پورچ سے گزرے گا اور عمارت کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ میں پورچ میں اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

جونہی ایم جی کے طویل قہقہے رُکے، شنکر شکرا ستون کی اوٹ سے نکلا لیکن یوں لگا کہ وہ دوڑتا ہوا نہیں ہوا میں اڑتا ہوا آیا ہے۔ میں ایک ثانیے میں صرف ایک فائر کر سکا اور وہ بھی خطا گیا۔ شنکر شکرا دروازے کے بالکل پاس دیوار سے چپک گیا۔ میں اب اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور راہداری کے موڑ کی دوسری پر پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ "ایم جی" کے تباہ کن برسٹ کے سامنے یہ دروازہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور چند سیکنڈ کے اندر شنکر اور اس کے ساتھی دروازہ توڑ کر اندر گھس آئیں گے۔ میں نے سنا، کوٹھی کا ہیڈ خانساماں ٹیلی فون پر چیخ چیخ کر پولیس کو مدد کے لیے بلا رہا تھا۔

درحقیقت اس وسیع کوٹھی میں ایک چوکیدار اور دو گارڈز کے علاوہ کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر سکتا۔ چوکیدار تو میرے سامنے سینے پر گولی کھا کر گرا تھا۔ گارڈز شاید ایم جی کے قہقہے سن کر کہیں دبک گئے تھے۔ مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کوٹھی میں موجود نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو اس وقت تک ضرور سامنے آ چکے ہوتے۔ مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کنور دونوں ایک سے بڑھ کر ایک جہاندیدہ تھے۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ میرے دشمن اس کوٹھی تک پہنچ سکتے ہیں تو وہ یہاں دس بیس مسلح گارڈز ضرور جمع کر لیتے۔ ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی بھوپال چھاؤنی کی اس گمنام عمارت تک رسائی حاصل کر لے گا۔

اچانک مجھے پولیس کی موبائلز کے سائرن سنائی دیے۔ یہ ایک سے زائد گاڑیاں تھیں اور تیزی سے کوٹھی کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ مقامی پولیس سے اتنی مستعدی کی توقع تو ہرگز نہیں تھی کہ وہ فون کال پر اتنی جلدی یہاں پہنچ جاتیں۔ یقیناً یہ ایم جی کی زبردست آواز تھی جو موبائلز کو اس طرف کھینچ لائی تھی۔ اسی دوران میں شیورلیٹ اسٹارٹ ہونے کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے کی کھڑکی تک گیا اور باہر

جھانکا۔ شیورلیٹ لہراتی ہوئی مین گیٹ میں سے باہر نکل رہی تھی۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں گاڑی کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش کرتا۔ ریوالور سے یہ کام لینا ناممکن تھا' میں بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

اسی دوران میں ایک ہٹا کٹا سیٹھ نما شخص بھی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس شخص کا نام غالباً رشید احمد تھا اور وہی اس عمارت کا منتظم اعلیٰ تھا۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا تھا اس لیے حواس باختہ نظر آرہا تھا۔ وہ بے حد لجاجت بھرے لہجے میں بولا "پلیز... آپ اوپر کی منزل پر چلے جائیں۔ اس معاملے سے ہم نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا "جو معاملہ ہو گیا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ وہ دیکھو سامنے' دو لاشیں گری پڑی ہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں جناب مگر.... مم.... میرا مطلب ہے کہ پولیس آگئی ہے۔ انہوں نے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ آپ یہاں ہوں گے تو خواہ مخواہ الجھن میں پھنسیں گے۔ مسٹر کلارک صاحب نے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ آپ کو ہر طرح کے ہنگامے سے دور رکھا جائے۔"

میں نے کہا "اور ساتھ میں یہ ہدایت بھی کی ہوگی کہ زیادہ گہری نیند نہ سونا اور ارد گرد سے خبردار رہنا لیکن تم نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا اور اس وقت بیدار ہوئے ہو جب حملہ آور کام دکھا کر چلے گئے ہیں۔"

رشید احمد نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "پلیز! یہ بات مسٹر کلارک کے سامنے نہ کہیے گا۔ وہ مجھ سے بہت بری طرح پیش آئیں گے۔ فار گاڈ سیک' آپ اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر دوسری منزل پر چلے جائیے۔ وہاں آرام سے سوئیے۔ صبح تک آپ کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔"

میرے ساتھیوں سے رشید احمد کی مراد زریں گل اور فریال تھی۔ فریال پہلے ہی سے میرے کمرے میں موجود تھی' اب زریں گل بھی آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور گہری نیند سے بیدار ہونے کے باوجود وہ پوری طرح چوکس نظر آرہا تھا۔ رشید احمد کی منت سماجت قبول کرتے ہوئے ہم تینوں بالائی منزل پر چلے گئے۔ مجھے فریال کچھ متفکر سی نظر آئی۔ حالانکہ وہ ایکشن کی رسیا تھی بلکہ انڈیا آئی ہی ایکشن دیکھنے کے لیے تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ "ہوہم جی" کے خوفناک قہقہے ابھی تک اس کی نازک سماعت میں گونج رہے ہیں اور نگاہوں میں وہ دو لاشیں ناچ رہی ہیں جو اس نے تھوڑی دیر قبل لان میں دیکھی ہیں۔ اس کے متفکر ہونے کی ایک وجہ میری بیماری بھی رہی ہوگی۔ میری حالت گاہے گاہے بگڑ جاتی تھی۔ اس حالت کا تقاضا تھا کہ میں علاج معالجہ کراؤں اور کچھ دن مکمل آرام کروں۔

ہم نے دو ڈھائی گھنٹے بالائی منزل کے ایک آرام دہ کمرے میں گزارے۔ یہاں سے پورچ میں نگاہ پڑتی تھی اور پورچ میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف پولیس کوٹھی میں موجود ہے بلکہ مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کنور بھی آچکے ہیں۔ رات تین بجے کے قریب ایک ایمبولینس کوٹھی میں داخل ہوئی۔ قریباً پون گھنٹے بعد ایمبولینس واپس چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیاں بھی روانہ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے نچلی منزل سے مسٹر جی کلارک کے گرجنے برسنے کی آوازیں آئیں۔ غور سے سننے پر پتا چلا کہ وہ رشید احمد پر برس رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہوا کہ رشید احمد اس فائیو اسٹار ہوٹل کا منیجر ہے جس کے مالکانہ حقوق مسٹر کلارک کے پاس ہیں۔

رشید احمد کو زبردست ڈانٹ پلانے کے بعد مسٹر جی کلارک بالائی منزل پر ہمارے پاس چلے آئے۔ مجتبیٰ کنور بھی ان کے ساتھ تھا۔ مسٹر کلارک نے میری خیر خیریت دریافت کی پھر بولے "مسٹر شاہ جہاں! تم جانتے نہیں تمہاری جان ہمارے لیے کتنی قیمتی ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم ہر قسم کے ہنگامے سے دور رہو گے۔"

میں نے کہا "میں آپ کے اور مجتبیٰ صاحب کے حکم کا احترام کرتا ہوں جناب! لیکن اس قسم کی پابندی قبول کرنا میرے اختیار میں نہیں۔"

مسٹر کلارک نے کہا "میں ہمیشہ کے لیے نہیں' ایک مختصر وقت کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تمہیں احساس نہیں ہے کہ اس وقت کیسے خطرناک لوگ تمہارے ارد گرد موجود ہیں۔"

"پچھلے سات آٹھ برس سے میں ایسے ہی لوگوں کے درمیان رہ رہا ہوں جناب۔ اب تو ان لوگوں کے چہرے دیکھے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔"

"کچھ بھی ہے شاہ جہاں! ہم تمہیں ایسی "رسکی لائف" نہیں گزارنے دیں گے۔" مجتبیٰ کنور نے مسٹر جی کلارک کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آنکھ سے خفیف اشارہ کیا کہ میں اس معاملے میں زیادہ بحث نہ کروں۔

مسٹر جی کلارک نے اپنی کشادہ پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا "ہمیں فوراً یہ رہائش گاہ چھوڑنا ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ سامان پیک کر لیں۔"

میں نے کہا "جناب! لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہماری نئی قیام گاہ شنکر شکرا جیسے لوگوں سے محفوظ رہے گی؟"

مسٹر جی کلارک نے میرا اعتراض کمال مہربانی سے سنا اور سمجھانے والے انداز میں بولے "آپ ہمیں اس بارے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر شاہ جہاں' تمہاری نقل مکانی کو صیغہ راز میں رکھنے کا مکمل انتظام کر لیا گیا ہے۔ مزید تسلی کی بات یہ ہے کہ واشنگٹن سے درآمد شدہ ایک ایسا گارڈ یہاں پہنچ گیا ہے جس کی پورے امریکا اور یورپ میں دھوم ہے۔ وہ وی آئی پی شخصیات کو گارڈ کرنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس شخص کی موجودگی میں شنکر شکرا جیسے لوگ تمہارے قریب پھٹکنے کی جرأت نہیں کریں گے" میں نے بولنے کے لیے منہ کھولا تو

مسٹر کلارک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے چپ کرا دیا "میں جانتا ہوں شاہ جہاں' تم دلیر شخص ہو۔ تم اب تک دوسروں کو خطرات سے بچاتے آئے ہو' تمہاری شجاعت یہ گوارا نہیں کرے گی کہ اب کوئی دوسرا تمہیں خطرات سے محفوظ رکھنے کا ٹھیکا لے لیکن یہ ہماری وقتی ضرورت ہے شاہ جہاں... میں تم سے درخواست کروں گا کہ تم اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ کرنا۔"

میں نے مجتبیٰ کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ میں اس سلسلے میں مصلحت کے تحت زبان بند رکھوں۔ میں نے کہا "جناب! یہ سب میرے لیے الجھن کا باعث ہے لیکن موجودہ صورت حال کو آپ مجھ سے بہتر سمجھ رہے ہیں لہٰذا میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

"تھینکس!" مسٹر کلارک کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا "ویسے میں اتنا ضرور جاننا چاہوں گا کہ امریکا سے تشریف لانے والے یہ صاحب کون ہیں؟"

مسٹر کلارک نے موبائل فون پر کسی سے گفتگو کی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ورزشی جسم کا مالک ایک کڑیل امریکی اندر داخل ہوا۔ اس کے باریک ہونٹ ایک دوسرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ نیلی آنکھیں' کمان ابرو اور بے حد مضبوط جبڑا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کے کان تھے۔ یہ کان تھوڑے سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ جیسے ہمہ وقت ہم آواز سننے کے لیے بے قرار ہوں۔ ان کانوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ یہ ایک بے حد چوکس' پھرتیلے اور زیرک شخص کے کان ہیں۔ ہالی ووڈ کے ہیرو جیمس بانڈ کے انداز میں یہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا آیا اور ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آواز بہت مدھم لیکن بالکل سپاٹ اور مشینی تھی۔ مسٹر کلارک نے ہم دونوں کا تعارف کرایا۔ نوارد کا نام اینڈرے تھا۔ وہ اور اس کے دو ساتھی آج رات دس بجے واشنگٹن سے براستہ دہلی یہاں بھوپال پہنچے تھے۔ جس وقت کوٹھی پر حملہ ہوا' عین اسی وقت مسٹر اینڈرے کا جہاز بھوپال ائرپورٹ پر اتر رہا تھا۔ اینڈرے ایک پُراسرار اور کم گو شخص کا نام تھا۔ وہ بہت کم بات کرتا تھا۔ بیس کی جگہ پانچ الفاظ بولتا تھا اور پانچ کی جگہ خاموش رہتا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد ہی میں جان گیا کہ میرے سامنے مہذب لباس میں بڑے رکھ رکھاؤ سے جو شخص بیٹھا ہے اس کے اندر عہد قدیم کا کوئی وحشی قاتل چھپا ہوا ہے۔

مسٹر کلارک نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ ہماری نقل مکانی کا بڑا محفوظ انتظام کر چکے ہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم یہ کوٹھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے ہم اس وسیع و عریض کوٹھی کی پچھلی سمت میں پہنچے۔ یہاں سے ایک ایک کر کے ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ دونوں کوٹھیوں کی درمیانی دیوار بمشکل چار فٹ بلند تھی اور اسے پار کرنے میں ہمیں دشواری پیش نہیں آئی۔

دو تین کینال کی یہ کوٹھی قریباً تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ منیجر رشید احمد ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے بتایا کہ کوٹھی کے مکین چھٹیاں منانے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کوٹھی کے چوکیداروں سے مل کر رشید احمد نے "راہداری" حاصل کر لی تھی۔ اس کوٹھی کا اختتام ایک زیر تعمیر شاپنگ سینٹر کے پہلو میں ہوا۔ ہم ایک مختصر دروازے سے گزر کر شاپنگ سینٹر کے اندر داخل ہوئے۔ یہاں چھت ڈالنے کے لیے "قالب" بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف بلڈنگ میٹریل بکھرا ہوا تھا۔ چند چارپائیوں پر مزدور سوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں چند گھنٹے پہلے ہماری رہائش گاہ پر ہونے والے ہنگامے نے انہیں جگایا ہی نہیں تھا یا وہ تماشا دیکھ کر پھر سو گئے تھے۔ جونہی ہم شاپنگ پلازا سے نکلے' سڑک پر ایک چھپر سی اسٹیشن ویگن کھڑی نظر آئی۔ میں' فریال اور زریں گل ویگن میں سوار ہوئے اور کینٹ کی سنسان سڑکوں پر سفر کرتے' ایک چھ منزلہ نہایت دیدہ زیب و عالی شان عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ مسٹر جی کلارک کا فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ ویگن سیدھی ہوٹل کے زیر زمین پارکنگ میں چلی گئی۔ پارکنگ لاٹ میں بیش قیمت گاڑیوں کی قطاریں دیکھ کر ہوٹل کے معیار کا اندازہ ہوتا تھا۔ منیجر رشید نے پارکنگ کے اندر سے ہی ایک مختصر راستہ اختیار کیا اور ہمیں ہوٹل کی پہلی منزل پر واقع ایک لگژری سوئٹ میں پہنچا دیا گیا۔ تین بیڈ' نشست گاہ' ٹی وی لاؤنج... اور سب کچھ شاہانہ انداز میں آراستہ و پیراستہ۔ دس بارہ ہزار روپیہ سے کم کیا کرایہ ہوگا اس سوئٹ کا۔ زریں گل خوش نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا "لو بھئی زریں گل! جی کلارک صاحب نے پہلے کوٹھی میں اور پھر اس ہوٹل میں ٹھہرا کر ہمارے تمام شکوے دور کر دیے ہیں۔"

زریں گل بولا "کون سے شکوے؟"

"بھئی وہی کنارا بس والے' جس پر ہم انجر پنجر ڈھیلا کرا کے لاہور سے پشاور پہنچے تھے۔"

زریں گل کا موڈ خراب ہو گیا "اس سفر کو تو ام کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ چاہے اس ہوٹل میں ام کو پورا ایک سال رکھا جائے اور خاطر تواضع کیا جائے۔"

"یار! بڑے ــــــ ہو تم غصے کے" میں نے سور کا لفظ جان بوجھ کر حذف کیا۔

زریں بولا "ہاں استاد صیب! ام فرنگی کے لیے واقعی غصے کا بہت برا ہے۔ بڑا زہر بھرا ہوا ہے امارے اندر ان گوری چمڑی والوں کے لیے۔ ام آپ کو آج ایک بڑا اہم بات بتاتا ہے۔ کسی کو بتاتا نہیں۔ بہت پرسنل بات ہے یہ۔ ام صرف آپ کو بتا رہا ہے۔ پچھلے پانچ چھ سالوں میں ام قریباً قریباً پچاس انگریزوں کو قتل کرچکا ہے اور ڈیڑھ سو کے قریب فیشن ایبل اورتوں کی ایسی تیسی کرچکا ہے۔ "ایسی تیسی" سمجھتا ہے نا آپ؟"

"یہ کیا بک رہے ہو؟" میں نے حیرانی سے زریں گل کی طرف

دیکھا "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟"

وہ مسکرا کر بولا "لیکن یہ سب کچھ ام نے خیالوں میں کیا ہے استاد صیب! اب اس کلارک صاحب کو دیکھو کل سے لے کر اب تک ام نے اسے کم از کم دو مرتبہ قتل کیا ہے اور وہ جو خدائی خوار مسٹر تمہارا جندر سنگھ اس کی چھنک چھلو پتی کی تو ام نے پہلی نظر میں ایسی تیسی کر دی تھی۔"

"اچھا بک بک بند کرو" میں نے اسے ڈانٹا۔ "سب فرنگی ایک سے نہیں ہوتے اور نہ سارے سردار ایک سے ہوتے ہیں۔ تم اپنے دماغ کو ٹھکانے پر رکھا کرو۔"

ہم بیڈ روم کی خوب صورت کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔ نیچے صاف شفاف کشادہ سڑک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ صبح پانچ بجے کا وقت تھا، رات کا اندھیرا بتدریج دن کے اُجالے میں ڈھل رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی سڑک سے گزر جاتی تھی۔ اِکّا دُکّا راہ گیر بھی فٹ پاتھ پر آ جا رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ میں نے شلوار قمیص والے اس شخص کو کہیں دیکھا تھا۔ کسی بہت اہم تقریب میں۔۔۔ کسی ایسی تقریب میں جو میرے لیے ازحد ناخوش گوار تھی۔ کہاں دیکھا تھا؟ کہاں دیکھا تھا۔۔؟ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے یہ چہرہ ایک ویڈیو فلم میں دیکھا تھا۔ غزالہ کی شادی کی ویڈیو فلم میں۔ میرے جسم میں سر سے پاؤں تک حیرت کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ میں زریں گل کو پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکلا اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ گراؤنڈ فلور پر استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ملازمین نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ داخلی دروازے سے نکل کر میں سڑک پر پہنچا تو شلوار قمیص اور کالے سوئٹر والا شخص ایک پک اپ میں بیٹھ چکا تھا۔ پک اپ حرکت میں آئی اور دس بیس گز آگے جا کر ایک بغلی سڑک پر اوجھل ہو گئی۔ میں نے کسی سواری کی تلاش میں نگاہ دوڑائی لیکن اردگرد کوئی سواری دکھائی نہیں دی۔ علی الصباح کوئی ٹیکسی والا بھی ہوٹل کے اردگرد موجود نہیں تھا۔ بہرحال میں نے پک اپ کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

ابھی میں سڑک پر ہی تھا کہ کسی جانب سے دراز قد امریکی چراغ کے جن کی طرح برآمد ہوا اور میرے پاس آ گیا "سوری مسٹر شاہ جہاں!" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "کلارک صاحب کی خواہش ہے کہ آپ کمرے سے باہر قدم نہ نکالیں۔"

"میں موم کی گڑیا نہیں ہوں کہ دھوپ میں پگھل جاؤں گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ شاید میں کچھ اور بھی کہتا لیکن پھر صبر کا گھونٹ بھرنا پڑا۔

واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو زریں گل کے علاوہ فریال بھی وہیں موجود تھی۔ ہماری طرح رات بھر وہ بھی نہیں سوئی تھی تاہم بناؤ سنگھار کر کے، ترو تازہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن پر وہی لباس تھا جو کل شام اس نے کوٹھی میں تبدیل کیا تھا۔ فریال کا اپنا سامان تو اس کی سہیلی کے پاس ہوٹل میں ہی رہ گیا تھا۔ یہاں بھوربن میں ہماری پہلی قیام گاہ پر ہمارے بیڈ روم کی الماریاں ہر قسم کے لباسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کوٹھی سے فرار ہو کر یہاں ہوٹل میں آنے سے پہلے ہم نے اپنا ضروری سامان اٹیچی کیسوں میں پیک کر لیا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا سوئیٹر فریال کے جسم پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ اس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھا لیتی تھی اور زیادہ اسمارٹ نظر آتی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" وہ بڑی فکر مندی سے بولی۔

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"ہاں... ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔"

"کشتی! کون سا کشتی؟" زریں گل کی سمجھ میں ہمیشہ کی طرح یہ محاورہ بھی نہیں آیا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، راہداری میں کوئی چیز بہت زور سے گری۔ پھر کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ اچانک یوں محسوس ہوا کہ کسی نے ہمارے سوئٹ کے بیرونی دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا ہے۔ اس شبے کی تصدیق کے لیے میں دوڑ کر دروازے تک پہنچا۔ دروازہ واقعی لاک کر دیا گیا تھا۔ میں نے چابی استعمال کی لیکن دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ یکایک ہمارے کمرے کے اردگرد راہداری میں فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ زریں گل اور فریال کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ان کے کان بھی فائرنگ پر لگے تھے۔ یہ کوئی معمولی قسم کی فائرنگ نہیں تھی۔ ماؤزر، آئی ایم جی اور ایم جی کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔

میں نے پہلے دروازہ کھلوانے کی کوشش کی، پھر کھڑکیوں کی طرف آیا۔ یہ فکسڈ شیشوں والی کھڑکیاں تھیں۔ شیشہ توڑے بغیر یہاں سے نکلا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کی بھرپور ضرب شیشے پر لگائی اور اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کھڑکیوں میں اعلیٰ قسم کا بلٹ پروف شیشہ لگا ہے..... غالباً جتنی قیمت اس لگژری سوئٹ کی ہوگی اتنی ہی ان تین کھڑکیوں کی تھی۔

فریال نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا "نہ جائیں باہر.... آپ کیوں جا رہے ہیں؟"

زریں گل کی دلیری بھی کچھ ڈانواں ڈول نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں کو ابھی پتا نہیں چلا تھا کہ کھڑکیوں کے شیشے "نا قابلِ شکست" ہیں اور میں باہر نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ راہداری سے ابھرنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ وہاں زبردست معرکہ ہو رہا ہے۔ ہم نے ابھی حملہ آوروں کو دیکھا تھا اور نہ ان سے لڑنے والوں کو لیکن اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ناتا آشنا مصیبت حیرت انگیز طور پر یہاں بھی پہنچ گیا ہے جس کا نام شنکر شکرا ہے اور فرشتۂ اجل ہر وقت جس کے ہم رکاب رہتا ہے۔ شنکر شکرا کی مزاحمت کرنے والا وہی امریکن ایجنٹ تھا جو

واشنگٹن سے ہنگامی طور پر یہاں پہنچا تھا اور صرف آٹھ گھنٹے پہلے اس نے بھوپال ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تھا۔

سنگین ہونے کے باوجود یہ بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ دو انتہائی خطرناک قاتل ایک مفرور مجرم کے لیے ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے۔ ایک اسے مارنا چاہ رہا تھا دوسرا بچانا۔ اپنی اپنی بے پناہ خونخواری کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے اور چھ منزلہ ہوٹل کے اس حصے میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر درجنوں گاڑیاں رُک گئی ہیں اور لوگ خوف و ہراس کے عالم میں منہ اٹھائے ہوٹل کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کچھ گاڑیاں بہت دھیمی رفتار سے گزر رہی تھیں جیسے رُکنا بھی چاہ رہی ہوں اور چلنا بھی۔ ہوٹل کے مکین راہداریوں میں چیختے چلاتے بھاگ رہے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی مصیبت کا مارا ہمارے کمرے کی کھڑکیوں کے سامنے سے بھی گزر جاتا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں صاحب!" فریال میرے بازو سے چپک کر بولی۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" میں نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ تم دونوں بھی اور انجوائے کرو اس صورتِ حال کو۔ دیکھو لوگ ہمارے لیے کس طرح وحشی جانوروں کی طرح لڑ رہے ہیں۔۔۔ سائیں عالی زندہ باد۔"

اچانک فریال کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔ کھڑکی کے عین سامنے جیسے ایک زلزلہ برپا ہو گیا تھا۔ ہم نے شیطان ابنِ شیطان شنکر شکرا کو دیکھا۔ وہ ایک تومند مقامی شخص کے ساتھ گتھم گتھا تھا۔ شنکر کی بھوری آنکھیں خون اگل رہی تھیں اور وہ بڑے غضب میں نظر آتا تھا۔ مقامی شخص بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح شنکر کی گردن دبوچ لے۔ اچانک شنکر نے پینترا بدلا اور مدِمقابل کا سر اتنی زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا کہ وہ تربوز کی طرح پھٹ گیا۔ یہ ایک نہایت لرزہ خیز نظارہ تھا۔ فریال چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ بدقسمت شخص کا گریبان ابھی تک شنکر کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کی پچکی ہوئی پیشانی کی جھلک دیکھ کر بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ شنکر نے مقتول کو دھکا دے کر نیچے سڑک پر گرایا اور کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب ہمارے سوئٹ کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور امریکن ایجنٹ اینڈریو بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک قوی ہیکل نیگرو تھا اور نیگرو کے عقب میں منیجر رشید احمد۔ اینڈریو اور نیگرو کے ہاتھ میں جدید قسم کی مشین گنیں تھیں۔ اینڈریو کے ایک بازو سے کہنی کے قریب خون رس رہا تھا۔

"پلیز! آپ میرے ساتھ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے" امریکی ایجنٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں جانتا تھا کہ اس موقعے پر سوال جواب فضول ہیں۔ میں نے فریال کا ہاتھ پکڑا، میز سے اپنا ریوالور اٹھایا اور اینڈریو کے ساتھ ہو لیا۔ زریں گل نے بھی میری تقلید کی۔ قالین پوش راہداری میں ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ دو تین جگہ خون کے دھبے تھے اور کئی دروازوں پر گولیوں کے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ہم قریباً بھاگتے ہوئے راہداری سے گزرے اور ایک تنگ زینے کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ یہ وہی زینہ تھا جہاں سے ہم چند گھنٹے پہلے اپنے کمرے میں پہنچے تھے۔ اس زینے کا نچلا سرا پارکنگ لاٹ میں تھا۔ ہم پارکنگ لاٹ میں پہنچے تو ہوٹل کے اردگرد ہونے والی فائرنگ کی آوازیں شدت سے سنائی دینے لگیں۔ پارکنگ لاٹ کے وسط میں ایک قوی اندام شخص کی لاش چت پڑی تھی۔ اس کے چہرے کا کچھ حصہ خودکار رائفل کے برسٹ نے اُڑا دیا تھا۔ زخم سے بہنے والا خون فرش پر دور تک پھیلا تھا۔ اس لاش کے پاس ہی ایک لینڈ کروزر جیپ اسٹارٹ حالت میں موجود تھی۔ منیجر رشید سمیت ہم چاروں پھرتی سے لینڈ کروزر میں بیٹھے۔ مسلح نیگرو نے پچھلی نشست پر جبکہ اینڈریو نے سب سے اگلی نشست پر جگہ سنبھال لی۔ اینڈریو نے واکی ٹاکی پر کوئی مختصر پیغام نشر کیا۔ اس پیغام کے نشر ہونے کے صرف دو سیکنڈ بعد ہوٹل کے ایک پہلو میں "ایم جی" کی زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ لینڈ کروزر لہراتی ہوئی زنّاٹے سے پارکنگ لاٹ میں سے نکلی اور سڑک پر آ گئی "ہیڈ ڈاؤن" امریکی ایجنٹ چلایا۔

ہم سب نے سر نیچے جھکا لیے۔ یہاں تک کہ ڈرائیور بھی ونڈ اسکرین کے لیول سے نیچے چلا گیا۔ گاڑی لہراتی، چرچراتی، کشادہ سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ ان ہی لمحات میں ہوٹل کے سامنے ہینڈ گرینیڈ یا ٹائم بم کا زوردار دھماکا ہوا۔ ہوا کے دوش پر سفر کر کے یہ آواز ہمارے کانوں کے پردے جھنجوڑ گئی۔ فریال کے ہونٹوں سے بے اختیار گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد لینڈ کروزر ایک متوسط درجے کی آبادی میں جا رکی۔ منیجر رشید احمد ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوا اور تین چار منٹ بعد واپس آ کر ہمیں بھی مکان کے اندر لے گیا۔ لینڈ کروزر کو مکان کے مختصر گیراج میں کھڑا کر دیا گیا۔ گھر کی عورتیں مہمانوں کی آمد کے بعد کونے کھدروں میں دبک گئی تھیں۔ گھر کے مرد کام کاج پر نکل چکے تھے۔ منیجر رشید ہمیں ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ امریکی ایجنٹ اینڈریو نے اپنے ساتھی نیگرو کے ساتھ مل کر بڑی تیزی سے اس مکان کے محلِ وقوع کا جائزہ لیا اور منیجر رشید کو سیکیورٹی کے سلسلے میں کچھ ہدایات دینے کے بعد واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی پیدل ہوئی تھی اور شاندار لینڈ کروزر اس مکان کے نیم تاریک گیراج میں کھڑی رہ گئی تھی۔ نیگرو بھی واپس نہیں گیا تھا۔ اینڈریو نے اسے کچھ ضروری ہدایات دے کر مکان کی چھت پر چڑھا دیا تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگ حیرت سے یہ

ساری سرگرمی رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور پر قوی ہیکل غیر ملکیوں اور خوبرو فریال نے انھیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ منیجر رشید احمد کی کوششوں سے ان لوگوں نے تاکا جھانکی بند کی اور ہم نے قدرے سکون محسوس کیا۔

جونہی ہمیں تنہائی ملی فریال مجھے ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ یہ کسی کالج بوائے کا اسٹڈی روم تھا۔ دیواروں پر بروس لی اور محمد علی کلے وغیرہ کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ فریال نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور عجیب انداز سے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ایسی سنجیدگی اور متانت میں نے اس کے چہرے پر اس سے قبل صرف ایک بار محسوس کی تھی۔ وہ اسپتال کے بستر پر لیٹی تھی اور اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ غزالہ کی شادی ہو رہی ہے۔ آج پھر ویسا ہی گمبھیر موڈ اس پر طاری تھا۔ اس نے نمناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولی "شاہ جہاں صاحب! میری ایک بات مانیں گے؟"

"کیسی بات؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں اور میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس کے بعد زندگی میں کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔"

"ہم کو میں کوشش کروں گا کہ تمھیں مایوس نہ کروں۔"

اس نے عجب بے ساختگی سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں ابھی تک وہ خونی منظر ٹھہرے ہوئے ہیں جو اس نے پچھلے دس بارہ گھنٹوں میں دیکھے ہیں۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "شاہ جہاں صاحب! واپس چلے چلیے۔ اپنے چاروں طرف بھڑکتی ہوئی اس آگ سے نکل کر دور چلے جائیے۔ نہ اس وقت مسٹر کلارک یہاں ہیں اور نہ مجتبیٰ صاحب۔ امریکن گارڈ بھی نہیں ہے۔ صرف نیگرو ہے جو اوپر چھت پر بیٹھا ہے۔ ہم خاموشی سے نکل چلتے ہیں۔ ایک بار ہم سڑک پر پہنچ گئے تو پھر ہمیں کوئی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔ اللہ نے چاہا تو ہم کل اس وقت پاکستان میں ہوں گے۔ پلیز شاہ جہاں صاحب! آپ انکار نہ کرنا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم تو مجھے ایکشن میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ اب یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو گھبرا رہی ہو۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں" وہ بلا تردد بولی "پلیز! آپ بات کو مذاق میں مت ٹالیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ یہ بہت سنہری موقع ہے۔ ہم نکل چلتے ہیں یہاں سے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "فریال! تم نے یہ بات دو تین گھنٹے پہلے کی ہوتی تو شاید میں اس پر غور کرتا لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں کسی صورت بھی بھوپال نہیں چھوڑ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے دامن بچانے کا یہ سنہری موقع ہے لیکن مجھے یہ موقع گنوانا ہوگا۔ ہاں تم اور زریں گل چاہو تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ بلکہ مجھے بے حد خوشی ہوگی کہ۔"

"لیکن آپ کیوں نہیں نکل سکتے؟" فریال نے میری بات کاٹی۔

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے مجھے ایک بہت عجیب بات کا پتا چلا ہے۔"

"کیسی بات؟" فریال نے پوچھا۔

"تمھیں یاد ہے ناکہ میں تھوڑی دیر پہلے کسی کو دیکھ کر اس کے پیچھے سڑک پر دوڑا چلا گیا تھا۔؟"

"ہاں ہاں، مجھے زریں گل نے بتایا تھا۔"

"تم جاننا چاہو گی کہ وہ کون تھا۔ وہ غزالہ کا دیور تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ غزالہ کی راہی تھی۔"

فریال نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "لیکن وہ لوگ تو کینیڈا میں ہیں!"

"نہیں۔۔۔ وہ یہاں ہیں۔۔۔ اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ غزالہ بھی یہیں ہے۔"

"لیکن۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" فریال نے بے حد حیرانی سے کہا۔

"ایسے اور بہت کچھ ہوا ہے" میں نے جواب دیا "جیسے تم لاہور سے چل کر یہاں بھوپال پہنچ گئی ہو۔ جیسے مجتبیٰ کو ریمل ہندوستان میں موجود ہے۔ جیسے خطرناک امریکی ایجنٹ واشنگٹن سے چل کر یہاں آیا ہے اور اب ہمارے اردگرد پایا جا رہا ہے فریال بی بی۔۔۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں ان میں سب کچھ ممکن ہے۔"

وہ بولی "کہیں آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی غزالہ جی کو اغوا کر کے یہاں لے آیا ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے" میں نے جواب دیا "سوچ کے گھوڑے دوڑانے کے لیے آزاد ہیں، جہاں تک چاہو دوڑا لو۔ ہو سکتا ہے کہ غزالہ کو اور اس کے شوہر کو یا صرف غزالہ کو زبردستی یہاں لایا گیا ہو اور اب اس کے اہلِ خانہ اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں۔ لیکن یہ صرف ایک امکان ہے۔ ایسے ایک سو ایک امکانات موجود ہیں۔"

"اوہ گاڈ! میرا تو سر چکرا رہا ہے۔" فریال نے دونوں ہاتھوں سے پیشانی تھام لی۔

میں نے کہا "فریال! ویسے مجھے تمھاری تجویز پسند آئی ہے۔ نیگرو محافظ کے سوا اس وقت کوئی ہمارا راستہ روکنے والا نہیں ہے۔ تم اور زریں گل بڑی آسانی سے یہ جگہ چھوڑ سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آٹھ دس روز کے اندر میں بھی پاکستان پہنچ جاؤں گا۔"

وہ بولی "اور اس عرصے میں آپ یہاں کیا کریں گے؟"

"غزالہ کو تلاش کروں گا اور یہ دیکھوں گا کہ وہ کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر اس کے سسرالی رشتے دار یہاں ہیں تو وہ بھی یہیں ہوگی۔"

"لیکن بھوپال چھوٹا شہر نہیں۔ آپ اسے کیسے ڈھونڈیں گے۔"

"میں نے اس گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا جس پر غزالہ کا دیور وغیرہ سوار ہو کر گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس نمبر کے ذریعے ان لوگوں کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔"

"جو لوگ بھوکے کتوں کی طرح آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں وہ آپ کو یہ کام کرنے دیں گے؟"

"ان کتوں کی دم میں نمدا فٹ کر کے ان کی آنکھوں میں لال مرچیں جھونکنا میرا کام ہے۔ تمھیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی "ایک بات ذہن نشین کر لیں شاہ جہاں صاحب! میں آپ کو یہاں اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قربانی دینا پڑے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں۔ کیونکہ میں لڑکی ہوں بجلی اور ٹائپ کی۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب" زریں گل کہتا ہوا اندر داخل ہوا "اس طرح کا ڈائیلاگ اداکارہ شبنم نے شاید فلم انمول میں بولا ہے۔ میں لڑکی ہوں ذرا اور ٹائپ کی۔۔۔ واہ کیا فقرہ ہے۔"

"یہ ہنسی مذاق کا وقت نہیں ہے زریں گل" میں نے سنجیدگی سے کہا "ہم پریشان کن صورتِ حال سے گزر رہے ہیں۔"

"وہ تو ام دیکھ رہا ہے استاد صیب۔ جہاں عورت ذات ہوتا ہے وہاں پریشانی تو ہوتا ہے۔"

فریال نے آنکھیں نکالیں "زریں گل! تمھارا اشارہ میری طرف تو نہیں؟"

زریں گل نے فوراً بات بدلی "توبہ ہے بی بی جی۔ ام آپ کے لیے ایسا گستاخی کر سکتا ہے۔ امارا اشارہ تو اس ارجمند عرف الوکی بی کی طرف ہے۔ وہ اس سارے فساد کا جڑ ہے اور یہ جڑ جونک آرام سے چھپا ہوا ہے۔ اللہ کرے اس کو کسی کا آیا ہوا آئے۔"

زریں گل بدستور ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ اور یہ صرف زریں گل کی بات ہی نہیں تھی ہم سب تھوڑے تھوڑے بے حس ہو گئے تھے ابھی دو گھنٹے پہلے ہم نے مسٹر جی کلارک کے خفیہ اسٹار ہوٹل میں "کشت و خون" کا بازار گرم دیکھا تھا۔ دو افراد ہمارے سامنے موت کے گھاٹ اترے تھے اور ایک کی لاش ہم نے تین روز پہلے جنگل میں دیکھی تھی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ایک دورن تک ان واقعات کی ناخوشگواری کو ذہن سے نہ جھٹک سکتا مگر ہم صرف دو گھنٹے بعد سب کچھ فراموش کیے ہوئے تھے بالکل میدانِ جنگ والی صورتِ حال تھی۔ سپاہی کے سامنے انسان مرتے ہیں زخموں سے تڑپتے ہیں اور متعفن لاشوں سے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں لیکن وہ ہر سبب سے بے نیاز روز مرہ کے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔

زریں گل نے ایک اخبار میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "یہ دیکھیے جناب! آج پھر نواب شہریار کے بارے میں خبریں آیا ہے۔"

میں نے اخبار دیکھا۔ پہلے صفحے پر نواب شہریار کے قتل کے بارے میں تین کالمی شہ سرخی موجود تھی۔ نیچے بھی اس سلسلے میں چھوٹی موٹی خبریں لگی ہوئی تھیں۔ جنازے کی تصویر تھی۔ بیوہ کا سوگوار پوز تھا۔ دو کالمی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ نواب شہریار کے قتل کے ڈانڈے اس پُراسرار سرنگ سے ملتے ہیں جو چند ماہ پہلے فرید کوٹ سے غائب ہو گیا تھا اس حوالے سے نواب کے دو ملازمین کے بیانات بھی چھاپے گئے تھے۔ ان ملازمین نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ نواب شہریار اور اس کے بیٹے کے درمیان جھگڑے اور کشت و خون کا اصل سبب رتی جی کی صندوقچی ہیں جو پُراسرار سرنگ سے آ مارے گئے تھے اور بڑے نواب نے کہیں محفوظ کر دیے گئے۔۔۔ خبر میں کسی طرح میرا نام بھی آ گیا تھا اور رپورٹر نے بڑے سنسنی خیز انداز میں لکھا تھا "اس امر کے قوی شواہد پائے جاتے ہیں کہ استاد جہانی بھی اپنے ساتھیوں سمیت حیدر آباد میں موجود ہے اور یہاں رونما ہونے والے خونی واقعات میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔" رپورٹ کے آخر میں اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اب حیدر آباد اور گرد و نواح میں بھی وسیع بدامنی پیدا ہو سکتی ہے جس نے اس سے

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

پہلے فرید کوٹ میں قانون کے محافظوں کی نیندیں حرام کئے رکھی ہیں۔

ان خبروں میں ایک چھوٹی سی خبر فیڈرل منسٹر راجندر سنگھ کے بارے میں بھی تھی۔ رپورٹر نے اپنے طور پر تحقیق کی تھی اور لکھا تھا "جس شب نواب شہریار قتل ہوئے منسٹر راجندر سنگھ اپنی پتنی اور پی اے کے ساتھ حیدر آباد کے نجی دورے پر تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ڈنر بھی مقتول نواب شہریار کے ساتھ کیا تھا۔ تاہم جس وقت پولیس موقع پر پہنچی منسٹر صاحب یا ان کی پتنی اور پی اے میں سے کوئی بھی موقع پر موجود نہیں تھا۔ متعلقہ حکام اس سلسلے میں تفصیلات چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ باوثوق ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب شہریار صاحب پاکستانی ٹرک سے برآمد ہونے والے تمام صندوق حکومت ہندوستان کے حوالے کرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور وزیر موصوف اسی سلسلے میں حیدر آباد پہنچے تھے لیکن اس سے پہلے کہ یہ ملاقات بار آور ثابت ہوتی نواب کو قتل کر دیا گیا۔"

اخبار دیکھتے دیکھتے میں چونک گیا۔ زریں گل اور فریال بھی ٹھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ یہاں سے مکان کا صحن اور مختصر گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گیٹ سے باہر کسی کار کا ہارن سنائی دے رہا تھا۔ منیجر رشید نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا اور ایک سفید ٹویوٹا کار رینگتی ہوئی اندر آ گئی۔ کار کے شیشے رنگ دار تھے پھر بھی میں سروج عرف ارجمند بانو کو پہچان گیا۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ کار کے دروازے کھلے اور سروج کے علاوہ مسٹر جی کلارک اور سائیں عالی کی صورتیں نظر آئیں۔ سائیں عالی حسب عادت دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پھنس پھنسا کر بیٹھا تھا۔ پارس نگینے "سرو داڑھی میں رحول" گلے میں بے شمار مالائیں اور گھنگیاں۔ اس کا چوغا سبز تھا لیکن مسلسل گرد آلود رہنے کے بعد خاکستری ہو چکا تھا۔

چم چم کرتی خوبصورت سروج عرف ارجمند بانو بسنتی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ وہ ہر قسم کا لباس بڑے سلیقے اور شوق سے پہنتی تھی۔ اس نے بڑے احترام کے ساتھ سائیں عالی کو سہارا دیا اور گاڑی سے اتار لیا۔ مسٹر جی کلارک بھی لپک کر آئے اور انہوں نے سائیں کا دوسرا بازو تھام لیا۔ ایک امریکی ارب پتی ایک ایسے شخص کا خدمت گار بنا ہوا تھا "جس کے جسم سے بدبو اٹھتی تھی اور جس کی غلیظ آنکھوں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سائیں عالی اور مسٹر جی کلارک کی موجودگی میرے لئے زیادہ حیران کن نہیں تھی کیونکہ اس سے پہلے وہ ہمارے ساتھ ہی مسٹر کلارک کے فائیو اسٹار ہوٹل میں موجود تھے لیکن یہ سروج عرف ارجمند بانو کہاں سے آ ٹپکی تھی۔

میں نے آخری بار اسے پنڈت مہاراج کے تہ خانے میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد پانچ چھ یوم تک اس کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً آیا کہ سروج کو یہاں لا کر ہمارے سر پر سوار

تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے ٹھیکا لے رکھا تھا کہ وہ سروج کو "ٹھکانے" تک پہنچا کر دم لے گا۔ یقیناً اب اس نے اپنے نئے عقیدت مند مسٹر جی کلارک کو مجبور کیا ہو گا کہ وہ سروج کو پنڈت مہاراج کے تہ خانے سے برآمد کرائیں اور یہاں اس مکان میں پہنچائیں تاکہ وہ دفینے تک پہنچنے کی دوڑ میں الگ تھلگ نہ رہ جائے۔ (میرا یہ اندازہ بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ سروج کو مسٹر کلارک ہی سائیں عالی کے کہنے پر یہاں لائے تھے)

کار سے اترنے کے بعد سائیں عالی صحن کے عین وسط میں پہنچا اور غیر متوقع طور پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا اس کے عقیدت مندوں کے لئے وہی جگہ خانقاہ ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ سائیں کے بیٹھتے ہی سروج بھی دو زانو ہو کر گرد آلود فرش پر بیٹھ گئی۔ مسٹر جی کلارک بیٹھنے سے جھجک رہے تھے لہٰذا ایک ستون کے پاس مؤدب کھڑے ہو گئے۔ سائیں عالی نے منیجر رشید کو حکم دیا کہ وہ ایک چھڑی لے کر آئے۔ مسٹر جی کلارک کے اشارے پر فائیو اسٹار ہوٹل کا نہایت بارعب منیجر حکم کی تعمیل کے لئے دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسی درخت سے ایک چھڑی نما شاخ توڑ لایا۔ سائیں عالی نے کسی اسکول ماسٹر کی طرح چھڑی کو گھما پھرا کر دیکھا پھر سروج کو حکم دیا کہ وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے۔ بلا حیل و حجت کسی اسکول گرل کی طرح سروج نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سائیں عالی نے چھڑی سے ہاتھ پر ضرب لگائی۔ تکلیف کی شدت سے ارجمند کا رنگ گلابی ہو گیا اور اس نے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ میں بھینچ لیا۔ سائیں عالی نے چھڑی کی حرکت سے حکم دیا کہ وہ دوسرا ہاتھ نکالے۔ ارجمند نے فوراً دوسرا ہاتھ بڑھا دیا۔ سائیں عالی نے اس ہاتھ کی نازک ہتھیلی پر بھی اچھی خاصی ضرب لگائی۔ اس کے بعد یہی عمل دونوں ہاتھوں کے ساتھ تین چار بار دہرایا گیا۔ ارجمند کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے لیکن وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جو پہلے ہی ایک دلچسپ تماشا دیکھ چکے تھے اب ایک اور زبردست تماشا دیکھنے کے لئے منڈیروں پر جمع تھے۔ منیجر رشید نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں پیچھے ہٹایا۔

سائیں عالی نے گرج کر سروج سے پوچھا "آئندہ ایسی حرکت ہو گی؟" وہ بڑی ندامت سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ سائیں عالی نے منیجر رشید کو حکم دیتے ہوئے کہا "جاؤ اس خبیث شفیع محمد کو یہاں لاؤ" (سائیں عالی نامعلوم وجوہ کی بنا پر مجھے شفیع محمد کہتا تھا)

منیجر رشید حیرانی سے ارجمند اور مسٹر کلارک کی طرف دیکھنے لگا۔ ارجمند نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "سائیں جی شاہ جہاں کو پوچھ رہے ہیں۔"

منیجر رشید اندر آیا اور مجھے لے کر باہر صحن میں چلا گیا۔ سائیں عالی نے مجھے سر تا پا گھورا۔ جیسے کئی برسوں بعد مجھے آج دیکھ رہا ہو

اس بات کی کہ یہ ہماری حکم عدولی کر رہی تھی۔ ہم نے اسے کہا تھا کہ یہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی لیکن یہ پچھلے کئی روز سے اس مندر میں تھی جہاں سے ہم اسے لے کر آئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بے قصور ہے تم اسے وہاں چھوڑ کر چلے آئے تھے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ قصوروار ہے۔ تم اسے چھوڑ آئے تھے تو اس کا فرض تھا کہ تمہیں تلاش کرتی تم تک پہنچتی۔ بہرحال اب اسے سزا مل چکی ہے۔"

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "تمہارا قصور سروج سے کہیں بڑا ہے لیکن ہم تمہیں سزا نہیں دے سکتے کیونکہ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ نہ پیری مریدی کا' نہ خون کا' نہ کوئی اور۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں سزا نہیں ملے گی' ضرور ملے گی' لیکن کسی اور وقت' کسی اور رنگ سے۔ اب ہم ایک بار پھر تم دونوں کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کا ساتھ تمہارے لئے مفید ہے اور ایک دوسرے سے دوری تم دونوں کی ناکامی ہے۔"

تھوڑی دیر ہم دونوں کو لیکچر پلانے کے بعد سائیں عالی کمال بے نیازی سے اٹھا۔ قریب ہی ویٹ لفٹنگ میں استعمال ہونے والی لوہے کی بار پڑی تھی۔ سائیں نے بار اٹھائی اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ جونہی اس نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ پڑوسیوں کی چھت پر کھڑے تماشائی چیختے چلاتے بھاگ اٹھے۔ انہیں ڈرانے دھمکانے اور صلواتیں سنانے کے بعد سائیں عالی اطمینان سے نیچے اترا اور گیٹ کے نزدیک کھڑی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ واپس جانا چاہ رہا ہے۔ مسٹر جی کلارک نے فوراً باوردی ڈرائیور کو اشارہ کیا اور خود بھی گاڑی میں نشست سنبھال لی۔ چند لمحے بعد گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔

○☆○

متوسط درجے کی گنجان آبادی میں گھرا ہوا یہ مکان دو منزلہ تھا۔ فرنیچر معمولی تھا اور دیگر گھریلو سامان بھی پرانا اور سستا تھا۔ مکان کی پیشانی پر ٹائیلوں کے اوپر بڑے اہتمام سے "برکت منزل" کے الفاظ لکھے گئے تھے۔ یا تو مالک مکان کا نام برکت تھا یا پھر مکان کو بابرکت بنانے کے لئے برکت منزل قرار دیا گیا تھا۔ اس مکان کے اندر ہم نے چار پانچ روز بڑی خاموشی سے گزارے۔ امریکن ایجنٹ انجونے اور اس کا نیگرو ساتھی مائیکل سائے کی طرح اس چار دیواری کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ یہاں موجود تھے جنہیں ہم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یقیناً وہ سب کے سب مسلح تھے اور ہماری حفاظت کے لئے پوری طرح چوکس بھی۔ دو تین اخبار روزانہ ہم تک پہنچتے تھے۔ اخباری خبروں سے پتا چلتا تھا کہ نواب شہریار جنگ کے قتل کی تفتیش زور و شور سے ہو رہی ہے اور درجنوں مشکوک افراد گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ پاکستان سے انڈیا پہنچنے والے ٹرک کا معاملہ ایک بار پھر شہ سرخیوں کی زینت تھا۔ پانچ روز پہلے بھوپال کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونے والے ہنگامے کی اکا دکا خبریں بھی اخبار میں جگہ پا رہی تھیں۔ اس ہنگامے میں تین افراد ہلاک اور دو شدید زخمی ہوئے تھے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق ہنگامہ کسی غیر ملکی گروہ اور شنکر شکرا کے درمیان ٹکراؤ کے سبب ہوا تھا۔

ان چار پانچ دنوں میں سروج اور زریں گل میں خوب ٹھنی رہی تھی۔ زریں کو سروج سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ سروج کا میرے قریب آنا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ایک دم تپ جاتا تھا۔ دوسری طرف سروج تھی کہ ہر وقت میرے آس پاس منڈلاتی رہتی تھی۔ پنڈت مہاراج کے تہ خانے میں وہ مجھ سے عہد لے چکی تھی کہ میں اسے خود سے دور نہیں کروں گا اور ہم جہاں رہیں گے ایک ساتھ رہیں گے۔ ضرورت کے تحت کیا ہوا یہ وعدہ میرے گلے کا ہار بنا ہوا تھا۔ وہ الو کی پٹھی تو رات بھی میرے کمرے میں گزارنا چاہتی تھی لیکن بصد کوشش میں نے اسے اس ارادے سے باز رکھا تھا۔ بے باکی و بے حجابی میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ فریال اور زریں گل کی موجودگی میں ایسی باتیں کہہ جاتی تھی جو تنہائی میں بھی نہیں کہی جا سکتیں۔ میرے ساتھ لپٹنا چپکنا' آغوش میں سر رکھنے کی کوشش' گلے میں بانہیں ڈال دینا اس کے لئے معمولی باتیں تھیں۔ میرے ساتھ سروج کا یہ رویہ دیکھ کر فریال نے یقیناً برا محسوس کیا تھا لیکن چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ بس ایسے موقعوں پر مسکراتی ہوئی چور نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ ایک روز زبردست رن پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانے کے بعد میں آرام کے لئے لیٹا۔ گھر کا ڈرائنگ روم میرے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اسی طرح مختلف کمرے سب میں بانٹ دیے گئے تھے۔ گھر کے اصل مکینوں کو یہاں سے کہیں اور بھیج دیا گیا تھا۔ یہ سارے انتظامات منیجر رشید نے ہی کئے تھے۔ ابھی میں بستر پر لیٹ ہی رہا تھا کہ زریں گل آ ٹپکا۔ کہنے لگا "استاد صیب! اب یہ فریال بی بی... آپ کا خیال بہت رکھتا ہے۔ آپ کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے۔ آپ کا کپڑے استری کرتا ہے۔ آپ کا بستر بچھاتا ہے۔ آپ کو وقت پر دوائی دیتا ہے۔ ایسا خدمت گار امارا ہو تو خدا قسم ام دونوں میں بھلا چنگا ہو جائے۔"

"تو کیا میں تمہیں بیمار نظر آتا ہوں؟"

"بیمار تو نہیں لیکن کچھ بجھا بجھا ضرور رہتا ہے۔ خاص طور پر فریال بی بی کے سامنے تو آپ بالکل ہی چپ رہتا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ آپ اب تک اس سے ناراض ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں تو میں نے ناراضگی والی کوئی بات نہیں کی۔"

زریں گل بولا "آج صبح وہ کمرے سے نکلا تو لگتا تھا کہ رویا ہوا

ہے۔ آنکھیں بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ ام نے پوچھا تو ٹال گیا۔ بولا تو ہنستا بولتا ہے لیکن ام دیکھ رہا ہے کہ اس کے اندر کا اصل شوخی اور شرارت کہیں گم ہو گیا ہے۔"

"بھئی! میں نے تو غور نہیں کیا۔ اب تم کہہ رہے ہو تو ضرور پوچھوں گا اس سے کہ کیا پریشانی ہے۔ ویسے ایک بات ہے زریں گل۔ اس کا سنجیدہ ہونا کوئی بری بات نہیں۔ اسے اب سنجیدہ ہونا ہی چاہئے۔ ساہی صاحب کے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی۔"

زریں گل بولا "بھئی تو ام کو لگتا ہے استاد صیب کہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا لگتا ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ سر کھجا کر بولا "خو ہے! امارے منہ میں نسوار ہے' ام جھوٹ نہیں بولے گا۔ یہ فریال بی بی دل کا بہت اچھا لڑکی ہے' بہت ہی اچھا۔ بالکل فرزانہ بی بی کے ماتق۔"

میں نے کہا "تم بات بدلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ پہلے تم کچھ اور کہنے لگے تھے۔"

اس سے پہلے کہ زریں گل کوئی جواب دیتا سروج عرف ارجمند زنانے سے اندر آ گئی۔ وہ بے حد چست پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ شرٹ باریک کپڑے کی تھی اور اس کے بالائی جسم کو چھپانے کے بجائے نمایاں کر رہی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی گھوم پھر کر زریں کو دیکھا اور بولی "یہ تم کیا الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتے رہتے ہو۔ بڑی ہمدردیاں ہیں تمہارے دل میں اس حرامزادی کے لئے۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری جو اس طرح سفارشیں کرتے پھرتے ہو۔"

سروج کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے ہماری گفتگو کا آخری حصہ سن لیا ہے۔ زریں گل کا چہرہ ایک دم آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ غرا کر بولا "ام تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہے کہ اپنی زبان قابو میں رکھا کرو۔ ورنہ امارا دماغ آؤٹ ہو جائے گا۔ پھر استاد صیب کا لالا بھی ام کو نہیں روک سکے گا۔"

"کیا ہر وقت دماغ دماغ لگائے رکھتے ہو" وہ تنک کر بولی "تمہارے اندر دماغ ہوتا تو انسان کے بچے نہ نظر آتے تم؟"

"ہاں نہیں ہے ام انسان کا بچہ۔ ام جانور ہے اس لئے بچ ام ہے۔ ورنہ ام پھاڑ کر پھینک دے گا۔ سچ کہتا ہوں۔ بہت روئے گا تم ام سے متھا لگا کر۔"

میں نے زریں گل کو جھڑکا کہ وہ خاموش رہے۔ وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا "استاد صیب! یہ بڑا غلط قسم کا زنانی ہے۔ ام سب جانتا ہے۔ یہ ڈورے ڈال رہا ہے آپ پہ۔ آپ کا ایمان خراب کر رہا ہے۔ ذرا اس کا لباس دیکھو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ ننگا گھومتا اور پھر اس کا حرکتیں! توبہ ہے یا خدا۔ یہ انگریزی فلموں کا ایکٹریس تو یونہی بدنام ہوا ہے۔"

تو زیادہ مولوی مت بن۔۔۔ میں جانتی ہوں تیری نیچر کو بھی۔ وہاں نواب کی حویلی میں غسل خانوں میں جھانکتا رہتا تھا۔"

"خدا کی مار تجھ پر حرافہ! اب ام کو یقین ہو گیا۔ اللہ تعالی تمہارا بیڑہ غرق ضرور فرمائے گا۔ اتنا جھوٹ' اتنا بڑا غلط بیانی' ام نے ایسا حرکت کیا ہو تو ایک دم پاگل ہو کر مرے۔ تم سب کو اپنے جیسا سمجھتا ہے۔ سارا زمانہ جانتا ہے کہ تم کس نالی کا کیڑا ہے۔ تو فرید کوٹ میں بابو لیاقت کی نیو سے نکلنے کے لئے تم نے کون سا "رشوت" دیا تھا' ام سب جانتا ہے۔ تم وہ رشوت اب بھی ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے۔ پھرتا ہے یا نہیں؟"

سروج ایک دم بے قابو ہو کر زریں پر جھپٹی۔ میں نے بیچ میں آکر اسے روکا۔ وہ پوری طاقت سے مجھے دھکیلنے لگی۔ دوسری طرف زریں گل نے بھی سینہ پھلا لیا۔ نیگرو باڈی گارڈ بھاگتا ہوا اندر آیا "اسٹاپ اٹ۔۔۔ اسٹاپ اٹ۔۔۔ واٹ از گوئنگ آن ہیئر؟" اس نے چیخ کر کہا اور سروج کو اپنی رائفل کے کندے سے دھکیل کر پیچھے لے گیا۔

شور و غل سن کر فریال' منیجر رشید اور دو تین ملازم بھی جمع ہو گئے۔ چند لمحے تک سروج اور زریں گل میں تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا پھر صورت حال قابو میں آ گئی۔ نیگرو باڈی گارڈ سروج کو سمجھا بجھا کر صحن کی طرف لے گیا۔ میں نے زریں گل کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرایا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "استاد صیب! آپ کو صاف صاف بتا رہا ہے۔ اب یہ بے شرم زنانی آپ کے ساتھ رہے گا یا ام۔ اگر آپ اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تو ام کو اجازت دے۔ ام ابھی یہاں سے سیدھا پشاور کے لئے روانہ ہوگا۔ وہاں پنڈت مہاراج کے تہ خانے میں بھی اس نے ام بدکلامی کیا۔ اب پھر کتیا کی طرح بھونک رہا ہے۔ امارے منہ میں نسوار ہے۔ ام جھوٹ نہیں بولے گا۔ یہ امارا بیوی ہوتا تو ام اسے تین طلاق دیتا۔"

میں نے کہا "میری ہوتی تو میں بھی دے دیتا لیکن یہ خراب تو کسی کی بیوی ہی نہیں ہے۔"

"پھر بھی سب کی ہے" زریں گل نے غصہ نکالا۔

فریال منہ پھیر کر رہ گئی۔

دو دن مزید گزرے' تیسرے روز رات کو زریں گل خاموشی سے میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! وہ حرامزادی سروج کوئی گڑبڑ کر رہی ہے۔ ابھی ام نے اسے کالے کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھا ہے۔"

"کون کالا؟"

"وہی فرنگی کا بچہ' جو امارا گارڈ بنا پھرتا ہے۔ وہ انگریزی بڑا ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے سروج سے۔ یہ سوچنے کا بات ہے' اس وقت وہ دونوں کہاں سے آیا ہے؟"

مجھے شک ہوا کہ پرسوں ہونے والے جھگڑے کے سبب

ایسے میں ام اس کا پیچھا کر کے اس کے دودھ کا پانی کر سکتا ہے۔"

"لیکن "دودھ کا پانی" تو تب ہو گا جب اس کا پیچھا کرنے کے لئے کوئی سواری ہو گی۔ سواری کہاں سے لاؤ گے؟"

اس سے پہلے کہ زریں گل کوئی جواب دیتا یا تجویز پیش کرتا ایک آواز نے اسے چپ کرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک ایسی آندھی نے ہمیں دبوچ لیا کہ کچھ کہنے سننے کی سکت ہی نہ رہی۔ سب سے پہلا فائر مکان کے عقب میں ہوا تھا اور یہ بارہ بور رائفل کا فائر تھا۔ رات کے سناٹے میں فائر کی آواز دور تک گئی۔ اس کے فوراً بعد خودکار رائفل کا خوفناک قہقہہ گونجا اور ہمارے کمرے کا روشندان چکنا چور ہو کر فرش پر آگرا۔ ایکا ایکی میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ اس مکان کو چاروں طرف سے نہایت خطرناک لوگوں نے گھیر لیا ہے۔ میں نے اور زریں گل نے ایک ساتھ اپنے ریوالور نکالے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ ہم دروازہ کھولتے دونوں کھلا جیسے توپ کا گولا اس سے آٹکرایا ہو۔ مجھے اپنے سامنے ایک مسلح شخص کی جھلک نظر آئی۔ میں نے خود کو زمین پر گرایا اور بے دریغ فائر کیا۔ گولی نووارد کی چھاتی پر لگی اور وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس کے اوپر سے "ڈائیو" کر کے میں برآمدے میں آگیا۔ مجھے نیگرو باڈی گارڈ مائیکل برآمدے کے چکنے فرش پر دکھائی دیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے سیڑھیوں پر پوزیشن لی اور دروازے کی طرف فائر کرنے لگا۔ اس کے پاس نہایت طاقتور اسپیڈی ایکشن رائفل تھی۔ میں نے ایک بڑے سکھ کو لڑکھڑا کر مین گیٹ کے پاس گرتے دیکھا۔ دفعتاً ایک گوریلا نما شخص بغلی دروازے سے نکلا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ماؤزر تھام رکھا تھا۔ ماؤزر کا رخ سیڑھیوں پر موجود نیگرو باڈی گارڈ کی طرف تھا۔ باڈی گارڈ کا رخ دوسری جانب تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ نووارد باڈی گارڈ پر فائر کرنے والا تھا۔ میں نے فرش سے اٹھ کر جست لگائی اور گوریلا نما شخص کو دبوچ لیا۔ اس نے گرتے گرتے بھی فائر کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا نشانہ خطا گیا ہے۔ اور میں باڈی گارڈ کو "گارڈ" کرنے میں کامیاب رہا ہوں مگر بعد ازاں یہ خوش فہمی نکلی۔ گوریلا نما کی چلائی ہوئی گولی باڈی گارڈ مائیکل کی بلٹ پروف جیکٹ کو بچا دے کر اس کے کولھے میں جا گھسی تھی اور وہ سیڑھیوں پر سے شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ کر برآمدے میں آگرا تھا۔ ماؤزر بردار گوریلے کو اپنے نیچے لیتے ہی میں نے اس کی کلائی پر قبضہ کیا اور پھر ایک طوفانی ٹکر اس کی ناک پر رسید کی۔ ایک لمحے میں اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس دوران ایک دوسرا شخص بلا کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ میں اس بلا کے خلاف کوئی کارروائی کرتا ایک اور بلا اس بلا سے چمٹ گئی اور اسے بے دریغ پیٹنے لگی۔ یہ زریں گل تھا۔ وہ ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ میں نے مضروب شخص کا ماؤزر اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو ایک گرجدار آواز نے اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالا۔ یہ منحوس ترین آواز شنکر شکرا کی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فریال کو اپنے بازوؤں میں جکڑے کھڑا تھا۔ بالکل یوں جیسے بہت بڑے عقاب نے ننھی سی چڑیا کو دبوچ رکھا ہو۔ فریال شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی۔ اس کا گریبان کھل گیا تھا اور جسم غیر ضروری حد تک نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال شنکر شکرا کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور گردن عجیب انداز میں ایک طرف مڑ گئی تھی۔ شنکر کے ہاتھ میں کولٹ پسٹل تھا جو اس نے فریال کے بائیں پہلو میں دل کے قریب دھنسا رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ بن کھڑا رہ گیا۔

"خبردار۔ حرکت کی تو یہ لڑکی جان سے جائے گی۔" شنکر بے حد سرد لہجے میں بولا۔

کہنے کو تو یہ عام سے الفاظ تھے لیکن ان الفاظ کے اندر چھپا ہوا زہر اور زہر کے اندر پنہاں بے رحمی صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ الفاظ نہیں کسی بم کے اندر سے نکلنے والے وہ آہنی ٹکڑے ہیں جو فولادی چادروں کو چیر کر گزر جاتے ہیں۔ میں ان الفاظ کی قدر و قیمت پہچانتا تھا۔ لہٰذا ماؤزر کا خیال چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے زریں گل کو اشارہ کیا کہ وہ ریوالور پھینک دے۔ میں یہ خطرہ ہرگز ہرگز مول نہیں لے سکتا تھا کہ زریں گل کی کسی غلط حرکت کے نتیجے میں سفاک شنکر فریال کی جان سے کھیل جائے۔

"ہینڈز اپ" شنکر نے دوسرا حکم دیا۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور مجھے دیکھ کر زریں گل نے بھی ہاتھ اٹھا دیے۔ شنکر کے چار پانچ مسلح ساتھیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ قیم شحیم نیگرو باڈی گارڈ سیڑھیوں کے قریب پڑا تڑپ رہا ہے۔

شنکر کے ایک "شاہی" نامی ساتھی نے آگے بڑھ کر میری اور زریں کی تلاشی لی۔ میرا خنجر پنڈلی سے جدا کر لیا گیا۔ پھر وہ لوگ ہمیں رائفلوں کے نشانے پر مکان سے باہر لے آئے۔ سروج کو بھی خودکار رائفل سے دھکیل کر باہر لایا گیا۔ آتشیں اسلحے کی دیدنے اس کا خوبصورت چہرہ دھواں کر دیا تھا۔ مکان کے عقب میں ابھی تک فائرنگ ہو رہی تھی۔ گلی میں خوفزدہ چہروں والے لوگ کھڑکیوں اور دروازوں کی درزوں سے جھانک رہے تھے۔ قرب و جوار میں شدید سنسنی پھیلی محسوس ہوتی تھی۔ گلی میں آگے پیچھے دو کاریں کھڑی تھیں۔ آگے وہی شیورلیٹ تھی جو اس سے پہلے کینٹ کی کوٹھی والے معرکے میں نظر آئی تھی۔ عقب میں ایک سیاہ اسٹیشن ویگن تھی اور اس پر سرکاری نمبر پلیٹ لگی تھی۔ مجھے اور زریں گل کو دھکیل کر شیورلیٹ میں بٹھایا گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت زریں گل نے ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو شنکر کے ایک ساتھی نے اس کے سر پر رائفل کے کندے سے زوردار ضرب لگائی۔ ضرب کی شدت سے زریں گل کا رنگ لیموں کی طرح زرد

ہو گیا۔ فریال بدستور شنکر کے چنگل میں تھی۔ بے چاری اپنی مرضی سے جنبش تک نہیں کر پا رہی تھی۔ شنکر اس کے بالوں کو جھٹکا دیتا تھا تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل جاتی تھی۔ شنکر فریال کو لے کر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں میرے لئے یہ پیغام تھا کہ میں نے جس لمحے مزاحمت کا ارادہ کیا وہ ساہی صاحب کی لاڈلی بیٹی کی زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو پچھلی نشست پر ایک رائفل بردار میرے اور زریں گل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

دونوں گاڑیاں گلی سے نکلیں اور بڑی سڑک پر آتے ہی فراٹے بھرنے لگیں۔ اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس کشادہ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ چوراہوں پر ٹریفک سگنلز بند کیے جا چکے تھے اور اب صرف زرد بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ کار میں مکمل خاموشی تھی بس کبھی کبھی فریال کی دبی دبی سسکی سنائی دے جاتی تھی۔ زریں گل نے اس بوجھل خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی اور شنکر سے مخاطب ہو کر بولا "خوچہ تم ایک کمزور لڑکی کو اس طرح دبوچ بیٹھا ہے' یہ مردانگی نہیں ہے۔ تمہارا جھگڑا ہم سے ہو سکتا ہے۔ اس لڑکی سے نہیں۔"

"شٹ اپ" شنکر حلق کے بل دہاڑا۔

اس لہجے کے پیچھے موجود غیر معمولی وحشت کو محسوس کر کے زریں گل گڑبڑا سا گیا۔ میں نے ہاتھ کے دباؤ سے اسے اشارہ کیا کہ وہ خاموش رہے۔ زریں گل پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس دوران ایک جیپ مخالف سمت سے آئی اور ہمیں کراس کر کے گزر گئی۔ میں نے پہچان لیا' یہ وہی گاڑی تھی جسے امریکن ایجنٹ اینڈرے آمد و رفت کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ اینڈرے نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ غالباً یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میرے کانوں میں بریک لگنے کی زوردار آواز گونجی۔ میں نے ترچھا ہو کر عقب نما آئینے میں دیکھا' وہ جیپ جس نے ہمیں ابھی کراس کیا تھا سڑک کے کنارے رک رہی تھی۔ معلوم نہیں شنکر نے میرے تاثرات سے کوئی اندازہ لگایا تھا یا یہ اس کی چھٹی حس تھی۔ بریک لگنے کی آواز سنتے ہی وہ پوری طرح چوکس ہو گیا۔ اس نے فوراً جیب سے ایک انگشت دراکی ناکی نکالا اور اس پر اسٹیشن ویگن والوں کو حکم دیا کہ وہ کسی گاڑی کو "اوور ٹیک" نہ کرنے دیں۔

دو تین منٹ بعد ہمارے عقب میں ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ میں ایسے زاویے سے بیٹھا تھا کہ عقب نما آئینے میں صورت حال کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ جیپ اسٹیشن ویگن سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن حسب ہدایت اسٹیشن ویگن کا ڈرائیور اسے راستہ نہیں دے رہا تھا۔ اب اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ جیپ میں اینڈرے اور غیور رشید سوار ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے رشید کے ملازم نے بتایا تھا کہ وہ دونوں گیارہ بجے تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ سو وہ "پہنچ گئے تھے" اور شنکر کی شیورلیٹ دیکھ کر اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔

اسٹیشن ویگن اور جیپ میں کچھ دیر کشمکش جاری رہی پھر فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ دو طرفہ فائرنگ یقیناً دونوں گاڑیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ میری نگاہ عقب نما آئینے میں چمکنے والی لائٹس پر لگی ہوئی تھی جب کہ شنکر شکرا گھوم کر براہ راست اس لڑائی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ دفعتاً عقب نما میں اسٹیشن ویگن کی ہیڈ لائٹس ناچ کر رہ گئیں۔ وہ ڈگمگاتی ہوئی سڑک سے اتری اور درختوں میں گھس گئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا امریکن ایجنٹ اینڈرے نے اسٹیشن ویگن کو سائیڈ مار کر الٹا دیا تھا۔

اسٹیشن ویگن والی رکاوٹ دور ہوتے ہی جیپ اور شیورلیٹ کا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ شنکر نے اپنے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اپنی طرف رائفل پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے رخ پھیر کر رائفل کی نال کھڑکی سے نکالی اور جیپ پر فائرنگ شروع کر دی۔ دوسری طرف سے بھی فوراً جواب آیا' کئی گولیاں شیورلیٹ کی باڈی میں گھس گئیں۔ ہم نے بے اختیار اپنے سر نیچے کر لئے تھے۔ یہ مقابل فائرنگ بمشکل ایک منٹ جاری رہی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اینڈرے کی رائفل خالی ہو چکی ہے۔ اس کی طرف سے فائر کا جواب نہیں آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ واقعی ایمونیشن سے محروم ہو چکا تھا' ورنہ وہ شیورلیٹ سے اتنا نزدیک پہنچ چکا تھا کہ اس کا ٹائر برسٹ کرنے کی کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ بہرطور اس کی ذہانت اور دلیری قابل داد تھی۔ وہ جیپ کو خودکار رائفل کے فائر سے بچاتا ہوا بڑی تیزی سے شیورلیٹ کے پہلو میں پہنچا اور اسے زبردست سائیڈ ماری۔ شیورلیٹ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بری طرح لہرائی اور ڈرائیور کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اینڈرے کو پانچ دس سیکنڈ مزید مل جاتے تو وہ "جارحانہ ڈرائیونگ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے یقیناً شیورلیٹ کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ "ڈرائیونگ" رشید کے سپرد کر کے جیپ سے شیورلیٹ کی چھت پر چھلانگ لگا دیتا۔ اس جیسے شخص کے لئے یہ اقدام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ بہرطور اسے اس مہم جوئی کا موقع نہیں ملا اور خودکار رائفل کے ایک برسٹ نے جیپ کا پچھلا ٹائر اڑا دیا۔ وہ بری طرح ڈگمگائی اور پھر لہراتی ہوئی سڑک سے اتر گئی۔ ہم ایک بار پھر شنکر اینڈ کمپنی کے رحم و کرم پر تھے۔

○○

ہماری منزل بھوپال ہی کا ایک محل نما مکان تھی۔ دکنی طرز تعمیر کا شاندار نمونہ تھی یہ عمارت۔ محرابی دروازے' منقش ستون' کنگرے اور پتھریلی جالیاں' قدامت اور جدت کے خوبصورت امتزاج نے اس عمارت کو انتہائی زیبا دیا تھا۔ اس محل نما مکان میں داخل ہونے سے پہلے ہمارے منہ' ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی لہٰذا عمارت کے گرد و نواح کے بارے میں ہم کچھ نہیں

کہہ سکتے تھے۔ یہ عمارت تقریباً پانچ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وسیع و عریض باغ، خوبصورت روشیں، فوارے، اصل عمارت سنگِ سرخ کی تھی اور درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ شنکر نے فریال کو تو اپنے خونخوار ساتھی شاہی کے سپرد کر دیا اور ہمیں لے کر محل کی آراستہ و پیراستہ نشست گاہ میں آ گیا۔ سوروج بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم خود کار رائفلوں کی زد میں تھے اور نہ بھی ہوتے تو کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ شنکر نے بہت واشگاف الفاظ میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ فریال کی زندگی صرف اس لمحے تک محفوظ رہے گی جب تک میں ان کی ہدایات پر عمل کروں گا۔ اور میں جانتا تھا کہ شنکر اپنی دھمکی کو عملی جامہ ضرور پہنائے گا چاہے بعد میں اسے مجھ پر قابو پانے میں کتنی بھی مشکل پیش آئے اور اس سلسلے میں کتنا بھی پچھتانا پڑے۔

محل نما مکان کی وسیع و عریض نشست گاہ میں جس شخص سے ہماری ملاقات سب سے پہلے ہوئی وہ شیخ عاصم بن ارشد تھا۔ وہ ایک سرخ مخملی پردے کے پیچھے سے برآمد ہوا اور بھاری قدموں سے چلتا ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے عقب میں ایک باڈی گارڈ چوکس حالت میں موجود تھا۔ مسٹری کلارک کی یہ اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی تھی کہ شیخ عاصم بن ارشد یہاں موجود ہے اور اس نے مجھے زیر کرنے کے لئے شنکر شکرا کی خدمات حاصل کی ہیں۔ شنکر جیسے لفنگے کی خدمات حاصل کرنا یقیناً شیخ عاصم جیسے ارب پتی ہی کا کام تھا۔ شیخ عاصم نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا پھر گونجتی ہوئی سی آواز میں بولا "کیسے ہو مسٹر شاہ جہاں!"

"تمہاری دعا سے ٹھیک ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ بولا "مجھے خدشہ ہے کہ میری دعائیں اب زیادہ دیر تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔" اس کے لہجے میں بے پناہ دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔

شیخ عاصم کی ہدایت پر سوروج اور زریں گل کو بھی نشست گاہ سے باہر بھیج دیا گیا۔ میں اور شیخ عاصم آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شیخ عاصم کے اشارے پر شنکر شکرا نے بھی قریبی صوفے پر جگہ سنبھال لی۔ کولٹ پسٹل جو اب تک شنکر کے ہاتھ میں تھا اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ رائفل بردار باڈی گارڈ میرے سر پر چوکس کھڑا تھا۔

شیخ عاصم جہاں ہمارے پکڑے جانے پر خوش نظر آ رہا تھا وہاں کچھ حیران بھی تھا۔ اس نے میرے سامنے ہی شنکر شکرا سے پوچھا کہ میں کس طرح اور کیونکر قابو میں آیا۔ شنکر نے بھی بلا تکلف یہ روداد سنا دی۔ اس روداد میں سوروج کا نام بھی بڑی وضاحت سے آیا۔ ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے پہلے ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ سوروج کو کینٹ کے علاقے میں ایک ریستوران سے نکلتے ہوئے پہچان لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہی تنگڑو باڈی گارڈ تھا جو کولہے پر گولی کھانے کے بعد برکت محل میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ ان دونوں کے ہمراہ ایک پنڈت نما شخص بھی تھا۔ (پنڈت نما شخص کے ذکر سے میرا دھیان فوراً پنڈت مہاراج کی طرف چلا گیا۔ یہ شخص بھی بالآخر دولت کا پجاری ثابت ہوا تھا اور اس نے زندگی کی گلیوں میں بڑے نواب کا ساتھ چھوڑ کر چھوٹے نواب فیروز کے کندھے سے کندھا ملا لیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رات کے اندھیرے میں سوروج تنگڑو باڈی گارڈ کو لے کر پنڈت مہاراج سے ہی ملنے گئی ہو) ریستوران کے سامنے شنکر کے چوکس کارندوں نے سوروج کو پہچان کر اس کا تعاقب کیا اور برکت محل پہنچ گئے۔ راستے ہی میں واکی ٹاکی کے ذریعے شنکر کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے فوراً ایک کامیاب چھاپا مارا اور ہمیں جا لیا۔

یہ ساری گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔ میں شنکر اور شیخ کی گفتگو سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوروج پر لعنتیں بھی ارسال کر رہا تھا۔ یہ گفتگو سننے سے پہلے ہی مجھے شبہ تھا کہ ہماری اس "بدقسمتی" کے پیچھے سوروج کی "نحوست" کا ہاتھ ہے۔ وہ بدبخت معلوم نہیں کس چکر میں پنڈت مہاراج سے ملنے نکلی تھی اور شنکر کی صورت میں ایک قیامت اپنے پیچھے لگا لائی تھی۔ شنکر کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ عاصم کی طرف سے مجھے زندہ گرفتار کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

شنکر اور شیخ عاصم کے درمیان مکالمہ جاری تھا کہ ایک باوردی ملازم نے اندر آ کر اطلاع دی کہ شیخ عاصم کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ شیخ عاصم کو یوں نشست گاہ سے بلانے کی جرأت اس کے اہل خانہ میں ہی سے کوئی کر سکتا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ شیخ عاصم کی کسی بیگم نے اسے پکارا تھا۔ میں نے "کسی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے وہ شیخ تھا اور اس کی بیگم کا واحد ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ پہلے تو شیخ عاصم نے اٹھ کر جانے کا ارادہ کیا مگر پھر نجانے دل میں کیا آئی کہ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ ملازم سے بولا "مسز کو یہیں بھیج دیا جائے۔"

چند لمحے بعد سرخ مخملی پردے میں جنبش پیدا ہوئی اور مسز شیخ عاصم اندر داخل ہوئیں۔ مسز عاصم کے چہرے کا زیریں حصہ باریک نقاب میں تھا۔ میری نگاہ اس چہرے پر پڑی اور جیسے گردشِ دوراں میرے لئے تھم گئی۔ یوں لگا کہ ایک دھماکے سے فلک ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے سر پر گر رہے ہیں۔ میرے سامنے غزالہ کھڑی تھی۔ غزالہ جلیس۔ میری روح میری کائنات۔ میری زندگی کا پہلا اور آخری سپنا۔ وہ مسز شیخ عاصم کے روپ میں تھی یا میں رات کے آخری پہر کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں تڑپ کر بیدار ہو جاؤں۔ یہ سپنا ٹوٹ جائے۔ لیکن بیدار ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی سو رہا ہو اور میں جاگ رہا تھا اور اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا۔ میں بے اختیار کھڑا ہو گیا تھا۔ غزالہ بھی "گم صم" کھڑی تھی۔ وہ ایک دیدہ زیب جھلملاتی ساڑی میں تھی۔ کانوں اور گلے میں

جڑاؤ زیور جگمگا رہا تھا۔

"بیٹھو جان" شنکر شکرا نے تحکمانہ انداز میں مجھ سے کہا۔

میں خوابیدہ انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ شنکر اور شیخ عاصم میری بے پناہ حیرت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شیخ عاصم نے سگار سلگایا اور نرم لہجے میں غزالہ سے بولا "تم بھی بیٹھ جاؤ بیگم۔"

غزالہ کے خوبصورت پیروں نے پھولدار قالین پر حرکت کی اور وہ آہستگی سے چلتی شیخ عاصم کے پہلو میں جا بیٹھی۔ "ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر شاہ جہاں عرف جمالی استاد۔ میرا خیال ہے کہ تم انہیں پہلے سے جانتی ہو۔"

"جی" غزالہ نے گردن جھکا کر ہولے سے کہا۔

"جمالی صاحب! آپ بھی انہیں جانتے ہوں گے۔ ڈاکٹر غزالہ جلیس معروف گائناکالوجسٹ۔ اب یہ میری بیوی ہیں۔"

میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ زبان منہ کے اندر ہی بل کھا کر رہ گئی تھی۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر چاہتا بھی تو بول نہیں سکتا تھا۔ ذہن میں زلزلہ سا بپا تھا۔ یا خدا... یہ کیا ماجرا ہے۔ غزالہ کی شادی تو ایک خوبرو جواں سال شخص سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھا۔ میں نے خود اس شادی کی فلم دیکھی تھی۔ وہ تمام موہوم رسومات دیکھی تھیں جنہوں نے میرے سینے پر انمٹ زخم لگائے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے غزالہ اپنے دولہا کی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی تھی.... کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ نہیں وہ جھوٹ نہیں تھا۔ بے شک میں نے سیکڑوں مرتبہ سوچا تھا کہ کاش کسی صورت یہ سارے مناظر میری آنکھ کا دھوکا ثابت ہوں۔ لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ اس دھوکے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غزالہ شیخ عاصم کے پہلو میں بیٹھی نظر آئے۔

شیخ عاصم نے شنکر سے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہارے دوست کو چکر آ گیا ہے۔ اسے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔"

"نہیں مجھے پانی کی ضرورت نہیں" میں نے بمشکل زبان کو حرکت دی۔

"میرا تو خیال ہے کہ تمہیں پانی کے علاوہ گلوکوز لگائے جانے کی بھی ضرورت ہے لیکن افسوس یہ سہولت ہم تمہیں یہاں مہیا نہیں کر سکتے۔ یہ عمارت ہم نے کرائے پر حاصل کر رکھی ہے۔ اگر ہمارا اپنا مکان ہوتا تو وہاں اسپتال کی تمام سہولیات بھی تمہیں میسر ہوتیں۔"

میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو زبردستی یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"محض مہمان نوازی کے لئے" شیخ عاصم نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "میری خواہش ہے کہ تم کچھ دن ہمارے ساتھ اس عمارت میں گزارو۔ مجھے امید ہے کہ چار سال جیل میں سڑنے کے بعد تمہیں یہاں کے آرام دہ ماحول میں راحت محسوس ہوگی۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ غزالہ بے قرار نظر آ رہی تھی۔ وہ شیخ عاصم سے بولی "میں جاؤں؟"

"نہیں بیگم بیٹھو" شیخ عاصم نے باقاعدہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تم ابھی کچہری چھوڑ کر کہاں جاؤ گی۔ اتفاقاً اگر جمالی صاحب سے ملاقات ہو ہی گئی ہے تو کچھ حال احوال پوچھو۔ کچھ نئے پرانے قصے۔ کچھ دیس بدیس کی باتیں۔"

میں نے دیکھا غزالہ کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کی نمی نمودار ہو رہی ہے۔ شیخ عاصم تھوڑی دیر مجھے یاد دلانے والی باتیں کرتا رہا پھر اس نے محسوس کیا کہ غزالہ کی بے قراری بڑھ گئی ہے۔ موضوع بدل کر بولا "ٹھیک ہے شنکر تم جمالی صاحب کو لے جاؤ اور انہیں ان کا کام سمجھاؤ۔ میں ان سے پھر ملاقات کروں گا۔"

میں نے کہا "میں یہاں کوئی کام سمجھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔ مجھے بتایا جائے کہ مجھے یہاں لانے سے تمہارا کیا مقصد ہے۔ اور اگر مقصد دشمنی ہے تو پھر یہ دشمنی میرے ساتھ کی جائے۔ میرے ساتھیوں کا اس میں کیا قصور ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ ساجی صاحب کی بچی ایک دن بھی یہاں رہے۔ اور اگر اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک ہوا تو اس کا انجام تم لوگوں کے تصور سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔"

شیخ عاصم مسکرایا۔ شنکر کے زہریلے ہونٹوں پر بھی ایک طنزیہ مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔ شیخ عاصم نے جمے ہوئے لہجے میں کہا "یہ دھمکیاں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو شاہ جہاں۔ اور یہ بھی کان کھول کر سن لو کہ یہاں تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے اور وہی دیکھو گے تم جو تمہاری تقدیر دکھائے گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

شنکر نے تپائی سے اپنا کولٹ پسٹل اٹھا لیا تھا اور اب منتظر تھا کہ میں دروازے کی طرف قدم بڑھاؤں۔ میں نے شیخ عاصم کے پہلو میں خاموش بیٹھی غزالہ پر ایک نگاہ ڈالی اور شنکر کے آگے چلتا نشست گاہ سے نکل آیا۔ اس وقت تک رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

چند منٹ بعد میں اور شنکر ایک شاندار گلاس روم میں بیٹھے تھے۔ اس گلاس روم سے لان کی وسیع ہریالی اور پھولوں کی بہار صاف نظر آتی تھی۔ دن کا وقت ہوتا اور بجلی کے بجائے قدرتی روشنی ہوتی تو یہ بہار کہیں زیادہ خوبصورت نظر آتی۔ کمرے کے فرش پر سرمئی رنگ کا ایک نہایت نفیس قالین بچھا تھا۔ اس قالین پر ایک بلوری تپائی اور تپائی پر غالباً مغلیہ دور کا ایک دو فٹ اونچا منقش مرتبان دھرا تھا۔ ہزاروں ڈالر قیمت رہی ہوگی اس مرتبان کی۔ اندر داخل ہوتے ہی شنکر نے ایک ننھی سی ڈبیا مرتبان کے قریب رکھ دی۔ اس ڈبیا کا حجم بمشکل ڈیڑھ مکعب سینٹی میٹر ہوگا۔ دیکھنے میں یہ کسی ریڈیو یا ٹی وی کا کل پرزہ نظر آتی تھی۔ شنکر اور میں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ شنکر کا چہرہ بھوری چٹان کی طرح

بے تاثر تھا اور آنکھوں میں وہی حیوانی چمک تھی جو اسے ایک غیر انسانی "مرغ" بنا رہی تھی۔ وہ مشینی لہجے میں بولا "محترم شیخ عاصم صاحب کی ہدایت کے مطابق تمہارے لئے اس محل کے اندر گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ بہت خاص ضرورت کے تحت تم اجازت لے کر محل سے باہر بھی جاسکو گے۔ لیکن اس کے لئے حد مقرر ہے اور وہ حد ہے دس کلومیٹر۔ اس سے آگے جانے پر پابندی ہوگی۔"

"لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ۔۔۔"

"خاموش" شنکر دہاڑا "مجھے بات مکمل کرنے دو۔ محل کے اندر تمہیں محترم شیخ عاصم صاحب سے ایک خاص فاصلے پر رہنا ہوگا۔ اس فاصلے کی کم از کم حد تین میٹر ہے۔ تین میٹر سمجھتے ہو نا؟ قریباً دس فٹ۔ غالباً تم اس بات پر حیران ہو رہے ہو کہ میں کلومیٹرز اور میٹرز کے حوالے کیوں دے رہا ہوں۔ تمہاری حیرانی بجا ہے لیکن مجھے آشا ہے کہ میں تمہاری حیرانی دور کرنے میں کامیاب رہوں گا۔ ساری بات تمہیں ذہن نشین کرانے کے لئے ہمیں تھوڑا سا پیچھے جانا ہوگا۔ چند ماہ پیچھے۔ راجستھان کی نادرل اسٹیٹ میں۔ جہاں تم ہزہائی نس رتن سنگھ کے مہمان تھے۔ مجھے وشواس ہے کہ یہ واقعات اتنے پرانے نہیں کہ تم انہیں بھول گئے ہوگے۔"

میں نے کہا "تم پہیلیاں مت بجھواؤ۔ مجھے سب یاد ہے۔ تم اصل بات بتاؤ۔"

کوئی سیکنڈ کلاس بدمعاش ہوتا تو میرے لب و لہجے پر بھنا اٹھتا' لیکن وہ شنکر تھا۔ سمندر سے گہرا اور قطب شمالی کے برفستانوں سے زیادہ سرد۔ اپنی خطرناک نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑتے ہوئے وہ بولا "میں جو بات بتانے جا رہا ہوں وہ تمہیں اجنبی لگے گی مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا۔ تمہارے اجنبیت محسوس کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔" ایک لمحہ توقف کرکے اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور بولا "اگر میں یہ کہوں کہ آج سے چند ماہ پہلے تمہاری بے خبری میں تمہارے جسم کے اندر ایک "الیکٹرانک ڈوائس" رکھ دیا گیا ہے اور تم نادرل اسٹیٹ سے نکل کر اب تک جہاں جہاں گھومتے رہے ہو اسی "الیکٹرانک ڈوائس" کے ساتھ گھومتے رہے ہو تو تمہارا تاثر کیا ہوگا؟"

میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ میرے ذہن میں نمو پانے والا ایک بدترین خدشہ پل بھر میں حقیقت کا روپ دھار گیا تھا۔ مجھے لگا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا ہے۔ میرا دھیان آپوں آپ اپنے پہلو کی تکلیف کی طرف چلا گیا۔ ذہن نے پکار کر کہا کہ اگر حقیقت وہی ہے جو شنکر کہہ رہا ہے تو پھر میرے پہلو کی مسلسل تکلیف کا تعلق اسی "ڈوائس" سے ہے جس کا تذکرہ شنکر کی کالی زبان سے ہوا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ میری پسلیوں کے نیچے درد کا پہلا حملہ فرید کوٹ کی آبادی گنج نگر میں ہوا تھا۔ سیٹھ رام داس کی کوٹھی میں میرے اور شیخ عاصم کے درمیان جھڑپ ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ شیخ عاصم نے مغلوب الغضب ہو کر مجھ پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کی تھی۔ اس کی ایک ٹھوکر میرے پہلو میں لگی تھی اور وہ درد جاگ اٹھا تھا جس نے اگلے چند ماہ میں مجھے گاہے گاہے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ میں فرید کوٹ سے بھکر پہنچا تھا اور بھکر سے لاہور۔ لاہور سے مجھے مجتبیٰ کور نے مسٹر جی کلارک کا محافظ بنا کر پشاور بھیج دیا تھا۔ اس تمام عرصے میں یہ پہلو کا درد مجھے رہ رہ کر بے حال کرتا رہا تھا۔

شنکر بڑے غور سے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا "کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" وہ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

"تمہاری بات پر غور کر رہا ہوں" میں نے کہا "اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو کیونکر ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق میرے جسم میں کوئی آلہ رکھا گیا ہے تو آپریشن کا نشان کہاں ہے اور پھر چند ہفتے پہلے میرے ایکسرے ہو چکے ہیں ان میں وہ آلہ نظر کیوں نہیں آیا۔"

وہ بولا "تمہارے رویے سے لگتا ہے کہ تمہیں پہلے ہی اس بات کا شک تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی ایسی کارروائی ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "یہ شک مجھے ابھی تمہاری بات سننے کے بعد گزرا ہے۔"

"غالباً تم حسب عادت جھوٹ بول رہے ہو" شنکر نے کہا "بہر حال تمہارے تمام سوالوں کا جواب میرے پاس موجود ہے اور یہی جوابات دینے کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔۔ میرا خیال ہے کہ میں شروع سے بات کروں گا تو بہت سے جوابات تمہیں خود بخود مل جائیں گے۔" چند لمحے کا شارٹ بریک کرکے شنکر نے اپنے مخصوص برانڈ کا نیا سگریٹ سلگایا اور بولا "نادرل اسٹیٹ میں تم پر چند بہت بھاری دن گزرے تھے۔ شیخ عاصم نے تم پر اسٹیٹ کے قانون کے مطابق فوری عدالت میں مقدمہ چلوایا تھا اور اس مقدمے میں تمہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ پھانسی سے پہلے تم نے چند روز پھانسی کی کوٹھڑی میں بھی گزارے تھے۔ تم اس بات سے بے خبر ہو کہ اس کوٹھڑی میں قیام کے دوران ایک روز تمہارے کھانے میں خواب آور دوا ملا دی گئی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں تمہیں کال کوٹھڑی سے نکال کر "ہیروں" میں واقع اسپتال پہنچایا گیا تھا اور وہاں ایک ماہر جاپانی انجینئر نے ایک مقامی سرجن ڈاکٹر کی مدد سے تمہارے جسم میں یہ چھوٹا سا آلہ رکھ دیا تھا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے شنکر نے اس ننھی سی ڈبیا کی سمت اشارہ کیا جو اس نے اندر داخل ہوتے ہی منقش مرتبان کے پاس رکھ دی تھی۔ میں نے بے اختیار اس سرخی مائل ڈبیا کی طرف دیکھا۔ شنکر کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ جھلک دکھا کر او جھل ہوگئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں شاہ جہاں! اس الیکٹرانک

دور میں سب ممکن ہے۔ دنیا بھر کے سائنس دان اور انجینئر محیّر العقول کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ دولت موجود ہو تو ہر چیز خریدی جا سکتی ہے' بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق ایجاد کرائی جا سکتی ہے۔ یہ چھوٹا سا الیکٹرانک آلہ تو ایک معمولی چیز ہے۔ اس سے ہزار گنا پیچیدہ اور دور رس آلے موجود ہیں۔ یہ آلہ تمہارے جسم میں آپریشن کے بغیر پہنچایا گیا۔ تم نے گیسٹرواسکوپی کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ معدے اور آنتوں کے اندرونی معائنے کا جدید طریقہ ہے۔ ایک ربر پائپ کے ذریعے ننھا سا کیمرا منہ کے راستے پیٹ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ تمہارے جسم میں یہ آلہ پہنچانے کے لیے بھی اس سے ملتا جلتا طریقہ اختیار کیا گیا ہے' لہٰذا تمہارے جسم پر آپریشن کا نشان نہیں۔ یہ آلہ تمہارے معدے کی اندرونی جھلی سے چسپاں کیا گیا ہے۔ معدے اور آنتوں وغیرہ کے اندرونی ٹشوز کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ ان سے کوئی چیز چپک نہیں سکتی لیکن اس آلے کے گرد موجود "کوٹنگ" میں یہ اہم خصوصیت ہے کہ آلہ جسم کے اندر کسی بھی جگہ چپک سکتا ہے۔" شنکر نے بڑی احتیاط سے ڈبیا اٹھائی اور مجھے اس کی سرخی مائل کوٹنگ دکھاتے ہوئے کہا "میری معلومات کے مطابق اس کوٹنگ میں جو کیمیکل استعمال کیا گیا ہے اس میں ایک اور غیر معمولی خصوصیت بھی ہے۔ ایکسرے یا الٹرا ساؤنڈ وغیرہ میں اس آلے کو "ڈیٹیکٹ" نہیں کیا جا سکتا۔ جاپانی ماہر کے مطابق ابھی یہ کوٹنگ تجرباتی مراحل میں ہے اور اسے مزید بہتر بنایا جائے گا۔"

نفسیاتی طور پر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے معدے میں کوئی چیز چپکی ہے اور اس سے پیدا ہونے والے انفیکشن کے سبب درد کی مدھم لہریں ابھر رہی ہیں۔ شنکر نے الیکٹرانک ڈوائس واپس تپائی پر رکھ دیا اور بولا "اب میں تمہیں اس آلے کے چند فنکشنز بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ زندہ رہنے کے واسطے تمہارے لیے یہ جانکاری از حد ضروری ہے۔ نمبر ایک۔ دس کلومیٹر کے دائرے میں تم جہاں کہیں بھی ہوگے اس آلے سے نشر ہونے والے سگنل ہم تک پہنچتے رہیں گے اور ہم ان کی مدد سے تم تک پہنچ جائیں گے۔۔۔۔ نمبر دو۔ اس آلے یعنی ٹرانسسٹر کے نچلے حصے میں تین ملی گرام نہایت طاقتور قسم کا ٹی این ٹی موجود ہے۔ ایک ننھا سا بٹن دباتے ہی یہ بولو پھٹ جائے گا اور تم آنجہانی قرار دیئے جاؤ گے۔ میں ابھی تمہیں اس "کارکردگی" کا عملی مشاہدہ بھی کراتا ہوں۔۔۔۔ نمبر تین۔۔۔ تم اپنے طور پر کسی سرجن یا معالج کی مدد سے اس ٹرانسسٹر کو اپنے جسم سے جدا نہیں کر سکتے ہو۔ ایسی حماقت کا فوری نتیجہ دھماکا خیز مواد کے پھٹنے کی صورت میں نکلے گا۔۔۔ نمبر چار۔۔۔ اس آلے میں موجود بیٹری تمہاری جسمانی حرارت کی مدد سے چارج ہوتی رہے گی۔ لہٰذا تم جب تک زندہ رہو گے یہ آلہ بخوبی کام کرتا رہے گا۔۔۔ نمبر پانچ۔ اس آلے کی مدد سے بوقتِ ضرورت تمہیں ٹارچر کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ غالباً شیخ عاصم صاحب خود تمہیں بتا دیں گے۔ اب میں آخر میں تمہیں اس آلے کی سب سے اہم خصوصیت بتاتا ہوں۔ میرے خیال میں اب واضح ہو جائے گا کہ میں نے میٹرز اور کلومیٹرز کا تذکرہ کیوں کیا تھا۔"

شنکر نے اپنی جیب میں سے دو خوبصورت گھڑیاں نکالیں۔ ان گھڑیوں پر چھوٹے چھوٹے چمکدار نگینے لگے تھے۔ شنکر نے ایک گھڑی تپائی پر الیکٹرانک آلے کے قریب رکھ دی' دوسری اس کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے بعد وہ طویل کلاس روم کے آخری سرے پر قریباً آٹھ میٹر دور چلا گیا۔ اس کے اشارے پر مجھے بھی اس کے پاس جانا پڑا۔ شیشے کی ان دیواروں پر جو کہ لان کی طرف تھیں ملکی پردہ کھینچ دیا گیا تھا۔ شنکر نے گھڑی پر کسی جگہ دباؤ ڈالا۔ چوبیس پچیس فٹ دور تپائی پر رکھی گھڑی پر ایک ننھا سا سرخ بلب جلنے بجھنے لگا۔ شنکر نے کہا "اب اس آلے کا "بلاسٹنگ سسٹم" آن ہو گیا ہے۔ اب دونوں گھڑیوں کا درمیانی فاصلہ تین میٹر سے کم اور دس کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ دونوں صورتوں میں اس آلے میں بلاسٹ ہو جائے گا۔ اب گھڑیوں کا درمیانی فاصلہ آٹھ میٹر یا کچھ کم ہے۔ لہٰذا خطرے سے آگاہ کرنے والی سرخ لائٹ اسپارک کر رہی ہے۔" وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولا "یہ دیکھو فاصلہ کم ہونے سے اسپارکنگ میں تیزی آگئی ہے۔ اب میں نے تین چار قدم اور آگے بڑھائے تو ڈوائس پھٹ جائے گا۔" پھر اس نے محتاط انداز میں تپائی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔ ایک پٹاخے جیسا دھماکا ہوا اور تپائی کے ارد گرد دھواں پھیل گیا۔ میں نے قیمتی مرتبان کو ٹوٹ کر فرش پر گرتے دیکھا۔

شنکر اور میں اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ شنکر نے کہا "یہ دھماکا بہت بڑا نہیں لیکن جب یہ تمہارے نرم و نازک معدے کے اندر اور دل و جگر کے درمیان ہوگا تو سوچو کتنا نقصان پہنچائے گا۔ بمشکل دو تین سانس لے سکو گے تم۔"

مجھے اپنا سانس سینے میں گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ شنکر نے آگے بڑھ کر دیواروں سے پردے ہٹا دیے اور ایگزاسٹ فین چلا دیا تاکہ بلاسٹ سے پیدا ہونے والا دھواں باہر نکل سکے۔ مرتبان کے علاوہ ایش قیمت تپائی بھی جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی۔

میں نے واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "لیکن یہ سب سرپا کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے۔ مجھ سے کیا چاہتا ہے شیخ عاصم۔ وہ مرد ہے تو مردوں کی طرح میرے سامنے آئے اور مقابلہ کرے۔"

شنکر نے کہا "مقابلہ اپنے برابر کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ تم شیخ صاحب کے دشمن نہیں ان کے معتوب ہو۔ وہ تم سے مقابلہ کرنے کے لئے نہیں تمہیں سزا دینے کے لیے دبئی سے یہاں آئے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ سزا ایسی یادگار ہو کہ ان کے مرحوم بھائی کی روح سکون پا جائے۔"

"سکون کیا کرتا ہے یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ میں کسی شعبدے بازی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔۔۔ یہ سب سے بڑا ڈراوا

موت کا ہوتا ہے اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ موت سے میں کتنا ڈرتا ہوں۔"

"بات مارنے کی نہیں ہے" شنکر سرد لہجے میں بولا "شیخ عاصم تمہیں مارنا چاہتے تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ وہ تم سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ جیسے باز کبوتر سے کھیلتا ہے اور جب وہ لب مرگ ہوتا ہے تو اسے پنجوں سے پھاڑ دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے ذہن میں ابھی تک یہ سوال نہیں آیا کہ جب تامل اسٹیٹ میں تمہیں پھانسی دی جا رہی تھی تو پھر پھانسی دینے سے ایک دن قبل تمہارے بدبخت جسم میں یہ الیکٹرانک ڈیوائس کیوں رکھا گیا؟"

"تمہاری اطلاع کے لیے ... میرے ذہن میں یہ سوال ہے" اور وہ جواب بھی موجود ہے جو تمہاری لعنتی زبان سے ادا ہو گا۔ تم یہی کہو گے کہ وہ پھانسی بھی محض کھیل تھا۔ مجھے کال کوٹھڑی میں رکھ کر موت کا مزہ چکھایا جا رہا تھا۔ تختۂ دار تک پہنچا کر مجھے چھوڑ دیا جاتا۔ ممکن ہے کہ تمہاری بات درست ہو اور ممکن ہے کہ غلط لیکن مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں تمہارے شیخ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسے اپنے ہر بڑے ارادے میں شرمناک ناکامی ہو گی۔ بالکل جیسے سات برس پہلے اس کے جنسی بھائی کو ہوئی تھی۔"

کہنے کو تو میں یہ بات کہہ رہا تھا لیکن نجانے کیوں اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ حقیقت میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی یا شیخ عاصم کی ناکامی کے بارے میں کوئی دعویٰ کر سکوں۔ شنکر شکرا کی منحوس زبان سے جو انکشافات ہوئے تھے وہ ناقابل یقین تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میں لاہور کے سروسز یا میو اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں جاؤں اور سینہ پکڑ کر یہ کہوں کہ میرے اندر کسی نے سگنل نشر کرنے والا ڈیوائس لگا دیا ہے اور اس ڈیوائس کے سبب میں درد سے تڑپ رہا ہوں تو ڈاکٹروں کا ردعمل کیا ہو گا۔ یقیناً وہ مجھے دماغی شفا خانے کا کیس قرار دیں گے اور جیل روڈ پارسل کر دیں گے۔ حقیقت میرے روبرو تھی لیکن ایسی شکل میں تھی کہ اس پر یقین کرنا خود میرے لیے بھی مشکل تھا۔ شنکر نے شواہد اور ٹھوس دلائل کے ساتھ بات کی تھی اور اگر بدقسمتی سے یہ تمام شواہد و دلائل سچ تھے تو میں ایک قابل رحم صورت حال میں گرفتار ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ فریال بھی ان لوگوں کے قبضے میں تھی۔ یقیناً وہ مجھے تگنی کا ناچ نچا سکتے تھے۔ میرا دماغ ماؤف سا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھنٹے پہلے تک میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ شیخ عاصم سے اس طرح ملاقات ہو گی کہ زندگی اور موت کی بازی میں تمام اہم پتے شیخ کے ہاتھ میں ہوں گے۔ فریال اس کے پنجۂ ستم میں ہو گی اور غزالہ کو وہ بیوی بنا چکا ہو گا.... اوہ' یہ کیا سراب ہے' یہ کیسا ڈراؤنا خواب ہے؟ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ غزالہ کیونکر شیخ عاصم کی بیوی بن گئی۔ یہ انہونی کب اور کیسے ہوئی؟

شنکر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ اس نے کہا "محترم شیخ عاصم صاحب کی خواہش ہے کہ تم نہ ان سے اتنے دور جاؤ کہ اوجھل ہو جاؤ اور نہ اتنے پاس آؤ کہ کوئی گستاخی دکھا سکو۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اس گھر میں ان کے آس پاس رہو۔ تمہارا عہدہ گھریلو ملازم کا ہو گا۔ ڈیوٹی مقرر نہیں ہے۔ حسب ضرورت کوئی بھی کام تمہارے سپرد کیا جا سکتا ہے۔" میں نے تعجب سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "مجھے معلوم تھا اس اطلاع پر تم مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھو گے۔ ہاں بات ہے بھی حیرانی کی۔ تم جیسا خطرناک مجرم اور بے خوف قاتل جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا کسی گھر میں گھریلو ملازم کی خدمات کیوں انجام دے گا۔ لیکن ذرا سنجیدگی سے اپنے حالات پر غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ ذلت تمہارا مقدر ہے اور تمہیں قبول کرنی ہی پڑے گی۔ تم چوہے دان میں ہو اور تمہاری وہ فریال نامی چوہیا شیخ محترم کے قبضے میں ہے۔ تمہاری ایک ذرا سی نافرمانی کی سزا اس خوبصورت چوہیا کو ایسے عذاب کی صورت میں ملے گی کہ تم خون کے آنسو رو دو گے۔ تمہارا انچارج ہیڈ سرونٹ یعنی ملازم خاص سعادت خان ہے۔ علی الصباح تم اس سے ملو گے وہ تمہیں تمہارا کام سمجھا دے گا۔ ویل۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

اس کے ساتھ ہی شنکر نے انٹرکام اٹھایا اور اس پر کسی سعادت خان کو گلاس روم میں بلایا۔ چند لمحے بعد ایک لمبا تڑنگا کابلی پٹھان اندر داخل ہوا۔ اس کا رنگ تپے ہوئے تانبے جیسا تھا اور کلف لگی سیاہ مونچھیں کانوں تک جا رہی تھیں۔ اس نے جھک کر شنکر شکرا کو سلام کیا۔

شنکر بولا "سعادت خان! اس کو اپنے ساتھ سرونٹ کوارٹرز میں لے جاؤ اور وردی بھی دے دو۔ صبح سے یہ کام پر لگے گا۔"

میں دانت کچکچا کر رہ گیا۔ رات کا باقی حصہ میں نے سرونٹ کوارٹر میں سو کر گزارا۔ بہت گہری نیند آئی تھی۔ صبح نو بجے تک میں نے غالباً کروٹ تک نہیں بدلی۔ بیدار ہونے پر سر کچھ بھاری بھاری محسوس ہوا۔ مجھے شک گزرا کہ سخت پریشانی کی حالت میں اور ایسی بے یقینی کی کیفیت میں اتنی گہری نیند "قدرتی" نہیں تھی۔ مجھے چائے میں کوئی خواب آور دوا پلائی گئی تھی۔ یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ جمائی لینے کے لیے جونہی میں نے ہاتھ منہ کی طرف بڑھایا ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرے ہاتھ پر کوئی دستانہ نما چیز تھی۔ اور یہ صرف ایک ہاتھ پر نہیں تھی دونوں ہاتھوں پر تھی۔ بالکل جیسے باکسنگ میں استعمال ہونے والے دستانے ہوتے ہیں۔ یہ دستانے نیند کی حالت میں مجھے پہنائے گئے تھے۔ ان میں تسموں کی جگہ لوہے کے بکل لگے ہوئے تھے۔ بکل میں چابی داخل کرنے کے لیے سوراخ بھی موجود تھا' جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان بکلز کو لاک کیا گیا ہے۔ میں نے مٹھی کھولنے کی کوشش کی تو بکسر ناکامی ہوئی۔ درحقیقت یہ کسی چرا نما میٹریل کی تھیلیاں تھیں جن میں اندر کی طرف فوم لگا ہوا تھا۔ ان تھیلیوں کو میری بند مٹھیوں پر یوں

چڑھایا گیا تھا کہ میں انگلیوں کو حرکت تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی کلائی پر وہ گھڑی بھی نظر آئی جو رات شنکر نے مجھے پہنائی تھی۔

جونہی میں بیدار ہوا ملازمین کا انچارج سعادت خان دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے چند لمحے مجھے تمسخرانہ نظروں سے دیکھا' پھر پر رعب لہجے میں بولا "چلو اٹھو۔ ناشتا ناشتا کرو اور کام پر لگو۔"

"لیکن یہ کیا ہے؟" میں نے اسے اپنے ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری ماں کا سر ہے" وہ تڑخ کر بولا "ام سے کوئی سوال پوچھے گا تو امارا دماغ گھوم جائے گا اور امارا دماغ گھوم گیا تو ام بہت بے رحمی سے پیش آئے گا۔ چلو اٹھو شاباش۔ جو کہا گیا ہے وہ کرو۔"

جی چاہا چھلانگ لگا کر اس خر دماغ شخص کو دبوچ لوں اور اس وقت چھوڑوں جب گردن کڑک بول جائے۔ لیکن کچھ کرنے سے پہلے ابھی مجھے یہ دیکھنا تھا کہ میرے "کرنے کے" نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ میں صبر کا بڑا سا گھونٹ بھر کر اٹھا اور سعادت خان کی ہدایت پر باتھ والے کمرے میں آ گیا۔ یہاں واش بیسن موجود تھا لیکن بند ہاتھوں کے ساتھ منہ ہاتھ دھونا کار محال تھا۔ اپنے چکراتے ہوئے سر کو سنبھالا دے کر میں نے پانی کی طرف دیکھا' یہاں دو قروٹ بن اور "ایک گلاس دودھ" کی صورت میں میرا ناشتا پڑا تھا۔ سعادت خان کے رویے سے ظاہر تھا کہ مجھے یونہی بند ہاتھوں سے ناشتا کرنا ہو گا۔ میں نے دودھ پیتے پر اکتفا کیا۔ ملازمین کے لیے مخصوص نیلی وردی مجھے رات ہی پہنا دی گئی تھی۔ میں نے بھی اس خیال سے پہن لی تھی کہ میرا لباس رات کی دھینگا مشتی کی وجہ سے نہ صرف خون آلود ہو چکا تھا بلکہ کئی جگہ سے پھٹ بھی گیا تھا۔

سعادت خان نے ناقدانہ نظروں سے میری وردی دیکھی پھر بولا "ٹھیک ہی ہے۔ امارا خیال ہے کہ آج تم لان میں کام کرو گے۔ گھاس تراش "مشین" وہاں پھلواری کے پاس پڑا ہے۔ دوپہر تک سارا لان تراش لو گے۔ اس کے بعد پودوں کو گوڈی کرنا۔"

میں نے کہا "اگر میں اس کام سے انکار کروں تو؟"

وہ بولا "تو پھر تمہیں الٹا لٹکانے اور تمہارا چمڑی ادھیڑنے کا پورا انتظام موجود ہے۔"

میں نے کہا "تم میرے نام سے واقف ہو؟"

وہ بولا "تم جو کوئی بھی ہو' بچے خاں ہے۔ اس وقت امارا ماتحت ہے۔ امارا کام ہے تم سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا اور اگر تم انکار کرے تو تمہارا ہڈی کا سرمہ بنانا اور یہ سرمہ تحفے کے طور پر تمہارا ماں بہن کو بھیجنا تاکہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے۔"

میں نے بازو گھمایا۔ ایک زوردار ہنچ سعادت خان کے جبڑے پر پڑا۔ وہ الٹ کر چارپائی پر گرا۔ اس کا سر پوری قوت سے واش بیسن کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ایک دم انار کی طرح

دہک اٹھا۔ قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے ریوالور نکالا اور میری طرف سیدھا کر لیا "کتا! تجھے جان سے مار ڈالے گا" وہ دانت کچکچا کر بولا۔ چند لمحے تک مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ واقعی گولی چلا دے گا۔ لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ریوالور بدستور میری طرف اٹھا ہوا تھا۔ غرا کر بولا "ایک منٹ پہلے امارا مالک سے پوچھ لے" اس کے بعد دیکھتا ہے کہ تم کام کیسے نہیں کرتا۔"

اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر ٹھوڑی تک پہنچ رہی تھی۔ کہنے کو تو وہ صرف گھریلو ملازم تھا۔ لیکن گھریلو ملازم اس طرح اپنے پاس ریوالور نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ یوں کسی پر اسلحہ تان سکیں۔ یقیناً یہ محض ملازم کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ اس نے فون کو انٹرکام کے طور پر استعمال کرتے ہوئے براہ راست شیخ عاصم سے رابطہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انہیں بتایا کہ نیا آدمی کام نہیں کر رہا اور باقاعدہ مارپٹائی پر اترا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے سعادت خان کو ہولڈ آن کرایا گیا۔ تقریباً دو منٹ بعد سعادت نے مجھے فون پر بلایا۔ دوسری طرف شیخ عاصم تھا۔ غصیلے لہجے میں بولا "میرا خیال تھا کہ تم میں اتنی عقل ہے کہ حالات کے تیور پہچان سکو۔ مگر اب محسوس ہو رہا ہے کہ تم ڈنڈے سے ہانکے جانے کے لائق ہو۔ لو یہ آوازیں سنو اور غور کرو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

چند سیکنڈ بعد "کلک" کی آواز آئی۔ انٹرکام کا رابطہ کسی دوسرے کمرے سے کرا دیا گیا تھا۔ میرے کانوں میں نسوانی چیخیں گونجیں۔ بلاشبہ یہ فریال کی آواز تھی۔ وہ چیخ رہی تھی "خدا کے لیے نہیں۔ خدا کے واسطے نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے چھوڑ دو... میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ پلیز... پلیز فار گاڈ سیک..."

اس کے بعد وہ بدزبانی انداز میں چلانے لگی۔ چیخنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھے آوازیں بھی دے رہی تھی۔ "شاہ جہاں صاحب... شاہ جہاں صاحب..." پھر وہ زریں گل کے نام کی دہائی دینے لگی۔ کسی مرد کی غراہٹ ابھری اور چٹاخ چٹاخ کی آوازیں آئیں۔ وہ فریال کو تھپڑ رسید کر رہا تھا۔ پھر وہ تحکمانہ انداز میں اپنے کسی ساتھی سے بولا "اتار دو اس کے کپڑے... سب اتار دو۔"

فریال بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اور منت سماجت کر رہی تھی۔ میرے اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میں نے ریسیور زور سے فرش پر پٹخا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔ اگر شیخ عاصم اس وقت مجھے نظر آ جاتا تو ہم دونوں میں سے ایک کو ضرور قتل ہونا تھا۔ جونہی میں بھاگا سعادت خان نے میری ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ تین فائر ہوئے جن میں سے ایک گولی میری پنڈلی کو چھید گئی۔ میں فائرنگ کی پروا کیے بغیر دوڑتا ہوا سرونٹ کوارٹر سے نکلا۔ اسی وقت کوئی وزنی چیز بڑے زور سے میری گردن کے پچھلے حصے پر لگی۔ قلابازی کھا کر میں سورج مکھی کی کیاری میں جا گرا۔ آنکھوں

میں تارے سے ناچ گئے تھے۔ حتی الامکان تیزی سے میں نے پلٹ کر دیکھا تو سامنے شنکر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی موٹی شاموں اور چمکدار میخوں والی وزنی لاٹھی تھی۔ اپنی مخصوص پھرتی کے ساتھ اس نے دوسرا وار کیا۔ اس مرتبہ لاٹھی کا سرا میری کنپٹی کے قریب لگا اور میں بچ نکلنے کی کوشش میں ایک بار پھر کیاری میں گر گیا۔ شنکر بے دریغ مجھے لاٹھی سے پیٹنے لگا۔ ایک دو موقعے ایسے آئے جب میں اس سے لاٹھی چھین سکتا تھا لیکن میرے ہاتھ دستانہ نما تھیلیوں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے کامیابی نہیں ہوئی پھر سعادت خان بھی لوہے کا ایک پائپ لے کر آگیا۔ اس نے میرے سر اور کندھے پر دو شدید ضربیں لگا کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ میں نڈھال ہو کر گر گیا تو وہ دونوں مجھے اٹھا کر لاؤنج میں لے آئے۔ میرے سر اور دائیں بازو پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ پنڈلی سے بہنے والے خون نے میرا ایک پاؤں اور چپل رنگین کر دی تھی۔ شنکر نے سفید پتلون کا پائنچہ اٹھا کر میرا زخم دیکھا۔ خیریت گزری تھی۔ گولی پنڈلی کے پچھلے حصے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ خون روکنے کے لیے سعادت خان نے فوراً وہاں پٹی باندھ دی۔ دس بارہ تماشائی مرغ پر جمع ہو چکے تھے۔ اور ان میں سے دو تین نے مجھے دبوچ رکھا تھا۔ میں نے چیختے ہوئے کہا "شنکر اگر اس لڑکی کو کچھ ہوا تو یاد رکھ میں تجھے زندہ درگور کر دوں گا۔ خدا کی قسم جیتے جی گاڑ دوں گا دشمن میں۔ اور شیخ عاصم! تو بھی سن لے۔ تیری آئندہ نسل ختم کر دوں گا تب....."

میرے منہ میں جو آرہا تھا میں کہے جا رہا تھا۔ شنکر کے اشارے پر سعادت خان کے سوا سب لوگ باہر چلے گئے۔ شنکر نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "شاہ جہاں تیرے لیے بہتری ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس پر عمل کر۔ تو بری طرح پھنس چکا ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں ہی تیری عافیت ہے۔"

سعادت خان مجھے خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں نجانے کیا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ لوہے کا پائپ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ دو تین منٹ بعد شیخ عاصم نے انٹرکام پر رابطہ کیا۔ شنکر نے بات کرنے کے بعد ریسیور میرے کان سے لگا دیا۔ شیخ عاصم کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے کہا "شاہ جہاں! ابھی ہم نے تمہیں کچھ کہا ہے اور نہ اس لڑکی کو۔ لیکن یہ رعایت بار بار نہیں ملے گی۔ میں تمہیں سہ پہر تین بجے تک کا وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کر لو کہ تمہیں ہمارے کہے پر چلنا ہے یا انکار کرنا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

سہ پہر تک میں اسی کمرے میں رہا۔ کبھی ٹہلنے لگتا، کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کوئی نگرانی کے لیے بھی موجود نہیں تھا۔ ایک دو بار تو جی میں آئی کہ یہاں سے نکلوں اور شیخ عاصم تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ اگر ایک بار اس کی لعنتی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آجاتی تو میں اپنی ہر بات منوا سکتا تھا جبکہ پھر میرا دھیان اس منحوس گھڑی کی طرف چلا گیا جو بیہوشی کی حالت میں میری کلائی پر باندھ دی گئی تھی۔ شنکر نے بتایا کہ یہ گھڑی میری زندگی کی محافظ ہے۔ اگر میں نے شیخ عاصم کے قریب پہنچنے کی کوشش کی تو یہ گھڑی مجھے وارننگ دے گی۔ اس وارننگ پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ میرے سینے میں ہونے والے ایک مہلک بلاسٹ کی صورت میں نکلے گا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو پھر میں شیخ عاصم کے قریب جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں کسی طرح کسی رائفل یا ریوالور پر قبضہ کروں اور اس کی مدد سے شیخ کو بے بس کر دوں۔ یہ خیال آتے ہی میرا دھیان اپنے ہاتھوں کی تھیلیوں کی طرف چلا گیا اور مجھے یہ آگاہی ہوئی کہ میں تو ریوالور، رائفل وغیرہ چلانے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ ریوالور یا رائفل چلانے کے لیے انگلی ٹریگر پر رکھنی پڑتی ہے اور میں ایسا کرنے سے مجبور تھا۔ ابھی مجھ پر انکشاف ہوا کہ عیار شیخ عاصم نے میرے لیے کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا۔ میں نہ یہاں سے بھاگ سکتا تھا نہ کسی خطرناک ارادے سے اس کے پاس جا سکتا تھا۔ نہ شیخ کا کوئی ایسا قریبی عزیز یہاں موجود تھا جس پر قابو پا کر شیخ کو دفاعی پوزیشن تک لایا جا سکتا۔ آخری سہارا آتشیں اسلحے کا تھا، میرے ہاتھوں پر تھیلیاں چڑھ جانے سے یہ سہارا بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ یہ عجیب و غریب غلاف میرے ہاتھوں پر اسی لیے چڑھائے گئے تھے کہ میں آتشیں ہتھیار استعمال کرنے کے قابل نہ رہوں۔ اس مقصد کے لیے میرے ہاتھ ہتھکڑی وغیرہ میں بھی جکڑے جا سکتے تھے لیکن ایسا کیا جاتا تو میں کسی کام کے قابل نہ رہتا اور شیخ عاصم یہاں مجھ سے "معمولی" کام لے کر اپنی انا کی تسکین چاہتا تھا۔

خوف کی انتہائی تنگ تھیلیوں کے اندر میرے ہاتھ پسینے میں تھے۔ میرا دل انگلیاں کھولنے کے لیے مچل رہا تھا۔ مگر انگلیاں کھولنا تو دور کی بات ہے انہیں حرکت تک دینا دشوار تھا۔ میں نے دانتوں سے چمڑے کو ادھیڑنے کی کوشش کی لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ یہ اصلی چمڑا نہیں کوئی بہت مضبوط قسم کا [illegible] تھا۔ درمیانی دانتوں کے نوکیلے ترین سرے بھی اسے کوئی نقصان پہنچانے سے قاصر ہے۔ میں مسلسل سوچ بچار میں مصروف اور تین بجے تک اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھے فی الحال شیخ عاصم کی بات ماننی ہی چاہیے۔

دھوپ میں مشین کے ذریعے گھاس کاٹنا دیکھنے میں اتنا مشکل نہیں لگتا جتنا عملی طور پر ثابت ہوا۔ ایک ہی گھنٹے میں میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پنڈلی کی چوٹ بھی تکلیف دے رہی تھی۔ سعادت خان نے ہدایت کی تھی کہ تمام لان میں بہر صورت لان تراشی کر کے فارغ ہو جاؤں۔ کل اسی لان میں پارٹی وغیرہ ہونی تھی۔ چار بجے کے قریب لان کے ایک حصے میں نہایت خوبصورت میز اور تین قیمتی کرسیاں رکھ دی گئیں۔ کچھ

شیخ عاصم اندرونی حصے سے برآمد ہوا اور دھوپ کھانے کے لیے کرسیوں پر آبیٹھا۔ وہ نیکر اور جرسی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر پی کیپ، آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھ میں کوئی انگلش میگزین۔ وہ انتہائی خوشگوار موڈ میں نظر آرہا تھا۔ میگزین کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ گاہے گاہے سر اٹھا کر مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ شیخ عاصم کے قریب جاؤں اور دیکھوں کہ جو "طلسمی" گھڑی میری کلائی میں باندھی گئی ہے وہ واقعی سگنل نشر کرتی ہے؟ میں شیخ عاصم سے پندرہ میٹر دور تھا۔ شنکر کا کہنا تھا کہ گھڑی "وارننگ" کا سگنل اس وقت دے گی جب میرا اور شیخ کا درمیانی فاصلہ آٹھ میٹر رہ جائے گا۔ اس کے بعد پانچ میٹر فاصلہ مزید کم کیا جا سکتا تھا۔ یعنی میرے اور شیخ کے درمیان فاصلے کی آخری حد تین میٹر تھی۔ یہ سب کچھ افسانوی محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن گھڑی میری کلائی میں تھی جس کا کرشمہ میں گلاس روم میں دیکھ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے غزالہ کا سراپا نظر آیا۔ وہ دھانی رنگ کپڑوں میں عمارت کے رہائشی حصے سے نکلی اور لان کی طرف بڑھی۔ ابھی چند قدم ہی آئی تھی کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ آنکھیں سکوڑ کر اس نے مجھے پہچانا۔ چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے اور وہ واپس پلٹ گئی۔ تاہم عین اسی وقت شیخ عاصم کی نگاہ بھی اس پر پڑی۔ اس نے غزالہ کو آواز دی اور پاس بلایا۔ وہ بادلِ ناخواستہ بوجھل قدموں سے اس کے قریب آبیٹھی۔ ملازمہ چائے لے آئی۔ دونوں چائے کی چسکیاں لیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر چائے لانے والی ملازمہ میرے پاس آئی اور اس نے انکشاف کیا کہ بڑے صاحب مجھے بلا رہے ہیں۔ بڑے صاحب سے اس کی مراد شیخ عاصم ہی تھی۔ میں نے مشین چھوڑی۔ پسینے سے تر چہرے کو صافی رومال سے پونچھا اور شیخ عاصم کی طرف چل دیا۔ ذہن تیزی سے مصروف کار تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شیخ عاصم نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ ان لمحوں میں دست راج اور ملک ذوالنس کا میرے ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ اچانک مجھے اپنی کلائی پر ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ گھڑی پر ننھا سا سرخ بلب بلنک کرنے لگا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ شنکر کی اطلاعات درست ثابت ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ رک کیوں گئے ہو؟ آگے آؤ۔" شیخ عاصم نے پکارا۔

میں آگے بڑھا۔ کلائی پر لگنے والے مدھم جھٹکوں میں شدت آئی۔ گھڑی کا بلب بھی تیزی سے "بلنک" کرنے لگا۔ تین چار قدم چلنے کے بعد میں رک گیا۔ "میرے پاس آؤ۔" شیخ عاصم نے تحکم سے کہا۔

میں نے نگاہوں نگاہوں میں اپنا اور اس کا درمیانی فاصلہ ناپا اور ایک قدم اٹھانے کے بعد پھر رک گیا۔ میرا محتاط انداز دیکھ کر شیخ کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ کھیل گئی۔ غزالہ بدستور گردن جھکائے بیٹھی تھی اور ظاہر کر رہی تھی کہ میگزین کی طرف متوجہ ہے۔ ملازمہ لان سے رخصت ہو چکی تھی۔ اب ہم تینوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ شیخ عاصم نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! ہمارے نزدیک تمہاری کم از کم سزا یہ تھی کہ تمہیں امارات کے کسی ریگزار میں زندہ زمین کے اندر گاڑ دیا جاتا۔ صرف تمہارا سر زمین سے باہر ہوتا اور مردار خور پرندے تمہارے چہرے کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے۔ لیکن تمہاری بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شاید تم نے ___"

شیخ عاصم کو بات ادھوری چھوڑنا پڑی۔ غزالہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے شیخ سے مخاطب ہو کر معذرت کے انداز میں کہا "معافی چاہتی ہوں، مجھے ایک بہت ضروری فون کرنا تھا۔"

اس کا فیصلہ کن انداز دیکھ کر شیخ عاصم بولا "او کے ڈیئر! تم جاؤ میں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر آتا ہوں۔"

غزالہ اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ شیخ عاصم کی مسکراتی ہوئی سی نگاہیں کچھ دیر اس کی پشت پر جمی رہیں پھر وہ ایک گہرا کش لے کر میری طرف متوجہ ہوا۔ اب میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دہکتی ہوئی نفرت صاف دیکھ سکتا تھا۔

"بیٹھ جاؤ!" اس نے کہا۔

ارد گرد کوئی کرسی نہیں تھی اور جہاں کرسی تھی وہاں تک میں جا نہیں سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے گھاس پر بیٹھنا ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ شیخ زہر بھرے لہجے میں بولا "تمہیں یاد ہو گا ہماری آخری ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ فرید کوٹ میں سیٹھ رام داس کی کوٹھی تھی اور جعلی ڈپٹی کمشنر وہاں تفتیش کرنے آگیا تھا۔ عمارت کے اندر سے بلند ہونے والی کسی عورت کی چیخ نے تمہیں بچا لیا تھا۔ لیکن یاد رکھو اب یہاں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہونے والا۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "تمہارا پالتو 'نصن' کدھر ہے؟"

میرے گستاخ لہجے نے اسے جھنجھوڑ دیا تاہم وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے بولا "تمہاری گولیوں کی بوچھاڑ رائیگاں نہیں گئی تھی۔ وہ اب اسپتال کا مکین ہے اور ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکا ہے۔ تمہاری اس فائرنگ میں میرے دو مزید کارندوں کی جان بھی گئی تھی۔ بہر طور گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ میری بات سے یہ مطلب نہ لینا کہ تمہیں سزا نہیں ملے گی۔ سزا ملے گی اور ضرور ملے گی لیکن اب اس کی نوعیت مختلف ہو گی۔ بے شک تم زندہ رہو گے لیکن یہ زندگی موت سے بدتر ہو گی۔ تم میری نگاہوں کے سامنے رہو گے۔ ذلت کے بوجھ تلے دب کر پل پل مرو گے اور پل پل جیو گے۔ دیکھنا تم کس طرح کتے کے پلے کی طرح میرے پاؤں چاٹنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "ایک سوال پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"ضرور۔ سوال پوچھنا تمہارا پیدائشی حق ہے۔"

میں نے پوچھا "تمہارے دل میں یہ نیک خیال کب اور کیسے پیدا ہوا۔ مطلب یہ کہ میری زندگی بخشنے کا اور مجھے موت سے بدتر زندگی دینے کا"

"اس کے لیے تمہیں اس خوبصورت و مہربان خاتون کا شکر گزار ہونا چاہیے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میری بیوی کی حیثیت سے اس نشست پر بیٹھی تھی۔ اس نے تمہارے لیے رحم کی درخواست کی تھی اور ہم اپنے دل کی ملکہ کی درخواست رد نہ کر سکے۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شنکر اور تم میں سے کون بڑا جھوٹا ہے۔ ابھی کل رات شنکر نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہارے ارادے شروع سے ہی نیک تھے۔ تم مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے' مجھے موت سے بدتر زندگی دینا چاہتے تھے اور اسی لیے تاندل اسٹیٹ میں میرے جسم کے اندر الیکٹرانک ڈیوائس رکھا گیا تھا۔ اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ غزالہ کی درخواست پر میری جاں بخشی کی گئی ہے۔"

وہ مسکرایا "تم بال کی کھال اتارنا چاہتے ہو تو اتارو۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اپنی مسز کی درخواست پر تمہیں زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور ہاں ایک بات اور" اس نے اچانک بے حد سنجیدہ ہو کر کہا۔ "آئندہ ہماری مسز کا نام تمہارے ہونٹوں پر اس انداز میں کبھی نہ آئے۔ وہ تمہاری مالکن ہیں۔ تم انہیں اسی حیثیت سے مخاطب کرو گے' ورنہ خاموش رہو گے... اوکے؟"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا' نہ انکار میں سر ہلایا نہ اقرار میں۔ میری پے در پے گستاخیاں شیخ عاصم کا درجۂ حرارت بڑھا رہی تھیں لیکن وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ غالباً اسے پختہ یقین تھا کہ میں اس کے رحم و کرم پر ہوں اور آنے والے شب و روز میں وہ مجھ سے گن گن کر بدلے لے سکتا ہے۔ وہ سگار اپنے پاؤں تلے مسل کر بولا "اب تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

میں خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی پر ہونے والے ہر اسپارک کے ساتھ کلائی پر ایک جھٹکا لگتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ شیخ عاصم سے قریب آنے کے بعد جھٹکوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میں واپس لان کے وسطی حصے میں پہنچا اور مشین کے ذریعے گھاس تراشنے میں مصروف ہو گیا۔ سات آٹھ میٹر کی رینج سے نکلتے ہی کلائی پر لگنے والے جھٹکے ختم ہو گئے اور ڈائل کی اسپارکنگ بھی ختم ہو گئی۔

اگلے روز صبح سویرے مجھے کسی نے جگا دیا۔ میں سرونٹ کوارٹر میں تھا اور مجھے جگانے والا سعادت خان تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا۔ یہ سوجن میرے اس رائٹ پنچ کی نشانی تھی جو کل صبح میں نے اس کے تھوبڑے پر رسید کیا تھا۔ سعادت خان نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں مجھے اطلاع دی کہ آج میری ڈیوٹی مرسیڈیز کار پر ہے۔ مجھے آٹھ بجے کے بعد ڈرائیور کیپ پہن کر کار کے پاس موجود رہنا ہے۔ نو اور دس بجے کے درمیان اہلِ خانہ میں سے کسی کو شاپنگ پر جانا ہے۔ میں انہیں شاپنگ پر لے جاؤں گا اور ڈرائیور کی تمام خدمات انجام دوں گا۔ سعادت خان نے مرسیڈیز کی چابی میرے سپرد کرتے ہوئے کہا "خوچے' ڈیش بورڈ میں تمہارے ڈرائیور کا لائسنس موجود ہے۔ اس سے کام چلا لینا۔ کار درمیان والے گیراج میں کھڑا ہے اسے دھلوا کر اچھی طرح صاف کر لو۔"

منحوس دستانے بدستور میرے ہاتھوں پر تھے۔ میں نے دستانے سعادت کو دکھاتے ہوئے کہا "کھلوا دو ان کو۔"

وہ مسکرایا "خو یہ تو تمہاری کینن ڈیتھ (کفن دفن) کے ساتھ کھلے گا۔ اور وہ بھی اگر اس کا چابی کہیں سے مل گیا۔ ورنہ تم ان کے ساتھ ہی جہنم میں جائے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں ان دستانوں کے ساتھ ڈرائیو کروں گا؟"

"تم ڈرائیو ہی نہیں ہر کام ان دستانوں کے ساتھ کرے گا۔ اگر نہیں کرے گا تو بڑا صاحب تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنائے گا۔ شاباش اڑی مڑی مت کرو' کل کا سبق یاد رکھو اور ناشتا مار پورا نو بجے گیراج میں۔"

ناشتا کل کی طرح بالائی والے دودھ اور فروٹ بن پر تھا۔ دستانہ بند ہاتھوں کے ساتھ اس طرح کا کھانا میرے لیے "نسبتاً آسان" ثابت ہوتا تھا۔ غالباً اسی "آسانی" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مجھے دوپہر کے کھانے میں قیمے والا نان اور رات کے کھانے میں برگر کھلایا گیا تھا۔ بصد دشواری منہ ہاتھ دھونے اور ناشتا کرنے کے بعد میں حسبِ ہدایت گیراج میں پہنچ گیا۔ یہاں نئے ماڈل کی مرسیڈیز موجود تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر چابی سے دروازہ کھولا اور جھاڑن نکال کر گاڑی کی جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو گیا۔ بار بار ذہن میں یہ سوال ابھر رہا تھا کہ مجھے کس کو شاپنگ لے جانا ہے۔ سعادت خان نے "اہلِ خانہ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہاں اہلِ خانہ دو ہی تھے۔ شیخ عاصم ارشد اور اس کی بیوی مسز غزالہ شیخ۔ اب ان دونوں میں سے کس کی ڈرائیوری مجھے کرنا تھی۔ گاڑی کی صفائی کے دوران وسیع و عریض لان کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ کل سعادت خان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں کوئی پارٹی منعقد ہو رہی ہے۔ لان میں شامیانے لگائے جا رہے تھے اور ملازمین دو ٹرکوں میں خوبصورت کرسیاں اتار اتار کر ایک کونے میں ڈھیر کر رہے تھے۔ سعادت خان کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ دفعتاً ایک کوتاہ قامت پر مجھے زریں گل کا شبہ ہوا۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ زریں گل نہیں تھا۔ میں زریں گل کے لیے پریشان تھا شاید اسی لیے ایک اجنبی پر زریں گل کا گمان ہوا۔ ہمیں یہاں پہنچے ہوئے نہیں گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے لیکن

ساتھیوں میں سے کسی کی شکل مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ معلوم نہیں زریں گل' فراال اور سورج کس حال میں تھے۔ مجھے زریں کی طرف سے یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں وہ جوش میں آ کر کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دے۔ ایسے میں فرال کی زندگی اور آبرو خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ مجھے آرڈر ملا کہ گاڑی لے کر پورچ میں پہنچوں۔ میں پورچ میں پہنچا۔ یہاں پانچ دس منٹ مزید انتظار کرنا پڑا۔ آخر پورچ میں کھلنے والے شاندار آبنوسی دروازے پر غزالہ کی صورت نظر آئی۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ مجھے غزالہ کو لے کر جانا ہے۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر حیدر آبادی خاتون تھی۔ خاتون کا انداز مؤدبانہ تھا۔ وہ ملازمہ یا نگران کے طور پر ساتھ جا رہی تھی۔ غزالہ نے آج پھر ایک قیامت خیز ساڑی زیبِ تن کر رکھی تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی۔ جس نے اسے قدرے سنجیدہ روپ دے دیا تھا۔ وہ سراپا ایک طرح دار نوبیاہتا دلہن نظر آ رہی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کون ہے وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ خاتون نے بھی اس کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔

"ڈرائیور ریجی مارکیٹ چلو" خاتون نے شائستہ لہجے میں ہدایت جاری کی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اگنیشن میں چابی گھما کر انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھائی۔ گاڑی مسحور کن خوشبوؤں سے مہک اٹھی تھی۔ ان خوشبوؤں میں میری ایک جانی پہچانی خوشبو بھی شامل تھی۔ نہایت سادہ اور دلفریب۔ یہ غزالہ کے بدن کی خوشبو تھی۔ کچے آموں کے بور سے پھوٹنے والی خوشبو جو مجھے بچپن سے دیوانہ کر دیا کرتی تھی۔ یہی خوشبو تھی جس کا شکار ہو کر میری زندگی آج اس حال تک پہنچی تھی۔ یہ جانی پہچانی خوشبو آج مجھ سے بہت دور... بہت دور چلی گئی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک روز غزالہ اس طرح ایک ادھیڑ عمر شیخ کی بیوی بن کر مرسڈیز کار میں بیٹھے گی اور میں ایک بے وقعت ڈرائیور کی حیثیت سے اسے بھوپال کی سڑکوں پر لیے گھوموں گا۔ ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ سب رکاوٹیں' سب پابندیاں اور دوریاں بھاپ بن کر اڑ جائیں۔ میں پلٹ کر غزالہ کو اپنی بانہوں میں بھر لوں اور اسے سینے سے لگا کر اپنی جان کا حصہ بنا لوں۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے ہوش میں آنا پڑا۔ غزالہ اپنی ساتھی خاتون سے کھسر پھسر کر رہی تھی۔ غالباً اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اب اپنی بے چینی کا اظہار کر رہی تھی۔

"ڈونٹ وری مسز' اٹ از آل دی آرڈر آف بڑے صاحب" حیدرآبادی خاتون کا دبا ہوا سا جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ وہ غزالہ کو تسلی دے رہی تھی کہ میرا ڈرائیونگ سیٹ پر پایا جانا معمول کے مطابق ہے اور ایسا شیخ عاصم کی مرضی سے ہوا ہے۔

گاڑی میں ایک دم بوجھل سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ہاں گاڑی سے باہر زندگی اپنے عروج پر تھی۔ بھوپال کی بھری پری سڑکوں پر ہر طرح کی گاڑیاں متحرک تھیں۔ بچے بوڑھے جوان اپنی اپنی منزلوں کی طرف اپنے اپنے انداز سے رواں تھے۔ غزالہ کی ساتھی خاتون کو بتا دیا گیا تھا کہ میں راستوں سے واقف نہیں ہوں لہٰذا وہ مجھے گاہے گاہے ہدایات دے رہی تھی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے اور میرے دستانہ پوش ہاتھ سڑک سے گزرنے والے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے' ورنہ لوگ ایسے "سنکی ڈرائیور" کو دیکھ کر ضرور حیران ہوتے جو باکسنگ گلوز جیسی چیز پہن کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ یکایک میری نگاہ اپنی رسٹ واچ کی طرف گئی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ شنکر نے بتایا تھا کہ میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتا۔ اس نے دس کلومیٹر کا ذکر کیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دور آ چکا ہوں۔ لیکن پھر یاد آیا کہ شنکر نے "وارننگ سسٹم" کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قریباً نو کلومیٹر کے بعد گھڑی کے ڈائل پر وارننگ لائٹ جلنا شروع ہو جائے گی۔ پورے ایک کلومیٹر کا "مارجن" تھا۔ میں دس کلومیٹر تک جا سکتا تھا۔ واہ کیسی انوکھی آزادی تھی۔ ایک نادیدہ زنجیر میرے پاؤں میں تھی اور میری جیل دس مربع کلومیٹر پر محیط ہو گئی تھی۔ یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھے تاندل اسٹیٹ سے آئے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ اس سے پہلے ڈیوائس کیوں نہیں چلتا حالانکہ میں شیخ عاصم سے سیکڑوں میل دور رہا۔ اس کا جواب جو بعد ازاں معلوم ہوا یہ تھا کہ اس وقت ڈیوائس کا بلاسٹنگ سسٹم آن نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ٹرانسمیٹر کام کر رہا تھا جو اپنے سگنلز کے ذریعے قریباً تیس کلومیٹر کے دائرے میں میری نشاندہی کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ عاصم اور حسن وغیرہ کامیابی سے میرا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھے اور وہیں اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں میں پہنچتا تھا۔

خاتون کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے تھے۔ گاڑی پارکنگ میں رک گئی تو وہ دونوں اتر کر "شاپنگ سینٹر" میں چلی گئیں۔ ان کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ خریدا ہوا سامان دکان کے ملازم نے اٹھا رکھا تھا۔ میں نے ملازم کے ساتھ مل کر سامان ڈکی میں رکھا۔ غزالہ سر جھکائے گاڑی میں بیٹھی رہی۔ دو چار منٹ بعد ہم روانہ ہوئے لیکن چند گز آگے جا کر ہی گاڑی روکنا پڑی۔ غزالہ کی ساتھی خاتون جس کا نام شیلا تھا پکار کر بولی "ٹھہرو ڈرائیور" میں نے بریک پیڈل دبا دیا۔ وہ غزالہ سے مخاطب ہوئی "ہائے مسز' ابو تیک والے سے آپ کے روپے تو لیے ہی نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ کل تک رکھوا دوں گا۔"

"چلو رہنے دو۔ پھر لے لیں گے" غزالہ نے کہا۔

"نہیں مسز' دو گلابی دوپٹا تو آج آپ کو لینا ہے' ورنہ سارا کمپوزیشن خراب ہو جائیں گے" غزالہ مسکرا کر رہ گئی۔ شیلا بولی "ڈونٹ یو ڈونٹ مائنڈ پلیز۔ میں ابھی آئی ہوں۔"

مجبور کیے۔ جلدی آؤ" غزالہ نے کہا

میں اور غزالہ گاڑی میں تنہا رہ گئے۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ ہمیں جان بوجھ کر تنہائی فراہم کی گئی ہے۔ لبوں پر سیکڑوں الفاظ مچل رہے تھے لیکن بولنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس گاڑی میں ہونے والی گفتگو کہیں محفوظ ہو جاتی ہو' یا براہ راست کہیں سنی جاتی ہو۔ غزالہ کی خاموشی کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا' بہرحال میری خاموشی اسی مصلحت کے تحت تھی۔ دل نے کہا "چپ کیوں ہو۔ شاید یہ موقع پھر برسوں نہ ملے' یا پھر زندگی ہی ساتھ نہ دے۔ دو محو گردش ستاروں کی طرح ہم ایک لمحے کے لیے نزدیک آکر کروڑوں نوری سال کی دوری پر چلے جائیں۔" میں نے تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر کہا "غزالہ! یہ سب کیا ہے؟ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

میرے عقب میں مکمل خاموشی رہی۔ کسی مردہ قبرستان کا سا سکوت۔ میں نے غزالہ کی طرف رخ پھیرا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں میں اشک تیر رہے ہیں۔ چند الفاظ خود بخود مچل کر میری زبان پر آگئے۔ "غزالہ! صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ اس کے بعد زندگی بھر تم سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا' کبھی نہیں" وہ کسی پتھریلی مورتی کی طرح ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں اپنی آغوش میں رکھے مرمریں ہاتھوں پر تھیں جن میں ہیرے کی نہایت قیمتی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کے انداز نے میرا حوصلہ مسمار کر دیا۔ الفاظ میری زبان پر جامد ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ قوت گویائی سلب ہوتی میں نے بصد کوشش مدعا بیان کر دیا۔ "غزالہ! تم نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیوں کر لیا۔ وہ کیا مجبوری تھی جو تمہیں مجھ سے اتنا دور لے گئی؟ وہ کیا مجبوری تھی؟"

اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری جانی پہچانی آنکھوں میں میرے لیے مکمل اجنبیت اور بیگانگی تھی۔ وہ بے حد سپاٹ لہجے میں بولی "میرے اور آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں بڑی مشکل سے عزت کی زندگی کی طرف لوٹی ہوں۔ اب میرا یہ آخری سہارا مجھ سے مت چھینیں۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

میں نے کہا "غزالہ یہ تم بھی جانتی ہو کہ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں ہوں۔ مجھے لایا گیا ہے اور اب یہاں رہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔"

"بس میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ آپ کا یہاں رہنا میرے لیے تباہ کن ہے۔ آپ کوشش کریں کہ ہمارا آمنا سامنا نہ ہو۔"

میں نے رمزیہ لہجے میں کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ شادی کیا ہوئی جو نومبر کی گیارہ تاریخ کو ہوئی تھی؟"

اپنی پہلی شادی کا ذکر سن کر غزالہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ نازک ہونٹ پھڑکے اور پلکیں تھرا کر رہ گئیں۔ وہ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر بے رخی سے بولی "میں کسی غیر مرد سے بات نہیں کر سکتی۔ میرے شوہر اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔ اور ان کی خوشنودی مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔"

"مجھے لگ رہا ہے تمہیں مجبور کیا گیا ہے۔"

"آپ مفروضوں پر بات کر رہے ہیں۔ میں یہاں بہت خوش ہوں اور اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ شیخ صاحب نے مجھے اس قابل جانا ہے۔ اگر آپ......"

وہ شیلا کو واپس آتے دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں بھی رخ پھیر کر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ آج ایک بالکل نئی غزالہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کتنی مختلف' کتنی اجنبی تھی وہ۔ مشرقی لڑکی اور مشتاق بیوی کا فرق بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ شیلا کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم اپنی رہائش گاہ انتھاسی لالہ زار سے سات آٹھ کلومیٹر دور آ چکے ہیں لیکن وہ حد بہت نزدیک تھی جہاں میری رسٹ واچ پر وارننگ لائٹ ظاہر ہوتی تھی۔ گاڑی میں ایندھن کم تھا۔ میرا دل چاہا کہ تیل ڈلوانے کے بہانے کچھ مزید آگے جایا جائے اور دیکھا جائے کہ لائٹ کب نمودار ہوتی ہے۔

میں نے شیلا سے تیل ڈلوانے کا ذکر کیا تو وہ تیزی سے بولی "نہیں ڈرائیور! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ بڑے صاحب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ پہلے ہمیں واپس پہنچاؤ پھر جو من چاہے کرتے رہنا۔"

مجبوراً مجھے گاڑی واپس موڑنا پڑی۔

O☆O

وہ شام جہاں میرے لیے بہت سی حیرتیں لے کر آئی وہاں مجھے میرے کئی سوالوں کے جواب بھی دے گئی۔ شام کو محل یعنی انتھاسی لالہ زار میں ہونے والی تقریب ایک طرح سے شیخ حاصم اور غزالہ کی شادی کی دعوت ولیمہ تھی۔ یہ دعوت شادی کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہو رہی تھی اور اس میں سو کے قریب مہمان شرکت کر رہے تھے۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ کچھ لوگ لاہور اور رحیم یار خان سے بھی اس تقریب میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ جے پور سے بھی جہاں شیخ حاصم اکثر شکار کے لیے جاتا رہتا تھا کچھ مہمان شرکت کر رہے تھے۔ شیخ حاصم کی ہدایت کے مطابق اس تقریب کو سادہ اور پروقار بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ ساری معلومات مجھے اپنے ایک "ساتھی ملازم" نور احمد سے حاصل ہوئیں۔ نور احمد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ شیخ حاصم کی یہ شادی کوئی چھ سات ہفتے پہلے دہلی میں ہوئی تھی۔

شام تک تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور مہمانوں کا انتظار شروع ہو گیا۔ سعادت خان نے آج میری ڈیوٹی باہر سڑک پر لگائی تھی۔ انتھاسی لالہ زار بے شک وسیع عمارت تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ آنے والوں کی گاڑیاں اندر پارک ہو سکیں لہٰذا انہیں سڑک پر پارک کیا جاتا تھا۔ میرے ذمے گاڑیوں کی چوکیداری کا

فریضہ تھا۔ شام کے فوراً بعد ہی میں نے ایک چادر کی بکل ماری اور سڑک پر ٹہلنے لگا۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ مہمان آنا شروع ہوئے۔ یہ لوگ بھوپال شہر کے معززین تھے۔ انگریزی لباس کے ساتھ ساتھ شیروانیاں اور ٹوپیاں بھی کثرت سے نظر آ رہی تھیں۔ کسی کسی گاڑی سے کوئی خاتون بھی برآمد ہو جاتی تھی۔ زیادہ تعداد بڑی عمر کے سنجیدہ لوگوں کی تھی۔ ڈی سی بھوپال' سیکرٹریٹ کے چند اعلیٰ افسران اور پولیس کے تین چار بڑے عہدیدار بھی مہمانوں میں شامل تھے۔ انتھاسی لالہ زار کی پارکنگ پر ہو گئی تو سڑک کی دونوں اطراف گاڑیاں کھڑی ہونے لگیں۔ ایک گاڑی سے اترنے والے مہمانوں کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ شیخ حاصم کی زرد مرسیڈیز میں سے چچا جلیس اور چچی فاخرہ اتر رہے تھے۔ میں نے خود کو ایک اسٹیشن ویگن کی اوٹ میں کر لیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ ہاں میری بصارت دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ چچا اور چچی ہی تھے۔ بیتے ہوئے ماہ و سال نے ان کے چہروں پر انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ چچا کے بال سفید ہو چکے تھے اور چچی بھی' جس کی گردن کبھی خم نہیں ہوتی تھی جھک کر اور قدرے عاجزی سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر عینک جگہ بنا چکی تھی۔ ان دونوں کا سامان جو ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا اتارا گیا۔ شیخ حاصم نے مین گیٹ پر آکر ان کا استقبال کیا۔ میں نے دیکھا شیخ حاصم کا رعب داب چچا جلیس اور چچی فاخرہ پر اثر انداز ہے اور وہ دبے دبے سے نظر آ رہے تھے۔

چچا جلیس نے آگے بڑھ کر شیخ حاصم کو گلے لگایا۔ چچی نے اس کے سر پر پیار دیا۔ پھر وہ لوگ اندر چلے گئے۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ چچا جلیس اور چچی فاخرہ اس تقریب میں شرکت کریں گے۔ میری اطلاعات کے مطابق چچا جلیس مستقل جرمنی میں رہتا تھا اور سال دو سال میں ایک مرتبہ پاکستان آتا تھا۔ چچی فاخرہ لاہور گلبرگ میں بیٹی غزالہ اور بیٹے ٹیپو کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ میں نے ان دونوں کی صورتیں سترہ برس بعد آج دیکھی تھیں۔

ان کی یہاں آمد سے عیاں تھا کہ وہ اس شادی سے آگاہ ہیں اور بیٹی اور داماد کو دعائیں دینے یہاں پہنچے ہیں لیکن ان کے چہروں کی مرعوبیت اور سراسیمگی یہ بھی ظاہر کرتی تھی کہ دال میں کالا موجود ہے۔ میرا دل چاہا کہ ان دونوں کو پھر دیکھوں۔ میرے گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد میں ٹہلتا ہوا لان کی طرف چلا گیا۔ خوبصورت شامیانوں کے اندر چہل پہل اور رونق نظر آ رہی تھی۔ قناتوں کے درمیان ایک جگہ ملازموں کی آمد و رفت کے لیے مختصر سا راستہ بنایا گیا تھا۔ میں یہاں کھڑا ہو کر اندر کا منظر دیکھنے لگا۔ میری نگاہ غزالہ پر پڑی اور دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ وہ اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ نظر اٹھ کر جھکنا بھول جاتی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کے مخمل کا کامدار سوٹ پہن رکھا تھا۔ لمبی صراحی دار گردن میں ہیروں سے مرصع گلوبند دمک رہا تھا۔ کانوں میں ٹوپس اور عارضوں پر حیا آمیز شباب کی لپک۔ وہ کسی شاعر کی حاصل الکلام غزل تھی۔ یا کسی مصور کا مایہ ناز شاہکار' یہ محفل ہی نہیں گرد و پیش کی ہر جاندار و بے جان شے اس کے وجود کے گرد گھومتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی والدہ یعنی چچی فاخرہ تھی۔ چچی فاخرہ کا ہاتھ غزالہ کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ جیسے بے خیالی میں ماں کے ہاتھ سے کھیل رہی تھی اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی۔ چچی فاخرہ کا دوسرا ہاتھ غزالہ کے کندھے پر تھا اور پیار دینے والے انداز میں بار بار اس کے سر پر آ جاتا تھا۔ چچا جلیس شیخ حاصم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ دونوں خوشگوار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ شیخ حاصم سعادت مندی سے اپنا سر بار بار اثبات میں ہلا رہا تھا۔ یہ سب کچھ معمول کے مطابق نظر آتا تھا لیکن پھر بھی نجانے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں کوئی نہ کوئی بات معمول سے ہٹ کر ہے۔ اس خوشگوار ہنستے مسکراتے ماحول کے اندر کہیں بہت دھیمی آواز میں جابر کا للکارا اور مجبور کا نوحہ بھی گونج رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد سعادت خان نے مجھے یہاں نیم تاریکی میں کھڑے دیکھ لیا اور ڈپٹ کر حکم دیا کہ میں باہر سڑک پر ڈیوٹی انجام دوں۔ میں باہر آگیا۔

تقریب رات قریباً بارہ بجے تک بپا رہی۔ پھر مہمان رخصت ہونے لگے۔ چچا جلیس اور چچی فاخرہ واپس نہیں گئے تھے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد بھی ملازمین کو بے شمار کام کرنا تھے۔ سعادت خان نے ہمیں ایک کمرے میں جمع کیا اور مختلف ڈیوٹیاں سونپنے لگا۔ تین ملازموں کو ان کمروں میں ڈیوٹیاں دی گئیں جن میں یہاں رہ جانے والے مہمان مقیم تھے۔ میں بھی ان ملازمین میں شامل تھا۔ میرے ذمے کمرا نمبر چار اور پانچ کی نگہداشت تھی۔ یعنی رات بھر مجھے بطور "اٹینڈنٹ" ان کمروں کے آس پاس رہنا تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں میری ڈیوٹی اس کمرے میں نہ لگا دی گئی ہو جہاں چچا جلیس اور چچی فاخرہ نے شب بسر کرنی ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو میرا خدشہ حقیقت میں ڈھل گیا۔ کمرا نمبر پانچ میں چچا اور چچی قیام پذیر تھے۔ ایک قالین پوش شاندار راہداری میں قریباً چھ کمرے بنائے گئے تھے۔ یہ وی آئی پی کمرے تھے اور خاص الخاص مہمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش پہلے بھی نہیں تھی کہ شیخ حاصم اس رہائش گاہ میں مجھے اپنے ساتھ رکھ کر ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے۔ تازہ ڈیوٹی سونپے جانے کے بعد یہ حقیقت مزید کھل کر سامنے آگئی تھی۔ اب مجھے بطور ملازم چچا اور چچی کے سامنے جانا تھا۔ وہ کوئی حقیر سے حقیر کام بھی مجھ سے لے سکتے تھے۔ انہیں چائے پیش کرنے سے لے کر ان کی جوتیاں سیدھی کرنے تک ہر خدمت

میرے فرائضِ منصبی میں شامل تھی۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ آج سترہ برس بعد چچی چچا سے میری ملاقات ہو رہی تھی' جب میں ان سے رخصت ہوا تھا تو دل میں عزم تھا کہ اب اُس وقت ان کا سامنا کروں گا جب وہ میری طرح سر جھکائے اشکبار کھڑے ہوں گے اور میں ان کی طرح سربلند و بااختیار ہوں گا۔ پھر میں ان سے اپنے دل پر لگنے والے چرکوں کا حساب مانگوں گا اور پوچھوں گا ان سے کہ میری معصوم بہن کے ہاتھ کو گرم چمٹے سے داغنے والے کی سزا کیا ہونی چاہیے۔ ان لوگوں کی سزا کیا ہونی چاہیے جن کے کہنے پر جل کوٹ کے چوہدریوں نے ایک نوعمر لڑکے کو گلیوں میں برہنہ بدن گھسیٹا تھا۔ میں سوچتا تھا' وہ چچی چچا جو مجھے دو وقت کی روٹی پر نوکر رکھے ہوئے ہیں میری حیثیت و مرتبہ دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں دبا لیں گے اور اپنی ناانصافیوں کا تصور ان کی پیشانیوں کو عرق آلود کر دے گا۔ لیکن ہوا کیا تھا۔ میں شاہ جہاں ایل ایل بی جرم کی راہوں پر چل کر استاد جہانی بن گیا تھا۔ ان گنت گناہ میرے نامۂ اعمال میں درج تھے اور میری پیشانی پر "مفرور مجرم" کی مہر ثبت تھی۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی گوارا تھی لیکن اب تازہ صورتِ حال یہ تھی کہ ایک زبردست شخص کی زبردستی کا شکار ہو کر میں بند پنجرے کا پنچھی بنا ہوا تھا۔ میرے جسم پر گھریلو ملازم کی وردی تھی اور کمرا نمبر چار اور پانچ میں بجنے والی گھنٹی کی صدا پر مجھے "جی سر" کہتے ہوئے لپک کر اندر جانا تھا۔

میرا دل چاہا کہ اس ڈیوٹی سے انکار کر دوں۔ اس حرامی سعادت خان سے کہہ دوں کہ مجھے کوئی اور کام سونپے۔ لیکن پھر ٹیلی فون پر سنائی دینے والی فریال کی لرزہ خیز چیخیں میرے کانوں میں گونجیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اس نوخیز کلی کو بے رحم ہاتھوں کی زد میں دیکھا۔ وہ ہاتھ جو اسے کچل مسل کر پتی پتی کر دینا چاہتے تھے۔ وہ غیور اور خوددار لڑکی جو اپنے پُرغرور شباب کے پر لگا کر اڑتی پھرتی تھی اور کسی ایرے غیرے کو خاطر میں نہ لاتی تھی اب ایک بند کمرے میں ہوس کاروں کے نشانے پر تھی اور بلک بلک کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا در و دیوار سے سر ٹکراؤں اور اس عمارت میں زلزلہ برپا کر دوں۔۔۔ لیکن یہ وقتی جوش تھا۔ جونہی سوچ کے پاؤں جلے اپنی مجبوریوں اور نارسائیوں کی زنجیر میرے ذہن میں جھنجھنا اٹھی اور میں جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

پانچ دس منٹ بعد کسی وجہ سے رہائش گاہ کی بجلی فیل ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ جنریٹر کا انتظام یہاں نہیں تھا لہٰذا ملازمین عارضی روشنی کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ کمرہ نمبر پانچ سے بھی آواز آئی "کوئی ہے؟"

میں جلدی سے دروازے پر گیا۔ چچا جلیس مجھ سے دو قدم کی دوری پر کھڑا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور نہ میں اسے۔ "جی سر! میں ابھی کینڈل لاتا ہوں" میں نے بھاری آواز میں کہا اور کچن کی طرف گیا۔

کچن میں ایک شخص دو تین موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔ میں نے دو موم بتیاں شمعدان میں لگائیں اور بوجھل قدموں سے کمرا نمبر پانچ کی طرف واپس آگیا۔ وہ پردہ چاک ہونے والا تھا جو اب تک میرے اور چچا چچی کے درمیان کھنچا ہوا تھا۔ میں اسے چاک ہونے سے زیادہ دیر نہیں روک سکتا تھا لہٰذا شمعدان تھامے اندر چلا گیا۔ چچی جو اب کافی فربہ ہو چکی تھی بیڈ پر پہلو کے بل لیٹی تھی۔ چچا جلیس کھڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے شمعدان میز پر سجا دیا۔ چچا نے طائرانہ نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کم روشنی کی وجہ سے پہچان نہیں سکے۔ ویسے بھی تصویر کی مدد سے کسی کو پہچاننا اتنا آسان نہیں ہوتا اور چچا چچی نے پچھلے سولہ سترہ برس سے مجھے نہیں دیکھا تھا' فقط میری تصویریں دیکھی تھیں اخباروں وغیرہ میں۔

"ایک گلاس پانی مل سکے گا؟" چچا نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"یس سر" میں نے کہا اور کچن سے ایک گلاس پانی لے آیا۔ واپس آیا تو چچا جلیس ہتھیلی پر دو کیپسول رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے دوا کھانے کے لیے پانی منگوایا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے گلاس آگے بڑھایا تو وہ میری بند مٹھیوں پر چمڑے کی تھیلیاں دیکھ کر چونک گیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دستانے ہیں" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیسے دستانے؟" وہ مزید حیران ہوا۔

"سوری سر۔ مجھے اس بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"اوہ" اس نے ہونٹ سکوڑے۔ پھر زیادہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "مجھے تمہاری شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ کہیں دیکھا ہے میں نے تمہیں"

چچی فاخرہ بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں میرے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے عینک ناک پر جمائی اور تب ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ "تم۔۔۔ تم شاہجہاں تو نہیں ہو؟" وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

چچا جلیس نے شمعدان اٹھا کر میرے چہرے کے سامنے کر دیا تھا اور مجھے شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تم شاہ جہاں ہو نا؟" وہ بھی ہانپی ہانپی سی آواز میں بولا۔

"ہاں" میں نے مختصر جواب دیا۔

چچی فاخرہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ خوفزدہ انداز میں مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ چچا جلیس بھی ایک دم خوفزدہ اور چوکنا نظر آنے لگا "تم یہاں کیسے؟" وہ گڑگڑا کر بولا۔

اس دوران سعادت خان لپکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کہیں پاس ہی موجود تھا۔ چچی کی چیخ سن کر دوڑا چلا آیا تھا۔ اسے

دیکھ کر چچی واویلا کرنے لگی۔ میری طرف اشارہ کرتے سعادت خان سے بولی "یہ یہاں کیوں آیا ہے' اسے نکالو یہاں سے۔ یہ ہماری جان کا دشمن ہے۔ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔" وہ سمٹی ہوئی کمرے کے ایک گوشے میں پہنچ گئی تھی۔

سعادت خان مؤدبانہ انداز میں بولا "آپ گھبراؤ نہیں جی۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوا ہے۔ یہ تو ایک معمولی نوکر ہے۔ اس کا کیا جرأت ہے کہ آپ کو کوئی نقصان پہنچائے۔ یہ تو ہاتھ بندھا غلام ہے آپ کا۔"

چچی چیخی "تم کو کچھ پتا نہیں۔ تم اس کو لے جاؤ یہاں سے اور اپنے مالک کو بلاؤ فوراً۔"

سعادت خان تذبذب میں کھڑا تھا۔ چچا جلیس نے کہا "ہاں لے جاؤ اسے اپنے ساتھ اور عاصم صاحب جاگ رہے ہوں تو ان سے ہماری بات کراؤ۔"

سعادت خان نے مجھے گھورا اور اپنے ساتھ لے کر باہر آگیا۔ باہر سے اس نے انٹرکام پر شیخ عاصم سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت خواب گاہ میں تھا۔ تین چار منٹ بعد وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ایک دو پیگ لگا رکھے ہیں اس نے۔۔۔ پہلے اس نے سعادت خان سے صورتِ حال دریافت کی پھر مجھے لے کر کمرا نمبر پانچ میں آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی چچی ایک بار پھر تھرانے لگی۔

چچا جلیس نے انگلش میں کہا "بابا عاصم! آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ملازم کون ہے؟"

شیخ عاصم اطمینان سے مسکرایا "میں سب جانتا ہوں انکل! اور شاید کچھ ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جو ابھی آپ نہیں جانتے۔ بے شک یہ زہریلا سانپ ہے لیکن میں نے اس کا ڈنک جڑ سے نکلوا دیا ہے۔ اب یہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں جب چاہوں گا' کسی چار تین سالہ بچے سے کہوں گا اور وہ اس کا سر کچل ڈالے گا۔"

میں شیخ عاصم سے پانچ چھ قدم کی دوری پر کھڑا تھا اور میری کلائی پر مسلسل ہلکے جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا ورنہ اس موقع پر اس کی گردن توڑنے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ کسی فرعون کے سے انداز میں مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے میری تذلیل کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ بے رحم نشتر تھے جو میرے سینے پر گھاؤ لگا رہے تھے۔ زندگی میں مجھے کبھی ایسی صورتِ حال سے پالا نہیں پڑا تھا۔ میں بندوقوں کے سائے میں نہیں تھا نہ ہی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا' پھر بھی مزاحمت میرے اختیار سے باہر تھی۔ میں مزاحمت کرتا بھی کیسے۔ اس کمرے میں میرے اور شیخ عاصم سمیت کل پانچ افراد تھے۔ میں شیخ عاصم کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ چچا چچی یا سعادت خان پر جھپٹنا اور ان پر حملہ کرنا لاحاصل تھا۔ فرض کیا میں سعادت خان یا چچا جلیس کو دبوچ لیتا اور ان کی گردن توڑنے کی دھمکی دے کر شیخ عاصم سے کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو اس سے کیا حاصل ہوتا تھا؟ اول تو شیخ عاصم اور اس کے کارندوں کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ میں بازو کی ہلکی سی جنبش سے اپنے شکار کی گردن کا کڑاکا نکال سکتا ہوں۔ اور اگر انہیں یقین آ بھی جاتا تو اس بات سے شیخ عاصم کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا کہ میں اس عمارت میں موجود ہر ذی نفس کی گردن توڑ دوں' بشمول چچا چچی اور غزالہ۔۔۔ بے شک مجھے یقین تھا کہ اگر میں غزالہ کو بھی یرغمال بنا لوں تو شیخ عاصم کو کسی طرح کی تشویش لاحق نہیں ہو گی۔ وہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ وہ تو انتقام اور عداوت کے اس خونی کھیل میں ایک معمولی مہرہ تھی۔ اور جب وہ مہرہ تھی تو پھر اس کے والدین کی کیا قدر و قیمت تھی شیخ عاصم کی نظر میں۔ میں نے بڑی حسرت سے سوچا کاش شیخ عاصم کا کوئی خونی رشتے دار' اس کا کوئی پیارا اس چھت تلے موجود ہوتا اور میں اسی طرح اس کی شہ رگ پر دانت جما سکتا جس طرح شیخ عاصم نے فریال کی شہ رگ پر جما رکھے تھے۔

چچی فاخرہ جب مجھ سے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی تھی تو ایک چھوٹی سی تپائی سے ٹکرا گئی تھی۔ تپائی پر رکھی ہوئی چائے نیچے قالین پر گر گئی تھی۔ شیخ عاصم نے گرج کر مجھے حکم دیا کہ میں چائے کے برتن باہر لے جاؤں اور کپڑا لا کر قالین صاف کروں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری تذلیل کا تماشا چچی' چچا کو دکھانا چاہ رہا تھا۔ میں نے شیخ عاصم کی نشیلی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں وہی بھیانک دھمکی پوشیدہ تھی جو اس سے پہلے بھی کئی بار میرے حواس کو مجروح کر چکی تھی۔ یہ اس انٹرکام کی دھمکی تھی جس پر میں نے فریال کی چیخیں اور اس کی منتیں سماجتیں سنی تھیں۔

میں نے قالین پر سے چائے کے برتن اٹھائے اور انہیں کچن میں لے گیا۔ شیخ سے دور جا کر کلائی پر لگنے والے جھٹکے معدوم ہو گئے لیکن جب دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ جب میں قالین صاف کر رہا تھا تو شیخ عاصم نے چچی فاخرہ سے مخاطب ہو کر کہا "آنٹی جان! یہ اب ایک بالکل بے ضرر شخص ہے۔ آپ کو اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال اگر آپ چاہتی ہیں تو سعادت خان ابھی دوسرا ملازم بھیج دیتا ہے۔ آپ کا آرام ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔"

شیخ عاصم کی انگریزی پوری طرح چچی فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ چچا جلیس نے اسے بتایا کہ داماد صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ بات سمجھ میں آئی تو چچی ایک دم نفی میں سر ہلانے لگی "نہیں نہیں ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ لے جائیں اسے۔ پلیز بیٹا! آپ اسے لے جائیں۔"

میرا خیال تھا کہ اگلے روز چچی چچا چلے جائیں گے۔ لیکن ان کے قیام میں توسیع ہو گئی۔ میری ڈیوٹی مہمان خانے کے کچن میں

نکھری گئی تھی۔ ہیڈ خانساماں کو اجازت تھی کہ مجھ سے ہر قسم کا کام لے سکتا تھا۔ یعنی برتن دھونا، فرش کی صفائی، کچرا اٹھانا اور اس کے علاوہ ہر وہ کام جو میں اپنے منحوس دستانوں سمیت کرنے کے قابل تھا۔ بہرحال یہ ہیڈ خانساماں قدرے بھلا مانس شخص ثابت ہوا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ میں یہاں قیدی ہوں اور کسی بہت بڑی مجبوری کے تحت اس عمارت میں ملازم کی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے خصوصی رعایت برتی اور عملی طور پر مجھ سے کوئی کام نہیں لیا۔ میں نے دو تین روز اسی کچن میں گزارے۔ رات دس بجے کے بعد سرونٹ کوارٹر میں جاکر سوتا رہا۔ یہاں کے ملازمین نے مجھے دبی زبان سے "دستانوں والا" کہنا شروع کردیا تھا۔ مثلاً دستانوں والا کہاں ہے؟ دستانوں والے کو ادھر بلاؤ۔ بھائی دستانے والے بات سنو۔ ملازمین کے زمرے میں آنے والے تمام مرد و زن میرے عجیب و غریب دستانوں کو حیرت سے دیکھتے تھے لیکن کسی نے بھی ان دستانوں کے بارے میں کرید کر کوئی سوال نہیں پوچھا۔ غالباً انہیں ایسا کرنے سے منع کردیا گیا تھا۔ یہ دستانے کسی خاص میٹریل کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے چمڑا نما بیرونی غلاف کو جلانے، دانتوں سے ادھیڑنے اور نوکدار چیزوں سے پھاڑنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ پھر ایک روز مجھے اندازہ ہوا کہ اس چمڑا نما غلاف کے اندر اور اندرونی فوم کے اوپر کوئی دھاتی خول بھی موجود ہے۔ یعنی اگر کسی طور میں بیرونی غلاف پھاڑ بھی لیتا تو اپنے ہاتھوں کو آزاد نہیں کراسکتا تھا۔ اس حوصلہ شکن انکشاف کے بعد میں نے ان عجیب الوضع دستانوں کے خالق پر غائبانہ لعنتوں کی بارش کی اور دستانوں سے الجھنا ترک کردیا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ دستانے میرے جسم کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ دستانوں کے اندر سکڑی سمٹی انگلیوں میں آزادی کی خواہش اور زندگی کی رمق معدوم ہوتی جارہی تھی۔ بند مٹھیوں میں پسینے کا احساس ہوتا تھا، نہ ناخنوں کے ہتھیلیوں پر چبھنے کا۔ بس کبھی کبھار خارش ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ دستانوں کے اندر کوئی باریک سلائی یا جھاڑو کا تنکا داخل کرکے ہاتھوں کو کھجانا شروع کردوں۔

ایک شام شیخ عاصم نے اپنے ساس سسر کو شہر کی سیر کرانے کے لیے اپنی زرد مرسیڈیز پر بھیجا۔ ابھی انہیں گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ شیخ کے اورنج جوس پینے کا ٹائم ہوگیا۔ وہ شام ٹھیک چھ بجے اورنج جوس کا ایک گلاس لیتا تھا۔ کوئی ملازم کچن میں موجود نہیں تھا لہٰذا ہیڈ خانساماں نے مجھے جوس دے کر بھیج دیا۔ ایک نہایت شاندار ٹرے میں جوس کا جگ اور دو خالی گلاس تھے۔ ایک گلاس یقیناً غزالہ کے لیے تھا۔ میں ٹرے لے کر شیخ عاصم کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جونہی راہداری کے آخری سرے پر پہنچا رسٹ واچ پر اسپارکنگ ہونے لگی اور کلائی پر ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ میں نے دیکھا تھا کہ میرے نزدیک آتے ہی شیخ عاصم کی رسٹ واچ پر بھی اسپارکنگ ہونے لگتی تھی۔ اب معلوم نہیں اسے بھی کلائی پر جھٹکے محسوس ہوتے تھے یا نہیں۔ ممکن ہے جھٹکے بھی محسوس ہوتے ہوں لیکن ان کی شدت اتنی زیادہ نہ ہو۔

شیخ عاصم اور غزالہ سے کمرے سے باہر ہی ملاقات ہوگئی۔ وہ پھولوں سے ڈھکی ہوئی بالکونی میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھے تھے اور ایسی حالت میں بیٹھے تھے جس میں انہیں کمرے کے اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔ شیخ عاصم کی بانہیں غزالہ کے گلے میں تھیں۔ اور وہ بڑی محویت سے غزالہ کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ پھر پاؤں سے آواز پیدا کی۔ غزالہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔ شیخ نے بھی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

"یہیں لے آؤ" وہ بارعب آواز میں بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹرے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔ صوفے سے تپائی کا فاصلہ بمشکل چار پانچ قدم رہا ہوگا۔ میری کلائی پر شدید جھٹکے محسوس ہورہے تھے۔ جیسے کوئی لکڑی کے ڈنڈے سے بار بار ہڈی پر ضرب لگا رہا ہو۔ میں نے سوچا اگر واقعی میرے سینے کے اندر چھپے ہوئے ڈیوائس میں بلاسٹ ہوسکتا ہے تو زندگی اور موت کے درمیان اس وقت کتنا کم فاصلہ ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے شیخ عاصم اچانک اٹھ کر میری طرف آجاتا تو میرے معدے میں وہ جان لیوا پٹاخا چل سکتا تھا۔ جس کی "بشارت" شنکر نے مجھے دی تھی۔

جوس رکھ کر میں پیچھے ہٹ گیا۔ شیخ عاصم نے ابھی تک اپنا بازو غزالہ کے کندھے سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ غزالہ کے چہرے پر حیا کی ہلکی سی سرخی تھی۔ مجھے شک گزرا کہ شیخ نے جان بوجھ کر میری نگاہوں کو اس "منظر" سے مجروح کیا ہے۔ بات سوچنے کی تھی۔ وہ کوئی نوجوان رنگیلا دولہا نہیں تھا کہ جس کے لیے رات کا انتظار کرنا بھی دشوار ہوتا ہے اور اسے جہاں کہیں چند لمحوں کی تنہائی میسر آتی ہے وہ اپنی شریک حیات کو اپنی محبت کا "ثبوت" فراہم کرنے لگتا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ بلکہ کافی حد تک خشک مزاج شخص تھا۔ پھر وہ کیوں یوں بالکونی میں بیٹھ کر بیوی سے کھلی محبت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ شاید۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ کچن میں کوئی ملازم موجود نہیں اور اس وقت میں ہی جوس لے کر بالکونی میں آؤں گا۔ پھر رسٹ واچ والی بات میرے ذہن میں آئی اور میرا شک مزید پختہ ہوگیا۔ جس طرح میری رسٹ واچ بتاتی تھی کہ شیخ عاصم قریب آرہا ہے اسی طرح شیخ کی رسٹ واچ بھی اسے میری آمد سے آگاہ کردیتی تھی۔ یقیناً میری آمد سے ذرا پہلے وہ جان گیا ہوگا کہ میں راہداری کے آخری سرے پر ہوں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ سکتا تھا لیکن اس نے سنبھلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

غزالہ اور شیخ عاصم کی قربت کا اذیت ناک منظر نگاہوں میں بسا کر میں کچن میں واپس چلا گیا۔ اس منظر کی تلخی ہی مجھے رات بھر جگانے کے لیے کافی تھی لیکن رات پہلے پہر مجھے ایک اور دھچکا لگا۔

میں کچن سے فارغ ہوکر اپنے کوارٹر میں جانے کی تیاری کررہا تھا کہ چچا جلیس کا پیغام ملا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ روم نمبر فائیو کے معزز مہمان مجھ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ میں پہنچا تو چچا جلیس کو کمرے سے باہر قالین پوش راہداری میں ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھ کر چچا بید کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے اپنے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نشست سنبھال کر میں سوالیہ نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا "تم غزالہ کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے شاہ جہاں۔۔۔ کیوں اس کی زندگی سے نہیں نکل جاتے۔ اب اور کتنا برباد کروگے اسے۔" اس کے عام سے لہجے کے نیچے غیظ و غضب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میں نے کہا "چچا میں تمہاری بیٹی کی زندگی سے اسی دن نکل گیا تھا جب میری ایک چھوٹی سی بھول کی سزا میں تمہاری بیوی نے مجھے سرعام برہنہ کرکے پٹوایا تھا اور اس منظر کے صدمے نے میرے والد کی جان لی تھی۔ اس روز سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا ہے تم سے یا تمہاری بیٹی سے۔"

"تم ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہے ہو شاہ جہاں۔ تم جس سانحے کا ذکر کررہے ہو وہ ایک سنگین اتفاق تھا۔ ہمیں بھی اس کا اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہوسکتا ہے۔ تم نے اپنا باپ کھویا تھا تو میں نے بھائی کھویا تھا۔ تمہیں کیا معلوم میں نے کتنے آنسو بہائے ہیں اس دکھ میں لیکن تمہیں صرف اپنا ہی دکھ نظر آتا ہے۔ تم نے اپنے اندر انتقام کا سانپ پال رکھا ہے اور اب اسی سانپ سے میری بیٹی کو ڈسوانے کے لیے اس کا سایہ بنے ہوئے ہو۔ اب اور کتنا زہر گھولوگے اس کی زندگی میں۔ بس اب ختم کرو یہ گھناؤنا کھیل۔ اگر تمہارے دل میں رشتوں کا تھوڑا بہت احترام بھی باقی ہے تو ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جاؤ۔"

میری رگوں میں آگ جاگ اٹھی۔ میں نے پھنکار کر کہا "مت کرو میرے سامنے رشتوں کے احترام کی بات۔ رشتوں کا احترام سمجھانا ہے تو جاکر اس عورت کو سمجھاؤ جو اپنی پانچ سالہ معصوم اور یتیم بھتیجی سے جانوروں کا سا سلوک کرتی رہی ہے اور اس کے نازک ہاتھوں پر گرم لوہا رکھتی رہی ہے۔ میں تو شروع سے ہوں ہی جنگلی وحشی اور اجڈ۔ مجھے کچھ مت سمجھاؤ۔"

وہ بولا "میں جانتا تھا کہ تمہیں سمجھانا اور دیوار سے سر پھوڑنا ایک برابر ہے۔ اسی لیے تمہارا پتا ٹھکانا معلوم ہوتے ہوئے بھی میں نے کبھی تم سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ کبھی آئندہ کروں گا۔ بس ایک آخری بات تم سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ یہاں سے جاکر اس بارے میں تھوڑا سا سوچنا۔ اگر دلدار بھائی زندہ ہوتے اور ان کے علم میں یہ آتا کہ تم اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کررہے ہو تو ان کا رویہ کیا ہوتا۔ کیا وہ تمہاری حرکتوں سے چشم پوشی کرلیتے۔ کیا وہ یہ نہ کہتے کہ اپنی عزت اپنے قدموں تلے نہ روندو۔ اور اگر وہ تم سے یہ کہتے تو کیا تم ان کی بات اسی طرح ٹھکراتے جس طرح میری بات ٹھکرا رہے ہو؟"

میں نے کہا "چچا جلیس مجھے لفظوں کے طوطے چڑیاں مت دکھاؤ۔ جو بات کہنی ہے سیدھی طرح کہو۔ اور سیدھی بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری بیٹی کے قریب رہنے یا اس کی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھولنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تھوڑی سی کوشش کرے تو یہ بات ایک اندھا بھی جان سکتا ہے کہ میں یہاں اپنی مرضی سے مقیم نہیں ہوں۔ تمہارے داماد صاحب نے مجھے زبردستی یہاں رکھا ہوا ہے۔ وہ جب چھوڑے گا یا جب بھی میرا داؤ لگے گا میں ایک منٹ بھی یہاں رہنا پسند نہیں کروں گا۔ ہاں اگر تم چاہو تو اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھاسکتے ہو۔ داماد صاحب سے کہہ کے مجھے گولی مروا دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

چچا جلیس کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور رخ پھیر کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف چل دیا۔ میرے سینے میں ایک تازہ آگ روشن ہوچکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ میرا سینہ ہی نہیں گرد و پیش کی ہر شے جل رہی ہے۔ پرانے زخموں سے کھرنڈ کیا اترا تھا ہر رگ و پے میں کرب کا دریا بہہ نکلا تھا۔ چچا جلیس کو کیا پتا تھا کہ وہ کس شخص پر کیا الزام لگا رہا ہے۔ اگر میں نے اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کا انتقام خدانخواستہ غزالہ سے لینا ہوتا تو کب کا لے چکا ہوتا۔ آج سے چھ سات سال پہلے میرے جیل جانے سے قبل بے شمار مواقع ایسے آئے تھے جب میرے اور غزالہ کے درمیان ترغیب آمیز تنہائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اور سراپا خود سپردگی و آمادگی تھی۔ میں اسے جس ڈگر پر چلانا چاہتا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سرپٹ دوڑتی چلی جاتی لیکن میں نے کبھی استحصال کی سوچ کو ذہن میں جگہ نہیں دی۔ یہ تو خیر ماضی بعید کی بات تھی۔ آج سے چند ماہ پہلے بھی غزالہ اور اس کی غیر مشروط محبت ہر جگہ اور ہر وقت میری دسترس میں تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کسی سے کوئی بدلہ چکانا ہے۔ میں کسی کو سزا کیا دیتا۔ میں تو خود اپنے حالات کی سزا بھگت رہا تھا۔ جیل کوٹ میں اپنے ساتھ بیتنے والی قیامت کے بعد میرے ذہن میں جو گرہ پڑی تھی وہ برسوں بعد بھی کھولے نہیں کھلی تھی۔ غزالہ کی محبت میں تڑپنے کے باوجود میں اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکا تھا اور اب وہ ایک ایسے راستے پر چل نکلی تھی جس پر کبھی میرے قدم نہیں پڑنا تھے۔

"او غزالہ!" میری آنکھیں بے اختیار نم ہوگئیں "تم نے مجھے تھوڑی سی مہلت تو اور دی ہوتی۔ اپنے ذہن کی گتھی سلجھانے کی میں تھوڑی سی کوشش تو اور کرلیتا۔ کیوں کیا تم نے اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی؟"

میں سرونٹ کوارٹرز کی تاریکی میں اپنے بستر پر لیٹا رہا اور کروٹیں لیتا رہا۔ چارپائی کی چوں چراں سن کر ساتھ والے کوارٹر سے میرے ساتھی ملازم نور احمد نے آواز دی "کیا بات ہے جی۔

نیند نہیں آرہی؟" حالانکہ میری حیثیت یہاں جونیئر ملازم کی تھی لیکن کسی دوسرے ملازمین کی طرح وہ بھی تنہائی میں مجھے احترام سے ہی بلاتا تھا۔

میں نے جواب میں کہا "ہاں.... سر میں درد سا ہے۔"

وہ بولا "اچھا میں ابھی آپ کا علاج کرتا ہوں۔"

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور نور احمد نے اندر آکر چپکے سے وہسکی کی کوارٹر بوتل میرے ہاتھ میں تھمادی۔ سینے میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ ان شعلوں پر ڈالنے کے لیے یہ پانی مجھے بہت موزوں محسوس ہوا۔ میرے ہاتھوں پر منحوس رستانے تھے لہٰذا نور احمد نے میرے لیے ڈھکن کھولا اور میں نے منہ سے لگا کر بوتل کو اوپر اٹھایا لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک گھونٹ بھی لیے بغیر بوتل نیچے رکھ دی "نہیں نور احمد۔ اسے رہنے دو۔ یہ تو اور آگ بھڑکائے گی۔ اگر تمہارے پاس نیند کی کوئی گولی ہے تو لا دو۔"

نور احمد نے کہا "ہاں نیند کی گولیاں بھی ہیں میرے پاس۔"

وہ "ایٹی وان" کی تین گولیاں اٹھا لایا۔ میں نے تینوں گولیاں ایک ساتھ نگلیں اور پڑ کر سو رہا۔

صبح بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ سعادت خان نے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ میرا خیال تھا کہ چہرے پر ایک یا دو گھونسا کھانے کے بعد وہ بہت محتاط ہو جائے گا لیکن اس کی خود سری میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے خود کو بمشکل اس پر جھپٹنے سے روکا۔ وہ غرا کر بولا "خوام تمہارے والد صاحب کا نوکر نہیں ہے کہ دو دو گھنٹا تمہارے سرہانے کھڑا ہو کر تمہیں جگاتا رہے۔ چلو پٹاپٹ چھوڑو اس چارپائی کو۔ ناشتا ماشتا کرو اور وردی پہن کر ادھر پورچ میں آجاؤ، تمہیں مہمانوں کو چھوڑنے ائرپورٹ جانا ہے۔"

"کون سا مہمان؟"

"وہی جو بڑے صاحب کا رشتے دار ہے..... لیکن تم کیوں پوچھتا ہے۔ چلو اپنا کام کرو خوا مخواہ کا پنگا مت لیا کرو.... اور وہاں آنے سے پہلے ڈرائیور کا ٹوپی ضرور پہننا ہے۔" اس نے زرد مرسیڈیز کی چابی میرے حوالے کی اور بڑبڑاتا ہوا سرونٹ کوارٹر سے نکل گیا۔

ناشتے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ طبیعت بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اور وردی پہن کر میں پورچ میں پہنچ گیا۔ چم چم کرتی مرسیڈیز تیار حالت میں کھڑی تھی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ نو بجے کے لگ بھگ چچا جلیس، چچی فاخرہ، غزالہ اور شیخ عاصم پورچ کی طرف آتے دکھائی دیے۔ کئی روز بعد شکر کی صورت بھی نظر آئی۔ وہ حسب معمول کسی خون آشام درندے کے مانند چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔ شکر کے عقب میں دو ملازم تھے۔ ایک نے مہمانوں کا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ غزالہ اور چچی فاخرہ کی آنکھیں آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ وقت رخصت غزالہ ایک بار پھر ماں سے لپٹ گئی.... چچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر شیخ عاصم سے معانقہ کیا اور دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔ ایک ملازم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

ائیرپورٹ تک کا سفر مکمل خاموشی میں طے ہوا۔ چچا چچی بالکل گم صم بیٹھے تھے۔ بچی کی جدائی کا غم تو یقیناً ہوگا لیکن اس کے علاوہ بھی ان کے دلوں پر کوئی بوجھ سا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ مجھے قابل رحم محسوس ہوئے لیکن ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ میں چاہتا بھی تو ان سے ہمدردی کے دو بول نہیں کہہ سکتا تھا۔

ائیرپورٹ تک کا فاصلہ یقیناً نو کلو میٹر سے کم تھا کیونکہ وہاں پہنچنے تک میری منحوس رسٹ واچ پر وارننگ لائٹ ظاہر نہیں ہوئی۔ مہمان ڈپارچر لاؤنج میں چلے گئے تو ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت تک دس بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدحام ختم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی ہم جس سڑک پر جا رہے تھے اس پر آمد و رفت کم تھی۔ دفعتاً مجھے چونکنا پڑا۔ ہمارے آگے جاتی ہوئی ایک شیورلیٹ نے اچانک بریک لگائے اور چرچراتی ہوئی سڑک پر ترچھی ہو گئی۔ میں نے مرسیڈیز اور شیورلیٹ کے تصادم کو بمشکل روکا۔ گاڑی رکتے ہی میرا ہاتھ ریوالور کے لیے خود بخود پاکٹ پر آیا۔ لیکن پاکٹ میں ریوالور نہیں تھا اور نہ ہی میرے ہاتھوں کو یہ "توفیق" تھی کہ وہ ریوالور چلا سکتے۔ میں نے عقب نما میں دیکھا۔ مرسیڈیز کے عقب میں بھی ایک گاڑی رک گئی تھی۔ یہ ٹویوٹا جیپ تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ امریکی ایجنٹ اینڈرے کی جیپ تھی۔ جیپ کا اگلا دروازہ کھلا اور دراز قامت اینڈرے چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ نال والا خوفناک ماؤزر تھا۔ سامنے شیورلیٹ میں سے بھی دو افراد باہر نکل آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ۲۲ رائفل تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے ساتھ بیٹھے ملازم کی گھگھی بندھ گئی۔ مرسیڈیز کے شیشے رنگ دار تھے لہٰذا اندر کا منظر زیادہ وضاحت سے نظر نہیں آتا تھا۔ اینڈرے کے ماؤزر پر جدید قسم کا سائلنسر تھا۔ "ٹھک.... ٹھک" کی آواز سے اس نے دو فائر کیے اور مرسیڈیز کے دونوں پچھلے ٹائر پنکچر کر دیے۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا مرسیڈیز کے پاس آیا اور اس کا پچھلا دروازہ جھٹکے سے کھول دیا۔ کار کے اندر صرف مجھے اور ایک نہتے ملازم کو دیکھ کر اینڈرے کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ یہاں ٹھیک ٹھاک ہنگامے کی توقع کر رہا تھا۔ خوفزدہ صورت والے ملازم نے گولیوں کی "مار" سے بچنے کے لیے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور میں ہاتھ اٹھائے بغیر ہی کار سے باہر نکل آیا۔

"کوئی اور تو تمہارے پیچھے نہیں آرہا؟" اینڈرے نے انگلش میں تیزی سے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"باقی افراد کہاں ہیں؟" اینڈرے کی مراد ڈیتھ گل، غزالہ اور سورج سے تھی۔

"وہ شیخ عاصم کی رہائش گاہ پر ہیں۔"

"ٹھیک ہے انہیں بعد میں دیکھیں گے۔ تم بیٹھو گاڑی میں اور اس بندے کو بھی بٹھاؤ" اس نے ملازم کی طرف اشارہ کیا جو اب رو دینے کے قریب تھا۔

میں نے ملازم کو ساتھ لیا اور ٹویوٹا جیپ.... میں آ بیٹھا۔ اینڈرے نے پھرتی سے ٹویوٹا جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اکا دکا گاڑیاں رک گئی تھیں اور ان میں موجود افراد تشویش آمیز خوف سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اینڈرے نے ایکسیلیٹر دبایا اور ٹویوٹا جیپ چیختی چلاتی شیورلیٹ کے پیچھے رواں ہوگئی۔

"کہاں جا رہے ہیں ہم؟" میں نے اینڈرے سے پوچھا۔

"فی الحال موٹیل سے دور" اینڈرے نے امریکن اسٹائل میں مختصر جواب دیا۔ جونہی ہم نے ایک نہر پر واقع پل پار کیا میری کلائی پر پہلا جھٹکا محسوس ہوا۔ میں نے چونک کر رسٹ واچ کے ڈائل کی طرف دیکھا، سرخ لائٹ اسپارک کر رہی تھی۔ میں نو کلو میٹر کی حد پار کر چکا تھا۔

"مسٹر اینڈرے! ذرا گاڑی روکیں۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا "یہاں رکنا مناسب نہیں۔ دو منٹ انتظار کرو۔"

گاڑی فراٹے بھرتی تیزی سے آگے بڑھتی رہی۔ میری کلائی پر لگنے والے جھٹکے بتدریج شدت اختیار کر رہے تھے.... دس کلو میٹر کی حد کسی بھی وقت پار ہو سکتی تھی۔ میں نے اینڈرے سے کہا "مسٹر اینڈرے! میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ آپ ذرا گاڑی روکیں۔"

اینڈرے کے چہرے پر پہلے تو تذبذب کے آثار نظر آئے لیکن جب اس نے میرے چہرے کی تشویش پڑھی تو سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ذرا الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں نے اسے اپنی گھڑی کے ڈائل پر ہونے والی اسپارکنگ دکھائی "یہ کیا ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

میں نے کہا "یہ ایک وارننگ لائٹ ہے اور آگاہ کر رہی ہے کہ مجھے اب مزید آگے نہیں جانا چاہیے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ پا رہا ہوں.... اور.... اور یہ تمہارے ہاتھوں پر دستانے کیسے ہیں؟"

"یہ سارا معاملہ کافی گمبھیر ہے مسٹر اینڈرے۔ شاید آپ کو یقین کرنے میں دشواری ہو کہ میرے جسم میں دھماکا خیز مادہ موجود ہے اور اگر میں نے مزید آگے جانے کی کوشش کی تو یہ مادہ پھٹ سکتا ہے۔"

اینڈرے اور اس کے مسلح ساتھی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میری دماغی صحت پر شبہ کر رہے ہوں۔ اینڈرے نے حیرت سے کہا "جسم میں دھماکا خیز مادہ؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔ بظاہر میں آپ کو آزاد نظر آرہا ہوں لیکن حقیقت میں نہیں۔ آپ خود سوچیں شیخ عاصم سو جتن کرکے مجھ تک پہنچا ہے۔ اب وہ مجھے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت کیوں دے گا۔ یہ دیکھیں یہ رسٹ واچ۔ یہ اسپارکنگ کرنے کے علاوہ میری کلائی پر مسلسل جھٹکے بھی لگا رہی ہے.....۔"

"یار! کیا باتیں کر رہے ہو تم" اینڈرے نے بیزاری سے کہا "کہیں تم نے پی تو نہیں رکھی۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے" اینڈرے کے ساتھی نے میری سوجی سوجی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے یہ سوجن ان خواب آور گولیوں کا نتیجہ تھی جو رات میں نے اکٹھی تین عدد کھالی تھیں۔ میں نے کہا "مسٹر اینڈرے! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں حرف بحرف درست ہے۔ یوں سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ گاڑی ایک طرف کھڑی کرکے میرے ساتھ آئیں۔ یہاں کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔"

مسٹر اینڈرے اور اس کے ساتھی نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات کی۔ یقیناً وہ سمجھ رہے تھے کہ کسی وجہ سے میں اپنے حواس میں نہیں ہوں۔ اینڈرے نے کہا "ٹھیک ہے کسی مناسب جگہ پر گاڑی روکتے ہیں" اور اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں جانتا تھا وہ مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھلی سڑک پر پہنچتے ہی وہ گاڑی کی رفتار اتنی تیز کر دیں گے کہ میرے لیے اس میں سے کودنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔ گھڑی کے ڈائل کا سرخ بلب اب تیزی سے جل بجھ رہا تھا۔ میری زندگی ایک ان دیکھی موت کے دہانے پر تھی۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ اینڈرے یا اس کے مسلح ساتھی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اتنی تیزی سے حرکت کروں گا۔ میں جیپ کے عقبی دروازے کا جائزہ لے چکا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے لیور کو صرف نیچے کی طرف دبانے کی ضرورت تھی۔ میں اپنے بند ہاتھوں کے ساتھ بھی لیور دبا کر دروازہ کھول سکتا تھا۔ جونہی جیپ نے ایک موڑ پر ٹرن لیا میں نے بیٹھے بیٹھے ایک زوردار ٹانگ مسلح شخص کے جبڑے پر لگائی۔ یہ بڑی تلی ضرب تھی۔ مسلح شخص میرے عین سامنے براجمان تھا۔ اس کا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور وہ تیورا کر فرش پر گرا۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایک طویل جست لگا کر سڑک کے کنارے ایک پھل فروش کی چھابڑیوں پر گرا اور پھر زمین پر آ رہا۔ میری ٹوپی اچھل کر دور جا گری تھی۔ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ اردگرد بازار کے اطراف میں تنگ گلیاں موجود تھیں۔ میں گرتے ساتھ ہی اٹھ کر ایک بغلی گلی کی طرف دوڑا۔ میں جانتا تھا کہ اینڈرے یا اس کا ساتھی مجھ پر فائر نہیں کریں گے۔ راہ گیروں سے ٹکراتا اور کچھ کو گراتا ہوا میں بغلی گلی میں پہنچا۔ یہ بمشکل بارہ فٹ چوڑی نیم پختہ گلی تھی۔ دونوں طرف رہائشی مکانات تھے۔ گلی میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تو دراز قد اینڈرے کو اپنے عقب میں پایا۔ وہ جینز کوٹ میں ملبوس تھا اور ہاتھ میں سیاہ ماؤزر تھامے کسی ایکشن انگلش فلم کے کردار کی طرح دوڑتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی تیز رفتاری اور پھرتی دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اپنی

جگنوں کی پوری قوت صرف کی اور اپنا اور اس کا درمیانی فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تقریباً نصف فرلانگ آگے جانے کے بعد میں جونہی ایک گلی میں مڑا مجھے ایک گھر کا ادھ کھلا دروازہ نظر آیا۔ گلی سنسان تھی۔ میں نے پلک جھپکنے میں فیصلہ کیا اور ایک لمحہ رُکے بغیر گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ بمشکل پانچ مرلے کا مکان رہا ہو گا۔ صحن خالی تھا۔ میں نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور برآمدے کی طرف آیا۔ یہاں مجھے گھر کی خواتین نظر آئیں۔ ایک جواں سال لڑکی واشنگ مشین میں کپڑے دھو رہی تھی۔ قریب ہی ایک بوڑھی عورت چارپائی پر بیٹھی مٹر کے دانے نکال رہی تھی۔ ایک دو ڈھائی سالہ بچہ باغیچے میں کھیل رہا تھا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر دونوں خواتین چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گئیں۔ میرے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ میں لپک کر آگے گیا اور جواں سال لڑکی کو دبوچ کر اس کی گردن بازو میں کس لی۔ بوڑھی عورت نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا وہ کھلا رہ گیا۔

"خبردار" میں نے خطرناک لہجے میں کہا "آواز نکالی تو جان سے مار دوں گا۔"

بڑھیا سمجھدار تھی۔ اس نے چیخنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لڑکی کا بھیگا ہوا سراپا لرز رہا تھا۔ گردن پر میری گرفت کی سختی محسوس کر کے اس نے مزاحمت کا ارادہ یکسر ترک کر دیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر واشنگ مشین بند کی اور لڑکی کو دھکیلتا ہوا برآمدے میں لے گیا۔ اتنے میں ایک بارہ چودہ سالہ نوکرانی بھی جھاڑو پکڑے باہر نکل آئی۔ باہر کا منظر دیکھ کر اس نے ہلکی سی چیخ ماری۔ تاہم میرے ڈرانے دھمکانے پر مزید چیخنے سے باز رہی۔ باغیچے میں کھیلتا ہوا بچہ اپنی ماں کو مصیبت میں دیکھ کر رونے لگا تھا۔ میں نے نوکرانی کو ہدایت کی کہ وہ بچے کو اٹھا کر کمرے میں لے جائے۔ اس نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ بڑھیا، جواں سال لڑکی کی ساس تھی۔ گھر کے مرد کام پر اور بچے وغیرہ اسکول جا چکے تھے۔ اس وقت گھر میں ان تین عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بڑھیا ہاتھ جوڑنے لگی اور بھگوان کے واسطے دینے لگی کہ میں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں اور گھر میں سے جو چیز چاہے وہ لے جاؤں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور ساس بہو کو بڑی نرمی سے سمجھایا کہ میں انہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک خطرناک شخص سے بچنے کے لیے کچھ دیر ان کے گھر میں "مہمان" ٹھہرا ہوں۔ معلوم نہیں انہیں یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال ان کی ہیجانی کیفیت میں کمی واقع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں نے لڑکی کو بہن کہہ کر مخاطب کیا اور ان سے اپنے رویے کی معافی مانگی تو یوں لگا کہ لڑکی کا دل بالکل صاف ہو گیا ہے۔ اس کی ساس بدستور واویلا کر رہی تھی۔ لڑکی نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے ساس کو سمجھایا اور اسے پوتے کے ساتھ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ نوکرانی کا خوف بھی اب کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔ وہ مالکن کی ہدایت پر چھت پر گئی اور سیڑھیوں کے بالائی دروازے کو اندر سے بند کر آئی۔

چند منٹ بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ لڑکی نے جس کا نام آشا تھا مجھے بالائی منزل کے ایک کمرے میں بھیج دیا اور صحن میں جا کر دروازہ کھولا۔ یہ کوئی پڑوسن تھی۔ وہ آشا سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگی۔ اسی دوران ایک عورت بھی آ کر گفتگو میں شریک ہو گئی۔ گفتگو کا موضوع وہ دو "فرلو" تھے جو کچھ دیر پہلے بڑی تیزی سے بھاگتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک مقامی تھا اور دوسرا انگریز۔ یہاں پہنچ کر مقامی شخص کہیں گم ہو گیا تھا۔ اب ٹریفک پولیس کے دو تین کانسٹیبل انگریز صاحب کے ساتھ مل کر اس شخص کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

آشا کی ہمسائی نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ کوئی جیب کترا تھا۔ انگریز صاحب کی کوئی موٹی رقم نکال کر بھاگا ہے۔ موقع پر پکڑا جاتا تو بات تھی۔ اب پکڑا بھی گیا تو رقم کہاں ہاتھ آنی ہے۔"

دوسری ہمسائی جو شمالاً جنوباً اور دور تک پھیلی ہوئی تھی بولی "بہن ان انگریزوں کو روپے پیسے کی اتنی پروا نہیں ہوتی لیکن یہ چور اُچکوں کا پیچھا قبر کی دیواروں تک کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہوا ہے انگریزوں کا دور۔"

اس کے بعد انگریزوں کے سنہری دور پر سیر حاصل بحث شروع ہو گئی۔ یہ بحث معلوم نہیں کتنا طول کھینچتی اور کیسے کیسے تاریخی انکشافات میرے علم میں اضافہ کرتے کہ ایک ہمسائی کو اپنی ہنڈیا جلنے کی بو آ گئی اور وہ مباحثہ بیچ میں چھوڑ کر ہنڈیا سنبھالنے بھاگ گئی۔ چند منٹ بعد جب دوسری ہمسائی بھی چلی گئی تو آشا میرے پاس آئی، کہنے لگی۔ "تم نے بہن کہا ہے تو اب اسے بہن کا گھر سمجھو اور جتنی دیر چاہے یہاں رہو۔ لیکن... کیا واقعی تم نے کسی انگریز صاحب کی... میرا مطلب ہے کہ انگریز صاحب سے تمہارا کیا جھگڑا تھا؟"

میں نے کہا "میں نے تمہاری پڑوسنوں کی باتیں سن لی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں جیب کترا ہوں۔ کیا میں تمہیں شکل سے ایسا نظر آتا ہوں۔"

وہ بولی "ہرگز نہیں۔ تم خدانخواستہ مجرم بھی ہو تو معمولی قسم کے مجرم نہیں۔ میری پڑوسنیں بھی تمہیں دیکھ لیتیں تو اپنے شبد (الفاظ) فوراً واپس لے لیتیں۔"

میں نے کہا "تم پڑھی لکھی ہو؟"

وہ بولی "بہت زیادہ نہیں۔ پھر بھی بھگوان کا شکر ہے۔ جو تھوڑا بہت والدین نے پڑھایا تھا وہ کام آ رہا ہے۔ ایک اسکول میں نوکری کر کے بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں۔"

"اور تمہارا پتی؟"

پتی کے ذکر پر اس کے چہرے پر غم و غصے کے عجیب سے سائے لہرا گئے۔ بولی "چھوڑو اس ذکر کو۔ اگر تمہیں چائے کی طلب ہو رہی ہے تو لاؤں؟"

میں نے کہا "تمہیں کشٹ ہو گا۔"

وہ بولی "بہنوں کو کوئی کشٹ نہیں ہوتا۔"

وہ چلی گئی تو میں بستر پر نیم دراز ہو کر سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ میری طلسمی رسٹ واچ اب خاموش تھی۔ اس کا مطلب تھا میں محفوظ دائرے میں ہوں۔ شیخ عاصم کے شیطانی ذہن نے زندگی کو کتنا کٹھن بنا دیا تھا میرے لیے۔ ہر گھڑی تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ میں سوچنے کی بات تھی کہ اگر شیخ عاصم ابھی "اٹھائی گیر" سے نکل کر کسی سمت سفر شروع کر دے اور فاصلہ بڑھ جانے کے نتیجے میں گھڑی پر وارننگ لائٹ نمودار ہو جائے تو مجھے بھی بے بسی کے عالم میں اس طرف جانا ہو گا جدھر شیخ عاصم جا رہا ہو۔ پھر میرا دھیان اینڈرے اور مسٹر جی کلارک صاحب کی طرف چلا گیا۔ یقیناً وہ لوگ مجھے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے اور کیوں نہ کرتے میں ان کی امید کا ستارہ تھا۔ ان کے خیال سے ان کا مستقبل میری ذات سے مشروط تھا۔ شیخ عاصم "وحشی انتقام" کی خاطر مجھے لے اڑتا تو ان کے دامن میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا تھا۔ یہ بات سائیں عالی نے ان کے ذہن میں بٹھائی تھی یا کسی اور نے بہرحال وہ اس بات پر یقین کرنے لگے تھے۔

اینڈرے ایک سمجھدار شخص تھا لیکن اس کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاطی نے اسے نقصان پہنچایا تھا۔ اگر وہ میری بات کو سنتا رہتا اور جلد بازی کا مظاہرہ کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کرتا تو بہت اچھا ہوتا۔ ہم اس تھوڑی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شیخ عاصم کے خلاف کچھ سوچ سکتے تھے بہرحال اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

میں آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ بہتر یہی تھا کہ ابھی میں کچھ گھنٹے یہاں سے نکلنے سے گریز کروں۔ ایک بار دل میں آئی کہ ایک بار پھر اینڈرے سے رابطہ کروں۔ ممکن تھا کہ وہ اس بار میری مجبوری سمجھ جاتا اور میری بات سنجیدگی سے سنتا۔ اگر وہ مانتا تو ہم شیخ عاصم اور اس کی شیطانی چال کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کر سکتے تھے۔ یہ امکان موجود تھا کہ اس گفتگو کے نتیجے میں شیخ عاصم اور شنکر وغیرہ سے نمٹنے کا کوئی راستہ نکل آتا لیکن پھر یہ خیال مجھے خود ہی رد کرنا پڑا۔ اب اینڈرے سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ اس کی وجہ وہ سگنل تھے جو بقول شنکر شکرا میرے اندر سے نشر ہو رہے تھے اور دس کلومیٹر کے دائرے میں ان کو صاف سنا جا سکتا تھا۔ اگر یہ بات صحیح تھی تو اس کا مطلب تھا کہ شیخ عاصم وغیرہ اس وقت بھی میری پوزیشن سے آگاہ ہیں۔ یہ بات قرین قیاس تھی کہ زخمی مرینڈیز کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر شیخ عاصم کو ہو چکی ہو اور اب اس کے ہرکارے شدت سے مجھے تلاش کر رہے ہوں۔ ایسی صورت میں وہ کسی بھی وقت اس مکان تک پہنچ سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ایسے سگنلز کو آلات کا استعمال کر کے بڑی وضاحت سے ریسیو کیا جا سکتا ہے اور بہت سرعت سے لوکیشن پر پہنچا جا سکتا ہے۔ (میں ایک سے زائد مرتبہ خود بھی ایسے تجربے سے گزر چکا تھا) لہٰذا اس وقت یہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا کہ میں اینڈرے سے مل کر اس کی عافیت خطرے میں ڈالتا۔

کچھ دیر بعد آشا چائے لے آئی۔ اس مرتبہ باغیچے میں کھیلنے والا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ مجھ سے ان عجیب و غریب دستانوں کے بارے میں پوچھنے لگی جو میں ہاتھوں پر چڑھائے ہوئے تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ ایک لمبا اور غیر دلچسپ قصہ ہے اور اس کے بارے میں جان کر اسے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ وہ ایک زیرک لڑکی تھی۔ سمجھ گئی کہ میں اس بارے میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تجسس کے باوجود اس نے دستانوں کے بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ چائے پلانے کے بعد اس نے مجھ سے کہا "اپنی قمیص اتار دو۔ پیچھے سے بالکل خراب ہو رہی ہے۔ شاید کہیں کیچڑ وغیرہ میں گرے ہو تم۔"

میں نے گھوم کر شیشے میں دیکھا سفید وردی کی کوٹ نما قمیص واقعی پہننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ٹویوٹا جیپ سے چھلانگ لگانے کے بعد میں ایک پھل فروش کی چھابڑیوں پر "نازل" ہوا تھا۔ یقیناً وہیں سے یہ کیچڑ لگی تھی۔ میں نے کہا "شکریہ اور پیشگی شکریہ۔"

وہ آنکھیں گھما کر بولی "کیا مطلب؟"

میں نے کہا "بتانے کا شکریہ اور دھونے کا پیشگی شکریہ۔"

وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی تو میں نے دروازہ بند کر کے قمیص اتار دی۔ قمیص اتارتے ہوئے ایک لفافہ جیب سے پھسل کر نیچے گر گیا۔ یہ سفید رنگ کا سادہ لفافہ تھا۔ کوئی نام وغیرہ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ اٹھا کر دانتوں سے چاک کیا۔ اندر سے انگریزی میں ٹائپ کیے ہوئے چار پانچ فل اسکیپ کاغذ برآمد ہوئے میں نے حیرت سے ان کاغذات کو دیکھا۔ سب سے اوپر میرا نام ٹائپ تھا۔ "شاہ جہاں صاحب" یہ انداز تخاطب کس کا تھا؟ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میں نے تیزی سے صفحے پلٹے اور خط کے آخر میں لکھنے والے کا نام پڑھا۔ وہاں لکھا تھا "فرزانہ شیخ عاصم"

میری دُھندلائی ہوئی سی نگاہیں تحریر پر پھسلنے لگیں۔ لکھا تھا "شاہ جہاں صاحب! اب آپ میرے لیے ایک اجنبی شخص ہیں۔ مناسب تو نہیں کہ میں اس طرح آپ کو مخاطب کروں لیکن چند روز پہلے آپ نے گاڑی میں مجھ سے ایک سوال پوچھا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو اس سوال کا جواب دے دوں۔ میرے خیال میں آپ کو اس سوال کا جواب مل جانا جہاں آپ کی الجھن دور کرنے کا سبب ہو گا، وہاں میرے اور میرے شوہر کے لیے بھی نیک شگون ہو گا۔

شاہ جہاں صاحب! میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے لہٰذا میں آپ کو سب کچھ صاف صاف بتا رہی ہوں۔ میرے شوہر کھلے دل کے مالک ہیں۔ میں یہ خط ان کی اجازت اور رضامندی سے لکھ رہی

ہوں۔۔۔ اب میں آپ کے سوال کی طرف آتی ہوں۔ آپ نے پوچھا تھا کہ میں نے شادی جیسا بڑا فیصلہ آپ سے پوچھے بغیر کیوں کر لیا؟

شاہ جہاں صاحب! میں چھ برس کی طویل کشمکش کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ آپ سے میری محبت سراسر یک طرفہ ہے اور آپ کے دل میں میرے لیے سرے سے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ ایک بار جب میں اس نتیجے پر پہنچ گئی تو پھر میرے لیے ضروری تھا کہ کوئی فیصلہ کروں۔ میں نے اپنے والدین کا فیصلہ ماننے کا فیصلہ کر لیا۔۔ یہ اور بات ہے کہ میرے والدین کا فیصلہ درست ثابت نہیں ہوا اور شادی کے بعد میں ایک اذیت ناک عذاب سے دوچار ہو گئی۔ آپ کی الجھن دور کرنے کے لیے میں آپ کو یہ تفصیل بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا سیاہ باب ہے جسے میں مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکوں گی۔ کوئی ماں کبھی اپنی اولاد کی دشمن نہیں ہوتی۔ میری ماں بھی میری دشمن نہیں تھی۔ لیکن نجانے انہیں اور مجھے کس گناہ کی سزا ملی کہ انہوں نے میرے لیے مراتب علی کا رشتہ ڈھونڈ نکالا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مراتب علی سے میری شادی گیارہ نومبر کو لاہور میں انجام پائی تھی۔ ہماری معلومات کے مطابق مراتب علی کے پاس کینیڈا کی شہریت تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد جہاں بہت سے انکشافات ہوئے وہاں یہ بھی پتا چلا کہ مراتب پر کینیڈا میں خرد برد کا کوئی کیس چل رہا ہے اور وہ فی الحال وہاں واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ دہلی میں مراتب علی کی بہن رہتی ہے۔ وہ شادی کے صرف دو ہفتے بعد مجھے ہنی مون کے بہانے دہلی لے گیا۔ دہلی میں پہلے میں اپنی نند کے گھر میں رہی پھر مراتب نے ایک علیحدہ کوٹھی کرائے پر لے لی۔ ہم دونوں اس کوٹھی میں رہنے لگے۔ میری نظر میں مراتب علی کا کردار کچھ مشکوک ہو چلا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ میرے لیے اس کے پاس بہت کم وقت ہوتا تھا' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ مجھے نہ ہونے کے برابر وقت دیتا تھا۔ اور ایسا رویہ اس نے شادی کے پہلے روز سے اپنا رکھا تھا۔ اسے میری ذات میں مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ ہم صرف نام کے میاں بیوی تھے۔ وہ "بیمار" تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنا علاج کروا رہا ہے لیکن میں جانتی تھی کہ بہت سے دوسرے معاملات کی طرح وہ علاج کے معاملے میں بھی سفید جھوٹ بول رہا ہے۔ شاید وہ علاج معالجے کے قابل ہی نہیں تھا۔

دھیرے دھیرے مجھے اس سے خوف آنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا نام نہاد شوہر میرے بارے میں کچھ خوفناک منصوبے بنا رہا ہے۔ مجھے اس کے ملنے جلنے والوں سے گھن آنے لگی۔ ایک روز اتفاق کے تحت میں نے ایک ایسی گفتگو سن لی جس کے بعد میں خود کشی کر لیتی تو بہت بہتر ہوتا۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان پھٹ کر میرے سر پر گر گیا ہے۔ مراتب علی کسی ڈاکٹر راجیش نامی شخص کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ ان کی بات چیت کا موضوع میں تھی۔ میرے شوہر کے لہجے میں کوئی دلال بول رہا تھا اور یہ دلال میری خرید و فروخت کی بات کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر راجیش کو بتایا کہ وہ اپنے مال کی منہ مانگی قیمت لینا چاہتا ہے' اسی لیے رکا ہوا ہے ورنہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ دینے والے تو درجنوں مل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر راجیش نے کہا "لیکن تم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔ لڑکی کو شک ہو چکا ہے اور اس کے خاندان والے بھی تمہیں مہینوں کے حساب سے مہلت نہیں دیں گے۔"

مراتب نے کہا "بس اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ جیسا خریدار میں چاہتا تھا' وہ خود چل کر میرے پاس آ گیا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ چھپر پھاڑ کر آیا ہے۔ آج ہی ہمسروا ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی ہے۔ سالا اصلی برانڈ کا عربی شیخ ہے' اور رنگین مزاج بھی ہے۔ میرے خیال میں اسے ڈھب پر لانے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔"

یہ باتیں سن کر میں اس گھر سے بھاگ نکلی لیکن میری بدقسمتی کہ مراتب علی اور ڈاکٹر راجیش کے ہاتھوں دوبارہ پکڑی گئی۔ وہ مجھے مار پیٹ کر واپس کوٹھی میں لے آئے اور کوٹھی کے ایک حصے میں قید کر دیا۔ میں نے وہاں سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی پیش نہیں چلی۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے گئے تھے۔ دروازے مقفل تھے اور مراتب علی چوبیس گھنٹے میرے پہرے پر موجود رہتا تھا۔

پھر ایک رات وہی ہوا جس کے اندیشے میں میں پل پل مر رہی تھی۔ مراتب ڈاکٹر راجیش کے ساتھ میرے بندی خانے میں داخل ہوا۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا۔ انہوں نے مجھے زبردستی خواب آور انجکشن لگایا اور میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر نائیلون کی رسی سے باندھ دیے۔ میں کچھ دیر تو چیختی چلاتی رہی لیکن پھر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس غنودگی کی حالت میں میں نے ایک شخص کو اپنے بالکل قریب دیکھا۔ میں دنگ رہ گئی۔ شیخ عاصم تھے....."

خط پڑھتے پڑھتے اچانک میں چونک گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دستانہ بند ہاتھوں کے ساتھ کاغذات کو تہ کر کے جیب میں ڈالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے انہیں بیڈ کے نیچے رکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ تاشا لینے کے لیے آئی ہے۔ لیکن دو قدم چل کر مجھے رکنا پڑا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ تاشا نہیں ہے۔ نہ آواز سنائی دی تھی' نہ کوئی جھلک نظر آئی تھی لیکن میں جان گیا کہ یہ فرشتۂ اجل ہے۔۔۔ جو میری بے خبری میں اس دروازے کے بالکل پاس پہنچ گیا ہے۔

میری کلائی پر شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ گھڑی کے ڈائل پر سرخ بلب بھی تیزی سے جل بجھ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دروازے سے باہر شیخ عاصم موجود ہے۔ وہی شیخ عاصم جس کی قربت میری موت تھی۔ کھیل کے طے شدہ اصولوں کے مطابق میرے اور شیخ عاصم کے درمیان کم از کم تین میٹر کا فاصلہ رہنا ضروری تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہو جاتا جو شنکر شکرا نے بتایا تھا۔۔۔ میرے سینے میں موجود دھماکا خیز مواد پھٹ جاتا۔ بقول شنکر شکرا دھماکا خیز مواد بہت قلیل مقدار میں تھا لیکن یہ مواد میرے سینے میں نازک اعضا کے درمیان موجود تھا۔ اس کے پھٹنے کا مطلب میری فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میری یہ تمام سوچ بچار ایک سیکنڈ کے مختصر عرصے کا عمل تھی۔ میرا اور دروازے کا درمیانی فاصلہ بمشکل تین میٹر رہا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں نے ایک قدم مزید اٹھایا تو میرا پاؤں زمین پر نہیں بم تباہ میں پڑے گا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور اضطراب کے عالم میں دیوار کے ساتھ جا لگا۔ دروازہ ایک بار پھر زور سے پیٹا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شنکر شکرا کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔ "دروازہ کھولو۔"

میں نے کہا "میں دروازہ کیسے کھولوں۔ پہلے تم لوگ پیچھے ہٹو۔"

یقیناً میری بات باہر سن لی گئی تھی اور بات کا مطلب بھی سمجھ لیا گیا تھا۔ دروازے کے ساتھ موجود افراد پیچھے ہٹ گئے۔ پھر شنکر کی آواز کچھ فاصلے سے آئی "ہم پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ دروازہ کھولو۔"

میری کلائی پر لگنے والے جھٹکے تھم گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنی قمیص پہنی۔ پھر غزالہ کے خط کے کاغذات بیڈ کے نیچے سے نکال کر اپنی بنیان میں چھپائے۔ باہر سے مجھے پھر پکارا جانے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے دستانہ پوش ہاتھوں کو استعمال کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد کنڈی گرانے میں کامیاب رہا۔ دروازے سے باہر شنکر شکرا اپنے خلا باک ساتھی باردو اور دیگر افراد کے ساتھ موجود تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ شیخ کہیں نظر نہیں آیا۔ شیخ عاصم یہاں نہیں تھا تو میری کلائی پر بندھی گھڑی کا "وارننگ سسٹم" کیوں آن ہوا تھا۔ ایک دم ہی یہ عجیب ترین خیال میرے ذہن میں آیا کہ شاید میں زیادہ سے زیادہ خطرے کی حد پر کھڑا ہوں۔ یعنی میرا اور شیخ عاصم کا درمیانی فاصلہ تین میٹر کے لگ بھگ ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ شیخ عاصم ابھی کسی گاڑی پر بیٹھ کر کہیں روانہ ہو جاتا تو میں یعنی استاد جمالی بیٹھے بٹھائے کھڑے کھڑے بے موت مارا جاتا۔ میرے سینے میں دل سو گنا تیز ہو جاتا اور ناک منہ سے نکلنے والا دھواں دیکھ کر یار لوگ پوچھتے "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے" یعنی نہ کوئی آتشیں اسلحہ استعمال ہوتا' نہ کوئی تیز دھار آلہ چمک دکھاتا اور مقتول کا کام تمام ہو جاتا۔ شاید ایسے ہی فن کار قاتلوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے "تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔"

پھر اچانک میری نگاہ شنکر شکرا کی بالوں بھری کلائی پر پڑی اور سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ شنکر کی کلائی پر وہی گھڑی نظر آ رہی تھی جو میں اس سے پہلے شیخ عاصم کی کلائی پر دیکھتا رہا تھا۔ میری ذات کو لاحق ہونے والے تمام خطرات کسی فرد سے نہیں اس گھڑی سے وابستہ تھے اب یہ گھڑی شنکر شکرا کی کلائی پر تھی لہٰذا شنکر کے سلسلے میں بھی مجھے وہی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا تھیں جو اس سے پہلے میں شیخ عاصم کے سلسلے میں کرتا تھا (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا شیخ عاصم از خود میری تلاش میں نہیں نکلا تھا۔ یہ کام اس نے شنکر کو سونپا تھا اس لیے شیخ عاصم کی طلسمی گھڑی بھی عارضی طور پر شنکر کی کلائی پر نظر آ رہی تھی۔) میں نے دیکھا تاشا ایک کونے میں ڈری سہمی کھڑی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے۔ وہ شاہی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مسلسل کانپ رہی تھی۔ شنکر نے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو نیچے اترو۔"

میں نے کہا "لیکن اس لڑکی کا کیا قصور تھا؟" میرا اشارہ تاشا کی طرف تھا۔

"یہ پھانسی کی رانی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہمارا راستہ روک رہی تھی۔"

"یہ اس کا گھر ہے۔ تمہارا راستہ روکنا اس کا حق تھا۔"

"ہم اس کا گھر سر پر اٹھا کر نہیں لے جا رہے..... صرف تمہیں لے کر جا رہے ہیں اور میرے خیال میں ایک ناپسندیدہ مہمان سے چھٹکارا پا کر اسے دلی خوشی ہوگی۔"

میں نے کہا "تم نے اسے طمانچے مارے ہیں' میں ان طمانچوں کا حساب ضرور لوں گا۔"

"اچھا زیادہ بکواس مت کرو ورنہ میرا دماغ گھوم جائے گا اور تم جانتے ہو میرا دماغ گھومنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

میرا دل چاہا کہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر شنکر پر ٹوٹ پڑوں۔ پچھلے پندرہ دن میں وہ مجھ پر بہت سا قرض چڑھا چکا تھا۔ پہلے برکت منزل سے ساتھیوں سمیت میرا اغوا۔ پھر اٹھائی والا۔ بازار میں لاٹھی سے میری پٹائی اور اب تاشا کے رخساروں پر طمانچوں کے سرخ نشان۔ تاشا کی تیز نظروں نے غالباً میرے چہرے سے میرے دلی جذبات بھانپ لیے تھے۔ وہ لپک کر آئی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی "نہیں بھائی! میرے لیے کسی سے جھگڑا مت مول لو۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

میرے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی وجہ تاشا نہیں تھی بلکہ یہ سوچ تھی کہ ابھی میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو میری کلائی پر منحوس بنی ڈھماش شروع ہو جائے گا۔ میں نے بازو بڑھا کر تاشا کا شانہ تھپکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے

تسل دیتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مسلح افراد صحن میں بھی موجود تھے۔ شنکر نے اپنی کلائی پر سے گھڑی اتاری اور اپنے ساتھی شاہی کے سپرد کردی۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ گلی میں آگیا۔ محلے دار جہاں، وہاں ٹولیوں میں کھڑے تھے اور سراسیمگی کے عالم میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ اس گلی کے کسی گھر سے پولیس کو ٹیلی فون کیا جا رہا ہو۔ یا پھر کوئی شخص پیدل ہی بڑی سڑک کی طرف بھاگ گیا ہو تاکہ پولیس کو اطلاع پہنچا سکے۔ یہ اہل محلہ کی غیرت کا معاملہ تھا۔ دن دہاڑے مسلح افراد جن کا تعلق ہرگز پولیس سے نہیں تھا، دندناتے ہوئے ایک گھر میں گھس گئے تھے اور خواتین سے دست درازی کر رہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مجھے ایک سفید کار نظر آئی۔ شنکر مجھے لے کر اس کار میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کا انتظار کرنے لگا۔ ڈرائیور ابھی ابھی ایک قریبی گلی سے نمودار ہوا تھا اور اپنے بھاری بوٹوں کو ہلکورے دیتا ہوا گاڑی کی طرف دوڑا آرہا تھا۔

شنکر نے زہر خند لہجے میں کہا "میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ تمہاری چالاکی کی اس خوبصورت چوہیا کو بڑی سخت سزا ملے گی۔ پھر بھی تم نے ہیرا پھیری کی کوشش کی۔" خوبصورت چوہیا سے اس کی مراد فریال تھی۔

میں نے کہا "تم کس ہیرا پھیری کی بات کر رہے ہو؟"

"تم دودھ پیتے بچے نہیں۔" وہ بولا "سب جانتے ہو۔ تمہیں مہمانوں کے ساتھ ائرپورٹ بھیجا گیا تھا۔ ائرپورٹ سے تمہیں سیدھا گھر واپس آنا تھا لیکن تم اپنے راستے سے بہت دور یہاں اس مکان میں پائے گئے ہو، کیا ارادے تھے؟ سب خراب ہو گئی تھی یا اس بات میں شبہ تھا کہ ہم ٹرانسمیٹر کے ذریعے تمہاری ڈوم سے چپکے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "دونوں میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارا وہ باپ اینڈرے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مجھ پر چڑھ دوڑا تھا۔ انہوں نے مجھے مرسڈیز سے زبردستی اتار لیا تھا۔ تم موقعے سے تصدیق کر سکتے ہو۔"

شنکر میرے لب و لہجے سے مشتعل ہو گیا۔ اس نے اپنا فولادی مکا میرے چہرے پر رسید کرنا چاہا۔ میں اس آفت کے لیے پہلے سے تیار تھا لہٰذا بروقت نیچے جھک گیا۔ اس کا مکا دروازے پر لگا اور پوری گاڑی جھنجھنا اٹھی۔ اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ اگر وہ دوسرا مکا مارتا تو میں اس کی ناک پر ایک ناقابل فراموش ٹکر رسید کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا لیکن بروقت اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ دانت کچکچا کر بولا "چلو گھر۔ ایسا حشر کروں گا تمہارا کہ دیکھنے والا کانپ جائے گا۔"

میں نے اطمینان سے کہا "تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم اس وقت شیخ عاصم کے زرخرید غلام ہو۔ اس کی اجازت کے بغیر تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔"

وہ بولا "تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ واقعی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہاتھ تو اس لڑکی کو لگایا جائے گا جو شاہی صاحب کی لاڈلی بنی ہے۔ اور یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔"

میں نے کہا "جو میرے سامنے آئے گا وہ میں دیکھ لوں گا۔ پہلے تو دیکھو جو تمہارے سامنے آنے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟" شنکر نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا "تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ میں اینڈرے سے پیچھا چھڑا کر یہاں پہنچا ہوں۔ اب ثبوت دیکھ لو۔"

شنکر نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔ میری نظریں پچاس ساٹھ گز دور بغلی سڑک کے آخری سرے پر جمی تھیں۔ جہاں ایک سیاہ کار اس طرح آکر رک گئی تھی کہ آگے بڑھنے کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ اب فربہ اندام ڈرائیور نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے سوالیہ نظروں سے شنکر کا منہ تک رہا تھا۔ شنکر کے چہرے پر وہی ہیجانی کیفیت نمودار ہونے لگی جو اسے انسان سے درندہ بنا دیتی تھی لیکن ان دنوں اس کا سامنا اپنے ہی جیسے ایک درندے سے تھا۔ خون آشام امریکن ایجنٹ اینڈرے۔ میں اپنے اردگرد اس کی بو سونگھ رہا تھا۔ وہ یقیناً یہیں کہیں موجود تھا۔ مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ اگر شنکر یہاں پہنچ گیا تو اینڈرے کے ساتھ اس کا ایک اور خونریز تصادم ہو سکتا ہے (ایسا پہلا تصادم مسٹر جی کلارک کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوا تھا۔ وہاں تین افراد ہلاک اور چار پانچ زخمی ہوئے تھے۔ ہوٹل کو جو بھاری مالی نقصانات پہنچے وہ اس کے علاوہ تھے) میں نے شنکر کی بھوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "یار دیکھ جاؤ میرا خیال ہے کہ تمہارا دوست اینڈرے تم سے دو دو ہاتھ کرنے آگیا ہے۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گلی کے آخری سرے پر دو تین فائر ہوئے۔ یہ رکی ہوئی سیاہ کار کے پیچھے سے فائر ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص کو دوڑ کر سیاہ کار کی اوٹ میں چھپتے دیکھا۔ گلی میں یہاں وہاں کھڑے لوگ خوفزدہ ہو کر دائیں بائیں بھاگے۔ عین اسی وقت شنکر کے ایک ساتھی نے بھی سیون ایم ایم سے فائرنگ شروع کر دی۔ شنکر کی آنکھوں میں آگ سی جلنے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی تمام حیوانی حسیات بیدار ہو چکی ہیں اور وہ اب ایک خون آشام درندے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس نے فربہ اندام ڈرائیور سے کہا "چلو گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

اس حکم کا صاف سیدھا مطلب یہی تھا کہ گاڑی آگے بڑھاؤ اور اس سیاہ کار کو ٹکر مار کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرو جس نے راستہ بند کر رکھا ہے۔ ڈرائیور نے مشینی انداز میں اس حکم پر عمل کیا۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور وہ تیز رفتاری سے سیاہ کار کی طرف بڑھی۔ ڈرائیور کوئی مشاق شخص نہیں تھا تو یہ کوشش کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ سیاہ کار نے سڑک کو پوری طرح "بلاک" نہیں کیا تھا۔ اس کے بمپر پر لگنے والی ایک ترچھی سی ضرب اسے جگہ

دھکیل سکتی تھی لیکن فربہ اندام ڈرائیور گھبراہٹ میں ٹھیک نشانہ نہ لگا سکا۔ تصادم کے بعد ہماری گاڑی ترچھی ہو کر ایک دیوار سے ٹکرائی اور اسے منہدم کرتی ہوئی ایک گھر کے صحن میں گھس گئی۔ یہ سات آٹھ مرلے کا مختصر سا مکان تھا۔ میں نے ایک جواں سال عورت کو چیخ کر اندرونی حصے کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ سفید شلوار قمیص پر اس نے لکھنوی انداز کی سیاہ مخملی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ہماری کار منہدم شدہ دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ اب اسے آگے بڑھانا یا ریورس کرنا ممکن نہیں تھا۔ شنکر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ صحن میں ایک طرف نیم کے درخت تلے ایک نیا نویلا چم چم کرتا اسکوٹر کھڑا تھا۔ شنکر نے اسکوٹر کے ہینڈل کو حرکت دی۔ وہ لاک نہیں تھا۔ پلک جھپکنے میں اس نے اسکوٹر اسٹارٹ کر لیا "آجاؤ" وہ تحکمانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں جانتا تھا میرے پاس شنکر کے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایک نادیدہ زنجیر نے میری ساری ہنگامہ پسندی اور دہشت کو پابند کر رکھا تھا۔ میں فوراً شنکر کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اب اندھا دھند فائرنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار ہو رہی تھی۔ اسکوٹر کا رخ مکان کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ شنکر اسکوٹر آگے بڑھاتا، اسکوٹر کا بدنصیب مالک لپکتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنا اسکوٹر بچانا چاہ رہا تھا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ اسکوٹر بچانے کے چکر میں وہ ایک ایسے شخص کے مقابل آرہا ہے جس کا سایہ موت ہے... وہ شے کو بھی پتھر کر دیتا ہے اور جسے چھوتا ہے اس کے بدن سے جان کھینچ لیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص شنکر کو دبوچنے کی کوشش میں کوئی جان لیوا چوٹ کھاتا، میں نے ٹانگ لمبی کر کے ایک زوردار ضرب اس کی چھاتی پر لگائی۔ وہ اچھل کر کئی قدم پیچھے گرا۔ اس مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے شنکر نے اسکوٹر آگے بڑھایا اور ہوا سا باہر گلی میں آگیا۔ میں اسکوٹر کے عقبی حصے پر شنکر کے درمیان پھنس کر بیٹھا تھا۔ گلی میں پہنچتے ہی شنکر نے اسکوٹر کا ایکسیلیٹر بھرپور گھما دیا۔ اس نے ایک کامیاب چال چلی تھی۔ اینڈرے سے مقابلہ کرنے کے بجائے وہ مجھے ساتھ لے کر راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اسکوٹر استعمال کیا تھا جو تنگ گلیوں میں بآسانی دوڑایا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہلکی بارش ہو چکی تھی۔ گلیاں گیلی تھیں اور کہیں کہیں بہت زیادہ پھسلن تھی۔ راستے بھی انجانے تھے۔ کسی بھی جگہ کسی متحرک یا ساکت شے سے ہمارا تصادم ہو سکتا تھا مگر شنکر ہر خطرے سے بے نیاز اڑا جا رہا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بالکل نو برانڈ اسکوٹر تھا۔ ابھی ہوا بھی نہ لگی تھی اور نہ نشستوں پر سے سوتی کاغذ اتارا گیا تھا۔ اس بے رنگ کی بھی کہاں پوری ہوئی ہوگی۔ ہم دو لمبے تڑنگے افراد صرف اس پر ڈبل سواری کر رہے تھے بلکہ اندھا دھند بھگا بھی

رہے تھے۔ میرے خیال میں اسکوٹر کا حال اس بدنصیب دلہن جیسا تھا جسے شادی کے فوراً بعد ڈاکو اڑا لے جائیں اور ناشنیدنی سلوک کا نشانہ بنائیں۔ کچھ دیر تک ہمیں اپنے عقب میں فائرنگ کی آوازیں آتی رہیں پھر فاصلہ بڑھ جانے کے باعث معدوم ہو گئیں۔ ہم میدان جنگ سے بحفاظت نکل آئے تھے۔

شنکر نے مجھے دوبارہ "اغاسی لالہ زار" کی وسیع و عریض عمارت میں پہنچا دیا۔ میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد وہ زرد مرسڈیز بھی پہنچ گئی جسے میں سرراہ چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا۔ شنکر نے مجھے شیخ عاصم کے سامنے پیش کیا اور مجھے شروع سے لے کر آخر تک تمام روداد حرف بحرف اسے سنانا پڑی۔

شیخ عاصم کے جبڑے کاٹ کاٹ بھنچ جاتے تھے اور آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگتی تھیں۔ ظاہر ہے اس کا یہ غیظ و غضب مسٹر جی کلارک اور اینڈرے وغیرہ کے لیے تھا۔ اب صورت حال کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ جن دو پارٹیوں کے درمیان زبردست کھینچا تانی کا سبب بنا ہوا تھا، ایک پارٹی کے سربراہ یا کرتا دھرتا مسٹر جی کلارک صاحب تھے۔ مسٹر جی کلارک نے اپنی معاونت کے لیے خطرناک امریکی ایجنٹ اینڈرے کو واشنگٹن سے بلوا رکھا تھا۔ مسٹر جی کلارک کے ساتھ جو اور لوگ شریک تھے ان میں نجیبی گروپ کا نام سب سے نمایاں تھا۔ اس ٹولے کے کچھ دوسرے افراد میں سرور، افراہیم اور قادر زماں وغیرہ شامل تھے۔ یہ سب لوگ سائیں عالی کی اس بات پر اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ نیند تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے جس "اسم اعظم" کی ضرورت ہے وہ صرف اور صرف میرے پاس ہے۔ یہی سبب تھا کہ یہ لوگ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر مجھے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے ٹولے کا کرتا دھرتا شیخ عاصم بن ارشد تھا۔ اس ادب پی شیخ نے اپنی معاونت کے لیے شنکر جیسے بدنام زمانہ غنڈے کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ شنکر سے پہلے منصور بھی اس ٹولے میں شریک رہا تھا۔ شیخ عاصم کو میری ذات سے جو دلچسپی تھی اس کا سرچشمہ انتقام تھا۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق وہ صرف اور صرف اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مذموم مقصد میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا اور اب پچھلے کئی روز سے بلا شرکت غیرے میں اس کی تحویل میں تھا...

بہرطور میری روداد سننے کے بعد شیخ عاصم نے مجھ سے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ قصور اس کا اپنا ہی تھا۔ میں از خود اغاسی لالہ زار سے نہیں نکلا تھا۔ میں نے باول ناخواستہ شیخ عاصم کے حکم پر عمل کیا تھا۔ وہ نہ مجھے ڈرائیور کی حیثیت سے اپنے ساس سسر کے ساتھ ائرپورٹ بھیجتا اور نہ یہ واقعہ پیش آتا۔ شیخ عاصم سے ملاقات کے بعد میری خدمات دوبارہ ملازم خاص سعادت خان کے سپرد کر دی گئیں اور اس نے دن کے باقی حصے کے لیے میری "پوسٹنگ" کچن

میں کردی۔ کچن میں ہیڈ خانساماں میرے مہمانوں میں شامل تھا" وہاں میں نے شام تک قریباً فارغ وقت ہی گزارا۔ بہرحال یہ فراغت مصروفیت سے زیادہ تکلیف دہ تھی کیونکہ انتظار کا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ مجھے رات کا انتظار تھا۔ ذہن میں بار بار ایک ہی خیال آرہا تھا کب دس بجیں گے اور چھٹی ہوگی اور کب میں سرونٹ کوارٹر میں پہنچ کر غزالہ کا باقی خط پڑھوں گا۔ خط ابھی تک میری بنیان میں اڑسا ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کاغذ سرسراتے تھے اور ان کی سرسراہٹ مجھے بے چین کردیتی تھی۔ میں نے خط اس موڑ پر ختم کیا تھا جہاں غزالہ کے نام نہاد اور بے غیرت شوہر مراتب علی نے دہلی میں اس کا سودا طے کردیا تھا اور خریدار کے روپ میں شیخ عاصم تاریکی کی چادر اوڑھ کر غزالہ کے سرہانے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ غزالہ کیسے شیخ عاصم کی بیوی بنی اور کیونکر دہلی سے بھوپال کی اس عظیم الشان عمارت میں پہنچی؟ یہ سب کچھ ان کاغذات پر تحریر تھا جو میرے پاس تھے لیکن میری نگاہوں سے اوجھل تھے۔

خدا خدا کرکے دس بجے کچن کے حبس زدہ ماحول سے جان چھوٹی اور میں شتابی شتابی قدم اٹھاکر اپنے کوارٹر میں پہنچا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد تمام مرحلے میں نے تیزی سے طے کیے اور بہت جلد میری بے قراری کی "ملاقات" غزالہ کی تحریر سے ہوگئی۔

غزالہ نے لکھا تھا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ سیاہ رات کی اس گناہ آلود تنہائی میں میرے سامنے شیخ عاصم کا چہرہ ہے۔ وہ مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر آنکھیں پوری کھولیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شیخ عاصم نے خلاف توقع نرم لہجے میں کہا "مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا" وہ انگلش بول رہے تھے۔

میں نے کہا "میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور مجھے کوئی خواب آور دوا پلائی گئی ہے۔"

شیخ عاصم نے فوراً میرے ہاتھ کھول دیے اور میری طبیعت بحال کرنے کے لیے قہوہ منگوایا۔ شاید قہوے میں کوئی دوا وغیرہ بھی ملائی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میری غنودگی کم ہونے لگی۔ شیخ عاصم نے کہا کہ مجھے یہاں اور اس حال میں دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچے ہیں؟

وہ بولے "مس غزالہ! یہاں آنے سے پہلے میری نیت کچھ اور تھی لیکن نجانے کیوں اب میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادینا چاہتا ہوں... تم جانتی ہی ہو کہ میرے اور شاہ جہاں کے درمیان دشمنی کا رشتہ ہے۔ اس نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا اور میرے لیے ضروری ہے کہ اس قتل کا بدلہ لوں یا خود بھی اس کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ یہ اٹل دشمنی ہے۔ نہ ختم ہوسکتی ہے نہ کم ہوسکتی ہے۔ اب بھی یہی دشمنی مجھے یہاں تک لائی ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں سب کچھ سچ سچ بتاؤں گا اور سچ یہ ہے کہ میں شاہ جہاں کی شہ رگ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں اس کی بہن شمشا کی تلاش میں تھا مگر کوشش کے باوجود مجھے اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ پھر میرا دھیان تمہاری طرف چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ شاہ جہاں سے تمہیں "خاص تعلق" ہے۔ تم پر قابو پاکر میں شاہ جہاں تک پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے تمہاری ٹوہ لی تو مجھے پتا چلا کہ پچھلے دنوں تمہاری شادی ہوئی ہے اور تم اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں ہو۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کیے اور تمہارے شوہر مراتب علی کا سراغ لگالیا۔ میرا ارادہ تمہیں اور تمہارے شوہر کو زبردستی اپنے ساتھ حیدرآباد لے جانے کا تھا لیکن تمہارے شوہر سے مل کر مجھے کچھ اور ہی محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ تمہارا شوہر نہ ہو' یا شوہر تو ہو لیکن تمہیں بیوی نہ سمجھتا ہو۔ اس کی گفتگو سے لالچ اور بے غیرتی کی بو آتی تھی.... آخر دو روز پہلے وہ کھل کر سامنے آگیا۔ "منورا" ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھ کر اس نے مجھ سے تمہارا سودا طے کرلیا۔ اب میں تمہارے خریدار کی حیثیت سے تمہارے سامنے ہوں۔"

شیخ عاصم اور میں رات آخری پہر تک باتیں کرتے رہے۔ وہاں سب کچھ شیخ عاصم کے بس میں تھا لیکن انہوں نے تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری ذات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور مجھے اس بے غیرت شخص کے چنگل سے نکال لینا چاہتے ہیں جو بھوکے بھیڑیوں سے میری بوٹیاں نچوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شیخ صاحب نے میرے سامنے ایک تجویز رکھی۔ انہوں نے کہا کہ میں ان سے شادی کی ہامی بھرلوں۔ اس کے بعد سارے معاملات وہ خود نمٹالیں گے۔ دوزخ سے نکلنے والا برزخ میں آئے تو اسے راحت کے سبب نیند آجاتی ہے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کررہی تھی۔ اپنے شیطان صفت قانونی شوہر کے چنگل سے نکلنے کے لیے کچھ بھی قبول کرسکتی تھی۔ اور میں نے شیخ عاصم کو قبول کرلیا۔ زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ میں نے بے حد عجلت اور افراتفری میں کیا تھا۔ میرے دل میں بار بار یہ وسوسہ اٹھتا تھا کہ کہیں میں کنوئیں سے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے پاتال میں تو نہیں گرگئی۔ پھر یہ خیال بھی دور دور تک چوکے لگاتا تھا کہ کہیں میرے ذریعے شیخ عاصم صاحب آپ کو زچ کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن شادی کے بعد بتدریج میرے شکوک رفع ہونے لگے اور اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے خود کو درپیش حالات کے حوالے سے مناسب ترین فیصلہ کیا تھا۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ یہ طمانیت آئندہ بھی مجھ سے جدا نہ ہو۔ بوجوہ میں اپنے امی ابو کو ان بدلے ہوئے حالات سے آگاہ نہ کرسکی تھی۔ شیخ عاصم سے میری شادی کا علم امی ابو کو شادی کے ہفتے بعد ہوا۔ میرے شوہر کی دلی خواہش تھی کہ امی ابو دعوت ولیمہ میں شرکت کریں لہٰذا

انہیں اس تقریب میں مدعو کیا گیا۔

خط کے آخر میں میں آپ سے دست بستہ درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ شیخ عاصم کی صورت میں مجھے زندگی کا جو آخری سہارا ملا ہے اسے کمزور کرنے یا چھیننے کی کوشش نہ کریں' اگر یہ سہارا چھن گیا تو میرے لیے موت کو گلے لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ ایک بیوی کی حیثیت سے میں شیخ عاصم کو کافی حد تک جاننے لگی ہوں۔ وہ سخت مزاج ضرور ہیں لیکن ان کا دل سمندر کی طرح وسیع اور گہرا ہے۔ میری خاطر وہ ہر دشمن اور عداوت بھلا دینے کو تیار ہیں۔ آپ بھی اپنے دل سے ہر کدورت دور کر دیں۔ مجھے یقین ہے سوجو یہ صورت حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ شیخ صاحب کا ذرا سا غصہ بھی بہت جلد ختم ہو جائے گا اور وہ آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس خطرناک دشمنی کو دفن کرنے کا یہ موقع ہاتھ سے نہ گنوائیں اور یہاں سے رہائی پانے کے بعد اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں۔ خیر اندیش "فرزالہ شیخ عاصم"

تحریر ختم ہو چکی تھی لیکن میری نگاہیں اب بھی کاغذ پر جمی تھیں۔ ذہن کے ویرانے میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ سوچ کا شتر بے مہار ہر طرف دھول اڑاتا پھر رہا تھا۔ اگر یہ تحریر واقعی فرزالہ کی تھی تو پھر یہ لہو کے آنسو رلانے کا مقام تھا۔ وہ صورت و سیرت کی خوبیوں سے مالا مال لڑکی جو سچے موتیوں میں تولے جانے کے قابل تھی' متاع کوچہ و بازار کی طرح در در بھٹکی تھی۔ کیسا بدنصیب شخص تھا وہ جسے یہ گوہر نایاب ملا اور اس نے اسے ہوس زدوں کے لیے شوکیس میں سجانے کی کوشش کی۔ میں یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ ان حالات میں گرفتار ہو کر فرزالہ کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ وہ سورج کی پہلی کرن کی طرح شفاف اور شبنم کی طرح پاکیزہ تھی۔ جب اسے پتا چلا ہوگا کہ اس کا شوہر اس کے لیے خریدار ڈھونڈتا پھرتا ہے تو کیا کیا آفت نہ گزری ہوگی اس کے دل و دماغ پر۔ وہ شیخ عاصم کے کردار سے اچھی طرح واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ خطرناک شخص میرے خون کا پیاسا ہے پھر بھی وہ اس سے شادی پر رضامند ہو گئی تھی۔ یہ ثبوت تھا اس امر کا کہ وہ اس مراتب نامی درندے کے ہاتھوں آخری حد تک لاچار ہو چکی تھی۔ اسے اپنے سامنے ایک چیتھڑا عورت کی گمنام زندگی نظر آ رہی تھی' اسے اپنے کانوں میں بھوکے بھیڑیوں کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں اسے پناہ کی ضرورت تھی۔ صرف پناہ کی ضرورت۔ یہ مہلت نہیں تھی اس کے پاس کہ وہ "جائے پناہ" کو دیکھتی۔ عیار شیخ عاصم نے اس کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا اور اس کی مجبوری اور بے اختیاری کو کیش کراتے ہوئے اسے اپنی منکوحہ بنا لیا تھا۔ تو یہ کیسا جگر پاش صدمہ تھا۔ میری آرزوؤں کا پھول میرے ہی دشمن کے بستر ہوس پر کچلا گیا تھا۔ اور اب بھی کچلا جا رہا تھا۔ ٹائپ شدہ کاغذات پر نظر آنے والے سیاہ حروف میری نگاہوں میں گڈمڈ ہونے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ فرزالہ نے اپنے اس خط میں مجھے اتنی حیرتیں اور اذیتیں سونپی تھیں کہ وہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ خط کے آخر میں اس نے مجھے یہ نوید سنائی تھی کہ شیخ عاصم عنقریب مجھے اپنی قید سے رہائی دینے والا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ فرزالہ کا یہ اندازہ غلط ہے بالکل جیسے اس کا یہ خیال غلط تھا کہ شیخ عاصم اس کا شوہر ہے اور اسے ایک باعزت زندگی دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے شیخ عاصم کے ارادے اس کی آنکھوں میں صاف پڑھے تھے۔ وہ اتنی جلدی میری جان بخشی کرنے والا نہیں تھا۔ فرزالہ کے سامنے اس کا رویہ میرے ساتھ کچھ اور ہوتا تھا لیکن تنہائی ملتے ہی اس کی آنکھیں مجھ پر شعلے برسانے لگتی تھیں۔ اس کے چہرے سے ایک نقاب اتر جاتا اور پیچھے سے ایک اذیت پسند قاتل کا چہرہ نمودار ہو جاتا تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے جلدی سے کاغذات کو تکیے کے نیچے رکھا اور دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں سرونٹ کوارٹر میں تھا اور اس سے پہلے کبھی کسی نے دستک دے کر سرونٹ کوارٹر میں آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ معلوم نہیں یہ کون "تمیزدار" تھا۔ دستک کی آواز سے مجھے اندازہ ہوا کہ دستک دینے والا ہاتھ نسوانی ہے۔ "آ جاؤ" میں نے کہا۔

دروازہ کھلا اور سورج سوا نیزے پر آ گیا۔ میرے سامنے سروج عرف ارجمند کھڑی تھی۔ وہ اسی بشاش بشاش اور چہکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیسے رات کے گیارہ نہ بجے ہوں صبح کے نو بجے ہوں اور وہ تیار و شیار ہو کر کہیں جانے کے لیے نکل رہی ہو۔ سروج کو میں نے آخری بار دس بارہ دن پہلے اسی عمارت میں دیکھا تھا۔ شنکر اور اس کے ساتھی ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں لائے تھے۔ سروج بھی ساتھ تھی اور اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پھر مجھے سب سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد میں نے اپنے کسی ساتھی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

"نمستے" سروج نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور بڑی ادا سے اندر آ گئی۔ اس کے عقب میں ایک ملازم بھی تھا۔ ملازم کے ہاتھ میں چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔ سوٹ کیس کمرے میں رکھ کر وہ چلا گیا۔ سروج نے کمال بے تکلفی سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ میرے ہاتھوں کی بند مٹھیوں پر ہی پڑی۔ "ہائے رام یہ کیا؟" وہ دیدے پھاڑ کر بولی "کیا یہاں باکسنگ کر رہے ہو تم؟"

"باکسنگ کرتا نہیں' کراتا ہوں" میں نے کہا "میری جیب یہاں "میچ بک" کی ہے۔ یار لوگ آ کر مجھ پر مکا بازی کی مشق کرتے ہیں۔۔۔ لیکن تم یہاں کیسے؟ خیریت سے تو ہو؟ اور یوں آتے ساتھ ہی دروازہ کیوں بند کر دیا؟"

وہ اطمینان سے کرسی سنبھالتے ہوئے بولی "اتنے سارے

سوال ایک ساتھ۔۔۔ اور میں نے ایک سوال کیا تھا اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں پوچھتی ہوں یہ تھیلیاں کیسی ہیں تمہارے ہاتھوں پر؟"

میں نے کہا "یہ عرب شیخ بعض شکاری پرندوں کے ناخن کاٹ دیتے ہیں۔ شاید انہوں نے مجھے بھی کوئی شکاری پرندہ سمجھا ہے۔"

"او گاڈ" وہ غور سے میرے دستانوں کو دیکھتے ہوئے بولی "یہ بہت تنگ ہیں۔ کیا تم کھول نہیں سکتے ہو؟"

"کھول سکتا تو کیا شوق تھا یوں لنڈورا ہو کر بیٹھنے کا۔"

وہ بولی "میں آج ہی شیخ صاحب سے بات کروں گی۔"

میں نے کہا "بہت یاری ہے شیخ صاحب سے؟"

"یاری تو نہیں لیکن کچھ کچھ نرم ہو گئے ہیں وہ میرے سلسلے میں۔ مجھے اور اس پٹھان (زریں گل) کو اوپری منزل کے دو کمروں میں رکھا گیا تھا۔ دروازے ہر وقت لاک رہتے تھے۔ بہت سختی کے دن کاٹے ہیں یہاں آ کر۔"

"پھر یہ سختی ٹلی کیسے؟"

"پرسوں شیخ صاحب آئے تھے۔ میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا اور کہا کہ ہم دونوں پتی پتنی کی طرح رہتے ہیں۔ میرے لیے تم سے جدا رہنا بڑا کٹھن ہے۔ معلوم نہیں شیخ صاحب کے من میں کیا آئی کہ انہوں نے میری قید تنہائی ختم کر دی۔ شام کو مجھے گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ آج صبح شیخ صاحب نے مجھے اجازت دے دی کہ میں چاہوں تو تمہارے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں رہ سکتی ہوں۔ میں بھلا کیوں نہ چاہتی۔ ضروری سامان لیا اور آ گئی تمہارے پاس۔"

"اس بے ہودگی سے مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"تم اسے بے ہودگی کہتے ہو' میرے نزدیک یہ محبت' پریم' پیار' یا عشق سب کچھ ہے۔ اور خبردار میرے ان جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی تو۔ مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے اور تم مجھے زبان دے چکے ہو۔ تمہاری محبت کی تصدیقی مہر میرے یہاں لگی ہوئی ہے" اس نے باقاعدہ اپنے گلابی ہونٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' پھر بولی "ہاں۔۔۔ ایک بات اور یاد آئی۔ ویسے بھی اب میرے اور تمہارے درمیان کیا پردہ رہا ہے" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی شوخی میں ذرا سی شرم بھی شامل ہو گئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کس واقعے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کی حویلی میں اس کی بے ہوشی دور کرنے کی کوششوں کے دوران میں میں نے اس کے تمام کپڑے اتار ڈالے تھے اور اسے شاور کے نیچے لے گیا تھا۔

جی چاہا مکا مار کر حرافہ کا ناک نقشہ بگاڑ دوں لیکن صرف غصے کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے کہا "سروج! کیوں اپنا اور مذاق بنا رہی ہو۔ یہ سرونٹ کوارٹر ہے۔"

"میں جانتی ہوں' یہ سرونٹ کوارٹر ہے" وہ بات کاٹ کر بولی "اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان کوارٹروں میں جوڑے بھی رہتے ہیں۔ پریمی جوڑے جو ہماری طرح دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھتے ہیں۔"

میرے ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ سروج کی یہاں موجودگی بھی شیخ عاصم کے انتقام کی ایک شکل ہے۔ وہ جس طرح فرزالہ پر مسلط ہو کر میرے لیے جان گسل اذیت کا سبب بنا ہوا تھا اسی طرح سروج کو مجھ پر مسلط کر کے فرزالہ کے لیے بے سکونی کا اہتمام کر رہا تھا۔ یقیناً وہ سروج کی گفتگو سے اس کی فطرت جان گیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اجازت پاتے ہی وہ کسی بلا کی طرح مجھ سے چمٹ جائے گی۔

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا "زریں گل کہاں ہے؟"

سروج کے چہرے پر فوراً ناگواری کے آثار ابھرے' بولی "اس کا نام مت لو میرے سامنے۔ میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ اس بدبخت سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ وہ منحوس تمہارے ساتھ رہا تو کیا کچھ ہوتا رہے گا جو اب ہوا ہے۔"

میں نے کہا "جو اب ہوا ہے وہ تو سراسر تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ برکت منزل پر چھاپا صرف تمہاری وجہ سے پڑا۔ نہ تم چوری چھپے تیکرو باڈی گارڈ کے ساتھ پنڈت مہاراج سے ملنے جاتیں نہ شنکر وغیرہ تمہارے پیچھے لگتے اور نہ ہم برکت منزل سے اغوا ہو کر یہاں پہنچتے۔"

"تک۔۔۔ کون گیا تھا پنڈت مہاراج سے ملنے؟"

"تم گئی تھیں" میں نے تلخ لہجے میں کہا "بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں نے خود شنکر سے ساری بات معلوم کی ہے۔ جس وقت تم ریسٹورنٹ میں پنڈت سے ملاقات کر کے نکلیں' شنکر کے کارندوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ بس وہ پہنچ گئے ہم تک۔"

سروج کا چہرہ اتر گیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا "تم سنی سنائی بات پر یقین کر رہے ہو۔ مجھے کیا ضرورت تھی پنڈت سے ملنے کی اور یوں بھی پنڈت صاحب کبھی حیدر آباد سے باہر نہیں نکلے۔ وہ مجھ سے ملنے بھوپال کیوں بھاگے چلے آتے؟"

"دولت۔۔۔ دولت میں بڑی طاقت ہے سروج۔ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو آج تم سب لوگ تگنی کا ناچ ناچتے نظر نہ آتے۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا' اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے تم سے زریں گل کے بارے میں پوچھا تھا۔"

وہ لڑاکا عورتوں کی طرح منہ پھیر کر بولی "مجھے کیا خبر وہیں پڑا سڑ رہا ہو گا کمرے میں۔"

"اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"ملاقات تو نہیں ہوئی مگر چار پانچ روز پہلے اس کی بک بک اور

پھر جیسے دبکا دی سی تھی میں نے۔"

"چیخ ایکار... کیا ہوا تھا رات؟"

میرا اضطراب دیکھ کر سروج کو دلی راحت نصیب ہوئی اور اس کا موڈ قدرے بہتر نظر آنے لگا۔ اپنے بالوں کو جوڑے کی صورت باندھتے ہوئے بولی "بد زبان شخص ہر جگہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ بندہ پوچھے، تمھیں کیا ضرورت تھی فلمی ولن کی طرح بڑکیں مارنے کی اور شیر بننے کی؟ اور اگر شیر بنے ہی تھے تو پھر بن کر رہتے۔ مار پڑنے پر عورتوں کی طرح ہائے وہائی نہ کرتے۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "خان بہادر نے روشندان میں سے نکلنے کی کوشش کی تھی لیکن عقل کی طرح جسم بھی موٹا ہے۔ بس پھنس گئے روشندان میں۔ آدھا دھڑ اندر، آدھا باہر، دو گھنٹے اسی طرح لٹکے رہے۔ آخر پہریداروں نے دیکھ لیا۔ کھینچ تان کر نیچے اتارا گیا تو معافی تلافی کے بجائے بڑکیں مارنے لگا۔ کہنے لگا 'ام اس مکان کی اینٹ سے اینٹ بجاوے گا۔ تم نے اماری عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے' ام تمھارے منہ میں ہاتھ ڈال کر تمھارا آنتیں کھینچ لے گا۔ پہریداروں نے پکڑ کر فرش پر لٹا دیا اور دولتیوں سے خوب پیٹا۔ آخر چیخنے چلانے لگا۔ بعد میں پہریداروں نے پھر کمرے میں بند کر دیا۔"

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ زویں گل ونگا فساد کی کوشش کرے گا اور نقصان اٹھائے گا۔ درحقیقت وہ ایک جوشیلا اور کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لانے والا شخص تھا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جرم اور مار دھاڑ کی دنیا میں ایسے لوگ زیادہ دیر نہیں جی سکتے۔ اگر زویں گل اب تک زندہ تھا تو یقیناً اس پر قدرت کا کرم خاص تھا۔۔ زویں گل کے بارے میں جان کر میں کچھ افسردہ سا ہو گیا۔ میری افسردگی نے سروج کا موڈ بالکل بحال کر دیا۔۔ وہ خوش و خرم نظر آنے لگی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اپنے استعمال کی اشیا مختلف جگہوں پر سلیقے سے رکھنے لگی۔ وہ کپڑوں کے تین جوڑے لائی تھی، چوتھا اس کے تن پر تھا۔ اس نے تینوں جوڑے مع تولیا اور سلیپنگ گاؤن وغیرہ سوٹ کیس سے نکالے اور ایسا کرتے ہوئے غالباً جان بوجھ کر ایک کپڑا نیچے گرا دیا۔ یہ عورتوں کے استعمال کا مخصوص زیر جامہ تھا۔

"اوہ نو" وہ ادا سے بولی "یہ کپڑا دو ذرا" اس نے ریشمی زیر جامے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نیم دراز تھا۔ ویسے بھی دستانہ پوش ہاتھوں سے کوئی چیز تھامنا اور اٹھانا مجھے دشوار محسوس ہوتا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے پاؤں کی انگلیوں میں دبوچ کر زیر جامہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ متنفر سے بولی "توبہ بھگوان! اس قدر احتیاط۔ آگے آگے کیا ہو گا۔"

کمرے میں صرف ایک مختصری الماری تھی اور اس میں میرا سامان تھا۔ سروج نے اپنے کپڑے دیوار پر لگی کھونٹیوں سے لٹکا دیے۔ یہ سادے قیمتی لباس تھے۔ اس سرونٹ کوارٹر میں ان قیمتی کپڑوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خستہ حال جھونپڑے میں فانوس روشن کر دیے گئے ہوں۔ سامان رکھنے کے بعد سروج نے غسل خانے میں جا کر شب خوابی کا لباس پہنا۔ بال بکھیر کر کنگھی کی، انھیں ڈھیلے ڈھالے انداز میں ربر بینڈ میں سمیٹا اور پرفیوم کی خوشبو بکھیرتی میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر میرے دستانوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور ان کی "سخت جانی" پر اظہار حیرت کرتی رہی پھر پوچھنے لگی کہ یہاں پر میرے ساتھ کیا بیت رہی ہے میں مختصر اور ڈھکے چھپے انداز میں جواب دیتا رہا۔ وہ میری بیزاری صاف محسوس کر رہی تھی لیکن اکتا نہیں رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب سرکتی آ رہی تھی۔ آخر میں نے سنجیدگی سے کہا "سروج! میں سونا چاہتا ہوں۔"

"ہائے رام! اتنی جلدی؟"

"ہاں میں جلدی سونا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

"بڑے چالاک ہو تم۔ میں سب سمجھتی ہوں۔"

"کیا سمجھتی ہو؟"

"یہی کہ جلدی سو کر جلدی اٹھ جاؤ گے اور رات پچھلے پہر ستاؤ گے مجھے۔"

"بے فکر رہو۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ تمھارے آرام میں خلل ڈالوں۔"

"خلل کہاں میری جان۔۔۔ یہ تو۔۔ یہ تو تمھارا حق ہے۔"

"کیسا حق؟"

وہ میری آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی اور خوابناک لہجے میں بولی "ہمارے بزرگ مدھیہ پردیش کی ایک ریاست جاتورا کے رہنے والے تھے۔ اس ریاست کے کچھ رسم و رواج آج بھی ہمارے خاندان میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک رسم یہ ہے کہ جو جان بچائے جان اسی کی ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے میری جان تمھاری ہے۔ تم نے بھی تو کوتاب راحدگی کے جان لیوا زہر سے میری جان بچائی تھی۔ تم۔۔۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتی، میں موت کے اندھیرے میں ڈوب رہی تھی اور تم کھینچ کھینچ کر مجھے باہر لا رہے تھے۔"

"بابا۔۔ یہ غلطی ہوئی تھی مجھ سے۔ آئندہ نہیں کروں گا۔"

"لیکن جو ہوئی اس کی سزا تو بھگتنا پڑے گی۔" وہ شوخی سے بولی۔

میں نے اسے اپنے دستانہ پوش ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا "پہلے یہ سزا بھگت لوں، پھر کسی دوسری کے بارے میں دیکھا جائے گا۔"

"بات ٹالنا کوئی تم سے سیکھے۔"

"اور بات نہ ٹالنا کوئی تم سے۔"

"ہائے سائیں نالی جی! کہاں ہو تم؟" وہ بڑی ادا سے ٹھنڈی سانس لے کر بولی "دیکھ لو یہاں تمھاری داسی سے کیا سلوک ہو رہا ہے۔"

وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ میں فرش پر بچھی چٹائی پر پڑا رہا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ سو گئی تو میں چپ آہستگی اٹھا۔ دوبارہ بتی جلائی اور تکیے کے نیچے سے غزالہ کے خط کے اوراق نکال کر محفوظ کر لیے۔

صبح آنکھ کھلی تو اس کی انگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ وہ ابھی تک سلیپنگ گاؤن میں تھی اور کھلے کھلے گریبان میں سے اس کا سیمیں بدن دور تک نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ مخمور آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، وہ میرے انداز سے بھانپ گئی کہ میں سگریٹ سلگانا چاہ رہا ہوں۔ یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی ورنہ دستانہ پوش ہاتھوں کے ساتھ میں سگریٹ سلگانے یا پینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پچھلے بارہ تیرہ روز میں میں سگریٹ سے اتنا ہی دور رہا تھا جتنا کوئی پیر صد سالہ اپنے دور جوانی سے دور ہوتا ہے۔ اپنے پسندیدہ برانڈ کا ذائقہ بار بار میرے منہ میں گھلتا تھا اور میں سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا تھا۔ سروج نے الماری میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اپنی حنائی انگلیوں کی مدد سے ایک سگریٹ نکال کر میرے ہونٹوں سے لگایا اور بڑے اسٹائل سے اسے سلگا دیا۔ پھر وہ میرے بازو سے چپک کر بیٹھ گئی اور مجھے سگریٹ پلانے لگی۔

میں نے کہا "سروج! ہمیں یہاں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ہوں گے۔ ورنہ بری طرح پھنس جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے پلکیں جھپکیں۔

میں نے کہا "سمجھنے کی کوشش کرو۔ شیخ عاصم نے تمھیں جان بوجھ کر یہاں بھیجا ہے۔ وہ مجھے زچ کرنا چاہ رہا ہے۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ ڈاکٹر غزالہ بھی یہاں اس چار دیواری میں موجود ہے۔"

"کون ڈاکٹر غزالہ۔۔۔" سروج نے حیران ہو کر کہا، پھر جیسے سے کچھ یاد آیا۔ ایرے تھما کر بولی "اچھا۔۔۔ وہ تمھاری۔۔۔ محبوبہ اور گائڈ، یہاں کیسے پہنچی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لو کہ شیخ عاصم نے تاحال اسے دادی کر لی ہے۔"

"او نو" اس نے ایک بار پھر شدید حیرت کا اظہار کیا "یہ کیسے اور کب ہوا؟"

"میں نے کہا ہے ناکہ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ فرصت میں تمھیں سناؤں گا۔ فی الحال یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ شیخ عاصم نے فقط رقابت کے تحت تمھیں یہاں بھیجا ہے۔ وہ مجھے تمھارے ملوث کر کے غزالہ کی نگاہوں سے گرانا چاہ رہا ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنے دشمن کی خواہش کے مطابق عمل کریں؟"

سروج خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگانا تو مشکل تھا لیکن میں جانتا تھا کہ غزالہ کی شادی کا سن کر اسے دلی مسرت ہوئی ہو گی۔ اس کے راستے کی ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ از راہ تکلف وہ مجھ سے ہمدردی کے دو بول بولے گی لیکن وہ بڑی بے رحم نکلی۔ بدستور اپنے رومانی موڈ میں بیٹھی رہی اور میرے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی "ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔۔۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تو پہلے ہی تم سے کہتی تھی 'عشق محبت' پریم سب بے معنی لفظ ہیں۔ انسان صرف اپنے آپ سے پریم کرتا ہے، باقی سب جھوٹ ہے۔ تم بھی اپنے آپ سے پریم کرو اور اپنے آپ سے پریم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے لیے خوشی حاصل کرو۔ جہاں سے بھی ملے جیسے بھی ملے۔ جیون ہے ہی کتنا اور جوانی تو جیون سے بھی مختصر ہوتی ہے۔ جوانی کے گنے چنے دن اور گنی چنی راتیں بھگوان کا انعام ہیں۔ ان کے ہر ہر پل سے فائدہ اٹھاؤ۔ بہت جلد یہ سب خواب و خیال ہو جائے گا اور وہ پل تمھیں بتانے لگے گا کہ بڑھاپا کبھی واپس نہ جانے کے لیے تم پر مسلط ہو چکا ہے۔"

اس کی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں اور بال مجھ پر سایہ کر رہے تھے۔ میں نے کندھے کی جنبش سے اسے ذرا دور ہٹاتے ہوئے کہا "یہ تمھارے ذاتی خیالات ہیں سروج۔۔۔ اور تم انھیں پاس ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

وہ ذرا چمک کر بولی "یعنی تم کہنا چاہ رہے ہو کہ تمھارا پریم عام پریم نہیں تھا۔ یہ مختلف پریم تھا۔ تم ڈاکٹر غزالہ سے سچا عشق کرتے تھے۔ سچا، کھرا، پاک صاف، دھلا دھلایا اور ٹرانسپیرنٹ۔۔۔ مائی فٹ۔۔۔ یہ سب باتیں ہیں شاہ جہاں، میں جانتی ہوں تمھیں صرف اپنی ضد سے عشق تھا۔ اس بے چاری نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے تمھارے لیے، کیا کیا مصیبتیں نہ اٹھائیں لیکن تم پتھر کے بت بنے بیٹھے رہے۔ تم مرد ہوتے ہی ایسے ہو۔ جو عورت تمھارے قدموں میں ہو اسے ٹھکراتے ہو۔ جو سات پردوں میں چھپی ہو اور تم پر لعنت بھیجتی ہو اس کے لیے مجنوں بن جاتے ہو۔"

سروج عرف الو کی پٹھی جب یوں تیوری چڑھا کر بولتی تھی تو بہت بری لگتی تھی مجھے۔۔۔ جی چاہا دھکا دے کر دور پھینک دوں بدبخت کو۔ تاہم پھر میں نے اپنی اس جھلاہٹ پر قابو پایا اور گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سروج نے سگریٹ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر تم سمجھتی ہو کہ جو عورت قدموں میں ہو مرد اسے ٹھکراتے ہیں تو پھر خود کو سنبھالتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ بھی ذرا سا مسکرائی اور بڑی ادا سے میرے بال مٹھی میں لے کر بولی "خوش فہمی ہے تمھیں۔ میں تمھارے قدموں میں نہیں ہوں، تمھارے سینے پر سوار ہوں۔۔۔ بولو۔۔۔ ہوں کہ نہیں؟" وہ اچانک مجھ پر جھکتے ہوئے بولی۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگی "تم اپنے قول کے پابند ہو۔ چاہو بھی تو مجھے خود سے جدا نہیں

کر سکتے ہو۔"

اچانک کمرے کی ایک کھڑکی دھڑ سے کھلی اور سعادت خان کی صورت نظر آئی۔ سروج ہلکی سی چیخ مار کر مجھ سے جدا ہو گئی۔ سعادت خان نے آنکھیں پھاڑ کر ہمیں دیکھا اور اس کی کانوں تک جاتی ہوئی مونچھیں جیسے پھڑکنے لگیں۔ سعادت خان کے عقب میں ایک اور ملازم کا چہرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سعادت خان سمیت تین افراد بھڑا بھڑا کر اندر آ گئے....

"کون ہے یہ چھوکری۔ اس کمرے میں کہاں سے آیا ہے؟" سعادت خان نے گرج کر پوچھا۔

میں نے کہا "یہ تمہارا بہن ہے۔ گاؤں سے تمہارے لیے چاول کا پنجری لے کر آیا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے ہمارے کمرے میں ٹھہر گیا۔"

سعادت خان نے جھنا کر مکا لہرایا۔ میں پہلے سے تیار تھا' نیچے جھک گیا۔ مکا عقب میں کھڑی سروج کی گردن پر پڑا۔ وہ چلا کر الماری کے پاس ڈھیر ہو گئی۔ سعادت کے ایک ساتھی نے مجھے دبوچنا چاہا۔ میں نے کھڑے کھڑے اس کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ منہ سے "اوہ" کی آواز نکال کر دروازے سے باہر جا گرا۔ دس بیس سیکنڈ کے لیے کمرے میں سخت دھینگا مشتی ہوئی۔ اس دھینگا مشتی کے نتیجے میں تین اہم نقصانات ہوئے۔ میری سفید شرٹ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے۔ سعادت خان کے ایک ساتھی کی ناک پر میری دھواں دھار ٹکر لگی اور اس کی ناک لمحوں میں پھول کر کپا ہو گئی' سعادت خان کا ہونٹ قریباً اسی جگہ سے پھٹ گیا جہاں سے چند روز پہلے پھٹا تھا اور اس مکرر چوٹ کے نتیجے میں اس کی ٹھوڑی خون سے سرخ ہو گئی۔ عین اس وقت جب سعادت خان بھنا کر اپنا ریوالور برآمد کرنے والا تھا' شنکر شکرا دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور آنکھوں میں وہی رحسابانہ چمک جو اردگرد کی ہر شے کو مسمرائز کر دیتی تھی۔ "اسٹاپ اِٹ" وہ گرجا۔

سعادت خان ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے رکتے ہی اس کے دونوں ساتھی بھی اپنی چوٹیں سہلاتے پیچھے ہٹ گئے۔ شنکر کے ریوالور کا رخ میری طرف تھا۔ میرے کمرے میں سروج کو دیکھ کر وہ بھی قدرے حیران نظر آ رہا تھا۔ "یہ یہاں کیسے آئی؟" اس نے سعادت خان سے پوچھا۔

"ہم کو کچھ الوم نہیں" سعادت خان نے ہونٹ سے خون پونچھتے ہوئے کہا "ہم کو شک گزرا تھا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو یہ دونوں آپس میں گڑبڑ کر رہا تھا۔"

"تمہیں کون لایا تھا یہاں؟" شنکر نے غصیلے لہجے میں سروج سے پوچھا۔

شور و غوغا سن کر اب کچھ دیگر ملازم بھی سرونٹ کوارٹرز کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب دلچسپ اور متجسس نظروں سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں نور احمد تھا اور وہ دوسرے افراد بھی تھے جو مجھے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کمرے کی صورت حال جاننے کے بعد وہ متذبذب نظر آ رہے تھے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ میرے لیے اپنے حفید تمندانہ جذبات برقرار رکھیں یا صرف تماشائی بن جائیں۔ اتنے میں ہیڈ خانساماں کی شکل نظر آئی اور اس نے اطلاع دی کہ بڑے صاحب سب کو بالکونی میں بلا رہے ہیں۔

شنکر نے اپنے سیاہ ریوالور کو حرکت دی اور کہا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ سروج سب کے سامنے آنے سے کترا رہی تھی لیکن شنکر کے حکم پر اسے بھی باہر نکلنا پڑا۔ وہ اپنا گاؤن سنبھالتی ہوئی میرے ساتھ چل دی۔ احاطے میں اچھا خاصا مجمع لگ چکا تھا۔ ان افراد میں شیخ عاصم کے دو تین مسلح محافظ موجود تھے۔ ایک ملازمہ بھی نظر آئی جو دوپٹا منہ میں دابے ملامتی نظروں سے مجھے اور سروج کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم بدنام بریگی "کچھ کرتے" ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں اور اب "گاؤں والے" انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہمیں پنچایت کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

میں نے دیکھا شیخ عاصم شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے بالکونی میں کھڑا تھا۔ اس کے پہلو میں مجھے غزالہ کا حیران پریشان چہرہ نظر آیا۔ یہ وہی پھولوں سے لدی ہوئی بالکونی تھی جس میں چند روز پہلے میں نے شیخ عاصم کو غزالہ پر جھکے ہوئے دیکھا تھا۔ اب احاطے میں سے یہ بالکونی اور بھی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

بالکونی کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ میری کلائی پر جھٹکا محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی شیخ عاصم سے میرا فاصلہ آٹھ میٹر سے زائد ہے۔ شیخ عاصم نے اپنی گونج دار آواز میں شنکر سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ کیسا شور ہے؟"

اس سوال کا جواب شنکر کے بجائے سعادت خان نے دیا اور وہی بات دہرا دی جو تھوڑی دیر پہلے شنکر سے کہی تھی۔ ان الفاظ کا ترجمہ شنکر نے انگریزی میں کیا۔ سروج خاموش کھڑی تھی' شاید اس کا خیال تھا کہ اسے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ شیخ صاحب خود ہی سب کے منہ بند کر دیں گے اور انہیں بتا دیں گے کہ وہ ان کی رضامندی سے میرے کوارٹر میں گئی تھی لیکن تب اسے شدید حیرت ہوئی جب شیخ عاصم نے سروج سے پوچھا کہ اس نے یہ حرکت کیوں اور کس کے کہنے پر کی۔ سروج کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ دہائی دینے لگی کہ اسے شیخ صاحب کا ذاتی ملازم اشرف خود سرونٹ کوارٹر میں چھوڑ کر گیا تھا.... شیخ عاصم نے حکم دیا کہ ملازم اشرف کو حاضر کیا جائے۔ جواب میں سعادت خان نے انکشاف کیا کہ وہ تو کل رات سے چھٹی پر ہے۔ شیخ عاصم نے سعادت خان اور شنکر سے کہا کہ وہ اوپر بالکونی میں آئیں۔ وہ دونوں اوپر چلے گئے اور شیخ

عاصم سے کھسر پسر کرنے لگے۔ میں اور سرونٹ بچے تماشائیوں کے گھیرے میں بجنسہٖ مجرم کھڑے تھے۔ بالکونی سے غزالہ کا چہرہ اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ بے چاری اور کیا کرتی۔ میری مشکلیں کم کرنا اس کے بس میں نہیں تھا لیکن اتنا تو وہ کر ہی سکتی تھی کہ میری مصیبتوں کی تماشائی نہ بنے اور اس نے یہی کیا تھا۔

میری سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ رہی تھی کہ یہ سارا شیخ عاصم کا رچایا ہوا ڈراما ہے۔ سروج کل رات میرے کوارٹر میں پہنچی تھی تو شیخ کی مرضی اور ایما سے پہنچی تھی لیکن اب وہ اس بات سے مکر رہا تھا۔ صورت حال کو الجھانے کے لیے ملازم اشرف کو منظر سے ہٹا لیا گیا تھا۔ ڈراما کامیاب تھا یا ناکام' یہ علیحدہ بات تھی لیکن ڈرامے نے اپنا مقصد ضرور حاصل کر لیا تھا اور یہ مقصد تھا غزالہ کو میری بد اخلاقی سے آگاہ کرنا اور میری ذلت کا ایک اور منظر رکھانا۔

میں ذہنی طور پر ایسی صورت حال کے لیے پہلے سے تیار تھا اس لیے مجھے کچھ زیادہ کوفت نہیں ہوئی۔ مجھ سے زیادہ کوفت اور کرب سے سروج کو گزرنا پڑا۔ وہ غم و غصے کے عالم میں بار بار اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے کہا "اب کہو.... کیسی رہی شیخ کی مہربانی؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی یا بالکونی سے شیخ عاصم ہم سے مخاطب ہوتا' ایک بھاری بھرکم سیاہ موٹر سائیکل طوفانی رفتار سے عمارت کے مین گیٹ میں داخل ہوئی اور لہراتی ہوئی پورچ کے پاس آ رکی۔ موٹر سائیکل پر شنکر کا قریبی ساتھی "شاہی" سوار تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھوں پر دستانے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ موٹر سائیکل سے اتر کر اس نے سوالیہ نظروں سے شنکر کو دیکھا۔ شنکر نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ اوپر بالکونی میں آ جائے۔ شاہی بڑی افراتفری کے عالم میں بالکونی کو جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ شاہی لنگڑا کر چل رہا ہے اور اس کے ایک جوگر بوٹ پر تازہ خون کے دھبے ہیں۔ بالکونی میں پہنچ کر شاہی نے نہایت سنسنی خیز انداز میں شنکر اور شیخ عاصم کو کچھ اطلاعات دیں۔ یہ اطلاعات اگر شنکر اور شیخ عاصم کے چہرے بھی پریشانی کی آماجگاہ بن گئے۔ شیخ عاصم فوراً بالکونی پر سے اوجھل ہو گیا' شنکر شکرا بھی شاہی کے ساتھ زینے پھلانگتا ہوا نیچے آ گیا۔ وہ مسلح محافظوں کو ساتھ لے کر وہ فوراً عمارت کی عقبی سمت میں چلے گئے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ عمارت کے آس پاس کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ گمان غالب تھا کہ اس گڑبڑ کا تعلق مخالف فریق یعنی اینڈرے اور مسٹر جی کلارک وغیرہ سے ہو گا۔ شیخ عاصم کی طرح ان لوگوں کے ہاتھ بھی بہت لمبے تھے اور مجھ تک پہنچنے کے لیے ان لوگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ بھوپال آنے کے بعد دونوں گروہوں میں دو مرتبہ اس معاملے پر شدید جھڑپ ہو چکی تھی۔ اب بھر حالات سنگین رخ اختیار کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ امریکی ایجنٹ اینڈرے شیخ عاصم کے اس ٹھکانے سے آگاہ ہو چکا ہو اور اب انغامی لالہ زار کی وسیع و عریض عمارت کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہو۔

بھوپال ایک شہر دلنواز تھا۔ بہت عرصے سے خواہش تھی کہ کبھی اس شہر کے رنگ و روپ دیکھوں گا۔ لکھنؤ کی طرز معاشرت جس کی جھلک حیدر آباد میں نظر آتی تھی وہی اس شہر کا خاصہ بھی تھا۔ شیروانیوں اور چست پاجاموں کی چمک دمک' رنگین آنچلوں کی بہار' رحواں دھار مشاعرے' سر راہ تخروں پر شطرنج کے مقابلے' پتنگوں کے پیچ' مرغ بازی اور بٹیر بازی کے میلے.... لیکن یہاں آ کر میرے کانوں میں صرف گولیوں کے دھماکے گونجے تھے اور آنکھوں نے صرف کشت و خون دیکھا تھا۔ میں اس شہر کی روایتی خوبصورتی اور دلنواز گہما گہمی کے درمیان سے یوں گزرا تھا جیسے کوئی نابینا کسی آرٹ گیلری میں سے گزر جائے.... شنکر اور شیخ عاصم بالکونی سے رخصت ہو گئے تو ہمارے گرد موجود مجمع بھی چھٹنے لگا۔ سعادت کی ہدایت پر دو ملازمائیں سروج کو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف لے گئیں۔ میں سعادت خان کے ساتھ اپنے کوارٹر میں واپس آ گیا۔ خلاف معمول سعادت خان نے آج میرے کمرے کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا تھا۔

شام تک انغامی لالہ زار کی فضا میں زبردست تناؤ کی کیفیت رہی۔ ایک سرخ ڈاٹسن بار بار عمارت میں آ جا رہی تھی۔ شیخ عاصم کی زرد مرسیڈیز بھی دو مرتبہ بڑی تیز رفتاری سے پورچ میں داخل ہوئی۔ مسلح محافظ چوکس تھے اور عجلت آمیز قدموں سے راہداریوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی تشویش ناک صورت حال میں پھنس کر اس عمارت کے مکین مجھے اور سروج کو یکسر فراموش کر چکے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس واقعے کو بھی جو علی الصباح پیش آیا ہے۔

شام کے وقت دو دیگر افراد کو بھی میرے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں بند کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک تو کوئی پہلوان نما پنجابی تھا۔ دوسرا ایک دبلا پتلا نفیس قسم کا حیدر آبادی تھا۔ اس نے اپنی سیاہ شیروانی میں بہت اعلیٰ قسم کا عطر لگا رکھا تھا۔ منہ میں قوام والا پان تھا۔ حیدر آباد دکن کے خاص انداز میں وہ "ق" کو "خ" بولتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔ اس نے اپنا نام غالباً ناصر الدین بتایا اور صرف یہ اشارہ دیا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ رات تقریباً دس گیارہ بجے کا وقت تھا جب اچانک انغامی لالہ زار کی تمام بتیاں بجھ گئیں۔ اس کے فوراً بعد مجھے سرونٹ کوارٹرز کے مختصر سے کمرے میں ایک نامانوس بو پھیلتی محسوس ہوئی۔ پہلوان نما پنجابی جو اب تک بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا' زور زور سے کھانسنے اور بڑبڑانے لگا۔ میرے اپنے حلق میں بھی کوئی پھندا سا لگ رہا تھا۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ کمرے میں زہریلی یا بے ہوش کرنے والی گیس

چھوڑ دی گئی ہے۔ میں نے کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ انھیں باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ دروازہ پہلے ہی مقفل تھا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹا اور سعادت خان کو آوازیں دیں۔ مجھے اپنے عقب میں ناصرالدین کے کراہنے اور بے ہوش ہو کر فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ پھر پہلوان بھی ہاتھ پاؤں چلاتا اوندھے منہ میرے قدموں کے پاس گرا۔ میں نے حتی الامکان حد تک اپنا سانس روکے رکھا اور دروازہ پیٹتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے میرا ذہن بھی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا اور پھر اپنے دائیں پہلو پر لڑھک گیا تھا۔

○☆○

یہ ایک طویل ترین بے ہوشی تھی۔ اسی بے ہوشی کے دوران میں کبھی کبھی مجھے لگتا کہ میں ایک لمبے سفر پر ہوں۔ اپنے اردگرد نامانوس فضا کا احساس ہوتا۔ نامانوس آوازیں میرے کانوں میں پڑتیں اور پھر سب کچھ ایک گہری نیند کی جھیل میں ڈوب کر کسی خواب کا حصہ بن جاتا۔ خواب جن میں اجنبی گندھا کے پھولوں کی مہک تھی، ساحلوں کی ٹھنڈی ریت کا لمس تھا اور سنسان جزیروں میں بھٹکنے والی ہوا کا مدھر شور تھا۔ میں کہاں تھا؟ ساکن تھا یا متحرک تھا۔ اکیلا تھا یا لوگوں میں تھا؟ قید تھا یا آزاد؟ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

ایک طویل نیند کے بعد میں بیدار ہوا اور حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک مختصر کمرے میں پایا۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کمرا سرونٹ کوارٹر والے کمرے سے بڑا تھا اور یہاں کا فرنیچر اور دیگر سامان بھی بہتر تھا۔ میں ایک اجلے بستر پر دراز تھا۔ میرا لباس تبدیل ہو چکا تھا تاہم ہاتھوں پر منحوس دستانے موجود تھے۔ کلائی پر وہ گھڑی بھی براجمان تھی جس نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو سب سے پہلا احساس مجھے یہی ہوا کہ میں کافی عرصے تک بے ہوش رہا ہوں۔ غالباً ڈیڑھ دو روز تک۔ میرا پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا اور معدے میں بھوک کے سبب اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پنجابی پہلوان اور وحید رضوی ناصر الدین مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ مجھے غزال کا خیال بھی آیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ فرش پر چپل موجود تھی۔ میں نے چپل پہنی اور دروازہ کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ شیشے کی دوسری جانب کا منظر دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا۔ جیسے میں کسی فلم کے سیٹ پر آ گیا ہوں۔ ایک سبزہ زار کا مختصر سا حصہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ناریل کے دو تین بلند و بالا درخت تھے۔ ان کے پیچھے کیلے کے درخت تھے۔ جن پر زرد کیلوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ سبزہ زار کی دیوار پر سفید اور سرخ پھولوں والی خوب صورت بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

نقاہت کے سبب مجھے چکر سا آ گیا اور میں وہیں کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”یہ میں کس جگہ آ گیا ہوں اور مجھے لانے والے کون ہیں؟“ یہ خیال بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔ سبزہ زار کے منظر سے ملتے جلتے منظر بمبئی اور مدراس وغیرہ میں دیکھے جا سکتے تھے لیکن یہ علاقے تو بھوپال سے بہت دور تھے اور پھر مجھے کچھ اور محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ہندوستان میں ہوں ہی نہیں۔ معلوم نہیں یہ میری چھٹی حس تھی، ذہن پر ہونے والا کوئی بے نام الہام تھا یا پھر یہاں کی فضا میں رچی بسی وہ اجنبی سی مہک تھی جو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے کمرے میں موجود اشیا کو بڑے غور سے دیکھا لیکن بید کی کرسی اور عجیب وضع کی چپل کے سوا مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ کمرے میں اسپرنگ دار بستر اور میز کرسی کے علاوہ ایک الماری بھی تھی۔ الماری میں میرے کپڑے اور ضروریات کا دیگر سامان موجود تھا۔ یہ وہی سامان تھا جو میں ”انفاسی لالہ زار“ میں استعمال کرتا رہا تھا۔ اس سامان کو جوں کا توں اپنے ساتھ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میں ابھی تک شیخ عاصم کی حویلی میں ہوں۔ بہرحال اس اندازے کی تصدیق کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا۔ الماری کے نچلے خانے میں ایک ریڈیو موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ ریڈیو آن کروں۔ شاید نشر ہونے والے کسی پروگرام سے اندازہ ہو جائے کہ میں کس شہر اور علاقے میں ہوں لیکن کوشش کے باوجود ریڈیو میں زندگی کے آثار نمودار نہیں ہو سکے۔ اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر گئی اور جم کر رہ گئی۔ یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا کہ میں ابھی تک شیخ عاصم کا مہمان ہوں۔ میں نے شیخ عاصم اور غزالہ کو دیکھا جو سبزہ زار کی ایک خوب صورت روش پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ غزالہ آسمانی رنگ کی کامدار ساری میں تھی۔ اس کے بالوں کا ریشم نیلے رنگ کے ایک تر و تازہ پھول سے سجا ہوا تھا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ کنول کا پھول ہے۔

ابھی تک میں اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ یہ شام کا وقت ہے یا دن طلوع ہو رہا ہے مگر شیخ عاصم کا تھری پیس سوٹ اور غزالہ کا لباس دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ شام اپنے پر پھیلا رہی ہے۔ تیز ہوا نے ایک پہلو سے غزالہ کی ساری اس کے جسم سے چپکا رکھی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کسی مصور کے سحری برش نے کینوس کو خوب صورت زاویوں سے مصور کردیا ہے۔ وہ دونوں سنگ مرمر کی ایک بینچ پر رنگ دار پانی والے فوارے کے سامنے جا بیٹھے۔ ان دونوں کی پشت میری طرف تھی اور اب میں صرف ان کے سر اور کندھے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے دستانہ پوش ہاتھوں سے کھڑکی کو دھکیلا۔ وہ ذرا سا کھل گئی۔ بے ساختہ ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ کیوں نہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیخ عاصم کا خانہ بالخیر کردوں۔ اس شخص نے گزشتہ سات برس سے میری زندگی کو عذاب بنا رکھا تھا۔ اندھیرے اجالے میں، ولیس پولیس میں، قید میں آزادی میں ہر جگہ سائے کی طرح میرا تعاقب کرتا رہا تھا۔ وہ مجھے مارنا چاہتا تو بھی کوئی بات تھی۔ وہ مجھے زندہ درگور کرنا

چاہتا تھا۔ غزالہ نے خود مجھے اپنے خط میں بتایا تھا کہ وہ لاہور میں دیوانوں کی طرح شفتا کو تلاش کرتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر غزالہ تو یونہی قسمت کے پھیر میں آ گئی تھی۔ اس بدباطن کا اصل ہدف شفتا تھی۔ میری پیاری بہن۔ میری دلاری بہن شفتا۔ جسے اپنے نجس ہاتھوں سے میلا کرنے کی کوشش میں شیخ عاصم کا جنسی بھائی میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا تھا۔

شفتا کا خیال آتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میرا دھیان اپنے پنڈلی کے خنجر کی طرف گیا لیکن وہ مجھ سے جدا کیا جا چکا تھا اور اگر ہوتا بھی تو دستانہ پوش ہاتھوں کے ساتھ میں اسے کیا استعمال کرتا۔ میری نگاہ لوہے کی اس کرسی پر جم گئی جو میز کے سامنے رکھی تھی۔ یہ وزنی کرسی تھی۔ میں اسے اپنی کلائیوں میں پھنسا لیتا تو عقب سے جا کر شیخ عاصم کے کھوپڑے پر ایک ایسی ضرب لگا سکتا تھا کہ اس کا مغز اس کے کندھوں پر بہہ نکلتا۔ میں چوٹ لگانے سے پہلے ہی اس کرسی کا وزن اور اپنی کلائیوں کی طاقت بھانپ سکتا تھا۔ نہایت وحشت کے عالم میں میں کرسی کی طرف بڑھا لیکن پھر فوراً ہی سارا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ سن کھڑا رہ گیا۔ بدن میں ایک دم وہی نقاہت اتر آئی جو بیدار ہونے کے بعد سے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا بستر پر جا بیٹھا۔ لمحاتی جوش و خروش میں میں یہ بات بالکل بھول گیا تھا کہ شیخ عاصم کے نزدیک جانا میرے لئے ممکن نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان کم و بیش دس فٹ کا فاصلہ رہنا ضروری تھا اور دس بارہ فٹ کی دوری سے کرسی تو کیا لاٹھی سے بھی شیخ کو گزند نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دوبارہ کھڑکی میں سے جھانکوں۔ دل کو دھڑکا تھا کہ کہیں پھر وہی کرب ناک منظر میری نگاہوں کو گھائل نہ کرے جو چند روز پہلے مجھے انفاسی لالہ زار کی بالکونی میں نظر آیا تھا۔ یہ ایک عجیب نفسیاتی کیفیت تھی۔ میں جانتا تھا کہ شیخ عاصم اور غزالہ میاں بیوی بن چکے ہیں اور اب ان میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا۔ شیخ عاصم کو غزالہ کی قربت ہر جگہ اور ہر وقت میسر تھی اور وہ یقیناً اس قربت سے فائدہ بھی اٹھاتا تھا لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا ایک معمولی سا منظر بھی میرے تصور میں آتشیں نیزے کی طرح دھنسا ہوا تھا۔ واقعی سچ کہا ہے کہ ذکر اور جھل پہاڑ اور جھل۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ میرے سامنے شیخ عاصم اپنا ہاتھ بھی غزالہ کے کندھے پر رکھے۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک لڑکی نے پٹ کھول کر اندر جھانکا۔ لڑکی قبول صورت لیکن گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ اس نے عجیب سا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ نیچے سے دھوتی نما اور اوپر سے تنگ کرتے جیسا تھا۔ لڑکی کے بال سلیقے سے جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی ”ڈو یو نو انگلش؟“ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ وہ کمرے میں آ گئی اور انگلش میں ہی بولی ”چائے پینا پسند کرو گے؟“

میں نے کہا ”ہرگز نہیں۔ پہلے مجھے کھانا دو۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک ہزار سال سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔“

”او، یہ بات ہے۔“ وہ مسکرائی اور نسواری ہونٹوں کے پیچھے سے اس کے دانت کلیوں کی طرح چمک اٹھے ”میں ابھی تمہارے لئے کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔“

میں نے کہا ”انتظام مت کرو۔ جو کچھ ہے فوراً لے آؤ۔ میرے پاس انتظار کی مہلت نہیں ہے۔“

”او کے“ وہ بولی ”میرا خیال ہے کہ تم مسلمان ہو اور گوشت کھا لوگے۔“

”اس وقت نہ بھی ہوتا تو کھا لیتا۔“ وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ میں نے کہا ”ایک منٹ، یہ کون سی جگہ ہے؟“

”تمہارا کیا اندازہ ہے؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کہا ”بھوپال تو ہرگز نہیں ہے۔“

”وہاٹ بھوپال؟“ اس نے تعجب سے کہا۔

”تمہیں بھوپال کا پتا نہیں؟“ میں نے اس سے زیادہ حیران ہو کر پوچھا۔

”نام تو کچھ کچھ سنا ہوا ہے لیکن ٹھیک سے معلوم نہیں۔“ وہ چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ میں کہاں پایا جا رہا ہوں؟“

وہ بڑے انداز سے دروازے کی طرف مڑی اور باہر نکلنے سے پہلے بولی ”ویلکم اِن سری لنکا۔“

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بھوپال یا حیدرآباد میں نہ ہونے کا یقین تو مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب میں نے کھڑکی میں سے جھانکا تھا لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ہندوستان کی حد پار کر کے خوابوں کے اس جزیرے میں پہنچ چکا ہوں جسے ماضی میں لنکا اور موجودہ دور میں سری لنکا یا سیلون کہا جاتا ہے۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی کے پاس ہو کر باہر جھانکا۔ شیخ عاصم اور غزالہ سبزہ زار میں موجود نہیں تھے لیکن سبزہ زار وہاں جگہ موجود تھا۔ میں نے اس مختصر سے منظر کے ذریعے سری لنکا کو پہچاننے کی کوشش کی۔ شاید وہ سیاہ چشم لڑکی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ یہ سری لنکا ہی تھا۔ مجھے فضا میں ناریل، بانس اور ساز کے درختوں کی مہک محسوس ہوئی۔ کالی مرچ، دار چینی، لونگ اور زیرے کی مسحور کن خوشبوئیں ساحلی ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ سری لنکا کو ہندوستان کا آنسو کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ یہ ہندوستان کے آخری سرے پر کسی آنسو ہی کی طرح لرزتا نظر آتا ہے اور شاید اس لئے بھی کہ یہ کسی آنسو ہی کی طرح ہر وقت نم رہتا ہے۔ سری لنکا کے گھنے جنگلوں میں بہنے والی دھواں دھار اور

لگا نادر پارٹوں کی مثالیں اکثر پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں۔

لڑکی نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ میں سری لنکا میں ہوں لیکن سری لنکا میں کس جگہ ہوں یہ ابھی تک عیاں نہیں ہوا تھا۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ عمارت کسی شہری آبادی کا حصہ نہیں ہے۔ ایک ایسی خاموشی تھی یہاں جو جنگلوں یا بیابانوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہی لڑکی میرے لئے کھانا لے آئی۔ گرم گرم پلاؤ کی خوشبو مجھے دور ہی سے آئی۔ ساتھ میں مچھلی کا شوربا اور ایک سویٹ ڈش تھی۔ دونوں بند ہاتھوں میں چمچ کو یوں دبوچنا کہ اس کا رخ میرے منہ کی طرف رہے اور پھر اس کے ذریعے چاول یا کوئی دوسری شے منہ تک پہنچانا ایک دشوار عمل تھا لیکن اب مشق کے بعد میں کافی حد تک اس عمل پر قادر ہو گیا تھا۔ لڑکی مجھے اس عجیب ڈھنگ سے چاول کھاتے ہوئے دیکھتی رہی لیکن اس نے میرے دستانوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا۔ یقیناً اس سلسلے میں اسے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہوا تو وہی لڑکی بھاپ اڑاتی خوشبودار چائے لے کر آ گئی۔ سری لنکا چائے کا گھر تھا اور اگر میں حالات کے گھوڑے پر سوار واقعی سری لنکا پہنچ چکا تھا تو پھر چائے کے گھر میں بیٹھ کر چائے نہ پینا سخت بدذوقی تھی۔ لڑکی خاموشی سے میری چائے نوشی کا نظارہ کرتی رہی۔ اس کے نچلے ہونٹ پر زخم کا ایک ننھا سا نشان تھا۔ وہ زیرلب مسکراتی تھی تو یہ نشان نمایاں ہو جاتا تھا لیکن نمایاں ہونے کے باوجود برا نہیں لگتا تھا۔

چائے نوشی کے دوران میں نے لڑکی سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل چکنا گھڑا ثابت ہوئی۔ میرے ہر سوال کا جواب اس نے اتنی صفائی سے گول کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اپنی طویل پوچھ گچھ کے نتیجے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ ایک سنہالی لڑکی تھی۔ اس کا نام اروشی تھا اور وہ یہاں ملازمہ کی حیثیت سے موجود تھی۔ اگلے روز سہ پہر تین چار بجے تک میرا رابطہ صرف اسی لڑکی اروشی سے رہا۔ وہی میرے لئے کھانا لاتی رہی۔ اسی نے میرا بستر درست کیا اور اسی کے ذریعے مجھے اگلے روز علی الصباح تازہ اخبار ملا۔ کولمبو سے شائع ہونے والا یہ اخبار انگریزی میں تھا۔ ہاں کہیں کہیں اس میں کسی دوسری زبان کے اشتہارات بھی موجود تھے۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ یہ سنہالی زبان کے اشتہارات تھے۔ اخبار میں میرے کام کی کوئی خبر نہیں تھی۔

تین چار بجے کا وقت تھا جب اچانک مجھے عمارت کے کسی حصے سے شور و غل سنائی دیا۔ یوں لگا جیسے چند افراد دوڑتے اور گرتے پڑتے سبزہ زار کی طرف آ رہے ہیں۔ میں لپک کر کھڑکی پر پہنچا اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ تین چار سیکنڈ بعد مجھے ایک شخص نظر آیا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا عمارت کے کسی حصے سے برآمد ہوا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ زریں گل تھا۔ زریں گل کے پیچھے دو پہلوان نما سنہالی محافظ بھاگے آ رہے تھے۔ ان میں سے جو آگے تھا اس نے سبزہ زار کے قریب زریں گل کو دبوچ لیا۔ زریں گل نے برق رفتاری سے پلٹ کر ایک ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ شخص کسی کیکڑے کی طرح اچھل کر سبزہ زار کی باڑ میں گرا۔ دوسرے محافظ نے اپنی رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرکے زریں گل کے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ زریں کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھرتی سے وار بچایا اور ٹانگ کی زوردار ضرب مقابل کے سینے پر لگائی۔ وہ بھی لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ زریں گل پھر اپنی نامعلوم منزل کی طرف دوڑا لیکن ابھی وہ سبزہ زار کے وسط میں پہنچا تھا کہ چہرے پر ٹکر کھانے والے محافظ نے اسے پھر دبوچ لیا۔ زریں گل اس سے گتھم گتھا ہو گیا اور اسے بری طرح پیٹنے لگا۔ اس پر وحشت سوار تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خود کو دونوں محافظوں سے چھڑا کر بھاگ جائے گا لیکن پھر ایک پریشان کن منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ میں نے شیطان ابن شیطان شنکر شنکرا کو دیکھا۔ وہ فرشتۂ اجل کی طرح زریں گل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ یہ خطرناک درندہ یہاں بھی ہمارے سروں پر مسلط تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں میں نے کئی بار شنکر کے بارے میں سوچا تھا اور اس کا ہولناک سایہ اپنے اردگرد محسوس کیا تھا۔ اب تصور حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ زریں گل اس خون آشام عفریت کی زد میں آنے والا تھا۔ میرا دل چاہا کہ چیخ کر زریں گل سے کہوں کہ وہ شنکر شنکرا کی مزاحمت نہ کرے لیکن اس مختصر وقت میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے شنکر کو زریں گل پر جھپٹتے اور اسے ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے دیکھا۔ یہ کسی معمولی شخص کی ضرب نہیں تھی۔ زریں گل تڑپ کر دور جا گرا۔ گرتے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے اٹھنا چاہا لیکن شنکر کی پھرتی اور عیاری کا مقابلہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ شنکر نے لپک کر دوسری ٹھوکر اس کے منہ پر لگائی۔ زریں گل پلٹ کر جنگلی گلاب کے پودوں میں گرا۔ اس کے منہ سے خون فوارے کی طرح چھوٹ نکلا تھا۔ پٹخنی کھا کر اس نے پھر اٹھنا چاہا مگر شنکر نے اسے بڑی آسانی سے ہوا میں اٹھا کر رنگین پانی والے فوارے پر دے مارا۔ اب میرے لئے رکنا ممکن نہیں تھا۔ میری رگوں میں سیال آگ بہنے لگی تھی۔ اس آگ کی حدت نے مجھے ہر اندیشے اور مجبوری سے بے نیاز کر دیا۔ پچھلے کچھ عرصے میں شنکر شنکرا نے بہت قرض چڑھایا تھا مجھ پر۔ اب میرے لئے ضروری تھا کہ میں یہ قرض اتارنے کی کوشش کروں۔

میں نے ہاتھوں کے دباؤ سے دیوار گیر کھڑکی کو کھولا اور چھلانگ لگا کر باہر آ گیا۔ میرے قدموں میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑتا ہوا شنکر پر جھپٹا۔ میری "جھپٹ" سے ایک سیکنڈ پہلے شنکر میری آمد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ زخمی اس نے زریں گل کو چھوڑ کر رخ میری طرف پھیرا۔ میری بھرپور لات اس

کے سینے پر پڑی اور وہ لڑکھڑا کر دور تک چلا گیا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر اس پر چارج کیا اور بیک ہینڈ رائٹ سے دو طوفانی مکے اس کے جبڑے پر رسید کئے۔ ان مکوں کے پیچھے وہ غیر معمولی طاقت کارفرما تھی جو شنکر کے مقابل آتے ہی میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔ یہ مکے کھا کر شنکر جیسا سخت جان بھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا اور ڈگمگا کر سرسبز گھاس پر جا گرا۔ دو گارڈ رائفلیں سونت کر میری طرف بڑھے۔ ان کی انگلیاں ٹریگرز پر تھیں "اسٹاپ" شنکر نے دونوں گارڈز کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ شنکر نے ایک باچھ سے بہہ آنے والا خون ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور اٹھ کر میرے مقابل آ گیا۔

اس کی بھوری آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں جھانک کر محسوس ہوتا تھا کہ شنکر انسان نہیں اور اگر انسان ہے تو پھر اس دنیا کا انسان نہیں۔ اس نے دونوں بازو پھیلا لئے تھے اور جبڑے اتنی مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما رکھے تھے کہ کانوں کے نیچے دو گومڑے نمودار ہو گئے تھے۔ میں اس کی ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور آہستہ آہستہ اپنی پشت دیوار کی طرف پھیر رہا تھا۔ حملہ کرنے میں پہل شنکر نے ہی کی۔ وہ برق کوندے کے مانند لہرا کر میری طرف آیا۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑی اور دھکا دے کر اسے دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا گھٹنا اس کی ناف پر پڑا اور وہ بے ساختہ دہرا ہو گیا۔ میں نے راؤنڈ پنچ کے انداز میں اس کی ٹھوڑی پر مکا رسید کیا تو اس کا سر ایک بار پھر دیوار سے ٹکرایا۔ تاہم اس مرتبہ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ یوں میری طرف آیا جیسے دیوار میں طاقت ور اسپرنگ لگے ہوں اور انہوں نے پوری قوت سے شنکر کو میری طرف دھکیل دیا ہو۔ اس کی یہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی۔ اس کے سر کی آہنی ضرب میری گردن سے ذرا نیچے سینے پر لگی اور میں پشت کے بل سنگ مرمر کی بینچ پر گرا۔ اگلے ہی لمحے میں نے شنکر کو کسی شکاری پرندے کی طرح خود پر جھپٹتے دیکھا۔ میں جانتا تھا وہ مجھ پر اپنا خطرناک ترین داؤ آزمانے کی کوشش کرے گا۔ وہ اپنی بغل میں مدمقابل کی گردن یوں جکڑتا تھا کہ چھٹکارے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی۔ فرید کوٹ کے نواح میں بھی میں اس کے اسی داؤ میں پھنسا تھا اور لاچار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس مرتبہ میں اسے یہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے لوٹ لگائی اور شنکر کی زد سے نکل گیا۔ شنکر زمین چھوتے ہی پھر مجھ پر آیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دیوار گیر کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں گرے۔ اس کے بعد جیسے ایک بھونچال سا آ گیا۔ ہم دونوں پوری وحشت سے ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ اردگرد کا کچھ ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ معلوم نہیں ہم کہاں کہاں گرے۔ کیا کیا اشیا ہمارے تصادم کی زد میں آ کر چکنا چور ہوئیں۔ کس نے کہاں کہاں چوٹ لگائی اور کہاں کہاں کھائی۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک سرخ دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند نے میری ہر مجبوری اور مصلحت کو ڈھانپ لیا تھا۔ الیکٹرانک ڈوائس کی زنجیر' فریال کا انجام' زریں گل کی صورت' سب کچھ میرے ذہن سے صاف ہو چکا تھا۔ اگر کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ آج میں نے ختم ہو جانا ہے یا اس شنکر نامی درندے کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ مجھے یاد ہے ہم لڑتے لڑتے ایک نشست گاہ میں پہنچ گئے تھے۔ ہمارے اردگرد تماشائی چہرے تھے اور ان میں شیخ عاصم کا سنتایا ہوا چہرہ بھی شامل تھا۔ شنکر نے ایک ٹی وی سیٹ اٹھا کر میرے سر پر مارا تھا جو جھٹک کر کندھے پر لگا تھا اور قالین پوش فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ جواباً میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ٹھوکر رسید کی تھی اور ہم پھر گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ پسینے سے شرابور ہانپتے ہوئے اور لہولہان۔ ان دو باکسرز کی طرح جو ایک دھواں دھار مقابلے کے پندرھویں راؤنڈ میں پہنچ چکے ہوں۔ یہی وقت تھا جب رائفل کی دو سرد نالیں میرے سر اور پہلو سے آ لگیں "اسٹاپ اٹ ناؤ" شیخ عاصم کی گرجدار اور کرخت آواز ابھری۔

رائفل برداروں نے مجھے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ شنکر بھی میرے سر کے بال اپنی گرفت سے آزاد کرکے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی قمیص اور بنیان تار تار تھی اور چہرے پر چوٹوں کے کئی سرخ اور نیلے نشان تھے۔ سب سے سنگین چوٹ اس کی ٹھوڑی کے نیچے آئی تھی۔ یہاں سے گوشت پھٹ گیا تھا اور مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میرے جسم پر سرے سے قمیص موجود ہی نہیں رہی تھی۔ شنکر کی طرح مجھے بھی کئی ہلکی اور شدید چوٹیں آئی تھیں۔ کوٹھی کا یہ حصہ کباڑ خانے کا منظر پیش کرنے لگا تھا اور اس کباڑ خانے میں شیخ عاصم اپنے ملازمین کے ساتھ دم بخود کھڑا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے حیرت کے آثار نظر آئے۔ جیسے وہ یقین نہ کر پا رہا ہو کہ میں شنکر شنکرا جیسے شخص کی اتنی شدید مزاحمت کر سکتا ہوں۔

شیخ عاصم کی ہدایت پر مجھے واپس میرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ زریں گل کو بھی میرے ساتھ بھیجا گیا۔ شنکر کے ہاتھوں چند فوارے پر گرنے کے بعد زریں گل کی کمر پر خاصی چوٹ لگی تھی اور وہ نیم جان و نڈھال سا ہو رہا تھا۔ میں اسے باقاعدہ سہارا دے کر کمرے میں لایا۔ اس کے منہ پر بھی زخم لگا تھا اور دونوں باچھوں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ہمیں کمرے میں پہنچا کر دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا اور اس کھڑکی سے باہر لگے ہوئے جالی دار نیٹ بند کر دیئے گئے جس میں سے گزر کر میں شنکر پر حملہ آور ہوا تھا۔ میں نے دروازہ زور زور سے پیٹا اور شیخ عاصم کے کارندوں کو آوازیں دیں کہ وہ مجھے مرہم پٹی کا سامان فراہم کریں لیکن کسی کے کانوں پر جوں نہیں رینگی۔ طیش کے عالم میں میں نے شیخ عاصم' شنکر شنکرا اور اس کے کارندوں کو بلند آواز میں چند موٹی موٹی گالیاں دیں لیکن ان میں سے کوئی شاید قریب دیوار

میں موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک میز پوش پھاڑ کر اس سے چند پٹیاں پھاڑیں۔ الماری کے نچلے خانوں میں سے ایک "فرسٹ ایڈ باکس" نکالا اور زریں گل کے رستے زخموں کا خون بند کیا۔ دستانہ پوش ہاتھوں کے ساتھ پٹی باندھنا میرے لئے ممکن نہیں تھا لہٰذا یہ کام تھوڑی دیر بعد زریں گل نے خود کیا۔ اس نے میری ایک کہنی، ٹخنے اور پنڈلی پر بھی پٹی باندھی۔

ایک دوسرے کو طبی امداد دینے کے بعد ہم نے تھرماس میں سے گرم گرم چائے پی اور کھڑکی کے قریب کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے ابھی تک کمرے میں فون نظر نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کہیں فون کا تار آتا جاتا دکھائی دیا تھا۔ آواز بیڈ کے نیچے سے آ رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ یہاں ایک نیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے سیٹ باہر نکالا۔ وہ دھول سے اٹا ہوا تھا "ہیلو" میں نے چونگا اٹھا کر کہا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے شیخ عاصم کی بھاری بھرکم اور درشت آواز ابھری "میرا خیال ہے کہ تم ایک بار پھر ساہی صاحب کی بیٹی کی چیخ و پکار سننا چاہتے ہو۔ کیا ارادہ ہے 'نشر' کیا جائے براہ راست یہ پروگرام؟"

میں نے کہا "شیخ عاصم! ہو سکتا ہے کہ تمہاری کوئی بہن یا بیٹی نہ ہو لیکن تمہیں پیدا تو کسی عورت نے ہی کیا ہوگا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک بے گناہ عورت سے ایسا سلوک کرنا جائز ہے؟"

وہ بولا "اب تمہیں فلسفہ سوجھ رہا ہے۔ اس وقت تمہاری اخلاقیات کہاں تھی جب تم قانون اپنے ہاتھ میں لے کر ایک شخص کو سزائے موت دے رہے تھے۔ اس وقت تم فلسفی نہیں تھے صرف ایک بے رحم قاتل تھے۔ بہرحال میں تم جیسے بے حس اور سفاک شخص پر اپنے الفاظ ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ ہوش کے ناخن لو۔ ساہی کی لڑکی ہمارے قبضے میں ہے۔ میرے وعدے کے مطابق وہ ابھی تک بالکل محفوظ ہے لیکن میرے ایک اشارے پر وہ ایسے شرمناک سفر پر روانہ ہو سکتی ہے جہاں قدم قدم پر وہ جئے گی اور مرے گی۔ اس کی ہر رات ایسے مردوں کے ساتھ گزرے گی جو عورت کو اناس کی طرح نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ آج تم نے پہلی غلطی کی ہے۔ غالباً جوش میں اندھے ہو گئے تھے تم۔ تمہاری ایلین بھول سمجھتے ہوئے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ تمہارے دوست کو اس لئے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے کہ اس ڈگل کو سمجھاؤ۔ اسے بتاؤ کہ اس کی خودسری کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ جس لڑکی کی خاطر اس کی غیرت بار بار جاگ رہی ہے ہم اس لڑکی کو اسی کے دشمنوں سے بے آبرو کروانے پر قادر ہیں۔ اسے سمجھاؤ سب کچھ..... آئندہ اگر اس نے کوئی سرکشی دکھائی تو میں سمجھوں گا کہ یہ تمہاری رضامندی سے ہوا ہے اور اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو تمہاری سرکشی کا نکلتا۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہا تھا وہ کتّے کا بچہ؟" زریں گل نے پوچھا۔

"تمہارا حال چال دریافت کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

زریں گل نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ایک دم خستہ ہو گیا ہے۔ لگتا ہے ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگا ہے۔"

میں نے کہا "زریں! میں نے شروع میں تم سے کہا بھی تھا کہ جب تک میں نہ کہوں کوئی ہلا گلا نہیں کرنا۔"

وہ بھڑک کر بولا "ام الّا گلا نہ کرے اور وہ امارا عورت کے ساتھ جو چاہے کرتا رہے۔ استاد صیب! معلوم نہیں آپ کا سوچ کیا ہے لیکن خدا کا قسم امارا تو دماغ بھک سے اڑ جاتا ہے جب ام کو فریال بی بی کا خیال آتا ہے۔ جس دن سے ام پکڑا گیا ہے امارا کھانا پینا سونا سب حرام ہے۔ ام یہ بے غیرتی نہیں کر سکتا اور نہ کرے گا۔"

"تو پھر کیا کرو گے؟"

"ام مر جائے گا اور مار دے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے فریال بی بی کا عزت بچ جائے ورنہ امارا غیرت تو بچ ہی جائے گا۔"

"بس ایسا ہی گدھا پن سوار ہو جاتا ہے تم پر جب تمہیں نسوار نہ ملے بھلے مانس..... ہمیں اس سارے معاملے کو ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا اور کوئی ایسی راہ نکالنی ہوگی جس سے فریال اور ہم سب کو باعزت آزادی نصیب ہو۔"

"لیکن آپ سمجھتا کیوں نہیں کہ....."

"میں سب سمجھتا ہوں۔ تمہیں یہی وسوسہ ہے نا کہ فریال کے ساتھ کچھ ہو جائے گا۔ کچھ نہیں ہوگا اسے۔ میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔ شیخ عاصم کے ساتھ میری بات ہو چکی ہے۔ فریال بالکل محفوظ ہے اور اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک ہم پھر آج جیسی حماقت نہیں کریں گے۔"

"استاد صیب۔ ام کو گستاخی پر معاف کرنا۔ آپ کا عقل شاید کہیں گھاس چرنے گیا ہے۔ آپ دشمن کی بات پر اعتبار کرکے چین سے بیٹھا ہوا ہے۔ ام کو پکا یقین ہے فریال بی بی سخت مشکل میں ہے۔ ام ہر رات اس کو خواب میں دیکھتا ہے۔ وہ ام کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ مجھے بھی خواب میں ملتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور زریں گل سے کہنا کہ الٹے سیدھے خواب نہ دیکھا کرے۔"

"آپ ہر بات کو مذاق میں ٹالتا ہے استاد صیب۔ یہ ہنسنے والا بات نہیں ہے۔ امارا دل خون ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "زریں گل! تم خود سوچو، اگر فریال کے لئے واقعی کوئی خطرہ ہوتا تو میں اس طرح اطمینان سے بیٹھا ہوتا اور تم سے

ہنس ہنس کر باتیں کرتا....."

بات کچھ کچھ زریں کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں نے اسے تحمل سے سمجھایا اور کسی حد تک باور کرا دیا کہ فریال ابھی تک محفوظ ہے۔ پھر میں نے زریں گل سے پوچھا کہ وہ یہاں کیونکر اور کیسے پہنچا۔ جواب میں زریں گل نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ ہے۔ سروج کے بیان کے عین مطابق انعامی لالہ زار میں سروج اور زریں عمارت کی بالائی منزل پر دو کمروں میں مقید رہے تھے۔ وہاں پہ ایک رات زریں نے روشن دان میں سے نکلنے کی کوشش کی تھی اور پھنس گیا تھا۔ بعد میں محافظوں نے اسے بری طرح مارا پیٹا۔ اس مار پیٹ کی کچھ نشانیاں زریں کے چہرے پر ابھی تک موجود تھیں۔ آگے کا احوال کچھ یوں تھا کہ چار روز پہلے شیخ عاصم کے کچھ مسلح کارندے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں زریں گل کو مقید رکھا گیا تھا۔ انہوں نے زریں گل کو دبوچ کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھے۔ بعد ازاں پاؤں بھی جکڑ دیے پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا اور آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ کچھ دیر بعد اسے اٹھا کر ایک ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ گاڑی میں مسلح افراد موجود تھے اور ان میں شکر شکرا بھی تھا۔ گاڑی بھربال سے چلی تو پھر چلتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔ راستے میں چند بار ہوٹر بجنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ جیسے کوئی پولیس کار ان کے ساتھ ساتھ آ رہی ہو یا تعاقب کر رہی ہو۔ گاڑی کے فرش پر پڑے پڑے زریں گل کا جسم سن ہو چکا تھا۔ تقریباً ۲۴ گھنٹے بعد گاڑی ایک جگہ رکی اور زریں گل کے منہ میں سے بدبودار کپڑا نکال کر اسے کھانے پینے کے لئے کچھ دیا گیا اور گاڑی سے اتار کر پیشاب وغیرہ کروایا گیا۔ یہ کوئی سنسان جگہ تھی اور یہاں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ بعد ازاں اس کے منہ میں دوبارہ کپڑا ٹھونسا گیا اور پہلے والی حالت میں فرش پر لٹا دیا گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں شکر کے کارندے زریں گل سے مسلسل گالی گلوچ کرتے رہے اور ٹھوکروں کے بٹ مارتے رہے۔ گاڑی ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ سفر کے اس مرحلے میں زریں گل نے کوشش کرکے اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھسکا لی اور دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے خود کو ایک لمبی اسٹیشن ویگن میں پایا۔ اس اسٹیشن ویگن کی پچھلی نشستیں نکال کر وہاں ایک دری بچھائی گئی تھی اور دری پر زریں گل کے علاوہ فریال بھی بندھی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں پر بھی سیاہ پٹی باندھی گئی تھی اور منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ زریں گل کی طرح اس کی مشکیں بھی کسی ہوئی تھیں اور وہ قابلِ رحم حالت میں پہلو کے بل دری پر پڑی تھی۔ زریں گل کے پاؤں کی طرف ایک بڑا سا ترپال دکھا تھا۔ بوقتِ ضرورت فریال اور زریں کو اس ترپال سے ڈھانپ دیا جاتا تھا۔

زریں گل یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ پولیس کی ویگن ہے اور اس میں شکر کے علاوہ دو باوردی پولیس والے بھی موجود ہیں۔ اب زریں گل کو اندازہ ہوا کہ راستے میں دو تین بار "ہوٹر" بجنے کی جو آوازیں آئی تھیں وہ دراصل اسی گاڑی کی تھیں۔ زریں گل نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ چند گھنٹے بعد ان کی گاڑی کسی ساحلی مقام پر پہنچی۔ یہ رات کا وقت تھا اور اسٹیشن ویگن کے رنگ دار شیشوں میں سے مختلف روشنیاں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ پانچویں منٹ بعد اندازہ ہوا کہ وہ لوگ کسی بندرگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔ جہازوں کے سائرن اور اسٹیمر وغیرہ چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آوازوں میں مسافروں اور مزدوروں کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ یہاں زریں گل کو "متار پورٹ۔ متار پورٹ" کی صدائیں بھی سنائی دیں۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی کشتی یا اسٹیمر والا مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ زریں گل نے "متار پورٹ" کا نام اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ گاڑی بندرگاہ کے ایک سنسان حصے میں رکی۔ یہاں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ فریال اور زریں گل کو پولیس کی اسٹیشن ویگن سے اتارا گیا اور نیلے رنگ کی ایک موٹر بوٹ پر سوار کر دیا گیا۔ یہ خاصی بڑی بوٹ تھی اور مضبوط رسوں کی مدد سے کنارے سے بندھی ہوئی تھی۔ بوٹ پر کام کرنے والا عملہ گہرے سانولے رنگ کا تھا۔ فریال اور زریں گل کو اسٹربجزو پر ڈال کر بوٹ میں پہنچایا گیا۔ یہاں شکر کے ایک ساتھی کی نگاہ زریں گل کے چہرے پر کھسک آنے والی سیاہ پٹی پر پڑ گئی۔ اس نے زیرِ لب زریں گل کو چند گالیاں دیں اور پٹی دوبارہ کس کے اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ زریں گل ایک بار پھر محروم بصارت ہو گیا۔

موٹر بوٹ نے سمندر میں تقریباً پون گھنٹا سفر کیا اور ساحل سے جا لگی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا وہ لوگ موٹر بوٹ میں ہی رہے۔ پھر انہیں بوٹ سے اتار کر دوبارہ ایک گاڑی میں سوار کرایا گیا۔ یہ گاڑی بھی آرام دہ اور ائرکنڈیشنڈ تھی۔ اس گاڑی نے نہایت تیز رفتاری سے تقریباً بارہ گھنٹے سفر کیا اور انہیں اس عمارت میں پہنچا دیا۔ عمارت میں ایک "نیس منٹ" بھی موجود تھا اور زریں گل کو بیس منٹ کے ایک کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ انعامی لالہ زار کی طرح وہ اس کمرے میں بھی تنہا تھا۔ فریال کی بے بسی کا خیال رہ رہ کر اسے تڑپاتا تھا۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے غیر متوقع طور پر اسے کمرے سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ ایک گہرے سانولے رنگ کا شخص اس کے لئے چائے لے کر آیا۔ اس کے عقب میں ایک مسلح شخص موجود تھا۔ یہ بھی گہرا سانولا اور زرد آنکھوں والا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کی خودکار رائفل دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور نجانے کیا ہوا کہ رائفل کا میگزین نیچے گر گیا۔ زریں گل اس سنہری موقع سے آنکھیں کیونکر بند کرتا۔ اس نے چائے لانے والے کو دھکا دیا اور ادھ کھلے دروازے سے نکل بھاگا۔ وہ باہر نکلنے اور احاطے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن پھر شکر شکرا کی وجہ سے دوبارہ پکڑا گیا۔

اپنی روداد مکمل کرنے کے بعد زریں گل سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ اب میری کتھا کہانی سننا چاہتا تھا اور خاص طور پر ان دستانوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو میں چڑھائے بیٹھا تھا۔ میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسے اپنے حالات سے آگاہ کیا۔ میرے عجیب و غریب دستانوں اور طلسمی گھڑی کے بارے میں جان کر وہ ششدر رہ گیا۔ یہ بات اسے کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ میرے جسم میں ایک مہلک ٹرانسمٹر رکھ دیا گیا ہے اور اس ٹرانسمٹر کی وجہ سے میں دس کلومیٹر کی حد میں قید ہوں۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میری ذہنی حالت پر شک کر رہا ہو۔ دستانوں کے بارے میں بھی اسے میری بہت سی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے الماری میں سے ایک "نیل کٹر" ڈھونڈ نکالا۔ اس نیل کٹر کے ساتھ ایک ننھا سا چاقو بھی تھا۔ زریں نے چاقو کی نوک سے میرے ایک دستانے کا "ڈبل لیدر" پھاڑنے کی کوشش کی لیکن بے حد حیرت سمیٹنے کے بعد ناکام ہوا۔

دھیرے دھیرے اس کی بے یقینی ڈھل ڈھل کر یقین میں بدلنے لگی۔ وہ مجھ سے کنٹرول کرنے والی گھڑی اور دستانوں کے بارے میں مختلف سوالات پوچھنے لگا۔ غزالہ کی شادی کی خبر بھی اس کے لئے بے پناہ حیرت کا سبب تھی۔ تفصیل جاننے کے باوجود وہ حیران تھا کہ غزالہ کیونکر شیخ عاصم سے منسوب ہو گئی۔ بہت دیر اپنے استعجاب سے دست و گریباں رہنے کے بعد جب وہ قدرے "نارمل" ہوا تو میں نے اس سے مروج کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا "ام نے سات آٹھ دن سے اس کا منحوس صورت نہیں دیکھا۔ ام کو کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولا "خدا کرے وہ کہیں بھی نہ ہو۔ ایک دم کتنا کا ناقی عورت ہے وہ۔ ام کو پورا پورا شک ہے کہ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا کہ ام روشندان میں پھنسا ہوا ہے اور اسی نے شیخ کے آدمیوں کو ہمارے بارے میں بتایا تھا۔ وہ ایک دم غدار عورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور اس کا بیڑا غرق فرمائے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو نہیں یقین کہ مروج نے ایسا کیا ہوگا۔ ایسا کرنے سے اسے بھلا کیا ملتا۔"

"دیکھیں استاد صیب۔ آپ اس کا حمایت مت کریں۔ ورنہ۔ ورنہ ام کچھ کھا کر جان دے دے گا۔ آپ کو پتا ہے کہ اس عورت نے ام کو بہن کا گالی نکالا ہوا ہے۔ یہ اتنا بڑا بوجھ ہے ام پر کہ بس ام ہی جانتا ہے۔ اگر آپ بھی ایسی باتیں کرے گا تو ام ایک دم زندگی سے بیزار ہو جائے گا۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ ہم اس وقت کس علاقے میں ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے؟"

وہ بولا "آپ تو بے ہوشی میں یہاں پہنچا ہے لیکن ام سارا راستہ ہوش میں رہا ہے۔ راستے میں کبھی کبھی شنکر یا اس کے کسی ساتھی کا آواز بھی ہمارے کانوں تک پہنچ جاتا تھا۔ موٹر بوٹ سے اترتے ہی ام کو معلوم ہو گیا تھا کہ ام انڈیا سے نکل کر سری لنکا میں پہنچ گیا ہے۔ امارا خیال ہے کہ ام اس وقت بھی سری لنکا میں ہی ہے۔ یہ ایک بالکل سنسان علاقہ ہے۔ یہ عمارت جس میں ام موجود ہے شیخ عاصم کا ذاتی ملکیت ہے۔ ام نے شنکر کی زبان سے خود یہ بات سنا تھا۔"

میں نے زریں سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے زریں۔ یہ شیخ عاصم ہمیں آناً فاناً بھوپال سے اٹھا کر یہاں سری لنکا میں کیوں لے آیا ہے۔"

زریں گل کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے نسوار کی ڈبیا ڈھونڈنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن ڈبیا وہاں نہیں تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر ٹھنڈی سانس لی اور بولا "امارا چھوٹی سی عقل میں تو یہی بات آتا ہے استاد صیب کہ شیخ عاصم آپ کو فرنگی صاحب (ڈی کلارک) سے بچا کر یہاں لے آیا ہے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ بھوپال میں بہت سا لوگ آپ کے پیچھے پڑ گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ اس کے ہاتھ سے نکل جائے اس لئے اس نے راتوں رات بھوپال سے اپنا بستر بوریا گول کیا اور آپ سمیت ام سب کو یہاں لے آیا۔"

زریں گل نے میرے دل کی بات کی تھی۔ موجودہ حالات کے تناظر میں میں خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ انعامی لالہ زار میں میری بے ہوشی سے چند گھنٹے قبل شنکر کا ساتھی شاہی کوئی سنسنی خیز خبر لے کر شیخ عاصم کے پاس پہنچا تھا اور اس خبر کے بعد عمارت کے طول و عرض میں ہلچل سی نظر آنے لگی تھی۔ یقیناً وہ خبر مسٹر ڈی کلارک اور اینڈرسن وغیرہ کے بارے میں ہی تھی۔ وہ انعامی لالہ زار کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے اور یہ گھیرا تنگ ہونے سے پہلے پہلے شیخ عاصم نے ہمیں وہاں سے نکال لیا تھا۔ شنکر کی وجہ سے شیخ عاصم کے ہاتھ بہت لمبے ہو چکے تھے۔ ممکن تھا کہ ہمیں بھی کسی پولیس ویگن کے ذریعے ہی بھوپال سے طویل مسافت کے بعد ساحل سمندر تک لے جایا گیا ہو اور وہاں سے سری لنکا پارسل کر دیا گیا ہو۔ ہو سکتا تھا کہ میرے ساتھ بے ہوش ہونے والے دونوں افراد بھی میرے ساتھ ہی سری لنکا پہنچے ہوں۔ میں جانتا تھا کہ شنکر کے انتظامیہ کے بڑے بڑے افسروں سے رابطے ہیں۔ خاص طور سے انڈین پولیس میں اس کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔ وہ ایک نامی گرامی مجرم اور قاتل تھا لیکن اس نے بھوپال سے انڈیا کے جنوبی ساحل تک کا سفر بڑے ٹھاٹ سے پولیس کی گاڑی میں کیا تھا۔ راستے میں درجنوں چیک پوسٹیں گزری ہوں گی اور کئی ضلعوں کی پولیس نے اسے اپنی ناک کے نیچے سے گزارا ہوگا۔ قانون کے کسی محافظ نے اتنی ہمت کہاں کی ہوگی کہ اپنے کسی اعلیٰ افسر کی گاڑی میں جھانک کر دیکھتا اور کسی لاقانونیت کا سراغ لگاتا۔ ایک بات یہ بھی سوچی جا سکتی تھی کہ شاید پولیس کی گاڑی اور اس میں موجود پولیس والے جعلی ہوں لیکن اگر فرضِ محال ایسا تھا بھی تو اسے شنکر کی حد سے بڑھی ہوئی ہمت

دلیری ہی کہا جا سکتا تھا۔

زریں گل نے اپنے بیان میں منار پورٹ کا ذکر کیا تھا۔ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہوا تھا۔ ماضی میں اس پورٹ کو تالی منار کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ بندرگاہ مدراس سے آگے ہندوستان کی جنوبی تکون کے آخری سرے کے عین سامنے واقع تھی۔ یعنی ایک طرف ہندوستان کے نقشے کی آخری جنوبی تکون تھی، درمیان میں مختصر سا سمندر تھا اور دوسری طرف سری لنکا کی یہ چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ یقیناً ہمیں اسی راستے سے سری لنکا پہنچایا گیا تھا۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ ہمارے سفری کاغذات تیار کئے گئے ہوں گے۔ شنکر جیسے شخص کے لئے یہ مشکل نہیں تھا کہ وہ ساحلی محافظوں کے ساتھ مل ملا کر ہمیں سری لنکا پہنچا دیتا۔ سری لنکا تو معمولی بات تھی، شیخ عاصم کی بے پناہ دولت کی اعانت حاصل ہونے کے بعد تو وہ ہمیں بلا کھٹکے دنیا کے کسی بھی کونے میں پارسل کر سکتا تھا۔

O☆O

تیسرے روز صبح سویرے کمرے کے دروازے پر اروشی کی شکل نظر آئی۔ حسب معمول وہ بنی ٹھنی تھی۔ شستہ انگریزی میں مجھ سے کہنے لگی "تم منہ ہاتھ دھو لو۔ ناشتا تیار ہے۔ میں ابھی تمہارے لئے لاتی ہوں۔"

میں نے وال کلاک دیکھتے ہوئے کہا "ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے ہمارا ناشتا نو بجے کے قریب آتا ہے۔"

وہ بولی "تمہاری حیثیت یہاں مہمان کی نہیں ملازم کی ہے۔ مالک جس وقت تمہیں ناشتا کرائیں گے اسی وقت کرنا ہوگا اور جو حکم دیں گے بجا لانا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوں لیکن اتنی جلدی ناشتے کی وجہ تو پوچھ سکتا ہوں۔"

وہ بولی "میرا خیال ہے کہ آج تمہیں مالک کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ شاید گولف گراؤنڈ میں۔"

"گولف گراؤنڈ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں مالک گولف کے زبردست شوقین ہیں۔ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ان کا ذاتی گولف گراؤنڈ موجود ہے۔"

پانچ دس منٹ بعد اروشی ناشتا لے آئی۔ ناشتا ہم دونوں یعنی میرا اور زریں کا تھا۔ زریں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور خود ناشتا کرنے کے بعد باقی اشیاء ڈھانپ کر اس کے پاس رکھ دیں۔

ناشتے کے بعد مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ آخر دروازہ کھلا اور چھوٹے قد کا ایک سیاہ فام سنہالی محافظ اروشی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سنہالی محافظ نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے کہا "چلو تمہیں بھی بڑے صاحب کے ساتھ گراؤنڈ میں جانا ہے۔"

میں سنہالی محافظ کے ساتھ باہر آ گیا۔ اروشی نے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ مجھے اس وسیع و عریض عمارت کے پورچ میں پہنچایا گیا۔ پورچ میں پہنچ کر میں نے پہلی بار عمارت کے خدوخال دیکھے اور کھلی ہوا میں سانس لی۔ یہ خوب صورت عمارت ہر طرف سے پھولدار بیلوں اور گل پوش پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اتنی کثرت سے سبزہ تھا یہاں کہ ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا۔ اس گل پوش سبزے میں سے کہیں کہیں دراز قامت کھڑکیوں کے شیشے چمکتے تھے یا بالکونیوں کے جنگلے نظر آتے تھے۔ اگر کوئی شخص کچھ فاصلے سے دیکھتا تو اسے یہی لگتا کہ یہ عمارت سنگ و خشت سے نہیں بلکہ سبزے اور پھولوں سے تعمیر کی گئی ہے۔ پورچ میں چار پانچ سنہالی اور تامل ملازم موجود تھے۔ ان میں سے دو نے گولف کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ ایک ملازم کے پاس تین چار چھتریوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا فولڈنگ خیمہ تھا۔ دیگر دو ملازم بھی مختلف قسم کے سامان سے لدے پھندے تھے۔ میرے کندھے پر بھی کینوس کا ایک بھاری بھرکم بیگ رکھ دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس سرسبز عمارت سے نکلے اور ایک چھوٹی سی شفاف سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک گھنے درختوں اور پھولدار جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کہیں کسی عمارت یا راہ گیر کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ ناریل، بانس اور تاڑ کے پتوں پر سے چھن چھن کر رہی تھی اور نباتات کی بھینی بھینی مہک چارسو پھیلی محسوس ہوتی تھی۔ ایک دو جگہوں پر سڑک اتنے گھنے درختوں سے گزری کہ ان میں گہری شام کا سماں محسوس ہوا۔ تقریباً تین فرلانگ فاصلہ طے کر کے ہم ایک کھلے گراسی میدان میں پہنچ گئے۔ میدان کو چاروں طرف سے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ خاص خاص جگہوں سے گھاس بڑی خوب صورتی اور محنت سے تراشی گئی تھی۔ یہی وہ گولف کورس تھا جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔

ملازمین ضروری تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ دس بجے کے لگ بھگ معزز کھلاڑی بھی تشریف لے آئے۔ ان میں شیخ عاصم اور مسز شیخ عاصم کے علاوہ کھچڑی بالوں والا ایک سرخ و سپید شخص بھی تھا۔ اس نے نصف آستین کی سفید بش شرٹ اور سرخ پتلون پہن رکھی تھی۔ شیخ عاصم کی طرح اس کے سر پر بھی پی کیپ تھی۔ شیخ عاصم کی کلائی پر منحوس گھڑی پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ غزالہ عام مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ شیخ عاصم اور کھچڑی بالوں والے کے درمیان گیم شروع ہوا۔ پہلے مرحلے میں بال کو زوردار ہٹس لگائی گئیں۔ شیخ عاصم اور کھچڑی بالوں والا بال کی طرف روانہ ہوئے تو میں اور ایک سنہالی ملازم اسٹک والے بیگ کندھوں پر لادے ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ غزالہ نے ایک دو بار کن انکھیوں سے مجھے دیکھا پھر میری طرف سے بالکل توجہ ہٹالی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ میری بے بسی و لاچاری کے تماشے کو روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

ایک بجے تک کھیل بغیر کسی وقفے کے جاری رہا۔ اس دوران میں شیخ عاصم اور کھچڑی بالوں والے کے درمیان لطیفے بازی بھی چلتی رہی۔ ایک موقع پر شیخ عاصم کے اصرار پر غزالہ نے بھی چند شاٹس لگائے۔ وہ اس معاملے میں بالکل اناڑی تھی۔ یوں ہٹ لگاتی تھی جیسے کسی چھپکلی وغیرہ کو مارنے کی کوشش کر رہی ہو۔ شیخ عاصم اس کے انداز سے خوب محظوظ ہوا۔ پھر وہ غزالہ کو اسٹک تھامنے اور ہٹ لگانے کا طریقہ سمجھانے لگا۔ غزالہ کے عقب میں کھڑے ہو کر اس نے اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا اور بڑی محویت سے "شاٹ" کی باریکیاں سمجھانے لگا۔ غزالہ اور شیخ کی قربت کا یہ منظر میری آنکھوں میں کانٹے چبھو رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ شیخ عاصم یہ سب کچھ مجھے دکھانے کے لئے کر رہا ہے۔

لنچ گولف کے میدان ہی میں کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ایک گوشے میں چھوٹا سا خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ اس خیمے کا ایک مقصد دھوپ میں سایہ فراہم کرنا بھی تھا۔ ملازمین اور دو مسلح محافظوں نے اپنا کھانا درختوں تلے کھایا۔ اس کھانے میں میں بھی شریک تھا۔ میرے دستانوں کے حوالے سے ہر آنکھ میں تعجب موجود تھا لیکن کسی نے بھولے سے بھی اس بارے میں مجھ سے سوال نہیں کیا۔ دوپہر ڈھائی تین بجے کھیل دوبارہ شروع ہوا لیکن ابھی آدھ پونا گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ایک ڈھلوان سے اترتے ہوئے غزالہ کا پاؤں رپٹا اور وہ گر گئی۔ شیخ عاصم نے اسے جلدی سے سنبھالا۔ اسے موچ آگئی تھی۔ کھچڑی بالوں والے نے غزالہ کا سینڈل اتارا اور اس کے پاؤں کو ہلانے جلانے لگا۔ غزالہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ شیخ عاصم نے غزالہ کو بازوؤں میں اٹھالیا اور خیمے کی طرف بڑھا۔ غزالہ کا سینڈل وہیں پڑا رہ گیا تھا۔ شیخ عاصم نے مجھے اشارہ کیا کہ میں سینڈل اٹھا کر اس کے پیچھے آؤں۔

غزالہ کی جوتی اٹھا کر اس کے شوہر کے پیچھے پیچھے چلنا ایک توہین آمیز تجربہ تھا لیکن چاروناچار میں اس تجربے میں سے گزر رہا تھا اور نجانے ابھی ایسے اور کتنے تجربے میرے منتظر تھے۔

ہماری طرح شیخ عاصم اور غزالہ وغیرہ بھی پیدل ہی گولف گراؤنڈ میں پہنچے تھے لیکن اب غزالہ کے لئے گاڑی منگوائی گئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ واپس رہائش گاہ روانہ ہو گئی۔ کھچڑی بالوں والا سرخ و سپید شخص بھی ان کے ساتھ تھا۔ کھچڑی بالوں والے کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کوئی اعلیٰ سرکاری افسر ہے اور اس کا شمار شیخ عاصم کے دوستوں میں ہوتا ہوگا لیکن ایک سینئر سنہالی خادم نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایرانی تاجر ہے۔ اس کا نام محمد اسحاق ہے اور شیخ عاصم اسے گولف کے کھیل میں اپنا استاد سمجھتے ہیں۔

"معزز کھلاڑیوں" کی واپسی کے تھوڑی دیر بعد ہم نے بھی سامان سمیٹا اور درختوں سے گھری ہوئی خوب صورت سڑک طے کر کے واپس رہائش گاہ پہنچ گئے۔

○☆○

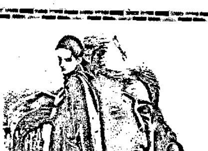

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل

اگلے روز ہم نے مکمل آرام کیا۔ تیسرے روز دوپہر تک بھی کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں اور زریں گل اپنے کمرے میں مقیم رہے اور سنہالی ملازمہ اروشی ہمیں کھانا وغیرہ پہنچاتی رہی۔ زریں گل کا غم و غصہ اب کافی حد تک قابو میں تھا اور اس نے مجھ سے یہ وعدہ بھی کرلیا تھا کہ فریال کی بہتری کی خاطر وہ کسی بھی طرح کی ہنگامہ آرائی سے باز رہے گا۔ اس کی کمر کی چوٹ بتدریج ٹھیک ہورہی تھی۔ سنہالی ملازمہ سے میں نے کسی نہ کسی طرح یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ ہم سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو سے تیس چالیس میل جنوب کی طرف شیخ عاصم کے ذاتی ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔ ساحل یہاں سے صرف چھ سات میل کے فاصلے پر تھا۔ ہائی وے سڑک دو میل کے فاصلے سے گزرتی تھی اور وہاں تک شیخ عاصم نے اپنے ذاتی خرچ سے سڑک ہموار رکھی تھی۔

تیسرے روز سہ پہر کے وقت ہمیں پھر سازوسامان اٹھا کر گولف کے میدان میں جانا پڑا۔ آج پھر یہاں دو روز پہلے والا سانولا کھچڑی بالوں والا محمد اسحاق بھی موجود تھا اور شیخ عاصم و غزالہ تھے۔ ان کے علاوہ، آج شکر شکرا بھی نظر آرہا تھا۔ غزالہ نے آج سینڈل کے بجائے ٹینس شوز پہن رکھے تھے اور بالوں کو جوڑے کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ شیخ عاصم، غزالہ کو گولف سکھانے کے سلسلے میں بڑے اشتیاق کا مظاہرہ کررہا تھا۔ غزالہ کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خود تو اس کھیل میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن شوہر کی خوشنودی کے لئے وہ سیکھنے کی کوشش کررہی ہے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم واپس آگئے۔ حسب سابق پہلے غزالہ اور شیخ عاصم روانہ ہوئے پھر سامان وغیرہ سمیٹ کر ہم بھی ریسٹ ہاؤس واپس پہنچ گئے۔ کہنے کو تو یہ ریسٹ ہاؤس تھا لیکن وسعت اور خوب صورتی کے اعتبار سے خوابوں کا محل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پھولوں، کلیوں اور ہریالیوں میں چھپی ہوئی یہ عمارت خاص طور سے مون سون کے نظارے دیکھنے کے لئے تعمیر کرائی گئی ہے۔ شیخ عاصم ریتلے ریگزار کا باسی تھا۔ اس نے گرجتے برستے آسمان کے نیچے کچھ بھیگے بھیگے شب و روز گزارنے کے لئے سری لنکا کے اس خوب صورت جنگل میں ڈیرا ڈال رکھا تھا تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

سہ پہر کو گولف کے میدان میں جانے اور شام کو وہاں سے واپس آنے کا سلسلہ تین چار روز جاری رہا۔ ابھی تک شیخ عاصم یا شکر نے میرے ساتھ کسی غیر معمولی رویے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ غیر معمولی رویہ جلد یا بدیر سامنے ضرور آئے گا۔ شب و روز دیر تک اسی طرح پُرسکون نہیں رہیں گے۔ ایک روز کھیل کے میدان میں ہی واکی ٹاکی پر شیخ عاصم کو کوئی اہم اطلاع ملی۔ میں نے محسوس کیا کہ شیخ عاصم اور غزالہ کا کوچ محمد اسحاق کچھ پریشان نظر آنے لگے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شکر شکرا بھی اس پریشانی میں شامل ہوگیا۔ وہ تینوں گاڑی میں بیٹھ کر گولف

گراؤنڈ سے روانہ ہو گئے۔ تاہم جاتے جاتے شنکر میرے لئے یہ ہدایت جاری کر گیا کہ غزالہ کو گولف گراؤنڈ سے ریسٹ ہاؤس تک پہنچانے کی ذمے داری میری ہے۔

میں اس ذمے داری پر زیادہ حیران نہیں ہوا۔ میں اس سے پہلے بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ شیخ عاصم مجھے اور غزالہ کو گاہے گاہے تنہائی فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معلوم نہیں اس طرح وہ اپنے کون سے جذبے کی تسکین کرتا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں اور غزالہ پیدل ہی گولف گراؤنڈ سے رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بانس، ناریل اور تاڑ کے طویل درختوں سے ڈھکی ہوئی سڑک خاموش اور سنسان تھی۔ پھولدار جھاڑیوں سے جھڑنے والے پھولوں نے ہمارا راستہ گل پوش کر رکھا تھا۔ میں غزالہ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ یوں لگا کہ میں اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہوں۔ لیکن کیا؟ اس کا مجھے خود بھی علم نہیں تھا۔ اچانک بادل زور سے گرجا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان گہرے تاریک بادلوں سے ڈھکا جا رہا تھا۔ ہم نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ یہ کوئی تین ساڑھے تین فرلانگ کا راستہ تھا۔ ہم نے بمشکل ایک فرلانگ فاصلہ طے کیا تھا کہ موسم کے تیور مزید بگڑ گئے اور پھر سری لنکا کی طوفانی بارش نے ہم کو آلیا۔ یوں لگا کہ ایک دم چھاجوں پانی برسنے لگا ہے۔ سڑک کے کنارے سرسبز ڈھلوان تھی۔ ہم اس ڈھلوان پر چڑھ کر ٹین کی ایک چھت تلے جا بیٹھے۔ غالباً یہ چھت ایسی ہی اچانک بارش میں پناہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی۔ گہرے بادلوں کی وجہ سے شام سے پہلے ہی رات چھا گئی تھی اور پانی کی دبیز چادر میں چار پانچ گز تک دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ غزالہ نے اپنے بھیگے ہوئے آنچل کو بھیگے ہوئے جسم پر پھیلا لیا اور دامن نچوڑتے ہوئے کہنے لگی "آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟"

"ہاں مل گیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا "تم نے تو لکھا تھا کہ شیخ عاصم کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہے اور رہی سہی رنجش بھی جلد ہی ختم ہو جائے گی لیکن وہ تو ہم سب کو باندھ کر یہاں اپنے ساتھ لے آیا ہے؟"

"شاید اس میں بھی آپ کی بہتری ہو؟" وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی "میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ کو اپنے ساتھ یہاں نہ لائیں۔ وہ کہنے لگے کہ مسٹری کلارک جیسے لوگ آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور وہ آپ کی زندگی کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ان لوگوں کی کھینچا تانی سے نکالنے کے لئے آپ کو اٹھا کر نکال لیا جائے۔"

"بہت خوب۔ مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ شیخ عاصم کو میرا کتنا خیال ہے۔ شاید تمہیں فریال کے بارے میں پتا نہیں۔ شیخ عاصم نے اسے بھی اپنی خاص محبت کے سائے میں رکھا ہوا ہے اور بڑا ہمدردانہ سلوک کر رہا ہے اس سے۔"

"مجھے سب پتا ہے۔ سب پتا ہے مجھے۔" غزالہ روہانسی آواز میں بولی تو آپ ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں جن سے شیخ عاصم گزر رہے ہیں۔ شاید آپ اس نفرت کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو چند ماہ پہلے تک ان کے دل میں آپ کے لیے موجود تھی۔ اس شدید نفرت اور عداوت سے موازنہ کیا جائے تو ان کا موجودہ رویہ بڑا نرم اور دھیما محسوس ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کا رویہ جلدی بالکل نارمل ہو جائے گا۔"

میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ میں نے کہا "یہ میرے ہاتھوں میں دستانے دیکھ رہی ہو۔ یہ شیخ کے دھیمے رویے کی نشانی ہیں۔ اور اس کے دھیمے رویے کی دوسری نشانی زرین گل ہے جسے شنکر کے غنڈوں نے مار مار کر بستر پر ڈال دیا ہے اور تیسری نشانی نہال ہے جو شرابی کتوں کے قبضے میں ہے اور وہ ہر گھڑی اس کی عزت کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ میری کلائی کی گھڑی دیکھو۔ جانتی ہو یہ گھڑی کیوں باندھی گئی ہے میری کلائی پر؟"

غزالہ غور سے گھڑی دیکھنے لگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے گھڑی کے بارے میں پتا نہیں "کیا ہے یہ؟" وہ بجھی بجھی سی آواز میں بولی۔

"تم نے ایسی گھڑی پہلے بھی دیکھی ہے؟"

"ہاں شیخ عاصم کی کلائی پر دیکھی ہے۔"

میں نے غزالہ کو مختصر الفاظ میں گھڑی اور گھڑی سے منسلک الیکٹرانک ڈیوائس کے بارے میں بتایا۔ غزالہ حیرت میں گم ہو گئی۔ یہ جان کر کہ الیکٹرانک ڈیوائس میں تین سو ملی گرام نہایت مہلک ٹی این ٹی موجود ہے اور وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے، غزالہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ میری ہربات پر فوراً یقین کر لیا کرتی تھی۔ لہٰذا اس بات پر بھی کر رہی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ایڈورڈ اور زرین گل دونوں نے میری بات سن کر حیرت سے آنکھیں پھاڑی تھیں اور میری ذہنی صحت پر شک کیا تھا۔

غزالہ کی آنکھوں میں نمی نظر آئی اور پھر سفید موتی اس کے بھیگے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ ناریل، تاڑ اور بانس کے اس خاموش جنگل میں برستی بارش اور غزالہ کی آنکھوں کی رم جھم نے آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک دل گداز سماں باندھ دیا تھا۔ جی چاہا بارش کبھی نہ رکے اور میں رحتی گندھا کی سفید کلیوں کے پاس بیٹھا ٹین کی اس شور مچاتی چھت تلے غزالہ کے حسن سوگوار کو دیکھتا رہوں۔ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی "شاہ جہاں! میں اپنے شوہر کی طرف داری نہیں کر رہی صرف یہ بتا رہی ہوں کہ وہ ایسے حالات سے گزر رہے ہیں کہ "ابنارمل" ہو کر رہ گئے ہیں۔ در حقیقت آپ کی وجہ سے یا آپ کے واسطے سے انہیں کچھ ایسے صدمات پہنچے ہیں کہ جنہیں وہ کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر پاتے شب و روز ایک آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ آج سے چند ماہ پہلے تک آپ کے حوالے سے ان کی سوچ اتنی خطرناک تھی کہ دل دہل جا

تا لیکن اب۔۔۔"

"اب بھی کچھ نہیں مسز غزالہ" میں نے بات کاٹی "اب بھی تمہارے شوہر کی سوچ وہی ہے۔ صرف تمہیں دکھانے کے لیے اس نے چہرے پر نقاب چڑھا رکھا ہے۔"

غزالہ نے کہا "آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے شاہ جہاں! آپ مکمل تاریکی میں ہیں۔ کبھی موقع ملا تو میں آپ کو بتاؤں گی۔"

"آج ہی کیوں نہیں۔ آج ہی بتا دو یہاں کون سن رہا ہے۔"

غزالہ نے گھنے درختوں کی طرف دیکھا۔ بارش نے اس مختصر سی پناہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ابھی سورج نہیں ڈوبا تھا لیکن تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سامان اٹھانے والے سنہالی مزدور بارش کی شدت دیکھ کر گولف گراؤنڈ میں ہی رک گئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں موجود افراد غالباً یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم سب گولف گراؤنڈ میں ہیں اور بارش رکنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ فرصت کے یہ لمحات غنیمت تھے۔ غزالہ نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے بولی "آپ کا کیا خیال ہے کہ شیخ عاصم صرف اس لیے آپ کے درپے ہیں کہ آپ نے ان کے بڑے بھائی کو جان سے مارا تھا؟" پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی "بے شک یہ وجہ بھی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ وجوہات ہیں۔ ان وجوہات کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح شیخ راشد کے قتل سے ہی جا ملتا ہے۔ شیخ راشد کسی اکیلے فرد کا نام نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کا خاندان تھا۔ اہل و عیال تھے اور دوست احباب تھے۔ جب وہ ناگہانی موت مرا تو اس کی موت مختلف طرح سے ان تمام لوگوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ شیخ راشد کی والدہ بیٹے کی موت کی خبر سنتے ہی صدمے سے جاں بحق ہو گئی تھیں۔ شیخ عاصم ان دنوں انگلینڈ میں پڑھ رہے تھے اور بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ بڑے بھائی اور والدہ کی موت کے بعد انہیں فوراً انگلینڈ سے دبئی لوٹنا پڑا اور تمام خاندانی اور کاروباری ذمے داریاں سنبھالنا پڑیں۔ انگلینڈ کے ایک نہایت اعلیٰ اور دولت مند خاندان کی لڑکی کے ساتھ شیخ عاصم کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ شیخ عاصم اور وہ لڑکی ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ امکان تھا کہ عنقریب دونوں کی شادی ہو جاتی لیکن بھائی کی موت کے بعد شیخ عاصم کے حالات یکسر بدل گئے۔ ان کا خاندان گو ماڈرن ہے لیکن اس میں ابھی تک کچھ قدیم قبائلی رسومات پائی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک رسم قتل اور اس کے بدلے کے بارے میں ہے۔ اس رسم کے حوالے سے شیخ عاصم جانتے تھے کہ اگر انہوں نے بھائی کے قتل کا بدلہ لیے بغیر شادی رچائی تو برادری میں انہیں حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ وہ آپ کو اپنے بھائی اور والدہ کا قاتل سمجھتے تھے۔ لہٰذا بدلہ چکانے کے لیے انہوں نے سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ خدا نے آپ کو اس شر سے محفوظ رکھنا تھا لہٰذا حالات خود آپ کی حفاظت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پاکستان میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گئے۔ جیل کے اندر بھی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی گئیں جو بار آور نہ ہوئیں۔ جوں جوں عاصم کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ان کے اندر آپ کے خلاف انتقامی جذبات بڑھتے جا رہے تھے۔ ان جذبات کو شدید تر بنانے میں دو واقعات نے اہم کردار ادا کیا۔ پہلے واقعے کا تعلق ایک اراضی کی خریداری سے تھا۔ مقتول شیخ راشد دبئی میں واقع یہ سیکڑوں ایکڑ اراضی ایک ماڈل کالونی بنانے کے لیے خریدنا چاہتے تھے اور یہ ماڈل کالونی ان کا دیرینہ خواب تھی۔ دبئی کی ایک اور متمول فیملی بھی اس اراضی پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ شیخ راشد کے قتل ہونے کے بعد شیخ عاصم نے اس اراضی کی خرید کو اپنا مشن بنایا لیکن چونکہ وہ بھائی کا بدلہ لینے کے چکر میں دور نکل گئے اور آپ کی ذات میں یوں الجھ گئے کہ اس اراضی کی خرید پر خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مخالف فریق یہ اراضی خریدنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس واقعے کا شیخ عاصم نے بہت اثر قبول کیا اور اسے اپنی شکست جانا۔ دوسرے واقعے کا تعلق شیخ عاصم کی نجی زندگی سے ہے۔ انہوں نے اپنی شادی کا معاملہ غیر معینہ مدت کے لیے التوا میں ڈال رکھا تھا لہٰذا وہ لڑکی بھی ان سے چھن گئی جسے وہ انگلینڈ سے دلہن بنا کر دبئی لے جانا چاہتے تھے۔ اس کا نام کرسٹی تھا۔ اس کی شادی اپنے ہی خاندان میں کہیں ہو گئی۔ اپنی تمام تر دولت اور طاقت کے باوجود شیخ عاصم اسے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ یہ دونوں واقعات ان دنوں پیش آئے جب آپ اٹک جیل میں قید کا دوسرا سال کاٹ رہے تھے۔ ان حالات سے گزرنے کے بعد عاصم قنوطیت کا شکار ہو گئے۔ وہ اپنے تمام تر حالات کا ذمے دار آپ کو سمجھ رہے تھے اور کسی نہ کسی طور اب بھی سمجھ رہے ہیں۔ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا بدلہ آپ سے لینا ان کی زندگی کا اولین مقصد بن چکا ہے۔۔۔"

بات کرتے کرتے غزالہ کی آنکھیں ایک دم پھر بھر آئیں۔ وہ آنچل سے انہیں پونچھتے ہوئے بولی "آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آج سے چند ماہ پہلے تک آپ کے بارے میں ان کے ارادے کتنے خطرناک تھے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اب آہستہ آہستہ وہ بہتر ہو رہے ہیں۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ وہ آپ کے بارے میں دل کے بجائے دماغ سے سوچیں۔ میں اس مرحلے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جس طرح بہتری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں مجھے امید ہے کہ بہت جلد وہ آپ کے بارے میں ایک نارمل انسان کی طرح سوچنے لگیں گے۔"

ابھی ٹین کی چھت کے نیچے سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کہا "غزالہ! تمہاری اس گفتگو کے دو ہی مقاصد میری سمجھ میں آئے ہیں۔ ایک تو تم مجھے شیخ عاصم کے خطرناک ارادوں سے خوفزدہ کرنا چاہ رہی ہو اور دوسرے یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تم میری خاطر تیاگ دے رہی ہو اور اپنے شوہر کو راہ راست پر لانے کی

کوشش کر رہی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں شاہ جہاں! آپ... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں۔ واقعی ایسی بات ہے... اور تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو، تم حقیقت بیان کر رہی ہو۔ مجھے شیخ عاصم کے خطرناک ارادوں سے بچانے کے لیے تم نے خود کو اس کی تند مزاجی کے حوالے کر رکھا ہے۔ اس کا غیظ و غضب اور اس کی سرکشی اپنے جسم پر جھیل رہی ہو اور میرے لیے اس سے معافیاں اور رعایتیں لے رہی ہو... سچ بتاؤ کیا ایسا نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں" وہ سر اٹھا کر بولی "میں آپ کو سب کچھ لکھ چکی ہوں۔ میں نے شیخ عاصم سے شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ میں ان سے آپ کے لیے رعایتیں لینا چاہتی تھی۔ میرے حالات نے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں شیخ عاصم کا سہارا لوں اور اس دلدل سے نکلوں جو مجھے نگل رہی ہے۔"

"میں اس وقت کی نہیں اب کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم نے شیخ سے میری جان بخشی کی اپیل کی تھی؟" وہ سر جھکا کر رہ گئی میں نے کہا "دیکھو غزالہ! مجھے تمہاری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ ایسا کرو گی تو میں اپنی نگاہوں میں اور بھی ذلیل و پست ہو جاؤں گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ یہ میری جنگ ہے۔ میں اسے تم سے بہت بہتر سمجھتا ہوں۔ میں شیخ عاصم سے خود لڑوں گا۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی "میں نہیں چاہتی کہ آپ لڑیں... میں... میں آپ دونوں میں سے کسی کو خطرے اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی... اور ان کو تو بالکل نہیں" آخری الفاظ جیسے خود بخود اس کی زبان سے پھسل گئے تھے۔

میرے بدن میں ایک یاس بھری لہر سی دوڑ گئی۔ نجانے کیوں ایک طنزیہ مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر آ گئی۔ میرے تاثرات دیکھ کر غزالہ نے نگاہیں جھکا لیں۔ "مشرقی بیوی کا روپ خوب سجا ہے تم پر" میں نے آہستگی سے کہا۔

جواب میں غزالہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ اس دوران بارش کی تند و تیز بوچھاروں میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ ریسٹ ہاؤس ہی کی گاڑی تھی اور ہماری تلاش میں اس سائبان تک پہنچی تھی۔ گاڑی میں سے دو چھاتا بردار ملازم نکلے اور چھاتوں کے سائے میں ہمیں گاڑی تک لے گئے۔

○☆○

شیخ عاصم اور شنکر شنکرا کی واپسی رات بھر نہیں ہوئی۔ صبح بہت نکھری ہوئی اور صاف و شفاف تھی۔ میں اور زریں گل کرسیاں برآمدے میں ڈال کر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ پوری عمارت سبزے اور پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندوں کی چہکار تھی اور زمین پر خوش پوش سنہالی ملازمائیں باغوں میں پھول لگاتے چہکتی پھر رہی تھیں۔ ان میں اروشی بھی شامل تھی۔ خواب ناک آنکھوں والی نرم و نازک اروشی جس کے نچلے ہونٹ پر زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔

دوپہر کے بعد اروشی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ مالک یعنی شیخ عاصم تین چار روز تک واپس نہیں آئیں گے۔ انہیں کسی ضروری کام کے سلسلے میں کولمبو رکنا پڑ گیا تھا۔ جیسے داستانی طوطے کی جان جن میں ہوتی ہے۔ ویسے ہی میری جان اس گھڑی میں تھی جو شیخ عاصم اپنی کلائی پر باندھتا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق کولمبو یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شیخ عاصم کولمبو میں تھا تو گھڑی اس کے پاس نہیں تھی۔ گھڑی اس وقت ریسٹ ہاؤس میں ہی کہیں موجود تھی۔ طرفہ تماشا تھا۔ میں گھڑی کو ناکارہ بنانے کے لیے اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا نہ ہی اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس سے دور بھاگ سکتا تھا۔ شیخ عاصم اور شنکر کی غیر موجودگی کے سبب میں خود کو قدرے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فریال کا کھوج لگانے کی کوشش کروں۔ یقیناً وہ اسی عمارت میں کہیں موجود تھی۔ انہی گل پوش در و دیوار میں کہیں وہ عقوبت خانہ بھی تھا جہاں اس معصوم کو محبوس رکھ کے جان لیوا ذہنی اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ جب سے ہم پکڑے گئے تھے ہمیں اس کی اور اسے ہماری خبر نہیں تھی۔ میں بڑی بے قراری سے رات پڑنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ کام بے حد احتیاط طلب تھا۔ شنکر اور شیخ عاصم ایک سے زائد مرتبہ مجھے یہ وارننگ دے چکے تھے کہ میری کسی بھی غلطی کی سزا فریال کو بے آبروئی کی صورت میں بھگتنا پڑے گی اور یہ ایک وارننگ تھی جسے میں کسی صورت نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیلی فون پر سنی ہوئی فریال کی چیخیں میرے کانوں میں گونجیں تو حوصلہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

رات تقریباً دس بجے جب عمارت میں ملازمین کی نقل و حرکت بہت کم رہ گئی تو میں زریں گل کو کمرے میں چھوڑ کر نکلا اور ٹہلنے والے انداز میں عمارت کے مرکزی حصے کی طرف آ گیا۔ ارادہ یہی تھا کہ آج صرف یہ جاننے کی کوشش کروں گا کہ فریال کو اس عمارت کے کس حصے میں رکھا گیا ہے۔ ایک دو سنہالی محافظوں نے مجھے عمارت کے مرکزی حصے میں گھومتے پھرتے دیکھا لیکن کوئی بازپرس نہیں کی۔ درحقیقت اس عمارت میں مجھ پر بہت کم پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ الیکٹرانک ڈیوائس کی نادیدہ زنجیر جو میرے پاؤں میں تھی! ایک سنہالی محافظ نے دوستانہ لہجے میں پوچھا "ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

میں نے بھی دوستانہ لہجے میں جواب دیا۔ وہ مجھے سلام کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ جب سے ریسٹ ہاؤس میں میرے اور شنکر کے درمیان زوردار معرکہ ہوا تھا میں ریسٹ ہاؤس کے ملازمین کے لیے ایک جانی پہچانی اور پرتجسس شخصیت بن گیا تھا۔ جونہی میں

ہوا ایک نیم تاریک راہداری میں مڑا مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ کسی بند دروازے کے پیچھے سے بلند ہونے والی یہ چیخ بڑی دلدوز تھی۔ اور یہ ایک چیخ نہیں تھی چیخوں کا ایک سلسلہ تھا جو کسی لرزہ خیز واقعے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ کیا یہ فریال کی چیخیں ہیں؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا اور تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا فریال کے ساتھ؟ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم دھماکے سے پھٹ جائے گا اور شدت کرب سے میں سو ٹکڑوں میں بٹ جاؤں گا۔ میں نے پورے غور سے ان نسوانی چیخوں کو سننے کی کوشش کی۔ چیخیں ایک دم بلند ہو گئی تھیں جیسے کوئی بند دروازہ کھل گیا ہو اور چیخنے والی دوڑتی ہوئی عمارت کے بیرونی حصے کی طرف آ رہی ہو۔ پھر مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ فریال کی چیخیں نہیں ہیں۔ یہ کوئی سنہالی لڑکی تھی جو چیخنے کے ساتھ ساتھ واویلا بھی کر رہی تھی۔ اچانک راہداری کا ایک آہنی دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے اروشی کو دیکھا۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور چیختی ہوئی گن کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی تھیں چھوٹے قد کا ایک مسلح تامل ان کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ یہ لوگ ریسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں پہنچے اور پھر بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

خوابیدہ سا ریسٹ ہاؤس ایک دم جاگ اٹھا تھا۔ محافظ اور ملازم آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہو گئے تھے اور ناقابل فہم زبان میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی کوئی ایسا سانحہ ہوا ہے جس کا تعلق خوب صورت آنکھوں اور لمبے بالوں والی اروشی سے ہے۔ کچھ اور لوگ بھی بیرونی دروازے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ میں ان میں شامل ہو گیا۔ چند ہی منٹ بعد ہم ریسٹ ہاؤس کے پچھواڑے ایک سرسبز ڈھلوان سے اتر رہے تھے۔ چاندنی رات تھی اور آسمان صاف... قرب و جوار کے مناظر واضح نظر آ رہے تھے۔ میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ ہمارا رخ اسی جھنڈ کی طرف تھا۔

ہم جھنڈ کی دوسری جانب پہنچے تو تقریباً نصف فرلانگ دور ایک مکان شعلوں میں گھرا نظر آیا۔ یہ چھوٹا سا خوب صورت مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اس کی سرخ چھت کھپریل کی تھی۔ ارد گرد غالباً مرچوں کے کچھ کھیت تھے۔ مکان نصف سے زائد جل چکا تھا اور جو باقی تھا اسے بھی بچانا ناممکن تھا۔ قریبی گڑھوں میں کل رات کی بارش سے کچھ پانی جمع ہو گیا تھا۔ موقعے پر موجود لوگ یہ پانی مختلف برتنوں کے ذریعے آگ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی تندور کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں "ڈراپر" سے پانی کے قطرے ٹپکائے جائیں۔ میں نے اروشی کو دیکھا۔ اسے چند افراد نے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر آگ کی طرف جا رہی تھیں اور بین کر رہی تھی۔

درات کا کھانا ہمیں
میں نے ایک سنہالی سے پوچھا تو اس۔ نے ہاتھ سے کھانا
اروشی کی چھوٹی بہن اور بہنوئی کا گھر ہے۔ ایک گپ شپ کرتے
بھی ہے۔ اندیشہ ہے کہ وہ سب لوگ مکان دوبارہ ریسٹ ہاؤس
ہیں۔ ل رکھنا ایک بار پھر
میں نے ایک ایسی چیز نوٹ کی کہ جو شی لڑکی تھی اور جیسی
لوگوں نے نوٹ نہیں کی تھی۔ آگ میں "محبت کرنے والی اور
جل جائے تو جلتے ہوئے گوشت کی تیز بو بڑا اسے کچھ سوگوار سا
فاصلے سے محسوس کی جا سکتی ہے لیکن یہیں آنسوؤں سے دھل
نہیں ہوئی۔ میں اروشی کے پاس پہنچا اور رات میں بارہ ایک
تسلی دی کہ اس کی بہن اور بہنوئی دیکھو اس بجے تک سویا رہا۔
یقیناً وہ بچ گئے ہیں۔ اروشی رو رو کر ہلکان ہو رہی 11.00 وشی
پلکیں اٹھا کر آس بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مگر وہ
پورے یقین کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور اسے باور کرایا کہ
ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ وہ مکان
کے مکینوں کو تلاش کریں، وہ یہیں کہیں ہوں گے۔

ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ ایک جانب کوئی زور سے چیخا۔ یہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا اور ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے میں بھی ان میں شامل تھا۔ وہاں تاڑ کے لمبے درختوں میں ایک مرد عورت اور بچہ ایک ہی رسی کے ذریعے ایک موٹے تنے سے بندھے ہوئے تھے۔ عورت کو لڑکی کہنا چاہیے بلکہ وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔ اس کی شکل بہت حد تک اروشی سے ملتی تھی۔ ان تینوں کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔ لڑکی اور اس کے نوجوان شوہر کا منہ کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا تھا جبکہ بچے کا منہ کھلا تھا یا کھلا رہ گیا تھا اور اس کے رونے کی آواز سن کر عمر رسیدہ شخص ان تک پہنچا تھا۔

اروشی دوڑتی ہوئی موقعے پر پہنچ گئی اور اپنی بہن سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہن بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ میں ایک چیز دیکھ کر چونک گیا۔ لڑکی کا لباس نہ صرف پھٹا ہوا تھا بلکہ ادھورا بھی تھا۔ وہ ایک نارنجی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی لیکن اس ساڑھی میں چولی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لڑکی نے ساری کے نچلے حصے کو ہی لپیٹ لپاٹ کر بالائی جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نوعمر لڑکی کے ساتھ شوہر اور بچے کی موجودگی میں ناروا سلوک ہوا ہے۔ غالباً اروشی نے بھی اپنی بہن کے اس ناگفتہ بہ حلیے کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی اوڑھنی اتار کر لڑکی کے جسم پر ڈال دی۔

○☆○

اگلے روز میرے اور زریں گل کے درمیان یہی موضوع زیر بحث رہا کہ اروشی کی بہن کے گھر کو آگ لگانے والے اور اس سے زیادتی کرنے والے کون لوگ ہیں۔ ہم بہت دیر قیاس آرائیاں

یہاں نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑا کر ایک کوشش کر رہی ہو۔" یہ تھی اور بار بار اس پر زور دے رہا تھا۔ اس میں کوئی بات ... یا بہن کسی شہری نوجوان سے پیار کرتی ہوگی ہیں۔" اسی علاقے کے کسی شخص سے ہوگی۔ شہری

"تمہیں صحیح سمجھ رہا ہوگا اور بری سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا جھوٹ نہیں بول رہی ہو۔ جو شروع سے لڑکی پر بری نظر رکھتا تھا اس کے خطرناک ارادوں سے ... وہ لڑکی کے گھر پر حملہ کر کے اس پر ظلم کا مزاحمتی کے حوالے کر دے گا۔ ام اس ناکام ہیرو پر آئے گا جو لڑکی کے سرکشی اپنے جسم پر جھیل ... اپنی اس کہانی کی تصدیق میں زریں گل اور روایتیں لے رہی ہو دو فلموں کی مثالیں بھی پیش کر دیں۔

"ہرگز نہیں" بی میرے! یہ پاکستان نہیں سری لنکا ہے۔ ہوں۔ میں یقین کر یہاں کے لوگ وحشیہ مزاد دورین کے کہنے پر ہی سے آپ

مجبور وہ بولا "استاد صیب! بات سری لنکا یا پاکستان کا نہیں، جذبات کا ہے اور جذبات ہر جگہ ایک طرح کا ہوتا ہے۔ اب آپ بتائیں ہاں سری لنکا میں کسی لڑکے سے اس کا محبوب چھن جائے تو وہ روئے گا نہیں، اور وہ روئے گا تو کیا پیے گا، وہی پیے گا جو فلموں میں ہیرو صدیوں سے پیتا آیا ہے۔ شراب پیے گا۔ جب شراب پیے گا تو کس کے پاس بیٹھے گا؟ بالکل ظاہر ہے کہ برے دوستوں کے پاس بیٹھے گا۔ اب ام اسٹوری کے دوسرے پارٹ کی طرف آتا ہے۔ ذرا سوچیں، اپنے دماغ سے سوچیں۔ ہیرو خود تو اپنی محبوبہ کا گھر برباد نہیں کرے گا؟"

"کیوں، ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟" میں نے اس کی بات کاٹی "سری لنکا میں محبوبہ کا گھر برباد کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ بندہ پکڑا نہ جائے۔"

"بات پکڑے جانے کا نہیں استاد صیب! جذبات کا ہے۔ ہیرو کتنا بھی گھٹیا نسل کا ہو اپنی محبوبہ کو برباد کر ہی نہیں سکتا۔ ام لالہ سدھیر کا مثال نہیں دے گا۔۔۔ وہ دے بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس نے تو کبھی اپنی محبوبہ کا شادی کہیں اور ہونے ہی نہیں دیا۔ ام آپ کو دلیپ کمار کا مثال دے گا۔ وہ بے چارہ کمزور جان ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے اکثر فلموں میں اس کی محبوبہ کا شادی کسی اور سے ہو جاتا ہے۔ اب آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کسی فلم میں دلیپ صاحب نے اپنی شادی شدہ محبوبہ کو چھیڑا ہے؟"

"نہیں چھیڑا ہے لیکن تم تو سری لنکا کی مثال دے رہے تھے۔"

"سوری۔ انڈیا اور سری لنکا میں فرق ہی کتنا ہے۔ بیچ میں ذرا سا سمندر ہی تو ہے۔ انڈیا کے فوجی جب کنیا کماری پر کھڑے ہو کر بڑھکیں مارتے ہیں تو سری لنکا میں صاف سنی جاتی ہیں۔ ام نے خود پڑھا تھا اخبار میں۔"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو۔ یہ بتاؤ تمہاری کمر کا کیا حال ہے؟"

ایک دم زریں گل کے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ گفتگو کے دوران بے خیالی میں کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا، تڑپ کر نیچے آ گیا۔

اسی روز دوپہر کو یعقوب میرے پاس آیا۔ یعقوب ایک مسلمان سنہالی ملازم تھا اور سینئر ہونے کی وجہ سے دوسرے ملازم اسے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں موجود تمام ملازمین کی طرح یعقوب بھی انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "مسٹر شاہ جہاں، تمہیں اپنی نئی ڈیوٹی معلوم ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولا "مالک چند روز تک کولمبو میں رہیں گے۔ اس لیے مالکن کو گولف گراؤنڈ لانے اور لے جانے کی ذمے داری تمہاری ہوگی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مالکن روزانہ گولف گراؤنڈ جایا کریں گی۔"

"ہاں۔۔۔ وہ روزانہ ڈھائی سے تین بجے کے دوران میں نکلا کریں گی۔ ایک باڈی گارڈ بھی ان کے ساتھ ہوا کرے گا۔"

میں نے کہا "ایک سوال پوچھ سکتا ہوں" یعقوب نے سر کے اشارے سے رضامندی ظاہر کی، میں نے پوچھا "جو ذمے داری تم نے مجھ پر لگائی ہے اس کی ہدایت کس کی طرف سے جاری ہوئی ہے۔"

"مالک نے خود یہ ہدایت جاری کی ہے۔ آج صبح کولمبو سے ان کا فون آیا تھا۔"

یعقوب واپس چلا گیا۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ آخر شیخ عاصم کس داؤ پر ہے۔ وہ کیوں بار بار جان بوجھ کر مجھے اور غزالہ کو تنہائی فراہم کر رہا ہے۔ کیا وہ مجھے غزالہ کے قریب رکھ کر میرے اعصاب توڑنا پھوڑنا چاہتا ہے۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ میں کوئی غلطی کروں اور ہمیشہ کے لیے غزالہ کی نظروں سے گر جاؤں۔۔۔ یا پھر وہ اپنی بیوی کی پارسائی کا امتحان لے رہا ہے؟ ایک عجیب الجھا ہوا سا معما تھا یہ۔

یعقوب کی ہدایت کے مطابق میں تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ تین بجے کے لگ بھگ غزالہ آ گئی۔ ایک مسلح مقامی محافظ اس کے ساتھ تھا۔ ہم پیدل ہی اس خوب صورت سڑک پر چل نکلے جو درختوں کے درمیان بل کھاتی گولف گراؤنڈ کی طرف جاتی تھی۔ ہم دونوں شانہ بہ شانہ چل رہے تھے۔ سنہالی محافظ ہمارے پیچھے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ گراؤنڈ تک کا فاصلہ ہم دونوں نے ایک بوجھل خاموشی میں طے کیا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی گراؤنڈ میں ملازمین ضروری سامان کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔ غزالہ کا کوچ ایرانی محمد اسحاق بھی کھیل کے لباس میں موجود تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا تاجر محمد اسحاق گولف گراؤنڈ کے پاس ہی واقع ایک خوب صورت کاٹیج میں رہتا تھا۔

گولف گراؤنڈ میں غزالہ نے شام تک ٹریننگ لی پھر میرے اور محافظ کے ساتھ واپس ریسٹ ہاؤس روانہ ہو گئی۔ حسب سابق

محافظ ہمارے عقب میں کچھ فاصلہ رکھ کر آ رہا تھا۔ بار بار میرا دل چاہ رہا تھا کہ غزالہ سے فریال کے بارے میں پوچھوں لیکن "مشورہ دار" دیوار بن کر میرے سامنے آ جاتی تھی۔ میں غزالہ سے کہہ چکا تھا کہ یہ میری جنگ ہے اور میں اپنے زور بازو پر لڑوں گا۔ اب زیب نہیں دیتا تھا کہ میں اس سے فریال کے بارے میں سوال کروں۔ غزالہ نے شاید میرے ذہن میں جھانک لیا تھا، میری مشکل آسان کرتے ہوئے بولی "میں نے کل رات آپ کو ٹیکسی کی طرف گھورتے دیکھا تھا۔ شاید آپ فریال کے بارے میں کھوج لینا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں اس موقعے پر آپ کو ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔ یہ بہت خطرناک ہوگا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں اور ... کی مہربانی کا انتظار کروں جو کبھی نہیں ہوگی۔"

... نے ناراض نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "میں ... کچھ کہنا نہیں چاہتی لیکن اتنا تو مجھے کہنا ہی پڑے گا ... کے لیے کوئی خطرہ پیدا مت کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ... بالکل محفوظ ہے اور اللہ نے چاہا تو بہت جلد آزاد بھی ہوگی۔۔۔ پلیز شاہ جہاں، آپ کوئی جلد بازی نہ کریں۔"

میں نے کہا "غزالہ! دو باتوں میں سے ایک بات تو ضرور ہوگی، یا تم وفادار بیوی نہیں ہو۔۔۔ یا مجھے غلط مشورہ دے رہی ہو۔"

وہ ایک دم روہانسی ہو گئی "پلیز شاہ جہاں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور پریشان نہ کریں۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی زبردست گڑبڑ ہے۔ کوئی ایسی خرابی موجود ہے یہاں جس کا علم شاید شیخ عاصم کو بھی نہیں۔"

میں نے چونک کر غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے کہا "تمہارا مطلب کسی سازش سے ہے؟"

"شاید۔۔۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی "کم از کم ایک شخص کو تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ وہ اس ریسٹ ہاؤس کے جانے پہچانے چہروں میں سے ہے۔ عاصم اس پر مکمل اعتماد کرتے ہیں لیکن وہ اعتماد کے قابل نہیں۔"

"مثلاً کیا دیکھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

غزالہ نے کن انکھیوں سے پیچھے آتے محافظ کو دیکھا اور بولی "یہ وقت مناسب نہیں، موقع ملا تو آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"اس واقعے کا تعلق کل رات والی واردات سے تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

میرا اشارہ کل رات والی آتشزدگی کی طرف تھا۔ غزالہ میری بات سمجھ گئی۔ کہنے لگی "ممکن ہے ایسا ہو لیکن اس انداز میں نہیں جس انداز میں آپ سمجھ رہے ہیں۔"

ہم اب ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے لہٰذا خاموش ہو گئے۔

O☆O

سہ پہر کو میں روزانہ غزالہ کو لے کر گولف گراؤنڈ پہنچتا تھا۔ وہاں سے ہماری واپسی شام کے وقت ہوتی تھی۔ رات کا کھانا ہمیں نو بجے ملتا تھا۔ زریں گل اصرار کر کے مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دس گیارہ بجے تک گپ شپ کرتے پھر سو جاتے۔ دو دن کے وقفے کے بعد اروشی دوبارہ ریسٹ ہاؤس میں نظر آنے لگی تھی۔ ہماری ضروریات کا خیال رکھنا ایک بار پھر اس کی ڈیوٹی میں شامل ہو گیا۔ وہ بڑی کومل سی لڑکی تھی اور جیسی باہر سے تھی ویسی ہی اندر سے بھی۔۔۔ نرم خو، محبت کرنے والی اور خوشبودار۔ بہن پر گزرنے والے حادثے نے اسے کچھ سوگوار سا کر رکھا تھا۔ چہرہ اترا اترا تھا اور بیمار آنکھیں آنسوؤں سے دھل دھلا کر شیشے کی طرح شفاف ہو گئی تھیں۔ ایک رات میں بارہ ایک بجے سویا اور ناشتا گول کر کے اگلے روز ڈیڑھ دو بجے تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو زریں گل کی آواز آئی۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھا اروشی سے باتیں کر رہا تھا۔ اروشی ٹوٹی پھوٹی ہندی بھی بول لیتی تھی۔ وہ بڑے دھیان سے زریں گل کی گلابی اردو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زریں گل کہہ رہا تھا "ہمارے استاد صیب کا غصہ ابھی یہاں کسی نے نہیں دیکھا۔ غصے میں ایک دم پھٹ پڑتا ہے بالکل ایٹم بم کا ماتق۔ بڑا بہادر فیملی ہے یہ۔ ۶۵ء کا جنگ تمہیں یاد ہوگا۔ پاکستان نے انڈیا کو کیسا رگڑا دیا تھا۔ ہمارے استاد صیب کے بڑے بھائی کو نشان حیدر ملتے ملتے رہ گیا تھا۔ وہ کھیم کرن میں گیا تھا اکبر مغل اعظم کی تلاش میں۔ وہاں سے غصہ کھا کر وہ سیدھا انڈیا میں گھس گیا۔ تین دیہات پر اس نے تن تنہا قبضہ کر لیا تھا۔ بعد میں پاکستانی فوجی اسے بڑی مشکل سے واپس لے کر آئے۔"

"ویری گڈ۔۔۔ بہت خوب" اروشی نے بلا سمجھے زور زور سے سر ہلایا۔

اس کے انداز پر زریں گل نہال ہو گیا "بی بی جی! جب آپ ایسے مسکراتا ہے تو ام کو بہت پیارا فل لگتا ہے، بالکل گلاب جامن کا ماتق۔ گلاب جامن سمجھتا ہے آپ؟ آپ کی طرح تھوڑا تھوڑا سانولا ہوتا ہے لیکن ایکدم فسٹ کلاس۔"

"وہاٹ گلاب جامن؟" اروشی نے پوچھا۔

"اوہو۔۔۔ آپ کو گلاب جامن کا نہیں پتا۔ وہ ذرا لمبا لمبا ہوتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ اونٹ کا مینگنی ہوتا ہے۔"

"یہ مینگنی کیا ہوتا ہے؟"

"او خدایا۔ مینگنی کا بھی نہیں پتا آپ کو۔۔۔ مینگنی۔۔۔ مینگنی، جسے پنجابی میں مینگن کہتے ہیں۔۔۔ اوہو آپ تو بالکل ہی بھولا ہے۔ اچھا ام استاد صیب سے اس کا انگریزی پوچھ کر آپ کو بتائے گا اوکے؟"

"اوکے" اروشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے دروازے سے باہر نکل کر کہا "اوئے چندا ابن چندہ۔ تجھے گلاب جامن کے لیے کوئی اچھی مثال نہیں ملی تھی؟ بہت شکریہ ہے تو۔ مجھے یقین ہے کہ اب تجھے کبھی سری لنکا سے واپس لوٹنا اور گلاب جامن کھانا نصیب نہیں ہوگا۔"

مجھے دیکھ کر اروشی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور انگلش میں بولی "مسٹر شاہ جہاں! میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ آپ جاگے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جلدی سے کھانا وغیرہ کھالیں۔ گراؤنڈز جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"او کے تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"تھینک یو" وہ بھی جواباً مسکرائی۔ اس کے ہونٹ کا ننھا سا زخم پھیل کر بیضوی شکل اختیار کر گیا۔

وہ لوٹ گئی تو میں نے زریں گل سے کہا "او ئے زریں! تو بڑا زبان دراز اور گپ باز ہے۔ کیا بتا رہا تھا اسے گھیم کرن اور میرے فرضی بھائی کے بارے میں۔"

وہ اپنی شرمندگی چھپا کر بولا "استاد صیب! جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ یہاں یہ لوگ امارا دشمن ہے اور دشمن پر رعب ڈالنے کا کوئی موقع گنوانا نہیں چاہیے۔ امارے دشمن کو مالوم ہونا چاہیے کہ ام بہادر بھی ہے اور جہاندیدہ بھی۔"

میں نے کہا "جہاندیدہ تو تم ہرگز نہیں ہو۔ جہاندیدہ ہوتے تو چیچنی کی مثال نہ دیتے کیونکہ تمہیں اس کی انگریزی نہیں آتی۔"

تھوڑی دیر بعد غزالہ تیار ہو کر آ گئی اور میں اس کے ساتھ گولف گراؤنڈ کی طرف چل دیا۔ محافظ حسب معمول ہمارے ساتھ تھا۔ راستے میں میں نے محسوس کیا کہ غزالہ کچھ بتانا چاہ رہی ہے۔ آخر اس کے ہونٹوں کی بات اس کی زبان پر آ گئی۔ کہنے لگی "اروشی تمہیں کیسی لڑکی لگتی ہے؟"

میں نے کہا "اچھی ہے۔ ہمدرد اور ذہین ہے۔ مجھے اس کی بہن کے ساتھ پیش آنے والے حادثے پر افسوس ہے۔"

غزالہ بولی "بات تو واقعی افسوس کی ہے۔"

میں نے پوچھا "کچھ سراغ لگا مجرموں کا؟"

"ابھی نہیں۔ مقامی پولیس چھان بین کر رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ کسی خاندانی جھگڑے کا شاخسانہ ہو۔"

میں نے کہا "تم نے اروشی کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھا ہے؟"

وہ بولی "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے ریسٹ ہاؤس میں رہنے والے ایک فرد پر شک ہے۔ وہ فرد اروشی ہے۔ مجھے اب یقین ہو چلا ہے کہ اروشی کسی گہرے چکر میں ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"آپ اس کی شکل و صورت اور معصومیت پر نہ جائیں۔ شاید عاصم بھی اس کی اسی معصومیت سے دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ وہ ایک چالباز لڑکی ہے۔"

"کیا تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اور آپ کو بھی دکھانا چاہتی ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ کل رات تک انتظار کریں۔ اگر عاصم کولمبو سے واپس نہ آئے تو آپ رات نو اور دس بجے کے درمیان ریسٹ ہاؤس کے سائیڈ گیٹ کی طرف آ جائیں۔ ہمارا بیڈ روم اس گیٹ کے بالکل سامنے ہے۔ آپ وہاں برآمدے میں کھڑے ہو جائیں۔ میں آپ کو دیکھ لوں گی۔ اگر آس پاس کوئی محافظ نہ ہوا تو میں فوراً باہر آ کر آپ سے مل لوں گی ورنہ آپ تھوڑی دیر انتظار کر لیں۔"

میں نے کہا "کوئی اشارہ نہیں دو گی کہ معاملہ کیا ہے؟"

"پلیز شاہ جہاں! کل جب آپ آئیں گے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

بہت ہلکی باریک سی پھوار پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ گولف گراؤنڈ تک پہنچتے پہنچتے ہم تقریباً بھیگ گئے۔ غزالہ کے پاس میں گو ٹینس شوز تھے لیکن اس نے شیفون کی ایک نفیس ساڑی بھی زیب تن کر رکھی تھی۔ سر پر پی کیپ تھی۔ اس حلیے میں وہ ہمیشہ سے زیادہ جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ بھیگی بھیگی ساڑی کا باریک پلو اس کی کمر اور پیٹ سے چپک گیا تھا اور عقب میں آتے ہوئے سنہالی محافظ کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار بھٹک جاتی تھیں۔ ایک برساتی نما کوٹ جو میں نے نکلتے ہوئے احتیاطاً کندھوں پر ڈال لیا تھا غزالہ کے کندھوں پر ڈال دیا۔

شام کو ہماری واپسی جلدی ہو گئی کیونکہ تھوڑے سے وقفے کے بعد بوندا باندی پھر ہونے لگی تھی۔ راستے میں غزالہ نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ واپس آ کر میں اور زریں گل گپ شپ میں مصروف رہے۔ میری طرف سے اس بات کی تسلی ملنے کے بعد کہ فریال یہاں بالکل محفوظ ہے، زریں گل کی خوش مزاجی اور بے فکری کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ بہرحال میرے دستانوں کے بارے میں وہ اب بھی بہت فکر مند رہتا تھا۔ کئی بار کہہ چکا تھا کہ میرے دستانوں کو دیکھ کر اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ خود ان دستانوں میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔ رات کا کھانا ہم نے نو بجے کھایا۔ تکی کی روٹی، ایک خاص قسم کی مقامی ترکاری، مچھلی اور اناس کا تازہ جوس۔ اس کے علاوہ بریانی بھی حسب معمول ہمارے کھانے کا حصہ تھی۔ سری لنکا آ کر ہم نے کئی قسم کی بریانی کھائی تھی اور ہر قسم پہلی سے اچھی لگی تھی۔ اس مسالے دار بریانی کے ساتھ سرکہ کی سرخ مرچیں بھی ہوتی تھیں جو ایسا کراری پن پیدا کرتی تھیں کہ کئی گھنٹے تک زبان سنسناتی رہتی تھی۔

کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر ریڈیو سیلون سنا پھر اس بات پر خیال آرائی کرتے رہے کہ کل رات غزالہ مجھے کیا بتانا چاہ رہی ہے اور یہ کہ شیخ عاصم چار پانچ روز سے کولمبو میں کیا کر رہا ہے؟ یہ دونوں موضوعات خاصے توجہ طلب تھے اور ہم سے گہری سوچ بچار کا تقاضا کر رہے تھے۔ تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ ہم نے زیادہ سوچنا مناسب نہیں سمجھا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ابھی مشکل سے میں نے جھپکی ہی لی تھی کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ زریں گل وہاں موجود نہیں تھا۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور میرے سامنے شنکر شکرا اپنے ساتھی شاہی کے ساتھ کھڑا تھا۔

شنکر کی غیر انسانی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ شراب کی سرخی بھی تھی۔ وہ تند و تیز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ یہ ٹانکے اسی لڑائی کی نشانی تھے جو چند روز پہلے اس عمارت میں میرے اور اس کے درمیان ہوئی تھی۔ غالباً اس لڑائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا غیظ و غضب بھی سرخی بن کر شنکر کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرے بال مٹھی میں جکڑے اور 45 بور طاقتور پسٹل کی نال میری پیشانی سے لگا دی "کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے کڑک کر حکم دیا۔

جونہی میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، شنکر نے زوردار گھونسا میرے جبڑے پر مارا۔ میں الٹ کر بستر سے نیچے گرا۔ شنکر نے مجھے اپنے وزنی بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے پسٹل کو بھی خطرناک انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مزاحمت کروں یا نہیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ نشے میں ہونے کے باوجود شنکر مجھے قتل نہیں کرے گا لیکن وہ میری ٹانگوں یا بازوؤں پر گولی چلا سکتا تھا۔ 45 بور کی ایک گولی مجھے کئی ہفتوں کے لیے بستر پر ڈالنے کے لیے کافی تھی۔ چند زوردار ٹھوکریں رسید کرنے کے بعد شنکر پیچھے ہٹ گیا۔ "اسٹینڈ اپ نا۔۔۔ اینڈ سٹ ڈاؤن ہیر۔" اس نے غرا کر بید کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اٹھا اور کپڑے جھاڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ شنکر نے جیب سے سفید رومال نکالا اور میری باچھ سے بہہ آنے والی خون کی پتلی سی لکیر پونچھ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اب وہ بڑی پرسکون لیکن خطرناک نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ بڑی دھیمی اور فیصلہ کن آواز میں بولا "تم ابھی یہاں سے نکلو گے اور مسز غزالہ کے کمرے میں جاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری آواز پر وہ دروازہ ضرور کھولیں گی۔ تم کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لو گے اور۔" ایک لحہ توقف کر کے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا "تم مسز غزالہ پر مجرمانہ حملہ کرو گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے شنکر کی زبان سے الفاظ کے بجائے زہر میں بجھے ہوئے تیر نکلے ہیں اور میری سماعت میں سفر کر کے دماغ میں پیوست ہو گئے ہیں۔ میں نے پھٹی ہوئی نظروں سے شنکر کو دیکھا۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ ہونٹوں تک نہیں آ رہے تھے۔ شنکر نے بڑے اطمینان سے اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔۔۔ تمہیں یہ سب کچھ کرنا ہو گا۔" اس کی آواز میں وہی سنگلاخ چٹانوں جیسی سختی تھی جو مدمقابل کو دہلا دیتی تھی۔

میں لرزتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ الفاظ مفلوج ہونٹوں کو چیرتے ہوئے میرے منہ سے نکلے "اپنی زبان بند رکھو کتے! میں تیری جان لے لوں گا۔"

عالم وحشت میں میں شنکر پر جھپٹا۔ شاہی نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں ایک لمحے میں یہ گھیرا توڑ سکتا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ اس سوال نے میری وحشت کو چند لمحوں کے لیے زنجیر کیا۔ شاہی نے مجھے کھینچ کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ شنکر نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری گود میں پھینک دیا۔ "دیکھو اس کو" وہ غرایا۔

میں نے دونوں دستانہ پوش ہاتھوں سے لفافہ تھام کر اپنی گود میں الٹا۔ اس میں سے کارڈ سائز کی کچھ فحش تصویریں پھسل کر میری گود میں گر گئیں۔ ان دنوں ایسی حیا سوز تصویریں کابل وغیرہ سے اسمگل ہو کر پاکستان آتی تھیں اور مہنگے داموں بکتی تھیں لیکن وہ تصویریں عموماً آرٹ کے پیپروں پر ہوتی تھیں اور ان میں نظر آنے والے مرد و زن غیر ملکی ہوتے تھے۔ جو تصویریں میری گود میں پھیلی ہوئی تھیں وہ پاکستانی یا ہندوستانی مردوں کی تھیں اور ان میں جو ایک لڑکی نظر آ رہی تھی وہ بھی اسی خطے سے تعلق رکھتی تھی۔ لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ناگفتہ بہ تھا اور اس کی رضامندی کے بغیر ہو رہا تھا۔ وہ کہیں روتی تھی، کہیں چیخ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نیلگوں نشان تھے اور مرد جنہوں نے اپنے چہرے مخصوص ٹوپیوں میں چھپا رکھے تھے اسے ربڑ کی طرح توڑ مروڑ رہے تھے۔

چند تصویروں پر نگاہ ڈال کر میں نے ساری تصویریں فرش پر گرا دیں۔ شنکر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دھواں میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے بولا "یہی سب کچھ ساہی صاحب کی بیٹی کے ساتھ ہونے والا ہے۔ سیٹ تیار ہے۔ سیٹ پر کام کرنے والے بھی تیار ہیں۔ صرف۔۔۔ تمہارے انکار کی دیر ہے۔ پھر تم اس بدنصیب لڑکی کی چیخیں بڑی آسانی سے اس ٹیلی فون پر سن سکو گے۔"

اس نے بیڈ کے نیچے پڑے گرد آلود ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا۔

میرے ذہن میں زلزلہ برپا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی تھی۔ اگر میں اسے پار کر جاتا تو منحوس دستانوں کے باوجود شنکر شکرا کا میرے ہاتھوں سے بچنا محال تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا؟ میں الیکٹرانک ڈیوائس کے چنگل میں تھا۔ اگر وہ ڈیوائس واقعی اسی طرح کام کرتا تھا جیسے شنکر نے مجھے بتایا تھا تو پھر میں شنکر کو مار کر بھی کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ نہ یہاں سے بھاگ سکتا تھا، نہ شیخ عاصم کو ڈھونڈ کر اس پر حملہ آور ہو سکتا تھا، نہ فریال کو بچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں اس ریسٹ ہاؤس کی چار دیواری میں مسلح محافظوں کے ہاتھوں یا ڈیوائس کی وجہ سے مر جاتا تو میرے مرنے سے فریال، زریں گل یا شنا کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ مکمل طور پر شیخ عاصم اور شنکر کے رحم و کرم پر ہوتے۔

شاہی نے اب اپنی خوفناک ایل ایم جی سنبھال لی تھی اور کمرے کے ایک کونے میں چوکس کھڑا ہو گیا تھا "میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔" شنکر نے کہا۔

وہ میری ذہنی کیفیت بھانپ چکا تھا، لہٰذا مجھ سے ہٹ کر کافی فاصلے پر کھڑا تھا۔ اگر میری کسی اچانک حرکت کی وجہ سے شاہی کو گولی بھی چلانی پڑتی تو شنکر کو گزند نہ پہنچتا۔

چاہتا ہوں۔"

"ہوں" شنکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "کوئی مہلت نہیں۔ کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ تمہیں ہمارے کہنے پر عمل کرنا ہوگا یا اس ٹیلی فون سیٹ پر لڑکی کی چیخیں سننا ہوں گی۔ اور اس کا فیصلہ تمہیں صرف پانچ منٹ کے اندر اندر کرنا ہے" شنکر نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظریں جمادیں۔

"لل... لیکن تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ تم جانتے ہو کہ غزالہ شیخ عاصم کی بیوی ہے..."

"سب کچھ جانتے ہیں ہم اور شیخ صاحب بھی جانتے ہیں۔ تم ان جھمیلوں میں مت پڑو' صرف ہاں یا نہ میں جواب دو... تم بند کمرے میں مسز غزالہ سے دست درازی کروگے' ان کے کپڑے پھاڑوگے' ان کا جسم نوچ گے اور یہ ساری کارروائی ہم دیکھ رہے ہوں گے۔ اگر تم نے کسی موقعے پر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی یا مسز غزالہ کو یہ باور کرایا کہ تم یہ سب کچھ مجبوری کے تحت کررہے ہو تو فوراً اس عمارت کے ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں ساہی صاحب کی لڑکی کی چیخ وپکار شروع ہوجائے گی۔"

میں کچھ دیر اپنے آپ سے الجھتا رہا پھر میں نے دبی دبی آواز میں پوچھا "تم لوگ... مجھے کس حد تک لے جانا چاہتے ہو؟"

"بہت آگے تک نہیں۔ ہم تمہیں زیادہ لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں دیں گے۔ تم جانتے ہی ہو وہ مالک کی بیوی ہیں۔ ہم بہت جلد مداخلت کریں گے اور محترم خاتون کو تم سے چھڑالیں گے۔"

میں نے تصور کی نگاہ سے غزالہ کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ وہ چیخ رہی تھی اور مجھے اپنے اوپر سے ہٹارہی تھی۔ میرا سارا جسم جھرجھرا کر رہ گیا۔ نہیں... میں یہ نہیں کرسکتا تھا' کسی قیمت پر نہیں' کسی حال میں نہیں۔ غزالہ کے اعتبار کو کند چھری سے ذبح کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ میں ذلت کے عمیق ترین گڑھے کو اپنے سامنے دیکھوں اور اس میں چھلانگ لگادوں۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔

"دو منٹ گزر چکے ہیں" شنکر نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہ بدستور گھڑی پر تھی۔

میرے اندر کا ناقابل تسخیر جہانی استاد ٹوٹنے پھوٹنے لگا۔ میں اپنے بدترین دشمن کے روبرو تھا اور حالات تقاضا کررہے تھے کہ میں اس سے رحم کی گزارش کروں۔ ایک دم ہی میرے جسم کی تمام توانائیاں نڈھال ہوکر سوگئی تھیں۔ میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "شنکر مجھے تھوڑی دیر سوچنے کا موقع دو۔"

شنکر نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس کی نگاہ بدستور گھڑی پر تھی۔ اس نے "پش بٹن" فون سیٹ پر ایک نمبر ڈائل کیا پھر ایک اور بٹن دبا کر کال کو "ہینڈ فری" کردیا۔ اب بیل کے جانے کی آواز ریسیور کے بجائے مائیک سے آرہی تھی اور پورے کمرے میں سنی جارہی تھی۔

تیسری گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھاکر "ہیلو" کہا۔ یہ ایک کرخت مردانہ آواز تھی۔ شنکر نے کہا "ہیلو جیکی' تیاری مکمل ہے؟"

"یس سر!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"او کے۔ دو منٹ مزید انتظار کرو۔"

فون بند کرکے شنکر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔

شنکر کی بے دریغ ٹھوکروں نے میرے پہلو کا درد جگادیا تھا لیکن یہ شدید درد بھی ان بے درد لمحات میں معمولی درجے کا اور بے معنی محسوس ہورہا تھا۔ میرا حلق خشک تھا اور زبان تل کھاکر تالو سے جاچپکی تھی۔ ایک طرف فریال تھی جو مجھ پر اندھا اعتبار کرکے رحم [illegible] سے سیکڑوں میل دور میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ دوسری طرف غزالہ تھی جس نے اپنے من مندر میں نہ جانے میری کون سی تصویر سجا رکھی تھی۔ میں ایک قاتل دوراہے پر تھا اور گھڑی کی سوئی ایک بے رحم ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"او کے۔ اب مجھے بتاؤ کیا چاہتے ہو تم؟" پانچ منٹ پورے ہونے پر شنکر نے سوال کیا۔

میں کوشش کے باوجود جواب نہیں دے سکا۔ میری پیشانی نمکین پسینہ میرے ہونٹوں کو تر کررہا تھا۔ شنکر نے نمبر دوبارہ ڈائل کیا اور اپنے کارندوں سے بولا "او کے۔ یو کین انجوائے رو ٹائٹ" اس کا لہجہ برفانی تھا۔

شنکر کی آواز مجھے کہیں دور' بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ در و دیوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ٹیلی فون کے اسپیکر پر مجھے فریال کی چیخ سنائی دی۔ شاید اسے گھسیٹ کر فون کے پاس لایا گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی' خدا [illegible] کے واسطے دے رہی تھی۔

"ان کو روکو کتے... ان کو روکو" میں نے کہا۔ میرے اندر گہرائیوں سے جیسے کوئی اور شخص شنکر سے مخاطب ہوا تھا "میں جارہا ہوں' ہاں جارہا ہوں میں..."

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ شنکر بے حد زہریلے انداز میں مسکرایا۔ اس نے مائیک پر جھک کر اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ ابھی انتظار کریں۔ فریال کی چیخیں ماند پڑگئیں۔ پھر اس کی آواز معدوم ہوگئی۔ وقتی طور پر بلا اس سے ٹل گئی تھی۔

"چلو آؤ" شنکر نے بڑے تحکم سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں جیسے خواب میں چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا۔ شنکر میرے ساتھ آرہا تھا "کوئی چالاکی نہیں چلے گی" اس نے پھر تنبیہ کی۔

احاطے میں پہنچ کر شنکر مجھ سے علیحدہ ہوگیا۔ میں اکیلا ہی اس سائیڈ گیٹ کی طرف بڑھا جس کے عین سامنے غزالہ اور شیخ عاصم کا خوب صورت بیڈروم واقع تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے یہاں کل آنا تھا لیکن میں آج آرہا تھا اور ایسی نیت سے آرہا تھا جس کا غزالہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ [illegible] میں پہنچ کر [illegible]

[illegible] کے لیے رک گیا۔ یہاں نیم تیرگی تھی اور ارد گرد کوئی سنتری گارڈ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا دل میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ غزالہ کا سامنا کرنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی لیکن مجھے سامنا کرنا تھا۔ زندگی کا ایک کڑوا امتحان سمجھ کر مجھے اس مرحلے سے گزرنا تھا۔ جب مجھے شیخ عاصم اپنے ساتھ یہاں لایا تھا تو یہ بات کھل گئی تھی کہ وہ مجھے بڑے اطمینان سے ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے اور میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھا۔ سابق تجربے کی روشنی میں میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے اس ریسٹ ہاؤس میں چھوٹے چھوٹے حقیر کام لے کر اپنی انا کی تسکین کرے گا۔ گاہے گاہے مجھے اپنے کرائے کے غنڈوں سے پٹوائے گا اور ہوسکتا ہے کہ بھوک پیاس کی مار سے مجھے توڑنے پھوڑنے کی کوشش کرے لیکن اس نے تو آغاز ہی انتہا سے کرڈالا تھا۔

میں نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر خواب گاہ کے بیرونی دروازے پر دستک دی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا اور مدھم نیلگوں روشنی نظر آئی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ مجھے اپنے سامنے غزالہ کی صورت نظر آئی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ بال شانوں پر بکھرے تھے۔

"آپ یہاں؟ آپ کو تو کل آنا تھا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں... آنا تو... کل تھا لیکن تم سے ایک ضروری بات کرنا پڑگئی۔"

"جج... جی..." اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

میں نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ جیسے یہاں کھڑے ہوکر بات کرنا میرے نزدیک مناسب نہ ہو۔ غزالہ چند لمحے متذبذب رہی پھر دروازہ چھوڑتے ہوئے بولی "آ... آئیے اندر آجائیے۔"

میں نے کمرے میں جاکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ مجھ پر اندھا اور لازوال اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔ میری اس حرکت کا اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ ہاں روشنی میں میرا چہرہ دیکھ کر وہ چونک ضرور گئی۔ آخر ڈاکٹر تھی' بندے کی ظاہری حالت سے اس کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ لگاتی تھی۔

"کیا بات ہے' آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے میرے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... ہاں... ٹھیک ہوں۔ بس ذرا چکر سا آرہا ہے۔"

"آپ بیٹھ جائیے... پلیز آپ بیٹھ جائیے۔ آپ شاید کسی سے لڑکر آئے ہیں۔ آپ کے ہونٹ سے خون رس رہا ہے۔ ٹھہریے میں آپ کے لیے دوا لاتی ہوں" وہ تیزی سے الماری کی طرف گئی۔ اس کے ہر انداز سے ہمدردی پھوٹ پڑرہی تھی۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اس شاندار خواب گاہ کا جائزہ لیا۔ کروڑوں روپیہ صرف ہوا ہوگا اس کی آرائش پر۔ شیخ عاصم کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ اس خواب گاہ میں ہونے والی ہر حرکت کو دیکھ سکے اور ہر آواز کو سن سکے۔ ممکن تھا کہ یہ آگاہی اسے براہ راست حاصل ہوتی ہو اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی چھوٹا سا ٹی وی کیمرا اس خواب گاہ کے سامان آرائش میں کہیں نصب ہو اور یہاں وہاں مائیکرو فون چھپائے گئے ہوں۔ ایک ننھا سا مائیکرو فون تو قلم کے ڈھکنے میں بھی سما سکتا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اگر میں نے غزالہ سے کوئی بات کرنے کی کوشش کی تو فوراً شیخ عاصم یا شنکر باخبر ہوجائیں گے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ نادیدہ نگاہیں اس خواب گاہ میں بھی مجھ پر مرکوز ہیں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جو کہا گیا ہے وہ کردوں۔

غزالہ تھوڑی سی روئی کسی دوا میں بھگوکر لائی اور میرے ہونٹ کو دباکر کھڑی ہوگئی۔ یہ اس کی فطری نیکی اور روحانی پاکیزگی تھی کہ وہ اس بند کمرے میں بھی میرے پاس کھڑے ہوکر کوئی اندیشہ محسوس نہیں کررہی تھی۔ میرے سینے میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ میں یہ کیسے کروں گا؟ میں یہ کیسے کروں گا؟ خون رسنا بند ہوگیا تو غزالہ کوئی دوسری دوا لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھی۔ ایک بار پھر اس کی پشت میری طرف تھی۔ مجھے یہ آسان محسوس ہوا کہ عقب سے اسے دبوچ لوں۔ میں بہ آہستگی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ دبیز قالین پر میرے قدموں نے کوئی آواز پیدا نہیں کی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "غزالہ! مجھے معاف کرنا... اور اس وقت کا انتظار کرنا جب میں اپنی اور تمہاری اس توہین کا قرار واقعی انتقام لے سکوں گا۔"

ایک قدم بڑھاکر میں نے غزالہ کو دبوچ لیا۔ وہ میرے بازوؤں کی آہنی گرفت میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے مڑکر میری طرف دیکھنا چاہا لیکن میں نے اس کی کوشش کو ناکام بنادیا۔ میرا دستانہ پوش ہاتھ اس کے گریبان میں گیا اور ایک جھٹکے سے گاؤن نیچے تک پھٹ گیا۔ میں نے اسے دھکیل کر بستر پر گرادیا۔ اس کا گداز جسم اچھلا اور وہ تڑپ کر سیدھی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت تھی۔ مجھے لگا جیسے میں سترہ سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ سترہ سال پہلے کی طرح میں نے آج پھر اس کا پیراہن پھاڑ دیا تھا اور وہ حیرت ناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"شاہ جہاں... شاہ جہاں! یہ آپ... کیا کررہے ہیں" وہ پھٹی ہوئی آواز میں چیخی "یہ آپ کو... کیا ہوگیا ہے... شاہ جہاں... شاہ جہاں" اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑا۔ میں نے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اس کی گردن سے پیوست کردیا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے کانوں میں صرف فریال کی چیخیں گونج رہی تھیں...!

"شاہ جہاں... شاہ جہاں" غزالہ نے مجھے ایک بار پھر جھنجوڑا۔

میں نے اس کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ میرا چہرہ اس کے گھنے نرم بالوں میں دھنستا اور ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ میں اپنے جسم کے نیچے اس کے جسم کا سما ہوا تلاطم صاف محسوس کر سکتا تھا۔ غالباً یہ قیامت خیز کشمکش دس پندرہ سیکنڈ جاری رہی تھی۔۔۔ پھر خوابگاہ کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا اور چند افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان میں سب سے آگے شنکر کا قریبی ساتھی شاہی تھا۔ شاہی اور دوسرے افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ شاہی نے میرے پیٹ میں چند زوردار گھونسے رسید کیے اور دھکا دے کر دور پھینک دیا۔ میں نے غزالہ کی جھلک دیکھی۔ اس کا ریشمی گاؤن پھٹا ہوا تھا۔ گردن پر اس خون کی سرخی تھی جو میرے ہونٹوں سے اب بھی بہہ رہا تھا۔ وہ جیسے سکتے کی کیفیت میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاہی نے بستر کی چادر سے اس کے عریاں کندھے ڈھانپ دیے۔ پھر وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے خواب گاہ سے باہر لے آئے۔ احاطے میں لے جا کر مجھ پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی گئی۔ وہ چار افراد تھے اور میں اس قابل تھا کہ ان کی مزاحمت کر سکوں لیکن نجانے کیوں مزاحمت کی خواہش ہی موجود نہیں تھی۔ ایک عجیب پژمردگی سی رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ یہ بات میں پہلے سے جانتا تھا کہ رشتوں کی زنجیر میں بندھ کر انسان کس طرح لاچار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کا تلخ تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔

شاہی اور اس کے ساتھی دل کی بھڑاس نکال چکے تو مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے سرونٹ کوارٹرز کے سامنے لے آئے۔۔۔۔ مارپیٹ کی آوازیں سن کر ریسٹ ہاؤس جاگ گیا تھا اور اب کئی افراد ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں شنکر شکرا بھی تھا۔ اس کی آنکھیں میرے لیے خون اگل رہی تھیں۔ شاہی نے دوسروں کو سنانے کے لیے بلند آواز میں شنکر کو اطلاع دی کہ میں "مالکن" کی خوابگاہ میں گھسا تھا اور ان سے دست درازی کرتے ہوئے موقع پر پکڑا گیا ہوں۔

شنکر نے پہلے حیرت اور پھر بے پناہ غضب کا اظہار کیا۔ اس کے حکم پر میرے پاؤں میں ایک رسی باندھی گئی اور سرونٹ کوارٹرز کے عین سامنے واقع ایک درخت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ شاہی اور اس کے ایک قابل ساتھی نے پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ان دونوں نے اپنی چرمی پیٹیاں اتار لیں اور ان سے مجھے بے دریغ پیٹنے لگے۔ پیٹیوں کے آخری سروں پر دھات کے وزنی بکل تھے۔ بکل ہتھوڑوں کی طرح میرے جسم پر ضربیں لگا رہے تھے۔ الٹا لٹکنے کی وجہ سے میری قمیص کھسک کر میرے چہرے پر آ گئی تھی اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے پیٹ اور کمر سے خون رسنے لگا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیم بے ہوش چھوڑ کر وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے جانے کے بعد تماشائی بھی ایک ایک کر کے چلے گئے۔ میں اسی طرح درخت سے الٹا لٹکا رہا۔

میرے جسم کا سارا خون سر اور بازوؤں میں جمع ہو چکا تھا۔ کنپٹیاں جیسے تڑخ رہی تھیں۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ میرے ٹخنوں سے کھال چھل گئی ہے اور نائیلون کی رسی گوشت میں گھسی جا رہی ہے۔

باقی کی شب میں نے اسی حالت میں گزاری۔ رات کی تاریکی میں صبح کا اجالا شامل ہوا تو درختوں پر پرندوں کی چہکار گونجنے لگی۔ گل پوش ریسٹ ہاؤس کے سرسبز در و دیوار میرے روبرو نمایاں ہونے لگے۔ میں نے اپنی خون آلود قمیص پھاڑ کر پھینک دی تھی اور اب ارد گرد کے مناظر دیکھ سکتا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش تھمی ہوئی تھی۔ اپنے دائیں ہاتھ پر دور مجھے وہ چھوٹا سا برآمدہ نظر آ رہا تھا جس میں شیخ عاصم کی سجی سجائی خوابگاہ کا دروازہ کھلتا تھا۔ میں خواب گاہ کی دیو ہیکل کھڑکی اتنی دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ کھڑکی کے ان بیضوی شیشوں کے پیچھے غزالہ تھی۔ ممکن تھا سو رہی ہو۔ ممکن تھا جاگ رہی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شیشے سے آنکھیں لگائے مجھے دیکھ رہی ہو۔ مجھے اس کی شکوہ کناں نگاہوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس ہوئی۔ یہ نگاہیں مجھ پر شکایت اور ملامت کے تازیانے برسا رہی تھیں۔ یہ نگاہیں پوچھ رہی تھیں مجھ سے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں ایسی پست اور قابل نفرت حرکت کر کے خود کو بدترین سلوک کا مستحق ٹھہرا دیا۔ ان نگاہوں نے برسوں تک مجھے ایک عالی شان مقام پر بٹھا کر میری پرستش کی تھی، اب یہ نگاہیں مجھے ذلت کے عمیق گڑھے میں دھکیل رہی تھیں۔

صبح کا اجالا اچھی طرح پھیل گیا تھا۔ مقامی محافظوں نے مجھے درخت سے اتار کر میری بندشیں کھولیں اور کمرے میں پہنچا دیا۔ زریں گل ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آیا تھا۔ اس کا سامان یہاں تک کہ چپل بھی جوں کی توں کمرے میں موجود تھی۔ منحوس ٹیلی فون بدستور بستر کے نیچے پڑا تھا جس پر میں نے دوسری جانب فریال کی چیخیں سنی تھیں۔۔۔ اور پھر ان چیخوں کو روکنے کے لیے شنکر شکرا کی مرضی کے مطابق عمل کیا تھا۔۔۔ کچھ دیر بعد اروشی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے الماری سے میرے لیے نیا لباس نکالا اور مجھے ہدایت کی کہ میں نہا لوں۔ میں کپڑے لے کر غسل خانے میں گھس گیا۔ جسم پر چرمی پیٹیوں کے سرخ نشان تھے۔ جہاں جہاں "بکل" سے چوٹ لگی تھی نیلگوں ابھار بن گئے تھے۔ ایسے کچھ نیلگوں ابھاروں سے خون بھی رس رہا تھا۔ نہانا میرے لیے ایک تکلیف دہ عمل ثابت ہوا۔ بہرطور جیسے تیسے میں یہ عمل کر گزرا۔ چند نیلگوں ابھاروں پر فرسٹ ایڈ کی ٹیپ چپکانے کے بعد میں نے کپڑے پہن لیے اور باہر نکل آیا۔ اروشی اس دوران میں میرے لیے کھانا لے آئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی جھلک رہی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع بات تھی۔ جو کچھ

میں نے کیا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد تو میں اس ہمدردی یا ترس کا حقدار نہیں تھا۔ شاید یہ لڑکی اصل بات جانتی تھی۔ میں نے اس سے انگلش میں پوچھا "کیا بات ہے؟ تم نے ابھی تک مجھ پر کوئی لعن طعن نہیں کی۔ جبکہ میں نے تمہاری مالکن پر حملہ کیا ہے۔ کوئی چھوٹا موٹا جرم تو نہیں ہے میرا۔"

وہ بڑی اداسی سے مسکرائی اور بولی "ضروری نہیں کہ جو نظر آ رہا ہو وہی حقیقت بھی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تو مجھے خود بھی معلوم نہیں، تمہیں کیا بتاؤں" وہ بات گول کر گئی۔

میں نے پوچھا "اچھا وہ تمہاری بہن اب کہاں ہے؟"

وہ بولی "یہیں میرے پاس آ گئی ہے۔ ساتھ والی راہداری میں دو کمرے چھوڑ کر اس کا کمرا ہے۔"

"اور اس کا شوہر؟"

"وہ بچے کے ساتھ کولمبو چلا گیا ہے۔ وہاں اس کا بڑا بھائی رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا "کچھ پتا چلا کہ وہ واردات کن لوگوں نے کی تھی؟"

وہ مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگی "ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ ان لوگوں کی تو کسی سے دشمنی بھی نہیں تھی۔ معلوم نہیں کس نے یہ ظلم توڑا ہے۔"

میں نے کہا "اگر وہ صرف ڈاکو ہوتے تو لوٹ مار کر کے چلے جاتے۔ مکان کو آگ لگانے کی کیا ضرورت تھی انہیں۔"

وہ بولی "یہی بات تو الجھن میں مبتلا کرتی ہے۔"

میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ جلدی سے اٹھ گئی کہنے لگی "بناں بیمار ہے۔ مجھے اس کو بھی دیکھنا ہے۔"

بناں اس کی بہن کا نام تھا۔ اروشی اسے لولی بھی کہتی تھی۔

اگلے دو روز تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں اسی کمرے میں بند رہا۔ دن میں تین چار دفعہ کمرے کا مقفل دروازہ کھلتا اور اروشی مجھے کھانا وغیرہ دے کر چلی جاتی۔ میں نے اروشی سے زریں گل کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں ہی ہے لیکن کہاں ہے اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چھپا رہی ہے۔ شیخ عاصم کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ کولمبو سے واپس لوٹ آئے ہیں اور میرے بارے میں عنقریب کوئی ہدایت جاری کریں گے۔

یہ ہدایت تیسرے روز جاری ہوئی۔ یہ کوئی بہت اہم ہدایت نہیں تھی۔ اس ہدایت کے نتیجے میں دو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے کمرے سے ایک سرونٹ کوارٹر میں منتقل کر دیا گیا، دوسرے مجھے ریسٹ ہاؤس کے عام ملازمین کے ساتھ کام پر لگا دیا

ایک صحافی کے عزم و ہمت
کی ناقابل فراموش داستان
علیم الحق حقی
کا شاہکار ناول
زنداں نامہ
قیمت ۱۰۰/- روپے
ایک پاکستانی صحافی
کے عزم کی کہانی جو ہندو بھیڑیوں
کے پنجے میں آگیا تھا۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۳۱۴

گیا۔ ریسٹ ہاؤس کا ہیڈ مالی پرشوتم ایک ادھیڑ عمر کا پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس کی تنخواہ سات ہزار سری لنکن روپے تھی۔ اشیائے صرف کی قیمتوں کے لحاظ سے اس تنخواہ کو بھاری بھرکم تنخواہ کہا جاسکتا تھا۔ وہ پتلون قمیص پہنتا اور عینک لگاتا تھا۔ تمام دیگر بیس مالی اور مزدور اس کے نیچے کام کرتے تھے۔ تمام مالی اپنے کام کے ماہر تھے۔ اور سارا دن ریسٹ ہاؤس کے مختلف حصوں کی تراش خراش اور دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پارٹی پروفیسر تھا جو ہر دوسرے تیسرے روز ریسٹ ہاؤس کے "نباتاتی معائنے" کے لیے پہنچا تھا۔

غالباً ہیڈ مالی پرشوتم کو میرے بارے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں کہ مجھے سخت ترین کام سونپے جائیں۔ پرشوتم نے پہلے ہی روز مجھے ٹوکری ڈھونے پر لگا دیا۔ ریسٹ ہاؤس کے عقبی باغ میں مٹی کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا' اس مٹی کو باغ کے نشیبی حصوں میں پھیلانا تھا۔ ایک پان خور سنہالی مزدور کسّی کی مدد سے ٹوکری بھرتا تھا' میں ٹوکری ہاتھوں میں اٹھا کر مٹی مطلوبہ مقام پر پھینک آتا تھا۔ دو روز ہم اسی کام میں جتے رہے' پھر ریسٹ ہاؤس کے ایک حصے میں گراسی گراؤنڈز کی تراش کا کام شروع ہوگیا۔ سری لنکا کے حبس زدہ مرطوب موسم میں مشقت کا ذرا سا کام بندے کو پسینے میں غرق کردیتا ہے اور بندہ اس ماحول سے نامانوس بھی ہو تو پھر اس کا جو حشر ہو جائے کم ہے۔ ان چار پانچ دنوں میں مجھے صرف ایک بار دور سے غزالہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ شام کے وقت ایک چمکیلی ساڑی پہنے شیخ عاصم کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو رہی تھی۔ اس کے اجلے چہرے پر سیاہ چشمہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ غزالہ کا خیال آتے ہی ایک عجیب سی شرمندگی میرے دل و دماغ پر حاوی ہونے لگتی تھی۔ یہ سوچ کر میں لرز جاتا تھا کہ اس رات مجھے غزالہ کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا پڑا تھا۔

ایک صبح حیدر نامی ایک مسلمان مالی چھٹی پر تھا۔ ہیڈ مالی نے میرے ذمے یہ کام لگایا کہ میں تازہ پھولوں کے دستے مختلف کمروں میں رکھ آؤں۔۔۔ میں اس وقت نشست گاہ میں گلدستہ رکھ کر واپس آرہا تھا جب شیخ عاصم اور غزالہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنستے ہوئے نشست گاہ میں داخل ہوئے تھے اور مجھے دیکھ کر میری ہی طرح ٹھٹک گئے تھے۔ خاص طور پر غزالہ کے چہرے پر ایک لمحے میں کئی رنگ گزر گئے تھے۔ آخری رنگ مکمل اجنبیت اور بیگانگی کا تھا' اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا اور ایک طرف بڑھ گئی۔ میں بھی تیز قدم اٹھاتا نشست گاہ سے نکل آیا۔ پانچ دس منٹ بعد شیخ عاصم بنفس نفیس' بھنایا ہوا ریسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں پہنچ گیا۔ سنہالی سیکریٹری اس کے ساتھ تھا۔ ہیڈ مالی پرشوتم اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے مالی بھی ایک دم مؤدب اور ہراساں نظر آنے لگے۔ شیخ عاصم کا چہرہ دیکھتے ہی وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ ان سے کوئی زبردست غلطی ہوئی ہے۔

میری کلائی پر ہلکا سا برقی ارتعاش محسوس ہونے لگا تھا۔ شیخ عاصم نے مجھے بے پناہ تحقیر کی نگاہوں سے دیکھا اور ہیڈ مالی سے بولا "اسے ڈرائنگ روم میں کس نے بھیجا تھا؟"

ہیڈ مالی نے انگریزی میں جواب دیا "یہ غلطی مجھ ہی سے ہوگئی جناب! در۔۔۔ دراصل ایک بندہ چھٹی پر تھا۔ میں نے اسے بھیج دیا۔"

شیخ عاصم نے ایک زناٹے کا تھپڑ ہیڈ مالی کے منہ پر مارا۔ اس کی عینک اتر کر دور جا گری۔ تاہم وہ اپنی جگہ پتھر کے بت کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا "بہت بڑے احمق ہو تم" شیخ عاصم گرجا "تمہیں یہ بتایا نہیں گیا تھا کہ یہ شخص رہائشی حصے میں داخل نہیں ہوگا؟"

"بتایا گیا تھا سرکار! بس بھول ہو گئی مجھ سے۔"

"تمہاری بھول کی سزا یہ ہے کہ تم اسی وقت گھر جاؤ۔"

"نہ۔۔۔ نہیں سرکار۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں معاف کردیں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی سرکار۔"

ہیڈ مالی نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے' پھر پاؤں پڑ گیا۔

شیخ عاصم کچھ دیر پرشوتم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر میری طرف اشارہ کرکے اپنے سیکریٹری سے بولا "آئندہ یہ شخص مجھے رہائشی حصے میں نظر نہیں آنے' ورنہ سب سے بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ بہتر ہے کہ اسے کسی دوسرے کام پر لگا دو۔"

"او کے سر" سیکریٹری نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

شیخ عاصم لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا تو سیکریٹری نے مجھے تحکمانہ انداز میں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے مرمریں برآمدے میں پہنچ گیا۔ سیکریٹری نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ میں مالی کے کام کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔

میں نے کہا "انگریزی بول سکتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں' لیکن جس قسم کے کام تم مجھ سے کروانا چاہتے ہو۔ ان میں سے کوئی کام مجھے نہیں آتا۔"

وہ بولا "اس سے پہلے تم شیخ صاحب کے پاس بھوپال میں تھے۔ وہاں کیا کرتے تھے؟"

میں نے کہا "وہاں مجھے باورچی خانے میں معاون کے طور پر رکھا گیا تھا۔"

"تو ٹھیک ہے" سیکریٹری نے اپنا بڑا سا سر ہلا کر کہا "کل سے تم باورچی خانے میں کام کرو گے اور خبردار آئندہ رہائشی حصے کی طرف نہیں آنا۔ مسٹر شنکر اکو پہلے ہی تم پر بہت غصہ ہے۔ اس بار تو تم ان کے ہاتھوں سے بچ گئے ہو' دوسری بار نہیں بچو گے۔"

اگلے روز سے میں نے باورچی خانے میں جانا شروع کردیا۔ وسیع باورچی خانہ اصل عمارت سے کچھ ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ تاہم راہداری نے اسے اصل عمارت سے مربوط کر رکھا تھا۔ باورچی خانے میں مجھ سے چھوٹے موٹے کام لیے جانے لگے۔ یہاں

ارونی سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر خاموش اور کھوئی کھوئی نظر آتی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرے کانوں میں غزالہ کے الفاظ گونجنے لگتے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ لڑکی وہ نہیں جو اوپر سے نظر آتی ہے۔ یہ اس ریسٹ ہاؤس میں کوئی بہت گہرا کھیل کھیل رہی ہے۔ میں ارونی کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں "کچھ" تلاش کرنے کی کئی بار کوشش کرچکا تھا لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ ایک روز میں نے ارونی سے اس کی بیمار بہن بیناں کا حال دریافت کیا تو وہ بولی "آؤ میرے ساتھ۔ میں اسی کی طرف جا رہی ہوں۔ تم خود عیادت کرلو۔"

مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا' میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کشادہ کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرا اسی پورشن میں تھا۔ جہاں میں چند روز زریں گل کے ساتھ قیام کرچکا تھا۔ بیناں صرف نوبی ایک اجلے بستر پر نیم دراز تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے تھے۔ بینا وہ خوبصورت لڑکی تھی لیکن میں نے اسے دونوں مرتبہ دگرگوں حالت میں دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ایک درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سکتے کی کیفیت تھی اور سانولے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آج دوسری مرتبہ وہ بستر علالت پر تھی اور بیماری کے اثرات نے اس کے نوخیز حسن کو گہنا دیا تھا۔ لڑکی کی عمر بمشکل اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس پر قیامت بیت گئی تھی۔ سال ڈیڑھ سال پہلے اس کا چمن لٹ گیا تھا' گھر جل گیا تھا اور وہ اپنے شوہر اور معصوم بچے کے سامنے بے آبرو ہو گئی تھی۔ یہ واردات ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ کم از کم یہ دونوں بہنیں تو یہی کہہ رہی تھیں کہ اس معمے کا کوئی سرا ابھی ہاتھ نہیں آیا۔

ارونی نے مجھے بتایا تھا کہ بیناں کے پہلو میں تکلیف ہے۔ اسے کچھ عرصے سے پتے کی شکایت تھی۔ حال ہی میں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ اب وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی لیکن اس دوران میں یہ لرزہ خیز واردات ہوگئی تھی۔ اس واردات کی ہنگامہ آرائی سے بیناں بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے آپریشن کے ٹانکے خراب ہوگئے تھے بلکہ پتے اور جگر میں بھی شدید تکلیف پیدا ہوگئی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ تکلیف بڑھ رہی تھی اور ڈاکٹروں نے ایک اور آپریشن کا فیصلہ کیا تھا۔ آپریشن سے پہلے بیناں کی اعصابی و جسمانی حالت کا بہتر ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا اسے ریسٹ منٹ دی جا رہی تھی۔ مجھے اس نوخیز لڑکی کی حالت پر بہت ترس آیا۔ وہ بڑی پیاری تھی اور اپنی عمر سے زیادہ ذہانت کی مالک بھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ارونی اس وقت چائے بنانے گئی ہوئی تھی۔ کہنے لگی "آپ کو ایک راز کی بات بتا دوں۔"

"کیسا راز؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی بے گناہی کا راز۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

وہ بولی "کسی کو پتا ہے یا نہیں۔ میری بڑی بہن کو بھی نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ یہ بات مجھے صرف اور صرف اپنے تک رکھنی چاہیے" محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر بولی "جس رات شیخ صاحب کے آدمیوں نے آپ کو زدوکوب کیا اور آپ کو مجبور کرکے مسز (غزالہ) کے بیڈ روم کی طرف بھیجا' میں نے سب کچھ سن لیا تھا۔"

میں حیرت زدہ نظروں سے بیناں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کتنی آسانی سے کتنی اہم بات کر گئی تھی۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کس رات کی بات کر رہی ہو؟"

وہ بولی "پلیز' آپ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا تھا۔ میں تھوڑی بہت ہندی سمجھ لیتی ہوں۔"

"کیا سنا تھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ شیخ صاحب کے آدمی آپ کو کسی لڑکی کی چیخیں سنانے کی دھمکی دے رہے تھے اور اس دھمکی نے آپ کو بے بس کردیا تھا۔ آپ اس بات پر راضی ہوگئے تھے کہ مسز کے کمرے میں جائیں گے اور وہی کچھ کریں گے جو آپ سے کہا گیا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ اگر واقعی تم نے کچھ سنا ہے تو تم اس کمرے کے آس پاس رہی ہوگی جہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔"

"نہیں' میں اسی کمرے میں تھی۔ ہے نا عجیب بات؟ اور اس سے بھی عجیب بات وہ "ذریعہ" ہے جس سے میں نے یہ بات چیت سنی تھی۔ میں بتاؤں گی تو آپ حیران رہ جائیں گے۔"

اسی دوران میں ارونی چائے لے آئی اور بیناں کو خاموش ہونا پڑا۔ بیناں کو چائے سے پرہیز تھا لہٰذا ٹرے میں صرف دو کپ تھے۔ میں اور ارونی سری لنکا کی خوشبودار چائے پیتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد جب ارونی برتن رکھنے گئی تو بیناں مجھ سے بولی "باتھ روم میں جاکر ہاتھ منہ دھو لیجیے اور واش بیسن کے بالکل نزدیک کان لے جا کر سنیے کیا سنائی دے رہا ہے۔"

بیناں کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مذاق نہیں کررہی۔ میں اٹھ کر مختصر سے باتھ روم میں گیا۔ اسٹیل کے واش بیسن میں ہاتھ دھوئے۔ ٹونٹی بند کرنے کے بعد غور سے سنا تو بہت باریک و مدھم آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کوئی کسی دراز میں منہ ڈال کر بول رہا ہو۔ بیناں کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنا کان اس جالی دار سوراخ سے قریب کیا جہاں سے پانی کا نکاس ہوتا تھا۔ مجھے میوزک اور سنہالی گانے کی آواز سنائی دی۔ غالباً کسی قریبی کمرے میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن آن تھا اور اس کی مدھم آوازیں کسی پائپ کے ذریعے اس واش بیسن تک پہنچ رہی تھیں۔ کبھی کبھار ایسا

اتفاق ہو جاتا ہے۔ کسی عمارت میں سیوریج یا پانی کے پائپ کے ذریعے آوازیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے لگتی ہیں۔ یہاں بھی کوئی ایسی ہی گڑبڑ تھی۔

میں ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو ییناں نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں جی! کچھ آیا سمجھ شریف میں؟" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"کچھ کچھ" میں نے جواب دیا۔

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں" وہ بولی "یہ سیدھی سادی بات ہے۔ آپ کے کمرے کی آوازیں' اس واش بیسن کے ذریعے اس کمرے میں سنی جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر رات کی خاموشی میں یہ آوازیں بہت واضح ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "مواصلات کا یہ "قدرتی نظام" واقعی خاصے کی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے بھی کچھ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے ہوں۔"

وہ بولی "فائدہ کس نے اٹھانا تھا۔ یہ کمرے سال میں آٹھ نو مہینے ویسے ہی بند رہتے ہیں۔ بس کبھی کبھار سیزن میں دو تین کمرے آباد ہوتے ہوں گے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ییناں! جو کچھ تم جان چکی ہو یہ بہت زیادہ ہے' تمہاری بہن ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تمہیں اس بارے میں بالکل خاموش رہنا ہو گا۔ دوسری صورت میں کوئی بہت سخت عذاب نازل ہو سکتا ہے تم پر۔"

اروشی کے قدموں کی آواز آئی تو ییناں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ اروشی نے آج اپنے بال کس کر جوڑے کی صورت باندھ رکھے تھے۔ نارنجی ساری اس کے جسم پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ہم تینوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں میں میرے عجیب رضع داستانوں کا ذکر بھی آیا۔ یہ داستانیں اس ریسٹ ہاؤس میں موجود ہر فرد کے لیے گہرے اسرار کی حیثیت رکھتے تھے۔ سرگوشیوں میں اکثر ان داستانوں کے بارے میں بات کی جاتی تھی۔ ییناں اور اروشی نے بھی ان داستانوں میں تجسس کا اظہار کیا۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں اس "ذاتی مصیبت" کے بارے میں بتا دیا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں کے پاس رک کر میں اپنے کوارٹر میں واپس آ گیا۔ غزالہ والے واقعے کے بعد ہر آنکھ میں میرے لیے اجنبیت اور فاصلہ پیدا ہو گیا تھا لیکن اروشی کا رویہ بدستور وہی تھا۔ آج میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ اروشی کا رویہ کیوں نہیں بدلا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ غزالہ پر حملے کے سلسلے میں میں قطعی بے قصور ہوں۔

اگلے روز میری ڈیوٹی نرل سنگھ نامی ایک ڈرائیور کے ساتھ لگا دی گئی۔ نرل سنگھ ایک جواں سال اور ہنس مکھ شخص تھا۔ وہ روزانہ علی الصباح ڈرین پر "گال روڈ" جاتا تھا اور وہاں کے ایک ڈیری فارم سے دودھ مکھن وغیرہ لاتا تھا۔ راستے میں وہ تھوڑی دیر کے لیے "ویٹوٹل" نامی قصبے میں رکتا تھا اور وہاں سے ریسٹ ہاؤس کے لیے تازہ سبزی اور فروٹ خریدتا تھا۔ گوشت مچھلی وغیرہ پہنچانے کے لیے آنش ہی آتی تھی۔ میری ڈیوٹی نرل سنگھ کے ساتھ لگی تو مجھے پہلی بار یہ موقع ملا کہ ارد گرد کا علاقہ اچھی طرح دیکھ سکوں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ریسٹ ہاؤس سے ایک سڑک ساحل سمندر تک جاتی تھی۔ راستے میں یہ سڑک گال روڈ کو قطع کرتی تھی۔ گال روڈ دو رویہ درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک خوبصورت ساحلی سڑک ہے اور کولمبو سے جنوب کی طرف گال نامی قصبے میں جاتی ہے۔ ڈیری فارم اس سڑک کے کنارے واقع تھا۔ ڈیری فارم کی مالک ایک بے حد موٹی سنہالی عورت تھی۔ کچھ کالی بھی تھی۔ لہٰذا بھینسوں کے درمیان گھومتے دیکھ کر الگ سے پہچاننا ممکن نہیں لیکن وہ بے حد صاف ستھری اور پڑھی لکھی بھی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ سری لنکا میں پڑھے لکھے لوگ وافر ہیں اور ان میں سے بڑی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ نرل سنگھ جتنی دیر ڈیری فارم پر رہتا' فارم کی مالکن سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ چونکہ وہ یہ چھیڑ چھاڑ پنجابی میں کرتا تھا لہٰذا معاملہ بگڑنے نہیں پاتا تھا۔ فارم پر آمد و رفت کے دوران میں کبھی میری کلائی پر جھٹکے محسوس نہیں ہوئے' اس کی وجہ یہ تھی کہ ریسٹ ہاؤس سے فارم تک کا فاصلہ نو کلو میٹر سے کم تھا۔

یہ پانچویں چھٹے روز کی بات ہے۔ ہم علی الصباح ڈیری [illegible] پہنچے۔ ابھی فارم سے نصف فرلانگ دور ہی تھے کہ ہماری [illegible] ہو گئی۔ اس کا انجن تو اسٹارٹ تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی تھی۔ نرل سنگھ یوں تو ڈرائیور بڑھیا تھا لیکن گاڑی کے بارے میں اس کی سوجھ بوجھ زیادہ نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ انجن پر جھک کر وہ یونہی ٹاک ٹوئیاں مارتا رہا۔ آخر میں نے اسے بتایا کہ گاڑی کی کلچ پلیٹیں فیل ہو گئی ہیں اور یہ نقص اتنی آسانی سے دور ہونے والا نہیں ہے۔ ہم دونوں دھکا لگا کر ڈیری فارم پر لائے۔ یہاں بھی ایک نیم مکینک شخص کافی دیر وین کے نیچے گھسا رہا' آخر مایوسی میں سر ہلا کر آیا۔ ایک قریبی ہوٹل سے نرل سنگھ نے ریسٹ ہاؤس کو فون کیا۔ وہاں سے ہدایت آئی کہ نرل سنگھ دودھ اور سبزی وغیرہ کے ذریعے لے کر واپس آ جائے۔ میرے بارے میں حکم ہوا کہ گاڑی ٹھیک کروا کے لے آؤں۔

ڈیری فارم کی مالکن نے ایک آدمی کو موٹر سائیکل پر بھیجا۔ وہاں سے وہ مکینک اور ضروری سامان لے کر آیا۔ کارروائی میں بارہ بج گئے۔ پھر انجن کے ساتھ ٹھوکا ٹھاکی ہوئی۔ قصہ مختصر جب گاڑی ٹھیک ہوئی تو شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ میں گاڑی لے کر ریسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میرے جانے پہچانے تھے اس لیے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ میں گال روڈ کراس کر کے اس تنگ سڑک پر آیا جو جنگل سے گزر کر ریسٹ ہاؤس تک پہنچتی تھی۔ ا

سڑک پر ڈیڑھ دو میل ہی گیا تھا کہ اچانک تیز بارش شروع ہو گئی۔ مطلع تو شام سے ہی ابر آلود تھا لیکن اتنی تیز اور اچانک بارش کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں نے گاڑی کی رفتار سست کر لی۔ پانی کی دبیز چادر میں بمشکل چند گز تک ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ مناسب محسوس ہوا کہ میں گاڑی سڑک سے اتار کر گھنے درختوں کے نیچے روک دوں اور بارش کی شدت کم ہونے کا انتظار کروں۔ مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اپنے اس فیصلے پر عمل کیا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ ابھی مجھے وہاں رکے پانچ چھ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ نظر آئی۔ وہ ریسٹ ہاؤس کی جانب سے گال روڈ کی طرف آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل میرے پاس سے گزری۔ اس پر ایک مرد اور عورت سوار تھے۔ عورت دونوں ٹانگیں ایک جانب کر کے مرد کے پیچھے بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بجلی چمکی اور مجھے مرد کی نیلی شرٹ اور عورت کی نارنجی ساڑی نظر آئی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ موٹر سائیکل پر سوار عورت اروشی ہے۔ اگر وہ اروشی تھی تو اس وقت اتنی طوفانی بارش میں کہاں جا رہی تھی۔ میں وین پر سوار ہونے کے باوجود رک گیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر ہونے کے باوجود چلے جا رہے تھے..... غزالہ کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجے "اروشی ایک مشکوک عورت ہے۔" تجسس کی ایک لہر میرے ذہن میں اٹھی اور ہاتھ خود بخود اگنیشن کی طرف بڑھ گئے۔ حسب معمول دونوں دستانہ پوش ہاتھوں کو باہم رگڑ کر میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ کچھ ہی لمحے میں یوٹرن لے کر موٹر سائیکل کے پیچھے جا رہا تھا۔

بارش کی شدت قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن نہیں کی تھیں۔ موٹر سائیکل کی سرخ ٹیل لائٹ میری رہنمائی کر رہی تھی۔ بڑی احتیاط سے موٹر سائیکل کا تعاقب کرتے ہوئے میں دوبارہ گال روڈ پر پہنچا۔ گال روڈ کراس کر کے موٹر سائیکل نے ساحل کا رخ کیا۔ ساحل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم پام اور ناریل کے گھنے درختوں میں پہنچ گئے۔ دن کے وقت دیکھ چکا تھا' یہ درخت ساحل سے بہت قریب تھے۔ موٹر سائیکل رک گئی تھی۔ میں نے چابک دستی سے وین درختوں میں گھسیڑی اور انجن بند کر دیا۔ موٹر سائیکل کی ٹیل لائٹ [illegible] تو میں بھی گاڑی لاک کر کے باہر نکل آیا۔ بارش کی بوچھاڑ نے لمحوں میں مجھے شرابور کر دیا۔ یہ ایک سنسان ساحل تھا اور بارش نے اسے سنسان تر کر رکھا تھا۔ میں نے غور [illegible] فاصلے پر ایک تیز روشنی ہچکولے کھاتی محسوس ہوئی۔ یہ کسی موٹر بوٹ یا اسٹیمر کی روشنی تھی۔ میں نے بے حد احتیاط سے [illegible] اور موٹر سائیکل کا فاصلہ کم کرنا شروع کیا۔ یہ بات تو اب تقریباً [illegible] تھی کہ یہ پراسرار جوڑا کسی خاص مقصد کے تحت اس ساحل پر پہنچا ہے۔ ایسے لوگ اپنے گرد و پیش سے بہت باخبر [illegible] ذرا سے شک پر بدک جاتے ہیں۔ گو تاریکی تھی اور

مسلسل برسنے والی بارش نے مجھے آڑ فراہم کر رکھی تھی پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہر قدم پھونک کر رکھوں۔ ناریل اور تاڑ کے فلک بوس درختوں کی اوٹ لیتا ہوا میں ساحل کے اس مقام سے قریب تر ہو گیا جہاں ایک بڑے سائز کی موٹر بوٹ پانی پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ موٹر بوٹ کی روشنی میں اندازہ ہوتا تھا کہ بارش کی شدت میں پھر اضافہ ہو گیا ہے۔ چھاجوں پانی برس رہا تھا آسمان سے۔ موٹر بوٹ کی روشنی پانی کی دبیز چادر سے گزر کر کیلے کے ایک جھنڈ پر پڑ رہی تھی۔ اس جھنڈ کے قریب ہی مجھے تین سائے نظر آئے۔ ان میں سے ایک یقیناً وہی لڑکی تھی جو اس طوفانی موسم میں موٹر سائیکل پر سوار یہاں پہنچی تھی۔ میں ٹخنے ٹخنے پانی میں بے آواز پاؤں دھرتا ان لوگوں سے کچھ اور نزدیک ہو گیا۔ میں نے دیکھا' لمبے بالوں والے ایک فربہ اندام شخص نے کوئی چیز لڑکی کو تھمائی جسے لڑکی نے بڑی احتیاط سے اپنے لباس میں رکھ دیا۔ میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا اور میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ وہ اروشی ہی ہے۔ یہ ایک سنسنی خیز صورت حال تھی۔ اور جتنی سنسنی خیز تھی اتنی ہی پر خطر بھی۔ میں اس ویران مقام پر کسی بھی وقت ان لوگوں کی نگاہ میں آ سکتا تھا۔

تینوں سائے تین چار منٹ کیلوں کے جھنڈ کے پاس کھڑے رہے۔ پھر ایک سایہ جھومتا ہوا سا بوٹ میں واپس چلا گیا۔ یہ لمبے بالوں والا وہی فربہ اندام تھا جس نے اروشی کو کوئی چیز تھمائی تھی۔ موٹر بوٹ اسٹارٹ ہوئی۔ اس کی روشنی کا زاویہ بدلا اور پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اروشی اور اس کا ساتھی مرد کچھ دیر درختوں کے پاس کھڑے رہے پھر موٹر سائیکل کی طرف واپس پلٹ آئے۔ اروشی کے ساتھی مرد نے لمبی برساتی پہن رکھی تھی۔ اس نے برساتی کی کسی جیب سے واٹر پروف ٹارچ نکال لی اور اس کے روشن دائرے کو یونہی ادھر ادھر حرکت دینے لگا۔ اچانک ان دونوں نے مجھے ناریل کے درخت کے پیچھے دیکھ لیا۔ ٹارچ کی روشنی ایک لمحے کے لیے مجھ پر پڑی تھی اور وہ دونوں ٹھٹک گئے تھے۔

"کون ہے؟" اروشی کے ساتھی مرد نے چونکی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ یقیناً وہ وہاں سے اپنا ریوالور نکالنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے کوئی موقع دیے بغیر اپنی جگہ چھوڑی اور جھک کر بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ درمیانی فاصلہ بمشکل آٹھ دس قدم تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ [illegible] اپنا ریوالور میری طرف سیدھا کرتا' میرے سر کی زوردار ٹکر اس کے سینے پر پڑی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ درخت سے ٹکرانے کے بعد وہ پشت کے بل بارش کے پانی میں گرا اور بے حرکت ہو گیا۔ پہلی ضرب ہی اس کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔ میں نے قریب سے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی اور حیران رہ گیا۔ وہ ییناں کا شوہر اور اروشی کا بہنوئی تھا۔ میں نے

اسے واردات کی رات بیناں کے ساتھ ہی درخت سے بندھے ہوئے دیکھا تھا۔ کل اروشی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بچے کے ساتھ "ٹکولبو" جا چکا ہے لیکن اب وہ یہاں اروشی کے ساتھ پایا جا رہا تھا۔ شاید میں اس شخص کے بارے میں کچھ اور بھی سوچتا لیکن پھر مجھے اروشی کے چلانے اور بھاگنے کی آواز آئی۔ وہ گھنے درختوں میں راہِ فرار اختیار کر رہی تھی۔ میں نے جھک کر اپنے مدمقابل کا گرا ہوا ریوالور اٹھانا چاہا لیکن سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ خیال ذہن سے گزر گیا کہ میں دستانہ پوش ہوں اور ریوالور استعمال نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی وہ پانی میں گرا تھا۔ میں نے ریوالور کا خیال چھوڑ کر اروشی کے پیچھے دوڑ لگائی۔ درختوں کے نیچے بارش کا پانی جمع تھا۔ لیکن زمین ریتیلی تھی اس لیے پاؤں پھسلنے سے محفوظ تھے۔ اروشی خاصی اسمارٹ لڑکی تھی' ساری کے باوجود وہ کافی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ کیلے اور ناریل کے درختوں میں سے تیزی سے راستہ بناتی اور جھاڑ جھنکاڑ کو پھلانگتی وہ نکل چلی جا رہی تھی۔ مگر کچھ بھی تھا' آخر لڑکی تھی' میں نے ایک منٹ کے اندر اندر اسے جا لیا۔ میرا ہاتھ لگا تو وہ چیخ کر منہ کے بل بارش کے پانی میں گری۔ میں نے جست لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اس کے جسم میں بلا کی پھرتی اور لچک تھی۔ کسی چکنی مچھلی کی طرح وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گئی۔ تاہم آخری لمحے میں اس کا لفافہ میری دونوں کلائیوں کی گرفت میں آ گیا۔ اس بار وہ پشت کے بل گری۔ میں نے اسے مکمل طور پر جکڑ لیا۔ بے بس ہونے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ پہلے لمبے ناخنوں سے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی پھر دانتوں سے میری گردن کو زخمی کرنا چاہا لیکن جب دونوں کوششیں ناکام ہو گئیں تو اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس نے اپنے بالائی لباس میں کوئی ڈبیا نما چیز چھپا رکھی تھی۔ میں اپنے دستانہ پوش ہاتھ کے ذریعے بھی اس ڈبیا کی سختی اور ساخت محسوس کر سکتا تھا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو مجھے۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ غرائی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے موقع دیکھ کر اپنا گھٹنا میرے پہلو میں رسید کر دیا۔ میں نے جھنجھلا کر اس کے چہرے پر ہاتھ کی ضرب لگائی۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ مقامی زبان میں مجھے صلواتیں بھی سنا رہی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا اور گردن میں یوں بازو ڈالا کہ وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئی۔ اسی حالت میں اسے اپنے ساتھ چلاتا ہوا میں وین میں لے آیا۔ اس کا دم خم ختم ہو گیا تھا اور ایک سہمی ہوئی نسوانیت اس پر غالب آ چکی تھی۔ وہ سر تا پا کانپ رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں نے کوئی نرمی دکھائی تو اس کی زبان کھلوانا مشکل ہو جائے گا۔

بند وین کی تاریکی میں' میں نے اروشی کے سامنے خود کو ایک سفاک اور بے رحم شخص کے روپ میں پیش کیا اور اسے باور کرایا کہ اگر اس نے اپنی زبان نہ کھولی تو وہ بدترین صورت حال سے دوچار ہو سکتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ بالکل محفوظ رہے گی نہ صرف یہ کہ اپنے بہنوئی کے ساتھ بخیریت اپنے گھر پہنچے گی بلکہ میں ہر ممکن اس کی مدد بھی کروں گا۔

شنکر کے ساتھ میری جو خونریز لڑائی ہوئی تھی وہ اروشی سمیت ریسٹ ہاؤس کے ہر فرد نے دیکھی تھی اور اس لڑائی نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ میں ایک معمولی ملازم کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اروشی پر میری باتوں کا اثر ہو رہا تھا۔ اس کی مزاحمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی رو رہی تھی لیکن اس کے رونے میں غیظ و غضب کے بجائے ماتمی کیفیت تھی۔ روتے روتے ایک دم اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن [illegible] لیے بولی "مجھے مار دو۔ میرا گلا گھونٹ دو۔ میں تم سے موت کی بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے ایسے کام پر مجبور نہ کرو جس کے بعد مجھے مرنے کے لیے ایک مدت تک ترسنا پڑے۔"

"کون مارے گا تمہیں؟ کون مار سکتا ہے؟" میں نے اس سے کہا۔

"وہی۔۔۔ جن کے بارے میں تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ پتا نہیں کہ وہ کتنے طاقتور اور خطرناک لوگ ہیں۔ [illegible] تمہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی میرے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میرے شناسا جانتے ہیں کہ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ آج اس وین میں ہونے والی گفتگو سے تم پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"ان کے ہاتھ تو بہت لمبے ہیں مسٹر شاہ جہاں۔"

"میں بھی صرف لمبے ہاتھ والوں کا شکار کرتا ہوں۔ اس حوالے سے میرے مقتولوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔"

وہ بے چارگی سے بولی "تم مجھے اور میرے گھرانے کو بدگور کر دینا چاہتے ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں اس خوف کو دور کرنا چاہتا ہوں جس نے تمہارے دل و دماغ کو جکڑ رکھا ہے۔"

میرے کہنے پر اروشی نے وہ چھوٹی سی ڈبیا میرے حوالے کی جو اس نے چولی میں چھپا رکھی تھی۔ میں وین کی اندرونی لائٹ جلا کر ڈبیا دیکھ سکتا تھا لیکن روشنی جلانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ڈبیا جیب میں رکھ کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

جواب میں وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ میں نے کہا "[illegible] کر رو لو تاکہ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس کے بعد میں پوچھوں گا تمہیں بتانا ہو گا۔"

اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔ میں وین کا دروازہ [illegible] باہر نکل آیا۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل اختیار کر گئی

[illegible] ہی قدم کے فاصلے پر گیلی ریت پر اروشی کا بہنوئی راکیش [illegible] بے حرکت پڑا تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر چوٹ آئی [illegible] اور وہ تب سے مسلسل بے ہوش تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے [illegible] کسمسا رہا تھا۔ مجھے چند منٹ کی مزید تاخیر ہوتی تو وہ ہوش [illegible] جاتا۔ میں نے اس کی صحت مند گردن کے مخصوص حصے پر ہاتھ کا [illegible] دباؤ ڈالا اور کم از کم ایک گھنٹے کے لیے اسے پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ اس دوران میں' میں وین اور اروشی کی طرف سے [illegible] کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔

راکیش کو کندھے پر لاد کر میں نے وین کے عقبی حصے میں ڈال [illegible] دروازے بند کر کے ایک بار پھر اروشی کے روبرو آ بیٹھا۔ طویل اور کٹھن مکالمے کے بعد جس میں گاہے گاہے دھمکیاں [illegible] بھی شامل ہوتی رہیں' میں نے اروشی کو زبان کھولنے پر آمادہ کر لیا۔ اروشی نے سب سے پہلے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ وہ [illegible] لوگوں کے لیے کام کر رہی ہے۔ جنہوں نے کچھ روز پہلے اس کی بہن کے گھر لوٹ مار کی تھی اور آگ لگائی تھی۔

"کون لوگ ہیں یہ؟" میں نے پوچھا۔

"میں ٹھیک سے کچھ نہیں جانتی" اروشی نے سسکیاں بھرتے [illegible] کہا "میرا رابطہ دھرمان کا کا نامی کے شخص سے ہے۔ سارے [illegible] لوگ اس شخص کی دہشت سے [illegible] کئی افراد کو قتل کر چکا ہے پھر [illegible] پھرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس شخص کا تعلق نال [illegible] سے ہے۔"

"ابھی موٹر بوٹ میں جو شخص تم سے ملنے آیا تھا وہ دھرمان ہی [illegible]"

"نہیں۔۔۔ یہ اس کے ساتھی تھے۔ ان میں ایک کا نام تیوان [illegible] دوسرے کا امر ناتھ ہے۔ ان کا ایک تیسرا ساتھی اشوک [illegible] آج ساتھ نہیں آیا تھا۔ میں دھرمان کے علاوہ صرف ان [illegible] کو جانتی ہوں۔"

"[illegible] چاہتے ہیں یہ لوگ؟"

"ٹھیک سے مجھے معلوم نہیں" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "[illegible] معلوم ہے اتنا بتا دوں۔"

[illegible] سر جھکائے بیٹھی رہی پھر بولی "یہ لوگ دو ڈھائی سال [illegible] سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ بیناں کی شادی پر میری والدہ [illegible] سے کچھ قرض لیا تھا۔ کوشش کے باوجود ہم یہ قرض [illegible] سکے۔ اس دوران میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد پہلے [illegible] چکے تھے۔ ہم صرف دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن ہونے کے [illegible] ادا کرنے کی تمام ذمے داری مجھ پر آ گئی۔ میں قرض تو نہ [illegible] دھیرے دھیرے جیون جی کے جال میں پھنس گئی اور وہ [illegible] مرضی کے مطابق کام لینے لگا۔ اس نے کئی مواقع پر مجھ [illegible] سے غیر قانونی کام کرائے پھر ایک موقعے پر اس نے [illegible] اپنے باس دھرمان سے کرا دی۔ دھرمان نے مجھے صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ ایک گروہ کا سرغنہ اور خطرناک قاتل ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگر میں اپنی اور اپنے خاندان کی عافیت چاہتی ہوں تو مجھے اس کی ہدایت پر بلا اعتراض عمل کرنا ہو گا۔ قانون کی مدد حاصل کرنے کا مطلب عبرت ناک موت ہو گا۔ اس واقعے کے بعد میں براہ راست دھرمان کی ماتحتی میں آ گئی اور وہ مجھ سے مطلب کے کام لینے لگا۔ ان لوگوں نے مجھ سے اپنے کئی مخالفوں کی جاسوسی کرائی۔ ایک مرتبہ مجھے ناجائز اسلحے سے بھری ہوئی گاڑی کے ساتھ انورادھا پور سے گالے تک کا طویل سفر کرایا گیا۔ ایک مرتبہ ایک کال گرل کے اغوا کی ذمے داری سونپی گئی۔ میں جس قسم کے کام کر رہی تھی ان میں میری عزت اور جان کو ہر وقت خطرہ لاحق تھا لیکن میں اس دلدل سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تین چار ماہ پہلے کی بات ہے۔ دھرمان کا کا کی طرف سے مجھے حکم ملا کہ میں رینی پیلس میں ملازمت کے حصول کی کوشش کروں گی۔ رینی پیلس دراصل اسی ریسٹ ہاؤس کو کہا جاتا ہے جہاں میں آج کل ملازم ہوں۔ اس حکم کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کا تراشا بھی تھا جس میں رینی پیلس کے لیے پڑھی لکھی ملازماؤں اور ملازموں کی ضرورت کا اشتہار تھا۔ میں حسب ہدایت انٹرویو کے لیے پہنچی اور غیر متوقع طور پر مجھے منتخب کر لیا گیا۔

دھرمان میری اس کامیابی پر بہت خوش ہوا اور اس نے میرے ذمے جیون جی کی تمام واجب الادا رقم معاف کر دی۔ لیکن اب اس معافی کا کیا فائدہ تھا۔ میں ناک تک بلیک میلنگ کی دلدل میں دھنس چکی تھی۔"

چند لمحے توقف کر کے اروشی نے ساری کے پلو سے آنسو پونچھے اور وین کے شیشوں سے باہر تاریکی میں گھورنے لگی۔ بارش کا ساز ایک بار پھر اونچے سروں میں بجنے لگا تھا۔ کبھی کبھی زور سے بجلی چمکتی تھی تو بھیگا ہوا ساحل دور تک روشن ہو جاتا تھا۔ ناریل اور کیلے کے جھنڈ' چمکیلی ریت' ریت پر دور کسی چھوٹے سے چائے خانے کی جھونپڑی' جھونپڑی سے آگے خلیج منار کا لامتناہی پانی اور پانی کے اوپر ہزارہا چھوٹی بڑی لہریں' سب کچھ ایک لمحے کے لیے آسمانی برق کی روشنی میں نہا کر تاریکی میں ڈوب جاتا تھا۔ اور بند وین کے اندر گہری سیاہ آنکھوں والی اروشی اپنی روداد غم جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس نے کہا "یہ صرف ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ دھرمان کی طرف سے جیون جی نے مجھے پیغام دیا کہ ریسٹ ہاؤس میں شیخ صاحب کا ایک خاص مہمان آ رہا ہے۔ یہ مہمان چند گھنٹے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر کر چلا جائے گا۔ تاہم اس کے بعد بھی وہ تین چار ہفتے تک گاہے گاہے آتا رہے گا۔ مجھے بڑی رازداری سے شیخ صاحب کے ساتھ اس مہمان کی تصویریں بنانا تھیں۔ کچھ ایسی تصویریں جن میں وہ دونوں بات چیت کرتے یا بے تکلفی کے ماحول میں بیٹھے نظر آئیں۔ اس مقصد کے لیے دھرمان کی طرف سے مجھے ایک جدید جاپانی کیمرا دیا گیا تھا۔ جیون جی نے [illegible]

مجھے اس کیمرے کا مفصل استعمال سمجھایا اور دیگر ضروری باتیں بتائیں۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ شیخ صاحب کا مہمان کسی بڑے جرم میں ملوث ہے اور یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شیخ صاحب سے اس شخص کے گہرے روابط ہیں۔ یوں وہ شیخ صاحب کو بھی اس جرم میں شریک ٹھہرانا چاہتے ہیں... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں گزرنے والے ہر دن کے ساتھ ایک شکنجے میں جکڑی چلی جا رہی ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ اس شکنجے کو توڑ کر نکل جاؤں۔ اس خواہش کے زیرِ اثر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے سوچا میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ میرے سابق شوہر کا ایک دوست آنند پولیس میں انسپکٹر ہے۔ وہ مجھ میں دلچسپی لیتا ہے۔ میری خاطر وہ یہ نوکری! شہر سب کچھ چھوڑ سکتا ہے۔ میں اسے ملنے کے لیے کولمبو گئی۔ نہ جانے کس طرح مہران کاکا کو اس کی خبر ہو گئی۔ اگلی رات وہ خوفناک واقعہ ہوا جس میں میری بہن کا سب کچھ اجڑ گیا۔ واردات کے صرف ایک گھنٹے بعد مجھے کاکا کی طرف سے ایک ٹائپ شدہ پیغام مل گیا تھا۔ اس پیغام میں کاکا نے لکھا تھا "یہ صرف جرم کا ٹریلر ہے۔ اصل فلم بہت دہشت ناک ہو گی۔ تمھاری بہن، تمھارا بہنوئی اور دو سالہ بھانجا سب ہمارے نشانے پر ہیں۔ تم انھیں کہیں بھی لے جاؤ وہ ہمارے نشانے پر رہیں گے۔ سلامتی کا راستہ صرف ایک ہی ہے۔ اپنے دماغ سے نافرمانی کا خناس نکال دو اور وہ کرو جو تم سے کہا گیا ہے۔"

اس رات بہت سوچ بچار کے بعد میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میں اپنی ذات پر تو ہر مصیبت جھیل سکتی تھی لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میری وجہ سے میری بہن یا کسی دوسرے عزیز پر کوئی آفت ٹوٹے۔ ان بلیک میلروں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ گلی محلے سے لے کر تھانے کچہری تک ہر جگہ ان کے آدمی موجود ہیں۔ میں اکیلی جان ان کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے وہی کیا جو وہ چاہتے تھے۔ پچھلے دو ہفتے میں میں نے تین چار دفعہ اسپائی کیمرے سے شیخ عاصم اور ان کے مہمان کی تصویریں بنائی ہیں۔ ایک فلم میں نے پچھلے ہفتے اشوک وغیرہ کو پہنچائی تھی، دوسری آج رہی ہے... آج جیون جی نے ایک اور ڈیوٹی مجھے سونپ دی ہے۔ یہ ڈبیا جو تم نے مجھ سے چھینی ہے جیون جی نے ہی دی تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا مائیکروفون ہے جسے اسٹیکر کے ذریعے کہیں بھی چھپایا جا سکتا ہے۔ ساتھ میں ایک ریسیور بھی ہے۔ ریسیور سے موصول ہونے والی آواز کسی بھی اچھے ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کی جا سکتی ہے۔ میرے لیے ہدایت ہے کہ میں شیخ عاصم اور ان کے مہمان کے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرنے کی کوشش کروں... مم میں بہت خوفزدہ ہوں شاہ جہاں صاحب، اور میرا خوف کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ وہ لوگ... سب کچھ کرنے پر قادر ہیں۔ انسانوں کے روپ میں شیطان ہیں یہ لوگ" وہ ایک بار پھر سسکیاں لے کر رونے لگی۔

میں نے پوچھا "تم نے تو بتایا تھا کہ تمھارا بہنوئی اور بہن کولمبو چلے گئے ہیں۔ لیکن آج تمھارا بہنوئی تمھیں خود موٹر سائیکل پر یہاں لایا ہے۔"

وہ بولی "میں نے خود اسے یہاں بلایا تھا۔ دراصل... وہ اکیلی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔"

"کیوں؟"

"سواری کی مشکل تھی، اور ویسے بھی..." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ میں نے اصرار سے پوچھا تو بولی "جب سے میں یہاں سے ملی ہوں کاکا اور اس کے ساتھیوں کا رویہ مجھ سے بہت سخت ہو گیا ہے۔ خاص طور پر کاکا کے ساتھی جیون جی اور رامرتا تو مجھ کو گالم گلوچ کرتے ہیں اور موقع دیکھ کر دست درازی سے بھی نہیں چوکتے۔ پچھلی مرتبہ انہوں نے اتنی درندگی سے میرے جسم پر چٹکیاں کاٹیں کہ ان کے نشان اب تک تازہ ہیں۔ یہاں اندھیرا ورنہ میں تمھیں دکھاتی..." آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سر جھکا کر خاموش ہو گئی...

"تمھاری بہن پر مجرمانہ حملہ بھی اسی جیون جی اور رامرتا نے کیا تھا؟"

میرے سوال کا جواب امرتی نے اثبات میں دیا اور دوپٹے کے پلو میں چہرہ چھپا کر ہچکیاں روکنے لگی۔

اسی دوران میں ذہن کے عقب میں بے ہوش شخص کسمسانے لگا تھا۔ امرتی اس کے بارے میں بہت فکر مند تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ چوٹ شدید نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں وہ مکمل طور پر ہوش میں آ جائے گا۔ اس کا ریوالور اور ... میں نے درختوں کے نیچے سے ڈھونڈ نکالی تھی۔ اس کی ڈیڑھ سو سی سی موٹر سائیکل کو بھی کھینچ تان کر میں نے ذہن کے عقبی حصے میں چھپا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ریسٹ ہاؤس کی طرف واپس جا رہے تھے۔ امرتی اور اس کا بہنوئی رہائی ملتے ہی پہلے ریسٹ ہاؤس روانہ ہو گئے تھے۔ دونوں کو ہلکی پھلکی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پہنچاتے ہوئے موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ امرتی کے لیے یہ بہانہ بنانا بہت آسان تھا کہ راستے میں وہ موٹر سائیکل سے گر گئے تھے۔ امرتی کا بہنوئی سر پر چوٹ کھا کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ بے یار و مددگار جنگل میں کھڑی تھی۔ کسے ضرورت پڑی تھی کہ اس کہانی کی تصدیق کرتا پھرتا؟ کوئی کرنا بھی چاہتا تو حقیقت تک پہنچنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

راستہ بھر میں امرتی سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ اسے یقین دلایا کہ آج میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو سینہ بہ سینہ راز رہے گی اور اس گفتگو کے سبب امرتی کو ... نہیں آئے گی۔ وہ میری ذات کو اہمیت تو اسی رات ... تھی جب میں نے شنکر شرما جیسے خطرناک شخص کو اڑنگا ...

...نے اب ایک ہمراز کی حیثیت سے وہ مجھ پر کچھ اعتماد بھی کرنے لگی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری صورت میں اسے اپنی گمنام زندگی میں امید کی کوئی کرن نظر آئی تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ مجھے سب کچھ بتا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا سا ہو گیا تھا۔

میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اپنے معمولات جاری رکھے۔ بس یوں سمجھے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی بات چیت ہوئی ہی نہیں۔ مائیکروفون والی ڈبیا اسے واپس کرتے ہوئے میں نے کہا "اس کا استعمال بھی ویسے ہی کرو جیسے تم نے سوچ رکھا ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتی رہی۔ راستے میں میں نے امرتی سے اس مہمان کا نام اور حلیہ بھی دریافت کیا جس سے شیخ عاصم کا تعلق ثابت کرنے کی پراسرار کوششیں کی جا رہی تھیں۔ امرتی کی معلومات کے مطابق اس شخص کا نام زکوان سجاف تھا۔ شیخ عاصم اسے کبھی کبھی سجانی کے نام سے بھی بلاتا تھا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا ایک بالکل کلین شیو اور سمارٹ شخص تھا۔ نقرئی کمانی دار عینک پہنتا تھا۔ یہ حلیہ سنتے ہی مجھے یاد آیا کہ اس ٹائپ کے ایک سرخ و سپید شخص کو میں ریسٹ ہاؤس میں دیکھ چکا ہوں۔

○☆○

اس رات میں اپنے کوارٹر میں لیٹ کر دیر تک اسی گورکھ دھندے میں الجھا رہا۔ غزال کا یہ خیال سو فیصد درست ثابت ہوا کہ یہاں شیخ عاصم کے گرد کسی سازش کا تانا بانا بُنا جا رہا ہے۔ ممکن تھا کہ شیخ عاصم کو بھی اس سازش کی بھنک پڑ چکی ہو مگر یقینی بات تھی کہ وہ اس سازش کے خدوخال سے واقف نہیں تھا۔ غزال کی معلومات بھی صرف امرتی تک محدود تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ امرتی کی حرکات و سکنات مشکوک ہیں اور وہ "کچھ" کر رہی ہے۔ اس "کچھ" کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن انکشاف سے صرف ایک رات قبل شنکر شرما نے مجھے ایک ذلیل جگہ میں پھنسا دیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ میں غزال سے ملوں۔ اس لیے بھی کہ صورتِ حال ہم دونوں پر واضح ہو سکے اور اس لیے بھی کہ کہیں مشرقی بیوی ہونے کے ناتے غزال اپنے ... امرتی کے کردار سے آگاہ نہ کر دے۔ اگر ایسا ہوتا تو امرتی پر ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ غزال سے ملاقات کیسے کی جائے۔ میرا باقی کے حصے میں جانا بند تھا۔ غزال نے ... والے واقعے کے بعد میری طرف پلٹ کر نہیں دیکھا ... وہ دیکھتی بھی کیسے؟ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی ... اس کا ردعمل یہی ہوتا۔ بہرحال امید کی موہوم سی کرن ... میرے دل میں باقی تھی۔ کسی وقت میں سوچتا تھا کہ شاید ... اس "سنگین حرکت" کے پیچھے جھانکنے میں کامیاب ... اور میری بداخلاقی کے اصل محرک تک پہنچ کر اس کا دل ... سے صاف ہو جائے۔

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اُن بلیک سے ذرماں کی کہانی جن کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں۔

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۷۲۲۷۲۱۴

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

میں دن چڑھے تک جاگتا رہا اور بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ چھ بجے کے لگ بھگ میں نے پورچ کی طرف سے شیخ عاصم کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ علی الصباح جوگنگ کے لیے نکلتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ غزالہ اس وقت بیڈ روم میں اکیلی ہوگی۔ کچن میں بھی اتنی صبح کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میں کچن کے انٹرکام پر غزالہ سے رابطہ کر سکتا تھا۔ ذہن میں اس اچانک آنے والے خیال کے تحت میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ لیکن پھر پاؤں نیچے اتارنے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے تصور میں یکایک شنکر شکرا کی دھمکیاں اور فریال کی چیخ و پکار گونجنے لگی تھی۔ شنکر نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ اس مرتبہ میری کسی غلطی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔۔۔ اور غزالہ سے رابطہ کرنے کا مطلب تھا ایک ناقابل معافی غلطی کا ارتکاب۔ میں بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد پھر ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ یہ گاڑی بڑی تیزی سے پورچ میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر سرونٹ کوارٹر کی کھڑکی میں سے جھانکا۔ یہ ایک سبز [illegible] کار تھی۔ کار میں سے ایک ڈاکٹر اپنا میڈیکل باکس تھامے تیزی سے اترا اور مخالف سمت کی راہداری میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر اور کار ڈرائیور کے چہرے پر بے چینی سی کیفیت تھی۔ چار پانچ منٹ بعد میں نے اردشی کو دیکھا۔ رات کے واقعے کے خراشوں کے نشان ابھی تک اس کے چہرے پر موجود تھے۔ اس کا چہرہ پریشانی اور ہراس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ قریباً بھاگتی ہوئی عمارت کے باقی حصے کی طرف گئی اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرا دھیان فوراً اردشی کے بہنوئی کی طرف چلا گیا۔ رات میرے ہاتھوں اس کے سر کے پچھلے حصے پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ وہ قریباً ایک گھنٹا گہری بے ہوشی میں رہا تھا۔ تاہم جب ہم رات دس گیارہ بجے ریسٹ ہاؤس واپس لوٹے تھے تو وہ ہوش میں آچکا تھا اور وہیں کے جنوبی حصے میں اردشی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کی حالت پھر بگڑ جائے گی۔ اگر یہ بھاگ دوڑ اسی شخص کے لیے تھی تو حیرت کی بات تھی۔

میں کمرے سے نکلا اور اس راہداری کی طرف بڑھا جہاں اردشی اور اس کی بہن رہائش رکھتی تھیں۔ ابھی میں نے راہداری میں قدم ہی رکھا تھا کہ مجھے نیناں کا شوہر نظر آگیا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی اور وہ ہیجانی انداز میں کسی کو ٹیلی فون کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تو خیریت سے ہے، پھر کس کی خیریت مشکوک تھی۔ میں یہی کچھ سوچتا ہوا اردشی کی بہن نیناں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر مرگ پر نظر آئی۔ اس کی سانس اکھڑ چکی تھی، رنگ لیموں کی طرح زرد تھا اور اس میں نیلاہٹ داخل ہو چکی تھی۔ دو عورتیں اس کے منہ میں پانی ٹپکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ سر کے اشارے سے انہیں منع کر رہی تھی۔ دو ڈھائی سالہ معصوم بچہ ذرا سہما سا جاں بلب ماں کی پائنتی سے لگا تھا۔

"کیا ہوا نیناں؟ کیا ہوا تمہیں" میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی تھامتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ [illegible] کی چھاؤں سے چھوٹنے والی نرم دھوپ جیسی مسکراہٹ جو پلکوں میں آنکھ کا دھوکا محسوس ہوتی ہے۔ اس کے لب تھرائے۔ اس نے مجھ سے کوئی بات کہی جو سنی نہیں گئی۔ میں نے اس کے پاس عورتوں سے پوچھا "کیا ہوا اسے۔ کل تک تو یہ بھلی چنگی تھی؟"

اتنے میں نیناں عرف نونی کا شوہر بڑبڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اسپتال ٹیلی فون کیا ہے۔ ایمبولینس پہنچا ہی چاہتی ہے۔ مقامی ڈاکٹر نے [illegible] انجکشن بھی لگایا لیکن مریضہ کا بلڈ پریشر اتنا لو ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر [illegible] نہیں ہو [illegible] تھی۔ نونی کے ہونٹ ایک بار پھر تھرائے۔ میں نے جھک کر سنا۔ کہہ رہی تھی "میں تو شاید نہ بچوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ تمہاری ایک مشکل آسان کر دی ہے میں نے۔۔۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو تم۔۔۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

لیکن تین چار منٹ بعد جب اسے ایمبولینس میں ڈالنے کے لیے بستر سے اٹھایا جا رہا تھا تو اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ مر چکی تھی۔ اردشی نے اس کے معصوم بچے کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ یہی حال مرنے والی کے شوہر کا تھا۔ کمرا ماتم اور آہ و بکا کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ میں سر جھکائے باہر نکل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ماں کی پائنتی سے لگے ہوئے ڈھائی سالہ معصوم بچے کی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں اور مجھ سے پوچھ رہی ہیں "میری ماں کو کیا ہوا ہے انکل؟ وہ کیوں چپ ہے؟ کیا وہ مر گئی ہے؟"

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ مری نہیں ماری گئی ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔۔۔ ہاں یہ قتل ہی تو تھا۔ ایک ایسی کمزور لڑکی پر درندوں نے چڑھائی کی تھی جو صرف چند روز پہلے اسپتال سے آپریشن کرا کے آئی تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ غذا اور دوا کی ضرورت تھی۔ اس امر کی ضرورت تھی کہ اس پر ایک پھول کا بوجھ بھی نہ ڈالا جائے لیکن وحشیوں نے اسے مسل کر رکھ دیا تھا۔ بے زبان گڑیا کی طرح توڑا مروڑا تھا۔ اس کے نازک جسم پر اتنے زخم لگے تھے کہ وہ موت کے راستے پر چل نکلی تھی اور آج اس واردات کے چند گھنٹے بعد وہ اپنے [illegible] خراب ہونے سے چل بسی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کے ملازمین اور خاص طور سے عورتوں میں کئی روز نیناں کی موت کا سوگ جاری رہا۔ پھر روز مرہ کے [illegible] شروع ہو گئے۔ یہ پانچویں چھٹے روز کی بات ہے۔ شیخ [illegible] اور شنکر شکرا کسی کام سے "پورا [illegible]" گئے ہوئے تھے۔ [illegible] روز وہاں رہتا تھا۔ ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر [illegible]

نے ایک دن کی چھٹی کر لی۔ اس روز مجھ پر کچھ اضافی ذمے داریاں عائد ہو گئیں اور میں علی الصباح کچن میں پہنچ گیا۔ رات کے جھوٹے برتنوں کا انبار لگا تھا۔ شاہ جہاں ایل ایل بی کرا [illegible] دستانہ پوش ہاتھوں سے یہ برتن مانجھنے لگا اور اس طرح مانجھنے لگا کہ چیزوں کی بیش قیمت کراکری پر خراش تک نہ آنے پائے۔ یقیناً یہ عمل میرے تراشنے سے زیادہ مشکل تھا۔ لیکن میرا تجربہ اب مددگار ثابت ہونے لگا تھا۔ میں اپنی کلائی اور کہنی کے خم کو کسی شکنجے کی طرح استعمال کر کے برتن تھام لیتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی صفائی کرتا تھا۔ دیگر چھوٹے موٹے کام بھی میں اسی خاص انداز میں انجام دینے پر قادر ہو گیا تھا۔ باقی ملازمین تعجب اور دلچسپی سے مجھے دیکھتے تھے لیکن اس بارے میں تبصرہ کوئی نہیں کرتا تھا۔

میں برتنوں میں مصروف تھا جب دیوار پر لگے ہوئے انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا۔ دوسری طرف غزالہ تھی "ہیلو خانساماں" اس نے کھنکتے لہجے میں کہا۔

"ہیلو" میں نے جواب دیا۔

وہ شاید گہری نیند سے اٹھی تھی، میری آواز پہچانے بغیر بولی "آج میں بیڈ ٹی نہیں لوں گی۔ مجھے غسل میں نمکین گرم پانی پہنچا دیجئے۔ ناشتے میں آج کیا ہے؟"

غزالہ کے سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ یہ سارے معاملات ہیڈ خانساماں اور اس کے دو ماتحت ڈیل کرتے تھے۔ ان میں سے اس وقت کوئی بھی کچن میں نہیں تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

"کون؟" دوسری طرف سے تیز لہجے میں پوچھا گیا اور فوراً ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

مجھے لگا جیسے غزالہ میری آواز تک سننے کی روادار نہیں رہی۔ مجھ سے ملنا تو دور کی بات ہے۔ وہ میرے سائے سے بھی بچنا چاہتی ہے۔ میں کتنی ہی دیر گم صم ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک منٹ بعد پھر انٹرکام کا بزر بجا اور میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف غزالہ کو پایا۔ اس مرتبہ اس کی آواز ہی نہیں لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی "شاہ جہاں صاحب! تین چار دن سے میں خود آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ سے بات ہو گئی۔" پھر ذرا رک کر کہنے لگی "اردشی کی مرحوم بہن نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس رات آپ میری خوابگاہ میں کیوں گھسے تھے۔۔۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے عاصم سے بات کی ہے۔ وہ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔ آج شام تک ساری بات کھل جائے گی۔ میں خود آپ کو بتاؤں گی کہ یہ واقعہ کیونکر اور کیسے ہوا۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "کچھ اور کہنا ہے یا بس؟"

وہ بولی "میں آپ کی ناراضی کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں لیکن یقین کریں عاصم اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارا شوہر ہے نا۔ ظاہر ہے بے قصور ہی ہوگا۔"

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ غزالہ کی آگاہی میرے لیے حیران کن تھی۔ میری نگاہوں میں نیناں کا جاں بلب چہرہ گھومنے لگا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میرے کانوں میں گونجے۔ اس نے کہا تھا "شاہ جہاں! میں نے تمہاری ایک مشکل آسان کر دی ہے۔"

اس وقت میں نے الفاظ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا اور پھر یہ فقرہ ویسے ہی ذہن سے نکل گیا تھا۔ آج اس فقرے کی اصلیت اور اہمیت مجھ پر آشکار ہو رہی تھی۔ مرتے مرتے نیناں نے وہ کام کیا تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مر رہی تھی اور مرنے والے کو بھلا کوئی کیا سزا دے سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے وہ بات غزالہ سے کہہ دی تھی جو اس کی بہن یا شوہر کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے بڑی دردمندی و دلیری سے غزالہ سے [illegible] کر دی تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا جب علی الصباح نیناں پر جان کنی کا عالم طاری ہوا تو غزالہ بحیثیت مالکن اور بحیثیت [illegible] اسے دیکھنے آئی۔ اس وقت نیناں نے غزالہ کو "مواصلات" کے اس قدرتی رابطے کے بارے میں بتایا جو اس کے باتھ روم میں موجود تھا اور جس کی مدد سے وہ اتفاقاً میرے اور شنکر کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس نے غزالہ پر انکشاف کیا کہ اس رات شنکر شکرا نے مجھے بے بس و مجبور کر کے اس کے بیڈ روم میں بھیجا تھا اور بعد میں مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ڈراما رچایا تھا۔

حسب توقع اسی شام مجھے شیخ عاصم بن ارشد کی طرف سے بلاوا آگیا۔ شیخ عاصم سرسبز ریسٹ ہاؤس کی روشن اور کشادہ نشست گاہ میں موجود تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر ٹیوب لائٹس کی روشنی میں [illegible] اور پھولوں والی بیلیں بہت خوشنما نظر آتی تھیں۔ شیخ عاصم صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی غزالہ بھی موجود تھی۔۔۔ ایک لمحے کے لیے میری اور شیخ عاصم کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے نرمی کی جھلک نظر آئی۔ میری کلائی پر ہلکا ہلکا سا ارتعاش شروع ہو چکا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ میں آٹھ میٹر کی حد کے اندر آ چکا ہوں۔ میں نے وسیع نشست گاہ کے آخری سرے پر ایک کرسی سنبھال لی۔ شیخ نے ٹھہرے لہجے میں کہا "ہم وہ لوگ ہیں جو دشمنی میں بھی رواداری اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ شنکر شکرا اپنے طور پر کوئی ایسا اقدام کر گزرے گا۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ اس رات مجھے تمہارے

بیڈ روم میں بھیجنے کا ذمے دار شکر شکرا تھا؟"

وہ بولا "میرے تمہارے درمیان دشمنی کا رشتہ ہے۔ ممکن ہے کہ تم میری بات پر یقین نہ کرو۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ شکر شکرا کا ذاتی فعل تھا۔ اس رات وہ نشے میں دھت تھا۔ اسے اپنے حواس پر قابو نہیں تھا۔ میری ملازمت کرتے کرتے وہ اپنی دشمنی چکانے کے چکر میں پڑ گیا۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "یہ تو کئی دفعہ سنا تھا کہ کچھ لوگ کوے کو سفید کہتے ہیں لیکن آج ایک ایسے جھوٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔"

میرے لہجے اور طرزِ تخاطب نے غزالہ کو بے چین کر دیا۔ وہ خفگی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شیخ کے چہرے پر بھی تلاطم نمودار ہو گیا۔ تاہم اس نے خود پر قابو رکھا۔ جچے ہوئے لہجے میں بولا "یہ لڑکی جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے میری شریکِ حیات ہے۔ تم عقل مند آدمی ہو۔ خود سوچو میں اپنی شریکِ حیات کے خلاف کوئی ایسی سازش کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "تم اس لڑکی کو شریکِ حیات کہہ کے دوسرا بڑا جھوٹ بول رہے ہو۔"

"شاہ جہاں" غزالہ روکھے لہجے میں بولی "میں۔۔۔ آپ کو اس انداز میں بات کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"بولنے دو بھی بولنے دو" شیخ نے نرمی سے کہا "ایک بندے کے دل کا غبار نکل جائے تو اس میں ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"تمہارے اندر اور باہر میں زمین آسمان کا فرق ہے شیخ عاصم اور یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں کیا ہوں اور میرا کردار کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی ایک شخص فیصلہ نہیں کر سکتا اور تم تو ہرگز نہیں کر سکتے۔ بہرحال میں نے تمہیں یہاں لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں اس وضاحت کے لیے بلایا ہے کہ اس واقعے کا ذمے دار شکر شکرا ہے۔ اس کے خلاف جو بھی ایکشن ضروری ہوا میں لوں گا۔"

"تم کیا ایکشن لو گے۔ تم تو ابھی ساتھ ساتھ اس کی صفائی بھی بیان کر چکے ہو۔ اس رات وہ نشے میں تھا۔ نشے میں آدمی کے حواس کہاں ساتھ دیتے ہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مٹی ڈالو اس پر۔"

وہ بولا "میں تمہارے مشوروں کا محتاج نہیں ہوں۔ جو مناسب سمجھوں گا کروں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں واپس چلا آیا۔ اس ملاقات کے بعد یہ تبدیلی آئی کہ مجھے تنگ و تاریک سرونٹ کوارٹر سے واپس اسی کمرے میں بھیج دیا گیا جہاں میں اس سے پہلے مقیم تھا۔ کمرے کے ساتھ ساتھ مجھے زریں گل بھی واپس مل گیا اور ہم دونوں کے لیے اروشی کی "سروس" بھی بحال ہو گئی۔ وہ ہم دونوں کے لیے رات کا کھانا لائی۔ کھانے کے دوران میں میں اور زریں گل نپی تلی گفتگو بھی کرتے رہے۔ یہ ہلکی پھلکی گفتگو تھی۔ زریں گل کافی خوشگوار موڈ میں تھا۔ پہلے سے کچھ صحت مند بھی ہو گیا تھا۔ اروشی کے جانے کے بعد جب میں اور زریں گل تنہا رہ گئے تو میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اچھی طرح کونوں کھدروں کی تلاشی لی۔ عین ممکن تھا کہ ہماری بات چیت سننے کے لیے اس کمرے میں بھی کوئی مائیکروفون قسم کی شے نصب کر دی گئی ہو۔ بہرحال کوشش کے باوجود میں اور زریں گل کسی ایسی شے کا سراغ نہیں لگا سکے۔ تسلی کرنے کے بعد ہم نے اصل گفتگو کا آغاز کیا۔ زریں گل نے بتایا کہ اسے اس کمرے سے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا لیا گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ بالائی منزل کے ایک نیم تاریک کمرے میں بند تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا جس سے اسے اندازہ ہوا کہ اسے کلوروفارم قسم کی چیز دی گئی تھی۔ اس نے بہت چیخ پکار کی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ تب سے اب تک وہ اسی کمرے میں بند رہا تھا لیکن اکیلا نہیں۔ تین چار دن بعد اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک لڑکی بھی بند کر دی گئی تھی۔ اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے زریں گل نے کہا۔

"ام کو کچھ ٹھیک سے یاد نہیں استاد صیب' اس کمرے میں امارا تیسرا چوتھا دن ہو گا جب شام کے وقت امارے کمرے سے باہر کسی لڑکی کا رونے دھونے کا آواز آیا۔ پھر امارے کمرے کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے ایک لڑکی کو دھکا دے کر کمرے میں پھینک دیا۔ دونوں کمروں کے درمیان والی دیوار میں ایک بڑا سا کھڑکی تھا اس لیے ام اُدھر کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ پہلے تو ام نے سوچا کہ کہیں یہ امارا غزالہ بی بی تو نہیں' لیکن وہ کوئی اور لڑکی تھا۔ بڑا بے شرمی کا منظر تھا۔ اس بے چاری کا کرتہ پھٹا ہوا تھا اور سر پاؤں سے بالکل ننگا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ ام کو اس لڑکی پر بڑا ترس آیا۔ وہ ساری رات ننگے فرش پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور ام اسے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھتا رہا۔ دو تین دن میں اس لڑکی سے امارا بے تکلفی ہو گیا۔ ام یہ جان کر حیران ہوا کہ وہ پاکستانی ہے اور ایبٹ آباد کا رہنے والا ہے۔ وہ اپنا نام صادقہ بتاتا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بہت غم ناک اسٹوری ہے اس کا لیکن وہ بتاتا نہیں تھا۔ ام کھڑکی سے منہ لگا کر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کھڑکی میں لڑکی کی طرف ایک تالا لگا ہوا تھا۔ ایک رات اس نے اپنے بالوں کی پن کے ساتھ تالے سے چھیڑ چھاڑ کیا تو وہ کھٹاک سے کھل گیا۔ ام دونوں بہت حیران ہوا۔ امارے درمیان کا کھڑکی کھل گیا تو ام ایک دوسرے کے کمرے میں آنے جانے لگا۔ یہ کام ام رات کے وقت کرتا تھا جب باہر سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ صادقہ امارے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اس نے ام کو بتایا کہ اچھے وقتوں میں اس نے بھی بہت سا پاکستانی فلمیں دیکھا تھا۔ اماری طرح وہ بھی لالہ سدھیر کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے دیبا کا بھی بہت سا فلمیں دیکھا ہوا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کو تھوڑا بہت انگریزی بھی آتا

ہے لیکن جب ام نے آزمانے کے لیے مٹھنی نا انگریزی پوچھا تو اسے نہیں آیا۔ بہرحال صادقہ کو امارا آواز بہت پسند تھا۔ وہ روز ام سے کوئی نہ کوئی گانا سنتا تھا۔ دیا اور طوفان کا یہ گانا تو اس نے کئی بار سنا۔ "کا میرے سنوا ہمیں کا ناجارے جانا ہے ام کا دور ہے۔"

میں نے کہا "گانے میں "ہمیں" کا لفظ تم نے پھر اپنی طرف سے لگا دیا۔"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "صادقہ کہتی تھی کہ اماری آواز میں بڑا درد ہے۔ ضرور امارا اسٹوری بھی دردناک ہو گا۔ وہ ام سے امارا سارا آپ بیتی بڑی تفصیل سے سننا چاہتا تھا۔ ہر وقت اس چکر میں پڑا رہتا تھا۔"

"اور تم اس چکر میں آ گئے" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"اوئے خدائی خوار۔۔۔ زریں گل کے بچے۔ کیا کچھ بتا دیا ہے اس لڑکی کو۔۔۔ کہیں شفتا وغیرہ کے بارے میں تو کوئی بات نہیں کر دی۔"

زریں گل اطمینان سے مسکرایا "نہیں استاد صیب! آپ کا شاگرد ہے ام' کوئی مذاق نہیں ہے اور آپ کے پاس آنے سے پہلے بھی ام کوئی ایسا گھامڑ نہیں تھا۔ ان سیانے ہیرو سنوں کے سارے چلتر سمجھتا ہے ام۔ ام تو اسی وقت ہوشیار ہو گیا تھا جب درمیان والی کھڑکی کا تالا اتنی آسانی سے کھل گیا تھا۔ ام جان گیا تھا کہ امارے ساتھ سین پارٹ کیا جا رہا ہے۔ بس ام فوراً کچھوے کے ماتق اپنی کھال کے اندر چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد ام سوچ سوچ کر ہر لفظ ناپ تول کر بولا۔ اس چھوکری نے بڑا زور لگایا امارا ایمان خراب کرنے کے لیے لیکن ام نے اس کا کوئی راز نہیں چلنے دیا۔ ایک روز تو اس نے حد کر دیا۔ تومی رات کو کھڑکی کھول کر امارے کمرے میں آ گیا اور اماری چارپائی پر پائنتی کی طرف لیٹ گیا۔ امارا آنکھ کھل گیا۔ ام نے پوچھا کیا بات ہے' کہنے لگا ادھر امارے کمرے میں چھپکلی گھوم رہا ہے۔ ام کو بہت ڈر لگ رہا ہے' ام تمہارے پاس آ گیا ہے۔ ام نے کہا تمہارے کمرے میں چھپکلی گھومتا ہو گا ادھر امارے کمرے میں تو چوہا گھوم رہا ہے۔ خوب موٹا تازہ ہے۔ ابھی شام کو ام نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ دیکھو ام نے احتیاط کے طور پر اپنی شلوار کا پائنچے بھی باندھ رکھا ہے۔ اماری شلوار کا بندھے ہوئے پائنچے دیکھ کر وہ تو ایک دم ڈر گیا استاد صیب۔۔۔ سٹی گم ہو گیا اس کا۔ بولا "اچھا اچھا ام واپس چلتا ہے۔" گھبراہٹ میں واپس مڑا تو پاؤں اس کڑکی (ذہنی شکنجہ) پر پڑ گیا جو ام نے چوہا پکڑنے کے لیے لگا رکھا تھا۔ بس ایک انگلی آ گیا اس کا کڑکی میں۔ وہ "ہائے رام!"۔۔۔ کہہ کر سیدھا اماری گود میں گرا۔ ام نے بڑی مشکل سے کڑکی میں سے انگلی نکالا۔ انگلی لہولہان تھا اور وہ الو کا دم فاختہ مچھلی کی طرح مچل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ام کو انڈین فلم کا وہ گانا یاد آ گیا۔۔۔ ایسے تڑپوں ہوں جیسے جل بن مچھلی۔ ام نے بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر کھڑکی سے پار پہنچایا۔ جب اس کے پاؤں میں کڑکی لگی تو اس کے منہ سے ہائے رام نکل گیا تھا۔ ام کو پکا پکا یقین ہو گیا کہ وہ نہ تو صادقہ ہے اور نہ ایبٹ آباد کا رہنے والا ہے۔ وہ کوئی انڈین عورت تھا جو روپ بھر کر امارے پاس آیا تھا۔ تاکہ امارے اندر کا بات اماری زبان پر لا سکے!!"

میں نے زریں گل سے پوچھا "اس نے تم سے کس طرح کی ٹوہ لینے کی کوشش کی؟"

وہ بولا "ہر طرح ٹوہ لینے کا کوشش کیا جی۔ خاص طور سے وہ آپ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مثلاً آپ سے امارا ملاقات کیسے ہوا۔ ام لاہور میں کہاں رہتا تھا۔ لاہور میں آپ کا بہن شفتا کہاں رہتا تھا۔ آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ وہ بہن شفتا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ باتوں باتوں میں بات کا رخ بہن شفتا کی طرف لے جاتا تھا۔ پوچھتا تھا کہ بہن شفتا کو غزالہ بی بی نے قلو زماں کے چنگل سے کیسے چھڑایا تھا۔ لاہور میں شفتا کا کون کون سہیلی تھا۔ وہ کہاں آتا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

زریں گل کی باتیں سن کر میری رگوں میں آگ گردش کرنے لگی۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ شیخ عاصم بن ارشد کا اصل نشانہ شفتا ہی ہے۔ اس بد باطن کے دل کی گہرائیوں میں سیاہی ہی سیاہی بھری تھی۔ شیخ عاصم سے ملاقات ہونے سے لے کر اب تک مجھے ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ اس شخص کی فطرت میں اچھائی کی کوئی رمق موجود ہے۔ کل پرسوں سے اس کے رویے میں کچھ نرمی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رکھاوے کی نرمی صرف غزالہ کو دھوکا دینے کے لیے ہے۔ وہ شخص کسی بھی لمحے مجھے کسی اور "قلت" کے حوالے کر سکتا تھا۔

○☆○

اس رات مجھے اس شخص کے درشن بھی ہو گئے جس کا ذکر اروشی نے کیا تھا۔ وہ فلمی کردار گوجیک کی طرح بالکل کلین شیو شخص تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ اس کا قد کم و بیش ساڑھے چھ فٹ رہا ہو گا۔ جسم مضبوط اور توانا تھا۔ ذکوان نامی یہ شخص پورچ میں ایک ٹیکسی کار سے اترا اور شیخ عاصم سے ملنے نشست گاہ کی طرف چلا گیا۔ شیخ عاصم کے ساتھ اس کی طویل گفتگو ہوئی ہو گی کیونکہ اس کی واپسی رات بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوئی۔ یہی شخص تھا جس کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے بارے میں نائل غنڈوں نے اروشی کو ہدایت جاری کی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ اروشی آج اس ہدایت پر عمل کر سکی ہے یا نہیں۔

ذکوان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد شیخ عاصم بھی اپنی مرسیڈیز گاڑی میں بیٹھ کر کہیں رخصت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی گاڑی میں رکھا گیا تھا۔ یہ سوٹ کیس دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ شیخ عاصم چند روز ریسٹ ہاؤس سے باہر رہے گا۔۔۔ اگلے روز سہ پہر کو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ اروشی نے آ کر مجھے

بتایا کہ مسز (غزالہ) مجھے ڈرائنگ روم میں طلب کر رہی ہیں۔ اس بلاوے نے مجھے چونکا دیا۔ یقیناً کوئی اہم بات تھی۔ میں لباس تبدیل کر کے اروشی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ غزالہ سنجیدہ موڈ میں تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر اب میرے لیے وہ بیگانگی نہیں تھی جو پچھلے چند ہفتے طاری رہی تھی۔ اس بیگانگی کی جگہ ایک طرح کی معذرت خواہی نے لے لی تھی۔ اروشی باہر نکل گئی تو وہ بولی "میں نے آپ کو ایک بہت اہم مسئلے پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ میں کئی دنوں سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔"

"کہو۔ میں توجہ سے سن رہا ہوں۔"

وہ بولی "میں نے ایک روز آپ سے اروشی کا ذکر کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لڑکی کسی لالچ یا خوف کے سبب کسی سازش کا حصہ بنی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا دوسرا خیال صحیح ہے۔ اروشی کے رویے کی وجہ خوف ہے۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے مجبوری کے تحت کر رہی ہے۔"

"یعنی آپ جانتے ہیں اس بارے میں؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس معاملے میں کچھ آگے بڑھا ہوں۔"

غزالہ سراپا سوال نظر آنے لگی۔ میں نے اس مزید اسے اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مختصر الفاظ میں میں نے اسے بتایا کہ نو دس روز پہلے رات کو کیا واقعات پیش آئے تھے۔ موسلا دھار بارش میں موٹر سائیکل کے تعاقب سے لے کر موٹر بوٹ کے سراغ تک اور اروشی کے ساتھ دھینگا مشتی سے لے کر اس کے طویل اقبالی بیان تک میں نے سب کچھ غزالہ کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت اور خوف میں ڈوب کر سنتی رہی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ بیناں کے گھر میں ڈاکے کی واردات بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی تو وہ خوف سے سفید پڑ گئی۔ میری روداد ختم ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں اندیشوں کے طویل سائے تھے۔ وہ روہانسی آواز میں بولی "میرا خدشہ درست نکلا ہے کہ یہ کوئی بہت سنگین چکر ہے۔ مجھے یہ شخص ذکوان پہلے ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ جرم اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔"

"تم جانتی ہو کچھ اس کے بارے میں؟"

وہ توقف کر کے بولی "ہاں۔ میں نے عاصم سے پوچھا تھا۔ یہ شخص امارات میں ہونے والے ایک بم دھماکا کیس میں ملوث ہے۔ یہ دھماکا ایک سال پہلے ہوا تھا اور اس میں کئی اعلیٰ افسران کے علاوہ شاہی خاندان کا ایک فرد بھی ہلاک ہو گیا تھا۔ اب یہ شخص ضمانت پر رہا ہے۔"

میں نے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو ایک سوال پوچھوں؟"

"میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مناتی۔ لیکن ایک گزارش مجھے بھی کرنی ہے۔ یہاں ہم دونوں کے درمیان جو گفتگو ہو وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اپنے الفاظ ضائع کیے ہیں۔ ایسی بات تمہارے ذہن میں آنی ہی نہیں چاہیے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر سر پر آنچل درست کیا اور بولی "آپ کچھ پوچھ رہے تھے"

"ہاں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ شیخ عاصم کہیں واقعی اس کیس میں ملوث تو نہیں۔"

اس کے چہرے پر ناگواری ابھری "آخر آپ اتنے بدظن کیوں ہیں ان کے بارے میں۔ وہ ایسے نہیں ہیں جیسا آپ انہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے شاہ جہاں.... وہ قانون کا احترام کرنے والوں میں ہیں۔ بم دھماکے والے معاملے میں تو میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتی ہوں وہ بالکل لاتعلق ہیں۔ میں نے ایک میگزین میں ان کا بیان بھی پڑھا ہے انہوں نے اس واقعے کی سخت مذمت کی تھی اور....."

"ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے" میں نے اس کی بات کاٹی "لیکن سوال یہ ہے کہ یہ شخص اس دور دراز جزیرے کے دور افتادہ علاقے میں شیخ عاصم سے ملنے کیوں آتا ہے؟"

"عاصم سے اس کی پرانی جان پہچان ہے۔ مروت کی وجہ سے عاصم اسے ملنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں نے دو تین بار ان کی گفتگو بھی سنی ہے۔ یہ گفتگو زیادہ تر شکار اور سیاحت کے بارے میں ہوتی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ کسی کو یہ گفتگو ریکارڈ کرنے کی ضرورت ہے۔ یا اس گفتگو کو ریکارڈ کر کے کوئی کسی طرح کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بہرحال مسئلہ تو اپنی جگہ موجود ہے نا۔ کچھ لوگ شیخ عاصم کو ایک سنگین جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ بڑے پراسرار طریقے سے ہو رہا ہے۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے ایک دو بار ان سے اروشی کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کر نہیں سکی۔ وہ آج کل کسی دوسرے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں اور بہت مصروف ہیں۔ ویسے بھی ڈرتی ہوں کہ پتا نہیں یہ کیا چکر نکل آئے اور عاصم کا پالا کیسے لوگوں سے پڑ جائے۔ اب آپ کی اطلاع کے بعد تو یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اروشی کو ہدایت دینے والے لوگ نہایت خطرناک ہیں۔"

کچھ دیر ہمارے درمیان گہری خاموشی طاری رہی پھر ذہن میں آنے والے کسی نئے خیال کے تحت غزالہ بولی "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اور آپ دونوں اس معاملے کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ عاصم آٹھ دس روز کے لیے انڈیا چلے گئے ہیں۔ اس دوران میں ہم اس معاملے کی چھان بین کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ تم دونوں کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی لیکن یہ مت بھولو کہ میں یہاں تمہارے شوہر کا قیدی ہوں۔ اس نے نرمال کو یرغمال کے طور پر اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے نہ صرف الیکٹرانک ڈیوائس کے جال میں جکڑا ہوا ہے بلکہ میرے ہاتھ پر یہ منحوس دستانے بھی منڈھوا رکھے ہیں۔"

دستانے کے ذکر پر غزالہ چونک گئی۔ وہ جیسے بھول ہی چکی تھی کہ میرے ہاتھوں پر دستانے بھی ہیں۔ انسانی نظر بہت جلد انوکھے مناظر کی عادی ہو جاتی ہے اور پھر وہ مناظر اپنا انوکھا پن کھو دیتے ہیں۔ میرے دستانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی تو خود میں بھی بھول جاتا تھا کہ میں دو تین ماہ پہلے تک ان دستانوں کے بغیر زندہ تھا۔

غزالہ نے میرے دستانوں کو تاسف کی نگاہ سے دیکھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "خیر ان دستانوں کا تو میں کچھ کر لوں گی۔ لیکن ہم کریں گے کیا؟ یہاں ہم بالکل اجنبی ہیں۔ اس نا نگر زمت رابستہ کسی خطرناک شخص تک پہنچنا اور پھر اس کی نیت کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر یہ کام آسان ہوتا تو میں اس کی ہامی کیوں بھرتا اور تم بھی مجھ سے اس کا ذکر کیوں کرتیں؟ میں یہ کام کروں گا اور ضرور کروں گا لیکن میری ایک شرط ہوگی...."

"کیا؟"

"میں یہ کام تنہا کروں گا۔ تمہیں اس چکر میں پڑنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے.... ہاں اگر مجھے کسی طرح کا تعاون درکار ہوا تو میں تم سے کہہ دوں گا۔"

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ اپنی جان خطرے میں ڈالیں۔ اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لیے جو آپ کا دوست نہیں۔"

"تم اپنے شوہر کی بات کر رہی ہو لیکن میں یہ کام اس کے لیے نہیں تمہارے لیے کروں گا اور اگر تمہیں میری شرط قبول نہیں تو پھر اس بات کو ختم سمجھو۔"

وہ لاجواب سی ہو گئی۔ کچھ دیر متذبذب رہنے کے بعد بولی "اچھا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیجئے۔ میں آپ کو کل یا پرسوں تک بتاؤں گی۔"

پرسوں کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے ہی روز سہ پہر کو غزالہ نے مجھے پھر بلا بھیجا۔ میں اروشی کے ساتھ نشست گاہ میں داخل ہوا تو وہ ایک سنہالی خادم کو بتا رہی تھی کہ وہ آج گولف گراؤنڈ نہیں جائے گی۔

"لیکن مسز...." خادم نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی "کہہ جو رہا ہے کہ آج نہیں جاؤں گی۔"

خادم بھیگی بلی کی طرح سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ غزالہ اب کافی بااختیار ہو گئی ہے اور شیخ عاصم کی غیر موجودگی میں ریسٹ ہاؤس کے ملازمین اور یہاں کے معاملات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

تنہائی ملتے ہی غزالہ نے مجھے بتایا کہ ٹیلی فون پر شیخ عاصم سے اس کی بات ہوئی ہے۔ شیخ عاصم بھوپال میں ہیں اور ابھی دس بارہ روز وہیں قیام کریں گے۔ غزالہ نے کہا "میں نے ان سے آپ کے دستانوں کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ مان گئے ہیں۔"

"لیکن میں نے تو تم سے گزارش کی تھی کہ اپنے شوہر سے میرے لیے کوئی رعایت نہیں مانگو گی۔ یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے ہمیں نمٹانے دو اور تم نے بھی وعدہ کیا تھا کہ تم نے شیخ سے میرے لیے کبھی رحم کی اپیل نہیں کی۔"

"اس پرانی بات کو چھوڑیے۔ اب میں جو کچھ کر رہی ہوں آپ پر احسان نہیں کر رہی ہوں۔ اس میں میرے شوہر کا ہی فائدہ ہے۔"

"کیا کہا ہے تم نے شیخ عاصم سے؟"

"بس آپ کے دستانوں کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ مان گئے ہیں۔"

"اروشی اور دو عمران وغیرہ کا ذکر نہیں کیا؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ ہاں انہیں احتیاطاً اتنا بتا دیا ہے کہ کچھ لوگ یہاں ذکوان کی ٹوہ لگاتے پھر رہے ہیں۔ اور وہ مشکوک قسم کے لوگ ہیں۔"

میں نے کہا "تم کہتی ہو کہ شیخ عاصم پریشان ہے۔ کہیں یہ پریشانی بھی تو اس دھماکا والے معاملے سے متعلق نہیں؟"

"نہیں۔ وہ تو کوئی پراپرٹی کا جھگڑا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دبئی میں ایک بہت بڑے رہائشی منصوبے کے لیے عاصم زمین خریدنا چاہتے تھے۔ وہ زمین مخالف پارٹی خرید چکی ہے۔ بس اسی کا کوئی تنازع ہے۔"

بات کرتے کرتے غزالہ کی انگلیاں اپنے پرس سے بھی مصروف رہی تھیں۔ پرس میں سے اس نے ایک چابی نکالی۔ یقیناً یہ میرے دستانوں کے لاکر کی چابی تھی۔ اس نے چابی کی مدد سے یکے بعد دیگرے دونوں لاکر کھول دیے.... آٹھ دس گھنٹے تک تنگ جوتے پہننے کے بعد اتار دیے جائیں تو پاؤں کو بے حد آرام محسوس ہوتا ہے۔ یہ سخت دستانے تو میرے ہاتھوں پر کئی ہفتے سے چڑھے ہوئے تھے۔ دستانے اترے تو یوں لگا جیسے میں اپنے ہاتھوں کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ کتنے اجنبی سے ہاتھ تھے یہ کمزور سیاہ دھبے پھیلے اور قابل نفرت۔ مجھے یہ یقین کرنے میں دشواری پیش آئی کہ یہ میرے ہی ہاتھ ہیں۔ میں نے بند مٹھیوں کو کھولنا چاہا تو انگلیاں لرز کر رہ گئیں۔ غزالہ کی آنکھوں میں دکھ تیرنے لگا۔

"آئی ایم رئیلی سوری شاہ جہاں" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"اس میں شرمندگی کی کون سی بات ہے۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس معمولی سی بات کے لیے تو شیخ عاصم کو بھی شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں شرمندہ ہونے والا جو کام اس نے کر رکھا ہے اس پر اسے ضرور شرمندہ ہونا پڑے گا۔ آج نہیں تو کل۔"

میرا اشارہ فریال والے واقعے کی طرف تھا۔ غزالہ یہ اشارہ سمجھ گئی۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی "آپ تھوڑا انتظار کریں شاہ جہاں! آپ کے ان ہاتھوں کی طرح وہ بھی ان شاء اللہ بہت جلد آزاد ہوگی۔"

غزالہ کے لہجے میں اعتماد تھا لیکن مجھے اس اعتماد کے پیچھے غزالہ کی خوش فہمیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ فریال کی رہائی کا مژدہ سنا رہی تھی اور مجھے ابھی تک یہ بھروسا بھی نہیں تھا کہ میرے ہاتھ مستقل طور پر آزاد ہو گئے ہیں۔ یقیناً فون پر غزالہ نے شوہر کی منت سماجت کی ہوگی۔ وہ مان گیا ہوگا۔ اس لیے کہ دس بارہ روز تک وہ اس ریسٹ ہاؤس سے سیکڑوں میل دور تھا۔ اسے مجھ سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا۔ امکان غالباً تھا کہ ریسٹ ہاؤس واپس پہنچتے ہی وہ کسی بہانے یہ دستانے پھر میرے ہاتھوں پر منڈھوا دے گا۔

غزالہ نے ایک ملازمہ سے گرم پانی، روئی اور جراثیم کش دوا منگوائی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو ایک کشادہ ٹب میں رکھ کر دھونا شروع کیا۔ غزالہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر بتا سکتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ اس اندوہناک واقعے پر معذرت کرنا چاہ رہی تھی جب مجھے مجبور کر کے ترست کی بستی میں دھکیلا گیا تھا۔ مجھ سے اس پر حملہ کروایا گیا تھا۔ اس کے کپڑے تار تار کروائے گئے تھے اور اس کے جسم کو میرے ہاتھوں کا اذیت ناک لمس دیا گیا تھا۔ لیکن یہ ایسا موضوع تھا جسے چھیڑتے ہوئے وہ پانی پانی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر سوچتی رہی۔ آخر موضوع بدل کر وہ بولی "کچھ سوچا ہے آپ نے کہ اب کیا کرنا ہے ہمیں؟"

میں نے کہا "تم پھر "ہم" کا لفظ استعمال کر رہی ہو۔ میں نے کل تمہیں اپنی شرط بتا دی تھی۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں اس دھڑان کا والے معاملے کا کھوج لگاؤں تو مجھے تنہا کوشش کرنے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی حوالے سے اس چکر میں تمہارا نام آئے۔"

"لیکن آپ مجھے آگاہ تو رکھیں؟"

"صرف اس حد تک جہاں تک ضروری ہوا۔ تم میرے لیے صرف تھوڑی سی نقدی اور ایک ریوالور کا انتظام کر دو۔"

"اور سواری؟"

"اگر ہو سکے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے کون سا زیادہ دور جانا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے سن گن لی ہے۔ کاکا نزدیکی قصبے "رگوانا" کا رہنے والا ہے۔ وہیں علاقے کا بدنام ترین ریسٹورنٹ "ڈنائٹ" ہے۔ یہ ریسٹورنٹ کاکا ہی کی ملکیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہاں اس سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔"

وہ بولی "آپ نے بتایا تھا کہ الیکٹرانک ڈیوائس کی وجہ سے آپ ایک خاص فاصلے تک جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد رسٹ واچ کی وجہ سے آپ کی کلائی پر برقی جھٹکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔"

"ہاں۔ لیکن یہ نو کلومیٹر کے بعد ہوتا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رگوانا نامی یہ قصبہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

غزالہ کی آنکھوں میں تشویش کے سائے تھے "لیکن اگر کسی وجہ سے آپ کو اس قصبے سے آگے جانا پڑا۔ میرا مطلب ہے مجبوراً"

میں غزالہ کا اندیشہ سمجھ رہا تھا۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر کسی نے زبردستی مجھے ریسٹ ہاؤس سے دور لے جانا چاہا تو اس صورت میں میرا انجام کیا ہوگا۔ میں نے کہا "دور دراز کی باتیں مت سوچو۔ اگر سواری کا انتظام ہو سکتا ہے تو آج شام تک کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ میں اور زریں گل آج رات کسی وقت یہاں سے نکل جائیں۔"

"زریں گل بھی آپ کے ساتھ جائے گا؟"

"کیوں۔ اس کی طرف سے کوئی اندیشہ ہے؟"

"نن.... نہیں" وہ جلدی سے بولی "میں انتظام کر دوں گی۔ مگر..." اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "اپنا خیال رکھیے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ بے اختیار میرے گیلے ہاتھوں سے چھو گئے تھے۔

لمس بھی کتنی انوکھی چیز ہے۔ حالات، جذبات اور رشتوں کے سانچوں میں لمس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ کبھی ایک انگلی کا دوسری انگلی سے چھونا قیامت بن جاتا ہے اور کبھی جسمانی ملاپ کی انتہا تک پہنچنے والے بھی ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور ہوتے ہیں۔ غزالہ کے ہاتھ جھجک کر پیچھے ہٹ گئے اور اب وہ بے جان کبوتروں کی طرح اس کی گود میں پڑے تھے۔ کبھی یہی ہاتھ میرے تھے۔ میرے لیے دعا کے لیے اٹھتے تھے۔ میرا دامن تھامنے کے لیے لپکتے تھے۔ میرے گلے کا ہار بن جاتے تھے۔ آج وہ مجھے چھونے کے حقدار بھی نہیں تھے اور دکھ کی بات یہ تھی کہ ان ہاتھوں کو ایک ایسے شخص نے مجھ سے دور کیا تھا جس نے اپنے دغاباز چہرے پر ایک مخلص شوہر کا چہرہ سجا رکھا تھا۔

واپس آکر میں نے زریں گل کو اپنے ہاتھ دکھائے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے بے اختیار اپنے ہونٹ میرے ہاتھوں سے لگا دیے اور اپنے گرم آنسوؤں سے انہیں تر کرنے لگا۔ میں نے بمشکل اس کی گرفت سے ہاتھ چھڑائے اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ ساری بات سن کر بولا "استاد میرا خیال ہے غزالہ بی بی بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ جس طرح بھی ہو شیخ عاصم اور آپ کے درمیان دشمنی کا الاؤ ٹھنڈا

پڑ جائے اور آپ فریال بی بی کو یہاں سے صحیح سلامت لے جانے میں کامیاب ہو جائیں۔ آپ بھی رگوانا والا چکر رہنے دیجیے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ غزالہ بی بی اپنے شوہر کے لیے فکرمند ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا مجازی خدا کسی سازش کا شکار نہ ہو جائے لیکن وہ اس کے علاوہ بھی کچھ چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس سازش کا پتا چلانے کا نیک کام آپ کے ہاتھوں ہو تاکہ شیخ عاصم کے دل میں آپ کے لیے ہمدردی پیدا ہو اور وہ آپ کے بارے میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ دراصل... ام... میں سمجھتا ہے کہ غزالہ بی بی آپ میں اور شیخ عاصم میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ آپ دونوں کا بھلا چاہتا ہے۔ آپ میں سے کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ کوشش کر رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ شیخ عاصم آپ کے بارے میں اپنا رویہ بدل لے گا۔"

"لیکن میں ایسا نہیں سمجھ رہا ہوں۔"

"آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟"

"تم نے کبھی پیاز دیکھا ہے۔ اس کے ہر چھلکے کے پیچھے ایک اور چھلکا ہوتا ہے۔ شیخ عاصم بھی ایک بہت بڑا اور نہایت کڑوا پیاز ہے۔ غزالہ نے ابھی اس کا پہلا چھلکا دیکھا ہے۔"

O☆O

میرے ہاتھ ابھی ٹھیک طرح کام نہیں کر رہے تھے۔ میں نے اپنا پروگرام چوبیس گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیا۔ زریں گل سارا دن میرے ہاتھوں کی مالش کرتا رہا اور انگلیوں کے پٹاخے نکالتا رہا۔ دوسرے روز پانچ چھ بجے کے لگ بھگ مطلع ابر آلود ہو گیا۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہی ریسٹ ہاؤس میں برقی قمقمے جگمگا اٹھے۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ ہر شے دھلی دھلائی اور نکھری نکھری سی تھی۔ غزالہ نے حسب وعدہ ریوالور اور کرنسی مجھے پہنچا دی تھی۔ اوڈتی یہ دونوں اشیا بڑی احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ کر لائی تھی۔ ریوالور کے ساتھ اس کی چار درجن گولیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ کرنسی والے بٹوے میں چابی بھی موجود تھی۔ اوڈتی نے مجھے بتایا کہ یہ اس فاکس ویگن کار کی چابی ہے جو ریسٹ ہاؤس کے عقبی گیٹ کے پاس کھڑی ہے۔

سرِشام ہی میں اور زریں گل فاکس ویگن پر سوار ریسٹ ہاؤس سے نکل آئے۔ مسلح محافظوں نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ یقیناً مالکن (غزالہ) کی طرف سے انہیں ہمارے بارے میں خصوصی ہدایات مل چکی تھیں۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی۔ اس کے ڈیش بورڈ میں مکمل کاغذات موجود تھے۔ کسی غلام علی نامی شخص کا ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ یہ لائسنس میرے کام آسکتا تھا۔ گاڑی کی ٹینکی فل تھی۔ ریسٹ ہاؤس سے نکلتے ہی ہم اس بھیگی بھیگی سڑک پر آگئے جس پر چند روز پہلے طوفانی بارش میں ہم نے اوڈتی کا تعاقب کیا تھا۔ یہ سڑک سیدھی "گال روڈ" تک جاتی تھی۔ گال روڈ سے دو ڈھائی کلومیٹر ادھر ہی ایک اور ذیلی سڑک جنوب کے رخ پر مڑتی تھی۔ یہ سڑک بھی بانس، ناریل اور اشوک کے سرخ پھولوں والے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جب ہم اس سڑک پر پہنچے تو "رگوانا" کا قصبہ ہم سے تقریباً پچیس کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ اس سڑک پر اکا دکا گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کبھی کبھی من چلے سائیکل سواروں کی کوئی ٹولی بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک ٹولی میں کچھ سائیکل سوار لڑکیوں نے منی اسکرٹ پہن رکھے تھے۔ ان کی عریاں ٹانگیں دیکھ کر زریں گل نے ناک بھوں چڑھائی۔ ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ مجھے کچھ نئے نئے سے لگ رہے تھے۔ انگلیوں کی حرکت پوری طرح بحال تو نہیں ہوئی تھی مگر میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

ادھ پون گھنٹے میں ہم قصبے میں پہنچ گئے۔ یہ قصبہ اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں میں گھرا ہوا تھا۔ سڑکیں صاف ستھری اور بازار پررونق تھے۔ قصبے کا بس اسٹینڈ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے پہلے تو قصبے کا ایک راؤنڈ لگایا۔ پھر ایک اسنیک بار سے کیلے کا ملک شیک پیا۔ یہاں سے پوچھ پاچھ کر ہم اس گنجان آباد علاقے میں پہنچ گئے جہاں چند بڑے بڑے ہوٹلوں کے درمیان "ڈے نائٹ" نام کا ریسٹورنٹ موجود تھا۔ ہم نے کار ریسٹورنٹ سے کافی فاصلے پر پارک کی اور پیدل ہی چل دیے۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک بتدریج کم ہو رہا تھا۔ فضا میں ناریل کے تیل اور خوشبودار تمباکو کی مہک رچی بسی تھی۔ چائے خانوں کے سامنے انناس اور زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی سنہالی دوشیزہ جوڑے میں ونجی گندھا کے پھول لگائے اپنے پریمی کے ساتھ گشت کرتی نظر آ جاتی تھی۔ سری لنکا میں انڈین فلمی گانے عام بجائے جاتے ہیں۔ کسی دکان پر ہیرو انجانا کا گانا "یہ ربنا یہ محفل میرے کام کی نہیں" زور شور سے بج رہا تھا۔ ڈے نائٹ ریسٹورنٹ کا راستہ ایک تنگ و نیم تاریک گلی میں سے تھا۔ میں اور زریں گل ریسٹورنٹ کے دروازے پر پہنچے تو اندر سے موسیقی کی بے ہنگم آوازیں آئیں۔ ایک خطرناک صورت غنڈا چوکیدار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں سر تا پا گھورا۔ ہم اس کے پاس سے نکل کر اندر آگئے۔ ایک نیم تاریک راہداری میں دو شرابی لڑھکے پڑے تھے۔ ہم ریسٹورنٹ کے ہال میں پہنچے تو ایک طوفان بدتمیزی نظر آیا۔ یہ ہفتے کی رات تھی لہٰذا محفل کچھ زیادہ ہی عروج پر آئی تھی۔ سگریٹوں کا دھواں، شراب کے بھبکے، چرس کی بو اور پُرشور موسیقی میں گندھے ہوئے زنانہ و مردانہ قہقہے۔ یہاں کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ سری لنکا میں ہونے کے باوجود یوں محسوس ہوا کہ تھائی لینڈ یا سنگاپور کے کسی نائٹ کلب میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہاں وہاں کچھ اخلاق سوز مناظر بھی نظر آئے۔ میں نے ایک چالیس پچاس سالہ یورپین کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی اور چشمہ تھا۔ قد تقریباً سوا چھ فٹ رہا ہوگا۔ وہ ایک ساڑھے چار

فٹ کی تامل حسینہ کو عقب سے بازوؤں میں لیے کھڑا تھا اور موسیقی کی لے پر مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص بڑی بے تکلفی سے سرِعام بوس و کنار میں مصروف تھا۔ قہقہے گونج رہے تھے اور وہسکی کے جام گردش میں تھے۔ کرسیوں کے علاوہ طویل صوفوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ان دو رویہ صوفوں کے سامنے بلوری تپائیاں رکھی تھیں۔ ہم دونوں ایک ایسے ہی صوفے پر براجمان ہو گئے اور اور سج دھج سے جی بہلانے لگے۔ میں نے ایسے دھواں دھار کلب اور جوا خانے بمبئی اور دہلی میں بھی بہت دیکھے تھے۔ ایسی جگہوں کا ہنگامہ پرور ماحول میرے لیے نیا نہیں تھا لیکن زرین گل کچھ ہراساں نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر سرِعام پیار و محبت اور چھیڑ چھاڑ کے مناظر اسے پریشان کر رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس پر دھربان کا کا کا شبہ ہو سکے۔ ہال میں آٹھ دس ایسے خطرناک غنڈے ضرور موجود تھے۔ جنہیں کا کا کے ساتھی سمجھا جا سکتا تھا۔ ان کی عقابی نگاہیں ہر لحظہ اور ہر منظر کو گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد ہال میں ایک اور تماشا شروع ہو گیا۔ ایک بنا خاص کی مدراسی رقاصہ ہال میں داخل ہوئی اور ہنگامہ خیز رقص کرنے لگی۔ اس نے تبری کا کمال جیسا تنگ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ باری باری ہال میں بیٹھے ہر مرد کے پاس پہنچ رہی تھی۔ اس کے گلے میں بانہیں ڈال رہی تھی۔ کبھی کسی کی آغوش میں بیٹھ جاتی تھی۔ کبھی کسی کو مجبور کرتی تھی کہ وہ اسے بازوؤں میں اٹھائے اور رقص کرے۔ کبھی کسی کے کندھے پر سوار ہو جاتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر زرین گل کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! یہ کم بخت ادھر ہماری طرف آیا تو کیا ہو گا۔ ام تو کبھی اس ناپاک کو ہاتھ نہ لگائے گا۔"

میں نے کہا "ہاتھ نہ لگانا منہ لگا لینا۔ دیکھو سب ایسا ہی کر رہے ہیں۔"

"سب جائے جہنم میں۔ ام سے یہ نہیں ہو گا۔ ام کو تو یہ رقص دیکھ کر بدنام فلم "دلہن ایک رات کا" یاد آ گیا ہے۔ خدا کا مارے۔ ناچ ہے یا گندا گالی ہے؟"

"تو پھر اٹھ کر باہر چلے جاؤ۔ ناچ ختم ہو تو آ جانا۔"

"ہاں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ام ابھی دو گھونٹ پیشاب کر کے آتا ہے۔"

وہ اٹھ کر مین دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن بالکل اتفاقیہ طور پر وہی بات ہو گئی جس سے وہ ڈر رہا تھا۔ شوخ و شنگ اندین رقاصہ کی نگاہ اس پر پڑی اور ہال کے عین وسط میں اس نے زرین گل کو جا لیا۔ زرین گل کے بازو کھول کر وہ اس کے ساتھ لگ گئی اور اسے رقص پر مجبور کرنے لگی۔ زرین گل ایک دو جھٹکے لگا دیتا تو اس کی جان چھوٹ جاتی لیکن وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس نے لڑکی کو خود سے دور دھکیلنے کی کوشش کی تو اردگرد کی میزوں سے قہقہے بلند ہوئے۔ لڑکی نے چٹا چٹ زرین گل کو دو تین بار پیار کیا اور پھر حیران کن پھرتی سے ایک میز پر چڑھ کر زرین کے کندھوں پر سوار ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ زرین گل بھی کچھ نہیں پایا۔ میں نے دیکھا زرین کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا ہے۔ وہ کوئی ایسا پارسا اور پرہیزگار تو نہیں تھا لیکن ایسا آزاد خیال بھی نہیں تھا کہ سرِعام لڑکی کو کندھوں پر اٹھائے پھرے۔ پھر یہ اس کی مردانگی کے بھی خلاف تھا کہ ایک لڑکی اسے سواری کا گھوڑا بنا لے اور لڑکی بھی وہ جو اندین تھی۔ ایک دم اس کا دماغ گھوم گیا۔ غالباً پشتو میں اس نے کچھ غیر مہذب الفاظ استعمال کیے پھر لڑکی کو گھما کر ایک میز پر گرا دیا۔ وہ پہلو کے بل گری اور چیخ اٹھی۔

ایک چھناکے سے موسیقی دم توڑ گئی۔ تماشائیوں میں سے کچھ زور زور سے ہنسنے لگے۔ چند حیران نظروں سے زرین گل کو دیکھنے لگے۔ ہال کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑے تین غنڈا صورت افراد خطرناک تیوروں سے زرین گل کی طرف بڑھے۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ میں نے احتیاط کے طور پر اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھ لی اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ غنڈا صورت افراد میں سے ایک نے زرین گل کو گریبان سے پکڑ لیا تھا اور تیز لہجے میں اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ زرین گل دھکا کھا کر دور ایک میز پر جا گرا ہے۔ یہ ہنگامے کا آغاز تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اگلے ہی لمحے خود بھی ہنگامے میں شریک ہو گیا۔ میری بھرپور ٹانگ ایک شخص کے منہ پر پڑی اور دوسرے کی ٹھوڑی تلے میرے مکے نے ایک بار گاوٹھ لگا دی۔ ہال میں ایک دم ہلچل سی مچ گئی۔ انتظامیہ کے کارندے دانت پیستے میری اور زرین گل کی طرف بڑھے۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ میری دل پسند صورت حال تھی۔ دھواں دھواں کلبوں اور جوا خانوں میں بدمست غنڈوں کے ساتھ میں نے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں۔ یہی چھوٹی بڑی لڑائیاں تھیں جنہوں نے مجھے شاہ جہاں سے جہانی استاد بنایا تھا اور جرم کی دنیا میں میری دھاک بٹھائی تھی۔

جونہی میں مکا تان کر ایک غنڈے کی طرف بڑھا ایک صحت مند انگریز عورت میرے سامنے آ گئی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔ وہ انگریزی میں چلائی "ٹھہرو۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ یہ تمہیں جان سے مار دیں گے" پھر وہ تامل غنڈوں کی طرف مڑی "نہیں چھوڑو انہیں۔ یہ اجنبی ہے۔ غلطی ہو گئی ہے اس سے غلطی ہو گئی ہے۔"

اس دوران میں ایک تامل نے مجھے گالی دی۔ میری ٹانگ بے اختیار حرکت میں آئی اور انگریز عورت کے پہلو سے نکل کر تامل غنڈے کے پیٹ میں پڑی۔ وہ کرب کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی عارضی جنگ بندی ٹوٹ گئی۔ تامل غنڈے غراتے ہوئے ہم پر پل پڑے۔ میں نے دو غنڈوں کے چہروں پر دھواں دھار ٹکریں رسید کیں اور ایک تیسرے پر بھاری بھرکم میز الٹا دی۔

یکایک کمانی دار چاقو کی کڑکڑاہٹ ابھری۔ ایک مجسم تامل جان لیوا انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے کس عذاب کو دعوت دے رہا ہے۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی اور وہ ایک تیجی تلی ٹھوکر اس کی کمر پر رسید کی۔ وہ ایک بڑے اسٹیریو ڈیک کے اوپر گرا اور اسے چکنا چور کر دیا۔ شارٹ سرکٹ کے سبب ڈیک میں پٹاخے چلے اور زبردست کرنٹ لگنے کی وجہ سے چاقو بردار تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیک کے قریب کاؤنٹر میں آگ بھڑک اٹھی۔ میرا مد مقابل ایک لمحے کے لیے غافل ہوا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر سر سے بلند کیا اور ایک ایسے سیاہ فام غنڈے کے سر پر دے مارا جو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھا کر مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ دوسری طرف زرین گل پوری وحشت کے ساتھ دو تاملوں سے برسرپیکار تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی طرح وہ کمانی دار چاقو آ گیا تھا جو مجھ پر حملہ کرنے والے کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ زرین گل جنونی انداز میں یہ چاقو چاروں طرف گھما رہا تھا اور ساتھ ساتھ بڑکیں بھی بلند کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا دو تین افراد جو اس کے ہاتھوں زخمی ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک زخمی کی آستین خون سے رنگین تھی۔ یک شخص زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور قوت سے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ گرا اور بے سدھ ہو گیا۔ بلائی ووڈ کا کاؤنٹر اب دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اسی کاؤنٹر سے بلند ہونے والے شعلوں میں سے مجھے وہ تماشائی نظر آ رہے تھے جو چیختے چلاتے "ٹرائٹ ریسٹورنٹ" سے باہر بھاگ رہے تھے۔ اگلے تیس چالیس سیکنڈ تک میں نے دو اور تامل غنڈوں کو ناکارہ کر دیا۔ ان میں سے ایک کی کلائی ٹوٹ گئی تھی اور دوسرا اپنا ہی ریوالور چل جانے سے زخمی ہو گیا تھا۔

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور زرین گل کو اشارہ کیا کہ اب ہمیں یہاں سے بھاگنا چاہیے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے لیکن اس سے پہلے کہ ہم راہ فرار اختیار کرتے ریستوران کے دروازے پر سری لنکن پولیس نظر آئی۔ دو سپاہیوں کے ہاتھ میں خود کار رائفلیں تھیں اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

"ہینڈز اپ" ناٹے قد کا ایک سنہالی انسپکٹر ریوالور تان کر گرجا۔

میں نے زرین گل کی طرف دیکھا۔ وہ بپھرا ہوا شیر نظر آتا تھا۔ میرے ایک اشارے پر وہ پھر لڑائی مار کٹائی کا آغاز کر سکتا تھا۔ تاہم میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے سمجھایا کہ اب ہمیں تھوڑی دیر کے لیے مونچھ نیچی کرنی ہو گی۔ میں نے ریوالور ایک میز پر لڑھکا دیا۔ زرین گل نے بھی چاقو ایک دیوار پر دے مارا۔ سنہالی پولیس مین ہم دونوں کو حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ ریستوران کے ملازمین گھبرا کے سلنڈروں سے آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ اسی دوران میں ہال کمرے سے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر ایک ہٹا کٹا سیاہ فام شخص نظر آیا۔ اس کی انسانی دو آنکھیں چمک رہی تھیں اور کنپٹیوں پر اکا دکا بال سفید تھے۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یہی کا کا ہے۔ اس شخص نے بڑی دلچسپی سے ہال کی ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لیا اور اپنے غنڈوں کی حالت زار بھی دیکھی پھر اس کے ہاتھ بے اختیار تالی بجانے کے لیے اٹھ گئے۔ "بہت خوب۔ کیا بات ہے" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "پیدائشی لڑاکے لگتے ہو تم لوگ۔ کا کا تمہیں دیکھ کر خوش ہوا" اس کا اشارہ میری اور زرین گل کی طرف تھا۔

وہ کچھ دیر ہمیں گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر پولیس والوں سے بولا "سوری انسپکٹر! تمہیں زحمت ہوئی۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔"

جواب میں انسپکٹر نے سنہالی زبان میں کوئی اعتراض کیا۔ دھربان کا کا نے سنہالی میں ہی اس اعتراض کا جواب دیا۔ ہال کے ایک کونے میں جا کر وہ دونوں کچھ دیر کھسر پھسر کرتے رہے پھر انسپکٹر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس لوٹ گیا۔ کاؤنٹر کی آگ اب بجھائی جا چکی تھی اور گاڑھا گاڑھا سفید دھواں ہال میں پھیلا ہوا تھا۔ اسٹیریو ڈیک میں ابھی تک کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کی بجلی منقطع کی گئی اور ناروں سے چپک جانے والے غنڈے کو وہاں سے ہٹایا گیا۔ وہ جان سے تو بچ گیا تھا لیکن شدید زخمی ہوا تھا۔ کچھ افراد اسے ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد اسپتال لے گئے۔ کا کا کے دو کارندوں کی خودکار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کا کا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے تاثرات سے ان کی دلی کیفیت بھانپنا مشکل ہوتا ہے۔ اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور زینے طے کر کے بالائی منزل پر آ گیا۔ رائفل بردار بڑے چوکس انداز میں ہمارے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک سجے سجائے تابین نوئی کمرے میں کا کا نے ہم سے پوچھ گچھ کی۔ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میں نے اس کو بتایا کہ میں اٹک جیل پاکستان سے بھاگا ہوا قیدی شاہ جہاں ہوں اور زرین گل میرا ساتھی ہے۔ ہم چوری چھپے انڈیا میں داخل ہوئے تھے اور وہاں سے خشکی کے راستے منار پورٹ پہنچے ہیں۔ منار پورٹ سے ساحلی محافظوں نے ایک ایک ہزار روپے کے عوض ہمیں سری لنکا پہنچا دیا ہے۔ زرین گل کے بارے میں بھی میں نے فرضی جعلی کہانی سنائی۔ ہمارے مجرمانہ بیک گراؤنڈ نے دھربان کا کا کو بہت متاثر کیا۔ اس نے ہمارے لیے کھانا اور مشروبات منگوائے اور یہ تاثر دیا کہ اس نے اپنے ریستوران میں ہماری مار دھاڑ اور توڑ پھوڑ کو درگزر کر دیا ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "تم لوگ اس شہر میں نئے ہو۔ ورنہ یہ سب کچھ نہ کرتے جو کیا ہے۔ اگر تمہیں اس قصبے اور اس علاقے میں رہنا ہے تو پہلے کا کا کو یعنی مجھے جاننا ہو گا۔"

میں نے کہا "آپ کے آدمیوں نے جلد بازی کی۔ ورنہ یہ سب

کچھ نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ بہرحال ہم دونوں کو آپ کے نقصان کا بے حد افسوس ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کسی "خدمت" کی شکل میں ہم سے اپنا نقصان پورا کر سکتے ہیں۔"

کاکا سپاٹ لہجے میں بولا "اس بات کو دل پر نہ لو۔ آرام کرو۔ میں کل تم سے بات کروں گا۔ کمرے کے فریج میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ سوائے لڑکی کے۔ اس کی ضرورت ہو تو بھی صرف کال بیل کا بٹن دبا دینا۔ اوکے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ "میو اے گڈ نائٹ" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ رات ہم نے "ٹمرنائٹ ریسٹورنٹ" کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں سو کر گزاری۔ صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور تازہ دم ہو گئے۔ وارڈروب میں مختلف ڈیزائنوں کے بہت سے لباس موجود تھے۔ زریں گل نے تو اپنی شلوار قمیص سے جدا ہونا پسند نہیں کیا مگر میں نے ایک پتلون قمیص منتخب کرلی۔ رات میری طرح زریں گل کے ہاتھوں بھی کاکا کے دو تین غنڈے زخمی ہوئے تھے۔ زریں گل ابھی تک ڈر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کاکا ہمیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا خوف اندر پڑتا جا رہا تھا۔ شام تک وہ بالکل نارمل ہو گیا۔ ہم اس آرام دہ کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھتے رہے اور گپ شپ کرتے رہے۔ ایک مرتبہ کاکا نے بھی انٹرکام پر ہمارا حال چال پوچھا۔ وہ بڑی لنگڑی لولی انگریزی بولتا تھا۔ ایک فقرے میں تین چار لفظ نامل زبان کے استعمال کرجاتا تھا۔ بہرحال اس کا لہجہ بے حد مؤثر تھا اور آواز میں کسی فوجی سردار کا سا دبدبہ تھا۔ اس کے کارندے اس کے احکامات پر مشینی انداز میں عمل کرتے تھے اور اس کا رعب یہاں کی ہر جاندار و بے جان شے پر چھایا نظر آتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر بعد نیچے ریستوران کے ہال میں چہنے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہلکی ہلکی موسیقی بھی بلند ہو رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کل کی توڑ پھوڑ اور آتشزدگی کے اثرات ہال میں سے ختم کر دیے گئے ہیں اور ریستوران گاہکوں کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ سارا دن کمرے میں بند رہنے کے بعد میرا اور زریں گل کا دل چاہ رہا تھا کہ نیچے جائیں لیکن کاکا کی اجازت کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔۔۔ رات کا کھانا ہمیں کمرے میں ہی دیا گیا۔ جس میں مچھلی کا لذیذ سالن تھا۔ ساتھ میں ایک مقامی سبزی تھی جسے ناریل کے تیل میں بھون کر اور گ کا تڑکا لگایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مرغ مسلم اور میٹھے چاول بھی کھانے میں شامل تھے۔ ٹی وی پر کھانا پکانے کا ایک طویل پروگرام دیکھنے کے بعد زریں گل کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ وہ نعرۂ وحشت بلند کرکے کھانے پر ٹوٹ پڑا اور تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ میں بھی اپنی بساط کے مطابق اس کا ساتھ دینے لگا۔

اسی دوران میں وہ انگریز عورت اندر داخل ہوئی جس سے کل رات ہال میں ہماری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے ہمیں لڑائی مار کٹائی سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا موٹا تازہ چربیلا جسم ریشمی اسکرٹ میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ زریں گل کے منہ میں بھاری بھرکم لقمہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں رنج آمیز طیش ابھر آیا۔ بولی "کھالو۔۔۔ کھالو۔ آج رات یہ سارا کھایا پیا تمہاری ناک کے راستے نکالا جائے گا۔"

زریں گل انگریز عورت کی انگریزی نہیں سمجھا۔ خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور منہ چلاتا رہا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے میڈم! آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں۔"

وہ بولی "پریشان ہو میری جوتی۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور جو کوئی تمہارے ساتھ ہے۔"

میں نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور سگریٹ سلگا کر کہا "میرا خیال ہے کہ آپ کو ہمارے بارے میں کوئی اندیشہ ہے۔"

"اندیشہ؟" وہ طنز سے بولی "میں ماتم کر رہی ہوں تمہارا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ یہاں تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"تم سمجھنے والے ہوتے تو اسی وقت سمجھ جاتے جب میں نے تمہیں لڑائی سے روکا تھا۔ سچ پوچھو تو میں نے تمہیں موت کے منہ سے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن تم نے بڑی بے پروائی سے یہ کوشش ناکام بنادی۔۔۔ تم جانتے نہیں ہو کہ یہ کتنے خطرناک اور بے رحم لوگ ہیں۔ کچھ خبر نہیں ہے تمہیں۔"

وہ غصے سے ہانپ رہی تھی اور اس کا بالائی جسم جو بے حد موٹا اور نمایاں تھا پھول پچک رہا تھا۔ صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی "تم نے سوچا ہوگا کہ اپنی لڑائی مار کٹائی سے تم نے کاکا کا دل جیت لیا ہے۔ اب وہ تمہیں فلمی ہیرو بنا کر اپنے پاس رکھے گا۔ تمہیں عیش کرائے گا اور اپنے خاص کارندوں میں شامل کرے گا۔ کچھ نہیں ہوگا ایسا۔۔۔ کچھ نہیں۔ کل صبح تمہاری لاشوں کا قیمہ کچھ کو میں بن رہا ہوگا یا تمہارے کچلے مسلے جسم گال روڈ کے کسی ویران موڑ پر پڑے ہوں گے۔"

"آپ کے کہنے کا مقصد ہے کہ مسٹر مہان کاکا کی یہ مہمان نوازی صرف دکھاوے کی ہے؟"

"مہمان نوازی؟ کیسی مہمان نوازی بے وقوف! یہ تو وہ خاطر تواضع ہے جو قربانی کے جانوروں کی کی جاتی ہے۔ آج رات کسی وقت تمہیں ٹمرنائٹ کے ہال میں عبرت ناک بنانے کے بعد قتل کر دیا جائے گا یا اس طرح تمہارے ہاتھ پاؤں توڑے جائیں گے کہ ساری زندگی بھیک مانگنے کے سوا کچھ نہ کرسکو گے اور یہ سب کچھ اتنی صفائی سے ہوگا کہ نہ کسی کے دامن پر دھبا لگے گا نہ کسی پر الزام آئے گا۔"

انگریز خاتون کے تیور دیکھ کر اب زریں گل نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور تشویش آمیز نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر کاکا صاحب ہمیں مارنا ہی چاہتے ہیں تو خاموشی سے مار کر کہیں گاڑ سکتے ہیں۔ "ٹمرنائٹ" کے ہال میں

رونقوں کو دوبالا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔ ہر بڑے آدمی کو اپنی ساکھ بنانے اور اپنا رعب داب قائم رکھنے کے لیے تم جیسے بدنصیبوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ یہ وہ ریستوران ہے جہاں داخل ہونے کے بعد بڑے سے بڑا بدمعاش بھی بھیگی بلی بن جاتا ہے اور کاکا کی اجازت کے بغیر میاؤں نہیں کرتا۔ بڑے بڑے خودسر پولیس افسر اس ریستوران کے سامنے سے نگاہیں جھکا کر اور کان لپیٹ کر گزرتے ہیں۔ لیکن تم نے کل رات وہاں نہ صرف ہنگامہ آرائی کی بلکہ کاکا کے چار کارندوں کو شدید زخمی کردیا۔ ان میں سے ایک بے ہوش ہے اور اسپتال میں پڑا ہے۔ ریستوران میں جو نقصان ہوا وہ اس کے علاوہ ہے۔ بے شک تم اجنبی سہی لیکن کاکا تمہاری یہ خودسری اور مار دھاڑ کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ وہ کل رات ہی تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دیتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی لیکن ایسا کرنے سے اس کی دھاک نہ بیٹھتی اور نہ وہ ان لوگوں کے سامنے سرخرو ہوتا جن کے سامنے تم نے کل رات بدمعاشی دکھائی تھی۔ آج رات ہال میں پھر وہی لوگ موجود ہوں گے جو کل فائرنگ اور پولیس کی آمد کی وجہ سے بھاگ گئے تھے آج جو کچھ ہوگا ان کے سامنے ہوگا۔"

"کیا کریں گے وہ؟"

"میں نے بتایا ہے نا کہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ تمہیں مارنے اور قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کے ان کے پاس ایک ہزار ایک طریقے ہیں۔"

"آپ کاکا کی کیا لگتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں وکیل ہوں اس کی" وہ بے باکی سے بولی "اسے گوری چمڑی والی فربہ اندام عورتیں پسند ہیں۔ اب یہ مت پوچھنا کہ میں یہاں کیسے اور کیوں آئی۔۔۔ بڑی لمبی کہانی ہے اور میں کسی کو سنانا پسند بھی نہیں کرتی" اس کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

"آپ کا نام تو پوچھ سکتا ہے؟"

"کیتھی" وہ پچھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

میں نے دھیان سے کیتھی کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی۔ شکل و صورت میں بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ کسی کی منظورِ نظر بن سکتی۔ ممکن تھا کہ کاکا نے صرف پرانی وابستگی کی وجہ سے اس کڑک مرغی کو اپنے دڑبے میں رکھ چھوڑا ہو۔ یہ کڑک مرغی جو کچھ بتا رہی تھی وہ حیران کن تو ضرور تھا۔ لیکن غیر متوقع نہیں تھا۔

میں نے لجاجت سے کہا "کیا آپ ہماری کوئی مدد کرسکتی ہیں؟"

وہ ایک دم سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی آنکھوں میں ممتا کی جھلک نظر آئی۔ ایسے ماحول اور ایسی عورت کی آنکھوں میں ممتا کی جھلک؟ شاید یہ میرا وہم تھا۔ وہ متذبذب لہجے میں بولی "یہ بہت مشکل کام ہے۔ لیکن۔۔۔ اگر تم ہاتھ پاؤں ہلاؤ تو کچھ ہو بھی سکتا ہے۔"

"آپ جو کہیں ہم کرنے کو تیار ہیں" میں نے کہا

وہ بولی "یہ ریستوران صرف نام کا "ریستوران" ہے۔ شراب خانہ، جوا خانہ، قحبہ خانہ سب کچھ انہی دیواروں کے اندر ہے۔ اس عمارت کے ارد گرد کم و بیش بیس مسلح محافظ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکلنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان کی کڑی نگرانی کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ وہ فاکس ویگن جو تم کل رات ریستوران سے ایک فرلانگ دور چھوڑ آئے تھے ان کی نظر میں آچکی ہے اور اب وہ چھان بین کر رہے ہیں کہ فاکس ویگن کس کی ہے اور تمہارے پاس کیسے آئی ہے۔"

"او گاڈ" میں نے ہونٹ سکوڑ کر کیتھی کے انکشاف کو سراہا۔

وہ بولی "بہرحال ایک طریقہ ہے۔ تم اپنے طور پر تیار رہو۔ میں ایک گھنٹے کے اندر اندر دوبارہ آؤں گی۔ پھر تمہیں بتاؤں گی سب کچھ۔"

وہ تھل تھل کرتی اور پاؤں پٹختی واپس چلی گئی۔

زریں گل کی نگاہیں حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ تنہائی ملتے ہی اس نے یہ سوال توپ کے گولے کی طرح داغا کہ موٹی فرنگن کیا بک بک کر رہی تھی۔

میں نے کہا "وہ بڑی خطرناک بات کہہ گئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کل جس بدذات رقاصہ کی وجہ سے تم نے سارا ہنگامہ کھڑا کیا اور تین چار بندے زخمی کردیے۔ اس رقاصہ کے ساتھ تمہیں ٹکوڑں کڑوں بولنا ہوگا۔"

"ٹکوڑں کڑوں؟ کیا مطلب!" زریں گل نے حیرت سے پوچھا۔

"ٹکوڑں کڑوں۔ مقامی زبان میں عورت کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ جب تک تم اس رقاصہ کے ساتھ ٹکوڑں کڑوں نہیں بولوگے اور پھر اس کا دل خوش نہیں کروگے "کاکا" تم کو ہرگز ہرگز معاف نہیں کرے گا۔"

"اوہ خدایا۔ یہ کیا بول رہا ہے آپ۔ شاید آپ مذاق فرمایا ہے۔"

"میں کچھ نہیں فرمارہا۔ اگر مذاق فرمایا ہے تو اس موٹی فرنگن نے فرمایا ہوگا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ بھی بالکل سنجیدہ تھی۔ وہ ٹکوڑں کڑوں والی بات بالکل صحیح ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا جناب۔ ام ٹکوڑں کڑوں۔۔۔ ام۔ امارا مطلب ہے کہ ام ایسا ویسا کام ہرگز نہیں کرسکتا۔"

"کیوں نہیں کرسکتا۔ تم نے خود کہا تھا کہ تم جب کسی فرنگن کو دیکھتے ہو تو خیال ہی خیال میں اس کی ایسی تیسی کردیتے ہو۔ اگر فرنگنیں تمہاری دشمن ہیں تو ہندو ناریاں کیسے دوست ہو سکتی ہیں۔

تمہیں اچھا موقع مل رہا ہے ایک ہندو ناری کو اپنے پیار کے جال میں پھنسا کر اپنا مطیع کرنے کا۔ اور پھر اس کو دھتکارنے کا۔"

وہ سٹپٹا گیا "خدا کا قسم استاد صیب! ام نے کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ خیالوں کا بات اور ہوتا ہے' حقیقت کا اور۔ اگر ام کو کسی ایسے کام پر مجبور کیا گیا تو ام۔۔۔ ام وہی کرے گا جو ایسے موقعے پر مسلمان کو کرنا چاہیے۔ ام جان دے دے گا' ایک منٹ میں شہادت کو گلے لگا لے گا اور۔۔۔"

"اپنے ساتھ مجھے بھی شہید کروا دے گا" میں نے فقرہ مکمل کیا "لیکن میں فی الحال غازی رہنے میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ تم میری مرضی کے بغیر مجھے شہید نہیں کروا سکتے ہو۔ بے موقع شہادت سے بچنا میرا بنیادی حق ہے۔ اگر تم یہ حق چھینو گے تو تمہارے نامۂ اعمال میں سیاہی ہی سیاہی بھری جائے گی۔"

ہماری گفتگو کے دوران ہی کیتھی واپس لوٹ آئی۔ وہ ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھی لیکن آدھ گھنٹے میں ہی واپس آگئی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے برابر کیے اور دروازے میں جھری بنا کر باہر راہداری میں جھانکنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھرتی سے حرکت کی اور ہمیں لے کر راہداری میں آگئی۔ کمرے کا دروازہ اس نے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ ہم دونوں اس کے عقب میں چلتے ایک اسٹور نما کمرے میں داخل ہوئے' یہاں اوپر تلے بہت سی گٹھریاں رکھی تھیں۔ دیکھنے میں یہ میلے کی گانٹھیں نظر آتی تھیں۔ کیتھی نے اسٹور کی عقبی کھڑکی کھولی اور بتایا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

ہم نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور کھڑکی سے نکل کر شیڈ پر چلتے ہوئے بیس پچیس گز دور ایک دوسرے کمرے کی کھڑکی سے اندر داخل ہو گئے۔ یہ بھی ایک نیم تاریک کمرا تھا۔ یہاں کیتھی پہلے سے موجود تھی اور ایک تنگ زینے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ہم یہ زینہ اتر کر ایک زمین دوز پارکنگ میں آگئے۔ پارکنگ لاٹ میں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ریستوران میں بجنے والے آرکسٹرا کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ دور پارکنگ لاٹ کے دروازے پر ایک مسلح شخص پہرا دے رہا تھا۔ میں اتنی دور سے بھی پہچان سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ۹ ایم ایم کی جرمن گن تھی۔ یہ خطرناک گن ایک ہی برسٹ میں کشتوں کے پشتے لگا سکتی ہے۔ پہرے دار کی نظر بچا کر کیتھی ہمیں ایک شیورلٹ گاڑی تک لے آئی اور تیز سرگوشی میں بولی "تم دونوں ڈکی میں گھس جاؤ۔ یہ میری گاڑی ہے۔ میں ابھی دس پندرہ منٹ تک ڈاکٹر سے ملنے کے بہانے یہاں سے نکلوں گی اور تمہیں راستے میں کسی جگہ چھوڑ دوں گی' اوکے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ درحقیقت جو صورت حال بن گئی تھی اس میں ہمارا ریستوران سے نکلنا ہی مناسب تھا۔ کیتھی نے شیورلٹ کی وسیع و عریض ڈکی کھولی۔ میں اور زریں گل ٹانگیں سکیڑ کر اس میں گھس گئے۔ کیتھی نے ڈکی بند کر دی۔ لوہے کی قبر میں گھپ اندھیرا چھا گیا' تاہم آوازیں مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئیں۔ میں نے کیتھی کی اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنی جو ہمیں چھوڑ کر زینوں کی طرف واپس جا رہی تھی۔ ریستوران سے اٹھنے والا موسیقی کا مدھم شور بھی ڈکی میں پہنچ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈکی میں ہوا کے آمد و رفت کا راستہ بھی موجود ہے۔ زریں گل کو نسوار سے علیحدہ ہوئے گھنٹے ہو چکے تھے پھر بھی اس کی سانسوں میں نسوار کی مہکار موجود تھی۔ وہ ڈکی میں گھس کر بالکل ہی گول مٹول ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو میں بڑا سا گاؤ تکیہ رکھا ہو۔ پسینے اور حبس نے ہمارا برا حال کر دیا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ مجھے سینے کا درد بھی پریشان کر رہا تھا۔ ابھی کیتھی کو گئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کوئی گاڑی اسٹارٹ ہو کر پارکنگ لاٹ سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد پارکنگ میں پھر قدموں کی چاپ ابھری اور مردانہ آوازیں سنائی دیں۔ ان میں ایک آواز یقیناً کاکا کی تھی۔ کسی گاڑی کے دروازے کھلے اور پارکنگ لاٹ میں آنے والے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہوا تو مجھے پتا چلا کہ یہ شیورلٹ کے پہلو میں کھڑی ٹویوٹا جیپ ہے۔ تاہم اسٹارٹ ہوتے ساتھ جیپ کا انجن پھر بند ہو گیا۔ ڈرائیور نے کئی بار "سیلف" مارا لیکن انجن ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جیپ والے جیپ سے اتر گئے۔

"کار لے چلو" کاکا کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔

چند لمحے بعد کار کے دروازے کھلے اور ہچکولوں کے ساتھ تین چار افراد اس میں سوار ہو گئے۔

"استاد صیب! یہ کیا ہو گیا؟" زریں نے میرے کان میں گرم سرگوشی کی۔

"آگے آگے دیکھو" میں نے جواب دیا "تمہیں بھی بڑا شوق ہے سیر سپاٹے کا۔"

گاڑی نے حرکت کی اور پارکنگ سے نکل کر کسی ہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔ زریں گل تو پہلے ہی پریشان تھا۔ میرا اطمینان بھی چند منٹ بعد مکمل طور پر رخصت ہو گیا۔ درد' ناوید' زنجیر جسے میں بالکل فراموش کر چکا تھا اچانک میرے ہاتھ میں چھنک اٹھی تھی۔ میرا مطلب کلائی کی گھڑی سے ہے۔ گھڑی سے سگنل کی مخصوص آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی مدھم مدھم برقی جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ یہ وہی نوکلو میٹر کی حد پار کرنے والا چکر تھا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب امریکن ایجنٹ اینڈرے مجھے اپنے ساتھ بھوپال شہر لے جا رہا تھا اور دفعتاً میری گھڑی پر برقی ارتعاش شروع ہو گیا تھا۔ ان پُرخطر لمحات کا تصور کر کے میں تھرا جاتا تھا۔ لیکن آج صورت حال کہیں زیادہ سنگین تھی۔ میں آزاد نہیں تھا ایک ڈکی میں بند تھا اور جن لوگوں کی گاڑی میں تھا وہ میرے دوست نہیں جانی دشمن تھے۔ ایک کلو میٹر۔۔۔ صرف ایک کلو میٹر۔۔۔ اور پھر

میرے سینے میں ایک شگاف ہو جاتا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ برقی جھٹکوں کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ "بیپ بیپ" کی مدھم آواز بھی ابھر رہی تھی۔ ڈکی کے اندر زریں گل میرے بالکل قریب تھا لہٰذا یہ آواز صاف سن سکتا تھا "یہ آپ کا گھڑی کیوں بولنے لگا استاد صیب!" اس نے پوچھا۔

"ہم ریسٹ ہاؤس سے بہت دور آ گئے ہیں۔"

"او خدایا۔ یہ آپ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کا جان ایک دم خطرے میں آ گیا ہے۔"

"لگ تو یہی رہا ہے" میں نے کہا۔

"تو ام کو گاڑی رکوانا چاہیے۔" زریں گل نے سخت مضطرب ہو کر کہا۔

"گاڑی رکوائیں گے تو وہ جو تمہارے سالے آگے بیٹھے ہیں' شوٹ کر دیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ آج پتا چل ہی جانے دو کہ اس منحوس چکر میں کیا حقیقت ہے؟"

زریں گل سراپا کانپ گیا "نہیں استاد صیب! ام آپ کو یہ رسک نہیں لینے دے گا' ہرگز نہیں۔ ام گاڑی رکواتا ہے۔"

"کیا کرو گے؟"

"ام زور سے ڈکی بجاتا ہے' وہ حرام کا تخم ابھی بریک لگا دے گا۔"

ایک کلو میٹر کا مختصر فاصلہ تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ زریں گل نے ڈکی بجانے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھائے لیکن اس سے پہلے کہ وہ آواز پیدا کرتا کار کی رفتار اچانک کم ہو گئی اور پھر ایک موڑ کاٹ کر وہ رک گئی۔ چند لمحے بعد اس کا انجن بھی بند ہو گیا۔ میرے اور زریں گل کے سینے سے طویل سانس نکل گئی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آئیں اور پھر اطراف میں گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ کوئی منظر۔ ایسے سکوت میں معمولی سا کھٹکا بھی چونکا دیتا ہے۔ جب کسی نے "کھٹک" کی آواز سے ڈکی کا تالا کھولا تو ہم بری طرح چونک گئے۔ تالا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف سے کھولا گیا تھا۔ اور اب تالا کھولنے والا گھوم کر ڈکی کی طرف آ رہا تھا۔ میں اور زریں گل پوری طرح چوکس ہو گئے۔ ڈکی کا ڈھکنا اٹھایا گیا۔ تازہ ہوا کا جھونکا تیزی سے اندر آیا۔ میری نگاہ ایک ناریل کے درخت کی بلند شاخوں پر پڑی۔ ان شاخوں کے پیچھے سے چاند جھانک رہا تھا۔ مگر ایک چاند ہمارے بالکل نزدیک تھا اور اسی چاند نے ڈکی کھولی تھی۔ اس ساڑھے چار فٹ قامت مردانہ چاند نے آنکھیں سکیڑ کر ہمیں دیکھا' پھر حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کھلے ہوئے منہ سے حیرت و استعجاب کی آواز نکلتی میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑی اور زور لگا کر سر نیچے جھکایا۔ زریں گل نے اسے ڈانگ رسید کی۔ میں نے گھٹنے سے اس کی پسلیوں میں ایک بڑی ظالم قسم کی ضرب لگائی پھر گردن کو مخصوص جھٹکا دے کر اسے ہوش سے بے ہوشی کی وادی میں دھکیل دیا۔ یہ سارا عمل چند

سیکنڈ کے اندر بڑی خاموشی سے انجام پایا۔ ہم اسے گھسیٹ کر قریبی درختوں میں لے گئے اور بڑے بڑے چوڑے پتوں والے پودوں میں لٹا دیا۔ یہاں چاند کی روشنی میں میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی ناک سے خون جاری تھا۔ غالباً میرے گھٹنے کی شدید ضرب نے اس کے پہلو میں کوئی چیز بھی توڑ ڈالی تھی۔ تاہم مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ یقیناً یہ وہی لمبی گردن والا شخص تھا جو اروشی تک کاکا کے پیغامات پہنچاتا تھا۔ طوفانی رات میں ساحل پر جو دو افراد اروشی سے ملنے آئے تھے ان میں یہ لمبی گردن والا شامل تھا۔ میں نے چند گز کے فاصلے سے اس کی پرچھائیں دیکھی تھی۔۔۔ اروشی نے اس "زوانے" کا نام ابراتھ بتایا تھا۔ اروشی کے بیان کے مطابق یہ شخص ان حملہ آوروں میں بھی شامل تھا جنہوں نے چند ہفتے پہلے ریسٹ ہاؤس کے پچھواڑے بیتاں کے آشیانے پر حملہ کیا تھا اور اس کی عزت تار تار کی تھی۔ اروشی سے بھی یہ شخص دست درازی کرتا رہتا تھا۔ میں نے نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ زریں گل نے اس کے پاس سے کچھ جھاڑ جھنکاڑ اکٹھا کر لیا تھا۔ ہم نے اسے اس جھاڑ جھنکاڑ میں یوں چھپا دیا کہ آسانی سے ڈھونڈنا ممکن نہ رہا۔ مطمئن ہو کر ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم ابھی تک عمارت کی چار دیواری میں تھے۔ یہ چار دیواری دو ڈھائی ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اصل عمارت کے چاروں طرف گھنے درخت' بدان بیلیں اور پھولدار جھاڑیاں گھیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ کھپریل کی چھت والی یہ پرشکوہ عمارت قدیم طرز کی تھی اور مین دروازے کی پیشانی پر ایک بہت بڑی گھڑی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا' روشن ڈائل والی گھڑی رات کے گیارہ بجے کا وقت بتا رہی ہے۔۔۔ اتنی رات گئے کاکا ریستوران کی گہما گہمی چھوڑ کر یہاں چلا آیا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کون رہتا تھا اور کاکا سے اس کا کیا تعلق تھا۔ ہم "جنگل نما باغ" میں بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے عمارت کے قریب تر پہنچ گئے۔ عمارت کے عین سامنے چند شاندار گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ایک گاڑی کے قریب ایک فربہ اندام شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ شخص عربی تھا۔ اس نے شیخ ہاشم کی طرح انگریزی لباس پہن رکھا تھا تاہم سر پر زلی دار سرخ عمامہ دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ عربی کو دیکھ کر میرا تجسس انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ میں نے زریں گل کو ضروری ہدایات دے کر درختوں میں چھپایا اور خود ایک تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا عمارت کی طرف بڑھا۔ بہت دنوں بعد میرے ہاتھ آزاد ہوئے تھے اور میرا دل مچل رہا تھا کہ ان ہاتھوں سے کچھ کروں۔ دیوار سے اصل عمارت تک کا درمیانی فاصلہ میں نے بھاگ کر طے کیا اور پھر ایک پائپ کے قریب پہنچ گیا۔ پانی کے پائپ کے ذریعے اوپر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں زریں گل کو باغ میں چھوڑ آیا تھا۔ پائپ کا حجم اور مضبوطی کا اندازہ کرنے

بعد میں نے اپنے جوتے اتار کر ایک تاریک گوشے میں رکھے اور اوپر چڑھنے لگا۔ پہلی منزل کی ایک کھڑکی کو دھکیلا تو وہ بے آواز کھل گئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں ایک سجے سجائے کمرے کا منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ عمارت قدیم طرز کی تھی لیکن اندرونی آرائش میں جدت اور سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔ دبیز قالین پر صوفے اور بیڈ کے درمیان ایک شخص چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے قریب ہی جانی واکر کی ایک بوتل لڑھکی پڑی تھی۔ پورے کمرے میں الکحل کی بو رچی بسی تھی۔ مدہوش شخص کا لباس دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی امارات کا کوئی باشندہ ہے۔ وہ اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ میں اسے پھلانگے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ بڑی احتیاط سے میں اس کے اوپر سے گزرا۔ اس شخص کے خدوخال کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ اونچی ناک جس کے درمیان ایک چھوٹا خم سا تھا۔ باریک ہونٹ اور رخساروں کی نمایاں طور پر ابھری ہوئی ہڈیاں میں کچھ دیر دھیان سے دیکھتا رہا' پھر ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس شخص کے خدوخال میں شیخ ناصم کی جھلک تھی۔۔۔ مجھے غزالہ کی بات یاد آئی' اس نے بتایا تھا کہ جن لوگوں سے شیخ ناصم کا پراپرٹی پر جھگڑا ہے وہ اس کی برادری میں سے ہی ہیں۔۔۔ تو کیا یہی وہ لوگ تھے جن سے شیخ ناصم کی دشمنی چل رہی تھی؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر کاکا کی یہاں موجودگی بھی سمجھ میں آجاتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ عین ممکن تھا کہ شیخ ناصم کے ان رشتے داروں کے کہنے پر ہی کاکا شیخ ناصم کے خلاف ثبوت وغیرہ اکٹھے کر رہا ہو۔ یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا لیکن میں زیادہ دیر اس انکشاف پر غور و فکر نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک اجنبی چھت تلے کھڑا تھا اور کسی بھی وقت یہاں کا کوئی مکین مجھے دیکھ کر شور مچا سکتا تھا۔

میں بالکل تنہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس کمرے میں سے اپنے دفاع کے لیے کوئی ہتھیار مل جائے۔ سونے والا مدہوش سو رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے کمرے کی تلاشی لی لیکن گوہر مطلوب حاصل نہیں ہوا۔ ہاں ایک الماری کی دراز میں سے پاسپورٹ اور ائرلائن کے ٹکٹ وغیرہ ملے۔ ان کاغذات سے پتا چلا کہ کمرے میں مدہوش پڑے شخص کا نام عیسیٰ ہے اور میری توقع کے مطابق اس کا تعلق دبئی ہی سے ہے۔ عیسیٰ کے نام پر مجھے اپنا سفاک دشمن عیسیٰ جان یاد آگیا۔ میرے ہی ہاتھوں اس کے غنڈوں نے مجھے اس سے ائرہوسٹسوں کو رہائی دلائی تھی اور اسے پشاور پولیس کے حوالے کرکے انڈیا آگیا تھا۔ اس معرکے میں عیسیٰ جان شدید زخمی ہوا تھا اور میں نے اس کے زخموں کی لالی بعد ازاں شکر شکرا کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

دو تین منٹ کمرے میں رہنے کے بعد میں دروازہ کھول کر باہر راہداری میں نکل آیا۔ ابھی تین چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ بہت پھرتی سے ایک ستون کی آڑ لینا پڑی۔ کچھ افراد باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ میں ستون تلے چپکے کر تاریکی کا حصہ بن

گیا۔ کلائی کی گھڑی ان پُرخطر لمحات میں بھی اپنا "کام" جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ نہ صرف میرے بازو پر مسلسل جھٹکے لگا رہی تھی بلکہ اس میں سے "بیپ بیپ" کی مسلسل آواز بھی نکل رہی تھی۔ اگر آنے والے ستون کے بالکل پاس سے ہو کر گزرتے تو یہ آواز ان کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے آواز دبانے کے لیے گھڑی والی کلائی اپنی ٹانگوں میں دبالی۔ آنے والوں میں کاکا کے علاوہ دو عرب بھی تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک عرب نے ہاتھ میں چیتے کا بچہ اٹھا رکھا ہے اور پیار سے اسے تھپک رہا ہے لیکن جب یہ لوگ قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ میں چیتا جاگتا چیتا نہیں' اس کی کھال تھی۔ وہ اس کھال کے بارے میں باتیں کرتے میرے قریب سے گزرے اور آگے بڑھ گئے۔ راہداری روشن تھی اور وہاں مختلف افراد کی آمدورفت جاری تھی۔ میں کچھ دیر ستون کے پیچھے چھپا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ راہداری خالی ہو اور مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ بلکہ یوں ہوا کہ کچھ مقامی ملازم مستقل طور پر راہداری میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ کاکا کے ڈرائیور کی گمشدگی کسی بھی وقت طشت ازبام ہو سکتی تھی۔ ایسا ہوتا تو میں اور زریں گل بھی شدید خطرے میں گھر جاتے۔

میں نے واپس لوٹنا مناسب سمجھا۔ ستون کی اوٹ سے نکل کر میں دوبارہ کمرے میں پہنچا۔ یہاں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ گھونگھریالے بالوں والے شیخ کے خراٹے بھی اسی طرح گونج رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر اس کو پھلانگا اور کھڑکی کے ذریعے پائپ تک پہنچ گیا۔ پائپ سے اترتے ہوئے ایک بار پھر جسم کے ہر حصے پر دباؤ پڑا اور میرے پہلو کی ٹیسیں شدید تر ہوگئیں۔ نیچے اتر کر میں نے جوتے پہنے اور دبے قدموں سے چلتا زریں گل سے جاملا۔

"ہاں جی' کیا کرکے آیا ہے آپ؟" زریں گل نے پوچھا۔

"ہمت کچھ۔ باہر چل کر بتاؤں گا۔"

"لیکن باہر نکلیں گے کیسے؟"

"جیسے انڈے میں سے چوزہ نکلتا ہے" "آؤ میرے پیچھے۔"

ہم دونوں گھٹنے درختوں میں چلتے واپس مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ ابھی تیس قدم دور تھے کہ بعد میری نگاہ اس شیورلٹ گاڑی پر پڑی جس کی ڈگی میں لیٹ کر ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک ننھی منی سی سفید کار تیزی سے شیورلٹ تک پہنچی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند ہوئیں اور اندر سے کوئی عورت نکل کر شیورلٹ کی طرف بڑھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا۔ وہ فربہ اندام کیتھی تھی۔ شیورلٹ کے نزدیک پہنچ کر اس نے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا پھر اپنے پرس میں سے چابی نکالی اور کار کی ڈگی کھول دی۔ ڈگی کھولنے کے بعد وہ ایک دم حیران پریشان نظر آنے لگی۔ ہم دونوں بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کیتھی

نے بوکھلاہٹ کے عالم میں ڈگی بند کی اور واپس اپنی ننھی منی گاڑی کی طرف بڑھی۔ اسی وقت میں اور زریں گل درختوں سے نکل کر اس کے سامنے آگئے۔

"او مائی گاڈ!" ہمیں دیکھ کر کیتھی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ "تم دونوں خبیث باہر کیسے نکل آئے؟"

"جادو کے زور سے" میں نے مختصر جواب دیا۔

کیتھی نے چونک کر کہا "ہمارا یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ چلو میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے باہر نکال دیتی ہوں۔"

میرا دل چاہا کہ میں اسے زخمی امرناتھ کے بارے میں بتادوں' جو باغ میں جھاڑ جھنکاڑ کے نیچے بے ہوش پڑا تھا اور زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ یہ شخص بینا جیسی معصوم لڑکی کے قاتلوں میں سے تھا اور معلوم نہیں اور کتنی زندگیاں اس کی بھینٹ چڑھی تھیں۔ ایسا شخص اگر مر رہا تھا تو اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔

کیتھی ہمیں اپنے ساتھ اپنی "صابن دانی" گاڑی میں لے آئی۔ اپنا بھاری بھرکم جسم توڑ موڑ کر وہ مختصر گاڑی میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے کوئی جناتی ٹیلی فون بوتھ میں گھس آئی ہے "تم دونوں سیٹوں کے درمیان چھپ جاؤ" اس نے ہمیں ہدایت کی۔

سیٹوں کے درمیان جگہ ہی کتنی تھی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ہم سمٹ سمٹا کر نیچے جھک گئے۔ گاڑی یوٹرن لے کر عمارت سے نکلی اور ہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔ میری کلائی پر لگنے والے جھٹکے بتدریج کمزور پڑ رہے تھے۔ دو ایک کلومیٹر آگے آنے کے بعد گاڑی کیلے کے ایک باغ میں رک گئی۔ چاندنی رات میں درختوں پر زرد کیلوں کے گچھے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ باغ سے آگے حد نگاہ تک تمباکو کے کھیت تھے۔ گاڑی بند کرکے کیتھی نے اس کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ وہ ہانپا ہانپی لگ رہی تھی۔ اپنے نشادہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی "شکر ہے خدایا۔ میں تو سمجھی تھی' تم پکڑے گئے۔۔۔ لیکن۔۔۔ تم ڈگی میں سے نکلے کیسے؟"

"بس قسمت ساتھ دے گئی" میں نے کہا "ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف سے ڈگی کھولی۔ شاید وہ ڈگی سے کچھ لینا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکل کر ڈگی تک پہنچتا ہم چپت ہوگئے۔"

"امیزنگ' ونڈرفل" کیتھی نے حیرت کا اظہار کیا "یہ تو معجزہ ہوگیا۔ خیر۔ اب بتاؤ کیا ارادے ہیں تم دونوں لونڈوں کے؟"

میں نے کہا "آپ نے ہمارے لیے بے حد مصیبت اٹھائی۔ اب ہم آپ کو مزید مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ بس ہمیں کسی مناسب سے مقام پر اتار دیجئے۔"

وہ تنک کر بولی "یہ دکھی کلمات مجھے بالکل پسند نہیں۔ بس جو میرے دل میں آیا تھا میں نے کیا' مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو یہ کرنا کہ پکڑے نہ جانا۔ ورنہ "کاکا" اور اس کے خونخوار بھیڑیے مار مار کر سب کچھ معلوم کرلیں گے تم سے اور پھر تمہارے ساتھ ساتھ میری جان بھی عذاب میں آجائے گی۔۔۔ چلو اب نکلو گاڑی سے۔ میرے خیال میں تمہارے رفو چکر ہونے کے لیے مناسب مقام یہی ہے۔ یہاں کھیتوں میں سے ہو کر چلو گے تو آدھ پون گھنٹے میں گال روڈ پر پہنچ جاؤ گے۔"

زریں گل بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اردو میں بولا "خو استاد صیب' آپ کا چہرہ پسینے سے تر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شاید درد پھر زور پکڑ گیا ہے۔"

میں نے کہا "زور تو پکڑ گیا ہے لیکن کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ بولا "کیوں نہ ام اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں اور ریسٹ ہاؤس واپس جانے سے پہلے کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھالیں۔ کچھ پتا چلے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آپ کے سینے میں واقعی کچھ موجود ہے یا ام کو صرف ڈرا دیا گیا ہے۔"

زریں گل کی بات میرے دل کو لگی۔ جب سے ہم سری لنکا پہنچے تھے یہ پہلا موقع تھا کہ اتنی آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں شکر شکرا موجود تھا اور نہ شیخ ناصم۔ غزالہ نے ہمیں فری ہینڈ دے کر ریسٹ ہاؤس سے نکالا تھا۔ ہم اپنی صوابدید کے مطابق دس کلومیٹر کے دائرے میں کہیں بھی جاسکتے تھے اور تین چار روز قیام کرسکتے تھے۔ میں نے کہا "زریں گل! بات تو تمہاری درست ہے لیکن اتنی رات گئے کون سا ڈاکٹر ہمیں خوش آمدید کہے گا۔ آوارہ گردی کے الزام میں کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔"

"آپ ارادہ تو کریں' باقی سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ کو پتا ہے تبلیغی جماعت والا لوگ کیا کرتا ہے؟ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ "ارادہ" لکھواؤ۔ اور جب لوگ ارادہ لکھواتا ہے تو وہ کہتا ہے بس تو سمجھو آدھے سے زیادہ کام ہوگیا۔"

ہماری اردو سے آشنا کر کیتھی نے کہا "او باسٹرڈ! یہ کیا بڑبڑ شروع کردیا ہے تم نے۔ میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں ہوں' چلو کھسکو اب یہاں سے۔"

میں نے کہا "ایک کام کریں آنٹی! ہمیں کسی بہت اچھے سے ڈاکٹر کا پتا بتادیں۔"

آنٹی کے خطاب اور "ڈاکٹر" کے ذکر نے کیتھی کو ذرا سا نرم کیا۔ وہ بولی "کیا بات ہے؟ ڈاکٹر کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

میں نے کہا "میرے سینے میں کچھ روز سے شدید درد ہے۔"

اس نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور کہنے لگی "مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہاں درد ہے؟" میں نے اسے درد کے بارے میں مختصراً بتایا اور کہا کہ وہ کسی اچھے سے سرجن کا پتا بتائے۔ وہ بولی "سرجن تو یہاں ایک بہت اچھا ہے لیکن اس کی فیس تمہاری طاقت سے باہر ہوگی۔"

میں نے کہا "آپ فیس کی پروا نہ کریں۔"

وہ بولی "امر سینا نام ہے ڈاکٹر صاحب کا۔ ارپانکی میں رہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "ارپانکی کس طرف ہے؟" کیتھی نے اسی طرف اشارہ کیا جدھر سے ہم آرہے تھے۔ میں نے کہا "نہیں کسی اور کا پتا بتائیں۔"

وہ حیران ہو کر بولی "کیا مطلب۔ تم ارپانکی کی طرف کیوں نہیں جاسکتے؟"

"بس یونہی کوئی معاملہ ہے" میں نے اسے ٹالا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ میرے سینے میں دھماکا خیز مواد چھپا ہوا ہے اور اگر میں شمال کی طرف گیا تو یہ مواد پھٹ کر مجھے مردوں کی صف میں کھڑا کر دے گا۔

وہ بولی "مجھے تو پاگل لگتے ہو تم دونوں۔ میں نے خواہ مخواہ تمہارے پھڈے میں ٹانگ اڑائی۔"

میں نے کہا "اچھی آنٹی۔ اب اپنا ثواب تو ضائع نہ کریں۔"

وہ بیزار لہجے میں بولی "ایک اور اچھا ڈاکٹر بھی ہے یہاں... غالباً ایم ڈی ٹانکے نام ہے اس کا۔ امراض سینہ کا ماہر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور رتنا پورہ میں مطب ہے اس کا۔ لیکن وہ خود گوا میں رہتا ہے۔ صرف ہفتے اتوار کے روز یہاں آتا ہے۔"

میں نے کہا "آج بھی تو اتوار ہے؟"

"اوہ ہاں" کیتھی چونک کر بولی "ممکن ہے تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے۔" اس کے بعد وہ ہمیں رتنا پورہ نامی قصبے تک جانے کا راستہ سمجھانے لگی۔ اس نے ڈیش بورڈ سے کاغذ قلم نکالا اور آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر پورا نقشہ ہمیں سمجھا دیا۔ زریں گل نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھ کر کیتھی سے کہا۔

"پلیز آنٹی! اگر آپ ہمیں قصبے تک پہنچا دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔"

"نہیں" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "زیادہ پاؤں مت پھیلاؤ۔ چلو نیچے اترو میری گاڑی سے۔ چلو..." اس نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن..." زریں گل نے کچھ کہنا چاہا۔

"شٹ اپ" وہ گرجی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ غیر محسوس طور پر سرک کر اپنی ٹانگ کے قریب پہنچ گیا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس نے کوئی لیڈیز پستول ویلکرو کے ذریعے اپنی ٹانگ سے باندھ رکھا ہو۔ اس ویرانے میں اس فربہ اندام تنہا عورت پر قابو پانا اور اس کی گاڑی چھین کر لے جانا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں تھا لیکن یہ سراسر احسان فراموشی ہوتی۔ میں نے زریں گل کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گاڑی سے اتر آئے۔

"خدا حافظ" میں نے کہا۔ کیتھی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

ہم دونوں سڑک سے ذرا ہٹ کر کھیتوں کے درمیان چل پڑے۔ کیکر کے درختوں میں زرد چاند ہمارے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ تمباکو کی مہک نصف شب کے بعد کھلنے والے پھولوں کی خوشبو میں شامل ہو کر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دور کہیں بہت دور کوئی پنچھی رزق کی تلاش میں روانہ ہوا تھا اور اس کا سنسناتا گیت ہوا کی لہروں پر ڈوب ابھر رہا تھا۔ یہ تو میں دانت کا سری لنکا تھا جو ہمارے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑ رہا تھا۔ درد کے سبب میرا دل نہ چاہتا تو شاید میں وہیں کہیں کسی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ جاتا اور ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتا... میں سوچنے لگا ہم کہاں سے کہاں آگئے ہیں۔ لاہور اور جھنگ تو دور کی بات ہے اب حیدر آباد اور بھوپال بھی خواب لگ رہے تھے۔ مقام کے ساتھ ساتھ جانے پہچانے چہرے بھی نگاہ سے دور ہو گئے تھے۔ سروج عرف الو کی چچی بھوپال میں رہ گئی تھی۔ مجھی کنور اور مسز رچی نکلا رک صاحب کو آخری بار حیدر آباد میں دیکھا گیا تھا۔ یونا سنگھ حیدر آباد کے ایک ویران قلعے کے آس پاس کہیں بچھڑ گیا تھا۔ اور فریال ہمارے ساتھ ہونے کے باوجود ہم سے بہت دور تھی۔ اسے گرفتار ہوئے اب دو ہفتے سے زائد وقت گزر چکا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ سوچ کر خوف آنے لگتا تھا کہ کہیں وہ بھی سمندر کی طرح مجھ سے ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر نہ چلی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں واپس جا کر ساجی صاحب اور نجمہ کو کیا منہ دکھاتا۔ ساجی صاحب کہتے دیکھو شاہ جہاں میں نے تو تمہاری بہن پر آنچ نہ آنے دی اور تم میری لاڈلی بچی کو درندوں کے حوالے کر کے آگئے۔ میرا دل غم سے معمور ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے فریال پر بہت غصہ بھی آنے لگا۔ اسے کیا ضرورت تھی میرے پیچھے انڈیا آنے کی اور اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مصیبت میں مبتلا کرنے کی۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی بیٹی تھی اور خود کو بہت ذہین بھی سمجھتی تھی۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ "جرم کی دنیا" کتنی سفاک اور ظالم ہوتی ہے۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے کیا کچھ دیکھا ہے اس دنیا میں۔ انگلیاں ہوتے قلم کا نپتا ہے اور آنکھیں جل اٹھتی ہیں۔ میں جرم کی سفاک دنیا میں قدم رکھنے کے فوراً بعد اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ یہاں وہی زندہ اور سربلند رہ سکتا ہے جس کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔ کوئی ایسا پیارا نہ ہو جس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر کوئی آپ کو زمین چاٹنے پر مجبور کر سکے۔ نہ کسی بہن کی عزت پاؤں کی زنجیر بنے۔ نہ کسی ماں کی فریاد بے بس کرے۔ بندہ تنہا ہو، بے فکر ہو۔

یکایک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ کیتھی واپس آرہی تھی۔ اس نے ہارن دے کر ہمیں متوجہ کیا پھر کار ہمارے پاس روک لی۔ ہم درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ "چلو بیٹھ جاؤ" وہ غرا کر بولی "خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔" اس نے

دل میں بھی ایک طرح کی محبت تھی۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم ایک سیکنڈ کی تاخیر کیے بغیر گاڑی میں گھس گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد کیتھی نے ہمیں رتنا پورہ نامی قصبے کے پاس اتار دیا۔ وقت رخصت مجھے کیتھی کی آنکھوں میں ایک بار پھر وہی ممتا بھری جھلک نظر آئی جس نے مجھے ڈ ناشتے ریسٹوران میں حیران کر دیا تھا... قصبہ خمار آلود شب کی بانہوں میں یوں جکڑا ہوا تھا جیسے خوابیدہ ماں کی آغوش میں بچہ سو رہا ہو لیکن جیسے بچہ سوتے میں کبھی کبھی مسکرا رہا ہے ایسے ہی قصبے میں بھی کہیں کہیں زندگی کے آثار موجود تھے۔ لب سڑک ایک ہوٹل میں روشنی ہو رہی تھی اور اندر سے میوزک کی آواز آرہی تھی۔ ہم ایک دو سنسان سڑکوں سے گزرے اور پھر کیتھی کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق ڈاکٹر ایم ڈی ٹانکے کے عالیشان بنگلے پر پہنچ گئے۔ یہ بنگلا قصبے کے وسطی علاقے میں تھا۔ قرب و جوار میں اور بھی ایک منزلہ اور دو منزلہ رہائشی عمارتیں موجود تھیں۔ درحقیقت یہ اس قصبے کا سب سے خوب صورت اور پوش ایریا تھا۔ بنگلے کے مین گیٹ پر ڈاکٹر ایم ڈی ٹانکے کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ نیچے اس کی ڈگریاں لکھی ہوئی تھیں۔ ان ڈگریوں پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ تعلیم کی حد تک وہ واقعی ایک قابل سرجن ہے۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ چند لمحے بعد ایک لمبا چوڑا گورکھا ہاتھ میں لٹھ لیے نمودار ہوا۔ وہ چوکیدار تھا۔ اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر نہایت تیز اور مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ یہ جان کر کہ ہم ہندی یا تامل نہیں ہیں وہ ہندی میں بولا۔

"کیا بات ہے۔ کس سے ملنا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب سے۔ ایمرجنسی ہے" میں نے جواب دیا۔

"ایمرجنسی ہے تو اسپتال جاؤ۔"

"یہ اسپتال کا کیس نہیں ہے" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ گورکھا چوکیدار کے چہرے پر لالچ کی جھلک نظر آئی اور میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ یہ "بیداگیر" شخص ہے "مسئلہ کیا ہے؟" اس نے ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔

"مسئلے کو چھوڑو، بس ڈاکٹر صاحب سے ملادو" میں نے سو کا ایک کرارا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے ذرا سا جھجک کر نوٹ تھام لیا پھر بولا "اچھا... میں کوشش کرتا ہوں، ویسے امید بہت کم ہے۔"

میں نے کہا "امید پیدا کرنا تمہارا کام ہے۔"

وہ چلا گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس آکر ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ بولا "میرا نام اجیت کمار ہے۔ راجستھان کا رہنے والا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے یہی کہا ہے کہ تم سے جان پہچان ہے۔"

"بہت مہربانی بڑی کرپا" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں کھڑا ہم سے باتیں کرتا رہا۔ ہم نے اسے اپنے فرضی کوائف بتائے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں وارد ہو گئے۔ ڈاکٹر کا رنگ سیاہ تھا چہرے سے مسیحائی کے بجائے کرختگی جھلکتی تھی۔ رات گئے بے آرام کیے جانے پر وہ کچھ برہم بھی تھا۔ وہ قیمتی گاؤن پہنے ہوئے تھا، عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔

"انگریزی جانتے ہو؟" اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ بولا "مریض کون ہے اور کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "جناب! مجھے شدید درد ہے۔ یہاں پسلیوں کے نیچے بائیں طرف۔ بالکل برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔ آپ جو فیس مانگیں گے میں دینے کو تیار ہوں۔"

"آؤ میرے ساتھ" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ایک معائنہ گاہ میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر کی ڈگریوں کی طرح اس کی معائنہ گاہ بھی عالی شان تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے قمیص اتارنے کی ہدایت کی۔ میں نے قمیص اور بنیان اتار دی۔ اب میرے جسم پر صرف کار ڈرائے کی پتلون تھی۔ جوتے اتار کر میں معائنے کی ٹیبل پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ پھیر پھیر کر پیٹ اور سینے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مختلف سوال بھی پوچھتا جا رہا تھا۔ میں کیا کرتا ہوں؟ کیا کھاتا پیتا ہوں؟ کب سے بیمار ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا اور میں ڈاکٹر کا... ڈاکٹر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے رخساروں پر لپ اسٹک کے بہت سے مدھم داغ نظر آئے۔ یوں لگا جیسے وہ ہمارے آنے سے قبل "خوب صورت وقت" گزار رہا تھا۔

اچانک معائنہ گاہ کے بغلی دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ اس دستک کے جواب میں ڈاکٹر مجھے ٹیبل پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے ڈاکٹر کی ٹوہ لگانے پر اکسا رہی تھی۔ میں ٹیبل سے اترا اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کی دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایک کوریڈور میں چل کر ایک کشادہ کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ کھڑکی میں اندر کی طرف نہایت قیمتی ریشمی پردے جھول رہے تھے۔ باتوں کی مدھم آواز بھی آرہی تھی۔ میں نے ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکا اور بری طرح چونک گیا۔ ڈاکٹر ایم ڈی ٹانکے ایک خوبرو لڑکی کے روبرو کھڑا تھا۔ لمبے بالوں اور ہیجان خیز ساڑی والی یہ انڈین لڑکی میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی مدراسی رقاصہ تھی جس سے صرف ایک رات پہلے ڈ ناشتے ریسٹوران میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ لڑکی زریں گل کے کندھوں پر سوار ہو گئی تھی اور نتیجے میں ایک خونریز ہنگامہ ہو گیا تھا۔ میں اس آفت زادی کو اس سنسان ڈاکٹر کے بیڈ روم میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رقاصہ کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ شستہ انگریزی میں ڈاکٹر ٹانکے سے کہہ رہی تھی "بھگوان کی قسم میری نگاہیں دھوکا نہیں

کھا رہی ہیں' یہ دونوں وہی ہیں جنہیں کل رات ماسٹر کا کا نے پکڑا تھا۔ میں انہیں سو گز دور سے پہچان سکتی ہوں۔"

"لیکن۔۔۔ یہ یہاں کیسے پہنچے؟"

"اسی بات پر تو میں حیران ہوں۔ ضرور یہ کوئی گہرا چکر ہے۔ آپ انہیں کسی کمرے میں بند کر کے فوراً ماسٹر کو فون کریں۔ ابھی ساری بات کا پتا چل جائے گا۔"

"لیکن اگر یہ وہ نہ ہوئے تو؟"

"آپ کیسی بات کر رہے ہو ڈاکٹر۔ میں پاگل نہیں ہوں اور نہ ہی نشے میں ہوں۔ یہ سو فیصد وہی ہیں۔ اگر آپ نے ان کے بارے میں کوئی غفلت کی تو ماسٹر کا کا بہت غضب ناک ہوگا۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہی ہوں۔"

ڈاکٹر نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کچھ دیر کمرے کے وسط میں خاموش کھڑا رہا۔ پھر ایک الماری کی طرف بڑھا۔ الماری میں سے کوئی شے نکال کر اس نے اپنے قیمتی سلیپنگ گاؤن میں چھپالی۔ یقیناً یہ ریوالور ہی تھا۔ مدراسی رقاصہ سے کچھ کھسر پھسر کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ لپک کر معائنہ گاہ میں پہنچا اور ٹیبل پر لیٹ گیا۔ چند لمحے بعد ڈاکٹر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ جونہی وہ مجھ پر جھکا میں نے لپک کر اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ڈاکٹر کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ وہ بظاہر صحت مند جسم کا مالک تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ بداعمالیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا ہے۔ وہ شدید مزاحمت نہیں کر سکا اور بری طرح ہانپنے لگا۔ میں نے گردن میں سے ہاتھ نکال کر اس کے گاؤن میں ڈالا اور ۳۸ بور کا انگلش ریوالور نکال لیا۔ ریوالور لوڈ تھا۔ جب یہ ریوالور ڈاکٹر کی کنپٹی پر آیا تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے ابل پڑیں۔ "خبردار' آواز نکالی تو بھیجے میں سیسا اتار دوں گا۔" میں نے اسے دھمکایا۔ وہ سر تا پا کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے وہ اب بولنا چاہے بھی تو نہیں بول سکے گا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا زریں گل کے پاس ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ یہی وقت تھا جب ڈرائنگ روم کے دروازے پر مدراسی رقاصہ کی صورت نظر آئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کے حلق سے سُریلی چیخ نکل گئی۔ وہ مڑ کر بھاگی لیکن زریں گل اس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ زریں گل کا ایک ہاتھ رقاصہ کی کمر میں آیا' دوسرے ہاتھ نے اس کا منہ دبایا اور وہ زور لگا کر اسے ڈرائنگ روم میں اٹھا لایا۔ رقاصہ نے تڑپ مچل کر خود کو آزاد کرانا چاہا لیکن زریں گل نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ میں اپنے شکار کو لے کر ایک قد آدم الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا' مدراسی رقاصہ کی چیخ رنگ لائے گی اور ابھی کوئی نہ کوئی دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہو جائے گا۔ میری نگاہیں ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے پر جمی تھیں۔ توقع کے عین مطابق دروازہ دھماکے سے کھلا اور گورکھا چوکیدار اجیت کمار لٹھ بدست اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر [illegible] کیفیت تھی۔ میں الماری کی اوٹ سے نکلا اور ایک زوردار لات اجیت کے سینے پر ماری' وہ لڑکھڑاتا ہوا سا دیوار سے جا ٹکرایا۔ لٹھ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔ اس کارروائی کے دوران ڈاکٹر نائیکے بدستور میری گرفت میں رہا تھا۔ میں نے ریوالور اجیت کی طرف سیدھا کیا اور نہایت سرد لہجے میں اسے ہاتھ اٹھانے کی ہدایت کی۔ میرے لہجے نے ہوشیار گورکھے کو سمجھا دیا کہ میں کروں گا جو کہہ رہا ہوں۔ وہ نہ صرف جلدی سے "ہینڈز اپ" ہو گیا بلکہ اپنے آپ دیوار سے لگ گیا۔

دوسری طرف زریں گل نے اپنے شکار کو پوری طرح قابو کر رکھا تھا۔ مدراسی رقاصہ قالین پر اوندھی پڑی تھی اور زریں گل اس کے دونوں ہاتھ موڑ کر پشت پر لگا رکھے تھے۔ رقاصہ گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی تھی اور اس کے رخسار پر انگلیوں کے سرخ نشان تھے۔ زریں گل نے اسے تھپڑ مارے تھے۔ یقیناً یہ تھپڑ اس حرکت کے جواب میں تھے جو کل رات رقاصہ نے نائٹ ریسٹورنٹ میں کی تھی۔ (وہ کسی مینڈک کی طرح جست لگا کر زریں گل کے کندھوں پر چڑھ بیٹھی تھی)

"خبردار۔۔۔ خبردار اگر آواز نکالا تو۔۔۔" زریں گل دانت پیس کر غرایا "تم عورت ذات ہے۔ ام تمہارا ہڈی پسلی توڑنا نہیں چاہتا ہے۔"

میں نے جب دیکھا کہ ڈاکٹر کی مزاحمت مکمل طور پر دم توڑ چکی ہے اور بھرے ہوئے سیاہ ریوالور کا خوف پوری طرح اس پر مسلط ہو چکا ہے تو میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور حکم دیا کہ وہ اجیت کمار کے پہلو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جائے۔ ڈاکٹر نے میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نے اجیت کمار سے پوچھا کہ اس عمارت میں اور کون کون ہے۔ اجیت کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ اس نے بتایا کہ اور کوئی موجود نہیں۔ ڈاکٹر کی پتنی بھی اپنی بچی کے ساتھ والدین کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میرے دیگر سوالوں کے جوابات میں اجیت نے بتایا کہ ڈاکٹر نائیکے کی پتنی مسز سروجنی کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہے اور یہ عالی شان بنگلا جس میں ہم کھڑے ہیں مسز سروجنی ریڈی کا ہے۔

ڈاکٹر نائیکے اب قدرے سنبھل چکا تھا۔ اس نے ہمیں خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ دھمکیاں اور گیدڑ بھبکیاں ہم پر قطعی بے اثر ہیں تو پینترا بدل لیا' کہنے لگا "میرے گھر میں زیادہ روپیہ نہیں ہے لیکن جتنا بھی ہے میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ تم یہ ریوالور ہٹاؤ اور انسانوں کی طرح بیٹھ کر بات کرو۔"

میں نے کہا "انسانوں کی طرح بات انسانوں سے کی جاتی ہے۔ تم انسان نہیں' انسانیت کے نام پر [illegible]

تمہارے چہرے پر دو سچ ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے کالک اکٹھی کر کے تم نے لگا رکھی ہے اپنے چہرے پر۔۔۔ اس وقت بھی تم اپنی پتنی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔"

"کک۔۔۔ کون سی رنگ رلیاں؟ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"تم چور ہو اور رنگے منہ پکڑے گئے ہو۔ اس مدراسی لڑکی کی لپ اسٹک کا رنگ دیکھو اور اپنے رخساروں کی لالی دیکھو' تمہیں کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"یہ۔۔۔ یہ لڑکی مریضہ ہے۔ اس کی پوری فائل موجود ہے میرے پاس۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے ایمرجنسی میں یہاں آئی ہے۔ میں نے اسے ڈرپ لگا رکھی تھی۔۔۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ میرے مریض کبھی کبھار ایمرجنسی میں یہاں آجاتے ہیں' میں نے یہیں "ٹریٹ منٹ" دینے کا انتظام کر رکھا ہے۔"

میں نے رقاصہ کو سرتاپا دیکھا۔ جوبن اس میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ زریں گل سے ہاتھا پائی کے نتیجے میں اس کی ساری کا پلو قالین پر بچھ گیا تھا اور شفاف کمر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ میں نے کہا "واہ! آج معلوم ہوا ہے کہ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بڑے خوش قسمت ڈاکٹر ہو تم۔ ایسے مریض کو تو تمہارے جیسا ڈاکٹر ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر دیکھ سکتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے دوائیں کھلا سکتا ہے۔ ڈرپ لگا سکتا ہے اور اگر مرنا بھی پڑے تو اس کی جگہ خود مر سکتا ہے۔"

"تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے ہو۔ یہ میری مریضہ ہے اور بس۔۔۔"

میں نے کہا "ثابت تو میں بہت کچھ کروں گا اور ابھی تمہارے سامنے کروں گا۔ بس دیکھتے جاؤ تم۔"

وہ اب کچھ حوصلہ پکڑ چکا تھا۔ تنک کر بولا "تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

میں نے زریں گل کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے مدراسی رقاصہ کو قالین سے اٹھایا اور دھکیل کر ایک قریبی باتھ روم میں بند کر دیا۔ پھر اس نے بڑے اطمینان سے اپنی جیب میں سے لائٹر نکالا اور ایک پردے کی ریشمی ڈوری کو آگ دکھا کر علیحدہ کر لیا۔ تب وہ اچانک بلائے ناگہانی کی طرح ڈاکٹر ایم ڈی نائیکے پر جا پڑا۔ اس نے ڈاکٹر کو اس کی تمام ڈگریوں سمیت اڑنگا لگا کر قالین پر گرایا۔ اور اپنی "میٹرک فیل کوالی فکیشن" کے ساتھ اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ چند ہی لمحے میں اس نے ڈاکٹر کے ہاتھ ڈوری کی مدد سے اس کی پشت پر باندھ دیے۔ بعد ازاں ٹانگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے سیاہ تر ہو رہا تھا۔ ایک ایسا شخص اسے [illegible] دے رہا تھا جو اس کے خیال میں اس کے نوکروں کا نوکر بننے کا بھی اہل نہیں تھا۔ ڈاکٹر مزاحمت کر رہا تھا لیکن زریں گل کی [illegible] طاقت اور پھرتی کے [illegible] نہیں جاری [illegible] گئی۔ بھنا کر وہ ایک بار [illegible] ہے [illegible] گالیاں دینے لگا اور قسمیں کھانے لگا کہ وہ مجھے باقی زندگی کے لیے جیل میں سڑا دے گا۔ اس دوران میں' میں نے اجیت کمار کو ریوالور سے کور کیے رکھا تھا اور اسے بتا رکھا تھا کہ اس کی ذرا سی حرکت کا نتیجہ گولی چلنے کی صورت میں نکلے گا۔ ڈاکٹر نائیکے کی مشکیں کسی جا چکیں تو زریں گل نے ایک اور ڈوری ڈھونڈی اور اس سے اجیت کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اجیت نے اس کارروائی کے دوران میں بڑی شرافت کا مظاہرہ کیا۔

مدراسی رقاصہ باتھ روم میں بند تھی اور دھیمے سروں میں مسلسل رو رہی تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ ڈرائنگ روم میں دھینگا مشتی ختم ہو چکی ہے اور دونوں مرد حضرات بے دست و پا ہو چکے ہیں تو وہ دروازے پر دستک دینے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا وہ رو رو کر آنکھیں سرخ کر چکی تھی۔ کہنے لگی "دیکھو' میری بات سنو۔ جو ہوا وہ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ مجھے۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارا ساتھی اس قدر خشک مزاج ہے' ورنہ میں اس کے پاس نہ جھکتی۔ میں بالکل جانتی نہیں تھی تم لوگوں کو پھر بھی میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہم صرف اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور کل رات والے واقعے کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ہم یہاں اتفاقاً پہنچے ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں 38 بور ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا "لیکن میرا ساتھی تمہیں ہرگز معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اس کے ارادے تمہارے بارے میں بہت خطرناک ہیں۔"

"کک۔۔۔ کیا؟" رقاصہ کی آنکھوں میں انجانے اندیشے ابھر آئے

"اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہاری ایک ٹانگ ضرور توڑے گا۔ پھر تم آئندہ رقص کر سکو گی اور نہ کسی کے کندھوں پر سوار ہو سکو گی۔"

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو"

"اس کوشش سے مجھے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟"

"دیکھو۔۔۔ سمجھو تم مجھے کچھ سمجھا رہے ہو۔ مجھے اس بدنامی سے بچاؤ۔ میں۔۔۔ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گئی

وہ زریں گل کی انگارا آنکھوں سے ڈر کر مجھے اپنی خوبصورتی کی رشوت پیش کر رہی تھی۔

"یہ کیا باتیں ہو رہا ہے استاد صیب!" زریں گل نے ڈرائنگ روم میں سے ہانک لگائی۔

"کچھ نہیں۔ تمہیں کیا فکر پڑ گئی ہے؟"

میں نے رقاصہ سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے سنیتا بتایا۔ میں نے کہا "دیکھو سنیتا! ابھی میرا ساتھی سخت غصے میں ہے' نہ میری

کوئی بات سنے گا نہ تمہاری فریاد پر کان دھرے گا۔ ابھی تم یہیں بند رہو۔ میں اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

سمیتا کو دوبارہ باتھ روم میں بند کرکے میں زریں گل کے پاس پہنچا۔ ہم دونوں نے سب سے پہلے ٹیلیفون کریڈل سے اتارے۔ پھر بیرونی گیٹ کو اندر سے مقفل کیا۔ بنگلے کی تمام فالتو بتیاں بجھا دی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے اطمینان سے مختلف کمروں کی تلاشی لینی شروع کی۔

کاکا کے ریستوران میں رقص کرنے والی سمیتا یہاں موجود تھی' لہٰذا بجا طور پر شک کیا جا سکتا تھا کہ ڈاکٹر ٹانکے کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور کاکا کے گروہ سے ہے۔

ابھی ہمیں تلاشی لیتے ہوئے پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک قریبی کمرے سے زریں گل کی چیخ سنائی دی۔ "استاد صیب! جلدی آؤ۔ یہ دیکھو۔"

میں دوڑ کر کمرے میں پہنچا۔ یہ ایک ڈارک روم تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہاں تصویروں کی ڈویلپنگ ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک چھوٹی سی کلر لیبارٹری تھی' ایسی "شوقیہ" لیبارٹریاں اکثر کھاتے پیتے لوگ اپنے گھروں میں قائم کر لیتے ہیں۔ یہ لیبارٹری چھوٹی سی تھی لیکن اس میں جدید ترین سامان موجود تھا۔ وہاں موجود مختلف چھوٹی بڑی تصویریں اور دیگر سامان دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لیبارٹری ڈاکٹر ٹانکے کی نہیں بلکہ اس کی بیوی کی ہے۔ (بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ ٹانکے کی بیوی کو فوٹوگرافی کا شوق تھا۔) اس لیبارٹری میں جو چیز ہمارے کام کی تھی اور جسے دیکھ کر زریں گل نے نعرۂ حیرت بلند کیا تھا' وہ چند رنگین تصویریں تھیں۔ کسی جدید کیمرے سے اتاری ہوئی یہ تصویریں ایک لفافے سے برآمد ہوئی تھیں۔ تصویروں میں شیخ عاصم ایک کلین شیو شخص کے ساتھ نظر آ رہا تھا جس کا نام ذکوان تھا اور جو غزالہ کے بقول ایک بم دھماکا کیس میں ملوث تھا۔ ان تصویروں میں سے کچھ ریسٹ ہاؤس کی نشست گاہ میں اتاری گئی تھیں اور کچھ شیخ کے اسٹڈی روم میں۔ کہیں شیخ اور ذکوان راز و نیاز کر رہے تھے' کہیں چائے پی رہے تھے اور کہیں دل کھول کر قہقہے لگا رہے تھے۔

میں ایک لمحے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ وہی تصویریں ہیں جو دھرمان کاکا اینڈ کمپنی نے اروشی سے کھنچوائی ہیں' اور جن کا مقصد شیخ عاصم کو ایک نہایت سنگین مقدمے میں ملوث کرنا ہے۔ میں نے یہ لفافہ قبضے میں لے لیا اور ایک بار پھر تلاشی کا کام شروع کر دیا۔ لیبارٹری سے کوئی اور خاص چیز برآمد نہیں ہوئی۔ ہم ڈاکٹر ٹانکے کے بیڈ روم کی طرف آ گئے۔ تصویروں کی برآمدگی کے بعد یہ بات اب واضح ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر ٹانکے کا تعلق بھی کاکا کے گروہ سے ہے۔ یہ اور بات تھی کہ کاکا کی داشتہ فربہ اندام تیتلی کو اس تعلق کا پتا نہیں تھا' وہ شاید ہمیں ڈاکٹر ٹانکے کی طرف بھیجنے کی غلطی نہ کرتی۔

بیڈ روم کی حالت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے کچھ دیر پہلے تک ڈاکٹر ٹانکے سمیتا کا کس طرح کا "علاج" کر رہا تھا۔ بیڈ روم کی ایک ایک چیز "خرمستیوں" کی چغلی کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر کے بیڈ روم سے کئی قابل اعتراض اشیا برآمد ہوئیں' چرس گانجے سے بھرے ہوئے سگریٹ بھی تھے۔ اس "مسیحا" کا یہ بڑا مکروہ تھا۔ زیریں منزل کی تلاشی کے دوران میں ہی میں نے چھوٹا سا اسٹور دریافت کیا جو گھر کے کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کاٹھ کباڑ کے عقب میں مجھے ایک ڈھائی فٹ چوڑے دروازے کی جھلک نظر آئی۔ دروازے میں چھوٹا تالا لگا ہوا تھا۔ نجانے کیوں اس دروازے کو دیکھ کر میرا تجسس ابھر آیا۔ میں کباڑ میں سے راستہ بنا کر دروازے تک پہنچا اور ہتھوڑی کی تین ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ دروازے کے قریب ہی سوئچ موجود تھا۔ میں نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ ایک قالین پوش فرش صاف ستھرا کمرا نظر آیا۔ کمرے میں براؤن رنگ کے کپڑے کی سی گٹھریاں پڑی ہوئی تھیں..... بالکل ایسی ہی گٹھریاں میں اس سے پہلے ڈائنامنٹ ریستوران کی بالائی منزل پر بھی دیکھ چکا تھا' وہ بھی ایک ایسے بند کمرے میں پڑی تھیں جہاں سے تیتلی نے ہمیں نکالا تھا۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ ان گٹھڑیوں میں کیا ہے۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک سنسنی خیز انکشاف کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں نے کمرے میں قدم رکھا لیکن اس سے پہلے کہ گٹھڑیوں کو ہاتھ لگاتا زریں گل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک بار پھر اس نے ایسی آواز نکالی تھی جیسے اس کی شلوار میں گھس آیا ہو۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔ میں دوڑ کر باہر نکلا۔ ریوالور ہاتھ میں تھا' اس کا ننگا جسم بھی ننگا تھا۔ زریں گل انیکسی کے ایک باتھ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "غضب ہو گیا استاد صیب! برا ہو گیا۔ ام نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا مار لیا۔" اس کے ساتھ ہی وہ مجھے ایک راہداری میں کھینچنے لگا۔ یقیناً ڈرائنگ روم کی طرف لے جا رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔

وہ بولا "بالکل فلم ستانہ ماہی والا معاملہ ہوا ہے۔ اس فلم میں ہیرو لوگ نے ایسا ہی بیوقوفی کیا تھا۔"

"ارے کچھ منہ سے پھوٹو' کچھ بتاؤ تو سہی۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ دوڑاتے ہوئے بولا "استاد صیب! غسل خانوں میں بھی ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔"

ایک دم زریں گل کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اگر وہ درست کہہ رہا تھا تو پھر واقعی خطرناک بات تھی۔ ہم نے رقاصہ سمیتا کو ایک باتھ روم میں ہی بند کیا تھا' وہ وہاں سے فون کرکے اپنے ساتھیوں کو یہاں بلا سکتی تھی..... ریوالور پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ جونہی ہم ڈرائنگ روم کے سامنے پہنچے' میری چھٹی حس نے چیخ کر مجھے خبردار کیا۔ میری نگاہ ٹی وی لاؤنج کے اندرونی دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اب معلوم نہیں یہ

میرا وہم تھا یا میرے وہم نے مجھے کوئی شکل دکھائی تھی۔ میں اور زریں گل تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر ٹانکے اور اجیت کمار اسی طرح مضبوط ڈوریوں سے بندھے پڑے تھے۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ دھڑ دھڑ بجایا۔ سمیتا نے دروازہ کھولا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ باتھ روم میں داخل ہو کر دیکھا اور تمام اندیشے حقیقت میں ڈھل گئے۔ اس لگژری ٹائپ باتھ روم میں بھی ایک منحوس ٹیلیفون موجود تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا..... وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ سمیتا نے ہماری اس غلطی یا بے خبری سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ طیش سے میری کنپٹیاں جل اٹھیں۔ میں نے باہر نکل کر ریوالور سمیتا کی پیشانی پر رکھا اور اسے دھکیل کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ سمیتا کسی بہت دلیر لڑکی کا نام نہیں تھا۔ میری آنکھوں میں جھانکنے کے بعد اس پر موت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا۔ دو منٹ کے اندر اندر اس نے سب کچھ بک دیا' اور مجھے یقین بھی آ گیا کہ اس نے ٹھیک "بکا" ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے ابھی چند منٹ پہلے باتھ روم سے ڈائنامنٹ ریستوران میں رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ غالباً لائن میں کوئی خرابی تھی۔ پھر اس نے اپنے ایک ساتھی کارکن جیون جی کو فون کیا جو یہاں قریب ہی قصبہ "اروانیکی" میں رہتا تھا۔ لیکن ابھی اس نے جیون جی سے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ٹانکے کی کوٹھی میں ہے اور ایک سخت مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے کہ رابطہ کٹ گیا۔ جیون جی کی آواز تو اس تک پہنچ رہی تھی لیکن اس کی آواز جیون جی کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ہیلو سمیتا..... ہیلو سمیتا کرتا جا رہا تھا۔ ابھی میں سمیتا سے پوچھ گچھ کر ہی رہا تھا کہ ڈرائنگ روم سے ڈاکٹر ٹانکے چلانے لگا۔ کسی بات پر زریں گل سے اس کی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ میں سمیتا کو کھینچ کر واپس ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر ٹانکے گرجا "تم حد سے بڑھ رہے ہو مسٹر! میں پھر کہتا ہوں' زیادہ کا لالچ مت کرو۔ جو کچھ ہاتھ لگ رہا ہے' لے کر یہاں سے رفع ہو جاؤ۔ ورنہ کتے کی موت مرو گے۔ اور اس لڑکی کو کچھ ہوا تو انجام اور بھی برا ہو گا تمہارا۔"

"بکواس بند کرو حرامی" میں نے اسے ڈانٹا۔

"میرے ہی گھر میں مجھ پر حکم مت چلاؤ" اس نے آنکھیں نکالیں۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ دروازے کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ میں لپک کر قدِ آدم الماری کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک شخص کمانڈو کے انداز میں رائفل سونتے اندر داخل ہوا۔ اس کا انداز واقعی خطرناک تھا اور انداز سے بڑھ کر رائفل خطرناک تھی۔ یہ 375 میگنم ڈبل بیرل رائفل تھی..... مجھے ایک ساعت کی تاخیر ہوتی تو وہ مجھے اور زریں گل کو بھون کر رکھ دیتا۔ میں نے الماری کی اوٹ سے نکل کر رائفل کے بیرل پر ہاتھ ڈالا اور پوری قوت سے ٹانگ چلائی۔ گو پاؤں ننگا تھا لیکن ضرب بھرپور تھی۔ نووارد اچھل کر دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب 38 بور ریوالور اس کی طرف سیدھا ہو چکا تھا۔ وہ جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔ میں نے رائفل زریں گل کی طرف اچھالی' جسے اس نے بڑی مشاقی سے دبوچ لیا۔

ٹیوب لائٹ کی روشنی میں' میں نے غور سے نووارد کا چہرہ دیکھا۔ وہ جیون جی ہی تھا۔ لمبے بال جو شانوں تک گئے ہوئے تھے۔ فربہ جسم اور مکار آنکھیں' اروشی اس شخص کا مکمل تعارف کرا چکی تھی۔ اس شخص نے اروشی کی مرحومہ والدہ کو قرض دیا تھا اور اب کاکا وغیرہ کے ساتھ مل کر اروشی کو بلیک میل کر رہا تھا۔ نیناں پر مجرمانہ حملہ کرنے والوں میں یہ شخص بھی شامل تھا اور اروشی کے نازک بدن پر اس کی ظالم چٹکیوں کے نشان موجود تھے۔ میرا سینہ جل اٹھا۔ اچانک ہی میرے اندر وہ جہانی استاد بیدار ہو گیا جو اپنے دشمن کے لئے بے رحم اور سفاک ہو جاتا تھا۔ جسے اس کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ اس نے اپنے مدمقابل کو "عبرت نگاہ" بنانا ہے۔ میری نگاہیں جیون جی کے منحوس چہرے پر جم گئیں اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اس شخص کو (جو اپنی شامت اعمال کے نتیجے میں دندناتا ہوا یہاں گھس آیا ہے) بدترین عذاب سے دوچار کروں گا۔ اس شخص کی کربناک چیخ پکار سے جہاں معصوم نیناں کی روح کو سکون ملتا' وہاں یقیناً ڈاکٹر ٹانکے کی اکڑفوں بھی پانی بن کر بہہ جاتی۔

میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ کمرے کی دیوار گیر کھڑکی پر سے پردہ ہٹا دے۔ زریں گل نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ کھڑکی سے باہر مدھم ساحلی ہوا میں ناریل جھوم رہے تھے' اشوک کے سرخ پھول اڑ رہے تھے اور کیلے کے جھنڈ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں نے نیناں کے قاتل کے لئے جو سزا منتخب کی تھی وہ اتنی سنگین اور اتنی سنسنی خیز تھی کہ اس کا تماشا دیکھنے کے لئے جنوبی ہند کا زرد چاند دریچے سے کھسک کر ایک روزن میں آ گیا اور کمرے میں جھانکنے لگا تھا...

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ" میں نے جیون جی کو حکم دیا۔

وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کی توند "ہانپ" رہی تھی اور لمبے بال قریباً شانوں تک گئے ہوئے تھے۔ میں نے قریبی الماری کی دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہاں سے ۳۸ بور ریوالور پر "فٹ" ہونے والا امپورٹڈ سائیلنسر نکال لیا۔ یہ سائیلنسر میں نے کمرے کی تلاشی کے دوران دیکھا تھا۔ میں نے سائیلنسر کی چوڑی ریوالور کے بیرل پر کسی اور زریں گل سے کہا کہ وہ مدراسی رقاصہ سمیتا کو ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں لے جائے۔ زریں گل نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ ۳۷۵ میگنم ڈبل بیرل رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو سمیتا اس کے سامنے چوں نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ ایسا ہی رعب طاری ہو چکا تھا اس پر زریں گل کا۔ ڈاکٹر ٹانکے اور اس کا چوکیدار

اجیت اوری سے بندھے فرش پر پڑے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں نے جیون جی سے کہا "چہرہ دیوار کی طرف پھیرو۔"

یہ الفاظ میں نے اردو میں کہے تھے۔ مجھے امروشی نے بتایا تھا کہ جیون جی ہندی اور اردو سمجھ لیتا ہے۔ تاہم میرے الفاظ سننے کے باوجود جیون جی اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ میری زبان اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے بے دریغ فائر کیا۔ ۳۸ بور کی گولی جیون کے دائیں پاؤں میں لگی اور وہ تڑپ کر پہلو کے بل گر گیا۔ سائلنسر کی وجہ سے فائر کی آواز محدود رہی تھی۔

"جو لوگ الفاظ کی زبان نہ سمجھیں میں ان سے گولی کی زبان میں بات کرتا ہوں" میں نے ریوالور اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

جیون جی کی ساری اکڑفوں اور خودسری ایک ہی زخم سے پانی بن کر بہہ گئی تھی۔ درد کی شدت سے اس کا رنگ ہلدی ہو گیا اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے بوٹ کی طرف دیکھنے لگا جس کے براؤن چمڑے میں سیاہ سوراخ ہو چکا تھا اور اب اس سوراخ میں سے خون نکل کر قالین کو داغدار کر رہا تھا۔

"چلو کھڑے ہو جاؤ" میں نے کہا "ورنہ دوسری گولی دوسرے پاؤں پر لگے گی۔"

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ جیون جی کسی زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ اس کے جسم میں ایک خطرناک جنبش بھی پیدا ہوئی لیکن پھر اپنی بے انتہا تکلیف اور میرے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کا خیال کر کے وہ اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا رہا۔

میں نے اس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ الٹ کر باتھ روم کے دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے سیاہ ہونٹوں سے خون کی پتلی دھار بہہ نکلی تھی۔ "کھڑے ہو جاؤ ورنہ پھر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے" میں نے ریوالور اس کے دوسرے پاؤں کی طرف سیدھا کیا۔

جیون جی کی حالت کسی ایسے درندے کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر کے آہنی سلاخوں سے چھیدا جا رہا ہو۔ وہ مزاحمت کرنا چاہتا تھا لیکن مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ توہین برداشت کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بے پناہ تکلیف کو چھپانا چاہتا تھا لیکن چھپا نہیں پا رہا تھا۔ اس کی زخمی ٹانگ کانپتی چلی جا رہی تھی اور بوٹ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر نایکے نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا "تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ تمہارا انجام بڑا دردناک ہوگا۔ یہ کاکا کا خاص آدمی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو کاکا تمہیں تمہارے اہل خانہ سمیت زندہ جلا ڈالے گا۔"

میں نے کہا "اونٹ پہاڑ کے نیچے آئے گا تو پتا چلے گا کہ کون کس کا انجام دردناک بناتا ہے۔ فی الحال تم یہ تماشا دیکھو جو میں کرنے جا رہا ہوں۔"

میں نے جیون جی کی طرف دیکھا۔ اس نے میری آنکھوں کا خاموش پیغام پڑھ لیا اور جان لیا کہ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی تو میں اس کا دوسرا پاؤں بھی پنکچر کر دوں گا۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بڑبڑایا۔ پھر اپنے لرزتے کانپتے جسم کو سنبھالا اور بائیں گھٹنے پر زور دے کر دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ "تت۔۔۔ تم چاہتے کیا ہو؟" وہ کراہتے ہوئے غرایا۔

"فی الحال صرف یہ کہ تم دیوار کی طرف چہرہ پھیر کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"یہ مت سمجھو کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں روانہ ہونے سے پہلے ماسٹر کاکا کو اطلاع کر چکا ہوں۔ وہ بس پہنچنے ہی والے ہوں گے" وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا۔

"اس کی خاطر تواضع تم سے بڑھ کر ہوگی۔ بالکل شانت رہو تم" میں نے کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ لمبے بالوں والا سیاہ ریچھ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ "ہیرو بنانے" کے چکر میں اکیلا یہاں گھس آیا تھا اور اب شامتِ اعمال سامنے دیکھ کر الٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ کاکا اس سارے معاملے سے یقیناً بے خبر تھا۔

میں نے سائلنسر لگے ریوالور کو خطرناک انداز میں حرکت دی تو جیون جی کو مونچھ نیچی کر کے اپنا رخ دیوار کی طرف کرنا پڑا (مونچھ کو میں نے محاورتاً استعمال کیا ہے۔ جیون جی کی مونچھ نہیں تھی)۔ زریں گل نے لپک کر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ ڈرائنگ روم کے وسط میں ایک خوبصورت آرائشی ستون تھا۔ اس چوکور ستون پر ڈیکوریشن کے لیے ساگوان کے چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹکڑے استعمال کیے گئے تھے۔ میں نے زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ جیون کو رسی کی مدد سے ستون کے ساتھ باندھ دے۔ زریں گل رسی کا انتظام کر چکا تھا۔ اس نے بڑی چابک دستی اور مضبوطی سے جیون جی کو ستون کے ساتھ پیوست کر دیا۔ وہ اپنے سر کے سوا جسم کے کسی عضو کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے رسی کے دو بڑے ٹکڑے لیے اور جیون جی کے سر کو بھی "ناقابلِ حرکت" بنا دیا۔ ایک رسی اس کی ٹھوڑی کے نیچے نکالی گئی تھی۔ دوسری رسی نے اس کی پیشانی کو یوں جکڑ رکھا تھا کہ وہ سر کو جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا۔ رسی کو خاص کوہ پیماؤں والی گرہیں لگائی گئی تھیں اور ان کے ڈھیلا پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

میرا دھیان مسلسل ان گٹھڑیوں میں اٹکا ہوا تھا جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے عمارت کے ایک عقبی کمرے میں دیکھی تھیں۔ مزید کوئی کارروائی کرنے سے پہلے میں نے ضروری سمجھا کہ گٹھڑیوں کا جائزہ لے آؤں۔ زریں گل کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر

عمارت کے عقبی صحن میں پہنچا۔ کاٹھ کباڑ والے کمرے سے گزر کر میں نے اس کمرے میں قدم رکھا جہاں فرش پر صاف ستھرا قالین تھا اور ایک طرف گٹھڑیوں کا ڈھیر سا نظر آ رہا تھا۔ افراتفری میں دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ بتی بھی جل رہی تھی۔ میں نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد دروازہ اندر سے بند کیا اور گٹھڑیوں کے پاس چلا آیا۔ اب مجھے گتے کے چند بڑے بڑے ڈبے بھی دکھائی دیے۔ یہ گٹھڑیوں کے ساتھ ہی پڑے تھے اور اوپر سے نظر آتے تھے۔

میں نے ایک گٹھڑی کھولی اور دنگ رہ گیا۔ اس میں کھالیں تھیں۔ نہایت نفیس اور فروخت کے لیے تیار کھالیں۔ جو کھال سب سے پہلے میرے ہاتھ لگی۔ وہ بنگال رائل ٹائیگر کی تھی۔ اس پر زرد اور خوبصورت سیاہ دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دوسری کھال دیکھی وہ بھی ٹائیگر کی تھی۔ اس گٹھڑی میں کم و بیش آٹھ کھالیں ٹائیگرز کی تھیں۔ دو کھالیں لومڑی کی اور دو تین کسی اور ایسے ہی جانور کی تھیں۔ میں نے ایک دوسری گٹھڑی کا معائنہ کیا۔ یہ گٹھڑی بھی جنگلی جانوروں کی قیمتی کھالوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں چھوٹی بڑی سب طرح کی کھالیں شامل تھیں۔ یہ سب منتخب [illegible] تھے۔ کہیں کسی کھال پر کوئی داغ یا کٹ نظر نہیں آتا تھا۔ سری لنکا میں اب شیر دیکھنے میں نہیں آتا یقیناً شیر کی کھالیں کہیں باہر سے لائی گئی تھیں۔ گتے کے ڈبوں میں "آئیوری" یعنی ہاتھی دانت سے بنی ہوئی اشیا تھیں یقیناً یہ لاکھوں کا سامان تھا۔ سامان کے علاوہ ہاتھی دانت خام شکل میں بھی یہاں موجود تھا۔ تین ڈبے ایسے تھے جو صرف جانوروں کے سینگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ سارا سامان ناجائز طریقے سے جمع کیا گیا ہے۔

کچھ دیر میں اس کمرے میں گم صم کھڑا رہا پھر اپنے پروگرام کے مطابق ڈاکٹر نایکے کی معائنہ گاہ میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک جہازی سائز فریج میں انجکشن کی بہت سی شیشیاں (وائلز) رکھی تھیں۔ یہ کوئی اینٹی بایوٹک انجکشن تھا اور پاؤڈر کی شکل میں تھا۔ میں نے چالیس انجکشن کا ایک پورا ڈبا اٹھایا اور واپس ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں نے انجکشن تپائی پر رکھے تو زریں گل سمیت سب حیرت سے دیکھنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ اگلے چند لمحوں میں یہ حیرت شدید تر ہو جائے گی۔

زریں گل بولا "یہ سارا انجکشن کیا اس حرامی کو لگے گا؟" اس کا اشارہ جیون کی طرف تھا۔

میں نے کہا "نہیں کوئی اور کام لے رہا ہوں ان سے" زریں گل بدستور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "زریں گل ہم اس دنیا کو وہی کچھ لوٹاتے ہیں جو دنیا سے حاصل کرتے ہیں۔ محبت، نفرت، انتقام، غصہ، یہ سب کچھ دنیا ہی کا تو دیا ہوا ہوتا ہے۔ جونہی موقع ملتا ہے ہم یہ چیزیں دنیا کو لوٹا دیتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ مقام اور لوگ بدل جاتے ہیں۔ جو سزا میں کاکا کے اس غنڈے کو دینے جا رہا ہوں۔ یہ شنکر شکرا نے میرے ایک وفادار ساتھی کو دی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شنکر شکرا نے یہ سزا ایک بے گناہ شخص کو دی تھی جب کہ میں ایک گناہ گار کو دے رہا ہوں۔"

زریں حیرت سے میری بات سن رہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تمہیں زبانی کلامی نہیں، عملی کارروائی سے سمجھاؤں گا۔ ان انجکشنوں میں سے ایک انجکشن اٹھاؤ اور اس حرامی کے سر پر رکھ دو" میرا اشارہ جیون جی کی طرف تھا۔

زریں گل نے ذرا سی ہچکچاہٹ دکھانے کے بعد میری ہدایت پر عمل کیا اور انجکشن کا ایک وائل جیون جی کے سر پر رکھ دیا۔ جونہی وہ پیچھے ہٹا۔ میں نے نشانہ لیا اور ریوالور سے فائر کر دیا۔ ریوالور کے سائلنسر سے "ٹھک" کی خوفناک آواز نکلی اور انجکشن جیون جی کے سر پر سے صاف اڑ گیا۔ انجکشن کا پاؤڈر دھول کی طرح ہوا میں اڑا اور آہستہ آہستہ قالین تک پہنچ گیا۔ جیون جی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔ کچھ یہی حال باقی ماندہ افراد کا بھی تھا۔ گولی چوکور ستون کی آرائشی لکڑی میں گھس چکی تھی۔

میں نے زریں گل کو اشارہ کیا کہ وہ دوسرا وائل جیون جی کے سر پر رکھے۔ زریں گل چونک کر آگے بڑھا اور میری ہدایت کے مطابق ایک اور وائل جیون جی کے سر پر رکھ دیا۔ جیون جی کے چہرے پر اب موت کی زردی کھنڈ چکی تھی "نہیں۔۔۔ نہیں، ایسا مت کرو" وہ چیخ کر بولا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا سر ہلانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وائل سر سے گر جائے لیکن میری کلاسیکل گرہوں نے سر کو ہلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے دوبارہ نشانہ لیا۔ جیون جی پر قیامت بیت رہی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ جیسے ڈر ہو کہ آنکھ بھی جھپکی تو میرا نشانہ خطا ہو جائے گا اور وہ موت کی وادی میں اتر جائے گا۔ میں دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ کسی مردے کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ میں نے دوسرا فائر کیا۔ اس مرتبہ تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ گولی جیون جی کے بالوں اور وائل کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ فائر ہوتے ہی جیون جی کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ جب اپنے زندہ بچ جانے کا یقین آیا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پہلے سنہالی میں واویلا کرتا رہا پھر دھمکیوں سے زور آزمائی کرنے لگا۔ اس دوران میں نے تیسری مرتبہ ریوالور سیدھا کر لیا تھا، لہٰذا اس نے تڑپنے مچلنے کی کوشش یکسر موقوف کر دی اور میرے نشانے کے سامنے پتھر کا بت بن گیا۔ یہ فائر کارگر رہا اور "ٹھک" کی آواز کے ساتھ ہی وائل جیون جی کے سر سے غائب ہو گیا۔

میں نے زریں گل کو اشارہ کیا کہ وہ تیسرا وائل جیون کے سر پر رکھے۔ وہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگا "ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو۔"

میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے گولی مار دو لیکن اہانت نہ کرو۔"

"ایسا تو ہو گا" میں نے اطمینان سے کہا "صرف ایک صورت ہے بچنے کی۔ اپنے اور کاکا کے بارے میں اور اس دھندے کے بارے میں جو تم لوگ کرتے ہو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔"

"کک... کون سا دھندا... کیسا دھندا؟"

زریں گل نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور رائفل جیون جی کے سر پر رکھ دی۔ رائفل سر پر آیا تو جیون کی آنکھوں میں پھر موت ناچنے لگی۔ وہ تھوک نگل کر اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا "مجھے اس کے سوا کچھ خبر نہیں کہ کاکا کے ریستوران میں جوا ہوتا ہے یا کبھی کبھار لڑکیاں لائی جاتی ہیں۔"

"میں ریستوران کی بات نہیں کر رہا' ان کٹھڑیوں کی بات کر رہا ہوں' جن میں کھالیں ہیں۔"

"کھالیں؟ کون سی کھالیں؟"

"وہی کھالیں جن کے بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ کھالیں اور دوسرا سامان کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟"

"میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں۔ اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔"

میں نے ریوالور سے نشانہ لیا۔ فرطِ خوف سے جیون بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ تمام جسم لرز رہا تھا اور وہ ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شاید پراتھنا کر رہا تھا۔ جیون جیسے شخص کو پراتھنا کرتے دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے کسی شراب خانے سے بھجن کی آواز سننا۔ میں نے فائر کیا۔ نشانہ خطا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی جیون جی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخا۔ اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ وہ شخص جو کچھ دیر پہلے تک خدائی فوجدار بنا ہوا تھا اور جس کے ہاتھ میں ۷۵ء۳ میگنم موت اور دہشت کی علامت تھی اب مجسم نگاہ بن کر زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔

اس کی حالت زار دیکھ کر میرا ذہن کئی ماہ پیچھے چلا گیا۔ شنکر اور اس کے ساتھیوں نے زویے مشعر میں ہیڈ کانسٹیبل نذیر اور سب انسپکٹر یا ہو کو ایسے ہی اذیت ناک لمحوں سے گزارا تھا۔ انہوں نے چاند ماری کے میدان میں ان دونوں کے سروں پر شیشے کی بوتلیں رکھی تھیں اور کئی گھنٹے تک نشانے بازی کی تھی۔ اس واقعے کا المناک پہلو یہ تھا کہ سزا پانے والے بے گناہ اور سزا دینے والے ڈاکو اور لٹیرے تھے۔

میں نے یکے بعد دیگرے تین راؤنڈ اور داغے۔ جب زریں گل نے ساتواں رائفل جیون جی کے سر پر رکھا تو اس کی حالت ایک دم غیر ہونے لگی۔ یوں لگا کہ وہ کھڑے کھڑے بے ہوش ہو جائے گا۔ جونہی میں نے نشانہ لینے کے لیے ریوالور سیدھا کیا وہ چیخ چیخ کر رونے لگا "مار دو... مجھے مار دو۔ بھگوان کے واسطے ایک ہی دفعہ مار دو... جو کچھ میں نے بتایا مجھے اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "ریستوران کے بارے میں تم نے جو کچھ بتایا اس سے زیادہ ہمیں پہلے سے پتا تھا۔ ہم تم سے ان کھالوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو یہاں رکھی گئی ہیں اور ریستوران کی بالائی منزل پر بھی ایک کمرے میں موجود ہیں۔"

"میں ان کھالوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے معلوم وہ کہاں سے آتی ہیں؟" جیون جی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بولا۔

میں نے کہا "یہ تو پتا ہو گا وہ کہاں جاتی ہیں؟"

"نہیں... نہیں پتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایک مہینے یہ کھالیں کولمبو کا کوئی تاجر ماسٹر کاکا کو امانت رکھوا کر گیا تھا۔"

میں نے ریوالور سیدھا کر کے نشانہ لیا۔ جیون جی کی [illegible] زیادہ شدت سے کانپنے لگی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے واسطے دینے لگا۔ بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا کہ اسے صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ اس کی یہ دلیل مجھے "فائر" سے روک نہیں سکتی تھی۔ جیون کا جرم صرف یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے اور کاکا کے بارے میں کچھ چھپا رہا تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی اور اگر اس کے باقی تمام جرائم نظر انداز کر دیے جاتے تو بھی یہ جرم اسے دار تک پہنچانے کے لیے کافی تھا کہ اس نے بنتاں کی عزت لوٹی تھی۔ اس کے جسم کو کتے کی طرح جھنجھوڑا تھا اور ایسے دیے تھے جنہوں نے اس نوخیز لڑکی کو چند روز میں خاک بنا کر خاک میں ملا دیا تھا۔ مجھے اپنے نشانے پر اعتماد تھا لیکن بہترین نشانہ باز غلطی ضرور کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جلد ہی مجھ سے بھی غلطی ہو گی اور لرزتا کانپتا جیون جی جان کنی کے عذاب سے نجات پا جائے گا۔ میں اب تک چھ راؤنڈ فائر کر چکا تھا۔ ان میں سے دو نشانے خطا ہوئے تھے اور دونوں مرتبہ گولی سر کے اوپر سے گزری تھی۔ میں نے ساتویں رائفل کو نشانہ بنایا۔ یہ نشانہ بھی بالکل ٹھکانے پر لگا اور کرچیاں پاؤڈر سمیت ہوا میں بکھر گئیں... یکایک جیون جی کی ہچکی زور زور سے نکلی اور مجھے لگا کہ اس کے ہونٹ گہرے نیلے ہو گئے ہیں۔ اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ زریں گل لپک کر جیون کے قریب آیا۔ اس کے حلق اور گالوں پر تھپڑ مارے۔ جیون جی کی پتلیاں الٹ رہی تھیں۔ "ہارٹ اٹیک" میرے ذہن میں یہ لفظ پوری شدت سے گونجا۔ میرے اشارے پر زریں گل نے جلدی جلدی جیون جی کی بالائی بندشیں کھولیں۔ جیون جی کی سوئی ہوئی آنکھیں چند بار زور سے پھڑپھڑائیں پھر اس کے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جو کسی بھیڑیے کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ ایک جھٹکے سے اس کا سر سینے پر جھول گیا۔ جب تک ہم اس کی بندشیں کھول کر اسے چارپائی پر لٹاتے اس کی گہری بے ہوشی موت کے اندھیرے میں بدل چکی تھی۔ وہ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ رقاصہ سمیتا جو پہلے ہی گھٹنوں میں چہرہ چھپائے سسک رہی تھی بلند آواز سے رونے لگی۔ ڈاکٹر نائیکے کے چہرے پر موت کا خوف بھوت بن کر ناچ رہا تھا "تم... تم نے اسے مار دیا...

قاتل ہو اس کے میں گواہی دوں گا عدالت میں" وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "گواہی دینے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر نائیکے نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے حلق میں ہی گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ فرطِ خوف سے اس کی گویائی سلب ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر میری بے رحمی میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے کہا "میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔ اپنے اور کاکا کے بارے میں بتاؤ اور اس کے کالے کاروبار کے بارے میں بھی جو کاکا کر رہا ہے۔"

بے بس نائیکے کی آنکھوں میں آنسو لرز گئے۔ خوبصورت سمیتا کی پروا کیے بغیر وہ ایک دم ہیرو سے زیرو بن گیا۔ اس کی آواز نے شیر کی دہاڑ سے گیدڑ کی آواز تک کا سفر صرف... ایک لمحے میں طے کر لیا۔ وہ گھگھیا کر بولا "مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے بدتمیزی کی۔ لیکن یہ سو فیصد حقیقت ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس بات پر یقین کر لو۔ میں ایک پڑھا لکھا..."

"شٹ اپ" میں نے غرا کر کہا "اپنی پڑھائی لکھائی کا رعب مت گانٹھو۔"

پھر میں نے فیصلہ کن لہجے میں زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ نائیکے کو جیون جی کی جگہ ستون سے باندھ دے۔ میں نے یہ ہدایت اردو میں جاری کی تھی لیکن میرے انداز ہی نے نائیکے کو سب کچھ سمجھا دیا۔ وہ یکبارگی یوں کانپنا شروع ہوا جیسے لرزے کے بخار نے آ لیا ہو۔ اس کی ساری مزاحمتی توانائی ایک دم صفر پر آ گئی تھی۔ زریں گل نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ایک دم لڑھک کر میرے قدموں میں آ گرا۔ اس کا سر میرے پاؤں پر رکھا تھا۔ معلوم نہیں اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا یا پاؤں اور سر کا ملاپ خود بخود ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے سمیتا اسے بتا چکی تھی کہ ہم دونوں نہایت خطرناک مخلوق ہیں اور کل مڈنائٹ ریستوران میں ہم نے ہنگامہ مچا دیا تھا۔ اب نائیکے بچشم خود ہمارے "مشاغل" ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس کی عقل یقیناً اسے یہی بتا رہی تھی کہ وہ نہایت خطرناک لوگوں کے شکنجے میں ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ آج کی رات اس کا یوم حساب ثابت ہو جائے۔ وہ روہانسی آواز میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں اور... اگر تمہیں قسم پر یقین نہیں تو مجھے وہ طریقہ بتاؤ جس سے میں تمہیں مطمئن کر سکوں۔"

میں نے کہا "میں اب بھی بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم کاکا کے گروہ کے آدمی ہو اور کاکا کے کالے دھندوں کے بارے میں الف سے یے تک جانتے ہو۔"

"میں کچھ نہیں جانتا" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخا اور چیختا چلا

گیا۔

زریں گل نے اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور اس ستون کے ساتھ کھڑا کر دیا جس میں اب گولیوں کے کئی سوراخ ہو چکے تھے۔ وہ یوں تڑپنے مچلنے لگا جیسے ستون میں بجلی دوڑ رہی ہو "چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو" وہ چلا رہا تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے لیکن سر آزاد تھا۔ وہ کبھی زریں کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا تھا کبھی سر کو ٹکر مارنے والے انداز میں حرکت دیتا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہی وہ بارعب ڈاکٹر ہے جو ایک گھنٹا پہلے سلیپنگ گاؤن پہنے خواب گاہ کے ریشمی اندھیرے سے برآمد ہوا تھا اور بڑے طمطراق سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو سنبھالنے میں زریں گل کی مدد کی اور اسے ایک دیوار کے ساتھ سیدھا کھڑا کر دیا۔ زریں گل نے ڈاکٹر کے دبلے جسم کو رسی میں جکڑنا شروع کیا۔ میں نے اس کے سر اور گردن "فکس" کرنے کے لیے رسی کے مخصوص گرہوں والے ٹکڑے اٹھائے... ایک دم یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے ہیں۔ کسی خاص فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کی مزاحمت اچانک ختم ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کا سیاہ چہرہ پسینے سے شرابور ہے۔ چند گہری سانسیں لے کر وہ بولا "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو... اور کاکا جیسے شخص سے ٹکرانے کا مشورہ تمہیں کس بدخواہ نے دیا ہے۔ بہرحال اس بات پر یقین رکھو کہ اب تمہارے سانس گنے جا چکے ہیں۔ کاکا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرا اور کاکا کا معرکہ دیکھنے کے لیے زندہ رہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جو میں پوچھتا ہوں صاف صاف بتاتے جاؤ۔"

وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا "میں ایک سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔"

میں نائیکے کے رویے کی تبدیلی صاف محسوس کر چکا تھا۔ وہ اپنی جان کڑے عذاب سے نکالنے کے لیے زبان کھولنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے زریں گل کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈبل بیرل رائفل پکڑ کر کمرے کے ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔ یہاں سے وہ سمیتا اور رچ کیدا راجیت کو بیک وقت نشانے پر رکھ سکتا تھا۔ سمیتا

اور جو کیدار اجیت کے درمیان متوفی جیون جی کی لاش پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کا ایک بوٹ گاڑھے سیاہ بالکل خون میں لتھڑا ہوا تھا اور لمبے بال قالین پر بکھرے تھے۔ میں نے ڈاکٹر ایم ڈی نائیکے کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور اسے کسی بوری کی طرح گھسیٹ کر بیڈ روم میں لے گیا۔ میں اور وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نائیکے کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا "کون سا سگریٹ پیو گے۔ خالی یا گانجے والا؟"

"خالی" اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے گولڈلیف کا ایک سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ مضطرب انداز میں ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

"یہ لڑکی سبھتا یہاں کیوں آئی تھی؟" میں نے پہلا سوال کیا۔

"میں نے بلایا تھا" وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"تمہارے آنے سے پہلے تم دونوں کیا کر رہے تھے؟"

"بیڈ روم میں تھے" نائیکے نے نگاہیں جھکا کر اعتراف کیا۔

"کیا یہ اس سے پہلے بھی یہاں آتی رہی ہے؟"

"ہاں۔ کبھی کبھار۔"

"کبھی کبھار سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جب تمہاری بیوی والدین کے گھر ہوتی ہے تم اس "مریضہ" کو علاج معالجے کے لیے بلا لیتے ہو؟"

"ہاں۔ ایک دو بار ایسا ہوا ہے۔"

"کاکا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں اس کے گروہ کا باقاعدہ ممبر نہیں ہوں۔ بس وہ کبھی کبھار میرے گھر کو سامان اسٹور کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔"

"سامان سے تمہاری مراد وہ قیمتی کھالیں ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور وہ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چیزیں اور سینگ وغیرہ جو ڈبوں میں بند ہیں؟"

"ہاں وہ بھی۔"

"یہ سامان کہاں سے آتا ہے؟"

"مجھے اس بارے میں معلوم نہیں۔"

"کہاں جاتا ہے؟"

"سری لنکا کے تمام بڑے شہروں میں سپلائی ہوتا ہے۔ اُن بڑی بڑی گفٹ شاپس کو بیچا جاتا ہے جہاں غیر ملکی سیاحوں کی آمدورفت ہوتی ہے۔"

"کیا وہ لوگ یہ سامان کھلے عام فروخت کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ بس خاص خاص گاہکوں کو رازداری کے ساتھ بیچا جاتا ہے۔"

"یہ غیر قانونی کاروبار کب سے ہو رہا ہے؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ کاکا اپنے قریبی ساتھیوں پر بھی

اعتماد نہیں کرتا۔ صرف اتنا ہی بتاتا ہے جتنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھ تو کاکا کا تعلق بہت زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ سات آٹھ ماہ قبل پہلی ملاقات ہوئی تھی اس سے۔"

"کیسے ہوئی ملاقات؟"

"کاکا مریض کے طور پر میرے پاس آیا تھا۔ پھر وہیں سے تعلقات بڑھ گئے۔"

"کیا اس کاروبار میں کاکا کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے؟"

"میں اس بارے میں نہیں جانتا۔"

میں نے ریوالور کو حرکت دی "میرا خیال ہے کہ تم عالم بالا میں جا کر اپنے پرانے مریضوں سے ملاقات کرنا چاہتے ہو۔"

"نن... نہیں میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا۔"

"زریں گل" میں نے زریں کو آواز دی۔

وہ جن کی طرح دروازے پر حاضر ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں سبھتا کے لمبے ریشمی بال تھے۔ وہ زریں کے ساتھ گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ زریں کو دیکھ کر نائیکے کو پھر لرزے کا بخار چڑھنا شروع ہو گیا۔ وہ تھوک نگل کر بولا "مجھے کاکا کے کسی پارٹنر کا پتا نہیں۔ لل... لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"سنا ہے کہ کاکا یہ کام کسی اور کے لیے کرتا ہے۔ کوئی بہت بڑی غیر ملکی پارٹی ہے۔ کروڑوں روپیہ انویسٹ کر رکھا ہے اس نے"

"کون سی پارٹی ہے؟" میں نے پوچھا۔

نائیکے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ گڑبڑا کر بولا "شاید۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔"

واقعات آپس میں مربوط ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے صورت حال کی ایک دھندلی سی تصویر ابھرنے لگی۔ جس پارٹی کے ساتھ شیخ عاصم کا کرایہ پر جھگڑا تھا وہ شیخ کے رشتے دار بھی تھے۔ ان میں سے ایک شخص کا نام عشارب تھا اور شجرۂ نسب کے اعتبار سے وہ شیخ عاصم کا چچا زاد بھائی تھا۔ اسی کے نام پر ایک معروف فرم عشارب ایجنسی تھی۔ شیخ عاصم اور اس کے چچا زاد کی دیرینہ رنجش اس دور دراز جزیرے میں ایک سنگین کشمکش کو ہوا دے رہی تھی۔ شیخ عاصم کا چچا زاد اس کی ٹوہ میں تھا۔ وہ اسے ایک جان لیوا مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ خود بھی کوئی ایسا پارسا اور قانون پسند نہیں تھا۔ وہ ایک غیر قانونی کاروبار میں ملوث تھا اور میری اب تک کی معلومات کے مطابق پورے سری لنکا میں یہ کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ شخص شیشے کے گھر میں بیٹھ کر شیخ عاصم پر پتھر پھینک رہا تھا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر نائیکے! تم بتا کم رہے ہو اور چھپا زیادہ... میں تمہیں کچھ دیر سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ اپنا برا بھلا اچھی طرح پرکھ لو لیکن اس سوچ بچار کے دوران تمہیں ایک کام بھی کرنا ہوگا۔"

"کون سا کام؟"

"وہی جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میرے سینے میں واقعی شدید تکلیف ہے۔ تمہیں میرا معائنہ کرنا ہوگا اور اگر ضرورت پیش آئی تو آپریشن بھی کرنا ہوگا۔ میں دیکھ چکا ہوں، یہاں تم نے آپریشن تھیٹر بھی بنا رکھا ہے۔"

ڈاکٹر نائیکے کچھ ریلیکس نظر آنے لگا۔ غالباً اسے احساس ہوا تھا کہ میں اپنی تکلیف کے حوالے سے اس کا مرہونِ منت ہوں۔ میں نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا "لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا ڈاکٹر! تم وہ ڈاکٹر نہیں ہو جو اپنے پیشے کو مقدس سمجھتے ہیں اور مریض بھی آنکھیں بند کر کے ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ تم آدھی رات کے وقت ایک حسینہ کا علاج اپنے بیڈ روم میں کرنے والے "مریض نما" ڈاکٹر ہو۔ میرے معائنے کے دوران میرا ساتھی رائفل بدست تمہارے سر پر کھڑا رہے گا۔ جہاں کہیں تم نے کوئی چالاکی دکھائی وہ تمہیں رات میں سورج دکھا دے گا۔ یاد رکھو وہ پٹھان ہے۔ گولی پہلے مارے گا یہ بعد میں سوچے گا کہ انجام کیا ہوگا۔"

دس پندرہ منٹ کے اندر میں نے زریں گل کے ساتھ مل کر سارا انتظام کر لیا۔ جیون جی کی بھاری بھرکم لاش کو گھسیٹ کر باتھ روم میں بند کیا۔ روتی بسورتی رقاصہ سبھتا کو ایک اسٹور نما کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ گورکھے اجیت کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ تسلی بخش طریقے سے بندھا پڑا تھا۔ زریں نے ڈبل بیرل رائفل کاندھے میں رکھ دی اور ریوالور تھام کر ڈاکٹر نائیکے کے سر پر چوکس کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر نائیکے کی بندشیں کھول دی گئی تھیں اور اب وہ میرے معائنے کے لیے آزاد تھا۔

ڈاکٹر نے پہلے میرے سینے پر الٹرا ساؤنڈ آزمایا۔ اس کے بعد گیسٹرو اسکوپی کا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے پانچ چھ گھنٹے ہو چکے تھے لہٰذا یہ "معائنہ" ممکن تھا۔ پہلے دوا کے ذریعے میرے گلے کو سُن کیا گیا تاکہ ابکائی نہ آئے، پھر ربڑ کا ایک طویل پائپ، جس کے ایک سرے پر ننھا سا ٹی وی کیمرا اور بلب نصب تھا میرے منہ میں داخل کیا گیا اور معدے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک چھوٹی سی اسکرین پر میرے معدے اور خوراک کی نالی کی رنگین تصویر نمودار ہونے لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں خود بھی یہ تصویر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ بالفاظ دیگر میں خود ہی اپنے معدے میں جھانک رہا تھا۔ چند لمحے بعد ایک خاص پوز بار بار اسکرین پر فوکس ہونے لگا۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ بار بار منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اسکرین پر تصویر فوکس ہوئی تو ایک سرخی مائل چوکور چیز کی جھلک نظر آنے لگی۔ یہ چیز اُس ڈبیا سے مشابہ تھی جو میں نے چند ہفتے پہلے بھوپال میں ننگر کے پاس دیکھی تھی اور جس کے ذریعے اس نے بلاسٹ کر کے ایک

قیمتی مرتبان توڑنے کا مظاہرہ کیا تھا۔

پانچ دس منٹ کے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے میرے حلق سے پائپ نکال لیا اور مجھے اٹھنے کی ہدایت کی۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں "کیا نتیجہ نکالا ڈاکٹر نائیکے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری اطلاعات حیرت انگیز ہونے کے باوجود سو فیصد درست ہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "تمہارے معدے کی اندرونی جھلی کے ساتھ کوئی آلہ نما دھاتی چیز مضبوطی سے چپکی ہوئی ہے۔ تمہارے سینے میں لگاتار اٹھنے والا درد بھی اسی آلے کے سبب ہے۔"

"کیا خیال ہے اس آلے کو نکالا جا سکتا ہے؟"

"نکالا تو جا سکتا ہے لیکن یہ اتنی آسانی سے ہونے والا کام نہیں، اس کے لیے ایک بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔ کم از کم اس چھوٹے سے کلینک میں تو یہ آپریشن نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا اندیشہ بھی موجود ہے" میں نے سوالیہ نظروں سے نائیکے کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "جیسا کہ تم نے بتایا ہے کہ اس آلے میں دھماکا خیز مواد موجود ہے دوسرے لفظوں میں یہ ایک ننھا سا بم ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس بم کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو یہ پھٹ جائے۔"

نائیکے نے ایک حقیقی خطرے کی نشاندہی کی تھی۔ یہی خطرہ تھا جس کی اطلاع ننگر ٹھکرانے ایک سنگین دھمکی کی شکل میں دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر آپریشن کے ذریعے کسی سرجن نے اس آلے کو میرے جسم سے جدا کرنے کی کوشش کی تو دھماکا خیز مواد معدے کے اندر ہی پھٹ جائے گا۔ ڈاکٹر نائیکے کے معائنے کے بعد میری بدترین اطلاعات کی تصدیق ہو چکی تھی۔ الیکٹرانک ڈیوائس میرے معدے میں موجود تھا اور میں اپنی آنکھوں سے اس کا عکس دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر نائیکے نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "تمہارے معدے کی اندرونی انفیکشن دور کرنے کے لیے دوائیں دی جا سکتی ہیں۔ ممکن ہے اس سے درد بھی کم ہو جائے۔ منہ کے ذریعے دی جانے والی دوائیں عموماً معدے اور آنتوں کی تکالیف میں بہت مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔ تمہارے درد میں وقتی افاقے کے لیے بھی ایک زود اثر دوا میرے پاس موجود ہے۔"

"ہوشیار استاد صیب" زریں گل بولا "دشمن کے ہاتھ کا دوا زہر سے بدتر ہوتا ہے۔ خو آپ کو اماری جان کا قسم اس ڈاکٹر کے ہاتھ سے آپ کو کوئی دوائی نہیں کھانا۔"

"تو تمہارے ہاتھ سے کھاؤں گا۔ لیکن دوا تو یہی دے گا..."

"نہیں استاد صیب! اس نے اس کو ہمینی لگایا ہے۔ یہ بدلہ ضرور لے گا۔ ضرور کوئی گڑبڑی کرے گا۔"

دفعتاً کال بیل بج اٹھی۔ کال بیل کی معمولی سی آواز ہمارے سروں پر بم کا دھماکا ثابت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نائیکے بھی چونک کر

کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ میں نے زریں گل کو آنکھوں آنکھوں میں سمجھایا کہ وہ ڈاکٹر نائیکے کو ریوالور کے نشانے پر رکھ کر چوکس کھڑا رہے۔ دراز میں سے رائفل نکال کر میں نے ہاتھ میں لی اور مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر پہلے ہم نے بیرونی بتیاں بجھا دی تھیں۔ لہٰذا پورچ اور "ڈرائیو وے" مکمل تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صرف مین گیٹ کے پاس دیوار پر دو چھوٹے گلوب روشن تھے اور ان کے آس پاس پتنگے منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گیٹ سے باہر کوئی گاڑی موجود ہے اور اس کی ہیڈ لائٹس گیٹ پر پڑ رہی ہیں۔ اگر چوکیدار اجیت یہاں موجود ہوتا تو اب تک آنے والوں سے رابطہ قائم کر چکا ہوتا لیکن وہ تو بے دست و پا ہو کر کمرے میں پڑا تھا۔ گیٹ کھلنے میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس نے آنے والے یا آنے والوں کو بے چین کر دیا تھا اور وہ وقفے وقفے سے کال بیل بجائے جا رہے تھے۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے بالکل تیار حالت میں کیا اور بھاگ کر چار دیواری کے قریب پہنچ گیا۔ مین گیٹ کی اونچائی تقریباً آٹھ فٹ تھی اور چار دیواری اس سے تین چار فٹ بلند تھی۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ پھولدار جھاڑیاں اور مختلف اقسام کے درخت تھے۔ احتیاطاً ان درختوں کی وہ شاخیں کاٹ دی گئی تھیں جو چار دیواری کو چھو سکتی تھیں۔ میں نے رائفل کا "شولڈر اسٹریپ" گلے میں ڈالا اور بڑی احتیاط سے ایک ایسے ہی درخت پر چڑھ گیا۔ باہر کا منظر میری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک اسٹیٹ کار نظر آرہی تھی اور کار کے پیچھے پولیس کی ایک بڑی جیپ کھڑی تھی۔ اس پٹرولنگ جیپ میں محکمے کے کم و بیش آٹھ ارکان موجود تھے۔ گیٹ پر نصب گلوبز کی روشنی میں میں اسٹیٹ کار کے اندر کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ کار میں مجھے مہربان کاکا کا زخمی ڈرائیور نظر آیا۔ امرناتھ نامی یہ دراز قد شخص ابھی ڈھائی گھنٹے پہلے میرے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ میرا گھٹنا اس کی پسلیوں میں لگا تھا اور اس کے ناک منہ سے خون پھوٹ گیا تھا۔ میں اور زریں گل اسے نزدیکی قصبے کی اس قدیم عمارت کے باغ میں چھپا آئے تھے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس ڈرائیور کی شکل دوبارہ دیکھنی پڑے گی اور وہ بھی اتنی جلدی۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ زخمی کو نازک حالت میں کولہاپور لے جانے کے بجائے یہاں ڈاکٹر نائیکے کے پاس لایا گیا ہے اور کیس کی تفتیش کے سلسلے میں سری لنکن پولیس بھی ہمراہ ہے۔

صورت حال سخت مخدوش تھی۔ عین ممکن تھا کہ مزید دو تین منٹ تک دروازہ نہ کھلنے پر پولیس والے چار دیواری پھاند کر اندر گھس آتے۔ میں تیزی سے نیچے اترا اور دوڑتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ زریں گل بدستور ڈاکٹر نائیکے کے سر پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔ میں نے ڈاکٹر نائیکے سے کہا "افسوس میں تمہاری مسیحائی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکا۔۔۔ تمہارا ایک اور مریض آگیا ہے اور وہ ایمرجنسی میں ہے۔ بہرحال یار زندہ صحبت باقی۔"

قریبی اسٹور روم کے اندر سے رقاصہ سیتا مسلسل دروازہ بجانے لگی تھی۔ ڈاکٹر نائیکے نے پوچھا "یہ دروازہ کون پیٹ رہا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو تمہاری محبوبہ ہے۔ ہم نے اسے اسٹور میں بند کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے بھی بندی کر کے تمہارے ساتھ اس بیڈ روم میں کیا جائے' تاکہ تم اس کا ادھورا علاج مکمل کر سکو۔"

ڈاکٹر نائیکے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ میں نے اسے بیڈ روم میں مقفل کیا اور زریں کے ساتھ مکان کے عقبی صحن میں آگیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا آہنی دروازہ موجود تھا۔ دروازے میں قفل لگا ہوا تھا' تاہم اس قفل کی چابی اس گچھے میں موجود تھی جو چوکیدار اجیت کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ میں تلاشی کے دوران یہ قفل اور دروازہ کھول کر دیکھ چکا تھا' لہٰذا دوسری مرتبہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چند ہی لمحے بعد میں اور زریں گل ڈاکٹر نائیکے کی رہائش گاہ سے باہر تھے۔ یہ ایک کشادہ سڑک تھی اور سڑک کی دونوں طرف رہائشی کوٹھیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہم نے سڑک پار کی اور رہائشی علاقے کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ رائفل میں نائیکے کی کوٹھی میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

○☆○

ہم اگلے روز بعد از دوپہر ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ ہماری واپسی تقریباً چالیس گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں حالات جوں کے توں تھے۔ شیخ عاصم ابھی بھوپال سے واپس نہیں آیا تھا۔ شنکر شترا بھی ہنوز غائب تھا۔ دیگر حالات معلوم کرنے کے لیے میں اروشی کو بلانا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی دوپہر کے کھانے کے ساتھ وارد ہو گئی۔ بہن کی موت کا شدید صدمہ جھیلنے کے بعد اب وہ کچھ سنبھل گئی تھی۔ غم و اندوہ کے گہرے بادلوں میں سے ایک باہمت اور مستقل مزاج لڑکی کا چہرہ نمودار ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھی کھیل جاتی تھی۔ ایسے میں اس کا نچلے ہونٹ کا ننھا سا زخم بھی مسکرا اٹھتا تھا۔ تاہم آج وہ مجھے کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ بولی "مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"کاکا اور اس کے غنڈوں سے۔"

"کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں نئی بات تو نہیں۔"

"اس مائیکرو فون کا کیا ہوا؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میں نے لگا دیا ہے" وہ خوفزدہ سرگوشی میں بولی۔

"کہاں؟"

"شیخ صاحب کے اسٹڈی روم میں۔ اکوان اور شیخ صاحب اکثر وہیں بیٹھا کرتے ہیں۔"

"کوئی ریکارڈنگ ہوئی؟"

"نہیں۔ شیخ صاحب اسی دن بھوپال چلے گئے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔"

"کاکا کے آدمیوں کو خبر ہے کہ تم نے مائیکرو فون لگا رکھا ہے؟"

"ممکن ہے" وہ شانے اچکا کر بولی "کوئی بات ان سے چھپی نہیں رہتی۔"

"انہوں نے ریکارڈنگ کے بارے میں پوچھا نہیں؟"

"یہی تو پریشانی ہے۔ آج رات جیون جی سے میری ملاقات ہے۔ یہیں حائل ہے۔۔۔ وہ ریکارڈنگ کے بارے میں پوچھیں گے۔ ناکامی کا لفظ تو یہ لوگ سن ہی نہیں سکتے۔ ایک دم آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کمینہ کس طرح پیش آئے میرے ساتھ۔"

میں نے پوچھا "جیون جی سے تمہاری آج کی ملاقات کب طے ہوئی تھی؟"

"پرسوں اس نے فون پر بات کی تھی۔"

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ ابھی دو تین روز جیون جی تم سے ملنے نہیں آئے گا۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بس مجھے معلوم ہے" میں نے اسے تسلی دی۔

تاہم یہ نہیں بتایا کہ جیون جی کل رات ملک عدم سدھار گیا ہے اور اب کبھی اسے خوفزدہ کرنے کے لیے واپس نہیں آئے گا اور نہ ہی یہ بتایا کہ امرناتھ میرے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

اس دوران اروشی کا جنونی راکیش سنگھے اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پر سفید پٹی ابھی تک موجود تھی۔ یہ پٹی اس چوٹ کی نشانی تھی جو راکیش سنگھے کو میرے ہاتھوں حاصل ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر راکیش سنگھے ششدر رہ گیا۔ تیزی سے بولا "آپ کب واپس آئے۔ میں نے تو سمجھا تھا' آپ یہاں نہیں ہیں۔ آپ کی گاڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"آپ سے کوئی ملنے آیا تھا۔ کوئی پاگل سا شخص تھا۔ ساتھ ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ دونوں میلے کچیلے لباس میں تھے۔ بھوکے ننگے نظر آتے تھے۔ میں نے کہہ دیا آپ یہاں نہیں ہیں۔ کچھ دیر بحث کرتے رہے' پھر کہنے لگے دوبارہ آئیں گے۔"

"کب کی بات ہے؟"

"ابھی ایک گھنٹا پہلے کی۔"

"کون ہو سکتے ہیں؟" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"وہ اپنا نام شاید عالی بتاتا تھا" راکیش سنگھے نے کہا اور میرے سر پر جیسے بم کا دھماکا ہو گیا۔

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت زریں گل کی بھی تھی۔ سنگھے کی انگریزی میں سے "عالی" کا لفظ اس کی سمجھ میں بھی آگیا تھا۔

"اس کا پورا نام کیا تھا۔ کہاں سے آیا تھا وہ؟" میں نے پوچھا۔

"پ پ۔۔۔ پورا نام تو یاد نہیں۔ وہ "عالی" کے ساتھ کچھ اور بھی لگا رہا تھا۔ کہتا تھا' میں کہیں سے نہیں آیا' آسمان سے ٹپکا ہوں۔ دو ہفتے تک ایک ناریل میں بند رہا ہوں۔ ناریل ٹوٹا ہے تو یہاں آگیا ہوں۔ عجب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔"

ایک دم مجھے یاد آیا کہ راکیش سنگھے تو سنہالی اور انگریزی کے سوا کوئی زبان سمجھ ہی نہیں سکتا پھر سائیں عالی اتنی وضاحت کے ساتھ اس سے کیسے مخاطب ہو گیا۔ میں نے سنگھے سے پوچھا "وہ شخص کس زبان میں بات کر رہا تھا؟"

سنگھے نے کہا "غالباً ہندی یا اردو تھی۔ اس کی ساتھی لڑکی انگریزی میں ترجمہ کرتی جا رہی تھی۔ ویسے وہ خود بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ دماغ جیسے لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہ سائیں عالی تھا یا کسی قدیم قزاق کی بھٹکی ہوئی روح تھا۔ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ دوسری لنکا تک میرا پیچھا کرے گا اور کسی حیلے اس دور دراز مقام تک آ پہنچے گا۔ مجھے اپنے جسم میں جھرجھری سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ مافوق الفطرت حوالوں پر میں نے آج تک یقین نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ شخص۔۔۔ یہ شخص کسی آسیب کی طرح میرے دل و دماغ سے چمٹتا جا رہا تھا۔ یہ میرے ہر اندازے کو غلط ثابت کرتا تھا اور ہر تجزیے کی دھجیاں بکھیر دیتا تھا۔۔۔ یہ کیا بلا تھا۔ کیا وسائل تھے اس شخص کے کہ زمین اس کے قدموں تلے سمٹی ہوئی تھی اور وقت کی باگ اس کے ہاتھوں میں تھی؟ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی یقیناً سروج عرف گلو کی بچی ہے۔ وہ اس کی خاص الخاص چیلی تھی اور میرے معاملات میں دخل اندازی اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔

ایک دم میں چونک سا گیا۔ میں نے راکیش سنگھے سے پوچھا کہ وہ دونوں کس طرف گئے تھے۔ راکیش سنگھے نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ میں نے اروشی سے پوچھا کہ کوئی سواری مل جائے گی۔

وہ بولی "تمہارے پاس فوکس ویگن تھی؟"

میں نے کہا "جہنم میں گئی وہ۔۔۔ کوئی اور گاڑی ہے؟"

راکیش سنگھے نے اپنے موٹر سائیکل کی چابی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ چند لمحے بعد ہم موٹر سائیکل پر سوار ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ نشیب کی طرف جاتی ہوئی صاف و شفاف سڑک تقریباً خالی تھی۔ اس سڑک پر تھوڑا آگے گولف گراؤنڈ واقع تھا۔ زریں گل نے اونچی آواز میں پوچھا "کیا ہوا استاد صیب! کہیں سائیں عالی تو یہاں نہیں پہنچ گیا؟"

"ہاں' پہنچ گیا ہے اور ساتھ وہ تمہاری گھر والی آلو کی چٹنی بھی آگئی ہے"

"ہائیں" زریں گل بری طرح بدکا اور موٹر سائیکل ڈگمگا کر رہ گئی "کیا واقعی وہ بھی آگئی ہے؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"دیکھا تو نہیں' لیکن امکان یہی ہے"

زریں نے دانت کچکچائے "استاد صیب! ہمارا دل چاہتا ہے' اس عورت پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے۔ اس کا منحوس صورت دیکھ کر ہمارا خون غصے سے چھلانگیں مارنے لگتا ہے۔ اس نے ام کو بہن کا گالی دے کر ام پر ہی ظلم نہیں کیا خود پر بھی ظلم کیا ہے۔"

"اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ظلم رہے اور امن بھی ہو" میں نے فقرہ مکمل کیا۔

"بالکل نہیں ہو سکتا۔"

"اگر ہو سکتا تو ریاض شاہد کو کیا ضرورت تھی فلم "یہ امن" بنانے کی اور اپنا ریوالیہ نکالنے کی" میں نے مزید اضافہ کیا۔

"آپ بات کو مذاق میں نہ لیں جی۔ یہ بےغیرت کا بچی ضرور امارے ہاتھوں سے قتل ہو گا۔ اس وقت آپ کو پتا چلے گا کہ زریں گل کے دل میں کتنا غصہ تھا اس عورت کے لیے"

"ابھی سے لال پیلے کیوں ہو رہے ہو" میں نے کہا "وہ ابھی ملی نہیں ہے۔ دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھتے جاؤ۔ وہ اور سائیں عالی تھوڑی دیر پہلے ریسٹ ہاؤس سے نکلے ہیں۔ ہو سکتا ہے' یہیں کہیں ہوں"

ہم گولف گراؤنڈ کے سامنے سے نکل کر آگے چلے گئے۔ آدھ پون گھنٹا سڑک کے دونوں کناروں پر اور درختوں میں سائیں عالی کا کھوج لگاتے رہے مگر ناکامی ہوئی۔ وہ چھلاوا تھا اور چھلاوے اتنی آسانی سے نہیں ملا کرتے۔ ہم بلندی پر تھے۔ نیچے کچھ فاصلے پر گولف گراؤنڈ کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ بانس' چناڑ اور صنوبر کے دراز قامت درخت' ان درختوں پر چہچہاتے پرندے اور پرندوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہلکی ہلکی مرطوب ہوا جو تازہ جھونکوں میں چل رہی تھی۔ زرد سورج کی روشنی میں انتہائی سرسبز میدان بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ اس سرسبز میدان میں کچھ لوگ متحرک تھے اور ان متحرک لوگوں میں ایک جسم سب سے پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ یہ غزالہ تھی۔ وہ گلابی شلوار قمیص میں تھی۔ پاؤں میں سفید جوتے اور سر پر کیپ' اپنے کوچ مسٹر محمد اسحاق کے ساتھ وہ پریکٹس میں مصروف تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر وہ ہمیں گراؤنڈ میں بلانے لگی۔ ہم موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر گولف گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔

میں نے زریں کو موٹر سائیکل کے قریب کھڑا کیا اور خود غزالہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی گردن سے پسینہ بہہ رہا تھا اور مشقت کے سبب رخسار دہک رہے تھے۔ سفید تولیے سے اپنے بازو پونچھتے ہوئے وہ بولی "مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر ٹہلنے والے انداز میں اشوک کے سایہ دار درختوں کے نیچے آگئی' بولی "کوئی پیش رفت ہوئی؟"

"کس سلسلے میں؟"

"جس سلسلے میں پرسوں آپ گئے تھے؟"

"فی الحال تو یہی پیش رفت ہوئی ہے کہ فاکس ویگن ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے"

"کیا مطلب؟"

"گاڑی ہم نے رحمان کاکا کے ریسٹوران کے قریب کھڑی کی تھی۔ ریسٹوران میں کاکا کے غنڈوں سے ہماری مار دھاڑ ہو گئی۔ اتنے میں پولیس بھی آ گئی۔ کاکا کے غنڈوں نے ہمیں پکڑ کر باندھ لیا اور گاڑی قبضے میں لے لی۔"

وہ بولی "گاڑی کی کوئی بات نہیں لیکن آپ دونوں تو ٹھیک ہیں نا۔۔؟"

"ٹھیک ہیں تو تمہارے سامنے کھڑے ہیں لیکن یہ خطرہ اپنی جگہ موجود ہے کہ گاڑی کے ذریعے وہ لوگ شیخ عاصم تک نہ پہنچ جائیں۔"

"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ گاڑی کے تمام کاغذات فرضی ناموں سے تھے" پھر کچھ سوچ کر بولی "کاکا کے چکر سے کیسے نکلے آپ؟"

"بس اس کی ایک انگریز محبوبہ کام آگئی۔ پختہ عمر کی بڑی مہربان سی عورت تھی۔ اس نے ہمیں ریسٹوران سے نکال دیا۔"

وہ بولی "میں نے صبح کے اخبار میں رحمان کاکا کا نام پڑھا ہے۔ لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے کل رات رحمان کاکا کے ڈرائیور امر ناتھ کو بری طرح زدوکوب کیا اور بےہوشی کی حالت میں جھاڑیوں میں پھینک گئے۔ رپورٹر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ایک دن پہلے کاکا کے ریسٹوران میں توڑ پھوڑ مچائی تھی اور ہنگامہ کیا تھا۔"

"اخبار کا خیال درست ہے" میں نے تائید کی "کاکا کا ڈرائیور کل رات میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔"

غزالہ نے اپنی لرزاں پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تفکر تھا۔ یہ تفکر غالباً اس بھاگ دوڑ کے لیے تھا جو میں غزالہ اور شیخ عاصم کے لیے کر رہا تھا۔ کچھ دیر ہم اس موضوع پر بات کرتے رہے' پھر غزالہ نے پوچھا "کچھ اندازہ ہوا آپ کو کہ رحمان کاکا عاصم کے خلاف کیوں مصروف ہے؟"

"کچھ کچھ۔ لیکن ابھی میں حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا' مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہے"

"شاہ جہاں! میں عاصم کے بارے میں بہت فکر مند ہوں" وہ دل گرفتہ آواز میں بولی۔

"ظاہر ہے ایک مشرقی بیوی کو ایسا ہی ہونا چاہیے" میں نے جواب دیا۔

"رات فون پر ان سے بات ہوئی ہے" وہ سنی ان سنی کر کے بولی "وہ بھوپال ہی میں ہیں۔ سخت پریشان لگ رہے تھے۔ اپنا پروگرام مختصر کر کے وہ آج رات ہی واپس آ رہے ہیں۔"

"پریشانی کی وجہ نہیں بتائی تھی انہوں نے؟"

"نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہی پراپرٹی والا معاملہ ہے۔ شاید وہ جھگڑا طول پکڑ گیا ہے"

میں نے کہا "ایک اہم بات بتاؤں تمہیں؟" وہ سراپا سوال نظر آنے لگی۔ میں نے کہا "یہ پراپرٹی والا معاملہ اور کاکا والا معاملہ ایک ہی ہیں" غزالہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "یہ کاکا انہی لوگوں کے لیے کام کر رہا ہے جو شیخ عاصم کو پراپرٹی والے چکر میں الجھائے ہوئے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ مشارب اور "ٹوے گو" والے؟" (مشارب ایڈ کو کے لیے "ٹوے گو" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا تھا)

"ہاں یہی لوگ کاکا سے بھی کام لے رہے ہیں۔"

غزالہ کی پیشانی عرق آلود نظر آنے لگی "اس سے مراد ہے کہ "ٹوے گو" والے عاصم پر دباؤ ڈالنے کے لیے انہیں ایک سنگین فوجداری کیس میں الجھانا چاہ رہے ہیں۔"

"بالکل اور وہ اس سلسلے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ بات صرف تصویروں اور ریکارڈ شدہ گفتگو ہی کی نہیں۔ یہ تو صرف اضافی ثبوت ہیں۔ ان لوگوں نے اس سلسلے میں اور بھی بہت سے ثبوت اکٹھے کر رکھے ہوں گے۔"

غزالہ بےدم سی ہو کر ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے قریب کھڑا رہا۔ وہ بولی "کیا رائے ہے آپ کی۔ مجھے اس بارے میں عاصم کو بتانا چاہیے۔"

"میں تمہیں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہوں اور نہ مجھے دینا چاہیے۔"

وہ بےبسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش درخواست تھی۔ یہ آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں "بےشک شاہ جہاں! حالات کا ایک ظالم جھونکا ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر چکا ہے لیکن اس اجنبی سرزمین پر' اس پردیسی آسمان تلے اور کون ہے جو میرے دل کی بات سن سکے' جو میرا رکھ رکھاؤ سمجھ سکے۔ ایک ہم وطن اور شناسا ہونے کے ناتے ہی میری مدد کریں۔"

میں نے غزالہ کو یہ بتا کر مزید پریشان نہیں کیا کہ ذکوان اور شیخ عاصم کی کچھ تصویریں ڈاکٹر نائیکے سے برآمد ہوئی تھیں اور اس وقت بھی میری جیب میں پڑی ہیں۔

○☆○

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

[illegible]

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:-
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون:۔ ۷۲۲۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور۔
فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۳

اس رات میں دیر تک جاگتا رہا اور ساتھ والے بیڈ پر زریں گل کے خراٹے سنتا رہا۔ غزالہ کی ملتجی نگاہیں بار بار میرے تصور میں آ جاتی تھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی، بہت چھوٹی تھی۔ ایک مرتبہ اپنے گھر میں اس کے ہاتھ سے چائے دانی گر گئی تھی اور نیا کور قالین خراب ہو گیا تھا۔ اتفاقاً میں بھی اس وقت چچی کے گھر میں موجود تھا۔ ٹوٹی ہوئی چائے دانی اور داغدار قالین دیکھ کر چچی نے یہی سمجھا تھا کہ یہ میری کارستانی ہے۔ وہ شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی تھیں اور مجھے پیٹنے لگی تھیں۔ میں نے چچی کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تھی لیکن، اسی وقت میری نظریں غزالہ کے چہرے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ وہ ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کا نام نہ لوں اور میں خاموش رہ گیا تھا اور کیوں خاموش نہ رہتا، اس کم عمری میں بھی غزالہ میری آنکھوں کا سب سے حسین اور معصوم سپنا تھی۔ اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا، ایسے بے شمار واقعات تھے اور بچپن کی ان معصوم یادوں میں گندھے ہوئے واقعات سے پہلے کا بھی ایک واقعہ تھا۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب غزالہ پیدا ہوئی تو وہ گلابی روئی کے گالے جیسی ایک خوبصورت گڑیا نظر آتی تھی۔ میں اس وقت بمشکل تین چار سال کا تھا۔ کھیلتا ہوا آیا اور اس گڑیا کے رخساروں پر ہونٹ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ بعد میں، میں کئی گھنٹے ضد کرتا رہا کہ اس گڑیا کو اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔ میں نے اس گڑیا کا ننھا منا بازو کھینچنے کی کوشش بھی کی تھی اور شاید یہی وہ وقت تھا جب مجھے غزالہ کے سلسلے میں چچا جلیس سے پہلی ڈانٹ پڑی تھی۔ کتنی حیرت کا مقام تھا کہ جب بیس برس بعد اس گڑیا نے اپنا ہاتھ خود میرے ہاتھ میں تھمایا تو نہ میں وہ ہاتھ تھام سکا اور نہ وہ تھما سکی... اور چند سال کی کشمکش کے بعد ہم پھر دو مختلف سمتوں کو جانے والی راہوں کے مسافر تھے۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے... ایسا کیوں ہوتا ہے؟" میں نے جیسے اپنے کمرے کی اتھاہ تاریکی سے یہ سوال پوچھا۔ کیوں کچھ محبتیں بچھڑنے کے بعد یاد آتی ہیں، اور کیوں کچھ جذبے اس وقت شدت پکڑتے ہیں جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ میں نے بڑی سچائی اور غیر جانبداری سے اپنے دل میں جھانکا اور یہ محسوس کیا کہ غزالہ کے لیے میرے اندر جتنی طلب اب ہے، پہلے ہوتی تو میں کبھی اسے کسی اور کے حوالے نہ ہونے دیتا۔ کاش... یہ زندگی ایک ویڈیو فلم ہوتی اور میں اسے ری وائنڈ کر کے اسی موڑ پر لا سکتا جب مری کی جی پی او کے چوراہے میں غزالہ نے آخری بار مجھے التجا آمیز نظروں سے دیکھا تھا اور پھر میری گاڑی کے دروازے سے اس کے ہاتھ یوں جدا ہوئے تھے جیسے کسی درخت سے دو پتے جدا ہوتے ہیں، طویل رفاقت کو ابدی جدائی میں بدلتے ہیں اور ہوا کے دوش پر کسی اجنبی سمت میں روانہ ہو جاتے ہیں۔

دفعتاً زریں گل کی بوجھل آواز نے مجھے چونکا دیا "کوئی یاد آ رہا ہے استاد صیب!"

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جاگ گیا تھا اور لیٹا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"تو پھر درد ہو رہا ہے؟"

"نہیں درد بھی نہیں"

"تو پھر ضرور وہی بات ہے، جو ام نے کہی ہے" اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر ماچس تلاش کی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "استاد صیب کبھی کبھی ام کو لگتا ہے امارا دل غم سے پھٹ جائے گا۔ آپ کیوں اتنا غم برداشت کرتا ہے۔ کیوں خود کو جان بوجھ کر کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہے۔ کبھی ام بڑی حسرت سے سوچتا ہے کہ کاش... آپ پٹھان ہوتا"

"پٹھان ہوتا تو کیا ہوتا؟"

"تو پھر... یہ پوچھو کیا نہ ہوتا" وہ جذباتی لہجے میں بولا "غزالہ بی بی آپ کا محبت تھا، آپ کا چاہت تھا۔ شیخ عاصم نے اسے ورغلا کر اس سے شادی بنایا۔ اور اس لیے بنایا کہ دن رات آپ کا خون جلا سکے اور وہ جلا رہا ہے۔ اسی جگہ، اسی چھت کے نیچے وہ ہر رات ایک شوہر کی طرح امارا غزالہ بی بی کے پاس جاتا ہے۔ آپ پٹھان ہوتا تو "[illegible]" سے اس حرامزادے کے بھیجے میں گولی اتارتا اور غزالہ بی بی کو نکال کر لے جاتا۔"

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "زریں گل، کچھ کام اتنے آسان نہیں ہوتے جتنے نظر آتے ہیں اور جو کام تم کہہ رہے ہو، وہ تو سوچنا بھی محال ہے۔ شیخ عاصم لاکھ برا سہی اور اس کی نیت کیسی بھی سہی، اس نے غزالہ سے باقاعدہ شادی کی ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ غزالہ اسے شوہر سمجھتی ہے اور ایک بیوی کی طرح اس کی عزت کرتی ہے۔ وہ شوہر کے نفع نقصان کو اپنا نفع نقصان سمجھتی ہے اور شوہر کا گھر اس کے نزدیک آخری پناہ گاہ ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان چند ماہ میں اس نے اپنے ذہن سے ماضی کے تمام نقش کھرچ دیے ہیں اور ایک نئی زندگی کی شروعات کی ہے۔"

زریں گل بولا "لیکن امارا خیال آپ سے نہیں ملتا۔ ام نے آپ کو پہلے بھی اس بارے میں بتایا تھا۔ ام سمجھتا ہے کہ آپ کا، غزالہ بی بی کا اور شیخ عاصم کا اسٹوری ایک بالکل علیحدہ ٹائپ کا اسٹوری ہے۔ بے شک غزالہ بی بی ایک بہت اچھا اور بہت نیک لڑکی ہے، لیکن وہ حالات کے چکر میں ایسا پھنسا ہے کہ آپ میں اور شیخ عاصم میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ دل و جان سے اپنے شوہر کا وفادار ہے، لیکن جو زندگی وہ آپ کے ساتھ گزار چکا ہے، اسے اپنے دماغ سے نکال نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "ان حالات میں تمہارا مشورہ کیا ہے؟"

وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر کھڑکی سے باہر ناریل کے طویل درختوں کو تکتا رہا، پھر کہنے لگا "ایک تو یہ "پٹھانی مشورہ" ہے جو ام نے آپ کو دیا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ام غزالہ بی بی کو اس کے

حال پر چھوڑ کر جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔"

"تم پھر بھول رہے ہو کہ ہم یہاں اپنی مرضی سے نہیں ہیں۔ ہماری سب سے بڑی مجبوری نوائل ہے۔"

"ام نوائل بی بی کو کیسے بھول سکتا ہے استاد صیب" آپ کو ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ہاں، جب سے ام نے سنا ہے کہ سائیں والی یہاں دیکھا گیا ہے۔ امارے دماغ میں امید کا ایک کرن سا ضرور چمکنے لگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ام کو اس مشکل سے نکالنے میں کوئی مدد کر سکے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سائیں والی کی وجہ سے ہم کچھ اور پھنس جائیں۔ ہمیں ہر پہلو سے سوچنا چاہیے۔"

"آپ کس پہلو کی بات کر رہا ہے؟"

"بہت سے پہلو ہیں۔ جیسے ایک پہلو یہ ہے کہ سائیں والی حیدر آباد یا بھوپال سے یہاں پہنچا ہے۔ یقینی بات ہے کہ حیدر آباد اور بھوپال میں مسز جی کلارک اور امریکن ایجنٹ ایڈورڈ پاگلوں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ وہ لوگ سائیں والی کی ٹوہ سے چیک کر کے یہاں پہنچ گئے ہیں تو اور ہی تماشا شروع ہو سکتا ہے۔ یہاں ایسا رنگ بج سکتا ہے کہ نہ مارنے والے کا پتا چلے اور نہ چیخنے والے کا۔"

"امارا چھٹی حس کہتا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا" زریں نے پورے یقین سے کہا۔

"تمہاری چھٹی حس کے منہ میں گھی شکر" میں نے ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کے لیے کہا۔

"اور امارے منہ میں نسوار" زریں گل نے گویا فقرہ مکمل کیا۔

ہم کچھ دیر جاگتے رہے اور مختلف امکانات پر غور کرتے رہے پھر زریں گل دوبارہ سو گیا۔ رات پچھلے پہر غزالہ کی اطلاع کے عین مطابق شیخ عاصم خاموشی سے واپس آ گیا۔ غیر متوقع طور پر شکر شکرا بھی اس کے ساتھ تھا۔ شکر شکرا اس دن سے لاپتا تھا جس دن بلبل نیناں نے غزالہ پر میری بے گناہی کا انکشاف کیا تھا۔ بعد میں شیخ عاصم نے غزالہ کے سامنے سارا الزام شکر کے سر تھوپ دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے مجبور کر کے غزالہ کے بیڈ روم میں بھیجنا شکر کا ذاتی فعل تھا۔ آج پھر وہی "مجرم" شکر شکرا، شیخ عاصم کے ساتھ نظر آیا تھا۔ میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا تھا کہ چند روز بعد شیخ عاصم شکر کو یہ کہہ کر معاف کر دے گا کہ مدہوشی کی حالت میں اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اپنی "شریک حیات" کے خلاف ایسی گستاخی سازش کرنے والے کو معاف کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا اور ایسا "دل گردہ" شیخ عاصم جیسے "شوہر" کا ہی ہو سکتا تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے میں اٹھا تو زریں گل بیدار ہو چکا تھا اور اروشی سے مصروف گفتگو تھا۔ اروشی سے بات چیت کرتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑی معصومانہ مسرت پھیل جاتی تھی۔ اروشی اس کی گلابی اردو کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ پاتی تھی مگر بڑی خوش اخلاقی سے اس کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتی چلی جاتی تھی۔ زریں گل نے ایک بار پھر وہی اونٹ کی بیٹی والا قصہ چھیڑا ہوا تھا۔ اس نے کہیں سے بیٹی کی انگلش معلوم کر لی تھی اور اروشی کو بتا رہا تھا لیکن یہ انگلش اروشی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اٹھے اور باہر نکل گئے۔

میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ باتھ روم کی کھڑکی سے مجھے پورچ کا منظر نظر آیا۔ ایک لمبی چوڑی گاڑی دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ گاڑی میں کل رات اس قدیم عمارت میں دیکھ چکا تھا جہاں ہم شیورلیٹ کی ڈگی میں بند ہو کر پہنچے تھے اور بعد ازاں مجھے پائپ کے ذریعے ایک کمرے میں داخل ہونا پڑا تھا... گاڑی کا نمبر تک یاد تھا مجھے... پورچ میں اس گاڑی کے موجود ہونے کا مطلب تھا کہ مشارب اینڈ کو سے متعلق کوئی شخص ریسٹ ہاؤس میں موجود ہے۔ یہ "آمد" بے حد اہم اور تعجب خیز تھی۔ شیخ عاصم آج رات ہی بھوپال سے واپس یہاں پہنچا تھا اور علی الصباح ایک "[illegible]" اس سے ملاقات کے لیے آ موجود تھا۔ میں نہائے بغیر باتھ روم سے نکل آیا اور چپل پہن کر کوریڈور میں پہنچ گیا۔ مجھ پر سے بیشتر پابندیاں اٹھائی جا چکی تھیں اور اب میں ریسٹ ہاؤس میں آزادانہ گھوم سکتا تھا۔ میں شاندار بیوک گاڑی کے پاس سے گزرا۔ گاڑی کے قریب باوردی ڈرائیور موجود تھا اور ایک گن مین بھی آس پاس ٹہل رہا تھا۔ گاڑی کے شیشوں پر سفید براق غلاف تھے اور ڈیش بورڈ پر تازہ انگریزی اخبار کے علاوہ واکی ٹاکی سیٹ بھی رکھا تھا۔ بڑے شاہانہ ٹھاٹ باٹ والی گاڑی تھی۔ میرا دل مچل رہا تھا کہ اس گاڑی میں سوار ہو کر آنے والوں کے بارے میں معلوم کروں اور یہ معلوم کروں کہ وہ علی الصباح یہاں ریسٹ ہاؤس میں کیا کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ کوئی بہت اہم میٹنگ تھی لیکن میری سماعت اور بصارت کی رسائی اس میٹنگ تک نہیں تھی۔ میں ادھر ادھر گھومنے لگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ مہمان کہاں ہیں۔ نشست گاہ میں تو زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے... دفعتاً میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اگر مہمان اور شیخ اسٹڈی روم میں تھے تو میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔ ابھی کل ہی اروشی نے مجھے بتایا تھا کہ اسٹڈی روم میں مائیکروفون لگا ہوا ہے اور اس کا ریسیور کمرے میں موجود ہے۔

اروشی ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی۔ میں تیز قدموں سے مین گیٹ کی طرف گیا۔ وہ آس پاس بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ معلوم نہیں زریں گل اسے "ورغلا" کر کہاں [illegible]۔ محبت کے معاملے میں وہ پاکستانی فلموں کا تربیت یافتہ تھا اور [illegible] انداز تھا کہ کوئی بھی خوبصورت موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اروشی کے معاملے میں بھی مجھے اس کی نیت ڈانواں ڈول لگتی تھی۔ میں واپس رہائشی حصے کی طرف آ گیا۔ اروشی کے کمرے میں

اجازت داخل ہونا معیوب تو تھا لیکن بے حد ضروری بھی تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ دروازہ مقفل نہ کر گئی ہو۔ یہ خدشہ درست نکلا۔ میں بے قراری میں تاؤ کھا کر رہ گیا۔ زریں گل کو غائبانہ کئی صلواتیں سنائیں اور کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ خیریت گزری کہ چار پانچ منٹ بعد زریں گل اور اروشی واپس آتے دکھائی دیے۔ زریں گل کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بڑے موڈ میں نظر آتا تھا۔ اروشی اس کی کسی بات پر دلکش انداز میں ہنس رہی تھی۔

میں نے اروشی کو اشارہ کیا کہ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں پہنچے۔ اروشی میرے تاثرات دیکھ کر ٹھٹک گئی اور زریں گل سے الوداعی کلمات کہے بغیر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ دو منٹ کا وقفہ دے کر میں بھی کمرے میں چلا گیا۔

"خیریت ہے؟" اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"مائیکرو فون کا ریسیور کہاں ہے؟"

"الماری میں"

"نکالو۔ جلدی مت۔ میرا خیال ہے اسٹڈی روم میں کوئی بہت اہم گفتگو ہو رہی ہے۔"

"کیا کاکا وہاں ہے؟"

"نہیں کچھ اور لوگ ہیں۔"

"دروازہ اندر سے بند کرنا پڑے گا" اروشی نے کہا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ میرے ساتھ کمرے میں بند ہو کر مجھے اور زد کو "مشکوک" بنانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں جاتا ہوں۔ تم ریسیور پر کچھ سننے کی کوشش کرو۔"

میں باہر نکلا تو اروشی نے "ویری ساری" کہہ کر اس بات پر شرمندگی کا اظہار کیا کہ وہ مجھے باہر نکال رہی تھی۔ اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔

آدھ پون گھنٹے بعد پورچ میں کھڑی شاندار "بیوک" کار واپس چلی گئی۔ پچھلی کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے لہٰذا میں اور زریں گل بمشکل دیکھ سکے کہ اندر کون ہے۔ گن مین اور باوردی ڈرائیور کے علاوہ جو تیسرا شخص کار میں موجود تھا' وہ دھرمان کاکا تھا۔ دھرمان کاکا جو نائٹ ریسٹوران کا مالک تھا اور اس پورے علاقے میں دہشت کی علامت بھی۔ دھرمان کاکا بڑے دھڑلے سے عشارب اینڈ کو کی کار میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ عشارب اینڈ کو دھرمان کاکا سے اپنا تعلق چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔

دوبارہ اروشی کی شکل دیکھنے کے لیے مجھے ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ یہ بہت کٹھن انتظار تھا۔ آخر اروشی میرے اور زریں گل کے لیے چائے لے کر آئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لائی ہے۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی زعفرانی ساری کے پلو میں سے ایک آڈیو کیسٹ نکال کر میری طرف بڑھا دی "اس میں ریکارڈ ہے سب کچھ۔" تیزی سے بولی اور ناشتہ دیکھ کر باہر نکل گئی۔

کیسٹ دیکھنے کے بعد ناشتہ میرے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔ کمرے میں ریڈیو کے علاوہ ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر بھی موجود تھا لیکن اس کا "پاور" نہیں تھا۔ میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ تین عدد بیٹری سیل کا انتظام کرے۔ زریں گل گیا اور جلدی ہی ایک خانساماں کے ٹرانسسٹر ریڈیو سے تین بیٹری سیل نکال لایا۔ ہم نے کمرا اندر سے بند کر کے کیسٹ پلیئر چلایا۔ چند لمحے بعد ایک بھاری بھرکم آواز ہمارے کانوں میں گونجی۔ یہ آواز جیسے کسی ٹیلی فون کے ریسیور میں سے آ رہی تھی۔ الفاظ بہت صاف نہیں تھے لیکن توجہ مرکوز کر کے انہیں سنا جا سکتا تھا۔ بولنے والا انگریزی ملی انگلش میں بات کر رہا تھا اور یقیناً یہ کاکا ہی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں صرف پیغام لے کر آیا ہوں۔ آپ نے جو کہنا ہے عشارب صاحب سے کہیں یا جی ایم صاحب سے ملیں۔"

شیخ عاصم غصے سے کانپتی آواز میں بولا "تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی اور ان لوگوں کو ہمت کیسے ہوئی تمہیں یہاں بھیجنے کی؟"

کاکا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "معافی معاف مسٹر شیخ! ہمت اور جرأت حالات دیتے ہیں۔ اور حالات میں نے آپ کو بتا دیے ہیں۔ آپ کے غصہ کرنے اور زور زور سے بولنے سے حالات بدل نہیں جائیں گے۔ آپ ناک تک اس دلدل میں دھنس چکے ہیں۔ بم بلاسٹ کیس میں آپ کے پرانے ساتھی ذکوان صاحب کی ضمانت پرسوں دہلی کی عدالت سے منسوخ ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اب پولیس اسے ہر طرف ڈھونڈتی پھر رہی ہوگی۔ کچھ ایسی ہی صورت حال چند روز تک آپ کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔"

"بکواس بہت ہو چکا۔ اب دفعان ہو جاؤ یہاں سے" شیخ عاصم گرجا۔

کاکا نے بے خوفی سے کہا "ایک بات یاد رکھیں عاصم صاحب! عدالت میں پہلی پیشی پر ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ ذکوان کے ساتھ اس جرم میں برابر شریک رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد...."

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو" شیخ عاصم حلق کے بل چیخا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے شنکر شرما کو آواز دی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں پھر شیخ عاصم اور کاکا وغیرہ مائیکرو فون سے دور ہٹ گئے۔ ان کی آوازیں مدھم اور غیر واضح ہو گئیں' غالباً ان میں شنکر شرما کی آواز بھی شامل تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ میں نے کیسٹ پلیئر آف کر دیا۔

"وہ دیکھیں استاد صیب! غزالہ بی بی!" زریں نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا' غزالہ اور اس کا شوہر شیخ عاصم سبزہ زار میں ٹہل رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر سوچ اور فکر کی لکیریں تھیں۔ خاص طور پر شیخ عاصم سخت پریشان نظر آتا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی

حرکت اور ہاتھوں کے اشاروں سے واضح تھا کہ وہ غزالہ سے نہایت سنجیدہ موضوع پر بات کر رہا ہے۔ شیخ عاصم اور غزالہ کی پریشانی میرے اور زریں گل کے لیے اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ شیخ عاصم کے مخالف پوری جانفشانی سے دشمنی چکانے پر تلے ہوئے تھے اور شیخ کو اپنے ملک کے بے لچک اور سخت قانون کا سامنا تھا۔ قانون جو ہر کس و ناکس کے لیے ایک سا تھا۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ کیا شیخ عاصم واقعی اس بم بلاسٹ کیس میں ملوث ہے یا صرف ذکوان سے تعلق کے سبب اسے لپیٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ شیخ عاصم خود کو ایک آہنی شکنجے میں محسوس کرنے لگا ہے۔

شب و روز کی گردش بھی نرالی ہوتی ہے۔ شیخ عاصم میری اور میری بہن کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے بھوپال سے پکڑ کر سری لنکا کے اس گھنے سیاہ جنگل میں لے آیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس الگ تھلگ ریسٹ ہاؤس میں اطمینان سے میری بے بسی کا تماشا دیکھے گا اور مجھے اپنی نوبیاہتا بیوی کے سامنے کا ہے کا ذلیل و رسوا کر کے حظ اٹھائے گا۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے چکر میں پھنس گیا تھا۔ اس کے دیرینہ دشمن حرکت میں آ گئے تھے اور مقامی بدمعاش کاکا کی مدد سے اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے تھے۔

زریں گل نے پُرسوچ لہجے میں کہا "استاد صیب! شیخ عاصم پر احسان چڑھانے کا یہ بڑا سنہری موقع ہے۔ امارا تو خیال ہے کہ آپ اسے اپنی مدد کا پیش کش کرے۔"

"کیسی مدد؟"

"شیخ عشارب کے خلاف مدد۔ عشارب اینڈ کو والا لوگ شیخ عاصم کو بم دھماکے کے مقدمے میں پھنسانے کا کوشش کر رہا ہے۔ لیکن عشارب اینڈ کو والوں کا اپنا ہاتھ بھی تو صاف نہیں ہے۔ ام نے خود دیکھ لیا ہے۔ وہ لوگ بڑی وادواری سے قیمتی کھالوں کا غیر قانونی کام کر رہا ہے۔ جس طرح عشارب اینڈ کو نے شیخ عاصم کے خلاف ثبوت اکٹھا کیا ہے' ام عشارب اینڈ کو کے خلاف کرے تو ان کو نانی یاد آ جائے گا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ شیخ عاصم ہماری پیش کش قبول نہیں کرے گا۔ میں اس کا دشمن نمبر ایک ہوں اور مجھے قابو کرنے کے لیے اس نے بے بہا دولت اور بہت سا وقت خرچ کیا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ اس قابل ہوا ہے کہ اپنے دل کی ہر حسرت پوری کر سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ بھول بھال کر میرا تعاون قبول کر لے۔ وہ ہرگز نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو یہ صرف دھوکا ہو گا۔ ہم آزادی کے لالچ میں الجھیں گے اور الو بننا میرے لیے سخت ناپسندیدہ کام ہے۔"

"خو ایک طریقہ امارا سمجھ میں آتا ہے۔" زریں گل نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا "آپ شیخ عاصم کو تعاون کی پیشکش اس شرط پر کریں کہ وہ قربان بی بی کو آزاد کر دے اور آپ کے اندر سے یہ ذاتی مخاصمت والا چکر بھی ختم کر دے۔ اگر وہ آپ کی بات مان لے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے ام سے کچھ لیا ہی نہیں ام کو کچھ دیا بھی ہے۔"

"وہ حالات گوارا نہیں ہے" میں نے زریں گل کی بات کاٹی "وہ بہن کا جھٹکا بڑی گٹی سے ہے۔ اس کے پاس شنکر شرما جیسے کارندے ہیں۔ وہ ہر کام لے سکتا ہے ان سے۔ جونہی ہم اسے بتائیں گے کہ ہم عشارب اینڈ کو کے خلاف جاسوسی کر سکتے ہیں' وہ سمجھ جائے گا کہ کوئی اہم سراغ ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر ایک طرف رکھے گا اور باقی کا کام شنکر شرما سے لے لے گا۔ مجھے ہرگز امید نہیں کہ شنکر شرما جیسے شیطان کے سامنے دھرمان کاکا کچھ بچ سکے گا۔ وہ چوبیس گھنٹے میں بخیے اُدھیڑ دے گا کاکا کے.... اور اس کے بعد خم ٹھونک کر "عشارب کو" کے مقابل آ جائے گا۔"

زریں گل نکتہ اٹھاتے ہوئے بولا "تو پھر آپ نے چار پانچ دن پہلے غزالہ بی بی کے سامنے ہامی کیوں بھرا تھا اور کیوں کہا تھا کہ آپ دھرمان کاکا والے معاملے کا کھوج لگائے گا؟"

"اس کا جواب سیدھا سادہ ہے" میں نے کہا "اس وقت شنکر شرما یہاں موجود نہیں تھا اور غزالہ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ شیخ عاصم شاید اسے واپس انڈیا بھیج چکا ہے۔"

زریں کے چہرے پر فکرمندی تھی "اس کا مطلب ہے کہ ام دونوں کسی باغ کا مولی نہیں ہے؟" وہ بجھے بجھے لہجے میں بولا۔

"مولی ہیں۔ کیوں نہیں ہیں مولی.... لیکن یہاں ہماری مولی' میرا مطلب ہے دال نہیں گلے گی۔ یہاں آ کر بری طرح پھنس گئے ہیں ہم اور خاص طور پر میں۔"

میرے آخری الفاظ نے زریں گل کو تڑپا دیا۔ وہ غصے میں تپ کر بولا "ماشاء اللہ استاد صیب بہت اچھا بات کیا ہے آپ نے۔ اب آپ کہے گا کہ ام موقع دیکھ کر یہاں سے نکل جائے اور پاکستان جا کر چین کی بانسری بجائے کیونکہ ام آپ کی طرح پھنسا ہوا نہیں ہے.... بہت افسوس کا بات ہے۔ امارا دل چاہتا ہے اپنا سر پھاڑ ڈالے یا سمندر میں جا کر ڈوب مرے۔"

میں نے کہا "میں نے تمہیں پاکستان جانے کو کب کہا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم کبھی نہیں جاؤ گے۔ ایک تو میرا مسئلہ ہے۔ میں تمہارا مصیبت کا مارا استاد ہوں اور تم میرے فرمانبردار شاگرد۔ شاگرد استاد کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ اروشی کا ہے۔"

"اروشی کا کیا مطلب؟" زریں نے پوچھا۔

"میں تیرا گرو ہوں بچے" میں نے شرارت سے کہا "تیری رگ رگ سے واقف ہو گیا ہوں۔ کسی بھوت کی اولاد تو عاشق ہو گیا ہے اس سری لنکن حسینہ پر' میں لکھ کر دے سکتا ہوں اسٹامپ پیپر کے اوپر۔"

"لنگت۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو استاد صیب۔ ام۔۔۔ ام نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں۔ تم نے ویسا کچھ کیا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کیا ہے۔ تم اسے دو تین بار ریسٹ ہاؤس سے باہر لے کر گئے ہو۔ درختوں میں لے کر بیٹھے رہے ہو۔ وہاں راکھی تو نہیں باندھی ہو گی نا۔۔۔ اس نے کلائی پر۔"

"وہ تو استاد صیب۔۔۔ وہ تو" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"میں جانتا ہوں۔ لالہ سدھیر' محمد علی اور وحید مراد جیسے استادوں سے بہت کچھ سیکھ رکھا ہے تم نے۔ اور پھر تم پر تو ستر کی پابندی بھی نہیں ہے۔ اوپر سے لوٹے ہو اندر سے بڑے ٹھرکی ہو تم' بتاؤ کہاں تک بڑھی ہے بات؟" میں نے باقاعدہ اس کا کان مروڑا۔

"کہیں تک بھی نہیں بڑھی جی۔ بات ہی نہیں ہوا جی۔ وہ تو امارا زبان ہی نہیں سمجھتا۔ ام انگریزی میں کورا ہے' وہ اردو میں جاہل ہے۔"

"پیار کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے میرے چاند' تم نے وہ گانا نہیں سنا۔ آنکھیں ہی کرتی ہیں سوال' آنکھیں ہی دیتی ہیں جواب۔"

"سنا ہے جی' لیکن ام قسم کھاتا ہے استاد صیب کہ آپ غلط سمجھ رہا ہے۔ اگر ام یہاں رہنا چاہتا ہے تو اس کی وجہ صرف آپ ہیں۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ ابھی ام سے کہیں کہ زریں گل آلو کے پیچھے چلو یہاں سے۔ ام ایک سیکنڈ دیری کرے تو کافر۔۔۔ آپ کا کہا امارے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔"

"اور جب میں کہتا ہوں کہ اروشی کے بارے میں بتاؤ تو دن دہاڑے جھوٹ بولتے ہو۔"

"آپ یقین کریں استاد صیب! ایسا کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو بہت تھوڑا سا۔ بس آنے میں تنک کے مافق۔ وہ تھوڑا تھوڑا ہنستا ہے۔ ام تھوڑا تھوڑا خوش ہوتا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو دیکھ کر خوش تو ہونا چاہیے نا؟"

"خدا نے تو رحمان کاکا کو بھی بنایا ہے' اسے دیکھ کر تمہاری باچھیں کیوں نہیں کھلتیں اور ایک بات میں تمہیں ابھی سے بتا دوں بیٹے! یہ سری لنکن لوگ عاشق کو سوکھے ناریل سے باندھ کر آگ لگا دیتے ہیں۔" میں نے اسے ڈرایا۔

وہ ہنسنے لگا "ام عاشق نہیں ہے' پھر بھی سوکھے ناریل سے بندھا ہوا ہے اور جل رہا ہے۔" اس نے مجھ پر چوٹ کی تھی۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم پاکستان ہی چلے جاؤ۔" میں نے بھی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا "مجھ سے یہ مجبوری کی محبت کب تک نبھاؤ گے۔ ویسے بھی آثار بتا رہے ہیں کہ وہ خوبصورت بھوتنی صرف تمہاری زندگی عذاب بنانے کے لیے یہاں پہنچ گئی ہے۔"

وہ تنک کر بولا "وہ امارا زندگی عذاب کیا بنائے گا۔ اب ام اس کے پیچھے پر موگا دے گا۔"

"اے بے جانوں کے امام!" میں نے اسے ٹوکا "معورتوں کے بارے میں ایسے نازک محاورے استعمال نہیں کرتے۔"

"کیسے محاورے؟"

"جیسا یہ محاورہ ہے "پیچھے پر موگا دینا"۔"

"اچھا جی! آپ بات سے بات نہ نکالیں۔ ام نے جو کہہ دیا ہے وہ لوہے پر لکیر ہے۔ اگر آئندہ آپ نے ایسا فیوں والا بات کیا تو امارا آپ کا پکا لڑائی ہو جائے گا۔ آپ یہ بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیں کہ زریں گل آپ کے ساتھ جئے گا اور مرے گا۔"

رات آٹھ نو بجے کے لگ بھگ اروشی نے مجھے ایک اور کیسٹ لا کر دی "اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مسٹر اور مسز عاصم کی باتیں ہیں۔ ابھی شام سے تھوڑی دیر پہلے ریکارڈ ہوئی ہیں۔"

یقیناً کوئی اہم گفتگو تھی اسی لیے اروشی نے ریکارڈ کی تھی۔ اتفاق کی بات تھی' یہ مائیکرو فون اروشی نے رحمان کاکا کے حکم پر نصب کیا تھا اور اس کا مقصد شیخ عاصم اور ذکوان کے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرنا تھا لیکن اس سے ہم کچھ اور قسم کے کام لے رہے تھے۔ پہلے شیخ اور کاکا کے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی۔ اب عاصم اور غزالہ کا مکالمہ کیسٹ میں محفوظ ہو گیا تھا۔ اروشی چلی گئی تو حسب سابق ہم نے دروازہ اندر سے مقفل کیا اور کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ چند لمحے کیسٹ کے فیتے سے سرسراہٹ کی آواز آتی رہی پھر کھٹ پٹ کی کچھ صدائیں ابھریں۔۔۔ تب غزالہ کی آواز سنائی دی "آپ ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں" اس نے انگریزی میں کہا۔

"ہاں تھوڑا سا کام تھا" شیخ عاصم نے جواب دیا۔

شیخ کی آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ مجھے حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے شیخ اور کاکا کے درمیان ہونے والی بات چیت کی ریکارڈنگ بہت مدھم اور دبی دبی تھی۔ غالباً اس وقت "بولنے والے" مائیکرو فون سے کچھ ہٹ کر بیٹھے تھے۔ شیخ کی صاف اور واضح آواز سن کر مجھے مائیکرو فون کی طاقت اور ریکارڈنگ مشین کی کوالٹی کا اندازہ بھی ہوا۔

"تم سناؤ تمہارا گولف کیسا جا رہا ہے؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک" غزالہ نے مختصر جواب دیا۔

اس مرتبہ غزالہ کی آواز بھی واضح تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مائیکرو فون کے قریب آ چکی ہے۔ شاید کرسی گھسیٹ کر شوہر کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔۔۔

"آپ سے ایک بات کرنا چاہتی تھی" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

"ہاں ہاں کہو۔ تمہارا غلام ہمہ تن گوش ہے۔"

چند لمحے کے توقف کے بعد غزالہ بولی "عاصم! آپ نے تو کہا تھا کہ آپ نے شنکر کو فارغ کر دیا ہے اور وہ پھر کبھی یہاں نظر نہیں

آئے گا۔"

عاصم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں خود تم سے یہ بات کرنے والا تھا ڈیئر۔ دراصل کل جب میں بھوپال سے واپس آیا تھا تو شنکر سے کولمبو میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے رویے پر بے حد شرمندہ ہے اور وہ بہت معافی مانگ چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس رات وہ نشے میں تھا ورنہ اتنی بڑی حماقت اس سے نہ ہوتی۔"

"اور آپ نے یہ وضاحت قبول کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا؟" غزالہ نے دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔

"در۔۔۔ اصل ڈارلنگ۔ کبھی کبھی حالات کے پیش نظر بندے کو اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کرنی چاہیے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ شنکر شرا کس قبیل کا شخص ہے۔ تم اسے ہندوستان کے چند خطرناک اور بارسوخ ترین افراد میں شمار کر سکتی ہو۔ اس علاقے کے بہت سے کروڑ پتی ایسے ہیں جو اپنے جائز یا ناجائز کاموں کے لیے شنکر شرا کی خدمات حاصل کرنے کو ترستے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں شنکر شرا جس کام کی ہامی بھرے گا وہ ہو کر رہے گا۔ یہ وہ شخص ہے جو پیچھے ہٹنا یا شکست کھانا جانتا ہی نہیں ہے۔ اس وقت یہ شخص ہمارا ہاتھ بندھا غلام ہے اور موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم اسے بے حد کامیابی سے رحمان کاکا اور مشارب اینڈ کو کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔" سوں سوں کی آواز آئی اور محسوس ہوا کہ غزالہ رو رہی ہے۔ شیخ عاصم نے گھبرا کر کہا "ابھی' یہ کیا حماقت ہے۔ کیا کہہ دیا ہے میں نے۔"

غزالہ اٹک اٹک کر آواز میں بولی "آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے پاکستان بھجوا دیں۔ میں امی کے لیے اُداس ہو رہی ہوں۔"

"ڈارلنگ تم ناراض ہو!"

"نہیں میں ناراض نہیں ہوں۔ میں کیسے ناراض ہو سکتی ہوں آپ سے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"وہی جو آپ سے کہہ دی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی' پھر شیخ عاصم نے کہا "اگر۔۔۔ میں کوئی ایسا انتظام کر دوں کہ تمہیں دوبارہ شنکر کی صورت نظر نہ آئے۔"

"نہیں عاصم! آپ میرے لیے اتنی پریشانی نہ اٹھائیں۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے لاہور بھیج دیں۔ اس دوران آپ کا کام ہو جائے گا اور۔۔۔ میں بھی خود کو سنبھال لوں گی۔"

"سنبھال لوں گی؟ کیا مطلب ہے؟"

"خود کو سمجھا لوں گی کہ آپ شنکر کے بغیر نہیں رہ سکتے اور مجھے گاہے گاہے اس کا سامنا کرنا ہے۔"

غزالہ نے آخری الفاظ بڑے آزردہ لہجے میں کہے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنے آنسوؤں کو چھپا نہیں پائی تھی۔

رس چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ بس کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر غزالہ کی منمناتی آواز ابھری۔ "چھوڑیں عاصم۔ کھڑکیاں کھلی ہیں۔"

"کھلی ہیں تو پھر کیا ہوا؟" عاصم کی ہانپتی ہانپتی شوخ آواز سنائی دی۔

"چھوڑیں نا۔۔۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھ لینے دو" وہ بولا۔

چند دس بیس سیکنڈ کے لیے پھر معنی خیز خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی میں ہانپتی ہوئی سانسیں سنائی دیتی تھیں یا غزالہ کی طلائی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ۔۔۔ ہم آواز کی مدد سے شیخ عاصم کی خلوت میں جھانک رہے تھے' اور خلوت میں شیخ عاصم ایک بالکل مختلف شخص "نظر" آ رہا تھا۔ اس کا تمام رعب داب' خشکی اور روکھا پن ایک رومان انگیز وارفتگی میں ڈھل چکا تھا اور وہ پینتیس سالہ خرانٹ ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کی طرح ایکٹ کر رہا تھا۔

چند لمحے بعد اس کی جذبات سے بوجھل آواز سنائی دی۔ اس آواز کو سرگوشی کہنا زیادہ مناسب تھا لیکن یہ سرگوشی چونکہ مائیکرو فون کے بہت نزدیک کی گئی تھی لہٰذا ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ شیخ نے کہا "تم نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے" چند لمحے کے وقفے کے بعد جس میں ہونٹوں کی "آہٹیں" بھی شامل تھیں وہ پھر بولا "غزالہ! میں نے جب نیو دہلی میں تم سے شادی کی تھی اس وقت میری سوچ کچھ اور تھی لیکن آج کچھ اور ہے۔ میں سچ کہتا ہوں' میں بہت بدل چکا ہوں تمہارے سلسلے میں۔۔۔ تم روز بروز میری ضرورت بنتی جا رہی ہو۔ یوں لگتا ہے میرا دل و دماغ تمہارے قبضے میں جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے ڈارلنگ؟ کیا جادو ہے تمہارے پاس؟ بتاؤ نا۔۔۔ کیا کرتی ہو تم؟"

"مجھے نہیں معلوم" غزالہ کی مدھم آواز ابھری۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دونوں اسٹڈی روم کے طویل صوفے پر نیم دراز ہیں' اور یوں ان کے چہرے اس ساتویں تختی کے بالکل نزدیک آ گئے ہیں جس کے نیچے اروشی نے مائیکرو فون چپکا رکھا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس بات کا خدشہ بھی موجود تھا کہ شیخ یا غزالہ کی نظر اس مائیکرو فون پر پڑ جاتی۔ شیخ عاصم نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا "لوگ کہتے ہیں' عورت جب حاصل ہو جائے تو اس کی دلکشی ختم ہو جاتی ہے لیکن تم ان عورتوں میں سے نہیں ہو ڈیئر۔ تمہارے حصول نے تمہاری طلب میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں تمہارے بارے میں۔"

"کیوں؟"

"ارسطو کا قول ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت پر دل و جان سے عاشق ہو جائے تو وہ عورت اسے خون کے آنسو رُلاتی ہے۔۔۔ اگر میں ایسی غلطی کر بیٹھوں تو تم بھی کہیں ایسا ہی سلوک نہ کرو میرے ساتھ۔"

"میری اتنی جرأت۔ میں تو لونڈی خادمہ ہوں آپ کی" غزالہ نے جواب دیا۔

"او ڈیش اٹ" عاصم نے کہا۔ چند لمحے پھر "معنی خیز" خاموشی سانس لیتی رہی، تب شیخ عاصم نے کہا "میرے لیے یہ فیصلہ کٹھن تھا لیکن میں نے اب کرلیا ہے۔ شنکر شکرا آج ہی انڈیا واپس چلا جائے گا اور یہ میرا وعدہ ہے کہ آئندہ تم کبھی اس کی صورت نہیں دیکھو گی..... اب خوش ہو؟"

"میری خوشی آپ کی خوشی کے ساتھ ہے۔"

"لیکن یہ خوشی تمہارے چہرے سے نظر نہیں آرہی۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"ہنس کر دکھاؤ" شیخ عاصم نے کہا۔ یوں لگا کہ وہ اسے گدگدانے لگا ہے۔

"پلیز عاصم..... پلیز" غزالہ نے سرگوشی کی پھر وہ دبی دبی آواز میں ہنسنے لگی۔ اب وہ دونوں اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور تھوڑا سا دور بھی ہٹ گئے تھے لہٰذا ریسیور سے آنے والی آوازیں بھی نسبتاً کمزور پڑ گئی تھیں۔ کچھ فقرے ٹھیک سے سننے کے لیے مجھے کیسٹ کو ری وائنڈ بھی کرنا پڑا۔

بوتل گلاس اور برف وغیرہ ٹکرانے کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یقیناً شیخ اپنے لیے ڈرنک تیار کر رہا تھا۔ جتنی دیر وہ ڈرنک تیار کرتا رہا ریسیور پر تقریباً خاموشی ہی رہی۔ پھر وہ پُرسوچ لہجے میں بولا "شنکر کے جانے سے جو خلا پیدا ہوگا اسے پُر کرنے کے لیے تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ شاید کل دو تین گھنٹے کے لیے مجھے کولمبو جانا پڑے۔"

"کولمبو میں کیا ہے؟"

"یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں مائی ڈارلنگ۔ تم اپنے ننھے سے ذہن کو زیادہ تکلیف نہ دو..... تمہارے لیے یہ اطمینان کافی ہونا چاہیے کہ شنکر اب سری لنکا سے واپس جارہا ہے۔"

غزالہ نے کہا "آپ کی اجازت ہو تو ایک ناچیز رائے پیش کروں؟"

"کہو۔"

"آپ سے پوچھے بغیر میں نے ایک حرکت کی تھی۔ اس امید پر کہ آپ ناراض نہیں ہوں گے۔"

"اگر تمہارا خیال تھا کہ میں ناراض نہیں ہوں گا تو پھر یقیناً وہ نامناسب حرکت نہیں ہوگی۔"

"اس کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے۔ میں صرف اتنا کہوں گی کہ آپ کے جانے کے بعد ایک رسم مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اروشی کی طرف سے اس بات کا پتا چلنے کے بعد کہ کچھ لوگ اسے آپ کے خلاف استعمال کررہے ہیں، میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں میں نے شاہ جہاں سے بات کی۔"

"ہوں" شیخ نے ہونٹ سکوڑنے والے انداز میں کہا۔

غزالہ مختصر لفظوں میں شوہر کو بتانے لگی کہ کس طرح اس سارا ایک فاکس ریگن کا نقدی اور ریوالور وغیرہ ہمارے حوالے کیا اور ہمیں رمضان کاکا کی طرف بھیجا۔ رمضان کاکا کے غنڈوں سے ہماری لڑائی اور میرے ہاتھوں کاکا کے ڈرائیور کی سنگین پٹائی کا تمام احوال بھی غزالہ نے سنایا۔

غزالہ کی طرح شیخ عاصم کو بھی یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ ہم دونوں کاکا کے ریستوران میں تباہی مچانے کے باوجود صاف بچ نکلے اور بخیر و عافیت واپس آگئے۔ آخر میں غزالہ نے اپنے شوہر کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ وہ کام جو شنکر سے لیا جانے والا تھا اب مجھ سے لیا جائے۔

میرا نام سن کر شیخ عاصم چپ سا ہوگیا۔

"کیا بات ہے۔ میری تجویز پسند نہیں آئی؟" غزالہ نے پوچھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں۔ موجودہ حالات میں تمہاری تجویز قابلِ غور ہے مگر اس معاملے کے کچھ دوسرے پہلو بھی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں وہ کون سے پہلو ہیں۔"

"پھر کیا رائے ہے تمہاری؟"

"میں نے شاہ جہاں سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور ان پر واضح کردیا تھا کہ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا غیر مشروط طور پر کرنا ہوگا۔ اس خدمت کے عوض وہ آپ سے کسی قسم کی رعایت کے طلب گار نہیں ہوں گے..... ہاں اگر آپ اپنی مرضی سے کوئی چھوٹ دینے پر آمادہ ہوں تو اور بات ہے۔"

شیخ کی شگفتگی اب گہری سنجیدگی میں ڈھل چکی تھی۔ وہ بولا "کبھی کبھی لگتا ہے غزالہ بیگم کہ تم میرے اور شاہ جہاں کے درمیان پُل بننے کی کوشش کررہی ہو لیکن میں نے پہلے روز ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ یہ پُل کبھی نہیں بنے گا۔ تم ہزار بار بھی تعمیر کرو گی تو ڈھے جائے گا..... میں دنیا کی ہر شے قربان کرسکتا ہوں لیکن شاہ جہاں کی دشمنی قربان نہیں کرسکتا۔"

کچھ دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد غزالہ نے سہمی ہوئی سی آواز میں کہا "لیکن آپ نے مجھ سے ایک وعدہ بھی کیا تھا۔"

"کون سا وعدہ؟"

"غزال کی رہائی کا۔"

"ہاں لیکن یہ بھی کہا تھا کہ کسی مناسب موقع پر۔ ابھی وہ مناسب موقع نہیں آیا۔"

ایک چھوٹا سا وقفہ آیا جس میں بوتل اور گلاس کی کھن کھن سنائی دیتی رہی۔ تب غزالہ نے کہا "اگر شاہ جہاں غیر مشروط طور پر اس سلسلے میں مدد کرنا چاہیں تو؟"

"مجھے نہیں یقین کہ وہ ایسا کرے گا۔ اور مجھے اس کی مدد کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال اگر تم چاہتی ہو تو اس سے بات کرکے دیکھ لو۔"

"آپ تو ایک دم ناراض ہوگئے ہیں" غزالہ لجاجت سے بولی۔

"ناراض نہیں ہوں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ جو معاملات ہم دونوں میں طے ہوچکے ہیں، انہیں بار بار چھیڑا جائے۔ شاہ جہاں میرا مجرم ہے اور اسے سزا دینے کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔ بہرحال اس کی سزا کے معاملے کو فی الحال ہوں کا توں رکھا جائے گا۔ غزال ہمارے قبضے میں رہے گی لیکن اس کی جان اور عزت محفوظ رہے گی۔ شاہ جہاں کے جسم میں الیکٹرانک ڈیوائس موجود رہے گا اور حسبِ موقع میں اس پر دیگر پابندیاں بھی لگا سکتا ہوں۔"

"میں نے کوئی نئی بات نہیں چھیڑی عاصم! میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ....."

"او کے..... او کے" شیخ نے کہا "چلو اپنے کمرے میں چلیں۔"

"نہیں پہلے آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں" وہ ازراہِ انداز سے بولی۔

"ہوجائے گا موڈ ٹھیک، ہوجائے گا، لیکن اب تھوڑا سا وقت تو لگے گا۔"

"کتنا وقت؟"

"رات تک کا" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

دروازہ کھلنے بند ہونے کی آوازیں آئیں اور کیسٹ خاموش ہوگئی۔

یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی لہٰذا زریں گل کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھا سر کھجاتا رہا تھا۔ میں نے کیسٹ پلیئر آف کیا تو سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شیخ اور غزالہ کی خلوت کے منظر پردۂ تصور پر انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ان کی سرگوشیاں کانوں میں زہر گھول رہی تھیں۔ جی چاہا کیسٹ پلیئر کو اٹھا کر فرش پر پٹخ دوں اور اس میں سے برآمد ہونے والی آواز کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردوں۔ بے بسی نے یہ کیا دن دکھایا تھا۔ غزالہ کسی اور کی ہوچکی تھی اور میں شب و روز اس کے قریب رہ کر اس کی دوری کا تماشا دیکھنے پر مجبور تھا۔ شیخ نے یہ کیسے عذاب سے دوچار کر رکھا تھا مجھے! اس سے تو بہتر تھا کہ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا تھا۔ میں ایک جیل کے اندھیروں میں گم رہتا۔ چاندنی رات میں بیرک کے فرش پر لیٹ کر نور محمد کے پُرسوز گانے سنتا اور یادوں سے دل بہلاتا۔ بے شک غزالہ مجھ سے دور رہتی لیکن یہ دلاسہ تو ہوتی کہ میری ہمن شنتا کی طرح وہ بھی میرا انتظار کررہی ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر کسی انہونی کے نتیجے میں وہ بہار بن کر میری زندگی میں آسکتی ہے..... اس کے علاوہ ایک اور انکشاف بھی میرے دل پر آرے چلا رہا تھا۔ کیسٹ سننے کے بعد مجھے یہ پتا چلا تھا کہ غزالہ اپنے شوہر کو اروشی کے کردار سے آگاہ کرچکی ہے۔ وہ جان چکا تھا کہ اروشی کاکا کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ میں نے غزالہ کو سختی سے کہا تھا کہ وہ اروشی کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے گی لیکن وہ ایسا نہیں کرسکی تھی۔

O☆O

صبح اروشی ناشتا لے کر آئی تو بہت افسردہ تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی سی تھیں۔ کہنے لگی "آپ نے کیسٹ سن لیے ہیں تو انہیں ضائع کردیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

میں نے کہا "تم کیسٹوں کی طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ یوں سمجھو کہ وہ تھے ہی نہیں۔"

وہ خاموشی سے برتن میز پر سجاتی رہی۔ میں نے پوچھا "کیا صرف اسی بات پر پریشان ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "تو پھر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک دم رونے لگی۔ آنسو بڑی خاموشی کے ساتھ اس کی پیاری آنکھوں سے نکلے اور ٹپ ٹپ تپائی پر گرے۔ میرے دوبارہ پوچھنے پر وہ بولی "مالک نے مجھے چھٹی دے دی ہے اور یہاں سے جانے کے لیے کل صبح تک کی مہلت دی ہے..... وہ جان گئے ہیں کہ میں کاکا کے لیے کام کرتی رہی ہوں۔"

مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ اروشی کے ساتھ ایسا کچھ ہوگا۔ شیخ عاصم کو یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ اروشی مخالف پارٹی کی آلۂ کار بنی رہی ہے۔ اب اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے ریسٹ ہاؤس میں رہنے دیتا۔ عام حالات میں تو وہ اروشی کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیتا لیکن یقیناً اس معاملے میں غزالہ آڑے آئی تھی اور اس نے اس سنگین سزا کو صرف نوکری سے نکالے جانے کی سزا میں بدلوا لیا تھا۔ اگر غیر جانبداری سے جائزہ لیا جاتا تو اروشی ہر طرح سے نرم سلوک کی مستحق تھی۔ شروع میں اس نے سخت دباؤ کے باوجود کاکا کے مقاصد پورے کرنے سے انکار کیا تھا اور اسی ضد کی وجہ سے اس کی اکلوتی بہن نیناں کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا تھا بعد میں نیناں اپنی زندگی ہی ہار گئی تھی۔ خود اروشی کو بھی کاکا کے غنڈوں نے بدترین ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اسے جنسی طور پر بھی ہراساں کرتے رہتے تھے۔ بہرحال شیخ عاصم سے اس اعلیٰ ظرفی کی توقع عبث تھی کہ وہ اروشی کو یکسر معاف کردیتا لیکن مجھے شیخ عاصم سے زیادہ غزالہ پر رنج تھا۔ اس نے میری درخواست کے باوجود اپنے شوہر کو اروشی کے راز میں شریک کرایا تھا اور یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا نتیجہ مصیبت زدہ اروشی کے حق میں کتنا برا نکل سکتا ہے۔

"شیخ نے کچھ کہا تو نہیں تمہیں؟" میں نے اروشی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کوئی سوال جواب بھی نہیں کیا؟"

"بہت دیر پوچھ گچھ کرتے رہے۔ میں نے صرف اتنا مانا کہ میں نے زکواں کے ساتھ ان کی تصویریں اتار کر کاکا تک پہنچائی ہیں۔"

مائیکرو فون اور ریکارڈنگ وغیرہ کے بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اور یہ ہے بھی حقیقت۔ ابھی تک میں نے کوئی ترمیم کیسٹ کاکا کو نہیں پہنچائی۔"

میں نے غور کیا تو اروشی کے نازک رخساروں پر طمانچوں کے نشان نظر آئے۔ یقیناً شیخ عاصم نے اس کے ساتھ تھوڑی بہت مار پیٹ بھی کی تھی۔ میں نے یہ ذکر چھیڑ کر اسے خجل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بولی "میں نے مائیکرو فون کل رات ہی اتار لیا تھا۔ مائیکرو فون اور ریسیور کو توڑ کر میں نے ٹکڑے باغ کی زمین میں دبا دیے ہیں۔۔۔ پلیز آپ بھی ان کیسٹوں کو ضائع کر دیں۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا "اب کہاں جاؤ گی تم؟"

"یہی سوال تو رات بھر اپنے آپ سے پوچھتی رہی ہوں" وہ بولی "پہلے ہم دونوں بہنیں اکٹھی رہتی تھیں۔ جی چاہتا ہے اب بھی اسی کے پاس جا رہوں" وہ سسکیاں لینے لگی۔

"حوصلہ رکھو اروشی!" میں نے اسے پچکارا "ہم اس مسئلے کا کوئی حل سوچتے ہیں"

وہ سر جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔ ایک ہی رات میں اس کا چہرا اتر گیا تھا اور رخساروں پر زردی کھنڈی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی غمزدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مجھے لگتا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔"

وہ خاموش رہی' تاہم اتنا ہوا کہ آنسو تواتر سے گرنے لگے۔ میں نے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی پر بٹھایا اور زریں گل سے کہا کہ وہ دروازہ بھیڑ دے۔ زریں گم صم کھڑا تھا۔ چونک کر دروازے کی طرف بڑھا اور پٹ بند کر دیے۔ میں نے اصرار کے ساتھ اروشی سے کہا کہ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہمیں اپنی پریشانی میں شریک کرے۔ زریں گل نے بھی اپنی گلابی اردو میں بڑی دردمندی سے یہی بات کی۔

آخر وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی "آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ جیون جی مر چکا ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں یہ اطلاع اتنی اہم نہیں تھی کہ میں تمہیں پریشان کرتا۔ ویسے بھی جیون کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ وہ طبعی موت مرا ہے۔"

"لیکن دھرمان کا کاکا کہنا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

"یہ سراسر الزام ہے۔ جیون جی ہارٹ اٹیک سے مرا ہے اور اس کی گواہی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی مل سکتی ہے۔ جس وقت اسے دورہ پڑا' مد ہاٹ کی رقاصہ سمیتا اور ڈاکٹر نائیکے بھی موقع پر موجود تھے۔"

"بہر حال کاکا اس بات کو نہیں مانتا۔ اس کے کارندے شکاری کتوں کی طرح آپ کو اور زریں گل کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ابھی تک وہ نہیں جان سکے کہ ڈاکٹر نائیکے کے گھر میں گھسنے والے ریسٹ ہاؤس میں ہی مقیم ہیں۔ کاکا سارا الزام مجھ پر عائد کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جیون جی کے قتل اور ڈرائیور رہنما کے زخمی ہونے کی تمام ذمے داری مجھ پر آتی ہے۔ اس نے مجھے بڑی سنگین دھمکیاں دی ہیں۔ کہتا ہے' میں تجھے مد ہاٹ میں ننگا نچواؤں گا اور۔۔۔" وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

میرا ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے اپنے پہلو سے لگایا اور حوصلہ دیتے ہوئے کہا "اروشی! میں تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

وہ روتے ہوئے بولی "آپ نے اپنا پہلا وعدہ پورا نہیں کیا' یہ کیسے کریں گے۔ آپ نے کہا تھا' میرے اور آپ کے درمیان ہونے والی بات صرف ہمارے درمیان رہے گی لیکن آپ نے مسز (غزالہ) کو بتا دیا۔ مسز سے یہ بات شیخ صاحب تک پہنچ گئی۔"

اروشی کی بات نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں نے دل کی گہرائی سے محسوس کیا کہ اس کا قصوروار میں ہوں۔ اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے' میں نے اس کا شانہ تھپکا "اروشی تمہاری بر ہمی بالکل بجا ہے۔ میں اپنے وعدے کا پاس نہیں کر سکا۔ کیوں نہیں کر سکا اس بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔ یوں سمجھو کہ مجھ سے اندازے کی ایک بہت سنگین غلطی ہو گئی تھی۔۔۔ فی الحال یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے معاف کر دو۔۔۔ پلیز اروشی۔۔۔ کہو تو میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں" اس کی آنکھوں میں سری لنکا کی خاموش برسات جیسی جھڑی لگی رہی۔ میں نے اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا "اروشی میں اپنے اس وعدے پر قائم ہوں کہ مجھے اپنا ہمراز بنانے کی "پاداش" میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے گی' بال بھی بیکا نہیں ہوگا تمہارا۔۔۔ کاکا جیسے دس بھی آ جائیں تو تمہاری ہوا کو نہیں چھو سکتے۔۔۔ یہ جہانی استاد کا وعدہ ہے تم سے۔"

اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔ میں نے دیکھا زریں گل کی گول مٹول آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی ہے۔

○☆○

اس روز شام تک شنکر شکرا ریسٹ ہاؤس میں نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ شیخ عاصم نے کل شام غزالہ سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا ہے اور شنکر کو کم از کم ریسٹ ہاؤس سے تو روانہ کر دیا ہے۔ رات کا کھانا اروشی کی جگہ کوئی دوسری ملازمہ لے کر آئی' اروشی شاید جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ شیخ عاصم کے حکم کے مطابق اسے کل کسی وقت ریسٹ ہاؤس چھوڑ جانا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ زریں گل بھی ملول تھا بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی متاثر دکھائی دیتا تھا۔ بار بار ٹھنڈی آہیں بھرتا' کبھی اٹھ کر کوریڈور میں ٹہلنے لگتا۔ پورے دن میں اس نے بمشکل تین چار نوالے لیے ہوں گے۔ رات کے کھانے پر بھی یونہی اداس بیٹھا رہا۔ میں نے بھی جلدی ہاتھ کھینچ لیا اور سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔

"مستر میب! ہماری سمجھ میں نہیں آتا غزالہ بی بی نے ایسا کیوں کیا۔"

"مشرقی بیوی ہے نا۔۔۔! اور تمہیں پتا ہی ہے مشرقی بیوی اپنے شوہر نامدار سے کچھ بھی نہیں چھپاتی۔"

"لیکن وہ کسی ڈھنگ سے بھی بات کر سکتا تھا نا۔۔۔ کسی ایسے طریقے سے کہ اس میں اروشی کا نام ہی نہ آتا۔ مقصد تو شیخ عاصم کو اس بات سے ہوشیار کرنا ہی تھا ناں کہ کچھ لوگ ڈکوان کے ساتھ اس کا تصویریں مصوری اتارنا چاہتا ہے۔ اب آپ بتائیں ریسٹ ہاؤس سے نکل کر وہ بیچارہ اروشی کیا کرے گا' کہاں جائے گا"

زریں گل کے خدشات حقیقت پر مبنی تھے۔ اروشی کے لیے تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ دو مست ہاتھیوں کی لڑائی میں وہ کچلی جا رہی تھی۔ شیخ عاصم اسے ناپسندیدہ قرار دے کر ریسٹ ہاؤس سے نکال رہا تھا اور کاکا وغیرہ یقیناً شدت سے منتظر تھے کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے نکلے اور وہ اس کا تیا پانچا کریں۔۔۔ اگر غزالہ' اروشی کی عیب پوشی کر لیتی اور شیخ عاصم اسے نوکری سے نہ نکالتا تو موجودہ حالات میں ریسٹ ہاؤس اروشی کی بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتا۔ ان بلند و بالا دیواروں میں وہ کاکا اور اس کے غنڈوں کی خونخواری سے تو بہ محفوظ رہ سکتی لیکن غزالہ نے نہ صرف میرے "اعتبار" کے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا بلکہ اروشی کی جان بھی عذاب میں ڈال دی تھی۔ ایک بار پھر میری نگاہوں میں غزالہ کی ماں یعنی چچی فاخرہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ بھی اکثر ایسی ہی "دانشمندی" اور کورے پن کا ثبوت دیا کرتی تھی۔ بالکل بے لچک اور روکھا پھیکا رویہ جس میں صرف دماغ ہی دماغ نظر آتا تھا' دل اور دل کے خوبصورت جذبوں کا کہیں عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی غزالہ کے پاس جاؤں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھوں کہ اس نے شوہر کے سامنے اروشی کا نام کیوں لیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ آج یا کل کسی وقت وہ مجھے ملاقات کے لیے طلب کرنے والی ہے۔ کیسٹ سے میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ جلد ہی مجھ سے ملے گی اور تجویز پیش کرے گی کہ میں شیخ عاصم کے دل میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے موجودہ حالات سے فائدہ اٹھاؤں۔ یعنی شیخ عاصم پر مخالف پارٹی کا دباؤ کم کرنے کے لیے تعاون کروں۔۔۔ اس ملاقات میں میں اروشی کے بارے میں بھی استفسار کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ غزالہ کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ وہ شیخ عاصم سے کہہ کر اروشی کی نوکری بحال کرائے یا کم از کم اسے ریسٹ ہاؤس سے نکالنے کا ارادہ ترک کیا جائے۔ بہر حال آخری فیصلہ تو شیخ عاصم نے ہی کرنا تھا اور اس وقت گیم کے تمام اہم پتے شیخ کے ہاتھ میں تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا رہتا اور اروشی کو ریسٹ ہاؤس سے جانا ہی پڑتا۔ میرا عزم تھا کہ اس دوسری صورت میں بھی کسی طور پر اروشی کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

زریں گل اور میں رات دیر تک جاگتے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ کھڑکیوں سے باہر نم آلود ساحلی ہوا میں ناریل جھومتے رہے اور جون بیلیں پھول بکھیرتی رہیں پھر رات آخری پہر زریں گل کو تو نجانے کیسے نیند آ گئی لیکن میں بدستور بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی موجود تھا لیکن میری شب بیداری کی اصل وجہ مصیبت زدہ اروشی کا تصور ہی تھا۔۔۔ لیٹے لیٹے میں تھک گیا تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دفعتاً میری نگاہ کھڑکی سے باہر ایک تیز رفتار سائے پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ یہ سایہ عمارت کے اس حصے کی طرف گیا تھا جہاں اروشی اور اس کے بہنوئی راکیش سنگھے کے کمرے تھے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی شدید خطرے سے خبردار کرنے لگی۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ اپنا رام پوری خنجر بھی نہیں تھا۔ صرف ایک پھل کاٹنے والی چھری قریب ہی میز پر پڑی تھی۔ میں نے چھری اٹھا کر اپنی قمیص کے نیچے چھپائی اور چپل پہن کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہوا میں اب کافی شدت آ چکی تھی۔ دور مین گیٹ پر دو گارڈز ڈھیلے ڈھالے انداز میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا عمارت کے اس حصے میں کچھ بھی ہو جائے وہ بے خبری رہیں گے۔ میں دیواروں کے ساتھ چپک کر چلتا ہوا اروشی کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ اندر نائٹ بلب روشن تھا' کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازہ دوسری طرف تھا۔ میں گھوم کر دروازے کی طرف آیا' وہ بھی بند ملا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید مجھے وہم ہوا ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ خیال باطل ثابت ہوا۔ مجھے کمرے کے اندر سے عجیب سی آہٹ سنائی دی تھی۔ جیسے کوئی دھم سے فرش پر گرا ہو اور اس کا سر کسی کرسی میز وغیرہ سے ٹکرایا ہو۔ اب میرے لیے اپنی جگہ کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا' میں جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ دباؤ ڈالا' وہ اندر سے بند تھا۔ میں گھوم کر کھڑکی کی طرف آیا۔ اس مرتبہ مجھے ایک مدھم مردانہ آواز سنائی دی۔ اروشی کے کمرے میں مردانہ آواز کا کیا کام تھا' اس کا بہنوئی تو دن کے وقت بھی کمرے میں نہیں جاتا تھا۔ میں نے جست لگا کر ایک شیڈ کو تھاما اور دونوں پاؤں جوڑ کر پورے زور سے کھڑکی پر رسید کیے۔ کھڑکی ٹوٹ گئی۔ اندر کی طرف جالی یا گرل نہیں تھی۔ لہٰذا میں باآسانی کمرے میں پہنچ گیا۔ اندر کا منظر میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ اروشی بے سدھ فرش پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر ایک ہلکی پھلکی "نائٹی" تھی۔ نائٹی سمٹ گئی تھی اور اروشی کی پنڈلیاں اوپر تک نظر آ رہی تھیں۔ اروشی کے سرہانے دو افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کا فل ٹائم ملازم' ڈرائیور زرل سنگھ تھا۔ زرل نے مجھے دیکھتے ہی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ میری بھرپور قوت والی ٹھوکر زرل سنگھ کے پستول

والے ہاتھ پر پڑی۔ پستول پر ابھی زرل سنگھ کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھو بھرونی شے اس کے ہاتھ سے یوں نکلی جیسے بوتل سے ہوائی چھوٹتی ہے۔ پہلے یہ "سیاہ شے" چھت سے ٹکرائی پھر لوھک کر کھڑکی سے باہر جاگری۔ زرل سنگھ کے چہرے پر خون کی سرخی نے جوش مارا' وہ غرا کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ کر اس کا وار خالی دیا لیکن اس سے پہلے کہ میں جوابی وار کرتا مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ میری نگاہ اروشی کی طرف اٹھی اور اٹھی رہ گئی۔ دوسرے شخص نے اپنے زرد لبادے میں سے تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبی کرپان نما شے نکالی تھی اور اس کی دھار اروشی کے گلے پر رکھ دی تھی۔

"خبردار" وہ جوگی نما شخص انگریزی میں بولا "حرکت کی تو گلا کاٹ دوں گا" اس کا سیاہ چہرہ کسی زہریلے ناگ کا چہرہ نظر آتا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا "اس چھرے کی دھار زہر میں بجھی ہے۔ ذرا سا چیرا لگا تو جان چلی جائے گی۔"

مجھے زرد چوغے والے اس سیاہ فام بدمعاش کے لہجے میں سچائی کی جھلک نظر آئی۔ میں بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میری نگاہ چھرے کی دھار پر جمی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ زہر میں بجھے ہوئے آلات کی دھار کا رنگ ذرا سا تبدیل ہو جاتا ہے۔ مجھے اس چھرے کی دھار کا رنگ بھی بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اروشی کی شہ رگ پر مجسم موت رکھی ہے۔ میں نے آواز نکالی یا کوئی حرکت کی تو یہ موت بے ہوش اروشی کے جسم میں اتر جائے گی۔

کھڑکی ٹوٹنے سے لے کر اب تک کا واقعہ بڑی سرعت سے پیش آیا تھا۔ اس سارے عمل میں بمشکل آٹھ دس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ یہ کمرے کچھ ایسے رخ پر واقع تھے کہ یہاں ہونے والی گڑبڑ کا اندازہ پہرے داروں کو ہونا دشوار تھا۔ پہرے دار یا تو مین گیٹ پر موجود رہتے تھے یا عمارت کے اس حصے میں جہاں شیخ عاصم کی رہائش تھی۔ ویسے بھی تیز ہوا چل رہی تھی۔ ایسے موسم میں عموماً کھڑکیوں دروازوں کے پٹ آپس میں پُرشور آواز سے ٹکرا جاتے ہیں۔ شاید کھڑکی ٹوٹنے کی آواز کو بھی کوئی ایسی ہی آواز سمجھ لیا گیا تھا۔ مجھے نہ تو کسی گارڈ کا چہرہ نظر آیا اور نہ آس پاس کوئی آواز سنائی دی۔

مجھے اپنی جگہ ساکت کھڑے دیکھ کر زرل سنگھ کی آنکھوں میں طیش انگیز چمک ابھر آئی۔ وہ اپنے ساتھی کی تائید کرتے ہوئے بولا "جن جی! یہ تمہارا چاچا بالکل صحیح کہہ رہا ہے۔ اس چھرے کی دھار پر زہر ہے۔ اس کا لگایا ہوا ذرا سا زخم بھی جان لے لیتا ہے۔ زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ کھڑے رہو۔"

میں نے پوچھا "اروشی کو کیا ہوا ہے؟"

وہ بولا "ابھی تو صرف بے ہوش ہوئی ہے' کلوروفام کی وجہ سے۔ لیکن اگر تم نے کوئی چالاکی دکھائی تو جبرو سنگھ اسے ہمیشہ کے لیے بے ہوش کر دے گا۔ یہ ڈرنے والا شخص نہیں ہے' کئی بندے پار کر چکا ہے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو میں چاہتا ہوں کہ تم ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ" زرل سنگھ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں قاتلانہ سفاکی رچی بسی تھی۔

یہی زرل سنگھ تھا جس کے ساتھ چند روز پہلے میں سبزیاں اور دودھ وغیرہ لینے گال روڈ جایا کرتا تھا۔ وہ "زین" ڈرائیو کرتا تھا اور ساتھ ساتھ لطیفے بھی سناتا چلا جاتا تھا۔ ڈیری فارم کی سیاہ موٹی مالکن کو دیکھ کر اس کی حس مزاح اور بھی پھڑک اٹھتی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ زرل سنگھ کالا کا بندہ نکلے گا اور اس ریسٹ ہاؤس میں وہی کردار ادا کرے گا جو گھر کے بھیدی نے لنکا میں کیا تھا۔

میں ہاتھ اوپر اٹھا کر دو قدم مزید پیچھے ہٹ گیا۔ جبرو سنگھ زہریلا چھرا لیے بدستور اروشی کی شہ رگ پر موجود تھا۔ اس کی نہایت سرخ آنکھیں قاتلانہ چمک لیے ہوئے تھیں۔ زرل سنگھ کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ کھڑکی سے باہر جا کر اپنا پستول اٹھا لائے اور یقیناً وہ اسی ارادے سے کھڑکی کی طرف گھوما بھی تھا' لیکن عین اس وقت کمرے میں برق سی کوند گئی۔ میں نے زریں گل کو دیکھا اس نے کھڑکی پر جھکے زرل سنگھ کی ٹھوڑی پر ایک طوفانی مُکا رسید کیا اور چھلانگ لگا کر کمرے میں آگیا۔ اس ایک لمحے میں چھرا بردار جبرو نے چونک کر زریں گل کی طرف دیکھا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ میں "ہوائیہ" کرنے والے انداز میں جبرو پر آیا۔ میری تمام تر توجہ چھرے والے ہاتھ پر تھی۔ میں نے اس ہاتھ کی کلائی تھامی اور جبرو سنگھ کو اپنے نیچے لیتا ہوا دور تک گھسٹ گیا۔

نیم گنجے جبرو کے چھریرے جسم میں کسی مست ہاتھی کی سی طاقت تھی۔ اس نے ایک ہی لمحے میں مجھے اپنے اوپر سے اچھال کر دور پھینک دیا' اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ جبرو نے وحشیانہ انداز میں چھرا چلایا۔ میں نے بروقت اپنا چہرہ پیچھے ہٹایا اور چھرا میری آنکھوں کے بالکل پاس سے لہراتا ہوا نکل گیا۔ جبرو نے ایک ہی ایکشن میں دوسرا وار کیا۔ اسے "ریورس" وار کہنا چاہیے۔ چھرا جس راستے سے گیا تھا اسی راستے سے واپس لوٹا اور اس مرتبہ میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا گیا۔ اس کے بعد تو جیسے لمبے بالوں والے اس سیاہ دیو کو دورہ سا پڑ گیا۔ وہ لپک لپک کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے حملوں میں اتنی تیزی تھی کہ میں دفاع کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں پا رہا تھا۔

اگر یہ چھرا واقعی زہر میں بجھا ہوا تھا تو میں اس بات کا متحمل نہیں تھا کہ اس کا زخم لے سکوں۔ میں تمام تر توجہ چھرے پر مرکوز کیے ہوئے تھا اور خود کو اس کے جان لیوا لمس سے بچا رہا تھا۔ دوسری طرف میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ زریں گل' زرل سنگھ سے گتھم گتھا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو اندھا دھند گھونسے مار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کوریڈور کی طرف بھی ہلچل نظر آرہی تھی۔ یہ مسلح گارڈ تھے جو بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ رہے تھے۔ جبرو سنگھ کے آٹھ دس وار بچانے کے بعد مجھے ایک موقع مل گیا۔ جبرو سنگھ اپنے ہی وحشیانہ زور میں لڑکھڑا کر ایک کرسی پر گر گیا تھا۔ میں نے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ میرے گھٹنے کی ایک بھرپور ضرب اس کی کلائی پر لگی۔ کلائی کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا لہٰذا ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی اور چھرا جبرو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے اسے لمبے بالوں سے پکڑا اور گھما کر دیوار سے دے مارا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ "اس گرتی ہوئی دیوار" کو ایک اور دھکا دینے کے لیے میں نے چند زوردار گھونسے رسید کیے۔ جبرو کسی چھپکلی کی طرح چپت سے کمرے کے وسط میں جا گرا۔ گرتے ہوئے اس کا زرد لبادہ اوپر اٹھ گیا تھا اور ٹانگیں یوں ننگی ہوئی تھیں کہ انڈرویئر تک نظر آگیا تھا۔

میں یہ دیکھ کر ٹھٹک گیا کہ جبرو سنگھ کی ران پر تیز دھار آلے کا زخم ہے اور خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں چکرا گیا' پھر یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ کرسی پر گرتے ہوئے جبرو سنگھ اپنے چھرے سے خود کو ہی زخمی کر بیٹھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی مزاحمت اتنی جلدی دم توڑ گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی سرخ آنکھوں میں اب دہشت نے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے مسلح سنہالی گارڈ اب کھڑکی کے راستے اندر گھس آئے تھے اور انہوں نے اپنی رائفلیں زرل سنگھ اور زریں گل پر تان لی تھیں۔ انہیں بمشکل ایک دوسرے سے جدا کیا گیا۔ دونوں کی قمیصیں پھٹ چکی تھیں لیکن زرل سنگھ کا قمیص کے ساتھ ساتھ منہ بھی پھٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک باچھ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ پگڑی کھل گئی تھی اور اس کا ایک پلو زمین پر لٹک رہا تھا۔ سنہالی گارڈز نے اروشی کو فرش پر پڑے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ان میں سے دو گارڈز نے اروشی کو فرش سے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ اروشی کے سینے پر ابھی تک وہ رومال رکھا تھا جس پر کلوروفام لگا کر اسے بے ہوش کیا گیا تھا۔

دو گارڈز کی رائفلیں میرے اور زریں گل کی طرف اٹھی ہوئی تھیں' جب کہ ایک نے اپنے ریوالور سے زرل سنگھ کو کور کر رکھا تھا۔ جبرو زمین پر تھا اور اپنی زخمی ران کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے کراہ رہا تھا۔ اچانک زرل سنگھ نے واویلا شروع کر دیا' وہ ایک عرصے سے سری لنکا میں مقیم تھا لہٰذا سنہالی زبان جاننے لگا تھا۔ اس نے سنہالی میں گارڈز کو بتایا کہ ہم دونوں زبردستی اروشی کے کمرے میں گھسے ہیں اور اس سے دست درازی کی کوشش کی ہے۔ اس نے ایک سنہالی گارڈ کو کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال بھی دکھایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اس کا رومال ہے۔

سنہالی گارڈ تو پہلے ہی ہم دونوں کو خشمگیں نظروں سے دیکھ رہے تھے' اب ان کے تیور مزید بگڑ گئے۔ ایک سنہالی گارڈ نے رائفل کی سرد نال میری گردن سے لگائی اور ہاتھ آگے بڑھا کر لباس کی تلاشی لی۔ زریں گل کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ میں نے انگریزی میں گارڈز کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجرم کو محافظ اور محافظ کو مجرم سمجھ رہے ہیں' اروشی کے کمرے میں زبردستی گھسنے کی کارروائی زرل سنگھ اور اس کے ساتھی نے کی ہے۔ لیکن سنہالی گارڈز نے میری بات پر کان نہیں دھرا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پہلے مجھ پر غزالہ کے بیڈ روم میں گھسنے کا الزام بھی لگ چکا تھا۔ پنجابی کا محاورہ "بدنالوں بدنام برا" یہاں صادق آرہا تھا۔ بہرحال مجھے تسلی تھی کہ اروشی ابھی ہوش میں آجائے گی اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گی۔ یقیناً زرل سنگھ اور جبرو کی آمد پر اس نے خود کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور ان کی شکلیں دیکھی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے دونوں حملہ آوروں سے بات چیت بھی کی ہو۔

اس شبینہ ہنگامے نے آج پھر خوابیدہ ریسٹ ہاؤس کو جگا دیا تھا۔ ملازمین اور گارڈز وغیرہ آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہو گئے تھے اور اب ہر ایک کے چہرے پر ان گنت سوال سجے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ میں شیخ عاصم بنفس نفیس موقع پر پہنچ گیا۔ اس کی آمد کی اطلاع مجھے کلائی پر لگنے والے خفیف جھٹکوں سے ہوئی۔ وہ شب خوابی کے گاؤن میں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ یقیناً اس میں پسٹل وغیرہ رہا ہوگا۔ اسے دیکھ کر زرل سنگھ نے ایک بار پھر واویلا شروع کر دیا۔ تاہم شیخ نے زرل سنگھ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی' وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اصل صورت حال کیا ہے' اور ساتھ ہی واضح بھی ظاہر کر دی کہ زرل سنگھ نے یقیناً مہران کاکا کے ایما پر یہ کارروائی کی ہے۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زرل سنگھ پہلے ہی شیخ عاصم کی نگاہوں میں کچھ مشکوک ہو چکا ہے۔ وہ بڑی کڑی نظروں سے زرل سنگھ کو گھور رہا تھا۔ اس نے زرل سنگھ سے پوچھا کہ یہ چوغے والا کون ہے؟

زرل سنگھ نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "یہ میرا دوست ہے جناب! آج رات میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا کوارٹر میں۔ میں نے اسے ٹھہرانے کی آپ کے سیکرٹری صاحب سے باقاعدہ اجازت لی تھی۔"

"تم اس کمرے میں کیسے پہنچے اور یہ چھرا کس کا ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

"یہ کرپان ہے جناب! میرے دوست جبرو سنگھ کی ہے۔ ہم دونوں کمرے میں سو رہے تھے۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے پیشاب کرنے اٹھا۔ مجھے یہ دونوں (میں اور زریں گل) مس اروشی کے دروازے پر کھڑے نظر آئے' زریں گل پیچھے تھا اور شاہ جہاں آگے پھر زریں گل بھی آگے آگیا۔ اس نے ایک دم مس اروشی کو دھکا

جا اور کمرے میں گھس گیا۔ شاہ جہاں نے بھی یہی کیا۔ مس اروشی کی دبی دبی چیخ سنائی دی اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے جیو سنگھ کو تواززی اور ہم دونوں بھاگتے ہوئے یہاں آ گئے۔ بعد میں، میں کھڑکی توڑ کر اندر گھس آیا۔ اس وقت تک یہ دونوں مس اروشی کو بے ہوش کر چکے تھے۔"

زل سنگھ سفید جھوٹ بول رہا تھا لہٰذا اس کا لب و لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ شیخ عاصم جیسا گھاگ شخص زل کے لب و لہجے سے ہی بہت کچھ جان گیا ہوگا۔

جیو سنگھ بڑی اذیت میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ران کا زخم نیلا پڑ گیا ہے۔ وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور بہ زبانِ حال یہ اعلان کر رہا تھا کہ اس نے کرپان نما چھرے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ درست ہے۔ چھرے کی دھار کو کسی جان لیوا زہر کی بان لگائی گئی تھی۔ شیخ عاصم کی ہدایت پر سنہالی گارڈ تڑپتے مچلتے جیو سنگھ کو اٹھا کر باہر لے گئے اور اسپتال پہنچانے کے لیے ایک ویگن میں ڈال دیا۔۔۔

غیر متوقع طور پر اروشی کو جلد ہی ہوش آ گیا۔ وہ بمشکل پون گھنٹا بے ہوش رہی تھی۔ شاید کلوروفارم ٹھیک سے سونگھایا نہیں جا سکا تھا، یا پھر ملاوٹی "کلوروفارم" نے اروشی سے رعایت کر دی تھی۔ اروشی کے ہوش میں آتے ہی وہ گرد صاف ہو گئی جو زل سنگھ نے بوکھلاہٹ میں اڑائی تھی۔ اروشی نے بتایا کہ حملہ آور زل سنگھ اور اس کا ساتھی ہیں۔۔۔۔ اس بیان کے فوراً بعد شیخ عاصم نے زل سنگھ کو اپنے مسلح گارڈز کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے عمارت کے کسی خاص کمرے میں لے گئے۔ (کسی ایسے ہی کمرے میں جہاں فریال بند تھی اور قیدِ تنہائی جھیل رہی تھی۔)

قریباً گھنٹے بعد جب زل سنگھ کو دوبارہ شیخ عاصم کے روبرو لایا گیا تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ قمیص تو اس کی زریں گل نے پھاڑ دی تھی اب جسم پر پتلون بھی نہیں تھی۔ وہ صرف زیرِ جامے میں تھا۔ ناک اور منہ سوج کر کپا ہو چکے تھے۔ دونوں ہونٹ پھول کر پھٹ گئے تھے اور جسم پر بید کے بے شمار سرخ سرخ نشان تھے۔ ایسے کچھ نشانات میں سے نہ صرف خون رس رہا تھا بلکہ سفید سفید گوشت بھی جھانک رہا تھا۔

سنہالی گارڈز نے زل سنگھ کو شیخ کے سامنے پیش کیا تو وہ ہر سوال کے جواب میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح فر فر بولنے لگا۔ اس سے جو کچھ معلوم ہوا وہ کچھ اس طرح تھا۔ زل سنگھ پچھلے چھ ماہ سے رحمان کاکا کے لیے کام کر رہا تھا۔ زل ولایتی شراب اور نوخیز لڑکیوں کا رسیا تھا۔ انہی کمزوریوں کی وجہ سے وہ کاکا کے جال میں آ گیا اور اس کے لیے کام کرنے لگا۔ وہ اس سے پہلے بھی کاکا کو ریسٹ ہاؤس کے بارے میں بہت سی اطلاعات فراہم کر چکا تھا۔ اروشی پر نگاہ رکھنا بھی زل سنگھ کے فرائض میں شامل تھا۔ ایک روز پہلے زل سنگھ کو بتایا گیا کہ اسے اروشی کو اغوا کر کے ڈیمانٹ ریستوران میں پہنچانا ہے کیونکہ صرف دو روز بعد ہفتے کی شب اسے ڈیمانٹ میں رقص کرنا ہے۔ زل سنگھ کی مدد کے لیے جیو سنگھ کو بطور دوست ریسٹ ہاؤس میں بھیجا گیا۔ ان دونوں نے سرونٹ کوارٹرز میں ہی بیٹھ کر اروشی کو ریسٹ ہاؤس سے لے جانے کی منصوبہ بندی کی (وہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ اروشی کو ملازمت سے نکالا جا چکا ہے اور دس بارہ گھنٹے بعد وہ خود ہی ریسٹ ہاؤس سے باہر آ جائے گی) جیو سنگھ کلوروفارم اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ پروگرام کے مطابق رات آخری پہر انہوں نے اروشی کے کمرے میں گھسنا تھا اور اسے بے ہوش کرنا تھا۔۔۔ زل سنگھ کی وہ ویگن جس میں وہ دودھ اور سبزی لینے علی الصباح شہر روز جاتا تھا قریب ہی کھڑی رہتی تھی۔ اروشی کے بے ہوش ہونے کے بعد وہ اسے اٹھا کر ویگن میں ڈالتے اور ترپال وغیرہ کے ذریعے چھپا دیتے۔ حسبِ معمول زل سنگھ صبح سویرے ویگن لے کر گال روڈ روانہ ہو جاتا اور اس کے ساتھ ہی اروشی بھی رحمان کاکا کے پنجۂ ستم میں چلی جاتی۔

شیخ عاصم کے لیے یہ سب کچھ بہت تعجب خیز اور ہتک آمیز تھا۔ رحمان کاکا کے غنڈوں نے اروشی کو اٹھانے کے لیے اس کے گھر میں گھسنے کی جرأت کی تھی اور اس سے بھی زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ رحمان کاکا اور اس کے گروہ نے شیخ عاصم کے گرد شک و شبے کا جال بُن دیا تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اپنے ارد گرد موجود ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھے کہ معلوم نہیں ان میں سے کون وفاداریاں تبدیل کر چکا ہو۔

میں نے شیخ عاصم سے کہا "مجھے تمہارے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں اور مجھے دخل دینا بھی نہیں چاہیے کیونکہ تم الٹ مطلب لو گے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تم اروشی کو ریسٹ ہاؤس سے نکال کر کاکا وغیرہ کے لیے لقمۂ تر بنا دو گے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اذیت ناک انجام سے دوچار کریں گے۔"

"نہیں۔۔۔ وہ لڑکی اب یہیں ہماری حفاظت میں رہے گی۔" شیخ عاصم بارعب لہجے میں بولا "ویسے بائی دی وے، تم بہت کچھ جانتے ہو کاکا وغیرہ کے بارے میں۔"

"بہت کچھ تو نہیں لیکن کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوں۔"

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً یہ کہ کاکا اور اس کے گروہ تمہیں قتل کے ایک سنگین کیس میں پھنسانے اور سزا دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ لوگ تمہارے اور زون کے خلاف کچھ اہم ثبوت حاصل کر چکے ہیں اور بہت جلد یہ ثبوت عدالت میں پیش کرنے والے ہیں۔"

ہمارے درمیان یہ گفتگو سیٹنگ روم میں ہو رہی تھی۔ شیخ عاصم ایک آرام دہ کوچ میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں وائن کا گلاس اور دوسرے میں سگریٹ تھا۔ غزالہ اس کے

پاس ہی بیٹھی تھی۔ شیخ عاصم نے کہا "اگر میں مان لوں کہ صورتِ حال وہی ہے جو تم کہہ رہے ہو اور تم سے تمہاری رائے طلب کروں تو تم کیا کہو گے؟"

"میں کہوں گا 'تا اے جُونیاوالے یہ کیسی تیری بستی ہے۔'"

میں نے مصرع چونکہ اردو میں کہا تھا لہٰذا شیخ عاصم آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا "کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ دنیا میں ایسے خبیث حضرات کی کمی نہیں جن کے منہ میں گھٹنے کی زبان ہوتی ہے اور وقت پڑنے پر وہ کسی کے پاؤں بھی چاٹ سکتے ہیں۔"

اس فقرے میں میں نے خبیث، گھٹنے اور پاؤں کے الفاظ اردو میں کہے تھے لہٰذا شیخ عاصم کی سمجھ میں پھر کچھ نہیں آیا۔ تاہم غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور بولی "شاہ جہاں! میں چاہوں گی کہ آپ غیر سنجیدہ گفتگو سے پرہیز کریں اور صرف اس بات کا جواب دیں جو عاصم آپ سے پوچھ رہے ہیں۔"

میں نے سر کھجا کر کہا "کون سی بات، میں تو بھول ہی گیا۔"

شیخ عاصم سخت لہجے میں بولا "میں نے موجودہ صورتِ حال میں تمہاری رائے دریافت کی تھی۔" میں پھر کوئی غیر سنجیدہ بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن غزالہ کی ناراض آنکھوں میں ایک خاموش التجا کی جھلک دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔۔۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔

"مسٹر عاصم! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ دھربان کاکا اور خاص طور سے عشارب اینڈ کو کو محدود پیمانے پر روکا جا سکتا ہے تو یہ غلط ہے۔ بہت لمبا چوڑا خون خرابہ ہو سکتا ہے اس سے۔ اور میرے خیال میں تم جیسا شخص جو ایک صنعت کار ہے اور بظاہر جرائم کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اس خون خرابے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں۔ آگے کہو۔" وہ بولا۔

"مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ عشارب اینڈ کو والے یہاں سری لنکا میں کوئی ایسا کاروبار کر رہے ہیں جو ناجائز اور غیر قانونی ہے لیکن بے حد منافع بخش ہے۔"

"کیسا کاروبار؟"

"میں ابھی خود کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا۔ ایک چھوٹا سا کلیو مجھے ملا ہے۔ اگر تھوڑا سا وقت مل گیا تو میں اس کلیو سے معاملے کی تہ تک پہنچ سکتا ہوں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ اس معاملے کا کھوج لگ جانے پر عشارب اینڈ کو پر خاطر خواہ دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ لوگ تم پر بم کیس والے معاملے میں دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"تم کس کلیو کی بات کر رہے ہو؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

"مجھے اندازہ ہوا ہے کہ عشارب اینڈ کو والے یہاں جنگلی جانوروں کی کھالوں اور "آئیوری" کا وسیع کاروبار کر رہے ہیں۔ ڈیمانٹ ریستوران میں اتفاقاً میرا ایک اسٹور روم میں جانا ہوا۔ وہاں قیمتی جانوروں کی درجنوں کھالیں گٹھڑیوں کی شکل میں رکھی ہوئی تھیں۔ بعد ازاں مجھے سینے میں درد کی وجہ سے قصبہ رتنا پورہ کے ڈاکٹر ہانیکے کے پاس جانا پڑا تھا۔ وہاں بھی میں نے ایک بند کمرے میں ایسی ہی گٹھڑیاں رکھی دیکھی ہیں۔ ان گٹھڑیوں کے ساتھ کچھ صندوق بھی تھے۔ ان میں ہاتھی دانت کی بنی ہوئی قیمتی اشیا، خام ہاتھی دانت اور مختلف جانوروں کے بیش قیمت سینگ تھے۔"

شیخ عاصم کی نگاہوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو گئی۔ وہ اپنی نشست پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میری اس اطلاع پر غزالہ بھی چونک سی گئی تھی۔ شیخ عاصم نے پوچھا "اس بات کا پتا تم نے کیسے لگایا کہ یہ کاروبار وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے اور پورے سری لنکا میں پھیلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "فی الحال تم اسے میری چھٹی حس کا اعلان ہی کہہ سکتے ہو لیکن مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ اعلان درست ثابت ہوگا۔"

شیخ عاصم کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا "تم یقیناً کچھ چھپا رہے ہو۔ بہرحال میں پوچھنا چاہوں گا کہ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟"

"وہ سب کچھ جو تم چاہتے ہو۔ میں ۴۸ گھنٹے میں عشارب اینڈ کو کا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے لے آؤں گا۔ لیکن یہ سب کچھ غیر مشروط نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کیا ملے گا؟"

ایک دم شیخ عاصم کے تیور بدل گئے۔ اس کی گھنی مونچھیں پھڑکیں اور وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کٹیلے انداز میں بولا "بہت خوب۔ تو تم شرطیں طے کرنا چاہ رہے ہو؟"

"یہ میرا حق ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہارے حق پر۔" وہ دہاڑا "تم کیا سمجھتے ہو، میں لولا لنگڑا ہوں کہ تمہارے جیسے خارش زدہ جانور کا سہارا لوں گا۔ چل نکل یہاں سے چل۔" اس نے چٹکی بجائی، پھر اپنے مسلح گارڈز کو آوازیں دینے لگا۔

غزالہ نے آگے بڑھ کر شوہر کا بازو تھام لیا "کیا کرتے ہیں عاصم۔ دماغ ٹھنڈا کریں، پلیز عاصم۔"

"اس کا دماغ تمہارے جیسی بھلی مانس عورت ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ اس کا دماغ میں ٹھنڈا کروں گا" میں نے اردو میں کہا۔

میری اردو نے شیخ کا پارہ مزید چڑھا دیا۔ وہ آنکھیں نکال کر بولا "بکواس بند کرو۔۔۔ اور میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

میں نے کہا "تیرے منہ میں گھی شکر۔ میں تو خود تیرے پلید سائے سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔"

شاید میں کچھ اور بھی کہتا لیکن وہ مسلح سنہالی رندنا تے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف فزالہ بھی بپھرے ہوئے شوہر کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ یوں وہ ملاقات جو بڑی رازداری کے ساتھ شروع ہوئی تھی' شور شرابے اور تلخ کلامی کے ساتھ ختم ہو گئی۔۔۔ تاہم صرف چھ سات گھنٹے بعد فزالہ اس ملاقات کا اثر زائل کرنے کے لیے میرے پاس آن موجود ہوئی۔ وہ گولف کھیلنے جا رہی تھی اور چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ میں اس پیشکش کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ وہ راستے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔۔۔ شیخ عاصم اس وقت ریسٹ ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ میں اور فزالہ ریسٹ ہاؤس سے گولف گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ سنہالی گارڈ حسب معمول ہمارے ساتھ تھا' اور آٹھ دس قدم کا فاصلہ چھوڑ کر آرہا تھا۔ فزالہ نے پہلے تو اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں شیخ عاصم سے بات کرتے ہوئے تلخ ہو جاتا ہوں اور جوش میں آ جاتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر وہی درخواست کی جو وہ پہلے کر چکی تھی۔ اس نے کہا کہ میں موجودہ صورتحال سے فائدہ اٹھاؤں اور شیخ عاصم کے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کروں ورنہ ہم دونوں کا ہی نقصان ہوگا۔ اس نے کہا "اگر آپ کو دھیان کاکا اور مشارب اینڈ کو کے بارے میں کوئی سراغ ملا ہے تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ آپ عاصم کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھائیں' بے شک یہ تعاون یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔"

فزالہ بہت آزردہ تھی۔ بلکہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ رو دینے کے قریب ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیسے قائل کرے۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے مزید آزمائش میں ڈالوں۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور یقین دہانی کرائی کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے سے چمک اٹھے۔۔۔ ہم دونوں پھولوں سے ڈھکی ہوئی شفاف سڑک پر پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ میں نے پوچھا "نرل سنگھ کا کیا بنا۔ کچھ اگلا ہے اس نے یا نہیں؟"

"میرے خیال میں اس سے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہو سکی۔" فزالہ نے جواب دیا۔ "عاصم بتا رہے تھے کہ وہ اندر کا آدمی نہیں ہے اور نہ ہی کاکا نے کبھی اس سے کوئی خاص کام لیا ہے۔"

"بہرحال نرل سنگھ ایک اہم مہرہ ہے۔ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ ضرور ہونی چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ ریسٹ ہاؤس میں کاکا یا مشارب اینڈ کو کا کوئی اور "ایجنٹ" بھی پایا جاتا ہو۔"

"پوچھ گچھ تو ایسی ہوگی کہ وہ سدا یاد کرے گا۔ عاصم کے سنہالی گارڈز بڑے سخت لوگ ہیں۔"

"اس کا مجھ سے زیادہ پتا اور کسے ہوگا" میں نے کہا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' یہ زریں گل تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا اور ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلانے لگا۔ "ایکسکیوزمی" میں نے فزالہ سے کہا اور زریں گل کے پاس پہنچا۔

وہ سرگوشی میں بولا "وہ آپ کا سائیں عالی کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے اور آپ کو یاد فرما رہا ہے۔"

"کیسی مصیبت؟"

"ہمارا خیال ہے کہ اسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ کسی تھانے سے تھانیدار کا ٹیلی فون آیا ہے۔ وہ آپ کو پوچھ رہا تھا۔ ام نے بتایا کہ آپ تو یہاں نہیں ہے۔ وہ بولا خوچہ' آپ کا بندہ فلاں تھانے میں ہے۔"

"فلاں تھانے میں؟ کیا تھانے کا کوئی نام پتا نہیں ہے؟"

"وہ جی دراصل' فون ام نے خود تو نہیں سنا تھا۔ اروشی صاحب کے بھنوئی نے سنا تھا اور انہوں نے ہی اپنی زبان میں تھانیدار سے بات چیت کیا تھا۔ باقی کا بات ان کو معلوم ہے۔"

میں نے فزالہ سے اجازت لی اور زریں گل کے ساتھ واپس ریسٹ ہاؤس میں آ گیا۔ اروشی کے بھنوئی راکیش سنگھے سے پوری بات معلوم ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ سائیں عالی اور اس کی ساتھی لڑکی "رکوانا" کے مرکزی پولیس اسٹیشن میں بند ہیں۔ غالباً آوارہ گردی کے الزام میں پکڑا گیا ہے انہیں۔

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ سائیں عالی ریسٹ ہاؤس میں ایک جھلک دکھانے کے بعد دوبارہ نظر کیوں نہیں آیا۔ وہ تھانے میں بند تھا اور ساتھ میں سروج عرف آلو کی چٹنی بھی تھی۔ اس پردیس میں ان کی مدد کے لیے پہنچنا ضروری تھا۔ میں نے راکیش سنگھے سے مشورہ کیا اور پھر راکیش کی موٹر سائیکل پر ہم دونوں "رکوانا" روانہ ہوئے۔ راکیش کی طرح میں نے بھی سر پر فل ہیلمٹ چڑھا لیا تھا۔ یوں یہ ممکن ہو گیا تھا کہ میں اس قصبے کی سڑکوں پر آزادانہ گھوم سکوں جہاں ہر جگہ دھیان کاکا کے لوگ موجود تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں ہم "رکوانا" پہنچ گئے۔ پہلے بھی میں شام ہی کے وقت قصبے میں پہنچا تھا' اب بھی شام ہونے والی تھی۔ صاف شفاف سڑکوں پر چہل پہل نظر آرہی تھی اور ہوٹلوں ریسٹورانوں سے پکوانوں کی امنڈتی ہوئی خوشبو اشتہا انگیز ہو رہی تھی۔ ہم مطلوبہ تھانے میں پہنچے' مخروطی چھت اور سرخ اینٹوں والی یہ ایک کشادہ عمارت تھی۔ ہم احاطے میں داخل ہوئے' ہر مقامی عمارت کی طرح یہاں بھی خوشنما سبزے کی بھرمار تھی۔ لکڑی کی ایک بینچ پر ایک موٹا تازہ تامل ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا اور بیڑی پی رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ خراب تھی۔۔۔ تھانے کا انچارج ایک کالا بھجنگ سنہالی تھا۔ جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا تاہم پاکستانی اور انڈین تھانیداروں کی طرح توند موجود نہیں تھی۔ راکیش سنگھے

نے اسے بتایا کہ ہم سائیں عالی اور اس کی ساتھی لڑکی کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ہمیں تھانیدارانہ نظروں سے گھورنے کے بجائے وہ ایک دم ریشہ خطمی نظر آنے لگا۔ اس نے راکیش سے سنہالی میں کچھ بات چیت کی پھر ہمیں لے کر اپنے دفتر میں آ گیا۔ دفتر میں ہمیں ایک عجب منظر نظر آیا۔ یہاں کوئی میز کرسی موجود نہیں تھی' صرف ایک چٹائی بچھی تھی۔ ایک سب انسپکٹر اور کانسٹیبل چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے' ان کے سامنے ایک مقامی طرز کا حقہ تھا۔ ملزم کو ہتھکڑی لگی تھی مگر وہ خوش باش نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے ٹرے میں چائے کی پیالی اور بسکٹ کی پلیٹ رکھی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں مجھے سائیں عالی نظر آیا۔ وہ حسب معمول میلے کچیلے چغے میں تھا۔ گلے میں ان گنت گھنٹیاں اور مالائیں' سر پاؤں میں دھول اور داڑھی کے بال الجھے ہوئے۔ وہ آنکھیں بند کیے پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ ایک شاندار گاؤ تکیہ اس کی پشت پر رکھا تھا۔ اس کے سامنے بھی چائے اور بسکٹ موجود تھے لیکن وہ جوں کے توں پڑے تھے۔

"سائیں عالی!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں اسے پکارا۔

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں اور اپنے حال میں مست رہا۔ انسپکٹر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کی آواز نکالی اور بتایا کہ سائیں صاحب کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

عجیب صورتحال سے پالا پڑا تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ سائیں عالی گرفتار ہے اور ہمیں اس لیے تھانے بلایا گیا ہے کہ اگر ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں' لیکن یہاں الٹا معاملہ نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں عالی نے تھانے والوں کو گرفتار کر رکھا ہے۔ وہ بھیگی بلیوں کی طرح اس کے آس پاس گھوم رہے تھے اور بہت دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ تھانیدار ہمیں لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے ہمارے لیے چائے کا آرڈر دیا اور راکیش سنگھے سے سنہالی میں بات چیت کرنے لگا۔ گفتگو کا بس کوئی کوئی لفظ ہی میری سمجھ میں آرہا تھا۔ تاہم میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ انسپکٹر نے سب سے پہلے ہمارا تعارف چاہا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ سائیں عالی سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ راکیش سنگھے نے پہلے اپنے کوائف بتائے اور کہا کہ وہ کافی عرصہ پہلے انڈیا میں سائیں عالی سے ملا تھا اور اس کا معتقد ہے' پھر میرے بارے میں بتایا کہ میں دعوت پیلس میں شیخ عاصم بن ارشد کے ساتھ ہی مقیم ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ انڈیا سے لائے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد انسپکٹر ایک دم مطمئن نظر آنے لگا اور اس نے سنگھے سے میرے بارے میں اور کچھ نہیں پوچھا' اس نے اپنا نام شاد اریں بتایا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "اگر آپ کو سنہالی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے تو ہم انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میری طرف سے فکرمند نہ ہوں" میں نے انگریزی میں کہا۔

انسپکٹر خوش اخلاقی سے مسکرایا اور انگریزی میں بات کرنے لگا۔ وہ بولا "میرے محلے نے محترم بزرگ کو پرسوں رات ڈھائی بجے گرفتار کیا تھا۔ وہ ایک پبلک پارک میں اپنی ساتھی لڑکی کے زانو پر سر رکھے سو رہے تھے۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ پہلے تو دونوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سنہالی اور انگریزی دونوں سے نابلد ہیں' لیکن پولیس اسٹیشن آ کر لڑکی انگریزی میں بات چیت کرنے لگی۔ ہم نے اس سے سوال جواب کیے تو شک گزرا کہ وہ غیر قانونی طور پر سری لنکا میں داخل ہوئے ہیں۔ ان کی ظاہری حالت بہت پتلی تھی لیکن محترم بزرگ کے لبادے میں سے دس ہزار روپے کی خطیر رقم برآمد ہوئی۔ ہم مزید شک میں پڑ گئے۔۔۔ ان پر تین چار سنگین نوعیت کے کیس بن سکتے تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ کیس رجسٹر کرنے میں جلدی نہیں کی ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اتفاقاً کل صبح ہمارے محکمے کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر گوپال مینڈس معائنے پر تشریف لے آئے۔ انہوں نے محترم بزرگ عالی صاحب سمیت تمام حوالاتیوں سے بھی بات چیت کی۔ محترم عالی صاحب نے معلوم نہیں ان کے کان میں کیا جادو پھونکا کہ وہ ان کے گرویدہ ہو کر رہ گئے۔ دونوں میرے دفتر میں بند ہو کر کوئی تین گھنٹے بات چیت کرتے رہے۔ مینڈس صاحب دفتر سے باہر نکلے تو ان کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔ محترم عالی صاحب کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر پرنام کر رہے تھے اور ان کی طرف پشت کرنے کے روادار بھی نہیں تھے۔

انہوں نے ہم سب کو سخت سست کہا اور اس بات پر سرزنش کی کہ ہم ایک بلند پایہ۔۔۔ ہستی کو پہچاننے میں ناکام رہے ہیں اور توہین آمیز انداز میں تھانے لے آئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حکم دیا کہ محترم عالی صاحب جب تک چاہیں تھانے میں رہ سکتے ہیں' انہیں ایک معزز مہمان کی حیثیت دی جائے اور ان کی ہر ہدایت پر بلا چون و چرا۔۔۔ عمل کیا جائے۔ ان کی کہی ہوئی بات کتنی بھی بے معنی اور نامناسب کیوں نہ ہو اسے من و عن تسلیم کیا جائے۔ اس حاکمانہ حکم کے بعد جناب گوپال مینڈس صاحب تو چلے گئے اور ہماری جان مصیبت میں آ گئی۔ محترم عالی صاحب نے ہمیں تگنی کا ناچ نچا دیا۔"

"کیا مطلب۔ کوئی الٹ پلٹ فرمائش کر دی انہوں نے؟"

"برادرم کوئی ایک فرمائش ہو تو بتائیں۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے ہمیں آدھا پاگل کر دیا ہے' اب حساب لگائیں' پورا پاگل ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے حکم دیا کہ "انسپکٹر آفس" میں سے تمام فرنیچر اٹھا لیا جائے اور وہاں ناریل کی چٹائی بچھائی جائے۔ اس کے بعد اپنی مترجم مس سروج کی زبانی آرڈر جاری کیا کہ تھانے کے تمام کانسٹیبل اور سپاہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جائیں اور سری لنکا کا ترانہ دس دس بار اونچی آواز میں پڑھیں' بھلا یہ کوئی تک ہے۔ دو سپاہیوں نے یہ تماشا کرنے سے انکار کیا تو محترم عالی صاحب جلال میں آ گئے۔ ایک سپاہی کو تھپڑ

مارے اور دوسرے کی موٹر سائیکل میں سے سارا پیٹرول نکال کر پی گئے۔ پیٹرول پینے کے بعد تھانے کے صحن میں چکر لگانا شروع کیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر منہ سے "گرر گرر" کی آواز نکالتے ہوئے کہنے لگے میں جنگی طیارہ ہوں، ابھی یہاں سے ٹیک آف کروں گا اور چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر جانے کے بعد اس تھانے پر بمباری شروع کردوں گا۔ پھر وہ سچ مچ تھانے کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے گملے پر اینٹیں برسانے لگے۔ ہم نے کرپال مینڈس صاحب کو فون کیا۔ وہاں سے جواب ملا کہ وہ جو کرتے ہیں کرنے دو، ان کے کسی کام میں رکاوٹ نہ ڈالو۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں چھت سے نیچے اتارا گیا اور دونوں سپاہیوں نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر سری لنکا کا ترانہ پڑھا۔"

انسپکٹر روہانسا ہو رہا تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ یہ واقعات سناتے ہوئے ہنسے یا روئے۔ راکیش سنگھے نے پوچھا "ابھی آپ کے کمرے میں ایک ملزم کے سامنے بسکٹ اور چائے رکھی تھی۔ وہ کیا معاملہ ہے؟"

انسپکٹر شاد بولا "میں نے کہا نا... کہ ہمیں تو پاگل کر دیا ہے عالی صاحب نے... کل سے اس تھانے میں جو بھی آ رہا ہے اس سے وی آئی پی سلوک کرنا پڑ رہا ہے۔ سائل تو سائل ملزم کو بھی آپ جناب اور حضور کہنا پڑتا ہے، اپنے برابر بٹھانا پڑتا ہے۔ چائے اور پیسٹری سے تواضع کرنا پڑتی ہے۔ اور تین چار اچکوں کو تو عالی صاحب کے حکم پر اپنے پلے سے پیسے دینے پڑے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس سلوک کے مستحق؟ ان کو تو ذرا ڈھیل دو تو سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ آپ ملزم ہیں اور وہ تھانیدار۔ ابھی جب آپ اندر آئے تھے تو ایک یک چشم غنڈے کو دیکھا ہو گا آپ نے، بینچ پر پھیل کر بیٹھا ہوا ہے۔ اسے ایک چوری کے شبے میں ارنانگل سے بلایا تھا۔ شبہ غلط نکلا۔ چائے وغیرہ پلا کر چھوڑ دیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ میں دل کا مریض ہوں، بس میں سفر نہیں کر سکتا۔ ٹیکسی کا کرایہ دو گے تو واپس جاؤں گا... یعنی ملاحظہ فرمائیں، ذہنوں میں یہ انقلاب آیا ہے کہ ایک ملزم "رہا ہونے" کے لیے ہم سے رشوت طلب کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کوئی زبردستی تھانے میں گھس آئے اور بزور بازو لاک اپ میں بند ہونا چاہے۔ جب اس سے پوچھا جائے کہ تمہارا قصور کیا ہے؟ تو وہ کہے یہ باتیں عدالت میں جا کر کرنا..."

رفتہ کمرے سے چیخم دھاڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم جلدی سے انسپکٹر آفس میں پہنچے وہاں ایک اور ہی تماشا نظر آیا۔ ایک لیڈی سب انسپکٹر پورے کمرے میں پھدکتی پھرتی تھی۔ سائیں عالی اس کے پیچھے تھا اور ایک کنگ سائز جھاڑو سے اسے مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ جھاڑو بانس کی تیلیوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ہی بھرپور ضرب لیڈی سب انسپکٹر کو لہولہان کرنے کے لیے کافی تھی۔ غالباً ایک آدھ ضرب اسے لگ بھی چکی تھی۔ تبھی تو اس کے گندمی رخسار سرخ ہو رہے تھے اور وہ اچھلنے کودنے کے ساتھ ساتھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بول بھی رہی تھی۔ چائے، بسکٹ، برتن، فرنیچر سب کچھ تہ و بالا ہو رہا تھا۔ سروج عرف آلو چھی بڑے اطمینان سے ایک کونے میں کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

کمرے کی صورت حال دیکھ کر انسپکٹر شاد کے طوطے اڑ گئے۔ وہ لپک کر سائیں عالی اور لیڈی سب انسپکٹر کے درمیان آ گیا۔ اس کوشش میں بانس جھاڑو کا ایک اچھا سا وار اس کی گردن پر بھی پڑا تاہم وہ یہ دھینگا مشتی رکوانے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی لیڈی سب انسپکٹر کی جان چھوٹی وہ اپنی پشت سہلاتی اور سائیں عالی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتی باہر بھاگ گئی۔ سائیں عالی انسپکٹر شاد سے مخاطب ہو کر دہاڑا "تم لوگ چغد سمجھتے ہو مجھے۔ الو کا پٹھا ہوں میں کہ کچھ پتا نہیں چلے گا مجھے۔ میرے سامنے ملزموں کو کیک پیسٹریاں کھلاتے ہو، دوسرے کمرے میں لے جا کر ان کی چمڑی ادھیڑتے ہو۔ میں تم سب کو اندر کرا دوں گا اور اگر اندر کرنے والوں نے اندر نہ کیا تو سب کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

انسپکٹر شاد نے سوالیہ نظروں سے سروج کی طرف دیکھا۔ سروج نے سائیں عالی کے "زبان" کا مفہوم انگلش میں بیان کرتے ہوئے کہا "سائیں جی فرماتے ہیں کہ آپ کی لیڈی سب انسپکٹر کسی ساتھ والے کمرے میں ایک نوجوان عورت سے مار پیٹ کر رہی تھی۔ ابھی برآمدے میں سے سائیں جی نے خود یہ آوازیں سنی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپ لوگ ویسے ہی غیر قانونی کام کر رہے ہیں جیسے دوسرے تھانوں میں کیے جاتے ہیں۔ وہ آپ کی رپورٹ اعلیٰ افسران تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

انسپکٹر شاد نے گڑبڑا کر کہا "محترم عالی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں تو کوئی عورت حوالاتی ہے ہی نہیں۔ شاید لیڈی سب انسپکٹر خاکروب سے جھگڑ رہی ہو۔ خاکروب کی آواز بھی بالکل عورتوں جیسی ہے۔"

سروج نے ان الفاظ کا ترجمہ سائیں عالی کے گوش گزار کیا۔ وہ بھڑک کر بولا "یہ سب جھوٹ ہے۔ تم سارے پولیس والے ایک جیسے...... ہوتے ہو" اس فقرے میں موٹی سی گالی بھی شامل تھی۔

سروج نے اس فقرے کا فصیح ترجمہ یوں کیا "سائیں جی فرماتے ہیں، انہوں نے اپنی آنکھوں سے زنانہ حوالات میں ایک جواں سال عورت کو دیکھا ہے۔ اس نے ہرے اور لال رنگ کی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کہتے ہیں آپ سب پولیس والے ایک سے جھوٹے ہوتے ہیں۔"

انسپکٹر شاد کا چہرہ اتر گیا۔ دوسری طرف سروج کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سائیں عالی نے خود ملزمہ کو نہیں دیکھا، سروج نے زنانہ حوالات میں جھانک کر اس کے کان بھرے

ہیں اور اب اس جھگڑے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

انسپکٹر شاد شد و مد سے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا جبکہ سائیں عالی کا پارہ دم بدم چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تھانے میں یوں گرج رہا تھا جیسے سری لنکا کا سارا محکمہ پولیس اس کی جیب میں ہو... آخر انسپکٹر شاد نے اپنے اسسٹنٹ سے مشورے کے بعد تسلیم کر لیا کہ زنانہ حوالات میں کوئی عورت موجود ہے۔ اس نے سائیں عالی سے کہا۔ "میں ابھی لیڈی انسپکٹر سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ اگر اس نے حوالاتی سے کوئی زیادتی کی ہے تو اس کے خلاف کارروائی ہو گی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔"

سروج نے ان الفاظ کا من پسند ترجمہ سائیں عالی کے گوش گزار کیا۔ سائیں عالی کا غصہ تو ٹھنڈا ہو گیا لیکن اب وہ ایک رم زار اور جلایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں اور چہرے کا زخم ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ "میں اب یہاں سے جاؤں گا" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میرا جھولا کدھر ہے؟"

سروج نے ان الفاظ کا انگلش میں ترجمہ کیا تو انسپکٹر سمیت سارے عملے کے چہرے کھل اٹھے۔ انہیں جیسے اپنی اس خوش بختی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ انسپکٹر شاد نے اپنی اندرونی مسرت کو چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے پوچھا "محترم عالی صاحب! آپ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں نا...؟ میرا مطلب ہے کسی طرح کا دباؤ تو نہیں ہے آپ پر؟" سائیں عالی نے سروج کی وساطت سے جواب دیا۔

"تم لوگوں کے نصیبے میں جہنم کی آگ لکھ دی گئی ہے۔ اب اس نصیبے کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ بھرلو جتنی آگ بھرنا چاہتے ہو اپنے پیٹ میں۔"

سروج کے ہونٹوں پر دبی دبی شریر مسکراہٹ تھی۔ اس نے سائیں عالی کے الفاظ کو مزید مرچ مسالا لگا کر یوں بیان کیا "سائیں جی فرماتے ہیں، تم لوگ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھے ہو۔ سو سال تک سانچے میں رکھا جائے تو بھی ٹیڑھے ہی رہو گے۔ تمہارا انجام ایسا ہو گا کہ جہنم بھی پناہ مانگے گی۔"

ایک سپاہی نے جلدی سے سائیں عالی کا میلا کچیلا جھولا ایک الماری سے نکالا اور سائیں عالی کو پیش کر دیا۔ سروج اس کے پیچھے تھی۔ دروازے سے گزر کر صحن میں جاتے ہوئے سائیں عالی میرے بالکل پاس سے گزرا لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ مکمل اجنبیت تھی اس کے انداز میں... البتہ سروج نے ایک تیز تیکھی نظر مجھ پر ضرور ڈالی۔ وہ حسب معمول مختصر اور ہیجان خیز لباس میں تھی۔ پیٹ گردن اور پنڈلیوں کا خاصا حصہ عریاں تھا۔ تھانے میں موجود عملے کی نظریں اس کے بدن سے چپکی ہوئی تھیں۔ وہ خراماں خراماں چلی تو ہر آنکھ اس کے ساتھ چلنے لگی۔

صحن میں پہنچ کر سائیں عالی دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نے بڑے ادب سے کہا "آپ کے لیے سواری کا انتظام کر دیا جائے؟"

سروج نے یہ پیشکش اردو کے قالب میں سائیں عالی تک پہنچائی تو وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کیا جس پر میں اور راکیش سنگھے یہاں تک پہنچے تھے۔ "میں اس موٹر سائیکل پر جاؤں گا۔" اس نے عجیب و غریب فرمائش کر دی۔

"لیکن... لیکن" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں" اس نے میری طرف دیکھے بغیر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں جاؤں گا تو اسی پر جاؤں گا۔ ورنہ نہیں جاؤں گا۔"

انسپکٹر کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ التجا بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے راکیش سنگھے کی طرف دیکھا۔ میں متذبذب تھا تو وہ کیوں متذبذب نہ ہوتا۔ اس کے لیے آسان نہیں تھا کہ وہ اپنی قیمتی موٹر سائیکل ایک مخبوط الحواس شخص کے حوالے کر دیتا۔ معلوم نہیں وہ اسے کہاں لے جاتا اور دوبارہ ہاتھ بھی آتا یا نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سڑک پر پہنچتے ہی کوئی سنگین قسم کا ایکسیڈنٹ کر دیتا اور موٹر سائیکل کی تباہی کے علاوہ راکیش سنگھے کی جان بھی قانونی چکروں میں پھنس جاتی۔

میں نے کہا "سائیں جی! موٹر سائیکل کی سواری آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ ہم آپ کے لیے کار وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو..."

"بس بس" سائیں عالی نے بات کاٹی۔ "زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں... میں جاؤں گا تو اسی چرخے پر جاؤں گا، ورنہ نہیں جاؤں گا۔ لاؤ اس کی چابی۔"

انسپکٹر شاد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک طرف لے جا کر کہا۔ "بھائی صاحب! فار گاڈ سیک، اس مصیبت سے ہماری جان چھڑائیں۔ اگر آپ نے موٹر سائیکل نہ دی تو یہ مستقل ہمارے سر پر سوار رہے گا... دیوانے کے ساتھ آپ کیوں دیوانے ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کو یہ خطرہ ہے کہ یہ موٹر سائیکل لے کر کہیں غائب ہو جائے گا تو ہم اس کا حل بھی نکال لیتے ہیں۔ میں اپنے اسسٹنٹ کو تھانے کی موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے روانہ کر دیتا ہوں۔ بلکہ دو موٹر سائیکلیں بھیج دیتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ موٹر سائیکل ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلے گی۔"

میں جانتا تھا کہ سائیں عالی کے منہ سے جو بات نکل جائے اس کا لوٹانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے راکیش سے مشورہ کیا اور اسے آمادہ کر لیا کہ وہ موٹر سائیکل کی چابی سائیں عالی کے حوالے کر دے۔

سائیں عالی نے چابی موٹر سائیکل کے اگنیشن میں لگائی پھر اپنا چوغا سمیٹ کر گھٹنوں تک چڑھایا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔

اس کے پاؤں ننگے تھے اور کندھے سے جھولا بدستور لٹک رہا تھا۔ اس ہیئت کذائی میں وہ موٹر سائیکل پر بیٹھا عجیب لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سڑک پر پہنچتے ہی سائیں عالی سروج سمیت اوندھے منہ گرے۔ ٹھیک ٹھاک چوٹیں آئیں دونوں کو۔۔۔ اور سروج کی کم از کم ایک ٹانگ تو ضرور ٹوٹ جائے تاکہ وہ یوں بگولے کی طرح ہر جگہ میرا پیچھا کرنے کے قابل نہ رہے لیکن میری اس بددعا کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہوا۔ سائیں عالی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی اور پھر ایک دم میرا کان پکڑ کر بولا۔ "او ئے شیخ عمر! تو غلطی پر غلطی کر رہا ہے۔ ہر جگہ اپنی جیون ساتھی کو چھوڑ کر چلا آتا ہے اور پھر مصیبت اٹھاتا ہے۔ بتا اٹھاتا ہے یا نہیں؟"

"کیا مطلب سائیں؟" میں نے پوچھا۔

"بڑا انجان بنتا ہے۔ میں سب جانتا ہوں یہاں آ کر کیا بنی ہے تیرے اوپر۔ شیخ عاصم کے ہاں بڑی عزت افزائی ہوئی ہے تیری۔۔۔ برتن مانجھتا رہا اور گھاس کھودتا رہا تو۔۔۔ اور گدھے کی طرح پٹتا بھی رہا ہے۔۔۔ اور وہ ایس پی ساہی کی بیٹی غنڈوں کے نرغے میں پڑی ہے۔۔۔ یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ تو اپنی جیون ساتھی سروج کو اپنے سے دور رکھے ہوئے ہے اور جب تک یہ دور رہے گی تیرا یہی حشر ہوتا رہے گا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ۔۔۔"

"چپ کر" وہ دہاڑا۔ "اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔ اس لڑکی کو اپنے ساتھ رکھ اور جو اس کے حقوق ہیں اسے دے۔۔۔ خدا حافظ۔"

اس نے گیئر لگایا۔ موٹر سائیکل بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح اچھلی اور یوں لگا کہ سائیں عالی کا سفر آغاز میں ہی ختم ہو جائے گا' لیکن اس نے لہراتی ہوئی موٹر سائیکل پر قابو پا لیا اور سنسنی خیز انداز میں گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی تھانے کی موٹر سائیکل تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ میں نے دیکھا' سروج بڑی بے باکی سے میرے کندھے سے لگی کھڑی ہے۔

انسپکٹر شار کو کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اس نے کہا وہ ایک گھنٹے تک واپس آ جائے گا۔۔۔ ہو سکتا ہے اس دوران ہماری موٹر سائیکل بھی واپس آ جائے اگر نہ بھی آئی تو وہ ہمیں اپنی جیپ پر رحق پیلس چھوڑ آئے گا۔ انسپکٹر شار چلا گیا اور ہم تھانے کے ایک کمرے میں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے لگے۔ سروج یقیناً مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن راکیش سنگھے کی موجودگی میں دل پر پتھر رکھے ہوئے تھی۔ تاہم زبان کی کھجلی کے سبب وہ گاہے گاہے کوئی لوفر سا فقرہ چست کر دیتی تھی۔ اس نے راکیش سنگھے سے سگریٹ طلب کیا پھر اپنے گریبان کے خطرناک کٹاؤ میں سے ایک طلائی لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر بڑی نزاکت سے چھوٹے چھوٹے کش لینے لگی۔ تھانے کا عملہ اسے دیکھ کر ٹھنڈی ٹھار آہیں بھر رہا تھا۔ ہماری

خاطر تواضع کے لیے وہاں ہمیں ناریل پانی بھی پیش کیا گیا۔ ا... میں سے نکلا ہوا یہ خوش ذائقہ ناریل پانی اپنی طرز کا منفرد مشرو... تھا۔ دو گھنٹے گزر گئے لیکن نہ راکیش سنگھے کی موٹر سائیکل آئی نہ انسپکٹر شار نے اپنی صورت دکھائی۔ اس دوران اس یک... غنڈے کو حوالات میں گھینٹی لگتی رہی جس نے ٹیکسی کا کرایہ بغیر تھانہ چھوڑنے سے انکار کیا تھا۔ اب وہ پلے سے پیسے بھی... بھی تیار تھا۔۔۔ ایک گھنٹے میں بمشکل اس کی جان چھوٹ... انسپکٹر کی راہی رات دس بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے ... کے لیے بے حد معذرت پیش کی اور عندیہ یہ ظاہر کیا کہ وہ ابھی اپنی جیپ پر رحق پیلس چھوڑ آتا ہے۔ ہمیں بھی تھانے اداس الوؤں کی طرح بیٹھ کر رات گزارنے کا کوئی شوق نہیں ... ہم تیار ہو گئے۔ ظاہر ہے وہاں جان اور خلوص کی ایمان سروج کو ہمارے ساتھ ہی جانا تھا۔ ہم تینوں انسپکٹر شار کی جیپ پر سوار ہو... اور "رکوانا" سے روانہ ہو گئے۔ ایک نس کے سائن مین ہمارے ساتھ تھا۔ انسپکٹر نے وعدہ کیا کہ جونہی موٹر سائیکل وا... آئی وہ وحق پیلس بھجوا دے گا۔

رکوانا ٹاؤن سے وحق پیلس یعنی ریسٹ ہاؤس تک کا سفر ... گھنٹے سے کم نہیں تھا۔ رکوانا سے نکلنے کے چند منٹ بعد ہی گھنے سنسان جنگل میں آ گئے۔ تاڑ بانس اور مہاگنی کے درختوں سے گزرتی ہوئی سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایسے گاڑی کہیں خراب ہو جاتی تو سخت مشکل پیش آتی۔ دفعتاً انسپکٹر شار کی جیپ میں نصب وائرلیس سیٹ جاگ اٹھا۔ انسپکٹر نے ا... ہاتھ سے ریسیور تھام کر کان سے لگایا اور مقامی زبان میں گف... کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر پہلے دلچسپی اور پھر تشویش کے آ... نمودار ہوئے۔۔۔ وائرلیس وصول کرنے کے بعد وہ کسی سوچ میں ... ہو گیا تھا۔ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد اس نے اپنے گن مین ... بھی ایک دو فقروں کا تبادلہ کیا۔ اس دوران ہم ایک سہ راہے پر پہنچ گئے۔ سڑک کے کنارے درختوں تلے ایک سایہ سا موجود... انسپکٹر نے اپنی جیپ اس سائے کے عین سامنے روکی۔ سایہ ج... کی کھڑکی پر جھک کر انسپکٹر شار سے باتیں کرنے لگا۔ وہ درمیانی... ننگ دھڑنگ دیہاتی تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی اور جسم پر ا... لنگوٹی تھی۔ وہ انسپکٹر کے ساتھ کسی بہت اہم گفتگو میں مصروف... پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنی لنگوٹی میں ہاتھ ڈ... کر ایک چھوٹا سا وائرلیس سیٹ نکال لیا۔ سیٹ کا ایریل کھینچ... اس نے اپنا رخ درست کیا اور تیز لہجے میں کسی سے باتیں کر... لگا۔ انسپکٹر بھی دھیان سے یہ گفتگو سن رہا تھا' مجھے اندازہ ہوا... دیہاتی کے بھیس میں یہ پولیس کا کوئی مخبر ہے اور ابھی تھوڑی... پہلے وائرلیس پر انسپکٹر کو اسی کا پیغام موصول ہوا تھا۔ دیہاتی کی گفتگو ختم ہوئی تو انسپکٹر شار نے ہم سے مخاطب ہو کر انگریزی...

"مجھے آدھ پون گھنٹا لگ جائے گا۔ اگر آپ میرے ساتھ ہی جانا چاہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرا گن مین آپ کو یہاں کسی گاڑی پر بٹھا دیتا ہے۔ بلکہ وہ آپ کے ساتھ ہی چلا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے جانا کہاں ہے؟"

وہ بولا۔ "زیادہ دور نہیں صرف دو ڈھائی میل کا فاصلہ ہے۔ دراصل یہاں کچھ لوگ غیر قانونی شکار میں مصروف ہیں۔ انہوں نے درختوں میں پھندے وغیرہ لگا رکھے ہیں۔ بس وہ پھندے دیکھنے ہیں۔"

انسپکٹر شار بات چھپا رہا تھا' اگر صرف پھندے دیکھنے کی بات ہوتی تو وہ بعد میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً وہ ان "مہم جو شکاریوں" کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا "کہیں ان شکاریوں سے ملاقات ہو گئی تو؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ساتھ تو صرف دو رہے ہیں۔"

"بندے تو اور بھی ہیں موقع پر لیکن میرا خیال ہے کہ ملزموں کو علم نہیں ہو گا' وہ صرف پھندے لگا کر چلے گئے ہیں۔۔۔"

ناجائز شکار کا سن کر میرے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے علاوہ سروج اور راکیش کی نمائندگی بھی کی اور انسپکٹر سے کہا ٹھیک ہے ہم بھی اس کے ساتھ چلتے ہیں۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اشارے پر لنگوٹی والا دیہاتی بھی جیپ میں گھس آیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ مین روڈ سے اتری اور ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نیم پختہ ذیلی سڑک پر چل دی۔

"کوئی گہرا چکر لگتا ہے انسپکٹر صاحب؟" راکیش سنگھے نے پوچھا۔

"ہاں ایک گروہ بڑے منظم طریقے سے غیر قانونی شکار میں ملوث ہے" انسپکٹر نے کہا۔ "کچھ لوگ پکڑے بھی گئے ہیں۔ ابھی ...ہی کینڈی اور انورادھا پور میں آٹھ دس گرفتاریاں ہوئی ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے وہاں بھی یہی لوگ قانون شکنی کر رہے تھے؟" راکیش نے پوچھا۔

"بھائی میرے' صرف سری لنکا میں ہی نہیں' ہمیں تو اب شبہ ہو رہا ہے کہ یہی لوگ جنوبی انڈیا میں بھی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ چھ سات روز پہلے آپ نے اخباروں میں خبر پڑھی ہوگی کالی کٹ کے نواحی جنگلات میں ایک ہی رات میں آٹھ بارہ سینگوں کو غیر قانونی طور پر شکار کیا گیا ہے۔ طریقہ واردات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی گینگ کی کارستانی ہے۔"

میرا دماغ جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یقین سا ہونے لگا کہ میں صحیح راستے پر آ گیا ہوں اور یہی راستہ ہے جو آگے چل کر عشارب اینڈ کو کے غیر قانونی کاروبار کے سارے اسرار مجھ پر کھول دے گا۔ سوچتے سوچتے نفشا سائیں عالی کا چہرہ میرے تصور میں آ گیا۔ اس کا دھیان کر کے میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے کئی بار دیکھا تھا کہ سائیں عالی کے بے معنی کاموں میں بھی حکمت پوشیدہ ہوتی تھی۔ میں کبھی اسے اپنا وہم سمجھتا تھا اور کبھی اتفاق۔۔۔ اب یہ بھی بظاہر اتفاق ہی نظر آ رہا تھا کہ سائیں عالی ایک ایسے تھانے میں گرفتار ہوا جہاں انسپکٹر شار تعینات تھا اور علاقے میں غیر قانونی شکار کھیلنے والوں کے خلاف کارروائی کر رہا تھا لیکن یہ اتفاق مجھے اچانک اپنے ٹارگٹ کے آس پاس لے آیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور بات آئی اور میری سنسنی آمیز حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ اگر سائیں عالی تھانے سے رخصت ہوتے وقت بے جا ضد نہ کرتا اور راکیش کی موٹر سائیکل ساتھ نہ لے جاتا تو عین ممکن تھا کہ ہم اسی وقت تھانے سے روانہ ہو جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمیں انسپکٹر شار کے ساتھ جیپ میں یہاں آنے کا موقع کب ملتا اور یہ انکشافات کیسے ہوتے جو اب ہوئے تھے اور ہونے والے تھے۔

ذہن نے کہا' یہ سب میرا وہم ہے' ایسے اتفاقات ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ لیکن جب سابقہ تجربات پر نگاہ پڑتی تھی تو دل اس "وہم" کو وہم ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ جیپ ہچکولے کھاتی گھنے اور تاریک جنگل میں گھستی جا رہی تھی۔ ہوا میں نامعلوم نباتات کی مہک رچی بسی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کے سوا چاروں طرف اندھیرے کا سمندر تھا۔ انسپکٹر شار کی زبانی پتا چل گیا کہ ہم ایک "وائلڈ لائف ریزرو" میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ علاقہ ستر اسی مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ قریباً دو میل آگے آنے کے بعد جیپ کچے رستے پر اتر گئی اور گیلی زمین میں ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کچھ آگے جا کر لنگوٹی پوش شخص نے جیپ روکنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب باہر نکل آئے۔ گن مین کو جیپ اور سروج کی حفاظت کے لیے وہیں چھوڑ دیا گیا' ہم لنگوٹی پوش کی رہنمائی میں احتیاط سے آگے بڑھے۔ انسپکٹر کی کمر سے سرکاری ریوالور لٹک رہا تھا' اور مجھے یقین سا تھا کہ لنگوٹی پوش کی لنگوٹی میں بھی کوئی چھوٹا موٹا ہتھیار موجود ہو گا۔ وہ اندھیرے میں بھی بڑی آسانی سے دیکھ رہا تھا اور یہاں کا چپا چپا اس کا دیکھا بھالا محسوس ہوتا تھا۔ وہ ہمیں تاڑ کے ایسے گھنے درختوں میں لے آیا جہاں پورے چاند کے باوجود گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس نے اپنی لنگوٹی کے اندر سے درمیانے سائز کی ٹارچ نکالی اور اس کے روشن دائرے کو خشک پتوں کے اوپر گردش دینے لگا۔ ہم سب کو اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر دیا تھا اور ہم اپنی جگہوں پر ساکت و جامد کھڑے تھے۔ بڑی احتیاط سے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ہاتھ میں پکڑی لاٹھی کے ذریعے خشک پتوں کو ادھر ادھر ہٹایا۔ پتوں کے نیچے بڑی کاریگری سے چھپایا ہوا ایک

آہنی پھندا برآمد ہوگیا۔ پھندے کا طاقتور اسپرنگ پورا کھنچا ہوا تھا۔ جانور کے پاؤں کو قابو کرنے والے قوس نما ٹکڑے قریباً ایک فٹ کی دوری پر تھے۔ پھندے پر مقررہ حد (دو تین کلو) سے زیادہ کا وزن پڑتا تو یہ دونوں ٹکڑے گولی کی رفتار سے بند ہو جاتے اور بدنصیب جانور کی آزادی شکاریوں کی آمد تک سلب ہو جاتی ۔۔۔ لنگوٹی پوش گجر کا نام رامسور تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ پھندے ایک خاص نسل کے بندر کے لیے لگائے گئے ہیں۔ یہ بندر یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں اور مہنگے داموں میں فروخت ہوتے ہیں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں رامسور نے بتایا کہ یہ آہنی پھندے جانور کے پاؤں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ اس نے ہمیں بیس مربع گز کے رقبے میں قریباً چھ پھندے مزید دکھائے اور بتایا کہ اس "ایریا" میں درجنوں ایسے پھندے لگائے گئے ہیں۔ جس وقت ہم یہ پھندے دیکھ رہے تھے چار اور افراد بھی موقع پر پہنچ گئے۔ یہ آس پاس ہی کہیں جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ سب سنہالی تھے اور انہیں دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سری لنکن پولیس کے اہلکار ہیں پھر ایک پانچواں شخص بھی نظر آیا۔ یہ کھچڑی بالوں والا ادھیڑ عمر تھا۔ اس کی سبز شرٹ پر وائلڈ لائف پروٹیکشن سوسائٹی کے الفاظ درج تھے۔ یہ تمام اہلکار پھندوں کا سراغ لگنے پر کافی پرجوش دکھائی دیتے تھے۔ اچانک ایک آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ ہمارے عقب سے یہ آواز قریباً ڈیڑھ فرلانگ کی دوری سے آئی تھی۔ اس آواز نے میرے رگ وپے میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ اس سے پہلے میں نے ہاتھی کی آواز صرف چڑیا گھر یا فلموں میں سنی تھی۔۔۔ آج میں تاریک جنگل میں تھا اور ایک آزاد ہاتھی کی چنگھاڑ سن رہا تھا۔ یوں لگا جیسے ابھی ایک دیو قامت مست ہاتھی چنگھاڑتا ہوا درختوں میں سے برآمد ہوگا اور اپنی تین گز لمبی سونڈ اٹھا کر ہم پر حملہ آور ہو جائے گا۔ خیر میرے ساتھ تو یہ پہلا اتفاق تھا لیکن انسپکٹر شاد اور رامسور وغیرہ تو یہیں کے باسی تھے اور یہاں کے باسیوں کے لیے ہاتھی کوئی انوکھی شے نہیں تھی اور نہ ہی اس کی آواز تعجب خیز تھی، پھر بھی وہ ایک دم ٹھٹکے ہوئے نظر آنے لگے۔۔۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ اسی دوران رامسور کی لنگوٹی میں رکھا ہوا واکی ٹاکی جاگ اٹھا۔ اس نے واکی ٹاکی نکال کر ایریل باہر کھینچا، دوسری جانب سے ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز یقیناً اسی شخص کی تھی جسے ہم سوزن کے پاس جیپ میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا۔۔۔ "ہاتھیوں نے حملہ کر دیا ہے جی۔۔۔ انہوں نے۔۔۔ جیپ الٹا دی ہے۔۔۔ میں اور میم صاحبہ جیپ کے اندر ہیں۔" (ان الفاظ کا انگریزی ترجمہ راکیش نے مجھ تک پہنچایا)

اس کے ساتھ ہی سوزن کی چیخیں سنائی دیں۔۔۔ چیخوں کے پس منظر میں کسی ہاتھی کی خوفناک چنگھاڑ تھی یوں لگ رہا تھا کہ وہ جیپ کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔۔۔ پھر واکی ٹاکی خاموش ہوگیا۔۔۔ "ہیلو۔۔۔ ہیلو" رامسور زور زور سے چیخا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔۔۔

ہم پلٹ کر جیپ کی طرف دوڑے۔ رامسور سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے انسپکٹر شاد تھا۔ اس نے اپنا سرکاری ریوالور نکال لیا تھا۔۔۔ ہاتھی کی چنگھاڑ اب "چنگھاڑوں" میں بدل گئی تھی۔ گن مین نے یقیناً درست اطلاع دی تھی۔ وہ ایک سے زائد ہاتھی تھے۔ ان کی آوازوں اور ان کے قدموں کی دھمک سے جنگل لرز رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ انسپکٹر ریوالور کے ساتھ ہاتھیوں کا کیا بگاڑ سکے گا۔۔۔ اسی دوران فاصلے پر اوپر تلے دو فائر ہوئے اور دھماکوں سے جنگل لرز اٹھا۔ یہ فائر گن مین نے کیے تھے۔ اس امر میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اور سوزن سخت مصیبت میں ہیں۔ ہم سو ڈیڑھ سو گز دور ہی گئے تھے کہ رامسور ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے انداز سے خوف ٹپکتا ہوا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور بے حس و حرکت رہ گیا۔ آٹھ فٹ اونچی جنگلی گھاس میں چار پانچ ہیولے تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں دو بڑے تھے اور باقی چھوٹے۔ یہ وہ سری لنکن ہاتھی تھے جنہیں دیکھنے کے لیے سیاح دور دور سے آتے ہیں اور جن کے کھیل تماشے تفریح گاہوں کی رونق میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ ہاتھی ہمارے لیے خوف اور دہشت کی علامت بن کر نمودار ہوئے تھے اور چاندنی میں حرکت کرتے ہوئے ان کے سیاہ ہیولے یہاں حد تک خوفناک تھے۔ ہم جان بچانے کے فطری عمل کے تحت پلٹ کر بھاگے۔ میں نے ایک پولیس اہلکار کو الجھ کر جھاڑیوں میں گرتے دیکھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر رکنا چاہا۔ انسپکٹر شاد نے پوری قوت سے دھکیلا ہوا چیخا۔ "بھاگو"

ہمارے عین عقب میں ایک طوفان سا بپا تھا۔ شاخیں ٹوٹ رہی تھیں، زمین دہل رہی تھی اور چنگھاڑوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور خواب میں اس تاریک جنگل میں بھاگا جا رہا ہوں۔ ڈر کے ٹھکانے میں داخل ہوتے ہی یکایک میں رک گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت ہے، میں رک گیا۔۔۔ اس شدید ہیجانی کیفیت میں بھی ذہن نے کام کیا تھا اور مجھے یاد آگیا تھا کہ میں جس طرف جا رہا ہوں وہاں قدم قدم پر آہنی پھندے ہیں۔۔۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والی مثل مجھ پر صادق آرہی تھی اور یہی مثل انسپکٹر شاد اور لنگوٹی پوش رامسور پر صادق آئی تھی۔ وہ مجھ سے چار قدم آگے بھاگے تھے۔ "رک جاؤ انسپکٹر" میں نے کہا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ انسپکٹر شاد پھندوں کے نرغے میں تھا۔۔۔

کھٹکے کی زوردار آواز آئی۔ کسی پھندے کے اسپرنگ نے حرکت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر شاد کی کربناک کراہ بلند ہوئی۔ میں نے اس کی پرچھائیں کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ یقیناً انسپکٹر شاد کا پاؤں شکنجے میں آگیا تھا۔ گرنے کے فوراً بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس دوران میں ایک دیوہیکل سایہ جھومتا ہوا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ یہ ان سری لنکن ہاتھیوں میں سے ایک تھا جو ہمارے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہاتھی انسپکٹر کو روندتا ہوا نکل گیا۔ تاریکی کے سبب میں اس منظر کی جزئیات نہیں دیکھ سکا اور ایک لحاظ سے یہ ٹھیک ہی تھا ورنہ میری آنکھیں شاید ہفتوں اس منظر کو بھول نہ سکتیں۔

میں نے پھندوں کی طرف سے رخ پھیر لیا تھا اور اب بائیں جانب بھاگ رہا تھا۔ یہاں ایک گہرا برساتی نالا تھا جس کے کنارے بے تحاشا درخت اگے ہوئے تھے۔ میرے عقب میں بدستور زمین دہل رہی تھی اور شاخیں ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ چونکہ میں نے رخ تبدیل کیا تھا لہٰذا یہ آوازیں کچھ اور نزدیک ہو گئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے تاریکی میں ابھی کسی ہاتھی کی سونڈ لہرا کر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ اچانک میری نگاہ رامسور پر پڑی۔ وہ میرے سامنے لڑکھڑا کر جھاڑیوں میں گرا۔ اس کے حلق سے ذری ذری کراہ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھر اٹھا اور بھاگنے لگا لیکن دو قدم اٹھانے کے بعد پھر گر گیا۔ اس کی ٹانگ پر کہیں شدید چوٹ آئی تھی۔ میں نے اس کا بازو تھاما اور سہارا دے کر اپنے ساتھ بھگانے لگا ہر قدم پر رامسور کے منہ سے کراہ نکل رہی تھی۔ اس کا عریاں بازو پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور وہ ناقابلِ فہم زبان میں معلوم نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے بہت زور سے دھکا دیا ہے۔ میں چند لمحے ہوا میں معلق رہا۔ سہارا تلاش کرنے کے لیے میں نے ہاتھ پاؤں چلائے اور پھر اچانک ایک شدید جھٹکے کے ساتھ میں کسی شے سے جھول گیا۔ یہ کسی درخت کی موٹی شاخ تھی۔ اچانک جھٹکا لگنے کے سبب میرے کندھوں اور گردن میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ جو سب سے پہلا احساس مجھے ہوا وہ یہ تھا کہ میرے جسم کے زیریں حصے سے کوئی بھاری بھرکم شے لپٹی ہوئی ہے اور جھول رہی ہے۔ اس "شے" کا سارا وزن بھی میرے کندھوں اور کلائیوں پر تھا۔ میں نے اپنے منتشر حواس جمع کیے۔ میرے کانوں میں لنگوٹی پوش رامسور کی گھٹی گھٹی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف ہوا کہ میری ٹانگوں سے جھولنے والا شخص رامسور ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی برساتی نالے کی گہرائی میں گرا تھا اور ہاتھوں کے ساتھ جھول گیا تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں وہ مقام صاف نظر آرہا تھا۔ جہاں سے ہم گرے تھے۔ وہ جگہ قریباً پندرہ فٹ بلند تھی۔ زمین کٹاؤ کا شکار تھی لہٰذا نالے تک جانے والی ڈھلوان قریباً عمودی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ڈھلوان کے بالائی کنارے پر روشن آسمان کے پس منظر میں بانس اور شیشم کی شاخیں بالکل صاف نظر آرہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک طویل شیشم بڑے زور سے ہلا پھر کڑاکے کی آواز آئی اور وہ لہراتا ہوا ایک طرف جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاتھی کی طویل چنگھاڑ سنائی دی۔ یہ بات عیاں تھی کہ اوپر کنارے پر ہاتھی موجود ہیں اور وہ ہم کو چنگھاڑ رہے ہیں۔ نشیب میں لڑھک جانے کے سبب ہم ہاتھیوں کی دست برد سے محفوظ ہو چکے تھے لیکن یہ نئی آفت بھی کچھ کم سنگین نہیں تھی۔ اپنے اور رامسور کے بوجھ سے میری کلائیاں اور انگلیاں ٹوٹی جا رہی تھیں اور نیچے زمین بہت دور تھی۔ دل کڑا کر کے میں نے نیچے دیکھا اور دل اچھل کر رہ گیا۔ بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ اونچائی کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل تھا، بہرطور یہ بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ یہاں سے گر کر ہم دونوں لازماً راہیِ عدم ہو جائیں گے۔ جس درخت سے ہم لٹک رہے تھے یہ نالے تک جانے والی ڈھلوان دیوار سے تین چار میٹر باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا، ہم اس درخت سے جدا ہوتے تو بغیر کسی رکاوٹ کے سیدھے نالے میں گرتے۔ چمکتی ہوئی چاندنی میں نالے کا پانی کسی آدم خور درندے کی آنکھوں کی طرح چمک رہا تھا۔ میں نے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے جسم کی تمام قوت ہاتھوں اور کلائیوں میں منتقل کر دی تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر شاخ سے چمٹا رہ سکوں۔ رامسور نے ایک ہاتھ سے میری پتلون کی بیلٹ تھام رکھی تھی، اس کا دوسرا بازو میری ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ حلق کی پوری طاقت سے اپنے ساتھیوں کو آوازیں دے رہا تھا۔ "پرستا" "راسون" "بانڈے۔۔۔"

یہ آواز اس بدنصیب شخص کی آواز سے مشابہ تھی جو پانی میں ڈوبنے سے پہلے آخری بار سطح آب پر ابھرتا ہے اور مدد کے لیے پکارتا ہے۔ موت کے خوفناک بوجھ سے لرزتی ہوئی اس آواز کا ارتعاش رامسور کے سینے سے میری ٹانگ میں منتقل ہو رہا تھا اور وہاں سے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ پندرہ بیس سیکنڈ پکارنے کے بعد رامسور ہانپ گیا۔ اس کی آواز بیٹھنے لگی اور جسم کی لرزش باقاعدہ کپکپاہٹ میں بدل گئی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کراہا "میں نے آپ کو تھامے رکھا تو ہم دونوں گر جائیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جواب دینے کی طاقت سلب ہو گئی ہے یا شاید جسم کی تمام توانائیاں سمٹ کر کلائیوں اور ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھیں۔ کلائیاں اور ہاتھ جن سے میں نے بے حد مضبوطی کے ساتھ شاخ کو تھام رکھا تھا۔ یہ میری زندگی کی ناقابلِ فراموش گھڑیاں تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے چہرے اور گردن سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے لال پیلی نارنجی چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں۔

سموج کہاں ہے؟ انسپکٹر شاد پر کیا بیتی ہے؟ انسپکٹر شاد کے ساتھی کہاں ہیں؟ مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ اگر یاد تھا تو صرف اتنا کہ میری انگلیاں ایک درخت کی کھردری شاخ سے لپٹی ہوئی ہیں اور مجھے ہر صورت انگلیوں اور شاخ کا یہ رشتہ برقرار رکھنا ہے۔ لیکن کب تک؟ کب تک میں یونہی اپنے اور راموور کے وزن کے ساتھ اس شاخ سے پیوست رہ سکتا تھا۔ ایک منٹ، دو منٹ، زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آنا تھا کہ دماغ اور رگ پٹھوں کا رشتہ ختم ہو جانا تھا۔ تھکن کی انتہا کو چھو کر میری انگلیاں خود بخود شاخ کی کھردری سطح پر پھسلنا تھیں اور مجھے راموور سمیت نیچے نیم خشک نالے میں جا گرنا تھا۔

راموور نے اپنے جسم کی تمام تر توانائی اپنے اس ہاتھ میں جمع کی جس سے میری بیلٹ تھام رکھی تھی۔ دوسرا بازو اس نے میری ٹانگ سے جدا کر لیا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک قدم تھا۔ وہ اب صرف ایک بازو کے سہارے میرے جسم سے جھول رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے درخت کی ایک قریبی شاخ تھامنے کی کوشش کی۔ شاخ کا فاصلہ پانچ فٹ سے کم نہیں تھا۔ پوری کوشش کے باوجود راموور کا ہاتھ تقریباً ایک فٹ کی دوری سے لہراتا ہوا نکل گیا۔ اس کے جسم کی حرکت سے ہم دونوں کو خطرناک ہچکولا لگا اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے راموور کے ہاتھ سے میری بیلٹ چھوٹ جائے گی۔

"راموور؟" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "ایسا مت کرو۔ تمہارا ہاتھ چھوٹ جائے گا۔"

"نہیں صاحب' نہیں چھوٹے گا۔"

"میں کہتا ہوں ایسا مت کرو۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"میں آپ سے لٹکا رہا تو ہم دونوں گریں گے صاحب۔ مجھے کوشش کرنے دو۔"

اس نے پھر ہاتھ لہرا کر شاخ کو تھامنا چاہا مگر کوشش ناکام گئی۔ اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے اوپر کی طرف اچھال دیا ہے۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے پتا چلا کہ راموور کا ہاتھ میری بیلٹ سے نکل گیا ہے۔ اس کی دلدوز چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ پھر کوئی شاخ ٹوٹنے کی آواز آئی.... اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"راموور.... راموور" میں نے بلند آواز میں اسے پکارا۔ میری آواز ویران نشیب میں اور ارد گرد کے جنگل میں گونج کر رہ گئی.... ہاتھیوں کی چنگھاڑیں بھی اب معدوم ہو چکی تھیں۔ وہ خاموش ہو گئے تھے یا دور نکل گئے تھے۔ کوئی انسانی حیوانی آواز کوئی کھٹکا یا آہٹ سنائی نہیں دیتی تھی.... "راموور تم ٹھیک ہو؟" میں نے ایک بار پھر آواز دی۔

اس مرتبہ میں پچیس فٹ نیچے مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ سر جھکا کر میں نے بڑے دھیان سے دیکھا۔ کافی نیچے ایک اور درخت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے راموور نیچے گرنے کے بجائے اس دوسرے درخت میں الجھ گیا۔ احساس خاصا اطمینان بخش اور حوصلہ افزا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ اس کی دبی دبی کراہیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک لمحے تو میرے جی میں بھی آئی کہ شاخ چھوڑ دوں اور خود کو سپرد کر دوں' شاید مجھے بھی اس درخت کی "پناہ" نصیب ہو لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں تھا۔ یہ تھکے ذہن کی بہکی ہوئی رو تھی اور بس۔

راموور کے گر جانے کے بعد میری ٹانگیں آزاد تھیں۔ میں نے کوشش کر کے اپنی ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلایا اور پھر جسم شاخ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب شاخ پر ہاتھوں کے علاوہ میری ٹانگوں کی گرفت بھی قائم ہو چکی تھی۔ اگلا خاصا مشکل تھا۔ میرے بازو شل تھے اور جسم پسینے میں نہایا ہوا۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طرح شاخ پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ دو تین منٹ شاخ پر بے سدھ پڑا سانسیں درست کرتا اور کلائیوں کو آرام دیتا رہا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ درخت سے اترنا شروع کیا۔ درخت سے اتر کر میں خطرناک ڈھلوان پر بہت احتیاط سے پاؤں جما جما کر رکھتا اوپر چڑھ گیا۔ یہاں اب خاموشی تھی۔ کسی شخص کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ شاخوں سے چھنتی ہوئی چاندنی میں مجھے وہ درخت نظر آیا جو تھوڑی دیر پہلے ہاتھی کی ٹکر سے زمین بوس ہوا تھا' اور زمین بوس ہونے والا یہ اکیلا درخت نہیں تھا۔ ارد گرد کئی اور چھوٹے بڑے درخت بھی "ہلاک یا زخمی" ہوئے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ڈھلوان کے کنارے چلتا ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں سے نشیب میں جا سکتا تھا۔ میں بیٹھ گیا اور گھسٹ گھسٹ کر نیچے جانے لگا۔ اولین ترجیح راموور تک پہنچنا اور اسے خطرے سے نکالنا تھا۔ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گرا ہے اور کس حال میں ہے۔

چاند کی روشنی میرا سفر آسان بنا رہی تھی' ورنہ اس انتہائی خطرناک ڈھلوان پر بغیر کسی سہارے اور روشنی کے اترنا جان لیوا تھا۔ میں ایک ایک انچ گھسٹ کر تقریباً دس منٹ میں اس مقام پہنچ سکا جہاں راموور صاگی کے ایک نو عمر درخت میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور کراہ رہا تھا۔ وہ ایک شاخ پر گرا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں تک نیچے لٹک رہی تھیں۔ بالائی دھڑ چھوٹی بڑی ٹہنیوں میں الجھا ہوا تھا۔ یہی چھوٹی بڑی ٹہنیاں تھیں۔ جنہوں نے اسے بروقت نیچے نالے میں گرنے سے بچایا تھا۔

ٹہنیوں میں سے کھینچ کر راموور کو اس درخت سے نیچے اتارنا ایک دشوار عمل ثابت ہوا تاہم میں نے کسی نہ کسی طور یہ مرحلہ طے کر لیا۔

راموور میری توقع سے زیادہ زخمی تھا۔ نشیب میں گرتے ہوئے اس کا سر کسی سخت تنے سے ٹکرایا تھا۔ دائیں آنکھ کے اوپر

پیشانی چھل گئی تھی اور خون رس رس کر چہرے پر پھیل گیا تھا۔ ٹانگ کے علاوہ راموور کے پیٹ میں بھی شدید ضربات آئی تھیں۔ کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ ناف کے قریب لگی تھی اور یہاں ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا۔ راموور کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ یہی شخص صرف آدھ پون گھنٹا پہلے ہشاش بشاش تھا اور انسپکٹر شاد سے پرجوش لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اب وہ سر تا پا زخم بنا میرے سامنے پڑا تھا۔ راموور سے میرا کوئی دیرینہ تعلق نہیں تھا۔ اس سے میری پہلی ملاقات بمشکل زیادہ گھنٹا پہلے ہوئی تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے اور کس قسم کا آدمی ہے؟ لیکن اس نے تھوڑی دیر پہلے ایک انتہائی خطرناک صورتحال میں جس بہادری اور ایثار کا مظاہرہ کیا تھا وہ قابل صد تعریف تھا۔ اس خیال کے تحت کہ اگر وہ میرے ساتھ لٹکتا رہا تو ہم دونوں گر جائیں گے اس نے زبردست رسک لیا تھا اور ایک قریبی شاخ تھامنے کی کوشش میں نیچے گر گیا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سیدھا نالے میں جانے کے بجائے وہ پھر ایک درخت میں اٹک گیا تھا۔

میں نے راموور کو کندھے پر لادا اور احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ وہ زیادہ وزنی نہیں تھا' بہرحال اس کا جسم ٹھوس اور ورزشی تھا۔ یہاں ڈھلوان زیادہ خطرناک نہیں رہی تھی اور میں پاؤں جما جما کر اترتا اور راموور کا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ چار پانچ منٹ میں ہم برساتی نالے تک پہنچ گئے۔ نالا اوپر سے جتنا چھوٹا نظر آ رہا تھا اتنا چھوٹا نہیں تھا۔ پچیس تیس فٹ سے زیادہ کم پاٹ رہا ہوگا اس کا تاہم پانی انتہائی کم تھا۔ جب میں پانی میں اترا تو بمشکل میرے بوٹ ڈوب سکے۔ نالا پار کر کے میں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے شک تھا کہ راموور کی لنگوٹی میں واکی ٹاکی کے علاوہ ریوالور وغیرہ بھی موجود ہے۔ میں نے اس سے ریوالور کے بارے میں پوچھا تو وہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کراہا۔ "نہیں کوئی ہتھیار نہیں ہے میرے پاس۔"

یہ اطلاع مایوس کن تھی۔ میں چاہتا تھا کہ فوری طور پر کوئی محفوظ پناہ گاہ میسر آ جائے۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں ہم دونوں کے لیے خطرات پوشیدہ ہیں۔ کس قسم کے خطرات ہیں؟ یہ ابھی میرے ذہن میں بھی واضح نہیں تھا۔ ہم اس وقت ایک "وائلڈ لائف ریزرو" میں تھے۔ اس قسم کے ریزروز اور نیشنل پارکس میں ہر قسم کے جانور حتیٰ کہ درندے تک پائے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امکان بھی موجود تھا کہ وہ لوگ جو جانوروں کے ناجائز شکار میں مصروف ہیں' ارد گرد موجود ہوں اور ہمیں تعاقب کرنے کی کوشش کریں۔ ان لوگوں کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ ہاتھیوں کے ایک غول کا یوں اچانک ہم پر چڑھ دوڑنا کچھ خلاف توقع محسوس ہوتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ انہیں بھی منصوبے کے تحت ہماری جانب دوڑایا گیا ہو۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہ امکان مزید قوی ہو جاتا تھا کہ "شکاری" ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ اچانک میں ٹھٹک کر رک گیا۔ تاڑ اور بانس کے گھنے درختوں کے درمیان مجھے ایک تنہا کمرا سا نظر آیا۔ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا یہ کمرا ذرا بلندی پر واقع تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے نیچے پختہ اینٹوں کا چبوترہ ہے جس کے سبب برساتی نالے کا پانی کمرے کے آس پاس سے زمین کاٹ نہیں سکا۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدھا کا مندر ہے۔ جو استبداد زمانہ سے خستہ حال اور ویران ہو چکا ہے۔ چاندنی میں اس مندر کا ہیولا بڑا پُراسرار لگ رہا تھا۔ میں نے جھاڑ جھنکاڑ میں سے چبوترے کی سیڑھیاں تلاش کر لیں اور راموور کو لے کر مندر میں آ گیا۔ راموور اخراج خون اور تکلیف کی شدت سے نیم بے ہوش تھا۔ میری جیب میں سگریٹ لائٹر موجود تھا اور میں اس کی روشنی میں راموور کے زخموں کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتا تھا۔ مگر روشنی کرنے کا مطلب سنگین خطرات کو دعوت دینا تھا۔ میں نے اسی چاندنی سے کام چلانے کی کوشش کی جو کمرے کے ایک کشادہ روزن میں سے گرد آلود فرش پر اور راموور پر پڑ رہی تھی۔ راموور کے زخموں میں سے ناف کا زخم زیادہ سنگین تھا۔ ٹوٹی ہوئی شاخ کی نوک نے خنجر کی طرح کام دکھایا تھا اور پیٹ تقریباً چاک کر دیا تھا۔ اس زخم کے علاوہ بھی راموور کے جسم پر بہت سی چھوٹی بڑی خراشیں تھیں۔ اگر اس نے لنگوٹی کے بجائے مکمل لباس پہن رکھا ہوتا تو شاید وہ اس بری طرح گھائل نہ ہوتا۔

میں نے اپنی قمیص اور بنیان اتار دی۔ پتلون کی جیب سے رومال بھی نکال لیا۔ سب سے پہلے رومال ناف کے زخم پر رکھا' پھر اس پر بنیان رکھی اور اوپر سے قمیص کس کر باندھ دی۔ راموور نیم بے ہوشی کے عالم میں بار بار کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سنہالی بول رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن قیافے سے میں نے جان لیا کہ وہ پانی مانگ رہا ہے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ برساتی نالے میں پانی موجود تھا' لیکن یہ ٹھہرا ہوا گدلا پانی تھا۔ اس کے علاوہ پانی کہاں ہو سکتا تھا؟ اچانک مجھے یاد آیا کہ راموور کی لنگوٹی میں واکی ٹاکی موجود ہے۔ اس واکی ٹاکی پر انسپکٹر شاد کی جیپ سے رابطہ قائم کیا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ زیادہ "رینج" کا واکی ٹاکی ہو اور کسی قریبی پولیس اسٹیشن پر بھی بات کی جا سکے۔ میں نے راموور کی لنگوٹی میں ہاتھ دوڑایا لیکن واکی ٹاکی کا سراغ نہیں ملا۔ یقیناً واکی ٹاکی لنگوٹی میں سے گر گیا تھا۔ یہ بڑی مایوس کن صورتحال تھی۔ اگر موقع پر ہی پتا چل جاتا تو میں واکی ٹاکی ڈھونڈ کر آگے روانہ ہوتا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ واکی ٹاکی اسی مقام پر گرا ہے جہاں میں اور راموور درخت کی شاخ سے جھولے تھے اور بعد میں راموور نیچے ایک صاگی کے درخت کی ٹہنیوں میں جا الجھا تھا۔ نالے کے کنارے درختوں میں رات کے وقت واکی ٹاکی ڈھونڈنا بھوسے کے

ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن پھر ایک نئی بات میرے ذہن میں آئی اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے وامودر کا واکی ٹاکی دیکھا تھا۔ اس سیٹ پر کال موصول ہوتے ہی سرخ بلب جلنے بجھنے لگتا تھا اور آواز بھی آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر کوئی نالے کے اس پار سے واکی ٹاکی پر رابطہ کر رہا ہے تو واکی ٹاکی کا کھوج لگانا بہت آسان ہے۔ اس تاریکی اور خاموشی میں سرخ بلب کی اسپارکنگ اور سگنل کی آواز آسانی سے محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں وامودر کو وہیں پرانے مندر میں چھوڑ کر نالے کی طرف بڑھا۔ جلد ہی میں نالہ کراس کر کے دوسرے کنارے پر ان درختوں میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں واکی ٹاکی کے پائے جانے کا امکان تھا۔ اس سے پہلے کہ میں جھاڑیوں میں واکی ٹاکی کی تلاش شروع کرتا' چند آہٹوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں جلدی سے ایک تناور درخت کی اوٹ میں ہو گیا اور سن گن لینے لگا۔ جلد ہی مجھے ایک ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ ٹارچ بردار ایک لحیم شحیم شخص تھا اور اس کا ہیولا دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ ایک دوسرا شخص بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ دونوں مدھم لہجے میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ وہ ٹھیٹ پنجابی بول رہے تھے۔

پچھلے شخص نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "چھوڑو گلاب سنگھ' خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ کچھ نہیں ہے یہاں۔"

جس شخص کو گلاب سنگھ کہا گیا تھا اس کے ہاتھ میں ایک عجیب وضع کی رائفل تھی اور وہ فربہ اندام ہونے کے باوجود پھرتیلا شخص نظر آتا تھا۔ ہاتھ جھٹک کر بولا "یار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دونوں کو گرتے ہوئے۔ اول تو ہمیں ان کی لاشیں ملنی چاہئیں تھیں' ورنہ زخمی حالت میں کہیں پڑے ہوتے۔ سالے بھوت کی اولاد عجیب تجسس چھوڑ گئے ہیں اپنے پیچھے۔"

"یار! وہ مل بھی گئے تو کون سا تمغا لگ جانا ہے تمہارے سینے پر۔"

گلاب سنگھ بولا "تمغے کو ہم نے چاٹنا ہے۔ ہمیں تو مال چاہیے مال اور مجھے وشواس ہے کہ اگر وہ گتے کا بچہ وامودر مل گیا تو باس خوش ہو جائے گا اور جب وہ خوش ہو جائے گا تو اس کا ہاتھ اپنی جیب میں جائے گا اور جب اس کا ہاتھ اپنی جیب میں جائے گا تو ہماری جیب گرم ہو جائے گی۔"

"۔۔۔ اور جب تمہاری جیب گرم ہو جائے گی تو تم کولہو کے بازار حسن میں جا کر ساری رات خود کو گرم اور ٹھنڈا کرتے رہو گے اور جب تم ایسا کرو گے تو باس پھر تم سے ناراض ہو جائے گا۔ جب آخر میں باس کو ناراض ہی کرنا ہے تو پھر اسے خوش کرنے سے کیا فائدہ۔ باز آ جاؤ میرے چاچا جی! اب تو میری ٹانگیں بھی جواب دے گئی ہیں۔ چلو واپس چلیں۔"

گلاب سنگھ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "بس یار! پانچ منٹ۔ تو کنارے کے ساتھ ساتھ دیکھ میں ادھر ان درختوں پر نظر ڈال لیتا ہوں۔"

معمولی پس و پیش کے بعد گلاب سنگھ کا ساتھی اپنی ٹارچ روشن کیے نالے کے ساتھ ساتھ نالے کی طرف بڑھ گیا' جب کہ گلاب سنگھ کھڑا ہو کر سگریٹ کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔ نصف سے زیادہ سگریٹ ختم کرنے کے بعد اس نے باقی ماندہ سگریٹ پاؤں تلے مسلا اور پتلون کی زپ کھول کر بڑے اطمینان سے کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔ اس کی پشت میری جانب تھی' درمیانی فاصلہ آٹھ قدم سے زائد نہیں تھا۔ میں نے نگاہوں نگاہوں میں اپنے شکار کو تولا اور چوکس ہو گیا۔

جونہی اس کی حاجت پوری ہوئی۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بلائے ناگہانی کی طرح اس پر جا پڑا۔ اس کے منہ سے ڈری ڈری چیخ نکل گئی تھی' لیکن یہ چیخ زیادہ بلند نہیں تھی کیونکہ میرا بازو اس کی گردن میں حمائل تھا اور اس کا نرخرا بری طرح دبا ہوا تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ گلاب سنگھ کی عجیب وضع والی رائفل پر تھا۔ میں نے وہ رائفل گلاب سنگھ کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ میری توقع سے زیادہ طاقتور اور پھرتیلا نکلا۔ اس نے نہ صرف رائفل پر اپنی گرفت مضبوط رکھی بلکہ میرے بائیں پہلو پر زور سے کہنی بھی رسید کر دی۔ یہ میرا "زخمی" پہلو تھا۔ کہنی کی ضرب کی تکلیف شدید محسوس ہوئی۔ میری گرفت ڈھیلی پڑی تو گلاب سنگھ نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی۔ پہلو کی ضرب نے میرے ذہن میں انگارے سے بھر دیے تھے۔ میں نے اپنا گھٹنا گلاب سنگھ کے پیٹ میں رسید کیا' وہ جھکا تو کڑی ہتھیلی کی ضرب اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگائی۔ اس ضرب میں ایک دم کی شدت شامل ہو گئی تھی' لہٰذا گلاب سنگھ کٹتے ہوئے شہتیر کی طرح میرے قدموں میں آن گرا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی۔ بٹوے سے نقدی اور موٹر سائیکل کے لائسنس کے علاوہ مقامی حسیناؤں کی تصویریں بھی برآمد ہوئیں۔ سینما کے پرانے ٹکٹ' چابیوں کا چھوٹا سا گچھا' افیون کی دو ڈلیاں اور گھڑی۔ اشیا تھیں جو گلاب سنگھ کی تلاشی میں ملیں۔ ٹارچ اور عجیب وضع کی رائفل پر پہلے ہی میرا قبضہ ہو چکا تھا۔

میرا یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں تھا۔ گلاب سنگھ کا ساتھی یا کوئی بھی دوسرا شخص یہاں قدم رنجہ فرما سکتا تھا۔ میں گلاب سنگھ کی مونچھیں کھینچ کر دیکھیں کہ شاید وہ ہوش میں آ جائے اور میں اس سے ایک دو کام کی باتیں معلوم کر لوں لیکن وہ تسلی بخش طریقے سے بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اس کی اشیا سے ضروری چیزیں اپنی پتلون کی جیبوں میں ڈالیں اور موقع

روانہ ہو گیا۔ نالہ پار کرنے اور واپس تاریک مندر تک پہنچنے میں مجھے پانچ منٹ سے زائد نہیں لگے۔ وامودر اسی طرح نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے مسلسل ہلکی ہلکی کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر غور سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا "تم جاؤ صاحب! میرے لیے اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔۔۔ وہ لوگ۔۔۔ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ بہت جلد تم کو ڈھونڈ لیں گے۔"

میں نے کہا "کون لوگ ہیں یہ؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟"

وہ بولا "اس چکر میں مت پڑو صاحب! تم جاؤ۔"

"میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں شاید۔۔۔ اب بچ نہ پاؤں گا۔" وہ کراہ کر بولا "تم مجھے بچانے کے چکر میں خود کو مصیبت میں نہ ڈالو۔"

"میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے پورے یقین سے کہا "تم ایک بہادر شخص ہو اور بہادر واقعی آسانی سے موت سے شکست نہیں کھایا کرتے۔"

اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی تو پورے جسم کو جھٹکا سا لگا اور وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ جلا کر دیکھا' اس کی ناف پر بندھی ہوئی میری قمیص پر خون کا داغ نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ آرام سے لیٹا رہے۔ وہ بے قراری سے غنودگی میں سرہلانے لگا۔ وہ کبھی انگریزی میں بولنے لگتا تھا کبھی سنہالی میں۔ اس کی بڑبڑاہٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کے چہرے پر جھک گیا اور کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا "یہاں سے نکلو۔۔۔ یہ جگہ فوراً ان لوگوں کی نظر میں آ جائے گی۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اگر کچھ لوگ ہماری تلاش میں یہاں پہنچتے تو وہ سب سے پہلے اسی پرانے مندر میں جھانکتے۔ اگر سب سے پہلے نہ بھی جھانکتے تو یہاں نگاہ ڈالے بغیر آگے نہ بڑھتے۔۔۔ وامودر تکلیف کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا سرگرد آلود فرش پر پٹختا تھا اور ایڑیاں رگڑنے لگتا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن طبی امداد یہاں سے بہت دور تھی اور راستوں پر موت کا پہرا تھا۔ میرا دھیان افیون کی ان ڈلیوں کی طرف چلا گیا جو گلاب سنگھ نامی شخص کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ڈلی میں سے مناسب مقدار میں افیون توڑ کر اسے گولی کی شکل دی اور وامودر سے کہا کہ وہ نگل لے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ افیون نگلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں قریب بیٹھ کر اس کا سینہ سہلانے لگا۔ چاند کی روشنی میں میں نے غور سے اس رائفل کو دیکھا جو گلاب سنگھ سے چھینی تھی۔ اس رائفل پر ایک طاقتور کمان لگی ہوئی تھی اور گولی کی جگہ اس میں سے تیر چھوٹتا تھا۔ اس "ایروگن" کے ساتھ چار تیر بھی موجود تھے۔ یقیناً یہ گن اس وائلڈ لائف ریزرو میں غیر قانونی شکار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

اچانک میں چونک گیا۔ کچھ فاصلے پر کسی کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ فوراً مجھے اندازہ ہو گیا کہ چار پانچ افراد نالا پار کر کے اس مندر کی جانب آ رہے ہیں۔ وامودر کے خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ میں جلدی سے واپس

ابنِ آدم کی نئی کتاب

اُس نوجوان کی داستان مسلسل جو اپنے حق کیلئے جاگیردارانہ نظام سے ٹکرا گیا

جس کو اپنے مفادات کے لیے کٹھن مراحل کا سامنا کرنا پڑا

— ناشر —
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اُردو بازار
لاہور فون ٧٢٣٣٢١٢

— اسٹاکسٹ —
علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ٧٢٢٣٨٥٢

پلنا نیم بے ہوش داسودر کو اپنے کندھے پر لادا اور منڈیر سے نکل آیا۔ ایروگن میرے ہاتھ میں تھی اور ٹارچ میں نے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لی تھی۔ میں اپنے قرب و جوار کے علاقے سے بالکل بے خبر تھا لہٰذا روانہ ہونے سے پہلے سمت متعین کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جدھر کو منہ تھا میں اسی طرف کو چل دیا۔ انجانے جنگل میں انجانے راستوں پر ایک آدمی کے بوجھ کے ساتھ سفر کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چاند کی روشنی مددگار ثابت ہو رہی تھی لیکن کہیں کہیں درخت اتنے گھنے ہو جاتے تھے کہ مکمل اندھیرا چھا جاتا تھا۔ داسودر پر افیون کا اثر ہو گیا تھا اور اس نے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ مگر تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ گہری غنودگی میں بھی اس کے منہ سے "ہائے" نکل جاتی تھی۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں میں نے کم و بیش نصف میل فاصلہ طے کیا اور میرے پاؤں دکھنے لگے۔ داسودر کی پریشانی میں میں اپنی چھوٹی موٹی چوٹیں بالکل بھول چکا تھا۔ میرے دونوں پاؤں ٹخنوں کے پاس سے بری طرح چھلے ہوئے تھے اور زخم ٹھنڈے ہو کر تکلیف دینے لگے تھے۔ لیکن میں رک نہیں سکتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رکنے اور سانس لینے کے لیے یہ جگہ کسی طور مناسب نہیں۔ میری چھٹی حس مجھے مسلسل خبردار کر رہی تھی کہ نادیدہ آنکھیں ہمیں کھوج رہی ہیں اور کچھ پُراسرار سائے ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ ایک جگہ بالکل اچانک مجھے رکنا پڑا۔ اپنے عقب میں قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے سے مجھے کسی کی تیز آواز سنائی دی۔ اس کی کا جواب ایک دوسری آواز نے دیا۔ یہ آواز میرے بالکل سامنے تیس چالیس قدم کی دوری سے ابھری تھی۔ پھر ایک ساتھ کئی ٹارچوں کی روشنی چمکی۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ میری نگاہ ایک گڑھے پر پڑی۔ یہ کافی بڑا گڑھا تھا تاہم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ اور مٹی وغیرہ ڈال کر گڑھے کو پاٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ موجودہ صورتِ حال میں مجھے یہ گڑھا ہی بہترین پناہ گاہ نظر آیا۔ داسودر سمیت میں گڑھے میں اتر گیا اور گڑھے کی دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا۔ خوش قسمتی سے گڑھے کے نصف حصے پر ایک گھنے درخت کا سایہ تھا اور میں اسی سائے میں بیٹھا تھا۔ داسودر کو نرم مٹی پر لٹا کر میں نے "ایروگن" سیدھی کر لی اور چوکس ہو گیا۔ ٹارچیں گڑھے کے آس پاس گردش کر رہی تھیں۔ کبھی نزدیک آتیں کبھی دور چلی جاتیں۔ ان کی حرکت کے ساتھ میری دھڑکنیں بھی کم و بیش ہو رہی تھیں۔ ایک موقعے پر ایک ٹارچ گڑھے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ میں نے انگلی گن کے ٹریگر پر رکھ لی اور گڑھے کی دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ ٹارچ بردار گڑھے سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس نے دور ہی سے ٹارچ کا روشن دائرہ گڑھے پر دوڑایا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ مطمئن ہو کر واپس چلا جائے گا لیکن پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ گڑھے کے کنارے آن کھڑا ہوا۔ وہ ایک پست قد تامل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں رائفل تھی۔ میں اس کے قدموں تلے خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز صاف سن رہا تھا۔ میرا اس کا فاصلہ بمشکل تین فٹ تھا۔ میں نے گن سے اس کے حلق کا نشانہ لے لیا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے رائفل سیدھی کرنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دی۔ میں نے ٹریگر دبا دیا۔ طاقتور کمان سے نکلا ہوا تیر سنسناہٹ کی آواز سے نشانے پر لگا اور وہ شخص لڑکھڑا کر اوندھے منہ گڑھے میں آگرا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے جھاڑ جھنکاڑ کے نیچے دبا کر اس پر اپنا وزن ڈال دیا۔ دو تین منٹ میں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ ایک انگلی موٹا تیر اس کے جبڑے کے نیچے سے گردن میں داخل ہوا تھا اور تالو چیر کر کئی انچ اندر گھس گیا تھا۔ اس کے بچنے کا زیرو فیصد امکان بھی نہیں تھا۔

ٹارچیں اب کچھ فاصلے پر گردش کر رہی تھیں لیکن اب یہ امکان نہیں تھا کہ ٹارچ بردار یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور اس کے بغیر وہ یہاں سے جا نہیں سکتے تھے۔ میں نے گڑھے کا بغور جائزہ لیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ شکاری حضرات ہاتھیوں اور اسی طرح کے دوسرے بھاری بھرکم جانوروں کو پکڑنے کے لیے گڑھے کھودتے ہیں اور پھر ان گڑھوں کو پتلی شاخوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ یہ گڑھا بھی غالباً کسی ایسے ہی مقصد کے لیے کھودا گیا تھا۔ اب مقصد پورا ہو جانے پر اسے پاٹا جا رہا تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ گڑھا میری واحد پناہ گاہ تھا۔ میں نے تامل شکاری کی تلاشی لی۔ اس کے خون آلود لباس سے کوئی قابلِ ذکر چیز برآمد نہیں ہوئی۔ میں نے اسے جلدی جلدی جھاڑ جھنکاڑ اور مٹی میں چھپا دیا۔ پھر اپنے اور داسودر کے جسم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ تامل شکاری کی طرح ہمارے چہرے جھاڑ جھنکاڑ میں دفن نہیں تھے۔

اگلا آدھ گھنٹا بے حد صبر آزما اور پُرخطر تھا۔ ٹارچ برداروں کو اپنے ساتھی کی گمشدگی کا پتا چل چکا تھا اور وہ اب درختوں میں ہر طرف اسے آوازیں دیتے پھر رہے تھے۔ اس کا نام پران تھا۔ پران جس کے "پران" میرے ہاتھوں نکل چکے تھے اور جو اب لاش کی صورت اس گڑھے میں پڑا تھا۔ گڑھے کے اندر سے دور کچھ فاصلے پر مجھے روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ شروع میں میں ان کو بھی ٹارچوں کی روشنیاں سمجھا تھا لیکن یہ ٹارچیں نہیں تھیں، یہ کوئی بستی تھی۔ اس ویرانے میں بستی کی موجودگی تعجب خیز تھی جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ چھوٹی سی ماڈل بستی "ریزورٹ" کے ملازمین کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ اس میں قریباً ڈیڑھ سو گھر تھے۔ بستی پانی، بجلی، ایندھن وغیرہ کے سلسلے میں خودکفیل تھی۔ گڑھے میں بیٹھے بیٹھے میں سوچنے لگا کہ اگر کسی طرح یہاں سے نکل کر بستی تک پہنچ جاؤں تو میرے ساتھ ساتھ داسودر کی جان بھی بچ سکتی ہے۔ داسودر

کو فوری طور پر ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ وہ زیادہ دیر طبی امداد کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بستی تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہاں تک کم و بیش نصف کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ غالب امکان تھا کہ بستی تک پہنچنے اور وہاں کے باسیوں کو متوجہ کرنے سے پہلے پہلے میں ان شکاریوں کی نظر میں آ جاؤں گا جو دیوانوں کی طرح مجھے ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ویسے بھی اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ یقینی بات تھی کہ بستی کے بیشتر مکین اپنے گھروں میں محو خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔ پھر اس بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں جن لوگوں سے رابطہ کروں گا وہ مجھے پناہ دینے پر آمادہ ہوں گے یا نہیں۔ لیکن ان تمام خدشات کے باوجود میرا اس گڑھے سے نکلنا ضروری تھا۔ اس لیے بھی کہ داسودر کی حالت نازک تھی اور اس لیے بھی کہ یہ گڑھا زیادہ دیر شکاریوں کی نگاہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔

داسودر ایک بار پھر بڑبڑانے لگا تھا۔ اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی اور الفاظ ناقابلِ فہم تھے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پانی مانگ رہا ہے۔ وہ سراپا پیاس ایک گھونٹ کے لیے ترس رہا تھا۔ بے بسی کے احساس سے میرا جی چاہا چیخنے لگوں۔ کچھ دیر پانی کے لیے پکارنے کے بعد وہ کسی ناگورے نام کے شخص کو یاد کرنے لگا۔ معلوم نہیں ناگورے مرد کا نام تھا یا عورت کا تاہم یقیناً وہ اس کی کوئی عزیز اور محبوب ہستی تھی۔ داسودر کی سانسوں کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کی خاطر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹارچوں کی روشنیاں میری بائیں جانب تاڑ کے ایک وسیع جھنڈ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بستی کے رخ پر کوئی ٹارچ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ٹارچ نظر نہ آنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہاں مسلح افراد بھی موجود نہیں ہوں گے۔ خطرہ ہر طرف موجود تھا کہیں سامنے نظر آ رہا تھا کہیں چھپا ہوا تھا۔

میں نے ایروگن وہیں گڑھے میں چھوڑ دی اور اس شخص کی تھری ایم ایم رائفل تھام کر گڑھے سے باہر نکل آیا جو چند منٹ پہلے میرے ہاتھوں ابدی نیند سویا تھا۔ تھری ایم ایم میں تیس گولیوں والا میگزین چڑھا ہوا تھا اور وہ بالکل تیار حالت میں تھی۔ داسودر حسبِ سابق میرے کندھے پر تھا اور ٹارچ میں نے پتلون کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا۔ گڑھے میں مچھروں کی بہتات تھی اور انہوں نے پچھلے آدھ پون گھنٹے میں جی بھر کر مجھ سے "محبت" کی تھی۔ ان کی جارحانہ محبت نے میرے جسم میں آگ سی لگا رکھی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ کہیں سرد پانی کا گڑھا ہو اور اس میں کود جاؤں۔ لیکن ایسا گڑھا یہاں کہیں نہیں تھا، اگر ہوتا تو میں سب سے پہلے اس میں سے پانی لے کر داسودر کی پیاس بجھاتا... گڑھے سے نکلتے ہی میں نے بستی کی طرف سفر شروع کیا... قریباً نصف فاصلہ بخیریت طے ہو گیا مگر پھر اچانک قرب و جوار میں ہلچل نمودار ہونے لگی۔ عقب سے کسی نے پکار کر کہا "کون ہے؟" اس کے ساتھ ہی رائفل "ٹاک ٹاک" کرنے کی خوفناک آواز ابھری۔ میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے بھاگتے ہی کوئی سنسنائی زور سے چیخا۔ پھر رائفل کے دھماکے نے جنگل کا سکوت ریزہ ریزہ کر دیا۔ بے شمار خوابیدہ پرندے جاگے اور پھڑپھڑا کر درختوں سے اڑ گئے۔ دوسرا فائر بھی میرے عقب سے ہوا۔ اس مرتبہ گولی میرے بہت قریب سے گزری تھی۔ میں نے رائفل کو سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر رکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے مڑ کر میں نے دو فائر کیے۔ رائفل سے دو شعلے نکل کر تاریک جنگل میں گم ہو گئے۔ ایک دم بہت سی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ میرے عقب میں بھاگ رہے تھے اور ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز یقیناً میلوں دور تک سنی جا رہی ہو گی۔ گھنے درختوں کے سبب میں گولیوں کے "حملے" سے محفوظ تھا۔ ویسے بھی یہ فائرنگ بغیر نشانہ لیے اندازے سے کی جا رہی تھی۔ میں نے بھی پلٹ کر تین چار فائر کیے جو یقیناً رائگاں ہی گئے ہوں گے۔ پھر اچانک فائرنگ رک گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جنگل سے نکل کر بستی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اس بستی کے چھوٹے چھوٹے مکان ایک ہی نقشے پر بنائے گئے تھے اور یہ سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ مجھے اپنے سامنے دس پندرہ مکانوں کی ایک قطار نظر آ رہی تھی۔ جونہی میں ان مکانوں کی اوٹ میں پہنچا، فائرنگ کی "براہِ راست زد" سے نکل گیا۔ مسلسل دھماکوں کے سبب خوابیدہ بستی جاگ گئی تھی۔ کھڑکیاں روشن ہو رہی تھیں اور دروازے کھل رہے تھے۔ میرے عین سامنے ایک گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور ایک تنومند باریش شخص ہاتھ میں خودکار رائفل لیے باہر نکلا۔ میرے ہاتھ میں رائفل اور کندھے پر ایک خون آلود لنگوٹی پوش کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

میں نے داسودر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ پولیس کا آدمی ہے۔ کچھ غنڈے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں.... اس کی جان بچانی ہے۔"

"پولیس" کے حوالے پر باریش شخص کے چہرے پر ہمدردی کے آثار نظر آئے۔ "مگر آپ کون ہیں؟" اس نے بھی انگریزی میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، میرا تعاقب کرنے والے دوڑتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔ جو پہلی ٹولی پہنچی اس میں تین افراد تھے۔ تینوں مسلح تھے اور ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی (جو اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں بھی جل رہی تھی) یہ تینوں افراد غنڈا صورت تھے اور میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان افراد کو دیکھتے ہی باریش شخص کا چہرہ اتر گیا۔ چند لمحے پہلے اس کی آنکھوں میں جو ہمدردی نظر آئی تھی وہ مکمل بیگانگی میں بدل گئی۔ وہ بغیر کچھ کہے الٹے قدموں واپس گھر میں داخل ہوا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے پلٹ کر مسلح افراد کی طرف دیکھا۔ ان کے سیاہ

باکل چکیلے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ نظر آرہی تھی' انہیں دیکھ کر ایک اور قریبی گھر کا دروازہ بھی کھلنے کے بعد بند ہوگیا تھا۔ اس گھر کی ایک بالائی کھڑکی سے خوفزدہ آنکھوں والی ایک عورت نیچے جھانک رہی تھی' پھر وہ بھی کھڑکی کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ مجھے اپنے داہنے ہاتھ پر ایک کشادہ گیٹ نظر آیا۔ گیٹ کے اوپر ایک بورڈ پر بڑے بڑے الفاظ میں "وائلڈ لائف پروٹیکشن سوسائٹی" کے الفاظ درج تھے۔ گیٹ کے اوپر سے مجھے ایک باوردی چوکیدار کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اندازہ ہورہا تھا کہ عمارت میں اور افراد بھی موجود ہوں گے "کوئی ہے؟" میں نے بلند آواز سے کہا اور زور زور سے گیٹ کھٹکھٹایا۔ گیٹ کی دوسری جانب ایک سہمی ہوئی سی خاموشی چھاگئی۔

میرے تعاقب میں یہاں پہنچنے والوں کی تعداد اب تین سے آٹھ ہوچکی تھی۔ ان میں سے اکثر کے پاس ہتھیار تھے۔ ایک کے پاس مجھے بالکل ویسی ہی اریو گن نظر آئی جیسی میں نے گلاب سنگھ نامی شخص سے چھینی تھی۔ یہ لوگ بڑی تضحیک آمیز نظروں سے مجھے گھور رہے تھے جیسے بزبان خاموشی کہہ رہے ہوں کہ بھاگ لو جتنا بھاگنا ہے۔ یہاں کسی میں اتنا دم خم نہیں کہ تمہاری مدد کرسکے.... اور شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ان کی صورتیں دیکھنے کے بعد پوری بستی قبرستان کا نمونہ پیش کرنے لگی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے راموور کو اپنے کندھے پر سہارا دے رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں رائفل تھی اور میں نے اس کا رخ تعاقب میں آنے والوں کی جانب رکھا تھا۔ میں دھیرے دھیرے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی جگہ کھڑے رہے اور مجھے دیکھتے رہے.... اب ایک جیپ بھی ان کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس میں سے مسلح افراد چھلانگیں لگا کر نیچے اتر رہے تھے۔ جونہی میں گلی کے نکڑ پر پہنچا اور مجھے ایک دیوار کی آڑ میسر آئی' میں نے فائرنگ شروع کردی۔ میری چلائی ہوئی پہلی دو گولیاں ایک شخص کی ٹانگوں پر لگیں اور وہ تڑپ کر سڑک پر جاگرا۔ باقی افراد نے بھاگ کر پوزیشنیں لے لیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ پوزیشنیں لیں اور مجھے دائیں بائیں ہونے کا موقع ملے۔ مجھے اپنے عقب میں کچھ فاصلے پر ایک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' یہ ایک سوزکی لوڈر تھا۔ ایک ہراساں شخص ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور ترچھی کھڑی گاڑی کو سیدھا کرکے موقعے سے بھگا لے جانے کی فکر میں تھا۔ عموماً جب کہیں آزادانہ فائرنگ شروع ہوجائے تو لوگ وہاں سے جانیں بچا کر بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ شخص بھی اسی قسم کی کوشش کررہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں نے "مقابلے" سے منہ موڑ کر لوڈر کی طرف دوڑ لگادی۔ کسی شخص کو کندھے پر لاد کر بھاگنا آسان نہیں ہوتا۔ راموور زیادہ وزنی نہیں تھا اس کے باوجود میرے بھاگنے کی رفتار ایک تہائی رہ گئی تھی۔ لوڈر تک کا فاصلہ میں نے حتی الامکان تیزی سے طے کیا اور اس سے پہلے کہ لوڈر سیدھا ہونے کے بعد حرکت میں آتا' میں راموور سمیت اس میں کود چکا تھا۔ فربہ اندام ڈرائیور نے مختصر کیبن کی عقبی کھڑکی میں سے مجھے دیکھا۔ اس کی کھلی کھلی آنکھوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ میں نے اے کے ایم ایم کو حرکت دی۔ رائفل کے آہنی بیرل نے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور ڈرائیور کی کنپٹی سے جا لگا "چلو" میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر کلچ چھوڑا اور گاڑی ایک جھٹکے سے بند ہوگئی۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھما کر اسے دوبارہ اسٹارٹ کیا۔ اسی دوران میں میری نگاہ راموور پر پڑی اور میں سکتے میں رہ گیا۔ راموور مرچکا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی دودھیا روشنی عین اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور پیاسے ہونٹ ادھ کھلے تھے۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران میں میرے کندھے سے چمٹے چمٹے نجانے کب اس نے جان دے دی تھی۔ مجھے راموور کی طرف متوجہ دیکھ کر لوڈر کا ڈرائیور متذبذب ہوگیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور بھاگ نکلا۔ میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جس کی زندگی بچانے کے لیے یہ ساری تگ و دو تھی۔ وہی نہیں رہا تھا۔ تعاقب کرنے والوں نے مجھے لوڈر پر سوار ہوتے دیکھ لیا تھا اور وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اب رائفل میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ انہوں نے فائرنگ کرکے لوڈر کے دونوں عقبی ٹائر برسٹ کردیے۔ پھر ایک شخص قریبی دکان کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے اپنی رائفل میری طرف سیدھی کرکے بولا "ہینڈز اپ"

O☆O

بستی پر چپ کا پہرا تھا۔ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ روشنیاں گل اور در و دیوار سہمے ہوئے تھے۔ مجھے پکڑنے والوں کی تعداد پندرہ بیس کے قریب تھی۔ ان میں زیادہ تر تامل تھے۔ وہ بے حد غضب ناک تھے' شاید ان کے اختیار میں نہیں تھا ورنہ وہ وہیں میری تکا بوٹی کردیتے۔ مجھے ایک جیپ میں بٹھایا گیا۔ راموور کی لاش بھی چادر میں لپیٹ کر جیپ کے عقب میں ڈال دی گئی۔ ایک آٹھ ایم ایم رائفل کی سرد نال میری کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ میرے لباس کی تلاشی لے کر تمام سامان نکال لیا گیا۔ اس میں وہ اشیا بھی تھیں جو میں نے گلاب سنگھ کی تلاشی میں حاصل کی تھیں۔ ان چیزوں کو شناخت کرلیا گیا لیکن کسی نے مجھ سے گلاب سنگھ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گلاب سنگھ ان بھائیوں سے "دستیاب" ہوچکا ہے جہاں میں نے اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑا تھا' ایک تامل غنڈا بڑے غور سے اس رائفل کو دیکھ رہا تھا جو میں نے تھوڑی دیر پہلے پست قد مقتول پر ان کے "مالِ غنیمت" میں سے حاصل کی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اس رائفل کو پہچان گیا۔ رائفل کو پہچانتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچی اور خوفناک

آواز میں غرانے لگا۔ وہ سنہالی بول رہا تھا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن مفہوم واضح تھا۔ وہ مجھ سے اپنے گمشدہ ساتھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر کسی وحشی درندے کی طرح وہ مجھ پر جھپٹ پڑا اور وہ اکیلا نہیں تھا' اس کے دو ساتھی بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ چند زوردار چوٹیں کھانے کے بعد میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ میں نے ایک غنڈے کے چہرے پر طوفانی ٹکر رسید کی اور دوسرے کی ٹانگوں کے درمیان ایسی ٹھوکر ماری کہ وہ تڑپ کر جیپ سے نیچے جاگرا۔ اس کے بعد تو جیسے وہاں زلزلہ آگیا۔ تامل غنڈے میری بوٹیاں نوچنے کے لیے مجھ پر پل پڑے۔ میں نے پوری قوت سے ان کا مقابلہ کیا اور ان کے منہ میں تر نوالے کی جگہ لوہے کے چنے ڈال دیے۔ خود مجھے بھی چوٹیں آئیں لیکن میں نے ہر چوٹ کے بدلے کم از کم تین چوٹیں انہیں لگائیں۔ راموور کا بے جان چہرہ دیکھ کر میرے سینے میں جو الاؤ دہک رہے تھے وہ شعلے بن گئے تھے اور ان کی تپش تامل غنڈوں کو ششدر کررہی تھی۔ بہرطور وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور پوری طرح مسلح بھی تھے۔ بے شک وہ مجھے ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن شدید طور پر زخمی تو کرسکتے تھے۔ لہٰذا جب تین رائفلوں کی نالیں میرے جسم سے آلگیں تو مجھے اپنے ہاتھ روکنے پڑے۔ ان تامل اور سنہالی غنڈوں کا سرغنہ کیسری آنکھوں والا ایک لحیم شحیم شخص تھا' نجانے کیوں مجھے شبہ ہورہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے۔ اس کے حکم پر بپھرے ہوئے غنڈے بھی مجھ سے علیحدہ ہوگئے اور پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر بے حد سرد لہجے میں کہا "ڈونٹ ٹچ۔ ناؤ ٹرن یور فیس" اس کی انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی اور انداز سے ظاہر تھا کہ اگر میں نے اس کا کہنا نہ مانا تو وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ میں نے اپنا رخ جیپ کی طرف موڑ لیا۔ پہلے مجھے ایک قمیص پہنائی گئی پھر میرے ہاتھ رسی سے پشت پر باندھ دیے گئے اور دھکیل کر جیپ پر سوار کروا دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس ماڈل بستی سے نامعلوم سمت میں روانہ ہورہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہ سفر جلد ہی ختم ہوجائے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جیپ ایک بار چلی تو پھر چلتی ہی چلی گئی۔ چار پانچ میل تک آنے کے بعد میرا دھیان اچانک اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف گیا اور ایک نئی پریشانی نے مجھے گھیر لیا۔ میں رینج چیلس سے زیادہ سے زیادہ دس کلومیٹر دور جاسکتا تھا۔ دس کلومیٹر کے دائرے سے نکلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ جیپ اسی طرح رواں رہتی تو میری گھڑی پر کسی بھی وقت وارننگ لائٹ ظاہر ہوسکتی تھی' بلکہ میرے اندازے کے مطابق اب یہ لائٹ ظاہر ہوجانی چاہیے تھی کیونکہ ہم رینج چیلس سے دور ہٹتے جارہے تھے۔ جیپ رواں رہی اور وارننگ لائٹ کا خدشہ میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ سات آٹھ کلومیٹر آگے آنے کے بعد بھی جب لائٹ ظاہر نہیں ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع ہوچکی ہے۔ عین ممکن تھا کہ شیخ عاصم رینج چیلس میں موجود نہ ہو۔ وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں سے میرا فاصلہ اب بھی دس کلومیٹر سے زیادہ نہ ہو۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک امکان موجود تھا' اور یہ امکان ذہن میں آتے ہی میری پریشانی پھر عروج پر پہنچ گئی۔ یہ امکان رسٹ واچ کے خراب ہونے کے بارے میں تھا۔ میری معلومات کے مطابق رسٹ واچ کا وارننگ سسٹم ایک مرتبہ آن ہونے کے بعد آف نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ خراب تو ہوسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ کے دوران میں میری گھڑی خراب ہوچکی ہو۔ یا پھر اس گھڑی میں کوئی نقص واقع ہوگیا ہو جو شیخ عاصم کی منحوس کلائی سے بندھی ہوئی تھی.... مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر ایک بہت وزنی تلوار ایک کمزور دھاگے سے لٹک رہی ہے اور کسی بھی وقت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرے گی۔ غالباً میرے یہ الفاظ اس کربناک کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو میں اس وقت محسوس کررہا تھا۔ جو موت سامنے نظر آرہی ہو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی جاسکتی ہیں لیکن ان دیکھی موت کا اندیشہ اعصاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اگلے آدھ گھنٹے میں میں نے کئی بار موت کا ذائقہ محسوس کیا اور ہر گھڑی مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو میں الیکٹرانک ڈوائس دھماکے سے پھٹنے والا ہے۔ شیخ عاصم نے بڑا انوکھا انتقام لیا تھا مجھ سے.... میں زندہ تھا لیکن ہر گھڑی موت کے سائے میں تھا۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم شہری حدود میں داخل ہوگئے۔ ایک اوور ہیڈ نیون سائن پر میری نظر پڑی۔ لکھا تھا۔ "کولمبو چھ کلومیٹر" ہم کولمبو میں داخل ہورہے تھے۔ کولمبو کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن آج میں اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ تاہم یہ دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے کسی زبردست رقاصہ کو خواب دیکھا جائے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ کسی بھی وقت سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ بادِ صبا کے مسحور کن جھونکوں نے گلی کوچوں کو خواب ناک بنا رکھا تھا۔ ان ویران اور سنسان گلی کوچوں میں جیپ فراٹے بھرتی جارہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی گنجان شہر میں نہیں' خالی دشت پر دوڑے جارہے ہیں۔ جیپ کے پیچھے ایک سفید کار بھی آرہی تھی۔ اس میں بھی تامل غنڈے سوار تھے۔ راستے میں کئی جگہ پولیس کی جھلک بھی نظر آئی لیکن کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی یہ دیکھنے کی زحمت کی کہ جیپ میں ان کے ایک چہیتے بھائی کی لاش پڑی ہے اور اس چہیتے بھائی کے ساتھی کو گن پوائنٹ پر کسی نامعلوم مقام کی طرف لے جایا جارہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک خوبصورت سڑک پر مجھے "ہنی کلب" کا نیون سائن نظر آیا۔ یہ نیون سائن دیکھ کر میں چونک گیا۔ کبھی کبھی کوئی بات بلاوجہ انسان کے ذہن میں آجاتی ہے۔ جیپ "ہنی کلب" کے سامنے رکی تو میری چھٹی حس اعلان کرنے لگی کہ بلونزار کاکا سے میری ملاقات ہونے والی ہے۔ اس سے پہلے

آخری ملاقات رکوانا کے نڈ نائٹ ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی جہاں سے اس کی انگریز محبوبہ نے مجھے اور زریں گل کو فرار کرا دیا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے نائٹ کلب کے وسیع و عریض زمین دوز پارکنگ لاٹ میں پہنچ گئیں۔ رات کے اس پہر لاٹ تقریباً خالی ہی تھا۔ مجھے گن پوائنٹ پر نیچے اتارا گیا اور کئی پیچ در پیچ راستوں سے گزارنے کے بعد ایک چوکور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کمرے میں قالین بچھا تھا اور ضروری فرنیچر بھی موجود تھا۔ ایک دروازے کے سوا کمرے میں اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پارکنگ لاٹ سے نکلنے کے بعد میں نے کہیں بھی زینے نہیں چڑھے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ کمرا بھی "زیر زمین" ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھ سے فوراً پوچھ گچھ شروع کر دی جائے گی اور پران کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عین ممکن تھا کہ اس سلسلے میں مجھے سخت جسمانی تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگلے دن بارہ بجے تک میں بڑے اطمینان سے کمرے میں بند رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ پران کی لاش گڑھے میں سے دریافت ہو چکی ہے اور وہ لوگ فوری طور پر مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے۔

میں سروج اور خاص طور سے راکیش سنگھے کے لیے پریشان تھا۔ سروج' انسپکٹر شاہ کی جیپ میں رہ گئی تھی اور راکیش سنگھے باغیوں کے حملے کے دوران میں بچھڑ گیا تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب انسپکٹر شاہ ایک ہاتھی کے نیچے کچلا گیا تھا اور میرے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ ذہن دو ہچکولے کھا گئی' کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ راکیش سنگھے اور سروج کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گیا ہو۔ واہی ناکی پر ملنے والی آخری اطلاعات کے مطابق جیپ الٹ گئی تھی اور را ئفل مین کے علاوہ سروج بھی جیپ میں پھنسی ہوئی تھی۔ خدانخواستہ سروج کو کچھ ہو جاتا تو سامیں عالی میری جان کو آجاتا۔ وہ اس کی خاص الخاص بھتیجی تھی اور وہ اسے خود میرے حوالے کر کے گیا تھا۔

اچانک مجھے کمرے سے باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے دروازے کے "کی ہول" سے آنکھ لگائی۔ ایک وسیع و عریض ہال نما کمرے کا کچھ حصہ نظر آیا۔ میں نے دیکھا دو تین افراد بہت سی تھیلیاں ایک دوسرے کے اوپر ترتیب سے رکھ رہے ہیں۔ یہ ویسی ہی تھیلیاں تھیں جو میں اس سے پہلے دو تین جگہوں پر دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہاں تھیلیوں کی تعداد کم تھی' یہاں انبار سا لگا ہوا تھا اور ابھی مزید تھیلیاں آ رہی تھیں۔ پھر اچانک مجھے کاکا کی شکل نظر آئی اور میرے تمام خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ کاکا یہیں موجود تھا اور عنقریب میرا اس سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ تاہم فی الوقت تو وہ بہت مصروف اور مگن نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر پریشانی کی گہری پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہا تھا اور اپنے کارندوں کو مختصر ہدایات دے رہا تھا۔

غیر متوقع طور پر اگلے اڑتالیس گھنٹے مجھے اسی کمرے میں گزارنے پڑے۔ چھپے نقوش والی ایک سانولی سلونی ملازمہ مجھے کھانا پہنچا رہی تھی اور دیگر ضروریات کا خیال رکھ رہی تھی۔ وہ جب بھی آتی' اس کے ساتھ ایک مسلح پہریدار ہوتا جو دروازے پر چوکس کھڑا رہتا۔ تیسرے روز مجھے ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کشادہ کمرے میں ایک کھڑکی پر اسٹیل کی چمکدار سلاخیں لگی تھیں۔ کشادہ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا کمرا بھی تھا۔ یہ دونوں کمرے کسی لاک اپ کا منظر پیش کرتے تھے۔ اس "لاک اپ" سے وسیع و عریض ہال کا منظر بھی نظر آتا تھا۔ میں اس لاک اپ میں سروج اور راکیش سنگھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھی "مہمانوں" کی حیثیت سے یہاں موجود تھے' لیکن جس صورت کو دیکھ کر میں سب سے زیادہ حیران ہوا وہ زریں گل کی تھی۔ زریں گل بھی خیر سے وہیں موجود تھا اور ایک گوشے میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے اور ٹھوڑی پر چوٹ کے تازہ نشانات تھے۔ یقیناً اسے یہاں لانے سے قبل مارا پیٹا گیا تھا۔ چار روز پہلے میں زریں گل کو وہیں پیلس میں چھوڑ کر آیا تھا۔ معلوم نہیں وہ یہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ سروج کے چہرے اور ہاتھ پر بھی چوٹ کے نشانات تھے۔

میرا دھیان فوراً جیپ الٹنے والے واقعے کی طرف چلا گیا۔ سروج اس وقت جیپ ہی میں تھی' اس کا زخمی ہونا قابل فہم تھا۔ سروج کے ساتھ را ئفل مین بھی تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سروج سے سب سے پہلے اسی کے بارے میں پوچھا۔ وہ منہ پھلا کر بولی "مجھے نہیں معلوم۔ کل تک یہیں ہمارے ساتھ تھا۔ شام کے بعد دو آدمی اسے لے گئے تھے۔"

میں نے کہا "لیکن تم نے رونے والی شکل کیوں بنا رکھی ہے۔ جو کچھ ہوا اس میں میرا قصور تو نہیں۔"

"سارا دوش میرا ہی ہے" اس نے غصے سے بال جھٹکے اور دور جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے راکیش سنگھے سے پوچھا "یار! یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ بھلی مانس خاتون کیوں برہم ہو رہی ہے؟"

راکیش سنگھے بولا "میں تو سو رہا تھا۔ زریں گل سے پوچھئے۔"

"ہاں بھئی زریں گل کیا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ام کو نہیں معلوم" اس نے ناگواری سے جواب دیا۔

"لیکن خو کے پتر تجھے یہ تو معلوم ہو گا کہ یہاں کیسے آگیا ہے تو؟ میں تو تجھے وہیں پیلس میں چھوڑ کر آیا تھا۔"

"ام نے بھی تو آپ کو پولیس اسٹیشن روانہ کیا تھا' پھر آپ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے" میں نے کہا۔

"سمجھ لیں وہ بھی ایک لمبا کہانی ہے" وہ بے رخی سے بولا۔

"اچھا چل یہ تو بتا سروج کو کیا ہوا ہے؟"

وہ تنک کر بولا "اس کا پوچھتے ہیں' امارا نہیں پوچھتے ام کو کیا ہوا ہے۔ یہ دیکھیں امارا ماتھا۔ یہ نیل نظر نہیں آ رہا ہے آپ کو۔"

میں ٹھٹک گیا۔ اب تک میں یہ سمجھ رہا تھا کہ زریں گل کو کاکا کے کارندوں نے مارا پیٹا ہے۔ جب کہ سروج کی چوٹوں کے ڈانڈے میں "جیپ الٹنے والے واقعے" سے ملا رہا تھا۔ لیکن اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ دونوں قیاس غلط تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے میں تیسری جنگ عظیم ہو چکی تھی اور جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ میرا مطلب زریں اور سروج کی لڑائی سے ہے۔ میرے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے وہ دونوں آپس میں دست و گریباں ہو چکے تھے اور اب اپنی اپنی جگہ بیٹھے بس گھور رہے تھے۔ میں نے زریں گل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ تنک کر بولا "یہ عورت نہیں کوئی بد روح ہے جو ام سے لپٹا ہوا ہے۔ عورت کا کیا کام ہے مردوں سے ہاتھا پائی کرنا اور غنڈہ گردی دکھانا۔"

سروج جلی اور آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی "غنڈہ ہو گا تو۔ تیرے اگلے پچھلے حرامی' تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ میں تجھے [illegible] زمین میں نہ گڑوا دوں تو میرا نام نہیں۔"

زریں گل بولا "ام جانتا ہے بڑا بڑا لوگ یار ہے تیرا' پر ام بھی زریں گل ہے۔"

وہ دانت پیس کر بولی "تیری تو میں..." اور پھر بے قابو ہو کر زریں گل پر جھپٹ پڑی۔

زریں گل بھی کہاں چوکنے والا تھا۔ وہ بھی اصیل مرغ کی طرح جنہ پھلا کر آگے بڑھا۔ قریب تھا کہ دونوں باقاعدہ گتھم گتھا ہو جاتے' میں نے زریں گل کی گردن میں بازو ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا اور پھر دھکیل کر باتھ روم میں پہنچا دیا۔ زریں گل کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں اور منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ دوسری طرف راکیش سنگھے سروج کا راستہ روکے کھڑا تھا' وہ خونخوار بلی کی طرح غرا رہی تھی اور آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ وہ مچل رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ "چھوڑ دو مجھے۔ آج میں اس بدتمیز زمال کی ناک نیچی کر کے رہوں گی۔ کتے کا پلا' سور کا بچہ' پتا نہیں یہ کس خیال میں ہے۔ میرا نام سروج ہے۔ ساری ہوا اس موذی ناک کے راستے نہ نکال دوں تو اپنے پتا کی نہیں۔"

میں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور ڈانٹا تو اس کا اُبال قدرے کم ہوا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور پوچھا کہ کیا بات ہوئی تھی۔

وہ بولی "مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس ساری مصیبت کی ذمے دار میں ہوں۔ میری وجہ سے تم ذلیل خوار ہو رہے ہو..." میں نے کہا' "ہوش کے ناخن لو' میں اب یہاں آئی ہوں۔ تم دونوں پہلے سے جنجال میں پھنسے ہوئے ہو۔" کہنے لگا' "یہ سب تمہاری نحوست ہے۔ تم بمبئی کی منحوس لومڑی ہو... اب بتاؤ شاہ جہاں' ایسی بات

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت : ۸۰/ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ :

ناشر : علی میاں پبلیکشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون : ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ : علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال لاہور
فون : ۷۲۳۳۸۵۳

اپنے ہاکر یا قریبی
بکسٹال سے طلب فرمائیں

پر کوئی چپ رہ سکتا ہے۔ تمہیں کوئی لاہور کا لومڑ کہے تو تم چپ رہو گے؟ میں نے اٹھا کر چائے دانی سر پر دے ماری۔ کتے کی طرح بھونکتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ دیکھو بابی نے یہاں مجھے کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نشان دیکھ رہے ہو نا؟" اس نے اپنے رخسار کی طرف اشارہ کیا "اور یہ دیکھو میرا ہاتھ۔ اسی نے زخمی کیا ہے۔ حرامی' سؤر کی اولاد' مرد بنتا ہے... زنخا کہیں کا۔ کچھ بھی ہو جائے میں تو اب اس کو سبق سکھا کر چھوڑوں گی۔"

میں نے کہا "سروج! تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"میں تالی کی بات نہیں کر رہی۔ اس بے غیرت کی بے غیرتی کی بات کر رہی ہوں۔ خبردار' جو تم میرے اور اس کے بیچ آئے تو۔"

دوسری طرف زریں گل بھی باتھ روم میں شور مچا رہا تھا۔ کبھی وہ دھاڑ رہا تھا' کبھی سروج کو بری بھلی سنانے لگتا تھا۔ اس کی آواز بہت مدھم سنائی دے رہی تھی۔ سروج بولی "تم پوچھ لو ان سب سے' یہ گواہ ہیں۔ تمہارے اس پالتو نے مجھے اغوا کرنے کی دھمکی دی ہے۔ کہتا تھا میں تمہیں اٹھا کر قبائلی علاقے میں لے جاؤں گا۔ دس دس روپے میں تمہیں فروخت کروں گا۔ پوچھ لو ان سب سے' اس نے کہا ہے یا نہیں" سروج نے ان پہریداروں کی طرف اشارہ کیا جو ایک کھڑکی میں سے یہ دلچسپ تماشا دیکھ رہے تھے اور زیر لب مسکرا رہے تھے۔

راکیش سنگھ نے کہا "بی بی! بات دونوں طرف سے بڑھی ہے۔ تم نے بھی تو اسے بے نقط سنائی ہیں.... بہر حال اب اس معاملے کو ختم ہونا چاہیے۔ یہ خود کو تماشا بنانے والی بات ہے۔"

میں راکیش سنگھ کو ایک طرف لے گیا اور اس سے پوچھا کہ اصل بات کیا ہے۔

وہ بولا "دونوں کا قصور ہے۔ بی بی بدکلام بہت ہے اور خان جوشیلا بہت ہے۔ بہر حال یہ بات غلط ہے کہ خان نے اس پر حملہ کیا ہے یا کاٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ خود اس پر جھپٹی تھی۔ خان نے اپنا بچاؤ کیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی دھینگا مشتی میں دونوں کو چوٹیں آئیں۔"

کچھ دیر بعد زریں گل ٹھنڈا ہو گیا تو میں نے اسے باتھ روم سے نکالا اور سختی سے ڈانٹ کر کہا کہ وہ خود پر قابو رکھے۔ میری گہری سنجیدگی دیکھ کر وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے آپہنچا ہے۔ اس نے جواب میں بتایا "ام نے بدھ کی رات صبح تک آپ کا انتظار کیا۔ آپ نہیں آیا تو ام پریشان ہو گیا۔ ام سمجھ گیا کہ آپ ضرور بدمعاش لالہ کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ ام سیدھا "رکوانا" پہنچا اور ونڈر نائٹ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک چھوٹے سے چائے خانے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کے وقت ام نے ونڈر نائٹ ریسٹورنٹ کے ایک بیرے کو دیکھا' وہ پیدل ایک طرف جا رہا تھا۔ ام نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ بس میں بیٹھ گیا' ام بھی بیٹھ گیا۔ بس قصبے سے باہر آخری اسٹاپ پر پہنچی اور سب سواری اتر گیا' خو ام بھی اتر گیا۔ بیرا صاحب شاید اپنے گھر جا رہا تھا' ام اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ آم کے ایک باغ میں سے گزر رہا تھا' ام نے سوچا یہ اچھا موقع ہے' ام اس کو چھاپ لیتا ہے اور جھاڑیوں میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کرتا ہے' وہ بالکل دبلا پتلا تھا۔ پنسل کے ماقت۔ ام نے اس پر بڑے اطمینان سے ہاتھ ڈالا تھا' اور یہ امارا غلطی تھا۔ وہ تو بجلی نکلا' ایک دم ایٹم بم کے ماقت اور گرانے مرانے جانتا تھا۔ اس نے پہلے امارے پیٹ میں کئی بار پھر گھوم کر ایسا ٹانگ چلایا کہ امارا دماغ گھوم گیا اور ام سبحان تیری قدرت کہہ کر زمین بوس ہو گیا۔ اس نے ایک دم آوازیں دے کر کچھ اور لوگوں کو بھی بلا لیا اور ان سب نے مل کر ام کو قابو کر لیا۔"

میں نے کہا "تمہیں کیا ضرورت تھی پنگا لینے کی۔ ہر جگہ اوکھلی میں سر دیتے ہو۔"

وہ بولا "سر ہوتا ہی اوکھلی میں دینے کے لیے ہے۔ اوکھلی سے کیا ڈرنا۔ آپ نے وہ گانا نہیں سنا' غم سے ڈرتے ہوئے دیکھا نہیں دیوانوں کو' یاد کرتا ہے زمانہ انہی انسانوں کو۔"

میں نے کہا "تم ان لوگوں میں شامل ہونا کیوں چاہتے ہو' جنہیں زمانہ یاد کرتا ہے' تم زندہ رہنا کیوں نہیں چاہتے۔"

"چھوڑیں جی آپ اس بات کو" وہ بولا "آپ دیکھیں' امارا یہاں آنا کوئی رائگاں تو نہیں گیا۔ کیا کیا انکشاف ہو رہا ہے ام پر' اور کیا کیا ہونے والا ہے۔"

"کیا انکشاف ہو گیا ہے تم پر؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ" وہ گول گول دیدے گھما کر بولا "یہاں کوئی بہت زبردست گڑبڑ چل رہا ہے جناب! سب لوگ حیران پریشان پھر رہا ہے۔ وقفے وقفے سے اس تہ خانے کا دروازہ کھلتا ہے اور کچھ لوگ کھالوں والی گٹھریاں اور گتے کے ڈبے اٹھا کر اوپر لاتا ہے۔ وہ دائیں طرف والا کمرا بالکل بھر چکا ہے' اب سامان سامنے والے ہال کمرے میں رکھا جا رہا ہے۔ پتا نہیں اتنا سامان یہ لوگ کہاں سے لے کر آ رہا ہے۔ ام کو تو لگتا ہے کہ ان لوگوں نے سری لنکا کے سارے جنگلوں کا صفایا کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ سارے جنگلوں سے ہاتھی' بھیڑیا' لومڑ' ہرن رفیو مار دیا ہے اور ان کا کھالیں والیں اتار کر یہاں جمع کر لیا ہے۔"

بات واقعی سوچنے کی تھی۔ یہ سامان اتنی بڑی مقدار میں یہاں جمع کیوں کیا جا رہا تھا۔ کیا اسے کہیں اسمگل کیا جانا تھا یا کسی اندیشے کے پیش نظر سامان کی یہاں منتقلی ہو رہی تھی۔ یہ بات تو اب طے تھی کہ مشارب اینڈ کو [illegible] کی کھالوں اور ہاتھی دانت کے غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہے اور لالا اس کمپنی کے لیے دست راست کا کردار ادا کر رہا ہے۔ لیکن ابھی تک کمپنی کے اصل لوگوں سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں کچھ دیر زریں گل سے بات چیت کرتا رہا۔ وہ جھگڑے کے باوجود ہمیشہ کی طرح بے فکر اور بلند حوصلہ تھا۔ زریں گل سے فارغ ہو کر میں بغلی کمرے میں سروج کے پاس پہنچا تو وہ بھی اب نارمل ہو چکی تھی۔ اپنے چہرے اور ہاتھوں کی خراشوں پر اس نے کوئی دوا لگائی تھی اور اپنے بکھرے بالوں کو ہیئر بینڈ میں سمیٹ لیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔

"شاہ جہاں پلیز' یہاں سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرو۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ چڑیا گھر میں گھس آئی ہوں۔ ہر طرف حنوط شدہ کھالوں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ یہاں کچھ زندہ جانور بھی موجود ہیں۔ یہ آوازیں سن رہے ہو تم؟" اس نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کان لگائے۔ ایک مدھم سی ناقابل فہم آواز مجھے بھی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس آواز میں۔ جیسے کسی کا منہ ہاتھ سے بند کر دیا گیا ہو اور وہ پورے زور سے چیخنے کی کوشش کر رہا ہو اور یہ ایک آواز نہیں تھی' بہت سی آوازیں تھیں جو کورس کی صورت میں بلند ہو رہی تھیں۔ ان آوازوں کو غور سے سننے کے بعد اعصاب پر ایک وحشت سی سوار ہونے لگتی تھی۔ چھت پر سے دھپ دھپ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں جیسے کچھ جانور اچھل کود کر رہے ہوں یا ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوں۔

میں نے سروج سے پوچھا "تم نے کیا اندازہ لگایا۔ کیسی آوازیں ہیں یہ؟"

وہ بولی "مجھے تو لگ رہا ہے کسی عامل نے بہت سی بدروحوں کو ایک جگہ قید کر رکھا ہے اور وہ اس قید سے بھاگ نکلنے کی فکر میں ہیں۔ تین روز سے ایک لمحے کے لیے بھی یہ آوازیں بند نہیں ہوئیں۔"

میں نے سروج سے پوچھا "وہ گٹھریاں تم نے دیکھی ہیں جو ہال کمرے میں جمع کی جا رہی ہیں؟"

"ہاں" ان میں کھالیں ہیں۔ یہ بہت قیمتی سامان ہے۔ ممکن ہے یہ سب کچھ کہیں اسمگل کیا جا رہا ہو۔ بہر حال تم ان چکروں میں مت پڑو۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ مجھے ان لوگوں کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔"

"تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کے لیے کس کے ارادے اچھے ہو سکتے ہیں" میں نے کہا "یہ بیوقوفی ہے تمہاری کہ منہ اٹھا کر شہر شہر اور ملک ملک گھومتی پھرتی ہو۔ تمہیں کس گدھے نے کہا تھا کہ خراماں خراماں بھوپال سے یہاں چلی آؤ۔"

"تم نے کہا تھا اور کس نے کہا تھا۔ تم جانتے ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جہاں جاؤ گے مجھے بھی وہیں جانا ہو گا۔"

"تو ٹھیک ہے پھر.... میں یہاں ہوں۔ اب رہو میرے ساتھ اور مزے اڑاؤ۔ میرا خیال ہے اچھا ٹائم گزرے گا تمہارا۔"

"مذاق مت کرو۔ یہاں سے نکلنے کا طریقہ سوچو۔"

"تو کیا یہ طے ہے کہ پھنسنے کے طریقے تم نے سوچنے ہیں اور نکلنے کے میں نے.... تمہیں کیا ضرورت تھی سائیں عالی کے ساتھ یہاں آنے کی؟"

"میں بتا چکی ہوں۔ یہ سائیں عالی کا حکم ہے کہ مجھے ہر جگہ اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا ہے۔"

"پھر سائیں عالی سے کہو کہ وہ یہاں سے نکلنے کا طریقہ بھی سوچے۔ تمہاری جان اور آبرو بچانے کی اصل ذمے داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔"

میں رخ پھیر کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ مجھے کھینچ کر واپس کمرے میں لاتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! تم کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ تم راستے سے بھٹک رہے ہو' یہ ہمارا راستہ نہیں ہے اور نہ یہ ہماری منزل ہے۔ ہماری منزل حیدر آباد میں ہے۔ ہمیں وہ چوبیس صندوق تلاش کرنے ہیں جن پر اب صرف اور صرف ہمارا حق ہے۔ ہم اس دولت کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اگر ہم نے اس موقعے پر ہمت ہاری تو ہم سے بڑا بیوقوف کوئی نہ ہو گا۔ پلیز شاہ جہاں! ذرا غور کرو۔ زر و جواہر اور نوادرات سے بھرے ہوئے چوبیس عدد صندوق جن کی مالیت کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ یہ دولت ہماری کون کون سی خواہشات پوری نہیں کرے گی اور اس دولت کی مدد سے ہم کیا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے میں تو کہوں گی' اس مرحلے میں دل چھوڑنا بھگوان کی دیا سے منہ موڑنا ہے' کفران نعمت ہے۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ شاہ جہاں! کیا رکھا ہے اسمگلروں کے تعاقب اور گینگسٹروں سے خون خرابے میں۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے کام ہیں۔ حقیر... بے وقعت۔ ہمیں ایک بڑا کام کرنا ہے۔ بڑا اور ناقابل فراموش۔"

"تم اچھی تقریر کر لیتی ہو" میں نے کہا "لیکن تم ایک بنیادی بات بھول رہی ہو۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور نہ مجھے گینگسٹروں سے سر پھٹول کا کوئی شوق ہے۔ مجھے تمہارے اس چاچے شیخ عاصم نے یہاں پہنچایا ہے۔"

"ٹھیک ہے اس نے پہنچایا ہو گا۔ لیکن اب تمہاری کیا مجبوری ہے۔ تم اس کی قید میں تو نہیں ہو۔ تم چلو میرے ساتھ۔ سائیں عالی ہمیں چوبیس گھنٹے میں واپس حیدر آباد پہنچا دے گا۔ نواب فیروز جنگ کی حویلی میں۔ صندوق اس کی حویلی کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ میں پورے وشواس سے کہہ سکتی ہوں۔"

"لیکن جانا اتنا آسان نہیں ہے" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں کیوں آسان نہیں" وہ تنک کر بولی "غزالہ یہاں ہے نا۔ وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے لیکن تم اب بھی اس کے نام کی مالا جپتے ہو۔ رات دن اس کے غم میں گھلتے ہو۔ اس آس پر زندہ ہو کہ شاید کوئی انہونی ہو جائے اور وہ پھر تمہارے جیون میں آ جائے۔"

مسو فیصد ٹکواس کر رہی ہو تم۔ تمہیں یہاں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ اور نہ یہ جانتی ہو کہ شیخ عاصم نے مجھے کس زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس زنجیر کا نام غزالہ ہے.... غزالہ جو شیخ عاصم کی بیوی ہے اور جس پر تم نظر رکھے ہوئے ہو۔"

"شٹ اپ" میں نے کہا اور میرا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ اچھل کر چہرے پر آگری۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر غرائی "تو باسٹرڈ! تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟"

خونخوار بلی کی طرح اس نے میرا گریبان نوچنا چاہا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ وہ زور لگانے لگی اور کہنیوں کی مدد سے مجھے دھکیلنے لگی۔ کسی زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی وہ۔ جب اس نے پاؤں سے میری پنڈلی پر ضرب لگائی تو میں نے اسے زور سے دھکیل کر بیڈ پر پھینک دیا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ وہ بلند آواز سے رو رہی تھی۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" ایک اڈین پہریدار کمرے کے باہر سے غرا کر بولا "کیا دنگل ہو رہا ہے یہاں؟"

"خوب دنگل تو تمہارے ساتھ ہو گا۔ یہ تو بس ریہرسل ہے۔" زریں گل نے جواب دیا۔

اڈین پہریدار نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر زریں گل کا گریبان پکڑ لیا۔ جواباً زریں گل نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔ قریب تھا کہ ایک نیا ہنگامہ شروع ہو جاتا کہ پہریدار کو اپنے سیاہ فام انچارج کی آواز پڑ گئی اور وہ لڑائی ادھوری چھوڑ کر زریں گل کو لال آنکھوں سے گھورتا واپس چلا گیا۔

زریں گل بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے سروج کو اس وجہ سے تھپڑ مارا ہے کہ وہ اس سے (زریں گل سے) لڑائی جھگڑا کر رہی تھی۔ میں نے زریں گل کی یہ خوش فہمی برقرار رہنے دی اور بڑے کمرے میں بچھی ہوئی ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں رات کا کھانا دیا گیا۔ سروج کمرے میں بند رہی اور اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں چٹائی پر آ لیٹا۔ میرے قریب زریں گل اور اس کے قریب رائیش سنگھے لیٹا تھا۔ میری نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ پُراسرار آوازوں کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ واقعی یوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ ہوائی چیزوں کو کسی عامل نے اپنے عمل کے زور سے ایک حصار میں بند کر رکھا ہے اور وہ بے قرار چیزیں اس حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ آوازیں مسلسل نہیں تھیں، کبھی مدھم ہو جاتی تھیں کبھی تیز۔ کبھی کبھی ان میں چند لمحوں کا وقفہ بھی آ جاتا تھا۔ ان آوازوں پر غور کرتے کرتے نجانے کس طرح میرے خیالات کا دھارا راموور کی طرف بہہ نکلا۔ اس کا دبلا پتلا سانولا چہرہ میری نگاہوں میں آیا اور دل سے ہوک سی اٹھ گئی۔ میں اپنی پوری

کوشش کے باوجود اسے بچانے میں ناکام رہا تھا اور وہ اپنے ہونٹوں پر سمندر کی پیاس لیے راہیِ عدم ہو گیا تھا۔ جب کوئی کہتا ہے کہ اس نے موت کو شکست دی تو وہ غلط کہتا ہے۔ موت کبھی شکست نہیں کھاتی۔ وہ اٹل ہوتی ہے۔

اچانک ہم چونک گئے۔ ہال کمرے کا بیرونی دروازہ زوردار آواز سے کھلا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ شاید گٹھڑیوں کی کوئی اور کھیپ یہاں اسٹور کرنے کے لیے لائی گئی ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس بار دلدہ کاکا کے کارندے کسی "شخص" کو لے کر آئے تھے۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ سلاخ دار کھڑکیاں بند تھیں لہٰذا ہم باہر نہیں جھانک سکتے تھے۔ چند لمحے بعد ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور پہریداروں نے ایک شخص کو بے دردی سے اندر دھکیل دیا۔ میں نے زخموں سے چور اور صدمے سے نڈھال اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر شاد کا راکفل مین تھا۔ جب ہاتھیوں کے غول نے تھلکہ مچایا تو راکفل مین سروج کے ساتھ ہی جیپ میں تھا۔ بعد میں وہ کاکا کے کارندوں کے ہاتھوں پکڑا گیا اور یہاں پہنچ گیا۔ سروج نے بتایا تھا کہ کل شام کاکا کے آدمی اسے پوچھ گچھ کے لیے ساتھ لے گئے تھے۔ راکفل مین کو اندر دھکیل کر دروازہ پھر سے بند کر دیا گیا۔ راکفل مین کے جسم پر نامکمل لباس تھا اور جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔

میں نے اس کے گال تھپتھپائے، چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ زریں گل نے اسے آہستہ آہستہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا "ناگورے! ہوش کرو ناگورے۔"

ناگورے کے نام پر میں چونکا۔ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ تین روز پہلے راموور نے بے ہوشی کے عالم میں اس لفظ کی تکرار کی تھی۔ اس وقت میں نے سمجھا تھا شاید یہ کسی لڑکی کا نام ہے جسے راموور اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ یاد کر رہا ہے۔ میں نے زریں گل سے پوچھا "تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟"

وہ بولا "اس نے خود بتایا تھا۔"

"اور کیا معلوم ہے تمہیں اس کے بارے میں؟"

"ہم کو تو بس یہی معلوم ہے، باقی کا باتیں اس الو کا بچی کو پتا ہو گا۔ وہ بہت گھل مل کر باتیں کر رہا تھا اس سے۔"

زریں گل کا اشارہ سروج کی طرف تھا۔

"تمہارے کان بہت تیز ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو سنا ہی ہو گا تم نے؟"

"بس ہم کو اتنا ہی پتہ چلا تھا کہ ناگورے کوئی کھلاڑی تھا۔ پھر اس کو کھیل چھوڑنا پڑا اور یہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ کوئی مشہور کھلاڑی تھا یہ.... بہت سا انعامات بھی ملا ہوا تھا اس کو۔"

قریباً ایک گھنٹے میں ناگورے کی بے ہوشی گہری نیند میں بدل

گئی۔ اس کے سانس ہموار ہو گئے اور چہرے کی زردی بھی کم ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ کاکا کے کارندوں نے ناگورے سے زبردستی پوچھ گچھ کی ہے۔ اسے بےحد کر کے پیٹا گیا ہے اور کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔ لگتا تھا کہ راموور کی طرح وہ بھی "اے کو" کے غیر قانونی کاروبار کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں شریک رہا تھا اور اس کاروبار کے بارے میں بنیادی معلومات رکھتا تھا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ زریں گل نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور ہم قریب قریب بچھی چٹائیوں پر سو گئے۔ میں نے ایک خاص بات یہ بھی نوٹ کی کہ رائیش سنگھے لنگڑا کر چل رہا ہے۔ اسے لیٹنے میں بھی تکلیف ہوئی تھی۔ سروج ابھی تک ملحقہ کمرے میں بند تھی۔ اس نے کھانا کھایا تھا اور نہ باہر آکر ناگورے کی شکل دیکھی تھی۔ حالانکہ ہماری آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہ جانتی تھی کہ ناگورے شدید زخمی حالت میں واپس آیا ہے۔ غیض میں بہت زہریلی ہو جاتی تھی سروج.... میرا تھپڑ کھانے کے بعد وہ خونخوار بلی کی طرح مجھ پر جھپٹی تھی۔ اس نے میری پنڈلی پر اپنی نوکدار جوتی سے ٹھوکر لگائی تھی اور یہ جگہ اب تک دکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں خیالات کے تانے بانے میں الجھا رہا پھر سو گیا۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کوئی نرم و گداز شے میرے پہلو سے لگی ہوئی تھی۔ کوئی زندہ جسم جس میں حرارت اور جنبش تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، کمرے کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس چیز کی طرف بڑھا۔ چھو کر جیسے میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ سروج تھی۔ میں نے اسے اس کے عریاں کندھوں سے پہچانا۔ وہ بغیر آستین کا کرتہ پہنے ہوئے تھی۔

"کیا بات ہے سروج! یہاں کیوں لیٹی ہو؟" میں نے اس کے کان میں تیز سرگوشی کی۔

اس کا گداز گال میرے کندھے پر دھرا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ میں نے ہلایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی "سروج! یہ کیا بےہودگی ہے؟" میں نے کہا۔

وہ سرگوشی میں بولی "جب تک تم مجھے چھما نہیں کرو گے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی" وہ میرے کان کے بالکل قریب بول رہی تھی۔ اس کی ابھی ابھی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ جاؤ تم" میں نے جواب دیا۔

"شکایت تو تمہارے لہجے سے ظاہر ہے" وہ بولی "... اور شکایت ہونی بھی چاہیے۔ میں نے تم سے اونچا پائی کی ہے، تمہیں ٹھوکر ماری ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پلیز شاہ جہاں! مجھے چھما کر دو۔"

"میرے خیال میں تو تم نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کی" میں نے کہا "میرا تمہارا تعلق ہی کیا ہے۔ مجھے تمہیں تھپڑ نہیں مارنا چاہیے تھا۔"

"چھما مت کہو" اس نے اپنا نرم چہرہ میری گردن سے پیوست کر دیا "بھگوان نے مجھے جیون دیا تھا اور تم نے میرا جیون بچایا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔"

"اچھا اب کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"معافی" اس نے رسان سے جواب دیا "آئی ایم رئیلی ویری ساری شاہ جہاں" اس کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

چند لمحے بوجھل خاموشی طاری رہی، پھر میں نے کہا "ٹھیک ہے، اگر تمہیں احساس ہو گیا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔"

اس کے ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ سر اونچا کر کے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، چند لمحے بعد بولی "نہیں.... میں جانتی ہوں۔ تم اب بھی ناراض ہو۔"

"کیا اس کے لیے اب کوئی بہت بڑی سوگند کھانی پڑے گی؟"

"نہیں.... ایک چھوٹا سا ثبوت" اس کی آواز میں اب ہلکی سی شوخی در آئی تھی۔

"کیسا ثبوت؟"

اس نے سر کے پیچھے سے میرے بال تھامے اور میرا چہرہ اپنے چہرے پر جھکا لیا "یہ کیا حماقت ہے؟" میں نے بےحد مدھم سرگوشی کی "زریں گل ساتھ ہی سو رہا ہے۔ جاگ جائے گا۔"

"صرف ایک بار" وہ بہکی ہوئی سی سرگوشی میں بولی "پھر میں چلی جاؤں گی۔" اس نے اپنے چہرے پر جو دوا لگائی تھی اس کی ہلکی ہلکی بُو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پر بندھی ہوئی سفید پٹی بھی اندھیرے میں اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ اس کے انداز اور لہجے میں ایسی دیوانی کیفیت تھی کہ میرا چہرہ خود بخود اس کے چہرے پر جھک گیا۔ وہ ایک دم بے ترتیب سی ہونے لگی۔ اس کی ہر جنبش میں منہ زور طوفانوں کی ہلچل تھی.... وہ مجھے اپنی بانہوں میں محصور کرتی چلی جا رہی تھی۔ ان تاریک لمحات میں وہ کسی ایسے بارودی ذخیرے کی طرح محسوس ہو رہی تھی جو ایک چنگاری کا اشارہ پا کر پھٹ پڑنے کے لیے بےتاب ہوتا ہے۔ اگر یہ بارود پھٹتا تو ساتھ میں استاد جمالی کی بھی دھجیاں بکھر جاتیں۔ میں نے ایک زبردست کوشش کے ساتھ خود کو سروج عرف ارجمند بانو کے طلسم سے آزاد کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تاریکی میں سروج کے جادوئی سانسوں کی گونج تھی۔ چند لمحے بعد وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ یہاں زیرو پاور کا سفید بلب روشن تھا، سروج کے بال منتشر تھے اور دنیا جہان کا خمار اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ تاہم اب اس کے چہرے پر جذباتی کیفیت نہیں تھی اور نہ ہی لہجے میں وہ لرزش تھی جس نے میرے ذہن میں ایک وحشی گھوڑے کو ایڑ لگائی تھی۔ وہ بڑے تحمل سے بولی "بیٹھ جاؤ شاہ جہاں! میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی

ہوں۔"

میں اس کے سامنے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے منتشر بال سمیٹنے کے لیے ہاتھ اٹھائے تو مرمریں باہیں شانوں سے اوپر تک عریاں تھیں' روشنی میں دمک اٹھیں۔ وہ ایک حسین عورت تھی۔ اس کے حسن میں ایک خاموش دعوت تھی' ایسی دعوت جسے ٹھکرانے کے لیے مرد کے سینے میں لوہے کا جگر ہونا چاہیے۔ وہ اپنے حسن کی اس خاموش طاقت سے آگاہ بھی تھی اور یہی چیز سب سے خطرناک تھی۔ وہ ڈرامائی لہجے میں بولی "شاہ جہاں' اگر میں یہ کہوں کہ ہم کل رات اسی وقت اس جیل منٹ سے بحفاظت نکل سکتے ہیں تو تم کیا کہو گے؟"

میں نے کہا "میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ ہم کیسے نکل سکتے ہیں؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں' میں سب انتظام کر چکی ہوں۔"

"میں اس بے سروپا بات پر یقین نہیں کر سکتا۔"

"یہ بے سروپا بات نہیں ہے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی "اس جیل منٹ کا انچارج ٹونی نام کا ایک شخص ہے۔ میں اس سے مل چکی ہوں۔ وہ آج یا کل رات مجھے پھر بلائے گا۔ میرا خیال ہے' میں اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب رہوں گی۔"

"کس سلسلے میں وہ بلائے گا تمہیں؟"

"تفتیش کے سلسلے میں' اور کس سلسلے میں۔ وہ باری باری ہم سب سے پوچھ گچھ کر چکے ہیں' صرف تمہارا وہ پیارا پالتو خان رہ گیا ہے۔۔۔ سب سے پہلے وہ لوگ راکیش سنگھے کو لے کر گئے تھے۔ تم نے دیکھا ہی ہے وہ ٹھیک سے چل نہیں سکتا۔ پولیس والوں کی طرح انہوں نے اس کی ٹانگوں پر رولر پھیرا ہے۔ ظاہر ہے مارا پیٹا بھی ہوگا۔ راکیش سنگھے کے بعد میری باری آئی تھی۔ انچارج ٹونی پینتیس چالیس سال کا ایک رنگین مزاج شخص ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ اس شخص کو رعب پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ انسپکٹر شاد سے میرا اور راکیش سنگھے کا کیا سمبندھ ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی سمبندھ نہیں۔ میں حوالاتی کی حیثیت سے تھانے میں بند تھی۔ راکیش سنگھے نے ترس کھا کر میری ضمانت دی' ہم شہر جانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر شاد نے ازراہ ہمدردی ہمیں اپنے ساتھ ہی جیپ میں بٹھا لیا۔ بعد میں ہم پولیس والوں کے ساتھ ہی پکڑے گئے۔ انچارج ٹونی بڑے دھیان سے میری باتیں سنتا رہا' میں اسے یہ وشواس دلانے میں کامیاب ہو گئی کہ پولیس والوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انچارج ٹونی مجھ پر مہربان نظر آنے لگا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے اپنے لیے ڈرنک تیار کروایا اور نرم لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے ساتھ پکڑے جانے والے رائفل مین ناگورے سے بے تکلفی پیدا کروں اور پتا چلانے کی کوشش کروں کہ وہ کیا چیز ہے' اس سیوا کے بدلے اس نے مجھے "چھوٹ" دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میرا اندازہ ہے آج یا کل رات تین بجے کے بعد کسی وقت پھر مجھے پوچھ گچھ کے لیے طلب کرے گا۔"

"تین بجے کے بعد کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت یہاں مکمل سکون ہوگا" سروج نے جواب دیا "رات تین بجے کے لگ بھگ نائٹ کلب سو جاتا ہے۔ یہاں جیل منٹ میں بھی صرف دو تین رہ جاتے ہیں۔ ایک انچارج اور دوسرا پہریدار جو ابھی ناگورے کو واپس چھوڑ کر گیا ہے۔ اس کے پاس بالکل نئے ماڈل کی اے کے 47 رائفل ہے' اور میرے اندازے کے مطابق وہ بے حد خطرناک شخص ہے۔"

میں نے کہا "تم رات تین بجے کی بات کر رہی تھیں۔"

"ہاں" وہ دوبارہ موضوع پر آتے ہوئے بولی "تین بجے مکمل سکوت ہوگا اور اگر ٹونی کی نیت میں گڑبڑ ہے تو وہ مجھے تین بجے سے پہلے نہیں بلائے گا۔ میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو۔"

"تم ٹونی کو اپنے آپ میں الجھا کر کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ٹونی نے جس کمرے میں مجھ سے سوال جواب کیے تھے وہاں ایک دیوار پر اس جیل منٹ کی چابیاں لٹکی رہتی ہیں۔ چابیوں کے اس گچھے میں ہمارے لاک اپ کی چابی بھی ہے اور اسی میں دروازے کی چابی بھی جو ہمیں جیل منٹ سے نکال کر پارکنگ لاٹ میں پہنچا دے گی۔ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ گچھا پار کر لوں گی اور تم تک پہنچا دوں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ دیکھو' وہ چھوٹی سی کھڑکی نظر آ رہی ہے؟" سروج نے دس پندرہ گز دور ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "یہ کھڑکی ایک باتھ روم کی ہے اور یہ باتھ روم انچارج ٹونی کے کمرے سے "اٹیچ" ہے۔ میں اسی کھڑکی کے راستے چابیوں کا گچھا تمہاری طرف پھینک دوں گی۔"

سروج کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہمارے لاک اپ کے برابر کمرے میں سلاخ دار کھڑکی لگی تھی' اگر سروج اس باتھ روم کی کھڑکی سے چابیاں ہماری طرف پھینکتی تو اسی فیصد امکان اس بات کا تھا کہ چابیاں سلاخوں سے گزر کر ہم تک پہنچ جاتیں۔ میں نے سروج سے کہا "پہلی بات تو یہ ہے کہ تم انچارج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چابیاں اڑاؤ گی کیسے؟ فرض محال تم نے یہ کر بھی لیا تو جب چابیاں ہماری طرف پھینکو گی تو اس سے آواز پیدا ہوگی' یقیناً وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

وہ بولی "تمہاری پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ جس وقت میں

چابیاں اڑاؤں گی کمرے میں مکمل اندھیرا ہوگا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟ ویسے ایک بالغ کو یہ بات بغیر سمجھائے بھی سمجھ میں آ جانی چاہیے۔ تمہاری دوسری بات کا جواب یہ ہے" اس نے بڑی بے باکی سے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک خوشبودار زنانہ رومال نکال لیا۔ "میں چابیاں اس رومال میں کس کر باندھوں گی' پھر وہ آواز پیدا نہیں کریں گی۔۔۔ میں نے پچھلے تین روز میں اس بارے میں خاصی سوچ بچار کی ہے۔ تین بجے کے بعد کا وقت ٹونی کو سوٹ کر رہا ہے' ہمیں بھی سوٹ کرے گا۔ جیل منٹ کا دروازہ کھولتے ہی ہم پارکنگ لاٹ میں آ جائیں گے۔ وہاں بھی زیادہ سے زیادہ ایک پہریدار ہوگا اور ایک اس کا معاون۔ اگر اے کے 47 رائفل تمہارے قبضے میں آ گئی ہوئی تو ان سے نمٹنے میں تمہیں کوئی کٹھنائی نہیں ہوگی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "سروج! تم اپنے خوبصورت جسم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہی ہو۔ بہت گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ مجھے تمہارے اس منصوبے سے کوئی سروکار نہیں۔"

"تم تکلف کر رہے ہو" وہ بے رحمی سے مسکرائی "ورنہ آزادی تو تم بھی چاہتے ہو۔"

"میں ایسی آزادی پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"اوور ایکٹنگ مت کرو ڈارلنگ۔۔۔ اگر کوئی احسان مجھ پر کرنا ہی چاہتے ہو تو یہ کرنا کہ یہاں سے جان چھوٹتے ہی یہاں کے چکروں سے بھی جان چھڑا لینا۔ کچھ نہیں رکھا ہے ان معمولی گینگسٹروں سے مارا ماری میں۔ سارا جیون بھی لڑتے رہو گے تو کیا حاصل کرو گے؟ کچھ نہیں ملے گا۔ نہ دنیا کا مزہ نہ آخرت کا ثواب۔ ہمارا اصل جیون تو ان صندوقوں میں بند ہے جو حیدر آباد میں ہیں اور کسی بھی وقت کسی ایرے غیرے کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔"

میں سروج کا مزاج اب کسی حد تک سمجھنے لگا تھا۔ وہ جس بات پر اڑ جاتی تھی بس اڑ جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس موضوع پر سر کھپانا فضول ہے۔ رات کے سناٹے میں چھت سے آنے والی پراسرار آوازیں کچھ اور بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ناقابل فہم گونج سی تھی جو کبھی مدھم پڑ جاتی تھی' کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس کے ساتھ بھگدڑ جیسی آوازیں بھی تھیں جیسے بہت سے بچے چھت کے کسی بالائی کمرے میں اودھم مچا رہے ہوں۔ میں نے سروج سے پوچھا۔

"ان آوازوں کے بارے میں رائفل مین ناگورے نے کچھ نہیں بتایا تمہیں؟"

"نہیں' اس نے کیا بتانا تھا؟"

"زرین کل بتا رہا تھا کہ تم ناگورے سے کافی دیر بات چیت کرتی رہی ہو۔۔۔ وہ خاصا بے تکلف ہو چکا ہے تم سے۔"

"ہاں بے تکلف تو ہو گیا تھا۔۔۔ پرسوں انچارج ٹونی کے کہنے پر ہی میں نے ناگورے سے بات چیت شروع کی تھی۔ پہلے تو وہ کافی کھنچا کھنچا رہا لیکن پھر رواں ہو گیا۔ کافی دکھی شخص ہے وہ۔ دردناک حالات سے گزرا ہے۔ شاید تمہیں جان کر حیرانی ہو کہ وہ سری لنکا کی باکسنگ ٹیم کا کھلاڑی رہا ہے اور بہت سے تمغے جیت چکا ہے۔ کھیل کے ماہرین کو ناگورے سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں اور وہ اسے ایشیائی کھیلوں میں بھیجنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے لیکن پھر ایک چھوٹے سے حادثے نے اس کے سارے جیون کو اتھل پتھل کر دیا۔ ایک معمولی سی چوٹ لگی تھی اس کے کندھے پر۔ بعد میں یہ چوٹ ٹھیک ہو گئی۔ کوئی عام شخص ہوتا تو اب تک اس حادثے کو بھول بھی چکا ہوتا لیکن ایک کھلاڑی کے لیے یہ چوٹ جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کا پورا کیریئر متاثر ہو گیا۔ وہ پوری کوشش کے باوجود پہلے کی طرح کھیل میں واپس نہ آ سکا۔ اس کے سارے سپنے ادھورے رہ گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک معمولی کانسٹیبل کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہونے پر مجبور ہو گیا۔"

میں نے پوچھا "یہ راموور کون ہے؟"

وہ بولی "راموور' ناگورے کا بڑا بھائی ہے' وہ بھی پولیس میں ہے۔ حال ہی میں اس کی سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی ہوئی ہے۔ لیکن تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟"

"انسپکٹر شاد سے پتا چلا تھا" میں نے گول مول جواب دیا۔

میں نے سروج کو یہ نہیں بتایا کہ رائفل مین ناگورے کا بڑا بھائی تین دن پہلے راہی عدم ہو چکا ہے اور انسپکٹر شاد کی "زندگی" بھی ایک ہاتھی کے پاؤں تلے کچلی جا چکی ہے۔ سروج اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "راموور اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد پریم کرتا ہے۔ ناگورے اس کی آنکھوں کا تارا اور امیدوں کا سہارا تھا۔ اسے بھروسا تھا ایک دن ناگورے کھیل کے میدان میں نام روشن کرے گا' بہت بڑا کھلاڑی بنے گا' بہت سارا پیسہ کمائے گا اور ان کے سارے دلدر دور کر دے گا۔ باپ کی بیماری' بہنوں کی شادی' ذاتی مکان' یہ سارے مسئلے اس نے ناگورے کی کامیابی تک کے لیے اٹھا رکھے تھے۔۔۔ اور اس کی سوچ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ ناگورے کی شاندار کامیابیوں کے بارے میں کسی کو شک نہیں تھا' سب جانتے تھے کہ وہ بہت نام اور دولت کمائے گا لیکن پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور اس کی وجہ بھی راموور ہی بنا۔ وہ عرصے سے رحمان کالا کے گروہ کے خلاف کام کر رہا تھا۔ کولمبو کے نواحی علاقوں میں کالا کے جو کارندے غیر قانونی شکار کھیلتے تھے وہ ان کے راستے کا پتھر بنا ہوا تھا۔ ایک موقع پر کالا کے کارندوں نے راموور کو سزا دینے کے لیے اس کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ راموور کو مارنے پیٹنے لگے۔ اپنے پیارے محترم بھائی کی جان بچانے کے لیے ناگورے آگے بڑھا۔ لڑائی کے دوران میں ایک ڈنڈے کی ضرب ناگورے کے کندھے پر لگی اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسی زخم نے بعد میں اسے کھیل چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا

جیون بھی کیا ہے کیا ہو گیا۔ وہ جو بہت اونچی ہواؤں میں اُڑنے کے لیے پر تول رہا تھا کیچوے کی طرح رینگنے پر مجبور ہو گیا۔"

سوج کی باتیں سن کر میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب انسپکٹر واسودو ایک گڑھے میں بے ہوش پڑا تھا اور اس کے خشک لب اپنے لاڈلے بھائی کا نام پکار رہے تھے۔ ہر شہر اور قریے میں کیا کیا کہانیاں چھپی ہوتی ہیں۔ سینوں میں کیسے کیسے راز ہوتے ہیں جو لوگ شب و روز اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ دنیا ایک بہت بڑی لائبریری ہے۔ اس لائبریری میں ہزاروں کمرے اور ہر کمرے میں لاکھوں کتابیں ہیں' ہر کتاب چھوٹی بڑی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ واسودو بھی ایک کتاب ہی تھا۔ میں اس کے چند صفحے ہی دیکھ پایا تھا کہ وہ گم ہو گئی۔ لیکن ان چند صفحوں میں بھی میں نے ایک دل گداز کہانی پڑھ لی۔

اچانک کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ سوج کا متوحش بھی یہی تھا۔ کمرے کے آہنی قفل میں چابی گھومی اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اندر آنے والا مسلح پہرے دار تھا۔ وہ شکل سے ہی بے رحم اور قاتل نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی اے کے ۵۶ رائفل تھی جس کا ابھی سوج نے ذکر کیا تھا۔ اس ڈیکس رائفل کی صورت جتنی اچھی تھی' سیرت اتنی ہی بھیانک تھی۔ مسلح پہرے دار کے پیچھے شلوار قمیص والا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ اس کا ایک پہلو بھاری تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بھی قمیص کے نیچے ریوالور یا پستول لگا رکھا ہے۔

دونوں افراد کے لاک اپ میں گھسنے سے جو آہٹیں پیدا ہوئیں' انہوں نے راکیش سنگھے اور زریں گل کو بیدار کر دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے مسلح افراد کی طرف دیکھنے لگے۔

"چھوکری کہاں ہے؟" رائفل بردار نے درشت لہجے میں سنگھے سے پوچھا۔

راکیش سنگھے نے چھوٹے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ دونوں افراد دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے بڑی حریص نظروں سے سوج کو دیکھا پھر رائفل بردار بولا "چلو لڑکی! تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔"

"کس لیے؟" سوج نے بھی انگریزی میں سوال داغا۔

"وہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ یہاں آ کر بھی پوچھ سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔ ابھی تمہاری باری بھی آ جائے گی" شلوار قمیص والا غرایا۔ اس کا ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے پستول پر رکھا تھا۔

اے کے ۵۶ رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ لبلبی پر انگلی کا ہلکا سا دباؤ میرے بدن میں درجنوں گولیاں اتار سکتا تھا۔ "چلنا ہو یا کھینچ کر لے جانا پڑے گا؟" رائفل بردار نے گرج کر کہا۔

سوج منہ میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں اسے لے کر باہر نکل گئے۔ رات کے پچھلے پہر سوج کو "تفتیش" کے لیے لے جاتے دیکھ کر زریں گل نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میں نے انگلی کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ شب کے سوا تین بج رہے تھے۔ سوج کا یہ اندازہ درست نکلا کہ انچارج ٹونی اسے تین بجے کے بعد طلب کرے گا۔ صورت حال ایک دم سنسنی خیز ہو گئی تھی۔ اگر سوج اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتی اور باتھ روم کی کھڑکی کے راستے چابیوں کا گچھا ہمارے لاک اپ میں پھینک دیتی تو ہمارے لیے ضروری تھا کہ فوری طور پر حرکت میں آ جائیں۔ اس صورت میں ہمیں سب سے پہلے رائفل بردار پر قابو پانا تھا اور پھر انچارج ٹونی کی خبر لینی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ زریں گل اور راکیش سنگھے کو بھی تمام صورت حال سے آگاہ کر دوں۔ سوج کا پروگرام سن کر راکیش سنگھے تو خوش ہوا لیکن زریں گل نے بہت برے برے منہ بنائے۔ کہنے لگا "استاد صیب! ام اپنے زور بازو کے ساتھ یہاں سے نکلے کوئی بات بھی تھا۔ یہ کیا ہوا کہ کوئی عورت اماری آزادی کا انتظام کرے اور وہ بھی کسی کے بستر پر لیٹ کر۔ خدا کا مار اس عورت پہ۔ ام کو اس کا یہ گندا احسان منظور نہیں ہے۔"

"وہ اپنی مرضی سے گئی ہے" میں نے کہا "میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ نہیں رکی۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ قطعی طور پر خود ذمے دار ہو گی۔ بہرحال ہمیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

زریں گل پھنکارا "یہ عورت ہے ہی حرافہ۔ ام تو پہلے ہی جان گیا تھا کہ یہ ان عورتوں میں سے ہے جو اپنا آبرو ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا چند ماہ پہلے اس نے فرید کوٹ میں کیا کیا تھا۔ آج پھر یہ اسی طرح کی اسٹوری دُہرا رہی ہے۔"

راکیش سنگھے خاموش بیٹھا تھا۔ ہم اردو بول رہے تھے لہٰذا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ناگورے بدستور گہری نیند میں تھا۔ اس کے زخموں سے بہنے والا خون خود ہی جم کر بند ہو گیا تھا۔

میں نے سلاخ دار کھڑکی کے پٹ کھول دیے اور ہال کمرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سوج مسلح پہرے داروں کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ یقیناً پہرے دار اسے چھوڑ کر جا چکے تھے اور اب وہ انچارج ٹونی کے ساتھ کمرے میں تنہا تھی۔ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچ کر میں ذہن پراگندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال یہ بات عیاں تھی کہ سوج ٹونی کو شراب اور شباب کے نشے میں مدہوش کرے گی اور کوشش کرے گی کہ لاک اپ اور بیرونی دروازے کی چابیاں ہم تک پہنچا سکے۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کے جاں گسل لمحات کی نذر ہو گیا۔ ٹونی کے کمرے کی لائٹ آن تھی یا آف؟ اس کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لاک اپ کی جانب کمرے کی کوئی کھڑکی یا روزن نہیں تھا۔ کوئی آواز یا آہٹ وغیرہ سنائی دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' لاک اپ سے کمرے کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ اس وقت رات کے

قریباً ساڑھے چار بجے تھے جب ٹونی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سوج لڑکھڑاتی ہوئی سی باہر آ گری۔ اس کے بال منتشر تھے اور جسم کے گرد کسی بستر کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں انچارج ٹونی نمودار ہوا۔ وہ ایک چوڑا چکلا سیاہ فام تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ کولٹ پسٹل نظر آ رہا تھا۔ اس نے پسٹل سوج کی طرف سیدھا کیا اور کڑک کر بولا "چلو اٹھو۔"

سوج نے اٹھنے میں تاخیر کی تو اس نے سوج کے بال مٹھی میں جکڑے اور کھینچتا ہوا لاک اپ تک لے آیا۔ ایک جانب سے شلوار قمیص والا شخص نمودار ہوا۔ ٹونی نے چابیوں کا گچھا اس کی طرف پھینکا۔ اس نے آگے بڑھ کر لاک اپ کا دروازہ کھولا۔ سوج ہچکیوں سے رو رہی تھی اور اس نے اپنا چہرہ بازو کے خم میں چھپا رکھا تھا۔

"دھوکا کرتی ہے کتیا" ٹونی دانت پیس کر غرایا "تیرے جیسیاں تو جیب میں لیے پھرتے ہیں ہم۔"

اس نے سوج کو پھر دھکا دیا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتی ہوئی زخمی ناگورے کے قریب آ گری۔ وہ اپنا جسم بمشکل چادر میں چھپائے ہوئے تھی۔ اس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے اور بالائی ہونٹ پھٹ کر متورم ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ اجڑی بکھری لڑکی وہی سوج ہے جو ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے بڑے طمطراق سے کمرے میں بیٹھی تھی اور اپنے تیرِ نظر سے شکار کرنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سوج کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا اور وہ غیر متوقع طور پر آخری مرحلے میں پکڑی گئی ہے۔ ٹونی انچارج کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں اور وہ سوج کو انگریزی اور سنہالی کی منتخب گالیاں دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے بازوؤں میں بجلی سی کوند گئی۔ میں نے دیکھا تھا کہ انچارج ٹونی اور اے کے ۵۶ والا شخص ایک ہی سیدھ میں کھڑے ہیں۔ اگر میں ٹانگ مار کر ٹونی کے ہاتھ سے پسٹل چھڑا دیتا تو رائفل بردار مجھے فوری طور پر نشانہ نہیں بنا سکتا تھا' اگر بناتا بھی تو اس حماقت کا نتیجہ انچارج ٹونی کی موت کی صورت میں نکلتا۔ میں ٹانگ کو حرکت میں لانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کمرے کے بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ انچارج ٹونی دروازے کی طرف گھوما تو رائفل کی زد سے نکل گیا۔ اب مہلک رائفل براہ راست ہماری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ کوئی رسک لینا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ شلوار قمیص والے شخص نے آگے بڑھ کر لاک اپ کا دروازہ مقفل کر دیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

سلاخ دار کھڑکی میں سے ہال کمرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ انچارج ٹونی نے بیرونی کمرے کا دروازہ کھولا تو چار پانچ مزدور گٹھڑیاں لیے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے جلدی جلدی گٹھڑیاں مقررہ جگہ پر رکھیں اور مزید گٹھڑیاں اور گتے کے باکس لینے چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سارا سامان مختلف ڈیوٹی فری شاپس اور سوونیئر شاپس سے سمیٹ کر یہاں لایا جا رہا ہے۔ اور یہ سارا کام بڑی ہنگامی بنیادوں پر کیا جا رہا تھا۔ کام کرنے والوں اور کرانے والوں میں افراتفری کی کیفیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

سوج جہاں کی تہاں پڑی تھی اور بازوؤں میں چہرہ چھپائے سسک رہی تھی۔ بہت توہین آمیز سلوک ہوا تھا اس سے۔ وہ اپنا حسن و شباب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت داؤ پر لگاتی تھی لیکن آج اس داؤ میں اسے مات ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی اور انچارج ٹونی کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو گیا تھا' لیکن جب وہ چابیوں کا گچھا لے کر باتھ روم میں داخل ہوئی تو ٹونی کو شک پڑ گیا۔ وہ اس کے پیچھے آیا اور چابیاں اس سے چھین لیں۔ اس نے سوج کو مارا پیٹا اور دھکے دے کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔

زریں گل اس واقعے پر دل ہی دل میں بہت خوش تھا لیکن اس نے عقلمندی کی کہ اس موقع پر زبان نہیں کھولی' ورنہ اس کی بات تیر کی طرح سوج کے سینے میں لگتی اور ایک نیا ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ مجھے سوج پر غصہ بھی آ رہا تھا اور کسی حد تک ترس بھی.... وہ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتی بھاگتی شرافت اور انسانیت سے بہت دور نکل چکی تھی۔ اب اس کی صرف ایک ہی منزل تھی۔ چنڈی لی کی حویلی سے نکلنے والا دفینہ.... اس منزل تک پہنچنے کے لیے وہ ہر راستے پر سر کے بل چلنے کے لیے تیار تھی۔

سامان کی تین کھیپ تقریباً تین درجن گٹھڑیوں اور گتّے کے باکسز پر مشتمل تھی۔ سامان رکھنے کے بعد مزدور اور کاکا کے کارندے باہر چلے گئے۔ ہال میں ایک بار پھر وہی گنے چنے افراد رہ گئے۔ وہ آپس میں تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی حرکات و سکنات سے بے چینی عیاں تھی۔ کچھ دیر بعد ناگورے بھی بیدار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ سُتا ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس نے پانی طلب کیا۔ زریں گل نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس کا منہ اندر سے بھی زخمی تھا۔ بہت سا پانی اس کی باچھوں سے بہہ نکلا۔ چند گھنٹے پہلے جب کاکا کے کارندے اسے "پوچھ گچھ" کے بعد واپس لاک اپ میں لائے تھے تو اس کے جسم پر پتلون نہیں تھی۔ زریں گل نے اس کی ٹانگیں ڈھانپنے کے لیے ایک کپڑا دھوتی کی شکل میں باندھ دیا تھا۔ اب اس کپڑے پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمودار ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے یہ خون اس کی ٹانگوں کے زخموں کا تھا۔ اس نے ہراساں نظروں سے اپنی خون آلود دھوتی کو دیکھا اور آنکھوں میں کرب کے آثار ابھر آئے۔

میں اس کے قریب بیٹھ کر دھیرے دھیرے اس کی پیشانی سہلانے لگا۔ اس نے نحیف آواز اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا

مس سروج کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "وہ کمرے میں ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اس کے ساتھ تو میرے جیسا سلوک نہیں کیا گیا؟" ناگورے نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔

"میرے بھائی صاحب کا کچھ پتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کون سے بھائی صاحب؟" میں جان بوجھ کر انجان بنا۔

"وامو ور' سب انسپکٹر وامو ور' وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔"

"نہیں' وامو ور صاحب کا ابھی کچھ پتا نہیں چلا۔ شاید وہ بچ نکلنے میں کامیاب رہے ہیں" مجھے دوبارہ جھوٹ بولنا پڑا۔

ناگورے اپنے بڑے بھائی وامو ور کے برعکس ایک تنومند نوجوان تھا۔ اس کا جبڑا مضبوط اور کلائیاں چوڑی تھیں۔ ناک بھی باکسروں کی طرح ذرا چپٹی تھی۔ وہ ایک بنا بنایا باکسر نظر آتا تھا۔ مضبوط اور سخت جان۔ سری لنکا کے بانسوں کی طرح لمبا تڑنگا اور کرارا۔ لیکن کاکا کے غنڈوں نے اس کی جو درگت بنائی تھی اس نے اسے نیم جان کر دیا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں بولا۔ الفاظ ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط تھے۔ اس نے کہا "دھریان کاکا ایک بہت بڑے گروہ کے لیے کام کر رہا ہے۔ یہ گروہ، کھالوں اور ہاتھی دانت کے غیر قانونی کاروبار میں مصروف ہے۔ پورے سری لنکا میں اس گروہ کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ پولیس پچھلے دو ماہ سے ان کے کھوج میں تھی۔ اب ان سب دکانوں اور گفٹ شاپس کی فہرستیں تیار ہو چکی ہیں جو اس گروہ کے زیر اثر ہیں اور ناجائز سامان فروخت کرتی ہیں۔ بہت جلد ان تمام دکانوں اور دکانداروں کے خلاف منظم کارروائی ہونے والی تھی اور وسیع پیمانے پر ناجائز سامان برآمد کرنے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ لیکن میں نے جو کچھ یہاں آکر دیکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کارروائی" کا پروگرام راز نہیں رہ سکا۔ مجرموں کی انٹیلی جنس اپنا کام دکھا گئی ہے اور وہ خطرے سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔ یہ سامان جو دھڑا دھڑ یہاں پہنچ رہا ہے ان دکانوں سے آ رہا ہے جو پولیس کی "ہٹ لسٹ" پر ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک دو روز بعد جب کارروائی ہوگی تو پولیس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

ناگورے کے انکشافات چشم کشا تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ سری لنکن پولیس کے کچھ فرض شناس اہلکار "اے کو" کے خلاف پہلے سے برسرِپیکار ہیں' اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں کہ "اے کو" (ایشارب اینڈ کو) کو پسپائی کا راستہ اختیار کرنا پڑ رہا ہے اور وہ سری لنکا کے طول و عرض سے کاروبار سمیٹنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

میں نے ناگورے سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ سامان یہاں جمع کیوں کیا جا رہا ہے؟"

وہ بولا "صحیح جواب تو بڑے افسری دے سکتے ہیں۔ ہو ہے کہ یہ لوگ تمام سامان سمندری راستے سے ملک سے باہر جا رہے ہوں۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر انہیں تھوڑی سی مہلت مل گئی تو یہ سب کچھ کر گزریں گے۔"

میں نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے' اس موقع پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ناگورے کے چہرے پر پھر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ "ہمیں جلد از جلد اعلیٰ افسران کو باخبر کرنا ہوگا۔ کاش وامو ور سے ہمارا رابطہ ہو سکتا۔"

رات کا باقی حصہ ہم نے جاگتے ہوئے کاٹا۔ ناگورے تکلیف کی وجہ سے مسلسل کراہ رہا تھا لیکن ہم اس کی تکلیف رفع نہیں کر سکتے تھے۔ اگلے روز بھی شام تک ہال کمرے میں مختلف افراد کی آمد و رفت رہی۔ بہت سا مزید سامان بھی لایا گیا۔ کچھ سامان گٹھڑ کے بجائے بڑی بڑی چوبی پیٹیوں میں بند تھا۔ ان پیٹیوں پر گاڑیوں کی بیٹریاں بنانے والی ایک مشہور کمپنی کا نام لکھا تھا۔ بعد میں ایک پیٹی کو ہال کمرے کے اندر کھولا گیا تو اس میں سے وہی کچھ نکلا جو گٹھڑوں میں تھا۔ یعنی جانوروں کی کھالیں۔ پیٹیوں کے اوپر لکھے گئے الفاظ پولیس کو دھوکا دینے کے لیے تھے۔ لاک اپ کی چھت سے کورس کی صورت میں بلند ہونے والی ناقابل فہم آوازیں مسلسل سنائی دیتی رہیں۔ رات آٹھ نو بجے کے لگ بھگ کاکا کی شکل بھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک غیر ملکی شخص تھا۔ کھلے لباس سے پتا چلتا تھا کہ اس کا تعلق امارات سے ہے۔ وہ دونوں باتوں میں اتنے مصروف تھے کہ انہوں نے کسی اور طرف توجہ نہیں دی۔

قریباً دس بجے میں سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کہیں پاس سے شور سا اٹھ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دو افراد ملحقہ کمرے میں گھسے ہوئے تھے اور سروج کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ وہی دونوں افراد تھے جو کل رات اسے لاک اپ سے لے کر گئے تھے۔ سروج مزاحمت کر رہی تھی لیکن یہ مزاحمت دو تگڑے افراد کے سامنے بے کار ہی نظر آ رہی تھی۔ شلوار قمیص والے نے سروج کے دونوں بازو تھام رکھے تھے اور اسے دروازے کی طرف گھسیٹ رہا تھا جب کہ اے کے 56 رائفل والا خطرناک لمبا اسے عقب سے دھکیل رہا تھا۔ "چھوڑ دو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو مجھے" سروج گھٹی گھٹی آواز میں احتجاج کر رہی تھی۔

میں تن کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کل کی بات اور تھی۔ سروج اپنی مرضی بلکہ شدید خواہش کے تحت انچارج ٹونی کے پاس گئی تھی۔ لیکن آج اسے زبردستی لے جایا جا رہا تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں اسے یوں جانے دیتا "کیا بات ہے؟" میں نے رائفل بردار سے پوچھا۔

"اس سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ بڑے صاحب نے بلایا ہے۔ تم بیٹھو اپنی جگہ پر۔ ابھی واپس آ جائے گی یہ" رائفل بردار نے جواب دیا۔

میں نے گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "تمہارے صاحب کو رات تین بجے کے بعد "پوچھ گچھ" بہت یاد آتی ہے۔"

میرے طنزیہ لہجے نے رائفل بردار غنڈے کو آگ بگولا کر دیا۔ شعلہ فشاں لہجے میں بولا "زرا چھتری تلے سانس لو۔ ابھی تمہاری باری بھی آ جاتی ہے پوچھ گچھ کے لیے۔"

اس نے سروج کو دوبارہ گھسیٹنا چاہا تو سروج نے اس کے ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ اس نے جھنا کر تھپڑ مارا۔ سروج لڑھک کر میرے پاس آ گری۔ اب راکیش سنگھے اور زریں گل بھی بیدار ہو چکے تھے۔ ناگورے اپنی جگہ لیٹا تھا اور روڑی ذری نظروں سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو رائفل بردار نے اپنی خود کار رائفل پھرتی سے میری طرف سیدھی کی اور سفاک لہجے میں بولا "خبردار ایک قدم بھی بڑھایا تو۔"

اس کی انگلی لبلبی پر تھی۔ میں اپنی جگہ رک گیا۔ شلوار قمیص والے نے میرے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہا' میں نے پیچھے کی طرف جھک کر یہ وار بچایا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے مغلظات کا دھارا بہہ نکلا۔ بڑے خطرناک انداز اور بے حد پھرتی سے اس نے اپنا کولٹ پسٹل نکال کر میری طرف سیدھا کیا۔ انداز گولی مارنے والا ہی تھا۔ اس کے پسٹل پر سائلنسر لگا تھا۔

"ڈونٹ شوٹ" رائفل بردار چلّایا۔

شلوار قمیص والا ٹھٹک گیا تاہم اس نے اپنے پسٹل کا رخ بدستور میری پیشانی کی طرف رکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ رائفل بردار اور شلوار قمیص والے کی تمام تر توجہ اب میری طرف تھی۔ ان لمحوں میں وہ سروج کو یکسر بھول چکے تھے۔ رائفل بردار میری طرف دیکھ کر غرایا "چلو' پہلے تم ہی چلو۔"

"کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"پوچھ گچھ کے لیے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"چلو" میں نے بڑے اطمینان سے آمادگی ظاہر کی۔

مجھے لاک اپ سے باہر نکال کر دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ اطراف میں گہری خاموشی طاری تھی۔ رائفل بردار اور شلوار قمیص والے نے مجھے بڑی احتیاط سے کوَر کر رکھا تھا۔ وہ مجھے لے کر انچارج ٹونی کے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں دھاوا بولنے کے لیے تیار تھا لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ حسب توقع انچارج ٹونی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ ایک طویل صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے شیشے کی تپائی پر شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ نشے کی وجہ سے تمتما رہا تھا۔ اس کے قریب ہی میز پر ایک رنگین ٹیلی وژن رکھا تھا۔ ٹیلی وژن پر ایک بہت بڑے اور خوبصورت ڈانسنگ ہال (رقص گاہ) کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اس رقص گاہ میں سیکڑوں جوڑے موجود تھے۔ کچھ میزوں کے گرد بیٹھے تھے۔ کچھ آرکسٹرا کی دھن پر پاؤں تھرکا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اسی کلب کا منظر ہے جو سنارٹ سرکٹ ٹی وی پر نظر آ رہا ہے۔ انچارج ٹونی سنہالی زبان میں کچھ بولا۔ غالباً اپنے کارندوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکی کی جگہ مجھے کیوں لے آئے ہیں۔

کارندوں نے اپنی زبان میں میری خود سری کا ذکر کیا۔ ٹونی کا تمتمایا ہوا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر شکستہ انگریزی میں بولا "بڑا شوق ہے تمہیں پوچھ گچھ کے لیے پیش ہونے کا؟" اس کا لہجہ طنز سے معمور تھا۔

"ملزم ہوں۔ ملزم سے تفتیش تو ہوتی ہے۔ مجھ سے ہوگی تو کون سی انوکھی بات ہوگی۔"

"لیکن تمہارا جرم چھوٹا نہیں ہے۔ تم سے تفتیش زرا اعلیٰ سطح پر ہوگی۔ تفتیشی افسر ماسٹر کاکا خود ہوں گے۔ اپنے ہاتھوں سے تمہاری کھال ادھیڑیں گے اور سر کی نزائی بنائیں گے۔"

"لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ یہ کن جرائم کی سزا ہوگی؟"

"جرائم کی فہرست تو طویل تھی لیکن چند موٹے موٹے جرائم تمہیں بھی ازبر ہوں گے۔ تمہارا سب سے پہلا اور دھماکا خیز جرم یہ تھا کہ تم مڈنائٹ ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور وہاں ہنگامہ کرنے کی جرأت کی۔ اس کے بعد تم نے کاکا کے ذاتی ڈرائیور رامرناتھ کو شدید زخمی کیا اور جیون جی کی اذیت ناک موت کا سبب بنے۔ بعد ازاں تم نے وہنی پیلس میں ہمارے دو ساتھیوں کو زخمی کیا اور ان میں سے ایک کی ٹانگ کاٹنا پڑی کیونکہ اس کی ٹانگ پر زہریلی کرپان کا گھاؤ لگ گیا تھا۔ میرا خیال ہے' تمہیں یہ سب باتیں بھولی نہیں ہوں گی۔ ابھی صرف پانچ دن پہلے وائلڈ لائف ریزرو میں تم ہمارے ایک ساتھی کو شدید زخمی اور دوسرے کو ہلاک کر چکے ہو۔ اور ان سب جرائم کے علاوہ تمہارا ایک جرم یہ بھی ہے کہ تم نے وہنی پیلس کی ملازمہ اروشی کو ماسٹر کاکا سے غداری پر اکسایا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔"

میں نے کہا "میں تمہاری ہربات کا جواب دے سکتا ہوں' لیکن تم خود ہی بتا چکے ہو کہ اصل "آدمی" کاکا ہے' تمہاری حیثیت چمچے سے زیادہ نہیں۔"

ٹونی نے دانت پیس کر میری طرف دیکھا۔ پھر سنہالی میں رائفل بردار سے کچھ کہنے لگا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اشاروں کنایوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے کارندوں سے لڑکی کو لانے کے بارے میں کہہ رہا ہے اور میرے بارے میں حکم جاری کر رہا ہے کہ مجھے واپس لاک اپ میں بند کر دیا جائے۔

دونوں مسلح افراد نے فوری طور پر اس حکم کی تعمیل میں حرکت کی۔ پسٹل والے نے پسٹل کے اشارے سے مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں الٹے قدموں واپس ہوا اور دروازے سے نکل آیا۔ پسٹل

بردار میرے عقب میں تھا۔ رائفل والا اس کے پیچھے آرہا تھا۔ کمرے سے نکل کر ہم لاک اپ کی طرف آٹھ دس قدم ہی گئے تھے کہ مجھے وہ موقع مل گیا جس کا میں دیر سے منتظر تھا۔ غلط یا بے پروائی میں پسٹل بردار نے میرا اور اپنا درمیانی فاصلہ کم کردیا۔ ایسے مواقع پر پاؤں سلپ کرنے کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ میرا جو پاؤں زمین پر پڑا وہ میں نے سلپ کردیا۔ بالکل جیسے پاؤں فرش پر نہیں کیلے کے چھلکے پر پڑا ہو۔ ایک سیکنڈ کے مختصر ترین حصے میں میں فرش پر گرا اور چت لیٹ گیا۔ پسٹل بردار نے اضطراری حرکت کے تحت فائر کیا۔ گولی چلنے سے بہت پہلے میں نیچے گر چکا تھا اور میرے دونوں ہاتھ پسٹل بردار کے ٹخنوں پر تھے، میں نے ایک جھٹکے سے اسے نیچے گرایا۔ وہ پشت کے بل گرا اور چت ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرے فائر کے لیے پسٹل کا رخ میری طرف موڑتا، میں نے کروٹ لے کر خود کو اوندھا کیا اور پھر جست لگا کر پسٹل بردار پر سوار ہوگیا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے پسٹل پر تھے اور انگلی پسٹل کی لبلبی تلاش کررہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہوگیا تھا۔

جونہی دوسرے شخص نے اپنی اے کے ۵۶ میری طرف سیدھی کی اور گولی چلانے کا فیصلہ کیا، میں نے پسٹل کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ پسٹل ابھی تک پسٹل والے کے ہاتھ میں تھا اور اس کا رخ بھی الٹا تھا، یعنی ٹریگر۔ اوپر کی طرف تھا لیکن اس سے رائفل بردار کو نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ میں نے گولی چلائی۔ سائلنسر لگے پسٹل سے "ٹھک" کی آواز آئی اور ۳۸ بور کی گولی عین رائفل بردار کے دل کے مقام پر لگی۔ وہ کسی بے جان پتلے کی طرح فرش پر گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ میں نے رائفل تک پہنچنے میں جلدی نہیں کی کیونکہ اردگرد رائفل کا کوئی دعویدار پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے زور لگا کر پسٹل کا رخ موڑا اور تیسرا فائر کیا۔ یہ گولی میرے نیچے دبے ہوئے شخص کی گردن میں لگی اور آر پار ہوگئی۔ پسٹل پر سے ایک دم اس کی گرفت ختم ہوگئی۔ میں نے پسٹل چھین کر ایک اور فائر مدمقابل کے سر پر کیا اور اسے ٹھنڈا کردیا۔ لاک اپ میں سے زریں گل اور سروج سمیت تمام افراد یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دو افراد کی خونچکاں تڑپتی لاشیں دیکھ کر سروج کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ زریں گل نے "زندہ باد استاد" کا پرجوش نعرہ بلند کیا۔ عین اسی وقت انچارج ٹونی کے کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور وہ بوکھلایا ہوا باہر نکلا۔ میں اس وقت تک پسٹل پھینک کر اے کے ۵۶ اٹھا چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل اور اپنے ساتھیوں کو زمین بوس دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے وا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ میں لپک کر اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ممکن تھا کہ میں فائر کردیتا لیکن عین وقت پر میرا دماغ کام کرگیا، رائفل پر سائلنسر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں فائر کرتا تو آواز نہ صرف سارے "بیس منٹ" میں گونجتی بلکہ بہت ممکن تھا کہ باہر بھی سنی جاتی۔ آواز باہر سنی جاتی تو رقص گاہ میں موجود مرد و زن چونک جاتے اور عجیب بات تھی کہ پہریدار "بیس منٹ" کی طرف بھاگتے... میں نے فائر کا ارادہ ترک کیا اور رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا۔ رائفل کی زوردار چوٹ انچارج ٹونی کی کنپٹی پر لگی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے رائفل ہی سے دوسری ضرب لگائی۔ اس مرتبہ ٹونی بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا۔ وزنی رائفل اور ٹھوس دیوار کا پرشور تصادم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹونی نے میرے پیٹ میں ٹانگ رسید کی۔ وار خالی جانے کے صدمے نے میرا غصہ دوچند کردیا تھا، رہی سہی کسر پیٹ کی چوٹ نے پوری کردی۔ میں نے تاک کر ٹونی کے "کلیجے" میں ٹھوکر ماری۔ وہ ڈکراتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا تھا۔ مارشل آرٹ کے کھلاڑی جانتے ہیں کہ سینے کی سامنے والی ہڈی کے نیچے نرم جگہ لگنے والی یہ ضرب کتنی خطرناک ہوتی ہے اور اس ضرب سے بچنے کے لیے کھلاڑیوں کو کس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ انچارج ٹونی یہ ضرب کھانے کے بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوچکا تھا اور عین ممکن تھا کہ یہ بے خبری ابدی ہو۔

میں رائفل تھام کر دیوار کے ساتھ چوکس کھڑا رہا۔ بیس منٹ میں اگر کوئی اور شخص موجود تھا تو اسے اب سامنے آجانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیس منٹ میں اور کوئی نہیں تھا۔ ہم ان لمحات میں بلاشرکت غیرے اس بیس منٹ کے "مالک" تھے اور بیس منٹ کے ساتھ ساتھ اس بے شمار قیمتی سامان کے بھی جو سٹیل ہال کمرے میں اسٹور کیا گیا تھا۔ میں چند سیکنڈ کے توقف کے بعد ٹونی کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں ابھی تک شارٹ سرکٹ ٹی وی چل رہا تھا اور گراؤنڈ فلور پر واقع رقص گاہ کے ہیجان خیز مناظر اسکرین پر نمودار ہورہے تھے۔ اب بہت سے مرد و زن اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہوچکے تھے اور والہانہ رقص کا ساتھ دے رہے تھے۔ کبھی کبھی اسکرین پر کسی ہوشربا منظر یا بہت حسین چہرے کی تصویر منجمد ہوجاتی تھی۔ موسیقی کا شور اپنے جوبن پر تھا۔ میں نے ایک میز پر سے چابیوں کا گچھا اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے میں نے لاک اپ کا دروازہ کھولا۔ زریں گل، سروج اور راکیش سنگھے تڑا مار کر باہر نکل آئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ ٹونی اور اس کے آنجہانی ساتھیوں کی تلاشی لیں۔ جب وہ تلاشی لے رہے تھے، میں نے بیس منٹ کی سیڑھیاں تلاش کرلیں۔ یہ سیڑھیاں بیس منٹ سے باہر نہیں نکلتی تھیں بلکہ بیس منٹ ہی کی دوسری منزل پر واقع کمروں تک جاتی تھیں۔ یہی کمرے جن میں کوئی جاندار مخلوق بند تھی اور جس کی پراسرار آواز کی گونج سروج اور راکیش سنگھے پچھلے چار روز سے سن رہے تھے۔

زریں گل اور سنگھے نے مجھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی لپکتے ہوئے آگئے۔ کے ہاتھ میں شلوار قمیص والے کا خون آلود پسٹل اور زریں کے پاس ٹونی کا ریوالور تھا۔ ان کے

چہرے جنس کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ سورج وہیں کھڑی تھی اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ کل چار کمرے تھے۔ آگے بالکونی سی بنی ہوئی تھی۔ درمیان والے دو کمروں کے دروازے مقفل نظر آتے تھے۔ میں ان دروازوں کے سامنے پہنچا تو ناقابلِ فہم گونج زیادہ واضح سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ناموس بُو بھی محسوس کی۔ یقیناً یہ حیوانی بُو تھی۔ زریں گل نے دروازوں کی نچلی درز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ دیکھیے استاد صیب! کسی جانور کا پیشاب لگتا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ بدبُودار زرد مائع یقیناً کسی جانور کا پیشاب تھا۔ ایک دروازے کے نیچے سے بہنے والے پیشاب کی مقدار زیادہ تھی اور وہ بالکونی میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ زریں گل نے تشویش ناک لہجے میں کہا "استاد صیب! امارے والے ریوالور میں صرف دو گولی ہے۔ اگر یہاں خطرے سطرے والا کوئی بات ہے تو امارے پر زیادہ بھروسا نہ کرنا۔"

سنگھے بولا "گولیاں تو میرے پسٹل میں بھی صرف دو ہیں لیکن میرا خیال ہے یہاں گولی چلانے کی نوبت نہیں آئے گی۔"

زریں نے پوچھا "سنگھے صاحب کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا "وہ کہتا ہے شاید یہاں گولی چلانے کی نوبت نہ آئے۔"

زریں بولا "امارا بھی یہی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے اندر کوئی ہوائی چیز ہو اور ہوائی چیزوں پر گولی تو کیا گولا بھی بیکار ہوتا ہے۔"

سورج نیچے دو لاشوں کے درمیان کھڑی تھی اور سخت ہراساں تھی۔ چیخ کر بولی "تم کیوں خواہ مخواہ مصیبت مول لے رہے ہو۔ واپس آجاؤ۔"

میں واپس جانے کے لیے اوپر نہیں آیا تھا۔ محتاط قدموں سے میں ایک کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ رائفل کی نال سے کھڑکی پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بند تھی۔ دروازے کو دھکیلا۔ حسبِ توقع وہ بھی مقفل تھا۔ میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ ایک حیرت ناک منظر میرے سامنے آیا۔ ایک لمبوترے ہال نما کمرے میں بہت سے بندر بند تھے۔ سرخ آنکھوں اور سیاہی مائل بالوں والے یہ جسیم بندر شکل سے ہی خونخوار اور خطرناک نظر آتے تھے۔ ان کے رخساروں پر ہلکی نیلی دھاریاں سی تھیں۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب ہم نے رانکلو لائف ریزرو میں چاندنی رات میں جھاڑ جھنکاڑ کے پیچھے بہت سے آہنی پھندے سے دیکھے تھے۔ راسپور نے بتایا تھا کہ یہ پھندے ایک نایاب قسم کے بندر کو پکڑنے کے لیے لگائے گئے ہیں۔ یقیناً یہ وہی نایاب بندر تھا جو درجنوں کے حساب سے اس کمرے میں بند تھا۔ کم و بیش دو درجن بندر اس کمرے میں موجود تھے۔ ان سب کے چہروں پر ایک "چمڑی بندش" سی تھی۔ یہ بندش بالکل اسی طرح چہروں پر چڑھائی گئی تھی جس طرح شکاری کتوں، گھوڑوں یا بھینس گائے کے بچھڑوں کی تھوتھنی پر چڑھائی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ جانور کسی بھی مقصد کے لیے اپنا منہ نہ کھول سکیں۔ ان بندروں کے منہ بھی سختی سے بند تھے۔ وہ اپنی فطری جبلت کے تحت غرغرانے اور چیخنے چلانے کی کوشش کرتے تھے لیکن منہ بند ہونے کی وجہ سے یہ آواز ان کے اندر ہی گونج کر رہ جاتی تھی اور جو تھوڑی بہت نکلتی بھی تھی وہ ناقابلِ فہم محسوس ہوتی تھی۔

میرے بعد زریں گل اور سنگھے نے بھی یہ منظر دیکھا اور حیرت زدہ ہوئے۔ مختصر سی جگہ میں محبوس جانور ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ کبھی کھڑکیوں سے چمٹتے تھے کبھی ایک دوسرے سے الجھتے تھے۔ ان کا پیشاب اور فضلہ پورے کمرے میں بکھرا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جانوروں کی غیر معمولی بے قراری کی ایک وجہ بھوک بھی ہے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں یہاں بند کرنے والوں نے دوبارہ مڑ کر ان کی خبر نہیں لی۔ شاید اپنی افراتفری میں وہ لوگ ان بے زبانوں کو بالکل ہی بھول گئے تھے۔ یا پھر وہ انہیں "آج کل" میں کہیں اور منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں بھی بالکل اسی نسل کے تین چار درجن بندر موجود تھے۔

"یہ کیا چکر ہے راکیش سنگھے؟" میں نے پوچھا۔

راکیش سنگھے کے چہرے پر سنسنی اور حیرت کے آثار تھے۔ وہ بولا "یوں لگتا ہے کہ یہ لوگ ان جانوروں کو بھی اس سامان کے ساتھ ہی کہیں بھیج رہے ہیں۔ یہ بہت کمیاب نسل کے جانور ہیں اور یقیناً بہت قیمتی بھی ہوں گے۔"

زریں گل بولا "استاد صیب! ام کو زیادہ دیر نہیں کرنا چاہیے۔ کسی بھی وقت کوئی پہرے دار تہ خانے میں جھانک سکتا ہے۔"

"لیکن باہر نکلنا بھی تو آسان نہیں" میں نے جواب دیا "خاص طور سے جب تک ڈانس پارٹی ہو رہی ہے۔ اس پارٹی کا ہنگامہ ختم ہو تو پھر نکلنے کے بارے میں سوچیں گے۔"

"مگر اس دوران میں کوئی آگیا تو؟" زریں گل نے پوچھا۔

"تو اسے لمبا لٹا دیں گے" میں نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے تیس منٹ کا ایک چکر لگائیں" سنگھے نے تجویز پیش کی۔

ہم نیچے اترے اور اس وسیع ہال میں جا پہنچے جہاں گٹھڑیوں کے انبار لگے تھے اور دیگر سامان پڑا تھا۔ جانوروں کی بیش قیمت کھالوں کے علاوہ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی بے شمار دلکش چیزیں اس سامان میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف جانوروں کے سینگ تھے اور کئی ٹن خام ہاتھی دانت تھا جسے احتیاط سے لکڑی کے ڈھانچوں میں "پیک" کیا گیا تھا۔ ایک بہت بڑے باکس میں ہم نے مختلف جانوروں از قسم شیر، ہرن، بارہ سنگا وغیرہ کے سروں کی ممیاں بھی دیکھیں۔ یقیناً اس قسم کے اور باکسز بھی سامان میں موجود ہوں گے

اس سامان کے معائنے کے دوران میں ہی میری نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی "اے کے ۴۷" رائفل پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ گن کی وہ "میکانزم" جس سے میگزین اٹیچ ہوتا ہے، ٹیڑھی ہو چکی تھی۔ میں نے میگزین علیحدہ کرنا چاہا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے علیحدہ ہو گیا۔ بادی النظر میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ گن ناکارہ ہو چکی ہے۔ انچارج ٹونی سے دست بدست لڑائی کے دوران میں گن بڑے زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ یہ نقص غالباً اسی وقت نمودار ہوا تھا۔ زریں گل اسلحے کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ گن کی "صورتِ حال" دیکھ کر اس کا چہرہ بھی لٹک گیا۔ یہ گن فی الوقت ہمارے لیے بے کار تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں صرف ایک پسٹل اور ایک ریوالور کے ساتھ اس خطرناک جگہ سے نکلنا ہے۔ (اور ان دو ہتھیاروں میں بھی ٹوٹل چار گولیاں تھیں) ہم نے مزید گولیوں اور اسلحے کی تلاش میں ٹونی کے کمرے کو کھنگالا لیکن ناکامی ہوئی۔ اچانک ایک آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ یہ بزر کی آواز تھی اور تیس منٹ کے اس دروازے کی طرف سے آئی تھی جو پارکنگ لاٹ میں کھلتا تھا۔ پانچ روز پہلے میں اسی دروازے سے تیس منٹ میں لایا گیا تھا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا یہ جدید دروازہ تقریباً دس ضرب چھ فٹ کا تھا۔ قفل میں چابی گھمانے کے بعد ایک بٹن دبایا جاتا تھا اور دروازہ خودکار طور پر کھلتا تھا۔ اس وقت یہ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ اسی طرح کا ایک اور دروازہ تیس منٹ کی شمالی دیوار میں بھی واقع تھا۔

بزر مسلسل بج رہا تھا اور ہر بار جب بزر بجتا تھا، دروازے کی پیشانی پر ایک سرخ بتی روشن ہو جاتی تھی۔ سورج کے چہرے پر گہرا خوف نظر آنے لگا۔ وہ دو لاشیں دیکھ چکی تھی اور اب اسے لگ رہا تھا کہ مزید لاشیں دیکھنی پڑیں گی۔ سنگھے کا چہرہ بھی تشویش ظاہر کر رہا تھا۔ تاہم زریں گل بالکل پُرسکون تھا۔ میں نے سنگھے کا پسٹل ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اب بزر کے ساتھ ساتھ دروازے کو ہاتھ سے بھی بجایا جانے لگا تھا۔ میں نے دروازے کے "کی ہول" سے آنکھ لگائی۔ دوسری جانب ٹیوب کی دودھیا روشنی میں مجھے پریشان کن منظر نظر آیا۔ دو افراد سروں پر کھالوں والی گٹھڑیاں اٹھائے کھڑے تھے، ان کے عقب میں تین مسلح پہرے دار نظر آرہے تھے، چوتھا پہرے دار بار بار دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ مختصر کی ہول سے یہی کچھ نظر آرہا تھا۔ یقیناً ارد گرد مزید افراد بھی موجود تھے۔

دروازہ کھولنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ پہرے داروں کی خودکار رائفلیں ہمیں بھون کر رکھ دیتیں۔ میں دوڑتا ہوا تیس منٹ کے شمالی دروازے کی طرف لپکا۔ اس دروازے کی چابی بھی کی رِنگ میں موجود ہونی چاہیے تھی۔ لیکن چابی آزمانے سے پہلے ہمیں بہت کچھ سوچنا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ دروازہ اس رقص گاہ سے قریب تر ہے جہاں اس وقت محفلِ رنگ و بو اپنے عروج پر تھی۔ دروازے کے پاس پہنچتے ہی مجھے موسیقی کا ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا اور مرد و زن کے مدھم قہقہے سماعت تک پہنچنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ہم اس دروازے سے نکلنے کی کوشش کرتے تو ہمیں رقص گاہ کے اندر سے یا بہت قریب سے ہو کر گزرنا پڑتا۔

میں واپس انچارج ٹونی کے کمرے میں آیا۔ یہاں شارٹ سرکٹ ٹی وی ابھی تک آن تھا۔ رقص گاہ کے ہوشربا مناظر نظر آرہے تھے۔ فرطِ جوش میں کئی مقامی حسینائیں نیم عریاں ہو کر محوِ رقص تھیں۔ ہر جسم تھرک رہا تھا اور میزوں کے درمیان سفید وردیوں والے ویٹرز جو خود بھی "پیے ہوئے تھے" ڈولتے پھر رہے تھے۔ کیمرا رقص گاہ کے جس حصے کی منظر کشی کر رہا تھا وہاں دو مسلح محافظ موجود تھے۔ دو مسلح محافظ دوسرے حصے میں تھے۔ یہاں سب مگن نظر آرہے تھے۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ رقص گاہ کے نیچے تیس منٹ میں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔

تیس منٹ کا جنوبی دروازہ اب وحشیانہ انداز میں بجایا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پہرے داروں کے چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ دروازے کی ڈپلی کیٹ چابی بھی موجود ہو گی اور کسی بھی لمحے دروازہ باہر سے کھول لیا جائے گا۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے سورج اور راکیش سنگھے سے کہا کہ وہ لاک اپ میں ناگورے کے پاس چلے جائیں۔ انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے کی رِنگ میں سے دو تین چابیاں آزمائیں اور تیس منٹ کے شمالی دروازے کا قفل کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم میں نے بٹن دبا کر دروازے کو کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد میں نے کی رِنگ زریں گل کو دے دیا اور اس سے کہا کہ وہ اوپر جا کر بندروں والے بڑے کمرے کا دروازہ کھول دے۔ اور دروازے کھولنے کے فوراً بعد خود کو ساتھ والے خالی کمرے میں بند کر لے۔

زریں گل پہلے تو حیران ہوا پھر میری بات سمجھنے کے بعد اس کی آنکھوں میں جوش کی چمک نمودار ہو گئی۔ اس نے اپنی پشاوری چپل کے تسمے کس کر باندھے اور چابیاں لے کر اوپر پہنچ گیا۔ جنوبی دروازے پر شور و غل جاری تھا اور بزر مسلسل بج رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد زریں گل نے اوپر جا کر دروازہ کھول دیا، اور خود دوڑ کر ساتھ والے خالی کمرے میں گھس گیا۔ دروازہ کھلنے کے بعد تین چار سیکنڈ تک کچھ نہیں ہوا، پھر ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں نے سیاہ بالوں والے جسیم بندروں کو دیکھا، وہ سیلابی ریلے کی طرح دروازے سے نکل رہے تھے۔ میں نے بٹن دبا کر شمالی دروازہ کھول دیا اور خود دوڑ کر لاک اپ میں سورج اور راکیش سنگھے کے پاس چلا گیا۔ "بھوک کے مارے بندر" جنونی ہو رہے تھے۔ وہ وحشیوں کی طرح تیس منٹ میں دندنانے لگے۔ ان کے منہ بند تھے لیکن پنجے تو آزاد تھے۔ پنجوں سے میری مراد ہاتھ اور پاؤں ہیں لیکن ان کے تیز لمبے

ناخنوں کی وجہ سے یہ ہاتھ پاؤں "پنجے" ہی نظر آرہے تھے۔ وہ ہر شے پر جھپٹ رہے تھے اور اسے بھنبوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں انہوں نے دونوں لاشوں کے کپڑے دھجیوں میں بدل دیے اور انچارج لڑکی کو بھی لہولہان کردیا۔ وہ لمبی جستیں لگا رہے تھے اور ہر اس جگہ پر لٹک رہے تھے جہاں ان کے پاؤں ٹک سکتے تھے۔ سوہج اپنی چیخیں بمشکل روکے ہوئے تھی۔ چند سیکنڈ میں ان جنوبی بندروں نے باہر کا راستہ دیکھ لیا اور بھرّا مار کر باہر نکلنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیس منٹ خالی ہوچکا تھا۔ میں نے زریں گل کو پکارا کہ وہ نیچے آجائے۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی سوہج اور راکیش سنگھے کو لے کر لاک اپ میں سے نکل آیا۔

تانگورے اس قابل نہیں تھا کہ اسے ساتھ لے جایا جاسکتا۔ اسے چھوڑنا ہماری مجبوری تھی۔ زریں گل کے نیچے آتے آتے آخری جانور بھی بیس منٹ سے نکل کر رقص گاہ کا رخ کرچکا تھا۔ رقص گاہ کی طرف سے اب ایک شورِ قیامت بلند ہورہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سیکڑوں افراد حلق پھاڑ کر چیخ رہے ہیں اور بھاگ دوڑ رہے ہیں۔ ہم بھی دوڑتے ہوئے باہر نکلے اور مختصر سے قالین پوش زینے طے کرکے رقص گاہ میں آگئے۔ یہاں کا منظر قابلِ دید تھا۔ ہر طرف ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ بہت سے شرفا جانیں بچانے کے لیے میزوں کے نیچے گھسے ہوئے تھے۔ مرد عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر گری پڑ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے جو حسینائیں مچل مچل کر رقص کر رہی تھیں ان میں سے کچھ اب ڈانسنگ فلور پر بے ہوش پڑی تھیں اور "ہم رقص" انہیں پھلانگتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میں نے دس بیس بندروں کو دیکھا جو ایک بہت بڑے فانوس پر چڑھ بیٹھے تھے اور اسے جھولے کی طرح جھلا رہے تھے۔ اس فانوس کے عین نیچے کچھ معزز سنہالی مرد و زن چیت پڑے تھے اور بندر ان کے سینوں پر چڑھے بیٹھے تھے۔

سوہج کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے اس نوحہ کناں ہجوم میں سے گزرے اور رقص گاہ کے مین دروازے تک پہنچ گئے۔ پسٹل میرے ہاتھوں میں تھا اور میں کسی بھی انسان یا حیوان کو نشانہ بنانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد ہم چاروں کلب سے باہر تھے۔ سڑک پر بھی قیامتِ صغریٰ برپا تھی۔ کچھ بندر باہر نکل آئے تھے اور خوف زدہ معززین پر حملہ کر رہے تھے۔ عورتوں کی سُریلی چیخیں رات کے سناٹے میں دور تک گونج رہی تھیں۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے ایک سفید بیوک گاڑی اسٹارٹ حالت میں نظر آئی۔ گاڑی کا باوردی ڈرائیور اگلا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور ہراساں نظروں سے لنکا کلب کے مین دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو نگاہوں نگاہوں میں تولا اور عقب سے جا کر پسٹل کا آہنی دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ کنپٹی پر لگنے والی دوسری ضرب نے اسے اٹاغفیل کردیا۔ میں نے لرزتی کانپتی سوہج کو گاڑی میں دھکیلا۔ زریں گل اور راکیش سنگھے پہلے ہی نشست سنبھال چکے تھے۔ میں نے پسٹل ڈیش بورڈ پر رکھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جونہی میں نے گاڑی آگے بڑھائی' ایک درمیانے جسم کا بندر سامنے آگیا۔ اس کے گلے میں کسی عورت کا "زیرِ جامہ" جھول رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس میں اس کی آنکھیں سرخ قمقموں کی طرح روشن تھیں۔ اس نے اچھل کر بونٹ پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن بمپر کی ہلکی سی ضرب نے اسے ایک طرف لڑھکا دیا۔ گاڑی چکنی شفاف سڑک پر آئی تو مجھے عقب نما آئینے میں لنکا کلب کا مین دروازہ نظر آیا۔ دروازے پر لگا بہت بڑا نیون سائن پُرشور آواز میں نیچے آن گرا تھا اور اب اس میں لگے ہوئے طاقتور بلب دھماکوں سے پھوٹ رہے تھے۔ مجھے ہندو دیو مالا کی وہ کہاوت یاد آگئی جس کے مطابق بندر و نارادن نے لنکا کو آگ لگا دی تھی۔ اسی کہاوت کی پیروی کرتے ہوئے آج بہت سے والوں نے "لنکا کلب" کو تہ و بالا کردیا تھا۔

گاڑی چرچراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہی مجھے اپنے عقب میں ایک بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل نظر آئی۔ موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے اور وہ بڑی رفتار سے ہمارے قریب آرہے تھے۔ ان کے لباس دیکھنے کے بعد میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ وہ کلب سے ہی ہمارے پیچھے لگے ہیں اور ان کا تعلق کاکا کے مسلح کارندوں سے ہے۔ میں نے گاڑی کو جلدی جلدی دو تین سڑکوں پر موڑا' ہر دفعہ موڑ مڑنے کے بعد مجھے عقب میں موٹر سائیکل کی روشنی نظر آئی۔ پوری طرح یقین کرلینے کے بعد میں نے بیوک کی رفتار آہستہ کرلی۔ زریں گل بھی عقب کی صورتِ حال ملاحظہ کرچکا تھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "ذرا اپنا نشانہ تو دکھاؤ زریں خان۔"

وہ چہک کر بولا "بندر پھڑکانا ہے یا صرف موٹر سائیکل الٹانا ہے؟"

"صرف موٹر سائیکل الٹانا ہے" میں نے کہا۔

"ابھی لیجئے استاد صیب!" زریں گل نے کہا اور ریوالور اٹھالیا۔

"نہیں' اس سے نہیں' یہ پسٹل لو" میں نے ڈیش بورڈ سے سائلنسر لگا پسٹل اٹھا کر دے دیا۔

زریں گل نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر چلتی گاڑی سے نشانہ لیا۔ پہلا فائر خالی گیا لیکن دوسرا عین نشانے پر لگا۔ میں نے عقب نما آئینے میں موٹر سائیکل کو ڈگمگاتے اور پھر اچھل کر ایک بند دکان کے شوکیس میں گھستے دیکھا "وہ گرا حرام زادہ" زریں گل نے نعرہ لگایا اور پھر سینہ پھلا کر کن انکھیوں سے سوہج کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے راکیش سنگھے سے انگریزی میں پوچھا "یہاں آس پاس کوئی ٹھکانا ہے؟"

وہ بولا "ہے تو لیکن ہمیں پھر گھوم کر چائنا چوک کی طرف جانا

ہوگا۔ وہاں میرے دوست کا فلیٹ ہے۔ ہم وہاں محفوظ طریقے سے چھپ سکتے ہیں۔"

"لنکا کلب کے سامنے سے تو نہیں گزرنا پڑے گا؟"

"نہیں وہ پچھلی سڑک پر ہے۔"

"او کے۔ تم راستہ بتاتے جاؤ۔"

سڑکیں سنسان اور کشادہ تھیں۔ چار پانچ منٹ بعد ہم ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے سوہج' زریں گل اور سنگھے کو وہیں اتارا اور گاڑی ایک ڈیڑھ فرلانگ دور ایک گلی میں چھوڑ آیا۔ میرے واپس آنے تک سنگھے' سوہج اور زریں کو فلیٹ میں چھوڑ آیا تھا اور خود اپنے خوابیدہ دوست کے ساتھ فٹ پاتھ پر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ سنگھے کا دوست ایک دفتری قسم کا بے ضرر سا سنہالی نوجوان تھا۔ ہم اس کے ساتھ بلڈنگ میں داخل ہوگئے۔ فلیٹ پانچویں منزل پر تھا اور لفٹ بھی نہیں تھی۔ سڑک کی طرف کھڑکیاں تھیں جن میں شیشے لگے تھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ سڑک صاف نظر آرہی تھی اور اس سے اگلی سڑک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس بلند و بالا فلیٹ میں سے "لنکا کلب" کی عمارت دکھائی دے رہی ہے۔ نہ صرف عمارت دکھائی دے رہی تھی بلکہ مین گیٹ کے سامنے مچی ہوئی افراتفری کے آثار بھی نظر آرہے تھے۔ ایمبولینس گاڑیوں کی چمکتی ہوئی سرخ روشنیاں اور تیزی سے متحرک انسانی ہیولے اتنی دور سے بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چند فائر بھی ہوئے تاہم پولیس بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔

راکیش سنگھے کا دوست حیران پریشان نظر آرہا تھا۔ میں اے کے ۵۶ رائفل وغیرہ بیس منٹ میں پھینک آیا تھا لیکن کاکا کے کارندوں سے چھینے ہوئے دونوں ہتھیار یعنی ریوالور اور پسٹل ہمارے پاس موجود تھے۔ سنگھے کا دوست ان ہتھیاروں کو ہراساں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سوہج کا ورم زدہ چہرہ اور اجڑا بکھرا حلیہ بھی اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ سنگھے اسے ایک طرف لے گیا اور پانچ دس منٹ میں اس کی حیرت دور کردی۔ میں نے سنگھے سے کہا "میں ایک ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔"

فلیٹ میں ٹیلی فون موجود تھا۔ سنگھے اپنے دوست سے رسمی اجازت لینے کے بعد مجھے ٹیلی فون سیٹ کے پاس لے گیا۔ میں نے کچھ دیر پہلے "لنکا کلب" سے نکلتے ہوئے اس کے نیون سائن سے ٹیلی فون نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ میں نے یہ نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر دوسری طرف سے ایک جھلائے ہوئے شخص کی آواز آئی وہ سنہالی بول رہا تھا۔ میں نے انگریزی میں پوچھا "کون ہے؟"

وہ دہاڑا "خون تم نے کیا ہے۔ تم بتاؤ کون ہو؟" بیک گراؤنڈ میں بجے بجے شور کی آواز آرہی تھی۔

میں نے کہا "بڑی الٹی کھوپڑی ہے تمہاری۔"

وہ بولا "الٹے بندے کے ساتھ الٹی کھوپڑی ہوتی ہے۔ تم کچھ بھونکو گے یا فون بند کردوں؟"

"لگتا ہے منہ میں کتے کی زبان لگوا رکھی ہی تم نے" میں نے اسے بھڑکایا۔

وہ بھڑکا تو انگریزی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ اپنی مادری زبان میں رائی تباہی بکنے لگا۔ میں نے بھی انگریزی میں اسے ایک شاندار گالی سے نوازا اور کہا کہ وہ اپنے ناجائز باپ دھرمان کاکا کو فون پر بلائے ورنہ جو کچھ کلب کے "بیس منٹ" میں ہے وہ دو تین گھنٹے کے اندر پولیس اسٹیشن کے مال خانے میں نظر آئے گا۔"

بیس منٹ کے حوالے نے مخاطب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی لرزتی ہوئی آواز فون پر ابھری "تک۔۔۔۔ کون ہو تم؟"

"تمہاری ماں کا کلاس فیلو۔۔۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ جلدی کرو۔ ورنہ دھرمان کاکا اور "اے کو" والے ہاتھ لگا لگا کر روئیں گے' اور ساری عمر روتے رہیں گے اور تیرا تو ایسا حشر ہوگا کاکا کے ہاتھوں کہ آتما حشر تک بین کرتی رہے گی۔"

"بیس منٹ" کے بعد "اے کو" کے حوالے نے مخاطب کی چولیں خراب کردی تھیں۔ وہ منمنیا کر بولا "ایک منٹ۔"

صرف بیس سیکنڈ بعد مجھے فون پر دھرمان کاکا کی آواز سنائی دی۔ دھرمان کاکا جو کولمبو اور گرد و نواح میں دہشت کی علامت تھا۔ جس کی آواز میں کسی جنگی سالار کا سا دبدبہ اور قہر تھا۔ اس وقت گھبرایا اور سٹپٹایا ہوا لگ رہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ کون ہو تم؟" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

"میں جو کوئی بھی ہوں' اس وقت تمہاری اور "اے کو" کی موت ہوں۔"

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے" دھرمان کاکا کی آواز میں لرزش نمودار ہوگئی "تم شاہ جہاں ہو۔ تگ۔۔۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"تمہارے پاگل کتوں کی پہنچ سے بہت دور ہوں۔ وہ جتنا بھی سر ٹکرائیں مجھے ڈھونڈ نہیں سکتے۔ لیکن میں بہت نزدیک بھی ہوں۔ لنکا کلب میری نظر میں ہے۔ یہاں سے تنکا بھی اڑ کر باہر جائے گا تو مجھے پتا چل جائے گا۔"

چند لمحے کے توقف کے بعد کاکا کی آواز آئی "تم چاہتے کیا ہو؟"

"ڈیل!"

"کس بات پر ڈیل؟"

"اس سارے سامان پر جو بیس منٹ میں اسٹور ہے اور جو میرے ایک اشارے پر پولیس کی تحویل میں جاسکتا ہے۔"

"میں۔۔۔ سمجھ نہیں پایا' کس۔۔۔ سامان کی بات کر رہے ہو تم؟"

"اس سارے سامان کی جو سری لنکا کے سیل سینٹرز سے لاکر

یہاں جمع کیا گیا ہے۔ جانوروں کی کھالیں جن میں کم و بیش آٹھ سو ٹائیگرز کی کھالیں بھی شامل ہیں۔ چھ سات کروڑ کی آئیوری' ہاتھی دانت کی بیش بہا اشیا اور خام ہاتھی دانت۔ سمجھ گئے ہو یا اور تفصیل سے سمجھاؤں؟"

"دیکھو۔۔۔ یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں' تم کسی مقام پر پہنچو' میں بھی پہنچتا ہوں۔ وہاں فوراً بات کرتے ہیں۔"

"میری ایک بات یاد رکھو کاکا۔۔۔ چالاکی نہیں چلے گی۔ تم نے لنکا کلب میں سے کوئی شے منتقل کرنے کی کوشش کی تو سمجھو سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں جانتا ہوں پولیس تمہارے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ صرف ایک کال کی دیر ہے۔ پورے کولمبو کی پولیس "لنکا کلب" پر چڑھ دوڑے گی۔"

فون پر کاکا کے ہانپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی' وہ بولا "ٹھیک ہے۔ تم جگہ بتاؤ میں پہنچ رہا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ تم سے بات ہونے تک لنکا کلب سے کچھ منتقل نہیں کیا جائے گا۔"

میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سنگھے سے پوچھا کہ کون سی جگہ مناسب رہے گی۔ اس نے اسٹار ہوٹل کا نام لیا۔ میں نے کاکا سے کہا "اسٹار ہوٹل پہنچو۔ میں بھی آدھ گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچ جاتا ہوں۔"

"اوکے!" کاکا نے حتمی لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہیں اکیلا نہیں ہونا چاہیے "اے کو" کا سرکردہ شخص تمہارے ساتھ ہو۔"

"وہ کس لیے؟"

"تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بغیر ہماری بات چیت بے معنی ہے۔"

"اگر وہ نہ آسکے تو؟"

"میں جانتا ہوں وہ آسکتا ہے۔ اور تمہارے انکار کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ڈیل میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ اس صورت میں میں فوراً دوسرے آپشن پر عمل کروں گا۔"

"دوسرے آپشن سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"پولیس!"

"نہیں۔ میرا خیال ہے اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے ہم پہنچ رہے ہیں۔"

ایک دو منٹ میں میں نے فون پر کاکا سے تمام تفصیل طے کرلی اور فون بند کر دیا۔

"کیا۔۔۔ تم اکیلے جاؤ گے؟" سوزج نے بہت دیر بعد زبان کھولی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "تمہارا یہ دوست سنگھے مجھے بتا رہا تھا کہ کاکا بے حد خطرناک شخص ہے۔ اسے یہاں بلیک لائن کہا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اس بلیک لائن کے دانت میں نے نکال دیے۔۔۔ تم نے سنا نہیں وہ فون پر کیسے میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔"

سوزج نے زور سے میرا بازو دبایا اور لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "شاہ جہاں! پلیز' نکل جاؤ اس چکر سے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں ڈالتے ہو۔ چلو آؤ میں تمہیں سائیں عالی کے پاس لے چلتی ہوں۔ وہ ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر واپس حیدرآباد پہنچا دیں گے۔ وہ بڑی شکتی کے مالک ہیں' سب کچھ کر سکتے ہیں وہ۔"

"سب کچھ کر سکتے ہیں تو پھر ان سے صندوق تلاش کرواؤ۔"

سوزج! اڑاؤ۔ میری جان کیوں کھا رہی ہو؟"

"بھگوان تمہیں چھما کرے۔ ایسی گستاخی کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ تم نے تو۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی کیونکہ زدین گل ایک گوشے میں کھڑا اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔

O☆O

ٹھیک تین گھنٹے بعد قریب ہی واقع شاہزادہ "اسٹار ہوٹل" میں دھریان کاکا اور مسٹر عشارب سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔ عشارب میری توقعات کے برخلاف ایک پختہ عمر شخص تھا۔ اس کی آنکھیں گہری بادامی تھیں اور نقوش سے خاندانی امارت جھلکتی تھی۔ اس کے چہرے پر تراشیدہ داڑھی بہت بھلی لگتی تھی۔ امارات کا یہ کروڑپتی باشندہ میرے ہاتھوں ایک جان گسل صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا' پھر بھی وہ بادل اور پراعتماد نظر آ رہا تھا۔ اس نے صاف سیدھے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟

میں نے پوچھا "آپ کیا دے سکتے ہیں؟"

وہ بولا "بیس لاکھ۔"

میں نے کہا "لنکا کلب میں جو کچھ اسٹور کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں بیس لاکھ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔"

"اس رقم کو دوگنا کر لو" میں خاموش رہا "تین گنا کرلو" اس نے بولی بڑھائی۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر کہنے لگا۔ "اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم ہی کچھ بولو۔"

میں نے کہا "مجھے رقم نہیں چاہیے' ایک کروڑ نہیں۔۔۔ دس کروڑ بھی نہیں۔"

"تو پھر؟"

"تمہیں شیخ عاصم صاحب کی دشمنی سے ہاتھ کھینچنا ہو گا۔"

"کیا مطلب!" "اے کو" کے کرتا دھرتا شیخ عشارب کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

"تم شیخ عاصم صاحب کو اس "بم دھماکا کیس" میں پھنسانے کی تگ و دو کر رہے ہو جس میں شاہی خاندان کے ایک درجن سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ شیخ عاصم صاحب اس جرم میں ملوث تھے یا نہیں' میں چاہتا ہوں کہ تم شیخ عاصم کو اس معاملے میں گھسیٹنے کی ہر کوشش ترک کر دو۔ جتنے بھی تحریری' تصویری یا زبانی ثبوت جمع کیے ہیں تم نے سب مٹانے ہوں

ے' بالکل ملیامیٹ کرنا ہو گا انہیں۔"

مشارب بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بظاہر سکون آنکھوں کے پیچھے خیالات کا بلاخیز تلاطم تھا۔ چند لمحے ہم دونوں کے درمیان بے حد بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "یہ بہت بڑی قیمت ہے۔"

میں نے کہا "جس چیز کی یہ قیمت ہے وہ بھی بے حد قیمتی ہے۔ کلب کے بیس منٹ پر پولیس کا چھاپا پڑ گیا تو "اے کو" کی کمر ٹوٹ جائے گی۔"

میرے اور شیخ مشارب کے درمیان یہ انتہائی سنگین نوعیت کی گفتگو پچیس منٹ جاری رہی۔ کسی کسی وقت دھریان کاکا بھی ایک آدھ جملہ بولتا رہا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ انتہا درجے کے چالاک اور دل گردے والے شخص تھے لیکن حالات کی کروٹ نے ان کی پیشانیاں عرق آلود کر رکھی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرا پلہ بھاری ہے۔ میں پورا انتظام کر کے آیا تھا۔ زدین گل اور راکیش سنگھے اسی فلیٹ میں موجود تھے جہاں سے میں نے دھریان کاکا کو ٹیلی فون کیا تھا۔ میں نے کاکا سے گفتگو کے بعد انہیں واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ فلیٹ کی کھڑکی میں سے انہیں لنکا کلب صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر انہیں شک پڑتا کہ لنکا کلب میں سے سامان نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ فوراً مجھے اسٹار ہوٹل کے نمبر پر رنگ کر دیتے۔ اسٹار ہوٹل میں اپنا رابطہ نمبر میں نے یہاں پہنچتے ہی بذریعہ فون سنگھے کو لکھوا دیا تھا۔ اگر میں ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر واپس نہ پہنچتا یا بذریعہ فون انہیں اپنی خیریت کی اطلاع نہ دیتا تو وہ پولیس کو مطلع کرنے کے لیے آزاد تھے۔

شیخ مشارب نے مجھ سے پانچ منٹ کی مہلت لی اور کمرے سے باہر جا کر دھریان کاکا سے صلح مشورہ کیا۔ اس مشورے کے فوراً بعد وہ واپس آئے اور چند تحفظات طے کرنے کے بعد ہمارے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔ یہ بہت اہم نوعیت کا معاہدہ تھا اور شیخ عاصم کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری سے کم نہیں تھا۔ اس معاہدے کی رو سے "اے کو" نے شیخ عاصم کے خلاف تمام معاندانہ کارروائیاں فوری طور پر ختم کرنا تھیں۔ بم کیس کے حوالے سے شیخ عاصم کے خلاف جتنے بھی حقیقی یا جعلی ثبوت "اے کو" کے پاس تھے وہ دوپہر ایک بجے تک میرے حوالے کیے جانے تھے۔ اور گواہوں کو پابند کیا جانا تھا کہ وہ عدالت میں شیخ عاصم کے خلاف بیان نہیں دیں گے اور آئندہ بھی اپنی زبان بند رکھیں گے۔ شیخ مشارب نے حلفیہ اعلان کیا کہ وہ اس کیس کے حوالے سے آئندہ بھی کوئی سرگرمی نہیں دکھائے گا۔ ان شرائط کے علاوہ میں نے تین اور اہم شرائط بھی دھریان کاکا اور عشارب سے منوائیں۔ پہلی دو شرطیں دراصل ان تانگورے کے بارے میں تھیں۔ تانگورے ابھی تک لنکا کلب کے بیس منٹ میں تھا۔ کاکا کو دوپہر ایک بجے تک اسے چھوڑ دینا تھا۔ دوسری شرط اس چوٹ کے بارے میں تھی جو تانگورے کو کاکا

کے کارندوں کے ہاتھوں لگی تھی اور جس کے نتیجے میں اس کا اسپورٹس کیریئر تباہ ہو گیا تھا۔ اس چوٹ کے ہرجانے میں "عشارب اینڈ کو" یعنی "اے کو" کو پچاس ہزار امریکی ڈالر تانگورے کو ادا کرنا تھے۔ تیسری شرط کا تعلق اروشی سے تھا۔ میں نے دھریان کاکا سے وعدہ لیا کہ وہ اروشی کا پیچھا چھوڑ دے گا اور اگر وہ سری لنکا سے باہر جانا چاہے تو اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔

اس موقعے پر کاکا نے اعتراض کیا' اس نے کہا "اس لڑکی کا زیر بحث معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لڑکی ہمارے گروہ کی ہے اور اس کا معاملہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "وہ لڑکی تمہارے گروہ کی نہیں۔ وہ تمہاری بلیک میلنگ کا شکار ہے اور اس کا تعلق زیر بحث معاملے سے ہے کیونکہ اس کا تعلق مجھ سے ہے۔ تم صرف اس لیے اسے سزا دینے پر تلے ہوئے ہو کہ اس نے مجھے تمہارے گروہ سے آگاہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ تمہارا گروہ اسے کس کس طرح بلیک میل کر رہا ہے۔ یہی گناہ ہے جس کی پاداش میں تم اسے دہلی پیلس سے اغوا کرانے کی کوشش کر چکے ہو اور نائٹ کلب میں اس سے عریاں رقص کروانا چاہتے ہو۔"

اس معاملے پر میرے اور کاکا کے درمیان تھوڑی سی گرما گرمی ہوئی لیکن پھر کاکا کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اس کا ولی نعمت شیخ عشارب سخت ترین مصیبت میں تھا اور کاکا ایک معمولی سی ضد کر کے ان "مذاکرات" کی ناکامی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ گفتگو کی میز پر میں ان دونوں کو پچھاڑ چکا تھا اور اب وہ صرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر معاملات طے ہو گئے اور میں نے راکیش سنگھے کو فون کر دیا کہ میں اسٹار ہوٹل سے روانہ ہو کر واپس آ رہا ہوں۔

اس کے بعد کی تمام کارروائی تیزی سے مکمل ہو گئی۔ سہ پہر دو بجے تک شیخ عشارب نے شیخ عاصم اور ذکوان کے تعلق کے بارے میں تمام دستاویزی ثبوت مجھے فراہم کر دیے۔ ان میں شیخ عاصم اور ذکوان کی تصاویر اور ان کے نیگیٹوز بھی شامل تھے۔ شیخ عاصم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک چٹ اور ان کے کرنٹ اکاؤنٹ کے دو چیک بھی اہم شہادتوں میں شمار کیے جا سکتے تھے۔ میں نے قانون پڑھ رکھا تھا۔ ان دستاویزات کی اہمیت کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یہ ثبوت شیخ عاصم کی آزادی کے پر کاٹ کر اس کی زندگی اجیرن کر سکتے تھے۔ میں نے تنہائی میں بیٹھ کر غور سے ان دستاویزات کا معائنہ کیا۔ حتمی نتیجہ نکالنا مشکل تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ شیخ عاصم کے جرم کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی جا رہی تھی۔

شیخ عشارب کون تھا اور کیا تھا؟ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا میں جان گیا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے

جو جرم اور گناہ کے کاروبار میں بھی وعدے کا پاس کرتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے معاہدے کی رو سے تمام شواہد میرے حوالے کر دیے ہیں اور کم از کم اس "بم کیس" کے حوالے سے وہ شیخ عاصم کو کبھی انوکی لاک لگانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اسٹار ہوٹل کی پارکنگ میں ہی ناگورے کو بھی میرے حوالے کر دیا گیا۔ میں اسے لے کر واپس سنگھے اور زریں کے پاس فلیٹ میں آگیا۔ ناگورے کے ساتھ ایک بریف کیس بھی تھا جس میں پچاس ہزار امریکی ڈالر کیش کی صورت میں موجود تھے۔

○☆○

منظر ایک بار پھر سرسبز و شاداب ریڈ پیلس کا تھا۔ میں پیلس کے شاندار ڈرائنگ روم میں غزالہ کے روبرو بیٹھا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بوگن بیلیں مہک رہی تھیں اور رجنی گندھا کی سفید کلیوں پر سری لنکا کی خاموش بارش تواتر سے گر رہی تھی۔ اسی کھڑکی سے پار دور دور سبزہ زار نظر آرہا تھا جہاں میں دستانہ بند ہاتھوں کے ساتھ گھاس کاٹتا رہا تھا اور وہ درخت بھی نظر آرہا تھا جہاں مجھے الٹا لٹکا کر چمڑے کی بیلٹوں سے مارا گیا تھا۔ لیکن آج صورتِ حال مختلف تھی۔ آج میں مجرم کی حیثیت سے نہیں ایک محسن کی حیثیت سے غزالہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی حسین آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے اور چہرے پر دل گداز تمکنت۔ ہمارے سامنے میز پر وہ بریف کیس رکھا تھا جس میں بم کیس کے حوالے سے شیخ عاصم اور ذکوان کے خلاف جان لیوا ثبوت موجود تھے۔ غزالہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "شاہ جہاں! میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ ہائی گاڈ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔"

میں نے سپاٹ آواز میں کہا "شکریہ وہاں ادا کیا جاتا ہے جہاں تکلف ہو۔ یہ میری ذمے داری تھی جو میں نے پوری کی ہے۔ ہاں ایک بات میں تم سے ضرور پوچھنا چاہوں گا اور مجھے امید ہے کہ تم اس کا ٹھیک جواب دوگی" وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شیخ عاصم اس وقت ریسٹ ہاؤس (ریڈ پیلس) میں موجود نہیں تھا۔ کسی ارجنٹ کام سے کولمبو گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا "غزالہ! شیخ تمہارا شوہر ہے اور تم اس کی بیوی ہو۔ مجھے تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔ لیکن بچپن کے ساتھی اور ہمدرد کی حیثیت سے مجھے تمہارے بارے میں اندیشے لاحق ہیں۔ بے شک فی الوقت شیخ عاصم ایک بہترین شوہر کی حیثیت سے تمہارے سامنے ہے لیکن کیا یہ صورتِ حال ہمیشہ برقرار رہے گی۔ کیا کچھ وقت گزرنے کے بعد شیخ عاصم کا کوئی دوسرا روپ تو سامنے نہیں آجائے گا۔ اور کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر فریال کو چھوڑنے پر رضامند ہو جائے گا؟" غزالہ خاموش رہی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم میری بات سمجھ رہی ہو۔ بے شک شیخ عاصم ایک طاقتور اور بااثر شخص ہے لیکن اس وقت اس کی تمام بالادستی اس بریف کیس میں بند ہے۔ میں اس سے سودے بازی کر سکتا ہوں۔ اسے مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ نہیں تو کم از کم فریال کو چھوڑ دے۔ میں اس بریف کیس کے عوض تمہارے بارے میں بھی تحفظات اور ضمانتیں حاصل کر سکتا ہوں۔ لیکن آخری فیصلہ تم ہی کو کرنا ہے۔ مجھے ٹھنڈے دل سے سوچ کر یہ بتاؤ کہ کیا یہ تمام ثبوت مجھے جوں کے توں شیخ عاصم کے حوالے کر دینے چاہئیں۔ فیصلہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی مدِنظر رکھنا کہ اگر کل شیخ عاصم نے فریال کو چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا تو میں اور تم کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی "میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں شاہ جہاں! میری رائے میں یا کسی پر بھروسا کیا جاتا ہے یا بالکل نہیں کیا جاتا۔ اور میں عاصم پر بھروسا کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں ان کے اندر ایک نیک فطرت اور ٹوٹ کر محبت کرنے والا انسان موجود ہے۔ آپ سے ان کا سلوک سخت اور ناروا ضرور ہے لیکن اس سلوک کے پیچھے جو کہانی ہے اس سے آپ بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔۔۔ آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عاصم اپنے رویے پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آپ نے جس طرح میرے اور ان کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالی ہے اور "ان" کو [illegible] رکھا ہے۔ وہ متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکیں گے۔ اور اس بات کا میں اپنی طرف سے یقین دلا سکتی ہوں کہ فریال کی رہائی اب صرف چند دن کی بات ہے۔۔۔ کل وہ اس بارے میں خود مجھ سے بات کر رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ اب وہ فریال کو پابند رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"

کھڑکی سے باہر بارش کی نرم پھواریں شیشوں پر رینگ رہی تھیں۔ سبزہ سبز تر اور گلاب سرخ تر نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا یہ رم جھم ہمیشہ جاری رہے گی، سالہا سال، موسم در موسم یہ بارش برستی رہے گی اور ہر شے اسی طرح ایک کیف انگیز کیفیت میں ڈوبی رہے گی۔ میں نے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستگی سے کہا "ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"پوچھیے" وہ ہمیشہ کی طرح فرمانبرداری سے بولی۔

"تم شیخ عاصم کے ساتھ خوش تو ہو نا؟"

"ہاں شاہ جہاں" وہ بڑی احتیاط سے بولی "جب میں نے عاصم سے شادی کی تھی اس وقت یہ شادی میری ضرورت تھی۔ لیکن اب عاصم کو قریب سے جاننے اور پرکھنے کے بعد مجھے یوں لگتا ہے جیسے۔۔۔ جیسے میں ایک عرصے سے انہیں جانتی ہوں۔ انہیں پسند کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھے بے انتہا چاہتے ہیں۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ ان کے خلوص اور پیار میں اضافہ محسوس کرتی ہوں۔ لگتا ہے۔۔۔ وہ بہت بدل چکے ہیں شاہ جہاں۔ شاید تم یقین نہ کرو ان کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ انہوں نے تمباکو نوشی اور ڈرنک بہت کم کر دی ہے۔ اب وہ ایک باقاعدہ اور پُرسکون زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

میں نے کہا "غزالہ! تم جانتی ہو شیخ عاصم جس معاشرے اور ماحول میں رہتا ہے وہاں کثرتِ ازدواج معمول کی بات ہے۔ لوگ اپنے پورے پورے حرم آباد کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شیخ عاصم نے اس سے پہلے ایک آدھ شادی کر رکھی ہوگی۔"

غزالہ کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ بہرحال اس نے جلد خود کو سنبھال لیا اور گہری سانس لے کر بولی "میں اس بارے میں جانتی ہوں شاہ جہاں۔۔۔ عاصم نے ایک سال پہلے ایک ماڈل گرل سے شادی کی تھی۔ اس کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ عاصم نے شادی سے پہلے مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔"

"وہ لڑکی اب کہاں ہے؟"

"دبئی میں۔"

"تو تم اس کے ساتھ اپنا سہاگ بانٹو گی؟"

"مجھے بانٹنا پڑتا تو میں بانٹ لیتی۔ لیکن عاصم نے پرسوں مجھے بتایا ہے کہ وہ لڑکی ان کی زندگی سے نکل چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

غزالہ نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک انگلش میگزین نکالا اور چند صفحے الٹ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ دبئی سے نکلنے والے اس میگزین میں شیخ عاصم کے بارے میں خبر چھپی تھی۔ لکھا تھا مشہور صنعت کار مسٹر عاصم ابن ارشد پاکستانی دوشیزہ کی محبت میں گرفتار۔ شادی کے بعد پہلی بیوی ماڈل گرل سوزی کو طلاق دے دی۔ سوزی نے حق مہر کی رقم ڈیڑھ لاکھ امریکی ڈالر وصول کر لیے۔ زیورات کے لیے عدالت سے رجوع کرے گی۔"

پوری خبر پڑھنے کے بعد میں نے میگزین ایک طرف رکھ دیا "شیخ عاصم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، پوری یکسوئی اور اپنائیت کے ساتھ۔۔۔ میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی شاہ جہاں! کہ وہ مجھے اتنی اہمیت دیں گے، اس طرح میرا مان بڑھائیں گے۔ میں کیا تھی؟ ایک بدمعاش شوہر کے پلے سے بندھی ہوئی مجبور عورت۔ جو اپنی مرضی سے مر سکتی تھی نہ جی سکتی تھی" غزالہ کی آواز رندھ گئی۔

میں نے دل میں کہا "تم کیا جانو غزالہ تم کیا ہو۔ شیخ تو پھر چھوٹا سا انسان ہے کوئی پتھر بھی ہوتا تو تمہاری عمر بھر رفاقت کی حدت سے جی اٹھتا۔ شیخ اپنی قسمت پر ہزار سال بھی رشک کرے تو کم ہے۔"

میرے دل میں ایک عجیب اداسی سی بھر گئی تھی۔ میں اس اداسی کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا کوئی کانچ کی نازک شے ریزہ ریزہ ہو کر سینے میں بکھری ہوئی ہے۔ دل چاہا میرے پر ہوں اور میں ابھی اڑ کر غزالہ سے بہت دور چلا جاؤں۔ میرے پر نہیں تھے لیکن پاؤں تو تھے، میں چل کر ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ بریف کیس میں نے وہیں غزالہ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ انسان کا ذہن بھی کیا گورکھ دھندا ہے۔ اس کے نہاں خانوں میں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ نہ مذہب، نہ قانون، نہ سماج۔ وہاں صرف اور صرف فطرت کی حکمرانی ہوتی ہے اور جذبات اپنے اصل اور حقیقی روپ میں نظر آتے ہیں۔۔۔ ان نہاں خانوں میں انسان صرف خود جھانک سکتا ہے اور کوئی نہیں جھانک سکتا۔ میں اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا، وہاں آج بھی غزالہ ایک محبوبہ کی صورت بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔ یہ کیسی بے راہ روی تھی، یہ کیسی گمراہی تھی۔ یہ گناہ نہیں تھا تو اور کیا تھا، وہ کسی کی منکوحہ تھی اور اس کا حسین سراپا میرے جسم کے پور پور میں سمایا ہوا تھا۔ وہ دھڑکن بن کر میرے دل میں گونجتی تھی اور سانس بن کر میرے سینے میں چلتی تھی۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید سرینا نے ٹھیک ہی کہا تھا میں پڑھا لکھا جاہل تھا، مہذب جنگلی تھا۔ میں آج بھی اس آس پر زندہ تھا کہ میری محبوبہ جو کسی کی بیوی بن چکی ہے شاید پھر میری زندگی میں آجائے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر آج کیوں میں اُداس ہو گیا تھا۔ کیوں میرے سینے میں کوئی شے چکنا چور ہو گئی تھی۔ کیا مجھے اس بات پر رنج ہوا تھا کہ شیخ اور غزالہ کی ازدواجی زندگی کامیاب جا رہی ہے۔ یقیناً ایسا ہی تھا۔ یہ جان کر کہ شیخ عاصم غزالہ کا گرویدہ ہو چکا ہے اور غزالہ کی خاطر اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ میرے سینے میں تیر سا لگ گیا تھا۔ شاید یہ حسد کا تیر تھا اور بدخواہی کی کمان سے نکلا تھا۔ اپنے آپ کو کوستا ہوا میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

دو تین گھنٹے بعد شام سے تھوڑی دیر پہلے شیخ عاصم ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ یہاں ایک بہت بڑی خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ یہ بہت بڑی اور یادگار خوش خبری اس بریف کیس کی صورت میں تھی جو میں غزالہ کو دے آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید رات کو کسی وقت شیخ عاصم مجھے طلب کرے اور اس معرکے کے بارے میں تفصیلات سننا چاہے جو میرے اور مشارب اینڈ کو کے درمیان ہوا تھا۔ لیکن شیخ نے مجھے طلب نہیں کیا۔ اگلے روز بھی غزالہ یا شیخ عاصم کی طرف سے کسی طرح کا ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ ہاں اس روز شام کو میں نے ان دونوں کی ایک جھلک ضرور دیکھی، وہ سبزہ زار میں سے گزر کر رہائشی حصے کی طرف جا رہے تھے۔ دونوں خوش نظر آتے تھے۔ سری لنکا آنے کے بعد پہلی بار مجھے شیخ عاصم کے چہرے پر بشاشت نظر آئی۔ وہ کسی مقناطیس کی طرح غزالہ سے چپک کر چل رہا تھا۔

اگلے دو روز بھی اسی طرح گزر گئے۔ سروج میرے اور زریں کل کے ساتھ ہی ریسٹ ہاؤس میں آگئی تھی۔ وہ اروشی کے ساتھ اسی کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اروشی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم چار پانچ دن کہاں رہے ہیں اور کیا کر کے آئے ہیں۔ وہ ایک

دوبار زریں گل سے فون لینے کی کوشش کر چکی تھی لیکن زریں نے سیٹھ ہدایت کے پیش نظر کچھ نہیں بتایا تھا۔ راکیش سنگھے کی حالت بھی اب بہتر ہوگئی تھی۔ وہ روزانہ ناریل کے تیل سے اپنی ٹانگوں کی مالش کراتا تھا اور نارمل انداز میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔

تازہ اخبارات میری نظر سے گزرتے رہتے تھے۔ خبروں میں آئیوری اور کھالوں کے ناجائز کاروبار کے بارے میں بھی خبریں آرہی تھیں۔ پولیس نے ملک کے طول و عرض میں بہت سے سیل پوائنٹس اور گفٹ شاپس پر چھاپے مارے تھے۔ یہ کارروائی بڑے منظم طریقے سے کی گئی تھی لیکن کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ صحافتی حلقوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ مجرم پہلے سے باخبر ہوچکے تھے اور انہوں نے تمام ناجائز سامان مارکیٹ سے اٹھالیا تھا۔ پولیس کی نااہلی پر لے دے ہورہی تھی اور ساتھ ساتھ ان خبروں کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی جن کا موضوع سب انسپکٹر واسودوا اور انسپکٹر شاکر کی موت تھا۔ وائلڈ لائف ویژن میں ہونے والے یہ دونوں حادثات عام و خاص کی توجہ کا مرکز تھے۔ سب سے دلچسپ خبر "لنکا کلب" کے حوالے سے سامنے آئی تھی۔ اس خبر میں محفلِ رقص و سرود پر بلوائیوں کے شب خون کا تذکرہ تھا۔ اس شب خون میں کوئی چار درجن مرد و زن زخمی ہوئے تھے اور کلب کو زبردست مالی نقصان ہوا تھا۔ کلب کی انتظامیہ نے بیان دیا تھا کہ یہ بلوائی ایک ٹرک میں سوار تھے۔ ٹرک ڈرائیور شراب پینے کے لیے کلب میں داخل ہوگیا۔ ٹرک کا عقبی دروازہ کسی وجہ سے کھل گیا اور بلوائی جنہیں چھپا کر پورٹ کی طرف لے جایا جارہا تھا اتر کر کلب میں گھس گئے۔ لنکا کلب کے اس تازہ ترین واقعے نے لوگوں کی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا اور وہ وائلڈ لائف ڈپارٹمنٹ پر سخت لعن طعن کر رہے تھے۔

اگر ہم "وائلڈ لائف" کے مجرموں کو قانون کی گرفت میں لاتے تو یقیناً یہ ایک بہت بڑا کام ہوتا، اور مجھے یہ کام کرکے خوشی بھی ہوتی لیکن کبھی کبھی انسان کو اپنی خواہش اور اپنے دل کی آواز کے خلاف بھی چلنا پڑ جاتا ہے۔ مجبوریوں کے گرداب میں پھنس کر اپنے اخلاقی ضابطے خود ہی تاراج کرنے پڑجاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ کڑوا کسیلا گھونٹ مجبوری کے تحت پیا تھا اور "اے کو" والوں کو قانون کے حوالے کرنے کے بجائے ان سے سودے بازی کی تھی۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ سری لنکا سے اب اس کاروبار کا بستر بوریا گول ہورہا ہے۔

○☆○

صبح بے حد نکھری ہوئی اور چمکیلی تھی۔ کئی دن کی لگاتار بارش کے بعد ہر چیز دھل دھلا کر صاف ہوگئی تھی۔ میں بیدار ہونے کے بعد بھی بستر پر ہی لیٹا رہا۔ کھڑکیوں سے باہر پام کے بلند و بالا درخت سنہری دھوپ میں ساکت کھڑے تھے۔ برآمدے کی طرف سے مجھے زریں گل کی آواز آئی، وہ اروشی سے مصروفِ گفتگو تھا۔ "ام کرم ایجنسی میں امارا بہت سا زمین ہے۔ کوئی دس بارہ ایکڑ کے قریب۔ ام اس پر ایک بہت بڑا فلم اسٹوڈیو بنائے گا۔ اگر لاہور کراچی میں فلم اسٹوڈیو بن سکتا ہے تو کرم ایجنسی میں کیوں نہیں بن سکتا۔ ام اس اسٹوڈیو کے افتتاح میں تم کو بھی ضرور بلائے گا۔ اسٹوڈیو کا افتتاح سُدھیر صاحب اپنے دستِ مبارک سے کرے گا۔ سُدھیر صاحب کو جانتا ہے آپ؟"

"کون سودھیر؟"

"سودھیر نہیں سُدھیر۔ لالہ سُدھیر۔ امارے ملک کا بڑا ایکٹر۔"

"نائیں جانتا۔ ام بس تھوڑا تھوڑا دلیپ کمار کو جانتا۔"

"اوہ خدایا! تم نے دلیپ کا نام لے کر امارے تن بدن میں آگ لگادیا۔ تم کو کیا پتا امارے ملک میں کیسا کیسا شیر دل ایکٹر ہے۔ دلیپ تو ان کے ایک گھونسے کا مار نہیں ہے۔ تم نے نجمی ملک کا نام سنا ہے؟"

"نائیں ہے سنا۔" اروشی نے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

"ام نے کئی بار سوچا ہے کہ تم کو اپنے ملک کے تمام بڑے شہ زور ایکٹروں کا نام بتائے لیکن جب ام تم کو دیکھتا ہے، تمہارا پیارا پیارا ہنسی سنتا ہے تو ام کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ خو کو ایک بات بتاؤ تم نے ایسا خوبصورت ہنسی کہاں سے سیکھا ہے؟"

"ہانسی... تو مین ڈہا کی؟"

"ہیس... لیسے"

"ہا ٹنگ کین ناٹ بی ٹاٹ۔ اِٹ اِز گاڈ گیون۔ اس کا مطلب ہے... ہنسی... خدا... دیتا ہے۔"

"خدا تم کو سب کچھ دیتا ہے، ام کو کچھ نہ دیتا ہے؟" زریں گل ہائے سے جھنجلایا۔

اروشی ایک خوبصورت جسم اور پاکیزہ روح کی مالک تھی۔ میں یہ سوچ کر لرز جاتا تھا کہ کاکا اور اس کے غنڈے نہ جانے اس کا کیا حشر کریں گے لیکن اب شیخ عناوپ سے معاہدے کے بعد مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ کاکا کی دست برد سے محفوظ رہے گی۔ بہرحال اروشی کے سلسلے میں مجھے غزالہ سے بہت شکوہ تھا۔ میری درخواست کے باوجود اس نے اپنے شوہر کو اروشی کے بارے میں سب کچھ بتا ڈالا تھا۔ کچھ بھی تھا اب شیخ عاصم کی نظروں میں اروشی ایک قابلِ اعتبار ملازمہ نہیں رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ریسٹ ہاؤس واپس پہنچ کر غزالہ سے اس بارے میں پوچھوں گا، لیکن اب ارادہ ترک کردیا تھا۔ پوچھنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ غزالہ کو اپنے شوہر کی خوشنودی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ ایک مشرقی بیوی کی حیثیت سے وہ اپنے اور شوہر کے درمیان کوئی پردہ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے شوہر سے اروشی کا "ذکرِ خیر" بھی کردیا تھا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ زریں گل نے

بہت بھرے لہجے میں کسی کو "آپ" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ دروازہ کھولتا، دروازہ خود بخود کھلا اور میں پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ میرے سامنے فریال کھڑی تھی۔ فریال جس کے غم نے کئی ماہ سے میری راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ جس کی چیخیں میں نے فون پر سنی تھیں اور جس کی بے بسی کا تصور مجھے پل پل تڑپاتا رہا تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھی۔ سر پر دوپٹا تھا۔ پہلے سے کچھ دبلی اور زرد ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے، پھر وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے ایک ہچکی لی۔ اس ہچکی نے ضبط کا بند توڑ دیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کے جسم میں جیسے زلزلہ بپا تھا اور ہچکیوں کی زبان میں وہ ان بے مہر شب و روز کی داستان مجھے سنا رہی تھی جن کا ہر ہر پل دکھ، تنہائی اور بے بسی سے عبارت تھا۔ میں اس کی کمر تھپکتا رہا اور دلاسا دیتا رہا۔ اس کے دل کا سارا غبار آنسوؤں کے راستے نکل گیا تو وہ دھلا دھلایا کنول سا چہرہ لے کر مجھ سے الگ ہوگئی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا فریال؟"

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس مختصر "ہاں" نے میری تسلی کردی۔ کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی مجھے یقین سا ہوگیا کہ درندوں کے نرغے میں رہنے کے باوجود وہ صحیح سلامت واپس آئی ہے۔ اس کی آبرو پر کوئی حرف نہیں آنے دیا گیا۔

اب اروشی، زریں گل اور راکیش سنگھے بھی اندر آگئے تھے۔ اروشی فریال کے پاس بیٹھ گئی اور اسے پچکارنے لگی۔ میں نے فریال سے پوچھا "کب چھوڑا ہے انہوں نے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ غزالہ جی اور شیخ عاصم خود آئے تھے۔ شیخ عاصم نے کہا کہ تم آزاد ہو... اور آپ کے بارے میں کہا کہ آپ بھی آزاد ہیں۔ ہم جب چاہیں پاکستان واپس جاسکتے ہیں..."

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ شیخ عاصم مجھے کیسے آزاد کرسکتا تھا۔ مجھے زیرِ دام لانے کے لیے تو اس نے اپنے سات بیڑے برباد کیے تھے۔ نہیں، فریال کو سننے میں غلطی لگی تھی اور اگر غلطی نہیں لگی تھی تو پھر یہ شیخ عاصم کا کوئی فریب تھا، کوئی گھنا چال تھی۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر اعلان کررہی تھی کہ ایسا نہیں ہے، میں غلط سن رہا ہوں۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور شیخ عاصم کا پرسنل سیکریٹری اجازت لے کر اندر آگیا۔

اس نے خوش اخلاقی سے سلام کیا اور شستہ انگلش میں بولا "مداخلت کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے آپ چاروں کے تین تین فوٹوگراف درکار ہیں..."

"کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی واپسی کے لیے کاغذات تیار کرنے ہیں۔"

"کس نے کہا ہے ایسا کرنے کو؟"

"شیخ صاحب نے ابھی یہ ہدایت جاری کی ہے... اور یہ بھی پوچھا ہے کہ مس سروج آپ کے ساتھ پاکستان جانا چاہتی ہیں یا انڈیا جائیں گی؟"

میرے کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں آزاد ہوں۔ اچانک میری کلائی پر ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ شیخ عاصم میری طرف آرہا ہے۔ چند ہی لمحے بعد یہ اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ شیخ عاصم تھری پیس سوٹ میں ملبوس لمبے ڈگ بھرتا اندر آگیا۔ اس کی "قربت" مجھے موت کے دہانے پر لاکھڑا کرتی تھی اور اس موت کی اطلاع دینے کے لیے میری کلائی پر لگنے والے جھٹکے شدید تر ہوجاتے تھے۔ اس وقت بھی یہی ہورہا تھا۔ میرے اور شیخ کے درمیان بمشکل دس بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ شیخ نے میری طرف دیکھے بغیر بھاری بھرکم آواز میں کہا "تم لوگ جب چاہو یہاں سے جاسکتے ہو لیکن اگر قانونی طریقے سے سری لنکا چھوڑنا چاہتے ہو تو تھوڑا سا وقت لگے گا۔ میں نے تمہارے سفری کاغذات تیار کرانے کی ہدایت کردی ہے۔ میرا خیال ہے پرسوں تک تم یہاں سے روانہ ہوسکو گے۔"

شیخ عاصم کو دیکھ کر فریال کچھ سہم سی گئی تھی اور میرے پیچھے چھپنے کی کوشش کررہی تھی۔ شیخ عاصم نے اچانک میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کچھ پوچھنا چاہتے ہو تم؟"

"پوچھنا تو بہت کچھ ہے" میں نے کہا "لیکن تم بہت بڑے آدمی ہو۔ تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا۔ صرف یہ بتادو کہ اس مذاق کا مطلب کیا ہے؟"

"کس مذاق کا؟" شیخ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

میں نے کہا "تم دوسروں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی آزاد کرکے پاکستان واپس بھیج رہے ہو لیکن تمہارا لگایا ہوا الیکٹرانک ڈیوائس ابھی تک میرے جسم میں موجود ہے۔ جب تک یہ ڈیوائس موجود ہے میں خود کو آزاد کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ میں جہاں بھی چلا جاؤں تمہاری گرفت میں رہوں گا۔"

وہ سگار کا کش لے کر بولا "مجھے معلوم ہے تم کسی پر اعتبار نہیں کرتے ہو۔ اپنی آزادی پر بھی نہیں کرو گے۔ تمہارا دماغ وسوسوں سے خالی رہ ہی نہیں سکتا۔ جہاں تک الیکٹرانک ڈیوائس کی بات ہے، اسے وہی لوگ تمہارے جسم سے نکال سکتے ہیں جنہوں نے رکھا تھا۔ میں چار پانچ روز میں ان سے رابطہ کروں گا۔ امید ہے پاکستان پہنچنے کے بعد تمہیں زیادہ دن اس ڈیوائس کے ساتھ نہیں رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "میں نے سنا تھا کہ ایک مرتبہ اس رولیکس کا بلاسٹ سسٹم آن کر دیا جائے تو پھر اسے تلف نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم نے ٹھیک سنا تھا۔ شاید تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ تم اس رولیکس کے ساتھ دس کلومیٹر کے دائرے سے باہر کیسے نکلو گے؟ تو اس کا جواب میرے ہاتھ کی یہ گھڑی ہے۔ جب تم یہاں سے روانہ ہو گے۔ میں یہ گھڑی تمہیں دے دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی شیخ عاصم نے رخ پھیرا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ سنہالی سیکرٹری بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے روانہ ہو گیا تھا۔ میری کلائی پر لگنے والے جھٹکے بتدریج مدھم ہوتے چلے گئے۔

زریں گل نے حیرانی سے پوچھا "استاد صیب! کیا ام راتھی یہاں سے جا رہا ہے؟"

میں نے کہا "جو تم نے سنا ہے' وہی میں نے سنا ہے۔"

زریں گل کی اچٹتی ہوئی سی نگاہ اروشی پر پڑی اور وہ ایک دم اداس ہو گیا۔ میں اس کی اداسی کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ وہ آج کل اروشی میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کا کھیل خوب جما ہوا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہاں سے بستر بوریا گول کرنا پڑے گا۔

اسی رات میں' فریال اور زریں گل دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ جب میں اور زریں گل پشاور کے ڈبگری بازار والے مکان میں مقیم تھے اور فریال ہمارے لیے کھانا لے کر آیا کرتی تھی۔ سخت سردی میں لحافوں میں دبک کر ہم دیر تک گپ شپ کیا کرتے تھے۔ اب موسم بالکل مختلف تھا۔ کھڑکیوں سے باہر سبزے پر بوندیں برس رہی تھیں اور حالات بھی وہ نہیں تھے جو پشاور میں تھے۔ ہم سب پردیس میں ایک نہایت غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھے۔ غزالہ ہم سے بہت دور جا چکی تھی' اور فریال دو ڈھائی ماہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر ہمارے پاس واپس آئی تھی۔ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ رنگت زرد تھی اور آنکھوں میں جیسے ابھی تک وہ درد ناک مناظر ٹھہرے ہوئے تھے جو اسے ٹیلی فون پر چیخنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔

شیخ عاصم کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد وہ ارد گرد کے حالات سے بالکل بے خبر رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم بھوپال سے سری لنکا' کیسے اور کیونکر پہنچے۔ یہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھی کہ شیخ عاصم ہمیں ایسا ایک چھوڑنے پر تیار کیوں ہو گیا ہے۔ وہ بے خبر تھی کہ اس آزادی کے لیے مجھے شیخ عاصم کے دشمنوں سے باقاعدہ معرکہ لڑنا پڑا ہے۔ فریال کی بے خبریوں کا سلسلہ بہت دراز تھا۔ یہاں تک کہ وہ شیخ عاصم اور غزالہ کو ایک ساتھ دیکھ کر بھی حیران ہو رہی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔ میں نے اسے اس رشتے کے بارے میں بتایا تو اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ غزالہ کی شادی تو کینیڈا میں مقیم پڑھے لکھے ایک اسمارٹ لڑکے سے ہوئی تھی۔ پھر وہ شیخ عاصم کی بیوی کیسے بن گئی۔ لیکن جب میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ غزالہ کا شوہر اخلاقی اور جسمانی دونوں طور پر بیمار تھا بلکہ اس کی اخلاقی بیماری تو اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ وہ اسے پیسہ کمانے کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔

فریال' غزالہ سے بہت پیار کرتی تھی۔ غزالہ پر گزرنے والے کربناک حالات کے ذکر نے اس کا دل پارہ پارہ کر دیا۔ وہ سسک کر بولی "یہ شادی نہیں شاہجہاں صاحب' یہ غزالہ جی کی مجبوری کا سودا ہے جو انہوں نے شیخ عاصم سے کیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ غزالہ جی کو شیخ عاصم کے قبضے میں چھوڑ کر واپس پاکستان جاؤں۔ ہمیں انہیں ساتھ لے کر جانا ہو گا۔ ہر صورت اور ہر قیمت پر۔"

میں نے کہا "فریال! تم یہ بات اس لیے کہہ رہی ہو کہ غزالہ سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی۔ غزالہ کے خیالات اس کے برعکس ہیں۔ وہ شیخ عاصم کو شوہر سمجھتی ہے اور ایک بیوی کی طرح اس کی ہمدرد اور وفادار ہے۔ وہ اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتی۔"

"وہ دھوکا کھا رہی ہے" فریال بولی "اور افسوس کی بات یہ کہ آپ سب کچھ جانتے بوجھتے اسے اس دھوکے میں رہنے دے رہے ہیں۔ آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں کہ شیخ عاصم وہ نہیں جو نظر آ رہا ہے۔"

"میں نے شروع میں کوشش کی تھی فریال... لیکن پھر مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے کسی مفاد کے لیے غزالہ کو اس کے شوہر سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں... میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔"

"شاہ جہاں صاحب! مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔ آپ کو تو میں ایک مضبوط آدمی سمجھتی ہوں۔ آپ کسی اجنبی کو بھی مصیبت میں دیکھتے ہیں تو اپنی جان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔ غزالہ جی تو ہماری اپنی ہیں' ہماری جان ہیں' ہماری زندگی کا ایک انمول حصہ ہیں۔ آپ نے ان کی طرف سے ایسی بے پروائی کیوں برتی؟"

"میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا" میں نے سرد مہری سے کہا۔

"لیکن میں کہنا چاہتی ہوں۔ آپ سے بھی اور غزالہ جی سے بھی۔ بلکہ میں صبح ہی جاؤں گی غزالہ جی کی طرف۔ ان سے پوچھوں گی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں اور کس کے لیے؟"

زریں گل بولا "فریال بی بی! ام آپ کو منع نہیں کرے گا لیکن یہ بات خود ام نے بھی محسوس کیا ہے کہ غزالہ بی بی بہت بدل گیا ہے۔"

زریں گل اس سلسلے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سیلانی لڑکی جو کہہ رہی ہے وہ کر کے رہے گی۔ اسے سمجھانے بجھانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔

اگلی صبح فریال نے واقعی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ غزالہ سے ملنے نکل کھڑی ہوئی۔ سنہالی گارڈز نے اسے روکا۔ اس نے ایک گارڈ سے کچھ بات چیت کی۔ وہ گارڈ رہائشی حصے کی طرف گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر فریال کو ساتھ لے گیا۔ فریال کم و بیش ایک گھنٹا غزالہ کے پاس رہی۔ اس کی واپسی تب ہوئی جب میں اور زریں گل ناشتا کر چکے تھے اور کمرے سے نکل کر باہر برآمدے کی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ فریال کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مایوس اور شکستہ دل واپس آئی ہے۔ اس کی آنکھیں نم تھیں اور گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد میں اور زریں گل اس کے پاس پہنچے۔ وہ رو رہی تھی۔

زریں گل نے کہا "فریال بی بی' ام نے کہا تھا نا کہ آپ غلط سوچ رہا ہے۔ غزالہ بی بی اپنے شوہر پر بے حد بھروسا کرتا ہے۔ وہ یہاں بالکل اپنی رضامندی اور خوشی سے رہ رہا ہے۔"

فریال نے گلوگیر آواز میں کہا "ہمیں کیا۔ یہ ان کی اپنی زندگی ہے۔ وہ جس طرح چاہیں گزاریں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "ہمیں کب واپس جانا ہے یہاں سے؟"

میں نے کہا "میرے بس میں ہو تو ابھی چل دوں۔ یہاں سب کچھ شیخ عاصم کے اختیار میں ہے۔"

فریال جو کل اس بات پر حیران تھی کہ ہم غزالہ کے بغیر یہاں سے جانے کا کیوں سوچ رہے ہیں' آج یکسر بدلی ہوئی تھی۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ ہم جانے کا پروگرام طے کرنے لگے۔ یہ باتیں سن کر زریں گل ایک دم اداس ہو گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔ مجھے لے کر وہ سبزہ زار میں آ گیا۔ یہاں رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ تیز دھوپ میں نباتات کی مہک رچی بسی تھی۔ زریں گل پر عجیب سا موڈ طاری تھا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگا "استاد صیب! ام جانے سے پہلے مس اروشی کو کوئی یادگار تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ایسا تحفہ جو مس اروشی کو ہمیشہ امارا یاد دلاتا رہے۔ وہ بہت اچھا لڑکی ہے استاد صیب! بہت پیارا اور محبت کرنے والا۔"

میں نے کہا "پھول سے اچھا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جانے سے پہلے اسی سبزہ زار میں سے اچھے اچھے پھول توڑنا اور ان کا گلدستہ بنا کر دے دینا۔"

"نہیں استاد صیب! پھول تو عارضی چیز ہے۔ ام چاہتا ہے کوئی پائیدار چیز ہو' بہت پائیدار۔"

"تم پھر پاتا کی چپل لے دو۔ سنا ہے یہاں سے بھی ملتی ہے!"

"خو استاد صیب! آپ تو مذاق کرتا ہے' ام بہت سنجیدہ ہے۔"

میں نے کہا "سنجیدہ تو تم درجنوں بار ہو چکے ہو۔ تین بار تم لاہور میں سنجیدہ ہوئے تھے۔ تین چار بار پشاور میں۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا۔"

"نہیں استاد صیب! وہ اور بات تھا۔ اس بار تو کسی نے بس امارا دل نکال لیا ہے۔ ام کو تو یوں لگتا ہے جیسے فلمستار ریکھا ایک نئے روپ میں بالکل نوجوان ہو کر امارے سامنے آ گیا ہے۔ آپ کو کچھ پتا نہیں ام پر کیا بیت رہا ہے۔ آپ بس امارا اتنا مدد کریں کہ ام کو کوئی اچھا سا تحفہ بتا دیں۔"

"تحفہ تو میری سمجھ میں کوئی نہیں آ رہا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "اگر بہت زیادہ ضروری ہے تو پاکستان سے جا کر بھیج دینا۔ وہاں سے بھیجو گے تو اسے خوشی بھی زیادہ ہو گی۔ اور پھر وہ ایسی چیز ہو گی جو اس کے لیے نئی بھی ہو گی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے" زریں گل چہکا "امارے پشاور میں بہت سا ایسا چیزیں ہے جو مس اروشی نے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔"

"بالکل" میں نے تائید کی "تم وہاں سے مس اروشی کو کڑھائی دار کرتہ' گرم شال اور رومال بھیج سکتے ہو۔ مس اروشی کے کسی بزرگ کے لیے نسوار کا توڑا بھیج سکتے ہو' قہوہ بھیج سکتے ہو' تمباکو کی بوری بھیج سکتے ہو اور بوری کے ساتھ غڑغڑی (حقہ) بھی۔"

"نہیں استاد صیب' ام نے سوچ لیا" زریں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ام مس اروشی کو سونے کے جھمکے بھیجے گا۔ ان جھمکوں پر ام کوہاٹ سے کشیدہ کاری کروائے گا۔ ایسا خوبصورت چیز بنے گا کہ مس اروشی ساری زندگی کانوں سے نہیں اتارے گا' لیکن..." ایک دم زریں گل چپ ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں۔ ام پیسوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ جھمکے کافی مہنگا بنتا ہے۔ دو ڈھائی ہزار تو لگ ہی جاتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ام کچھ نہ کچھ کر لے گا۔"

میں نے کہا "خو اوئے کھاچڑا! ایک دم ناکارہ شخص ہے تو۔ دو ڈھائی ہزار روپے کے لیے پریشان ہو رہا ہے۔ ابے عقل کے اندھے! تو بہت امیر کبیر شخص ہے۔ اس بات کو کیوں بھول رہا ہے جس کے مال میں صرف تم' منور اور میں حصے دار ہیں۔ تمہیں یاد نہیں ہم نے ڈیڑھ سو کروڑ کا حساب کتاب لگایا تھا۔ پچاس پچاس کروڑ تو ہمارے حصے میں آ ہی جاتا ہے۔ پتا آتا ہے کہ نہیں؟ اس پچاس کروڑ میں سے دو ڈھائی کروڑ کے جھمکے وغیرہ بنوا دینا اپنی پیاری کو۔"

"خو استاد صیب! آپ اماری ہر بات کو مذاق میں لیتا ہے۔"

میں نے کہا "تم بات ہی ایسی کرتے ہو۔ جہاں اچھی صورت

دیکھتے ہو تمہاری رال ٹپک پڑتی ہے۔ بھلا یہ کوئی جگہ تھی عشق کرنے کی۔"

"ھو استاد صیب! ام آپ کو کیا سمجھائے۔ عشق کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے۔ آپ پاکستانی فلموں کا بات مذاق میں ٹال دیتا ہے اس لیے ام یہ مثال نہیں دے گا۔ آپ انڈیا کا مثال لیں۔ ہالی ووڈ کی فلموں کا مثال لیں۔ دنیا کا کوئی فلم ایسا بتادیں جس میں عشق اپنی مرضی سے کیا گیا ہو۔ بتائیں کوئی مثال؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میری نگاہ رہائشی حصے کی طرف اٹھ گئی۔ غزالہ چھل قدمی کے انداز میں سبزہ زار کی طرف چلی آرہی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں کوئی آسمانی چیز ہی نظر آتی تھی۔ بال اس نے شانوں پر کھلے چھوڑ رکھے تھے جو خنک ساحلی ہوا میں ہولے ہولے لہرا رہے تھے۔ مجھے اور زریں گل کو سبزہ زار میں دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ واپس مڑ جائے گی۔ لیکن ہم رکھ رکھاؤ کے تحت ہی لہٰذا اسے قدم بڑھانے ہی پڑے۔ وہ متانت سے چلتی ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی "کیا حال ہے زریں گل؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"بس جی زندہ ہے" زریں گل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اور آپ کیسے ہیں شاہ جہاں؟" وہ جھکی جھکی نظروں سے بولی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور شیخ عاصم کے فرمان کے تحت پاکستان جارہا ہوں۔"

"اللہ آپ کو خیریت سے پہنچائے۔ فریال کا بہت خیال رکھئے گا۔ اسے جو تکلیف یہاں پہنچی ہے اس کے لیے معذرت اور معافی کے الفاظ بہت چھوٹے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے ایک دن بھی اس حالت میں نہ رہنے دیتی۔ بہرحال اب وہ آزاد ہے۔ آپ اسے جلد از جلد پاکستان لے جائیں۔"

میں نے کہا "ہم تو مسافر ہیں۔ سامان باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ جس وقت آرڈر آئیں گے روانہ ہو جائیں گے۔"

اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ میں اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن یہ کیفیت ایک لمحے میں میرے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی۔ وہ زریں گل سے مخاطب ہو کر بولی "زریں! تم بھی فریال کی طرح مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں غزالہ بی بی! ام آپ سے ناراض کیسے ہو سکتا ہے۔ امارے دل میں آپ بہت اونچے مقام پر بیٹھا ہوا تھا۔ ام کو خود پتا نہیں ام آپ کا کتنا عزت کرتا ہے۔"

"پاکستان جا کر مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟" وہ قدرے اداسی سے بولی۔

"نہیں غزالہ بی بی! ام میں سے کوئی آپ کو نہیں بھول سکتا۔۔۔ کبھی نہیں۔ آپ خود سوچیں' فریال آپ کو بھول سکتا۔ انجم بی بی بھول سکتا ہے؟ استاد صیب بھول سکتا ہے؟ یہ استاد آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان سے پوچھیں' یہ بھول سکتے آپ کو۔۔۔ کبھی نہیں۔"

غزالہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "زریں! تم نے یہاں کی کوئٹہ بریانی کھائی ہے؟" زریں نے نفی میں سر ہلایا۔ غزالہ نے کہا "پشاور کے چپل کباب کی طرح کی بریانی مشہور ہے۔ میں آج آپ کو کھلاؤں گی۔"

کھانے پینے کا ذکر آیا تو زریں کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ غزالہ اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ میری نگاہ غزالہ کے پاؤں پر ٹکی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت سینڈل پہن رکھی تھی اس نے اور بے حد قیمتی بھی۔ ان پر دائرے کی شکل میں قیمتی پتھر لگے ہوئے تھے۔ یہ پتھر اگر شامل کر لیے جاتے تو اس جوتی کی قیمت لاکھوں میں تھی۔ شیخ کے بس میں نہیں تھا ورنہ شاید وہ غزالہ کو ایسی جوتی پہناتا جس میں ہیروں کے سوا اور کچھ بھی استعمال نہ ہوتا۔ وہ غزالہ کے سلسلے میں دیوانہ سا ہو چکا تھا۔ ہر گھڑی ہر پل اس کا سایہ بنا رہنا چاہتا تھا' اور اس کی یہ وارفتگی اتنی واضح تھی کہ ریسٹ ہاؤس کا ہر مکین محسوس کر سکتا تھا۔

جس وقت میں' زریں گل اور غزالہ باتیں کر رہے تھے' سعودہ سامنے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ غزالہ کو میرے قریب پا کر اس کے چہرے پر بے چینی اور کدورت کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تو برداشت کرتی رہی پھر اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئی۔ چہرے پر منافقانہ مسکراہٹ سجا کر بولی "لو واہی بات چیت ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "صرف بات چیت ہو رہی ہے۔"

وہ بولی "صرف بات چیت ہو رہی ہو تو چہرے یوں نرائی نہیں ہوتے۔"

زریں گل ترخ کر بولا "تم امارے پر تھانیدار لگا ہے جو یہاں تفتیش فرما رہا ہے۔ بولو کیا لگا ہے تم؟"

"تم میرے منہ مت لگو خان۔ میں تم سے بات نہیں کر رہی۔"

"لیکن ام تم سے بات کر رہا ہے۔ تم یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ۔ خو سچ تم کو کسی نے بتایا نہیں کہ جب تین شریف آدمی بات کر رہا ہو تو خوار تحرا ہی نہیں لیتے۔"

"پھٹے باز تم خود ہو" وہ چمک کر بولی۔

زریں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے اسے سختی سے روک دیا "خبردار زریں! مجھے یہاں فساد نہیں چاہیے۔ اور تم بھی چپ رہو سوچ۔"

میں اسی وقت میری نگاہ ایک لمبے تڑنگے شخص پر پڑی۔ وہ سبزہ زار کے درختوں میں سے نکل کر ہماری طرف آرہا تھا۔ اس نے ایک سیاہ چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ میں نے اس شخص پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے ملازمین میں سے کوئی ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنی تیزی سے ہوا اور اس قدر حیران کن تھا کہ ہم ہکے بکے رہ گئے۔ مجھ سے قریباً پندرہ گز کی دوری پر پہنچنے کے بعد ٹانگ سے معذور شخص نے اپنی چادر کی بکل کے اندر سے سیاہ نال والا ریوالور نکال لیا۔ میں نے ریوالور کی جھلک دیکھی اور اس کے ساتھ ہی میری نگاہ ریوالور بردار کے چہرے پر پڑی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس شخص سے میری مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ دراز گیسو اور زرد چہرے والے اس شخص کا نام جیو سنگھ تھا اور یہ تھوڑے دن پہلے اروشی کو اغوا کرنے کے لیے ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ اس نے زہریلی کرپان کے ساتھ مجھ پر حملہ بھی کیا تھا۔ اس نے ریوالور میری طرف سیدھا کیا تو میں تیزی سے زمین پر گر گیا۔ فائر کے دھماکے کے ساتھ ہی غزالہ اور سوچ کی چیخیں گونجیں۔ اضطراری طور پر وہ دونوں مخالف سمت میں بھاگیں۔ زریں گل نے دوڑ کر ایک درخت کی آڑلی تھی۔ حملہ آور کی دوسری گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ قدرت کی طرف سے مجھے ایک سنہری موقع ملا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو خودکشی کا مرتکب ہوتا۔ میں کھلے میدان میں تھا اور میری جان کا دشمن ہاتھ میں ریوالور لیے صرف دس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ میں نے کہنیوں اور گھٹنوں کے بل اپنے جسم کو زمین سے بلند کیا اور لیٹے لیٹے جست کر کے ایک فوارے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اسی دوران میں تیسرا فائر بھی ہوا لیکن اب میں براہ راست فائرنگ کی زد سے نکل گیا تھا۔ میں اور زریں گل دونوں نہتے تھے ورنہ اب تک حملہ آور کے جسم میں چھٹانک بھر سکہ اتر چکا ہوتا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ حملہ آور فاصلے پر تھا۔ جب تک وہ پاس نہ آتا میں اس کے خلاف کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اسی دوران میں میں نے مسلح گارڈز کی آوازیں سنیں۔ وہ بھاگتے ہوئے سبزہ زار کی طرف آرہے تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ حملہ آور کسی بھی لمحے مجھے یا زریں کو نشانہ بنا سکتا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی رائفلیں حملہ آور کی طرف سیدھی کر لیں۔ حملہ آور پر جنونی کیفیت سوار تھی۔ اس نے بلا دریغ مسلح گارڈز پر بھی فائر جھونک مارے۔ میں نے فوارے کی اوٹ سے ایک گارڈ کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ اس کے بعد ایک دم رائفلوں کی تڑتڑ گونجی۔ ہر ایک کا ہدف جیو سنگھ ہی تھا۔ وہ اچھل کر ایک بار زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ اس کا ریوالور دور جا گرا تھا۔

مسلح گارڈ کے ساتھ ساتھ میں اور زریں گل بھی موقعے پر پہنچے۔ جیو سنگھ راہی عدم ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے اور سینے پر نصف درجن گولیاں لگی تھیں۔ اس کے جسم کے گرد بکل کی طرح لپٹی چادر خون سے رنگین ہوتی جارہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک اپنی بیساکھی پر تھا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی ریسٹ ہاؤس میں ہر طرف افراتفری مچ گئی تھی۔ مجھے ایک جانب سے کسی ملازمہ کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا غزالہ فرش پر بے سُدھ پڑی تھی اور ادھیڑ عمر ملازمہ اس کے سرہانے بیٹھی چلا رہی تھی۔ میں اور زریں گل دوڑتے ہوئے غزالہ تک پہنچے۔ کوئی اس کے ٹخنے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کا پاؤں اور قیمتی سینڈل خون سے داغدار ہو رہے تھے۔ زخم ایسا سنگین نہیں تھا' پھر غزالہ کے بے ہوش ہونے کی وجہ کیا تھی؟ ملازمہ نے واویلا کیا تو پتا چلا کہ غزالہ کو گرنے سے چوٹ آئی ہے۔ دراصل سبزہ زار کا فوارے والا حصہ باقی سبزہ زار سے چار پانچ فٹ بلند تھا۔ یہاں سے سنگِ مرمر کے شفاف زینے نیچے اترتے تھے۔ گولی لگنے کے بعد غزالہ انہی زینوں سے گر گئی تھی۔ پہلی نظر میں اندازہ ہوجاتا تھا کہ اسے سر یا ریڑھ کی ہڈی میں شدید چوٹ آئی ہے۔ وہ بالکل بے ہوش تھی۔ رنگت لیموں کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ زریں گل نے فوارے کے چھوٹے سے حوض سے پانی لے کر غزالہ کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ ملازمہ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگی۔ میں نے شانوں سے تھام کر اسے جھنجوڑا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

میں نے نبض دیکھی۔ وہ تشویشناک حد تک مدھم تھی۔ بظاہر جسم پر کہیں چوٹ کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اب شیخ عاصم اور اس کا سیکرٹری بھی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے تھے۔ شیخ عاصم کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور چہرے پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ گارڈز رائفلیں سونتے چاروں طرف چکراتے پھر رہے تھے۔ غزالہ کو فوراً گاڑی میں ڈال کر اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ شیخ عاصم اور ایک بوڑھی چینی ملازمہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ہر چہرے پر خوف و ہراس تھا اور اندیشوں کے گہرے سائے پھیلتے جارہے تھے۔

میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ جیو سنگھ کے بارے میں یہ طے تھا کہ وہ دوھیان کاکا کا آدمی ہے۔ وہ مجھ پر قاتلانہ حملے کی نیت سے ریسٹ ہاؤس میں گھسا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دھیان کاکا اور ۳ ے کو "کو اس معاہدے کا کوئی پاس نہیں تھا جو صرف بہتر گھنٹے پہلے ہوا تھا اور جس کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر اور بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ سارے معاملات چوپٹ ہو سکتے تھے لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ حملہ جیو سنگھ کا انفرادی فعل ہو اور اس میں کاکا وغیرہ کا عمل دخل نہ ہو۔ میں نے دل کی گہرائی سے دعا کی کہ کاش ایسا ہی ہو اور ہمیں کسی نئے طوفان سے آشنا نہ ہونا پڑے۔

غزالہ کو پیش آنے والے حادثے نے فریال اور زریں گل کو بھی سخت ملول کر رکھا تھا۔ شام تک نہ تو شیخ عاصم واپس آیا اور نہ

غزالہ کے بارے میں کوئی اطلاع ملی۔ ریسٹ ہاؤس میں ہر اس کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ سہ پہر چار بجے کے لگ بھگ پولیس کی دو گاڑیاں ریسٹ ہاؤس پہنچی تھیں اور ایک انسپکٹر نے موقعے پر تفتیش کرنے کے بعد جیو سنگھ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی تھی۔ حالانکہ جیو سنگھ کے حملے کا نشانہ میں ہی تھا اور مجھے خدشہ تھا کہ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

رات آٹھ نو بجے تک سخت بے چینی رہی پھر پتا چلا کہ غزالہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا اور وہ اسپتال کے آئی سی یو میں زیرِ علاج ہے۔ غزالہ کی مسلسل بے ہوشی تشویشناک تھی۔ میرے خیال میں اسے زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے کے اندر ہوش میں آجانا چاہیے تھا۔ ایسا نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ صورتِ حال ٹھیک نہیں۔

رات دس بجے کے قریب وہ سنہالی ملازمہ ریسٹ ہاؤس واپس آگئی جو غزالہ اور شیخ عاصم کے ساتھ اسپتال گئی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ مسز (غزالہ) کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ ابھی تک گہری بے ہوشی میں ہیں۔ ان کے سر کے پچھلے حصے پر چوٹ آئی ہے اور خون جمع ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر وہ جلد ہی ہوش میں نہ آئیں تو آپریشن کرنا ہوگا۔

یہ ساری اطلاعات بڑی جانکاہ تھیں۔ میری نگاہوں میں غزالہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ زریں گل سے باتیں کر رہی تھی جب اچانک وہ لنگڑا بلائے ناگہانی کی طرح ہم پر نازل ہوا تھا۔ اس کے غضب کا نشانہ میں تھا لیکن اس غضب نے میرے بجائے غزالہ کو ہدف بنا ڈالا تھا۔ میرے سینے میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ مہربان کاکا کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ کیا۔

"ہیلو کاکا! میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

"او' شاہ جہاں! مجھے امید تھی تم فون کرو گے۔ آج جو کچھ وہاں ہوٹل میں ہوا مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔"

"ظاہر ہے افسوس تو ہوگا" میں نے کہا "تمہارا کارندہ مجھے قتل کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

"نہیں شاہ جہاں! تم غلط سوچ رہے ہو" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "ہم وعدے کا پاس کرنے والے لوگ ہیں۔ تم سے جو کچھ طے ہو چکا ہے ہم اس سے باہر نہیں جائیں گے۔"

"تمہاری چالبازی مجھے فریب نہیں دے سکتی۔"

"میں نے کوئی چالبازی نہیں کی۔ جیو سنگھ نے جو کچھ کیا اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ وہ ایک آتش مزاج شخص تھا۔ تمہارے ساتھ لڑائی میں اسے زہریلی کرپان کا زخم لگا۔ اس زخم کے سبب اسے ٹانگ سے محروم ہونا پڑا۔ جو لوگ جیو سنگھ کو جانتے ہیں انہیں معلوم تھا کہ وہ تم سے بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ لیکن یہ امید کسی کو نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی کرے گا اور اسپتال سے بھاگ کر سیدھا وہی ہوٹل جا پہنچے گا۔"

"تم اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہو" مہربان کاکا سے میں نے کہا "تمہیں تاوان میں کچھ کرنا ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"

"میں تمہارے سامنے صفائیاں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا" کاکا کے لہجے میں خفگی عود کر آئی۔ "فی الحال غصے میں ہو۔ ایک دن میں خود ہی جان جاؤ گے کہ سچ کیا ہے۔ جہاں تک معاہدے کا تعلق ہے تو ہم اس کے سلسلے میں پوری طرح نیک نیت ہیں۔"

کاکا سے بات کرنے کے بعد مجھے کسی حد تک اطمینان ہو گیا ہونے کو" اور میرے درمیان ہونے والا سمجھوتا خطرے میں نہ تھا۔ لیکن غزالہ کے سلسلے میں تشویش برقرار تھی بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ زریں گل بھی مسلسل جاگ رہا تھا اور اسپتال سے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا۔ وہ ساری رات ہم نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح معلوم ہوا کہ غزالہ کو پرائیویٹ اسپتال سے کولمبو کے بڑے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا اور وہاں اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔ یہ خطرناک قسم کا آپریشن تھا اور شیخ عاصم مشش و پنج میں تھا کہ یہ آپریشن یہاں کرایا جائے یا نہیں۔ وہ غزالہ کو سری لنکا سے باہر لے جانا چاہ رہا تھا لیکن اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سفر اور اس کی تھکن برداشت کر سکتی۔ ہاؤسنگ کے چیچے میں سیڑھیوں سے گرنے کا واقعہ جو شروع میں معمولی لگا تھا بتدریج انتہائی سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔

دوپہر سے ذرا پہلے شیخ عاصم ریسٹ ہاؤس واپس آیا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ تھیں۔ اس نے بتایا کہ دواؤں کے استعمال سے غزالہ کی حالت قدرے سنبھلی ہے اور اس کا آپریشن فی الحال ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ غزالہ کے آپریشن کے لیے آسٹریا سے ایک سرجن کو یہاں بلا رہا ہے۔

میں نے کہا "اگر کسی طور میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ۔"

وہ بولا "میں چاہتا ہوں کہ غزالہ کے والدین کو مطلع کیا جائے اور ہو سکے تو انہیں یہاں بلا لیا جائے۔ میں تمہیں لاہور کا ایک ایڈریس دے رہا ہوں۔ وہاں رابطہ کرو۔ وہ لوگ غزالہ کے والدین کو یہاں بھجوانے کی کوشش کریں گے۔"

اس کے بعد شیخ عاصم نے مجھے لاہور کا ایک ایڈریس لکھوا دیا۔ وہ اس کی فرم کے ایک برانچ آفس کا ایڈریس تھا۔ ایڈریس لکھوانے کے بعد شیخ عاصم کے ذہن میں کوئی نیا خیال آیا اور اس کی سرخ و سپید پیشانی پر سوچ کی نئی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ سگار کا ایک گہرا کش لے کر بولا "ویسے بہتر یہ ہے کہ تم خود ہی لاہور چلے جاؤ اور انہیں یہاں لے آؤ۔ تمہارے ساتھ آنے میں وہ لوگ آسانی محسوس کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے سفری کاغذات آج شام تک تیار ہو جائیں گے۔ تم آج ہی نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "میرا خیال یہ ہے کہ میں اس کام کے لیے موزوں نہیں ہوں۔"

شیخ عاصم غمزدہ آواز میں بولا "یہ موزوں یا ناموزوں ہونے کی بات نہیں۔ غزالہ کی حالت خطرے میں ہے اور اس کے والدین کو یہاں لانے کے لیے میں خود پاکستان جا نہیں سکتا۔ اگر وہ از خود یہاں آنا چاہیں گے تو انہیں کافی مشکلات پیش آئیں گی اور خاطر خواہ تاخیر بھی ہوگی۔ تم اپنے مہربان ایس پی احمد دجال ساحی کی مدد سے انہیں جلد یہاں لا سکتے ہو۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ شیخ عاصم غزالہ کے والدین کو سری لنکا لانے کی ذمے داری مجھے ہی کیوں سونپ رہا ہے۔ وہ اس سے پہلے کئی بار پاکستان جا چکا تھا۔ یقیناً وہاں بااختیار لوگوں سے اس کے رابطے ہوں گے۔ وہ ان کے ذریعے آنا فاناً اپنا کام کرا سکتا تھا۔

میں نے کہا "اگر میرا جانا بہت ضروری ہے تو میں چلا جاؤں گا۔"

"تھینکس" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "مجھے یقین ہے آج شام تک تم چاروں یہاں سے روانہ ہو سکو گے۔ اگر نہ بھی ہوا تو کل علی الصباح یہاں سے نکل جانا۔"

سہ پہر کے وقت میں' فریال اور زریں گل اسپتال میں غزالہ کو دیکھنے گئے۔ آئی سی یو میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے بند دروازے کے شیشے میں سے غزالہ کو دیکھا۔ وہ سفید براق بستر پر سفید لباس میں بالکل سیدھی پڑی تھی۔ اس کی رنگت کورے لٹھے کی طرح سفید تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ گلوکوز' گیس اور دل کی حرکت بتانے والے آلے کی نالیوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ گندمی رنگوں والے سری لنکن ڈاکٹر اور نرسیں اس کے گرد خاموشی سے گھوم پھر رہے تھے۔ فریال' غزالہ کی حالت دیکھ کر آنسو بہانے لگی مجھے بھی اپنا دل ایک بھاری بوجھ تلے دبتا محسوس ہوا۔ ایک عجیب سا خوف دل و دماغ کو گھیرے میں لے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کئی برس پیچھے چلا گیا ہوں۔ گرمیوں کی سنسان دوپہر ہے۔ میں جل کٹ کے کسی باغ میں جامن توڑ رہا ہوں۔ ننھی منی غزالہ بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ نٹنی پر گری جامنوں کی تلاش میں بہت دور نکل گئی ہے۔ میں اسے آوازیں دے رہا ہوں "غزالو! دور مت جاؤ۔ غزالو۔ آگے مت جاؤ۔ واپس آجاؤ غزالو" وہ میری نہیں سن رہی۔ آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ پیڑوں کے پیچھے اوجھل ہو رہی ہے۔

میرا دل ہولنے لگا۔ میں آئی سی یو کے بند دروازے سے ہٹ کر دور رکھے صوفوں پر جا بیٹھا۔ زریں گل عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم اسپتال میں ہی تھے جب ہمیں پتا چلا کہ آسٹریا کا ایک معروف نیورو سرجن آج رات غزالہ کو دیکھنے کولمبو پہنچ رہا ہے۔

اس شام ہم پاکستان کے لیے روانہ نہیں ہو سکے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے ٹکٹ اگلے روز بارہ بجے کے ہیں۔ ہمیں ائیر لنکا سے سفر کرنا تھا۔ مجھے' زریں اور فریال کو پاکستان پہنچنا تھا جب کہ سہراب کو دہلی جانا تھا۔ روانگی سے پہلے ہمیں ایک قدرے خوش کن خبر ملی۔ معلوم ہوا کہ رات آسٹریا کے سرجن نے مقامی ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر تین چار گھنٹے تک غزالہ کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ جدید ترین طریقوں کے مطابق اس کی برین اسکیننگ کی گئی ہے اور دیگر ٹیسٹ لیے گئے ہیں۔ سرجن نے کہا ہے کہ غزالہ کا آپریشن نہیں ہوگا۔ نہ ہی اسے بیرونِ ملک لے جایا جائے گا۔ کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اسے صرف دواؤں کے ذریعے "ٹریٹ" کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ وہ جلد سے جلد ہوش میں آجائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یورپین سرجن غزالہ کے ہوش میں آنے تک سری لنکا میں ہی رہے گا۔

ہمیں دو گھنٹے پہلے ائیرپورٹ پہنچنا تھا لہٰذا دس بجے کے لگ بھگ ہم ریسٹ ہاؤس چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دو ڈھائی ماہ پہلے جب ہم یہاں پہنچے تھے' ریسٹ ہاؤس کی سرسبز عمارت پر تاریک بادلوں کے سائے تھے' آج بھی گھنگھور گھٹاؤں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا اور ننھی ننھی بوندیں گر رہی تھیں۔ زریں گل

ایم اے راحت کے قلم سے

قارئین پر اپنی گرفت سخت کرتی ہوئی ایک دلچسپ کہانی

پرواز

ایک بانکے اور سجیلے نوجوان کا قصہ جو پاکستان پر سو جان سے قربان ہونے کو تیار رہتا ہے۔

★

وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اس پر نامہربان ہو گئے تو وہ اندر سے ٹوٹ گیا۔ لیکن فتح اس کا مقدر تھی

قیمت -/۵۰ ——— ڈاک خرچ -/۲۰

ناشر: علمی پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

اشاعت: علمی بک سٹال نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور

بسمہ لوا اس نظر آرہا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ٹینا اروشی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن اروشی رات سے اسپتال میں فرزانہ کے پاس تھی۔ اسے نو دس بجے تک آجانا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ زریں گل آخری لمحے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس گاڑی میں سوار ہو گیا جو ہمیں ائیرپورٹ لے جا رہی تھی۔ گاڑی میں میرے اور زریں گل کے علاوہ فریال اور سوہج بھی سوار تھیں۔ سوہج کا منہ سوجا ہوا تھا۔ ایک تو اس کا دشمنِ جاں یعنی زریں گل گاڑی میں سوار تھا۔ دوسرے میں سوہج کی بے انتہا کوشش اور اصرار کے باوجود بھوپال یا حیدر آباد کے بجائے لاہور کا رخ کر رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر اس کے پہلو سے چپک جاؤں اور ہم دونوں سائیں عالی مرتبت کی کرشمہ ساز رہنمائی میں حیدرآباد کی خاک چھاننا شروع کریں اور ان "صندوق جات" تک پہنچیں جو نواب کی حویلی میں ہمارے ہاتھ آتے آتے رہ گئے تھے۔ لیکن مجھے کچھ اور ضروری کام بھی تھے اور میں ان کاموں سے پہلو تہی نہیں کر سکتا تھا۔

جب ہم ائیرپورٹ پہنچے ہماری گاڑی کے سنہالی ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کے اندر سے ایک بڑا لفافہ نکال کر زریں گل کو تھما دیا۔ اس لفافے میں ایک خوبصورت کرتہ اور لنگی تھی۔ ان کپڑوں پر سری لنکا کے مخصوص انداز میں کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ان کپڑوں کے بارے میں ڈرائیور نے انگریزی میں زریں گل کو بتایا کہ یہ مس اروشی نے اس کے لیے دیے ہیں۔ زریں گل کی سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا تاہم فقرے میں "اروشی" کا لفظ اس نے فوراً سن لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی باچھیں کھل گئیں اور آنکھوں میں مسرت ناچنے لگی۔ وہ لرزاں لہجے میں ڈرائیور سے بولا "تم ہماری طرف سے مس اروشی کو بہت بہت شکریہ بولنا۔ تھینک یو۔ تھینک یو۔ ویل ڈن اور اس سے بولنا تم بہت اچھا گرل ہے۔ بہت اچھا۔"

میں نے زریں گل کو بمشکل لاؤنج کی طرف دھکیلا۔ اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہیں سڑک پر لنگی کرتہ پہن کر خٹک ڈانس شروع کر دیتا۔ ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے ہمارے کاغذات وغیرہ چیک کیے گئے۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ہم سب غیر قانونی طور پر سری لنکا میں داخل ہوئے تھے اور اب قانونی طور پر سری لنکا سے باہر جا رہے تھے۔ ایک طرح سے ہماری حیثیت مجرموں کی تھی لیکن اب ہم وی آئی پی تھے اور پورے اعزاز کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ کسی نے ہماری شان میں گستاخی کی جسارت نہیں کی۔ یہ شیخ عاصم کی دولت اور اس کے رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہم سری لنکن حکام کی نظر میں مظلوم ثابت ہو گئے تھے۔ شیخ عاصم کے "کلرز" نے ثابت کیا تھا کہ ہمیں ایک جرائم پیشہ گروہ نے انڈیا سے اغوا کیا اور زبردستی سری لنکا میں پہنچا دیا۔ کاغذات کی پڑتال کا مرحلہ بخیریت طے ہو گیا اور ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ فریال کو میرے ساتھ والی نشست ملی تھی۔ وہ غور سے میری کلائی کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

کہنے لگی "یہ گھڑی کہاں سے لی ہے آپ نے؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"یہ گھڑی کچھ عجیب سی نہیں ہے؟"

"ہاں عجیب تو ہے" میں نے اعتراف کیا۔

"کہیں یہ وہی گھڑی تو نہیں جو اس سے پہلے شیخ عاصم کے پاس تھی اور جس کی وجہ سے آپ کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا"

"ہاں یہ وہی طوطا ہے جس میں میری جان بند ہے اور آج ہی شیخ عاصم نے میرے حوالے کیا ہے۔"

"لیکن اس گھڑی اور آپ کے درمیان کم از کم دس فاصلہ رہنا ضروری تھا۔"

"ہاں ایسا ہی تھا۔ مگر اب اس میں کوئی ٹیکنیکل تبدیلی ہے اور کم از کم فاصلے کی حد کم کر دی گئی ہے۔"

فریال اس گھڑی کے بارے میں تفصیل جاننا چاہتی تھی میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا "لاہور جا کر سب کچھ بتا دوں گا۔"

لاہور کے ذکر پر وہ ایک بار پھر گم صم سی ہو گئی۔ بالکل اس بچی کی طرح نظر آنے لگی جس نے گرمیوں کی چھٹیوں کا کام نہ کیا ہو اور اگلے روز اسکول جانے کا خوف اسے ستا رہا ہو۔ کچھ ایسی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔ وہ لاہور جانا چاہ رہی تھی اور جا بھی رہی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی چاہ رہی تھی کہ وہ جلدی منزل پر نہ پہنچ پائے۔ آنے والی گھڑیوں کا خوف اسے ستا رہا تھا۔ وہ باپ سے یہ کہہ کر انڈیا روانہ ہوئی تھی کہ اپنی سہیلی کے پاس ناگپور جا رہی ہے اور دو تین ہفتے سیر و تفریح کر کے واپس آجائے گی۔ لیکن انڈیا جا کر وہ سیدھی میرے پاس حیدر آباد آئی تھی اور پھر میرے ساتھ ہی ایسے حالات کا شکار ہو گئی تھی کہ ڈھائی ماہ تک گرد و پیش سے اس کا رابطہ بالکل کٹ گیا تھا۔ اب یہ بات یقینی تھی کہ اس کا پول کھل چکا ہو گا۔ اس کی ناگپور والی سہیلی مہتاب کو اب تک اس کی گمشدگی کا راز چھپا نہیں ہو گی۔ یہ خیال فریال کے لیے سوہانِ روح تھا کہ اس کے عزیز اقارب اور خاص طور سے والدین پر کیا بیتی ہو گی اور وہ اس کی خاطر کن کن عذابوں سے گزرے ہوں گے۔

جب جہاز نے ائیرپورٹ سے ٹیک آف کیا تو وہ آنسو جو دیر سے فریال کی آنکھوں میں مچل رہے تھے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے چہرہ ہتھیلیوں میں چھپایا اور سسکنے لگی۔ میں نے اس خوش باش اور باتونی لڑکی کو پہلی بار اتنا رنجیدہ دیکھا تھا۔ میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "ایک بات کہوں فریال؟" وہ بدستور سسکیاں لیتی رہی۔ میں نے کہا "میں نے دو ہفتے پہلے تمہارے ڈیڈی کو خط لکھا تھا۔"

یہ اطلاع فریال کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئی "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

وہ اتنی اونچی آواز میں بولی کہ ارد گرد کے مسافر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔

میں نے کہا "ہاں میں نے خط لکھا تھا اور پھر بعد میں فون پر بھی ابی صاحب سے میری بات ہوئی ہے۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں پوری طرح تسلی کرا دی ہے۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم بالکل حفاظت سے ہو اور میرے ساتھ ہو۔ تمہیں سری لنکا لانے کا الزام بھی میں اپنے سر لے چکا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ ناگپور میں اتفاقاً تم سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں ہم ٹھگ گروہ کے ہتھے چڑھ گئے اور وہ ہمیں زبردستی سری لنکا لے گئے۔"

فریال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی بلا اتنی آسانی کے ساتھ اس کے سر سے ٹل گئی ہے۔ وہ مجھ سے تفصیلات پوچھنے لگی۔ میں نے سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔ در حقیقت جب فرزانہ نے بعد میں مجھے نئی دہلی چھوڑ کر "رکوانا" قصبے میں بھیجا تھا اور میں زریں گل کے ساتھ ڈے نائٹ ریسٹورنٹ کے اندر گرد سرگشت کرتا پھرتا تھا تو میں نے ایک کام یہ بھی کیا تھا کہ گاڑی میں بیٹھ کر رجال ساہی صاحب کو ایک طویل خط لکھا تھا اور زریں کے ہاتھوں پوسٹ کروایا تھا۔ بعد میں میں نے انہیں کولمبو سے کال فون بھی کیا تھا۔ اسی گفت و شنید اور انہی رابطوں کا نتیجہ تھا کہ اب رجال ساہی صاحب ہمیں ریسیو کرنے کے لیے خود ائیرپورٹ پر آ رہے تھے۔ میں نے جب یہ خبر فریال کو سنائی تو اس کی آنکھوں کی نمی خوشی کے آنسوؤں میں بدل گئی۔ اس کے جسم نے بے ساختہ حرکت کی اور وہ میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔ اس مرتبہ وہ خوشی سے رو رہی تھی۔ میں نے اسے رونے دیا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ آہستہ آہستہ وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس کی مدھم آواز میرے سامنے گونجی "میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

میں نے کہا "اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ تم اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہ ڈالو اور اچھے بچوں کی طرح کچھ دیر کے لیے اچھی طرح سے سو جاؤ۔ لاہور تک ہمارا سفر بہت طویل ہے۔ تم ڈیڑھ گھنٹے آرام سے سوتی رہو گی تو میں سمجھوں گا کہ تم نے میرا شکریہ ادا کر دیا۔"

میں اسے بزرگانہ لہجے میں مخاطب کرتا تھا تو اسے بہت برا لگتا تھا اور وہ لاشعوری طور پر اپنا سینہ کچھ اور تان لیا کرتی تھی۔ ایسے لمحوں میں وہ بھی جان بوجھ کر ایسی "بالغانہ" بات کیا کرتی تھی کہ میں بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور آنکھیں بند کیے چپ بیٹھی رہی۔ اس کی ایک بچکانہ خواہش یہ بھی تھی کہ ہر وقت مجھے ایکشن میں دیکھنا چاہتی تھی لیکن ان دنوں اس کی یہ خواہش بھی اس کے اندر گہرائی میں کہیں سو چکی تھی۔ میں نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیا اور سری لنکا کا میوزک سننے لگا۔ میوزک جس میں چائے کی خوشبو تھی۔ گھنے جنگلوں میں برستی بارشوں کا شور تھا اور ساحلی حسیناؤں کی آنکھوں کا زعفرانی رنگ تھا۔ میوزک سنتے سنتے میں سو گیا۔ میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں بانس اور تاڑ کے ایک تاریک جنگل میں بھاگا جا رہا تھا۔ فرزانہ کہیں کھو گئی تھی اور میں اسے ڈھونڈ رہا تھا پھر میں نے اپنے عقب میں سائیں عالی کو دیکھا۔ وہ کسی عفریت کی طرح میرے پیچھے لپکا آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بہت بڑا عصا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے سوہج کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ دونوں پلک جھپکتے میں میرے سر پر پہنچ گئے۔ سائیں عالی نے اپنا عصا پورے زور سے میرے سر پر مارا۔ میرا سارا جسم سُن ہو گیا۔ سائیں عالی غضب ناک انداز میں چلایا "سوہج کو چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔ سوہج کو چھوڑ کر مت جاؤ ورنہ میں تمہیں بھسم کر دوں گا۔"

سوہج میرے سینے سے چپک گئی۔ "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ میرے دیوتا! آؤ ہم اس دفینے کو تلاش کریں جس کی قدر و قیمت بے حساب ہے۔ تو ہم دنیا جہان کی مسرت اور شان و شوکت اپنی جھولیوں میں بھر لیں۔"

یکایک میں بیدار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہوائی جہاز میں ہوں۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے ائیر لنکا کی فضائی میزبان کو دیکھا۔ وہ مہمانوں کے سامنے مشروب سرو کر رہی تھی۔ میرے ذہن پر سے نیند کا ہلکا سا غبار چھٹنے لگا۔ یکایک میں نے ائیر ہوسٹس کے عقب سے سائیں عالی کا چہرہ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ اپنی سرخ بھری آنکھوں سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر اتنا حیرت ناک تھا کہ میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا۔ میری آنکھیں پوری کی پوری کھلی تھیں۔ لیکن اب سائیں عالی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ائیر ہوسٹس کے عقب میں سپاٹ دیوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یقیناً میں نے خواب ہی کا آخری منظر جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

سائیں عالی کا نادیدہ وجود کسی آسیب کی طرح میرے حواس پر سوار ہونے لگا۔ وہ اب میری نیند میں بھی مخل ہونے لگا تھا۔ ہم سوہج کو کولمبو ائیرپورٹ پر ہی چھوڑ آئے تھے کیونکہ اسے ایک دوسری پرواز کے ذریعے "دہلی" جانا تھا۔ سوہج سے جدا ہوتے ہی سائیں عالی خیالوں کے راستے میری نیند میں پہنچ گیا تھا اور مجھے سرزنش کر رہا تھا کہ میں اس الو کی پٹھی کو تنہا کیوں چھوڑ آیا ہوں۔

زریں گل ایک سیمن سیٹ کے کندھے سے سر ٹکائے بے خبر سو رہا تھا۔ تاہم فریال بدستور جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہم چند منٹ تک پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہونے والے ہیں۔

○☆○

توقع کے عین مطابق رجال ساہی صاحب ائیرپورٹ پر ہمیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھے۔ وہ سادہ لباس میں تھے۔ ان کی پیشانی پر ڈیڑھ دو ماہ پرانے زخم کا چھوٹا سا نشان نظر آرہا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ دبلے بھی ہوگئے تھے۔ ان کے پیچھے اسپیشل پولیس کے دو مسلح کمانڈوز چوکس حالت میں کھڑے تھے۔ ان کمانڈوز کے علاوہ بھی مجھے ساہی صاحب کے ارد گرد چند سفید پوش مسلح افراد نظر آئے۔ اس زبردست پروٹوکول کے ساتھ ساہی صاحب کچھ اجنبی سے محسوس ہورہے تھے۔ وہ تو بہت بے تکلف اور نرم خو قسم کے پولیس آفیسر تھے۔ پھر ان کے گرد محافظوں کا یہ مجمع کیا معنی رکھتا تھا۔

فروال ساہی صاحب کو دیکھتے ہی ان سے چمٹ گئی اور دیر تک سسکتی رہی۔ وہ خود بھی آبدیدہ ہوگئے۔ ان کا ہاتھ آہستہ آہستہ فروال کی پشت سہلا رہا تھا۔ ہم باہر آکر ساہی صاحب کی پرائیویٹ کار میں بیٹھے۔ کار کے ساتھ بھی مسلح کمانڈوز کی جیپ موجود تھی۔ ایک سی آئی ڈی انسپکٹر وائرلیس کان سے لگائے بالکل چوکس نظر آرہا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں ساہی صاحب کی رہائش گاہ پر موجود تھا۔ میں اور ساہی صاحب ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے اور باتیں کررہے تھے۔ ساہی صاحب جلد از جلد وہ حالات جاننا چاہتے تھے جن سے میں اور فروال پچھلے دوڑھائی ماہ میں گزرے تھے لیکن میں یہ سب کچھ بتانے سے پہلے ساہی صاحب کی پیشانی کی چوٹ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور ان غیر معمولی حفاظتی انتظامات کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا جو یہاں میرے دیکھنے میں آئے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی پیاری بہن شفتا کی سلامتی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

ساہی صاحب نے میری غیر معمولی تشویش دور کرنے کے لیے بتایا کہ شفتا خیریت سے ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہاں حالات زیادہ تسلی بخش نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا "شاہ جہاں! کچھ لوگ مسلسل میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں انہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ وہ ایک دفعہ مجھے اغوا کرنے کی ناکام کوشش بھی کرچکے ہیں۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ شفتا اور انجم کا پتا صرف آپ کو معلوم ہے اور جو لوگ شفتا تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ آپ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان سے کسی بھی وقت آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"مثلاً کون لوگ؟"

"مثلاً آغا قادر زماں۔ ٹھکر شکرا اور شیخ عاصم۔"

ساہی صاحب نے کہا "قادر زماں کے بارے میں تو اب میں تمہیں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں ہرگز ملوث نہیں۔ پچھلے ڈھائی ماہ میں بہت بدل گیا ہے وہ۔ بلکہ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ میرے اغوا کی کوشش ناکام بنانے میں اس کے باڈی گارڈز کا کردار بھی ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اول درجے کا بدمعاش جاگیردار ہے۔ خوبصورت عورتیں اغوا کرنا، غنڈے اور دشمنیاں پالنا اس کا شوق ہے۔ اس کے دماغ سے برائی کا خناس نکل ہی نہیں سکتا۔"

ساہی صاحب بولے "برائی کا خناس نکلا یا نہیں اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا بہرحال اب وہ میری اور تمہاری دشمنی سے مکمل طور پر باز آچکا ہے اور اس کا سہرا مجھی کنور صاحب کے سر ہے اور مجھی کنور صاحب سے بھی زیادہ امریکی ارب پتی مسٹر جی کلارک صاحب کے سر ہے اور میرے خیال میں اس سے بھی زیادہ اس شخص کے سر ہے جسے تم سائیں عالی کہتے ہو۔"

میں نے کہا "میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔"

وہ بولے "بات واقعی کچھ الجھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے اس کو تھوڑا سا سلجھا لیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ قادر زماں، ٹھکرا، مجھی کنور، سورج اور ابراہیم وغیرہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ سب لوگ رفیقے تک پہنچنا چاہ رہے ہیں اور باہم دوست بھی ہیں۔ امریکی ارب پتی مسٹر جی کلارک کی سربراہی میں یہ سب لوگ متحد ہوگئے ہیں اور انہوں نے مشترکہ جدوجہد کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں سے صرف ٹھکر شکرا ہے جو لالچ میں آکر شیخ عاصم سے مل گیا ہے ورنہ باقی سب مسٹر جی کلارک صاحب کی ہدایات پر بلا چوں چراں عمل کررہے ہیں۔ سائیں عالی نے کسی طرح مسٹر جی کلارک صاحب کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ اگر کوئی رفیقے تک پہنچ سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف تم ہو۔ اب مسٹر جی کلارک ہرگز نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے یا کسی غلط فہمی کے نتیجے میں تم انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگو۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ تمہاری لاڈلی بہن شفتا میری تحویل میں ہے اور قادر زماں اس پر بری نگاہ رکھتا ہے۔ انہوں نے مجھی کنور کے ذریعے قادر زماں کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ وہ شفتا یا انجم کا خیال دل سے نکال دے۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ قادر زماں نے مجھی کنور کی موجودگی میں شفتا کو اپنی بہن کہا ہے اور سابقہ رویے پر سخت شرمندگی کا اظہار کیا ہے۔ وہ سب لوگ تمہارے بارے میں سخت پریشان رہے ہیں اور انڈیا کے علاوہ پاکستان میں بھی تمہیں تلاش کرتے پھرے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں تمہاری آمد کے بارے میں نہیں بتایا، جونہی بتاؤں گا وہ سب سرپٹ بھاگے چلے آئیں گے۔"

میں حیرانی سے ساہی صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بھوپال سے میری گمشدگی کے بعد یہاں کافی انقلابات آچکے ہیں۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "آپ پر حملے کا کیا واقعہ تھا؟"

وہ بولے "یہ کوئی تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میں ایک شادی

شرکت کے بعد رات بارہ بجے کے لگ بھگ واپس ہوٹل سے آرہا تھا۔ سرکاری رائفل مین میرے ساتھ تھا۔ شہر کے ایک سنسان سڑک پر ایک بار بردار گاڑی ہمارے سامنے آئی۔ میرے ڈرائیور کو بریک لگانا پڑے۔ اتنے میں ایک ٹویوٹا کار موقع پر پہنچ گئی۔ اندر سے تین مسلح افراد نکلے۔ ایک نے خود کار رائفل کا برسٹ مار کر ڈرائیور اور گارڈ کو شدید زخمی کردیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میرے ریوالور نکالنے سے پہلے ہی مزید دو مسلح افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے مزاحمت کی لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ شاید وہ مجھے اپنی گاڑی تک لے جانے میں کامیاب ہوجاتے لیکن اس دوران میں آغا قادر زماں وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی شادی میں شریک ہوکر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ بونے باڈی گارڈز بھی تھے۔ یہ باوردی بونے چیختے چلاتے حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ تمہاری یہ بات درست ہے کہ وہ لڑائی بھڑائی کی ماہر نہایت خطرناک قسم کی مخلوق ہیں۔ انہوں نے ایک منٹ کے اندر اندر دو حملہ آوروں کو ڈھیر کردیا اور باقی تین بھاگ گئے۔ پکڑے جانے والوں میں لوہاری گیٹ کا ایک خطرناک غنڈا لیفا بھی شامل تھا۔ وہ کسی عبدالکریم نامی شخص کے لیے کرائے پر کام کررہا تھا۔ مجھے اغوا کرنے کے بعد ان لوگوں نے ماڈل ٹاؤن کی ایک زیر تعمیر کوٹھی میں لے جانا تھا۔ اس کے بعد ان کا کام ختم ہوجاتا تھا۔ ہم نے دونوں گرفتار شدہ افراد سے کافی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ عبدالکریم گرفتاری سے پہلے ہی فرار ہوگیا۔ اس کے علاوہ دو روز پہلے بھی کوٹھی کے باہر سے ایک مشکوک شخص کو گرفتار کیا گیا ہے۔ ابھی تھانے میں اس سے پوچھ گچھ جاری ہے۔"

میں نے پوچھا "مجھی کنور سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟"

ساہی صاحب اثبات میں جواب دیتے ہوئے بولے "وہ قریباً ہر تیسرے چوتھے روز مجھ سے ملنے آجاتا ہے۔ بہت فکرمند رہتا ہے تمہارے بارے میں۔ میرے لیے اسپیشل کمانڈوز کا انتظام اسی نے کروایا ہے۔ مجھے تو بہت الجھن ہوتی ہے لیکن مجھی جیسے بااثر اور طاقتور شخص کا حکم ٹالنا بھی آسان نہیں۔ سنا ہے عنقریب وہ کسی صوبائی اہم انتظامی عہدے پر فائز ہونے والا ہے۔ اب تو وہ عنقریب نئی شادی بھی کررہا ہے۔"

نئی شادی کا سن کر میں چونکا۔ مجھے مجھی کنور کا وہ معاشقہ یاد آیا جو ایک بیکار کی بیوی ناہید سے چل رہا تھا۔ مجھی کنور ناہید کے شوہر کو کسی سرکاری کام سے گھر سے دور بھیج دیتا تھا اور خود ناہید کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ ایسے "روحانی دوروں" پر وہ ایک دو مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کس سے شادی کررہا ہے مجھی؟"

"کوئی ناہید نام کی لڑکی ہے" ساہی صاحب نے جواب دیا "کسی بیکار کی بیوی ہے۔"

"اور مجھی کی پہلی بیوی؟"

"اسے وہ دو ہفتے پہلے طلاق دے چکا ہے۔ ان جاگیردار سیاستدانوں کے لیے شادیاں اور طلاقیں زیادہ اہم واقعات میں شمار نہیں ہوتیں۔"

میں مزید تفصیل جاننا چاہ رہا تھا لیکن اس دوران میں ایک خوش پوش ملازم چائے وغیرہ لے آیا۔ وہ گیا تو ہماری گفتگو کا رخ دوسری جانب مڑ چکا تھا۔ میں نے رجال ساہی صاحب کو وہ واقعات بتائے جو پہلے حیدرآباد اور پھر سری لنکا میں پیش آئے تھے۔ شیخ عاصم کا کردار کھل کر ساہی صاحب کے سامنے آیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ یہ خبر ان کے لیے بھی بے حد تعجب خیز تھی کہ غزالہ کے کینیڈا پلٹ شوہر نے غزالہ کو بھیانک دھوکا دیا اور وہ بدترین حالات کا شکار ہونے کے بعد شیخ عاصم کی بیوی بن چکی ہے۔ غزالہ کو پیش آنے والے حادثے کا ذکر سن کر اور اس کی تشویشناک حالت کے بارے میں جان کر ساہی صاحب مضطرب نظر آنے لگے۔

شیخ عاصم نے میرے جسم میں جو الیکٹرانک ڈیوائس نصب کیا تھا اس کے بارے میں بھی میں نے ساہی صاحب کو تفصیل سے بتایا۔ ہم بہت دیر باتیں کرتے رہے، پھر گفتگو کا رخ شفتا اور انجم کی طرف مڑ گیا۔ ساہی صاحب نے کہا "یہ شبہ تو مجھے شروع سے تھا کہ میرے ارد گرد جو پراسرار لوگ موجود ہیں وہ میرے ذریعے شفتا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اب تمہاری باتیں سن کر یہ شبہ پختہ یقین میں بدل گیا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ شیخ عاصم ہی کروا رہا ہے۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! میری رہنمائی کریں۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا کہ شیخ عاصم کے مہربان رویے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ غزالہ اس بات پر مصر ہے کہ شیخ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور اس محبت کے سبب وہ بہت بدل گیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ میں نے شیخ کو بم دھماکا کیس سے بچانے کے لیے جو تگ و دو کی ہے اس کا شیخ پر اچھا اثر پڑا ہے اور اب وہ میرے ساتھ اپنی رنجش ختم کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ لیکن میرا دل اس بات کو نہیں مانتا۔ شیخ جیسے شخص سے بہتری کی توقع ہی عبث ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شاہ جہاں" ساہی صاحب نے تائید کی "ایسے شاطروں کے مقابلے میں ہر قدم پھونک کر رکھنا چاہیے۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ساہی صاحب! میں یہاں سے روانہ ہوتے وقت آپ سے اور شفتا سے مل کر جانا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ آپ سے ملاقات ہوسکی اور نہ شفتا سے۔ اب آپ سے تو مل لیا ہے لیکن شفتا کے لیے اب بھی میرا دل بے چین ہے۔"

"میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں شاہ جہاں" ساہی صاحب نے بزرگانہ لہجے میں کہا "لیکن میں تمہیں شفتا سے ملانے کا رسک نہیں لے سکتا۔ یہ بہت خطرناک ہوگا۔ تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ یہ راز صرف میرے سینے میں رہنے دو کہ وہ کہاں ہے۔ اسی میں اس کی بہتری ہے۔"

"ساہی صاحب! مجھ سے اب برداشت نہیں ہو گا۔"
"تمہیں برداشت کرنا ہو گا۔ تمہیں وہ تحفظ حاصل نہیں جو سرکاری افسر کی حیثیت سے مجھے حاصل ہے۔ تم کسی بھی وقت ان لوگوں کے نرغے میں پھنس سکتے ہو جو شنکا کو ریاتوں کی طرح کھوج رہے ہیں۔ آج کل تشدد کے ایسے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں کہ پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ اگر تم نے کچھ بول دیا تو پھر کیا ہو گا؟"

"میں کیا کروں ساہی صاحب! اپنی بہن کو دیکھے مجھے کئی مہینے ہو چلے ہیں۔ پلیز کچھ کریں۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے لے جائیں۔"

"ہم یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا جائے گا۔ یا کسی اور طریقے سے ہماری نقل و حرکت پر نگاہ نہیں رکھی جائے گی۔ کیا معلوم تمہارے جسم میں رکھا گیا ذرا کس ہی تمہاری نشاندہی کر دے۔ نہیں شاہ جہاں! تم ان دونوں کے لیے خطرہ مول مت لو۔"

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک ڈی ایس پی کسی ضروری کام سے ساہی صاحب سے ملنے آ گیا۔ میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ میں شنکا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اتنا عرصہ اس نے میرے بغیر کیسے اور کس حالت میں گزارا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس کے سامنے اپنا دکھ بیان کرنا چاہتا تھا۔ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہتا تھا اور بتانا چاہتا تھا کہ خزالہ نامساعد حالات کا شکار ہو کر ہم دونوں سے کتنی دور جا چکی ہے۔

یونہی پریشانی کے عالم میں میں سڑکوں پر گھومنے لگا۔ شہر کے مسلسل ہارن والے ٹریفک سے میں نے ٹیکسی پکڑی اور لکشمی چوک آ گیا۔ یہاں کے در و دیوار اور گلی کوچے میرے جانے پہچانے تھے۔ بہت وقت گزارا تھا میں نے یہاں۔ یہاں کے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں محفلیں سجائی تھیں۔ یہاں کی نیم تاریک گلیوں میں مخالف گروہوں کے ساتھ مار دھاڑ کی تھی اور رائل پارک کے فلمی دفتروں میں فلمی لوگوں کے ساتھ تاش کی لمبی لمبی بازیاں کھیلی تھیں۔ اس جانی پہچانی فضا میں پہنچتے ہی پرانی یادیں خوشبو کی طرح میرے ہوش و حواس پر چھانے لگیں۔ سات برس کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن یہ جگہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ شام چھ بجے والے شو چھوٹ رہے تھے۔ لکشمی چوک اور ادھر گرد لوگوں کا اژدحام نظر آ رہا تھا۔ انسانوں کا سمندر تھا جو بڑھتا اور پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس سمندر میں گم ہو گیا۔ ایک تنکے کی طرح بہنے لگا اور یہاں وہاں ڈولنے لگا۔ مجھے ایسے ہجوم میں گم ہو کر گھومنا بہت اچھا لگتا تھا۔ جام ٹریفک میں پولیس کی ایک جیپ مسلسل سائرن بجا رہی تھی۔ میں نے دیکھا جیپ کی فرنٹ سیٹ پر ایس پی برکت بیٹھا ہے۔ وہی پیندار ٹائپ، چھ فٹ لمبا، کھردرے چہرے والا ایس پی برکت جو ہر فقرے میں تین چار گالیاں دیتا تھا۔ اور زبان سے زیادہ ہاتھ سے بات کرتا تھا۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں تھا۔ ایس پی برکت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ جیپ سے اترا اور لپکتا ہوا میرے پاس آیا "ہو! شاہ جہاں صاحب تم؟ میری نظر بھوتنی دی رہو کا تو نہیں کھا رہی۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

وہ بے ساختہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ میں نے کہا "کیسے ہیں برکت صاحب؟"

"بالکل ٹھیک۔ سولہ آنے فٹ۔ مگر یار شاہ جہاں صاحب تم یہاں؟ تمہارے پیچھے تو ایک دنیا پاگل ہو رہی ہے۔ جھنگ کا جاگیردار قدرزماں، جناب نجیبی کور صاحب، امریکا کا ایک امیر کبیر تاجر اور پتا نہیں اور کون کون۔ تم تو بہت بڑے توپ بن گئے ہو شاہ جہاں صاحب۔ بڑی ڈیمانڈیں ہیں بھئی تمہاری اور تم یہاں چیل تھیٹے پھر رہے ہو۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

"سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لیں گے یا کہیں چل کر بیٹھیں گے؟"

"او جناب عالی! تمہارے لیے تو بندہ صبح سے شام تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہ سکتا ہے۔ بیٹھنے کی تو بات ہی کوئی نہیں۔ میں یہاں ایک بندے کو پکڑنے آیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یاروں سے ملاقات ہو جائے گی۔" پھر وہ جیپ کے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا "اوئے سکندرے! اس بھوتنی دے کو تھانے لے جا اور ذرا چھتر ول شتر ول کروا اس کی۔ میں ابھی کچھ دیر ٹھہر کے آؤں گا۔"

ڈرائیور نے تابعداری سے سر جھکا کر جیپ آگے بڑھا دی اور ان لوگوں کے درمیان سے راستہ بنانے کی کوشش کرنے لگا جو ہمیں دیکھ کر ادھر گرد جمع ہو گئے تھے۔ ایس پی برکت نے بلند آواز میں تماشائیوں کی ماں بہن ایک کی اور مجھے لے کر کیپٹل سینما کی طرف آ گیا۔ ایک دو گلیوں سے گزر کر ہم میکلوڈ روڈ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک اچھے ریستوران میں بیٹھ کر ایس پی برکت نے چائے منگوائی اور مجھے یوں دیکھنا شروع کیا جیسے میں شاہ جہاں نہیں کسی اجنبی ستارے سے اتری ہوئی مخلوق ہوں۔ جذبات سے اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ بولا "کیا نجیبی کور صاحب کو تمہارے آنے کا پتا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ اور ابھی چند گھنٹے تک پتا بھی نہیں چاہیے۔ مجھے ایک دو ضروری کام کرنے ہیں۔"

وہ بولا "او بادشاہو! کام تو بھوتنی دے ہوتے ہی رہیں گے۔ آپ پتا نہیں کہاں سے جل خراب ہو کے آئے ہو۔ ذرا آرام شرام کر لو۔ کوئی لسی پانی پیو، کوئی چرغہ شرغہ کھاؤ۔ ذرا سکون سے مل کو پھر کام بھی کر لیں گے۔"

میں نے کہا "برکت صاحب! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ مجھے "آپ جناب اور صاحب" وغیرہ کہہ کر مخاطب نہ کریں۔ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں جیسے دوزخ میں بلایا کرتے تھے اور یہی سمجھیں کہ میں آپ کا ہیڈ کانسٹیبل ہی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں

بالکل ٹھیک ٹھاک نہیں ہوں، ایک دم تندرست ہوں۔"
وہ بولے "یہ تو خیر چہرے سے ہی نظر آ رہا ہے۔ جوان جہان ۔۔۔ ہو، ہماری طرح ہنڈے ہنڈائے تو نہیں۔ لیکن یار یہ تو بتاؤ ۔۔۔ دن رہے کہاں ہو، اور نجیبی کور جیسے لوگ ایک دم تمہارے ۔۔۔ کیسے ہو گئے؟ اور وہ دفینے والا چکر؟ وہ افواہ ہی ہے یا کچھ سچ ہے ۔۔۔ میں۔ ادھر پاکستان میں بھی یار لوگ بڑی دلچسپی لے رہے ہیں ۔۔۔ معاملے میں۔ سنا ہے بہت لمبا مال ہے۔ وہ اربوں کروڑوں روپے کی ۔۔۔ چیزیں ہیں۔ میں پرسوں ہیرا منڈی گیا تھا ایک تفتیش کے چکر ۔۔۔ وہاں ایک بڑی کوانٹی کی طوائف ملی تھی۔ وہ بھی یہی باتیں ۔۔۔ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ یہ سارا مال سن ستاون میں ہندو ساہو ۔۔۔ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے ایک سوال میں دس سوال کیے ہیں اور ہر سوال کے جواب کے لیے کم از کم ایک گھنٹا چاہیے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ موضوع پھر کسی وقت چھیڑیں گے۔ پہلے مجھے یہ بتائیے کہ وہ چوتھی میز پر جو براؤن جیکٹ والا شخص بیٹھا ہے، پولیس ۔۔۔ کا بندہ تو نہیں؟"

ایس پی برکت چونک گیا۔ رخ پھیر کر اس نے بڑے غور سے اس میز کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔

میں نے کہا "پچھلے دس پندرہ منٹ سے میں اسے اپنے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔"

برکت بولا "اگر یہ تمہارے پیچھے ہے تو پھر گڑبڑ تو ضرور ہے۔ یہ شخص اسمگلر ٹیسٹر ہے۔" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

اس شخص کی عمر تیس پینتیس سال رہی ہوگی۔ جسم درزشی اور مضبوط۔ چوکھٹا بند مضبوط جیسا تھا۔ اس نے پھولی ہوئی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایسی جیکٹس بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ ریوالور وغیرہ تو معمولی بات ہے، ماؤزر اور چھوٹی موٹی رائفل بھی ان میں چھپائی جا سکتی ہے۔ پولیس والوں کو بھی اس بات سے باخبر رکھا جاتا ہے کہ جیکٹس والے افراد اگر چہرے مہرے سے مشکوک نظر آئیں تو ان پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ ایس پی برکت بولا "میرا خیال ہے میں کاؤنٹر سے ٹیلی فون کرتا ہوں۔ قریبی تھانے سے ایک دو بندے بلا لیتے ہیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔
"تو پھر کیا کرو گے؟"
"میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔"
"مگر ہو سکتا ہے اس بھوتنی دے کے ساتھی بھی آس پاس بیٹھے ہوں۔ ہال میں تیس چالیس بندے تو ہیں۔ ان میں کوئی بھی سور کا تخم ہو سکتا ہے۔"

"ہال میں کچھ نہیں کریں گے" میں نے وضاحت کی "باہر نکل کر سڑک پر دیکھتے ہیں۔ اگر یہ اکیلا ہی پیچھے آیا تو پکڑ لیں گے۔"

ایس پی برکت کے اندر کا خصیلا دیہاتی تھانیدار انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے سے تیرنے لگے۔ ہم نے پروگرام طے کر لیا کہ اس شخص پر کس طرح قابو پانا ہے۔ پھر ہم ریستوران سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئے۔ ہمارے اٹھتے ہی اس شخص نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ کاؤنٹر کے قریب بل ادا کر کے جب ہم باہر نکلے تو وہ بھی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے باہر آ گیا۔ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد میں اور برکت ایک نیم تاریک گلی میں مڑ گئے۔ یہاں فلموں کے بڑے بڑے ہورڈنگ لکھنے والے بیٹھے تھے اور میلی کچیلی روشنی میں اُجلے اُجلے چہرے پینٹ کر رہے تھے۔ گلی میں مڑتے ہی میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایس پی برکت چند قدم آگے جا کر ایک ہورڈنگ کی اوٹ میں ٹھہر گیا۔ ہمیں بمشکل دس سیکنڈ انتظار کرنا پڑا۔ براؤن جیکٹ والا گلی کے سرے پر نمودار ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے گلی میں قدم رکھ دیا۔ جونہی وہ میرے پاس سے گزرا میں نے لپک کر پیچھے سے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرا سینہ اس کی پشت سے لگا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بھی میرے حلقے میں تھے۔ اس میں حیوانی قوت اور ریلا کی پھرتی تھی۔ پنجاب کا بہت سا دودھ، مکھن اور گوشت اس کے جسم میں توانائی بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس نے پنجابی میں چند گالیاں دیں اور یکبارگی تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا۔ اسی دوران میں چوہدری برکت لپک کر آیا اور اس نے اپنا ۳۸ بور سرکاری ریوالور اس کی پیشانی پر رکھ دیا "خبردار" وہ گرجا "ہلے تو گولی اتار دوں گا۔"

لیکن مدمقابل نہ صرف ہلا بلکہ اس نے دیوار سے پاؤں ٹکا کر پیچھے کی طرف اتنا زور مارا کہ مجھ سمیت الٹ گرا۔ ایک ہورڈنگ پر جا گرا۔ تازہ تازہ پینٹ کیا ہوا ہورڈنگ ہمارے ساتھ ہی زمین بوس ہو گیا اور زبردست آواز پیدا ہوئی۔ پشت پر چوٹ لگنے کے باوجود میں نے مدمقابل کو چھوڑا نہیں اور اس کے بالائی جسم کو بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ شور و غل سن کر چوک کی طرف سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔ ایس پی برکت ریوالور سونتے پریشان کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ میں نے جب دیکھا کہ مدمقابل کی مزاحمت کم ہونے کے بجائے شدید ہو رہی ہے تو ایک ہاتھ اس کی گردن پر ڈالا اور آناً فاناً اس کا سر دو تین بار پختہ سڑک سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی اور اس کی ساری تن فن ختم ہو گئی۔ ایس پی برکت نے آگے بڑھ کر تلاشی لی۔ اس کی جیکٹ سے بھرے ہوئے پسٹل کے علاوہ دو درجن گولیاں بھی برآمد ہوئیں۔ ایک پاسپورٹ اس کے علاوہ تھا۔

وہ شخص ہورڈنگ کے رنگوں میں بری طرح لتھڑ گیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ابھی کہیں سے ہولی کھیل کر آیا ہے۔ میرے اپنے کپڑے بھی جگہ جگہ سے رنگین ہو گئے تھے۔ سر کے بالوں پر وہ تمام سرخی لگ گئی تھی جو تھوڑی دیر پہلے بابر شریف کے ہونٹوں پر نظر آ رہی تھی۔ ہجوم دیکھ کر ٹریفک پولیس کے دو ہیڈ کانسٹیبل بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ہم نے ان کی مدد سے "جیکی گلر" غنڈے کو ایک

جیپ میں بٹھایا اور تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہ تھانہ اندرون شہر واقع تھا۔ خرم کو حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ میرا حلیہ بہت خراب تھا اور میں کپڑے وغیرہ بدلنے کے لیے واپس گلبرگ جانا چاہتا تھا تاہم ایس پی ساگر نے میرے لیے تھانے سے ہی ایک لباس فراہم کر دیا۔ اس نے میرے ساتھ ایک کانسٹیبل بھیجا تاکہ میں قریبی حمام میں جا کر نہا سکوں۔ حمام میں مجھے بمشکل دس پندرہ منٹ لگے ہوں گے۔ ہم واپس تھانے آئے تو ایس پی برکت خرم کو لے کر ہیڈ کوارٹر جا چکا تھا اور میرے لیے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ ساہی صاحب کی ہدایت پر وہ خرم کو ہیڈ کوارٹر لے جا رہا ہے۔ میں بھی ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤں۔ تھانے میں گاڑی موجود نہیں تھی۔ چند منٹ بعد گاڑی آئی تو میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے خرم کی جیب سے پاسپورٹ بھی برآمد ہوا تھا۔ پاسپورٹ پر امارات کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ شخص پندرہ روز قبل ویزے پر امارات جا چکا تھا۔ میرے لیے یہ کلیو بہت اہم تھا۔

لیکن ابھی میں ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ وائرلیس پر ایک بری خبر پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ اسمبلی ہال کے قریب ایس پی برکت کی جیپ پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی ہے۔ اس فائرنگ میں دو کانسٹیبل شدید زخمی ہو گئے اور گرفتار شدہ خرم موقع پر ہی مارا گیا ہے۔

○☆○

صبح کا وقت تھا۔ میں اور ساہی صاحب آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش اور اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ آخر ساہی صاحب بھاری آواز میں بولے "میں نے ٹھیک کہا تھا کہ شگفتہ سے تمہارا ملنا خطرے سے خالی نہیں۔"

میں نے کہا "میرے ذہن میں تو اب ایک اور بات بھی آ رہی ہے ساہی صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ شیخ عاصم نے مجھے رہائی اس لیے دی ہو کہ شگفتہ کا کھوج لگ سکے۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان پہنچ کر میں شگفتہ سے ملنے کی کوشش کروں گا اور میرے ذریعے وہ لوگ اس تک پہنچ جائیں گے۔"

ساہی صاحب نے تائیدی انداز میں سر ہلایا "شیخ عاصم اس بے پناہ محبت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو تم اپنی بہن کے لیے رکھتے ہو۔ وہ ہر صورت اور ہر قیمت پر شگفتہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ شگفتہ اس کے بڑے بھائی کی ضد تھی اور اب اس کی ضد ہے۔ وہ یہ ضد پوری کرنے کے لیے ہر انتہا تک جانے کو تیار نظر آتا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ شگفتہ کی محبت میں ڈوب کر میں واقعی ایک غلط قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھے روک لیا تھا۔ مجھے ان کے تدبر اور فراست کی داد دینا پڑی۔

ساہی صاحب نے پوچھا "غزالہ کی بیماری کی اطلاع جلیس احمد کو دے دی؟"

"ہاں دے دی" میں نے جواب دیا "میں کل شام ان کے گھر گیا تھا۔ بس یہی کہا ہے کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ آپ دونوں کو یاد کر رہی ہے۔ ان کے پاسپورٹ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو دے دیے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا آج دوپہر تک ویزے لگوا دوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم آج رات یا کل صبح واپس روانہ ہو جاؤ گے۔"

"میری تو کوشش ہے کہ آج رات ہی کوئی فلائٹ مل جائے۔ غزالہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔"

ساہی صاحب بولے "اگر مجتبیٰ کنور کو معلوم ہو گیا کہ تم پاکستان آئے تھے اور دو دن میرے پاس رہنے کے بعد اسے ملے بغیر واپس چلے گئے ہو تو بہت برہم ہو گا۔ میرا تو خیال ہے ایک بار اسے چہرہ دکھا ہی دو۔"

میں نے کہا "جیسے آپ کی مرضی، لیکن آپ کو اس بات کی ضمانت دینا ہو گی کہ وہ لوگ مجھے سری لنکا واپس جانے سے روکیں گے نہیں۔"

"ایسا نہیں ہو گا" ساہی صاحب بولے "میں تمہاری مجبوریاں سمجھ رہا ہوں اور تمہارے پاس یہاں نہ رکنے کی معقول وجوہات بھی ہیں۔ غزالہ بیمار ہے اور تم بھی آزاد ہونے کے باوجود آزاد نہیں ہو۔ جس الیکٹرانک ڈیوائس کا تم نے ذکر کیا ہے وہ ایک ایسی زنجیر ہے جسے ہلا کر شیخ عاصم کسی بھی وقت تمہیں اپنے پاس بلا سکتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ مجتبیٰ کنور کو مطلع کر دیں۔"

ساہی صاحب نے کہا "ان لوگوں کو تو بس اشارہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ بھاگے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔ مسٹر جی کلارک ایک ادب پسند صنعت کار ہیں اور بے حد روشن خیال بھی لیکن سائیں عالی نے نجانے ان پر کیا جادو چلایا ہے کہ وہ کسی ان پڑھ دیہاتی کی طرح ایکٹ کر رہے ہیں۔ وہ سائیں عالی کی اس بات پر پختہ ایمان لے آئے ہیں کہ [illegible] کا عقدہ جب بھی حل ہو گا تمہارے ہاتھوں ہو گا۔"

"یہ سائیں عالی واقعی ناقابلِ فہم چیز ہے" میں نے اعتراف کیا "اس کے عقیدت مند اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتے ہیں۔ پھر ایک اور بات بھی ہے۔ وہ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سری لنکا میں بھی اس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میرا خیال ہے وہ اب بھی وہیں ہے۔"

ساہی صاحب بولے "میں نے اپنے طور پر سائیں عالی کے بارے میں کچھ چھان بین کی ہے۔ یہ بات درست ثابت ہوئی ہے کہ سائیں عالی جھنگ کے آس پاس کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کے چہرے پر زخم کا بدنما داغ کسی سنگین حادثے کی یادگار ہے۔ اس سنگین حادثے کے سبب وہ ذہنی توازن اور یادداشت سے محروم ہوا ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ سائیں عالی رفیقے اور اس کے

[illegible] کے بارے میں بہت پہلے سے جانتا ہو لیکن یادداشت بگڑ جانے کے باعث وہاں تک نہ پہنچ سکا ہو۔"

کچھ دیر اس بارے میں بات کرنے کے بعد ساہی صاحب ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئے۔ میں نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ مجھے بمشکل پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔ جب تک باتھ روم میں سے باہر نکلا مجتبیٰ کنور کی لمبی چوڑی سیاہ گاڑی کوٹھی کے پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ ٹریفک پولیس کے دو سارجنٹ سفید موٹر سائیکلوں پر گاڑی کے ساتھ تھے۔ گاڑی کے عقب میں ایک پولیس جیپ کا ہوٹر بھی سنائی دے رہا تھا۔ میں مجتبیٰ کنور کی پھرتیوں پر حیران رہ گیا۔ یہ وہ شخص تھا جس سے وقت لینے کے لیے صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران کو بھی مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ پرائم منسٹر، صدر اور وزیر اعلیٰ کے سوا خود کسی سے ملنے جائے لیکن ساہی صاحب کی ایک کال پر وہ یوں چلا آیا تھا جیسے سدھایا ہوا گھوڑا شہسوار کی سیٹی پر سرپٹ بھاگا چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت میں اضافہ ہوا کہ مسٹر جی کلارک صاحب بھی اس کے ساتھ تھے۔ آغا قادر زماں جس کی دہشت سے ایک خلقت کانپتی تھی ان دونوں کے عقب میں تھا اور اپنے بونوں ہی کی طرح ایک چھوٹا سا بونا نظر آ رہا تھا۔ سچ ہے کہ کسی کا قد کاٹھ اس کے ناپ سے نہیں اس کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قادر زماں اس وقت بڑے لوگوں کے درمیان تھا اس لیے چھوٹا نظر آ رہا تھا۔

مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور میرے ساتھ بے حد گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ وہ آگے بڑھ گئے تو قادر زماں نے بھی معانقہ کیا۔ آہستگی سے بولا "کہا سنا معاف کرنا جان جی۔"

میں نے کہا "تمہارے نومولود بھتیجے کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے" قادر زماں نے کہا "میں اس کی زندگی کے لیے تمہارا اور ڈاکٹر غزالہ دونوں کا شکر گزار ہوں۔ اگر ڈاکٹر غزالہ نہ ہوتی تو شاید وہ دنیا ہی میں نہ آ سکتا۔ اور اگر تم زندگی کا وسیلہ بن کر اسے ڈوبنے سے نہ بچاتے تو میری اور ترنم کی گود خالی ہوتی۔"

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن مجتبیٰ کنور نے آواز دے کر پاس بلا لیا۔ ساہی صاحب ٹیلی فون پر انہیں کافی کچھ بتا چکے تھے پھر بھی بہت کچھ ایسا تھا جو انہیں معلوم نہیں تھا اور وہ جاننا چاہتے تھے۔ خاص طور سے وہ اس بات پر حیران تھے کہ شیخ عاصم اور شکر شکرا ہمیں حیدر آباد سے پکڑنے کے بعد سری لنکا کیوں لے گئے۔ وہ پچھلے ڈھائی ماہ کے دوران میں پورے انڈیا اور پاکستان میں ہمیں ڈھونڈتے پھرے تھے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم سری لنکا میں ہوں گے۔

میں نے مجتبیٰ کنور سے کہا "آپ کو شاید معلوم نہ ہو لیکن سائیں عالی سے کوئی بات چھپی نہیں تھی۔ وہ اپنی چیلی کے ہمراہ ہمارے پیچھے ہی پیچھے سری لنکا جا پہنچا تھا۔"

مسٹر جی کلارک نے امریکی انداز میں انگلش بولتے ہوئے کہا "وہ ایک ماورائی ہستی ہے، ایک روحانی شخصیت۔ اس کے بارے میں جو بھی کہا جائے کم ہے اور جو توقع بھی کی جائے تھوڑی ہے۔ میں نے مشرق کی پُراسراریت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ سائیں عالی کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ جو سنا وہ درست تھا۔"

میں نے مختصر الفاظ میں اپنی روداد بیان کی اور بتایا کہ سری لنکا میں کیا حالات پیش آئے اور شیخ عاصم کے جذبۂ انتقام نے وہاں میرے لیے کتنی بھیانک شکل اختیار کر رکھی تھی۔ اس گفتگو میں الیکٹرانک ڈیوائس کا ذکر بھی آیا اور اس جدوجہد کا ذکر بھی جو میں نے شیخ عاصم کی خاطر "ہے کو" کے خلاف کی تھی۔

گفتگو کے دوران میں ہی مسٹر جی کلارک نے حاضرین سے اجازت لی اور مجھے لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ ان کی پُررعب شخصیت اردگرد کی ہر شے کو اپنے حصار میں لے لیتی تھی اور تیز نگاہیں اپنے مخاطب کے آر پار دیکھتی لگتی تھیں۔ کہنے لگے "مسٹر شاہجہاں! میں صاف سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔ تم ہماری ضرورت بن چکے ہو۔ ہم کسی قیمت پر تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ تمہارے جو بھی مسائل ہیں بیان کرو، میں انہیں حل کروں گا۔ تمہیں صرف ایک وعدہ کرنا ہو گا، تم اب ہمارے ساتھ رہو گے۔"

میں نے کہا "جناب! کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جو دنیا کی تمام تر دولت اور اثر و رسوخ کے باوجود حل نہیں ہو سکتے۔"

"شاید تم جذباتی مسائل کا ذکر کر رہے ہو۔ میرے علم کے مطابق تمہارے اہم جذباتی مسئلے دو ہی ہیں۔ ایک تمہاری بہن شگفتہ جسے تم نے بچپن سے والدین کی طرح پالا ہے اور دوسرے مسٹر جلیس احمد کی بیٹی غزالہ جو شادی کے بعد پریشانیوں کا شکار ہے اور اب شیخ عاصم کی تحویل میں ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے یہ دونوں مسائل اڑتالیس گھنٹے کے اندر حل کر سکتا ہوں۔ تمہاری بہن جو میری بیٹی کی طرح ہے ان تمام خطرات سے محفوظ ہو جائے گی جو آج اسے لاحق ہیں۔ تم دنیا کے جس حصے میں چاہو میں اسے پہنچا دیتا ہوں اور اس کی حفاظت کا سو فیصد محفوظ اور فول پروف انتظام کر دیتا ہوں۔ جہاں تک غزالہ کا تعلق ہے وہ تمہاری محبت ہے اور ایک نوجوان کے لیے اپنی محبت سے محروم ہونا کتنا اذیت ناک ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں خود بھی اپنی نوجوانی میں اس روح فرسا تجربے سے گزر چکا ہوں۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر وہ لڑکی ہر بندھن ہر پابندی سے آزاد ہو کر تمہارے پاس آ سکتی ہے۔ تمہیں صرف ایک بار اقرار میں سر ہلانا ہو گا شاہجہاں! اس کے بعد سب کچھ میری ذمہ داری ہو گی۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "مسٹر جی کلارک! آپ سے پہلے بھی ایک شخص یہ پیشکش کر چکا ہے۔ اس کا نام مجتبیٰ کنور ہے۔ لیکن میں نے اسے جو جواب دیا تھا وہ آپ کو نہیں دے سکتا کیونکہ آپ مشرقی اقدار اور روایتوں سے واقف نہیں اور میرے

اس جذباتی معاملے کو عملی زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ مسٹر کلارک! ہم لوگوں کے لیے محبت میں جسمانی ملاپ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں آپ کو ایسے ایسے محبت کرنے والے ملیں گے جنھوں نے ساری زندگی جان بوجھ کر خود کو کانٹوں میں گھسیٹا اور ان راحتوں سے دور رہے جو محبوب کے قرب سے نصیب ہوتی ہیں۔ بلکہ ساری زندگی گزار دی اور اپنے محبوب پر "محبت" کا اظہار تک نہیں کیا۔ آپ مجھے بھی ان سرپھرے افراد میں شامل کرسکتے ہیں۔ جہاں تک شکنتا کا تعلق ہے' وہ میری بہن ہے اور ایک بہن کی حفاظت جتنے اچھے طریقے سے ایک غیرت مند بھائی کرسکتا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔ یہی میرا ایمان ہے۔ بہرحال میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ حتی الامکان آپ کی مدد کروں گا۔ لیکن مجھے تھوڑی سی مہلت دیں۔ غزالہ کی حالت ٹھیک نہیں اور وہ ایک ایسے شخص کی تحویل میں ہے جس کی نیت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں کچھ دن کے لیے سری لنکا جارہا ہوں۔ واپسی پر میں سب سے پہلے آپ سے رابطہ کروں گا۔"

"لیکن ایک بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہیے مسٹر شاہ جہاں" مسٹر کلارک نے کہا "ہم صندوق تلاش کرنے میں زیادہ تاخیر کریں گے تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ ساری مشقت اور ریاضت بے کار جائے گی جو اب تک اس سلسلے میں کی جاچکی ہے۔ تم جانتے ہی ہو ہم اکیلے ان نوادرات کے پیچھے نہیں ہیں اور بھی پارٹیاں ہیں جو سر توڑ کوشش کررہی ہیں۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں میں اس تلاش کے سلسلے میں اتنا اہم نہیں ہوں۔ میں کیا کرسکتا ہوں جو آپ لوگ نہیں کرسکتے۔ بہرحال اگر آپ مجھے کسی لائق سمجھتے ہیں تو میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

مسٹر کلارک نے گہری سانس لے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ایک آخری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں الیکٹرانک ڈوائس کے حوالے سے کوئی خدشہ موجود ہے تو وہ نکال دو۔ ہم وہ ڈوائس شیخ عاصم کی مدد کے بغیر بھی نکال سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں شارٹ نوٹس پر ماہر ترین افراد کو جمع کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا "کلارک صاحب! ہمیں آپ کی مدد طلب کرنے میں کبھی بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

ہم واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ میں نے بجلی کنور سے کہا "غزالہ کے والدین کے سفری کاغذات مکمل ہونے میں تاخیر ہورہی ہے۔"

بجلی کنور نے اسی وقت ٹیلی فون اٹھا کر دو تین جگہ بات کی۔ پھر رسٹ واچ دیکھ کر کہنے لگا۔ "ایک گھنٹے میں کاغذات تمہیں مل جائیں گے۔"

اس رات دو بجے کے لگ بھگ میں ایک بار پھر سری لنکا روانہ ہورہا تھا۔ زریں گل بہت اداس تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ روتا رہا ہے۔ کہنے لگا "استاد میرا مارو غزالہ بی بی بچ تو جائے گا نا؟"

میں نے کہا "تم دعا کرو۔ دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے۔"

وہ بولا "ام تو کہتا ہے ہمارا زندگی بھی غزالہ بی بی کو لگ جائے وہ بہت اچھا بی بی ہے۔ کاش اس کے ساتھ وہ نہ ہوا ہوتا جو ہوا ہے۔"

اسی دوران میں چچا جلیس اور چچی فاخرہ بھی وہاں پہنچ گئے میں نے زریں گل کو اشارے سے کہا کہ وہ اب چپ رہے۔ ساہی صاحب نے ہمیں خود ائرپورٹ پہنچایا۔ میرے ساتھ غزالہ کے والدین یعنی چچی چچا کے علاوہ ایس پی برکت بھی تھا۔ ایس پی برکت کو ساہی صاحب نے بہت اصرار کرکے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ مجھے کسی صورت بھی اکیلے بھیجنے پر تیار نہیں تھے۔ ایس پی برکت کا ایک چچازاد بھائی بیس پچیس سال سے کولمبو میں مقیم تھا۔ وہ وہاں کی غلہ منڈی "پیٹہ" میں چاول کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کا نام حاجی امین تھا اور وہ مدراس کی ایک تامل فیملی میں بیاہا ہوا تھا۔ ایس پی برکت ایک عام شہری کی حیثیت سے میرے ساتھ سفر کررہا تھا۔

"یہ جہاز بھوتی کا کتنے بجے کولمبو پہنچے گا؟" ایس پی برکت نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"تین گھنٹے کا راستہ ہے۔ ڈھائی بجے چلے ہیں۔ اس کا مطلب ہے چھ بجے تک پہنچ جائیں گے۔"

ایس پی برکت نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ کھڑکی سے باہر تھوکے گا لیکن جہاز کی کھڑکی سے باہر تھوکنا ممکن نہیں تھا لہٰذا برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ ممکن ہے دل ہی دل میں ائرلائن والوں کو صلواتیں بھی سنا رہا ہو۔ کچھ دیر ائر ہوسٹس کو تلاشی لینے والی نظروں سے گھورتا رہا' پھر بولا "میری پہلی بیوی کا ایک بھرا تھا' رستم علی۔ پنڈ دادن خان کا رہنے والا تھا۔ بڑا اونچا لمبا جوان تھا۔ راج گیری کا کام کرتا تھا۔ ایک دن دوسری منزل پر ایک دیوار بنا رہا تھا۔ پاؤں پھسلا تو اوپر سے سر کے بل آگرا۔ بس چکر کھا کر تڑپا اور ٹھیک ہوگیا۔ شام کو گھر گیا۔ کھانا شانا کھا کے سوگیا۔ صبح بیوی نے اٹھایا تو پتا چلا کہ مرچکا ہے۔ یہ سر کی چوٹ ہوتی ہی بڑی بری ہے۔ اللہ معافی دے۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تری کڑی (غزالہ) کی بات کررہا ہوں۔ اگر اب تک ہوش میں نہیں آئی تو۔۔۔"

"برکت صاحب" میں نے تیز سرگوشی میں اس کی بات کاٹی "میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ جہاز میں یہ موضوع نہیں چھیڑیں گے۔"

"میں تو یونہی دوا ہی بات کررہا تھا۔" ایس پی برکت سٹپٹا کر

چپ ہوگیا۔

چچا جلیس میری ساتھ والی نشست پر بیٹھے تھے اور بار بار تفتیشی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیخ عاصم نے انہیں سری لنکا لانے کے لیے مجھے ہی کیوں بھیجا ہے۔ پھر وہ غزالہ کے سلسلے میں بھی پریشان تھے۔ اس بات پر یقین کرنا ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ معمولی بیماری سے گھبرا کر غزالہ نے انہیں کولمبو بلالیا ہے۔ وہ کئی بار مجھ سے تفتیشی گفتگو کرچکے تھے۔ لیکن میں ہر بار ان کے سوالات خوبصورتی سے ٹال چکا تھا۔ چچی تائی مجھے مسلسل جلتی نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ کسی صورت بھی میرے ساتھ سفر کرنے پر تیار نہ ہوتی اگر کولمبو سے شیخ عاصم خود فون کرکے اسے سفر کے لیے نہ کہتا۔ بے حد وہمی عورت تھی وہ۔ خاص طور پر میرے سلسلے میں تو وہ کوئی اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بری نیت سے اس کی بیٹی اور داماد کے ساتھ چپکا ہوا ہوں اور موقع ملتے ہی ان کی ازدواجی زندگی میں ایسا زہر گھولوں گا کہ کوئی تریاق کام نہیں کرے گا۔ یہ بات حیدرآباد میں چچی نے چچا کی زبانی بھی مجھے گوش گزار کی تھی۔ چچا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں غزالہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں۔ یہاں سے دور چلا جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں شیخ عاصم کا قیدی ہوں۔ چاہوں بھی تو ایسا نہیں کرسکتا۔

ہم تقریباً چھ بجے کولمبو پہنچے۔ کولمبو کے ائرپورٹ پر ایس پی برکت سے ہمارا راستہ جدا ہوگیا۔ ایس پی برکت اپنے چچازاد بھائی کے پاس اندرون شہر چلا گیا۔ ائرپورٹ پر ریسٹ ہاؤس یعنی رحنی پیلس کی گاڑی ہمیں لینے کے لیے موجود تھی۔ شیخ عاصم کا پرسنل سیکریٹری نرائن ہمیں خود لینے آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیخ عاصم کی ہدایات کے مطابق آپ کو سیدھا ریسٹ ہاؤس لے جایا جارہا ہے۔ غزالہ کے بارے میں سیکریٹری نے اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا کہ وہ بدستور اسپتال میں ہیں۔ میں نے بھی مزید استفسار نہیں کیا۔

گال روڈ سے ہم اس سڑک پر مڑے جو گھنے جنگل سے گزر کر ریسٹ ہاؤس تک پہنچتی تھی۔ یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے میں تین چار دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے پورچ میں وہ مرسڈیز گاڑی نہیں تھی جو شیخ عاصم کے ذاتی استعمال میں رہتی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ غزالہ کے پاس اسپتال میں ہے۔ نرائن چچا اور چچی کو لے کر رہائشی حصے کی طرف چلا گیا۔ میں اروشی رفیو سے ملنے مہمان خانے کی طرف آگیا۔ اروشی تو مجھے وہاں نظر نہیں آئی لیکن ایک منظر دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ مین گیٹ کے قریب ایک تناور درخت سے ایک شخص الٹا لٹکا ہوا تھا۔ یہ وہی درخت تھا جس سے چند ہفتے پہلے مجھے الٹا لٹکایا گیا تھا اور چمڑے کی پیٹیوں سے پیٹا گیا تھا۔۔۔ آج جو شخص لٹکا ہوا تھا اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پورے جسم پر زخموں کے نشان تھے اور سرخ سرخ لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یقیناً اس شخص کے جسم پر بھی کوڑا فنی یا "ہیلٹ زنی" کی گئی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب جاکر دیکھا اور کانپ گیا۔ بدنصیب شخص کے تمام زخموں میں پسی ہوئی سرخ مرچیں بھری گئی تھیں۔ مرچوں کے اوپر لیموں کا رس نچوڑا گیا تھا۔ لیموں کے بہت سے چھلکے نیچے گھاس پر پڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک کرخت چہرہ تامل گارڈ ٹہلتا ہوا وہاں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بلڈاگ کتے کی زنجیر تھی۔ میں نے پوچھا "یہ شخص کون ہے؟"

وہ بولا "اس کا نام سروپ ہے۔ یہ وہی گارڈ ہے جس کی گولی لگنے سے مسز زخمی ہوئی تھیں۔"

"یہ کب سے بندھا ہوا ہے یہاں؟"

"آج صبح سویرے سے۔ مالک کا حکم ہے کہ جب تک اس کی جان نکل نہیں جاتی اسے اسی طرح لٹکا رکھا جائے اور کھال ادھیڑی جائے۔"

"او میرے خدا!" میں دہل گیا۔ آخر اس شخص کا کیا قصور تھا۔ اس بے چارے نے تو اپنی طرف سے بہادری کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر لٹیرے جھونگھو پر گولی چلائی ہوگی کہ اس کی پھرتی اور حاضردماغی کی داد دی جائے گی اور انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اگر ایک گولی بھٹک کر غزالہ کو جا لگی تھی تو اس میں وہ کہاں سے قصوروار ٹھہرتا تھا۔

مجھے سوچ میں غلطاں دیکھ کر تامل گارڈ نے کہا "ایک مرتبہ پہلے بھی اس گارڈ کی رائفل غلطی سے چل گئی تھی اور ایک شکاری کتا زخمی ہوگیا تھا۔ ممکن ہے اس غلطی کی سزا بھی اس سزا میں شامل ہوگئی ہو۔"

دل پر ایک بوجھ سا لے کر میں مہمان خانے کے کمروں کی طرف چلا گیا۔ عین اسی وقت اروشی بھی واپس آگئی۔ اس کا رنگ زرد ہورہا تھا۔ غزالہ کی وجہ سے وہ بھی گم صم نظر آتی تھی۔ اس نے بتایا کہ مسز مسلسل بے ہوش ہیں اور شیخ عاصم پچھلے تین دن میں صرف چند گھنٹوں کے لیے ریسٹ ہاؤس آئے ہیں۔

اروشی نے پوچھا "آپ اکیلے ہی واپس آئے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں۔ غزالہ کے والدین بھی ہیں۔ وہ اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"زریں گل وہیں رہ گیا ہے؟" اروشی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ وہ تمہیں سلام کہتا تھا۔ تمہارا تحفہ اسے بہت پسند آیا تھا۔"

اروشی کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہورہا تھا کہ اروشی اور "عاشق امین عاشق زریں گل" میں تھوڑی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہوچکی ہے۔ مجھے اروشی کی آنکھوں میں ان بھیگے بھیگے دنوں کا عکس نظر آرہا تھا جو زریں گل یہاں گزار کر گیا

تھا۔ میں نے امدوشی سے پوچھا کہ کالا وغیرہ کی طرف سے اسے تنگ کرنے کی کوشش تو نہیں کی گئی۔ امدوشی نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ اب وہ یہاں خود کو کافی محفوظ محسوس کرتی ہے۔

شیخ عاصم سے میری ملاقات اگلے روز ہو سکی۔ میں غزالہ کو دیکھنے کولمبو اسپتال گیا تھا۔ غزالہ وی آئی پی روم میں تھی۔ اسے گلوکوز اور آکسیجن لگی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور رنگت سرسوں ہو رہی تھی۔ وہ تین چار دن میں ہی پہلے سے بہت کمزور نظر آنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس بستر پر پڑے پڑے گھل رہی ہے۔ چچی فاخرہ اور چچا جلیس اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ دونوں کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ خاص طور سے چچی بے حد غمزدہ نظر آ رہی تھی۔ وہ بار بار ایک سرد آہ کھینچتی تھی اور اوڑھنی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر غزالہ کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے ہمیں کمرے سے نکال دیا۔ غالباً غزالہ کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ ہونے تھے۔ میں باہر برآمدے میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ دل پر عجیب مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی تپائی پر تازہ اخبار رکھا تھا۔ میں پڑھنے لگا۔ ان دنوں غیر قانونی شکار اور جنگلی حیات کے تحفظ کے سلسلے میں خبریں بڑے تواتر سے شائع ہو رہی تھیں۔ اس حوالے سے پورے سری لنکا میں بیداری کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور مجرموں کی پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ لیکن ان خبروں میں راہمور کا نام کہیں نہیں تھا۔ وہ فرض شناس سب انسپکٹر جس نے جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے تن تنہا ایک بڑی مافیا سے ٹکر لی تھی اور آخر اس کے پاؤں کولمبو سے اکھاڑ دیے تھے۔

اچانک مجھے اس بدنصیب گارڈ کا خیال آیا جو کل سے ریسٹ ہاؤس میں الٹا لٹکا تھا اور جرم بے گناہی کی سزا بھگت رہا تھا۔ میں فوراً شیخ عاصم کے پاس پہنچا۔ وہ راہداری میں کھڑا ایک لیڈی ڈاکٹر سے گفتگو کر رہا تھا۔ ان کی گفتگو ختم ہوئی تو میں نے شیخ سے کہا "محترم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر تم مان جاؤ تو۔۔۔"

"اگر ماننے والی ہوئی تو ضرور مانوں گا۔"

"محترم نے ایک گارڈ کو سزائے موت سنا رکھی ہے۔ وہ بے چارہ کل سے ریسٹ ہاؤس میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔"

گارڈ کا ذکر سنتے ہی شیخ کے چہرے پر تلخی عود کر آئی۔ بولا "اسے مر ہی جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "سزا غلطی کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس بدنصیب کے بال بچوں کی بددعائیں غزالہ پر بوجھ بنیں گی۔ میرے خیال میں وہ کافی سزا بھگت چکا ہے۔ اب اسے چھوڑ دو۔"

شیخ عاصم کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور سگار کا ایک طویل کش لے کر سیکرٹری نرائن کو آواز دی۔ سوٹ بوٹ والے سنہالی سیکرٹری نے قریب آ کر تعظیم پیش کی اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ شیخ عاصم نے کہا "ریسٹ ہاؤس فون کرو۔ انچارج سے کہو، جس گارڈ کو الٹا لٹکایا گیا تھا، اسے چھوڑ دو۔"

سیکرٹری کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ "کیا بات ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

سیکرٹری ایک قدم آگے بڑھ کر شیخ کی طرف جھکا اور آہستہ سے بولا "جناب! وہ تو تھوڑی دیر پہلے ختم ہو گیا۔"

"کب کی بات ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

"کوئی آدھ گھنٹا ہوا ہے۔ مجھے فون آیا تھا۔"

شیخ عاصم نے بے پروائی سے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور شانے اچکا کر میری طرف دیکھنے لگا۔

کتنا سنگدل نظر آ رہا تھا وہ اس لمحے۔ نہ اسے ملکی قانون کا خوف تھا، نہ غیر ملکی قانون کا۔ میں سوچنے لگا، کتنے تضادات ہیں اس شخص کی ذات میں۔ ایک طرف وہ اپنی بیوی کے لیے اتنا حساس ہے کہ اسے تکلیف میں دیکھ کر بے قرار و بے چین پھر رہا ہے، لیکن اپنے ایک ملازم کی اذیت ناک موت نے اسے ذرا بھی ملول نہیں کیا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ غزالہ کے لیے شیخ کی یہ پریشانی بھی مصنوعی اور سطحی سی چیز ہے۔

اگلے پانچ چھ روز میں کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا، سوائے اس کے کہ ایک رات میں نے شنکر شکرا کو پھر ریسٹ ہاؤس میں دیکھا۔ وہ اور شیخ عاصم ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شنکر کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ یہ شخص میرا دشمن تو کئی برس سے تھا لیکن اب میری اور اس کی دشمنی یوں بھیانک تر ہو گئی تھی کہ وہ شیخ عاصم کا دست راست بن گیا تھا، اور شیخ عاصم کا ٹارگٹ میری معصوم بہن شمسا تھی۔ شنکر شکرا کی یہاں موجودگی سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی تھی اور وہ یہ کہ شیخ عاصم کو ان وعدوں کا پاس نہیں جو اس نے غزالہ سے کر رکھے ہیں۔ شیخ اور غزالہ کی نجی گفتگو میں نے مائیکروفون کے ذریعے خود سنی تھی۔ شیخ نے غزالہ سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ شنکر شکرا سے کوئی تعلق باقی نہیں رکھے گا اور یہ کہ وہ شنکر کو واپس انڈیا بھیج رہا ہے۔ اب شنکر نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ شیخ عاصم کے ساتھ اہم مشوروں میں شریک تھا۔ میرا یہ اندیشہ قوی تر ہونے لگا کہ غزالہ کی غیر مشروط شوہر پرستی کسی نہ کسی موقعے پر غزالہ کو نقصان پہنچائے گی۔

غزالہ بدستور قوما میں تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس کی بے ہوشی کی طوالت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت دیر تک ہوش میں نہ آئے۔ جب وہ یہ کہتے تھے کہ "بہت دیر تک ہوش میں نہ آئے" تو پھر یہ بھیانک اندیشہ بھی ذہن میں سر اٹھاتا تھا کہ شاید وہ کبھی ہوش میں نہ آئے اور ایسا سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ کیا غزالہ اب کبھی آنکھیں نہ کھولے گی۔ وہ اسپتال کے اسی سفید بستر پر پڑے

پڑے ختم ہو جائے گی۔ اگر وہ ختم ہو جائے گی تو پھر میرے زندہ رہنے کا جواز کیا ہو گا۔ یہ دنیا کیا ہو گی غزالہ کے بغیر؟ غزالہ کے بغیر میرے لیے زندگی کا تصور کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ عجیب گورکھ دھندا تھیں میری سوچیں۔ ایک چیز کی جدائی کے اندیشے میں پاگل ہو رہی تھیں جو میری تھی ہی نہیں۔

یہ فروری مارچ کے دن تھے۔ موسم نیم گرم اور نیم مرطوب تھا۔ سری لنکا کے آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ ہر چیز پر عجیب اداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کی فضا میں ایک اکتا دینے والا ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ میں دوسرے تیسرے روز کولمبو جا کر غزالہ کو دیکھ آتا تھا۔ "ڈاکٹر غزالہ" جو اب ایک "مریضہ" تھی۔

میری کوشش ہوتی تھی کہ اس دن جاؤں جب غزالہ کے پاس چچی کے بجائے چچا ٹھہرے ہوئے ہوں۔ اگر اتفاقاً چچی سے ملاقات ہوتی تھی تو اس کی پُرعداوت نظریں میرے جسم سے آر پار ہونے لگتی تھیں۔ شیخ عاصم کی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن نجانے کیوں میں ابھی پاکستان جانا نہیں چاہتا تھا۔ دل میں وسوسہ سا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے۔ شام کے بعد شنکر شکرا اکثر ریسٹ ہاؤس آ جاتا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں شیخ عاصم کے ساتھ وقت گزارتا اور سبزہ زار میں آزادانہ چہل قدمی کرتا رہتا۔ کسی وقت میرا اور اس کا آمنا سامنا بھی ہو جاتا۔ ایسے میں برقی کوندا سا ہم دونوں کے درمیان لپک جاتا جو ہماری جان لیوا دشمنی کی پہچان تھا۔۔۔ امدوشی سارا دن گھریلو کام کاج میں مصروف رہتی، کبھی وقت ملتا تو میرے پاس آ بیٹھتی۔ اس نے اب بالوں میں روجنی گندھا کے پھول لگانا چھوڑ دیے تھے۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں اداسی جھانکتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ رونے لگتی۔ کہتی "وہ دن کب آئے گا جب مسز (غزالہ) کو چلتے پھرتے دیکھوں گی۔" ایسے میں، میں اسے بہلانے کی کوشش کرتا اور زریں گل کی باتیں سنانے لگتا۔ زریں گل کی باتیں سننا اسے اچھا لگتا تھا۔ بے خیالی میں اس کی آنکھیں مسکرانے لگتیں۔ ایک دن کہنے لگی "زریں گل نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ پاکستان سے مجھے تحفہ بھیجے گا۔ اس نے بھیجا کیوں نہیں۔"

میں نے کہا "وہ ضرور بھیجے گا۔ لیکن اس وقت جب اس کی سمجھ میں آئے گا کہ اسے کیا بھیجنا ہے۔"

"مجھے پتا ہے" امدوشی بولی "وہ کہتا تھا، میں تمہیں ودا بھیجوں گا۔ چاکی ودالا ودا۔"

"چاکی ودالا ودا؟ یہ کیا چیز ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" وہ شستہ انگریزی میں بولی "میرا خیال ہے وہ کوئی جانور ہے۔ جس کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ زریں گل کہتا تھا کہ وہ کسی آنے جانے کے ہاتھ مجھے اس جانور کا خشک گوشت بھیجے گا یا پھر پورا جانور بھیجے گا۔"

"چاکی ودالا ودا؟" میں نے حیرت سے دہرایا "یہ ہے کیا بلا؟"

"معلوم نہیں۔ وہ کہتا تھا یہ کابل کا جانور ہے۔"

بہت تگ و دو کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ امدوشی "چکی والا دنبہ" (مینڈھا) کہہ رہی ہے۔ زریں گل پاس ہوتا تو میں اس کی گردن پر ایک دو جھانپڑ ضرور رسید کرتا۔ وہ تو سیکڑوں میل دور لاہور یا پشاور میں بیٹھا تھا۔۔۔

دھیرے دھیرے غزالہ کی بیماری اور بے ہوشی ایک روٹین کی چیز بن گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شیخ عاصم کی پریشانی میں اب پہلی سی شدت باقی نہیں رہی۔ وہ تین تین چار چار دن اسپتال کا رخ نہیں کرتا تھا۔ اس دوران میں۔۔۔ وہ پورے ایک ہفتے کے لیے سری لنکا سے باہر بھی چلا گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ڈاکٹروں نے غزالہ کے لیے کچھ انجکشنز منگوائے تھے۔ یہ کافی مہنگے انجکشن تھے۔ سیکرٹری نرائن کے پاس اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ انجکشنز منگوا سکتا۔ دوسری طرف شیخ سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ آخر تیسرے چوتھے دن شیخ واپس آیا تو یہ مسئلہ حل ہو سکا۔

ایک روز صبح سویرے امدوشی نے مجھے بتایا کہ "مسز" کی والدہ غسل خانے میں گر کر بے ہوش ہو گئی ہیں اور ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کیا گیا ہے۔ میں بھاگم بھاگ موقعے پر پہنچا۔ چچی فاخرہ قالین پر نیم بے ہوش پڑی تھیں۔ چچا جلیس بدحواسی کے عالم میں اس کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہے تھے۔ میرے پہنچتے ہی ڈاکٹر بھی پہنچ گیا۔ اس نے دو تین منٹ کے معائنے کے بعد اعلان کیا کہ مریضہ کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ چچی فاخرہ کی زبان تلے گولی رکھی گئی۔ نس کا انجکشن لگایا گیا اور دیگر "ٹریٹمنٹ" دی گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد چچی فاخرہ کی حالت سنبھل گئی۔ گرنے سے اس کی پیشانی پر چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر نے بینڈیج وغیرہ کر دی۔

چچا اور چچی پچھلے پانچ چھ دن سے چپ چاپ نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں کیا مسئلہ تھا۔ اب چچی فاخرہ کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ میاں بیوی کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔ میں نے چاہا کہ چچا کو ایک طرف لے جا کر پرسشِ احوال کروں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ دونوں میری طرف سے اتنے بدظن تھے کہ میری ہر ہمدردی کو سازش اور چالبازی سے تعبیر کرتے تھے۔ مجھے دیکھ کر چچی فاخرہ کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں اور وہ کچھ زیادہ شدت سے ہائے ہائے کرنے لگی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس حالت میں اس کے سامنے نہ رہوں۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ کچھ دیر بعد امدوشی بھی وہاں پہنچ گئی۔ کہنے لگی "شاہ جہاں صاحب، میرا خیال ہے کہ مسز کے والدین انہیں پاکستان لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سری لنکا کی نسبت وہ پاکستان میں جلدی اچھی ہو جائیں گی اور دیکھ بھال بھی زیادہ ہو سکے گی۔ لیکن مالک (شیخ عاصم) یہ بات نہیں مانتے۔ کل رات انہوں نے مسز کی والدہ کو اس بات پر ڈانٹا بھی تھا۔ میرا خیال ہے اسی ذہنی تناؤ کی وجہ سے آج انہیں دورہ پڑا ہے۔"

میرے لیے یہ انکشافات حیران کن تھے۔ اگر چچی اور چچا غزالہ کو پاکستان لے جانا چاہ رہے تھے تو میرے خیال میں یہ کوئی نامناسب بات نہیں تھی۔ دو تین غیر ملکی ڈاکٹرز کولمبو پہنچ کر غزالہ کا تفصیلی معائنہ کر چکے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ مریضہ کی قوما کی حالت جب بھی ختم ہوگی خود ہی ہوگی۔ انہوں نے کوئی خاص ٹریٹمنٹ بھی تجویز نہیں کی تھی۔ دوسرے لفظوں میں لواحقین کا کام اب صرف یہ تھا کہ گلوکوز وغیرہ کے ذریعے غزالہ کے جسم کو خوراک کی فراہمی جاری رکھیں اور چوبیس گھنٹے میں ایک یا دو انجکشن لگواتے رہیں۔ اس کے علاوہ انہیں صرف اچھے وقت کا انتظار کرنا تھا۔ ایسی صورت میں غزالہ پاکستان میں رہتی یا سری لنکا میں کیا فرق پڑتا تھا۔ لیکن شیخ عاصم غزالہ کا شوہر تھا اور اس پر ہر اختیار رکھتا تھا۔ اس کے حکم یا رائے کو چیلنج کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ ان کے بس میں بھی نہیں، جنہوں نے اسے پیدا کیا تھا، پالا تھا اور جوان کیا تھا۔

چچی فالج کے دورے سے سنبھل تو گئی تھی لیکن اس کی طبیعت بدستور خراب تھی۔ چند روز بعد شیخ عاصم نے مجھے بلایا اور ہدایت کی کہ میں چچی اور چچا کو واپس پاکستان چھوڑ آؤں۔ میں نے پس و پیش سے کام لیا اور کہا کہ پاکستان میں میری گرفتاری کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ عذر کارگر رہا اور شیخ عاصم نے مجھے بھیجنے کا ارادہ بدل دیا۔ اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ ان دونوں کو اکیلے ہی واپس بھیج دیا گیا ہے۔

دو روز بعد شیخ عاصم خود بھی کسی کام سے امارات چلا گیا۔ غزالہ کی دیکھ بھال کے لیے مجھے اسپتال میں رہنا پڑا۔ یہ دو کمروں اور باتھ روم والا ایک آرام دہ سوئٹ تھا۔ ایک نرس بھی ہمہ وقت غزالہ کے پاس رہتی تھی۔ غزالہ کو دیکھ کر دل کانپ جاتا تھا۔ وہ بجھے رنگوں میں بنی ہوئی ایک دھلی دھلی تصویر کی طرح بستر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کی غزالی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہونے لگے تھے۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں سوکھ گئی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں بہت نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ میں کسی وقت غزالہ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا۔ اس کا سرد استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتا اور دھیرے دھیرے اسے پکارنے لگتا "غزالہ! آنکھیں کھولو... آنکھیں کھولو غزالہ... غزالہ..."

مجھے یوں لگتا جیسے ہم دونوں ایک بار پھر بچے بن گئے ہیں اور جل کوٹ کے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں۔ وہ جامن کے باغ میں کسی درخت پر چڑھنے کی کوشش میں گر گئی ہے اور جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر کے گھاس پر لیٹ گئی ہے۔ میں اسے جگا رہا ہوں "ہوش کرو غزالہ۔ آنکھیں کھولو" لیکن یہ جامن کا باغ نہیں تھا اور نہ غزالہ نے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

ایک عجب زوردار رات کو میرا دل چاہا کہ میں غزالہ کو اس منحوس بستر سے اٹھا لوں اور اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ساری نالیاں، سارے تار نوچ کر علیحدہ کر دوں۔ پھر وہ ایک ننھی سی بچی بن کر میرے بازوؤں میں سما جائے اور میں اسے اپنے سینے میں چھپا کر ہر تکلیف ہر آلام سے محفوظ کر لوں۔

غزالہ کو بستر پر پڑے اب تین مہینے ہو چلے تھے۔ اس عرصے میں اس کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کوشل جو شیخ عاصم کی جاننے والی بھی تھی، غزالہ کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ڈیوٹی پر پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے آکر غزالہ کو دیکھتی، گھر سے بھی فون کرتی رہتی۔ اکثر وہ ملحقہ کمرے میں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ یہ باتیں عموماً غزالہ کے متعلق ہی ہوتی تھیں۔ عاصم پورے دو ہفتے بعد امارات سے واپس آیا۔ ائیرپورٹ سے سیدھا اسپتال پہنچا لیکن ایک بار اسپتال آنے کے بعد اس نے دس بارہ روز تک شکل نہیں دکھائی۔ یوں لگتا تھا کہ غزالہ سے اس کی تمام دلچسپی اور محبت کی بنیاد غزالہ کی خوبصورتی اور جسمانی کشش تھی۔ اب یہ چیزیں غزالہ سے چھنتی جا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی شیخ عاصم کی محبت کا ٹمپریچر بھی نیچے آتا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اپنے طور پر کوشاں ہو کہ اس کے رویے کی یہ تبدیلی کسی کو محسوس نہ ہونے پائے لیکن اصلیت چھپانے سے چھپتی نہیں ہے۔

ایک دن میں غزالہ کے قریب آرام کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اچانک چونک گیا۔ آج چوبیس تاریخ تھی۔ یہ میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن کا خیال آتے ہی میرا ذہن پورا ایک سال ماضی میں چلا گیا۔ پچھلے سال یہ دن مجھے مری میں آیا تھا۔ غزالہ مجھے لاہور سے بے ہوشی کی حالت میں مری لے آئی تھی اور اپنی ایک سہیلی کی کوٹھی میں رکھا تھا۔ وہ دن میری یادوں کے آسمان پر روشن تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ غزالہ کی قربت، اس کی محبت، کچھ بھی بھولا نہیں تھا مجھے... اس کی الھڑ دوشیزگی کس کس طرح مجھے رجھاتی رہی تھی۔ اس کی میزبان محبت کس کس طرح مجھے پکارتی رہی تھی۔ ایک عورت اپنے روٹھے محبوب کو منانے کے لیے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ کاش... اس وقت میرا دل پگھل گیا ہوتا۔ میں نے غزالہ کی ترسی ہوئی باہوں کو گلے سے لگایا ہوتا۔ لیکن بقول شاعر، یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم تھا کہ غزالہ تھی بھی اور نہیں بھی۔ اپنی سالگرہ کے حوالے سے مجھے وہ تحائف یاد آئے جو غزالہ نے مری میں مجھے دیے تھے۔ وہ گرم سوٹ کا کپڑا، وہ گھڑی اور چند کف... غزالہ نے کہا تھا، میں آپ کو خوشبو دینا چاہتی تھی لیکن اپنے مطلب کی خوشبو مجھے ملی نہیں۔ وہ غلط کہہ رہی تھی، جو کچھ اس نے دیا وہ خوشبو ہی تو تھا۔ ایسی خوشبو جو ہمیشہ کے لیے میری روح میں بس گئی تھی۔

تب... ایک برس بیت گیا اور اس ایک برس میں کیا کیا انقلابات آگئے۔ میں نے غزالہ کا سرد کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور عجب رازداری میں اسے سہلانے لگا "غزالہ آنکھیں کھولو۔ آج پھر میری سالگرہ ہے۔ آج مجھے کوئی تحفہ نہ دو گی؟ غزالہ... تم

بولتی کیوں نہیں۔ تم میری طرف دیکھتی کیوں نہیں۔ غزالہ... غزالہ"

معلوم نہیں میں کب تک اس طرح غزالہ کا ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا۔ نرس آئی اور چلی گئی، ڈاکٹر آیا اور اسے دیکھ گیا۔ میں یونہی محو رہا۔ شام ہونے والی تھی۔ کھڑکیوں پر تاریکی پر پھیلا رہی تھی۔ سورج کی آخری کرنیں غزالہ کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ وہ کہانیوں کی وہ بیمار شہزادی دکھائی دیتی تھی جس کے جسم میں سیکڑوں سوئیاں پیوست تھیں اور جو ایک مدت سے سو رہی تھی۔ میرا ہاتھ غزالہ کے بے جان ہاتھ کو سہلا رہا تھا۔ اچانک مجھے غزالہ کے ہاتھ میں حرکت محسوس ہوئی۔ میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ پچھلے تین مہینے میں یہ پہلی حرکت تھی جو میں نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی۔ "غزالہ! آنکھیں کھولو۔ پلیز آنکھیں کھولو۔"

میں آہستہ آہستہ اس کا شانہ ہلانے لگا۔ میں نے اس کے ہونٹ دیکھے۔ یوں لگا جیسے گلاب کی خشک پتیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی ہوں۔

وہ ہوش میں آرہی تھی۔ میں اس پر جھک گیا۔ اسے مسلسل پکارنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں درز پیدا ہوئی۔ نیم وا خالی خالی آنکھوں سے وہ کسی نامعلوم نقطے کی طرف دیکھنے لگی۔ "غزالہ، میری طرف دیکھو" میں نے اسے دھیرے دھیرے ہلایا۔

مجھے تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نرس اور ڈاکٹرز بھاگتے ہوئے کمرے کی طرف آرہے تھے۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے شانے سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا "پلیز آپ باہر جائیں" نرس نے ہدایت جاری کی۔ میں پیچھے ہٹ آیا۔ وہ دونوں پوری توجہ سے غزالہ کو دیکھنے لگے۔ چند منٹ بعد دو تین اور ڈاکٹر بھی اس وی آئی پی روم میں پہنچ گئے۔ انہوں نے غزالہ کے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔ تھوڑی دیر بعد نرس میرے پاس آئی۔ کہنے لگی "مریضہ ہوش میں آرہی ہیں۔ آپ ان کے شوہر کو بلا لیجیے۔"

غزالہ کے ہوش میں آنے کی خوشخبری بہت بڑی خوشخبری تھی۔ شاید یہ میری سالگرہ کا تحفہ تھا۔ میں دھڑکتے دل اور لرزاں قدموں کے ساتھ ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھا۔ ریسٹ ہاؤس کا نمبر ڈائل کیا تو معلوم ہوا کہ شیخ عاصم گھر میں نہیں ہیں۔ میرے استفسار پر ایک سرونٹ نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کوشل رائے کی طرف گئے ہیں۔ شاید مسز کے بارے میں کوئی مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر کوشل لوئر کولپٹیا میں ہی رہتی تھی۔ اس کی رہائش پوربیلا جنکشن پر تھی۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ کئی بار کوشش کرنے کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ ایک چھوٹی سوزوکی کار میرے استعمال میں تھی۔ میں نے "پارکنگ" سے کار نکالی اور ڈاکٹر کوشل کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شیخ عاصم والی گھڑی اب میری کلائی پر تھی۔ لہٰذا جسم میں الیکٹرانک ڈیوائس کی موجودگی کے باوجود میں ہر جگہ آزادانہ گھوم پھر سکتا تھا۔ اب رات کی تاریکی پوری طرح پر پھیلا چکی تھی اور کولمبو کی بھیگی بھیگی سڑکیں روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ آسمان حسب معمول ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر کوشل کا گھر خوبصورت علاقے میں تھا۔ گھنے درختوں کے درمیان سے شفاف سڑک بل کھاتے ہوئے نکلتی تھی۔ اس سڑک کی دونوں اطراف پھولوں کی نرسریاں تھیں اور کہیں کہیں پکنک اسپاٹ سے بنے ہوئے تھے۔ تاہم اس وقت یہ علاقہ بالکل سنسان نظر آرہا تھا۔ جس سڑک پر میں جا رہا تھا وہ ایک نہر نما مصنوعی جھیل کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ اس نہر کے دوسرے کنارے پر بھی سڑک موجود تھی۔ اس سڑک پر ناریل کے گھنے جھنڈ تھے۔ ایک ایسے ہی جھنڈ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ مجھے ایک کار کا عقبی حصہ نظر آیا تھا۔ یہ شیخ عاصم کی زرد مرسیڈیز تھی۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ ڈاکٹر کوشل کے گھر سے تین چار فرلانگ دور یہ مرسیڈیز اس وقت یہاں کیا کر رہی تھی؟ میرا پاؤں خود بخود بریک پیڈل کی طرف بڑھ گیا اور میں نے گاڑی سڑک کے کنارے تاریکی میں روک دی۔ اس نہر نما جھیل پر تھوڑا آگے لکڑی کا پل موجود تھا۔ میں نے اس پل کے ذریعے جھیل عبور کی اور دوسری جانب کے گھنے درختوں میں پہنچ گیا۔ تجسس میری انگلی پکڑ کر گاڑی کی طرف کھینچے لے جا رہا تھا۔ میں بے حد محتاط قدموں سے گاڑی کی عقبی جانب پہنچ گیا۔ آخری چند قدم کا فاصلہ میں نے زمین پر "کرالنگ" کر کے طے کیا۔ گاڑی کا اگلا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ مجھے دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی پھر اسی آواز میں ایک سسکاری سی ابھری اور تاریک فضا میں چنگاریاں بھر گئیں۔ میں نے کیلے کے بڑے بڑے پتوں کی اوٹ سے دیکھا، ادھ کھلے دروازے میں سے دو عریاں پنڈلیاں اور زنانہ سینڈل نظر آرہے تھے۔ ان پنڈلیوں پر گردش کرتا ہوا ہاتھ شیخ عاصم کے سوا اور کسی کا نہیں تھا۔ ایک بار پھر مترنم ہنسی گونجی اور گاڑی بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ میں پہچان چکا تھا مستی میں ڈوبی ہوئی یہ ہنسی ڈاکٹر کوشل کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کوشل غزالہ کی دیکھ بھال کرتے کرتے اس کے شوہر کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی تھی...

میرے لہو میں آگ دوڑنے لگی۔ شیخ عاصم کا چہرہ آج میرے سامنے پوری طرح بے نقاب ہو چکا تھا۔ اپنی "محبوب" بیوی کو نرسوں اور ڈاکٹروں کے سپرد کر کے وہ فراغت کے لمحات سے خوشیاں کشید کر رہا تھا۔ میری انگلیوں کی پوروں میں وہی سنسنی جاگ گئی جو مجھے خطروں سے بے نیاز کرتی تھی۔ میرا جی چاہا اوٹ سے نکل کر شیخ عاصم پر جا پڑوں اور اس کے منحوس جسم سے زندگی کشید کر لوں۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ سوچ میرے ذہن میں ابھری، کیا غزالہ میرے اس فیصلے کو قبول کرے گی؟ کہیں وہ مجھے اپنے شوہر کا قاتل تو نہیں گردانے گی۔ کیا وہ میرے اس جواز کو تسلیم کرے گی کہ میں نے اس کے شوہر کو گناہ کی حالت میں دیکھ کر قتل کر دیا ہے۔ کتنی

بیویاں ہیں جو اپنے شوہروں کی آوارگی سے باخبر ہونے کے بعد انہیں سزائے موت کا مستحق سمجھتی ہیں؟ نہیں۔۔۔ غزالہ مجھے خونی قاتل اور درندہ گردانے گی۔ وہ اب تک اس فریب کو نہیں سمجھ سکی جو اس سے ہوا ہے اور نہ آئندہ سمجھ سکے گی۔۔۔ میرے تذبذب نے جو چند لمحے ضائع کیے وہ شیخ عاصم کے لیے زندگی کی ضمانت بن گئے۔ گاڑی کا اگلا دروازہ مدھم آواز سے بند ہونے کے بعد اندر سے لاک ہو گیا۔ پھر گاڑی کا بے آواز انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ ڈاکٹر کوشل کی رہائش کی طرف نہیں تھا۔ غالباً وہ دونوں کسی زیادہ محفوظ اور پرسکون گوشے کی تلاش میں ساحل کی طرف نکل گئے تھے۔۔۔ میں نڈھال قدموں سے واپس سوزوکی کار کی طرف چل دیا۔

میں اسپتال پہنچا تو غزالہ اپنے سفید براق بستر پر ساکت لیٹی تھی۔ اس کی نیم وا آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ دو ڈاکٹر اس کے سرہانے موجود تھے اور اس کی کیفیات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک سنہالی ڈاکٹر نے پوچھا "ان کے شوہر کا نام عاصم ہے نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے دو تین بار یہ نام لیا ہے۔"

میں نے کہا "وہ۔۔۔ کسی ضروری کام سے گئے ہوئے ہیں۔ کولمبو میں نہیں۔"

ڈاکٹر بولا "ان کا اس وقت یہاں ہونا ضروری تھا۔"

رات گئے تک ڈاکٹر غزالہ کے اردگرد موجود رہے، ان میں ایک انگلش ڈاکٹر بھی تھا۔ اس کا نام مائیکل تھا۔ وہ غزالہ کی حالت میں آنے والی تبدیلی کو خوش آئند قرار دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مریضہ مکمل بے ہوشی کی حالت سے نیم بے ہوشی کی حالت میں آگئی ہے اور اب "مکمل ہوش" کی طرف اس کا سفر آسان ہو گیا ہے۔۔۔ رات پچھلے پہر جب ڈاکٹر جا چکے تھے اور نرس بھی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی تھی میں غزالہ کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور دھیمے لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ خوشگوار باتیں، خوشگوار یادیں، جن سے غزالہ کا ذہن اچھا اثر قبول کر سکتا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ میری باتیں سن رہی ہے۔ بہت دیر بعد اس کے ہونٹوں میں ہلکی ہلکی جنبش پیدا ہوئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے کان اس کے قریب کیا اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بہت مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔

"عاصم کہاں ہیں۔ وہ آئے۔۔۔ کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "غزالہ، وہ کولمبو میں نہیں ہے۔ میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی وہ یہاں پہنچ جائے گا۔"

اس کی آنکھوں کی پتلیاں متحرک ہو گئیں۔ وہ جیسے خلا میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھی، شاید اپنے شوہر کو، شاید اپنے آپ کو۔

میں ایک بار پھر فون بوتھ پر پہنچا۔ ریسٹ ہاؤس فون کیا۔ عاصم ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ یقیناً اس نے ساری رات کوشل کی زلفوں میں کالی کی تھی، تاہم وہ ڈاکٹر کوشل کی کوٹھی میں نہیں تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی تھی لیکن اٹھاتا کوئی نہیں تھا۔ لگتا [illegible] وہ کسی ویران ساحل پر داد عیش دے رہے ہوں، یا پھر [illegible] لیے استعمال ہونے والی کسی ہٹ میں چلے گئے ہوں۔

اگلے تین چار روز میں غزالہ کی حالت میں وقفے وقفے سے تبدیلی آتی رہی۔ کسی وقت وہ بالکل بے ہوش نظر آتی، کسی وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑاتی یا نیم وا آنکھوں سے کمرے کی چھت کو دیکھتی۔ وہ اب چہروں کو پہچاننے لگی تھی اور آوازوں کا مفہوم بھی سمجھتی تھی۔ تاہم اس کی زبان میں لکنت تھی اور بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ اب وہ کبھی نارمل حالت میں نہیں آسکے گی۔ شیخ عاصم دو دفعہ اسے دیکھنے آیا اور دونوں دفعہ چند منٹ بیٹھ کر چلا گیا۔ غزالہ کی ذات میں اس کی دلچسپی بس واجبی سی رہ گئی تھی۔ یقیناً اس چیز کو خود غزالہ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ میں نے دو تین دفعہ دیکھا کہ غزالہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے ہیں اور ہونٹوں میں بے قرار پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ ہے۔ بیماری کے اس مرحلے میں غزالہ کو مکمل سکون اور دلجوئی کی ضرورت تھی۔ شیخ عاصم کا رویہ اس کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ میں اپنے طور پر غزالہ کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ شیخ ابھی تک کاکا والے معاملے میں الجھا ہوا ہے لہٰذا اسے زیادہ وقت نہیں دے رہا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ شیخ جلد ہی غزالہ کے والدین کو پاکستان سے بلا رہا ہے اور وہ انہیں دیکھ سکے گی۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں جھوٹ تھیں۔ کاکا اور "اے کو" والا معاملہ ختم ہو چکا تھا، اور شیخ تقریباً فارغ تھا۔ جہاں تک غزالہ کے والدین کو بلانے کا تعلق تھا میں نے تین بار شیخ سے کہا تھا لیکن اس نے کان نہیں دھرے تھے۔

ڈاکٹر کوشل بھی کئی دفعہ غزالہ کو دیکھنے آچکی تھی۔ وہ چھوٹے بدن کی تیکھے نقوش والی مدراسی لڑکی تھی۔ امیر کبیر لیکن روایت پسند ہندو فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے غزالہ کی مزاج پرسی کرتے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ نوجوان ڈاکٹر اپنی مریضہ کے شوہر کے ساتھ کیا گل کھلا رہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

دس بارہ روز کے افاقے کے بعد غزالہ کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ اس رات شیخ عاصم نے آنا تھا لیکن نہیں آیا۔ غزالہ ساری رات جاگتی رہی اور شیخ کی راہ دیکھتی رہی۔ علی الصباح اسے سر میں شدید درد شروع ہو گیا اور بلڈ پریشر بھی بہت بڑھ گیا۔ ڈاکٹرز نے انجکشن وغیرہ دیے۔ اس سے بلڈ پریشر تو کم ہو گیا لیکن وہ گہری غنودگی میں چلی گئی۔ اس کے سانس کی روانی بھی متاثر ہو رہی تھی۔

دوپہر تک ایک بار پھر اسے گلوکوز لگ گیا اور آکسیجن ماسک منہ پر آگیا۔

میں نے ٹیلی فون پر شیخ عاصم کو غزالہ کی حالت بگڑنے کی اطلاع دی۔ اس نے صرف سیکرٹری نرائن کو بھیجنے پر اکتفا کیا۔ سیکرٹری نے بتایا کہ شیخ عاصم صاحب شنکر شکرا اور چند دیگر افراد کے ساتھ کسی اہم میٹنگ میں شریک ہیں۔ وہ ایک بجے سے پہلے فارغ نہیں ہوں گے۔ غزالہ کی تشویشناک حالت نے ڈاکٹروں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر غزالہ کے سلسلے میں باہم متفکر نظر آنے لگے تھے۔ میرا اپنا دل بھی بجھ سا گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اگر غزالہ کی جان کو کسی بیرونی خطرے کا سامنا ہوتا تو میں اس خطرے کے سامنے ڈھال بن جاتا۔ ہر بلا کو اس تک پہنچنے سے روک دیتا لیکن اب تو خدا کے بعد صرف ڈاکٹروں کا بھروسا تھا اور وہ اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ شام کے وقت شیخ عاصم نے ایک چکر لگایا۔ کچھ دیر ڈاکٹروں سے بات چیت کی۔ غزالہ اس وقت بے ہوش تھی۔ شیخ عاصم بمشکل دو منٹ اس کے پاس بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ اگلے روز میں نے یہ حیرت انگیز خبر سنی کہ وہ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے امارات چلا گیا ہے۔ میں نے ریسٹ ہاؤس فون کیا تو معلوم ہوا کہ شیخ عاصم کا وہ عملہ بھی واپس چلا گیا ہے جو اس کے ساتھ سری لنکا آیا تھا اور اب ریسٹ ہاؤس میں چند ہی گنے چنے ملازم ہیں جو سارا سال یہاں رہتے ہیں۔ جاتے جاتے شیخ عاصم نے بس اتنی مہربانی کی تھی کہ سیکرٹری نرائن کمار کے اکاؤنٹ میں معقول رقم جمع کروا دی تھی اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ غزالہ کے علاج معالجے کے لیے ضرورت کے مطابق یہ رقم نکلواتا رہے۔

کچھ دن یہ سلسلہ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ریسٹ ہاؤس میں کچھ نامعلوم افراد نے داخل ہو کر توڑ پھوڑ کی اور سیکرٹری نرائن کو اغوا کر کے لے گئے۔ یہ خبر اخباروں میں بھی تفصیل سے شائع ہوئی۔ اخبارات میں خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ واردات پرانی عداوت کا شاخسانہ ہے اور اس کا سلسلہ اسی چپقلش سے ملتا ہے جو شیخ عاصم اور "اے کو" کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس واردات کی اطلاع ملتے ہی مجھے اروشی کی طرف سے فکر لاحق ہوئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پتا چل گیا کہ وہ بخیر و عافیت ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں واردات ہونے کے بعد اس بات کا امکان موجود تھا کہ اسپتال میں بھی کوئی اس قسم کی کارروائی کی جائے۔ میں نے مقامی پولیس اور اسپتال کی انتظامیہ سے درخواست کی کہ مسز شیخ عاصم کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ حسب توقع یہ درخواست دفتری چکروں کی نذر ہو گئی۔ مجبوراً میں نے بلیک مارکیٹ سے ڈیڑھ ہزار روپے کے عوض ایک ریوالور اور تیس چالیس گولیاں خرید لیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے امارات میں شیخ عاصم سے رابطہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ تھا تو امارات میں ہی لیکن فون پر مل نہیں رہا تھا۔ دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ کہیں سیر و شکار کے لیے نکلا ہوا تھا یا پھر جان بوجھ کر رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ یقینی بات تھی کہ اخبارات ریڈیو کے ذریعے اسے بھی یہ اطلاع مل چکی ہے کہ نامعلوم افراد نے ریسٹ ہاؤس پر حملہ کیا ہے اور اس کے سیکرٹری کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ضروری تھا کہ وہ فوری طور پر کوئی ایکشن لیتا۔ کم از کم غزالہ کے علاج معالجے پر اٹھنے والے اخراجات کا انتظام تو کر دیتا۔ لیکن وہ تو کولمبو سے پرواز کرتے ہی جیسے سری لنکا کو بالکل بھول گیا تھا۔

سری لنکا میں میں خود بھی اجنبی تھا۔ میرے لیے آناً فاناً کثیر رقوم کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ میں نے سوچا کہ پاکستان فون کر کے ساہی صاحب سے کچھ رقم منگوا لوں لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود ساہی صاحب سے بات نہیں ہو سکی۔ میں نے انہیں ارجنٹ خط پوسٹ کر دیا۔ ایک دن شام کے وقت میں غزالہ کے سرہانے پریشان بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے سامنے مسز کیتھی کھڑی تھی۔ سرخ و سپید اور فربہ اندام انگریز عورت جو رحمان کاکا کی محبوبہ بھی تھی۔ اس نے مجھے اور زریں گل کو کاکا کے شکنجے سے نکالا تھا اور ہم لے ناٹ ریسٹورنٹ کی قاتل تاریکی سے آزاد ہو کر واپس رینی پیلس پہنچ پائے تھے۔ میں اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد کیتھی میرے پاس بیٹھ گئی اور دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ اس نے اپنے پرس سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بڑی سرعت سے میری جیکٹ کی جیب میں رکھ دی۔

"یہ کیا ہے آنٹی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"رکھ لو" وہ ملائمت سے بولی "مجھے معلوم ہے تمہیں ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ تمہارے کام آکر مجھے خوشی ہوگی۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ وہ تمہارا گول مٹول ساتھی کہاں ہے۔۔۔ بہت خبیث ہے وہ۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت شرارت ٹپکتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ پاکستان چلا گیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم پاکستانی ہو۔۔۔ دیکھو، کتنی حیرت کی بات ہے، مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ تم پاکستانی ہو۔ بہت خوبصورت ملک ہے پاکستان۔ بہت اچھے لوگ ہیں وہاں کے۔ کچھ عرصہ قبل میں بھی وہاں جا چکی ہوں" پھر جیسے اس کے ذہن میں کوئی نیا خیال آیا اور وہ غور سے بے ہوش غزالہ کی طرف دیکھنے لگی۔ بولی "تم اس لڑکی کو پاکستان کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں بھی اس کی بہت اچھی دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔ کون سی ایسی سہولت ہے جو یہاں موجود ہے اور کراچی یا لاہور میں موجود نہیں۔ اور پاکستانی ڈاکٹر تو باہر کے ملکوں میں بہت زیادہ مشہور ہیں۔ بہت ذہین اور قابل لوگ شمار ہوتے ہیں وہ۔ اور پھر لڑکی کی جو حالت ہے اس میں اسے علاج معالجے سے بھی زیادہ پیار محبت اور مانوس ماحول کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ یہاں یہ کب تک اسی طرح بے یار و مددگار پڑی رہے گی۔ اپنا ملک ہوگا۔ اپنے لوگ ہوں گے تو کئی طرح کی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ پھر یہاں حالات ویسے بھی غیر یقینی ہیں۔ پچھلے ہفتے روشنی ویلی میں واردات ہوئی ہے۔ کل یہاں بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے شیخ عاصم کے سارے دشمن اب اس جاں بہ لب لڑکی کے بھی دشمن ہیں۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔"

مسز کیتھی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! اگر تمہارے ذہن میں کاکا کی طرف سے کوئی بدگمانی ہے تو وہ نکال دو۔ میں بالکل غیر جانبداری سے یہ بات کہہ رہی ہوں کہ کاکا نے فون پر تم سے جو کچھ کہا وہ بالکل درست تھا۔ تمہارے ساتھ معاہدہ ہونے کے بعد وہ معاہدے کی تمام شرائط کی پابندی کر رہا ہے۔ برے سے برے آدمی میں کچھ اچھے وصف ہوتے ہیں اور کاکا کا ایک اچھا وصف زبان کا پاس بھی ہے۔"

"تو پھر روشنی ویلی پر کن لوگوں نے کارروائی کی ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا' دو تین ڈاکٹرز اور ان کے اسسٹنٹس کمرے میں داخل ہو گئے اور ہمیں چپ ہونا پڑا۔ مسز کیتھی کو جلدی تھی۔ وہ مجھ سے اجازت لے کر اور میرا حوصلہ وغیرہ بڑھا کر چلی گئی۔

دو روز بعد ساہی صاحب کا بھیجا ہوا بینک ڈرافٹ بھی اسپتال کے پتے پر پہنچ گیا۔ میرے مشورے کے مطابق یہ ڈرافٹ اروشی کے نام تھا۔ اروشی نے ڈرافٹ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد کیش میرے حوالے کر دیا۔ ساہی صاحب نے بھی اپنے خط میں یہی مشورہ دیا تھا کہ غزالہ کے شوہر سے اجازت لینے کے بعد میں غزالہ کو پاکستان لے آؤں۔ غزالہ کے تمام سفری کاغذات موجود تھے۔ مسز کیتھی کی مدد سے اسے اسپتال سے بھی ڈسچارج کرایا جا سکتا تھا۔ اصل مسئلہ غزالہ کو پاکستان لے جانے کے لیے شیخ عاصم سے اجازت لینے کا تھا۔ وہ بدبخت امارات جا کر نجانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ نہ اس نے خود آ کر خبر لی تھی نہ فون کیا تھا اور نہ ہی کسی کو پرسشِ احوال کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ شیخ عاصم کے رابطے کا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد غزالہ کو لے کر پاکستان روانہ ہو جاؤں گا۔

غزالہ کی حالت میں انیس بیس کا فرق پڑا تھا۔ دن میں ایک کوھ بار اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل جاتی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ارد گرد دیکھنے کی کوشش کرتی اور ہونٹوں کو حرکت دیتی۔ ایسے میں جب میں جوس یا دوا وغیرہ کا چمچ اس کے لبوں سے لگاتا تو وہ ہونٹ کھول دیتی۔ کسی وقت وہ اپنے ہڈیوں بھرے ہاتھ کو بستر پر حرکت دیتی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔ اس کے چہرے پر طمانیت بکھر جاتی اور آنکھوں کے گوشے بھیگ سے جاتے۔ میں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا۔ اس کے خشک بے رونق بالوں میں انگلیاں اور اس کے سرد ہاتھ کو ہولے ہولے دباتا رہتا۔

ایک رات غزالہ کے بازو میں لگی ہوئی وہ سوئی اکھڑ گئی جو اس کے ناتواں جسم میں گلوکوز اور خوراک پہنچاتی تھی۔ تھوڑا تھوڑا خون رستا رہا۔ غزالہ کی قمیص اور بستر کی چادر داغدار ہو گئی۔ میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ نرس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ غزالہ کے پاس رہتی لیکن وہ فراغت دیکھ کر نہ جانے کہاں نکل گئی تھی۔ میں نے غزالہ کی چادر پر سرخ دھبے دیکھے تو چونک گیا۔ برآمدوں میں نرس کو تلاش کیا پھر خود ہی گلوکوز اس کے جسم سے علیحدہ کیا۔ غزالہ اپنی قمیص پر خون کے دھبے دیکھ چکی تھی اور مضطرب نظر آتی تھی۔ ضروری تھا کہ قمیص بدل دی جاتی۔ میں نے غزالہ کے اوپر چادر پھیلانے کے بعد خود ہی اس کی قمیص بدلی پھر گلوکوز لگانے کے بعد تکیے کے سہارے اس کا سر تھوڑا سا اونچا کر دیا۔ اس کی طبیعت قدرے بحال نظر آ رہی تھی۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ میں نے گیلے تولیے سے اس کا چہرہ صاف کیا' اسے دوا پلائی اور رات کی رانی کے مہکتے ہوئے پھولوں کا دستہ اس کے قریب رکھا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا "غزالہ میں کل تمہیں پاکستان لے جا رہا ہوں۔ وہاں تم سب کو دیکھ سکو گی۔ امی کو' ابو کو۔ اپنے بھائی کو' نزہال اور انجم کو۔۔۔ تم چلو گی نا پاکستان؟"

اس نے بڑی نقاہت سے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹوں اور نتھنوں میں کپکپاہٹ تھی۔ وہ رونے لگی۔ خاموش آنسو اس کے ہڈیوں بھرے چہرے پر پھیلنے لگے۔

○☆○

اسی روز علی الصباح غیر متوقع طور پر شیخ عاصم کا ٹیلی گرام آ گیا۔ یہ ٹیلی گرام اسپتال کے پتے پر تھا اور شیخ نے شارجہ کے کسی غیر معروف قصبے سے ارسال کیا تھا۔ یہ ٹیلی گرام میرے نام تھا اور اس میں شیخ عاصم نے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو غزالہ کو پاکستان لے جاؤں۔ وہ فی الحال بہت مصروف ہے۔ فرصت ملتے ہی وہ بھی پاکستان آ جائے گا۔

دل ہی دل میں میں نے شیخ عاصم کو بہت سی صلواتیں سنائیں اور ٹیلی گرام سند کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا۔ ہماری روانگی کے تمام انتظام مکمل ہو چکے تھے۔ شام چھ بجے ہماری فلائٹ تھی۔ غزالہ کو ائیرپورٹ لے جانے کے لیے ایمبولینس کا انتظام ہو چکا تھا۔ مسز کیتھی بارہ بجے ہی اسپتال آ گئی اور اس نے غزالہ کو ڈسچارج کروانے اور اسپتال سے روانہ کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔ میں نے ایس پی برکت کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ ہم پاکستان واپس جا رہے ہیں وہ بھی جب چاہے پاکستان آ سکتا ہے۔

تین بجے کے لگ بھگ ہم اسپتال سے روانہ ہوئے۔ اروشی بھی ہمیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھی۔ وہ آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ بولی "اب میرا بھی یہاں دل نہیں لگتا۔ جی چاہتا ہے میں بھی پاکستان ہی چلی جاؤں۔"

میں نے کہا "اگر تم چاہو تو ایسا ممکن ہے۔"

وہ بولی "ٹھیک ہے۔ میں خط میں آپ کو تفصیل سے لکھوں گی۔"

میں نے کہا "ضرور لکھنا لیکن ایک خط زریں گل کو بھی لکھنا ورنہ وہ میری جان کو آ جائے گا۔" اروشی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرانے لگی۔

مسز کیتھی میرے اور غزالہ کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہمیں ائیرپورٹ پر الوداع کہنا چاہتی تھی۔ ایک عجیب سی بزرگانہ شفقت سمٹی ہوئی تھی اس کے رویے میں۔ اس شفقت میں کہیں کہیں ممتا کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ مسز کیتھی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں اور اب تیسری بار رضوان کاکا کے چنگل میں آ پھنسی تھی۔ اس کی زندگی بہت تلخ تھی شاید اس لیے وہ سگریٹ اور شراب وغیرہ کا سہارا لیتی تھی۔ وہ کسی وقت مجھے شاہ جہاں اور کسی وقت "اے لڑکے" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ کہنے لگی "اے لڑکے! پاکستان پہنچتے ہی سب سے پہلے مجھے ٹیلی فون کرنا ہے اور اس لڑکی کی زندگی بگاڑنے میں جتنا ہاتھ تمہارا ہے اور کسی کا نہیں۔ اب اس کو نارمل زندگی تک لانے کی سب سے زیادہ ذمے داری بھی تم پر ہی ہے۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل بجا کہا آپ نے" میں نے جواب دیا۔

"اور ہاں۔۔۔ میرے ہاں غیریت نہیں چلے گی۔ تم جب بھی کولمبو آؤ سب سے پہلے مجھے اطلاع دو۔ تم جب تک یہاں رہو گے تمہارے طعام قیام کا بندوبست میرے ذمے ہوگا۔"

میں نے پھر فرمانبرداری سے سر ہلایا۔ اچانک ایمبولینس کو زور سے جھٹکا لگا۔ وہ لہرائی اور سڑک سے اتر کر کسی نیم پختہ راستے پر دوڑنے لگی۔ میں نے چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مین روڈ کافی فاصلے پر رہ گئی تھی۔

"یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" مسز کیتھی نے تیکھے ہوئے لہجے میں ذرا ڈرائیور سے پوچھا۔

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے شخص نے اپنے لباس کے اندر سے ریوالور نکالا اور اس کا رخ میری طرف کر دیا "خبردار" وہ انگریزی میں گرجا۔ "آرام سے بیٹھے رہو۔ ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

کیتھی کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے گھوم کر اس شخص کی طرف دیکھا جو ہمارے پہلو میں بیٹھا تھا۔ یہ سکھ ملازم میرے ساتھ غزالہ کا اسٹریچر اٹھا کر ایمبولینس تک لایا تھا۔ اب اس نے اپنی بغل کے اندر سے ٹریل ٹو رائفل نکال لی تھی اور بڑی خوفناک نظروں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ مسز کیتھی سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔

"کون لوگ ہو تم۔ کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟"

سکھ رائفل بردار اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا "ذرا چھتری کے نیچے سانس لو سوہنیو! ابھی سب کچھ بتا دیتے ہیں۔"

غزالہ اسٹریچر پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اس ہنگامے سے قطعی بے خبر تھی جو اس ایمبولینس کے اندر شروع ہو گیا تھا۔ اگر میں رائفل بردار پر جھپٹتا تو یقیناً گاڑی میں گولی چل جاتی۔ اگر میری جلد بازی کی وجہ سے غزالہ کو کچھ ہو جاتا تو میں ساری عمر خود کو معاف نہ کر سکتا۔ میں نے سکھ رائفل بردار کا تاؤ دلانے والا لہجہ بے حد مشکل سے برداشت کیا' اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایمبولینس اچھلتی کودتی نیم پختہ راستے پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ جس رفتار سے گاڑی بھاگ رہی تھی اس سے دوگنا رفتار سے میرا ذہن بھاگ رہا تھا۔ عین موقعے پر یہ کیا آفت نازل ہو گئی تھی۔ یہ کون لوگ تھے جو آخری لمحوں میں ہمارا راستہ کھوٹا کر رہے تھے۔ یہ کاکا کے آدمی تھے۔ "بوبے کو" کے تھے یا کوئی اور گروہ تھا!

مسز کیتھی حملہ آوروں کو برا بھلا کہنے لگی اور انہیں بتانے لگی کہ ہمارا وقت پر ائیرپورٹ پہنچنا کتنا ضروری ہے۔ جواب میں مسلح افراد نے سخت لہجہ اختیار کیا اور کیتھی کو چپ رہنے کی تلقین کی۔ وہ اور زور و شور سے بولنے لگی اور انہیں سمجھانے لگی کہ وہ اپنی اس سنگین حرکت سے ایک مریضہ کی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ سکھ رائفل بردار نے بڑی بے پروائی سے ٹریل ٹو کی سیاہ نال مسز کیتھی کی گردن سے لگا دی اور خطرناک لہجے میں اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تیرے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا ہے شہزادے۔ اگر ایک بات یاد رکھنا۔ تیرا واسطہ تلوے بدمعاشوں سے نہیں پڑا۔ ہم صرف اسلحہ پکڑنا ہی نہیں چلانا بھی جانتے ہیں۔"

دو پانچ میل جنگل میں سفر کرنے کے بعد جب گاڑی ایک موڑ پر گھوم رہی تھی' ڈرائیور کو یک لخت زور سے بریک لگانا پڑے۔ دراصل راستے کے عین درمیان بارش کے سبب گڑھا سا بن گیا تھا۔ بریک اتنے اچانک اور شدید لگے کہ میں اچھل کر اس شخص سے جا ٹکرایا جو اگلی نشست پر ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ یہ قدرتی موقع ضائع کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے ریوالور بردار کی گردن پر کھڑے ہاتھ کی جچی تلی ضرب لگائی۔ وہ منہ کے بل ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اور نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں سکھ رائفل بردار کی طرف پلٹا۔ بریک لگنے کی وجہ سے اس کا توازن بھی خراب ہو چکا تھا۔ وہ پہلو کے بل نشست پر گرا ہوا تھا۔ رائفل کی نال فرش کی طرف جھک چکی تھی۔ میں نے اس پر جست لگائی اور چھاپ لیا۔ مگر عین اس موقعے پر ڈرائیور نے پھرتی کا مظاہرہ کر دیا۔ اس نے لوہے کی کسی وزنی چیز سے میرے سر کو نشانہ بنایا۔ میری گرفت سکھ رائفل بردار پر ذرا سی ڈھیلی پڑی تو اس نے مجھے پرے

کے زور سے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پھر رائفل سیدھی کرنی چاہی۔ مجھے خطرے میں دیکھ کر مسز کیتھی نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور رائفل بردار پر جا پڑی۔ اس کے ساتھ ہی تڑتڑ کی آواز سے گاڑی گونج اٹھی۔ ایک سیکنڈ کے مختصر عرصے میں تین گولیاں مسز کیتھی کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کی پشت پر سرخ داغ نمودار ہوتے دیکھے۔ میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ یہی لمحہ تھا جب ڈرائیور نے پھر مجھ پر حملہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی آہنی راڈ قسم کی شے تھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اپنا سر اس ضرب سے بچایا اور پیچھے کی جانب گرتے ہوئے ایک ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس ٹھوکر میں وہ تمام غیظ و غضب اور رنج سمٹ آیا تھا جو مسز کیتھی کو موت کے دہانے پر دیکھ کر میرے اندر پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا بہت زوردار ٹھوکر تھی۔ ڈرائیور ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا باہر جا گرا۔ یقیناً وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ دوسری طرف مسز کیتھی سکھ رائفل بردار کے اوپر گری ہوئی تھی۔ وہ دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پھنس گیا تھا اور نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری نظر مسز کیتھی کی پشت پر پڑی اور دل لرز گیا۔ تین میں سے دو گولیاں مسز کیتھی کی کمر کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اس باہمت عورت نے سکھ رائفل بردار کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ میرے لیے یہ لمحات بہت قیمتی تھے۔ میں نے فرزالہ کو کھینچ کر کندھے پر لادا اور بھاگ نکلا۔ چاروں طرف گھنے درخت، جھاڑیاں اور لمبی جنگلی گھاس تھی۔ فرزالہ مجھے پھول کی طرح ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے گھٹنوں کی ہڈیاں اور پسلیاں میرے جسم پر چبھ رہی تھیں۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھی۔ دو تین منٹ بعد مجھے اپنے عقب میں ٹرپل ٹو کا فائر سنائی دیا۔ یقیناً سکھ رائفل بردار میرے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ پیدل ہی تھا۔ ورنہ مجھے انجن کا شور سنائی دیتا۔ تنہا شخص سے نمٹنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں خالی ہاتھ تھا اور اس کے پاس انتہائی طاقتور رائفل تھی۔ پھر میرے ساتھ فرزالہ بھی تھی۔ میں زیادہ تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے عقب میں سکھ رائفل بردار کی چنگھاڑیں سنائی دینے لگیں۔ وہ میرا نام لے لے کر پکار رہا تھا اور بازاری زبان میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ نشے میں بھی ہے۔ مسز کیتھی کو شوٹ کرنے کے بعد اس کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا اور وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں آواز کی مخالف سمت میں گھنے تاریک درختوں کے اندر گھستا چلا گیا اور سکھ رائفل بردار سے کافی دور نکل گیا۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں کچھ دیر کے لیے فضا میں معلق رہ کر زبردست شور آواز کے ساتھ پانی کے اندر گرا۔ یہ ایک برساتی گڑھا تھا جو ڈھلوان پر واقع تھا اور جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ گڑھا کافی گہرا تھا۔ گرنے کے بعد چند لمحے کے اندر اندر مجھے دو تین ڈبکیاں آ گئیں۔ میں نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ پہلے فرزالہ کو پانی سے نکالا پھر خود بھی نکل آیا۔ کہنیوں اور گھٹنوں پر خراشوں سوا اور کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ ایک آدھ ڈبکی فرزالہ کو بھی لگی تھی اور اس کے بال بھیگ کر چہرے سے چپک گئے تھے۔ ہوش تو پہلے سے نہیں تھی، اب اس بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ نے اسے بے جان سا کر دیا تھا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ ختم نہ ہو گئی ہو۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی' اس کے سینے سے کان لگا کر دھڑکن سنی۔ وہ زندہ تو تھی لیکن کسی بھی وقت موت کی دہلیز... سکتی تھی۔

اس کی حالت دیکھ کر میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا۔ دل چاہا کہ چیخ چیخ کر سکھ رائفل بردار کو اپنی طرف بلاؤں اور جو وہ آ جائے تو بلا دریغ اس پر ٹوٹ پڑوں۔ شاید چند لمحے مزید گزر جاتے تو میں یہی کچھ کرتا لیکن اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ اب رائفل بردار اکیلا نہیں ہے۔ اس کے مزید ساتھی بھی یہاں پہنچ چکے ہیں۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چار یا دس بارہ نہیں ہیں۔ وہ تو ایک جلوس سا تھا جو یکایک کسی طرف سے برآمد ہوا اور اب غل مچاتا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ لوگ پھیل کر آ رہے تھے جیسے کسی جانور کا ہانکا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔ میں نے نیم جان فرزالہ کو کندھے پر اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کا رخ کروں۔ وہ لوگ تین اطراف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر میں نے تاڑ' بانس اور کیلے کے گھنے درختوں میں ان کی جھلک دیکھی۔ ان کی رنگت اور لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ مقامی لوگ ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے' بانکیاں' برچھے اور ..... بہت کچھ تھا۔ جونہی انہیں میری جھلک نظر آئی وہ میری طرف بھاگے۔ ان کے چہرے غضب سے تپے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے پاس پہنچتے ہی مجھے پیٹنا شروع کر دیں گے۔ ان لمحات میں' میں نے خود کو جتنا بے بس محسوس کیا زندگی میں کبھی نہیں کیا۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ تھے اور انہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھ سے مار ماری شروع کی تو یقیناً فرزالہ بھی زد میں آ جائے گی۔ وہ پہلے ہی جاں بہ لب تھی' مزید کوئی صدمہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے فرزالہ کو گڑھے کے کنارے ڈالا اور خود دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ اسی دوران میں مشتعل افراد کی ٹولی مجھ تک پہنچ گئی۔ حسب توقع انہوں نے پہنچتے ہی مجھ پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تین چار گھونسے میرے چہرے پر پڑے۔ پھر عقب سے کسی نے لاٹھی سر پر ماری۔ میں گھٹنوں کے بل گرا۔ مشتعل افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے اور بری طرح پیٹنے لگے۔ نہ وہ میری زبان سمجھ سکتے تھے نہ میں ان کی۔ غیظ و غضب کے عالم میں وہ پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ ان میں سے چند افراد انہیں روکنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ کبھی روکنے والے غالب آ جاتے تھے' کبھی مارنے والے۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل چکا

...سے بھی مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ہجوم میں مجھے وہ رائفل بردار سکھ بھی نظر آیا جو ایمبولینس سے میرے پیچھے آیا تھا۔ وہ مشتعل افراد کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہجوم میں موجود معتبر افراد مار پیٹ کرنے والوں کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں کپڑے جھاڑتا اور خون تھوکتا زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں ایک کھٹارا سی جیپ بھی موقع پر پہنچ گئی۔

"چلو اس میں بیٹھ جاؤ۔" سفید گھونگریالے بالوں والے ایک شخص نے مجھ سے انگلش میں کہا۔

"نہیں اس لڑکی کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے گڑھے کے کنارے بے سدھ پڑی فرزالہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے' اسے بھی لے آتے ہیں۔"

"نہیں اسے میرے ساتھ جیپ میں سوار کرو۔"

گھونگریالے بالوں والے نے چند لمحے تک تیز نظروں سے مجھے گھورا پھر مقامی زبان میں اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ جیپ کو فرزالہ کے پاس لے جائیں۔ جیپ وہاں پہنچی تو فرزالہ کو اٹھا کر پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا۔ میں نے اپنی بھیگی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا اور فرزالہ کا پاسپورٹ نکالا' ہوائی جہاز کے ٹکٹ نکالے اور گھونگریالے بالوں والے شخص کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارا ایئرپورٹ پہنچنا کتنا ضروری ہے۔

اس نے بڑے اطمینان سے کہا "تم ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکتے۔ نہ ایک گھنٹے کے اندر نہ ایک ہفتے کے اندر۔"

"لیکن کیوں۔ تم لوگوں کو اگر مجھ سے کوئی دشمنی ہے تو اس لڑکی کا خون اپنے سر کیوں لیتے ہو۔ اس کی حالت دیکھو۔ وہ موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال اور ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"اگر اس کے سانس پورے ہو چکے ہیں تو اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اور اگر سانس ہیں تو وہ کبھی نہیں مرے گی۔ تم جیپ میں بیٹھو۔"

"یہ بے رحمی تمہیں بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔" میں نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔ گھونگریالے بالوں والے نے کالر سے پکڑ کر مجھے جیپ میں دھکیل دیا۔

جیپ پیدل چلنے والی رفتار سے نامعلوم سمت میں روانہ ہوئی۔ مشتعل افراد دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی جیپ کے آگے جا رہی تھی اور دوسری پیچھے۔ ہجوم میں سے کئی افراد خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ تقریباً ایک میل گھنے جنگل میں سفر کرنے کے بعد یہ جلوس ایک جھونپڑا بستی میں پہنچا۔ یہاں ایک چوڑے پتوں والا درخت بہت کثرت سے اگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کیلے اور ناریل کے درخت تھے۔ یہ کافی بڑی بستی تھی۔ بہت سے مرد و زن اور بچے یہاں وہاں کھڑے جلوس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور فرزالہ کو ایک پختہ کوٹھری میں پہنچا کر لکڑی کا تین انچ موٹا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ اس کوٹھری کی پیمائش بمشکل دس ضرب دس فٹ رہی ہو گی۔ دروازے کے علاوہ اس کوٹھری میں صرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں سلاخوں کی جگہ بہت مضبوط قسم کے بانس لگے ہوئے تھے۔ ایک میلا کچیلا گدیلا بچھا کر میں نے اس پر [illegible] رکھا اور فرزالہ کو احتیاط سے لٹا دیا۔ فرزالہ کو ہنگامی ضرورت کے تحت کھلائی جانے والی دوا کی شیشی میری جیکٹ کی جیب میں موجود تھی۔ یہ دوا ڈراپر کے ذریعے فرزالہ کے منہ میں ٹپکائی جاتی تھی۔ میں نے مقررہ مقدار میں دوا اس کے منہ میں ٹپکائی۔ پھر اس کا سر اپنی گود میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اس کی پیشانی سہلانے لگا۔ یہ طریقہ اکثر کارگر ثابت ہوتا تھا اور فرزالہ کی گہری غنودگی ختم ہو جاتی تھی' لیکن آج فرزالہ کے چہرے پر زندگی کی رمق واپس نہیں آ رہی تھی۔ میں بے چین ہو کر اٹھا اور لکڑی کا دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔

دروازے سے باہر لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ سب بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ مچھلی بازار میں ہوں اور اپنی اپنی مچھلی کا بھاؤ بتا رہے ہوں۔ میری بے قرار دستک کی صدا ان کے شور و غل میں گم ہونے لگی۔ یہ کیسی بے چارگی تھی' یہ کیسا ستم تھا۔ سری لنکا میں اگر کوئی میرا یا فرزالہ کا دشمن تھا تو وہ صرف شیخ عاصم کی وجہ سے تھا۔ اور شیخ عاصم ہمیں اس دشمنی کی آگ میں بے یار و مددگار چھوڑ کر امارات میں گل چھرے اڑا رہا تھا۔ اس نے واپس مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا..... اور کھٹکھٹاتا چلا گیا۔ اس بار نقار خانے میں طوطی کی صدا سن لی گئی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور مجھے اپنے سامنے سفید گھونگریالے بالوں والا شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں دو رائفل بردار موجود تھے۔ "کیا بات ہے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا "دیکھو! یہ جو لڑکی فرش پر لیٹی ہوئی ہے نا..... مر رہی ہے اور اگر یہ مر گئی تو میں تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا..... ہاں کسی ایک کو بھی"

میرا لہجہ جذبات میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ خود مجھے بھی اجنبی محسوس ہوا۔ اس لہجے میں چھپی ہوئی طاقت اور وحشت نے سفید سر والے کو چونکنے پر مجبور کر دیا "تحت..... تمہاری کیا لگتی ہے یہ؟" سفید سر والے نے پوچھا۔

"یہ میرا سب کچھ ہے۔ اور اگر میرا یہ سب کچھ نہ رہا تو میں تمہارا بھی کچھ نہیں رہنے دوں گا۔"

میری آنکھوں میں پانی سا لرزنے لگا تھا۔ یہ پانی اس طوفان بلاخیز کی علامت تھا جو میرے سینے کی گہرائیوں میں جنم لے رہا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" مخاطب نے پوچھا۔

"دیکھو اس لڑکی کی جان سخت خطرے میں ہے۔ روشنی چکانے

کے لیے یہ وقت ٹھیک نہیں۔ تم ہمیں جانے دو۔"

"یہ ناممکن ہے" فیصلہ کن لہجے میں جواب ملا۔

"تو پھر اس لڑکی کو اسپتال پہنچاؤ۔"

"یہ بھی ممکن نہیں۔ ہاں۔۔۔ ایک اور چیز ممکن ہے۔" میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا "ایک معالج ہے ہمارے پاس۔ بہت پہنچی ہوئی چیز ہے۔ اس لڑکی کو بھی ٹھیک کر دے گا۔"

پھر وہ اٹھ کر باہر گیا اور ایک بدبودار شخص کو لے کر اندر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی میں بے حد حیرت میں گم ہو گیا۔ وہ سائیں عالی تھا۔ اپنے جانے پہچانے کاسٹیوم میں۔ گلے میں گھنٹیاں اور مالائیں، سر میں خاک اور لباس چیتھڑوں کی شکل میں بدن پر جھولتا ہوا۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور سیدھا غزالہ کی طرف گیا۔ اب میں نے سائیں عالی کے لیے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ حیران اس چیز پر ہوا جاتا ہے جس کی توقع نہ ہو اور میں سائیں عالی سے ہر قسم کی توقع کر سکتا تھا۔ سائیں عالی کچھ دیر جلالی نظروں سے غزالہ کو گھورتا رہا اور ناک سے شوں شوں کی عجیب سی آواز نکالتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھومنا شروع کیا۔ دو تین منٹ اسی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ لپک کر کوٹھری کے ایک گوشے میں گیا اور وہاں سے پانی کا صراحی نما برتن اٹھا کر غزالہ پر الٹ دیا۔ وہ پہلے ہی بھیگ کر نیلگوں ہو رہی تھی' سائیں عالی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ سائیں عالی مجھے کبھی بھی غزالہ کا خیر خواہ نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اب بھی اس نے دشمنی چکائی ہے۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اسی انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ غزالہ کو بھگونے کے بعد سائیں عالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ شہادت کی دونوں انگلیاں آسمان کی طرف اٹھا کر ناچنے لگا۔ مجھے اس پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے گرج کر کہا اور اسے دھکیل کر کوٹھری سے باہر نکال دیا۔

میرے رویے نے گھونگریالے بالوں والے شخص کو مشتعل کر دیا۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے بولا "یہ کیا کرتے ہو تم۔ بابا جی بڑی کرنی والے ہیں۔ دیکھنا تمہاری مریضہ ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گی۔"

"مریضہ" اٹھ کر تو نہیں بیٹھی' تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کی حالت مزید بگڑنے سے بچ گئی۔ سانس کا زیروبم جو معدوم ہو چلا تھا پھر محسوس ہونے لگا۔ نبض میں بھی رفتار اور ابھار پیدا ہوا۔ وہ مشت استخواں زرد رو مجھے ایسی شمع کی طرح نظر آرہی تھی جو بجھتے بجھتے ایک بار پھر بھڑک اٹھی ہو۔ ممکن تھا کہ سائیں عالی کا کوئی دیوانہ اسے سائیں کی کرشمہ سازی کہتا لیکن میں جانتا تھا ایسا نہیں ہے۔ پچھلے چھ سات روز سے غزالہ کی حالت میں یہ خرابی اور بہتری گاہے گاہے پیدا ہو رہی تھی۔

اب شام ہو چکی تھی۔ کوٹھری کی اکلوتی کھڑکی میں سے دو بلند درخت دکھائی دے رہے تھے اور ان کے پیچھے سورج بھی۔ کوٹھری کے ایک حصے میں دھوپ پڑ رہی تھی۔ غزالہ کا گدا کھینچ کر دھوپ والے حصے میں کر دیا تاکہ اس کا سوکھ سکے۔ گاہے گاہے میرے ذہن میں مسز کیتھی کی موت بھی چمک جاتا تھا۔ یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ وہ بچ نہیں سکے گی۔ اسے کم از کم تین گولیاں سامنے کی طرف سے لگی تھیں اور ان میں سے دو آرپار ہو گئی تھیں۔۔۔ کوٹھری سے باہر ہجوم بدستور تھا اور ہجوم میں موجود مشتعل افراد نعرہ زنی بھی کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اگر انہیں کوئی روکنے والا نہ ہو تو وہ ابھی کوٹھری میں در آئیں گے اور ہم دونوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔ شور مسلسل بڑھتا جا رہا تھا اور میرے دل میں انجانے وسوسے سر ابھار رہے تھے۔ ہجوم اس کوٹھری پر ٹوٹ پڑتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کسی کے ہاتھ سے ریوالور' رائفل وغیرہ چھین لیتا اور تین چار توسیوں کو شوٹ کر دیتا۔ اس کے بعد میرا اور غزالہ کا جو انجام ہوتا وہ بالکل سامنے کی بات تھی۔۔۔ دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا اور دو مسلح افراد دروازے کے سامنے تھے۔ بہت زیادہ افراد جن کی تعداد تیس چالیس سے کم نہیں تھی' بار بار بلّہ بول کر دروازے کے پاس آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔۔۔ پھر ایک شخص زور سے چلاتا ہوا کھڑکی تک پہنچ گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ غصے اور جوش کی زیادتی سے اس کا سیاہ رنگ اور بھی سیاہ نظر آرہا تھا۔ اس نے پہلے اینٹ کا ایک ٹکڑا کھڑکی پر مارا پھر کھڑکی کے بانسوں سے منہ لگا کر انگلش میں بولا "تم جبو کے قاتل ہو۔ تم ہمارے بچوں کے قاتل ہو۔ ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یاد رکھنا۔۔۔ یاد رکھنا' تمہاری جان لے کر چھوڑیں گے۔"

جبو سنگھ کے نام نے میرے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوڑ دیں۔ یہ وہی شخص تھا جو میرے ہاتھوں لنگڑا ہوا تھا اور بعد میں عاصم کے کارندے نے فائرنگ کر کے اسے ہلاک کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ مجھے گھیر کر یہاں لانے والوں کا تعلق کسی نہ کسی طور جبو سنگھ سے تھا۔ لیکن وہ تو اپنے بچوں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر لگا رہے تھے۔ میں نے کس کے بچے قتل کیے تھے اور کب کیے تھے؟ اس بستی کے باسیوں کی غضب ناک نگاہیں سرخ دہکتی سلاخوں کی طرح میرے ذہن میں گھستی چلی جا رہی تھیں۔

وہ مسلح افراد جو شکل و صورت سے مقامی شکاری نظر آتے تھے آگے بڑھے اور مشتعل نوجوان کو کھینچتے ہوئے کھڑکی سے دور لے گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ سفید گھونگریالے بالوں والا شخص انہیں مشتعل نوجوان اور دیگر نوجوانوں کو کچھ سمجھانے لگا۔ وہ مجھ سے

کافی دور تھے۔ ویسے بھی سنتالی بول رہے تھے۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں ان کی باتیں سمجھ سکوں۔ بہرطور یہ اندازہ مجھے بخوبی ہو رہا تھا کہ وہ انہیں تحمل اور صبر کی تلقین کر رہا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اسے مجھ سے کوئی ہمدردی تھی یا اسے غزالہ پر ترس آرہا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ ہمیں زندہ رکھ کر کوئی سودا کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ سودا کس سے ہو گا اور کس نوعیت کا ہو گا' میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

شام کے وقت بستی کے جھونپڑوں میں مشعلیں اور لیمپ وغیرہ جل اٹھے۔ غالباً مچھروں اور پتنگوں وغیرہ کو دور بھگانے کے لیے کوٹھری سے کچھ فاصلے پر ایک ہموار جگہ ایک دھونی سی رچا دی گئی۔ ایک مسلح شخص میرے لیے کھانا لایا۔ اس میں مسالے دار چاول' ترکاری اور مچھلی کا شوربہ تھا۔ بھوک مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں نے کھانا واپس کر دیا اور دیگر مسلح افراد سے کہا کہ وہ کسی طرح میری ملاقات اپنے سربراہ سے کرائیں۔ انہوں نے میری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور ہر بات کے جواب میں "یادو سے۔۔۔ یادو سے" کہتے رہے۔ غالباً مقامی زبان میں اس کا مطلب "خاموش رہو" تھا۔ میں خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ جب کسی کی جان رفتہ رفتہ اس کے جسم سے نکالی جا رہی ہو تو وہ خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ ان میں سے ایک شخص تھوڑا بہت پڑھا لکھا نظر آرہا تھا اور گفتگو میں انگلش کے الفاظ بھی استعمال کرتا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارے مذہب میں بیماروں کی تیمارداری پر خاص زور دیا گیا ہے۔ کیا اپنے مذہب سے تم نے یہی سیکھا ہے کہ ایک لڑکی کو جو پل پل مر رہی ہے' علاج معالجے اور طبی سہولتوں سے دور رکھا جائے اور اس کی موت کا نظارہ کیا جائے؟ ہم تو بیمار کو میدان جنگ میں بھی معاف کرتے ہیں اور تم ایک راہ چلتی نہتی عورت کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہو اور اب اس کی جان کنی کا تماشا دیکھ رہے ہو۔"

وہ بے رخی سے بولا "تمہارے بس میں کچھ نہیں ہے۔ یہاں وہی ہو گا جو ڈی جان کہے گا۔"

"یہ ڈی جان کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ میرے مخاطب نے کھڑکی سے باہر سفید گھونگریالے بالوں والے کی طرف اشارہ کیا جو چند مشتعل افراد سے گفتگو میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے مخاطب سے پوچھا "آخر ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا اور تمہارے ڈی جان کا؟"

وہ تلخی سے بولا "کیا نہیں بگاڑا تم نے۔۔۔ تم نے ہمارے پیٹ پر لات ماری ہے۔ ہمارے بچوں کے منہ سے نوالہ چھینا ہے۔ ہماری عورتوں کی چھاتیوں سے دودھ خشک کیا ہے اور اب ہماری زندگیاں بھی لے رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "میں کچھ نہیں سمجھا' تم کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ بولا "ہمارا روزگار شکار سے وابستہ ہے۔ ہم پیشہ ور شکاری لوگ ہیں۔ یہ بیسیوں میل تک پھیلا ہوا جنگل ہماری جولان گاہ تھا۔ ہم اپنی جان خطرے میں ڈال کر جنگلی جانوروں سے پنجہ آزمائی کرتے تھے اور ان کی کھالیں' دانت اور سینگ وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ تم نے ہمارا کاروبار برباد کر دیا ہے۔ ان لوگوں کو یہاں سے بھگا رہے ہو جو ہمارے "مال" کے خریدار تھے اور ان لوگوں کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے جو ہر وقت ہماری زندگی اور آزادی کے درپے رہتے ہیں۔ میرا مطلب رینجرز اور وائلڈ لائف والوں سے ہے۔ وہ لوگ ہمیں جنگل بدر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہمارے بچے بھوک اور بیماری سے مر رہے ہیں۔ ہمارے "کمانے والوں" کو پکڑا جا رہا ہے یا شوٹ کیا جا رہا ہے۔ پرسوں ہمارے دو آدمی رنگاپورہ کے جنگل میں مار دیے گئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے اور تمہارے اس ان داتا کی وجہ سے ہوا ہے جسے شیخ عاصم کہا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم لوگوں سے یہ بات کہنے والا دھریان کاکا ہے۔"

"ہم کسی کاکا کو نہیں جانتے اور نہ ہمیں کسی نے کچھ بتایا ہے۔ ہماری اپنی آنکھیں ہیں۔ ہم خود سفید اور سیاہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیا تم اس سے انکار کرو گے کہ تم نے ہماری بستی کے ایک معاشی جبو سنگھ کو ٹانگ سے معذور کیا اور بعد میں اس کے قتل کا سبب بنے۔ کیا اس بات سے انکار کرو گے کہ ہمارے دیہنو گمن سب انسپکٹر واسودر سے تمہارے تعلقات تھے اور تم اسے زخمی حالت میں رات بھر لیے پھرے تھے۔ اور میرے خیال میں تم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ کولمبو میں اور ملک بھر میں آئیوری اور کھالیں فروخت کرنے والوں کی دکانیں بند کرانے میں تمہارا ہاتھ ہے۔۔۔"

وہ سنتالی غصے میں بھرا ہوا تھا' یقیناً کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں کوٹھری سے باہر پھر شور و غل شروع ہو گیا اور مخاطب دوسرے رائفل برداروں کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ اب جو شور و غل بلند ہو رہا تھا اس کی نوعیت مختلف تھی۔ بہت سے لوگ اس "دھونی" کے گرد جمع ہو گئے تھے جو سر شام رچائی گئی تھی۔ اس دھونی پر اب لکڑیاں وغیرہ رکھ کے الاؤ کی شکل دے دی گئی تھی۔ سب لوگ دائرے کی شکل میں آگ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ بانس کی مشعلیں بھی گاڑ دی گئی تھیں۔ آگ کے گرد جمع ہونے والے لوگوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ان میں عورتیں اور بچے شامل نہیں تھے۔ دائرے کے عین وسط میں تین چار عمر رسیدہ سنتالی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہاں کوئی رسم ادا ہونے والی ہے۔ ایک جگہ ایک بہت بڑا ٹب نما برتن رکھا تھا اور تین افراد اصول نما چیزیں لیے اس برتن کے قریب کھڑے تھے۔ ڈی جان بھی اس برتن کے قریب موجود تھا۔

تھوڑی دیر بعد ذی جان کے اشارے پر تینوں افراد نے اپنے اپنے لمبوترے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے۔ ان کی آواز نقاروں سے ملتی جلتی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا ہے۔ پھر مجھے ایک دیوہیکل ہاتھی نظر آیا۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو، گلے میں ہار اور ماتھے پر چاندی کا بڑا سا جھومر تھا۔ اس کی گردن پر ایک مہاوت بیٹھا تھا اور ہاتھی کے بڑے بڑے کان پنکھوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ ہاتھی سیدھا اس ٹب نما برتن کے قریب پہنچا۔ اور سونڈ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف سے ایک دبلی پتلی عورت مدقوق بیمار سے شیر خوار بچے کو گود میں اٹھائے نمودار ہوئی۔ اس نے شیر خوار بچے کا ہاتھ برتن سے مس کیا اور پھر روتے چلاتے بچے کو لے کر پیچھے چلی گئی۔ برتن میں غالباً کوئی راتب قسم کی شے تھی جس میں گڑ ملا ہوا چارا بھی شامل تھا۔ جسیم ہاتھی اس خوراک کو بڑی رغبت اور تیزی سے کھا رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایک بڑا ہاتھی ایک وقت میں ایک من کے لگ بھگ خوراک کھا جاتا ہے۔ آج میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھی آگ کے گرد دائرے کی شکل میں چکرانے لگا۔ اس کے پاؤں سے بندھی ہوئی گھنٹیاں پُرشور آواز سے بج رہی تھیں۔ ہاتھی کا مہاوت بدستور اس کی گردن پر موجود تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہاتھی ڈھول کی تھاپ پر رقص کرے۔ اس کی کوشش سے ہاتھی بے تکے انداز میں قدم اٹھانے لگا اور کسی وقت محسوس ہوتا کہ وہ واقعی محوِ رقص ہے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی مقامی رسم ہے جو اس لیے ادا کی جا رہی ہے کہ بستی کے لوگوں کو فاقہ کشی اور بے روزگاری جیسے مصائب سے نجات مل سکے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔

ہاتھی کچھ دیر محوِ رقص رہ چکا اور مستی میں آگ کے گرد چکرا چکا تو مجمع ایک بار پھر کائی کی طرح پھٹا۔ اس مرتبہ ایک ہتھنی کو الاؤ کے قریب لایا گیا۔ ہتھنی بھی گھنگروؤں، ہار اور جھومر وغیرہ سے آراستہ تھی۔ جونہی ہتھنی وہاں پہنچی، ہاتھی پر دیوانگی سوار ہو گیا۔ اس نے سونڈ اوپر اٹھا کر ایک چنگھاڑ بلند کی۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مہاوت اب اس کی گردن پر سے اتر جائے اور اسے اپنی مادہ سے پیار محبت کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ مہاوت جست لگا کر نیچے اتر آیا۔ ڈھول زور شور سے پیٹے جانے لگے اور دونوں جسیم جانور خوش فعلیوں میں مصروف ہو گئے۔

ڈھول کی آواز سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ میں کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ کوٹھری میں ناریل کے تیل کا چراغ موجود تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں غزالہ کا چہرہ دیکھا اور ایک بار پھر چونک گیا۔ اس کی سانسوں کا زیر و بم پھر مدھم پڑ گیا تھا۔ ہموار سانس کے بجائے وہ ایک خفیف جھٹکے سے سانس لے رہی تھی اور آکسیجن کی کمی کے سبب ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے۔

نجانے کیوں ان لمحات میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ یاد آ گیا۔ آخری وقت میری ماں کا چہرہ بھی تو ایسا ہی ہو گیا تھا، پھر کچھ دیر بعد ماں کے ہونٹ لرزے تھے اور اس کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا "غزالہ..... غزالہ۔ ہوش کرو میری جان..... آنکھیں کھولو" میں بے قراری کے ساتھ اسے اپنے سینے سے لپٹانے لگا اور اس کی گردن سہلانے لگا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بالکل بے حس و حرکت رہا۔ اس کے ہونٹوں پر پانی کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ وہ جاں بہ لب تھی۔ میرا جی چاہا اپنی جان اس کے جسم میں داخل کر دوں۔ میں نے اس کے نیلے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ لگائے اور اس کے حلق میں سانس پھونکنے لگا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور اس لمحے دل میں ایک ہی خواہش تھی کاش میری جان غزالہ کے جسم میں داخل ہو جائے۔ کافی کوشش کے باوجود غزالہ کی سانس بحال نہیں ہوئی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے دوا کی شیشی نکالی اور ڈراپر کے ذریعے کئی قطرے غزالہ کے منہ میں ٹپکائے۔ پھر میں کھڑکی کی طرف بڑھا اور زور زور سے ذی جان کو آوازیں دینے لگا۔ ڈھول کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اس شور نے میری آوازوں کو بے اثر کر دیا تھا۔ میں دروازے کی طرف آیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو" میں حلق کی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

میری آواز کوٹھری کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ اور جو تھوڑی بہت باہر نکلتی تھی وہ ڈھول تاشوں کے شور میں دب جاتی تھی۔ میری بے بسی انتہا کو چھو کر دہشت میں بدلنے لگی۔ میرا جی چاہا وحشیوں کی طرح اس دروازے پر پل پڑوں اور اسے اکھاڑ کر پھینک دوں۔ یہ بند دروازہ غزالہ اور اس کی زندگی کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ دروازہ پیٹتے پیٹتے میری نگاہ غزالہ کی طرف اٹھی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی حالت ایک دم سنبھل گئی ہے۔ سانس کی آمد و رفت بحال ہو گئی تھی اور چہرے کی خوفناک نیلاہٹ بھی کم ہو گئی تھی۔ غزالہ کی حالت میں یہ عارضی تبدیلی کئی بار رونما ہو چکی تھی۔ لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی مثال تھی۔ جونہی غزالہ کی حالت میں بہتری کے آثار نمودار ہوتے تھے میں دل کو یہ تسلی دینے لگتا تھا کہ شاید یہ افاقہ مستقل ثابت ہو۔ میں دروازے سے ہٹ کر غزالہ کے پاس آ گیا۔ اس کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اس کے منہ میں تھوڑا تھوڑا پانی ٹپکانے لگا۔ پانچ دس منٹ بعد غزالہ کی پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی۔ بہت بے نور اور بے رونق آنکھیں تھیں یہ..... یوں لگتا تھا جیسے وہ چھت کو نہیں دیکھ رہی، چھت سے اوپر لاکھوں کروڑوں میل دور تک تاریک خلا میں جھانک رہی ہے۔ میرا جسم

جلنے لگا۔ میں نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں۔

نصف شب کا وقت تھا۔ مجھے کوٹھری کی اکلوتی کھڑکی کے پاس ایک سایہ سا لرزتا محسوس ہوا۔ پھر ایک سرسراتی آواز میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں صاحب!" میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ آواز بہت مدھم تھی اس کے باوجود میں نے پہچان لی۔ یہ ناگورے کی آواز تھی۔ آنجہانی سب انسپکٹر راسوور کا چھوٹا بھائی ناگورے۔ تاتولا کا کانسٹیبل میرے ساتھ ہی دھرمان کانا کے شکنجے میں پھنس کر اس کلب پہنچا تھا۔

"ناگورے یہاں کیسے پہنچ گیا؟" یہ سوال پوری شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔ میں نے ایک نگاہ غزالہ پر ڈالی۔ وہ گہری غنودگی میں تھی۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ ناگورے کوٹھری کی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں صاحب، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کا کھوج لگاتا ہوا بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ آپ کا دوست برکت بھی ہے۔ ایس پی برکت جو پاکستان سے آپ کے ساتھ آیا ہے۔"

"ایس پی برکت؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں..... فی الحال میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔ مجھے یہاں سے باہر بھی جانا ہے۔ ہم دونوں فوری طور پر کولمبو واپس جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ صبح تک ہم پولیس لے کر یہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے پوچھا "کیا پولیس لانا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے" وہ بولا "آپ کے ساتھ بیمار خاتون بھی ہے۔ اگر یہاں ہنگامہ شروع ہو گیا تو آپ دونوں کے لیے سخت خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ پولیس کی بھاری نفری یہاں پہنچ جائے اور یہ لوگ بغیر مزاحمت کے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔"

اچانک کھڑکی کے پاس شور سنائی دیا۔ ناگورے ایک دم جیسے غوطہ مار کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تین چار افراد ٹولی کی صورت میں آئے اور چند لمحے کھڑکی کے سامنے رکنے اور آوازے کسنے کے بعد آگے نکل گئے۔ کوٹھری کے سامنے الاؤ کے گرد ہونے والا تماشا ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور یہ افراد یقیناً اسی تماشے میں سے اٹھ کر آ رہے تھے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ناگورے کا ہیولا ایک بار پھر کھڑکی میں نظر آنے لگا۔

وہ بولا "بستی کے چاروں طرف خاردار باڑھ لگی ہوئی ہے۔ میں بہت مشکل سے اندر آ سکا ہوں۔ اب باہر نکلنا بھی آسان نہیں ہو گا۔"

میں نے پوچھا "اسلحہ کتنا ہے ان لوگوں کے پاس؟"

وہ بولا "اسلحہ تو کافی ہے۔ خودکار رائفلوں کے علاوہ ایمونیشن وغیرہ بھی ہیں لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہ سارا اسلحہ ایک ہی جگہ ایک ہی کمرے میں پڑا ہے۔ صرف چار پانچ پہرے دار ہی مسلح ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صبح سب سے پہلے ہم اسلحے والے کمرے پر قبضہ کر لیں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ مزاحمت کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"یہ کمرا کس طرف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کوٹھری کے عین پیچھے" وہ بولا "کمرا کیا ہے جھونپڑا سا ہے۔ شاید آپ اس کھڑکی میں سے بھی دیکھ سکیں۔"

میں نے کھڑکی میں سلاخوں کی جگہ لگے ہوئے مضبوط بانسوں سے سر لگا کر عقب میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی تاہم اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ جھونپڑا کس جگہ واقع ہو گا۔ ناگورے کے لیے زیادہ دیر کھڑکی کے پاس رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے کہا "آپ تیار رہیے گا علی الصباح ہم پہنچ جائیں گے" پھر وہ تیزی سے ایک طرف نکل گیا۔

ناگورے کا یوں اچانک آنا اور جانا میرے ذہن میں بہت سے سوال چھوڑ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کولمبو میں ہماری گمشدگی کی اطلاع پہنچ چکی ہے اور ہمیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ ممکن تھا کہ مسز کیتھی بھی زخمی یا مُردہ حالت میں کہیں سے برآمد ہو چکی ہو۔ ناگورے کا کہنا تھا کہ ایس پی برکت اس کے ساتھ آیا ہے۔ یقیناً وہ اسے خاردار تار سے باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔

وہ رات بہت طویل تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک عمر بیت گئی ہے اس رات کو گزارتے گزارتے۔ گاہے گاہے شب بیدار جنگلی جانوروں کی آوازیں ہوا کے دوش پر سفر کر کے میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ کوٹھری سے باہر مرطوب ہوا بلند و بالا درختوں کو ہولے ہولے جھومنے پر مجبور کر رہی تھی اور اندر "چراغِ شب" کی مدھم روشنی میں غزالہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں بار بار اس کے سانس کی روانی دیکھتا تھا اور نبضیں ٹٹولنے لگتا تھا۔ میری بے خواب آنکھیں رہ رہ کر اس کے چہرے پر جم جاتیں۔ ایسے میں میرا تصور مجھے اُڑا کر ماضی کے دھندلکے میں پہنچا رہا اور میرے چاروں طرف جل کوٹ کے نشیب و فراز اور بچپن کے سہانے دن بکھر جاتے۔ رات تین ساڑھے تین بجے کا عمل تھا جب غزالہ کی طبیعت پھر خراب ہونا شروع ہوئی۔ پہلے اس کے سانس کی روانی متاثر ہوئی۔ پھر ہونٹ بتدریج نیلے ہونے لگے، میرے جسم میں سرد برفیلی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی سے ہنگامی دوا کے قطرے اس کے ہونٹوں پر ٹپکائے اور اس کا سر گود میں لے لیا۔ ایک ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے رکھ کر میں نے سر پیچھے کی طرف جھکا دیا۔ اس طریقے سے سانس کی نالی سیدھی ہو جاتی ہے اور مریض کو سانس لینے میں آسانی رہتی ہے۔ لیکن سانس میں آسانی تو اس وقت ہوتی ہے جب مریض سانس لینا چاہے۔ وہ تو جیسے اپنے سانس سے بھی بیزار ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے اور چہرہ بتدریج نیلا ہوتا گیا۔ میرے اندر سے کوئی پکار کر بولا "وہ صبح بہت دور ہے جس

کا تو انتظار کر رہا ہے اور وہ موت بھی جس کا ناگورے نے وعدہ کیا ہے۔ غزالہ اسی طرح تیرے ہاتھوں میں مر جائے گی۔ اس بے مہر رات کی تنہائی میں نہ کوئی تیری آواز سنے گا اور نہ کوئی یہ منحوس دروازہ کھولے گا۔ کیا تو غزالہ کو اس حالت میں مرتا دیکھ سکے گا.... بول دیکھ سکے گا؟"

"ہرگز نہیں۔" میں عالم وحشت میں بڑبڑایا۔

میں نے غزالہ کا سر بڑی احتیاط سے فرش پر ٹکایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میری نگاہ کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی میں خاص قسم کے مضبوط اور بے لچک بالس لگے ہوئے تھے۔ انہیں توڑنا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی کھڑکی بلندی پر تھی۔ میں اسے کندھے سے ضرب لگا سکتا تھا اور نہ میری ٹانگ وہاں تک پہنچ سکتی تھی۔ کھڑکی سے نگاہ پھسل کر دروازے پر آ گئی۔ وہی بے رحم دروازہ جو غزالہ کی زندگی کا دشمن ہو چکا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ لکڑی کا قریباً تین انچ موٹا دروازہ تھا اور کوٹھڑی کی پختہ دیواروں میں بڑی مضبوطی سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن ان لمحات میں وہ مجھے کاغذ کا دروازہ نظر آیا۔ مجھ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں پوری قوت کے ساتھ اس دروازے سے ٹکرانا چاہتا تھا۔ اسے توڑ دینا چاہتا تھا یا اپنا سر پاش پاش کر لینا چاہتا تھا۔ کوئی تیسری خواہش نہیں تھی میرے دل میں.... میں الٹے قدموں چل کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ پوری رفتار سے بھاگ کر میں نے دروازے کو کندھے کی ٹکر رسید کی۔ پہلی ٹکر کے بعد دوسری اور پھر تیسری.... میری چوتھی تباہ کن ٹکر نے ایک جانب سے دروازے کے قبضے اکھاڑ دیے اور وہ مکمل طور پر باہر کی طرف جھک گیا۔ میں جست لگا کر کوٹھڑی میں سے نکلا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تنی ہوئی تھی۔ اس چادر کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مجھے۔ میں نے دیکھا ایک رائفل بردار شخص نے گھٹنا زمین پر ٹیک رکھا ہے اور میرا نشانہ لے رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کا آخری نشانہ لے رہا ہے۔ میں چیتے کی طرح اڑتا ہوا اس پر جا پڑا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی رائفل پر اور دوسرا گردن پر آیا تھا۔ ایک جھٹکے سے رائفل بردار کا نرخرا ٹوٹ گیا اور اس کی رائفل پکے ہوئے پھل کی طرح میرے ہاتھ میں آ گئی۔ عین اسی لمحے ایک دوسرا سنتھالی بھاگتا ہوا کھڑکی کے عقب سے نمودار ہوا۔ میں نے بھاری بھرکم رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور زوردار وار سے نووارد کا سر کھول دیا۔ وہ ہچکی کی آواز کے ساتھ رائفل سمیت ڈھیر ہوا تو میں اس جھونپڑے کی طرف بھاگا جس کی نشاندہی ناگورے نے کی تھی۔ اس جھونپڑے کی دیواریں پختہ تھیں اور یہ اس کوٹھڑی کے عین عقب میں واقع تھا۔ جہاں میں قریباً دس گھنٹے قید رہا تھا۔ جھونپڑے کے عقب میں ایک تالاب تھا جس میں بارشی پانی چمکتا دکھائی دیتا تھا۔ اس جھونپڑے کے سامنے دو مسلح پہرے دار تھے۔ ایک تو وہی تھا جس کا سر چند لمحے پہلے میں نے تربوز کی طرح کھول دیا تھا۔ دوسرا جھونپڑے کے سامنے موجود تھا اور ہاتھ میں گن لئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے "فائر" کیا۔ ایرو گن تھی۔ میں اوندھے منہ زمین پر گرا۔ قاتل تیر سنسناتا ہوا میرے اوپر سے گزرا اور کوٹھڑی کی دیوار میں پیوست ہو گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں فائر کر کے اسے ڈھیر کر سکتا تھا لیکن میں دوڑ کر اس سے جا ٹکرایا۔ وہ پشت کے بل میرے نیچے گرا۔ میں نے اس کی گردن پر مخصوص داؤ آزمایا اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ کے اندر مکمل ہوئی اور قابل ذکر بات تھی کہ سوائے دروازہ ٹوٹنے کی آواز کے کوئی شور پیدا نہیں ہوا۔ میں نے بے ہوش پہرے دار کی جیبیں ٹٹولیں اور اس بھاری بھرکم قفل کی چابی نکال لی جس سے اسلحہ خانے (نیم پختہ جھونپڑے) کا دروازہ مقفل کر رکھا تھا۔ جونہی میں نے قفل میں چابی گھمائی ایک شخص دوڑ کر میرے پاس پہنچ گیا۔ میری انگلی سیون ایم ایم کے ٹریگر پر دبتے دبتے رہ گئی۔ وہ ناگورے تھا۔ اگر وہ بول کر مجھے اپنی پہچان نہ کراتا تو یقیناً اس کی خاموشی ابدی خاموشی میں بدل جاتی۔ بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا اس کی زندگی اور موت کے درمیان۔

"نثار جہاں صاحب۔ یہ میں ہوں۔" وہ تیزی سے بولا تھا اور میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

دروازہ کھلتے ہی ہم دونوں اندر گھس گئے۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے کو دور کرنے کے لئے ناگورے نے ایک ٹارچ روشن کر دی۔ اس کی اطلاع بالکل درست تھی۔ یہ نیم پختہ جھونپڑا اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ قریباً پچیس ساٹھ رائفلیں، ریوالور اور ایرو گن یہاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سا ایمونیشن بھی تھا۔ میں نے ناگورے سے پوچھا "گولیو[illegible] نہیں گئے؟"

وہ بولا "نہیں جا سکا۔"

اس سے زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے رائفلوں میں سے ایک سیون ایم ایم اور ایک "اے کے ۴۷" علیحدہ کر لی۔ ناگورے نے ایک ریوالور اٹھا لیا۔ دوسرے ہتھیار کے طور پر وہ ایک خودکار رائفل اٹھانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے اسے ایرو گن لینے کا مشورہ دیا۔ اس نے ایک ایرو گن اور قریباً درجن تیر اٹھا لئے۔ اگر بستی والے ہجوم کی صورت میں بھی "اسلحہ خانے" پر حملہ آور ہوتے تو ہم انہیں اس "اسلحہ خانے" کے اندر سے با آسانی روک سکتے تھے لیکن اس قسم کی صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ غیر متوقع طور پر بستی کی اکثریت یہاں ہونے والی کارروائی سے بے خبر رہی تھی۔ میں نے جھونپڑے کی عقبی کھڑکی کھولی۔ بیضوی شکل کے تالاب کا قریب ترین کنارہ صرف ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر تھا۔ تالاب میں کناروں تک گدلا پانی بھرا ہوا تھا۔

میں نے رائفلیں اٹھا اٹھا کر کھڑکی سے باہر تالاب میں پھینکنا شروع کر دیں۔ ناگورے نے بھی بڑا ساتھ دیا [illegible]

اور ہم نے تمام اسلحہ اور ایمونیشن کھڑکی کے راستے تالاب کی تہ میں پہنچا دیا۔ ایمونیشن میں سے میں نے صرف چند بھرے ہوئے میگزین بچائے تھے۔ یہ میگزین سیون ایم ایم اور "اے کے ۴۷" رائفل کے تھے۔ یہ میگزین میں نے اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لئے۔

میں نے ناگورے سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم بیمار لڑکی کو لے کر یہاں سے نکل سکتے ہیں؟"

"بہت مشکل ہے۔" اس نے جواب دیا "خاردار تاروں کے نیچے سے گزرنا پڑے گا۔ دوسری طرف پہرے دار موجود ہیں۔"

میں نے پوچھا "ایس پی برکت صاحب کہاں ہیں؟"

وہ بولا "وہ تاروں کے نیچے سے نہیں گزر سکتے تھے اس لئے باہر ہی چھوڑ آیا ہوں۔"

"لیکن تم تو [illegible] میں کو لے واپس جا رہا ہوں؟"

"کیا کروں، باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں مل رہا۔ وہ دیکھیں، سامنے روشنی نظر آ رہی ہوگی آپ کو.... یہ چھوٹے چھوٹے الاؤ ہیں۔ ان لوگوں نے خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ بھڑکا رکھے ہیں۔ میرا خیال ہے ان لوگوں کو جنگلی جانوروں کی طرف سے خطرہ رہتا ہے اس لئے رات بھر چوکس ہو کر پہرا دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "ہمارے ساتھ مسز کیتھی بھی تھیں۔ ان کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"آپ کو نہیں پتا ان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"وہ میرے سامنے زخمی ہوئی تھیں۔"

"رات نو بجے ان کی لاش ایک چرواہے کو ملی تھی۔ اس نے قریبی پولیس اسٹیشن میں اطلاع پہنچا دی۔ اس کے بعد ہی آپ کی تلاش شروع ہوئی ہے۔"

میرا بدترین خدشہ حقیقت میں بدل گیا تھا۔ مسز کیتھی اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ میری نگاہ میں اس سفاک شخص کا چہرہ گھوم گیا جس نے مسز کیتھی کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا۔ میرے دل میں یہ شدید خواہش ابھری کہ کاش میں اس شخص کے اپنے ہاتھ سے ٹکڑے کر سکتا۔

ہماری پوزیشن اس وقت ایسی تھی کہ ہم بستی والوں کو تگنی کا ناچ نچا سکتے تھے لیکن ہمارا مقصد کسی کو ناچ نچانا یا اس پر قبضہ پانا نہیں تھا۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا اور جاں بہ لب غزالہ کو بھی نکالنا تھا۔ تھوڑی دیر تک قرب و جوار کا جائزہ لینے کے بعد ہم دونوں اس جھونپڑے سے باہر نکل آئے۔ پہرے دار ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر تاریکی میں کیا۔ دروازے کو باہر سے مقفل کیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔

"کہاں چلنا ہے؟" ناگورے نے پوچھا۔

میں نے کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ اچانک ایک سایہ تڑپ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ ناگورے نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایرو گن چلائی۔ بدقسمتی سے نشانہ خطا گیا۔ سایہ اچھل کر بھاگا اور کوٹھڑی کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اس کا بچ نکلنا خطرناک تھا۔ وہ اب زور زور سے چیخ رہا تھا اور ساتھیوں کو مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ اس کی یہ چیخ و پکار صرف تین چار سیکنڈ کے اندر رنگ لے آئی۔ جھونپڑوں کے پیچھے سے آٹھ دس افراد ٹولی کی صورت میں برآمد ہوئے اور شور مچاتے ہوئے ہماری طرف لپکے۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ گن کا ایک برسٹ آنے والوں کو لہولہان کر سکتا تھا لیکن میں خوامخواہ خون میں ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا تھا۔ اس مشتعل ٹولی سے بچنے کے لئے میں اور ناگورے بستی کے شمالی حصے کی طرف دوڑے۔ یہاں ایک پختہ مکان موجود تھا۔ بیرونی پھاٹک کھلا ہوا تھا ہم دندناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ میں نے ایک کھڑکی پر ٹانگ رسید کی۔ وہ اندر کی طرف کھل گئی۔ گیس لیمپ کی روشنی میں مجھے سفید گھونگریالے بالوں والا ذی جان نظر آیا۔ وہ ایک جواں سال عورت کے ساتھ لپٹ کر لیٹا ہوا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"خبردار!" میں نے "اے کے ۴۷" اس کی طرف سیدھی کی۔

ایک ہی لمحے میں ذی جان کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ اس کی ہم بستر بھی اب اٹھ بیٹھی تھی اور دہشت زدہ نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور دو نوخیز لڑکیاں اندر داخل ہو گئیں۔ ان کی عمریں بمشکل اٹھارہ اٹھارہ سال رہی ہوں گی۔ وہ ہم شکل بھی تھیں، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ جڑواں بہنیں ہیں۔ منہ زور شباب ان کے مہین کپڑوں میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں۔ پھرتی سے انہوں نے واپس پلٹنا چاہا لیکن ناگورے نے تیزی سے حرکت کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دونوں دروازے اندر سے بند کر دیے۔ ذی جان جو چند گھنٹے پہلے تک شیر نظر آ رہا تھا اب بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ وہ جہاندیدہ شخص تھا۔ میرے چہرے سے اندازہ لگا چکا تھا کہ میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو چکا ہوں اور اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا۔

جواں سال بنگالی عورت ذی جان کی بیوی اور نوخیز لڑکیاں اس کی بیٹیاں تھیں۔ وہ دونوں چہرے مہرے سے بے حد تیز طرار نظر آتی تھیں۔ وہ ایسے گرم شعلوں کے مانند جنہیں ان کے والدین نے اونچی چار دیواری کے اندر چھپا رکھا تھا۔ مکان سے باہر شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً ہمارا تعاقب کرنے والے مسلح افراد مکان کے سامنے پہنچ گئے تھے اور اب سوچ رہے تھے کہ انہیں اندر داخل ہونا چاہئے یا نہیں۔ میں نے آتشیں لہجے میں ذی جان سے کہا "میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا "کک.... کیا ہوا ہے اسے؟"

"نہیں..... ابھی وہ زندہ ہے۔" میں نے کہا "لیکن زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گی۔ اور اس کی ساتھ ہی تم سب کی سانسیں بھی ٹوٹ جائیں گی۔"

"تت..... تم چاہتے کیا ہو؟" میرے لب و لہجے نے ذی جان کو ایک دم خوف زدہ کردیا۔

"مکان سے باہر تمہارے آدمی جمع ہو رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہاں سے دور رہیں اور میری ساتھی لڑکی کو فوراً ہمارے پاس یہاں پہنچائیں۔ میں اس کام کے لئے تمہیں صرف پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ پانچ منٹ تک وہ لڑکی یہاں نہ پہنچی تو جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟" وہ بے ساختہ بولا۔

"میں تمہاری ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو شوٹ کردوں گا۔ میں جانتا ہوں یہ سفاکی ہے لیکن تم جیسے سفاک سے نمٹنے کے لئے اس وقت میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔"

"کیا سفاکی کی ہے میں نے؟"

میں نے ذی جان کو تھپڑ مارا۔ یہ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ ذی جان کا گال پھٹ گیا اور اس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ وہ اور اس کی بیوی مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے فرشتۂ اجل کو دیکھ لیا ہو۔ میں نے کہا "ایک عورت دس گھنٹے سے تمہاری قید میں سسک سسک کر مر رہی ہے اور تم پوچھتے ہو کیا سفاکی کی ہے تم نے۔ خدا سے دعا کرو وہ بچ جائے۔ اسے کچھ ہوا تو میں تمہاری موت کو عبرت ناک تماشا بنا دوں گا۔"

بنگالی عورت سنتھالی زبان میں اپنے شوہر کی منت سماجت کرنے لگی۔ یقیناً وہ اسے یہ مشورہ دے رہی تھی کہ وہ میری بات مان لے۔ ذی جان خود بھی ایک دم شکست خوردہ اور بدحال نظر آنے لگا تھا لیکن ابھی اس کا دم خم مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اس خیال میں تھا کہ بستی میں بہت سے ہتھیار موجود ہیں اور اس کے جانباز ساتھی موقع ملتے ہی کھیل کا پانسا پلٹ دیں گے۔

میں نے کہا "کسی خوش فہمی میں نہ رہنا ذی جان' بے شک تمہارے ساتھی بہت سے ہیں لیکن اسلحے کے نام پر ان کے پاس ایک دو رائفلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں نے سب کچھ ٹھکانے لگا دیا ہے اگر میں اور میرے ساتھی چاہیں تو اس وقت تمہاری پوری بستی کو آگ لگا سکتے ہیں۔ یقین نہیں تو جاکر پوچھ لو اپنے لوگوں سے۔"

ذی جان نے پہلے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور خون آلود ہونٹ پونچھ کر مکان کے بیرونی دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے کی دوسری جانب لوگوں کا ہجوم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بدستور نشانے پر لے رکھا تھا۔ اسے وارننگ دیتے ہوئے میں نے کہا "میں سنتھالی نہیں جانتا لیکن میرا ساتھی جانتا ہے۔ کوئی الٹی سیدھی بات کرو گے تو موت کو آواز دو گے۔"

اس نے تعمیلی انداز میں سر ہلایا اور مقفل گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے بات کرنے لگا۔ اس بات چیت کا فوری نتیجہ نکلا اور پانچ منٹ کے اندر اندر غزالہ اس نیم پختہ مکان میں پہنچ گئی۔ وہ ایک چٹائی پر لیٹی تھی اور چٹائی کے چار کونے چار افراد نے تھام رکھے تھے۔ میں نے ان افراد سے کہا کہ وہ مکان کے عقبی صحن میں چلیں۔ عقبی صحن کافی کشادہ تھا۔ اور یہاں وہی جیپ کھڑی تھی جس پر مجھے اور غزالہ کو شکاریوں کی اس بستی میں لایا گیا تھا۔ میرے حکم پر تینوں افراد نے بے ہوش غزالہ کو جیپ کی عقبی نشست پر لٹا دیا اور پھر مکان سے باہر چلے گئے۔

اتنے میں انگورے داتفل بدست مکان کے اندرونی حصے سے نکل آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ لڑکیوں اور ان کے والدین کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں مقفل کر آیا ہے۔ اس نے بتایا "لڑکیوں کے نام چندرا اور پارا ہیں۔ بڑی عجیب لڑکیاں ہیں وہ۔ کسی بات پر آپس ہی آپس سے جھگڑ رہی تھیں۔ بنگالی میں نجانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ زیادہ خوف زدہ بھی نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ اغوا ہونا ان کے لئے ایک دلچسپ اور پر تجسس تجربہ ہے۔ وہ دونوں جڑواں ہیں لیکن ان میں سے ایک زیادہ سمجھدار ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہم پر گولی مت چلانا' تم جو کہو گے ہم وہی کریں گے۔"

میں نے کہا "تم نے انہیں کمرے میں کیوں بند کر دیا ہے؟"

"تو اور کیا کرتا؟"

"ان چاروں کو بڑی احتیاط سے یہاں لے کر آؤ۔ میری ساتھی لڑکی جیپ میں پہنچ گئی ہے۔ اب ہم یہاں سے نکلیں گے۔"

انگورے نے سعادت مندی سے سر جھکایا اور مکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ذی جان اور اس کے اہل خانہ کو رائفل کے نشانے پر رکھ کر باہر لے آیا۔ ذی جان کے ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ یہ کافی بڑی جیپ تھی۔ ذی جان اپنے اہل خانہ سمیت با آسانی جیپ میں سوار ہو گیا۔ میں نے انگورے سے کہا کہ وہ ایروگن چھوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لے۔ انگورے نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

"تم کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" ذی جان نے ڈرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"زیادہ دور نہیں لے جاؤں گا۔ جلد ہی چھوڑ دوں گا۔"

"میری بچیاں جوان ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"تمہیں تو بڑا مان ہے اپنے لوگوں پر۔ جب تم انہیں بتاؤ گے کہ تمہاری بچیوں کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک نہیں ہوا تو کیا وہ یقین نہیں کریں گے۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا نہ کرو۔ میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ تم بحفاظت یہاں سے نکل جاؤ گے۔"

"تم ایک سفاک اور بے رحم شخص ہو اور میرا ایمان ہے کہ ایسا شخص قول کا پکا نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں....."

"خاموش" میں نے اسے جھاڑا اور اس کے ساتھ ہی رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی بھی کانپ رہی تھی۔ لڑکیاں بھی ڈری ہوئی تھیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی حوصلہ مند ہیں۔ وہ اپنی ماں کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے انگورے کو حکم دیا کہ وہ جیپ آگے بڑھائے۔ انگورے نے جیپ بڑھائی۔ مکان کا بیرونی پھاٹک میں نے ذی جان سے کھلوایا۔ جیپ پھاٹک سے باہر آئی تو دور تک لوگوں کا ہجوم اور مشعلیں نظر آئیں۔ وہ کم و بیش دو سو افراد ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے' لاٹھیاں اور معلوم نہیں کیا کچھ تھا۔ میں نے ہوائی فائرنگ کی تو مجمع کائی کی طرح چھٹتا محسوس ہوا۔ لیکن ہمیں راستہ پھر بھی نہیں دیا گیا۔ ان لوگوں کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ورنہ وہ جیپ پر ٹوٹ پڑتے اور ہم دونوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ میں نے ذی جان سے کہا کہ وہ اپنی زبان میں اپنے لوگوں کو سمجھائے اور ان سے کہے کہ ہمیں جانے دیں۔ ذی جان نے پھنسی پھنسی آواز میں میری ہدایات دہرا دیں۔ جواب میں بہت سے افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ وہ بے حد مشتعل تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ذی جان کو اس موت کی اطلاع دے رہے ہیں جو تھوڑی دیر پہلے میرے ہاتھوں واقع ہوئی ہے (میں نے جس شخص کی گردن توڑی تھی اس کے زندہ بچ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) کچھ افراد نے جیپ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے گریبان کھول دیے جیسے دعوت دے رہے ہوں کہ ہم ان کے سینے پر گولی چلائیں۔ پھر کچھ لوگ فرط جوش میں جیپ کے سامنے لیٹ گئے۔ وہ دونوں پہلوؤں سے بھی قریب تر آ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ہوا میں گولیاں چلائیں اور انگورے سے کہا کہ وہ جیپ کو آگے بڑھائے۔ انگورے نے لرزاں آواز میں کہا "معاملہ بگڑ نہ جائے۔ اگر کوئی نیچے آگیا تو؟"

"نہیں آئیں گے نیچے۔" میں نے بے حد تلخی سے کہا "یہ بے رحم اور بے حس لوگ ہیں۔ ایسے لوگ دعوے کرتے ہیں جان نہیں دیتے۔ تم گاڑی بڑھاؤ۔"

انگورے نے ایک جھٹکے سے کلچ چھوڑا۔ گاڑی غرانی ہوئی آگے بڑھی۔ سامنے لیٹنے والے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ جیپ تیزی سے آگے نکل گئی۔ تمیں چالیس گز آگے جانے کے بعد پھر کچھ لوگوں نے راستہ بند کر دیا۔ دونوں لڑکیاں اطمینان سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان کا رویہ عجیب و غریب تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر ہم انہیں اغوا کرکے لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں کچھ زیادہ قلق نہیں ہو گا۔ غالباً وہ اس چار دیواری میں اپنے سخت گیر والد کی زیر نگرانی بہت گھٹن کی زندگی گزار رہی تھیں۔ بظاہر وہ پرسکون نظر آتی تھیں لیکن ان کے ذہن کے کسی نہاں خانے میں موجیں مارتا ہوا تجسس اور اس تجسس میں تڑپتا ہوا شباب انہیں ایک خود سپردگی کی سی کیفیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

اسی دوران میں ایک ستر اسی سالہ سنتھالی جس نے تنگ پائنچے والی پتلون پہن رکھی تھی ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے ساری عمر شکار کھیلتے اور جنگلی جانوروں کے پیچھے بھاگتے گزاری ہے۔ وہ میرے پاس پہنچ کر آہستگی سے انگریزی میں بولا "بیٹا! بے شک ہم سے غلطی ہوئی ہے لیکن تم ہم سے بڑی غلطی نہ کرو۔ ذی جان اور اس کے گھر والوں کو چھوڑ دو۔ تم اس کی جوان بیٹیوں کو ساتھ لے گئے تو وہ ساری عمر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ ایسے معاملوں میں ہمارے رسم و رواج بڑے سخت ہیں۔"

میں نے کہا "ذی جان کی بچیوں کے لئے تم بہت فکر مند ہو۔ یہ عورت جو پچھلے دس گھنٹوں سے تمہاری قید میں سسک سسک کر مر رہی تھی یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔ اس پر تم لوگوں کو ترس نہیں آیا تھا۔ پیچھے ہٹ جاؤ تم۔"

وہ عاجزی سے بولا "بیٹا! میں مانتا ہوں کہ ہم نے جوش میں غلط قدم اٹھایا ہے۔ دراصل بھوک سے بڑی مجبوری کوئی نہیں ہوتی اور بھوک نے ہمارے دماغ سوچ سمجھ سے خالی کر رکھے ہیں۔ ہمارا غصہ تم پر نہیں ان حالات پر تھا جن میں ہم شیخ عاصم کی وجہ سے جکڑے

علیم الحق حقی کے دو ناول
پرماتما
ببول
قیمت ۱۵۰/-
قیمت ۱۵۰/-
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

گئے ہیں۔ ہمارا روزگار ختم ہو چکا ہے اور پولیس کے چھاپوں نے ہماری جان ہلکان کر دی ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ چاہتے تھے کہ شیخ عاصم کی بیوی کو اپنی تحویل میں رکھ کر شیخ عاصم سے تاوان کا مطالبہ کیا جائے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ شیخ عاصم کو تمہاری یا اپنی بیوی کی جان سے کوئی سروکار نہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے امارات میں شیخ عاصم کے منیجر سے بات کی تھی۔ اس نے شیخ کو یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں سب کچھ بتا رہا ہے۔ اس کے باوجود شیخ عاصم نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ایسے موقعوں پر تو لواحقین چند منٹ کی تاخیر بھی نہیں کرتے کہاں یہ کہ دس بارہ گھنٹے ہو چکے ہیں۔"

"پھر اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

وہ بولا "سوچا تو کچھ اور تھا لیکن اب ہم وہی کریں گے جو تم نے کہا ہے۔"

"یقین میں ذی جان کے اہلِ خانہ کو چھوڑ دوں تو تم لوگ مجھے بحفاظت اپنے علاقے سے نکلنے دو گے؟"

وہ بولا "یقیناً اس کے لئے ہر ضمانت دینے کو تیار ہوں۔ بس تم ان بچیوں کو اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ یہ ایک گھنٹا بھی بستی سے باہر رہ گئیں تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔"

عین اسی وقت ذی جان کی بیوی بھی منت سماجت کرنے لگی۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ بنگالی آمیز اردو بول سکتی تھی۔ کہنے لگی "تم مجھے دل کے اچھے لگتے ہو۔ تم نے بستی والوں پر اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔ اب تم ان سے مہربانی کا سلوک کرو گے تو وہ تمہارے احسان مند ہوں گے اور اگر من مرضی کرو گے تو پھر تمہیں کسی اور جگہ اس کا صلہ مل جائے گا۔"

میں نے کہا "ابھی میں نے اپنی برتری ثابت نہیں کی۔ برتری اس وقت ثابت ہو گی جب میں بستی سے صحیح سلامت نکل جاؤں گا۔"

ذی جان بولا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تمہیں اپنی طاقت سے روک نہیں سکے۔ اگر تم اجازت دو تو میں بستی والوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ جیپ سے دور ہٹ جائیں اور اپنی لاٹھیاں، ڈنڈے وغیرہ ایک جگہ ڈھیر کر دیں۔"

میں نے کہا "یہ حکم تم پہلے بھی دے چکے ہو لیکن کسی نے تمہاری بات نہیں مانی۔"

"وہ بات اور تھی۔ تم مجھے ایک موقع اور دو۔" ذی جان نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ناگورے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مانندی کے تاثرات تھے۔ ذی جان کی بیوی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لے کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ذی جان اور اس کے اہلِ خانہ سمیت ہر شخص کی اکڑفوں ختم ہو چکی ہے۔ میں نے ذی جان کو اجازت دی کہ وہ ایک بار پھر بستی والوں سے بات کر لے۔ جیپ کی چھت اوپر سے کھل سکتی تھی۔ ذی جان تقریر کرنے والے انداز میں جیپ کے اندر کھڑا ہو گیا اور بستی والوں کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ بستی والوں کا جوش و خروش تو پہلے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ ذی جان کی تقریر نے انہیں ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے اور جیپ سے کافی فاصلے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایس پی برکت کو دیکھا۔ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا "بہت خوب بھئی شاہ جہاں! بہت ستھرا کام ہے تم نے۔ یہ بھوتنی والے اسی لائق تھے۔" اس نے چہرے پر اپنا تکیہ کلام ہوا اڑنا شروع کر دیا۔

میں نے فالتو گن ایس پی برکت کو تھما دی۔ وہ عقبی سیٹ پر بے ہوش غزالہ کے قریب جا بیٹھا۔ غزالہ کی حالت دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہونے لگے۔

ذی جان کی جواں سال بیٹی گلوگیر لہجے میں بولی "بھیا! میں الہ آباد کی رہنے والی ہوں۔ کلکتہ سے تعلق ہے ہمارا۔ یقین کرو تمہاری اس ساتھی لڑکی کی حالت دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا ہے۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کے لئے کچھ کرتی۔"

میں نے کہا "مجھے نہیں بھروسا کہ یہ لوگ تمہیں کچھ کرنے دیتے۔"

"بھیا! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میری بات پر یقین کرو۔ یہ لوگ اتنے برے نہیں جتنا بھوک نے انہیں کر دیا ہے۔ بھوک کے بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں۔ پھر ملیریا بھی پھیل گیا ہے۔ کئی بچے تو مر بھی گئے ہیں۔ رہی سہی کسر پولیس کی مخبروں نے پوری کر دی ہے۔ وہ آئے دن لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ تین چار ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ نہ ہم جنگل میں جا سکتے ہیں، نہ شہر میں۔ اس ویرانے میں پڑے سڑ رہے ہیں۔"

ان لمحات میں شکاریوں کی یہ بستی اور یہاں کے مکین مجھے واقعی مظلوم اور قابلِ رحم نظر آئے۔ میں نے زرد چہرہ عورتوں کو دیکھا جنہوں نے نڈھال بچوں کو سینوں سے لگا رکھا تھا۔ اترے ہوئے چہروں اور بڑھی ہوئی داڑھیوں والے لنگوٹی پوش مرد جن کی آنکھوں میں ویرانی جھانک رہی تھی۔ وہ صرف شکار کرنا جانتے تھے۔ شکار جائز ہے یا ناجائز اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تفریح کے لئے نہیں پیٹ کے لئے شکار کرتے تھے۔ نہ جانے کولمبو کے نواحی جنگلوں میں اور کتنی ایسی بستیاں بھوک کے شکنجے میں جکڑی گئی تھیں اور جو اصل بیوپاری تھے جنہوں نے اس ناجائز کاروبار سے کروڑوں کمائے تھے ان پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ وہ اپنا کالا دھندا کسی اور جگہ شروع کر سکتے تھے یا چند ماہ یا چند سال کا وقفہ دے کر پھر انہی جنگلوں میں سرگرم ہو سکتے تھے۔ میرے دل میں آئی کہ اس بستی کے لئے کچھ کروں؟ لیکن کیسے؟ اس سوال کا

جواب فی الحال میرے پاس نہیں تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ میں ایسا شخص کو معاف نہیں کر سکتا تھا جس نے مسز کیتھی پر گولی چلائی تھی اور اسے زندگی سے محروم کیا تھا۔ اس کا چہرہ اب تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور اس کی قاتل آنکھیں میرے اندر آتش فشاں دہکا رہی تھیں۔ میں نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا "ذی جان! میں تمہیں اور تمہارے اہلِ خانہ کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں لیکن اس کے لئے دو شرطیں ہوں گی۔ پہلی یہ کہ جب تک ہماری جیپ بستی کے بڑے گیٹ سے باہر نہیں نکلتی تم چاروں ہمارے ساتھ رہو گے۔ دوسری یہ کہ تم وہ بندہ ہمارے حوالے کرو جس نے انگریز عورت مسز کیتھی کو گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

پتلون قمیص والے بوڑھے سنہالی نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا "انگریز عورت کو تو بشن سنگھ نے گولی ماری تھی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ جو بھی اس کا نام ہے۔ مجھے وہ بندہ چاہئے۔"

"لیکن اسے تو تم خود موت کے گھاٹ اتار چکے ہو؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

بوڑھے سنہالی نے کچھ دیر مجھے گھورتے رہنے کے بعد عقب میں کسی کو اشارہ کیا اور بلند آواز سے سنہالی میں کچھ کہا۔ چند لمحے بعد تین چار افراد ایک چنائی اٹھائے نمودار ہوئے۔ اس چنائی میں کسی کا جسم تھا۔ انہوں نے وہ چنائی جیپ کے عین سامنے لا کر رکھ دی۔ بوڑھا سنہالی بولا "یہی ہے بشن سنگھ۔ یہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے مرا ہے اور یہ کام تمہارے ہاتھوں ہوا ہے۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ میرے سامنے پڑی ہوئی لاش اسی شخص کی تھی جس نے کل شام ایمبولینس میں مسز کیتھی پر گولی چلائی تھی۔۔۔ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی اور یقیناً میرے ہی ہاتھوں ٹوٹی تھی۔ وہ گہری تاریکی میں میرا شکار ہوا تھا لہٰذا میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس بستی کے مسلح افراد میں سے وہی قاتل میرا نشانہ بنا تھا جس نے مسز کیتھی کی جان لی تھی۔ بشن سنگھ کی لاش دیکھ کر میرے دل کو ایک گونہ تسلی محسوس ہوئی۔ اور مجھے یوں لگا کہ میرے سینے پر رکھا ہوا غم کا پہاڑ تھوڑا سا سرک گیا ہے۔

ناگورے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور ناگورے ہی کیا موقع پر موجود ہر فرد کی نگاہ مجھ پر تھی۔ وہ میرے فیصلے کے منتظر تھے۔ میں نے ناگورے سے کہا کہ وہ جیپ آگے بڑھائے۔ جیپ چھوٹے بڑے جھونپڑوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی بستی کے گیٹ کے پاس پہنچ گئی۔ گیٹ کے دونوں جانب خاردار تار کے بجائے لکڑی کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہم گیٹ سے گزر کر باہر نکلے۔ میں نے رائفل کی جنبش سے ذی جان کو حکم دیا کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کو لے کر جیپ سے نیچے اتر جائے۔ وہ تو جیسے میرے اشارے کا منتظر تھا۔ فوراً بیوی بچوں سمیت جیپ سے اتر گیا۔ میں نے جڑواں بنگالی لڑکیوں کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر خوشی و شادمانی کے بجائے ہلکی سی مایوسی کی جھلک تھی۔ سرخ و روپہلی چمکیلی آنکھیں گم صم سی نظر آتی تھیں۔ عجیب سحر زدہ لڑکیاں تھیں وہ۔ ان کے چہرے اور تاثرات آج تک میرے حافظے پر نقش ہیں۔

O☆O

منظر کولمبو کے اسی اسپتال کا تھا جہاں غزالہ اس سے پہلے تین مہینے زیرِ علاج رہی تھی۔ شکاریوں کی قاتل وہ بستی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد میں اور ناگورے اسے سیدھا یہیں لائے تھے۔۔۔ آٹھ دس دن کی دیکھ بھال کے بعد اب اس کی طبیعت پھر سنبھل گئی تھی۔ وہ کسی وقت چمچ کے ذریعے دودھ یا یخنی پی لیتی تھی۔ کسی وقت وہ بہت مدھم آواز میں سرگوشی کرتی جسے میں کوشش کرکے سمجھ لیتا۔ ان سرگوشیوں میں اس نے ایک بار بھی شیخ عاصم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے اپنے والدین کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیوں نہیں آئے۔

ناگورے اور ایس پی برکت نے مجھے اپنی پوری کتھا سنائی تھی کہ وہ کیونکر اس بستی تک پہنچے اور وہاں کیسے میرا کھوج لگایا۔ درحقیقت مسز کیتھی کی لاش دریافت ہونے ہی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ میرے اور غزالہ کے ساتھ بھی کوئی سانحہ پیش آگیا ہے۔ پھر دو تین گھنٹے بعد ایک سرکاری رکھ سے وہ ایمبولینس بھی برآمد ہوئی جو ہمیں لے کر ائرپورٹ روانہ ہوئی تھی۔ میں نے ایک دو موقع پر ایس پی برکت سے ناگورے کا تعارف کرایا تھا۔ ایس پی برکت نے ناگورے سے رابطہ کیا اور دونوں اپنے طور پر میری تلاش میں لگ گئے۔ وہ موٹر سائیکل پر سوار تھے۔ رات دس بجے کے لگ بھگ اتفاقاً ان کی ملاقات ایک ایسے دیہاتی معالج سے ہوئی جو جنگل میں سانپ پکڑنے نکلا ہوا تھا اور جس نے مجھے اور غزالہ کو ایمبولینس میں دیکھا تھا۔ اس سراغ کی مدد سے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ناگورے اور ایس پی برکت شکاریوں کی بستی تک پہنچ گئے۔

غزالہ کو اسپتال میں داخل کرائے دس روز ہو چکے تو میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی کہ میں مریضہ کو اسپتال سے لے جا سکتا ہوں۔ اس سے پہلے مسز کیتھی نے میری بہت مدد کی تھی اور میں اور غزالہ ورنہ ہم تمام قانونی تقاضے پورے کر چکے تھے جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے پورے کرنے ضروری ہوتے ہیں لیکن اب مسز کیتھی بھی منوں مٹی کے نیچے سو رہی تھی۔ اس مہربان عورت کی مہربان روح اپنے جسم اور اپنے شوہر کی قید سے آزاد ہو کر ابدی بلندیوں کی طرف پرواز کر چکی تھی۔ (مقامی پولیس کیس کی تفتیش کر رہی تھی۔ میرے ایک بیان سے ذی جان اور اس کی بستی پر پولیس کا قہر ٹوٹ سکتا تھا لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھی تھی۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اب ختم ہو گیا تھا کیونکہ مسز کیتھی کا قاتل ذرامائی طور پر کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا) شیخ عاصم کے سیکریٹری صاحب کا بھی تاحال

کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ لے دے کے ایس پی برکت رہ جاتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ایس پی برکت کا چچا زاد بھائی یہاں کا معروف کاروباری شخص تھا اور اس کے تعلقات بھی تھے۔ وہ ہمارے کاغذات سنئے سرے سے تیار کروا سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شام کو جب ایس پی برکت غزالہ کو دیکھنے اسپتال آئے گا تو اس سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوپہر کے وقت جب میں اور غزالہ کمرے میں تنہا تھے۔ میں نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کرتے ہوئے کہا "غزالہ! ہم ایک دو دنوں میں پاکستان کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔"

غیر متوقع طور پر اس کی آنکھوں میں بے چینی سی نظر آنے لگی۔ ہونٹ کرب ناک انداز میں کپکپائے۔ وہ بہت نحیف آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیا "نہیں... شار جہاں... پاکستان..."

بس یہ دو تین لفظ ہی میری سمجھ میں آ سکے "لیکن کیوں غزالہ؟ ہم کیوں نہ جائیں پاکستان۔ وہاں سب تمہارے اپنے ہوں گے۔ تمہاری دیکھ بھال زیادہ اچھے طریقے سے ہو سکے گی۔"

اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ بتاتی تھی کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں پوری توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے۔ پانچ دس منٹ کی کوشش میں بس چھ سات الفاظ ہی میری سمجھ میں آ سکے۔ ان الفاظ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس ناگفتہ بہ حالت میں پاکستان جانا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ کچھ دن مزید سری لنکا میں رہے۔ لیکن کیوں؟ کہیں اس لئے تو نہیں کہ وہ اب بھی اس بے وفا، دغا باز کا انتظار کرنا چاہتی تھی جس کا نام شیخ ہاشم تھا؟ میں اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہرطور میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ غزالہ کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ ڈاکٹروں کا کہنا بھی یہی تھا کہ اگر قرب و جوار کا ماحول مریضہ کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوگا تو وہ ذہنی طور پر پُر سکون رہے گی۔ اور اس کی صحت اور بحالی کا دار و مدار اس کے ذہنی و جسمانی سکون پر تھا اور ان کاوشوں پر تھا جو اس نے خود کرنی تھیں۔

میں نے ایس پی برکت اور ناگورے سے مشورہ کیا اور ہم اگلے ہی روز غزالہ کو اسپتال سے ڈسچارج کرا کے کولمبو سے تقریباً ایک سو میل دور نوریلیا نام کے قصبے میں لے آئے۔ یہ قصبہ سری لنکا کے جنوبی حصے میں مشہور شہر کینڈی سے تھوڑا آگے واقع ہے اور اپنے اندر ہل اسٹیشن کی سی خصوصیات رکھتا ہے۔ اس پُر فضا مقام پر سیاحوں کے لئے کاٹیج اور گیسٹ ہاؤس دکھائی دیتے ہوئے ہیں۔ ناگورے اور آنجہانی سب انسپکٹر داسوور اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ ہم ایک آرام دہ ایمبولینس کے ذریعے یہاں پہنچے تھے۔ ساتھ میں دو پولیس گارڈز بھی تھے۔ ناگورے ہمیں سیدھا اپنے گھر میں لایا۔ گھر میں اس کی بیوہ بھابی (داسوور کی بیوی) کے علاوہ تین بہنیں اور بوڑھا باپ بھی تھا۔ باپ گردوں کا دائمی مریض تھا اور مرض کی وجہ سے کچھ چڑچڑا سا ہو چکا تھا۔ ایس پی برکت بھی ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ ناگورے نے ہمارے لئے مکان کی بالائی منزل پر ایک کشادہ اور ہوا دار حصہ خالی کروا دیا تھا۔ یہ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ایک جانب کی کھڑکیوں سے دور تک پھیلی ہوئی سرسبز وادی نظر آتی تھی۔ دوسری جانب کی کھڑکیاں ایک سرسبز وسیع میدان کی طرف کھلتی تھیں۔ یہ میدان ایک چھوٹے موٹے اسٹیڈیم سے کم نہیں تھا۔ ایک طرف اسٹیڈیم ہی کی طرز پر لکڑی اور سیمنٹ کے بے شمار زینے بنے ہوئے تھے۔ میدان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال اور تراش خراش باقاعدگی سے کی جاتی ہے۔ میں نے پہلی بار دیکھا تو اس وقت بھی چند لڑکے گراؤنڈ میں جاگنگ کر رہے تھے۔ میں نے ان کے لباس اور چال ڈھال سے اندازہ لگایا کہ وہ مقامی نہیں ہیں۔ میرے پوچھنے پر ناگورے نے کہا "یہ کنگ کیڈٹ کالج کے لڑکے ہیں۔ وہ سامنے سرخ رنگ کی عمارت اسی کالج کی ہے۔"

غزالہ کا بستر کھڑکی کے پاس لگایا گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی لیٹی گراؤنڈ کا نظارہ کر سکتی تھی۔ اور گراؤنڈ سے آگے دور تک پہاڑی سلسلہ بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس پہاڑی سلسلے پر چائے کے باغات پھیلے ہوئے تھے اور کہیں کہیں آبشاروں کے پانی کی چمک تھی۔ ایک ایسے مریض کے لئے جسے آٹھوں پہر بستر پر لیٹنا تھا یہ بڑی مناسب قیام گاہ تھی۔ سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ قصبے میں ایک اسپیشل نیورو فزیشن موجود تھا اور غزالہ کے حوالے سے کسی ہنگامی صورت میں اسے کنسلٹ کیا جا سکتا تھا۔

ناگورے کے بھائی سب انسپکٹر داسوور کو انتقال کئے چار ماہ سے اوپر ہو چکے تھے لیکن گھر میں ابھی تک سوگواری کی کیفیت موجود تھی۔ جواں سال بیوہ کا نام مالنی تھا۔ وہ ایک پردہ دار عورت تھی۔ ناگورے کی دو بہنیں بھی جوان تھیں اور مکمل پردہ کرتی تھیں۔ تاہم چھوٹی بہن نادو جو چودہ پندرہ سال کی تھی کھلے منہ ہمارے سامنے آ جاتی تھی۔ وہ بہت تیز طرار اور باتونی لڑکی تھی۔ سنہالی اور انگریزی روانی سے بول سکتی تھی۔ ہندی بھی بولتی تھی۔ دو ہی دن میں وہ بڑی اپنائیت سے مجھے بھائی جان، ایس پی برکت کو انکل اور غزالہ کو باجی کہنے لگی۔ اس نے بتایا کہ ناگورے بھائی بہت اچھے باکسر تھے ہمیں اور بستی والوں کو ان سے بہت سی امیدیں تھیں لیکن افسوس کہ ان کے کندھے پر چوٹ لگنے کے بعد یہ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

میں نے پوچھا "اب ناگورے باکسنگ نہیں کرتا؟"

"نہیں اب باکسنگ نہیں کرتے۔" وہ بولی "ہاں آج کل دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ روزانہ صبح سویرے اٹھتے ہیں اور دس

پندرہ میل تک دوڑ کر واپس آتے ہیں۔ کنگ کیڈٹ کالج کا ایک لڑکا ہے نوری۔ اس کے ساتھ بھائی جان کی پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ باکسنگ میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کے زبردست حریف تھے اب دوڑ میں بھی حریف ہیں۔ دو ہفتے بعد کھیلوں کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ ان مقابلوں کو یہاں ڈسٹرکٹ مقابلے کہا جاتا ہے۔ ان میں کراس کنٹری ریس بھی ہوتی ہے۔ بھائی جان اور نوری دونوں اس ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا پہلے بھی ناگورے نے کراس کنٹری میں حصہ لیا ہے؟"

"صرف ایک دفعہ۔ لیکن تب ان کی پوری تیاری نہیں تھی اس لئے ہار گئے تھے۔"

"جیتا کون تھا؟"

"وہی نوری۔" نادو نے کہا اور اس کے چہرے پر نفرت کا سایہ لہرا گیا "پچھلے چار پانچ سال سے وہی بدبخت جیت رہا ہے۔ نوری سے پہلے اس کا بڑا بھائی راج چیمپئن تھا اور راج سے پہلے ان کا چچا واہندو سردار۔ ان لوگوں نے تو جیسے ٹرافی جیتنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔"

اگلے روز صبح سویرے ناگورے سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ گھر کی بیٹھک میں اپنے چار پانچ دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ ناکا کرتا تھا اس لئے بری طرح ہانپ رہا تھا اور جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اس کے دوستوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور تالیاں بجا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ناگورے اٹھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "آئیے بیٹھئے بھائی صاحب۔" وہ سعادت مندی سے بولا۔

میں نے کہا "سنا ہے تم کسی ریس میں حصہ لے رہے ہو؟"

"بالکل جناب" وہ چھاتی ٹھونک کر بولا "حصہ بھی لے رہا ہوں اور جیت بھی رہا ہوں۔ یہ برسوں پرانا خواب ہے میرا اور ہم سب کا۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کتنی لمبی ریس ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائیس کلومیٹر ہوتی ہے جی۔ اسی گراؤنڈ سے شروع ہوتی پکی سڑک پر "چانی کر" جھیل تک جانا ہوگا اور دوسرے راستے سے واپس آنا ہوگا۔"

"کوئی انعام وغیرہ بھی ہوتا ہے؟"

"بیس ہزار روپیہ اور ایک ٹرافی۔ لیکن بھائی صاحب یقین کریں میں انعام کے لئے نہیں دوڑ رہا۔ بس اس خواب کو سچا کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے قصبے کا نچلا طبقہ اٹھارہ بیس برس سے دیکھ رہا ہے۔ ان برسوں میں ہمارا کوئی ایک لڑکا بھی یہ ریس نہیں جیت سکا ہے۔ سردار بہادر سنگھ کی فیملی جیتتی ہے یا ان کی برادری میں سے کوئی اور لڑکا جیت جاتا ہے۔ غریب غربا کو تو وہ مقابلے میں آنے ہی نہیں دیتے۔ آ بھی جائے تو اسے اتنا دباؤ میں رکھتے ہیں کہ بے چارہ

[illegible]

"یہ سردار بہادر سنگھ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لینڈ لارڈ ہے جی اس علاقے کا۔ کئی ایک ولاز اور گیسٹ ہاؤس بنا رکھے ہیں اس نے۔ سیاحوں سے بہت مال بٹورتا رہتا ہے۔ اس کا ایک لڑکا ہے نوری..."

"ہاں میں نے سن لیا ہے۔" میں نے ناگورے کی بات کاٹی "تمہارا اصل مقابلہ اسی سے ہے۔"

"بالکل جناب۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے باکسنگ بھی اسے ہی نیچا دکھانے کے لئے شروع کی تھی لیکن افسوس کہ اس کے ساتھ میرا ایک مقابلہ بھی نہ ہو سکا۔ میں اسے ہرانے کے قابل ہوا تو وہ باکسنگ ہی چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر چند ماہ بعد میرے کندھے پر بھی چوٹ لگ گئی اور یہ معاملہ ختم ہو گیا۔"

"تو اب یہ معاملہ ریس کے میدان میں چالو ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"بالکل جناب" ناگورے کا ایک ساتھی بولا "آج کل پورا قصبہ دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف کنگ کالج کے لڑکے اور کھاتے پیتے خوش حال گھرانوں کے لوگ ہیں۔ دوسری طرف عام طبقہ ہے۔ بڑا جوش و خروش ہے سب میں۔"

اسی دوران میں بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ناگورے کے بوڑھے والد نے اندر جھانکا۔ ناگورے اور اس کے دوستوں کو دیکھ کر بوڑھے سنہالی کے چہرے پر ناپسندیدگی اور خفگی کے آثار صاف دکھائی دیئے۔ کچھ کہے بغیر وہ دروازے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

اسی شام جب میں غزالہ کو انجکشن وغیرہ لگوا کر فارغ ہوا تو ہم دبلا سنہالی ایک نرس اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ نرس میں بھاپ دیتی چائے کے دو مگ رکھے تھے کہنے لگا "سر اگر تم پسند کرو تو چھت پر بیٹھ کر چائے پئیں۔"

میں اخلاقاً اٹھ کھڑا ہوا۔ لکڑی کے زینے چڑھ کر ہم بالائی منزل کی چھت پر آ گئے۔ دور سورج کا زرد گولا سرسبز درختوں اور ٹیلوں کی اوٹ میں اور جھیل ڈوب رہا تھا۔ چھت پر چاروں طرف بانس کا جنگلا لگا تھا اور ایک کونے میں بید کی کرسیاں رکھی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر قصبے کا نظارہ کرنا بہت بھلا محسوس ہوا۔ دائیں طرف گہرے سبز گراؤنڈ میں رنگ برنگی نیکروں والے نوجوان لڑکے کھیل کود میں مصروف تھے۔ کوئی ہاکی کھیل رہا تھا کوئی کرکٹ اور کوئی یونہی ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ یہ گراؤنڈ دراصل کنگ کالج ہی کی ملکیت تھا لیکن گراؤنڈ کی حد بندی نہیں تھی لہٰذا قصبے کے عام لوگ بھی یہاں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کنگ کالج میں مخلوط تعلیم تھی یہی وجہ تھی کہ گراؤنڈ میں لڑکوں کے علاوہ لڑکیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک طرف انہوں نے والی بال کا نیٹ لگا رکھا تھا اور نکریں پہنے والی بال کھیلنے میں مصروف تھیں۔ یہ سب ماڈرن گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔

چائے کی ایک طویل چسکی لیتے ہوئے ناگورے کے بوڑھے

باپ رام سنہا نے کہا "یہ لڑکا میری ایک نہیں مانتا۔ اسے معلوم ہے کہ واسودو کی موت کے بعد گھر کا خرچہ چلانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود فضول کاموں میں الجھا ہوا ہے۔ کیا ملنا ہے اسے کھلاڑی بن کر۔ مجھے تو لگتا ہے اس چکر میں کانسٹیبل کی نوکری سے بھی جائے گا۔ ایک مہینے کی چھٹی اس نے پہلے لی تھی۔ اب ایک مہینے کی اور لے لی ہے۔"

میں نے کہا "بزرگوار! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ چھٹی لینے سے نوکری تو نہیں چلی جاتی۔ آپ بے فکر رہیں تانگورے کی نوکری پکی ہے۔ اس کے بڑے بھائی نے جان دے کر محکمے اور ملک کا وقار بلند کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ نہ صرف اس کی نوکری پکی رہے گی بلکہ ترقی بھی ملے گی۔"

"ترقی تو تب ملے گی جب یہ کام پر جائے گا۔ یہاں پڑا اینٹھتا رہے گا تو کون گھر آکر اسے ترقی کا پروانہ دے گا۔"

"آپ بے فکر رہیں بزرگوار! سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ اس میں ایک اچھا کھلاڑی بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اگر وہ اچھا کھلاڑی بن گیا تو اسے پولیس مین بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ بڑی دولت کماتے ہیں یہ کھلاڑی لوگ۔"

"بڑے عجیب آدمی ہو تم۔" بوڑھا ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا "میں چاہتا تھا کہ تم اسے سمجھاؤ اور تم الٹا اس کی وکالت کر رہے ہو۔ کوئی ہوش مند تو یہ بات نہیں مان سکتا کہ پولیس کی نوکری سے کھیل کود اچھی ہے۔"

"میں آپ کی بات رد نہیں کر رہا جناب۔" میں نے جلدی سے کہا "میں خود پولیس مین رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہیں سارے قاعدے ضابطے اس محکمے کے۔ کھلاڑی کی یہ لوگ بڑی قدر کرتے ہیں۔ کھلاڑیوں کو بڑی جلدی ترقیاں ملتی ہیں اور ڈیوٹیاں بھی آسان ہوتی ہیں۔ آپ کا بیٹا صحیح لائن پر جا رہا ہے فکرمند نہ ہوں آپ۔"

بوڑھے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "فکرمندی کی کوئی ایک بات ہو تو تب ہے نا۔ اس لڑکے نے تو میری نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ ہر حرکت نرالی ہے اس کی۔ جوانی میں غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ ہم سے بھی ہوئی۔ اسی لئے تو یہ پیدا ہوا۔ لیکن یہ تو مہا غلطی کر رہا ہے۔ اب دیکھو۔ آنکھ لڑائی ہے تو کہاں لڑائی ہے۔ ہندو سیٹھ شاستری لال کی اکلوتی بیٹی ہے۔ سیٹھ شاستری تین سنیماؤں کا اکلوتا مالک ہے۔ اس جیسا سیٹھ تھوک دے تو ہم بہہ جائیں۔ لیکن یہ وہاں ماتھا پھوڑ رہا ہے اور سچ پوچھو تو سیٹھ شاستری کی بیٹی ہی اس کی آوارہ گردیوں کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ایک آفت ہے وہ لڑکی۔ وہ دیکھو۔ وہ سامنے جو لڑکیاں والی بال کھیل رہی ہیں ان میں سرخ نیکر والی لڑکی۔ انیلا نام ہے اس کمبخت کا۔"

میں نے رام سنہا کی نگاہ کا تعاقب کیا اور سرخ نیکر والی لڑکی کو دیکھا۔ عام سنہالی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ بہت صاف تھا اور وہ دور سے بھی خوشنما نظر آ رہی تھی۔ رام سنہا بولا "ایک موم فتنہ چھوکری ہے۔ ہاتھ دھو کر میرے بیٹے کے پیچھے پڑی ہے اسی کے اکسانے پر وہ سردار بہادر سنگھ کے بیٹے سے ٹکر لیتا رہتا ہے۔ ہر وقت دشمنی رہتی ہے اس سے۔"

میں نے کہا "بزرگوار! یہ بڑی پرانی کہاوت ہے کہ کیوپڈ کو دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کے بیٹے نے اونچی جگہ آنکھ لڑا کر کوئی نئی غلطی نہیں کی۔ یہ غلطی تو روز آفرینش سے ہو رہی ہے۔ بہرحال میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں اور مجھے پوری ہمدردی ہے آپ سے۔"

"واقعی ہمدردی کے قابل ہوں میں۔" رام سنہا نے ایک لمبی آہ کھینچی "مجھے نہیں یقین کہ میرا یہ دوسرا بیٹا بھی بچ سکے گا۔ تم اس کے دوست اور خیرخواہ ہو۔ تم اسے سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کیوں وہ آگ سے کھیل رہا ہے کیوں مجھے اور اپنی جوان بہنوں کو زندہ درگور کر رہا ہے۔" اسی گفتگو کے دوران میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ قصبے کے بارونق بازار میں رام سنہا کی دکان تھی جہاں وہ ٹائپ رائٹرز مرمت اور فروخت کرتا تھا لیکن اپنے چچا زاد بھائی سے جو پولیس میں حوالدار اور ٹائپ ملازم تھا، رام سنہا کی ان بن ہو گئی اور یہ دکان اس سے چھن گئی۔

⊙☆○

دو ہفتے پلک جھپکتے گزر گئے۔ غزالہ کی حالت میں بہت معمولی بہتری واقع ہوئی تھی لیکن یہ معمولی بہتری بھی میرے لئے ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہیں تھی۔ میرے دل کے اندر سے یہ آواز آنے لگی تھی کہ غزالہ کا مشکل ترین وقت گزر چکا ہے۔ وہ بچ جائے گی۔ میں نے ایک تجربہ کار نرس کا انتظام کر رکھا تھا اس کے باوجود میں اپنا زیادہ تر وقت غزالہ کے بستر کے پاس گزارتا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے دوائی پلاتا، انجکشن دیتا اور خوراک کا خیال رکھتا۔ کبھی کبھی اس کے بازو میں خفیف حرکت پیدا ہوتی اور اس کی استخوانی انگلیاں میرا ہاتھ تھام لیتیں۔ جیسے وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس دنیا میں وہ اکیلی نہیں۔

ایک صبح میں نے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر وسیع و عریض گراؤنڈ کا جائزہ لیا تو وہاں ہلچل نظر آئی۔ گراؤنڈ کی چوبی سیڑھیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے اور گراؤنڈ یعنی میدان کے اندر بھی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تانگورے کی چنچل بہن نادو نے آکر مجھے بتایا کہ آج "کراس کنٹری ریس" ہوگی۔ اس نے بڑے اشتیاق سے درخواست کی کہ میں بھی ریس دیکھنے چلوں۔ میں نے ہامی بھر لی۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں بھی اسٹیڈیم نما میدان میں پہنچ گیا۔ اب وہاں کافی رش ہو چکا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مختلف اعلان کئے جا رہے تھے اور بلیک اینڈ وھائٹ لباس والے ریفری حضرات "اسٹارٹنگ پوائنٹ" کے آس پاس گھوم رہے تھے۔ مجھے

توقع نہیں تھی کہ اس دور دراز قصبے میں کراس کنٹری ریس کے لئے اتنے اچھے انتظامات کئے گئے ہوں گے۔ میدان میں ایک اسٹینڈ صرف خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ اس اسٹینڈ میں کنگ کالج کی شوخ لڑکیاں تتلیوں کی طرح منڈلاتی پھرتی تھیں۔ ان میں مجھے انیلا بھی نظر آئی۔ وہ دراز قد وجیہہ لڑکی سیکڑوں میں نمایاں دکھائی دیتی تھی۔ جہاں میں نے پہلی بار نوی کو بھی دیکھا۔ وہ ورزشی جسم کا مالک قبول صورت لڑکا تھا۔ بال بہت لمبے تھے اور شانوں پر لہراتے تھے۔ امارت اور شان و شوکت اس کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔

ریس میں نوی اور تانگورے سمیت کم و بیش پچاس ایتھلیٹ حصہ لے رہے تھے۔ نوی اور تانگورے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں کے اعصاب تنے ہوئے ہیں اور وہ خود کو آنے والے لمحات کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کنگ کالج کے لڑکے مسلسل شور کر رہے ہیں۔ وہ تانگورے اور تانگورے جیسے دوسرے کھلاڑیوں کو ہوٹنگ کا نشانہ بنا رہے تھے۔

دس بجے کے لگ بھگ ریس شروع ہوئی۔ قواعد کے مطابق کھلاڑیوں نے پہلے تین چار چکر گراؤنڈ کے اندر ہی لگائے پھر پختہ سڑک کی طرف نکل گئے۔ پانچ دس منٹ بعد لاؤڈ اسپیکرز پر تازہ ترین صورت حال بتائی جانے لگی۔ فلاں فلاں نمبر کے لڑکے آگے ہیں۔ ان کے پیچھے فلاں فلاں نمبر کے لڑکوں کی ٹولی ہے۔ ہراول لڑکے فلاں مقام سے گزر رہے ہیں۔ اسپیکر پر ہونے والے ہر اعلان کے ساتھ تالیوں کی گونج بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ اعلانات ایک بار سنہالی میں اور ایک بار انگریزی میں کئے جاتے تھے۔ ان اعلانات کا ذریعہ وہ "واکی ٹاکیز" تھے جو تماشائی لڑکے مختلف مقامات پر لئے کھڑے تھے۔ میں آدھ پون گھنٹہ میدان میں موجود رہا پھر غزالہ کے پاس واپس آگیا۔ بالائی کمرے کی کھڑکیوں سے بھی گراؤنڈ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا میں گاہے گاہے اس طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر میں غزالہ کی دوا لینے وسطی قصبے کے میڈیکل اسٹور میں چلا گیا۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ ریس کا فیصلہ ہو گیا ہے..... یہ ریس ایک بار پھر نوی ہی جیتا تھا۔ تانگورے دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ اسٹیڈیم نما میدان میں کنگ کالج کے لڑکے اور ان کے حامی اودھم مچا رہے تھے جب کہ قصبے کے عام لوگ دل گرفتہ نظر آتے تھے۔

○☆○

غزالہ ساری رات اور سارا دن جاگتی رہی تھی۔ اس کے سر کے پچھلے حصے اور گردن میں درد تھا۔ میں بھی بغیر آنکھ جھپکے اس کے بستر کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ شام کے وقت اس کا درد کم ہوا اور وہ سو گئی۔ تانگورے کی بہن نادو میرے پاس آئی۔ کہنے لگی "آپ نے رات بھر آنکھ نہیں لگائی۔ اب جی بہن (غزالہ) سو گئی ہیں۔ آپ بھی ذرا آرام کر لیجئے۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے مجھے غزالہ کے پاس سے اٹھا دیا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔ غزالہ کب ٹھیک ہوگی؟ ہم کب واپس پاکستان جا سکیں گے؟ پاکستان میں ہمارے بارے میں کیا سوچا جا رہا ہوگا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات تھے۔ وہی پولیس اور اسپتال میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں اور غزالہ کہاں ہیں۔ اگر کوئی پاکستان سے ہماری تلاش میں آتا بھی تو وہ ہمیں آسانی سے ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔

میرے ساتھ والے بستر پر ایس پی برکت محو خواب تھا۔ اس کے صحت مند خراٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔ اس کے خراٹوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں کمرے سے نکل آیا اور چہل قدمی کی غرض سے اس ڈھلوان سڑک پر ہو لیا جو آبادی کی مخالف سمت میں جاتی تھی۔ کولمبو کی نسبت اس پہاڑی علاقے کا موسم خنک اور خوشگوار تھا۔ شام ہوتے ہی خوشبو سے لدی پھندی تروتازہ ہوا چلنے لگی تھی۔ میں اس ہوا میں بہتا ہوا سا کافی دور نکل گیا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ بڑی سریلی سی زنانہ آواز تھی اور ایک چٹان کے پیچھے سے ابھری تھی۔ میرے قدم خود بخود ہی تھم گئے۔ اسی دوران میں آواز پھر ابھری۔ کسی نے مجھے میرا نام لے کر پکارا تھا۔ میں نے تاریکی میں غور سے دیکھا۔ چٹان کے پہلو میں دو سائے موجود تھے۔ ایک لڑکی تھی اور دوسرا لڑکا۔ لڑکے کو میں نے اس کے ڈیل ڈول اور کھڑے ہونے کے انداز سے پہچان لیا۔ وہ تانگورے تھا۔

میں ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ قریب جا کر لڑکی کو پہچاننا بھی میرے لئے دشوار نہیں رہا۔ وہ تانگورے کی محبوبہ انیلا تھی۔ اس نے ٹی شرٹ اور جین پہن رکھی تھی۔ خوب صورت ترشیدہ بال اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔

تانگورے نے کھسیانے لہجے میں کہا "میرا خیال ہے آپ بھی ہماری طرح چہل قدمی کے لئے نکلے ہیں۔"

میں نے کہا "چہل قدمی کے لئے تو نکلا ہوں۔ مگر تمہاری طرح نہیں۔"

میرے معنی خیز لہجے سے وہ دونوں جھینپ گئے۔ تانگورے نے کہا "یہ انیلا ہے میں نے آپ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ بہت عزیز دوست ہے میری۔۔۔ اور انیلا! یہ شاہ جہاں صاحب ہیں۔"

شوخ اور آزاد خیال انیلا نے بے تکلفی سے ہاتھ ملایا اور رواں انگریزی میں بولی "تانگورے نے آپ کا تفصیلی تعارف کرایا تھا۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ جس طرح اپنی بیمار دوست کی صحت کے لئے کوشاں ہیں اور اس کے لئے رات دن ایک کر رہے ہیں میں بہت متاثر ہوئی ہوں آپ سے۔"

"شکریہ" میں نے کہا "لیکن بہتر تھا کہ تم دونوں اس وقت مجھے آواز نہ دیتے اور اپنی "چہل قدمی" سے لطف اٹھاتے۔"

انیلا ادا سے بولی "آپ کو آواز میں نے دی تھی اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ مسکراتی نظروں سے

ناگورے کی طرف دیکھنے لگی۔ ناگورے سر جھکائے اُداس سا کھڑا تھا۔

"کیا وجہ ہے بھئی؟" میں نے پوچھا۔

انیلا ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولی "ہار جیت تو کھیل کا حصہ ہوتی ہے نا جناب! پھر ہار کو اپنے ذہن پر سوار کر لینا اور ہمت ہار کر بیٹھ جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔"

وہ بولی "لیکن یہ بات ناگورے کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جناب فرما رہے تھے کہ اب کبھی ریس میں حصہ نہیں لیں گے۔ بس وہی کریں گے جو ان کے ڈیڈی فرماتے ہیں۔ یعنی کانسٹیبل کی نوکری۔ بڑی مشکل سے تھوڑا بہت مانے ہیں۔ آپ کو تو اس لئے روکی تھی کہ آپ بھی ذرا ان کے کان کھولیں۔ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کی بات اثر کرے گی۔"

میں نے کہا "محبت کا نمبر پہلے ہوتا ہے عزت کا بعد میں۔ جب "محبت" نے سمجھا دیا ہے تو پھر "عزت" کے سمجھانے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔"

تاریکی کی وجہ سے نظر تو نہیں آیا لیکن یقیناً انیلا کے چہرے پر سرخی لہرا گئی ہوگی۔ بال جھٹک کر بولی "دیکھیں جناب! صرف ڈیڑھ ماہ بعد ہمارے قصبے میں "سالانہ میلہ" ہے۔ اس میلے میں گیمز بھی ہوتی ہیں۔ کراس کنٹری ریس ان گیمز کا اہم ترین ایونٹ ہے۔ اردگرد کے تمام قصبوں بلکہ کینیڈی تک سے کھلاڑی اس ریس میں حصہ لینے کے لئے یہاں پہنچتے ہیں۔ ناگورے اس ریس میں حصہ لے کر ٹونی کا بھرپور مقابلہ کر سکتا ہے اور ہم سب کو امید ہے کہ یہ جیتے گا بھی۔ یہ مسلسل "امپروو" کر رہا ہے۔ پہلی ریس حالانکہ ناگورے نے ہنسی مذاق میں دوڑی تھی۔ پھر بھی ٹونی سے صرف چار منٹ کے فاصلے پر رہا تھا۔ پرسوں ہونے والی ریس میں یہ فرق صرف ڈیڑھ منٹ کا تھا۔ یہ تھوڑی سی ہمت اور کرے تو ٹونی کو شکست دینے کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ناگورے! تمہاری دوست باتیں تو سو فیصد درست کر رہی ہے۔ گر گر کر سنبھلنا اور سنبھل کر آگے بڑھنا ہی زندگی کی نشانی ہے۔ تم تھوڑی سی کوشش اور کرو تو اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو۔"

ناگورے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے کمرے کی کھڑکیوں سے اسٹیڈیم نما میدان میں جھانکا تو ناگورے اپنے تین چار دوستوں کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ سب پسینے سے شرابور اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ مجھے ناگورے کی سیاہ آنکھوں میں ایک آگ سی روشن نظر آئی۔ اس کے تمتمائے ہوئے چہرے پر "عزم نو" کی چمک تھی۔ ورزش وغیرہ مکمل کرنے کے بعد ناگورے اپنے دوستوں کے ساتھ گھر میں آ گیا۔ ان کی محفل گھر کی بیٹھک ہی میں جمتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ ناگورے اور اس کا ایک دوست ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ ناشتا دیکھ کر مجھے کچھ عجیب محسوس ہوا۔ تین انڈوں کا آملیٹ، نصف ڈبل روٹی، تھوڑے چاول جو یقیناً رات کے کھانے سے بچے تھے اور سیاہ رنگت کی چائے۔ کئی میل دوڑنے اور ورزش کرنے والے شخص کے لئے یہ ناشتا یقیناً ناکافی تھا۔ ناگورے کے گھر کی معاشی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی اور اس کا اندازہ کئی ایک باتوں سے ہوتا تھا۔ کل شام بھی گھر کے اندر سے لڑائی جھگڑے کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ پہلے ناگورے اور اس کی والدہ بول رہے تھے۔ پھر باپ دام سنہا بھی تیز تیز لہجے میں بولنے لگا تھا۔ اس کے لہجے میں بلا کی تلخی اور سختی تھی۔ وہ سنہالی میں لڑ رہے تھے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کی معاشی حالت ہی زیرِ بحث ہے۔ میرا خیال ہے ایس پی برکت کا ان لوگوں پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ہماری حیثیت "پے انگ گیسٹ" کی تھی اور ہم نے اپنے طعام وغیرہ کے لئے وافر "اخراجات" دے رکھے تھے البتہ کچھ دوسرے معاملات زیرِ بحث تھے اور ان کا تعلق "ہوم اکنامکس" سے تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ اگر ناگورے سالانہ میلے کی ریس میں حصہ لینا چاہتا ہے اور ٹونی جیسے لڑکے کو ہرانا چاہتا ہے تو اسے سخت محنت کے ساتھ ساتھ بہترین خوراک کی بھی ضرورت ہے۔ کم از کم اس ایک ڈیڑھ ماہ میں تو اسے بہترین خوراک اور بہترین سہولتوں کی ضرورت تھی۔ میں نے ناگورے سے کہا کہ وہ دوپہر کے بعد تھوڑا سا وقت نکال کر آئے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا "دوپہر کو تو والد صاحب کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ میں شام پانچ بجے تک واپس آ جاؤں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں پانچ بجے چھت پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"او کے۔ اکٹھے چائے پئیں گے۔" وہ بولا۔

"چائے تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ بہرحال گپ شپ کرنے کے لئے پی لیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شام پانچ بجے میں چھت پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ نادو سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس سے واپس آ چکا ہے۔ چھ بجے کے لگ بھگ ایس پی برکت قصبے کے بازار میں ایک تو "دوست مرغی" چھوڑ کر واپس آیا تو اس نے بتایا کہ ناگورے نوواری کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "اکیلا ہی تھا؟"

بولا "اکیلا ہی تھا بھوتنی دا۔ لیکن بڑی تیز تیز جا رہا تھا۔ جیسے جھاڑا بیٹھنے (حاجت کے لئے) جا رہا ہو۔"

میں نے کہا "چاچا برکت۔ یہ سیالکوٹ میں تمہارا گاؤں نہیں، سری لنکا ہے۔ یہاں لوگ ایسے کاموں کے لئے باہر نہیں جاتے۔"

وہ بولا "اسی لئے تو ان لوگوں میں حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ انڈوں کے ڈبل ان پر چھاتے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کھیت میں جانے سے حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت کہاں سے آ جاتی ہے۔"

وہ بولا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت آتی ہے صبر سے اور صبر پیدا ہوتا ہے مشق سے اور پریکٹس سے۔ اب ذرا تم سوچو۔ بندے نے آدھ سیر دودھ میں گھیو (گھی) ملا کے پی رکھا ہو یا گنے کے رس کے دو تین گلاس چڑھا رکھے ہوں اوپر سے پڑ جائے اس کو زور دار جانا پڑے گاؤں سے باہر کھیت میں۔ اب بتاؤ اس بھوتنی والے میں صبر کا مادہ پیدا ہوگا یا نہیں۔ سوچو کتنا صبر کرنا پڑے گا اسے۔"

میں نے کہا "واہ۔ آپ نے تو سری لنکا میں نالوں کا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے۔ خرابی کی اصل بنیاد یہی ہے کہ یہ لوگ آپ کے گاؤں کی طرح کھیت میں نہیں جاتے اور گھر میں ہی ٹوائلٹ وغیرہ بنا رکھے ہیں۔"

"تم میری بات کو مذاق کی طرف لے گئے ہو۔" ایس پی برکت نے بُرا سا منہ بنا کر ایک لمبی سی ڈکار لی اور صوفے پر ہی پھیل کر لیٹ گیا۔

ناگورے سے میری ملاقات رات دس بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ پانچ بجے کہاں چلا گیا تھا وہ۔ میں تو اس کا انتظار ہی کرتا رہا۔ میں نے ایس پی برکت کا حوالہ بھی دیا اور کہا "برکت صاحب نے تمہیں وادی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔"

ناگورے کی آنکھوں میں تذبذب کی کیفیت تھی۔ پھر وہ صوفے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گیا کہنے لگا "آپ کو میرے اور انیلا کے افیئر کا علم تو ہو ہی گیا ہے اس لئے آپ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دراصل میں انیلا کے ساتھ گیا تھا۔ یہاں سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک گھاٹی ہے۔ اسے مقامی زبان میں راجا کی گھاٹی کہتے ہیں۔ اس گھاٹی کو علاقے کے لوگ بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ یہاں جو لفظ بھی زور سے پکارا جاتا ہے وہ دو تین بار گونجتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس گھاٹی کے کنارے کھڑے ہو کر جھوٹ بولنے والے پر آسمان سے قہر نازل ہوتا ہے اور وہ دنیا میں ہی اپنے جھوٹ کی سزا پا لیتا ہے۔ اس گھاٹی کے کنارے کھڑے ہو کر لوگ قسمیں کھاتے ہیں اور عہد و پیمان باندھتے ہیں۔ آج میں اور انیلا بھی کچھ عہد و پیمان باندھنے وہاں گئے تھے۔"

"یعنی وہی ساتھ جینے مرنے کی قسمیں۔ عمر بھر محبت نبھانے کے وعدے۔"

"بالکل" ناگورے نے ذرا سا شرماتے ہوئے کہا "لیکن سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہم ابھی گھاٹی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ساتھ والی خانہ بدوش بستی کے لوگ ایک چور کو پکڑ کر وہاں لے آئے اور صفائی وغیرہ مانگنے لگے۔ اس ہنگامے کی وجہ سے ہمیں واپس لوٹنا پڑا۔"

"یعنی کباب میں ہڈی۔"

ناگورے مسکرایا "ایک مرتبہ پہلے بھی ہم گھاٹی کی طرف جاتے جاتے واپس آ گئے تھے۔ موسم ایک دم خراب ہو گیا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے اوپر والے کو منظور ہی نہیں کہ ہم "راجا کی گھاٹی" پر عہد و پیمان باندھیں۔"

میں نے کہا "اصل عہد و پیماں دل میں ہوتے ہیں۔ اگر تم وہ باندھ چکے ہو تو پھر گھاٹی پر جانا یا نہ جانا ایک برابر ہے۔ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو کسی مقدس گھاٹی پر نہیں جاتے پھر بھی ساتھ جینے مرنے کے وعدے نبھاتے ہیں۔"

"بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" ناگورے نے اپنا بڑا سا سر ہلایا "ہاں آپ نے کس بات کے لئے بلایا تھا مجھے؟"

میں نے کہا "بہت اہم بات ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم آئندہ ماہ ہونے والی کراس کنٹری جیتنا چاہتے ہو تو تمہیں اس بات پر عمل بھی کرنا ہوگا۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں جناب۔"

میں نے کہا "میں پچھلے کچھ روز سے بغور تمہاری تیاریوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی مشقت تم کرتے ہو اس کی نسبت سے تمہاری خوراک ناکافی ہے۔ پھر جسمانی فٹنس برقرار رکھنے کے لئے تمہیں خاطر خواہ سہولتیں بھی میسر نہیں۔ میں نے تمہاری ورزش میں استعمال ہونے والا ساز و سامان دیکھا ہے۔ کہیں تم نے رسیوں سے پتھر باندھ رکھے ہیں، کہیں ٹین کے خالی ڈبوں میں سیمنٹ وغیرہ بھر کے "ویٹس" بنا رکھے ہیں۔ یہ سب عارضی انتظامات ہیں۔ اگر تم کھیل کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتے ہو اور نام کمانا چاہتے ہو تو تمہیں بہتر سہولتوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر تم چاہو تو میں اس سلسلے میں تم سے تعاون کر سکتا ہوں۔ کم از کم آئندہ ہونے والی ریس تک تو تمہیں یہ تعاون ضرور حاصل کرنا چاہئے۔"

ناگورے کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولا "جناب! میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر سکوں۔ لیکن میری ایک درخواست ہے۔ آپ اس سلسلے میں مجھے معاف کر دیں۔ میں ٹونی کو اپنے زورِ بازو سے شکست دینا چاہتا ہوں اور انہی لوگوں کے تعاون سے دینا چاہتا ہوں جنہیں وہ نخوتیوں سے بڑھ کر کمزور اور حقیر سمجھتا ہے۔ جہاں تک ورزش وغیرہ کی سہولتوں کا تعلق ہے میں اپنے طریقۂ کار کا عادی ہو چکا ہوں۔ یقین کریں جناب! ٹونی جو فائدے اپنے جدید جمنازیم میں حاصل کرتا ہے۔ میں وہی فائدے اپنے دیسی طریقے سے حاصل کر لیتا ہوں۔ ہاں خوراک کا معاملہ واقعی اہم ہے۔ مجھے بہتر خوراک کی ضرورت ہے اور یہ بات میرے ساتھی بھی سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے مل جل کر ایک فنڈ بنایا ہے۔ اس فنڈ میں سے مجھے

اور ان تین دیگر لڑکوں کو "ڈانٹ" دی جائے گی جو اس ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔"

میں نے ناگورے کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی عزتِ نفس کے حوالے سے بہت حساس واقع ہوا ہے اور کسی قسم کا مالی تعاون قبول نہیں کرے گا۔ میں نے اس پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا ورنہ میرا خیال تھا کہ ایس پی برکت سے کہہ کر ناگورے کے لئے آٹھ دس ہزار روپے کا انتظام کروا دوں گا۔

غزالہ کی حالت بتدریج سنبھل رہی تھی۔ ہڈیوں کے اس ناقابلِ شناخت ڈھانچے میں زندگی کی رمق پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ بہت نحیف اور باریک آواز میں بولتی تھی اور کبھی کبھی اپنے آپ کوشش کر کے کروٹ بدل لیتی تھی۔ جب اس کا دل کروٹ بدلنے کو چاہتا تو وہ عموماً اپنا رخ کھڑکی کی طرف ہی کرتی۔ کھڑکی میں سے اسے سرسبز میدان نظر آتا اور میدان سے آگے گل پوش پہاڑیاں اور پہاڑیوں کے اوپر تیرتے ہوئے اودے بادل' وہ اس وسیع و عریض منظر میں کھو سی جاتی پھر جب دن ڈھلتا اور سرسبز میدان میں نوجوان لڑکے لڑکیاں اور بچے کھیلنے کے لئے آتے تو اس منظر میں غزالہ کی دلچسپی اور بڑھ جاتی۔ وہ بے حس و حرکت بڑی ایک ٹک زندگی کی یہ گہما گہمی دیکھتی رہتی۔ ناگورے غزالہ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ اس کے لئے سرخ گلاب اور رجنی گندھا کے تازہ پھول توڑ کر لاتا اور ان کا گلدستہ غزالہ کے سرہانے سجاتا۔ کسی وقت وہ غزالہ کو سری لنکا کا خاص میوزک سناتا جو بانسری کی مدھم دھن پر بجایا جاتا تھا۔ شام اور صبح کے وقت میدان میں دوڑ لگاتے ہوئے وہ جب کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تو دونوں ہاتھ لہرا کر مجھے اور غزالہ کو "وِش" کرتا۔ وہ اور انیلا دونوں غزالہ کو بڑی بہن (باجی) کہہ کر پکارتے تھے۔ غزالہ اتنی کمزور اور بے جان تھی کہ ان کی محبتوں کے جواب میں اپنا ردِّ عمل بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ بس سپاٹ چہرے اور خاموش آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہتی تھی۔۔۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اب وہ چہروں اور آوازوں کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھی اور جو کچھ اس کے اردگرد ہو رہا تھا اس کے بارے میں جانتی تھی۔

ایک دن جب وہ پہلو کے بل لیٹی کھڑکی سے باہر سرسبز میدان کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگی "یہ ریس کب ہوگی؟"

"اگلے ماہ پانچ تاریخ کو۔"

"میں دیکھ سکوں گی؟" وہ بے حد نحیف آواز میں بولی۔

"کیوں نہیں۔ ریس اسی میدان سے شروع ہو کر اسی میں ختم ہوگی۔"

"ناگورے جیت جائے گا؟" وہ الفاظ توڑ توڑ کر بول رہی تھی۔

"امید تو بہت ہے۔"

کئی ماہ بعد پہلی بار مجھے غزالہ کی نڈھال آنکھوں میں زندگی کی رمق نظر آئی۔ ایک معصوم سا اجالا اس کے چہرے پر پھیلتا محسوس ہوا۔ پھر بہت مدھم آواز میں کہنے لگی "مجھے وہم سا ہو گیا ہے شاہ جہاں! مجھے لگتا ہے کہ اگر ناگورے یہ ریس ہار گیا تو میں بھی مر جاؤں گی۔"

میں نے بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا "ایسی بات نہیں کرتے غزالہ! تم اب بالکل ٹھیک ہو۔ تم زندہ رہو گی۔ اپنے لئے' میرے لئے ہم سب کے لئے۔ اب تو صرف چند دن کی بات ہے۔ تم چھلانگ لگا کر اس بستر سے نیچے اُتر آؤ گی۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور وہ بڑی اداسی سے میدان کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اس میدان کی وسعت میں اپنا مستقبل تلاش کر رہی ہو۔ طویل بیماری کے دوران میں اکثر مریضوں پر اسی قسم کی یاسیت اور بیزاری طاری ہو جاتی ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ واہموں کے تانے بانے بُنتے رہتے ہیں۔ اپنی صحت یا بیماری کو کسی غیر متعلق واقعے یا شے سے منسوب کر لیتے ہیں اور یہ خیال ان کے ذہن میں پختہ ہوتا رہتا ہے۔ مجھے کورس کی کتابوں میں پڑھی ہوئی کہانی "دی لاسٹ لیف" یاد آ گئی۔ اس کہانی میں ایک مریضہ کھڑکی میں سے نظر آنے والی ایک بیل کو دیکھتی رہتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اگر بیل کا کم از کم ایک پتہ بھی خزاں کی دست برد سے محفوظ رہا تو وہ بچ جائے گی۔

یہ سالانہ میلہ شروع ہونے سے ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ میں اور ایس پی برکت مٹر گشت کے بعد واپس آ رہے تھے۔ سائیں عالی کی بات ہو رہی تھی۔ میں ایس پی برکت کو بتا رہا تھا کہ اس شخص میں کسی چھلاوے کی سی خصوصیات ہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اس کی آمد جتنی حیرت انگیز ہوتی ہے۔ رخصتی بھی اتنی تعجب خیز ہوتی ہے۔ میں نے ایس پی برکت کو بتایا کہ وہ اب بھی سری لنکا میں موجود ہے اور کسی بھی وقت اپنا درشن کرا سکتا ہے۔

ایس پی برکت بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کوئی نامی گرامی مجرم ہے۔ جس نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ تھانے میں تھوڑی سی چھترول ہو تو سب کچھ بک دے گا۔"

"توبہ کرو چاچا برکت! وہ بڑی پہنچی ہوئی شے ہے۔" میں نے اسے ٹوکا "یہ نہ ہو کہیں پر حاضر ہو کر تم سے سوال جواب شروع کر دے۔"

ایس پی برکت بولا "او بھئی! تم چھلاوے کی بات کر رہے تھے۔ وہ بھوتنی دی چھلاوی بھی آ گئی ہے۔"

میں نے ایس پی برکت کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ سامنے سے انیلا آتی دکھائی دی۔ وہ پینٹ قمیص میں تھی۔ ہاتھ میں رنگین چھتری اور کندھے پر لیڈیز بیگ تھا۔ ایس پی برکت بولا "تم انگریزی میں گٹ مٹ کرو اس سے۔ میرا تو معدہ بھوتنی دا بھاں بھاں کر رہا ہے بھوک سے۔ میں تو چلا گھر۔"

وہ لمبے ڈگ بھرتا ایک طرف نکل گیا۔ انیلا میرے پاس آن

کھڑی ہوئی۔ رسمی کلمات کے بعد بولی "آپ ناگورے کے دوست بھی ہیں اور وہ بڑے بھائی کی طرح آپ کی عزت بھی کرتا ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیں۔"

"بولو کیا کام ہے؟"

"ناگورے کے جوتے بہت پُرانے ہو چکے ہیں۔ اسے نئے جوتوں کی ضرورت ہے لیکن وہ پُرانے جوتوں سے ہی ریس دوڑ رہا ہے۔ میں نے اس کے لئے جوتے رکھے ہیں۔ ایڈیڈاز ہیں اور خاص طور سے کراس کنٹری ریس کے لئے بنے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار میں مل جائیں گے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے جوتے خرید لئے تو ناگورے لینے سے انکار نہ کر دے۔ ایسے معاملوں میں بڑا ضدی ہے وہ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے طور پر یہ جوتے اسے پریزنٹ کر دیں۔ ریس کے بعد ہم اسے بتا دیں گے۔"

میں نے کہا "انیلا! تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ ناگورے ایسے معاملوں میں بڑا حساس ہے۔ اور میں یہ بات ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں خود چاہتا تھا کہ ناگورے سے کچھ مالی تعاون کروں لیکن اس نے بے حد شکریے کے ساتھ معذرت کر لی۔ وہ یہ "جنگ" اپنے طور پر لڑنا اور جیتنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی یہ ادا قابلِ صد تعریف ہے۔ اسے اپنی توانائیوں پر اور اپنے جذبوں پر بھروسا ہے اور ہمیں اس کے بھروسے کو ڈانواں ڈول نہیں کرنا چاہئے۔"

وہ بولی "بھروسے والی بات بالکل درست ہے جناب لیکن وسائل بھی تو کوئی چیز ہوتے ہیں۔ اور پھر اگر وہ مجھے اپنا سمجھتا ہے تو میری لائی ہوئی چیز اسے قبول کیوں نہیں ہوتی۔ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میرا دل اس کی طرف سے کھٹا ہوتا جا رہا ہے۔"

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ دل کھٹا ہونے کی بات کر رہی تھی لیکن یہ بات اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی' اس کے دل سے نہیں۔ اس کا دل تو پورے کا پورا ناگورے کی محبت کے شہد میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ ناگورے کا حوصلہ بہت بلند ہے۔ تمہیں اور ہم سب کو یہ ریس جیت کر دکھائے گا۔"

وہ اداسی سے بولی "کل پھر ناگورے کا اپنے والد سے جھگڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آخری بار ہے اگر وہ یہ ریس جیت نہ سکا تو بس' اس کے بعد وہ اسے ان الٹے تلّلوں کی اجازت نہیں دیں گے اور اسے سیدھے سیدھے پولیس کی نوکری کرنی ہوگی۔"

میں نے کہا "مستقبل کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ناگورے نام پیدا کرے گا اور کانسٹیبل کے بجائے اچھا ایتھلیٹ بنے گا۔" اسی روز میں نے ناگورے سے اس رقم کے بارے میں بھی پوچھا جو میں نے اسے عشارب اینڈ کو سے بطور بازیابی کروائی تھی۔ ناگورے نے کہا کہ ان کے گھرانے پر چودہ پندرہ برس سے ایک بھاری بھرکم قرضے کا بوجھ تھا جو اس رقم سے اترا ہے باقی رقم سے انہوں نے یہ مکان خریدا ہے جس میں رہتے ہیں۔

○☆○

قصبے کا سالانہ میلہ واقعی دیکھنے کی چیز تھا۔ میلے کے مقام پر کھانے پینے کی اشیا کے بے شمار اسٹال لگائے گئے تھے۔ ایک بہت بڑا بازار تھا جس میں دستکاری کے نمونوں سے لے کر ریڈی میڈ ملبوسات تک ہر چیز برائے فروخت موجود تھی۔ تین دن تک زبردست کھیل تماشے ہوئے۔ ہاتھیوں کا ایک مصنوعی جھیل میں نہانا' سانپوں کا رقص' روشنیوں کا شو اور اس قسم کے بہت سے تفریحی آئٹم اس میلے کا حصہ تھے۔ اسٹیڈیم نما میدان میں کھیلوں کے مقابلے بھی جاری تھے۔ آخری روز کراس کنٹری ریس کا انعقاد ہوا۔ اس روز تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ قصبے کے تماشائی واضح طور پر دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ نوی کا حامی تھا اور دوسرا ناگورے کا۔ ناگورے کے حامیوں میں قصبے کا غریب طبقہ اور متوسط لوگ شامل تھے۔ دس گیارہ بجے کے لگ بھگ ریس شروع ہوئی۔ میں اس وقت اسٹیڈیم نما میدان میں موجود تھا۔ ایس پی برکت بھی میرے ساتھ تھا۔ میدان تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حسب پروگرام پہلے ایتھلیٹس نے تین چار چکر میدان کے اندر ہی لگائے پھر سڑک کی طرف نکل گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر پر اعلانات نشر ہونے لگے۔ ہر اعلان کا پُرجوش تالیوں سے استقبال کیا جاتا تھا۔ ان اعلانات کے مطابق تین چار میل بعد ہی نوی نے دیگر کھلاڑیوں پر لیڈ حاصل کر لی اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ نوی سے بیس تیس گز پیچھے آٹھ لڑکوں کی ایک ٹولی تھی۔ اس میں ناگورے بھی شامل تھا۔ یہ ٹولی نوی سے اپنا فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھی۔ کسی وقت یہ فاصلہ کم ہو جاتا تھا اور کسی وقت زیادہ۔ اس ٹولی سے پیچھے تین تین چار چار لڑکوں کی چند ٹولیاں اور تھیں۔

قریباً تیرہ چودہ کلومیٹر تک یہ صورتِ حال برقرار رہی پھر ناگورے اپنی ٹولی سے نکلا اور اس نے تیزی سے نوی کا تعاقب شروع کر دیا۔ ریس کا یہ مرحلہ خاصا پُرجوش تھا۔ اسٹیڈیم نما میدان میں موجود تماشائیوں کے کان لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر لگے تھے۔ ناگورے کوشش کر کے نوی سے آگے نکل گیا اور پھر اس نے نوی سے اپنا درمیانی فاصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ میدان میں موجود ناگورے کے حامی مسلسل پُرجوش نعرے بلند کرنے لگے۔ ریس اب ایسے علاقے میں داخل ہو گئی تھی جہاں زیادہ تماشائی نہیں تھے۔ لہٰذا اسپیکر پر اعلان بھی لمبے وقفوں کے بعد ہو رہا تھا۔ پھر اعلانات کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ قریباً پون گھنٹے کے وقفے کے بعد اعلانات دوبارہ شروع ہوئے تو ریس اختتامی مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ایتھلیٹس واپس میدان میں

داخل ہونے والے تھے۔ اطلاعات سے پتا چلتا تھا کہ کھیل کا پانسا ایک بار پھر پلٹ چکا ہے۔ نوری سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے کنگ کالج ہی کے دو اور لڑکے تھے۔ تقریباً دو فرلانگ پیچھے چار لڑکوں کی ایک اور ٹولی آ رہی تھی۔ ٹانگورے ان میں بھی شامل نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹانگورے کے لئے ریس جیتنے کا چانس تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ حیرانی کی بات تھی کہ ٹانگورے اتنا پیچھے کیسے رہ گیا۔

جب اگلے دس بارہ لڑکوں میں ٹانگورے کا نام نہیں آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ میں نے اسی وقت ٹانگورے کے ایک قریبی دوست مجاہد علی کو ساتھ لیا اور اس کی تلاش میں روانہ ہوا۔ ہم دونوں ۷۰ سی سی ہنڈا موٹر سائیکل پر سوار تھے۔ ہم اس راستے سے روانہ ہوئے جہاں سے لڑکے واپس آ رہے تھے۔ تین چار میل آگے جانے کے بعد کچھ لڑکوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ہل ٹاپ موڑ کے قریب ایک جیپ کو حادثہ پیش آ گیا ہے اور ٹانگورے سمیت کئی ایتھلیٹ وہاں رکے ہوئے ہیں۔ "ہل ٹاپ موڑ" وہاں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم تیزی سے وہاں پہنچ گئے۔ میرے ذہن میں بے شمار سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں ٹانگورے کے ساتھ کوئی سازش تو نہیں ہوئی تھی؟ وہ کیوں پیچھے رہ گیا؟ جس جیپ کو حادثہ پیش آیا وہ کس کی تھی؟

ان تمام سوالوں کے جوابات ہمیں جائے حادثہ پر پہنچ کر ملے۔ جیپ موڑ کاٹتے ہوئے بے قابو ہوئی تھی اور پختہ سڑک سے قریباً پچاس فٹ نیچے کھائی میں جا گری تھی۔ اس جیپ میں دو نوجوان تماشائی سوار تھے۔ دو اسٹیڈیم نما میدان سے ایتھلیٹس کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں ان کی تصاویر اتارتے رہے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے۔ پھر وہ ایتھلیٹس سے آگے نکل گئے اور ہل ٹاپ موڑ پر حادثے کا شکار ہو گئے۔ ان کی جیپ بلندی سے لڑھک گئی تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان تو جیپ کے اندر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوسرا جیپ کے نیچے دب گیا تھا۔ اور مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا تھا۔

جب ہم جائے حادثہ پر پہنچے تو جیپ کو آگ لگی ہوئی تھی اور اس کا بیشتر حصہ جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ بے ہوش نوجوان کو ایک ٹیکسی کار میں ڈال کر اسپتال روانہ کیا جا چکا تھا اور زخمی نوجوان کو ٹانگورے اور اس کا ایک دوست سہارا دے کر اوپر لا رہے تھے۔ یہ نوجوان پڑھا لکھا نظر آتا تھا اور لباس سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا لگتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں اور کندھے پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اسے پختہ سڑک پر لایا گیا اور پھر ایک ویگن میں ڈال کر اسپتال روانہ کر دیا گیا۔

میں نے ٹانگورے سے پوچھا "یہ سب کیا اور کیسے ہوا؟"

ٹانگورے نے پسینے سے بھیگے ہوئے بال پیشانی سے ہٹائے اور نڈھال سا ہو کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے انداز میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔ ٹانگورے اپنے حریف نوری کو قریباً ایک فرلانگ پیچھے چھوڑ چکا تھا اور یہ درمیانی فاصلہ مزید بڑھ رہا تھا۔ ٹانگورے جانتا تھا کہ اگر وہ ڈیڑھ دو میل بھی یہ "حیثیت" برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تو پھر اس کی کامیابی کا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا۔ وہ اپنی جیت کے سلسلے میں بہت پر امید تھا۔ لیکن پھر اچانک سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ جب وہ بھاگتا ہوا "ہل ٹاپ موڑ" کے نزدیک پہنچا تو اسے کسی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے چند قدم ڈھلوان کی طرف اٹھائے اور نیچے گہرائی میں جھانکا۔ یہ دیکھ کر وہ لرز گیا کہ ایک جیپ الٹی پڑی ہے اور اس کے نیچے دبا ہوا شخص مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ ٹانگورے نے پہچان لیا کہ یہ وہی جیپ تھی جو ان کے ساتھ ہی میدان سے روانہ ہوئی تھی اور ریس کے روٹ پر ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جیپ کے انجن سے شعلے اٹھ رہے تھے اور وہ کسی بھی وقت دھماکے سے اڑ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں جیپ کے اندر موجود دونوں افراد کا بچنا محال تھا۔ ٹانگورے نے پلٹ کر دیکھا۔ نوری اسے نظر آ رہا تھا۔ وہ اب بھی اس سے ڈیڑھ دو سو میٹر دور تھا۔ یہ کڑی آزمائش کے لمحات تھے۔ ٹانگورے کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ رکے بغیر آگے بڑھ جائے۔ وہ یہ ریس جیت رہا تھا۔ سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کی آواز اور کہہ رہی تھی۔ بونٹ کے شعلے بلند تر ہو رہے تھے۔ چند لمحے عذاب ناک کشمکش میں گزارنے کے بعد ٹانگورے نے نشیب کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس نے جیپ کے نیچے دبے ہوئے شخص کو نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا پھر سڑک پر آیا۔ نوری اب موڑ پر سے گزر رہا تھا۔ ٹانگورے نے چیخ کر کہا "رک جاؤ نوری! یہاں حادثہ ہو گیا ہے۔ ایک بندہ مر رہا ہے۔ رک جاؤ۔"

نوری سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کے عقب میں پندرہ بیس قدم کی دوری پر دوڑتے ہوئے دو لڑکے بھی بغیر رکے آگے نکل گئے۔ ٹانگورے پھر بھاگ کر جیپ تک پہنچا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈالی اور سرتوڑ کوشش کے بعد زخمی کو جیپ تلے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے اندر بے ہوش پڑے شخص کو بھی نکال لیا۔ اور دونوں کو گھسیٹ کر جیپ سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔ اسی دوران میں جیپ کی فیول لائن نے آگ پکڑ لی اور چند لمحے بعد دھماکے سے پوری جیپ آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ دھماکے کی آواز سن کر کچھ اور ایتھلیٹ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے امدادی کارروائی شروع کر دی۔

ٹانگورے نے دو مرتے ہوئے افراد کی جان تو بچا لی تھی لیکن جیتی ہوئی ریس ہار گیا تھا۔ اس دفعہ بھی فاتح نوری ہی قرار پایا۔ ٹانگورے کے حصے میں صرف ستائشی کلمات اور تعریف و توصیف آئی۔ جن دو افراد کو اس نے جان لیوا خطرے سے نکالا تھا۔ ان کا تعلق کولمبو سے تھا اور وہ صرف ریس دیکھنے کے لئے نوریلیا آئے تھے۔ ان کے ورثا نے ٹانگورے کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہا

ن اس نے شکریے سے انکار کر دیا۔ دو روز بعد قصبے کے پوش انے میں سرداروں کی فیملی نے اپنے سپوت کی فتح کا جشن منایا۔ ا بجانا ہوا اور پٹاخا چلایا گیا۔ دوسری طرف قصبے کے عام لوگوں مایوسی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے کچھ نوری کی فتح کو چیلنج دہے تھے لیکن ان کی سننے والا کون تھا۔ غزالہ کو بھی یہ خبر ہو چکی ی کہ ٹانگورے ریس نہیں جیت سکا۔ ٹانگورے کی اس ناکامی کا الہ کی صحت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس کے ذہن میں انے کیا بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ حد درجہ مایوس نظر آنے لگی تھی۔ ا اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ میرا دل رکھنے کے لئے بہت یکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا لیتی۔

ایک دن میں کمرے میں بیٹھا ایس پی ساہی صاحب کو خط لکھ رہا تھا۔ اس خط میں میں نے ساہی صاحب کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور اپنا ایڈریس وغیرہ بھی بتا دیا تھا۔ جس وقت میں خط کی آخری سطور لکھ رہا تھا ایس پی برکت دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی پھولی ہوئی ناک کچھ اور پھولی ہوئی تھی۔ کہنے لگا "شاہ صاحب! لگتا ہے یہاں کوئی بکرے کے کھروڑے (پائے) بھون رہا ہے۔ تمہیں خوشبو نہیں آ رہی ہے؟"

"مجھے تو زکام لگا ہے چاچا! ناک بالکل بند ہے۔ لیکن اگر کوئی بھون بھی رہا ہے تو ہمیں کیا؟"

"ہمیں کیوں نہیں۔" وہ تنک کر بولا "ہم نے خرچہ دیا ہے ان لوں کو۔ ہمیں تو ابھی دال چاول کھلاتے ہیں اور خود بھونی دے بکے لگا رہے ہیں۔"

"چاچا اگر تمہیں پائے زیادہ پسند ہیں تو کل ان سے پکوا لیں گے۔"

"بات پسند ناپسند کی نہیں۔ اصول اور انصاف کی ہے۔"

"ایک تو تم چاچا ہر بات میں انصاف اور قانون لے آتے ہو۔ اب چوری چھپے پائے پکانے پر کوئی دفعہ نہ لگا دینا۔"

ایس پی برکت نے خالص دیہاتی نعرہ لگایا "دفعہ پر کانوں تو ہر جگہ لگ سکتی ہے پتر جی! یہاں بھی لگ سکتی ہے۔"

میں نے نتھنے سکوڑے۔ خوشبو تو واقعی آ رہی تھی جیسے کہیں چمڑا جل رہا ہو لیکن یہ پائے بھوننے کی خوشبو ہرگز نہیں تھی۔ میں قلم رکھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ خوشبو یا بدبو نچلی منزل سے آ رہی تھی۔ میں زینے اتر کر نیچے آیا۔ ٹانگورے کا کمرا زینوں کے پاس ہی تھا۔ میں نے ادھ کھلے دروازے سے جھانکا۔ وہ کمرے میں موجود تھا اور بیڈ پر جھکا ہوا "بستر بند" باندھ رہا تھا۔ چمڑا جلنے کی بدبو اسی کے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا آتش دان میں آگ بھڑک رہی ہے اور کوئی شے تیزی سے جل رہی ہے۔ میں نے اندر جا کر غور سے دیکھا۔ یہ ٹانگورے کے اسپورٹس شوز تھے۔ وہ جل کر راکھ ہو چکے تھے۔

"یہ جوتے کیوں جلائے تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"اب کیا کرنا تھا ان کا؟" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

"بہت الٹی کھوپڑی ہے تمہاری۔"

"کھوپڑی تو شاید سیدھی ہے تقدیر الٹی ہے۔"

"اور یہ بستر کیوں باندھ رہے ہو؟"

"تو کیا کروں۔ گھر والے دھکے دے کر نکالیں تو نکلوں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے اپنے والد صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ آخری بار ریس میں حصہ لے رہا ہوں اگر نہ جیت سکا تو نوکری پر چلا جاؤں گا۔"

"لیکن ٹانگورے تم یہ ریس ہارے نہیں ہو۔ سب جانتے ہیں کہ تم یہ ریس نہیں ہارے۔ تمہیں یوں مایوس ہونے اور قصبہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں جناب" وہ آزردگی سے بولا "میں اب اپنے گھر والوں پر اور بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ شاید والد صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میرے سر پر جوان بہنوں کا بوجھ ہے اور جن پر جوان بہنوں کا بوجھ ہو انہیں یہ کھیل تماشے زیب نہیں دیتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ٹانگورے بے حد مایوس اور دل گرفتہ ہے۔ اس کی سوچوں پر مکمل قنوطیت طاری تھی۔ میں اسی وقت نکلا اور ٹانگورے کے جگری یار مجاہد کے گھر جا پہنچا۔ وہاں ٹانگورے کے آٹھ دس ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ وہ سب اس نئی صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد غیر متوقع طور پر انیلا بھی وہیں آ گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹانگورے سخت افسردہ ہے۔ اسے ہم سب کی ہمدردی اور ڈھارس کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر اپنا کردار ادا نہ کیا تو وہ ہمیشہ کے لئے بددل ہو جائے گا۔

ٹانگورے کا ایک پرجوش ساتھی بولا "ہم اسے بددل نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اس کے ساتھ تھے اور اب بھی اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے لئے ہم ہر قربانی دیں گے۔"

ایک بوڑھے شخص نے سنہالی میں جو کچھ کہا اس کا ترجمہ یہ تھا "ہم ٹانگورے کو پھر دوڑتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب دام سنہا سے ملیں گے اور اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ بیٹے کو شہر بھیجنے کا خیال دل سے نکال دے۔"

بہت سے افراد نے اس خیال کی پرزور تائید کی۔ محفل کے شرکا کی تعداد اب بیس پچیس کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ سب ٹانگورے کے پرستار تھے۔ اس موقع پر انیلا نے ایک مختصر لیکن مؤثر تقریر کی۔ اس تقریر کا مفہوم یہ تھا "ٹانگورے ایک زبردست کھلاڑی ہے۔ اس نے نوری سے شکست نہیں کھائی لیکن اب وہ حالات سے شکست کھا رہا ہے۔ اسے تعاون کی ضرورت ہے اور یہ تعاون اسے صرف آپ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے آپ لوگوں کے سوا اور کسی کا تعاون قبول نہیں۔ اور آپ سے بھی وہ کوئی مالی

امداد نہیں چاہتا۔ اسے صرف آپ کی پرجوش حمایت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کے ارد گرد رہیں اور آپ کی آنکھوں میں اس کی کامیابی کی امید روشن رہے۔"

میری اور انیلا کی باتوں نے ناگورے کے ساتھیوں پر خاطر خواہ اثر کیا۔ یہ سب نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ کوئی دکاندار تھا۔ کوئی دہاڑی دار تھا۔ کوئی مزدور تھا اور کوئی ملازم۔ لیکن ان سب کے ذہنوں میں صرف ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا۔ وہ ناگورے کو فتح مند دیکھنا چاہتے تھے۔ میں اور انیلا تو ناگورے کے ساتھیوں کو ہوش دلا کر واپس آ گئے تاہم وہ سارے رات گئے تک میٹنگ میں مصروف رہے۔ صبح مجھے معلوم ہوا کہ رات مجاہد علی کے گھر میں قصبے کے چار پانچ عمر رسیدہ و معزز افراد بھی جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ناگورے کے باپ رام سنہا کو وہاں بلا لیا تھا۔ رام سنہا کو سمجھا بجھا کر انہوں نے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ بیٹے کو پولیس کی نوکری کے لئے شہر نہیں بھیجے گا۔ وہ یہیں قصبے میں رہے گا اور ان مقابلوں کے لئے تیاری کرے گا جو آئندہ ماہ کینڈی میں ہوں گے۔ اس میٹنگ میں ایک اور اہم کام بھی ہوا تھا۔ رام سنہا کا اس کے چچا زاد سے تصفیہ کرا دیا گیا تھا۔ رام سنہا کی دکان اسے واپس مل گئی تھی اور اب وہ وہاں کاروبار کرنے کے لئے آزاد تھا۔

اس روز دوپہر کے بعد قصبے کے لوگوں نے ایک بڑا جلوس نکالا۔ ناگورے کو کندھوں پر اٹھایا گیا اور منچلوں نے بانسری اور ڈھول کی لے پر رقص کیا۔ سنہالی اور تامل زبانوں میں جو نعرے لگائے گئے ان کا مطلب یہ تھا کہ "اصل فاتح ناگورے ہے۔ زرائی بے شک سرداروں کے لڑکے کو ملی ہے لیکن ہمارے دلوں کی زرائی ناگورے کے لئے ہے۔"

O☆O

ناگورے کی ویران بیٹھک پھر آباد ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر نئے عزم سے کھیل کے میدان میں واپس آ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب نوی کو ہرانا صرف ناگورے کا مسئلہ نہیں رہا قصبے کے تمام غریب لوگوں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ وہ اس معاملے کو ایک چیلنج کے طور پر لے رہے تھے۔ اٹھارہ بیس برس سے وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ کراس کنٹری ریس کی زرائی سردار ڈیلی کے لڑکے اٹھا رہے ہیں۔ ایک طویل انتظار کے بعد ان کی صفوں سے ایک ایسا باصلاحیت نوجوان آگے آیا تھا جو سردار ڈیلی کو ہرا سکتا تھا۔ وہ اس سنہری موقع کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔

ایس پی برکت سادا ان پر دو ہوتا تھا۔ بے شک وہ حالات کی مہربانی سے ایس پی بن گیا تھا لیکن اس کے اندر ایک دیہاتی تھانیدار کی روح بسی ہوئی تھی۔ ملزمان سے گالی گلوچ اور مار دھاڑ کئے بغیر اس کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ بہت جھلایا ہوا سا رہتا تھا۔ ہر آنے جانے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا۔ جیسے دل چاہ رہا ہو کہ فوراً کسی کو مشتبہ سمجھ کر پکڑ لے اور مار مار کر "برانٹ" بنا دے۔ ایک روز ناشتا کر کے ایسا نکلا کہ سہ پہر تک واپس نہیں آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی سے جھگڑ ہی نہ پڑا ہو۔ جھلاہٹ میں تو وہ کسی سے بھی سر پھٹول کر سکتا ہے۔ یہاں کسی کو کیا معلوم تھا کہ وہ ایس پی ہے۔ ہتھیار وغیرہ بھی اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ اگر نال غنڈے کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ ساری تھانیداری پر استری کر دیتا۔

میں اسے ڈھونڈنے کے لئے نکلا۔ قصبے کی بڑی سڑک سے ہوا میں آبادی سے باہر نکل آیا۔ یہاں ڈھلوان میں دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا اور درختوں میں کہیں کہیں بندر اور ان کے ... پھدکتے ہوئے نظر آ جاتے تھے (ایک روز انہی درختوں میں الجھ کر برکت ٹیکری کی مسواک ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا)۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی لیکن درختوں کے نیچے کپڑے بھیگنے سے محفوظ تھے۔ ویسے بھی موسم ایسا نہیں تھا کہ بھیگنا برا لگے۔ یونہی ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک آواز نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نشیب میں تھا۔ یہ آواز بلندی سے آئی تھی۔ میں نے دیکھا انیلا تیزی سے بھاگتی ہوئی میری طرف آ رہی ہے۔ وہ بوشرٹ اور جینز میں تھی۔ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ قریب آ کر اس نے بازو پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے بولی "پلیز شاہ جہاں صاحب! آئیے میرے ساتھ نوی اور ناگورے لڑ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی مر جائے گا۔ پلیز آئیے میرے ساتھ۔"

وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ بھیگی ہوئی باریک بوشرٹ میں اس کا "ماڈرن" جسم پورے کا پورا چھپی ہوئی شمع کے مانند جھلک رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں چھپا پا رہی تھی اس کی بوشرٹ۔ میں نے پوچھا "کہاں ہے ناگورے؟"

اس نے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا "کیسے ہوئی لڑائی؟" میں نے بھاگتے بھاگتے پوچھا۔

"میں اور ناگورے بیٹھے تھے اوپر سے نوی آ گیا۔ ناگورے کو برا بھلا کہنے لگا" انیلا نے بھی بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔

ہم چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے قریباً ایک فرلانگ آگے آ گئے۔ میں نے دور ہی سے نوی اور ناگورے کو دیکھ لیا۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ دونوں کے کپڑے کیچڑ اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور ہونٹوں سے غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔ نوی نیچے تھا اور ناگورے اوپر۔ نوی نیچے پڑے پڑے ناگورے کی گردن دبا رکھی تھی اور اسے اپنے اوپر سے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے زور لگا کر ناگورے کو نوی کے اوپر سے کھینچا اور پیچھے ہٹا لیا۔ انیلا نے نوی کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ نوی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پھرتی سے ٹانگ چلائی۔ یہ شدید ضرب ناگورے کے سینے پر لگی اور وہ درد کی شدت سے دُہرا ہو کر گر گیا۔

ناگورے کو گرتے دیکھ کر نوی اور بھی شیر ہوا اور ناگورے پر جھپٹا۔ میں نے مضبوطی سے اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں۔ وہ ہنکارا "پیچھے ہٹ جاؤ تم۔ میں اس حرامی عاشق کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کلائیاں چھڑانے کے لئے زور مارا۔ نوجوانی اور امارت کے نشے نے اسے شہ زور بنا رکھا تھا لیکن اتنی طاقت اس میں پھر بھی نہیں تھی کہ استاد جمالی سے اپنی کلائیاں چھڑا سکتا۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کے لئے کلائیوں کو ذرا سا مروڑا تو اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے اور وہ باحیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اس کی ناتوانی کا احساس دلا کر میں نے کلائیاں چھوڑ دیں۔ وہ ایک بار پھر ناگورے پر جھپٹا اور اس کا گریبان پکڑ لیا "اگر ماں کا دودھ پیا ہے تو پھر زبان پر قائم رہنا۔ آؤ میرے ساتھ... کھاؤ قسم۔"

ناگورے نے زور لگا کر گریبان چھڑایا اور بولا "ہاں اٹھاؤں گا اور پوری کر کے بھی دکھاؤں گا۔ تیرا لعنتی منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دوں گا۔"

نوی نے کہا "تو پھر سوچتے کیا ہو آؤ۔"

ناگورے نے سینہ تان کر کہا "چلو آؤ۔"

دونوں بڑے طیش بھرے انداز میں گھنے درختوں کی طرف چل دیے۔ میں حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے۔ انیلا بھی گم صم سی ایک پتھر پر کھڑی تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ میں نوی اور ناگورے کے پیچھے گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں پھر گتھم گتھا نہ ہو جائیں۔ بیس پچیس قدم چل کر وہ رک گئے۔ سامنے ایک گہری کھائی نظر آ رہی تھی۔ اس کھائی کے پار دور اونچی چوٹیاں تاریک بادلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی کھائی ہے جسے مقدس سمجھا جاتا ہے اور "راجا کی کھائی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لوگ اکثر قسمیں کھاتے تھے اور منتیں مانگتے رہتے تھے۔ اس وقت رم جھم کی بارش میں یہ کھائی بالکل سنسان نظر آ رہی تھی۔

"ہاں کھاؤ قسم" نوی نے گرجدار آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں کوئی تھی محسوس ہوئی۔

جواب میں ناگورے نے بڑے فیصلہ کن انداز میں ایک دو الفاظ ادا کئے۔ اس کی آواز چونکہ مدھم تھی لہٰذا میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ اس نے انیلا کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ بڑا ڈرامائی اور فلمی سا منظر تھا یہ۔ یوں لگا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو۔ انیلا پتھر پر کھڑی تھی۔ اس سے بیس تیس قدم آگے میں تھا۔ ہماری طرف پشت کئے نوی اور ناگورے کھڑے تھے اور ان کے گرد اس دھواں سی بارش نے ہر چیز کو ڈھانپ رکھا تھا۔

ہوئی تھی۔ وہاں ناگورے کا مفلر اور جوتے پڑے تھے۔ انیلا نے یہ دونوں چیزیں اٹھا کر ناگورے کو دیں۔ ناگورے نے مفلر نما کپڑے سے ہونٹوں کا خون پونچھا اور جوتے پہن کر ہمارے ساتھ چل دیا۔

گھر پہنچ کر ناگورے نے مجھے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ ناگورے اور انیلا ڈھلوان کے پتھروں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ادھر سے نوی آ گیا۔ غالباً وہ ان کی ٹوہ لگاتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے حسب عادت ناگورے کو طنز کا نشانہ بنایا اور کہا کہ ایک شکست خوردہ لڑکے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ قصبے کی سب سے خوب صورت لڑکی کا فاتح کہلائے۔ اس طرح کی کچھ اور باتیں بھی اس نے کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں لڑ پڑے۔ ناگورے نے نوی سے کہا کہ شکست خوردہ میں نہیں تم ہو۔ اور اگلے مقابلے میں سارا قصبہ تمہاری شکست کو دیکھ لے گا۔ جواب میں نوی نے کہا کہ جب تم جیتو گے پھر دیکھا جائے گا۔ اب تم کس برتے پر انیلا کے ساتھ گھومتے نظر آتے ہو۔ انیلا ہمارے کالج کی لڑکی ہے۔ اور تمہارا اس کے ساتھ گھومنا ہمارے لئے انتہائی بے عزتی کا معاملہ ہے۔ ناگورے نے کہا ٹھیک ہے اب میں تمہیں شکست دے کر ہی انیلا کا ہاتھ پکڑوں گا۔ نوی نے ناگورے کو جھوٹا دغاباز اور ریچ قرار دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ انیلا پہلے انہیں چھڑانے کی کوشش کرتی رہی جب صورت حال سنگین دیکھی تو کسی کی مدد حاصل کرنے کے لئے بھاگی۔ راستے میں اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ مجھے لے کر موقع پر پہنچ گئی۔ دست بدست لڑائی ختم ہونے کے بعد نوی' ناگورے کو کھینچ کر پاس ہی واقع "راجا کی کھائی" پر لے گیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی "جیت" تک انیلا سے نہ ملنے کی قسم کھائے۔ ناگورے نے بڑے عزم کے ساتھ یہ قسم کھائی تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ جب تک نوی کو شکست فاش نہیں دے دے گا انیلا سے بات کرے گا اور نہ ہی اس سے کوئی تعلق رکھے گا۔

یہ ناگورے اور انیلا کی کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ تھا۔ ناگورے کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ نوی' انیلا پر نگاہ رکھتا ہے اور باتوں باتوں میں کئی بار اسے ورغلانے کی کوشش کر چکا ہے۔ اسے انیلا کا ناگورے سے ملنا جلنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور وہ اپنی اس ناپسندیدگی کا کھل کر اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ یہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ نوی اور اس کے دوست ناگورے کو طنز کا نشانہ بناتے تھے اور فقرے کستے تھے۔ راجا کی کھائی پر ڈرامائی انداز میں قسم کھانے کے بعد ناگورے کے لئے نوی سے ریس جیتنا زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ اس نے بے حد تندہی سے ریس کی تیاری شروع کر دی۔ یہ ریس صوبائی سطح کی تھی اور کچھ عرصے بعد کینڈی میں منعقد ہونا تھی۔ مختلف علاقوں سے قریباً دو سو ایتھلیٹ اس میں حصہ لے رہے تھے۔ ریس منعقد ہونے

دوڑی جا رہی ہو۔ ناگورے کے پرجوش ساتھی ہر پل اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور اس کی دیکھ بھال اور ٹہل سیوا میں مصروف رہتے تھے۔

غزالہ کی حالت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ اب وہ کبھی کبھی تکیے کے سہارے بیٹھ جاتی تھی۔ اس کی زبان کی لکنت ختم ہو گئی تھی۔ گو اس کی آواز اب بھی بہت کمزور تھی لیکن اس کی بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہڈیوں کے ایک ناقابلِ شناخت ڈھانچے میں سے پھر وہی پانچ ماہ پہلے کی غزالہ نمودار ہو رہی ہے۔ اس کے خد و خال اب پہچانے جاتے تھے اور آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس نے ایک بار بھی شیخ عاصم کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ یہ پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے اور نہ یہ دریافت کیا تھا کہ وہ کب آئے گا۔ میں نے بھی اس کا ذکر چھیڑ کر غزالہ کو آزردہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کچھ بھی تھا بہرحال وہ اس کا شوہر تھا۔ میں نے ابھی اسے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ ائیرپورٹ کے رستے میں ہمیں فاقہ زدہ شکاریوں نے اغوا کر لیا تھا اور شیخ عاصم سے ہماری جان کا تاوان طلب کیا تھا۔ جس کے جواب میں شیخ نے مکمل خاموشی اختیار کی تھی۔

شیخ عاصم کے ساتھ ساتھ شکر شکرا کے بارے میں بھی ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ بھی شیخ کے ساتھ امارات میں ہے۔ میں نے ایک روز ایس پی برکت کو ان دونوں کے کھوج میں کولیو بھیجا تھا۔ ایس پی برکت نے واپس آ کر بتایا تھا کہ وہی چیلس بند پڑا ہے اور امارات سے ان دونوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں آئی۔

غزالہ نے اپنے والدین اور چھوٹے بھائی کا ذکر بھی بس ایک دو بار ہی کیا تھا۔ ہاں فریال کے بارے میں اسے بہت تشویش تھی۔ اسے دلی طور پر اس بات کا رنج تھا کہ فریال کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے اور اس نے وہی چیلس میں قیدِ تنہائی کے اذیت ناک دن کاٹے ہیں۔ میں نے فریال کے بارے میں غزالہ کو بہت تسلی دی تھی اور اسے بتایا تھا کہ میں فریال کو بحفاظت پاکستان میں ساہی صاحب کے پاس پہنچا چکا ہوں لیکن اسے وہم تھا کہ شاید میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ آخر پاکستان سے ساہی صاحب کا خط آ گیا جس میں انہوں نے فریال سمیت سب کی خیریت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے یہ خط غزالہ کو دکھایا تو تب اس کی تسلی ہوئی۔ ساہی صاحب کے خط کے ساتھ ہی ایک اور خط بھی آیا تھا۔ یہ لفافہ بند خط زرین محل کا تھا۔ اس نے میری خیر خیریت پوچھی تھی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں امداد تی کی خیر خیریت بھی پوچھی تھی۔ بڑے اداس موڈ میں اس نے کچھ دردناک شعر بھی لکھے تھے۔ مثلاً ایک شعر یہ تھا۔

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے
رو رو کے گزرتی ہیں راتیں آنکھوں میں سحر ہوجاتا ہے

[illegible]

ماہ میں دو تین دفعہ آ کر اسے دیکھ چکا تھا۔ اس نے غزالہ کی صحت کی رفتار کو تسلی بخش قرار دیا تھا۔ غزالہ اپنا زیادہ تر کمرے میں گزارتی تھی۔ بستر پر لیٹی رہتی یا تکیے سے ٹیک لگا جاتی اور دیوار گیر کھڑکی میں سے میدان کا منظر دیکھتی رہتی۔ اس بات پر خوش تھی کہ ناگورے پھر سے ریس کی تیاری کر رہا ہے۔ ناگورے جب میدان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگ رہا ہوتا تو غزالہ یہ منظر دیکھنے کے لئے خاص طور سے اٹھ بیٹھتی۔ اس کی ویران آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہونے لگتی۔ ناگورے غزالہ کو بڑی بہن (باجی) کہتا تھا اور اس کا بہت رکھتا تھا۔ میں جب غزالہ کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو وہ اور غزالہ سے دلجوئی کی باتیں کرتا۔ اسے سنہالی زبان کے لطیفے یاد تھے جنہیں وہ ترجمہ کر کے غزالہ کو سناتا۔ ناگورے کی چھوٹی بہن نادرہ بھی اکثر غزالہ کے پاس بیٹھی نظر آتی۔ وہ سب والے غزالہ سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔

ایک دن میں غزالہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر بالکونی میں لے آیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آسمان صاف تھا اور سنہری دھوپ نے پھیلی ہوئی ہریالی کو چمکا رکھا تھا۔ نادرہ نے غزالہ کا سر دھویا تھا اور بال کنگھی کر کے جوڑے کی صورت گردن پر باندھ دیئے تھے۔ گاؤن کی کشادہ آستینوں میں سے غزالہ کے بازو بہت دبلے نظر آ رہے تھے جیسے وہ کسی مریض سوکھی کے بازو ہوں۔ میدان میں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان میں ناگورے بھی تھا۔ غزالہ کمزور آواز میں بولی "ناگورے کو دیکھ کر نجانے مجھے نیپو یاد آ جاتا ہے۔"

نیپو غزالہ کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ وہ تقریباً ناگورے کا ہم عمر تھا۔ میری معلومات کے مطابق غزالہ اور نیپو ہر وقت جھگڑتے رہتے تھے۔ آپس میں کبھی بھی ان کی بنی نہیں۔ اب اپنے وطن اور اپنے پیاروں سے دور ہونے کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ وہ درحقیقت اپنے چھوٹے بھائی سے کتنا پیار کرتی ہے۔ میں اکثر اس کا نام غزالہ کے ہونٹوں پر سنتا تھا۔ سے غزالہ کی وابستگی کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ وہ نیپو کی طرح کھلاڑی تھا۔ غزالہ محبت سے ناگورے کو تھی۔ کہنے لگی "ناگورے جیت تو جائے گا نا؟"

"ضرور جیتے گا۔" میں نے کہا۔

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "جس دن وہ دن میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ میں یہ ریس دیکھ سکوں گی نا؟"

میں نے کہا "وہ ریس یہاں نہیں کسی اور شہر میں ہوگی۔ ویسے بھی ان مقابلوں میں خاصے دن باقی ہیں۔ ابھی دیر تک تھوڑا ہی دیکھیں گے۔ تم ماشاءاللہ تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہو۔ اللہ نے چاہا تو تین چار ہفتے میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"[illegible] میرے ساتھ [illegible]

ہوا اور کیا تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ خالی خالی نظروں سے اپنی گود میں دیکھتی رہی۔ پھر بولی "شاہ جہاں! آپ نے میرے لئے بہت دکھ اٹھایا ہے۔ میں آپ کے احسانوں کا بدلہ کیسے چکاؤں گی۔"

"خاموش" میں نے اسے ڈانٹا "بیگانوں جیسی باتیں مت کرو۔ اس سے مجھے واقعی دکھ ہوگا۔"

"لیکن۔"

"بس چپ۔ کوئی بات نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اچانک ہمیں چونکنا پڑا۔ نیچے میدان میں ہلچل سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک لمبا تڑنگا نوجوان جس کا حلیہ ہپیوں جیسا تھا اور جو سرخ جیکٹ و پتلون پہنے ہوئے تھا ناگورے سے جھگڑ رہا تھا۔ میں نے اس نوجوان کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ صورت سے ہی وحشی اور غصیلا نظر آتا تھا۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر باتیں کر رہا تھا۔ ناگورے پہلے کچھ پریشان نظر آیا پھر وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے لگا۔ فاصلہ زیادہ تھا اس لئے ہمیں ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ قصبے کے ایک دو بزرگ افراد بھی میدان میں موجود تھے۔ وہ ناگورے اور وحشی صورت شخص کے درمیان آ گئے اور دونوں کو لڑنے جھگڑنے سے روک دیا۔

یہ منظر دیکھ کر غزالہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ میں اسے کمرے میں لے آیا۔ شام کے بعد مجھے ناگورے کے قریبی دوست مجاہد کی زبانی معلوم ہوا کہ وحشی صورت نوجوان کا نام سرجیت ہے۔ وہ ناگورے کی محبوبہ انیلا کا سگا بھائی ہے۔ وہ انگلینڈ میں تھا اور چند دن پہلے ہی سری لنکا واپس پہنچا ہے۔ مجاہد نے یہ بھی بتایا کہ ماضی میں سرجیت کا نوجی وغیرہ سے دوستانہ رہا ہے۔

میں نے پوچھا "شام کو کیا واقعہ ہوا تھا؟"

وہ بولا "یہ سرجیت بہت خرد ماغ شخص ہے۔ شاید نوجی وغیرہ نے اسے انیلا کے سلسلے میں بھڑکایا ہے۔ وہ ناگورے کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ تو ایک دو معزز افراد بیچ میں آ گئے ورنہ شاید لڑائی ہی ہو جاتی۔"

میں نے کہا "یہ شخص شکل صورت سے خطرناک لگتا ہے۔"

مجاہد بولا "خطرناک تو ہے جی۔ قصبے میں اکثر لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ ایک ٹرک ڈرائیور کو قتل کر کے انگلینڈ بھاگا تھا وہاں سے تین چار سال بعد واپس آیا ہے۔"

میں نے کہا "اس شخص کی طرف سے تم لوگوں کو ہوشیار رہنا درست ہے۔"

"میں ابھی تھوڑی دیر پہلے یہی بات ناگورے سے کہہ رہا تھا" مجاہد بولا "آپ بھی اسے سمجھائیں۔"

"تم لوگوں کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" مجاہد نے جواب دیا "یہ تو اب اس قصبے میں غریبی اور امیری کی جنگ بن گئی ہے جناب۔ وہ لوگ اپنے انداز میں تیاریاں کر رہے ہیں ہم اپنے انداز میں۔ وہ اپنے ایتھلیٹس کو ڈبا بند امپورٹڈ خوراکیں کھلا رہے ہیں ہم چاول چپاتی پر گزارا کر رہے ہیں۔ وہ جدید جمنازیم میں ورزشیں کرتے ہیں ہم ڈنڈ بیٹھک لگا کر خود کو فٹ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس دس دس جوتے ہیں ہم ننگے پاؤں بھی دوڑ لیتے ہیں۔ وہاں پیسہ کام کر رہا ہے یہاں جذبے کام کر رہے ہیں۔ اور آپ دیکھ لینا جناب اس مرتبہ ٹرافی ہمارا ناگورے ہی اٹھائے گا۔ اور اللہ نے چاہا تو پہلی دس پوزیشنوں میں آدھے سے زیادہ لڑکے ہمارے ہوں گے۔"

"وِش یو گڈ لک۔" میں نے تہِ دل سے کہا۔

O☆O

اس رات میں دیر تک سائیں عالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک بہت بڑی چمگادڑ کی صورت میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے اور کسی بھی وقت جھپٹا مار کر مجھے اس قصبے سے اچک لے جائے گا اور کہیں دور لے جا کر اس "چمگادڑی" کے پہلو میں پھینک دے گا جسے وہ اپنی چیلی کہتا تھا (یعنی سروج عرف اُلّو کی بچی) پھر ہم دونوں کو ڈنڈے کے زور پر ہانکے گا اور کہے گا جاؤ چنے گل کی حویلی کا دفینہ تلاش کرو ورنہ دونوں کو مکھی بنا کر کسی خارش زدہ کتے پر بٹھا دوں گا۔

میرے سینے کی تکلیف آج کل بالکل ٹھیک تھی۔ شاید میرے معدے نے [illegible] کو چار و ناچار قبول کر لیا تھا۔ اس سے پہلے میں بستر پر لیٹ کر دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ لیکن آج کل فوراً ہی نیند آ جاتی تھی۔ پُراسرار سائیں عالی کے خیالوں میں الجھا الجھا میں سو گیا۔ صبح ذرا جلدی ہی میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایس پی برکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ کہنے لگا "واردات ہو گئی ہے بیٹا جی۔۔۔"

"کیا ہوا؟"

"رات کسی نے ناگورے کو مار مار کر شدید زخمی کر دیا ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔"

"ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟" میں نے کراہ کر پوچھا۔

"ہاں دونوں ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں پنڈلی کی۔ سر میں بھی سخت چوٹیں آئی ہیں۔"

میرے جسم میں مایوسی اور دکھ کی لہر سی دوڑ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سارے خواب چکنا چور ہو کر بکھر گئے جو اس قصبے کے غریب لوگ دیکھ رہے تھے اور شاید ان کے ساتھ ساتھ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ امید کا وہ شاندار محل جو اس قصبے کے لوگوں نے ایک ایک اینٹ جوڑ کر بنایا تھا بھربھرا کر گر گیا تھا اور اس دفعہ یوں ڈھے گیا تھا کہ دوبارہ بننے کی کوئی آس نہ رہی تھی۔ معلوم نہیں کچھ عمارتوں کی

قسمت میں بار بار گرنا ہی کیوں ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں تقدیر کبھی کبھی اتنی بے رحم ہو جاتی ہے کہ جرأت ہمت اور حوصلے جیسے جذبوں کی کونپلیں اس کے بے پناہ بوجھ تلے دب کر پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں۔

ایس پی برکت بولا "پتا نہیں کون بھوتنی والا تھا جس نے یہ کام کیا ہے۔ کتنا سوہنا جوان تھا۔ ساری زندگی کے لئے روگی ہو گیا ہے۔"

میں کمرے سے باہر نکلا تو سامنے سے ٹانگورے کا والد رام سنہا آتا دکھائی دیا۔ وہ رو رہا تھا "یہ کیسے ہوا رام سنہا؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے ہی ہوا جیسے ہونا تھا۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "میں نے تم سے کہا تھا نا یہ لڑکا بری طرح پچھتائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی پچھتانا پڑے گا۔ دیکھ لو دوست۔ یہ کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ۔"

"مگر یہ کیا کس نے؟"

"اسی بدبخت کے بھائی نے جو بدروح کی طرح میرے بیٹے سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسے معذور کر کے بستر پر ڈلوا دیا ہے۔ اب چین آیا ہوگا اسے۔ بڑا زہریلا بھائی ہے اس کا۔ میں اسے بچپن سے جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک نہ ایک دن میرے بیٹے کو ضرور ڈسے گا۔ اور اس نے ڈس لیا ہے۔ کل شام وہ گراؤنڈ میں ٹانگورے سے جھگڑا تھا۔ سب کے سامنے اسے دھمکیاں دی تھیں۔ جو کچھ کیا ہے اسی نے کیا ہے۔ وہی میرے بیٹے کا مجرم ہے۔"

اسی دوران میں ٹانگورے کے دو دوست بھی آ گئے۔ ان کے چہرے غم و اندوہ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا "ٹانگورے علی الصباح تین بجے ورزش کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ ایک دن چھوڑ کر ہم پندرہ کلومیٹر کی دوڑ لگاتے تھے۔ آج صبح بھی دوڑ کی باری تھی۔ ٹانگورے گھر سے نکل کر ہماری طرف آ رہا تھا کہ بڑے ڈاک خانے کے پیچھے سرجیت نے اسے گھیر لیا۔ سرجیت کے ساتھ اس کا ایک دوست بھی تھا۔ دونوں نے اسے بری طرح مارا اور پھر ہاکی کی ضربوں سے اس کی ٹانگ توڑ دی۔ مجاہد علی نے اسے زخمی حالت میں سڑک پر پڑے پایا اور اُٹھا کر اسپتال لے گیا۔"

اسی دوران میں میری نگاہ سیڑھیوں کی طرف گئی تو ٹانگورے کی بہن تاہو نظر آئی۔ وہ اوپر جا رہی تھی۔ شاید مجھے اطلاع دینا چاہتی تھی۔ میں نے لپک کر اسے روکا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی اور بتانے لگی کہ اس کے بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ غزالہ کے سامنے کوئی بات نہ کرے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ غزالہ کو اس خبر سے شدید دھچکا لگے گا اور اس کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قسم کے دھچکے برداشت کر سکے۔

میں ٹانگورے کے والد رام سنہا کو لے کر اسی وقت اسپتال پہنچا۔ وہاں ٹانگورے کے اور بھی کئی دوست اور بہی خواہ پہنچے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ٹانگورے کی ٹانگ کا آپریشن ہو رہا ہے۔ ٹانگورے کی خبر گیری کے لئے آنے والے بہت غم و غصے میں تھے۔ وہ برملا کہہ رہے تھے کہ نوبی وغیرہ نے سازش کے ذریعے ٹانگورے پر حملہ کروایا ہے۔ سرجیت کے خلاف بھی لوگوں میں شدید جذبات پائے جاتے تھے۔

ٹانگورے والی خبر میں نے غزالہ سے چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن ایسی خبریں چھپانے سے چھپتی نہیں ہیں۔ میں شام اسپتال سے واپس آیا تو غزالہ بہت آزردہ سی بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی صحرا کی طرح ویران نظر آ رہی تھیں۔ کہنے لگی "آپ نے مجھ سے ٹانگورے والی بات چھپائی کیوں؟"

"نہیں! چھپائی تو نہیں بس جلدی میں اسپتال چلا گیا۔ تمہیں بتانا یاد ہی نہیں رہا۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی دردناک مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگی "شاید آپ کو میری بات یاد آ گئی ہوگی۔ میں نے بار کہہ دیا تھا کہ اگر ٹانگورے ریس نہ جیت سکا تو میں بھی تو باپ نہ ہو سکوں گی۔"

"نہیں میں ایسی فضول باتوں پر یقین کرنے والا نہیں۔"

"میں بھی نہیں کرتی۔ بس یونہی میرے منہ سے نکل گیا تھا لیکن شاہ جہاں! بات تو دکھ کی ہے نا۔ کتنی محنت کر رہا تھا بے چارہ کتنی امیدیں تھیں اسے۔ ہر بار گر کر سنبھل جاتا تھا وہ اور پھر کوشش کرنے لگتا تھا لیکن اس بار ایسا گرا ہے کہ سنبھل نہ سکے گا۔ اب کہاں دوڑ سکتا ہے وہ۔"

میں نے کہا "بات تو واقعی مایوسی کی ہے لیکن مایوسی کفر کہا جاتا ہے اور یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک دروازہ بند ہو تو دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ٹانگورے کے لئے کامیابی کا کوئی اور دروازہ کھل جائے۔ وہ پہلے باکسنگ کرتا تھا۔ دوڑ میں اس نے باکسنگ سے زیادہ کامیابی حاصل کی اور لوگوں نے اسے پہلے سے زیادہ پسند کیا۔ اب وہ دوڑ کے قابل نہیں رہا۔ ہے کسی اور میدان میں کامیابیاں اس کی منتظر ہوں۔"

غزالہ ایک آہ کھینچ کر چپ ہو گئی۔ میں نے اسے انجکشن لگائے۔ انجکشن لگتے ہی وہ سو جاتی تھی۔ وہ سو گئی تو میں نیچے بیٹھک میں آ گیا۔ یہ بیٹھک آج ویران نظر آ رہی تھی۔ صرف دو لڑکے گم صم بیٹھے تھے۔ میں ان لڑکوں سے باتیں کرنے لگا۔ اس گفتگو سے علی الصباح پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔ ٹانگورے پر اکیلے سرجیت نے حملہ کیا تھا۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ دونوں میں دن نو دن لڑائی ہوئی تھی۔ ٹانگورے سرجیت جیسے ڈشکرے کے سامنے ٹھہر نہیں سکا تھا۔ [illegible]

چکا تھا اور اسے قصبے سے باہر کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ آیا تھا۔

ٹانگورے پر ہونے والے حملے کے بعد ٹانگورے کے حامیوں میں سخت طیش پایا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب سرجیت سے اور اس کے قبیلے پن سے خوف زدہ ہیں۔ وہ پیٹھ پیچھے تو اسے برا بھلا کہتے تھے لیکن اس کے سامنے جا کر اس کا گریبان پکڑنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ سب کے سب لاشعوری طور پر سرجیت کی جنگجو طبیعت سے دہشت زدہ تھے۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ گلی میں کسی کے للکارے سنائی دینے لگے۔ پھر کئی ملی جلی آوازیں آئیں اور کسی نے زور زور سے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ایک کھڑکی میں سے دیکھا۔ دروازے سے باہر وہی سرخ جیکٹ والا ہپی اسٹائل نوجوان کھڑا تھا۔ جس کا نام سرجیت تھا اور جس نے ٹانگورے کو زخمی کیا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کم و بیش آٹھ دس افراد مزید اس کے ساتھ تھے۔ اس کی دستک کے جواب میں ٹانگورے کا والد رام سنہا اور اس کا ایک چچا زاد بھائی باہر نکلے۔ سرجیت نے ان پر گرجنا برسنا شروع کر دیا۔ وہ بے حد تند و تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کے منہ سے جیسے جھاگ اُڑ رہے تھے۔ اگر لوگ درمیان نہ آ جاتے تو شاید وہ رام سنہا اور اس کے کنبے کو مارنا ہی شروع کر دیتا۔ وہ اور اس کے ساتھی سنہالی بول رہے تھے لہٰذا بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ہاں اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ انہیں دھمکیاں دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اگر وہ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو گردن جھکا کر اور نگاہیں نیچی کر کے رہیں ورنہ نو دو گیارہ ہو جائیں۔ بھاگ جائیں اس قصبے سے۔

سرجیت کو دیکھ کر میرا دماغ کھولنے لگا۔ جی چاہا باہر نکل کر اس بپھرے خان کو اس کی اوقات بتاؤں لیکن پھر دل مسوس کر رہ گیا۔ میں یہاں کوئی تنازع کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں صرف اس لئے یہاں مقیم تھا کہ غزالہ کی حالت بہتر ہو جائے۔ اس کے ٹھیک ہوتے ہی مجھے یہاں سے چلے جانا تھا لیکن ٹانگورے اور اس کے اہلِ خانہ کو یہیں ان لوگوں کے درمیان رہنا تھا۔ یہ مناسب نہیں تھا کہ میں اس دشمنی کو اور ہوا دوں۔ سرجیت اور اس کے ساتھی کچھ دیر چیخنے چنگھاڑنے کے بعد واپس چلے گئے۔

○☆○

غزالہ کی حالت میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ بلکہ کچھ دن بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی زبان میں پھر لکنت سی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا وزن کم ہو رہا ہے۔ وہ زیادہ تر وقت بستر پر لیٹ کر گزارتی۔ کسی وقت کوشش کر کے وہیل چیئر پر بیٹھ جاتی لیکن جلد ہی اُکتا جاتی اور واپس کمرے میں چلنے کا کہتی۔ ایک دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ میں کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی۔ یونہی بستر پر پڑے پڑے مر جاؤں گی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "آپ کیوں میرے لئے اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ کیوں ہلکان ہو رہے ہیں میرے لئے۔ میں نے کبھی ٹھیک نہیں ہونا۔ مجھے اُٹھا کر کہیں ویرانے میں پھینک آئیں۔ میری جان چھوٹ جائے اور آپ کی مشکل بھی آسان ہو۔"

میں نے غزالہ کو کبھی اتنا آزردہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو غم کا آتش فشاں سینے میں چھپا کر ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے والی لڑکی تھی۔ اس کی آہ و زاری نے میرا دل ہلا دیا۔ میں جو موت کے قہقہے سن کر خود بھی قہقہے لگایا کرتا تھا اس کے آنسو دیکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ میں نے بے اختیار اسے بانہوں میں لے لیا۔ اس کا کمزور جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ میں نے کہا "حوصلہ رکھو غزالہ۔ اتنی پہاڑ سی بیماری تم نے کاٹ لی ہے۔ اب تو اچھے دن آنے والے ہیں۔ اب ہمت کیوں ہار رہی ہو۔ تم نے ٹھیک ہونا ہے۔ اپنے لئے میرے لئے ہم سب کے لئے۔"

میں نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ وہ کسی ننھی بچی کی طرح سسکنے لگی۔ اس کے سانس کی روانی درہم برہم ہو رہی تھی اور بخار کی شدت سے ہونٹ بار بار خشک ہو جاتے تھے۔ میں اسے یونہی لئے بیٹھا رہا۔ کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کسی کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر جو کر سکتے تھے کر چکے تھے۔ اب سب کچھ وقت کے ساتھ ٹھیک ہونا تھا۔ یا نہیں ہونا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو اس کی ساری تکلیفیں سمیٹ کر اپنی جان اس کے جسم میں ڈال دیتا اور اس سے کہتا کہ مجھے اس بسترِ مرگ پر چھوڑ کر مسکراتی ہوئی اس کمرے سے نکل جاؤ۔ لیکن یہ صرف ایک بھٹکا ہوا خیال تھا۔ اس قادرِ مطلق نے یہ طے کر رکھا ہے کہ جس کی تکلیف ہے اسی کو جھیلنا پڑتی ہے۔ کوئی کسی کی تکلیف نہیں بانٹ سکتا صرف دھیان بٹایا جا سکتا ہے اور وہی ہم بٹاتے ہیں۔

ٹانگورے اسپتال سے واپس آ گیا تھا۔ اس کی ٹانگ پر پلاستر اور ہاتھ میں بیساکھی تھی۔ اس کی پنڈلی کی دونوں ہڈیوں میں فریکچر ہوئے تھے۔ واپس آنے کے بعد وہ تین چار روز تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلا "آخر ایک روز اس سے ملاقات ہوئی" اس کے سرہانے بھی پپی موجود تھی۔ بہت چپ چاپ نظر آ رہا تھا وہ۔ اس کا سارا جوش و خروش اور ولولہ ایک بے نام سی اداسی میں ڈھل چکا تھا۔ وہ مجھ سے یوں آنکھیں چرا رہا تھا جیسے کوئی جرم کیا ہو۔ میں نے اسے پاس بٹھایا اور اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سمیٹنا ممکن ہی نہیں۔

اگلے روز شام کو گھر میں پھر لڑائی ہوئی۔ پہلے ٹانگورے نے کسی بات پر اپنی بہن تاہو کو ڈانٹا پھر رام سنہا کے گرجنے کی آواز بھی آنے لگی۔ ٹانگورے اور اس کے والد کے بیچ تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ٹانگورے کے والد نے کوئی خالی برتن اٹھا کر بڑے زور سے صحن میں پھینکا اور گالی گلوچ کرنے لگا۔ ٹانگورے کھٹ کھٹ بیساکھی بجاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ رات گئے اس کے دوست اسے واپس گھر لائے۔ اس وقت وہ نشے میں چور تھا اور بری طرح ڈگمگا رہا

تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کا باپ پھر دھکے دے کر اسے گھر سے نہ نکال دے۔ لیکن اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

اگلے دو تین ہفتوں میں ناگورے کے اندر نمایاں تبدیلیاں محسوس ہونے لگیں۔ اس کی خوش اخلاقی چڑچڑے پن میں بدل چکی تھی' چستی کی جگہ سستی اور واسنگ رنگ کی جگہ اتھاہ مایوسی نے لے لی تھی۔ سب سے غلط بات یہ ہوئی تھی کہ وہ چوری چھپے نشہ کرنے لگا تھا۔ میں نے دو تین بار رات گئے اسے نشے کی حالت میں گھر آتے دیکھا کہ اس کا جسمانی توازن بگڑا ہوا تھا اور کسی ... دوست نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ ... لباس اور طہارت ... صفائی کی طرف سے بھی وہ بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی خوبرو لڑکا ہے جو علی الصباح چند روز تک ... پر بھی تروتازہ نظر آتا تھا۔ ایک روز رات گئے جب وہ واپس آیا تو میں نے اسے گھیر لیا۔

"یہ سارا سارا دن کہاں غائب رہتے ہو تم' اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی؟" میں نے پوچھا۔

وہ شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولا "یہاں گھر میں بھی کیا رکھا ہے۔ لڑائی جھگڑا' طعنے۔ جب بھی کوئی بات کرتا ہے' بہنوں کے بوجھ کی گٹھری بنا کر میرے سر پر رکھ دیتا ہے۔ بہنوں کا بوجھ...... بہنوں کا بوجھ۔ میں نے پیدا کی تھیں اپنی بہنیں؟ میرے باپ نے پیدا کی تھیں۔ اگر وہ جوان ہو کر شادی کے قابل ہو گئی ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے..... اور اگر گھر کا چولہا ٹھنڈا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے' میں نے خود ٹانگ توڑی ہے اپنی؟ بتا کیں میں نے خود توڑی ہے؟"

میں نے کہا "ٹانگ ٹوٹنے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اب جس طرح تم خود کو برباد کر رہے ہو' تمہارا نقصان ہو رہا ہے۔ تمہارے چاہنے والے تم سے دور ہو رہے ہیں۔ تمہارے دشمن تم پر ہنس رہے ہیں۔"

وہ تن لہجے میں بولا "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ نہ چاہنے والوں کی' نہ دشمنوں کی' میں کسی کے لیے اپنے چہرے پر نقاب نہیں چڑھا سکتا۔ میں جیسا ہوں بس ویسا ہی ہوں' جسے میں اچھا نہیں لگتا نہ خیر خواہی کرے میری۔"

بیساکھی بغل میں دبا کر اس نے تیزی سے حرکت کی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ناگورے کے لیے کیا کیا جائے۔ گھوم پھر کر میرا دھیان انیلا کی ہی طرف جا رہا تھا' وہی اسے سمجھانے کی کوشش کر سکتی تھی' وہ اس کی محبت تھی۔ اس کی بات ناگورے کے دل پر اثر کر سکتی تھی لیکن وہ کہاں تھی؟ آخری اطلاعات کے مطابق اسے اس کے انگلینڈ پلٹ بھائی نے اپنے کسی رشتے دار کے ہاں پہنچا دیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ناگورے کے قریبی دوست مجاہد علی سے معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجاہد علی تامل مسلمان تھا۔ سنہالی بولتا تھا تاہم انگریزی بھی بہتر بول لیتا تھا' اس کا گھر ناگورے کے گھر سے ... فاصلے پر نہیں تھا۔ میں شام کے وقت ان کے گھر جا پہنچا۔ یہ ... قصبے کے ایک بارونق علاقے میں تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں مجاہد علی کے باپ کی قالینوں اور دریوں وغیرہ کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میرے ساتھ ایس پی برکت بھی ... مجاہد علی کا باپ ہم ... سے ملا۔ اس نے بتایا کہ مجاہد تو ناگورے کی طرف ہی ہے۔ ناگورے کا کوئی دوست ناگورے کے لیے کوئی چٹھی دے ... پہنچانے کے لیے گیا ہے۔

ہماری باتوں کے درمیان ہی مجاہد بھی آگیا۔ وہ ہمیں گھر کے اندر بیٹھک نما کمرے میں لے گیا۔ بیٹھک کی سجاوٹ اور ... کے رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مذہبی قسم کا شریف گھرانہ ہے۔ مجاہد نے چائے اور کوکونٹ بسکٹ سے ہماری تواضع کی۔ رسمی گفتگو کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آگیا اور مجاہد سے انیلا کے بارے میں پوچھا۔ مجاہد نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ پرسوں شب قصبے میں آئی تھی اور ناگورے سے ملی تھی' وہ دونوں رات گئے تقریباً ایک گھنٹے تک ناگورے کے گھر بیٹھک میں موجود رہے تھے۔

اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے مجاہد نے کہا "انیلا پرسوں رات دس بجے کے لگ بھگ بڑی رازداری سے یہاں پہنچی تھی۔ اس نے جو کپڑے ... پہن رکھے تھے وہ ہمارے ہاں شادی کی تقریبات میں پہنے جاتے ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسی ہی تقریب کا بہانہ کر کے یہاں آئی تھی۔ وہ سیدھی میرے پاس پہنچی تھی۔ میں نے اسے ناگورے کے پاس پہنچایا تھا۔ انیلا بڑی دلیر لڑکی ہے۔ اس نے ناگورے سے کہا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی وجہ وہ خود کو سمجھتی ہے۔ نہ وہ اس سے میل جول رکھتی نہ اس کا بھائی طیش میں آ کر اس سے مار پیٹ کرتا اور نہ ناگورے اس حال کو پہنچتا۔ اس نے صاف لفظوں میں ناگورے سے کہا کہ وہ اس کی محبت میں دیوانی ہے اور اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے ساتھ ... رقم اور ڈائمنڈ کی جیولری وغیرہ بھی لے کر آئی تھی۔ اس نے ناگورے سے کہا کہ وہ دونوں قصبے سے نکل چلتے ہیں۔ کینڈی جا کر وہ کورٹ میرج کر لیں گے۔ وہ دونوں عاقل بالغ ہیں اور انہیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ نہ اس کا بھائی نہ والدین اور نہ کوئی اور...... ناگورے نے اس پیش کش کے جواب میں صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ بہت دیر تک ناگورے کی منت سماجت کرتی رہی اور آنسو بہاتی رہی لیکن ناگورے اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ اس نے انیلا سے کہا کہ ہم دونوں کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں......"

میں نے مجاہد سے پوچھا "اب انیلا کہاں ہے؟"

"اسی رات ایک دو بجے واپس چلی گئی تھی۔ یہاں سے چودہ

پندرہ میل دور گاورام نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہیں انیلا کی ایک آنٹی کے گھر ٹھہری ہوئی ہے۔ ابھی سہ پہر کی ڈاک سے اس کا ایک خط مجھے ملا ہے۔ وہ ناگورے کے لیے تھا۔ یہی خط پہنچانے میں ناگورے کے گھر گیا تھا۔"

"کس قسم کا خط تھا؟" ایس پی برکت نے پوچھا۔

مجاہد چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے لفافے میں سے خط نکالا۔ وہ سنہالی میں تھا' خط پر دو تحریریں تھیں۔ ایک سامنے دوسری پشت پر۔ سامنے والی تحریر انیلا کی تھی۔ مجاہد نے ہمارے لیے اس تحریر کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا۔ انیلا نے لکھا تھا "میں ساری رات جاگتی رہی ہوں اور سوچتی رہی ہوں تم ایسے تو نہ تھے جیسے اب ہو! پھر کہاں سے آگئی تم میں یہ سنگ دلی اور سرد مہری۔ شاید تمہارے ذہن میں اس "قسم" کا خوف بیٹھا ہوا ہے جو تم نے نوی کے سامنے راجا کی کرسی پر کھائی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ جب تک نوی کو شکست نہیں دے لو گے مجھ سے بات کرو گے اور نہ کوئی تعلق رکھو گے۔ اب چونکہ تم کبھی نوی کو شکست نہیں دے سکتے اس لیے تم نے قسم نبھانے کے لیے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ ڈیئر! اگر واقعی ایسی بات ہے تو تمہاری سوچ بالکل خام ہے۔ خود کو ان سخت خود ساختہ پابندیوں میں مت جکڑو۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ ویسے بھی تمہاری قسم تمہاری صحت اور تندرستی کے ساتھ مشروط تھی۔ اب تم دوڑنے کے قابل ہی نہیں ہو' اب ہار جیت کا سوال کیا؟ پلیز! اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے تو اسے نکال دو۔ اپنی اور میری زندگی کو بے معنی خیالات کی دلدل میں غرق مت کرو۔ اگر تم چاہو تو میں کسی بھی بڑے "عالم" سے اپنے موقف کی تصدیق کرا سکتی ہوں۔

تمہارے جواب کی منتظر' تمہاری دید کی پیاسی انیلا۔"

اس خط کی پشت پر ناگورے نے اپنا مختصر جواب لکھ کر مجاہد کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ جواب یوں تھا "انیلا! میں معذور ضرور ہوا ہوں' ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوا۔ مجھے تمہارے عاقلانہ مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنا راستہ تم سے اس لیے جدا نہیں کر رہا کہ میں نے مقدس کھائی پر قسم کھا رکھی ہے' اس کی بہت سی اور وجوہات ہیں اور ان میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں اب زندگی کی دوڑ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم امیر گھرانے کی خوبصورت لڑکی ہو۔ جس قسم کا رشتہ تم چاہو گی' مل جائے گا بہت جلد تم خود کو حالات کے مطابق ڈھال لو گی' میں بھی کسی ایسی لڑکی سے شادی کر لوں گا جو موجودہ حالات میں میرے لیے مناسب ہو' آئندہ مجھ سے ملنے یا خط لکھنے کی ضرورت نہیں' میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔

ناگورے"

دونوں تحریریں پڑھنے کے بعد مجاہد علی نے خط پھر جیب میں رکھ لیا۔ ایس پی برکت نے تفتیشی انداز میں مجھ سے پوچھا "اس لڑکے (یعنی مجاہد علی) کا کیا خیال ہے۔ کیا وہ ناگورے بھوتی راج کی "قسم" کے چکر میں پڑا ہوا ہے؟"

میں نے یہی بات انگریزی میں مجاہد سے پوچھی تو وہ بولا "انیلا نے جو اندازہ لگایا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے جناب...... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ناگورے نے وہ "قسم" اپنے سر پر سوار کر رکھی ہے' اور اس میں ناگورے کا بھی کیا قصور ہے' ہم جس ماحول اور جن لوگوں میں رہتے ہیں وہاں اس قسم کی بہت اہمیت ہے' اور ناگورے جیسے خوددار لوگوں کو تو ویسے بھی اپنے قول و قرار کا بہت پاس ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے جال میں جکڑا گیا ہے' اور کبھی بھی کوشش کرے نکل نہیں سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ناگورے اور انیلا کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ... ہو چکے ہیں؟"

"فی الحال تو یہی لگتا ہے" مجاہد علی نے جواب دیا۔ "جہاں تک ناگورے کی ٹانگ ٹھیک ہونے کا تعلق ہے' کوئی امید نظر نہیں آتی۔ فریکچر زیادہ گہرا نہیں لیکن ہڈیوں میں ہے' میں اسے ایک دو ڈاکٹروں کے پاس لے کر گیا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ پیچیدہ قسم کے فریکچرز ہیں۔ مریض چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا' یہی غنیمت ہے۔"

اچانک ہمیں چونکنا پڑا۔ گھر سے باہر سڑک پر شور و غل سنائی دیا تھا۔ مجاہد علی نے ایک کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا' باہر بازار کا منظر نظر آنے لگا۔ میں نے انیلا کے خود دماغ بھائی سرجیت کو دیکھا۔ وہ مجاہد کے باپ کی دکان کے سامنے کھڑا تھا اور اونچی آواز میں بول رہا تھا...... مجاہد کا باپ شاید نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ ایک نوجوان نوکر دکان پر تھا اور وہ بے چارہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ مجاہد تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجاہد کو دیکھتے ہی سرجیت کا پارا مزید چڑھ گیا۔ پہلے وہ تند و تیز لہجے میں بولتا رہا پھر اس نے مجاہد کا گریبان پکڑ لیا۔ نوکر چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو سرجیت نے پھرتی سے اس کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا دکان کے اندر جا گرا۔ مجاہد دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ جواب میں سرجیت کا گریبان پکڑ سکتا۔ میری دلی خواہش تھی کہ مجھے اس منحوس سرجیت کے سامنے نہ آنا پڑے لیکن حالات بار بار مجھے اس کام پر اکسا رہے تھے۔ شاید میں مجاہد علی کی جان چھڑانے کے لیے باہر نکل ہی جاتا کہ اچانک مجاہد علی کا باریش والد ایک اندرونی کمرے سے برآمد ہو گیا۔ اس نے آستینیں اڑس رکھی تھیں اور داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے' غالباً وضو کرتے ہوئے آیا تھا۔ میرے اور ایس پی برکت کے تیور دیکھ کر وہ ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔ نرمی بھری آواز میں بولا "نہیں بیٹا! تم باہر نہ جانا۔ بات بڑھ جائے گی۔ میں سنبھال لیتا ہوں سب کچھ۔ میں سنبھال لیتا ہوں۔"

ہمیں روک کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ مجاہد علی صحت مند اور دلیر لڑکا تھا لیکن سرجیت کے سامنے بالکل بے بس نظر آ رہا تھا غالباً سرجیت نے اسے ایک آدھ مکا بھی رسید کر دیا تھا۔ اس کی ایک باچھ سے خون بہتا صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا گریبان ابھی تک سرجیت کی مضبوط گرفت میں تھا۔ مجاہد کے باپ نے بیٹے کو سرجیت کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی اور منت سماجت و نرم گفتاری کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ سرجیت کسی اصیل مرغ کی طرح اکڑا ہوا تھا اور گلے کی رگیں پھلا پھلا کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے تکبر آمیز نفرت جھلکی پڑتی تھی۔

جب سرجیت اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلا گیا تو مجاہد علی اور اس کا بوڑھا باپ بھی گھر واپس آ گئے۔ مجاہد علی کی زبانی پتا چلا کہ چند روز پہلے اس نے ہانگورے کے بارے میں اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپوا دی تھی۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ کینیڈی کی ریس کے فیورٹ ایتھلیٹ ہانگورے کو سازش کے ذریعے زخمی کر دیا گیا ہے لہٰذا اب وہ ریس میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ سرجیت اسی خبر کا غصہ اتارنے کے لیے یہاں آیا تھا۔

میں نے مجاہد علی سے پوچھا "آپ سب لوگ سرجیت سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟"

مجاہد بولا "وہ بے حد خر دماغ بلکہ کریک شخص ہے۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے" اور اب تو اسے سردار بہادر سنگھ کی فیملی کی حمایت بھی حاصل ہے۔ جیسے جھیل میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا ایسے ہی سرجیت سے بھی دشمنی مول نہیں لی جا سکتی۔"

میں نے سرجیت کو مزہ چکھانے کا پکا فیصلہ کر چکا تھا۔ صرف اتنی احتیاط میں کرنا چاہتا تھا کہ میری کارروائی کا شبہ ہانگورے اور اس کے ساتھیوں پر نہ پڑے۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں میں نے سرجیت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ وہ انگلینڈ سے آنے کے بعد اپنا زیادہ وقت آوارہ گردی میں گزار رہا تھا۔ صرف شام کے وقت اپنے ہم عمر سرچ اہل کے ساتھ اپنے سینما جاتا تھا اور کچھ دیر حساب کتاب میں مصروف رہتا تھا۔

شام سات آٹھ بجے سینما ہاؤس سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی سپورٹس گاڑی میں سوار ہوتا تھا اور نورطیا کے سب سے مہنگے نائٹ کلب "کوبرا" میں جا پہنچتا تھا۔ سرجیت کو "جوئے" کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ رات گیارہ بارہ بجے تک اس شغل میں مصروف رہ کر اپنی رہائش گاہ پر واپس آ جاتا تھا۔ نائٹ کلب قصبے کی بھری پری آبادی سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ سرجیت جس راستے سے گزر کر آتا تھا وہ دو تین میل تک بالکل سنسان تھا۔ میں نے اسی راستے میں سرجیت کو گھیرنے کا فیصلہ کیا۔ نورطیا میں کرائے پر کاریں مل جاتی تھیں۔ میں نے مجاہد علی کے ایک ہمراز دوست کی مدد سے بغیر ڈرائیور کے کار حاصل کی اور ایک ماؤزر جیب میں رکھ کر نائٹ کلب "کوبرا" کی طرف نکل گیا۔ میں نے اپنی شناخت چھپانے کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ ایک ٹوپی میری جیب میں موجود تھی۔ اس سے آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چھپایا جا سکتا تھا گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی تبدیل کی تھی۔ نائٹ کلب سے ڈیڑھ دو میل ادھر ہی ایک سنسان جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی درختوں میں روک لی اور سرجیت کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ غیر متوقع طور پر مجھے کافی انتظار کرنا پڑا۔ رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ مجھے سرجیت کی سرخ اسپورٹس کار نظر آئی۔ یہ نو سیٹر کار چھت کے بغیر تھی اور دور ہی سے پہچانی جاتی تھی۔ جونہی کار میرے قریب سے گزری اس کے اندر سے موسیقی کا شور سنائی دیا اور ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوا کہ کار میں سرجیت کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ میں پہلے سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور ٹوپی بھی سر پر چڑھا لی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے کار کا تعاقب شروع کر دیا...... تھوڑا دور جا کر میں نے کار کو اوورٹیک کر لیا اور اس کے آگے آگے جانے لگا۔ ایک ٹریفک سگنل پر میں نے اچانک اور اتنے زور سے بریک لگائے کہ سرجیت کی نئی نویلی اسپورٹس کار میری گاڑی سے ٹکرانے سے نہ بچ سکی۔ ایک پرشور تصادم کے ساتھ اس کی ایک ہیڈ لائٹ چکنا چور ہو گئی اور بونٹ درمیان سے کسی پہاڑی کی طرح اوپر اٹھ گیا۔

تصادم ہوتے ہی میں نے سگنل کی پروا کیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔ توقع کے عین مطابق سرجیت نے بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میرا پیچھا کیا۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر گھنے درختوں میں گھسا دی۔ سرجیت بھی فرط غضب میں میرے پیچھے آیا۔ درختوں کے درمیان ناہموار راستے پر دونوں گاڑیاں قریباً دو فرلانگ تک گئیں، پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی روک لی اور باہر آ گیا۔ ظاہر ہے سرجیت نے بھی گاڑی روکی۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا گاڑی سے برآمد ہوا اور میری طرف لپکا۔

شاید وہ آتے ساتھ ہی میرا گریبان پکڑ لیتا لیکن میرے اچھے لباس اور پُراعتماد انداز نے اسے محتاط رہنے پر مجبور کیا۔ وہ میرے عین سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ کیا ہے؟"

میں نے بغور دیکھا۔ گاڑی میں ایک سترہ اٹھارہ سالہ قیامت نیم عریاں بیٹھی تھی۔ لباس کے نام پر اس کے جسم کو صرف دو چھوٹے چھوٹے پارچہ جات نے ڈھانپ رکھا تھا۔ سرجیت نے کڑک کر اپنا سوال دہرایا "میں پوچھتا ہوں یہ کیا ہے؟" اس کا اشارہ گاڑی کے نقصان کی طرف تھا۔

میں نے کہا "گاڑی ہے اور گاڑی کے اندر خوب صورت سنہالی لڑکی ہے جو یقیناً تمہاری ہمشیرہ نہیں ہے" میں نے اپنی آواز کافی حد تک بدل لی تھی۔

سرجیت نے مجھے انگلش میں گالی دی اور بولا "یہ تمہاری بہن

ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر چڑھائی کر دی۔ میں نے سمجھا اس نے مجھ پر مکا چلایا ہے لیکن وہ مکا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دبا ہوا تھا۔ اگر وار بچانے میں مجھ سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوتی تو چاقو میرا کلا چیر کر تالو میں گھس گیا ہوتا۔ وار خالی جاتے ہی بے انتہا پھرتی سے سرجیت نے ٹانگ چلائی۔ یہ ٹانگ اس نے گھوم کر گرانے کے انداز میں ماری تھی۔ میرا دایاں پہلو نشانہ بنا اور میں لڑکھڑا کر سرجیت کی گاڑی سے ٹکرایا۔ اندر بیٹھی لڑکی نے سریلی چیخ ماری۔ ایک چوٹ کھانے کے بعد میری رگوں میں آگ بھڑک اٹھی پوری وحشت کے ساتھ مد مقابل پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنا چاقو استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن یہ "مہارت" میرے غیظ و غضب میں بہہ گئی۔ میں نے اسے اٹھا کر زمین پر پٹخا اور پھر اس کے چہرے اور سینے پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ وہ جیسے دیوانہ ہو رہا تھا۔ کسی بد مدمست کی طرح چیخ رہا تھا اور مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ کوشش تو تب کامیاب ہوتی جب میں اسے اٹھنے کا موقع دیتا۔ دیر ہوئی چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور چاقو کے ساتھ ساتھ جیسے اس کی چھوٹ چکے تھے پھر دیکھتے دیکھتے ایک دم اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میں نے جیب سے ماؤزر نکالا اور اسے حکم دیا کہ وہ سیدھا کھڑا ہو جائے۔ میرا حکم ماننے کے بجائے اس نے حلق سے کسی درندے جیسی غراہٹ نکالی اور ایک بار پھر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کا وار خالی دیا اور وہ اوندھے منہ کیچڑ میں گرا۔ میں نے ایک بار پھر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کی ایک کلائی شدید زخمی تھی اور جب وہاں ٹھوکر لگتی تھی تو وہ بری طرح چیختا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ کیچڑ نے اسے بھوت بنا دیا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور گاڑی کے ساتھ سہارا دے کر بٹھا دیا۔ لڑکی سہمی سہمی آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹی ہوئی تھی جیسے سوچ رہی ہو کہ سرجیت جیسا پہلوان اتنی جلدی ناک آؤٹ کیسے ہو گیا۔

میں نے ماؤزر دائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ سے چند کرارے تھپڑ سرجیت کے چہرے پر رسید کیے۔ وہ کراہنا کے انداز میں کراہنے لگا اور ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ماؤزر اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے پوچھا "کتنی نقدی ہے تمہارے پاس؟" جواب دینے کے بجائے وہ شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی ہٹ دھرمی پر میرا دماغ بھنا اٹھا۔ میں نے اس کے منہ پر چند زوردار گھونسے مار کر اسے پھر لمبا لٹا دیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون دھار کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ سر کے بالوں سے کھینچ کر میں نے اسے پھر سیدھا کیا "بولو کتنی نقدی ہے اور کہاں ہے؟"

وہ ہٹ دھرمی سے میری طرف دیکھتا رہا شاید میں ایک بار پھر اس پر پل پڑتا کہ لڑکی کراہ کر بولی "مجھ میں بتاتی ہوں"

اس نے سرجیت کی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھمایا پھر کپڑے کی وہ سرخ جیکٹ دیکھی جو سرجیت پہنے رہتا تھا۔ جیکٹ کی جیبوں سے آٹھ نو سو مارک لیکن روپے نکلے۔ لڑکی نے کانپتے ہاتھوں سے روپے مجھے تھما دیے۔

"بس یہی ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ لڑکی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا "یہ شخص آج قمار خانے سے جیت کر آیا ہے۔ اس حرامی کے پاس سیکڑوں میں نہیں لاکھوں میں رقم ہوگی۔"

"وہ... وہ دراصل" لڑکی ہکلا کر چپ ہو گئی۔

"نکالو باقی رقم کہاں رکھی ہے؟ ڈیش بورڈ میں ہے یا کسی خفیہ خانے میں" میں نے گرج کر کہا۔

"مت...... تمہیں کس نے بتایا کہ اس شخص نے رقم جیتی ہے؟"

"ایک بہت قابل اعتماد ذریعے نے۔"

"تمہیں غلط اطلاع ملی ہے۔ یہ جیتا ضرور ہے۔ لیکن رقم نہیں...... یہ مجھے جیت کر لایا ہے۔"

میں نے غور سے لڑکی کی شکل دیکھی۔ وہ بہت ڈری سہمی ہوئی تھی۔ واقعی ایک ایسی لڑکی نظر آتی تھی جسے کوئی جوئے میں جیت کر لایا ہو۔ قریب سے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو مجھے اس کے گالوں پر طمانچوں کے نشان بھی نظر آئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ طاقت اور دولت کے نشے میں چور سرجیت اس لڑکی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ سرجیت اور میری لڑائی کے دوران میں لڑکی عنصر معطل بنی گاڑی میں بیٹھی رہی تھی۔

میں نے پوچھا "کس سے جیتا ہے تمہیں سرجیت نے؟"

وہ بولی "میں اس ناپاک جانور کا نام اپنی زبان پر لانا نہیں چاہتی وہ میرا شوہر تھا۔ اس شرابی کمینے کی کمینگی دیکھو زیور تو دور کی بات ہے میرے کپڑے اور جوتے تک نہیں دیے اس نے...... کہا تھا بازی صرف میری ذات پر لگی تھی۔ ان چیزوں پر نہیں تھی جو اس نے پہن رکھی ہیں۔"

"بہت خوب 'بڑا سیانا شوہر تھا۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

لڑکی خنک موسم میں اپنا جسم بازوؤں میں سمیٹے سسک رہی تھی۔ کوئی ایسا کپڑا بھی نہیں تھا اس کے پاس جس سے جسم ڈھانپ سکتی۔ میں نے اپنی کار کی ڈکی میں سے کار کا غلاف نکال کر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید ہماری مشرقیت کو کہاں سے کہاں لے جا رہی تھی۔ عظمت کی حد ہوتی ہے لیکن پستی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ انسان گرتے گرتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں جانور بھی اس سے شرما جاتا ہے۔ ایک خوبرو لڑکی جو اپنے شوہر کے ساتھ بڑی شان سے نائٹ کلب میں داخل ہوئی تھی

اب "مالِ غنیمت" کے طور پر ایک دوسرے موڑ کے ساتھ جا رہی تھی اور اپنی عزت کا جنازہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اوزر سرجیت کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور ایک ٹھوکر اس کی زخمی کلائی پر رسید کی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلا اٹھا۔ "تم کہاں لے جا رہے تھے اس لڑکی کو؟" میں نے پوچھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کی اکڑ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی تو ایک بار پھر غراتا ہوا میری ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس دفعہ میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ میں نے اسے بے رحمی سے مارا۔ اس کے جسم کے بیشتر حصوں سے خون رسنے لگا۔ انڈرویئر کے سوا تمام کپڑے تار تار ہوگئے اور میں نے نوچ کر دور پھینک دیے۔ اس کا سر کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا اور اب وہ دردناک انداز میں کراہنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کی قیمتی گھڑی اتاری۔ اور گاڑی میں موجود قابلِ استعمال اشیا مع ایک عدد قیمتی پسٹل سمیٹ لیں سرجیت کے دونوں بازو ٹوٹ چکے تھے اور وہ کسی حشرات کی طرح کیچڑ میں پڑا سسک رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام پوچھا اور کہا کہ اگر وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو چلے۔ لڑکی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے اقرار کے آثار نظر آئے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ غالباً اس نے سوچا تھا کہ وہ اس گورکھ دھندے سے نکل کر کہاں جائے گی۔ سرجیت جیسا شخص اسے کہیں نہ کہیں سے دوبارہ ڈھونڈ نکالے گا۔ میں نے جاتے جاتے سرجیت کی پیٹھ پر ایک زوردار لات جمائی اور اپنی کرائے کی گاڑی میں آگیا۔ گاڑی کو یوٹرن دینے کے بعد میں پختہ سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں مارپیٹ کی اس واردات کو ڈکیتی کا رنگ دینے میں کامیاب رہا ہوں۔ سرجیت کے خلاف میرے دل کی بھڑاس بھی نکل گئی تھی اور وہ حرامی نسل کا ٹھیک طور پر زخمی بھی ہوگیا تھا۔ امید تھی کہ [illegible] تین چار ماہ تک وہاں سے بیٹھے گا۔

میں واپس اپنی رہائش گاہ یعنی ناگورے کے گھر پہنچا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ زیریں منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی دیکھ کر تعجب ہوا۔ یہ ناگورے کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ نجانے وہ اس وقت تک کیوں جاگ رہا تھا۔ اب تو اس کے یار دوست بھی اس کے پاس بہت کم بیٹھتے تھے۔ بالکل الگ تھلگ ہوگیا تھا وہ۔۔۔ پھر میری نگاہ مین دروازے کے اندر موٹر سائیکل پر پڑی اور چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یہ اروشی کے بھتوال راکیش سنگھ کی موٹر سائیکل تھی اور اسی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سائیں عالی "رکوانا" کے تھانے سے "فرار" ہوا تھا۔

دو پولیس والے سرکاری موٹر سائیکل پر سوار اس کے پیچھے لئے تھے کہ کہیں سائیں موٹر سائیکل لے کر غائب نہ ہو جائے لیکن بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ سائیں عالی پولیس والوں کو جُل دے کر غائب ہوگیا تھا۔۔۔ اگر یہ موٹر سائیکل اب تک سائیں عالی کے پاس تھی تو اس کا مطلب تھا کہ سائیں عالی یہاں وارد ہو چکا ہے اور ناگورے کے گھر میں موجود ہے۔ ایک دم میرا خیال غزالہ کی طرف چلا گیا۔ سائیں عالی، غزالہ کا میرے قریب رہنا اچھا نہیں سمجھتا تھا اور اس سلسلے میں کئی بار غزالہ کو ڈانٹ ڈپٹ چکا تھا۔ زریں گل کا خیال تھا کہ سائیں کے اس رویّے میں کوئی حکمت ہے لیکن مجھے تو اب تک اس کے سوا کوئی حکمت نظر نہیں آئی تھی کہ وہ غزالہ کے بجائے سوہج کو میرے قریب دیکھنا چاہتا تھا۔ سائیں کی موٹر سائیکل دیکھ کر مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ وہ کہیں غزالہ کے کمرے میں نہ چلا گیا ہو۔ وہ مخبوط الحواس شخص کچھ بھی کر سکتا تھا، یہاں تک کہ غزالہ کا گلا بھی گھونٹ سکتا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر تیزی سے غزالہ کے پاس پہنچا لیکن سائیں وہاں نہیں تھا۔ غزالہ سو رہی تھی۔ میں نیچے ناگورے کے کمرے میں آیا۔ کھڑکی سے جھانکا، سائیں عالی اپنے مخصوص لباس میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ناگورے نے اس کے سامنے کھانا چن رکھا تھا۔ وہ بڑے "سلیقے" سے کھا رہا تھا۔ میرے سامنے اس نے چاولوں کے اوپر چائے انڈیلی اور پھر روانی کے ساتھ کھانے لگا۔ اس سے پہلے ایک دفعہ میں اسے مرغی کے شوربے میں شہد گھول کر پیتے دیکھ چکا تھا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ وہ ناگورے سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ بالکل چونکا نہیں بلکہ روانی سے بولا "آ شیخ محمد تم بھی چائے چاول کھاؤ اس سے پیٹ اور دماغ دونوں روشن ہوتے ہیں۔ تم نے لمبے سفر پر جانا ہے اس لیے اچھی طرح کھا پی لو۔"

"لمبے سفر پر؟ کیا مطلب؟"

"ارے کھوتے کہیں کے! ہم نے حیدرآباد جانا ہے۔ وہاں بڑے زور کا رنگ ہونے والا ہے اور تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو چڑیاں چگ جائیں کھیت؟"

"کس کھیت کی بات کر رہے ہو تم؟"

"وہی جس میں سونا چاندی اُگا ہوا ہے۔۔۔ پتا نہیں تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ اگر زیادہ دیر کرے گا تو وہ چھتیس صندوق ہاتھ سے نکل جائیں گے اور ساتھ میں سورج بھی جو تیری اصل جیون ساتھی ہے۔ وہ تیری راتوں کو مہکا کر تیرے دل و دماغ کو سکون دینے والی چیز ہے۔"

"میرا کوئی جیون ساتھی نہیں، میں بالکل اکیلا ہوں۔ تم جاؤ یہاں سے اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"میں نے تمہیں کہاں پکڑ رکھا ہے میرے چاند! تجھے تو تیرے ستاروں نے پکڑ رکھا ہے۔ تو کہیں نہیں جا سکتا۔"

ناگورے حیرت سے ہم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے کہا "ناگورے ایک کپ چائے تو لاؤ" وہ بیساکھی کے سہارے اٹھا اور چائے لینے باہر چلا گیا۔ اس کا لباس اور جسم خستہ حال تھا۔ میں

نے سائیں عالی سے پوچھا۔ اکڑ وہ یہاں سے اور کیسے پہنچا ہے۔ اس نے سب توقع اوٹ پٹانگ۔ اب وہ بولا "میں پرستان گیا تھا۔ وہاں ساہری کے بھائی کا ولیمہ تھا۔ ولیمے میں جنوں نے ہوائی فائر کیے۔ بجلی کے آدھے نیچے آ گرے اور کوہ قاف کے ڈپٹی کمشنر سمیت بارہ جن ہلاک ہوگئے۔ ان کی قبروں کے لیے پھٹوں کی ضرورت تھی۔ یہاں سری لنکا میں لکڑی بہت ہے۔ میں پہلے ادھر آنکلا۔ یہاں نظر پڑ گئی تمہارے پوتے پر۔۔۔ اب چلو میرے ساتھ پرستان۔ جنوں کی تدفین کے بعد سیدھے حیدرآباد چلیں گے۔ نواب فیروز جنگ کی حویلی میں۔"

میں نے سائیں عالی کی پُراسرار آنکھوں میں جھانکا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ "سائیں عالی جب تک غزالہ ٹھیک نہیں ہوتی اور یہاں کے مسائل حل نہیں ہوتے میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے تم کبھی نہیں جاؤ گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں اندر سے لرز گیا۔ کہیں سائیں کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ غزالہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔

"میرا مطلب ہے کہ تم نہیں جاتے تو نہ جاؤ مجھے تو جانا ہوگا۔ تمہیں پتا نہیں پرستان میں آج کل جون جولائی کا موسم ہے پھر جنوں کے جنازے ہیں۔ ایک میت کو سو من سے کم برف نہیں لگتی۔ کب تک پھٹوں کا انتظار کریں گے وہ لوگ۔"

سائیں عالی ایک بڑی سی ڈکار لے کر مڑا ہوا۔ پھر ہوا میں اشارہ کرتے ہوئے بولا "چلو بھئی پھٹے اٹھاؤ۔" نہ مجھے نظر آ رہے تھے اور نہ اٹھانے والے۔ سائیں عالی بھی جانتا تھا کہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ بس وہ اپنی اوٹ پٹانگ فطرت سے مجبور تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "بس تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ مجھے ذرا اتر لنکا کے دفتر تک لے جاؤ۔ سری لنکا سے کوہ قاف کے لیے کوئی پرواز نہیں جاتی ہے۔ بڑی مصیبت ہے۔ پہلے مجھے کولمبو سے کراچی جانا ہوگا۔ کراچی سے احمد پور شرقیہ اور احمد پور شرقیہ سے پرستان۔"

اب مجھے سائیں عالی کی بے معنی گفتگو پر زیادہ حیرت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے شکر کیا کہ اس کا دھیان ابھی سورج کی طرف نہیں گیا تھا ورنہ وہ سوال پوچھ پوچھ کر میرا ناک میں دم کر دیتا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے آؤ۔ میں چھوڑ آتا ہوں جہاں جانا ہے۔"

اس نے ایک نظر ناگورے پر ڈالی جو اسی کی طرح مشکوک الحال اور غلیظ نظر آ رہا تھا پھر اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ میں اسے گاڑی میں بٹھانا چاہتا تھا لیکن اس نے "مسروقہ" موٹر سائیکل کو ترجیح دی۔ پھر مجھے ایک اور رسک بھی لینا پڑا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ موٹر سائیکل پر بٹھا لیا۔ اس وقت تک صبح کے چھ بج چکے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے وہ نوریلیا کی مختلف سڑکوں پر فراٹے سے موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ کبھی قصبے کے اردگرد چکر لگانے لگتا، کبھی اندرونی سڑکوں پر پہنچ جاتا۔ یوں گھوڑے کی [illegible] چکراتا وہ کوئی عفریت ہی لگ رہا تھا۔ اس کا طویل و عریض لبادہ چمگادڑ کے پروں کے مانند پھڑپھڑا رہا تھا اور بار بار میرے چہرے کو ڈھانپ لیتا تھا۔ سائیں عالی ساتھ ساتھ فضا میں اشارے بھی کرتا جا رہا تھا جیسے اپنے تصوراتی جنوں کو [illegible] دے رہا ہو۔ آخر خدا خدا کر کے اس نے اتر لنکا کے بکنگ آفس کے سامنے موٹر سائیکل روکی۔ یہ دو منزلہ بکنگ آفس سیاحوں کی سہولت کے لیے علی الصباح کھل جاتا تھا۔ سائیں عالی نے مجھے موٹر سائیکل کے پاس ٹھہرایا اور خود اوپر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ پانچ دس منٹ میں وہ ٹکٹ لے کر آ جائے گا اور میں اسے کولمبو جانے والی بس میں سوار کر کے فارغ ہو جاؤں گا۔ لیکن سائیں تو وہاں جا کر [illegible] ہی ہو گیا۔ [illegible] انتظار کی سولی پر لٹکنے کے بعد میں اوپر گیا۔ سائیں عالی دفتر کے عملے کے درمیان اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ عملے میں دو مرد اور دو خواتین تھیں۔ ان سب کے چہروں سے عاجزی [illegible] تھی اور وہ سائیں عالی [illegible] قائل کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ [illegible] مرد کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے اشارے سے اسے پاس بلایا۔ "کیا جناب؟" اس نے شستہ انگریزی میں پوچھا۔

میں نے سائیں عالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شخص مجذوب ہے۔ میرے ساتھ آیا ہے۔ کیا کہہ رہا ہے آپ سے؟"

کلرک نے ایک گہری سانس لی، بولا "یہ [illegible] کہہ رہا ہے کہ اسے کولمبو سے کراچی جانے والی سب سے پہلی پرواز [illegible] خاص [illegible] جنازے میں [illegible] کے لیے وہ قاف جانا ہے۔ بڑی مشکل سے ہم نے [illegible] وہ [illegible] پہلے [illegible] نہیں جا سکتا کیونکہ [illegible] ہی جاتی ہے۔ اب اس نے ٹکٹ تو لے لیا ہے لیکن ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

کلرک اپنی [illegible] ہوئے بولا "وہ کہتا ہے کہ جہاز یہاں آئے، چونکہ میں نے یہاں سے ٹکٹ لیا ہے اس لیے سوار بھی یہیں سے ہوں گا۔۔۔ اب اس [illegible] ہزار فٹ بلند [illegible] اسٹیشن پر جہاز کون لے کر آئے۔ بہت غصے میں ہے کہتا ہے کہ تمہاری [illegible] اور میرے پاس [illegible] تم سب کی ایسی تیسی کرا دوں گا۔"

مجھے شروع سے ہی یہ [illegible] رہا تھا کہ سائیں عالی نے [illegible] جانا نہیں۔ وہ یونہی ناٹک کر رہا ہے یا پھر خلقِ خدا کو تنگ کرنے کے موڈ میں ہے۔ اچانک ایک خوش پوش نوجوان کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ ایک [illegible] کار سے نکل کر دفتر میں داخل ہوا اور اب استقبالیہ لیڈی سے محوِ گفتگو تھا۔ یہ وہی سنہالی نوجوان

جو چند ماہ پہلے جیپ کے حادثے کا شکار ہوا تھا اور جس کی جان ٹانگورے نے بچائی تھی۔ اس کے چہرے پر اب تک چوٹوں کے نشان موجود تھے اور چال میں بھی لنگڑاہٹ تھی تاہم یہ لنگڑاہٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ "آپ کا نام اروندا ہے نا؟" اس نے اثبات میں جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "میں آپ کو ایک ناخوشگوار واقعہ یاد دلانا چاہ رہا ہوں۔ چند ماہ پہلے آپ کی جیپ کو حادثہ پیش آیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہ کوئی بھولنے والا واقعہ تو نہیں تھا۔"

"میں اس وقت موقع پر ہی موجود تھا۔ آپ کی ٹانگوں پر شدید ضربیں آئی تھیں۔ ایک ٹانگ تو بری طرح زخمی ہوئی تھی۔"

"ہاں خدا کا شکر ہے کہ اب میں ٹھیک ہوں اور بغیر سہارے کے چل پھر سکتا ہوں۔"

"میرے لیے یہ بات حیرت اور خوشی کا باعث ہے۔ توقع نہیں تھی کہ آپ اتنی جلدی اچھے ہوں گے اور یوں چل پھر سکیں گے۔"

وہ مسکرایا "یہ سب اوپر والے کی مہربانی ہے۔ دراصل میرے والد ملک کے سب سے بڑے آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ وہ امریکا کی ایک معروف ترین سرجیکل یونٹ کے سربراہ ہیں اور پچھلے پانچ سال سے وہاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حادثے کے فوراً بعد انہوں نے مجھے اپنے پاس امریکا بلا لیا تھا۔ میں یہ عرصہ انہی کے پاس زیر علاج رہا ہوں۔ صرف ایک ہفتہ پہلے وہ مجھے واپس سری لنکا لے کر آئے ہیں۔"

میرے ذہن میں ایک پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ ٹانگورے کا سب سے بڑا مسئلہ بھی تو اس کی ٹانگ کا فریکچر تھا۔ اس سلسلے میں اس نے مقامی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تھا لیکن وہ کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کر سکے تھے۔۔۔۔ میں نے اروندا سے کہا "آپ کو یاد ہے ایک مقامی ایتھلیٹ نے آپ کو جیپ کے نیچے سے نکالا تھا۔ ٹانگورے نام تھا اس کا۔"

اروندا بولا "میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔ اس کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ قدرت نے آپ کو یہ احسان چکانے کا ایک موقع دیا ہے۔ ٹانگورے کو اس وقت آپ کی شدید ضرورت ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟" اروندا نے کہا۔

"اگر آپ کے پاس تھوڑا سا وقت ہو تو ہم کہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

"ضرور۔۔۔۔ ضرور" اروندا نے جواب دیا اور میرے ساتھ ائرلائن کے دفتر سے باہر آ گیا۔ وہ بیوک گاڑی خود چلا کر یہاں پہنچا تھا۔ ہم گاڑی کے اندر بیٹھ گئے۔ وہ بولا "میں اس وقت بہت جلدی میں تھا اس لیے ٹانگورے سے ملے بغیر نوریلیا سے واپس جا رہا تھا تاہم دس پندرہ دن بعد مجھے پھر آنا تھا۔ میرا پروگرام تھا کہ ٹانگورے اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ اطمینان سے ملاقات کروں گا۔" پھر ذرا توقف سے بولا "کیا بات ہے ٹانگورے کے ساتھ؟ وہ خیریت تو ہے نا؟"

میں نے جواب میں ٹانگورے کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ اروندا محویت اور ہمدردی سے سنتا رہا۔ ٹانگورے کی ٹانگ ٹوٹنے والا واقعہ سن کر اس کی آنکھوں میں گہرا اضطراب کروٹیں لینے لگا۔ اس نے پوچھا "آپ کہاں ہے ٹانگورے؟"

"اپنے گھر میں" میں نے جواب دیا "نشے میں دھت پڑا رہتا ہے۔ دس گیارہ بجے سے پہلے بستر نہیں چھوڑتا۔"

"مجھے اس کے پاس لے چلیں" اروندا نے عجلت سے کہا۔

"میرے ساتھ ایک شخص ہے۔ اوپر ائرلائن کے بکنگ آفس میں گیا ہے میں اسے بتا کر آتا ہوں۔"

میں دفتر کے زینے چڑھ ہی رہا تھا کہ سائیں عالی نیچے اترتا دکھائی دیا۔ میں نے کہا "سائیں عالی کیا بنا ٹکٹ کا؟"

وہ بولا "میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں جنوں کی ائرلائن پر کوہ قاف جاؤں گا۔ مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ ان کے ائرپورٹ ہر چھوٹے بڑے شہر میں موجود ہیں اور سروس بھی لاجواب ہے۔ پی ٹی اے کی۔"

"پی ٹی اے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا

"ہاں۔۔۔ پرستان انٹرنیشنل ائر۔ تم خود سوچ لو۔ جس میں جن بیٹھے ہیں وہ کتنی تیز رفتار سروس ہوگی۔ یہ مردار ائرلنکا تو اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی" اب تم کہاں جاؤ گے؟"

وہ بولا "تمہارے ساتھ۔"

"لیکن مجھے تو ایک دوست کے ساتھ جانا پڑ گیا ہے۔ وہ باہر میرا انتظار کر رہا ہے۔"

سائیں عالی معنی خیز لہجے میں بولا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ تم آؤ گے موٹر سائیکل پر اور جاؤ گے کسی لمبی سی گاڑی پر۔۔۔۔ خیر جیسے تمہاری مرضی۔"

سائیں عالی کے الفاظ برقی لہروں کی طرح میری سماعت میں کوند گئے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق کھڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سائیں عالی ائرلائن کے دفتر میں آیا ہی اس لیے تھا کہ یہاں اروندا سے میری ملاقات ہو سکے اور اس ملاقات کی وجہ سے ٹانگورے کی کہانی ایک نیا موڑ لے سکے۔ میں نے غور سے سائیں کا چہرہ دیکھا۔ مجھے اپنے جسم میں سرد لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔ سائیں کی پُراسرار روحانیت ایک بار پھر پوری شدت سے اپنے "وجود" کا احساس دلا رہی تھی۔۔۔۔ کوئی

بات تھی اس شخص میں جو اسے عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔

میں اروندا کے ساتھ ٹانگورے کے گھر پہنچا۔ شاندار بیوک جھونپڑی سی گلی میں داخل ہو کر دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہم اندر پہنچے تو ٹانگورے حسب توقع بستر میں ہی تھا۔ میلے کچیلے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا وہ خود بھی ایک چیتھڑا ہی نظر آتا تھا۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ٹانگ غلیظ پٹیوں میں لپٹی اور ناریل کے تیل میں بھیگی ایک عضو معطل کی طرح چارپائی پر پڑی تھی۔ اروندا اس کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

O☆O

اگلے چوبیس گھنٹے میں واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ اروندا کے والد صاحب معروف آرتھوپیڈک سرجن کملا راجے کینڈی میں تھے۔ اروندا نے فون کر کے ان سے ہدایات لیں اور پھر ٹانگورے کو اپنی بیوک کے ذریعے کینڈی لے گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ کینڈی کے سب سے بڑے اسپتال میں مسٹر کملا راجے سے ملاقات ہوئی۔ وہ پینتالیس پچاس برس عمر کے ایک بارعب ڈاکٹر تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی خود اعتمادی دیکھ کر ان کے مسیحا صفت ہونے کا یقین آ جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے "بیٹے کے محسن" پر فوری توجہ دی اور وہ معائنہ جس کے لیے مریضوں کو مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا اور لاکھوں خرچ کرنا پڑتے تھے دو گھنٹے میں ہو گیا۔ اس تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر کملا راجے نے مجھے اور اروندا کو خوش خبری سناتے ہوئے کہا "مریض کا آپریشن ہو جائے گا اور ٹانگ بالکل ٹھیک کام کرنے لگے گی۔"

"کیا وہ پھر سے بھاگ دوڑ سکے گا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہنڈرڈ پرسینٹ" ڈاکٹر کملا راجے نے زندگی بخش لہجے میں کہا "بالکل عربی گھوڑے کی طرح دوڑے گا۔"

اروندا نے کہا "ڈیڈی ان کا مطلب ہے۔۔۔۔۔"

"میں ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا ہوں" ڈاکٹر نے بیٹے کی بات کاٹی "یہ لڑکا بھاگ دوڑ کے ہر مقابلے میں حصہ لے سکے گا۔ یو ڈونٹ وری۔ اٹ ول بی آل رائٹ۔"

اسی روز شام کو ڈاکٹر کملا راجے نے بتایا کہ دو روز بعد مریض کو کولمبو لے جانا ہوگا۔ اس کا آپریشن ممکن ہے کہ کولمبو میں ہی ہو۔ آپریشن کے بعد بھی دو تین ہفتے تک وہ زیر نگرانی رہے گا۔ اروندا سے مشورہ کرنے کے بعد میں نوریلیا واپس روانہ ہو گیا۔ ٹانگورے کے والدین کو اطلاع دینا تھی اور ٹانگورے کا سامان وغیرہ کینڈی پہنچانا تھا۔ کینڈی سے نوریلیا تک کا سفر میں نے بس میں طے کیا۔ بس میں ہی میں نے اخبار میں یہ چھوٹی سی خبر بھی دیکھی "سیٹھ تاسنری لال کے بیٹے کی ڈاکوؤں کے ہاتھوں پٹائی۔ دونوں بازو توڑ ڈالے" یقیناً میں یہ خبر تفصیل سے پڑھتا اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتا لیکن اس وقت میرے ذہن پر کچھ اور قسم کی سوچیں حملہ آور تھیں۔ راستے بھر میں سوچتا رہا کیا ڈاکٹر کملا راجے کی بات سچ ہو سکے گی۔ کیا ٹانگورے واقعی ایک بار پھر دوڑ کے مقابلوں میں حصہ لے سکے گا۔ کیا یہ انہونی ہو سکے گی کہ وہ اپنے ازلی حریف "سوار نوری" کو شکست دے سکے۔ دراصل اتنی ناکامیاں ٹانگورے کے حصے میں آئی تھیں کہ اب اس کے حوالے سے کامیابی کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ نجانے کیوں دل میں ایک خدشہ سا تھا کہ سب کچھ ٹھیک بھی ہو گیا اور ٹانگورے واپس کھیل کے میدان میں آ بھی گیا تو وہ نوری سے نہیں جیت سکے گا

انہی سوچوں میں گم میں نوریلیا پہنچا۔ بس سے اتر کر پیدل ہی ٹانگورے کے گھر آ گیا۔ گھر کے سامنے میدان میں مجمع نظر آیا۔ اس مجمع کے درمیان سائیں عالی دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے ناچ رہا تھا۔ پنجابی اور اردو میں اس انداز کو دھمال ڈالنا کہتے ہیں۔ دھمال کے دوران میں وہ کوئی نعرہ بھی لگا رہا تھا۔ مجمع میں موجود لوگ ایک آواز ہو کر اس نعرے کا جواب دے رہے تھے۔ یہ نعرہ بازی سنہالی میں ہو رہی تھی اس لیے میں سمجھ نہ سکا۔ قریب جا کر دیکھا تو سائیں عالی کے ہاتھ میں ایک تصویر بھی نظر آئی۔ یہ بڑے سائز کی فریم شدہ بلیک اینڈ وہائٹ تصویر تھی اور میں کئی دفعہ ٹانگورے کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ یہ ٹانگورے ہی کی تصویر تھی۔ میں نے مجمع میں موجود ایک پڑھے لکھے شخص سے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ انگریزی میں بولا "کوئی مجذوب ہے کل شام سے یہاں مجمع لگائے کھڑا ہے۔"

"یہ کہہ کیا رہا ہے۔۔۔۔؟" میں نے دریافت کیا۔

"کہہ رہا ہے۔۔۔۔ جیتے گا۔ بھئی جیتے گا۔ دوسرے لوگ بھی جواب میں کہتے ہیں۔۔۔۔ جیتے گا بھئی جیتے گا۔۔۔۔ کل شام سے یہی کچھ ہو رہا ہے"

وہ تیس چالیس افراد کا مجمع تھا۔ وہ سب بڑے والہانہ انداز میں سائیں عالی کا رقص دیکھ رہے تھے اور اس کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن اس مسکراہٹ میں طنز یا تضحیک کے بجائے ادب و احترام کا عنصر تھا۔ سائیں عالی میں یہ پراسرار خاصیت موجود تھی کہ وہ انجانے لوگوں کو معمولی کوشش سے اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا اور وہ اس پر بے پناہ بھروسا کرنے لگتے تھے۔ شاید یہ ہپناٹزم کی کوئی شکل تھی یا پھر اس روحانیت کا کرشمہ تھا جو سائیں عالی کے سراپا میں موجزن نظر آتی تھی۔ وہ نعرہ لگاتا تھا "جیتے گا بھئی جیتے گا۔"

مجمع یک زبان ہو کر جواب دیتا تھا "جیتے گا ہاں جیتے گا۔"

سائیں عالی کے ہاتھ میں ٹانگورے کی تصویر تھی اور وہ اپنے ساتھ ساتھ تصویر کو بھی نچا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ سائیں عالی جو نعرہ زنی کر رہا ہے وہ ٹانگورے کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس وسیع و عریض میدان کے اندر کھڑا ہو کر یہ پیش گوئی کر رہا تھا کہ ٹانگورے اپنے پرانے حریف نوری سے جیت جائے گا۔ بہرحال

یہ میرا قیاس تھا اس نعرے کا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ کہ ناگورے اپنی محبت جیت جائے گا۔ یعنی شاستری اول کی سندر چتری اپلا کو یا پھر یہ کہ اگر وہ کھیل کے میدان میں نہیں جیت سکا تو کسی دوسرے میدان میں جیت کر دکھائے گا۔ بہرطور کچھ بھی تھا یہ نعرہ بازی ناگورے کے حق میں تھی۔ میں نے بھی دل ہی دل میں سائیں نے نعرے کا جواب دیا اور دعا کی کہ ان کے مصائب ختم ہو جائیں۔

سائیں عالی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی یا شاید اس نے جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کیا تھا۔ میں اس سے بغیر ملے ہی واپس ہو گیا۔ زینے طے کر کے اوپر کمرے میں پہنچا تو غزالہ حسب معمول کروٹ کے بل بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ ناگورے کی بہن نادو ابھی ابھی گلدان میں پھول بدل کر گئی ہے۔ پورا کمرا گلابوں کی مانند خوشبو سے مہک رہا تھا لیکن ان پھولوں کی تازگی غزالہ کے چہرے پر نہیں تھی۔ چہرہ ویران اور اداس تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی سے پار سائیں عالی کی نعرہ زنی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے زرد سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری اور کھڑکی سے نگاہیں ہٹا لیں۔ بات چیت کرنے میں اس کی بہت توانائی خرچ ہوتی تھی لہٰذا میں کوشش کرتا تھا کہ بولنے سے پہلے ہی اس کا مافی الضمیر سمجھ جاؤں۔ وہ ناگورے کے بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "ناگورے بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کملا راجے نے اس کا آپریشن کرنے کی ہامی بھری ہے۔ ہم اسے کل کولمبو لے جا رہے ہیں۔ وہاں ڈاکٹر کملا راجے خود اس کا آپریشن کریں گے اور وہ ڈیڑھ دو ماہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کملا راجے کا تو کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی کی طرح بھاگ دوڑ بھی سکے گا۔"

غزالہ کی آنکھوں میں موہوم سی چمک نمودار ہو گئی۔ غیر خصوصی طور پر اسے ناگورے سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اور اس کی "جیت" غزالہ کی خواہش بن گئی تھی۔ میں نے کہا "غزالہ! میں جانتا ہوں کہ تم ناگورے کو فتح یاب دیکھنا چاہتی ہو لیکن پلیز اپنی اس خواہش کو "وہم" نہ بناؤ۔ تمہاری صحت یابی یا بیماری کا اس مقابلے سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہاری یہاں موجودگی میں ناگورے دو دفعہ یہ "ریس" ہارا ہے لیکن اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑا ہے۔ تمہاری صحت کی بہتری یا خرابی کا تعلق تمہاری ذہنی و جسمانی حالت سے ہے۔ خود کو پرسکون رکھو۔ اپنے اندر جینے کی رغبت پیدا کرو اور کوشش کر کے غذا اپنے جسم میں پہنچاؤ۔"

وہ مسکرائی اور نقاہت بھری آواز میں بولی۔ "پتہ نہیں ان دنوں نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ دماغ ہر وقت بے معنی سوچیں سوچتا رہتا تھا۔ عجیب عجیب سے ہیولے مجھے ڈراتے تھے۔ اب بہت بہتر ہو گئی ہوں لیکن پھر بھی کبھی کبھی وہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ کل یونہی بیٹھے بٹھائے تمہارا خیال آ گیا۔ وہ کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ اس کا شوہر (شیخ عاصم) میری بہن کے بارے میں کتنے نیک منصوبے رکھتا ہے۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا "سب ٹھیک ہو جائے گا غزالہ! اب تھوڑی سی آزمائش رہ گئی ہے۔"

اتنے میں زینوں پر آہٹ ہوئی اور پھر کسی نے دھکیل کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ناگورے کی چنچل بہن نادو کھڑی تھی اور نادو کے ساتھ چچی فاخرہ اور چچا جلیس نظر آ رہے تھے انہیں دیکھ کر غزالہ کے ساتھ ساتھ میں بھی دم بخود رہ گیا۔ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ یوں بن بتائے پاکستان سے سری لنکا چلے آئیں گے اور پھر اس قصبے تک آ پہنچیں گے۔

والد اور والدہ کو دیکھ کر غزالہ کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ بھی بیٹی کی حالت دیکھ کر ششدر نظر آ رہے تھے۔ چچی فاخرہ کے حلق سے کراہ سی نکلی اور وہ بھاگ کر بیٹی سے لپٹ گئی۔ اس نے غزالہ کی کمر میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھا لیا اور گلے سے لگا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ چچا جلیس نے بھی غزالہ کے گرد بازوؤں کا حلقہ قائم کر دیا۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا یہ جذباتی ملاپ دیکھتا رہا۔ دو تین منٹ بعد جب آنسوؤں کی یورش تھمی تو چچی فاخرہ نے ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھا۔ چچا جلیس بھی جیسے چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے۔

انہوں نے بے دلی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور پوچھا "کیسے ہو شاہ جہاں؟"

"ٹھیک ہوں" میں نے مختصر جواب دیا۔ "لیکن آپ اچانک کیسے آن پہنچے؟"

"ایڈریس تو تم نے ہمیں تاریخ والے خط میں لکھ دیا تھا۔ ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "لیکن غزالہ آپ کو یہ بھی تو لکھوا رہی ہے کہ اب وہ بہتر ہے۔ آپ یہاں نہ آئیں۔"

"ہمیں برداشت نہیں ہو سکا ہم سے۔"

"مگر آپ کو آنا ہی تھا تو اطلاع کرتے۔ میں کم از کم آپ کو کولمبو سے لے آتا۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہی کولمبو سے آیا ہوں۔ ابھی چند منٹ پہلے پہنچا ہوں۔"

"ٹیلی گرام تو دیا تھا شاید ملا نہیں" چچی فاخرہ نے خشک لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ ٹیلی گرام کو خوامخواہ موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔

نادو نے ایک سنہری بکسا کر اندر رکھ دیا۔ یہ چچا جلیس کا بیگ تھا۔ اب وہ ایک کونے میں خاموش کھڑی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے چائے وغیرہ لانے کے لیے کہا۔ چچی فاخرہ دونوں ہاتھوں سے غزالہ کی بلائیں لے رہی تھی۔ کبھی اس کا منہ چومتی کبھی گلے سے لگاتی تھی "ہائے اللہ کیا حال ہو گیا میری بچی کا۔ ہڈیوں کا

ڈھانچا بن گئی۔ صورت ہی نہیں پہچانی جاتی۔ اللہ اس کی ساری بیماری میرے سر۔ اللہ! اسے ٹھیک کر دے" میں نے سوچا اگر یہ لوگ غزالہ کو دو ماہ پہلے دیکھتے تو ان کا کیا حال ہوتا۔ اس وقت وہ قریب مرگ تھی اور واقعتاً ہڈیوں کا ناقابلِ شناخت ڈھانچا نظر آتی تھی۔

میں اس بات کا امیدوار نہیں تھا کہ چچی چچا اپنی بیٹی کی طرح میرا ماتھا بھی چومیں گے، مجھے سینے سے لگائیں گے اور تحسین کی باتیں کریں گے تشکر کے پھول پرو کر میرے گلے میں پہنائیں گے لیکن اتنی توقع مجھے تھی کہ وہ مجھ سے "شکریے" کا اظہار کریں گے۔ زبانی کلامی ہی سہی لیکن اس بات کی تعریف کریں گے کہ میں نے دیارِ غیر میں ان کی بیٹی کو سنبھالا اور اس کی جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کی لیکن ان دونوں نے رسمی طور پر بھی ایسی بات منہ سے نہیں نکالی۔ بلکہ چچی فاخرہ نے تو ایک توصیفی جملے کے سوا مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ نجانے میرے خلاف کدورتوں کے کیسے کیسے انبار سمیٹ رکھے تھے اس عورت نے اپنے سینے میں۔ وہ میری ازلی دشمن تھی۔ میری کوئی بھی بھلائی، کوئی بھی کوشش اس کے "ازلی خیالات" کو بدل نہیں سکتی تھی۔

میں چچا جلیس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ماں بیمار بیٹی کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی اور راز و نیاز کرنے لگی۔ میں نے یہاں کے حالات کے بارے میں چچا جلیس کو خطوط میں بہت کچھ لکھ دیا تھا جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بھی مختصر الفاظ میں بتا دیا۔

چچا جلیس نے کہا "میں نے فون پر عاصم سے امارات میں رابطہ کیا ہے۔ وہ تو کہتا تھا کہ وہ غزالہ کے علاج اور نگہداشت کا پورا انتظام کر کے امارات آیا تھا اور اس کے لیے اکاؤنٹ میں بہت سی رقم بھی چھوڑ کر گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اول تو اس نے ایسا کچھ کیا نہیں لیکن اگر کرتا بھی تو ہر چیز پیسے سے خریدی نہیں جا سکتی۔ ایک شوہر کی حیثیت سے اسے اپنی جاں بلب بیوی کے پاس رہنا چاہیے تھا لیکن وہ اسے نازک حالت میں چھوڑ کر امارات چلا گیا اور میرے علم میں نہیں کہ وہ آپ کی بیٹی کی بیماری کے دوران میں ایک بار بھی اس کی خبر گیری کرنے آیا ہو۔"

"وہ خود نہیں آ سکا لیکن اس نے ہر پل غزالہ کے بارے میں اطلاع رکھی ہے۔ دراصل وہاں کوئی ایسی مصروفیت ہے جس کی وجہ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ ابھی بھی نہیں آ سکا۔ کوئی گہرا چکر چلا ہوا ہے وہاں۔"

"کوئی چکر نہیں چلا ہوا وہاں۔ اگر چکر چلا ہوا ہے تو یہاں چلا ہوا ہے۔ وہ پرلے درجے کا خود غرض اور مکار شخص ہے اور یہ بھی آپ کی خوش فہمی ہے کہ اس نے ہر پل غزالہ کے بارے میں خبر رکھی ہے۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا غزالہ کی طرف۔ وہ تو بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور امارات میں شکار کھیل رہا تھا۔ اس کے دشمن غزالہ کے دشمن تھے اور غزالہ کی وجہ سے وہ میرے دشمن تھے۔ جب انہوں نے ہم دونوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ہمیں یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے شیخ عاصم سے تاوان طلب کیا تھا۔ شیخ نے تاوان کیا ادا کرنا تھا وہ تو خود چاہتا تھا کہ ہم دونوں کا قصہ پاک ہو جائے۔"

چچا جلیس سپاٹ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے سمجھتا ہو کہ میرے دماغ کو ہوا چڑھی ہوئی ہے اور میں اپنے رقیبانہ جذبات کی وجہ سے واہی تباہی بول رہا ہوں۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر بولا "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں شاہ جہاں! دراصل جو کچھ ہوا وہ عاصم کے سیکرٹری نرائن کے اغوا کے سبب ہوا۔ غزالہ کی تمام تر ذمہ داری سیکرٹری نرائن پر تھی۔ چیک وغیرہ پر سائن بھی اسی کے حوالے تھے۔ اس کے نہ ہونے سے تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔"

"ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ شیخ عاصم کو پل پل کی خبر تھی۔ کیا وہ جانتا نہیں تھا کہ سیکرٹری غائب ہے اور غزالہ اسپتال میں بے یار و مددگار پڑی ہوگی؟"

"جب یہ واقعہ ہوا تو عاصم دبئی میں نہیں تھا۔ یہ بات اسے بہت دیر سے معلوم ہوئی۔ اس وقت تک وہ اپنے معاملات میں بری طرح الجھ چکا تھا۔"

"شیخ عاصم کچھ بھی کر لے، سیاہ کو سفید ثابت نہیں کر سکتا اور نہ آپ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ واقعی کسی غلط فہمی میں ہیں تو وہ بھی بہت جلد دور ہو جائے گی اور اپنے داماد کا اصل چہرہ آپ کے سامنے آ جائے گا" میں تیز قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

اگلے روز علی الصباح میں ناگورے کا سامان وغیرہ لے کر کینڈی چلا گیا اور اسی روز شام کو ہم کینڈی سے کولمبو روانہ ہو گئے۔ ہم نے بذریعہ سڑک سفر کیا تھا۔ اروندا کی شاندار بیوک کی پچھلی نشست پر ناگورے نیم دراز ہو گیا۔ میں اروندا کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم صرف ایک اسٹاپ کر کے اسی رات گیارہ بجے کولمبو پہنچ گئے۔ اروندا کے والد مشہور و معروف سرجن ڈاکٹر کملا راجے ہم سے پہلے ہی کولمبو پہنچ چکے تھے۔ ایک جدید اسپتال "ژان میموریل" میں انہوں نے ناگورے کا چار گھنٹے تک طویل آپریشن کیا اور ہمیں یہ خوش خبری سنائی کہ ناگورے کے آرتھوپیڈک مسائل بہت کامیاب طور پر آپریٹ ہو گئے ہیں۔

ناگورے کا آپریشن ہو چکا تو میں نے اس کے والد کو نوریلیا اطلاع بھجوا دی۔ وہ فوراً کولمبو پہنچ گئے۔ ان کے آ جانے سے مجھے فرصت ملی اور میں غزالہ کو دیکھنے کے لیے واپس نوریلیا آ گیا۔ نوریلیا کا موسم بہت خنک ہو گیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے بارش اور ژالہ باری ہو رہی تھی۔ میں غزالہ کے کمرے میں پہنچا تو وہ بستر

تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس چچا چچی کے علاوہ ایک نہایت فربہ اندام شخص موجود تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ امارات کا باشندہ ہے۔ چچا جلیس نے بتایا کہ یہ شیخ عاصم کے منیجر مسٹر داؤد ہیں اور صرف غزالہ کی خبر گیری کے لیے امارات سے یہاں پہنچے ہیں۔ غزالہ کے بستر کے پاس پھولوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا اور تحفے تحائف قسم کی کچھ دیگر اشیا تھیں۔ یہ شخص شیخ عاصم کی نمائندگی کے لیے یہاں آیا تھا۔ چچا کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ غزالہ کے نام شیخ کا ایک طویل خط بھی لایا ہے۔ اس خط میں شیخ عاصم نے غزالہ کو یہ "مژدہ" سنایا تھا کہ وہ چند دن تک امارات میں اپنے پیچیدہ معاملات سلجھا لے گا اور پھر سری لنکا پہنچنے کے حوالے سے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔

داؤد نامی یہ شخص مجھے بڑی خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا' جیسے میری یہاں موجودگی اسے ایک لمحے کے لیے بھی پسند نہ ہو۔ میں خود ہی اٹھ کر باہر آگیا۔ ایس پی برکت بالکونی میں ٹہل رہا تھا۔ وہ نہاری کھانے والا اور پیڑوں کی لسی پینے والا بندہ تھا۔ یہاں سری لنکا کی چائے پی پی کر اس کا ستیاناس ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا وہ بڑی اداس صورت بنائے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا "شاد جہاں! اب اور کتنی دیر ہمیں یہاں رکنا ہے؟"

"یہ تو حالات پر منحصر ہے" میں نے کہا۔

"حالات بھوتنی دے تو اب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اصل مسئلہ تو اس کڑی غزالہ کا تھا۔ اس کے والی وارث پہنچ گئے ہیں۔ اب وہ سنبھال لیں گے اسے۔ باقی رہی ناگورے کی بات' تو اس کا آپریشن بھی ہو گیا ہے۔"

"چاچا برکت" میں نے اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ غزالہ کو اس حالت میں چھوڑ کر مجھے کہیں جانا نہیں چاہیے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ شیخ عاصم' بکتے کا ایک بہت اونچی کلاس کا فراڈیا ہے۔ وہ مجھے اذیت دینے کے لیے غزالہ کو کسی بھی مصیبت سے دوچار کر سکتا ہے۔"

"یار! تم اس حرامی شیخ عاصم سے جان چھڑوا کیوں نہیں دیتے اس لڑکی کی۔ اگر لڑکی سمجھتی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی تو قانون میں اس کے لیے طریقہ کار موجود ہے" ایس پی برکت کے اس فقرے میں حسب معمول تین چار گالیاں بھی شامل تھیں۔

"مسئلہ تو یہی ہے چاچا" میں نے کہا۔ "غزالہ ایک مشرقی لڑکی ہے اور مشرقی لڑکی کے دل میں شوہر کی بے وفائیوں' بے اعتنائیوں اور دغابازیوں کے لیے بڑی جگہ ہوتی ہے۔ وہ ایسے فیصلے آسانی سے نہیں کر سکتی جن میں طلاق یا علیحدگی کی بات ہو۔ میرا خیال ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود غزالہ شیخ عاصم کو اپنا شوہر ہی سمجھتی ہے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"یہی تو دیکھنا ہے" میں نے مختصر جواب دیا۔

ایس پی برکت بولا "لڑکی کی ماں بڑی چنڈال عورت ہے۔ بالکل نہیں چاہتی کہ اتنا دولت مند امیر کبیر داماد ہاتھ سے جائے۔ کل وہ بیٹی کو باہر بالکونی میں لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی اور ساتھ ساتھ سمجھا بھی رہی تھی۔"

"کیا سمجھا رہی تھی؟" میرا تجسس ایک دم بیدار ہوگیا۔

"میں نے زیادہ تو نہیں سنا۔ بس تھوڑی سی بات کان میں پڑی تھی۔ کہہ رہی تھی' زندگی میں اونچ نیچ آتی ہی رہتی ہے' پھر بھی وہ تمہارا شوہر ہے......"

دوسرے روز علی الصباح مجھے پتا چلا کہ غزالہ کے، غزالہ کو لے کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ میں نے چچا جلیس سے دریافت کیا تو وہ بولا "ہم سری لنکا سے نہیں جا رہے بلکہ نوریا سے بھی نہیں جا رہے' بس رہائش تبدیل کر رہے ہیں۔ مسٹر داؤد نے ایک مقامی ہوٹل میں سوئٹ بک کرایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں زیادہ آرام سے رہے گی۔"

"آپ نے غزالہ سے پوچھ لیا ہے؟"

"اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اچھی طرح ہوں۔"

"دیکھیں' آپ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کریں۔ وہ ماحول میں بہت خوش ہے اور خود کو بہتر محسوس کرتی ہے۔"

چچا جلیس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "منٹ بیٹھ کر میری بات سن لو۔"

میں بیٹھ گیا۔ کمرے میں وہ اور میں اکیلے تھے۔ چچا جلیس گمبھیر لہجے میں کہا "تم نے جو کچھ غزالہ کے لیے کیا میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں اور میں یہ بات زبان سے نہیں دل سے کہ ہوں۔"

"یہ میرا فرض تھا" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

چچا جلیس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "تم کی طرف سے کافی بدظن ہو اس لیے میں بہتر سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تمہیں کچھ بتا دوں۔ امید رکھتا ہوں کہ تم یہ بات اپنے تک ہی رکھو گے۔"

"جی فرمائیے" میں نے کہا۔

"عاصم' غزالہ کی بیماری کے دوران میں اس لیے سری نہیں آسکا کہ وہ پولیس کی حراست میں تھا۔ بعد ازاں جوڈیشل ریمانڈ پر اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ بہرطور اب اس کی ضمانت ہو گئی ہے اور وہ عنقریب یہاں پہنچ جائے گا۔"

یہ اطلاع میرے لیے زیادہ غیر متوقع نہیں تھی۔ مجھے معلوم شیخ عاصم' غزالہ کے والدین سے کوئی ایسا ہی بہانہ بنائے گا۔ فی الحال اگر کسی کرتوت کی وجہ سے اسے جیل کی ہوا کھانا ہی پڑی تھی

اس غفلت اور سنگدلی کا کوئی جواز نہیں تھا جو اس نے اپنی حیات سے روا رکھی تھی۔ چچا جلیس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ وہی بم دھماکا کیس والا معاملہ ہے جس میں عاصم کو غلط پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بہرطور عدالت کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ امید ہے چند روز تک اس کی ہو جائے گی۔ یقینی بات ہے کہ اگلی ایک دو میٹنگوں میں وہ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "میں اس بارے میں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔"

چچا جلیس چند لمحے تک گمبھیر نظروں سے میرا چہرہ تکتا رہا' پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں تم سے بڑا ہوں شاہ جہاں ہاتھ جوڑ کر تمہاری منت کرتا ہوں۔ میری بیٹی کو اس کے حال چھوڑ دو۔ اس کی زندگی سے دور چلے جاؤ۔ اس کو اپنے طور پر جینے"

میں نے چونک کر دیکھا' چچا جلیس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے یوں خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا میں کوئی عفریت ہوں۔ ایسا عفریت جو موقع ملتے ہی اس کی بیٹی کی ازدواجی زندگی کو نگل جائے گا۔ میں جانتا تھا چچا کی اہوں میں یہ خوف چچی کا پیدا کردہ ہے اور اس کے منہ میں جو بان حرکت کر رہی ہے وہ بھی چچی ہی کی ہے۔ پھر چچا نے ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"چھوڑ دے شاہ جہاں' میری بچی کا پیچھا چھوڑ دے۔ میں اور میرا گھرانا زندگی بھر تیرے احسان مند رہیں گے۔"

ان لمحات میں مجھے چچا پر ترس آیا لیکن اس ترس میں وہ نفرت بدرجہ اتم موجود تھی جو مجھے ان میاں بیوی سے تھی۔ میں سب کچھ بھول سکتا تھا لیکن اپنی ننھی بہن کے ننھے ہاتھ پر گرم چمٹے کا داغ نہیں بھول سکتا تھا اور اپنی وہ عزت افزائی نہیں بھول سکتا تھا جو ہل کوٹ کے گلی کوچوں میں ہوئی تھی۔

میں جانتا تھا چچی اور چچا نے غزالہ سے پوچھا ہوگا کہ وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے یا نہیں۔ غزالہ نے صاف انکار کیا ہوگا۔ وہ اس ماحول سے اتنی مانوس ہو چکی تھی کہ اپنے گھر ہی کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ کھڑکی سے نظر آنے والا سرسبز میدان اور اس میدان میں صبح و شام کھیلتی کودتی 'ناچتی زندگی' اور پس منظر میں خوب صورت پہاڑوں کے نظارے...... یہی وہ منظر تھے جنہوں نے غزالہ میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا کی تھی۔ وہ ان مناظر سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کسی وقت اگر میں کھڑکی پر پردے کھینچ دیتا تھا تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ میں اس کی اس ذہنی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں غزالہ سے پوچھے بغیر ہی پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ چچی چچا غزالہ کو اس کی خواہش کے بغیر یہاں سے لے جا رہے ہیں۔

میں نے سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا اور چچا سے کہا "میں جانتا ہوں آپ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کو ڈر ہے کہ آپ کا داماد اس بات پر ناراض ہوگا کہ غزالہ اس گھر میں رہتی ہے جہاں میں رہ رہا ہوں۔ آپ کا خوف بجا ہے۔ مجھ جیسا خطرناک شخص آپ کی بیٹی کی "خوشگوار" ازدواجی زندگی کو کسی بھی وقت تباہی کے کنارے پہنچا سکتا ہے۔ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں آپ۔ میں کوڑھ مغز ہوں۔ آپ کے کہنے سے پہلے ہی مجھے اس بات کا علم ہو جانا چاہیے تھا۔ بہرحال آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ جتنے دن یہاں اپنی بیٹی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں' سکون سے رہیں۔ میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔"

"ہم...... میرا یہ مطلب......"

"میں نے کہہ دیا نا کہ آپ نوریلیا میں دوبارہ میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ میری وجہ سے خود کو اور اپنی بیمار بیٹی کو ہوٹلوں میں خراب نہ کریں۔"

میں نے اسی وقت اپنا مختصر سامان سمیٹا' ایس پی برکت کو ساتھ لیا اور ناگورے کے گھر سے روانہ ہو گیا۔ ناگورے کا والد رام سنہا تو اسپتال میں ناگورے کے پاس تھا۔ گھر میں صرف اس کی والدہ' بہنیں اور بھابی تھیں۔ وہ میرے یوں اچانک روانہ ہونے پر سخت حیران ہوئیں۔ ناگورے کی والدہ کا اصرار تھا کہ میں کم از کم ناگورے کے والد کے آنے تک رک جاؤں۔ میں نے کہا۔ "میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ میرا رکنا ممکن نہیں ورنہ میں رک جاتا۔"

نادو نے پوچھا "اور بڑی بہن غزالہ؟"

میں نے کہا "امید ہے وہ یہیں رہے گی۔"

"اور ان کے والدین؟"

"وہ بھی یہیں رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ جب تک رہیں انہیں کوئی شکایت نہ ہو" میں نے کچھ رقم زبردستی نادو کے حوالے کر دی۔ وہ انکار ہی کرتی رہ گئی۔ میری روانگی پر وہ افسردہ تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ آخر ایسی کیا وجہ ہے کہ میں جا رہا ہوں اور باقی لوگ یہیں ہیں۔ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا "میں نوریلیا سے جا نہیں رہا۔ یہیں کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ تم سے پھر ملاقات ہوگی اور خدا نے چاہا تو ہم سب ناگورے کو دوبارہ بھاگتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔"

ناگورے کی بوڑھی والدہ سنہالی میں مسلسل واویلا کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں اس کی مکمل بات تو نہیں سمجھ سکتا تھا تاہم مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ ناگورے میری ہر بات مانتا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں کہ وہ ہندو سیٹھ کی لڑکی کا خیال دل سے نکال دے۔ اس دفعہ تو وہ زندہ بچ گیا ہے' اگلی مرتبہ وہ لوگ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔

میں نے اشاروں کنایوں میں بوڑھی عورت کو سمجھایا کہ وہ حوصلہ رکھے' عنقریب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں ان حالات میں نوریلیا سے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا' صرف چچی چچا کی پریشانی کم کرنے کے لیے میں نے ناگورے کا گھر چھوڑا تھا۔ میں کسی قریبی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا اور میری خواہش تھی کہ غزالہ کے حالات کی مجھے ہر پل خبر رہے۔ نجانے کیوں مجھے اس سے دور جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا۔

نوریلیا کے وسط میں واقع ایک "شاستری" نامی ہوٹل ہمیں قیام کے لیے پسند آیا۔ صاف ستھرا علاقہ تھا۔ رونق بھی تھی اور ٹیلی فون کی سہولت' جو نوریلیا میں خال خال ہی میسر تھی یہاں موجود تھی۔ اس ہوٹل میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا کہ مالک کوئی ہندو ہے کیوں کہ استقبالیہ کے عین پیچھے ایک شوکیس میں دیوی دیوتاؤں کی طلائی مورتیاں آراستہ تھیں۔ یہ نیم عریاں اور عریاں مورتیاں ہندو دیو مالا کے جنسی پہلو کو اجاگر کر رہی تھیں۔ ہم استقبالیہ پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سنگ سرخ کے زینوں سے انیلا اترتی نظر آئی۔ وہ پتلون قمیص میں تھی۔ بال بڑی شان سے شانوں پر بکھیر رکھے تھے۔ ایک ہیجان انگیز کشش تھی اس کے سراپا میں۔ اس کے ساتھ بوائے کٹ بالوں والی ایک لڑکی بھی تھی۔ میں انیلا کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور وہ مجھے دیکھ کر۔ میرے حیران ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انیلا کو اس کے انگلینڈ پلٹ مخبطے بھائی سرجیت نے نوریلیا سے باہر بھیج رکھا تھا اور اس کے آزادانہ گھومنے پھرنے پر پابندیاں عائد تھیں لیکن اب وہ یہاں نظر آ رہی تھی۔ انیلا مجھے دیکھ کر اس لیے حیران ہوئی تھی کہ میں ناگورے کے گھر ٹھہرا ہوا تھا اور میرے ساتھ غزالہ بھی تھی لیکن اب میں بوریا بستر اٹھائے ہوٹل کے استقبالیہ پر موجود تھا۔

"آپ یہاں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"یہ تو ہوٹل ہی ہمارا ہے" اس نے انکشاف کیا۔

تب میرا دھیان ہوٹل کے نام کی طرف گیا۔ نیون سائن کے مطابق یہ "شاستری ہوٹل" تھا اور شاستری' انیلا کے پتا صاحب کا نام تھا۔

"اس کا مطلب ہے ہم ٹھیک جگہ پر آ گئے ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟"

"اگر آپ کو کسی وجہ سے ناگورے کا گھر چھوڑنا ہی پڑا ہے تو پھر آپ ہوٹل میں نہیں رہیں گے۔ چلیں میرے ساتھ۔ میں آپ کو گھر میں ٹھہراؤں گی۔"

"نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔"

"مناسب تو یہ بھی نہیں ہے کہ ہم یہاں دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہیں۔ چلیں آئیں گاڑی میں بیٹھیں باتیں ہوں گی۔"

میں منع ہی کرتا رہا لیکن انیلا نے پورٹرز کو اشارہ کر دیا۔ انہوں نے پلک جھپکتے میں ہمارے سفری بیگ اٹھائے اور باہر کھڑی شاندار مرسڈیز میں رکھ دیے پھر وہ ہمیں بھی بڑے پیار کے ساتھ گاڑی میں لے آئی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے یہاں آئی تھی۔ میں اور ایس پی برکت پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ لڑکیوں نے اگلی نشستیں سنبھال لیں اور بے آواز گاڑی شو سے ہوٹل کے مین گیٹ کے سامنے سے یوں پھسلی جیسے کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ تمام وہ گاڑی لڑکیوں کے لباس فاخرہ سے اٹھنے والی مہک سے مہک رہی تھی اور ایس پی برکت بڑے بڑے منہ بنا رہا تھا۔ عورتوں اور خاص طور پر نوجوان لڑکیوں سے اسے بڑی چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تھانوں میں جو کیس درج ہوتے ہیں ان میں سے ... فی صد کی اصل وجہ یہی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ ہوں تو تھانوں میں فائلوں کے انبار اور عدالتوں میں کیسوں کی بھرمار نہ ہو اور یہ سب کچھ نہ ہوتا تو پولیس والوں کی زندگی عذاب نہ ہوتی۔ وہ مزے سے نوکریاں کرتے اور رزق حلال کی روزی کھاتے۔ اس وقت بھی ایس پی برکت برا سا منہ بنائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ سوچ رہا ہو کہ اگر یہ لڑکیاں پاکستان میں ہوتیں تو ان کے خلاف کون کون سی دفعات کے تحت مقدمہ درج کیا جا سکتا تھا۔

ہوٹل سے انیلا کی رہائش گاہ قریباً دس منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔ یہ دس منٹ خاموشی میں ہی گزرے۔ آخر ہم ایک شاندار وسیع رہائشی کوٹھی کے سامنے رکے۔ ارد گرد کا ماحول ایسا ہی تھا جیسے مری میں کشمیر پوائنٹ کا ہے۔ وادی کے رخ پر سرخ چھتوں والی بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی طویل بالکونیوں میں دیدہ زیب سبز کرسیاں رکھی تھیں اور کہیں کہیں کوئی صاحب یا صاحبہ دھوپ سینکتے نظر آ جاتے تھے۔ کئی پہر کی بارش کے بعد اب مطلع صاف ہوا تھا اور دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ شاستری لال' سینما اونر اور ہوٹل اونر تھا۔ اس کی رہائش گاہ اس کی حیثیت کے عین مطابق تھی۔ پورچ میں تین چار گاڑیاں موجود تھیں اور عمارت کی اندرونی آرائش بھی دیکھنے کے لائق تھی۔ ایک بیڈمنٹن کورٹ کے قریب رکھی کرسیوں پر ہمیں انیلا کا بھائی سرجیت بیٹھا نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے چھ سات انچ اوپر تک پلستر میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ گود میں کوئی انگلش رسالہ رکھے پڑھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر گہری شکنیں تھیں اور ان شکنوں کو دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ پپی نما شخص غصے کا منبع ہے۔ ہم اس کے پاس سے گزرے لیکن وہ ایک نگاہ غلط انداز ہم پر ڈالنے کے بعد دوبارہ رسالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" میں نے دبی آواز میں انیلا سے پوچھا۔

"میرا بڑا بھائی سرجیت ہے۔ چند دن پہلے اسے "ڈاکوؤں" نے گھیر لیا تھا۔ اسی واقعے میں بازوؤں میں چوٹیں آئی ہیں۔"

"کتنا ہے بڑے نسائی قسم کے ڈاکو تھے" ایس پی برکت نے کہا اور معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ سرجیت کی یہ درگت میرے ہاتھوں ہوئی ہے۔

ہم کوٹھی کی نشست گاہ میں پہنچے۔ انیلا نے ہمارے سامنے مشروبات وغیرہ رکھوائے۔ اس نے اپنی ساتھی لڑکی کو راستے ہی میں ڈراپ کر دیا تھا' اب وہ ہمارے سامنے تنہا بیٹھی تھی۔ کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی تھی وہ۔ میں نے کہا "کیا بات ہے۔ تم نے ابھی تک ناگورے کا حال چال نہیں پوچھا؟"

"مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا آپریشن ہوا ہے" انیلا نے مختصر جواب دیا۔

"یہ تو بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ تمہیں تو کچھ زیادہ معلوم ہونا چاہیے تھا" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں' مجھے کیوں زیادہ معلوم ہونا چاہیے تھا" وہ بے پروائی سے بولی اور بال جھٹک کر چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ حالات میں کوئی اہم تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ شاید یہی تبدیلی تھی جس کی وجہ سے وہ نوریلیا واپس آ گئی تھی اور آزادانہ گھوم پھر رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ناگورے میں انیلا کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور ایسا ہونا عین ممکن بھی تھا۔ اس نے ناگورے کو رام کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ناگورے نے ہر مرتبہ اسے ٹھکرا دیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اب انیلا کی انا پرستی بھی بیدار ہو گئی ہو اور اس نے اپنا راستہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ نوجوانی میں ایسے جذباتی فیصلے اکثر کر لیے جاتے ہیں چاہے عمر بھر پچھتانا ہی پڑے۔

میں نے سوچ بچار میں جو چند لمحے صرف کیے ان میں انیلا کو گفتگو کا رخ موڑنے کا موقع مل گیا۔ بولی "ہاں اب بتایئے آپ نے ناگورے کا گھر کیوں چھوڑ دیا؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ پاکستان سے غزالہ کے والدین آ گئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں ضروری نہیں تھا کہ میں بھی غزالہ کے پاس رہوں۔ ویسے بھی بالائی منزل میں اتنی گنجائش نہیں کہ دو تین کمرے ہمارے لیے خالی کیے جا سکیں۔ انیلا بہت ذود فہم لڑکی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے میری وضاحت پر یقین نہیں کیا۔

گہری سانس لے کر بولی "شاہ جہاں صاحب! میں آپ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی لیکن آپ جس بے لوث انداز میں اپنی بیمار گرل فرینڈ کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں' میں بے حد متاثر ہوئی ہوں آپ سے۔ ہمارے ملک کے مڈل اور اپر کلاس لوگوں میں اس قسم کے رویے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور سے

لہو کا سراغ

نوجوان ابھی صرف ظاہری پکا چوند پر جان دیتے ہیں۔ میں جب اپنی دوستوں کو بتاتی ہوں کہ ایک پاکستانی چار پانچ ماہ سے دن رات اپنی بیمار دوست کی تیمارداری کر رہا ہے اور اپنے ہاتھ سے تیمارداری کے تمام امور انجام دے رہا ہے تو وہ ششدر رہ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "خود غرضی تو دنیا میں ہر جگہ موجود ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہاں سری لنکا میں اپنے مصیبت زدہ دوستوں سے آنکھیں چرانے کا رواج کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جیسے سری لنکا کے موسم جلد جلد بدلتے ہیں' لوگ بھی آناً فاناً بدل جاتے ہیں۔"

انیلا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ میں ناگورے کی بات کر رہا ہوں جو کولمبو میں بستر علالت پر پڑا ہے۔

اسی دوران میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور میں اندر آنے والے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نوبی تھا۔ ناگورے کا رقیب روسیاہ۔ سرخ شرٹ اور سیاہ رنگ کی نہایت قیمتی پتلون میں وہ اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور چہرے پر توانا مسکراہٹ تھی۔ "ہیلو انیلا" وہ چہک کر بولا۔

"ہیلو نوبی" انیلا نے برابر کی خوش دلی سے جواب دیا "جلدی آ گئے تم۔ چپیٹ شو تو گیارہ بجے شروع ہو گا۔"

"ہاں' میں نے سوچا راستے میں ایک دوست کو بھی لیتے جائیں گے۔"

"آئی ایم ویری سوری نوبی! میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ آج میں جا نہیں سکوں گی۔ کچھ مہمان آ گئے ہیں میرے۔"

نوبی نے جیسے پہلی مرتبہ ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ چہرے پر رسمی مسکراہٹ سجا کر بولا "ہیلو' کہیں دیکھا ہوا ہے آپ کو۔"

"مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے" میں نے جواب دیا۔

میرے فقرے نے نوبی کو بدمزہ کر دیا۔ اتنا مشہور و معروف اتھلیٹ اور کراس کنٹری ریس کا اکلوتا مستقل چیمپئن اور اسے پہچانا نہ جائے یقیناً دل گرفتہ کرنے والی بات تھی۔

انیلا جلدی سے تعارف کراتے ہوئے بولی "شاہ جہاں صاحب! یہ سردار پرنام ہیں۔ انہیں ہم سب نوبی کہتے ہیں۔ چار پانچ برسوں سے کراس کنٹری ریس کے چیمپئن اور بہترین اتھلیٹ ہیں۔ ایکٹنگ بھی کرتے رہے ہیں۔ اور نوبی یہ شاہ جہاں صاحب

ہیں اور یہ ان کے دوست مسٹر برکت۔ میں نے تم سے ان کا ذکر کیا تھا۔"

"اوہو" نوی جوش سے بولا "تو یہ ہیں ناگورے صاحب کے پاکستانی دوست۔ اگر یہ ناگورے صاحب کے دوست ہیں تو ہمارے بھی دوست ہیں۔"

"ناگورے صاحب" کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بے حد طنز اور کاٹ شامل ہو گئی تھی۔ یہ کاٹ اس رقیبانہ جذبے کی دین تھی جو کئی برسوں سے ان دونوں میں پروان چڑھ رہا تھا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی" وہ ہم دونوں سے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تو زیادہ نہیں تھا لیکن مصافحے میں نوجوانی کا جوش و خروش نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "اب مجھے یاد آیا جب کھائی کے پاس ناگورے نے مجھ سے جھگڑا کیا تھا آپ ہی نے بیچ بچاؤ کرایا تھا" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ نوی انیلا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "او کے ڈارلنگ۔ اگر تم مصروف ہو تو پروگرام کینسل۔ لیکن ایک منٹ ذرا میری بات سن لو۔"

انیلا نے شائستہ انداز میں ہم سے معذرت طلب کی اور نوی کے ساتھ ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف چل دی۔ نوی نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا تھا۔ دونوں اسی انداز میں چلتے بند شٹر کورٹ کے قریب سے گزرے۔ وہاں سرجیت بھی موجود تھا تاہم نوی کا ہاتھ بدستور انیلا کے شانے پر رہا۔ سرجیت اور نوی میں ایک آدھ دوستانہ فقروں کا تبادلہ ہوا پھر نوی اور انیلا بالکونی کی طرف میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

میں حالات کی اس کروٹ پر حیران تھا۔ انیلا جو قریب ناگورے پر جان دیتی تھی اور ہر برے بھلے وقت میں اس کا ساتھ دینا چاہتی تھی یوں اچانک اپنے ہی جیسے ایک امیرزادے کی باہوں میں چلی گئی تھی۔ محبوب کے بجائے اب اس کے شانے پر محبوب کے رقیب کا ہاتھ تھا۔ میں نے سوچا شاید حقیقت وہ نہیں جو نظر آ رہی ہے ممکن تھا کہ انیلا کوئی ناٹک رچا رہی ہو۔ اپنے غصیلے بھائی کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے یہ بھیس بدلا ہو۔ وہ ایک ماڈرن سمجھدار لڑکی تھی اور اس انداز کا کوئی پینترا بھی بدل سکتی تھی۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اسے کسی حیلے سے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن نوی کے قریب آنے پر آمادہ ہو گئی ہو۔ امکانات لاتعداد تھے۔ یہ امکان کہ وہ یہ سب کچھ اپنے محبوب کو جلانے اور ستانے کے لیے کر رہی ہو۔ ناگورے نے بھی تو اسے بہت ستایا تھا۔ وہ اپنی قسم کا قیدی ہو کر انیلا سے دور چلا گیا تھا اور وہ اسے پانے کے لیے دیواروں سے سر پٹخ رہی تھی۔ میں بہت دیر سوچتا رہا کہ انیلا کے رویے میں اس تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

انیلا نے ہمیں کوٹھی کی انیکسی میں ٹھہرایا۔ یہاں ہمارے قیام و طعام کا بڑا شاہانہ انتظام تھا۔ انیلا نے ہیڈ بٹلر کو ہمارے بارے خاصی ہدایات دی تھیں۔ بٹلر ادھیڑ عمر تھا اور شملہ کا رہنے والا۔ یہ علاقہ چونکہ مشرقی پنجاب سے قریب ہے لہٰذا بٹلر صاحب لذت کام و دہن کے تمام پنجابی انداز معلوم تھے۔ اس نے سری لنکا میں ہوتے ہوئے ہمارے لیے خاص پنجابی کھانوں کا انتظام کیا۔ شلجم گوشت، تندوری روٹی، آم کا اچار، دہی کی لسی، یہ وہ چیزیں تھیں جو ہمیں سری لنکا میں کبھی کبھار میسر ہوئی تھیں۔ ایس پی برکت کی کدورت میں نمایاں کمی واقع ہو گئی۔ خاص طور پر دہی کی لسی نے اسے باغ باغ کر دیا۔ بولا "یہ کڑی انیلا اتنی بری بھی نہیں۔ بس فیشن ایبل ضرور ہے۔ ناگورے کے ساتھ اس کی بڑی اچھی جوڑی بنتی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے دونوں کو۔ اور میرے خیال میں تو اس میں ناگورے بھوتنی والے کا زیادہ قصور ہے۔ بالکل لوہے کا بنا ہوا ہے۔ بندے میں تھوڑی بہت لچک ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں یہ سارا معاملہ "قسم" کی وجہ سے خراب ہوا تھا۔ ناگورے کا تعلق بدھ مت سے ہے اور بدھ مت کے لوگ مقدس کھائی پر کھائی جانے والی قسم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انیلا ہندو ہے۔ اس کے نزدیک قسم کی اتنی اہمیت نہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہے کہ ناگورے ایک معمولی قسم کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہے۔ وہ ناگورے کی ہٹ دھرمی کی وجہ کچھ اور سمجھتی ہے۔"

ایس پی برکت نے کہا "کچھ لوگ ویسے بھی ضرورت سے زیادہ نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بندہ پوچھے۔ اگر وہ حادثے کی جگہ پر نہ رکتا تو کیا قیامت آ جاتی۔ اس کی جگہ کوئی اور رک جاتا۔ وہ ریس جیت جاتا تو یہ اتنا لمبا جھگڑا ہی کھڑا نہ ہوتا۔"

ہم بالکونی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مین گیٹ کی طرف گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ باوردی چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھولا۔ نوی کی نئی نویلی اسپورٹس ماڈل شیراڈ اندر آئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کے پہلو میں انیلا بیٹھی تھی۔ انیلا کو اتار کر نوی واپس چلا گیا۔ وہ اپنے شیفرڈ کتے کو پیار کرتی ہماری طرف چلی آئی۔ بالکونی کے سامنے رک کر بولی "ہیلو شاہ جہاں صاحب! ہیلو انکل برکت! کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک" میں نے جواب دیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں یہاں؟" اس نے پوچھا۔

"تکلیف تو ہے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ جلدی سے زینے طے کر کے اوپر آ گئی "کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب!" اس نے پوچھا۔ اس کے نرم و نازک بدن کی خوشبو سے پوری بالکونی مہک اٹھی تھی۔

"چند منٹ تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"آیئے" وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے میں آ گئی۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ سے بولتی تھی۔ ہم اطمینان سے بیٹھ چکے تو میں نے کہا۔

"میں یہ سب کیا دیکھ رہا ہوں انیلا؟"

"میں سمجھی نہیں۔"

"انجان مت بنو انیلا۔ میں تمہارے اندر نمایاں تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ تم تو ناگورے کا سایہ بنی رہتی تھیں۔ ایک پل اس کے بغیر گزارنا تمہارے لیے مشکل تھا۔ ناگورے کو نوی کے مقابلے میں کامیاب کرانے کے لیے تم نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ ہر وقت بس یہی دھن تمہارے سر پر سوار رہتی تھی...... لیکن اب میں کچھ اور دیکھ رہا ہوں۔ ناگورے کا سب سے بڑا حریف اور دشمن ہی تمہارے پہلو میں ہے۔"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو محسوس ہوا کہ وہ مجھے اپنے ذاتی معاملات میں دخل نہ دینے کی ہدایت جاری کر دے گی لیکن پھر شاید اس نے ارادہ بدل دیا۔ چند لمحے سر جھکائے مغموم کھڑی رہی پھر بولی "ناگورے سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ انتہا درجے کا خود پرست اور بے حس آدمی ہے۔ وہ کسی سے پیار نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو اپنے آپ سے اور اپنے گھمنڈی ارادوں سے۔ میں لعنت بھیج چکی ہوں اس پر۔ اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ جیے یا مرے۔"

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "چلو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ تم نے ناگورے سے قطع تعلق کر لیا لیکن نوی کے ساتھ گھومنے پھرنے سے مطلب؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم یہ سب کچھ ناگورے کو جلانے تڑپانے کے لیے کر رہی ہو؟"

"شاہ جہاں صاحب! میں نے کہہ دیا نا کہ اب ناگورے سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں" وہ اٹل لہجے میں بولی۔

"میری طرف دیکھو" میں نے کہا۔

اس نے دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ بہت گہری آنکھیں تھیں یہ۔ ان کی تہ میں کیا ہے؟ یہ جاننا بہت مشکل تھا۔ یہ "مشکل کام" سرانجام دینے کی کوشش صدیوں سے کی جا رہی ہے لیکن کوئی اسے انجام نہیں دے سکا۔ نہ دانشور، نہ سائنس دان، نہ شاعر اور ادیب۔ یہ عورت کی آنکھوں کا مسئلہ ہے، یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔

انیلا سے گفتگو کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کا دل اب بھی ناگورے کے نام کی مالا جپتا ہے لیکن وہ اپنے دل کی واردات سے جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی ہے۔ ناگورے کو اس کی کج ادائیوں کی سزا دینے کے لیے اس نے نوی سے راہ و رسم بڑھائی ہے۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ناگورے کے دل میں اپنی تڑپ جگانے میں کامیاب ہو جائے گی اور وہ ساری خود ساختہ پابندیاں توڑ کر اس کے در حسن پر آ جائے گا۔

میں ناگورے کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ انیلا غلط سوچ رہی ہے۔ ناگورے کی خودداری اور انا پرستی اسے کبھی انیلا کے در حسن پر جھکنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ وہ انیلا کے رویے سے بددل ہو کر اس سے کچھ اور دور چلا جاتا۔ درحقیقت کھیل کے میدان سے آؤٹ ہونے کے بعد اس پر انتہا درجے کی قنوطیت طاری ہو چکی تھی۔ وہ ذہنی طور پر انیلا کی جدائی کا صدمہ سہنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ انیلا کا رویہ اس کے ارادوں کو اور مضبوط کر سکتا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی "کون ہے؟ اندر آ جاؤ" انیلا نے چونک کر کہا۔ دروازہ کھلا اور انیلا کا بھائی سرجیت اندر آ گیا۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا پھر انیلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دونوں کے درمیان سنہالی میں مختصر مکالمہ ہوا پھر سرجیت واپس چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انیلا کو دیکھنے آیا تھا۔ ممکن ہے وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا ہو کہ انیلا میرے ساتھ کمرے میں بند ہو کر کیا کر رہی ہے۔ وہ سخت مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ شکی طبیعت کا مالک بھی تھا۔ خاص طور پر بہن کے حوالے سے اس کا رویہ بڑا تھانیدارانہ قسم کا تھا۔ اس کی نگاہ ہر وقت انیلا کی نگران رہتی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بھائی بہن کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہو گیا ہے۔ انیلا نے ناگورے سے قطع تعلق کر لیا ہے اور سرجیت نے جواباً خیرسگالی کے طور پر انیلا پر سے سخت پابندیاں اٹھا لی ہیں۔ اب چونکہ وہ سرجیت کے پرانے دوست نوی کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی لہٰذا سرجیت کو اس کی مصروفیات پر کوئی خاص اعتراض نہیں تھا۔

دیکھنے میں تو سیٹھ شاستری لال کا گھرانا آزاد خیال نظر آتا تھا۔ ان کا رہن سہن ہر لحاظ سے مغربی تھا۔ وہ لوگ گھر میں انگریزی بولتے تھے۔ کلبوں میں جاتے تھے اور آزادانہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے مگر کوئی کتنا بھی "لبرل" ہو اس کے اندر کہیں نہ کہیں ایک بنیاد پرست چھپا رہتا ہے۔ یہ دقیانوسی بنیاد پرست وہی ہزاروں سال پرانا قبائلی ہوتا ہے جو اپنی بہن بیٹی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا ہے اور تیز دھار آلے سے اس کے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ یقیناً یہی تھا۔ سرجیت کے اندر بھی ایک ایسا ہی دقیانوسی چھپا ہوا تھا۔

شاستری لال خود تو نوریلیا میں نہیں تھا ہاں انیلا کی ماں اور خالہ وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ ان مغرب زدہ عورتوں کو اپنی امارت پر اترانے اور منہ ٹیڑھے کر کے انگریزی بولنے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ دونوں بے تحاشا موٹی تھیں اور کیوں نہ ہوتیں۔ فلمی سینماؤں اور ایک شاندار ہوٹل کی کمائی رات دن ان پر مرغن غذاؤں کا بوجھ لادتی رہتی تھی۔ اور ہاتھ سے کام کرنے کی نوبت نہیں تھی۔ گھر میں نوکروں کی فوج ظفر موج موجود تھی۔ جس نے قسم کھا رکھی تھی کہ ان دونوں معزز خواتین کو تنکا دوہرا کرنے کی زحمت بھی نہیں دینی اور پوری وفاداری سے یہ کوشش کرنی ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے بوجھ تلے دب کر مر جائیں۔ انیلا کے پتا سیٹھ شاستری لال کے

بارے میں ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ وہ قانون ساز ادارے کے الیکشن میں حصہ لینا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں جوڑ توڑ کر رہا ہے۔

سرجیت کا شاندار کمرا کوٹھی کے وسط میں تھا۔ وہ تین کلب میں جاتا تھا لہٰذا سینما سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آجاتا تھا۔ پھر اس کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ صبح دو ڈھائی بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ بیڈمنٹن کورٹ کے قریب بیٹھ کر وسیع وادی کا نظارہ کرنا اور انگور کی بیل سے دل بہلانا اس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ سٹے بازی تو اس کی فطرت میں شامل تھی۔ ورا کیلا بیٹھا بھی کبھی کبھی تاش کھیلنے لگتا تھا۔ یہ تیسرے یا چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ سرجیت حسب معمول رات ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ واپس آیا۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے لایا تھا۔ یہ وہی کھلی چھت والی اسپورٹس کار تھی جسے میں اپنے ہاتھ لگا کر ویرانے میں لے گیا تھا اور پھر سرجیت کو اس میں سے اتار کر ٹھیک ٹھاک کھینچی لگائی تھی۔ یوں تو سرجیت کی دونوں کلائیوں پر پلستر چڑھا ہوا تھا لیکن اس کا داہنا ہاتھ حرکت کرنے کے قابل تھا اور وہ اس اکلوتے ہاتھ سے کسی نہ کسی طرح ڈرائیو کر لیتا تھا۔ گاڑی سے اتر کر سرجیت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اتفاقاً اس وقت بجلی گئی ہوئی تھی۔ پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ بس کہیں کہیں ملازموں نے شمعدان روشن کر رکھے تھے۔ ایک ایسا ہی شمعدان سرجیت کے کمرے میں بھی روشن تھا اور اس کی مدھم روشنی دروازے کی نچلی درز سے جھانک رہی تھی۔ میں نے انیکسی کی کھڑکی میں سے سرجیت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں پہنچا ایک ملازم نے حسب معمول کافی کی ٹرے اندر پہنچا دی۔ کافی وصول کرنے کے بعد سرجیت نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ابھی اسے کمرے میں گھسے بمشکل پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے کہ بجلی آگئی۔

کوٹھی کے طول و عرض میں ٹیوب لائٹس، فانوس اور بلب روشن ہو گئے۔ ملازمین نے شمعدان بجھا دیے۔ ہم انیکسی کے جس کمرے میں تھے وہاں سے سرجیت کا کمرا زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جس میں جاپان کے قیمتی بونے پودے گملوں میں سجے ہوئے تھے اور فانوس کی روشنیوں میں جگمگا رہے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ سرجیت کے کمرے میں ٹی وی چل رہا ہے۔ ٹی وی کسی ایسے چینل پر آن تھا جس کی نشریات ختم ہو چکی تھیں اور اب وہاں صرف شائیں شائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ سرجیت شاید باتھ روم میں ہے جو ٹی وی آف نہیں کر رہا یا اس کا چینل نہیں بدل رہا لیکن جب بیس پچیس منٹ گزر گئے اور ٹی وی کی پرشور شائیں شائیں ختم نہیں ہوئی تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اگر سرجیت کمرے میں موجود تھا تو ٹی وی آف کیوں نہیں کر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ کمرے میں گھستے ہی سو گیا ہو۔ کپڑے بدلنے اور کافی پینے دس پندرہ منٹ تو لگ ہی جاتے ہیں اور تقریباً اتنا ہی وقت بجلی آنے میں لگا تھا۔ وہ نشے میں بھی نہیں تھا اور بڑے مستحکم قدموں سے چل کر کمرے میں گیا تھا پھر کیا بات تھی۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کمرے سے نکل کر پھولوں سے مہکتے ہوئے برآمدے میں پہنچا۔ کمرے کی تمام کھڑکیوں پر بلائنڈز گرے ہوئے تھے۔ دروازہ بھی بند تھا۔ ٹی وی کا شور یہاں سے زیادہ واضح سنائی دے رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ کی ہول میں چابی لگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر برآمدے میں رکنے کے بعد میں واپس آگیا۔ سرجیت کی شخصیت پہلے دن سے ہی کچھ پُراسرار محسوس ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے چہرے مہرے اور طور اطوار سے ان کے باطن کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اگلے روز میں ناگورے کو دیکھنے کولمبو چلا گیا۔ اسپتال میں اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ناگورے نے بتایا کہ اروندا ہر روز اسے دیکھنے آتا ہے اور ہر ایک ضرورت کا خیال رکھتا ہے۔ اروندا کی احسان شناسی واقعی قابلِ تعریف تھی۔ شاید یہ مکافاتِ عمل کی ہی کرشمہ سازی تھی۔ چند ماہ پہلے ناگورے نے اپنی کامیابی اور اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر اس وقت اروندا کی جان بچائی تھی جب وہ ایک جلتی گاڑی کے نیچے دبا پڑا تھا۔ آج وہی اروندا ایک ٹوٹے پھوٹے بدحال ناگورے کو سہارا دے رہا تھا۔ اس کا مسیحا صفت باپ ناگورے کی ٹانگ کا علاج کر رہا تھا۔

شام کو میں نوریلیا واپس آگیا۔ ایس پی برکت رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ یہاں آکر بہت خوش تھا۔ انیلا نے میزبانی کی حد تک تو ایس پی برکت کے لیے سری لنکا میں پنجاب بنا ڈالا تھا۔ مرغ گوشت اور پراٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے ایس پی برکت نے مدھم لہجے میں مجھ سے کہا "شاہ جہاں! یہ انیلا کا بھائی بڑا مشکوک سا لگتا ہے۔ گھر آتے ہی کمرے میں گھس جاتا ہے اور دیر تک نہیں نکلتا۔ پتا نہیں بھوتنی کا کیا کرتا رہتا ہے۔ اگر بندہ نمازی شوقین ہو تو پھر بھی بات ہے۔ کھلے ڈلے بندے کو بھلا کیا کام ہو سکتا ہے بند کمرے میں۔"

میں نے کہا "چاچا! یہ سرجیت کے سوچنے کی بات ہے یا اس کے والدین کی۔ اس کے والدین ماشاءاللہ بالغ ہیں۔ اپنے بالغ بچے کا اچھا برا سمجھ سکتے ہیں۔"

اس وقت تو بات مذاق میں ٹل گئی لیکن میرے دل میں جو تجسس جاگ گیا تھا وہ اپنی جگہ موجود تھا بلکہ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس رات میں بستر پر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہ سکا۔ میرے اندر وہ کھوجی روح بیدار ہو چکی تھی جو مجھے ان جان راستوں کی طرف کھینچتی تھی اور میں چھپے ہوئے چہروں کو بے نقاب کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ حسبِ معمول رات گیارہ بجے کے قریب سرجیت گھر واپس آیا اور کچھ دیر اپنی ماتا جی

کے کمرے میں رکنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے قریباً ایک گھنٹا انتظار کیا پھر انگڑائی لے کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایس پی برکت گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کی ایک اندرونی جیب سے وہی ٹوپی نکالی جو آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چھپا لیتی تھی۔ یہ ٹوپی جیب میں ڈال کر میں نے سبز رنگ کی ایک چادر کو بکل کی طرح جسم کے گرد لپیٹا اور کمرے سے نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں صبح کا باسی اخبار تھا۔

برآمدے میں مکمل خاموشی تھی۔ کوٹھی کے اس حصے میں کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ برآمدے کے وسط میں قالین کی قریباً تین فٹ چوڑی پٹی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس پٹی پر بے آواز چلتا اس آبنوسی دروازے کے عین سامنے پہنچ گیا جو سرجیت کے کمرے میں کھلتا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا لیکن کہیں زندگی کے آثار محسوس نہیں ہوتے تھے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کمرا خالی ہے۔ میں نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بعد کی کارروائی میں نے صرف دو تین سیکنڈ میں مکمل کر لی۔ یہ آزمودہ نسخہ میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کامیابی سے استعمال کر چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار کھول کر میں نے دروازے کی نچلی درز سے کمرے کے اندر بچھا دیا پھر جیب سے ماچس نکالی اور ایک دیا سلائی کی ہول میں داخل کر کے دروازے کی چابی اندر کی طرف گرا دی۔ چابی اندر اخبار پر گری۔ اخبار کے نیچے قالین تھا اس لیے کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے آہستہ سے اخبار کھینچ کر چابی باہر نکال لی۔ چند لمحے بعد میں دروازہ کھول کر کمرے کے اندر سے کنڈی لگا چکا تھا۔ (کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا چہرہ چھپانے والی ٹوپی سر پر چڑھا لی تھی) میری چھٹی حس کی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ اس آراستہ و پیراستہ کمرے کے اندر کوئی متنفس نہیں تھا۔

یہ بڑی سنسنی خیز صورت حال تھی۔ یہی نامعقول صرف ایک گھنٹا پہلے میرے سامنے کمرے میں داخل ہوا تھا اور یقینی بات تھی کہ پھر باہر نہیں نکلا۔ باتھ روم کا دروازہ بھی ادھ کھلا تھا۔ میں قریب جائے بغیر دیکھ سکتا تھا کہ باتھ روم میں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ "کہاں گیا وہ حرامی؟" یہ سوال ایک چیخ کی طرح میرے ذہن میں ابھرا لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ یہ جواب اتنا واضح اور مفصل تھا کہ اور کچھ سوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ کمرے کے ایک کونے میں طویل صوفے کے پیچھے سے قالین اٹھا کر فرش کا کچھ حصہ ننگا کر دیا گیا تھا۔ اس فرش میں تین فٹ ضرب دو فٹ کا ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ خلا میں سے سیاہ پتھریلی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اعشاریہ دو پانچ کا وہ چھوٹا سا پستول نکال لیا جو میں کمرے سے ہی اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ پستول میں نے کولمبو میں غزالہ کی حفاظت کے لیے خریدا تھا اور اسی وقت سے میرے پاس تھا۔ پستول نکال کر میں خلا کی طرف بڑھا اور زینے اترنے لگا۔ میں نے کیا کرنا ہے؟ اور میں کیوں نیچے جا رہا ہوں؟ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ بس ایک تجسس تھا جو انگلی تھام کر مجھے لیے جا رہا تھا۔ زینوں میں ایک چھوٹی ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے قالین تھا لہٰذا قدموں کی چاپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چودہ پندرہ زینے اترنے کے بعد مجھے چوبی در کا ایک نصب دروازہ نظر آیا۔ میں نے کی ہول میں سے جھانکا تو کسی کمرے کا مختصر حصہ دکھائی دیا۔ ایک صوفہ، ایک میز جس پر انگلش میگزین بکھرے ہوئے تھے، اور ایک قد آدم الماری جس میں لوہے کے بہت سے چھوٹے ڈبے رکھے تھے۔ میں نے کان لگا کر سن گن لی۔ کسی متنفس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ کم از کم اس کمرے میں تو کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازے کی ناب گھمائی۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے کھل گیا۔ میں محتاط انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک لمبا چوڑا کمرا تھا۔ قالین اور فرنیچر سمیت ہر شے پر گرد پڑی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہلکی سی بو باس بھی تھی جو تہ خانوں میں اکثر محسوس کی جاتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ کئی مہینوں سے اس "تہ خانے" میں صفائی نہیں کی گئی۔ اس کمرے میں تین دیواری الماریاں موجود تھیں اور ان میں قفلوں کے ڈبے پڑے تھے۔ غالباً شاستری لال سینماؤں کے ساتھ ساتھ قفلوں کی ڈسٹری بیوشن وغیرہ کا کام بھی کرتا رہا تھا۔ اس کمرے میں ایک بغلی دروازہ موجود تھا۔ یہ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دراصل ساتھ والے کمرے میں جو تھوڑی بہت روشنی تھی وہ اسی دروازے سے ہی آ رہی تھی۔ اس دروازے کے اندر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ایک آواز تو سرجیت ہی کی تھی، دوسری آواز کسی لڑکی کی تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں ہر قسم کے حالات کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھسکتا ہوا میں ادھ کھلے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے کمرے میں سرجیت نظر آیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا۔ کوٹ کی ایک جیب واضح طور پر پھولی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے تپائی پر سگریٹ وغیرہ رکھے تھے۔ سرجیت کے سامنے وہی نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جسے دو تین روز پہلے سرجیت کوبرا کلب سے جوئے میں جیت کر لایا تھا۔ جس روز میں نے سرجیت کو یادگار پھینٹی لگائی تھی یہ لڑکی سرجیت کی گاڑی میں موجود تھی۔ اس وقت لڑکی کے جسم پر نہ ہونے کے برابر لباس تھا اور وہ اپنے آپ میں سمٹی جا رہی تھی۔ آج بھی اس کے لباس کو مکمل تو نہیں کہا جا سکتا تھا بہرحال اس کے جسم کا نصف رقبہ ڈھکا ہوا تھا۔ وہ جینز کی خوب صورت نیکر پہنے ہوئے تھی۔ بالائی جسم پر آدھی آستینوں والی دھاری دار شرٹ تھی۔ بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال رہی ہو گی لیکن آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انگلش نژاد ہے۔ وہ غریب طبقے کی ایک ایسی

پڑھی لکھی لڑکی نظر آئی تھی جو اپنی خوب صورتی اور ذہانت کی وجہ سے امیرزادوں میں پھنس گئی تھی۔ پہلے ایک امیرزادے کی بیوی بنی تھی اور اب ایک امیرزادہ اسے جیت کر لے آیا تھا۔ اس نے جو بشرٹ پہن رکھی تھی اس پر حکم کا ایک بڑا سا کا بنا ہوا تھا۔ اور صرف اس کی بشرٹ پر ہی نہیں پورے کمرے پر تاش کے پتوں کی حکمرانی تھی۔ کمرے کے ایک گوشے میں جو جہازی سائز بیڈ تھا اس کی بیڈ شیٹ پر تاش کے چار اکے بنے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر پینٹنگ کے انداز میں باون پتوں کا عکس تھا۔ کمرے میں موجود ڈیکوریشن پیس بھی چڑیا اینٹ پان اور حکم کی شکل میں تھے۔ میں نے سنا تھا کہ سرجیت تاش کا رسیا اور زبردست پتے باز ہے۔ آج اس کا ثبوت بھی آنکھوں کے سامنے تھا۔ سرجیت اور وہ لڑکی کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ ان کا ذریعہ اظہار انگلش تھا۔ لڑکی کی آواز میرے کانوں میں پڑی "اپنی بہن کے لیے تمہارے معیار اور ہیں' دوسروں کے لیے اور۔ عزت ہر کسی کی ہوتی ہے۔ ذرا سوچو میں بھی تو کسی کی بہن لگتی ہوں۔ اگر انیلا کے ساتھ ایسا ہو تو......؟"

"بکواس بند کرو" سرجیت گرجا "ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا۔"

کمرے میں چند لمحے گمبھیر خاموشی رہی۔ پھر سرجیت غضیلے لہجے میں بولا "میری بہن اتنی بد اخلاق نہیں کہ تمہاری طرح دوسروں کی عزتیں اچھالتی پھرے۔ وہ بھی کلب میں جاتی ہے محفلوں میں بیٹھتی ہے لیکن دوسروں کو بدنام کرنے کا چسکا اسے نہیں ہے۔"

"میں نے کون سا چسکا لیا تھا۔ مسز تہواری نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ناگورے کے ساتھ گھومتی ہے۔ اور یہ کون سی ڈھکی چھپی بات تھی۔ پورا شہر جانتا ہے۔"

"بکواس بند کرو" سرجیت دہاڑا "میں ہر وہ بات جانتا ہوں جو اس تقریب میں ہوئی۔ اگر تم کہو تو میں تمہارے سامنے گواہیاں پیش کر دوں گا۔ کیا تم مسز لا کو جھٹلا سکتی ہو۔ اس نے خود سنا ہے کہ تم نے انیلا کو اس حرامی ناگورے کی دیوانی قرار دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ راتوں کو اس سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے۔"

"تو...... تو میں نے غلط کیا کہہ دیا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ انیلا اور ناگورے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی کمرے میں کھٹ پھٹ ہوئی اور نسوانی کراہ گونجی۔ میں نے ذرا سا جھک کر کمرے میں جھانکا۔ لڑکی قالین پر گری ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا۔ غالباً سرجیت نے بیٹھے بیٹھے اسے ٹھوکر ماری تھی۔ پھر میرے سامنے اس نے اور ٹھوکریں لڑکی کو رسید کیں۔ وہ چیخنے لگی۔

"خاموش" سرجیت چنگھاڑا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ اس کا بایاں ہاتھ پلستر میں جکڑا ہونے کے باوجود استعمال کے قابل تھا۔

پستول دیکھنے کے بعد لڑکی نے چیخنا چلانا تو موقوف کر دیا تاہم رونا جاری رکھا۔ وہ اوندھے منہ صوفے پر گر پڑی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ سرجیت واپس صوفے پر آ بیٹھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ یہاں کی صورتِ حال سمجھنا میرے لیے اب زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ سرجیت نے اس لڑکی کو جیتا تو جوئے میں ہی تھا لیکن سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جیتا تھا۔ شومئی قسمت اس لڑکی نے کسی محفل میں سرجیت کی بہن انیلا اور ناگورے کے تعلقات کے بارے میں کچھ باتیں کہہ دی تھیں۔ سرجیت سکہ بند "بے غیرت" ہونے کے باوجود چوں کہ بہن کے معاملے میں بہت حساس تھا لہٰذا اس نے لڑکی سے بدلہ لینے کی ٹھانی تھی اور اسے اپنی کوٹھی کے اس تہ خانے میں لے آیا تھا۔ اس نے لڑکی کو جوئے کی بازی میں جیتا تھا' ممکن تھا کہ اگر وہ جیت نہ سکتا تو اغوا کر کے لے آتا اور اغوا نہ کر سکتا تو کسی سے اغوا کروا لیتا۔ اس کا مقصد بہرحال لڑکی کو یہاں لانا تھا۔

انسانی کردار کی یہ دورنگی کتنی نمایاں تھی۔ سرجیت ایک طرف تو اپنی بہن کا بھائی بنا تھا اور اس بات پر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ اس کی بہن کا نام کسی لڑکے کے ساتھ...لیا جائے۔ دوسری طرف وہ خود رات رات بھر کلب میں ڈانس پارٹیاں انجوائے کرتا تھا اور جوئے میں جیتی ہوئی لڑکی کو اپنے گھر تک لے آتا تھا۔ معلوم نہیں وہ سب کی نگاہ سے بچا کر اس لڑکی کو تہ خانے تک کیسے لایا تھا۔ ممکن تھا کہ کسی رازدار ملازم کا تعاون اسے حاصل رہا ہو۔ ایسے امیرزادے اپنے ملازموں میں سے ایک دو معتمد ضرور رکھتے ہیں۔ یہ معتمد ان کے لیے خاص کام انجام دیتے ہیں اور ان خاص کاموں کے سبب آنے والی آفات کے سامنے اکثر خود کو قربانی کا بکرا بنا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ لڑکی کو رُلانے کے بعد سرجیت کا غیظ و غضب بھی دھیما پڑ گیا۔ اس نے اپنے لیے سگریٹ نکالا اور پھر سرخ پان کی شکل والے لائٹر سے سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ یہ کمرا باقی تہ خانے کی نسبت کافی صاف ستھرا تھا اور وہاں سے ائیر فریشنر کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ لڑکی اونچے سُروں میں رونے کے بعد اب مدھم سُروں پر آ گئی تھی۔ سرجیت نے فریج سے بیئر کی بوتل نکالی اور اس میں کوک ڈال کر لڑکی کے لیے لائٹ سا ڈرنک بنایا۔ پھر وہ قدرے نرم لہجے میں لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ ڈرنک لینے کے بعد لڑکی پرسکون نظر آنے لگی۔ اس نے واش روم میں جا کر منہ دھویا اور بال سنوارتی ہوئی صوفے پر آ بیٹھی۔ میں بدستور دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ لیونگ روم میں نیم تیرگی تھی لہٰذا ممکن نہیں تھا کہ بیڈ روم میں بیٹھے بیٹھے سرجیت یا لڑکی مجھے دیکھ سکتے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی کسی کام سے یہاں آ جاتا تو پھر اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ وہ مجھے دیکھ لیتا۔ بہرحال میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔

لڑکی نے ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے ہوئے کہا "دیکھو

سرجیت! تم حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ اس وقت ہم دونوں یہاں اکیلے بیٹھے ہیں۔ کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ انیلا اور ناگورے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟"

سرجیت نے جبڑے بھینچ کر اپنا غصہ برداشت کیا اور نارمل لہجے میں بولا "انیلا صرف دوستی کی حد تک ناگورے سے ملتی تھی۔ وہ انتخاب کے معاملے میں اتنا نہیں گر سکتی کہ ناگورے جیسے لڑکے کو جیون ساتھی بنانے کا سوچے۔ یہ باتیں ہمارے گھرانے کو بدنام کرنے کے لیے پھیلائی گئی ہیں اور تم ــــــ"

"اچھا چھوڑو اس بحث کو" لڑکی نے جلدی سے بات کاٹی "تم ــــــ تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کب تک یہاں رہنا ہو گا؟"

"تمہیں کیا تکلیف ہے یہاں؟"

"کون سی تکلیف مجھے یہاں نہیں ہے!" لڑکی تلخی سے بولی۔ پھر گہری سانس لے کر کہنے لگی "دیکھو سرجیت! میں تمہارے ساتھ رہنے کو تیار ہوں لیکن اس قبر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔ تم مجھے یہاں سے باہر نکالو' تم جو کہو گے میں وہی کروں گی' جہاں رکھو گے رہ لوں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سرجیت بولا "تم خود ہی سوچو۔ کیا تم اس گھر میں رہ سکتی ہو۔ نوریلیا میں میں تمہیں کہیں بھی رکھوں' میرے والدین کو پتا چل جائے گا۔ میں یہ رسک کسی صورت افورڈ نہیں کر سکتا۔"

"تم غلط کہتے ہو" وہ تڑخ کر بولی "تم مجھے جان بوجھ کر ذہنی اذیت دے رہے ہو۔ ایک زرخرید لونڈی کی طرح مجھے یہاں باندھ رکھا ہے اور اپنی ہوس پوری کر رہے ہو"

وہ عجیب خباثت بھرے انداز میں مسکرایا "میں نے تمہیں کہاں باندھ رکھا ہے۔ میں نے تو پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ تم یہاں سے جانے کے لیے آزاد ہو۔ شرط صرف ایک ہی ہے اور وہ بھی بہت معمولی سی۔ تم میرے تو سبھی پتے دیکھ لو اور چار بازیوں میں سے صرف ایک بازی مجھے ہرا دو۔ جس روز تم مجھے ہرا دو گی میں تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔"

"میں نہیں ہرا سکتی تمہیں۔ میں نہیں ہرا سکتی" وہ روہانسی آواز میں بولی "میرا دماغ پھٹ جائے گا تم سے کھیل کھیل کر۔ پلیز۔ دور ہٹاؤ ان منحوس پتوں کو۔" اس نے میز پر ہاتھ مارا اور تاش کے پتوں والی ڈبیا پھسل کر دروازے کے پاس آن گری۔

سرجیت زہریلے انداز میں مسکرایا "اتنی معمولی شرط اور اتنی زیادہ مایوسی۔ لوگ کسی کا ایک پتا دیکھ لیں تو اسے مات دے دیتے ہیں' میں تمہیں ہر بار اپنے پتے دکھانے کی پیشکش کرتا ہوں۔ ویری سیڈ۔ ویری سیڈ۔"

وہ مسکراتے ہوئے اٹھا اور تاش کی گڈی کی طرف بڑھا۔ یہ نازک لمحات تھے۔ وہ دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا اور سانس تک روک لی۔ سرجیت غالباً تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی رات کے اس پہر اس "ہیں حت" تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بالکل بے پروا تھا۔ اس نے کمرے کا صرف بیرونی دروازہ مقفل کیا تھا' باقی دروازے کھلے تھے۔ اس نے اطمینان سے گڈی اٹھائی اور واپس صوفے پر جا بیٹھا۔ پیکٹ میں سے تاش نکال کر اس نے مہارت سے پھینٹنے شروع کیے اور پھر گڈی لڑکی کے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھی رہی۔ سرجیت نے باقی پتے اٹھائے اور بانٹنے لگا۔ لڑکی کے چہرے پر بے بسی' جھنجلاہٹ اور خجالت کے ملے جلے تاثرات تھے' میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں کھیل میں مگن ہو گئے۔ اب میرے لیے وہاں مزید رکنا دلچسپی سے خالی تھا۔ میں گداز قالین پر دبے پاؤں واپس مڑا اور دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر نکل آیا۔ زینے طے کر کے میں بالائی کمرے میں پہنچا۔ یہاں سب کچھ ویسے ہی تھا جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی گرائی اور باہر نکل آیا۔ دروازے کو باہر سے مقفل کرنے کے بعد میں نے چابی پھر درز سے اندر پہنچا دی۔ سرجیت چابی تالے میں چھوڑ کر گیا تھا اور اب وہ قالین پر پڑی تھی لیکن یہ کوئی ایسی حیران کن یا انوکھی بات نہیں تھی۔ تالے میں لگی ہوئی چابی کسی وجہ سے گر بھی جاتی ہے۔

اگلے روز سرجیت کے باپ شاستری لال سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ ہو بہو ایک ہندو سیٹھ تھا۔ رنگ گہرا سانولا۔ توند نکلی ہوئی۔ ماتھے پر تلک اور سفید قمیص کے نیچے سفید دھوتی جو پیچھے سے کمر میں اڑسی گئی تھی۔ شاستری لال کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سرد لیکن لومڑیوں کی سی چمک تھی۔ انیلا نے اپنے پتا سے ہمارا تعارف کرایا۔ وہ بظاہر خوشدلی اور اخلاق سے ملا لیکن ایسے لوگوں کی خوشدلی کے پیچھے کیا ہوتا ہے یہ جاننا آسان نہیں ہوتا۔ شاستری لال سے ملنے کے بعد اس اطلاع کی تصدیق ہو گئی کہ وہ الیکشن میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ درحقیقت وہ اس تیاری کے سلسلے میں ہی کولمبو سدھارا ہوا تھا۔ کولمبو سے وہ آٹھ ہزار گز سوتی کپڑا اور بہت سے پوسٹر چھپوا کر لایا تھا۔ کپڑا بینرز وغیرہ لکھنے میں استعمال ہونا تھا۔ شاستری لال کو قوی امید تھی کہ وہ اس کاغذ اور کپڑے کی مدد سے الیکشن میں کامیاب ہو کر ملک و قوم کی "خدمت" کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

شاستری لال سے ملنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ میں رات بھر سوچتا رہا تھا کہ شیطان صفت سرجیت کمار سے اس لاچار لڑکی کی جان کیسے بچائی جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کروں جس سے ہلا گلا ہو اور کسی قسم کی دشمنی کا آغاز ہو جائے۔ اب شاستری لال کو دیکھ کر ایک بڑا مناسب سا طریقہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔ اس طریقے کے بارے میں میں آگے چل کر بتاتا ہوں۔ جس وقت میں اور ایس پی برکت شاستری لال سے بات چیت کر رہے تھے اور اس کی تکبر و نخوت میں ڈوبی "رئیسانہ" باتیں

رہی تھی کہ ایک ملازم نے آکر اطلاع دی کہ میرا فون ہے۔ کوئی جلیس صاحب بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ چچا جلیس کو معلوم نہیں تھا کہ میں یہاں شاستری لال کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یقیناً اس نے بہت تگ و دو کے بعد معلوم کیا ہوگا کہ میں یہاں ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی بہت اہم بات کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں اٹھا اور فون پر پہنچ گیا۔

"ہیلو میں شاہ جہاں بول رہا ہوں" میں نے کہا۔

"شاہ جہاں' بڑی مشکل سے تمہارا نمبر ملا ہے۔ میں بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں تم سے" چچا کے لہجے میں ہلکی سی لجاجت تھی۔

"کہیے میں سن رہا ہوں۔"

"نہیں یہ بات فون پر نہیں ہو سکتی۔ تم ابھی یہاں چلے آؤ۔ میرا مطلب ہے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اب نوریلیا میں دوبارہ ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔ میں وعدہ خلافی کرنا نہیں چاہتا۔"

"شاہ جہاں بچکانہ باتیں مت کرو۔ تمہارا یہاں آنا ضروری ہے" چند لمحے فون پر خاموشی رہی پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "غزالہ کی طبیعت پھر خراب ہے... وہ تمہیں بلا رہی ہے"

چچا جلیس کی اطلاع نے مجھے چونکایا' تاہم میں لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولا "میں اس کی طبیعت کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ یہاں پاس ہی ڈاکٹر سوتھی ہیں۔ بڑے اچھے نیورو فزیشن ہیں۔ وہی اسے دیکھتے رہے ہیں۔ نادر کو ان کے بارے میں معلوم ہے۔ اسے بھیجیں۔ وہ انہیں بلا لائے گی۔"

"ڈاکٹر سوتھی کو تو میں خود بھی بلا سکتا ہوں لیکن تمہارا آنا ضروری ہے۔ تم خواہ مخواہ ضد نہ کرو۔"

"ضد اپنوں سے کی جاتی ہے" میں نے سرد لہجے میں کہا "میں نہیں سمجھتا کہ مجھے آپ سے ضد کرنے کا حق ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کر دیا۔

میرے ذہن میں ہلچل سی ہونے لگی تھی۔ کیا غزالہ کی طبیعت واقعی پھر خراب ہو گئی تھی یا پھر چچا جلیس نے صرف مجھے وہاں [بلا]نے کے لیے بہانہ تراشا تھا۔ وہ مجھے کیوں بلانا چاہ رہا تھا۔ یہ کوئی [س]ازش تھی؟ یا پھر غزالہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا [ا]سی ادھیڑبن میں رہا' اتنے میں چچا جلیس بنفس نفیس سیٹھ شاستری [لال] کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ملازم نے مجھے اطلاع دی کہ کوئی [ص]احب آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ انہیں نشست گاہ میں بٹھایا گیا [ہ]ے۔ ملازم نے آنے والے کا جو حلیہ بتایا وہ چچا جلیس کا تھا۔ میرا [دل] نہیں چاہ رہا تھا کہ بار بار اس شخص کی صورت دیکھوں۔ اس کی [صور]ت میں مجھے چچی فاخرہ کی صورت نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں [میں] چچی فاخرہ کا بخشا ہوا کینہ تھا۔ اس کے منہ میں چچی فاخرہ کی [زبا]ن تھی۔ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا تھا اس کے پیچھے چچی فاخرہ جھلکتی

تھی۔ میں نے بمشکل خود کو نشست گاہ تک جانے پر آمادہ کیا۔ چچا جلیس پریشان صورت بنائے صوفے پر بیٹھا تھا۔ بال منتشر' آنکھیں سرخ اور لباس شکن شکن۔ میرے اور چچا کے درمیان جو مختصر گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا۔ چچا مجھے واپس ناگورے کے گھر لے جانا چاہ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ غزالہ کی طبیعت خراب ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے پاس رہوں۔ وہ دو راتوں سے سو نہیں سکی اور مسلسل رو رہی ہے۔

میں نے کہا "آپ اس سے کہہ دیں کہ میں سری لنکا میں نہیں ہوں۔"

"تم ضد کیوں کر رہے ہو شاہ جہاں۔ کس بات کی سزا دے رہے ہو ہمیں؟"

"سزا جزا کی طرف مت جاؤ چچا' یہ اگر چھڑ گیا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ بس تم میری معذرت قبول کر لو۔ میں وہاں نہیں جا سکتا۔ تم دونوں وہاں ہو' تمہارے داماد کا منیجر وہاں ہے۔ بقول تمہارے ایک دو دن میں داماد خود بھی آ جائے گا۔ تم سب لوگ مل کر اسے نہیں سنبھال سکتے تو میں کیسے سنبھال لوں گا۔"

چچا جلیس بولا "تم اس بات سے ناراض ہو کہ ہم نے غزالہ کو وہاں سے لے جانے کا ارادہ کیوں کیا تھا۔ شاہ جہاں یہ ہمارا فیصلہ نہیں تھا۔ عاصم کے منیجر مسٹر داؤد کا فیصلہ تھا۔"

"مسٹر داؤد کو یہ فیصلہ کرنے کا حق تھا۔ وہ تمہارے داماد کا منیجر ہے۔ ابھی یہ لوگ اور بھی بہت سے فیصلے کریں گے۔ جب ان فیصلوں میں تم رکاوٹ نہیں بن سکتے تو میں کس گنتی میں ہوں۔ پلیز چچا' مجھے مجبور نہ کرو۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے تمہاری بیٹی کے لیے کر دیا۔ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔"

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور چچا کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

اگلے روز چچا اور چچی ایک کامیاب چال کھیل گئے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اس حد تک جائیں گے لیکن صورت حال نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دونوں نوریلیا سے واپس کولمبو چلے گئے ہیں اور آج رات ہی کی فلائٹ سے واپس پاکستان چلے جائیں گے۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ان کی غیر موجودگی میں غزالہ یہاں اکیلی ہوگی اور میرے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ میں اس دیار غیر میں اسے بے سہارا چھوڑ دوں۔ اسی رات نادر نے مجھے سیٹھ شاستری لال کے گھر فون کیا۔ اس نے حسب توقع مجھے اطلاع دی کہ "بڑی بہن" کے والدین اسے چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ہیں اور وہ مسلسل آپ کو یاد کر رہی ہیں۔

میں نے جیسے تیسے رات کاٹی' اگلی صبح ایس پی برکت سے مشورہ کیا۔ ایس پی برکت کی رائے بھی یہی تھی کہ موجودہ صورت حال میں ہمیں واپس غزالہ کے پاس جانا چاہیے۔ ہم نے اہل خانہ سے اور خاص طور سے انیلا سے اجازت لی اور واپس روانہ

ہو گئے۔

O☆O

میں نے دروازہ کھولا۔ کھٹکے کی آواز نے غزالہ کو چونکا دیا۔ وہ تکیے سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس کی آنکھوں میں دنیا کی حسین ترین روشنی نمودار ہو گئی لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے یا لمحے کے کچھ حصے کے لیے ہوا۔ پھر ان آنکھوں میں ان گنت شکوے سمٹ آئے۔ اس نے نقاہت بھرے انداز میں آنکھیں موند لیں اور سر دوبارہ تکیے پر ڈال دیا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ زرد زرد نظر آ رہی تھی۔ غالباً ڈاکٹر سوتھی ابھی ابھی اسے انجکشن دے کر گیا تھا۔ انجکشن کا خالی وائل اور سرنج وغیرہ تپائی پر رکھی تھی۔

"کیا حال ہے غزالہ؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں" وہ کمزور آواز میں بولی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی انگلیوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ یہ انگلیاں کچھ دیر ہچکچاتی رہیں پھر انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ وہ میرے ہاتھ کو اپنے چہرے تک لے گئی۔ اس کے گرم آنسو میرے ہاتھ کی پشت پر گرنے لگے۔ لمبی جھڑی کی خاموش بارش جیسے یہ خاموش آنسو تھے۔ مجھے لگا جیسے یہ ہاتھ پر گرنے کے بجائے میرے دل پر گر رہے ہیں اور روح میں جذب ہو رہے ہیں۔ میں اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ نہ میں نے اس سے کچھ پوچھا نہ اس نے مجھ سے۔ ہم دونوں چپ چاپ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کرتے رہے۔ کھڑکیوں سے باہر دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سیاہ بادل جھکتے چلے جا رہے تھے اور گھر کے سامنے کا وسیع میدان گہرا سبز نظر آنے لگا تو... دھیرے دھیرے غزالہ سو گئی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ نادر اندر آئی اور بڑی آہستگی سے میرے قریب چائے رکھ کر باہر چلی گئی۔

شام کو نادر نے مجھے بتایا "بڑی بہن کی والدہ نے بڑی بہن کو یہاں سے ہوٹل لے جانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانی تھیں۔ وہ آپ کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں لیکن انہیں ٹھیک سے کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ دو تین دن پہلے میں موقع دیکھ کر ان کے کمرے میں چلی گئی اور میں نے بڑی بہن کو بتایا کہ شاہ جہاں صاحب نوریلیا میں ہی کہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور ان کے گھر چھوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے والدین ان کا آپ کے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا' مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ بس کل کمرے سے بڑی بہن کے رونے کی آواز آتی تھی۔ بڑی بہن کی والدہ غصے سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر بڑی بہن کے والد پریشان صورت لیے باہر چلے گئے تھے۔ کل شام مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے آپ کا کھوج لگا لیا ہے۔ آپ نوریلیا میں ہی ہیں۔ آپ کو شاستری ہوٹل سے مس انیلا اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھیں۔"

تمام صورت حال اب واضح ہو گئی تھی۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ غزالہ نے اس طویل جنگ میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا جو برسوں سے میرے اور چچی فاخرہ کے درمیان لڑی جا رہی تھی۔ پہلا موقع تھا کہ وہ خاموش تماشائی نہیں بنی رہی تھی۔ دبے لفظوں میں ہی سہی لیکن اس نے میرے حق میں آواز بلند کی تھی۔ گو اب بہت... بہت دیر ہو چکی تھی لیکن یہی بڑی بات تھی کہ اس نے سیاہ اور سفید میں فرق محسوس کیا تھا۔

نجانے میں کیوں ... خوش تھا۔ معلوم نہیں میری یہ خوشی نیکی کے زمرے میں آتی ... نہیں اور اخلاقی طور پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا یا نہیں لیکن میں خوش تھا۔ مجھے روحانی مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ چچی فاخرہ کو اپنی تمام ریشہ دوانیوں کے ساتھ واپس پاکستان جانا پڑا ہے۔ شاید بچپن سے سینے میں دبی ہوئی کسی معصوم خواہش کی تکمیل آج ہوئی تھی۔ وہ دن واقعی بہت خوش کن اور حوصلہ افزا تھا۔ نکھرا نکھرا' روشن اور امنگ رنگ سے لبریز۔ بعد از دوپہر ایک اور اچھی خبر ملی۔ ناگورے' کولمبو سے نوریلیا واپس آ رہا تھا۔ وہ لوگ صبح سویرے روانہ ہوئے تھے اور اب قصبے میں پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے غزالہ اور ایس پی برکت کو بھی یہ خوشخبری سنائی۔ بعد ازاں مجاہد علی سمیت ناگورے کے چند دوستوں کو بھی اطلاع دی۔

شام پانچ بجے جب اروندا کی شاندار وہیکل ناگورے کے گھر کے سامنے رکی تو وہاں جشن میں کافی رونق ہو چکی تھی۔ ناگورے کی ٹانگ کا پلستر اتر چکا تھا۔ اور وہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اروندا نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے نکالا۔ ناگورے کا والد بھی ساتھ تھا۔ ناگورے نے سب سے پہلے مجھ سے معانقہ کیا پھر مجاہد علی سے گلے ملا۔ اسی دوران میں ایک طرف سے شور بلند ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سائیں عالی ایک چھوٹے سے جلوس کے ساتھ ایک گلی سے برآمد ہوا اور موقع پر پہنچ گیا۔ جلوس میں کم و بیش ڈیڑھ سو افراد تھے۔ وہ سب اچھل کود رہے تھے اور سائیں عالی کے ساتھ مل کر نعرہ زنی کر رہے تھے۔ سائیں عالی سنہالی میں پکار رہا تھا۔ "جیتے گا' بھئی جیتے گا" وہ سب کہتے تھے "جیتے گا بھئی جیتے گا" میں یہ منظر ایک دفعہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج اس منظر میں زیادہ جوش و خروش و سرمستی تھی۔ ناگورے اور اروندا سمیت سب مڑ کر جلوس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے دیکھا سائیں عالی کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کا ایک ہار ہے۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور اس نے یہ ہار ناگورے کے گلے میں ڈال دیا پھر پہلے سے زیادہ اچھلتے کے ساتھ وہ نیچے جھکا' گھوم کر ناگورے کے عقب میں آیا اور اس نے اپنا سر ناگورے کی ٹانگوں میں گھسیڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکنے کی کوشش کرتا' اس نے ایک جھٹکے سے ناگورے کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ ناگورے کوئی ہلکا پھلکا لڑکا نہیں تھا لیکن

سائیں کے مجھے میں نو کولی حیوانی قوت سرایت کر گئی تھی۔ نہ صرف اس نے ناگورے کو کندھوں پر اٹھایا بلکہ وجدانی انداز میں رقص بھی کرنے لگا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ ناگورے سیدھا اسپتال سے آرہا تھا اور ٹانگ کے سلسلے میں اسے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی لیکن سائیں عالی نے اسے اٹھا کر ناچنا شروع کردیا تھا۔ وہ سائیں کے کندھوں پر کبھی ایک طرف جھک جاتا تھا کبھی دوسری طرف۔ یوں بھی سائیں عالی مخبوط الحواس ہی تھا۔ وہ ناگورے کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ کیا پتا سڑک پر ہی پٹخ دیتا لیکن اسے روکنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں نے احتیاطاً ناگورے کو پیچھے سے تھام لیا۔ دو تین منٹ کی اچھل کود اور نعرہ زنی کے بعد سائیں عالی نے ناگورے کو بڑی احتیاط سے نیچے اتار دیا۔ پھر اس کے دونوں کندھے زور زور سے تھپکنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "دیکھا شفیع محمد۔ کیسا استقبال کیا تیرے ہیرو کا۔ اور مزے کی بات ایک اور ہے۔ یہ استقبال عام لوگوں نے ہی نہیں جنوں نے بھی کیا ہے۔ یہ دیکھو دائیں طرف وہ جو سامنے لوہے کا جنگلا ہے نا! اس کے ساتھ جنوں کا جلوس کھڑا ہے۔ پانچ چھ سو جن تو ہوں گے۔ ان جنات میں دس پندرہ بہت اچھے ایتھلیٹ بھی ہیں۔ جنوں میں بھی کراس کنٹری ریس ہوتی ہے۔ پینتالیس ہزار میل اڑنا پڑتا ہے ان کو۔ اور کاکا جی ان کا میل بھی کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس میل کے حساب سے احمد پور شرقیہ سے لنڈی کوتل کا فاصلہ پونے دو میل سے زیادہ نہیں۔"

پھر وہ ہوا میں اشارے کرکے "جنوں" سے باتیں کرنے لگا۔

مجمع کی اکثریت بڑی محبت سے سائیں کو تک رہی تھی۔ ان میں سے کچھ کی آنکھوں میں تمسخر تھا لیکن زیادہ تر بڑے احترام سے سائیں کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے سائیں کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا "کیوں مذاق بناتے ہو اپنا۔ مت ایسی حرکتیں کرو۔"

"کیسی حرکتیں" وہ غصے سے بولا "تم اسے حرکتیں کہتے ہو۔ یہ گفتگو ہے۔ میں اس سامنے والے جن سے بات کررہا تھا۔ اس کا نام سراج دین ہے۔ پرستان کی فلموں میں کام کرتا ہے۔ تم اسے پرستان کی فلموں کا مصطفیٰ قریشی کہہ سکتے ہو۔ برے رول کرتا ہے لیکن کردار کا بڑا نیک ہے۔ سوشل ورک بھی کرتا ہے۔ اب میرے منع کرنے کے باوجود تمہارے دوست کے لیے پھولوں کا ہار لے آیا ہے لیکن ہار بہت بڑا ہے۔ تمہارے دوست کے گلے میں نہیں آسکتا ہے۔ میں نے کہا ہے 'اس سامنے والے ناریل پر ڈال دو۔' اس نے ناریل پر ڈال دیا ہے۔ وہ دیکھو وہ ناریل۔ سڑک کے پار، بس اسٹاپ کے سامنے۔" میں نے غیر ارادی طور پر اس جانب دیکھا۔ سڑک کے کنارے مجھے انیلا کے بھائی سرجیت کی نوسیٹر گاڑی کھڑی نظر آئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ پلستر میں جکڑی ہوئی کلائیاں اسٹیئرنگ وہیل پر تھیں۔ انداز سے ظاہر تھا کہ کہیں جارہا تھا اور جلوس دیکھ کر رک گیا ہے۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن اس فاصلے سے بھی میں اس کے چہرے پر کدورت اور نفرت کے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً یہ کدورت اور نفرت ناگورے کے لیے تھی اور ان لوگوں کے لیے تھی جو ناگورے کا استقبال کررہے تھے۔ سرجیت کو دیکھتے ہی میرا دھیان ہر چیز سے کٹ کر اس لڑکی کی طرف چلا گیا جو سرجیت کی حبس بے جا میں تھی اور ہر رات اس سے تاش کی بازی کھیل کر ہار رہی تھی۔ اس "ہار" کے نتیجے میں اسے اپنا آپ ہارنا پڑتا تھا۔ یہ سب کچھ میری نگاہ سے اوجھل رہتا تو اور بات تھی۔ اب میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکا تھا اور میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس لڑکی کی "نجات" کے لیے کوشش نہ کرتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل سب سے پہلا کام یہی کروں گا۔

اچانک سائیں عالی کا ہاتھ میرے شانے پر آیا اور میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ "کہاں کھو گئے شفیع محمد! میں نے تمہیں ناریل دکھایا تھا' تم کانٹوں بھری جھاڑی کو دیکھنے لگے۔ خیر چھوڑو۔ میں نے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ ذرا آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"زیادہ دور نہیں۔ بس اس مجمع سے ایک طرف ہو جاؤ۔"

"کیسی بات ہے؟"

"بہت ہی اہم۔"

"تو چلو پھر اندر چلو۔ اوپر کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

سائیں نے اپنا گرد آلود سر اثبات میں ہلایا اور میرے ساتھ ہولیا لیکن دو ہی قدم چل کر رک گیا۔ "نہیں شفیع محمد!" وہ عجیب لہجے میں بولا "ابھی نہیں۔ یہ بات میں تم سے بعد میں کروں گا۔"

میں نے دل ہی دل میں سائیں عالی کے ناقابل فہم رویے کو کوسا۔ کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ وہ کب کیا کہہ دے گا۔

میں نے کہا "ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ بہت ضروری بات ہے اور ابھی کرنی ہے۔"

"اب میں کہہ رہا ہوں کہ ابھی نہیں کرنی" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک طرف چل دیا۔ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے عقیدت مندوں نے جب دیکھا کہ سائیں عالی واپس جارہا ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ چل دیئے۔

ناگورے ایک بار پھر حوصلہ مند اور پر امید نظر آرہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود کو بہت چاق و چوبند اور خوش باش محسوس کررہا ہے۔ اسپتال سے ایک بہت اچھا فزیو تھراپسٹ اس کے ساتھ آیا تھا اور یقین تھا کہ ناگورے ایک ڈیڑھ ماہ میں بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جائے گا۔ ناگورے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے وہ بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آجاتی تھی جس میں کوئی بادشاہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا تھا اور ایک کیڑے کو بار بار کنویں کی دیوار پر چڑھتے اور گرتے دیکھ رہا تھا۔ کئی بار کوشش کرنے کے بعد آخر وہ کیڑا کنویں سے

نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ناگورے بھی تو اس کیڑے کی طرح مسلسل میں معروف تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں نوں سے آگے بڑھنے کی کوشش میں کئی بار گرا اور سنبھلا تھا۔ ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس کے ارادے مضبوط اور عزائم جواں ہوئے تھے۔ اب وہ ایک بار پھر اپنے پرانے حریف سے پنجہ لڑانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے ایک اہم کام ایس پی برکت کے سپرد کیا۔ اس کام کا تعلق سرجیت اور اس کے قبضے میں آئی ہوئی برطانوی نژاد لڑکی سے تھا۔ سرجیت اس لڑکی کو کوبرا کلب سے جیت کر لایا تھا۔ میں نے ایس پی برکت سے کہا کہ وہ کوبرا کلب جائے اور یہ معلوم کرے کہ پچھلے ماہ اٹھائیس تاریخ کو سیٹھ شاستری لال کا سپوت سرجیت کمار جس لڑکی کو قمار خانے سے جیت کر لایا تھا وہ کون ہے اور کس کی بیوی ہے۔

ایس پی برکت بے شک کپا ایس پی تھا لیکن افسرانہ شان اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس نے اپنے ماتحتوں کے تعاون کے بغیر کبھی تنکا بھی نہیں توڑا تھا' ایک لڑکی کے کوائف کیسے معلوم کرتا۔ اس نے مجھ سے ایک عدد ماتحت طلب کیا۔ میرا دھیان فوراً ہی مجاہد علی کی طرف چلا گیا۔ میں نے مجاہد علی سے رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ وہ ایس پی برکت کے ساتھ کوبرا کلب جائے۔

بے شک ایس پی برکت ایک چوہدری ٹائپ افسر تھا لیکن ایسے لوگوں میں اکثر ایک خاص قسم کی ذہانت اور معاملہ فہمی پائی جاتی ہے۔ پنجاب پولیس کے ایسے عقدہ کشاؤں کی صلاحیت کو تو انگریز نے بھی تسلیم کیا تھا۔ ایس پی برکت نے مجاہد علی کی مدد سے صرف بارہ گھنٹے کے اندر برطانوی نژاد لڑکی کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلیں۔ نہ صرف معلومات حاصل کرلیں بلکہ اس کہانی کے ایک اہم کردار کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ یہ کردار ایک تیس پینتیس سالہ فیشن ایبل سنہالی تھا۔ ایک لمبی سی کار میں آیا تھا لہٰذا یقینی بات تھی کہ امیر کبیر ہے۔ اس کا نام تھلنگا تھا۔ ایس پی برکت نے بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی بیوی کو سرجیت جوئے میں جیت کر لایا تھا۔

میں نے اس شخص سے انگریزی میں بات چیت کی۔ اس نے کہا "میرا نام تھلنگا ہے اور میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے دوستوں نے بتایا ہے کہ آپ مجھے میری بیوی کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس لڑکی کو بیوی کہتے ہوئے آپ کو خیال کرنا چاہیے۔ آپ اسے بڑے خلوص کے ساتھ جوئے میں ہار چکے ہیں۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں بھائی' مجھے اور شرمندہ نہ کرو" وہ نادم لہجے میں بولا۔ "اس رات جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا۔ میں نشے میں تھا اور مسلسل بازی لگا رہا تھا۔ میری بیوی "سارا" مجھے مسلسل ٹوک رہی تھی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم گھر چلیں۔ روک ٹوک سے تنگ آکر میں نے اسے دھکا دے دیا۔ جواب میں اس نے میرے سر پر شیشے کا کپ توڑ دیا۔ وہ جب غصے میں ہوتی ہے تو بہت تلخ بولتی ہے۔ اس کی تلخ کلامی نے میرا دماغ گھما دیا۔ میں نے اسے گالیاں دیں اور کہا کہ وہ دو ٹکے کی لڑکی ہے۔ بسوں میں بچوں کی ٹافیاں بیچتی تھی۔ میں نے اسے فرش سے عرش پر پہنچایا ہے۔ بس طیش میں بہت کچھ منہ سے نکل گیا۔ حالانکہ میں خود بھی کوئی جدی پشتی رئیس نہیں ہوں۔ بہرحال میں غصے اور نشے میں مدہوش ہورہا تھا۔ اس عالم میں میں لگاتار ہارتا چلا گیا۔ جب ہارنے کو کچھ بھی باقی نہ رہا تو میں نے "سارا" کو داؤ پر لگا دیا۔ حسب معمول یہ داؤ بھی میں ہارا اور سارا کو سرجیت کے حوالے کردیا۔ دماغ اس قدر گرم ہورہا تھا کہ میں نے سارا کے قیمتی زیورات کے ساتھ ساتھ اس کا لباس بھی اتروالیا۔ اگلے روز جب نشہ اترا تو مجھے اپنے کیے پر سخت افسوس ہوا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ چند روز سخت پریشانی میں رہنے کے بعد میں نے سرجیت کمار سے رابطہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ سرجیت کی منہ مانگی قیمت چکا کر سارا اس سے واپس لے لوں لیکن سرجیت نے مجھے یہ بتا کر سخت مایوس کیا کہ اس نے چند روز لڑکی کو اپنے پاس رکھنے کے بعد جانے کی اجازت دے دی تھی اور معلوم نہیں وہ کہاں گئی ہے۔"

اپنی روداد سنانے کے بعد تھلنگا خاموش ہوگیا۔ میں نے پوچھا "کیا تم نے سرجیت کی بات کا یقین کرلیا تھا؟"

"اس کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا" تھلنگا نے جواب دیا "اور ویسے بھی سرجیت کسی لڑکی کو زیادہ دیر ساتھ رکھنے کا عادی نہیں ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس نے چھوٹی موٹی رقم لے کر سارا کو کسی نامعلوم شخص کے حوالے کردیا ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سارا ابھی تک سرجیت ہی کے پاس ہے۔ اس نے اسے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور برا سلوک کررہا ہے۔"

"تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں نے یہ سب کچھ اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھا ہے" میں نے آنکھوں کو انگلیوں سے چھو کر کہا۔

"کہاں ہے وہ؟" تھلنگا نے بے تابی سے پوچھا۔

"جہاں سرجیت ہے"

"تمہارا مطلب ہے سیٹھ شاستری لال کے گھر؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تھلنگا ہیجانی لہجے میں بولا۔ "پھر سرجیت نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟"

"سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ وہ سارا کو تمہارے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس سے ایک طرح کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے پلاننگ کے تحت سارا کو تم سے حاصل کیا۔"

"بدلہ؟ کیسا بدلہ؟"

میں نے مختصر الفاظ میں تھلنگا کو بتایا کہ چند روز پہلے کسی محفل میں سارا نے سرجیت کو بہن انیلا کے بارے میں بات کہہ دی تھی۔ سرجیت کو وہ بات بہت بری لگی تھی اور وہ سارا کے خلاف جذبۂ انتقام میں سلگ رہا تھا۔ تھلنگا کے اصرار پر میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ بات انیلا اور تانگورے کے بارے میں تھی۔

تفصیل جاننے کے بعد تھلنگا کا رنگ زرد نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گہری پریشانی تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "سرجیت من مانی کرنے والا بدمعاش ہے۔ پورا نوریلیا اس سے خوفزدہ رہتا ہے۔ اگر بات واقعی اسی طرح ہے جس طرح تم نے کہی ہے تو پھر وہ سارا کو آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "وہ بھی تمہاری طرح بگڑا ہوا رئیس ہے۔ یعنی جو وہ ہے وہی تم ہو، پھر تم اس سے فکر کیوں نہیں لے سکتے؟"

"یہ کروڑ پتی لوگ ہیں" تھلنگا نے کہا "باپ کی کمائی سے تجوریاں بھری ہوئی ہیں ان کی۔ اوپر سے بدمعاشی میں بھی پاؤں رکھتے ہیں۔ کم از کم میں تو یہ فکر نہیں لے سکوں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"کوئی اور حکمتِ عملی سوچنی ہو گی۔"

میں نے کہا "میں تمہیں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ بہت آسان اور جاندار بھی" وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "تم جانتے ہو کہ سرجیت کا باپ شاستری لال مقامی الیکشن میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

"اڑتی اڑتی بات تو میں نے بھی سنی ہے" تھلنگا نے جواب دیا۔

"اڑتی اڑتی بات نہیں حقیقت ہے۔ شاستری لال الیکشن لڑ رہا ہے۔ اندرونِ خانہ اس سلسلے میں تیاری بھی شروع ہو چکی ہے۔ جس شخص نے الیکشن میں حصہ لینا ہو وہ اپنی نیک نامی کے حوالے سے بڑا محتاط ہو جاتا ہے۔ چاہے اندر سے کتنا بھی کالا ہو اوپر سے اُجلا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس موقع پر شاستری لال اپنے بیٹے کی بدنامی "افورڈ" کر ہی نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ شاستری لال کے گھر میں ایک نوجوان مغویہ موجود ہے اور شاستری کا بیٹا اس کی عزت کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہے تو وہ اس کا حقہ پانی بند کرنے کی سوچنے لگیں گے۔ ووٹ دینا تو بہت دور کی بات ہے۔"

تھلنگا کی آنکھوں میں چمک سی نمودار ہو گئی۔ "بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ شاستری لال الیکشن لڑ رہا ہے؟"

"سو فیصد" میں نے جواب دیا۔

"سارا ہے کدھر؟"

"کوٹھی کے بیس منٹ میں۔ بیس منٹ کا راستہ سرجیت کے بیڈ روم میں موجود ہے۔ کمرے کے ایک کونے سے چند سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں۔ یہ بیس منٹ غالباً بیس تیس سال پہلے گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اب وہاں سرجیت نے چھوٹا سا عشرت خانہ قائم کر رکھا ہے۔ وہاں کی ڈیکوریشن اس انداز میں کی گئی ہے کہ جس طرف بھی دیکھیں تاش کے باون پتے نظر آتے ہیں۔"

میں نے تھلنگا کو اس بارے میں تمام تفصیل بتائی اور اپنی طرف سے کچھ ہدایات بھی دے دیں۔ تھلنگا اسی وقت میرے پاس سے روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ اپنی بیوی "سارا" کے لیے سرجیت سے دو دو ہاتھ کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ بیوی کو دوبارہ حاصل کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟ اس سوال کے کئی امکانی جوابات تھے۔ ممکن تھا کہ سارا اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔ ممکن تھا کہ میاں بیوی میں زبردست قسم کا جھگڑا ہو جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ تھلنگا اسے پھر کسی اندھیری رات کو جوئے میں ہار جاتا اور وہ کسی دوسرے "سرجیت" کے پاس جا پہنچتی۔ کچھ بھی تھا بہرحال اتنا تو ضرور ہوتا کہ سارا اس حبس زدہ تہہ خانے اور سرجیت کے چنگل سے نکل جاتی۔

تھلنگا کی اس شخص کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر تانگورے کے پاس بیٹھا اور اس کی مزاج پرسی کی۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر بجنے گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ سائیں عالی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ وہ ایک لمبی سی گاڑی میں بیٹھا تھا اور مجھے باہر بلا رہا تھا۔ یہ لمبی گاڑی کسی ہندو مہاشے کی شیورلیٹ تھی۔ حسبِ عادت سائیں دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ماتھے پر ایک موٹی سی پٹی باندھ رکھی تھی۔ اس پٹی میں کسی خاردار جھاڑی کی دو تین شاخیں اڑسی ہوئی تھیں۔ ایک کان میں بھی گھاس پھونس اڑسا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اشارے سے گاڑی میں بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے چالیس پینتالیس سالہ شخص کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی چلائے۔ یہ شخص شکل و صورت سے ہی اس گاڑی کا مالک نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں سائیں نے اس پر کیا جادو چلایا تھا کہ وہ اپنی ہی گاڑی پر سائیں کا ڈرائیور بنا ہوا تھا۔ سائیں مجھے ایک فور اسٹار ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل منیجر کے کمرے میں وہ یوں داخل ہوا جیسے اپنے ہی کمرے میں گھس رہا ہو۔ چند لمحے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس ہوٹل کا منیجر و مالک دراصل وہی شخص ہے جو سائیں کو بصد احترام گاڑی میں بٹھا کر یہاں لایا ہے۔ کمرے میں گھستے ہی سائیں نے منیجر صاحب کو باہر نکلنے کا حکم دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اب میں اور سائیں وہاں تنہا تھے۔ سامنے خوبصورت میز پر تین رنگوں کے ٹیلیفون سیٹ رکھے تھے۔ سائیں ایک دم غصے سے آگ بگولا نظر آنے لگا۔ بولا "اوئے کھوتے! تمہیں پتا ہے تمہاری بے پروائی کی وجہ سے کتنا نقصان ہوا ہے۔ سوروج اسپتال پہنچ گئی ہے۔"

"اسپتال میں! میں سمجھا نہیں؟"

"تجھے ساری زندگی سمجھ نہیں آئے گی کہ تو سوروج کے لیے اور سوروج تیرے لیے کتنی ضروری ہے۔ ہاں ابھی سمجھ نہیں آئے گی تجھے۔ تو اگر اسے واپس حیدر آباد نہ بھیجتا یہیں اپنے پاس رکھتا اور اس کی دلجوئی کرتا تو یہ کچھ نہ ہوتا جو اب ہوا ہے۔ اس نے زیادہ مقدار میں نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ بہت مشکل سے بچی ہے۔"

"اوہ گاڈ" میں نے پریشانی سے کہا "کیا وہ واقعی بچ گئی ہے۔"

"تو اسے مر جانا چاہیے تھا؟" سائیں نے آنکھیں نکالیں۔

"مریں اس کے دشمنوں کے دشمن۔ مگر ہوا کیا تھا؟"

"وہی جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تمہاری بے رخی اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ ذہنی سکون اور نیند کے لیے اس نے زیادہ مقدار میں دوا کھالی اور اسپتال پہنچ گئی۔"

سائیں عالی زبانِ حال سے گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے ایک سو دس فیصد یقین تھا کہ اس اُلّو کی دُم نے میری خاطر کچھ نہیں کیا۔ وہ اس کینڈے کی لڑکی ہی نہیں تھی۔ اسے دنیا میں صرف ایک چیز سے محبت تھی اور وہ تھا چنے لال کی حویلی کا دفینہ۔ اس کے روز و شب کا محور صرف اور صرف وہ دفینہ تھا۔ ہاں یہ بات تھی کہ وہ کچھ دنوں سے بہت جھلائی ہوئی اور مایوس نظر آتی تھی۔ خاص طور سے کولمبو کلب والے واقعے کے بعد اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ کولمبو کلب میں اس نے مجھے اور خود کو چھڑانے کی نیت سے متوفی نام کے ایک شخص کو اپنے بدن اور خوبصورتی کی رشوت پیش کی تھی۔ اس کی یہ چال ذلت آمیز طریقے سے ناکام ہوئی تھی۔ متوفی پہلے جی بھر کر سوروج سے کھیلا تھا پھر اس حالت میں اسے کمرے سے باہر پھینک دیا تھا کہ ایک چادر کے سوا اس کے جسم پر اور کوئی شے نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے اور پورے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ اس واقعے کے بعد چند روز سوروج ہمارے ساتھ ہی رہی، کلب میں رہی لیکن سخت افسردہ نظر آتی تھی۔ پھر اسے مجھ سے جدا ہو کر حیدر آباد (انڈیا) جانا پڑ گیا تھا۔ اب میں سائیں عالی کی زبانی سن رہا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے۔

میں نے سائیں عالی سے کہا "تمہاری وہ مریدنی ایک نمبر کی چالباز ہے۔ وہ کسی کی خاطر گولیاں کھانے والی نہیں۔ بہرحال اب تم کیا چاہتے ہو؟"

سوروج کے لیے "چالباز" کا خطاب سائیں نے بڑی مشکل سے برداشت کیا۔ پھر مجھے گھورتے ہوئے بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم سوروج کو ٹیلیفون کرو۔ اس نمبر پر" سائیں عالی نے ایک چٹ میری طرف بڑھا دی۔

"یہ کہاں کا نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حیدر آباد کے اس اسپتال کا جہاں سوروج داخل ہے۔ یہ فون اس کے سرہانے رکھا ہے۔"

"لیکن میں اسے فون کیوں کروں؟"

"یہ بتانے کے لیے کہ تم بھی اس سے محبت کرتے ہو اور اس کی بیماری کی اطلاع نے تمہیں پریشان کیا ہے۔"

میں نے کہا "میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا اور ایسے دو جھوٹ اوپر تلے تو بالکل نہیں۔"

"اگر یہ جھوٹ بھی ہے تو تمہیں بولنا پڑے گا ورنہ میری جوابی کارروائی تمہارے چودہ طبق روشن کر دے گی۔"

"کیسی کارروائی؟"

"میں تمہارا یہاں رہنا حرام کر دوں گا۔ میرے ایک اشارے پر مسٹر جی کلارک اور بھتیجی کنور سمیت دفینے کے سارے شکاری یہاں پہنچ جائیں گے اور تمہیں حیدر آباد لے جانے کے لیے تم پر اتنا دباؤ ڈالیں گے کہ تمہیں یہاں سے بھاگتے ہی بنے گی۔ انہیں صرف میں نے یہاں پہنچنے سے روک رکھا ہے ورنہ تم جانتے نہیں وہ تمہارا دیدار کرنے کے لیے کتنے بے قرار ہیں۔"

سائیں عالی بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مسٹر جی کلارک اس کے مرید بن چکے تھے اور اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر رہے تھے۔ اگر وہ ان سے کہہ دیتا کہ دوسری لنکا چلے آئیں تو وہ فوراً ہی چلے آتے اور ان کے ساتھ بھتیجی کنور، قادر زماں، افراہیم اور نجانے کون کون آتا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں میرا جینا واقعی حرام ہو جاتا۔ سائیں عالی کی چمکیلی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں اور ہونٹوں پر ایک مطمئن مسکراہٹ تھی۔

میں نے کہا۔ "سائیں عالی! محبت کوئی ایسی چیز نہیں جسے زبردستی پیدا کیا جا سکے۔ جس طرح کھجانے کا مزہ اسی جگہ آتا ہے جہاں کھجلی ہو رہی ہو ایسے ہی بات کرنے کا مزہ بھی اسی سے آتا ہے جس سے بات کرنے کو دل چاہ رہا ہو۔ تم سوروج سے زبردستی میری بات تو کروا سکتے ہو لیکن میرے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا نہیں کر سکتے۔"

"آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا۔ فی الحال تم اس سے بات کرو" سائیں نے ایک فون کا ریسیور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ انٹرنیشنل فون لائن تھی۔ میں براہِ راست حیدر آباد میں بات کر سکتا تھا۔ سائیں عالی نے مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا "سوروج کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم کسی کے کہنے پر اسے فون کر رہے ہو۔ میں یہیں کھڑا سب کچھ سن رہا ہوں گا۔ اگر ایسا کچھ ہوا تو تمہارے حق میں برا ہو گا۔"

میں نے سائیں عالی کے دیے ہوئے نمبر ڈائل کیے۔ دو تین کوششوں کے بعد مطلوبہ نمبر مل گیا۔ دوسری جانب سے جو آواز ابھری وہ سوروج ہی کی تھی۔ آواز میں ہلکی سی نقاہت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ "او شاہ جہاں تم؟ بھگوان کی سوگند مجھے اپنے کانوں پر وشواس نہیں ہو رہا۔"

"مجھے بھی نہیں ہو رہا۔ تمہاری آواز تمہاری لگتی ہی نہیں ہے۔ لگتا ہے کوئی بیمار بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہے۔ کیا ہوا ہے

تمہیں؟"

"تمہیں معلوم ہے۔ اگر معلوم نہ ہوتا تو یہاں اسپتال میں فون کیوں کرتے۔ کہاں سے ملا تمہیں میرا نمبر؟"

"ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو پھر ایک نمبر تھا۔ ایک ایسی چنچل لڑکی کا نمبر جس نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھائی ہیں۔"

"مر ہی جاتی تو اچھا تھا' تمہارا راستہ تو صاف ہو جاتا۔"

"میرا راستہ کبھی بھی تمہاری وجہ سے بلاک نہیں ہوا اور نہ کبھی آئندہ ہو گا۔"

"میں اسے اپنی توہین سمجھوں یا عزت افزائی؟"

"جو تمہارا جی چاہے سمجھ لو۔ بہرحال مجھے تمہاری بیماری کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔"

"کاش تم یہ بات اپنے حلق کے بجائے دل سے کہتے۔"

"میں دل سے کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر میرا من چاہتا ہے کہ خوشی سے مر جاؤں۔"

"آگے چل کر مرنے کے بہت سے مواقع تمہیں ملیں گے۔ نئی اخلال زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کرو۔"

"میری زندگی تو تم ہو میرے سویٹ ہارٹ لیکن میں اتنی جلد تمہاری طرف لوٹ نہیں سکتی ہوں۔ تھوڑی سی مہلت دو تو اڑ کر پہنچ جاؤں گی۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی تم ہو۔ تمہارے ساتھ تو میں تپتے صحرا میں کانٹوں کے بستر پر بھی سو سکتی ہوں۔ ہائے رام' تمہاری باتیں' تمہارے ہونٹ' تمہاری گرم سانسیں کچھ بھی تو بھولی نہیں ہوں میں۔ تم ضرور کوئی کالا پیلا علم جانتے ہو۔ میرا سوا ستیاناس کر دیا ہے تم نے۔ جانتے ہو رات کیا سپنا دیکھا میں نے۔ مجھے لگا جیسے تمہارا ہاتھ۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ فون پر یہ الف لیلہ مت چھیڑو" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی "اپنا خیال رکھو۔ میں تمہیں صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہائے رام اتنی میٹھی باتیں۔ کہیں میں کوئی سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔" پھر وہ ایک دم چونک سی گئی۔ ذرا توقف سے بولی "کہیں سائیں جی۔ میرا مطلب ہے کہیں سائیں جی نے تو تمہیں یہ فون کرنے کے لیے نہیں کہا؟"

"سائیں جی۔ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟ اچھا سائیں عالی کی بات کر رہی ہو تم۔ نہیں بھئی۔ وہ حضرت تو آٹھ دس روز سے کہیں نظر ہی نہیں آئے۔"

"اس اسپتال کا فون نمبر تمہیں کیسے ملا؟" اس نے پھر نکتہ اٹھایا۔

"ابھی بتایا ہے نا تمہیں کہ ڈھونڈنے سے سب کچھ مل جاتا ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی "ہاں۔ ڈھونڈنے سے واقعی سب کچھ مل جاتا ہے اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اب اور دیر مت کرو۔ وہ پچیس صندوق یہیں کہیں حیدر آباد میں موجود ہیں۔ ہم ان کے بہت نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ہم انہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ ہائی گارڈ شاہ جہاں ہم انہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔"

"اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" میں نے کہا۔

چند رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

سائیں عالی نے میری پیٹھ تھپکی "شاباش! شفیع محمد۔ تم مجھے اسی لیے پسند ہو کہ میرے دل کی بات سمجھ لیتے ہو۔ میں یہی چاہتا تھا کہ تم سوچ کی تھوڑی سی دلجوئی کرو۔"

"اب میرے لیے کیا حکم ہے محترم سائیں صاحب؟" میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

"تم وہی کرو جو اب تک کر رہے ہو" سائیں نے میرے طنز کا جواب سنجیدگی سے دیا "وہ لڑکا ناگورے بڑا ہونہار ہے۔ بڑی ہمت ہے اس میں۔ تم اس کی ہمت بندھاؤ۔ اس کو جوش دلاؤ۔ ستاروں کی چال بھی اس کے حق میں ہے۔ امید ہے کہ وہ اس مرتبہ اپنے پرانے دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا اور یہ شکست صرف اس کے دشمن کی شکست نہیں ہو گی اس قصبے کے ان سب لوگوں کی شکست ہو گی' جو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور غریب طبقے کو کیڑے مکوڑوں کا طبقہ سمجھتے ہیں۔" سائیں عالی کچھ دیر خاموش نظروں سے خلا میں گھورتا رہا پھر اپنی چھوٹی انگلی ناک میں گھماتے ہوئے بولا "کیا نام ہے اس لڑکی کا جو ناگورے سے شادی کرنا چاہتی ہے؟"

"انیلا" میں نے جواب دیا "لیکن اب تو وہ سرداروں کے لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔"

"یہ آج کی بات ہے۔ کل کیا ہو گا' کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" سائیں نے وجد کے انداز میں جھومتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال ہے کہ انیلا پھر ناگورے کی طرف آ جائے گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی" سائیں نے فلسفہ جھاڑا۔ "کس کو کیا ملے گا' اس کا دارومدار صرف اور صرف کوشش پر ہوتا ہے۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ ناگورے کو بھی وہی کچھ ملے گا جس کے لیے وہ خون پسینہ ایک کرے گا۔"

"خون پسینہ تو وہ ضرور ایک کرے گا۔ انیلا کو حاصل کرنا ناگورے کے لیے زندگی موت کا سوال ہے۔"

سائیں نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔ "میں خود بھی چاہتا ہوں کہ ناگورے اپنی محبت جیت سکے۔ بہت سی اکڑی گردنوں والے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی نظریں صرف اسی

وقت جھکتی ہیں جب کوئی غریب ان کا داماد بنتا ہے۔ ہا ہا ہا۔ کروڑ پتی سسرا۔ کنگال داماد۔"

میں نے کہا "تم ناگورے کو کنگال تو کہہ سکتے ہو لیکن وہ نالائق نہیں۔ آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔"

"ہاں اسی لیے تو میں اس کے ساتھ ہوں" سائیں نے تائید کی۔

O☆O

ناگورے حیرت انگیز تیزی سے روبہ صحت تھا۔ وہ علی الصباح میدان میں چلا جاتا اور اپنے فزیو تھراپسٹ کے ساتھ مختلف ورزشیں کرتا۔ ان ورزشوں میں ہلکی رفتار سے دوڑنا بھی شامل تھا۔ شام کے بعد گھر کی بیٹھک میں پھر ناگورے کے دوستوں اور ہم خواہوں کی محفل جمنے لگی۔ ناگورے کے وہ پرستار جو اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر مایوس ہو گئے تھے اور اس سے دور ہٹ گئے تھے ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی آنکھوں میں بجھ جانے والی امید کی کرنیں ایک بار پھر روشن ہونے لگیں۔ حالات کی اس خوشگوار کروٹ کا نظارہ بڑا دلچسپ اور دلفریب تھا۔ دھیرے دھیرے جوش و خروش کی وہی فضا پیدا ہو رہی تھی جو ناگورے کو چوٹ لگنے سے پہلے موجود تھی۔ ناگورے کے حامیوں کے بیدار ہوتے ہی دوسری طرف نوی کے سپورٹرز بھی بیدار ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی اور بیان بازی ہونے لگی تھی۔ تناؤ کی یہ فضا ناگورے کے سینے میں چھپے ہوئے شعلے کو ہوا دے رہی تھی اور وہ زیادہ پرعزم ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس دفعہ ضرور جیتے گا۔

غزالہ کی حالت بھی اب بہتر تھی۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی کہ ناگورے کولمبو سے تندرست ہو کر واپس آیا ہے۔ وہ اب خود اپنے پاؤں پر چل کر بالکونی میں جا بیٹھتی تھی اور میدان میں شام کو ہونے والی کھیل کود کا منظر دیکھتی تھی۔ کسی وقت میں غزالہ کو لے کر چہل قدمی کے لیے نکل جاتا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں ہم شفاف سڑک پر پہلو بہ پہلو چلتے دور نکل جاتے۔ ہماری ایک جانب سرسبز وادی ہوتی اور دوسری طرف بلند پہاڑ جن کی پتھریلی دراڑوں میں سے قطار اندر قطار پھول جھانکتے۔ مجھے یوں لگتا جیسے شام کے سارے رنگ غزالہ کے لباس میں سما گئے ہیں اور وہ میرے پہلو میں چل نہیں رہی بلکہ کسی بہت ہلکی پھلکی شے کی طرح تیر رہی ہے۔ غزالہ کا جسم اب بھی دبلا تھا لیکن اس میں اب گداز نمودار ہونے لگا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں چھپنے لگی تھیں اور ہونٹوں کی زردی میں ہلکی ہلکی سرخی کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے کبھی کبھی میرے دل میں آتی' کاش وقت تھم جائے۔ یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ ہم یونہی آگے بڑھتے جائیں اور صبح شام اور رات پیچھے کسی موڑ پر کھڑا رہ جائے۔ وہ چند روز و شب میری زندگی کے یادگار روز و شب تھے۔ سری لنکا کا حسین موسم' نوریلیا کی پرفضا وادیاں' فراغت اور آرام ہی آرام۔ بہت عرصے بعد میں ایک ایسے مقام پر تھا جہاں بارود اور خون کی بو میرے تعاقب میں نہیں تھی۔ جہاں گولیوں کے دھماکے میرے کانوں میں نہیں گونجتے تھے اور موت سایہ بن کر میرے ساتھ نہیں چل رہی تھی۔ میں پرآشوب ہنگاموں کے درمیان ملنے والی اس مختصر مہلت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک ایک لمحے سے حظ اٹھا رہا تھا۔ میں بالکونی کی نرم دھوپ میں لیٹ کر اخبارات دیکھتا' ڈائجسٹ پڑھتا اور ناگورے کی چھوٹی بہن نادو کے ساتھ کیرم وغیرہ کھیلتا۔ کبھی کبھی ناگورے یا غزالہ بھی ہمارے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتے۔

سچ کہتے ہیں' سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کے اندر بھی ایک بچہ چھپا رہتا ہے۔ جب بھی موقع ملتا ہے یہ قلقاریاں مارتا ہوا باہر آ جاتا ہے۔ اور ہم بچاتا ہے' شرارتیں کرتا ہے' اور اپنے بچپنے سے خود ہی محظوظ ہوتا ہے۔

ایک شام میں اور نادو کیرم .... کھیل رہے تھے اتنے میں ناگورے بھی آ گیا اور کھیلنے لگا۔ وہ پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سمجھا شاید ٹریننگ کے بعد واپس آیا ہے اس لیے مضمحل ہے لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وجہ کچھ اور ہے۔ وہ اندر ہی اندر کسی بات پر اُبل رہا تھا۔ اس کی ہیجانی کیفیت کا اندازہ اس کے کھیل سے بھی ہو رہا تھا۔ وہ بڑے زور سے اسٹرائیکر کو پش کر رہا تھا۔ میں نے کہا "خیریت ہے ناگورے؟ بہت اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے ہو"

"نہیں کوئی خاص بات نہیں" وہ اپنی تمام توجہ کیرم بورڈ کی طرف مبذول کرتے ہوئے بولا۔

"کہیں رقیب روسیاہ سے پھر جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟" میرا اشارہ نوی کی طرف تھا۔

"نہیں" ناگورے نے مختصر جواب دیا۔

"والد محترم نے کچھ کہا؟"

"نہیں۔ انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

"عشق میں دھوکا ہوا" نادو نے خیال آرائی کی۔

اتنے میں غزالہ بھی موقع پر پہنچ گئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سنجیدگی سے بولی "آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتائے گا۔"

"تو پھر آپ بتا دیں" نادو پریشان ہو کر بولی۔

غزالہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "انیلا کی منگنی ہو گئی ہے۔ سرداروں کے لڑکے نوی کے ساتھ۔"

یہ دھماکا خیز اور افسوس ناک خبر تھی۔ میں حیرت سے ناگورے کا منہ تکنے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر چٹان کی سی سختی تھی۔

"غزالہ کیا کہہ رہی ہے۔ ناگورے؟" میں نے ناگورے سے پوچھا۔

"بڑی بہن (باجی) ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ واقعہ کل رات ہوا

ہے" وہ بے پروائی سے بولا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ انیلا ان دنوں ٹونی کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے کر رہی ہے۔ وہ ناگورے کی سرد مہری کو جذبۂ رقابت کی شدت سے پگھلانا چاہتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی میرے دماغ میں یہ نہیں آیا تھا کہ انیلا سچ مچ ٹونی سے منسوب ہو جائے گی اور ناٹک حقیقت کا روپ دھار جائے گا۔ نوجوانی میں کیے جانے والے طوفانی فیصلوں کے نتائج کبھی کبھی ایسے ہی حیران کن نکلتے ہیں۔ انیلا غیر معمولی طور پر شائستہ لڑکی تھی اور اس کی سمجھ بوجھ بھی قابلِ تعریف تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ شاید انیلا واقعی ناگورے کی طرف سے مایوس ہو گئی تھی یا پھر اس کے والدین کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے ٹونی کے ساتھ انیلا کے میل جول کو "انڈر اسٹینڈنگ" سمجھ لیا تھا اور جھٹ سے دونوں کی منگنی کر ڈالی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا ناگورے کے لیے بہت تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ وہ اپنی "وحشت" کی وجہ سے انیلا سے دور ہوا تھا اور اب یہ دوری مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔

انیلا کی منگنی کی خبر نے ناگورے کو دو چار دن تو افسردہ رکھا مگر پھر وہ جیسے سب کچھ بھول گیا۔ اب اس کی تمام تر توجہ ریس کی تیاریوں کی طرف تھی۔ وہ صحیح معنوں میں خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ روزانہ شام کو وہ کم از کم تین گھنٹے مختلف ورزشوں میں صرف کرتا۔ علی الصباح ایک طویل دوڑ اس کے معمول میں شامل تھی۔ اس کے تین چار دوست بھی اس دوڑ میں شریک رہتے تھے۔ دو تین بار میں بھی ان لوگوں کے ساتھ جوگنگ کے لیے گیا۔ وہ پیشہ ور ایتھلیٹ تھے میں شوقیہ کھلاڑی تھا۔ وہ پندرہ بیس کلو میٹر دوڑتے تھے میں تین چار کلو میٹر دوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ ایک ایسی ہی جوگنگ کے دوران میں میری ملاقات "سارا" سے بھی ہوئی۔ یہ بالکل اتفاقی ملاقات تھی۔ میں ٹریک سوٹ میں تھا اور ڈھلوان سڑک پر تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی سوزوکی کار دیکھی۔ اس کی چھت پر دو تین اٹیچی کیس وغیرہ لدے تھے۔ ایک لڑکی گاڑی کا ٹائر بدل رہی تھی۔ ایک دوسری لڑکی گاڑی کے اندر بیٹھی تھی۔ وہ سارا تھی۔ سارا کے قریب ہی اس کا شوہر تھلنگا بیٹھا ہوا تھا۔ تھلنگا نے بھی مجھے پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

میں نے کہا "تھلنگا! تمہاری بیوی کو اس منحوس قمار خانے سے باہر دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی اور اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ تم دونوں ساتھ ہو۔"

وہ بولا "پہلی بات تو واقعی خوشی کی ہے۔ آپ کی ہدایات پر عمل کر کے میں سارا کو سرجیت کے چنگل سے نکالنے میں کامیاب رہا ہوں لیکن ہم ایک ساتھ نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب۔ سارا کہیں جا رہی ہے؟"

"ہاں" تھلنگا نے مدھم لہجے میں کہا "وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ یہ دوسری لڑکی اس کی سہیلی ہے' جاپان میں کسی پرائیویٹ کمپنی میں حصہ دار ہے۔ سارا اب اسی کے پاس رہے گی۔ وہ مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہے لیکن میں نے طلاق نہیں دی۔ میں ابھی امید کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے چند ماہ یا سال دو سال بعد اس کے خیالات بدل جائیں اور وہ مجھے معاف کر دے۔"

میں نے دل میں سوچا "کام تو تم نے معافی والا نہیں کیا لیکن عورت کے دل کی کیا خبر۔ کیا معلوم معاف کر ہی دے۔" تھلنگا بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے سچے دل سے توبہ کی ہے کہ اب کبھی قمار خانے کا رخ نہیں کروں گا۔ یقین کرو میں اپنے کیے پر بہت بہت نادم ہوں۔"

سارا گاڑی میں بیٹھی تھی اور خالی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں ہی وہ "نقاب پوش" ہوں جس نے چند ہفتے پہلے سرجیت کمار کو کھلی چھت والی گاڑی سے نکال کر یادگار پھینٹی لگائی تھی اور اس کے بازو توڑے تھے نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ اسے سرجیت کی قید سے رہائی دلانے میں میرا کیا کردار رہا ہے؟ ممکن تھا کہ میرے جانے کے بعد تھلنگا اسے میرے بارے میں بتا دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ نہ بتاتا۔ بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کے بعد میں اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھوں گا اور شاید وہ بھی مجھے کبھی نہیں دیکھے گی۔ خیر آباد۔ الوداع۔ زندگی میں کتنے ہی کردار ایسے آتے ہیں جو ایک بار مل کر پھر کبھی نہیں ملتے۔

O☆O

جوں جوں ریس کے دن قریب آ رہے تھے ایتھلیٹس کی تیاریاں عروج پر پہنچ رہی تھیں۔ ناگورے کے گھر کے سامنے میدان میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ غزالہ کے ساتھ ساتھ میں بھی اس ریس میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ ہم سب ناگورے کو جیتتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ایس پی برکت علی اگرچہ پاکستان واپس جا چکا تھا پھر بھی اسے ریس کے نتیجے سے دلچسپی تھی۔ وہ خط اور فون کے ذریعے ریس کے بارے میں دریافت کرتا رہتا تھا۔ درحقیقت جب سے ہم نوریلیا پہنچے تھے کراس کنٹری ریس ہی ہماری سوچوں کا محور بنی ہوئی تھی۔ باقی سب کچھ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ [illegible] کی حویلی والا فتنہ بھی لیکن جو فتنے کے اصل مبدا تھے وہ بھلا کیسے بھول سکتے تھے۔ میری شدید خواہش تھی کہ وہ لوگ میرے پیچھے سری لنکا نہ پہنچیں لیکن بہت سی دوسری خواہشوں کی طرح یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ ایک روز میں نے یہ دھماکا خیز اطلاع سنی کہ ارب پتی مسٹر بی کلارک' پنجاب کا بے تاج بادشاہ مجتبیٰ کنور اور جاگیردار قمر زماں وغیرہ کینڈی پہنچ چکے ہیں اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم ہیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچانے والا سائیں

عالی ہی تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آناً فاناً ہی نمودار ہوا تھا۔ میں نے اسے گھر کے سامنے میدان میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے لٹھ کی طرح مندرجہ بالا خبر میرے سر پر دے ماری۔

میں نے کہا "سائیں عالی! یہ سراسر تمہاری شرارت ہے۔ میں تم سے سمجھ لوں گا۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا "تم مجھ سے کیا سمجھو گے۔ میں تو شاہ جنات کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اس کے بہت سے "جن" ٹھوکر کھا کر میری طرف آتے رہتے ہیں۔ وہ دانت نکالنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتا۔ بہرحال ان لوگوں کو یہاں بلانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ خود سے آئے ہیں اور اپنی مرضی سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"کیا چاہتے ہیں وہ؟"

"دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ویسے ان کا کہنا ہے کہ وہ کینڈی کی کراس کنٹری ریس دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ ریس دیکھ کر چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں ان میں سے کسی کا فون بھی آ جائے۔ پھر تفصیل سے سب معلوم کر لینا۔"

میں نے کہا "سائیں عالی! تم جتنا چاہے زور لگا لو لیکن میں یہاں سے جاؤں گا اسی وقت جب میرا دل چاہے گا۔"

"میں تمہیں یہاں سے لے جانا چاہوں تو تم ایک پل بھی یہاں نظر نہ آؤ۔ انڈیا تو یہ پاس ہی ہے' میں تو قطب شمالی پر بھی تمہیں اتنی دیر میں پہنچا سکتا ہوں جتنی دیر میں کوئی لڑکا..." اس سے آگے اس نے ایک بہت گندی سی مثال دی۔ پھر اپنے زنگ آلود دانت نکال کر بولا "لیکن میں تو خود چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہو اور کینڈی کی ریس دیکھو۔ تمہارا دماغ اس طرف سے فارغ ہو جائے تو پھر ہم حیدر آباد چلیں گے' نواب فیروز جنگ کی حویلی میں اور دیکھیں گے کہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔"

جس وقت میں سائیں عالی سے باتیں کر رہا تھا' ایک چم چم کرتی لمبی سی گاڑی میدان کے سامنے رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوردی ڈرائیور تھا۔ عقبی نشست پر میں مجتبیٰ کنور اور اس کی محبوبہ دلنواز ناہید کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بڑی شان کے ساتھ گاڑی سے اترے۔ دراز قد دبلی پتلی ناہید گلابی ساڑی میں ملبوس تھی۔ کانوں میں ہیرے کے آویزے جگمگا رہے تھے۔ مجتبیٰ کنور بھی سوٹڈ بوٹڈ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے ذہن نے نعرہ لگایا کہ مجتبیٰ کنور ناہید سے شادی کر چکا ہے۔ اگلے بیس تیس سیکنڈ میں اس خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ مجتبیٰ کنور میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا "ان سے ملو۔ یہ ہیں مسز مجتبیٰ کنور۔ یہ کینڈی کی کراس کنٹری ریس دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر پاکستان سے آئی ہیں۔"

ناہید نے مسکرا کر سلام کیا۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔ دل میں عجیب اداسی سی بھر گئی تھی۔ حکمراں عوام کی جان و عزت کے محافظ ہوتے ہیں لیکن جب انہی میں سے کچھ لوگ لٹیرے بن جائیں تو پھر امان کہاں مل سکتی ہے۔ مجتبیٰ کنور نے اپنے ایک ماتحت کے گھر میں نقب لگائی تھی۔ اس کی خوبرو بیوی پر آنکھ رکھی تھی اور دھیرے دھیرے اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔ اب وہ مسز نواز کے بجائے مسز کنور تھی۔

"شادی مبارک" میں نے رسمی لہجے میں کہا۔

"خیر مبارک" مجتبیٰ اپنے بارعب لہجے میں بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم اس شادی میں شریک نہیں ہو سکے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم ناگورے کے گھر آ گئے۔ میں نے مجتبیٰ اور مسز مجتبیٰ کو گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ مجتبیٰ نے بتایا کہ کینڈی میں کراس کنٹری ریس اور دیگر کھیلوں کے حوالے سے بہت جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ سری لنکا کے مختلف حصوں سے تماشائی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہوٹلوں کے بیشتر کمرے بک ہو چکے ہیں۔

میں نے پوچھا "مسٹر کلارک کہاں ہیں؟"

"وہیں ہوٹل میں ہیں۔ میں تمہارے لیے ان کا خاص پیغام لایا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

"مسٹر کلارک کا کہنا ہے کہ کراس کنٹری ریس میں یورپ کا ماہر ترین کوچ ان دنوں استنبول آیا ہوا ہے۔ اگر تم چاہو تو اس کوچ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہاں بلایا جا سکتا ہے۔ وہ ناگورے کو نہایت مفید "ٹپس" دے گا اور باقی کے چار پانچ دن میں اس کی ٹریننگ بھی کرے گا۔"

میں نے کہا "ناگورے بہت مختلف ٹائپ کا لڑکا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ وہ یہ پیشکش قبول کرے گا۔ وہ ایسی کسی بھی پیشکش کو اپنی خودداری پر حرف سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کوئی مالی مدد قبول نہیں کرے گا اور ٹریننگ بھی اسی طور طریقے سے کرے گا جس سے اب تک کرتا آیا ہے۔"

مجتبیٰ کنور کی نوبیاہتا بیوی نے کہا "ہم نے سنا ہے کہ اس کے پاس ٹریننگ کی سہولتیں ناکافی ہیں۔ میرا مطلب ہے جمنازیم وغیرہ۔"

"اس کے پاس سرے سے سہولتیں ہی نہیں ہیں۔ بہرحال وہ پرعزم ہے اور اسے یقین ہے کہ اس مرتبہ ہار اس کا مقدر نہیں۔"

مسز کنور نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا کسی لڑکی سے افیئر وغیرہ بھی تھا۔"

"وہ افیئر تو ہے" میں نے کہا "لیکن اب اس کی تمام تر توجہ ریس جیتنے پر ہے۔ باقی سب کچھ اس نے ذہن سے نکال رکھا ہے۔"

"یار اس بندے کا کیریکٹر تو کمال ہے۔ بڑا تجسس ہو گیا ہے اس کے بارے میں" مجتبیٰ نے کہا۔

"جی فی الحال تو وہ گھر میں نہیں۔ اگر آپ بیٹھ کر انتظار کر سکتے ہیں

تو ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے وہ نو رس بجے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

ناہید بولی "اتنے طویل انتظار کی پوزیشن میں تو ہم نہیں۔ واپس کینڈی بھی پہنچنا ہے۔ بہرحال ناگورے کی جیت کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

"اور مجھے بھی" مجتبیٰ نے کہا۔

میں نے دل میں سوچا 'مجتبیٰ کنور تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ناگورے کی جیت کا انتظار نہیں تمہیں تو اس بات کا انتظار ہے کہ کراس کنٹری ریس کا یہ بے مقصد چکر جلد ختم ہو۔ یہ چکر ختم ہونے کے بعد میرا "دماغ ٹھکانے" پر آئے اور میں تمہارے ساتھ حیدر آباد جانے پر رضامندی ظاہر کروں۔ تمہاری زندگیوں کا محور صرف اور صرف حویلی کا دفینہ ہے۔ اس دفینے سے آگے تم کچھ سوچ سکتے ہو اور نہ سمجھ سکتے ہو۔

تھوڑی دیر بعد مجتبیٰ کنور واپس کینڈی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا "ایک بار ناگورے سے بھی پوچھ کر دیکھ لو۔ اسے جس قسم کا تعاون درکار ہو ہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے کہا "میں اس سے پوچھے بغیر بھی آپ کو بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ بات نہیں مانے گا۔"

ریس سے تین دن پہلے سب ایتھلیٹس کو کینڈی چلے جانا تھا۔ اس رات ناگورے کی بیٹھک میں ناگورے کے حمایتی حضرات کا زبردست اجتماع ہوا۔ قصبے کے معمر افراد نے ناگورے کو دعائیں دیں۔ اس کے بازوؤں پر امام ضامن کی قسم کی کوئی شے باندھی گئی۔ ناگورے کے دوست اس کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ دوستوں اور بہی خواہوں میں گھرا ہوا ناگورے پُر عزم لگ رہا تھا۔ میرے دل کی گہرائی سے بھی یہ دعا نکلی کہ ناگورے اس دفعہ کامیاب ہو جائے۔ وہ آنجہانی سب انسپکٹر دامھور کی امیدوں کا تارا تھا۔ اس کی آرزوؤں کا مرکز اور زندگی کا سہارا تھا۔ دامھور کی ایک ہی خواہش تھی۔ اس کا چہیتا بھائی کامیابی کے زینے طے کرے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں تھا لیکن اس کی آتما یقیناً یہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔ میں نے ناگورے کے لنگوٹیے دوست مجاہد علی کو ایک طرف بلایا اور اس سے کہا "تم لوگوں کو مخالف پارٹی سے ہوشیار رہنے کی بہت ضرورت ہے۔"

"مخالف پارٹی سے آپ کی مراد سردار نوی وغیرہ تو نہیں؟"

"بالکل" میں نے جواب دیا "ان لوگوں کا کچھ بھروسا نہیں۔"

مجاہد علی نے کان کھجاتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! یوں تو وہ ایک نمبر کے بدمعاش ہیں اور بہت سی برائیاں ہیں ان میں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی وہ اسپورٹس مین شپ سے مکمل طور پر کورے نہیں ہوئے۔ سردار جمیل کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ناگورے کو میدان میں ہی شکست دیں۔

"تمہاری بات درست ہے لیکن کسی بھی امکان کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ نوی اور اس کے دوستوں میں اسپورٹس مین شپ ہو لیکن انبلا کے بھائی سرجیت میں تو اس نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ ناگورے کا جانی دشمن ہے۔ ایک بار اس کی ٹانگ توڑ چکا ہے۔ دوسری بار کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"میں آپ کی بات ذہن میں رکھوں گا" مجاہد علی نے کہا "ویسے ہم لوگ ہر وقت ناگورے کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ کسی اجنبی کو اس کے قریب نہیں آنے دیتے۔"

O☆O

ریس کا دن بہت اجلا اور نکھرا نکھرا تھا۔ یہ دن ایک لحاظ سے ان کھیلوں کا کلائمکس بھی تھا جو پچھلے دس بارہ دن سے کینڈی میں جاری تھے۔ ایک وسیع اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایتھلیٹکس کے مختلف مقابلے ہو رہے تھے۔ اسی دوران میں بارہ بجے کے قریب کراس کنٹری ریس بھی شروع ہو گئی۔ یہ پُرجوش ریس دیکھنے کے لیے نوریلیا سے بھی بہت سے تماشائی آئے تھے۔ یہ تماشائی واضح طور پر دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ طبقہ امرا کے تماشائی سردار نوی کے حمایتی تھے۔ دوسرا طبقہ ناگورے کی جیت کا خواہشمند تھا۔ ہر طرف جھنڈے و جھنڈیاں لہرا رہے تھے اور نعرے بلند ہو رہے تھے۔ غزالہ خاص طور پر یہ ریس دیکھنے کے لیے میرے ساتھ کینڈی پہنچی تھی۔ ناگورے کی چنچل بہن ہارو بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ بھی ناگورے کے بہت سے قریباً دو سو عزیز اور دوست میدان میں موجود تھے۔ مسٹر جی کلارک۔ مجتبیٰ کنور اور ٹھاکر زماں وغیرہ سے بھی کئی ماہ بعد ملاقات ہوئی۔ وہ اسپیشل انکلوژر میں سیاہ چشمے چڑھائے بیٹھے تھے اور ریس کے سلسلے میں پُرجوش نظر آتے تھے۔ ان سے مختصر بات کرنے کے بعد میں غزالہ اور ہارو کے پاس واپس آ گیا۔ اس ریس میں قرب و جوار کے قریباً دو سو ایتھلیٹس حصہ لے رہے تھے جن تین چار لڑکوں کو فیورٹ قرار دیا جا رہا تھا ان میں نوی کا نام سرِ فہرست تھا۔ ناگورے کا نام چوتھے نمبر پر لیا جا رہا تھا۔

ریس کا آغاز دستور کے مطابق ہوا۔ ایتھلیٹس "اسٹارٹنگ لائن" پر جمع ہوئے اور پسٹل کا فائر ہوتے ہی بھاگنے لگے۔ انہوں نے دو تین چکر اسٹیڈیم کے اندر ہی لگائے پھر باہر نکل گئے۔ اسٹیڈیم میں مختلف جگہوں پر اسپیکر فائز لگائے گئے تھے۔ ان کے ذریعے ریس کی تازہ ترین صورتِ حال کا اعلان ہونے لگا۔ اس مقصد کے لیے حسبِ معمول واکی ٹاکیز استعمال کیے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ شارٹ سرکٹ ٹی وی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ یہ چوبیس کلومیٹر کی ریس تھی۔ راستہ ہموار تھا۔ سارا راستہ بارونق تھا اور جا بجا ہجوم ہو گیا تھا۔ لوگ پُرجوش نعروں سے کھلاڑیوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ان میں ماڈرن گھرانوں کی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ وہ دوڑنے والوں کو کھانے پینے کی اشیا پیش کرتی نظر آتی تھیں۔

کھلاڑیوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے کچھ من چلے ان پر پانی بھی پھینک رہے تھے۔ ریس کے پہلے مرحلے میں چند ایسے لڑکے آگے نکل گئے جو "آگے دوڑنے" کا شوق پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ تا دیر آگے رہ سکیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ تین چار کلومیٹر دوڑنے کے بعد وہ ترکے آگے نکلنا شروع ہوئے جنہوں نے راتھی اس ریس میں کچھ کر کے رکھانا تھا۔ نوبی' تانگورے اور مجاہد وغیرہ بھی ان میں شامل تھے۔ نوبی تیسرے نمبر پر دوڑ رہا تھا۔ اس کے پیچھے مجاہد اور اس کے پیچھے تانگورے تھا۔ ان لڑکوں سے ساٹھ ستر میٹر پیچھے رزجن بھر لڑکوں کی ایک ٹولی آ رہی تھی۔ اس ٹولی میں کینڈی کا ہی ایک ہونہار ایتھلیٹ بھی شامل تھا۔ نوبی کی طرح اسے بھی فیورٹ قرار دیا جا رہا تھا۔ میری اطلاعات کے مطابق اس ریس میں پس پردہ بازیاں بھی لگائی جاتی تھیں۔ "بکیز" نے چار پانچ فیورٹ کھلاڑیوں پر لاکھوں کی شرطیں لگا رکھی تھیں۔

ایتھلیٹس آٹھ دس کلومیٹر دوڑ چکے تو اصل اور سخت ترین مقابلہ شروع ہوا۔ نوبی اور تانگورے اگلے چھ لڑکوں میں شامل تھے۔ ٹی وی اسکرین پر میں نے تانگورے کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ کچھ تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔ پسینہ اس کے چہرے سے دھاروں کی صورت پھوٹ رہا تھا۔ پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گاہے گاہے تھوڑا سا پانی اپنے سر پر ڈال لیتا تھا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ تانگورے اور نوبی شانہ بشانہ دوڑنے لگے۔ نوبی کے پہلو میں دوڑتے ہوئے تانگورے کے چہرے پر ایک غیر معمولی چمک نمودار ہوگئی۔ اس کے جسم میں جیسے کوئی اضافی قوت داخل ہو رہی تھی۔ شاید یہ قوت اس رقیبانہ جذبے کی دین تھی جو ان دونوں میں برسوں سے پروان چڑھ رہا تھا۔ نوبی امیر کبیر تھا۔ وہ ایک بارسوخ سردار کا بیٹا تھا اور صرف اثر و رسوخ میں ہی نہیں طاقت میں بھی اس نے اب تک خود کو تانگورے سے بہتر ثابت کیا تھا۔ وہ اب تک ہر میدان کا فاتح رہا تھا اور اس فتح مندی کا ہی اعجاز تھا کہ اب اپلا بھی اس کی دسترس میں تھی۔ تانگورے کی محرومیاں عروج پر پہنچ کر اب ایک شعلہ فشاں جذبے میں ڈھل گئی تھیں۔ اس جذبے نے اسے پر لگا دیے تھے اور وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آج شاید ایک ہی بات تھی۔ وہ آج جیتے گا یا پھر کبھی نہیں جیتے گا۔ اگلے تیرہ چودہ کلومیٹر تک تین لڑکوں میں سخت اور نہایت سنسنی خیز مقابلہ ہوا۔ یہ لڑکے تھے نوبی' تانگورے اور کینڈی کا ایتھلیٹ پالے۔ پورا اسٹیڈیم نعروں اور تالیوں سے گونج رہا تھا۔ کبھی ایک ایتھلیٹ کے حمایتی شور مچاتے نشستوں پر کھڑے ہو جاتے' کبھی دوسرے کے۔ ہاؤ ہو کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے فرزانہ کا چہرہ دیکھا۔ تانگورے کے لیے اس کی آنکھوں میں نیک خواہشات کا سیلاب نظر آتا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ریس انتہائی مرحلے میں داخل ہوگئی اور ایتھلیٹس قریباً بائیس کلومیٹر کا طویل چکر کاٹنے کے بعد دوبارہ اسٹیڈیم میں داخل ہونا

شروع ہوگئے۔ تماشائیوں کا جوش و خروش اس وقت نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا۔ پچھلے آٹھ دس منٹ سے نوبی نے تانگورے پر سبقت لے رکھی تھی اور اس کوشش میں تھا کہ یہ سبقت آخری چند منٹوں میں بھی برقرار رہے۔ دوسری طرف تانگورے نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ نوبی سے تانگورے کا فاصلہ دس بارہ قدم سے زیادہ کا نہیں تھا۔ لیکن یہ مختصر فاصلہ بہت طویل بھی تھا۔ اسے پاٹنے کی کوشش میں تانگورے نے ایک عمر کھو دی تھی۔ آج اسے یہ فاصلہ پاٹ کر سرخرو ہونا تھا اور اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر اچھلنا تھا یا پھر سر جھکا کر کھیل کے میدان سے نکل جانا تھا اور اپنے سیکڑوں پرستاروں کو مایوسی اور شرمندگی کے حوالے کر دینا تھا۔ در حقیقت دوڑ کے آخری مرحلے میں یہ صرف تانگورے اور نوبی کی دوڑ بن گئی تھی۔ ان دونوں میں سے ہی کسی کو جیتنا یا ہارنا تھا۔ میں نے اندرون ملک ہاکی اور کرکٹ اور بیرون ملک فٹ بال اور رگبی رغیرہ کے بہت سنسنی خیز مقابلے دیکھے تھے لیکن جو سنسنی خیزی اس مقابلے میں محسوس ہوئی۔ کبھی نہیں ہوئی اور نہ شاید آئندہ کبھی ہو۔ میں خود کو مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا ہوں لیکن ان لمحوں میں میری اپنی ہتھیلیاں بھی پسینے سے تر تھیں۔ ہر نگاہ میدان کے وسط میں جمی تھی جہاں دو دو میرینہ حریف ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ میدان کا آخری (Lap) چکر شروع ہوا تو تانگورے اور نوبی قریباً شانہ بشانہ دوڑ رہے تھے۔ دونوں کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں لیکن وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے۔ ای لمحے ساتیں عالی کی دور افتادہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی "جیتے گا بھئی جیتے گا" اور پھر کورس کی صورت میں لوگوں کا جواب "جیتے گا ہاں جیتے گا" مجھے معلوم نہیں یہ آواز واقعی انکلوژر کے کسی گوشے سے بلند ہو رہی تھی یا پھر یہ اسی آواز کی بازگشت تھی جو میں نے ایک دن تانگورے کے گھر کے سامنے سنی تھی۔ ان ہیجان خیز لمحات میں میں کوئی درست اندازہ قائم نہ کر سکا۔ نصف لیپ مکمل ہو چکا تھا جب تانگورے نے جسم و جاں کی رہی سہی قوت سمیٹ کر زور لگایا اور ایک ایک انچ کر کے نوبی سے آگے بڑھنے لگا۔ تماشائی سینے کی پوری قوت سے چیخ رہے تھے' ان کے دل جیسے فرط جوش سے پھٹ پڑنے کے قریب تھے۔ پورا مجمع پنجوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔ چشم تماشا چوتھائی صدی بعد یہ منظر دیکھ رہی تھی کہ سرداروں کا ایتھلیٹ مشکل میں تھا۔ ہاں وہ مشکل میں تھا۔ تانگورے اس سے آگے نکل رہا تھا۔ ان دونوں کا فرق اب بالکل واضح محسوس ہو رہا تھا۔ قریباً ایک میٹر کا فرق تھا۔ پھر وہ دونوں ہمارے بالکل سامنے سے گزرے۔ میں نے نوبی کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے انتہا کوشش کر رہا تھا لیکن دنیا جہاں کی بے چارگی اس کے چہرے پر ثبت ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے دو دو ریسے کے قریب ہے۔ اور پھر وہ دونوں "فنشنگ لائن" پر پہنچ گئے۔ تانگورے جیت گیا۔ نوبی ہار گیا۔ پورا اسٹیڈیم فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔

ں تانگورے کی طرف دوڑ پڑے۔ میں نے نوبی کو چکرا کر گرتے دیکھا۔ آکسیجن ماسک والے اس کی طرف لپکے اور اس کی سانس بحال کرنے لگے۔ کینڈی کا ایتھلیٹ پالے تیسرے نمبر پر آیا۔ فنشنگ لائن کراس کرنے کے بعد وہ بھی گر گیا۔ اس کے منہ پر بھی آکسیجن ماسک چڑھایا گیا۔

تانگورے لوگوں کے کندھوں پر تھا۔ وہ والہانہ رقص کر رہے تھے اور پورے اسٹیڈیم میں بھاگے پھر رہے تھے۔ یہ سب غریب اور مڈل کلاس لوگ تھے۔ ان کا تعلق مظلوم اور پسے ہوئے طبقے سے تھا۔ آج برسوں بعد ان کی آرزو پوری ہوئی تھی۔ ان کی کلاس کے ایک لڑکے نے کراس کنٹری ریس کا میدان مارا تھا۔ اچانک ایک طرف سے شور و غل کی آوازیں آئیں۔ دیکھا تو آٹھ دس افراد لڑ رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دس پندرہ مزید افراد ان میں شامل ہوگئے۔ میدان کا وہ حصہ اچھا خاصا میدان جنگ بن گیا۔ کرسیاں' ڈنڈے' مشروبات کی خالی بوتلیں سبھی کچھ چل رہا تھا۔ مجھے اس بھیڑ بھاڑ میں سردار نوبی بھی نظر آیا۔ اس نے ایک غریب صورت لڑکے کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور اسے تھپڑ مار رہا تھا۔ میں لپکتا ہوا موقع پر پہنچا۔ میں نے چند لڑکوں کو کھینچ کر ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اسی دوران میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ پولیس اہلکاروں نے دنگا کرنے والوں پر لاٹھی چارج کیا اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ مگر لڑائی رکتے رکتے بھی چار پانچ افراد تسلی بخش طور پر زخمی ہو چکے تھے۔ تین افراد کے سر پھٹ گئے تھے۔ ایک کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اور ایک نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ ان زخمی ہونے والوں میں سے چار کا تعلق سردار قبیلے کے لوگوں سے تھا۔

لڑائی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ریس کے بعد نوبی نیچے گرا ہوا تھا اور تانگورے کے چند حمایتی اسے روندتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔ یہ سراسر الزام تراشی تھی۔ میں نے خود نوبی کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تماشائی اس کے اوپر سے نہیں گزرے تھے۔ ممکن تھا کہ کسی شخص کی ٹانگ اتفاقاً اسے لگ گئی ہو یا ٹھوکر لگنے سے کوئی اس کے اوپر گر گیا ہو۔ بہرحال شکست کی ندامت چھپانے کے لیے ان لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنایا تھا اور اپنی کم ظرفی کا ٹھوس ثبوت فراہم کیا تھا۔ تانگورے کے دوست مجاہد علی کی یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی تھی کہ مخالف فریق میں اسپورٹس مین شپ موجود تھی' یہ اسپورٹس مین شپ نہیں تھی موقع شناسی تھی۔ نوبی اور اس کے ہم نوا جانتے تھے کہ ریس ہمیشہ وہی جیتتے تھے اور جب وہ بے ایمانی یا دھاندلی کے بغیر ہی جیت جاتے تھے تو پھر انہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آج برسوں کے بعد وہ ہارے تھے اور آج ہی ان کی کم ظرفی ثابت ہو گئی تھی۔

اسٹیڈیم میں ہونے والے جھگڑے کی خبر جنگل کی آگ کے مانند ہر طرف پھیل گئی۔ جھگڑا کرنے والوں نے جھگڑے کا اولین مقصد حاصل کر لیا تھا۔ تانگورے کی شاندار اور یادگار فتح کا مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔ سردار قبیلے کا اثر و رسوخ ہر شبہے سے بالاتر تھا۔ شام تک پولیس نے ان سات آٹھ لڑکوں کو گرفتار کر لیا جن کے نام سردار بہادر سنگھ نے ایف آئی آر میں لکھوائے تھے۔ تانگورے کا نام بھی ان میں شامل تھا۔ بہرحال تانگورے کی گرفتاری نہیں ہو سکی۔ جس وقت پولیس پارٹی نے گھر پر چھاپا مارا وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔

صبح تک یہ خبر پورے نوریلیا میں پھیل گئی کہ رات پولیس نے مختلف جگہوں پر چھاپے مارے ہیں اور تانگورے کے آٹھ دوستوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ تانگورے کی تاریخی کامیابی کی خوشی میں جو شاندار جلوس نکالا جانے والا تھا وہ احتجاجی جلوس میں تبدیل ہو گیا۔ لوگوں نے سردار قبیلے' پولیس اور انتظامیہ کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ سڑکوں پر ٹائر جلائے گئے اور پوش علاقے میں کئی دکانوں اور ریستورانوں کے شیشے توڑ دیے گئے۔ پولیس نے سخت لاٹھی چارج کر کے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ میں نے قصبے میں کئی جگہ بڑے بڑے بینرز لہراتے دیکھے۔ ان بینرز کے ذریعے کراس کنٹری ریس کے فاتح تانگورے کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کی گئی تھی۔

مسٹر جی کلارک صاحب کراس کنٹری ریس دیکھنے کے فوراً بعد پاکستان واپس روانہ ہو گئے تھے۔ وہ تانگورے کو اس کی جیت پر نقد انعام پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ریس ختم ہوتے ہی چونکہ ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی تھی لہٰذا انہوں نے وہ نقد انعام میرے حوالے کر دیا تھا۔

یہ دس ہزار امریکن ڈالرز کی خطیر رقم تھی۔ آغا قادر زماں' مجتبیٰ کنور اور اس کی نوبیاہتا بیگم بھی مسٹر کلارک کے ساتھ ہی پاکستان واپس جا چکے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کے جانے کے بعد یہاں نوریلیا میں کیا پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی ہے۔

شام کے اخبارات نے ایک سنسنی خیز اطلاع دی۔ کل جن آٹھ لڑکوں کو ہنگامہ آرائی اور بلوے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا ان میں سے دو کے قبضے سے ناجائز اسلحہ برآمد ہوا اور انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ تامل ٹائیگرز کی ایک ذیلی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث رہے ہیں۔ مبینہ طور پر اس اعتراف کے بعد گرفتار شدہ لڑکوں میں سے کسی کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی اور پولیس تانگورے وغیرہ کو پوری تندہی سے تلاش کرنے لگی تھی۔

یہ سراسر الزام تراشی تھی کہ تانگورے کے ساتھیوں کا تعلق تامل ٹائیگرز سے ہے۔ میں ان سب لڑکوں کو ذاتی طور پر جاننے لگا تھا۔ وہ سیدھے سادے' کھیل کود سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان تھے۔ انہیں قطعی غلط طور پر ملوث کیا جا رہا تھا۔ اور اس کی وجہ وہی رقابت آمیز تعصب تھا جس نے سردار قبیلے اور اس طبقے کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں جڑ پکڑ رکھی تھی۔ وہ اپنی شکست ہضم نہیں کر سکتے تھے نہ تانگورے کی جیت۔ اب وہ اوچھے ہتھکنڈوں کا سہارا

لے رہے تھے۔ رات دو تین دفعہ پولیس ناگورے کے گھر آئی۔ انہوں نے اہل خانہ سے پوچھ گچھ کی۔ مجھ سے اور غزالہ سے بھی الٹے سیدھے سوالات کرتے رہے۔ ان کے پاس سرچ وارنٹ بھی تھے۔ ناگورے کی تلاش میں انہوں نے پورا گھر چھان مارا لیکن وہ کہیں ہوتا تو ملتا۔ اس کی تلاش میں ناکام رہنے کے بعد وہ ناگورے کے بوڑھے والد رام سنہا کو ہانک کر ساتھ لے گئے۔ اہل خانہ نے بہت احتجاج کیا لیکن پولیس کے سامنے ان کی ایک نہیں چلی۔

میں نے ناگورے کی چھوٹی بہن نادو سے پوچھا "کیا تم لوگوں کو واقعی معلوم نہیں کہ ناگورے کہاں ہے؟"

وہ روتے روتے انکار میں سر ہلانے لگی۔ بولی "ہم تو آپ کے ساتھ ہی نورطیا واپس آگئے تھے۔ میں نے اور میری سہیلیوں نے پروگرام بنایا تھا کہ پورے گھر کو پھولوں سے سجائیں گے اور ناگورے بھائی کا شاندار استقبال کریں گے۔ بھائی کو شام پانچ بجے پہنچنا تھا لیکن چار بجے ہی خبر آگئی کہ پولیس نے مجاہد بھائی سمیت ناگورے بھائی کے کئی دوستوں کو پکڑ لیا ہے اور باقیوں کی تلاش ہو رہی ہے۔"

میں نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ ناگورے کہاں جا سکتا ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" وہ روتے ہوئے بولی "میرے والد کہتے تھے' ہو سکتا ہے کہ ناگورے بھائی کو کسی نے زبردستی روک لیا ہو۔"

نادو کی بات قابل غور تھی۔ یہ امکان موجود تھا کہ ناگورے پولیس کے ڈر سے نہ چھپا ہو بلکہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہو۔ سردار فیملی ایسا کر سکتی تھی اور پھر انیلا کا بھی نما بھائی بھی تو اس کا جانی دشمن تھا۔ بے شک وہ آج کل اپاہج تھا لیکن اپنے جیسے کسی اور "خبیث" کا تعاون تو حاصل کر ہی سکتا تھا۔

قصبے کے عام لوگوں میں ناگورے کے والد کو پولیس اسٹیشن لے جانے کا شدید ردعمل ہوا۔ ایک بار پھر قصبے کی گلیاں دھوئیں سے بھر گئیں اور جگہ جگہ توڑ پھوڑ ہوئی۔ لوگ اندھے نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دہشت گردی کی باتیں صرف ڈھکوسلا ہیں۔ یہ سارا کیا دھرا سردار فیملی کا ہے۔ وہ لوگ اپنی شکست کا بدلہ پولیس کی مدد سے لے رہے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کے دل غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سراپا احتجاج نظر آرہے تھے۔

تقریباً آٹھ بجے کے لگ بھگ ایک نامعلوم سنہالی نے آکر مجھے اطلاع دی کہ ناگورے نورطیا میں ہی ہے۔ وہ اپنے ایک پرانے مسلمان دوست حسنات احمد کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے مجھے حسنات احمد کے گھر کا مکمل ایڈریس بھی بتایا اور کہا کہ اگر میں ناگورے سے ملنا چاہوں تو رات نو بجے کے بعد احتیاط سے وہاں پہنچ جاؤں۔

اس اطلاع نے کم از کم یہ خدشہ تو دور کر دیا کہ کہیں ناگورے کو اغوا نہ کر لیا گیا ہو بہرحال اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نامعلوم سنہالی کی اطلاع کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ایسی چال جس میں مجھے یا ناگورے کے کسی اور ہی خواہ کو پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ غزالہ "ناگورے" کے بارے میں بہت پریشان تھی۔ میں نے اسے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ غزالہ کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ "آپ اس کے لیے ضرور کچھ کریں" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"تم نہ بھی کہتیں تو میں کرتا" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یقین ہے آپ کسی طرح اسے اس مشکل سے نکال لیں گے" اس نے اتنے یقین سے کہا کہ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرنے والی لڑکی تھی۔ ایک وقت ہم پر ایسا بھی گزرا تھا' جب میں اسے یہ کہتا کہ وہ "مینار پاکستان" سے چھلانگ لگا دے اور میں اسے گرنے سے بچا لوں گا تو وہ چھلانگ لگا دیتی۔

میں نے کہا "میں پوری کوشش کروں گا غزالہ! لیکن تم جانتی ہو' یہ پرایا دیس ہے۔ یہاں سب کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"آپ... کچھ بھی کریں لیکن ناگورے کو کچھ ہونا نہیں چاہیے" غزالہ رنجیدہ آواز میں بولی "ناگورے کی والدہ بہت رو رہی ہے۔ اس کو ڈر ہے کہ کہیں پولیس اس کے بیٹے کو "مقابلے" کے بہانے جان سے نہ مار ڈالے۔ پچھلے مہینے نورطیا اور کینڈی میں اس طرح کے دو تین واقعات ہو چکے ہیں۔"

میں بے چینی سے رات ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جونہی گھڑی نے ساڑھے آٹھ بجائے میں اپنا چھوٹا پسٹل اور اس کے پندرہ بیس راؤنڈ لباس میں چھپا کر گھر سے نکل آیا۔ مجھے جو ایڈریس بتایا گیا تھا وہ نورطیا کے مضافاتی علاقے کا تھا۔ میں ایک ٹیکسی کار میں بیٹھا اور قصبے کی مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد اس بات کا اطمینان کر لیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔ بعد ازاں میں اس آبادی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں حسنات احمد نامی لڑکے کا گھر واقع تھا۔ یہ پہاڑی درختوں اور پھول دار جھاڑیوں میں گھرا ہوا ایک الگ تھلگ مکان تھا۔ مکان کی بیرونی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ صدر دروازے کے پاس ایک ٹویوٹا کار کھڑی تھی۔ کار میں مجھے دو افراد بیٹھے نظر آئے۔ یہ اپنی صورت اور حلیے کے اعتبار سے بھکشو نظر آتے تھے۔ بدھ مندروں کے آس پاس میں اکثر ایسے لوگوں کو گھومتے دیکھ چکا تھا۔ ان لوگوں سے صرف نظر کرتا ہوا میں دروازے پر پہنچا اور کال بیل پر انگلی رکھی۔ تھوڑی دیر بعد گہری سیاہ آنکھوں والے ایک سانولے نوجوان نے دروازہ کھولا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ "آپ کا نام حسنات احمد ہے؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "میرا نام شاہ جہاں ہے۔ میں ناگورے کے گھر سے آیا ہوں۔"

نوجوان کے چہرے پر کچھائی تاثرات ابھرے۔ اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ پھر تیزی سے دائیں بائیں جھانکا۔ جیسے خدشہ ہو کوئی مجھے تاڑ تو نہیں رہا۔ پھر اس نے میرے لیے راستہ چھوڑا اور اندر آنے کے لیے کہا۔ میں چوکنا انداز میں اندر داخل ہوا۔ یہ مکان آٹھ دس مرلے میں تھا۔ سری لنکا کے روایتی انداز میں در و دیوار پھولدار بیلوں اور پودوں سے سجے ہوئے تھے۔ ایک راہداری سے گزار کر میزبان مجھے ایک چوکور کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے کا فرش لکڑی کا تھا۔ چھت پہاڑی مکانوں کی طرح ڈھلوانی تھی۔ میں نے ناگورے کو دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا ٹیلیفون نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر چونکا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہاں؟" میں نے کہا۔

وہ بھاگ کر آیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔ "حوصلہ رکھو یار" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "سب اچھا ہو جائے گا۔ میرے ہوتے کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

وہ رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا "پولیس مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ یہ سب کیا دھرا سردار بہادر سنگھ کا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو میرے ہاتھوں شکست کھاتے نہیں دیکھ سکا اور اب مجھے دہشت گردی کے الزام میں پھنسا رہا ہے۔ بائی گاڈ شاہ جہاں صاحب۔ ایسے کسی کام سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ مجھے تو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے سیاست سے۔"

میں نے کہا "ناگورے! تمہیں یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اس طرح چھپنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ پولیس جلد یا بدیر تمہیں ڈھونڈ لے گی اور پھر تمہاری بے گناہی بھی "جرم" نظر آنے لگے گی۔"

"میں نے اسی بارے میں بات کرنے کے لیے آپ کو بلایا ہے لیکن اس سے پہلے میں ایک ضروری کام کرنا چاہتا ہوں" آخری الفاظ کہتے کہتے ناگورے کے لہجے میں وہی عزم عود کر آیا جو ایک فاتح کھلاڑی کے شایان شان تھا اور جس کا مظاہرہ ناگورے تین دن پہلے کینڈی کے میدان میں کر چکا تھا۔

"کیسا کام؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا" ناگورے نے جواب دیا۔

"پھر بھی کوئی اشارہ تو دو"

"اشارے کی ضرورت نہیں۔ کام ہو جائے تو پھر آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ بس مجھے چند منٹ کی مہلت دے دیں۔"

مہلت سے ناگورے کی مراد یہ تھی کہ میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔ وہ کسی کو ٹیلیفون کرنا چاہ رہا تھا۔ میں دروازے کی طرف مڑا تو وہ ایک بار پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میزبان حسنات احمد نے مجھے ایک دوسرے کمرے میں لا کر بٹھا دیا۔ حسنات احمد شکل و صورت سے پڑھا لکھا سمجھدار لڑکا نظر آتا تھا۔ میں نے ایک دو بار پوچھا تو اس نے بتایا کہ ناگورے اپنی سابقہ محبوبہ انیلا کو فون کر رہا ہے۔

"کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ میں انیلا کو ایک آخری اور فیصلہ کن ٹیلیفون کرنا چاہتا ہوں"

"آخری اور فیصلہ کن؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں وہ کیا چاہ رہا ہے"

کہیں پاس ہی اس فون کی ایکس ٹینشن بھی موجود تھی جس پر ناگورے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ وہ جب نمبر ڈائل کرتا تھا تو گھنٹی کی ٹن ٹن دوسرے سیٹ پر سنائی دیتی تھی۔ میزبان مجھے کمرے میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد قریبی کمرے سے ناگورے کی مدھم آواز ابھرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بالآخر اسے مطلوبہ لائن مل گئی ہے۔ میں خود کو اس کی بات سننے سے باز نہ رکھ سکا۔ میں نے ایکس ٹینشن والے فون کا ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سننے لگا۔ ناگورے بول رہا تھا۔ وہ انیلا سے بات کر رہا تھا۔ "ہمم۔ تم بول کہاں سے رہے ہو ناگورے؟" انیلا کی آواز ابھری۔

"یہ بات چھوڑو انیلا!" ناگورے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "بس وہ سنو جو میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ پلیز انیلا! میری یہ بات بڑے دھیان سے سنو۔ یہ بات میں صرف ایک ہی دفعہ کہوں گا۔ پھر کبھی نہیں کہوں گا۔ مرتے دم تک بھی نہیں۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"ہاں بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" انیلا کی آواز لرز رہی تھی۔

"انیلا! میں جانتا ہوں کہ تم کسی اور سے منسوب ہو چکی ہو۔ اور تم بھی جانتی ہو کہ میں تمہاری ان تھک کوشش کے باوجود تم سے بے رخی برتتا رہا ہوں۔ تمہارے ذہن میں بہت سے سوال ہوں گے اور میرے ذہن میں بھی بہت سی الجھنیں ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ بجا' لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھو اور نہ میں تم سے۔ میں تم سے بس ایک التجا کروں اور تم میری وہ التجا مان لو"

فون لائن پر چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ایسی خاموشی جس میں مہیب طوفانوں کی گھن گرج تھی۔ پھر انیلا کی کھوئی کھوئی آواز فون پر ابھری۔ وہ جیسے کہیں بہت دور سے بول رہی تھی۔ "کہو ناگورے! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ناگورے نے ایک گہری سانس لی اور بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں حسنات احمد کے گھر سے بول رہا ہوں۔ میرے پاس چلی آؤ انیلا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہاں مجھے تمہاری ضرورت ہے"

فون لائن ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ یہ سات آٹھ سیکنڈ کی خاموشی تھی لیکن یوں محسوس ہوا جیسے برسوں سے یہ لائن خاموش

ہے اور میں ریسیور کان سے لگائے بیٹھا ہوں۔ اگر میری یہ کیفیت تھی تو تانگورے کی کیفیت کیا ہو سکتی تھی۔ عین اس وقت جب میں یہ سوچنے لگا تھا کہ شاید یہ لائن کٹ جائے گی' انیلا کی ایک بار آواز فون پر ابھری۔ اس نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا "میں آرہی ہوں تانگورے! میں پندرہ بیس منٹ کے اندر آرہی ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔ واقعی بیس پچیس منٹ کے اندر انیلا قصبے کے اس مضافاتی مکان پر پہنچ گئی۔ وہ اپنی شیراڑ گاڑی خود ڈرائیو کرکے لائی تھی۔ وہ ایک کھلے سے گاؤن میں تھی اور بال شانوں پر بکھر رہے تھے۔ وہ سیدھی تانگورے کے پاس کمرے میں پہنچی۔ دونوں آدھ پون گھنٹا کمرے میں بند رہے۔ پھر تانگورے کا دوست حسنات احمد اور اس کا والد بھی کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں سن رہا تھا کہ تانگورے اور انیلا بدھ مت کے طریقے کے مطابق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو رہے ہیں۔ میرے لیے یہ خبر چونکا دینے والی اور حیرت انگیز تھی۔ حسنات احمد کا والد باہر گیا اور ٹویوٹا گاڑی میں بیٹھے دونوں بھکشوؤں کو اندر لے آیا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ دونوں حضرات شادی کی مذہبی رسوم کی انجام دہی کے لیے یہاں بلائے گئے تھے۔ حسنات احمد کا والد سابقہ ایڈووکیٹ تھا اور ایسے معاملات کی تمام باریکیاں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے دو تین معتبر گواہ بھی جمع کر رکھے تھے۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر بند کمرے میں انیلا کی شادی کی تمام رسوم ادا ہو گئیں اور وہ مس انیلا سے مسز انیلا تانگورے بن گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور آناً فاناً ہوا کہ خواب جیسا لگا۔ انیلا' تانگورے سے بہت دور جا چکی تھی لیکن تانگورے کا عشق اسے کچے دھاگے سے باندھ کر یہاں لے آیا تھا۔ ان دونوں نے سارے فاصلے ایک ہی جست میں طے کیے تھے اور ایک بار پھر یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب کم از کم میرے لیے تو بہت آسان تھا۔ تانگورے اب تک اس قسم کا تیدی بنا رہا تھا جو اس نے مقدس گھاٹی پر کھائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انیلا کی سخت کوششوں کے باوجود وہ اس سے دور رہا تھا۔ اب چونکہ اس نے وہ قسم پوری کر لی تھی اور نوی کوٹ کھیل کے میدان میں شکست دے لی تھی لہٰذا اپنے بازو کھول کر اس نے انیلا کو پکارا تھا۔ انیلا نے بھی والہانہ جرأت کا ثبوت دیا تھا اور سب طرف سے آنکھیں بند کرکے تانگورے کی بانہوں میں سما گئی تھی۔ یہ ذرا منفرد قسم کی شادی تھی' لڑکی ہندو تھی اور لڑکے کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ بدھ مت میں غیر مذہب کے فرد سے شادی کرنے کے کیا قواعد و ضوابط تھے' اور یہ شادی کس انداز میں انجام پائی تھی۔ بہر طور یہ بات اب طے تھی کہ یہ شادی ہو چکی ہے (جیسا کہ مجھے کئی روز بعد معلوم ہوا اس شادی کے لیے انیلا نے ہندو مت چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لیا تھا) میں کمرے میں داخل ہوا تو تانگورے اور انیلا پہلو بہ پہلو صوفے پر بیٹھے تھے اور

حسنات احمد ان کی تصویریں اتار رہا تھا۔ انیلا اسی لباس میں تھی جس میں وہ یہاں پہنچی تھی' صرف اس نے ایک موٹی اوڑھنی سر پر رکھ لی تھی۔ اس اوڑھنی میں وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت اور دلکش نظر آرہی تھی۔

تانگورے نے سر پر ایک پگڑی سی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں نے مجھے پرنام کیا پھر ہندوستانی انداز میں میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے دونوں کو مبارکباد دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟" میں نے تانگورے سے پوچھا۔

"شب عروسی منانے کا" وہ دلکش انداز میں مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کی چمک تھی۔ مجھے لگا جیسے اس نے ابھی ابھی کراس کنٹری ریس جیتی ہے اور اس جیت کے صلے میں اسے انیلا "ٹرافی" کی صورت میں ملی ہے۔ انیلا کی آنکھیں بھی دو خوبصورت ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس چمک سے پھوٹنے والی مسرت اور طمانیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بہت پیاری سی لڑکی تھی اور گفتگو میں رکھ رکھاؤ تو اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس کی گفتگو میں مہذب الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی۔ پلیز' تھینکس' اکسکیوز می جیسے الفاظ وہ مسلسل اور بڑے دلکش انداز میں استعمال کرتی تھی۔

اچانک ایک آواز نے سب کو چونکا دیا۔ یہ کسی گاڑی کے انجن کا شور تھا۔ ذرا سی دیر میں یہ شور مکان کے عین سامنے پہنچ گیا۔ میں نے لپک کر ایک کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ ایک ہی لمحے میں میرے اور ہم سب کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔

حسنات احمد کے مکان کے عین سامنے دو پولیس گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیوں کے پچھلے دروازے کھلے اور ان میں سے پولیس کے جوان چھلانگیں لگا کر نیچے اترنے لگے۔ وہ سب کے سب مسلح اور پوری طرح چوکس تھے۔ کمرے میں موجود ہر فرد کا چہرہ خوف اور حیرت کی آماجگاہ بن گیا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے تانگورے سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" اس نے عجیب سی لاتعلقی سے کہا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا۔ آنکھوں کی چمک بھی دھندلانے لگی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ خود کو ذہنی طور پر گرفتاری کے لیے پہلے ہی تیار کر چکا ہے۔ گرفتاری سے پہلے بس اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ انیلا کو اپنا لے' یہ خواہش پوری ہو چکی تھی اور اب اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں نے اپنا بھرا ہوا پستول لباس میں سے برآمد کیا اور تانگورے سے کہا "چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

انیلا کے چہرے پر رضامندی کے آثار نظر آئے لیکن

تانگورے نے انکار کر دیا "کوئی فائدہ نہیں شاد جہاں صاحب۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے گرفتاری دے دینی چاہیے۔"

"سوچ لو اچھی طرح" میں نے کہا "ان لوگوں کے ارادے تمہارے بارے میں کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔"

"سوچنے کا وقت تو گزر چکا" تانگورے نے کہا۔ انیلا تانگورے سے لپٹ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ اسے رونا ہی چاہیے تھا۔ یہ اس کی سہاگ رات تھی اور اس کا رکھوالا بہیمانہ تشدد کا شکار ہونے کے لیے لاک اپ کی طرف جا رہا تھا۔

"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے" انیلا نے روتے ہوئے... تانگورے کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

اسی دوران میں کوریڈور سپاہیوں کے وزنی بوٹوں کی چاپ سے گونج اٹھا۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ پولیس اندر داخل ہونے والی تھی۔ اگر میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو یہ نادانی تھی۔ میں عقبی دروازہ کھول کر گھر کے پچھلے صحن میں آیا۔ پھولوں کی سات فٹ اونچی ریوار باؤنڈری کا کام دے رہی تھی۔ میں نے پھرتی سے یہ باؤنڈری کراس کی اور اطراف کے گھنے درختوں میں آگیا۔ جلد ہی اونچے نیچے پھولوں اور بے تحاشا سبزے نے مجھے اپنی اوٹ میں چھپا لیا۔

حسنات احمد کے گھر سے نکلنے کے بعد واپس اپنی رہائش گاہ پر جانا غلطی تھی۔ میں نے یہ غلطی نہیں کی۔ قریب مقامی آبادی میں واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل کے چھوٹے سے مسافر خانے میں رات بسر کرنا میرے لیے ایک یادگار تجربہ ثابت ہوا۔ ساری رات گرگڑی کی آواز اور قہوے کی خوشبو میرے اردگرد چکراتی رہی اور سرائے کا مالک ایک الفونز نما پہاڑی سارا ہیا کروئیک اینڈ کی خوشی مناتا رہا۔ علی الصباح اس سرائے میں قصبے کی تمام چیدہ چیدہ خبریں گردش کرنے لگیں۔ ان میں سب سے اہم خبر یہ تھی کہ رات تانگورے کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مگر اس خبر میں تانگورے اور انیلا کی شادی کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ لوگ جو باتیں کر رہے تھے ان سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تانگورے کو اس کے کسی دوست کے گھر سے پکڑا گیا ہے۔ اس کے دوست کو بھی ساتھ ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور دوست کے اہل خانہ کا کچھ پتا نہیں۔ معلوم نہیں وہ بھاگ گئے ہیں یا ساتھ ہی پکڑے گئے ہیں۔

اس سارے چرچے میں انیلا کا ذکر تک نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ سردار رتیلی اور سیٹھ شاستری لال کا اثر و رسوخ کام آیا ہے۔ پولیس والوں کی جیبیں گرم ہو گئی ہیں اور انہوں نے اس واقعے میں سے انیلا اور اس کی شادی کا ذکر صاف کر دیا ہے۔ جو لوگ اس بارے میں کچھ کہہ سکتے تھے انہیں پکڑ لیا گیا تھا یا ڈرا دھمکا کر چپ کرا دیا گیا تھا۔ کل کلاں پیسے کے زور پر اس شادی کو عدالت میں بھی غلط ثابت کیا جا سکتا تھا بلکہ اگر ضرورت پڑتی تو تانگورے اور

اس کے دوست پر اغوا اور حبس بے جا کے اضافی کیس بھی بنائے جا سکتے تھے۔ اسی سرائے میں اتفاقاً میری ملاقات تانگورے کے ایک اور دوست سے ہو گئی۔ یہ دوست بھی پولیس کے خوف سے چھپتا پھرتا تھا۔ اس کا نام رجے تھا اور اس نے بھی کراس کنٹری ریس میں حصہ لے کر آٹھویں پوزیشن حاصل کی تھی۔ وجے پڑھا لکھا نوجوان تھا اور کافی ذہین بھی۔ تانگورے کی گرفتاری سے وہ کافی فکر مند نظر آتا تھا۔ اسے اصل بات کا تو پتا نہیں تھا لیکن اتنا اندازہ اسے تھا کہ تانگورے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تانگورے کے رومانس کا بھی حصہ ہے۔ وہ کہنے لگا "شاد جہاں صاحب! یہ سارا کیا دھرا پولیس آفیسر جگن ناتھ کا ہے۔ وہ ایک نمبر کا بدمعاش آفیسر ہے اور سردار رتیلی سے اس کے گہرے رابطے ہیں۔ آپ اسے سردار رتیلی کا نمک خوار بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ تانگورے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ ان پر دہشت گردی کا الزام یونہی نہیں لگایا گیا ہے۔ اگر آپ کسی طرح اس شخص کو اپروچ کر سکیں تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔"

میں نے اپنے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "میں اپروچ ضرور کروں گا لیکن پولیس آفیسر جگن ناتھ کو نہیں' اس شخص کو جو جگن ناتھ کا باپ ہے۔"

"جگن ناتھ کا باپ؟"

"ہاں۔ سردار رتیلی کا سربراہ۔ سردار بہادر سنگھ۔ وہ گاڑ فادر بنتا ہے نا۔ آج رات اس کی ساری فادری ناک کے راستے نکل جائے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" نوجوان رجے کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "آپ... سردار بہادر سنگھ سے ٹکر لیں گے۔"

"کیوں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ وہ بھی ہماری طرح گوشت پوست کا انسان ہے۔"

وہ رات سردار بہادر سنگھ پر واقعی قیامت کی طرح آئی۔ سردار بہادر سنگھ کا تمام "ڈیٹا" میں ایک روز پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ نوجوانی اور درمیانی عمر میں وہ بڑا رنگ باز شخص تھا۔ اور وہ ساری برائیاں اس میں تھیں جو اس ناپ کے سرداروں اور چودھریوں میں ہوتی ہیں۔ بازارِ حسن سے کسی عورت کو تفریحِ طبع کے لیے لانا اتنا گھناؤنا فعل نہیں جتنا گھناؤنا یہ فعل ہے کہ تفریحِ طبع کے لیے کسی عورت کو بازارِ حسن میں پہنچا دیا جائے۔ اور سردار بہادر سنگھ کی وجہ سے کئی عورتیں بازارِ حسن میں پہنچی تھیں۔ ریس اور شراب اس کی بہت پرانی کمزوری تھی۔ بہرحال عمر بڑھ جانے کے بعد اس نے پینترا بدل لیا تھا۔ بالکل جس طرح شیر بوڑھا ہونے کے بعد آسان شکار کو ترجیح دیتا ہے' سردار بہادر سنگھ نے بھی اپنی راتوں کو رنگین کرنے کے لیے آسان راستہ چن لیا تھا۔ پچھلے چار سال میں اس نے دو شادیاں اور کی تھیں اور اب تین بیویوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔ وہ سخت مزاج بھی مشہور تھا کہ

اپنے مستوجبین کو بجلی کے ہیٹر کے ذریعے سزا دیتا ہے۔ بدقسمت فرد کو جسم برہنہ کر کے چارپائی سے باندھ دیا جاتا تھا۔ بندشیں اتنی مضبوط ہوتی تھیں کہ وہ شخص ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے قریب ہیٹر لگا دیا جاتا تھا۔ ہیٹر کو جسم سے خاص فاصلے پر رکھا جاتا تھا۔ وہ نہ تو اتنا نزدیک ہوتا تھا کہ کھال جل جائے اور نہ اتنا دور کہ بدقسمت شخص کی اذیت میں کمی ہو۔ وہ بھی تیخ پر کنے کی یہ سزا بڑی دردناک تھی۔ جسم کے مساموں سے خون رسنے لگتا تھا اور سزا پانے والا موت کی دعا مانگتا تھا۔

سردار بہادر سنگھ جوگنگ کا بھی شوقین تھا۔ وہ شام کے بعد جوگنگ کے لیے نکلتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا اتھلیٹ بیٹا نوی بھی ساتھ ہوتا تھا تاہم اکثر و بیشتر وہ تنہا ہی ہوتا تھا۔ دو عدد ویہیکل کتوں اور ایک عدد باڈی گارڈ کے ساتھ وہ اپنی شاندار شیورلیٹ میں کمپنی پارک کی طرف جاتا تھا۔ پارک کے مین گیٹ کے سامنے وہ گاڑی سے اتر جاتا تھا اور پارک کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ جوگنگ شروع کر دیتا تھا۔ اس شام وہ پانچ منٹ سے زیادہ جوگنگ نہیں کر سکا۔ جونہی وہ سڑک کے ایک نیم تاریک حصے میں پہنچا ایک کار تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کار کی ڈرائیونگ نشست پر ناگورے کا دوست وجے تھا۔ میں نے پچھلی نشست سنبھال رکھی تھی۔ میں نے احتیاطاً اپنے سر پر وہی ٹوپی چڑھالی تھی جو آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چھپا سکتی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی میں لحیم شحیم بہادر سنگھ پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ چونکتا یا اپنے دفاع میں کوئی حرکت کرتا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک جچا تلا ہاتھ رسید کیا۔ اس کی عینک اچھل کر دور جا گری اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میری بانہوں میں آ رہا۔ وہ نیم بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر ٹویوٹا کار کی پچھلی نشست پر ڈالا۔ پھر اس کی عینک سڑک سے اٹھا کر جیب میں رکھی۔ اگلے ہی لمحے گاڑی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ یہ کارروائی بمشکل پندرہ سیکنڈ میں مکمل ہو گئی۔

○☆○

یہ ایک عام سائز کا کمرا تھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے تھے۔ وال کلاک رات نو بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پسٹل تھا۔ سردار بہادر سنگھ میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ سرخ رنگ کے ٹریک سوٹ میں تھا۔ اس کی کنپٹی پر نیلگوں گومڑ نمودار ہو چکا تھا اور غصے کی شدت سے اس کی توند بری طرح پھول پچک رہی تھی۔ ”آخر تم ہو کون؟“ وہ بری طرح پھنکارا۔ ”اور یہ کیا ناٹک رچا رکھا ہے تم نے۔ اتار دو یہ ٹوپی۔“

”میں نے بتایا ہے ناکہ میں سلطانہ ڈاکو ہوں اور سلطانہ نیک اور سیانا ڈاکو تھا۔“

”دیکھو مجھ سے سیدھی طرح بات کرو۔ تم جانتے نہیں ہو کہ تم نے کس شخص پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔“

”حالانکہ ترس تمہیں خود پر آنا چاہیے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”یہاں تمہاری جو درگت بننے والی ہے وہ یادگار ہو گی۔ کینیڈی میں ہونے والی کراس کنٹری ریس کی طرح لوگ تمہارے حشر کو بھی مدتوں یاد رکھیں گے۔“

سردار بہادر سنگھ نے مجھے یوں دیکھا جیسے میری ذہنی صحت پر شک کر رہا ہو۔ اس کی بلیک اینڈ وائٹ صحت مند مونچھیں غصے سے پھڑکیں۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور دھیمے لہجے میں بولا ”تم یہ ٹوپی پہن کر اور بگڑے لہجے میں انگریزی بول کر مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ میرا خیال ہے کہ تم رام سنہا کے بیٹے (ناگورے) کے کوئی دوست ہو۔ اور تمہاری بدبختی نے تمہیں اکسایا ہے کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرو۔“ اس نے خود کو ایک شاندار گالی دی اور اعلان کیا کہ وہ بہت سخت شے ہے اور حشر نشر کر دے گا۔ اس دھمکی کا اختتام اس نے ان الفاظ میں کیا ”دیکھو۔ میں تمہیں ایک آخری موقع دیتا ہوں۔ یہ پسٹل ہٹاؤ اور مجھے یہاں سے جانے دو۔“

میں نے کہا ”آخری موقع وہ دیتے ہیں جو صورت حال کو سنبھالنا چاہتے ہیں میں تو بگاڑنا چاہتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے بیٹھے بیٹھے ایک زوردار ٹانگ سردار بہادر سنگھ کی سخت توند پر رسید کی۔ وہ صوفے سے گرتے گرتے بچا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے ابل پڑیں۔ نورلیا کی معزز ترین فیملی اس فیملی کا معزز ترین فرد اور اس کے ساتھ یہ سلوک؟ سردار بہادر سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بھیانک خواب کی دلدل میں پھنس گیا ہے۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا ”میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ ناگورے وغیرہ سے میرا اتنا ہی تعلق ہے جتنا کسی مظلوم سے سلطانہ ڈاکو کا ہو سکتا ہے۔ نورلیا میں جتنے بھی ناگورے ہیں میں ان سب کا مددگار ہوں اور جتنے بھی سردار بہادر سنگھ ہیں میں ان کا وہی حشر کروں گا جو آج تمہارا کرنے والا ہوں۔“

ایک دم سردار بہادر سنگھ کی آنکھوں میں پسپائی کے آثار نظر آئے۔ اس نے اچھی طرح کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا ”کوئی بھی کام بلاوجہ نہیں کیا جاتا۔ تم نے یہ سب کچھ کیا ہے تو تمہارا کوئی مطالبہ بھی ہو گا۔“

”فی الحال میرا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ تم انڈرویئر کے سوا اپنے سارے کپڑے اتار دو۔“

سردار بہادر سنگھ کا چونق ہو گیا۔ توند پر لگنے والی ٹھوکر ہی اس کے لیے قیامت تھی۔ میرے نئے حکم نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ”کیا بک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ اس کی مونچھیں حیرت زدہ انداز میں پھڑکیں۔

”کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں کی میں نے۔“ میں نے جواب دیا ”ملتا جلتا مطالبہ تم بھی کئی لوگوں سے کر چکے ہو گے۔ ممکن ہے ان میں ایسی شریف لڑکیاں بھی شامل ہوں جو کسی کو صورت تک نہیں دکھاتیں۔“

میرے تیور بہادر سنگھ کا پتا پانی کر رہے تھے۔ وہ بولا ”دیکھو ہم دونوں جانور نہیں ہیں۔ پرماتما نے ہمیں زبان دی ہے۔ ہم بول سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”میرا مطلب یہی ہے کہ تم اپنے کپڑے اتارو۔ ویسے بے فکر رہو میں الیکٹرک ہیٹر سے تمہاری توند کی چربی نہیں پگھلاؤں گا۔ میرے پاس میرے اپنے طریقے ہیں۔“

ایک دم کوئی نئی بات سردار بہادر سنگھ کے ذہن میں آئی۔ وہ زیادہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔ میری طرف انگلی اٹھا کر بولا ”کہیں۔۔۔ تم وہی تو نہیں ہو جس نے شاستری لال کے بیٹے۔۔۔“

”ہاں۔ اس کے بازو بھی میں نے توڑے تھے۔“ میں نے بہادر سنگھ کی بات مکمل کی۔ ”میں نے تم سے کہا ہے ناکہ میں آج کل نورلیا میں گھوم پھر رہا ہوں۔ جہاں کسی سے زیادتی ہوتے دیکھتا ہوں اس کی مدد کرتا ہوں۔ نورلیا میں کئی لوگ تصدیق کریں گے کہ نوبل پوش عرف سلطانہ ڈاکو نے ان کی مدد کی ہے۔ اور خبردار اپنی جگہ بیٹھے رہو۔“ میں نے کڑک کر کہا۔ میں نے دیکھا تھا کہ بہادر سنگھ صوفے سے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میری ڈانٹ نے اسے پھر صوفے پر ڈھیر کر دیا۔

”اگر تم ناگورے کے ساتھی ہو اور اسے بچانا چاہتے ہو تو ہم اس سلسلے میں بات کر سکتے ہیں۔“ بہادر سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔

”میں فی الحال ایک ہی بات چاہتا ہوں۔ تم اپنا لباس اپنے جسم سے علیحدہ کر دو۔“

”مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔“ بہادر سنگھ غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔

میں ایک دم اس پر پل پڑا۔ گھونسے، ٹھوکریں، تھپڑ سب کچھ میں نے اس پر نچھاور کر دیا۔ دو منٹ بعد وہ مادر زاد برہنہ میرے سامنے فرش پر پڑا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ اس کا لباس دھجیوں کی صورت کمرے میں بکھرا ہوا تھا۔ میں نے الماری میں سے ایک ٹلو ٹوکس کیمرا نکال لیا۔ نورلیا اور سری لنکا چھوڑنے سے پہلے میں اپنے ساتھ دو پاؤں والے سری لنکن ہاتھی کے چند یادگار فوٹو لے جانا چاہتا تھا۔

جونہی کیمرا میرے ہاتھ میں آیا، سردار بہادر سنگھ چیخا ”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں۔“ وہ انگریزی میں بول رہا تھا۔

میں نے کہا ”اس میں دماغ کی خرابی والی کون سی بات ہے۔ کیا تم نے کسی کو تصویر اتارتے نہیں دیکھا؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے کیمرا آنکھ سے لگایا اور انگلی بٹن پر رکھ دی۔ سردار بہادر کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ وہ چیختا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ یہ بڑا شاندار پوز تھا۔ سردار بہادر بڑی رینگ شخصیت کا مالک تھا۔ لباس سے بے نیاز ہو کر کچھ اور بھی ”رینگ“ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے ”کلک“ سے تصویر اتار دی اور اس کے ساتھ ہی ٹانگ کی جچی تلی ضرب اس کے چہرے پر لگائی۔ وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا اور پھر پھسل کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں نے اسی پوز میں اس کی دو تصویریں مزید اتاریں۔ وہ جنونیوں کے انداز میں چیخنے چلانے اور واویلا کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ اپنا آپ چھپانے کی کوشش بھی کر رہے تھے لیکن یہ کوشش ایسے ہی تھی جیسے جیبی رومال کسی ہاتھی کی آنکھوں پر باندھنے کی کوشش کی جائے یا ایک مختصر لحاف سے دو منزلہ مکان کو ڈھانپا جائے۔

وہ گرانڈیل شخص تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے دل و دماغ کے مالک ہوتے ہیں۔ پچھلے چھ سات برس میں ایسے بہت سے لوگ میری زندگی میں آئے تھے۔ میں اپنی زبان میں انہیں ”پہاڑ“ کہا کرتا تھا۔ پہاڑ ہی کی طرح یہ لوگ بھی ٹھوس ورنہ چھلکوں میں چھپے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذات کے سوا کسی سے مخلص نہیں ہوتے۔ اور کبھی کبھی تو اپنے آپ سے بھی دغا کرنے لگتے ہیں۔ میں ایک ایسے ہی ”بڑے دل و دماغ والے“ شخص کو جانتا ہوں۔ اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کی تھیں لیکن بچہ صرف ایک پیدا ہوا تھا۔ وہ ان بچوں کو بھاری بھرکم گالیاں دیتا تھا جو اس نے پیدا ہی نہیں کیے تھے اور کہتا تھا کہ یہ بچے ہمارے نہیں ہوتے۔ قدرت کے بچے ہوتے ہیں۔ ہم انہیں پالنے پوسنے اور اچھا شہری بنانے کے چکر میں اپنی ساری زندگی برباد کر لیتے ہیں۔

یہ سردار بہادر بھی اسی گرانڈیل قبیلے کا فرد تھا۔ چیختے چیختے وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کا ارادہ کیمرا چھیننے کا تھا۔ میں نے پہلو بچا کر اسے ٹانگ رسید کی۔ وہ باتھ روم کے دروازے سے ٹکرایا اور اسے کھولتا ہوا دور جا گرا۔ اس کا چہرہ کئی جگہ سے زخمی تھا۔ اس حالت میں وہ ٹوائلٹ کے قریب پڑا بڑا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ کسی شریر کارٹونسٹ کا شاہکار۔ میں نے اس کی دو ”باوقار“ قسم کی تصاویر مزید بنائیں اور فلیش گن اتار کر کیمرہ الماری میں

منتقل کر دیا۔

وہ چیخا "تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر بہت پچھتانا پڑے گا تمہیں۔ میں تمہارے پورے خاندان کو..." اس کی آواز پست ہو گئی اور بعد کے الفاظ یوں آپس میں گڈمڈ ہوئے کہ کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

میں اس کی کربناک جھلاہٹ سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ کمرا مکان کے وسط میں واقع تھا اور خاصا محفوظ تھا۔ میں جانتا تھا کہ سردار بہادر سنگھ کتنا بھی واویلا کر لے، آواز باہر نہیں جائے گی۔ کچھ دیر جنونیوں کی طرح چیخنے اور مجھے اور تاگورے کو خطرناک دھمکیاں دینے کے بعد سردار بہادر سنگھ ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ غالباً غم و غصے کے شدید حملے کے بعد ایک بار پھر اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ چیخ و پکار کر کے وہ نہ تو مجھے ڈرا سکتا ہے اور نہ اپنی آواز کسی دوسرے تک پہنچا سکتا ہے۔ اسے چیخ و پکار کرتے قریباً دس منٹ تو ہو ہی گئے تھے۔ اگر کسی نے چیخ و پکار سن کر اس کمرے تک آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ مجھ سے ہاتھا پائی کر کے مجھے زیر کر سکتا۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ وہ تحمل سے کام لیتا اور "کچھ دو، کچھ لو" کے طریقے پر عمل کر کے اس "بلا" سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا جو میری صورت میں پچھلے دو گھنٹے سے اسے چمٹی ہوئی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں عمر میں تم سے دوگنا بڑا ہوں۔ شاید تمہارے بڑے بھی اسی عمر کے ہوں گے۔ ان کا تصور ذہن میں لاؤ اور سوچو کہ میرے ساتھ جو سلوک تم کر رہے ہو یہ کرنا چاہیے یا نہیں۔" وہ اب اپنا جسم چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور ٹانگیں سمیٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "شیطان کی کوئی عمر نہیں ہے اور اسی طرح فرشتے بھی کم سن یا عمر رسیدہ نہیں ہوتے۔ انسان اپنے کردار کی وجہ سے احترام یا تضحیک کا حقدار ہوتا ہے، اپنی عمر کی وجہ سے نہیں۔ تم چاہتے ہو کہ میں اپنے کسی بزرگ کا تصور کروں۔ لیکن کیا تم نے بھی کبھی اپنے تصور کو آواز دی ہے۔ میری معلومات کے مطابق صرف دو سال پیشتر تم نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی سے بیاہ رچایا ہے۔ اس کی عمر تم سے تین گنا کم ہے اور اس بیچاری کا وزن تمہاری توند سے بھی تھوڑا ہے۔ رات کے اندھیرے میں اسے نوچتے کھسوٹتے ہوئے کیا کبھی اپنی بائیس سالہ بیٹی کا تصور تمہارے ذہن میں آیا ہے۔"

وہ اپنی مونچھ چبا کر بولا "تم مجھے طیش دلانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں۔"

"آرام سے بیٹھے تو ہوئے ہو۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے لباس چاہیے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہیں ماہ و سال کی رنگین تنہائیوں میں یہ درخواست تم سے کئی لڑکیوں نے کی ہو گی لیکن تم نے وہی کیا ہو گا جو تمہارا دل چاہتا ہو گا۔ بہرحال میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔"

میں اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں گیا اور وہاں سے ایک دھوتی قمیص لا کر بہادر سنگھ کو دے دی۔ یہ دھوتی کا ہی لباس تھا۔ یہ مکان بھی انہی لوگوں کا تھا۔ اہل خانہ کینیڈی کے کھیل دیکھنے کینیڈی گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں دبے اور میں اس مکان میں نگراں کی حیثیت رکھتے تھے۔

باریک سوتی قمیص بہادر سنگھ کو کافی تنگ تھی اور اس میں بہادر سنگھ کی توند کسی زچہ کی طرح پھنسی ہوئی تھی۔ بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا وہ اس کم ناپ لباس میں۔ بہرحال یہ مضحکہ خیزی، بے لباسی والی مضحکہ خیزی سے کم تر تھی۔

لباس پہن کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ رومال سے خون آلود چہرہ پونچھ کر وہ کچھ دیر گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بولا "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور تمہارا مقصد کیا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لیے تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہت بے وقوفی کا ہے اور بہت برا بھی۔"

میں نے کہا "تمہاری دوسری بات میں مانتا ہوں۔ یہ برا راستہ ہے۔ لیکن تم جیسے برے لوگوں سے نمٹنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا۔"

"تم نے میری تصویریں اتاری ہیں۔ اس کا مطلب ہے تم مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"میں کوئی "ارادہ" نہیں رکھتا۔ میں تو واقعی تمہیں بلیک میل کر رہا ہوں۔ یہ بہت صاف ستھرا کیمرا ہے اور بہت صاف ستھری تصویریں اتارتا ہے۔ رنگین پرنٹ میں تمہارے جسم کا ایک ایک بال صاف نظر آئے گا۔"

"کیا کرو گے تم ان تصویروں کا؟" سردار بہادر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں یہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔" میں نے جواب دیا "اگر یہ کسی ملائم سی لڑکی کی تصویریں ہوتیں تو اچھے خاصے روپے ہاتھ آسکتے تھے۔ نوجوان نسل میں آج کل ایسی تصویروں کی بڑی مانگ ہے۔ بہرحال پریشانی کی بات نہیں۔ تمہاری ان تصویروں کے ایک سو ایک استعمال میرے پاس موجود ہیں۔ میں ان کی پچاس پچاس کاپیاں نکلواؤں گا۔ تمہارے خاندان اور حلقۂ احباب میں شامل ہر فرد کو یہ تصویریں بذریعۂ ڈاک ارسال کی جائیں گی۔ تمہارے بیٹے، تمہاری بہوئیں، تمہارے پوتے پڑپوتے سب تک یہ تصویریں پہنچیں گی۔ بے شک ان میں سے بہت سے تم سے ذکر نہیں کریں گے لیکن وہ سب کے سب تمہیں کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیں گے۔ یہ تو میں نے تمہیں صرف ایک طریقہ بتایا ہے۔ ایسے بے شمار طریقے میرے پاس ہیں بلکہ اگر تم چاہو تو میں یہ تصویریں "پلے بوائے" جیسے رسالوں میں شائع کروا کے تمہیں بین الاقوامی شخصیت بنا سکتا ہوں۔"

میرا پُراعتماد لہجہ سردار بہادر سنگھ کا پتا پانی کر رہا تھا۔ کوئی کمزور شخص ہوتا تو اب تک ٹوٹ پھوٹ چکا ہوتا۔ لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم مجھے ایکسٹورشن (اسٹیٹ) کر رہے ہو۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہماری پولیس بلیک میلروں سے نمٹنا بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ اور بلیک میلروں کے لیے سزائیں بھی بہت سخت ہیں۔ پکڑے گئے تو موت سے بدتر زندگی ہو جائے گی تمہاری۔ مقامی پولیس کا سربراہ نجمن ناتھ سری لنکا کا سخت ترین پولیس آفیسر ہے۔ اور آج دوپہر کا کھانا وہ میرے گھر میں میرے ساتھ کھا کر گیا ہے۔ ٹھیک نو بجے میری اس سے پھر ملاقات تھی۔ اور اب دس بج چکے ہیں۔ جونہی اسے میری خیریت کے بارے میں شک ہوا وہ حرکت میں آجائے گا اور اس کے ساتھ ہی پوری نوریلیا کی پولیس حرکت میں آجائے گی۔"

"اوہ گاڈ" میں نے مصنوعی تشویش ظاہر کرتے ہوئے ہونٹ سکیڑے "تم نے یہ سب کچھ پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"اب جو بتا رہا ہوں۔" وہ خشمگیں لہجے میں بولا۔

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ میرے کیمرے میں بس گنی چھ سات تصویریں تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مزید تصویریں نہیں ہیں، ورنہ میں تمہاری عزت میں کچھ اور اضافہ کرتا۔ جیسے تم لوگ بے بس عورتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے کارندوں کے ساتھ ان کی بڑی "پاکیزہ" قسم کی تصویریں بناتے ہو، میں بھی کسی بازاری عورت کو "کمپوزیشن" کے لیے بلا لیتا۔ وہ تمہارے ساتھ بڑے اچھے اچھے پوز بناتی۔ سچی بات ہے، تم جیسے بارسوخ شخصیتوں کی عزت بڑھا کر بڑا مزہ آتا ہے مجھے۔ جس شخص کے تعلقات جتنے بڑے بڑے افسران سے ہوتے ہیں اس کی اتنی ہی خاطر تواضع کرتا ہوں۔"

ایک بار پھر بیٹھے بیٹھے میں نے سردار بہادر سنگھ کے منہ پر ٹانگ جمائی۔ وہ صوفے سمیت الٹ گیا۔ اس کی موٹی ٹانگیں مضحکہ خیز انداز میں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور جو کچھ پردہ دھوتی میں تھا عیاں ہو گیا۔ سردار بہادر سنگھ کی مزاحمت اب یکسر ختم ہو چکی تھی۔ منہ پر ٹانگ کھانے کے باوجود نہ تو اس نے مجھے گالی دی اور نہ چیخ پکار کی۔ بس فرش پر بیٹھا لرزتا کانپتا رہا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ غالباً اس نے دل ہی دل میں یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ اس کا واسطہ ایک "ایب نارمل" شخص سے پڑ گیا ہے اور یہ "ایب نارمل" شخص طیش میں آکر اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ فرش پر گرا پڑا تھا۔ میں نے اس کی اکڑفوں کے انگاروں پر مزید پانی ڈالنے کے لیے چند اور ٹھوکریں اس کی پسلیوں پر رسید کیں۔ وہ دردناک انداز میں کراہنے لگا۔ میں نے اسے بالوں سے کھینچ کر سیدھا کیا اور دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

"دیپپانی" وہ سینے کو سہلاتا ہوا بولا۔

"کڑوا یا سادہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے میں نے اسے سادہ پانی ہی پلایا۔ پانی پی کر وہ کچھ دیر اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ پھر ذرا نحیف آواز میں بولا "کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

میں نے کہا "اس وقت تو میں سب کچھ چاہ سکتا ہوں۔ یہ بھی چاہ سکتا ہوں کہ تم مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لو۔ اور تھوڑی سی چھینا جھپٹی کے بعد تم یہ درخواست قبول بھی کر سکتے ہو لیکن فی الحال میں اس حد تک جانا نہیں چاہتا۔ بلکہ "فی الحال" کا لفظ بھی میں نے غلط استعمال کر دیا ہے۔ میں کبھی ایسی کسی حد تک جانا ہی نہیں چاہتا۔ میں سلطانہ ڈاکو ہوں اور اگر تمہاری کوئی فیشن ایبل عزیزہ مسز سلطانہ ڈاکو بن کر میرے گھر میں آگئی تو وہ ننھے ننھے ڈاکو پیدا کر کے میرا ناک میں دم کر دے گی۔ جب اپنے ہی خرچے بے شمار ہو جائیں گے تو پھر دوسروں کی مدد خاک کروں گا میں... بس عام سا ڈاکو بن کر رہ جاؤں گا۔ لاکھوں کروڑوں ڈاکوؤں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا... بے شک تمہارے جیسے سردار کا داماد بن کر اس کی گردن جھکانا ایک دلکش آئیڈیا ہے لیکن اس دلکش آئیڈیے کے لیے میں "سلطانہ ڈاکو" کے مرتبے سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ کبھی کسی سردار، سیٹھ یا وزیر کی جھکی ہوئی گردن دیکھنے کا خیال دل میں مچلا کرے گا تو تمہارے سابقہ سمدھی سیٹھ شاستری لال کو دیکھ لیا کروں گا... واہ... واہ کیسی ضدی گردن کو جھکایا ہے تاگورے نے... اس کی بیٹی کو شریکِ حیات بنا کر نوریلیا کی ساری اپر کلاس کا غرور خاک میں ملا دیا ہے... کیوں، ملایا ہے یا نہیں؟"

"تم بات کو خواہ مخواہ طول دے رہے ہو۔" سردار بہادر سنگھ کراہا "میں نے تم سے صرف تمہارا مطالبہ پوچھا تھا۔"

میں نے ٹوپی اتارتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے مجھے اب مطالبہ بتا ہی دینا چاہیے۔"

سردار بہادر بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وحشی لہجے میں بولا "تو میرا اندازہ درست نکلا۔ تم تاگورے کے دوست ہو۔"

"تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا؟"

"ریس کے میدان میں... بلکہ دو دفعہ تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ ایک مرتبہ یہاں نوریلیا میں، دوسری مرتبہ کینیڈی میں۔"

"چلو ٹھیک ہے تعارف کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا "پولیس نے تاگورے کے دس ساتھیوں کو گرفتار کیا ہے۔ کل رات تاگورے اور اس کے ایک قریبی دوست حسنات احمد کو بھی پکڑ لیا گیا ہے۔ میرا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ ان تمام لڑکوں کو بلا حیل و حجت رہا کر دیا جائے۔ اور آئندہ ان پر ہاتھ نہ ڈالنے کی مکمل یقین دہانی کرائی جائے۔"

مثل ہے۔ لیکن ان لڑکوں پر تو دہشت گردی کا الزام ہے۔ وفاقی ایجنسی کے لوگ ان سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ انہیں بھلا کون چھڑا سکتا ہے۔"

"تم" میں نے اس کے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "تم چھڑا سکتے ہو انہیں کیونکہ انہیں پکڑوانے والے بھی تم ہو اور دہشت گرد ٹھہروانے والے بھی تم۔"

"تمہیں سراسر غلط فہمی ہو رہی ہے۔" سردار بہادر سنگھ نے کہا "تم جانتے ہو' میچ کے بعد لڑکوں میں لڑائی ہوگئی تھی۔ تانگورے کے دوور جن ساتھیوں نے ہمارے لڑکوں کو بری طرح مارا پیٹا تھا۔ خود میرے بیٹے نوی کے سر پر چوٹیں آئی ہیں۔ ان حالات میں میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ ظاہر ہے پولیس میں پرچہ تو درج کراتے۔ میں نے بھی پرچہ درج کرایا اور جن جن لڑکوں کو قصوروار سمجھتا تھا' ان کا نام بھی لکھوایا۔ بس میرا دوش تو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ بعد میں جو کچھ ہوا وہ میری لاعلمی میں ہوا۔ سنا ہے کہ ایک لڑکے سے مارپیٹ کی گئی تو اس نے دو تین ناجائز رائفلیں برآمد کرا دیں۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ رائفلیں دہشت گردی کے ایک واقعے میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ پولیس کی تفتیش کا رخ دہشت گردی کی طرف مڑ گیا۔"

میں نے کہا "چلو ایک منٹ کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ لڑکے اپنی بدقسمتی کی وجہ سے پھنسے ہیں۔ تمہیں تانگورے اور اس کے ساتھیوں سے کوئی عناد نہیں تھا بلکہ تم تانگورے کی جیت پر خوش تھے اور اسے اپنے ہاتھوں سے ٹرافی دینا چاہتے تھے۔ ہم فرض کر رہے ہیں۔ فرض کرنے میں کیا حرج ہے۔ اب تم ایسا کرو سردار پیارے! کہ ان بچوں کو پولیس کے چنگل سے نکالو اور بھگوان کے ساتھ ساتھ سنسار کو بھی خوش کرو۔"

سردار بہادر سنگھ نے چہرے پر بے بسی سجائی۔ "تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے۔ یہ معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں جا چکا ہے اور۔۔۔ میری اتنی پہنچ نہیں کہ میں ان لڑکوں کو چھڑا سکوں۔ چھوٹا موٹا کیس ہو تو بھی بات ہے۔ یہ تو سراسر۔۔۔"

"بہادر سنگھ" میں نے اسے خطرناک لہجے میں ٹوکا "میرا خیال ہے شراب اور شباب کے بے دریغ استعمال نے تمہارے حافظے پر اثر ڈالا ہے۔ ابھی چند منٹ پہلے تم نے کہا ہے کہ تم بڑی "ہستی" ہو اور مقامی پولیس کا اعلیٰ ترین افسر تمہارے اشاروں پر ناچتا ہے۔"

بہادر سنگھ ایک دم گڑبڑا سا گیا۔ یہ بات تھوڑی ہی دیر پہلے واقعی اس کے منہ سے نکلی تھی اور میرا خیال ہے سچ ہی نکلی تھی۔

"لیکن یہ وفاقی ایجنسی۔۔۔"

"ایسی کم نہیں تمہاری اور وفاقی کی۔" میں نے اس کی بات کاٹی "میرا دماغ گھوم گیا تو کل تک کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"دیکھو تم حد سے نہ بڑھو۔" وہ کانپتے لہجے میں بولا "میں دل کا مریض ہوں۔"

"تم دل کے نہیں ذہن کے مریض ہو۔" میں نے جواب دیا "ہیٹر کے ذریعے لوگوں کے جسم کباب کرتے ہو اور لطف اندوز ہوتے ہو۔ دل کے مریض ایسا نہیں کرتے۔"

"تمہیں غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔" وہ کراہا۔

"مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمہاری درندگی کی جھلکیاں دیکھی ہیں۔ تمہارے لاڈلے سپوت نوی کی کار کے نیچے آ کر ایک بچہ ہلاک ہو گیا تھا۔ نوی کا جرم تم نے اپنے ایک کارندے پر ڈال دیا تھا اور وہ ہنسی خوشی چار سال کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ اس وفادار کارندے کو اپنی قربانی کا صلہ یہ ملا تھا کہ تمہارے لاڈلے بیٹے نے اس کی جواں سال بیوی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ اور جب اس مصیبت کی ماری نے اپنی عزت بچانے کے لیے احتجاج کیا تھا تو تم نے اس پر ستم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔ پہلے اسے بدچلن ثابت کر کے شوہر سے اسے طلاق دلوائی تھی اور پھر ہیٹر سے اس کے جسم کے نازک حصے جلا دیے تھے۔ بولو ایسا ہوا تھا یا نہیں؟ میں نے کل خود اس لڑکی سے ملاقات کی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کراہا۔

"معلوم ہو بھی کیسے؟ کوئی ایک واقعہ ہو تو یاد بھی رہے۔ ویسے بھی جس پر بیتتی ہے اس کو یاد رہتی ہے۔ کیا خیال ہے؟ کوئی واقعہ تمہاری یادداشت میں بھی محفوظ نہ کیا جائے۔ میرا مطلب ہے ہیٹر تو یہاں بھی موجود ہے۔ تمہیں اس کرسی سے باندھنے کے لیے رسی بھی مہیا ہو جائے گی۔ یہی دھوتی جو تم نے پہن رکھی ہے' اسے پھاڑ کر ایک ٹکڑا تمہارے منہ میں ٹھونسے دیتے ہیں۔"

سردار بہادر میں بہادری کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا زرد چہرہ کچھ اور زرد ہو گیا۔ پورا جسم زلزلے کی زد میں تھا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھٹے گھٹے لہجے میں بولا "ٹھیک ہے' میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے بات بن جائے۔"

"بات بنے گی۔" میں نے پورے یقین سے کہا "اور اگر نہیں بنے گی تو تمہارا ستیاناس ہو جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تم میرے سامنے اپنے چہیتے پولیس آفیسر مجن ناتھ کو فون کرو گے اور اس سے کہو گے کہ وہ ان لڑکوں کو چھوڑ دے۔"

میں نے ایک لسٹ سردار بہادر سنگھ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس لسٹ میں تانگورے اور حسنات احمد کے علاوہ ان کے دس ساتھیوں کے نام موجود تھے۔

لسٹ دیکھنے کے لیے سردار بہادر سنگھ نے اپنی آنکھوں کو سکوڑا تو میں نے جیب سے اس کی عینک نکال کر آنکھوں پر لگا دی۔ یہ عینک اس وقت گر گئی تھی جب ہم نے سردار بہادر پر ہاتھ ڈالا تھا۔ عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور اس شکستہ عینک کو لگانے کے

بعد سردار بہادر کے ڈھلکے پھولے چہرے کا حسن دوبالا ہو گیا۔ لسٹ پڑھ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے کہا "اتنی لمبی سانس مت لو۔ ابھی تمہیں اور بھی پریشان ہونا ہے۔ یہ نہ ہو تمہاری ساری ہوا ختم ہو جائے۔" وہ بے چارگی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ میں نے اگلا مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا "بہادر سنگھ' تانگورے اور اس کے ساتھیوں پر جو مصیبت آئی ہے وہ تمہاری وجہ سے آئی ہے۔ اب ان لوگوں کے مستقل تحفظ کا اہتمام بھی تم ہی کو کرنا ہو گا۔ اگر دہشت گردی والے اس بوگس اور فراڈ کیس کی وجہ سے پولیس نے کبھی ان لوگوں کو تنگ کیا تو میں تمہاری گردن پکڑوں گا۔ اور تم جان ہی گئے ہو کہ میری گرفت کتنی پکی ہے۔ میرے پاس تمہاری سات تصویریں ہیں اور ان میں سے ہر تصویر ایسی ہے جو "نیوڈ فوٹو گرافی" کے عالمی مقابلے میں بڑے افتخار کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے۔"

سردار بہادر سنگھ نے پھر اپنے خشک ہونٹوں پر نیم خشک زبان پھیری۔ اب اس کے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے اور دماغ میں تجسس بھر گیا تھا۔ میرا تیسرا مطالبہ تانگورے کی نویا بتا رنس انیلا کے حوالے سے تھا۔ میں نے بہادر سنگھ کو بتایا کہ مقامی رواج اور قانون کے مطابق انیلا اور تانگورے کی شادی ہو چکی ہے اور اب بہادر سنگھ کا یہ فرض ہے کہ وہ انیلا کو گھر لے جانے کے سلسلے میں تانگورے کی مدد کرے اور سیٹھ شاستری کو سمجھائے۔ میں نے بہادر سنگھ سے دو سادے کاغذوں پر دستخط کروائے اور انگوٹھے لگوائے پھر کچھ مزید شرطیں منوا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ جس مکان میں ہم موجود تھے یہ نور لیا سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ درحقیقت شہد کی مکھیوں کا ایک چھوٹا سا فارم تھا اور رجے یہاں اپنے ماموں کی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ میں باہر نکلا تو وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا اس کی بے چینی قابلِ فہم تھی۔ سردار بہادر سنگھ پر ہاتھ ڈالے ہمیں دو ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ پولیس سردار کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائے۔ میں نے رجے کو تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ یہاں ٹیلیفون موجود تھا۔ میں نے سردار بہادر سے اس کے گھر ٹیلیفون کروایا۔ اس نے اپنے پریشان اہلِ خانہ کو بتایا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ اسے اتفاقاً اپنے ایک دوست کے ساتھ جانا پڑ گیا تھا۔ آدھ پون گھنٹے میں وہ گھر واپس آ رہا ہے۔

O☆O

اگلے روز سب کچھ یوں ٹھیک ہو گیا جیسے کسی نے "بری خبروں کی مشین" کا بٹن آف کر کے "خوشخبریوں والی مشین" کا بٹن آن کر دیا ہو اور ہر طرف حالات آپوں آپ ہی درست ہوتے چلے گئے ہوں۔ دوپہر تک تانگورے' مجاہد علی' حسنات احمد اور ان کے پانچ ساتھی پولیس اسٹیشن سے رہا ہو گئے۔ ایک فون کال کے ذریعے سردار بہادر نے مجھے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ باقی لڑکے بھی دو تین روز میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ صرف اس لڑکے کی رہائی میں تاخیر ہو گی جس کے قبضے سے رائفلیں برآمد ہوئی تھیں۔ سردار بہادر سنگھ' جو بات کرتے ہوئے شیر کی طرح دہاڑتا تھا فون پر میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ وہ ڈرنے یا ڈرانے والا شخص نہیں تھا۔ اگر وہ مجھ سے دبا ہوا تھا تو اس کی ایک ہی وجہ تھی' وہ جان گیا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ کل میں نے اس سے تین باتیں کی تھیں اور وہ تینوں سو فیصد درست تھیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ اگر بہادر سنگھ نے تانگورے اور اس کے ساتھیوں کو رہا نہ کروایا اور رہا کروانے کے بعد آئندہ ان سے کوئی دشمنی چکائی تو میں ان تصویروں کے ذریعے اسے نہایت تسلی بخش طریقے سے ڈیل کروں گا' جو میں نے کھینچی ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ سردار بہادر سنگھ اور اس کے سنگی ساتھیوں میں انتا دم خم اور اتنی صلاحیت ہرگز نہیں ہے کہ مجھے میرے ارادے سے باز رکھ سکیں۔ جب یہ دونوں باتیں سردار بہادر کو ذہن نشین ہو گئی تھیں تو میں نے تیسری بات بتائی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میں کوئی پیشہ ور بلیک میلر نہیں ہوں۔ اگر بہادر سنگھ نے میری پہلی دونوں باتوں پر یقین کر لیا ہے اور ان پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر اسے مجھ سے کبھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ آج کے بعد کبھی میری صورت بھی نہ دیکھے۔ وہ یوں سمجھ لے کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں' نہ کبھی کسی نے اس کا زنگ سوٹ پھاڑا ہے اور نہ ڈرائیلٹ میں گرا کر "حشر خیز" تصویریں کھینچی ہیں۔ جو ہوا وہ سب ماضی کی قبر میں دفن ہو گیا۔

سردار بہادر نے اپنے اندر کی آنکھ سے پرکھا تھا اور میری باتوں پر یقین کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرے کہنے کے عین مطابق عمل کر رہا تھا۔ تانگورے اور اس کے ساتھی دوپہر کے وقت رہا ہوئے تھے۔ شام تک تانگورے کی بیٹھک میں اس کے دوستوں اور پرستاروں کا ہجوم ہو گیا۔ وہ تانگورے کی رہائی اور جیت کی خوشی میں ایک زبردست جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے سختی سے انہیں روک دیا۔ جب حالات خود بخود ٹھیک ہو رہے تھے تو نعرہ بازی اور اشتعال انگیزی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تانگورے کے چند ایک ساتھی بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے بلکہ اس جوش و خروش کو بے وقوفی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ان کا کہنا تھا کہ تانگورے کی رہائی کے سلسلے میں جو جلوس نکالا جائے وہ بعد میں "برات" کی شکل اختیار کر جائے اور سیٹھ شاستری لال کے گھر پہنچے۔ شاستری لال کو بتایا جائے کہ اس کی بیٹی کی شادی تانگورے کے ساتھ ہو چکی ہے اور وہ میاں بیوی کے راستے میں دیوار بننے کی کوشش ترک کر دے۔ میں نے ان جوشیلے لڑکوں کو سختی سے ڈانٹ دیا۔ تانگورے نے بھی اس خیال کو رد کیا۔

اس دوران میں مجھے سردار بہادر سنگھ کا فون آ گیا۔ "جی سردار صاحب کیسے یاد فرمایا۔" میں نے کوشش کی کہ لہجے میں طنزیہ

جسنور کا شائبہ تک نہ ہو۔

وہ سپاٹ لہجے میں بولا "میں ابھی شاستری لال کے گھر سے آرہا ہوں۔ اس کا بیٹا سرجیت کافی مشتعل تھا۔ مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔ رائفل لوڈ کر کے گھر سے نکل آیا تھا لیکن ہم نے روک لیا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا کیا آپ نے۔ ادھر بھی ناگورے کے دوست بہت گرم ہیں۔ خواہ مخواہ خون خراب ہو جاتا۔"

وہ بولا "میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ ایک دو دن میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا مطلب ہے "انیلا کی رخصتی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر آپ کو امید ہے تو پھر ناامیدی والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ شاستری لال کیا کہتا ہے؟"

"شاستری لال تو نیم رضامند ہے۔ اصل مسئلہ اس کے بیٹے کا ہے۔ وہ ناگورے کا نام بھی سننا نہیں چاہ رہا۔"

میں نے کہا "بہنوئی کا نام تو اسے سننا ہی پڑے گا۔ اگر آپ کہیں تو میں وہ دستاویز آپ کو بھجوا دوں جو شادی کے موقع پر تیار کی گئی ہے۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔" بہادر سنگھ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "سردار صاحب! انیلا کہاں ہے؟"

"گھر میں ہی ہے۔"

"میں نے سنا تھا کہ سرجیت نے اسے پھر نوریلیا سے باہر بھیج دیا ہے؟"

"نہیں یہ غلط ہے۔ وہ گھر میں ہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ سرجیت نے اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔"

میں نے کہا "سردار صاحب! گستاخی معاف "آپ کو اور شاستری لال کو ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ انیلا اب رام سنہا کی بہو اور ہم سب کی عزت ہے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"بے فکر رہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" سردار بہادر نے کہا۔

چند رسمی کلمات کے بعد یہ بات چیت ختم ہو گئی۔

سردار بہادر سنگھ نے دو تین روز کے اندر سب ٹھیک ٹھاک کرلیا۔ انیلا کا جوشیلا اور ضرورت سے زیادہ "باغیرت" بھائی سرجیت کمار بھی راہ راست پر آگیا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ انیلا بالغ تھی اور اس کی شادی گواہوں کی موجودگی میں طریقہ کار کے عین مطابق ہوئی تھی۔ وہ جتنی زیادہ مزاحمت کرتا اتنا ہی تماشا بنتا۔ بڑوں نے سمجھا بجھا کر اسے رام کرلیا تھا۔ انیلا کا باپ سیٹھ شاستری لال اس بات پر رضامند ہو گیا کہ دلہا کے ساتھ آٹھ دس افراد آئیں اور لڑکی لے جائیں۔

انیلا کی رخصتی کے لیے ایک ہفتہ کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس دوران میں ناگورے کے باقی دوست بھی رہا ہو گئے۔ رخصتی کا مرحلہ کافی عافیت سے انجام پایا۔ انیلا شاستری سرخ جوڑے میں لپٹ کر انیلا ناگورے بنی اور اس کے گھر آگئی۔ شادی کے روز ناگورے کو انیلا کے علاوہ جو دوسرا بڑا تحفہ ملا وہ دس ہزار امریکن ڈالر کی رقم تھی۔ یہ وہی رقم تھی جو مسٹرجی کلارک ناگورے کو انعام میں دے کر گئے تھے۔ کراس کنٹری ریس میں جیتنے والے کو ٹرافی کے ساتھ تو چالیس پچاس ہزار روپیہ نقد بھی ملتا تھا۔ یہ دونوں انعامات وصول کرنے میں ناگورے نے پہلے تو پس و پیش سے کام لیا۔ خاص طور سے مسٹرجی کلارک والا انعام وہ لینا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے سمجھانے بجھانے سے وہ مان گیا۔ اس سے پہلے میں نے ایک خطیر رقم اسے مشارب اینڈ کو سے بھی دلوائی تھی۔ اس رقم کا بہت سا حصہ تو ناگورے کے اہل خانہ نے قرضے وغیرہ چکانے میں صرف کردیا تھا۔ کچھ مکان پر خرچ ہو گیا تھا تاہم کچھ رقم ابھی بھی بینک کے فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ میں پڑی ہوئی تھی۔ اس رقم کو موجودہ انعامات کی رقم سے ملایا جاتا تو ایک اچھی خاصی رقم بن جاتی تھی۔ ناگورے یہ رقم کسی مناسب کاروبار میں لگا کر معقول ماہانہ آمدنی حاصل کر سکتا تھا۔ کم از کم میاں بیوی کے اخراجات تو احسن طریقے سے پورے ہو سکتے تھے۔ بالفاظ دیگر ناگورے کو ملازمت کی فوری ضرورت نہیں تھی اور وہ تمام تر توجہ اپنے کھیل پر دے سکتا تھا۔ کینڈی کی ریس ایک اہم سنگ میل تھا اور یہ سنگ میل عبور کرنے کے بعد ناگورے کے سامنے کامیابیوں اور ترقی کے دروازے کھل گئے تھے۔ وہ خود کو بہت پُرجوش اور پُرعزم محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایک یاس انگیز کہانی کا "ہیپی اینڈ" تھا اور اس "ہیپی اینڈ" نے بہت عرصے بعد مجھے دلی مسرت کا احساس دلایا تھا۔

شادی کے روز ناگورے کے گھر میں گہما گہمی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ رسمیں پاکستان و ہندوستان کی رسموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ عورتوں نے رنگ برنگی قمیصوں کے نیچے تنگ لنگیاں باندھ رکھی تھیں۔ ان کے بالوں میں رنگین گندھا کے پھول اور گلے میں کلیوں کے ہار تھے۔ ان کے ہونٹ خوب رنگے ہوئے تھے اور کسیری آنکھوں میں کاجل کی فراوانی تھی۔ وہ دلکش انداز میں گیت گا رہی تھیں اور آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی کرتی جا رہی تھیں۔ کا ہے گا ہے ان کے مترنم قہقہوں سے در و بام گونج اٹھتے تھے۔ میں بالائی منزل میں اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور ایک مقامی میگزین دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں غزالہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ زینے طے کر کے اوپر آرہی تھی۔ اس نے پھولدار ساڑھی باندھی تھی اور بہت ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ آج وہ اس غزالہ سے بہت مختلف نظر آتی تھی جو چار پانچ ماہ پہلے بستر پر پڑی دکھائی بھی نہیں دیتی تھی اور جسے پہچاننے

کے لیے ذہن پر زور دینا پڑتا تھا۔ اس کے جسم کا گداز اور چہرے کا (؟) ابھی پوری طرح واپس نہیں لوٹا تھا لیکن پھر بھی وہ دلکش اور زنانہ نظر آرہی تھی۔ مجھے یوں یک ٹک دیکھتے پاکر وہ ٹھٹکی اور اس کا ایک ہاتھ نے بے ساختگی کے انداز سے آنچل سینے پر پھیلایا۔

"آپ یہاں بیٹھے ہیں اور نادو آپ کو پورے گھر میں تلاش رہی ہے۔" وہ کھنکتی آواز میں بولی اور اندر آگئی۔

"کیا کہتی ہے؟"

"معلوم نہیں۔"

"لیکن ابھی وہ تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دو بار مجھ سے مارا پوچھ کر گئی ہے۔"

"عجیب لڑکی ہے" غزالہ نے انگریزی میں اسے اسٹرینج گرل کا خطاب دیا۔

"ہاں میں واقعی عجیب لڑکی ہوں۔" دروازے کی طرف سے نادو کی آواز ابھری اور وہ چھم سے اندر آگئی۔ اس نے بڑے ذوق سے کپڑے پہن رکھے تھے اور سری لنکا کے روایتی زیور سے لدی پھندی تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی آج اس کے بھائی کی شادی تھی۔

"ہاں بھئی کیا بات تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ دونوں بھی بڑے عجیب ہیں۔ ایک ملتا ہے تو دوسرا نہیں ملتا۔ دراصل میں آپ دونوں سے ایک ساتھ ملنا چاہتی تھی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" غزالہ نے پوچھا۔

"دراصل۔ میں آپ دونوں کی ایک پیاری سی تصویر اتارنا چاہتی تھی۔" اس نے ایک خوبصورت بے بی کیمرا اپنے آنچل میں سے برآمد کرلیا۔ میں اور غزالہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ادا سے بولی "یقین کریں بڑی شاندار تصویر آئے گی۔ بالکل ہیرو ہیروئن لگیں گے۔ لیکن پلیز ذرا کلوز ہو کر بیٹھیے نا۔"

میں نے غزالہ کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھے۔ وہ چند لمحے تذبذب میں رہی پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے نادو کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر کیمرا ایک دوسری لڑکی کو دیا اور اس سے کہا کہ وہ ہم تینوں کی تصویر کھینچے۔

نادو ٹھنکی "یہ کیا بات ہوئی جی۔ تصویر تو آپ دونوں کی ہونی چاہیے تھی۔ مجھے درمیان دیوار کیوں بنا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تم دیوار نہیں۔ تم تو ہماری پیاری سی "کیوٹ سی" میزبان ہو۔ ہم یہاں سے جا کر بھی تمہیں یاد رکھنے پر مجبور ہوں گے۔"

اس نے اپنے بازو ہم دونوں کے کندھوں پر رکھ دیے اور کھٹا کھٹ تین چار تصویریں بنوالیں۔

غزالہ "نادو کے ساتھ ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ خاموش اور ابھی ابھی سی نظر آرہی تھی۔ غزالہ اور نادو کمرے سے نکلی ہی تھیں کہ ناگورے کا دوست کیا بدلی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک لفافہ مجھے تھمادیا۔ یہ احمد رجال ساہی صاحب کا خط تھا اور پاکستان سے آیا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے خط پڑھنا شروع کیا۔ ایس پی برکت نے لاہور سے خیر خیریت کی اطلاع دی تھی۔ نریال کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ٹھیک ہے اور غزالہ کی صحت کے بارے میں فکر مند رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ساہی صاحب نے مجھے کچھ معلومات بھی بہم پہنچائی تھیں۔ ان معلومات کا تقاضا ان سے میں نے ہی کیا تھا۔ دراصل میں شیخ عاصم کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ وہ امارات میں تھا اور ساہی صاحب اپنے تعلقات استعمال کر کے اس کا اتا پتا اور حال احوال دریافت کر سکتے تھے۔ ساہی صاحب نے میری توقع کے عین مطابق یہ کام انجام دے لیا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا "شیخ عاصم واقعی جیل میں ہے۔ بم دھماکا کیس میں تو شاید اس کی ضمانت ہو ہی جاتی لیکن وہ ایک دو اور معاملات میں بھی ملوث ہے۔ قرائن سے نظر آتا ہے کہ ابھی وہ آٹھ دس ماہ تک جیل سے باہر نہیں آسکے گا۔ تاہم ایک بات نوٹ کرنے والی ہے۔ شیخ عاصم سری لنکا سے واپس امارات جانے کے ایک ماہ بعد تک آزاد تھا اور اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اونٹ ریس کے مقابلے دیکھنے شارجہ گیا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ غزالہ کی شدید بیماری کے دوران میں وہ سیر و تفریح میں مصروف تھا اور جانتے بوجھتے اس سے رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ بہرحال اس کے اعمال اس کے سامنے آگئے ہیں اور وہ قانونی چکروں میں بری طرح الجھا ہوا ہے۔ شنکر شکرا کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی دبئی اور شارجہ میں پایا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں وہاں کے ایک بہت بڑے گینگسٹر سے اس کی ٹکر بھی ہوئی ہے۔ اس ٹکر کے تین چار دن بعد گینگسٹر کی لاش ایک گٹر سے ملی ہے۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ یہ شخص شنکر شکرا کا نشانہ بنا ہے۔"

میں ابھی ساہی صاحب کا خط پڑھ ہی رہا تھا کہ زیریں منزل سے لرزہ خیز چیخیں سنائی دیں۔ یہ ان خواتین اور بچوں کی چیخیں تھیں جو ناگورے اور انیلا کی شادی کی خوشی منا رہے تھے۔ میں تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن کے اندر کہیں گہرائی میں چھپا ہوا خوف ایک دم ہی ابھر کر سامنے آگیا تھا اور اس خوف کے سائے میرے پردہ تصور پر ایک زرارتا منظر تخلیق کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا نچلی منزل پر بڑے کمرے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے محفل رنگ و طرب برپا تھی کہرام مچا ہوا تھا۔ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے بھاگ گئے تھے۔ پھولدار قالین پر ناگورے اور انیلا کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان دونوں کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے اور خون تیزی سے ان کے عروسی لباسوں کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ ایک لمحے میں یہ بھیانک منظر میرے ذہن میں ابھر کر غائب ہو گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور سیڑھیاں اترتا ہوا بڑے کمرے میں پہنچا۔ میرا ایک ہاتھ

قمیص کے نیچے ریوالور پر تھا۔ ہال میں ابھی تک چیخیں گونج رہی تھیں لیکن کمرے کا منظر دیکھنے کے بعد میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔ یہاں کوئی خون خرابہ نہیں ہوا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ ایک بہت بڑا اژدہا اچانک کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ اور یہ اژدہا بھی سچ مچ کا نہیں تھا۔ یہ کپڑے اور فوم وغیرہ سے بنا ہوا اژدہا (ڈریگن) تھا اور اسے حرکت دینے کے لیے اس کے اندر سنہالی لڑکیاں گھسی ہوئی تھیں۔ سری لنکا کی کسی لوک دھن پر یہ اژدہا کمرے کے وسط میں اچھل کود رہا تھا' دوسرے لفظوں میں ڈانس پیش کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا' تانگورے اپنی دلہن کا ہاتھ تھامے کمرے کے ایک گوشے میں کھڑا تھا' دونوں ہنس ہنس کر سرخ ہو رہے تھے۔ نادو اور اس کی سہیلیاں بھی آس پاس موجود تھیں اور اژدہے سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا "اگر چند روز پہلے میں سردار بہادر سنگھ کو آڑے ہاتھوں نہ لیتا تو آج یہ گہماگہمی اور خوشی' خواب و خیال ہوتی۔ مجھے کتری وکری بٹلر صاحب کے اس قول سے زیادہ اتفاق نہیں "جو کام پیار محبت سے برسوں میں انجام نہیں پاتا وہ طاقت کے مناسب استعمال سے دنوں میں ہوسکتا ہے" لیکن کبھی کبھی مخصوص حالات میں یہ نظریہ درست بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ سردار بہادر سنگھ گفت و شنید اور دھمکیوں وغیرہ سے مرعوب ہونے والا کہاں تھا' لیکن میرے ڈائریکٹ اور کسی حد تک بے رحمانہ ایکشن نے اسے تیر کی طرح سیدھا کر دیا تھا۔

اسی دوران میں اژدہے کا رقص ختم ہو گیا۔ نادو کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چند شوخ لڑکیوں کے ہمراہ میرے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ وہ سب چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھیں "آپ کی عمر کتنی ہے؟ آپ کی ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟ کیا خفیہ شادی کر رکھی ہے؟" وہ اس قسم کے لایعنی سوالات کر رہی تھیں۔ ایک بولی "یہ برہمچاری ہوں گے۔"

دوسری نے کہا "یہ مسلمان ہیں۔ یہ تو کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ ضرور کوئی اور بات ہے۔ دل پر گہری چوٹ کھائی ہے۔"

نادو بولی "بڑی بہن غزالہ کہاں ہیں۔ وہ نظر نہیں آ رہیں۔"

صورت حال اب نازک صورت اختیار کر رہی تھی۔ یہ لڑکیاں مجھ سے کسی نئے نویلے لڑکے کا سا سلوک کر رہی تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے بارے میں جانتی نہیں تھیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ شاہ جہاں کس تیرہ بخت شخص کا نام ہے؟ وہ جہاں جاتا ہے تباہیاں اور ہولناکیاں اس کی ہمرکاب ہوتی ہیں۔ وہ وحشیوں سے وحشیوں کی طرح لڑتا ہے اور انسانوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کے ٹکڑے ہوا میں اچھالتا ہے۔ کہنے والے اسے قانون کا خطرناک باغی کہتے ہیں اور کوسنے والے معاشرے کا لاعلاج روگ گردانتے ہیں۔ ہاں ان بچاریوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اگر معلوم ہوتا تو وہ چیختی چلاتی بھاگ جاتیں' اور یقیناً اس تقریب کو بھی ادھورا ہی چھوڑ جاتیں۔

تانگورے نے قریب آکر میری مدد کی اور میں ان لڑکیوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ اوپر کمرے میں پہنچا تو غزالہ میرا بستر درست کر رہی تھی۔ ایک چیز دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ ایس پی برکت والا خط میز پر پڑا تھا۔ لڑکیوں کی چیخیں سن کر میں یہ خط تکیے کے نیچے چھوڑ گیا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ غزالہ میری واپسی سے پہلے کمرے میں آجائے گی اور بستر ٹھیک کرنے لگے گی۔ میں نے غزالہ کا چہرہ دیکھا اور ایک ہی لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ یہ خط دیکھ چکی ہے۔

یہ بڑی غیر متوقع بات ہوئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق غزالہ کو اتنا تو معلوم تھا کہ اس کے شوہر شیخ عاصم کو مقدمات کا سامنا ہے اور وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ شیخ عاصم سری لنکا سے جانے کے ایک ماہ بعد گرفتار ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ امارات پہنچتے ہی پکڑا گیا تھا لہٰذا اس کی خبر گیری نہ کر سکا۔ میں نے دیکھا غزالہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ بظاہر وہ بستر کی چادر درست کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن غم و اندوہ کی آندھی میں گزرا جا رہا تھا۔ آنسوؤں سے بوجھل آواز میں بولی "میں بڑی بدقسمت عورت ہوں۔ شاہ جہاں۔ میری زندگی نے ہر قدم پر مجھ سے مذاق کیا ہے؟"

"کیا مذاق ہوا ہے تم سے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ میں سب جانتی ہوں۔ جو کچھ پچھلے چار پانچ ماہ میں ہوتا رہا ہے وہ سب معلوم ہے مجھے۔ ہر روز سوچتی ہوں' کاش یہ میری زندگی کا آخری دن ہو۔ کاش مر جاؤں میں۔"

میرے اندر غصے کی ایک بلند لہر اٹھی۔ ہاتھ میں ایک برق سی لہرا گئی۔ اگر میں خود پر قابو نہ پاتا تو شاید یہ ہاتھ طمانچے کی صورت غزالہ کے نازک رخسار پر پڑتا۔ میں نے بے حد تلخی سے کہا "ضرور مرو۔ ضرور مرو۔ بڑا چاؤ ہے تمہیں مرنے کا' کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔ تم مر جاؤ گی تو میں بھی مر جاؤں گا... یا ہوش کھو دوں گا اور کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں نکل جاؤں گا۔ کچھ نہیں ہوگا مجھے اور نہ کسی اور کو۔ تمہاری زندگی تمہاری ہے' جو جی چاہے کرتی رہو اس کے ساتھ۔ میں ہی پاگل تھا جو چار مہینے سے تمہیں لیے لیے پھر رہا ہوں۔ تمہیں زندہ اور خوش دیکھنا چاہ رہا ہوں۔"

غزالہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی اشک بار آنکھوں میں حیرت تھی۔ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ یہ الفاظ اچانک کیسے میری زبان سے نکل گئے تھے۔ میں نے تو غزالہ کے سامنے آج تک ایسی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بے شک الفاظ کڑوے تھے' لیکن ان کی کڑواہٹ میں محبت اور اپنائیت کا اظہار تھا وہ شہد سے میٹھے الفاظ میں بھی نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا' غزالہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ ایک اندرونی مسرت کی جھلک بھی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے لب مرتعش تھے۔ وہ دھیرے سے اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور گہرے کش لینے لگا۔ کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری تھی۔ مجھے شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے کہا "غزالہ' میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر صورت اور ہر قیمت پر۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم تندرست ہو جاؤ' پھر وہی پہلے جیسی غزالہ بن جاؤ۔ اور یقین کرو' میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تمہارے اور شیخ عاصم کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو جائے اور زندگی کا جو نیا سفر تم نے شروع کیا تھا وہ کامیابی سے طے ہو۔"

غزالہ خاموش تھی۔ اس کا چہرہ بھی خاموش تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی' کس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نیچے ہال سے جلترنگ کی آواز آ رہی تھی اور شوخ قہقہے ابھر رہے تھے۔ کئی لمحے بعد وہ دھیمی آواز میں بولی "شاہ جہاں! میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ اپنے اور اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے وقت درکار ہے۔ پلیز آپ مجھے پاکستان بھجوانے کا انتظام کریں۔"

میں نے کہا "میں تو کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ موجودہ حالات میں پاکستان تمہارے لیے مناسب ترین جگہ ہے۔ میں کل صبح ہی تمہارے کاغذات کا انتظام کرواتا ہوں اور پاکستان میں تمہارے گھر بھی فون کر دیتا ہوں۔"

اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا "آپ کہاں جائیں گے؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔"

"لیکن سائیں مالی تو کہہ رہا تھا کہ آپ پھر حیدرآباد جا رہے ہیں۔"

"کب کہہ رہا تھا؟"

"ابھی کہہ رہا تھا۔ وہ ادھر میرے کمرے میں بیٹھا ہے۔"

"تمہارے کمرے میں؟ کب آیا ہے وہ؟"

"ابھی دو چار منٹ پہلے۔ نیچے ایک لمبی کار بھی کھڑی ہے۔"

میں غزالہ کو وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے کی طرف لپکا۔ وہاں واقعی وہ آفتِ جاں زلزلہ صفت موجود تھا۔ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چہکا "او جی۔ آگئے تم۔ مجھے تو ڈر تھا کہیں تم نیچے کسی لڑکی سے عشق نہ لڑانے لگ جاؤ۔"

"ہاں کہو' کیسے آئے ہو؟" میں نے رکھائی سے پوچھا۔

"کار پر بیٹھ کر آیا ہوں اور تمہیں لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ فوراً چلو ورنہ زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا۔ تمہیں وہ کلارک خان بلا رہا ہے۔" (سٹرچی کلارک کو وہ کلارک خان کہتا تھا)

"کہاں ہیں کلارک صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"ٹیلیفون پر اور کہاں پہ۔ حیدرآباد سے بول رہے ہیں۔ ابھی دس پندرہ منٹ بعد پھر کال کریں گے۔"

"کہاں کال کریں گے؟"

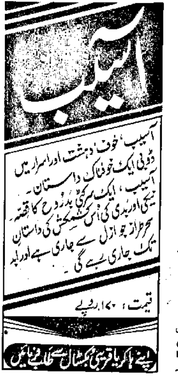

"آ بے گھما مڑو ہیں' جہاں اس سے پہلے تمہاری شریکِ حیات سوچ کی کال آئی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں الّو کی پٹھی کو گالی دی اور سائیں سے کہا "تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں' مسٹر کلارک کو آخر میری کیا ضرورت آن پڑی ہے۔"

سائیں بولا "کوئی بڑا خاص معاملہ ہے وہاں۔ شاید جنات نے کوئی چکر چلایا ہوا ہے۔ حیدر آباد سے تھوڑی دور شاہ پور نام کا ایک قصبہ ہے' وہاں ایک جن قابض ہو گیا ہے۔ وہ جن پرستانی پارلیمنٹ کا رکن ہے اور بدبخت نے ایک پورا قبضہ گروپ بنایا ہوا ہے۔ اب یہ شرارتی جن راہ چلتے لوگوں کو پکڑ کر ہوا میں الٹا لٹکا دیتے ہیں اور عورتوں سے چھیڑ خانیاں کرتے ہیں۔" سائیں عالی ایسی بے معنی گفتگو کرتا ہی رہتا تھا لہٰذا میں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ وہ اپنے انداز میں بولتا رہا۔ اچانک میری نگاہ انگریزی اخبار کے ایک صفحے پر پڑی اور میں دنگ رہ گیا۔ اندرونی صفحے پر یہ ایک دو کالمی خبر تھی۔ لکھا تھا "حیدر آباد کے نزدیک ایک گاؤں پر جنات کا قبضہ۔ پچھلے ایک ہفتے میں چار افراد پُراسرار طور پر قتل ہو چکے ہیں۔" سرخی سے نیچے لکھا تھا۔ "حیدر آباد دکن کے قصبے شاہ پور کے ایک قریبی گاؤں میں ایک عجیب الخلقت مخلوق دیکھنے میں آ رہی ہے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مخلوق بھیڑ بکریوں کی شہ رگ پر دانت رکھ کر ان کا خون چوس جاتی ہے اور اکیلے دکیلے شخص کو دیکھ کر قتل کر ڈالتی ہے۔ مختلف لوگوں نے اس مخلوق کا حلیہ مختلف بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ شریر جنات کی کارستانی ہے' وہ روپ بدل بدل کر لوگوں کو شدید قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا کر رہے ہیں۔ علاقے کے بہت سے عامل اور جنات پجاری گاؤں میں موجود ہیں اور جنوں کو مار بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

خبر پڑھنے کے بعد میں نے حیرت سے سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے ناخن چبانے میں مصروف تھا اور بے قرار نظر آ رہا تھا۔ میں نے خبر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "کیا تم اس خبر کی بات کر رہے ہو؟"

وہ بولا "تم خبروں کو چھوڑو شفیع محمد! میری بات پر یقین کرو۔ چلو فٹافٹ اٹھ جاؤ اب۔ کلارک خان انتظار کر رہا ہوگا۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ سائیں عالی کے کہنے پر مسٹر جی کلارک صاحب سے بات کر کے دیکھ لوں۔ میں سائیں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ یہاں ناگورے کی شادی کا ہنگامہ ابھی جاری تھا۔ سب اپنے حال میں مگن تھے۔ دروازے پر وہی شاندار گاڑی کھڑی تھی جس پر سائیں عالی چند روز پہلے بھی آیا تھا۔ معلوم نہیں اسے یہ ساری سہولتیں اور آسائشیں کیسے مہیا ہو جاتی تھیں۔ ہر قسم اور طبقے کے لوگ اس کے حلقۂ مریدگان میں شامل ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ گاڑی کسی بڑے سرمائی صنعت کار کی تھی اور پچھلی دفعہ وہ سائیں عالی کے لیے خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس مرتبہ اسٹیئرنگ وہیل' وردی پوش ڈرائیور کے ہاتھوں میں تھا۔

ڈرائیور نے چند منٹ کے اندر ہمیں اسی آراستہ و پیراستہ دفتر میں پہنچا دیا جہاں ایک خوبصورت میز پر کئی ٹیلیفون سیٹ رکھے تھے اور یہاں ڈراپ خاموشی طاری تھی۔ سائیں عالی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چوکڑا مار کر قالین پر براجمان ہو گیا۔ قالین پر سگریٹ کے بے شمار ٹکڑے پڑے تھے اور گنڈیری کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ یقیناً یہ سب سائیں عالی کی کارستانی تھی۔ میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ اخبار میں دیکھی ہوئی مختصر خبر بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ یہ کوئی انوکھی خبر نہیں تھی۔ دور افتادہ علاقوں سے ایسی جھوٹی سچی اطلاعات اکثر پڑھنے اور سننے کو ملتی رہتی ہیں' انوکھی بات یہ تھی کہ بقول سائیں عالی' مسٹر جی کلارک صاحب اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سائیں نے بمشکل ایک سگریٹ پیا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سائیں کے اشارے پر میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف مسٹر جی کلارک ہی تھے۔ ایک دو منٹ تک ہمارے درمیان رسمی گفتگو ہوئی جس میں ناگورے کی خیر خیریت اور اس کی شادی کا ذکر بھی آیا اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ پاکستان سے چند روز پیشتر ہی یہاں پہنچے ہیں پھر کلارک صاحب اصل موضوع پر آ گئے انہوں نے کہا "بہت اہم بات تھی اس لیے میں نے سوچا کہ خود فون کروں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں جناب! آپ بتایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

وہ بولے "یہاں ایک بہت عجیب معاملہ پیش آیا ہے شاہ جہاں۔ اور اسی وجہ سے تمہارا یہاں جلد واپس آنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ شاید تھوڑا بہت تمہیں سائیں عالی صاحب نے بھی بتا دیا ہو۔ شاہ پور سے کچھ فاصلے پر ایک جگر گھلی نامی گاؤں ہے۔ پچھلے دنوں وہاں کچھ عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ سادہ لوح لوگوں کو شدید قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان واقعات سے ہمارا تعلق بھی پیدا ہو گیا ہے۔"

"ہمارا تعلق۔ میں سمجھا نہیں جناب؟"

وہ بولے "میں فون پر تفصیل تو نہیں بتا سکتا' یہ سمجھ لو کہ ان واقعات میں تین چار افراد قتل بھی ہو چکے ہیں۔ ان مقتولوں میں سے ایک مجتبیٰ کنور کا دستِ راست خدا بخش ہے۔" خدا بخش کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ سفید کپڑے پہنتا تھا اور مجتبیٰ کنور کے لیے وہی کام کرتا تھا جو الٰہ دین کے لیے چراغ کا جن کرتا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجتبیٰ کی محل نما ر

ہائش گاہ میں رہنے والا یہ شخص حیدر آباد کے اس دور افتادہ گاؤں میں جا کر کیسے قتل ہو گیا۔

میں نے کہا "لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکوں گا جناب۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے پاس ہر طرح کے قوی موجود ہیں۔ اور پھر مجتبیٰ کنور صاحب ہیں جنہیں بجا طور پر ہر مرض کی دوا کہا جا سکتا ہے۔"

جی کلارک صاحب کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔ انہوں نے کہا "شاہ جہاں! یہاں کے حالات ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اگر واقعی تمہاری ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی تمہیں فون نہ کرتا۔"

"او کے جناب" میں نے جلدی سے کہا "میں کوشش کرتا ہوں کہ ایک دو روز میں حیدر آباد پہنچ سکوں۔"

"ایک دو روز میں نہیں۔ آج ہی' رات والی فلائٹ سے۔ تمہارے ٹکٹ اور دوسرے کاغذات کا انتظام ہو چکا ہے۔ تمہیں یہاں آ کر اندازہ ہوگا کہ تمہارا یہاں جلد پہنچنا کتنا ضروری تھا۔"

میں مسٹر جی کلارک صاحب کی عزت اس لیے نہیں کرتا تھا کہ وہ بے حد امیر کبیر شخص تھے بلکہ اس لیے کہ وہ بھی ساہی صاحب کی طرح ایک معقول آدمی تھے۔ بے شک دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی اس وقت دفینے کے چکر میں تھے لیکن بہ حیثیتِ انسان ان کی معقولیت میں کلام نہیں تھا۔ میں نے جی کلارک صاحب سے کہا کہ ٹھیک ہے' میں ان کی ہدایت کے مطابق حیدر آباد پہنچ رہا ہوں۔

○☆○

میں غزال کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب مجبوری تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ناگورے کو مکمل ہدایات دے دیں۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ کولمبو سے کراچی جانے والی پہلی یا دوسری پرواز کے ذریعے غزال کو روانہ کر دے گا۔ اس سلسلے میں میں نے جو انتظامات کیے تھے' غزال ان سے پوری طرح مطمئن تھی۔ نوریلیا چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک دفعہ سردار بہادر سنگھ سے بھی ٹیلیفون پر بات کی اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سمجھایا کہ اگر وہ ناگورے اور اس کے ساتھیوں سے بدلہ وغیرہ لینے کے چکر میں نہیں پڑے گا تو میں بھی اسے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا (اور ظاہر ہے' ان شاہکار تصویروں کو بھی جو میرے پاس موجود تھیں)

ناگورے' مجاہد علی اور میں بائی روڈ کولمبو پہنچے۔ سائیں عالی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میرا ٹکٹ اور دیگر ضروری کاغذات سائیں عالی کے پاس ہی تھے۔ میں نے سائیں سے پوچھا کہ وہ حیدر آباد نہیں جائے گا۔ سائیں نے حسبِ توقع اوٹ پٹانگ جواب دیا۔ بولا "میں ایسی مُردار اور لا کلاس بر سفر نہیں کرتا۔ پی آئی اے (پرستان انٹرنیشنل ائرلائن) میں سفر کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں بیچ بیچ کی پریاں میزبانی کرتی ہیں اور اکثر جہاز اڑنے سے پہلے ہی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جاتا ہے۔"

کولمبو سے دہلی تک کا سفر میں نے سوتے میں طے کیا۔ دہلی سے حیدر آباد کے لیے رابطہ پرواز موجود تھی۔ تاہم تھوڑا سا انتظار کرنا پڑا۔ انڈین ائرلائن کا دیو ہیکل جہاز جس وقت حیدر آباد کی فضاؤں میں پہنچا' رات کے اندھیرے میں صبح کا اجلا پن شامل ہو رہا تھا۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ ٹمٹماتی روشنیوں کا ایک سمندر میرے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ ہاں یہی حیدر آباد تھا۔ قلبِ دکن اور دکنی ثقافت کا مرکز' راجوں مہاراجوں' نوابوں اور رئیسوں کی سرزمین' پرانی روایتوں کا امین اور یادگار داستانوں کا گہوارہ۔ اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ ابھی یہ شہر بیکراں سو رہا تھا۔ میں نے سوچا آج کا دن اس شہر کے لیے نجانے کون کون سے ہنگامے لے کر آئے گا۔ کون کون روئے گا اور کون کون ہنسے گا۔ کہاں کہاں زندگی مسکرائے گی اور کہاں کہاں موت کے سائے پھیلیں گے۔ دستِ قدرت کس کس پر اپنی نوازش کرے گا اور کس کس کو دن بھر کی مشقت کے بعد بھی پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملے گا۔ کس کس دل میں پیار کی کونپلیں نکلیں گی اور کہاں کہاں دشمنی اور نفرت کے پودے لگائے جائیں گے۔ یہ سب کچھ پردۂ غیب میں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ پچیس عدد نادر صندوق بھی جو اس شہر کی وسعتوں میں یا اس کے ارد گرد کہیں گم ہو چکے تھے۔

ائرپورٹ پر مقتول نواب شہریار جنگ کا منیجر عبداللہ غازی اور ملازمِ خاص قلی قطب مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ یہ قلی قطب وہی خطرناک باکسر تھا جو میرے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔ یہ شخص نواب جیلی کا بڑا وفادار تھا لیکن مجتبیٰ کنور نے اس پر نجانے کون سی گیدڑ سنگھی آزمائی تھی کہ وہ اب اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ یہ دونوں حضرات مجھے ائرپورٹ سے سیدھا "گینٹ" لائے۔ یہاں گھنے درختوں اور اونچی چار دیواری میں گھری ہوئی ایک عالیشان کوٹھی میں مسٹر جی کلارک صاحب' رتنا تاور زماں اور چالباز امریکی ایجنٹ مسٹر اینڈرے سے ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' مسٹر اینڈرے بہت کم گفتگو کرتا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ مضبوطی سے بھنچے رہتے تھے اور خاموش آنکھیں ہر شے میں برمے کی طرح گھستی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی جسمانی ساخت اور صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ شکرا کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جس کی جسمانی ساخت اور فائٹنگ کے انداز نے مجھے متاثر کیا تھا۔

علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد مسٹر جی کلارک صاحب مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئے۔ یہاں درمیانے قد اور بالکل گول چہرے والا ایک مقامی شخص موجود تھا۔ اس نے چست پائجامہ اور دیہاتی انداز کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس نے اٹھ کر حیدر آبادی اسٹائل میں مجھے سلام کیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس شخص کے ایک بازو پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔

مسٹر کلارک نے اس شخص کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا "اس کا نام ابدال احمد ہے۔ یہ پولیس کے لیے مخبری کرتا رہا ہے اور اس وقت ہمارے لیے خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ بھروسے کا آدمی ہے اور ہم اس کی موجودگی میں بھی کھل کر بات کر سکتے ہیں" اپنے طلائی لائٹر سے دنیا کے مہنگے ترین برانڈ کا سگریٹ سلگانے کے بعد امریکی اور بی جی نے بات جاری رکھی۔ گہری سانس لیتے ہوئے بولے "شاہ جہاں! تم سری لنکا جا کر اپنے معاملات میں الجھ گئے تھے۔ ہم نے واپسی کے لیے تم پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال ہم اپنے طور پر گمشدہ صندوقوں کی تلاش میں لگے رہے ہیں۔ قمر زماں کے علاوہ مجتبیٰ کنور اور ابراہیم نے بھی اپنا زیادہ تر وقت یہیں گزارا ہے۔ پچھلے چند ہفتوں سے سروج بھی یہیں پر ہے۔ ہم نے چند ٹیمیں تشکیل دی تھیں جو حیدرآباد اور فاروق نگر میں مختلف جگہوں کی نگرانی کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ چند مشکوک افراد کو بھی مسلسل زیر نگرانی رکھا جا رہا تھا۔ مجتبیٰ کنور کا خاص آدمی خدا بخش بھی ان کارروائیوں میں سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ مجتبیٰ کنور نے اسے ایک مقامی سکھ کے ساتھ اٹیچ کر رکھا تھا اور یہ دونوں افراد اسٹیشن کے نزدیک ایک عمارت کی نگرانی کر رہے تھے۔ یہ پچھلے اتوار کی بات ہے۔ مجتبیٰ کنور کو خدا بخش کی طرف سے ایک اہم ٹیلیفون کال موصول ہوئی۔ یہ کال خدا بخش نے کسی پبلک ٹیلیفون بوتھ سے کی تھی۔ اس نے مجتبیٰ سے کہا کہ اسے ایک بہت اہم سراغ ملا ہے۔ وہ اس سراغ کی تصدیق کے لیے جا رہا ہے۔ بہت جلد وہ خوشخبری سنائے گا۔ وہ بہت جلدی میں تھا اس لیے بات ادھوری چھوڑ کر چلا گیا۔ اس واقعے کے ٹھیک بارہ گھنٹے بعد اس کی موت کی اطلاع آ گئی۔ اسے اتوار کی رات ہی نو دس بجے کے قریب قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش شاہ پور سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے سرکنڈوں سے ملی۔ خدا بخش کی جیب میں ایک موٹر سائیکل کی رسید موجود تھی۔ اس رسید کی مدد سے مقامی پولیس کو اس کا اتا پتا معلوم ہوا اور ایک اہلکار نے یہاں حیدرآباد آ کر مجتبیٰ کنور کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ جائے واردات پر خون بکھرا ہوا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل اور مقتول میں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ قاتل کوئی طاقتور شخص تھا۔ اس نے خدا بخش کا سر بڑے زور کے ساتھ ایک پلی کی دیوار سے ٹکرایا تھا اور اس کی کھوپڑی سامنے کی طرف سے چٹک گئی تھی۔ قاتل سے جدوجہد کے دوران میں مقتول نے مدد کے لیے چیخ و پکار بھی کی تھی۔ قریبی راستے سے گزرنے والے کچھ راہگیر بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے تھے۔ انہوں نے مقتول کے قریب ایک سایہ سا دیکھا اور اس کے پیچھے بھاگے۔ وہ کوئی عجیب الوضع شخص تھا۔ اس کا سر معمول سے بہت بڑا نظر آتا تھا۔ راہگیروں میں سے ایک شخص اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا لیکن اسے پکڑنے میں ناکام رہا۔ قاتل نے اس پر بھی کسی تیز دھار شے سے حملہ کیا تھا۔ یہ شخص تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔" مسٹر جی کلارک نے اس دیہاتی کی طرف اشارہ کیا جس کا نام انہوں نے ابدال بتایا تھا۔

میری نگاہ اس شخص کے زخمی بازو پر چلی گئی۔ بازو پر بندھی ہوئی سفید پٹی یقیناً اسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ کلارک صاحب نے کہا "مقامی پولیس تو ڈھیلی ڈھالی تفتیش کر رہی تھی۔ ہم نے مسٹر اینڈرے کو بھی متحرک کر دیا۔ مسٹر اینڈرے سراغ رسانی کی زبردست صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ پُرخطر حالات میں اس کا دماغ کسی تیز کمپیوٹر کی طرح کام کرنے لگتا ہے۔ وہ جائے واردات پر پہنچا اور بہت جلد اس نے یہ بات پوائنٹ آؤٹ کر لی کہ جس رات نہر کے کنارے سرکنڈوں میں واردات ہوئی اسی رات آٹھ دس میل دور جگرگاں نامی گاؤں میں بھی ایک فرد قتل ہوا اور دوسرے کو شدید زخمی کیا گیا۔ ان دونوں واقعات میں پانچ چھ گھنٹے کا فرق موجود تھا۔ یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ قاتل پہلی واردات کرنے کے بعد جگرگاں پہنچا ہو اور وہاں بھی خون کی ہولی کھیلی ہو۔ اس شبے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ طریقۂ واردات ملتا جلتا تھا۔ جگرگاں گاؤں میں قتل ہونے والے شخص کا سر بھی دیوار سے ٹکرایا گیا تھا یا پھر کسی وزنی شے سے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ اینڈرے نے اپنی تفتیش کا رخ جگرگاں گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ اسی دوران میں ایک قتل جگرگاں میں اور ہو گیا۔ ایک عورت ایسے ہی حملے میں شدید زخمی ہوئی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں تو پہلے ہی ہو رہی تھیں لیکن ان واقعات کے بعد حالات مکمل طور پر پُراسرار رنگ اختیار کر گئے۔ اب پورے علاقے میں خوف و دہشت کی فضا پیدا ہو چکی ہے اور جگرگاں کی بیشتر آبادی نقل مکانی کر گئی ہے۔ لوگ سرِ شام گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔ خاص ... اور شعبدے باز قسم کے لوگ نت نئی افواہیں پھیلا رہے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ اینڈرے کو تھوڑا سا وقت مل جاتا تو شاید وہ کسی اہم سراغ تک پہنچ جاتا لیکن مقامی لوگ اس سے بالکل تعاون نہیں کر رہے۔ بلکہ اب تو اس کے لیے جگرگاں میں گھسنا بھی ممکن نہیں رہا۔ کسی مقامی عامل نے یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ اگر غیر مقامی لوگ گاؤں میں آتے رہے تو مزید آفات آئیں گی۔ خاص طور پر کسی بے عقیدہ غیر ملکی کا بار بار آنا بہت خطرناک ہے۔ "غیر ملکی" سے اس عامل کی مراد اینڈرے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں ایمرجنسی میں یہاں بلایا ہے۔ یہ ہمارے لیے بہت اہم معاملہ بن چکا ہے۔ ایک ایسا شخص قتل ہوا ہے جو نہ صرف مجتبیٰ کنور کا دیرینہ ساتھی تھا بلکہ ہمیں "ٹریژر" کے حوالے سے کوئی خاص اطلاع بھی دینے جا رہا تھا۔"

جی کلارک صاحب خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا "معاملہ تو واقعی دلچسپ ہے جناب..... لیکن سوال یہ ہے کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے....."

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔" مسٹر جی کلارک نے میری بات

اُچکی "میں تمہیں فری ہینڈ دینا چاہتا ہوں۔ تم مقامی حلقے میں بآسانی دیہاتی لوگوں میں گھل مل سکتے ہو۔ جگرگاں میں کسی کو تمہاری آمد ورفت پر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری رائے ہے کہ تم ابھی اینڈرے سے مل لو۔ اس کے فوراً بعد ابدال کو لے کر جگرگاں چلے جاؤ۔ موقع پر جا کر جو کچھ تم دیکھو گے اور محسوس کرو گے وہ زیادہ اہم ہوگا۔"

میں نے کہا "جناب! کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ہم اس کام کے لیے مقامی پولیس میں سے ہی کسی باصلاحیت افسر کو منتخب کرتے؟"

"میں نے اور مجتبیٰ نے اس بارے میں بھی سوچا تھا۔" جی کلارک صاحب نے کہا "لیکن یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے کسی خاص شخص کو ہی "ہینڈ اوور" کیا جا سکتا ہے اور موجودہ حالات میں ہماری نظر میں وہ خاص شخص تم ہی ہو۔"

"میرے نزدیک یہ میری عزت افزائی ہے۔" میں نے کہا۔

کلارک صاحب جلدی سے بولے "بس ٹھیک ہے۔ تم پہلے اینڈرے سے مل لو پھر ابدال کے ساتھ جگرگاں چلے جاؤ۔"

میں ابھی کلارک صاحب سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے جگرگاں بھیجنے کے سلسلے میں بہت جلدی میں نظر آتے تھے۔ میں حیدرآباد (فاروق نگر) سے ایسے وقت میں بھوپال روانہ ہو گیا تھا جب حالات بہت نازک موڑ پر تھے۔ اس وقت گمشدہ صندوق بڑے نواب شہریار جنگ کی تحویل میں تھے۔ ان کا رجحان اللہ کی طرف ہو گیا تھا اور وہ یہ ساری دولت گورنمنٹ آف انڈیا کے حوالے کر دینا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں نئی دہلی سے فیڈرل منسٹر راجندر سنگھ چوپڑا خصوصی طور پر حیدرآباد پہنچا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ در، نواب شہریار جنگ تک پہنچتا میں نے اس پر قابو پا لیا تھا اور اس کے روپ میں خود نواب شہریار تک پہنچ گیا تھا۔ مگر پھر صورت حال نے ایک اور کروٹ لی تھی۔ اس سے پیشتر کہ نواب شہریار مجھے صندوقوں کے بارے میں کچھ بتاتے وہ اپنے نافرمان بیٹے نواب فیروز جنگ کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے اور پورے حیدرآباد میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ بعد کے حالات کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ میں کلارک صاحب سے اس بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ بہت جلدی میں تھے۔ وہ مجھے فوراً سے پیشتر روانہ کر دینا چاہتے تھے۔ میں نے دس پندرہ منٹ اینڈرے سے گفتگو کی اور اس کی تفتیش کا احوال سنا پھر ابدال نامی حیدرآبادی کے ساتھ جائے واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔

O☆O

دوپہر کے دو بجے تھے۔ میں اور ابدال اسی جگہ کھڑے تھے جہاں چھ سات دن پہلے خدا بخش پُراسرار طور پر قتل ہوا تھا۔ یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ ایک طرف نہر تھی۔ نہر کے کنارے رتیلے تھے اور ان رتیلے کناروں پر دور تک سرکنڈے لہراتے نظر آتے تھے۔ سرکنڈوں کی اس فصیل کے عقب میں درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔ بیری اور شہتوت وغیرہ کے درخت میں دور سے بھی پہچان سکتا تھا۔ اس جگہ سے قریب ترین گاؤں "جگرگاں" تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس کا فاصلہ کم و بیش آٹھ میل تھا۔ ہاں راستے میں پیڑوں کے نیچے کہیں کہیں اِکا دُکا مکان موجود تھے۔ خدا بخش کی لاش ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر ملی تھی۔ معلوم نہیں وہ اس ویران جگہ پر کیا کرنے کے لیے آیا تھا۔ یقیناً وہ یہاں تک پیدل پہنچا تھا۔ علاقے میں آمدورفت کا واحد ذریعہ دیہاتی تانگے تھے۔ اگر وہ تانگے پر آیا تھا تو بھی اسے جائے واردات سے قریباً چار فرلانگ دور اترنا پڑا ہوگا۔ اپنے قتل سے چند گھنٹے پہلے خدا بخش نے مجتبیٰ کو فون پر بتایا تھا کہ اسے ایک اہم سراغ ملا ہے۔ اس کے لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد جلدی میں ہے..... عین ممکن تھا کہ وہ کسی شخص کا تعاقب کرتے ہوئے اس دور افتادہ مقام پر پہنچا ہو۔ جس کا تعاقب کیا جا رہا تھا انہیں شک ہو گیا ہو اور انہوں نے خدا بخش کو جان سے مار ڈالا ہو۔ موقع کا ایک گواہ میرے ساتھ ہی موجود تھا یعنی ابدال احمد۔ اس نے دور ایک چوڑی پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا اور حیدرآبادی لہجے میں بولا "ہم اس پگڈنڈی پر جا رہے تھے جی..... کل آٹھ بندے۔ تھے ہم۔ نہر پار کے ایک گاؤں میں مرگ ہو گئی تھی۔ جنازہ پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ میرا خیال ہے وہ کوئی ساڑھے نو بجے کا وقت ہوئیں گا۔ ہم اس جگہ پر پہنچے تو کوئی بڑے غصے سے بولا پھر چیخیں سنائی دینے لگ گئیں۔ بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم میں سے چار بندوں کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ ایک لالٹین بھی تھی۔ پہلے تو ہم گھبرائے۔ پھر سرکنڈوں کے اندر سے گزر کر آواز کی طرف دوڑے۔ میں سب سے آگے تھا۔ اس پرانی پلی کے بازو میں میں نے ایک بندے کو زمین پر گرتے دیکھا۔ ایک لمبا چوڑا سایہ سا اس کے نزدیک (قریب) تھا۔ میں اللہ رسول پر ایمان رکھنے والا بندہ ہوں جی۔ خدا میری زبان سے جھوٹ نہ بلوائے۔ اس سائے کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کوئی عجیب سی شے تھی وہ۔ نہ انسان نظر آتا تھا نہ جانور۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ پھر قدرت نے حوصلہ دیا اور میں اس کے پیچھے بھاگا۔ میں نے اندھا دھند لاٹھی بھی چلائی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ لاٹھی اس کو لگی تھی یا نہیں۔ وہ سرکنڈوں میں گھس گیا تھا۔ ایک دم پلٹ کر اس نے مجھے کچھ مارا۔ کوئی چاقو خنجر کا تے ہوئیں گا۔ میری کہنی کے پاس انگارے سے اتر گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر سرکنڈوں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کس طرف جا رہا ہے۔ ہم نے اس کا پیچھا جاری رکھا۔ رات کے وقت کھیتوں میں کام کرنے والے تین چار ہور بندے بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ نہر کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں میں ہم دور تک اس کے پیچھے گئے۔ آگے جا کر سرکنڈے ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ اس مقام پر جا کر وہ پکڑا جائے گا۔ لیکن جب سرکنڈے ختم ہوئے تو اس کا نام و

نشان بھی نہیں تھا۔ ہمیں شک گزرا کہ شاید ہم کسی کتے بلی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ہم ایسی جگہ پہنچے اس درخت تک لاش جوں کی توں پڑی تھی۔ چار پانچ دیہاتی موقعے پر (موقع پر) جمع ہو چکے تھے۔ ان کے پاس دو تین لالٹینیں بھی تھیں۔ مقتول نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے خود اس کی تلاشی لی۔ اس کے جیبی بٹوے میں نقدی اور کچھ ضروری کاغذات تھے۔ ایک پستول بھی موقعے سے ملا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مقتول کا پستول ہے کیونکہ اس کی قمیص کے نیچے چمڑے کا ہولسٹر لگا ہوا تھا۔ میں نے جائے واردات پر موجود کسانوں کو ہدایت کی کہ وہ یہاں موجود کسی شے کو نہ چھیڑیں۔ پھر میں نے ایک تانگے کا انتظام کیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ راج گڑھ پہنچا۔ وہاں سے ہم نے شاہ پور کے پولیس اسٹیشن میں فون کیا اور بتایا کہ بڑی نہر کے کنارے بندہ قتل ہو گیا ہے۔"

میں نے ابدال احمد سے پوچھا "پولیس نے اردگرد کے لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہوگی؟"

"جی ہاں" ابدال احمد نے جواب دیا "انسپکٹر صادق علی (صادق علی) نے یہ ڈیوٹی میرے ہی ذمے لگائی تھی۔ میں نے جائے واردات کے آس پاس رہنے والے تمام لوگوں کو جمع کیا اور انہیں باری باری انسپکٹر صادق کے سامنے پیش کیا۔ ان میں چار پانچ کاشت کار تھے۔ ایک بھٹا کے تین چار ملازم تھے۔ تھوڑا آگے جا کر نہر کے کنارے چند چھوٹے چھوٹے باغ ہیں۔ وہاں رکھوالی پر رہنے والے بھی پولیس کے سامنے پیش ہوئے۔ اس لمبی چوڑی تفتیش سے کوئی بھی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ مقتول کے ساتھ کسی کی جان پہچان تھی اور نہ کبھی کسی نے پہلے اسے یہاں دیکھا تھا۔"

میں نے ابدال احمد سے پوچھا "تم جگرگاں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں جی۔ یہاں آگے چل کر نہر کے کنارے ہی پندرہ بیس گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی "مزار شریف" ہے۔ وہاں رہتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "جس رات خدا بخش قتل ہوا' اسی رات جگرگاں میں بھی ایک واردات ہوئی تھی؟"

"جی ہاں" ابدال احمد نے جواب دیا "ایک بندہ ہلاک ہوا تھا۔"

میں نے کہا "تم اور تمہارے ساتھی شاہ پور ٹیلیفون کرنے راج گڑھ گئے تھے۔ وہاں سے تمہاری واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟"

"یہی کوئی رات ایک بجے کے لگ بھگ۔"

"اور جگرگاں والی واردات؟"

"وہ رات تقریباً تین بجے ہوئی تھی۔"

"یعنی راج گڑھ سے تمہاری واپسی کے دو گھنٹے بعد تقریباً جگرگاں میں واردات ہوئی۔" ابدال احمد نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "اس واردات کے بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا ہے؟"

واردات کا تصور کر کے ابدال کی آنکھوں میں انجانا سا خوف لہرا گیا۔ بولا "کہنے کو تو یہ واردات اسی رات ہوئی تھی جس رات خدا بخش قتل ہوا۔ مگر اس واردات کا پتا اگلے روز شام کو ہی چل سکا۔ قتل ہونے والا گاؤں کا ایک کاشتکار امریش تھا۔ وہ علی الصباح ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ بیدار ہوا۔ اسے کھیتوں میں پانی دینے کے لیے جانا تھا۔ کسی کام سے وہ گھر کے پچھواڑے والی کوٹھڑی میں گیا۔ اس کوٹھڑی میں پرال بھرا ہوا تھا اور دیگر کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ کوٹھڑی کے اندر کوئی شخص پہلے سے چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے امریش پر حملہ کر کے اسے جان سے مارا اور بھاگ گیا۔ امریش کا اپنے چھوٹے بھائی سے گھر کے بٹوارے پر جھگڑا چل رہا تھا۔ واردات سے ڈیڑھ پونے گھنٹے پہلے بھی دونوں بھائیوں میں سخت کلامی ہوئی تھی۔ مقتول امریش جب دوپہر کو کھانے پر گھر نہیں آیا تو اس کی پتنی نے سمجھا کہ شاید رات میں ہونے والے جھگڑے کی وجہ سے وہ ناراض ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی لاش پچھواڑے والی کوٹھڑی میں پڑی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ سارا دن اس کوٹھڑی کی طرف کسی کا جانا نہ ہوا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے مقتول کی والدہ اپلے لینے کے لیے کوٹھڑی میں گئی اور پرال کے درمیان بیٹے کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ لاش بالکل سیدھی پڑی تھی۔ پاس ہی کسی اور درانتی وغیرہ رکھی تھی۔ مرنے والے کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور سر میں سے خون کے ساتھ ساتھ مغز بھی بہہ گیا تھا۔ مقتول کی پتنی کا یہ کہنا ہے کہ اس کے پتی کو اس کے دیور نے مارا ہے لیکن دیگر اہل خانہ اور گاؤں والوں کی رائے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریش کا بھائی ایسا کام نہیں کر سکتا اور یہ کہ اس کی پتنی وقتی صدمے کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ مقتول کے بارے میں اس کی والدہ اور بہن بھائیوں نے ایک عجیب بات بتائی ہے۔ وہ پچھلے دو تین مہینوں سے سخت پریشان تھا۔ بظاہر پریشانی کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اسے وہم سا ہو گیا تھا کہ اسے یا اس کے بال بچوں کو کچھ ہو جائے گا۔ خاص طور سے اپنے بارے میں وہ ہر وقت پریشان کن باتیں سوچتا تھا۔ کبھی کہتا تھا' میں ڈوب کر مر جاؤں گا' کبھی کہتا تھا میری ارتھی اٹھنے والی ہے۔ سر میں ہر وقت درد رہتا تھا۔ کچھ عرصے سے اس نے عاملوں اور جھاڑ پھونک والوں کے پاس جانا شروع کر دیا تھا اور مزاروں پر حاضری دینے لگا تھا۔ ہندو عام طور پر قوالی (قوالی) نہیں سنتے لیکن وہ قوالی سننے لگا تھا۔ اپنے مرنے سے فقط چار پانچ دن پہلے اس نے جگرگاں کے میلے میں ایک مسلمان بزرگ کے مزار پر دو سو روپے کی اگربتیاں جلائیں اور پھر قوالی سنی۔ قوالی سننے کے دوران میں اسے زور کا "حال" پڑا کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ نکلی۔ جس دن امریش کی ارتھی اٹھی' اسی دن رنگیں سرگوشیاں کرنے لگے تھے کہ یہ قتل وقتل کچھ نہیں' یہ ہوائی چیزوں کا کام ہے۔ پھر دوسرے دن جب لوگوں کو یہ پتا چلا کہ آٹھ دس میل دور بڑی نہر کے کنارے "پرانی پلی" پر بھی ایک قتل ہوا ہے اور قاتل کا حلیہ عجیب و غریب تھا تو وہ فوراً یہ کہنے لگے کہ یہ دونوں قتل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں اور یہ ہوائی چیزوں کی کارستانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پورے علاقے میں شدید قسم کا خوف و ہراس پھیل گیا۔"

میں نے کہا "میں نے سنا تھا کہ جس رات امریش قتل ہوا اس روز کوئی زخمی بھی ہوا تھا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" ابدال نے جواب دیا۔ "دراصل امریش کی لاش دیکھ کر اس کی والدہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ گرتے ہوئے اس کا سر کوٹھڑی کی دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔ کسی نے کہا' امریش کے بعد ہوائی چیز والے نے اس کی ماتا کو بھی جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ بس یہی بات سارے علاقے میں پھیل گئی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی سچی جھوٹی باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگرگاں میں آج دو تین افراد ایسے ہیں جو پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ انہوں نے اندھیرے میں کسی پراسرار شے کو دیکھا ہے۔ کوئی اس کا سر بہت بڑا بتاتا ہے' کوئی کہتا ہے کہ وہ انسان کی شکل کا جانور ہے۔ ان باتوں سے کچھ ہو نہ ہو' یہ بھی پتا ہو لیکن اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ جگرگاں میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔ اور پرسوں ہونے والے قتل کے بعد تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو گئی ہے۔"

"یہ قتل کہاں ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جگرگاں کے بڑے قبرستان میں۔" ابدال نے میرے قریب گھاس پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "قتل ہونے والی چھیماں نامی ایک عورت تھی۔ اس کا خاوند جیل میں ہے۔ اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے خود بھی اسے دیکھا ہوا ہے۔ جوان سال تھی اور شکل بھی اچھی تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ آٹھ دس بھینسیں تھیں۔ اکیلی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی اور چرانے کے لیے بھی لے جاتی تھی۔ پرسوں دوپہر بھی وہ بھینسیں چرا کر واپس آ رہی تھی۔ راستے میں اسے قبرستان کے قریب سے گزرنا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ قبرستان کے اندر چلی گئی۔ بھینسیں اس کے بغیر ہی گھر واپس آ گئیں۔ چھیماں کا چھوٹا بچہ جس کی عمر ڈیڑھ سال ہے ایک بھینس کے اوپر سوار تھا۔ گھر والوں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ عصر کی نماز کے بعد گاؤں کے پیش امام صاحب کسی قبر (قبر) پر فاتحہ پڑھنے کے لیے قبرستان گئے تو انہوں نے چھیماں کی لاش گھنی جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی دیکھی۔ شاخیں کاٹنے والی لمبی چھری' جو چھیماں کی تھی' اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ چھیماں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کا لباس بری طرح پھٹا ہوا تھا اور جسم جگہ جگہ سے ننگا ہو رہا تھا۔ بالائی جسم پر تشدد کے نشانات بھی تھے۔ بعد ازاں چھیماں کی ایک بچھیری بھی قبرستان کے اردگرد گھومتی پائی گئی۔ اندازہ ہوا کہ وہ بچھیری ریوڑ میں سے بھاگ نکلی ہو گی۔ چھیماں بچھیری کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے قبرستان میں گئی ہو گی۔ وہاں پر اس بدقسمت کے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا ہو گا۔ جگرگاں کا یہ قبرستان کافی پرانا ہے اور بہت بڑا بھی ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہاں اس عورت کے ساتھ کیا ہوا۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ کسی نے اسے جبراً جھاڑیوں میں گرا لیا اور اس کی آبرو لوٹنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ بہرحال جناب۔ اس واقعے کے بعد تو سب لوگ ایک دم دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تو جگرگاں سے نقل مکانی آج شروع کر دی ہے اور تو اور ہماری پولیس کے شیر جوان بھی جگرگاں میں آتے ہوئے خوف کھانے لگے ہیں۔ رہی سہی کسر عاملوں اور جھاڑ پھونک والوں نے پوری کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس پورے علاقے پر جنات کا سایہ ہے اور وہی لوگوں کی جانیں لے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ابدال احمد! تم پولیس کے لیے مخبری کا کام بھی کرتے ہو۔ مخبر ایک ہوشیار و سمجھدار شخص ہوتا ہے' اور میں تمہیں ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری ذاتی رائے ان واقعات کے بارے میں کیا ہے؟"

ابدال احمد کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کا سایہ سا لہرایا۔ اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا "میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا جناب' لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ ہر بندے کا ذہن دہشت کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ شاید میں دوسرے لوگوں کی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتا لیکن میں اپنی آنکھوں سے بھی کچھ دیکھ چکا ہوں۔ کسی جانور یا انسان کا اتنا بڑا سر اور پھر وہ چھلاوے کی طرح سرکنڈوں میں غائب ہو گیا' سمجھ سے تو باہر ہے۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ یہاں ہے ضرور۔ ورنہ یہ لوگ کیسے قتل کیا کیا معنی رکھتے ہیں۔ کسی نے ان لوگوں کو قتل کیا ہے تو وہ ہوئے ہیں نا۔ کوئی خود سے قتل نہیں ہو جاتا۔"

میں نے کہا "کئی بار جرائم پیشہ لوگ حالات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دہشت کی فضا بنی ہوئی ہے۔ ایسے میں جرم ہو جائے تو تفتیش فوراً غلط سمت بھٹک جاتی ہے۔"

"میں آپ کی اس بات سے سو فیصد اتفاق نہیں کر سکتا جی۔ قتل کی ان تینوں وارداتوں میں پولیس نے اب تک دل جمعی سے تفتیش کی ہے لیکن کسی ایک کیس کا سرا بھی ہاتھ نہیں آیا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ بالکل اندھے قتل ہیں۔ صرف امریش والے واقعے میں پولیس کو تھوڑا بہت شک تھا کہ شاید یہ اس کے چھوٹے بھائی کا کام ہو لیکن اب تک کی تفتیش میں وہ بھی بے گناہ ثابت ہوا ہے۔"

سورج اب اپنا نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا۔ نہر کے پانی پر

دھوپ کی کرنیں اشرفیاں سی بکھیر رہی تھیں۔ میں نے گہری نظروں سے وہ مقام دیکھا جہاں چند روز پہلے خدا بخش کبھی نہ اٹھنے کے لیے گرا تھا۔ وہ اپنی موت کے مقام پر مرنے کے لیے لاہور سے چل کر آیا تھا اور اب اس کا جسدِ خاکی پھر لاہور پہنچ چکا تھا۔ منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔ مجنّی کور اسی کی تجہیز و تکفین کے لیے لاہور گیا تھا اور ابھی تک وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "چلو ابدال احمد! اب جگر گاں چلتے ہیں۔"

حیدر آبادی طرز کے خستہ حال تانگے نے کچے پکے راستے پر سفر کر کے ہمیں بعد از شام جگر گاں پہنچایا۔ کہنے کو تو یہ گاؤں تھا لیکن آبادی چھوٹے موٹے قصبے سے کم نہیں تھی۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے لالٹینیں جل چکی تھیں اور تاریکی نے اُجالے کی آخری رمق کو بھی نگل لیا تھا۔ گاؤں کا وسیع قبرستان گاؤں کے دامن میں واقع تھا اور اپنے گھنے جھنڈوں کی وجہ سے دور ہی سے نظر آتا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں اُداسی ناچ رہی تھی اور ہر شے کو کسی پُراسرار اندیشے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ گاؤں میں ایک بازار بھی تھا جو مکمل طور پر بند تھا، ہاں گلیوں میں اکا دکا افراد نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا لیکن ابدال احمد میرے ساتھ تھا لہٰذا یہ شک "اظہار" کی حد تک نہیں پہنچا۔

ابدال احمد مجھے سیدھا اپنے ایک دیرینہ دوست پٹواری نواب دین کے گھر لے گیا۔ پٹواری نواب دین کا گھر تین چار اونچی چھت والے کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں نواب دین اپنی دو جواں سال بیویوں اور تین بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اپنی جگہ نواب دین بھی ایک انوکھا کردار تھا۔ عمر بمشکل تیس سال رہی ہوگی۔ کالا بھجنگ چہرہ اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ تاہم اس میں پٹواریوں جیسی کرختگی نہیں تھی۔ ملائم لہجے میں بات کرتا تھا اور ہنس مکھ بھی تھا۔ اس نے دونوں شادیاں صرف پانچ ماہ کے وقفے سے کی تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں بیویاں آپس میں سہیلیاں تھیں اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بھی سہیلیاں ہی تھیں۔ نواب دین نے انہیں بڑے انصاف اور سلیقے سے رکھا ہوا تھا اور ان دونوں نے بھی سوکن پنے کو قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ جس وقت ہم دونوں ان کے گھر میں داخل ہوئے اس وقت بھی ان دونوں نے بڑے سلوک سے نواب دین کی ایک ایک ٹانگ بانٹ رکھی تھی اور اسے دبانے میں مصروف تھیں۔ گھر کا دروازہ نواب دین کے چھ سالہ بچے نے کھولا تھا۔ نواب دین بڑے تپاک سے ملا اور ہمیں گھر کی بیٹھک میں لے آیا۔ بھوک نہیں تھی لیکن اس نے زبردستی ہمیں کھانا کھلایا۔ کھانے کے دوران میں گفتگو بھی جاری رہی۔ گاؤں پر چھائے ہوئے خوف کے بادلوں کی گھٹن نواب دین کے گھر میں بھی محسوس ہوتی تھی۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ بیرونی دروازے کی چوکھٹ پر ایک چاندی سا لٹک رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چمڑے میں سیا ہوا بڑا سا تعویذ ہے۔

نواب دین نے کہا کہ اس کی گھر والیاں بہت خوفزدہ ہیں! چھوٹی بیوی اپنے میکے جانا چاہ رہی ہے لیکن دونوں میں اتنی محبت ہے کہ ایک دوسرے کی جدائی پسند نہیں کرتیں۔ بڑی کہتی ہے کہ میں بھی ساتھ ہی جاؤں گی اور اگر وہ دونوں چلی گئیں تو گھر کون سنبھالے گا؟ اسے روٹی پکا کر کون دے گا۔ لہٰذا وہ کوشش کر رہا ہے کہ ابھی وہ دونوں یہیں رہیں۔ اگر کوئی چارہ نہ رہا تو پھر وہ سب چلے جائیں گے اور گھر کو تالا لگا جائیں گے۔

میں نے نواب دین سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی جنوں بھوتوں کی ایسی کارستانیوں پر یقین رکھتے ہیں؟"

وہ بولا "آپ سے کس نے کہا ہے کہ یہ سب جن بھوت کر رہے ہیں؟"

"سب لوگ کہہ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"لوگوں کی باتیں چھوڑیں جی۔ لوگوں کے منہ میں تو جو آتا ہے کہہ دیتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ باتیں وہ بناتے ہیں جو بالکل انگوٹھا چھاپ لوگ ہیں۔ یہ جن بھوت کا چکر نہیں ہے۔ مگر یہ کوئی سیدھا سادہ معاملہ بھی نہیں ہے۔ کوئی بہت گڑا خسم (قسم) کا ہیر پھیر ضرور ہے اس میں۔ جن دو چار لوگوں نے اپنی آنکھوں سے قاتل کو دیکھا ہے وہ بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ کوئی بہت خوفناک خسم کا جانور ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ خوفناک خسم کا جانور یہاں کہاں سے آگیا۔ گیدڑ، لومڑ اور سور وغیرہ کے سوا یہاں کسی جانور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ایک بات بار بار میرے ذہن میں آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی ہوشیار خسم کا بندہ ہو جس نے لوگوں کو وحشت زدہ کرنے کے لیے عجیب و غریب شکل بنا رکھی ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ ایک ہی بندہ ہے؟" میں نے پٹواری سے پوچھا۔

"بالکل جی۔ یہ سو فیصد کسی ایک شخص کا کام ہے۔ پرسوں جو قتل ہوا ہے وہ قبرستان کے اندر ہوا ہے۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ وہ بندہ یا جانور جو کوئی بھی ہے قبرستان کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو۔ کل صبح ہمارے چوہدری صاحب کے بلاوے پر شاہ پور تھانے سے پولیس کے آٹھ دس اہلکار آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک سب انسپکٹر بھی تھا۔ ان لوگوں نے قبرستان کے اندر ایک چھوٹا سا گشت لگایا تھا۔ گشت بھی کیا تھا بس تھوڑی سی چہل قدمی کر کے باہر آگئے تھے۔ آخر کو تو وہ بھی ہماری طرح دیہاتی ہیں۔ بھوت پریت کا خوف ان کی گھٹی میں بھی پڑا ہوا ہے۔ بدبختوں کے زرد چہرے ہو رہے تھے۔ بس سارا دن قبرستان کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ ایک دو بار ہوائی فائر بھی کیے۔ شام سے پہلے پہلے واپس چلے گئے۔"

ابدال احمد نے کہا "میری اپنی رائے بھی یہی ہے۔ یہ صرف

ایک بندے کا کام ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بندہ قبرستان کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہو۔ اگر گاؤں کے لوگ ہمت کریں اور دو چار سو بندہ گھیراؤ ڈال کر قبرستان میں گھس جائے تو قاتل پکڑا جا سکتا ہے۔"

"لیکن یہ ہمت کرے گا کون؟" نواب دین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "گھروں میں بیٹھے بیٹھے تو پیشاب خطا ہو رہا ہے ان لوگوں کا۔ کل ہمارے پڑوس میں ایک بچی کو دورہ پڑ گیا۔ اس کی ماں گلی میں آکر چیخ چلا رہی کہ کوئی حکیم صاحب کو بلا لائے۔ کسی نے گھر کا دروازہ آج نہیں کھولا۔ میری بڑی بیوی نے مجھے جگایا کہ باہر پڑوسن واویلا کر رہی ہے۔ میں باہر نکلا اور حکیم صاحب کو لے کر آیا۔"

"کیا ہوا تھا لڑکی کو؟" ابدال احمد نے پوچھا۔

"بس ڈر گئی تھی۔ بارہ تیرہ سال لڑکی ہے۔ رات دن جن بھوتوں کی باتیں سن سن کر اثر ہو گیا بے چاری پر۔ بچہ تو ہوتا کچے ذہن کا ہے۔"

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ موسم میں خنکی تھی۔ نواب دین کے حقے کی چلم میں دہکتے ہوئے انگارے بھلے لگ رہے تھے۔ رات کے نو بجے تھے لیکن یوں لگتا تھا کہ رات آدھی ہو گئی ہے۔ ہام ور خاموش تھے صرف آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دیہات میں رات جلدی شروع ہو جاتی ہے اور یہاں تو ویسے بھی حالات معمول کے مطابق نہیں تھے۔ بڑا افسانوی سا ماحول بن گیا تھا پٹواری نواب دین کی بیٹھک میں۔ ابدال نے نواب دین سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ میں اس کا پرانا واقف ہوں۔ حیدر آباد میں ایک ڈاکٹر کی دکان پر کمپاؤنڈری کرتا رہا ہوں اور اب کسی کماتے پیتے گاؤں میں اپنی ڈسپنسری کھولنا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں جائزہ لینے کے لیے اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوں۔ پٹواری نواب دین نے کہا "ابدال میرے بھائیوں جیسا ہے۔ اگر تم اس کے دوست ہو تو میرے بھی دوست ہو۔ جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو بلکہ میرے اسی گھر کی بیٹھک میں ڈسپنسری کھول سکتے ہو۔"

ایک حیدر آبادی سے ایسی ہی وضع داری کی توقع کی جا سکتی ہے، بے شک وہ پٹواری ہی کیوں نہ ہو۔ پٹواری ہونے کے باوجود نواب دین تھوڑی بہت شاعری بھی کرتا تھا۔ یعنی اس کا تعلق صرف زمین کے قطعوں سے نہیں شاعری کے قطعوں سے بھی تھا۔ اس نے اپنی دونوں ازواج کے باہمی پیار کی مدح میں ایک طویل نظم ہمیں سنائی۔ رات دس گیارہ بجے تک ہمارے درمیان گپ شپ جاری رہی، پھر بیٹھک میں ہی ہم دونوں کے لیے بستر بچھا دیے گئے۔ نواب دین اپنی پیاری بیویوں کی طرف چلا گیا تو ہم بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میرا ذہن خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا تھا۔ قارئین اسے میری خود ستائشی نہ سمجھیں تو میں ایک بات کہوں گا۔ اسرار نے مجھے زندگی میں کبھی خوفزدہ نہیں کیا۔ چاہے اس اسرار کا تعلق فطرت سے ہو چاہے ماورائے فطرت سے۔ بھوت پریت، جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے، ہوائی چیزیں، یہ سارے الفاظ لڑکپن میں ہی میرے لیے بے معنی بن گئے تھے اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں کسی ایسے لفظ سے متاثر ہوتا یا اس حوالے سے کوئی واقعہ میرے لیے ذرا سی الجھن کا باعث بھی بنتا۔ میں بغیر کسی تفتیش اور تحقیق کے کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ جگر گاں اور ارد گرد کے علاقے میں ہونے والے واقعات میں کوئی ایسا انوکھا پن نہیں جو صرف عاملوں اور پنڈتوں کی سمجھ میں آ سکتا ہو اور عام آدمی دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جائے۔ تھوڑی سی پیچیدگی ضرور تھی لیکن کوشش سے اسے دور کیا جا سکتا تھا... ایک فیصلہ کر کے میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟" ابدال احمد نے چونک کر پوچھا۔

"تھوڑی سی چہل قدمی کرنے۔"

"کہاں؟"

"بس ذرا قبرستان تک۔" میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

ابدال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "شاید آپ مذاق کر رہے ہیں!"

"نہیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ میں ذرا وہاں گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جیب میں سے ریوالور نکال کر چیک کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن... لیکن اتنی رات گئے اور اکیلے۔" ابدال واقعی حیران تھا۔

"میرے لیے رات اور دن میں کوئی فرق نہیں۔ رہی بات "اکیلے پن" کی تو میں وہاں بھی اتنا ہی سکون محسوس کروں گا جتنا یہاں کر رہا ہوں۔ اور اجِ خبیثہ سے میری پرانی شناسائی ہے۔"

ابدال احمد سراسیمہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا "کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" وہ پُراندیش لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھی جگر گاں کے عام لوگوں کی طرح سوچنے لگے ہو؟"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں لیکن۔"

"لیکن بھی کچھ نہیں۔ میں بیٹھک کے دروازے سے نکل جاتا ہوں۔ تم اندر والا دروازہ بند کر کے لائٹ آف کر دو۔ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔"

ابدال کو حیران و پریشان چھوڑ کر میں پٹواری نواب دین کے گھر سے نکل آیا۔ احتیاطاً ایک "ہتھیار" میں نے اور لے لیا تھا۔ یہ ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا جو ابدال احمد [illegible] کے پیچھے سے مجھے مل گیا تھا۔ اس ہتھیار نے آگے چل کر بہت کام دیا۔ قبرستان کے قریب پہنچتے ہی جب آوارہ کتوں نے میرا گھیراؤ کیا تو میں نے اسی ہتھیار سے انہیں تسلی بخش ضربات لگا کر پسپا ہونے پر

مجبور کردیا۔ گاؤں میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ اور قبرستان تو پھر قبرستان تھا۔ مدھم چاندنی میں جنڈ اور نیم کے درخت آسیبی ہیولوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ کچی پکی قبروں پر چاندنی برص کے داغوں جیسی نظر آتی تھی۔ گھنے درختوں تلے مکمل تاریکی تھی۔ مجھے سراغرسانی کا کبھی شوق نہیں رہا اور نہ میں ایسی صلاحیت رکھنے کا دعویدار ہوں لیکن کبھی کبھی حالات بندے کو ان چاہے راستوں پر بھی دھکیلنے لگتے ہیں۔ مسٹر جی کلارک کو نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ مجھے اس "تفتیش" پر بھیج دیا تھا۔ میں محتاط قدموں سے قبرستان کے وسطی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ شاخیں میرے چہرے سے چھو رہی تھیں اور قبروں کے درمیان سے راستہ تلاش کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ ایسا نہیں کہ خوف مجھ پر طاری نہیں تھا لیکن یہ ٹھوس اور ذی روح چیز کا خوف تھا' غیر مرئی اور ہوائی چیز کا خوف نہیں تھا۔ اس خوف کی نوعیت وہی تھی جو اس شخص پر طاری ہوتا ہے جو کسی واردات کے تعاقب یا کھوج میں کسی عمارت کے اندر داخل ہوتا ہے۔ یہ جن چمٹ جانے کا خوف نہیں ہوتا بلکہ کسی اندھی گولی یا ان دیکھے حملہ آور کا خوف ہوتا ہے۔ اور اس خوف کی میرے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔۔۔ میں کم و بیش ایک گھنٹا قبرستان میں گھومتا رہا۔ کبھی قبروں کے وہ کتبے پڑھنے لگتا جن پر براہ راست چاند کی روشنی پڑ رہی تھی۔ کبھی کسی درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ کبھی قبرستان کے تاریک ترین حصوں میں چکراتے لگتا۔ میری تمام حسیات بیدار تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں ریوالور پر دھرا تھا۔ کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے میں پوری طرح چوکس تھا۔ یوں اپنے آپ کو چارا بنا کر کسی پوشیدہ خطرے کے سامنے پیش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال کا اعصاب شکن دباؤ وہی محسوس کر سکتا ہے جس پر یہ کیفیت گزری ہو۔ اگر قبرستان میں "قاتل" موجود تھا تو یقینی بات تھی کہ وہ میری "سیر گشت" سے باخبر ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات یقینی نہیں تھی کہ وہ میرے سامنے بھی آئے گا۔ اس کے سامنے آنے کا انحصار اس کے اپنے حالات پر تھا۔ ممکن تھا کہ وہ سامنے آنا ہی نہ چاہتا ہو۔ جہاں تک مقتولہ چھیماں کی بات ہے وہ ایک عورت تھی۔ ممکن تھا کہ قاتل جنسی جنونی ہو۔ اور اگر نہ بھی ہوتا تو ایک عورت پر حملہ آور ہونے میں اسے زیادہ ہچکچاہٹ کا سامنا نہیں ہوا ہو گا۔ اور پھر ایک تیسری وجہ بھی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ چھیماں بے خبری میں خود ہی اس پناہ گاہ میں جا گھسی ہو جہاں قاتل چھپا بیٹھا تھا۔ اس انداز میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں امریش والا واقعہ آ گیا۔ وہ تب قتل ہوا تھا جب وہ بھوسے والی کوٹھڑی میں سے کوئی چیز لینے گیا تھا۔ قاتل پہلے سے وہاں موجود تھا' یا دوسرے لفظوں میں' وہاں چھپا بیٹھا تھا اس نے امریش پر حملہ آور ہو کر اس کی جان لے لی تھی۔ ان دونوں واقعات کی مماثلت سے یہ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ قاتل خود کو بچانے کے لیے چھپتا پھرتا ہے لیکن جب کوئی اس کے سامنے آ جاتا ہے تو وہ خوفزدہ ہو کر یا وحشت کے زیرِ اثر اس پر حملہ کرتا ہے۔ اس نے تینوں قتل بغیر کسی ہتھیار کے کیے تھے' حالانکہ اس کے پاس کوئی تیز دھار آلہ بھی موجود تھا۔ خالی ہاتھ تو قتل کرنا طاقتور کا کام ہوتا ہے اور اب تک ملنے والے شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ طاقتور بلکہ شہ زور شخص ہے۔ میں قاتل کو "شخص" قرار دے رہا ہوں۔۔ اور حقیقت یہی ہے کہ میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں گزرا تھا کہ قاتل ہمارے جیسے جیتے جاگتے انسان کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

ایک گھنٹے سے زائد وقت جگرگاں کے قبرستان میں گزارنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ گاؤں کی تاریک گلیوں میں سے گزر کر پٹواری نواب دین کے گھر تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں ابدال بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے "حیات" دیکھ کر اس کے سینے سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔

اگلا دن بھی ہم دونوں نے نواب دین کے گھر ہی گزارا۔ در و دیوار سے ایک پُراندیش خاموشی لپٹی ہوئی تھی۔ سہ پہر کے وقت نواب دین نمبردار کی حویلی میں گیا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ حویلی میں چالیس پچاس آدمی جمع ہوئے تھے۔ کافی دیر یہ پروگرام بنتا رہا کہ مسلح ہو کر قبرستان میں گھسا جائے اور اگر وہاں کوئی شخص یا جانور چھپا ہوا ہے تو اسے زندہ یا مردہ پکڑ لیا جائے۔ مگر یہ پروگرام بس پروگرام ہی رہا۔ باتیں سب کر رہے تھے "آگے بڑھنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ نواب دین نے مزید بتایا کہ جگرگاں کا سب سے بڑا عامل اور کالے جادو کا ماہر بھی حویلی میں موجود ہے۔ اس نے حویلی کے پھاٹک پر دھونی رما رکھی ہے اور مختلف تماشے کر رہا ہے۔

رات ہوتے ہی ایک بار پھر گاؤں کو تاریک دہشت نے ڈھانپ لیا۔ ناگفتہ بہ حالات کے باوجود نواب دین ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا مرغ' مٹن قورمہ اور حلوا شامل تھا۔ ساتھ میں ہاتھ کی بنی ہوئی سویاں تھیں جن کو مختلف رنگوں سے خوبصورت بنایا گیا تھا۔ ان سویوں نے پنجاب کے دیہات کی یاد تازہ کر دی اور اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت کچھ یاد آ گیا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کی ساری یادیں انہی دیہات سے وابستہ تھیں' اور ان یادوں میں غزالہ کی یاد بھی شامل تھی۔ جو ہر لمحے نت نئے رنگ میں میرے ساتھ رہتی تھی۔ ان بنی ہوئی سویوں کے حوالے سے بھی مجھے اپنا اور غزالہ کا ایک یادگار واقعہ یاد آ گیا تھا۔

رات کے دس بجے تو میں ایک بار پھر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ آج میں نے ابدال احمد کو سب کچھ بتا دیا تھا لہٰذا اس نے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ بیٹھک کا دروازہ کھول کر میں باہر نکلا اور دو تین سنسان گلیوں سے گزر کر قبرستان میں پہنچ گیا۔ آج مطلع ابر آلود تھا اور قبرستان میں گہری تاریکی تھی۔ ایک شکستہ قبر کے اندر دو کتے جوش و خروش سے غرا رہے تھے۔ وہی محبت کی نحوست والا ازلی

جھگڑا نظر آتا تھا۔ اگر یہ کتے "فیصلے" کے لیے میری طرف رجوع کرتے تو ان کی تواضع کے لیے میرے پاس کل رالا ہتھیار یعنی ہاکی کا دستہ موجود تھا۔ میں محتاط قدموں سے گہری تاریکی میں گھستا چلا گیا۔ آج میرا پروگرام تین چار گھنٹے یہاں گزارنے کا تھا۔ نجانے کیوں یہ بات بار بار میرے ذہن میں آ رہی تھی کہ میری یہ شب بیداری رنگ لائے گی۔

میں کچھ دیر قبرستان کے وسطی حصے میں گھومتا رہا پھر جنڈ کے ان درختوں کی طرف چلا گیا جہاں نماز وغیرہ پڑھنے کے لیے ایک پختہ چبوترہ سا بنا ہوا تھا۔ میں سر کے نیچے بازو رکھ کر چبوترے پر لیٹ گیا۔ ذہن پر مختلف خیالات کی یورش تھی۔ آخر وہ کیا اہم سراغ تھا جس تک مقتول خدا بخش کی رسائی ہوئی تھی۔ کیا اس کا قتل اسی سراغرسانی کا نتیجہ تھا' اور کیا یہاں جگرگاں میں ہونے والے دونوں خونی واقعات کا تعلق "منشر کنارے" والے واقعے سے تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ چنے گلی کی حویلی سے شروع ہونے والی کہانی جگرگاں کے اس قبرستان تک آن پہنچی ہے۔

اچانک میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ ریوالور تک پہنچ گیا۔ کہیں بالکل پاس ہی مجھے آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے دیکھا' ایک سرو قد ہیولا ایک پختہ قبر کی اوٹ سے نکلا اور دھیمی رفتار سے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا جہاں پانچ دن پیشتر چھیماں نامی عورت کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر ہیولے کا جائزہ لیا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ میرے علاوہ بھی کوئی قبرستان کی تاریکی میں موجود تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس کے چلنے کا انداز اور اوڑھنی کا پھیلاؤ فاصلے سے بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ یوں چل رہی تھی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ قبرستان میں لوگ اپنے پیاروں کی قبریں ہی ڈھونڈتے ہیں' تاکہ ان کی قربت کو محسوس کر کے زیادہ توجہ اور اخلاص سے بخشش کی دعا مانگ سکیں۔ لیکن اس قبرستان میں تو کوئی دن کے وقت بخشش کی دعا مانگنے کا رسک نہیں لیتا تھا۔ میں دو راتوں سے یہاں گھوم رہا تھا۔ نہ کسی قبر پر تازہ پھول نظر آئے تھے نہ کہیں دیا روشن کیا گیا تھا۔ شاید لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر آج کل اپنے لیے ہی دعائیں مانگ رہے تھے' پھر یہ کون عجوبہ عورت تھی جو رات کے اس پہر قبرستان میں چلی آئی تھی۔

مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں اپنی جگہ بیٹھا رہا تو وہ گہری تاریکی کے سبب میری نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ میں چبوترے سے اٹھا اور بڑی احتیاط سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جائے واردات پر رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ کم و بیش بیس گز تھا۔ لیکن میں کافی دیر سے یہاں موجود تھا اور میری آنکھوں میں اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت بڑھ چکی تھی۔

وہ سرتاپا ایک طویل چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی جواں سال عورت یا لڑکی ہے۔ چلتے ہوئے وہ دائیں بائیں دیکھتی جاتی تھی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ میں اس کے آہنی حوصلے کی داد دیتا اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی میری ہی طرح کسی خاص مقصد کے تحت یہاں چہل قدمی کر رہی ہے۔ وہ چل تو رہی تھی لیکن کہیں بھی جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ قبرستان کے انتہائی شمالی گوشے میں جا کر ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں زرد رو چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ میں اب اس بدوضع یا خوش وضع کو زیادہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ مجسم حقیقت شیشم کے تنے پر موجود تھی۔ اس کے مشرقی سینڈل اور ارغوانی اوڑھنی کے روپہلی تار چاندنی میں چمک رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد ایک بار پھر چاندنی تاریکی میں بدل گئی۔ میری نگاہیں عورت یا لڑکی کے ہیولے پر مرکوز تھیں۔ یکایک مجھے پھر چونکنا پڑا۔ جھاڑیوں کے اندر سے ایک اور سایہ نمودار ہوا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا۔ وہ ایک پختہ قبر کے بلند کتبے کی اوٹ میں تھا۔ اسے دیکھتے ہی عورت بھی چونک کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے منہ سے مدھم سی آواز بھی نکلی جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر وہ بے تاب قدموں سے چل کر اس دوسرے ہیولے کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دونوں پتھریلے کتبے کے عقب میں تھے' مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر بے آواز قدموں کتبے کی سمت بڑھا۔ اس موقع پر ذرا سی آہٹ بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ چھوٹی بڑی قبروں کے درمیان سے راستہ بناتا میں کتبے کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا جب اچانک میرا پاؤں ایک کھوکھلی قبر کے پہلو میں دھنس گیا۔ جھٹکا لگنے سے مدھم آہٹ پیدا ہوئی اور اسی آہٹ نے کتبے کی دوسری جانب موجود ہیولوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ وہ لمحہ میری زندگی کے چند ناقابلِ فراموش لمحات میں سے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سکتے میں رہ گیا۔ میری تمام پھرتی' حاضر دماغی اور روشن خیالی پلک جھپکنے میں فنا کے گھاٹ اتر گئی۔ شہرِ خموشاں کے اس دہشتناک اندھیرے میں' میں نے اپنے سامنے ایک عجیب الخلقت شے دیکھی۔ اس شے کا سر بہت بڑا تھا اور اس کے جسم پر دو سے زائد بازو تھے۔ اس کے جسم کے عریاں حصوں پر بے تحاشا بال تھے۔ وہ شے غضبناک انداز میں میری طرف بڑھی تھی۔ ایک دھماکے سے میرے ریوالور نے شعلہ اگلا۔ ایک نسوانی چیخ گونجی' جو یقیناً پاس ہی کھڑی عورت کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ گولی نشانے پر لگی یا خطا گئی۔ میرے منہ پر ایک بڑا زوردار ہاتھ پڑا تھا۔ اس ہاتھ میں جناتی قوت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جبڑے پر ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ میں چکرا کر کچی قبر پر گرا تھا اور کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ کیفیت کتنی دیر رہی۔ شاید چند سیکنڈ' شاید دو چار منٹ۔ میں نے سر جھٹک کر خود کو کھوکھلی قبر سے باہر نکالا۔ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ دونوں ہاتھ پاس مٹی میں تھڑ چکے تھے۔ میں نے

اردگرد دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ "کون ہے تو۔ حرام زادے سامنے آ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میری آواز سننے والے قبروں کے مُردے تھے اور وہ پرندے تھے جو میرے فائر کے بعد درختوں میں پھڑپھڑانے لگے تھے۔ میری آواز سن کر بدلیوں میں چھپی ہوئی چاندنی میری مدد کے لیے قبرستان میں اتر آئی لیکن آس پاس کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ مجھے اپنی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ کہیں میں نے خواب تو نہیں دیکھا۔ چاندنی کا فائدہ اٹھا کر میں نے جنتر کے درختوں میں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کی لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اچانک مجھے دھیان آیا کہ میں نے اپنے سامنے آنے والی عجیب الخلقت چیز پر فائر کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ گولی اسے لگی ہو۔ میں واپس اس مقام پر آیا جہاں میں نے گولی چلائی تھی۔ اونچے کتبے والی قبر کے پاس وہ جگہ میرے ذہن میں محفوظ تھی جہاں عجیب الخلقت قاتل پر میں نے فائر کیا تھا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر روشن کیا اور نیچے بیٹھ کر غور سے اس مقام کو دیکھنے لگا۔ فوراً ہی گوہرِ مقصود پر نظر پڑی۔ میں نے نیم مرطوب گھی زمین پر خون کے دھبے دیکھے۔ ان دھبوں کے علاوہ یہاں قدموں کے نشان بھی موجود تھے۔ یہ نشان دیکھ کر ایک بار پھر جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ نشان انسانی پاؤں سے مشابہ تھے لیکن بہت بڑے تھے۔ کم از کم ڈیڑھ گنا۔ اس نشان کے علاوہ زنانہ سینڈل کا نشان بھی صاف پہچانا جاتا تھا۔ ان نشانات کو دیکھنے کے بعد میں نے خون کے مزید دھبوں کی تلاش شروع کی۔ جلد ہی اس مقصد میں بھی کامیابی ہوئی۔ شیشم کے گرے ہوئے تنے کے پاس چند اور دھبے نظر آئے۔ پھر دس پندرہ گز کی دوری پر بھی چند دھبے دکھائی دیے۔ یہ دھبے اس راستے کو ظاہر کر رہے تھے جو عجیب الخلقت قاتل نے زخم کھانے کے بعد اختیار کیا تھا۔

اب مجھے تعاقب جاری رکھنے کے لیے ٹارچ کی ضرورت تھی' اس کے لیے ضروری تھا کہ میں گاؤں جاؤں۔ میں نے سوچ بچار میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا اور گاؤں روانہ ہو گیا۔ ابھی میں پٹواری نواب دین کے گھر سے ایک فرلانگ دور ہی تھا کہ ابدال نظر آگیا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور پریشان نظر آتا تھا۔

"کیا بات ہوئی ہے؟ ابھی میں نے فائر کی آواز سنی ہے۔"

"ہاں' تو بڑی زبردست ہوئی ہے۔" میں نے کہا "لیکن ابھی یہ ذکر چھیڑنے کا وقت نہیں۔ ہمیں فوراً ایک دو ٹارچوں کا بندوبست کرنا ہے۔ نواب دین کے گھر میں ٹارچ ہوگی؟"

"ٹارچ تو ہے۔ لیکن کریں گے کیا اس سے؟"

"میرا خیال ہے کہ اسے سب کچھ بتا دیا جائے۔ وہ قابلِ بھروسا تو ہے۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ میں نے پہلے ہی بتایا تھا آپ کو۔"

ہم گھر پہنچے تو صحن کی لائٹ روشن نظر آئی۔ بیٹھک کا اندرونی دروازہ بار بار پیٹا جا رہا تھا۔ بات کی تہ تک پہنچنا ہمارے لیے بہت آسان تھا۔ کسی وجہ سے نواب دین جاگ گیا تھا اور اس نے بیٹھک کے بند دروازے پر دستک دینا شروع کر دی تھی۔ مگر دروازہ کون کھولتا۔ میرے بعد ابدال احمد بھی گلی کی جانب والا دروازہ استعمال کر کے بیٹھک سے نکل آیا تھا۔ ابدال احمد نے جلدی سے اندر جا کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف نواب دین ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی "کہاں چلے گئے تھے آپ دونوں؟" وہ بے حد تعجب سے بولا۔

"اس کا جواب ذرا سا لمبا ہے۔" ابدال نے بے تکلفی سے کہا "تم ذرا اپنی ٹارچ نکال کر لے آؤ۔"

"لیکن! ہاں کیا ہے؟" نواب دین اس ڈرامائی صورت حال سے پریشان نظر آنے لگا تھا۔

"ابھی سب کچھ بتا دیتا ہوں تمہیں۔ بس ٹارچ اور ایک لالٹین لے آؤ فوراً۔"

نواب دین دونوں چیزیں لے آیا۔ وہ گاہے گاہے حیرانی سے میرے چہرے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ یقیناً یہاں اس جناتی گھونسے کا نشان موجود تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے میرے چہرے پر پڑا تھا۔ ہم گاؤں سے نکل کر ایک بار پھر قبرستان میں پہنچے' راستے میں ابدال احمد' نواب دین کو موجودہ صورت حال سے بھی آگاہ کرتا رہا۔ نواب دین کی آنکھوں میں اب حیرت کے ساتھ ساتھ خوف بھی سمٹ آیا تھا۔ اس نے پوچھا "لیکن یہ فائر کا کیا چکر ہے بھائی صاحب؟"

"ابھی تک پوری طرح میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ایک سایہ سا میں نے دیکھا تھا' اس پر فائر کیا۔ وہ بھاگ نکلا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"آپ کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی؟"

"بالکل معمولی سی۔"

خون کے آخری دھبے میں نے قبرستان کی بیرونی حدود کے پاس دیکھے تھے۔ یہاں سے ٹارچ کی روشنی میں' میں نے پھر ان دھبوں کو ٹریس کرنا شروع کیا۔ اس قسم کا کام دن کے وقت بھی مشکل ہوتا ہے یہ تو پھر اندھیری رات تھی۔ پہلے خون دھبوں کی صورت میں مل رہا تھا' پھر قطروں کی صورت میں ملنا شروع ہوا۔ آخر معدوم ہو گیا۔ یہاں زمین پر جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے اگا ہوا تھا لہٰذا قدموں کے نشان بھی دستیاب نہیں تھے۔ یہاں تک لگتا ہے کہ سینڈل کا نقش نظر آ رہا تھا لیکن اب وہ بھی اوجھل تھا۔ بہرطور زمین کی گواہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل ساتھی عورت کے ساتھ قبرستان سے نکلنے کے بعد' اس سرکاری رکھ کی طرف گیا ہے جو جگر گاں کے مضافات میں شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھی۔ یہ رکھ چھوٹی سی تھی پھر بھی چار پانچ ایکڑ میں تھی۔ اس تاریکی میں ان گنجان درختوں میں گھسنا ان دیکھی موت کو دعوت دینا تھا۔ صرف ایک ہی

صورت تھی۔ پورے گاؤں کو جگا دیا جاتا اور لوگوں سے کہا جاتا کہ وہ اس رکھ کا گھیراؤ کر لیں۔ پھر "ہانکے" کی صورت میں اندر داخل ہو کر قاتل اور اس کی ساتھی عورت کو باہر نکال لیا جاتا۔

میں نے اپنا یہ خیال ابدال اور نواب دین پر ظاہر کیا تو نواب دین پورے یقین سے نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں بھائی صاحب۔ یہ بہت اوکھا مشکل ہے۔ لوگاں سخت ڈرے ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب ہر ایک کے ہاتھ میں خود کار ہتھیار بھی تھما دیں تو لوگاں اس وخت رکھ میں گھسنے پر راضی نہیں ہوئیں گے۔ ہو رہا بھی ممکن ہے کہ وہ الٹا ہم پر چڑھ دوڑیں۔ بہت سے لوگاں کا خیال ہے کہ انہیں اس مصیبت سے نجات صرف جادو ٹونے والے دلا سکتے ہیں۔ کوئی ہور کوشش کریں گا تو وہ صرف کام خراب کریں گا۔ چند روز پہلے ایک لمبا چوڑا انگریز صاحب بھی یہاں آیا تھا۔ اس نے بھی یہی باتاں کی تھیں جو ہم آپ کر رہے ہیں۔ بس حویلی میں بیٹھے ہوئے عامل نے بھڑکا دیا لوگاں کو۔ وہ چڑھ دوڑے انگریز صاحب پر اور اسے یہاں سے نکال کر دم لیا۔"

میں سمجھ گیا کہ انگریز صاحب سے پٹواری نواب دین کی مراد "ایڈورڈ" ہے۔ کچھ دیر سرکاری رکھ کے اردگرد ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد ہم گاؤں میں واپس آ گئے۔ باقی کی رات ہم نے جاگتے ہوئے ہی گزاری تھی۔ میرا جبڑا سوج گیا تھا اور گردن کے نچلے حصے سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ گاہے گاہے وہ خوفناک منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا جب میں نے اس عجیب و غریب سائے کو خود پر جھپٹتے دیکھا تھا۔ وہ جانور تو ہرگز نہیں تھا' وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور یقیناً انسان تھا۔ لیکن وہ عام انسان نہیں تھا۔ عام انسان جسیم اور گرانڈیل تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا سر اتنا بڑا نہیں ہو سکتا اور اس کے تین یا چار بازو نہیں ہو سکتے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر عجیب الخلقت شخص ہے۔ اکثر اوقات ایسے بچوں کی پیدائش ہوتی رہتی ہے۔ بعض پیدائش کے دوران میں مر جاتے ہیں اور بعض کو "تلف" کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماں باپ اور خاص طور سے ماں کے دل میں موجود فطری محبت کی وجہ سے بچ جاتے ہیں' بلکہ پرورش بھی پا جاتے ہیں... گئے وقتوں میں شقی القلب لوگ ایسے بچوں کو خاص طور پر تلاش کرتے اور پالتے تھے۔ بعد ازاں انہیں FREAK SHOWS میں پیش کر کے ان کے جسمانی عیوب کو تماشا بنایا جاتا تھا اور دولت کمائی جاتی تھی۔ برطانیہ میں خاص طور سے ایسے شوز بہت مقبول تھے۔ ایک اور بات بھی میرے ذہن میں شدت سے اتھل پتھل مچا رہی تھی۔ جس وقت میں نے سائے پر فائر کیا اس کے ساتھ کوئی عورت چیخی تھی۔ یہ چیخ اور چیخ کا آہنگ میرے ذہن میں منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ ایسی آواز اور چیخ میں نے کہیں سنی ہوئی ہے۔ یہ ماضی قریب کی بات تھی۔ شاید حیدر آباد ہی کا کوئی واقعہ تھا۔ میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے آتے رہ جاتی تھی۔ یہ بھی عجیب سی حس ہے۔ کوئی بات ذہن میں آدھی ہو تو پہلے ہی خبر ہو جاتی ہے کہ بازیافت ہو رہی ہے یا ہوتے ہوتے رہ گئی ہے... میں بھی اسی گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا تھا' پھر یک دم میں بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ رات کو قبرستان میں' میں نے جو آواز سنی وہ شناخت ہو گئی تھی۔ وہ نواب زادی شاہین کی آواز تھی۔ بڑے نواب کی ولایت پلٹ بیٹی' جو باپ اور بھائی کے مسلسل جھگڑے سے اکتا کر واپس ولایت چلی گئی تھی۔ اور میری اطلاعات کے مطابق ابھی تک وہیں تھی۔ یہ عجیب معما سامنے آیا تھا۔ میرے حافظے نے مجھے بہت کم دھوکا دیا ہے اور یہ "حافظہ" پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ آواز اور چیخنے کا وہ انداز سراسر نواب زادی شاہین کا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ میں نے اس کی چیخ پہلے کہاں سنی تھی۔ یہ بھی کوئی بہت پرانا واقعہ نہیں تھا۔ نواب کی حویلی میں ایک رات میں قلی قطب کو زخمی کر کے بھاگا تھا اور محافظوں سے بچنے کی کوشش میں نواب زادی کی خواب گاہ میں گھس گیا تھا۔ وہ نیم عریاں تھی اور بستر پر اوندھی پڑی تھی' غالباً ملازمہ سے پشت کی مالش کروانا چاہ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں جس قدر سوچ رہا تھا مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ابھی چند گھنٹے پہلے قبرستان میں عجیب الخلقت شخص سے ملنے والی نواب زادی شاہین ہی تھی۔

علی الصباح میں' ابدال احمد اور نواب دین کو ساتھ لے کر پھر رات والی جگہ پر پہنچ گیا۔ دن کی روشنی میں شواہد زیادہ نمایاں اور صاف نظر آ رہے تھے۔ سیاہی مائل خون کے قطرے "رکھ" کے اندر تک چلے گئے تھے۔ کہیں کہیں ننگے پاؤں کا نشان بھی نظر آتا تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا تاہم بالکل انسانی پاؤں جیسا تھا۔ کوشش کے بعد میں سینڈل کے نقش ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ ہم تینوں سرکاری رکھ کے گنجان درختوں میں گھس گئے۔ یہاں رکھ کے ایک عمر رسیدہ محافظ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ بندہ ملازم پٹواری نواب دین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لہٰذا اس نے رکھ میں گھومنے پھرنے پر ہم سے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم قریباً ایک گھنٹا رکھ میں رہے۔ کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ یوں لگتا تھا کہ لڑکی اور عجیب الخلقت شخص رکھ میں تھے ضرور تھے مگر اُجالا ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکل گئے تھے۔

میں نے ابدال احمد کو ساتھ لیا اور شاہ پور روانہ ہو گیا۔ وہاں سے میں بذریعہ ٹیلی فون حیدر آباد میں جناب جی کلارک صاحب سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اس علاقے میں ٹرانسپورٹ کمیاب تھی۔ شاہ پور پہنچنے میں مجھے قریباً تین گھنٹے لگ گئے۔ یہاں ایک میڈیکل اسٹور کا مالک ابدال احمد کا شناسا تھا۔ میڈیکل اسٹور سے میں مسٹر جی کلارک صاحب سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ رسمی کلمات کے بعد میں فوراً اصل موضوع پر آگیا۔ میں نے کلارک

صاحب سے کہا "جناب! میں آپ سے نواب شہریار جنگ مرحوم کی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا مطلب نوابزادی شاہین سے ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولے "نوابزادی شاہین تو انگلینڈ میں ہے۔ ہم نے اس کے لیے۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ پھر بولے "فون پر کھل کر کیا بات ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "آپ اشاروں کنایوں میں بتائیں۔ میرے لیے نوابزادی کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔"

وہ بولے "اچھا" تم مجھے اپنا فون نمبر بتاؤ۔ میں ابھی تمہیں خود رنگ کرتا ہوں پھر بات ہو گی۔"

میں نے فون پر نمبر بتا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ بی کلارک صاحب کے پاس غالباً کوئی مخصوص فون لائن موجود تھی جس کے "ٹریس" کیے جانے کا امکان نہیں تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ حسب توقع یہ کلارک صاحب کی ہی کال تھی۔ انہوں نے کہا "جیسا کہ تم جانتے ہی ہو پچھلے دو تین ماہ میں ہم نے گمشدہ سامان (صندوق) کی تلاش جاری رکھی ہے۔ بڑے نواب کے علاوہ ان صندوقوں کے اصل ٹھکانے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن کسی ایسے فرد تک نہیں پہنچ سکے جو نواب کی موت کے بعد ان صندوقوں کے بارے میں کچھ بتا سکتا۔ پھر ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نواب مرحوم بیٹے سے زیادہ اپنی بیٹی کے قریب تھے اور وہ بھی ان کے دکھ سکھ میں نسبتاً زیادہ شریک رہتی تھی۔ یہ بات ممکن تھی کہ انہوں نے بیٹی کو اس حوالے سے کچھ بتا دیا ہو۔ میں نے نوزا اینڈریے کو نوابزادی شاہین کے پیچھے انگلینڈ بھیجا۔ اینڈریے جب انگلینڈ میں نوابزادی شاہین کے ایڈریس پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ نوابزادی کسی کام سے اپنے سیکرٹری کے ساتھ برمنگھم گئی ہوئی ہے۔ اینڈریے کو شبہ گزرا۔ اس نے اپنے طور پر تحقیق کی تو پتا چلا کہ نوابزادی تو سرے سے انگلینڈ آئی ہی نہیں۔ وہ پچھلے برس اپنے بھائی کے ساتھ انڈیا گئی تھی پھر نہیں لوٹی۔ اس انکشاف کے بعد نوابزادی ہمارے لیے اور بھی اہمیت اختیار کر گئی۔ سوچ بچار کے بعد میں اور تجتنی کوور اس نتیجے پر پہنچے کہ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو نوابزادی اپنے پسندیدہ ملک سوئٹزر لینڈ چلی گئی ہے اور وہاں اپنے اسکول کے زمانے کی کسی دوست کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے' یا پھر وہ انڈیا میں ہی کہیں موجود ہے' چھپی ہوئی ہے یا کسی کے قبضے میں ہے۔ اب تک ہم نوابزادی کے حوالے سے انہی دو لائنوں پر کام کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کلارک صاحب! میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔ میں سن رہا ہوں۔" وہ بے تابی سے بولے۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ نوابزادی انڈیا میں ہی موجود [illegible]"

"وہ قتل" کلارک صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا "کیا تم اس کے بارے میں کچھ تفصیل بتاؤ گے؟"

"میں ابھی جستجو کے مرحلے میں ہوں جناب۔" میں نے کہا "ویسے میرا اندازہ ہے کہ مقتول خدا بخش نے ٹیلی فون پر جس اہم سراغ کا ذکر کیا تھا' وہ نوابزادی شاہین ہی تھی۔ میں نے اپنے طور پر جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا بخش نے نوابزادی شاہین کو حیدر آباد یا مضافات میں کہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے بڑی نہر کے کنارے اس مقام تک پہنچا جہاں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔"

"کیا تم نے کہیں نوابزادی کو دیکھا ہے؟" کلارک صاحب نے مرتعش آواز میں پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں" میں نے کہا۔

وہ بولے "شہزاد جہاں! کیا تم کچھ دیر کے لیے حیدر آباد نہیں آسکتے۔ میں تم سے تفصیلاً بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "فی الحال تو یہ مشکل ہے جناب۔ یہاں سے میرے جانے میں بہت حرج ہو گا۔"

"ٹھیک ہے' جیسے تم مناسب سمجھو۔ لیکن کوشش کرو کہ جلد سے جلد ہماری ملاقات ہو سکے... نوابزادی شاہین ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ جیسے بھی ہو اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"

"اوکے جناب"

"اور قتل کے دیگر واقعات کا کیا سلسلہ ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ قتل بھی خدا بخش والے قتل سے منسلک ہیں۔"

"میرا خیال ہے جناب کہ ایسا ہی ہے۔ میں اس بارے میں آپ کو حیدر آباد آکر بتاؤں گا۔"

"اوکے وش یو گڈ لک۔ اپنا خیال رکھنا۔"

کلارک صاحب سے فون پر بات کر کے میں اور ابدال سہ پہر کو جگرگاں واپس لوٹ آئے۔ یہاں ایک اور سنسنی خیز خبر ہماری منتظر تھی۔ معلوم ہوا کہ آج صبح سویرے قریبی بستی "مزار شریف" میں پھر وہی عجیب و غریب "مخلوق" نظر آئی ہے جو اس سے پہلے جگرگاں میں لوگوں پر جان لیوا حملے کر چکی ہے۔ لوگوں کے بقول اس سفاک قاتل نے مزار شریف میں بھی ایک گھناؤنی واردات کا ارتکاب کیا تھا۔ چند عورتیں صبح سویرے کھیتوں میں کھانا لے کر جا رہی تھیں۔ ایک دوران پگڈنڈی پر جہاں دونوں طرف اونچی فصل تھی ایک عجیب وضع شخص ان کے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر عورتیں چیختی چلاتی دوڑیں۔ اس نے ایک جواں سال لڑکی کو دبوچ لیا اور گھسیٹ کر کھیتوں میں لے گیا۔ عورتیں روتی پیٹتی دوڑ کر اور ان کھیتوں میں پہنچیں جہاں ان کے مرد کام کر رہے تھے۔ مرد ایک قریبی ڈیرے پر گئے اور وہاں سے لاٹھیوں کے علاوہ دو رائفلوں کا انتظام کیا۔ مسلح ہو کر وہ لوگ موقع پر پہنچے تو لڑکی جس کا نام خورشید تھا کھیت میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ جگہ

جگہ لوچنے کھسوٹنے کے نشانات موجود تھے۔ لڑکی کی حالت بڑی ابتر اور شرمناک تھی۔ اسے اٹھا کر گاؤں میں لایا گیا۔ وہ اب تک بے ہوش پڑی ہے۔

یہ وہ بات تھی جو ہمارے کانوں تک پہنچی۔ یقینی بات تھی کہ اس میں مرچ مسالا بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس سے کم چیخنی اور زیادہ چٹپٹی خبریں بھی گردش کر رہی ہوں۔ یہ "مزار شریف" وہی بستی تھی جہاں ابدال احمد رہتا تھا۔ خبر سن کر وہ بستی جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ وہ روانہ ہوا تو میں بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم تانگے پر سوار ہوئے اور نیم پختہ راستے پر قریباً ایک گھنٹا ہچکولے کھانے کے بعد "مزار شریف" پہنچ گئے۔ یہ بستی جگرگاں کے مقابلے میں ایسے ہی تھی جیسے لاہور کے مقابلے میں مرید کے کا قصبہ۔ حسب توقع بستی میں ایک مزار بھی موجود تھا۔ جس گھر میں یہ واقعہ ہوا وہ ابدال کی گلی ہی میں تھا۔ ابدال مجھے سیدھا اس گھر میں لے گیا۔ یہاں آکر جو بات معلوم ہوئی وہ بالکل مختلف تھی۔ لڑکی کے باپ نے بتایا کہ اس کی بچی کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوا۔ وہ صرف ڈر گئی ہے۔ ڈر کی وجہ سے اسے شدید بخار ہو گیا ہے اور بس۔

واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا "عورتوں کا کہنا ہے کہ وہ کوئی خوفناک شکل صورت والا شخص تھا۔ وہ اندھیرے میں سے کسی سائے کی طرح نکلا اور عورتوں پر جھپٹا۔ اس کا سر بہت بڑا تھا اور ایک بازو کسی شہتیر کی طرح لمبا اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اس نے عورتوں سے کھانا چھیننے کی کوشش کی تھی۔ لگتا تھا کہ کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ عورتیں برتن پھینک کر بھاگ نکلیں۔ میری بچی خورشید بے ہوش ہو کر گر گئی۔ جب کچھ دیر بعد لوگ رائفلیں وغیرہ لے کر موقع پر پہنچے تو خورشید اسی طرح پگڈنڈی پر پڑی تھی۔ گرنے سے اسے کہیں معمولی چوٹ آئی ہو تو آئی ہو ورنہ اسے ہاتھ تک نہیں لگایا گیا تھا۔ ہاں کھانے کے جو برتن عورتیں پھینک گئی تھیں ان میں سے دو تین غائب تھے۔ آج دوپہر یہ برتن موقع سے آدھا میل دور جوار کے کھیت سے ملے ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ وہاں بیٹھ کر اس شخص نے کھانا وغیرہ کھایا ہے۔ رائفلوں اور لاٹھیوں سے مسلح دو پارٹیاں آج سارا دن اس شخص کا کھوج لگاتی رہی ہیں لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔"

لڑکی کے والد نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی پر جھاڑ پھونک کرنے کے لیے اس نے جگرگاں سے دو عامل بلائے تھے' وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس گئے ہیں....

میرے کہنے پر ابدال احمد نے ایک مقامی شخص کو ساتھ لیا اور ہم بستی سے باہر ان کھیتوں میں پہنچے جہاں آج منہ اندھیرے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ جائے واردات پر ابھی تک مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ پاؤں کے نشان وغیرہ ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' معلوم نہیں اب تک وہاں کتنے لوگوں کے پاؤں

بڑ چکے تھے۔ ویسے بھی اب رات ہو چکی تھی۔ کچھ دیر موقع پر ٹھہرنے اور وہاں سنسناتی ہوئی وحشت کو محسوس کرنے کے بعد میں اور ابدال بذریعہ تانگا واپس جگرگاں روانہ ہو گئے۔ میرا ذہن واقعات کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ قاتل اس سرکاری رکھ میں زیادہ دیر نہیں رہا تھا۔ وہ رات پچھلے پہر وہاں سے نکلا تھا اور مزار شریف آپہنچا تھا۔ غالباً وہ پناہ کی تلاش میں تھا اور بھوکا بھی تھا۔ اسی بھوک کے سبب وہ عورتوں پر حملہ آور ہوا تھا۔

دوران سفر میں میرے ذہن میں سائیں عالی کا تصور بھی ناچتا رہا۔ نوریلیا میں مجھے حیدر آباد کا راستہ دکھا کر وہ خود نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب اور کہاں ظاہر ہو گا۔ اور ظاہر ہو کر کیا فتنہ کھڑا کرے گا۔ ابھی ہم جگرگاں کی حدود میں داخل ہی ہوئے تھے کہ دو افراد نے ہمارا راستہ روک لیا۔ یہ دونوں افراد خاصے ہٹے کٹے تھے۔ انہوں نے جو قمیصیں پہن رکھی تھیں وہ گھٹنوں سے نیچے تک جاتی تھیں۔ ان کے بال لمبے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اسے زبردستی روک لیا تھا۔

"کیا بات ہے بھئی؟" ابدال احمد نے پوچھا۔

"بابُو کا پتا تمہیں حویلی میں چل کر لگے گا۔ حضرت صاحب نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔"

"کون حضرت صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا حضرت صاحب کو بھی نہیں جانتے تم؟ چلو ٹھیک ہے۔ حویلی چل کر اس بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"تمہیں اس طرح تانگا روکنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" میں نے تپ کر کہا۔

"جرأت تو ہم کو اور بھی بہت سی باتاں کی ہے۔ لیکن فی الحال تم ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے دیکھا ابدال پریشان نظر آرہا تھا۔ کوچبان کا رنگ بھی فق ہو رہا تھا۔

ابدال نے سرگوشی میں کہا "یہ اسی عامل کے چیلے ہیں جو بڑے بھرے حویلی میں بیٹھا ہے۔ یہ لوگاں نمبردار کے بہت منہ چڑھے ہیں۔ ان کا حکم ٹالنا یہاں کسی کے بس میں نہیں۔"

حویلی کے عامل کا دیدار کرنے کے لیے میں بھی دوران سے بے تاب تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس کے گماشتے خود مجھے لینے پہنچ گئے تھے۔

"کیا کہتا ہے تمہارے حضرت جی نے؟" میں نے زیادہ موٹی گردن والے چیلے سے پوچھا۔

"تم سوال جواب مت کرو۔" وہ تنک کر بولا "اگر چلنا ہے تو چلو۔ ورنہ کہہ دو کہ نہیں جا سکتے۔ ہم تمہارا جواب حضرت جی تک پہنچا دیں گے۔"

کوچبان نے مجھے ٹھوکا دیا اور سرگوشی میں بولا "چلے جاؤ بابو۔

یہ اچھے لوگاں نہیں ہیں۔ بری طرح پیش آئیں گے۔"

ابدال احمد بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا اور متذبذب میں نظر آتا تھا۔ میں نے تانگے والے کو کرایہ دیا اور ابدال کے ہمراہ ان کئے چیلوں کے ساتھ چل دیا۔ اس وقت تک رات کے نو بج چکے تھے۔ گلیاں حسب معمول سونی تھیں۔ آج صبح والے واقعے اور افواہوں کے سبب در و بام کی وحشت پہلے سے سوا معلوم ہوتی تھی۔ حویلی مزاروں کے وسط میں واقع تھی اور عام دیہاتی حویلیوں سے کچھ بڑی تھی۔ ہم حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئے۔ مردانے کی طرف ایک بڑا احاطہ تھا۔ اس احاطے میں لکڑی کی ایک چوکی پر کوئی شخص گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ یہ خاصا لحیم شحیم شخص تھا۔ بال لمبے، مونچھ داڑھی صاف، ماتھے پر تلک اور ہاتھ میں موٹے دانوں کی تسبیح۔ اس نے ایک سفید چادر بگل کی صورت اپنے فربہ جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ لکڑی کی چوکی کے سامنے ایک بڑے سے پرات نما برتن میں کوئی سرخ سیال ہلکورے لے رہا تھا اور اس سیال کے عین درمیان ایک دو بالشت لمبی موم بتی روشن تھی۔ زمین پر دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان دریوں پر بیس پچیس مرد و زن سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ چوکی پر بیٹھا شخص عامل ہے اور دریوں پر اس کے عقیدت مند بیٹھے ہیں۔ دو رائفل بردار افراد بھی یہاں موجود تھے۔ ان کا تعلق یقیناً نمبردار کی حویلی سے تھا۔ عامل یعنی حضرت جی کے عقب میں اس کے دو اور چیلے مؤدب کھڑے تھے۔ عقیدت مندوں میں مجھے کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آیا جسے میں جگر کاں کا نمبردار سمجھ سکتا۔ وہ سب غریب مسکین ڈرے سہمے لوگ تھے، جنہیں پُراسرار صورت حال کے جبر نے حضرت گرو جی کے سامنے سرنگوں کر رکھا تھا۔

اس محفلِ "بابرکت" میں پہنچتے ہی ہمیں یہاں تک لانے والے چیلوں کا رویہ مزید جارحانہ ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے میرا بازو تھام لیا اور دوسرے نے ابدال احمد کو کالر سے دبوچ لیا۔ ہمیں قریباً دھکیلتے ہوئے انہوں نے حضرت گرو جی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ "بندے حاضر ہیں حضرت" ایک چیلے نے بے حد مؤدب لہجے میں کہا۔

حضرت گرو جی نے بڑی حکمت سے اپنا بھاری بھرکم سر اٹھایا۔ پھر اپنی غلافی آنکھوں پر سے پردوں کی جھالر ہٹائی اور سرخ سرخ آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ یہاں۔" وہ بڑے ملائم لہجے میں گویا ہوئے۔

ایک چیلے نے جلدی سے میرے کندھے پر دباؤ ڈالا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں جلدی سے بیٹھ جاؤں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ صورت حال اب مجھے لطف اندوز کرنے لگی تھی۔ حضرت گرو جی چند لمحے ہمیں بڑی مدبرانہ و بزرگانہ نظروں سے گھورتے رہے پھر بولے "تم دونوں کس چکر میں ہو بابا جی۔ کیا کرتے پھر رہے ہو یہاں؟"

ابدال نے کہا "حضرت! یہ میرا پرانا دوست ہے۔ شہر میں ایک ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈری کرتا رہا ہے۔ اب چاہتا ہے۔"

"ہمیں یہ نہیں پوچھ رہا" حضرت گرو جی نے ابدال کی بات کاٹی "ہمیں اصل بات جاننا چاہ رہا ہوں۔"

"یہی اصل بات ہے حضرت۔" ابدال منمنایا۔

"نہیں بٹا جی۔ یہ اصل بات نہیں ہے۔" حضرت گرو کی آواز بدستور ملائم تھی" ابدال احمد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ حضرت گرو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی فی الحال خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ وہ بولا "اچھا چھوڑو اس بات کو۔ ابھی تم مزار شریف میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"مزار شریف میں میرا گھر ہے جی۔"

"لیکن تم اپنے گھر نہیں گئے تھے۔ تم اس لڑکی کے گھر گئے تھے جس پر جن آئے ہیں۔ اور پھر تم دونوں وہ جگہ دیکھنے گئے تھے جہاں وہ لڑکی بے ہوش ہو کر گری تھی۔"

"حضور حضور (قبلہ) ہم کسی خاص مقصد سے تو نہیں گئے تھے۔ ویسے ایچ گئے تھے جیسے عام لوگاں گئے تھے۔"

"بکواس بند کرو" ایک دم حضرت گرو زور سے دہاڑے۔

یہ دہاڑ سن کر میرے جیسا شخص بھی بھونچکا رہ گیا۔ ملائم لہجے میں بولتے بولتے حضرت گرو بڑے زور سے بولا تھا، ہمارا اچھلنا لازمی تھا۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ حضرت گرو کے حلق سے جو آواز نکلی تھی وہ اتنی بلند اور گرجدار تھی کہ میں ہرگز توقع نہیں کر سکتا تھا۔ بلا مبالغہ یہ آواز حویلی سے باہر بھی دور تک سنی گئی ہوگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بولا ہو اور سیکڑوں کے مجمع کو سنانے کے لیے بولا ہو۔ ایک عام انسان کے ہونٹوں سے اتنی اونچی آواز کیونکر بلند ہو سکتی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، بری طرح چونکتا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میرے سوا اس انہونی پر اور کوئی بھی نہیں چونکا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ حضرت گرو کی یہ کرامت پہلے بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد حضرت گرو پھر گرجا "تم جیسے لوگوں کی وجہ سے یہ ساری آفت آئی ہے اس علاقے پر۔ بے عقیدہ، بے دین اور دھرم دروہی لوگ ہو تم۔ ہر بات میں سائنس ڈھونڈتے ہو۔ حقیقت تلاش کرتے ہو۔ سائنس ہر جگہ نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں ان دیکھی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو تم جیسے پاپیوں کو نہ نظر آ سکتی ہیں اور نہ سمجھ آ سکتی ہیں۔"

حضرت گرو کی غیر معمولی بات دار آواز پوری حویلی میں گونج رہی تھی۔ وہ لوگ جو رنگین دریوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی ہراساں نظریں جن میں عقیدت بھی تھی، حضرت گرو کے چہرے پر جمی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے تو میں بھی چکرا سا گیا کہ اتنی بلند آواز اس شخص کے حلق سے کیونکر نکل رہی ہے۔ ان دنوں ابھی اتنے حساس اور ننھے منے مائیک عام نہیں ہوئے تھے جو قمیص کے گریبان میں اڑس لیے جاتے ہیں۔ پھر مائیک کے ساتھ ایمپلی فائر کا ہونا بھی ضروری ہوتا لیکن یہ دونوں چیزیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ پھر اس گونج دار آواز کی کیا حقیقت تھی جو اس شخص کے حلق سے بلند ہو رہی تھی۔

میں نے صورت حال کے پیش نظر چہرے پر عاجزی پیدا کر لی اور لجاجت سے کہا "معافی چاہتا ہوں حضرت گرو۔ میں اور میرا دوست غلطی پر تھے۔ ہمیں جان لینا چاہیے تھا کہ آپ جیسے مہان گرو کی نگاہ سے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں۔ میں آپ کے سامنے کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میرا تعلق "اخبار والوں" سے ہے اور میں رپورٹ تیار کرنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہوں۔"

حضرت گرو کچھ دیر خونخوار نظروں سے ہم دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ اس مرتبہ وہ بولا تو اس کی آواز پہلے کی طرح دھیمی اور نرم تھی۔ کہنے لگا "کیا خبر تم پہلے جھوٹ بول رہے تھے یا اب جھوٹ بول رہے ہو۔"

"آپ کو سب خبر ہوتی ہے۔ آپ تو دلوں کا حال جان لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور جیب سے وہ پریس کارڈ نکال کر حضرت گرو کے سامنے رکھ دیا جو میں نے حیدرآباد میں پہل قدمی کے موقع پر استعمال کیا تھا۔

حضرت گرو نے کارڈ کے بجائے میرا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر بڑے ناصحانہ لہجے میں بولا "جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جاؤ۔ اور خبردار کوئی کھوٹ نہ رکھنا اپنے من میں۔ ورنہ بری طرح پچھتاؤ گے۔ اس دفعہ تو معافی مل گئی۔ آئندہ نہیں ملے گی۔"

میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ ابدال احمد نے میرا ساتھ دیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کہا "حضرت گرو جی! اگر اجازت ہو تو ہم کچھ دیر آپ کی اس مجلس میں بیٹھ جائیں۔ یقین کریں آپ کے ساتھ اس مختصری ملاقات نے بہت اثر کیا ہے میرے دل پر۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں، بس اب تم لوگ جاؤ یہاں سے" اور پھر ادھر کا رخ نہیں کرنا۔ یہ بھلے مانسوں کی بستی ہے۔ تمہارے من میں اور تمہاری نظر میں کھوٹ ہے اور یہ کھوٹ اتنی جلدی دور نہیں ہو سکتا۔"

دونوں فربہ اندام چیلے ہمارے قریب آن کھڑے ہوئے۔ لالٹینوں کی روشنی میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب ہم یہاں سے نکل جائیں۔ ہم دونوں حویلی کے بڑے پھاٹک سے باہر نکل آئے۔ پھاٹک کی دونوں جانب بڑے بڑے گیس لیمپ لٹک رہے تھے۔ یہاں دھوتی برتی دیہاتی لباس میں ملبوس ایک ہٹا کٹا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک کان میں موتی سی طلائی بالی تھی۔ وہ سگریٹ مٹھی میں دبائے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ مجھے سر تا پا دیکھ کر بولا "تم اخبار والے ہو؟" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ کہنے لگا "کیا لکھو گے اس چکرباز عامل کے بارے میں؟"

"چکرباز عامل؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تو اور کیا" نوجوان بولا "میں ڈرتا نہیں ہوں کسی سے۔ وارث ہوں میں اس گاؤں کا اور گاؤں کی ساری زمینوں کا۔"

ابدال احمد نے مجھے کہنی سے ٹہوکا دیا اور آہستگی سے بولا "یہ نمبردار صاحب کا بیٹا ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

نوجوان نے خوش دلی سے مصافحہ کیا۔ ہم وہیں ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ نوجوان کا نام اکبر تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سیدھی سادی دو ٹوک بات کرتے ہیں۔ اور جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آ جاتا ہے۔ نوجوان اکبر کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ دیہاتی اور ان پڑھ ہونے کے باوجود کسی حد تک روشن خیال بندہ ہے۔ فراڈ عامل کے حوالے سے حویلی میں ہونے والا یہ تماشا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا، لیکن باپ کی وجہ سے وہ کوئی سخت بات نہیں کہتا۔ اس کے علاوہ عامل کی شعبدہ بازیوں سے بھی وہ کسی حد تک پریشان تھا۔ مثلاً عامل کی بلند و بالا گرجدار آواز ایک ایسا شعبدہ تھا جس نے گاؤں میں موجود ہر فرد کو دہلا رکھا تھا۔ دھیمی آواز میں بولتے بولتے عامل صاحب جب اچانک جلال میں آتے تھے اور زور سے بولتے تھے تو ان کی آواز کئی گنا بلند ہو جاتی تھی اور دور دور تک سنی جاتی تھی۔ اکبر یہ تو جانتا تھا کہ یہ کوئی شعبدہ بازی ہے لیکن وہ سب کے سامنے اسے شعبدہ بازی قرار دیتے ہوئے ڈرتا بھی تھا۔

میں نے اکبر سے پوچھا "حضرت گرو کے سامنے برتن میں وہ خون جیسی چیز کیا ہے؟"

وہ بولا "یہ الو کا خون ہے اور عامل کے حکم پر جمع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تین ایسی ہندو لڑکیوں کا خون ہے جن کی شادی کے پھیرے تو ہو چکے تھے لیکن ابھی انہوں نے اپنے پتی کے ساتھ رات نہیں گزاری تھی۔ عامل کا کہنا ہے کہ اس خون کے اندر جلنے والی موم بتی کی روشنی جہاں تک جا رہی ہے، وہاں تک کوئی جن بھوت پر نہیں مار سکتا۔"

میں نے پوچھا "یہ عامل ہندو ہے یا مسلمان؟"

"یہ کچھ بھی نہیں ہے۔" چھوٹے نمبردار اکبر نے جواب دیا "آپ اس کا نام نہیں دیکھ رہے 'حضرت گرو جی'۔ کہتا ہے کہ میرا نام مسلمانوں والا بھی ہے، سکھوں والا بھی اور ہندوؤں والا بھی۔ کبھی ہندی بولنے لگتا ہے، کبھی پنجابی اور کبھی اردو۔ باتیں بھی تینوں مذہبوں کی کرتا ہے۔ شیشے کی ایک بڑی سی بوتل آپ نے بھی اس کے پاس دیکھی ہوگی۔ سب کو اسی میں سے سادہ پانی دیتا ہے۔ لیکن کسی کے برتن میں جا کر یہ پانی سرخ ہو جاتا ہے، کسی کے

برتن میں سبز اور کسی کے برتن میں زرد۔ اگر کسی کے برتن میں جاکر پانی کا رنگ نہیں بدلتا تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس شخص کو عامل صاحب کے عمل سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

میں نے اکبر سے ایک سگریٹ لے کر سلگایا اور اس سے پوچھا کہ بڑے نمبردار یعنی اس کے والد صاحب کہاں ہیں۔ وہ بولا "والد صاحب ایک پیشی بھگتنے حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ کل دوپہر تک آجائیں گے۔"

میں نے کہا "نمبردار اکبر! اگر میں اس جھوٹے عامل کو چھٹی کرا دوں تو کیسا رہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولا۔

"مطلب یہ کہ اس کو اور اس کے چیلوں کو ایسی مار ماری جائے کہ وہ مرغے بن کر ککڑوں کوں بولنے لگیں اور یہاں سے ایسے بھاگیں کہ پھر ساری زندگی شکل نہ دکھائیں۔"

اکبر کی آنکھوں میں اندرونی مسرت چمکی لیکن اس چمک میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "لیکن۔۔۔ یہ کام آپ کریں گے؟"

میں نے کہا "یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

وہ بولا "کہیں۔۔۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر واقعی۔۔۔ اس بندے کے پاس۔۔۔ تھوڑا بہت علم ہے تو۔۔۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"

"کچھ نہیں ہے اس بندے کے پاس۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "سر سے پاؤں تک فراڈ ہے یہ۔ تم خواہ مخواہ دل چھوٹا نہ کرو۔ ابھی سب کچھ تمہارے سامنے آجاتا ہے۔"

اکبر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "معاملہ آسان نہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔"

میں نے کہا "سب سوچ لیا ہے میں نے اور سب جان بھی لیا ہے۔ تم بس اتنا کرو کہ مجھے ایک گارنٹی دے دو۔"

"کیسی گارنٹی؟"

"تمہاری حویلی کے ملازم بیچ میں نہیں کودیں گے اور دریوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جو آٹھ دس مرد ہیں وہ بھی دور رہیں گے۔"

"لیکن بھائی صاحب اکیلے آپ کریں گے کیا؟ اس کے چار پانچ چیلے تو اس وقت بھی یہاں موجود ہیں اور وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہیں۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے حویلی کے ایک تاریک گوشے میں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ طے ہو گیا۔

○☆○

میں نے پتلون کی جیب سے اپنا بیلم ماڈل پسٹل نکال کر چیک کیا اور دوبارہ اس احاطے میں چلا گیا جہاں حضرت گرو اپنے عقیدت مندوں کے درمیان بڑے طمطراق سے براجمان تھا۔ اس کا مراقبہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی ایک عقیدت مند عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ کوئی عمر رسیدہ عورت تھی جس نے اپنا سراپا میلی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ وہ حضرت گرو کے سامنے جھکی ہوئی تھی اور گزارش کر رہی تھی۔ "حضرت! آپ کرنی والے ہیں۔ کوئی کام بھی آپ کے لیے مشکل نہیں۔ میرا بچہ مجھے واپس دلا دیں۔ ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہوں گی۔"

وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ حضرت گرو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ کوئی عمر رسیدہ عورت نہ ہو چھوٹی سی بچی ہو۔ سر پر ہاتھ پھیرنے سے عورت کا پردہ سرک گیا۔ وہ گندمی رنگ کی پچاس پچپن سالہ غریب صورت عورت تھی۔ اس نے جلدی سے گھونگھٹ درست کیا اور حضرت گرو کی جوتیوں کے پاس سے خاک لے کر سر میں لگانے لگی۔ حضرت گرو نے منہ میں کچھ بدبدا کر عورت پر پھونکا اور تسلی تشفی کے کلمات کہے۔ عورت الٹے قدموں چل کر واپس چلی گئی اور ایک جوان سال دیہاتی عرضِ احوال کے لیے حضرت گرو کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

حضرت گرو کے چیلے مجھے کڑی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ان کے اس طرح گھورنے کا جواز بنتا تھا۔ حضرت گرو مجھے یہاں سے جانے کی ہدایت جاری کر چکا تھا اور میں جاکر تھوڑی دیر بعد ہی پلٹ آیا تھا۔ اسی دوران میں حضرت گرو کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ اس کے آثرات دیکھ کر ایک لحیم شحیم چیلے نے کڑے لہجے میں مجھ سے پوچھا "تم گئے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "میں تمہارے حضرت گرو کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے حضرت کو پڑیا میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں اور روز تھوڑا تھوڑا گھول کر پیتا رہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" چیلے نے لرزتے لہجے میں پوچھا۔

"تم اسے بکواس کہتے ہو، یہ تو عقیدت ہے۔ بلکہ عقیدت سے بھی آگے کی چیز ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ مجھے حضرت سے عشق ہو گیا ہے۔ میں جب تک حضرت کو گھول کر نہ پی لوں گا۔۔۔ یا ان کا کشتہ اور پڑیا میں بند نہ کر لوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔ پھر حضرت کے کشتہ ہو جانے سے تمہیں بھی ایک آسانی ہو جائے گی۔ ان کا ایک خوبصورت سا مزار بنا کر رات دن چڑھاوے اور نیازیں وصول کرنا۔"

حضرت گرو اور ان کے چیلوں کی صورتیں دیکھنے والی تھیں۔ چہروں پر زلزلے کے آثار تھے اور آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ وہ سمجھ گئے تھے، ان کا پالا کسی سر پھرے خطرناک شخص سے پڑ گیا ہے۔ سب سے پہلے میرے قریب کھڑے موٹی گردن والے چیلے نے حرکت کی۔ اس نے دانت کچکچا کر کچھ کہا اور بڑی وحشت سے مجھ پر جھپٹا۔ میں اس کارروائی کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ بڑی آسانی سے پہلو بچا کر میں نے چیلے کا وار خالی دیا اور بیچ کی ٹانگ اس کی

پسلیوں پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر چند عورتوں پر گرا اور عورتوں کی چیخوں سے احاطہ گونج اٹھا۔ میں نے لپک کر وہ چوکی الٹا دی جس پر حضرت گرو بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ چوکی کے ساتھ ہی وہ بھی الٹا۔ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں پھر وہ اپنی ہی اولاد و منی پر گر کر چاروں شانے چت ہو گیا۔

اس حیرت ناک منظر نے حاضرین پر سکتہ طاری کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت گرو کے چیلے بھی چند لمحوں کے لیے مبہوت رہ گئے۔ میں نے ان لمحوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور اچھل کر ایک چیلے کے سینے پر ٹانگ رسید کی۔ یہ "ناک آؤٹ" کرنے والی ضرب تھی۔ چیلا صاحب پشت کے بل پختہ دیوار سے ٹکرائے اور اوندھے منہ گر کر ساکت ہو گئے۔ دو چیلوں نے برق رفتاری سے اپنی لمبی قمیصوں کے نیچے سے تیز دھار آلے نکال لیے۔ یہ خاص طرز کے حیدر آبادی چاقو تھے۔ ان کے لمبے پھل گیس لیمپس کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ دریوں پر بیٹھے لوگ چیختے چلاتے بھاگ اٹھے تھے۔ ان میں سے کسی نے اس خطرناک پھڈے میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اس موقع پر اپنا پسٹل نکال سکتا تھا لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے پہلے تھوڑی سی اوا ماری بھی کر لی جائے۔ ایک چیلے نے بڑی درندگی سے چاقو کا وار کیا۔ میں نے یہ وار بھی مکمل اطمینان سے بچایا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے دور گھما دیا۔ وہ ڈگمگا کر اس پرات نما برتن پر گرا جس میں بقول نمبردار اکبر "الوؤں" اور نوبیاہتا لڑکیوں کا خون تھا۔ برتن الٹ گیا اور دری خون سے رنگین ہو گئی۔ دوسرا چاقو بردار میرے بازو پر چھوٹا سا چرکا لگانے میں کامیاب رہا لیکن اس چرکے کا خمیازہ اسے تابڑ توڑ مکوں اور جگر پاش ٹھوکروں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ جونہی چاقو اس کے ہاتھ سے نکلا، میں نے اسے بازوؤں پر اٹھا کر حضرت گرو کے سرِ پُرغرور پر دے مارا۔ حضرت گرو بھی شاید اپنے لبادے کے نیچے سے کوئی ہتھیار نکالنے کی فکر میں تھا لیکن جب چیلا صاحب اڑتے ہوئے اس کے سر پر آپڑے تو وہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ یہ ساری کارروائی آٹھ دس سیکنڈ کے اندر مکمل ہوئی تھی۔ دوسری بار گرنے کے بعد حضرت گرو کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی بھاری بھرکم چادر کھل گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی بغل کے پاس ایک ایمپلی فائر کسی بینڈیج وغیرہ سے بندھا ہوا تھا۔ یہ ویسا ہی ایمپلی فائر تھا جیسا میگا فون میں ہوتا ہے۔ حضرت گرو کی گردن سے ایک چھوٹا سا آلہ چپکا ہوا تھا۔ اس آلے سے نکلنے والا تار ایمپلی فائر تک چلا گیا تھا۔ ان آلات کو چلانے کے لیے ایک چھوٹی سی بیٹری بھی حضرت گرو کے جسم سے منسلک تھی۔ (یہ بیٹری بعد ازاں حضرت گرو کی کمر سے بندھی ہوئی پائی گئی) گرنے سے حضرت گرو کی دھوتی بھی ڈھیلی ہو گئی تھی اور وہ نیم عریاں ہونے لگا تھا۔ میں نے تین چار زوردار ٹھوکریں "حضرت گرو" کی پسلیوں میں لگائیں اور پسٹل نکال کر اپنی پشت دیوار سے لگا دی۔ میرا یہ عمل بروقت تھا۔ ایک چیلا چاقو بدست تیر کی طرح میری طرف آرہا تھا۔ میں نے فائر کیا۔ گولی اس کے ہاتھ یا کلائی پر لگی۔ چاقو گر گیا اور وہ خود بھی گھٹنوں کے بل گر گیا۔ "خبردار" میں نے چیخ کر کہا اور دوسرے چیلے کے قدموں میں فائر کیا۔

اسی دوران میں چھوٹا نمبردار اکبر بھی اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بارہ بور کی رائفل نظر آرہی تھی۔ یہ رائفل اس نے حضرت گرو کی طرف سیدھی کر دی اور کڑک کر کہا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ جونہی اکبر کے ہاتھ میں رائفل نظر آئی اس کے خاص کارندے بھی حرکت میں آگئے۔ انہوں نے حضرت گرو کے چیلوں کو دبوچ لیا اور بری طرح مارنے پیٹنے لگے۔ ایک چیلے کو میں نے اپنے سامنے دیوار پھاند کر فرار ہوتے دیکھا۔ حضرت گرو کا برا حال تھا۔ اس کا سفید براق لباس "الو کے خون" میں لتھڑ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایمپلی فائر اس کے جسم سے جدا کیا اور اکبر کو بتایا کہ یہ وہ آلہ ہے جس کے زور پر حضرت گرو "اونچے سُروں" میں بولتا تھا۔ ایک مائیک وہ گردن کے ساتھ چپکا لیتا تھا۔ گردن کے ساتھ چپکا ہوا یہ مائیک بھی بغل میں چھپا رہتا تھا۔ ایسے مائیک اس ارتعاش کے ساتھ کام کرتے ہیں جو بولنے کے دوران میں گلے میں پیدا ہوتا ہے۔ حضرت گرو کے لباس میں بھی ایک تیز دھار چاقو موجود تھا۔ میں نے وہ نکال لیا۔ چوہدری اکبر نے سارے اندیشے جھٹک کر ایک زنانے کا تھپڑ حضرت گرو کے منہ پر مارا اور گالیاں دینے لگا۔۔۔

حضرت گرو کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ بہت کھوکھلے اور بے اثر لہجے میں ہمیں خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اشارے پر اکبر کے چار کارندوں نے اس کے ہاتھ پاؤں دبوچ کر اسے چت کر دیا۔ میں نے اس کی مکمل تلاشی لی۔ اس کے لباس سے کئی قسم کے الم غلم کے علاوہ ایک چھوٹی سی پوٹلی بھی برآمد ہوئی۔ اس میں خشخاش کے دانوں جیسی چھوٹی چھوٹی سفید گولیاں تھیں۔ بعد ازاں ان گولیوں کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مختلف رنگوں کی گولیاں تھیں۔ سفید تہہ کے نیچے بہت تیز قسم کا رنگ تھا۔ حضرت گرو جس وقت اپنی مخصوص بوتل سے عقیدت مند کے برتن میں پانی ڈالتا تھا۔ صفائی سے یہ گولی بھی برتن میں پھینک دیتا تھا۔ یہ گولی فوراً حل ہو کر پانی کا رنگ تبدیل کر دیتی تھی۔

اس رات بارہ ایک بجے تک حویلی میں چہل پہل رہی۔ گاؤں کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں آتے رہے اور حضرت گرو کا کچا چٹھا اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ ٹھوس شواہد دیکھنے کے بعد بیشتر دیہاتی حضرت گرو کو برا بھلا کہنے لگے اور صلواتیں سنانے لگے پھر بھی کچھ کٹر قسم کے جاہل ایسے تھے جو اس کارروائی کو غلط اور خطرناک قرار دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ علاقے پر پہلے ہی آفت آئی ہوئی ہے۔ اب ایک مانے ہوئے عامل کی "بے حرمتی" کر کے مزید مشکلات کو دعوت دے لی گئی ہے۔ چھوٹے نمبردار اکبر

کے حکم پر حضرت گروا اور اس کے زخمی چیلوں کو حویلی کی بیٹھک میں بند کر دیا گیا تھا اور اس کے مفرور چیلوں کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔

رات گئے میں اور ابدال اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ ہمارا میزبان پٹواری نواب دین تمام حالات سے آگاہ ہو چکا تھا اور سخت حیران تھا۔ ابدال احمد اسے تفصیلات بتانے میں لگ گیا۔ میں اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ لیکن نیند۔ نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بازو کے زخم میں بھی جلن ہو رہی تھی۔ میں صبح تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ ذہن مسلسل ایک ہی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بدہیئت کون تھا اور نوا... شاہین کے ساتھ اسے کیا رویہ تھا۔ غور و خوض کے بعد میں نے ... آنے والے حالات کا ایک مدھم سا خاکہ ذہن میں تیار کر ... تاکہ کچھ اس طرح تھا۔

آٹھ دس روز پہلے مقتول خدا بخش نے مجتبیٰ کو فون کیا اور اسے بتایا کہ ایک اہم کھوج اس کے ہاتھ لگا ہے اور وہ بہت جلد کوئی اچھی خبر سنائے گا۔ یہ اچھی خبر یہی تھی کہ ... خدا بخش نے نوابزادی شاہین کو دیکھا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اکیلی ہو اور زیادہ ممکن یہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور شخص یا اشخاص بھی ہوں۔ خدا بخش نے نوابزادی شاہین کا تعاقب کیا تھا اور جگرگاں سے آٹھ دس میل دور نہر کے کنارے اس مقام تک جا پہنچا تھا جہاں اسے قتل کیا گیا۔ یہاں ایک ویرانی کڑی غائب تھی۔ خدا بخش کو قتل کرنے والا اور پھر راہ گیروں سے ڈر کر بھاگنے والا وہ عجیب الخلقت شخص شروع سے ہی نوابزادی کے ساتھ آیا تھا یا اس ویرانے میں نوابزادی اور وہ اکٹھے ہوئے تھے۔ بہرحال اس گمشدہ کڑی سے آگے واقعات یوں چلتے تھے کہ وہ عجیب الخلقت قاتل اپنا تعاقب کرنے والوں سے ڈر کر بھاگا اور چھپتا چھپاتا جگرگاں جا پہنچا۔ جگرگاں میں وہ جس چار دیواری میں چھپا وہاں مقتول امریش رہتا تھا۔ علی الصباح امریش کھیتوں میں جانے لگا تو اس کی بدقسمتی اسے بھوسے والی کوٹھڑی میں لے گئی۔ وہاں قاتل نے اس پر حملہ کیا اور اسے جان سے مار کر بھاگ گیا۔ اس کی اگلی پناہ گاہ جگرگاں کا وسیع و عریض قبرستان تھا۔ اس قبرستان میں قاتل کے ہاتھوں ایک اور جان چلی گئی۔ یہ قریبی محلے کی رہائشی چیمپاں تھی جو ایک گمشدہ بچھیری کو تلاش کرتی ہوئی قبرستان میں گھسی اور بدقسمتی سے ان گھنے درختوں میں چلی گئی جہاں قاتل چھپا بیٹھا تھا۔ قاتل کو دیکھ کر مقتولہ نے چیخ پکار کی۔ طاقتور قاتل نے اسے دبوچ لیا اور گلا گھونٹ کر اس کی آواز ہمیشہ کے لیے دبا دی۔ جہاں تک مقتولہ کی آبروریزی کا تعلق تھا اس بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ خوفزدہ لوگوں نے مقتولہ کی چتا پولیس کی آمد سے پہلے ہی جلا ڈالی تھی۔ مقتولہ ہندو تھی اور اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ بعد ازاں یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی کہ خونخوار قاتل جگرگاں کے قبرستان میں موجود ہے۔ سب لوگ خوفزدہ تھے۔

یہاں تک کہ پولیس بھی۔ وہ آئی اور خانہ پری کر کے چلی گئی۔

نوابزادی کو بھی پتا چل چکا تھا کہ عجیب الخلقت شخص جگرگاں کے قبرستان میں موجود ہے۔ نوابزادی ولایت پلٹ پڑھی لکھی روشن خیال لڑکی تھی۔ ہوائی چیزوں اور جنوں بھوتوں سے متعلق افواہیں اسے کیا متاثر کر سکتی تھیں۔ قبرستان کی تنہائی اور تاریکی بھی اس کے لیے اتنی خوفناک نہیں تھی جتنی کسی عام شخص کے لیے ہو سکتی تھی۔ وہ ایک رات اس عجیب الخلقت شخص سے ملنے کے لیے قبرستان چلی آئی۔ یہیں پر ان دونوں کی مڈبھیڑ مجھ سے ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عجیب الخلقت قاتل زخمی ہوا اور ان دونوں کو قبرستان سے بھاگنا پڑا۔ یہ تھا وہ خاکہ جو میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس میں کئی خامیاں ہوں لیکن حقیقتِ حال اس خاکے سے ملتی جلتی تھی۔

کہہ رہا تھا کہ اس خاکے کی گمشدہ کڑی کا سراغ لگانے کے لیے مجھے اسی جگہ پر جانا پڑے گا جہاں خدا بخش قتل ہوا تھا۔ وہاں سے کوئی نہ کوئی کھوج ایسا مل سکتا تھا جو اس الجھی ہوئی گتھی کا سرا ڈھونڈنے میں مدد دیتا۔ اس روز صبح سویرے میں ابدال کے ساتھ جگرگاں سے روانہ ہوا اور گیارہ بجے کے لگ بھگ اس نہر کے کنارے جا پہنچا جہاں حدِ نگاہ تک سرکنڈے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ میں اور ابدال آدھ پون گھنٹے تک جائے واردات پر گھومتے رہے اور مختلف اندازے قائم کرتے رہے۔ میں نے ابدال سے کہا "تم نے بتایا تھا کہ واردات کے بعد پولیس نے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کے بیانات بھی لیے تھے۔ کیا ان بیانات کی نقل مجھے مل سکتی ہے؟"

وہ بولا "مل تو سکتی ہے، لیکن اس کے لیے مجھے ... پڑے گا اور ایک آدھ دن وہاں بھی لگ جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو مشکل کام ہے۔"

وہ بولا "ایک طریقہ ہے۔ ہم ان لوگوں سے پھر بیانات لے لیتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ دس بار بھی ان سے بیانات لیں گے تو یہ اعتراض نہیں کریں گے۔ اور پھر یہ لوگ بھی کتنے ہیں۔ مشکل سے سات آٹھ بندے ہوں گے۔ میرا رعب داب بھی ہے ان لوگوں پر۔ مجھے پولیس کا آدمی سمجھتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر اکٹھے ہو جائیں گے۔"

"ویری گڈ" میں نے کہا "تم ان لوگوں سے ملاقات کا انتظام کرو۔"

وہ چٹکی بجا کر بولا "فکر ہی نہ کریں۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب کو بلا لیتا ہوں۔ لیکن جگہ کون سی ہو؟"

میں نے کہا "جو سب کو نزدیک پڑے۔"

اپنے کہنے کے مطابق ڈیڑھ گھنٹے میں ابدال نے ان تمام لوگوں کو جمع کر لیا جنہوں نے واردات کے بعد بیان دیے تھے۔ ان میں دو تین اہلکار محکمۂ انہار کے تھے۔ یہ چوکیدار ٹائپ کے لوگ تھے۔ دو

تین کاشتکار تھے۔ سرکنڈوں سے آگے نہر کے ساتھ ساتھ چند باغات تھے۔ ان باغات کے رکھوالے بھی بیان دینے والوں میں شامل تھے۔ ابدال نے آٹھ دس افراد کو ایک کاشتکار کے ڈیرے پر جمع کر لیا تھا۔ محکمۂ انہار کے چوکیدار کے سوا سب ان پڑھ دیہاتی تھے اور ابدال کو ہی "تھانیدار" سمجھ کر اس سے ڈرے سہمے نظر آ رہے تھے۔ ابدال نے سب کو باری باری علیحدہ کمرے میں بلانا شروع کیا۔ میں بھی اس کمرے میں موجود تھا۔ سوال جواب ابدال کر رہا تھا۔ جہاں ضرورت ہوتی تھی، میں بھی بول لیتا تھا۔ معمولی تضادات کے سوا ان لوگوں کے بیانات تقریباً ملتے جلتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مقتول کو نہیں جانتے اور نہ واردات سے پہلے انہوں نے اسے اس علاقے میں دیکھا۔ قتل کی رات ان میں سے کسی کو فائر کی آواز سنائی دی اور نہ کسی طرح کی چیخ و پکار ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ کسی فرد پر شک کا اظہار بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہیں قتل کا علم رات نو اور دس بجے کے درمیان ہوا تھا جب انہوں نے کچھ راہ گیروں کا شور سنا اور انہیں بتایا گیا کہ ایک شخص قتل کر کے بھاگ گیا ہے اور لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

بیان دینے والوں میں چھٹا یا ساتویں نمبر پر ایک عورت کمرے میں آئی۔ اس نے میلی کچیلی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ مقامی عورتوں کی طرح اس نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ عورت کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں تھی۔ کل رات یہ عورت جگرگاں میں موجود تھی۔ "حضرت گروجی" کی مجلس میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ حضرت گروجی سے اپنے گمشدہ بچے کے لیے دعا کرانے آئی تھی۔ یقیناً وہ مجھے نہیں پہچانتی تھی لیکن میں اسے پہچانتا تھا۔

ابدال نے حسبِ معمول اس سے بھی سوال جواب شروع کیے۔ "بی بی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"عائشہ بی بی۔"

"کہاں رہتی ہو؟"

"ساتھ والے باغ میں۔ وہیں پر چھوٹا سا کوٹھڑا بنا رکھا ہے۔ رکھوالی کرتی ہوں باغ کی۔"

"کس کا باغ ہے؟"

"میرا اپنا ہی ہے پتر۔"

"تمہارا شوہر ہے؟"

"فوت ہو چکا ہے۔"

"بچے کتنے ہیں؟"

"بچہ... کوئی نہیں ہے۔"

میں چونک گیا۔ اس سے پہلے کہ ابدال اگلا سوال کرتا میں نے عائشہ نامی اس عورت سے پوچھا۔

"تمہارا بچہ نہیں ہے؟"

"نن... نہیں جی۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"کسی کو گود لیا ہوا ہے؟"

"نن... نہیں جی۔"

"کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"اکیلی جان ہوں جی۔"

مجھے عورت کے جوابات نے شبہے میں مبتلا کر دیا۔ ابدال نے عورت سے چند سوالات مزید پوچھے اور واپس بھیج دیا۔ عورت کے بعد ایک اور شخص اندر آ گیا۔ میرا ذہن مسلسل عورت میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ جھوٹ کیوں بول رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد "بیانات" کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

میں نے ابدال سے کہا "مجھے عائشہ نام کی اس عورت پر شک ہو رہا ہے۔"

"کیوں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"اس کی ایک وجہ ہے۔" میں نے کہا "تم ایسا کرو کہ ان مولوی صاحب کو بلاؤ جنہوں نے سب سے پہلے بیان دیا تھا۔"

ابدال نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ درمیانی عمر کا یہ باریش شخص کاشتکار تھا اور دوسروں کی نسبت زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ میں نے اس سے عائشہ یا عاشاں نامی عورت کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا "عاشاں پندرہ بیس سال سے یہاں رہ رہی ہے۔ بڑی چپ چاپ اور خاموش طبع عورت ہے۔ آٹھ دس سال پہلے اس کا خاوند فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اور بھی گم صم ہو گئی ہے۔ بال بچہ بھی کوئی نہیں۔ نہ کوئی اس سے ملتا ہے نہ یہ کسی سے ملنا پسند کرتی ہے۔ بلکہ اب تو آس پاس والے اس سے خوف کھاتے ہیں۔ کوئی بددماغ کہتا ہے کوئی سڑی سمجھتا ہے۔ وہ بھی بس اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ باغ کی رکھوالی کرتی ہے اور جب پھل تیار ہوتا ہے تو شاہ پور کے ایک بیوپاری کو پیغام بھیج دیتی ہے وہ آ کر لے جاتا ہے۔ وہی بیوپاری اس کے لیے شہر سے کئی ماہ کا سودا سلف بھی لے آتا ہے۔ آٹھ دس سال سے عاشاں کا رہن سہن یہی تھا مگر اب کچھ عرصے سے ایک تبدیلی آئی ہے۔ ایک لڑکی عاشاں کے ساتھ آ کر رہنے لگی ہے۔ نوجوان لڑکی ہے۔ شکل کی بھی اچھی ہے۔ کہتے ہیں لاوارث ہے اور عاشاں نے اسے بیٹی بنا لیا ہے۔ وہ بھی عاشاں ہی کی طرح گم صم اور اپنے آپ میں رہنے والی لڑکی ہے۔ پہلے پھر عاشاں نے اسے گونگا بہرا بنا رکھا ہے۔ وہ بہت کم کوٹھڑے سے باہر نکلتی ہے۔ پچھلے چھ سات مہینوں میں میں نے اسے صرف ایک بار باغ میں دیکھا ہے۔ وہ پودوں کی گوڈی کرنے میں عاشاں کی مدد کر رہی تھی۔"

میں نے کہا "ایسے ویرانے میں دو اکیلی عورتوں کو رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

باریش شخص بولا "عاشاں ڈرنے والی عورت نہیں ہے۔ اس کا حوصلہ مردوں جیسا ہے۔ اپنی حفاظت کے لیے اس نے کئی

را ئفل رکھی ہوئی ہے اور کتا بھی پال رکھا ہے۔ بڑی خونخوار عورت ہے۔"

میں حیران ہو رہا تھا کہ یہی حوصلہ مند اور "خونخوار" عورت یہاں سے آٹھ دس میل دور جگرگاں کی حویلی میں نواز حالی کے جنازے پہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور اپنے کسی گمشدہ بیٹے کے لیے دعائے خیر کروا رہی تھی۔ میری چھٹی حس اعلان کر رہی تھی کہ عنقریب مجھ پر کوئی انکشاف ہونے والا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پہلی فرصت میں اس عورت سے اس کے ٹھکانے پر جا کر ملنا چاہیے۔

میں اور ابدال امرود اور مالٹے کے اس گھنے باغ میں داخل ہوئے تو سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی تھیں اور افق کے چہرے پر شفق کی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ باغ کے عین وسط میں نانک شاہی اینٹوں کا بنا ہوا ایک گول کمرا تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی برجی تھی۔ یہ کوٹھا اور برجی یقیناً کسی آثار قدیمہ کا حصہ تھی۔ یہی جگہ عاشاں کا مسکن تھی۔ کوٹھے سے باہر ایک گیلا ذاگ بندھا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ایک صحت مند بکری اپنے بچے سے لاڈ کر رہی تھی۔ ابدال کو اور مجھے دیکھ کر عورت ٹھٹک گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس کی آنکھوں میں ہراس نظر آ رہا تھا۔ بہر طور ہم دروازے پر آ گئے تھے، اسے ہمیں اندر تو لے جانا ہی پڑا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خاصی جزبز نظر آئی۔ یہ گول کوٹھا اندر سے بھی خستہ حال تھا۔ ایک طرف دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پرانی جستی پیٹی پر دو تین صندوق رکھے تھے۔ باغبانی کا معمولی سامان بھی یہاں وہاں بکھرا ہوا تھا۔ ان میں دو کنستر بھی شامل تھے جنہیں بجا کر چڑیاں، طوطے وغیرہ اڑائے جاتے ہیں۔ کمرے میں ایک جانب دیوار پر دو نالی رائفل مع کارتوس والی پیٹی کے لٹک رہی تھی۔ عورت نے جلدی سے اس رائفل پر ایک کپڑا لٹکا دیا۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے، کوئی تیزی سے دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ یقیناً یہ وہی لڑکی تھی جو کچھ عرصے سے عاشاں کے ساتھ رہ رہی تھی۔ عاشاں کی گھبراہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس نے سمجھا ہو کہ ہم دوسرے لوگوں کے گھروں میں بھی اسی طرح گھستے ہیں، اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم نے یہ "اعزاز" صرف اسی کو بخشا ہے تو اس کی گھبراہٹ دو چند ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سے ضرور قسم کے سوالات کیے۔ ان میں صرف ایک سوال ذرا تیکھا تھا اور وہ یہ کہ "اپنے بیان میں اس نے کہا تھا کہ وہ یہاں اکیلی رہتی ہے لیکن اس کے برعکس اس نے اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بھی رکھا ہوا تھا۔

عاشاں بولی "یہ لڑکی تو بس عارضی طور پر یہاں ہے۔ پتا نہیں کب چلی جائے گی۔ حیدر آباد میں ہی کسی جگہ کی رہنے والی ہے اپنا اتا پتا ٹھکانا بتاتی نہیں ہے۔ کہتی ہے جب میرا دل چاہے گا، خود ہی چلی جاؤں گی۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا جائے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی باغ میں بندھا ہوا کتا کھل گیا اور باغ سے باہر نکل کر کسی پر زور و شور سے بھونکنے لگا۔ عاشاں جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ یقیناً کتے پر قابو پانے گئی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں ابدال سے کہا "یار! یہ عورت بڑی گہری ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ ہمیں قاتل کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتی ہے۔"

ابدال بولا "تو ٹھیک ہے۔ سالی کو پکڑ کر تھانے لے جاتے ہیں۔ وہاں سب کچھ اگل دے گی۔"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔ فی الحال میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں سے کوئی کھوج مل جائے گا۔ اور پھر یہاں رہنے والی لڑکی۔ مجھے اس کے بارے میں بھی ایک خاص قسم کا شک ہو رہا ہے۔"

"کس قسم کا؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم کسی طرح اس کے گھر اور باغ کی تلاشی کا انتظام کرو۔ لیکن یہ انتظام اس طرح ہو کہ کسی طرح کا پھڈا نہ پڑے۔"

ایکا ایکی ابدال کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ شاید بیٹھے بٹھائے کوئی خاص خیال اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔ اس نے بڑی تیز نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ پھر اٹھ کر اندرونی دروازے کے قریب چلا گیا۔ یہاں ایک چھوٹے سے ڈول (بالٹی) میں کوئی چیز ڈھکی پڑی تھی۔ ابدال نے ڈول کا ڈھکن اٹھایا۔ اس میں بکری کا ڈیڑھ دو سیر دودھ تھا۔ دودھ کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی دوہا گیا ہے۔ ابدال نے جیب سے کوئی شے نکالی اور پھرتی سے دودھ میں ڈال دی۔

اس دوران میں عاشاں نے رکھوالی کا کتا دوبارہ باندھ لیا تھا۔ وہ ہانپی ہوئی سی اندر آئی۔ غریب صورت ہونے کے باوجود وہ ایک توانا اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی عورت تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ موقع پڑنے پر وہ ہر قسم کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہم زبردستی اس کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی۔ وہ ہمارے سوالوں کے جواب بھی خفا خفا انداز میں دے رہی تھی اور ڈر تھا کہ کسی بات پر بھڑک ہی نہ اٹھے۔ دس پندرہ منٹ اس کے خستہ حال کوٹھے میں بیٹھنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

باہر آ کر ابدال نے اپنی حیدر آبادی اردو میں مجھے بتایا کہ اس نے بکری کے دودھ میں "ایٹی وان" کی گولیوں کا سفوف ملا دیا ہے۔ یہ سفوف اتفاقاً اس کے پاس موجود تھا اور اس نے موقع دیکھ کر دودھ کے ڈول میں پھینک دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ دودھ آج رات تک استعمال ہو جائے گا اور اسے استعمال کرنے کے نتیجے میں عاشاں اور لڑکی بہت گہری نیند سو جائیں گی۔ ویسی ہی نیند جس کے

لیے گھوڑوں والا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

ویسا ہی ہوا جیسا ابدال نے سوچا تھا۔ ہم دونوں رات دس بجے تک یونہی ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتے رہے۔ پھر ہم نے نہر کا پل عبور کیا اور کنارے کنارے چلتے عاشاں یا عائشہ کے باغ میں پہنچ گئے۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ ہم تاروں کی چھاؤں میں باغ کے اندر داخل ہوئے تو حسب توقع رکھوالی کے کتے نے ہمارا استقبال کیا۔ اس "پروٹوکول" کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ میں نے ایک بانس کی سوٹی شاخ لٹھ کے طور پر سنبھال رکھی تھی۔ ایسے کتوں سے نمٹنے کا مجھے خاطر خواہ تجربہ بھی تھا، کچھ تجربات تو پچھلے دنوں جگرگاں میں ہی ہو چکے تھے۔ جونہی کتا ہماری شان میں قصیدہ پڑھتا ہماری طرف لپکا، میں نے پہلو بچایا اور "زاد" کے طور پر لٹھ کا ایک جچا تلا ہاتھ اس کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ کتے ہمیڈ ذ بھیڑیے اور سؤر وغیرہ کے سر پر لگنے والی اس انداز کی ضرب بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ہمارا قصیدہ گو بھی ضرب کھا کر چکرایا اور پہلو کے بل گر کر اٹا غفیل ہو گیا۔ اب یہ اس کی تقدیر کا معاملہ تھا کہ وہ بچتا ہے یا نہیں۔ ہم محتاط قدموں سے اس گول کمرے تک پہنچے جس کی ایک جانب لکڑی کا مختصر لیکن بے حد مضبوط دروازہ تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک کھڑکی بھی تھی جس کے عین نیچے ایک چولہا تھا اور چولہے کے مسلسل استعمال نے کھڑکی کے ارد گرد کی دیوار کو سیاہ کر رکھا تھا۔ میں نے اس چولہے میں سے ہی دو اینٹیں اکھاڑیں۔ یہ اینٹیں سیمنٹ کے ساتھ مضبوط ملی سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان ڈبل اینٹوں کی تین چار ضربوں نے ہی کھڑکی کی اندرونی کنڈی توڑ دی اور ہم چوکھٹ پر چڑھ کر اندر کود گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی اس گول کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دیگر ساز و سامان کے علاوہ بکری بھی کمرے کے اندر ہی تھی۔ دونوں چارپائیوں پر عورتیں محو خواب تھیں اور یقیناً وہ بہت گہری نیند سو رہی تھیں کیونکہ کھڑکی ٹوٹنے کی آوازیں انہیں حالت بیداری میں نہیں لا سکی تھیں۔ ایک چارپائی پر تو وہی کل والی جفاکش دہقان عاشاں تھی جبکہ دوسری چارپائی پر نوابزادی شاہین سو رہی تھی۔

ہاں وہ نوابزادی شاہین ہی تھی۔ وہ خوب رو جو کسی شاعر کی غزل لگتی تھی، حالت خواب میں آزاد نظم کی طرح بے ترتیب پڑی تھی۔ بال منتشر، لباس منتشر اور اس لباس میں سے چھلکتا ہوا سیمیں بدن۔ خدانخواستہ ہم بھلے مانسوں کی جگہ کوئی ڈاکو قسم کے لوگ اس کوٹھے میں گھسے ہوتے اور انہوں نے نوابزادی کو یوں محو خواب دیکھا ہوتا تو انہیں اپنا "میلا کچیلا" ایمان سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا اور وہ کچے پکے دوزخی ہو کر اس کوٹھے سے نکلتے... بلکہ ممکن تھا کہ "جہنم رسیدی" کا یہ خوبصورت سبب بھی مال مسروقہ میں شامل ہو جاتا۔ نوابزادی کو دیکھ کر ابدال کا اوپر کا سانس بھی اوپر ہی رہ گیا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ حیرانی کی بات تھی، مسٹر جی کلارک جس لڑکی کو انگلینڈ کے طول و عرض میں تلاش کروا رہے تھے وہ اس ویرانے کے ایک خستہ حال کوٹھے میں محو خواب تھی۔

دونوں عورتوں کو ڈسٹرب کرنا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر ہم نے کمرے کا اندرونی دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اور چھوٹا سا کمرا نظر آیا۔ یہ دراصل وہی برجی تھی جو باہر سے اتنی کشادہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس برجی میں ان کی کسی ایک اور چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے سامنے لکڑی کی الماری رکھ کر ڈھانک دی گئی تھی۔ میں نے الماری ہٹا کر دروازہ کھولا۔ ... ہوئی جو اکثر زمین دوز مقامات کا خاصہ ہے" میں کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں کا ایک تنگ سا زینہ نیچے اتر رہا تھا ... زبردستی نہیں کریں گے" خانے میں پہنچا۔ تہہ خانے میں ... تھا جسے عاشاں نامی عورت کے جلایا۔ تہہ خانے کے در و دیوار ... پانی کے چھینٹے کرتے ہیں۔ ... سی چارپائی پڑی تھی۔ چار الماری سے تین چار قدم ہٹ کر تھی تاہم اس کی بیکلی ابھی تک بندھی ہوئی لکڑی کے معمولی تختہ میان ہی اس نے نواب زادی کو اطلاع دی کہ کھولا تو سامنے ابا کو ہلاک کر دیا ہے۔ خانے کا پانی "تہ" وضاحت کرتے ہوئے کہا "وہ ہلاک نہیں بے ہوش تھا۔ ہوری کے بدلے اچانک ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کے سر یہاں جو چوٹ لگائی تھی" اس کے ساتھ ہی میں نے ابدال کو چارپانچ گز لمبی یہ زنجیر کا حال احوال دریافت کر کے تہ کے دوسرے سروں پر کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ معاملہ فہم شخص تھا۔ کہ یہ زنجیریں کسی کو باندھنے کے لیے کھینچ کر رکھا ہے تو وہ یہ اطلاع پھیلا تھی کہ بندھا ہوا شخص با آسانی چارپائی پر نشست کرے گا۔ میرا یہ زنجیروں اور ان کے تالوں کی حالت چغلی کھا رہی تھی تو اس کا چہو استعمال میں رہتی ہیں۔ میں نے چوبی الماری کھولی اسے عاشاں کو سے مختلف لباس جھول رہے تھے۔ کچھ تہ شدہ حالت میں اور وہ کمری پڑے تھے۔ یہ سب مردانہ لباس تھے۔ میں نے ایک کرتہ ... تھی۔ دیکھا۔ وہ کچھ عجیب سا نظر آیا۔ اس کا گریبان معمول سے کافی بڑا تھا۔ پھر میری نگاہ اس کی آستینوں پر پڑی۔ میں دنگ رہ گیا۔ دو کے بجائے اس کی تین آستینیں تھیں، اور ایک آستین حیرت انگیز طور پر بڑی تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین کرتے دیکھے۔ ان سب کی تین تین آستینیں تھیں۔ وہ عجیب الوضع کرتے تھے۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔

میری آنکھوں کے سامنے اس عجیب الخلقت شے کا تصور ناچ رہا تھا جو میں نے چند دن پہلے جگرگاں کے قبرستان میں دیکھی تھی۔ وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ جیتی جاگتی زندہ حقیقت تھی۔ اونچی نیچی قبروں کے درمیان زرد زرد چاندنی میں بہت بڑے سر والا وہ انسان نما جانور مجھ سے چند قدم کی دوری پر کھڑا رہا تھا۔

میرا ذہن چیخ چیخ کر گواہی دینے لگا کہ یہ تین آستینوں والے عجیب و غریب کرتے جو میں الماری میں دیکھ رہا ہوں اسی عجیب الخلقت شخص کے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی "تو کیا وہ شخص بھی یہیں کہیں موجود ہے؟" بے اختیار میرا

ہاتھ پسٹل تک پہنچ گیا اور میں نے پسٹل نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں لالٹین تھا۔ میں نے لالٹین اونچا کیا اور نحیف روشنی میں تہ خانے کے در و دیوار دیکھے۔ میرے سوا یہاں سے آگے کسی کا گزر نہیں تھا۔ کہیں کوئی دروازہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سامنے بلیک بورڈ ... خیال کیا جا سکتا کہ اس تہ خانے کا کوئی اور دہانے خیر کردار ہی تھی۔ عنقریب مجھ پر کوئی انکشاف ہونے والا تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں اس عورت ... آستینوں والے یہ کرتے پہنے والا کی موجود عورت عائشاں اس کی چاہیے۔

میں اور ابدال امرود اور مالٹے کے ... کا سا ہوا اور اس شخص سے ہوئے تو سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی پھنگ ... کی ماں تھی۔ یہی عجیب اور افق کے چہرے پر شفق کی سرخی پھیلنے لگی ... دیکھ لے کر عائشاں وسط میں نانک شاہی اینٹوں کا بنا ہوا ایک گول کمرا ... بنے والی کڑکڑاتی ساتھ ایک چھوٹی سی برجی تھی۔ یہ کوٹھا اور برجی ... عائشاں کی کوکی قدیم کا حصہ تھی۔ یہی جگہ عائشاں کا مسکن تھی۔ کوٹھے ... تھی۔ اس کا ایک مٹیالا اگ بندھا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ایک صحت ... نگاہ سے بچا اپنے بیٹے سے لاڈ کر رہی تھی۔ ابدال کو اور مجھے دیکھ کر وہ ان آنکھی ٹھٹک گئی۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس کی آنکھوں میں ... مشکوک تھیں۔ آرہا تھا۔ بہرطور ہم دروازے پر آگئے تھے۔ ... آگئی۔ یہ زنجیریں جاتا ہی پڑا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خاصہ ... ثبوت خود ہی اپنی حفظ اندر سے بھی خستہ حال تھی ... اور میں اس نیم تاریک تہ خانے کے ایک پرانی جستی پیٹی پر ... کھڑا تھا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے سامان بھی یہاں ... کمرے سے آئی تھی۔ یقیناً اس چاردیواری جنہیں بچا کر ... اماں نامی عورت گہری نیند سے بیدار ہو گئی تھی۔ میں ایک جانب ... دو سیڑھیاں چڑھ کر تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ یہاں ... میں افراتفری نظر آئی عائشاں جاگ اٹھی تھی اور ابدال سے ہاتھا پائی کر رہی تھی۔ وہ ایک مضبوط اور توانا دیہاتن تھی۔ ابدال عام قد کاٹھ کا تھا۔ عائشاں عورت ہونے کے باوجود اسے باآسانی رگید سکتی تھی لیکن فی الوقت اس کی مزاحمت میں کوئی خاص جوش جذبہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا سبب وہ غنودگی تھی جو ابھی تک بری طرح اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ابدال سے الجھ رہی تھی۔ ابدال نے اس کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں اور اسے بستر پر لٹائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عائشاں زور آزمائی کے ساتھ ساتھ واویلا بھی کر رہی تھی "کون ہو تم؟ چھوڑ دو مجھے! خبردار میری بچی کو ہاتھ لگایا تو میں جان سے مار دوں گی۔ چھوڑ دو مجھے"

پھر یکدم اس کا جی متلانے لگا اور وہ قے کرنے لگی۔ ابدال نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں۔ وہ چارپائی پر لیٹی لیٹی نیچے جھک گئی اور ابکائیاں لینے لگی۔ یقیناً یہ خواب آور دوا کا اثر تھا۔ چند لمحے کے بعد وہ نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا ہے مجھے؟ کیا کھلا دیا ہے ہم دونوں کو؟ ہائے اللہ میں مر جاؤں۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور تسلی دینے کے لہجے میں کہا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوا اماں! اور نہ تمہاری بچی کو کچھ ہوا ہے۔ تم دونوں بالکل ٹھیک ہو اور بالکل محفوظ بھی۔ ہم پولیس کے آدمی ہیں، جو کچھ کریں گے قانون کے مطابق کریں گے۔"

"یہ کیسی پولیس ہے جو کھڑکیاں توڑ کر لوگوں کے گھروں میں گھس آتی ہے" عورت نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ہم گھسے تھے۔

میں نے کہا "ہاں! یہ کھڑکی توڑنے والے اور لوگ تھے۔ ہمیں دیکھ کر بھاگ گئے ہیں۔ اب تمہیں کوئی ڈر خطرہ نہیں"

"تم پولیس والے نہیں ہو۔ میں سب جانتی ہوں۔ تم میری بچی کے پیچھے یہاں آئے ہو۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی اپنی بچی کو"

اس نے لیٹے لیٹے اپنا بازو قریبی چارپائی کی طرف بڑھایا اور نواب زادی شاہین کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔

میں ٹھٹک گیا۔ عائشاں نامی یہ عورت میری توقع سے زیادہ جانتی تھی۔ ظاہر تھا کہ اسے میرے بارے میں بتانے والی نواب زادی شاہین ہی ہے۔ اس بات کے واضح امکانات موجود تھے کہ کل جب ہم اس مکان میں آئے تو نواب زادی نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اسی دوران میں نواب زادی شاہین بھی کسمسانے لگی۔ میں نے اور ابدال نے اس کی طرف دیکھا۔ اسی ایک لمحے کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر عائشاں نے کروٹ بدل کر خود کو زمین پر گرایا اور پھر تیزی سے اس رائفل کی طرف بڑھی جو دیوار پر ایک کپڑے کے نیچے لٹک رہی تھی۔ ایک تو عائشاں بھاری بھرکم تھی۔ دوسرے غنودگی کے سبب اس میں زیادہ تیزی بھی نہیں تھی۔ جتنی تیزی اس نے دکھائی تھی اس سے چار پانچ گنا تیزی کا مظاہرہ بھی کرتی تو میں اسے رائفل تک نہ پہنچنے دیتا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور باآسانی رائفل قبضے میں لے لی۔ عائشاں ڈگمگا کر رہ گئی میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا اور خطرناک لہجے میں کہا۔ "میں گولی چلاتے وقت زیادہ نہیں سوچتا۔ اپنی اور لڑکی کی خیریت چاہتی ہو تو آرام سے چارپائی پر بیٹھ جاؤ"

میرے لب و لہجے نے عائشاں کا رنگ زرد کر دیا۔ وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح چارپائی پر بیٹھ گئی اور بار بار ایک ہاتھ سے ماتھا پیٹنے لگی۔ پھر ایک دم کتے کا خیال آیا اور اس نے زور زور سے "موتی موتی" چلانا شروع کر دیا۔

"چپکی بیٹھی رہو" میں نے پسٹل کی نال اس کے سر سے لگا دی "ورنہ موتی کی طرح تمہیں بھی ہمیشہ کا چپ کرا دیں گے"

"تم نے موتی کو مار دیا؟" وہ کراہی۔

"ہاں بس مرا ہی سمجھو"

اس کے ہونٹ بری طرح کانپے۔ پھر اس نے سر چارپائی کے پائے سے ٹکرایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کے رونے پیٹنے سے ہماری صحت پر بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ یہ تنہا مکان باغ کے وسط میں واقع تھا۔ عائشاں کے قریب ترین پڑوسی کا فاصلہ بھی اس مکان سے زیادہ دو فرلانگ سے کم نہیں ہو گا۔ اس امر کا قطعی امکان نہیں تھا کہ عائشاں یا نواب زادی شاہین کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ سکے گی۔

دو تین منٹ بعد نواب زادی شاہین نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کی خوابیدہ روشنی میں جیسے کوئی ہیرا جگمگا اٹھا تھا۔ وہ بالکل خالی نظروں سے ہمیں دیکھتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی حیران آنکھوں میں خوف اور غصہ سمٹنے لگا۔ وہ جاگ گئی تھی لیکن اس کا ذہن اب بیدار ہونا شروع ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی مرمریں انگلی میری طرف سیدھی کی اور سرسراتی آواز میں بولی "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آپ کی تلاش میں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"میں اپنی مرضی سے آیا ہوں"

"جھوٹ بولتے ہو تم" اس کی خوابیدہ آنکھوں میں ان گنت اندیشے رقصاں ہو گئے۔ "تمہیں بھیجا گیا ہے اور بھیجنے والے وہی لوگ ہیں جو میرے پاپا کے دشمن تھے"

نواب زادی کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ بہرحال اس کی باتوں میں ربط تھا۔ یہ بات باآسانی محسوس کی جا سکتی تھی کہ اس پر خواب آور دوا کا اثر نسبتاً کم ہے۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "نواب زادی صاحبہ! ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ میری وجہ سے آپ کا بھلا تو ہو سکتا ہے نقصان نہیں"

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میرے الفاظ نے اس پر اثر کیا تھا، اور کیوں نہ کرتے۔ ان الفاظ کو سہارا دینے کے لیے وہ واقعات موجود تھے جو ماضی قریب میں پیش آئے تھے۔ جواں سال خوب صورت نواب زادی کو سلجوق نے فاروق نگر سے اغوا کرایا تھا اور ایک ویران سرنگ میں لے گیا تھا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتا تو وہ اپنے کارندوں سے نواب زادی کی عزت تار تار کروا دیتا۔ اسی سرنگ میں ایک رات ایسی بھی آئی تھی جب ڈاکوؤں نے نواب زادی کو مکمل طور پر میرے اور ریونا سنگھ کے حوالے کر دیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اپنی تمام تر طاقت اور دولت کے باوجود وہ اس بے رحم رات کی گرفت میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ لیکن ہم نے اس رات "بدلے" کے بجائے "انسانیت" کی راہ اپنائی تھی۔ ایسا واقعہ کوئی عورت آسانی سے نہیں بھلا سکتی۔

وہ آنکھیں ملنے اور سر جھٹکنے کے بعد بستر سے اتر آئی۔ صراحی سے پانی لے کر اس نے چہرے پر چھینٹے مارے۔ عائشاں ابھی تک رو رہی تھی۔ نواب زادی سے مخاطب ہو کر بولی "بی بی جی ان کی کسی بات میں نہ آنا۔ یہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ اگر تو بھاگ سکتی ہے تو بھاگ جا یہاں سے"

نواب زادی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ماسی! تم حوصلہ رکھو۔ یہ مجھ سے کوئی زبردستی نہیں کریں گے"

نواب زادی کے ان الفاظ نے عائشاں نامی عورت کے اعصاب پر وہی اثر کیا جو فصلوں پر پانی کے چھینٹے کرتے ہیں۔ وہ قدرے پرسکون نظر آنے لگی تاہم اس کی ہچکی ابھی تک بندھی ہوئی تھی۔ ہچکیوں کے درمیان ہی اس نے نواب زادی کو اطلاع دی کہ ہم نے کتے موتی کو ہلاک کر دیا ہے۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "وہ ہلاک نہیں بے ہوش ہوا ہے۔ اس نے اچانک ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کے سر پر لکڑی سے چوٹ لگائی تھی" اس کے ساتھ ہی میں نے ابدال کو اشارہ کیا کہ وہ کتے کا حال احوال دریافت کر کے آئے۔

ابدال دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ معاملہ فہم شخص تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کتا دار فانی سے کوچ کر چکا ہے تو وہ یہ اطلاع چھپا لے گا اور عائشاں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ دو تین منٹ بعد ابدال واپس آیا تو اس کا چہرہ دیکھ کر ہی میں جان گیا کہ کتا جانبر نہیں ہو سکا۔ ابدال نے عائشاں کو بتایا کہ کتے کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی ہے اور وہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہے۔ عائشاں یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ ایک نظر خود کتے کو دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے پہلے نرم اور پھر سخت الفاظ استعمال کر کے اسے باہر جانے سے روک لیا۔

نواب زادی شاہین میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ وہ بولی۔ "تم اس منحوس شے کو اپنی جیب میں رکھو، کیوں خواہ مخواہ ہراس پھیلا رہے ہو"

میں نے کہا "یہ خواہ مخواہ کا ہراس نہیں ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ کی یہ موٹی تازی ماسی صاحبہ ہمارے لیے مشکلات پیدا کریں گی"

"میں ان کی طرف سے تمہیں ضمانت دیتی ہوں۔ یہ کچھ نہیں کریں گی" وہ اعتماد سے بولی۔

میں نے پسٹل جیب میں رکھ لیا اور بارہ بور کی رائفل میں سے کارتوس نکال کر ابدال کو تھما دیے۔ کھڑکی پہلے ہی بند تھی۔ میں نے دروازے کو بھی اندر سے کنڈی چڑھا دی اور دونوں چارپائیاں گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیں۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ عائشاں ہماری کسی لمحاتی غفلت کا فائدہ اٹھا کر دروازے کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرتی۔

میزبان کی ہدایت پر ابدال نے چائے کی پتیلی چولہے پر چڑھا دی۔ میں چاہتا تھا کہ عالشاں اور نواب زادی کو کڑک قسم کی چائے پلائی جائے تاکہ ان کی غنودگی دور ہو۔ ابدال نے دس منٹ کے اندر بہترین چائے تیار کر لی۔ یہ چائے بکری کے دودھ سے تیار کی گئی تھی لیکن نواب اور دودھ کے بجائے اس میں تازہ دودھ جوش کر ڈالا گیا تھا۔ عالشاں کو خطرہ تھا کہ ہم نے اس چائے میں بھی کچھ ملا دیا ہے۔ وہ پینا نہیں چاہ رہی تھی تاہم نواب زادی کے اصرار پر اسے پینا پڑی۔

چائے پینے کے بعد میں نواب زادی کے ساتھ تہ خانے میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے اہم نوعیت کی گفتگو کر رہے تھے۔ ابدال بالائی کمرے میں تھا۔ میں نے اپنا پسٹل اسے دے دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ عالشاں کی طرف سے ہوشیار رہے۔ نواب زادی شاہین نے جو سب سے پہلا سوال مجھ سے کیا وہ یہ تھا "تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

میں نے نواب زادی سے اجازت لے کر سگریٹ سلگایا اور پہلے کش کا لطیف دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "نواب زادی صاحبہ! میں آپ سے ایک درخواست کروں گا اور مجھے امید ہے آپ یہ درخواست قبول کریں گی۔"

"کہو" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "آپ اس بارے میں کوئی سوال نہ کریں کہ میں یہاں کیوں، کب اور کیسے آیا ہوں۔ بس مجھے اپنا ہمدرد اور غمگسار سمجھیں اور یقین رکھیں کہ مجھ سے آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی "ٹھیک ہے۔ میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

"تھینک یو ویری مچ" میں نے خلوص دل سے کہا۔

"نو مینشن۔ اب تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے دیوار میں پیوست زنجیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہاں کسے باندھا جاتا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" نواب زادی نے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں عالشاں کے بیٹے کو باندھا جاتا ہے اور یہ بیٹا وہی عجیب الخلقت شخص ہے جس نے علاقے میں شدید خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے" نواب زادی نے آہستگی سے کہا۔

مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے نواب زادی سے پوچھا "آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے؟"

"بے شمار دفعہ۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔"

"رہتا تھا سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا وہ اب یہاں نہیں؟"

"نہیں۔"

"وہ عالشاں کا سگا بیٹا ہے؟"

"ہاں اس نے عالشاں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اس کا نام قادر بخش ہے اور ماسی عالشاں اسے بخشو کہتی ہے۔ بخشو کی عمر اس وقت اکیس برس ہے۔ وہ بھوپال میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش ایک روح فرسا واقعہ تھی۔ وہ ایک بھیانک شکل و صورت والا بچہ تھا۔ جانوروں کی طرح اس کے سارے جسم پر بال تھے۔ اس کے سر کے ساتھ ایک اور سر جڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ سر بہت بڑا نظر آتا تھا۔ اس کے کندھوں سے بھی ایک فالتو بازو جڑا ہوا تھا۔ یہ بازو اس کے اصل بازوؤں سے بڑا اور مضبوط تھا۔ اس کی ٹانگوں کے ساتھ اضافی گوشت موجود تھا اور پاؤں بہت چوڑے چکلے تھے۔

دایہ نے مشورہ دیا کہ بچے کو گلا گھونٹ کر مار دیا جائے لیکن گھر کی عورتیں فوری طور پر اس فیصلے پر عمل نہ کر سکیں۔ پورے چوبیس گھنٹے یہ بچہ اپنی ماں کے پاس موجود رہا۔ اس کا دودھ پیتا رہا اور اس کے پہلو میں کھیلتا رہا۔ ان چوبیس گھنٹوں میں ماں اور بچے کی فطری محبت رنگ لے آئی۔ چوبیس گھنٹے بعد جب بچے کا باپ گھر آیا اور اس نے کریہہ المنظر بچے کو تلف کرنا چاہا تو ماں اس کے سامنے دیوار بن گئی۔ اس نے کہا 'جیسا بھی ہے یہ میرا بچہ ہے۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گی۔' ماں اور باپ میں ان بن ہو گئی۔ عالشاں بچے سمیت گھر چھوڑ کر بھوپال کے ایک نواحی گاؤں میں چلی گئی۔ یہاں عالشاں کا ایک چچا رہتا تھا۔ وہ دم درود کرتا تھا اور گاؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔ یہ بچہ اس کے گھر میں رازداری سے پرورش پانے لگا۔ لیکن یہ رازداری زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ گاؤں کے لوگوں کو اس عجیب الخلقت بچے کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ عالشاں کے چچا نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ بچے کو چھپانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس نے لوگوں کو اجازت دے دی کہ وہ بچے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک دو ماہ تو خوب تماشا بنا رہا پھر دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ تجسس تو پہلے چند دنوں میں ہی دور ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ لوگوں کی دہشت بھی ختم ہو گئی۔

عالشاں اپنے چچا کے گھر میں صرف ڈیڑھ برس رہی۔ بچے نے دودھ چھوڑ دیا تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ یہاں حیدر آباد آ گئی۔ یہ قدم اس نے اپنے خاوند کے مجبور کرنے پر اٹھایا تھا۔ خاوند نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ بچے کو نہیں چھوڑ سکتی تو وہ اسے طلاق دے کر دوسرا بیاہ کر لے گا۔ عالشاں کے چچا نے ذمہ داری لے لی تھی کہ وہ خود اس بچے کی پرورش کرے گا۔ یہاں آ کر عالشاں اور اس کے خاوند نے یہ باغ ٹھیکے پر لے لیا۔ دھیرے دھیرے وہ اس باغ کے مالک بن گئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ پہلے بچے کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ عالشاں سال میں ایک آدھ بار خاموشی سے بھوپال جاتی تھی اور اپنے بچے کو دیکھ آتی تھی۔ دس بارہ سال اسی طرح گزر گئے۔ چند سال پہلے عالشاں کا خاوند فوت ہو گیا تو عالشاں سوچنے لگی کہ وہ اپنے بچے کو اپنے پاس

لے آئے۔ لیکن وہ ڈرتی بھی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں کے لوگ اس کے بخشو کو دیکھ کر کیا سوچیں گے اور کیا کہیں گے۔ بخشو اب ایک طاقتور اور عجیب الخلقت جانور کی طرح نظر آتا تھا۔ پہلی بار اسے دیکھنے والے کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ دو ڈھائی سال اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ آخر عالشاں کی ممتا نے ایک بار پھر جوش مارا اور وہ بخشو کو بڑی رازداری کے ساتھ بھوپال سے یہاں حیدر آباد لے آئی۔ یہ آج سے کوئی چار سال پہلے کی بات ہے۔ بخشو اس وقت سے اسی تہ خانے میں تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ ماسی عالشاں کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی اور بھی رہ رہا ہے۔ اس نے اپنے بچے کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔"

میں بڑی توجہ سے نواب زادی کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ روداد ہی "ہارر فلم" کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی زنجیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ان زنجیروں کی ضرورت عالشاں کو کیوں پیش آئی؟"

نواب زادی بولی "دراصل بخشو اس تنگ و تاریک تہ خانے میں رہ رہ کر سٹپٹا گیا تھا۔ وہ باہر نکلنا چاہتا تھا۔ دھوپ، روشنی اور آسمان دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بول نہیں سکتا مگر عالشاں اس کی زبان میں اپنی ماں کو سب کچھ سمجھا سکتا ہے۔ وہ اس سے رات دن فریاد کرتا تھا کہ وہ اسے اس تاریکی سے باہر نکالے۔ کبھی کبھی وہ زبردستی باہر نکلنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ یہ کشمکش اس حد تک بڑھی کہ عالشاں تنگ آ گئی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ بخشو کو واپس بھوپال ہی بھیج دیتی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ عالشاں کا وہ چچا فوت ہو گیا تھا جس نے ابتدائی چودہ پندرہ سال تک بخشو کی پرورش کی تھی۔ عالشاں جانتی تھی کہ اب اسے اپنے بیٹے کو اپنے پاس ہی رکھنا ہے۔ یہی وقت تھا جب اس نے ان زنجیروں کا انتظام کیا۔ جن دنوں بخشو کے مزاج میں تیزی آئی تھی اور وہ باہر نکلنے کے لیے زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے لگتا تھا، وہ سوتے میں اسے یہ زنجیریں پہنا دیتی تھی۔ ماں اور بیٹے کی محبت کی یہ ایک ایسی مثال ہے شاذ و نادر ہی، جس پر جتنا غور کیا جائے اتنی ہی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔"

میں نے نواب زادی سے پوچھا "کیا نہر کے کنارے سرکنڈوں میں ہونے والا قتل اسی بخشو نے کیا تھا؟"

وہ ایک لمحہ میری آنکھوں میں جھانکتی رہی، پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں۔ لیکن تم اسے قتل نہیں کہہ سکتے۔ بخشو نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا۔"

"اور جگر گاں میں جو قتل ہوئے ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بولی "مجھے معلوم نہیں وہ واقعات کیوں رونما ہوئے لیکن اگر ان میں بخشو کا ہاتھ ہے تو میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ سب کچھ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کیا ہوگا۔"

باغی

میں نے کہا۔ "مقتول خدا بخش اور امریش تک تو یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن جگر گاں کے قبرستان میں ایک جواں سال عورت قتل ہوئی، اس سے قاتل کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟"

نواب زادی بولی "تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم بخشو کے بارے میں کچھ جانتے نہیں ہو۔ تم نے صرف اس کی صورت دیکھی ہے یا وہ افواہیں سنی ہیں جو علاقے میں اُڑائی جا رہی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ بخشو کی بات کر رہی ہیں، میں تو آپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے سے آپ کے ساتھ موجود ہوں۔"

"یعنی تم جاننا چاہتے ہو کہ میں یہاں کیسے پہنچی اور کیوں یہاں رہ رہی ہوں؟"

"بالکل یہی بات ہے۔ اور میرے خیال میں اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے تو دیگر باتیں بھی آسانی سے سمجھ میں آ جائیں گی۔"

وہ طویل سانس لے کر بولی "میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ اب اس فیصلے پر عمل کروں گی، چاہے کوئی خمیازہ بھی بھگتنا پڑے۔"

میں نے کہا "میں بھی یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ آپ سے وابستگی کا حق ادا کروں گا چاہے اس کے لیے کوئی قیمت بھی چکانی پڑے۔"

وہ پیشانی پر آنے والی لٹوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔ "جب پاپا جانی اور بھائی میں جھگڑا طول پکڑ گیا تو میں سخت ڈپریشن کا شکار ہو گئی، کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ میں سوچتی تھی شاید میری موت ہی ان دونوں کو راہِ راست پر لے آئے۔ لیکن کوشش کے باوجود میں خود کو مرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ ایک عجیب سی یاسیت بھر گئی تھی میرے اندر، زندگی سے جی اُکتا گیا تھا۔ سونے پر سہاگا وہ شرمندگی تھی جو دن رات میرا سینہ چاٹتی تھی۔ جس شخص کو دیکھتی تھی اس کی آنکھوں سے طنز کے تیر چھوٹتے نظر آتے تھے، ہر کوئی بزبانِ خاموشی کہہ رہا تھا 'دیکھو یہ ہے وہ نواب زادی جو اغوا ہوئی اور کئی راتیں ڈاکوؤں کے قبضے میں رہی۔' ایک روز بڑی خاموشی سے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی آئی۔ میں نے پاپا کے لیے جو خط چھوڑا اس میں یہ لکھا تھا کہ میں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر واپس انگلینڈ جا رہی ہوں۔ لیکن میں انگلینڈ نہیں گئی۔ میرا دل کہیں جانے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا۔ بس سوچتی تھی، یونہی چلی جاؤں۔ جنگلوں اور صحراؤں کی طرف نکل جاؤں، کسی ایسی جگہ جا رہوں جہاں کوئی مجھے جاننے پہچاننے والا نہ ہو۔ اور پھر مجھے وہ سب کچھ مل گیا جو میں چاہتی تھی۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسی

ہوئی دوپہر تھی۔ میں شاہ پور کے بس اڈے پر اتری اور یونہی بے مقصد دیہاتی علاقے کی طرف چل پڑی۔ میں ایک بیحد پرانے برقع میں تھی اور مجھے توقع نہیں تھی کہ کوئی مجھے جواں سال لڑکی کے طور پر پہچان سکے گا۔ لیکن پتا نہیں کیسے بس اڈے سے ہی چند اوباش میرے پیچھے لگ گئے۔ مجھے ان کے تعاقب کی خبر اس وقت ہوئی جب میں جگر گاں سے کافی آگے آچکی تھی۔ یہ بالکل سنسان علاقہ تھا۔ شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ میں نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ایک دو افراد سے مدد لینا چاہی لیکن معلوم نہیں انہوں نے کیا سمجھ کر انکار کر دیا۔ میں سخت پریشان تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں میں زیادہ ویران مقام کی طرف نکل آئی۔ اونچے کھیتوں میں دو افراد نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے ان میں سے ایک کے سر پر اینٹ ماری اور دوسرے کو دھکا دے کر بھاگ نکلی۔ تاریکی میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کدھر جا رہی ہوں۔ میں اس باغ میں گھس آئی۔ ماسی عاکشاں کا کتا مجھ پر چڑھ دوڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچاتا، ماسی عاکشاں نے اسے پیچھے ہٹا لیا۔ میں نے ماسی کو اپنی بپتا سنائی۔ اس نے جلدی سے مجھے اپنی کوٹھڑی میں چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد میرا تعاقب کرنے والے بھی یہاں آموجود ہوئے۔ انہوں نے ماسی عاکشاں سے میرے بارے میں پوچھا۔ ماسی نے انہیں کچھ نہیں بتایا اور باغ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے پس و پیش کیا تو ماسی اندر سے رائفل لے آئی۔ وہ ساری رات باغ کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ اگلے روز دوپہر کو ماسی نے اپنے چند پڑوسیوں کو ساتھ ملایا اور ان غنڈوں کو یہاں سے بھگا دیا۔

ماسی عاکشاں کی کوٹھڑی میں گزاری ہوئی وہ رات میری زندگی کی انوکھی اور ناقابلِ فراموش رات تھی۔ ایک طرف تو ان بدمعاشوں سے خطرہ تھا جو باغ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے، دوسری طرف میں کوٹھی کے اندر بھی ایک ایسی چیز دیکھ چکی تھی جو کسی بھی نگاہ میں ہمیشہ کے لیے دہشت بن کر جم سکتی ہے۔ میں نے بخشو کو دیکھ لیا تھا۔ یہ واقعہ بس اتفاقاً ہی ہو گیا تھا۔ تہ خانے کی طرف سے چیخ و پکار کی مدھم آواز آئی اور ماسی لالٹین لے کر تہ خانے میں اتری تو میرے اندر تجسس جاگ اٹھا۔ میں نے تہ خانے کے بند دروازے کی ایک باریک جھری سے آنکھ لگائی اور زنجیروں میں بندھے ہوئے بخشو کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہی۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ ماسی لپکتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے جان لیا کہ میں کیوں چیخی ہوں۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس وقت تو یہ گھبراہٹ میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ ماسی عاکشاں کو اپنا راز فاش ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میں نے ماسی سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ ایک دو گھنٹے میں ہم آپس میں خوب گھل مل گئے۔ میں تہ خانے میں بخشو کے پاس جانے لگی۔ اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس کے پاس بیٹھنے لگی۔ آہستہ آہستہ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگی۔ بے شک وہ ایک کریہہ المنظر شخص ہے لیکن اس کے سینے میں ایک بڑا پیارا سا معصوم سا دل دھڑکتا ہے۔ وہ اپنا مافی الضمیر صرف غوں غاں کی آوازوں سے بیان کر سکتا ہے لیکن اس بے زبانی میں بھی شیرینی اور خوب صورتی ہے۔ بخشو کا ذہن کسی سات آٹھ سالہ بچے کی طرح ہے لیکن دوسری طرف غصے کے عالم میں وہ بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر اس کی حیوانی جبلت پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے اور وہ کسی درندے کے مانند چوکس اور پھرتیلا نظر آنے لگتا ہے۔ ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا تھا جب وہ خود کو گھٹن اور تنہائی کا شکار محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی زنجیریں زور زور سے جھنجھناتا تھا، چیختا چلاتا تھا اور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتا تھا۔ ایسے میں اس کی ماں کی حالت دیدنی ہوتی تھی، رنگ ہلدی ہو جاتا تھا۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی تھی منتیں کرتی تھی اور تھک ہار کر خود بھی رونے لگتی تھی۔

میں نے اشاروں کنایوں کی زبان میں بخشو سے وعدہ کیا کہ میں اسے تہ خانے سے باہر لے کر جاؤں گی اور کھلی ہوا میں گھماؤں پھراؤں گی، لیکن اسے بھی یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ وہ سرکشی نہیں دکھائے گا۔ ادھر ادھر بھاگے دوڑے گا نہیں اور جب میں کہوں گی خاموشی سے واپس آجائے گا۔ بخشو میری بات اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ وہ منہ کو عجیب سے انداز میں حرکت میں لا کر اور زبان کو بل دے کر چند الفاظ بول لیتا ہے۔ وہ مجھ کو "بہن" کہنے کی کوشش کرتا تھا اور اپنا سر بار بار میرے قدموں میں رکھ کر یہ بتاتا تھا کہ وہ وہی کرے گا جو میں اس سے کہوں گی۔

ایک روز میں نے اصرار کر کے ماسی عاکشاں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ بخشو کی زنجیریں کھول دے گی اور میں اسے رات کے وقت ایک آدھ گھنٹے کے لیے تہ خانے سے باہر لے جاؤں گی۔ میرا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ بخشو نے تہ خانے سے باہر آکر کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنتی۔ وہ باغ میں گھومتا رہا۔ چاند تاروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا اور غوں غاں کی زبان میں مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے پھول توڑ کر دیے اور رات کی رانی کے گجرے بنا کر اس کے ہاتھوں میں پہنائے۔ جب میں نے واپس چلنے کو کہا تو وہ خاموشی سے تہ خانے میں چلا گیا۔ اس کے بعد یہ ہمارا معمول بن گیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز رات آٹھ نو بجے کے قریب میں بخشو کو تہ خانے سے باہر نکالتی اور باغ میں گھماتی پھراتی۔ اس تفریح نے بخشو کے مزاج پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور وہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگا۔

اس مختصر سے گھرانے کی بدقسمتی آج سے کوئی چودہ پندرہ روز پہلے شروع ہوئی۔ وہ ایک خاصی گرم رات تھی۔ میں بخشو کو لے کر تہ خانے سے باہر آئی۔ بخشو بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس کے اچھے

موڈ میں ہونے کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس کے منہ سے زیادہ رال بہنے لگتی ہے اور آنکھوں کے گدلے پن میں ایک چمک سی نمودار ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ دیر کتے موتی سے پیار کرتا رہا، پھر باغ میں ٹہلنے لگا۔ نو بج چکے تھے، رات گہری تاریک تھی اور قرب و جوار بالکل سنسان تھے، اب کبھی کبھی بخشو اور میں باغ سے باہر بھی نکل جاتے تھے اور نہر کے ساتھ ساتھ چلتے سرکنڈوں تک چلے جاتے تھے۔ اس رات بھی ہم سرکنڈوں کے قریب تھے، اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی، میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ نہر کے ڈھلوان کنارے پر کوئی موجود تھا۔ بخشو نے بھی کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔ وہ دوڑ کر سرکنڈوں میں چھپ گیا۔ میں نے اور ماسی عاکشاں نے اسے یہی سمجھا رکھا تھا کہ اسے کسی کے سامنے نہیں آنا۔ نہر کے کنارے کھڑا شخص تیز قدموں سے میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ درمیانی عمر کا ادھیڑ لمبا شخص تھا۔ تاریکی کی وجہ سے خدوخال صحیح طرح نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے بالکل سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور اتنی رات گئے اس ویرانے میں کیا کر رہی ہوں۔ میں نے کہا کہ وہ یہ پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ سادہ کپڑوں میں پولیس والا ہے اور گشت پر ہے۔ میں نے کہا کہ میں یہاں ماسی عاکشاں کے پاس رہتی ہوں اور باغ کی رکھوالی کرتی ہوں۔ وہ بولا، "تم بالکل جھوٹ کہتی ہو، میں جانتا ہوں تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟" پھر وہ سرکنڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہارے ساتھ کون تھا؟"

میں نے کہا "کوئی بھی نہیں"

اس نے اپنی قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور سرکنڈوں کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن اس نے دھکا دے دیا۔ ابھی اس نے سرکنڈوں پر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ بخشو کسی بلا کی طرح اس سے چمٹ گیا۔ نووارد کا ریوالور پہلے ہی جھٹکے میں کہیں گر گیا تھا۔ اس نے خود کو بخشو کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے اور تم نے خود بھی دیکھا ہو گا بخشو کے جسم پر تین بازو ہیں اور وہ تینوں بازو یکساں طاقت سے استعمال کر سکتا ہے۔ ویسے بھی وہ نووارد کے مقابلے میں کہیں زیادہ زور آور تھا۔ رہی سہی کسر اس کے ہیبت ناک سراپا نے پوری کر دی تھی۔ نووارد اس کی گرفت میں چیخنے چلانے لگا اور مدد کے لیے پکارنے لگا۔ بخشو نے اسے اٹھایا اور قریبی پرانی پلی کے قریب پٹخ دیا۔ وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے گرا تھا، اس کا سر بڑی شدت سے پلی کے پختہ کناروں سے ٹکرایا، اور وہ تڑپنے لگا۔ میں نے جھک کر دیکھا اس کی کھوپڑی ایک طرف سے پچک گئی تھی اور خون بڑی تیزی سے اس کی سفید قمیص کو بھگو رہا تھا۔ میں نے کہا "بخشو! یہ کیا کر دیا تو نے"

بخشو بھی سخت خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اسی دوران میں سرکنڈوں کی طرف سے شور و غل سنائی دیا اور یوں لگا کہ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے اس طرف آرہے ہیں۔ بخشو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ ایک دم بخشو وہاں سے بھاگ اٹھا۔ اس کا رخ باغ کی مخالف سمت میں تھا۔ اس کے بھاگتے ہی میں بھی نہر کے نشیب میں چل گئی اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتی واپس باغ میں آگئی۔ ماسی عاکشاں کو اس روح فرسا واقعے کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا کہ بخشو کا یوں روز روز باہر نکلنا کوئی مصیبت لائے گا۔ آج یہ مصیبت آگئی تھی۔ اس نے براہِ راست تو مجھ سے کچھ نہیں کہا تاہم اس کی آہ و زاری کا مطلب یہی تھا کہ یہ سب کچھ میری ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ اسی وقت چادر اوڑھ کر نکل گئی اور پوری رات بخشو کو تلاش کرتی رہی۔ بخشو کا کچھ پتا نہ چلا۔ روتے روتے ماسی عاکشاں کا برا حال تھا۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اگلے دو تین دن ہم نے شدید پریشانی کے عالم میں گزارے۔ ماسی عاکشاں سارا سارا دن بیٹے کی تلاش میں سرگرداں رہتی اور میں اس چار دیواری میں بیٹھ کر دعائیں مانگتی کہ ماسی کامیاب واپس آئے۔ تیسرے چوتھے روز ہمیں پتا چلا کہ قریبی گاؤں جگر گاں میں بھی اوپر تلے دو قتل ہو گئے ہیں اور یہ دونوں قتل کسی ایسے انسان نے کیے ہیں جس کی شکل جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ یہ خبر مجھ پر اور ماسی پر بجلی بن کر گری۔ اس بات میں شبہے کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں تھی کہ جس قاتل کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ بخشو ہے۔ لوگوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ جگر گاں کے لوگ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں یا گھروں میں بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ پولیس علاقے کے مسلح لوگوں کے ساتھ مل کر عجیب الخلقت قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر یہ خبر پہنچی کہ وہ عجیب الخلقت قاتل جگر گاں کے وسیع قبرستان میں چھپا ہوا ہے اور پولیس نے قبرستان کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ یہ خبریں ماسی عاکشاں کے لیے جان لیوا تھیں۔ وہ دن رات تڑپ رہی تھی اور اس کی زبان پر ایک ہی بات تھی "وہ لوگ میرے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"

نہر پر ہونے والے قتل کی پوچھ گچھ کے لیے ایک روز پولیس یہاں باغ میں بھی آئی۔ ماسی عاکشاں تو سخت بخار میں نیم بے ہوش پڑی تھی، میں نے ہی پولیس والوں کے سوالوں کے جواب دیے اور انہیں بالکل شبہ نہیں ہونے دیا کہ اس واردات سے ہمارا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جگر گاں کے قبرستان سے پولیس چلی گئی ہے اور گاؤں کے لوگوں میں سے بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ قبرستان میں جانے کی جرأت کرے۔ اس روز میں نے فیصلہ کیا کہ میں بخشو کی تلاش میں نکلوں گی، رات کو جب ماسی عاکشاں بخار کی دوا کھا کر گہری نیند سو گئی تو میں باغ سے نکل کھڑی ہوئی۔ میں سر تا پا چادر میں لپٹی ہوئی تھی، کچے راستے تک میں پیدل گئی۔ وہاں ایک ریڑھے والے نے خدا ترسی کر کے مجھے

ریڑھے پر سوار کرلیا' جگرگاں سے تھوڑے فاصلے پر میں اُتر گئی۔ جگرگاں کا قبرستان آبادی سے تھوڑا ہی ہٹ کر ہے۔ میں سیدھی قبرستان میں چلی گئی۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس ایک تیز دھار چھری تھی اور میں کسی بھی طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی' قبرستان میں پہنچ کر میں نے اپنی چادر کندھوں پر ڈال لی اور یونہی اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ وہ چاندنی رات تھی' مجھے یقین تھا کہ اگر بخشو اس قبرستان میں موجود ہے تو اس کا اور میرا سامنا ضرور ہوگا اور پھر یہی ہوا۔ میری منصوبہ بندی کامیاب رہی۔ بخشو سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ بہت ڈرا سہما ہوا تھا۔ خوف اور پریشانی کے سبب اس کے حلق سے غوں غاں کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھنے درختوں کی طرف لے گئی۔ لیکن یہاں ایک اور غیر متوقع واقعہ ہوگیا۔ گاؤں کا کوئی شخص وہاں آدھمکا۔ اس نے بخشو پر فائر کیا۔ گولی بخشو کی کلائی پر کہیں لگی۔ بخشو نے تڑپ کر اسے دھکا دیا اور بھاگ نکلا میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ قبرستان سے نکلے تھے۔ پھر نہ جانے بخشو کو کیا ہوا کہ اس نے مجھے بھی دھکیل کر جھاڑیوں میں گرا دیا اور خود بھاگتی کے ساتھ اندھیرے میں اوجھل ہوگیا"

بات کرتے کرتے نواب زادی ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس کے ملیح چہرے پر گہرا تاسف نظر آرہا تھا۔ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدتے ہوئی بولی "معلوم نہیں بخشو نے کیا سمجھا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ میں اسے پکڑوانے کے لیے قبرستان میں آئی تھی یا ایسی ہی کوئی غلط فہمی اسے ہو گئی ہو۔ یا پھر اس نے سوچا ہو کہ اس کے ساتھ رہ کر میں خود بھی خطرے میں گھر جاؤں گی۔ بہرحال وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح واپس ماسی عاکشاں کے پاس آگئی۔ تب سے اب تک ہمیں بخشو کی کچھ خبر نہیں ہے"

اپنی روداد ختم کرکے نواب زادی شاہین خاموش ہو گئی۔ اس کی زُلفیں بکھری بکھری تھیں۔

لالٹین کی روشنی میں اس کا خوابیدہ سراپا کچھ اور بھی خوابیدہ نظر آتا تھا' میں نے نواب زادی سے پوچھا "آپ کو میری یہاں موجودگی کے بارے میں کب علم ہوا؟"

"مجھے کل ہی پتا چل گیا تھا۔ جب تم اپنے ساتھی کے ساتھ باغ میں داخل ہوئے تھے' میں دروازے کے سامنے بکری کو چارا ڈال رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میں جلدی سے اندر گھس آئی پھر جب تم کمرے میں آئے تو میں ساتھ والے کمرے میں چلی گئی"

"ماسی عاکشاں کو آپ نے ہمارے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"میں نے اس سے صرف یہی کہا ہے کہ میں تمہیں پہلے سے جانتی ہوں"

میں نے کہا "آپ جانتی ہیں کہ نہر کے کنارے سرکنڈوں میں جو شخص بخشو کے ہاتھوں قتل ہوا وہ کون تھا؟"

"تمہارا کوئی ساتھی ہوگا"

"نہیں' لیکن میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑے گروہ کا ملازم تھا اور ایسے ہی اور بھی بہت سے بڑے بڑے گروہ اس وقت ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں"

نواب زادی کا چہرہ زرد نظر آنے لگا۔ وہ کراہ کر بولی "مگر کیوں؟ وہ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

"یہ بات آپ اچھی طرح جانتی ہیں"

"کیا جانتی ہوں میں؟"

"خیر چھوڑیں اس بات کو" میں نے موضوع بدلا "یہ بتائیں کہ نہر پر ہونے والے قتل سے پہلے آپ اس باغ سے باہر کہیں گئی تھیں"

"باہر سے کیا مطلب ہے؟"

"باہر سے مطلب ہے شاہ پور یا حیدر آباد وغیرہ"

ایکا ایکی نواب زادی کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ بولی "ہاں میں گئی تھی۔ میں نے بتایا ہے ناکہ ماسی عاکشاں سخت بیمار ہو گئی تھی۔ بخار ایک سو پانچ سے اوپر ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوشی میں ہذیان بول رہی تھی' مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کے دماغ کی کوئی شریان ہی نہ پھٹ جائے۔ میں برقع اوڑھ کر شاہ پور گئی تھی لیکن شاہ پور میں کسی وجہ سے ہڑتال تھی۔ نہ کوئی کلینک کھلا تھا اور نہ میڈیکل اسٹور۔ مجبوراً مجھے حیدر آباد کی نئی آبادی جانا پڑا تھا لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہتا تھا اور یہ تصدیق ہو گئی ہے" میں نے جواب دیا "میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص جو نہر کنارے بخشو کے ہاتھوں قتل ہوا' آپ کا تعاقب کرتے ہوئے حیدر آباد سے یہاں پہنچا تھا"

وہ گہری سانس لے کر بولی "میرے ذہن میں بھی اسی طرح کا شُبہ موجود تھا' میں پہلے ایک کلینک میں گئی تھی پھر قریبی میڈیکل اسٹور سے دوا خریدی تھی۔ کلینک اور میڈیکل اسٹور میں مجھے دو تین دفعہ برقع کا نقاب اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً وہیں پر مجھے کسی نے پہچان لیا تھا"

"ہاں اس کا نام خدا بخش تھا۔ وہ پنجاب (پاکستان) کی ایک طاقتور سیاسی شخصیت کا دست راست تھا"

وہ بولی "ہو سکتا ہے جس شخص نے قبرستان میں بخشو پر گولی چلائی وہ بھی انہی لوگوں میں سے ہو؟"

"ممکن ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ "نیک کام" میرے ہی ہاتھوں ہوا تھا اور بخشو نے جسے اپنا جناتی مکا یا تھپڑ مار کر جھاڑیوں میں گرایا تھا وہ میں ہی تھا۔

"تم مجھ سے چھپا رہے ہو شاہ جہاں' تم جانتے ہو کہ جو لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ کون ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں؟"

میں نے کہا "آپ بھی تو مجھ سے بہت کچھ چھپا رہی ہیں اور جب تک بے اعتباری کی یہ فضا موجود رہے گی ہم دونوں نقصان میں رہیں گے"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا چھپا رہی ہوں؟"

"میں جانتا ہوں اور میرے علاوہ بھی بہت سے لوگ جانتے ہیں"

"تم پہیلیاں مت بجھواؤ' میرا دل ہول رہا ہے"

"مگر آپ میرے منہ سے سننا چاہتی ہیں تو میں اُن چھتیس تالا بند صندوقوں کی بات کر رہا ہوں جو نواب مرحوم کی تحویل میں تھے۔ میرا خیال ہے' اور میری طرح کچھ اور لوگوں کا بھی یہ خیال ہے کہ نواب مرحوم نے اپنی موت سے قبل ان صندوقوں کے بارے میں آپ کو بتا دیا تھا"

میں بغور نواب زادی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا لہرا کر اوجھل ہوگیا۔ تاہم وہ قطعی پُرسکون رہی۔

"تمہارا اور لوگوں کا خیال سو فی صد غلط ہے" وہ اطمینان سے بولی "اور اگر تم لوگ ان صندوقوں کے لیے میرے پیچھے ہو تو صرف اپنا وقت برباد کر رہے ہو"

"مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی"

"لیکن ایک چیز کی توقع تمہیں ہرگز نہیں" وہ بدستور سخت لہجے میں بولی "میں غصے میں آکر آدمی کو شوٹ بھی کر دیتی ہوں"

"میرا خیال ہے کہ آپ اتنی احسان فراموش نہیں ہو سکتی ہیں"

میرے جواب نے نواب زادی کو چپ لگا دی۔ شاید اس کی آنکھوں میں اس سرنگ کے مناظر گھومنے لگے تھے' جہاں ڈاکوؤں نے اسے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ تہ خانے میں بوجھل سی خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ اسی خاموشی کا اثر کم کرنے کے لیے نواب زادی اپنی جگہ سے اٹھی۔ لالٹین کی لو مدھم ہو چکی تھی' اس نے لو اونچی کی اور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "شاہ جہاں! میں تمہیں اپنے دل کی بات بتا رہی ہوں' میرا جی دنیا کے ہنگاموں سے بھر گیا ہے۔ میں مکمل سکون اور تنہائی چاہتی ہوں۔ کسی بھی اچھے برے شخص سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتی"

میں نے کہا "حیرت کی بات ہے' اتنی چھوٹی سی عمر میں آپ کے خیالات ایسے درویشانہ ہیں۔ یہاں تو لوگ جوں جوں بوڑھے ہوتے ہیں ان میں زندگی کی حرص بڑھتی جاتی ہے۔ بہرحال آپ کے خیال سے قطع نظر ایک بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں"

"کہو" وہ نوابی شان سے بولی۔

میں نے کہا "حالات ایسا رخ اختیار کر چکے ہیں کہ اپنی شدید خواہش کے باوجود آپ دنیا کے ہنگاموں سے دور نہیں رہ سکتیں' بلکہ ہنگامے تو آپ کو اپنا محور بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ نواب مرحوم کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھیں۔ بیٹے کے ساتھ اختلافات ہونے کے بعد وہ اپنے دل کی بات آپ کے سوا اور کس سے کرسکتے تھے۔ لہٰذا یہ منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ آپ کو اس دفینے کے حدود اربعہ سے آگاہ کر چکے تھے"

"یہ تم لوگوں کی خام خیالی ہے"

"ہو سکتا ہے کہ آپ زور دے کر کہیں تو میں یہ بات مان جاؤں لیکن بہت سے دوسرے لوگ نہیں مانیں گے۔ آپ کہیں بھی چلی جائیں' کہیں بھی جا چھپیں' آپ کی تلاش جاری رکھی جائے گی اور جلد یا بدیر آپ کو ڈھونڈ لیا جائے گا"

وہ طنزیہ انداز میں بولی "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں تمہاری پناہ میں آجاؤں"

"ہرگز نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان بے لوث دوستی اور ہمدردی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ اسی میں ہم دونوں کا فائدہ ہے"

"بے لوث دوستی کا لفظ زبان سے ادا کرنا بہت آسان ہے لیکن اس کو عملی شکل دینا بے حد دشوار' میں اپنی مختصر زندگی میں بہت سے تلخ تجربوں سے گزر چکی ہوں"

"میں آپ کو کسی اور تلخ تجربے سے دوچار نہیں کروں گا' اور اس دوستی کی شروعات میں اپنی طرف سے کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کی اجازت دیں گی"

"میں سمجھی نہیں؟"

"ہم نے بڑوں سے سنا ہے کہ اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کی ضرورت کو زبان پر آنے سے پہلے سمجھ جائے۔ میں جانتا ہوں اس وقت آپ کی ضرورت کیا ہے۔ آپ جلد سے جلد بخشو کو ڈھونڈنا چاہتی ہیں۔ بتایئے ایسا ہے یا نہیں؟"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔ پہلو بدل کر بولی "یہ بات درست ہے کہ بخشو کی گمشدگی نے ماسی عاکشاں کو صدمے سے نڈھال کر رکھا ہے' اگر ماسی عاکشاں یا بخشو کو کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ میں بخشو کو تہ خانے سے باہر لے جاتی نہ یہ مصیبتیں گلے پڑتیں"

میں نے کہا "نواب زادی صاحبہ۔ اب یہ آپ کی نہیں میری درد سری ہے۔ میں بخشو کو ڈھونڈوں گا اور اللہ نے چاہا تو اگلے چند گھنٹوں کے اندر وہ یہاں آپ کے اور ماسی عاکشاں کے پاس ہوگا"

وہ تعجب سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ شاید میرے دعوے کا وزن تول رہی تھی "تم۔۔۔ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" وہ مشکوک لہجے میں بولی۔

"فی الحال تو کچھ نہیں" میں نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں اس کام پر نکلوں گا تو زیادہ وقت نہیں لوں گا"

نواب زادی کی آنکھوں میں اُمید کی جھلک نظر آنے لگی تھی

وہ اب مجھے کچھ کچھ جاننے لگی تھی۔ اس نے مجھے دو مرتبہ دھواں دھار ایکشن میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں نے اسے ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالا تھا۔ دوسری مرتبہ جب نواب فیملی کا خطرناک ترین ملازم قطب میرے ہاتھوں جان لیوا طور پر زخمی ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نواب زادی کا دل میرے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور نواب زادی کو یاد دلا رہا ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ کر دکھاؤں گا۔

نواب زادی کے چہرے کے تنے ہوئے رگ ریشے ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔ ہم دیر تک اس تہ خانے میں مصروف گفتگو رہے۔

○☆○

وہ ایک حبس زدہ شام تھی۔ پوری رات کا چاند سورج غروب ہوتے ہی نکل آیا تھا۔ ابدال کے گھر میں چاند بیری کے درخت کی اوٹ سے ایک روشن تھال کی مانند نظر آ رہا تھا۔ بڑا آسیبی سا منظر تھا یہ۔ اور یہ منظر ابدال کے گھر میں ہی نہیں پورے گاؤں پر پھیلا ہوا تھا۔ مزار شریف کے سب گلی کوچوں میں ایک دہشت سی سنسناتی محسوس ہوتی تھی۔ صرف تین دن پہلے اس گاؤں میں وہ واقعہ رونما ہوا تھا جس میں عجیب الخلقت شخص نے راہ چلتی لڑکیوں پر حملہ کیا تھا اور خورشید نامی ایک لڑکی بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی اور گاہے گاہے ہذیان بکنے لگتی تھی۔ کل رات اچانک اس لڑکی کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں یہ کسی الٹ پلٹ دوا کا اثر تھا جو لڑکی کو کھلائی گئی تھی بہرحال اس واقعے کے سبب دہشت زدہ لوگوں کی دہشت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اسے ہوائی چیزوں کی ریشہ دوانی قرار دے رہے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ اگر بخشو کے ساتھ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تو وہ اب تک اسی گاؤں کے آس پاس کہیں موجود ہو گا۔ میں اور ابدال آج سہ پہر بخشو ہی کی تلاش میں ماسی عائشاں کے باغ سے روانہ ہوئے تھے اور دو میل کچے پر تانگے کا صبر آزما سفر کر کے مزار شریف پہنچے تھے۔ ایک بات کا ذکر کرنا تو میں شاید بھول گیا۔ ہماری روانگی سے قبل ماسی عائشاں کو اپنے کتے کی موت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ بہت روئی چیخی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ابدال کی ماں اور بھابی سکہ بند دیہاتی عورتیں تھیں۔ وہ پھسکڑے مار کر ہمارے قریب ہی چارپائیوں پر بیٹھی تھیں اور باقاعدہ حقہ نوشی بھی کر رہی تھیں۔ یوں تو دونوں باتونی تھیں لیکن ابدال کی ماں کی زبان تو قینچی کی طرح چلتی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں اس نے پورے علاقے کی تازہ ترین خبریں ہمارے گوش گزار کر دیں۔ یوں تو یہ ساری خبریں دلچسپ تھیں اور ان کا تعلق کسی نہ کسی طور علاقے کے موجودہ پُراسرار حالات سے ہی تھا لیکن ایک خبر ان میں خاص طور پر میری دلچسپی کا باعث بنی۔ ابدال کی ماں نے بتایا "پتر تم شہری لوگ ہو۔ تمہیں یہ باتیں عجیب سی لگتی ہوں گی لیکن ہم دیہاتوں میں بسنے والے تو بھوت پریت اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ درجنوں مرتبہ تو میں نے خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے جنات دیکھے ہیں۔ اللہ بخشے ابدال کے ابا کے ابا تو ہر سال جنوں کے میلے پر جاتے تھے پیر صاحب شریف کے ساتھ۔ خیر یہ تو پرانی باتیں ہیں بندہ سوچے پتا نہیں ان میں کتنا جھوٹ سچ مل چکا ہے مگر جو بالکل تازی تازی بات ہے اس کو تو کوئی نہیں جھٹلا سکتا نا۔ یہ ہماری گلی میں آٹھ دس گھر چھوڑ کر رشید لوہار کا گھر ہے۔ اس کی بیٹی سعیدہ روز اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے جن کو اور دو دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھتی ہے۔ جب جن اس سے ملنے آتا ہے سب گھر والے کوٹھے پر چلے جاتے ہیں۔ وہ اکیلی کمرے میں بیٹھی رہتی ہے جن کے ساتھ۔ مجال ہے کسی کی جو پر بھی مار جائے وہاں۔"

میں نے وضاحت طلب نظروں سے ابدال کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جیسے ماں کی بات پر یقین رکھتا بھی ہو اور نہیں بھی۔ کہنے لگا "ہاں یہ بات تو ہے بھائی صاحب! سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا ہے کہ لڑکی کے پاس جن آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں یہ وہی جن ہے جس نے جمعرات کو انسانی شکل میں لڑکیوں پر حملہ بولا تھا۔"

"لیکن وہ جن تو اچھا بھلا گوشت پوست کا بندہ ہے۔ تم اسے دیکھ چکے ہو اور میں باقاعدہ اس پر گولی چلا چکا ہوں۔"

"یہ سب تمہاری بھول ہے بیٹا!" ابدال کی ماں ہاتھ نچا کر بولی "تمہاری آنکھوں کا دھوکا ہے۔ ہوائی چیزوں کو کوئی گولی نہیں مار سکتا نہ کبھی کسی نے ماری ہے۔ اللہ توبہ کرو۔ تم دونوں کے دماغ میں فتور ہے۔ جادو، جن اور جنتر منتر یہ سب چیزیں برحق ہیں۔"

میں نے کہا "ہم انہیں غلط تو نہیں کہہ رہے۔ لیکن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے کیسے جھٹلا دیں۔"

ابدال کی ماں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور ہماری بے راہ روی اور بدعت پر لعنت بھیجتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ابدال سر کھجاتے ہوئے بولا "کہتے ہیں جی۔ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں بھی رائی کا کوئی چھوٹا سا دانہ موجود ہو۔ پورے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ لڑکی کے پاس جن آتا ہے۔ شام کے بعد مقررہ وقت پر سب گھر والے گھر کی چھت پر چلے جاتے ہیں اور لڑکی نیچے کمرے میں بند ہو جاتی ہے۔ بند کمرے کے اندر سے جن کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ کبھی اردو بولتا ہے اور کبھی عربی۔ کبھی ایسی زبان میں بات کرنے لگتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا "ایسے عالم فاضل جن سے تو ضرور ملاقات کرنی چاہیے۔"

ابدال گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اگر ایسی بات ہے تو پھر ابھی چلتے ہیں رشید لوہار کی طرف۔ میرے خیال میں یہی وہ ٹائم ہے جب

جن صاحب تشریف لاتے ہیں۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گلی میں تاریکی اور خاموشی تھی ہم پیدل ہی مطلوبہ مکان کی طرف چل دیے۔ ان دور افتادہ دیہات کے لوگ بے حد سادہ دل اور توہم پرست تھے۔ رہی سہی کسر ان عاملوں اور فقیروں نے پوری کر دی تھی جو مال بنانے کی خاطر الٹی سیدھی افواہیں پھیلاتے تھے۔ میرا ذہن رشید لوہار کی لڑکی اور اس کے پاس آنے والے جن میں الجھا ہوا تھا۔ ابدال نے بتایا تھا جن آنے کے وقت گھر والے چھت پر چلے جاتے تھے اور لڑکی اکیلی کمرے میں بند ہو جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مجھے مشہور لوک قصے ہیر رانجھا کا واقعہ یاد آگیا بقول وارث شاہ شادی کے بعد ہیر نے سانپ سے ڈسے جانے کا بہانہ کیا تھا اور اس کی نند سہتی نے رانجھے کو جو جوگی کے روپ میں تھا ہیر کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اہل خانہ باہر بیٹھے رہے تھے کہ جوگی ہیر کا زہر نکال رہا ہے اور جوگی صاحب ہیر کو ہی نکال کر لے گئے تھے۔ یہ بھی کوئی اسی قسم کا چکر معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں جہالت اور تنگ نظری کا نشیب ہو وہاں حماقت کا پانی خود بخود پہنچ جاتا ہے اور پھر اس پانی میں ایسے ایسے "بے پیندے" کے جہاز چلتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ہم رشید لوہار کے گھر پہنچے تو اس کی بیٹی سعیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ رشید لوہار سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ جگر گاں گئی ہوئی ہے۔ وہاں کے پیر صاحب اسے دم درود کریں گے۔ میں نے پوچھا "ان پیر صاحب کا نام حضرت گرو جی تو نہیں؟"

رشید لوہار نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے دماغ میں لاوا سا کھول گیا۔ یہ وہی فراڈیا عامل تھا جو صرف تین روز پہلے میرے ہاتھوں بری طرح بے عزت ہوا تھا۔ میں نے پورے گاؤں کے سامنے اس کا پول کھول دیا تھا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ اسے جوتے مار کر علاقہ بدر کر دیتے مگر ان لوگوں میں کچھ ایسے ہٹ دھرم جاہل موجود تھے جو اب بھی حضرت گرو کی شیطانیت پر یقین نہیں کر رہے تھے اور اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے ہوئے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ عقل کی حد ہوتی ہے لیکن بے وقوفی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

رشید لوہار نے ہمیں خالص دودھ اور گڑ والی چسکے دار چائے پلائی۔ اس کے بعد گھر ہی کی بنی ہوئی حیدر آبادی مٹھائی سے ہماری تواضع کی گئی۔ اپنی لڑکی کی بیماری پر وہ لوگ کچھ زیادہ پریشان نظر نہیں آتے تھے۔ غالباً انہیں یقین تھا کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔

میں نے رشید لوہار سے پوچھا "تمہاری بچی پر پہلی دفعہ جن کب آیا تھا؟"

اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "یہ پچھلے جمعے کی بات ہے جی۔ وہ کھیتوں میں گئی تھی' وہیں اس پر دورہ پڑا تھا۔ روتی چیختی گھر آئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے سایہ دیکھا ہے۔ اس کے بعد دو دن آرام سے گزرے پھر ہر روز شام کو دورہ پڑنے لگا۔ دورے کے وقت اس کا منہ بالکل سرخ ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمرے میں چلی جاتی ہے اور دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لیتی ہے۔ اس کے بعد کمرے میں کوئی بھاری آواز میں بولنے لگتا ہے۔ عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ وہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔"

ابدال نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ایک مشہور ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر صاحب ہیں۔ خود بھی ڈاکٹری کرتے ہیں۔ آج کل اس علاقے میں اپنا کلینک کھولنے کے لیے جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ تم جھاڑ پھونک تو کروا ہی رہے ہو لیکن ایک مرتبہ اپنی بچی انہیں بھی دکھاؤ۔"

رشید لوہار مجھ سے بے حد مرعوب نظر آنے لگا۔ اس نے لجاجت سے کہا "اس وقت تو میں معافی چاہتا ہوں۔ کل میں خود بچی کو لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔ ہم کو تو سرکار شفا چاہیے۔ چاہے کسی پیر فقیر کے ہاتھوں ملے یا ڈاکٹر کے ہاتھوں۔"

میں نے رشید سے پوچھا کہ لڑکی جب بولتی ہے تو اس کی آواز کیسی ہوتی ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود ہی آواز بدل کر بولنے لگتی ہو۔ رشید نے کہا "وہ بہت بھاری آواز ہوتی ہے جی۔ بالکل مردانہ آواز لگتی ہے۔ میری بچی ایسی آواز کیسے نکال سکتی ہے۔"

ابدال نے پوچھا "کیا تمہیں پورا بھروسا ہے کہ جب سعیدہ کمرے میں اکیلی ہوتی ہے تو کوئی دوسرا وہاں نہیں ہوتا؟"

رشید لوہار نے ناپسندیدہ نظروں سے ابدال کی طرف دیکھا۔ مگر اپنے لہجے کو قابو میں رکھتے ہوئے بولا "ایسی کوئی بات نہیں پتر ابدال! ہم اتنے اندھے نہیں ہیں۔ میں چھت پر سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔ میری نظریں کمرے کے دروازے پر ہی لگی رہتی ہیں۔ ویسے بھی سعیدہ نیک لڑکی ہے۔ تم نے اسے بچپن سے دیکھا ہوا ہے۔ تم بتاؤ وہ کیسی ہے؟"

ابدال جلدی سے بولا "میرا یہ مطلب نہیں تھا چاچا رشید! میں تو ویسے ہی بات کر رہا تھا۔"

میں اور ابدال' رشید لوہار کے گھر سے واپس آگئے۔ وہ رات میں نے ابدال ہی کے گھر میں گزاری۔ ابدال ایک اچھا مہمان نواز ساتھی ثابت ہوا۔ نجانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے اپنا بچھڑا یار صفدر یاد آجاتا تھا۔ اس کے بولنے اور ہنسنے کا انداز صفدر سے ملتا جلتا تھا۔ ہم نے رات بھر باتیں کیں۔

اگلے روز سہ پہر تک ہم رشید لوہار کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ بچی کو لے کر نہیں آیا۔ ہم نے سوچا شاید وہ کل والی بات سے ناراض ہو گیا ہے مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ابدال اس کے گھر معلوم کرنے گیا تو انکشاف ہوا کہ سعیدہ ابھی تک جگر گاں سے واپس ہی نہیں آئی۔ اس کی ماں بھی ادھر ہی تھی۔ صرف خالہ

واپس آئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ حضرت گرو جی نے کہا ہے کہ مسلسل تین دنوں تک لڑکی پر عمل ہونا ضروری ہے اس لیے سعیدہ اور اس کی والدہ وہیں رک گئی ہیں۔

ابدال بولا "یہ سور کا بچہ اتنی مار کھا کے بھی باز نہیں آیا۔ لگتا ہے بستر نصیب مٹی گئی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "کیا خیال ہے' ایک بار پھر خبر نہ لی جائے اس کی؟"

"دل تو بہت چاہتا ہے۔ مگر جگر گاں میں کچھ پکے پکے الو کے پٹھے بھی موجود ہیں۔ وہ کوے کو سفید ہی کہتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "ہم ان کی زبان نہیں پکڑ سکتے لیکن کوے کی گچی تو مروڑ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی مصروفیت نہیں تو چلو جگر گاں چلتے ہیں۔"

وہ بولا "مصروفیت ہو بھی تو آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

ہم اسی وقت بذریعہ تانگا جگر گاں روانہ ہو گئے۔ میری نگاہ میں حضرت گرو کا مکروہ چہرہ گھوم رہا تھا' اور دل میں اس کے خلاف نفرت کی آگ روشن تھی۔ راستہ بھر میں سعیدہ نامی اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا معاملہ کافی الجھا ہوا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید لڑکی کا کوئی یارانہ ہے اور وہ جن کا بہانہ بنا کر اپنے کسی چاہنے والے کو کمرے میں بلا لیتی ہے یا اس قسم کا کوئی اور چکر چلا ہوا ہے۔ لیکن لڑکی کے اہل خانہ سے ملنے کے بعد مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا تھا۔ اہل خانہ سیدھے سادے ضرور تھے لیکن اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ ان کی ناک کے عین نیچے لڑکی کوئی اپنا کھیل کھیل سکتی۔ لڑکی کا باپ تصدیق کر چکا تھا کہ بند کمرے میں لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ گھر کا بیرونی دروازہ باہر سے مقفل کر دیا جاتا ہے اور وہ چھت پر بیٹھ کر کمرے کے دروازے پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں پھر ہر شام مقررہ وقت پر لڑکی کمرے میں کیوں گھس جاتی ہیں؟

ہم جگر گاں کے مضافات میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ افق پر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ آندھی آ رہی ہے۔ حضرت گرو جی کا ڈیرا جگر گاں سے ڈیڑھ دو میل دور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر واقع تھا۔ اس ٹیلے کے چاروں طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ ڈیرے کی سفید عمارت دور ہی سے نظر آ جاتی تھی۔ یہ مختصر سی عمارت نہ تو مسجد تھی اور نہ مندر بلکہ ان دونوں کی ملی جلی شکل تھی۔ اس عمارت کا داخلی دروازہ کسی گردوارے کے دروازے سے مشابہ تھا۔ دروازے کے اوپر بسنتی رنگ کا ایک بہت بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہم جوار کے ایک کھیت میں رک کر ڈیرے کا منظر دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں شام کا جھٹ پٹا گہری تاریکی میں بدل گیا' اور پھر ڈیرے کی عمارت سمیت ہر شے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ صرف وہ چند روشنیاں منظر میں باقی رہیں جو ڈیرے کے احاطے میں روشن تھیں۔ یہ گیس لیمپس کی روشنیاں تھیں لہٰذا بہت مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔ نیم تیرگی میں ٹیلے سے چند مرد و زن بھی اترتے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہ عقیدت مند تھے جو جھاڑ پھونک کروانے کے بعد ڈیرے سے واپس جا رہے تھے۔ ابدال نے بتایا کہ وہ ایک دو دفعہ پہلے بھی اس ڈیرے پر آ چکا ہے۔ مقامی لوگ اسے حضرت کا آستانہ کہتے ہیں۔ یہاں حضرت گرو کے چار پانچ چیلے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ شب جمعہ کو یہاں لنگر بھی پکتا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ہوا تیز ہو گئی تھی۔ ڈیرے کے داخلی دروازے پر نصب جھنڈا زور زور سے پھڑپھڑانے لگا۔ آناً فاناً ایک انتہائی تیز آندھی نے ہمیں آ لیا۔ گرد و غبار کا طوفان ہر شے کو اڑائے لیے چلا جا رہا تھا۔ ہم تانگے پر یہاں آئے تھے۔ ابدال کو بروقت سوجھ گئی اور اس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا ورنہ معلوم نہیں وہ طوفان کے تھپیڑے کھا کر تانگے سمیت کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

میں نے کہا "ابدال! کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "ہم اس موسم کا فائدہ اٹھا کر ڈیرے میں گھس جاتے ہیں۔ دیکھو سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا ہے۔ اس وقت کون ہمیں شناخت کرے گا۔"

وہ بولا "خیال تو آپ کا بالکل درست ہے لیکن اندر گھسنا خطرے سے خالی نہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈر رہا ہے۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی۔ ابدال کو اس سارے معاملے سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کرائے کا ٹٹو تھا اور اتنا ہی "رسک" لے سکتا تھا جتنے اس نے پیسے لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جگر گاں کی حویلی میں میں نے حضرت گرو کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اب اگر وہ اپنے ڈیرے پر مجھے پہچان لیتے تو ذرا سی بھی رعایت نہ کرتے۔ عین ممکن تھا کہ موقع پر ہی میرے اور ابدال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے۔ ابدال چند سو روپے کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے بھی اسے مجبور نہیں کیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے بھائی! تم یہاں تانگے گھوڑے کے پاس ٹھہرو۔ آخر کار ان کا دھیان بھی تو کسی نے رکھنا ہے۔ بس اتنا کرو کہ اپنی یہ چادر مجھے دے دو۔ اس کی بکل میرے لیے بڑی کارآمد ثابت ہو گی۔ اول تو میں ایک آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔ لیکن اگر دیر ہو گئی تو تم لوٹ جانا۔ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک میرا انتظار کرنا۔"

ابدال منمنایا "میرا تو خیال ہے کہ آپ کو تن تنہا ڈیرے پر نہیں جانا چاہیے۔"

"میں تن تنہا کہاں ہوں۔ یہ دیکھو' یہ آفت کا پرکالا میرے ساتھ ہے۔" میں نے جیب سے "مسلم ماڈل" پسٹل نکال کر اسے دکھایا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی خطرہ ہو تو آپ فائر کر دیں۔" اس نے رائے دی "مجھے کم از کم پتا تو چل جائے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"دعا کرو کہ یہاں تک نوبت ہی نہ آئے۔" میں نے کہا اور اس چادر کی بکل مار لی جو اب تک ابدال کے کندھوں پر تھی۔

تیز آندھی تناور درختوں کو بار بار رکوع کی حالت میں جھکا رہی تھی۔ ہر جھونکے کے ساتھ مٹھیاں بھر بھر گرد آنکھوں اور منہ میں گھس رہی تھی۔ میں نے چادر کو مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹا اور منہ سر ڈھانپ لیا۔ ابدال کو خدا حافظ کہہ کے میں اس پگڈنڈی کی طرف بڑھا جو کھیتوں کے درمیان سے بل کھاتی ٹیلے تک پہنچتی تھی اور پھر ڈیرے کے داخلی دروازے تک لے جاتی تھی۔ ہوا چونکہ سامنے کی طرف سے آ رہی تھی لہٰذا چلنے میں معمول سے کئی گنا زیادہ طاقت صرف ہو رہی تھی۔ ٹیلے کی ڈھلوان پر پہنچ کر چلنا اور مشکل ہو گیا۔ میں نے دیکھا داخلی دروازے پر لہرانے والا دیو ہیکل جھنڈا ستر کے زاویے سے زمین کی طرف جھکا ہوا ہے۔ کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخیں اڑتی ہوئی آئی تھیں اور داخلی دروازے کے قریب کھڑی ایک بائیسکل سے الجھی ہوئی تھیں۔ ڈیرے کی بیشتر بتیاں بجھ چکی تھیں لیکن احاطے میں ایک دو گیس لیمپ روشن تھے۔ میں منہ سر لپیٹے احاطے میں داخل ہوا اور اس برآمدے میں جا بیٹھا جہاں پہلے سے دس پندرہ افراد سکڑے سمٹے بیٹھے تھے اور اس طوفان بلاخیز کا نظارہ کر رہے تھے۔ ڈیرے کے اندرونی دروازے بند کر دیے گئے تھے تاکہ کمرے گرد و غبار کی یورش سے محفوظ رہیں۔ احاطے میں بچھی ہوئی صفیں وغیرہ لپیٹ کر برآمدے کے ایک گوشے میں ڈال دی گئی تھیں۔ ابھی مجھے برآمدے میں بیٹھے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ کوئی شے فرش پر گر کر چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ یہ ایک بڑے سائز کا گیس لیمپ تھا جو برآمدے کے ایک محرابی در میں جھول رہا تھا۔ برآمدے کی مدھم روشنی کچھ اور ماند پڑ گئی۔ میں نے برآمدے میں بیٹھے افراد کو غور سے دیکھا۔ ان میں مردوں کے علاوہ دو تین عمر رسیدہ عورتیں بھی شامل تھیں لیکن کوئی نوجوان لڑکی دکھائی نہیں دی۔ ابدال نے مجھے بتایا تھا کہ سعیدہ کی ماں گورے رنگ کی دبلی پتلی عورت ہے اور اس کی ایک آنکھ خراب ہے لیکن ان عورتوں میں اس حلیے کی کوئی عورت نہیں تھی۔ معلوم نہیں وہ ماں بیٹی کہاں تھیں اور اس ڈیرے پر تھیں بھی یا نہیں۔ کچھ دیر بعد زور کی بارش ہونے لگی۔ بارش سے گرد و غبار تو کم ہو گیا لیکن ہوا کا زور ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران میں حضرت گرو کا کوئی مصاحب مجمع میں آ بیٹھا اور اس نے حاضرین کو کوئی وظیفہ شروع کرا دیا۔ یہ وظیفہ یا جاپ سنسکرت زبان میں تھا۔ حاضرین وظیفہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے سر بھی ہلا رہے تھے۔ میں بھی سر ہلانے لگا اور اپنی آواز مجمع کی آواز میں ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا۔ ہوا کی شدت کچھ کم ہوئی تو برآمدے میں دو تین گیس لیمپ مزید روشن کر دیے گئے۔ روشنی میرے لیے خطرناک تھی۔ میں نے اپنی گردن یوں جھکا لی کہ ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔ سر پر چادر تھی۔ اور بھی کئی افراد اسی طرح سر نہوڑے انداز میں بیٹھے تھے۔ جب تک کوئی خاص طور سے مجھے پہچاننے کی کوشش نہ کرتا میرا کسی کی نظر میں آنا ممکن نہیں تھا۔

صحن میں ایک دیوار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پانچ چھ حجرے سے بنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہاں چلہ کاٹنے والے لوگ بیٹھتے تھے یا وہ لوگ رہتے تھے جو دور دراز دیہات سے آتے تھے اور ان کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ ایک دو روز ڈیرے پر رہیں۔ میں یونہی بے خیالی میں ان حجروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک حجرے کا دروازہ کھلا اور کوئی عورت ہاتھ میں مٹی کا لوٹا اٹھائے غسل خانوں کی طرف بڑھی۔ برآمدے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ چند لمحوں کے لیے روشنی میں آئی تو میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی ایک آنکھ بھینگی ہوئی تھی۔ بلاشبہ یہ سعیدہ کی ماں تھی۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور رنگ غیر معمولی طور پر گورا تھا۔ وہ پھولدار ٹائلوں والے فرش پر دھیرے دھیرے پاؤں رکھتی غسل خانوں کی طرف چلی گئی اور میں جلدی سے اٹھ کر حجرہ نما کوٹھریوں کی طرف آ گیا۔ عورت جس حجرے سے نکل کر گئی تھی اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں اندر جھانک کر دیکھ سکتا تھا کہ سعیدہ بھی اس کے ساتھ ہے یا نہیں۔ میں نے حجرے میں جھانکا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ بالکل خالی نظر آ رہا تھا۔ میں احاطے کا چکر کاٹ کر واپس مجمع میں آ بیٹھا۔ رسٹ واچ کی طرف دیکھا تو ساڑھے آٹھ کا وقت بتا رہی تھی۔ مجھے اس ڈیرے یا "آستانے" پر آئے ہوئے اب قریباً ڈھائی گھنٹے ہو چلے تھے لیکن ابھی تک حضرت گرو کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ ہوا بدستور چل رہی تھی لیکن اب گاہے بگاہے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ جوں جوں رات ہوتی گئی برآمدے میں بیٹھے افراد پر نیند غالب آتی گئی۔ وظیفہ پڑھوانے والا خود بھی نیند کے جھونکے میں تھا۔ حاضرین میں سے کچھ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے' جو زیادہ تنگ تھے وہ وہیں صفوں پر آڑے ترچھے لیٹ گئے' اور چادریں اوڑھ لیں۔ میں بھی ایک دیوار کے ساتھ لیٹ گیا اور سرتاپا چادر اوڑھ لی۔ ابھی تک کسی نے مجھ سے باز پرس نہیں کی تھی۔ بہرطور میں ہر قسم کی صورت حال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ برآمدے کے بیشتر لیمپس بجھا دیے گئے ہیں۔ میں نے سر سے چادر سرکا کر دیکھا۔ اب صرف برآمدے کے وسط میں دو لالٹین روشن تھیں۔ حضرت گرو کے بڑے تگڑے چیلے سخت لہجے میں لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ یوں آڑے ترچھے نہ لیٹیں۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ تک بھی آئیں۔ لیکن خیریت گزری۔ تھوڑی ہی دیر بعد برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔ میں نے دس پندرہ منٹ مزید انتظار کیا پھر چادر...

سرکائی اور اٹھ بیٹھا۔ چادر کو بُکل کی طرح لپیٹ کر میں نے پسٹل اپنے ہاتھ میں لیا اور ڈیرے کے اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ ارد گرد کوئی منتظم موجود نہیں۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر میں ایک تنگ دروازے میں داخل ہوا اور چھوٹی سی راہداری میں پہنچ گیا۔ یہاں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی تھی اور طاقچوں میں بجلی کے چراغ روشن تھے۔ بڑا خوابناک سا ماحول تھا۔ میں نے ایک چھوٹے سے چبوترے پر کسی دھات کی ایک قد آدم مورتی بھی دیکھی۔ یہ کسی دیوی کی مورتی تھی۔ اس نیم عریاں مورتی کے پورے جسم پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اچانک ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں تیزی سے اپنے دائیں پہلو پر جھکا۔ ایک پرچھائیں سی لہرا کر میرے قریب سے گزر گئی۔ میں نے دیکھا یہ ایک تنومند چیلا تھا۔ اس نے اچانک جھپٹ کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی تھی اور وار خالی جانے کے سبب دیوار سے ٹکرایا تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنا گھٹنا اس کی پسلیوں میں مارا۔ اس کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز نکلی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا اس کی ادھ کٹی گردن میرے دائیں بازو میں جکڑی جا چکی تھی۔ یہ وہی مخصوص گرفت تھی جو میرے مدِمقابل کو لاچار کر دیتی تھی۔ میں نے گردن کو نیچے کی طرف جھکا کر زیریں حصے پر دباؤ ڈالا۔ پہرے دار چیلا کوئی آواز نکالے بغیر میری بانہوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے آرام سے فرش پر لٹا دیا۔ اس کے پیٹ پر سے چوغا نما کرتہ اوپر ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا یہاں چمڑے کی پیٹی میں ایک خم دار خنجر بندھا ہوا تھا۔ یہ دام پوری خنجر تھا لیکن اس خنجر سے ذرا بڑا تھا جو میری پنڈلی سے لگا رہتا تھا۔ میں نے خطرناک خنجر چیلے کے جسم سے جدا کر کے اپنے پاس رکھ لیا اور چیلے کو گھسیٹ کر تنگ راہداری کے ایک تاریک گوشے میں ڈال دیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں کوئی بھی غیر معمولی آہٹ نہیں ابھری تھی، پھر بھی میں کچھ دیر ایک نیم تاریک گوشے میں ساکت کھڑا رہا اور ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے باہر راہداری میں نگاہ دوڑائی۔ یہاں صرف دو دروازے تھے۔ ایک دروازے کے باہر مجھے وہی چپل نظر آئی جو میں اس سے پہلے جگر گاں کی حویلی میں دیکھ چکا تھا۔ اس پر دو سرخ نگینے جڑے ہوئے تھے۔ یہ حضرت گرو کی چپل تھی اور میں اسے باآسانی شناخت کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حضرت گرو اسی کمرے میں موجود تھے۔ میں نے ہاتھ کی پشت سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ کہیں اندر کھٹ پٹ ہوئی اور چند لمحے بعد دروازے میں جھری نمودار ہو گئی "کون ہے؟" ایک خوابیدہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ یہ حضرت گرو کی آواز تھی۔

میں نے دروازے کو زور سے دھکا دیا اور اندر گھس گیا۔ بے حد آسانی کے ساتھ میں نے اپنا ایک بازو حضرت گرو کی گردن میں حمائل کر دیا۔ اس بازو کی گرفت نے حضرت گرو کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ مدھم سی آواز نکال سکے۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں ایک نسوانی چیخ گونجی۔ اس چیخ پر توجہ دیے بغیر میں نے اپنا فارغ ہاتھ دروازے کی طرف بڑھایا اور اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کمرے میں بھی لالٹین روشن تھی۔ ایک بڑے سائز کی چارپائی پر مجھے کوئی لیٹا نظر آیا۔ اس نے ایک کمبل لاتے سر سے پاؤں تک اوڑھ لی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جو ابھی چیخی تھی۔ وہ اب بھی کمبل کے نیچے ڈری ڈری آواز میں رو رہی تھی۔ میرے بازو کی گرفت اتنی سخت تھی کہ گروجی کی آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں اور منہ بھاڑ کی طرح کھل گیا تھا۔ میں نے پسٹل کی سیاہ نال اس کے منہ میں داخل کر دی "خبردار! آواز نکالی تو ڈھیر کر دوں گا۔"

میری صورت پہچان کر حضرت گرو کی پھٹی پھٹی آنکھیں اور پھٹ گئیں۔ غالباً اسے وہ سارے مناظر یاد آ گئے تھے جو حویلی میں اس کی آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوئے تھے۔ میں نے حضرت گرو کی گردن پر سے گرفت ختم کی اور اپنا ہاتھ اس کے پورے جسم پر گھمایا۔ مجھے خدشہ تھا کہ حضرت گرو نے اپنے لباس میں کوئی ہتھیار نہ چھپا رکھا ہو۔ یہ خدشہ غلط ثابت ہوا۔ رات کے اس پہر اس محفوظ خوابگاہ میں حضرت گرو نے اپنے ساتھ کوئی ہتھیار رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ایک طویل چوغا پہنے ہوئے تھا۔ چوغا کے نیچے ریشمی پائجامہ تھا۔ میں نے پسٹل حضرت گرو کے منہ سے نکال کر اس کے سینے پر رکھا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اچانک مسہری پر موجود عورت کمبل ایک طرف پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ گوری چٹی جواں سال لڑکی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سعیدہ ہے۔ وہ ویسا ہی پھولدار چھینٹ کا لباس پہنے ہوئے تھی جیسا اس کی ماں نے پہن رکھا تھا۔ اس کے شہد رنگ بال منتشر تھے اور آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ وہ تڑپ کر مسہری سے اتری اور میرے پاؤں میں گر پڑی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ چھوڑ دو ان کو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ان پر ہاتھ مت اٹھاؤ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔"

میں نے اسے پاؤں سے دھکیل کر پیچھے ہٹایا "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا بکواس کر رہی ہو؟"

وہ کراہی "میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ بہت "کرنی" والے فقیر ہیں۔ تمہیں مٹی کا ڈھیر کر دیں گے۔ ان سے گستاخی مت کرو۔"

"یہ تو خود مٹی کا ڈھیر ہے۔ یہ کسی کا کیا بگاڑے گا" میں نے کہا اور ایک زور کا تھپڑ حضرت گرو کے رُخسار پر لگایا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ سعیدہ کے منہ سے پھر دبی دبی چیخ نکل گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ شاید وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ حضرت گرو جیسی "برگزیدہ ہستی" کے ساتھ ایسا سلوک ہو سکتا ہے۔ غالباً اسے خدشہ تھا کہ ابھی زمین پھٹ جائے گی یا آسمان ٹوٹ کر سر پر آن گرے گا۔ اچانک دروازے

پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے پسٹل کی نال حضرت گرو کی پیشانی سے لگا دی "خبردار! اگر میری مرضی کے بغیر ایک لفظ بھی بولا تو فائر کر دوں گا۔"

حضرت گرو تلملا کر رہ گیا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ یہ بڑی مؤدبانہ دستک تھی۔ اس مرتبہ کسی نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس بھی دلایا۔ چند لمحے کے توقف سے دستک دینے والے کی آواز آئی "سب اچھا تو ہے نا حضرت؟"

میں نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور حضرت گرو کے کان میں نہایت سرد لہجے میں سرگوشی کی "جواب دو کہ سب ٹھیک ہے۔"

حضرت گرو کے ہونٹ کپکپائے۔ میں نے پیشانی پر پسٹل کی نال کا دباؤ بڑھا دیا۔ سعیدہ دبی دبی سسکیاں لے رہی تھی۔ حضرت گرو نے مری ہوئی سی آواز میں کہا "سب ٹھیک ہے' پریم کمار! تم جاؤ۔"

"بہت اچھا حضرت" دروازے کے باہر سے آواز آئی اور قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

یقیناً یہ شخص سعیدہ کی چیخ سن کر آیا تھا۔ حضرت گرو کا تسلی آمیز جواب سن کر واپس چلا گیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ راہداری کے آخری سرے پر اپنے بے ہوش ساتھی کو نہ دیکھ لے۔ بہر طور خیریت گزری۔ دروازے کی دوسری جانب گہری خاموشی طاری رہی۔ لڑکی نے روتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "خدا کے لیے اپنے آپ پر رحم کھاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

مجھے لڑکی پر غصہ آ رہا تھا۔ درست ہے کہ وہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ لڑکی تھی لیکن ایسی بھی سادگی کیا۔ انسان اپنا سب کچھ لٹا دے اور اسے ہوش نہ آئے۔ وہ اس خوابگاہ میں حضرت گرو کے رحم و کرم پر پڑی تھی اور اس کی ماں باہر حجرے میں وظیفے پڑھ رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو ڈانٹ کر کہا کہ وہ بالکل خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ جائے اور میرے کسی کام میں دخل نہ دے۔ میری ڈانٹ نے اسے سہما دیا اور وہ میری ہدایت کے مطابق چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس کا سارا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔

میں نے حضرت گرو سے کہا کہ وہ فرش پر بیٹھ جائے۔ اس کی خوبصورت مریدنی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ یہ حضرت گرو کے لیے بے حد توہین آمیز تھا کہ وہ فرش پر بیٹھے۔ اس نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ "یہ تم اچھا نہیں کر رہے۔ بڑی سخت سزا بھگتنا پڑے گی اس کی۔"

"تیری تو میں...!" میرے منہ سے گالیاں اُبل پڑیں۔

پسٹل کا دستہ میں نے زور سے حضرت گرو کے سر پر مارا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے کھینچا اور اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا "یہ لو اپنے پاؤں باندھو اس سے" میں نے ایک ازاربند اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اس نے پہلے تو پس و پیش سے کام لیا لیکن جب میں نے پھر پسٹل کے دستے سے ضرب لگانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ جلدی جلدی اپنے پاؤں ازاربند سے باندھنے لگا۔ میں نے اپنی نگرانی میں مضبوط گرہیں لگوائیں۔ پھر پسٹل ایک طرف رکھ دیا اور حضرت گرو کو اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ چند لمحے بعد میں اس کے ہاتھ بھی پردے کی ایک ڈوری سے باندھ چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے مسہری کے ایک ریشمی تکیے میں سے روئی نکالی اور اسے بال پوائنٹ کی مدد سے اچھی طرح حضرت گرو کے دونوں کانوں میں ٹھونس دیا۔ اب مجھے حضرت گرو کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں لڑکی کے پاس آ بیٹھا۔ اس کا نام پتا پوچھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے بتا دیا۔ وہ خوبصورت لیکن بے وقوفی کی حد تک سادہ مزاج تھی۔ ایسی دوشیزہ اس پکے ہوئے پھل اور درخت کی طرح ہوتی ہے جو سرِ راہ لگا ہو اور ہر آتا جاتا اس پر رال ٹپکانے لگے۔ یقینی بات تھی کہ حضرت گرو نے بھی اس پر رال ٹپکائی تھی اور اس کی خوشہ چینی میں کامیاب رہا تھا۔

میں نے حضرت گرو کی مشکیں کسنے کے بعد اسے کروٹ کے بل لٹایا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا تھا اور وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کان بند ہونے کی وجہ سے وہ ہماری آواز بھی واضح طور پر نہیں سن سکتا تھا۔ کسی کو مدد کے لیے پکارنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ اگر اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی تو یہ اس کی منحوس زندگی کی آخری آواز ہو گی۔ میں نے سرگوشی کے لہجے میں سعیدہ سے پوچھا کہ وہ یہاں حضرت گرو کی خوابگاہ میں کس حیثیت سے موجود ہے۔

سعیدہ کے چہرے پر خجالت آمیز خوف بکھر گیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے لیکن وہ کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ میرے ہاتھوں حضرت گرو کی ذلت دیکھ کر سعیدہ سخت تذبذب کا شکار ہو چکی تھی۔ اب تک حضرت گرو کا جو چمکدار تصور اس کے ذہن میں تھا وہ اگرچہ مکمل نہیں ہوا تھا تو دھندلا ضرور گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ بولی "حضرت گرو جو کچھ کر رہے تھے وہ آسمانی حکم تھا۔ وہ اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے تھے لیکن آسمانی حکم کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ وہ ایسا نہ کرتے تو میرے گھر پر سخت آفت آتی۔"

"آسمانی حکم؟ یہ کیا چیز ہے؟"

"غیب کی آواز۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔ اس آواز نے حضرت گرو کو حکم دیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔"

میرے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ حضرت گرو نے اس سیدھی سادی لڑکی کو اپنے کسی شعبدے کے جال میں پھنسایا ہے اور اتنا ہراساں کیا ہے کہ وہ اس کی ہر شیطانی خواہش کی تکمیل پر آمادہ ہو گئی ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ دور دراز دیہاتی علاقوں میں ایسے عیّار عاملوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ لوگوں کے حواس کے گرد یوں جال بنتے ہیں کہ اچھے بھلے سیانے کاٹھ کے اُلو بن کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے سعیدہ کو سمجھاتے ہوئے کہا "تمہارے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی کہ یہ شخص اوّل درجے کا جھوٹا اور مکار ہے۔ تمہارے سامنے میں نے اس کی کیا دُرگت بنائی ہے۔ اگر اس کے پاس کوئی علم یا شکتی ہوتی تو اتنا بے عزت کیوں ہوتا۔ اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے۔ جگر گاں میں بھی یہ میرے ہاتھوں ایسے ہی خوار ہو چکا ہے۔ تم نے اس کے ماتھے اور ٹھوڑی پر چوٹ کا نشان دیکھا ہو گا۔ یہ اسی مار کی نشانیاں ہیں جو میں نے اسے لگائی تھی۔"

لڑکی منمنائی "آپ اس علاقے میں نئے لگتے ہیں۔ آپ حضرت گرو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ بڑے اللہ والے ہیں۔ جب غصے میں آتے ہیں تو کنوؤں کے لوگ ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی ان کی آواز سنی ہے؟ زور سے بولتے ہیں تو یہ آواز پورے گاؤں میں سنی جاتی ہے۔"

لڑکی اس شعبدے کا ذکر کر رہی تھی جس کا پول میں نے چوہدری کی حویلی میں کھولا تھا۔ حضرت گرو کی بغل میں سے مائیکروفون اور ایک چھوٹی تار کے علاوہ بیٹری بھی برآمد ہوئی تھی وہ جب خود کو طیش اور جلال میں ظاہر کرنا چاہتا تھا ایک بٹن دبا کر مائیکروفون آن کر دیتا تھا۔ ایک دم اس کی آواز کئی گنا بلند ہو جاتی تھی۔ اب میں اس سادہ لوح لڑکی کو یہ ساری بات کیسے سمجھاتا۔ میں نے کہا "بی بی! یہ سب اس فراڈیے کی چکر بازیاں ہیں۔ یہ اپنی بغل میں ایک چھوٹا سا لاؤڈ اسپیکر چھپا کر رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسپیکر یہیں کہیں اس کمرے میں موجود ہو۔"

لڑکی کو مجھ سے اختلافات تھے، بہر حال اب وہ میری بات توجہ سے سن رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت گرو کے حوالے سے اس کا عقیدہ متزلزل ہو رہا ہے۔ صدیوں پرانی توہم پرستی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوا کرتی۔ سالہا سال اور نسل در نسل اس میں دراڑیں پڑتی ہیں تب کہیں جا کر وہ ٹوٹتی پھوٹتی ہے۔ سب کچھ سعیدہ کے سامنے تھا، پھر بھی وہ حضرت گرو کے خلاف کھل کر نہیں بول سکتی تھی۔

یہ کمرا ڈیرے کے اندرونی حصے میں واقع تھا۔ تاہم طوفانِ باد و باراں کی پھنکاریں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ گاہے گاہے بادل زور سے گرجتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔ میں نے سعیدہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی روداد شروع سے سنائے۔ وہ پہلے تو ہچکچائی پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ سعیدہ نے سیدھے سادے انداز میں جو کچھ بتایا اور اپنے سوالات کی مدد سے میں نے جو کچھ اس سے اُگلوایا وہ مختصراً یوں ہے۔

"سعیدہ سب سے پہلے کوئی ڈیڑھ سال قبل حضرت گرو کے پاس آئی تھی۔ اس کی گردن پر دو مسّے تھے۔ حضرت گرو سانپ کے زہر اور جھاڑ پھونک کے ذریعے مسّوں کا علاج بھی کرتا تھا۔ حضرت گرو نے سعیدہ کو بوتل میں رنگین پانی دیا اور گلے میں باندھنے کے لیے ایک سیاہ دھاگا بھی دیا۔ سعیدہ کی ماں اس کے ساتھ آئی تھی لیکن حضرت گرو کے پاس صرف سعیدہ ہی گئی تھی۔ یہ حضرت گرو کا اصول تھا کہ وہ ہر عقیدت مند کو علیحدہ علیحدہ اپنے پاس بلاتا تھا۔

حضرت گرو نے سعیدہ سے کہا کہ اس سے ایک بہت بڑے گناہ کا کام سرزد ہوا ہے اور اگر وہ کفارہ ادا نہیں کرے گی تو اس کے گھر پر ایک بہت بڑی مصیبت آئے گی اور ممکن ہے کہ اس مصیبت کا نشانہ سعیدہ کا بڑا بھائی بنے۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہر مرد و زن سے چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ سعیدہ سے بھی ایک غلطی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ایک ماموں زاد میں دلچسپی لیتی رہی تھی اور تنہائی میں اس سے ملتی جلتی بھی رہی تھی۔ گو اب یہ تعلق ختم ہو چکا تھا لیکن اس تعلق اور چھیڑ چھاڑ سے وابستہ احساسِ گناہ سعیدہ کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ رات دن اپنے آپ میں گھلنے لگی۔ اس کے ذہن پر لرزہ خیز خیالات کی یورش رہنے لگی۔ وہ ایک بہن تھی۔ اور بہنوں کی بھائیوں میں جان ہوتی ہے۔ آخر وہ اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ بڑی خاموشی سے حضرت گرو کے پاس پہنچی۔ یہ دوسری ملاقات سعیدہ کی بدقسمتی کے حوالے سے بڑی اہم ثابت ہوئی۔ حضرت گرو نے خود سعیدہ کے گرد اپنا جال بننا شروع کر دیا۔ اس کا شیطانی ذہن شیطانی راستوں پر سرپٹ بھاگتا تھا۔ بڑے بڑے گھاگ اس کی شعبدہ بازیوں کے آگے سپر ڈال دیتے تھے۔ وہ تو پھر ایک ڈری سہمی سی سادہ لوح لڑکی تھی۔ سردیوں کی ایک یخ بستہ سہ پہر کو جب ڈیرے کے ایک بند کمرے میں اگربتیوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور آتش دان میں لوبان سلگ رہا تھا۔ حضرت گرو نے چاندی کی ایک منقش مورتی کے سامنے دیر تک پرارتھنا کی اور پھر اپنی سرخ سرخ آنکھیں سعیدہ کے چہرے پر گاڑ کر بولا "معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ اب نجات کی ایک ہی صورت ہے۔ تم کو اپنے جسم کا بلیدان دینا ہو گا۔ ضروری ہو گیا ہے کہ آٹھ پہر کے اندر اندر کوئی ایسا مرد تمہاری زندگی میں آئے جو غیر شادی شدہ ہو اور اس نے اس سے پہلے کسی عورت کے جسم کو ہاتھ نہ لگایا ہو۔"

سعیدہ سمجھ رہی تھی کہ حضرت گرو کیا کہہ رہا ہے اور حالات اسے دھیرے دھیرے کس کی بانہوں میں دھکیل رہے ہیں لیکن وہ یوں حضرت گرو کے اثر میں آ چکی تھی کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حضرت گرو نے اشاروں کنایوں میں اسے سمجھا دیا کہ فی الوقت وہی وہ "دستیاب مرد" ہے جو سعیدہ کا "مسئلہ" حل کر سکتا ہے۔ آخری لمحوں میں سعیدہ نے حضرت گرو کے ارادے کے سامنے مزاحمت کا کمزور بند باندھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ حضرت گرو نے نتائج و عواقب سے اسے یوں ڈرایا کہ وہ بے دم ہو کر اس کمرے کے خوشبودار دھوئیں میں غرق ہو گئی۔ ایک بار یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ حضرت گرو کی ہدایت کے

مطابق اسے مہینے میں کم از کم ایک بار ڈیرے پر آنا پڑتا تھا۔ جگر گاں میں رہنے والی ایک سہیلی سعیدہ کی رازدار تھی۔ وہ سلائی کڑھائی کے بہانے اس سہیلی کے پاس آتی تھی اور راستے میں کچھ دیر کے لیے ڈیرے پر رُک جاتی تھی۔ آخر یہ "ملاقاتیں" رنگ لائیں اور سعیدہ کو اپنے وجود کے اندر ایک نئے وجود کا احساس ہونے لگا۔ اس نے "بصد احترام" حضرت گرو کو اس معاملے سے آگاہ کیا۔ حضرت گرو نے اسے تسلی تشفی دی اور کہا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

یہاں تک بیان کرنے کے بعد سعیدہ خاموش ہو گئی۔ اس کے حلق میں جیسے کوئی گولا سا پھنس گیا تھا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور آمادہ کیا کہ وہ اپنا بیان جاری رکھے۔ وہ مجھ سے نگاہیں چرا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے بولی "ایک دن حضرت گرو نے کہا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر ان کی مریدنی ہے، وہ اس سے میرا "علاج کروا" دیں گے۔ لیکن پھر پتا نہیں کیوں انہوں نے ارادہ بدل لیا۔ شاید اس کام میں کوئی خطرہ دیکھا ہو گا۔ ایک روز میں یہاں آئی تو یہ خوش نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ غیب کے پردے سے میری پردہ پوشی کا انتظام ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کہ تم اپنے گھر والوں پر یہ ظاہر کرو کہ تم پر دورے پڑ رہے ہیں۔ اُلٹی سیدھی باتیں کرو۔ غصہ دکھاؤ، جو تمہیں سمجھانے کی کوشش کرے اسے مارنا پیٹنا شروع کر دو۔ امید ہے کہ گھر والے تمہیں میرے پاس لائیں گے۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ لڑکی پر جن آنا چاہتا ہے اور اگر اس کا راستہ روکا گیا تو وہ نقصان کرے گا۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ جب لڑکی کو دورہ پڑنے لگے تو اسے بند کمرے میں بھیج دیا جائے۔ جب جن آ کر چلا جائے گا تو وہ خود ہی باہر نکل آیا کرے گی۔ میں نے حضرت گرو سے پوچھا کہ اس سے کیا ہو گا۔ یہ کہنے لگے کہ جب وقت آئے گا تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔ میں نے حضرت گرو سے پوچھا کہ کیا میرا اس طرح جھوٹ موٹ بیمار ہونا اور ماں باپ کو دھوکا دینا گناہ نہیں؟ حضرت گرو نے غصے سے میرا بازو مروڑا اور بولے 'اسے گناہ مت کہو۔ جو کام قدرت کی طرف سے ہوتا ہے اسے "گناہ" کہنے والا مہاپاپی ہوتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہارا پردہ رکھنے کا انتظام کسی بندے بشر نے نہیں قدرت نے خود کیا ہے۔ تم جانتی ہو اس وقت علاقے میں جنات کی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ سب لوگ آئے دن کے واقعات سے سہمے ہوئے ہیں۔ جب تم کہو گی کہ تم پر جن آ رہا ہے تو ہر سننے والا فوراً یقین کر لے گا۔ میں نے حضرت گرو سے پوچھا کہ اس سے کیا ہو گا؟ وہ بولے 'جو میں کہتا ہوں وہ کرتی جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں نے گھر آنے کے بعد وہی ناٹک کیا جو حضرت گرو نے کہا تھا۔ کئی دوسری باتوں کی طرح حضرت گرو کی یہ بات بھی بالکل سچ نکلی کہ لوگوں نے میرے ناٹک پر فوراً یقین کر لیا۔ میری ماں اور خالہ مجھے یہاں حضرت گرو کے پاس لے کر آئیں۔ حضرت گرو نے بھی کہہ دیا کہ مجھ پر جن آ رہا ہے۔ پورے گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ مجھ پر سایہ ہے۔ جب میں سانس روک کر زور لگاتی ہوں اور اپنا منہ لال کر لیتی ہوں تو گھر والے فوراً مجھے چھوڑ کر چھت پر چلے جاتے ہیں۔ میں کمرے میں آ جاتی ہوں۔ بھاری آواز میں زور زور سے بولتی ہوں۔ حضرت گرو نے ایک کاغذ پر مجھے عربی کے لفظ لکھ کر دے رکھے ہیں، وہ لفظ اونچی آواز میں پڑھتی ہوں۔ بے ڈھنگی حرکتیں کرتی ہوں پھر باہر آ جاتی ہوں۔"

اپنی روداد بیان کرتے ہوئے سعیدہ کی آنکھوں میں بے پناہ خجالت نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "اب تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

وہ بولی "ماں اور خالہ مجھے حضرت گرو کو دکھانے کے لیے لائی تھیں۔ حضرت گرو نے انہیں بتا دیا ہے۔"

"کیا بتا دیا ہے؟"

سعیدہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی، بڑی دقت سے بولی "حضرت گرو نے انہیں بتا دیا ہے کہ میرا پاؤں بھاری ہو گیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ پاؤں "جن آنے" کی وجہ سے بھاری ہوا ہے۔ میری ماں زور زور سے رونے لگی تھی اور خالہ بھی۔ ان دونوں کو حضرت گرو کی بات پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ میری ماں نے حضرت گرو کے پاؤں پکڑ لیے تھے اور رو رو کر کہا تھا کہ اس مصیبت کا کوئی حل نکالیں۔"

"پھر کیا حل نکالا تمہارے حضرت گرو نے؟" میں نے سعیدہ سے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

ندامت اور پشیمانی سے سعیدہ کی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ آہستہ سے بولی "حضرت گرو نے کہا ہے کہ وہ اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے خاص عمل کریں گے۔ یہ عمل تین چار دن میں ہو گا اور اس دوران میں ہم کو یہیں رہنا ہو گا۔ اگر عمل کامیاب ہو گیا تو ٹھیک ورنہ میری ماں مجھے لے کر میری نانی کے پاس شمس آباد چلی جائے اور آٹھ نو ماہ گزار کر بچہ پیدا ہونے کے بعد واپس آئے۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "تو اب یہ بدبخت عمل کرنے کے لیے تمہیں یہاں اس کمرے میں لایا ہوا ہے۔"

سعیدہ کچھ نہیں بولی۔ اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ رات، یہ تنہائی اور اس کمرے میں سعیدہ کی موجودگی۔ یہ سب کچھ بہ زبانِ حال، حالات کا جائزہ پیش کر رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی اور اس کی ماں کو بے نقط سناؤں۔ اور ہو سکے تو ان دونوں کو دو دو جھانپڑ بھی رسید کروں۔ ممکن تھا کہ اسی سلوک سے ان دونوں کے دماغ کے کیڑے جھڑیں اور وہ حضرت گرو کا اصل چہرہ دیکھنے کے قابل ہو سکیں۔ جہالت کی انتہا تھی۔ ایک شخص ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی عزت اور ان کے مال پر ڈاکا ڈال رہا تھا اور وہ پھر بھی

اسے "کبریٰ والا فقیر" قرار دے رہی تھیں۔

میں نے سعیدہ سے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ تو بھی حضرت گرو کے ساتھ اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔ تو اندھی ہے؟ کیا تجھے نظر نہیں آتا کہ حضرت گرو تیرے ساتھ کیا کر رہا ہے؟" اچانک وہ سسکنے لگی۔ میں نے کہا "مجھے رو کر مت دکھاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ اس شخص کی بدکاری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ تیرے ناجائز بچے کا باپ بن گیا ہے۔ بتا اس سے بڑا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی "سب حضرت گرو کو مانتے ہیں۔ گاؤں کے کسی بھی سیانے سے پوچھ لیں' وہ کہے گا کہ حضرت گرو "کرنی والے" ہیں۔ سب ان سے ڈرتے ہیں آخر کوئی بات تو ہوگی جو سب ان سے ڈرتے ہیں۔"

"یعنی تم اس لیے اس سے ڈرتی رہی ہو کہ سب ڈرتے ہیں؟"

"نہ ڈرتی تو اور کرتی بھی کیا؟" وہ روتے ہوئے بولی "کون میری بات پر یقین کرتا۔ کون مانتا کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا' اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

میں نے کہا "خاموشی سے ظلم سہنا بھی ظلم ہوتا ہے۔ اس سے ظالم کو شہ ملتی ہے۔ تمہارے بعد حضرت گرو پتا نہیں اور کتنی لڑکیوں کو برباد کرے گا۔"

وہ کچھ نہ بول سکی' بس خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا' اب وہ ہمت سے کام لے اور سب کے سامنے حضرت گرو کا بھانڈا پھوڑ دے۔ وہ سراپا کانپ گئی "میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے ماں باپ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ لوگ ان پر تھوکیں گے اور مجھ پر بھی۔"

میں نے کہا "تمہاری سوچ بالکل غلط ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ جو ناٹک تم نے حضرت گرو کے کہنے پر رچایا ہے' اس پر سب یقین کرلیں گے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایک وقت میں کچھ لوگوں کو تو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے لیکن زیادہ دیر کے لیے سب لوگوں کو بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ بہت سے لوگ اس بات کو نہیں مانیں گے کہ تمہارا پاؤں اس وجہ سے بھاری ہوا ہے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔ وہ دال میں کالا ڈھونڈ لیں گے اور پھر شک حضرت گرو پر ہی نہیں تم پر بھی جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں بھی شریکِ جرم سمجھا جائے۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی "مجھے لوگوں سے کیا لینا ہے۔ میرے ماں باپ تو حضرت گرو کی بات پر یقین کر رہے ہیں نا۔ وہ مجھے یہاں سے شمس آباد لے جائیں گے۔ وہاں کسی کو کیا پتا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں۔"

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں" میں نے اسے سمجھایا "کہیں نہ کہیں سے بات نکل ہی جاتی ہے اور پھر سوچو اس بچے کا کیا کرو گی جو تمہاری کوکھ سے جنم لے گا۔ اگر یہ گناہ چھپانے کے لیے اسے قتل کردو گی تو قاتل کہلاؤ گی۔"

"پھر میں کیا کروں؟" وہ سسک کر بولی۔

"وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔ پوری طاقت اور جرأت سے حضرت گرو کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ لوگوں کو اس کا وہ شیطانی چہرہ دکھاؤ جو اس نے پیری فقیری کے نقاب میں چھپا رکھا ہے۔ فیصلہ کرلو کہ جو ظلم تم پر ہوا ہے اس کے خلاف آواز اٹھاؤ گی' گاؤں میں' پنچایت میں اور عدالت میں' ہر جگہ اور ہر کسی کے سامنے' میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر جگہ تمہارا ساتھ دوں گا۔"

سعیدہ کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس آزمائش میں پوری نہیں اتر سکتی۔ وہ ایک سادہ لوح' کمزور دل لڑکی تھی۔ جیسے تیسے یہ مصیبت اپنے اوپر ٹالنا چاہتی تھی۔ پھر اس کی توہم پرستی بھی اس کے راستے کی دیوار بن رہی تھی۔ کراہ کر بولی "آپ حضرت گرو کو عام آدمی کیوں سمجھ رہے ہیں۔ وہ۔۔۔۔ وہ اچھا ہے یا برا یہ علیحدہ بات ہے لیکن اس کے پاس علم تو ہے نا۔ سب لوگ کہتے ہیں' حضرت گرو کے پاس جن ہیں۔ وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتا ہے۔ کیا آپ جنات کو نہیں مانتے ہو؟"

"جس طرح تم لوگ مانتے ہو اس طرح نہیں" میں نے جواب دیا۔

"مجھے پتا ہے آپ شہری لوگ ضرور مزار اور جن بھوت کو نہیں مانتے۔ مگر یہ سب چیزیں ہوتی ہیں۔ اب آپ بتائیں' جمعرات کو گاؤں کی لڑکیوں نے جو کچھ دیکھا وہ سپنا تو نہیں تھا۔ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور دن دہاڑے ہوا۔ میری سہیلی جنو ان لڑکیوں میں شامل تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتایا ہے۔"

میں نے کہا "اس روز لڑکیوں نے جو کچھ دیکھا وہ ضرور شرار نہیں تھا' میری اور تمہاری طرح کا جیتا جاگتا بندہ تھا۔ صرف اتنا تھا کہ اس کا جسم اور چوڑا اور ٹا تھا۔ تم نے کبھی میلہ دیکھا ہے؟"

سعیدہ نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "میلوں میں ایک عجائب گھر ہوتا ہے۔ اس میں عجیب عجیب جسموں اور شکلوں والے جانور رکھے جاتے ہیں۔ کسی بکرے کے چھ پاؤں ہوتے ہیں۔ کسی گائے کے دو سر ہوتے ہیں۔ تم سمجھو وہ بھی ایک عجیب جسم اور شکل والا شخص تھا۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ بھوکا پیاسا ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔ لڑکیوں کے سروں پر کھانے کے برتن دیکھ کر اس نے ان پر حملہ کردیا۔"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔ گاؤں والوں کا خیال کچھ اور ہے" سعیدہ نے کہا "وہ چاچا کرامت کی لڑکی خورشید کو اٹھا کر کھیتوں میں لے گیا تھا اور اس کے سارے کپڑے پھاڑ دیے تھے جب لوگ اسلحہ لے کر موقع پر پہنچے تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اور پھر اگر وہ "ہوائی چیز" نہیں ہے تو اب تک کسی کے قابو میں کیوں نہیں آیا۔ اور تو اور حضرت گرو کے مُرید بھی ابھی تک اسے پکڑ نہیں

سکے۔"

سعیدہ کا آخری فقرہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا "حضرت گرو کے مُرید بھی اسے ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"ہاں" سعیدہ نے سادگی سے جواب دیا "اس بات کا پتا مجھے یہاں آستانے پر آکر چلا ہے۔"

میں نے سعیدہ کو ذرا کریدا تو پتا چلا کہ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے حضرت گرو کے دو کارندے یہاں آئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر بھی چوٹ کا نشان تھا۔ اس کمرے سے باہر کھڑے ہو کر دونوں کارندوں نے حضرت گرو سے باتیں کی تھیں۔ یہ باتیں مدھم آواز میں ہوئی تھیں تاہم سعیدہ کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں۔ ان باتوں سے سعیدہ کو اندازہ ہوا کہ وہ عجیب الخلقت شخص جو جمعرات کو کھیتوں میں نظر آیا اب مزار شریف گاؤں سے کچھ فاصلے پر بیلے میں موجود ہے۔ اس نے خود کو کسی کمرے میں بند کر رکھا ہے اور لوہے کے دروازے کو اندر سے تالا لگا لیا ہے۔ حضرت گرو کے کارندے کوشش کے باوجود یہ تالا نہیں کھلوا سکے تھے۔ وہ رائفلوں سے فائرنگ کر کے دروازہ توڑ سکتے تھے لیکن اس سے خطرہ تھا کہ قریبی بستی کے لوگ جاگ جائیں گے اور موقع پر اکٹھے ہو جائیں گے۔ حضرت گرو نے کارندوں کو واپس بھیج دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آئیں۔ اتنی دیر میں مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

سعیدہ کی فراہم کردہ یہ اطلاعات میرے لیے بے حد اہم تھیں۔ اس وقت میرا اوّلین مقصد یہ تھا کہ قادر بخش عرف بختو کو تلاش کروں اور اسے اس کی والدہ تک پہنچاؤں۔ بے شک بختو قاتل تھا اور پولیس اسے آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی مگر ہمیشہ کے لیے جیل یا پاگل خانے کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے پہلے وہ چند گھنٹے یا چند دن تو اپنی ماں کے ساتھ اپنے گھر میں گزار سکتا تھا۔ بختو کے سلسلے میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ وہ ابھی تک مزار شریف کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ قرائن سے پتا چلتا تھا کہ حضرت گرو کے کارندوں نے اس کا کھوج لگا لیا تھا اور اب اسے گھیر کر پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے اچانک میں چونک گیا۔ میں مسہری پر بیٹھا تھا۔ مجھے اپنے پاؤں کے بالکل قریب کوئی چیز سرسراتی محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے جھک کر دیکھا۔ آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میرے پاؤں پر ایک سانپ رینگ رہا تھا۔ یہ براؤن رنگ کا قریباً دو فٹ لمبا سانپ تھا اور اس کی کھال پر چھوٹے چھوٹے نشانات تھے ایسے سانپ پھیرے لگانے والے سپیروں کے پاس عام ہوتے ہیں۔ انہیں کوڑی والا سانپ بھی کہا جاتا ہے' میں نے سن رکھا تھا کہ ایسے سانپوں کی بعض قسمیں بے حد زہریلی ہوتی ہیں۔ میرا ہاتھ بے اختیار سانپ کی طرف بڑھا اور میں نے کھینچ کر اسے پاؤں سے جدا کردیا۔ سعیدہ کے حلق سے دلدوز چیخ نکل گئی۔ سانپ نے میرے ہاتھ میں بل کھایا۔ غالباً وہ پلٹ کر میری کلائی پر ڈسنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے قوت سے دیوار پر دے مارا۔ جونہی وہ نیچے گرا میں نے پھرتی سے اپنا پاؤں اس کے سر پر رکھ دیا "میوں" کی باریک سی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بوجھ تلے سانپ کے سر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا جسم بری طرح بل کھا رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب حضرت گرو نے لیٹے لیٹے بلند آواز سے چیخنا شروع کردیا "پہلوپ" جسنے "اکبر" وہ اپنے کارندوں کو آوازیں دے رہا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے اسے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر اس نے میرے لیے مصیبت کھڑی کرنے کی کوشش کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ لیکن اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا فتور اٹھا تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے جست لگائی اور حضرت گرو کے اوپر گرا' میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر آیا تھا اور حضرت گرو کی چیخیں بلند ہونے سے پہلے ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ اسی وقت میری نگاہ حضرت گرو کے قدموں کی طرف اٹھی اور پلک جھپکنے میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ میرے پاؤں پر رینگنے والا سانپ کہاں سے آیا تھا۔ حضرت گرو کے پاؤں کے پاس ایک پٹاری الٹی پڑی تھی' اور اس کے اندر سے ایک اور سانپ کنڈلی کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ حضرت گرو نے لیٹے لیٹے اپنے پاؤں سے دھکیل کر یہ پٹاری الٹائی تھی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ دل چاہا اس منحوس بدکار کی بوٹیاں نوچ لوں۔ میں نے ایک ہاتھ سے حضرت گرو کے بال مٹھی میں جکڑے اور سر پوری زور سے فرش کے ساتھ ٹکرا دیا۔ مجھ پر وحشت سوار ہو گئی تھی۔ یہی عمل اس شدت سے میں نے کئی مرتبہ دُہرایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سانپ کی طرح حضرت گرو کی کھوپڑی کی کوئی ہڈی بھی چٹخ گئی ہے۔ سعیدہ لپک کر آئی اور مجھے حضرت گرو سے دور ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کوشش کے ساتھ ساتھ دبی آواز میں میری منتیں بھی کر رہی تھی "چھوڑ دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔ کیا جان سے مار دو گے۔"

چند سیکنڈ بعد جب میں نے حضرت گرو کے بال مٹھی سے آزاد کیے تو اس کی ناک سے خون جاری ہو چکا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ سعیدہ کی نگاہ ابھی تک دوسرے سانپ پر نہیں پڑی تھی' ورنہ وہ یوں فرش پر نہ بیٹھی رہتی۔ سانپ اب پٹاری سے باہر آچکا تھا اور رینگتا ہوا سعیدہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسا کمرے کے وسط میں مردہ پڑا تھا۔ ممکن تھا یہ نر مادہ کا جوڑا ہو۔ اگر حضرت گرو نے پٹاری الٹا کر یہ سانپ ہم پر چھوڑے تھے تو یقیناً یہ زہریلے سانپ تھے (بعد ازاں اس کی تصدیق بھی ہو گئی) جونہی سانپ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر پہنچا' میں نے پھرتی سے اس کی "دُم پُرغرور" پکڑی اور پوری طاقت سے گھما کر فرش پر پٹخ دیا۔ یہ جان لیوا ضرب تھی' سانپ کی تن فن ختم ہو گئی مگر اس کے جسم میں حرکت ابھی باقی تھی۔ میں نے اپنے لباس میں سے وہ خنجر نکالا جو کچھ

دیر پہلے حضرت گرو کے پہریدار کے جسم سے جدا کیا تھا۔ اس خنجر کی ایک ہی حرکت نے سانپ کا منہ اس کے باقی جسم سے جدا کر دیا۔ کمرے کا فرش موذی جانور کے گہرے سرخ خون سے داغدار ہونے لگا۔

سعیدہ نے اپنے منہ پر دوپٹا رکھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔ یوں وہ اپنی گھٹی گھٹی چیخوں کو حلق کے اندر ہی سمیٹے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے بستر سے چادر اتاری اور فرش صاف کرنے والے کپڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے دونوں سانپوں کے مردہ جسم مسہری کے نیچے پہنچا دیے۔ اب فرش پر خون کی مدھم آلائش کے سوا کوئی نشانی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مندرجہ بالا کارروائی کے دوران میں سعیدہ زور سے چیخی تھی اور حضرت گرو نے بھی اپنے کارندوں کو آوازیں دی تھیں۔ ان آوازوں کے رد عمل میں کسی بھی وقت اس خوابگاہ کے دروازے پر دستک ہو سکتی تھی۔ میں نے پسٹل نکال لیا اور دروازے کے پاس چوکس کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ سسپنس میں گزرے۔ پھر آہستہ آہستہ میرے تنے ہوئے اعصاب معمول پر آ گئے۔ اس کمرے میں ہونے والے ہنگامے کی خبر کمرے سے باہر نہیں ہو سکی تھی۔ یہ کمرا ڈیرے کے اندرونی حصے میں تھا' ویسے بھی ہوا اور بارش کا شور آوازوں کو پھیلنے سے روک رہا تھا۔

مطمئن ہونے کے بعد میں نے پسٹل واپس لباس میں رکھ لیا۔ سانپ کے خون سے آلودہ خنجر کو پاس رکھنے میں کراہت محسوس ہوئی لہٰذا اسے مسہری کے نیچے پھینک دیا۔ حضرت گرو کا جائزہ لیا' اس کی ناک کے نتھنوں سے بہنے والا خون ایک رخسار کو تر کر چکا تھا۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا اور اس کی سانس غیر ہموار تھی۔ میں اسے اتنی شدت سے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی منحوس صورت دیکھ کر نجانے کیوں مجھے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔ اس وقت میری نگاہ میں ان سیکڑوں ہزاروں سادہ لوح دیہاتیوں کے چہرے گھوم گئے تھے جو حضرت گرو کی فریب کاریوں کا شکار ہو چکے تھے اور ہونے والے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور ایک بار پھر میں اور سعیدہ بری طرح چونک گئے۔ میں نے حضرت گرو کے بے ہوش جسم پر ایک چادر پھیلائی اور جیب سے پسٹل نکال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے اشارے پر لرزتی کانپتی سعیدہ نے لالٹین کی لو کچھ اور مدھم کر دی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔

"کون؟" میں نے بھاری آواز میں پوچھا۔

"میں راجو ہوں گرو جی۔" باہر سے آواز آئی "آپ نے بلایا تھا نا مجھے۔" میں چند لمحے سوچتا رہا۔ آنے والا اکیلا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص کی شبیہ نظر آئی۔ اس نے ایک پھٹی پرانی برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ برساتی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے' نو وارد کے ہاتھ میں کچھ اوزار تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا چہرہ غور سے دیکھ پاتا۔ میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر اندر کر لیا۔ جونہی وہ اندر آیا میرا دوسرا بازو اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ اس کی دبلی پتلی گردن یوں شکنجے میں آئی کہ بے چارے کے لیے جنبش کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ میں نے دروازے کو کنڈی لگائی اور نو وارد کو گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں لے آیا۔ اس کی پھٹی پھٹی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں اور خوف سے گھگی بندھ گئی تھی۔ میں نے پسٹل اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "اس میں پوری گولیاں موجود ہیں۔ آواز نکالی تو تمہیں ڈھیر کر دوں گا۔"

اس کے سیاہی مائل ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے مطمئن ہونے کے بعد اس کی گردن آزاد کر دی۔ وہ سرتاپا کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے اوزار مسہری پر رکھے اور ہاتھ جوڑ کر بولا "مم ۔۔۔ میں نردوش ہوں جی۔ مجھے چھما کر دیں۔"

میں نے اسے مسہری پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ یوں ایک دم بیٹھ گیا جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی تو مسہری ہوا میں پرواز کر جائے گی۔ میں نے دیکھا۔ اس کے اوزاروں میں ایک ہتھوڑی' ایک زنبور' تار کا ایک مڑا تڑا ٹکڑا اور چابیوں کا ایک گچھا تھا "کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"تت ۔۔۔ تالے مرمت کرتا ہوں جی۔ چھوٹے چھوٹے بالک ہیں۔ مم ۔۔۔ مزدوری کر کے ان کا پیٹ پالتا ہوں۔ حضرت گرو نے بلایا تھا۔ ان کا حکم ٹال نہیں سکتا۔ اس کارن اتنی رات گئے چلا آیا۔ آپ کہتے ہیں تو ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔"

"واپس جانے کی اتنی جلدی تھی تو آئے ہی کیوں تھے۔ کیا کہا تھا تم سے حضرت گرو نے؟"

"کچھ بھی نہیں بتایا تھا جی۔ بس اتنا کہا تھا' آجاؤ' کہیں ضروری کام سے بھیجنا ہے۔"

سعیدہ کے بیان کی روشنی میں اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا تھا کہ یہ قفل ساز یہاں کیوں آیا ہے اور اسے کہاں بھیجا جانے والا ہے۔ حضرت گرو کے کارندوں نے کسی ایسے قفل کی بات کی تھی جو کھل نہیں رہا تھا اور حضرت گرو نے انہیں ایک ڈیڑھ گھنٹا بعد آنے کو کہا تھا۔ یقیناً حضرت گرو اسی قفل ساز کو اپنے کارندوں کے ساتھ بھیجنا چاہ رہا تھا۔

میں نے تیزی سے سوچا اور لرزتے کانپتے قفل ساز کو فرش پر لٹا کر اس کی مشکیں کس دیں۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ لیکن یہ سارا کام کرنے سے پہلے میں نے قفل ساز سے چند ایک سوالات پوچھ لیے تھے۔ اس کا نام راجندر ناتھ عرف راجو تھا۔ وہ جگر گاؤں کی ایک قریبی بستی کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے بچے کا علاج کرانے کئی دفعہ اس ڈیرے پر آ چکا تھا تاہم حضرت گرو کے بیشتر کارندوں کے لیے وہ اجنبی ہی تھا۔ مشکل سے ایک دو افراد ہوں گے جو اسے بطور قفل ساز جانتے ہوں گے۔

قفل ساز راجو کی مشکیں کسنے کے بعد میں نے اسے مسہری کے پیچھے دھکیل دیا۔ سعیدہ اس طوفانی رات کی کارگزاریاں دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہو چکی تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ میں نے پہلے اسے پھر تین چار زوردار جھانپڑ اس کے چہرے پر لگائے وہ الٹ کر پجاری کے پاس جا گری جو حضرت گرو کے قدموں میں کھلی پڑی تھی۔ اس کا سر ایک چوبی الماری سے ٹکرایا اور خون رسنے لگا۔ میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھٹکا دیا اور پھولدار ... کی "مفلس" قمیص ناف تک پھٹتی چلی گئی۔ قمیص کے نیچے اس کا زیریں لباس اور چمکتا دمکتا بدن نظر آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ شاید اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں اندیشے ہی اندیشے تھے۔ یہ اندیشے ان تلخ تجربوں کی دین تھے جن سے سعیدہ حضرت گرو کے ہاتھوں گزر چکی تھی۔ جب سادہ لوح عورت کسی مرد کی درندگی کا نشانہ بنتی ہے تو دنیا بھر کے مردوں سے اس کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

میں نے آنکھیں نکال کر سعیدہ سے کہا کہ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہے اور جب تک میں نہ کہوں' یہاں سے حرکت نہ کرے۔ میں جانتا تھا کہ سعیدہ کو میرا یہ سلوک بہت برا لگا ہو گا لیکن یہ سلوک" اسی کے فائدے کے لیے تھا۔ اب نہیں تو تھوڑی دیر بعد اسے پتا چل جانا تھا کہ میں نے اس پر کتنی مہربانی کی ہے۔ وہ اب زیادہ اعتماد کے ساتھ یہ بیان دے سکتی تھی کہ حضرت گرو کے کمرے پر شب خون مارنے والے نے حضرت گرو کے ساتھ ساتھ اسے بھی بے بس کر دیا تھا۔ قفل ساز بھی سعیدہ کے اس بیان کی تصدیق کر سکتا تھا۔

میں نے قفل ساز راجندر عرف راجو کے جسم سے اس کی برساتی اتروا لی تھی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی برساتی میں نے پہن لی۔ سر کو ڈھانپنے والی کیپ برساتی کے ساتھ ہی منسلک تھی۔ یہ کیپ سر پر چڑھا کر میں نے ٹھوڑی کے نیچے تسمہ باندھ لیا۔ میرا چہرہ کافی حد تک چھپ گیا تھا۔ ویسے بھی اس عمارت کے بیشتر حصے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مجھے امید تھی میں حضرت گرو کے چیلوں سے اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب رہوں گا۔ اگر نہ چھپا سکا تو پھر پسٹل تو تھا ہی۔ ان لوگوں کے پاس آتشیں ہتھیار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں با آسانی ایک دو کو زخمی یا ہلاک کر کے راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا۔

بمشکل پانچ دس منٹ گزرے تھے کہ دروازے پر ایک بار پھر مودبانہ دستک ہوئی۔ پھر کسی چیلے کی آواز آئی "حضرت گرو۔ میں نصیرالدین ہوں۔"

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے سعیدہ نے بتایا تھا کہ جن چیلوں نے عجیب الخلقت شخص کو بیلے کے درختوں میں گھیر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام نصیرالدین ہے۔

میں نے قفل ساز راجو کے اوزار تھامے اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ نصیرالدین دستک دینے کے بعد بڑے احترام سے راہداری میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

نصیرالدین ایک لمبا اور دبلا پتلا شخص تھا۔ حضرت گرو کے دوسرے چیلوں کی طرح اس نے بھی چوغا پہنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس شخص سے پہلے میری مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ اس ناواقفیت میں میرا اور چیلے دونوں کا بھلا تھا۔ بصورت دیگر مجھے اس کی کھوپڑی پر پستول رکھنا پڑتا اور کوئی رعب دار گالی دے کر حکم دینا پڑتا کہ وہ خاموشی کے ساتھ میرے ساتھ ساتھ ڈیرے سے باہر آ جائے۔ نصیرالدین نے مجھے غور سے دیکھا پھر بولا "گرو جی ہیں؟"

"ہاں ہیں ۔۔۔"

"کیا کر رہے ہیں؟"

"بہت غصے میں ہیں۔ تم نے اتنی دیر کیوں لگائی ہے؟"

"تم کون ہو؟"

"تالے مرمت کرتا ہوں" میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اوزار اسے دکھاتے ہوئے کہا "حضرت نے مجھے ایک گھنٹے سے بلا کر یہاں بٹھایا ہوا ہے۔"

"اچھا اچھا چلو تم۔" چیلے نے گرو سے ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور گھبراہٹ میں میرے ساتھ باہر آ گیا۔

اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ڈیرے پر ہو کا عالم طاری تھا۔ مجھے پورے ڈیرے پر صرف تین لالٹینیں نظر آئیں۔ دو برآمدے میں روشن تھیں اور ایک ڈیرے کے داخلی دروازے پر۔ ہوا اب مدھم ہو گئی تھی اور بارش کی بوچھاریں رم جھم برسات میں بدل گئی تھیں۔ داخلی دروازے پر ایک تنومند جسیم چیلا فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ اس کے پاس بھی کوئی آتشیں ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیلے کی ڈھلوان طے کرنے کے بعد ہم کچے راستے پر پہنچے۔ یہاں ایک تانگا کھڑا بارش میں شرابور ہو رہا تھا۔ کوچوان نے اپنے سر پر چھتری تان رکھی تھی اور تانگے کی چھت سے ایک لالٹین لٹکا رکھی تھی۔ حضرت گرو کا چیلا کوچوان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ سر پر تو چھت تھی لیکن ٹانگیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ ٹانگوں کو بھیگنے سے بچانے کے لئے ایک چھتری مجھے بھی تھما دی گئی۔ کچے راستے پر جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ کئی بار ہمارا گھوڑا پھسلتے پھسلتے بچا۔ وہ سائی گھوڑا تھا ورنہ ہمارے سفر کو کب کا فل اسٹاپ لگ چکا ہوتا۔

گرج چمک اور موسلا دھار بارش میں سفر کرتے ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں منزل تک پہنچ سکے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی۔ بالکل جنگل کا سماں تھا۔ راستہ مسدود ہو چکا تھا ہمیں تانگے سے اترنا پڑا۔ گیلی زمین پر جما جما کر قدم رکھتے ہم ایک جانب بڑھنے لگے۔ حضرت گرو کا چیلا نصیرالدین سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے کوچوان اور آخر میں میں تھا۔ لالٹین نصیرالدین کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے

لالٹین کو چھتری کے نیچے محفوظ کر رکھا تھا ورنہ وہ ہمیں کسی بھی وقت داغِ مفارقت دے سکتی تھی۔ پانچ دس منٹ کے پیدل سفر کے بعد ہم بارشی پانی کے ایک بہت بڑے جوہڑ کے کنارے پہنچ گئے۔ اس جوہڑ کو چھوٹی موٹی جھیل بھی کہا جا سکتا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو اس جھیل کا پانی ایک فرلانگ دور تک نظر آتا تھا۔ سطحِ آب سے اندازہ ہوتا تھا کہ جھیل کافی گہری ہے۔ جھیل کے کنارے قدیم طرز کی ایک مینارہ نما عمارت تھی۔ اونچائی تقریباً پچاس فٹ ہوگی۔ اس گول عمارت کی چھت پر جنگلا لگا ہوا تھا۔ غالباً یہ انگریزوں کے دور کی تعمیر تھی۔ ممکن تھا کہ یہ جھیل بھی اتنی ہی پرانی ہو۔ کسی انگریز لارڈ یا لیڈی نے جھیل کے کنارے یہ مینارہ کھڑا کر دیا ہوگا تاکہ یہاں بیٹھ کر جھیل کا نظارہ کیا جا سکے اور شکار سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔

اس مینارے میں داخلے کا دروازہ تقریباً سات ضرب چار فٹ کا تھا اور یہ لوہے کا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہی دروازہ ہے جس کے پیچھے عجیب الخلقت بخشو بند ہو چکا ہے۔ غالباً وہ حضرت گرو کے کارندوں سے جان بچا کر اس مینارے میں گھس گیا تھا اور دروازہ اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ اگر دروازہ مقفل ہو چکا تھا تو پھر اس پچاس فٹ بلند مینار میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا.... لیکن چند ہی لمحے بعد میرے یہ تمام اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ آہنی دروازہ کھلا اور میں نے ایک بے کٹے چیلے کو رائفل بدست مینار سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مینار کے کسی بالائی حصے سے چیخ پکار کی مدھم آواز آئی۔ میں نصیرالدین کے پیچھے پیچھے چلتا مینار کے تنگ و تاریک زینوں میں داخل ہوا۔ یہاں گھٹن تھی اور جلتے ہوئے ربر کی بُو محسوس ہوئی۔ لگتا تھا کہ یہاں ٹائر جلائے گئے ہیں۔

تیس چالیس زینے طے کرنے کے بعد ہم ایک اور دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر پہلے سنائی دینے والی چیخ پکار اب بالکل واضح ہو گئی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی پر وحشیانہ تشدد کیا جا رہا ہے اور جس پر تشدد ہو رہا ہے اس کا درد و کرب اپنی انتہا کو چھو رہا ہے۔ کچھ عجیب سی آوازیں بلند ہو رہی تھیں معتوب کے حلق سے۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ اس دہشت ناک انداز میں چیخنے والا بخشو کے سوا اور کوئی نہیں۔ چند لمحے کے بعد یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ جونہی ہم ایک گول کمرے میں داخل ہوئے میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ میں نے اس عجیب الخلقت شخص کو دیکھا جس کی ایک خوفناک جھلک میں اس سے پہلے جگر گاں کے قبرستان میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس دیکھنے اور آج کے دیکھنے میں بہت فرق تھا۔ اس وقت تاریکی میں وہ صرف ایک سیکنڈ کے لیے میری نگاہوں کے سامنے آکر اوجھل ہو گیا تھا۔ آج وہ میرے سامنے چھت سے الٹا لٹک رہا تھا اور تین گیس لیمپس کی روشنی میں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ خدا کی پناہ! اسے دیکھنا ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ اس کے پورے جسم پر صرف ایک شلوار تھی جس کے پائنچوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اس کے پورے جسم پر نہایت گھنے سیاہ بال تھے۔ اس کا سر عجیب ساخت کا تھا اور خوفناک حد تک بڑا تھا۔ اس کے کندھوں کے ساتھ ایک فالتو بازو منسلک تھا۔ یہ بازو دوسرے دو بازوؤں سے زیادہ طاقتور اور بڑا نظر آتا تھا۔

حضرت گرو کے کم از کم پانچ چیلے عجیب الخلقت بخشو کے گرد موجود تھے اور ہر دستیاب شے سے اسے مار رہے تھے۔ لاٹھیاں، رائفل کے کندے، بٹی ہوئی رسی کے کوڑے، غرض کہ بہت سی چیزیں اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔ رسا بخشو کی صرف ایک ٹانگ سے باندھا گیا تھا اور چھت میں موجود کنڈے میں سے گزار کر ایک کھڑکی کی سلاخوں سے گرہ دے دی گئی تھی۔ بخشو کے جسم سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور اس کی چیخیں دلدوز ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر میری طرح نصیرالدین بھی محوِ تماشا رہا پھر چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ سرگوشی میں بولا "تم جاؤ۔ نیچے جا کر تانگے میں بیٹھو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے.... لیکن" میں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"لیکن کچھ نہیں۔ اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں۔ جو تالا تم نے کھولنا تھا، وہ کھل چکا ہے۔ بس جاؤ اب یہاں سے۔ میں نیچے آکر تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔" اس نے مجھے باقاعدہ دروازے کی طرف دھکیل دیا۔

میں جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ میرا یہاں سے ہٹنا ہی بہتر تھا۔ یہاں موجود چیلوں میں سے کم از کم دو مجھے پہچانتے تھے۔ فی الوقت ان کا دھیان بخشو کی طرف تھا۔ اس کی طرف سے فارغ ہو کر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ایک اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ عین ممکن تھا کہ بخشو کی طرح مجھے بھی کسی چھت سے لٹکانے کی کوشش کی جاتی۔ سیڑھیوں میں کسی سے میری مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی اور میں بخیریت نیچے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں نے غور سے دیکھا۔ دروازے کے پاس ادھ جلے ٹائروں کے ٹکڑے اور راکھ نظر آئی۔ صورتِ حال کا اندازہ لگانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مینار کا آہنی دروازہ واقعی بہت مضبوط تھا۔ اس میں جناتی قفل لگا ہوا تھا۔ قفل کی تقریباً چھ انچ لمبی چابی دروازے میں اندر کی طرف موجود تھی۔ کل سہ پہر سے بخشو اس مینار نما عمارت میں موجود تھا۔ حضرت گرو کے چیلوں نے مینار کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور مقفل دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں مسلسل ناکامی کے بعد انہوں نے کسی قفل ساز کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں حضرت گرو نے قریبی بستی میں راجو نامی لاک ماسٹر کو بلا بھیجا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا تھا کہ "لاک ماسٹر" کے پہنچنے سے پہلے ہی چیلوں کے دماغ میں ایک اور ترکیب آ گئی تھی۔ انہوں نے آہنی دروازے کی نچلی درز سے جلتے ہوئے ٹائر اور پرانے کپڑے اندر پہنچانے شروع کر دیے تھے۔ مینار کے تنگ و تاریک زینوں میں دھواں بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ آخر نتیجہ وہی نکلا تھا جو حضرت گرو

کے چیلے چاہتے تھے۔ بخشو کا دم گھٹنے لگا تھا اور وہ کھانستا اور چیختا ہوا مینار نما عمارت سے باہر نکل آیا تھا۔ چیلے تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف سے بخشو کو دبوچ لیا تھا اور بے بس کر کے اوپر لے گئے تھے۔ اب وہ اسے باندھ کر بے دریغ پیٹ رہے تھے اور ان زخموں کا بدلہ لے رہے تھے جو پچھلے چند گھنٹوں میں بخشو کے ہاتھوں انہیں لگے تھے۔

جونہی میں مینار نما عمارت سے باہر نکلا ایک چیلا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے پاؤں پر چوٹ آئی تھی اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔ جگر گاں کی حویلی میں اس شخص سے میری مڈھ بھیڑ ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی سے چھتری کھول کر اپنے سامنے کر لی۔ چیلا میرے قریب سے گزر گیا۔ میں درختوں کے اندر ہی اندر چلتا واپس تانگے تک پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ حضرت گرو کے چیلوں نے بخشو کو قابو کرنے کے لیے اتنی محنت کیوں کی ہے اور اب وہ اس سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن تھا کہ حضرت گرو بخشو کی "گرفتاری" کو پوشیدہ رکھتا اور بعد ازاں جب یہ سارا معاملہ ٹھنڈا ہو جاتا تو وہ بخشو کو کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بخشو کی گرفتاری کو فی الفور کیش کرا لیتا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ حضرت گرو کی "روحانی" طاقت نے عجیب الخلقت شخص کو پابہ زنجیر کر دیا ہے تو عقیدت مندوں میں اس کی توقیر کئی گنا بڑھ جاتی۔ اور تو اور پولیس بھی اس کی شکر گزار ہوتی اور ممکن تھا کہ علاقے کے بااثر پولیس افسران میں سے کوئی ایک ترمہ الو کا پٹھا اس کا مرید بھی بن جاتا۔ لیکن ان امکانات کے علاوہ ایک اور سنگین امکان بھی موجود تھا۔ ہو سکتا تھا کہ بخشو کے ہاتھوں حضرت گرو کا کوئی چیلا جان لیوا طور پر زخمی ہو گیا ہو یا..... مر ہی گیا ہو اور اس جرم کی پاداش میں بپھرے ہوئے چیلے اسے جان سے ہی مار دیں۔

میری نگاہوں میں مائی عالگاں کا غمزدہ چہرہ گھوم گیا۔ وہ دکھیاری ماں، جس کی کوکھ نے ایک عجوبے کو جنم دیا تھا۔ لیکن وہ ماں کے لیے عجوبہ نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے بیٹا تھا۔ وہ دنیا جہان کی خوبصورتی اپنے بیٹے پر قربان کر سکتی تھی۔ اس نے ایک سہمی ہوئی مرغی کی طرح برسوں اسے اپنے پروں میں چھپائے رکھا تھا۔ اب اتفاقاً وہ اس کے پروں کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ وقت کی بے رحم چیل اس پر جھپٹ رہی تھی۔ تیز نوکیلے پنجے اس کا زندہ گوشت نوچنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ موت کے دہانے پر تھا۔ دم بدم برستی بارش میں میں سر پر چھتری تانے تانگے کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ تانگے کی نشست کے نیچے تاریک خلا میں [illegible] کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نظر آئی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا یہ کوئی وزنی چیز تھی۔ جیسے پختہ اینٹ کو کپڑے میں لپیٹ کر یہاں رکھ دیا گیا ہو۔ میں نے کپڑے کی تہیں کھولیں۔ نیچے ایک مومی کاغذ تھا۔ کاغذ ہٹایا تو ایک ڈائنامائٹ پر نظر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ بلاشبہ یہ ڈائنامائٹ ہی تھا۔ تقریباً نو انچ لمبی پانچ چھ "سٹکس" تھیں جنہیں ڈوری سے باندھ کر فلیتے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس تانگے میں ان ڈائنامائٹ اسٹکس کی موجودگی ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے حضرت گرو کے چیلے مینار کا آہنی دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید یہ ڈائنامائٹ بھی اسی سلسلے میں یہاں پڑا تھا۔ چیلوں نے سوچا ہوگا کہ شاید کسی موقع پر اس کی ضرورت پڑ جائے۔

ڈائنامائٹ ہاتھ میں لیتے ہی میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں نے ڈائنامائٹ کو پھر سے پولی تھین میں لپیٹا اور پھر کپڑے میں لپیٹ کر اپنی برساتی کی طویل و عریض جیب میں ڈال لیا۔ چند ہی لمحے بعد میں تیزی سے واپس مینار کی طرف جا رہا تھا۔ مینار کے ارد گرد بدستور ہلچل موجود تھی۔ حضرت گرو کے چیلے یہاں وہاں کھڑے تھے۔ مینار کے بالائی حصے سے چیخ پکار اور گالی گلوچ کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں تیز قدموں سے مینار میں داخل ہوا۔ زینوں کے قریب پہنچتے ہی میں نے ڈائنامائٹ اسٹکس نکالیں۔ پولی تھین پھاڑ کر ڈائنامائٹ کا بارودی فلیتہ ننگا کیا اور لائٹر جلا کر فلیتے کو آگ دکھا دی۔ یہ عمل بمشکل چار پانچ سیکنڈ میں مکمل ہو گیا۔ کوئی شخص تیزی سے زینے اترتا نیچے آ رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ مجھے دیکھ پاتا میں نے سلگتا ہوا ڈائنامائٹ سیڑھیوں کے نیچے تاریک خلا میں پھینک دیا۔ اس کے بعد میں دو دو زینے پھلانگتا اوپر اسی گول کمرے میں پہنچ گیا جہاں حضرت گرو کے چیلے عجیب الخلقت بخشو کو مار پیٹ رہے تھے۔ جونہی میں نے دہلیز پر پاؤں رکھا ایک لرزہ خیز دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے۔ تقریباً دو کلو وزنی ڈائنامائٹ نے کام کر دکھایا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو کمرے میں موجود ہر شخص مبہوت رہ گیا۔ منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے ایک جھٹکے سے سب لوگ ہوش میں آ گئے۔ وہ چیختے چلاتے زینوں کی طرف دوڑے۔ چند سیکنڈ بعد گول کمرے میں میرے علاوہ صرف دو افراد رہ گئے تھے، ایک بخشو جو چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور دوسرا حضرت گرو کا چیلا نصیرالدین جو مجھے یہاں لایا تھا۔ اعصاب شکن دھماکے نے اسے بھی حواس باختہ کر رکھا تھا۔ وہ کبھی دوڑ کر کھڑکی کی طرف جاتا تھا کبھی دروازے کی طرف آتا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا۔ مجھے خود پر حملہ آور دیکھ کر اس کی دہشت زدہ آنکھیں کچھ اور دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔ دیوار سے ٹکرا کر جب وہ پھر سے میری طرف آیا تو میرے تنے ہوئے مکے کے لیے ایک بڑا شاندار نشانہ موجود تھا۔ میں نے یہ مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ یہ مکا کھا کر وہ چاروں شانے چت گرا اور ناک آؤٹ ہو گیا۔

دھماکے سے پیدا ہونے والا بارودی دھواں اب سیڑھیاں طے

کر کے کمرے میں بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ نیچے سے چیخ و پکار اور دھما چوکڑی کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اچانک جھک کر بخشو کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور پنڈلی سے خنجر کھینچ کر وہ رسّا کاٹ دیا جس سے وہ جھول رہا تھا۔

بخشو۔۔۔۔ جس کا وزن عام آدمی کے وزن سے دوگنا تھا اور جس کا سارا بدن کسی جانور کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا تھا، میرے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اسے چھوتے ہوئے تھوڑی بہت کراہت محسوس کرتا لیکن اس وقت کچھ بھی "محسوس" کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ یہاں موجود افراد اعصاب شکن دھماکے سے سنبھلتے، مجھے بخشو کو یہاں سے لے کر نکلنا تھا۔ بخشو جو ایک آسیب تھا۔۔۔۔ جو ایک درندہ تھا، جو ایک عجوبہ تھا اور ایک سوال تھا۔۔۔۔ اس وقت میرے سامنے تھا، میرے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے جسم کی بو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی، اس کے فولادی جسم کی حرارت میری ہتھیلیوں میں منتقل ہو رہی تھی۔ میں نے اسے کھڑکی کی طرف کھینچا۔ وہ ایک جسیم گوریلے کی طرح غرایا اور یک لخت اس کی تمام حیوانی قوتیں بیدار ہو گئیں۔ خون آلود پیشانی کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شعلے سے لپک گئے تھے۔ میں نے اس کے بے جوڑ بازو کو حرکت میں آتے دیکھا۔ یہی خوفناک بازو تھا جس کے جناتی تھپڑ نے جگر گاں کے قبرستان میں مجھے لٹو کی طرح گھما دیا تھا۔ اس مرتبہ میں اس بازو کو موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر خود کو بچایا اور گھوم کر بخشو کو عقب سے دبوچ لیا۔ اس کی بالوں بھری کمر میرے بازوؤں میں تھی۔ میرا قد چھ فٹ ہے، بخشو مجھ سے ایک بالشت اونچا نظر آ رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا "بخشو۔ میں دوست ہوں تیرا۔۔۔۔ تجھے چھڑانے آیا ہوں۔ تو نے۔۔۔۔"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ بخشو کے جسم میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ زخمی ہو کر وہ کچھ اور خطرناک ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو قوت سے جھٹکا دیا۔ اس کی کمر سے میری گرفت ختم ہو گئی اور میں لڑکھڑا کر کمرے کے آتشدان کے پاس جا گرا۔ اب ایک لمحے کی تاخیر کا مطلب یہ تھا کہ بخشو مجھے بھنبھوڑ ڈالتا۔ میں پھرتی سے اٹھا پھر سر جھکا کر بخشو کی طرف لپکا۔ بخشو میری جانب قدم اٹھا چکا تھا۔ کمرے کے وسط میں ہم دونوں کا تصادم ہوا۔ میرے بازو ایک بار پھر بخشو کی کمر کے گرد حمائل ہو چکے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب میں بخشو کے سامنے تھا۔ میں اپنے زور میں اسے دھکیلتا ہوا کھڑکی تک لے گیا۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس کھڑکی سے تقریباً چالیس فٹ نیچے برساتی جھیل کا تاریک پانی تھا۔ اس سے پہلے کہ بخشو کچھ کرتا یا سمجھتا وہ کھڑکی سے باہر تھا۔ اس کی کمر پر میرے بازوؤں کی گرفت برقرار تھی۔ دو سیکنڈ کے لیے ہم تاریک فضا میں تیرے پھر ایک زور دار چھپاکے سے سرد پانی میں گرے۔ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ پانی معقول حد تک گہرا تھا۔ ہم دونوں کشش ثقل کے زیر اثر پانچ چھ فٹ تک گہرائی میں گئے پھر سطح آب پر ابھر آئے۔

ایک دم دور سے بادل گرجا اور بارش کی بوچھاریں اور شدت اختیار کر گئیں۔ ہم جس سمت گرے تھے وہاں کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہم چیلوں کی نگاہوں سے محفوظ رہے ہیں۔ میں نے پانی پر ہاتھ پاؤں چلائے اور بخشو کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ بخشو میرے قریب ہی موجود تھا۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تیرنا نہیں جانتا۔ تیرنا جان بھی کیسے سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بند چار دیواریوں میں گزارا تھا۔ زندگی اسے ایک الزام کی طرح ملی تھی اور وہ اس الزام کو چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر میں نے اس کی مدد نہ کی تو وہ ڈوب جائے گا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کا طویل بازو میرے ہاتھ میں آیا۔ میں نے یہ بازو اپنے کندھے پر ڈالا اور اسے سہارا دے کر تیرتا ہوا کنارے کی طرف بڑھا۔ بہت سا پانی اس کے پھیپھڑوں میں جا چکا تھا اور وہ بری طرح ڈکرا رہا تھا۔ میں نے کوشش کر کے اس کا سر سطح آب سے بلند کر رکھا تھا۔ اور یہ کوشش کوئی آسان کوشش نہیں تھی۔ وہ ضخیم تھا اور اپنے طور پر بالکل جدوجہد نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میں قریبی کنارے کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اسی کنارے کی طرف جانا تھا جو مینار نما عمارت کی مخالف سمت میں واقع تھا۔ چار پانچ منٹ کی جاں گسل کوشش کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ مینار کے نچلے حصے میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور دروازے میں سے شعلے برآمد ہو رہے تھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں جھیل کا قریبی کنارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے حضرت گرو کے چیلوں کو افراتفری میں بھاگتے دوڑتے دیکھا۔

کنارے پر پہنچ کر میں نے بخشو کو کھینچ کر پانی سے نکالا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ایک بازو پر چند روز پرانا زخم تھا۔ مجھے یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ یہ اسی گولی کا زخم ہے جو میں نے چند روز پہلے اس پر داغی تھی۔ اعشاریہ ۳۸ کی یہ گولی بخشو کی کہنی کے پاس سے گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کے ایک پاؤں سے رسی ابھی تک بندھی ہوئی تھی جو میں نے خنجر سے کاٹی تھی۔ رسی کا یہ باقی ٹکڑا بھی میں نے خنجر سے کاٹ کر اس کی ٹانگ سے علیحدہ کر دیا۔ اپنی بھیگی ہوئی برساتی میں سے پستول نکال کر میں نے "برساتی" جھاڑیوں میں پھینک دی۔ بخشو کو کندھے پر لادنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ کام کرنا تھا۔ ابھی میں اسے زمین سے اٹھانے کا [illegible] سوچ رہا تھا کہ آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ جھیل کے کنارے درختوں میں کسی تانگے کے آثار نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد میں زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے قابل ہو گیا۔ یہ خاص قسم کا تانگا تھا۔ اس میں سواریوں کے بجائے سامان وغیرہ لادا جاتا ہے۔ ایک مستطیل تختہ سا ہوتا ہے جس کے اطراف میں لوہے یا لکڑی کا جنگلا لگا دیا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں یہ سواری میں کئی بار دیکھ چکا

تھا۔ حسن اتفاق یہ تھا کہ تانگا میری ہی طرف آ رہا تھا اور اس پر صرف ایک شخص یعنی کوچوان سوار تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے کوئی شے سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ اس تانگا سوار کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے روکوں گا۔ ممکن تھا کہ وہ میری مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتا اور نہ بھی ہوتا تو اسے اس "نیکی" پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ حضرت گرو کے بوکھلائے چیلے بہت جلد اپنے حواس میں آنے والے تھے۔ پھر جب وہ بخشو کو غائب دیکھتے تو آناً فاناً چاروں طرف پھیل جاتے۔

جونہی باربرداری میں استعمال ہونے والا یہ تانگا میرے قریب پہنچا میں سامنے آگیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ میں روکتا تانگا خود ہی رک گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس میں ایک کے بجائے دو افراد تھے۔ کوچوان کے فرائض انجام دینے والا شخص چھلانگ لگا کر نیچے اترا۔ اسے دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس کی فطرت ہی دوسروں کو حیران کرنا تھی۔ وہ سائیں عالی تھا۔ تاریکی کی بھیگی ہوئی چادر میں سے وہ یوں برآمد ہوا جیسے جیتا جاگتا انسان نہ ہو کوئی بھٹکا ہوا خیال ہو۔

"تم بھی نرے کھوتے ہو" اس نے حسب عادت ہانک لگائی "میں نے تمہیں دس آوازیں دیں لیکن تم نے ایک نہیں سنی۔ سرپٹ دوڑے چلے آئے یہاں۔"

"تم۔۔۔۔ تم نے آوازیں دی تھیں؟"

"تو اور کیا' وہ کوئی چنار تھا جو گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا؟"

"مجھے کسی کی آواز نہیں آئی" میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"اب تو آ رہی ہے نا۔ چلو اٹھاؤ اس لاش کو اور ڈالو اس ریڑھے میں۔ ورنہ وہ درانی خاں کے سالے آ جائیں گے یہاں' اور تمہارا کڑاہی گوشت بنانے کے چکر میں پڑ جائیں گے۔ چلو شاباش اٹھاؤ اس کو۔"

میں جیسے چونک کر بخشو کی طرف دیکھنے لگا۔ سائیں عالی کی آمد اتنی حیران کن تھی کہ چند لمحوں کے لیے میں گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ سائیں عالی اپنے مخصوص لبادے میں تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے سر پر پولی تھین کی شیٹ اوڑھ رکھی تھی۔ سائیں کے ساتھ آنے والا دوسرا آدمی بھی تانگے سے نیچے اتر آیا۔ ہم تینوں نے مل کر بخشو کو تانگے پر پہنچایا اور تختے پر الٹا لٹا دیا۔ سائیں عالی نے گھوڑے کی لگام تھامی اور تانگا آگے بڑھا دیا۔ مینار ہم سے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ اس کے نچلے حصے میں بھڑکنے والے شعلے بارش کی بوچھاروں کے سبب ماند پڑ گئے تھے اور اب سفید دھواں جھیل کے اوپر پھیل رہا تھا۔

میں نے سائیں عالی کے ساتھ آنے والے شخص کو غور سے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کا نام عمر دراز تھا۔ وہ تانگا چلاتا تھا اور یہ اسی کا تانگا تھا۔ جگر گاں اور مزار شریف کے درمیان سفر کرتے ہوئے دو تین دفعہ اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ فوج میں سپاہی بھی رہ چکا تھا۔ بہت ہنس مکھ اور ملنسار تھا۔ تانگا چلاتے ہوئے بڑی رسیلی آواز میں گانا بھی گاتا تھا۔ ایک بار میں نے جگر گاں سے شہر کی طرف جاتے ہوئے عمر دراز کے تانگے پر سفر کیا تھا اور اس کا ایک لوک گیت سنا تھا۔ اس گیت میں گاؤں کے ان نوجوانوں کا ذکر تھا جو شادی کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ وہ چوپال میں بیٹھ کر خفیہ سرگوشیاں کرتے ہیں' کبھی ایکدم زور زور سے ہنسنے لگتے ہیں اور کبھی ان کے چہروں پر شرارت ابھر آتی ہے۔ پھر جب لڑکیاں پن گھٹ پر جانے کے لیے ان کے قریب سے گزرتی ہیں تو وہ انہیں دکھانے کے لیے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کھردرے رخساروں کے بوسے لیتے ہیں اور کشتی کرنے لگتے ہیں۔۔۔۔ عمر دراز ایسے گیت بہت لہک لہک کر گایا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی اپنی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ چالیس سال کا ہونے والا تھا لیکن ابھی تک اتنے پیسے ہی اکٹھے نہیں کر سکا تھا کہ شادی کا بوجھ اٹھا سکے۔ اب شاید وہ شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ چکا تھا۔ اور یہ حالات اکیلے عمر دراز ہی کے نہیں تھے۔ ان گنت لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تنگ دستی کے باعث عمر بھر "محروم النساء" رہتے ہیں۔

تانگا یا ریڑھا' وہ جو کچھ بھی تھا' ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے فرسٹ ایڈ کے اصول کے مطابق بخشو کے پیٹ سے پانی نکالنا شروع کیا۔ اس کی سانس بحال ہونے لگی۔

میں نے سائیں عالی سے پوچھا "کدھر جا رہے ہو؟"

"موت کی طرف" وہ درویشانہ شان سے بولا "زندگی دراصل موت ہی کی طرف سفر کرنے کا نام ہے۔ ہم سب موت ہی کی طرف جا رہے ہیں۔"

"میں ابھی کی بات کر رہا ہوں۔۔۔۔ ابھی کہاں جا رہے ہو؟"

"اچھا۔ میں سمجھا شاید تم دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہے ہو۔"

"میں تمہاری طرح سڑی نہیں ہوں کہ اس طوفانی رات میں اس تانگے پر بیٹھ کر ایسے مسئلوں پر غور کروں۔ ویسے بائی دی وے تم نکلے کہاں سے ہو؟"

"تم نے پھر فلسفیانہ بات کر دی" سائیں عالی بولا "میں وہیں سے نکلا ہوں جہاں سے دنیا کا ہر ذی روح نکلا ہے۔ جہاں سے بادشاہ نکلے' فقیر نکلے' جہاں سے عقلمند نکلے' بیوقوف نکلے' جہاں سے قاتل نکلے' مقتول نکلے' جہاں سے عاشق نکلے' معشوق نکلے۔ معشوق کا لفظ جب بھی بولتا ہوں' پتا نہیں کیوں مجھے سروج یاد آ جاتی ہے۔ وہ بڑی پیاری اور نیک معشوق ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے اسے تمہارے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے۔ یا پھر تم اس کے لیے بھیجے گئے ہو۔ سوچو کتنی بڑی دنیا ہے' اور کب سے قائم ہے۔ تم دونوں کسی اور زمانے میں کسی اور جگہ بھی علیحدہ علیحدہ نکل سکتے تھے اگر نہیں نکلے تو۔۔۔۔"

سائیں عالی کی بات ادھوری رہ گئی اور اس کے منہ سے "اوہ اوہ" کی آوازیں نکل گئیں۔ گھوڑا پھسل کر ایک ڈھلوان پر لڑھکتے لڑھکتے بچا تھا۔ میں نے کہا "بہتر ہے کہ تم تانگا چلانے پر توجہ دو۔ یہ نہ ہو کہ یہ سفر واقعی موت کی طرف سفر بن جائے۔"

"ہا ہا ہا" سائیں عالی نے جنونی انداز میں قہقہہ لگایا "موت سے ڈرتے ہو؟ میں جس اُستاد جمالی کو جانتا ہوں وہ تو موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو نرا شفیع محمد ہے۔ شفیع محمد کو جانتے ہو تم؟" سائیں نے آخری الفاظ گہری سنجیدگی سے کہے تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود ہی بولا "شفیع محمد ایک جن تھا۔ بڑا جوان اور دلیر۔ سو جنوں میں کھڑا ہوتا تھا تو سب سے جُدا نظر آتا تھا۔ آواز بھی بڑی خوبصورت تھی۔ سمجھو جنوں کا مہدی حسن تھا۔ ایک پری پر عاشق ہو گیا۔ بس اسی عشق نے شفیع کی زندگی تباہ کر دی۔"

"لیکن ہماری زندگی کیوں تباہ کر رہے ہو؟" میں نے گھوڑے کی لگام پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ گھوڑا جو سیدھا ایک جوہڑ کی طرف جا رہا تھا پھر سے راہِ راست پر آ گیا۔

بخشو کی حالت اب ٹھیک ہو گئی تھی۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ وہ پھر دھما چوکڑی شروع نہ کر دے۔ میں نے بخشو کی شلوار میں سے آزار بند نکال کر شلوار کو دھوتی کی طرح کمر پر کس دیا اور آزار بند سے اس کے "متینوں" ہاتھ مضبوطی سے جکڑ دیے۔ پاؤں جکڑنے کے لیے میں نے ایک پرانا کپڑا استعمال کیا۔ سائیں عالی خاموشی سے یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی بخشو کی خوفناک جسمانی ساخت اور شکل و صورت پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ جیسے سب کچھ پہلے سے ہی جانتا تھا۔ میں نے اب سائیں عالی کے معاملے پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی بات بھی اب مجھے انوکھی نہیں لگتی تھی۔

گھوڑا اپنے راستے پر چلتا رہا اور سائیں عالی کی زبان اپنے راستے چلتی رہی۔ میں نے سائیں کو بتا دیا تھا کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ قریباً ایک گھنٹے میں ہم اس نہر کے کنارے پہنچ گئے جہاں بخشو نے خدا بخش کو قتل کیا تھا۔ یہاں ہم نے تانگا درختوں کے نیچے ٹھہرا دیا۔ براہِ راست باغ میں داخل ہو جانا مناسب نہیں تھا۔ پہلے میں اکیلا گیا اور صورتِ حال کا جائزہ لے کر واپس آیا۔ پھر ہم تانگے کو بخشو سمیت باغ میں لے گئے۔ ماسی عائشاں اور نوابزادی شاہین کو خبر ہو چکی تھی۔ وہ بخشو کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں۔ خاص طور سے ماسی عائشاں سے ایک لمحہ انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر تانگے پر چڑھ گئی اور بخشو کے اوپر گر کر اس سے لپٹ گئی۔ بیٹے سے اس کا ملاپ دیدنی اور رقت آمیز تھا۔ پھر اس کی نگاہ بخشو کے جسم کی چوٹوں پر پڑی۔ وہ رونے لگی اور ان سنگدلوں کو بددعائیں دینے لگی جنہوں نے اس کے "لال" کو اتنی بے دردی سے مارا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بخشو کے ہاتھ پاؤں کی بندشیں کھولنا شروع کر دیں۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ چند ہی لمحے بعد بخشو آزاد تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ ماسی عائشاں اسے سینے سے لپٹا رہی تھی۔ اس کا منہ چوم رہی تھی اور بلائیں لے رہی تھی۔ یہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک کریہہ المنظر شخص جس کی طرف کسی کو دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ اپنی ماں کی آنکھ کا تارا اور اس کے دل کا ٹکڑا تھا۔ ●●

اِس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چھٹے حصّے میں ملاحظہ فرمائیں۔

تاوان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ـــــ ۱۹۹۹ء

مطبع ـــــ یو اینڈ می پرنٹرز لاہور

کمپوزنگ ـــــ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر لاہور

قیمت ـــــ ۶۰/- روپے

اشاعت

علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال

لاہور، فون ۷۲۲۳۸۵۳

ISBN 969-8429-33-6

اس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا تھا [illegible]

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ٹھوکر کھاتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت

ہم ان دونوں کو اندر لے آئے۔ ماسی عاکشاں بیٹے کی چوٹیں دیکھ کر جیسے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً چولہے پر پانی رکھ دیا اور کہیں سے بہت سی روئی نکال لائی۔ نوابزادی شاہین کے پاس لیکوئڈ ہائیڈروجن اور "ڈیٹول" وغیرہ موجود تھی۔ ہم نے دستیاب دواؤں کی مدد سے بخشو کی مرہم پٹی کی۔ اس دوران میں سائیں عالی، ماسی عاکشاں کی بکری کے پاس بیٹھا رہا اور اس کی خشک مینگنیاں گن گن کر اپنے جھولے میں ڈالتا رہا۔ وہ یہ کام اتنے انہماک سے کر رہا تھا جیسے اس دنیا میں اس سے زیادہ ضروری کام اور ہے ہی نہیں۔ میں نے ابدال کی تلاش میں کمرے کے کونے کھدروں میں دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ابھی تک واپس پہنچا ہی نہیں تھا۔

اب رات کے تین بج چکے تھے۔ بارش رک چکی تھی۔ ہوا بھی بڑے دبے پاؤں چل رہی تھی۔ مجھے پہلی بار یہ موقع مل رہا تھا کہ میں بخشو کو قریب سے اور اطمینان سے دیکھ سکوں۔ وہ بدصورت اور بھیانک ضرور تھا مگر اس کی آنکھیں ایک عام انسان کی آنکھیں تھیں۔ نوابزادی شاہین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کا ظاہر عجیب ہے لیکن باطن عجیب نہیں ہے۔ وہ اپنی ماں کے شانے سے سر ٹکائے "بھوں بھوں" رو رہا تھا جیسے وہ ایک دیو ہیکل شخص نہ ہو ایک ننھا سا بچہ ہو جو گھر سے اسکول جانے کے لیے نکلا ہوا اور راستہ بھول گیا ہو۔ اپنے ننھے ننھے پیروں کے ساتھ پہروں گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہا ہو، اب اپنی ماں کے پاس واپس آ کر اسے اپنا دکھ سنا رہا ہو۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ "معصوم گمشدہ بچہ" تین افراد کا قاتل ہے، اور قانون اپنی تمام تر بے رحمی کے ساتھ اس کے خلاف حرکت میں آ چکا ہے۔

میں نے ماسی عاکشاں سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے سے پوچھے کہ اس نے تین افراد کی جان کیوں لی ہے۔

ماسی عاکشاں کراہی "کیوں بیٹا! کیا کیا ہے تُو نے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تُو نے کسی کو مارا ہے۔ بول مارا ہے تُو نے؟" وہ بولنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشاروں سے بھی بخشو کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بخشو حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کوئی مبہم سا لفظ بھی بولتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ماں کے سوال کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔ نوابزادی شاہین نے اسے پچکارتے ہوئے کہا "دیکھو بخشو! ہمیں بھی نہیں بتاؤ گے تو اور کسے بتاؤ گے۔ ہم جانتے ہیں تُو نے جان بوجھ کر کسی کو کچھ نہیں کہا ہو گا۔ بتاؤ میرے بھائی! کیا ہوا تھا؟"

بخشو بدستور ناراض انداز میں حلق سے آوازیں برآمد کرتا رہا۔ نوابزادی نے اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھا "بخشو! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ یاد کرو، تم نے کہا تھا کہ اپنی بہن سے بھی جھوٹ نہیں بولو گے......"

بخشو کی ماں بھی اسے پچکارنے لگی۔ وہ ایک بار پھر بھوں بھوں کی آواز سے رونے لگا۔ اس کے منہ سے رال بھی بہہ رہی تھی۔ پھر وہ مخصوص انداز میں غوں غاں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے تینوں ہاتھوں کے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کے تین ہاتھوں کو ایک ساتھ حرکت میں دیکھنا ایک عجیب تجربہ تھا۔ بخشو کا بیان تقریباً دس پندرہ منٹ جاری رہا۔ بیان ختم ہوا تو نوابزادی مجھے لے کر تہ خانے میں آگئی۔ میرے گیلے کپڑے اب سوکھ چکے تھے اور میں خود کو کافی پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

میں نے کہا "نوابزادی صاحبہ! اتنی بات تو میری سمجھ میں بھی آگئی ہے کہ بخشو کے ہاتھوں یہ تینوں قتل ہوئے ہیں۔"

"ہاں وہ اعتراف کر رہا ہے۔" نوابزادی غمزدہ لہجے میں بولی "مگر یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ کسی ایسے مصیبت زدہ جانور کی طرح تھا جس کے پیچھے شکاری لگے ہوں اور وہ اپنی جان بچانے کا فطری حق استعمال کر رہا ہو۔ وہ بے حد دہشت زدہ تھا۔ اس کے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ اگر وہ مدِ مقابل کو قتل نہ کرے گا تو مدِ مقابل اسے قتل کر دے گا۔ میرے خیال میں قانون کی زبان میں اسے حفاظت خود اختیاری کہا جاتا ہے۔"

"مقتول امریش کے بارے میں اس نے کیا بتایا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بخشو نے اس کے سر پر اینٹ سے ضربیں لگائی تھیں۔ بعد میں وہ یہ اینٹ ہتھیار کے طور پر اپنے ساتھ ہی قبرستان میں لے گیا تھا۔"

"قبرستان میں وہ کیا کرتا رہا؟"

"بس ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں چھپ کر بیٹھا رہتا تھا۔ جیماں نامی اس لڑکی کی بدقسمتی کہ وہ اپنی بچھیری کی تلاش میں سیدھی بخشو کے پاس جا پہنچی۔ اس وقت جیماں کے ہاتھ میں تیز دھار چھری تھی۔ اسے دیکھ کر بھی بخشو یہی سمجھا کہ وہ اسے جان سے مارنے کے لیے آئی ہے۔ وہ ایکدم اس پر پل پڑا۔ جیماں مضبوط اور جھگڑالو عورت تھی۔ چھری تو پہلے ہلے میں ہی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی' تاہم اس نے بخشو کی مزاحمت کی۔ اسی مزاحمت کے دوران میں اس کے کپڑے پھٹے اور جسم پر خراشیں وغیرہ آئیں۔ بخشو نے ہرگز اس کی عزت پر حملہ نہیں کیا۔ اور سچ بات یہ ہے کہ اسے صنفِ مخالف میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "مزار شریف والے واقعے کے بارے میں وہ کیا بتاتا ہے؟"

شاہین بولی "لڑکیوں پر حملہ کرنا تو دور کی بات ہے وہ ان کے پاس سے بھی نہ گزرتا مگر بھوک نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ پورے تین دن سے کچھ بھی اس کے پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ گولی لگنے سے خون بھی بہت بہہ گیا تھا اور اس کی ملی جلی نقاہت نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔"

اچانک بالائی کمرے سے سائیں مالی کی آواز ابھری اور ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں نوابزادی کو تہ خانے میں چھوڑ کر اوپر آیا تو سائیں مالی کہیں جانے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سبز واکوہ قاف تک۔ بس لنچ ٹائم تک واپس آ جاؤں گا۔"

"یہ ہاتھ میں کیا ہے؟" میں نے ایک خاکی لفافے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"بکری کی مینگنیاں ہیں" اس نے ورمان سے جواب دیا "شاہ جنات کو بکری کی خشک مینگنیوں کی سخت ضرورت ہے۔ دراصل شاہ جنات نے پچھلے ویک اینڈ پر ایک اور شادی کی ہے۔ بڑی چھوٹی سی عمر کی دلہن ہے۔ بمشکل پانچ سو سال عمر ہو گی۔ شاہ جنات خود پندرہ سو سال کے لپیٹے میں ہے۔ ایک جن حکیم نے شاہ جنات کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ اپنے ازدواجی معاملات اچھے طریقے سے چلانا چاہتا ہے تو اسے سدا بہار اور سدا جوان رکھنے والی دھونی کی ضرورت ہے۔ اس دھونی میں جو بے شمار چیزیں استعمال ہوتی ہیں ان میں بکری کی خشک مینگنیاں بھی شامل ہیں۔"

"اچھا..... اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو' یہاں کے حالات کی خبر باہر ہو گئی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"میں کیوں کروں گا گڑبڑ۔ سروج میری بیٹی کی طرح ہے' اور تم ہو داماد کی طرح۔ میں تمہیں ناراض کر کے سروج کے لیے مصیبت کھڑی نہیں کر سکتا۔"

میں منہ بنا کر رہ گیا۔ سائیں عالی اپنی مالائیں اور گھنگھناں کھڑ کھڑاتا' باہر نکل گیا۔ میں نے مائی عائشاں کو دیکھا' وہ نچلے ہارے بخشو کا بڑے تربوز جیسا سر گود میں لیے بیٹھی تھی۔ نوابزادی شاہین بھی اوپر ہی آ گئی۔ وہ کریہہ المنظر بخشو کو بڑی اپنائیت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نوابزادی سے پوچھا "ابدال تو واپس نہیں آیا۔"

"نہیں۔۔۔۔ تمہارے ساتھ ہی تو گیا تھا وہ" نوابزادی نے جواب دیا۔

"لیکن وہ پہلے آ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ یہاں پہنچ جائے۔"

حیرانی کی بات تھی۔ میں نے تانگہ گھوڑا ابدال کے سپرد کیا تھا اور خود حضرت گرو کے ڈیرے میں چلا گیا تھا۔ میں نے ابدال سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک میرا انتظار کرے اور پھر مائی عائشاں کے پاس باغ میں چلا جائے۔ اس واقعے کو اب دس گھنٹے ہو چکے تھے اور ابدال یہاں نہیں پہنچا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہ ہو گئی ہو۔

بمشکل دس منٹ گزرے تھے کہ سائیں عالی پھر آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آ رہا تھا۔

کہنے لگا "ادھر شفیع محمد بڑا خطرناک چکر چل گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ ہو گیا ہے۔ وہ تمہارا ساتھی 'کتے کا بچہ' کیا نام ہے اس کا؟ پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ پولیس اسے لے کر ادھر ہی آ رہی ہے۔"

"تم ابدال کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں' اسی بدبخت کی بات کر رہا ہوں۔ اگر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ یہاں سے' اور اسے بھی نکال لو" سائیں عالی کا اشارہ بخشو کی طرف تھا۔

"تم نے کہاں دیکھا ہے پولیس کو؟" نوابزادی نے سخت گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہر کے کنارے پہنچ گئے ہیں۔ سمجھو آیا ہی چاہتے ہیں۔"

میں نے غور سے سنا۔ جیپ کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ سائیں عالی کی اطلاع میں شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی۔ مائی عائشاں نے تڑپ کر بخشو کو سینے سے لگایا "نہیں..... نہیں" وہ بدبانی انداز میں بولی "میرے بیٹے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ میرے بخشو کو کوئی کچھ نہ کہے۔" بیس برس تک اس کے سینے میں پلنے والی ممتا جوش مار کر اس کی رگ رگ میں تڑپنے لگی تھی۔

میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا سلم ماڈل پسٹل نکال لیا۔ یہ پسٹل پولی تھین کے ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا اور بھیگنے سے محفوظ رہا تھا۔ نوابزادی شاہین چلا کر بولی "میرا خیال ہے ہم اس کھڑکی کے راستے نکل جاتے ہیں۔" پھر وہ بخشو کو اٹھانے میں مائی عائشاں کی مدد کرنے لگی۔

میرے اشارے پر عمر دراز نے دیوار پر ٹنگی ہوئی بارہ بور کی رائفل اتار لی۔ مائی عائشاں' بخشو کو کھڑکی کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی "بھاگ جا بخشو۔ اس کھڑکی کے راستے بھاگ جا۔" بخشو کھڑکی تک پہنچا۔ نوابزادی اس کے ساتھ تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان میں کوئی چوکھٹ پر چڑھ کر باہر کودتا' ایک للکارتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔

"خبردار! کوئی باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔"

اس کے ساتھ ہی کھڑکی روشنی میں نہا گئی۔ میں نے دیکھا۔ یہ ایک پولیس جیپ کی روشنیاں تھیں جو براہِ راست کھڑکی پر پڑ رہی تھیں۔ ایسی ہی روشنیاں مخالف سمت کی دیوار پر بھی پڑنے لگی تھیں۔ انجنوں کا شور اب واضح سنائی دے رہا تھا۔ پولیس باغ میں داخل ہو رہی تھی اور اس نے مکان کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ میں نے ایک فربہ اندام سب انسپکٹر کو دیکھا' اس کے ہاتھ میں سرکاری ریوالور تھا اور وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے کھڑکی کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے خبردار کرنے کے لیے دو فائر کیے۔ اس کے ساتھ ہی بلند آواز سے کہا کہ وہ ہمارے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرے۔

یہ کوئی سر پھرا اور مہم جو قسم کا سب انسپکٹر تھا۔ فائرنگ ہوتے ہی وہ ایکدم زمین پر گر پڑا تھا اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھا شاید اپنے پیٹی بھائیوں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے پسپا ہو گیا ہے' لیکن صورتِ حال برعکس نکلی۔ وہ آفت زادہ ایکدم کھڑکی کے عین سامنے سے نمودار ہوا۔ اس کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ ریوالور والا ہاتھ کھڑکی کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ اب میں مہلت دیتا تو ممکن تھا وہ جست لگا کر اندر آ جاتا۔ میں نے فائر کیا۔ مجھے اس کا صرف بالائی دھڑ نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے نشانہ بھی بالائی دھڑ کا لیا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ تڑپ کر ایک کیاری میں جا گرا۔ صورتِ حال ایکدم سنگین ہو گئی تھی۔ پولیس کے بندے کو گولی لگنے کا مطلب یہ تھا کہ اب پولیس والے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے اور ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

سب انسپکٹر کے گرتے ہی تڑا تڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ سیون ایم ایم اور روسی ساخت کی پمپ ایکشن گن کا فائر تھا۔ نوابزادی شاہین کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئی تھیں۔ کھڑکی کی چوکھٹ کا ایک حصہ ٹوٹ کر کمرے میں آ گرا اور تاریکی میں ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ میں نے آگے کر دو فائر کیے اور اس جیپ کی ہیڈ لائٹس کو چکنا چور کر دیا جس کی روشنی کھڑکی پر پڑ رہی تھی۔ اسی دوران میں دروازے والی جانب سے بھی ایک للکار گونجا اور للکارے کے فوراً بعد فائر ہونے لگے۔ طاقتور رائفل کی چند گولیاں دروازے میں لگیں اور لکڑی کو پھاڑتی ہوئی دیواروں میں پیوست ہو گئیں۔ یہ فائرنگ نسبتاً بلندی سے کی گئی تھی لہٰذا زیادہ خطرناک تھی۔ ہم فرش پر بیٹھے ہونے کے باوجود محفوظ نہیں تھے۔ میں نے کوجوان عمر دراز کو اشارہ کیا کہ وہ بخشو' نوابزادی اور مائی عائشاں کو تہ خانے میں اتار دے۔ عمر دراز میری ہدایت پر عمل کرنے کے لیے اٹھا۔ لیکن فوراً ہی گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے جلدی سے اسے دیکھا۔ سیون ایم ایم کی نوکیلی گولی اس کی کھوپڑی چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کی کنپٹی سے ابلنے والے گرم خون نے ایک سیکنڈ میں میرا بازو بھگو دیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ عمر دراز کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے اسے بہ آہستگی ایک طرف لٹا دیا۔ ایک محنت کش جو ایک سپاہی بھی تھا ایک لمحے میں ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" نوابزادی شاہین چونکی ہوئی آواز میں بولی۔

"زخمی ہو گیا ہے" میں نے جھوٹ بولا۔

نوابزادی نے اٹھ کر عمر دراز کو دیکھنے کی کوشش کی "بیٹھی رہو" میں چلایا۔ وہ ٹھٹک کر پھر فرش پر ڈھے گئی۔ میں کسی ہرن کی طرح جست لگا کر دروازے کے سامنے سے گزرا' اور بخشو اور اس کی ماں کو دھکیل کر سیڑھیوں کی طرف لے گیا پھر میں نے نوابزادی شاہین کا بازو کھینچا اور اسے بھی سیڑھیوں کی طرف لے

آیا۔

"تہ خانے میں چلو" میں نے چیخ کر کہا۔

ابھی میرا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ خود کار رائفل کے ایک برسٹ نے مسہری کے قریب رکھی تپائی کو چھید کر رکھ دیا۔ تپائی کے نیچے رکھی لالٹین بھی چکنا چور ہو گئی۔ اب کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ میرے جسم میں آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ اُستاد جہانی کی وحشت سے پیدا ہو رہا تھا۔ انڈین پولیس سے میری دشمنی کوئی نئی تازہ بات نہیں تھی۔ قریباً سات سال ہو چکے تھے اس دشمنی کو پھلتے پھولتے ہوئے۔ میں انڈین پولیس کو بے شمار مقدمات میں مطلوب تھا اور پچھلے سات آٹھ ماہ میں ان مقدمات میں کئی سنگین مقدموں کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ میرے خون کے پیاسے تھے اور اپنے خون کے پیاسوں کی پیاس میں ہمیشہ پگھلے ہوئے سیسے سے بجھاتا تھا۔

میں کھڑکی کے عین نیچے دیوار سے چپک گیا اور دوبارہ رائفل سے جوابی فائر کرنے لگا۔ رائفل کے ساتھ صرف آٹھ کارتوس تھے۔ یہ کارتوس میں نے دو منٹ میں استعمال کر دیے۔ فائرنگ کے دھماکے زوردار تھے۔ کمرے میں بندھی ہوئی بکری بدک کر مسلسل چیخ پکار کر رہی تھی۔ یکدم وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے سوچا شاید وہ رسا تڑا کر بھاگ گئی ہے لیکن جب مڑ کر دیکھا تو وہ عمر دراز کی لاش کے پاس تڑپتی ہوئی نظر آئی۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔

دروازے کی جانب سے ایک للکارتی ہوئی آواز پھر ابھری "ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس والے دونوں اطراف سے نزدیک آ گئے ہیں اور انہوں نے درختوں کے پیچھے پوزیشنیں لے رکھی ہیں۔ اگر میری طرف سے ایک دو منٹ تک جوابی فائر نہ ہوتا تو وہ یقیناً زیادہ جارحانہ انداز اختیار کر لیتے۔ میرے پاس پسٹل کی دو ڈھائی درجن گولیاں موجود تھیں۔ لیکن زیادہ فاصلے سے یہ فائر کارگر نہیں تھا۔ اس موقع پر پسٹل سے فائر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پولیس کو آگاہ کر دیا جاتا کہ ہمارے پاس کوئی مؤثر ہتھیار موجود نہیں ہے۔

میں ابھی اسی شش و پنج میں ہی تھا کہ مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ہوں پتر" ماسی عائشاں کی آواز آئی "یہ لے گولیاں۔ پوری چار درجن ہیں۔"

ماسی نے کارتوسوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کارتوس میری اہم ترین ضرورت تھے۔ تھیلا لے کر میں نے ماسی عائشاں سے کہا کہ وہ واپس جائے۔ ماسی بولی "نہیں بیٹا۔ مجھے اپنا یہ پستول دو۔ میں بھی تمہارے ساتھ گولی چلاؤں گی۔ مجھے آتی ہے گولی چلانی۔"

میں نے ماسی کو منع کیا لیکن وہ ایک نہیں مانی۔ اس نے پسٹل میرے ہاتھ سے لے لیا اور میرے پاس ہی دروازے کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا مگر حوصلہ پہاڑ کی طرح بلند تھا۔ اس کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ وہ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ نواب زادی شاہین اور اپنے بیٹے کو تہ خانے میں بند کر کے باہر آئی تھی۔ اچانک مجھے سائیں عالی کا خیال آیا۔ وہ تہ خانے میں نہیں گیا تھا۔ نہ کمرے میں اس کی آواز آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں یہ لرزہ خیز خیال آیا کہ کہیں اس کو بھی تو گولی نہیں لگ گئی۔

رائفل لوڈ کرتے ہوئے میں نے اسے پکارا "سائیں عالی...... سائیں عالی۔"

میرے بالکل پاس سے آواز آئی "میں یہاں ہوں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں نے کوہ قاف ٹیلی گرام بھیج دیا ہے۔ ایک کوہ جن اُدھر سے آتا ہی ہو گا۔"

یہ سائیں عالی کی آواز تھی۔ مجھے اطمینان ہوا۔ اگلے تین چار منٹ میں میں نے پولیس کی فائرنگ کا خاطر خواہ جواب دیا۔ ماسی عائشاں نے بھی بڑی دلیری سے پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ تین چار گولیاں اس نے بھی چلائیں۔ میرے ایک فائر کے جواب میں کسی پولیس والے کی بڑی دردناک کراہ اٹھی۔ پھر تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ کھڑکی کے بالکل پاس پوزیشنیں لینے والے پولیسے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ فائرنگ کی شدت بھی کم ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں دو صورتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ سچ مچ پسپا ہو رہے تھے یا انہوں نے محفوظ فاصلے پر پوزیشن لے لی تھی اور کمک کا انتظار کرنے لگے تھے۔ تاہم دو تین منٹ بعد میرے یہ دونوں اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ پولیس والوں کی سفاکی مجھ پر پوری طرح عیاں ہوئی اور میرے تن بدن میں انگارے دہک گئے۔ ان بدبختوں نے دروازے کے قریب اور دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سی پرال پھینکنے کے بعد آگ لگا دی تھی۔ آگ کو بھڑکانے کے لیے غالباً مٹی کا تیل بھی استعمال کیا گیا تھا۔ آناً فاناً پورا کمرا آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہرا سیاہ دھواں کمرے میں بھرنا شروع ہوا اور ہم تینوں بے طرح کھانسنے لگے۔ پھیپھڑوں میں موت بھر جائے تو انسان بے اختیار زندگی بخش ہوا کی طرف بھاگتا ہے۔ اس اضطراری عمل کے تحت ماسی عائشاں بھی کھانستی کھانستی کھڑکی کی طرف گئی۔ دھماکے سے سیون ایم ایم کا فائر ہوا اور گولی ماسی عائشاں کے سینے میں لگی۔ وہ دھپ سے فرش پر گری اور تڑپنے لگی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے لیے ممکن نہ رہا کہ کسی بھی احتیاط کو ملحوظ رکھوں۔ میں نے کھڑکی کے سامنے آ کر اس کانسٹیبل پر فائر کیا جس کی گولی نے ماسی عائشاں کو زمین بوس کیا تھا۔ بارہ بور دو نالی کے مہلک چھرے عین نشانے پر لگے۔ کانسٹیبل اوندھے منہ زمین پر گرا اور آگ کی روشنی میں پھڑکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے دوسرا فائر کرنا چاہا لیکن ٹریگر نے دبنے سے انکار کر دیا۔ مجھ پر خوفناک انکشاف ہوا کہ یہ "کلاشن ہو گئی" رائفل جام ہو گئی ہے۔ انڈین پولیس کے ساتھ اس گھمسان کے رن میں یہ رائفل میرا واحد سہارا تھی اور یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میں نے چند لمحے کی کوشش کرنے کے بعد رائفل کو فرش پر پٹخا اور اس پسٹل کی تلاش میں تاریک فرش پر ہاتھ مارنے لگا جو ابھی ابھی ماسی عائشاں کے ہاتھ سے گرا تھا۔ پسٹل کہیں نہیں مل رہا تھا اور سیاہ دھوئیں کے سبب میرا دم گھٹتا چلا جا رہا تھا "کیا سب کچھ ختم ہونے والا ہے؟" میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا "کیا میری موت انڈین پولیس کے ہاتھوں اسی جگہ ہونی تھی...... کیا کل کے اخباروں میں اس پولیس مقابلے کی خبر چھپنے والی ہے جس میں اُستاد جہانی موقع پر ہلاک ہوا۔"

ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں سیکڑوں خیالات میرے ذہن میں لپک گئے۔ یکایک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا (اس کی کنڈی فائرنگ سے ٹوٹ چکی تھی) کوئی شخص جھک کر تیزی سے اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی اس نے سیدھی میرے چہرے پر ڈالی۔ چند لمحے روشنی میرے چہرے پر ساکت رہی۔ پھر آنے والا آگے بڑھا۔ میں اس پر جھپٹنے اور اس کی گردن کو خشک لکڑی کی طرح توڑنے کے لیے پوری طرح تیار تھا...... لیکن پھر جو آواز میرے کانوں میں پڑی اس نے مجھے پتھر کا بت بنا دیا۔ مجھے لگا جیسے میرے جسم کی ایک ایک رگ سے توانائی سمٹ کر میری سماعت میں آ گئی ہے اور میں اس آواز کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو ابھی میرے کانوں نے سنی ہے۔ یہ وہ آواز تھی جو میں نے خوابوں میں سنی تھی جس کے لیے میں پل پل تڑپا تھا اور جس کی یادوں نے مجھے ہر لمحہ انگاروں پر لوٹایا تھا۔ یہ آواز میرے جانِ جگر، میرے بچھڑے یار صفدر کی تھی۔ وہ آ گیا تھا...... ہاں وہ آ گیا تھا۔ وہ سچا یار تھا اور سچے یار ایسے ہی موقعوں پر آیا کرتے ہیں۔ ان کے ملن کے لیے ایسے ہی کٹھن اور دشوار لمحات مخصوص ہوتے ہیں۔ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ وہ تیز سرسراتی ہوئی سرگوشی میں بولا تھا۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر پکارا تھا اور کہا تھا کہ میں اس کا ہاتھ تھام لوں۔

میرا ہاتھ بے اختیار صفدر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی مضبوطی سے میرا ہاتھ تھاما۔ ایک سچی کھری دوستی کی تمام تر حرارت اور گرمجوشی اس ہاتھ میں موجود تھی۔ ان جان لیوا لمحات میں وہ ہاتھ مجھے زندگی کا ہاتھ لگا۔ اس ہاتھ نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور پھر لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میری آنکھوں اور میرے سینے میں کڑوا سیاہ دھواں بھر رہا تھا۔ نہ کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ سجھائی دے رہا تھا۔ میرا ذہن جیسے کسی تاریک دلدل میں دھنسا جا رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ صفدر مجھے لے کر دروازے میں سے گزرا تھا اور ایک تنگ راہداری میں گھس گیا تھا۔ جس روم ہم دروازے میں سے گزرے تھے ہمارے آس پاس چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ یہ اس فائرنگ کی چنگاریاں تھیں جو پولیس والے ہم پر کر رہے تھے۔ راہداری دس پندرہ گز طویل ہو گی۔ ہم لکڑی کے ایک دروازے تک پہنچے اور پھر اچانک میں نے خود کو درختوں کے جھنڈ میں پایا۔ مکان سے نکاسی کا یہ راستہ پہلی بار میرے علم میں آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ صفدر پہلے بھی یہاں آ چکا ہے اور اس چار دیواری کے گرد و پیش سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ مجھے مسلسل آگے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہم پولیس کے حصار سے نکل آئے ہیں۔ وہ جیپ جس کی روشنیاں کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر پڑ رہی تھیں ہماری دائیں جانب بیس پچیس قدم کی دوری پر رہ گئی تھیں۔ اس جیپ کی روشنی میں کمرے کی جلتی اکلوتی کھڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ میری نگاہوں میں نوابزادی شاہین، بخشو اور سائیں عالی کے چہرے گھومے۔ وہ اس مکان کے اندر تھے جو چاروں طرف سے دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ سائیں عالی کمرے میں تھا اور کسی نہ کسی طرح فرار ہونے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن نوابزادی شاہین اور عجیب الخلقت بخشو تہ خانے میں تھے۔ وہ تہ خانے کے اندر ہی جل بھن کر کباب ہو سکتے تھے۔ میں نے صفدر کا ہاتھ کھینچ کر اسے روک لیا۔

"ٹھہرو صفدر! کچھ لوگ ابھی اندر ہیں۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ مجھے دونوں کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

میرے قدم جیسے زمین سے پیوست ہو چکے تھے۔ نہ میں پیچھے جا سکتا تھا نہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ پھر جذبات پر عقل غالب آ گئی۔ صفدر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ واپس جانا خودکشی کے مترادف تھا۔ اگر اس خودکشی سے نوابزادی یا بخشو کی جان بچ جاتی تو شاید میں خودکشی بھی کر گزرتا لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہم واپس شعلوں کی طرف لپک کر موت کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہمارے بالکل قریب سے سیون ایم ایم کا فائر ہوا اور گولی سنسناتی ہوئی ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔

"بھاگ چلیے شاہ جہاں صاحب" صفدر نے اندھا دھند میرا بازو کھینچا۔

ہم دونوں رکوع کے بل جھک کر دوڑے اور تیزی سے باغ کے شمالی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جس نے چند لمحے پہلے ہم پر فائر کیا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ ایک شخص ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ ایک سے زیادہ ہوں۔ میرے ہاتھ خالی تھے (کوشش کے باوجود میں ماسی عائشاں کے ہاتھ سے گرا ہوا پسٹل نہیں ڈھونڈ سکا تھا) تاہم صفدر کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ

پینتالیس بور کا امریکن کولٹ پسٹل تھا۔ چند ہی لمحے بعد ہم ماسی عاشاں کے باغ سے باہر تھے۔ اب ہمارے دونوں اطراف کیکر اور شیشم کے درخت تھے۔ یہ درخت اتنے زیادہ تھے کہ جنگل بیلے کا گماں ہو رہا تھا۔ بارش ابھی کچھ ہی دیر پہلے رکی تھی۔ زمین پر پھسلن تھی اور جگہ جگہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ تاریکی میں ایسے راستے پر بھاگنا ایک دشوار اور خطرناک عمل تھا۔ بھاگتے بھاگتے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے تعاقب میں آنے والا صرف ایک شخص ہے۔ غالباً صفدر بھی میرے ہی انداز میں سوچ کر میرے والے نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اچھے دوستوں میں یہ بات عام پائی جاتی ہے۔ ان کے ذہن جیسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ایک دوسرے سے بندھے رہتے ہیں۔ اکثر یہ کرشمہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی موقع پر ایک ہی بات سوچ لیتے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے ہم دونوں ایک ساتھ ہی ایک تناور درخت کی اوٹ میں ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد ہمارا تعاقب کرنے والا آندھی کی رفتار سے ہمارے قریب پہنچا۔ وہ سفید شلوار قمیص میں تھا اور اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے جست لگا کر اسے جھاپ لیا۔ اس کے منہ سے "اوہ" کی آواز نکلی تھی اور وہ پشت کے بل کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے ایک گڑھے میں گرا۔ میرا ایک ہاتھ تو اس کی رائفل پر آیا اور دوسرے ہاتھ نے اس کی گردن جکڑ لی۔ اس سے پہلے کہ وہ اچانک جھٹکے سے سنبھل کر مزاحمت پیش کرتا میرے بازو کی مخصوص حرکت نے اس کی گردن کا زاویہ لے لیا اور وہ چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ صفدر نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ بے ہوش شخص کی سیون ایم ایم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گرتی صفدر نے اسے قبضے میں لے لیا تھا۔ صفدر شلوار قمیص میں تھا۔ اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس نے ٹارچ نکالی اور روشنی بے ہوش شخص کے چہرے پر ڈالی۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ سادہ لباس میں انڈین پولیس کا اہلکار ہے۔ شکل و صورت سے وہ اے ایس آئی یا سب انسپکٹر قسم کی کوئی شے لگتا تھا۔ اس نے بڑی دلیری سے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ فطری طور پر جی دار ہو تاہم اس کی جی داری کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ اس نے اپنی سفید قمیص کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔

میں نے پولیس اہلکار کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی قمیص سامنے کی طرف سے پھاڑ دی۔ صفدر نے اسے اوندھا کیا اور پشت پر موجود بلٹ پروف جیکٹ کے تسمے کھول دیے۔ یہ جیکٹ بڑے کام کی شے تھی اور اسے پولیس اہلکار کے پاس چھوڑنا بڑی ناعقلمندی بلکہ بے وقوفی تھی۔ ہم نے یہ بے وقوفی نہیں کی۔ جیکٹ کے علاوہ ہم نے سیون ایم ایم اور اس کے فالتو راؤنڈ قبضے میں لیے اور اہلکار کا بے ہوش جسم کھینچ کر جھاڑیوں میں دکھ دیا۔

صفدر نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کھینچتا ہوا ایک جانب بڑھنے لگا۔ عقب میں آگ کی روشنی ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھار فائر بھی ہو رہا تھا۔ میرا دل غم سے لبریز تھا۔ خوف تھا کہ نوابزادی شاہین، بخشو اور سائیں عالی شعلوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ پولیس اہلکاروں نے مکان کو آگ صرف اس لیے لگائی ہو کہ ہم ڈر کر باہر نکل آئیں اور وہ ہمیں گرفتار کر سکیں لیکن آگ اتنی تیزی سے بھڑکی تھی کہ لمحوں میں نکاسی کے راستے بند ہو گئے تھے۔ ماسی عاشاں میرے سامنے سینے پر گولی کھا کر گری تھی اور توقع نہیں تھی کہ وہ قاتل شعلوں سے بچ پائی ہو گی۔ ہاں سائیں عالی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جس وقت آگ بھڑکی وہ کھڑکی سے نزدیک تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کھڑکی پار کر گیا ہو۔ ویسے بھی وہ ایک عجوبہ تھا۔ اس کے بارے میں ہر قسم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ سب سے اہم اور نازک سوال نوابزادی شاہین اور بخشو کے حوالے سے تھا۔ وہ تہ خانے میں تھے۔ تہ خانے کا دروازہ لوہے کا تھا۔ تہ خانے اور کمرے میں آمد و رفت کا واحد ذریعہ یہی دروازہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ دروازہ آگ کی یلغار کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اگر آگ تہ خانے تک نہ پہنچی اور وہاں دھواں بھی نہ بھرتا تو وہ دونوں بچ سکتے تھے۔

موقع سے تقریباً ایک فرلانگ دور آ کر ہم گنجان درختوں میں رک گئے۔ ایک پولیس جیپ باغ کی طرف سے آئی تھی اور نیم پختہ راستے پر تیزی سے اچھلتی کودتی بنگر گاں کی طرف نکل گئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس میں کسی زخمی یا زخمیوں کو لے جایا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ ٹھیک نکلا۔ جیپ میں ایک شدید زخمی پولیس اہلکار کے علاوہ ماسی عاشاں بھی تھی جسے جھلسی ہوئی حالت میں آگ سے نکالا گیا تھا۔ (اس بات کا علم ہمیں دو روز بعد ہوا)

نیم پختہ راستے کے کنارے گنجان درختوں اور سرکنڈوں کی بھرمار تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم وقتی طور پر پولیس اہلکاروں کی نگاہ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ "فرصت" کے ان لمحات میں، میں نے پہلی بار دھیان سے صفدر کی طرف دیکھا۔ وہ میرا گبھرو یار، میرا شیر، میرا جگر...... جہانی چوڑی کیے کندھے سے کندھا ملائے میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون سیروں بڑھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے ایک ذبح شدہ حصے میں پھر سے جان پڑ گئی ہے اور میں پورا ہو گیا ہوں۔ میرے رگ و پے سے مسرت و شادمانی کی لہریں اٹھیں اور آنکھوں میں آنسو بن کر چمک گئیں۔ دوسری طرف صفدر کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ ہم کچھ دیر بالکل ساکت کھڑے رہے۔ بے حس و حرکت اور خاموش۔ لیکن یہ سکون بڑا یا طوفانوں پر بھاری تھا اور یہ خاموشی کروڑہا الفاظ پر فوقیت رکھتی تھی۔ میرا جی چاہا میں اپنے یار کو پہروں اسی طرح بازوؤں میں سمیٹے کھڑا رہوں لیکن حالات نے ہمیں جو مہلت دی تھی وہ بہت مختصر تھی۔ میں نے صفدر کا رخسار چوما، اس

نے میرا شانہ تھپکا اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

صفدر سے جدا ہوتے ہی میرا دھیان ایک بار پھر اس آتشی سرخی کی طرف چلا گیا جو ماسی عاشاں کے باغ کی طرف بلند ہو رہی تھی۔ یہ بے رحم آگ کی سرخی تھی۔ میں اس میں نوابزادی شاہین، سائیں عالی اور بخشو کو گھرا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے کہا "صفدر! بہت برا ہوا ہے۔ ایک لڑکی سمیت میرے تین ساتھی مکان کے اندر ہی رہ گئے ہیں۔"

صفدر نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھیں شاہ جہاں صاحب! جیسے قدرت نے آپ کو بچایا ہے ان کو بھی بچا سکتی ہے..... میں نے...... خود اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے وہ آپ ہی کا ساتھی تھا۔ لمبا سا چوغہ پہن رکھا تھا اس نے۔"

میرے سینے سے اطمینان کی سانس نکلی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم سائیں عالی تو بچ نکلا ہے۔ میں نے صفدر سے ایک دو سوال پوچھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ کھڑکی سے کود کر بھاگنے والا سائیں عالی ہی تھا۔

صفدر نے پولیس اہلکار سے چھینی ہوئی رائفل چیک کی۔ اس کے میگزین میں ڈیڑھ درجن کے قریب گولیاں موجود تھیں۔ ایک مکمل بھرا ہوا میگزین صفدر نے جیب میں ڈال رکھا تھا..... صفدر یہ رائفل مجھے دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے کولٹ پسٹل لے لیا۔ ایک دوسرے کا ساتھ پا کر ہمارے سینے جوش اور ولولے سے بھر گئے تھے اور ہم ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے تھے۔

صفدر نے مجھ سے پوچھا کہ میرے ساتھ اور کون کون تھا۔ میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسے آگاہ کیا۔ صفدر بولا "خدا کرے وہ لوگ بچ جائیں۔ اگر وہ بچ جاتے ہیں تو پولیس والے انہیں فوراً یہاں سے ہٹا کر کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کی کوشش کریں گے اور فی الوقت وہ محفوظ مقام شاہ پور کا تھانہ ہی ہو سکتا تھا۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر صفدر کے خیال کی تائید کی۔ وہ پرسوچ انداز میں بولا "پولیس والے دو گاڑیوں پر آئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کے ساتھیوں کو دوسری گاڑی میں یہاں سے لے جایا جائے گا۔"

"بشرطیکہ وہ بچ گئے" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"انشاء اللہ وہ بچ جائیں گے" صفدر نے مجھے تسلی دی۔ پھر اس کی نگاہیں درختوں میں سے گزر کر نیم پختہ راستے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ بہت تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ سیون ایم ایم کے ٹیکیلے دستے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ بالکل کسی سپاہی کی طرح کھڑا تھا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! اگر ہم کسی طرح پولیس کی گاڑی کو ان درختوں میں روک سکیں تو بڑے فائدے میں رہیں گے۔"

"لیکن روکیں گے کس طرح؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔"

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے" میں نے کہا "آؤ میرے ساتھ، ہم ایک کام کرتے ہیں۔"

صفدر کوئی بھی سوال پوچھے بغیر میرے ساتھ چل دیا۔ ہم کیچڑ اور بارشی پانی کے گڑھوں سے بچتے بچاتے واپس اس مقام پر پہنچے جہاں میں نے پولیس اہلکار کی گردن مروڑی تھی۔ وہ کیکر کے خودرو درختوں میں بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے صفدر کے ساتھ مل کر اسے کندھے پر لادا اور دوبارہ نیم پختہ راستے کے کنارے پہنچ گیا۔ صفدر اب میرے ارادے سے آگاہ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف اتنا ہوا کہ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی عقابی چمک کچھ اور نمایاں ہو گئی اور وہ آنے والے لمحات کے لیے چاروں خانے چوکس ہو گیا۔

ماسی عاشاں کے ڈیرے پر بھڑکنے والی آگ اب بجھ چکی تھی۔ کسی طرح کی فائرنگ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم بغور اردگرد کے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ باغ کی طرف کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور پھر انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ بلاشبہ یہ پولیس جیپ تھی جو باغ کی طرف سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ میرے اور صفدر کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر ہم نے بے ہوش اہلکار کو اٹھایا اور راستے کے درمیان اوندھا ڈال دیا۔ اس کے بعد ہم قریبی درختوں میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ میں پولیس جیپ ہمارے سر پر پہنچ گئی۔ یہ جیپ دراصل ایک لوڈر تھی۔ اس لوڈر کے پچھلے حصے پر ترپال ڈال کر اور نشستیں لگا کر بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ نیم پختہ راستے پر تیزی سے ہچکولے کھاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ بے ہوش اہلکار کے پاس سے گزری اور روانی میں آگے نکل گئی لیکن پھر وہی ہوا جس کی ہمیں توقع تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگائے اور گاڑی کیچڑ میں پھسلتی ہوئی رک گئی۔ عقبی حصے سے دو اہلکار چھلانگیں لگا کر اترے اور بے ہوش اہلکار کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے فوراً اپنے ساتھی کو پہچان لیا۔ پہچانتے ساتھ ہی اس نے اپنے پیٹی بھائیوں کو آوازیں دیں۔ ان آوازوں کے جواب میں دو مزید اہلکار گاڑی سے اتر آئے۔ ان میں سے ایک اگلی نشست سے اترا تھا اور اپنے بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے وہ کوئی توپ قسم کا افسر لگتا تھا۔ جونہی یہ لوگ بے ہوش اہلکار کے گرد جمع ہوئے، صفدر اور میں نے تیزی سے حرکت کی اور پولیس گاڑی پر حملہ آور ہو گئے۔ پچھلے حصے میں اندرونی بتی روشن تھی۔ اس روشنی میں مجھے نوابزادی شاہین اور عجیب الخلقت بخشو کے خوفزدہ چہرے نظر آئے اور میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ نوابزادی شاہین کے پہلو میں بھاری بھرکم مونچھوں والا ایک ہندو کانسٹیبل رائفل تھامے بیٹھا تھا..... اور یہ واحد اہلکار تھا جو گاڑی

کے پچھلے حصے میں موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ شخص کوئی حرکت کرتا میرا بھرپور گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ وہ پہلو کے بل گرا۔ میں نے اپنی پنڈلی سے رام پوری خنجر نکالا اور دستے تک اس کے سینے میں گھسا دیا۔ کانسٹیبل کا منہ اور آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور حلق سے ایک دردناک کراہ کے سوا کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔

کانسٹیبل کا "انجام" دیکھ کر نوابزادی شاہین کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی تھی۔ دوسری طرف گاڑی کے اگلے حصے سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں آئی تھیں۔ پھر سیون ایم ایم کا ہلکا فائر ہوا اور میں نے ایک سایہ سا گاڑی سے لڑھکتے دیکھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گاڑی کا ڈرائیور ہے جو صفدر کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔ اگلے ہی لمحے گاڑی ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور لہراتی ہوئی نیم پختہ راستے پر آگے بڑھی "نیچے لیٹ جاؤ" میں نے بخشو کو پورے زور سے فرش کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

بخشو اوندھے منہ فرش پر گرا۔ اسے دیکھ کر نوابزادی شاہین بھی فرش پر گر گئی۔ ہمارا یوں گرنا ہمارے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا۔ آگے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور دو تین گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے ترپال پھاڑتی ہوئی گزر گئیں۔ یہ فائرنگ ان پولیس اہلکاروں نے کی تھی جو اپنے بے ہوش ساتھی کے گرد جمع تھے۔ ان کی یہ فائرنگ ہمیں کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی جس پر وہ ہمارا تعاقب کر سکتے۔ یقیناً وہ جھنجھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئے ہوں گے۔

صفدر نے چلا کر مجھ سے پوچھا "سب ٹھیک ہے شار جہاں صاحب؟"

"سب ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "ایک بکرا ذبح کر دیا ہے۔ وہ اندر ہی پڑا ہے۔"

"میں نے بھی ایک کر دیا ہے اور اسے باہر پھینک رہا ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

مونچھ بردار کانسٹیبل اب ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس کا خون گاڑی کے فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نظارے نے نوابزادی شاہین کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور وہ گاڑی کے ایک گوشے میں سمٹی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی کی اندرونی لائٹ آف کر دی۔ عجیب الخلقت بخشو گاڑی میں کبھی ایک طرف لڑھکتا تھا کبھی دوسری طرف۔ یوں لگتا تھا کہ وہ زندگی میں ایک آدھ بار ہی گاڑی میں بیٹھ سکا ہے۔ اس کے لیے چلتی گاڑی میں اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے نشست پر بٹھا دیا۔ گاڑی کی چھت پر آہنی کنڈے موجود تھے۔ میں چاہتا تھا کہ بخشو کسی کنڈے کو مضبوطی سے تھام لے لیکن جب میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کنڈے کی طرف لے جانا چاہا تو پتا چلا کہ اس کے "تینوں ہاتھ" بڑی مضبوطی سے تین ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان ہاتھوں کو اسی ہتھکڑی لگائی گئی تھی اور پھر ایک ہی زنجیر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ چلتی گاڑی میں بخشو کے ادھر ادھر لڑھکنے کی ایک وجہ یہ ہتھکڑیاں بھی تھیں۔

صفدر بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ اس کی ڈرائیونگ کا انداز بتا رہا تھا کہ منزل کا تصور اس کے ذہن میں واضح ہے۔ ڈیڑھ دو میل تک نیم پختہ راستے پر چلنے کے بعد اس نے گاڑی کچے میں اتار دی۔ اس راستے پر کیچڑ کی بھرمار تھی اور گاڑی لہراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب صبح کے چار بج چکے تھے۔ طوفان باد و باراں کے بعد موسم میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ کہیں کہیں بدلیوں کی اوٹ سے تارے بھی جھانک رہے تھے۔ میں نے نوابزادی شاہین سے پوچھا کہ وہ اور بخشو پولیس کے ہتھے کیسے چڑھے۔ نوابزادی نے جو کچھ بتایا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کمرے کی آگ تہ خانے تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ آگ لگنے کے بعد تہ خانہ تنور کی طرح دہکنے لگا تھا۔ پندرہ بیس منٹ یہ کیفیت رہی پھر پولیس والے تہ خانے کا دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے اور دونوں کو پکڑ لیا ــــ نوابزادی سے میری گفتگو کے دوران میں ہمارا سفر جاری رہا تھا۔ صفدر نے جس ویران مقام پر گاڑی روکی وہاں ایک اور گاڑی بھی موجود تھی۔ یہ ایک نیلی ہل مین کار تھی اور اس پر حیدرآباد کا نمبر تھا۔ کار راستے سے اتر کر ایک کھیت میں گھس گئی تھی اور اگلا پہیا کسی گڑھے میں پھنسا ہوا تھا۔ گاڑی رکتے ہی صفدر اور میں نیچے اتر آئے۔ سب سے پہلے ہم نے ٹارچ کی روشنی میں اس پولیس کانسٹیبل کا معائنہ کیا جس کے سینے میں میرے خنجر نے جان لیوا گھاؤ لگایا تھا۔ کانسٹیبل کے ماتھے پر کھنچے ہوئے "قشقہ" سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ ہندو ہے اور مرا نہیں بلکہ سورگ باشی ہوا ہے۔ اس کی رائفل دیسی ساخت کی تھری ناٹ تھری تھی۔ ہم نے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ چرس سے بھرے ہوئے سگریٹ، کچھ رسیدیں اور ایک بٹوا ملا۔

میں نے نیلی ہل مین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صفدر سے پوچھا "یہ کس کی کار ہے؟"

"میری" اس نے حیران کن جواب دیا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں اسی پر یہاں پہنچا تھا۔ اس کیچڑ میں یہ پھنس گئی۔ مجبوراً مجھے چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔"

"کیا اب یہ نکل سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب ہم تین چار ہیں۔ کوشش کریں تو نکل بھی سکتی ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

بخشو کے ہاتھ تو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے اسے گاڑی میں ہی رہنے دیا تاہم نوابزادی شاہین میرے کہنے پر نیچے اتر آئی۔ صفدر دروازہ کھول کر کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ میں نے اور نوابزادی شاہین نے مل کر زور لگایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ عورت ذات سے زیادہ مشقت کرانا بھی مناسب نہیں تھا۔ صفدر ڈرائیونگ سیٹ سے اتر آیا اور اپنی جگہ نوابزادی شاہین کو بٹھا دیا۔ اسی دوران میں بخشو بھی رضاکارانہ طور پر پولیس کی گاڑی سے نکل آیا۔ بخشو کی دہشت ناک ساخت دیکھ کر صفدر نے کسی طرح کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی بخشو سے ملتا رہا ہے۔ نوابزادی شاہین کے حوالے سے بھی یہی بات کہی جا سکتی تھی۔ نوابزادی شاہین سے بھی صفدر کا رویہ وہی تھا جو جانے پہچانے لوگوں سے ہوتا ہے۔

بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بخشو نے کار نکالنے میں ہماری کافی مدد کی۔ اس نے اپنی پشت کار کے بمپر سے جوڑ کر زور لگایا۔ دوسری طرف صفدر اور میں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کار کا انجن بھی ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بری طرح پھنسی ہوئی کار ایک جھٹکے سے راستے پر آ گئی۔ ہم جتنی جلدی پولیس کی گاڑی چھوڑ دیتے ہمارے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ ہم نے بالکل تاخیر نہیں کی اور پہلی فرصت میں پولیس کی گاڑی سے ہل مین کار میں منتقل ہو گئے۔ میں صفدر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ نوابزادی اور بخشو نے پچھلی نشست سنبھال لی۔ صفدر مقامی راستوں کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ قریباً ایک میل کچے پر چلنے کے بعد وہ ایک تنگ سے پختہ راستے پر مڑ گیا۔ اینٹوں کی سولنگ والا یہ صاف ستھرا راستہ بل کھاتا گنے کے کھیتوں میں سے گزر رہا تھا۔ جس رفتار سے کار دوڑ رہی تھی اس سے کئی گنا رفتار سے ہمارے ذہن مصروف کار تھے۔ انڈین پولیس کے ساتھ ہمارا ٹاکرا زبردست رہا تھا اور اب اس ٹاکرے سے کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ ماہی ناشاں کے باغ سے لے کر یہاں تک کم از کم دو پولیس اہلکار میرے ہاتھوں ہلاک اور تین شدید زخمی ہوئے تھے۔ اگر اس ڈرائیور کو بھی سورگ باشیوں میں شامل کر لیا جاتا جسے صفدر نے گولی ماری تھی تو مرنے والوں کی تعداد تین ہو جاتی تھی۔ اس نقصان کے بعد یقینی بات تھی کہ پولیس کا حال وہی ہو گیا [illegible] کے بعد باؤلے کتے کا ہوتا ہے۔ نوابزادی شاہین ابھی تک ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہندو کانسٹیبل کے سینے میں خنجر اتارا تھا اور یہ ایسا منظر نہیں تھا جسے نوابزادی جیسی لڑکی جلدی بھلا سکتی۔ یہ درست ہے کہ اس منظر میں کسی حد تک سفاکی شامل ہو گئی تھی لیکن یہ سفاکی اس بے بسی سے بہت کم درجے کی تھی جو پولیس والوں نے ماہی ناشاں کے باغ میں دکھائی تھی۔ مٹی کا تیل چھڑک کر مکان کو آگ لگا دینا سنگدلی کی انتہا تھی۔

کار میں چھائی ہوئی بوجھل خاموشی کو توڑنے کے لیے صفدر نے نوابزادی شاہین کو مخاطب کیا "نوابزادی صاحب! آپ کو کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں" نوابزادی نے کہا "ہاں بخشو زخمی ہے۔ بازو کا ایک زخم تو کافی سیریس ہے۔ اس کی مرہم پٹی ہونی چاہیے۔"

بخشو عجیب و غریب آواز میں غوں غاں کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ نوابزادی شاہین نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "بخشو! ماہی ناشاں کے لیے پریشان ہے۔ کہہ رہا ہے میں ماں کے پاس جاؤں گا۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بخشو کی بدقسمتی کا احساس درد کی شدید تیز لہر بن کر میرے رگ و پے میں پھیل گیا۔ ماں کے سوا دنیا میں بخشو کا اور کوئی نہیں تھا اور اس کی ماں کو میں نے اپنے سامنے گولی کھا کر ڈھیر ہوتے دیکھا تھا۔ بہرحال بخشو کی تسلی کے لیے میں نے اور نوابزادی شاہین نے ایک دو باتیں کہیں۔ وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

پختہ سڑک پر پہنچتے ہی کار بڑی تیز رفتاری سے شاہ پور کی طرف بڑھنے لگی۔ صفدر نے مجھے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔

"تمہارا گھر؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "تمہارا گھر یہاں کیسے آ گیا؟"

"اپنے گھر سے میری مراد وہ ٹھکانا ہے جہاں میں رہ رہا ہوں۔ حیدرآباد کی نواز کالونی میں ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے جو نوابزادی صاحبہ کی مہربانی سے مجھے ملا ہے۔ اس وقت وہ کوارٹر ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو گا۔"

میں جانتا تھا کہ صفدر کے پاس بہت سے انکشافات ہیں لیکن ان انکشافات تک پہنچنے کے لیے مجھے تھوڑا سا صبر کرنا تھا۔ صفدر بھی جانتا تھا کہ ان انکشافات کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ایک خاموش معاہدے کے تحت ہم فی الحال اس بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔

جس وقت مشرقی افق سے صبح صادق طلوع ہوئی اور پرندوں نے نیم تاریک فضا میں اڑانیں بھرنی شروع کیں ہم حیدرآباد شہر کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں ایک دو جگہ پولیس نے معمول کے ناکے لگا رکھے تھے تاہم ہم ان ناکوں سے بچ بچا کر گزرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی نے ہمیں روکنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اگر کوئی روکتا بھی تو ہم جوابی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہمارے پاس لوڈڈ پستول اور رائفل تھی۔ تین پولیس والوں کو ہم عدم آباد روانہ کر چکے تھے۔ ایک دو کی اور "روانگی" ہو جاتی تو کون سی بڑی بات تھی۔

صبح کے چھ بجے تھے جب ہم ایک متوسط آبادی کے چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اس مکان کو "کوارٹر" تو بہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں گیراج موجود تھا اور دس بائیس گز کا صحن بھی تھا۔ ہم گیراج میں پہنچنے کے بعد گاڑی سے اترے اور صفدر کی رہنمائی میں ایک بیٹھک نما کمرے کے اندر پہنچ گئے۔

چولوں کی وجہ سے بخشو کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بائیں بازو کا زخم خاص طور سے بہت تکلیف دہ تھا۔ کچے راستے پر تیز رفتار سفر کے سبب یہ زخم کھل گیا تھا اور مسلسل خون اگل رہا تھا۔ بہرحال اتنی سویرے کسی قسم کی طبی امداد بھی نہیں مل سکتی تھی۔ یہ بھی آسان نہیں تھا کہ بخشو کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیا جاتا۔ اس ہیبت ناک شخص کے قریب آنا دل گردے کا کام تھا۔ ممکن تھا کہ ڈاکٹر اور نرسیں اسے دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتے اور الٹا ان کا علاج کرنا پڑ جاتا۔ صفدر نے عقلمندی کا کام کیا تھا اور میرے ہاتھوں جاں بحق ہونے والے کانسٹیبل کی جیب سے بخشو کی ہتھکڑی کی چابیاں نکال لی تھیں۔ ہم نے معمولی سی کوشش سے ہتھکڑیاں کھول لیں۔ نوابزادی شاہین نے بڑی محبت سے بخشو کا بازو تھاما اور اسے بہ آہستگی چلاتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ بخشو کہیں لیٹ کر آرام کر لے۔

میں اور صفدر بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ صفدر کو مطالعے کا شوق ہے۔ اس شوق کا اظہار ایک الماری میں بھری ہوئی کتابوں سے بھی ہوتا تھا۔ باقی ماندہ گھر کی طرح بیٹھک بھی صاف ستھری تھی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ شاید اس چھوٹی سی "کائنات" میں وہ دوزن کی وجہ سے رنگ ہے۔ مگر بعد میں یہ شک غلط نکلا۔ صفدر لنگوٹ اور ارادے کا پکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لاہور میں وہ لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ جو برسوں سے تمنا بن کر اس کے دل میں بسی ہے۔ میری مراد پری چہرہ انجم سے ہے۔ انجم اور صفدر کی لازوال محبت کا ہر ہر نقش میرے حافظے میں محفوظ تھا۔ مجھے وہ سنسنی خیز شام ابھی بھولی نہیں تھی جب انجم سراپا دلہن بن کر ہمیشہ کے لیے صفدر کی زندگی میں داخل ہونے والی تھی لیکن جب وصل کی منزل صرف چند قدم پر رہ گئی تھی اور صفدر کا نکاح انجم سے ہونے والا تھا۔ میرے ساتھ ایک ڈرامائی واقعہ پیش آگیا تھا اور میں غزالہ کا اسیر ہو کر مری جا پہنچا تھا۔

صفدر میرے سامنے بیٹھا تھا اور بغور میرے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ میں نے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے ہوئے صفدر سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرے۔ خود صفدر کے سینے میں بھی تلاطم پیدا ہو رہا تھا۔ وہ خود پر بیتنے والی ہر تکلیف اور ہر راحت میں مجھے شریک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی روداد ان لفظوں میں بیان کی۔

"شاہ جہاں صاحب! آپ یہاں تک تو جانتے ہی ہیں کہ ہم عشرت فارم میں تھے اور آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ فارم میں ڈاکو گھس آئے۔ یہ خانہ بدوش لوگ تھے اور انہوں نے اپنی کلہاڑیوں اور تیز دھار آلات پر زہر لگا رکھا تھا۔ انہوں نے آناً فاناً چوکیدار کما سنگھ کو قتل کر دیا اور رکھوالی کا کتا بھی مار ڈالا۔ مجھے اور فارم کے مالک کو انہوں نے کمرے میں بند کر دیا۔ فارم کے مالک کا نام شاید آپ بھول گئے ہوں۔ اس کا نام عشرت تھا۔ اس نے ٹرک اور ہماری حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا تھا لیکن ڈاکوؤں نے آناً فاناً سب کچھ تہ و بالا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ عشرت فارم میں ایک گونگی ملازمہ بھی موجود تھی۔ اس کا نام سکینہ عرف چھبو تھا۔ نشے میں بدمست ڈاکوؤں نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ جب انہوں نے چھبو سے دست درازی شروع کی تو اس بدنصیب کی چیخیں ہمارے کانوں تک پہنچتی رہیں لیکن ہم اس کی مدد سے قاصر رہے۔ ٹرک فارم کے احاطے میں برگد کے بڑے درخت تلے کھڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ فارم میں گھسنے والے ڈاکو اس ٹرک کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ صرف معمول کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ لیکن ڈاکوؤں کی یہ بے خبری زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ ڈاکوؤں کا سرغنہ آگاہ ہو گیا کہ ٹرک میں لدے ہوئے گنے کے نیچے زر و جواہر سے بھرے ہوئے صندوق موجود ہیں۔ شاید آپ کو بھی یاد ہو ڈاکوؤں کے سردار کا نام شیرا منگی تھا۔" میں نے صفدر کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ اپنی روداد جاری رکھتے ہوئے بولا "ٹرک کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے بعد شیرا منگی نیم پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مجھے، زخمی ولجیت سنگھ اور چوہدری عشرت کو ٹرک میں سوار کرایا اور فوراً فارم سے روانہ ہو گیا۔ ہمارے چاروں طرف مسلح افراد موجود تھے اور ہمیں کسی طرح کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں ان کے اندر چھپی ہوئی بے رحمی کے سائے ان کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا میں نے مسلح افراد کے خلاف کسی طرح کا رسک لینے کی کوشش نہیں کی۔ چوہدری عشرت بھی موقع کی نزاکت سمجھ لیتا تو اس کی جان نہ جاتی۔ وہ اس وقتی جوش میں آگیا جو اکثر دیہاتی چوہدریوں اور وڈیروں کا خاصہ ہوتا ہے۔ اس نے ایک ڈاکو سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ شیرے منگی نے زہر میں بجھی ہوئی کرپان اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ گنوں کے ڈھیر پر گرا اور میرے سامنے تڑپ تڑپ کر ختم ہو گیا۔ شیرا منگی اور اس کے ساتھی ٹرک سمیت ایک قریبی ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہ ڈیرا ان کے لیے ایک بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔ یہاں انہوں نے پورے دو روز آرام کیا اور جشن منایا۔ اس ڈیرے پر فرید کوٹ سے آئی ہوئی دو طوائفیں بھی موجود تھیں۔ طوائفوں کے سازندوں اور رکھوالوں کے ساتھ ڈاکوؤں کا جھگڑا ہو گیا۔ ڈاکوؤں نے انہیں مار پیٹ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور دو راتوں تک طوائفوں کو زبردستی نچاتے اور ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ رات کو طوائفوں کی چیخیں دور دور تک گونجتی تھیں لیکن وہ ڈیرا ایک ویران مقام پر تھا لہٰذا کوئی ان کی مدد کو پہنچنے والا نہیں تھا۔ شیرا منگی اور اس کے ساتھیوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ علاقے میں ٹرک اور چوہدری عشرت کی تلاش زور و شور سے جاری ہے اور وہ لوگ خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتے کہ ٹرک کو ڈیرے سے کسی اور جگہ منتقل

کریں۔ اسی دوران میں شیرے منگی کے ستارے گردش میں آگئے۔ جن سازندوں کو پکڑ کر بند کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک طبلہ نواز دیپک سنگھ کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ شیرے منگی اور اس کے ساتھیوں کو اس واقعے کا علم صبح کے وقت ہوا۔ دیپک سنگھ کو فرار ہوئے اس وقت چھ سات گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ شیرا منگی اور اس کے ساتھی کچھ سمجھتے یا کچھ کرتے۔ طوائفوں کے وارث اسلحے سے لیس ہو کر موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے پاس ایل ایم جی کے علاوہ تین چار جدید ترین رائفلیں بھی تھیں۔ دوسری طرف خانہ بدوش ڈاکو کلہاڑیوں اور تیر کمان وغیرہ سے مسلح تھے۔ ان کے پاس صرف ایک رائفل تھی۔ طوائفوں کے وارثوں میں فرید کوٹ کے بازار حسن کا ایک نامی گرامی بدمعاش بلھا بھی شامل تھا۔ بلھے نے بڑی ہوشیاری دکھائی۔ پہلے اس نے بات چیت کے لیے شیرے اور اس کے ساتھیوں کو ڈیرے سے باہر بلایا پھر ایک دم انہیں گولیوں سے بھون دیا۔ شیرا منگی اور اس کے تین ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ یہ اس جھگڑے کا انجام تھا جو "طوائفوں کے معاوضے" پر شروع ہوا تھا۔ صرف دو تین سو روپے کی خاطر وہ چاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جو ٹرک کی شکل میں کروڑوں روپے کے مالک بن چکے تھے۔ بلھے اور اس کے ساتھیوں نے مقتول خانہ بدوشوں کی خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں وہیں ایک گڑھا کھود کر دبا دیں جہاں دو روز پہلے خانہ بدوشوں نے چوہدری عشرت کی لاش دبائی تھی۔

اس خونی واقعے کے بعد ڈیرے پر بلھا اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ٹرک پر موجود بیش بہا سامان نے ان کی آنکھیں چندھیا دیں اور دوران رات اس دولت کو ٹھکانے لگانے کے منصوبے بنائے گئے۔ میں اور زخمی ولجیت بدستور کوٹھڑی کے اندر کڑی نگرانی میں رہے۔ ہم سے گاہے گاہے پوچھ گچھ بھی کی جاتی تھی۔ بلھا اور اس کے ساتھی جاننا چاہتے تھے کہ یہ دفینہ ہم نے کہاں سے اور کیسے حاصل کیا؟ وہ یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ ہم اس دفینے کو انڈیا کیوں لائے؟ وہ اس بات پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے کہ ہم پاکستان میں سفر کرتے کرتے اتفاقاً انڈیا کی سرحد پار کر آئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں ٹرک کے بیش قیمت ساز و سامان کا کوئی خریدار موجود ہے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ اس دفینے سے تعلق رکھنے والا مزید سامان بھی ہمارے علم میں ہے۔ بلھا ایک بے رحم اور سفاک شخص کا نام ہے۔ اس نے سخت گرمی میں ہمیں کئی کئی روز بھوکا پیاسا رکھا اور دو تین بار مار پیٹ بھی کی۔ زنجیروں میں بندھا ہونے کی وجہ سے ہم مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔

چند روز بعد بلھا کسی جگہ سے تین چار کاریگروں کو اغوا کر کے ڈیرے پر لے آیا۔ ان میں دو ترکھان ایک لوہار اور ایک رنگ ساز تھا۔ اگلے روز ایک ٹریکٹر ٹرالی پر دو ڈھائی من لوہا، تھوڑی سی لکڑی

کنارہ

مصنف
محمود احمد مودی

اور ویلڈنگ پلانٹ بھی ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ بلھا اور اس کے ساتھی ٹرک کا ڈیزائن اور رنگ وغیرہ تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی یہ کوشش ناقابل فہم نہیں تھی۔ اس ٹرک کو سڑک پر لانا ایسے ہی تھا جیسے چیتوں سے بھرے ہوئے جنگل میں اندھی ہرنی کو چھوڑ دیا جائے۔ پولیس اور جرائم پیشہ گروہ چپے چپے پر اس ٹرک کو تلاش کر رہے تھے۔ بلھا اور اس کے ساتھیوں نے اس ٹرک کو ایک نئے ٹرک کی صورت دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کام قریباً تین ہفتے جاری رہا۔ آپ کو یاد ہو گا پاکستان سے انڈیا میں داخل ہوتے وقت ولجیت کی ران پر ایک گہرا زخم آیا تھا۔ مناسب دیکھ بھال اور علاج نہ ہونے کی وجہ سے یہ زخم روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ اس زخم کی خرابی ہی کی وجہ سے وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہوا اور چار پانچ دن بعد بے ہوشی کی حالت میں دم توڑ گیا۔ رنجیت کی حسرت ناک موت میرے سینے میں شعلے برابر بھڑکا رہی تھی لیکن آہنی زنجیروں نے مجھے بے بس کر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔"

صفدر نے اپنے ٹخنوں سے شلوار اٹھا کر مجھے وہ سیاہی مائل نشان دکھائے جو زنجیروں کی رگڑ سے بنے تھے۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "میں رات دن زیر عمل اور آپ کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ ولجیت کی ناگہانی موت کے بعد بلھا کا رویہ مجھ سے نرم ہو گیا۔ وہ تشدد سے مجھے جھکانے میں ناکام رہے تھے۔ اب حکمت سے کام لے کر کچھ اگلوانا چاہتے تھے۔ مجھے اچھا کھلایا پلایا جانے لگا۔ ایک نو عمر طوائف میرے ساتھ کوٹھڑی میں بند کر دی گئی جو دن رات میرے جذبات بھڑکانے میں لگی رہتی تھی۔ مجھے کئی روز بعد معلوم ہوا کہ وہ بلھا بدمعاش کی قریبی رشتے دار تھی۔ ایک روز وہ دیسی شراب سے بھرا ہوا گھڑا کوٹھڑی میں اٹھا لائی اور مجھے پلانے کے جتن کرنے لگی لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس بدبخت نے ٹیپ ریکارڈر پر ایک انڈین گانا لگایا اور شراب سے بھرا ہوا گھڑا اپنے اوپر انڈیل لیا۔ موسم گرما کا باریک لباس اس کے بدن سے چپک گیا اور وہ گانے کے بولوں پر ڈانس کرنے لگی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خرمستیاں میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے تھپڑ مار کر اس حرافہ کو دور گرا دیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون رسنے لگا۔ اتنے میں بلھا دندناتا ہوا اندر آیا۔ اس کی آنکھیں خون اگل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ جبکہ میرے ہاتھ خالی تھے اور ایک پاؤں بھی زنجیر میں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب خیر نہیں۔۔۔۔ بلھا نے ٹرک کے حوالے سے وہی بے معنی سوال پوچھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے غصے کو "چار

چاند" لگ گئے اور وہ مجھے قتل کرنے کے لیے آمادہ نظر آنے لگا لیکن اس موقع پر قدرت نے میری مدد کی۔ ڈیرے سے باہر اسی ٹریکٹر ٹرالی کا شور سنائی دیا جو اکثر یہاں آتی جاتی تھی۔ بلٹا جلدی سے باہر نکل گیا اور اس واقعے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ لوگ ڈیرا چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس ٹرک کو ڈیرے کے کسی اندھیرے گوشے سے باہر نکالا گیا جسے ہم چند ماہ پہلے چنے پل والی حویلی سے لے کر نکلے تھے۔ ٹرک اب پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس کی باڈی' نمبر پلیٹ' رنگ روپ' سب کچھ بدل چکا تھا۔ کنوں کے بجائے اب اس پر خشک پیاز کی بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ بوریوں کے درمیان تھوڑا سا خلا بھی رکھا گیا تھا۔ مجھے باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسی خلا میں ڈال دیا گیا۔ ٹرک شام کے جھٹپٹے میں فرید کوٹ سے روانہ ہوا تھا۔ وہ بغیر رکے ساری رات چلتا رہا۔ اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ اسے ایک ویران مقام پر روکا گیا۔ یہاں ٹرک میں موجود افراد نے ہاتھ منہ دھو کر کھانا وغیرہ کھایا۔ میرے علاوہ یہ کل پانچ افراد تھے۔ بلٹا ان میں شامل نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم شمال سے جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔ یعنی ہمارا سفر جنوبی ہند کی طرف تھا۔ اس روز دوپہر کے بعد ٹرک پھر روانہ ہوا اور بغیر رکے رات پچھلے پہر تک چلتا رہا۔ یہ ایک بہت طویل اور صبر آزما سفر تھا۔ پیاز کی بو میری رگ رگ میں رچ بس گئی تھی۔ بوریوں کے درمیان مختصر خلا کے اندر ایک ہی آسن میں پڑے پڑے میرا بالائی دھڑ مفلوج سا ہو گیا تھا۔ اگلے روز شام پانچ بجے کے لگ بھگ ہم سکندر آباد شہر کے اندر سے گزرے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم حیدر آباد کے آس پاس پہنچ چکے ہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہمارا سفر مزید جاری رہا۔ اب شام کے سائے گہری تاریکی میں بدل چکے تھے۔ اسی اثنا میں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ اس گاڑی کا ہارن بار بار سنائی دیتا تھا۔ وہ ٹرک کو "اوورٹیک" کرنا چاہ رہی تھی لیکن ٹرک ڈرائیور اسے راستہ نہیں دے رہا تھا۔ تنگ سڑک پر یہ کشمکش چار پانچ میل تک جاری رہی۔ پھر ٹرک نے گاڑی کو "سائیڈ" دے ماری۔ اس واقعے کے فوراً بعد گاڑی سے ٹرک پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ خود کار رائفل کی فائرنگ تھی اور اس نے پورے ٹرک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ٹرک کچے میں اتر کر رک گیا۔ گاڑی بھی رک گئی تھی اور اب دونوں اطراف سے اندھا دھند گولی چل رہی تھی...... جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ واقعہ بالکل اتفاقاً پیش آیا تھا۔ جو گاڑی ٹرک کے پیچھے آ رہی تھی وہ ایک اوپل کار تھی۔ اس میں نواب شہریار جنگ کے کارندے سوار تھے اور سینما دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ترنگ میں ٹرک سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ ٹرک نے انہیں راستہ نہیں دیا۔ نواب کے کارندے بھی ضد میں آ گئے اور مسلسل کوشش کرنے لگے۔ ٹرک والوں کے دل میں چور تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ کار والے انہیں روکنا چاہ رہے ہیں۔ اسی کشمکش میں کار کو ٹکر لگ گئی اور نواب کے کارندوں نے ٹرک پر فائر کھول دیا۔ نواب کے کارندے پوری طرح مسلح تھے اور ویسے بھی یہ ان کا اپنا علاقہ تھا۔ انہوں نے ٹرک پر موجود افراد کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک کے سوا وہ سب کرائے کے ٹٹو ہی تھے۔ انہیں سخت مزاحمت کا مقابلہ کرنا پڑا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ نواب کے کارندے ٹرک کو تھانے میں جمع کرانے لے گئے۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ پیاز کی بوریوں کے نیچے کیا قیامت چھپی ہوئی ہے۔ تھانیدار نے کہا' یہ میرے علاقے کا کیس نہیں' اور ٹرک جمع کرنے سے معذرت کر لی۔ نواب کے کارندے ٹرک کو فاروق نگر' نواب کی حویلی میں لے گئے۔ یہاں ان پر انکشاف ہوا کہ پیاز کی بوریوں کے نیچے نہایت قیمتی سامان سے بھرے ہوئے صندوق ہیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ پیاز کی بوریاں اتاری گئیں تو میں بھی "برآمد" ہو گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں زنجیر میں جکڑے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار نواب شہریار جنگ اور نوابزادی شاہین کو دیکھا۔ نواب کے کارندوں نے مجھے ایک علیحدہ کمرے میں پہنچایا اور کئی گھنٹے پوچھ گچھ کی۔ میں نے وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے تیرا سنگھ اور بلٹا وغیرہ کو بتا چکا تھا۔ میں نے کہا' رفینہ اتفاقاً ہمارے ہاتھ لگا تھا اور ہم غلطی سے انڈیا میں گھس آئے تھے۔ میرے اس بیان پر نیم دلی سے یقین کیا گیا۔ نواب شہریار اور اس کے کارندے مجھ سے "میرے ساتھیوں" کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ اخباری خبروں کے ذریعے انہیں معلوم ہوا تھا کہ فرید کوٹ پہنچنے والے ٹرک میں تین افراد سوار تھے۔

اگلے روز مجھے ایک زمین دوز مقام پر پہنچا دیا گیا۔ یہ جگہ حویلی کے اندر ہی واقع تھی اور بالکل کسی جیل سے مشابہ تھی۔ یہاں باقاعدہ بیرکس بنی ہوئی تھیں اور کال کوٹھریاں تھیں۔ جیل ہی کی طرز پر یہاں باوردی پہرے دار گھومتے تھے۔ جیل کا انچارج ایک قلی قطب نامی شخص تھا (صفدر جس جیل کا ذکر کر رہا تھا میں اس کے واقعات اس روداد میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ پرائیویٹ جیل نواب شہریار کی ذاتی ملکیت تھی اور یہیں پر میری قلی قطب سے ملاقات ہوئی تھی) مجھے علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا اور عام قیدیوں کی نسبت مجھ سے بہتر سلوک ہوتا تھا۔ ڈیڑھ دو ہفتے جیل میں گزارنے کے بعد میں یہاں کے ماحول سے خاصا مانوس ہو گیا۔ جیل کا ایک محافظ اصغر علی میرا دوست بن گیا۔ میں نے اس سے کہا یہاں بے کار بیٹھ بیٹھ کر میں اکتا گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وقت گزاری کے لیے مجھے کچھ کتابیں مل جائیں۔ اصغر علی نے کہا کتابوں کا داخلہ یہاں ممنوع ہے بہرحال وہ میرے لیے کوشش کر کے دیکھ لیتا ہے۔ میں نے اسے کتابوں کی ایک چھوٹی سی لسٹ فراہم کر دی۔ حویلی میں ایک بڑا کتب خانہ موجود ہے۔ اصغر علی کوئی چکر چلا کر چلا گیا اور میرے لیے کتابیں لانے کے لیے کتب خانے میں پہنچ گیا۔ اتفاقاً یہاں اصغر علی کی مڈھ بھیڑ نوابزادی شاہین

ہو گئی۔ وہ بھی مطالعے کی شوقین ہے۔ نوابزادی شاہین نے اصغر علی کے ہاتھ میں انگریزی فکشن کی کتابیں دیکھیں تو حیران ہوئی۔ اس نے ان کتابوں کا جائزہ لیا۔ کل چار کتابیں تھیں اور چاروں مشہور مصنفہ اگاتھا کرسٹی کی تھیں۔

نوابزادی نے اصغر علی سے پوچھا کہ وہ یہ کتابیں کس کے لیے لے جا رہا ہے۔ اصغر علی پڑھا لکھا تھا لیکن اتنا بھی نہیں تھا کہ ان کتابوں کے "مطالعے" کا بہانہ بنا سکتا۔ اس نے پہلے تو ادھر ادھر کی ہانکی پھر تسلیم کر لیا کہ وہ یہ کتابیں جیل میں موجود ایک قیدی کے لیے لے جا رہا ہے۔ نوابزادی صاحبہ بھی اگاتھا کرسٹی اور ایلسٹر میکلین وغیرہ کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔ ان کے دل میں آئی کہ وہ اس شخص کو دیکھیں جو ان کا قیدی بھی ہے اور ہم ذوق بھی۔ نواب فیملی کا کوئی بھی فرد جیل کا رخ نہیں کرتا تھا لیکن نوابزادی کی بات اور تھی۔ وہ انگلینڈ پلٹ سیلانی لڑکی تھی۔ اوپر سے باپ کی لاڈلی بنی بھی تھی۔ جو اس کے دماغ میں سماتا تھا کر گزرتی تھی۔ جب اس کے دماغ میں آ گیا کہ مجھ سے ملے گی تو بس پھر دندناتی ہوئی جیل میں پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اصغر علی کے ساتھ ایک حسین و جمیل چنچل لڑکی بھی کھڑی ہے۔ اس سے پہلے میں نے نوابزادی شاہین کو صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ نوابزادی نے خود ہی اپنا تعارف کرایا اور پھر بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اصغر علی کے ہاتھ میں پکڑی کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ کیا یہ کتابیں میں نے منگوائی ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد جو ہم دونوں میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہیں آیا۔ دو تین گھنٹے میں ہم نے دنیا جہان کی باتیں کر لیں اور یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم گہرے دوست ہیں اور ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔

نوابزادی ایک بے تکلف اور کھلے دل و دماغ کی لڑکی ہے۔ اس کے ظاہر اور باطن میں بہت کم فرق ہے۔ جو بات اس کے ذہن میں ہوتی ہے وہ بلا روک ٹوک زبان پر آ جاتی ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد ہر تیسرے چوتھے روز نوابزادی مجھ سے ملنے میری کوٹھری میں آنے لگی۔ ہم دروازے کھڑکیاں کھول کر بیٹھے رہتے اور دنیا کے ہر موضوع پر بلا تکان باتیں کرتے۔ پہلے ہمارے درمیان بے تکلفی کا رشتہ قائم ہوا پھر یہ بے تکلفی دوستی میں ڈھل گئی۔ لیکن اس دوستی میں مرد عورت والے لگاؤ کا تعلق بالکل نہیں تھا۔ یہ ویسی ہی دوستی تھی جو دو مردوں یا دو عورتوں میں ہو سکتی ہے اور یہ بے لوث رشتہ اب تک قائم ہے۔

میری قید کے دوران میں ہی نواب شہریار مرحوم اور ان کے بیٹے نواب فیروز میں چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ اس چپقلش کی بنیاد وہی پچیس صندوق تھے جو میرے ساتھ ہی یہاں حیدر آباد پہنچے تھے۔ نوابزادی شاہین کی زبانی مجھے اس چپقلش کے اتار چڑھاؤ کی خبر ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک روز نوابزادی صاحبہ نے مجھے بتایا کہ ان کے والد نے رفینے کے صندوق حویلی سے کسی اور جگہ منتقل کر دیے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ نواب فیروز اس دولت کے لالچ میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے۔ میں نے نوابزادی صاحبہ کو کریدنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس مقام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جہاں صندوق منتقل کیے گئے تھے۔ انہی دنوں ان میں حویلی میں حالات مزید خراب ہو گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اپنی بہو کے قتل کے بعد نواب شہریار آناً فاناً بدل گئے ہیں۔ انہوں نے داڑھی رکھ لی ہے اور صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرنے لگے ہیں۔ اس کایا پلٹ کے ساتھ ہی اپنے بیٹے سے ان کے اختلافات مزید سنگین ہو گئے تھے۔ نواب صاحب چاہتے تھے کہ ٹرک سے برآمد ہونے والے صندوق حکومت ہندوستان کی تحویل میں دے دیے جائیں۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ نواب صاحب کو نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ حویلی سے مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ گھات میں بیٹھے کچھ لوگوں نے انہیں زخمی کیا اور زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ جس روز یہ واقعہ ہوا اسی روز نوابزادی شاہین نے ایک محافظ کی مدد سے مجھے جیل سے فرار کرا دیا۔ نوابزادی صاحبہ نے میرے نام ایک خط بھی ٹائپ کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا۔ حالات بہت سنگین ہیں۔ خدا کرے میرے اندیشے غلط ہوں لیکن یہ بات خارج از امکان نہیں کہ پاپا جانی کو حویلی ہی کے کسی فرد نے اغوا کیا ہو۔ اب بھائی فیروز ہر نیک و بد طریقے سے ان صندوقوں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا جو پاپا جانی نے حویلی سے کہیں اور بھجوا دیے ہیں۔ ان صندوقوں کا سراغ لگانے کے لیے مشکوک افراد پر تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تم سے بھی باز پرس کی جائے۔ ان لوگوں کی باز پرس کا طریقہ بڑا وحشیانہ اور جان لیوا ہو گا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اس تشدد کی چکی میں پیسے جاؤ۔ میں تمہیں جیل سے نکالنے کا انتظام کر رہی ہوں...... دل رفینہ بڑا کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرو۔

میں جیل سے کیسے چھوٹا اور کیسے نواز کالونی کے اس کوارٹر تک پہنچا یہ ایک لمبی کہانی ہے شاہ جہاں صاحب...... نواز کالونی کے اس کوارٹر میں پہنچنے سے پہلے مجھے دو تین ماہ تک ایک اور مکان میں محصور رہنا پڑا۔ اس مکان میں مجھے نوابزادی ہی کے حکم سے محصور رکھا گیا تھا۔ نوابزادی صاحبہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں اپنی من مانی کر کے باہر نکل آؤں اور نواب فیروز جنگ کے ہتھے چڑھ جاؤں۔ انہوں نے میری حفاظت کی ذمے داری تین مسلح افراد کے سپرد کی تھی۔ یہ تینوں ریٹائرڈ فوجی تھے اور بے حد سخت گیر۔ انہوں نے مجھے باقاعدہ ہتھکڑی لگا کر ایک کوٹھری میں بند کر رکھا تھا۔ اپنی طرف سے نوابزادی صاحبہ نے میری بہتری کی تھی لیکن یہ بہتری میری جان کو آ چکی تھی۔ میں اس قید تنہائی سے نکلنا چاہتا تھا لیکن نوابزادی صاحبہ کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔ مجھے بتایا جاتا تھا کہ وہ

واپس انگلینڈ جا چکی ہیں۔ ان کی نئی ہدایات کے بغیر میرے محافظ مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ میں مرنے کی حد تک مایوس ہو چکا تھا۔ مگر پھر چند ماہ پہلے میری رہائی کا پروانہ آگیا اور میرے محافظوں نے مجھے آزاد کر کے اس کوارٹر میں پہنچا دیا۔ اس کوارٹر میں فون لائن موجود ہے۔ نوابزادی صاحبہ نے ایک فون کال کے ذریعے مجھے بتایا کہ وہ انگلینڈ میں نہیں بلکہ یہیں حیدر آباد کے نواح میں موجود ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنا مکمل ایڈریس بھی فراہم کیا۔ یوں میں نوابزادی صاحبہ سے ملنے جا پہنچا۔ وہاں پر میری ملاقات عجیب الخلقت بخشو اور اس کی والدہ سے بھی ہوئی۔ مجھے ان تمام حالات سے آگاہی ہوئی جن میں نوابزادی شاہین یہاں پہنچی تھی اور رہ رہی تھی۔۔۔۔ حیدر آباد کے اس کچھ جزیرے سے ماسی عاشاں کے باغ تک کا سفر بہت طویل اور کٹھن تھا اور اس سفر کے دوران میں پکڑے جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ بہرحال میں پچھلے ڈیڑھ مہینے میں پانچ چھ دفعہ یہ سفر اختیار کر چکا ہوں۔ بخشو کی گمشدگی والا واقعہ میرے علم میں ہے۔ اسی دوران میں ایک بار فرید کوٹ بھی گیا ہوں اور آپ کا کھوج لگانے کی ناکام جدوجہد کی ہے۔ فرید کوٹ ہی سے میں نے بارڈر پار کر کے پاکستان جانے کی کوشش بھی کی۔ یہ کوشش بے حد سنگین ثابت ہوئی۔ میرے ساتھ دو افراد بھی تھے۔ بی ایس ایف والوں نے ہم پر فائرنگ کر دی۔ میرا ایک ساتھی زخمی ہو کر گر پڑا۔ ہم دو افراد بمشکل جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ اب میں نے ایک فرضی نام سے پاسپورٹ وغیرہ بنوایا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ کل یا پرسوں دبئی کے لیے کوشش کرنے دہلی جاؤں گا۔ اس دوران میں میں فلا اور ٹیلیفون کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا ہوں لیکن اس حوالے سے بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ میں آپ سب لوگوں کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ فرید کوٹ اور حیدر آباد میں گمشدہ ٹرک کے سلسلے میں بہت ہنگامہ آرائی ہوئی ہے اور درجنوں افراد مارے جا چکے ہیں۔۔۔۔"

اپنی روداد ختم کر کے منور خاموش ہو گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں سوالات کی بھرمار نظر آ رہی تھی۔ لیکن میرے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کہا "منور! رات تم میرے لیے سچ مچ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے۔ دھوئیں کی وجہ سے میرا دم گھٹ چکا تھا۔ شاید میں چکرا کر وہیں گر پڑتا۔ جب تم دروازہ توڑ کر اندر گھسے تو میں یہی سمجھا کہ سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہے۔ میں تم پر حملہ آور ہونے ہی والا تھا کہ تمہاری آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں اس کمرے میں ہوں۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا تو اس کی خوبصورت بتیسی چمک اٹھی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا "بات دراصل یہ ہے شاہ جہاں صاحب کہ میں نے آپ کو اسی وقت دیکھ لیا تھا جب آپ بخشو کو تانگے میں ڈال کر باغ میں لے آئے تھے۔ آپ کے ساتھ دو افراد بھی تھے۔ ایک تو وہی ملنگ نما شخص تھا جسے میں نے بعد میں کھڑکی سے کود کر فرار ہوتے دیکھا۔ دوسرا شاید کوچوان تھا۔۔۔ میں اس وقت پیدل باغ کی طرف آ رہا تھا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے میری گاڑی کھیت میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں طوفانی بارش میں قریباً ڈیڑھ میل پیدل چل کر باغ تک پہنچا تھا۔ ابھی میں باغ میں داخل نہیں ہوا تھا کہ میری نگاہ تانگے پر پڑ گئی۔ اس وقت میں آپ کو بالکل نہیں پہچان سکا لیکن جب آپ لوگ زخمی بخشو کو تانگے سے اتار رہے تھے میں نے آپ کو دیکھ لیا اور آپ کی آواز بھی پہچان لی۔ آپ کی وہاں موجودگی نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ میں آپ کو کئی ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس طوفانی رات میں ماسی عاشاں کے باغ میں آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں دوڑ کر آپ کے سامنے آ جانا چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لے لوں۔ مجھے کچھ پراسرار سا لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ آپ کے ساتھ کون لوگ ہیں اور گمشدہ بخشو آپ سب کے درمیان کیسے نظر آ رہا ہے۔ میں کافی دیر باغ کے اردگرد ٹہلتا رہا اور اپنا لائحہ عمل سوچتا رہا۔ اسی دوران میں میری نگاہ اس ملنگ نما شخص پر پڑی جس کا نام آپ سائیں عالی بتا رہے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے چلتا ہوا درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ مگر پھر پانچ دس منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس کی واپسی کے ساتھ ہی مجھے پولیس کی گاڑیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا آپ کو بھی معلوم ہے۔ جب پولیس والوں نے پراپرٹی میں 'آگ لگائی' میں مکان کے بیرونی دروازے سے صرف پچیس تیس گز کی دوری پر تھا۔ پولیس والے بہت غصے میں تھے اور آپ لوگوں کو غائبانہ گالیاں دے رہے تھے۔ ان کا غصہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ آپ کی فائرنگ سے ان کا ایک سب انسپکٹر ہلاک اور دو کانسٹیبل زخمی ہو چکے تھے۔ وہ اندر گھستے ہوئے بھی ڈرتے تھے کیونکہ اندر سے مسلسل فائر ہو رہا تھا۔ آگ لگنے کے بعد جب میں نے اندر سے ماسی عاشاں کی چیخیں سنیں اور پھر ایک دم خاموشی ہو گئی تو میں سمجھ گیا کہ آپ سخت مصیبت میں ہیں۔ میرے پاس بھرے ہوئے پسٹل کے علاوہ ٹارچ بھی موجود تھی۔ میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی اور تیزی سے اندر گھس گیا۔ اگر کسی پولیس والے نے مجھے دیکھا بھی ہو گا تو یہی سمجھا ہو گا کہ میں ان کا ساتھی ہوں اور کوئی تمغہ لینے کے چکر میں اندر گھس گیا ہوں۔ اندر گھستے ہی میں نے ٹارچ روشن کر لی تھی لہٰذا آپ فوراً میری نگاہ میں آ گئے۔"

منور خاموش ہوا تو میرے بولنے کی باری آ گئی۔ میری طرح منور بھی چاہتا تھا کہ میں اسے وہ تمام واقعات تفصیل سے سناؤں جو پچھلے چند ماہ میں پیش آئے تھے۔ میں خود بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک زخم، ایک ایک داغ اپنے یار کو دکھانا چاہتا تھا۔ دنیا میں کوئی ایک شخص تو ایسا ہونا چاہیے جس سے آدمی دل کی ہر بات کہہ سکے۔ عام سے عام بات بھی اور خاص سے خاص

بھی۔۔۔ اور منور میرے لیے ایسا ہی شخص تھا۔ لیکن میری کہانی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! آپ کی کہانی سننے کے لیے میں اتنا صبر کر گیا ہوں۔ تھوڑا اور سہی۔ پہلے میں آپ سب کو ناشتہ کراؤں گا۔ اس کے بعد گرم گرم چائے کا دور چلے گا اور چائے کی میز پر ہم اپنی گفتگو کا سلسلہ پھر جوڑیں گے۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کسی سگھڑ خانہ دار عورت کی طرح باورچی خانے میں گھس گیا۔ مغربی اسٹائل میں وہ یہاں اپنا سارا کام کاج خود ہی کرتا تھا۔ باورچی خانے میں کھانا پکانے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ ایک چھوٹا سا فریج بھی موجود تھا۔ منور نے فریج میں سے نصف درجن انڈے نکالے اور پیاز وغیرہ کاٹ کر بڑی پھرتی سے انڈوں کو پھینٹ لیا۔ فریج میں ہی گندھا ہوا آٹا بھی موجود تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے چولہے پر توا ڈالا اور ٹھا ٹھپ پراٹھے پکانے شروع کر دیے۔ میں نے اس کا ہاتھ بٹانا چاہا تو اس نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی۔ بڑی تیزی سے اس نے چار پانچ ساز پراٹھے اتار لیے پھر فرائی پان میں دیسی گھی ڈال کر آملیٹ بنانے لگا۔ اسے کام کرتے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ ایک جنگجو شخص ہے، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے اور خطرناک ترین ہتھیاروں کی حیثیت اس کے نزدیک کھلونوں سے زیادہ نہیں۔ مجھے اس کی اداؤں پر بے ساختہ پیار آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم ایک عرصے کے بعد ملے تھے اور اسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں دن رات ترسی تھیں۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہم دونوں نے ایک بڑی میز پر ناشتہ چن دیا۔ یہ پنجابی لوگوں کا خالص ناشتہ تھا۔ انڈوں کا آملیٹ، گرما گرم پراٹھے، لسوڑے کا اچار اور ساتھ میں دہی کی ٹھنڈی لسی سے لبالب بھرے ہوئے دو جگ۔

ان لوازمات کا بیشتر ہم ہی کو کھانا پڑا۔ بخشو اور نوابزادی شاہین نے ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا۔ وہ دونوں گم صم اور آزردہ تھے اور آزردگی کی وجہ ماسی عاشاں کا مرنا ہی تھا۔ اس سلسلے میں پریشان تو ہم بھی تھے لیکن ظاہر ہے 'جس' کا جتنا تعلق ہوتا ہے اتنی ہی پریشانی بھی ہوتی ہے۔ نوابزادی خاموش تھی۔ اس کے تصور میں شاید ابھی تک میرے ہاتھوں ہلاک ہونے والے ہیڈ کانسٹیبل کی لاش پھڑک رہی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے نو بج چکے تھے۔ نو بجے تک میڈیکل اسٹور کھل جاتے ہیں۔ منور بازار گیا اور بہت سی دوائیں اور بینڈیج وغیرہ لے آیا۔ ہم دونوں نے بڑی احتیاط سے بخشو کے زخموں کو صاف کیا۔ ایک دو زخموں پر میں نے اپنے ہاتھ سے ٹانکے لگائے۔ قوی ہیکل بخشو درد سے کراہ رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ابھی کسی زخمی درندے کی طرح بھڑک اٹھے گا۔ نوابزادی شاہین اسے مسلسل پچکار رہی تھی۔ زخموں کی بینڈیج کے بعد بخشو کو درد کش اور "اینٹی بایوٹک" ادویات کھلائی گئیں اور وہ فوراً ہی کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ نوابزادی شاہین بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ منور نے میرے اور اپنے لیے الائچی والی چائے تیار کی اور ہم گھر کی بیٹھک میں آ بیٹھے۔ منور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "سب سے پہلے تو یہ بتائیے جناب! کہ ہماری ہونے والی بھابی صاحبہ کا کیا حال ہے؟"

بھابی سے منور کی مراد غزالہ تھی۔ منور کا یہ سوال میرے دل پر تیر کی طرح لگا۔ جب منور بے پتا ہوا تھا میرے اور غزالہ کے درمیان کھینچا تانی جاری تھی۔ غزالہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں مری لے گئی تھی اور منور نے بمشکل مجھے تلاش کیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتا رہتا کہ میں غزالہ کی قدر کروں اور اس کے ساتھ بے رخی برتنا چھوڑ دوں۔ لیکن اب حالات کہاں سے کہاں ہو چکے تھے۔ غزالہ بیاہی جا چکی تھی اور اپنے شوہر سے زچگی کے بعد بڑی مصیبت میں تھی۔

"کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب!" منور نے میرے تاثرات دیکھ کر کہا "ڈاکٹر غزالہ خیریت سے تو ہیں نا!"

"ہاں خیریت سے ہے" میں نے جواب دیا "میں اپنی روداد سناتا ہوں۔ اس میں حسب موقع اس کا ذکر بھی آ جائے گا۔"

"جی کہیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔" منور نے کہا۔

میں نے اس لمحے سے کہانی شروع کی جب میں منور اور زرین گل کو ٹرک کے پاس گوردوارے کے کھنڈر میں چھوڑ کر بابو لیاقت کو تلاش کرنے نکلا تھا۔ میں فرید کوٹ شہر میں پہنچا تھا اور حالات کے شکنجے میں یوں پھنسا تھا کہ سات آٹھ دن واپس نہیں لوٹ سکا تھا۔ اور جب میں لوٹا تھا تو ٹرک وہاں موجود نہیں تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا تھا کہ ٹرک کو عشرت فارم پہنچایا گیا ہے۔ لیکن جب ہم مار دھاڑ کے بعد عشرت فارم (گنڈا راپور) پہنچے تو وہاں بھی ٹرک نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ہمیں صرف ایک ملازمہ لڑکی جھمو چارپائی سے بندھی ہوئی ملی تھی جس کی عزت کو کسی انسان نما کتے نے بری طرح بھنبھوڑا تھا اور اسے بے ہوش کر کے بھاگ گیا تھا۔۔۔ حالات کے تیز رو دھارے نے ہمیں عشرت فارم سے بہایا تھا تو راجستھان میں مہاراج رتن سنگھ کی اسٹیٹ میں لا پھینکا تھا۔ ماڈل اسٹیٹ میں شیخ عاصم بھی آموجود ہوا تھا اور میں مقامی فوجیوں کے ہاتھوں پھانسی پاتے پاتے بچا تھا۔ بعد ازاں میں ایک بار پھر پاکستان پہنچ گیا تھا۔ پاکستان میں مجنی کنور اور مسٹر تیا کلارک رفیو سے ملاقات کا تفصیلی احوال بھی میں نے منور کے سامنے بیان کیا۔ اس دوران میں اس واقعے کا ذکر بھی آیا جو میرے سینے پر ایک انمٹ اور ہر دم سلگنے والا داغ چھوڑ گیا تھا۔ میری مراد غزالہ کی شادی والے واقعے سے ہے۔ منور سکتے کے عالم میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ میں نے منور کو ان خونی کرداروں سے بھی آگاہ کیا جو پچھلے چند ماہ میں میرے روز و شب کو تہ و بالا کرتے رہے تھے۔ شیطان ابن شیطان شنکر شکرا، ٹونی کی چھمی سرن، اوچوں کا ڈاری

عیسیٰ جان' بارود کا بار لشکر خان اور مجوبہ روزگار سائیں مالی اس فہرست میں شامل تھے۔ اس کے بعد میں نے صفدر کو اپنی زندگی کے اہم ترین راز سے آگاہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنے ایک پرانے دشمن شیخ عاصم سے میری ملاقات بڑی سنگین ثابت ہوئی ہے۔ اس شخص نے میرے سینے میں ایک مسک ڈوائس دکھ چھوڑا ہے۔ میں نے اس ڈوائس کی موشگافیاں بیان کیں تو صفدر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ میری زندگی اور موت کے درمیان ایک ریموٹ کنٹرول کا ہلکا سا اشارہ حائل ہے۔ اس ڈوائس کے حوالے سے ان سنسنی خیز واقعات کا ذکر بھی آیا جو میرے اور غزالہ کے ساتھ سری لنکا میں پیش آئے تھے۔ سری لنکا میں شکاریوں کی غیر قانونی سرگرمیوں سے بات شروع ہو کر تاکورے اور کراس کنٹری ریس تک پہنچی اور پھر اختتام پذیر ہو گئی۔

میں نے اپنی یہ کہانی قریباً تین گھنٹے میں مکمل کی تھی۔ اس کے بعد قریباً ایک گھنٹا مجھے صفدر کے مختلف سوالات کے جواب دینے پڑے۔ اس لرزہ خیز روداد میں کھو کر صفدر دوپہر کا کھانا تیار کرنا بھی بھول گیا تھا۔ قریباً دو بجے وہ بازار گیا اور کسی مسلم ہوٹل سے پکا پکایا کھانا لے آیا۔ اس کھانے میں چھوٹے گوشت کا قورمہ' ماش کی دال اور تنوری روٹیاں تھیں۔ میری کہانی اس کی کہانی سے کہیں زیادہ اثر انگیز تھی۔ اس کہانی میں تین واقعات نے صفدر کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ پہلا واقعہ غزالہ کی شادی کا تھا۔ دوسرا واقعہ لشکر شکرا سے ٹکراؤ کا اور تیسرا واقعہ میرے سینے میں الیکٹرانک ڈوائس کی "نصب" تھا۔ خاص طور پر غزالہ کی شادی والے واقعے نے صفدر کو بے حد غمزدہ کیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں مجھ سے درجنوں سوال پوچھ چکا تھا۔

میں خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ صفدر کو مطمئن اور خوش و خرم نظر آؤں۔ میں نے صفدر کو یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ میں غزالہ کی جدائی کا صدمہ سہیل چکا ہوں اور اب نئے سرے سے زندگی میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ صفدر پر میری اس کوشش کا کیا اثر ہوا' میں نہیں جانتا۔ تاہم اگلے روز دوپہر تک اس کی سوگواری اور افسردگی کسی حد تک کم ضرور ہوئی۔ میں اور صفدر برآمدے میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے جو ابھی ابھی ہمیں ملا تھا۔ اس اخبار میں کل رات ہونے والے ہنگامے کی خبر شہ سرخیوں میں موجود تھی۔ مختلف خبروں کا خلاصہ یہ تھا کہ کل رات پولیس نے جگر گاں کے نواح سے ایک مشتبہ تانگا بان کو گرفتار کیا۔ اس تانگا بان نے تفتیش کے بعد یہ انکشاف کیا کہ جگر گاں کے نواح میں تین افراد کو قتل اور کئی افراد کو زخمی کرنے والا عجب الخلقت قاتل بڑی نہر کے کنارے ایک باغ میں رہائش رکھتا ہے۔ علاقہ ایس ایچ او نے پولیس کی جمعیت کے ساتھ مذکورہ باغ پر دھاوا بولا۔ وہاں چھپے ہوئے ملزمان نے پولیس پر اندھا دھند فائرنگ کردی۔ دو طرفہ فائرنگ میں ایک ملزم اور ایک فرض شناس سب انسپکٹر ہلاک ہو گئے۔ چند افراد زخمی ہوئے جن میں قاتل بخشو کی والدہ ماسی عاقشاں بھی شامل تھی۔ عجب الخلقت قاتل بھی اس پناہ گاہ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک خوبرو لڑکی بھی تھی۔ جس کی ابھی شناخت نہیں ہو سکی۔ ملزم بخشو کی والدہ کو زخمی پولیس اہلکاروں کے ہمراہ اسپتال روانہ کروا دیا گیا۔ بعد ازاں پولیس کی دوسری گاڑی بخشو اور خوبرو لڑکی کو لے کر شاہ پور تھانے روانہ ہوئی۔ لیکن راستے ہی میں آنولہ کے قریب مسلح افراد نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا اور شدید فائرنگ کے بعد دونوں ملزمان کو چھڑا لیا۔ اس واقعے میں دو پولیس اہلکار ہیڈ کانسٹیبل مجید اور کانسٹیبل ہردی پرشاد ہلاک ہو گئے۔ ملزمان پولیس گاڑی بھی لے گئے' تاہم یہ گاڑی انہوں نے کچھ آگے جا کر چھوڑ دی اور فرار کے لیے ایک دوسری گاڑی استعمال کی۔ ملزمان کی تلاش میں پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

بڑی دھواں دھار خبر تھی۔ حسب عادت پولیس والوں نے اس واقعے کے حوالے سے بھی کئی جھوٹ بولے تھے۔ ان میں سب سے بڑا جھوٹ یہ تھا کہ بخشو اور اس کی ساتھی لڑکی کو پولیس پارٹی سے چھڑانے کے لیے آٹھ افراد نے حملہ کیا۔ یعنی مجھے اور صفدر کو چار چار افراد شمار کیا گیا تھا۔ شاید اسی کو ایک ایک کے چار نظر آنا کہتے ہیں۔ اس خبر میں ایک بڑے خاصے کی چیز بھی موجود تھی۔ اور اس چیز نے خبر کو بے حد سنسنی خیز بنا دیا تھا۔ یہ عجب الخلقت بخشو کی تصویر تھی۔ اس کے ہاتھوں میں آلنی ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ مسلح و حیرت زدہ پولیس اہلکاروں کے نرغے میں نظر آرہا تھا۔ تصویر رات کے اندھیرے میں فلیش گن کے ذریعے کھینچی گئی تھی اور زیادہ صاف نہیں تھی۔ بہرحال جتنی بھی نظر آتی تھی' حیران کن تھی۔

ابھی میں اور صفدر اس خبر کے مندرجات ہی پڑھ رہے تھے کہ اندرونی کمرے سے "ہوں ہوں" کی عجیب سی آواز بلند ہونے لگی۔ ہم چونک گئے' یہ بخشو کی آواز تھی۔ یوں لگا جیسے رو رہا ہے۔ نوابزادی شاہین اس کے پاس ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے سنبھال لے گی' لیکن بخشو کی آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ مانوس آواز میں چیخنے چلانے لگا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ یہ مکان گنجان آبادی میں تھا۔ کمرے کے اندر بند ہونے کے باوجود بخشو کی آواز پڑوسیوں کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ میں اور صفدر اخبار چھوڑ کر دوڑے ہوئے اندر گئے۔ بخشو فرش پر کسی بچے کی طرح پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ نوابزادی شاہین اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کا دوپٹا اتر گیا تھا۔ ریشمی بال بکھر گئے تھے اور رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

ہم تینوں نے مل کر بمشکل بخشو کو قابو کیا۔ نوابزادی شاہین نے بتایا کہ بخشو اپنی ماں کے لیے رو رہا ہے۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے دیکھا وہ خوفناک شخص بچ بچ بلک رہا تھا۔ کسی معصوم بچے کی

طرح آنسو اس کے کھردرے رخساروں پر لڑھکتے چلے آرہے تھے۔ ماں اور بیٹے کی یہ محبت انوکھی بھی تھی اور ناقابل فراموش بھی۔ ان لمحات میں کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ روتا بلکتا شخص تین افراد کا خون کر چکا ہے۔ ہمارے سمجھانے بجھانے اور پچکارنے سے بخشو چپ تو ہو گیا لیکن اس کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی رہی۔ وہ کئی دن کی جدائی کے بعد کل رات اپنی ماں سے ملا تھا' اور ماں اب پھر اس سے جدا ہو گئی تھی۔ میرا دل یہ سوچ کر لرز گیا کہ کہیں یہ جدائی دائمی نہ ہو۔

کچھ دیر بعد جب بخشو رو دھو کر سو گیا تو ہم تینوں نے مشورہ کیا۔ ماسی عاقشاں کا پتا لگانا ضروری تھا۔ اگر وہ زندہ بچ گئی تھی تو یقیناً کسی اسپتال میں تھی۔ اسپتال میں اس پر پولیس کا پہرا ہونا ضروری تھا۔ بہرحال اسپتال اور تھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اسپتال سے کسی شخص کو پولیس کی حراست سے نکالنا خاصا آسان ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ ہم بھی ماسی عاقشاں کے لیے کچھ کر سکتے اور اگر کچھ نہ کر سکتے تو کم از کم یہ پتا تو چل جاتا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اگلے روز صبح سویرے میں اور صفدر ماسی عاقشاں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہمیں اس بات کا ہرگز خطرہ نہیں تھا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ پرسوں رات جو کارروائی ہوئی تھی۔ اس میں ہمارے حلیے بالکل پوشیدہ رہے تھے۔ صرف دو پولیس اہلکاروں نے ہمیں دیکھا تھا اور دونوں ہی ہمارے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ ہم نے کوارٹر کے بیرونی دروازے کو باہر سے تالا لگایا اور نوابزادی شاہین کو ہدایت کی کہ وہ بخشو کے ساتھ اندرونی کمرے میں رہے اور کسی ٹیلیفون کال کا جواب نہ دے۔ صفدر نے نیلی ہل مین کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ بڑا اجلا اجلا موسم تھا۔ دھوپ کی تمازت گوارا تھی۔ صفدر نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کی الماری میں سے ایک سیاہ پتلون اور بادامی بوشرٹ نکال کر پہن لی تھی۔ رات کی پرسکون نیند کے بعد موڈ ہلکا پھلکا تھا۔ صفدر بھی تندرست بہتر نظر آرہا تھا۔ بہت عرصے بعد ہم دونوں اکٹھے ہوئے تھے۔ دل میں ایک عجیب امنگ ترنگ سی جاگ گئی تھی۔ ایک بار پھر کچھ کر گزرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ایک بار پھر رگ و پے میں ایک ہنگامہ طلب توانائی دوڑنے لگی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے' ایک اور ایک گیارہ۔ آج پھر بہت عرصے بعد میں خود کو "گیارہ" محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے مجھی کنور اور مشرقی کلاک ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں گمشدہ صندوق تلاش کرنے میں ان کی مدد کروں۔ لیکن میں اس کام کے لیے اپنے اندر کوئی تحریک ہی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کسی طرح کا جوش و خروش ہی نہیں تھا۔ اب صفدر کا ساتھ ملا تھا تو ایک بار پھر بڑے سے بڑا معرکہ مجھے اپنے سامنے ہیچ نظر آنے لگا تھا۔

صفدر کی نیلی ہل مین کار حیدرآباد کی بارونق سڑکوں پر دوڑتی

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ——— ایک نوجوان جس کے انداز زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

ہر جگہ دستیاب ہے

قیمت ۱۵۰/-

ڈاک خرچ ۲۰/-

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۲۲۷۲۱۴

رہی۔ گاڑی کے ڈیک پر گانا بج رہا تھا۔ آج پھر جینے کی تمنا ہے۔ آج پھر مرنے کا ارادہ ہے...... گانا حسب حال تھا۔ راستے میں ایک جگہ موٹی توند والے ہندو سیٹھ کی اسپالا کار سے ہماری کار کا بمپر ٹکرا گیا۔ ہندو سیٹھ اور اس کا نوجوان ملازم آگ بگولا ہونے لگے اور ہاتھ نچا نچا کر ہمیں بھی آگ بگولا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ کھجلی تو ہمارے ہاتھوں میں بھی بہت ہو رہی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے مارا ماری کرنے کا موقع ملے۔ لیکن یہ بے چارہ سیٹھ اور اس کا ملازم ہمارے معیار کے نہیں تھے۔ ایک ایک گھونسے کی مار بھی نہیں تھے۔ لہٰذا ہم نے ان کی بدکلامی کو مسکراتے ہوئے برداشت کیا اور گاڑی نکال کر آگے لے گئے۔

اس بات کا قوی امکان تھا کہ زخمی ماسی عائشاں کو حیدر آباد ہی کے اسپتال میں لایا گیا ہوگا۔ حیدر آباد شہر میں کم و بیش تین بڑے اسپتال موجود تھے۔ ان میں چند کو چھوڑ کر باقی سب سرکاری تھے۔ ہم نے صرف اہم اسپتالوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں تین چار اسپتال ایسے بھی تھے جن میں "برن یونٹ" موجود تھے۔ ماسی عائشاں چونکہ آگ میں جھلس گئی تھی لہٰذا امکان تھا کہ وہ کسی ایسے اسپتال میں پہنچائی گئی ہو جہاں "برن یونٹ" موجود ہو...... ہم نے ترتیب وار ایک ایک اسپتال میں جانا اور وہاں کی ایمرجنسی وارڈز میں جھانکنا شروع کیا۔ جس چوتھے اسپتال میں ہم گئے وہ پرائیویٹ تھا۔ یہاں بھی ایک جدید "برن یونٹ" موجود تھا۔ آئی سی یو کے علاوہ زنانہ اور مردانہ وارڈز موجود تھے۔ یہ دونوں وارڈز آمنے سامنے تھے۔ ہم زنانہ وارڈز میں جھانکنے کے بعد باہر نکل رہے تھے جب اتفاقاً میری نگاہ مردانہ وارڈز میں چلی گئی۔ میں حضرت گرو جی کے ایک چیلے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ نیم عریاں حالت میں بستر پر پڑا تھا۔ جسم کی بیشتر کھال جل چکی تھی۔ اسے گلوکوز وغیرہ لگا ہوا تھا۔ بستر کے گرد تین چار افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک موٹے مشٹنڈے چیلے کے ساتھ میری نگاہیں چار ہوئیں اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں صفدر کے ساتھ فوراً برآمدے کی طرف نکل گیا لیکن میری چھٹی حس خطرے کی بُو سونگھ چکی تھی۔ حضرت گرو کے چیلے نے مجھے پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب وہ نچلا نہیں بیٹھے گا۔ صورت حال نے یہ ایک غیر متوقع کروٹ لی تھی۔ ہم ماسی عائشاں کو ڈھونڈ رہے تھے اور واسطہ پڑ گیا تھا حضرت گرو کے چیلوں سے جو صرف دو روز پہلے میرے ہاتھوں سخت زک اٹھا چکے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا 'اسپتال کے "برن یونٹ" میں موجود چیلا میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ وہ اس ڈائنامائٹ کا شکار ہوا تھا جو میں نے جنات نما عمارت کی سیڑھیوں میں چلایا تھا۔ بہرحال اسپتال کے مین دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے صفدر کو بتا دیا کہ کچھ بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات ہو گئی ہے اور ہنگامہ آرائی کا خطرہ ہے۔ جونہی ہم اسپتال کے زمین دوز پارکنگ لاٹ میں پہنچے' ایک شخص تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔

میں نے دور ہی سے اس کے سیاہی مائل چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھ لیے۔ کاروں کی قطار میں سے گزر کر وہ تیر کی طرح میری طرف آیا اور گریبان پکڑ لیا "تم حضرت گرو جی کے قاتل ہو" وہ چیخ کر بولا اور وحشیانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔

اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو تھا۔ میں ذرا سی غفلت کرتا تو یہ چاقو دستے تک میرے پہلو میں گھسا دیتا۔ میں نے اس کا یہ وار کلائی پر روکا اور سر سے ٹکر مار کر اسے دور ہٹا دیا۔ وہ سیدھا صفدر کی بانہوں میں آیا۔ صفدر نے بازو مروڑ کر اس سے چاقو چھینا اور پلک جھپکنے میں اسے سر سے اوپر اٹھا لیا۔ یہ تکنیک اور طاقت کا خوبصورت مظاہرہ تھا۔ حملہ آور ایک لمحے کے لیے مجھے صفدر کے ہاتھوں پر جھولتا نظر آیا پھر ایک کار کی ونڈ اسکرین پر گرا اور اسے دھماکے سے توڑتا ہوا اندر نشستوں پر جا گرا۔ اسی دوران میں، میں ال مین کار کے دونوں اگلے دروازے کھول چکا تھا۔ صفدر نے بے حد پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ال مین کے پہیے چیخے، فرش پر چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی داخلی پھاٹک کی طرف بڑھی۔ یہی وقت تھا جب پارکنگ لاٹ میں ریوالور یا پسٹل کا فائر ہوا۔ پھر میں نے ایک ٹرک نما لوڈر کو حرکت میں آتے دیکھا۔ ایسے لوڈر عموماً پاکستان میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کا انتظام کرنے والی فرمیں شامیانوں اور کرسیوں وغیرہ کی نقل و حرکت کے لیے ایسے ہی چھوٹے ٹرک استعمال کرتی ہیں۔

جونہی ہم بیرونی دروازے سے نکلے لوڈر نے بھی ٹرن لیا اور چنگھاڑتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ ٹوکن لینے والا ہاتھ نچاتا رہ گیا اور دونوں گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر آ گئیں۔ یہ چھاؤنی کا شمالی علاقہ تھا۔ سڑکیں کشادہ اور ٹریفک کم تھا۔ لوڈر ڈرائیور جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم لوڈر کو یوں چلا رہا تھا جیسے وہ چھوٹی سی ریس کار ہو۔ لوڈر لہراتا اور دندناتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ صفدر نے بھی کار کا ایکسیلیٹر پورا دبا دیا تھا لیکن کار پرانی تھی۔ پچاس ساٹھ سے زیادہ اسپیڈ نہیں پکڑ سکتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ چند ہی سیکنڈ میں لوڈر ہمارے سر پر پہنچ جائے گا اور پھر کچلتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ میرے کانوں میں وہ نعرہ گونج رہا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے حملہ آور کی زبان سے سنا تھا۔ اس نے مجھے حضرت گرو کا قاتل قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ حضرت گرو جہانِ زندگانی میں "سُرخرو" ہو چکا ہے۔ دو دن پیشتر وہ اپنے عشرت کدے میں میرے ہاتھوں شدید زخمی ہوا تھا۔ میں نے اس کا سر متعدد بار پختہ فرش سے ٹکرایا تھا اور اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ بعد میں، میں جتنی دیر اس کمرے میں رہا تھا حضرت گرو کو ہوش نہیں آیا تھا۔ حضرت گرو کے چیلے جس جنونی انداز میں ہم پر حملہ آور ہو رہے تھے اس سے بھی یہی اشارہ ملتا تھا کہ حضرت گرو اپنے پاپوں کی گٹھری باندھ کر دارِ فانی سے کوچ کر چکا ہے۔

"صفدر نیچے ہو جاؤ" میں نے چیخ کر کہا اور خود بھی نشست اور ڈیش بورڈ کے درمیانی خلا میں گر گیا۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ لوڈر کی ایک کھڑکی سے ایک ماؤزر بردار ہاتھ باہر نکل رہا ہے۔ توقع کے عین مطابق چند لمحے بعد اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ دوسرا فائر کار کی پچھلی اسکرین میں لگا اور وہاں روشندان کھل گیا۔ شیشے کی کرچیاں اڑ کر میرے چہرے تک پہنچی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ لوڈر والے کار کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے 'جوش کی زیادتی انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔' اگر محاورے کی زبان میں بات کی جاتی تو لوڈر والے شیشے کے گھر میں بیٹھ کر ہمیں پتھر مار رہے تھے۔ وہ یہ فراموش کیے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس بھی اسلحہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہماری کار کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش کر سکتے تھے تو ہم بھی جوابی کوشش کر سکتے تھے۔ کار کا ٹائر برسٹ ہو بھی جاتا تو صفدر اسے سنبھال کر روک لیتا۔ مگر بھاری بھرکم لوڈر کا ٹائر برسٹ ہوتا تو اس کا سنبھلنا مشکل تھا۔ وہ حد رفتار سے چلا آ رہا تھا اور اونچی نیچی سڑک پر بُری طرح ہچکولے بھی کھا رہا تھا۔

جب ہم پر تین چار فائر ہو چکے تو میں نے بھی وہ سیون ایم ایم رائفل نکال لی جو کار کی نشست کے نیچے بالکل تیار حالت میں پڑی تھی۔ ٹرک نما لوڈر کسی بدمست درندے کی طرح چنگھاڑتا ہوا عین ہمارے سر پر پہنچ چکا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں بمشکل پندرہ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ صفدر غلطی سے بھی بریک لگاتا تو دونوں گاڑیوں میں خوفناک تصادم ہو جاتا۔ میں نے سیون ایم ایم سے پہلی گولی "وارننگ" کے طور پر چلائی۔ حضرت گرو کے ان خیر خواہوں سے کھلی جنگ کے بارے میں نہیں چاہتا تھا کہ لوڈر کسی سنگین حادثے کا شکار ہو۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ لوگ فرطِ غضب میں سُدھ بُدھ کھو چکے تھے۔ نصیحت پکڑنے کے بجائے انہوں نے اوپر تلے دو تین فائر اور کر دیے۔ اب انہیں موقع دینا اپنی عافیت خطرے میں ڈالنا تھا۔ میں نے رائفل والا ہاتھ کھڑکی سے نکالا اور نشانہ لے کر دو فائر کیے۔ ایک گولی نے لوڈر کا اگلا ٹائر دھماکے سے برسٹ کر دیا۔ قریباً ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑتا ہوا ٹرک بری طرح لہرایا! پھر اپنے ایک پہلو پر جھک گیا۔ میں نے اس کے داہنی جانب کے پہیوں کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد کا منظر کسی مغربی فلم کا سین تھا۔ ایک مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ لوڈر الٹ گیا۔ اس کا بایاں پہلو سڑک سے ٹکرایا اور دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ دن کی روشنی کے باوجود فضا میں چنگاریاں سی اڑتی نظر آئیں۔ جیسا میں نے دیکھا لوڈر کے عقبی حصے سے دو بڑی بڑی "ویٹ تھریشرز" لڑھکیں اور گرد و غبار میں قلابازیاں کھا گئیں۔ یہ مشینیں غالباً جگر گاں لے جائی جا رہی تھیں۔ چالیس پچاس گز سڑک پر گھسٹنے کے بعد لوڈر کی چھت نیچے اور پہیے آسمان کی طرف ہو گئے...... وہ کنارے کے درختوں سے ٹکرانے کے بعد رک گیا۔

ہم اپنی انتہائی رفتار سے سیدھے نکلے چلے جا رہے تھے۔ جائے حادثہ سے قریباً ایک فرلانگ دور آنے کے بعد میں نے ایک سرخ شیورلیٹ دیکھی۔ وہ گرد و غبار کے ریزہ بادل میں سے نکل کر تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ اگلے چند لمحوں میں میرا یہ اندیشہ درست ثابت ہو گیا کہ یہ کار بھی ہمارے تعاقب میں ہے اور اسپتال ہی سے ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ اس دوران میں ہماری کار کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کار کے پچھلے داہنے پہیے میں ہوا تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ٹائر فلیٹ ہو گیا۔ اور کار لہراتی ہوئی کچے میں آ گئی۔ دو طرفہ فائرنگ میں کوئی چھرا ہماری کار کے ٹائر میں بھی جا گھسا تھا۔

"ایک کار پیچھے آ رہی ہے" میں نے صفدر کو خبردار کیا۔

"ملاقات کر لیتے ہیں اس سے بھی" صفدر نے زندہ دلی سے کہا۔

ہماری کار ہچکولے کھاتی، اچھلتی کودتی اور ڈگمگاتی درختوں میں جا رکی تھی۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے سرپٹ بھاگتی کسی دیہاتی دوشیزہ کے پاؤں میں کانٹا لگ گیا ہو۔ ہم دونوں نے کار سے اتر کر پھرتی کے ساتھ پوزیشن لی اور اس "ٹلر" کار کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے جو ہماری نازک اندام "ال مین" کا تعاقب کرتے یہاں تک پہنچی تھی۔ میرے ہاتھ میں سیون ایم ایم اور صفدر کے ہاتھ میں طاقتور کولٹ پسٹل تھا۔ سرخ شیورلیٹ نے تیزی سے ٹرن لیا اور ہماری کار سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر رک گئی۔ پھر کار کے دروازے کھلے اور اس میں موجود افراد تیزی سے درختوں میں تتر بتر ہو گئے۔ میں نے سیون ایم ایم سے دو گولیاں چلائیں۔ ایک گولی کا نشانہ بے جان چیز تھی اور دوسری کا نشانہ جاندار چیز...... بہرطور دونوں نشانے ایک جیسے اہم تھے۔ پہلی گولی نے شیورلیٹ کا ٹائر پنکچر کیا اور دوسری گولی نے ایک "شیورلیٹ سوار" کا...... یعنی اس کی ٹانگ نشانہ بنی اور وہ تڑپ کر کار کی اوٹ میں گر گیا۔ اس کے فوراً بعد باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں طرف سے تڑاتڑ فائر ہونے لگے۔ ال مین کار کی باڈی گولیوں کی ضربوں سے لرزنے لگی۔ ہم دونوں نے کار کے عقب میں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ آڑ بڑی سود مند تھی۔ ہم کار کی کھڑکیوں اور اطراف میں سے ہاتھ نکال کر فائر کر سکتے تھے۔ فائرنگ کی نوعیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے مدمقابل افراد کے پاس کم از کم تین خودکار رائفلیں اور ایک پسٹل موجود ہے۔ ان کی تعداد بھی ہم سے دگنی تھی۔ یعنی وہ چار تھے۔ ہم ذرا بلندی پر تھے۔ لہٰذا اطراف میں دور تک نظر جا رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سڑک پر سفر کرنے والی اِکا دُکا گاڑیاں جائے واردات سے کافی فاصلے پر رکی ہوئی ہیں۔ یقیناً ان کے اردگرد متجسس لوگ بھی موجود ہوں گے جو اس اندھا دھند فائرنگ کا سبب جاننے کے لیے بے قرار ہوں گے۔ ممکن تھا کہ ان میں چند ایسے افراد بھی موجود ہوں جنہوں نے قریباً دو فرلانگ پیچھے ٹرک نما لوڈر کو الٹتے ہوئے دیکھا ہو اور اب اس پُراسرار موبا

فائرنگ کا انجام دیکھنے کے لیے یہاں تک آ پہنچے ہوں۔

تین چار منٹ کی دلچسپ شوٹنگ کے بعد اچانک مجھے پٹرول کی بُو محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا میرے اور صفدر کے پاؤں کے نیچے پٹرول پھیل رہا تھا۔ یہ پٹرول ہماری ہی بل مین کار کا تھا۔ پٹرول کی ٹینکی "لیک" ہو گئی تھی۔ بلاشبہ یہ دو طرفہ فائرنگ کا نتیجہ تھا۔ صورتِ حال مخدوش ہو گئی تھی۔ ہمارا کار کی آڑ میں رُکنا اب خطرناک تھا۔ صفدر نے بھی اب پٹرول دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر تشویش نمودار ہو گئی تھی۔ ایک اور پریشانی بھی ہمیں شروع سے لاحق تھی۔ کار جس درخت تلے رُکی تھی اس کی ایک تناور شاخ پر شہد کی مکھیوں کا چھتا نظر آ رہا تھا۔ یہ بڑی مکھی کا چھتا تھا۔ بڑی مکھی عموماً بلندی پر چھتا لگاتی ہے لیکن اس چھتے کی اونچائی بمشکل پندرہ سولہ فٹ تھی۔ فائرنگ شروع ہونے کے بعد سے یہ مکھیاں بے قرار نظر آ رہی تھیں اور کسی بھی وقت مشتعل ہو کر چھتا چھوڑ سکتی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سب سے زیادہ نقصان ہمیں کو اٹھانا پڑتا کیونکہ ہم چھتے سے قریب تر تھے۔

صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم نے اپنے محفوظ ترین مورچے سے پسپائی اختیار کر لی اور کار کی اوٹ کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے بیس پچیس گز پیچھے چلے گئے۔ اس مرتبہ شیشم کا جڑ سے اکھڑا ہوا ایک تناور درخت ہمارا مورچہ ٹھہرا۔ ہم نے افقی رُخ پر گرے ہوئے تنے کی اوٹ میں پوزیشن لی اور جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ ہمارے پاس کافی تعداد میں فالتو راؤنڈ موجود تھے۔ جس انداز میں شوٹنگ جاری تھی ہم تقریباً آدھ گھنٹا مقابلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ (ان لمحات میں مجھے رہ رہ کر اس بلٹ پروف جیکٹ کا خیال بھی آ رہا تھا جو ہم کوا ونر میں چھوڑ آئے تھے)

جونہی ہم نے کار والا "مورچا" خالی کیا شیورلیٹ میں سے اُترنے والے دو مسلح افراد وہاں قابض ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے وہ جگہ بلندی پر تھی۔ وہاں سے کی جانے والی فائرنگ زیادہ کارگر تھی۔ ہم تنے کی اوٹ سے سر اُٹھاتے ہی فائرنگ کی زد میں آ جاتے تھے۔ لیکن اس مورچے پر قابض ہونے کا ایک نقصان بھی تھا جو ابھی تک ہمارے حریفوں کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاید فرطِ جوش نے ان کی حسِ شامہ کو بھی کُند کر دیا تھا۔ وہ پٹرول کی بُو نہیں سونگھ سکے تھے یا پھر اس بُو کو انہوں نے اہمیت نہیں دی تھی۔ حالانکہ یہ بُو بہت اہم تھی۔ کار کے نچلے حصے میں لگنے والی کوئی بھی گولی اس کار کو "آگ کے الاؤ" میں تبدیل کر سکتی تھی۔

صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی "سوچ کیا رہے ہیں جی۔ فائر مار کر آگ لگائیں کار کو...... مرنے دیں حرامیوں کو۔"

میں نے کہا "سوچ لو۔ انڈیا میں کار ملنا آسان نہیں۔"

"زندگی ملنا بھی تو آسان نہیں" اس نے ترت جواب دیا "وہ حرامی سر پر چڑھے آ رہے ہیں۔ اور میں ابھی ڈیڑھ دو سال زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"ڈیڑھ دو سال کیوں۔ زیادہ کیوں نہیں؟"

"کم از کم سر پر شادی کا سہرا تو سج جائے۔ اور زیادہ بھی نالائقی کروں گا تو ڈیڑھ دو سال میں تو انجم ماں بن ہی جائے گی۔ اس کے بعد کوئی پروا نہیں۔"

میں نے کہا "تم لمبی سوچوں میں پڑ گئے ہو۔ لیکن جو بات فوراً سوچنے کی ہے وہ تم نے سوچی نہیں۔"

"کون سی بات؟" اس نے کولٹ پسٹل سے فائر کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "شہد کے چھتے والی بات۔ گاڑی میں دھماکا ہو گیا تو مکھیاں طوفان مچا دیں گی۔ تم نے دیکھا ہی ہے کتنا بڑا چھتا ہے وہ...... مکھیاں بھڑک گئیں تو ہمیں بھی دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کا حل......" صفدر کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ رائفل کی گولی اس کے سر کو انچوں سے "مس" کرتی گزر گئی تھی۔

میں نے کہا "اس کا حل یہ ہے کہ پہلے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈو پھر کوئی پنگا لیتا۔"

مگر پھر اس سے پہلے کہ ہم کوئی حل ڈھونڈتے "پنگا" خود بخود ہی ہو گیا "پھک پھک" کی خوفناک آوازوں سے صفدر کی بل مین کار کو آگ لگ گئی۔ یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ بعین یوں لگا جیسے کسی نے تیل سے بھرے ہوئے ڈرم پر دستی بم پھینک دیا ہو۔ معلوم نہیں یہ آگ کیسے لگی تھی۔ کم از کم ہماری گولی سے تو نہیں لگی تھی۔ شاید حملہ آوروں میں موجود افراد میں سے کسی نے سگریٹ کا ٹکڑا یا دیا سلائی پھینک دی ہو۔ یا ان کے عقب میں موجود افراد میں سے کسی کی گولی نے کام دکھایا ہو۔ بہرحال آگ بھڑکتے ہی وہی کچھ ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ ایک تیز گونج جیسی بھنبھناہٹ اُبھری اور مکھیوں کا سیاہ بادل فضا میں پھیلتا اور بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اور صفدر ایک ساتھ اٹھ کر بھاگے۔ ہمارا رخ گھنے درختوں کی طرف تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ گھنے درختوں میں پہنچتے ہی ہمیں ایک فیاٹ کار نظر آ گئی۔ یہ کار درختوں کا کلاوا کاٹ کر یہاں تک پہنچی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ پر بڑے بڑے حروف میں "پریس" لکھا ہوا تھا۔ دو درمیانے قد کے افراد جو صورت سے ہی اخبار نویس نظر آتے تھے۔ گاڑی کے قریب موجود تھے۔ یقیناً وہ اس ہنگامے کی ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے تک لب سڑک جاری تھا۔

ہمیں اندھا دھند اپنی طرف بھاگتے دیکھ کر دونوں اخبار نویس گھبرائے اور واپس گاڑی میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ہم اس سے پیشتر ہی ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں گاڑی میں گھس کر دروازے بند کرتے ہم بھی گاڑی میں گھس گئے۔ دو مکھیاں میری قمیص کی آستین میں گھسی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں اندر ہی مسل دیا۔ ایک مکھی صفدر کے بالوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔

صفدر نے اسے نوچ کر فرش پر پھینکا میں نے رائفل کے کندے سے اسے بیاں جی کر دیا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے ورنہ مشتعل مکھیاں ہمارے ساتھ ساتھ اخبار نویسوں کا بھی حشر نشر کر دیتیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک دبلا پتلا باوردی نوجوان بیٹھا تھا۔ میں نے اسے رائفل سے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا "گاڑی چلاؤ گھامڑ۔"

وہ جیسے سکتے کی کیفیت سے باہر آیا اور جلدی جلدی انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مکھیاں ٹڈی دل کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ کچھ کار کی ونڈ اسکرین پر بیٹھی تھیں کچھ کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے دور سڑک کی طرف ایک شخص کو سرپٹ بھاگتے دیکھا۔ وہ زہرناک مکھیوں کی زد میں تھا۔ بلاشبہ وہ شیورلیٹ کے سواروں میں سے ایک تھا۔ میں اس کے ہاتھوں میں خودکار رائفل صاف دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً وہ ایک خطرناک رائفل رہی ہوگی۔ خطرناک سے خطرناک درندہ بھی سامنے ہوتا تو یہ رائفل اسے دوسرا سانس نہ لینے دیتی۔ لیکن یہ چھوٹی سی مکھی اس رائفل کی زد سے باہر تھی۔ یہ ننھا منا اُڑنے والا کیڑا جو شہد جیسی انمول چیز تخلیق کرتا تھا۔ قدرت نے اس کے اندر زہر جیسی خطرناک شے بھی رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے رائفل بردار کو لوٹ پوٹ ہو کر بنجر کی جھاڑیوں میں گرتے دیکھا۔ جھاڑیوں کے پس منظر میں صفدر کی کار سے اٹھنے والے شعلوں کا سیاہ دھواں صاف نظر آ رہا تھا۔

جلد ہی فیاٹ کار اچھانی کوٹی درختوں سے باہر نکل آئی۔ ایک چھوٹی سی نیم گزرگاہ کے ساتھ ساتھ کچا راستہ جاتا تھا۔ صفدر کی ہدایت پر ڈرائیور نے کار کو اس راستے پر ڈال دیا۔ دونوں اخبار نویس سہمے سکڑے ایک گوشے میں دبکے ہوئے تھے۔ عینکوں کے پیچھے ان کی سہمی ہوئی نظریں ہمارے اسلحے پر جمی تھیں۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" فربہ جسم والے اخبار نویس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں یہاں پریس کانفرنس نہیں کر رہا جو تم سوال پوچھ رہے ہو" میں نے جواب دیا۔

"اسلحہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے سوال کرنے کا حق بھی ہمارا ہے۔" صفدر نے میری بات مکمل کی۔

"کون ہو تم؟" دُبلے اخبار نویس نے پوچھا۔

"ہم زبردست ہیں" میں نے کہا "اور تمہیں پتا ہی ہے زبردست کا ٹھینگا سر پر ہوتا ہے۔ ہم دونوں زبردستوں کے سامنے تم تینوں زیر دستوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا جو پوچھا جائے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

دونوں افراد خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔

"کس اخبار میں کام کرتے ہو؟" صفدر نے پوچھا۔

"روزنامہ ندائے حق (ندائے حق) سے متعلق ہے۔"

"یہاں کیسے پہنچے؟"

"وہ...... وہ ہم دراصل ٹماٹر پور جا رہے تھے۔ وہاں جگر گاں نامی گاؤں میں ایک موت ہو گئی ہے۔ اس کی کوریج کرنی تھی۔"

"کس کی موت؟" میں چونکا۔

"بڑا مشہور آدمی ہے۔ حضرت گرو جی۔ کل رات ان کا نسو اسپتال میں انتقال ہو گیا ہے۔ دو دن پہلے جگر گاں میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

یہ ہمارے مطلب کی...... خاص طور پر میرے مطلب کی بات تھی۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ اسپتال کی پارکنگ میں میں نے جو بات سنی وہ بالکل صحیح تھی۔ حضرت گرو جی واقعی اس حیات چند روزہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے اخبار نویسوں سے کرید کرید کر چند مزید سوالات پوچھے جن سے علم ہوا کہ حضرت گرو نسو اسپتال پہنچنے پر بھی مسلسل بے ہوش رہا تھا اور پھر ختم ہو گیا تھا۔ حضرت گرو کی ناگہانی موت پر علاقے میں سخت اضطراب پایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ اسے بہت بُرا سمجھتے تھے اور کچھ بہت اچھا۔ بہرحال اعلیٰ افسران تک اس کی رسائی تھی اور وہ علاقے میں ایک دبنگ شخص سمجھا جاتا تھا۔

دونوں اخبار نویس ہمیں جرائم پیشہ افراد سمجھ رہے تھے لیکن یہ بات تو ان کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ وہ جس خبر کی کوریج کے لیے ٹماٹر پور جا رہے ہیں۔ اس خبر کا اہم ترین کردار ان کے ساتھ اس کار میں سفر کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ چند گھنٹوں بعد جب ان اخبار نویس حضرات کو پتا چلتا کہ لوزر کے حادثے اور کار کے جلنے والے واقعے کا تعلق حضرت گرو کے چیلوں سے ہے تو وہ مزید تفتیش کرتے اور پھر انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت گرو کے چیلوں نے لوزر اور شیورلیٹ میں سوار ہو کر حضرت گرو کے قاتل کا تعاقب کیا تھا۔ اس صورت میں یہ دونوں اخبار نویس سمجھ جاتے کہ ان کے ساتھ کار میں زبردستی لفٹ لینے والے افراد کون تھے۔ بہرحال اس وقت تک یہ دونوں ہماری اصلیت سے بے خبر تھے۔ ان دونوں کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ ہائی وے پر لوزر اُلٹنے کا منظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد شیورلیٹ کار بل مین کا تعاقب کرتی نظر آئی اور جنتر کے درختوں میں دونوں گاڑیوں کے سوار ایک دوسرے پر فائرنگ کرنے لگے۔ اس فائرنگ کا سبب جاننے کے لیے ہی دونوں اخبار نویس اپنا راستہ چھوڑ کر درختوں میں پہنچے تھے اور نتیجے کے طور پر ہمارے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔

صفدر جلد سے جلد موقع واردات سے دور پہنچ جانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے گاڑی کا رُخ حیدر آباد کے مضافات کی طرف رکھوایا تھا۔ میں نے فربہ اندام اخبار نویس سے پوچھا "تم کیا کرتے ہو اخبار میں؟"

"آرٹیکل لکھتا ہوں کبھی کبھی رپورٹنگ بھی کرتا ہوں۔"

"کچھ ادب سے لگاؤ بھی ہے؟"

"ہاں کبھی کبھی خلعہ (قطعہ) لکھتا ہوں۔"

"گویا شاعر بھی ہو...... اور اگر شاعر بھی ہو تو پھر قطعوں کے علاوہ بھی کچھ لکھتے ہو گے۔" میں نے اس کے پاس پڑی ضخیم نوٹ بک اٹھالی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس نوٹ بک کا ایک حصہ "ماڈرن" شاعری کے لیے مخصوص تھا۔ یہ جدید نظمیں تھیں۔ بندش کے لحاظ سے بھی مادر پدر آزاد تھیں اور نفس مضمون کے لحاظ سے بھی۔ یعنی رومانی اعتبار سے بہت کھلی ڈلی نظمیں تھیں اور ان کے مجموعے پر "صرف بالغوں کے لیے" لکھا جا سکتا تھا۔ شاعر کا نام یعنی میرے سامنے بیٹھے فربہ اندام اخبار نویس کا نام راجندر ناشاد تھا۔

میں نے کہا "ناشاد صاحب! آپ کے گھر میں ماں بہن نہیں ہیں جو آپ ایسی نظمیں لکھتے ہیں۔"

صفدر نے کہا "ایسی نظموں کی تخلیق کا سبب ماں بہن کی غیر موجودگی نہیں بلکہ بیوی کی غیر موجودگی ہوتی ہے۔ ناشاد صاحب کی عمر پینتیس سال سے کم کیا ہوگی۔ اس عمر میں بھی شادی نہ ہو سکے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔"

میں نے دبلے پتلے ڈرائیور سے پوچھا "کیوں بھائی ڈرائیور! یہ تمہارے صاحب شادی شدہ ہیں؟"

"جج...... جی ہاں" وہ تھوک نگل کر بولا "تت...... تین بچے ہیں۔"

"پھر تو یہ بالکل قابل معافی نہیں۔ تین بچوں کی موجودگی میں ایسی گندی نظمیں" صفدر نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

میں نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ ان نظموں کی سزا کے طور پر ناشاد صاحب کو کسی ویرانے میں چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ وہاں سے پیدل مارچ کرتے ہوئے واپس شہر پہنچیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے" صفدر نے میری تجویز کو سراہا "پیدل چلنے سے ذرا ان کی چربی بھی پگھلے گی۔"

نظموں کی بات تو ہم یونہی ازراہ تفنن کرنے لگے تھے ورنہ اس گاڑی میں لفٹ لیتے ہی ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ ڈرائیور سمیت ان تینوں صاحبان کو راستے میں کہیں سنسان جگہ اتار دیں گے اور خود گاڑی لے کر کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اور یہ محفوظ مقام ظاہر ہے صفدر کا کوارٹر ہی تھا...... وزیرہ سے قریباً آٹھ میل آگے آنے کے بعد صفدر نے سرکنڈوں کے درمیان ایک مناسب سے مقام پر کار رکوالی۔

دونوں اخبار نویس خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔ صفدر نے فرد جرم عائد کرتے ہوئے نوٹ بک راجندر ناشاد صاحب کی گود میں پھینک دی اور بولا "یہ نظمیں ہیں؟ سیدھی سیدھی واہیات ہے۔ میرا دوست پرویز کہا کرتا تھا۔ اچھی شاعری وہ ہوتی ہے جسے پڑھ کر یا سن کر بندے کو اپنی بچھڑی محبوبہ یاد آنے لگے اور فحش شاعری وہ ہوتی ہے جسے پڑھ کر بیوی یاد آنے لگے۔ پتا نہیں وہ درست کہتا تھا یا غلط...... بہرحال تمہاری اس شاعری کی سزا یہ ہے کہ تم اس جنگل میں اتر جاؤ...... چلو شاباش...... اترو نیچے! سر جھکا کر اور الحمدللہ پڑھ کر۔"

"یہ کیا بے ہودگی ہے" فربہ اندام نے احتجاج کیا "تم ہمارے ساتھ آج نہیں پوری صحافی برادری کے ساتھ بدسلوکی کر رہے ہو۔ ہم تم کو ٹھیک کر دیں گا۔"

میں نے کہا "فی الحال تم اس ویرانے میں بیٹھ کر اپنی نظموں کو ٹھیک کرو اور اگر اس کے بعد کچھ وقت بچ رہے تو ایک دو اچھی اچھی نظمیں لکھو۔ سنا ہے تنہائی اور سکون پا کر شاعر حضرات کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اس سے زیادہ سکون اور خاموشی بھلا اور کہاں ہوگی۔"

راجندر ناشاد چیخ کر بولا "تم جانتے ہو ہم کو جنازے میں شرکت کرنی ہے؟"

"شرکت کرنی تھی" میں نے تصحیح کی "اب تم شرکت نہیں کر سکو گے۔ بلکہ یہاں بیٹھ کر نظم لکھو گے۔ اس نظم کا عنوان یہ بھی ہو سکتا ہے "وہ جنازہ جو میرا نہ ہوا" یعنی وہ جنازہ جس نے میرے پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔"

"تو دیکھو تم صحافیوں سے ٹکر لے رہے ہو" راجندر ناشاد چیخا۔

"صحافیوں سے نہیں ایک "ڈبل ایکس شاعر" سے ٹکر لے رہے ہیں۔ چلو نیچے" میں نے اسے رائفل کی نال سے ٹھوکا دیا۔

رائفل کے لمس نے راجندر ناشاد کا غصہ کافور کر دیا اور وہ لرزتا کانپتا گاڑی سے اتر گیا "چلو تم دونوں بھی اترو" میں نے راجندر ناشاد کے ساتھیوں سے کہا۔ راجندر ناشاد کے پہلو میں بیٹھا ہوا شخص تو اتر گیا۔ لیکن ڈرائیور لڑکا متذبذب نظر آ رہا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں وہ بڑے پرسکون طریقے سے بیٹھا رہا تھا۔ بلکہ مجھے محسوس ہوا تھا کہ راجندر ناشاد کی بے عزتی پر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے۔ شاید کوئی پرانی پرخاش تھی اسے۔

سرگوشی میں مجھ سے کہنے لگا "صاحب! آپ نے جو کچھ بھی کیا۔ بہت اچھا کیا۔ یہ سالا ہے اسی قابل۔ اتنی گندی نظمیں لکھتا ہے کہ میری بیوی کانوں میں انگلیاں دے کر پڑھتی ہے۔ لیکن صاحب مجھ کو تو یہاں مت چھوڑیں۔ پیدل چل چل کر ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔"

میں نے کہا "ہمہ یاراں دوزخ۔ جو کچھ یہ کریں گے تم بھی کرنا۔"

وہ خوشامدی انداز میں مسکرایا "صاحب! یہ تو شاعر لوگ ہیں۔ بیٹھ کر نظمیں لکھیں گے۔"

میں نے کہا "پھر تو تمہارا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہے۔ جب شاعر کچھ لکھ لیتا ہے تو اسے سامع کی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ چلو شاباش اترو نیچے۔"

میں نے اسے بھی گاڑی سے اتار دیا۔ چند ہی لمحے بعد ہم ایک نیم پختہ راستے پر سفر کرتے واپس ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ ہماری منزل ایک بار پھر حیدرآباد تھی۔

ہم بخشو اور نواب زادی شاہین کو کوارٹر میں چھوڑ آئے تھے۔ بیرونی دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ بخشو یا نوابزادی میں سے کوئی وہاں سے نکلے گا۔ پھر بھی دل کو دھڑکا سا لگا تھا۔ مجھے نوابزادی شاہین کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ اس وقت صرف نوابزادی ہی تھی جو ہمیں گمشدہ صندوقوں کے بارے میں کوئی سراغ دے سکتی تھی۔ اگر وہ اپنے سیلانی موڈ کے زیر اثر پھر کہیں غائب ہو جاتی تو ہم جہاں کے تہاں کھڑے رہ جاتے۔ اس صورت حال کے لیے پنجابی میں ایک بڑا عامیانہ سا محاورہ ہے "جتھے دی کھوتی اوتھے ای آن کھلوتی" اور ہم اس محاورے کی زد میں آنا نہیں چاہتے تھے۔

واپسی کا سفر ہم نے قریباً ایک گھنٹے میں مکمل کیا اور سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ واپس نواز کالونی پہنچ گئے۔ ہم اسی گاڑی میں تھے جس پر پریس کی نمبر پلیٹ لگی تھی۔ گاڑی ہم نے کوارٹر سے ایک فرلانگ دور ہی روک دی اور پیدل چل کر کوارٹر پر پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر دلی اطمینان نصیب ہوا کہ بیرونی دروازے پر تالا جوں کا توں موجود ہے۔ ہم تالا کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ نوابزادی شاہین بخشو کے ساتھ اندرونی کمرے میں موجود تھی۔ کھانے کی ٹرے میں دو جلے ہوئے ناقابل شناخت ٹکڑے پڑے تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ روٹیاں ہیں۔ ایک پلیٹ میں سالن بھی موجود تھا یہ بھی اپنی جگہ دیکھنے کی چیز تھا۔ آلو کریلے پکائے گئے تھے لیکن کریلوں کو کاٹنے یا چھیلنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ وہ شوربے میں ایسے پڑے تھے جیسے ابھی ابھی بیل سے توڑے گئے ہوں۔ نوابزادی شاہین شرمندہ سی ایک طرف بیٹھی تھی۔

ہمیں یہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی کہ نوابزادی صاحبہ نے کھانا پکانے کی کوشش فرمائی ہے۔ بے چاری کی ناک پر ابھی تک آٹا لگا تھا اور ایک ہاتھ کی انگلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس انگلی کو نابکار گستاخ توے نے بوسہ دینے کی کوشش کی تھی...... نوابزادی نوابانہ ناز و نعم میں پلی تھی۔ انگلینڈ میں بھی اس نے تنکا پکڑ کر دوہرا نہیں کیا تھا۔ وہ بھلا امور خانہ داری کیسے انجام دے سکتی تھی۔ اس کا اپنا معاملہ ہوتا تو شاید وہ کچن میں گھسنے کے بجائے دو تین دن بھوکا رہنے کو ترجیح دیتی۔ لیکن بخشو کی خاطر اسے کھانا پکانا پڑا تھا۔

"اور روٹیاں ہیں۔ تم دونوں بھی کھانا کھالو" نوابزادی نے بجھی بجھی نظروں سے کہا۔

"شکریہ...... کھانا تو ہم کھا آئے ہیں" صفدر جلدی سے بولا جیسے اسے ڈر ہو کہ نوابزادی اسے زبردستی سالم کریلا نگلنے پر مجبور کر دے گی۔

"کچھ پتا چلا ابا جی کے سامان کا؟" نوابزادی نے دریافت کیا۔

"نہیں ابھی نہیں" میں نے جواب دیا "ہم چار پانچ اسپتالوں میں دیکھا ہے لیکن کہیں پتا نہیں چلا۔"

"پانچ چھ گھنٹے میں تم صرف چار پانچ اسپتال دیکھ سکے ہو؟" نوابزادی نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک اور پھڈا ہو گیا تھا" میں نے جواب دیا "کچھ لوگ پیچھے پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے جان چھوٹی ہے۔"

"اور صفدر تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" نوابزادی نے چونک کر کہا۔

"گاڑی تو شہادت پا گئی" صفدر نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"کیا مطلب؟" نوابزادی کی حیرت مزید بڑھ گئی۔

"کچھ نہیں۔ یونہی بک رہا ہے" میں نے کہا "احتیاطاً کچھ فاصلے پر کھڑی کر آئے ہیں۔"

نوابزادی اتنی بچی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمارے ساتھ اور گاڑی کے ساتھ کوئی اہم واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ بہرحال اس نے ہمیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

صفدر کو نواب زادی شاہین کے پاس چھوڑ کر میں دوسرے کمرے میں آیا۔ یہاں ٹیلیفون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے مسٹر جی کلارک کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلے سیکرٹری کی آواز آئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ چند لمحے بعد امریکی ارب پتی بنفس نفیس لائن پر موجود تھا۔

"ہیلو شاہ جہاں!" کلارک صاحب پرجوش آواز میں بولے "تم کہاں تھے اب تک۔ ہم تو پریشان تھے تمہارے لیے؟"

"میں آپ کے آس پاس ہی رہا ہوں جناب! اب بھی زیادہ دور نہیں ہوں۔ یہاں حیدرآباد سے ہی بول رہا ہوں۔ بتانے میں رسک ہے ورنہ میں آپ کو اپنا ایڈریس وغیرہ بھی بتا دیتا۔"

"خیر کوئی بات نہیں" کلارک صاحب کی آواز آئی "تم ٹھیک تو ہو نا؟ ادھر جگہ جگہ سے بڑی دھماکا خیز خبریں مل رہی ہیں۔ پہلے بانسوں کے جنگل میں کار گاہ کو آگ لگی۔ پھر بڑی نہر کے کنارے کسی باغ میں زبردست پولیس مقابلہ ہوا۔ پتا چلا ہے کہ تین چار پولیس والے مارے گئے ہیں۔ تمہیں ان واقعات کا پتا تو ہوگا؟"

"بالکل پتا ہے جی' بلکہ میں ان واقعات کا چشم دید گواہ ہوں۔ ملاقات ہوگی تو سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔"

کلارک صاحب بولے "مقامی لوگوں میں بڑا خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ بڑے ہی سادہ دل لوگ ہیں۔ وہ ان نئے واقعات کو بھی جن بھوتوں کی کارستانی قرار دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پولیس والے جنات کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں اور روحانی پیشوا حضرت گرو بھی جنات نے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔ تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا۔ وہ روحانی پیشوا کل رات بچتے بچتے

بلاک ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔ مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوگیا ہے۔"

مسٹر جی کلارک نے پوچھا "جس کام کے لیے تمہیں بھیجا تھا' اس کا کیا بنا؟"

مسٹر جی کلارک کا اشارہ خدا بخش کے قاتل کی طرف تھا۔ میرے جگر گاں جانے کا اصل مقصد اس قاتل کی تلاش ہی تھا۔ وہ قاتل مجھے مل گیا تھا اور ساتھ والے کمرے میں آلو کرلے کھا کر بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ لیکن میں فی الحال اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ مسٹر جی کلارک صاحب کو قاتل کی موجودگی سے آگاہ کر سکتا۔

میں نے کہا "میں قاتل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں جناب..... اس بارے میں بھی آپ کو جلد رپورٹ دوں گا.... فی الحال میں نے ایک ضروری کام کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔"

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" جی کلارک صاحب نے کہا۔

میں نے کہا "بڑی نہر کے پاس باغ میں جو پولیس مقابلہ ہوا اس میں ایک عورت عائشاں شدید زخمی ہوئی تھی۔ وہ گولی کھا کر گری تھی اور پھر آگ لگنے سے جھلس گئی تھی۔ میری اطلاعات کے مطابق اسے حیدرآباد کے کسی اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ میں اس کے بارے میں فوری طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ میری پوزیشن ایسی نہیں کہ خود اسے ڈھونڈ سکوں۔ میں چاہتا ہوں......"

"میں سمجھ گیا" مسٹر جی کلارک نے میری بات کاٹی "تم اس عورت کا حلیہ وغیرہ بتاؤ۔ میں جلد سے جلد تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں۔"

میں نے مسٹر کلارک کو ماسی عائشاں کا حلیہ بتایا اور دیگر تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مسٹر کلارک میرا فون نمبر جاننا چاہتے تھے لیکن میں نے اس سلسلے میں احتیاط سے کام لیا اور کلارک صاحب کو بتایا کہ مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ میں کس نمبر سے کال کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ ڈیڑھ گھنٹے تک میں دوبارہ فون کروں گا۔

شام کا کھانا صفدر نے خود تیار کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ماہر باورچی کی سی لذت پیدا ہو چکی تھی۔ کھانے کے بعد میں نے مسٹر کلارک صاحب کو پھر فون کیا۔ پہلے فون کے پرسنل سیکرٹری نے بات کی پھر کلارک صاحب خود فون پر آگئے۔ میری توقعات کے عین مطابق انہوں نے ماسی عائشاں کا پتا چلا لیا تھا۔ وہ بولے "تمہارا کام تو ایک گھنٹے میں ہی ہو گیا تھا۔ میں کافی دیر سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں..... عائشاں نامی وہ عورت گارڈن اسپتال کے "برن یونٹ" میں ہے۔ ایک مقامی پولیس سرجن میرا واقف کار ہے۔ وہ خود اسپتال میں عورت سے مل کر آیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عورت کی حالت ٹھیک نہیں۔ اس کے جسم کا ایک تہائی حصہ جل چکا ہے اور وہ سخت نگہداشت میں ہے۔ اس کے سینے میں بھی گولی لگی تھی' بہرحال اس گولی نے اسے شدید نقصان نہیں پہنچایا اور وہ نکالی جا چکی ہے۔ عورت کو اصل خطرہ ان زخموں کی وجہ سے ہے جو جھلسنے کے سبب آئے ہیں۔ اگر وہ اگلے دو تین دن نکال گئی تو پھر اس کے بچنے کے امکانات ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے کلارک صاحب نے پوچھا "کیا اس عورت کا کوئی بیٹا بھی ہے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

"وہ اپنے بیٹے کو بہت یاد کرتی ہے" کلارک صاحب نے کہا "سوتے جاگتے بیٹے کا نام اس کی زبان پر ہے۔ میرے سرجن دوست کا کہنا ہے کہ عورت میں اس بات کی شدید خواہش موجود ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی خاطر زندہ رہے' اور جن مریضوں میں زندہ رہنے کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے وہ اکثر "سروائیو" بھی کر جاتے ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو" میرے منہ سے نکلا۔

"کیا تم اس کے بیٹے کو جانتے ہو؟"

"کسی حد تک" میں نے کہا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ یہی وہ بیٹا ہے جو خدا بخش کا قاتل ہے' اور جس کا کھوج لگانے کے لیے مسٹر کلارک نے مجھے حیدرآباد کے مضافات میں بھیجا تھا۔ اگر میں یہ بتاتا تو پھر مجھے یہ بھی بتانا پڑتا کہ خدا بخش کب کیوں اور کیسے قتل ہوا اور اگر یہ روداد بتائی جاتی تو پھر اس میں نوابزادی شاہین کا ذکر بھی آتا اور میں ابھی نوابزادی شاہین کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس علاقے کی بساط پر دفینے کی جو جنگ لڑی جا رہی تھی' نوابزادی شاہین اس میں سب سے اہم مہرہ تھی۔ اور میں اس مہرے کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے موضوع بدلنے کی خاطر مسٹر جی کلارک سے مجتبیٰ کنور کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا "مسٹر مجتبیٰ واپس آگئے ہیں اور میرے پاس ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ تمہاری واپسی کے شدت سے منتظر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کل اپنے ایک خاص آدمی کو لندن بھیج رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر نوابزادی شاہین کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جا سکے۔ میری طرح ان کا بھی یہی خیال ہے کہ نواب زادی ہمیں دفینے کے بارے میں کوئی سراغ دے سکتی ہے۔"

"بجا ارشاد فرمایا آپ نے" میں نے کہا' اور چند رسمی باتوں کے بعد کلارک صاحب سے اجازت طلب کر لی۔

گنجان آبادی میں واقع اس مکان کے اندر ہم بالکل محفوظ تھے۔ چھڑے چھانٹ لوگوں کو محلے دار شک کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن صفدر نے یہاں اپنی عزت بنا رکھی تھی..... اخبار والوں کی کار ہم نے اپنے محلے سے کافی فاصلے پر چھوڑی تھی لہٰذا اس کار کی وجہ سے ہمیں کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔ جو ال مین کار ہائی وے پر جل گئی تھی اس کی نمبر پلیٹ بھی جل گئی تھی۔ اس کار کی وجہ سے بھی کوئی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔

مسٹر کلارک کو فون کرنے کے بعد میں نے نوابزادی شاہین کو اطلاع دی کہ ماسی عائشاں کا پتا چل گیا ہے۔ وہ ایک مقامی اسپتال میں زیر علاج ہے اور آپریشن کے ذریعے اس کی گولی بھی نکال دی گئی ہے۔ ماسی عائشاں کا زندہ ہونا خوشخبری سے کم نہیں تھا۔ نوابزادی شاہین کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس نے لفظوں اور اشاروں کی زبان میں بخشو کو بھی اس خبر سے آگاہ کیا۔ اس آگاہی کے بعد بخشو کے چہرے پر تشویش کا سیاہ رنگ قدرے دھیما پڑ گیا۔ اس کی رال جو خشک ہو چکی تھی' آہستہ آہستہ پھر بہنے لگی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ماں کے حوالے سے اس کا دکھ کچھ کم ہوا ہے۔

صفدر کے منع کرنے کے باوجود نوابزادی شاہین کچن میں گھس گئی اور ہمارے لیے چائے بنا لائی۔ یہ بڑی عبرتناک قسم کی چائے تھی۔ چینی بے حد و حساب تھی اور اندر سے پیاز کی بھینی بھینی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ لیکن یہ چائے چونکہ "محبت" سے تیار کی گئی تھی لہٰذا ہم نے خون پسینہ ایک کر کے پی لی۔ اگر ذوق گل ہوتا تو اس موقع پر یہ شعر ضرور پڑھتا "اظہار بھی مشکل ہے چپ رہ بھی نہیں سکتے۔ مجبور ہیں اف اللہ' کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

نہ صرف ہم نے چائے پی بلکہ دل کھول کر نوابزادی شاہین کی مہارت کی تعریف بھی کی۔ اس تعریف کی پاداش میں ہمیں آدھا آدھا کپ مزید پینا پڑا۔ ہم نے یہ "نیکی" بھی کر ڈالی۔ کیونکہ اس نیکی کے سبب اور چائے نہیں بچی اور اس بات کا امکان ختم ہو گیا کہ نوابزادی اپنی تیار کی ہوئی چائے پی کر آپ ہی شرمندہ ہوگی۔

نوابزادی لیٹنے کے لیے کمرے میں چلی گئی تو صفدر بولا "نوابزادی صاحبہ بظاہر جتنی تیز طرار اور چنچل نظر آتی ہیں اندر سے اتنی ہی معصوم اور سادہ دل ہیں۔ انہوں نے شاہانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور اب تک کی زندگی اسی ماحول میں گزاری ہے۔ جو لوگ ایسے پرتکلف ماحول میں پرورش پاتے ہیں وہ عام لوگوں سے کچھ مختلف ہو جاتے ہیں۔ کئی معاملات میں وہ بہت ہوشیار اور کئی میں بالکل نابلد ہوتے ہیں۔"

میں نے صفدر سے کہا "لگتا ہے کہ نوابزادی کو کافی جاننے لگے ہو۔"

"جی ہاں" صفدر نے جواب دیا "جب میں نواب مرحوم کی پرائیویٹ جیل میں تھا' نوابزادی صاحبہ میرے پاس آ جاتی تھیں اور پہروں مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔ بالکل کسی رازدار دوست کی طرح وہ ہر بات مجھ سے کہہ دیتی ہیں۔ جب وہ سلطون نامی شخص کے ہاتھوں اغوا ہوئیں اور رفن کی نوبیاہتا بھابی گولی کا شکار ہوئی تو تقریباً ایک روز وہ مجھ سے ملنے نہیں آئیں۔ پھر جب آئیں تو میرے سامنے بیٹھ گئیں اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہوں نے خود پر گزرنے والے حادثے کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی میں نے کچھ پوچھا۔ ہم دونوں کے درمیان جیسے یہ خاموش معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم یہ ناپسندیدہ ذکر کبھی نہیں چھیڑیں گے۔ اب آپ نے بتایا ہے تو پتا چلا ہے کہ آپ اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں اور نوابزادی صاحبہ کو ڈاکوؤں سے رہائی دلانے میں آپ کا اور رستم کا ہاتھ ہے..... یہ اغوا والا واقعہ' واحد واقعہ ہے جو نوابزادی صاحبہ نے مجھ سے چھپایا ہے' ورنہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی مجھ سے کھل کر بات کر لیتی تھیں۔ لندن میں وہ آزادانہ ماحول میں گھومتی پھرتی رہی ہیں۔ یہاں حیدرآباد میں بھی انہوں نے ہر طرح کی محفلیں "انجوائے" کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی اب تک کی زندگی میں صرف ایک شخص سے متاثر ہوئی ہیں۔ وہ ان کا ہم وطن نہیں تھا۔ بس اتفاقاً اس سے ملاقات ہو گئی۔ معلوم نہیں اس کی اصل کیا ہے اور وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن وہ اسے زندگی بھر بھلا نہیں سکیں گی' وہ ہمیشہ لاعلاج درد بن کر ان کے سینے میں رہے گا۔ اس شخص نے نوابزادی صاحبہ پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔ نوابزادی صاحبہ اس احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھیں۔ اس بندے کو بتانا چاہتی تھیں کہ ان کے دل میں اس کے لیے کتنی جگہ ہے۔ لیکن یہاں بھی نوابزادی صاحبہ کی آن بان آڑے آئی اور وہ اپنے جذبات کا اظہار اس پر نہ کر سکیں۔ وہ اس سے زبانی بات کرنے کے منصوبے بناتی رہیں۔ اس کے نام خط لکھ لکھ کر پھاڑتی رہیں' آخر پھر اپنے نوابی خول میں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ کسی نے سچ کہا ہے جناب! ایسے لوگ اپنی زندگیوں کے گرد ایک آسمان جتنی بلند دیوار اٹھا لیتے ہیں۔ پھر زندگی بھر اس دیوار کے قیدی بنے رہتے ہیں۔"

صفدر روکھے لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن اس کے الفاظ نے مجھے بُری طرح چونکا دیا تھا۔ صفدر' نوابزادی کے حوالے سے کس شخص کی بات کر رہا تھا؟ جہاں تک "ہم وطن نہ ہونے" کا تعلق ہے' وہ تو میں بھی تھا۔ نوابزادی نے مجھے بھی خط لکھے تھے' اور وہ پھٹے ہوئے خط میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ لیکن...... لیکن مجھ سے نوابزادی کو کیا وابستگی ہو سکتی تھی۔

"کس خیال میں کھو گئے آپ؟" صفدر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں' یونہی سوچنے لگ گیا تھا۔ ان نوابوں مہاراجوں کے رویے واقعی ناقابل فہم ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نوابزادی صاحبہ نے خود کو خاندانی شان و شوکت کی دیواروں میں چن رکھا ہے ورنہ وہ اندر سے بڑی نرم اور رومانی مزاج کی لڑکی ہیں۔ بالکل جیسے کوئی لاابالی کالج گرل ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ ان کا لاابالی پن ہی ہے نا کہ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر چلی آئی ہیں اور ایک غریب باغبان عورت کے ساتھ رہ رہی ہیں اور ایک ایسے شخص کی دیکھ بھال کر رہی ہیں کہ کوئی جس کے قریب سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو' بخشو انہیں بس کہتا ہے اور وہ اسے اپنے

ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں۔۔۔۔"

صفدر باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سن بھی رہا تھا لیکن یوں سن رہا تھا جیسے یہ باتیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔۔۔۔ میرا دھیان کہیں اور تھا۔ ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بار بار یہ سوال ذہن میں سر ابھار رہا تھا کہ صفدر نے نوابزادی شاہین کے حوالے سے کس شخص کی بات کی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں میں نے اپنے نام نوابزادی صاحبہ کے لکھے ہوئے خطوط رکھے تھے۔ ان خطوط میں میرا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ میں نے نوابزادی کو سلجوق کے چنگل سے نکالا تھا۔ کسی خط میں مجھے شاہ جہاں صاحب لکھا گیا تھا۔ کسی میں مسٹر شار جہاں، کسی میں صرف شار جہاں۔ القاب کے ساتھ ساتھ نفسِ مضمون میں بھی تبدیلیاں آتی رہی تھیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ نوابزادی صاحبہ کسی بھی لقب اور مضمون سے مطمئن نہیں ہو سکیں۔ آخر انہوں نے خط لکھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ یہ سادے بھنچے اور مڑے تڑے تشکر نامے مجھے ردی کی ٹوکری سے ملے تھے۔ اسی وقت ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ ان تشکر ناموں کو کسی بھی حوالے سے محبت نامے کہا جا سکتا ہے اور اب بھی میں کسی طرح کی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔۔۔۔ میں کوئی ایسی خوش فہمی "افورڈ" ہی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں میری چھٹی حس پکار رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ میں نے دو تین بار شاہین کی نگاہوں میں کوئی عجیب سا جذبہ کروٹ لیتے دیکھا تھا۔

درحقیقت سلجوق کے ہاتھوں اغوا ہونے کے بعد نوابزادی شاہین اپنی زندگی کی مشکل ترین گھڑیوں سے دوچار ہو گئی تھی۔ اس موقع پر میں اور یوتا سنگھ نے مردانہ وار آگے بڑھ کر اسے بچایا تھا۔ بے شک بچانے والی ذات خدا تعالیٰ کی ہوتی ہے لیکن ہم نوابزادی کے لیے ایک اہم وسیلہ بنے تھے جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ زمانے بدل گئے ہیں لیکن انسان کے بنیادی رویے وہی ہیں جو آج سے ہزار سال پہلے تھے۔ دس ہزار سال پہلے تھے اور دس لاکھ سال پہلے تھے۔ قبل از تاریخ کے تاریک دور کی طرح آج بھی عورت پر مرد جھپٹتا ہے۔ آج بھی وہ مدد کے لیے پکارتی ہے۔ آج بھی اجنبی قبیلے کا کوئی فرد اس کی مدد کرتا ہے اور آج بھی وہ اپنی عزت بچانے والے سے محبت کرنے لگتی ہے۔ ان گنت زمانے گزر گئے لیکن اس کہانی میں کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ کردار اور انداز بدل جاتے ہیں۔ ماحول اور زمانہ بدل جاتا ہے لیکن کہانی وہی رہتی ہے۔ یہ کہانی اور ایسی ہی بہت سی کہانیاں، ہزاروں سال سے انسانی خون میں سفر کر رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ بے شک نوابزادی ایک پڑھی لکھی، روشن خیال اور ماڈرن لڑکی تھی۔ لیکن تھی تو لڑکی۔۔۔۔ وہی لڑکی جس نے ہزاروں لاکھوں سال پہلے بھی اپنی عزت اور جان بچانے والے کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کیا تھا۔ نوابزادی ایک حسین، دلچسپ اور طرحدار لڑکی تھی۔ صنفِ مخالف کے لیے اس میں زبردست کشش موجود تھی۔ مجھے اس میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ درحقیقت فرزانہ وہ رنگیلی لڑکی تھی جس کے لیے میرے دل و دماغ میں جگہ موجود تھی، جسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی تھیں۔ باقی جو کچھ تھا، حالات کا جبر تھا۔ جیل جانے سے پہلے شراب اور شباب شدت سے میری زندگی میں موجود تھے۔ کئی خوبصورت لڑکیاں میری راتوں کے اندھیرے مہکائے تھے اور کئی نرم جسم میری ... میں موم ہوئے تھے لیکن وہ سب جسمانی تقاضے تھے، ضرورتیں تھیں۔ جیل سے نکلنے کے بعد میں نے اپنے آپ میں بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔ اب شراب میری کمزوری نہ تھی اور نہ کوئی عورت میری شریکِ شب بنی تھی۔ صرف سورج تھی جو کبھی کبھی مجھ پر آ جھپٹتی تھی اور مجھے بہکانے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میرے ساتھ سورج کا لگاؤ کاروباری لگاؤ ہے۔ عشق اور محبت وغیرہ کے الفاظ اس کی ڈکشنری میں ہی نہیں تھے۔ وہ صرف دولت سے محبت کرتی تھی یا اپنی ذات سے۔

اسی دوران میں خرخراہٹ کی مہیب آواز نے مجھے اور صفدر کو چونکا دیا۔ یہ آواز اندرونی کمرے سے بلند ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں جھانکا۔ جسیم ضخیم بخشو پھیل کر چارپائی پر پڑا تھا۔ یہ اس کے خراٹوں کی آواز تھی۔ نوابزادی شاہین اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور کھوئے کھوئے انداز میں بخشو کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ بخشو کے کریہہ المنظر چہرے کو اور نوابزادی کے خوبصورت چہرے کو دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے سیاہ رات کے بعد چمکیلے دن کو دیکھ لیا جائے۔ بدصورتی اور خوبصورتی دو صفات ہیں لیکن یہ دونوں صفات اس کمرے میں یکجا نظر آ رہی تھیں۔

میں صفدر کے پاس واپس آ گیا۔ کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ صفدر بھی جماہیاں لے رہا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر لیٹ گیا جبکہ میں اندر چارپائی پر جا لیٹا۔

رات گیارہ بارہ بجے کا وقت تھا جب کسی آہٹ سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یہ آہٹ میرے قریب ہی کہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر دیکھنا چاہا لیکن نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ ارادہ خود بخود ملتوی ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ایک بار پھر "کھڑ کھڑ" کی آواز سنائی دی۔ اس مرتبہ یہ آواز بیرونی دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ نیم غنودگی کے عالم میں، میں نے سوچا کہ اٹھ کر دیکھنا چاہیے لیکن نیند کے جھونکے ہر خیال کو حرفِ غلط کی طرح مٹا رہے تھے۔ نیند سے نبرد آزما ہو کر اسے شکست دینا آسان کام نہ ہوتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے بوجھل سر کو سنبھالا اور

اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی لائٹ روشن کر کے میں صحن کی طرف بڑھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ صفدر بیٹھک میں صوفے پر سو رہا تھا۔ برآمدے میں جلنے والے چھوٹے بلب کی روشنی میں بیرونی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اندر سے مقفل تھا۔ مطمئن ہو کر میں واپس کمرے میں آ گیا۔ نیند ایک بار پھر غلبہ پانے لگی لیکن چھٹی حس مجھے سونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ پانچ منٹ گزرے تھے۔ جب ایک بار پھر بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس بار میں نے تکیے کے نیچے سے کولٹ پستول نکالا اور لپک کر صحن میں آیا۔ یہ دیکھ کر چودہ طبق روشن ہو گئے کہ بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر دروازے میں پہنچا اور باہر جھانکا۔ گلی کے موڑ پر ایک سایہ تیزی سے اوجھل ہوتا نظر آیا۔ لباس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک عورت ہے۔ میں بھی بھاگ کر سنسان گلی کے موڑ پر پہنچا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی لیکن مجھے ایک ہیولا سا حرکت کرتا نظر آیا۔ میں ننگے پاؤں نکلا تھا اس لیے میرے بھاگنے سے بالکل آواز نہیں ہوئی۔ میں نے اس ہیولے کو عقب سے دبوچ لیا۔ بلاشبہ یہ نوابزادی شاہین ہی تھی۔ میرے ہاتھوں کی گرفت محسوس کرتے ہی وہ بری طرح مچلی۔ پھر اس نے گھوم کر میرا چہرہ دیکھا اور کراہی۔ "چھوڑو مجھے۔ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ چھوڑ دو۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کی گرفت ختم کر دی لیکن اس کے سامنے ڈٹا رہا۔ "کیا بات ہے؟ کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟ اور وہ بھی اتنی رات گئے؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"بس میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پلیز تم جانے دو مجھے۔۔۔۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

"لیکن اتنی رات گئے اور بالکل اکیلی۔۔۔ کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔۔۔۔ اور پھر بخشو ہے، وہ آپ کے بغیر کیسے رہے گا۔ اسے آپ کی ضرورت ہے۔"

"وہ میری ذمہ داری نہیں ہے" وہ جلدی سے بولی "ویسے بھی اس کی والدہ زندہ ہے۔ وہ کچھ دنوں میں اسپتال سے آ جائے گی۔"

"اچھا۔ آپ پہلے گھر تو چلیں۔ میں اس طرح آپ کو نہیں جانے دوں گا۔"

"تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟" وہ ذرا تیزی سے بولی۔

میں نے کہا "دیکھیے آپ سمجھدار لڑکی ہیں۔ اس طرح گلی میں بحث کرنا ٹھیک نہیں۔ کوئی جاگ جائے گا تو کیا کہے گا۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں مجھے جانے دو" اس نے باقاعدہ آگے بڑھنا چاہا۔

میں نے پھر اس کا بازو تھام لیا۔ وہ روہانسی ہو گئی اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ دبی آواز میں احتجاج بھی کر رہی تھی۔ ہماری کشمکش کے دوران میں ہی ایک قریبی چوبارے کی بتی روشن ہوئی اور گلی کی جانب والی کھڑکیاں کھل گئیں "کون ہے یہاں؟" ایک بھاری بھرکم آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی کچھ فاصلے سے سائیکل سوار چوکیدار کی سیٹی بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے نوابزادی کو واپس کوارٹر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "کیوں تماشا بنا رہی ہیں آپ۔ چلیں اندر چل کر بات کرتے ہیں۔"

میں اسے بمشکل کوارٹر تک لانے میں کامیاب ہو سکا۔ بیرونی دروازہ اندر سے بند کر کے میں نوابزادی کو کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی وہ مجھ پر پھٹ پڑی "تم کون ہوتے ہو میرے فیصلے کرنے والے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ ابھی اور اسی وقت یہاں سے جاؤں گی۔" اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور رنگ بھی سرخ گلابی ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "لیکن ہماری خطا تو بتائی جائے۔"

وہ بولی "تمہاری کوئی خطا نہیں۔"

میں نے کہا "تو پھر آپ کی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا "مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہو رہا ہے۔ اور نیند بھی یوں آ رہی ہے جیسے آندھی آئی ہے۔"

"حت۔۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"گستاخی معاف۔۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے نوابزادی صاحبہ کہ زیادہ گھنٹے پہلے جو چائے ہم نے پی تھی اس میں کوئی شے ملا دی گئی تھی۔ میرا مطلب ہے نیند کی گولی وغیرہ۔۔۔۔"

نوابزادی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ بولی "کیا تم مجھ پر الزام لگانا چاہ رہے ہو؟"

"نہیں محترمہ! میں تو صرف یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ اتنی رات گئے آپ کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ کچھ لوگ دن رات آپ کو تلاش کر رہے ہیں اور جونہی آپ ان کی نگاہ میں آئیں وہ سائے کی طرح آپ کا پیچھا کریں گے۔"

"اور ان لوگوں میں تم بھی شامل ہو" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "میں تم سب کی فطرت سے واقف ہوں۔ لالچی ہو تم سب۔۔۔۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی اپنا لالچ چھپائے رکھتا ہے اور کوئی ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں تم میرے پیچھے جگر کاں بنے تھے۔ کیا تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ تم دفینے کی تلاش میں نہیں ہو؟"

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "ہاں، میں ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں لالچی ہوں۔ انڈین گورنمنٹ کی کئی ایجنسیاں بھی دفینے کی تلاش میں ہیں۔ کیا آپ ان سب کو لالچی ہونے کا طعنہ دیں گی۔ لالچی ہونا اور بات ہے اور کسی گمشدہ چیز کی تلاش اور بات۔"

"چلو تم نے یہ تسلیم تو کیا کہ تم اس دفینے کی تلاش میں ہو۔"

"مجھے یہ تسلیم کرنا ہی تھا۔ اگر نہ کرتا تو آپ سے پوچھتا کیسے کہ وہ سب کچھ کہاں ہے؟"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ میں ان صندوقوں کے بارے میں جانتی ہوں؟"

"خیال نہیں یقین ہے۔ مرحوم نواب جس قدر آپ کے قریب تھے اور کسی کے نہیں تھے۔ اپنی موت سے قبل وہ آپ کو آگاہ کر چکے تھے کہ صندوق کہاں پہنچائے گئے ہیں۔"

نوابزادی کے چہرے پر زلزلے کے آثار اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "آخر دل کی بات تمہاری زبان پر آ ہی گئی۔"

میں نے کہا "میں نے یہ بات چھپانے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ دراصل پچھلے تین چار دن میں ایسی سنجیدہ گفتگو کے لیے وقت ہی نہیں مل سکا۔"

نوابزادی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اگر میں کہہ دوں کہ میں صندوقوں کے بارے میں جانتی ہوں تو کیا کرو گے تم؟"

"میں آپ سے درخواست کروں گا، مجھے اپنا شریکِ راز بنا لیں۔ کیونکہ آپ اکیلی ان صندوقوں کی حفاظت کر سکتی ہیں اور نہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق کسی کے سپرد کر سکتی ہیں۔ آپ جانتی نہیں کہ کیسے خون آشام لوگ آپ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تم اس سے پہلے بھی مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کر چکے ہو۔ میرا جواب حتمی اور آخری ہے۔ میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کروں گی۔"

"سوال آپ کی پسند، ناپسند کا نہیں۔ کچھ لوگ آپ کو مجبور کریں گے کہ آپ اس سلسلے میں بات کریں۔ بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آج کل زبان کھلوانے کے ایسے ایسے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں کہ پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ آپ تو ایک نازک سی لڑکی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن جو لوگ آپ کے پیچھے ہیں وہ اپنے شکار کو جینے دیتے ہیں اور نہ مرنے...... اور آپ یہ بات بھی اپنے ذہن سے نکال دیں کہ آپ ان سے کہیں چھپ سکیں گی۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو" نوابزادی شاہین لرزتی آواز میں بولی "میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں اور تم مجھے روک نہیں سکتے۔"

اچانک میری نگاہ چارپائی کی دوسری جانب تپائی پر پڑی۔ اس تپائی پر ایک کتاب رکھی تھی۔ کتاب کے نیچے ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار تپائی کی طرف بڑھا اور میں نے لفافہ کتاب کے نیچے سے نکال لیا۔ جونہی لفافہ میرے ہاتھ میں آیا نوابزادی شاہین مجھ پر جھپٹی۔ اس نے مجھ سے لفافہ چھیننے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر مجھ سے ہاتھا پائی کرنے لگی "چھوڑ دو اسے۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو" وہ میرے ہاتھ سے لفافہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ کیا کر رہی ہیں۔ ہوش کریں" میں نے اسے تنبیہ کی۔ پھر اس کی دونوں کلائیاں ایک ہی ہاتھ میں جکڑ لیں۔

نوابزادی شاہین ایک باوقار لڑکی تھی لیکن اس وقت انا بچگانہ حرکت کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دانتوں سے میرے ہاتھ کاٹا۔ درد کی شدید ٹیس اٹھی لیکن میں نے اس کی کلائیاں نہ چھوڑیں۔ وہ مایوس ہو کر پاؤں چلانے لگی۔ اس کے پاؤں میں سینڈل تھے۔ دو تین ٹھوکریں میری پنڈلی پر لگیں۔ میں نے ہلکا سا اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی چارپائی پر جا گری۔ میں نے جلدی سے نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

اس نے دو تین بار چیخ کر مجھے دروازہ کھولنے کا حکم دیا! خاموشی چھا گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ کر رونے لگی ہے...... رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ صفدر بیٹھک میں بے خبر سو رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ساتھ والے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ یقیناً وہ بھی خواب آور دوا زیر اثر تھا۔ بخشو بھی اپنی چارپائی پر موجود تھا اور مسلسل خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے ان میں سے کسی کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ بیٹھک میں جا کر میں نے وہ بند لفافہ دیکھا جو کتاب کے نیچے سے ملا تھا اور جس کے لیے نوابزادی نے مجھ سے ہاتھا پائی کی تھی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ لفافے پر میرا نام لکھا ہے۔ یقیناً یہ نوابزادی شاہین کی ہی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر درمیانے سائز کا ایک پرچہ نکلا۔ اس پر فونٹین پین سے لکھی ہوئی باریک اور نفیس سی تحریر موجود تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

لکھا تھا "مسٹر شاہ جہاں! بہت دنوں سے خواہش تھی کہ اپنے احساسات تم تک پہنچا سکوں، لیکن کوشش کے باوجود اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اب قدرت نے ایک اور موقع دیا ہے میں اس سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔

مسٹر شاہ جہاں! میں ٹھیک سے نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کن مقاصد کے تحت حیدرآباد آئے ہو، نہ تمہارے مذہب اور قومیت وغیرہ کے متعلق مجھے قابلِ بھروسا معلومات حاصل ہیں۔ پھر بھی نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں جانتی ہوں اور تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ شاید اس اپنائیت کی وجہ تمہارا سلوک ہے جو تم نے مجھ سے اغوا کے بعد کیا تھا۔ میں نے تم پر زیادتیاں کی تھیں اور پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ میں تمہارے رحم و کرم پر آ گئی۔ تم مجھ سے میری ہر زیادتی کا بدلہ لے سکتے تھے اور حالات تمہیں مجبور بھی کر رہے تھے کہ تم ایسا کرو۔ لیکن تم نے شرافت اور مردانگی کی مثال قائم کی۔ میں وہ رات زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ جب تم نے مجھے کپڑے پھاڑنے اور چیخنے چلانے کی ہدایت کی تھی تاکہ مجھے اغوا کرنے والے یقین کر لیں تم مجھ پر زیادتی کر رہے ہو۔ میں اس احسان کا بوجھ تا زندگی اپنے

جسم و جان پر محسوس کرتی رہوں گی۔ مسٹر شاہ جہاں! یہ میری پہلی اور آخری تحریر ہے۔ شاید آج کے بعد ہماری ملاقات کبھی نہ ہو۔ میں اپنے دل کی بات تم سے کہہ دینا چاہتی ہوں۔ تم وہ پہلے مرد ہو جس کے لیے میرا دل انوکھے انداز میں دھڑکا تھا۔ اگر میں نے ایک نارمل زندگی گزارنا ہوتی اور اپنے جیون ساتھی کے لیے کسی مرد کا انتخاب کرنا ہوتا تو یقین کرو، وہ مرد تم ہوتے۔ اس دعا کے ساتھ کہ جہاں رہو، خوش رہو، آباد رہو، اجازت چاہتی ہوں۔ میں بخشو کو تمہارے سپرد کیے جا رہی ہوں۔ امید ہے تم اسے بے سہارا نہیں رہنے دو گے۔

والسلام۔ شاہین شہریار"

خط کے مندرجات حیران کن تھے۔ صفدر نے مجھے نوابزادی شاہین کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کی تصدیق اس خط کے ذریعے ہو گئی تھی۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ نوابزادی شاہین نے اس خط میں ایک ایسی بات کہہ دی تھی جسے کہنا کسی لڑکی کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ نوابزادی شاہین یہ بات اس لیے کہہ گزری تھی کہ وہ اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اس کے خط سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے ارادے کہیں بہت دور نکل جانے کے تھے۔ اس نے سب کچھ منصوبہ بندی کے تحت کیا تھا۔ گھر چھوڑنے کے لیے اس نے آدھی رات کا وقت منتخب کیا تھا۔ میری اور صفدر کی چائے میں "سلیپنگ پلز" ملا دی تھیں تاکہ ہم چین کی نیند سوتے رہیں۔ اسے معمولی سا شبہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے فرار کے پروگرام پر عمل درآمد نہیں کر سکے گی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خط میں بے باکی موجود تھی۔

دو تین بار خط پڑھنے کے بعد میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ رات سوتے جاگتے میں گزر گئی۔ صبح صفدر نے اندرونی کمرے کے دروازے کو باہر سے مقفل دیکھا تو استفسار کیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے رات والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ نوابزادی کے گھر چھوڑنے کے بارے میں سن کر اسے بھی حیرانی ہوئی تاہم اس نے کہا، نوابزادی صاحبہ کی طرف سے یہ اقدام متوقع تھا۔ وہ جرگے سے بیزار ہیں اور ایک گمنام لڑکی کی حیثیت سے کہیں دور نکل جانا چاہتی ہیں۔ میں نے صفدر کو نوابزادی کے خط کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

صفدر ناشتا تیار کر کے نوابزادی والے کمرے کی طرف گیا تو پتا چلا کہ اس نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔ صفدر نے دستک دی اور کہا کہ وہ ناشتا لے کر آیا ہے۔ صفدر کے بار بار دستک دینے اور پکارنے کے باوجود نوابزادی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس نے کہا کہ وہ ناشتا کرنا ہی نہیں چاہتی۔ تھک ہار کر نوابزادی کے حصے کا ناشتا بھی میں نے اور صفدر نے زہر مار کیا۔ عجیب اتفاق تھا، بخشو، نوابزادی کو اپنے قریب نہ پا کر سخت پریشان تھا۔ اسے بھی بمشکل مطمئن کیا گیا اور ناشتا کرایا گیا۔

اسی کوارٹر میں ہم نے دو دن مزید گزار دیے۔ اسپتال میں ماسی عائشاں کی حالت قدرے بہتر تھی اور ڈاکٹروں نے مریضہ کی قوتِ مزاحمت پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ ڈاکٹروں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک مریضہ کی نہیں "ایک ماں" کی قوتِ مزاحمت ہے۔ ایسی ماں جس نے گوشت کے ایک بدصورت لوتھڑے کو اپنے دل کا ٹکڑا کہا ہے۔ اسے دودھ پلایا ہے، پالا پوسا ہے اور اب تک اس کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ وہ اسے بے سہارا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔

اخباری خبروں سے اردگرد کے حالات کا علم بھی ہو رہا تھا۔ حضرت گروجی کے جنازے کی باتصویر خبر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ اس تصادم کا ذکر بھی تھا جو حضرت گرو کے مشتعل چیلوں اور دو "مشتبہ" افراد کے درمیان ہائی وے پر ہوا تھا۔ لوڈر کے الٹنے اور ریلی میں کار کو آگ لگنے کا ذکر بھی اس خبر میں موجود تھا۔ ان واقعات میں حضرت گرو کے تین عقیدت مند (چیلے) شدید زخمی ہو گئے تھے۔

اڑتالیس گھنٹے گزرنے کے باوجود بند کمرے میں نوابزادی شاہین کی بھوک ہڑتال جاری تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تھا اور نہ کچھ کھایا پیا تھا۔ صفدر نے دو تین بار روشندان سے جھانکا تھا۔ وہ مرتبہ وہ مسہری پر لیٹی نظر آئی تھی۔ ایک مرتبہ کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔ تیسرے روز بھی یہ سلسلہ جاری رہتا تو نوابزادی کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں دیر تک سوچ بچار میں مصروف رہا۔ نوابزادی ہمدرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انا پرست اور طرحدار لڑکی بھی تھی۔ ایسے لوگوں کے منہ سے جو بات نکل جاتی ہے وہ اسے پورا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ نوابزادی دل میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ دفینے اور دفینے کے صندوقوں کی بابت کسی سے کوئی بات نہیں کرے گی۔ اب اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ بہت کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اپنی جان بھی گنوا دیتی۔ بعض لوگ بظاہر کمزور نظر آتے ہیں لیکن "اصول پرستی" پر اترتے ہیں تو ہر انتہا کو پار کر جاتے ہیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ نوابزادی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ میرے پاس دوسرا راستہ یہ تھا کہ نوابزادی کو حیلے وسیلے سے زبان کھولنے پر آمادہ کروں۔ اتفاقاً نوابزادی یہ اعتراف کر چکی تھی کہ اس کے دل میں میرے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے۔ اگر میں اس گوشے کو وسیع کر سکتا اور نوابزادی کو اعتماد میں لے سکتا تو ایک انتہائی مشکل کام آسانی سے اور احسن طریقے سے ہو سکتا تھا۔ میرا ارادہ نوابزادی کو دھوکا دینے کا نہیں تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جس راستے پر سرپٹ بھاگنا چاہ رہی ہے۔ وہ اسے خونخوار کتوں سے بھرے ہوئے جنگل میں لے جائے گا۔ یہ کتے اس کی خوبصورت زندگی کو پامال کریں گے اور پھر چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ نوابزادی کو اس انجام سے بچانے کے لیے اور نوادرات کو غلط ہاتھوں میں پہنچنے سے

روکنے کے لیے ضروری تھا کہ کسی بھی طریقے سے میں نوابزادی کو اپنے قریب رکھوں۔

دوپہر کے بعد میں نے کمرے کا بند دروازہ کھولنے کے لیے سیون ایم ایم استعمال کی۔ رائفل کے وزنی کندے سے ضربیں لگا کر میں نے دروازے کی بالائی چٹخنی توڑ دی اور اندر چلا گیا۔ میرے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ یہ کھانا صفدر نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ اس میں گندم کا دودھ والا دلیا تھا۔ مرغی کا پتلا شوربا تھا اور گرم چپاتی تھی۔

ظاہر ہے نوابزادی شاہین نے چٹخنی ٹوٹنے کی آوازیں سنی تھیں لیکن وہ مسہری پر بے حرکت پڑی تھی اور ایک بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ سینے کے زیروبم سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ میں نے ٹرے اس کے قریب تپائی پر رکھ دی "نوابزادی صاحبہ! آپ کھانا کھالیں" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ اپنی جگہ خاموش لیٹی رہی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور سمجھانے بجھانے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ کھانے سے اس کی کوئی دشمنی نہیں لہٰذا وہ اپنے پیٹ پر ظلم نہ کرے۔ بے شک کچھ معاملات الجھے ہوئے ہیں لیکن ہم انہیں مل بیٹھ کر طے کرلیں گے۔ نوابزادی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ "بھوک کا چوہا" اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کے معدے کو کھرچ رہا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہورہا تھا اور ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ جلد ہی اس کی مزاحمت کمزور پڑگئی۔ میں اسے کھانے پر آمادہ کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔ میں کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تاکہ وہ سہولت سے کھا سکے۔ جب میں واپس کمرے میں آیا تو وہ آخری نوالے لے رہی تھی۔

بلب کی روشنی میں وہ تصویر جیسی نظر آرہی تھی۔ زلفیں پریشان تھیں۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں اور گردن کے نیچے ہنسلی کی ہڈی نمایاں نظر آرہی تھی۔ میری موجودگی کو محسوس کرنے کے باوجود اس نے پلکیں نہیں اٹھائیں۔ منوں وزن پڑا ہوا تھا اس کی پلکوں پر..... یہ اس خط کا وزن تھا جو وہ مجھے لکھ بیٹھی تھی۔ یہ احساس خجالت بن کر اس کے چہرے پر چھایا ہوا تھا کہ وہ اپنی تحریر میں ایک ایسے جذبے کا اظہار کرچکی ہے جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کھانا ختم کرکے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا ریشمی لباس شکن شکن ہورہا تھا۔ اس نے کھینچ تان کر لباس کو ٹھکانے پر کیا۔ اپنے بکھرے بالوں کو جوڑے کی صورت باندھا اور باتھ روم میں جاکر ہاتھ منہ دھونے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلی تو کافی نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ اس کی پلکیں بدستور آنکھوں پر سایہ فگن تھیں اور وہ میری طرف سے رخ پھیر کر کھڑی تھی۔ اس کے خط کے لکھے ہوئے الفاظ جیسے آواز کے قالب میں ڈھل گئے تھے اور اس کمرے میں گونج رہے تھے "تم وہ پہلے مرد ہو جس کے لیے میرا دل انوکھے انداز میں دھڑکا تھا..... اگر میں نے ایک نارمل زندگی گزارنا ہوتی اور اپنے جیون ساتھی کے لیے کسی مرد کا انتخاب کرنا ہوتا تو یقین کرو وہ مرد تم ہوتے....."

وہ میری طرف سے رخ پھیرے پھیرے بولی "وہ لفافہ..... کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے؟"

"وہ مجھے واپس کردو" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لفافہ نکال لیا "لیکن لفافہ واپس کرنے کی ایک شرط ہوگی۔ بے تو گستاخی..... لیکن یہ شرط آپ کو ماننی پڑے گی۔"

"کیسی شرط؟" اس نے میری طرف گھوم کر کہا۔

وہ مجھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے ادھ کھلے ہونٹ چوم لیے..... وہ جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھوگئی تھی۔ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ میں نے اطمینان سے لفافہ اس کے سامنے تپائی پر رکھا اور الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

اگلے چوبیس گھنٹے تک نوابزادی سے آمنا سامنا نہیں ہوسکا۔ وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ردعمل چھپائے ہوئے ہے۔ میں کسی "نمن انجم" کی طرح اندازے لگانے میں مشغول تھا۔ وہ اب تک خاموش تھی۔ ممکن تھا کہ بہت سخت ردعمل کا اظہار کرتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا رویّہ نرم ہوتا۔ صفدر ہر گھڑی مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ شام کے وقت کہنے لگا "شہر جہاں صاحب! نوابزادی صاحبہ بہت بدلی بدلی نظر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے کوئی چال چلی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایک بڑا زبردست شک ہونے لگتا ہے۔"

"کیسا شک؟" میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

اس کی ذہین آنکھیں مسکرانے لگیں "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟"

"ہاں ہاں کہو۔"

وہ مسکراتے لہجے میں بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ نوابزادی صاحبہ نے مجھ سے اپنے جس محسن کا ذکر فرمایا تھا وہ آپ ہی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ نے بھی نوابزادی صاحبہ پر احسان کیا تھا اور انہیں سلجوق کے چنگل سے نکال لائے۔"

میں نے پوچھا "تمہیں کیسے شبہ ہوا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کا تذکرہ نوابزادی نے کیا تھا؟"

"اس کی کئی ایک وجوہات ہیں" صفدر نے کہا "پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔"

میں نے اس موقع پر بہتر سمجھا کہ صفدر کو اندھیرے میں نہ رکھا جائے۔ مختصراً الفاظ میں میں نے صفدر کو سارے معاملے سے آگاہ کردیا۔ اس گفتگو میں خط کا ذکر بھی آگیا۔ میں نے یہ سب کچھ سنجیدگی سے بیان کیا تھا۔ لہٰذا صفدر نے بھی پوری سنجیدگی سے سنا۔ وہ معاملہ فہم شخص تھا، جان گیا کہ لاابالی اور من موجی نوابزادی کو قابو میں رکھنے کے لیے میں نے مجبوراً یہ سب کچھ کیا ہے۔ (اور یہ تھا بھی سو فیصد حقیقت۔ میں نے جو کچھ کیا اس میں ہوسنائی سوز کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا)

نوابزادی کے ردعمل کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل رہا تھا تاہم اگلے روز صبح سویرے یہ ردعمل ظاہر ہوگیا۔ بیدار ہونے کے بعد میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو نوابزادی شاہین سامنے صحن میں ہی نظر آگئی۔ بخشو بھی اس کے قریب موجود تھا۔ وہ بخشو کو واپس کمرے میں لے جانے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ پہاڑ کا پہاڑ اپنی جگہ اڑا کھڑا تھا۔ اس کے بھیانک چہرے پر ضد کے تاثرات تھے۔ بخشو کا یوں صحن میں نکل آنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ اردگرد کے مکانات میں سے کوئی اسے دیکھ سکتا تھا۔ نوابزادی اسے واپس کمرے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ پھر وہ صفدر کو آوازیں دینے لگی "صفدر، صفدر! جلدی آؤ۔ یہ دیکھو کیا مصیبت کھڑی ہوگئی ہے۔"

اسی دوران میں صفدر بھی تولیے سے منہ پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔ دونوں بخشو کو اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ نوابزادی کے رویے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ نہ وہ برہم نظر آتی تھی اور نہ پریشان۔ بس عام سے موڈ میں تھی۔ یہ حوصلہ افزا اشارہ تھا۔ اس روز نوابزادی نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا اور کچھ دیر باتیں بھی کیں۔ تاہم وہ مجھ سے آنکھ چرا رہی تھی۔ ہماری گفتگو کا موضوع بخشو اور اس کی ماں تھا۔ بخشو کو قانون کے حوالے کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ باقی کی ساری زندگی جیل یا پاگل خانے میں گزار دیتا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ گنہگار نہیں۔ اس نے جو کچھ کیا، اپنی جان بچانے کے فطری عمل کے تحت کیا۔ وہ گرانڈیل اور طاقتور شخص تھا لیکن اس کا ذہن ایک بچے کے مانند تھا۔ ہم میں سے کوئی اسے حوالۂ قانون کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر کیا کیا جاتا؟ یہ بڑا گمبھیر اور غور طلب سوال تھا۔

دو تین روز میں وہ جھجک دور ہوگئی جو میرے اور نوابزادی کے درمیان پیدا ہوگئی تھی۔ ہم اکٹھے کھانا کھانے لگے اور بے تکلف ماحول میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی کبھی صفدر ہمیں جان بوجھ کر تنہا چھوڑ جاتا۔ ایسے میں، میں نوابزادی سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا اور اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ وہ تن تنہا روپوش ہونے کا بے معنی خیال دل سے نکال دے۔ میں اب اسے بے تکلفی سے شاہین کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اور وہ تو پہلے ہی مجھے میرے نام سے پکارتی تھی۔ تنہائی میں ہمارے درمیان کبھی کبھی کرنٹ لگ "قربت" کا بھی آجاتا۔ ایسے میں نوابزادی کی آنکھوں میں گہرے سرخ ڈورے تیر جاتے اور مجھے لگتا جیسے شدت جذبات سے اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے والا ہے۔

وہ مقناطیسی شخصیت کی مالک ایک گداز و شاداب لڑکی تھی۔ اس کے حسن کا سب سے اہم پہلو اس کا باوقار اور طرحدار ہونا تھا۔ جنگ، امن، محبت، نفرت، غم، خوشی غرض ہر حالت میں وہ نوابزادی ہی نظر آتی تھی۔ حیدرآباد دکن کی آب و ہوا میں صدیوں سے سفر کرنے والی وضع داری، شان و شوکت اور خوبصورتی نوابزادی شاہین میں موجود تھی۔ اس "روایت" میں یورپ کی "جدت" مل جانے سے ایک خوبصورت امتزاج بن گیا تھا۔ وہ شعلہ بدن ایک دو آتشہ شراب کی طرح ہوگئی تھی۔ لیکن افسوس، اس دو آتشہ شراب نے اپنے نشے کی پرکھ کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا تھا جس کے سینے میں دل کی جگہ ایک نیم جان لوتھڑا دھڑکتا تھا۔

وہ ایک خنک اور خوشگوار رات تھی۔ لیکن جب طبیعت ناساز ہو تو خوشگواری ناگواری میں بدل جاتی ہے۔ میں بھی دیر سے بستر پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا۔ صفدر نے دو تین دن مسلسل حلوا پوری کا ناشتا کرایا تھا۔ نتیجے میں گلا پکڑا گیا تھا اور نزلے بخار نے آلیا تھا۔ عام قسم کے نزلہ بخار کی میں نے کبھی پروا نہیں کی تھی لیکن یہ ذرا سخت جان قسم کا انفلوئنزا تھا۔ تیز بخار کے ساتھ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ لہٰذا میں سونے کے لیے جلدی لیٹ گیا تھا۔ مگر ابھی تک صرف کروٹیں ہی بدلی تھیں۔ اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی میرے پاس آن بیٹھا۔ میں نے سمجھا صفدر ہے لیکن وہ نوابزادی شاہین تھی۔ تاریکی میں اس کی موجودگی کا اندازہ مجھے چوڑیوں کی جھنکار سے ہوا۔

"کون؟ شاہین؟" میں نے پوچھا۔

"کیسے پتا چلا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"صفدر چوڑیاں نہیں پہنتا" میں نے کہا۔

"سر درد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری مرضی" میں نے جواب دیا۔

اس کی نرم گداز ٹھنڈی ہتھیلی میری پیشانی پر آٹکی۔ بخار کی غنودگی کے سبب مجھے نیند سی آنے لگی۔ نجانے میں کتنی دیر نیند کے جھونکے میں رہا۔ اچانک مجھے اپنے ہونٹوں پر گداز لمس کا احساس ہوا۔ نوابزادی شاہین مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا "کیوں بیماری مول لے رہی ہو۔ مجھے انفلوئنزا ہے۔"

وہ انگلش میں بولی "آئی وانٹ یور رولی انفلوئنزا۔"

"لیکن یہ میرا اپنا نہیں ہے۔ میں نے کسی سے ادھار لیا ہے۔"

"فی الوقت تو تمہارا ہے۔" وہ ذرا بیہودہ انداز میں بولی۔

کتنی ہی دیر اس کی تیز سانسیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اس کے ہونٹ میرے چہرے اور سینے پر گردش کرتے رہے۔ اس کی بے تاب سانسوں نے میری سانسوں کو بھی متحرک ہونے پر مجبور کردیا

تھا۔ وہ ٹوٹ کر پیار کرنے والی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میں نے اسے "رومانس" کی راہ دکھا کر کہیں کوئی بڑی مصیبت تو مول نہیں لے لی۔۔۔۔ کمرے کی گہری تاریکی میں نوابزادی میرے روبرو تھی۔ میں وہ بات کہنے میں آسانی محسوس کر رہا تھا جو پچھلے چار پانچ روز سے میری زبان پر آتے آتے رہ جاتی تھی۔ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا "شاہین! میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے دولت کا لالچ نہیں۔ اگر کوئی آزمائش کا وقت آیا تو تم دیکھو گی کہ میں اپنے دعوے میں کتنا سچا ہوں۔۔۔۔ اگر میں تم سے صندوقوں کے بارے میں پوچھتا ہوں تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ دولت غلط ہاتھوں میں جا کر برباد ہو۔۔۔۔" شاہین خاموشی سے سن رہی تھی۔ تاریکی کے سبب میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا "تمہیں ایک قابل اعتماد ہم راز کی ضرورت ہے شاہین۔۔۔ جو تمہاری پریشانیاں بانٹ سکے اور تمہارے ساتھ مل کر پیچیدہ مسائل کو سلجھا سکے۔ کہو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ خفا لہجے میں بولی۔

"تمہیں اپنی ضد چھوڑنا ہو گی شاہین" میں نے کہا "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ بے شک تمہارے پاپا نے وہ صندوق کہیں بہت محفوظ جگہ رکھوائے ہوں گے۔ لیکن تلاش کرنے والے انہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ بو کبر کتوں کی طرح اس علاقے کے چپے چپے میں ان کی بو سونگھ رہے ہیں۔"

"اچھا چھوڑو مجھے" وہ جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولی اور ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے جدا ہو گئی۔

"میری بات تو سنو" میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اب کمرے میں صرف وہ خوشبو رہ گئی تھی جو اس کے پیراہن اور جسم سے پھوٹ کر گرد و پیش میں جذب ہوئی تھی۔

بخار اور پریشانی کی شدت سے میرا سر پھٹنے لگا۔ شاہین کے رویے نے مجھے آزردہ کر دیا تھا۔ اگلے روز میں سارا دن اس بارے میں سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خدانخواستہ شاہین کو ورغلا رہا ہوں اور اس کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد پورے کرنا چاہتا ہوں۔ کم از کم شاہین کا ردعمل تو مجھے یہی احساس دلا رہا تھا۔ یہ ایک مایوس کن صورت حال تھی۔ میری نیک نیتی اور ارادوں کی سچائی شاہین پر مطلق اثر نہیں کر رہی تھی۔۔۔۔ رہا دوسرا راستہ یعنی سختی کا راستہ تو اب میرا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا کہ شاہین سے کسی بھی درجے کا سخت رویہ اختیار کروں۔ میں جانتا تھا کہ سخت رویے سے گریز سراسر جذباتیت ہے۔ جرم و سزا کی دنیا میں ایسی جذباتیت کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی مجھ پر ایسی جذباتیت (بلکہ نالائقی) غالب آ جاتی تھی۔

اگلے تین روز میں میں نے دو دفعہ مسٹر کلارک سے رابطہ کیا۔ وہ جلد سے جلد مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے لیکن میں ملنے کے ساتھ انہیں ٹال رہا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری خواہش کے مطابق ماسی عائشاں کا علاج بڑی توجہ سے ہو رہا ہے اور وہ روبہ صحت ہے۔ تاہم انہوں نے تنبیہہ کی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی مریضہ سے ملنے نہ آئے کیونکہ وہ پولیس کی خفیہ نگرانی میں ہے اور جو کوئی بھی اس کو دیکھنے آئے گا 'دھر لیا جائے گا'۔ تجرابدال کے بارے میں کلارک صاحب نے بتایا تھا کہ وہ اسے جیل سے ضمانت پر رہا کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔

نوابزادی شاہین کا معاملہ جوں کا توں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس لڑکی کو کیسے ہینڈل کیا جائے۔ وہ خطروں کی زد میں تھی۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اسے اپنے ساتھ رکھنے میں بھی فی الوقت کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ بات بھی پختہ ہو سکتی تھی کہ ہم اسے جیسے بے جا میں رکھے ہوئے ہیں۔ تین دن پہلے رات کے وقت جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد میں نے شاہین سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کھانا بھی منصور اور میں کچن میں ہی کھاتے رہے تھے۔ شاہین بھی زیادہ وقت بختو کے پاس کمرے میں گزارتی تھی۔ گھر کی فضا میں ایک گمبھیر خاموشی سی طاری تھی۔

وہ ایک سنسان اور گرم دوپہر تھی۔ منصور گوشت لینے بازار گیا ہوا تھا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ میں اس نے جو "ریسرچ" کی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ قسائی کی دکان سے اچھا گوشت صرف دوپہر کو ملتا ہے۔ کوالٹی اچھی ہوتی ہے اور وزن بھی پورا۔۔۔۔ بختو اندرونی کمرے میں سویا ہوا تھا۔ میں بیٹھک میں کرسی پر بیٹھا اپنا کولٹ پینتالیس پسٹل صاف کر رہا تھا۔ میری پشت دروازے کی طرف تھی۔ اچانک عقب سے قدموں کی نہایت مدھم چاپ سنائی دی۔ میں جان گیا کہ وہ نوابزادی شاہین ہے۔ اس نے پیچھے سے بازو میرے گلے میں حمائل کر دیے اور ٹھوڑی میرے سر پر ٹکا دی۔ اس کے جسم کا ایک تہائی بوجھ میرے کندھوں پر تھا "کیا بات ہے' ناراض ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں کچھ اتنا زیادہ نہیں" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پھر کتنے زیادہ ہو؟" وہ اٹھ کر میرے سامنے تپائی پر بیٹھ گئی۔

وہ ایک پھولدار ساری میں تھی۔ ریشمی بال ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندھے ہوئے تھے۔ ہیرے کی طرح طلائی ہار اس کے گلے میں تھا۔ اس میں ایک نہایت شاندار زمرد جڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا "شاہین! میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں کہ انسان آخر کیا گورکھ دھندا ہے۔ کبھی تو کسی پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرتا ہے اور کبھی ہزار بار آزمانے کے بعد بھی کسی پر بھروسا نہیں کرپاتا۔"

"کون تم پر بھروسا نہیں کر رہا؟"

"تم۔"

"یہ غلط ہے۔"

"یہ سچ ہے شاہین۔ اور کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ ہم

ایک دوسرے کو "خدا حافظ" کہہ دیں۔ جب اعتماد نہ ہو تو پھر ساتھ چلنے سے فائدہ؟"

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر تپائی سے اٹھ کر کرسی کے ہتھے پر آ بیٹھی۔ اس کی مسحور کن مہک میرے حواس پر چھانے لگی۔ اس نے بے باکی سے بانہیں میرے گلے میں حمائل کیں اور بولی "جانتے ہو نا کہ تمہیں چاہنے لگی ہوں۔ کٹھور مردوں کی طرح مجھے آزمائش میں ڈال رہے ہو۔ دیکھنا چاہتے ہو کہ۔۔۔۔ تمہاری محبت میں کہاں تک جا سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم بھول رہی ہو شاہین! ہمارے تعلق کا آغاز بعد میں ہوا تھا۔ میں نے پہلے دن ہی تم سے کہا تھا کہ تمہیں ایک قابل اعتبار رازدار کی ضرورت ہے اور اس رازدار کے بغیر تم بہت پچھتاؤ گی۔ بولو کہا تھا نا؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ چہرے پر غم آمیز سنجیدگی کے سائے لہرانے لگے تھے۔ اس نے بانہیں میرے گلے سے نکالیں اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے باہر دیوار کے ساتھ ساتھ موتیے اور گلاب کے پھول گملوں میں مہک رہے تھے۔ ڈھلتی دوپہر کی پرچھائیاں دھیرے دھیرے ان گملوں تک پہنچ رہی تھیں۔ محرابی کھڑکی میں چڑیا کا ایک جوڑا اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ نوابزادی دور کہیں خلا میں دیکھتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! اگر کوئی بہت پیاری۔۔۔۔ بہت ہی پیاری ہستی تم سے کوئی عہد لے اور تم دل و جان سے یہ ٹھان لو کہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہو گے۔ تو کیا مرنے سے پہلے اس عہد کو توڑنا قابل معافی ہو گا؟"

میں نے کہا "حالات کوئی جامد شے نہیں ہیں شاہین! وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے۔ قسموں وعدوں کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ ہمیں خود کو "ایڈجسٹ" کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عہد تو برقرار رہتا ہے لیکن عہد کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔"

شاہین نے کھڑکی کی طرف سے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کا رعب دار چہرہ تپا تپا نظر آتا تھا۔ آنکھوں میں "آنچ" کی سی کیفیت نظر آنے لگی "شاہ جہاں! میں اعتراف کرتی ہوں کہ پاپا جانی نے مجھے صندوقوں کے اصل ٹھکانے کے بارے میں بتایا تھا۔ اور میں نے عہد کیا تھا کہ اس راز کو بہر صورت اپنے تک محدود رکھوں گی۔ پاپا جانی وہ تمام دولت انڈین گورنمنٹ کے حوالے کر دینا چاہتے تھے۔ پاپا جانی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو میں ان کی خواہش پوری کروں گی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ دولت بھائی فیروز کے قبضے میں چلی جائے یا کچھ اور غلط ہاتھ اس پر پڑیں' میں اسے دہلی کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دوں گی۔"

مندرجہ بالا بات کہنے کے بعد نوابزادی کے ذہن سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا اور وہ تھکی تھکی سی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے کہا "شاہین! مجھے خوشی ہے کہ تم نے چپ کی مہر توڑی ہے۔ مجھے بار بار یہ کہنا اچھا نہیں لگ رہا کہ میں تمہارے اعتبار پر پورا اتروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے دعوؤں کا اصل گواہ وقت ہے۔ وہ جیسے پہلے یہ گواہی دیتا رہا ہے آئندہ بھی دے گا۔"

شاہین روہانسی آواز میں بولی "شاہ جہاں! کسی معاملے میں خاموش رہنا ہر فرد کا حق ہوتا ہے۔ کیا تم مجھے یہ رعایت دو گے؟ میرا مطلب ہے کہ اگر میں پاپا جانی سے کیے گئے وعدے کی پاسداری کرنا چاہوں تو۔۔۔۔"

میں نے کہا "میرا تم پر کوئی اختیار نہیں ہے شاہین! تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ لیکن ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے۔"

"کیا؟"

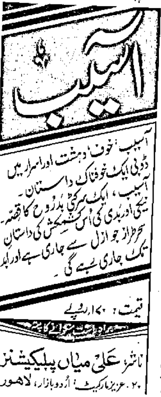

"اگر تم بغیر کسی مشورے کے اپنی سوچ کے مطابق چلو تو کیا کروگی؟"

وہ بولی "فی الحال میں اس معاملے کو بالکل چھیڑنا نہیں چاہتی۔ میری خواہش ہے کہ کچھ عرصہ نہایت خاموشی کے ساتھ کسی انجانے مقام پر گزار دوں۔ پھر جب حالات درست ہوں اور دفینے کی تلاش میں مصروف گروہ آرام سے بیٹھ جائیں تو میں اپنے پاپا کی آرزو پوری کردوں۔ وہ دولت انڈین گورنمنٹ کے حوالے کردوں۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "شاہین! مجھے تمہاری دونوں باتوں سے اتفاق نہیں۔ تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ صندوق تلاش کرنے والے لوگ تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اس محفوظ مقام تک پہنچ ہی جائیں گے جہاں نواب مرحوم نے انہیں چھپایا ہے۔ جس شدت سے یہ تلاش ہو رہی ہے۔ اس شدت سے تلاش کیا جائے تو سمندر سے سوئی بھی مل جاتی ہے۔ رہی بات "دفینہ" انڈین گورنمنٹ کو سونپنے والی تو میں معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ یہاں بھی تمہاری سوچ غلط ہے۔ تم یہ بات ذہن میں سے بالکل نکال دو کہ نواب مرحوم اس دولت کو انڈین گورنمنٹ کے خزانے میں جمع کرانا چاہتے تھے یا یہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کے خزانے میں جمع ہونے سے ہی وہ دولت حقداروں تک پہنچ سکے گی۔ میری ناقص رائے کے مطابق وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ وہ دولت غلط ہاتھوں میں نہ پہنچے اور اس کے لیے انسانی جانوں کا زیاں نہ ہو۔ ان کے ذہن میں فوری بات یہی آئی تھی کہ دفینہ اور اس کے نوادرات انڈین گورنمنٹ کو دے دیے جائیں۔ اگر ان کے پاس وقت ہوتا اور وہ تسلی سے سوچ بچار کرتے تو عین ممکن تھا کہ وہ اس دولت کو اپنی تحویل میں رکھ کر ایسے رفاہی کاموں میں لگاتے کہ ایک خلقت کی قسمت سنور جاتی یا خلقِ خدا کی بھلائی کا کوئی اور بڑا منصوبہ ان کے ذہن میں پرورش پا جاتا۔"

میں نوابزادی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میری بات اس کے دل کو لگ رہی تھی اور بات اتنی جلدی دل کو اسی وقت لگتی ہے جب سننے والے کے اپنے ذہن میں بھی وہ بات پہلے سے موجود ہوتی ہے۔

یکایک میں چونک گیا۔ میری نگاہ اس طلائی ہار پر تھی جو نوابزادی کے گلے میں حمائل رہتا تھا۔ اس ہار میں چھوٹے چھوٹے بہت خوبصورت آئینے لگے ہوئے تھے۔ مجھے ان آئینوں میں ایک شخص کی شبیہ نظر آئی۔ وہ کمرے کے دروازے کی جانب سے نمودار ہوا تھا۔ دروازے کی طرف میری پشت تھی۔ نوابزادی شاہین اسے دیکھ سکتی تھی لیکن وہ سر جھکائے نجانے کس خیال میں گم تھی۔ وہ شخص صفدر ہرگز نہیں تھا۔ کیونکہ صفدر یوں دبے پاؤں اندر نہ آتا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جو کولٹ پسٹل صاف کر رہا تھا وہ اب تیار حالت میں میرے سامنے پڑا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کیا میرے پاس اتنی مہلت ہے کہ میں اس پسٹل کو اٹھا سکوں اور اپنا رُخ نووارد کی طرف پھیر سکوں۔ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ ایسے سوالوں کے جواب "سوچنے" سے نہیں "کرنے" سے سمجھ میں آتے ہیں۔ بہرحال ایک بات کا تہیہ میں کر چکا تھا۔ میں اس نئے ہنگامے کی وجہ سے دفینے کا سراغ اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دوں گا۔ اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا ـــــ اس دفعہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

میری نگاہیں اس ننھے سے آئینے پر مرکوز تھیں جو دوسرے آئینوں کے ساتھ نوابزادی کے ہار میں چمک رہا تھا۔ نوابزادی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرایا۔ انگلیوں نے بے اختیار حرکت کی اور اس نے ساڑی کا ریشمی دامن تمام کر سینے پر پھیلا لیا "کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ جھکی جھکی نظروں سے بولی۔

حیرت کی بات تھی کہ وہ ابھی تک اس شخص کو نہیں دیکھ سکی تھی جو اس کے سامنے دروازے میں سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ داناؤں نے صحیح کہا ہے "کبھی کبھی عورت اپنے آپ میں یوں گم ہوتی ہے کہ اسے اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا" نوابزادی ایک ذہین اور چوکس لڑکی تھی لیکن ان لمحات میں اس پر سراسر نسائیت طاری تھی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ نووارد کا فاصلہ اب دس فٹ سے زیادہ نہیں۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا اور میری دونوں ٹانگیں سامنے دیوار پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ پوزیشن اس کارروائی کے لیے بہترین تھی۔ جو میں کرنے والا تھا۔ میں نے پاؤں کی مدد سے اپنے آپ کو زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ کرسی الٹ گئی اور میں کرسی سمیت گھسٹتا ہوا پیچھے کی طرف گیا۔ ایک لمحے میں "میں" نووارد کے قدموں میں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی ٹانگوں میں دے کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ ایک پُرشور آواز کے ساتھ پشت کے بل چِت فرش پر گرا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہوا کہ نووارد سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا تھا۔ جب وہ پشت کے بل گرا تو ٹریگر پر اس کی انگلی خود بخود دب گئی۔ فائر ہوا اور گولی چھت سے ٹکرا کر کسی طرف نکل گئی۔ اس پستول پر سائیلنسر لگا تھا لہٰذا آواز کمرے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی تھی۔ پستول کی آواز کے ساتھ ایک دوسری آواز بھی بلند ہوئی تھی۔ یہ نوابزادی شاہین کی دبی دبی چیخ تھی (چیخ کے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر شیشے کی ٹاپ والی میز پر گری تھی۔ شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اسے گولی وولی نہیں لگی تھی۔ وہ اپنی ہی ساڑی کے پلو میں الجھ گئی تھی۔) اس چیخ پر توجہ دیے بغیر میں تیزی سے پلٹا اور نووارد پر جست لگائی۔ وہ سفید کپڑوں میں ایک تنومند شخص تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پستول دیکھا اور سب سے پہلے اس پستول پر ہی جھپٹا مارا۔ اس کی پستول والی کلائی اپنی گرفت میں لے کر میں نے بازو کو اس طرح موڑا کہ پستول کا رخ ایک بار پھر چھت کی طرف ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے ہاتھ میں پکڑے کولٹ پسٹل کی سیاہ نال اس کی پیشانی سے لگادی "خبردار، کھوپڑی توڑ دوں گا۔"

میں نے سفاک لہجے میں دھمکی دی۔

اس نے زور لگا کر مچلنا چاہا لیکن ایک ہی لمحے میں یہ کوشش ترک کردی۔ میری آہنی گرفت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ مقابلہ آسان نہیں ہے۔ میں نے کولٹ پسٹل کا دباؤ اس کی پیشانی پر بڑھا دیا تو پیشانی کی کھال چھل گئی اور خون رسنے لگا "پستول چھوڑ دے کتے" میں نے پھر اسے وارننگ دی۔

اس مرتبہ وارننگ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اپنے پستول پر نووارد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کی کلائی زور سے جھٹک کر پستول اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ نوابزادی شاہین جلدی سے آگے بڑھی اور پستول اٹھا کر ایک گوشے میں سمٹ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور ساڑی کا پلو شانے سے ڈھلک گیا تھا۔

میں نے حملہ آور کو چھوڑا اور اسے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک اپنی کلائی کو سہلا رہا تھا۔ حملہ آور کا پستول دیکھتے ہی مجھے شک گزرا تھا کہ یہ سرکاری پستول ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس شخص کا تعلق پولیس یا کسی دوسری سرکاری ایجنسی سے ہو۔

"کون ہو تم؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"انسپکٹر رام ناتھ" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اس کا حلیہ، لباس اور بولنے کا انداز بھی اس کے دعوے کی تصدیق کر رہا تھا۔

"یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"یہ تم بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میں جو بھی کچھ جانتا ہوں اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میرے سوال کا جواب دو" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑی اور اطمینان سے بولا "ہماری تصدیق شدہ اطلاعات کے مطابق تین افراد کا قاتل خاور بخش عرف بخشو اس چاردیواری میں موجود ہے۔"

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے چہرے کا رنگ بھی بدلا ہوگا۔ حملہ آور خاص تھانیدارانہ نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اب پہلے صدمے سے سنبھل گیا تھا اور اس کے چہرے پر پیشانی کا تناؤ تک نہیں تھا۔ اگر وہ واقعی پولیس آفیسر تھا تو حیدرآباد کے چند گھاگ اور خرانٹ ترین آفیسرز میں سے ہوگا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قد چھ فٹ سے اٹھتا ہوا، رنگ گہرا سانولا۔ آنکھیں سانپ کی طرح چمکدار، جبڑا چوڑا، سینے اور بانہوں پر گھنے سیاہ بال۔ وہ سرتاپا ایک کرخت "پلیا" نظر آتا تھا۔

اس کا سکون و اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ پوری منصوبہ بندی سے اس چاردیواری میں گھسا ہے۔ عین ممکن تھا کہ صفدر کا یہ پُرسکون سا آشیانہ پولیس کے گھیرے میں ہو اور تھوڑی ہی دیر میں یہاں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے والی ہو۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" وہ بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ میرا پستول بدستور اس کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس پستول سے قطعی مرعوب نہیں تھا۔ میں نے کہا "معلوم نہیں تم کیا بھونک رہے ہو۔ ہم یہاں کسی قادر بخش کو نہیں جانتے۔"

"تمہارے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "ابھی تھوڑی دیر میں پولیس پارٹی یہاں پہنچے گی تو بھوسے کے ڈھیر سے تنکا بھی ڈھونڈ نکالے گی۔ وہ تو پھر سات فٹ کا دیو ہے۔"

"کہاں ہے تمہاری چھاپا مار پارٹی؟"

"میرے ساتھ آئی ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ مکان ہمارے گھیرے میں ہے۔"

اسی دوران میں بیرونی دروازے کی طرف سے صفدر کی آواز آئی۔ حسب عادت وہ اونچی آواز میں بولتا ہوا کمرے کی طرف آرہا تھا "یہ دیکھیے شاہ جہاں صاحب گوشت ـــــ ایسے لگتا ہے کہ چاندی کے ورق ہوں۔ اگر میں جنگلی ہوتا تو ایک دو بوٹیاں تو کچی کھا جاتا۔"

کمرے کی دہلیز پر پہنچتے ہی صفدر کی نگاہ اندر کے منظر پر پڑی اور وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئی تھیں۔

"آئیے آئیے صفدر صاحب" میں نے کہا "یہ دیکھیے آپ کے دولت کدے پر کیسے معزز مہمان تشریف لائے ہیں۔ بڑے انکسار ہیں۔ آنے کے ساتھ ہی مجھ سے لپٹ گئے تھے۔ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ تحفے تحائف بھی لائے ہیں۔ ایک تو یہ سائیلنسر لگا پستول ہے جو شاہین نے پکڑ رکھا ہے۔ فرما رہے ہیں کہ کچھ تحائف باہر بھی موجود ہیں۔ خدام اور درباری بھی ہیں۔ وہ باہر کھڑے ہیں اور اندر آنے کے لیے اجازت ملنے کے منتظر ہیں۔"

میری طرح صفدر نے بھی ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا کہ جو "معزز مہمان" سامنے کرسی پر بیٹھا ہے وہ انڈین پولیس کا کوئی پرکارہ ہے۔ اس نے کہا "میں اس بن بلائے مہمان کو نہیں جانتا۔ بہرحال مہمان "مہمان" ہی ہوتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میرے پہنچنے سے پہلے آپ اس کو چائے پانی پوچھ چکے ہیں۔ یہ اس کی پیشانی پر چندیا بھی شاید آپ نے ہی لگائی ہے۔"

"ہاں" یہاں میں نے پستول سے خوش آمدید کا بوسہ دیا تھا۔"

نوابزادی شاہین ڈری ڈری آواز میں بولی "آپ باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ اگر اس کے ساتھ عملہ بھی ہے تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"کیوں بے" عملہ بھی ہے تیرے ساتھ یا ہمیں صرف اُلو بنا رہا ہے؟" میں نے حملہ آور سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے" میں پاگل ہوں؟"

"تمہارے خیال کو چھوڑو" صفدر نے کہا "ہمارا خیال تو یہ بھی ہے کہ پاگلوں اور بے وقوفوں کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔"

شاہین روہانسی آواز میں بولی "یہ تم لوگ کیا فضول باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔ جاؤ صفدر باہر جا کر دیکھو۔ اگر مکان واقعی گھیرے میں ہے تو پتا چل جائے گا۔"

صفدر نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں بھئی' شاہین ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر مزید مہمان ہیں تو تصدیق ہونی چاہیے۔ آخر ہمیں روٹی پانی کا انتظام کرنا ہے۔"

صفدر نے گوشت والا لفافہ شیلف پر رکھا۔ قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور چیک کیا اور باہر نکل گیا۔ شاہین بھی باہر نکل گئی۔ وہ دروازے کی طرف گھومی تو میں نے دیکھا کہ اس کا بلاؤز خون سے تر ہے۔ جب وہ شیشے کی تپائی پر گری تو شیشے کا ٹکڑا اس کی کمر میں لگ گیا تھا۔ اب وہ یقیناً خود ہی مرہم پٹی کے لیے گئی تھی۔

صفدر کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں ہم خاموش ہی رہے تھے۔ صفدر نے کہا "آثار تو ٹھیک ہی دکھائی دیتے ہیں۔ نہ کوئی وردی والا مہمان نظر آتا ہے' نہ سفید پوش۔ کوئی مشکوک گاڑی بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

حملہ آور انسپکٹر غرایا "میں پھر کہتا ہوں کہ تم پولیس کے نرغے میں ہو۔ کسی قسم کی غلط حرکت تمہاری جان لے سکتی ہے اور میں تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ یا تو وہ سچ کہہ رہا تھا یا پھر بے حد مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور جھوٹ کو سچ کی طرح بولنے کا ہنر جانتا تھا۔ میں نے پوچھا "اگر تمہارے چمچے تمہارے ساتھ ہیں تو نظر کیوں نہیں آئے؟"

وہ بولا "تم اکیلے اس دنیا میں سیانے نہیں ہو۔ کچھ اور لوگ بھی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ میرے آدمی ارد گرد کے مکانوں میں موجود ہیں۔ جونہی انہیں یہاں گڑبڑ کا احساس ہوا وہ حرکت میں آجائیں گے۔" میں نے صفدر کو اشارہ کیا کہ وہ بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جائے۔ صفدر نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ نوابزادی شاہین اپنے زخم پر پٹی لگا کر اور ساڑی بدل کر آگئی تھی۔ میں نے نوابزادی سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں جائے اور دھیان رکھے۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گئی۔

دھیان رکھنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ وہ بخشو کا دھیان رکھے۔ انسپکٹر کی باتوں سے اس امر کا اشارہ مل رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے کسی قسم کی گنجائش پیدا کر سکتا ہے۔ وہ شکل وصورت سے دیانت دار نظر نہیں آتا تھا۔ اوپر سے پولیس والا بھی تھا۔ اس کی فربہ گردن' چربی دار توند اور نشیلی آنکھوں کے سرخ ڈوروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دنیا کی لذتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اور اس غلامی کے زیر اثر وہ ہاتھ پاؤں بچا کر کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ صفدر کو دیا' دوسرا انسپکٹر کی طرف بڑھایا۔ وہ اپنے رومال سے پیشانی کا خون پونچھتے ہوئے غرایا "میں یہاں سگریٹ پینے نہیں ملزم کو ہتھکڑیاں لگانے آیا ہوں۔ تھانے میں میرے خالہ زاد بھائی نہیں بیٹھے میرے افسر بیٹھے ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں میرا اور تمہارا۔"

میں نے کہا "سگریٹ تو پیو بادشاہو۔ کوئی نشہ وشہ نہیں ہے اس میں۔" "میں نہیں پیتا۔" وہ غرایا۔

"یعنی سادہ سگریٹ نہیں پیتے؟" صفدر نے پوچھا۔

"کوئی سی بھی نہیں پیتا" وہ دانت پیس کر بولا۔ اس کے منہ سے صفدر کے لیے گالی نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

میں نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کوئی معاملہ ہو سکتا ہے؟"

"میں تمہیں گدھے کا بچہ نظر آتا ہوں؟" وہ گرجا "کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔ رشوت دیتے ہو؟ یہ علیحدہ سے کیس بنے گا تم پر۔" اس کے ساتھ ہی اس نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے پستل سیدھا کیا "خبردار' زیادہ لفٹ مت لو۔ بیٹھے رہو اپنی جگہ۔" اس نے میرے تیور دیکھے اور ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

صفدر نے ملائمت سے کہا "بادشاہو! آپ تو ناراض ہی ہو گئے ہو۔ دیکھو جی یہ دنیا ہے۔ یہاں ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور ہر مرض کی دوا بھی اور پھر آپ جیسے لوگ تو مسیحا ہوتے ہیں۔ مردے کو زندہ کر دیتے ہیں۔"

"لیکن کسی کو زندہ کرنے کے لیے خود نہیں مر سکتے" انسپکٹر خشک لہجے میں بولا۔ "میرا دماغ خراب ہے کہ میں تمہارا بندہ چھوڑوں اور اس کی جگہ پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لوں؟ تم زیادہ بھولے بادشاہ بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ تہرے قتل کا کیس ہے۔ پورے علاقے کی پولیس دیوانی ہو رہی ہے ملزموں کے پیچھے۔ بڑی اوپر تک بات پہنچی ہوئی ہے۔ ملزم نے اب نہیں بچنا ہے۔ خواہ مخواہ میرا اور اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

"تو کیا کریں ہم؟" میں نے پوچھا۔

اس نے خود کو ایک بھاری بھرکم گالی دی اور بولا "یا میں پاگل ہوں' یا تمہارے دماغ کھسکے ہوئے ہیں۔ میں نے دس بار کہا ہے کہ مجھے باہر جانے دو۔ میں اپنے بندے اندر لے آؤں۔ گرفتاری تو تمہیں دینی ہے۔ شرافت سے بھی اور خوار ہو کر بھی۔"

صفدر نے انسپکٹر کے غصے کو جوتے کی نوک پر رکھا اور بڑے اطمینان سے کہا "ایک لاکھ میں کام بن سکتا ہے؟"

انسپکٹر نے صفدر کے الفاظ پر غور کیا اور اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ تاہم اس کا غیظ وغضب برقرار رہا اور وہ ہمیں مسلسل خشمگیں نگاہوں سے گھورتا رہا "ڈیڑھ لاکھ میں؟" میں نے قیمت بڑھائی۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"ڈھائی لاکھ؟" میں نے نعرہ دیا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو تم......؟" وہ منمنایا۔

"تین لاکھ؟" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

میں نے دیکھا انسپکٹر کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک میں ایک اور جھلک شامل ہونے لگی ہے۔ غالباً یہ حرص کی چمک تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے "چار لاکھ" کے بھاری بھرکم لفظ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔ سگریٹ سلگاتے وقت اس کے ہاتھوں کی لرزش نمایاں ہو گئی تھی۔ چار لاکھ کا سنسنی خیز ہندسہ ابھی تک دھماکے کی طرح کمرے میں گونج رہا تھا۔ دو تین گہرے کش لینے کے بعد انسپکٹر رام ناتھ کے چہرے کے تنے ہوئے پٹھے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ایک بدلا سا شخص نظر آنے لگا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "ملزم کہاں ہے؟"

"یہیں ہے ساتھ والے کمرے میں" میں نے جواب دیا۔

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"وہ زخمی ہے اور خواب آور گولی کھا کر گہری نیند سویا ہوا ہے۔ ویسے بھی تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

"تمہیں اپنی رقم سے غرض ہونی چاہیے" صفدر نے لقمہ دیا۔

انسپکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ناپ تول نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا اور دھیمی آواز میں بولا "جو رقم (رقم) تم بتا رہے ہو یہ بہت کم ہے۔ یہ تہرے قتل کا کیس ہے اور کم از کم تین افسر ایسے ہیں جو اس کیس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان تینوں کے منہ بند کرنے ہوں گے اور صرف اسی کے لیے چار لاکھ روپیہ درکار ہوں گے۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا "تم بتاؤ۔ کتنے میں یہ کام ہو سکتا ہے؟"

وہ کچھ دیر سوچ بچار میں مصروف رہا۔ اس کی نگاہیں سگریٹ کے روشن سرے پر تھیں۔ ایک کریہہ سی سنجیدگی چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ کہنے لگا "پہلے یہ بتاؤ کہ رقم ملے گی کیسے؟"

"کیش کی صورت میں" میں نے پورے اعتماد سے کہا "اور اسی جگہ' ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر۔"

"یعنی رقم اسی گھر میں ہے؟"

"نہیں۔ لیکن زیادہ دور بھی نہیں۔"

وہ بولا "اگر تم اپنے بندے کو بچانا چاہتے ہو تو اس کے لیے تمہیں سات لاکھ روپیہ دینا ہو گا۔ نہ ایک پیسہ کم نہ زیادہ۔"

"سات لاکھ؟" صفدر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "یہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"بڑی ہے یا چھوٹی۔ اس سے کم ایک پیسہ نہیں ہو گا۔"

"لیکن انسپکٹر۔ سات لاکھ؟" صفدر نے حیرت سے گنگ رہ جانے کی ایکٹنگ کی۔

"کچھ رعایت کرو بادشاہو" میں نے عاجزی سے کہا "اتنی پہلی نہیں ہماری۔"

"پہلی تو بہت ہے تمہاری۔ میں بھی انسپکٹر ہوں' کوئی گھسیارا نہیں ہوں۔ اپنی جو رقم میں نے تمہیں بتائی ہے یہ ساری میں نے اپنی پاکٹ میں نہیں ڈالنی۔ میرے حصے تو مشکل سے ساٹھ ستر ہزار روپیہ آنا ہے۔ باقی سب تقسیم (تقسیم) ہو جانا ہے۔"

میں نے انسپکٹر سے کہا "مجھے اور میرے ساتھی کو مشورے کے لیے پانچ دس منٹ چاہئیں۔"

"پانچ دس منٹ کی تو کوئی بات نہیں" انسپکٹر بولا "لیکن زیادہ وقت لو گے تو پھر کام مشکل ہو جائے گا۔ اگر میں آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر واپس ہیڈ کوارٹر نہ پہنچا تو ایس پی صاحب کے کان کھڑے ہو جائیں گے...... اور ہاں ایک بات اور ہے۔"

انسپکٹر نے شہادت کی انگلی میری طرف اٹھائی "کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا' ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے تمہیں۔"

میں صفدر کو لے کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ اس کمرے کی کھڑکی سے مکان کا عقبی کمرا بھی نظر آ رہا تھا۔ وہاں بخشو اور نوابزادی شاہین موجود تھے۔ بخشو حسب توقع سویا پڑا تھا۔ ڈری سہمی نوابزادی شاہین اس کے قریب اکڑوں بیٹھی تھی۔ میں نے صفدر سے پوچھا "ہاں بادشاہو! کیا خیال ہے اس مچھندر کے بارے میں؟"

صفدر بولا "بڑی کنی شے ہے یہ مچھندر۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہمیں چکر دے رہا ہے۔ یہ اکیلا یہاں آیا ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔ بہرحال ابھی اس کی تصدیق کر لیتے ہیں۔" "وہ کیسے؟"

"بڑی آسان ترکیب ہے۔ تم ایسا کرو کہ کوئی تار کھینچ کر ٹیلی فون "ڈیڈ" کر دو۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"جو ہو گا تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

صفدر نوابزادی والے کمرے میں گیا اور ٹیلی فون کے تار کھینچ دیا۔

میں نے کہا "صفدر بادشاہو! ابھی اس مچھندر کو یہ معلوم نہیں کہ حضرت گرو جی اور اس کے چیلے کی دنیا سے رخصتی ہماری وجہ سے ہوئی ہے۔ ورنہ وہ بخشو کی طرح ہمیں بھی گرفتار کرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگتا اور رشوت کی رقم بھی سات لاکھ سے بڑھ کر دس بارہ لاکھ ہو جاتی۔"

"ویسے بدبخت ہے بڑے مضبوط اعصاب کا۔ یا پھر واقعی اسے تحفظ حاصل ہے۔"

"کیسا تحفظ؟"

"ہو سکتا ہے یہاں آنے سے پہلے یہ مچھندر اپنے کسی اعلیٰ اف

کو بتا آیا ہوں۔ اگر آدھ پون گھنٹے تک یہ واپس نہ پہنچے تو وہ افسر نفری کے ساتھ اس مکان پر چڑھ دوڑے۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی خدشہ ہے۔"

ہم تین چار منٹ گفتگو میں مصروف رہے۔ اسی دوران میں انسپکٹر رام ناتھ بیٹھک میں سے آوازیں دینے لگا۔ وہ بڑی شدت سے ہماری واپسی کا منتظر تھا۔

میں نے بیٹھک میں واپس پہنچ کر انسپکٹر رام ناتھ سے کہا "ہمیں تمہاری شرط منظور ہے انسپکٹر! اگر تم چاہو تو ابھی تھوڑی دیر میں ہم تمہیں نصف رقم کیش کی صورت میں دے سکتے ہیں۔ باقی رقم اس وقت دی جائے گی جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ہمارے بندے کے خلاف کیس داخل دفتر ہو گیا ہے اور اب اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔"

"مجھے منظور ہے" انسپکٹر نے کہا "آدھی رقم کتنی دیر میں مل جائے گی؟"

"اس میں تھوڑا سا وقت لگے گا" میں نے معذرت کے لہجے میں کہا "ایک بج گیا ہے۔ بنک بند ہو گئے ہیں۔ ہمیں متبادل انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن پھر بھی دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ تین بجے تک رقم تمہارے ہاتھ میں ہو گی۔"

"دو گھنٹے کا وقت تو بہت زیادہ ہے۔"

"ساڑھے تین لاکھ رقم بھی تو کم نہیں" صفدر نے جواب دیا۔

"ٹھیک لیکن ایس پی صاحب تھانے سے روانہ ہو کر یہاں آ گئے تو معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

"تو تم جا کر انہیں صورت حال سے آگاہ کر دو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ مکان گھیرے میں ہے۔ مکان گھیرے میں ہے تو پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟ ہم بھاگنے سے تو رہے۔ تم اپنے عملے کو ہمارے بارے میں ہدایات دے جاؤ اور چلے جاؤ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"پھر کیا ہو سکتا ہے؟"

ایک دم انسپکٹر کے ذہن میں کوئی بات آئی' وہ بولا "یہاں ٹیلی فون ہے؟ میں ٹیلی فون پر بات کرتا ہوں۔"

"فون تو کل سے خراب پڑا ہے" میں نے جواب دیا۔

"او مائی فٹ" انسپکٹر نے دانت پیسے۔

"اپنے کسی اہلکار کو بھیج دو" میں نے تجویز پیش کی۔

انسپکٹر نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لیے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہمیں کیا جواب دے۔ اپنے جھوٹ کے جال میں وہ خود ہی پھنس گیا تھا۔ ہمارا یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا کہ وہ تن تنہا یہاں آیا ہے۔ اگر اس کے ساتھ عملہ ہوتا تو وہ ہمیں بغیر ان کے سپرد کر کے ہیڈ کوارٹرز چلا جاتا' یا اپنے کسی آدمی کو ہیڈ کوارٹرز بھیجتا تاکہ ایس پی صاحب کو تازہ صورت حال سے باخبر کیا جا سکے۔ لیکن اس کے ساتھ چڑیا کا بچہ بھی نہیں تھا لہٰذا وہ ہمیں چھوڑ کر جانے کا رسک نہیں لے رہا تھا۔ آخر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے' اگر ایس پی صاحب یہاں پہنچ گئے تو میں ان کو سنبھال لوں گا۔ تم رقم کا بندوبست کرو۔"

مجھے اب یقین ہو چلا تھا کہ انسپکٹر رام ناتھ نے ایس پی کے بارے میں بھی جھوٹ ہی بولا ہے۔ وہ اپنی سرکاری حیثیت کے زعم میں اکیلا یہاں گھس آیا تھا۔ نہ اس کے ساتھ نفری تھی اور نہ کسی اعلیٰ افسر کو خبر تھی کہ وہ کسی "شکار" پر گیا ہے۔ اب وہ ہمیں ذرا دھمکا کر ہم سے رقم اینٹھنا چاہ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ شکار کے چکر میں خود شکار ہونے والا ہے۔ غلطی سے اس نے تمک کو مصری کی ڈلی سمجھ کر منہ میں رکھ لیا تھا۔ میں نے اور صفدر نے پانچ دس منٹ تک انسپکٹر سے مزید گفتگو کی۔ اس کے بعد ہمیں اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا کہ وہ بالکل لاوارث ہے۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا۔ اس نے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ میرا اور انسپکٹر کا درمیانی فاصلہ دو قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا میں اس کے پہلو میں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے لپک کر انسپکٹر کی گردن عقب سے دبوچ لی۔ نرخرے پر دباؤ پڑا تو انسپکٹر کا منہ کھلا رہ گیا۔ صفدر نے پھرتی سے اس کھلے منہ میں ایک پرانا نیپکن ٹھونس دیا اور پھر اوپر سے فرش صاف کرنے والے کپڑے کی پٹی پھاڑ کر باندھ دی۔ اس دوران میں، میں انسپکٹر کے ہاتھ پشت پر باندھ چکا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی بیلٹ استعمال کی تھی۔

اگلے پانچ دس منٹ میں ہم نے انسپکٹر رام ناتھ کو ایسے ہی استعمال کیا جیسے کک باکسر سینڈ بیگ کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے گھونسوں اور ٹھوکروں سے بچنے کے لیے پورے کمرے میں گیند کی طرح لڑھکتا پھرتا تھا لیکن اماں کہیں نہیں تھی۔ اس کے چہرے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون رس رہا تھا۔ صفدر بڑے موڈ میں تھا اور اسے پیٹنے کے ساتھ ساتھ بولتا بھی جا رہا تھا "اور یہ ٹھوکر پسلیوں میں...... پندرہ ہزار سے کم کیا ہو گی...... اور یہ دوہتڑ بیس ہزار کا...... کل ملا کے ہو گئے دو لاکھ اسی ہزار۔ بولو باقی کتنے رہ گئے؟"

وہ حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ یقیناً ہمیں حساب نہیں بتا رہا تھا۔ نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ صفدر نے آخری دو جھانپڑ اسے دس دس ہزار کے مارے اور ساڑھے تین لاکھ برابر کر دیے۔

انسپکٹر کے منہ سے نیپکن نکالا گیا تو وہ نیم بے ہوش تھا "پانی" اس کے حلق سے تھکی تھکی آواز نکلی۔

صفدر بولا "ہمیں نے سنا ہے جب کوئی لاوارث حوالاتی مار کھا کر پانی مانگتا ہے تو تم اسے پیشاب پلا دیتے ہو۔ بہرحال ہم ایسی بے ہودگی نہیں کریں گے۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ لو پانی۔"

اس نے جگ میں سے پانی اپنے جوتے میں انڈیلا اور انسپکٹر کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بلا تردد پانی پینے لگا۔ بے ضمیر لوگوں کی آن بان اور قوت مزاحمت ایسے ہی چھٹ پٹ مسمار ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک راشی پولیس آفیسر تھا۔ بدکاری اور حرام خوری اس کے چہرے پر درج تھی۔ ہماری مار پیٹ سے اس کی قمیص پھٹ گئی تھی اور توند کی وجہ سے وہ ایک مجسم تخمینہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا خون آلود چہرہ اوپر اٹھایا' لمبی مونچھیں پانی میں بھیگ کر نیچے کو لٹک گئی تھیں اور تھوڑی خون آلود تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ہمارے ٹھکانے تک کیوں کر اور کیسے پہنچا؟

اس سوال کے جواب میں انسپکٹر نے جو طویل بیان دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ حیدر آباد کے کئی علاقوں میں تہرے قتل کے مجیب الثقت ملزم کی تلاش جاری ہے۔ اس علاقے میں تلاشی کی ذمہ داری ہیڈ کوارٹرز کے چند اہلکاروں پر تھی۔ انسپکٹر رام ناتھ کا اس تلاش سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ ایک اتفاق کے تحت وہ اس تلاش میں شامل ہو گیا تھا۔ انسپکٹر رام ناتھ اسی گلی میں چار پانچ مکان چھوڑ کر رہتا تھا۔ بدھ کو رات گئے وہ ڈیوٹی سے واپس آیا۔ اپنے چوبارے پر سے اس نے ہمارے گھر کے صحن میں جھانکا تو ایک دبو ہیکل ہیولا اسے نظر آیا۔ وہ ٹھٹک گیا اور گہری نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ اسے یوں لگا کہ ایک گرانڈیل شخص نے اپنے سر پر بہت بڑا پگڑ باندھ رکھا ہے۔ پھر اسے ایک لڑکی نظر آئی جو اس ہیولے کو کھینچ کر واپس کمرے میں لے جانا چاہ رہی تھی۔ اس منظر نے انسپکٹر رام ناتھ کے ذہن میں عجیب سا شک جگا دیا۔ اس نے اپنی پتنی سے پوچھا کہ نکڑ والے مکان میں کون لوگ آئے ہیں۔ پتنی بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی۔ انسپکٹر رام ناتھ نے چپکے چپکے ٹوہ لینا شروع کی اور اسے اندازہ ہوا کہ اس چار دیواری میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اصولی طور پر اسے افسران اعلیٰ کو اطلاع دینا چاہیے تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ اگر افسران اعلیٰ کو اطلاع دی تو وہ ملزم کی گرفتاری کا سارا کریڈٹ خود لے جائیں گے۔ اس نے تن تنہا یہ معرکہ مارنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا لیکن پھر ہمارے شکنجے میں آ گیا۔

صفدر ایک کائیاں شخص تھا۔ وہ تین چار روز پیشتر سویرے کے بغیر ہی ایک مکان تلاش کر چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ موجودہ حالات میں ہمیں متبادل پناہ گاہ ڈھونڈ کر رکھنی چاہیے۔ اس کی یہ احتیاط اس وقت ہمارے کام آئی تھی۔ بہتر تو یہی تھا کہ ہم فوراً یہاں سے نکل جاتے لیکن مسئلہ سواری کا تھا اور سواری سے بھی زیادہ بخشو کا تھا۔ سواری مل بھی جاتی تو ہم دن دہاڑے بخشو کو چار دیواری سے باہر کیسے لاتے۔ نظر پڑتے ہی اسے دیکھتے تو ملی مچ جاتی۔ ٹیکسی والا تو شاید ٹیکسی چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ وہ ایک مفرور قاتل تھا اور ایسا مفرور قاتل جو اپنی پہچان آپ تھا۔ جو پہلا شخص اسے دیکھتا' پکار اٹھتا' یہ جا رہا ہے تہرے قتل کا مجرم۔

ہم نے انسپکٹر رام ناتھ کی مشکیں اچھی طرح کس کے اور منہ میں کپڑا وغیرہ ٹھونس کر ایک غسل خانے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے اطمینان سے مشورہ کیا۔ اس مشورے میں نواب زادی شاہین بھی شریک تھی۔ فیصلہ ہوا کہ ہم شام کے بعد مکان چھوڑیں' شام سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے صفدر سواری کی تلاش میں نکل جائے اور کوئی مناسب سی سواری "اغوا" کر کے لے آئے۔ صفدر جیسے مہم جو شخص کے لیے سواری "اغوا" کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا..... اور اس نے یہ ثابت بھی کر دیا۔ جب شام کا جھٹپٹا تاریکی میں بدل رہا تھا' مکان کے دروازے پر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر گلی میں جھانکا۔ ایک اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر صفدر براجمان تھا۔ پانچ منٹ کے اندر ہم اپنے ضروری سامان کے ساتھ ویگن میں منتقل ہو چکے تھے۔ اس ضروری سامان میں وہ بلٹ پروف جیکٹ بھی شامل تھی جو ہم نے چند روز پیشتر جگر گاں کے نواح میں ایک پولیس اہلکار سے چھینی تھی۔ بخشو کو باہر لاتے ہوئے خاص احتیاط کی گئی۔ ویگن میں اسے دو نشستوں کے درمیانی خلا میں لٹا دیا گیا۔ نواب زادی شاہین نے اپنی ایک چادر اس پر ڈال دی۔ جہاں بخشو کو لٹایا گیا تھا وہاں مجھے ایک خوب صورت زنانہ گھڑی بھی پڑی نظر آئی۔ اس کا اسٹریپ ٹوٹا ہوا تھا۔ اس گھڑی کی موجودگی کی وجہ مجھے بعد ازاں صفدر کی زبانی معلوم ہوئی۔

چھوٹی موٹی سڑکوں اور گلیوں میں نصف گھنٹے کے اعصاب شکن سفر کے بعد ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ فیشن ایبل آبادی میں یہ دس بارہ مرلے کی خوب صورت سی کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے سامنے وسیع و عریض پارک تھا۔ صفدر نے گاڑی سے اتر کر کوٹھی کے گیٹ کا تالا کھولا اور ہمیں گاڑی سمیت اندر پہنچا دیا۔

"یہ لیجیے صاحبان' چابیاں اور اس نئے گھر کو آباد کیجیے" اس نے چابیوں کا گچھا مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس مصیبت سے جان چھڑانے" صفدر نے اسٹیشن ویگن کی طرف اشارہ کیا۔ راستے میں اس نے ہمیں ویگن کے "اغوا" کی تفصیلی کہانی سنا دی تھی۔ اس نئی نویلی ویگن کا شکار صفدر نے ہرجنس روڈ کی ایک نیلی سڑک پر کیا تھا۔ ویگن ایک سنسان جگہ درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ صفدر نے سوچا "واردات" کرنے کے لیے جگہ اور یہ گاڑی موزوں ترین ہے۔ ویگن کے قریب پہنچ کر اس نے مقفل دروازوں پر طبع آزمائی کی۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ ویگن کے اندر کوئی موجود ہے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے وہ

ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے ویگن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خوفزدہ صورت والے نوجوان کا چہرہ نظر آیا۔ نوجوان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کی لپ اسٹک ہونٹوں سے پھسل کر گردن اور رخساروں تک چلی گئی تھی۔ جونہی نوجوان نے شیشہ نیچے کیا، صفدر پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ نوجوان جوڑے نے سمجھا کہ ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے والا خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ وہ دونوں اس کے آگے ہاتھ جوڑنے اور منتیں سماجتیں کرنے لگے۔ صفدر نے ان دونوں کو یہ سزا دی کہ انہیں ان کی گاڑی سے محروم کردیا۔ اب وہ یہ گاڑی کسی سنسان جگہ کھڑی کرنے کے لیے واپس جارہا تھا۔ نشستوں کے نیچے سے جو گھڑی ملی تھی وہ اسی لڑکی کی تھی جو اپنے ساتھی کے ساتھ کچھ "اچھا" وقت گزار رہی تھی۔

صفدر کے جانے کے بعد ہم نے بخشو کو تو ایک کمرے میں بھیج دیا اور خود گھوم پھر کر نئے گھر کا جائزہ لینے لگے۔ تین بیڈ روم، امریکن اسٹائل کا خوب صورت کچن، ٹی وی لاؤنج اور بالائی منزل پر ایک شیشے کا کمرا یعنی "گلاس روم" یہ تھی اس کوٹھی کی تفصیل۔ سب کچھ نہایت آراستہ اور رہائش کے لیے بالکل تیار تھا۔ کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہ شاہین کی پشت پر پڑی۔ دونوں کندھوں کے درمیان بلاؤز پر خون کا داغ نظر آرہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شیشے کے ٹکڑے سے لگنے والا زخم ابھی رس رہا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے اس کی پشت ایک آئینے کی طرف کردی۔ وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے سے پریشانی مترشح ہوگئی۔ میں نے کہا "چلو آؤ میں ٹھیک سے پٹی کردوں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی پھر ذرا شرما کر بولی "نہیں۔ مجھے نہیں کرانی پٹی۔"

"تو پھر؟"

"خون ہی بند ہوجائے گا نا۔"

"ظاہر ہے جب سارا نکل جائے گا تو بند ہوجائے گا..... کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ چلو اندر۔" میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

وہ چند لمحے کشمکش میں رہنے کے بعد میرے ساتھ اندر آگئی۔ ہمارے سامان میں فرسٹ ایڈ باکس موجود تھا۔ اسی باکس کی مدد سے ہم نے چند روز پہلے بخشو کی مرہم پٹی کی تھی۔ "مجھے شرم آرہی ہے" نوابزادی شاہین نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں شرمانے کی" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "اس وقت تم مریض ہو اور میری حیثیت ڈاکٹر کی ہے بلکہ لیڈی ڈاکٹر کی۔"

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کے بلاؤز کی زپ کھول کر میں نے پشت سے کپڑا ہٹایا۔ شیشے کے ٹکڑے سے تقریباً دو انچ لمبا کٹ لگا ہوا تھا؛ بظاہر کٹ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ شاید کوئی رگ وغیرہ کٹ گئی تھی۔ بہرحال اسٹیچنگ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کاٹن اسپرٹ سے خون صاف کرنے کے بعد پاؤڈر چھڑک دیا۔ اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھلا اور روہیلا بخشو نے اندر جھانکا۔ مجھے اور شاہین کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وسیع و عریض چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا ہے۔ غالباً اس نے میری اور شاہین کی موجودگی سے کوئی غلط مطلب لیا تھا۔ شاہین جلدی سے اپنا بلاؤز درست کیا اور ساڑی کے پلو سے کندھے ڈھانپ لیے۔ بخشو کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ میں ان آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور کدورت صاف دیکھ رہا تھا۔ وہ دو قدم چل کر اندر آگیا۔ اس کے رال میں لتھڑے ہوئے ہونٹ عجیب سے انداز میں بھنچ گئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ حیوانی انداز میں مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ یقیناً شاہین نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔ وہ جلدی سے ہم دونوں کے درمیان آگئی "بخشو کیا بات ہے؟" اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

بخشو کے حلق سے غوں غاں کی پرطیش آوازیں نکلنے لگیں۔

"کچھ نہیں ہے بخشو۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ تم" وہ اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

بخشو اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جما کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے پیوست تھیں۔ شاہین نے اسے ذرا زور سے دھکیلا اور دروازے سے باہر نکال کر لے گئی۔ میں کرسی پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر تک ساتھ والے کمرے سے شاہین کی باتوں کی آواز اور بخشو کی غوں غاں سنائی دیتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں شاہین مسکراتی ہوئی واپس آگئی۔

"پاگل ہے" اس نے بخشو کے رویے پر تبصرہ کیا۔

"ویسے اتنا پاگل بھی نہیں" میں نے کہا۔

شاہین کے چہرے پر حیا کی سرخی لہرا گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ شرم و حیا کا تاثر شاہین کے باوقار انداز میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ بے شک وہ چنچل تھی۔ ہنسی مسکراتی تھی۔ موڈ خوشگوار ہوتا تو چھیڑ چھاڑ بھی کرتی تھی۔ لیکن ہر انداز میں نوابزادی ہی نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے خط میں مجھ سے محبت کا اقرار کیا تھا اور بعد میں زبان سے بھی کہہ چکی تھی کہ اس نے اپنا دل ہار دیا ہے لیکن اس کی ہار میں بھی رکھ رکھاؤ اور نوابی طمطراق موجود تھا۔ کچھ دیر ہم دونوں بخشو کے رویے پر ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔ میں نے کہا "بھئی بڑا غصیلا ہے تمہارا بھائی۔ اگر اس جیسے دو تین بھائی اور ہوتے تو ساری زندگی تمہاری شادی نہ ہونے دیتے۔"

وہ بولی "غصیلا تو واقعی بہت ہے۔ اشاروں سے بتا رہا تھا کہ مجھے ہاتھ لگانے والے کا سر توڑ دے گا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں تمہارے پاس نہ جایا کروں...... میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ایسا کچھ نہیں، وہ میری مرہم پٹی کررہے تھے۔"

○☆○

اس نئے مکان میں ہم نے دو ہفتے نہایت خاموشی سے گزار لیے۔ چند روز حضرت گروجی کے قتل کا شور شرابا رہا پھر یہ خبریں دوسری خبروں کے انبار میں دب کر ختم ہوگئیں۔ تاہم جگر گاں میں ہونے والے تین پراسرار قتل ابھی تک اخباری سرخیوں کا موضوع تھے۔ جھاڑ پھونک کرنے والے عاملوں سے لے کر اعلیٰ پولیس افسروں تک بہت سے لوگ اس مسئلے کو حل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اس معمے کا واحد سراغ بخشو کی ماں تھی جو ابھی تک سرکاری اسپتال میں زیر علاج تھی۔ پولیس اسی انتظار میں تھی کہ یہ ماں نشاں صحت یاب ہو اور اسے تشدد کی چکی میں پیس کر اس کے بیٹے کے بارے میں معلوم کیا جاسکے۔ اخبارات میں بخشو کی تصویر بھی شائع ہوچکی تھی۔ اس تصویر کی اشاعت کے بعد حیدرآباد کے مضافاتی علاقوں میں لوگوں کا خوف و ہراس قدرے کم ہوگیا تھا۔ بہرحال اب بھی بہت سے سادہ لوح ایسے تھے جو ان اموات کے لیے جنات اور ہوائی چیزوں کو ذمے دار قرار دے رہے تھے۔

میں جانتا تھا کہ مسٹر جی کلاوک اور مجتبیٰ کنو سمیت تمام حضرات میرے لیے بہت پریشان ہوں گے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انتظار میں تڑپ رہے ہوں گے۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں سے رابطے کا مطلب یہ تھا کہ نوابزادی شاہین کے بارے میں انہیں بتادیا جاتا۔ اور اگر نوابزادی کے بارے میں انہیں بتادیا جاتا تو پھر سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ نوابزادی اس کھیل کا سب سے اہم مہرہ تھی اور مجھے ہر حال میں اس مہرے کو پٹنے سے بچانا تھا۔

میں، شاہین اور بخشو اپنا تمام تر وقت گھر کی چار دیواری میں گزار رہے تھے۔ صرف صفدر باہر نکلتا تھا اور وہ بھی اشد ضرورت کے وقت۔ ہم سارا دن ٹی وی دیکھتے، اخبار پڑھتے اور عقبی لان میں بیڈمنٹن وغیرہ کھیلتے۔ صفدر مطالعے کا شوقین تھا۔ وہ اکثر کوئی موٹی سی انگلش کتاب لے کر کمرے میں گھس جاتا اور گھنٹوں باہر نہ نکلتا۔ یوں اس کے دو مقاصد پورے ہوجاتے۔ ایک تو وہ مطالعہ کرلیتا، دوسرے مجھے اور شاہین کو مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ میرے اور شاہین کے درمیان تکلف کی بہت سی دیواریں ڈھے چکی تھیں۔ ہم آزادانہ ہنسی مذاق کرلیتے تھے۔ ایک افسردہ اور بجھی بجھی سی آدم بیزار نوابزادی کے اندر سے ایک زندہ دل اور شوخ و شنگ لڑکی برآمد ہورہی تھی۔ چند ماہ پہلے کی وہی لڑکی جو اپنی وسیع و عریض حویلی میں جوگنگ کیا کرتی اور ٹھٹھے بکھیرا کرتی تھی۔ اب وہ نوابزادی میری ضروریات کا عمدہ خیال رکھتی۔ میرے کپڑے استری کرتی، میرا کمرا ٹھیک کرتی اور میرے منع کرنے کے باوجود میرے لیے کھانا پکانے کچن میں گھس جاتی۔ کچن میں اس کا برا حال ہوتا تھا۔ کبھی انگلی جل گئی، کبھی دوپٹے کو آگ لگ گئی، کبھی چھری نے چرکا دے ڈالا اور کبھی ہنڈیا الٹ گئی۔ لیکن اس پر جیسے جنون سا سوار تھا کہ وہ کھانا پکانا سیکھے گی اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر امور خانہ داری بھی..... میرے اور صفدر کے چار پانچ کپڑے جلانے کے بعد اسے بری بھلی استری کرنا تو آگئی تھی لیکن سینا پرونا اسے قیامت تک نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا کوئی بٹن وغیرہ ٹانکنا ہوتا تو جب صفدر خود ٹانکتے۔ کپڑے دھونے کی ذمے داری صفدر نے کلی طور اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ نوابزادی کی نظر بچا کر جھاڑ پونچھ بھی کر دیتا تھا۔

کبھی ہم تنہا ہوتے اور نوابزادی رومانی موڈ میں ہوتی تو بڑی بے باکی کا مظاہرہ کرتی۔ ایسے میں مجھے بھی جوابی گرمجوشی دکھانا پڑتی۔ وہ ایک ایسی ہی دل فریب شام تھی۔ ہم بالائی منزل پر گلاس روم میں تھے۔ چاروں طرف گلابی مخمل کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ صرف سامنے کی طرف تھوڑا سا پردہ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔ اس خلا میں سے صحن، سڑک اور پارک کا منظر نظر آرہا تھا۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھائے تھے۔ رہ رہ کر اس سیاہی میں برق تڑپتی تھی اور نشیب و فراز جھلملا جاتے تھے۔ کمرے کے ریشمی اندھیرے میں شاہین اور میں ایک دوسرے میں گم تھے۔ وہ کسی شاخ شاخ بیل کی طرح میری بانہوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کی مہکی سانسیں اس امنگ ترنگ کا سراغ دے رہی تھیں، جو مجھ سے مل کر اس کے مردہ تن میں جاگ اٹھتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم مجھ سے دور ہٹ گئی۔ بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے سراپا میں دوڑتی ہوئی کوئی برقی رو ایک دم منقطع ہوگئی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شاہ جہاں! تم پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہوتے ہو۔ ہزاروں میل دور۔ ایسا کیوں ہوتا ہے شاہ جہاں؟"

"تم بہت وہمی ہو" میں نے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔

"نہیں شاہ جہاں! مجھے بتاؤ نا۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے؟ کیا یہ میرا دھوکا ہے؟"

میں صوفے سے اٹھ کر بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ شاہین میرے نزدیک کرسی پر آبیٹھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ میرے دل پر بوجھ سا تھا اور یہ بوجھ پچھلے کئی دنوں سے موجود تھا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس بوجھ میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوجاتا تھا۔ میں جب اپنے لیے شاہین کا والہانہ پن دیکھتا تھا اور اس کی پرجوش محبت کی شدت مجھ پر اثر انداز ہوتی تھی تو دل میں کسک سی جاگ جاتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں نوابزادی سے محبت نہیں کررہا۔ اس کے باوجود اس کی حوصلہ افزائی کررہا ہوں بلکہ اس کی بے تابیوں کو بڑھاوا دے رہا ہوں۔ بے شک یہ مجبوری تھی لیکن اس مجبوری کو جھوٹ کے لیے جواز نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ میں کوئی ایسا راست گو انسان نہیں تھا۔ میں نے بڑے بڑے چالبازوں کی چالوں کا توڑ جوابی

چالوں سے کیا تھا۔ بڑے بڑے شاطروں کو ان کی پسندیدہ بساط پر مات دی تھی اور اب بھی دے رہا تھا لیکن۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ کسی شخص کے سچے اور کھرے جذبات کو کھلونا بناؤں۔ ایسے معاملات میں میں خود کو کمزور ترین شخص محسوس کرنے لگتا تھا۔

میں نے نگاہ اس روم کی نیم تیرگی میں شاہین کا ملیح چہرہ دیکھا اور میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا "شاہین! میری قربت تمہیں آگ اور انگاروں کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم صرف دو اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا سہارا بنے رہیں؟"

جیسے کوئی روشنی سی نوابزادی شاہین کے اندر بجھ گئی۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "کوئی اور ہے؟"

ایک بہت مشکل سوال اس نے بڑی آسانی سے کر دیا تھا۔ یہ اس کی خاص نوابانہ اداؤں میں سے ایک تھی۔ میں نے کہا "کوئی نہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی بھی نہ ہو۔ میری زندگی اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی اپنی امیدیں وابستہ کرے۔"

"تم چھپا رہے ہو۔"

"میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں" میں نے کہا۔

میں جانتا تھا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرے پاس چھپانے کے لیے ایک چہرہ تھا۔ وہی چہرہ جو بچپن سے اب تک ہر پل میرے ساتھ رہا تھا۔ ہر موسم میں، ہر دور میں، ہر جگہ، ہر آن۔ وہ چہرہ اور میرا تصور ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ میں غزالہ کے چہرے کو اپنا تصور کہہ سکتا تھا اور اپنے تصور کو غزالہ کا چہرہ۔۔۔ ہاں میں جھوٹ بول رہا تھا۔

نوابزادی شاہین ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ اس کے عقب میں کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے بند ہو گیا۔ کھڑکی سے باہر بجلی چمکی اور آسمان پر افق تا افق گھن گرج کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ میں خاموشی سے بستر پر نیم دراز رہا۔

نوابزادی کا ردعمل وہی تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ چند دن جیسے ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر اپنی ذات کے سخت خول میں سمٹ چکی تھی۔ وہی قنوطیت، وہی دائمی بیزاری اس پر غالب آ گئی تھی جس کا شکار وہ اپنے اغوا ہونے کے بعد سے تھی۔ پورے دو روز تو وہ کمرے میں بند رہی۔ تیسرے روز میں نے اسے دیکھا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ یہ لڑکی زندگی کی حرارت اور امنگ ترنگ سے ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر چلی گئی ہے۔ ایک دم میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ نوابزادی کوئی خطرناک قدم اٹھا جائے گی۔ وہ خاموشی سے کہیں نکل جائے گی یا پھر اپنے آپ کو نقصان پہنچا لے گی۔ ان لمحات میں مجھے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا۔ شاید مجھے وہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ نوابزادی کسی طفل تسلی سے بہلنے والی نہیں ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرے دل میں نوابزادی کے لیے انسیت کی ایک چھوٹی سی لہر پیدا ہوئی۔ میں اس کیفیت کو محبت تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ ایک ایسا جذبہ ضرور تھا جو بے کلی، درد اور اپنائیت سے قریب تھا۔ اس رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں رات کا کھانا کھا کر ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ صفدر بازار کا چکر لگانے گیا تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ بخشو تھا۔ اپنے بہت بڑے سر اور تنومند بازوؤں کے ساتھ وہ نیم تاریکی میں کھڑا تھا اور کسی عفریت کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہم اسے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود اگر اچانک اس پر نظر پڑتی تھی تو جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی۔ جونہی میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ بخشو کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ وہ غصے میں آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا پوچھتا، بخشو کے حلق سے نامانوس آواز نکلی اور وہ مجھ پر جھپٹا۔ میں دو دفعہ اس سے برسرپیکار ہو چکا تھا۔ اپنے سابقہ تجربات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بخشو کے اضافی بازو پر نگاہ رکھی تھی۔ یہ بازو بلا کی تیزی اور طاقت سے حرکت میں آتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسی بازو نے مجھے نشانہ بنانا چاہا۔ میں پھرتی سے جھکا اور دفاعی انداز میں بخشو کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور ایک بہت بڑی فریم شدہ تصویر فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ پشت پر لگنے والی چوٹ نے بخشو کو پاگل کر دیا۔ اس نے لپک کر مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی۔ اپنی رفتار کے سبب وہ اس چوٹ کی اصل شدت سے محفوظ رہا تاہم لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل کمرے کے وسط میں گرا۔ میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا۔

"دیکھو بخشو!" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "میری تمہاری کوئی لڑائی نہیں۔ ہم دوست ہیں۔ کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں نے۔۔۔"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ بخشو نے پھر اپنا آہنی بازو لہرایا تھا۔ یہ بازو وہ خفیہ ہتھیار تھا جو بخشو کے مدمقابل کو ایک ہی ضرب میں ناک آؤٹ کر دیتا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر یہ وار بچایا لیکن اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ بخشو کا ہاتھ اچٹتا ہوا سا میری گردن پر پڑا تھا۔ فولادی ضرب سے آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکتا۔ میں نے جھرجھری لی اور بخشو سے لپٹ گیا۔ اسی دوران میں شاہین بھی دوڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے بخشو کو کمر سے پکڑ لیا اور پیچھے کی طرف کھینچنے لگی "کیا کر رہے ہو بخشو! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ چھوڑ دو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو" وہ گھٹی گھٹی آواز میں چیخ

رہی تھی۔

پھر وہ ہم دونوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے بخشو کو زور سے دھکیلا اور دروازے تک لے گئی۔ بخشو کا چہرہ تپ رہا تھا اور پورا جسم بھولے کی زد میں تھا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر بھی چار پانچ منٹ تک بخشو کی غصیلی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ کبھی کبھی شاہین کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ وہ اسے سمجھا رہی تھی "مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں۔۔۔"

دھیرے دھیرے یہ آوازیں خاموشی میں بدل گئیں اور کوٹھی کی چار دیواری میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔

بخشو کے غیظ و غضب کی وجہ ناقابل فہم نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نوابزادی شاہین پر میری طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے۔ اس زیادتی کی وجہ سے نوابزادی گم صم ہے اور روتی دھوتی رہتی ہے۔ وہ نوابزادی سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا۔ اسی لگاؤ کے سبب وہ مجھ پر چڑھ دوڑا تھا۔ بخشو سے کسی قسم کا گلہ فضول تھا۔ اس بے چارے کی سمجھ بوجھ ہی اتنی تھی۔ اس کے گرانڈیل اور تنومند زور آور جسم کے اندر ایک دس بارہ سالہ معصوم بچے کا ذہن تھا۔ مجھے اس بات پر ترس آنے لگا کہ اسے اپنی پسلیوں پر میری زوردار ٹھوکر سہنی پڑی ہے۔ یقیناً اسے پشت پر بھی چوٹ آئی ہوگی۔ اس کے پہلے زخم ہی ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ اگر میرے ہاتھوں کوئی شدید ضرب لگ جاتی تو نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔

نوابزادی کی طرف سے میرے خدشات پختہ ہو چکے تھے اور ضرورت اس امر کی تھی کہ میں اس کی طرف سے بہت محتاط رہوں۔ اگر وہ کسی طرف نکل جاتی یا اپنی زندگی ہی کا خاتمہ کر لیتی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ میں نے صفدر سے مشورہ کیا۔ صفدر کا خیال بھی یہی تھا کہ نوابزادی صاحبہ خاموشی سے کہیں چلے جانے کا سوچ رہی ہیں۔ اس نے کہا "میں اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا ہی چاہ رہا تھا۔ رات کے وقت ضروری ہے کہ ہم بیرونی دروازے کو اندر سے تالا لگائیں۔ ٹیلی فون بھی کامن روم سے ہٹا دینا چاہیے۔ کل دوپہر نوابزادی صاحبہ نے کہیں فون کیا تھا اور دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں۔"

"کیا بات کر رہی تھیں؟"

"میں ٹھیک سے سن نہیں سکا۔ شاید ان کی کوئی دوست تھی۔۔۔ بہرحال اس گفتگو سے زیادہ اہم ایک اور بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"نوابزادی صاحبہ اپنا زیادہ تر سامان پیک کر چکی ہیں۔ ان کی الماری میں کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا ہے۔ باقی سب کچھ اٹیچی کیس میں رکھا جا چکا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ موقع ملتے ہی وہ ہمیں چھوڑ جائیں گی۔" صفدر کی اطلاعات پریشان کن تھیں۔ اگر واقعی شاہین یہاں سے جانے پر تل جاتی تو ہم کیا کر سکتے تھے۔ زبردستی روکنے کی کوشش کرتے تو شور و غل ہوتا۔ ممکن تھا کہ اہل محلہ اکٹھا ہو جاتے۔ شاہین کہتی کہ ہم نے اسے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ عورت کی بات پر اور خاص طور سے خوب صورت عورت کی بات پر عوام الناس فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ وہ تھانہ کچہری "افورڈ" نہیں کر سکتی تھی تو ہم بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہنگامہ ہوتا تو بخشو کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

میں دیر تک اپنے آپ پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ رات کو صفدر کے مشورے کے مطابق بیرونی دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا گیا۔ ٹیلی فون بھی اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ بہرحال ایک بات میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر نوابزادی شاہین یہاں سے جانے کا تہیہ کر چکی تھی تو اس قسم کی احتیاطی تدابیر بے کار تھیں۔ اگر ہم واقعی اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ اس سے کسی قسم کی زبردستی نہ کریں تو پھر اس سے افہام و تفہیم کی ضرورت تھی۔ ضروری تھا کہ اس کا موقف سنا جائے اور اپنا بیان کیا جائے۔

رات قریباً گیارہ بجے کا عمل ہوگا جب میں اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر ساتھ والے بیڈ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ مطلع آج بھی ابر آلود تھا۔ کبھی کبھی بارش کی بوچھاریں کھڑکیوں پر دستک دینے لگتی تھیں۔ شاہین اپنے کمرے میں ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس کا ثبوت ٹی وی کی مدھم آواز تھی۔ کوئی کلاسیکل انگلش فلم چل رہی تھی۔ میں سلیپر پہن کر اپنے کمرے سے نکلا اور شاہین کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ سر کے نیچے کشن رکھا ہوا تھا۔ نگاہیں ٹی وی اسکرین پر تھیں لیکن ذہن جیسے کہیں بہت دور پہنچا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ میں اس کے قریب صوفے پر جا کر بیٹھ گیا پھر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ پھر بھی دم بخود بیٹھی رہی۔ اس کی خاموشی مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی۔ میں نے کہا "شاہین! میں نے سنا ہے کہ تم یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہو؟"

"تم میرے معاملات میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟" وہ بے حد روکھے پھیکے اور بیزار لہجے میں بولی "اور باقی جہاں تک جانے کا تعلق ہے میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ میں بخشو کو تم جیسے غیرذمے دار لوگوں کے سپرد کر کے کہیں نہیں جا سکتی۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو" میں نے کہا "تمہارا اٹیچی کیس تیار ہے اور تم کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتی ہو۔"

میں نے جھک کر بیڈ کے نیچے سے اس کا اٹیچی کیس کھینچ لیا۔ وہ کھڑی ہو گئی "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میرے معاملات میں دخل مت دو" اس کے لہجے میں نسل در نسل ورثے میں ملنے والی نوابانہ آن بان موجود تھی۔ چہرہ شعلے کی طرح دہکنے لگا تھا اور پیشانی فرط غضب سے چمک رہی تھی۔

میں نے کہا "تم ایک بات مت بھولو۔ میں اس بات پر اختیار رکھتا ہوں کہ تمہیں زبردستی یہاں روک سکوں۔"

"یہ ارمان بھی نکال لینا" وہ گرجی "میں موم کی گڑیا نہیں ہوں کہ جدھر چاہو گے موڑ لو گے۔ میں نواب شہریار کی بیٹی ہوں۔ جان دے دوں گی یا جان لے لوں گی اور اب جاؤ میرے کمرے سے۔"

اس نے باقاعدہ مجھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ وہ بپھری ہوئی تھی۔ مجھ سے الجھنے لگی۔ اس کے لمبے بال کھلے تھے اور شانوں پر جھوم رہے تھے۔ جسم میں زلزلہ سا برپا تھا۔ ایک دم میرا دماغ بھی تپ گیا۔ میں نے اسے زور سے دھکیلا وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گری اور سر پُرشور آواز سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا "تم باسٹرڈ" وہ چیخی اور مجھ پر جھپٹی۔ اگر میں تیار نہ ہوتا تو اس کے ناخن میرے چہرے پر نقشہ کھینچ دیتے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ہاتھ ذرا زور کا پڑ گیا تھا۔ پورا کمرا چٹاخ کی آواز سے گونج اٹھا اور وہ لہراتی ہوئی بیڈ پر جا گری۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر جھپٹے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر وہ رعایت نہیں کرے گی تو میں بھی اس سے کوئی رعایت نہ کروں گا۔ وہ وہیں پہلو کے بل پڑی رہی اور سسکتی رہی۔ ریشمی گاؤن کے کھلے گریبان میں اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ صد شکر کہ کمرے کا دروازہ بند تھا ورنہ یہاں ہونے والا شور و غل صنوبر کو بیدار کر سکتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ صنوبر کے بجائے قیامتِ صغریٰ ہی بیدار ہو جاتی۔ میری مراد عجیب الخلقت بخشو سے ہے۔ وہ مجھے اور شاہین کو اس حالت میں دیکھتا تو یقیناً مرنے مارنے پر تل جاتا۔

دو تین منٹ تک شاہین اسی طرح بستر پر پڑی رہی اور مسلسل ہچکیاں اس کے جسم میں بھونچال پیدا کرتی رہیں۔ پھر وہ ایک دم اٹھی اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے اپنا لباس نکالا اور واش روم کا رخ کیا۔ وہ شب خوابی کا لباس بدلنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا "کیا کر رہی ہو؟"

اس نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں اور بولی "میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ اسی وقت...... ابھی۔ میں دیکھتی ہوں مجھے کون روکتا ہے۔"

غیظ و غضب نے اسے ہر اندیشے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی "میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔" میرا لہجہ بھی شاہین کی طرح فیصلہ کن تھا۔

"چھوڑ دو مجھے" وہ زور آزمائی کرنے لگی "تم کیسے روک سکتے ہو مجھے؟" اس کے اس سوال کی کئی پرتیں تھیں۔

ایک دم میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی پھر اچانک سب کچھ میرے اختیار سے باہر ہو گیا۔ نوابزادی شاہین میری بانہوں میں تھی۔ اس کی وحشیانہ مزاحمت ایک سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی۔ یہ جنبش مجھے [illegible] سے بہت دور لے گئی۔ ہزاروں لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر۔ میں نے خود کو ایک اجنبی سرزمین پر پایا۔ ایسی سرزمین [illegible] تاریک ریشمی اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں گداز تھا، حرارت تھی اور بے خودی تھی۔ یہ ایسی دنیا تھی جہاں ہزاروں لاکھوں سال سے ایک ہی موسم ٹھہرا ہوا تھا۔ پیار کا موسم، مر مٹنے کا موسم، کسی میں گم ہونے اور کسی کو اپنے میں گم کر دینے کا موسم۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری سماعت میں نوابزادی کی گرم سانسوں کی گونج تھی اور میں نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی۔

○☆○

وہ رات میری زندگی کی ٹھہری ہوئی جھیل میں ایک دم بہت لہریں جگا گئی تھی۔ اس رات کو میری زندگی میں لانے والا ہاتھ میرا تھا نہ شاہین کا۔ وہ تقدیر کا ہاتھ تھا ــــ تقدیر، جسے بشر ارادوں سے ازلی دشمنی ہے۔ جو انسانی منصوبوں کو خاک میں ملا اور اس کے ذہن کو حیرت میں جکڑ کر اپنے وجود کا ثبوت دیتی ہے۔

رات جو لمحہ لمحہ سرک رہی تھی اور بوند بوند میرے احساس میں جذب ہو رہی تھی۔ تاریک کمرے کی کھڑکی سے باہر بارش کی بوچھاڑیں اور بجلی کی چمک تھی۔ اور اس سے اوپر بہت اوپر حیدرآباد کا آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے جیل میں چار سال گزارے تھے اور اب جیل سے رہا ہوئے خاصا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں نوابزادی شاہین وہ پہلی لڑکی تھی جو میری زندگی میں آئی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا، وہ نیم دراز تھی۔ اس کا سر میرے شانے سے ٹکا ہوا تھا اور ریشمی بال میرے چہرے پر پریشان تھے۔ میری طرح وہ بھی کھڑکی سے باہر گرتی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"شاہ جہاں ایک بات کہوں؟"

"کہو"

"یہ بات میں آج کہوں گی۔ پھر کبھی نہیں کہوں گی۔ یہ وعدہ ہے تم سے۔"

"کہو بھی"

"مجھ سے شادی کر لو شاہ جہاں۔ میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ پچھلے ایک گھنٹے میں زندگی میرے لیے کتنی بدل گئی تھی۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا۔ ایک سرکش لہر تھی جو سب کچھ بہا کر لے گئی۔ ایک ہی جست میں باہمی تعلق کی ہر منزل سے گزر گئے تھے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا ایک لڑکی یوں بگولے کی طرح میری زندگی میں داخل ہو گی اور خود کو اس کے سامنے بے دست و پا پاؤں گا۔ مجھے پارسائی کا دعویٰ نہیں رہا، لیکن جس روز میں نے اپنی بہن شگفتہ سے وعدہ کیا تھا میں جرم کی دنیا چھوڑ دوں گا۔ اسی دن میں نے اپنے دل میں یہ بھی کر لیا تھا کہ شراب اور عورت کی کمزوری اپنے اوپر حاوی ہونے دوں گا۔ اب شراب میری کمزوری نہیں تھی اور عورت... میں ایک ایسا قیدی تھا جس نے چار سال جیل میں گزارے تھے

عورت کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ جیل سے رہائی کے بعد سے سروناز جیسی فتنہ سامان حسینہ مسلسل میرے ارادوں کو للکار رہی تھی لیکن مجھے ورغلانے میں یکسر ناکام رہی تھی، اور یہ صرف سروناز تک ہی محدود نہیں تھا۔ پچھلے چند برسوں میں بے شمار مواقع ایسے آئے تھے جب حالات نے بے پناہ قوت کے ساتھ مجھے زندگی کی رنگینیوں کی طرف کھینچا تھا مگر میرے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں ایک گوشہ نشین زاہد خشک کی نسبت اس شخص کے لیے اپنی پارسائی پر قائم رہنا کہیں دشوار ہوتا ہے جسے دل بستگی کے بہترین مواقع میسر ہوتے ہیں ــــ لیکن نوابزادی شاہین کی مقناطیسی شخصیت نے اور ان حالات نے جن میں وہ مجھے ملی تھی۔ میرے ہر دفاعی حصار کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

کھڑکیوں پر بوندوں کا جلترنگ تھا اور میری سماعت میں نوابزادی کے فقرے کی بازگشت تھی "مجھ سے شادی کر لو شاہ جہاں! میں زندگی بھر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "شاہین! تمہارے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں تمہیں دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ دو شرطیں ہیں؟"

"نہیں دو اعترافات ہیں۔"

"میں سن رہی ہوں" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "شاہین! میں ایک مفرور قیدی ہوں۔ مجھے قتل کے جرم میں بارہ سال کی سزا ہوئی تھی۔ جس میں سے میں نے تین سال کاٹے تھے اور پھر ایک حادثہ مجھے جیل سے باہر لے آیا تھا۔ میں جرم و سزا کی دلدل میں ناک تک دھنسا ہوا ہوں شاہین۔ انڈیا اور پاکستان میں میرے جانی دشمنوں کی تعداد درجنوں میں نہیں سیکڑوں میں ہے۔ کسی بھی وقت میرا کوئی قاتل مجھے تلاش کر سکتا ہے اور پھر پولیس ہے، جسے حکم ہے کہ مجھے دیکھتے ہی شوٹ کیا جائے۔ مجھ سے شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی لاش سے شادی کی جائے۔ بے شک زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن میں جب تک زندہ ہوں، موت کے گہرے سائے میں ہوں۔

دوسری بات جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، میرے خیال میں وہ تمہارے لیے پہلی بات سے زیادہ تکلیف دہ ہو گی۔ میں کسی سے محبت کرتا ہوں۔ یہ محبت میرے دل و دماغ میں ایسے رچ بس چکی ہے کہ میں اس کو خود سے جدا نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا میرے اختیار میں ہی نہیں ہے۔ وہ میرے بچپن کی ساتھی ہے۔ میری چچا زاد غزال۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے دور ہو چکے ہیں لیکن میں اپنے دل کا سچ تم سے چھپانا نہیں چاہتا۔ وہ پہلی اور آخری لڑکی ہے میں نے جسے چاہا ہے اور اب بھی چاہتا ہوں۔"

شاہین خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا لیکن آنکھوں کی جھیلوں میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی "غزال اب کہاں ہے؟" شاہین نے پوچھا۔

"پاکستان میں"

"کبھی ملاقات ہوتی ہے اس سے؟"

"کبھی کبھار......"

"مجھے اس سے ملواؤ گے؟"

"کس لیے؟"

"میں اس خوش قسمت کو دیکھنا چاہوں گی جس نے تمہارا دل چھینا۔"

"وہ سب کچھ اب ماضی کا حصہ ہے۔ اسے کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

"کوئی اور بات کہنا ہے یا بس؟"

"بس یہی دو باتیں تھیں۔"

وہ بولی "تمہارے بارے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو یہ باتیں سننے سے پہلے تھے۔"

اس نے اپنا سر پھر میرے شانے سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے ملیح چہرے پر خود سپردگی کی کیفیت تھی۔ تاہم اس خود سپردگی میں بھی وقار اور تمکنت کا عنصر برقرار تھا۔

"مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے آنکھیں بند کیے کیے سوال کیا۔

"نہیں"

"اگر پوچھنا ہے تو پوچھ لو"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ اس کے بازو میرے گلے میں حمائل ہو گئے۔

"جی چاہتا ہے سو جاؤں۔ اور اسی طرح ہزاروں جنم تک سوتی رہوں" وہ مترنم آواز میں بولی۔

"سو جاؤ" میں نے کہا۔

اور وہ سچ مچ سو گئی۔

○☆○

اس پھولوں سے آراستہ کوٹھی میں اگلے آٹھ دس روز ہم نے بڑے خوشگوار ماحول میں گزارے۔ نوابزادی شاہین کے مردہ تن میں جیسے پھر سے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مایوسی اور تنہائی کی گہری وادیوں میں اترتے اترتے وہ پھر روز و شب کی رعنائیوں کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی دیے روشن ہو گئے تھے جو میں نے پہلی ملاقات میں دیکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر گلاب اور رخساروں پر چاند کھلنے لگے تھے۔ صنوبر اس سارے احوال سے آگاہ تھا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ الف سے یے تک سب کچھ بتا دیا تھا اور اس فقرے کے متعلق بھی بتا دیا تھا جس کے بارے میں شاہین نے کہا تھا کہ وہ یہ فقرہ ایک بار کہے گی پھر کبھی نہیں کہے گی اور اگر وہ فقرہ رائیگاں گیا تو اسے کوئی گلہ بھی نہیں ہو گا۔ شاہین نے کہا تھا "مجھ سے شادی کر لو شاہ جہاں۔ میں زندگی

بھر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

صفدر یہ ساری روداد بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو وہ بولا "اب کیا سوچا ہے آپ نے کیا آپ نوابزادی صاحبہ سے شادی کریں گے؟"

"شاید مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا" میں نے جواب دیا "شاہین کو دھوکا دینا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرسکتا ہوں لیکن اپنے آپ سے نہیں لڑسکتا۔"

جس وقت میں اور صفدر باتیں کررہے تھے۔ شاہین چھم سے اندر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلاب کی کلیاں تھیں۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ صفدر کو دیکھ کر ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ صفدر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا "آئیے آئیے نوابزادی صاحبہ بیٹھیے۔"

"نہیں آپ لوگ بیٹھیں۔ میں ناشتا بنانے جارہی ہوں" وہ بولی "یہ دیکھیے تازہ پھول" اس نے کلیاں ہمارے سامنے تپائی پر ڈھیر کردیں۔

"ناشتا آج میں بنا رہا ہوں" صفدر نے کہا "مولی والے پراٹھے ہیں۔ مولی کدوکش کرکے تیار رکھی ہوئی ہے۔ بس ابھی پانچ منٹ میں لاتا ہوں" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"بھئی اپنے حصے کی خوشبو تو لیتے جاؤ" میں نے کلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ساری آپ کے حصے کی خوشبو ہے" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

شاہین کے چہرے پر قوس قزح لہرا گئی۔ وہ صفدر کے سامنے اب کچھ خاموش سی رہتی تھی۔ لیکن یہ خاموشی اس کے دل کے رنگین موسم پر پردہ ڈالنے میں اکثر ناکام ہوتی تھی۔ جیسے اب ہوا تھا۔ گلاب کی سرخ کلیوں نے اس جذبے کی بھرپور عکاسی کی تھی جو نوابزادی شاہین کے دل میں پروان چڑھ رہا ہے۔ میں نے کہا "شاہین! میرا ایک دوست ہے زریں گل۔ وہ ان دنوں پاکستان میں ہے۔ بڑا دلچسپ کریکٹر ہے اور بہت عاشق مزاج بھی۔ نئی اور پرانی فلموں کے محبت بھرے نغمے ہر وقت اس کی زبان پر رواں رہتے ہیں۔ اگر وہ اس وقت یہاں ہوتا تو پتا ہے تمہارے لیے کون سا گیت اس کے ذہن میں آتا؟"

"کون سا؟" نوابزادی شاہین نے پوچھا۔

"بہت مشہور پاکستانی گانا ہے۔ تو لاکھ چلے رے گوری تھم تھم کے۔ پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے۔"

"کیا مطلب ہے اس گانے سے؟"

"یہی کہ تم جتنی بھی احتیاط کرو۔ پیار کی خوشبو کو مٹھی میں بند نہیں کرسکتی ہو۔"

وہ بولی "اگر یہ خوشبو اڑی ہے تو اس میں میرا ہی نہیں جناب کا قصور بھی ہے۔"

"میرا کیا قصور ہے؟"

"اچھا جی۔ ختم کریں اس بحث کو۔ یہ لیں اخبار نوشی فرمائیں۔ صبح صبح کچھ حق اخبار کا بھی ہوتا ہے ہمارے اوپر" اس نے اخبار سے میرا منہ ڈھانپ دیا اور اٹھ کر چلی گئی۔

بظاہر مطمئن اور بے پروا نظر آنے والی یہ لڑکی اندر سے پیار کا صحرا تھی۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش اس کے اندر یوں بھری ہوئی تھی کہ کسی اور جذبے کے لیے جگہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس کی وارفتگی سے خوف آنے لگتا تھا۔ وہ اپنے اندر بہا لے جانے کی قوت رکھتی تھی۔ پہلی رات والے واقعے کے بعد میں نے خود کو حد میں رکھا تھا۔ دوری نہ ہونے کے باوجود ہمارے درمیان ایک دوری موجود تھی۔ ہم تنہائی میں بیٹھتے تھے۔ وہ میری بانہوں میں گم ہوجاتی تھی۔ اس کی سرگوشیاں میرے کانوں میں گونجتی تھیں لیکن وہ بے خودی میں نے خود پر طاری نہیں ہونے دی تھی جو ہر فاصلے کو ملیا میٹ کردیتی ہے۔ کم از کم شادی تک میں اس فاصلے کو برقرار رکھنا چاہتا تھا...... وصل کی گھڑیوں اور محبت کی باتوں سے نوابزادی شاہین کا دل بھرتا نہیں تھا۔ ایک لامتناہی خلا تھا اس کے اندر۔ وہ پہروں میرے پاس بیٹھ کر بھی اٹھتی تھی تو تشنہ کام اٹھتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ یہ لڑکی کس طرح آندھی کی طرح اٹھی تھی اور طوفان بن کر میری زندگی پر چھا گئی تھی۔ وہ کہتی تھی 'میری محبت دائمی ہے۔' لیکن میں سوچتا تھا۔ طوفان دائمی یا دیرپا کب ہوتے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے آتے ہیں اتنی ہی تیزی سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ دیرپا تو ساون کی جھڑیاں ہوتی ہیں۔ دھیمی دھیمی اور مسلسل اور شاہین کی محبت ساون کی جھڑی نہیں تھی۔ وہ تو ٹوٹ کر برسنا چاہتی تھی۔ اس صحرا کو جل تھل کرنا چاہتی تھی جو اس کے اندر موجود تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کا رویہ مجھے پریشان کرتا تھا۔

میں محسوس کررہا تھا کہ شاہین مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ وہ کیا بتانا چاہتی ہے یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے اس سے سوال نہ کرنا پڑے۔ وہ خود اپنی رضا و رغبت سے مجھے اس راز میں شریک کرے جو اب تک صرف اسی تک محدود ہے۔ میں اس سلسلے میں اس پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنی نیت کی سچائی پر یقین تھا اور میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر شاہین خود اس بارے میں بات کرے گی اور پھر یہی ہوا۔ ایک روز جب ہم بالائی منزل پر گلاس روم میں بیٹھے تھے اور چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ شاہین اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک لفافہ نکال کر مجھے تھمادیا۔ یہ سبز رنگ کا چھوٹا سا سادہ لفافہ تھا۔ اس کا منہ گوند وغیرہ سے بند کیا گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صندوقوں کا پتا" وہ ذرا بانکے لہجے میں بولی۔

چند لمحے کے لیے میں مبہوت رہ گیا۔ پھر سنبھل کر پوچھا "تم

فیتے والے صندوقوں کی بات کررہی ہو؟"

"اور کن صندوقوں کی بات ہوسکتی ہے" اس نے جواب دیا۔

ہلکا پھلکا لفافہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ میں بغیر کسی بڑی دشواری کے اس سراغ تک پہنچ گیا ہوں جس تک پہنچنے کے لیے ایک خلقت دیوانی ہورہی ہے۔

"شاہین! اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک کاغذ۔ جس پر پاپا جانی نے اس جگہ کا ایڈریس لکھا ہے جہاں صندوق موجود ہیں۔"

میں نے کہا "اگر تمہارے پاپا نے تمہیں اس جگہ کا ایڈریس لکھ کر دیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ تم اس جگہ سے واقف تھیں؟"

"میں نے ابھی تک یہ جگہ نہیں دیکھی" نوابزادی شاہین نے کہا "بلکہ میرا خیال ہے کہ پاپا جانی کے سوا اور کسی کو اس جگہ کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ دراصل ہر مصروف اور کاروباری آدمی کی طرح پاپا کو بھی کبھی کبھار سکون اور مکمل تنہائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کلاسیکل موسیقی کو دیوانگی کی حد تک پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی تفریح یہ تھی کہ وہ کسی پرسکون جگہ پر کئی روز مکمل تنہائی میں گزاریں اور اس دوران میں صرف موسیقی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ شہر کے مضافات میں کانڈی نام کا قصبہ ہے۔ کانڈی سے ایک سڑک دریا تک جاتی ہے۔ شاید تم نے نام سنا ہو۔ اسے "کارانجا" کہتے ہیں۔ "کارانجا" ہی کے کنارے کچھ کوٹھیاں اور فارم وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے لیکن آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہیں پر پاپا نے ایک کوٹھی بنوا رکھی تھی یا شاید بنی بنائی لی تھی۔ یہ لفافہ جو میں نے تمہیں دیا ہے اس میں اس کوٹھی کا مکمل ایڈریس موجود ہے اور لکیریں وغیرہ کھینچ کر وہ جگہ بھی سمجھائی گئی ہے۔ جہاں یہ عمارت واقع ہے۔ یہ عمارت دو منزلہ ہے لیکن دیکھنے میں ایک منزلہ نظر آتی ہے۔ دراصل نشیبی جگہ تھی۔ عمارت بنانے والوں نے مٹی ڈالنے کے بجائے ایک منزل زیر زمین بنالی۔ صندوق اس وقت عمارت کی زیریں منزل میں موجود ہیں اور بالکل محفوظ ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "تم بتا رہی ہو کہ تمہارے پاپا کے سوا اس عمارت اور اس میں موجود صندوقوں کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہارے پاپا نے وہ صندوق تن تنہا تو اس عمارت میں منتقل نہیں کیے ہوں گے۔ کسی ٹرک یا بڑی گاڑی پر ان صندوقوں کو بار کیا گیا ہوگا۔ پھر یہ گاڑی دریا کے کنارے اس عمارت تک لے جائی گئی ہوگی۔ صندوقوں کو عمارت کے اندر پہنچانے کے لیے مزدور استعمال ہوئے ہوں گے۔ پھر یہ سب کچھ راز کیسے رہ سکتا ہے۔ اور مجھے تو اس بات پر بھی یقین نہیں آرہا کہ ایک عمارت طویل عرصے تک تمہارے پاپا جانی کے استعمال میں رہی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں۔ تم نے بتایا ہے کہ تمہارے پاپا کبھی کبھار وہاں جایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے وہ وہاں یکسر تنہا تو نہیں رہتے ہوں گے۔ کم از کم ایک ملازم کی ضرورت تو انہیں ہوتی ہوگی جو ان کا کھانا وغیرہ پکا سکے۔ پھر گھر کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کے لیے بھی ایک ملازم درکار ہوتا ہے ورنہ لوگ بے آباد گھروں سے بجلی کے سوئچ اور ٹونٹیاں تک اکھاڑ کر لے جاتے ہیں۔"

شاہین بولی "مجھے ان امور کی تفصیل معلوم نہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ پاپا نے ان کاموں کے لیے کوئی بہت بااعتماد ملازم رکھا ہوا تھا۔ لیکن جن دنوں صندوق وہاں منتقل ہوئے وہ ملازم بھی عمارت میں موجود نہیں تھا۔ تم نے ایک سوال یہ کیا ہے کہ پاپا نے وہ صندوق تن تنہا وہاں تک پہنچائے کیسے؟ اس بارے میں میں نے بھی پاپا سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا 'شاہین! یہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ نہیں کروڑوں کے نوادرات ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بے حد احتیاط کی ہے۔ اس "احتیاط" کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ صندوقوں کو دریائے "کارانجا" کے کنارے والی عمارت میں منتقل کرنے کے لیے جو تین افراد استعمال کیے گئے تھے وہ پاپا کے بہت وفادار ملازم تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انہیں مطلوبہ مقام تک لے جایا گیا۔ پٹیاں اس وقت کھولی گئی تھیں جب وہ عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ چکے تھے۔ پاپا نے اپنی نگرانی میں صندوق مقررہ مقام پر رکھوائے تھے۔ پھر ملازمین کی آنکھوں پر دوبارہ پٹیاں باندھی گئی تھیں اور انہیں لوڈر میں بٹھا دیا گیا تھا۔ پاپا لوڈر کو خود ڈرائیو کرکے حیدرآباد میں لائے تھے۔"

میں نوابزادی کی باتیں پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا "اگر اجازت ہو تو یہ لفافہ کھول لوں۔"

وہ بولی "میرے خیال میں یہ اس کے لیے مناسب وقت ہے۔"

میں نے لفافہ چاک کیا۔ اندر لیٹر پیڈ کا ایک صفحہ موجود تھا۔ اس صفحے پر نواب شہریار مرحوم نے اپنے ہاتھ سے حیدرآباد کے گردونواح کا نقشہ بنایا تھا۔ شہر سے کانڈی اور کانڈی سے دریا کے کنارے تک جانے والی سڑک کی نشاندہی کی گئی تھی۔ کانڈی سے سیدھے مغرب کی طرف جاکر دریا سے ملیں تو دریا قوس کی شکل میں گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی قوس کے زیریں حصے پر وہ عمارت موجود تھی جس کا "ذکر خیر" ہم کررہے تھے۔ دریا کی نشانی نہایت واضح تھی اور میرے خیال میں ان معلومات کی مدد سے "عمارت" تک پہنچنا دشوار نہیں تھا...... لیکن جو تکلیف دہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ کیا صندوق واقعی وہاں پہنچائے گئے ہیں اور اگر پہنچائے گئے ہیں تو کیا واقعی وہاں موجود

ہوں گے؟

میں نے کہا "شاہین ابھی نہیں جانتا کہ یہ جگہ کتنی محفوظ یا غیر محفوظ ہے۔ لیکن ایک بات واضح ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں بہت تاخیر کی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں حیدرآباد میں کیسے کیسے لوگ موجود ہیں اور "شکار" پر نکلے ہوئے ہیں۔"

شاہین اعتماد سے بولی "مجھے اپنے پاپا کی ذہانت اور معاملہ فہمی پر پورا بھروسا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ پاپا نے ان نوادرات کے لیے جو جگہ منتخب کی ہوگی وہ موزوں ترین ہوگی۔ وہ تو چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی حد درجہ احتیاط برتنے کے عادی تھے "اتنے بڑے معاملے کو نظرانداز کر ہی نہیں سکتے تھے۔"

میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ ہم نے گلاس روم کی بتیاں بجھا رکھی تھیں لہٰذا ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا...... ہاں ہم دور دور تک دیکھ رہے تھے۔ یہ جگہ بلندی پر واقع تھی لہٰذا حیدرآباد کی روشنیاں دور تک جھلملاتی نظر آتی تھیں۔ رہائشی علاقے سے آگے کافی فاصلے پر کسی مسجد کے میناروں کی سبز روشنی نظر آ رہی تھی۔ ان میناروں کے عقب میں ایک بڑی مشروب ساز کمپنی کا نیون سائن جلتا بجھتا نظر آ تا تھا۔ اس نیون سائن کے پیچھے پھر کچھ روشنیاں تھیں اور اس سے آگے تاریکی۔ تاریکی جو حیدرآباد کے مضافات سے جا ملتی تھی اور پھر بیس پچیس میل دور دریا کے کنارے سے...... جہاں ایک عمارت میں زر و جواہر اور نوادرات کا عظیم الشان و بے مثل ذخیرہ موجود تھا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں صفدر کو لے کر ابھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں اور اس عمارت تک جا پہنچوں۔ لیکن یہ بے صبری مناسب نہیں تھی۔ اس کام کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ کم از کم آج کی رات تو ہمیں سوچ بچار میں گزارنا تھی۔ مناسب یہ تھا کہ پہلے دن کی روشنی میں، میں اور صفدر رازداری سے وہاں پہنچیں۔ اصل عمارت دیکھنے کے علاوہ اس کے قرب و جوار کا بھی جائزہ لیں۔ بعد ازاں کل رات کیل کانٹے سے لیس ہو کر عمارت میں داخل ہوا جائے۔

پچھلے دس پندرہ روز سے میں نوابزادی شاہین کو بہت اچھی طرح اور بہت قریب سے جاننے لگا تھا۔ پچانوے فیصد سے زائد امکان اس بات کا تھا کہ اس نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ حقیقت ہے۔ نواب مرحوم کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایڈریس وغیرہ بھی موجود تھا۔ جو باتیں اس نے کہی تھیں وہ بھی دل کو لگتی تھیں۔ تاہم یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی کہ نواب مرحوم کا وہ ٹھکانا اس کے ہر سنگی ساتھی اور ملازم سے پوشیدہ تھا۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ میرا یہ خدشہ غلط تھا اور نوابزادی کا بیان بالکل صحیح۔) درحقیقت عام نوابوں کے دستور کے مطابق نواب شہریار نے بھی بڑی رنگین زندگی گزاری تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ سب کچھ پردہ داری سے کرتے تھے اور عام لوگوں کی نظر میں زیادہ رنگین مزاج نہیں تھے۔ ایسے مقاصد کے لیے انہوں نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی الگ تھلگ ٹھکانا رکھا تھا۔ پچھلے سات آٹھ سال کے دوران میں ناگونڈا کا ایک بنگلا ایسے مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ پھر ایک اتفاق یا حادثے کے سبب یہ ٹھکانا پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اس ٹھکانے سے محرومی کے بعد نواب نے کانڈی والی یہ کوٹھی ڈھونڈی تھی۔ وہ ایسے معاملوں میں اتنے محتاط اور زیرک تھے کہ عمارت کے آس پاس رہنے والوں کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ حیدرآباد کا مشہور و معروف نواب ان کا پڑوسی ہے۔ یہ کوٹھی کسی ناصر میمن نامی شخص کے نام پر خریدی گئی تھی اور نواب یہاں اسی حیثیت سے آیا کرتے تھے۔ کلاسیکل موسیقی ان کا شوق تھا اور کلاسیکل موسیقی کا بہت بڑا ذخیرہ اس کوٹھی میں موجود تھا لیکن اس کے علاوہ بھی نواب کے شوق تھے جو ان کی بیٹی نے ظاہر ہے "احترام" کی وجہ سے بیان نہیں کیے تھے۔ وہ کلاسیکی موسیقی ضرور سنتے تھے لیکن شراب کے نشے میں ڈوب کر اور ایسے میں آندھرا پردیش کے کسی دور دراز علاقے کی خوب صورت طوائف بھی ان کے پہلو میں ہوتی تھی۔ بہرطور یہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔ اپنی بچی کے اغوا اور بہو کی موت کے بعد جب اچانک نواب کی کایا پلٹی تھی تو انہوں نے عیاشی کا سارا سامان دریا بُرد کر دیا تھا اور کوٹھی میں جگہ جگہ زیاراتِ مقدسہ کی تصویریں آویزاں کر دی تھیں اور بار روم کو چھوٹی سی مسجد کی شکل دے دی تھی) میں سوچ بچار میں مصروف تھا اور میری انگلیوں میں وہ ہلکا پھلکا کاغذ دبا تھا جس نے اپنے سینے میں پچیس صندوقوں کا بیش قیمت بوجھ سمیٹا ہوا تھا۔ نوابزادی شاہین بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ میں نے کہا "شاہین! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم اس دفینے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کریں گے باہمی مشورے اور مکمل رضامندی سے کریں گے۔ تمہیں اپنے اس فیصلے پر کبھی پشیمانی نہیں ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے" اس نے آہستگی سے کہا اور اپنا چہرہ میرے شانے میں دھنسا دیا۔ مجھے صندوقوں کے بارے میں بتا کر اس نے جیسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ کر وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

میں نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلائیں تو وہ مجھ سے پیوست ہونے لگی۔ خوابیدہ آواز میں بولی "شاہ جہاں! جی چاہتا ہے ہم کہیں دور نکل جائیں۔ کسی دوسرے ملک کسی اجنبی شہر، وہاں پھولوں سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔"

"پھر؟"

"پھر میں تمہارے لیے اچھے اچھے کھانے بناؤں۔ تمہارے لباس ہینگرز میں لگا کر الماری میں رکھوں۔ شام کو ہم ایک روشن روشن بالکونی میں بیٹھ کر چائے پئیں اور پھر کسی شفاف سڑک پر سیر

کرتے ہوئے دور نکل جائیں۔ تمہیں فلمیں اچھی لگتی ہیں؟ انگریزی کلاسیکل فلمیں؟"

"ہاں کچھ کچھ" میں نے کہا۔

"مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ گون ود دی ونڈ، قلوپطرہ، سیمسن اینڈ ڈیلائلہ، لارنس آف عربیہ اور اس نوع کی بہت سی فلمیں۔ میں ان میں کھو سی جاتی ہوں اور پھر پرانے سفرنامے پڑھنے میں بھی بہت مزہ آتا ہے۔ کولمبس، مارکوپولو، ابن بطوطہ، واسکوڈی گاما اور بہت سے عرب سیاحوں کے سفرنامے پڑھ رکھے ہیں میں نے۔ شاید پرانی کلاسیکل چیزوں کا شوق مجھے اپنے پاپا سے ورثے میں ملا ہے۔"

"ایسی تفریحات کا شوق تو مجھے بھی ہے۔ تمہارے ساتھ رہ کر یہ شوق اور چمکے گا۔"

"شوق کو چمکنا ہی پڑے گا" اس نے بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔ ہم کچھ دیر ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ میں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "جو خواب تم دیکھ رہی ہو وہ ایک ہی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں۔"

"کیسے؟" وہ بولی۔

"ہم شادی کر لیں۔"

"کیوں نہیں؟" اس نے خوابیدہ آواز میں کہا اور اپنا چہرہ میرے سینے میں کچھ اور دھنسا لیا۔ مجھے اس کے جسم میں مسرت و شادمانی کی ایک لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ دفینے کے موضوع کو جیسے بالکل بھلا بیٹھی تھی، یا پھر جان بوجھ کر اس ذکر سے پہلوتہی کر رہی تھی۔ جیسے بزبانِ خاموشی کہہ رہی ہو۔ میں نے تم پر بھروسا کر لیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ کچھ دیر بعد جب شاہین چلی گئی تو میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ میں کمرے میں ٹہلنے لگا اور اس تعلق کے بارے میں سوچنے لگا جو میرے اور نوابزادی کے درمیان آناً فاناً پیدا ہو گیا تھا اور اب میری زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ میں نوابزادی شاہین کی فطرت کو بہت حد تک سمجھنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ زندگی بھر بھی میرے ساتھ رہے تو کبھی شادی کی خواہش زبان پر نہیں لائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر گھڑی، ہر پل دلہن بننے کی منتظر بھی رہے گی۔ اس کا یہ خاموش انتظار میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اب جلد یا بدیر اس سے شادی کرنا تھی۔ میں نے اپنے تصور کی نگاہ سے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میری شادی کی خبر فوزالہ پر کس طرح اثرانداز ہوگی۔ یقینی بات تھی کہ وہ دنگ رہ جائے گی۔ بے شک عملی طور پر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔ لیکن محبت کے ٹوٹے ہوئے ساز میں ابھی بہت سے ایسے تار باقی تھے جو اس خبر سے جھنجھنا سکتے تھے۔ دل کے نہاں خانوں میں بچ رہنے والی کچھ اور شمعیں اس جھونکے سے بجھ سکتی تھیں...... پھر میرا دھیان شبنا کی طرف چلا گیا۔ یقیناً میری شادی کی خبر سن کر اسے بھی حیران رہ جانا تھا۔ میری شادی کے سلسلے میں اس نے بہت سے ارمان پال رکھے تھے۔ بچپن سے وہ کہا کرتی تھی کہ وہ میری شادی پر پورے تین ماہ ڈھولک بجائے گی۔ اتنے گیت گائے گی کہ کسی نے خواب میں بھی نہ سوچے ہوں گے۔ تین ماہ تک ہر رات مہمانوں کی آؤ بھگت ہوگی اور ہر رات جشن منایا جائے گا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ یہ شادی اس طرح ہوگی کہ اسے پتا بھی نہ ہوگا۔ چاروں طرف دشمنوں کی گھاتیں ہوں گی۔ وہ لاہور کی کسی نامعلوم چار دیواری میں پناہ گزین ہوگی اور میں حیدرآباد دکن کی ایک کوٹھی میں محصور ہوں گا۔ میں اس شادی کو چند ہفتوں یا چند ماہ کے لیے مؤخر کر سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ تاخیر نوابزادی کے جسم و جاں پر ناقابلِ برداشت عذاب توڑے گی۔ وہ ہوا سے ہلکی ہو چکی تھی۔ اس کا اعتبار، اس کا مان اور عزت اسی صورت میں اسے واپس مل سکتے تھے جب اس کے نام کو میرا نام مل جاتا۔ وہ شاہین شہریار سے شاہین شاہ جہاں بن جاتی۔

وہ رات میں نے ایسی ہی سوچوں کے گورکھ دھندے میں گزاری۔ صبح سویرے میں نے صفدر کو وہ لفافہ دکھایا جو رات شاہین نے مجھے دیا تھا۔ اس لفافے کا حصول ایک بڑی کامیابی تھی۔ صفدر اور میں دیر تک مشورہ کرتے رہے پھر شاہین بھی اس مشورے میں شامل ہو گئی۔ ناشتے کے فوراً بعد میں اور صفدر "کانڈی" جانے کے لیے اپنی رہائش گاہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ اپنی حفاظت کے لیے ایک پستول شاہین کے پاس رہنے دیا گیا تھا۔ صفدر نے شاہین کو ہدایت کر دی کہ وہ دروازے اندر سے بند رکھے اور کوئی فون کال وصول نہ کرے۔

بس وغیرہ کے بجائے ہم نے ٹیکسی کے ذریعے سفر مناسب سمجھا۔ یہ سواری مہنگی ضرور تھی لیکن محفوظ تھی۔ رات کو بارش ہوئی تھی لہٰذا حیدرآباد سے کانڈی تک کا سفر ہم نے سست رفتاری سے قریباً ڈھائی گھنٹے میں طے کیا۔ کانڈی ایک خاصا بارونق اور صاف ستھرا قصبہ تھا۔ سڑکیں دھلی دھلائی اور چمکدار تھیں۔ ہر چیز نکھری نکھری اور خوب صورت تھی۔ قصبے کے بارونق علاقے میں ٹیکسی ڈرائیور ایک پیٹرول پمپ پر رکا۔ میں ذرا ٹانگیں کھولنے کے لیے ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔ صفدر پچھلی نشست پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک پان شاپ کی طرف اٹھ گئی۔ اس کھوکھا نما شاپ کے عقب میں کوئی شخص موجود تھا۔ اس کی نگاہ ایک ساعت کے لیے میری نگاہ سے ٹکرائی تھی اور وہ شاپ کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ میرے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ ہماری نگرانی ہو رہی تھی اور اگر ایسا نہیں تھا تو اتنا ضرور تھا کہ ہا واکوئی "شناسا" ہمارے آس پاس موجود تھا۔

میں نارمل انداز میں پان شاپ کی طرف بڑھا۔ یقیناً شاپ کے پیچھے کوئی چھپا ہوا تھا کیونکہ جونہی میں نزدیک پہنچا ایک سایہ سا حرکت میں آیا اور تیزی سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک دیکھ پایا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور سر پر

خاکستری ٹوپی تھی۔ اس کے پیچھے ٹکنا فضول تھا۔ وہ ایک بازار میں گھسا تھا اور یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔

میں واپس ٹیکسی میں آ بیٹھا "کوئی گڑبڑ ہے؟" میں نے انگریزی میں صفدر سے کہا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

"کسی کو دیکھا ہے آپ نے؟"

"ہاں"

اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ صفدر اور میں غور سے اپنے تعاقب کا جائزہ لینے لگے۔ پانچویں منٹ تک ہم نے ٹیکسی کا ڈی کی مختلف سڑکوں پر گھمائی لیکن کوئی مشکوک گاڑی دریافت نہ کر سکے۔

"شاید آپ کا وہم ہو" صفدر نے کہا۔

"یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے" میں نے جواب دیا۔

"سفید کہاں ہوئے ہیں؟" صفدر نے کہا۔

"میں محاورتاً بات کر رہا ہوں بھائی ـــــ بہرحال کوئی نہ کوئی چکر ہے ضرور۔"

تعاقب کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہم نے ایک بار پھر اپنا سفر شروع کیا۔ دریا تک پہنچنے میں ہمیں مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کو بتایا تھا کہ ہم اپنی فیکٹری کے لیے کسی سستی زمین کی تلاش میں ہیں اور یہ بھاگ دوڑ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک بیس فٹ کی سڑک جنوب مغرب کی طرف نکلتی تھی۔ ہم اسی سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ میں نے نواب شہریار مرحوم کا تحریر کردہ کاغذ نکال لیا تھا اور اس پر کھینچی ہوئی لکیروں کی مدد سے قرب و جوار کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ مطلوبہ عمارت کا مکمل ایڈریس بھی کاغذ پر تحریر تھا لیکن ہمیں کسی سے تصدیق کرانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اور دریا کے ساتھ ساتھ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ کافی پر فضا اور خوب صورت جگہ تھی۔ دریا قدرے قریب سے گزرتا تھا۔ دریا سے قریباً دو فرلانگ کی دوری پر ایک حفاظتی پشتہ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس چوڑے پشتے پر درخت اور گھاس وغیرہ لگا کر پارک کی شکل دے دی گئی تھی۔ اسی طویل پارک کے عقب میں کہیں کہیں فام ہاؤسز اور کوٹھیاں وغیرہ بنی ہوئی تھیں۔ ہماری مطلوبہ کوٹھی سبز رنگ کی تھی۔ چاروں طرف سرسبز درخت تھے لہٰذا وہ ان درختوں کا ہی حصہ دکھائی دیتی تھی۔ کوٹھی تک جانے والے نیم پختہ راستے پر جگہ جگہ گڑھے پڑے تھے اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوٹھی میں آمد و رفت بہت کم ہے۔ کوٹھی کا برج فاصلے سے بھی نظر آ رہا تھا۔ وہاں ہمیں گاڑی قسم کی کوئی شے نظر نہیں آئی۔ بظاہر کوٹھی غیر آباد دکھائی دے رہی تھی۔ ہمیں قریب ہی ایک پراپرٹی ڈیلر کا دفتر نظر آیا۔ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ڈیلر تنہا بیٹھا ایک ہندی اخبار کھنگال رہا تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی کا نام بھی ہندی میں ہی تھا۔ ہم ڈیلر کے پاس جا بیٹھے۔ اسے بتایا کہ ہم اپنی سرامکس فیکٹری کے لیے جگہ دیکھ رہے ہیں۔ ڈیلر ہماری باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کم خرچ میں سرامکس فیکٹری کھڑی کرنے کے لیے یہ علاقہ بھگوان نے خاص طور سے تخلیق کیا ہے اور ہمیں پوری دنیا میں اس سے مناسب جگہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ باتوں باتوں میں ہم نے سبز کوٹھی کا ذکر بھی کیا۔ پراپرٹی ڈیلر نے دفتر کے ادھ کھلے دروازے سے کوٹھی پر نگاہ دوڑائی اور بتایا کہ یہ کوٹھی حیدر آباد کے کسی "ناصر میمن" نامی سیٹھ کی ہے۔ وہ مہینے دو مہینے بعد ایک آدھ چکر یہاں کا لگاتا ہے ورنہ یہ خالی پڑی رہتی ہے۔ اب تو پچھلے کئی ماہ سے یہاں کوئی آیا گیا نہیں۔ بس ایک گونگا ملازم ہے جو یہاں رہتا ہے۔ کوئی ریٹائرڈ فوجی ہے۔ بھارت چین جنگ میں چینی اسے پکڑ کے لے گئے تھے۔ سنا ہے پوچھ گچھ سے بچنے کے لیے اس نے خود ہی اپنی زبان کاٹ لی تھی۔ اپنے حال میں مست رہنے والا بندہ ہے، کسی سے ملتا جلتا نہیں اور نہ کسی کے معاملے میں دخل دیتا ہے۔

ہم قریباً ایک گھنٹا ڈیلر کے پاس بیٹھے اور مختلف معلومات حاصل کیں۔ زمین دیکھنے کے بہانے ہم نے تین اطراف سے سبز کوٹھی کا جائزہ بھی لے لیا۔ ڈھائی تین بجے ہم حیدر آباد کے لیے واپس روانہ ہو گئے۔ واپسی کا سفر میں نے بے چینی کے عالم میں گزارا۔ کانڈی میں مشتبہ شخص کو دیکھنے کے بعد ایک "تشویش" سی میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ شاید یہ چھٹی حس کی ہی کوئی شکل تھی۔ صفدر کانڈی میں رک کر تھوڑی سی شاپنگ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا "نہیں صفدر! واپس چلتے ہیں۔ شاہین گھر میں اکیلی ہو گی۔"

وہ بولا "ابھی سے یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہو گا۔ آپ تو بے کار ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "اسی ڈر سے تم نے شادی نہیں کی تھی؟"

"اس میں تو سراسر جناب کا قصور تھا" وہ بولا "نہ آپ غائب ہو کر مری پہنچتے نہ ہماری شادی کو آخری مرحلے میں فل اسٹاپ لگتا۔"

"تو کیوں لگایا تم نے فل اسٹاپ؟ بھئی کر لیتے شادی۔ ایسے مواقع روز روز کہاں ملتے ہیں۔ میرا کیا تھا "اس دن نہ سہی آنجا، اس روز ٹھہر کر تمہاری شادی کی مٹھائی کھا لیتا۔"

"آپ کی شمولیت کے لیے میں قیامت تک شادی کا انتظار کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ لہجہ نام سا تھا لیکن اس لہجے کے نیچے مجھے درد کی لہر محسوس ہوئی۔ غالباً میری بات سے صفدر کو ٹھیس پہنچی تھی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو مذاق کی بات تھی صفدر! ورنہ

یقین کرو میں آج تک اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تمہاری شادی کی تقریب ادھوری رہ گئی۔ کاش وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔"

"وہ سب تقدیر کا لکھا تھا" صفدر نے کہا "میرے اور انجم کے ایک ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، تو ہم کیسے ایک ہو جاتے۔ جب وقت آئے گا تو اسباب بھی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "میں نے فیصلہ کر رکھا ہے صفدر۔ پاکستان پہنچنے کے بعد جو سب سے پہلا کام میں کروں گا۔ وہ تمہاری شادی کا ہو گا۔ جو تقریب میری وجہ سے ادھوری رہی تھی۔ اسے میں اپنے ہاتھ سے انجام دوں گا۔ اور یہ سب کچھ یادگار طریقے سے ہو گا۔"

صفدر نے موضوع بدلنے کے لیے بخشو اور اس کی بیمار ماں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ماں کے لیے بخشو کی بے قراری قدرے کم ہو گئی تھی پھر بھی وہ چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک مرتبہ ماں کے لیے ضرور آنسو بہاتا تھا۔ ایسے وقت میں شاہین ہی تھی جو اسے چپ کرانے میں کامیاب رہتی تھی۔ وہ اسے پچکارتی، اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیتی۔ اپنے رومال سے اس کی رال پونچھتی اور اسے تھپک تھپک کر کسی بچے کی طرح سلا دیتی۔

صفدر اور میں گفتگو کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عقب پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں پورے راستے میں کوئی ایسی گاڑی نظر نہیں آئی جس پر تعاقب کا شبہ کیا جا سکے۔ ٹیکسی ہم نے بڑی سڑک پر چھوڑ دی اور گھر تک کا باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔ اس وقت شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ میں نے کال بیل بجائی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر دروازے کی دوسری جانب آہٹ سنائی دی لیکن دروازہ کھولا نہیں گیا "شاہین یہ ہم ہیں، دروازہ کھولو" میں نے کہا۔

اس مرتبہ دروازے کی کنڈی گرا دی گئی۔ ہم نے چند لمحے دروازہ کھلنے کا انتظار کیا پھر خود ہی اندر چلے گئے "شاہین" میں نے آواز دی۔

وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ دروازے کی چٹخنی اتار کر تیزی سے اندر چلی گئی ہے۔ میں نے کوریڈور میں پہنچ کر دیکھا۔ وہ کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ منہ دیوار کی طرف رکھا تھا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ ناراض ہو گئی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سہ پہر تک واپس آ جائیں گے لیکن اب شام ہو رہی تھی یقیناً اسے انتظار کے جاں گسل مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ میری نگاہ اس براؤن چادر پر پڑی تھی جو شاہین کے جسم پر کندھوں تک کھینچی ہوئی تھی۔ چادر پر سامنے کی طرف خون کا ایک بڑا دھبا نظر آ رہا تھا اور صرف چادر پر ہی نہیں یہ خون بستر پر بھی پھیلا ہوا تھا "شاہین" میرے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا میرے ہاتھ اس کے شانوں پر تھے اور میں نے ایک جھٹکے سے اسے سیدھا کر دیا ـــــ شاہین کے پیٹ پر سے چادر خون سے تر بتر تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا "شاہین ـــــ شاہین" میں نے اسے زور سے پکارا۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھی۔ اس دوران میں صفدر بھی میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے جھٹکے سے چادر شاہین کے جسم سے ہٹائی لیکن جتنی تیزی سے ہٹائی تھی اسی تیزی سے واپس ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ شاہین کے زیریں جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کی پھولدار قمیص میں پیٹ کے مقام پر سوراخ تھا۔ یہاں گولی لگی ہوئی تھی۔ اس سوراخ میں سے خون نکل نکل کر لوتھڑوں کی صورت میں بستر پر جما ہوا تھا۔

یکایک میری چھٹی حس نے کہا کہ نوابزادی شاہین کو گولی مارنے والا شخص یہیں میرے پاس موجود ہے۔ بالکل قریب ـــــ میرا ایک ہاتھ پسٹل کے دستے پر آیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے گھوم کر دیکھا۔ کمرے کے اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور میں نے ایک شخص کو ریوالور بدست اپنے سامنے پایا۔ گھنی مونچھیں داڑھی اور ٹوپی میں اس کا تین چوتھائی چہرہ چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ـــــ خدا کی پناہ، یہ میری جانی پہچانی آنکھیں تھیں۔ ان ظالم، بے رحم آنکھوں کو میں ہزاروں آنکھوں میں سے شناخت کر سکتا تھا۔ یہ اس شخص کی آنکھیں تھیں جسے پاکستان میں آزاد قبائلی علاقوں کا آسیب کہا جاتا تھا اور جو زوبے مشت کے ویرانوں میں کسی نرم آشام درندے کی طرح دندناتا تھا۔ یہ کرم ایجنسی کا خطرناک ترین ڈاکو اور عورتوں کا شکاری "عیسیٰ جان" تھا۔ یہ شخص پشاور میں میرے ہاتھوں شدید زخمی ہوا تھا اور اس کے بعد سے مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص حیدر آباد میں یوں اچانک میرے سامنے آن کھڑا ہو گا۔ میرا پسٹل والا ہاتھ حرکت میں آنا چاہتا تھا لیکن عیسیٰ جان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن دیکھ کر یہ ہاتھ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ یہ گن ہی ایسی تھی۔ جو کوئی بھی اسے شناخت کر سکتا تھا وہ اس کے خلاف پسٹل یا ریوالور سے مزاحمت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک جرمن ساختہ "ایم جی ۴۲" تھی۔ اس میں گولیاں "بیلٹ" کی صورت میں چلتی ہیں۔ فائرنگ ریٹ لگ بھگ سات سو راؤنڈ فی منٹ ہوتا ہے۔ یہ ہر لحاظ سے خوفناک گن تھی۔

"خبردار" عیسیٰ جان کی سانپ جیسی پھنکار میرے کانوں میں گونجی "چالاکی بالا کی مت دکھانا، نہیں تو جسم کو چھلنی بنا دوں گا۔"

میں نے ہاتھ پسٹل کے دستے پر سے ہٹا لیا۔ صفدر کے تنے ہوئے اعضا بھی ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے "چلو شاباش۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ" عیسیٰ جان نے دوسرا حکم دیا "تم ام کو اچھی طرح جانتا ہے، ام بات دہرانے کا عادی نہیں ہے۔"

موقع محل کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں اور صفدر الٹے قدموں

پیچھے ہٹ گئے۔ میرے ذہن میں ایک تند و تیز سرخ آندھی چلنی شروع ہو گئی تھی۔ میں اس آندھی میں عیسیٰ جان کے گوشت کے ٹکڑے محوِ پرواز دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج میں زندہ رہوں گا یا وہ درندہ جس کا نام عیسیٰ جان ہے۔ میری آنکھیں عیسیٰ جان کی منحوس آنکھوں میں پیوست تھیں۔ "اس لڑکی کو گولی تم نے ماری ہے؟" میں نے عیسیٰ جان سے پوچھا۔ میرے لہجے میں اس آتش فشاں کی آگ موجود تھی جو ابھی ابھی میرے سینے میں پھٹا تھا اور اس آگ کے ساتھ ساتھ آنکھیں آنسوؤں کا ایک سیلاب بلاخیز بھی تھا۔

"ہاں ام نے ہی گولی مارا ہے اسے" عیسیٰ نے کامل اطمینان سے جواب دیا "اب تم پوچھے گا کہ کیوں مارا ہے۔ اس نے امارا بات نہیں مانا ام نے اس کو گولی مار دیا ہے۔ تم نہیں ملنے گا تو تمہیں بھی مار دے گا۔ تم جانتا ہے ہمیشہ سے امارا یہی دستور رہا ہے۔" عیسیٰ جان کی انگلی ایم جی ۳۴ کی لبلبی پر تھی اور سانپ جیسی آنکھیں ہماری ہر جنبش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ دو قدم چل کر کمرے کے اندر آ گیا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دیکھے یہ لڑکی بے بڑا زبردست۔ اس نے کسی پہلوان کی طرح ام سے کشتی کیا۔ ایسی ہی زور آور عورتوں کو چاروں شانے چت کرنے میں ام کو مزہ آتا ہے۔ افسوس اپنے دماغ کو ٹھنڈا نہ رکھ سکا اور ام نے غصے میں اس کو گولی مار دیا۔ ورنہ تمہارے آنے سے پہلے ام یہاں بہت اچھا وقت گزارتا۔ یہ بالکل کھوئے ملائی جیسا لڑکی تھا لیکن افسوس ام نے خود اس کھوئے ملائی میں مکھی ڈال دیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ یہ لڑکی تو ام کو بونس کے طور پر ملا تھا۔ امارا اصل ٹارگٹ تو تم ہے' اور تم اماری آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر امارے سامنے کھڑا ہے۔"

اب پوری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہماری غیر موجودگی میں عیسیٰ جان اس چاردیواری میں گھسا تھا۔ اس نے ہشتو پر کسی طرح قابو پایا تھا اور پھر شاہین کو ڈرا دھمکا کر اس کمرے میں لے آیا تھا۔ خوب صورت عورت کی بھوک عیسیٰ جان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کی یہ بھوک 'ہر وقت' ہر جگہ اور ہر موقع پر چمکی رہتی تھی۔ اس چاردیواری میں عیسیٰ کا اصل نشانہ میں تھا لیکن شاہین کو دیکھ کر وہ اپنی روایتی حیوانیت پر اتر آیا تھا۔ لیکن اس کا پالا بھی ایک نوابزادی سے پڑا تھا۔ شاہین نے پوری طاقت سے اس کی مزاحمت کی تھی۔ اس کوشش میں اس کا زیریں لباس تار تار ہو گیا تھا لیکن اس نے عیسیٰ جان کے سامنے سپر نہیں ڈالی تھی۔ بوکھلاہٹ اور طیش میں عیسیٰ جان نے اسے گولی مار دی تھی۔ اس واقعے کو پیش آئے یقیناً ڈیڑھ پون گھنٹا ہو چکا تھا۔ شاہین کے جسم میں سے بیشتر خون نکل چکا تھا اور وہ نزع کے عالم میں تھی۔ درندہ صفت عیسیٰ جان نے اسے بستر پر لٹا کر اس کے اوپر چادر ڈال دی تھی۔

میں نے اپنا اور عیسیٰ جان کا درمیانی فاصلہ نگاہوں نگاہوں میں ناپا۔ مجھے لگا کہ میری رگوں میں خون کی جگہ "انتقام" دوڑنے لگا ہے اور یہ انتقام مجھے عیسیٰ سے دور نہیں رہنے دے گا۔ میرے تیور دیکھ کر عیسیٰ جان چوکس ہوا اور اپنی گن پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی "خو تم خودکشی مت کرنا" وہ زہرناک لہجے میں بولا "ام تمہارے لیے یہ حرام موت پسند نہیں کرے گا۔ ام تو تم کو بڑے حلال طریقے سے اور بڑے آرام سے مارنا چاہتا ہے۔"

میں نے ہیجانی انداز میں کہا "عیسیٰ جان! تو اس چاردیواری سے زندہ نکل کر نہیں جا پائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

وہ مسکرایا "خو مر تو ام اسی دن ہی گیا تھا جس دن تم نے امارے بھائی کو مارا تھا۔ یہ دیکھو' اس کا خون ـــ یہ خون آج تک ام نے اپنے جسم پر سجا رکھا ہے۔"

اس نے اپنی چادر ہٹائی اور ایک جھٹکے سے قمیص کے گریبان کے بٹن توڑ دیے۔ قمیص کے نیچے اس نے وہی خون آلود کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے بھائی کے جسم سے جدا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا عیسیٰ جان یہ کرتہ ایک سال سے پہنے پھرتا ہے اور اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک مجھے قتل نہ کرے گا' یہ کرتہ نہیں اتارے گا۔ اچانک میں نے صفدر کو حرکت میں آتے دیکھا۔ اس نے ناقابلِ یقین پھرتی سے عیسیٰ جان پر جست لگائی تھی۔ عیسیٰ جان کی "ایم جی ۳۴" نے شعلہ اگلا لیکن گولی صفدر کے سر پر سے گزری۔ پھر وہ اپنے بدن میں جست کی بھرپور قوت سمیٹے عیسیٰ جان سے ٹکرایا۔ عیسیٰ جان پشت کے بل گرا۔ اس کا فولادی سر کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے ٹکرایا۔ گرتے ساتھ ہی عیسیٰ نے اپنی گن اوپر اٹھا لی تھی۔ وہ اپنی گن کے وزنی کندے سے صفدر کے سر پر ایک بھرپور وار کرنے جا رہا تھا۔ یہ وار صفدر کے لیے ناقابلِ گمان حد تک مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ میرے پاس صرف ایک لمحے کی مہلت تھی۔ اس لمحے میں' میں یہ نہیں کر سکتا تھا کہ قمیص کے نیچے سے پسٹل نکال کر عیسیٰ جان پر فائر کروں۔ ہاں یہ کر سکتا تھا کہ اپنے سامنے تپائی پر پڑی چینی کی وزنی پلیٹ اٹھاؤں اور عیسیٰ کے منہ پر دے ماروں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ قریباً آدھ انچ موٹی پلیٹ عین عیسیٰ کے چہرے پر پڑی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پلیٹ میں بہت سارا بچا کھچا سالن موجود تھا۔ عیسیٰ کا چہرہ سالن میں لتھڑ گیا۔ میری کوشش کارگر رہی تھی۔ جو وار عیسیٰ جان صفدر کے سر پر کرنا چاہتا تھا وہ اچٹ کر اس کے کندھے پر لگا۔ اس کے ساتھ ہی عیسیٰ جان نے اپنی طاقتور ٹانگوں کو حرکت دے کر صفدر کو تپائی پر دے مارا۔ صفدر تپائی سے ٹکراتا ہوا توپ کے گولے کی طرح میرے سینے پر لگا اور ہم دونوں لڑکھڑا کر گر گئے۔ عیسیٰ جان کوتاہ قد لیکن چوڑا چکلا تھا۔ اس کے جسم میں حیوانی قوت تھی۔ صفدر کو ٹانگوں سے اچھالنے کے بعد وہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں خطرناک ترین گن تھی اور یہ گن ہم دونوں کی موت تھی۔ میں نے

تیزی سے ہاتھ چلا کر اپنا پسٹل نکالنا چاہا۔ لیکن اس وقت مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ پسٹل قمیص کے نیچے موجود نہیں ہے۔ درحقیقت میں نے قمیص کے نیچے چمڑے کا ہولسٹر لگا رکھا تھا۔ جس وقت میں نے عیسیٰ کی پہلی جھلک دیکھی تھی۔ میرا ہاتھ خود بخود ہولسٹر تک پہنچ گیا تھا اور میں نے ہولسٹر کے ڈھکن کا بٹن کھول دیا تھا۔ بعد میں مجھے پسٹل نکالنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب چند منٹ بعد جب میں صفدر سے تصادم کے بعد نیچے گرا تھا تو پسٹل میرے ہولسٹر میں سے پھسل گیا تھا۔ میں نے پسٹل ڈھونڈنے کے لیے چاروں طرف ہاتھ چلائے۔ اس دوران میں عیسیٰ جان کی گن سے کم از کم چار فائر ہوئے۔ لیکن ان میں سے ایک فائر بھی مجھے یا صفدر کو نہیں لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہوا کہ عیسیٰ جان کو کچھ نظر نہیں آ رہا اور وہ اندھوں کی طرح ہوا میں گولیاں چلا رہا ہے۔ اس کا چہرہ سالن سے لتھڑ گیا تھا۔ یقیناً یہ سالن اس کی آنکھوں میں بھی پڑا تھا اور مرچوں نے اسے چند لمحوں کے لیے اندھا کر دیا تھا۔ وہ گولیاں چلاتا ہوا باہر کو دوڑا۔ دس بارہ قدم بھاگ کر وہ سنگِ مرمر کے گملوں سے ٹکرایا اور لڑھک کر ایک کمرے میں جا گرا۔ اسی دوران میں' میں اپنا پسٹل ڈھونڈ چکا تھا۔ صفدر نے بھی اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ ہم دونوں نے دروازے کی دونوں جانب پوزیشن لے لی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر عیسیٰ جان پر کیے وہ تڑپ کر کمرے کی تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔ ہمیں یہی محسوس ہوا کہ اسے گولی لگ گئی ہے۔ اگر گولی لگ گئی تھی تو پھر یہ بڑے قیمتی لمحے تھے۔ ہمیں بھاگ کر عیسیٰ جان کو چھاپ لینا چاہیے تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اسے گولی نہ لگی ہو۔ جو دو یا تین سیکنڈ ہم نے سوچنے میں صرف کیے وہ بڑے سودمند رہے۔ کیوں کہ اس مختصر وقفے کے بعد عیسیٰ جان کی طرف سے تابڑ توڑ فائر ہوئے۔ اس فائرنگ سے نہ صرف یہ ثابت ہوا کہ عیسیٰ جان شدید زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہے بلکہ یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس کی آنکھیں پھر سے کام کرنے لگی ہیں۔ اس نے باقاعدہ دیکھ کر دروازے پر فائرنگ کی تھی۔ ۳۴ ایم جی کی گولیوں نے لکڑی کے ٹھوس دروازے کے دو جگہوں سے پرخچے اڑا دیے۔ دھماکے اتنے زوردار تھے کہ پورے علاقے میں سنے گئے ہوں گے۔

میں نے مڑ کر دیکھا' صفدر' شاہین پر جھکا ہوا تھا۔ وہ بڑے اضطراب سے بولا "شاہ جہاں صاحب! ان کی حالت خطرے میں ہے۔ ہمیں ان کو فوراً اسپتال پہنچانا چاہیے۔"

"تم ایمبولینس کے لیے فون کرو" میں نے بلند آواز سے کہا۔

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ ایک بار پھر "ایم جی ۳۴" کا خوفناک قہقہہ گونجا اور پانچ چھ گولیوں کے ایک برسٹ نے دیوار کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ یہ گن ری کوائل سسٹم کے تحت کام کرتی ہے۔ اس کے ذریعے سنگل شاٹ کے علاوہ چھوٹے اور بڑے برسٹ بھی مارے جا سکتے ہیں۔

صفدر جھک جھک کر کمرے کے شمالی گوشے میں پہنچا۔ ٹیلی فون سیٹ یہیں رکھا تھا۔ صفدر نے چونگا اٹھایا تو اس کے ماؤتھ پیس میں سے اسپیکر لڑھک کر نیچے جا گرا۔ فون کا ڈائل بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ ٹیلی فون سیٹ کے عین اوپر واقع شوکیس کے شیشے بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ ٹوٹ پھوٹ اس زبردست مزاحمت کا نتیجہ تھی جو شاہین نے گولی کھانے سے پہلے عیسیٰ جان کے خلاف کی تھی "فون تو ناکارہ ہو چکا ہے" صفدر نے اطلاع دی۔

"پھر کیا کیا جائے؟"

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ انہیں فوراً اسپتال لے جانا ہوگا" صفدر کے لہجے میں بدترین اندیشے نوحہ کناں تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا "ایم جی ۳۴" پھر گرجی۔ مجھے اپنی دائیں پنڈلی میں انگارا سا محسوس ہوا۔ بے خیالی میں' میں اپنی حفاظت سے تھوڑا سا غافل ہوا تھا اور نتیجے میں یہ گولی "انعام" مل گئی تھی۔ میں نے ڈگمگا کر دیوار کا سہارا لیا۔

"کیا ہوا؟" صفدر نے چونک کر پوچھا۔ وہ اٹھ کر میری طرف بڑھا لیکن پھر فوراً اس کی عقل کام کر گئی اور اس نے دروازے کے سامنے سے گزرنے کی حماقت نہیں کی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً یہ اس کی زندگی کی آخری غلطی ہوتی۔ کمرے کا اکلوتا دروازہ مکمل طور پر عیسیٰ جان کی زد میں تھا۔ ہم کمرے کے اندر تھے اور ہم نے اس دروازے کی دونوں اطراف میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ میرا کولٹ پسٹل خالی ہو چکا تھا۔ جس دوران میں' میں اس کا میگزین بدل رہا تھا۔ صفدر اکا دکا فائر کرتا رہا۔ بڑی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ عیسیٰ جان نے جس کمرے میں مورچا سنبھال رکھا تھا وہ سرونٹ کوارٹر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور کوٹھی کے مین گیٹ کے پاس تھا۔ ہم اندرونی کمرے میں محصور تھے۔ اگر ہم جاں بہ لب شاہین کو اندرونی کمرے سے باہر نکالتے تو عیسیٰ جان کی مہلک مشین گن ہمیں بھون کر رکھ دیتی۔ اب تو دو ہی راستے تھے۔ پہلا یہ کہ عیسیٰ جان ہماری گولی سے شدید زخمی یا ہلاک ہو جاتا جو بظاہر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرا یہ کہ وہ فی الحال پسپائی پر آمادہ ہو جاتا۔ یعنی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر فرار ہو جاتا اور یہ بھی قرینِ قیاس نہیں تھا۔ عیسیٰ جان مرنے اور مار دینے کا ارادہ لے کر یہاں آیا تھا۔ اور اس ارادے کی تکمیل کے لیے اس نے پوری تیاری بھی کر رکھی تھی۔ اس کے جسم پر کئی درجن گولیاں بیلٹس کی شکل میں بندھی ہوئی تھیں۔ کندھے پر کینوس کا ایک وزنی بیگ بھی تھا۔ یقیناً اس میں بھی ایمونیشن موجود تھا۔ ہمارے پاس ایک ریوالور اور دو پسٹل تھے۔ لیکن فالتو راؤنڈز کی تعداد پانچ چھ درجن سے زائد نہیں تھی۔ اتنے راؤنڈز کے ساتھ ہم کتنی دیر عیسیٰ جان کا راستہ روک سکتے تھے۔

ایک موہوم سی امید یہ بھی تھی کہ شاید باہر سے کوئی کمک

آجائے۔ ہم کسی جنگل بیابان میں نہیں تھے۔ ایک بھری پُری بستی میں تھے۔ جس قسم کی فائرنگ یہاں ہو رہی تھی، وہ یقیناً دور دور تک سنی جا رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اہلِ محلہ اس کوٹھی کے گرد جمع ہو چکے ہیں اور خوفزدہ چہروں پر حیرانی سجائے چہ میگوئیوں میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں میں سے کچھ نے فون پر پولیس سے بھی رابطہ کرلیا ہوگا۔ اگر پولیس کی کوئی موبائل ٹیم اس واقعے سے باخبر ہو جاتی تو عین ممکن تھا کہ وہ یہاں پہنچتی اور ہماری مدد کی کوئی صورت نکل آتی۔ لیکن سست روی میں انڈین پولیس بھی پاکستانی پولیس سے پیچھے نہیں تھی بلکہ شاید ایک دو ہاتھ آگے ہی تھی۔ توقع نہیں تھی کہ وہ یہاں پہنچنے سے پہلے وہ کسی مؤثر کارروائی کے قابل ہو سکے گی۔۔۔۔۔ اور ہمارے پاس وقت منٹوں میں نہیں سیکنڈوں میں تھا۔ شاہین کا بستر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے جسم کا بیشتر خون نکل چکا ہے اور اب دل محض نام کو دھڑکتا جا رہا ہے۔

"شاہین..... شاہین" میں نے اسے جھنجوڑا۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکن کسی بہت گہرے کنوئیں میں ہلکورے لیتے پانی جیسی تھی۔ میں نے الماری میں سے اس کا لباس نکالا اور اس کی عریانی کو ڈھانپ دیا۔ وہ صبح کے تارے کی طرح تیزی سے مدھم ہوتی چلی جا رہی تھی۔۔۔۔ ہاں وہ مر رہی تھی "صفدر ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ یہ ختم ہو رہی ہے" میں نے کراہ کر کہا۔

صفدر نے دانت پیسے۔ اس کے منہ سے عیسیٰ جان کے لیے گالیاں ابل پڑیں۔ دیوار کی اوٹ سے ہاتھ نکال کر اس نے پسٹل عیسیٰ جان کی پوزیشن کی جانب کیا اور پورا میگزین خالی کر دیا۔ اس فائرنگ کا جواب حسبِ سابق ایک تباہ کن برسٹ سے آیا۔ ٹیلی وژن کی اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ دروازے کے پاس سے دیوار کا ایک حصہ ٹوٹ کر کمرے میں آن گرا اور قالین پر دور تک پلستر اور اینٹوں کے ٹکڑے بکھر گئے۔

صفدر کی آنکھوں میں آگ سی روشن تھی۔ میں جانتا تھا یہ آگ عیسیٰ جان کے لیے ہے۔ عیسیٰ جان جو میرا دشمن تھا لیکن دوستی کے ناتے صفدر کا بھی دشمن تھا۔ صفدر سے ملاقات کے بعد میں نے اپنی جو طویل روداد اُسے سنائی تھی۔ اس میں عیسیٰ جان کا ذکر بھی تفصیل سے آیا تھا۔ صفدر باخبر تھا کہ میرے اور عیسیٰ کے درمیان کیا کیا معرکے ہوتے رہے ہیں۔

اپنے پسٹل میں نیا میگزین ڈالتے ہوئے صفدر الماری کی طرف بڑھا اور اس نے ایک خانے میں سے وہی بلٹ پروف جیکٹ نکال کر پہن لی جو ہم جگر گاں سے لائے تھے "شاہ جہاں صاحب! میں باہر جا رہا ہوں۔"

"کس لیے؟"

"اس کتے کی گردن مروڑنے کے لیے۔ وہ فائر کرتا رہے گا تو ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔ نوابزادی صاحبہ یہیں پڑے پڑے دم توڑ دیں گی۔"

میں نے اس کا راستہ روک لیا "نہیں صفدر! اگر باہر ہی جانا ہے تو پھر میں جاؤں گا۔ تمہارے لیے یہ بندہ نیا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"آپ پیچھے ہٹیے شاہ جہاں صاحب" اس نے غصے سے کہا "اپنی ٹانگ دیکھیے، آپ زخمی ہیں۔ آپ ادھر نوابزادی کے پاس رہیں۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔"

"نہیں صفدر۔ پاگل مت بنو" میں نے سختی سے کہا۔

اچانک اس نے مجھے دھکیلا اور تڑپ کر دروازے سے باہر گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر دروازے تک پہنچتا اس نے ناقابلِ یقین پھرتی سے دروازہ باہر سے بولٹ کر دیا۔ سرونٹ کوارٹرز سے "ایم جی ۳۴" کے دو فائر ہوئے۔ میں نے صفدر کو تیزی سے رول کر کے ایک دیوار کی اوٹ میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ اس کی ساری صلاحیتیں بیدار تھیں اور انداز میں کسی خونخوار چیتے کی سی لپک تھی۔ صفدر سرونٹ کوارٹرز کی عقبی جانب گیا تھا۔ یہاں بلندی پر دو روشن دان موجود تھے۔ صفدر اگر عیسیٰ کی بے خبری میں ان روشن دانوں تک پہنچ جاتا تو کوئی فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دروازہ صفدر باہر سے بند کر گیا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں یہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ صفدر میرے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالے اور ایک ایسے شخص کے سامنے آئے جس کے سر پر خون سوار تھا اور ہاتھوں میں مشین گن۔۔۔۔ بے شک صفدر نے بلٹ پروف جیکٹ پہن لی تھی لیکن یہ جیکٹ ایم جی ۳۴ جیسی گن کے سامنے بہت معمولی تحفظ فراہم کر سکتی تھی اور ظاہر ہے یہ تحفظ بھی صرف سینے اور پیٹ تک محدود تھا۔ مجھے صفدر کی سلامتی شدید خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اگر صفدر کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ شاید میں بھی خودکشی پر مجبور ہو جاتا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ صفدر کے بارے میں کوئی بری خبر سن سکوں۔ میں اس بند کمرے میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک بار پھر شاہین پر پڑی۔ اس کی سانس سینے میں اُلجھ رہی تھی "کیا وہ مر رہی ہے؟" یہ سوال درد کی ایک شدید لہر بن کر میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ گیا۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے عیسیٰ جان کی کمین گاہ کی طرف چند فائر کیے اور پھر لپک کر شاہین کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا جسم برف کی طرح سرد تھا اور چہرہ کسی ایسے فرد کا چہرہ نظر آتا تھا جو اس دارِ فانی سے بہت دور جا چکا ہو۔

میں شاہین کے دل کو حرکت میں رکھنے کے لیے فوری طبی امداد کی تربیت کو بروئے کار لانے لگا۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔۔۔۔ میرے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ دور

تک چیخ و پکار سے اندازہ ہوتا تھا کہ اڑوس پڑوس کے لوگ چھتوں پر اور گلی میں جمع ہیں اور صورتِ حال کے بارے میں ایک دوسرے کو مطلع کر رہے ہیں۔ پھر مجھے کہیں پاس ہی پولیس کار کا سائرن سنائی دیا اور اندازہ ہوا کہ "قانون کے محافظ" موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ تاہم ان محافظین سے "فوری امداد" کی توقع رکھنا فضول تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اندر بھاری بھرکم خودکار گن چل رہی ہے۔ انہیں پاگل کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ وہ اپنی معمولی تنخواہ کے عوض اس "موت" کے سامنے آجاتے۔ ہاں کوئی بے ضرر قسم کا چور اُچکا یا جیب کترا ہوتا تو وہ اپنی فرض شناسی کو آواز دے سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے کوئی بھی عملی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے بڑے افسروں کو زحمتِ غور و فکر دیں گے اور کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے کم از کم ایک گھنٹا ضائع کریں گے۔ اس ایک گھنٹے میں عیسیٰ جان اپنی گن کے بل بوتے پر بیسیوں افراد کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔

میں نے دروازے کی نچلی درز سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس درز میں سے دس پندرہ گز دور تک نظر آ رہا تھا۔ کافی تگ و دو کے باوجود میں صفدر یا عیسیٰ جان کو دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اسی دوران میں مجھے سرونٹ کوارٹرز کے عقب سے پسٹل کے تین فائر سنائی دیے۔ یہ فائر یقیناً صفدر کے پسٹل سے ہوئے تھے۔ فائرنگ کے فوراً بعد مشین گن کے برسٹ سے در و دیوار گونج اٹھے۔ اس مرتبہ اس برسٹ کا رخ ہماری جانب نہیں تھا۔ تو پھر کس کی جانب تھا؟ شاید صفدر کی جانب۔ میں لرز اٹھا۔ اس برسٹ کے فوراً بعد کسی درخت کی شاخ ٹوٹنے کی آواز آئی اور یوں لگا جیسے کوئی شے "دھپ" سے زمین پر گری ہے۔ میں قالین پر اوندھا لیٹا تھا اور بدستور دروازے کی نچلی درز سے جھانک رہا تھا۔ مجھے عیسیٰ جان کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا تھا اور دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے چند فائر مزید کیے اور پھر چھت پر چلا گیا۔ چھت پر اس کے قدموں کی چاپ میں نے صاف سنی۔

قریباً ایک منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے دیکھا، صفدر دوڑتا ہوا سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ پسٹل بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے لپک کر کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا اور پرجوش لہجے میں بولا "بھاگ گیا کتے کا بچہ۔"

میں نے تیز نظروں سے سرتاپا صفدر کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سلامت نظر آ رہے تھے۔ صرف ایک پہلو مٹی میں لتھڑا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں گرا ہے۔ میں نے اپنا پسٹل صفدر کو تھمایا اور شاہین کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ پورچ میں سے گزر کر ہم مین گیٹ پر پہنچے۔ سڑک پار ایک دو منزلہ کوٹھی کی بالکونی پر پولیس اہلکار موجود تھے۔ ان میں سے کسی نے ہوائی فائر کیا اور للکار کر کہا "کون ہو تم؟ اپنی جگہ کھڑے رہو۔"

صفدر نے چیخ کر کہا "ہم گھر والے ہیں۔۔۔۔ وہ بھاگ گیا ہے جس کو پکڑنا تھا تمہیں۔"

جونہی ہم مین گیٹ کھول کر باہر آئے، اہلِ محلہ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ زخمی شاہین کو دیکھ کر ان سب کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ ایک پڑوسی بھاگ کر گیا اور کار نکال لایا۔ ہم نے زخمی شاہین کو کار میں ڈالا۔ میں واپس کوٹھی میں گیا، مجھے بختو کی فکر تھی۔ وہ ابھی تک نظر نہیں آیا تھا، نہ ہی اس کی آواز سنائی دی تھی۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ شاہین کی طرح وہ بھی عیسیٰ جان کے ہاتھوں نقصان نہ اٹھا بیٹھا ہو۔ میں نے پہلے کمروں میں اور پھر باتھ رومز میں دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا تھا۔ یقینی بات تھی کہ چند منٹ بعد پولیس اس کوٹھی میں دندنانے لگے گی۔ بختو یہاں موجود ہوتا تو گرفتار ہو جاتا۔ بے شک یہ امر بھی تشویش ناک تھا کہ وہ یہاں نہیں تھا لیکن اس بارے میں بعد میں سوچا جا سکتا تھا۔

بختو کی تلاش میں ناکامی کے بعد میں باہر آیا اور ہم شاہین کو لے کر اسپتال روانہ ہو گئے۔ پولیس کا ایک اہلکار بھی زبردستی گاڑی میں گھس بیٹھا تھا۔۔۔۔ وہاں سے قریب ترین اسپتال مریم میموریل تھا۔ جونہی ہم اسپتال پہنچے ڈاکٹر شاہین کو آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ شاہین کے لیے فوری طور پر خون کی ضرورت تھی۔ اتفاقاً میرا اور صفدر دونوں کا خون شاہین سے ملتا تھا۔ صفدر اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ میں خون دوں۔ اس نے ایک بار پھر میری توجہ میری زخمی پنڈلی کی طرف مبذول کرائی اور کہا کہ میرا بہت سا خون بہہ گیا ہے۔ مجھے خون دینے کے بجائے خون لگوانا چاہیے۔ بڑی مشکل سے اور بہت ضد کر کے میں نے ایک بوتل خون دیا۔ صفدر نے خون کی دو بوتلیں دیں۔۔۔۔ دو تین بوتلوں کا انتظام باہر سے کیا گیا۔ شاہین کا آپریشن رات نو بجے کے لگ بھگ شروع ہوا تھا۔ بارہ بجے تک آپریشن مسلسل جاری رہا۔ یہ تین گھنٹے ہم نے جس اضطراب میں گزارے ہم ہی جانتے ہیں۔ ہر لمحہ سُولی پر بیت رہا تھا۔ اپنی پنڈلی کا زخم تو میں جیسے بالکل بھول ہی گیا تھا۔ یہ صفدر تھا جس نے اس زخم کی فکر کی۔ وہ مجھے اسپتال کی ایمرجنسی میں لے گیا۔ گولی پنڈلی کا گوشت چاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہڈی البتہ نقصان سے محفوظ رہی تھی۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ٹانکے لگا کے اور مرہم پٹی کر کے مجھے فارغ کر دیا۔

ہم ایک بار پھر آپریشن تھیٹر کے دروازے پر آ بیٹھے اور آپریشن کے نتیجے کا جاں گُسل انتظار کرنے لگے۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کچھ زیادہ پُرامید نہیں۔۔۔۔ ہو سکتا تھا یہ میرا وہم ہو۔ لیکن ہم نے خود بھی شاہین کی حالت دیکھی تھی۔ اس کے جسم کا سارا خون نچڑ چکا تھا۔ جو گولی اسے لگی تھی اس کی ہلاکت خیزی سے بھی ہم واقف تھے۔ یقیناً اس نے پیٹ کے نازک اعضا کے چیتھڑے اڑا دیے تھے۔

رات ساڑھے بارہ بجنے کے لگ بھگ آپریشن اختتام پذیر ہوا۔ ہماری سوالیہ نظریں انچارج سرجن کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا "ہم نے اپنی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن مریضہ کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ اگلے دو گھنٹے اس کی صحت یابی کے لیے خاص طور سے بہت اہم ہیں۔"

ہم نے شاہین کو آئی سی یو میں دیکھا۔ اسپتال میں، میں نے اس کا نام سائرہ درج کرایا تھا اور خود کو اس کا شوہر بتایا تھا۔ اسپتال کے بیڈ پر نوابزادی شاہین کا نام سائرہ اسلم درج تھا۔ اسلم میرا فرضی نام تھا۔ شاہین کی ناک میں نالی تھی جو حلق کے راستے اس کے معدے میں اتاری گئی تھی۔ بازوؤں سے خون اور گلوکوز کی نالیاں چپکی تھیں۔ اس کے گلاب سے ہونٹ ان پتیوں جیسے ہو گئے تھے جو موسم گرما کی طویل دوپہر میں جلتے سورج کے نیچے پڑی رہی ہوں۔ آنکھوں کے گرد نیلے حلقے نمودار ہو چکے تھے اور رخسار سوجے سوجے تھے۔ میرا دل غم و اندوہ میں غرق تھا۔ میں نے بے زبان خاموشی اس سے کہا "شاہین! میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا قرب تمہیں آگ اور انگاروں کے سوا کچھ نہیں دے گا ____ جو زہریلی ہوائیں گلی گلی مجھے ڈھونڈ رہی ہیں وہ تمہیں بھی جھلسا دیں گی۔"

وہ خاموش رہی۔ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ میں نے اس سے کچھ کہا ہی نہیں تھا اور اگر کہتا بھی تو وہ کہاں سنتی۔ وہ ہوش و حواس سے کوسوں دور تھی ____ میں اور صفدر اسپتال کے کوریڈور میں بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ صفدر نے بتایا کہ اس نے عیسٰی جان پر تین گولیاں چلائی تھیں۔ ان میں سے ایک اس کی کمر میں لگی تھی ____ یہ گولیاں اس نے سرونٹ کوارٹرز کے عقبی روشن دان میں سے چلائی تھیں۔ وہ کوارٹر کے عقب میں واقع ایک درخت پر چڑھ گیا تھا اور اتنی بلندی تک پہنچ گیا تھا کہ کوارٹر میں مورچا بند عیسٰی جان اسے دکھائی دینے لگا تھا۔ جونہی صفدر کی گولی عیسٰی جان کو لگی تھی اس نے تڑپ کر اپنا رُخ پھیرا تھا اور ایک طویل برسٹ روشن دان پر دے مارا تھا۔ برسٹ چلنے سے پہلے ہی صفدر نے درخت سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک شاخ کو توڑتا ہوا نیچے آگرا تھا۔ کمر میں گولی لگنے کے بعد عیسٰی جان حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ مورچا غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ وہ سیڑھیاں طے کر کے چھت پر چلا گیا تھا اور وہاں سے قریبی چھت پر کود کر فرار ہو گیا تھا۔

مجھے اور صفدر کو بخشو کے بارے میں بھی فکر لاحق تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اگر وہ خود سے کہیں نکل گیا تھا تو یہ بھی بے حد تشویش ناک تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد وہ قطعی غیر محفوظ تھا۔ یہ تو ایسے ہی تھا کہ چڑیا گھر سے کوئی درندہ چھوٹ جائے اور شہر کی گلیوں میں دندنانے لگے۔ یقینی بات تھی کہ لوگ اسے ماردیں گے یا وہ لوگوں کو مارے گا۔ علی الصباح پانچ بجے کے قریب صفدر اسپتال سے نکل گیا۔ وہ بخشو کی کے سلسلے میں گیا تھا۔ اس کی واپسی نو بجے ہوئی۔ وہ قطعی طور پر ناکام واپس آیا تھا صفدر کو آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ متعلقہ تھانے دار میرے اور صفدر کے بیانات لینے اسپتال میں آ دھمکا۔ ہم نے اس واردات کو ڈکیتی کی واردات قرار دیا تھا اور ابتدائی بیان میں کہا تھا کہ ہم نے صرف ایک ڈاکو کو دیکھا ہے اور بوقت ضرورت ہم اسے پہچان سکتے ہیں۔ تھانے دار نے ہم سے اس اسلحے کے بارے میں پوچھا جو حملہ آور استعمال کر رہا تھا۔ اگر ہم "ایم جی 42" کا نام لیتے اور دیگر تفصیلات بتاتے تو "اسلحہ شناس" قرار پاتے اور اس حوالے سے بھی مشکوک ٹھہرتے۔ ہم نے صرف یہ بتایا کہ مجرم کے پاس کوئی نوجی قسم کی بہت طاقتور رائفل تھی اور برسٹ مار رہی تھی۔

تھانے دار نے ہم سے ہمارے اسلحے کے بارے میں پوچھا۔ صفدر نے اپنا پستول نکال کر تھانے دار کے سامنے رکھ دیا۔ یہ پستول باقاعدہ لائسنس یافتہ تھا اور اس کا لائسنس صفدر کے فرضی نام انیس احمد پر تھا۔ تھانے دار نے پستول الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا "لیکن موضع (موقع) سے جو خول ملے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ایک اور پستول یا ریوالور بھی استعمال ہوا ہے۔"

صفدر بولا "ہم نے تو ایک ہی استعمال کیا ہے جناب! ہو سکتا ہے کہ مجرم کے پاس بھی پستول ہو۔"

"اگر ہوتا تو تمہیں اس کی آواز سنائی دیتی" تھانے دار نے کہا۔

"ہو سکتا ہے آواز آئی ہو لیکن ہمیں آوازیں سننے اور پہچاننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔"

"مجرم کو جو گولی لگی کیا وہ اسی پستول کی تھی؟" تھانے دار نے صفدر سے پوچھا۔

صفدر نے بڑے اعتماد سے اثبات میں جواب دیا۔ تھانے دار نے ہمارے کوائف اور روزگار وغیرہ کے بارے میں چند رسمی اور گھسے پٹے سوال کیے اور کاغذات کا پیٹ بھرنے کے بعد چلا گیا۔ ممکن تھا کہ اسے ہمارے بارے میں شبہات پیدا ہوئے ہوں لیکن اس نے ہم سے کسی شبے کا اظہار نہیں کیا۔

شاہین اس رات دس بجے تک بے ہوشی کی حالت میں رہی۔ دس بجے کے بعد آئی سی یو کی ہیڈ نرس میرے پاس آئی۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے اسلم بتایا۔ وہ کہنے لگی کہ بستر نمبر چار کی مریضہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں فوراً وارڈ میں پہنچا۔ شاہین ہوش میں تھی لیکن بالکل ساکت لیٹی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ میں نے کان اس کے چہرے کے قریب کیا۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا "بخشو تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور صفدر؟"

"وہ بھی۔"

اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ پھر آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی "تم نے ____ اپنی اور ____ تمہاری عزت پر ____ حرف نہیں آنے دیا۔"

میں نے اس کے ہاتھ کی پشت چوم لی "مجھے تم پر فخر ہے۔"

کچھ دیر تک وہ خاموشی سے آنکھیں بند کیے لیٹی رہی اور میں ہولے ہولے اس کا ہاتھ دباتا رہا۔ اس کی سانس ہموار نہیں تھی اور گاہے گاہے چہرے پر کھچاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی ____ تین چار منٹ بعد وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی "شاہ جہاں! اگر میں مر جاؤں تو میری آخری خواہش ضرور پوری کرنا۔ وہ میرے ____ بابا کی بھی آخری خواہش ہے۔ وہ دولت جو بابا کی کوٹھی میں ہے ____ غلط ہاتھوں میں نہ جائے ____ اس پیسے سے غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھلا ہونا چاہیے ____ تم ایسا کرو گے نا شاہ جہاں؟"

"تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو" میں نے کہا "تم بالکل بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ کوئی خطرناک زخم نہیں لگا ہے تمہیں۔ دس پندرہ روز میں سب اچھا ہو جائے گا ____ پھر تم اس سامان کے بارے میں اطمینان سے فیصلہ کرنا۔ تمہارا ہر فیصلہ مجھے قبول ہو گا۔"

اس نے نحیف آواز میں پوچھا "بابا کی کوٹھی تمہیں مل گئی؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "پھر اب دیر نہ کرو ____ تم اور صفدر ____ آج رات ہی چلے جاؤ ____ اور وہ صندوق اپنی حفاظت ____ میں لے لو۔"

"سب ہو جائے گا شاہین! پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ۔"

"پلیز شاہ جہاں ____ میری بات مان لو۔ اس کام کو کل پر مت ڈالو۔"

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا کہ ٹھیک ہے، ہم آج رات ہی چلے جائیں گے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ مریضہ سے زیادہ باتیں نہ کی جائیں۔ میں شاہین کو تسلی دے کر واپس آ گیا۔

وہ ساری رات میں نے اور صفدر نے اسپتال کے برآمدے میں کاٹ دی۔ بخشو کے علاوہ ہماری گفتگو کا دوسرا اہم موضوع عیسٰی جان تھا۔ اس کی یہاں حیدرآباد میں موجودگی پر ہم نے دیر تک تبادلۂ خیال کیا۔ صبح تین چار بجے شاہین کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ نرس کے بلاوے پر میں اندر گیا تو وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ ڈاکٹرز ابھی ابھی اسے انجکشن وغیرہ دے کر گئے تھے۔ ڈرِپ اور آپریٹس بستر کے قریب کھلے پڑے تھے۔ وہ بولی "میرے قریب بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ گیا۔ اس نے کروٹ لے کر میرا ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے دبا لیا۔ جلد ہی میرا ہاتھ اس کے آنسوؤں سے نم ہونے لگا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کا سینہ تلاطم کی زد میں تھا۔ غمناک آواز میں بولی "شاہ جہاں! کیا تم مجھے دلہن بنا سکتے ہو؟"

میں بھونچکا رہ گیا "کیسی باتیں کرتی ہو شاہین۔ تم تو بہت دلیر لڑکی ہو۔ تمہارا یہ زخم گواہ ہے کہ تم ایک بہت دلیر لڑکی ہو۔ اپنا حوصلہ چھوٹا مت کرو۔"

"میری بات کا جواب دو شاہ جہاں۔ کیا مجھے ____ دلہن بنا سکتے ہو؟"

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا "تم میری دلہن ہو۔ میں نے دل و جان سے تمہیں قبول کیا ہے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر جو رسمیں ہیں وہ بھی پوری ہو جائیں گی۔"

"اور اگر میں ____ ٹھیک نہ ہوئی تو؟"

"تمہیں ٹھیک ہونا پڑے گا۔ میری خاطر، ہم سب کی خاطر"

میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

شدید کرب کے عالم میں بھی اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔ میں تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا پھر اٹھ گیا۔ وہ آہستگی سے بولی "مجھے ایک بات کے لیے معاف کر دینا شاہ جہاں ____"

"کیسی بات؟"

"میں نے تم سے کہا تھا ____ کہ کبھی ____ شادی کا ذکر زبان پر ____ نہیں لاؤں گی ____ میں اپنا وعدہ نبھا نہیں سکی۔"

"فضول باتیں مت کرو" میں نے اسے پیار سے ڈانٹا "بس جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔"

اگلے روز سہ پہر تک شاہین کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ وہ دو تین بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ میں صفدر کو ساتھ لے جاؤں اور "بابا کی کوٹھی" پہنچ کر صندوق اپنی تحویل میں لے لوں۔ میں نے صفدر سے مشورہ کیا۔ اس کوٹھی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے تادیر لاوارث چھوڑا جاتا۔ وہاں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف ہم دونوں میں سے کسی ایک کا شاہین کے پاس رہنا بھی ضروری تھا۔ صفدر بضد تھا کہ وہ شاہین کے پاس رہے گا۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ایک بار پھر مجھے ہی ہار ماننا پڑی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ رات نو دس بجے تک شاہین کی طبیعت ٹھیک رہی تو میں "کانڈی" کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

○☆○

وہ ایک تاریک اور حبس زدہ رات تھی۔ صفدر نے اپنے ایک شناسا کے ذریعے میرے لیے گاڑی کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ ایک "ہرلیما" کار تھی۔ پیٹرول کی ٹینکی فل تھی اور گاڑی میں مکمل کاغذات موجود تھے۔ میں نے اپنے کولٹ پستول کے علاوہ صفدر کا ریوالور بھی لے لیا۔ اس ریوالور کی خصوصیت یہ تھی کہ اس پر سائیلنسر چڑھ سکتا تھا۔ ہمارے پاس سائیلنسر موجود تھا۔ یہ ہم نے نواز کالونی والے مکان میں انسپکٹر رام ناتھ عرف جھنڈو سے چھینا تھا۔

کمبل کاٹنے سے لیس ہو کر میں رات ساڑھے دس بجے کے قریب مریم میموریل اسپتال سے کانڈی کے لیے روانہ ہوا۔ اسپتال سے کانڈی اور کانڈی سے دریائے کارانجا کے کنارے تک کا سفر بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ جس وقت میں درختوں میں گھری ہوئی مطلوبہ عمارت تک پہنچا' رات کے دو بج چکے تھے۔ میں نے گاڑی پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کے عقب میں درختوں کے درمیان کھڑی کی اور پیدل عمارت کی طرف بڑھا۔ سائیلنسر لگے ریوالور کے علاوہ ایک طاقتور ٹارچ بھی میرے پاس موجود تھی۔ گرد و نواح گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کسی کوٹھی یا فارم ہاؤس کے اندر سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی تھی۔ ورنہ ہر طرف خاموشی تھی۔ میں اپنی زخمی پنڈلی سے اٹھنے والی ٹیسوں کو برداشت کرتا آگے بڑھتا رہا۔

میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق کوٹھی کے اندر ایک مسلح چوکیدار موجود رہتا تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا اور گونگا تھا۔ اس نے اپنی امانت کے لیے ایک خونخوار کتا بھی رکھا ہوا تھا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ کتے کو احاطے میں کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ گونگا چوکیدار نہ نواب ثمریار کو جانتا تھا نہ اس کی بیٹی کو اور نہ مجھے...... وہ کسی صورت میں مجھے کوٹھی میں گھسنے اور وہاں تلاشی لینے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اس شخص سے زبردستی ہی کرنی پڑے گی۔ پرسوں دن کے وقت میں نے گھوم پھر کر کوٹھی کا جائزہ لیا تھا۔ کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے چوکیدار کو بلانا خطرناک تھا۔ اس کام کے لیے وہ چھوٹا دروازہ زیادہ مناسب تھا جو کوٹھی کے عقب میں موجود تھا۔ وہ جگہ سنسان تھی اور اگر چوکیدار اور اس کے کتے سے دھینگا مشتی بھی کرنی پڑتی تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔

میرا خیال تھا کہ جونہی میں کوٹھی کے نزدیک پہنچوں گا' احاطے میں گھومنے والا کتا بھونکنا شروع کر دے گا' لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میں دروازے کے پاس بھی پہنچ گیا لیکن کوٹھی کے اندر یکسر خاموشی رہی۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سب کچھ ویسا نہیں جیسا میں نے سوچا ہے۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ دور کہیں اندر بیل بجنے کی آواز آئی اور آتی چلی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ کوٹھی میں کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ صرف ایک اندرونی کھڑکی میں روشنی تھی ورنہ سب کچھ تاریکی میں غرق تھا۔ بیل کے بعد میں نے دو تین بار دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ اچانک مجھے ہلکی ہلکی ناگوار بو کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسی اور بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ احاطے میں بھی موت کا سناٹا تھا۔ یہاں سنبل اور پاپولر کے دو تین درخت موجود تھے۔ ان درختوں کے خشک پتے میرے پاؤں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ریوالور پکڑا اور محتاط قدموں سے عمارت کی اکلوتی روشن کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اور لرزہ

کھلی کھڑکی میں سے مجھے ایک مختصر کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہ کمرہ شاید سرونٹ کوارٹر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں معمولی فرنیچر پڑا تھا۔ ایک طرف حقہ رکھا تھا۔ مسہری کے پاس کسی کی چپلیں پڑی تھیں اور تکیے پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کوئی خبریں سنتے سنتے اٹھ کر گیا ہے۔

میں نے ٹارچ روشن کی اور ایک بار پھر مین گیٹ کے پاس آگیا۔ بدبو کا مرکز گیٹ کے آس پاس کہیں تھا۔ برآمدے میں مجھے ایک جستی ٹرنک نظر آیا۔ ٹارچ کی روشنی ٹرنک پر ڈالی تو ٹرنک کے اردگرد کیڑے مکوڑے رینگتے نظر آئے۔ قریبی دیوار سے بہت سی مکھیاں چپٹی ہوئی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے ٹرنک کا ڈھکنا اٹھایا۔ بدبو کا ایک تیز جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ ٹرنک کے اندر ایک بل ڈاگ کی پھولی ہوئی لاش پڑی تھی۔ کتے کے سر پر وزنی شے سے شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایک آنکھ ابل کر باہر آ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے ڈھکنا دوبارہ بند کر دیا۔ ٹرنک کے پاس ہی گھسیٹے جانے کے نشان موجود تھے۔ پختہ فرش پر یہ نشانات مین گیٹ سے باہر تک چلے گئے تھے۔ ان نشانات میں خون کی آمیزش بھی تھی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کتے کو مین گیٹ کے قریب ہلاک کیا گیا اور پھر گھسیٹ کر اس ٹرنک میں بند کر دیا گیا۔

کوٹھی کا اندرونی دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ ایک خوب صورت "آراستہ" کوٹھی تھی۔ زیادہ تر دروازے مقفل تھے۔ غالباً مالک کی آمد پر کھولے جاتے ہوں گے۔ جو کمرے کھلے تھے ان میں قالین بچھے تھے اور صاف ستھرا فرنیچر رکھا تھا۔ تاہم اس فرنیچر پر گرد کی تہہ تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چار پانچ روز سے جھاڑ پونچھ نہیں کی گئی۔ کہیں کہیں دیواروں پر قرآنی آیات اور مقدس مقامات کی تصاویر بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک چھوٹے دروازے کے سامنے تھوڑی سی ریزگاری بکھری نظر آئی۔ اس ریزگاری کے ساتھ ایک ماچس' ایک بال پوائنٹ اور ایک دو پرچیاں پڑی تھیں۔ یوں لگا جیسے یہ اشیا کسی کی جیب میں سے یہاں گر گئی ہیں۔ چھوٹے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ میں نے کنڈی ہٹائی۔ یہ ایک اسٹور روم تھا۔ میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو اسٹور روم میں حرکت دی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک کونے میں کسی شخص کی لاش پڑی تھی۔ لاش کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوٹھی کے چوکیدار کی لاش ہے۔ بدنصیب شخص کے ہاتھ پاؤں رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ایک رومال نما کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔ متوفی کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرے کی ہڈیاں نمایاں تھیں اور ہونٹ سوکھ کر سیاہ ہو رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ شخص بھوک پیاس کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہوا ہے۔ غالباً اسے دم توڑے ہوئے زیادہ وقت نہیں

گزرا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھنٹے ہوئے تھے۔ اس کے جسم میں ابھی اکڑ تھی اور بدبو اٹھنا بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بغیر میگزین کے ایک سیون ایم ایم رائفل بھی متوفی کے پاس پڑی تھی۔ یقیناً یہ اسی شخص کی رائفل تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ ایک گونگا شخص تھا...... اور اب اس کی بے زبانی' ابدی خاموشی میں بدل چکی تھی۔ میں نے اسٹور کا دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ روشن ٹارچ کو ایک کرسی پر رکھ کر میں نے جیب سے وہی کاغذ نکالا جو نواب مرحوم نے تحریر کیا تھا اور جس میں کوٹھی کی زیریں منزل میں جانے کا راستہ دکھایا تھا۔ زیریں منزل کے اس ہال کی نشاندہی بھی اس کاغذ میں موجود تھی جہاں صندوق اسٹور کیے گئے تھے۔

زیریں منزل کو جانے والے زینے ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ان زینوں پر پاؤں رکھتے ہوئے میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت بھی مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی اور خاموشی سے اس دفینے تک پہنچ جاؤں گا جس نے ایک خلقت کو پاگل کر رکھا ہے' اور اب یہاں کے حالات دیکھنے کے بعد تو یہ امید اور بھی کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی ایک ہیجانی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ ریوالور پر میری گرفت مضبوط تھی اور ٹارچ کا روشن دائرہ میرے قدموں کو راہ دکھا رہا تھا۔ زیریں منزل میں بھی ہو کا عالم طاری تھا۔ زیادہ تر دروازے مقفل تھے۔ ہال کا راستہ ایک راہداری کے اندر سے تھا۔ جونہی میں راہداری میں پہنچا' میری موہوم سی امید بھی دم توڑ گئی۔ ہال کا آٹومیٹک آہنی دروازہ دو پٹ کھلا تھا۔ میں لپک کر دروازے پر پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی اندر پھینکی۔ اندر ایک حیرت ناک اور مایوس کن منظر میرا منہ چڑا رہا تھا۔ ہال کے گرد آلود فرش پر جابجا صندوق کھلے پڑے تھے۔ وہ تمام چوبیس صندوق جو ہم نے بٹنے پل کی حویلی سے نکالے تھے اور ٹرک پر لادے تھے۔ یہاں موجود تھے۔ میں نے دیکھا کہ تمام صندوقوں کے قفل ٹوٹے پڑے ہیں اور انہیں یوں خالی کر دیا گیا ہے کہ اندر ایک تنکا بھی موجود نہیں۔ میں نے ہال کی ایک لائٹ روشن کر دی۔ مدھم روشنی پورے ہال میں پھیل گئی۔ میں نے صندوقوں کو گنا' وہ پورے چوبیس تھے۔ میں ان میں سے ہر صندوق کو پہچان سکتا تھا۔ صندوقوں کے شکستہ قفل پورے ہال میں بکھرے تھے۔ ان قفلوں کو توڑنے کے لیے جو وزنی ہتھوڑا استعمال کیا گیا تھا وہ بھی دیگر اوزاروں کے ساتھ فرش پر پڑا تھا۔ مجھے گندھارا آرٹ کے کسی نوادر کے ٹکڑے بھی نظر آئے۔ غالباً سامان کی نقل و حمل کے دوران میں یہ نمونہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ مٹی کے ایک منقش مرتبان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اور اس کے ٹکڑے ہال کے سلائیڈنگ دروازے کے قریب بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ راہداری کے فرش پر گھمایا۔ گرد آلود فرش پر جابجا گھسیٹے جانے کے نشانات تھے۔ ان نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ سامان کو بڑے بڑے بوروں یا گٹھڑیوں میں ٹھونس

کر یہاں سے نکالا گیا ہے۔ ان نشانات کے اردگرد بہت سے نقوش پا بھی تھے۔ کہیں چپل کا نقش تھا' کہیں بوٹ کا' کہیں اسپورٹس شوز کا۔ ان شواہد کا جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہ تسبیح کے دانوں جیسی چھوٹی چھوٹی اشیا پر پڑی۔ میں نے انہیں اٹھا کر دیکھا۔ یہ خالص سونے کے موتی تھے اور کوئی مالا ٹوٹ جانے کی وجہ سے بکھرے تھے۔ یہ کسی رانی مہارانی کا زیور ہو گا۔ گئے وقتوں میں بھی اس کی قیمت ہزاروں میں ہوگی اور اب تو ہر موتی بہت قیمتی تھا' لیکن دفینہ لوٹنے والوں نے ان موتیوں کو سمیٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب کروڑوں بلکہ اربوں کی دولت ہاتھ میں ہو تو پھر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی حیثیت جیب سے گرنے والی چونی کی سی ہوتی ہے۔

میں کچھ دیر تک ہال کے لمبے چوڑے مضبوط دروازے کے سامنے کھڑا رہا اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا اور حقیقت وہی ہے جو اپنی تمام تر بے مہرانی کے ساتھ سامنے آ چکی ہے...... دفینہ اور اس کے نوادرات اب یہاں نہیں ہیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ سب کچھ اجنبی ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے اور یہ "منتقلی" کچھ زیادہ عرصے کی بات نہیں تھی۔ شواہد بتا رہے تھے کہ یہ سب کچھ اسی ایک ہفتے کے اندر اندر ہوا ہے...... میں سوچنے لگا۔ کاش شاہین چند روز پہلے ہمیں یہ سب کچھ بتا دیتی۔ کاش اسے اپنے پاپا کی ذہانت اور معاملہ فہمی پر ضرورت سے زیادہ بھروسا نہ ہوتا اور وہ میرے اس خدشے کو اہمیت دیتی کہ "دفینے کے شکاری" دفینے کو کہیں سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔

جس وقت میں ڈیڑھ دو گھنٹے اس خالی ڈبے جیسی کوٹھی میں گزار کر باہر نکلا' سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا اور قرب و جوار سے پرندوں کے چہچہانے کا شور بلند ہو رہا تھا۔ دریا کی جانب سے چلنے والی ہوا نے حبس اور گھٹن کو کافی حد تک دور کر دیا تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر کے عقب میں میری گاڑی موجود تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ کوٹھی سے ملنے والے کچھ شواہد میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ان میں نوادرات کے ٹکڑے بھی تھے جو ہال سے ملے تھے۔ سارے راستے میں یہی سوچتا رہا کہ اب جا کر شاہین کو کیا بتاؤں گا۔ اسے اس امر میں ذرا سا شک بھی نہیں تھا کہ اس کے پاپا نے صندوقوں کی حفاظت کا نہایت معقول انتظام کیا ہے اور وہ برسوں بھی وہاں پڑے رہیں تو کوئی ان تک پہنچ نہیں سکے گا۔ اس نے بڑی سادگی اور نیک نیتی کے ساتھ اس دولت کے حوالے سے رفاہی منصوبے بنائے تھے۔ وہ اس دولت کا ایسا استعمال چاہتی تھی کہ مستحق لوگ مدتوں تک اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور اس کے پاپا کی روح تسکین پاتی رہے۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ نہ دولت' نہ خلقِ خدا کی بھلائی کے منصوبے اور نہ وہ غیر متزلزل اعتماد جو ایک بیٹی کو اپنے باپ کی دانائی اور ذہانت پر تھا۔ کتنا مان تھا اسے اپنے پاپا جانی پر۔ وہ ہر بات میں ان کا حوالہ دیتی تھی۔ ان کے علم و دانش کے

نصیبے پڑھتی تھی۔ مجھے یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ میں نواب مرحوم کے بارے میں شاہین کے تصورات کو بہاد کروں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال میں شاہین کو دلنے کی صورت حال سے آگاہ نہیں کروں گا اور اسے بتاؤں گا کہ فی الحال میں کوٹھی کے اندر نہیں جاسکتا ہوں۔

میں نو بجے کے قریب حیدر آباد پہنچا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے روزگار کی طرف دوڑا چلا جارہا تھا۔ کاریں، بسیں، موٹر سائیکلیں، رکشا، ٹیکسیاں، تانگے، ہر قسم اور ہر طرز کے ٹریفک نے سڑکوں پر آکر راستے مسدود کر رکھے تھے۔ میں معظم جاہی مارکیٹ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ کار رینگنے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اچانک کسی نے کار کا بائیں جانب والا دروازہ کھولا اور میرے پہلو میں آبیٹھا۔ میں نے چونک کر دیکھا اور سناٹے میں رہ گیا۔۔۔۔ وہ سائیں عالی تھا۔ اس کا سیاہ چغہ گرد و غبار سے اَٹا ہوا تھا۔ داڑھی اور سر کے بالوں میں گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح برق سی کوند رہی تھی۔

اس نے زور سے میرے کندھے پر دھپ مارا اور بولا "اوئے شفیع محمد! تیرا سوا ستیا ناس ہو۔ تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ کوہ قاف کی ساری پولیس تیرے پیچھے لگا رکھی ہے اور تو نظر ہی نہیں آرہا۔"

میں نے کہا "میں تو کہیں نہیں جاتا۔ تو خود ہی گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اور پھر اچانک ٹپک بھی پڑتا ہے۔ جیسے اب ٹپکا ہے۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بنا" سائیں عالی نے منہ سے تھوک اُڑاتے ہوئے کہا "چل اپنے اس کھٹارے کو ایک طرف روک لے۔ تجھ سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا یہ بات گاڑی میں نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں، نہیں۔ یہ گاڑی والی بات نہیں ہے۔ چل آگے جو واٹر اپارٹ آرہا ہے وہاں سے گاڑی واپس موڑ لے۔ وہ پیچھے جو بس اسٹاپ تھا اس کے پاس رکنا ہے۔"

میں جانتا تھا سائیں عالی سے بحث فضول ہے۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گول چکر سے گاڑی واپس موڑ لی۔ سڑک کے کنارے ایک خانہ بدوش عورت بانس کی تیلیوں سے بنے ہوئے جھاڑو بیچ رہی تھی۔ گاڑی پاس سے گزری تو سائیں عالی نے عورت کی ایک جھاڑو کھینچ لی۔ وہ غصے میں گاڑی کے پیچھے بھاگی لیکن پھر سائیں عالی کی درویشانہ صورت دیکھ کر رُک گئی۔ سائیں عالی واہ چلتے ایسی ہی عجیب و غریب حرکتیں کرتا تھا۔

میں نے پوچھا "اس جھاڑو کا کیا کرنا ہے؟"

وہ پیلے پیلے دانت نکال کر مسکرایا "وہاں بس اسٹاپ پر میں اپنی مٹھری رکھ کر آیا ہوں۔ اس میں گڑ ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے گڑ پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ اس جھاڑو سے انہیں اُڑاؤں گا۔"

اب بھلا میں اس بات کے جواب میں کیا کہتا۔ خاموشی۔ گاڑی چلاتا رہا۔ کوئی ایک فرلانگ پیچھے جاکر ایک بس اسٹاپ سامنے سائیں نے کار رکوالی۔ مجھے ساتھ لے کر وہ کار سے اُترا بس اسٹاپ کی طرف بڑھا۔ یہ ایک خستہ حال اسٹاپ تھا۔ شاید روٹ پر زیادہ بسیں نہیں چلتی تھیں۔ صرف پانچ چھ سواریاں کھڑی تھیں۔ پتھر کی بینچ پر بیٹھی ہوئی ایک "چیز" کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سروج عرف الو کی پٹھی تھی۔ اس موقع پر صرف الو کی پٹھی کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی واہیات لباس پہنا ہوا تھا اس نے۔۔۔۔ بازو کندھوں تک اور ٹانگیں گھٹنوں تک عریاں تھیں اور ہر آنکھ کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں! لباس موجود تھا وہ بھی چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ بخت سرتاپا قیامت بنی اس ٹوٹے پھوٹے بس اسٹاپ پر جلوہ گر تھی۔ چند نوجوان جنہیں اپنے وفا نزاور کالجز کی "ٹائمنگ" بھول گئی تھی، بھیڑیوں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ آنکھوں آنکھوں میں اسے کھا جاتے اور بڑی پوٹلی گٹھڑی بنا کر اپنے پاس رکھ لیتے۔ ایک ذرا دلیر قسم کا نوجوان سروج کے قریب ہی بینچ پر بیٹھ چکا تھا اور اس کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ عنقریب سروج سے اس کی "تنہائیوں اور اداسیوں" کا سبب پوچھنے والا ہے۔ وہ حرافہ بڑی معصوم سی صورت بنائے نگاہیں زمین میں گاڑے بیٹھی تھی۔ بس اسٹاپ کے اندر پہنچتے ہی سائیں عالی نے "یاہو" کا نعرہ لگایا اور بانس کی جھاڑو پوری شدت سے اس نوجوان کی کمر پر دے ماری جو سروج کے قریب بیٹھا تھا۔ نوجوان تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا کرتا جھاڑو کی دوسری ضرب اس کے چہرے پر پڑی اور اس کا دھوپ کا چشمہ اُچھل کر دور جاگرا۔ اس کے بعد تو جیسے بس اسٹاپ کے اندر اور باہر بھونچال سا آگیا۔ سائیں عالی نے سروج کے ارد گرد کھڑے بھونڈ عاشقوں پر تابڑ توڑ جھاڑو برسائے اور انہیں تگنی کا ناچ نچا دیا۔ ایک تو سائیں عالی کا غیظ و غضب اور پھر اوپر سے جھاڑو جب "حلیہ" بگاڑنے والے ڈر کر بھاگے اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ارد گرد کے لوگ مسکراتی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ اس کام سے فارغ ہو کر سائیں عالی نے جھاڑو ایک طرف پھینکی اور ہاتھ جھاڑ کر مجھ سے بولا "دیکھا۔۔۔۔ کیسے اُڑایا ان مکھیوں کو۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ گڑ سے اس کی مراد سروج تھی۔ وہ ایسی ہی پہلو دار باتیں کرتا تھا۔ سروج مجھے بڑے ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھی۔ میں جانتا تھا۔ مجھ سے کرنے کے لیے اس کے پاس بہت سی باتیں ہیں اور بہت سے سوال ہیں۔ لیکن فی الحال وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ کیوں کہ اس کے پیر و مرشد عزت مآب قبلہ سائیں عالی صاحب موقع پر موجود تھے۔ سائیں عالی کے چہرے پر عجیب سی چمک نظر آرہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کسی اندرونی

جوش کی وجہ سے اس کی آنکھیں دمک رہی ہیں۔ بس اسٹاپ کی اس مختصر سی چھت کے نیچے اب ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سائیں عالی مجھے لے کر بس اسٹاپ کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اس کے دوسرے پہلو میں فتنہ سامان سروج بیٹھی تھی۔ سائیں عالی نے اپنا بوسیدہ جھولا اٹھایا۔ پہلے اس میں سے کچھ پھٹے پرانے کاغذ اور باسی اخبار نکالے۔ پھر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ائرلائنز کے چار پانچ ٹکٹ نکالے۔ ان میں سے دو ٹکٹ مجھے تھماتے ہوئے اس نے کہا "دیکھو یہ کس کے ٹکٹ ہیں؟"

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہ میرا اور صفدر کا ٹکٹ ہے۔ ان پر ہمارے وہی فرضی نام لکھے تھے جن ناموں سے ہم یہاں رہ رہے تھے۔ یعنی میرا نام اسلم اور صفدر کا انیس احمد۔ یہ ٹکٹ حیدر آباد سے مدراس تک کے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہے" سائیں عالی برابر کے جوش سے بولا "وہ سب کچھ تمہیں ملنے والا ہے جس کے تم اور سروج متلاشی ہو اور وہ سب کچھ تمہیں دریائے کاوانجا کے کنارے سے نہیں ملے گا، کہیں اور سے ملے گا۔ کافی آگے جانا پڑے گا تمہیں۔ ڈر ڈر کر تم تو گھبرا گئے۔۔۔۔ بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے سارے جنات بھی۔ ہم لے کے جائیں گے تمہیں۔۔۔۔ ہاہاہا" سائیں عالی نے زوردار قہقہہ لگایا "بھئی مزہ آجائے گا۔ سفر، خطرات، دھینگا مشتی، ایڈونچر۔۔۔۔ بس اب تم چلنے کی تیاری کرو۔ ایک منٹ کی دیر نہیں لگانی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم واپس ہی نہ جاؤ۔ اپنے یار کو ٹیلی فون کر کے یہیں بلالو۔ گاڑی تمہارے پاس ہے ہی۔ شام تک اِدھر اُدھر گھومیں گے۔ کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے۔ وہ بھی کر لیں گے۔ رات کا کھانا تاج محل ہوٹل میں کھائیں گے۔ دس بجے ہماری فلائٹ ہے۔"

تجربات نے مجھے سکھا دیا تھا کہ میں سائیں عالی کی بے معنی باتوں کو بے معنی نہ سمجھا کروں۔ بظاہر تو وہ اُلٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ مگر اس کا جوش و خروش اور سنجیدہ پن کہے دے رہے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ پھر وہ ٹکٹ بھی لیے بیٹھا تھا۔ اس نے صرف دو ٹکٹ مجھے دکھائے تھے۔ یقینی بات تھی کہ باقی ٹکٹوں میں سروج کا ٹکٹ بھی شامل ہوگا۔

میں نے سروج کی طرف دیکھا۔ وہ سائیں عالی کے منصوبے سے پوری طرح متفق نظر آرہی تھی۔ بلکہ سائیں ہی کی طرح پُرجوش بھی تھی۔ کہنے لگی "اگر آپ جانا نہیں چاہتے تو مجھے اپنے دوست کا فون نمبر دیجئے۔ میں انہیں رنگ کر کے یہیں بلا لیتی ہوں۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ اس کو فون نمبر، یہ خود رنگ کرلی ہے" سائیں عالی نے کہا۔

میں نے کہا "آپ لوگوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ کیسے کرسکتا ہوں۔ اور اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں بھی تو اتنی آسانی سے نہیں جاسکتا۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ مائی عاتاں کا بیٹا بخشو ہماری تحویل میں تھا۔ وہ دو تین روز سے مل نہیں رہا۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا؟ اس کو ڈھونڈنا ہے۔ پھر شاہین ہے۔ وہ شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی۔۔۔۔"

"تم یہ سب باتیں چھوڑ دو" سائیں عالی نے ہانک لگائی "یہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ تم بس جانے کی تیاری کرلو۔ ہمیں ہر صورت آج رات دس بجے مدراس کے لیے روانہ ہو جانا ہے۔ یہ فیصلہ پتھر پر لکیر ہے۔"

بس اسٹاپ کے ارد گرد ابھی تک تماشائی موجود تھے اور دلچسپ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوستانہ لہجے میں سائیں عالی سے کہا "اچھا اس معاملے پر کہیں تسلی سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ فی الحال تو میں اسپتال جا رہا ہوں۔ اگر چلنا ہے تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اسپتال سے ہو کر گھر چلیں گے۔"

وہ فوراً اپنا جھولا پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سروج نے بھی اٹھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ وہ اٹھی تو اس کے جسم کے نشیب و فراز اور بھی قیامت خیز ہو گئے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ کرانے کے لیے یہاں آئی ہے۔ وہ لہراتی ہوئی باہر نکلی اور لوگوں کے دلوں پر پاؤں رکھتی ہوئی میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔ سائیں عالی حسبِ معمول نشست پر نہیں بیٹھا تھا۔ بلکہ دو نشستوں کے درمیانی خلا میں پھنس پھنسا کر بیٹھ گیا تھا۔۔۔۔ گاڑی کے اندر میرے پہلو میں بیٹھتے ہی سروج نے اپنا گھٹنا میرے گھٹنے سے لگا دیا اور اسے آہستہ آہستہ رگڑنے لگی۔ میں نے اب اس کی حرکات پر پیچ و تاب کھانا چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں اس کی موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا۔

شہر کی بھری پُری سڑکوں پر آدھ گھنٹے کے صبر آزما سفر کے بعد ہم "مریم میموریل" اسپتال پہنچ گئے۔ سارے راستے میں سائیں عالی کی معنی خیز باتیں میرے ذہن میں ہلچل مچاتی رہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور ان تمام حالات سے باخبر ہو جاتا ہے جو مجھ پر گزرتے ہیں۔ بس اسٹاپ پر ہونے والی گفتگو میں اس نے کئی حیران کن حوالے دیے تھے۔ ان میں دریائے "کاوانجا" اور صفدر کا حوالہ بھی شامل تھا۔۔۔۔ اب وہ مجھے کسی انجانی مہم کی طرف مائل کر رہا تھا اور یقین دلا رہا تھا کہ یہی مہم ہمیں منزل تک پہنچائے گی۔ سروج عرف الو کی پٹھی بھی والہانہ انداز میں اس کی تصدیق کر رہی تھی۔

گاڑی اسپتال کی پارکنگ میں روک کر میں شاہین کو دیکھنے چل دیا۔ سائیں عالی اور سروج وہیں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ میں ذہن میں وہ الفاظ ترتیب دے رہا تھا جو میں نے دیکھنے اور تواورات وغیرہ

کے بارے میں شاہین سے کہنے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس حالت میں شاہین کے احساسات کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچے۔ کوریڈور میں سے گزر کر جب میں آئی سی یو کے سامنے آیا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے کوئی میرے عین پیچھے موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹتا' کسی نے عقب سے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔۔۔۔۔۔ وہ منصور تھا۔۔۔۔۔ اور زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا کہ شاہین ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی ہے۔۔۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ دھند سی پھیلتی چلی گئی۔ میں نے مڑ کر منصور کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں "نواب زادی صاحبہ ہم سے روٹھ گئی ہیں" اس نے دل دوز لہجے میں کہا۔

میری نگاہ انتہائی نگہداشت وارڈ کے اندر گئی۔ شاہین کے بستر کے گرد پردہ تان دیا گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں بستر کے قریب موجود تھیں۔ ڈاکٹر ایک رجسٹر پر اندراجات کرنے میں مصروف تھا۔ میں شاہین کے بستر کی طرف بڑھا لیکن دو قدم چل کر رک گیا۔ مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا مردہ چہرہ دیکھ سکوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کب اسپتال سے باہر نکلا اور کب میرے قدم مجھے سڑک پر لے آئے۔ میں تیز دھوپ میں چلتا رہا تھا۔ جسم کے ہر مسام سے پسینہ ابل رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سینے میں کسی نے دل کی جگہ بڑا سا انگارا رکھ دیا ہے۔ اس انگارے کی حدت سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ میرے ارد گرد زندگی حرکت میں تھی۔ ٹریفک کا شور' گاڑیوں کے ہارن' سائیلنسروں کا دھواں' لوگوں کی آوازیں' کچھ بھی توجہ پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس ہجوم میں یکسر اکیلا تھا۔ شاہین کی باتوں کی بازگشت میرے کانوں میں تھی۔ ایک آواز میری سماعت میں گونجی۔ "مجھے ایسا کیوں لگتا ہے شاہ جہاں! تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہوتے ہو۔ ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر۔"

پھر ایک اور آواز نے میری سماعت کو مجروح کیا "مجھ سے شادی کر لو شاہ جہاں! میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

پھر میں نے دیکھا' وہ گلاب کی کلیاں لیے میرے سامنے کھڑی ہے "دیکھو شاہ جہاں۔ کیا لائی ہوں تمہارے لیے۔"

پھر اس کی کھنکتی ہنسی میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُبلتے چشمے جیسی صاف شفاف اور پر ترنم ہنسی۔

شاہین سے وابستہ ایک ایک آواز' ایک ایک منظر میرے ذہن میں آ رہا تھا اور میں بے سمت چلا جا رہا تھا۔ میں اس اسپتال سے دور چلا جانا چاہتا تھا جس کے ایک منحوس کمرے میں شاہین کا بے جان جسم پڑا تھا۔ میں لوگوں کے ہجوم میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ ہاں گم ہو جانا چاہتا تھا' اس امید پر کہ شاید انہی لوگوں میں کہیں شاہین کا قاتل مجھ سے ٹکرا جائے یا میں اس سے ٹکرا جاؤں۔ وہ سفاک درندہ انہی گلی کوچوں میں کہیں موجود تھا۔ باقی فضا میں کہیں سانس لے رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا' واپس نہیں پلٹوں گا اور اگر پلٹوں گا تو اس وقت جب عیسیٰ جان میرے ہاتھوں ذبح ہو چکا ہو گا۔۔۔۔۔۔

چلتے چلتے میں ایک پارک میں پہنچ گیا۔ ایک مصنوعی آبشار کے سامنے بہت سی ڈھیریلی بینچ پڑی تھیں۔ میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ میری جیب میں وہ لفافہ ابھی تک موجود تھا جو چند ہفتے پہلے شاہین نے میرے نام لکھا تھا۔ یہ لفافہ میں نے اسے دے دیا تھا لیکن اس نے پھر واپس کر دیا تھا۔ میں نے لفافے میں سے شاہین کا خط نکالا اور دھندلائی نگاہوں سے پڑھنے لگا۔ یہ خط شاہین کا اظہار محبت تھا۔ اظہار محبت اس نے اس غلط فہمی میں کیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور جا رہی ہے۔ پھر اس کی یہی غلط فہمی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ پھر سب کچھ کتنی تیز رفتاری سے ہوا تھا۔ اظہار محبت سے شادی کے پروگرام تک کے تمام مراحل کتنی سرعت سے طے ہوئے تھے اور اب۔۔۔۔۔ سب کچھ ختم بھی ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ شاید میرے ذہن میں وہ بات ٹھیک ہی آئی تھی۔ شاہین ساون کی جھڑی نہیں تھی۔ وہ ایک طوفانی بارش تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ کاش' میں نے یہ خط پڑھا نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہوا ہوتا کہ وہ میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس روکنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کر ہوتا۔ کوئی ایسا راستہ جو اس کی زندگی کے لیے خطرہ نہ بنتا۔

اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' وہ سائیں عالی تھا۔ خود پر گزرنے والی قیامت کے بعد مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں سائیں عالی اور سروج کو اسپتال کی پارکنگ میں چھوڑ آیا ہوں۔ غالباً سائیں عالی میرے پیچھے پیچھے چلتا یہاں تک آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد بولا "کہاں جا رہے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا۔ میری آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

"عیسیٰ جان کو ڈھونڈنا چاہتے ہو؟" اس نے کہا۔ میں چونک کر سائیں عالی کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"چلو میرے ساتھ" سائیں عالی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لبادے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکال لی۔ میں یہ چیز دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

یہ ایک نیم پلیٹ تھی۔ پیتل کی اس خوبصورت نیم پلیٹ پر زیڈ اے درانی کا نام لکھا تھا۔ نام کے نیچے ڈگریاں لکھی ہوئی تھیں اور پھر ایڈریس درج تھا۔ زیڈ اے درانی نام کے اس شخص نے

الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری لے رکھی تھی اور پاور منیجمنٹ کا کورس کر رکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سائیں عالی نے یہ نیم پلیٹ بڑو بازور کسی دیوار سے اکھاڑی ہے۔ پلیٹ تھوڑی سی ٹیڑھی ہوئی تھی اور اس میں لگے ہوئے پیچوں کی چوڑیوں میں ابھی تک سیمنٹ اور ریت پھنسی ہوئی تھی۔ میں سوالیہ نظروں سے سائیں عالی کی طرف دیکھنے لگا۔

سائیں عالی بڑی سنجیدگی سے بولا "جاؤ اس پتے پر چلے جاؤ۔ شاہ جیناں تمہاری مدد کرے گا۔ اس بندے کا کھرج لگ جائے گا جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔"

"تم عیسیٰ جان کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اسی سور کھ کی۔۔۔۔۔ جاؤ دیر نہ کرو۔"

میں نے ایک بار پھر حیرت زدہ نظروں سے نمبر پلیٹ کو دیکھا اس پر سوسائٹی ٹاؤن کا ایڈریس تھا۔ سڑک کا نام ان سنگھ روڈ تھا اور مکان نمبر ۱۵ تھا۔ حیدر آباد میں گھومتے پھرتے اب مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح سوسائٹی ٹاؤن کا علاقہ بھی میرا دیکھا ہوا تھا غالباً مان سنگھ روڈ کا نام بھی میں نے کہیں پڑھا ہوا تھا۔ سائیں عالی کی باتوں کو میں اکثر سنجیدگی سے نہیں لیا کرتا تھا' آج نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں سائیں عالی کی باتوں پر من و عن یقین کر لوں اور وہی کروں جو وہ کہہ رہا ہے۔ میری آنکھوں میں نواب زادی شاہین کا چہرہ گھوم رہا تھا جو ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس کی بے قرار روح جیسے میرے ارد گرد منڈلا رہی تھی اور تقاضا کر رہی تھی کہ میں اس کے قاتل سے عبرتناک انتقام لوں۔۔۔۔۔ مجھے لگا جیسے میں اپنی جگہ جمنا رہا تو میرا جسم پھٹ کر سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ ارد گرد کے سارے مناظر اور ساری آوازیں مجھے خود سے بہت دور محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک سرخی مائل دھند میں چھپا ہوا تھا۔ میں جیسے خواب میں چلتا ہوا بڑی سڑک تک پہنچا تھا۔ یہاں میں نے ایک ٹیلیفون بوتھ دیکھا۔ میرے قدم خود بخود بوتھ کی طرف اٹھ گئے۔ جیسے خواب کی سی حالت میں میں نے اس حویلی کے نمبر ڈائل کیے جہاں شاہین کا بھائی نواب فیروز رہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے فون اٹھایا اور کیا کہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے فون اٹھانے والے کو نواب زادی شاہین کی موت کی اطلاع دی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس کی لاش حیدر آباد کے کریم میموریل اسپتال میں پڑی ہے۔۔۔۔۔ فون بند کرنے کے بعد میں باہر نکلا اور ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی کی رفتار آہستہ ہوئی لیکن پھر ایک دم تیز ہو گئی اور وہ رکے بغیر نکل گئی۔ معلوم نہیں ٹیکسی ڈرائیور کو میری صورت میں کیا نظر آیا تھا کہ اس نے رکنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سچ کہتے ہیں' ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں کی چھٹی حس تیز ہوتی ہے۔ ایک دوسری ٹیکسی بھی میرے اشارے پر رکے بغیر آگے بڑھ گئی تو میں ایک رکشا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ رکشا ڈرائیور کو مجبوراً رکشا روکنا پڑا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں رکشا میں گھس گیا۔

"سوسائٹی جاؤ" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ پنجر سیٹ کے سامنے ایک فریم میں آئینہ لگا تھا۔ میں نے اپنی صورت دیکھی۔ بال منتشر اور آنکھیں سرخ انگارا تھیں۔ بے خیالی میں آنسو میرے رخساروں پر لڑھک آئے تھے۔ میں نے جلدی سے رخسار صاف کیے اور بالوں میں انگلیاں چلا کر انہیں پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ میرا یقین ہے کہ آنسو آتش غم کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ آتش غم ٹھنڈی ہو۔ کم از کم عیسیٰ جان کی موت تک میں اسے روشن رکھنا چاہتا تھا۔ سوسائٹی پہنچ کر میں رکشے سے اتر آیا۔ معلوم نہیں کرایہ بھی دیا یا نہیں۔ بھرا ہوا ریوالور میری جیب میں موجود تھا۔ اس کی اطمینان بخش سختی میں اپنی ران پر محسوس کر سکتا تھا۔ رکشا میں نے مان سنگھ روڈ سے کافی دور رکوایا تھا۔ باقی فاصلہ میں نے پیدل طے کیا۔

مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ دروازے پر نیم پلیٹ نہیں تھی لیکن میں پہچان گیا کہ یہی وہ مکان ہے جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ درحقیقت نیم پلیٹ کا نہ ہونا ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ مطلوبہ مکان ہے۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں

ایک نئی صدا بہار تخلیق
کھلاڑی
ایم۔ اے۔ راحت
ایک بلند حوصلہ نوجوان کی داستان جو چٹانوں جیسا عزم رکھتا تھا
ایک ایسا نوجوان جو چھلاوے سے زیادہ پھرتیلا تھا
وہ جو ہواؤں کو تسخیر کر چکا تھا۔
اپنے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرنا جانتا تھا۔ فرمت جس کے لیے ترک ہوا تھا۔ ہوائیں اپنا رخ موڑ دیتی تھیں۔
قیمت ۲۲۵/-
ڈاک خرچ ۲۰/-
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

سے نمبر پلیٹ اکھاڑی گئی تھی۔ پلستر شدہ دیوار پر نمبر پلیٹ کا مستطیل نشان موجود تھا اور دو چھوٹے چھوٹے گڑھے بھی۔ یہ گڑھے ان پیچوں کی نشاندہی کرتے تھے جہاں سے پیچ اکھاڑے گئے تھے۔ یہ وسیع رقبے کا ایک خوبصورت سا مکان تھا۔ اردگرد کوٹھیاں موجود تھیں۔ اس مکان کے دونوں اطراف دو دو تین پلاٹ خالی تھے۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی کی آواز بار بار ابھری لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ دروازے میں جیبی قفل موجود تھا اور عجیب بات تھی کہ دروازے کو لاک کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دروازے کے قریب لگا ہوا بجلی کا میٹر تیزی سے چل رہا ہے۔ اہل خانہ گھر میں موجود نہ ہوں تو عموماً ایک عدد فریج کے سوا بجلی کی کوئی چیز استعمال نہیں ہوتی۔ اور بعض اوقات فریج بھی استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن اس دروازے پر لگا ہوا بجلی کا میٹر بتا رہا تھا کہ فریج کے علاوہ کم از کم دو تین کمروں میں پنکھے چل رہے ہیں اور بلب وغیرہ روشن ہیں۔ اگر گھر میں کوئی موجود تھا تو اسے مسلسل کال بیل کے جواب میں دروازہ کھولنا چاہیے تھا۔

اس وقت پانچ بج چکے تھے اور تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اتفاقاً قرب و جوار میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے دیوار پھاندی اور اندر داخل ہو گیا۔ صحن میں پہنچتے ہی میں نے ریوالور جیب سے نکال لیا۔ دوسری جیب سے سائلنسر نکالا اور ریوالور پر چڑھا لیا۔ کسی اندرونی کمرے سے مجھے معمولی کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ اندرونی عمارت کی تمام کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ تاہم عقبی سمت کی ایک کھڑکی مجھے کھلی مل گئی۔ اس کھڑکی کی گرل میں سے ہاتھ گزار کر میں نے دروازے کی چٹخنی گرائی اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک سجی سجائی آباد کوٹھی تھی۔ تاہم مختلف اشیا کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہفتے بھر سے یہاں جھاڑ پونچھ نہیں کی گئی۔ کھٹ پٹ کی آوازیں کچن کے ساتھ والے کمرے سے بلند ہوئی تھیں۔ کمرے کے دروازے کو باہر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ اندر کا منظر میرے لیے حیران کن تھا۔ سنہری بالوں والی ایک انگریز لڑکی ڈری سہمی بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی رہی ہوگی لیکن اس وقت اس کی خوبصورتی پر خوف و ہراس اور بے ترتیبی حاوی تھی۔ آنکھیں ویران اور چہرے پر وحشت ناک زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے مخبوط الحواس نظر آئی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے دلدوز چیخ نکل گئی اور وہ سہم کر کمرے کے ایک کونے میں سمٹ گئی۔

"پلیز۔۔۔ پلیز۔۔ مجھے مت مارنا" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "تم جو کہو گے میں کروں گی" اس کے ہونٹ گلاب کی خشک پنکھڑیوں کی طرح لرزاں تھے۔ اور چہرے کی بے رونقی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔

"چلو ادھر آ جاؤ" میں نے بیڈ کی جانب اشارہ کیا۔

میرا مطلب تھا کہ وہ کمرے کے نیم تاریک گوشے سے نکل کر بیڈ پر بیٹھ جائے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ اور دردناک انداز میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دل میں تیر سا لگا۔ نجانے اس لڑکی کے ساتھ اس مقفل مکان میں کیا سلوک ہوا تھا۔ اس کے اعصاب تباہ ہو گئے تھے اور وہ بازاری سی نظر آ رہی تھی۔ انسانی تذلیل کا یہ تماشا میرے لیے بے حد کربناک تھا۔ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ اس کی قوم نسل کو نہیں جانتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں کیوں اور کیسے موجود ہے۔ لیکن نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ میری اپنی ہے۔ انسانیت کے رشتے سے یہ میری قریبی عزیز اور محترم ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے وہ میرے ساتھ ہوا ہے اور ہر اس فرد کے ساتھ ہوا ہے جو خود کو انسان سمجھتا ہے۔ ان لمحات میں مجھے طالب علمی کے زمانے میں پڑھا ہوا منٹو کا ایک افسانہ یاد آ گیا۔ اس افسانے میں سعادت حسن منٹو نے تقسیم ہندوستان اور فسادات کو موضوع بنایا تھا اور ایک ایسی ہی لٹی پٹی حواس باختہ لڑکی کا ماجرا بیان کیا تھا۔ وہ لڑکی اپنی ایک چھوٹی سی اضطراری حرکت سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کی طویل کہانی بیان کر دیتی ہے۔

میں حیرت کے عالم میں ریوالور تھامے کھڑا تھا اور بستر پر لیٹی' سسکیاں بھرتی سفید فام لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ "اٹھ کر بیٹھو" میں نے تحکم سے کہا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا' اس کے ایک ہاتھ پر کہنی کے قریب پٹی بندھی ہوئی ہے۔ چہرے اور گردن پر بھی چوٹوں کے مدھم نشان تھے۔

"تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں؟" میں نے پوچھا

"م۔۔۔ مجھے نہیں معلوم' مجھے کچھ نہیں معلوم" وہ شکستہ اردو میں بولی "فار گاڈ سیک۔ میرے بچے کو کچھ مت کہنا' میں مر جاؤں گی' میں ہاتھ جوڑتی ہوں' میرے بچے کو کچھ مت کہنا۔" وہ بے ربط انداز میں بول رہی تھی۔

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں کہا "جن لوگوں نے تمہیں یہاں بند کر رکھا ہے' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم کون ہو اور یہاں کیسے پہنچی ہو؟"

اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا' جیسے میری بات کی صحت جانچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مجھے اس کی ویران آنکھوں میں پہلی بار امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ "کون ہو تم؟" اس نے لرزتے کانپتے لہجے میں پوچھا۔

"میں کسی شخص کی تلاش میں ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ اس کوٹھی میں موجود ہے۔ میں دیوار پھاند کر اندر آیا ہوں۔"

وہ ایک دم بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے سنہری بالوں کی لٹیں چہرے پر ڈھلک آئیں اور ناک سرخ ہو گئی۔ وہ دردناک آواز میں بولی "انہوں نے میرے شوہر اور بچے کو پچھلے آٹھ روز سے

اسٹور روم میں بند کر رکھا ہے۔ وہ بڑے ظالم ہیں۔ انہوں نے بہت مارا ہے ہمیں۔ وہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ میرے بچے کو وہاں سے مار ڈالیں گے۔ وہ بہت برا سلوک کر رہے ہیں ہم سے۔ بہت ہی برا سلوک......"

میں نے پوچھا "تمہارے شوہر کا نام زبیر اے۔ درانی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ میں نے پوچھا "پچھلے آٹھ روز میں اڑوس پڑوس میں سے کسی نے تمہاری خبر نہیں لی؟"

وہ بولی "یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ جس روز ہمارے گھر واردات ہوئی ہم دو ہفتے کے لیے ناگپور جا رہے تھے۔ پڑوسیوں کو بھی پتہ تھا کہ علی الصباح ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے۔ اقبال بھروچی دودھ فروش اور دھوبی وغیرہ کو بھی بتا دیا تھا۔ صبح چار بجے ہمیں گھر سے روانہ ہونا تھا۔ تین بجے یہ لوگ آ دھمکے......"

اچانک وہ سہم کر خاموش ہو گئی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے غور سے سنا۔ قدموں کی مدھم چاپ مجھے بھی سنائی دی۔ کوئی شخص سخت لکڑی والی بھاری بھرکم جوتی پہنے بالائی منزل پر چل رہا تھا۔ لڑکی نے لرزتی آواز میں کہا "وہ آ رہا ہے۔ تم...... چھپ جاؤ کہیں...... وہ بہت خطرناک ہے۔"

وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ جلدی سے اٹھی اور اس نے مجھے کمرے کے اندر ہی ایک قدِ آدم الماری کے پیچھے چھپا دیا۔ میں الماری کے پیچھے واقع خلا میں مکمل طور پر چھپ گیا۔ لڑکی یقیناً انگریز تھی۔ دوبارہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ اس نے ایک جیبی رومال سے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے اور منتشر بالوں کو سمیٹ کر کانوں کے پیچھے اڑس لیا تھا۔ میں الماری کے پیچھے کھڑا تھا اور خود کو اس الف لیلوی کہانی کے کردار کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کی آمد سے پہلے کسی محفوظ جگہ چھپا دیتی ہے۔ اب معلوم نہیں تھا کہ یہاں آنے والا جن کون ہے۔ میرے دھڑکتے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی...... کاش وہ عیسیٰ جان ہو۔ عیسیٰ جان کے خون کی پیاس میری رگ رگ میں کانٹے چبھو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج میں عیسیٰ جان کو قتل نہ کر سکا تو شام تک خود اپنی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ میری خطرناک بالائی منزل سے آنے والی سیڑھیوں پر تھیں اور انگلی ریوالور کی لبلبی پر...... لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ ہر خواہش وقت پر پوری ہو جائے۔ سیڑھیوں سے اترنے والا شخص عیسیٰ جان نہیں تھا۔ وہ ایک بیس بائیس سالہ باریش نوجوان تھا۔ کسی قبائلی علاقے کا باشندہ لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی اور پاؤں میں بھاری بھرکم پشاوری چپل۔ اس کے کندھے سے خودکار رائفل لٹک رہی تھی اور سینے پر گولیوں کی دو بیلٹیں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر اس نے کمرے کا دروازہ دیکھا۔ اس کا یوں حیران ہونا ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ یقیناً وہ دروازہ باہر سے بند کر کے گیا تھا۔ اب دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس کے جوان چہرے پر الجھن اور تذبذب کے آثار صاف نظر آئے۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ انگریز لڑکی سے دروازے کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے تاہم پھر یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ غالباً اس نے یہ تصور کر لیا تھا کہ دھیان میں وہ خود ہی دروازہ بند کرنا بھول گیا ہے۔ اس نے کڑی نگاہوں سے لڑکی کو گھورا۔ طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ دروازہ باہر سے بند کر کے کچن کی طرف چلا گیا۔ کچن کے عین سامنے ایک واش بیسن موجود تھا۔ اس نے اپنی رائفل دیوار سے ٹکا دی اور واش بیسن پر وضو کرنے لگا۔ کمرے کی ایک کھلی کھڑکی میں سے میں یہ منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ الماری کے پیچھے چونکہ تاریکی تھی لہٰذا یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ آسانی سے مجھے دیکھ سکے گا۔ وضو کر کے اس نے برآمدہ نما جگہ پر جائے نماز بچھائی اور نماز پڑھنے لگا۔ وقت کے لحاظ سے یہ یقیناً ظہر کی نماز تھی۔

انگریز لڑکی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں گھٹنے تھوڑا سا ابھرے ہوئے تھے اور وہ بڑے دھیان سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ پیسٹری کی طرح مخمل کی بیڈ شیٹ پر رکھے تھے۔ وہ مشرقی لباس شلوار قمیص میں تھی۔ کندھوں پر دوپٹا بھی موجود تھا۔ اس کے چہرے کی چوٹوں، اس کی ذہنی حالت اور گفتگو سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر میں داخل ہونے والوں نے اس سے بدترین سلوک کیا ہے۔ وہ کسی کھلونے کی طرح اس سے کھیلتے رہے تھے اور ساتھ ساتھ توڑتے پھوڑتے رہے تھے۔ انگریز لڑکی کی گفتگو سے پتا چلتا تھا کہ گھر میں داخل ہونے والے ڈاکو دو تھے۔ ایک ڈاکو تو میرے سامنے نماز پڑھ رہا تھا۔ میرا دل چیخ چیخ کے گواہی دے رہا تھا کہ دوسرا یقیناً عیسیٰ جان ہے۔ میں نے عیسیٰ جان کے ستم کا شکار ہونے والی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ درندہ صفت اپنے بس میں آنے والی عورت کو یوں پامال کرتا تھا کہ ناقابلِ شناخت بنا دیتا تھا۔ میں نے اجڑی بکھری نبیلہ کو دیکھا تھا۔ عندلیب اور نزہت کو دیکھا تھا۔ اور ان اڑھوسیوں کو دیکھا تھا جن کے پھول جیسے چہرے عیسیٰ جان کے قبضے میں رہ کر زرد پتوں کا روپ دھار گئے تھے۔ انگریز لڑکی کی ترس ناک حالت گواہی دے رہی تھی کہ اسے توڑنے پھوڑنے والا عیسیٰ جان کے سوا کوئی نہیں۔

نماز پڑھنے کے بعد باریش نوجوان نے رائفل کندھے سے لٹکائی۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور رنگت سانولی تھی۔ انگریز لڑکی سے بولا "تم ابھی چائے بناؤ۔ ام ابھی آتا ہے" وہ کسی معمول کی طرح اٹھی اور جلدی سے کمرے کے بغلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ دروازہ کچن کو اس کمرے سے مربوط کرتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کچن کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ یوں کچن اور یہ کمرا ایک ہی قید خانے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

کچن سے برتنوں کی آواز آ رہی تھی۔ یقیناً چائے تیار کی جا رہی تھی۔ باریش نوجوان کمرے کے عین سامنے سیڑھیوں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ وہ چائے وہیں بیٹھ کر پئے گا۔ تین منٹ کے بعد لڑکی چائے بنا کر لائی۔ اس نے چائے نوجوان کے سامنے رکھ دی اور خود واپس دوبارہ کمرے میں بند کر دیا۔ وہ لڑکی کے ساتھ ساتھ میں بھی کمرے میں بند ہو گیا۔ میں نے لڑکی کی راہ سے پہلے حرکت میں آنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ بہرحال مجھے ہو چکا تھا کہ زیریں منزل پر لڑکی اور باریش نوجوان کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ میں الماری کی اوٹ سے نکلا اور بے آہستگی دروازے کی طرف بڑھا۔ قبائلی نوجوان کی رائفل ایک بار پھر دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنے پیالے پر جھکا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اجنبی اس کے اتنے قریب موجود ہے۔ اس کی یہی بے خبری تھی جس نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے اس کی رائفل اٹھائی اور تین چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل اور دوسرے میں سائلنسر لگا ریوالور تھا۔ جب میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا تو ہلکا سا کھٹکا ابھرا۔ نوجوان نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ خطرناک ہتھیار اس کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ "ٹھہرو" اس کی آواز نکلی تو "میں نے دانت پیس کر کہا۔

میرے اندر ابلنے والے لاوے کی تمام تر حدت میرے لہجے میں منتقل ہو چکی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار نظر آئے لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ دوسرے ہی لمحے خود سری کی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ میں ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر نوجوان نے حماقت کی تو میں بھی کوئی رعایت نہیں کروں گا۔

نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا "کون ہے تم؟" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

"یہ میرا سوال ہے، اور جواب تم نے دینا ہے۔"

اسی دوران میں انگریز لڑکی بھی بھاگتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ اس کی نیلی آنکھیں حیرت اور خوف سے وا تھیں۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ خوف سے چیخی "یہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے۔"

"یہ کچھ نہیں کر سکتے" میں دہاڑا "تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے تم بس خاموش رہو۔"

وہ سہم کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ میں نے ریوالور کو کمر میں اڑسا اور رائفل کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا "کون ہو تم؟" میں نے باریش نوجوان سے پوچھا "اور کیا کر رہے ہو یہاں؟"

وہ سینہ تان کر بولا "امارا نام زری خان ہے۔ اور ام اپنے ایک دشمن کو پکڑنے کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔"

"کون دشمن؟"

"ہے ایک بدبخت۔ اس نے امارے دوست کے بھائی کو قتل کیا ہے۔ ام خان بچہ ہے۔ جب تک اپنے مجرم کو ڈھونڈ کر مارے گا نہیں، چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

میں نے پوچھا "تمہارا دوست بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

وہ بولا "ہاں، وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔ تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ امارا ہتھیار ام کو واپس کر دو۔ ورنہ بہت تڑپ تڑپ کر مرے گا امارے ہاتھوں سے۔ ام کو لگ رہا ہے کہ تم بھی اماری طرح پاکستانی مسلمان ہے۔ ام نہیں چاہتا کہ امارے ہاتھ سے تمہارا خون بہے۔"

میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے دوست کا نام عیسیٰ جان ہے؟"

نوجوان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "تم عیسیٰ جان کو کیسے جانتا ہے؟"

"میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم ابھی بچے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ابھی خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ عیسیٰ جان کیا ہے؟"

نوجوان گم صم کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اب خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ اندرونی غیظ و غضب کی وجہ سے تمتما رہا تھا۔ میں نے پوچھا "اس عورت کے بچے اور شوہر کو کہاں رکھا ہے تم نے؟"

وہ کچھ بگڑ کر بولا "خو، یہ تم کوئی تھانیدار نہیں ہے اور نہ ہم کوئی چور اچکا ہے۔ جو تم ہم سے یوں سوال جواب کر رہا ہے۔ ہم یہاں انصاب (انصاف) کے لیے آیا ہے۔ اپنے بندے کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے...... اور ان شاء اللہ ام بدلہ لے کر جائے گا۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "بڑے زبردست منصف ہو تم۔ ایک معصوم بچے اور اس کے باپ کو باندھ رکھا ہے اور ایک بے بس عورت کی عزت سے کھیل رہے ہو۔"

"کون کس کی عزت سے کھیل رہا ہے؟"

"تم اور تمہارا ساتھی عیسیٰ جان اس عورت سے زبردستی کر رہے ہو۔ کر رہے ہو یا نہیں؟"

"یہ سوال صد غلط ہے۔" وہ اکڑ کر بولا "یہ کاپر (کافر) عورت ہے اور ہمارے کاپر دشمن کا بیوی ہے۔ ام نے اپنے دشمن کو باندھ کر شکست دیا ہے۔ خو اب اس کا بیوی امارا مالِ غنیمت ہے۔ اس عورت پر امارا حق ہے۔ لیکن ام نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ اس کا سارا معاملہ لالہ عیسیٰ جان کے سپرد ہے۔"

میں نے کہا "ہر جگہ تمہارے قبائلی قانون نہیں چلتے ہیں۔ اور تم قبائلی قانون کی تشریح بھی غلط کر رہے ہو۔ مالِ غنیمت کی بات وہاں ہوتی ہے جہاں کافروں سے لڑائی ہو۔ یہاں کون سا لشکر اور کون سا کافر ہے؟"

وہ بولا "یہ سامنے کھڑی کاپر تم کو نظر نہیں آتی ہے۔ اور اس کا خاوند وہ بھی تو کاپر ہے۔ ہر انڈیا کی گورنمنٹ کا وفادار ملازم ہے اور انگریز عورت سے شادی کرتا ہے۔ وہ کاپر نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے" میں نے اس کے جوش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تم کسی کو کافر اور مسلمان قرار دینے والے کون ہوتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ انڈین گورنمنٹ کا ملازم ہونے کے باوجود اس گھر کا مالک مسلمان ہے اور اس لڑکی نے بھی مسلمان

ہو کر اس سے شادی کی ہے۔"

میں نے انگریز لڑکی سے پوچھا "مسز درانی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"عفت" لڑکی نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

وہ پھنکار کر بولا "یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے مسلمان بن رہا ہے۔ اندر سے یہ دونوں میاں بیوی پکا بے ایمان ہے۔ ان سے ہمارا کوئی دشمنی نہیں تھا لیکن انہوں نے ہم کو پولیس کے ہاتھوں پکڑوانے کا کوشش کیا۔ اس مکان کے پچھواڑے جو خالی پلاٹ ہے وہاں پر ہمارا گاڑی خراب ہو گیا تھا۔ ہم اندھیرے میں جھک کر گاڑی کا انجن دیکھ رہا تھا۔ اس عورت کا خاوند وہاں آیا اور خانہ بدوش کی طرح ہم سے پوچھ گچھ کرنے لگا کہ ہم کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس مکان کے پیچھے اندھیرے میں کیوں کھڑا ہے۔ ہم نے اس کا تسلی کرنے کی کوشش کیا۔ لیکن وہ خود اپنی مصیبت کو آواز دے رہا تھا۔ حرامی پکا پولیس والا بنا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر گاڑی میں رکھی ہوئی رائفل پر پڑ گئی۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اس کو قابو میں کریں۔ لالہ عیسیٰ جان نے اپنا پستول نکال لیا اور پستول کے نشانے پر اسے گھر میں لے آیا۔ یہاں اس کی بیوی اس سے بھی چنڈال نکلی۔ یہ کسی کھڑکی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ خوام جونہی مکان میں داخل ہوا اس نے دروازے کے پیچھے سے نکل کر لالہ عیسیٰ کے سر پر شیشے کا ایک وزنی گلدان توڑ دیا۔ لالہ عیسیٰ کو زخم لگے۔ بکھانو درانی بھی مجھ سے لپٹ گیا۔ ان کا ایک بنا کنا نوکر بھی مدد کے لیے دوڑا آیا۔ لالہ عیسیٰ نے نوکر کے پیٹ میں خنجر گھونپ کر اسے چپ کر دیا۔ ہم نے اس لڑکی کو سنبھال لیا۔ تھوڑی سی مار ماری کے بعد لالہ عیسیٰ نے درانی کو قابو کر لیا۔ ان لوگوں سے ہمارا کوئی دشمنی نہیں تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر دشمنی مول لیا۔ ہم کو قتل کرنے کا کوشش کیا۔ اور اس کوشش میں اس کافر عورت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔"

میں نے نوجوان زری خان کی پوری بات اطمینان سے سنی جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "عیسیٰ جان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

وہ بولا "عیسیٰ جان ہمارا دوست ہے اور ہمارے بڑے بھائی کے ساتھی بھی۔ اس کی طرح ہم بھی بارڈر پار کر کے انڈیا آ رہا تھا۔ ہم کو بھارت کی سرحدی پولیس نے پکڑ رکھا تھا۔ لالہ عیسیٰ نے ہمارا مدد کیا۔ پولیس سے ہمارا جان بچایا۔ ہم اس کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔"

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم عیسیٰ جان کو زیادہ دیر سے نہیں جانتے ورنہ کبھی اس طرح اس کے اشاروں پر نہ ناچتے۔ وہ ایک بدقماش اور خطرناک شخص ہے۔ اور اپنے ساتھ اس نے تمہیں بھی خطرات میں جھونک دیا ہے۔ اس گھر میں گھسنے کے بعد تم لوگوں نے سنگین جرائم کیے ہیں۔ حتیٰ کہ قتل تک کیا ہے۔ تم بچ کر نہیں نکل سکو گے۔"

وہ اکڑ کر بولا "ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم حق پر ہے۔ ہم خون ناحق کا بدلہ لینے کے لیے یہاں پہنچا ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں مرتا ہے تو شہید کہلائے گا۔"

مجھے اس پرجوش قبائلی نوجوان پر ترس آ رہا تھا۔ دشمنی، دوستی، مذہب، دنیا وغیرہ کے بارے میں اس کے خیالات بہت ناپختہ تھے۔ عیسیٰ جان جیسے گمراہ اور مفاد پرست لوگ ایسے نوجوانوں کے جذبات بھڑکا کر انہیں خطرات میں جھونکتے ہیں اور اپنے مذموم مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ مذہب ہو، سیاست ہو یا محبت، ہر میدان میں عیسیٰ جان موجود ہوتے ہیں اور زری خان ان کی خاطر زندگی کو موت کے حوالے کرتے ہیں۔

زری خان کی داڑھی مونچھ ابھی پوری طرح نہیں نکلی تھی۔ اس کے ہونٹ سرخ، آنکھیں بادامی اور سینہ چوڑا تھا۔ میرا دل مجھے کہا کہ یہ نوجوان شدید خطرات کی زد میں ہے اور یہ ممکن ہے کہ عنقریب انڈین پولیس کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ نوجوان نے اپنے جذباتی انداز میں جو کچھ بتایا تھا وہ میرے لیے حیران کن نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ عیسیٰ جان اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے انڈیا پہنچا ہے۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا کہ وہ کس سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ وہ میرے ہی پیچھے بھارت آیا تھا۔ میرے ساتھ اس کا آمنا سامنا بھی ہو چکا تھا۔ اس آمنے سامنے کا نتیجہ لوہاروی شاہین کی موت کی صورت میں نکلا تھا۔۔۔ اور اب صورت حال یہ تھی کہ عیسیٰ جان کے بجائے میں اس کو تلاش کر رہا تھا۔

اپنے خیالات کی رو میں بہہ کر میں ایک لمحے کے لیے زری خان سے غافل ہوا تھا۔ اس نے تڑپ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملے میں نوعمری کی پھرتی اور طراری شامل تھی۔ مجھ سے ذرا سی غلطی ہوئی تو وہ میرے ہاتھ سے رائفل چھین چکا تھا۔ میں نے اسے اڑنگی دی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ عفت کے قریب گرا۔ عفت کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ وہ میرے نشانے پر تھا۔ میری انگلی ٹریگر پر دب کے رہ گئی۔ میں اس کے جواں سال پیکر کو خون میں نہیں نہلانا چاہتا تھا۔ فائر کرنے کے بجائے میں نے اس پر جست لگائی اور رائفل کا وزنی کندا اس کی پیشانی پر مارا۔ اس کے سر پر دو طرفہ ضرب لگی۔ پیشانی پر کندے سے اور پیچھے فرش سے۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے ایک اور طوفانی ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنی ناف پر تھا۔ میں نے دیکھا، بہادر چمڑے کی بیلٹ میں خمدار خنجر اڑسا ہوا تھا۔ آخری لمحات میں زری خان نے خنجر نکالنے کی کوشش کی تھی، اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو یقیناً اس پر قابو پانے میں دشواری ہوتی۔

انگریز لڑکی جس کا اسلامی نام عفت تھا، خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ میں نے خنجر زری خان کے جسم سے جدا کیا، پھر اس کے لباس کی تلاشی لی۔ زری خان کی جیب سے نسوار، رومال، ایک چھوٹی سی تسبیح اور چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ عفت نے

بتایا کہ یہ اسی گھر کی چابیاں ہیں۔ عفت کے ساتھ مل کر میں نے زری خان کو اسی کمرے میں بند کیا جہاں اس سے پہلے عفت بند تھی۔ اس کے بعد میں عفت کے شوہر اور بچے کی تلاش میں گھر کی دوسری منزل پر پہنچا۔ عفت بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ عفت کے اشارے پر میں نے بالائی منزل کے ایک بند کمرے کا تالا کھولا۔ سامنے ہی بستر پر عفت کا شوہر نظر آیا۔ وہ گٹھے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط شخص تھا۔ عمر تقریباً تیس سال تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال منتشر اور آنکھوں پر بے خوابی کی سوجن تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ایک پاؤں زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ اس زنجیر کا دوسرا سرا پلنگ کے پائے سے منسلک تھا۔ اس شخص کے قریب ہی ایک ڈھائی تین سالہ بچہ محو خواب تھا۔ عفت دوڑی اور بھاگ کر بچے سے لپٹ گئی۔ "میرے بچے۔۔۔ میرے بچے" وہ انگلش میں بول رہی تھی اور اس کے بے تاب ہونٹ اپنے بچے کو جگہ جگہ سے چوم رہے تھے۔ بانہوں نے بچے کے گرد حلقہ سا بنا لیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ اسے سینے میں سمونے کی کوشش کر رہی ہے۔ بچہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اور خالی خالی نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پابہ زنجیر شخص جو یقیناً الیکٹریکل انجینئر زیڈ اے درانی تھا، تڑپ کر اٹھا اور اس نے بیوی بچے کو اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔

ایک بچھڑی ہوئی فیملی کا یہ ملاپ رقت آمیز تھا۔

"انہوں نے عبدل کو مار دیا درانی۔۔۔۔ انہوں نے اسے قتل کر دیا" عفت نے روتے ہوئے اپنے خاوند کو بتایا۔

یہ اطلاع درانی کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ان کا نوکر قتل ہو چکا ہے۔ وہ بیوی کو دلاسا دینے لگا۔ لیکن اسے خود بھی دلاسے کی ضرورت تھی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔

میں نے عفت سے پوچھا کہ اس کا کیا خیال ہے "مقتول ملازم کی لاش کہاں ہو گی؟" وہ بولی "قتل کے اگلے روز وہ اس کی لاش کو ایک پرانے قالین میں لپیٹ کر کہیں لے گئے تھے۔ یہ کام انہوں نے صبح سویرے تین چار بجے کے لگ بھگ کیا تھا۔ ان کے باہر نکلنے کی میں نے کوٹھی کے پچھواڑے کسی کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی کار تھی جسے وہ لوگ ٹھیک کر رہے تھے۔ آدھ پون گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آ گئے تھے۔ اس مرتبہ کار کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بعد کے دنوں میں وہ گھر سے نکلے ہی نہیں۔ اگر کسی وقت نکلنا ضروری ہوا تو رات بارہ بجے کے بعد بڑی خاموشی کے ساتھ نکلے۔ وہ محلے داروں اور پڑوسیوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ مکان بالکل خالی پڑا ہے۔ رات کے وقت وہ کمروں کی بتیاں بھی نہیں جلاتے تھے۔ صرف کچن میں موم بتی جلائی جاتی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ کچن دوسرے کمروں میں گھرا ہوا ہے۔"

میں نے عفت سے پوچھا "آپ کی کوٹھی پر یہ بپتا کیسی ہے؟"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنی شکستہ اردو میں بولی "وہ تینوں وقت کھانا مجھ سے پکواتے تھے۔ مجھے کوکنگ نہیں آتی۔ کوکنگ کا سارا کام عبدل کیا کرتا تھا۔ اور عبدل کو انہوں نے جان سے مار ڈالا تھا۔ میں جیسے تیسے کھانا پکاتی تھی۔ ایک روز سالن پکاتے ہوئے گرم توے سے جھلس گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "آپ اس دوسرے ڈاکو کا حلیہ بتا سکتی ہیں؟"

میرے سوال پر عفت کو جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا ہے۔ اور آنکھوں میں وہی دیوانگی ابھر آئی ہے جو پہلی بار مجھے دیکھ کر ابھری تھی۔ اس کے ہونٹ لرزے اور وہ کچھ نہ بول سکی۔ بیوی کو مشکل میں دیکھ کر زیڈ اے درانی نے دوسرے ڈاکو کا حلیہ بیان کیا۔ میرے تمام شبہات دور ہو گئے۔ یہ عیسیٰ جان ہی کا حلیہ تھا۔

میں نے درانی سے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، وہ دوسرا ڈاکو اب کہاں ہے؟"

درانی کے بجائے عفت درانی نے جواب دیا۔ وہ اشکبار لہجے میں بولی "چار روز پہلے وہ علی الصباح گھر سے نکلا تھا۔ اس نے کوئی وزنی شے کپڑے میں لپیٹ رکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی خطرناک قسم کی رائفل تھی۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔ زری خان اس کے بارے میں بہت پریشان تھا۔"

عفت درانی کا بیان میری توقع کے مطابق تھا۔ یہ چار دن پہلے کا ہی واقعہ تھا جب عیسیٰ جان بلائے ناگہانی کی طرح اس گھر پر جھپٹا تھا جہاں صفدر، میں اور شاہین رہائش پذیر تھے۔ عیسیٰ جان کی "ہم ہم ہو" کی منحوس غراہٹ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس حرامی کی پشت میں صفدر کی چلائی ہوئی گولی لگی تھی اور وہ زخمی ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ زخمی ہونے کے بعد اسے واپس اپنے ٹھکانے پر آنا چاہیے تھا لیکن نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ کہیں وہ ہلاک ہی تو نہیں ہو گیا۔ مگر پھر فوراً ذہن نے خود ہی اس خیال کی تردید کر دی۔ عیسیٰ جان جیسا سخت جان ناسور اتنی جلدی نابود کیسے ہو سکتا تھا۔ دوسرا خیال ذہن میں یہ آیا کہ شاید وہ زخمی حالت میں پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

مسٹر درانی نے اپنی شریک حیات کو گلے سے لگا رکھا تھا۔ وہ "مصیبت زدہ" مسلسل بلکتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہا تھا، اسے دلاسا دے رہا تھا۔ میں نے مسٹر درانی سے پوچھا "آپ اتنے روز دونوں مجرموں کے ساتھ رہے ہیں۔ کیا آپ کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہیں کہ دوسرا مجرم واپس یہاں کیوں نہیں لوٹا؟"

درانی نے کہا "میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ جانکاری حاصل کرنا چاہوں گا کہ آپ کون ہیں اور یہاں کیسے پہنچے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے خیال میں فی الحال آپ کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں دوست ہوں اور آپ کی بہتری چاہتا ہوں۔ آپ یہ ہرگز ذہن میں نہ لائیں کہ سب اچھا ہو گیا ہے۔ یہ دونوں ڈاکو اکیلے نہیں ہیں۔ ان کے ساتھی اس گھر کے آس پاس موجود ہیں۔"

اپنے سرغنہ کے ایک اشارے پر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"کیا ہم یہاں سے پولیس کو فون نہیں کر سکتے؟"

"آپ کا فون اسی روز کاٹ دیا گیا تھا جب یہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تھے۔" میں نے مسز درانی کو اطلاع دی۔

مسٹر اور مسز درانی کے چہروں پر ایک بار پھر خوف و ہراس کے گہرے سائے پھیلنے لگے تھے۔ در حقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ مسٹر اور مسز درانی فوری طور پر پولیس سے رابطہ کرلیں۔ اور اگر عیسیٰ جان اس عمارت میں کہیں چھپا ہوا ہے تو پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے خود جہنم واصل کروں۔ مکان پر پولیس کا قبضہ ہو جاتا تو ایک اور نقصان کا خدشہ پیدا ہو جاتا۔ اور وہ یہ کہ اگر عیسیٰ جان اس عمارت میں موجود نہیں تھا تو بھی یہ امکان تو موجود تھا کہ وہ لوٹ آئے گا۔ لیکن مکان پولیس کی نگرانی میں چلا جاتا تو عیسیٰ جان کبھی اِدھر کا رخ نہیں کرتا۔ میری خواہش تھی کہ کم از کم رات تک صورتِ حال جوں کی توں رہے تاکہ میں عیسیٰ جان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ لیکن میاں بیوی جس طرح گھبرائے ہوئے تھے اور بچہ جس طرح زار و قطار رو رہا تھا یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ ان کا اپنا گھر تھا۔ لیکن آٹھ دن تک اس میں محبوس رہنے کے بعد یہ انہیں قید خانہ محسوس ہو رہا تھا اور وہ اس قید خانے سے نکل بھاگنا چاہتے تھے۔

مسز درانی نے کہا "مجھے ایک شک ہوتا ہے۔ یہاں بہار کالونی میں پٹھانوں اور کابلیوں کی ایک بستی ہے۔ زری خان اور اس کا ساتھی ہمارے سامنے زیادہ تر پشتو میں بات کرتے تھے لیکن اس بات چیت میں کوئی کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آ جاتا تھا۔ جیسے یہ "بہار کالونی" کا لفظ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زری خان کے ساتھی کا کوئی تعلق اس کالونی سے ہو۔"

یہ ایک اچھا "کلیو" تھا۔ میں نے بہار کالونی دیکھی نہیں تھی لیکن یہ نام سنا ہوا تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر وہ مزدور پیشہ لوگ آباد تھے جو دوسرے علاقوں سے یہاں روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ایک بار اچھی طرح مکان کی تلاشی لوں۔ اگر عیسیٰ جان کا کوئی سراغ ملے تو ٹھیک ورنہ اہلِ خانہ کو ان کے حال پر چھوڑ کر بہار کالونی کا رخ کروں۔۔۔۔ مکان کی دونوں منزلوں کی تلاشی میں نے دس منٹ میں مکمل کرلی۔ حسبِ توقع یہاں سے کوئی قابلِ ذکر سراغ نہیں مل سکا۔ صرف ایک کمرے سے "ایم جی ۳" کے چند راؤنڈ اور جانی واکر شراب کی تین خالی بوتلیں برآمد ہوئیں۔ ان اشیا کا تعلق یقیناً عیسیٰ جان سے تھا۔ زیریں منزل پر کچن کے ساتھ والے کمرے میں زری خان بدستور بے ہوش پڑا تھا۔ تاہم اس کی بے ہوشی سنگین نہیں تھی اور وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتا تھا۔ میں نے اس کی بندشیں اچھی طرح دیکھیں پھر مسٹر اور مسز درانی سے اجازت طلب کی۔ وہ حیران رہ گئے۔

میں نے کہا "میں زری خان کے ساتھی عیسیٰ جان کی تلاش میں یہاں پہنچا تھا۔ وہ یہاں نہیں ہے لہٰذا میرا یہاں ٹھہرنا بھی فضول ہے۔ اب آپ اپنے فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ چاہے تو یہاں ٹھہریں، چاہے کہیں اور چلے جائیں...... اور چاہے تو پولیس سے رابطہ کرلیں۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کے بارے میں کیا بتایا جائے؟" مسٹر درانی نے مرعوب لہجے میں سوال کیا۔

"یہی کہہ دیں کہ عیسیٰ جان کا کوئی دشمن آیا تھا۔ زری خان کو مار پیٹ کر چلا گیا۔"

میں نے بچے کا گال تھپتھپایا اور میاں بیوی کو حیران چھوڑ کر کوٹھی سے نکل آیا۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر میں بہار کالونی پہنچ چکا تھا۔ بہار کالونی زیادہ وسیع نہیں تھی۔ بمشکل پچاس ساٹھ مکانات ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ گلیوں میں ٹین کی چادروں کے کیبن نما گھر بنے ہوئے تھے۔ کالونی کے وسط میں "آزاد ہوٹل" کے نام سے منشیات فروشوں اور جرائم پیشہ افراد کا ایک اڈا تھا۔ کچھ ہفتے پہلے اس ہوٹل میں ایک شخص قتل بھی ہو چکا تھا۔ اس قتل کے حوالے سے "آزاد ہوٹل" کا اخباروں میں کافی ذکر آیا تھا۔ عام لوگ اس ہوٹل میں جاتے ہوئے یقیناً ڈرتے ہوں گے۔ لیکن میرے لیے ہوٹل کی ریلنگ پار کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ایسے ہوٹلوں اور اڈوں کو میں گھول کر پی چکا تھا۔ یہاں کا ماحول، یہاں کے لوگوں کی نفسیات کچھ بھی تو مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ جس وقت میں ہوٹل میں داخل ہوا، شام کے سات بج چکے تھے۔ ہوٹل کے ہال میں گہما گہمی تھی۔ "بنگالی"، "اہل"، "مہاجر" ہر طرح کے افراد یہاں موجود تھے۔ تاہم اکثریت پٹھانوں کی تھی۔ ہال میں سگریٹ اور گاڑھے دھوئیں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ اس دھوئیں میں چرس کی بو بھی شامل تھی۔ فرائی جہان تڑک۔ چائے بن رہے تھے اور گوشت کے ان ٹکڑوں کو شدید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جو سیخوں میں پرو کر کوئلوں پر بھونے جا رہے تھے۔

جونہی میں ہوٹل میں داخل ہوا کئی نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ہوٹل کے مالک کی تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اگر عیسیٰ جان نے زری خان کے بعد اس کالونی میں کہیں پناہ لی ہے تو آزاد ہوٹل کے مالک کو اس بارے میں ضرور پتا ہوگا۔ جلد ہی مالک پر میری نظر پڑ گئی۔ وہ جسیم تخمینی قد کا ایک پستہ قد تھا جو چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ چارپائی پر بڑا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ قریب ہی ایک تپائی پڑی تھی جس پر بل بنانے کے لیے کاغذ قلم رکھے ہوئے تھے اور ایک ٹیلیفون پڑا تھا۔

میں اس شخص کی طرف بڑھا۔ اس نے میری موجودگی کا نوٹس نہیں لیا اور بدستور اخبار پڑھتا رہا۔ میں نے دیکھا اس کے عقب میں انڈین فلموں کے عریاں اور سیکسی پوسٹر آویزاں تھے۔ ایک پوسٹر میں فلم نگری کا معروف اداکار امجد خان نظر آ رہا تھا۔ اس چارپائی پر پھیل کر بیٹھا ہوا شخص بھی مجھے امجد خان ہی لگا۔ میں اپنے آپ میں

نہیں تھا۔ ایک آگ تھی جو میرے رگ و پے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس آگ نے مجھے ہر مصلحت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں اس شخص کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بلا تمہید کہا "اس کالونی میں ایک زخمی شخص آیا ہے۔ اس کا نام عیسیٰ جان ہے۔ مجھے اس کا پتا چاہیے۔"

میرے انداز نے اس شخص کو گڑبڑا دیا۔ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "کون ہو تم؟"

میں نے کہا "جو کوئی بھی ہوں" تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوں۔ اگر میں تمہیں مارنے لگوں اور تمہارے سارے چیلے چانٹے تمہیں چھڑانے میں لگ جائیں تو بھی تمہیں چھڑا نہیں سکیں گے" شاہ جہاں عرف استاد جانی کا نام سنا ہے تم نے......؟"

میرے آخری الفاظ نے میرے مخاطب پر بجلی سی گرا دی۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا "تم ہم...... پاکستانی استاد جانی کی بات کر رہا ہے؟"

"ہاں"

"تو پھر...... تم...... اس کا کیا لگتا ہے؟"

"میں خود جانی استاد ہوں۔"

اس شخص کے چہرے پر زردی سی لہرا گئی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے تاثرات پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا۔ پھر قدرے سنبھل کر بولا "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم جانی استاد ہے۔ امارا مطلب یہ ہے کہ......"

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک بغلی دروازہ جھٹکے سے کھلا اور لمبے قد کا بانس نما شخص چبوترے پر چڑھ آیا۔ وہ بھی غنڈا صورت تھا۔ اس کی لمبی مونچھیں جھالر کی طرح اس کے ہونٹوں کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اس نے جلدی سے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں میں لرزش ہے۔ پھر وہ ہوٹل کے مالک سے مخاطب ہوا "ایک منٹ کے لیے میری بات سنیں۔"

یہ فقرہ اس نے پشتو میں کہا تھا۔ تاہم تھوڑی بہت پشتو تو میں اب سمجھنے ہی لگا تھا۔ دونوں افراد بغلی دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ ان کی واپسی پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر ہی ہو گئی۔ اس مرتبہ ہوٹل کے مالک کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ وہ بے حد دوستانہ بلکہ "عقیدت مندانہ" نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر مجھ سے معذرت کیا "گستاخی معاف جی۔ ام...... آپ کو صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔ خدا ام کو بہت خوشی ہوا آپ سے مل کر۔ ام نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔"

میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ بانس نما شخص دروازے کی اوٹ سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اتفاقاً وہ مجھے شکل سے پہچانتا تھا۔ غالباً اس نے کہیں اخبار میں میری تصویر وغیرہ دیکھی تھی۔ اس نے بروقت مداخلت کرکے ہوٹل کے مالک رحمت خان کو مار دھاڑ سے بچا لیا تھا۔

بعد کے سارے مرحلے میرے لیے بہت آسان ہو گئے۔ ہوٹل کا مالک رحمت خان مجھے بڑے "تزک و احتشام" سے ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک نوخیز لڑکی نے جو یقیناً رحمت خان کی رکھیل تھی، ہمیں قہوہ پیش کیا۔ وہ بھی مجھے حیرت آمیز دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی اس "منفی شہرت" پر مجھے کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی اب بھی نہیں ہوئی۔ میں رحمت خان سے اپنی آمد کا مقصد تو پہلے ہی بیان کر چکا تھا اب وضاحت بھی کردی۔ رحمت خان نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ عیسیٰ جان نامی زخمی شخص اسی بستی میں موجود ہے۔ اس نے کہا "وہ بندہ بستی کے ملک (سردار) راج خان کے مکان میں ہے۔ وہیں پر اس کا دوا دارو کیا جا رہا ہے۔ لیکن تم اس شخص کو کیوں ڈھونڈ رہا ہے۔ امارا مطلب ہے کہ وہ آپ کا دشمن ہے یا دوست؟"

"دشمن" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

رحمت خان اور بانس نما شخص کے چہروں پر پریشانی بکھر گئی۔ رحمت خان بولا "پھر تو یہ کام کافی مشکل ہو گیا ہے۔ راج خان بڑا خر دماغ شخص ہے۔ وہ اپنی پناہ میں آئے ہوئے بندے کو کبھی آپ کے حوالے نہیں کرے گا۔ امارے خیال میں اب آپ کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک وہ بندہ راج خان کے مہمان خانے سے نکل نہیں جاتا۔"

انتظار کا لفظ کسی تیر کی طرح میرے سینے میں لگا۔ عیسیٰ جان کے لہو کی پیاس میں میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میری رگیں ٹوٹ رہی تھیں۔ "انتظار نہیں" میں نے ہیجانی لہجے میں کہا "میں ابھی اس کی طرف جانا چاہتا ہوں۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھا تو ہوٹل کا مالک رحمت خان اور بانس نما شخص بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا "نہیں۔ تم لوگ کسی قسم کے جھگڑے میں مت پڑو۔ تمہیں یہاں رہنا ہے۔ خوامخواہ دشمنی مت پالو۔"

بانس نما شخص والہانہ "عقیدت" سے بولا "ذرا استاد صاحب۔ دشمنی تو ایک طرف رہا "ام آپ جیسے بندے کے لیے اپنا جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ ام اپنی کالونی میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔"

رحمت خان بولا "جناب! ام کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح یہ معاملہ بغیر جھگڑے کے طے ہو جائے۔ امارا مطلب ہے......"

"نہیں خان" میں نے اس کی بات کاٹی "جس بندے کے پیچھے میں آیا ہوں وہ بڑا عیار ہے۔ اسے بھنک بھی پڑ گئی تو وہ یہاں سے نکل بھاگے گا۔"

"مگر آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہوگا جانی صاحب! جس بندے کا آپ بتا رہے ہیں اس کے پاس بہت خطرناک قسم کا اسلحہ ہے۔ وہ مقابلے پر آیا تو بہت نقصان کرے گا۔"

"یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں خان۔ تم بس مجھے اس مکان کا پتا سمجھا دو جہاں وہ زخمی شخص موجود ہے۔"

زرست خان اور اس کے ساتھی نے پھر معترض ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ بانس نما شخص ہارے ہوئے لہجے میں بولا "پھر ایسا کریں جناب! ہمارے پیچھے پیچھے چلتے جائیں۔ ہم جس مکان کے دروازے کے سامنے اپنا سگریٹ پھینکیں گے وہی راج خان کا مکان ہو گا۔"

اس کے بعد بانس نما شخص نے مجھے اس مکان کی اندرونی ساخت اور حدود اربعہ سے آگاہ کیا' یہ بھی بتایا کہ اندر کتنے افراد موجود ہو سکتے ہیں۔۔۔ ہم ہوٹل کے دھواں دھواں ہال سے ہو کر گزرے اور گلی میں آ گئے۔ اب شام کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ کچے پکے مکانوں میں کہیں کہیں بلب روشن ہو گئے تھے۔ میں نے دراز قد شخص کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ وہ سگریٹ کے کش لیتا درمیانی رفتار سے جا رہا تھا۔ ایک کشادہ گلی میں مڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ راج خان کا مکان کون سا ہو گا۔ یہ پختہ مکان دو منزلہ تھا۔ اور دوسرے مکانوں میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مکان کے دروازے پر دو تگڑے افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ترچھی ٹوپی پہن رکھی تھی اور کان میں گلاب کا پھول اڑس رکھا تھا۔ وہ رنگ روپ کے اعتبار سے کوئی پٹھان اور حلیے کے اعتبار سے ہندو نظر آتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ "ہندو پٹھان" تھا۔ "ہندو پٹھان" کا لفظ بعض قارئین کے لیے نیا ہو گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انڈیا میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ہندو کابلی کہلاتے ہیں۔

میرے دراز قد مددگار نے سگریٹ کا ٹکڑا دو منزلہ مکان کے سامنے پھینکا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔ میں نے بھی فی الوقت رکے بغیر آگے بڑھنا مناسب سمجھا۔ لیکن یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا۔ ترچھی ٹوپی والا رعب دار شخص دو قدم چل کر آگے آیا اور میرا راستہ روک لیا۔ وہ دو گھوڑا بوسکی کی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے نیچے پہلو میں ریوالور یا پسٹل کی موجودگی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے مجھے تند ہیر انداز نظروں سے گھور کر پوچھا۔

"تم یہ پوچھنے والے اور میرا راستہ روکنے والے کون ہوتے ہو؟"

"میں ملک ہوں اس بستی کا۔ میرا نام راج خان ہے۔ میں کسی بھی مشکوک بندے کا راستہ روک سکتا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے" میں نے گہری سانس لے کر کہا "راستہ تو رک ہی گیا ہے۔ اب بات بھی ہو جانی چاہیے۔"

"کیسی بات؟"

"اس بندے کی بات جس کا نام عیسیٰ جان ہے اور جو تمہارے گھر میں ہے۔ میں اس کو لینے آیا ہوں۔"

راج خان کے چہرے پر زلزلہ سا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے کسی ساتھی کو آواز دی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص دو پلے پلائے ال سیشن کتوں کو لیے گلی میں آ گیا۔ اس شخص کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔ "تم کس عیسیٰ جان کی بات کر رہے ہو؟" ملک راج خان نے پوچھا۔

میرے سینے کی آگ میرے لہجے میں منتقل ہونے لگی تھی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں" میں نے پھنکار کر کہا "میرے مجرم میرے حوالے کر دو یا لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ نہ تمہارے پاس نہ میرے پاس۔"

اندرونی ہیجان کے سبب راج خان کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ وہ میرے انداز سے خوفزدہ تو تھا لیکن پٹھانی جوش اور غرور نے اس کے خوف کو وقتی طور پر دبا لیا تھا۔ تنک کر بولا "ہم کابلی لوگ ہے۔ جس کو پناہ دیتا ہے اس کا حفاظت جان دے کر بھی کرتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا قبائلی قانون انسانوں کے لیے ہو گا۔ تم نے جس کو پناہ دینے کی غلطی کی ہے وہ آدم خور درندہ ہے۔ اس کو ہلاک کرنا ہم سب کا فرض ہے۔"

وہ سینہ تان کر بولا "خو چہ! کون درندہ ہے اور کون انسان یہ میں نہیں جانتا۔ عیسیٰ ہمارا مہمان ہے اور بھگوان کی سوگند ہم اس کی رکھشا کرے گا۔"

کئی اور لمبے چوڑے قبائلی بھی میرے ارد گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ میرے سینے کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ میں نے پلک جھپکنے میں قمیص کے نیچے سے ریوالور نکالا اور گولی راج خان کی پیشانی پر ماری۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ مردہ چھپکلی کی طرح چت سے گلی میں گرا۔ ایک ال سیشن چھلانگ لگا کر میری طرف آیا۔ میں نے دوسرا فائر اس کتے پر کیا۔ یہ فائر بھی کارگر رہا۔ نزدیک سے چلی ہوئی گولی کتے کی کھوپڑی چیر کر نکل گئی۔ میرے اچانک حملے نے ارد گرد کھڑے قبائلیوں کو چند ثانیے کے لیے ششدر کر دیا تھا۔ وہ مفلوج ذہنوں کے ساتھ ساکت کھڑے تھے۔ میں نے ایک شخص کے سینے پر لات رسید کی اور لپک کر دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ دروازے کے گرد کھڑے افراد سنبھلتے میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ دوسرا ال سیشن جو بجلی کی طرح میری طرف آ رہا تھا' دھماکے کے ساتھ اس بند دروازے سے ٹکرایا اور یقیناً لوٹ پوٹ ہو گیا۔

میں اندرونی حصے کی طرف دوڑا۔ تاہم میری نگاہ عقب میں بھی تھی۔ جونہی میں برآمدے میں پہنچا' مجھے بیرونی دیوار پر دو افراد نظر آئے۔ یہ راج خان کے ساتھی تھے۔ جو دروازہ بند ہونے کے بعد دیوار پر چڑھ آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر کودتے میں نے یکے بعد دیگرے ان دونوں کو نشانہ بنایا۔ تاہم یہ فائر ان کی ٹانگوں پر کیے گئے تھے۔ مجھ پر وحشت طاری تھی لیکن اس کیفیت میں بھی یہ خیال ذہن میں موجود تھا کہ مجھے ناحق کسی کی جان نہیں لینی چاہیے۔ میرے دونوں فائر نشانے پر لگے اور دونوں افراد تڑپ کر دیوار سے نیچے گرے۔ ایک اندر گرا اور دوسرا باہر۔ گیٹ نما دروازے کے

پیچھے جو خلا موجود تھا اس میں ال سیشن نے اپنی تھوتھنی گھسیڑ دی تھی اور زور و شور سے بھونک رہا تھا۔

میں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ تیز چیخ کے ساتھ ایک جوان عورت میرے سامنے آئی۔ لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھر کی ملازمہ ہے۔ اس کم بخت کے ہاتھ میں کسی چارپائی کا وزنی پایہ تھا۔ اس نے بڑی دلیری سے یہ پایہ میرے سر پر توڑنا چاہا۔ میں نے جھک کر سر بچا لیا' لیکن کندھے کو پھر بھی چوٹ سہنا پڑی۔ میں نے بھنا کر عورت کے کولھے پر ٹانگ جمائی۔ وہ چیختی ہوئی ایک چھوٹے سے کمرے میں جا گری۔ میں نے جلدی سے اس اسٹور کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ کوئی شخص تیزی سے فرش پر دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے خود کو دروازے کی اوٹ میں کیا۔ جونہی وہ شخص اندر داخل ہوا میں نے عقب سے اسے دبوچ لیا۔ میرا ایک بازو اس کی گردن میں حمائل ہو چکا تھا۔ میری کہنی کا خفیف سا جھٹکا اس کی گردن کی ہڈی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ وہ سخت جان قبائلی تھا لیکن گردن میرے قابو میں آنے کے بعد موم کی طرح نرم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیا تو انگلیوں میں دبا ہوا چاقو پکے ہوئے پھل کی طرح فرش پر جا گرا۔ وہ کوشش کے باوجود حلق سے آواز نہیں نکال پا رہا تھا۔

"مہمان کہاں ہے؟" میں نے نہایت سرد لہجے میں پوچھا

اس نے معمولی سی مزاحمت کی لیکن گردن پر بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے لاچار ہو گیا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے بلا تاخیر راہداری کی دوسری جانب ایک روشن کھڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے اس کی گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور اسے عالم بے ہوشی کے حوالے کر کے روشن کھڑکی کی طرف دوڑا۔ بیرونی کمرے کا دروازہ دھڑا دھڑ کوٹا جا رہا تھا۔ میں جھک کر بھاگتا ہوا روشن کھڑکی تک پہنچا۔ اگر عیسیٰ جان اس کمرے میں موجود تھا تو یقیناً کھات میں تھا۔ اتنا شور شرابا سن کر وہ کبھی بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں جتنی بھی احتیاط کرتا کم تھا۔ لیکن احتیاط میرے بس میں نہیں رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پہلو میں کھڑے ہو کر کھڑکی کو ٹانگ رسید کی۔ اس کے شیشے چکنا چور ہوئے اور دونوں پٹ کھل گئے۔ ایک سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد میں نے کمرے میں جھانکا۔ کمرے میں ایک چھوٹا ایک اینڈ وائٹ ٹی وی چل رہا تھا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ تپائی پر ایک ادھ کھایا سیب پڑا تھا لیکن کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری انگلی ریوالور کی لبلبی پر تھی اور میں کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ایک سیکنڈ کے مختصر وقفے میں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ عیسیٰ جان اس کمرے میں موجود نہیں بلکہ اس کوٹھی میں ہی موجود نہیں۔ وہ زخمی حالت میں راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ گلی کی جانب والے کمرے کی اکلوتی کھڑکی چوپٹ کھلی ہوئی تھی۔۔۔۔ اور اس کی چوکھٹ پر مٹی کا واضح نشان تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی نے چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر اوپر کودا ہے۔ اسی دوران میں بیرونی کمرے کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے ٹوٹ گیا۔ زینے قریب ہی تھے۔ میں دو دو تین تین زینے پھلانگتا ہوا مکان کی چھت پر آ گیا۔ نچلی منزل پر شاٹ گن اور ریوالور کے تین چار فائر ہوئے پھر کچھ افراد دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں نے چھت پر سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ارد گرد کی گلیاں کافی فاصلے تک نظر آ رہی تھیں لیکن عیسیٰ جان کے آثار دور دور تک نظر نہیں آئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے گلی میں مجھے دیکھ لیا تھا اور بیرونی دروازے پر ہنگامہ شروع ہوتے ہی اس نے راہ فرار اختیار کر لی تھی۔

زینے چڑھنے والے افراد اب چھت پر پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے نیچے جھانکا' پہلی منزل کے روشندانوں کے قریب سے ٹیلیفون کے تار گزرتے تھے۔ یہ تین چار تار بالکل پاس پاس تھے۔ میں نے چھت سے چھلانگ لگائی۔ ان تاروں کو پکڑ کر ایک لمحے کے لیے جھولا اور پھر نیچے گلی میں گرا۔ جونہی پاؤں زمین سے لگے' میں اٹھ کر سامنے والی گلی میں گھس گیا۔ یہ ایک بل کھاتی ہوئی طویل گلی تھی اور اس میں سے شاخ در شاخ گلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے دو تین گلیاں تبدیل کیں اور بڑی سڑک پر آ گیا۔ خوش قسمتی سے بڑی سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک رکشا مل گیا۔

○☆○

وہ ساری رات میں نے یونہی حیدر آباد شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے گزار دی۔ عیسیٰ جان میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سائیں علی اور سرمد کا کچھ پتا نہیں تھا اور صفدر کے پاس میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر جانا چاہتا بھی تو شاید پہنچ نہ سکتا۔ یقینی بات تھی کہ نواب زاوی شاہین کی موت کے بعد صفدر نے قانونی چکروں سے بچنے کی عقلمندانہ کوشش کی ہو گی اور مریم سمیت ریل اسپتال سے نکل گیا ہو گا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اس نے دوبارہ گھر کا رخ نہیں کیا ہو گا۔ حیدر آباد کی جتنی بھی سڑکوں اور گلیوں میں گزاری ہوئی وہ طویل رات میرے لیے ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گی۔ میرے سامنے کوئی ٹھکانا تھا اور نہ کوئی منزل۔ میں بس یوں ہی پاگلوں کی طرح چلتا جا رہا تھا۔ معظم جاہی مارکیٹ' فضل گنج' مینا بازار' فاروق آباد' اسٹیشن۔۔۔۔۔ معلوم نہیں کون کون سے علاقے میری نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ روشنیوں' رنگوں اور شور کی بوچھاڑ۔ قدیم شہر ایک بہت بڑے طلسم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے تھا لیکن مجھ سے بہت دور تھا۔ میں حیرت کو نیند دھندلائی ہوئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ پارکوں میں گونجتی ہوئی بچوں کی چہکاریں' بازاروں میں لہراتے ہوئے رنگین آنچل۔ دکانوں کے تختوں پر جیتی ہوئی رنگوں کی ٹولیاں۔۔۔۔ دریچوں سے جھانکتے ہوئے چاند چہرے' کچھ بھی تو مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے دھیرے شہر کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ پارک سنسان' بازار سونے اور دریچے تاریک ہو گئے لیکن میں سونے راستوں پر بھٹکتا رہا۔ دور کسی

چوبارے پر رقص ہو رہا تھا۔ مجروح سلطان پوری کسی مغنیہ کی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح۔

ایک جگہ پولیس نے ناکہ لگا رکھا تھا۔ میں دامن بچا کر ایک گلی میں داخل ہو گیا اور پھر گلیوں گلیوں چلتا یونیورسٹی کے گراؤنڈ کی طرف نکل گیا۔ ایک نیم تلے پتھر کی بینچ پر بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... کبھی کبھی جی میں آتا کہ آخری بار شاہین کا چہرہ دیکھ لوں۔ اس "سراپا محبت" کو نگاہوں سے بوسہ دے لوں جو چند ہفتے پہلے ایک طوفان کی طرح میری زندگی میں آئی تھی اور میرے دل و دماغ میں دھوم مچا کر اچانک مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اپنی تمام خواہش، ارمان اور جذبے اپنے سینے میں سمیٹ کر قبر کی گہرائیوں میں اترنے والی تھی...... کبھی میں یہ "سوچ" ذہن سے جھٹک دیتا اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لینے لگتا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں شاہین کے گھر یعنی نواب فیروز جنگ کی حویلی میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اگر میں جانا چاہتا تو بڑی سے بڑی مصلحت بھی مجھے روک نہیں سکتی تھی۔ درحقیقت مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شاہین کا مرا چہرہ دیکھ سکوں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے زندہ چہرے کا تصور ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی خواب کی طرح گزر گئے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں بس ایک اہم واقعہ ہوا۔ دوپہر کے وقت میں نے یونہی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک چھوٹا سا پرچہ ہاتھ میں آ گیا۔ اس پر بڑے بڑے لفظوں میں بس ایک فقرہ لکھا تھا "بخشو کی طرف سے پریشان مت ہونا۔ وہ میرے پاس ہے۔" (سائیں عالی) یقیناً یہ پرچہ سائیں عالی یا سرور نے میری جیب میں رکھا تھا۔ اگر یہ اطلاع صحیح بھی تھی تو مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ خوشی کے لیے میرے دل و دماغ میں گنجائش ہی نہیں تھی...... ان چوبیس گھنٹوں میں نہ جانے میں کہاں کہاں بھٹکا تھا۔ سویا بھی تھا یا نہیں، کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں۔ شاہین کی مترنم ہنسی مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھی۔ جب اس ہنسی کی بازگشت کرب ناک ہو جاتی تو بھینی جان کا چہرہ بے پناہ نحوست کے ساتھ میرے تصور میں گھومنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کی جگہ سیال آگ دوڑنے لگتی۔ غیظ و غضب کی اسی حالت میں میں نے ایک چوک میں ایک ٹریفک کانسٹیبل کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ ایک غریب گڈریا کو چابک سے مار رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے دو تین گھونسوں میں اس کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا۔ عقل کی کسوٹی پر رکھا جاتا تو میرا یہ اقدام بے حد خطرناک اور احمقانہ تھا۔ صرف ۲۶ گھنٹے پہلے میں بہار کالونی میں ایک قتل کر چکا تھا۔ ایک "قاتل" کی حیثیت سے تو مجھے کہیں چھپ جانا چاہیے تھا لیکن میں دیدہ دلیری سے نہ صرف سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہا تھا بلکہ اب ایک پولیس والے کو پیٹ بھی ڈالا تھا۔ لیکن میرا یہ بے حد خطرناک رویہ بھی میرا کوئی نقصان نہ کر سکا۔ موقع پر موجود بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہو گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ مضروب کا ساتھی اہلکار وائرلیس پر امداد طلب کرتا یا پولیس کی کوئی موبائل موقع پر پہنچتی ایک کار والے نے مجھے لفٹ دی اور موقع سے نکال کر لے گیا۔ کار والے نے مجھے شاہی مسجد کے قریب اتارا تھا۔ میں مسجد کے عقب میں واقع ایک چھوٹے سے سرسبز گراؤنڈ میں جا بیٹھا۔ ابھی مجھے بیٹھے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی نے میرے کندھے پر دھپ مارا۔ یہ وہی کندھا تھا جس پر بہار کالونی میں ایک عورت نے لکڑی کا وزنی وار رسید کر دیا تھا۔ دھپ لگنے سے میرے پورے بازو میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا...... وہاں سائیں عالی موجود تھا۔

"اوئے تیغ عمر" اس نے مجھے مخصوص انداز میں مخاطب کیا "تو بندہ ہے کہ منتر تو...... کچھ پتا نہیں چلتا تیرا کہ کس طرف رخ کرے گا اور کہاں چھپ کر بیٹھ رہے گا۔ ہم دو روز سے پاگل ہو گئے ہیں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔"

میں نے دیکھا سائیں عالی کے ساتھ زبیدائے درانی بھی موجود تھا۔ اس کی موجودگی حیران کن تھی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ درانی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مسکرا کر بولا "سائیں صاحب درست فرماتے ہیں۔ ہم نے آپ کو بہت تلاش کیا ہے۔"

"کیوں؟ میری کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

درانی بولا "یہ سائیں صاحب کل صبح میرے گھر آئے تھے۔ آپ کا پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ وہ تو چلے گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ انہیں ڈھونڈنا ہے۔ ہر صورت میں ڈھونڈنا ہے۔ بس کل سے جگہ جگہ تلاش کر رہے ہیں آپ کو۔"

سائیں عالی تنک کر بولا "یہ کیا پولیس والوں کی طرح سوال جواب کر رہے ہو ہم سے۔ چلو اٹھو ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"جہاں میں لے جاؤں اور تمہیں پتا ہے کہ میں کسی اچھی جگہ ہی لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ جنات ہوتے ہیں اور جنات کسی ایری غیری نتھو خیری جگہ پر قیام نہیں کر سکتے۔ بڑی صاف ستھری مخلوق ہوتی ہے یہ...... اور پڑھے لکھے جنات کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ ایسے جنات تمہاری دنیا میں داخل ہوتے ہی ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ ہم انسان ہیں یا بھوت، جو اتنی دھواں دھواں اور بدبودار دنیا میں بھی زندہ ہیں۔" پھر وہ میرا ہاتھ تھام کر بولا "چلو تم باتیں زیادہ مت کرو۔ ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

میں بے دلی کے ساتھ سائیں عالی اور درانی کے ساتھ چل دیا۔ کچھ فاصلے پر وہی سفید کار کھڑی تھی جو میں نے درانی کی کوٹھی میں دیکھی تھی۔ ہم کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے درانی سے پوچھا کہ اس کی بیوی اور بچے کا کیا حال ہے؟

وہ بولا "دونوں خیریت سے ہیں۔ عفت پرسوں سے کئی بار آپ

کے بارے میں پوچھ چکی ہے۔ یقین کریں، ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے ہم آپ کا شکریہ ادا کر سکیں۔ آپ نے ہمیں نئی زندگی دی ہے۔ کاش ہم آپ کے لیے کچھ کر سکیں۔"

میں نے پوچھا "زری خان کا کیا بنا؟"

"اسے حوالۂ پولیس کر دیا گیا ہے۔" درانی نے جواب دیا۔

میں نے کہا "مسٹر درانی! بے شک زری خان مجرم ہے۔ لیکن ایک بات آپ نے بھی محسوس کی ہوگی۔ وہ مذہبی پس منظر رکھنے والا ایک جذباتی نوجوان ہے۔ درحقیقت بھینی جان کی باتوں میں آ کر وہ اس کا آلۂ کار بنا ہے۔ ورنہ اس واردات میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے خلاف زیادہ سخت چالان نہ بنے اور اسے اتنی ہی سزا ملے جتنا اس نے جرم کیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جہاں صاحب۔ آپ اس بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ اصل اور بڑا مجرم وہی ہے جسے زری خان 'لالہ' کہتا تھا۔"

میں نے پوچھا "آپ کے نوکر کی لاش ملی یا نہیں؟"

درانی کے چہرے پر حزن و ملال کے سائے گہرے ہو گئے۔ بولا "نہیں، ابھی تو کوئی پتا نہیں چلا۔ پولیس والے کل سارا دن مارے اور محلے داروں کے بیانات قلم بند کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے دو تین بندوں کو شاملِ تفتیش بھی کیا ہے۔"

درانی سارے راستے میں باتیں کرتا رہا۔ سائیں بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ درانی کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنی بیوی پر ٹوٹنے والے ظلم کا پتا چل چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ لالہ (بھینی) نامی ڈاکو چار روز تک اس کی اہلیہ کی عزت پامال کرتا رہا ہے۔ تاہم وہ ایک روشن خیال اور وسیع القلب شخص نظر آتا تھا۔ اس سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس سانحے کے اثرات سے نکلنے میں اپنی مظلوم بیوی کی مدد کرے گا۔

درانی ویسے بھی ایک ہمدرد اور مخلص شخص محسوس ہوتا تھا۔ ممنون ہونے کے ناتے بھی وہ میرے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی طور میری مدد کرے۔ اسی لیے وہ میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے زیادہ کچھ بتاؤں۔ بس صرف یہیں تک محدود رہا کہ میں یہاں بھینی جان کی تلاش میں ہوں اور اس سے اپنا کوئی پرانا حساب چکتا کرنا چاہتا ہوں۔

ہماری منزل حیدرآباد کا ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھی۔ سائیں عالی جس کے لباس اور ہاتھ پاؤں پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں، اس ہوٹل کے ایک اپارٹمنٹ میں مقیم تھا۔ وہ ایک انوکھا شخص تھا۔ کچھ پتا نہیں کس وقت کہیں بھی پایا جا سکتا تھا۔ آرام دہ اپارٹمنٹ میں ڈرائنگ روم بھی فرحت بخش تھی۔ وہ بہار کی طرح جذبات انگیز نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے چہرے پر مصنوعی سوگواری طاری کر لی۔ جیسے بے زبان خاموشی مجھ سے شاہین کی ناگہانی موت پر اظہارِ تعزیت کر رہی ہو۔ پرسوں سائیں عالی نے کہا تھا کہ بخشو بھی اس کے پاس ہی موجود ہے۔ اس کے بعد بخشو کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ موہوم سی امید تھی کہ شاید بخشو بھی اسی اپارٹمنٹ میں پایا جائے۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ سائیں عالی نے "روم سروس" کے ذریعے چائے منگوائی۔ بڑی اچھی چائے تھی لیکن سائیں نے اپنے کپ میں پسی ہوئی کالی مرچیں گھول کر اور تھوڑی سی برف ڈال کر اس کا بیڑا غرق کر لیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم باتیں بھی کرتے رہے۔ درانی کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ اسی اسپتال میں "سپروائزر" ہے جہاں بخشو کی والدہ عائشاں بی بی زیرِ علاج ہے۔ میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ درانی، عائشاں کو اسپتال سے نکالنے میں ہماری مدد کرے؟

میں نے اس سلسلے میں درانی سے بات کی۔ اسے عجیب الخلقت بخشو اور اس کی دکھیاری ماں کے بارے میں بتایا اور ان حالات کا بھی تذکرہ کیا جن میں وہ ماں بیٹا ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ درانی بڑی ہمدردی سے کہانی سنتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ زخمی ہونے کے بعد بخشو کی ماں اسی اسپتال کے "برن یونٹ" میں زیرِ علاج ہے جہاں درانی ملازم ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ کسی طرح عائشاں بی بی کو اسپتال سے نکالنے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟"

درانی کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرائیں۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا "بے شک یہ ایک مشکل کام ہے اور غیر قانونی بھی۔ لیکن آپ نے جو کچھ عائشاں اور اس کے بیٹے کے بارے میں بتایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حالات کے بے رحم چکر میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ میں اس سلسلے میں سوچنے کے لیے آپ سے تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں۔ میں کل کسی وقت آپ کو اپنے جواب سے آگاہ کروں گا۔"

"حق ہو" سائیں عالی نے نعرۂ مستانہ بلند کیا "پہلے تولو پھر بولو۔ پہلے سوچو پھر کرو۔ تم بھی کل تک ضرور سوچو۔ لیکن جو فیصلہ بھی کرنا، اچھا کرنا۔"

چائے پلانے کے بعد سائیں عالی نے زبیدائے درانی کو رخصت کر دیا۔ پھر خود بھی اٹھ کر ایک کمرے میں گھس گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے مراقبے کا وقت ہے...... میں نشست گاہ میں اکیلا رہ گیا۔ چند ہی لمحے بعد سروج وہاں آ دھمکی۔ اس کے ہاتھ میں بدنامِ زمانہ رسالہ "پلے بوائے" تھا۔ سرورق پر ہی کسی امریکی حسینہ کی توبہ شکن تصویر موجود تھی۔ سروج نے جان بوجھ کر رسالہ اس انداز سے تھام رکھا تھا کہ سرورق میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ میں نے بیزاری سے رخ پھیر لیا۔ وہ معنوی سنجیدگی سے بولی

"نواب زادی شاہین کی موت کا بہت افسوس ہوا ہے شاہ جہاں۔ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔"

"ہمدردی کا شکریہ۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

وہ بولی "تمہارے چہرے کی سوگواری دیکھ کر تو میرا بھی مرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ اگر مجھے وشواش ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم اتنے ہی غمگین نظر آؤ گے تو میں ابھی اپنی جان لے لوں۔"

"تم زندہ رہ کر بھی مجھے بے انتہا تکلیف پہنچا رہی ہو ــــــ مرنے سے کیا فائدہ؟"

"تم کبھی میری بات کو سنجیدگی سے نہ لو گے۔ کاش تم نے کبھی مجھے آزمایا ہوتا، پرکھا ہوتا۔"

"تمہیں آزمانے اور پرکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو ہر ایک کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہو۔"

اس نے اپنی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھیں اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ پھر ٹیک لگانے کے بجائے اس نے اپنے جسم کو صوفے پر یوں بے ترتیب کیا کہ ہر نشیب و فراز نمایاں تر ہو گیا۔ خواب ناک لہجے میں بولی "غم کو سینے سے لگائے رکھیں تو وہ روگ بن جاتا ہے۔ غم کو غلط کرنے کی کوشش کیا کرو۔ کہو تو ایک جام بناؤں تمہارے لیے؟"

اس کی یہ بے وقت پیشکش مجھے زہر لگی۔ میں نے کہا "سائیں عالی کسی وقت غصے میں آ کر تمہیں جوتے مارتا ہے تو ٹھیک ہی کرتا ہے۔ تم ہو ہی اسی قابل۔"

اگر میرا یہ خیال تھا کہ یہ بات اسے کڑوی لگے گی تو یہ غلط ثابت ہوا۔ وہ بدستور مسکراتی رہی "سچی بات یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی ایسے آدمی ہیں جو مجھ سے کیسا بھی سلوک کریں، مجھے برا نہیں لگے گا۔ ایک سائیں عالی اور دوسرے تم۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں سے چلنا چاہیے۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"ارررے۔۔ کیا کرتے ہو۔" وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی "کیا سائیں جی سے جوتے پڑوانے ہیں۔ وہ تو میری کھال کھینچ لیں گے۔ ویسے بھی جس عورت سے اس کا مرد ہاتھ چھڑا کر چلا جائے وہ نالائق اور بے کار کہلاتی ہے۔"

"میرے منزل میں حقیقت کو ثابت ہونا چاہیے۔" میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے میری کلائی پر گرفت مضبوط کر دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "کیا خنجو کے بارے میں جاننا نہیں چاہو گے؟"

اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ مجبوراً مجھے پھر بیٹھنا پڑا۔ اس نے میری انگلیوں سے سگریٹ کھینچا اور بڑے خوب صورت انداز میں دو چھوٹے چھوٹے کش لے کر پھر سے میری انگلیوں میں اڑس دیا "ہائے رام، اتنا تیز تمباکو پیتے ہو تم؟" وہ گلا مسل کر بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس ڈر سے کہ میں پھر اٹھ نہ جاؤں اس نے دوبارہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر میری کلائی کی گھڑی کو سہلاتی رہی پھر بولی "خنجو دانی سائیں جی کے پاس ہے۔ وہ تمہارے اکبر نگر والے گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ گلیوں میں گھومنے لگتا تو شاید لوگ اسے پتھر مار مار کر ختم کر ڈالتے۔ اس کے لیے تمہیں سائیں جی کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اسے بہلا پھسلا کر اپنے ایک مرید کی کار میں بٹھایا اور محفوظ ٹھکانے پر لے آئے۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی مرید کے گھر میں جس کی کار میں اسے لایا گیا تھا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے وہ جگہ۔ آج صبح بھی میں اور سائیں جی اس سے مل کر آئے ہیں۔"

"وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ دو تین روز اس نے ماں سے ملنے کی رٹ لگائی تھی اور پریشان بھی کیا تھا۔ پھر سائیں جی کی ہدایت پر ان کے مرید نے اسے کوئی مکسچر پلانا شروع کر دیا۔ اب وہ زیادہ تر سوتا رہتا ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیسے جاؤ گے؟"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں نہیں جا سکتی نا۔" وہ اداس انداز سے بولی "سائیں جی میرے ذمے کام لگا گئے ہیں۔ وہ سارا سامان جو پڑا ہے مجھے فوری طور پر ترتیب سے رکھنا ہے اور پیک کرنا ہے۔" اس نے کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پہلی بار غور سے دیکھا۔ کمرے کے اس گوشے میں تین چار سفری بیگ پڑے تھے۔ ورقین تار پیچیں۔ نائیلون کے ایک موٹے رسے کا بنڈل، کینوس شوز، تہہ ہو جانے والے سفری خیمے، گیس لیمپ، دو پورٹیبل چولہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی دور دراز سفر پر روانہ ہونے والی شکاری پارٹی کا سامان پڑا ہے یا کوئی کوہ پیما ٹیم ہے جو بلند چوٹی سر کرنے کا ارادہ باندھ رہی ہے۔

"یہ کس کا سامان ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارا ــــــ اور ہم میں تم بھی شامل ہو۔" سروج نے اٹھلا کر کہا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"سائیں جی نے سب کچھ بتا تو دیا تھا تمہیں اور مدراس کے ٹکٹ بھی تو دکھا دیے تھے۔ بھئی ہم روانہ ہونے والے ہیں ایک سفر پر اور یہ ساری شاپنگ اسی سلسلے میں کی گئی ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس دوران میں سائیں عالی بھی باہر آ گیا۔ اس نے سروج کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دی اور

کہا کہ وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہی ہے۔ اٹھے اور سامان کی پیکنگ کرے۔

سائیں عالی کی گالی سے سروج ذرا بھی بدمزہ نہیں ہوتی تھی۔ ہاں کچھ ڈر سی جاتی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سامان کی طرف بڑھ گئی۔ سائیں عالی نے مجھ سے کہا کہ اگر میں سونا چاہتا ہوں تو ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جاؤں۔ میں نے تھوڑی دیر سائیں کی پیشکش پر غور کیا پھر سونے کے لیے چلا گیا۔

آرام دہ بستر پر لیٹ کر بھی نیند آنکھوں سے دور رہی۔ پہلے شاہین کا تصور ذہن کو کچوکے لگاتا رہا۔ پھر سائیں عالی کا ناقابلِ فہم رویہ الجھن بن کر دماغ سے چمٹ گیا۔ وہ کہاں جانا چاہ رہا تھا اور مجھے اپنے ساتھ کیوں کھینچ رہا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سائیں عالی کے پروگرام کا تعلق اسی دفینے سے ہے جو ہمیں مہینوں سے تگنی کا ناچ نچا رہا تھا۔ سائیں عالی کے ہاتھ میں کوئی اہم "کلیو" آیا تھا اور وہ اس "کلیو" کی روشنی میں کسی مہم جوئی کا ارادہ کر رہا تھا۔ درحقیقت شاہین کے زخمی ہونے کے بعد سے "دفینے" کا خیال بالکل میرے ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ ان پانچ چھ روز میں شاید ایک بار بھی میں نے اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ نواب شہریار مرحوم کی کوٹھی سے مجھے چوکیدار اور اس کے کتے کی بدبودار لاش کے سوا اور کچھ نہیں ملا تھا۔ ایک اندرونی ہال میں وہ پچیس صندوق کھلے پڑے تھے جن میں 'صندر' اور زریں کل ترک سمیت انڈیا لائے گئے تھے۔ یہ کھلے صندوق اور صندوقوں کے ٹوٹے ہوئے تالے اس بات کے گواہ تھے کہ پنے پل کی حویلی کا عظیم الشان دفینہ ایک بار پھر نئے ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ میں اس بارے میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح ناشتے سے قبل ایک بار پھر درانی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ میرے لیے اپنے گھر کی پھلواری سے چھوٹا سا خوب صورت گلدستہ لایا تھا۔ کہنے لگا "یہ میرے بیٹے زبیر کی طرف سے ہے۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ میرے آنے سے پہلے توتلی زبان میں آپ کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔"

"میری طرف سے اسے پیار دیجئے۔" میں نے کہا۔

جلد ہی ہم اپنے اصل موضوع پر آ گئے اور یہ موضوع تھا، ماسی عائشاں کی اسپتال سے "رہائی"۔ درانی کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی اہم اور قابلِ عمل تجویز موجود ہے۔ یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ درانی نے کہا "آپ جانتے ہی ہیں، میرا تعلق "اسپتال کو بجلی کی ترسیل" سے ہے۔ میں نے اسی حوالے سے ایک بات سوچی ہے۔" اس نے سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لے کر بولا "اسپتال میں بجلی چوبیس گھنٹے بحال رکھی جاتی ہے۔ اگر کسی وقت بجلی فیل بھی ہو تو جنریٹر سسٹم فوری طور پر کام شروع کر دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسپتال میں اور خاص طور سے آپریشن

تھیٹرز میں بجلی فیل ہو جانے کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیا جا سکتا ــــــ عائشاں نام کی عورت اسپتال کے جس بلاک میں ہے اسے ریوی بلاک کہا جاتا ہے۔ اس بلاک میں صرف ایک ہی آپریشن تھیٹر ہے اور آج رات بارہ بجے کے بعد اس تھیٹر میں کوئی آپریشن نہیں ہو گا۔ یعنی اگر ہم چاہیں تو آج رات اس بلاک کی بجلی پانچ دس منٹ کے لیے مکمل طور پر بند کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے؟" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا "بجلی کی بندش کے دوران میں آپ بہ آسانی اپنی کارروائی کر سکتے ہیں۔ اسپتال میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ بجلی اور جنریٹر سسٹم ایک ساتھ فیل ہو جائیں۔ لہٰذا وہاں روشنی کا کوئی متبادل انتظام بھی نہیں ہے۔ موم بتیاں یا لیمپ وغیرہ روشن ہوتے ہوتے بھی پندرہ بیس منٹ لگ جائیں گے۔ اس دوران میں آپ بآسانی مریضہ کو "برن یونٹ" سے نکال سکتے ہیں۔ ریوی بلاک اسپتال کی پارکنگ کے بالکل ساتھ ہے۔ بلاک کے ساتھ ہی پارکنگ لاٹ اور مین گیٹ کی روشنی بھی چلی جائے گی اور آپ کو مریضہ کے نکالنے میں بہت آسانی رہے گی۔"

درانی کی تجویز قابلِ غور تھی۔ ہم نے قریباً ایک گھنٹے تک اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور ماسی عائشاں کو اسپتال سے نکالنے کا لائحہ عمل تیار کر لیا۔

اسی رات بارہ بجے میں اسپتال کے سبزہ زار میں موجود تھا۔ میں درانی کی گاڑی پر آیا تھا۔ گاڑی کی چابی میری جیب میں تھی۔ جوں ہی گھڑی کی سوئیاں بارہ کے ہندسے پر ایک ہوئیں میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہاتھ میں دو تین دوائیں تھیں۔ ان دواؤں نے مجھے "برن یونٹ" کے داخلی دروازے سے گزرنے میں مدد دی۔ یہاں کرخت چہرے والا ایک نگران کھڑا رہتا تھا اور ہر آنے جانے والے کو کڑی نگاہ سے گھورتا تھا اور اکثر کو روک بھی لیتا تھا۔ میرے انداز میں تیزی اور ہاتھ میں دوائیں دیکھ کر اس نے مجھے اندر جانے دیا۔ میں نے ایک راہداری طے کی اور یونٹ کے زنانہ وارڈ کے سامنے پہنچ گیا۔ میری جیب میں بھرا ہوا کولٹ پسٹل موجود تھا۔ پنڈلی سے مخصوص رام پوری خنجر بھی بندھا ہوا تھا۔ وارڈ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ماسی عائشاں کا بستر دیکھ لیا تھا اور ان پولیس اہلکاروں کو بھی دیکھ لیا جو ماسی عائشاں کی نگرانی کے لیے موجود تھے۔ ان میں ایک گدلے جسم لیڈی کانسٹیبل تھی جو وارڈ کے اندر ہی ایک خالی بستر پر نیم دراز تھی۔ دو مرد اہلکار تھے۔ وہ وارڈ سے باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور اسپتال کے کسی ملازم سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ بالکل "ریلیکس" نظر آ رہے تھے۔ جیسے ڈیوٹی دینے کے بجائے چھٹی گزار رہے ہوں۔ تاہم ان کے کندھوں پر تھری ناٹ تھری کی رائفلیں موجود تھیں

اور وہ بنیادی طور پر ان لفظوں کا استعمال بھی جانتے تھے۔ میں نے ماسی عاشاں کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ وہ کافی کمزور نظر آرہی تھی۔ اتنی رات گئے بھی وہ جاگ رہی تھی اور اپنے لاوارث بخشو کے بارے میں سوچ رہی تھی یا پھر ان خوفی واقعات کے بارے میں جنہوں نے ایک دم اس کی جمی جمائی زندگی کو تہ وبالا کردیا تھا۔

میں زنانہ وارڈ کے سامنے سے گزر کر راہداری کے آخری سرے پر چلا گیا اور کھڑکیوں میں سے نیچے پارکنگ لاٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جوں ہی میری گھڑی نے بارہ بج کر پانچ منٹ کا وقت بتایا درود یوار اچانک گہری تاریکی میں ڈوب گئے۔ یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی دواؤں میں سے ایک دوا رومال پر چھڑکی۔ یہ خالص کلوروفارم تھا۔ زنانہ وارڈ کے اندر داخل ہونے میں مجھے قطعی دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے ہاتھ سے چھو کر بستر گنے۔ چوتھا بستر ماسی عاشاں کا تھا۔ ماسی عاشاں کو کلوروفارم سونگھانے کے لیے میں آگے بڑھا تو کسی سے ٹکر ہوگئی۔ یقیناً یہ کوئی عورت تھی کیوں کہ اس کے جسم کا گداز میں نے واضح طور پر محسوس کیا اور یہ بھی یقینی بات تھی کہ وہ کوئی نرس ہے کیوں کہ اس نے انگریزی میں "اوہ! اللہ" کہا تھا۔ میں اس دلچسپ تصادم کی پروا کیے بغیر ماسی عاشاں کی طرف آیا...... ٹٹول کر اس کا چہرہ ڈھونڈا اور پھر طاقت سے اس کا منہ دبالیا۔ ٹیکوئڈ کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال ماسی کی ناک اور ہونٹوں کو ڈھانپ چکا تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ ماسی کی گردن پر تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ چند سیکنڈ میں ماسی کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

وارڈ میں پنکھے بند ہوگئے تھے اور سب مریض ایک ساتھ بولنے لگے تھے۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں صورت حال پر تبصرہ کررہا تھا۔ میں نے گھپ اندھیرے میں جھک کر ماسی عاشاں کو کندھے پر لادا اور وارڈ سے نکل آیا۔ اس ساری کارروائی میں بہ مشکل دو منٹ صرف ہوئے۔ جب میں وارڈ سے نکل کر سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا "ایک پولیس اہلکار نے ماچس نکال کر جلائی تھی اور اس کی روشنی میں وارڈ کے اندر داخل ہورہا تھا۔ یہ کسی حد تک تشویش ناک صورت حال تھی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ابھی آٹھ دس زینے باقی تھے کہ بالائی منزل سے شور وغل بلند ہوا۔ پہلے ایک اہلکار چیخ کر بولا۔ پھر "بھاگو پکڑو" کی آوازیں آئیں۔ ماسی عاشاں ایک مجسم تنومند عورت تھی۔ اسے کندھے پر لاد کر تیزی سے حرکت کرنا آسان نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ تاخیر خطرناک ہے۔ سیڑھیاں اترتے ہی میں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں بلاک کی طرح پارکنگ لاٹ بھی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہرحال یہاں اندرونی عمارت کی طرح گھپ اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر ماسی عاشاں کو نشست پر لٹایا تو پارکنگ کے ملازم نے دیکھ لیا۔ اسپتال کے اندرونی حصے میں شور وغل بلند نہ ہورہا ہوتا تو شاید وہ میری اس مشکوک حرکت کو بھی نظرانداز کردیتا لیکن اب اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا "یہ عورت کون ہے جی؟"

اس کے لہجے میں مستقبل قریب کے بے شمار خطرات کی جھلک تھی۔ ممکن تھا کہ میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو وہ چیخ پکار شروع کردیتا۔ لیکن میں تاخیر کیوں کرتا؟ میں ایسے بے شمار مراحل سے گزر چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر بروقت کارروائی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ ابھی بہ مشکل اس کا سوال مکمل ہوا تھا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے سمیٹتا ہوا گاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد وہ بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ مین گیٹ کی طرف بالکل سکون تھا۔ سارا ہنگامہ دیوانی بلاک کی طرف ہورہا تھا۔ میں اطمینان سے باہر نکلا اور گاڑی کو چکنی سڑک پر دوڑاتا چلا گیا۔

○☆○

میں ماسی عاشاں کو پہلے فائیو اسٹار ہوٹل کی پارکنگ میں لایا۔ یہاں سے سائیں عالی میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور ہم سائیں کے اس مرید کے گھر پہنچے جہاں عجیب الخلقت بخشو کو رکھا گیا تھا۔ ماسی عاشاں کو ایک علیحدہ کمرے میں لے جایا گیا۔ وہ ابھی تک اسپتال کے لباس میں تھی۔ میں نے اس کا جسم دیکھا۔ پیٹ اور ٹانگوں کا بہت سا حصہ جل چکا تھا۔ گولی کا زخم اس کے دائیں کندھے کے نیچے تھا۔ نازک مقام پر گولی لگنے اور ایک تہائی جسم جھلسنے کے باوجود وہ زندہ بچ گئی تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر اس کی کوئی بھی توجیہ کرتے لیکن میرے نزدیک اسے زندہ رکھنے والی قوت صرف اور صرف "ممتا" کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی۔ وہی عجیب الخلقت بخشو جو اس کے لیے چاند کا ٹکڑا تھا۔

کلوروفارم کا اثر کافی حد تک ختم ہوچکا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد ماسی عاشاں ہوش میں آگئی۔ خود کو اسپتال کے وارڈ کے بجائے ایک سجے سجائے کمرے میں پاکر وہ از حد حیران ہوئی۔ کتنی ہی دیر وہ خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مجھے اور سائیں عالی کو پہچان لیا۔ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ ہم اسے اسپتال سے لے آئے ہیں۔ اس کا پہلا سوال یہی تھا "بخشو کہاں ہے؟"

ہمارے پاس ماسی عاشاں کے سوال کا بہت معقول جواب موجود تھا اور یہ جواب ہم نے ماسی کے سامنے پیش کردیا۔ میری مراد "بخشو" سے ہے۔ میں ساتھ والے کمرے سے بخشو کو لے کر ماسی عاشاں کے سامنے پہنچا تو اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں جیسے ہزاروں چراغ جل اٹھے۔ وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے ایک ہی پل میں صحت یابی کے تمام مراحل سے گزر گئی ہو۔ دوسری طرف بخشو کی حالت بھی دیدنی تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور کسی بچے کی طرح ہمکنے لگا تھا۔ اس کے "تنبوں" جیسے ہاتھ ایک بے

بے تابی کے ساتھ حرکت میں آئے اور ماں کی طرف بڑھے۔ دونوں لوہے اور مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ ماں بیٹے کے ملاپ کا منظر دیدنی تھا اور رقت آمیز بھی۔ بہت دیر کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ تین افراد کا قاتل ٹنڈ منڈ بخشو کسی بچے کی طرح بھوں بھوں رو رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ بے حد معصوم اور قابلِ رحم نظر آیا۔ میں بخشو کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کرچکا تھا...... اور یہ فیصلہ تھا بخشو اور اس کی ماں کو قانون کی گرفت سے بچانے کا۔ میں نے کئی دن پہلے ہی تہیہ کرلیا تھا کہ اس بات کے لیے اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ بخشو اور ماسی عاشاں انڈین پولیس کے ہتھے نہ چڑھنے پائیں۔

اگلے روز علی الصباح میں نے اس شخص سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جو بخشو اور اس کی ماں کو قانون کے آہنی شکنجے سے بچانے میں میری مدد کرسکتا تھا۔ میری مراد مسٹرجی کلاوک صاحب سے ہے۔ اس امریکی ارب پتی کے پاس بے پناہ دولت کی صورت میں الٰہ دین کا ایسا جن موجود تھا جو ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتا تھا۔ بے شک مسٹرجی کلارک صاحب ایک غیرملک میں اور اجنبی لوگوں کے درمیان تھے لیکن ان کا اسٹیٹس انہیں ہر جگہ ایک جانی پہچانی اور بارسوخ شخصیت بنادیتا تھا...... لیکن افسوس کوشش کے باوجود میں کلاوک صاحب یا ان کے سیکریٹری ڈیوڈ سے رابطہ قائم نہیں کرسکا۔ بہت مشکل سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ کچھ دنوں سے مسٹر کلارک حیدرآباد میں نہیں 'تاباؤ' وہ مدراس گئے ہوئے ہیں۔

مدراس کا نام سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ سائیں عالی اور سروج بھی مجھے مدراس لے جانے کی باتیں کررہے تھے...... آخر ایک دم مدراس اتنا اہم کیوں ہوگیا تھا۔ فون کرنے کے بعد میں نے سائیں عالی کو کریدنے کی کوشش کی۔ لیکن سائیں کو کریدنا ایسے ہی تھا جیسے پتھر کو کریدا جائے۔ اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا اور مجھے شاہ جنات اور اس کی سب سے چھوٹی ملکہ کی دلچسپ داستان کی کتھا سنانے بیٹھ گیا۔ بہرحال اس کی باتوں سے اتنا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا کہ مسٹرجی کلاوک صاحب بھی مدراس میں موجود ہیں اور وہاں دنیے کے سلسلے میں کوئی بہت "خاص کھچڑی" پک رہی ہے۔

سائیں عالی کی بے سروپا باتوں سے زچ ہوکر میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر بخشو اور اس کی والدہ کی حفاظت کا کوئی مستقل انتظام نہیں ہوگا تو میں حیدرآباد سے کہیں نہیں جاؤں گا۔

سائیں نے خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا "کس قسم کی حفاظت چاہتے ہو تم؟"

"ان کی زندگی کی ضمانت اور اس بات کی ضمانت کہ بخشو پولیس کی پکڑ سے محفوظ رہے گا۔"

سائیں عالی بولا "تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ بخشو اور اس کی ماں کے لیے سوچنے والے تم اکیلے نہیں ہو اور بھی کچھ لوگ ہیں جو ان دونوں کے خیر خواہ ہیں۔"

"مثلاً کون؟"

"مثلاً میں" سائیں نے جواب دیا۔

"تم کیا کرسکتے ہو؟"

"میں کچھ نہیں کرسکتا لیکن کروا بہت کچھ سکتا ہوں۔ وہ میرا انگریز مرید کیا نام ہے اس کا...... کلاوک خان...... وہ اسی کام میں لگا ہوا ہے۔"

"کلارک خان" سے سائیں عالی کی مراد مسٹرجی کلاوک سے تھی۔ میں نے سائیں سے پوچھا "مسٹرجی کلارک کیا کریں گے؟"

"وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ وہ صرف اس انتظار میں تھا کہ بخشو کی ماں رہا ہوجائے...... جیسے تم چند ماہ پہلے ستارپوٹ سے سمندر پار کرکے سری لنکا جا پہنچے تھے ایسے ہی یہ ماں بیٹا بھی سری لنکا پہنچ جائیں گے۔ وہاں یہ ڈیڑھ دو ماہ حفاظت سے رہیں گے۔ پھر انہیں وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے تھائی لینڈ یا ہانگ کانگ بھیج دیا جائے گا۔"

سائیں عالی بڑی سنجیدگی سے بات کررہا تھا۔ اس نے بحری جہاز کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا کہ مسٹرجی کلارک کی اپنی "شپنگ کمپنی" بھی ہے۔ اس کی کمپنی کے مال بردار جہاز کراچی، بمبئی اور کولمبو تک آتے جاتے تھے۔ اگر مسٹرجی کلارک نے واقعی بخشو اور اس کی والدہ کو انڈیا سے فرار کرانے کا منصوبہ بنایا تھا تو یہ بات قرین قیاس تھی کہ انہیں جس جہاز پر سری لنکا سے نکالا جاتا وہ ان کا کوئی ذاتی جہاز ہی ہوتا۔ بہرحال جب تک مسٹرجی کلاوک صاحب سے بالمشافہ بات نہ ہوتی اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سائیں عالی نے مجھے سوچ میں دیکھا تو زور سے کندھے پر دھپ ماری "او کے پاگل خانے! تو کن جھگڑوں میں پڑ گیا ہے۔ یہ سب کچھ بھول جا۔ بس سمجھ لے کہ یہ ساری میری ذمے داری ہے۔ بس اب تو فوراً چلنے کی تیاری کر...... بڑی مشکل سے ٹکٹوں کی تاریخ آگے کروائی ہے۔ کل صبح سات بجے ہمیں نکل جانا ہے حیدرآباد سے...... اور ہاں ایک اور اچھی خبر ہے تیرے لیے۔ وہ نیلا بادلو کا بچہ وہ بھی مل گیا ہے۔ میرے جنات نے بڑی مشکل سے کھوج لگایا ہے اس کا...... اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ لیکن بدبخت بڑی تیز چیز ہے۔ اسے یہاں لانا آسان نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ تم خود چلے جاؤ اور اسے لے آؤ یہاں" میں سمجھ گیا کہ سائیں عالی منصور کا تذکرہ کررہا ہے۔

میں نے کہا "جن جنات نے اسے ڈھونڈا ہے وہ اسے اٹھا کر یہاں بھی لاسکتے ہیں۔"

"ہاں لاسکتے ہیں۔" سائیں عالی نے کہا "لیکن جنات پھر جنات ہوتے ہیں۔ کوئی اس کی ٹانگ لے آئے گا کوئی بازو۔ بہتر ہے کہ تم خود جاؤ۔ اسے جاکر بتاؤ کہ ہم ایک یادگار سفر پر جارہے ہیں۔ اگر وہ

ہو گیا تو ساری عمر پچھتائے گا۔"

میں نے کہا "اچھا میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔ لیکن مجھے ایک بات بتاؤ۔"

"پوچھ شفیق محمد پوچھ۔ تجھے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔" سائیں نے فراخ دلی سے کہا۔

میں نے کہا "تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم نواب زادی شاہین کے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو اور تم نے اپنی اس چنڈال مریدنی (سروج) کو بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آگے کہو۔"

"آگے یہ کہنا ہے بلکہ درخواست کرنی ہے کہ اپنی یہ اطلاعات صرف اپنے تک رکھو۔ میرا مطلب ہے کہ بخشو کی ماں اور بخشو کو نواب زادی کی موت کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ وہ دونوں اور خاص طور سے بخشو، نواب زادی سے بہت انس رکھتا تھا۔ نواب زادی کی موت کا سن کر وہ بہت واویلا مچائے گا۔ دوسری طرف ماسی عائشاں کی حالت بھی ایسی نہیں کہ اسے سخت صدمے والی خبر سنائی جائے۔"

خلاف توقع سائیں عالی نے میری درخواست پر کوئی اوٹ پٹانگ تبصرہ نہیں کیا اور میری بات مان لی۔ میں نے کہا "ایک بات اور ہے اگر تم برا نہ مانو تو۔"

سائیں بولا "تم نے ایک بات کا پوچھا تھا۔ بہرحال کہو۔ تمہیں انکار تو نہیں کر سکتا نا۔"

میں نے کہا "جیسے کہ تم اور بھی بہت سی باتیں جانتے ہو یقیناً تمہیں یہ بھی پتا ہو گا کہ میں نے مسٹر جی کلارک صاحب کو نواب زادی شاہین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

وہ بولا "مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں، بہرحال تم اپنی بات پوری کرو۔"

میں نے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ تم مسٹر جی کلارک اور مجنبی کنور کو میرے اور نواب زادی کے بارے میں بتا چکے ہو اور میں ان کی نظروں میں ناقابل اعتبار ٹھہر چکا ہوں۔"

"اور اب اسی لیے تم مدراس جانے سے کنی کترا رہے ہو؟" سائیں عالی نے جیسے میرے دل میں جھانک لیا تھا۔

"اگر سچ پوچھو تو ایسا ہی ہے۔" میں نے رواں لہجے میں کہا۔

سائیں بولا "اگر یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو میں اس کی...... " اس سے آگے ایک مشان دار گالی تھی "لیکن تم سے کیا کہوں...... کیا میں تمہیں کوتے کا چز نظر آتا ہوں جو ایسی باتیں سوچتے ہو میرے بارے میں۔"

میں نے سائیں کے لہجے سے کوئی اثر نہیں لیا اور اطمینان سے کہا "سائیں عالی! اچھی بات ہے کہ تم ایک عجیب و غریب شخص ہو۔ میں تمہارے بارے میں کوئی بات بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ تم نے نواب زادی والے معاملے میں میری پردہ پوشی کی ہو گی۔"

وہ دانت پیس کر بولا "میں نے کی ہے پردہ پوشی۔ کی ہے...... کی ہے...... اور یہ تو ایک معمولی بات ہے بدبخت...... تو نے ابھی سائیں کا کلیجا نہیں دیکھا۔ تجھے پتا ہی نہیں اس میں کیا کچھ سما تا ہے۔ جا میرے منہ نہ لگ۔ ابھی بچہ ہے تو۔ جا میں نے تجھے معاف کیا۔ میرا اللہ بھی تجھے معاف کرے۔"

میں اطمینان سے سگریٹ سلگاتا رہا۔ لیکن اس اطمینان میں ہوشیاری بھی شامل تھی۔ میں سائیں عالی کی طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔ اس گھن چکر کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ کیا پتا غصے سے بے قابو ہو کر اچانک میرے سر پر لنڈا ہی دے مارتا۔ سائیں عالی کچھ دیر شدید غصے کی کیفیت میں رہا پھر حیرت انگیز طور پر ایک دم نارمل ہو گیا۔ اس کے موڈ کو بحال دیکھ کر میں نے کہا "سائیں! تم میری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم نے نواب زادی والی بات اپنی مریدنی سروج کو بھی بتا دی ہے اور یہ وہی مریدنی ہے جو اپنی غلطیوں کی وجہ سے گاہے گاہے تمہارے ہاتھوں پٹتی بھی رہتی ہے۔ اگر غلطی سے یا نافرمانی کرتے ہوئے اس نے یہ بات 'آؤٹ' کر دی تو پھر؟"

سائیں عالی بولا "تم میرے ذاتی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرو۔ جب میں تمہیں ضمانت دے رہا ہوں کہ نواب زادی والی بات کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو پھر تمہیں اس سے کیا؟ میں اپنے ایک مرید کو بتاؤں یا ایک سو مریدوں کو بتاؤں۔ یا پانچ سو مریدنیوں کو۔"

اسی دوران میں سروج اندر داخل ہو گئی۔ وہ سائیں عالی کا پسندیدہ مشروب یعنی برف والی چائے لے کر آئی تھی۔ اس کی آمد پر میں اور سائیں عالی دونوں خاموش ہو گئے۔

O☆O

صفدر واقعی اسٹیشن کے قریب ایک غیر معروف ہوٹل میں موجود تھا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ سائیں عالی اس کا کھوج لگا چکا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ اسی مکان میں لے گیا جہاں سائیں عالی اور سروج کے علاوہ بخشو اور ماسی عائشاں بھی موجود تھی۔ نواب زادی شاہین کی موت کو اب پانچ چھ دن ہو چکے تھے لیکن اس الم ناک واقعے کی سوگواری ابھی تک مجھ پر اور صفدر پر طاری تھی۔ ہم دونوں رات گئے تک بند کمرے میں بیٹھے رہے اور شاہین کی باتیں کرتے رہے۔ صفدر نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ فی الحال بخشو اور ماسی عائشاں کو شاہین کی موت کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ صفدر کے پاس پانچ روز پہلے کا وہ منحوس اخبار بھی موجود تھا جس میں نواب زادی کی موت کی خبر شہ سرخی میں چھپی

تھی۔ لکھا تھا "نواب شہریار کی بہو اور نواب شہریار کے بعد نواب کی اکلوتی بیٹی کو بھی قتل کر دیا گیا۔"

سرخی کے نیچے تفصیل کچھ اس طرح تھی "کل صبح نواب شہریار مرحوم کے بیٹے نواب فیروز جنگ کو ایک گمنام فون کال کے ذریعے بتایا گیا کہ ان کی بہن نواب زادی شاہین کی لاش حیدر آباد کے مریم میموریل اسپتال میں پڑی ہے۔ اس سنسنی خیز فون کال کے بعد مقامی پولیس حرکت میں آ گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس فون کال کی تصدیق ہو گئی۔ اسپتال کے ذرائع سے معلوم ہوا کہ تین روز پہلے دو نوجوان نواب زادی کو شدید زخمی حالت میں اسپتال لائے تھے۔ ان لوگوں نے نواب زادی کے علاوہ اپنے نام بھی فرضی لکھوائے۔ دو گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد جب کل صبح نواب زادی نے دم توڑ دیا تو دونوں نوجوان اسپتال سے غائب ہو گئے۔ نواب فیملی کے افراد اس واقعے پر سکتے کی حالت میں رہ گئے ہیں۔ ان کی معلومات کے مطابق نواب زادی شاہین اس وقت انگلینڈ میں تھیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کب حیدر آباد آئیں اور کب اس الم ناک سانحے سے دوچار ہو گئیں......"

اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ لیکن میں نے آزردہ ہو کر اخبار تہ کیا اور ایک طرف رکھ دیا۔

صفدر نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ میری طرح وہ بھی عیسیٰ جان کی تلاش میں پاگلوں کی طرح حیدر آباد کی سڑکوں پر پھرتا رہا ہے۔ اس نے مجھے وہ چھالے دکھائے جو عیسیٰ جان کی تلاش میں مسلسل گھومنے سے اس کے پاؤں میں آ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ایسے ہی چھالے اس کے دل میں بھی پڑے ہیں۔ اگر میرا دل خونچکاں تھا تو اس کا کیوں نہ ہوتا۔ آخر یار تھا وہ میرا۔ اس رات صفدر اور میں دیر تک جاگتے رہے۔ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے اور ان حالات کے بارے میں سوچتے رہے جو مستقبل قریب میں پیش آنے والے تھے۔

O☆O

اگلی صبح ہم حیدر آباد سے مدراس روانہ ہو گئے۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب مستقبل قریب میں میرا حیدر آباد آنا نہیں ہو گا۔ بالفاظ دیگر میں غیر معینہ مدت کے لیے حیدر آباد کو الوداع کہہ رہا تھا۔ ایئرپورٹ کا چکر لگا کر بوئنگ فضا میں بلند ہوا تو حیدر آباد ایک تصویر کی طرح میری نگاہوں کے سامنے بچھ گیا۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی انسانوں کی عظیم الشان آبادی۔ میں نے سوچا، رنگ و بو کے اس سمندر میں کہیں کہیں شہر خموشاں بھی آباد ہوں گے۔ وہ بستیاں جنہیں قبرستان کہا جاتا ہے اور ایسے ہی کسی قبرستان میں وہ لڑکی منوں مٹی اوڑھے سو رہی ہو گی جس نے مجھے ٹوٹ کر چاہا تھا اور میرے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہوئی تھی اس کی کہانی۔

حیدر آباد سے مدراس تک کے سفر میں میرے ساتھ صفدر، سائیں عالی اور سروج کے علاوہ دو اور افراد بھی شامل تھے۔ یہ سائیں عالی کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مدراس تک کا سفر خیر و خوبی طے ہوا۔ ہم ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مدراس ساحلی شہر ہے اور انڈیا کے ساحلی شہروں کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ حبس بہت زیادہ تھا۔ سانولے سلونے چہروں پر پسینے کے دریا بہہ رہے تھے۔ ایئرپورٹ پر ایک شان دار بیگوار کار ہمیں ریسیو کرنے کے لیے موجود تھی۔ کار میں جی کلارک صاحب کے سیکرٹری ایوز کو دیکھ کر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کلارک صاحب مدراس میں بہ نفس نفیس موجود ہیں اور سائیں عالی ہمیں انہی کے پاس لے کر آیا ہے۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میں اور صفدر ایک عالی شان ہوٹل کے لگژری سوئٹ میں جی کلارک صاحب کے روبرو بیٹھے تھے۔ سائیں عالی ساتھ والے کمرے میں تھا اور سروج سے اپنے سر کی مالش کروا رہا تھا۔ کلارک صاحب مجھ سے اب تک کی روداد سننے کے لیے بے چین نظر آتے تھے۔ میں نے ان کی بے چینی دور کرنے میں زیادہ تاخیر نہیں کی اور شروع سے آخر تک ساری کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ یہ کہانی بڑی سچائی سے بیان کی گئی تھی۔ اس میں صرف ایک ہی جھوٹ تھا اور وہ یہ کہ نواب زادی شاہین کا تذکرہ اس میں موجود نہیں تھا۔ کلارک صاحب پوری توجہ سے سنتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کیسے میں نے جعلی پیر حضرت گرو سے ملاقات کی اور کیسے اس کی محفل میں ایک ایسی عورت کو دیکھا جو اپنے گم شدہ بیٹے کے لیے تعویذ کروانے آئی تھی۔ پھر جب یہ عورت مشکوک ٹھہری تو کیسے میں اس کی وساطت سے قاتل بخشو تک پہنچا۔ حضرت گرو کے کارندوں کے ہاتھوں بخشو کے زخمی ہونے اور بخشو کے گھر پر پولیس کے فوری چھاپے کے واقعات بھی میں نے تفصیل سے بیان کیے۔

مجھے بخشو کی وکالت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ کام سائیں عالی بڑے اچھے طریقے سے انجام دے چکا تھا۔ مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور کو اس نے قائل کر رکھا تھا کہ بخشو بے قصور ہے اور "خدا بخش" سمیت اس نے تینوں قتل حفاظت خود اختیاری میں کیے ہیں۔ مجتبیٰ کنور کو اپنے خاص کارندے (خدا بخش) کے قتل کا دکھ ضرور تھا لیکن پورے حالات جاننے کے بعد وہ بھی بخشو کو معاف کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ مجتبیٰ کنور ان دنوں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اس نے خصوصی خط کے ذریعے کلارک صاحب کو آگاہ کیا تھا کہ وہ پورے حالات جان چکا ہے۔ چوں کہ خدا بخش کا قاتل ذہنی طور پر معذور شخص ہے لہٰذا وہ اسے معاف کر رہا ہے اور مقتول کے وارث بھی اسے معاف کر رہے ہیں۔

میری پوری بات سننے کے بعد بھی مسٹر جی کلارک کی پیشانی پر

الجھن کی ایک سلوٹ باقی رہی۔ مجھے معلوم تھا یہ "سلوٹ" باقی رہے گی۔ میں اس سلوٹ کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ لہٰذا میں یہ بھی جانتا تھا کہ کلارک صاحب اب مجھ سے کیا سوال پوچھیں گے۔ میری توقع کے عین مطابق وہ بولے "مسٹر شاہ جہاں! اس ساری روداد میں ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اور یہی وہ بات ہے جو ان تمام واقعات کی بنیاد ہے۔ میرے خیال میں تم میرا نقطۂ نظر سمجھ رہے ہو۔ آخر وہ کیا کھوج تھا جس کے پیچھے مقتول خدا بخش جگر گاں پہنچا تھا اور نتیجے میں بخشو کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سوال مجھے بھی ہر وقت پریشان کرتا رہا ہے۔ جناب۔ کوشش کے باوجود میں کوئی جواب نہیں ڈھونڈ سکا۔"

مسٹر جی کلارک نے کہا "تم نے بتایا ہے کہ بخشو اور اس کی ماں کے ساتھ ایک لڑکی بھی رہائش پذیر تھی اور باغ کی رکھوالی کرتی تھی۔ اخباری خبروں میں بھی ایک خوبرو لڑکی کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لڑکی سے کوئی "پوچھ گچھ" کی تم نے؟"

"اس کا موقع ہی نہیں مل سکا۔" میں نے گھما گھما کر جواب دیا "جب ہم بخشو اور اس لڑکی کو پولیس والوں کے قبضے سے چھین کر حیدرآباد آ رہے تھے' وہ سارے راستے میں گم صم بیٹھی رہی تھی۔ شہر کے ایک معروف چوراہے میں وہ چلتی کار سے اتر گئی اور اتنی تیزی سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوئی کہ ہم دیکھتے رہ گئے۔ چویشن ایسی تھی کہ ہم اس کا پیچھا بھی نہیں کر سکتے تھے۔"

معلوم نہیں میرے جواب سے کلارک صاحب کی مکمل تسلی ہوئی یا نہیں لیکن ان کی کشادہ پیشانی پر نظر آنے والی سلوٹ ضرور غائب ہو گئی۔

ہم کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان باتوں میں نواب زادی شاہین کے پُراسرار قتل کا تذکرہ بھی آیا۔ جی کلارک صاحب کو یقین تھا کہ نواب زادی شاہین کا قتل بھی "دفینے" ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے کہا "جو لوگ اور گروہ اس دفینے کی تلاش میں ہیں' وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نواب زادی شاہین اس کھیل کا ایک نہایت اہم مہرہ ہے۔ ان کے نزدیک دفینے کا ملنا یا نواب زادی کا ملنا ایک ہی بات تھی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ نواب زادی کسی ایسے ہی جرائم پیشہ گروہ کے ہاتھوں ہلاک ہوئی ہے۔"

بہ امر مجبوری میں نے کلارک صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں انہیں یہ کیسے بتاتا کہ وہ جس امکان کو نوے فیصد بتا رہے ہیں' وہ زیرو فیصد ہے۔ نواب زادی کو کسی دولت کے شکاری نے نہیں' حُسن کے شکاری نے قتل کیا ہے اور قاتل کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کتنے "تھوڑے" فائدے کے لیے کتنی "اہم" جان لے رہا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی دروازے پر "ناک" ہوئی اور سیکریٹری ڈیوڈ نے اندر آ کر بتایا کہ کوئی مسٹر داس ملنے کے لیے آئے ہیں۔ کلارک صاحب نے آنے والے کو فوراً اندر بلا لیا۔ یہ ایک تامل ہندو تھا۔ رنگ کالا' سفید دھوتی اور پگڑی کے ساتھ وہ بلیک اینڈ وائٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بہت سی انگوٹھیاں اور گلے میں بڑی موتیوں کی مالا تھی۔ کلارک صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہیں مسٹر شاہ جہاں اور ساتھ میں ان کے دوست مسٹر صفدر اور یہ ہیں مسٹر رام داس۔ شہر میں تین چار بڑے گفٹ شاپس اور نوادرات کی دکانیں ان کی ملکیت ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے کچھ بہت خاص قسم کے نمونے خریدے ہیں اور اسی سلسلے میں یہ یہاں موجود ہیں۔"

رام داس نے انکسار سے دانت نکالے۔ انڈین انگریزی میں بولا "یہ آپ کی عزت افزائی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھ رہے ہیں اور اپنے برابر بٹھا رہے ہیں۔ آپ جیسے عظیم کاروباری لوگوں کے بارے میں تو ہم صرف کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں یا تصویروں میں آپ کا دیدار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں' ایسا مت کہیں۔" کلارک صاحب بولے "آپ نے جو کام کیا ہے اس کی قدر و قیمت ہمارے نزدیک بہت زیادہ ہے۔"

رام داس نے ایک بار پھر انکسار سے دانت نکال دیے اور مسٹر جی کلارک کی طرف جھک کر بہت دھیمے لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ اس کا یہ انداز مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ ہی صفدر بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ کلارک صاحب نے چونک کر پوچھا "کہاں چلے؟"

میں نے کہا "آپ اطمینان سے بات کریں۔ میں ذرا سائیں عالی صاحب کو دیکھ کر آتا ہوں۔"

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے تو سائیں عالی کو محوِ خواب پایا۔ سروج کمرے میں موجود نہیں تھی۔ یہ ایک کشادہ اور ہوادار کمرا تھا۔ فرش پر دبیز قالین' کھڑکیوں پر قیمتی پردے۔ دنیا کی بہترین آسائشیں یہاں موجود تھیں اور ان آسائشوں کے درمیان میلا کچیلا بدبودار سائیں عالی بالکل اجنبی اور "آؤٹ آف فٹ" نظر آ رہا تھا۔

کمرے میں ایک جانب بہت سا سامان انبار کی صورت میں پڑا تھا۔ اس میں کچھ تو وہ سامان تھا جو سائیں عالی اور سروج حیدرآباد سے لائے تھے۔ باقی سامان میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ کینوس کے بڑے بڑے تھیلے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بند تھے اور کچھ کھلے پڑے تھے۔ کھلے تھیلوں کے اندر سے ان کا سامان بھی جھانک رہا تھا۔ اس سامان کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کوہ پیمائی یا ہائیکنگ میں استعمال ہونے والے لوازمات ہیں۔ ان میں آئس ایکس یعنی برف توڑنے کی مضبوط کلہاڑیاں تھیں' ایسی پولز یعنی برف پر چلنے میں استعمال ہونے والی نوکیلی چھڑیاں تھیں اور انتہائی گہرے رنگ کی سبز یعنی چمک سے محفوظ رکھنے والی عینکیں تھیں۔ اس کے علاوہ ہیلمٹس' ہیڈ ٹارچز' فولڈنگ خیمے' رسے اور پتا نہیں کیا کچھ ان تھیلوں میں بھرا ہوا تھا۔ یہ سارا سامان نیا اور نہایت قیمتی تھا۔ میں اور صفدر حیرت

سے ان چیزوں کا معائنہ کرنے لگے۔ اسی دوران میں کلارک صاحب کا سیکریٹری مسٹر ڈیوڈ بھی اندر آ گیا۔ میں نے انگریزی میں کہا "ڈیوڈ صاحب! یہ سب کیا ہے؟"

"آپ کے سفر کی تیاری۔" مسٹر ڈیوڈ نے مسکرا کر کہا۔

"کیسا سفر؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مگر باس نے آپ کو نہیں بتایا؟ تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی آپ کو تجسس میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تاہم پریشانی کی بات نہیں' یہ تجسس زیادہ طول نہیں کھینچے گا۔ آپ لوگوں کے سفری کاغذات تیاری کے مراحل میں ہیں۔ کل تک یہ کاغذات مکمل ہو جائیں گے اور کل ہی کسی وقت ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"سفری کاغذات!" صفدر نے چونکانے والے انداز میں کہا "اس کا مطلب ہے کہ ہم ملک سے باہر جا رہے ہیں۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" ڈیوڈ مسکرایا۔

"لیکن کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے زیادہ بتانے کی اجازت نہیں ہے مجھے۔" ڈیوڈ بولا۔

اسی دوران میں سروج بھی کمرے میں وارد ہو گئی۔ دراصل وہ باتھ روم میں اشنان کر رہی تھی۔ اس کا لباس حسبِ معمول قابلِ دید اور ناقابلِ ذکر تھا۔ پیاز کے چھلکے جیسا کھلا لبادہ نظر کا دھوکا ہی محسوس ہوتا تھا۔ بالوں سے پانی کے قطرے تواتر سے گر رہے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اکسانے والی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اردو میں کہا "سروج یہ کیا سلسلہ ہے۔ سیکریٹری صاحب کہہ رہے ہیں کہ کل ہم کہیں روانہ ہو رہے ہیں۔ کہاں جانا ہے ہمیں؟"

"مجھے کیا معلوم؟" وہ ادا سے بولی۔

"تم نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" وہ نشیلے انداز میں بولی "میرے لیے اتنی جانکاری ہی کافی ہے کہ تم بھی ساتھ جا رہے ہو اور اگر تم ساتھ ہو تو پھر میں ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہوں۔" باتیں کرتے کرتے اس نے سامان میں سے ایک سلیپنگ بیگ اٹھا لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولی "سنا ہے پہاڑوں پر بہت سردی ہوتی ہے اور بعض دفعہ ایک ایک "بیگ" میں دو دو افراد گھس کر سوتے ہیں۔ اف کتنا مزہ آتا ہو گا۔" صفدر نے چھت کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ مجھے بے ساختہ زرینہ گل یاد آ گیا۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو یقیناً کوئی بہت "کرارا" سا جواب دے کر سروج کی بولتی بند کر دیتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ سروج کی اس جارحیت کے نتیجے میں زبردست قسم کی جنگ شروع ہو جاتی جس میں الفاظ کے ہزار ہزار پاؤنڈ وزنی گولے پھینکے جاتے۔ پھر اس جنگ کے نتیجے میں سائیں عالی بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور سامراجی قوت کا کردار ادا کرنے لگتا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا کیوں کہ زرینہ گل وہاں نہیں تھا۔

سیکریٹری ڈیوڈ کی اطلاع کے عین مطابق اگلے روز شام کو مسٹر جی کلارک نے مجھے بتایا کہ ہمارے کاغذات مکمل ہو گئے ہیں۔ مجھے اور صفدر کو انڈین پاسپورٹس پر سفر کرنا تھا۔ صفدر کا نام نذیر احمد انصاری اور میرا کمال پاشا تھا۔ سروج اور سائیں عالی بھی ہمارے ساتھ جا رہے تھے اور مسٹر جی کلارک کو تو جانا ہی تھا۔ لیکن یہ بات ابھی تک میرے لیے راز تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے جی کلارک صاحب سے پوچھا تو وہ بولے "میں دراصل تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں۔"

میں واقعی حیران رہ گیا۔ کلارک صاحب بولے "اب یہ مت پوچھنا کہ پاکستان میں کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ کچھ باتیں میں آپ لوگوں کو راستے میں بتاؤں گا اور کچھ وقت کے ساتھ خود بخود کھلتی جائیں گی۔ امید ہے کہ یہ ایک دلچسپ سفر ثابت ہو گا اور تم جیسا "خطرہ پسند" شخص اس سے لطف اٹھائے گا۔"

میں نے مؤدب انداز میں کہا "ٹھیک ہے جناب ..... جو آپ نہیں بتانا چاہتے نہ بتائیں' لیکن امید کرتا ہوں کہ بخشو اور اس کی ماں کے مستقبل کے بارے میں میری الجھنیں ضرور دور کریں گے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' انڈین پولیس ہر جگہ ان کی بُو سونگھتی پھر رہی ہے۔ بخشو ان کے ہتھے چڑھ گیا تو پھانسی سے بچ نہیں سکے گا اور اگر اسے کچھ ہوا تو اس کی ماں بھی اس کے ساتھ ہی مرے گی۔"

"شاہ جہاں" کلارک صاحب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "شاید تمہیں یہ جان کر مسرت ہو کہ بخشو اور اس کی ماں اب سے تین چار گھنٹے پہلے سری لنکا پہنچ چکے ہیں۔" یہ خبر میرے لیے واقعی حیران کن اور مسرت انگیز تھی۔ یہ خبر کلارک صاحب مجھے اپنی زبان سے دے رہے تھے۔ لہٰذا اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ وہ شخص جو دو ڈھائی ماہ تک جگر گاں کا آسیب بنا ہوا تھا اور جس کے ہاتھوں تین جانیں بھی گئی تھیں بالآخر حالات کی بے رحم گردش سے نکل آیا تھا۔ اس رات ہم سب بہت جلد سو گئے۔ کیوں کہ صبح سویرے ہمیں ایک طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ پہلے ہمیں دہلی پہنچنا تھا۔ وہاں سے رابطہ پرواز کے ذریعے اسلام آباد کا رخ کرنا تھا۔ ابھی یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہم اسلام آباد ہی میں رکیں گے یا وہاں سے آگے روانہ ہوں گے۔ جس قسم کا سامان ہمارے ساتھ جا رہا تھا اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں اسلام آباد سے شمالی علاقہ جات کا رخ کرنا ہے اور کافی دور تک جانا ہے۔ بے شک مسٹر جی کلارک صاحب کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور انہوں نے ہمارے تمام سفری کاغذات بہترین طریقے سے تیار کروائے تھے۔ بہرحال یہ جعلی کاغذات تھے اور کسی بھی مرحلے میں ہمارے پکڑے جانے کا اندیشہ موجود تھا۔ رات کو سونے سے پہلے میں دیر تک اپنے کاغذات دیکھتا رہا اور کوائف وغیرہ یاد کرتا رہا۔ طرفہ تماشا تھا کہ میں اپنے ہی ملک میں غیر ملکی کی حیثیت سے داخل

ہو رہا تھا۔ میرے انڈین پاسپورٹ پر پاکستانی سفارت خانے کی مہر تھی۔ میں پاکستان میں صرف ایک ماہ رک سکتا تھا اور صرف اسلام آباد اور پنڈی میں قیام کر سکتا تھا۔ پاسپورٹ پر میری جو تصویر لگائی گئی تھی اس میں شکل کافی بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ ناک کچھ پھولی ہوئی تھی۔ گلے بھاری تھے اور بالوں کا رنگ سنہری مائل تھا۔ یہ تبدیلیاں اسی ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے کی گئی تھیں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ پاسپورٹ پر یہ تصویر لگوا کر مسٹر جی کلارک نے دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انڈین پولیس کے لیے میری شکل و صورت اجنبی نہیں تھی۔ میں اپنی اصل صورت میں بہت جلد ان کی نگاہوں میں آ سکتا تھا۔

میں نے ریڈی میڈ میک اپ میں استعمال ہونے والی کچھ چیزیں دن کے وقت ہی بازار سے منگوالی تھیں۔ رات کو میں سب سے آخر میں سویا اور سونے سے پہلے میں نے اپنے چہرے میں پاسپورٹ کی تصویر کے مطابق ضروری تبدیلیاں کر لیں۔

رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کا یہ آرام دہ سوئٹ خاموشی اور نیم تیرگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے اس کمرے کی طرف آہٹ محسوس ہوئی جہاں مسٹر جی کلارک صاحب قیام پذیر تھے۔ دبیز قالین پر ننگے پاؤں چلتا میں اس کمرے کی طرف بڑھا۔ مجھے دھیمی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں ایک آواز یقیناً جی کلارک صاحب کی تھی۔ میری چھٹی حس نے اعلان کیا کہ کمرے کے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر میری نگاہ دروازے کے ہینڈل پر پڑی۔ ہینڈل کی چمکیلی سطح پر ایک سرخ نشان موجود تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ خون کی سرخی تھی۔ میرے کانوں میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کمرے کے اندر جھانکنا ضروری ہو چکا تھا۔ میں باتھ روم میں داخل ہوا۔ باتھ روم کی کھڑکی سڑک کی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی سے نکل کر میں نے آٹھ نو انچ چوڑے چھجے پر پاؤں جمائے اور کھسکتا ہوا ساتھ والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ پچاس ساٹھ فٹ نیچے سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ رات کے اس درمیانی پہر میں یہ سڑک ہی نہیں پورا مدراس نیند کے جھونکے میں تھا۔ یہاں تک کہ میں خود بھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ابھی تک سویا پڑا ہوں اور حالت خواب میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ ترچھی کھڑکی تک پہنچ کر میں نے ایک مختصر درز ڈھونڈ لی اور اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی کمرا تھا جو مسٹر کلارک کے زیر استعمال تھا۔ اس کمرے کا منظر حیران کن تھا۔ میری نگاہیں نوادرات کے مقامی تاجر رام داس کے سیاہی مائل چہرے پر جم گئیں۔ وہ کمرے کے قالین پر مردہ پڑا تھا۔ اس کی کنپٹی اور سر پر کسی کند آلے کی گہری ضربات تھیں۔ سیاہی مائل خون اس کے زخموں سے رس رس کر پورے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ اس خون سے قالین کو بچانے کے لیے رام داس کے سر اور کندھوں کے نیچے پولی تھین کی ایک چھوٹی شیٹ رکھ دی گئی تھی۔ پھر بھی کہیں کہیں قالین پر سرخ نشان نظر آ رہے تھے۔ رام داس کی لاش کے قریب مسٹر جی کلارک پریشان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ سیکرٹری زیوڈ کے علاوہ دو افراد اور بھی تھے۔ ایک تو مسٹر کلارک کا ہم وطن تھا۔ دوسرا اسی ہوٹل کا ملازم تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ اسسٹنٹ منیجر تھا۔ کمرے میں جو گفتگو ہو رہی تھی وہ انگریزی میں تھی۔ اسسٹنٹ منیجر کہہ رہا تھا "آپ بے فکر ہو جائیں جناب ـــ میں نے جو ذمے داری لی ہے اسے پوری طرح نبھاؤں گا۔ آپ یہ سمجھیں کہ یہ لاش یہاں موجود ہی نہیں ہے۔"

"بات صرف لاش کی نہیں دوسرے سوالوں کی بھی ہے۔" مسٹر کلارک نے سپاٹ لہجے میں کہا "راہداری کے قالین پر جو داغ لگے ہیں ان کا کیا کرو گے۔ وہ سارا قالین تو وہاں سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔"

"یہ سارا انتظام بھی ہو جائے گا جناب" آپ یہ سب کچھ اپنے اس خادم پر چھوڑ دیں۔" اسسٹنٹ منیجر کے چہرے پر دنیا جہان کی خباثت اور عیاری خیمہ زن تھی۔

مسٹر کلارک نے اپنے سیکرٹری کو اشارہ کیا۔ سیکرٹری زیوڈ نے ایک چھوٹا سا نفیس بریف کیس اسسٹنٹ منیجر کو تھما دیا۔ یقیناً اس میں کوئی بہت بڑی رقم تھی۔ کیوں کہ بریف کیس کو چھوتے ہی اسسٹنٹ منیجر کی آنکھوں میں ہزار پاور کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ شاید مستقبل قریب کے خوش آئند خیالات نے اس کے ذہن پر یلغار کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دولت تھی اور دولت سے کیا کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ تصور سے زیادہ نشیلی شرابیں 'شرابوں سے زیادہ نشیلی عورتیں 'عورتوں سے زیادہ نرم و نازک گاڑیاں 'گاڑیوں سے زیادہ مہک کام زندگی۔ وہ ایک لاش پر کھڑا تھا اور اسے ٹھکانے لگانے کا سودا کر رہا تھا۔ زیوڈ پہلے کی طرح اس جگہ کھڑی تھی اور اپنی کسی کارکردگی پر مسٹر کلارک سے شاباش وصول کر رہی تھی۔ اس سے پہلے معلوم نہیں اس لگژری اپارٹمنٹ میں کون تھا اور اس نے کیا کیا تھا اور اس سے پہلے کیا ہوا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا ہو گا اس میں سب سے اہم کردار "دولت" کا ہی رہا ہو گا۔ کیوں کہ یہ دولت والوں کی دنیا تھی۔ یہ امرا کا ہوٹل تھا اور امرا کے "حریم" بسیروں میں رات گئے ایسے سودے ہوا ہی کرتے ہیں۔

میں جس خاموشی سے کھڑکی تک آیا تھا۔ اسی خاموشی سے واپس لوٹ گیا اور پھر آہستگی سے بستر پر جا لیٹا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ایک انتہائی سنسنی خیز منظر دیکھ کر بھی نیند میری آنکھوں سے پوری طرح بھاگی نہیں تھی۔ میں اسے بے حسی کے سوا اور کیا کہوں۔ کوئی عام شخص ہوتا تو شاید ہفتوں تک نہ سو سکتا لیکن میں تھوڑی ہی دیر بعد سارے سوال 'ساری الجھنیں ذہن سے جھٹک کر ایک بار پھر سو چکا تھا۔

علی الصباح اٹھا تو یوں لگا جیسے رات کو واقعی کوئی خواب دیکھا تھا۔ پورا واقعہ آہستہ آہستہ ذہن میں تازہ ہونے لگا۔ میں اٹھ کر مسٹر کلارک صاحب کے عالی شان بیڈ روم کی جانب آیا۔ کلارک صاحب باتھ روم میں تھے اور کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں

نے اندر جھانکا۔ رام داس کی لاش کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ قالین بھی بالکل صاف تھا۔ کہیں آلائش تک نہیں تھی۔ دروازے کا خون آلود ہینڈل اب صاف شفاف تھا۔ مجھے اپنی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا تو قدم خود بخود راہداری کی طرف اٹھ گئے۔ راہداری کے خوب صورت نیلگوں قالین میں دروازے کے پاس ہی تین چار بدنما سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا سوراخ قریباً نو انچ قطر کا اور سب سے چھوٹا میرے ہاتھ کے برابر تھا۔ ہوٹل کے دو باوردی ملازم قریب ہی موجود تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا۔ ان میں سے ایک تاسف سے بولا "کسی نے شرارت کی ہے جناب۔ قالین جلا دیا ہے۔"

"ارے! یہ تو بہت نقصان ہوا" میں نے ہونٹ سکیڑے۔

باوردی ملازم مؤدب سے بولا "کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے جناب۔ معزز مہمانوں کے ساتھ کچھ من چلے مہمان بھی تشریف لے آتے ہیں۔"

میں نے غور سے قالین کو دیکھا۔ اسے بڑی احتیاط سے جلایا گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ جن جگہوں پر اب سوراخ تھے وہاں رات 'خون کے دھبے تھے۔

صبح آٹھ بجے ناشتے کے فوراً بعد ہم ائرپورٹ روانہ ہو گئے۔ مدراس سے دہلی تک ایک طویل سفر ہے۔ ہم لمبائی کے رخ پر قریباً ہندوستانی انڈیا پر سے گزر کر دہلی پہنچے۔ دہلی سے اسلام آباد کی پرواز کچھ لیٹ تھی۔ ہم قریباً پانچ بجے دہلی سے محو پرواز ہوئے۔ جہاز وطن کی حدود میں داخل ہوا تو دل میں خوش گوار سی دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ اور ـــ جب پنڈی اور اسلام آباد کی جگمگاتی روشنیاں نظر آئیں تو آنکھوں میں ٹھنڈک سی اترنے لگی۔ کچھ یہی کیفیت صفدر کی بھی تھی۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد آج پھر ان در و دیوار کی جھلک دیکھ رہا تھا جو اس کے اپنے تھے۔ جہاں اس کے والدین 'اس کے بہن بھائی رہتے تھے۔ جہاں اس کی انجم رہتی تھی۔ وہ انجم جو عروسی جوڑا پہنے اوڑھے ایک مدت سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم دہلی کی طرح اسلام آباد کے ائرپورٹ سے بھی بخیر و عافیت گزر گئے۔ میریٹ ہوٹل میں ہمارے کمرے پہلے سے ریزرو تھے۔ اپنے کمروں میں پہنچ کر ہم نے سکون کا سانس لیا۔

○☆○

اگلے تین چار روز ہم نے اسی ہوٹل میں گزارے۔ کلارک صاحب کی ہدایت پر میں نے اور صفدر نے اپنے انڈین پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات ضائع کر دیے تھے۔ اب ہم اپنے اصل روپ میں تھے۔ میریٹ ہوٹل میں ہمارا کمرا بھی اصلی ناموں سے بک کیا گیا تھا۔ یعنی میرا نام شاہ جہاں اور صفدر کا صفدر۔ تاہم میرے چہرے پر ریڈی میڈ میک اپ ابھی برقرار تھا...... میں نے مسٹر جی کلارک سے اجازت لے کر صفدر کو لاہور بھیج دیا تھا۔ راستے میں اسے گجرات ٹھہر کر اپنے اہل خانہ سے ملنا تھا پھر انجم سے ملنے لاہور چلے جانا تھا۔ میں نے ٹیلی فون پر سائیں صاحب کو اپنی آمد سے آگاہ کر دیا تھا اور انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ صفدر ان کی طرف آ رہا ہے۔ صفدر کی آمد کا سن کر وہ بھی بہت خوش ہوئے تھے۔ میں نے سائیں صاحب سے شفقت اور انجم کا حال احوال پوچھا تھا اور انہوں نے ان کی مکمل خیریت کی اطلاع دی تھی۔ میں ان سے غزالہ کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں کوشش کے باوجود غزالہ کا نام میری زبان پر نہیں آ سکا تھا۔ بہرطور میں نے صفدر سے کہہ دیا تھا کہ وہ غزالہ کی خیر خیریت بھی دریافت کر کے آئے۔

سائیں عالی کا کمرا میرے کمرے کے ساتھ تھا۔ وہ الوصفت ساری رات جاگتا تھا' اور پھر دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔ رات گئے اس کے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگتی تھیں۔ کبھی نعرے بلند ہوتے 'کبھی "یا ہو" کی لمبی لمبی صدائیں ابھرتیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ سائیں عالی کسی سے لڑ جھگڑ رہا ہے۔ سورج کا کہنا تھا کہ سائیں صاحب رات گئے جنوں سے مذاکرات کرتے ہیں لیکن میرے لیے اس بات پر یقین کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک رات سائیں کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ کئی گھنٹے گھنگرو پہن کر ناچتا رہا اور اپنے ساتھ سورج کو بھی نچاتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں شہتوت کی چھڑی تھی۔ جب سورج ناچتے ناچتے بے دم ہو جاتی اور اس کے پاؤں سست پڑنے تو وہ اس کے جسم کے عریاں حصوں پر چھڑی سے زوردار ضربیں لگاتا اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل جاتیں۔ یہ مار پیٹ سورج کے ساتھ ہی نہیں تھی۔ وہ اس سلسلے میں خود کو بھی معاف نہیں کر رہا تھا۔ جب اس کے رقص میں سستی آ جاتی تو وہ خود کو بھی مارنے لگتا۔ انتظامیہ اس ہنگامے پر بوکھلائی بوکھلائی پھرتی رہتی۔ مسٹر جی کلارک نے بڑی مشکل سے منیجر کو راضی کیا کہ وہ سائیں صاحب کے رقص میں دخل اندازی نہ کرے۔

مسٹر جی کلارک اپنا زیادہ تر وقت کمرے میں گزار رہے تھے۔ تین چار مرتبہ انہوں نے اپنے کمرے میں طویل میٹنگز بھی کیں۔ ان میٹنگز میں شامل ہونے والے افراد میرے لیے اجنبی ہی تھے۔ صرف ایک مرتبہ میں ایک میٹنگ کے شرکا میں سے دو افراد کو پہچان سکا۔ یہ حضرات منسٹری آف ٹورازم کے افسران تھے۔

کلارک صاحب کا لائحہ عمل ابھی تک واضح نہیں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ رہ رہ کر وہ واقعہ بھی میری نظر میں گھوم جاتا تھا جو میں نے مدراس سے روانگی کی رات دیکھا تھا۔ بادی النظر میں تو یہی لگتا تھا کہ وہ قتل مسٹر جی کلارک نے کروایا تھا۔ نوادرات کے تاجر رام داس کی لاش میرے تصور میں پہلے روز کی طرح تازہ تھی۔ ایک رات میں اپنے خیالوں میں گم صم بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا 'سامنے جی کلارک صاحب کھڑے تھے۔ حسب معمول وہ دنیا کے مہنگے ترین سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھے اور مہنگا ترین سگار پی رہے تھے۔ ان کے سرخ و سپید ہاتھوں میں لاکھوں ڈالر کی جڑاؤ انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

وہ بولے "میں معذرت چاہتا ہوں کہ مصروفیت کے سبب دو تین روز تم سے مل نہ سکا۔"

"کوئی بات نہیں جناب" مجھے اس کے سوا اور کوئی لفظ نہیں سوجھا۔

"تمہارا دوست لاہور سے کب لوٹ رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کل دوپہر تک آ جائے گا۔"

"اسے فون کردو کہ کل ہر صورت پہنچ جائے۔ پرسوں ہم گلگت کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔"

"گلگت؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ شاید ہم ایک دو روز پہلے ہی روانہ ہو جاتے لیکن پروازیں ہی "آپریٹ" نہیں ہو رہی ہیں۔ ہر بار یہی رپورٹ ملتی تھی کہ موسم خراب ہے۔ شکر ہے کہ آج سے پرواز کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ پرسوں ہماری باری آ جائے گی۔"

گلگت کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں برف پوش چوٹیوں اور وسیع برف زاروں کے مناظر گھوم گئے تھے۔ میں نے پوچھا "گلگت میں کوئی خاص کام ہے جناب؟"

وہ مسکرائے "میں جانتا ہوں، تمہارے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے ہیں۔ میں ان ہی سوالوں کے جواب دینے یہاں آیا ہوں۔ دراصل شاہ جہاں! کوئی پانچ ہفتے پہلے ہمیں دفینے کے بارے میں ایک اور اہم سراغ ملا ہے۔ اسی سراغ کے بعد میں حیدرآباد سے مدراس پہنچا تھا۔ میں تمہیں بھی اپنے ساتھ مدراس لانا چاہتا تھا لیکن تم چوں کہ جگر گاں والے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اور "رابطے" میں بھی نہیں تھے لہٰذا میں اکیلا ہی چلا آیا۔ سائیں صاحب نے بھی یہی رائے دی کہ میں چلا جاؤں۔ وہ بعد میں تمہیں ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔"

"میں اس سراغ کی نوعیت جان سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولے "جیسا کہ تم جانتے ہو ہم کئی خطوط پر کام کر رہے تھے۔ ہماری تلاش کا ایک راستہ تو نواب زادی کی طرف جاتا تھا اور ہم زیادہ توجہ بھی اسی راستے پر دے رہے تھے۔ مگر اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے بڑے راستے تھے۔ ان میں ایک راستہ یہ تھا کہ نوادرات کی بڑی بڑی شاپس اور اسٹورز پر نگاہ رکھی جائے۔ ہم نے آندھرا پردیش اور اڑیسہ میں موجود ایسے تمام اسٹورز کی لسٹ تیار کروائی اور پھر ان اسٹورز کے مالکان سے فرداً فرداً رابطہ قائم کیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن ہمیں کرنا تھا لہٰذا کر گزرے۔ اس سلسلے میں حسب ضرورت پولیس سے بھی مدد لی گئی۔ ان اسٹورز کے مالکان کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ جس میں میگا سی کا ذخیرہ بھی شامل ہے لاپتا ہے۔ بیشتر اسٹورز کے مالکان کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ مطلب یہ کہ اگر انہیں مسروقہ سازوسامان اور نوادرات کے بارے میں کوئی اطلاع ملے تو وہ ہمیں مطلع کریں۔ اس سلسلے میں اسٹورز کے مالکان کو گراں قدر انعامات کی پیشکش بھی کی گئی۔ دفینے میں موجود نوادرات کے متعلق اخبارات میں اتنا کچھ چھپ چکا ہے کہ نوادرات کے زیادہ تر اشیا کو دیکھ کر ہی پہچان سکتے ہیں۔ یہاں مدراس میں سیٹھ رام داس کے ایک گفٹ سینٹر پر بھی یہی کچھ ہوا۔ یہ قریباً پانچ ہفتے پہلے کی بات ہے۔ ایک فلپائنی سیاح جو کوہ پیما بھی تھا۔ اس گفٹ سینٹر میں داخل ہوا۔ اس نے سیٹھ رام داس سے اس کے عالی شان دفتر میں ملاقات کی اور اس کے آگے گندھارا آرٹ کے کچھ نادر نمونے فروخت کرنا چاہے۔ سیٹھ رام داس ایک تجربہ کار اور گھاگ شخص تھا۔ اسے شک گزرا کہ ان نمونوں کا تعلق اسی دفینے سے ہے جس کے بارے میں اخبارات روزانہ خبریں چھاپ رہے ہیں۔ سیٹھ رام داس نے نوجوان سیاح کو تو باتوں میں لگایا اور اپنے اسسٹنٹ کے ذریعے اس فون نمبر پر رنگ کروایا جو ہم نے تمام اسٹورز کے مالکان کو فراہم کیا تھا۔ یہ فون ہمارے ایک کارندے نے مدراس میں ہی وصول کیا اور پھر ہمیں حیدرآباد میں اطلاع پہنچا دی۔ لیکن یہاں بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہم میں سے کوئی بھی ذمے دار شخص حیدرآباد میں موجود نہیں تھا۔ مجتبیٰ کنور پاکستان گیا ہوا تھا۔ میرا سیکرٹری ڈیوڈ بھوپال گیا ہوا تھا۔ یہ اطلاع مجھے دو روز کی تاخیر سے ملی۔ حیدرآباد سے مدراس پہنچتے پہنچتے مجھے دو روز مزید لگ گئے۔ سیٹھ رام داس نے بڑی حاضر دماغی اور فراست کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے جون چاڈل نامی اس سیاح کا پتا ٹھکانا معلوم کر لیا تھا جس نے اسے گندھارا آرٹ کے نمونے بیچنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک مقامی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چھ افراد اور بھی تھے۔ دراصل یہ ایک کوہ پیما ٹیم تھی جو فلپائن سے پاکستان جاتے ہوئے چند روز کے لیے مدراس میں رکی تھی۔ اس ٹیم کو دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی نانگا پربت سر کرنا تھی۔ رام داس نے بڑی ہوشیاری اور تیزی سے جون چاڈل کے ساتھ تعلقات گانٹھ لیے۔ وہ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گندھارا آرٹ کے نمونے اسے کہاں سے ملے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے چینی سے ہماری آمد کا منتظر بھی تھا۔ ایک رات رام داس، چاڈل کو مقامی رسم و رواج دکھانے کی آڑ میں ایک کوٹھے میں لے گیا۔ وہاں چاڈل نے وہسکی پی، رقص دیکھا اور ایک نوخیز طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں اور نشے کی حالت میں اول فول بولتا رہا۔ اسی حالت میں اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ چند روز پہلے وہ میگا سی کے نوادرات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے اور ان میں سے چند ایک نوادرات اس کے پاس بھی موجود ہیں۔ اس انکشاف کے بعد رام داس کے لیے جون چاڈل اور بھی اہم ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اگلے روز اسے یہ معلوم ہوا کہ جون چاڈل اپنی ٹیم کے ساتھ پاکستان روانہ ہو رہا ہے تو وہ بہت سٹپٹایا۔ لیکن وہ اسے زبردستی نہیں روک سکتا تھا۔ جب میں اپنے دو ملازمین کے ساتھ مدراس پہنچا تو جون چاڈل کو مدراس سے روانہ ہوئے بارہ چودہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگلے روز میں نے پاکستان میں مجتبیٰ کنور سے رابطہ کیا اور

اسے کہا کہ وہ اسلام آباد پہنچے اور فلپائن کی کوہ پیما ٹیم کو نرغے میں لے۔ مجتبیٰ کنور اپنے کسی سیاسی چکر میں الجھا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی سستی دکھا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت میں آتا، فلپائنی ٹیم اسلام آباد میں دفتری کارروائی مکمل کروا کے گلگت روانہ ہو چکی تھی۔ خراب موسم کے سبب گلگت سے فضائی اور زمینی رابطہ عارضی طور پر منقطع تھا۔ لہٰذا مجتبیٰ کنور کے کارندوں کو گلگت پہنچتے پہنچتے پانچ روز لگ گئے۔ اب فلپائنی ٹیم کا تعاقب کرنا لاحاصل تھا۔ وہ اپنی مہم کے دشوار ترین مراحل میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے مجتبیٰ کنور کو ہدایت کی کہ اس کے کارندے گلگت میں موجود رہیں اور فلپائنی ٹیم کی نانگا پربت سے واپسی کا انتظار کریں۔"

گفتگو کے دوران میں توقف کر کے جی کلارک صاحب نے نیا سگار سلگانا شروع کیا۔ میں نے پوچھا "تو اس کا مطلب ہے کہ مجتبیٰ کنور صاحب اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ گلگت میں ہیں اور فلپائنی کوہ پیماؤں کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

کلارک صاحب بے دلی سے مسکرائے "ایسا ہوتا تو اچھی بات تھی۔ ہمیں اتنی افراتفری میں مدراس سے کوچ کر کے یہاں نہ آنا پڑتا..... لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔" میں سوالیہ نظروں سے کلارک صاحب کا سرخ و سپید چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سگار کا گہرا کش لیتے ہوئے بولے "فلپائنی ٹیم کے تین ارکان غائب ہیں..... اور ان میں چاڈل بھی ہے۔"

"کیا کوئی حادثہ ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حادثہ تو یقیناً ہوا ہے۔ لیکن ویسا نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ یہ ارکان کوہ پیمائی کے دوران میں ہلاک نہیں ہوئے۔ یہ لوگ تو ابھی اپنے بیس کیمپ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ سنا ہے کہ بیس کیمپ تک ابھی ایک دن کی مسافت باقی تھی کہ خراب راستے کے سبب پارٹی کو رکنا پڑا۔ غالباً کوئی پل وغیرہ ٹوٹا ہوا تھا۔ چاڈل اور اس کے دو ساتھی ارکان بتائے راستے پر "ٹریکنگ" کے لیے نکل گئے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ یہ لڑکی پارٹی لیڈر کی بیٹی ہے۔ ان لوگوں کو اگلے روز کیمپ میں واپس آ جانا تھا لیکن یہ نہیں لوٹے۔ اگلے روز ان کی تلاش شروع ہوئی..... اور یہ تلاش کسی نہ کسی طور اب تک جاری ہے۔"

یہ اطلاعات میرے لیے حیران کن تھیں اور دلچسپ بھی۔ کوہ پیماؤں کی گم شدگی کے حوالے سے کئی مفروضے قائم کیے جا سکتے تھے۔ یہ راستہ بھول سکتے تھے۔ کسی حادثے کا شکار ہو سکتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اپنی نوجوان ساتھی لڑکی کی وجہ سے وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گئے ہوں۔ مہم جو خواتین و حضرات کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہمارے لیے خصوصی اہمیت کا حامل بن گیا تھا۔ میں اور کلارک صاحب دیر تک اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ یہ بات کسی طور بھی دل کو نہیں لگتی تھی کہ کوہ پیماؤں کے غائب ہونے کا کوئی تعلق نوادرات والے معاملے سے ہو سکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص "رنگینی" کی خاطر جون چاڈل پر ہاتھ ڈالنا ہی ہوتا تو وہ مدراس میں ڈالتا۔ بہ ظاہر یہی نظر آتا تھا کہ کوہ پیماؤں کا لاپتا ہونا ایک الگ معاملہ ہے۔ گفتگو کے دوران میں میں نے عام سے لہجے میں پوچھا "سیٹھ رام داس اب کہاں ہے؟"

کلارک صاحب ایک دم خاموش سے ہو گئے۔ ان کی چوڑی پیشانی پر لکیریں ابھریں اور وہ پہلو بدل کر بولے "رام داس نے ہمارے لیے اچھا کام کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اسے خوش کروں۔ لیکن..... اس کی زندگی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔"

"کب؟" میں نے چہرے پر حیرت سجائی۔

"جس رات ہم مدراس چھوڑنے والے تھے۔ وعدے کے مطابق میں رام داس کو انعامی رقم دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ہوٹل بلایا تھا۔ لیکن کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ہوٹل کی راہداری میں رام داس ان سے الجھ گیا۔ انہوں نے اسے اغوا کرنا چاہا اور اسے بے ہوش کرنے کے لیے سر پر زور دار چوٹ لگائی۔ رام داس تیورا کر گر گیا۔ اس دوران میں ہوٹل کا ایک ملازم راہداری میں داخل ہوا اور اسے دیکھ کر حملہ آور بھاگ گئے۔ تم نے دیکھا ہی ہے، رام داس سوکھا سڑا آدمی تھا۔ کنپٹی پر لگنے والی ایک خوف ناک ضرب نے اس کی جان لے لی۔ رقم سے بھرا ہوا وہ بریف کیس جو میں نے رام داس کے لیے رکھا تھا۔ اس کی لاش اٹھوانے کے کام آیا۔ وہ رقم میں نے ہوٹل کے ایک افسر کو دے کر رام داس کا مردہ ٹھکانے لگوایا......"

کلارک صاحب کی اس گفتگو نے میرے دل سے بہت سے شکوک و شبہات صاف کر دیے اور ان کے رویے کے حوالے سے جو الجھن سی میرے ذہن میں تھی، دور ہو گئی۔ اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا، سامنے سندر کھڑا تھا۔ وہ میری توقع سے چودہ پندرہ گھنٹے پہلے ہی آ گیا تھا۔ "اسلام علیکم" اس نے توانائی بخش گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے بھی جوش و خروش سے اس کا ہاتھ دبایا۔

یکایک ایک سایہ سا سندر کے عقب میں متحرک ہوا اور کسی بلا کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اس کے دھکے سے گرتے گرتے بچا تھا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں میں ٹھیک سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے مجھے بانہوں میں جکڑ رکھا تھا اور باقاعدہ زمین سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا "ارے استاد صاحب! تم نے تو ہمارا زندگی حرام کر دیا۔" آواز سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ روز رین گل تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ زور محبت میں مجھے اٹھا لیتا اور چٹکیاں دینا شروع کر دیتا۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ کمرے میں مسٹر جی کلارک صاحب بھی موجود ہیں اور حیرت آمیز دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بہ مشکل خود کو روز رین گل کی گرفت سے آزاد کیا۔ وہ خوشی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ

وہ صفدر کے ساتھ ہی لاہور سے نازل ہو گیا ہے۔ اس نے روشنی میں ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا اور حیران رہ گیا۔ ریڈی میڈ میک اپ نے میرے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی تھی لیکن یہ تبدیلی ایسی نہیں تھی کہ زریں گل جیسا شکرا مجھے پہچان نہ سکتا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور چیخ کر بولا "اوئے استاد صاحب! یہ تم نے کیا کر لیا ہے اپنے چہرے کے..... خدا قسم تم اپنا ہی بڑا بھائی لگ رہا ہے۔ یعنی استاد بھی خود اور استاد کا بڑا بھائی بھی خود۔ لالے کی جان ایک سیکنڈ کے لیے تو ام بھی چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ فلم تھی نا "جیسے جانتے نہیں" اس میں محمد علی صاحب نے بھی ایسا ہی کام دکھایا تھا۔ اس فلم میں زیبا نے......"

میں نے اشارے سے زریں گل کو خاموش کرایا اور اسے بتایا کہ مسٹر کلارک صاحب بھی کمرے میں موجود ہیں۔ زریں گل نے گھوم کر کلارک صاحب کو دیکھا اور ایک دم چونک گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر اس کی بتیسی خود بہ خود نکل آئی۔ اس نے جھک کر دو تین بار کلارک صاحب کو سلام کیا اور پھر اردو میں ان کے بال بچوں کا حال چال پوچھنے لگا۔ اس صورتِ حال پر صفدر بھی پریشان تھا۔ وہ زریں گل کو بازو سے کھینچ کر باہر لے گیا۔

جی کلارک صاحب انگریزی میں بولے "یہ دلچسپ کردار ہے اور کارآمد بھی۔ پچھلی دفعہ پشاور میں اس نے ہماری کافی مدد کی تھی۔ وہاں سری لنکا میں بھی تو یہ تمہارے ساتھ ہی تھا نا؟"

"جی ہاں۔"

"سنا ہے کہ وہاں اسے کسی مقامی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا۔"

"جی ہاں' اس وقت تو ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ اب افاقہ ہو۔ بات ہو گی تو پتا چلے گا۔"

کلارک صاحب اٹھتے ہوئے بولے "چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ تمہارا دوست آج ہی پہنچ گیا ہے۔ بس کل شام تک تیاری کر لینا۔ صبح سویرے ہمیں نکل جانا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کا پروگرام یہ ہے کہ ہم علاقے میں گم شدہ کوہ پیماؤں کو تلاش کریں؟" کلارک صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "گستاخی معاف جناب...... کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ یہ کام پیشہ ور لوگوں سے کرایا جاتا؟"

وہ بولے "پیشہ ور لوگوں کی مدد بھی لی جائے گی۔ لیکن یہ کام اتنا اہم ہے کہ ہم لوگوں کا موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "لیکن...... سائیں عالی اور سروج وغیرہ کی موجودگی تو قطعی غیر ضروری محسوس ہو رہی ہے۔"

"سائیں صاحب اپنی مرضی سے آ رہے ہیں۔" مسٹر کلارک نے جواب دیا "اور تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ اپنی مرضی میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔"

"لیکن سائیں عالی کے دو چیلے بھی تو ہمارے ساتھ ہیں۔"

"نہیں وہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ انہیں ہمیں اسلام آباد تک آنا تھا۔"

تھوڑی دیر بعد مسٹر کلارک میرے کمرے سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی زریں گل طوفان کی طرح آ دھمکا۔ صفدر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے صفدر سے کہا "لاہور سے یہ تحفے لے آئے ہو۔" میرا اشارہ زریں گل کی طرف تھا۔

وہ بولا "جس جی' ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ شاید آپ کو پتہ نہ ہو یہ حضرت آج کل سائیں صاحب کی بلا معاوضہ ڈرائیوری کر رہے ہیں۔ میں سائیں صاحب سے ملنے گیا تھا۔ سائیں صاحب سے پہلے ان سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کا پتا چلا تو ایک دم کر بالی کہ مجھے بھی ساتھ لے کے چلو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

مندرجہ بالا گفتگو ہم نے انگریزی میں کی تھی۔ لیکن زریں گل کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ وہ تڑخ کر بولا "ارے خوچہ! ام سے چالاکی مت کرو۔ ام سب جانتا ہے جو تم کہہ رہا ہے۔ لیکن جو کہنا چاہ رہا ہے وہ آپ نہیں جانتا...... میرے پیارے استاد صاحب' آپ پر جان قربان لیکن ایک بات آپ کان کھول کر سن لیں۔ ام آپ کے ساتھ گلگت جائے گا اور گلگت سے آگے جہاں آپ جائے گا ام آپ کے ساتھ ہو گا۔ امارا تو یہ سوچ کر پیٹ پھٹ رہا ہے کہ اگر آپ امارے بغیر چلا جاتا تو کیا ہوتا۔ کتنا زیادہ نقصان ہوتا آپ کا۔"

"کیسا نقصان؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ام کتنا زیادہ جانتا ہے گلگت کے بارے میں۔ ام تو کیڑا ہے بلکہ بڑا کیڑا ہے اس علاقے کا۔ ان وادیوں کو ایسے ہی جانتا ہے جیسے آپ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو جانتا ہے۔ اب بتائیں آپ کا نقصان ہوتا ہے یا نہیں امارے بغیر۔"

"واقعی ہم تو بے موت مارے جاتے۔" صفدر نے آنکھیں گھمائیں۔

"مذاق مت کریں آپ" وہ چیخ کر بولا "جتنی مدد ام آپ کی کر سکتا ہے کوئی بڑے سے بڑا گائیڈ بھی نہیں کر سکتا...... شینا ہے آپ کو؟"

"شینا" میں نے حیرانی سے کہا "یہ تو کسی لڑکی کا نام لگتا ہے۔"

"یہ لڑکی کا نام نہیں ہے۔ یہ زبان ہے جو ادھر بلتستان۔ علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ام "شینا" ایسے ہی جانتا ہے جیسے آپ فرنگی کی زبان جانتا ہے اور صرف زبان کا بات ہی نہیں ام سب رسم و رواج اور سب اونچ نیچ جانتا ہے ادھر کے بارے میں۔"

"لیکن کیسے جانتے ہو؟"

"ام نے کافی عرصہ گزارا ہے گلگت اور بلتستان میں۔ ادھر امارا چاچا رہتا ہے۔ وہ ام سے بہت پیار کرتا تھا......"

پانچ دس منٹ زریں گل کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔ سارا زور بیان ہمیں یہ بات سمجھانے میں صرف ہو رہا تھا کہ اگر ہم اسے ساتھ لے جائیں گے تو بہت فائدے میں رہیں گے۔ اس کا

جادو ختم ہوا تو ہمیں واقعی یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم کوئی بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔ اگر خدا نخواستہ...... خدا نخواستہ ہم زریں گل کے بغیر گلگت چلے جاتے تو در در کی ٹھوکریں کھاتے۔ قدم قدم پر ذلیل ہوتے اور اگر زندہ واپس آتے تو باقی کی ساری عمر پچھتانے میں صرف کرتے۔

زریں کا جوش و خروش قدرے کم ہوا تو میں نے صفدر سے لاہور کے حالات پوچھے۔ وہ بڑا ترو تازہ و خرم لوٹا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ خوشی دیدار یار اور وصالِ یار کی دین ہے۔ صفدر نے مجھے لاہور کے حالات تفصیل سے بتائے۔ میں یہ تفصیل بیان کرنے لگوں تو کئی صفحے کالے ہو جائیں گے۔ مختصراً یہ کہ رجال سائیں صاحب نے ایک ہوٹل میں صفدر اور انجم کی ملاقات کرائی تھی اور اس تسلی بخش ملاقات کے بعد وہ انجم کو اسی نامعلوم ٹھکانے پر لے گئے تھے جہاں سے لائے تھے۔ شگفتہ بھی خیریت سے تھی۔ اس نے صفدر کے ہاتھ ایک خط بھی مجھے بھجوایا تھا۔ غزالہ کے بارے میں صفدر نے بتایا تھا کہ اس نے خود کو بے پناہ مصروف کر لیا ہے۔ صبح کے وقت وہ اسپتال جاتی ہے۔ شام کو ایک پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتی ہے اور رات گیارہ بجے وہاں سے فارغ ہوتی ہے۔ خاوند سے اس کے تعلقات بدستور منقطع تھے۔

وہ ساری رات ہم نے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔ علی الصباح زریں گل کی آنکھ لگ گئی۔ اسے سوتا دیکھ کر صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! اگر یہ اتنی ضد کر رہا ہے تو لے جائیں اسے۔" اس کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔

میں نے کہا "لے جانے میں حرج نہیں۔ لیکن تمہیں معلوم ہے وہ الو کی پٹھی سروج بھی ساتھ جا رہی ہے۔ زریں اور سروج میں اینٹ کتے کی دشمنی ہے۔ یہ دونوں ہمارا جینا حرام کیے رکھیں گے۔"

زریں گل غالباً پوری طرح سویا نہیں تھا۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور غرایا "تو یہ بات ہے۔ وہ حرام زادی بھی ساتھ جا رہی ہے۔ اب تو ام ضرور آپ کے ساتھ جائے گا۔ ام آپ کو اس چڑیل لفنگی کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی صورت نہیں۔"

○☆○

اگلے روز ہم اسلام آباد ائیرپورٹ سے گلگت کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نے مسٹر جی کلارک سے زریں گل کے بارے میں بات کی تھی اور انہوں نے اسے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے زریں گل کو اس شرط پر ساتھ لیا تھا کہ وہ سروج سے اچھی بری کسی طرح کی بات نہیں کرے گا۔ اسی طرح کی کچھ اور شرائط بھی میں نے اس سے منوائی تھیں۔

جہاز کے حرکت میں آنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم گلگت ائیرپورٹ پر پہنچ چکے تھے۔ راستے میں دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلے کے مناظر نے ہمیں محظوظ کیا۔ یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ اسلام آباد کی شدید گرمی کی نسبت یہاں موسم خنک تھا۔ ہم نے رات گلگت کے ایک ہوٹل میں گزاری اور علی الصباح اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔ یہاں ہماری حیثیت بہ ظاہر ٹریکرز کی تھی اور ہمارا سامان بھی وہی تھا جو ٹریکرز استعمال کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ٹریکرز یا ٹریکر' وہ سیاح ہوتے ہیں جو قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے دشوار راستوں پر سفر کرتے ہیں۔ لیکن پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے وہ ایک خاص بلندی سے زیادہ نہیں جاتے۔ عموماً یہ بلندی ۲۰۰۰ میٹر ہوتی ہے۔ اگر کوئی ٹریکر انسانی بلندی کی اس حد کو پار کرتا ہے تو پھر وہ کوہ پیما یعنی "کلائمبر" کہلاتا ہے اور اس پر وہی پابندیاں اور شرائط عائد ہوتی ہیں جو کلائمبرز پر ہوتی ہیں۔

ہم بھی ٹریکرز کے طور پر وہاں پہنچے تھے لیکن ظاہر ہے ہمارا اصل مقصد اس گم شدہ شخص کی تلاش تھا جس کا نام جون چارلس تھا اور جس نے بڑے اعتماد سے "وینیٹ" کے بارے میں اپنی باخبری کا دعویٰ کیا تھا۔ گلگت سے ہماری پارٹی تین جیپوں پر چلاس کی طرف روانہ ہوئی۔ چلاس کا فاصلہ ستر اسی کلو میٹر کے لگ بھگ تھا۔ تاہم ہم چلاس سے سات آٹھ کلو میٹر ادھر ہی بنر (BUNAR) نام کے مقام پر اتر گئے۔ بنر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کا نام میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔ اس قصبے کی وجہ شہرت یہ ہے کہ نانگا پربت اور موزینو پاس وغیرہ کی طرف جانے والی مہم جو ٹیمیں یہیں سے پیدل سفر کا آغاز کرتی ہیں۔ بنر کے اس چھوٹے سے قصبے میں ہماری ملاقات پنجاب کے ایک بہت بڑے رنگین شخص سے ہوئی۔ میری مراد مجتبیٰ کنور سے ہے۔ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی ناہید کے ساتھ اس قصبے میں فروکش تھا۔ ہم سب کے ساتھ وہ بہت تپاک سے ملا۔ وہ بنر سے ہماری روانگی کا انتظام مکمل کیے بیٹھا تھا۔ ہمارا بستر سامان جس میں خورد و نوش کا سامان بھی شامل تھا' درمیانے سائز کے ڈرموں میں بند کیا جا چکا تھا۔ پلاسٹک میٹریل کے یہ ڈرم ہر قسم کے موسمی اثرات سے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ قریباً تیس عدد ڈرم تھے۔ انہیں اٹھانے کے لیے مجتبیٰ کنور نے تیس قلیوں (پورٹرز) اور سات آٹھ خچروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ تمام کے تمام پورٹرز مقامی تھے۔ ان میں سے کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے لیکن زیادہ تر صرف مقامی زبان شینا جانتے تھے۔ زریں گل انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دھڑا دھڑ ان سے مقامی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرنے کے بعد اس نے ہمیں بتایا کہ یہ قلی لوگ بہت پریشان ہیں۔ انہیں معاوضہ کم دیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں تھوڑی سی زیادہ اجرت دی جائے۔ کیوں کہ وہ ایک خطرناک کام کر رہے ہیں۔

"خطرناک کیا ہے اس میں؟" میں نے پوچھا۔

زریں گل بولا "یہ لوگ کہتا ہے کہ ادھر زگوٹ اور کیچال کی طرف حالات زیادہ اچھا نہیں ہے۔ لوٹ مار کی واردات ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ ابھی دو دن پہلے کیچال سے تھوڑا آگے دو مقامی لوگ قتل ہو گیا ہے۔ وہ خچر پر کچھ سامان لاد رہا تھا' راستہ بھٹک کر

دڑے کی طرف نکل گیا۔ خو کسی نے ان دونوں کو مار دیا ہو وساماں لوٹ لیا۔ خو اس جگہ پر اس سے پہلے بھی اس طرح کا دو تین واردات ہو چکا ہے۔"

بہ ظاہر یہ قلیوں کی کٹ حجتی نظر آ رہی تھی۔ اکثر سننے میں آیا تھا کہ پورٹرز لوگ سیاحوں سے زائد پیسے بٹورنے کے لیے اس قسم کے عذر تراشتے رہتے ہیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں کیپٹن کنور بھی موقع پر پہنچ گیا اور اس نے پورٹروں کے سردار کی مدد سے یہ "معاوضے" والا مسئلہ حل کرلیا۔ بہرحال ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ پاپیادہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پورٹرز کے علاوہ ہماری پارٹی میں کل آٹھ افراد شامل تھے۔ مسٹر جی کلارک، ان کے دو خاص آدمی (یہ دونوں امریکن تھے) سائیں عالی، 'سروج'، میں، 'صفدر' اور زریں گل۔ کیپٹن کنور اور اس کی بیگم مسٹر کلارک کی ہدایت پر بیس میں ہی رہے تھے۔ اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا۔ ہم میں سے کم از کم ایک ذمے دار شخص کو بیس میں موجود ہونا چاہیے تھا۔

ہمارے راستے میں زیادہ تر خشک پہاڑ تھے۔ موسم بھی کچھ ایسا سرد نہیں تھا۔ لیکن جس جانب ہم جا رہے تھے۔ ادھر فلک بوس برفانی چوٹیاں سینہ تانے کھڑی تھیں اور ان ہی چوٹیوں میں عظیم الشان نانگا پربت بھی تھی۔ موسم صاف تھا۔ دور سے اس چوٹی کا منظر کسی خواب کا حصہ محسوس ہوتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ دنیا کی نویں اور پاکستان کی دوسری بلند ترین چوٹی تھی۔ کہنے والے اسے "کلر ماؤنٹین" بھی کہتے ہیں کیوں کہ کوہ پیمائی کی تاریخ میں سب سے زیادہ مہم جو اس چوٹی پر ہلاک ہوتے ہیں۔ ہمارے تیس پورٹرز میں تین "سردار پورٹرز" بھی تھے۔ یہ تینوں اردو روانی سے بولتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام قادر خاں تھا لیکن اسے "قادر الکلام خاں" کہنا چاہیے کیوں کہ وہ باتیں بہت کرتا تھا۔ دوران سفر میں اس نے ہمیں بتایا کہ ہم جس رخ سے نانگا پربت کو دیکھ رہے ہیں یہ اس کا دیا میر فیس کہلاتا ہے۔ اور یہی فیس (رخ) چڑھائی کے اعتبار سے مشکل ترین ہے۔

دن بھر کے سفر کے بعد ہم نے دیا مراتی نامی مقام پر پڑاؤ کیا۔ ایک ہموار جگہ پر چھوٹے چھوٹے خیمے لگا دیے گئے اور سب ادھر ادھر لیٹ کر آرام کرنے لگے۔ سروج اب انتہائی چست پتلون پہنے ہوئے تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے صرف قمیص پہن رکھی ہے اور ٹانگوں پر گلابی رنگ کیا ہوا ہے۔ شریف الطبع قسم کے پورٹرز راستے بھر اس کے لباس سے نظریں چراتے رہے تھے لیکن ان میں سے کچھ ایسے "زنبارار" بھی تھے جو چور نظروں سے اس کی مستانی چال دیکھتے رہے تھے اور پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے رہے تھے۔

اب سروج اپنے خیمے کے قریب ایک ہموار پتھر پر بڑے توبہ شکن انداز میں نیم دراز تھی اور چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ اس کے قریب ہی زمین پر ایک پورٹر بیٹھا تھا۔ اس جواں سال پورٹر کا نام شاہد خاں تھا۔ سروج راستے میں بھی اس سے خوب ہنسی مذاق کرتی رہی تھی۔ کبھی اس کے چٹکی کاٹتی تھی۔ کبھی دھپ مارتی تھی۔ کبھی کھلکھلا کر ہنسنے لگتی تھی۔ تاہم وہ یہ سب کچھ سائیں عالی کی نظر بچا کر کرتی تھی اور سائیں عالی کی نظر بچانا کون سا مشکل تھا۔ سارے راستے میں خچر پر سوار رہا تھا اور اونگھتا رہا تھا۔

مختصر خیموں میں کھانے پکانے اور سونے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ کلارک صاحب کے لیے ایک علیحدہ خیمہ استادہ کیا گیا تھا۔ ان کے قریب دونوں امریکن حضرات کا خیمہ تھا۔ سائیں عالی اور سروج ایک خیمے میں تھے۔ جب کہ میں 'صفدر' اور زریں گل ایک خیمے میں تھے۔ رات سونے سے پہلے زریں گل دردناک انداز میں گنگنا رہا تھا "تجھے اپنے دل سے ام کیسے بھلا دے۔ تیری یاد ہی تو اماری زندگی ہے۔"

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے زریں گل سے اس کے طوفانی عشق کا ماجرا تو پوچھا ہی نہیں۔ شاید وہ گنگنایا ہی اس لیے تھا کہ میرا دھیان اس معاملے کی طرف جائے۔ میں نے پوچھا "اوئے زریں گل۔ وہ تیری محبوبہ اروشی کا کیا بنا؟"

زریں گل نے اتنی لمبی آہ کھینچی کہ مختصر سے خیمے کی ساری آکسیجن استعمال ہو گئی۔ وہ بڑے پُرسوز لہجے میں بولا "بس ام جی رہا ہے استاد صیب...... لیکن یہ مت پوچھیں کہ کیسے جی رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لباس میں ہاتھ مارا اور کاغذات کا ایک پلندہ جسے ربر بینڈ میں سمیٹا گیا تھا، میرے سامنے رکھ دیا "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مس اروشی کے خط ہیں جو اس نے ام کو سری لنکا سے لکھے ہیں۔"

"لیکن یہ سارے تو انگلش میں ہیں؟"

"بس ام کسی سے پڑھوا لیتا ہے۔ جیسے وہ کسی سے لکھواتی ہوگی۔"

"یعنی تم اسے اردو میں لکھتے ہو؟"

"بالکل اردو میں لکھتا ہے اور پچھلے دنوں تو ام نے اس کو ایسا خط لکھا کہ ام کو یرقان ہو گیا۔"

"یرقان ہو گیا؟ خط لکھنے سے یرقان کیسے ہو سکتا ہے؟"

زریں گل مسکرایا "امارے جیسا عاشق ہو تو یرقان ہو سکتا ہے۔ امارے خیال میں ام کو خون کا کمی ہو گیا تھا۔ ام ہر خط خون سے لکھتا تھا۔"

"آفرین ہے تم پر" میں نے اسے شاباش دی "ضرور نام روشن کرو گے اپنا۔"

زریں گل نے میرے مذاق کو نظر انداز کر دیا اور لمبی لمبی آہیں کھینچ کر اپنے بے قرار شب و روز کی روداد سنانے لگا۔ اس نے مجھے یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ اروشی اس کی زندگی میں آنے والی آخری لڑکی ہے اور اگر وہ اس عشق میں بھی ناکام رہا تو پھر سائیں عالی کے ہاتھ پر بیعت کرکے جنگلوں میں نکل جائے گا۔ اس نے گریبان کھول کر مجھے اپنا سینہ بھی دکھایا جس پر پرمانینٹ روشنائی سے دل کا نشان بنا ہوا تھا اور اس دل کے اندر "ع" سے عروشی

لکھا ہوا تھا۔

میں نے کہا "خلیفہ جی! اروشی عین سے نہیں الف سے ہوتا ہے۔"

وہ بولا "عین سے ہو یا الف سے۔ ام تو اتنا جانتا ہے کہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اروشی کے حوالے سے زریں گل کی داستانِ غم طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میں کچھ دیر تو "ہوں ہوں" کی آواز سے ہنکارا بھرتا رہا۔ پھر گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے روز ہم نے دیا مراتی کے کیمپ سے سفر کا آغاز کیا۔ قرب و جوار بالکل سنسان تھے۔ کہیں کہیں دور پہاڑوں پر اِکا دُکا مکانات نظر آ جاتے تھے۔ سروج حسب سابق بڑی ترنگ میں تھی اور جواں سال پورٹر شاہد خاں کے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی۔ جب سے ہم نے دراس چھوڑا تھا، سروج مجھ سے کچھ کھنچی کھنچی رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر پہلے والی بے تکلفی اور لگاوٹ کا مظاہرہ نہیں کر رہی۔ غالباً وہ اپنا طریقہ کار بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے آگے پیچھے پھر کر اس نے بہت دیکھ لیا تھا۔ اب وہ مجھ پر اپنی بے رخی آزمانا چاہ رہی تھی۔ میرے خیال میں پورٹر شاہد سے اس کی بے تکلفی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اپنی دانست میں وہ اس بے ہودگی کے ذریعے میرے اندر رقیبانہ و حاسدانہ جذبات جگا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی سمجھا رہی تھی کہ وہ اپنے حسن و شباب کی خود مالک ہے اور چاہے تو کسی بھی اہم یا غیر اہم شخص پر مہربان ہو سکتی ہے۔

شاہد خاں حلیے اور لباس کے اعتبار سے تو عام پورٹروں جیسا ہی تھا لیکن اس کے نین نقش اچھے تھے اور بول چال میں وہ ذرا دوسروں سے مختلف نظر آتا تھا۔ اس کی اردو بھی دوسرے مقامیوں سے اچھی تھی۔ زریں گل سروج کی شوخیاں دیکھ دیکھ کر کباب ہو رہا تھا۔ اگر وہ مجھے قول نہ دے چکا ہوتا تو اب تک سروج سے اس کی کئی خونریز جنگیں ہو چکی ہوتیں۔ اب وہ صرف دانت پیس سکتا تھا اور پیس رہا تھا۔ زریں گل کے لیے سب سے پریشان کن چیز سروج کی چست پینٹ تھی۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں اس پینٹ پر ہزاروں لعنتیں ارسال کر چکا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا اور پہاڑوں پر سبزہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس رات ہم نے زنگوٹ نامی مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ہمارا پڑاؤ دیکھ کر کچھ مقامی لوگ بھی وہاں آ گئے۔ ان میں ایک دو عورتیں بھی تھیں۔ جب مسٹر کلارک کے امریکن ساتھیوں نے ان کی تصویریں لینے کے لیے کیمرے سیدھے کیے تو عورتیں یوں ڈر کر بھاگیں جیسے ان کی طرف رائفلیں سیدھی کی گئی ہوں۔ اس کیمپ کے ارد گرد ہمیں مکئی کے کھیت بھی نظر آئے۔

یہ رات بھی بہ خیریت گزری۔ تیسرے روز ہماری منزل کیپال تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، قدرتی نظارے حسین تر ہو رہے تھے۔ شام کو ہم نے کیپال میں کیمپ لگایا۔ ہم نے جو پورٹر بھرتی کیے تھے ان میں سے پانچ چھ کیپال کے بھی تھے۔ ہمارے سامان کا کچھ حصہ استعمال ہو گیا تھا لہٰذا بوجھ بھی کم ہو گیا تھا۔ مناسب سمجھا گیا کہ کیپال کے پانچ پورٹروں کو فارغ کر دیا جائے۔ کیپال میں مطلع ابر آلود تھا۔ کسی وقت بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں۔ شام کے وقت ہم تھک کر چور ہو چکے ہوتے تھے۔ لہٰذا کھانا کھانے سے پہلے کچھ دیر خیموں میں یا کھلی جگہ پر لیٹ کر آرام کر لیتے تھے۔ اس شام میں لیٹا تو نیند نے آ دبوچا۔ صفدر اور زریں گل مجھے کھانا کھلانے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ تھکاوٹ دور ہوئی تو نو بجے کے لگ بھگ آنکھ کھل گئی۔ زریں گل سو چکا تھا۔ صفدر گیس لیمپ کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں انگڑائی لے کر خیمے سے نکل آیا۔ مطلع اب صاف ہو گیا تھا اور مشرقی افق پر درمیانی راتوں کا چاند نظر آ رہا تھا۔ اس چاند کی روشنی میں افسانوی پہاڑ نانگا پربت کی جھلک دیکھنا ایک یادگار تجربہ تھا۔ میں نے دیکھا، پورٹر شاہد خاں اپنے خیموں کے قریب ایک پتھر پر بیٹھا تھا اور محویت سے پہاڑی سلسلے کو تک رہا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ ابھی مجھے وہاں کھڑے ایک دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ قریبی خیمے سے سروج نکلی اور مجھ پر ایک خالی سی نظر ڈالتی ہوئی پورٹر شاہد کی طرف چلی گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ میں نے خود کو اخروٹ کے ایک تناور درخت کی چھاؤں میں کر لیا۔ دو تین منٹ باتیں کرنے کے بعد سروج نے بے تکلفی سے شاہد خاں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور نشیب میں اتر گئی۔

اس کی یہ بچکانہ حرکت یقیناً مجھے پریشان کرنے کے لیے تھی۔ مجھے خیمے سے باہر دیکھ کر ہی وہ اپنے خیمے سے نکلی تھی اور پورٹر شاہد کے ساتھ "سرگشت" کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ میری صحت پر بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ اس پر لعنت بھیج کر میں خیمے میں واپس آ گیا۔ سائیں عالی اور سروج کا خیمہ نزدیک ہی تھا۔ میں اپنے خیمے میں لیٹا لیٹا ان کا خیمہ دیکھ سکتا تھا۔ جب آدھ پون گھنٹے تک سروج واپس نہیں آئی تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ وہ کہاں دفعان ہو گئی تھی۔ اس علاقے کے بارے میں رپورٹیں بھی کچھ تسلی بخش نہیں تھیں۔ کہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔ میں نے صفدر کو صورت حال بتائی اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔ صفدر کے پاس کولٹ ۴۵ پسٹل موجود تھا۔ میرے پاس میرا ساتھی رام پوری خنجر تھا۔

ہم خیموں کے درمیان سے گزر کر نشیب کی طرف آئے۔ یہاں اخروٹ اور چیڑ وغیرہ کے درخت بہ کثرت موجود تھے۔ سو پچاس گز آگے جانے کے بعد اچانک مجھے دبی دبی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کسی نے بند منہ کے ساتھ چیخنے کی ادھوری کوشش کی ہو۔ میں نے اپنی جیب سے چھوٹی ٹارچ نکالی، صفدر نے پسٹل برآمد کیا اور ہم آواز کی طرف لپکے۔ چاند کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر ہمیں دو ہیولے دست و گریباں نظر آئے۔ ہم قریب پہنچے تو ایک ہیولے نے دوسرے کو چھوڑا اور راہ فرار اختیار کی۔ صفدر نے

کمال پھرتی سے اس کا پیچھا کیا۔ دوڑتے دوڑتے اس نے جست لگائی اور بھاگنے والے ہیولے کو اپنے نیچے لیتا ہوا پتھریلی زمین پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک دلچسپ پنجابی گالی نکلی تھی اور اس کا بھرپور دستی گھونسا بھاگنے والے کے تھوبڑے پر پڑا تھا۔ میں نے دوسرے ہیولے پر ٹارچ پھینکی۔ وہ سروج تھی۔ اس کی قمیص کا گریبان تار تار تھا۔ زیریں لباس بھی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا اور بالائی جسم قریباً عریاں ہو گیا تھا۔ خوف اور غصے کی زیادتی سے وہ کانپ رہی تھی۔ ان سنسان درختوں میں اس سے زور آزمائی کرنے والا وہی پورٹر شاہد خاں تھا جسے وہ اپنے ساتھ یہاں لائی تھی۔ صورت حال بالکل واضح تھی۔ اپنی دانست میں مجھے ستانے اور جلانے کے لیے سروج نے جو چال چلی تھی، وہ اسی پر الٹ گئی تھی۔ ایسی اشتعال انگیز تنہائی میں سروج جیسی لڑکی کسی پر "مہربانی" کرے تو وہ کیسے آپے میں رہ سکتا ہے۔ شاہد خاں بھی آپے میں نہیں رہا تھا اور سروج کو بھنبھوڑنے کے درپے ہو گئے تھے۔

پندرہ بیس سیکنڈ کی دھینگا مشتی کے بعد صفدر نے شاہد خاں کو قابو میں کر لیا۔ اس کی شلوار پائنچے سے پھٹ گئی تھی اور ایک پشاوری چپل پاؤں سے نکل کر اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ اس نے صفدر کی بھرپور مزاحمت کی تھی لیکن بالآخر ناکام ہوا تھا۔ جب صفدر اور شاہد خاں میں زور آزمائی ہو رہی تھی تو شاہد خاں کی زبان سے ایک لفظ نکلا تھا اور یہ لفظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ شاہد نے صفدر کو "سن آف باسٹرڈ" کہا تھا۔ حیرت کا مقام تھا کہ شاہد خاں جیسے ان پڑھ قلی کے منہ سے یہ لفظ نکلا تھا۔ غالباً زور آزمائی کی ہیجانی کیفیت میں شاہد خاں کو خود بھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنے حریف کو شستہ انگلش میں گالی دی ہے۔

میں بڑے غور سے شاہد خاں کو دیکھنے لگا۔ اس کے سر پر بہت چھوٹے بال تھے غالباً مشین پھری ہوئی تھی۔ اس نے میلی سی قمیص اور گھیردار شلوار پہن رکھی تھی۔ گلے میں چمڑے کا بڑا سا تعویذ تھا اور سر پر کوہستانی ٹوپی۔ وہ ایک ان پڑھ پہاڑی نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ یہ آنکھیں اس کے حلیے اور اس کی بول چال کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر مرکوز کیا۔ تیز روشنی میں اس کی نیلگوں آنکھیں ہیروں کی طرح دمکنے لگیں اور اس وقت مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ مجھے شک گزرا کہ اس شخص کی آنکھوں پر کونٹیکٹ لینز ہیں۔ ایک دیہاتی محنت کش کی آنکھوں پر کونٹیکٹ لینز، یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

میں نے صفدر کے ہاتھ سے کولٹ پسٹل لیا اور اسے کہا کہ وہ سروج کو خیموں میں چھوڑ آئے۔

سروج نے خشمگیں نظروں سے شاہد خاں کو گھورا اور اسے چند گالیاں دینے کے بعد صفدر کے ساتھ چلی گئی۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں بھرا ہوا پسٹل تھا۔ میں نے انتہائی سرد لہجے میں شاہد خاں سے پوچھا "کون ہو تم؟"

وہ غرا کر بولا "میں جو کچھ بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں لیکن تم تینوں نے مل کر میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

اس کا فقرہ مکمل ہوتے ہی میری زوردار لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ حلق سے کرب ناک آواز نکال کر دوہرا ہو گیا۔ میں نے پسٹل کے آہنی دستے سے اس کی گردن کی پشت پر ضرب لگائی۔ ضرب نے مدمقابل کی ساری تن فن ختم کر دی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پشت پر سوار ہو کر اس کی گردن دبوچ لی اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی "تم وہ نہیں ہو جو نظر آ رہے ہو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اصلیت بتاؤ ورنہ بھیجا باہر نکال دوں گا۔"

اس نے مچلنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی گردن ایک مخصوص داؤ میں جکڑ لی۔ وہ مفلوج ہو کر رہ گیا اور اس کے ساتھ یہ بھی جان گیا کہ اس کی مزاحمت کا نتیجہ گردن ٹوٹنے کی صورت میں نکلے گا۔ تکلیف کی زیادتی سے اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑ رہی تھیں "کون ہو تم؟" میں نے سفاک لہجے میں پوچھا "تم ابھی تھوڑی دیر پہلے انگریزی میں گالی دے رہے تھے اور تمہاری آنکھوں پر لینز لگے ہوئے ہیں۔"

وہ پھنسی پھنسی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر سے گرفت ذرا نرم کی اور کان اس کی کرب ناک آواز پر لگا دیے۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے چھوڑ دو ــــ میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

"نہیں پہلے بتاؤ۔" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔

اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں "میں مر رہا ہوں" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولا۔

"اگر نہیں بتاؤ گے تو ضرور مرو گے۔" میں نے گردن پر دباؤ اور بڑھا دیا۔

اس نے قے کر دی۔ معدے کا مواد ایک باریک پچکاری کی صورت اس کے حلق سے نکلا۔ وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا "میں ــــ میں ــــ اخبار نویس ــــ ہوں۔" یہ سرگوشی جیسے الفاظ بمشکل میرے کانوں تک پہنچ پائے تھے۔

"تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"شش ــــ شکیل ــــ شاہد خاں۔" وہ نزع کے عالم میں بولا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑنا شروع ہو گئے تھے۔

میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ پہلو کے بل پتھریلی زمین پر گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ یقیناً ہر سانس کے ساتھ وہ اس ہستی کو بھی یاد کر رہا تھا جس نے اس کے لیے مہربان اور زندگی بخش ہوا بنائی تھی۔ آٹھ دس گہرے سانسوں کے بعد وہ پھر زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ میرا پسٹل بدستور اس کے سر کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ میں نے کالر سے کھینچ کر اسے کھڑا کیا۔ وہ چوں چرا کیے بغیر کھڑا ہو گیا "چلو خیمے میں۔" میں نے پسٹل اس کی گردن میں دھنسا کر

ہوئے کہا۔

اسی دوران میں صفدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے ٹارچ کی مدد سے شاہد خاں کی گم شدہ جوتی ڈھونڈی اور اسے لے کر اپنے خیمے میں آ گئے۔ خیمے میں دو گیس لیمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں شاہد خاں کا چہرہ لیموں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی تک وہ ہلکی گلابی لپ اسٹک موجود تھی جو اس نے سروج کے ہونٹوں سے چرائی تھی۔ وہ ایک جوان اور مضبوط آدمی تھا۔ شاید ہم وہاں نہ پہنچتے تو وہ سروج کو اس کی شرمستیوں کی قرار واقعی سزا دے ــــ مگر سب وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اب وہ خود سزا کی زد میں تھا اور بے حد ڈرا ہوا تھا۔

میں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اسے جان لیوا طور پر زخمی کرنا یا جان سے مار دینا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے گن پوائنٹ پر اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو اس نے زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق ظفر آباد سے نکلنے والے ایک انگریزی "روزنامہ" سے ہے۔ وہ نوشکرو کا رہنے والا ہے اور گلگت میں بھی کافی عرصہ گزار چکا ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ پچھلے چھ سات ماہ سے چلاس میں مقیم ہے اور اس نے رپورٹنگ کے لیے پورٹر کا بھیس بدل رکھا ہے۔

میں نے پوچھا "ایسی کون سی خاص رپورٹنگ ہے جس کے لیے تمہیں اتنا تردد کرنا پڑا ہے؟"

وہ بولا "کوئی بہت خاص رپورٹنگ تو نہیں ہے۔ یہ رپورٹنگ عام انداز میں بھی کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ میرا اپنا آئیڈیا تھا کہ پورٹر کے بھیس میں پورٹروں میں شامل ہو جاؤں اور حالات و واقعات کا بلاواسطہ اور حقیقی انداز میں مشاہدہ کر سکوں۔"

"اپنی رپورٹنگ کی نوعیت بتانا پسند کرو گے تم؟" صفدر نے پوچھا۔

"ایک سگریٹ مل سکے گا۔" اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ اب وہ خوف و ہراس سے کافی حد تک آزاد ہو چکا تھا اور بہتر انداز میں بات کر رہا تھا۔

صفدر نے اسے سگریٹ اور لائٹر تھما دیا۔ وہ ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ بولا "اگر اجازت دو تو ایک چھوٹی سی وضاحت کر دوں؟"

"کرو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ یقین کریں، میں کوئی نامعقول آدمی نہیں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہوا، اتنا اچانک تھا کہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آ سکا۔ میں اتنا شرمندہ ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ویسے یہ شاہ زادی صاحبہ لڑکی ہے کون؟"

"تمہاری پارٹی کی رکن ہے۔ بلکہ سرگرم رکن ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

"سرگرم تو واقعی بہت ہے۔" شاہد خاں نے دبے لہجے میں اعتراف کیا۔

"کھل کر بات کرو ہم مائنڈ نہیں کریں گے۔" صفدر نے اسے حوصلہ دیا۔

وہ اپنا گلا مسلتے ہوئے بولا "یقین کریں صاحبان! وہ زبردستی مجھے کیمپ سے باہر لے گئی تھی۔ اس کی الٹی سیدھی حرکتیں تو آپ سے بھی پوشیدہ نہیں ہوں گی۔ سارا سارا دن مجھ سے مذاق کرتی تھی۔ بالکل مت مار رکھی تھی اس نے میری ــــ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس معاملے میں زیادہ مضبوط شخص نہیں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اکیلے میں لے گئی اور لپٹنے چمٹنے لگی۔ پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

"اوکے ــــ اوکے۔ اٹ از آل رائیٹ۔" صفدر نے اسے تسلی دی "اب چھوڑو اس بات کو۔ تم ہمیں اپنی رپورٹنگ کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "صاحبان! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں آپ سے کھل کر بات کر سکتا ہوں۔"

"بے شک" میں نے اس کی تائید کی۔

اس نے کہا "میں آپ کو ایک بہت خاص بات بتانے جا رہا ہوں۔ لہٰذا توقع رکھتا ہوں کہ جواب کے طور پر آپ بھی مجھے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتائیں گے۔"

"ہمارے پاس تمہیں بتانے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "سب ہی کچھ تمہارے سامنے ہے۔ مسٹر جی کلارک صاحب ہمارے باس ہیں۔ وہ امریکا سے پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیاحت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ٹریکنگ ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ ہم اسی سلسلے میں ان کا ساتھ دینے کے لیے یہاں موجود ہیں۔"

"اور وہ ملنگ جسے آپ لوگ سائیں کہتے ہیں؟"

"ہمارے باس کلارک صاحب اس کے عقیدت مند ہیں۔ وہ باس کے ساتھ آنا چاہتا تھا لہٰذا وہ اسے لے آئے ہیں۔"

شاہد خاں بولا "میرا خیال ہے کہ سائیں صاحب اور سروج کا تعلق انڈیا سے ہے۔"

صفدر نے تائید کی اور بتایا کہ ہمارے باس براستہ انڈیا تشریف لائے ہیں لہٰذا یہ لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔

معلوم نہیں شاہد خاں نے ہماری باتوں پر کتنے فیصد اعتبار کیا اور کیا بھی یا نہیں، بہرحال ہمارے اور اس کے درمیان کسی حد تک "انڈر اسٹینڈنگ" پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں صفدر نے تھرماس میں سے گرما گرم چائے بھی پیالوں میں انڈیل لی۔ ہم چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ چائے نوشی کے دوران میں شاہد خاں نے ایک بار پھر تھوڑی دیر پہلے والے واقعے پر اظہار افسوس کیا۔ صفدر بولا "بھائی صاحب! جو کچھ ہوا بہتر ہی ہوا۔ اگر یہ کچھ نہ ہوتا تو آپ کے اصل روپ سے پردہ کیسے اٹھتا اور پردہ نہ اٹھتا تو آپ یہاں ہمارے پاس موجود کیسے ہوتے۔"

چائے پیتے ہوئے شاہد خاں کے نئی لینز بھی زیر بحث آئے۔ شاہد خاں نے بتایا کہ وہ عینک لگاتا ہے۔ لیکن وہ جس روپ میں پورٹرز کے ساتھ شامل ہوا ہے اس روپ میں عینک "مس فٹ" تھی۔ لہٰذا اس نے لینز کا سہارا لیا۔ چائے نوشی کے دوران میں شاہد خاں کی آنکھیں مسلسل سوچ میں ڈوبی رہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کے پاس ہمیں بتانے کے لیے کوئی اہم بات موجود ہے۔ شاید وہ ہمیں نہ بتاتا لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر وہ ہمیں بتانے میں کوئی عار بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر وہ بولا "آپ نے اس علاقے کے بارے میں کوئی خاص بات سنی ہے؟"

"کیسی خاص بات؟"

"کسی حادثے یا گمشدگی وغیرہ کے بارے میں؟"

میں نے کہا "ہمیں پتا چلا تھا کہ کسی وادی میں دو مقامی افراد قتل ہو گئے ہیں۔"

"اس کے علاوہ؟"

صفدر بولا "دو ہفتے پہلے کوئی لائزن آفیسر بھی مارا گیا تھا۔"

(لائزن آفیسر وہ پاکستانی راہبر ہوتا ہے جو غیر ملکی ٹیموں کے ساتھ مہمات پر جاتا ہے اور اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ ملکی قوانین کی پابندی کی جائے)

"بالکل ایسا ہوا تھا۔" شاہد خاں نے کہا۔

پھر اس نے اپنا گریبان کھول کر اندرونی لباس کی کسی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پولی تھین کا ایک لفافہ نکال لیا۔ اس لفافے میں انگریزی اور اردو اخباروں کے کچھ تراشے تھے۔ یہ تراشے اس نے ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ان تمام تراشوں میں ایسے حادثات کی خبریں تھیں جو پچھلے ایک سال کے مختلف اوقات میں رونما ہوئے تھے۔

سب سے پہلے تو ان جاپانیوں کی خبر تھی جو تین ہفتے پہلے لاپتا ہو گئے تھے۔ مارچ کے مہینے میں تین مقامی افراد مارے گئے تھے اور ان کا سامان لوٹ لیا گیا تھا۔ جنوری میں ایک عورت پُراسرار طور پر لاپتا ہو گئی تھی۔ اکتوبر اور دسمبر کے دوران میں مختلف واقعات میں چھ مقامی افراد اور تین غیر مقامی ٹریکرز لاپتا ہوئے تھے۔ ستمبر کے آخر میں امپورٹڈ خوراک اور دیگر سامان سے بھرے ہوئے چالیس "پلاسٹک ڈرم" چوری ہو گئے تھے۔ یہ ڈرم ایک جاپانی کوہ پیما ٹیم واپسی پر زیادہ وزن کی وجہ سے چھوڑ گئی تھی اور اس سامان پر پورٹرز کا حق تھا۔ جولائی میں پھر چار پاکستانی ٹریکرز پُراسرار طور پر غائب ہو گئے تھے۔

میں اور صفدر ان تراشوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ یہ تراشے علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں ہماری نظروں سے گزرتے تو شاید اتنا گہرا تاثر نہ چھوڑتے۔ مگر اب یہ واقعات ایک ہی سنگین سلسلے کی کڑیاں محسوس ہو رہے تھے۔ یہ تمام واقعات کے کے رینج (قراقرم رینج) کے جنوب مشرقی علاقوں میں پیش آئے تھے۔ ٹریکنگ کے لیے جانے والی پارٹیوں کا مقصد ویرانوں میں گم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا لہٰذا وہ خوراک اور خیمے لے کر رواں نکل جاتے ہیں۔ غائب ہونے والوں میں زیادہ تعداد ان ہی لوگوں کی تھی۔

شاہد خاں نے ہماری دلچسپی دیکھتے ہوئے سگریٹ کا ایک کش لیا اور ڈرامائی انداز میں بولا "عزیزم! میں نے جو اعداد اکٹھے کیے ہیں ان کے مطابق پچھلے تین ساڑھے تین سال میں کم و بیش آٹھ سو افراد ایسے ہی جان لیوا واقعات کا شکار ہو چکے۔ ان واقعات کو قرار واقعی اہمیت اس لیے نہیں مل رہی کہ یہ وقفے وقفے سے رونما ہو رہے ہیں۔ پھر بہت سے واقعات ایسے جنہیں محض حادثہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو واقعات مقامی لوگوں کو پیش آتے ہیں وہ علاقے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اخبارات تو دور کی بات ہے، بعض اوقات پولیس تک کو ان کی رپورٹ نہیں جاتی۔"

میں اور صفدر حیرت سے شاہد خاں کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ بھی تھا وہ ایک ذہین اور مشکل پسند اخبار نویس دکھائی دیتا تھا۔ اس کی باتوں میں سچائی اور ہوش مندی کی جھلک تھی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تمہارا ذاتی خیال کیا ہے ان واقعات کے بارے میں؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔" وہ انگلش اسٹائل میں کندھے اچکا کر بولا "میں تو خود تجسس کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہوں۔ لیکن ایک بات ہے عزیزم! اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔ ایک ایسی وجہ جو معمولی نہیں ہے۔"

اچانک ایک آواز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ کاپٹر کی آواز تھی۔ چند لمحوں بعد یہ گرجدار آواز ہمارے سر پر پہنچ گئی۔ دیو ہیکل پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ہمارے کان بج اٹھے۔ ہوا کے زور سے خیمے پھڑپھڑاتے اور یوں لگا کہ جڑوں سے اکھڑ جائیں گے۔ لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا۔ ہیلی ہمارے عین اوپر سے گزرتا ہوا گلگت کی طرف نکل گیا۔ یہ ایک فوجی ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے شاہد خاں سے پوچھا "یہ فوجی ہیلی یہاں کیا کر رہا ہے؟"

وہ بولا "یہ ائیر فورس کا ہیلی کاپٹر ہے۔ انہی تین فلپائنی کوہ پیماؤں کو ڈھونڈ رہا ہے جن کا ذکر آپ نے اس تراشے میں ہے۔ رولز کے مطابق (FNCA) کی ذمے داری ہوتی ہے کہ گمشدہ کوہ پیماؤں کی تلاش میں ہیلی کاپٹر کی مدد فراہم کرے۔"

میں اور صفدر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہم شاہد خاں کو کیسے بتاتے کہ ہم بھی انہی فلپائنیوں کی تلاش میں یہاں ہیں۔ شاہد خاں کی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ میرے جسم میں لہریں دوڑنے لگیں۔ یقیناً یہی کیفیت صفدر کی بھی تھی۔

حالات بہت اُلجھے ہوئے تھے۔ ان ویران پہاڑوں میں یقیناً کوئی انہونی ہو رہی تھی۔ تین سال میں کم و بیش آٹھ سو افراد کا لاپتا یا ہلاک ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بے شک ایسے پُرخطر علاقوں میں مہم جو افراد کے ساتھ حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ لوگ برفانی طوفانوں میں دبے ہیں۔ راستے بھولتے ہیں۔ ایوالانچس کی نذر ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے لیکن پھر بھی اخبار نویس شاہد خاں جو اعداد و شمار بتا رہا تھا وہ چونکا دینے والے تھے۔

خیمے سے باہر تیز سرد ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور چاندنی کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ شاہد خاں نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا۔ یہ نانگا پربت اور گرد و پیش کا نقشہ تھا۔ مختلف مقامات پر سرخ سیاہی سے نشانات لگائے گئے تھے۔ ایک ایسے ہی سرخ نشان پر انگلی رکھتے ہوئے شاہد خاں نے کہا "ہم اس وقت کیجال کیمپ میں ہیں اور یہ دیکھیے یہ ہے کیجال۔ نانگا پربت کا بیس کیمپ یہاں سے صرف ایک دن کی مسافت پر ہے۔ یہاں سے جنوب کی طرف سفر کریں تو مشہور و معروف "موزینو پاس" آتا ہے۔ جن لوگوں نے نانگا پربت پر نہیں چڑھنا ہوتا اور صرف ٹریکنگ کرنا ہوتی ہے وہ کیجال سے موزینو پاس کی طرف نکل جاتے ہیں۔ یہی "کیجال" وہ جگہ ہے جہاں سے فلپائنی کوہ پیما ٹریکنگ کے لیے نکلے اور لاپتا ہوئے۔"

صفدر نے انجان بن کر پوچھا "لیکن وہ لوگ تو نانگا پربت پر چڑھنے کے لیے آئے تھے۔"

شاہد خاں نے جواب دیا "دراصل یہاں سے تھوڑا آگے ایک تند و تیز پہاڑی نالہ ہے۔ پل کے بغیر اسے پار کرنا ممکن نہیں۔ جس دن فلپائنی ٹیم کیجال پہنچی تیز بارشوں کے سبب پل ٹوٹ چکا تھا۔ پل مرمت ہونے میں دو تین دن لگ جاتے تھے لہٰذا فلپائنیوں کو کیجال میں رکنا پڑا۔ کیجال میں فارغ بیٹھے رہنے کے بجائے کچھ فلپائنیوں کے دل میں آئی کہ وہ ٹریکنگ کریں۔ دو افراد پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف نکل گئے اور تین نے موزینو پاس کا رُخ کیا۔ یہی تینوں افراد لاپتا ہوئے ہیں۔"

شاہد خاں کے جواب سے ان اطلاعات کی تصدیق ہوئی جو ہمارے پاس موجود تھیں۔ میں نے اور صفدر نے فلپائنیوں کی گمشدگی والے واقعے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور شاہد خاں سے تفصیل جاننا چاہی۔ شاہد خاں نے اخباری تراشوں کی مدد سے بتایا "لاپتا ہونے والے تین فلپائنیوں میں دو مرد اور ایک لڑکی تھی۔"

شاہد خاں نے مزید بتایا "مردوں کے نام جون چاؤل اور لی وانگ تھے۔ لڑکی پارٹی لیڈر کی سگی بیٹی تھی اور اس کا نام جینگ ہن تھا۔ وائرلیس کے ذریعے ان لوگوں کا رابطہ کیجال کیمپ سے تھا۔ پارٹی لیڈر راموس نے انہیں تنبیہ کی تھی کہ وہ جانے پہچانے راستوں پر رہیں اور زیادہ دور نہ جائیں کیوں کہ علاقے میں گمشدگی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دوپہر کے بعد راموس کو جون چاؤل کی طرف سے اطلاع ملی اس سے پتا چلا کہ وہ لوگ موزینو پاس کو جانے والے اصل راستے سے ہٹ کر سفر کر رہے ہیں اور کیجال کیمپ سے تقریباً تیس کلومیٹر دور پہنچ چکے ہیں۔ راموس نے وائرلیس پر سختی سے ہدایت کی کہ وہ خطرناک اور انجانے علاقے میں ہیں لہٰذا فوراً واپسی کا سفر شروع کر دیں۔ راموس کی بیٹی نے سفارش کی کہ وہ صرف ڈیڑھ دو کلومیٹر اور آگے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں سامنے ہی ایک برف پوش بلندی نظر آ رہی تھی اور وہ اس کی دوسری جانب دیکھنا چاہتے تھے۔ پارٹی لیڈر راموس نے نیم رضامندی کے انداز میں انہیں اجازت دے دی لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ غیر محفوظ علاقے میں ہیں لہٰذا وائرلیس پر مسلسل رابطہ رکھیں اور جلد سے جلد واپسی کا سفر اختیار کریں۔ اس وقت تک دو بج چکے تھے اور راموس کو معلوم تھا کہ وہ تیز رفتاری سے بھی سفر کریں گے تو رات نو دس بجے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا اور ابھی تک پردۂ راز میں ہے۔ وائرلیس پر مسلسل سگنل موصول ہو رہے تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد لڑکی نے اپنے باپ سے مختصر بات بھی کی اور بتایا کہ بہت سنسان لیکن خوب صورت علاقہ ہے۔ ہر طرف برف کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اچانک ان لوگوں سے ریڈیائی رابطہ منقطع ہو گیا۔ ریڈیائی رابطہ منقطع ہونے کی کئی ایک وجوہات ہوتی ہیں۔ شروع میں راموس اور اس کے ساتھیوں نے اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن جوں جوں وقت گزرا ان کے اندیشے جوان ہونے لگے۔ پانچ چھ بجے تک رابطہ بحال نہیں ہوا تھا اور شام کے ڈھلتے سائے نشیب و فراز کو ڈھانپنے لگے تھے۔ اب ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ رابطہ بحال ہونے کا انتظار کریں اور اگر رابطہ بحال نہ ہو تو رات نو دس بجے تک انتظار کی سُولی پر لٹکتے رہیں۔

رابطہ بحال نہیں ہوا اور انہیں رات گئے تک انتظار کرنا پڑا لیکن اس انتظار کا نتیجہ بھی مثبت نہیں نکلا۔ فلپائنی ممبرز کا دور دور پتا نہیں تھا۔ وہ رات جیسے تیسے کاٹ کر علی الصباح راموس دیگر کوہ پیماؤں کے ساتھ گمشدہ ساتھیوں کی تلاش میں نکلا۔ یہ تلاش اب تک جاری ہے۔"

میں نے کہا "یہاں کیمپ میں تو کوئی فلپائنی نظر نہیں آتا۔"

شاہد خاں بولا "تین دن پہلے تک وہ لوگ یہیں تھے۔ اب ان میں سے تین تو واپس چلے گئے ہیں اور تین مقامی کھوجیوں کے ساتھ آگے موزینو پاس کی طرف گئے ہیں۔"

اس رات ہم صبح تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ علی الصباح میں سائیں عالی کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ سورج، رات والے واقعے پر ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ عین ممکن تھا کہ وہ سائیں عالی کو بھڑکا دیتی۔ اسے بتاتی کہ رات ایک پورٹر نے

اس کی "عزت افزائی" کی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو سنا میں عالی کیمپ میں قیامت برپا کر سکتا تھا۔ میں خیمے میں پہنچا تو سنا میں عالی بے خبر سو رہا تھا۔ سورج نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ میں نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلایا تو وہ جاگ گئی۔ میں نے اشارے سے اسے باہر بلا لیا۔ وہ ابھی تک غصے میں ابل رہی تھی۔ اس نے لباس بدل لیا تھا" تاہم اس کی گردن اور ہاتھوں پر اب ہاتھا پائی کے نشان نیلے ہو رہے تھے جو رات اس میں اور شاہد خان میں ہوئی تھی۔

وہ بولی "کماں ہے وہ کمینے کا بچہ۔ تم نے اس کی ہڈی پسلی توڑی یا نہیں؟" اس کا اشارہ شاہد خان کی طرف تھا۔

میں نے کہا "ہڈی پسلی تو یقیناً توڑ دی ہے لیکن وہ خود ہی ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے اور ہاتھ پاؤں تک جوڑ کر معافی بھی مانگ رہا ہے۔ میں تم سے یہی پوچھنے آیا ہوں کہ اسے معاف کیا جائے یا نہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ جھنا کر بولی "اگر وہ اس کیمپ میں رہا تو میں نہیں رہوں گی۔ اسے ـــــ جو نے مار کر نکالو یہاں سے۔"

"لیکن تھوڑا بہت قصور تو تمہارا بھی ہے۔" میں نے کہا "تم نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اسے تنہائی میں بے تکلف ہونے کا موقع دیا۔ آخر بندہ بشر ہے وہ۔ تمہارے جیسی لڑکی اسے اکیلے میں اکسانے گی تو وہ کیا کرے گا۔ وہی کرے گا جو اس بے چارے نے کیا ہے۔"

میرے آخری الفاظ نے سورج کا پارا ایک دم نیچے گرا دیا۔ ظاہر ہے ان الفاظ سے سورج کی تعریف کا پہلو نکلتا تھا اور یہ تعریف وہ پہلی بار میری زبان سے سن رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک تکا ہٹ انداز سے دیکھا اور بولی "کیا بات ہے۔ آج بڑے میٹھے لہجے میں بات کر رہے ہو۔"

اس سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ ضرورت کے وقت انسان گدھے کو بھی باپ بنا تا ہے" لیکن یہ جواب سورج کو ہرگز پسند نہیں آتا۔ لہٰذا میں نے بدستور نرم لہجے میں کہا "سورج! میرا خیال ہے کہ اب اس قصے کو یہیں ختم کر دو۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ آئندہ وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

"سفارش کر رہے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

"چلو تمہارے کہنے پر معاف کیا۔" وہ اداسے بولی۔

"تھینک یو۔"

"تھینک یو کی ضرورت نہیں۔ تمہارے کہنے پر تو میں اپنا خون بھی معاف کر سکتی ہوں۔" وہ پٹری سے اترنے لگی تھی لیکن شکر ہے کہ اس وقت مسز جی کلارک آنکھیں ملتے ہوئے اپنے خیمے سے باہر نکل آئے۔ انہیں دیکھ کر سورج بہکتے بہکتے سنبھل گئی۔

اس روز مسز جی کلارک اور ان کے دونوں امریکن ساتھیوں میں کافی دیر تک تبادلۂ خیال ہوا۔ میں اور صفدر بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔ ہماری زبانی یہاں ٹریکنگ کے بہانے آئی تھی لیکن یہ ٹریکنگ ہمیں اس انداز سے کرنا تھی کہ جون جانوں کی تلاش ... کا کام بھی احسن طریقے سے ہو سکتا۔ ہم نے اپنی پارٹی کو دو گروپس میں تقسیم کر دیا اور فیصلہ کیا کہ یہ دونوں گروپ مختلف اطراف میں ٹریکنگ کے لیے نکلیں گے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ روز بعد واپس کیجال پہنچ جائیں گے۔ ہمارے گروپ میں میرے، صفدر اور زریں گل کے علاوہ سورج بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ مسز جی کلارک کا ایک امریکن ساتھی مسٹر رابرٹ بھی ہمارے گروپ میں تھا۔ دوسرے گروپ میں مسز جی کلارک" ان کا ہم وطن ساتھی۔ سائمن ہال اور مجنی کا ایک ساتھی شامل تھے۔ دونوں گروپس نے پورٹرز (قلیوں) کی بھی تقسیم کر لی۔ ہمارے حصے میں چھ اور دوسرے گروپ کے حصے میں پندرہ پورٹرز آئے۔ میں نے کوشش کی کہ شاہد خان ہمارے حصے میں آئے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ دونوں گروپس کے پاس ٹریکنگ کے مکمل سامان کے علاوہ اسلحہ بھی موجود تھا۔ ظاہر ہے یہ اسلحہ ہم نے اپنے دفاع کے لیے رکھا تھا۔ مسٹر کلارک والے گروپ کے پاس دو ریوالور تھے۔ ہمارے پاس ایک لانگ رینج پسٹل اور ریوالور تھا .... دونوں گروپس کے پاس ایک ایک طاقتور خودکار رائفل بھی تھی۔ یہ دونوں رائفلیں پارٹس کی شکل میں ہمارے سامان کے اندر موجود تھیں اور بوقت ضرورت فوراً جوڑی جا سکتی تھیں۔ ان ہتھیاروں کے کافی راؤنڈز بھی ہمارے سامان میں موجود تھے۔ اس روز دس بارہ بجے کے لگ بھگ ہم اپنے سفر پر روانہ ہو جانا چاہتے تھے لیکن پھر ہمیں اطلاع ملی کہ گمشدہ کوہ پیماؤں کی تلاش میں گئی ہوئی ایک پارٹی آج دوپہر واپس کیجال پہنچ رہی ہے۔ یہ بھی پتا چلا کہ اس پارٹی میں لاپتا ہونے والی فلپائنی لڑکی کا رالدار پارٹی لیڈر مسٹر راموس بھی شامل ہے۔ اس اطلاع کے بعد مسز جی کلارک نے کیجال سے روانگی چوبیس گھنٹے کے لیے ملتوی کر دی۔ یہ ایک بڑا اچھا فیصلہ تھا۔ ہمیں تازہ ترین صورت حال کا علم ہو سکتا تھا اور راستے کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

متلاشی پارٹی سہ پہر تین بجے واپس پہنچی۔ اس میں دو فلپائنی تھے۔ دو پاکستانی کوہ پیما تھے اور آٹھ پورٹرز تھے۔ پاکستانی کوہ پیماؤں میں سے ایک کا تعلق فوج سے تھا۔ یہ تھکے ہارے لوگ پانچ دن کی ناکام برف پاشی کے بعد واپس پہنچے تھے۔ پارٹی لیڈر راموس کی عمر پچیس سال کے قریب تھی تاہم وہ چہرے مہرے سے بہ مشکل تیس سال کا نظر آتا تھا۔ بہت اچھی صحت تھی۔ بے پناہ برداشتی اور جسمانی مشقت کے باوجود پژمردہ نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ رنج والم کا ایک سمندر اس کے سینے میں موجزن ہے۔ وہ اپنی مہم کے ابتدائی مراحل میں ہی اپنے تین ساتھیوں سے محروم ہو گیا تھا اور ان میں اس کی منگیتر بھی شامل تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ ان لوگوں کی

امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں اور مایوسی غالب آ رہی تھی۔ یہ لوگ اپنے خیمے میں رفیو گاڑ چکے تو میں اور مسز کلارک مسٹر راموس کے پاس چلے گئے۔ ہم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مسٹر راموس کو بتایا کہ ہم ٹریکنگ کے لیے یہاں پہنچے ہیں اور پھر اس بات پر صدمے کا اظہار بھی کیا کہ فلپائنی ٹیم کو یہاں آ کر ایک دل خراش سانحے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

مسٹر راموس ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرتے تھے انہوں نے بتایا کہ مقامی حکام گمشدہ کوہ پیماؤں کی تلاش میں بھرپور مدد کر رہے ہیں۔ علاقے میں کئی متلاشی پارٹیاں مصروف کار ہیں اور فضائی جائزہ بھی لیا جا رہا ہے۔ راموس نے ہم سے کہا "آپ لوگ اس علاقے میں پہلے نہیں آئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ اس فیلڈ میں زیادہ تجربہ کار بھی نہیں ہیں۔ میرا آپ کو یہ مشورہ ہے کہ آپ زیادہ دور نہ جائیں۔ قرب و جوار میں ٹریکنگ کے لیے حالات زیادہ ساز گار نہیں۔ بارشیں بہت ہو رہی ہیں اور راستے بھی خراب ہیں۔"

مسز جی کلارک نے کہا "مسٹر راموس! آپ کا مشورہ ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ ہم آپ کی ہدایت پر عمل کریں گے۔"

مزید گفتگو کے دوران میں راموس نے بتایا کہ وہ لوگ گلگت واپس جا رہے ہیں۔ فلپائن سے چند لوگ آ رہے ہیں جو اس تلاش کے سلسلے میں اپنی ماہرانہ رائے دیں گے اور تجاویز پیش کریں گے۔

○☆○

اگلے روز حسب پروگرام ہم ٹریکنگ پر روانہ ہو گئے کیجال سے تقریباً پانچ کلو میٹر آگے تک ہم نے اکٹھے سفر کیا۔ پھر مسز جی کلارک اپنی پارٹی کے ساتھ علیحدہ ہو گئے۔ ان کا رخ سوزجو پاس کی طرف تھا۔ جب کہ ہم شمال مشرق کی طرف محو سفر ہو گئے ـــــ موسم غیر متوقع طور پر خوش گوار تھا۔ دور بلندیوں پر نانگا پربت کی برف پوش چوٹی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس کے دونوں اطراف بلند و بالا پہاڑی سلسلہ تھا۔ ایشیا کے حسین ترین قدرتی مناظر نے ہمیں اپنے اثر میں لے رکھا تھا۔

ہمارے قافلے میں چار خچر بھی شامل تھے۔ وہ سامان سے لدے پھندے تھے لیکن ڈھلوان راستے پر کمال آسانی سے چڑھ رہے تھے۔ کچھ یہی کیفیت ہمارے پورٹرز دوستوں کی تھی۔ تھکاوٹ نام کی کوئی شے ان پر اثر انداز نہیں تھی۔ اس کے برعکس ہمارے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ ہم نے اپنے سوئٹر اتار لیے تھے اور زریں گل تو قمیص تک اتارنے کی فکر میں تھا۔ اگر اسے یہ خیال نہ ہوتا کہ قافلے میں ایک عدد سامان لڑکی بھی موجود ہے تو وہ کب کا جامے سے باہر ہو چکا ہوتا۔ سورج کا رنگ لال گلابی ہو رہا تھا۔ اس نے سوئٹر اتار کر کمر سے باندھ لیا تھا اور آستینیں کندھوں تک چڑھا لی تھیں۔ دو روز پہلے پیش آنے والے واقعے کو جیسے وہ قطعاً بھول چکی تھی اور اس واقعے کے ساتھ ساتھ شاہد خان کو بھی۔ وہ اس قافلے میں موجود تھا لیکن سورج نے اسے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

زریں گل اور سورج میں پہلی جھڑپ اس شام آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ ہم نے ایک خطرناک گھاٹی کے کنارے ہموار قطعے پر کیمپ لگایا۔ بھوک بہت لگی تھی۔ جوں ہی خیمے کھڑے ہوئے کھانا تیار ہونے لگا۔ یہ زیادہ تر ڈبا بند خوراک تھی۔ اس خشک خوراک کو صرف پانی میں ابالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانچ دس منٹ میں ہر چیز تیار ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ سرسبز گھاس دیکھ کر دسترخوان بچھایا گیا اور کھانا چن دیا گیا۔ گیس لیمپس کی روشنی میں ہزاروں فٹ گہری گھاٹی کے کنارے بیٹھ کر ڈنر کرنے کا اپنا ہی لطف تھا۔ کھانا کھانے کے بعد زریں گل نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کمر سیدھی کر کے ایک گونج دار ڈکار لی۔ اس ڈکار نے سورج کو ایک دم بدمزا کر دیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جوس کا گلاس دور پھینک دیا اور اٹھ گئی۔ "بدتمیز! بے ہودہ "جنگلی۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"کیا ہوا۔" صفدر نے پوچھا۔

"میرا دماغ خراب ہوا ہے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"خو چہ یہ کون سا نیا اطلاع ہے۔" زریں گل نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" سورج پلٹ کر غرائی۔

"اس نے تو کچھ نہیں کہا۔" میں نے سورج کا راستہ روکا۔

وہ بولی "تم زیادہ طرف داری مت کرو اس کی۔ اگر اس سے ہمدردی کرنا چاہتے ہو تو اسے کچھ تمیز سکھاؤ۔ اٹھنا بیٹھنا بتاؤ اس جانور کو۔"

"ابھی کیا کیا ہے اس نے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ابھی تم نے ڈکار نہیں سنی اس کی ـــــ کوئی بھینسا بھی کیا ڈکراتا ہو گا ایسے۔ میرا تو ـــــ کھانا پیا باہر آنے لگا تھا۔"

زریں تنک کر بولا "دیکھو میم صاحب! ام کو زیادہ نخرا مت دکھاؤ۔ امارا اپنا پیٹ ہے اور اپنا ڈکار ہے۔ ام جس طرح چاہے گا ڈکار لے گا۔ ام مرد بچہ ہے جو کام کرتا ہے ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہے۔ ڈکار بھی ڈنکے کی چوٹ پر مارے گا۔ تمہاری طرح چس پس نہیں کرے گا۔"

"سن رہے ہو۔ سن رہے ہو تم اس جانور کی باتیں۔" سورج میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرائی۔

امریکن مسٹر رابرٹ نے انگلش میں کہا "مس سورج بات تو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ محفل کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھی کو خیال رکھنا چاہیے۔"

میں نے اردو میں زریں گل سے کہا "تم غلطی پر ہو زریں! دیکھو مسٹر رابرٹ بھی تمہیں غلط کہہ رہے ہیں۔"

زریں ایک دم بھنا گیا "خو استاد صیب! تم اس فرنگی کا بات چھوڑ دو۔ اس پاگل کو کیا پتا کہ کھل کھلا کر ڈکار لینے کا کیا مزہ ہوتا ہے۔ یہ تو بس منہ پر ہاتھ رکھ کر چس پس کرنا جانتا ہے۔ بلکہ میں تو

کہتا ہوں کہ یہ فرنگی لوگ ڈکار لیتا ہی نہیں ہے۔ یہ پورا پورا ملک کھا جاتا ہے اور ڈکار نہیں لیتا۔"

"تم بات کو دوسری طرف لے جا رہے ہو۔" صفدر نے کہا۔

"صفدر صیب! آپ بیچ میں مت بولیں۔ یہ ڈکار کا بات ہو رہا ہے اور ام ڈکار کے بارے میں ہی کچھ کہے گا جو امارا دل کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ڈکار اس لیے نہیں بنایا کہ اس کا گلا گھونٹ کر اس کا بیڑا غرق فرما دیا جائے۔ ڈکار تو ایسی چیز ہے..... ایسی چیز ہے۔"

"تم بکواس بند کرتا ہے یا نہیں۔" سوزن زور سے چیخی اور پھر بے اختیار زریں گل پر جھپٹی۔

صفدر نے بروقت سامنے آ کر اسے روک لیا۔ دوسری طرف زریں گل بھی سینہ پھلا چکا تھا اور ہاتھا پائی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ سوزن نے طیش میں اپنی جوتی اتارنی چاہی لیکن صفدر نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ زریں گل دہاڑا "صفدر صیب! چھوڑ دو اس کو۔ ام دیکھتا ہے یہ چھپکلی کیا بگاڑ سکتی ہے امارا۔ تم چھوڑ دو اس کو۔"

سوزن نے زریں گل کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ جواب میں زریں گل نے اسے بمبئی کی بدمعاش لومڑی کا خطاب دیا اور گرج کر بولا "ام کو صرف استاد صیب کا خیال ہے۔ اگر استاد صیب درمیان میں نہ ہو تو خدا کی قسم ام ابھی تمہیں اٹھا کر علاقہ غیر میں لے جائے۔ بہت دیکھا ہے تم جیسا میم صاحب ام نے۔ ادھر علاقہ غیر میں جا کر سب ٹھیک ہو جاتا ہے پھر تم کو ڈکار بھی آئے گا، نہ چھینک، نہ کھانسی۔ تم اپنے ہاتھوں سے امارے لیے نسوار تیار نہ کرے تو امارا نام زریں گل نہیں۔"

میں نے زریں گل کے سر پر ایک جھانپڑ رسید کیا تو اس کا پارا تھوڑا سا نیچے آ گیا۔ دوسری طرف سوزن بھی چیخ چیخ کر تھک گئی تھی۔ صفدر بھی اسے کھینچ تان کر خیموں کی طرف لے گیا۔

خیمے میں آ کر میں نے زریں گل کو بُری طرح جھاڑا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنا دماغ قابو میں رکھے ورنہ یہاں سب کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

وہ بولا "استاد صیب! دماغ قابو میں ہی تھا ورنہ اس کی چٹنی نہ بنا دیتا۔"

"خاک قابو میں تھا۔" صفدر بولا "ذرا غور کرو تم جھگڑ کس جگہ رہے تھے۔ جہاں تم کھڑے تھے وہاں ساتھ ہی اندھی کھائی تھی۔ ہاتھا پائی ہو جاتی تو تم دونوں یاروں میں سے ایک ضرور کھائی میں گرتا۔"

زریں گل نچلے ہونٹ سے مسکرایا "اسی لیے تو صبر کر کے کھڑا تھا وہاں۔ خدا کی قسم آج وہ الو کا بچی ام پر جھپٹنے کی کوشش کرتا تو مزہ آ جاتا۔ ام اس کارروائی کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ وہ سیدھا کھائی میں جاتا اور انا للہ ہو جاتا۔"

اگلے روز ہم نے پھر سارا دن سفر کیا۔ شام کو ہمیں کیمپ کے لیے بڑی مناسب سی جگہ مل گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ کو اپنا "بیس کیمپ" بنا لیں۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اپنے تین چوتھائی پورٹرز فارغ کر دیے اور انہیں کہا کہ وہ ایک ہفتے بعد آ کر ہمیں یہیں سے لے جائیں۔ یہ بڑا خوب صورت مقام تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زمین و آسمان کے درمیان برف پوش پہاڑوں، گھاٹیوں اور جھرنوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کہیں کہیں جگہ جہاں برف کم تھی تھوڑا بہت سبزہ بھی نظر آ جاتا تھا۔ بلند چوٹیوں میں گھری ہوئی یہ جگہ بڑی حد تک الگ تھلگ اور ویران تھی۔ اس روز ہم نے سارا دن کیمپ میں آرام کیا۔ ہمارے امریکن ساتھی مسٹر رابرٹ تصویریں وغیرہ کھینچتے رہے۔ صفدر مطالعے میں مصروف رہا اور میں یوں ہی کیمپ کے اردگرد چہل قدمی کرتا رہا۔ شاہد خان (جو پورٹرز کے بھیس میں تھا) میرے ساتھ تھا۔ وہ پڑھا لکھا شخص تھا لیکن اپنا کردار نبھانے کے لیے ویسے ہی لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ ہماری گفتگو کا موضوع وہی گمشدگیاں تھیں جو پچھلے کچھ برسوں سے علاقے میں رونما ہو رہی تھیں اور جن کے اعداد و شمار اکٹھے کر کے شاہد خان نے ایک سنسنی خیز موضوع ڈھونڈ لیا تھا۔ شاہد خان کو یقین تھا کہ کوئی جرائم پیشہ گروہ جو مقامی ہے منظم طریقے سے یہ کارروائیاں کر رہا ہے۔ بظاہر ان کارروائیوں کا مقصد لوٹ مار تھا لیکن کوئی اور چکر بھی ہو سکتا تھا۔

اس روز سہ پہر کے وقت پھر زریں گل نے ڈکار لی تھی۔ سوزن کا پارا چڑھ گیا اور ایک بار پھر تو تکرار شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے دلچسپ القابات و خطابات کا تبادلہ ہوا۔ سوزن نے کہا "میں آخری بار کہہ رہی ہوں بھینسے! اگر اب تم نے ایسی ڈکار لی تو میں تمہارے منہ میں ڈنڈا گھسیڑ دوں گی۔"

اس نے ایک کلہاڑی کا دستہ باقاعدہ زریں گل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ زریں کب مونچھ نیچی کرنے والا تھا۔ اس نے بھنا کر اپنا سینہ پھلایا اور پیٹ کو دو تین بار اوپر نیچے کر کے دو لمبی ڈکاریں لیں۔ اس کے بعد پھندنے باز نظروں سے سوزن کو دیکھنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو کر لو جو کرنا ہے۔

اس کی ان "زوردار" ڈکاروں نے سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ صفدر تو باقاعدہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ سوزن کا غصہ بھی دھیما پڑ گیا۔ وہ انگلش میں بولی "شاہ جہاں! یہ دماغی اسپتال کا کیس ہے۔ اس شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہی ہے کہ اسے پاگل خانے پہنچا دیا جائے۔"

شکر ہے کہ اس جملے میں سے "مینٹل ہاسپٹل" کے الفاظ زریں گل کی سمجھ میں نہیں آئے ورنہ وہ سوزن کو سچ مچ پاگل بنا کر رکھ دیتا۔

موسم کے لحاظ سے وہ رات بھی بڑی پُرسکون رہی۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ درمیانی راتوں کا چاند ناگا پربت کی اوٹ سے نکل آیا۔ جب وہ بلندی پر پہنچا تو اس کی کرنیں چوٹی پر پڑنے لگیں۔ یہ ایک ہوش ربا نظارہ تھا۔ میں اور صفدر آرام دہ نیند کو تج کر

رات گئے تک خیمے سے باہر بیٹھے رہے اور اس حسین منظر کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارتے رہے۔ شاہد خان ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اس نے بتایا کہ سیاح حضرات خصوصی کیمروں اور خصوصی تکنیک کے ساتھ اس منظر کی تصاویر اتارتے ہیں جو دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔

اگلے روز میں اور زریں گل جنوب کے رخ پر ٹریکنگ کے لیے نکل گئے۔ ہتھیار کے طور پر ہمارے پاس لانگ رینج پسٹل اور خنجر تھا۔ صفدر، مسٹر رابرٹ اور سوزن نے شمال کی سمت منتخب کی۔ ان کے پاس ریوالور اور رائفل تھی۔ مسٹر رابرٹ کے پاس ایک چھوٹا سا نقشہ بھی تھا۔ اس نقشے پر نشانات تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ ان نشانات کے مطابق ٹریکنگ کریں گے۔ میں اور زریں گل صبح چار بجے نکلے تھے۔ رات آٹھ بجے تک ہم نے علاقے کے بے شمار نشیب و فراز دیکھے اور اپنی اس آوارہ گردی سے بہت لطف اٹھایا۔ وہ علاقہ واقعی دیکھنے کے لائق تھا۔ فطرت اپنے حسین ترین روپ میں وہاں محو خواب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ صدیوں سے یہ خواب ٹوٹا نہیں۔ اس خواب کو منتشر کرنے کے لیے نہ کوئی انسان یہاں آیا اور نہ جانور۔ شاید ہم ان مناظر سے زیادہ لطف اندوز ہوتے اگر ہم صرف سیاح ہوتے لیکن ہم سیاح نہیں تھے۔ ہم یہاں تین گمشدہ افراد کی تلاش میں آئے تھے اور یہاں کے حالات کے بارے میں ہمیں جو رپورٹیں ملی تھیں وہ بھی تسلی بخش نہیں تھیں۔ لہٰذا اس برف زار میں گھومتے ہوئے ایک انجانا سا خدشہ ہمارے ذہن میں موجود رہا اور یہ خدشہ موجود رہنا بھی چاہیے تھا۔ ورنہ ہم اس انجانے دشمن سے غافل ہو جاتے جو یہاں کسی بھی درخت یا پتھر کی اوٹ میں پایا جا سکتا تھا۔ اس جادہ پیمائی کے دوران میں ہمارے ذہن مسلسل مسٹر جوان جاوٹل کے خیال سے الجھتے رہے۔ اس شخص نے مدراس کے کسی تجربہ خانے میں برف زنی کی تھی۔ وہ خاص اقسام نوعیت کی تھی۔ مسٹر جی کلارک کو یقین تھا کہ یہ شخص دفینے کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور اس کی باخبری کا ثبوت وہ چند نوادرات تھے جو اس کے پاس موجود تھے۔ یہ بڑی قابل غور صورت حال تھی۔ یہ شخص فلپائن سے انڈیا پہنچا تھا تو اپنی ٹیم کے ساتھ سیدھا مدراس آیا تھا۔ مدراس کے سوا وہ اور کہیں نہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دفینہ جو ہماری آخری اطلاعات کے مطابق دریائے کارانجا کے کنارے واقع ایک کوٹھی میں تھا اب مدراس پہنچ چکا تھا اور کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس کے سبب دفینے میں موجود کچھ نوادرات مسٹر برن جاوٹل کے پاس بھی پڑ گئے تھے۔

انہی برف پوش پہاڑوں، سنگلاخ چٹانوں اور پرہول گھاٹیوں کے درمیان ہماری یہ آوارہ گردی مسلسل چار روز تک جاری رہی۔ ہم دو گروپس کی صورت میں علی الصباح نکل جاتے اور شام کے بعد واپس آتے۔ ان چار دنوں میں صرف دو اہم واقعات ہوئے۔

دونوں واقعات معمولی نوعیت کے تھے۔ پہلا واقعہ ایک حادثہ تھا جو رابرٹ اور سوزن کو پیش آیا۔ ایک ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے سوزن پھسل گئی۔ رابرٹ نے اسے سنبھالنا چاہا تو وہ بھی پھسلا اور دونوں دس پندرہ فٹ نیچے ایک برفانی گڑھے میں جا گرے۔ رابرٹ کو تو معمولی خراشیں آئیں لیکن سوزن کا پاؤں مڑ گیا اور وہ بمشکل "بیس کیمپ" تک پہنچ پائی۔

سوزن کو چوٹ آنے کا سب سے زیادہ غم زریں گل کو تھا۔ غم اسے اس بات کا تھا کہ سوزن ذرا بلندی سے کیوں نہیں گری اور اس کا نخرہ ٹوٹنے سے بچ کیوں گیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں مجھ سے کئی بار اظہار افسوس کر چکا تھا..... سوزن اور رابرٹ کو پیش آنے والے واقعے میں وہ لانگ رینج واکی ٹاکی بھی ٹوٹ گیا جو ہمارے درمیان رابطے کے کام آتا تھا..... دوسرا واقعہ یہ تھا کہ بیس کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک برف پوش وادی میں ہماری ملاقات ایک کوہ پیما پارٹی سے ہوئی۔ اس پارٹی میں ایک فلپائنی بھی شامل تھا۔ وہ لوگ بھی ان تین کوہ پیماؤں کی تلاش میں تھے جو چار ہفتے پیشتر اچانک لاپتہ ہو گئے تھے۔ اس پارٹی میں ایک سرکاری ایجنسی کے دو اہلکار بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں سختی سے کہا کہ ہم اس علاقے میں سیاحت نہ کریں۔

پانچویں روز ہم کچھ کچھ بور ہونے لگے۔ وہ نظارے جو دلنشیں نظر آتے تھے رفتہ رفتہ دلکشی کھونے لگے۔ کسی حد تک تو کاہلی بھی غالب آنے لگی تھی۔ ہم پورٹرز کو فارغ کر چکے تھے اور انہیں ٹھیک سات روز بعد واپس آنا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم پہلے ہی اس مقام سے ڈیرے اٹھا لیتے۔ (اب ہمارے ساتھ صرف تین پورٹرز تھے)

چھٹے روز ہم صبح سویرے "ٹریکنگ" پر روانہ ہوئے تو کیمپ سے کافی دور نکل گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمیں رات بھی کیمپ سے باہر ایک کھوہ نما جگہ پر بسر کرنا پڑی۔ ہم ساری رات ایک درے میں گھس کر بیٹھے رہے اور ٹھٹھرتے رہے۔ مکمل گرم لباس کے باوجود سردی ہڈیوں سے پار ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ صفدر اور زریں کے علاوہ شاہد خان بھی تھا۔ درحقیقت اس کی تحریک پر ہی ہم کیمپ سے اتنی دور آئے تھے..... صبح سویرے ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ یہ جگہ ضرورت سے زیادہ خاموش تھی۔ کسی پرندے یا جھرنے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ درختوں کا تو نام و نشان نہیں تھا یہاں۔ بس کہیں کہیں برف کی چادر میں سے زرد رو گھاس جھانکتی نظر آتی تھی۔ بہرطور ویران اور سنسان جگہوں کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ روانگی سے پہلے صفدر نے گرد و پیش کی کئی تصاویر بنائیں۔ ہم نے "رک سیک" اپنی اپنی پشت پر کس لیے۔ آئس پوائنٹ (برف پر چلنے میں مدد دینے والی چھڑیاں) ہاتھوں میں پکڑیں، آنکھوں پر اینٹی گلیئر گلاسز چڑھائے اور کیمپ کی طرف اپنے طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب سے آگے شاہد خان تھا، اس کے پیچھے

میں وصفدر اور آخر میں زریں گل۔ میں رابرٹ وغیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ واکی ٹاکی کی عدم موجودگی میں ہم ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں اور کس سمت میں ہیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ ہمارے بارے سے فکرمند ہوں گے۔ ہم تیزی سے قدم اٹھا رہے تھے۔ ابھی ہم نے بمشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک ایک آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا اور جیسے سکتے کی کیفیت میں رہ گیا۔ مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ مجھ سے صرف چار پانچ قدم کے فاصلے پر ایک کرخت چہرے والا ہیکل شخص کھڑا تھا۔ اس کے لمبے بال کندھوں تک چلے گئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے اور اس کے بالوں بھرے ہاتھوں میں ایک چمک دار پھل کا کلہاڑا تھا۔ یہ شخص ابھی ابھی ایک تنگ پہلے نشیب سے برآمد ہوا تھا۔ یہ وہی نشیب تھا جس میں ہم اترنے والے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا ایک دل دوز چیخ نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ یہ چیخ میرے عقب سے بلند ہوئی تھی اور یقیناً زریں گل کی تھی۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ زریں گل برف پر اوندھا گرا تھا اور اس کے عقب میں دو افراد موجود تھے۔ یہ دونوں گرانڈیل اور عجیب و غریب حلیے کے مالک تھے۔ ان میں سے جو زریں گل کے قریب تھا اس کے ہاتھ میں ویسا ہی وزنی کلہاڑا تھا جیسا میں نے ایک ساعت پہلے دیکھا تھا۔ حیرت اور خوف کا شدید ریلا گزرا تو میرا ہاتھ برق رفتاری سے اپنی پنڈلی تک پہنچا اور رام پوری خنجر میرے ہاتھ میں آگیا۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے لیے میں اس شخص کو بھول گیا تھا جو سب سے پہلے نظر آیا تھا۔ اس مختصر مہلت کا فائدہ اٹھا کر اس نے مجھ پر کلہاڑے سے وار کیا۔ مجھے اپنے پہلو میں ایک ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔ میں پھرتی سے نیچے جھکا اور یہی اضطراری حرکت میری زندگی کی ضامن بن گئی۔ کلہاڑے کا چمکیلا پھل میرے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا نکل گیا تھا۔ میں نے خنجر والے ہاتھ کو "ریورس" میں حرکت دی۔ خنجر مد مقابل کی ران میں لگا اور کچ کی آواز سے پانچ چھ انچ تک گھس گیا۔ مضروب تکلیف کے زیر اثر دُہرا ہوا۔ میں نے اس کے چہرے پر بھرپور ٹھوکر رسید کی اور اسے کلہاڑے سمیت کئی فٹ پیچھے اچھال دیا۔ یہی وقت تھا جب میں نے صفدر کو پسٹل برآمد کرنے اور اس کے ذریعے ایک حملہ آور کو نشانہ بناتے دیکھا۔ صفدر نے پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے گھٹنوں میں تھوڑا سا خم تھا اور وہ اس گرانڈیل شخص کو نشانہ بنا رہا تھا جو دونوں ہاتھوں میں کلہاڑا بلند کیے جان لیوا انداز میں صفدر پر جھپٹ رہا تھا۔ ابھی وہ صفدر سے دو تین قدم دور تھا کہ دھماکے سے ویرانہ گونج اٹھا۔ ۳۸ بور کی مہلک گولی حملہ آور کے نرخرے میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر صفدر کے قدموں میں گرا۔ اس کا کلہاڑا چھوٹ کر پختہ برف پر گرا تھا اور دور تک پھسل گیا تھا۔ عین اسی وقت ایک برفانی تودے کی اوٹ

سے فائر ہوا۔ یہ سائیلنسر لگے ریوالور کا فائر تھا۔ میں نے خود کو زمین پر گرا لیا اور اس کے ساتھ ہی صفدر اور شاہد خاں کی طرف دیکھا۔ گولی صفدر پر چلائی گئی تھی اور یہ گولی نشانے پر لگی تھی۔ میں نے دیکھا صفدر ایک دم دُہرا ہو گیا ہے اور سیاہ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر برف پر گر گیا ہے۔ صفدر نے اپنی کلائی تھام رکھی تھی۔ یہی وقت تھا جب نشیب میں واقع تودے کے عقب سے دو مزید افراد نکل کر سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا ریوالور اور دوسرے کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی جدید رائفل تھی۔ اپنے ساتھیوں کی طرح یہ دونوں افراد بھی عجیب و غریب حلیے کے مالک تھے۔ آنکھیں نشے میں سرخ، بال لمبے، کانوں میں بالے اور چہروں پر خود رو داڑھیاں۔ ان کے چہرے اور ہاتھوں کی جلد بے حد کھردری اور سخت نظر آتی تھی۔ نجانے کیوں انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں برفانی جانور ہیں۔ وہ عجیب و غریب لباس میں تھے۔ کسی نے بے حد قیمتی امپورٹڈ جیکٹ پہن رکھی تھی، کوئی اوور کوٹ میں تھا، کسی نے مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ان سب کے پاؤں میں برف پر چلنے والے مخصوص جوتے تھے۔ رائفل بردار نے رائفل میری طرف سیدھی کی اور وحشیانہ انداز میں کچھ بولا۔ میں یہ زبان سمجھ نہیں سکا۔ بہرحال یہ بات ظاہر تھی کہ وہ مجھے خنجر پھینکنے کا حکم دے رہا ہے۔ اس کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ میں نے حکم عدولی کی تو وہ ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میں نے گہری سانس لے کر خون آلود خنجر برف پر پھینک دیا اور پھر ٹھوکر مار کر اسے رائفل بردار کی طرف کھسکا دیا۔ صفدر کا پسٹل ذرا سی پھسل کر نیچے کی طرف چلا گیا تھا۔ ریوالور بردار نے آگے بڑھ کر پسٹل قبضے میں لے لیا۔ میرے عقب میں اخبار نویس شاہد خاں بھی ہکا بکا کھڑا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیے تھے۔

میں نے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی کلائی مٹھی میں دبا رکھی تھی۔ بند مٹھی کے اندر سے خون بہ دھاروں کی صورت میں نکل رہا تھا اور برف پر گلکاریاں کر رہا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر زریں گل کی تھی۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں پڑا تھا۔ میں بجا طور پر یہ اندیشہ کر سکتا تھا کہ کلہاڑے کے وار سے زریں گل کی گردن کٹ چکی ہے یا ریڑھ کی ہڈی حرام مغز سمیت دو ٹکڑے ہو چکی ہے۔ لیکن زریں کے آس پاس کہیں خون نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر اس کی پشت پر کلہاڑے کا کوئی گہرا زخم موجود تھا تو آس پاس کی برف خون سے لالہ زار ہونی چاہیے تھی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ زریں گل بھاری لباس کی وجہ سے شدید زخمی نہ ہوا ہو اور صرف مکر کیے پڑا ہو۔ جوں ہی کوئی اس کے قریب پہنچے وہ لالے شد جبر کی طرح بڑک مار کر اس سے لپٹ جائے یا اپنا "آئی پول" اس کے سینے سے پار کر دے اور یہی امکان سب سے زیادہ تشویش ناک تھا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا اگر ہم میں سے کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو یہ منگی زریں

کوشش ہوگی۔

رائفل بردار شخص مستحکم قدموں سے زریں کے پاس پہنچا۔ اس کی حرکات و سکنات میں کسی درندے کی سی پھرتی اور ہوشیاری تھی۔ اپنے بھاری بھرکم بوٹوں سے اس نے اچانک زریں کی پسلیوں میں زوردار ضرب لگائی۔ دھپ کی آواز دور تک گئی۔ رد عمل کے طور پر زریں گل کے جسم میں تھوڑی سی لرزش پیدا ہوئی اور پھر ساکت ہو گیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ گہری بے ہوشی میں ہے۔

وہ کل سات افراد تھے۔ ان میں سے ایک صفدر کی گولی کا نشانہ بنا تھا اور اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دو بور پسٹل کی گولی اس کے نرخرے میں لگی تھی اور نالو چیر کر کھوپڑی کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ مرنے والے کا خون برف پر دور تک پھیلا ہوا تھا..... گرم خون برف اب لوتھڑوں کی صورت میں جم رہا تھا۔ باقی چھ افراد کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک عورت ہے لیکن وہ بھی مردوں ہی کی طرح لمبی تڑنگی اور جنگجو تھی۔ وہ ایک پائجامہ نما پتلون پہنے ہوئے تھی۔ پتلون کے پائنچے فل بوٹوں کے اندر تھے۔ بالائی جسم پر بوسیدہ سی جیکٹ تھی۔ عورت نے اپنے ماتھے پر سفید رنگ سے دو متوازی لکیریں کھینچ رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے دستے کی دو دھاری کلہاڑی تھی۔ مردوں کی طرح یہ عورت بھی نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں دیکھ کر خطرے کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے یہ سارا خواب کا منظر لگ رہا تھا۔ ابھی صرف ڈیڑھ دو منٹ پہلے ہم چاروں اچھے بھلے جا رہے تھے۔ اب ہم میں سے دو زخمی تھے اور دو حیران پریشان مسلح افراد کے نرغے میں کھڑے تھے۔ اس منظر میں سب سے خوفناک چیز وہ لاش تھی جو ہمارے درمیان پڑی تھی۔ یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ یہ سوال برق کی طرح میرے ذہن میں کوند رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ انہیں اچانک زمین نے اگل دیا ہے لیکن عجیبی بات تھی کہ انہیں زمین نے نہیں اگلا۔ وہ ہماری گھات میں تھے اور ہمیں دیکھ کر اچانک سامنے آگئے۔ کیا یہ لوگ اس گروہ میں سے تھے جو اس سے پہلے بہت سے لوگوں کے لیے موت کا سامان کر چکا تھا؟ کیا بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی ایک خوفناک صورت حال کا شکار ہو چکے تھے۔

یہ آخری خیال ذہن میں آتے ہی بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا منہ بالکل خشک ہو رہا ہے اور ہاتھ پاؤں کے عضلات اکڑے ہوئے ہیں۔ میں کچھ کرنا چاہ رہا تھا لیکن آتشیں ہتھیاروں کے بیرل اور بیرل کے تاریک سوراخ ہمیشہ سے زیادہ خوفناک محسوس ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی بلاوجہ یہ سوراخ شعلے اگل دیں گے۔ حملہ آوروں میں سے ایک شخص نشیب کے کنارے کھڑا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر کسی کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ جسے وہ بلا رہا تھا وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ دو افراد نے بڑی

بے رحمی سے زریں گل کو ٹانگوں سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے نشیب کے پاس لے آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں نشیب کی طرف سے ایک اور غلیظ و بدبودار شخص برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے دو پہاڑی خچر چلے آرہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ زریں گل کو ان میں سے ایک خچر پر لادا جائے گا۔ دوسرا خچر شاید لاش کی سواری بننے والا تھا۔ اچانک ایک شخص پیچھے سے آیا اور اس نے رائفل کی نال میری کمر سے لگا دی۔ دوسرے نے بڑی چابک دستی سے میرے جسم پر ہاتھ پھیر کر تلاشی لی۔ اس کارروائی کے دوران میں اس نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی جو مجھے مزاحمت کا موقع فراہم کرتی یا "رسک" لینے پر اکساتی۔ رائفل کی نال کمر سے پیوست تھی اور میری ایک جنبش جسم میں ایک درجن گولیاں اتار سکتی تھی۔ تلاشی کے بعد میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ ظاہر ہے میرے بعد شاہد خاں اور صفدر کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا، جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا اور آوازوں سے بھی اندازہ ہوا، تلاشی کے وقت صفدر نے ایک دلیرانہ کوشش کی۔ اس نے رائفل بردار کی رائفل پر ہاتھ ڈالا اور اسے اڑنگا لگا کر نیچے گرا دیا۔ وہ اس کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اگر اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر تک پہنچ جاتی تو وہ تین چار افراد کو ضرور بھون کر رکھ دیتا۔ لیکن وہ رائفل پر کنٹرول حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اس نے اپنے قریب آنے والے دو افراد کو شدید ضربیں لگائیں اور ایک کا جبڑا توڑ ڈالا۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی اور کمر سے خودکار رائفل کی نال لگی ہوئی تھی۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ شور شرابا کیسا ہے۔ اس وقت مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ سب کچھ صفدر کر رہا ہے۔ اگر صفدر کر رہا تھا تو بہت خطرناک کر رہا تھا۔ میرے کان گولی کی آواز پر تھے اور خیال تھا کہ ابھی ایک آدھ سیکنڈ میں وہ لوگ صفدر کو بھون کر رکھ دیں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ آٹھ دس دن بعد سمجھ میں آئی...... جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ مزاحمت کرنے والے کی مزاحمت ختم کر دی گئی ہے۔ وہ لوگ آپس میں با آواز بلند باتیں کر رہے تھے لیکن کوئی ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ صرف ایک دو بار شاہد خاں کی آواز سنائی دی۔ اس نے ان ہی کی زبان میں کوئی بات کی تھی۔

ہم وہاں صرف چار پانچ منٹ رکے پھر میں نے اپنی پشت پر رائفل کی سخت نال کا وحشیانہ دباؤ محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی غراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ مجھے کسی نامعلوم سمت میں چلنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ بمشکل بیس قدم چل کر ہم رک گئے۔ کسی نے مجھے اچانک زور سے دھکا دیا۔ میں اوندھے منہ برف پر گرا۔ میں نے جھنجلا کر اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹانی چاہی لیکن فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کی نال پھر میری کمر سے آلگی۔ کوئی مجھے ٹھوکا دے کر وحشیانہ انداز میں غرایا۔ یقینی بات تھی کہ مجھے اپنی جگہ جوں کا توں پڑا رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ دو سخت

جان افراد نے مجھے دبوچ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی وحشیانہ گرفت میں اپنی کلائیوں اور اپنی گردن کے منکے پر محسوس کررہا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کے گھٹنے میری کمر میں پیوست تھے۔ میرے ہاتھ موڑ کر میری پشت پر باندھ دیے گئے اور لباس کی تلاشی لے کر ہر چیز نکال لی گئی۔ پھر مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا گیا اور چلنے کا حکم دیا گیا۔ باتوں اور آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ باقی لوگ بھی ہمارے ساتھ آ رہے ہیں جن میں شاہد خاں، صفدر اور بے ہوش زریں گل بھی شامل تھا۔

یہ سفر میری توقع سے کہیں زیادہ طویل ثابت ہوا۔ ہم دوپہر تک بغیر رکے چلتے رہے۔ پہلے ہمارا سفر بالائی ڈھلوانوں پر تھا پھر ہم کسی سرنگ نما جگہ سے گزرے۔ یہاں زمین پتھریلی تھی اور خنکی کا احساس بھی کم تھا۔ اسی سرنگ میں قدموں کی چاپ، نچروں کی ٹاپ اور دیگر آوازیں گونج رہی تھیں۔ سرنگ سے نکل کر ہم ایک دشوار گزار چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی لہٰذا میں کئی بار پھسلا۔ آخر ایک رائفل بردار نے میرا ہاتھ اپنے سخت کھردرے ہاتھ میں تھام لیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے جسم سے نہایت ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ غالباً یہ لوگ ہفتوں تک نہاتے نہیں تھے۔

اس طویل چڑھائی کا اختتام کسی درہ نما جگہ پر ہوا۔ یہاں نہایت تیز اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہمارے اردگرد خشک پتھر تھے۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ قدم زمین سے اکھڑتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ درے میں سے گزر کر ہم ایک نسبتاً پرسکون جگہ پر آ گئے۔ یہاں ہوا کم تھی اور اردگرد سبزے کی موجودگی بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہاں تھوڑی دیر سستانے اور سانسیں درست کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر چلنے لگے۔ اب ہمارا سفر ڈھلوان کا تھا۔ جوں جوں ہم نیچے اتر رہے تھے کسی گھنے جنگل میں گھستے جا رہے تھے۔ کسی کسی جگہ مجھے جھرنوں کی گنگناہٹ بھی سنائی دی۔ غالباً دو ڈھائی بجے کا وقت تھا جب ہم درختوں کے نیچے کسی ہموار سطح پر بیٹھے اور کھانا کھایا۔ میرے ہاتھ چوں کہ پشت پر بندھے ہوئے تھے لہٰذا مجھے کھانا کھلانے کے لیے وہی لمبی تڑنگی عورت آئی جس کے ہاتھوں میں میں نے کلہاڑی اور آنکھوں میں خون آشام چمک دیکھی تھی۔ کھانا میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی کھانا تھا جیسا ہم "ٹریکنگ" کے دوران کھاتے رہے تھے۔ اس ڈبا بند خشک کھانے میں صرف پانی ملایا جاتا ہے اور ابالا جاتا ہے۔ ہر ڈش منٹوں میں تیار ہو جاتی ہے۔ اس خون آشام عورت نے چمچے کی مدد سے جو شے میرے منہ میں ٹھونسنی شروع کی وہ "نوڈلز" (چائنیز سویاں) تھیں۔ گاہے گاہے وہ ایک گلاس کے ذریعے مچھلی کے سوپ کا ایک گھونٹ بھی مجھے پلا رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر محوِ سفر ہو گئے۔ یہ ساری وادی سرسبز تھی اور درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس سفر کے دوران میں ہم کسی تنگ پہاڑی دراز کے اندر سے گزرے اور پھر کسی پُرشور پہاڑی نالے کا چوبی پل پار کر کے کسی بستی میں داخل ہو گئے۔ یہاں بکریوں کے ممیانے کی آوازیں بھی تھیں اور بچوں کی چہکاریں بھی۔ کبھی کبھی رکھوالی کے کتے بھی بھونکنے لگتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے اردگرد لوگ موجود ہیں اور ہمیں دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب ناقابلِ فہم زبان میں باتیں کر رہے تھے پھر اچانک کچھ عورتیں رونے دھونے لگیں۔ ان میں سے ایک عورت کی آواز کافی بلند تھی اور اس کا انداز بین کرنے والا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اس شخص کے لواحقین ہیں جس کی لاش ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔

تھوڑی دیر میں رونے دھونے کا شور پیچھے رہ گیا اور ہم بستی کے چند پُرپیچ راستوں پر سفر کرنے کے بعد کسی غار نما جگہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے قدموں کے نیچے زمین پتھریلی اور کھردری تھی۔ ایک جگہ ہم رک گئے۔ کسی نے میرے قدموں میں بیٹھ کر میرے جوتوں کے تسمے کھول دیے۔ یہاں سے ہم آگے بڑھے تو پاؤں کے نیچے دبیز قالین کا احساس ہوا۔ پٹی میں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس غار یا سرنگ میں مشعلیں روشن ہیں۔ رائفل بردار بدستور میرے عقب میں تھا اور اس کی رائفل گاہے گاہے میری کمر سے چھو جاتی تھی۔

ایک جگہ پہنچ کر میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔ میں اپنے اردگرد کا منظر دیکھنے کے قابل ہو گیا اور یہ منظر واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔ میں ایک بلند و بالا غار میں تھا۔ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا لیکن غار کے اندرون کی روشنی داخل نہیں ہو رہی تھی۔ روشنی حاصل کرنے کے لیے چار پانچ جگہوں پر گیس لیمپ روشن کیے گئے تھے۔ اس کشادہ غار کے فرش پر مختلف رنگوں کے مختلف قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک شاہانہ کرسی پر گہری سلیٹی آنکھوں والا ایک لمبا چوڑا شخص بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بڑا اور لمبوترا تھا۔ لمبے لمبے بال شانوں تک چلے گئے تھے اور ان بالوں میں قیمتی پتھر، یاقوت، لعل، زمرد اور فیروزہ جڑے ہوئے تھے۔ یہ ہیبت ناک شخص مقامی لباس میں تھا اور کسی قدیم پہاڑی قبیلے کا سردار نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے منہ میں قیمتی سگار اور پاؤں میں جدید طرز کے جوتے دیکھ کر اس خیال کی نفی ہوتی تھی کہ وہ کسی قدیم قبیلے کا غیر مہذب سردار ہے۔ اس کے ساتھ والی کرسی پر ایک مقامی لڑکی بیٹھی تھی، بلکہ اس کو عورت ہی کہنا چاہیے۔ وہ قبول صورت تھی۔ اس کے بالوں میں بھی قیمتی پتھر ٹانکے گئے تھے۔ وہ مقامی لباس کے اوپر فر کا نہایت قیمتی اوور کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ کمرے میں دس بارہ مسلح افراد موجود تھے اور ان کے نرغے میں میرے اور صفدر کے علاوہ شاہد خاں بھی تھا۔ میری طرح ان دونوں کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ صفدر کی زخمی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے

علاوہ بھی اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ یہ نشانات یقیناً اس مزاحمت کا نتیجہ تھے جو صفدر نے گرفتاری سے قبل کی تھی۔ زریں گل کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش لاحق ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاہد خاں مقامی زبان کی کچھ سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ میں نے شاہد خاں سے پوچھا کہ زریں گل کہاں ہے؟

وہ بولا "اس کی گردن پر سخت چوٹ آئی ہے۔ وہ تین چار گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آیا ہے۔ لیکن ابھی بھی پوری طرح سنبھلا نہیں۔ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اسے یہ لوگ مقامی معالج کے پاس لے گئے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں یہ۔۔۔ کچھ اندازہ ہوا ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شاہد خاں جواب میں کچھ کہتا ایک رائفل بردار نے بری طرح اسے جھڑک دیا۔ غالباً انہیں ہماری یہ گفتگو اجنبی زبان میں سخت ناپسند ہوئی تھی۔

وہ لوگ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس گفتگو کے دوران میں بار بار شاہد خاں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ سلیٹی آنکھوں والے شخص کو وہ لوگ "پاناسہ خا" کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ اس نے فرداً فرداً ہمارے چہرے گھورے پھر اس کی نگاہ میری کلائی کی خوب صورت اور منفرد طرز کی گھڑی پر پڑی۔ اس نے میرے عقب میں پہنچ کر گھڑی کو غور سے دیکھا اور میری کلائی سے اتار لیا۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح پاناسہ نامی شخص کے جسم سے بھی حیوانی بو اٹھ رہی تھی۔ جلد پر غلاظت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی غیر معمولی طور پر بھاری آواز میں ساتھیوں کو کوئی حکم دیا اور وہ ہمیں لے کر اس غار سے نکل آئے۔

وہ غار سرنگ کی طرح طویل تھا۔ ہم دہانے کے قریب پہنچے تو روشنی اندر آنے لگی۔ غار کے دہانے کے پاس چار مسلح افراد موجود تھے۔ یہ سب بے ڈھنگے لباسوں میں تھے اور ان میں ایک عورت بھی تھی جس نے ایک مردانہ قمیص کے نیچے اونی پتلون پہن رکھی تھی اور سر پر اسکارف نما کپڑا باندھ رکھا تھا۔ ان لوگوں کے رنگ برنگے لباس اور ان کا ساز و سامان دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ سب لوٹ مار کا مال ہے۔ روزمرہ استعمال کی دو اشیا بھی ہمیں اپنے اردگرد نظر آ رہی تھیں۔ ان کے حقیقی مالکان یقیناً مقتول ہو کر عدم آباد سدھار چکے تھے یا پھر کسی نامعلوم انجام سے دوچار ہو چکے تھے۔

غار سے باہر نکلتے ہی ہمیں اپنے سامنے ایک نئی دنیا نظر آئی۔ غار کے دہانے کے اوپر ایک ہموار پتھریلی سطح پر ایک غضب ناک سانڈ کی شبیہ کندہ کی گئی تھی۔ اس شبیہ کے ساتھ ہی ایک درخت تھا جس کی شاخوں سے بے شمار پُراسرار پوٹلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان لاتعداد دراڑیں تھیں۔ ان دراڑوں کو تراش خراش کر کشادہ کیا گیا تھا اور گھروندوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ کہیں کہیں قدرتی غار اور کھوہ بھی موجود تھے۔ پتھریلے راستوں پر بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ ان میں بچے بوڑھے، مرد عورتیں سب شامل تھے۔ بہت سی عورتوں کے ماتھے پر سفید رنگ کی ایک باریک دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم نسبتاً بلند اور کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر میں اس وادی کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوا جہاں ہم موجود تھے۔ مجھے اپنے سامنے اور بائیں جانب بلند و بالا پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ پہاڑ کیا تھے پتھر کی عمودی دیواریں تھیں جو آسمان کو چھوتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان دیواروں کے عقب میں کسی پہاڑ کی برفانی چوٹی اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ قرب و جوار کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم دس بارہ ہزار فٹ سے کم بلندی پر نہیں ہیں۔

غار سے نکلنے کے بعد ہم تینوں کے راستے جدا ہو گئے۔ شاہد خاں کو تو پاس ہی واقع درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل کر دیا گیا۔ صفدر کو ان قطار اندر قطار گھروندوں کی طرف لے جایا گیا جو ایک پہاڑ کے دامن میں واقع تھے۔ مجھے دو مسلح افراد نے اپنے نرغے میں لے لیا اور ایک یخ بستہ جھرنے کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتے بلندی کی طرف جانے لگے۔ راستے میں موجود لوگ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم ان کے انداز سے یہ بات ظاہر تھی کہ ایسے مناظر ان کے لیے عجوبہ نہیں ہیں۔ مسلح افراد کے ہاتھوں میں دو عدد خوف ناک رائفلوں کا نظارہ بھی ان کے لیے انوکھا نہیں تھا اور نہ ہی یہ بات انوکھی تھی کہ میں کسی مزاحمت یا احتجاج کے بغیر خاموشی سے رائفل برداروں کے ساتھ چلا جا رہا ہوں۔ راستے میں ایک دو جگہ مجھے مکانات بھی نظر آئے۔ یہ پتھروں سے بنے ہوئے نیم پختہ کوٹھے تھے۔ چھتیں کچی تھیں اور ایک خاص بات یہ تھی کہ ان ساری چھتوں پر بے تحاشا گھاس پھونس اگا ہوا تھا۔ کسی کسی چھت پر مجھے مکئی کے پودے بھی نظر آئے۔ میں نے نوٹ کیا کہ ایسے سارے مکانات گھنے درختوں کے نیچے واقع ہیں اور یہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا کہ مکانات گھنے درختوں کے نیچے ہوں۔ میرے ساتھ آنے والے افراد میں سے ایک کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بہت وزنی تھیلا تھا۔ وہ اسے بہت مشکل سے اٹھا پا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں کوئی زر و زیور ہو۔ لیکن زر و زیور اتنا وزنی نہیں ہو سکتا۔

دو تین فرلانگ دور مجھے پتھروں سے بنے ہوئے ایک مکان میں پہنچا دیا گیا۔ یہ مکان تین چار کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل تھا۔ برآمدے سے آگے ایک وسیع احاطہ کھلا پڑا تھا۔ یہاں میں نے تین چار درختوں کے تنے دیکھے۔ ان تنوں سے چھلکا اتار دیا گیا تھا اور اب انہیں ایک مخصوص رخ سے کاٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ کوشش کرنے والا مزدور ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ تقریباً چار پانچ فٹ لمبی دستی آری کے ذریعے وہ ایک تنے میں جھری ڈال رہا تھا اور پیچھے

سے شرابور تھا۔ جس چیز نے مجھے حیرت زدہ کیا وہ ایک زنجیر تھی جو اس ادھیڑ عمر شخص کے پاؤں میں تھی۔ اس دو فٹ لمبی زنجیر کے دوسرے سرے پر لوہے کا ایک وزنی گولا تھا۔ کم و بیش پچیس کلو وزن تو ہوگا اس آہنی گولے کا۔ میں نے ایسے آہنی گولے پرانے دور کی فلموں میں دیکھے تھے لیکن اپنی آنکھوں سے آج میں پہلی بار یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جبری مشقت لینے کا یہ انداز انسانیت سوز تھا۔ مشقت کرنے والے زندی کو اپنے ساتھ یہ گولا بھی گھسیٹنا پڑتا ہے۔ بھاگنا تو دور کی بات ہے وہ نارمل انداز میں حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔

میں اس مصیبت زدہ مزدور کو دیکھ رہا تھا جب "ہاتھی" کا ایک جوڑا اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ کہنے کو تو وہ مرد اور عورت تھے لیکن انہیں ہاتھی اور ہتھنی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ دونوں بے حد فربہ اندام اور بے ڈول تھے۔ مرد نے داڑھی مونچھ، سر بھی کچھ منڈوا رکھا تھا۔ عورت نے اپنے روکھے بے رونق بالوں کو سر پر ایک گھونسلے کی شکل میں سجایا ہوا تھا۔ دونوں کے کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ یہ میاں بیوی ہیں اور اس گھر کے مالک ہیں۔ میرے ساتھ آنے والے مسلح افراد سے میاں بیوی کی گفتگو ہوئی۔ میاں بیوی نے مجھے سرتاپا گہری نظروں سے گھورا۔ جیسے میں انسان نہیں کوئی قربانی کا بکرا ہوں اور وہ میری قدروقیمت کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ اس دوران میں برآمدے میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بھی نظر آئیں۔ لڑکا کم عمر تھا۔ لڑکیوں میں سے چھوٹی کی عمر چودہ پندرہ سال اور بڑی کی انیس بیس سال ہوگی۔ وہ سب دلچسپی سے مجھے دیکھ رہے تھے اور زیرلب مسکرا بھی رہے تھے۔ میں خود کو سچ مچ قربانی کا جانور محسوس کرنے لگا، جسے گھر میں دیکھ کر تمام اہل خانہ شاداں ہو جاتے ہیں۔

میرے ساتھ آنے والے مسلح افراد میں سے ایک نے وہ چرمی تھیلا کھولا جسے وہ بڑی مشکل سے اٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔ میں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں بھی ایک آہنی گولا موجود ہے۔ بالکل ایسا ہی گولا اور زنجیر میں ادھیڑ عمر مزدور کے پاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ یہ دوسرا آہنی گولا میرے پاؤں کے لیے ہے۔ یہ ایک زبردست "شاک" تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے یہ شاک برداشت کرنا ہے کیوں کہ دو عدد خوف ناک رائفلیں مجھے زد میں لیے ہوئے تھیں اور میرے ہاتھ نائیلون کی رسی سے پشت پر بندھے تھے۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار کر لیا۔

چند لمحے بعد رائفل بردار کے حکم پر مجھے نیچے بیٹھنا پڑا۔ دوسرے رائفل بردار نے پھرتی اور چابک دستی سے زنجیر کا ایک سرا میری پنڈلی سے منسلک کر دیا تھا۔ یہ ایک کڑا سا تھا جس میں چابی گھما کر مقفل کر دیا گیا۔ میری پنڈلی زنجیر میں جکڑی گئی تو رائفل بردار فارغ ہو کر واپس چلے گئے۔ اب میں کلی طور پر اہل خانہ کے سپرد تھا اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ لڑکیاں جو اب تک برآمدے میں کھڑی تھیں، جھجکتی ہوئی قریب آگئیں۔ دس بارہ سال کا خوش شکل لڑکا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس نے میری جیکٹ میں لگے ہوئے چمکیلے مونوگرام میں زبردست دلچسپی ظاہر کی اور پھر ایک جھٹکے سے اسے اکھاڑ لیا۔ میں اپنے آپ میں تلملا کر رہ گیا، بہرحال کسی قسم کا احتجاج بے کار تھا۔ ہاتھی نما شخص نے میرے بال مٹھی میں جکڑ کر میرا چہرہ اپنی طرف پھیرا اور اپنی منحوس زبان میں کوئی تبصرہ کیا پھر میری کمر پر ایک لات رسید کی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو جاؤں۔ کمر پر لات کھانا مجھے سخت ہتک آمیز محسوس ہوا لیکن میں نے چونکہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا لہٰذا یہ لات ہضم کر گیا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہضم کرنے کو تیار ہو گیا۔

تیرہ چودہ گھنٹے میں کیسا انقلاب آگیا تھا۔ اُستاد جہانی جو جرم وسزا کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام تھا، ننگے سر ننگے پاؤں، ننگے فرش پر بیٹھا تھا اور عہد قدیم کے کسی بد نصیب غلام کی طرح پابہ زنجیر تھا...... خطرات کی دھار پر چلنے والوں کے ساتھ ایسی انہونیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو رہا تھا کہ ذہن چکرا کر رہ گیا تھا...... کمر پر دوسری لات کھانے سے پہلے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اہل خانہ ناز دلانے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ لڑکیوں سمیت وہ سب میلے کچیلے تھے اور ان کے جسموں سے ایک ناگوار بُو اٹھ رہی تھی۔ معلوم نہیں یہ بُو کیوں ان لوگوں کے وجود کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ ہاتھی نما شخص نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے قدم اٹھایا۔ قدم منوں بھاری ہونا ایک محاورہ ہے لیکن میرے لیے یہ محاورہ حقیقت بن گیا تھا۔ پچیس تیس کلو وزنی گولے کو پتھریلی زمین پر اپنے ساتھ گھسیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ کام کرنا تھا لہٰذا کسی نہ کسی طور کر گزرا۔ مضحکہ خیز انداز میں چلتے ہوئے ہر قدم پر جی چاہا کہ "ہاتھی" پر جھپٹ پڑوں اور اگر کچھ اور نہیں تو دانتوں سے ہی اس کا نرخرا ادھیڑ دوں۔

ہمیں پچیس گز دور احاطے کے ایک گوشے میں دو چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ پیمائش بمشکل آٹھ ضرب آٹھ فٹ ہوگی۔ چھت اتنی ہی اونچی تھی کہ میں رکوع کے بل کھڑا ہو سکتا تھا۔ اس گھروندے کا دروازہ لکڑی کے موٹے تختوں کا تھا۔ اندر ایک چٹائی، دو تین برتنوں اور ایک بہت پرانے لحاف کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہاتھی نما شخص نے اپنے لباس میں سے ایک کراری دار چاقو نکالا۔ یہ چاقو میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر دھمکی آمیز لہجے میں کچھ اور کہا پھر میرے بندھے ہوئے ہاتھوں کی رسی کاٹ کر مجھے کمرے میں دھکیل دیا۔ دروازہ بند ہوا تو میرے ارد گرد گہری تاریکی پھیل گئی۔ کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔ میں اندازے سے ٹٹول کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ کئی گھنٹے بندھے رہنے کے سبب میرے ہاتھ سن ہو رہے تھے اور کلائیوں پر

رسی کے گہرے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ میں اپنی کلائیوں کو سہلاتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے۔

O☆O

اگلے روز صبح سویرے مجھے ناشتا دیا گیا۔ میں اس ناشتے کو دیکھ کر حیران ہوا۔ مرغی کے دو کچے انڈے، گائے کا کچا دودھ اور ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے۔ یہ بھی ڈبل روٹی اسی سامان کا حصہ تھی جو کل صبح سویرے ان لوگوں نے ہم سے چھینا تھا۔ بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ میں نے دو منٹ میں یہ ناشتا صاف کر دیا۔ جونہی میں ناشتے سے فارغ ہوا ایک شخص میری کوٹھری میں آدھمکا۔ منحنی سا یہ شخص اس گھر میں گھریلو ملازم اور چوکی دار کے ملے جلے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس نے مجھے کوٹھری سے نکالا اور اس احاطے میں پہنچا دیا جہاں کل شام والا ادھیڑ عمر شخص موجود تھا اور کام شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اس کے پاس ایک کے بجائے دو دستی والی آری تھی۔ اس آری کو دو افراد چلاتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ آج مجھے اس شخص کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ منحنی شخص نے دھمکی آمیز اشاروں کنایوں کے ذریعے مجھے میرا تمام کام سمجھایا اور واپس چلا گیا۔

میں نے اپنے ساتھی قیدی کو غور سے دیکھا۔ وہ کوئی بلتستانی تھا۔ ناکافی خوراک اور سخت مشقت کے سبب اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ پاؤں سے منسلک وزنی گولہ کھینچ کھینچ کر اس کی پنڈلی پر زخم آگیا تھا اور وہاں مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ وہ بار بار ہاتھ سے ان مکھیوں کو اڑانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی پرانے زخم کا نشان اس کی دوسری پنڈلی پر تھا۔ یقیناً یہ شخص ایک طویل عرصے سے یہاں موجود تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا "تم اردو جانتے ہو؟" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے مہیب سائے تھے۔ میں نے اپنے الفاظ پشتو میں دہرائے۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔

اس یک طرفہ "گفتگو" کے بعد ہم دونوں کام پر لگ گئے۔ چیڑ کے ایک موٹے تنے کی ایک جانب میں بیٹھ گیا اور دوسری طرف وہ۔ دو دستی والی آری تنے پر رکھ دی گئی اور ہم اسے حرکت دینے لگے۔ آری چلانا آسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں کہیں مشکل تھا۔ سردی کے باوجود دو گھنٹے میں میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میرے ہاتھ شل پڑنے لگے تو میرے ساتھی نے زیادہ زور لگانا شروع کر دیا۔ اس مشقت کے دوران میں، میں ماحول کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ اس احاطے میں ایک طرف لکڑی کے چرائی شدہ تختوں کا انبار لگا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ سارے تختے اسی بلتستانی نے چیرے ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس بیگار میں اس کے ساتھ کچھ اور بدنصیب بھی شریک ہوں۔ یہ گھر اس بستی کے کسی اہم فرد کا تھا۔ اہل خانہ میں ہاتھی اور ہتھنی اور ان کے تین بچے شامل تھے۔ یہ سب لوگ بے حد جھگڑالو اور باتونی تھے۔ کبھی اندرونی کمرے سے گاہے گاہے میاں بیوی کے جھگڑے کی آوازیں آتی تھیں۔ چھوٹا لڑکا ہاتھ میں غلیل لیے پرندوں پر نشانے بازی کر رہا تھا۔ دو تین بار اس نے ہمیں بھی نشانہ بنایا اور ہمیں تکلیف میں دیکھ کر قہقہے لگائے۔ دوپہر کے وقت میں نے ایک حیران کن بلکہ خوف ناک منظر دیکھا۔ لڑکے کی غلیل سے ایک چھوٹا سا چڑیا نما پرندہ زخمی ہو کر برآمدے کے قریب گرا اور تڑپنے لگا۔ لڑکے نے اسے زمین پر پٹخ کر بالکل بے جان کر دیا پھر اس نے دانتوں سے اس کی کھال اُدھیڑی اور یوں کھینچ کھینچ کر گوشت کھانے لگا جیسے روسٹ چرغہ کھا رہا ہو۔ ذرا ہی دیر میں وہ پرندے کا گوشت چٹ کر گیا اور اپنے خون آلود ہونٹ آستین سے پونچھ کر درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ ہمیں کچھ دیر کے لیے چھٹی دی گئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے پاؤں کا وزن گھسیٹتے، درختوں کے نیچے جا پہنچے۔ منحنی ملازم ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ یہ کھانا ناشتے سے بھی بدتر تھا۔ اسٹیل کے ایک بڑے پیالے میں سیاہی مائل ناقابل شناخت لئی میرے سامنے پڑی تھی۔ کچے گوشت کی بُو میں دور ہی سے سونگھ سکتا تھا۔ میں نے انگلی لگا کر دیکھا، یہ کچے قیمے جیسی چیز تھی جس میں کچا انڈا مکس کیا گیا تھا۔ میرا دل متلانے لگا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ میرا ساتھی اطمینان سے یہ کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے ساتھی نے میرا کندھا جھنجوڑ کر مجھے کھانے کی طرف متوجہ کیا لیکن میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کے باسی کچا گوشت کھاتے ہیں یا شاید وہ ہر چیز ہی پکائے بغیر کھاتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کا منظر میرے ذہن میں تازہ تھا۔ میں نے جس طرح نو عمر لڑکے کو دانتوں سے پرندے کی کھال اُدھیڑتے دیکھا تھا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔ شاید ان لوگوں کے جسموں سے اٹھنے والی ناگوار بُو کی وجہ بھی یہی کچا گوشت تھا۔ یہ بات تو کسی طور بھی یقین کرنے والی نہیں تھی کہ یہ لوگ پکانے کے عمل سے ناآشنا ہوں گے۔ جو کام انسان ہزاروں لاکھوں سال پہلے سیکھ چکا تھا وہ اس سے نابلد کیسے ہو سکتے تھے۔ یقیناً اس صورت حال کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔

ہم سارا دن کام کرتے رہے اور شام کو تھکن سے چُور ہو کر اپنی اپنی کوٹھری میں چلے گئے۔ نامانوس مشقت کے سبب میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے اور کندھے دُکھنے لگے تھے۔ رات کو ایک بار پھر اسی منحوس کھانے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی بُو سے ہی مجھے اُبکائی آنے لگی۔ تاہم یہ غنیمت تھا کہ اب اس سیاہی مائل لئی یا ملیدے کے ساتھ تھوڑا سا فروٹ بھی تھا۔ یہ خوبانی جیسے پھل کے تین چار دانے تھے۔ میں نے ایک دانہ پانی سے دھو کر منہ میں ڈالا۔ اس کا ذائقہ خوبانی سے کم تر تھا لیکن بھوک کے سبب

اچھا لگا۔ میں نے صرف پھل کھانے پر اکتفا کیا اور بوسیدہ چٹائی پر لیٹ کر اس حیرت کدہ وادی پر غور فرمانے لگا۔

میرا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ ہم ان ہی لوگوں میں آ پھنسے ہیں جو پچھلے کچھ عرصے سے اس علاقے میں لوٹ مار کی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ یہ کون لوگ تھے؟ ان کی بنیاد کیا تھی اور جس وادی میں ہم رہ رہے تھے یہ کس سمت میں اور کہاں واقع تھی؟ میرے ذہن میں ایسے بہت سے سوال ابھر رہے تھے۔ اپنے آخری "کیمپ" سے اس وادی تک کے درمیانی راستے میں میری آنکھیں بند رہی تھیں۔ میں جو اندازے لگا رہا تھا ان سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ یہ جگہ موزیو پاس سے شمال کی جانب واقع ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ بالکل غیر آباد اور دشوار گزار پہاڑ تھے۔ یہاں کی ایسی پُر پیچ وادیاں تھیں جہاں شاید روز ازل سے کسی انسان کے قدم نہیں پڑے تھے۔ یقیناً یہ کوئی ایسی ہی الگ تھلگ اور عدم پتا وادی تھی۔ فلک بوس برفانی پہاڑوں میں گھری ہوئی اور موزیو پاس کو جانے والے "ٹریک" سے بہت دور۔ مجھے رہ رہ کر زریں گل کا خیال آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی گردن پر چوٹ لگی تھی اور یہ چوٹ معمولی نہیں ہوتی۔ منصور کی طرف سے بھی مجھے سخت تشویش تھی۔ اس کے ہاتھوں ایک شخص کا قتل ہوا تھا اور یہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ ہم حیوان صفت لوگوں کے قبضے میں تھے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے...... بہت سے دوسرے اندیشوں کے ساتھ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ منصور کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جاتا اور وہ ازیتیں دے کر اس کی جان لے لیتے۔

میرے دل میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ منصور کی دوستی میرے رگ و پے میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ منصور وہ شخص تھا جسے دیکھ کر میرے اندر جینے کی اُمنگ جاگتی تھی اور جس کی قربت مجھے حوصلے اور توانائی سے مالا مال کرتی تھی۔ ایک عجب روحانی سا رشتہ قائم تھا ہم دونوں کے درمیان۔ اگر منصور کو کچھ ہوتا تو شاید میں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ منصور نے گولی چلانے میں اتنی جلدی کیوں کی۔ ورنہ کلہاڑا بردار کا وار بچایا بھی جا سکتا تھا اور اگر اسے گولی ہی چلانا تھی تو جسم کے ایسے حصے کو زخمی کرنے کے لیے چلاتا۔ مجھے یہ خیال بار بار ستانے لگا کہ منصور کسی سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ سوال جتنا اہم تھا اتنا ہی نازک بھی تھا۔ جدوجہد میرے لیے مشکل نہیں تھی کیوں کہ میں ہر قسم کے حالات میں جدوجہد کرنا جانتا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ابھی مجھے گرد و پیش کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں اس گھر کے مکینوں کو زیر کر بھی لیتا تو کہاں جاتا؟ اس چار دیواری سے باہر کیا پیش آئے گا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ نصف شب تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر تھکا ماندہ ذہن دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اتر گیا۔

اگلی صبح میں نے پھر کچے انڈوں اور بچے ہوئے دودھ پر مشتمل ناشتا کیا اور کام پر لگ گیا۔ دوپہر تک ہم تھکن سے چُور ہو چکے۔ عملی طور پر میں ۴۸ گھنٹے سے بھوکا تھا۔ تھکن اور بھوک نے پورے جسم کو جکڑ لیا تھا۔ مجھے آرام اور خوراک کی ضرورت تھی لیکن یہ دونوں چیزیں یہاں موجود نہیں تھیں۔ دوپہر کو خوراک کے نام پر ہمیں پھر وہی ملغوبہ دیا گیا جس میں قیمہ، انڈے اور پیاز حالت میں موجود تھے اور ناپسندیدہ بو دے رہے تھے۔ بھوک بُری ہے، لیکن برتن میں رکھا ہوا کھانا اس سے بھی بُری بلا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شاید اس وقت منصور، زریں اور شاہد خاں بھی ایسی ہی مشکل سے دوچار ہوں گے۔ میں کھانا سامنے رکھے بیٹھا تھا جب صاحب (ہاتھی نما شخص) جھومتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر خشکی اور وحشت کا راج تھا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بے دردی سے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری اور "کھانے" کی طرف اشارہ کر کے چیخنے لگا۔ ظاہر ہے مجھے حکم دے رہا تھا کہ میں یہ نعمت تناول فرمانے میں دیر نہ کروں۔ میری حکم عدولی دیکھ کر اس کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس نے مجھے گدی سے دبوچ کر زبردستی میرا چہرہ کھانے کے برتن میں ڈبونا چاہا۔ میری گردن ٹس سے مس نہیں ہوئی تو وہ میرے اوپر پل پڑا۔ اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں مجھ سے کوئی "بے ادبی" ہو جائے۔ اگر اس بے ادبی کا آغاز ہو جاتا تو پھر بات بہت دور تک پہنچتی۔

عین اس وقت جب "ہاتھی" مجھ سے گتھم گتھا تھا، بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ہانپتا کانپتا مجھ سے الگ ہو گیا اور غصے کے انداز میں بڑبڑا کر ایک اور ٹھوکر میرے پہلو میں رسید کی۔ ملازم نے جا کر دروازہ کھولا اور تین افراد کو لے کر اندر آ گیا۔ ان میں سے ایک شخص وہی تھا جو مجھے اس گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی۔

ہاتھی نما شخص نے آنے والوں کا استقبال کیا اور انہیں لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ چار پانچ منٹ تک چاروں میں گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں ایک دو بار میری طرف اشارہ کیا گیا۔ پھر ہاتھی نما شخص نے مجھے آنے والوں کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے پہلے میرے ہاتھ پشت پر باندھے۔ پھر میرے پاؤں سے آہنی گولا نکالا اور مجھے لے کر مکان سے باہر آ گئے۔ ایک بار پھر جھرنے کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہم اس غار کی طرف بڑھنے لگے جس کے دہانے پر ایک بڑا درخت تھا اور بے شمار بوتلیاں لٹک رہی تھیں۔ اسی درخت کے قریب ایک ہنکارتے ہوئے سانڈ کا شبہ بھی گزرا تھا۔ راستے میں ہمیں اکا دکا افراد ملے لیکن کسی نے ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ ہم غار کے سامنے سے سیدھے نکلتے چلے گئے اور پھر ایک کھوہ نما گھروندے میں داخل ہو گئے۔ یہ کھوہ میری توقع سے زیادہ وسیع تھی۔ یہ اندر سے کشادہ ہوتی جا رہی تھی اور اس میں سے شاخ در شاخ اور راستے بھی پھوٹ رہے تھے۔ یہ سب راستے صاف ستھرے تھے اور انہیں مختلف قسم کے لیمپس اور لالٹینوں وغیرہ کے ذریعے روشن کیا گیا تھا۔ ان راستوں میں مجھے اکا دکا مرد و زن بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔ یہ سب مقامی لوگ تھے۔ انہیں ان کے کانوں کی بڑی بڑی بالیوں اور میلے کچیلے چہروں کے سبب دور ہی سے پہچانا جا سکتا تھا۔

چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد میں نے خود کو ایک چوبی دروازے کے سامنے پایا۔ دروازے پر اندر کی طرف مخملی پردہ جھول رہا تھا۔ ایک خطرناک صورت والا مسلح شخص یہاں چوکی دار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مجھے یہاں لانے والے افراد میں سے ایک نے مقامی زبان میں با آواز بلند کچھ کہا۔ دروازے کی دوسری جانب سے فوراً جواب آیا۔ میں یہ آواز سن کر چونک گیا۔ یہ شاہد خاں کی آواز تھی۔ مسلح افراد میں سے ایک نے میرے ہاتھ کھول دیے اور مجھے دروازے کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی مجھے خوش بُو کی لپٹوں نے گھیرے میں لے لیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دبیز قالین پر گاؤ تکیہ لگا تھا اور شاہد خاں شراب کے نشے میں مست نیم دراز تھا۔ اس کے قریب ہی بوتل اور گلاس وغیرہ رکھے تھے۔ کمرے میں تین لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ وہ تینوں عریاں لباس میں تھیں۔ ان میں سے ایک نے تو یہ "نیم عریاں" لباس بھی ابھی ابھی زیب تن کیا تھا، کیوں کہ لباس کے بٹن وغیرہ بند نہیں کیے گئے تھے۔ تینوں لڑکیاں مقامی نہیں تھیں۔ ان میں سے ایک انگریز تھی اور دو جاپانی نظر آتی تھیں۔ جاپانی لڑکیوں کے جسم سڈول اور بے داغ تھے اور وہ اس مختصر سی جگہ میں موم کی شمعوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ میں نے حیرت آمیز نظروں سے شاہد خاں کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اپنی خمار آلود نگاہیں مجھ پر گاڑ رکھی تھیں۔ "بھئی! بڑے مزے ہیں تمہارے تو۔" میں نے کہا۔

"کیوں تمہارے مزے نہیں ہیں۔" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"تم مزے کی بات کرتے ہو۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے کہا اور اپنی ساری روداد سنا ڈالی۔

"یہ کیا چکر ہے؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

میں اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل تھا کہ وہ واقعی بے خبر ہے یا بن رہا ہے۔ ان لمحوں میں ایک اور شک میرے ذہن میں سر اٹھانے لگا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ شاہد خاں ہمیں دھوکا دے رہا ہو اور اسی "سیٹ اپ" کا حصہ ہو جس میں ہم موجود تھے۔

شاہد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یقین کرو شہزاد جہاں صاحب! مجھے کچھ معلوم نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ بس مجھے جو کچھ اندازہ ہوا ہے کہ یہ لوگ مجھے بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ میری زبردست خاطر مدارات کر رہے ہیں اور میری ہر بات مانی جا رہی ہے۔ میں نے آج صبح ان لوگوں سے کہا تھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ چپٹی ناک والا شخص بولا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے بہرحال وہ کوشش کرے گا۔ اب میں آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ میرا تو خیال تھا کہ میری طرح آپ بھی موج میں ہوں گے اور یہ سب کچھ آپ کے ارد گرد بھی موجود ہو گا۔" اس نے خوب رو لڑکیوں اور کھانے پینے کی اشیا کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "دوسروں کا تو پتا نہیں لیکن میرے ساتھ تو سب کچھ الٹ ہے۔"

وہ مجھے تفصیل سے اپنی روداد سنانے لگا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ واقعی مزے میں ہے۔ وہ دو روز سے یہاں راحت و عیش سے رہ رہا تھا۔ اس کی خوراک میں بہترین فروٹ، دودھ، بسکٹ، ڈبل روٹی اور جوس وغیرہ شامل تھے۔ وہ شراب اور شباب میں دلچسپی رکھتا تھا اور یہ لوازمات بھی یہاں وافر "مقدار" میں موجود تھے۔ بہترین ولایتی وہسکی اور بیئر یہاں موجود تھی۔ اس نشے کو دوآتشہ کرنے کے لیے لڑکیاں بھی موجود تھیں جو پرسوں رات سے اس کے بستر پر لوٹیں لگا رہی تھیں۔

یہ جاننے کے بعد کہ میں نے دو روز سے کھانا نہیں کھایا، شاہد خاں اٹھا اور ایک چوبی الماری میں سے ٹن کا چوکور ڈبا نکال لایا۔ اس ڈبے میں بہترین قسم کا سینڈوچ موجود تھا۔ میری بھوک چمک اٹھی۔ میں نے کچھ گوشت کھایا اور پھر اورنج جوس پیا۔ یہ جوس پاؤڈر کی شکل میں تھا جس میں ایک جاپانی لڑکی نے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے پانی ملایا اور مجھے پیش کیا۔ جوس پینے کے ساتھ ساتھ میں نے انھوں کو کونٹ بسکٹ بھی کھائے اور میرے پیٹ میں کچھ رونق ہو گئی۔ بھوک کی شدت کم ہوئی تو دماغ بھی بہتر طور پر کام کرنے لگا۔ میں نے شاہد خاں سے پوچھا کہ اسے زریں گل کی صحت کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے۔

اس نے کہا "میں نے اپنے پہرے دار سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اب ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "شاہد خاں! تم یہاں کے حالات کے بارے میں ہم سب سے زیادہ جانتے ہو اور ان لوگوں کی زبان بھی کسی نہ کسی حد تک سمجھ لیتے ہو۔ تمہارا کیا اندازہ ہے، کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم تحقیق کرتے پھر رہے تھے؟"

"ہنڈرڈ پرسینٹ" شاہد خاں نے ربے رسے جوش سے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مشن میں کامیاب رہا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہارے پُریقین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم شدید ترین خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر گزریں گے...... کیا تم نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔"

وہ بولا "میں نے چار پانچ ماہ پہلے اس سلسلے میں تھوڑی بہت

ریسرچ کی تھی۔ ایک بہت پرانا انگریز کوہ پیما مسٹر بڈسن ناٹ تھا۔ اس نے ان علاقوں میں سفر کیا تھا اور ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ نانگا پربت کے چاروں طرف قراقرم رینج میں ایسی ایسی دشوار گزار وادیاں موجود ہیں کہ جہاں کبھی کوئی ٹریکر یا ہائیکر نہیں پہنچا۔ یہ چھوٹی چھوٹی نامعلوم وادیاں بیرونی دنیا سے کٹی ہوئی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان وادیوں میں سے کچھ میں لوگ آباد ہوں جو اپنی ضروریات مقامی طور پر پوری کرتے ہوں اور شاذ و نادر ہی ان کا واسطہ باہر کے لوگوں سے ہوتا ہو۔"

"تمہارا خیال ہے کہ ہم اس وقت کسی ایسی ہی وادی میں موجود ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔" شاہد خاں بولا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ لوگ ایک قبیلے کی شکل میں یہاں رہ رہے ہیں' ان کا اپنا ایک رہن سہن ہے۔ جو زبان یہ لوگ بولتے ہیں اس میں بلتستانی زبان "شینا" کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں کوشش کر کے ان کی بات سمجھ لیتا ہوں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ لوگ کیا گوشت کھاتے ہیں؟" میں نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" شاہد خاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں نے شاہد خاں کو بتایا کہ کس طرح میں نے ایک لڑکے کو نیم جان چڑیا دانتوں سے بھنبھوڑتے ہوئے دیکھا ہے اور کس طرح پچھلے دو روز سے مجھے کباب قیمہ اور انڈے وغیرہ کھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

شاہد خاں کے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکڑ گئے۔ اس نے کہا "میرے ساتھ تو کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ میں بٹر بسکٹ اور ڈبل روٹی کھا رہا ہوں' بلکہ ڈبل روٹی تو وہی ہے جو ہم لوگ ساتھ لائے تھے۔ بہرحال کوئی گڑبڑ ہے ضرور۔ یہ لڑکیاں تم دیکھ رہے ہو خوب صورت اور نرم گرم ہیں لیکن ان میں سے کسی کو چوم کر دیکھو۔" اس نے اشارے سے ایک جاپانی لڑکی کو اپنے قریب بلایا۔

میں نے چومنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ کیوں کہ لڑکی کے قریب آتے ہی وہی مخصوص بو میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی تھی جو یہاں کے ہر باسی کے جسم سے چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی میں یہ بو قدرے کم تھی' بہرحال موجود تھی۔ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ یہ بو اسی گوشت کے سبب ہے جو یہ لوگ کھاتے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں اندازہ ہوا یہ بو صرف ہم ہی کو محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ ہم اس بو سے مانوس نہیں تھے۔

شاہد خاں نے ولایتی شراب کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بولا "ان لڑکیوں سے کچھ پوچھنا فضول ہے' کیوں کہ یہ ایک لفظ بول کر نہیں دیتیں۔ پرسوں رات ان سے بہت سر کھپایا تھا میں نے۔ اب ان سے صرف وہی کام لے رہا ہوں جس کے لیے انہیں یہاں بھیجا گیا ہے۔" اس نے ایک لڑکی کو بغل میں لے لیا۔

مجھے شاہد خاں کی یہ تفریح زیادہ اچھی نہیں لگی۔ ہم نہایت تشویش ناک صورت حال کا شکار تھے اور وہ رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے کیا اندازہ لگایا ہے' یہ لوگ ہم سے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ابھی کچھ بھی واضح نہیں ہے۔" اس نے ایک سیب پر دانت گڑاتے ہوئے کہا "بہرحال ایک بات طے ہے' یہ لوگ ہمیں آسانی سے چھوڑیں گے نہیں۔"

"یعنی ان کی کوشش ہو گی کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہیں قیام پذ ہو جائیں۔"

"بالکل......" شاہد خاں نے دانش ورانہ انداز میں سر ہلایا۔ پھر بولا "تاہم مجھے آپ کے دوست صفدر کی طرف سے تشویش لاحق ہے۔ اس کے ہاتھوں ایک شخص قتل ہوا ہے' اس کے علا گرفتاری سے پہلے اس نے سخت مزاحمت بھی کی ہے۔ شاید آپ معلوم نہ ہو' ایک شخص کا جبڑا توڑ ڈالا ہے اس نے۔ ایک بندوا بھی زخمی ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "تم نے صفدر کو لڑتے دیکھا تھا؟"

اس نے نفی میں جواب دیا اور بولا "اس وقت میری آنکھو پر بھی پٹی باندھی جا چکی تھی۔ جبڑا توڑنے والی بات مجھے یہاں آ معلوم ہوئی ہے۔"

"صفدر اب ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نشیلے لہجے میں کہا "اس کے بارے میں میں بھی اتنا جانتا ہوں جتنا آپ جانتے ہیں۔"

"تم یہ بات یقین سے کہہ رہے ہو؟" میں نے اسے ٹٹو والی نظروں سے دیکھا۔

"سو فیصد یقین سے۔" اس نے انگلی لہرائی۔

وہ مسلسل پی رہا تھا اور نشے سے اس کی آنکھیں سرخ جا رہی تھیں۔ نشے کو سنبھالنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہو درحقیقت یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔ کچھ لوگ گھونٹ پی کر ہی غرانے لگتے ہیں' کچھ نشے کی انتہا کو چھونے باوجود مہذب اور شائستہ نظر آتے ہیں اور ان کی طبعی شرافت برقرار رہتی ہے۔ شاہد خاں پہلی قسم کے لوگوں میں سے تھا۔ ا لوگ زندگی کے چھتے میں سے زیادہ سے زیادہ رس نچوڑنے قائل ہوتے ہیں اور دل بستگی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جا دیتے۔ محفوظ قسم کا جو چانس بھی انہیں ملتا ہے اس سے فا اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہد خاں کے حوالے سے دو دن پہلے والا واقعہ ہمارے سامنے تھا۔ اس نے نشے ہی میں ٹھیک ٹھاک جھپٹا مارنے کی کوشش کی تھی۔ اب بھی شاہد خاصا بہک رہا تھا۔ شاید وہ اپنی موجودہ پریشانی کو شراب کے میں غلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاتھ لہرا کر مجھ سے

"چھوڑو شاہ جہاں صاحب! یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ خود ذرا آپ بھی تھوڑا سا موج میلہ کر لو' یہ جاپانی چھوکریاں تو بہت ہی مزے دار ہیں۔ جیسے آم کی طرح تازہ اور رس بھری۔" پھر اس نے اپنی پسندیدگی کا عملی ثبوت فراہم کیا۔

اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور وہ ڈگمگا رہا تھا۔ اس کے بازوؤں نے آکٹوپس کے بازوؤں کی طرح حرکت کی اور لڑکی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ باقی دونوں لڑکیاں سپاٹ چہروں کے ساتھ لاتعلق بیٹھی تھیں۔ میں نے چاہا کہ شاہد خاں کو جھنجھوڑ کر ہوش کی دنیا میں واپس لاؤں لیکن اس سے پہلے ہی دو افراد اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے مجھے باہر چلنے کو کہا۔ ان میں سے ایک حسب سابق رائفل دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا۔ شاہد خاں نے لڑکی کی طرف سے توجہ ہٹا کر اندر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ شاہد خاں نے ان کے ساتھ مختصر مکالمہ کیا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ مجھے ابھی تھوڑی دیر اور اس کے پاس رہنے دیا جائے لیکن پہرے داروں نے اس سلسلے میں معذوری ظاہر کی اور مجھے لے کر باہر آ گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر میں واپس اسی چار دیواری میں پہنچ چکا تھا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔

ایک بار پھر میرے ہاتھ کھولنے سے پہلے میرے پاؤں میں آہنی گولا ڈال دیا گیا۔ دو ہی روز میں اس منحوس گولے کے خلاف میری نفرت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ میں سوچتا تھا کاش اس زنجیر کی لمبائی کچھ طویل ہو اور میں گولا دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پہلے ہاتھی اور پھر ہتھنی کے سر پر دے ماروں۔ گولے کو اپنے پاؤں کے ساتھ گھسیٹتا ہوا میں چیڑ کے ان درختوں تلے جا بیٹھا جہاں ادھیڑ عمر بلتستانی پسینے میں شرابور بیگار میں مصروف تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی جت گیا۔

اس روز شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک بار پھر ادھیڑ عمر شخص سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی۔ ہاتھی اور ہتھنی ایک لڑکی کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں نگرانی کے طور پر صرف ملازم تھا۔ وہ دروازے کے قریب ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی اونگھنے لگتا تھا۔

میں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے آہستگی سے کہا "میں اس بات پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ تم اردو اور پشتو میں سے کسی کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ میرا خیال ہے' تم جان بوجھ کر چپ ہو۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔ اس نے یہ بات اردو میں کہی تھی۔

میرا جی خوش ہو گیا۔ وہ ہم زبان مجھے مل گیا تھا جس کی میں اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا "لیکن اس سے پہلے تم چپ کیوں رہے؟"

اس نے کن انکھیوں سے پہرے دار کی طرف دیکھا جو مسلسل اونگھ رہا تھا۔ پھر بدستور دھیمے لہجے میں بولا "خاران کے ہوتے ہوئے چپ رہنا ضروری ہے۔ وہ "ہاراروں" کا ایک دوسرے سے بولنا پسند نہیں کرتا۔ بہت سخت مزاج ہے۔"

"یہ ہاراروں کون ہیں؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

ادھیڑ عمر شخص نے پشتو آمیز اردو میں کہا "ہاراو یہاں ان قیدیوں کو کہا جاتا ہے جنہیں مشقت کے لیے یہاں کے کھاتے پیتے لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ قیدیوں کو زندہ رکھیں یا مار دیں۔ میں اور تم یہاں ہاراو کی حیثیت سے موجود ہیں۔"

"اور یہ خاران کون ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"خاران ہمارا مالک ہے۔ وہی موٹا جس نے صبح کے وقت تمہیں ٹھڈے مارے تھے۔ وہ یہاں کے مندو کا رکھوالا ہے۔"

"مندو کا رکھوالا؟ یعنی یہ لوگ ہندو ہیں؟"

"نہیں" میرے ساتھی نے جواب دیا "مندو تو یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا ہے۔ ان کی ایک عبادت گاہ ہے۔ پتا نہیں کیا نام لیتے ہیں اس کا...... یہ وہاں پوجا پاٹھ کراتا ہے۔ آج کل اس عبادت گاہ کو کشادہ کیا جا رہا ہے۔ یہ جو لکڑی کے تختے چیرے جا رہے ہیں' اسی کے لیے ہیں۔"

میں حیرت آمیز دلچسپی سے ادھیڑ عمر شخص کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم یہاں کتنے عرصے سے ہو؟"

"تین سال دو ماہ سے۔" ادھیڑ عمر شخص نے فوراً جواب دیا۔ یہ تین سال دو ماہ جیسے اس نے انگلیوں پر گن رکھے تھے۔

"تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"رحمت خان۔ دیا مرافی کا رہنے والا ہوں۔"

یقیناً میرا اگلا سوال یہی ہوتا کہ رحمت خان یہاں کیوں کر پہنچا ہے' لیکن میرے بولنے سے پہلے وہ پھر بول پڑا "ایک بات پوچھوں؟" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں؟"

"تمہارا کوئی ساتھی شاہد خان بھی ہے؟"

"ہاں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"وہ اب کہاں ہے؟"

"یہیں اسی بستی میں ہے۔ درحقیقت دوپہر کو میں اسی سے مل کر آیا تھا۔ وہ تو بڑے آرام سکون میں ہے' بہت مہمان نوازی ہو رہی ہے اس کی۔"

"یہ مہمان نوازی نہیں ہے۔" میرے ساتھی رحمت خان نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے کبھی قربانی کا جانور دیکھا ہے۔ چھری پھرنے سے پہلے وہ بھی کتنا خوش ہوتا ہے۔ خوب کھاتا پیتا ہے' نہ کوئی اس کو مارتا

ہے کہ اس پر سواری کرتا ہے۔ ہر طرف اڑاتا پھرتا ہے لیکن پھر اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟"

میں حیرت زدہ رہ گیا "تم کہنا کیا چاہ رہے ہو رحمت خان..... کیا شاہد خاں پر..... کوئی مصیبت آنے والی ہے؟"

رحمت نے میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر سر جھکا لیا "ہاں..... سخت مصیبت۔ اسے قتل کر دیا جائے گا۔"

"قتل لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔

میری آواز ذرا بلند ہو گئی تھی۔ رحمت خان نے آری چلاتے چلاتے چونک کر چوکی دار کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل اونگھنے میں مصروف تھا۔ رحمت خان بولا "میرا خیال ہے کہ تم انجان بن رہے ہو۔ اپنے ساتھی کا جرم تمہیں خود بھی معلوم ہے۔ اس نے قتل کیا ہے۔"

میں واقعی حیران رہ گیا "کس کو قتل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مقامی شخص درگال کو۔ جب ان لوگوں نے تمہیں پکڑا تو تمہارے ساتھی شاہد نے پستول سے درگال پر فائر کیا اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔ اس کی لاش تمہارے ساتھ ہی بستی میں پہنچی تھی۔"

میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ رحمت خان جس واقعے کو شاہد خاں سے منسوب کر رہا تھا، وہ تو صفدر سے تعلق رکھتا تھا۔ مقامی شخص کو صفدر نے ہلاک کیا تھا...... میں نے اس سلسلے میں رحمت خان کے سامنے زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ معلوم نہیں اس بات میں کیا راز تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ شاہد خاں کو چند روز عیش و آرام سے رکھنے کے بعد ہلاک کر دیا جائے گا۔"

رحمت خان نے نہایت سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ بولا "یہاں کا یہی دستور ہے۔ جس 'تاوان' کو سزائے موت دی جانے والی ہوتی ہے، اسے ایک عشرے (دس روز) تک خوب کھلایا پلایا جاتا ہے اور اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔ اس کے کانوں میں یہ بھنک بھی نہیں پڑنے دی جاتی کہ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ بلکہ اگر اسے شک ہو بھی تو یہ شک اس کے دل سے نکال دیا جاتا ہے۔ عشرہ پورا ہونے پر اسے تکلیف دے کر مار دیا جاتا ہے۔ تمہارے ساتھی کے عشرے میں سے تین دن گزر چکے ہیں، اسے صرف چھ سات روز اور زندہ رہنا ہے۔"

میں نے رحمت خان کی آنکھوں میں سچائی تلاش کرنے کی کوشش کی اور با آسانی کامیاب ہوا۔ سینے میں گھٹن اور تشویش کا دھواں پھیل گیا۔ یہ بات قابل غور تھی کہ صفدر کے کیے کی سزا شاہد خاں کو کیوں دی جا رہی ہے اور آیا یہ واقعی صفدر کے کیے کی سزا ہے یا یہ کوئی اور چکر ہے۔ میں رحمت خان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے لیکن ایک دم سے ہماری گفتگو کو "فل اسٹاپ" لگ گیا۔ ہاتھی نما شخص جس کا نام رحمت نے خاداں بتایا تھا، جھومتا ہوا گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور بچی بھی تھی۔ بیوی اور بچی اندرونی کمرے کی طرف چلی گئیں جب کہ خاداں وہیں برآمدے میں کھڑا رہا۔ اسی دوران میں بیرونی دروازہ پھر کھلا اور وہاں تین عدد مسلح افراد دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ یہ وہی تھے جو تین دن پہلے مجھے لائے تھے۔ آج ان کے ساتھ ایک قیدی تھا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ زریں گل تھا۔ زریں اس لباس میں نہیں تھا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ اس نے جین نیلی پتلون اور سرخ جرسی پہن رکھی تھی اور یہ دونوں چیزیں اس کے ناپ کی نہیں تھیں۔ وہ اپنے گول مٹول جسم کے ساتھ پہلے سے زیادہ مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان ابھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ایک خونخوار رائفل کی نال اس کی طرف خطرناک انداز میں اٹھی ہوئی تھی۔

میں چونکہ ایک درخت کی اوٹ میں تھا زریں گل مجھے نہ دیکھ سکا۔ اس کے چہرے سے جھلاہٹ اور بے چارگی ایک ساتھ ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اکڑفوں جو ہر وقت زریں گل کے سنگ رہا کرتی تھی، بہت حد تک ختم ہو چکی تھی۔ مسلح افراد میں سے ایک کے پاس ہی آہنی گولا موجود تھا جیسا میرے اور رحمت خان کے پاؤں کی زینت بنا ہوا تھا۔ جب زریں گل کو یہ گولا پہنایا جانے لگا تو اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی اور غضبناک آواز میں بڑبڑایا بھی لیکن مزاحمت اور بڑبڑاہٹ جلدی دم توڑ گئی۔ آہنی گولے کی زنجیر زریں کی ٹانگ (پنڈلی) سے منسلک کر دی گئی۔ بعد ازاں اس کے ہاتھ کھول دیے گئے اور اسے ہانکنے والے انداز میں اس کوٹھری کی طرف لے جایا گیا جہاں تین روز سے میں مقیم تھا۔ وزنی گولے کو اپنے ساتھ گھسیٹنا زریں گل کے لیے دشوار ثابت ہوا، وہ لڑکھڑاتا ہوا بمشکل کوٹھری تک پہنچ پایا۔

زریں گل کو صحیح سلامت دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر تھی۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ اسے میرے والی کوٹھری میں ہی بند کیا گیا تھا۔ اگر بدقسمتی آڑے نہ آتی اور مجھے کہیں اور ٹھہرایا جاتا تو آج رات ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر زریں کے پاس پہنچوں۔ لیکن ابھی ہماری تھوڑی سی بیگار باقی تھی۔ خدا خدا کر کے چھٹی ہوئی اور میں رحمت خان کو زیر لب خدا حافظ کہہ کر کوٹھری کی طرف بڑھا۔ اب وزنی گولے کو اپنے ساتھ گھسیٹنے کی مجھے کافی مشق ہو چکی تھی۔ وسیع صحن کو دو تین منٹ میں پار کر کے میں کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ زریں گل کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں لہٰذا جوں ہی میں کوٹھری میں داخل ہوا اس نے مجھے پہچان لیا اور آ کر لپٹ گیا۔ میں نے اس کی تھپکی۔ وہ کانپتے لہجے میں بولا "استاد صیب! آپ ٹھیک..... تو..... ہو...؟"

"سولہ آنے۔" میں نے جواب دیا "اور تم؟"

"اگر آپ سولہ آنے ٹھیک ہے تو ام اٹھارہ آنے ٹھیک ہے۔" وہ چہکا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہ میرے پاؤں کی طرف اٹھی اور ٹھٹک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے میرے پاؤں کی زنجیر اور زنجیر سے منسلک گولے کو دیکھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ استاد جی کے ساتھ بھی کوئی ایسا کر سکتا ہے "یہ..... یہ آپ....." وہ ہکلایا۔

"یہ کچھ نہیں ہے یار۔" میں نے بظاہر تسلی سے کہا "ہم جب چاہیں گے ان سنگلوں (زنجیروں) کے سو ٹکڑے کر دیں گے۔ پہلے ذرا ہم دیکھ بھال تو لیں کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارے ارد گرد کس قسم کی مرغابیاں ہیں۔"

"مرغابیاں؟" زریں گل نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ یہ محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنا آپ دکھانے سے پہلے اپنے ارد گرد کے بارے میں جان تو لینا چاہیے نا..... یہ کون لوگ ہیں۔ کیا چاہتے ہیں، ان کی حیثیت کیا ہے، طاقت کیا ہے؟"

زریں گل اپنا گولے جیسا سر اثبات میں ہلانے لگا۔ اس نے صفدر اور شاہد خاں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ دونوں بھی خیریت سے ہیں۔ زریں گل خاص طور سے صفدر کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن صفدر کے بارے میں مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میں کیا بتاتا لہٰذا جواب گول کر گیا۔

زریں گل نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا "ام کو گردن پر بڑا سخت چوٹ لگا تھا۔ جب ام کو ہوش آیا تو ام خچر پر سوار تھا اور ایک خطرناک پہاڑی راستے پر جا رہا تھا۔ آپ، صفدر اور شاہد خان بھی ساتھ تھے۔ آپ تینوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ام پھر بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا۔ دوبارہ ہوش آیا تو ایک بستر پر تھا۔ دو افراد امارا گردن کا مالش کر رہے تھے۔ امارا دماغ آؤٹ ہو گیا تھا۔ پتا نہیں رات بھر ام کیا اول فول بولتا رہا۔ ام کو تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ ام نے مسرت نذیر کو اپنا بہن بنایا تھا اور یوسف خاں کو اپنا سالا۔ شاید ام نے دو تین بار قمر الزمان کا گانا بھی گایا تھا۔ اکیلے نہ جانا ام کو چھوڑ کر نہ..... جواب میں ایک بندے نے امارے منہ پر دو ہنٹر مارا تھا۔ یہ امارا آنکھ کے اوپر آپ لال نشان دیکھ رہا ہے نا..... یہ اسی گانے کی وجہ سے۔"

"اور یہ نیچے والا نشان؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

وہ بولا "امارا جیکٹ کی ایک جیب میں ایک ماچس اور دو سگریٹ پڑا رہ گیا تھا۔ کل رات ام نے سگریٹ پینے کا کوشش کیا۔ جونہی ام نے ماچس جلایا۔ ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ لمبے بالوں والا ایک مسلح آدمی بھاگتا ہوا آیا۔ پہلے انہوں نے ماچس کا تیلی بجھایا پھر ام پر ٹوٹ پڑا۔ ام کو نیچے گرا کر امارے اوپر چڑھ گیا۔ یہ نیچے والا چوٹ اسی واقعے کا نشانی ہے۔ پتا نہیں یہ لوگ آگ سے اتنا ڈرتا کیوں ہے۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ لوگ کھانا بھی کچا کھاتا ہے۔ امارا مطلب ہے کہ اس کو آگ پر پکاتا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیوں کہ میں بھی پچھلے تین روز سے کچا کھا رہا ہوں۔"

"او خدایا۔ یہ ان لوگوں کو کیا خبط ہے؟"

میں زریں گل کو کیا جواب دیتا۔ یہی سوال تین دن سے میرے دماغ میں بھی چکرا رہا تھا۔ ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا اور ایک آئیڈیا ذہن میں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ اس وادی میں اپنی موجودگی کو راز رکھنے کے لیے آگ جلانے سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ خیال میرے دل کو لگا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ جہاں آگ جلائی جاتی ہے یا دھواں اٹھتا ہے، وہ جگہ فضا سے بہر صورت نظر آ جاتی ہے۔ بے شک یہ وادی قراقرم کے دور دراز اور دشوار گزار حصے میں تھی لیکن کبھی نہ کبھی تو جہاز اور ہیلی کاپٹر وغیرہ اس کے اوپر سے گزرتے ہوں گے۔ جہازوں اور ہیلی کاپٹرز کے پائلٹ ایسی وادیوں کی نشان دہی با آسانی کر سکتے ہیں جہاں آبادی کے آثار پائے جاتے ہوں۔ آبادی کے آثار کا ایک بڑا ثبوت آگ اور دھواں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان تعمیراتی اشیا کا نمبر آتا ہے جو فضا سے دیکھی جا سکتی ہوں۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ اس علاقے میں وہ تمام مکان جو انسانی ہاتھوں نے بنائے ہیں، گھنے درختوں کے نیچے ہیں اور ان کی چھتوں پر کثرت سے گھاس پھونس اگا ہوا ہے۔ یقیناً یہ بھی بستی کو "کیموفلاج" کرنے کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ اس وادی میں آنے کے بعد روشنی مجھے صرف غار کے اندرونی حصوں میں نظر آئی تھی ورنہ ہر جگہ تاریکی کا راج تھا۔

"آپ کہاں کھو گیا؟" زریں گل نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "سوچ رہا ہوں کہ یہ لوگ ہمیں بھی پکانے کی زحمت کریں گے یا نہیں۔"

"میرا تو خیال ہے کچا ہی کھائیں گے۔" زریں گل نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

مجھ سے مل کر وہ سارا رنج و غم، ساری چوٹیں، تکلیفیں بھول گیا تھا۔ اس نے جیب سے کاغذ کی ایک پڑیا نکالی اور اس میں سے نسوار کا ایک بڑا چٹکا لے کر منہ میں رکھ لیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا "نسوار کہاں سے لی تم نے؟"

"شکر خورے کو شکر مل ہی جاتا ہے استاد صیب..... وہاں دواخانے میں اللہ کا ایک بندہ مل گیا تھا۔ وہ جیلاس کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔ کوئی چھ مہینے پہلے درموز جو کی طرف جا رہا تھا کہ راستہ بھٹک کر اس خطرناک علاقے میں آ نکلا۔ ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور یہاں لے آئے۔ بہروز نام ہے اس کا۔ اسی نے ام کو یہ نسوار عنایت فرمایا تھا۔"

"وہ دواخانے میں کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

زریں گل نے جھرجھری سی لی اور اس کی آنکھوں میں خوف

کے سامنے لہرانے لگے۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا "اللہ ہر ایک کو ایسی بیماری سے بچائے۔ اس بے چارے کے پیٹ میں ناف کی جگہ ایک بڑا سوراخ ہے۔ کم از کم تین انچ چوڑا تو ہوگا۔ اس میں پیپ پڑ گئی تھی اور سارا پیٹ پھوڑا بن گیا تھا۔ اس کی یہ حالت چار پانچ مہینے رہی ہے۔ اب وہ بہتر ہو رہا ہے۔"

"کیا کوئی چوٹ وغیرہ لگی تھی؟"

"ہاں جی۔" زریں گل نے کہا "یہ بڑا دلچسپ اسٹوری ہے۔ دراصل جب بہروز خان پکڑا گیا تو اس نے خود کو بچانے کے لیے گولی چلایا تھا۔ اس گولی سے ایک لڑکا ہلاک ہو گیا۔ اس لڑکے کو ہلاک کرنے کے جرم میں بہروز خان کو سزا دی گئی۔ سنا ہے کہ ان لوگوں نے یہاں کوئی کنواں سا کھود رکھا ہے۔ اس کنویں کی دیواریں پتھروں کی ہیں۔ مقامی زبان میں اسے موت کا کنواں کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ ویسا کنواں نہیں جس میں سینڈر لوگ موٹر سائیکل چلاتا ہے یہ اور طرح کا کنواں ہے اور اس میں جو کھیل ہوتا ہے وہ بھی بہت خطرناک ہے۔ خوچے جس مادار (غلام) کو یہ لوگ مارنا چاہتا ہے اسے اس کنویں میں ڈال دیتا ہے اور خود چاروں طرف تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ کنویں میں نوکیلے سینگوں والا ..... تین سانڈ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ سانڈ سینگ مار مار کر قیدی کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ لیکن قیدی کے لیے ایک رعایت بھی ہوتا ہے اگر وہ کنویں کی پتھریلی دیواروں پر چڑھ کر باہر نکل آئے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ بہروز خان نے بتایا ہے کہ پچھلے تین برسوں میں بے شمار لوگوں کو مارا گیا ہوگا لیکن وہ دوسرا شخص ہے جو زندہ بچنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کی ناف کا زخم ایک سانڈ کے سینگ سے آیا تھا۔ بعد میں وہ زخم خراب ہو گیا اور بہروز خان بستر سے لگ گیا۔ خو اب بھی یہ پکا پتا نہیں ہے کہ وہ مکمل طور پر ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں۔"

زریں گل کی گفتگو انکشاف انگیز تھی۔ میں نے اس سے کہا "اگر بہروز خان چھ مہینے سے یہاں ہے تو اسے کافی کچھ معلوم ہوگا۔ اس نے کچھ اور بتایا نہیں۔"

"ام دونوں زیادہ بات نہیں کر سکا۔ وہ لوگ سخت نگرانی رکھتا تھا۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ یہاں کا سردار کوئی "پاناسہ" نام کا شخص ہے۔ بے رحمی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور انگریزی بول سکتا ہے۔ اس کی دو بیویاں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوٹ مار میں جو عورتیں پکڑی جاتی ہیں وہ ان میں سے بھی کسی کو پسند کر لیتا ہے۔ ایسی عورت کو وہ دو ہفتے اور کبھی کبھی ایک ماہ تک اپنے پاس رکھتا ہے۔ یہاں کے قانون بہت سخت ہیں اور انہیں باقاعدہ لکھا گیا ہے۔ قانون کی خلاف ورزی یہاں کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ خلاف ورزی کرنے والا عام شخص ہو یا خاص اس کو پورا پورا سزا ملتا ہے ۔۔۔۔"

بات کرتے کرتے زریں گل کو ایک دم کوئی خیال آیا اور وہ بولا "استاد جیب! امارے صفدر صاحب کے ہاتھوں سے بھی تو ایک بندہ مرا ہے۔ کہیں ان کے ساتھ بھی کوئی برا سلوک نہ کیا جائے۔ امارا مطلب ہے ــــــ امارا دھیان ــــــ بار بار اس سانڈوں والی بات کی طرف جاتا ہے۔"

میں نے کہا "صفدر کا تو مجھے پتا نہیں لیکن شاہد خاں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کسی نے مجھے بتایا ہے کہ قتل کا الزام صفدر کے بجائے شاہد خاں پر لگایا جا رہا ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس قتل کی سزا بھی اسی کو ملے۔"

"یہ کیا چکر ہے استاد جیب؟" زریں گل نے آنکھیں پٹ پٹائیں "ایسا تو ام نے کسی بھی فلم میں نہیں دیکھا۔ نہ پاکستانی میں نہ انگریزی میں۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے کسی انڈین فلم میں ایسا ہوا ہو۔"

"خو انڈین فلم کا نام مت لیا کریں امارے سامنے۔ جب ام پاکستانی فلم سے ہر قسم کا اعلیٰ مثال لے سکتا ہے تو ام کیوں انڈیا کی بات کرے۔"

"لیکن کبھی کبھی تو انڈیا کی فلم تم بھی دیکھتے ہو۔"

"وہ تو ام بس ان کی غلطیاں نکالنے کے لیے دیکھتا ہے اور ان کی بے حیائی پر لعنت بھیجنے کے لیے دیکھتا ہے ــــــ خیر آپ بات کو لے کر اور طرف نکل گیا ہے۔ ام شاہد خاں کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں کا اس میں کیا مفاد ہو سکتا ہے کہ صفدر صاحب کا الزام شاہد خاں کے سر آ جائے۔"

"ممکن ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے صفدر کی جان بچانا چاہتے ہوں۔ لیکن اپنے سخت قانون سے بھی مجبور ہوں۔ قانون کا پیٹ بھرنے کے لیے انہوں نے شاہد خاں کو قربانی کا بکرا بنا رہا ہو۔"

زریں گل نے پوچھا "کیا آپ کی اطلاع کے مطابق شاہد خاں کو کسی جیل وغیرہ میں رکھا گیا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو مجھے پتا نہیں کہ یہاں کوئی جیل قسم کی چیز ہے یا نہیں۔ لیکن اگر ہے بھی تو شاہد خاں وہاں نہیں۔ وہ فی الحال بڑے عیش آرام میں ہے۔ بہترین شرابوں اور لڑکیوں نے اسے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ مگر میری اطلاع کے مطابق یہ سب کچھ چھ سات دن کے اندر ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد شاہد کو قتل کر دیا جائے گا۔"

زریں گل کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ فکرمند لہجے میں بولا "پھر کیا کیا جائے۔ یہ امارا فرض ہے کہ اپنے ساتھی کو بچانے کی کوشش کرے۔ اگر نہ کرے گا تو بزدل کہلائے گا۔"

میں نے کہا "ہم بزدل کہلانا چاہتے ہیں اور نہ "مرحوم"۔ ہمیں سوچ سمجھ کر کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

اور یہ چار پانچ دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ ہمارے معمولات بھی بندھے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد ہم تینوں کو وسیع احاطے میں لایا جاتا۔ یہاں ہم سارا دن لکڑی کاٹتے۔ دوپہر کے وقت صرف ایک گھنٹا آرام کرنے کی اجازت ہوتی۔ سرِشام ہمیں کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا۔ بھوک بڑی بلا ہے اور اس "بلا" نے اپنا آپ ہم سے منوا لیا تھا۔ کچا گوشت جسے کسی خاص طریقے سے نرم کیا جاتا تھا اور قیمے کی شکل دے دی جاتی تھی، رفتہ رفتہ ہمارے حلق سے نیچے اترنے لگا۔ شروع شروع میں ابکائی روکنا مشکل تھا، لیکن دو تین بار کھانے کے بعد یہ عمل نسبتاً آسان محسوس ہونے لگا۔ زریں گل تو اس نمکین قیمے کا ایک گولا سا بنا کر حلق میں رکھتا تھا اور ناک کو چٹکی میں دبا کر پانی کے گھونٹ سے نگل لیتا تھا۔ اپنے ساتھی مزدور سے دوبارہ میری گفتگو نہیں ہوئی۔ اس نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک صاحبِ خانہ (فاران) گھر میں موجود ہے، وہ چپ کا روزہ برقرار رکھے گا اور صاحبِ خانہ نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ وہ گھر سے نہیں نکلے گا۔

ایک شام میں اور زریں گل اپنی کوٹھری میں گم صم بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہمارے بعد ہمارے بیس کیمپ میں کس قسم کے حالات پیش آئے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ سروج اور رابرٹ نے قلیوں کی مدد سے ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی اس کے بعد انہوں نے سخت مایوسی اور خوف کے عالم میں "بیس کیمپ" چھوڑا ہوگا اور کیچول پہنچ گئے ہوں گے۔ کیچول میں مسٹر جی کلارک کو اس اندوہناک خبر سے آگاہ کیا گیا ہوگا اور اب وسیع پیمانے پر ہماری تلاش جاری ہوگی۔ زریں گل کو اس سلسلے میں تھوڑا سا اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ الو کی پٹھی سروج نے مسٹر رابرٹ کو مشورہ دیا ہوگا کہ ہماری تلاش میں نکلنا خطرناک ہے لہٰذا وہ آناً فاناً وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے۔

دفعتاً ہم چونک گئے۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ باہر سے تالا کھولا گیا اور تین افراد دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس سے پہلے مجھے شاہد خاں کے پاس لے کر گئے تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آج بھی اسی مقصد سے آئے ہیں۔ حسبِ سابق پہلے میرے ہاتھ پشت پر باندھے گئے پھر پاؤں سے زنجیر گزارا گیا ــــــ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میں اسی شاخ در شاخ سرنگ میں موجود تھا جس کے ایک گوشے میں شاہد خاں کا عشرت کدہ واقع تھا۔

سرنگ میں مکمل تاریکی تھی۔ کہیں مٹی کا دیا تک نہیں رکھا گیا تھا۔ ہاں تھوڑا آگے جا کر روشنی کی ایک دو کرنیں نظر آئیں۔ یہ کرنیں کچھ بند دروازوں کے پیچھے سے پھوٹ رہی تھیں۔ ان ہی دروازوں میں سے ایک دروازہ اس عشرت کدے کا تھا جس میں شاہد خاں پچھلے کئی روز سے موجود تھا۔ مجھے اس دروازے سے گزار کر مسلح نگران پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے شاہد خاں کو دیکھا۔

کثرتِ شراب نوشی سے اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہونٹ سیاہی مائل ہو رہے تھے۔ وہ آج کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے گرد حسن و شباب کا جمگھٹا بھی نہیں تھا۔ صرف ایک جاپانی لڑکی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی اور اونگھ رہی تھی۔ میری آمد کے بعد شاہد خاں نے اس لڑکی کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ وہ خاموشی سے نکل گئی۔ اب ہم اس جگہ تنہا تھے۔ شاہد خاں نے پہلے تو زریں گل اور صفدر کے بارے میں پوچھا، پھر الجھے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ لوگ مجھ سے عجیب سا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جیسے مجھے یہاں سے کہیں بھیجا جانے والا ہے اور بھیجنے سے پہلے میری مہربانی کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ کل میں نے دو نگرانوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ وہ میرے لیے "بے چارے" کا لفظ استعمال کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میرے پاس عیش و آرام کے لیے تھوڑی سی مہلت رہ گئی ہے۔ ان کی باتوں میں "بے چارے" کا لفظ بار بار استعمال ہوا اور مجھے بہت برا لگا۔"

میں نے اپنے تاثرات بمشکل چھپائے اور شاہد خاں سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ اس کے حالات ہم سب سے بہتر ہیں۔ پھر اس سے کوئی جرم بھی سرزد نہیں ہوا ہے۔ اگر ہمارے ساتھ یہاں برا سلوک ہونا بھی ہے تو اس سلوک کا نشانہ سب سے پہلے صفدر بنے گا کیوں کہ اس کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔

میری بات شاہد خاں کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن اس کی الجھن دور نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "کل رات ایک نگران نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اپنے کسی ساتھی سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو کر لوں۔ میں نے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگا کہ ضرورت تو کوئی نہیں لیکن اگر مجھے موقع مل رہا ہے تو میں فائدہ اٹھا لوں۔ میں نے کہا یہ موقع پھر نہیں ملے گا؟ وہ بولا "کل کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا "اچھا کل مجھے شاہ جہاں صاحب اور صفدر .... صاحب سے ملوا دو ــــــ صفدر تو نہیں آیا لیکن سارے دن کے انتظار کے بعد آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔"

میرے ذہن میں نئے وسوسے جاگ اٹھے۔ کہیں شاہد خاں سے یہ ملاقات "آخری ملاقات" کی کوئی شکل تو نہیں تھی۔ پریشانی میرے سینے میں ہلچل مچا رہی تھی لیکن میں نے اپنا چہرہ پرسکون ہی رکھا۔ میں نے شاہد خاں سے حوصلے تسلی کی چند باتیں کہیں پھر اس سے کہا کہ وہ صفدر کو یہاں بلانے کی کوشش کرے۔

شاہد خاں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نگران نے کنڈی کھولی اور اندر جھانکنے لگا۔ شاہد خاں نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں اور ہاتھ کے بے تحاشا اشاروں کی مدد سے اپنی بات نگران کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ "شنا" زبان کے الفاظ بول رہا تھا اور ساتھ میں پشتو کے کچھ الفاظ بھی استعمال کر رہا تھا۔ شاہد خاں اور نگران بڑی دقت کے ساتھ ایک دوسرے کو اپنا مافی الضمیر سمجھا سکے۔ شاہد خاں کے

چہرے پر مایوسی نظر آرہی تھی۔ نگران واپس لوٹ گیا تو وہ بولا "نہیں بلند جہاں صاحب! وہ معذرت پیش کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ایک ساتھ آپ دونوں کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ آپ چلے جائیں گے تو منصور صاحب کو یہاں بلایا جائے گا۔"

اس جواب سے میری کم از کم تسلی تو ہو گئی کہ منصور بہ خیر و عافیت ہے لیکن اسے دیکھنے کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ شاہد خاں کے بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی لیکن میں اس تشویش کا اظہار کر کے اسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی دوران میں ایک مسلح نگران اندر آگیا اور اس نے اشاروں کی مدد سے ہمیں بتایا کہ اب ہماری بات چیت ختم ہونی چاہیے کیوں کہ مجھے اب واپس غاران کے گھر جانا ہے۔

میں اپنے تینوں نگرانوں کے ساتھ سُرنگ سے باہر نکل آیا۔ جب میں دہانے کے قریب تھا' میرے کانوں میں ایک عجیب آواز پڑی۔ یہ آواز کسی بھینسے کے ڈکرانے سے مشابہ تھی۔ بڑی ہولناک اور گونجتی ہوئی آواز تھی۔ میرے کان آواز پر لگے رہے لیکن دوبارہ وہ نہیں ابھری۔ [illegible] شک تھا۔ میں نے پانچ ان بھینسے اور [illegible] خوں خوار سانڈوں کے بارے میں سنا تھا۔ شاید وہی خیالی ڈانم بن کر میرے کانوں میں گونج گیا تھا۔

وہ رات میں نے اور زریں گل نے سوچتے ہوئے گزاری۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں ایک دو دن کے اندر اندر شاہد خاں کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اذیت ناک انجام سے دوچار ہو جائے۔ لیکن کیسے؟ شاہد خاں کے لیے کیسے کچھ کیا جا سکتا تھا! پاؤں میں پچیس کلو وزن کے ساتھ کسی بھی تیز رفتار کارروائی کے بارے میں سوچنا نادانی تھا۔ میں اور زریں گل اپنی اپنی زنجیر کا دو تین بار معائنہ کر چکے تھے۔ یہ دو فٹ لمبی زنجیر بہترین فولاد کی تھی اور قریباً چار کلو وزن رکھتی تھی۔ اس زنجیر اور زنجیر کے قفل کو توڑنا بہ ظاہر ناممکن تھا۔ میرے پاؤں سے اب تک دو دفعہ یہ زنجیر نکالی گئی تھی اور زنجیر نکالنے سے پہلے دونوں مرتبہ میرے ہاتھ پشت پر باندھ لیے گئے تھے۔ درحقیقت یہ لوگ جنگلی جانوروں کی سی حسیات رکھتے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کو پژمردہ یا کاہل نہیں دیکھا۔ شکار کرنے والے جانوروں ہی کی طرح وہ ہر وقت چوکس اور ہوشیار نظر آتے تھے۔ ایسے لوگ اگر مسلح بھی ہوں تو انہیں دھوکا دینا آسان نہیں ہوتا۔

اگلے روز حسب معمول صبح سویرے ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد ہمیں کام پر لگا دیا جاتا تھا لیکن آج پروگرام کچھ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ گھر میں چہل پہل محسوس ہو رہی تھی اور ابھی تک چوکی دار سانور نے بھی اپنی منحوس صورت نہیں دکھائی تھی۔ نو بجے کے لگ بھگ ہماری کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔ سامنے چار مسلح افراد کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا ساتھی مزدور رحمت خان بھی تھا۔

غالباً اسے بھی ابھی ابھی کوٹھری سے نکالا گیا تھا۔ مسلح افراد میں ایک وہی لمبی تڑنگی وحشی صورت عورت تھی جس سے آغاز میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ آج بھی اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص کا گریبان خطرناک حد تک کھلا تھا اور دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ سرخ شیفون کا دوپٹا عورت نے کسی اسکارف کی طرح گلے میں لپیٹ رکھا تھا۔ ساتھی مردوں کی طرح وہ بھی مسلح تھی۔

ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ کر پاؤں سے وزن نکالا گیا اور گن پوائنٹ پر گھر کے بیرونی دروازے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ جب ہم ڈیوڑھی سے نکل رہے تھے گھر کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک انڈا ہوا میں تیرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میں نے جلدی سے سر جھکا لیا۔ انڈا چھچ کی آواز سے زریں گل کی کنپٹی پر لگا اور اس کی زردی سفیدی اس کے چہرے پر بہہ گئی۔ ہمارے ساتھ یہ "شائستہ" حرکت کرنے والی صاحب خانہ کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ کھی کھی کی آواز سے ہنستی ہوئی کھڑکی کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ زریں گل نے کھا جانے والی نظروں سے کھڑکی کو گھورا۔ شاید وہ کھڑکی پر جھپٹ ہی پڑتا لیکن اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ایک آٹو میٹک رائفل کی نال قریباً اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ کھڑکی کی طرف منہ کر کے بڑبڑایا "ام تم کو اس سے بڑا بددعا اور کیا دے سکتا ہے کہ یا خدا! تمہارا شادی اردو فلموں کے [illegible] ولن مصطفیٰ قریشی سے ہو جائے' وہ ہر رات تمہیں بورے میں باندھے اور ہر صبح اغوا کر کے واپس لے آئے۔ وہ ہر سال تمہارے اندر سے ایک بچہ پیدا کرے' یہ بچہ پیدائشی ولن ہو اور پیدا ہوتے ہی لڑکیوں کے سر سے دوپٹے کھینچنا شروع کر دے۔"

زریں نے یہ بکواس اردو میں کی تھی لہٰذا مسلح افراد میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ ہمیں جھیل کی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ چلاتے سُرنگ کے دہانے پر لے آئے۔ سورج نکلا ہوا تھا اور دہانے کے ارد گرد چہل پہل نظر آرہی تھی۔ ایکا ایکی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی خاص تقریب برپا ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سردی کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ کہیں یہ تقریب شاہد خاں کی سزا کے حوالے سے تو نہیں تھی...... اگلے دس منٹ میں میرا یہ بھیانک اندیشہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔

مسلح افراد ہمیں سُرنگ کے اندر لائے۔ آج ہم ایک نئے راستے سے اندر آئے تھے اور سُرنگ کا یہ حصہ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس حصے کو تراش خراش کر باقاعدہ راہداریوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ وسطی راہداری تو اتنی کشادہ تھی کہ اس میں سے دو کاریں پہلو بہ پہلو گزر سکتی تھیں۔ راہداری کی چھت بھی نسبتاً بلند تھی۔ دیواروں پر انسانوں اور جانوروں کی شبیہیں کندہ تھیں اور ان میں تین چار جگہ سانڈ کی وہ شبیہ بھی تھی جو دہانے پر بڑے اہتمام

سے بنائی گئی تھی۔ جب ہم کشادہ راہداری میں آگے بڑھے تو ایک نامانوس شور کانوں میں داخل ہونے لگا۔ جیسے بہت سے افراد کسی جگہ جمع ہوں اور "ہاؤ ہو" کر رہے ہوں۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے شور واضح تر ہوتا گیا۔ جلد ہی ہم نے خود کو ایک تماشا گاہ میں پایا۔ بلند و بالا پہاڑی کی جڑ میں یہ تماشا گاہ بھی انسانی ہاتھوں نے ہی بنائی تھی۔ اسٹیڈیم کے انداز میں یہاں پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر کم و بیش پانچ سو افراد ایک دوسرے میں پھنس پھنسا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مرد عورتیں اور بچے سب ہی شامل تھے۔ یہ سب مقامی لوگ تھے۔ بڑے بڑے بال' کانوں میں بالیاں اور رنگ برنگے لباس جو یقینی طور پر لوٹ کے مال کا حصہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نشے میں تھے۔ یہ لوگ رم کا نشہ کرتے تھے اور بے تحاشا پیتے تھے۔ ان میں سے کسی کسی مرد یا عورت کے بالوں میں بیش قیمت پتھر بھی ٹنکے ہوئے تھے اور دور سے جگمگاتے نظر آتے تھے۔ ان پتھروں کو خاص تکنیک کے ذریعے بالوں میں گوندھ لیا جاتا تھا۔ تماشائیوں کے جسموں سے اٹھنے والی ناگوار بو نے تماشا گاہ کو متعفن کر رکھا تھا لیکن تعفن کا احساس تماشائیوں کو نہیں تھا۔ تماشا گاہ کے عین بیچ ایک کنواں نما تالاب تھا۔ اس تالاب کی گہرائی سولہ فٹ کے لگ بھگ تھی اور قطر تقریباً تیس فٹ ہوگا۔ اس تالاب کی دیواریں پتھر کے چوکور بلاکوں کی تھیں۔ تالاب کے بالکل قریب جو لوگ بیٹھے تھے ان میں سے اکثر کے بالوں میں قیمتی پتھر گوندھے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ بستی کے خواص میں سے ہیں۔ ان میں کنجی سلیٹی آنکھوں والا وہی لمبا تڑنگا شخص بھی شامل تھا جسے میں نے اس بستی میں آنے کے فوراً بعد دیکھا تھا۔ وہ مقامی نظر نہیں آتا تھا لیکن اس کی قومیت کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ وہ ایک زرنگار کرسی پر پھیل کر بیٹھا تھا اور اس کے خواب ناک چہرے سے پُراسراریت جھلکتی تھی۔ میں نے تالاب میں جھانکا۔ وہ بالکل خشک تھا۔ اس کے اندر کا منظر دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ ایک خوف ناک جنگلی بھینسا جس کے جسم پر لمبے بال تھے' تالاب میں موجود تھا۔ اس کے سامنے ایک دراز قامت جوان عورت لباس سے بالکل بے نیاز کھڑی تھی۔ عورت کے لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے تھے اور اس کے چہرے پر خوف اور شرم کے بجائے وحشی پن نظر آتا تھا۔ وہ خوفزدہ بھی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ ہلاتے بھینسے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے زور سے چیخ مار کر بھینسے کو مشتعل کیا۔ بھینسے نے اپنا سر جھکایا اور تیر کی طرح عورت کی طرف آیا۔ عورت نے بجلی کی تیزی سے حرکت کی اور بھینسے کی زد سے صاف نکل گئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ بھینسے کے نوکیلے سینگوں پر روئی یا فوم سے بھری ہوئی دو تھیلیاں چڑھی ہیں۔ ان تھیلیوں کا مقصد یہی تھا کہ بپھرا ہوا جانور عورت کو کوئی سنگین زخم نہ لگا سکے۔ عورت نے بھینسے کا وار بچایا تو تماشا گاہ لوگوں کے نعروں سے گونج اٹھی۔

مجھے اور زریں گل کو تماشائیوں کے عقب میں ایک جگہ بٹھا دیا گیا۔ یہ تماشا گاہ کی سب سے بلند سیڑھی تھی اور اس پر ہم دونوں جیسے ایسے افراد موجود تھے جن کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر باندھے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کی پنڈلیوں پر مجھے "آہنی کڑے کے زخم" بھی نظر آئے۔ ہم سب کے بندھے ہوئے ہاتھوں کے درمیان سے ایک طویل زنجیر گزار کر ہمیں ایک ہی "رشتے" میں مربوط کر دیا گیا۔ رحمت خان بھی ہمارے ساتھ تھا۔

تالاب میں ہونے والا سنسنی خیز تماشا قریباً دس منٹ جاری رہا۔ جواں سال عورت چیخ کر اور اچھل کود کر بھینسے کو مشتعل کرتی۔ وہ تیر کی طرح اس کی طرف آتا اور وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ جاتی۔ اس تماشے کے دوران میں ہی میری نظر منصور پر پڑی۔ اسے ابھی ابھی تماشا گاہ میں لایا گیا تھا اور سب سے عقبی سیڑھی پر ہمارے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا تھا۔ منصور کے ہاتھ بھی ہماری طرح پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ منصور کو دیکھ کر میں اور زریں گل کھل اٹھے۔ منصور کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے چہرے پر آٹھ دس دن پرانی چوٹوں کے نشان تھے' اس کے سوا وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اسے ہم سے کافی فاصلے پر بٹھایا گیا تھا لہٰذا ہم اس سے بات نہیں کر سکتے تھے۔

دس منٹ کی خطرناک اچھل کود کے بعد جواں سال عورت تالاب کے اندر ہی واقع ایک آہنی دروازے کے راستے اوجھل ہو گئی۔ ایک ایسے ہی دوسرے دروازے کے راستے بدمست بھینسے کو بھی باہر نکال دیا گیا۔ اس کے بعد جو تماشا ہوا وہ خاصا طویل تھا اور تماشائیوں کے لیے بہت دلچسپ بھی۔ ایک نوجوان خوب رو لڑکی اور لڑکا تالاب میں داخل ہوئے۔ ان کے جسموں پر بھی لباس نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ نوجوان لڑکے کے لمبے بال چوٹی کی صورت میں اس کی گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ اس شوخ چنچل جوڑے کے ساتھ ہی ایک بدمست بھینسا بھی تالاب میں داخل ہو گیا۔ اس بھینسے کے سینگوں پر بھی حفاظتی تھیلیاں چڑھائی گئی تھیں۔ لڑکی لڑکے اور بھینسے کے درمیان ایک طویل کشمکش شروع ہو گئی۔ یہ درحقیقت ایک "ڈرامائی" "مثلث" تھی۔ لڑکا اور لڑکی اپنے فطری جذبات کے تحت ایک دوسرے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے لیکن بھینسا جو "ظالم سماج" کی علامت تھا اپنی خوف ناک پھنکاروں کے ساتھ ان کے درمیان آ جاتا تھا۔ نوجوان اپنی پھرتی اور چالاکی سے اس "ظالم سماج" کے وار بچاتا تھا اور اس کا رخ پھیر دیتا تھا لیکن جوں ہی وہ فارغ ہو کر اپنی محبوبہ کی طرف بڑھنے لگتا تھا' ظالم سماج پھر ان پر جھپٹ پڑتا تھا۔ ایک دو بار لڑکی براہ راست بھینسے کی زد میں آئی' نوجوان نے آگے بڑھ کر جانور کے غیظ و غضب کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور تماشائیوں سے خوب داد پائی۔

اس تماشے کے بعد چند منٹ بھولے موٹے کھیل ہوئے پھر ماحول پر ایک دم سنجیدگی غالب آ گئی۔ یوں لگا جیسے کوئی سنسنی خیز کھیل دکھایا جانے والا ہے۔ میری رگوں میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ شاہد خاں کے حوالے سے میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں تو اسی وقت بج اٹھی تھیں جب آج صبح مسلح افراد ہمیں لینے آئے تھے۔ اب اس بات میں شک کی بہت کم گنجائش رہ گئی تھی کہ آج کا دن شاہد خاں پر بہت بھاری ہے۔ کیا اسے واقعی مار دیا جائے گا؟ ہماری موجودگی میں؟ ہماری آنکھوں کے سامنے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ لیکن فیصلوں سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز "عمل" ہوتی ہے اور ہمارے پاس "عمل" کی معمولی سی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میں نے راستے میں اپنے ہاتھوں کی بندشوں کے ساتھ بہت کوشش کی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں۔ اب ہمارے بندھے ہوئے ہاتھوں کے درمیان سے طویل زنجیر بھی گزار دی گئی تھی۔ اس پر مستزاد دو رائفل بردار تھے جو چاروں خانے چوکس ہمارے سروں پر کھڑے تھے۔ ہم لوہے کے جال میں پھنسے ہوئے جانور کی طرح پیچ و تاب کھانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے دیکھا، دو عورتیں لکڑی سے تراشا ہوا ایک بڑا مجسمہ اٹھا کر لا رہی تھیں۔ چھ سات فٹ اونچا۔ مجسمہ "سانڈ" کا تھا۔ اسے گہری سلیٹی آنکھوں والے شخص کے روبرو رکھ دیا گیا۔ یہی شخص کا سربراہ پانامہ تھا۔ جس کے بارے میں زریں گل نے بھی بتایا تھا۔ میرے اس خیال کو ایک دو منظر سے بھی تقویت مل رہی تھی۔ زریں گل نے بتایا تھا کہ پانامہ کی دو بیویاں ہیں۔ سلیٹی آنکھوں والے اس گرانڈیل شخص کے دائیں بائیں دو خوب رو عورتیں موجود تھیں۔ انہوں نے اطلس کے ایک جیسے گلابی لبادے پہن رکھے تھے۔

مجسمہ گرانڈیل شخص کے سامنے رکھ دیا گیا تو سب لوگ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے اور کورس کے انداز میں گیت گانے لگے۔ یقیناً یہ کوئی مذہبی گیت تھا۔ اس گیت میں ان نو عمر بچوں کی آواز سب سے بلند تھی جو تماشائیوں کی سب سے اگلی صف میں گرانڈیل "پانامہ" کے دائیں بائیں موجود تھے اور اب تک بڑی دلچسپی سے مختلف تماشے دیکھتے رہے تھے۔ ان بچوں کی تعداد پچاس ساٹھ سے کم نہیں تھی۔

گیت ختم ہوا تو ایک دل دوز منظر نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہم نے شاہد خاں کو دیکھا۔ تین افراد اسے گھسیٹتے اور دھکیلتے ہوئے تالاب کی طرف لا رہے تھے۔ شاہد خاں اسی حالت میں تھا جس میں پچپن چھپن برس پہلے ماں کے شکم سے پیدا ہوا ہو گا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور لرز اٹھا۔ خوف و دہشت نے شاہد خاں کے نقوش بگاڑ رکھے تھے اور اس کا رنگ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے حلق کی پوری قوت سے چلا رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ شاہد خاں

اس شاہد خاں سے بہت مختلف تھا جو چھ سات روز پہلے مجھے ایک عشرت کدے میں ملا تھا اور اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا۔ تب اس کے حواس شراب اور شباب کے نشے میں گم تھے۔ آج موت کی دہشت نے اس کے حواس مختل کر رکھے تھے۔ اس کی چیخ و پکار سے یہ واضح تھا کہ وہ اپنے انجام سے باخبر ہو چکا ہے۔

مجھے لگا کہ میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی کہ شاہد خاں کو ہمارے سامنے زندگی سے محروم کیا جانے والا تھا۔ میں نے صفدر کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔ ہاں، میں اپنے پہلو میں بیٹھے زریں گل کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔

"مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے" میرے اندر سے صدا بلند ہوئی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میرے عقب میں کھڑے رائفل بردار نے نجانے کیسے میری دلی کیفیت بھانپ لی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ مجھ سے میرے سر پر آن کھڑا ہوا اور اس کی رائفل کی نال میری کمر سے قریب تر ہو گئی۔ مسلح پہرے دار روتے چلاتے فریاد کناں شاہد خاں کو لے کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ تاہم دو تین منٹ بعد ہی شاہد خاں ایک بار پھر ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس مرتبہ وہ اس دروازے سے برآمد ہوا جو تالاب کے اندر واقع تھا۔ تبھی دروازہ ایک زوردار کھٹکے سے کھلا تھا اور دو افراد نے شاہد خاں کو دھکیل کر تالاب کے وسط میں پھینک دیا تھا۔ شاہد خاں بھاگ کر پھر دروازے تک پہنچا لیکن اس وقت تک دروازہ دوسری طرف سے بند ہو چکا تھا۔ وہ دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگا اور رونے دھونے لگا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ تالاب میں دھکیلنے سے پہلے شاہد خاں کے ہاتھ کھول دیے گئے ہیں۔

اس کی حالت ترس ناک تھی لیکن اس جم غفیر میں اس پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ مادر زاد برہنہ تالاب کے وسط میں کھڑا تھا اور "پشتو" زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ یقیناً اپنی صفائی پیش کر رہا ہو گا، اپنی بے گناہی ثابت کر رہا ہو گا۔ شاید اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ بلکہ ہم بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ کس جرم کی سزا پا رہا ہے۔ اگر ہم جانتے بھی ہوتے تو کیا کر سکتے تھے، اپنا مافی الضمیر ان لوگوں کے سامنے بیان کرنا ہمارے لیے بہت مشکل تھا۔ صفدر سمیت ہم تینوں شاہد خاں کی صفائی میں ایک فقرہ بولنے کے قابل بھی نہیں تھے۔

یکایک کھٹکا ہوا اور تالاب میں واقع دوسرا دروازہ کھل گیا۔ ایک ساتھ تین سانڈ گولی کی رفتار سے برآمد ہوئے اور تالاب میں چکرانے لگے۔ شاہد خاں کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی لیکن یہ چیخ ان سیکڑوں پُرجوش چیخوں میں دب گئی جو تماشائیوں نے بلند کی تھیں۔ ان بدمست سانڈوں کے نوکیلے سینگ اس قدرتی روشنی

میں چمک رہے تھے جو تماشا گاہ کے مختلف روزنوں سے چھوٹ رہی تھی۔ ان سینگوں پر کوئی حفاظتی غلاف نہیں تھا۔ یہ خنجر صفت تھے، خوفناک تھے، یہ موت تھے۔ اس موت کو اپنے سامنے دیکھ کر شاہد خاں نے تالاب کی دیوار پر چڑھنا چاہا۔ سولہ فٹ اونچی چکنی دیوار جس کے پتھروں کے درمیان باریک درزیں موجود تھیں۔ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں ان درزوں میں پھنسا کر وہ قریباً دو تین فٹ اوپر گیا ہو گا کہ پھسل کر نیچے آ گرا۔ ایک سانڈ بجلی کی رفتار سے اس پر جھپٹا اور اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر دور پھینک دیا۔ تماشائیوں نے وحشیانہ نعرے بلند کیے۔ زمین پر گرتے ہی شاہد خاں اٹھا لیکن وہ اپنے عضب سے بے خبر تھا۔ ایک سانڈ نے سر جھکا کر اگلے پاؤں کو مخصوص حرکت دی اور ایک بے رحم ٹکر شاہد خاں کی کمر پر رسید کی وہ جیسے اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایک بار پھر شور و غل بلند ہوا۔ شاہد خاں اٹھا اور بری طرح لنگڑاتا ہوا مخالف سمت میں بھاگا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ایک کان خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ تالاب کی دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے ایک بار پھر اپنی انگلیاں پتھروں کی درمیانی درز میں پھنسائیں اور اوپر چڑھنا شروع کیا۔ وہ سانڈ عالم مستی میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ایک لاتعلق سا نظر آنے لگا تھا۔ زخمی شاہد خاں کو موقع ملا کہ وہ اوپر جانے کی تگ و دو کرے۔ تالاب کی دیوار سے کسی چھپکلی کی طرح چپک کر وہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھسکنے لگا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں بھی نکل رہی تھیں۔ قریباً چار پانچ فٹ اوپر جا کر وہ پھر پھسلا اور دھڑام سے تالاب کے پختہ فرش پر گر گیا۔ ایک سانڈ نے اسے سینگوں سے دھکیلا اور دوسرے سانڈ کی ٹانگوں میں لا پھینکا۔ وہ سانڈ مستی میں اچھل رہا تھا۔ اس کے سموں نے شاہد خاں کو لہولہان کر دیا——

اس کی چیخیں اب مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ وہ اب نہیں اٹھ سکے گا لیکن جان بچانے کے فطری جذبے کے تحت وہ پھر اٹھا۔ اس کا عریاں بدن خون سے لت پت تھا۔ ایک کندھے سے کھال اتر کر نیچے لٹک رہی تھی۔ لنگڑاتا ہوا وہ پھر دیوار تک پہنچا اور اوپر چڑھنا شروع ہوا۔ اس مرتبہ وہ بمشکل دو فٹ ہی اوپر آیا تھا کہ ایک سانڈ نے اچھل کر اس کے کولھے پر ٹکر رسید کی اور چاروں شانے چت گرا دیا۔ تالاب کے بالکل نزدیک بیٹھے نو عمر لڑکوں نے جوش و خروش سے تالیاں بجائیں۔ وہ اس خونی نظارے کو بے حد "انجوائے" کر رہے تھے۔ شاید انہیں یہاں لایا ہی اس لیے گیا تھا کہ بچپن سے ہی سفاکی اور خوں خواری ان کے مزاج میں شامل ہو جائے۔

شاہد خاں کے ساتھ یہ انسانیت سوز تماشا صرف دو تین منٹ مزید جاری رہا۔ وہ نزع کے عالم میں تھا کہ ایک سانڈ کے تیز نوکیلے سینگ اس کی پسلیاں توڑتے ہوئے سینے میں جا گھسے اور وہ اب بے جان لوتھڑے کی طرح اس کے سینگوں پر جھول کر رہ گیا لیکن

سانڈوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ اس کے مُردہ جسم کو بھی ادھر سے ادھر اچھالتے رہے اور اپنے پاؤں تلے روندتے رہے۔۔۔ چند منٹ بعد تالاب کا وہ دروازہ کھل گیا جس میں سے سانڈ اندر داخل ہوتے تھے۔ چار افراد لمبے لمبے بانس لیے تالاب کے بالائی کنارے پر نمودار ہوئے۔ ان بانسوں کے آگے نوکیلا لوہا لگا ہوا تھا۔ ان بانسوں سے دھکیل دھکیل کر سانڈوں کو دروازے میں داخل کر دیا گیا۔

تالاب خالی ہو گیا تھا۔ اس کے وسط میں شاہد خاں کی ناقابلِ شناخت لاش پڑی رہ گئی تھی۔ یہ سب کو رد کفن لاش اس باہمت اخبار نویس کی تھی جس کی ذہانت نے اسے ایک خطرناک کام پر اکسایا تھا۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے ان برف زاروں میں گھوم رہا تھا اور ان واقعات کا کھوج لگا رہا تھا جو وقتاً فوقتاً اس علاقے میں رونما ہو رہے تھے۔ دو ہفتے پہلے تک شاہد خاں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ خود بھی ایک ایسے ہی واقعے کی نذر ہونے والا ہے اور اخبار میں اس کے بارے میں بھی یہ سرخیاں لگنے والی ہیں۔

جانوروں کی آمد و رفت والا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوسرا دروازہ کھلا جس میں سے بدنصیب شاہد خاں اندر داخل ہوا تھا۔ اب اس میں سے ایک عورت برآمد ہوئی۔ اس مقامی عورت نے کسی جانور کی بھدی سی کھال کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سیاہ گھونگریالے بال کسی بہت بڑے چھاج کی طرح اس کے سر پر دھرے تھے۔ عام مقامی عورتوں کی طرح اس کی پیشانی پر بھی سفید دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ شاہد خاں کی مسخ لاش کے قریب پہنچ کر عورت نے اپنے لباس میں سے ایک خنجر برآمد کیا اور وحشیانہ انداز میں لاش پر جھک گئی۔ غور سے دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ عورت نے خنجر کی نوک سے شاہد خاں کی ایک آنکھ حلقے میں سے نکالی اور اپنی ہتھیلی پر رکھ لی۔۔۔۔ پھر یہی سلوک اس نے دوسری آنکھ سے کیا اور منہ سے ایک ناقابلِ فہم آواز نکال کر تالاب میں سے نکل آئی۔ اس کی ناقابلِ فہم آواز کے جواب میں تماشائیوں نے بھی نعرہ زنی کی پھر سب لوگ اپنی اپنی نشستوں سے اٹھنا شروع ہو گئے۔ رائفل برداروں نے ہمیں بھی اٹھا دیا۔ زریں گل غم زدہ لہجے میں شاہد خاں کے قاتلوں کو کوس رہا تھا۔ لیکن یہ کوسنے چونکہ اردو میں تھے لہٰذا رائفل برداروں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔

صفدر بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ایک نیا غیظ و غضب ہمارے دلوں میں بھر گیا۔ صفدر کی آنکھوں میں مجھے وہی عقابی چمک نظر آ رہی تھی جو کسی حالت میں بھی مدھم نہیں پڑتی تھی اور جس کی کرنیں ہر اندھیرے کا سینہ چیر کر نکلتی تھیں۔ ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو تسلی دی اور اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ صفدر سمیت کچھ دیگر ماراؤں کو تماشا گاہ کے مشرقی دروازے سے نکالا گیا تھا۔ ہم مخالف سمت کے

دروازے سے نکلے۔ شاہد خاں کی موت کا منظر میرے سینے میں کہرام مچا رہا تھا۔ آج لمبے بالوں اور بدبودار جسموں والے یہ پہرے دار مجھے ہمیشہ سے زیادہ برے لگ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ سب مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر ان پر ٹوٹ پڑوں۔ اپنی کی اور اپنی چاہی ایک کروا لوں۔

ترنگ کی بھول بھلیوں سے نکل کر ہم کھلی جگہ پہنچے۔ سورج اب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ وادی کے سرسبز نشیب و فراز روشن تھے۔ جھرنے کا پانی شریر بچے کی طرح پتھروں کو پھلانگتا ہوا گزر رہا تھا اور دور فاصلے پر برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں۔ یہ خوب صورت مناظر تھے لیکن کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہر منظر پہ شاہد خاں کے خون ناحق کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ آج میرے عقب میں تین کے بجائے دو افراد ہیں۔ یعنی پہلے مجھ اکیلے کی نگرانی تین افراد کرتے تھے، اب ہم دونوں کی نگرانی دو افراد کے ذمے تھی۔ یا بالفاظ دیگر میرے اور تریں گل کے حصے میں ایک ایک پہرے دار آتا تھا۔ میرے اندر کچھ کر گزرنے کی امنگ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ میں نے اردو میں تریں گل سے کہا ”مجھ سے لڑ سکتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ وہ بڑبڑایا۔

”لڑائی کا مطلب لڑائی ہوتا ہے۔“

”آپ..... جو کرنا چاہ رہا ہے“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں! اسے لیکن تم اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔ ہمیں پہلے تلخ کلامی کرنا ہو گی پھر دھینگا مشتی لیکن بھاگنے کی کوشش صرف میں کروں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”لیکن استاد یہ سب.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر کر سکتے ہو تو بولو۔“

تریں گل کے چہرے پر رضامندی کے آثار نظر آ رہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا ایک رائفل بردار نے ہمیں بری طرح جھاڑ دیا۔ اپنی زبان میں اس نے نہ جانے ہمیں کیا کیا صلواتیں سنائیں۔ بہرحال اتنی بات ہماری سمجھ میں بھی آ گئی کہ وہ ہمیں خاموش رہنے کا حکم دے رہا ہے۔

ہم خاموش ہو گئے لیکن یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ میں ذہنی طور پر خود کو تیار کر رہا تھا۔ ترنگ کے راستے سے قریباً تین سو گز اوپر آنے کے بعد وہ مقام آ گیا تھا جو میری کارروائی کے لیے موزوں ترین تھا۔ میں اس راستے سے اب تک چھ سات دفعہ گزر چکا تھا۔ اس آمدورفت کے دوران میں ایک ہی جگہ مجھے ایسی نظر آئی تھی جہاں کسی قسم کا ”رسک“ لیا جا سکتا تھا۔ یہ جگہ درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ دائیں طرف جھرنے کی گزرگاہ تھی، بائیں طرف خطرناک ڈھلوان تھی جس پر ابھی تک برف کی تہ موجود تھی۔ میں اس ڈھلوان پر لڑھک جاتا تو چالیس پچاس فٹ آگے جا کر ان کی گولیوں کی زد سے نکل سکتا تھا۔ یہیں سے یہ ڈھلوان شروع ہوتی

میں نے تریں گل سے جھگڑا شروع کر دیا۔ جو بھی اول فول منہ میں آیا تھا ہم بک رہے تھے۔ اب تو وہ فقرے بھی یاد نہیں آ رہے جو ہم نے ادا کیے۔ پہرے دار ہماری نافرمانی پر چیخ رہا تھا۔ دوسرے پہرے دار نے تریں گل کو چپ کرانے کے لیے اس کی کمر پر رائفل کا دستہ رسید کیا۔ اسی دوران میں میں نے بھی ایک لات اس کی پشت پر جمائی۔ جواباً تریں گل مجھ پر جھپٹا اور ٹکر میرے سینے پر رسید کرنا چاہی۔ یہ ٹکر میرے کندھے پر لگی اور تریں گل دور گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں کم طاقت سے گھونسا رسید کیا۔ تریں گل اپنے پہلو پر جھک گیا۔ تریں گل کی ٹانگ نے بجلی کی طرح حرکت کی اور میرے پیٹ پر لگی۔ یہ ضرب جتنی غیر متوقع تھی اتنی ہی باموقع اور برمحل بھی تھی۔ میں لڑکھڑا کر ڈھلوان کے بالکل کنارے پر پہنچ گیا، یہاں سے مجھے ڈھلوان پر لڑھکنا اتنا آسان محسوس ہوا کہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میں پشت کے بل ٹھوس برف پر گرا اور تیزی سے پھسلتا ہوا دور نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ رائفل بردار بھونچکا رہ گئے۔ جس وقت پہلا فائر ہوا میں راستے سے قریباً ڈیڑھ سو فٹ نیچے گھنے درختوں میں پہنچ چکا تھا۔ میرے جسم پر ہلکی پھلکی خراشیں اور چوٹیں ضرور آئی تھیں تاہم میں ہوش و حواس میں تھا۔ جہاں میں رکا تھا وہاں سے راستہ نظر نہ آتا تھا اور نہ رائفل بردار۔ برف کی ڈھلوان نے مجھے پھسلا کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا لیکن درختوں کی وجہ سے میں رک گیا تھا۔ رکنے کے ساتھ ہی میں اٹھا اور مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کدھر جا رہا ہوں۔ ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی، مجھے رائفل برداروں سے دور نکلنا ہے۔ میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور جسم میں توانائی لہریں لے رہی تھی۔ ڈھلوان کے سبب میری رفتار تیز ہو رہی تھی تاہم اپنے قدموں پر مجھے پورا قابو تھا۔ قدم تو ہوا میں اڑ رہے تھے، پتھروں کو پھلانگ رہے تھے، کھائیوں کو پار کر رہے تھے۔ آٹھ دس سیکنڈ کے وقفے کے بعد میرے عقب میں تین چار فائر ہوئے اور پھر ایک فل میگزین برسٹ مارا گیا لیکن اس فائرنگ سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میرے جسم میں کوئی انگارا اترا اور نہ وہ جھٹکا محسوس ہوا جو گولی لگنے کی نشانی ہوتا ہے۔ یقیناً یہ فائرنگ مجھے دیکھے بغیر کی گئی تھی۔ خود کو محفوظ پا کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ ڈھلوان طے کر کے میں ایک چھوٹے سے راستے پر آ گیا۔ ایک بارہ تیرہ سالہ مقامی لڑکی چند پالتو مرغیوں کو گھیر کر گھر میں لے جا رہی تھی۔ مرغیاں میری وجہ سے پھڑپھڑائیں اور چاروں طرف پرواز کر گئیں۔ لڑکی بھی دھکا لگنے سے دوہری ہو گئی اور خوف آمیز حیرت سے مجھے تکنے لگی۔ میں راستہ پار کر کے ایک گلی میں گھس گیا۔ یہاں ایک بہت موٹی عورت میرا دھکا لگنے سے نالی میں گری اور ایک بوڑھا جو فائرنگ کی حقیقت جاننے کے لیے گھر کے دروازے سے نکلا تھا، تڑپ کر دوبارہ دروازے میں گھس گیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا، یہاں کچی چھتوں والے مکانات تھے

جن پر کثرت سے جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ جوں ہی میں گلی کے سرے پر پہنچا ایک مقامی شخص رائفل بدست نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے رائفل سیدھی کی۔ گولی چلنے سے پہلے میں ایک ذیلی گلی میں گھس گیا۔ میرے عقب میں ہونے والی ہوائی فائرنگ اب بہت نزدیک آ چکی تھی۔ یہ گنجان آبادی میرے لیے جائے امان ثابت ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ لوگ گھروں سے نکل کر مجھ سے لپٹ جاتے اور تکہ بوٹی کر ڈالتے، میں نے رسک لیا اور ایک گھر کے ادھ کھلے دروازے کو کندھے سے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹے سے صحن میں ایک پہاڑی بکرا کھڑا تھا۔ آٹھ نو ماہ کا ایک ننگ دھڑنگ بچہ آنگن میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل رہا تھا۔ میں ان دونوں کے درمیان سے گزرتا ہوا تیر کی طرح ایک تاریک کمرے میں گھس گیا۔ اس کمرے میں ایک اور کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ یہ دوسرا کمرا مجھے زیادہ محفوظ نظر آیا۔ اس کمرے کا اثاثہ چند تہ شدہ بستروں، ایک چوبی صندوق اور پلاسٹک کے تین چار ڈرموں پر مشتمل تھا۔

دروازے کے بالکل ساتھ کمرے کا تاریک ترین گوشہ موجود تھا۔ میں یہاں دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈھلوان پر گرنے سے میرے جسم پر جو چوٹیں وغیرہ آئی تھیں ان میں جلن ہو رہی تھی تاہم ان تشویش ناک لمحات میں یہ جلن غیر اہم سی چیز بن گئی تھی۔ چند لمحے بعد مجھے کسی عورت کے کھانسنے کی آواز آئی۔ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ وہ اسی کمرے کی طرف آ رہی ہے۔ میں پوری طرح چوکس ہو گیا۔ دروازے سے تین چار قدم دور رک کر عورت نے ایک چونکی ہوئی سی آواز نکالی۔ جیسے اپنی زبان میں پوچھ رہی ہو کہ کون ہے۔ یقیناً وہ شک میں مبتلا ہو چکی تھی۔ میں منتظر رہا کہ وہ اندر آئے لیکن وہ واپس پلٹ گئی۔ یہ زیادہ پریشان کن صورت حال تھی۔ میں نے ادھ کھلے دروازے کی درز میں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ چند سیکنڈ بعد عورت کے قدموں کی چاپ دوبارہ ابھری۔ دروازے کے بالکل پاس آ کر اس نے ایک بار پھر چونکی ہوئی آواز نکالی۔ پھر محتاط قدموں سے اندر آ گئی۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میرے اس پر جھپٹنے سے پہلے اس نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹھ دس انچ لمبا چمک دار چھرا نظر آ رہا تھا۔ اس چھرے کی ایک تیز حرکت میری انتڑیوں کا ”مزاج“ پوچھ سکتی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد عورت نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ تاریکی میں وہ ٹھیک سے مجھے دیکھ سکتی میں نے دائیں پاؤں کی سخت ٹھوکر کی ضرب اس کے جبڑے پر رسید کی۔ وہ اچھل کر عقبی دیوار سے ٹکرائی اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر آن گری۔ یقیناً وہ بےہوش ہو چکی تھی تاہم اس کی بےہوشی پختہ کرنے کے لیے میں نے ایک اور ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی۔ عورت کے ہاتھوں سے چھرا فرش پر گر چکا تھا۔ میں

چھرے کی طرف پشت کر کے زمین پر بیٹھ گیا اور اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے چھرا اٹھا لیا۔

عورت گہری سانسیں لے رہی تھی۔ میرے ”ٹریننگ بوٹ“ کی ٹھوکر سے اس کے جبڑے کی کھال چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو چکی تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب ہو گی لیکن سخت موسمی حالات میں رہنے کے سبب وہ چالیس کے لگ بھگ نظر آتی تھی۔ بستی کی عورتوں کی طرح اس کی پیشانی پر بھی دھاریاں تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جوان اور کنواری عورتوں کی پیشانی پر ایک اور شادی شدہ کی پیشانی پر دو دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس عورت کی پیشانی پر دو دھاریاں تھیں۔ تاہم ابھی کچھ دیر پہلے ”قتل گاہ“ میں میں نے جس عورت کو مقتول شاہد خاں کی آنکھیں نکالتے دیکھا تھا اس کی پیشانی پر تین دھاریاں تھیں۔ ممکن تھا کہ یہ تین دھاریاں بیوگی کی نشانی ہوں۔ اس حوالے سے یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ شاہد خاں کی آنکھیں نکالنے والی عورت اسی فرد کی بیوہ ہو جو دس روز پہلے منصور کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

کہیں قریب ہی ہونے والی فائرنگ نے مجھے میرے خیال سے چونکایا۔ یقیناً میرا تعاقب کرنے والے اس طویل گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ فائرنگ کے علاوہ ملا جلا شور بھی میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ میری سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ آزاد ہوں۔ اس کے بعد ہی میں اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو سکتا تھا۔ یہ چھرا جو اب میرے ہاتھ میں تھا عورت اپنے دفاع کے لیے لائی تھی لیکن اب یہ میرے دفاع کے کام آنے والا تھا۔ وہ جب پہلی بار دروازے کے پاس آئی تھی تو پلٹ کر چلی گئی تھی۔ یقیناً اس وقت وہ یہ چھرا ہی لینے گئی تھی۔

میں نے چھرا اپنے دائیں ہاتھ میں تھاما اور اس کی دھار رسی پر رکھ کر آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔ چھرا بہت تیز تھا ”زاویہ“ نامناسب ہونے کے باوجود وہ رسی کو ”مجروح“ کرنے لگا۔ شروع میں یہ کام قدرے دشوار محسوس ہوا لیکن جلد ہی چھرے کی حرکت حسب منشا ہو گئی۔ چار پانچ منٹ کے اندر اندر میں نے ایک رسی کاٹ ڈالی اور دوسری کو قابل ذکر نقصان پہنچا دیا۔ دونوں بازوؤں کو کھینچ کر زور لگایا تو یہ دوسری رسی بھی ٹوٹ گئی..... میرے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔

یہی وقت تھا جب میں نے صحن کی طرف سے بچے کے رونے کی آواز بلند ہوتے سنی۔ میرا اندازہ تھا کہ بے ہوش عورت ہی اس کی ماں تھی اور اب وہ اسے پکار رہا تھا۔ بچے کا مسلسل رونا کسی تیسرے فرد کو بھی میری طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ میں محتاط قدموں سے صحن میں آیا۔ پہلے بیرونی دروازہ اندر سے بند کیا، پھر بچے کو چمکارتے ہوئے اٹھایا اور اندر لے آیا۔ یہ مکان دو کمروں اور ایک تنگ سے کچن پر مشتمل تھا۔ واپس کمرے میں آتے ہوئے

میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا کوٹھری میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر میں ماں اور بچے کے سوا اور کوئی نہیں۔ بچہ مسلسل حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا اور خوف ہی سے وہاں بہہ رہی تھی۔ دوسری طرف گلی میں بھی ہلچل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ غالباً چند ہی چوہے گھروں کے دروازے پیٹے جا رہے تھے اور اہلِ خانہ سے استفسار کیا جا رہا تھا کہ کسی مارد (قیدی) نے یہاں چھپنے کی کوشش تو نہیں کی۔ میں نے بچے کی چیخ پکار روکنے کی کوشش کی۔ اسے سینے سے لگایا، بانہوں میں جھلایا لیکن اس پر ذرا اثر نہیں ہوا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور اندھا دھند ہاتھ چلا رہا تھا جیسے مجھے گھونسے مارنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں نے اس کی ماں کو کیوں مارا ہے۔

میں نے جھک کر عورت کو دیکھا۔ اس کے جبڑے سے خون رس رہا تھا۔ میں نے مجبوراً اسے چوٹ لگائی تھی، بہرحال چوٹ کچھ زیادہ ہی لگ گئی تھی۔ میں نے اس کا جبڑا ہلا جلا کر دیکھا ہڈی ٹوٹنے سے محفوظ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں نظر گھمائی۔ چوبی صندوق پر آرائش کا معمولی سامان رکھا تھا۔ اس میں ہلکم پاؤڈر کا ایک ڈبا بھی تھا۔ میں نے عورت کے زخم پر پاؤڈر چھڑک کر اس کا خون روک دیا۔ پھر اس کی قمیص اٹھائی اور روتے بلکتے بچے کو وہاں پہنچا دیا جہاں پہنچ کر وہ سکون پا سکتا تھا۔ بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا تو میں نے گھوم پھر کر دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ مجھے فوری طور پر کسی ہتھیار کی ضرورت تھی۔ میں نے دونوں کمروں کا سامان الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن ہتھیار کے نام پر ایک تیر کمان کے سوا کوئی شے نظر نہیں آئی۔ یہ کمان اور اس کے بہت سے تیر ایک پلاسٹک ڈرم میں رکھے تھے۔ یہ وہی پلاسٹک ڈرم تھے جو ہائیکرز اور کوہ پیما اپنے سامان کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یقیناً گزرے ماہ و سال میں یہ ڈرم کسی "حوث اور" میں ان لوگوں کے ہاتھ لگے ہوں گے، اور بات صرف ڈرموں کی نہیں تھی اس چاردیواری میں موجود بیشتر سامان مالِ غنیمت کا حصہ تھا۔ مجھے ایک کونے میں ایک نہایت بیش قیمت ہیڈ ٹارچ بھی پڑی نظر آئی۔ یہ پڑے پڑے برباد ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس بدنصیب کوہ پیما کے سامان کا حصہ تھی۔ وہ کون تھا؟ کب اس مہلک سفر پر روانہ ہوا تھا اور کب ان خونخوار قبیلے کے ہتھے چڑھا تھا۔ تیر کمان میرے لیے بے کار تھی۔ میں نے انہیں واپس پلاسٹک ڈرم میں رکھ دیا اور صرف چھرے پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسی دوران میں گھر کا داخلی دروازہ دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا۔ آخر خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میں نے چھرا ہاتھ میں لیا اور بیرونی کمرے کے دروازے میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ دھڑ دھڑانے کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ بلند آواز میں بول رہے تھے پھر کوئی کسی وزنی چیز غالباً ہاتھ والی کے کندے سے دروازے پر ضربیں لگانے لگا۔

اب اس سے اگلا اقدام یہ تھا کہ لوگ دیوار پھاند کر اندر آ جاتے۔ میں نے دوڑ کر صحن عبور کیا اور دروازے کی مخالف سمت والی دیوار پھاند کر باہر گلی میں آ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے جس نے مہر نوکری اٹھا رکھی تھی مجھے دیکھ کر زوردار چیخ ماری۔ میں گلی عبور کر کے ایک کشادہ راستے پر آ گیا پھر اس راستے کو کراس کر کے ایک اور گلی میں گھس گیا۔ اب میرے ہاتھ آزاد تھے اور ایک تیز دھار آلہ بھی میرے پاس تھا۔ میں خود کو زیادہ بااعتماد محسوس کر رہا تھا۔ جس گلی میں، میں بھاگ رہا تھا وہاں اکا دکا راہ گیر موجود تھے۔ انہوں نے خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھا لیکن کسی نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر یہ صورت حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ یوں ہی میں ایک موڑ سے گزرا مجھے اپنے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی اور بہت سا شور و غل بلند ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ "بھاگو پکڑو" جیسا یہ شور و غل میرے ہی اعزاز میں بلند ہو رہا تھا۔ ایک منجھے کٹے شخص نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی، میں نے وحشیانہ انداز میں چھرا گھمایا تو وہ تڑپ کر دور ہٹ گیا۔ اب میں اسی منحوس ٹرنک کے پاس تھا جس کے دہانے پر سائڈ کی شبیہ کندہ تھی اور جس کے اندر ابھی تو وہ پون گھنٹا پہلے شاہد خاں کو موت کی نیند سلایا گیا تھا۔ دہانے کے پاس ابھی تک کچھ تماشائی ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ ان ہی میں سے ایک معاملہ فہم شخص نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ اس معاملہ فہمی کا انعام اسے کاری زخم کی صورت میں ملا۔ چھرے کے اس زخم نے اس کی ایک ران کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ان تماشائیوں کے لیے میری رگوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اگر وہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کرتے تو یہ ان میں سے تین چار کی لاشیں ضرور زمین پر لڑھکا دیتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، وہ اپنی جگہ سکتے کی حالت میں کھڑے تھے۔ میں نے اس کشادہ جگہ کو عبور کیا اور جھرنے کی گزرگاہ کی طرف نکل گیا۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور بے ترتیب مکانات تھے۔ ڈھلوان پر دو مزید افراد سے میری مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک کے پیٹ میں میرے چھرے کا وار لگا، دوسرا میری زبردست ٹھوکر کھا کر ایک کھائی میں جا گرا۔ اسی دوران میں کسی نے دبی دبی آواز میں چیخ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا اخروٹ اور چیڑ کے گھنے درختوں میں ایک لڑکی کھڑی مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اس کا انداز سراسر دوستانہ تھا، پھر اس کے الفاظ بھی میری سمجھ میں آ گئے تھے۔ اس نے دو تین بار "کم آن" کہا تھا۔ نشیب سے بلند ہونے والا غضبناک شور لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ ایسے میں لڑکی کی پیشکش کو رد کرنا بے وقوفی تھی۔

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر تیزی سے لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ خوف سے زرد ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور بھاگتی ہوئی ایک دروازے میں گھس گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دروازے میں داخل ہوا۔ لڑکی

دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی اس نے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"کم آن کم آن" وہ ہیجانی لہجے میں بولی اور مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

خون آلود چھرا ہاتھ میں لیے میں لڑکی کے پیچھے ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا "یو آر سیف ہیئر" اس نے کانپتی آواز میں کہا اور مجھے ایک قدِ آدم سی الماری کی اوٹ میں چھپا دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لڑکی مقامی ہونے کے باوجود انگریزی بول رہی تھی۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی بند کر کے وہ باہر نکل گئی اور پھر دروازہ بھی باہر سے بند کر دیا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا۔ لیکن اگلے ہی لمحے دور ہو گیا۔ فرض محال اگر لڑکی نے کوئی چال بھی چلی تھی تو اس کمرے میں آ کر میں گھاٹے میں نہیں رہا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک شاندار سیون ایم ایم لٹک رہی تھی اور اس کے درجنوں راؤنڈ بھی بیلٹ میں موجود تھے۔ میں نے سیون ایم ایم اپنے قبضے میں کی۔ یہ سنگل شاٹ چلانے والی رائفل تھی لیکن اس میں "مین" کا اضافہ کر کے اسے برسٹ مارنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ میگزین پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ گزرے پھر آدھ گھنٹا پھر ایک گھنٹا گزر گیا۔ نہ کوئی اندر آیا نہ کوئی آواز سنائی دی۔ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے میرا جسم اکڑنے لگا تھا۔ میں اٹھ کر مختصر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک دروازے کے پاس آہٹ ہوئی۔ میں نے سیون ایم ایم پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ دروازہ کھلا اور وہی مقامی لڑکی اندر آ گئی۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ بیس بائیس برس کی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس نے بالوں کے درمیان سے مانگ نکالی ہوئی تھی اور مقامی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی پیشانی پر صرف بک دھاری تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔

میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر وہ ٹھٹکی پھر آہستگی سے بولی "رکھ دو۔ تمہارے لیے اب کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے اس پر اعتماد کا اظہار ضروری سمجھا اور رائفل ایک طرف رکھ دی۔ وہ شکستہ انگریزی میں بولی "ہم نے تمہیں ٹرنک کے دہانے کے پاس لڑتے دیکھا تھا، پھر تم اوپر آ گئے۔ وہاں بھی تم نے دو افراد کے ساتھ لڑائی کی۔ ہم نے سوچا کہ تمہاری جان بچانی چاہیے۔"

"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا "کیا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ تھا؟"

وہ ذرا چونک کر بولی "ہاں۔۔۔ میری سہیلی ہے۔ ڈاملہ۔۔۔ اسی کے کہنے پر میں باہر درختوں میں گئی تھی اور تمہیں آواز دی تھی۔ وہ ذرا مصروف ہے۔ ابھی اس کا مالک چلا

جاتا ہے تو وہ آتی ہے۔"

"مالک؟ کیا وہ یہاں ملازمہ ہے؟"

"ہاں، وہ مارد (قیدی) ہے۔ اسی گھر میں کام کرتی ہے۔ میں بھی بہت عرصے سے اس گھر میں کام کرتی رہی ہوں۔" لڑکی عجیب ٹوٹے پھوٹے لہجے میں انگریزی بول رہی تھی۔ اس کا "مافی الضمیر" سمجھتے سمجھتے ذہن کی کافی ورزش ہو جاتی تھی۔

میں نے کہا "تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"بیلاس" اس نے ذرا شرماتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور تمہاری سہیلی کا؟"

"ینگ وہی" اس نے جواب دیا۔

ینگ کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ نام۔۔۔۔۔ یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا تھا، اور۔۔۔۔ یہ زیادہ دنوں کی بات بھی نہیں تھی۔ اچانک مجھے یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ نام میں نے سب سے پہلے مدراس میں سنا تھا۔ یہ اس کوہ پیما لڑکی کا نام تھا جو جون جاوِل اور دل وانگ کے ساتھ ہی لاپتا ہوئی تھی۔ وہ پارلی لیڈر کی سگی بیٹی تھی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا "یہ ینگ کب سے ہے یہاں؟"

لڑکی نے میرے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر کہا "تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس۔۔۔۔ بس یوں ہی۔ یہ نام کچھ سنا ہوا لگتا ہے۔"

"تم کچھ چھپا رہے ہو۔" وہ ٹٹولنے والے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"جس شخص کو ابھی کچھ دیر پہلے "موت کے کنویں" میں مارا گیا ہے، وہ تمہارا ساتھی تھا؟" میں نے اثبات میں جواب دینا مناسب سمجھا کیوں کہ لڑکی اس بارے میں پہلے سے جانتی تھی۔ اس نے دوسرا سوال پوچھا "تمہارے دو اور ساتھی بھی یہاں پکڑے گئے ہیں؟" میں نے اس مرتبہ بھی اقرار میں سر ہلایا۔ وہ بولی "تم لوگ کس چکر میں آئے تھے یہاں؟"

"ہمارا کوئی چکر نہیں تھا۔ ہم صرف سیر و سیاحت کے لیے نکلے ہوئے تھے۔"

اسی دوران میں دروازے پر خاص انداز میں دستک ہوئی۔ لڑکی نے جس نے اپنا نام بیلاس بتایا تھا اٹھ کر دروازہ کھولا۔ میں نے ایک خوبرو سفید رو لڑکی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے بال جوڑے کی صورت گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پُرکشش نسوانی جسم پر نیلی کوبلی جیکٹ اور بوشرٹ اور براؤن پتلون تھی۔ پاؤں میں بوسیدہ سے جوگر تھے۔ ہم اس حلیے میں بھی وہ شاندار نظر آتی تھی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ وہ ینگ ہی ہے۔ نیپال میں میری ملاقات اس کے والد مسٹر راموس سے ہو چکی تھی۔ بیٹی کے نقوش میں باپ کی شکل و صورت کی بہت سی جھلکیاں موجود تھیں۔ اس نے اندر آ کر مجھے

سر کا پھر کچھ سوچا پھر شائستہ انگریزی میں بولی "مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی۔"

"بے حد شکریہ۔" میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی اس ہمدردی کا صلہ کیسے ادا کروں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے میرے لیے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی "میرا خیال ہے کہ فی الحال آپ کو ایسے سوالوں کا بوجھ ذہن پر نہیں ڈالنا چاہیے۔" اس نے کوکونٹ بسکٹ کا ایک ڈبا میرے سامنے رکھ دیا' اس کے علاوہ تھوڑا سا پنیر بھی تھا۔ وہ آہستگی سے بولی "آپ یہ کھائیں اور پوری تسلی کے ساتھ آرام کریں۔ یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں اور آپ کو کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟ اگر ایسا ہے تو میں آپ کے لیے مرہم پٹی کا انتظام کر سکتی ہوں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن......"

"باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" اس نے شائستگی سے میری بات کاٹی "میں شام سے ذرا پہلے آپ کے پاس پھر آؤں گی۔" اس کے ساتھ ہی دونوں سہیلیاں باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ باہر نکلنے سے پہلے تھنگ نے وارننگ کے انداز میں کہا۔

"میرے خیال میں آپ کو یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے کہ یہاں آپ کے لیے سخت خطرہ موجود ہے۔"

میں نے اپنا سر تفہیمی انداز میں ہلایا۔ دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں۔ کمرے کی نیم تاریکی میں' میں ایک بار پھر اکیلا تھا۔ تھنگ کا ملنا نیک شگون تھا اور ایک بڑی کامیابی بھی۔ میں بجا طور پر امید کر سکتا تھا کہ ہمارا گوہر مقصود جوان چاؤل بھی یہیں آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا' اور اگر موجود نہ ہوگا تو کم از کم اس کا اتا پتا ضرور چل جائے گا۔

میں نے ایک کشن پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا اور کوکونٹ بسکٹ کھانے لگا۔ ساتھ ساتھ میں کمرے کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ یہ کمرا کسی پنساری یا طبیب کا دواخانہ معلوم ہوتا تھا۔ شیشے کی چھوٹی بڑی بوتلوں اور مرتبانوں میں کاڑھے اور خشک جڑی بوٹیاں رکھی تھیں۔ ایک بڑے جار میں کسی پودے کے اعضاء خشک کیے ہوئے تھے۔ کھلے منہ کی دو تین بوتلوں میں جامن کی شکل جیسا ایک خشک پھل بھرا ہوا تھا۔ ان تمام بوتلوں اور مرتبانوں پر چٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ جس فرنیچر نما الماری کے عقب میں مجھے چھپایا گیا تھا وہ کوئی آٹھ فٹ چوڑی تھی۔ میں نے الماری کے پٹ کھول کر دیکھے یہ نیچے سے اوپر تک بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان سب بوتلوں پر کاغذ کے ڈھکن تھے۔ میں نے ایک بوتل کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ شراب کی بو واضح طور پر محسوس ہوئی۔ یہ ناریل اور چاول کی تیز شراب تھی۔ باقی ماندہ بوتلوں میں بھی یقیناً یہی سیال تھا۔ یہاں کا جیسے اس چار دیواری میں شراب تیار کرنے کا کام ہوتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ خانہ ساز شراب کو اسی طرح بوتلوں میں بھر کے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ مہینوں تک یوں ہی پڑے رہنے کے بعد تیار ہو جاتی ہے۔

کمرے کے تفصیلی معائنے کے بعد میں تھک گیا اور دوبارہ ایک چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ دروازے میں اندر کی طرف ایک کنڈی موجود تھی' یہ کنڈی میں نے لڑکیوں کے جاتے ہی چڑھا دی تھی۔ چٹائی پر لیٹ کر میں نے اپنے سر کے نیچے کسی "بدنصیب سیاح" کا میلا کچیلا تکیہ رکھ لیا اور سوچوں میں گم ہو گیا۔ وقت کیسے حالات کے رنگوں کے ساتھ کتنی تیز رفتاری سے نئے سے نئے مناظر تخلیق کر رہا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں بے شمار پرانے مناظر رنگوں کا برش چل گیا تھا۔ لیکن ایک منظر ایسا بھی تھا جو تمام رنگوں کے نیچے دب کر بھی ابھر رہا تھا' اور یہ منظر تھا تواب زادہ شاہین کی موت کا۔ میں نے اس کا مردہ چہرہ نہیں دیکھا تھا لیکن میرے نہ دیکھنے سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی تھی کہ وہ مر چکی ہے۔ اپنی تمام تر ظاہری اور باطنی خوب صورتیوں اور اپنے انوکھے پیار کی تمام شدتوں کے ساتھ وہ اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ گلاب حیدر آباد کی اس انوکھی اور بے مثال کلی کو ایک زہریلے سانپ نے اپنی پھنکار سے بھسم کر دیا تھا اور وہ زہریلا ناگ نیسلی جان تھا اسے قتل کرنا اور پھر اس کے ہاتھوں قتل ہو جانا اب مجھ پر فرض تھا اس کا تصور ہر روز دو رات یار میرے ذہن کے دروازے پر دستک دیتا تھا اور مجھے یاد دلاتا تھا کہ وہ شاہین کا قاتل ہے......!

میرا دھیان شاہد خان کی دردناک موت کی طرف چلا گیا اور اس اندوہناک واقعے کے ساتھ ساتھ سفر کرتا تورین گل تک پہنچ گیا۔ میں نے تورین گل کو تشویش ناک صورت حال میں چھوڑ دیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس بات پر تورین گل کو سخت ناراضی ہو کہ اس نے مجھ سے جھگڑا کیوں کیا (اسی جھگڑے کے نتیجے میں' میں فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا) تورین گل سخت جان تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر قسم کی سزا خندہ پیشانی سے جھیلے گا۔ لیکن اس کے جو حالات ہیں مجھے ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔

اچانک کچھ نامانوس آوازوں نے مجھے میرے خیالات سے چونکا دیا۔ کمرے کی عقبی دیوار کے بالکل قریب سے "دھپ دھپ" کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے ریت کی بوریوں پر مسلسل گھونسے یا لاتیں رسید کی جا رہی ہوں۔ کبھی کبھی کسی کے تیز سے بولنے کی آواز بھی آتی تھی۔ پہلے تو میں ان آوازوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر کمرے کی عقبی دیوار کے پاس پہنچا۔ یہاں کمرے کی اکلوتی کھڑکی واقع تھی۔ یہاں بھی لڑکی نے کھڑکی کو اندر کی طرف سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ میں نے بے آہستگی کنڈی کھولی اور کھڑکی کے ایک پٹ کو تھوڑا سا اندر کی طرف دھکیل دیا۔ یہ ایک مختصر سا کمرا تھا۔ یقیناً اسے اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہاں لوہے کے چھوٹے جار پڑے تھے' ساتھ ہی لکڑی کے پرانے

ڈبے اور نہ جانے کیا کچھ پڑا تھا۔ اس کمرے کی چھت کے پاس مجھے ایک چھوٹا سا روشن دان نظر آیا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ایک جستی صندوق کے اوپر بید کی ایک خستہ کرسی رکھی اور روشن دان تک پہنچ گیا۔ احتیاطاً میں نے سیون ایم ایم پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اپنی نحوست بھرے قیمتی رنگوں کھانے کے بعد میں مختصر روشن دان سے باہر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک سرسبز احاطے کا وسیع منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ اس منظر میں کئی افراد موجود تھے لیکن ایک شخص ایسا تھا جسے دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

وہ منصور تھا۔ منصور نے صرف ایک سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ جوتوں سے بے نیاز تھا جو کہ بوٹس میں اڑس لیے گئے تھے۔ اس کا بالائی جسم ننگا تھا۔ رنگ بچھے اور نسل خوب تمازت نظر آ رہے تھے اور پسینے کی نمی سے چمک رہے تھے۔ منصور کی ایک کلائی پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی گولی کے اس زخم کی نشانی تھی جو گرفتاری کے وقت منصور کو آیا تھا۔ منصور کے مقابل لمبے بالوں والا ایک مقامی شخص تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ غصیلی نظروں سے منصور کو گھور رہا تھا پھر اس نے بجلی سے منصور پر حملہ چلایا۔ منصور نے جھکائی دے کر یہ وار خالی دیا اور اٹ لمحے اس نے بجلی کی ضرب مقابل کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب اس کا چہرہ مکمل طور پر میرے سامنے آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی تو حمد نوجوان تھا جس نے آج صبح تبتی تماشا گاہ میں لڑکی کے ساتھ مل کر مظاہرہ کیا تھا اور بپھرے ہوئے بھینسے کو نیچا دکھایا تھا۔ مگر یہاں صورت حال مختلف نظر آ رہی تھی۔ یہ پھرتیلا اور طاقت ور نوجوان میرے یار منصور کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔ منصور پوری تیاری میں نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں اس کے سامنے کسی کا ٹکنا سہل نہیں۔ پیٹ پر چوٹ کھانے کے بعد نوجوان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے بھنا کر منصور پر اوپر تلے تین چار حملے کیے۔ منصور نے بڑے اطمینان سے خود کو بچایا پھر سرعت سے مقابل کے چہرے پر ٹانگ سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ لٹو کی طرح گھوم کر ایک درخت کی جڑ میں گرا۔ بہت سے تو عمر لڑکے جو ذرا بلندی پر بیٹھے ہوئے ایک قطار میں بیٹھے تھے' تالیاں بجانے لگے۔ ان کے قریب کھڑے چند دیگر افراد نے بھی تالیاں بجائیں۔ مقامی روایات کے مطابق یہ لوگ تالیاں بجاتے کے ساتھ زبان اور ہونٹ دانتوں میں دبا کر حلق سے ایک عجیب سی آواز بھی نکالتے تھے۔ منصور نے گرے ہوئے نوجوان کو ہاتھ کا سہارا دے کر کھڑا کیا اور "شاباش" کے انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔ نوجوان کے چہرے پر گرد تھی شکست کی خجالت قدرے کم ہو گئی۔

منصور نے اپنے پسینہ بھیگے بال سر جھٹک کر پیچھے کیے اور نو عمر تماشائیوں میں سے ایک آٹھ دس سالہ تنومند لڑکے کو اپنے سامنے بلایا۔ اس نے لڑکے کو اپنے اوپر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ لڑکا پہلے تو جھجکا پھر اس نے مٹھیاں بھینچیں اور منصور پر حملہ آور ہو گیا۔ منصور اسے حملے سے بچاؤ کے انداز بتانے لگا' ساتھ ساتھ وہ اسے تبتی زبان میں سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ وہ دونوں حرکت کرتے کرتے میری نظروں کی "رینج" سے نکل گئے۔ اب وہ اس دیوار کے بالکل قریب تھے جس میں یہ روشن دان واقع تھا۔ میں اب صرف ان کی آوازیں سن سکتا تھا' یا پھر وہ آوازیں سن سکتا تھا جو ریت کی بوریوں پر ضرب لگنے سے پیدا ہو رہی تھیں۔ یقیناً وہاں بھی کچھ لڑکے "سینڈ بیگز" پر مکے بازی یا "لاتیں چلانے" کی مشق کر رہے تھے۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ مقامی لوگوں نے منصور کو اپنے نو عمر بچوں کی "حربی" تربیت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ یہ ایک اہم سوال تھا' تاہم اس کا جواب بھی فوراً ہی میرے ذہن میں آ گیا۔ منصور نے مقامی لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہوتے وقت زبردست مزاحمت پیش کی تھی اور اپنی حربی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر تین مسلح افراد کی اچھی خاصی درگت بنا دی تھی۔ چند دن پہلے شاہد خان نے بھی منصور کی اس دلیرانہ جدوجہد کی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ مقامی لوگوں کو منصور کے حملے نے بوکھلا دیا تھا۔ شاید منصور کی ان ہی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے مقامی بچوں کی ٹریننگ کا کام سونپا گیا تھا۔ پھر ایک اور بات میرے ذہن میں آئی اور ایک پیچیدہ سوال کا جواب خود بخود میرے سامنے واضح ہوتا چلا گیا۔ شاید یہ بات ٹھیک ہی تھی کہ مقامی لوگ اپنے آدمی کے بدلے میں منصور کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اور صرف قانون کا پیٹ بھرنے کے لیے اور مقتول کے وارثوں کو مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے شاہد خان کو مجرم ٹھہرا کر اسے سزائے موت دے دی تھی۔ منصور کو "قتل" نہ کرنے کی وجہ بھی اب سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے نئے طور طریقوں سے آگاہ نہیں تھے۔ غالباً منصور کے روپ میں انہیں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ایک ماہر ترین استاد نظر آیا تھا۔ بہرحال اس معاملے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا' ممکن تھا کہ میرے یہ سارے اندازے درست ہوں اور ممکن تھا کہ سارے غلط ہوں۔

اگر فاصلے کے حوالے سے دیکھا جاتا تو میرا یار مجھ سے صرف آٹھ دس گز کی دوری پر تھا۔ میں آواز دے کر اسے آسانی سے اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ لیکن یہ مختصر فاصلہ درحقیقت بہت لمبا فاصلہ تھا۔ منصور کو اپنی طرف متوجہ کرنا ان تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا جو یہاں موجود تھے...... میں بہ آہستگی نیچے اتر آیا۔

مجھے اب تھنگ ہی کا انتظار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آئے اور مجھے یہاں کے اور اپنے حالات کے بارے میں بتائے۔ جو کچھ وہ مجھے بتا سکتی تھی اور کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ اچانک مجھے ایک دل دوز

چیخ سنائی دی۔ یہ نسوانی چیخ تھی۔ کوئی عورت بھاگتی ہوئی دروازے کی طرف آئی پھر ایک دم پلٹ کر مخالف سمت میں گئی۔ اس کے پیچھے کوئی مرد تھا اور غضب ناک انداز میں گرج رہا تھا۔ دیگر اہلِ خانہ کی ملی جلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازے کی ایک جھری سے آنکھ لگائی۔ چند لمحے بعد میں متاثرہ لڑکی بلاس کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی اور ایک درمیانی عمر کا مقامی شخص ہاتھ میں لٹھ لیے اس کے پیچھے تھا۔ وہ بے دریغ اسے پیٹ رہا تھا۔ لڑکی دوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گئی' وہ بھی اس کے پیچھے گیا۔ چند لمحے بعد وہ دونوں اسی طرح آگے پیچھے بھاگتے نیچے اتر آئے۔ لڑکی ایک ستون کے گرد گھوم کر پھر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ غضب ناک شخص اب بھی اس کے پیچھے تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے لڑکی اور اسے پیٹنے والے مرد نے سیڑھیوں کے تین چکر اسی انداز میں مکمل کیے۔ لڑکی کی چیخیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ پھر لڑکی ٹھوکر کھا کر برآمدے میں ستون کے پاس گر گئی۔ مرد وحشیانہ انداز میں اس پر جھپٹا اور اس کے اوپر چڑھ کر اس کا گلا دبانے لگا۔ اہلِ خانہ لڑکی کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ چھڑانے والوں میں ایک بہت بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے علاوہ فینگ ہن بھی شامل تھی۔ وہ تینوں غضب ناک شخص سے چمٹے ہوئے تھے۔ اس کی منتیں کر رہے تھے اس کو واسطے دے رہے تھے۔ لیکن اس شخص پر دیوانگی طاری تھی۔ وہ لڑکی کا گلا دباتا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی کا منہ کھل گیا اور آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں۔ وہ کسی کمزور نحیف بکری کی طرح قسائی کے شکنجے میں تھی۔ لڑکی کو جاں بلب دیکھ کر فینگ ہن غضب ناک شخص کے کندھے پر دوہتڑ مارنے لگی۔ اس نے ٹانگ مار کر فینگ ہن کو دور گرا دیا۔ فینگ کے منہ سے دردناک چیخ نکل گئی لیکن وہ پھر اٹھ کر اس شخص کی طرف آئی "پلیز۔۔۔۔ پلیز' ڈونٹ کِل ہر" وہ پھر غضب ناک شخص کی منتیں کرنے لگی۔

میں نے دیکھا بدنصیب لڑکی کا چہرہ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ موت کی دہلیز پر تھی۔ وہ بے رحم ہاتھ اس کے جسم سے زندگی کشید کرتے چلے جا رہے تھے۔ باہر نکلنا میرے لیے خطرناک تھا' لیکن اب میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں مزید یہ تماشا دیکھتا۔

میں نے اندر کی طرف سے دروازے کی کنڈی گرائی اور پھر کندھے کی ایک زوردار ضرب سے دروازے کا کھٹکا توڑ دیا۔ جوں ہی دروازہ کھلا میں تیر کی طرح بلاس کی طرف گیا۔ وہ خوب صورت لڑکی اب موت کی دہلیز پر تھی۔ ہٹا کٹا شخص اس کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا اور بے پناہ وحشت سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ بلاس کو چھڑانے والے بے بس ہو چکے تھے اور اسے مارنے والا بہت "باافتیار" نظر آ رہا تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس شخص پر جھپٹا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ میں نے عقب سے اس کی گردن اپنے دائیں بازو میں جکڑ لی۔ جوں ہی گردن کی گولائی میری کہنی کے خم میں "سیٹ" ہوئی۔ میں نے بازو کو مخصوص جھٹکا دیا۔ ایک دم اس شخص کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ ساری وحشت' توانائی اور سختی ایک ہی لمحے میں معدوم ہو گئی جو برق کی طرح اس کے جسم پر دوڑ رہی تھی اور بلاس کی موت کا سامان کر رہی تھی۔ جیسے کسی نے چنگھاڑتے طاقت ور انجن کو ایک بٹن دبا کر خاموش کر دیا جائے' وہ شخص بھی میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر بلاس پر سے اتار لیا۔

اہلِ خانہ کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ میری طرف دیکھتے یا میری موجودگی پر غور کرتے۔ وہ سب بلاس کی طرف متوجہ تھے اور جیسے یہ یقین کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ موت کے منہ میں جاتی ہوئی لڑکی اچانک واپس آ گئی ہے۔ فینگ ہن رو رہی تھی اور بلاس کو جھنجوڑ رہی تھی "بلاس' بلاس!" وہ اسے پکارتی چلی جا رہی تھی۔

بلاس نے ایک گہری سانس کھینچی اور بری طرح کھانسنے لگی۔ یہ کھانسی زندگی کی علامت تھی۔

بوڑھے مرد اور عورت نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت نظر آنے لگی۔ بلاس کو مارنے والے شخص کی گردن ابھی تک میرے بازو میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ میں نے اسے آہستگی سے فرش پر ڈال دیا۔ بوڑھے اور بوڑھی کی آنکھیں حیرت آمیز خوف سے پھٹنے لگیں۔ میری اچانک آمد ہی کم حیرت انگیز نہیں تھی کہ اس پر طرّہ یہ کہ میں نے ایک قوی ہیکل شخص کو ایک جھٹکے میں اتنا ختم کر دیا تھا۔ شاید میری موجودگی بوڑھے جوڑے کو چیخنے پر مجبور کر دیتی مگر فینگ ہن نے بروقت صورتِ حال سنبھال لی۔ وہ بلاس کو چھوڑ کر میری طرف آئی اور میرا بازو تھام لیا "تھینک یو سر۔ تھینک یو ویری مچ" وہ لرزاں لہجے میں بولی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ کون ہیں؟" بوڑھے نے حیرت میں ڈوب کر فینگ ہن سے پوچھا۔ بوڑھے کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔

"میں ابھی آپ کو بتاتی ہوں ان کے بارے میں۔" فینگ ہن نے شکستہ انگریزی میں بوڑھے کو جواب دیا۔

میں نے بے ہوش شخص کی بغلوں میں ہاتھ دیا اور اسے کھینچ کر کمرے میں لے آیا۔ فینگ ہن اور بوڑھے نے بلاس کو سہارا دیا اور اسے بھی کمرے میں لے آئے۔ بلاس کے ہونٹ ابھی نیلے تھے اور اس کی شفاف گردن پر انگلیوں کے گہرے نشانات ہو چکے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہ غالباً اس مارپیٹ کی نشانی تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بلاس سے ہوئی تھی۔ مارنے والے شخص کو بے ہوش دیکھ کر بلاس کی آنکھوں میں ایک بار پھر خوف اور اندیشوں کے مہیب سائے پھیل گئے۔

تیزی سے بے ہوش شخص کی طرف بڑھی اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ پھر وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"اس کو کیا ہوا ہے؟ یہ بولتا کیوں نہیں۔ اس کو کیا کیا ہے آپ نے!" وہ خوف زدہ آواز میں بولی۔

"پریشانی کی بات نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا "یہ صرف بے ہوش ہے ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

فینگ ہن بولی "یہ اس کا بڑا بھائی ہے۔ اس کا نام نوار ہے۔"

میں نے کہا "بڑا بھائی ہے یا دشمن؟ یہ تو اسے جان سے مار رہا تھا۔"

فینگ بولی "دشمن ہی کہنا چاہیے۔ اس نے بے چاری بلاس کی زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔ اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کرنا ہے جو عمر میں اس سے پندرہ سال بڑا ہے اور دیکھنے میں انسان سے زیادہ ریچھ نظر آتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"میں اس کے بارے میں تفصیل آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں انکل ہنری اور آنٹی وائین کی حیرت دور کر دوں۔ وہ آپ کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں۔"

فینگ ہن کا اشارہ اس بوڑھے بوڑھی کی طرف تھا جو اب تک حیرت سے بت بنے کھڑے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمر رسیدہ جوڑا اس گھر کا مالک ہے اور فینگ ہن ان ہی کے پاس ملازم ہے۔ فینگ نے مجھ سے معذرت چاہی اور عمر رسیدہ جوڑے کو لے کر قریبی کمرے میں چلی گئی۔ میں روتی ہوئی بلاس کو تسلی دینے لگا اور اسے سمجھانے لگا کہ اس کے بھائی کی جان کو کوئی عارضی یا مستقل خطرہ درپیش نہیں۔

آٹھ دس منٹ میں فینگ ہن عمر رسیدہ جوڑے کے ساتھ واپس ہمارے پاس آ گئی۔ عمر رسیدہ جوڑے کی آنکھوں میں اب میرے لیے اجنبیت کی جگہ اپنائیت اور حیرت کی جگہ شناسائی نظر آ رہی تھی۔ معلوم نہیں فینگ نے انہیں میرے بارے میں کیا بتایا اور کیسے ان کی تسلی کی۔ بہرطور یہ بات واضح تھی کہ یہ بوڑھا بوڑھی فینگ کی بات بہت مانتے تھے اور اس پر کلی اعتبار بھی کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ وقتاً فوقتاً فینگ کو بیچ میں کر کے طلب کرتے ہیں۔ بعد میں بلاس کی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ فینگ ملازم (نیپی) ہونے کے باوجود اس گھر میں گھر کے فرد کی طرح رہتی ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اس گھر میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔

فینگ نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا "میں نے انکل اور آنٹی کو آپ کے بارے میں ضروری باتیں بتا دی ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ آپ میرے ساتھیوں میں سے ہی ایک ہیں اور کسی طرح جان بچا کر یہاں آ گئے ہیں۔ یہاں کسی مفرور ملازم کو پناہ دینے کی سخت سزا مقرر ہے۔ یہ انکل اور آنٹی کا حوصلہ ہے کہ وہ میری درخواست پر آپ کو یہاں عارضی پناہ دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔"

پھر فینگ مجھے واپس کمرے میں لے آئی۔ یہی وہ کمرا تھا جہاں میں اب تک بند رہا تھا۔ میں نے کہا "اس بے ہوش بندے کا اب کیا ہوگا؟"

وہ بولی "آپ اس بارے میں فکرمند نہ ہوں۔ ہم سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

میں نے کہا "اس کی بے ہوشی کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بے ہوشی ٹوٹنا شروع ہو گئی ہے۔"

وہ بولی "اسے اتنی جلدی بھی ہوش میں نہیں آنا چاہیے۔ ہم نے ابھی اسے گھر بھی پہنچانا ہے۔"

پھر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

اس کی واپسی شام کے وقت ہوئی۔ وہ میرے لیے کھانا لائی تھی۔ کھانا دانا یہ لوگ سرِشام ہی کھا لیتے تھے۔ بلکہ تمام قسم کی مصروفیات شام تک ختم کر دی جاتی تھیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو

ابن حسن عثمان آبادی کا ایک شاہکار ناول

تحیر' تجسس اور رومان سے بھرپور

ایک چونکا دینے والا ناول

رشتوں کے اندھیرے دور کرنے والے ان بدنصیب چراغوں کی داستان جن کے پاس اپنے لیے صرف اور صرف اندھیرے تھے کیونکہ قسمت نے ایک ہوا ان کا بجھا کر رکھی تھی۔

ان خوابوں کی کہانی جن کی قسمت میں جوان ہونے کے بعد زخموں میں جاگنا اور رونا لکھا تھا۔

ایڈونچر سے بھرپور ناول

قیمت -/100 روپے

ڈاک خرچ -/20 روپے

علی میاں پبلی کیشنز

صرف سونا ہوتا تھا اور سونے کے لیے روشنی کی نہیں اندھیرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اندھیرا شام ہوتے ہی وادی کے طول و عرض میں پھیل جاتا تھا۔ صبح یہ لوگ پو پھٹتے ہی اٹھ جاتے تھے اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ جنگ جو کھانا میرے لیے لائی تھی یہ ویسا ہی نامعقول کھانا تھا جو اب تک میں کھاتا رہا تھا۔ کچے گوشت اور کچے لہسن کی بو دور ہی سے محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں نے جیسے تیسے لقمے لینے شروع کیے۔ کھانے کے دوران میں جنگ ہن مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس نے بتایا "میں اور انکل ہنری بیلاس کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ آئے ہیں اور اسے بتا آئے ہیں کہ وہ اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے۔"

میں نے کہا "وہ شخص کون ہے جس سے بیلاس کا رشتہ ہو رہا ہے۔"

وہ بولی "اسی بستی کا بدمعاش ہے۔ اس کا نام تابے ہے۔ اس خبیث نے بیلاس کے بھائی ژاو کو شیشے میں اتار رکھا ہے۔ اسے رقم وغیرہ دیتا رہتا ہے۔ اب ژاو کی یہ کوشش ہے کہ جیسے بھی ہو بیلاس اس منحوس کے پلے بندھ جائے۔"

"اور بیلاس کا باپ؟"

"اس کے دل کی بات تو معلوم نہیں، لیکن وہ بھی بیٹے کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ شادی ہو جائے۔"

"تمہارا اس معاملے میں کیا کردار ہے؟"

"میرا تو کوئی کردار نہیں۔ بس بیلاس میری دوست ہے اور میں اس کی بھلائی چاہتی ہوں۔ کبھی آپ اس شخص کو دیکھیں جس کے ساتھ بیلاس کی زندگی تباہ کی جارہی ہے۔ آپ کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔"

میں نے گہری نظروں سے جنگ ہن کو دیکھا۔ وہ ویسی ہی تھی جیسا اس کے بارے میں سنا تھا اور اندازہ لگایا تھا۔ بے باک، ذہین، شوخ اور ماحول سے جلد مطابقت پیدا کرنے والی۔ وہ اس وحشت ناک بستی میں ایک قیدی کی حیثیت سے موجود تھی اور یہاں اس کی موجودگی کو زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ بہ مشکل چند ہفتے ہوئے تھے لیکن اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ یہیں پلی بڑھی ہے۔ یہی اس کا وطن ہے اور انکل آنٹی اس کے خونی رشتے دار ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کہیں ایسا تو نہیں کہ بیلاس نے تمہاری وجہ سے شادی سے انکار کیا ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم نے اسے اکسایا ہو۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی "اکسانے کا لفظ آپ غلط استعمال کر رہے ہیں۔ بیلاس ایک عاقل بالغ لڑکی ہے اور ذہین بھی۔ وہ کبھی بھی تابے سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ مجھ سے مل کر اس کے خیالات کو تقویت ملی ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری حیثیت یہاں ماوار (قیدی) کی ہے۔ تمہیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے ورنہ تمہارے لیے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔"

"کس قسم کے خطرات؟" جنگ نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ شخص تمہارے خلاف محاذ بنا سکتا ہے جس سے بیلاس کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ تم پر الزام لگا سکتا ہے کہ تم نیچے کی ایک لڑکی کو غلط راہ پر ڈال رہی ہو اور قبیلے کے رسم و رواج کی خلاف ورزی کروا رہی ہو۔"

وہ تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی "آپ بہت دور تک سوچتے ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی "لیکن آپ اتنے ہی سمجھ دار ہوتے تو یہاں پھنستے کیوں۔ آخر کو تو آپ بھی "ماوار" ہیں۔ خطرات تو یہاں آپ کے لیے بھی موجود ہیں۔"

میں نے اطمینان سے کہا "یہ خطرات میں نے اور میرے ساتھیوں نے خود مول لیے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

میں تقریباً ایک گھنٹا پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اس سوال کا کیا جواب دینا ہے۔ میں نے کہا "مس جنگ! ہم حادثاتی طور پر یہاں نہیں پہنچے۔ ہم پچھلے دو ہفتوں سے اس علاقے میں چکرا رہے تھے۔ ہمیں ان خطرات کا پورا احساس تھا جو ہمیں درپیش تھے۔"

"میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھی۔"

"ہم آپ کی تلاش میں یہاں پہنچے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

میرا جواب جنگ کے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوا تھا۔ وہ حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں امید کے ستارے ٹمٹمانے۔ اس نے وحشی ہرنی کی سی محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا اور میرے قریب آگئی "آپ... آپ کیا جانتے ہیں میرے بارے میں۔"

"سب کچھ" میں نے اطمینان سے کہا "تم چند ہفتے پہلے فلپائنی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ بدواس سے پاکستان پہنچی تھیں۔ فلپائنی ٹیم کے سربراہ مسٹر داموس تمہارے والد ہیں۔ پچھلے مہینے کی چودہ تاریخ کو تم اپنے دو ساتھیوں جون چاڑل اور لی وانگ کے ساتھ نر کھنگ پر نکلیں اور لاپتا ہو گئیں۔"

ایک دم جنگ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کی بشاشت اور شوخی اچانک نہ جانے کہاں اوجھل ہو گئی تھی۔ اس کے لرزاں ہاتھوں نے میرا بازو تھام لیا۔ پھر ایک سسکی اس کے ہونٹوں سے نکلی اور وہ زارو قطار رونے لگی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی "میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ گلگت میں ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔"

"آپ... آپ ان سے ملے ہیں۔"

"کئی دفعہ" میں نے کہا "وہ بڑے حوصلے اور بردباری سے آپ لوگوں کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔"

وہ بولی "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کوئی ہماری مدد کو یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے یقین نہ کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔"

اس نے پوچھا "کیا آپ کا تعلق پاکستانی فورسز سے ہے۔ میرا مطلب ہے کمانڈوز وغیرہ سے۔"

"تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ بولی "میرا خیال ہے کہ آپ کے جو ساتھی پکڑے گئے ہیں وہ بھی کمانڈوز ہیں۔ ان میں سے ایک تو مارشل آرٹ کی زبردست سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ آپ کے اس ساتھی کو یہاں ایک اہم کام کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔"

"کیسا کام؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں نوعمر لڑکوں کو لڑائی بھڑائی کی تربیت دے گا۔ یہاں اس مکان کے پچھواڑے بستی کی سب سے بڑی جانزو (عبادت گاہ) ہے۔ اس کے وسیع احاطے میں یہ تربیت گاہ قائم کی گئی ہے۔"

میں نے کہا "یہ ایک امید افزا اطلاع ہے۔"

وہ بولی "کیا آپ کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں؟"

میں نے جنگ کی حوصلہ افزائی کے لیے تھوڑی سی غلط بیانی ضروری سمجھی اور کہا "ہاں، اس وادی میں ہمارے ساتھی موجود ہیں۔"

وہ مجھ سے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں سوالات کرنے لگی۔ میں اب جنگ کو کافی حد تک جان چکا تھا۔ وہ اعتبار کے قابل لڑکی تھی۔ میں نے اسے اپنے علاوہ صفدر اور ڈربی گل کے بارے میں بھی تمام ضروری باتیں بتا دیں۔ میں نے اسے اپنا اصلی نام شاہ جہاں بتایا۔ وہ شاہ جہاں کا لفظی مطلب نہیں جانتی تھی تاہم اس لفظ کے صوتی تاثر نے اسے کافی متاثر کیا۔ وہ کہنے لگی "مسٹر شاہ جہاں آپ کے فرار ہونے کے بارے میں تفصیل ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوئی ہے۔ آپ نے جھرنے کے قریب نشیب میں چھلانگ لگائی تھی۔ کچھ دیر آپ ایک قریبی مکان میں گھسے رہے۔ وہاں ایک عورت آپ کے ہاتھوں زخمی ہوئی۔ آپ کے ہاتھوں کی کٹی ہوئی رسی بھی اسی مکان کے کمرے سے ملی ہے۔ جب محافظوں نے اس مکان کا گھیراؤ کیا تو آپ دیوار پھلانگ کر بھاگ نکلے۔ راستے میں آپ نے کم از کم تین افراد کو اپنے پنجے سے زخمی کیا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی جان لیوا طور پر زخمی نہیں ہوا۔ ورنہ آپ کی تلاش میں شاید اس پوری بستی کو خالی کرا لیا جاتا۔ اس قبیلے کے قانون میں قتل، اغوا اور آبروریزی وغیرہ کے لیے بڑی سخت سزائیں مقرر ہیں۔"

سزا کے تذکرے پر میرا دھیان ڈربی گل کی طرف چلا گیا۔ میں نے جنگ سے پوچھا "جس وقت میں فرار ہوا میرا دوست ڈربی گل بھی میرے ہمراہ تھا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

جنگ بولی "نہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔"

میں نے پوچھا "بیلاس کے بے ہوش بھائی کو کہاں چھوڑ کے آئے ہو تم لوگ؟"

"اس کے گھر میں۔" جنگ نے جواب دیا "وہ اب ہوش میں ہے۔ اس کی گردن ایک طرف سے چوٹی ہوئی ہے۔ سر گھمانے میں سخت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اندھیرے میں کسی نے پیچھے سے آکر اس کی گردن پر چوٹ لگائی ہے۔ ہم نے اس کے خیال کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ ویسے وہ اب تاؤ میں ہے۔ باپ نے اسے کافی ڈانٹا ڈپٹا ہے۔" پھر چند لمحے خاموش رہ کر جنگ بولی "لیکن آپ نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟ وہ تو ایک دم مردہ گرگٹ کی طرح چھت سے گرا تھا۔"

"تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں نے تو بس اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا تھا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

معلوم نہیں اسے میری بات پر یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال اس نے یہ موضوع ترک کر دیا اور بولی "کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کس طرح اس علاقے میں پہنچے اور آپ کی گرفتاری کیسے عمل میں آئی۔"

میں نے کہا "اس بارے میں پھر بات ہوگی۔ ہمارا یہ وقت بہت قیمتی ہے۔ لہٰذا کسی اہم موضوع پر بات کرنی چاہیے۔"

"تو پھر یہ بتائیں کہ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

"کس سلسلے میں؟"

"جس سلسلے میں آپ یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہمیں اور اپنے آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے آپ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا "کچھ بھی طے نہیں ہے۔ ہمارے طریقہ کار کا دارومدار حالات پر ہے۔ ابھی تو میں مکمل طور پر اندھیرے میں ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارے دونوں ساتھی کہاں ہیں۔ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔"

ایک بار پھر جنگ کی آنکھوں میں رنج و الم کے گہرے بادل چھا گئے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس کوئی ناخوش گوار خبر موجود ہے۔ وہ بولی "ہماری گرفتاری کے وقت لی وانگ کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ اس کی وہ ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔ لی وانگ ابھی تک مقامی شفاخانے میں ہے۔"

"اور جون چاڑل؟" میں نے اپنا بے پناہ تجسس چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بھی ماوار کی حیثیت سے یہیں موجود ہے۔"

"اسی گھر میں؟"

"نہیں عبادت گاہ میں ہے۔ عبادت گاہ میں توسیع کا کام ہو رہا ہے۔ چالیس پچاس ماوار وہاں بیگار کرتے ہیں۔ جون چاڑل بھی انہی میں شامل ہے۔ میں اس مکان کی چھت سے کئی بار اسے دیکھ چکی ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ روزانہ ہی اسے دیکھتی ہوں۔ ہاں پچھلے تین چار روز سے وہ نظر نہیں آیا۔ شاید اسے کہیں اور بھیج دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار ہو۔ میں نے آج انکل ہنری سے کہا ہے کہ وہ مجھے اس بارے میں معلوم کر کے بتائیں۔"

بیماری کا خیال مجھے اس وجہ سے آ رہا ہے کہ اس نے کمرے میں ورد تھا۔ دراصل جب ان لوگوں نے انہیں پکڑا تو انکل اور وہ نا چاول نے سخت مزاحمت کی۔ اس مزاحمت میں بڑی چاول کو بھی چوٹیں آئیں۔ اس کی کمر میں اتنی سخت چوٹ لگی کہ اسے بیٹا اب میں ٹرن آنے لگا اور گردے کا درد شروع ہو گیا۔ دراصل......"

"مس تبنک......" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ تم شروع سے یہ روداد سناؤ۔"

تبنک ہن نے ایک گہری سانس لی۔ نیم تاریکی کی وجہ سے اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنے خیالات جمع کر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ بولتی ایک آواز نے ہمیں کسی طرف متوجہ کیا۔ یہ کسی بھاری آواز والے مرد کی گھن گرج تھی۔ وہ ابھی ابھی بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا اور اب برآمدے کے آس پاس کھڑا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ آواز سن کر تبنک ایک دم بے چین نظر آنے لگی۔ اس نے جلدی سے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی۔ وہ جھنجی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر جھری کے بالائی حصے سے باہر جھانکا۔ ایک بھاری بھرکم شخص میری نگاہ کے سامنے آیا۔ اس نے جین کی پتلون اور فرکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بال مقامی لوگوں کی طرح لمبے اور کانوں میں وزنی بالیاں تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کسی جانور کی زنجیر تھی۔ میں اس جانور کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ تیندوا تھا۔ تیندوے کو چیتا اور HUNTING LEOPARD بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انتہائی غصیلا "لڑاکا" خوں خوار اور خبیث درندہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ قد کاٹھ میں عام چیتے سے کچھ چھوٹا ہوتا ہے لیکن طاقت میں اس سے زیادہ۔ سؤر اور گائے بیل تک کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے جو تیندوا میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اس کی جلد سفید تھی اور اوپر داغ سے تھے۔ اس کے منہ پر ایک جالی دار غلاف تھا اور اس کے طور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے سدھایا گیا ہے۔ فرکی جیکٹ والا شخص بلند آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے دیکھا "اس کا مخاطب وہی بوڑھا ہے جسے تبنک انکل کہتی تھی۔ بوڑھے کی گھنی سفید بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں ذری ذری نظر آ رہی تھیں اور زبان تیزی کے ساتھ اس کے پوپلے منہ میں حرکت کر رہی تھی پھر بڑھیا بھی باہر آ گئی۔ وہ بوڑھے ہنری کی بیوی تھی۔ تاہم میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ سفید فام نہیں۔ وہ مقامی عورت تھی۔ خاوند کی طرح اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تبنک بدستور جھری سے آنکھ لگائے بیٹھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی سہمی ہوئی ہے۔ پھر جیسے اسے ایک دم کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرے کان میں بولی "یہ دیکھو لو۔ یہ ہے بلاس کا ہونے والا شوہر کانب۔"

میں نے پھر جھری سے آنکھ لگائی اور غور سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ چالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ چہرے کے نقوش بھدے اور کرخت تھے۔ یہ بات بالکل ٹھیک تھی کہ وہ کسی طرح بھی بلاس جیسی خوبصورت و نازک لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ کچھ دیر بلند آواز سے بولنے کے بعد اس نے تیندوے کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے تبنک سے پوچھا "کچھ پتا چلا کیا کہہ رہا ہے یہ شخص؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگی "ابھی میں مقامی زبان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

اس نے مجھے چند ضروری ہدایات دیں اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

تبنک کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس وقت تک گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ جو صرف اس کا ہیولا دیکھ سکتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ بند کمرے کی گہری تاریکی میں بیٹھنا "باہر" دنیا میں بے حد معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اس وادی میں یہ معمول کی بات تھی۔ میں نے تبنک سے اس تیندوے کے بارے میں پوچھا جسے کانب زنجیر سے تھامے پھرتا تھا۔ تبنک نے بتایا کہ یہ شکار کے لیے سدھایا گیا جانور ہے۔ کانب کے ایک اشارے پر یہ کسی بھی انسان یا حیوان کو چیر پھاڑ کر رکھ سکتا ہے۔ پھر تبنک بتانے لگی کہ کس طرح اس درندے نے چند روز پہلے درخت پر چڑھے ہوئے ایک مادار بچے کو ہلاک کر ڈالا تھا۔

تبنک کچھ گم صم سی لگتی تھی۔ میرے پوچھنے پر انکشاف انگیز لہجے میں بولی "کانب میری توقع سے زیادہ برا ہے مسٹر سرجاں۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہ انکل اور آنٹی کو دھمکا کر گیا ہے۔" تبنک لرزاں آواز میں بولی "وہ مجھ پر بے حد خفا ہے۔ اس کی وجہ میں ہوں۔ وہ بڑے زور سے کہتا ہے کہ وہ بلاس سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ بیمار بھی ہو گئی تو نہیں کرے گا۔ بلاس کی جگہ اب وہ......" تبنک بولتے بولتے رک گئی۔ پھر ذرا توقف سے بولی "وہ کہتا ہے کہ اب وہ مجھ سے شادی کرے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت کینہ پرور اور خطرناک آدمی ہے شاید...... آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔"

"کیا ٹھیک کہتا تھا؟"

"یہی کہ مجھے اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے تھی۔ میں نے خونخوار بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے۔"

"تمہارے انکل نے اسے کیا جواب دیا ہے؟"

"انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ اس وقت وہ بڑے گرم دماغ کے ساتھ آیا ہے۔ دماغ ٹھنڈا ہو گا تو اس معاملے میں بات کریں گے۔"

میں نے پوچھا "کیا تمہارے انکل کو یہ اختیار ہے کہ وہ تمہارے بارے میں کوئی اچھا یا برا فیصلہ کر سکیں۔"

وہ بولی "ہر بار او کے بارے میں اس کے مالک کو ہر قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ انکل مجھے بغیر وجہ کے قتل بھی کر سکتے ہیں۔

بہرحال وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے اچھے کئے ہیں لیکن میں ڈر گئی۔ وہ مجھے بیٹیوں کی طرح چاہنے لگے ہیں۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ مجھے آپ جیسے کسی شخص کے حوالے کر دیں یا کوئی اور ایسا فیصلہ کریں جس سے مجھے نقصان پہنچے۔"

"اور کانب؟"

"یہ تو بہت اثر و رسوخ والا شخص ہے۔ یہ رشتے میں اس بستی کے مکھیا (سردار) کا سالا ہے۔ پتا ہے اس کی ہر بات مانا جاتا ہے کون جانتے ہیں آپ؟"

"کون ہے اس بستی کا سردار ہے؟"

"ہاں۔ بستی کی پہلی بیوی نیلم کانب کی بہن ہے۔ اس کے بے پناہ اثر نے کانب کو اس بستی میں خدائی کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لوٹ مار کا سارا مال کانب کی تحویل میں رہتا ہے۔ وہ جس کو چاہے خوش حال اور جسے چاہے بدحال کر سکتا ہے۔ اگر یہ شخص اپنی بات پر اڑ گیا تو میرے اور انکل کے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "یعنی اب تم چاہتی ہو کہ تمہاری جان اس چکر سے چھوٹ جائے۔ پہلے بلاس کی شادی کانب سے ہو جائے۔"

"ہرگز نہیں" وہ رحم سے بولی "جو غلط ہے وہ غلط ہے لیکن جو تمہارے ساتھ ہو گا وہ غلط نہیں ہو گا۔"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" وہ منضبط لہجے میں بولی "خدا نے چاہا تو انکل سب ٹھیک کر لیں گے۔"

"کیسے ٹھیک کریں گے؟"

"انہوں نے کہا ہے کہ وہ کل یا پرسوں کانب کی طرف جائیں گے تب تک اس کا دماغ ٹھکانے پر آ چکا ہو گا۔ وہ اسے سمجھائیں گے اور وہ سمجھ جائے گا۔"

"اور اگر نہ سمجھا تو۔"

"پھر میں اسے سمجھاؤں گی۔"

"کیسے؟"

"میں جانتی ہوں اس جیسے بدکردار اور سر پھرے مردوں کو کیسے ہینڈل کیا جاتا ہے۔"

"تم تو بہت جانتی ہو مردوں کے بارے میں۔"

"میں کوئی چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہوں۔" وہ بے باکی سے بولی "جہاز پر کرتی رہی ہوں۔ مردوں کے شانہ بشانہ مہینوں سفر کرتی رہی ہوں۔ ایک آزاد معاشرے میں وہی بڑی اور ہر قسم کے لوگوں سے ملی ہوں۔"

"خاص طور پر مردوں سے۔" میں نے طنز کیا۔

وہ تڑخ کر بولی "تمہارے ملک کی عورتوں کی طرح مرد ہمارے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہیں۔"

"کتنے اشجار سے پھل توڑا ہے تم نے!" میں نے پوچھا۔

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
انسان بلائے بے درماں کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں۔

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور
فون: ۷۲۲۷۴۱۳

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

"کیا مطلب؟"

"کچھ خاص نہیں۔" میں نے کہا "میری مراد ہے کہ انڈیا اور پاکستان کے علاوہ کہاں کہاں گئی ہو تم؟"

"نیپال اور جاپان" اس نے جواب دیا "دونوں مرتبہ میرے ڈیڈی میرے ساتھ تھے۔"

ڈیڈی کا ذکر آتے ہی وہ ایک بار پھر اداس ہو گئی۔ مجھ سے کرید کرید کر اپنے ساتھیوں اور اپنی ٹیم کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے ضروری باتیں اسے بتا دیں۔ قریباً ایک گھنٹا میرے پاس رہنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ کل وہ میرے دونوں ساتھیوں یعنی صفدر اور ذریں گل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔

اگلے روز صبح سویرے ٹینگ ہی میرے لیے ناشتا لائی۔ یہ ناشتا کچے انڈوں اور باسی ڈبل روٹی پر مشتمل تھا۔ ساتھ میں تھوڑا سا شہد بھی تھا۔ یہ وہی ناشتا تھا جو پہلے روز مجھے زہر لگا تھا لیکن اب میں اطمینان سے کھا رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اب مجھے مقامی لوگوں کے جسموں سے اٹھنی والی بو بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ کل جب میں نے بلاس کے بھائی فواد کو دبوچا تھا تو کسی طرح کی بو میرے نتھنوں سے نہیں ٹکرائی تھی۔ اس سے پہلے بلاس بھی کافی دیر میرے پاس بیٹھی رہی تھی۔ یقیناً آہستہ آہستہ میری حس شامہ کند ہو رہی تھی' یا شاید میرے اپنے جسم میں بھی وہی بو باس پیدا ہونے لگی تھی' جس کی وجہ کچے گوشت کا استعمال تھی۔

ناشتے کے دوران میں' میں نے ٹینگ سے پوچھا کہ اسے صفدر یا ذریں گل کے بارے میں کیا معلوم ہوا۔

وہ بولی "مسٹر ذریں گل کے بارے میں تو نہیں' ہاں مسٹر صفدر کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرائی اور اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے ایک واکی ٹاکی نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ کہاں سے آیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہاں ایسی بہت سی اشیا موجود ہیں۔" وہ بولی "سیاح اور کوہ پیما اکثر ان علاقوں میں گم ہوتے رہتے ہیں اور ایسی چیزیں یہاں پہنچتی رہتی ہیں۔"

"کیا یہ کام کرے گا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

اس نے واکی ٹاکی کا انٹینا کھینچا اور اینٹینے کے قریب لگا ہوا سرخ بٹن دبا دیا۔ مختصر توقف سے "شائیں شائیں" کی آواز آنے لگی۔ وہ بولی "فی الحال اس کی بیٹری کام کر رہی ہے۔"

"اور جب بیٹری ختم ہو جائے گی۔" میں نے پوچھا۔

"یہ وقتی طور پر بیکار ہو جائے گا۔ پھر جب کوئی اور بیٹری مال غنیمت میں ملے گی تو اس میں جان پڑ جائے گی۔"

"لیکن یہ تم میرے ہاتھ میں کیوں تھما رہی ہو؟"

"اس لیے کہ اس طرح کا ایک دوسرا سیٹ آپ کے دوست صفدر کے پاس ہے اور وہ کسی بھی وقت آپ سے رابطہ کر سکتا ہے۔"

"واقعی؟" میری آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ ٹینگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "لیکن یہ سیٹ ان کے پاس کہاں سے آیا؟"

"میں نے دیا ہے۔" وہ اپنے سینے پر انگلی رکھ کر بولی "یہ ٹاکی انکل ہنری کو مال غنیمت میں ملا تھا۔ پتا نہیں کب سے ان کے پاس بیکار پڑا ہوا ہے۔ میں کل جانزو (عبادت گاہ) میں گئی تو لے گئی۔ وہاں مسٹر صفدر سے ملاقات ہوئی تو میں نے سیٹ ان کو دے دیا۔ واکی ٹاکی انہیں تھما دیا اور یہ بھی بتایا کہ دوسرا واکی ٹاکی آپ کے پاس ہے۔"

"ونڈر فل۔" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ میں صفدر سے رابطہ کر سکتا ہوں۔"

"اتنی جلدی مت کریں۔" وہ مسکرائی "رابطہ آپ سے صفدر خود کریں گے' موقع محل دیکھنے کے بعد۔"

ٹینگ کی بات مناسب تھی۔ معلوم نہیں صفدر کہاں اور کس پوزیشن میں تھا۔ رابطہ اسی کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔

اس روز میں سارا دن صفدر کے رابطے کا انتظار کرتا رہا۔ جب سے اس وادی میں پہنچے تھے ہمارے درمیان بالکل بات نہیں ہوئی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق صفدر نے شام کے وقت رابطہ کیا۔ اس وقت کمرے میں گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ کسی کونے سے پیانو بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ پیانو بجانا ہنری کا مشغلہ تھا اور وہ اپنا زیادہ تر وقت اسی مشغلے میں صرف کرتا تھا۔ میں نے ہنری کو جتنی مرتبہ سنا اس نے ہر بار ایک ہی فلمی گیت کی دھن بجائی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس گیت کے بول کچھ یوں تھے۔

گھڑی الٹی نہیں چلے گی۔
وہ دن رات لوٹ کر نہیں آئیں گے۔
بچھڑا یار اب نہیں ملے گا۔

آواز پورے مکان میں گونج رہی تھی۔ میں غیر ارادی طور پر اس آواز سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب اچانک میرے سامنے رکھے واکی ٹاکی پر سگنل موصول ہوا اور "بیپ بیپ" کی ہلکی آواز ابھرنے لگی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ ایک بٹن دبا کر آن کیا۔ صفدر کی جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہیلو شاہ جہاں صاحب۔ صفدر اسپیکنگ۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔"

میں نے فوراً جواب دیا "ہیلو صفدر! میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

"شاہ جہاں صاحب! آپ کیسے ہیں؟" صفدر کی جوش سے لرزتی آواز ابھری۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"آپ جس مکان میں ہیں اس کے پچھواڑے ان لوگوں کی عبادت گاہ ہے۔ میں بھی ایک حجرے میں مقیم ہوں۔ میری حیثیت یہاں قیدی کی ہے۔ لوہے کا ایک وزنی گولا اس وقت بھی میری پنڈلی سے بندھا ہوا ہے۔ میں اس گولے کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر ہی مشکل سے چل سکتا ہوں۔ جب ان لوگوں نے مجھ سے کام لینا ہوتا ہے تو یہ گولا میرے پاؤں سے نکال دیتے ہیں۔"

"کیا کام کرتے ہو تم وہاں؟"

"میں یہاں نو عمر لڑکوں کو لڑائی بھڑائی کی ٹریننگ دے رہا ہوں' روحانی اپ و نف۔۔۔"

"میں اس بارے میں جانتا ہوں۔" میں نے صفدر کی بات کاٹی "میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی امکان ہے؟"

"مجھے تو بالکل نظر نہیں آتا" صفدر کے لہجے میں مایوسی تھی "بے حد سخت نگرانی ہے۔ میرے پاس سے دو وقت صرف کھانا دینے کے لیے ہی زنجیر کھولی جاتی ہے اور اس دوران میں بھی مسلح افراد میرے سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ پھر ویسے بھی یہ وادی عجیب و غریب ساخت کی ہے۔ شاید آپ کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ یہ ایک پیالہ سا ہے۔ اس کی تین اطراف عمودی دیواریں ہیں۔ یہ دیواریں زمینی کٹاؤ کے سبب وجود میں آئی ہیں اور رسہ لگائے بغیر ان پر چڑھنا ناممکنات میں سے ہے۔ چوتھی جانب ایک تیز کوہی نالہ ہے اور اس پر لکڑی کا پل بنا ہوا ہے۔ اس پل پر چوبیس گھنٹے سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ اس وادی میں داخلے کے صرف دو راستے ہیں۔ ایک تو لکڑی کا پل دوسرے ایک سرنگ نما درہ جس کی چوڑائی بمشکل دس فٹ اور گہرائی سو فٹ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے اندر سے گزریں تو آواز گونجتی ہے۔ یہ بڑی قابل دید جگہ ہے۔ اس میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھیں تو قریباً سو فٹ اوپر آسمان ایک باریک لکیر کی طرح نظر آتا ہے۔ اس درے پر بھی انتہائی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ درحقیقت ان لوگوں کی بقا اسی میں ہے کہ یہاں کا کوئی قیدی کسی بھی صورت میں فرار نہ ہو سکے۔ جب بھی ایسا ہوا اور کوئی شخص قریب و دور کی بستیوں تک چل کر کسی پولیس والے تک پہنچ گیا۔ ان لوگوں کی سلامتی خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہاں سے نکل بھاگنے کا امکان صفر ہے؟"

"فی الوقت تو یہی نظر آ رہا ہے۔"

"کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں' کوئی ہتھیار نہیں۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"جو آپ کے ہیں۔" صفدر نے کہا "شاید کل ان بت پرستوں نے ہماری ٹیم کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ جو ہمیں نقصان پہنچا ہے میں ہی جانتا ہوں۔ سب خیر خواہ ہی نہ تھے ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔"

"بے فکر رہو۔ یہ ان لوگوں کا قرض ہے ہمارے اوپر۔ ہم یہ تاوان سود سمیت ادا کریں گے۔"

"کچھ پتا چلا تینوں کے بارے میں؟"

"تھوڑا تھوڑا" میں نے جواب دیا "جو لڑکی مجھے یہ واکی ٹاکی دے کر گئی ہے وہ ٹینگ ہے۔"

"اوہ گاڈ۔" صفدر کی حیرت بھری آواز سنائی دی "میں تو اسے جاپانی یا کوریائی سمجھ رہا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ٹینگ ہے تو ضرور اس کا نام پوچھنے کی کوشش کرتا۔"

میں نے کہا "یہ واکی ٹاکی بڑے کام کی چیز ہے صفدر۔ اسے بچا کر رکھو۔ ہمیں زیادہ لمبی بات نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ بیٹری ری پلیس نہیں ہو سکتی۔"

"مگر یہ تو بتائیں' کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

"اسی مکان کے ایک تاریک کمرے سے جس کے بارے میں تمہیں معلوم ہو گا۔"

"اور ذریں گل کہاں ہے؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں۔ بہرحال وہ بھی خیریت سے ہے۔"

"دوبارہ کال کے لیے یہ وقت مناسب رہے گا؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن ہمیں سخت ضرورت کے تحت ہی رابطہ کرنا چاہیے۔"

رسمی کلمات کے بعد ہم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

○☆○

اس تاریک کمرے میں' میں نے چار روز مزید گزارے۔ رات کی بھیانک تاریکی میں اکثر نواب زادی شاہین کی موت کا غم مجھے گھیر لیتا۔ اس کی مسکراہٹ میرے بدن میں انگارے دہکا دیتی۔ نجانے کیوں اس کے ساتھ ہی سائیں عالی کا خیال بھی میرے ذہن میں آ جاتا۔ مجھے لگتا جیسے سائیں عالی کو بھی شاہین کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوا ہے جتنا مجھے' اور اگر سائیں عالی مجھے اپنے اردگرد نظر نہیں آ رہا تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ عصبی جان کے غضب میں ہے۔

ٹینگ اب میری ہر ضرورت کا خیال رکھ رہی تھی۔ اس وادی میں چوں کہ دن کے معمولات جلدی شروع ہو جاتے تھے۔ مجھے علی الصباح جاگنا پڑتا۔ ناشتے کے بعد میں پھر سو جاتا۔ آنکھ نو بجے کے لگ بھگ کھلتی۔ اس وقت انکل ہنری اپنے کام میں مصروف ہوتا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اس نے چھوٹا سا دواخانہ بنا رکھا تھا۔ وہ جڑی بوٹیوں کی شناخت میں ماہر تھا اور ان کے مرکبات کو دواؤں کی شکل دینا بھی جانتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس وادی کے باشندوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار نفوس کے قریب تھی۔ یہ آبادی دو حصوں میں منقسم تھی۔ دونوں حصوں کو علیحدہ ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ان ناموں کو ٹھیک سے سمجھنا میرے لیے آسان کام نہیں تھا۔ انکل ہنری کی شکل میں اس آبادی کو ایک ماہر ڈاکٹر اور حکیم میسر تھا۔ انکل ہنری انگریز تھا اور قریباً پچاس سال قبل ایک مہم جو کی حیثیت سے اس وادی میں پہنچا تھا۔ اس کی جوان

سالہ بیوی بھی ساتھ تھی۔ اس وادی میں پہنچ کر وہ بیمار ہو گئی اور دو تین ہفتے کے اندر راہی عدم ہو گئی۔ انکل ہنری کو اس صدمے نے نیم پاگل کر دیا۔ وہ کئی ماہ ویرانوں میں سرگرداں رہا۔ آخر ایک اور لڑکی اس کی زندگی میں آئی۔ اس خوب صورت مقامی لڑکی کا نام چشنگ رابین تھا۔ چشمے جیسی چنچل اور پھولوں جیسی نوخیز۔ رابین کے محبت بھرے ہونٹوں نے ہنری کے "زخم دل" سے رنج و الم کا سارا زہر چوس لیا۔ وہ اس کی بیوی بن گئی۔ ہنری نے بھی دل و جان سے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اپنی باقی زندگی اسی وادی میں گزارے گا۔ جڑی بوٹیوں کی پہچان کا فن ہنری کو ورثے میں ملا تھا۔ اس کا یہ فن اس وادی کے باشندوں کے لیے بہت سود مند ہو سکتا تھا۔ وادی کے سربراہ پاپامہ نے ہنری کو خصوصی اہمیت دینا شروع کر دی (مقامی لوگوں کے بقول پاپامہ پچاس سال پہلے بھی موجود تھا اور ستاون سال کا تھا...... اس انہونی کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا) پاپامہ کی آشیرباد سے پہلے تو ہنری کی مادار (قیدی) کی حیثیت ختم کی گئی۔ پھر اسے رہائش اور خوراک کی بہتر سہولتوں کا حق دار قرار دے دیا گیا۔ بتدریج ہنری مقامی باشندوں میں رچ بس گیا اور اسی ماحول کا حصہ بن گیا۔ اب ماضی سے اس کا کوئی ناتا نہیں تھا۔ اگر کوئی ناتا تھا تو بس ایک پیانو تھا اور ایک نغمہ تھا۔ اس نغمے کی دھن وہ اکثر تنہائی میں بجاتا تھا۔

گھڑی الٹی نہیں چلے گی۔
وہ دن رات لوٹ کر نہیں آئیں گے۔
بچھڑا یار اب نہیں ملے گا۔

ان چار پانچ دنوں میں دو مرتبہ صفدر نے بھی مجھ سے مختصر بات کی۔ وہ زریں گل کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ زریں گل کے بارے میں خود مجھے معلوم نہیں تھا' اسے کیا بتاتا۔ اس کے بارے میں ژبنگ صرف اتنا جان سکی تھی کہ وہ اپنے سابق مالک تھاران کے پاس ہی ہے۔ ایک روز ژبنگ بے حد اداس موڈ میں میرے پاس آئی۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ وہی ہوا ہے جس کا ڈر تھا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ منحوس قابے میری جان کو چمٹ گیا ہے..... وہ ہر صورت مجھے بیوی بنانا چاہتا ہے۔" ژبنگ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"تم نے کہا تھا' تمہارے انکل......"

"کچھ نہیں ہو سکا۔" وہ بات کاٹ کر بولی "وہ اپنے کے پر راز گیا ہے۔"

میں نے کہا "انکل ہنری کی یہاں کافی عزت ہے۔ وہ کسی اور ذریعے سے اس پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔"

"دباؤ ڈالنے کا وقت اب گزر گیا ہے۔ پاپامہ نے اس شادی کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے اور کہا ہے کہ دونوں فریق ایک عشرے کے اندر باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ طے کریں۔"

"واقعی؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ کے خیال میں میں مذاق کر رہی ہوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ میں نے کہا "انکل ہنری اب کیا کہتے ہیں؟"

"قابے نے انہیں کافی حد تک قریب کر لیا ہے۔ ان سے کہا ہے کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہنے لگا ہے۔ میں اس کی ضرورت بن گئی ہوں۔ وہ مجھے بڑی محبت سے رکھے گا اور ہر آسائش مہیا کرے گا۔ اس نے انکل سے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ میری مادار کی مہر ختم ہو جائے گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا دل تو خوشی سے ناچنے کو چاہ رہا ہے۔" وہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "تمہیں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خود ہی تو کہتی ہو کہ تم کوئی چھوئی موئی لڑکی نہیں ہو۔ ایک آزاد ماحول میں بھرپور آزادی سے پروان چڑھی ہو۔ ایسے ماحول کی لڑکیاں تو نت نئے تجربات پسند کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مردوں کے حوالے سے بہت متجسس ہوتی ہیں۔ تم اسے بھی ایک پُرتجسس ایڈونچر سمجھ لو۔"

"پلیز شٹ اپ" وہ برہمی سے بولی۔

اس کا چہرہ شرم سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آج وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کی گفتگو اور حرکات و سکنات میں خاص قسم کی بے باکی نہیں تھی جو ماڈرن اور آزاد خیال لڑکیوں کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔ اپنی تمام تر اجنبیت کے باوجود وہ آج مجھے ایک مشرقی لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے' آج تو تم نے بالکل حوصلہ ہار رکھا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں..... میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ بولتی چلی گئی "میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ میں نے غلط کہا تھا۔ میری زندگی میں کبھی کوئی مرد نہیں آیا۔ سوائے ایک کے۔ وہ میرا فرینڈ جون چاؤل ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ ہم نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسمیں کھا رکھی ہیں۔ میں اس کے سوا کسی کو اپنی زندگی میں داخل نہیں کر سکتی۔ کسی قیمت پر نہیں۔"

وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ ہر ہچکی کے ساتھ اس کی خوب صورت گردن میں سامنے کی طرف چھوٹا سا گڑھا پڑ جاتا تھا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ آنے والے کل کا خوف اس کے دل و دماغ سے آسیب بن کر چمٹا ہوا تھا۔ اس کا یہ انکشاف حیران کن تھا کہ وہ جون چاؤل سے محبت کرتی ہے۔ بے چاری! مجھے اس پر ترس آیا۔ اپنی سہیلی کی بھلائی کا سوچتے سوچتے وہ خود ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ ایک زور آور نے اسے اپنی ہوس کے نشانے پر رکھ لیا تھا اور وہ اس کے سامنے چڑیا ہی کیا تھی۔ وہ اس بستی کا ایک بااختیار شخص تھا اور ژبنگ ایک قیدی جس کی زنجیر کسی کو بھی سونپی

جا سکتی تھی۔ پیار محبت کرنے والوں کے لیے میرے دل میں ہمیشہ سے ایک گداز رہا ہے۔ ایک نرم گوشہ ہے جس پر اہل وفا کی اجارہ داری ہے۔ شاید اس لیے کہ میں خود بھی اسی جذبے کا گھائل ہوں۔ میری اپنی رگوں میں بھی وہی کانٹے چبھے ہوئے ہیں جو "دل والوں" کا مقدر ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں والی یہ لڑکی خاموشی کی زبان میں مجھ سے التجا کر رہی تھی "میں ایک کمزور عورت ہوں۔ دشمنوں کے بس میں ہوں۔ تم مرد ہو۔ توانا اور صحت مند ہو۔ تمہیں دعویٰ ہے کہ تمہیں خطرات سے کھیلنے کی تربیت دی گئی ہے۔ تم اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ تم میری جان بچانے کے لیے یہاں آئے ہو۔ اگر میں بے آبرو ہو گئی تو شاید اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں۔"

میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ مشرق پھر مشرق ہوتا ہے۔ یہ قبائلی لڑکی ہر طرح سے یورپین یا امریکن نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے بے باکی اور بے حجابی کا دعویٰ بھی تھا اور وہ کوہ پیمائی جیسا کٹھن کام بھی کرتی تھی۔ لیکن اندر سے وہ وہی مشرقی لڑکی تھی جو اپنے محبوب کے نام کی مالا جپتی ہے اور اپنے جسم و جاں کو صرف اور صرف اس کی امانت سمجھتی ہے۔

میں نے انگلی سے ژبنگ کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور پوچھا "یہاں سے نکلنا چاہتی ہو؟" اس نے اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا "تو پھر تیار رہو جاؤ۔ ہم کل رات تک یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"کہاں جائیں گے۔"

"خدا کی زمین بڑی وسیع ہے۔"

"لیکن یہاں زمین وسیع نہیں ہے۔ یہ وادی ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔ یہاں آنے والا شخص کبھی یہاں سے واپس نہیں گیا۔"

"میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "بہرحال میں اس موضوع پر تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا تم واقعی اس گھر سے نکلنا چاہتی ہو۔"

"میں نکلنا چاہتی ہوں کیوں کہ میں اس گھر میں رہی تو وہ شیطان قابے اپنے شیطانی ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن میں اس طرح نکلنا نہیں چاہتی کہ انکل اور آنٹی کی جان عذاب میں آ جائے۔"

"تمہارے جانے سے انکل اور آنٹی کی جان عذاب میں کیوں آئے گی۔"

"آپ بھول رہے ہیں کہ میں ایک مادار ہوں۔ اگر میرے پاؤں میں زنجیر نہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انکل ہنری نے پاپامہ کو میرے فرار نہ ہونے کی ضمانت دے رکھی ہے۔ میرے فرار ہونے پر انکل اور آنٹی کو پاپامہ کے شدید ترین غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں کسی صورت انکل اور آنٹی کے اندھے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔"

"اس کا حل بھی نکل سکتا ہے۔" میں نے کہا "یہاں سے فرار ہوتے وقت تمہارے انکل اور آنٹی کو معمولی زخمی کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے ثبوت یہاں چھوڑ دیے جائیں گے جن سے پتا چلے کہ تمہیں زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے اور انکل و آنٹی تمہاری حفاظت کے سلسلے میں بے بس ہو گئے تھے۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا شاہ جہاں صاحب..... یہاں کے قانون بڑے بے لچک ہیں۔ انکل اور آنٹی پر پھر بھی مصیبت آئے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قابے کی طرف سے میری حفاظت کا انتظام کیا گیا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اس مکان کی نگرانی کی جا رہی ہو۔ جوں ہی ہم یہاں سے نکلیں دھر لیے جائیں۔"

"تم تو ہر امکان کو رد کر رہی ہو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

ژبنگ کی دردمندی اور دلیری اس کے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ قابے نے اس کی سہیلی کا پیچھا چھوڑ دیا تھا اور اب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا..... اس تنگ و تاریک کمرے میں میں نے تین دن مزید گزار دیے۔ ان دنوں میں ژبنگ سے صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مجھے کھانا آنٹی رابین پہنچاتی تھیں۔ جھریوں بھرے چہرے والی وہ عمر رسیدہ عورت بہت کم گو اور کم آمیز تھی۔ وہ مقامی تھی تاہم انکل ہنری کی طویل صحبت میں رہ کر اسے انگریزی بولنا آ گیا تھا..... ژبنگ کی سہیلی بیلا کا معاملہ بھی یہی تھا' وہ چار پانچ سال انکل ہنری اور آنٹی رابین کی گھریلو ملازمہ رہی تھی اور تھوڑی بہت انگریزی سیکھ گئی تھی۔ ایک روز ہنری بھی میرے پاس آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں ژبنگ کا ساتھی ہوں لہٰذا اسے سمجھاؤں کہ یہ شادی کرنے کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ مزید خرابی سے بچنے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ اسے پینا ہی پڑے گا۔

چوتھے روز ژبنگ سے میری ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھیں رو رو کر باقاعدہ سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ صرف دو روز بعد اسے قابے کے حوالے کیا جا رہا ہے اور اس زبردستی کو "شادی" کا نام دیا جا رہا ہے۔ ژبنگ کی دودھیا پیشانی پر ایک سفید لکیر بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ لکیر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ژبنگ نے کہا "اب میں مادار نہیں آزاد ہوں۔ میری حیثیت مقامی لوگوں کی ہو گئی ہے۔ وہ مقامی عورتیں جو غیر شادی شدہ ہوتی ہیں پیشانی پر ایک لکیر کھینچتی ہیں۔"

"یہ آزادی تمہیں کس کے حکم سے ملی ہے؟"

"پاپامہ کے حکم سے اور قابے کی خواہش پر۔ قابے نے انکل ہنری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا اور شادی مادار سے نہیں آزاد عورت سے کی جاتی ہے۔ لہٰذا قابے نے مجھے آزاد کرا لیا..... تو آزادی۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

"بہت پریشان لگتی ہو کیوں؟"

"جب کہ مجھے خوش ہونا چاہیے۔ جشن منانا چاہیے۔ پرسوں شادی ہو رہی ہے نا میری۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ اس کی آواز کی لے میں درد کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

میں نے اس کی تھوڑی اوپر اٹھائی۔ اس کی پلکیں آنکھوں پر جھکی رہیں اور چہرے پر خفگی طاری رہی۔ وہ میری طرف سے بالکل مایوس نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ینگ! میں نے تمہاری رہائی کا پروگرام طے کر لیا ہے۔" وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں وہ ایک ڈری سہمی بچی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پورے یقین کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور کہا "ہاں ینگ! تمہیں تابے کے ساتھ رخصت نہیں ہونا پڑے گا۔ میں تمہیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ شاید تم ڈر رہی ہو کہ انکل اور آنٹی پر مصیبت آئے گی۔ نہیں انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اس گھر میں کوئی ہلا گلا نہیں کریں گے۔ ہلا گلا اس وقت ہوگا جب تم یہ گھر چھوڑ کر تابے کے دولت کدے پر پہنچ جاؤ گی۔ اس وقت تمہاری حفاظت کی ذمے داری انکل اور آنٹی پر نہیں تابے پر ہوگی۔"

ینگ کی بھیگی آنکھوں میں امید کی بجلی سی چمک نظر آئی۔ وہ بولی "کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ تابے کے گھر میں۔۔۔"

"ہاں۔ تم بس میرے لیے ایک مقامی طرز کا لباس مہیا کر دو۔ سر پر لپیٹنے کے لیے گرم چادر بھی ہونی چاہیے۔ جیسی بلاس کے بھائی کے سر پر تھی بالکل ویسی چادر۔ کل رات کسی وقت تم مجھے یہاں سے نکال دو۔ اس کے بعد کا سارا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔"

"کہیں۔۔۔ آپ میرا دل رکھنے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تم سے وعدہ کر رہا ہوں۔ اسے اپنی جان پر کھیل کر نبھاؤں گا۔"

وہ کچھ دیر گم صم سی میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر بولی "معلوم نہیں کیوں آپ پر یقین کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"اگر دل چاہ رہا ہے تو کر لو یقین" بلکہ یقین محکم کر لو کیوں کہ ہمارے قائد کا فرمان بھی یہی ہے۔"

وہ جاپانی لہجے والی انگریزی میں بولی "آپ کا مطلب ہے قائد اعظم محمد علی جناح۔" میں نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کہنے لگی "کتنے عظیم آدمی تھے وہ۔ میں نے ان کے بارے میں پڑھا ہے۔ آپ پاکستانی یقیناً ان پر فخر کرتے ہیں۔ آپ کرتے ہیں نا... فخر؟"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کیوں کہ اس سوال کا جواب بہت تلخ تھا اور بہت طویل بھی۔ اتنے میں دروازے کے قریب سے کسی نے مدھم آواز میں ینگ کو پکارا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پر ایک بار پھر مردنی سی چھا گئی تھی۔ بولی "پرسوں ہونے والی شادی کی تقریب کے لیے مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب میرے لیے یہاں آنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "ایک بار تو تمہیں آنا ہی پڑے گا۔ میرے ناپ کا لباس لے کر۔۔۔ اور شاید ایک بار پھر مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے۔"

اس کے چہرے پر الجھن نظر آ رہی تھی لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ مجھ سے سوال جواب کر سکتی، لہٰذا دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

اگلے روز گھر میں چہل پہل رہی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس چار دیواری میں کوئی تقریب برپا ہونے والی ہے۔ عورتوں کی آوازیں اور بچوں کی چہکاریں سنائی دیتی تھیں۔ گاہے گاہے کوئی بانسری قسم کا ساز بھی بجایا جاتا رہا۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں بند کمرے کے اندر لحاف میں لپٹ کر بھی ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ سیون ایم ایم رائفل میرے قبضے میں تھی اور وہ چھرا بھی جو میں نے ایک مقامی عورت سے چھینا تھا۔ ان ہتھیاروں کی موجودگی میرے لیے خاصی تسلی بخش تھی۔ سارا دن مجھے ینگ کا انتظار رہا۔ وہ ایک دو بار دروازے کے بالکل پاس آ کر واپس چلی گئی تھی۔ غالباً اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دروازے کو باہر سے تالا چڑھا رکھا تھا اور چابی اسی کے پاس تھی۔

ینگ کی آمد رات آٹھ بجے کے قریب ہوئی۔ وادی کے اوقات کار کے لحاظ سے "آٹھ بجے" کو رات ہی کہنا چاہیے۔ اس وقت گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اہل خانہ سو رہے تھے۔ کسی نے آہستہ سے دروازے کا قفل کھولا اور اندر چلا آیا۔ وہ ینگ تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس کے ہاتھ میں ایک لباس موجود تھا۔ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ جاپانی اسٹائل کی ایک چپل بھی ساتھ لے آئی تھی۔ گہری تاریکی میں پردے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ینگ کی موجودگی میں ہی لباس بدلا۔ یہ کسی بلتستانی کا لباس تھا۔ بہت بڑے گھیر کی شلوار تھی اور فراک نما کرتہ۔ کرتے کے اوپر پہننے کے لیے ایک موٹی صدری بھی تھی۔ لباس پہننے کے دوران میں میں ینگ سے تابے کے ٹھکانے کا اتا پتا بھی پوچھتا جا رہا تھا۔

ینگ بار بار پوچھ رہی تھی "آپ کرنا کیا چاہ رہے ہیں۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ بس اتنا یاد رکھو کہ میں تمہاری مدد کو ضرور پہنچوں گا۔"

وہ الجھن سے بولی "پتا نہیں آپ واقعی پُراسرار ہیں یا پُراسرار بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یہ سب کچھ کل طے ہو جائے گا۔"

وہ بولی "آپ کے پاس ایک چھرا ہے نا۔؟" میں نے ہاں میں جواب دیا۔

"وہ چھرا مجھے دے دیں۔" ینگ نے کہا۔

"کیا کرو گی؟"

"اپنے لباس میں چھپا کر رکھوں گی۔ اگر آپ کا انتظار رہا تو پھر اس چھرے سے کام لوں گی۔ تابے کو ماروں گی یا خود کو ختم کر لوں گی۔"

"خدا نے چاہا تو اس کی نوبت نہیں آنے گی۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

اس وقت تاریکی کی کوکھ سے ایک مدھم آواز ابھرنے لگی۔ یہ بانسری کی آواز تھی۔ بوڑھا ہنری رات کے سناٹے میں مدھر سُروں کی جوت جگا رہا تھا۔ ایک عجیب درد بھری مٹھاس تھی اس کی لے میں۔

گھڑی الٹی نہیں چلے گی۔

وہ دن رات لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

بچھڑا یار نہیں ملے گا۔

میں اور ینگ گم صم یہ آواز سن رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ینگ رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا "تمہارے فرینڈ جون جاوئل کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" وہ دکھی لہجے میں بولی "خبر نہیں کہاں گیا وہ۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔" اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی اور تاریکی میں جذب ہو گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ینگ کا شانہ تھپکا۔ میرے دوسرے ہاتھ کی گرفت سیون ایم ایم کے دستے پر مضبوط ہو چکی تھی۔ میں ینگ کی مدد کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکا تھا۔ ینگ کی مدد کر کے مجھے دو فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک فائدہ روحانی تھا اور دوسرا مادی۔ روحانی فائدہ یہ تھا کہ میرا ضمیر مطمئن ہوتا کہ میں نے ایک بے بس لڑکی کو مصیبت سے نکالا ہے۔ مادی فائدہ یہ تھا کہ ینگ ہن کی مدد کر کے میں اس کے محبوب جون جاوئل کی نظروں میں اہم مقام حاصل کر لیتا۔ اگر میں اور جون جاوئل ایک دوسرے کے قریب آ جاتے تو بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتیں۔ وہ "راز" جو جون جاوئل اپنے سینے میں چھپا کر یہاں لے آیا تھا میری دسترس میں آ جاتا یا کم از کم اس تک پہنچنا میرے لیے آسان ہو جاتا۔

اس رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ سیون ایم ایم اور تیز دھار چھرے کے علاوہ وہ واکی ٹاکی بھی میرے پاس تھا جس کے ذریعے میں کسی بھی وقت منصور سے رابطہ کر سکتا تھا۔ انکل ہنری کے گھر میں اس وقت کم و بیش ایک درجن مہمان موجود تھے۔ وہ سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ میں بآسانی بیرونی دروازے سے نکلا اور گلی میں آ گیا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ ہوا جسم کے ننگے حصوں پر برچھی کی طرح لگتی تھی۔ سناٹے میں کبھی کبھی رکھوالی کے کتوں کی آواز ابھرتی تھی اور پہاڑوں میں گونجتی تھی۔ جس جگہ کو ینگ "جانزو" یعنی عبادت گاہ کا نام دے رہی تھی وہ ایک وسیع ہال نما جگہ تھی۔ اس چار دیواری کے ایک سرے پر تین بڑے بڑے مستطیل کمرے بنے ہوئے تھے۔ مدھم چاندنی میں میں نے دیکھا کہ ان ہال نما کمروں کے اوپر بیلیں چڑھائی گئی تھیں۔ چوڑے پتوں والی یہ بیلیں اتنی گھنی تھیں کہ عمارت ان میں چھپ کر رہ گئی تھی۔ اسی چار دیواری میں کہیں منصور موجود تھا۔ ہم بہت قریب ہونے کے باوجود بہت دور تھے۔

میں نے اپنا منہ سر گرم چادر میں یوں لپیٹ رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ نو انچ لمبے پھل کا چھرا میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے کسی بھی وقت حرکت میں لا سکتا تھا۔ اس یخ بستہ رات کی تاریکی میں میں کسی آسیب کی طرح اس اجنبی بستی کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ ایک دو جگہ متحرک ہیولوں سے میرا آمنا سامنا ہوا لیکن میں کنی کترا کر نکل گیا۔ ینگ کی بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے میں وہ مکان ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں تابے رہتا تھا۔ یہ تنہا مکان اخروٹ اور چیڑ کے درختوں کے ایک ڈھلوان پر واقع تھا۔ اس مکان کے نزدیک سے ایک سڑک نما راستہ گزرتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس راستے پر گھوڑے وغیرہ آ جاتے ہیں اور کسی قسم کے چھکڑے بھی چلتے ہیں۔ میں نے مکان کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر ایک قریبی درخت پر چڑھ کر مکان کی چھت پر اتر گیا۔ گھنے درختوں کے سبب مکان کے اندر اور باہر گھٹا ٹوپ تاریکی تھی۔ میں چھت سے اترنے والی سیڑھیوں کے ذریعے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن خالی تھا۔ کسی قریبی کمرے سے ایک عجیب سی غراہٹ بلند ہوئی۔ یوں لگا کہ کوئی جانور غرایا ہے۔ اچانک میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس خوف ناک نیولے کا تصور میرے ذہن میں آیا تھا جسے میں نے تابے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگر وہ جانور آزاد تھا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تیز دھار چھرے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر آواز کا ماخذ دیکھنے کی کوشش کی۔ آواز صحن کے گوشے میں واقع ایک کمرے سے آ رہی تھی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا کمرے کا چوبی دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ غالباً جانور نے اجنبی کی بو پا لی تھی اور بے قرار ہو گیا تھا۔

میں دبے قدموں چلتا برآمدے میں پہنچا۔ سردی روکنے کے لیے برآمدے کے دروں پر بڑی بڑی اونی چادریں لٹکا دی گئی تھیں۔ میں نے غور کیا تو برآمدے میں گدیلوں پر کئی افراد لیٹے نظر آئے۔ یقیناً یہ وہ مہمان تھے جنہوں نے کل شادی کی تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ اچانک اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی شخص کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ گہری تاریکی میں میں صرف اس کا ہیولا ہی دیکھ پا رہا تھا۔ یقیناً اس نے بھی میرا ہیولا ہی دیکھا ہوگا۔ وہ میرے قریب سے گزر کر باہر چلا گیا۔ مجھے یقین تھا اگر گھر میں موجود تمام افراد بھی بیدار ہو جائیں تو میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں آسانی سے ان کے درمیان گھوم پھر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے اس ماحول میں یہ بھی کہ کوئی یہاں روشنی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بلاس نے

بنایا تھا کہ اس وادی میں روشنی کرنے یا آگ جلانے کی بڑی سخت سزا مقرر ہے۔ ایسے شخص کے ایک ہاتھ کی تین انگلیاں جڑ سے کاٹ دی جاتی ہیں۔

اپنے پروگرام کے مطابق میں اطمینان سے گھر کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ اس مکان میں کم و بیش سات کمرے موجود تھے۔ ایک مختصر کمرا خاص طور پر سجا سنورا تھا۔ درمیان میں ایک چوکور تخت بچھا تھا۔ تخت پر گدیلا تھا اور اوپر کامدار ریشمی غلاف چڑھایا گیا تھا۔ اس تخت کے چاروں طرف جھالریں تھیں۔ یہ جھالریں چھت سے شروع ہو کر فرش تک چلی گئی تھیں۔ میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ جھالروں میں کاغذ اور کپڑے کے مصنوعی پھول پروئے گئے ہیں۔ کسی تیز پرفیوم کی خوشبو بھی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تخت کے سرہانے کی طرف مٹی کی ایک بڑی سی ہانڈی لٹک رہی تھی۔ اس ہانڈی میں خشک میوے اخروٹ، بادام، کشمش وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ قابے کا حجلہ عروسی ہے۔ یعنی یہ وہ جگہ ہے جہاں اگلے دس بارہ گھنٹوں میں ٹینگ پہنچنے والی ہے۔ اس کمرے میں تو چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن اس سے ملحقہ ایک کمرے کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ کمرا نیچے سے اوپر تک جانوروں کی خشک کھالوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں ان کھالوں میں گھس گھسا کر بیٹھ سکتا تھا اور بوقت ضرورت آسانی سے نکل بھی سکتا تھا۔ درحقیقت کھالوں کا یہ ڈھیر میرے لیے ایک بنی بنائی پناہ گاہ تھی۔ میں نے اس پناہ گاہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کھالوں کے اس ڈھیر میں خود کو یوں چھپایا کہ بس گم ہو کر رہ گیا۔

کھالوں سے ناگوار بو اٹھ رہی تھی لیکن سخت سردی میں ان کھالوں نے مجھے آرام بھی بہت پہنچایا۔ میرے اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں میں بھرپور حرارت جاگ اٹھی اور نرم گرم گداز کے سبب میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ نجانے کب ان کھالوں میں دبے دبے مجھے نیند آ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کانوں میں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔ مردوزن اور بچوں کی یہ آوازیں اس "پُرمسرت" تقریب کی علامت تھیں جو آج اس گھر میں برپا تھی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ چمڑے کی تہوں کے درمیان ایک سوراخ بنایا اور باہر جھانکا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف دن چڑھ چکا ہے بلکہ سورج اپنا نصف فاصلہ بھی طے کر چکا تھا۔

میں اپنی جگہ دم سادھے بیٹھا رہا اور باہر سے آنے والی آوازیں سنتا رہا۔ بھوک سے اب میرا برا حال تھا اور کھالوں میں دب کر بھی میری سردی دور نہیں ہو رہی تھی۔ سیانے ٹھیک کہتے ہیں کہ گرمی لحاف میں نہیں ہوتی، لحاف اوڑھنے والے کے جسم میں ہوتی ہے۔ اگر بھوک کی وجہ سے جسم ٹھنڈا ہو تو لحاف کچھ نہیں کرتا۔ میرے اندازے کے مطابق تین بجے کا وقت ہوگا جب مجھے گلی کی طرف سے بانسریاں بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ بانسریاں کورس کی شکل میں بجائی جا رہی تھیں اور ان کے ساتھ گاہے گاہے تالیاں بھی بجائی جا رہی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وادی میں برات، شادی اور رخصتی وغیرہ کی رسمیں کیا ہیں لیکن اندازہ یہی ہوتا تھا کہ بانسریاں بجانے والے لوگوں کی حیثیت قابے کے براتیوں کی ہے۔ اب ایک اور مسئلہ تھا۔ اس بند کمرے کے اندر سے میں یہ نہیں جان سکتا تھا کہ "برات" آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ میں پوری توجہ سے باہر کی آوازیں سننے لگا۔ کچھ دیر بعد یک لخت بانسریاں خاموش ہو گئیں اور کچھ لوگ زور زور سے نعرے بلند کرنے لگے۔ اس کے بعد زبردست ہوائی فائرنگ ہوئی۔

گھر کے اندر چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ برات روانہ نہیں ہوئی واپس آئی ہے۔ میں خاموشی سے بیٹھا رہا اور گزرتے لمحوں کا شمار کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ گھر کی رونق ماند پڑنے لگی۔ شوروغل کی آوازیں معدوم ہونے لگیں۔ نو بجنے والے تھے اور اس وادی کی رات شروع ہونے والی تھی...... اور پھر رات ہو گئی۔ کمرے میں پھیلی گہری تاریکی سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں گھر کے اندر اور باہر تمام سرگرمیاں موقوف ہو گئیں۔ میں کھالوں کے ڈھیر میں سے نکل آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ اب برآمدہ غیر آباد نہیں تھا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ مجھے مدھم آواز میں باتیں کرنے کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ یہ قابے کی آواز تھی۔ اس کے علاوہ بھی دو تین عورتوں کی آوازیں تھیں۔ پانچ دس منٹ بعد یہ آوازیں ختم ہو گئیں۔ میں نے ذہنوں سے اندازہ لگایا کہ عورتیں باہر جا چکی ہیں۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اب حجلہ عروسی میں "دولہا اور دلہن" کے سوا اور کوئی نہیں۔ چالیس سال کا کریہہ دولہا اور بیس سال کی گڑیا سی دلہن...... یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ بڑی ڈرامائی بلکہ تصوراتی سی پوزیشن تھی۔ یہ قابے کی شادی کی رات تھی اور میں اس کے "رنگ" میں زبردست قسم کی بھنگ ڈالنے کے لیے اس کے حجلہ عروسی کے قریب موجود تھا۔ لڑکپن اور نوجوانی میں ایسے فلمی خیالات اکثر ذہن میں آیا کرتے ہیں۔ میں بھی غزالہ کے حوالے سے ایسی ہی باتیں سوچا کرتا تھا۔ ذہن میں خیال آتا تھا کہ اگر کبھی کسی انہونی کے نتیجے میں غزالہ کی شادی کسی اور سے ہوئی۔ تو میں عین سہاگ رات کو اسے حجلہ عروسی سے اٹھا کر لے جاؤں گا۔ جب غزالہ کی ساری امیدیں ختم ہو چکی ہوں گی اور خود کو کسی اجنبی مرد کے رحم و کرم پر پا رہی ہوگی، میں کسی جانباز عاشق کی طرح کسی تاریک گوشے سے برآمد ہوں گا اور اپنے ریوالور کی نال اپنے رقیب کی گردن پر رکھ دوں گا۔ لیکن یہ سب کچے ذہن کی سوچیں تھیں۔ جب سچ مچ غزالہ کی شادی ہوئی اور اس کے لیے حجلہ عروسی سجایا گیا اور شیخ عاصم غزالہ کی خلوت کا

ساتھی بنا، میں غزالہ سے سیکڑوں میل دور بیٹھا تھا اور اپنی بدبختیوں سے بے خبر تھا۔ معلوم نہیں اس وقت ان لمحوں میں، میں کیا کر رہا تھا۔ تفتیش کر رہا تھا، اطمینان سے سو رہا تھا یا کسی ہنگامے میں الجھا ہوا تھا۔

آج میرے تصورات کا منظر زندہ حقیقت کی صورت میں میرے سامنے تھا، لیکن حجلہ عروسی میں میری غزالہ نہیں تھی ایک کافرستانی لڑکی تھی اور اس کی خلوت میں داخل ہونے والا شیخ عاصم نہیں قابے تھا۔ چند لمحے بعد قابے کی آواز پھر سنائی دینے لگی۔ مجھے اس کے الفاظ کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، ہاں لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تنہائی میں ٹینگ سے محبت جتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسی محبت تھی جس کی بنیاد ہی زبردستی پر رکھی گئی تھی۔ ایسے مکروہ جذبے کو محبت کہنا بھی محبت کی توہین تھا۔ یہ سیدھی سادی ہوس کاری تھی۔ محبت مکمل اختیار اور خودسپردگی کا نام ہے، جب کہ ہوس کاری مکمل مجبوری اور گریز سے عبارت ہوتی ہے۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یقیناً قابے سراپا لرز گیا ہوگا۔ دروازے کی دوسری جانب آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ قابے کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ غالباً اس نے پوچھا تھا "کون ہے؟" اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس سوال کے جواب میں کوئی اس سے لپٹ جائے گا اور اس کی توانا گردن یوں اپنے بازو میں جکڑے گا کہ آواز نکالنا تو دور کی بات ہے، اس کے لیے سانس لینا بھی آسان نہیں رہے گا۔ میرا بازو اتنی سرعت سے اس کی گردن کے گرد لپٹا تھا کہ قابے ذرا سی مزاحمت بھی نہیں کر سکا۔ جوں ہی اس نے گردن چھڑانے کے لیے اپنے جسم کی حیوانی قوت کو آزمایا۔ میں نے گردن کے مخصوص پٹھوں پر دباؤ بڑھا دیا۔ قابے تڑپ کر رہ گیا۔ لیکن اپنی کوشش سے باز نہیں آیا۔ میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا کر ایک بار پھر اسے باور کرایا کہ اس کی مزاحمت اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے حلق سے "خرخر" کی منحوس آواز برآمد ہو رہی تھی مگر وہ کوشش کیے جا رہا تھا اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو میں نہیں چاہتا تھا۔ قابے کی گردن کی ہڈی تڑخ سے ٹوٹ گئی۔ میں ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ میں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یا کم از کم اتنی جلدی قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہمیں اس چاردیواری سے نکلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی پوشیدہ راستہ موجود ہوتا اور نہ بھی ہوتا تو وہ اس گھر کا مالک تھا۔ وہ اپنی صوابدید پر ہمیں بہ حفاظت یہاں سے نکال سکتا تھا۔ قابے کی گردن "ٹوٹنے" کے ساتھ ہی یہ تمام امکانات بھی ختم ہو گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ قابے کا جسم میرے بازوؤں میں بری طرح مچل رہا ہے۔ وہ جاں کنی کے عالم میں تھا۔ گردن ٹوٹ گئی تھی مگر اس کے جسم و جاں کا رشتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے تادیر اسی طرح تڑپنا پڑے گا۔

ٹینگ کی ڈری ڈری آواز تاریکی سے ابھری "شاہ جہاں صاحب...... شاہ جہاں صاحب"

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے۔ قابے...... قابے کو کیا ہوا ہے؟"

"میں نے اسے پہلوانی داؤ لگا رکھا ہے۔ یہ چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"خدا کے لیے...... خدا کے لیے بس کریں یہ سب کچھ" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نو دس انچ لمبے چھرے کو تیزی سے حرکت دی۔ اس کا تین چوتھائی پھل قابے کی بغل سے ذرا نیچے دل کے مقام پر گھس گیا۔ تڑپتے پھڑکتے قابے کی موت آسان ہو گئی تھی۔ اس کا جسم اینٹھا اور ایک دم ڈھیلا پڑنے لگا۔ پسلیوں کے اندر سے ابلنے والے گرم خون کی حرارت میں اپنے بخ بستہ ہاتھ کی پشت اور کلائی پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس کا نیم جان جسم زمین پر گرا دیا اور تخت کے نیچے دھکیل دیا۔

"اب کیا ہوا؟" ٹینگ کی ڈری ڈری آواز ابھری۔

"بے ہوش ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"کیا ہوگا اب؟"

"اب ہم یہاں سے نکلیں گے" میں نے کہا "تم ٹھیک ہو نا......؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔" وہ بولی اور اپنے ہاتھوں سے مجھے ٹٹولنے لگی۔

اس کے ہاتھوں سے الکحل کی بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

وہ بولی "مجھے نہیں معلوم۔ شاید یہ یہاں کی کوئی رسم ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے قابے نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہاتھوں کو باہم ملا کر پیالہ سا بناؤں۔ پھر اس نے اس پیالے میں کوئی سیال انڈیلا تھا اور پینے لگا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی قسم کی شراب تھی۔"

میں نے ٹینگ کو تخت پر بٹھایا۔ وہ سراپا لرز رہی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی ریشمی کامدار لباس تھا۔ گلے میں، کانوں میں، کلائیوں میں اور پیشانی پر پھولوں کی سجاوٹ تھی۔ یقیناً وہ ایک خوب صورت دلہن نظر آ رہی ہوگی لیکن میں تاریکی کے سبب دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے ٹینگ سے ہلکی پھلکی باتیں کر کے اس کا خوف کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ بار بار قابے کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور جاننا چاہ رہی تھی کہ وہ بچ جائے گا یا مر جائے گا۔ میں نے کہا کہ اسے قابے کی طرف سے فکرمند ہونے کی مطلق ضرورت نہیں، وہ خود کو پرسکون رکھے۔

وہ بولی "شاہ جہاں صاحب! ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

میں نے کہا "اگر تم بے ہوش ہونا چاہتی ہو تو اطمینان سے

ہو جاؤ۔ ابھی ہمیں ڈیڑھ دو گھنٹے یہاں رکنا ہے۔ روانگی کا وقت آنے تک میں تمہیں ہوش میں لے آؤں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور تاریکی میں میرا بازو مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گئی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ہم اس حجلۂ عروسی سے نکلے تو رات کے دس بجے تھے لیکن وادی کے اوقات کے مطابق یہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ چہار سو گہری خاموشی، تاریکی اور سردی کا راج تھا۔ اہل خانہ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نے شادی کی تقریب میں جی بھر کر شراب پی تھی اور یوں بے خبر سو رہے تھے کہ کوئی ان کے سرہانے ڈھول بھی بجاتا تو ٹس سے مس نہ ہوتے۔

میں ژینگ کو تاریکی میں بڑی احتیاط سے چلاتا باہر صحن میں لے آیا۔ گرم چادر کے نیچے رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی اور چھرا میرے بائیں ہاتھ میں تھا۔ ہم صحن کے وسط میں تھے جب میرے کانوں میں پھر وہی دہشت ناک غراہٹ گونجی جو کل رات اسی جگہ سے گزرتے میں نے سنی تھی۔ یہ پالتو تیندوے کی آواز تھی۔ درندے کی چھٹی حس اسے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی اور وہ اس خطرے سے اپنے مالک کو آگاہ کر رہا تھا۔ مالک جو اپنے حجلۂ عروسی میں خون میں لت پت پڑا تھا اور ابدی نیند سو رہا تھا۔ درندے کی ہیبت ناک آواز سن کر ژینگ میرے بازو سے چمٹ گئی۔

ہم نے بیرونی دروازہ کھولا اور باہر نکل آئے۔ اچانک ایک قوی ہیکل شخص ہمارے سامنے آگیا۔ غالباً یہ چوکی داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ پہلے سے چوکس ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ تیندوے کی غیر معمولی آوازوں اور آہٹوں نے اسے چونکا دیا ہو۔ وہ ہم سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک وزنی کلہاڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ہم سے ہماری شناخت چاہی اور جواب نہ پا کر مزید چوکس ہو گیا۔ اسی دوران میں وہ ژینگ کے چمکیلے لباس اور گہنوں وغیرہ کی وجہ سے اسے شناخت کر چکا تھا۔ اس نے حیرت انگیز تیزی سے اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلہاڑا بجلی کی رفتار سے حرکت میں آیا۔ میں اس وار کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا اور ایک ناوک خنجر اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ وہ الٹ کر پچھاڑ کھا کر زمین پر گرا۔ میں نے اسے زمین پر ہی دبوچ لیا۔ کوئی موقع دیے بغیر میں نے اس کا سر دو تین بار پتھروں سے ٹکرایا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ میری کارروائی دیکھ کر ژینگ کو بھی نئی جرات پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے بے ہوش شخص کو گھسیٹنے اور ایک طرف ڈالنے میں میری مدد کی۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی ہم ایک گلی میں روپوش ہو گئے۔

اس یخ بستہ تاریک اور سنسان رات میں اپنے لیے پناہ گاہ ڈھونڈنا ہمارے لیے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ بستی سے قریباً ایک کلومیٹر دور انسانی قد سے اونچے گنجان درختوں اور اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان ہمیں سر چھپانے کی جگہ میسر آگئی۔ یہ ایک تنگ و تاریک کھوہ تھی۔ اسے مستقل پناہ گاہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا، ہاں وقتی طور پر یہ ہمیں منجمد کر دینے والی ہواؤں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ دہانے پر بے تحاشا جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اس کھوہ میں داخل ہوتے وقت ہمیں بڑے حوصلے سے کام لینا پڑا۔ اس کھوہ میں حشرات الارض کے علاوہ ہر قسم کے جانداروں سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ ہمارے پاس ٹارچ یا لالٹین قسم کی بھی کوئی چیز نہیں تھی جس کی روشنی میں کھوہ کا جائزہ لیا جا سکتا۔ بس ایک موٹی شاخ کی مدد سے میں نے کھوہ کو ٹھونکا بجایا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ میرے بعد ژینگ بھی ڈرتی سہمتی اندر آگئی۔ ژینگ کے پاس ایک موٹی شال اور میرے پاس گرم چادر موجود تھی۔ ہم نے گرم کپڑے بھی پہن رکھے تھے، اس کے باوجود سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں ہمیں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ بستی کے کسی گھر کے بجائے اس ویرانے کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر کے ہم نے عقل مندی کی ہے۔ یقیناً بستی میں اور بستی کے ارد گرد ہماری تلاش زور و شور سے جاری تھی لیکن ہماری پناہ گاہ کی طرف کوئی نہیں آیا تھا۔ قابے کے حجلۂ عروسی سے فرار ہوتے وقت میں دو نام خشک میوہ ایک تھیلے میں اپنے ساتھ باندھ لایا تھا۔ یہ مٹی کی ہانڈی میں وہاں رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بسکٹ، بن اور ڈبا خوراک بھی وہاں سے مل گئی تھی۔ ہم دونوں اس خوراک پر چار پانچ روز با آسانی گزارا کر سکتے تھے۔ دوسرے دن رات کو صفدر نے واکی ٹاکی پر مجھ سے رابطہ کیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اپنی پچھلی پناہ گاہ چھوڑ چکا ہوں اور اب بستی سے دور ایک ایسے مقام سے بول رہا ہوں جو زمانۂ قدیم کے انسان کی رہائش گاہ ہوا کرتا تھا۔ انسان اور کھوہ کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ اس کھوہ میں اگر ہم دونوں بھی خود کو پتھر کے دور میں محسوس کرنے لگے تھے تو اگر معمولی سا فرق تھا تو واکی ٹاکی اور سیون ایم ایم کا تھا۔ غالباً زمانۂ قدیم میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔

میں نے مختصر ترین الفاظ میں صفدر کو اپنی روداد سنائی اور بتایا کہ میں ژینگ جیسی حسین شکل قابے کے حجلۂ عروسی سے اڑا لایا ہوں۔ قابے کی ناگہانی موت کا صفدر کو بھی علم تھا، تاہم اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ قابے کے قتل کا الزام اس کے ایک دیرینہ دشمن صابت کے سر آیا ہے۔ صابت کے بارے میں صفدر زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ دو تین سال پہلے قابے نے صابت کی سہاگ رات کو اس کے گھر میں شب خون مارا تھا۔ اس شب خون میں صابت نامی شخص کی نوبیاہتا بیوی ہلاک ہوئی تھی اور صابت شدید زخمی ہوا تھا۔ بہرطور مجھے اور صفدر کو اس تذکرے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جو بات ہمارے لیے اہم تھی وہ یہ تھی کہ "بنیادی طور پر قابے کے قتل کی تفتیش ایک غلط رخ

پر مرکوز تھی اور ہمارے لیے خطرات کم سے کم ہوتے جا رہے تھے۔

○☆○

اس کھوہ میں قیام کے دوران میں ژینگ نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا۔ وہ یونیورسٹی میں سال دوم کی طالبہ تھی۔ سیر و سیاحت اور کوہ پیمائی کا جنون اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ وہ جون چاؤل کی محبت میں گرفتار تھی۔ جون چاؤل بھی اسے چاہتا تھا۔ دو منتخب ژینگ نے اپنے پاپا سے ضد کر کے اس مہم میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس شمولیت کی وجہ ظاہر ہے جون چاؤل ہی تھا۔ ژینگ کے بیانات کے مطابق جس روز وہ اس پراسرار قبیلے کے ہاتھوں گرفتار ہوئے وہ اپنے بیس کیمپ سے کافی دور ایک بالکل سنسان جگہ پر موجود تھے۔ یہاں چاروں طرف برف کی چادر بچھی تھی اور ہو کا عالم طاری تھا۔ پارٹی لیڈر مسٹر واٹسن نے انہیں وارننگ بھی دی تھی کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں لہٰذا جلد واپس آجائیں لیکن انہوں نے سنی ان سنی کی اور ایک چوٹی دیکھنے کے لیے تھوڑا سا مزید آگے نکل گئے۔ جب وہ تینوں چوٹی پر کھڑے تھے انہیں ایک برفانی تودے کے عقب سے نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ ژینگ ڈر گئی لیکن جون چاؤل اور ڈی رانگ نے اسے اپنی مردانگی کے خلاف سمجھا کہ وہ چیخیں سن کر واپس پلٹ جائیں۔ وہ چیخنے والی کی "مدد" کے لیے تودے کے قریب پہنچے اور اسی وقت ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کم از کم چار قوی ہیکل افراد نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ تیز دھار کلہاڑوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ژینگ نے واکی ٹاکی پر بات کرنی چاہی لیکن ایک جنگلی نے ژینگ کو دبوچ لیا۔ اس کا واکی ٹاکی توڑ دیا اور اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ جنگلیوں کے ساتھ لڑائی میں ڈی رانگ کی ٹانگ پر گولی لگی اور جون چاؤل بھی زخمی ہوا۔۔۔۔

جون چاؤل کی محبت ژینگ کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی۔ وہ خاص مشرقی انداز میں اسے اپنے جسم و جاں کا مالک سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے اور جون چاؤل کے بارے میں کئی باتیں بتائیں۔ ان میں سے ایک بات خاص طور پر اہم تھی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں جون چاؤل نے ژینگ کو ایک خوب صورت جھومر تحفے میں دیا تھا۔ اس طلائی گہنے میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ جون چاؤل نے ژینگ کو بتایا تھا کہ یہ جھومر ہندوستان کی کسی مہارانی کا ہے اور ڈیڑھ دو سو سال پرانا ہے۔ یہ جھومر ژینگ کے اس سامان میں رہ گیا تھا جو گلگت کے ہوٹل میں موجود تھا۔ جھومر کے علاوہ ایک انگوٹھی بھی جون چاؤل نے ژینگ کو پیش کی تھی۔ اس انگوٹھی کو نوادرات میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ جب جنگلیوں نے انہیں پکڑا تو تلاشی کے دوران میں یہ انگوٹھی ژینگ کی انگلی سے اتار لی۔

میں نے ژینگ سے پوچھا کہ جون چاؤل نے وہ انگوٹھی اور جھومر کہاں سے حاصل کیے تھے۔

"بازار سے لیے ہوں گے۔" وہ سادگی سے بولی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ یہ معاملہ کتنا گہرا اور گھمبیر ہے۔ یا پھر وہ اپنے دلی جذبات چھپانے میں ماہر تھی اور جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ہمارے پاس موجود خوراک چار پانچ روز کے لیے کافی تھی لیکن دوسرے روز خوراک کا آدھے سے زیادہ حصہ ضائع ہو گیا۔ میں نے کھوہ میں موجود تمام سوراخ کپڑے کے ٹکڑوں اور گول پتھروں کی مدد سے اچھی طرح بند کر دیے تھے مگر رات کے وقت ایک سوراخ کسی طرح کھل گیا۔ اس سوراخ میں سے سرخ چیونٹیوں کی ایک فوج نکلی اور کھانے کی اشیا پر حملہ آور ہو گئی۔ صبح ہم نے دیکھا تو ہر شے پر سرخ غلاف سا چڑھا ہوا تھا۔ ظاہر ہے ہمیں یہ سب کچھ ضائع کرنا پڑا۔ چوبیس گھنٹے تو ہم نے بھوکے رہ کر گزارے پھر خوراک کی طلب ناقابل برداشت ہو گئی۔ سخت سردی میں ویسے بھی جسم کو خوراک کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ ژینگ کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگی تھیں۔ میرے اپنے معدے کو بھی بھوک کا پرندہ اپنے نوکیلے پنجوں سے کھود رہا تھا۔

پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر دو چٹانوں کے درمیان برف موجود تھی۔ میں تین چار بار یہ برف اٹھا کر لایا۔ اس برف نے ہماری پیاس تو بجھا دی لیکن معدے کا بھر جانا سراب ہی ثابت ہوا۔

چوتھے روز صبح سویرے سردی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہمارے گرم کپڑوں میں بھی سرایت کر چکی تھی اور کھوہ سے باہر چاروں طرف گہری دھند پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سورج اب ہفتوں صورت نہیں دکھائے گا۔ گہری دھند کے ساتھ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑتی تھیں یا شاید یہ دھند ہی تھی جو بوندوں کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ ژینگ سے اب بھوک مزید برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے خوراک کی تلاش میں باہر نکلنا پڑے گا۔ میرے نکلنے کے لیے موسم بھی بہت مناسب تھا۔ میں اپنا منہ سر گرم چادر میں لپیٹ سکتا تھا۔ دھند اور سردی کے باعث اہل بستی یقیناً گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

میں نے کھوہ چھوڑی اور بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک دو افراد ملے لیکن انہوں نے مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میں بستی کے مضافات میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک کشادہ سڑک نشیب کی طرف جاتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جو "آنجہانی قابے" کے گھر کے پاس سے بھی گزرتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ سڑک وادی کی اس دوسری بستی کی طرف جاتی ہے جس کا ذکر ژینگ نے کیا تھا۔ میں نے سڑک کراس کی اور پتھروں سے بنے ہوئے ایک دو منزلہ مکان کے قریب پہنچ گیا۔ میری معلومات کے مطابق یہ بستی کا واحد دو منزلہ مکان تھا۔ اس مکان کی حیثیت بستی کے گودام کی سی تھی۔ لوٹ مار کی کارروائیوں میں جو بھی خوراک حاصل ہوتی تھی وہ اس گودام میں رکھی جاتی تھی۔ اس گودام کا "انچارج" بلکہ سابق "انچارج" قابے تھا۔ گودام کے سامنے ایک وسیع احاطہ تھا۔ اس

احاطے میں مجھے دو تین چھکڑے بھی کھڑے نظر آئے۔ ان چھکڑوں کے آگے لمبے بالوں والے پہاڑی گھوڑے اور ٹٹو باندھے جاتے تھے۔ کسی چھکڑے کے آگے دو اور کسی کے آگے ایک جانور جوتا جاتا تھا۔ احاطے کے سامنے کھڑے چھکڑوں میں سے ایک بہت سجا سجایا تھا۔ اوپر کی لکڑی پر پیتل اور تانبے کے پترے چڑھے تھے۔ بیٹھنے کے لیے نفیس گدے موجود تھے اور گھوڑے بھی خوب صاف ستھرے تھے۔ بالفاظ دیگر اس چھکڑے کو چھکڑے کے بجائے گھوڑا گاڑی یا بگھی کہنا چاہیے تھا۔

میرا خیال تھا کہ غنی الصباح گودام پر زیادہ افراد موجود نہیں ہوں گے۔ میں اندر چلا جاؤں گا اور کسی طور تھوڑی سی خوراک حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ شاید میں بتانا بھول گیا کہ اس وادی میں خرید و فروخت کے لیے کرنسی استعمال نہیں ہوتی تھی۔ عموماً جنس سے جنس کا تبادلہ کیا جاتا تھا یا پھر فیروزی رنگ کے تسبیح کے دانوں جیسے چھوٹے چھوٹے گول پتھر تھے جو لین دین میں استعمال ہوتے تھے۔ کسی چشمے کھود یا سرنگ سے برآمد ہونے والی اس "قدرتی کرنسی" کو مخصوص نام بھی دیا گیا تھا۔ بنگ کے پاس اس کرنسی کی کچھ مقدار موجود تھی۔ میں یہ "کرنسی" اس امید پر اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ شاید کسی کام آسکے...... تاہم گودام کی صورت حال دیکھ کر میں نے اندر جانے کا فوری ارادہ ترک کر دیا۔ اگر گودام سے باہر گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں تو اندر دو افراد کا ہونا بھی لازمی تھا۔

وہاں قریب ہی درختوں کے چند پتھر پڑے تھے۔ ان پتھروں کی ہموار چکنی سطح دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں لوگ تھوڑا سستانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور اس خوب صورت ڈھلوان کا نظارہ کرتے ہیں جو کسی خوب رو کے سبز آنچل کی طرح نیچے بکھرنے کی گزرگاہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں بھی ان میں سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہ میری بھوک کی کرشمہ کاری ہی تھی کہ مجھے گودام کے اندر سے بنٹر بیف کی خوش بو آ رہی تھی۔ معلوم نہیں یہ میرا وہم تھا یا واقعی گودام میں بنٹر بیف کا ایک آدھ ٹکڑا موجود تھا۔

گودام کے سامنے کھڑی "تگڑی" گھوڑا گاڑی میں ایک پانچ چھ سالہ بچی بیٹھی تھی۔ اس نے بے تحاشا گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ایک اونی ٹوپی بھی تھی۔ بچی مقامی نظر آتی تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سپید اور نقوش دلکش تھے۔ ایک گاڑی بان بھی گھوڑا گاڑی میں موجود تھا۔ درنشست سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بچی اور گاڑی بان کسی ایسے شخص کے انتظار میں کھڑے ہیں جو کسی کام سے گودام کے اندر گیا ہوا ہے۔

بچی میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر نجانے کیوں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے غزالہ یاد آگئی تھی۔ اس بچی کی شکل میں کسی نہ کسی حد تک غزالہ کی شباہت موجود تھی۔ غزالہ کا بچپن میری آنکھوں میں رچا بسا ہوا تھا۔ یقیناً جب غزالہ اس عمر کی تھی تو ایسی ہی تھی۔ مسکرانے سے ایسے ہی اس کی آنکھیں ذرا چھوٹی ہو جاتی تھیں اور رخسار کھنچ جاتے تھے۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر بچی نے بھی مجھے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ کبھی منہ سے ہو ہو کی آواز نکالتی، کبھی بازوؤں کو یوں حرکت دیتی جیسے کوئی چیز میری طرف پھینک رہی ہو، کبھی تالی بجاتی، کبھی ہنسنے لگتی۔ اس ظالم بستی کے مکینوں میں سے یہ ہنستی مسکراتی بچی مجھے بڑی اچھی لگی۔ میں نے سوچا کاش یہ ہمیشہ ایسی ہی معصوم رہے۔ اس کے ہاتھوں میں چمک دار پھل کا کلہاڑا نہ آسکے۔ اس کی آنکھوں میں درندگی نہ اترے۔ اسے درانتی اور قتل و غارت کی تربیت نہ دی جائے۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ یہ اس بستی کی مکین تھی۔ اس قبیلے کا حصہ تھی۔ اسے وہی کرنا تھا جو اس کے بڑے کرتے تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک سائے پر پڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سایہ گاڑی کے نیچے سے نکلا ہے اور پاس ہی واقع جھاڑ جھنکاڑ میں گھس گیا ہے۔ گہری دھند کے باوجود میں نے یہ حرکت واضح طور پر دیکھی تھی۔ میرے دل میں کھد بد ہوئی اور میں اٹھ کر گھوڑا گاڑی کی طرف چل دیا۔ مجھے اپنے قریب دیکھ کر سرخ و سپید بچی مقامی زبان میں کچھ بولنے لگی۔ میں اسے نظر انداز کرتا جھاڑ جھنکاڑ کی طرف بڑھا۔ یہ چھ سات فٹ اونچے خود رو پودے تھے۔ سرمائی پھولوں کی ایک دو جھاڑیاں بھی تھیں۔ میں محتاط قدموں سے اس جھاڑ جھنکاڑ تک پہنچا۔ میں نے کسی کو وہاں چھپے دیکھا۔ چھپنے والے کی نگاہیں ایک ساعت کے لیے مجھ سے ٹکرائیں۔ وہ کوئی مقامی نوجوان تھا۔ ایک دم وہ اٹھ کر بھاگا۔ میری نگاہ میں بجلی سی چمک گئی۔ نوجوان کے ہاتھ میں کوئی اوزار تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نٹ بولٹ کسنے والا بڑی چابی ہے۔ نوجوان اتنے خوف زدہ انداز میں بھاگا تھا کہ میں اس کا پیچھا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ تقریباً سو فٹ تک ہم دونوں اندھا دھند بھاگتے چلے گئے پھر وہ ایک راستہ چھوڑ کر درختوں میں گھس گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میرے ذہن میں بڑی تیزی سے یہ خیال گزرا تھا کہ اس شخص نے گھوڑا گاڑی کے نیچے گھس کر کوئی گڑبڑ کی ہے۔ شاید کوئی نٹ بولٹ ڈھیلا کر دیا ہے جس کے سبب گاڑی کو حادثہ پیش آسکتا ہے۔ نوجوان چھریرے جسم کا تھا اور ویسے بھی راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ تھا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح اڑتا چلا جا رہا تھا۔ مگر میں نے بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ایک موقع پر تو میں اس کے بالکل نزدیک پہنچ گیا لیکن پھر اچانک وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے چاروں طرف پتھر اور جھاڑیاں تھیں۔ بھول بھلیوں کا سا منظر تھا۔ ان بھول بھلیوں میں سے کسی خاص شخص کو ڈھونڈنا کار دشوار تھا۔

میں نے رائفل ہاتھ میں لے لی تھی۔ تھوڑی دیر میں نے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھا، پھر واپس روانہ ہو گیا۔ گودام تک کا فاصلہ میں نے تیزی سے طے کیا۔ یہ دیکھ کر مجھے دھچکا لگا کہ تگڑی ٹاپ گھوڑا گاڑی گودام کے سامنے موجود نہیں۔ وہ

نامعلوم سمت میں روانہ ہو چکی تھی۔ میری نگاہوں میں اس معصوم چہرے والی بچی کی صورت گھوم گئی۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گاڑی پر موجود تھی اور میرے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اگر گاڑی کے نیچے سے نکل کر بھاگ جانے والے شخص نے واقعی گاڑی کے ساتھ کچھ کیا تھا تو پھر گاڑی پر سوار افراد کو خطرہ لاحق تھا۔ میں نے ایک قریبی پتھر پر چڑھ کر دیکھا۔ دھند کے باوجود مجھے گاڑی نظر آگئی۔ وہ بل کھاتے ڈھلوانی راستے پر تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ یہ راستہ نشیب کی طرف جاتا تھا لہٰذا میں بلندی سے بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ راستے کی ایک جانب پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ ایسے راستوں پر ہونے والے حادثے مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ عین اس وقت میری نگاہ بوڑھے مسٹر ہنری پر پڑی۔ وہ جھک کر چلتا ہوا اسٹور کے اندر سے نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ سا تھا۔

میں لپک کر مسٹر ہنری کے قریب پہنچا۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کی جھریاں کچھ زیادہ گہری دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں نے اپنے چہرے پر سے گرم چادر ہٹائی۔ مسٹر ہنری نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر بے پناہ حیرت اور خوف نظر آنے لگا "تم...... تم یہاں کیسے؟" اس نے پوچھا۔ اس کے ہاتھ سے لفافہ گرتے گرتے بچا تھا۔

میں نے کہا "مسٹر ہنری! میں اپنے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو رنگ دار گھوڑا گاڑی یہاں کھڑی تھی کس کی تھی۔"

"وہ پاناما کی تھی۔ پاناما جو اس بستی کا ملک (سردار) ہے۔ ساتھ میں اس کی بچی تھی لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

میں نے تیزی سے کہا "مسٹر ہنری! پاناما کو کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ مجھے شک گزرا ہے کہ کسی نے اس کی گھوڑا گاڑی میں کوئی گڑبڑ کی ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" ہنری نے پوپلے منہ میں زبان گھما کر کہا۔

میں نے مختصر الفاظ میں ہنری کو بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ مسٹر ہنری کی پیشانی پر واقعی ریختوں سلوٹوں میں الجھن کی سلوٹیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں نے کہا "مسٹر ہنری! پاناما کو اس واقعے سے مطلع کرنا ضروری ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ابھی ان کے پیچھے جائیں۔" ہنری کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میری رائے سے متفق ہے لیکن اس کے بوڑھے قویٰ کسی بھاگ دوڑ کے حق میں نہیں تھے۔ میں نے ہنری سے پوچھا "آپ کے پاس سواری ہے؟" ہنری نے اس چھکڑے کی طرف اشارہ کر دیا جو گودام کے دروازے کے بالکل پاس کھڑا تھا اور جس میں صرف ایک گھوڑا جتا ہوا تھا۔ میں نے کہا "آئیے مسٹر ہنری! ہم پاناما کے پیچھے چلتے ہیں۔"

معمولی تذبذب کے بعد ہنری تیار ہو گیا۔ چھکڑے پر بیٹھ کر اس نے گھوڑے کی گدی میں ٹھوکا دیا۔ جیب سے وہسکی کا ایک پوا نکال کر دو تین گھونٹ لیے۔ میں نے اس کے پہلو میں جگہ سنبھال لی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک دس فٹ چوڑے نیم ہموار راستے پر بھاگے چلے جا رہے تھے۔ یہ راستہ بتدریج نشیب میں اترتا جا رہا تھا اور جوں جوں نشیب میں اتر رہا تھا خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔

"یہ کدھر کو جاتا ہے یہ راستہ؟" میں نے پوچھا۔

"سکرام کی طرف" بوڑھے نے چلا کر کہا۔

سکرام وادی کی اس دوسری بستی کو کہا جاتا تھا جو ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھی۔

"کتنا فاصلہ ہے یہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

"قریباً آدھ گھنٹا لگے گا۔" بوڑھے ہنری نے کہا۔ وہسکی چڑھا کر اس کے جسم میں حرارت اور توانائی جاگ اٹھی تھی۔ وہ مجھے بعینہٖ کسی کاؤ بوائے فلم کا کردار لگا۔

میں نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے۔ پاناما کدھر گیا ہے۔"

"سکرام گیا ہوگا۔ راستے میں رکنے والی اور کوئی جگہ نہیں ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولا "بنگ کا شوہر قتل ہو گیا ہے اور بنگ گھر سے غائب ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس بارے میں؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا "مجھے شکایت ہے کہ تم اس بارے میں جانتے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں میں جانتا ہوں۔ لیکن ابھی یہ بات چھیڑنے کا موقع نہیں۔" گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

دھند نے جہاں تک اجازت دی میں نے وہاں تک دیکھا۔ بل کھاتے راستے پر کوئی گھوڑا گاڑی کوئی چھکڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا سامنے کی طرف سے چل رہی تھی۔ ٹھنڈ اس کی کاٹ دونی ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں مختلف خیالات کی یورش تھی۔ شاید مجھے وہم ہی ہوا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ پُراسرار نوجوان گاڑی کے نیچے سے نہ نکلا ہو۔ کسی اور طرف سے آیا ہو اور اگر وہ گاڑی کے نیچے سے بھی نکلا تھا تو یہ بالکل ضروری نہیں تھا کہ اس نے گاڑی میں کوئی نقص ڈالا ہو۔ وہ کسی اور وجہ سے بھی گاڑی کے نیچے چھپ سکتا تھا۔ جس گاڑی یا گھوڑا گاڑی کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ عام چھکڑوں اور گھوڑا گاڑیوں سے بالکل مختلف تھی۔ آرام دہ بگھی کی طرح اس میں کمانیاں اور اسپرنگ وغیرہ لگے ہوئے تھے۔

ناہموار راستے پر بھی بڑی تیزی سے روانہ ہوئی تھی اور اب اس کا دور دور پتا نہیں تھا۔ اچانک میری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ میں سکتے کی کیفیت میں اپنے سامنے دیکھتا چلا گیا۔ وہ گھوڑا گاڑی جسے میں دور دور تلاش کر رہا تھا اچانک میری آنکھوں کے سامنے آگئی تھی لیکن ایسی حالت میں کہ میرا دل و دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ میں نے دیکھا گھوڑا گاڑی ڈھلوان راستے سے اتر کر کھڈ میں لڑھک چکی

ہے۔ لیکن اس کے دونوں گھوڑے راستے کے کنارے واقع درختوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ چمڑے کے مضبوط ساز نے گھوڑوں کو گاڑی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ لہٰذا گاڑی کھڈ میں نہیں گری تھی بلکہ ہوا میں جھول رہی تھی۔ گاڑی کے وزن کے سبب گھوڑوں کی ٹانگیں ہوا میں اٹھ چکی تھیں اور وہ درد ناک آواز میں ہنہنا رہے تھے۔

بشری کے ہاتھوں نے بے ساختہ گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور چھکڑا رک گیا ہم تیزی سے نیچے اترے۔ اس وقت میری نگاہ گھوڑا گاڑی کے ایک پہیئے پر پڑی۔ پاناما کی گاڑی کا یہ پہیہ گاڑی سے الگ ہو چکا تھا اور راستے کے وسط میں پڑا تھا۔ پہیے کے قریب ہی ایک جسم بھی نظر آرہا تھا۔ یہ پاناما کا جسم تھا۔ ہم نے قریب جاکر دیکھا اس کی پیشانی خون سے تر تھی اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس حالت میں بھی وہ بڑبڑانے لگا۔ پہلے اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی پھر گھوڑا گاڑی کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہنے لگا۔ یقینی بات تھی کہ اس کی بچی گاڑی میں ہے۔ ہم نے پاناما کو اس کے حال پر چھوڑا اور گاڑی کی طرف لپکے۔ کھڈ کے کنارے سے نیچے جھانکا تو بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ دھند کی وجہ سے کھڈ کا پیندا نظر نہیں آرہا تھا تاہم کھڈ کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ سات آٹھ سو فٹ سے کم گہری نہیں ہے۔ اس قاتل گہرائی میں بھاری بھرکم گھوڑا گاڑی "شاخ سے لگے" جھولے سے پھل کی طرح جھول رہی تھی۔ ایسا پکا ہوا پھل جو کسی بھی وقت ٹوٹ کر گر سکتا تھا۔ بچی کے علاوہ گاڑی بان بھی گاڑی کے اندر تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ رہا تھا۔ بچی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی آواز بھی ناپید تھی۔

بشری نے مقامی زبان میں گاڑی بان سے پوچھا کہ بچی کہاں ہے؟ اس نے روتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ بچی بے ہوش ہے۔ گاڑی بان کی آواز ایسے شخص کی آواز لگ رہی تھی جس نے موت کے فرشتے کو اپنے روبرو دیکھ لیا ہو۔ یہ لمحوں کا کھیل تھا۔ گاڑی کسی بھی وقت گھوڑوں سے جدا ہو کر گہرائی کے سفر پر روانہ ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ گھوڑے بھی گاڑی کے ساتھ ہی جاتے۔ بے پناہ کھچاؤ کے سبب گھوڑے بری طرح تڑپ پھڑک رہے تھے۔ وہ جن درختوں میں الجھے ہوئے تھے وہ اتنے مضبوط نہیں تھے کہ دیر تک انہیں سہار سکتے۔ دھند میں لپٹا ہوا راستہ دونوں طرف دور تک خالی تھا۔ ادرگرد کہیں کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بچی اور گاڑی بان کی جان بچانے کے لیے جو کچھ کرنا تھا ہمیں خود ہی کرنا تھا۔ میں نے اپنی گرم چادر اتار کر ایک طرف پھینکی۔ میون ایم ایم تھا اس میں چھپائی اور بالکل عمودی ڈھلوان پر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ میرے پاؤں آغاز میں ہی پھسل گئے۔ گرنے سے بچنے کے لیے میں نے گھوڑا گاڑی کا سہارا لیا۔ پوری گھوڑا گاڑی جھولے کے مانند ہل گئی اور اس کے ساتھ

ساتھ وہ درخت بھی جن میں وہ الجھی ہوئی تھی۔ گاڑی بان کے سے بلی دبلی چیخیں نکلیں۔ کوشش اپنے پاؤں جمانے کے بعد میں نے گاڑی کا سہارا ترک کردیا اور وہ ایک بار پھر نیچے کی طرف کھسکنے لگا۔ دس پندرہ فٹ کا وہ فاصلہ چند سو میل کے سفر پر بھاری تھا۔ تاہم سفر ختم ہوا اور میں گاڑی کے اس حصے تک پہنچ گیا جہاں بچی اور گاڑی بان محصور تھے۔ گاڑی بان نے زخمی و بے ہوش بچی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ گاڑی بان خود بھی بری طرح زخمی ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ایک تباہ شدہ نشست کے نیچے پھنسی ہوئی تھیں۔

واپسی زیادہ دشوار تھی۔ اب بچی کا بوجھ بھی میرے ساتھ تھا ہو نہیں نجانے میرا پاؤں پھسلا اور مجھے گھوڑا گاڑی کا سہارا لینا پڑا۔ مرتبہ جب میں نے سہارا لیا گاڑی نے بری طرح ہچکولا کھایا اور کچھ نیچے کی طرف کھسک گئی۔ کنارے تک پہنچتے پہنچتے میری کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ بچی کو محفوظ فاصلے پر بٹھا کر میں پھر گاڑی کی طرف بڑھا۔ صورت حال اب مزید خطرناک ہو چکی تھی۔ ایک گھوڑے نے بری طرح تڑپ پھڑک کر چمڑے کی ایک بندش توڑ دی تھی اور وہ اب اپنی اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیٹ پر سے کھال اتری ہوئی تھی اور سفید سفید گوشت نظر آرہا تھا۔ بندش ٹوٹنے سے گھوڑا گاڑی کچھ اور نیچے کھسک گئی تھی۔

میں نے نیچے اترنا چاہا تو بوڑھے بشری کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ وہ انگریزی میں بولا "یہ بہت خطرناک ہے۔"

"لیکن اس کے سوا چارہ نہیں۔" میں نے کہا "ہمیں اس شخص کو بچانا ہے۔"

"نہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔" وہ لرزاں آواز میں بولا۔

میں نے ایک درخت کی جڑوں سے نکلی ہوئی جڑیں پکڑیں اور پاؤں جما جما کر نیچے اترنے لگا۔ ابھی یہ مشکل میں نے تین چار فٹ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک زوردار چرچراہٹ کی آواز آئی۔ میں نے دونوں گھوڑوں کو اٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی بان کی لرزہ خیز چیخ میرے کانوں میں گونجی۔ گاڑی حرکت میں آچکی تھی۔ یہ موت کی حرکت تھی' یہ اجل کا سفر تھا۔ ایک مہیب گڑگڑاہٹ سے گاڑی لڑھکی اور دھند کی دبیز تہ میں اوجھل ہو گئی۔

○☆○

میں نے اس شاخ در شاخ سرنگ کے اندر تھا جس کے دہانے پر بچھے ہوئے سانپ کی شبیہ تھی اور ایک تناور درخت سے بہت سی پراسرار پوٹلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے جو شخص بیٹھا تھا وہ پاناما تھا۔ اس کے سر اور ایک بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ سرنگ کا ایک نہایت سجا سجایا حصہ تھا۔ اس وادی میں یہ واحد جگہ تھی جہاں فانوس نظر آرہے تھے اور جہاں روشنی کرنا یا آگ جلانا ممنوع نہیں تھا۔ ہم ایک دبیز قالین پر بیٹھے تھے

پراوں کے ساتھ کشن لگے ہوئے تھے۔ ایک خوب رو خادمہ ابھی ابھی ہمارے سامنے چائے کی پیالیاں رکھ کر گئی تھی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے کئی برسوں کے بعد چائے کا ذائقہ میری زبان پر آیا ہے۔

پاناما واضح طور پر کسی یورپی ملک کا باشندہ لگتا تھا اور شستہ لہجے میں انگریزی بولتا تھا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہہ رہا تھا "تم نے جو کچھ میری بچی کے لیے کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکوں گا۔"

میں نے کہا "یہ میرا انسانی فرض تھا جو میں نے ادا کیا۔"

"لیکن یہ فرض ادا کرتے ہوئے تم نے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی۔ میں تمہاری سمجھ بوجھ اور دلیری سے بہت متاثر ہوا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کئے جانے والے فیصلوں پر نظرثانی کی جائے۔"

وہ مجھے بہت گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجب طرح کی بے اطمینانی کروٹیں لے رہی تھی۔ شاید یہ بے اطمینانی اس واقعے کا نتیجہ تھی جو پرسوں صبح کے وقت پیش آیا تھا۔ اس واقعے میں پاناما اور اس کی بچی زخمی ہوئے تھے۔ جب کہ گھوڑا گاڑی چلانے والا موقع پر ہلاک ہوا تھا۔ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ کسی سازش کے تحت گھوڑا گاڑی میں نقص ڈالا گیا تھا۔ ان آہنی کنڈوں کے نٹ کھول دیئے گئے تھے جو گاڑی کی کمانیوں کو جوڑے رکھتے تھے۔ رفتار پکڑنے کے بعد جب گاڑی کہیں اچھلی تھی کنڈے اتر گئے تھے اور ایک پہیہ گاڑی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ میں نے پاناما کی بچی کو گھوڑا گاڑی سے نکالنے کے لیے جو جدوجہد کی تھی وہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ بعد میں وہ مجھ سے لپٹ گیا تھا اور اپنے خون آلود ہونٹوں سے اس نے مجھے مسلسل بوسے دیئے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہی اپنی رہائش گاہ پر لایا تھا۔ یہاں پہنچ کر بشری نے پاناما کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ بیان کر بھی کہ میں مفرور ملازم ہوں اور میرے ہاتھوں چند افراد زخمی ہو چکے ہیں پاناما کا رویہ میرے ساتھ نرم ہی رہا تھا۔

جنیفر ابھی تک اسی کھوہ میں تھی جہاں اس نے تجلہ عروسی سے فرار ہو کر پناہ لی تھی اور خوراک ختم ہو جانے کے سبب بھوک سے نڈھال تھی۔ میں چاہتا تو پاناما سے درخواست کرکے جنیفر کو بھی اپنے پاس بلا لیتا۔ لیکن اگر میں ایسا کرتا تو یہ میری غلطی ہوتی۔ جنیفر سے میرا تعلق ثابت ہو جاتا تو پھر یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ قالب کے قتل میں میرا ہاتھ ہے۔ کم از کم میں اس سلسلے میں مشکوک تو ضرور ٹھہر جاتا۔ لہٰذا میں نے اس سلسلے میں پاناما سے کوئی بات نہیں کی تھی اور بوڑھے بشری سے کہا تھا کہ وہ بھوکی پیاسی جنیفر کو کھوہ سے نکالے اور اسے اپنی حویلی میں لے جائے۔ میں نے اسے رازداری کی بھی تلقین کی تھی۔

ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے اور پاناما کی پرسوچ نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔ وہ آہستگی سے بولا "اگر میں تمہاری خدمات اپنے لیے وقف کرلوں تو کیسا رہے گا؟"

"میں سمجھا نہیں؟"

وہ بولا "میں سوچ رہا ہوں کہ تم میرے پاس رہو۔ میرے ذاتی گارڈز میں شامل ہو جاؤ۔"

"آپ کے گارڈز بھی ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "کیا آپ کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ ہے؟"

"ہاں" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "بہت شدید خطرہ ہے اور اس کا ایک ثبوت وہ واقعہ ہے جو ہمارے ساتھ پرسوں پیش آیا ہے۔"

"یعنی آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ پرسوں جو کچھ ہوا وہ کسی سلسلے کی کڑی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" پاناما نے کہا "کوئی شخص ہے۔ کوئی نامعلوم شخص مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔"

یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا اور اس سے بھی بڑھ کر سنسنی خیز بات یہ تھی کہ پاناما مجھ سے اپنے ایک انتہائی نجی معاملے پر بات کر رہا تھا۔ وہ ان لمحات میں ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ اس کی رعب دار و دبنگ شخصیت کہیں اوجھل ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک عام سا شخص میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اپنے اندیشوں میں گھرا ہوا اور اپنی مجبوریوں میں جکڑا ہوا۔ مجھے لگا کہ پاناما دو چہروں کا مالک ہے۔ ایک چہرہ وہ تھا جو اس وادی کے لوگوں کے سامنے رہتا تھا۔ ڈرانے دھمکانے والا چہرہ۔ دستبانہ۔ قانون بنانے والا اور ان پر عمل کرنے والا چہرہ۔ سادہ لوح لوگوں کو روحانیت کے طلسم میں جکڑنے والا چہرہ اور ایک دوسرا چہرہ اس وقت میرے سامنے تھا۔ لاچار مجبور اور ان دیکھی موت کے خوف سے اترا ہوا چہرہ۔ ان دیکھی موت جو اس کے علاوہ اس کی بچی پر بھی سایہ فگن تھی۔ اس موت کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟ غالباً یہی سوال پاناما کے ذہن میں بھی انگارے دہکا رہا تھا۔

پاناما کے سامنے شراب سرخ کا ایک بلوری برتن تھا۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی شراب تھی۔ جنیفر نے بتایا تھا کہ اس شراب کو تیار کرنے کے لیے آگ جلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پاناما اس شراب میں سے جام بھر بھر کر پی رہا تھا۔ اس کا جام ایک چھوٹا سا گلاس تھا۔ وہ پہلے بلوری صراحی میں سے تھوڑی سی شراب گلاس میں ڈالتا۔ پھر ایک دوسری صراحی میں سے تھوڑا سا پانی ملاتا۔ اسٹیل کے ایک برتن میں قدرتی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موجود تھے۔ شراب کا یہ وہ ایک آدھ ٹکڑا بھی گلاس میں ڈال لیتا تھا۔ گلاس بے شک چھوٹا تھا لیکن پاناما ایک گلاس خالی ہوتے ہی دوسرا بھرنا شروع کر دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی چلی گئیں اور آواز میں لڑکھڑاہٹ آتی۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کرنا چاہا۔ مجھے اس سے میں بالکل

دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر صورت حال کے پیش نظر مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ اس کی نظر بچا کر ایک دو جام میں نے اپنی نشست کے پیچھے بھی انڈیلے۔ یہ ایک تیز شراب تھی اور میں اپنے حواس کھونا نہیں چاہتا تھا۔

پاپامہ تیز رفتاری سے شراب نوشی کرتا رہا اور آخر بالکل بہک گیا۔ اس کے اندر کی باتیں باہر آنے لگیں۔ وہ مجھ سے زیادہ بے تکلف ہو گیا۔ اس نے پہلی بار مجھ سے میرا نام پوچھا اور مجھے نام لے کر مخاطب کرنے لگا۔ خبر نہیں اس پر کیسا موڈ طاری تھا۔۔۔ اس نے اپنا آپ مجھ پر کھول کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنی نجی زندگی کے بارے میں بھی باتیں کرنے لگا۔ وہ بظاہر جتنا بااعتماد اور مطمئن نظر آتا تھا اندر سے اتنا ہی دکھی اور بے چین تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خود ساختہ اور موروثی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی کو پسند نہیں کرتا لیکن قبائلی دباؤ کے سبب لاچار ہے۔ اس نے اپنا بازو میرے گلے میں ڈال کر میرے دونوں رخسار چومے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "تم نے پرسوں جو کچھ میرے لیے کیا ہے، میں تمہیں اس کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ چاہوں بھی تو نہیں دے سکتا۔ میری بچی سانچا میری کل کائنات ہے۔ تم نے میری کائنات بچائی ہے۔۔۔۔" پھر ایک دم وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں نے کہا "میں آپ کو اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا۔ آپ تو بالکل حوصلہ چھوڑ رہے ہیں۔ جو شخص یا اشخاص آپ کو نقصان پہنچانا چاہ رہے ہیں وہ آخر کو اسی قبیلے سے ہیں۔ آپ کوشش کر کے ان کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"

وہ بولا "تم اجنبی ہو۔ تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں معلوم نہیں اس لیے یہ کہہ رہے ہو۔"

اس نے اپنی جیب میں سے ایک کارڈ سائز تصویر نکالی۔ یہ اسی بچی کی تصویر تھی جو پرسوں حادثے میں زخمی ہوئی تھی اور ابھی تک "شفاخانے" میں تھی۔ یہ پولورائڈ (فوری) کیمرے کی تصویر تھی۔ یقیناً کسی بدنصیب سیاح کا کیمرا ہوگا جو ان لوگوں کے ہتھے چڑھا ہوگا۔ تصویر میں سانچا نامی یہ بچی ایک عورت کی گود میں نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ عورت بچی کی ماں تھی۔ نشے کے عالم میں پاپامہ اس تصویر کو چومنے لگا اور رونے لگا "میں جانتا ہوں میری بچی! مجھے تم سے جدا کر دیا جائے گا۔ میں تمہیں دیکھنے اور پیار کرنے کے لیے زیادہ دیر اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔"

پاپامہ پر رقت طاری تھی اور وہ دیوانوں کی طرح تصویر سے باتیں کیے چلا جا رہا تھا "میں زندہ ہوں میری بچی، لیکن میں جانتا ہوں کہ میں زندہ نہیں ہوں۔ مجھے زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ تیرا باپ تجھ سے دور جانے پر مجبور ہو جائے گا میری بچی۔۔۔ جب ایسا ہو جائے تو اپنے مجبور باپ کو معاف کر دینا۔"

پاپامہ کی ہچکی بندھ گئی۔ روتے روتے وہ شراب کی صراحی لڑھکا گیا۔ بلوری صراحی فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی اور ساتھ ہی چائے کے برتن بھی۔ دروازہ کھلا اور ایک عورت نے اندر جھانکا۔ یہ عورت تصویر میں بچی کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ یہ عورت اس سے پہلے خوش نما شامگاہ میں بھی پاپامہ کے ساتھ نظر آئی تھی۔ پایار کی طرح اس کے بالوں میں بھی قیمتی پتھر ٹنکے ہوئے تھے۔ اس نے پاپامہ کو اٹھا کر ایک تخت پر لٹانے میں میری مدد کی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ عورت کو میری موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی باہر نکل آیا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد پاپامہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے خود نشست گاہ میں بلایا تھا۔ آج وہ ترو تازہ اور اجلا اجلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے لباس بدلا ہوا تھا اور بال سلیقے سے بنے دکھائی دیتے تھے۔ پیشانی پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی کی جگہ نئی پٹی نے لے لی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں بولا "کل میں نے نشے کی حالت میں جو باتیں کیں انہیں اپنے دل و دماغ میں جگہ مت دینا۔"

میں نے کہا "اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں۔"

"ہاں کہو۔"

میں نے کہا "ضروری نہیں کہ کوئی نشے میں بہکی بہکی باتیں ہی کرے۔ کبھی کبھی ٹھیک باتیں بھی اس کی زبان سے نکل جاتی ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ کل رات میں نے آپ کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھا ہے۔ اس روپ کو دیکھنے کے بعد آپ کے بارے میں میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ میں خود کو آپ کے زیادہ قریب محسوس کر رہا ہوں۔"

"شکریہ" پاپامہ نے سپاٹ لہجے میں کہا "لیکن اگر تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں مقامی قوانین میں کسی طرح کی رعایت دے سکوں گا تو یہ خیال دل سے نکال دو۔"

میں نے کہا "میں کسی رعایت کی توقع کے بغیر ایک کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا کام؟"

"اگر آپ اسے گستاخی نہ سمجھیں تو میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"آپ کی جان کو درپیش خطرے کے سلسلے میں۔"

پاپامہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بڑی بڑی سلیٹی آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست تھیں۔ وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں بہت کم وقت میں آپ کے مزاج کو بہت زیادہ سمجھ گیا ہوں۔ آپ کی دلیری اور بہادری پر دو رائے ہرگز نہیں ہو سکتیں لیکن ایک بزدل دشمن جو چھپ کر نقصان پہنچانا چاہ رہا ہے آپ کے لیے بے سکونی اور ذہنی تناؤ کا باعث ہے۔ آپ سامنے آ کر وار کرنے والے دشمن کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں لیکن کسی ایسے چوہے کا کھوج نہیں لگا سکتے جو بل سے نکل کر وار کرتا ہے اور پھر بل میں گھس جاتا ہے۔ لیکن میں ایسا کر سکتا ہوں کیوں کہ میرا کام ہی یہی ہے۔ میں جرم و سزا کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا شخص رہا ہوں۔ پچھلے سات آٹھ سال میں نے اپنے 'قاتلوں' سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزارے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر آپ مجھے اپنی پریشانی میں شریک کر سکیں اور محدود مدت کے لیے مجھے فری ہینڈ دیں تو میں آپ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔"

پاپامہ نے سگار سلگا لیا۔ اس وادی میں وہ واحد شخص تھا جو کسی طرح کی تمباکو نوشی کرتا تھا۔ وہ بولا "میں تمہاری صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ لڑنے مرنے والے لوگ تو میرے پاس بھی بہت ہیں لیکن ذہانت اور ہوشیاری سے حالات کا مقابلہ کرنا اور خطرات کا سامنا کرتے ہوئے حکمت سے کام لینا یہاں کے مقامی لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ تم ان کے لیے "بجلی" کا خطاب بڑی سہولت سے اور بلا جھجک استعمال کر سکتے ہو۔ یہ حیوان نما انسان ہیں۔ مجھے یہ مسئلہ درپیش ہے وہ میرے لوگوں میں سے کوئی حل نہیں کر پائے گا' اور اگر حل کرے گا تو اس طرح کہ جتنے بھی مشکوک لوگ ہوں گے انہیں ایک لائن میں کھڑا کر دے گا اور ان سب کے سر کلہاڑے سے جدا کر دے گا۔ تمہاری پیشکش میرے لیے قابل غور ہے' اور میں اس پر غور کروں گا بھی۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بات پھر تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے قوانین بے لچک ہیں۔ ان میں کسی کے لیے کسی بھی صورت نرمی نہیں ہو سکتی۔ جو شخص "نارار" کی صورت ایک بار اس وادی میں داخل ہو جاتا ہے پھر کبھی یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ پچھلے پندرہ برس میں کوئی ایک نارار بھی یہاں سے فرار نہیں ہو سکا۔ اس کامیابی میں جہاں انسانی سخت نگرانی کو دخل ہے وہاں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ تم اس وادی کو آمد و رفت کے لحاظ سے دنیا کی دشوار ترین وادیوں میں شمار کر سکتے ہو۔ اس کی مثال ایک بہت بڑے کنوئیں جیسی ہے جس میں فقط ایک جانب سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس جانب ایک تنگ درہ ہے جہاں سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ کوئی ارادتاً اس درے میں سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "یہ بات میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جیل سے زیادہ گزار مقام اور کیا ہو سکتا ہے لیکن فرار ہونے والے وہاں سے بھی فرار ہوتے ہیں۔ خود میں بھی مفروروں کے زمرے میں آتا ہوں۔ آپ کی یہ وادی کتنی بھی خاص الخاص ساخت کی ہوگی لیکن اس میں ایسے مقامات ضرور ہوں گے جہاں نگرانی کمزور ہوگی یا قدرتی رکاوٹیں موجود نہیں ہوں گی۔"

پاپامہ بولا "ہر فرار ہونے والا اسی طرح سوچتا ہے جس طرح تم سوچتے ہو اور اسے ایک آدھ مقام ایسا مل بھی جاتا ہے جہاں سے فرار نسبتاً آسان نظر آتا ہے اور یہی اس کی بدقسمتی ہوتی ہے۔"

"میں۔۔۔ آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

وہ سگار کا کش لگا کر بولا "ناداروں کو اکثر اس بات کا مطلب نہیں سمجھایا جاتا اور ان کی یہ بے خبری ہی ان کے "فرار کے جرم" کی سزا بن جاتی ہے۔ لیکن تم نے میری بچی کو بچا کر جو احسان مجھ پر کیا ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں تمہیں یہاں کی اونچ نیچ سے آگاہ کر دوں تاکہ تم کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہو۔" اس نے سگار کی راکھ پتھر کی ایش ٹرے میں جھاڑی اور اپنے زخمی ماتھے کو سہلاتے ہوئے بولا "وادی کو عموری دیواروں نے گھیر رکھا ہے۔ تاہم دو تین مقامات ایسے ہیں جہاں سے اوپر چڑھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ مگر ان مقامات پر پتھروں' سنگریزوں اور مٹی کے نیچے موت چھپی ہوئی ہے۔ ایسی موت جو دھماکے سے بدن کے چیتھڑے اڑا دیتی ہے۔ یہ سینکڑوں بارودی سرنگیں ہیں جو ان مقامات میں دبائی گئی ہیں۔ کوئی شخص' حتیٰ کہ ہم خود بھی ان مقامات سے گزر نہیں سکتے۔"

میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک تشویش ناک خیال میرے ذہن سے آ چپکا۔ یہ زینی کل کا خیال تھا۔ اس کی ذات میں چین نہیں تھا۔ وہ ہر وقت مہم جوئی کے لیے تیار رہتا تھا۔ اگر وہ کوئی ایسی ویسی کوشش کر بیٹھتا تو کیا ہوتا اور پھر منصور بھی تھا۔ اس سے بھی ایسی غلطی ہو سکتی تھی۔

میں نے پاپامہ سے پوچھا "آپ کی اس وادی میں پالتو جانور بھی ہیں۔ خاص طور سے پہاڑی بکرے وغیرہ تو بہت بلندی تک چلے جاتے ہیں۔ کیا وہ ان بارودی سرنگوں سے نہیں ٹکراتے؟"

پاپامہ کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے "تم نے اچھا سوال کیا ہے۔ تین چار سال پہلے ایسے کچھ حادثات ہوئے تھے مگر اب ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ وادی کے جانور ان مقامات کا رخ نہیں کر سکتے۔"

میں نے پوچھا "اتنی بڑی تعداد میں بارودی سرنگیں آپ کو ملیں کہاں سے؟"

"یہ دراصل وہ ڈائنامیٹ ہیں جو چٹانیں اڑانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں ایک خاص تکنیک سے بارودی سرنگوں کی شکل دی گئی ہے۔ کافی عرصہ پہلے یہ ڈائنامیٹ ایک بڑے معرکے میں ہمارے ہاتھ لگے تھے۔ بہرحال۔۔۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں سے نکلنے کا خیال اب اپنے دل سے نکال دو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ باقی جہاں تک تمہارا تعاون حاصل کرنے کا تعلق ہے، میں اس بارے میں سوچوں گا اور کل تک تمہیں آگاہ کروں گا۔"

میں نے کہا "کل میں نے آپ سے اپنے ساتھی زریں گل کے بارے میں بات کی تھی۔"

وہ بولا "مجھے بالکل یاد ہے۔ میں نے اس سلسلے میں حکم جاری کر دیا ہے۔ میرے خصوصی اجازت نامے کی رو سے آج کسی وقت تمہارا ساتھی تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ بلکہ تمہارے دوسرے ساتھی (منصور) کو بھی یہ سہولت دی جائے گی کہ وہ جب چاہے تم سے مل سکے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ اس وادی کے تمام قوانین تحریر شدہ ہیں۔ ان کی خلاف ورزی پر کڑی سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ چوری کی سزا سو ہنٹر ہے۔ ڈاکا ڈالنے والے کے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کاٹ دی جاتی ہیں۔ آبرو ریزی کی سزا زبان کا قطع کیا جانا ہے۔ اس کے علاوہ تین دن کے اندر اسے تین سو ہنٹر بھی رسید کیے جاتے ہیں۔ بغاوت، فراڈ اور قتل کی سزا موت ہے۔ اکثر اس سزا کے لیے مجرم کو بپھرے ہوئے سانڈوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ یہ قوانین ہر کس و ناکس کے لیے برابر ہیں۔ وادی کے لوگوں کو قانون کی اس عمل داری پر فخر ہے۔"

میں نے دل میں سوچا "تمہارے قانون کا ایک کرشمہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں"۔ میں یہ حقیقت کیسے بھول سکتا تھا کہ دوگال نامی شخص کے قتل پر منصور کے بجائے شاہد خاں کو سزائے موت دے دی گئی تھی۔ غالباً پاپامہ اس ہیرا پھیری سے بے خبر تھا۔ ممکن تھا کہ یہ کام ان "بزرگ قبائلیوں" نے کیا ہو جو پاپامہ کی مشاورت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میں پاپامہ کو اس بارے میں بتانا چاہتا بھی تو نہیں بتا سکتا تھا۔ میری اس اطلاع کے نتیجے میں منصور قاتل ٹھہرتا تھا۔

اسی روز رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ پاپامہ کی رہائش گاہ کے پاس ہی مجھے ایک حجرہ نما کوٹھری رہنے کے لیے دی گئی تھی۔ پتھریلی دیواروں والی یہ کوٹھری درحقیقت سرنگ کا ہی حصہ تھی۔ جہاں پتھر سے تراشے ہوئے ایک چبوترے پر گدیلا بچھا تھا۔ اس کوٹھری میں روشنی کرنے کی اجازت تھی۔ میں چراغ کی روشنی میں گم صم لیٹا تھا اور زریں گل کا انتظار کر رہا تھا۔ پاپامہ کے وعدے کے مطابق آج کسی وقت زریں گل کو میرے پاس پہنچ جانا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اچانک حجرے کا پردہ ہلا اور پاپامہ کی بیوی اندر آگئی۔ وہ گوری چٹی غیر ملکی عورت تھی۔ عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے شہد رنگ بال شانوں پر بکھرے تھے۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو بیٹھو۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔" اس نے اطالوی لہجے میں انگریزی بولی۔

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میری معلومات کے مطابق پاپامہ کی یہ دوسری بیوی تھی۔ اس کا تعلق اٹلی سے تھا اور اس کا نام کیرولین تھا۔ کیرولین کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کوئی بہت اہم بات کہنے کے لیے میرے پاس آئی ہے۔ ایک آدھ منٹ تک

وہی گفتگو کے بعد وہ بولی "مجھے معلوم ہے کہ میرے شوہر تم سے مدد لینے کا ارادہ کر رہے ہیں اور انہیں یہ ارادہ کرنا بھی چاہیے تھا۔ اپنے طور پر اپنی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر کے وہ تھک چکے ہیں اور ناکام ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ مسلسل ان کی جان کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی شروعات آج سے قریباً دو سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ موسم بہار کا تہوار تھا۔ میرے شوہر جانو (عبادت گاہ) سے گھر کی طرف آ رہے تھے۔ راستے میں کسی نے گھات لگا کر ان پر دو فائر کیے۔ ایک گولی ان کے بازو میں لگی تھی۔ اس واقعے کے تین چار ماہ بعد پھر ان پر فائرنگ ہوئی۔ اس بار بھی وہ بال بال بچے۔ پھر تھوڑے عرصے بعد وہ شدید بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹر ہنری کا خیال تھا کہ انہیں کھانے میں کوئی زہریلی چیز دی گئی ہے۔ اب یہ گھوڑا گاڑی کے حادثے والا تازہ واقعہ پیش آیا ہے۔ یہ کوئی بہت عیار شخص ہے جو کسی طرح کا ثبوت چھوڑے بغیر میرے شوہر کی جان لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہادر ہیں اور دشمن کا مقابلہ خم ٹھونک کر کرتے ہیں لیکن ایک ان دیکھے عیار دشمن کے خوف نے ان کے اعصاب کو بری طرح جکڑ رکھا ہے۔"

میں نے کہا "محترمہ! آپ بے فکر رہیں۔ اس طرح کے حالات سے نمٹنے کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔ اگر محترم پاپامہ نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا تو میں اس اعتماد پر پورا اتر کر دکھاؤں گا۔"

"وہ تم سے بہت متاثر ہیں۔" کیرولین بولی "اصولی طور پر وہ تمہارا تعاون حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں تم سے ایک بہت خاص بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"جی فرمائیے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ بات ایک خاص مدت تک صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔"

میں نے کہا "اگر آپ سمجھتی ہیں کہ اس بات کو چھپانے میں آپ کی اور محترم پاپامہ کی بہتری ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"میرے شوہر کا ایک دوست ہے۔" وہ ٹھہری ٹھہری آواز میں بولی "وہ مقامی شخص ہے۔ اس کا نام سدرت ہے۔ میرے شوہر اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ شخص ایسا نہیں کہ اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جا سکے۔۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اس شخص کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی۔"

میں نے کہا "کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ وہ شخص ان افراد کی فہرست میں شامل ہے، جن پر محترم پاپامہ کو نقصان پہنچانے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ بات تم نے بالکل صحیح کی ہے۔ میں سدرت کو مجرم نہیں ٹھہراتی لیکن میرے خیال میں قاتلانہ حملوں کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے سدرت جیسے لوگوں کو کھوجنا ضروری ہے۔ یہ شخص انتہائی درجے کا عیار ہے۔ اس کی عیاریاں گنوانے بیٹھوں تو رات گزر

جائے۔ میں فی الوقت صرف ایک بات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے کہا۔

کیرولین بولی "سدرت میرے شوہر کے عہدے اور حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا رہتا ہے اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ وہ کسی انجان شخص کے سامنے خود کو پاپامہ کے طور پر پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ اکثر بن ٹھن کر رہتا ہے اور ویسا ہی لباس پہنتا ہے جیسا میرے شوہر پہنتے ہیں۔ اس نے لوگوں پر اپنی امارت کا رعب ڈالنے کے لیے بازوؤں میں نہایت قیمتی پتھر گودھ رکھے ہیں۔ یہ کوئی ایک ماہ پہلے کی بات ہے ایک ہاوا لڑکی کسی کام سے میرے شوہر سے ملنے آئی۔ اتفاقاً اس وقت وہ سو رہے تھے۔ ہاوا لڑکی میرے شوہر کو شکل سے نہیں جانتی تھی۔ سدرت نے اس سے کہا کہ وہی پاپامہ ہے۔ پھر وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنے مکان پر لے گیا۔ چند روز بعد مجھے پتا چلا کہ سدرت نے لڑکی کے اصل مالک کو اس کی قیمت ادا کر دی ہے اور اسے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں نے اپنے ذریعے سے تصدیق کرانا چاہی کہ کیا واقعی کوئی قیدی لڑکی سدرت کے پاس ہے لیکن تصدیق یا تردید نہیں ہو سکی۔ میں نے خود سدرت سے پوچھا تو وہ صاف مکر گیا۔ کہنے لگا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھی اور نہ اب ہوں۔ جس ذریعے سے مجھے یہ اطلاع ملی تھی وہ نہایت قابل اعتماد ہے۔ وہ میری ذاتی خادمہ سورانی ہے۔ اس نے اپنے کانوں سے قیدی لڑکی اور سدرت کی گفتگو سنی تھی۔ وہ لفظ بہ لفظ گفتگو دہرا سکتی ہے۔"

میں نے مسز کیرولین کی بات پوری توجہ سے سنی اور کہا "کیا آپ نے اپنے شوہر محترم پاپامہ سے اس بارے میں بات نہیں کی؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا۔۔۔ کہ وہ سدرت کے بارے میں کبھی کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں تم انہیں اچھا پند کر سکتے ہو۔ کہنے لگے اگر سدرت کہتا ہے کہ اس کے پاس کوئی لڑکی نہیں تو پھر نہیں ہوگی۔ مجھے اس پر مکمل بھروسا ہے۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ میں نے چشم دید گواہ سورانی کا حوالہ دیا تو وہ بولے تم ایک ادنیٰ خادمہ پر بھروسا کر رہی ہو لیکن مجھ پر بھروسا نہیں کر رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ سورانی کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لڑکی سدرت کی تحویل میں ہے؟"

"سو فیصد" کیرولین نے جواب دیا۔

"پھر آپ یہ ضرور چاہتی ہوں گی کہ اس لڑکی کا کھوج لگے تاکہ سدرت محترم پاپامہ کی نظروں میں جھوٹا ثابت ہو سکے۔"

"یقیناً میری یہی خواہش ہے۔ خدا گواہ ہے مجھے اس اندھے اعتماد سے خوف آتا ہے جو میرے شوہر اس عیار سدرت پر رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میرے شوہر کی آستین میں ایک سانپ ہے جو بار بار انہیں ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔" کیرولین کی نیلی آنکھوں میں ایک ہوبکی کی نام نہ تشویش اور پریشانی موجود تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "مجھے توقع ہے کہ کل میرے شوہر تمہیں اپنے پاس بلائیں گے اور بتائیں گے کہ انہوں نے تمہارا تعاون حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر وہ ایسا کہے تو تم دس پندرہ روز کے لیے ان سے فری ہینڈ مانگو۔ اگر فری ہینڈ مل جائے تو پھر تم سدرت کے خلاف بھی چھان بین کر سکتے ہو۔ سدرت کے قریب جانے کا ایک آسان طریقہ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ آج کل سدرت کے مکان کی مرمت ہو رہی ہے' وہاں مزدوروں کی ضرورت ہے۔ تم وہاں جا کر کام کر سکتے ہو۔"

"وادی میں تو ہاوا اروں اور دو دار بیگار کرنے بیٹھ مزدوری نہیں۔"

"بے شک تم ہاوا رہو لیکن اب وہ پہلے والے ہاوا رنہیں ہو جس کی ٹانگ سے ہر وقت آہنی گولا بندھا رہتا تھا۔ اب تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا درجہ کچھ بلند ہو گیا ہے۔ اب تمہارے لیے ضروری نہیں کہ اپنے آقا ہی کی بیگار کرو۔ اب تم اس وادی میں کہیں بھی محنت مزدوری کر سکتے ہو۔ تمہیں اپنے آقا کو اپنی آمدن میں سے صرف ایک مخصوص حصہ دینا ہوگا۔"

میں نے موضوع بدلنے ہوئے کہا "مسز پاپامہ! آپ میری ایک الجھن دور کریں۔ اگر آپ ہاوا لڑکی کے بارے میں اتنی سنجیدہ ہیں تو پھر اس کے مالک سے پوچھیں کہ اس نے لڑکی کہاں فروخت کی ہے؟"

کیرولین بولی "یہی تو مسئلہ ہے۔ لڑکی کو میری خادمہ نے دیکھا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھی اور اس کا مالک کون تھا۔"

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ مسز کیرولین اٹھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے کہ تمہارا ساتھی آگیا ہے۔ اب میں چلتی ہوں، پھر ملاقات ہوگی۔"

مسز کیرولین کے جاتے ہی زریں گل اندر آ دھمکا۔ میری توقع کے برعکس وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ آتے ساتھ ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ بڑے جوش سے بولا "رونا راب ہی سا۔"

"ہائیں۔۔ کیا کہہ رہے ہو۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"رونا راب ہی سا۔ یہ مقامی زبان کا فقرہ ہے۔ نوچے اس کا مطلب ہے۔ السلام علیکم، آپ کا حال چال کیسا ہے۔"

"میرا حال چال تو ٹھیک ہے لیکن تم کچھ کھسکے ہوئے نظر آتے ہو۔ بھلے مانس! تمہیں یہ منحوس زبان سیکھنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔"

"خو استاد صیب! اس کو منحوس زبان مت کہو۔ آپ کی جان کا قسم یہ بڑا پیارا زبان ہے۔ اس لیے کہ یہ کلثوم کا زبان ہے۔"

"کلثوم — یہ کون ذات شریف ہے؟"

"ارے استاد صیب! آپ سب کھڑے کھڑے پوچھے گا' یا بیٹھنے کو بھی کہے گا۔"

"اوہو یہ تمہاری اپنی ہی سرنگ ہے۔ جس پتھر پر چاہو تشریف رکھ لو۔" میں نے کہا۔

میں نے کوٹھری کے دروازے کا پردہ برابر کیا اور ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ زریں گل لہک کر بولا "کلثوم ہمارے مالک کی بڑی لڑکی کا نام ہے۔ وہ جتنی خوب صورت ہے اس سے زیادہ سمجھدار اور ہمدرد ہے۔"

میں نے کہا "یہ وہی ہے نا... جس نے تمہاری کنپٹی پر انڈا توڑا تھا۔"

زریں گل نے برا سا منہ بنایا "وہ بات چھوڑیں جی۔ وہ تو پتا نہیں کیسے شرارت ہو گیا اس سے...... وہ اس غلطی پر بہت شرمندہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اماری محبت کی شروعات ہی اس شرارت سے ہوئی ہے۔"

"محبت؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "تو تم محبت کر رہے ہو یہاں؟"

زریں گل کا چہرہ دبے دبے جوش سے سرخ ہو گیا "ابھی جی کچھ نہ پوچھیں۔ بڑا زبردست چکر چل گیا ہے یہاں۔ یہ سب قدرت کا کام ہے۔ وہ شخص جو ام سے بیگار لیتا تھا اور ہر وقت ام کو ڈنڈے کی نوک پر رکھتا تھا' اسی کا لڑکی اب اماری محبت کا دم بھرتا ہے۔ ام سے ملنے اماری کوٹھری میں آتا ہے۔ جو کچھ ام کہتا ہے وہ کرتا ہے۔"

زریں کی باتیں مجھے سچ مچ حیران کرنے لگی تھیں۔ میں نے پوچھا "کیا اس لڑکی کا نام واقعی کلثوم ہے؟"

وہ بولا "نام تو کچھ اور ہے۔ گل تو بیا گل توم کی طرح کا لیکن ام اپنی آسانی کے لیے اسے کلثوم کہتا ہے۔ آپ بھی اسے کلثوم کہہ سکتے ہیں' ام کو کوئی اعتراض نہیں۔"

"اعتراض کے بچے... یہ ہوا کیسے؟"

"آپ کی جان کا قسم ام نے تو کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا اسی نے کیا۔ بس ام کو یہ افسوس ضرور تھا کہ اس نے ام کو انڈا مارا ہے۔ ام گم صم اپنے کام میں لگا رہتا تھا' اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ وہ کھڑکیوں سے تانک جھانک کرتا تھا اور ام کو ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی منہ چڑاتا تھا' کبھی کنکر مارتا تھا' کبھی اپنی چھوٹی بہن کو اماری طرف بھیج دیتا تھا اور وہ ام سے مسخری کرتا تھا۔ ایک روز اس نے کھڑکی سے ام کو پھول مارا۔ اس روز ام نے پہلی دفعہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اماوے مسکرانے سے وہ باغ باغ ہو گیا۔ جیسے بہت بڑا انعام مل گیا ہو۔ ام نے آپ کو بتایا تھا نا... کہ جب ام غصہ کرنے کے بعد مسکراتا ہے تو اماری مسکراہٹ میں بڑا کشش ہوتا ہے۔ بس اسی مسکراہٹ نے کلثوم کا دل جیت لیا۔ اس رات اس نے اماری کوٹھری میں آکر ام کو حیران کر ڈالا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ام سے معافی مانگا کہ اس نے ام سے بہت برا شرارت کیا۔ وہ اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ ام اس کو معاف کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ دو تین بار ام سے ملنے کوٹھری میں آچکا ہے اور ام پر جان چھڑکنے لگا ہے۔"

"اور تمہارے دل کے جذبات کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

زریں گل کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا "استاد صیب!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ام اپنے دل کی بات آپ کو بتانے کو [illegible] نہیں کرے گا۔ لیکن ام یہ بات آپ سے چھپا بھی نہیں سکتا۔ ام کلثوم سے محبت کرنے لگا ہے استاد صیب...... ایسا محبت ام نے پہلے کبھی نہیں کیا اور نہ شاید آئندہ کرے گا۔ ام کو یوں لگتا ہے کہ برسوں بعد ام کو اماری منزل مل گیا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خلا میں گھورتے ہوئے بولا "وہ کیا خوب صورت نغمہ تھا وحید مراد صاحب کی فلم کا..... مل گیا مل گیا ام کو پیار کا وہ منزل بھٹکی ہوئی ان موجوں نے آخر پایا اپنا ساحل۔ مل گیا مل گیا......"

میں نے ایک دوہتڑ زریں کی گردن پر مارا اور اس کا نغمہ ادھورا رہ گیا اور گڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "کسی مجنوں کی اولاد! یہ کیا آتے کے ساتھ ہی عشق کی کتھا شروع کر دی ہے۔ مجھے کچھ باہر کے حالات بتا اور یہ بتا کہ میرے آنے کے بعد ان لوگوں نے تیرے ساتھ کیا کیا تھا؟"

وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا "خو چے استاد صیب! آپ کو خدا کا واسطہ اماری ان باتوں کو مذاق میں مت لیں۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے سری لنکا میں یہی الفاظ تم نے اروی کے لیے کہے تھے اور اس سے پہلے بھی نجانے کتنی لڑکیوں کے لیے کہے ہوں گے۔ بہرحال میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے کوئی ڈھنگ کی بات کرو اور بتاؤ کہ باہر کے حالات کیا ہیں۔"

زریں گل نے ایک اور ٹھنڈی سانس کھینچی اور میری مطلوبہ معلومات بہم پہنچانے لگا۔ اس کے بیان کے مطابق میرے فرار کے بعد مسلح محافظوں نے اسے اچھی خاصی مار لگائی تھی اور کچھ دیر کے لیے الٹا بھی لٹکا دیا تھا۔ وہ اب تک غاران ہی کے قبضے میں تھا۔ سارا دن اس سے سخت بیگار لی جاتی تھی اور سرِ شام زنجیری کوٹھری میں بند کر دیا جاتا تھا۔ میرے فرار کے بعد اس کی نگرانی مزید سخت ہو گئی تھی اور قریباً ہر روز اس کے ذہنی گولے کی زنجیر اور تالا "چیک" کیا جاتا تھا۔ آج شام اچانک اسے بتایا گیا تھا کہ اسے غاران کی ملکیت سے نکالا جا رہا ہے اور پامہ کی رہائش گاہ پر پہنچایا جا رہا ہے۔

اگلے روز پامہ نے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا لیکن اس سے پہلے ہی ایک اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے پامہ کے قریبی دوست

سدرت کے گھر جانے کا موقع مل گیا۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ پامہ کی مسز کیبرولین میرے پاس آئی۔ وہ بڑی جلدی میں تھی۔ کہنے لگی "تمہارا کام بن گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سدرت یہاں آیا تھا۔ کہہ رہا تھا اسے کچھ باہمت مزدوروں کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا دو صحت مند مزدور یہاں بھی موجود ہیں' میں انہیں بھجوا دوں گی۔ ابھی تھوڑی دیر میں سدرت کا آدمی آئے گا تم دونوں اس کے ساتھ چلے جانا۔"

"لیکن کرنا کیا ہو گا؟"

"یہی کوئی پتھر وغیرہ توڑنے کا کام ہے۔ ہتھوڑا چلانے کے لیے کاری گری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے پامہ سے تمہارے بارے میں تھوڑا بہت بتا بھی دیا ہے۔ میرے شوہر کی طرح وہ بھی تم سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ پتھر تڑوانے کے بجائے تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہیے۔ میں نے کہا چھوٹا کام لے کر دیکھو' اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو پھر بڑا کام بھی لے لینا۔"

"مگر محترم پامہ کی اجازت......"

"وہ سب میں سنبھال لوں گی۔ بس سدرت کا کارندہ آئے تو تم دونوں اس کے ساتھ چلے جانا۔ اگر اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو گے تو مجھے یقین ہے کہ اس مکان سے تمہیں قیدی لڑکی کا کھوج مل جائے گا۔"

آخری فقرہ ادا کرتے ہی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد سدرت کا کارندہ آگیا۔ اس وقت تک میں اور زریں گل تیار ہو چکے تھے۔ ہم اس کے ساتھ وادی کی عظیم الشان سرنگ سے نکلے اور بستی کے مختلف راستوں پر سفر کرتے ہوئے تناور درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گئے۔ یہاں پتھروں سے بنا ہوا ایک بڑا مکان موجود تھا۔ اس کی چھت سپاٹ تھی اور حسب رواج اس پر گھاس پھوس اگا دیا گیا تھا۔ میں نے اب تک جتنے مکان دیکھے تھے یہ ان میں سب سے بڑا تھا۔ مکان کے اندر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ دو تین ماہ پہلے کی طوفانی بارشوں اور برف باری کے سبب مکان کا ایک حصہ منہدم ہو گیا تھا' اسے پھر سے بنایا جا رہا تھا۔ مکان کے باقی کمزور حصوں کو بھی مضبوط کیا جا رہا تھا...... کم و بیش دس مزدور یہاں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے چار بیگار کر رہے تھے۔ بیگار کرنے والوں کی نشانی یہ تھی کہ ان کے پاؤں میں ذہنی گولے یا بیڑیاں تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹنے پر مجبور تھے۔ یہیں پر سدرت سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ چوڑے چکلے جسم کا ایک مضبوط اور جواں سال شخص تھا۔ بال مقامی لوگوں جیسے تھے لیکن بہت زیادہ لمبے نہیں تھے اور سلیقے سے بنائے گئے تھے۔ اس میں مردانہ کشش موجود تھی۔ اس کی آنکھیں گہری اور غیر معمولی طور پر چمک دار تھیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی آنکھیں تھیں جس کے کردار اور خیالات کے بارے میں آسانی سے فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولا "تم پشتو سمجھ سکتے ہو؟"

میں نے کہا "بہت تھوڑی۔"

وہ اٹک اٹک کر کہنے لگا "تم بہادر ہو...... ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ ہم تمہارے لیے کوئی اچھا کام ڈھونڈیں گے۔"

"شکریہ" میں نے کہا۔

ہمیں وہاں پتھر توڑنے اور انہیں چوکور شکل میں تراشنے پر لگا دیا گیا۔ سارا دن سدرت ہمارے پاس ہی ٹہلتا رہا۔ وہ سارے کام کی نگرانی خود کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی کسی کام میں لگ جاتا تھا حالانکہ اس کے ایک بازو پر کوئی گہرا زخم تھا اور وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شام کو ہمیں چھٹی مل گئی۔ اس وادی میں شام سے مراد ساڑھے تین یا چار بجے کا وقت تھا۔ واپسی میں ہمارے ساتھ کوئی نگران موجود نہیں تھا۔ میں اور زریں گل خود ہی چہل قدمی کرتے اور گپیں ہانکتے واپس آئے۔ زریں گل مجھ سے ٹینگ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جسے میں نے تابے کی دست برد سے بچایا تھا اور تین چار روز بستی سے باہر ایک ویران کھوہ میں چھپائے رکھا تھا۔

میں نے زریں گل کو بتایا کہ ٹینگ اب واپس بوڑھے ہنری کے پاس ہے۔ میں نے ہنری کو سب کچھ سمجھا دیا ہے اور ٹینگ کو بھی۔ وہ دونوں دربار میں بیانات دیں گے۔ اس سے بالکل اندازہ نہیں ہو پائے گا کہ تابے کو حجلہ عروسی میں قتل کرنے والا اور ٹینگ کو اڑا لے جانے والا کون تھا...... ٹینگ بتائے گی کہ اس شخص نے مستقل طور پر اپنا چہرہ چھپائے رکھا تھا۔ مقامی لوگ چونکہ تابے کے ایک پرانے دشمن پر شبہ کر رہے ہیں لہٰذا توقع یہی ہے کہ اس قتل کی تفتیش سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔

○☆○

سدرت کے زیر مرمت مکان میں ہماری "مزدوری" جاری رہی۔ عونانے کے بارے میں ہم نے پوچھا تھا۔ ابھی سدرت نے بتایا تھا۔ پامہ کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں وادی سے باہر گیا ہوا ہے۔ تین چار روز کے اندر میں نے مکان کا حدود اربعہ اچھی طرح دیکھ لیا اور یہ بھی جان لیا کہ یہاں کتنے افراد رہتے ہیں۔ یہاں رہائش پذیر افراد کی تعداد صرف چار تھی اور یہ چار افراد تھے سدرت' اس کی بیوی' ماں اور ایک بہت پرانا خادم۔ ایک شام چھٹی کرنے سے پہلے میں ذرا بہانہ کر کے سامنے والے کمرے میں گیا اور ایک کھڑکی کی کنڈی اندر سے گرا دی۔ کھڑکی بظاہر بند تھی لیکن دھکا دینے سے کھل سکتی تھی۔

اسی رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے بڑی خاموشی سے اپنا بستر چھوڑ دیا۔ زریں گل اپنی نئی محبوبہ کی یاد میں دیر تک تڑپنے کے بعد سو چکا تھا۔ میں سرنگ سے نکل کر سیدھا سدرت کی رہائش گاہ پر پہنچا اور زیر تعمیر حصے کی جانب سے اندر داخل

ہوگیا۔ میری خوش قسمتی کہ کھڑکی ابھی تک کھلی تھی۔ میں کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوگیا۔ پورا مکان گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے دو روز پہلے ایک پنسل ٹارچ کا انتظام کر لیا تھا اور یہ ٹارچ میری جیب میں تھی۔ میں نے بے حد احتیاط اور سست روی سے مختلف کمروں میں گھومنا شروع کیا۔ میرا واحد ہتھیار وہ نو انچ لمبا چھرا تھا جو ابھی تک میرے کام آ رہا تھا۔ (اپنا واکی ٹاکی اور رائفل میں اسی کھائی کے قریب چھپا آیا تھا جہاں گھوڑا گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا) جلد ہی میں سدوت کی خواب گاہ تک پہنچ گیا۔ خواب گاہ کی تاریکی میں وہ اپنی بیوی کے قریب محو خواب تھا۔ اس کی خوب رو بیوی ایک دھان پان اور مسکین صورت عورت تھی۔ میں صرف اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔ مکان کے اندرونی کمرے کے دروازے پر مجھے تالا نظر آیا۔ یہاں تالے وغیرہ لگانے کا رواج بہت کم تھا۔ جرائم کی کڑی سزائیں مقرر تھیں لہٰذا چوری چکاری بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس مکان میں بھی یہ واحد کمرا تھا جسے قفل لگایا گیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کمرے کے گرد گھوم کر دیکھا۔ ایک کھڑکی دروازے کے قریب ہی موجود تھی لیکن اندر سے بند تھی۔ ہاں بلندی پر ایک روشن دان ادھ کھلا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے نچلے حصے میں پاؤں رکھنے کے لیے جگہ موجود تھی۔ میں اس جگہ کو استعمال کر کے اپنا ہاتھ روشن دان تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھایا اور روشن دان تک پہنچ گیا۔ میرے پاؤں کو چوکھٹ کے بالائی کنارے کا سہارا مل گیا تھا۔ روشن دان سے اندر جھانکا تو گہری تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ تاریکی کے اندر کوئی موجود ہے۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی کمرے میں پھینکی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس "ذی روح" کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا جو یہاں موجود تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ایک چارپائی پر پہلو کے بل لیٹی تھی۔ اس کے پاؤں میں ایک آہنی زنجیر میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ زنجیر کا دوسرا سرا کمرے کی پتھریلی دیوار میں لگے کنڈے سے پیوست تھا۔ لڑکی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ایک پٹی باندھ دی گئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم بازو جس طرح پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے یقینی بات تھی کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ لڑکی کے جسم پر تشدد کے نشانات بھی تھے اس کی چولی اور قمیص دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد شبہے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ پاتامہ کی بیوی کیرولین نے جو بیان دیا وہ بالکل درست تھا۔ سدوت کے گھر میں وہ ماراور لڑکی موجود تھی جو کچھ روز پہلے پاتامہ سے ملنے آئی تھی اور جسے سدوت بہلا پھسلا کر اور یہ کہہ کر کہ وہی پاتامہ ہے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مسز کیرولین کا یہ شبہ بھی درست ہے کہ سدوت اس کے شوہر کا مخلص ساتھی نہیں ہے۔ اگر وہ مخلص ساتھی نہیں تھا تو پھر اس پر ہر قسم کا شک کیا جا سکتا تھا۔ یہ شک بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہی پاتامہ کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ اس نے لڑکی کے سامنے خود کو پاتامہ بتایا تھا۔ کوئی نفسیات داں اس فعل کا تجزیہ کرتا تو یہ نتیجہ نکال سکتا تھا کہ سدوت خود کو پاتامہ کی جگہ سمجھ رہا ہے۔ یا اس کی خواہش ہے کہ وہ پاتامہ کی جگہ لے لے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اچانک ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور سکتے میں رہ گیا۔ نیچے تاریکی میں ایک ہیولا موجود تھا۔ غیرارادی طور پر میری ٹارچ کا رخ اس ہیولے کی طرف ہوگیا۔ سب سے پہلے میری نظر چھوٹے دستے کی ایک خطرناک کلہاڑی پر پڑی۔ پھر وہ دشمن نظر آیا جس نے یہ کلہاڑی تھام رکھی تھی۔ وہ سدوت خود تھا۔ وہ خطرناک تیوروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے اندر فیصلہ کیا اور ایک دم خود کو سدوت پر گرا دیا۔ میری یہ حرکت اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ سدوت بھونچکا رہ گیا۔ اسے تب ہوش آیا جب میں اسے لیتا ہوا پتھریلے فرش پر گرا اور اس کی کلہاڑی کے پھل نے پتھر سے ٹکرا کر چنگاریاں چھوڑیں۔ میری کوشش تھی کہ میں اس کا کلہاڑی والا ہاتھ دبوچ لوں مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور اس کا خمیازہ مجھے فوری طور پر بھگتنا پڑا۔ سدوت نے بڑی تیزی سے سنبھل کر مجھ پر وار کیا۔ کلہاڑی بڑے زور سے میری پیشانی پر لگی لیکن پھل کا رخ پیشانی کی طرف نہیں تھا لہٰذا کھال کٹنے سے محفوظ رہی۔ میری آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے تھے۔ اس سے پیشتر کہ میں اس چوٹ سے سنبھلتا سدوت نے مہارت سے میرے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا اور مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر کلہاڑی والا ہاتھ بلند کیا۔ نشانہ میری گردن تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس مرتبہ بھی پھل کا زاویہ درست نہ ہوتا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور لپک کر اس کا کلہاڑی والا ہاتھ دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طوفانی مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور کلہاڑی اس کی گرفت سے نکال لی۔ میرے دوسرے مکے نے مدمقابل کو ہاتھ پاؤں پھینکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے اندر سے چھرا نکالا اور اس کی شہ رگ پر رکھ دیا "خبردار آواز نکالی تو" میں نے اسے دھمکایا۔ یہ الفاظ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں ادا کیے گئے تھے لہٰذا امید تھی کہ اس کی سمجھ میں آگئے ہوں گے۔

وہ اپنی جگہ ساکت پڑا رہا۔ پنسل ٹارچ جو میرے ہاتھ سے گر گئی تھی اتفاقاً ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سدوت کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا جبڑا ایک جگہ سے نیلا ہوگیا تھا اور باچھ سے خون کی لکیر نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے اسے لمبے بالوں

سے کھینچ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ تیز دھار چھرا بدستور اس کی گردن پر تھا۔ میرے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ اس کی شہ رگ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ سدوت کا ایک ہاتھ اپنے زخمی بازو پر تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ یقیناً اس دھینگا مشتی میں اس کا پرانا زخم رِس گیا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کی تلاشی لی۔ اس تلاشی میں ایک چاقو، اسپرین کی چند ٹکیاں اور چابیوں کا ایک گچھا ملا۔ مجھے توقع تھی کہ ان چابیوں میں سامنے والے بند کمرے کی چابی بھی ہوگی۔ تاہم یہ بند دروازہ کھلوانے سے پہلے میں تھوڑی دیر انتظار کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ دھینگا مشتی کی آوازیں سن کر اہل خانہ میں سے کوئی جاگ گیا ہو اور یہاں پہنچ جائے۔ قریباً دو منٹ انتظار کرنے کے باوجود جب کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو میں نے سدوت کو حکم دیا کہ وہ کمرے کا مقفل دروازہ کھولے۔ سدوت نے تذبذب کا اظہار کیا۔ شاید اگر چابیوں کا گچھا برآمد نہ ہوا ہوتا تو وہ ٹال مٹول کرتا مگر چابیوں کی موجودگی میں اس کے پاس کوئی عذر نہیں تھا۔ ان چابیوں میں سے ایک واضح طور پر اسی کمرے کی تھی۔ چھرے کی قاتل دھار سدوت کی گردن پر تھی اور چھرا جس کے ہاتھ میں تھا اسے بھی سدوت اچھی طرح جانتا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً اس کی دلیری اور بے خوفی کا اعتراف بھی کرتا رہتا تھا۔ اس کے پاس دروازہ کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے پنسل ٹارچ کی روشنی قفل پر مرکوز کی۔ سدوت نے آگے بڑھ کر قفل کھول دیا۔ میں سدوت کو دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ چکی تھی اور ہراساں نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ منطقی طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ اتنی رات گئے اپنے بندی خانے کا دروازہ کھلنے پر اور دو مردوں کو دیکھ کر اندیشوں میں گھر گئی ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی کو بھی بڑی حیرت ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے یہ روشنی اس کے لیے کوئی عجوبہ ہو۔ وہ بیس بائیس سال کی لڑکی تھی اور مقامی نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق شمالی پنجاب سے ہے۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا اور پنسل ٹارچ فرش پر اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی باہر سے دیکھی نہ جا سکے۔ میں پینٹ اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اتار دی۔ اس بیلٹ میں آخر تک سوراخ موجود تھے۔ یہ بیلٹ میں نے پھرتی سے سدوت کے پاؤں کے گرد لپیٹی اور کس دی۔ پھر اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر چارپائی پر گر گیا۔ لڑکی کراہتی ہوئی چارپائی سے اتری اور ایک کونے میں سمٹ گئی۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے گلابی پشتو میں سدوت سے پوچھا۔

"ماراور (قیدی) ہے۔" اس نے بھی میرے جیسی پشتو میں جواب دیا۔

"لیکن یہ تمہاری ماراور نہیں ہے۔ تم اسے دھوکے سے یہاں لائے ہو اور اسے بری نیت سے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو...... اور تم یہ سب کچھ پوچھنے والے ہوتے کون ہو؟"

میں نے کہا "یہ سب کچھ تو بستی کا کوئی فرد بھی تم سے پوچھ سکتا ہے۔ تم نے ایک جرم کیا ہے اور اس لڑکی کی موجودگی سے یہ جرم ثابت ہوتا ہے۔"

میں اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں ورنہ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں ہماری یہ گفتگو بڑی مضحکہ خیز اور گنجلک تھی۔

وقتی جھٹکے کے بعد سدوت اب سنبھل گیا تھا اور بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہونٹ سکوڑ کر کہنے لگا "مجھے لگتا ہے کہ تم کسی کے کہنے پر یہ سب کچھ کر رہے ہو۔ کوئی لالچ وغیرہ دیا گیا ہے تمہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ محترم پاتامہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے سوال کیا۔

"پاتامہ ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ بے پناہ یقین اور مکمل اطمینان سے بولا "پاتامہ اور میں ایک ہی جسم کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ دوسرے کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہے۔"

"جو کچھ نظر آ رہا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ ایک حصہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے اور دوستی کی آڑ میں منافقت کر رہا ہے۔"

وہ بولا "ضروری نہیں ہوتا کہ جو نظر آئے حقیقت بھی وہی ہو۔"

"چلو تم خود ہی بتا دو کہ حقیقت کیا ہے۔"

"پہلے مجھے یہ تو معلوم ہو کہ مجھ پر الزام کیا لگایا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "الزام تمہارے سامنے ہے۔ یہ خستہ حال ماراور لڑکی جو زنجیر سے بندھی پڑی ہے۔ ایک ماہ پہلے اپنے کسی کام سے محترم پاتامہ سے ملنے آئی تھی۔ اتفاقاً اس کی ملاقات تم سے ہوگئی۔ تم نے اسے بتایا کہ تم ہی پاتامہ ہو اور بہلا پھسلا کر یہاں لے آئے۔ یہ بھی سنا گیا کہ تم نے ماراور لڑکی کو اس کے اصل مالک سے خرید لیا ہے لیکن جب تمہارے جگری دوست اور "تمہارے جسم کے دوسرے حصے" نے تم سے یہ پوچھا کہ لڑکی کا کیا معاملہ ہے تو تم صاف مکر گئے کہ کوئی لڑکی تمہارے پاس موجود ہے یا تم نے کسی سے کوئی لڑکی خریدی ہے......"

سدوت نے ایک گہری سانس لی اور گمبھیر آواز میں بولا "اب یہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ تمہیں میری طرف بھیجنے والا کون ہے۔ بہرحال میں اس کا نام نہیں لوں گا۔ وہ جو بھی ہے میرے لیے عزت کے مقام پر ہے اور رہے گا۔" کچھ دیر توقف کرنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا "دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے کوئی وضاحت پیش نہ کروں اور تم سے کہوں کہ جو تمہارے دل میں آئے کر گزرو لیکن میں اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتا کیوں

کہ اس سے میری اور پاسہ کی پریشانیاں بڑھیں گی۔"

اس کے بعد لنگڑی ٹوٹی پشتو میں میرے اور سدوت کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں قیدی لڑکی کی کچھ بند گتھیں کھول دی گئی تھیں۔ کچھ باتیں لڑکی سے بھی ہوئیں۔ اس گفتگو کے نتیجے میں ایک بالکل مختلف صورت حال سامنے آئی۔ میں اس گفتگو کو اپنے الفاظ میں مختصراً بیان کر رہا ہوں۔

"ماراور لڑکی کا نام شکیلہ تھا۔ اس کا تعلق اسلام آباد سے تھا۔ وہ پیشہ ور فوٹو گرافر تھی اور سیر و سیاحت کی زبردست شوقین بھی۔ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے وہ اپنے بھائی اور کزن کے ساتھ ٹریکنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے یہ لوگ فرافرم رینج میں بہت آگے نکل گئے اور کلاشا پر وار قبیلے کے ہتھے چڑھ گئے۔ شکیلہ کا کزن تو بھاگنے کی کوشش میں موقع پر ہلاک ہو گیا جب کہ شکیلہ اور اس کا بھائی عدنان گرفتار ہو کر اس وادی میں پہنچ گئے۔ عدنان کی عمر صرف بیس سال تھی اور وہ شکیلہ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ دونوں بہن بھائی پڑھے لکھے مہذب خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس وادی میں ان کا واسطہ جنگلیوں سے پڑا اور ان کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ چند ہفتے بعد عدنان نے اپنے "آقا" کو شدید زخمی کر کے بھاگنے کی کوشش کی اور پکڑا گیا۔ پاسہ نے اسے سزائے موت سنائی اور نوخیز جوان کو سُرنگ میں واقع خونی تماشا گاہ کے اندر سانڈوں کی نذر کر دیا گیا۔ بدقسمت شکیلہ نے اپنی آنکھوں سے اپنے چھوٹے بھائی کی دردناک موت کا نظارہ دیکھا۔ وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔ شکیلہ کو ماراور کے طور پر جس شخص کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ وادی کی دوسری بستی سکرام میں رہتا تھا۔ اس شخص نے پہلے تو شکیلہ کو بہت سخت نگرانی میں رکھا پھر دھیرے دھیرے اس پر پابندیاں نرم کر دیں۔ اسی دوران میں شکیلہ ایک بچے کی ماں بھی بنی جو چند روز بعد مر گیا۔ شکیلہ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی موت بھولی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کی موت کا حکم جاری کرنے والا پاسہ نامی شخص ہے۔ وہ دل ہی دل میں پاسہ کے خلاف انتقام پال رہی تھی۔ آخر ایک روز وہ اپنی بستی سے نکلی اور دربدر بھٹکتی ہوئی وادی کی عظیم الشان سُرنگ تک آ پہنچی۔

یہاں اس کی ملاقات پاسہ کے بجائے اس کے دوست اور دستِ راست سدوت سے ہو گئی۔ سدوت ایک ذہین اور زیرک شخص تھا۔ ان پڑھ لوگوں کی طرح اس کی یادداشت بھی غضب کی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ یہ وہ ماراور لڑکی ہے جس کے بھائی کو آٹھ دس ماہ پہلے سزائے موت کے عمل سے گزارا گیا تھا۔ لڑکی سے بات کر کے اور اس کے تاثرات دیکھ کر سدوت کو عجیب سا شبہ ہونے لگا۔ اسے لگا جیسے یہ لڑکی پاسہ کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ وہی پاسہ ہے اور اسے بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے شبہات کی تصدیق کے لیے لڑکی سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن زبان کی دشواری آڑے آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ملازم کو کسی مترجم کی تلاش میں بھیجا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ لڑکی کے لباس میں ایک نیزہ دھار خنجر چھپا ہوا ہے اور وہ اچانک اس پر حملہ کر دے گی۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ سدوت گر گیا۔ پہلا وار اس کی ران پر لگا لیکن موٹے لباس کی وجہ سے گہرا زخم نہیں آیا۔ دوسرا وار بازو پر لگا اور وہ پھل آر پار ہو گیا۔ قسمت اچھی تھی کہ لڑکی کی کلائی سدوت کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ تیسرے اور مہلک زخم سے بچ گیا۔ لڑکی جنونی انداز میں چلا رہی تھی اور اسے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ سدوت نے اسے بہ مشکل قابو میں کیا اور گھسیٹ کر مکان کے اندرونی کمروں میں لے گیا۔ یہاں اس نے اپنی بیوی کی مدد سے لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کی چیخ و پکار روکنے کے لیے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔

لڑکی رات بھر کمرے میں محصور رہی۔ صبح سدوت نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ اس وقت سدوت کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ لڑکی نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ صرف ایک ہی بات کہہ رہی تھی "میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ تم نے میرے بھائی کی جان لی ہے (وہ سدوت کو ابھی تک پاسہ ہی سمجھ رہی تھی) لڑکی کی جنونی کیفیت دیکھ کر سدوت کو صاف پتا چل رہا تھا کہ اگر اس لڑکی سے ڈھیل کی گئی تو یہ بڑی خطرناک ثابت ہو گی۔ اس نے لڑکی کو کمرے میں بند رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دو تین دن میں لڑکی کی ذہنی حالت کچھ بہتر ہوئی تو وہ ایک مترجم کے ذریعے اسے سمجھانے بجھانے میں لگ گیا۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ وہ پاسہ نہیں ہے۔ پھر اس نے پاسہ کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس نے لڑکی کو سمجھایا کہ پاسہ وادی کے قانون کا پابند ہے۔ اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو فیصلے کے بزرگوں نے طے کر رکھا ہے۔ اگر لڑکی کے بھائی کی جگہ پاسہ کا اپنا بھائی بھی ہوتا تو اسے یہی حکم صادر کرنا پڑتا۔

شکیلہ نامی یہ لڑکی کسی صورت سدوت کی دلیلیں ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی "اس نے پاسہ کو قتل کرنا ہے۔" ان ہی دنوں پاسہ نے سدوت سے پوچھا تھا کہ "کیا کوئی ماراور لڑکی اس کے پاس موجود ہے۔" سدوت نے اس سوال کا جواب نفی میں دینا مناسب سمجھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاسہ کی گوناگوں پریشانیوں میں اضافہ ہو۔ پہلے ہی کوئی پُراسرار ٹولہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ ایک اور "قاتلہ" بھی اس کی گھات میں ہے تو یقیناً اس کی الجھنیں بڑھ جاتیں۔ ایک اچھے دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے سدوت نے پاسہ کو اس معاملے سے بے خبر رکھا۔"

لڑکی شکیلہ اور سدوت کے مندرجہ بالا بیانات سے تصویر کا ایک نیا رخ سامنے آیا تھا۔ مجھے سدوت کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی سدوت اس وادی کے عام لوگوں

سے مختلف مجھے اچھا شخص لگا تھا۔ جنگلی خواص تو اس میں بھی تھے لیکن انسانیت کی جھلکیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مسز کیرولین کو اپنے شوہر کے دوست کے بارے میں غلط فہمیاں ہیں۔ میں نے سدوت کے پاؤں کی بندش کھول دی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ پہلا کمرا چھوڑنے سے پہلے اس نے لڑکی شکیلہ کی بندشیں دوبارہ کس دی تھیں اور دروازہ مقفل کر دیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "میں اس لڑکی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جلد ہی اس کے دماغ سے پاسہ کے قتل کا خناس نکل جائے گا۔ اگر میں اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا تو اسے آزاد کر دوں گا۔"

"ورنہ؟"

"ورنہ اس کی حیثیت سر و قیدیوں کی سی ہو جائے گی۔ اس کے پاؤں میں ذہنی گولہ باندھ کر رکھا جائے گا اور یہ کسی چار دیواری تک محدود کر دی جائے گی۔" تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد سدوت نے کہا "تم ایک باصلاحیت شخص ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی ایسے فرد کے مشورے پر عمل کرو جو نامناسب سوچ رکھتا ہو۔"

"میرا خیال ہے تمہارا اشارہ مسز کیرولین کی طرف ہے۔"

"دیکھو میں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا..... بہرحال یہ حقیقت ہے کہ پاسہ کی جان کو خطرہ درپیش ہے" اور یہ خطرہ کچھ ایسے لوگوں کی طرف سے ہے جو انتہا درجے کے عیار اور منصوبہ ساز ہیں۔ اگر ہم آپس میں الجھے رہے اور ایک دوسرے سے دشمنی نکالتے رہے تو میرے منہ میں خاک، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اپنا مقصد حاصل کر لیں۔" پھر ایک دم جیسے اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے باہر صحن میں لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ دکھانا چاہتا ہے۔ اس گھر کے اندر ہی کہیں، مگر جب ہم عقبی دروازے سے باہر نکل آئے تو میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ گلی تاریک تھی۔ راستے میں ایک دو جگہ مسلح چوکی داروں سے مڈبھیڑ ہوئی مگر سدوت کو روکنے کی کوشش کون کر سکتا تھا۔ ہم تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک اور تنگ گلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں گھاس پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑا نما مکانات تھے۔ کچھ آگے جا کر سدوت ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا۔ اس جھونپڑا نما مکان کا دروازہ لکڑی کا تھا اور دروازے پر ٹاٹ جھول رہا تھا۔ یہاں چاروں طرف خاموشی تھی۔ سدوت نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم اس آدمی کو پہچان سکتے ہو جس نے پاسہ کی گاڑی کے ٹائر پر لشو چلائے تھے؟"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے کہا "ہاں میں پہچان سکتا ہوں۔" میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس کا ناک نقشہ مجھے یاد ہے۔"

سدوت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے کہ وہ لڑکا اسی گھر میں رہتا ہے..... میں ابھی اسے تمہارے سامنے لاتا ہوں۔"

اس نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ یہی وقت تھا جب بائیں جانب سے ایک برچھا سرسراتا ہوا آیا اور پوری شدت سے سدوت کے ساتھ جا ٹکرایا۔ سدوت الٹ کر پہلو کے بل کندے پوش میں گرا۔ اچانک ایک سایہ مجھ پر بھی جھپٹا۔ کسی سخت شے کی ضرب میری پسلیوں میں لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔ سائے نے پھر مجھ پر جست کی۔ اس دفعہ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا چھرا کھینچ لیا۔ میری نگاہ سدوت پر پڑی۔ وہ کیچڑ میں لت پت اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنا ریوالور نکال رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور کسی کی طرف سیدھا کرتا، ایک شخص نے اس پر کلہاڑی سے وار کیا۔ کلہاڑی کی چوٹ اس کے ہاتھ پر لگی اور ریوالور نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی دھماکے سے گولی چل گئی۔ یہ گولی ریوالور کے نیچے گرنے سے چلی تھی۔ چند لمحوں کے لیے کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ گولی کسی کو لگی ہے یا نہیں۔ قریباً ایک سیکنڈ کے لیے سب اپنی اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میری پسلیوں میں شدید ٹیس اٹھی ہے۔ اس ٹیس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ پسلیوں پر لگنے والی چوٹ یا پھر اسپیڈ بریکر اور ڈوائس والا منحوس درد جاگ اٹھا تھا۔ یا پھر ۳۸ بور کی گولی نے میرے مزاج پوچھ لیے تھے..... کوئی تیسری وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ان ہی لمحات میں میں نے ایک آواز سنی..... یہ تنبدوے کی آواز تھی۔

ہاں یہ تیندوا ہی تھا۔ بلی کے خاندان کا وہ خبیث درندہ جو خوں خواری میں بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ میں تابے کے اس پالتو درندے کی ایک جھلک پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ جھلک میں نے بوڑھے ہنزی کے گھر میں دیکھی تھی۔ پھر جب تابے کو قتل کرنے کے بعد میں اس کے گھر سے نکلا تھا' اس درندے کی لرزہ خیز غراہٹیں میں نے ایک بند کمرے کے اندر سے سنی تھیں اور اب۔۔۔ اب وہ خبیث میرے بالکل قریب موجود تھا۔ میں نے تیزی سے سر گھمایا۔ وہ ایک دیوار کی اوٹ سے نکل کر ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ مدھم چاندنی میں مجھے اس کے خدوخال نظر آئے۔ سفید جلد پر گہرے داغ تھے' اس کی دم تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔ اس کی کمر اونٹ کے کوہان کی طرح اوپر اٹھی ہوئی تھی اور اگلے پنجے پچھلے پنجوں سے جا ملے تھے۔ یہ اعلان تھا اس بات کا کہ وہ جست کرنے والا ہے۔ اور پھر اس نے جست کی۔ کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح وہ ہوا میں اچھلا۔ اس کے حلق سے ایک غضب ناک غراہٹ نکلی اور وہ سدرت پر جا پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک بڑی گیند اچھل کر سدرت کے سینے سے ٹکرائی ہو اور اسے پشت کے بل گرنے پر مجبور کردیا ہو۔ میں نے سنا تھا کہ تیندوا اور چیتا وغیرہ اکثر شہ رگ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آج یہ منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تیندوا سدرت کے سینے پر چڑھ گیا تھا اور اس کا خوں خوار جبڑا سدرت کی گردن سے قریب تر تھا۔ نیم تاریکی کے سبب میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن یہ بات عیاں تھی کہ سدرت کی سلامتی شدید خطرے میں ہے۔ وہ چھرا جو میں نے پنڈلی سے کھینچا تھا ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے سینے کی تکلیف بالکل بھول گیا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور چھرے کا پھل دستے تک تیندوے کے پہلو میں گھسا دیا۔ خطرناک جانور ایک کرب ناک چیخ کے ساتھ میری طرف پلٹا۔ میرے ہاتھ میں اس کی آہنی زنجیر آگئی۔ میں نے اس زنجیر کو کھینچ کر اس کا منہ خود سے الگ کیا۔ اس کی گرم غضیلی سانس میرے چہرے سے ٹکرائی اور اس کے جسم سے اٹھنے والی حیوانی بو میرے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ میں چھرا اس کے پہلو سے نکالنا چاہتا تھا لیکن وہ زخم کھا کر یوں تڑپا کہ چھرے کا دستہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ جوں ہی دستہ میرے ہاتھ سے نکلا وہ کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے حلق سے لرزہ خیز غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں بلی کی غراہٹ سے کوئی دس گنا بھاری تھیں لیکن ان کا آہنگ بلی کی غراہٹوں جیسا ہی تھا۔

سدرت اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شدید طور پر زخمی ہونے سے محفوظ رہا ہے۔ پھر ایک دھماکے کے ساتھ شعلہ نکلا اور مجھے پتا چلا کہ سدرت کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ یہ وہی ریوالور تھا جو چند لمحے پہلے اس کے ہاتھ سے گرا تھا۔ گولی کلماڑی بردار کے پیٹ میں لگی اور وہ پیٹ سے گندے پانی کے گڑھے میں گرا۔ اس کے بعد سدرت نے یکے بعد دیگرے تین فائر مزید کیے۔ یہ تینوں فائر تڑپتے ہوئے تیندوے پر کیے گئے تھے۔ ہم نے دو سایوں کو پلٹ کر بھاگتے دیکھا۔ چند قدم دوڑ کر میں نے ایک کو دبوچ لیا اور اڑنگا لگا کر نیچے گرا دیا۔ چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اردگرد کے جھونپڑوں میں ہلچل پیدا ہو چکی تھی۔ بہت سے لوگ باہر نکل آئے تھے اور خوف زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ سدرت نے چلا کر کچھ کہا۔ تماشائیوں میں سے چار پانچ افراد آگے بڑھے اور انہوں نے میرے نیچے دبے ہوئے کلماڑی بردار کو اچھی طرح جکڑ لیا۔ وہ سب لوگ آپس میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے' میں نے تیندوے کو دیکھا' وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ میرا چھرا اس کی پسلیوں میں پھنسا پڑا تھا' میں نے زور لگا کر چھرا کھینچ لیا۔ جس شخص کو گولی لگی تھی وہ شدید زخمی تھا اور اوندھے منہ پڑا تھا۔ اچانک میری نگاہ چند گز دور ایک ہیولے پر پڑی۔ وہ لنگڑاتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا۔ میں چونک سا گیا۔ اس لنگڑاتے ہیولے کو میں نے ایک دو دفعہ پہلے بھی اپنے آس پاس دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کون تھا وہ۔ سدرت کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اسی جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا تھا جس پر دستک دینے کے لیے ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں نے دیکھا' وہ کسی عورت سے جھگڑ رہا تھا۔ میں اسی کے پاس چلا گیا۔ عورت کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ بار بار نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ میں نے قیافہ لگایا کہ یہ عورت اس لڑکے کی ماں ہے جس سے ملنے کے لیے ہم یہاں آئے ہیں (سدرت کا خیال تھا کہ اسی لڑکے نے پاناسہ کی گھوڑا گاڑی کے نٹ بولٹ ڈھیلے کیے تھے اور نتیجے میں گاڑی ایک خونی حادثے کا شکار ہوئی تھی) عورت رو دینے کے قریب تھی۔ میں نے سدرت سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

وہ بولا "لڑکا یہاں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے ان لوگوں نے اسے بھگا دیا ہے۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے' اسے بھگانے والے بھی وہی لوگ ہوں جنہوں نے ہم پر حملہ کیا ہے۔"

"اس بات کا پتا بھی ابھی چل جاتا ہے۔" سدرت نے جواب دیا۔

سدرت کا زخمی بازو دھینگا مشتی کے بعد پھر سے خون اگلنے لگا تھا' اس کی گردن پر خونی خراشیں نظر آ رہی تھیں' یقیناً یہ تیندوے کے پنجوں کے نشانات تھے۔ سدرت نے عورت کی طرف سے رخ پھیرا اور لپکتا ہوا اس شخص کے سر پر پہنچ گیا جسے میں نے فرار ہونے سے روکا تھا۔ وہ اب چار پانچ افراد کی گرفت میں مچل رہا تھا۔ لمبے بالوں اور موٹی ناک والا وہ ایک بدبودار شخص تھا۔ اس کے کانوں میں پڑی ایک بالی کی وجہ سے اس کا کان چر گیا تھا اور

خون رس رہا تھا۔ سدرت کے حکم پر اس شخص کی مشکیں کس دی گئیں اور ایک چھکڑے پر لاد دیا گیا۔ تیندوے کی خون میں آلود لاش بھی اس کے ساتھ ہی چھکڑے پر پھینک دی گئی۔ خطرناک جانور جسے بطور خاص شکار کے لیے سدھایا گیا تھا' آج خود شکار ہو چکا تھا۔ جھونپڑے سے برآمد ہونے والی ادھیڑ عمر عورت کو بھی زبردستی چھکڑے پر بٹھایا گیا اور چھکڑا یخ بستہ رات کی تاریکی میں سدرت کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

○☆○

سدرت کے گھر نے عملی طور پر ایک پولیس اسٹیشن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ موقع سے گرفتار ہونے والے بدبودار شخص کی خوب ٹھکائی کی گئی اور اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ یہ پوچھ گچھ مقامی زبان میں ہو رہی تھی۔ سدرت گلابی پشتو میں مجھے ساتھ ساتھ بتا جا رہا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ پکڑے جانے والے شخص کا نام واہر خاں تھا۔ وہ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والے تابے کا ساتھی تھا۔ وہ کسی طور پر یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے کسی منصوبے کے تحت ہم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ وہ غلط فہمی کیا تھی۔ اس بارے میں ابھی اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔

جوں جوں تفتیش لمبی ہو رہی تھی' میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک خدشہ بار بار میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا۔ تابے اتفاقی طور پر میرے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور تجلہ موہی میں اس نے میرے ہاتھوں اپنی گردن چھڑانے کے لیے ایک دم زور مارا تھا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ تابے کے ساتھی اس قتل کا کھوج لگا چکے ہوں اور انہوں نے تابے کے انتقام میں مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی ہو۔ مگر جب گہرائی میں جا کر غور کیا تو یہ خدشہ غلط محسوس ہوا۔ فرض محال اگر کسی طرح ان لوگوں نے تابے کے قتل کا سراغ لگا بھی لیا تو انہیں اپنے سردار پاناسہ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا' نہ کہ مجھ پر حملہ آور ہونا چاہیے تھا۔ وہ مقامی قانون کے ذریعے مجھے عبرت ناک سزا دلوا سکتے تھے تو پھر قانون ہاتھ میں لینے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔ بے شک پاناسہ آج کل مجھ پر مہربان تھا لیکن وہ اپنے سالے کے قاتل کو کبھی معاف نہ کرتا۔

میں نے سدرت سے پوچھا "لڑکے کے بارے میں یہ شخص کیا کہتا ہے؟"

سدرت نے جواب دیا "اس لڑکے کا نام خانوں ہے۔ واہر خاں اسے جانتا ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ ماننے کو تیار نہیں۔"

"اور لڑکے کی ماں کیا کہہ رہی ہے؟"

"وہ کہتی ہے کہ لڑکا کل صبح گھر سے نکلا تھا' ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔"

"کیا وہ پہلے بھی یوں گھر سے باہر رہتا تھا؟"

"دراصل وہ کچھ آوارہ مزاج ہے۔ اس کا باپ لوہے کے اوزار یعنی 'کلماڑیاں' چاقو اور شکار کے پھندے وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا۔ وادی میں اس کا خوب نام تھا۔ باپ کی موت کے بعد اب بیٹا یہ کام کرتا ہے۔ مگر وہ نہ تو باپ کی طرح کاریگر ہے اور نہ اس کی طرح بھلا مانس۔ اسے جوئے کی لت بھی ہے۔ اس لت میں اکثر رات گھر سے باہر گزار دیتا ہے۔"

"یعنی ہو سکتا ہے کہ وہ کل رات واقعی گھر سے باہر ہو!"

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال میں نے اپنے آدمی اس کی تلاش میں بھیجے ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آ کر سب کچھ بتا دیں گے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ سدرت کا ایک کارندہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ وہ بستی کے قمار خانے سے آیا تھا۔ اس نے سدرت کو بتایا کہ خانوں نامی وہ لڑکا کل رات قمار خانے میں نہیں گیا۔ وہ تین دن پہلے وہاں گیا تھا اور شام کے فوراً بعد واپس آ گیا تھا۔

میں نے پوچھا "یہ قمار خانہ کہاں واقع ہے؟"

وہ بولا "بڑی سرنگ کے اندر۔۔۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ بڑی سرنگ کے اندر ایک حصہ ایسا ہے جہاں رات کو روشنی کرنے کی اجازت ہے۔ وہاں ایک قمار خانہ' دو شراب خانے اور۔۔۔ تین تماشاگاہیں ہیں۔"

لڑکے کی ماں مسلسل رو رہی تھی۔ سدرت ایک بار پھر اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ یقیناً یہی جاننا چاہ رہا تھا کہ اس کا لڑکا قمار خانے میں نہیں گیا تو پھر کہاں گیا ہے۔ وہ بار بار اپنا سر نفی میں ہلا رہی تھی اور لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ چالیس پینتالیس سال کی خستہ حال عورت تھی۔ پیشانی پر تین سفید لکیریں اس کی بیوگی کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے سدرت سے کہا کہ وہ عورت کی جان چھوڑ دے اور گرفتار شدہ شخص سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' اس بے انتہا بدبودار شخص کا نام واہر خاں تھا۔ وہ سنگلاخ فرش پر چت لیٹا تھا۔ اس کی دونوں کلائیوں اور دونوں ٹخنوں سے رسیاں باندھی گئی تھیں اور ان رسیوں کو مختلف اطراف میں کس دیا گیا تھا۔ واہر خاں کے ہاتھ پاؤں چاروں طرف کھنچ گئے تھے۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا لیکن اس کی برہنگی کو کوئی بھی شدت سے محسوس نہیں کر رہا تھا۔

سدرت نے ایک بار پھر واہر خاں سے سوال جواب شروع کیے۔ اس پوچھ گچھ کے دوران میں مار پیٹ کا مرحلہ بھی آیا۔ چیڑ کی ایک موٹی شاخ سے واہر خاں کے پیٹ اور ٹانگوں پر بے دریغ ضربیں لگائی گئیں۔ چند منٹ کی چیخ و پکار کے بعد واہر خاں نے زبان کھول دی۔ اس نے مقامی لب و لہجے میں اٹک اٹک کر اور کراہتے ہوئے جو کچھ سدرت کو بتایا اس کا تعلق براہ راست ہماری

تفتیش سے نہیں تھا۔ یہ ایک دوسرا سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔ واہر خان کے بقول وہ اور اس کے دونوں ساتھی محض ایک غلط فہمی کے سبب سدرت پر حملہ آور ہوئے۔ واہر خان کا کہنا تھا کہ انہوں نے کسی اور کے لیے گھات لگا رکھی تھی۔ اس گھات کا تعلق تابے کے قتل سے تھا۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں حسنِ اتفاق سے تابے کے قتل کا الزام مہابت نامی ایک شخص پر لگ رہا تھا۔ مہابت سے تابے کی پرانی دشمنی تھی۔ وادی میں یہ بات سب جانتے تھے کہ تابے نے مہابت کی سہاگ رات کو اس پر حملہ کیا تھا اور اس کی بیوی کو جان سے مار ڈالا تھا۔ اب تابے کی سہاگ رات تھی اور وہ خود قتل ہو گیا تھا۔ منطقی طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ قتل مہابت نے کرایا ہے۔ بقول واہر خان وہ اور اس کے دونوں ساتھی مہابت ہی کی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ مہابت اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ اس بستی میں پہنچے گا۔ سدرت اور مہابت کا قد کاٹھ اور حلیہ بھی ایک جیسا تھا لہٰذا تاریکی کے سبب وہ لوگ دھوکا کھا گئے اور ہم پر حملہ آور ہو گئے۔

مجھے واہر خان کے اس بیان میں صداقت نظر آ رہی تھی پھر بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ ہم ان لوگوں پر شک کریں۔ ان کا رویہ ایسا نہیں تھا کہ یکسر نظرانداز کر دیا جاتا۔ انہوں نے مجھے اور سدرت کو جان سے مارنے کی کوشش کی تھی، ہم پر خطرناک درندہ چھوڑا تھا اور یہ سب کچھ ایسے وقت پر کیا گیا تھا جب ہم اس واردات کے ایک اہم کردار خانوں نامی لڑکے پر ہاتھ ڈالنے والے تھے۔ اب وہ لڑکا مل رہا تھا اور نہ اس کا کھوج۔

دوپہر کے وقت مجھے پامہ کی رہائش گاہ سے بلاوا آ گیا۔ پامہ تو وادی میں موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے بلانے والی اس کی بیوی کیرولین تھی۔ اسے بلانا چاہیے بھی تھا۔ میں رات بھر غائب رہا تھا اور اسے کوئی رپورٹ نہیں دی تھی۔ میں سدرت سے اجازت لے کر پامہ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ یہ قیام گاہ مرگنگ کے سب سے ہوادار اور محفوظ حصے میں واقع تھی۔ اس قیام گاہ کو مقامی زبان میں "تخت" کہا جاتا تھا۔ تخت کئی راہداریوں اور دس پندرہ کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ سب کمرے بھرے بھرے چترو‌ں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ جوں ہی میں "تخت" پہنچا، زرین گل سے ملاقات ہو گئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا "آپ کہاں چلا گیا تھا ام کو بتائے بغیر؟" وہ جھگڑالو بیوی کی طرح بولا۔

"بس ایک کام تھا۔"

"لیکن ام کو بتا کر تو جانا۔ پریشانی کی وجہ سے امارے حلق... سے تو لقمہ نہیں اتر رہا تھا۔"

"چلو۔ یہ تو ثابت ہوا کہ تم نے کھانا کھایا ہے۔"

"کھانے سے زیادہ غم کھایا ہے۔" وہ ترخ کر بولا "آپ کو کسی کا کوئی فکر نہیں ہوتا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یار! بات یہ تھی کہ تم بڑی گہری نیند سو رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے تم کوئی بڑا زبردست خواب دیکھ رہے ہو۔ آخر تمہاری نئی نئی محبت شروع ہوئی ہے تمہاری۔ نئی نئی محبت کے خواب بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔"

وہ بولا "شاید آپ کلثوم کا بات کر رہا ہے۔ ام کو انکار نہیں ہے استاد صیب کہ وہ لڑکی امارا بیڑا غرق فرما چکا ہے۔ مگر آپ کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ ساری دنیا کا لڑکیاں ایک طرف اور آپ ایک طرف۔ آپ امارے لئے زیادہ اہم ہے۔"

"اچھا مسکہ مت لگاؤ۔"

"ام مسکہ نہیں لگا رہا استاد صیب۔ یہ سچ ہے کہ ام آپ سے عشق کرتا ہے۔ آپ سے بچھڑ کر امارا وہی حال ہو جاتا ہے جو آدم سے بچھڑ کر فلسنار فردوس کا ہوا تھا اور نغمے سے بچھڑ کر اُلّن کا ہوا تھا۔"

"ماشاءاللہ پتا نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ لیتے ہو تم؟"

"آپ مذاق کرتا ہے لیکن ام سچ مچ فکرمند تھا... ایک امارا فکرمندی اوپر سے وہ فرنگی عورت۔ معلوم نہیں اس کو کو سانس لینے نہیں دیتا۔ بار بار یہاں آ رہا تھا اور آپ کا پوچھ رہا تھا۔ آخر اس کو بیماری کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی مر گیا ہے اس کا۔"

"مرا تو نہیں لیکن اندیشہ ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس کے شوہر کی جان شدید خطرے میں ہے۔ کچھ لوگ اس کو قتل کرنا چاہ رہے ہیں۔ وہ چار پانچ بار بال بال بچا ہے۔ کسی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"لیکن وہ کوئی چھوٹی موٹی لڑکی تو نہیں۔ اچھا بھلا گرانڈیل شخص ہے۔ کچا گوشت کھاتا ہے اور جنگلوں سے بڑھ کر جنگلی۔ ایسے بندے کو موت سے تو نہیں ڈرنا چاہیے۔"

"یہ بڑی باریک بات ہے زرین گل۔" میں نے اسے سمجھایا "بندہ کتنا بھی دلیر اور نڈر ہو لیکن وہ موت جو ہر گھڑی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹکتی رہتی ہے اور نظر نہیں آتی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے والا اپنے سائے سے بدکنے لگتا ہے۔ کچھ یہی حال پامہ کا بھی ہو رہا ہے۔"

زرین گل کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گہری سوچ میں غرق تھیں وہ ہونٹ سکوڑ کر بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ پامہ صاحب کی گاڑی کو پیش آنے والا حادثہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہو۔"

"ایک سو دس فیصد۔" میں نے جواب دیا۔

اسی دوران میں جواں سال کیرولین پردہ اٹھا کر اندر آئی۔ اسے دیکھ کر زرین گل خاموشی سے باہر نکل گیا۔ کیرولین کی نیلی آنکھوں میں شب بیداری کے آثار تھے۔ پورا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آتا تھا۔ کیرولین کے ساتھ اس کی بچی بھی تھی۔ وہی خوب صورت

بچی جو حادثے کے بعد گاڑی سے نکالنے کے لیے مجھے اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑی تھی۔ بچی کے ایک ہاتھ اور سر پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بہرحال وہ تندرست اور خوش و خرم تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں غزالہ کے بچپن کی جھلک تھی۔ نجانے کیوں کچھ لوگ کسی نہ کسی بہانے سے انسان کو یاد آتے رہتے ہیں۔ کسی ہنسی کے ناتے، کسی موسم کے وسیلے، کسی منظر کے حوالے سے، دور ہونے کے باوجود لوگ ہمارے بہت قریب رہتے ہیں۔ ہماری آتی جاتی سانسوں میں سفر کرتے ہیں۔ اس گمنام اور انجان وادی میں جہاں ماضی کا کوئی حوالہ میرے ساتھ نہیں تھا، یہ گڑیا سی لڑکی میرے دل میں غزالہ کی یادیں ابھار رہی تھی۔ بچی کو دیکھ کر میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی پیشانی چومی۔ اس کی ماں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے اس کی جان بچائی ہے۔ لڑکی نے توتلی زبان میں "تھینک یو" کہا۔

کیرولین گہری سانس لے کر بولی "یہ کیا ہو رہا ہے مسٹر شاہ جہاں۔ ساری وادی میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ سدرت نے تابے کے ایک ساتھی کو شدید زخمی کر دیا ہے اور اس کے پالتو تیندوے کو مار ڈالا ہے۔"

"یہ بالکل درست ہے مسز پامہ، میں سدرت کے ساتھ ہی تھا بلکہ میں نے بھی اس لڑائی میں حصہ لیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" وہ بولی۔

میں نے تفصیل سے ساری روداد کیرولین کو سنائی اور یہ بھی بتایا کہ اپنے شوہر کے دوست پر اس کا شک درست معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے کہا "مسز پامہ! آپ کی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ سدرت کے گھر میں لڑکی موجود ہے اور یہ وہی مادار لڑکی ہے جس کے بارے میں آپ کو ذاتی ملازمہ نے بتایا تھا۔ لیکن سدرت کے بقول وہ لڑکی محترم پامہ کی جان کی دشمن ہو رہی تھی لہٰذا وہ اسے اپنے گھر لے گیا تاکہ اس کے ارادوں سے محترم پامہ کو محفوظ رکھ سکے۔"

"یہ سب ڈھونگ ہے۔" کیرولین غرائی۔

میں نے کہا "میں خود اس لڑکی سے ملا ہوں مادام۔ وہ ڈیڑھ سال پہلے نبدی ہو کر اس وادی میں آئی تھی۔ اس کے سگے بھائی کو محترم پامہ کے حکم سے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ وہ بھائی کے غم میں پاگل ہو رہی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ سدرت ٹھیک ہی کہہ رہا ہو اور وہ لڑکی آپ کے شوہر کی جان کی دشمن ہو۔"

"اگر ایسا ہوتا تو سدرت ہم سے بات کرتا۔ لڑکی کو اپنے گھر میں چھپا کر نہ رکھتا۔ کم از کم میرے شوہر کو تو بتاتا۔"

"مادام! وہ کہتا ہے کہ اس نے سوچ سمجھ کر یہ بات چھپائی ہے۔ محترم پامہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ وہ اس نئی مصیبت سے آگاہ کر کے ان کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔"

"میں یہ دلیل ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔" کیرولین نے کہا "میرا ایمان ہے کہ یہ شخص میرے شوہر سے مخلص نہیں۔"

میں نے کہا "خدانخواستہ میں سدرت کی طرف داری نہیں کر رہا۔ اس مرحلے میں ہم کسی کو بھی گناہ گار یا بے گناہ نہیں ٹھہرا سکتے۔ لیکن شک کرنے کے لیے بھی کوئی وجہ درکار ہوتی ہے۔ آپ نے "لڑکی والی" وجہ بتائی تھی، میں نے اس کی تصدیق کرنا چاہی لیکن تصدیق نہیں ہوئی۔ اب کوئی اور وجہ آپ کے ذہن میں ہو تو بتائیں۔"

"بظاہر سدرت تمہیں کیسا نظر آتا ہے؟" کیرولین نے پوچھا۔

"وہ آپ کے شوہر کا دوست ہے، یقیناً آپ کے شوہر کا انتخاب بلاوجہ نہیں ہوگا۔ بظاہر تو مجھے وہ معقول شخص نظر آیا ہے۔"

"یہ تمہاری نامعقولیت ہے۔" کیرولین نے کہا "یہ بہت گہرا شخص ہے، تمہیں ابھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ اس نے تمہیں لڑکے کے بارے میں بھی چکمہ دیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"یہ ممکن ہے کہ خانوں نامی اس مشکوک لڑکے کو سدرت نے خود ہی غائب کروا دیا ہو۔"

"اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لڑکے کے بارے میں ہمیں بتایا بھی تو اسی نے ہے۔"

"سب کچھ ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لڑکے کے بارے میں کسی طرح ہمیں خود ہی معلوم ہونے والا ہو۔ سدرت نے سوچا ہو کہ کیوں نہ یہ کام اس کے ذریعے سے ہو تاکہ وہ معتبر ٹھہرے۔ پھر ایک بات اور بھی سوچنے کی ہے۔ اس لڑکے کے بارے میں سدرت کو معلوم کیسے ہوا۔"

"یہ تو ایسی انوکھی بات نہیں۔" میں نے جواب دیا "آپ کے شوہر سدرت کے دوست ہیں۔ سدرت کا کہنا ہے کہ وہ اپنے طور پر ان لوگوں کا کھوج لگا رہا ہے جو آپ کے شوہر کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ گھوڑا گاڑی والے حادثے کے بعد جب یہ بات مشہور ہوئی کہ گاڑی میں سازش کے تحت نقص ڈالا گیا ہے اور ایسا کرنے والا ایک لڑکا تھا تو سدرت نے کچھ ایسے جواں سال لڑکوں کی فہرست بنائی جو اس وادی میں ٹیکنیکل کام کر سکتے ہیں۔ یہ کل پانچ لڑکے تھے۔ ان میں سے خانوں نامی وہ لڑکا جس کی طرف ہم کل رات گئے تھے، کچھ آوارہ مزاج ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہ رہا ہے۔ سدرت کو اس پر شک ہو گیا۔"

کیرولین اپنی بات پر اڑی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے شوہر کے دوست سے خدا واسطے کا بیر رکھتی ہے اور گھوم پھر کر اس کے شک کی سوئی شوہر کے دوست پر ہی اٹک جاتی ہے۔ نجانے ایسا

کیوں تھا۔ میں اس کی نیت پر ہرگز شک نہیں کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ شوہر کی جان کو درپیش خطرے کی وجہ سے وہ خبطی سی ہو رہی ہے۔ میں اس کی بحث سے تھک آ چکا تھا۔ وہ ذرا خاموش ہوئی تو میں نے کہا "مجھے ایک بات بتائیں مادام ۔۔۔ سدورت کے علاوہ بھی آپ کو کسی پر شک ہے؟"

اس نے بولنے کے لیے جلدی سے منہ کھولا۔ شاید یہی کہنے جا رہی تھی کہ سدورت کے علاوہ اسے کسی پر شک نہیں لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ غالباً کوئی بات اس کے ذہن میں آئی تھی اور وہ اس پر غور کرنا چاہتی تھی۔ اس کی پیشانی پر الجھن کی سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ شاید سدورت کے علاوہ اور کسی مشکوک کے بارے میں غور کرتے ہوئے اسے دلی کوفت ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "شاید آپ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں؟"

وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی "سدورت کے علاوہ اگر میں کسی پر شک کر سکتی ہوں تو وہ کوکی دادا ہے۔ یہاں کے لوگ اسے صرف دادا کہتے ہیں۔ دادا اس وادی کا سب سے شہ زور شخص ہے۔ چند سال پہلے وہ پہاڑ سے گر گیا تھا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج ہو چکا ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ شخص بھی میرے شوہر سے گہرا عناد رکھتا ہے۔ لیکن اس عناد کا سبب بھی بالواسطہ کی منحوس سدورت ہے۔ اسی سدورت کا ایک چھوٹا بھائی ہے جس کی وجہ سے دادا کو میرے شوہر سے عداوت پیدا ہوئی تھی۔ کاش میرے شوہر کو سدورت کا منحوس ساتھ نصیب نہ ہوا ہوتا۔"

کیرولین کی سوئی گھوم پھر کر دوبارہ سدورت پر آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا "سدورت کے بھائی کا دادا سے کیا تعلق ہے؟"

وہ بولی "سدورت کے چھوٹے بھائی کا نام آمن ہے۔ آمن، دادا کی جواں سال لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ ان کے معاشقے نے وادی میں بڑی دھوم مچائی تھی۔ یہ آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے کی بات ہے۔ کوکی دادا نے آمن کو قتل کروانے کی کوشش کی تھی۔ میرے شوہر کوکی دادا کے آڑے آ گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ لڑکا اور لڑکی بالغ ہیں۔ وادی کا قانون انہیں اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کریں۔ اسی بات پر کوکی دادا میرے شوہر کا بھی دشمن ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے شوہر نے فیصلہ صرف اس لیے دیا ہے کہ آمن ان کے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔ بات اگر یہاں تک ہی رہتی تو شاید معاملہ نہ بگڑتا لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی۔ میرے شوہر کے حکم پر آمن اور کوکی دادا کی بیٹی سابینہ کو ملاقات کی اجازت مل گئی تھی۔ ان ملاقاتوں کے دوران میں وہ جذبات کی رو میں بہہ گئے اور ان سے غلطی ہو گئی۔ اس غلطی کا علم آمن اور سابینہ کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ سابینہ کے حاملہ ہونے کے بعد آمن نے وہی کیا جو اس جیسے بدکردار اور بزدل مرد کرتے ہیں۔ وہ وادی سے فرار ہو گیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد دادا کی بیٹی سابینہ نے ایک بچے کو جنم دیا۔ کوکی دادا اپنی بیٹی اور نواسے دونوں کو مار دینا چاہتا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ بچ گئے۔ اب وہ بستی کے ایک معزز شخص کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ یہ دادا کی جو بے عزتی ہوئی ہے وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں آتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کوکی ہی میرے شوہر کی جان کا دشمن ہو گیا ہو۔"

میں نے کوکی دادا نامی اس شخص کے بارے میں کیرولین کچھ مزید سوال کیے۔ آخر میں میں نے کہا "مادام! اب بات [illegible] ہو گئی ہے۔ آپ کے نزدیک دو افراد مشکوک ہو گئے ہیں۔ سدورت اور دادا۔ اگر آپ کو شک کرنے کے لیے سو نمبر دیے جائیں تو ان نمبروں کو سدورت اور دادا میں کیسے تقسیم کریں گی؟"

وہ فوراً بولی "سدورت نوے نمبر، دادا دس نمبر۔"

میں نے کہا "اور اگر مشکوک بندوں کی اس فہرست میں آنجہانی قابے کو بھی شامل کیا جائے تو؟"

"قابے اور اس کے ساتھیوں کے لیے میرے پاس کوئی نمبر نہیں۔" کیرولین نے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ وہ اس سلسلے سے لاتعلق ہیں۔"

"لیکن آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اس کے کارندوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں کہ وہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔" کیرولین کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے مادام! میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ اگر آپ کے نزدیک سدورت اور دادا ہی زیادہ مشکوک ہیں تو میں اپنی توجہ ان ہی پر مرکوز کرتا ہوں۔ لیکن پوچھ گچھ کرنے کے لیے میرے پاس کوئی اتھارٹی بھی تو ہونی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر میں کسی سے پوچھ گچھ کرنا چاہوں گا تو وہ بآسانی میرے ساتھ تعاون کرے گا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک مترجم بھی درکار ہے۔"

کیرولین نے کہا "تمہارے یہ دونوں مسئلے ابھی حل ہو جاتے ہیں۔"

وہ کمرے سے باہر گئی اور تھوڑی دیر بعد چمڑے کی ایک دو انگل چوڑی پٹی لے آئی۔ اس پٹی کی لمبائی سترہ اٹھارہ انچ کے لگ بھگ تھی۔ کیرولین نے یہ پٹی امام ضامن کی طرح میرے دائیں بازو پر باندھ دی اور بولی "اسے سنبھال کر رکھنا۔ اس کی موجودگی میں تمہاری حیثیت پاپامہ کے خاص کارندے کی ہو گی۔ تم جس شخص سے چاہے بازپرس کر سکو گے اور اسے پکڑ کر پاپامہ کے روبرو لا سکو گے۔"

کیرولین نے اس پٹی کے اختیارات کے بارے میں مجھے مزید باتیں بتائیں اور پھر صدو خاں نامی ایک نوجوان کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔ کہنے لگی "یہ ہے تمہارا مترجم۔ یہ مقامی زبان سمجھتا ہے اور اردو کے علاوہ پشتو میں بھی اس کا ترجمہ کر سکتا ہے۔" صدو [illegible] نوجوان تھا۔ اس کی چھاتی چوڑی تھی۔ پورے جسم پر نہایت گھنے بال

تھے جن کی وجہ سے وہ بھرپور کشش کا مالک نظر آتا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے ایک بھلا مانس اور ہنس مکھ شخص لگا۔ صدو خاں سے میرا تعارف کرا کے کیرولین اپنی بچی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ صدو خاں بھی تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ میں رات بھر کا جاگا تھا اور تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا۔ سینے پر لگنے والی چوٹ بھی تکلیف دے رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

○☆○

اگلے روز میں دیر تک بستر پر لیٹا رہا اور خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ اپنے الجھاؤ کو کم کرنے کے لیے میں نے خیالات کو مرتب دینا شروع کیا۔ اب تک کی تفتیش کا نتیجہ یہ تھا کہ میرے سامنے تین مشکوک افراد تھے۔ نمبر ایک قابے، نمبر دو سدورت، نمبر تین کوکی دادا ۔۔۔ قابے مر چکا تھا لیکن یہ امکان موجود تھا کہ اس کے ساتھی اس کے مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں۔ قابے کے ساتھیوں پر میرا شک زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ بہرحال میں انہیں نظرانداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے نمبر پر سدورت تھا۔ سدورت بظاہر مجھے اچھا شخص لگا تھا اور اس نے لڑکی کے سلسلے میں خود پر لگائے جانے والے الزام کو غلط بھی ثابت کر دیا تھا۔ مگر اتنی جلدی میں اسے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ تیسرے نمبر پر کوکی دادا تھا۔ وہ ایک تند مزاج شخص سمجھا جاتا تھا اور پاپامہ سے اس کی دشمنی بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ زریں گل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھے پکارتا ہوا تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے اپنا کندھا میرے سامنے جھکایا اور بولا "استاد صیب! ام کو شاباشی دیو۔"

"لیکن کس بات کی؟"

"شاباشی تو دیو، پھر ام آپ کو بتاتا ہے۔" میں نے اس کے جھکے ہوئے کندھے پر تھپکی دی۔ وہ بولا "شاعر کہتا ہے کہ عشق نے انسان کو نکما بنا دیا لیکن ام سمجھتا ہے کہ عشق انسان کو نکما نہیں بناتا بلکہ اس کے اندر نئی طاقت اور امنگ ترنگ پیدا کرتا ہے۔ اب اپنا مثال لیں، چند دن پہلے تک ام کتنا ہڈحرام تھا۔ اب امارے اندر ایک دم کرنٹ آ گیا ہے، بڑا پاور کا کرنٹ۔"

"کیا کوئی اطلاع دینی تھی تم نے؟"

"نہیں یہ تو ام نے تمہید باندھا ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ ام ابھی جاترو (عبادت گاہ) سے آیا ہے۔ آج منگل وار ہے اور منگل کے دن جاترو میں صبح سویرے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں اور لڑکیوں کا رقص ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا عبادت ہے۔ ارے خدایا! کیا بتائے ام آپ کو کتنا خطرناک عبادت کرتا ہے یہ لوگ۔ سائنز کے بت کے سامنے یہ لڑکیاں اندھا دھند ناچتا ہے۔ ناچنے والیوں کے کندھوں پر ایک بہت باریک جالی دار کپڑا ہوتا ہے اور وہ بھی بہت اوپر سے بہت نیچے تک لگا ہوتا ہے۔ وہ اپنے جسم کو ایسا توڑتا موڑتا ہے جیسے بھڑنے کاٹ کھایا ہو۔ اگر یہ عبادت ہے تو پھر تو یہاں کا کوئی بندہ بھی عبادت سے جی نہیں چراتا ہوگا۔ پورا کا پورا بستی جنت کا ٹکٹ کٹائے گا۔ خو فلم ہنڈرڈ والنفلز میں وائکل دبنج کا مجرا دیکھا تھا آپ نے؟"

"میں نے نہیں دیکھا۔"

"پھر ام آپ کو کیا بتائے کہ کتنا چٹ پٹا رقص تھا وہ۔۔۔۔ بہرحال آپ یہ مت سمجھیں کہ ام وہاں رقص دیکھنے گیا تھا۔ سچا بات یہ ہے کہ جب سے کلثوم امارے دل میں سمایا ہے خوب صورت سے خوب صورت لڑکی بھی ام کو اچھا نہیں لگتا۔ شاید اب ہیما مالنی اور آشا پاریکھ بھی امارے سامنے آ جائے تو ام ان کو گھاس نہ ڈالے۔ ام تو وہاں اس امید پر گیا تھا کہ شاید صدو صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ صدو صاحب تو نہیں ملا۔ بس ام ادھر ادھر گھومتا رہا اور لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ آپ جانتا ہی ہے کہ مقامی زبان شنا میں کہیں کہیں پشتو زبان کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ ام غور کرے تو کوئی کوئی بات امارا سمجھ میں آ جاتا ہے۔ ام جاترو کے احاطے سے گزر رہا تھا۔ وہیں پر ایک جگہ سات آٹھ لوگ مجمع لگائے بیٹھا تھا۔ ان میں لمبے دانتوں اور سرخ آنکھوں والا ایک بھدا سا شخص بھی تھا۔ بالکل کسی جانور کے ماتی نظر آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بستی کے اکلوتے قمار خانے کا مالک ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی حالاتِ حاضرہ پر بحث فرما رہا تھا۔ اس بحث میں خانوں نام کے اس چھوکرے کا ذکر بھی آیا جس پر پاپامہ کی گاڑی خراب کرنے کا الزام ہے۔ قمار خانے کے مالک نے بتایا کہ اس لڑکے کا ماں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پرسوں رات وہ لڑکا واقعی اپنے گھر میں نہیں تھا۔ قمار خانے کے مالک نے اس سے کچھ رقم لینی تھی۔ اس نے رات گئے اپنا نوکر خانوں کے گھر بھیجا تھا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ وہ ابھی گھر نہیں آیا۔"

زریں گل کی اطلاع اہم تھی۔ اس اطلاع سے میرے ذاتی خیالات کی تصدیق ہوتی تھی یعنی اس رات خانوں واقعی اپنے جھونپڑے میں نہیں تھا۔ پھر اگر وہ اپنے جھونپڑے میں نہیں تھا تو یہ شبہ کرنا بے کار تھا کہ قابے کے ساتھیوں نے اس لیے ہم پر حملہ کیا کہ وہ خانوں کو فرار کرانا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں قابے کے ساتھیوں کا یہ بیان درست تھا کہ انہوں نے غلط فہمی کے سبب ہم پر ہلہ بولا۔

زریں گل کی انگلی میں ایک چمک دار چھلا دیکھ کر میں چونک گیا۔ "یہ کہاں سے لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بری طرح گڑبڑا گیا، پھر سنبھل کر بولا "خوچے! ٹھیک ٹھیک بات یہ ہے کہ یہ ام کو کلثوم نے دیا تھا۔"

"لیکن رات تک تو یہ تمہارے ہاتھ میں نہیں تھا۔"

زریں گل کا چہرہ اتر گیا۔ دھیمے لہجے میں بولا "خوا ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے دیا ہے۔ وہ عبادت گاہ میں ام سے ملا تھا۔"

میں نے کہا "تو زریں گل یہاں کر اس سے ملنے وہاں گئے تھے۔ اگر سارا پروگرام پہلے سے بنا ہوا تھا تو منصور کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو۔"

وہ پہلے تو خجل ہوا پھر ایک دم مسکرانے لگا "صاب آپ سے کیا چھپانا ہے۔۔۔۔ سچی بات تو یہی ہے جو آپ نے کہا ہے۔ امارا حال تو اس گانے جیسا ہو گیا ہے 'امارے خیالوں پہ چھائی ہے اک صورت متوالی سی' نازک سی شرمیلی سی معصوم سی بھولی بھالی سی۔۔۔۔ ام سچ کہتا ہے استاد صیب! اس مرتبہ دل کا زخم بڑا کاری ہے۔ ام بچ نہیں سکے گا۔ اگر ام فوت ہو جائے تو امارا مقبرہ اسی بستی میں کلثوم کے گھر کے سامنے بنوا دینا اور لوگوں سے کہہ دینا کہ۔۔۔۔"

"وہ آتے جاتے یہاں جوتے مارے۔" میں نے فقرہ مکمل کیا۔

زریں گل نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن موڈ چوں کہ خوشگوار تھا لہٰذا غصہ نہیں رکھا یا منہ میں نسوار رکھتے ہوئے بولا "استاد صیب آپ مذاق اڑا رہا ہے لیکن ام کو اس محبت کا انجام بڑا دردناک نظر آ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو ام کو کلثوم پر ترس آنے لگتا ہے۔ ام کو معلوم ہے کہ ایک دن ام کو یہاں سے جانا پڑے گا اور کلثوم اماری جدائی میں زار و قطار روئے گا۔ امارے کانوں میں قلم اسمان کا وہ گیت گونج رہا ہے۔ 'اکیلے نہ جانا ام کو چھوڑ کر تم' آپ نے دیکھا ہوگا اس گیت میں کتنا بے چارگی تھا زیبا کے چہرے پر۔ شاید وہی بے چارگی کلثوم کے چہرے پر بھی نظر آئے۔"

میں نے کہا "زیبا تو خاصا لنگڑی ہو گئی تھی، تمہاری محبوبہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اس کی جگہ ام جو لنگڑا ہو گیا ہے۔" زریں گل نے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کا ٹخنہ تازہ تازہ چھلا ہوا تھا (یہ بات زریں گل نے دو تین دن بعد بتائی کہ عبادت گاہ میں عشق پیچا کرتے ہوئے کسی محافظ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ نتیجے میں محافظ کے ساتھ زریں گل کی مارا ماری ہو گئی تھی اور ٹخنہ مڑ گیا تھا) زریں گل کراہتا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

زریں گل کو لنگڑاتے دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔ کچھ دن پہلے بھی میں نے اسی طرح ایک شخص کو لنگڑاتے دیکھا تھا۔ وہ میری نگاہوں کے سامنے لپک کر ایک دیوار کی اوٹ میں اوجھل ہوا تھا۔ اور ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ اس وادی میں آنے کے بعد میں نے دو تین مرتبہ اس لنگڑے شخص کی جھلک دیکھی تھی جو میرے آس پاس موجود تھا۔ میرا ذہن خود بخود کوکی دادا کی طرف جانے لگا۔ کل مسز کیرولین نے مجھ سے کوکی دادا کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔ اس نے یہ بات بھی بتائی تھی کہ کوکی دادا پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے اور وہ لنگڑا کر چلتا ہے۔ میرے ذہن میں ہلچل سی ہونے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ لنگڑا جو تین چار دفعہ میرے آس پاس نظر آیا تھا کوکی دادا ہو۔ ذہن میں یہ خیال آنے کے بعد زیادہ ضروری محسوس ہونے لگا کہ میں جلد از جلد کوکی دادا سے ملوں۔

اس دوپہر میں نے اپنے مترجم صدر خاں کو ساتھ لیا اور کوکی دادا کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ اس کے گھر کو ڈیرا ہی کہنا چاہیے۔ کوکی دادا وادی کے خوش حال لوگوں میں سے ایک تھا۔ تقریباً دو سو بھیڑیں اور بکریاں اس کی ملکیت تھیں۔ اس کے علاوہ اپنے کارندوں کے ذریعے وادی کے طول و عرض میں شہد بھی سپلائی کرواتا تھا۔ کوکی دادا سے ملاقات ایک سجے سجائے کمرے میں ہوئی۔ یہاں منقش طاقوں میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں موجود تھیں۔ ان میں اکثر مورتیاں لکڑی سے تیار کی گئی تھیں۔ ان میں سب سے بڑی مورتی اس بپھرے ہوئے سانڈ کی تھی جو ان لوگوں کا مہادیو تھا۔ کوکی دادا پچاس کے پیٹے میں تھا۔ اس کے لمبے بالوں میں قیمتی پتھر گندھے ہوئے تھے اور اس نے ایک طویل اونی چغہ پہن رکھا تھا۔ میرے مترجم نے کوکی دادا کو بتایا کہ میں محترم پایامہ کی طرف سے اس بات کا کھوج لگا رہا ہوں کہ پچھلے ہفتے محترم پایامہ کی گاڑی کو حادثہ کیوں کر پیش آیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے اسپیشل ڈیوٹی سونپی گئی ہے اور مختلف لوگوں سے بیانات لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ مترجم نے میرے فرائض کو نرم ترین الفاظ میں بیان کیا تھا اس کے باوجود کوکی دادا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اگر اس نے میرے بازو پر سرکاری چی پی نہ دیکھی ہوتی تو شاید ہم پر جھپٹ ہی پڑتا۔ اس نے اپنے اندرونی غضب کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا اور مجھ سے سوال کیا کہ میں اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ بات مترجم نے اردو کے قالب میں ڈھال کر مجھ تک پہنچائی۔ میں نے کہا "محترم دادا! میں آپ سے پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں صرف آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ یہاں وادی میں آپ کی بہت شہرت سنی تھی۔"

کوکی دادا کا تنا ہوا چہرہ ذرا نرم پڑ گیا۔ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور بولا "پھر کیسا پایا مجھ کو؟"

"جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر۔" میں نے کہا "آپ اس وادی میں ایک شان دار آدمی ہیں۔"

"لیکن تمہارے پایامہ کی رائے بہت مختلف ہوگی۔" کوکی دادا نے زہرخند سے کہا "وہ مجھے ایک ظالم، خود سر اور باغی شخص قرار دیتا ہے۔ حالاں کہ اس وادی پر میرے احسانات لاتعداد ہیں۔ جب کبھی قحط پڑتا ہے، بیماری پھیلتی ہے یا کوئی اور آفت آتی ہے تو کوکی دادا خود پر رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر لیتا ہے لیکن ان سارے احسانات کے بدلے اس وادی نے کیا دیا مجھ کو؟ بے عزتی، حقارت اور تنہائی۔ آہ، میرا سب کچھ چھین لیا ان لوگوں نے۔۔۔ سب کچھ۔"

کوکی دادا ایک دم بے حد آزردہ نظر آنے لگا۔ اس نے خبطیوں کے سے انداز میں میرا بازو پکڑا اپنی بغل کے نیچے بھینچ لی اور مجھے کھینچتا ہوا ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ مترجم صدر

بھی میرے ساتھ تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں مجھے بچوں کے استعمال کی بہت سی اشیا نظر آئیں۔ رنگ دار لباس، کپڑے کے جوتے، چاندی اور قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے زیورات، سوتی کپڑے جن پر خوب صورت کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ کوکی دادا بولا "جانتے ہو یہ سب چیزیں کس کی ہیں۔ یہ میری لاڈلی بچی کی ہیں۔ اس کا نام ساچینہ ہے۔ ساچینہ جو مجھے اپنی جان سے ہزار گنا پیاری تھی۔ اس وادی نے میری بیٹی کو مجھ سے چھین لیا۔ یہ دنیا میرے لیے بے کار کر دی۔ بتاؤ کیا روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی ظلم ہو سکتا ہے 'ایک ایسا شخص جس کا اس دنیا میں ایک بیٹی کے سوا اور کوئی نہ ہو اس نے اپنی جان پر ہزاروں مصیبتیں جھیل کر اس ننھی بچی کو پالا پوسا ہو، اسے بڑا کیا ہو، وہ بچی اس کے لیے دنیا کی سب سے پیاری چیز ہو، اور بچی کے لیے بھی باپ دنیا کی سب سے پیاری چیز ہو پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے۔ بتاؤ کیا اس ظلم سے بڑا کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔"

کوکی دادا بہت جذباتی نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں نے نرمی سے کہا "کوکی دادا! جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا، مجھے اس پر بہت افسوس ہے، حالاں کہ مجھے تفصیل معلوم نہیں کہ یہ سانحہ کیوں کر رونما ہوا۔"

میری بات مترجم نے کوکی دادا تک پہنچائی۔ کوکی دادا بولا "مجھ سے مت پوچھو۔۔۔ مجھ سے مت پوچھو کہ یہ کیوں کر ہوا۔ میں تو جھوٹا ہوں، مکار ہوں، میری کسی بات پر اعتبار مت کرو۔ اگر کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو جاؤ اس پہاڑی کے پار چلے جاؤ۔ وہاں پایامہ اور اس کے کاہنوں کی ڈسی ہوئی ایک لڑکی رہتی ہے۔ صبح و شام گھر کے دروازے پر کھڑی ہو کر کسی کا انتظار کرتی ہے، کسی کی راہ دیکھتی ہے۔ اگر وہ انتظار کی آگ میں جل کر اب تک مر نہیں گئی تو اس سے پوچھنا کہ اس کی زندگی برباد کرنے والے کون ہیں اور انہوں نے کیسے برباد کیا اسے۔ جاؤ پوچھو اس سے۔"

مترجم نے مجھے بتایا کہ کوکی دادا اپنی بیٹی کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ وادی کی دوسری بستی میں رہتی ہے۔

کوکی دادا لنگڑاتا ہوا کمرے کے ایک گوشے میں گیا۔ اس نے ایک جستی ٹرنک کھولا۔ ٹرنک میں بے شمار چھوٹے بڑے فراک اور کپڑے تھے۔ ان میں چھ ماہ سے لے کر سولہ سترہ سال کی عمر تک کے بچوں کے کپڑے تھے۔ انہیں بڑی احتیاط سے تہ در تہ رکھا گیا تھا۔ وہاں چاندی کی چھوٹی چھوٹی پازیبیں تھیں۔ چوڑیاں تھیں۔ سونے کے جھمکے تھے۔ کوکی دادا نے کہا "یہ سب چیزیں بھی میری بچی کی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھو اور محسوس کرو کہ وہ کیسے پورا پورا بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔۔۔ کیسی کیسی یادوں کے تیر چھوڑ گئی ہے وہ اپنے بدنصیب باپ کے سینے میں۔" کوکی دادا کی حالت قابل رحم تھی۔ میں یہاں اس سے پوچھ گچھ کے لیے آیا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ کسی سانحے پر اس سے افسوس کرنے آیا ہوں۔۔۔ بہرحال ایک چیز نے مجھے چونکا دیا۔ کوکی دادا کی گردن کے سامنے والے حصے پر مجھے زخم کا نشان نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دو روز پہلے کسی کے ساتھ کوکی دادا کی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوکی دادا اپنے حواس میں آ گیا۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور ٹھہری ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا "مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے جوان! تم یہاں اجنبی ہو اور وہی کر رہے ہو جو تمہارا آقا تم سے کہہ رہا ہے۔ میری طرف سے جا کر پایامہ سے کہہ دو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ میری اور اس کی دشمنی کھلی کتاب کی طرح ہے۔ اگر کبھی میں نے اس پر وار کیا تو للکار کر کروں گا۔"

پھر کوکی دادا ہمیں زبردستی اپنے گھر کی نشست گاہ میں لے آیا۔ یہ ایک مستطیل کمرہ تھا۔ فرش پر بھیڑ کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمارے سامنے بکری کے دودھ سے بھرے ہوئے پیالے رکھے گئے اور ان میں شہد ملایا گیا۔ سخت سردی میں یہ ایک توانائی بخش مشروب ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کوکی دادا سے اجازت چاہی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ مکان سے باہر نکلنے کے لیے ہم ایک راہداری سے گزرے۔ اس راہداری کے دونوں اطراف چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک کمرے کی بناوٹ جیل کی کوٹھری جیسی تھی۔ کوٹھری ہی کی طرح اس میں آہنی سلاخوں والا دروازہ بھی لگا تھا۔ اس دروازے کے اندر کا منظر دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ اس کے جسم پر ایک لنگر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے چہرے، سر، سینے، غرض ہر جگہ سے بال صاف کر دیے گئے تھے۔ نوجوان کے ہاتھ ایک زنجیر سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی گردن میں ایک طوق تھا۔ جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ ننگے فرش پر گھٹنوں کے بل جھکا تھا اور ایک پیالے سے کوئی مشروب پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو چوپائے اختیار کرتے ہیں۔ میں جوان کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ شکل و صورت سے فلپائنی یا ویت نامی لگتا تھا۔ میں نے اپنے مترجم صدر خان سے اردو میں پوچھا "یہ کون ہے؟"

وہ بولا "چند ہفتے پہلے کچھ فلپائنی پکڑے گئے تھے۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ کوکی دادا نے اسے خریدا ہے۔"

"کس سے؟"

"جازرو (عبادت گاہ) کے بڑے جاز (پجاری) خاندان سے۔ یہ شخص پہلے جازرو میں بیگار کرتا تھا۔ کوکی دادا کو کسی ایسے ماوار (قیدی) کی ضرورت تھی جس کے جسم پر کسی چوٹ یا زخم وغیرہ کا داغ نہ ہو۔ پندرہ بیس ماواروں میں سے اس شخص کا انتخاب ہوا تھا۔"

"کوکی دادا کو ایسے شخص کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ تو مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔" صدر خان نے مبہم جواب دیا۔ شاید وہ کچھ چھپا رہا تھا۔

"اس کا نام جانتے ہو تم؟"

"نام تو مجھے معلوم نہیں۔ اگر آپ کہتے ہیں تو دادا سے پوچھ کر بتا دیتا ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔" میں نے کہا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ یہی شخص جون چاؤل ہے۔ میں نے ایک بار پھر اسے دھیان سے دیکھا۔ وہ کسرتی جسم کا مالک خوش شکل نوجوان تھا۔ مگر منڈا چٹ بالوں اور تنگ دھڑنگ جسم کے ساتھ عجیب نظر آ رہا تھا۔ ہاں یہی وہ شخص تھا جس کے لیے ہم سیکڑوں میل طے کر کے حیدر آباد دکن سے مدراس اور پھر مدراس سے گلگت پہنچے تھے اور اب کئی ہفتے سے اس گمنام وادی میں سر ٹکرا رہے تھے۔ یہی وہ شخص تھا جو دفینے کے نئے ٹھکانے سے آگاہ تھا اور جس کے پاس وہ نوادرات موجود تھے جو عظیم الشان دفینے کا حصہ تھے۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ یوں ایک دم گوہرِ مقصود میرے سامنے آ جائے گا۔ میں نے کوشش کی کہ میرے دلی جذبات میرے چہرے سے ظاہر نہ ہونے پائیں۔ میں کوکی دادا کے ساتھ چلتا ہوا مکان سے باہر آ گیا۔

بے شمار سوالات ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کوکی دادا جون چاؤل کو خرید کر اپنے گھر کیوں لایا ہے اور اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔ اس قبیلے کے رسم و رواج عجیب تھے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے طرزِ عمل کا اندازہ پیشگی لگا سکوں۔ میری نگاہوں میں جنگ ہن کی صورت گھوم گئی۔ وہ جون چاؤل سے پیار کرتی تھی اور ہر وقت اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ وہ اس بات سے بے حد پریشان تھی کہ جون چاؤل عبادت گاہ میں نظر نہیں آ رہا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کا ساتھی کوچا، اس کا دوست، اس کا محبوب جون چاؤل پابہ زنجیر ہے۔ اس کے گلے میں طوق ہے اور وہ کسی کتے کی طرح کھانے پینے پر مجبور ہے۔

جب ہم کوکی دادا سے رخصت ہو چکے تو صدر خاں نے پوچھا "اب آپ کا کیا پروگرام ہے۔ بی بی سا بینہ کی طرف جانا چاہیں گے آپ؟"

"کیا وہ ہم سے ملنے پر آمادہ ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

صدر خاں نے میرے بازو سے بندھی ہوئی پٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "اس مرشد پٹی کی موجودگی میں کوئی آپ سے ملنے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں اس کی طرف۔" میں نے کہا۔

سکرام تک کا فاصلہ ہم نے گھوڑا گاڑی پر طے کیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی دشوار مسافت کے بعد بستی میں پہنچے اور چند گلیوں سے گزر کر ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے ٹھہر گئے۔ سبزے اور خوب صورت مناظر نے اس گھروندے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ رہنے اور شاعری کرنے کے لیے یہ بڑی آئیڈیل جگہ تھی لیکن اتفاق سے یہاں شاعر کی بجائے ایک واعظ رہتا تھا۔ لمبی سفید داڑھی اور بھرے بھرے چہرے والا ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ وہ بستی کی جامع میں مذہبی گیت گاتا تھا اور تقریر وغیرہ کرتا تھا۔ کوکی دادا کی بیٹی سا بینہ اسی واعظ اور اس کی بیوی کے ساتھ مقیم تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس شخص کا نام لوہان تھا اور وہ کوکی دادا کا دوست بھی تھا۔ وادی میں پردے کا رواج نہیں تھا لہٰذا سا بینہ نے ہم سے ملنے کے لیے بالکل پس و پیش نہیں کیا۔ وہ معصوم چہرے اور نکھری رنگت والی اٹھارہ بیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کی گود میں ایک ہمکتا ہوا چار پانچ ماہ کا بچہ تھا۔ جیسا کہ کیرولین نے مجھے بتایا تھا یہ بچہ سا بینہ کے محبوب کی نشانی تھی۔ وہ محبوب جو اسے چھوڑ کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سا بینہ نے اپنی پیشانی پر دو سفید دھاریاں بنا رکھی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خود کو شادی شدہ سمجھتی ہے۔ مترجم صدر خاں نے سا بینہ سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں پانامہ کو پیش آنے والے اس خونی واقعے کی تحقیق کر رہا ہوں جس میں ایک گاڑی بان کی جان ضائع ہو چکی ہے۔

سا بینہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں قانون کی عمل داری موجود ہے اور لوگ قانون کے شکنجے میں کسے جانے سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ میں نے لڑکی کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا "خدانخواستہ تم پر کوئی شک نہیں کیا جا رہا۔ میں صرف اپنی معلومات میں اضافے کے لیے تم سے ملنے آیا ہوں۔ اگر تم مجھ سے بات کرنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں واپس چلا جاتا ہوں۔"

لڑکی کی گھبراہٹ قدرے کم ہوئی۔ اس نے مترجم کی وساطت سے کہا کہ وہ میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار ہے کیوں کہ محترم پانامہ بطور سردار اس کے لیے اتنے ہی اہم ہیں جتنے بستی کے دوسرے لوگوں کے لیے ہو سکتے ہیں۔ میں نے لڑکی سے پوچھا "کیا وہ بتائے گی کہ وہ اپنے باپ کے گھر سے کیوں نکلی اور اس کی گود میں یہ بچہ کس کا ہے؟"

مجھے توقع تھی کہ لڑکی اس سوال کا جواب بے باکی سے دے گی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس وادی میں جاہلیت کا دور دورہ ہونے کے باوجود عورتوں کو بعض آزادیاں حاصل تھیں۔ وہ اپنے شریکِ زندگی کا انتخاب اپنی مرضی سے کرتی تھیں اور اس بارے میں بے جھجک بات کرتی تھیں۔ بعض دوسرے قبائل کی طرح اس قبیلے میں بھی لڑکی اغوا کرنے کا رواج موجود تھا۔ لڑکی لڑکے میں محبت ہو جاتی تھی اور ان کے بڑے ان کے راستے میں ناجائز طور پر رکاوٹ ڈالتے تھے تو لڑکے کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو اغوا کر کے لے جائے۔ اس کے بعد لڑکا اپنے سسر سے معافی مانگ لیتا تھا اور عام طور پر سسر اسے معاف بھی کر دیتا تھا۔ بعض اوقات اس معافی کے لیے کچھ ہرجانہ وغیرہ بھی لیا جاتا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق سا بینہ نے بلا جھجک مجھے بتایا کہ وہ آمن نام کے لڑکے سے پیار کرتی تھی اور جو بچہ اس کی گود میں ہے وہ اس کی نشانی ہے۔

"کیا آمن سے تمہارا بیاہ ہوا تھا؟"

ایک لمحے کے لیے اس کی گردن جھک گئی اور چہرے پر شرم کا رنگ لہرایا۔ "نہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں پوچھا۔

"بس حالات ایسے ہو گئے تھے۔" وہ منمنائی۔

میں نے اس سے حالات کی تفصیل پوچھنا چاہی۔ وہ پہلے تو کچھ کترائی رہی پھر دھیرے دھیرے مطلب کی بات کرنے لگی۔ اس گفتگو میں میرے اور مترجم کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ سا بینہ نے رک رک کر اور سوچ سوچ کر مترجم کی وساطت سے جو کچھ مجھے بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

سا بینہ صرف تین ماہ کی تھی جب اس کی ماں مر گئی۔ اس کے باپ کوکی دادا نے اسے ماں اور باپ بن کر پالا۔ وہ اس سے اتنا پیار کرتا تھا کہ اس پیار کا احاطہ لفظوں میں کرنا ممکن نہیں۔ سا بینہ بھی باپ کے بغیر ایک پل نہیں گزار سکتی تھی۔ باپ بیٹی کی یہ محبت مثالی تھی۔ لوگ یہ سوچ کر حیران ہوتے تھے کہ اگر خدانخواستہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو کچھ ہو گیا تو کیا دوسرا زندہ رہ سکے گا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ اٹھارہ برس بیت گئے اور پھر خوب رو سا بینہ کی زندگی میں وہی موڑ آیا جو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ وہ کسی سے پیار کرنے لگی اور کوئی اس سے پیار کرنے لگا۔ یہ بستی کا ایک نوجوان آمن تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ایک دوسرے سے ملے اور پھر ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دیوتاؤں نے انہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔ ایک موقع پر سا بینہ کے باپ نے آمن اور سا بینہ کو اکٹھے دیکھ لیا۔ اس نے آمن کو برا بھلا کہا اور سا بینہ کو گھر لے آیا۔ کوکی دادا اپنے خاندان کو آمن کے خاندان سے اعلیٰ و افضل سمجھتا تھا۔ اسے یہ کسی طور گوارا نہیں تھا کہ سا بینہ ایک ناپسندیدہ گھرانے کے فرد سے میل جول رکھے۔

سا بینہ نے اپنے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن صورتِ حال تبدیل نہیں ہو سکی۔ یہیں سے سا بینہ کی ذات دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف وہ اپنے باپ سے بے مثال محبت کرتی تھی۔ دوسری طرف آمن اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کو چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان دو انتہائی شدید محبتوں میں پس کر رہ گئی تھی۔ آمن کی طرف نظر دوڑاتی تھی تو جان سے پیارا باپ آزردہ ہو جاتا تھا اور باپ کی خوشنودی کا خیال رکھتی تھی تو محبوب روٹھ جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اکثر یہی ہوتا ہے کہ لڑکی چند دن نئی منزلوں کی طرف سفر کرتی ہے۔ ماں باپ یا بہن بھائی کا پیار مدھم پڑ جاتا ہے اور عشق کی لو تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دو کشتیوں کو چھوڑ کر ایک کشتی میں دونوں پاؤں رکھ لیتی ہے۔ لیکن سا بینہ کا معاملہ مختلف تھا۔ آمن پر جان نچھاور کرنے کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے باپ سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے آمن سے بے رخی اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمن اس سے ناراض ہو گیا۔ وہ گھر میں بند ہو کر رہ گیا اور کئی ماہ تک اس نے سا بینہ کو اپنی صورت نہیں دکھائی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ سا بینہ یہ جدائی برداشت نہیں کر پائے گی اور اسے منانے آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری طرف کوکی دادا بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے بیٹی کے لیے دو تین بہترین رشتے دیکھے تھے اور اسے یقین تھا کہ اس کے ایک اشارے پر ان میں سے کوئی رشتہ بھی اسے مل سکتا ہے۔ انہی حالات میں کچھ لوگوں نے آمن اور سا بینہ کا معاملہ وادی کے حاکمِ اعلیٰ پانامہ کے سامنے پیش کیا۔ پانامہ نے وادی کے قانون کے مطابق فیصلہ دیا اور لڑکی لڑکے کو اجازت دی کہ ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اور اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔

بقول سا بینہ اس واقعے کے بعد آمن سے صرف دو مرتبہ اس کی ملاقات ہوئی۔ ایک مرتبہ راہ چلتے ان میں ایک دو باتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ جب کوکی دادا وادی سے باہر گیا ہوا تھا تو آمن اس سے ملنے گھر آ گیا۔ اس ملاقات میں سا بینہ نے آمن کو باور کرایا وہ اپنے باپ کی منشا اور خوشی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی اور بے شک پانامہ نے فیصلہ دیا ہے لیکن اس کے لیے وہی فیصلہ زیادہ اہم ہے جو اس کا محترم باپ کرے گا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایک شام سا بینہ کی ایک سہیلی نے سا بینہ کو اطلاع دی کہ آمن نے زہر کھا لیا ہے اور لوگ اسے نیم مردہ حالت میں شفا خانے لے کر گئے ہیں۔ یہ اطلاع سا بینہ پر بجلی بن کر گری۔ وہ مدد کرنے والوں سے آمن کے جیون کی بھیک مانگتی رہی۔ بڑی مشکل سے آمن کی جان بچائی گئی لیکن وہ نیم پاگل تھا۔ ہوش میں آتے ہی چلاتا تھا کہ وہ مرنا چاہتا ہے۔ سا بینہ کے ذہن پر اندیشوں کی یلغار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اگر حالات جوں کے توں رہے تو آمن اپنی جان لے لے گا۔ جو شخص اپنی جان لینے کا فیصلہ کر چکا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت زندہ نہیں رکھ سکتی اور یہ سا بینہ کے دل کی گواہی تھی کہ آمن اپنی جان لینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے یوں لگا کہ آمن مر گیا تو وہ بھی مر جائے گی۔ بیٹھے بیٹھے اس کا دل سینے میں پھٹ جائے گا اور روح جسم سے پرواز کر جائے گی۔

ایک دن اپنی سہیلی کے ہاتھ اس نے آمن کو پیغام بھیجا کہ وہ رات کو اس سے ملنے آئے گی۔ وہ اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھے۔ اس رات محبت کی ماری سا بینہ یخ بستہ تاریکی کا سینہ چیر کر آمن سے ملنے پہنچ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھ کر آنسو بہائے اور ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو گئے۔ دل کے زخموں سے خون رسنے لگا اور فراق راتوں کے دکھ ہونٹوں پر جاری ہو گئے۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ ایک دوسرے میں

گم ہو گئے اور ایک ٹھنڈی آگ کے دریا میں بہتے چلے گئے۔

وہ عملی طور پر میاں بیوی بن چکے تھے۔ وہ محبت کی اس ستم ظریفی پر حیران تو تھے لیکن پشیمان نہیں تھے۔ ان کی نیتوں میں کھوٹ نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کو دل و جان سے اپنانا چاہتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اس واقعے کے بعد بھی دو تین دفعہ ملے۔ پھر ایک روز آمن خاموشی کے ساتھ وادی چھوڑ گیا۔ جاتے جاتے وہ ساپینہ کی سہیلی کو ساپینہ کے لیے پیغام دے گیا تھا۔ آمن نے کہا تھا "ساپینہ! اپنے آمن پر بھروسا رکھنا۔ وہ تمہیں دھوکہ دینے سے ہزار درجے بہتر سمجھتا ہے کہ اپنی جان لے لے۔ میں جا رہا ہوں لیکن بہت جلد واپس آؤں گا۔ واپس آتے ہی میں پوری شان اور عزت سے تمہیں بیاہ کر اپنے گھر لاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ جب سرما بیت جائیں اور چشموں میں پانی بہنے لگے اور درختوں پر پتے آجائیں تو میرا انتظار شروع کر دینا۔"

اور ساپینہ انتظار کر رہی تھی۔ بہار آکر پھر چلی گئی تھی' خزاں جا کر پھر آگئی تھی لیکن آمن کا کوئی پتا نہیں تھا۔ تقریباً آٹھ نو ماہ پہلے بستی والوں کو علم ہوگیا تو یہ بات ساپینہ کے باپ سے کیسے چھپی رہتی۔ ساپینہ کے باپ نے ساپینہ کو بری طرح مارا پیٹا تھا اور پھر بے کسی کر کے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ اس کے لیے مرچکی ہے۔ اب وہ کہیں بھی رہے' کچھ بھی کرے کوکی دادا کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔

ساپینہ کو کوکی دادا کا قریبی دوست لوبان اپنے گھر لے گیا تھا' یہاں چار پانچ ماہ بعد ساپینہ نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا۔ اب وہ بچے کو گود میں لے کر ہر صبح آمن کا انتظار کرتی تھی اور ہر شام مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب جاتی تھی۔

ساپینہ کی کہانی انوکھی تو نہیں تھی لیکن اس میں کئی باتیں چونکا دینے والی تھیں جن میں سے اہم ساپینہ اور کوکی دادا کی محبت تھی۔ باپ اور بیٹی کی یہ محبت غیر معمولی تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے لیے تڑپتے تھے اور ان کی تڑپن میں ایک ذرا سی بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ ایک ایسی لڑکی کی روداد تھی جو دو محبتوں میں یوں تقسیم تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی تھی۔ ساپینہ کے دونوں ہاتھوں کی پشت پر چھوٹے چھوٹے کئی زخم نظر آرہے تھے۔ میں نے مترجم کے ذریعے اس سے پوچھا کہ یہ زخم کیسے ہیں۔ ساپینہ نے مختصر جواب دیا۔ اس جواب کو مترجم صدر خان نے وضاحت سے بیان کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک مقامی رسم ہے۔ لڑکیاں اپنے باپ بھائیوں کی خوش حالی اور سلامتی کے لیے "روشن" دیوتا کے سامنے اپنے لہو کی بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ کسی اناج کا آٹا گوندھا جاتا ہے پھر اپنے ہاتھ کی پشت پر چھوٹا سا زخم لگا کر خون کے قطرے اس آٹے میں گرائے جاتے ہیں۔ یہ لہو ملا آٹا مٹی کے ایک پیالے پر لیپ کر دیا جاتا ہے۔ آٹا سوکھ

جانے پر یہ پیالہ ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لڑکیاں یہ رسم کبھی کبھار کرتی ہیں مگر ساپینہ اپنے باپ کے لیے دوسرے تیسرے روز اپنے ہاتھ کی پشت پر زخم لگاتی ہے۔"

میں نے ساپینہ سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ آمن کہاں گیا ہے اور ابھی تک آیا کیوں نہیں۔"

وہ گلوگیر لہجے میں بولی "صاحب جی' وہ ضرور آئے گا۔ اسے آنا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہاری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ تم اس کی قریب ترین ہستی ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں گیا ہے۔"

وہ بولی "اس وادی سے نکل کر آباد علاقے میں جانے کا تو ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ہم لوگوں کا پختہ عقیدہ ہے کہ دیوتاؤں نے یہ وادی ہمیں انعام میں بخشی ہے اور اسے ہمارے لیے محفوظ ترین ٹھکانہ بنایا ہے۔ اگر ہم اس انعام کو ٹھکرائیں گے تو دیوتاؤں کے غضب کو آواز دیں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب کوئی مقامی شخص یہاں سے بھاگ کر کسی دوسری بستی میں آباد ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ چند دن کے اندر مر جاتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آمن اسی علاقے میں کہیں ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ آمن وادی کے راعد (ڈاکٹر) ہری کا شاگرد ہے۔ جڑی بوٹیوں کی اسے بھی ڈاکٹر ہری کی طرح بہت پہچان ہے۔ ہمارے علاقے میں کالی چاندنی نام کی ایک بوٹی پائی جاتی ہے۔ بہت نایاب اور قیمتی بوٹی ہے۔ اس سے ایک تیز نشہ آور مشروب تیار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بوٹی اس مسالے کا بھی لازمی جزو ہے جو ہم گوشت وغیرہ گلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آگ نہیں جلائی جاتی لہٰذا اناج اور گوشت کو کھانے کے قابل بنانے کے لیے ہم یہ مسالا استعمال کرتے ہیں۔ کالی چاندنی نامی یہ بوٹی بہت مشکل سے ہاتھ لگتی ہے' یہی وجہ ہے کہ آمن اور اس جیسے دوسرے لوگ اس بوٹی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ آمن اپنی مالی حالت بہتر بنانا چاہتا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ہی وادی سے نکلا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن راچنہ! کوکی دادا تو کہتا ہے کہ آمن تمہاری عزت خراب کرنے کے بعد وادی چھوڑ گیا ہے اور اب کبھی نہیں لوٹے گا۔"

وہ روتے ہوئے بولی "یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی۔"

میں نے پوچھا "پاناسہ کے بارے میں تمہارے والد کے خیالات کیا ہیں؟"

وہ دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگی "میرے بابا محترم پاناسہ سے ناراضی ضرور رکھتے ہیں لیکن یہ ناراضی ایسی نہیں کہ وہ ان کی جان کے دشمن بن جائیں اور ایک بات میں آپ کو اور بتادوں'

میرے بابا چھپ کر وار کرنے والے نہیں۔ ایسا بزدل کرتے ہیں اور میرے بابا اس وادی کے سب سے بہادر انسان ہیں۔" اس کی آنکھوں میں اپنے بابا کے لیے محبت اور عقیدت کے جذبات تھے۔ میں نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ بولتی چلی گئی "آپ کو محترم پاناسہ کی جان کے دشمن کا کھوج لگانا ہے تو کہیں اور لگائیں۔ میرے بابا کو پریشان کر کے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آپ اس لڑکے کو کیوں نہیں ڈھونڈتے جسے آپ نے خود گھوڑا گاڑی کے نیچے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ لڑکا سامنے آجائے تو ہر بھید پر سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کی تلاش بھی ہو رہی ہے۔"

وہ بولی "اس کی ماں کو پکڑیں۔ وہ آپ کو سب کچھ بتا سکتی ہے۔"

"وہ ہماری تحویل میں ہے۔" میں نے کہا۔

ہم کچھ دیر ساپینہ کے پاس مزید رکے اور پھر بستی سکرام سے واپس لوٹ آئے۔ گھوڑا گاڑی نے ہمیں آدھ پون گھنٹے میں باجورت واپس پہنچا دیا۔ باجورت وادی کی اس دوسری بستی کا نام تھا جہاں عظیم الشان سرنگ واقع تھی اور پاناسہ کے علاوہ وادی کے دیگر معززین رہتے تھے۔ ایک طرح سے یہ بستی اس چھوٹی سی وادی کا چھوٹا سا دارالحکومت تھی۔

ہم سیدھے وادی کے بندی خانے (جیل) میں پہنچے۔ یہ بندی خانہ سرنگ کے شمالی دہانے کے اندر واقع تھا۔ جونہی ہم بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے نسوانی چیخ پکار کی آوازیں آئیں۔ یہ وہی ادھیڑ عمر عورت تھی جسے پرسوں جھونپڑے سے پکڑ کر لایا گیا تھا۔ یہ ایک دن سدورت کے گھر میں رہی تھی' پھر بندی خانے میں منتقل کر دی گئی تھی۔ یہ عورت گمشدہ لڑکے خانوں کی ماں تھی۔ میں نے سمجھا شاید وہ رو رہی ہے۔ لیکن قریب جا کر دیکھا تو یہ خیال غلط نکلا' عورت پر تشدد نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک کوٹھڑی میں اکیلی جبلی تھی اور زور زور سے اپنا ماتھا پیٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی چند چھوٹے بڑے کنکر بکھرے تھے اور ایک دائرہ سا کھنچا تھا۔ میں نے مترجم صدر خان کی زبانی عورت سے پوچھا کہ وہ کیوں واویلا کر رہی ہے۔ صدر خان نے عورت کے سامنے میرا سوال دہرایا اور کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا۔ پھر اس نے بتایا "یہ اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہے۔ سوچ رہی ہے کہ وہ بھوکا پیاسا ہوگا' سخت سردی میں پتا نہیں کہاں رات گزارتا ہوگا۔"

"اور یہ کنکر کیسے پڑے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اس نے فال نکالی ہے۔" صدر خان نے کہا "یہاں لوگ اکثر ایسی فالیں نکالتے ہیں۔ عورت کی فال نے اسے بتایا ہے کہ اس کا لڑکا بھوکا پیاسا ہے اور ماں کو یاد کر رہا ہے۔ اگر وہ ماں تک نہ پہنچا تو سخت مصیبت میں پھنس جائے گا۔"

میں نے دیکھا' آنسو اس سادہ لوح عورت کی آنکھوں سے نکل کر گردن تک پہنچ رہے تھے۔ وہ لٹی پٹی اور زخم زخم نظر آتی تھی۔ زخم جو اس کی سطح پر تھے اور اس کے جسم پر بھی۔ اس کے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں زخمی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک انتظامیہ کے کارندے اس پر تشدد کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ تشدد اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہی تھا۔ میں نے صدر خان سے کہہ کر بندی خانے کے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ عورت کی زخمی انگلیوں کی مرہم پٹی کرے۔ اس کے علاوہ اسے ٹھیک ٹھاک جھاڑ بھی پلائی کہ عورت پر تشدد نہ کیا جائے۔

اتنے میں پاناسہ کا دوست اور قریبی ساتھی سدورت بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ تھکا ماندہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں ایک قریبی کمرے میں جا بیٹھے۔ سدورت نے اپنی ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا "میں رات گئے تک عورت سے پوچھ گچھ کرتا رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ وہ بیٹے کے ٹھکانے سے آگاہ ہے لیکن چھپا رہی ہے۔ اب میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عورت کو بری کر کے گھر واپس بھیج دیا جائے۔ امید ہے کہ ایک دو روز کے اندر وہ کسی نہ کسی طرح بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لڑکا خود ماں کے پاس پہنچ جائے۔"

میں نے کہا "تمہارا پروگرام تو مناسب ہے لیکن بندی خانے کے لوگوں نے جس وحشیانہ طریقے سے عورت کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔"

"آپ بجا کہتے ہیں۔" سدورت نے جواب دیا "مگر آپ اپنے حساب سے بات کر رہے ہیں' یہاں کا حساب اور ہے۔ ہم نیم وحشی لوگ ہیں۔ جڑی بوٹی کھول ہے ہماری۔ جسمانی اذیت سہنا اور جسمانی اذیت دینا ہمارے ہاں معمول کی بات ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اگر وہ لڑکا ہمیں نہیں ملتا تو پھر؟"

"پھر ہماری تفتیش تو جاری ہے۔ لڑکے کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے بھی پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ اس بات کے واضح ثبوت ملے ہیں کہ لڑکے کے پاس ان دنوں کافی رقم تھی اور وہ جوئے میں بھی لمبی رقمیں لگا رہا تھا۔ اس بات میں اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ لڑکا مجرموں کا آلۂ کار ہے۔"

پھر ہماری گفتگو کا رخ بتدریج پاناسہ اور اس کی دوسری بیوی کیرولین کی طرف مڑ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سدورت کیرولین کی عزت کرتا ہے لیکن یہ عزت صرف اس لیے ہے کہ وہ اس کے سردار اور دوست پاناسہ کی بیوی ہے ورنہ ذاتی طور پر وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ شاید یہ اس رویے کا ردعمل تھا جو کیرولین نے اس کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔ بہرحال سدورت اور کیرولین میں ایک چیز مختلف تھی۔ کیرولین بلا جھجک سدورت کی برائیاں کرتی تھی اور اسے دغاباز فریبی قرار دیتی تھی لیکن سدورت اس سلسلے میں بڑا محتاط تھا۔

اس نے ابھی تک کوئی ایسا لفظ اپنی زبان سے نہیں نکالا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ وہ کیرولین کو برا سمجھتا ہے۔ ہاں اس کی باتوں سے یہ احساس ہوتا تھا کہ کیرولین اس کے نزدیک اچھی عورت نہیں۔ بلکہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ پاتامہ پر ہونے والے حملوں کے سلسلے میں بھی کیرولین پر شک کرتا ہو۔ اگر بات کیرولین پر شک کرنے کی تھی تو پھر میرے ذہن میں بھی ایک شبہ پیدا ہوتا تھا۔ مجھے بار بار کیرولین کا وہ لہجہ یاد آتا جس میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آنجہانی تا بے اور اس کے ساتھیوں کا پاتامہ والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے یہ بات اتنے یقین سے کہی تھی کہ یوں لگا تھا جیسے وہ اصل مجرموں کو جانتی ہے۔ اصل مجرم ۔۔۔ جو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ خود بھی ہو سکتی ہے۔ کیرولین پر شک کرنے کے لیے وجوہات ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ وہ جواں سال تھی' خوب صورت تھی اور پاتامہ کی دوسری بیوی تھی۔ پاتامہ عمر میں اس سے کم از کم دس سال بڑا تھا۔ کیرولین ایک ماداراطانوی عورت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور اسی وادی میں پلی بڑھی تھی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ وادی کے حاکم اعلیٰ پاتامہ کی بیوی بنے گی۔ پہلی بیوی سے پاتامہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ کیرولین پر پڑ گئی۔ وہ ایک جشن کے موقع پر رقص اور ناٹک کرنے والی لڑکیوں میں شامل تھی۔ پاتامہ نے اسے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا فیصلہ اٹل حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ چند ہی ہفتے بعد کیرولین اور پاتامہ کی شادی ہو گئی تھی۔ بے شک کیرولین پاتامہ کی چہیتی بیوی تھی اور کیرولین بھی اسے بہت چاہتی تھی لیکن دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔

یہ بات نہیں تھی کہ اس سے پہلے میرا شک کیرولین کی طرف نہیں گیا تھا۔ میں نے اس حوالے سے کئی مرتبہ کیرولین کے بارے میں سوچا تھا۔ لیکن ایک بات ایسی تھی جو کیرولین کو مشکوک افراد کی فہرست سے پرے رکھ کر خارج کر دیتی تھی' اور یہ بات اتنی اہم تھی کہ اسے کسی طور نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ جس وقت پاتامہ کی گھوڑا گاڑی کو حادثہ پیش آیا' پاتامہ اور کیرولین کی اکلوتی بچی سانچا بھی گاڑی میں موجود تھی' اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ کیرولین کا اس واردات سے کوئی تعلق نہیں تھا' اگر ہوتا تو وہ اپنی بچی کو موت کے منہ میں نہ دھکیلتی۔ اچانک ایک شخص تیز قدموں سے اندر آیا' اس کے بازو پر سرخ والی چھری بنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ انتظامیہ کا اہلکار ہے۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سدرت کو کچھ بتایا۔ سدرت کے چہرے پر بھی ہیجان نظر آنے لگا۔ میرے پوچھنے پر سدرت نے بتایا "بستی سے باہر کھائی سے ایک لاش ملی ہے۔ خیال ہے کہ وہ لڑکے خانوں کی لاش ہے۔"

اطلاع واقعی چونکا دینے والی تھی۔ سدرت کے ساتھ ساتھ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں انتظامیہ کے اہلکار کے ساتھ چل دیے۔ بندی خانے سے نکلے تو دو تین مزید اہلکار ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہم بستی سے باہر نکلے اور قریبی گھاٹیوں کی طرف چل دیے۔ مترجم صدر خاں بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ لاش ابھی ایک گھنٹہ پہلے ایک چرواہی نے دریافت کی ہے۔ وہ بکریوں کے ساتھ کھائی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اسے بو آئی اور کچھ آوارہ جانور بھی گھومتے پھرتے دکھائی دیے۔ اس نے کھائی میں جھانکا تو کسی لڑکے کی بچی ہوئی لاش پڑی تھی۔

آٹھ دس منٹ کے پیدل سفر کے بعد ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ ایک تنگ کھائی تھی۔ اس میں چھوٹے بڑے پتھر بکھرے تھے اور کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ لاش پر ایک اونی کمبل ڈال دیا گیا تھا۔ خاکستری کمبل پر خون کے دھبے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ یخ بستہ موسم کے باوجود لاش سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس خونی واقعے کو چوبیس گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا ہے۔ سدرت نے لاش پر سے کمبل ہٹایا۔ ایک لرزہ خیز منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یقیناً لاش رات بھر کھائی میں پڑی رہی تھی۔ آوارہ جانور بلیاں کتے وغیرہ اس پر منہ مارتے رہے تھے۔ چہرے کا گوشت ایک طرف سے بالکل صاف ہو چکا تھا۔ انتڑیاں باہر پڑی تھیں اور جسم پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے گھاؤ نظر آ رہے تھے۔ یہ منظر کسی مہذب شہری کے لیے انتہائی بھیانک ثابت ہو لیکن ان جنگلیوں کے لیے اس منظر میں کوئی خاص کراہت نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے یہاں وہاں کھڑے تھے اور مسخ شدہ لاش کا نظارہ کر رہے تھے۔

سدرت نے بغور لاش کا چہرہ دیکھا' اور پھر میری طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ یہ لڑکے خانوں ہی کی لاش تھی۔ میں گم صم کھڑا رہ گیا۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے میں نے خانوں کی بدنصیب ماں کو دیکھا تھا۔ وہ بلک بلک کر اپنے خداؤں سے اپنے بچے کی سلامتی مانگ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھوکا پیاسا ہے اور سخت مصیبت میں ہے۔ اس کی بھوک پیاس کا تو معلوم نہیں تھا بہرحال مصیبت اس پر واقعی ٹوٹ کر آئی تھی۔ میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ نوجوان بیٹے کی لاش دیکھ کر ماں کا کیا حال ہو گا۔ میں نے اس سے پہلے لڑکے کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ پاتامہ کی گھوڑا گاڑی کے نیچے سے نکل کر جھاڑیوں میں چھپا تھا اور میں اس کے پیچھے لپکا تھا۔ میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس ایک جھلک کی مدد سے ہی میں نے لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ یہ اسی کی لاش تھی۔ لاش کے قریب سے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل بھی ملی تھی۔ شراب سے اندازہ ہوتا تھا کہ بوتل میں بالکل سیاہ رنگ کا ایک تیز نشہ آور مشروب موجود تھا۔ یہ مشروب مقامی طور پر اس جنگلی بوٹی سے تیار کیا جاتا تھا جس کا نام میرے مترجم نے "کالی چاندنی" بتایا تھا۔ کافی مہنگا مشروب تھا۔ لاش کے قریب بوتل کی موجودگی سے پتا چلتا تھا کہ خانوں نشے میں چور ہو کر یہاں سے گزر رہا تھا کہ کھائی میں گر گیا۔ اب اس بات میں کتنی حقیقت تھی اور کتنا جھوٹ' اس

کا فیصلہ تو ٹھوس ثبوت ملنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی لاشیں دیکھی تھیں۔ سترہ اٹھارہ سالہ خانوں کی لاش ان میں سے ایک تھی جس نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے کسی سراغ رساں کی طرح لاش کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کر بڑے دھیان سے لاش کا جائزہ لیا۔ تفتیش کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے سب سے پہلے متوفی کے ہاتھوں کا معائنہ کیا۔ میرا یہ پہلا معائنہ کافی حد تک کامیاب رہا۔ متوفی کے لمبے ناخنوں میں مجھے گوشت کے باریک ریشے نظر آئے۔ یہ ریشے سورج کی روشنی میں بالکل صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ریشے اس امر کی علامت تھے کہ مرنے والے نے مرنے سے پہلے جدوجہد کی ہے اور اپنے تیز ناخنوں سے کسی کا چہرہ یا جسم نوچا ہے۔ متوفی کی جسمانی ضربات میں بھی ایک چیز بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پچھ چوٹیں اور زخم نئے تھے۔ جب کہ کچھ تین چار دن پرانے تھے۔ میں نے یہ بات سدرت کو بھی نوٹ کرائی اور اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ یہ حقیقت بالکل عیاں تھی کہ خانوں کو قتل کیا گیا ہے اور اس قتل کا مقصد اس سازش کو چھپانا ہے جو پاتامہ کو ختم کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔

کچھ دیر ہم لاش کے پاس ٹھہرے رہے۔ اس ادھیڑ عمر چرواہی سے بھی بات چیت کی جس نے لاش دریافت کی تھی۔ پھر ہم بندی خانے واپس آ گئے۔ صورت حال ایک سنسنی خیز رخ اختیار کر چکی تھی۔ پاتامہ کے دشمنوں نے وہ واحد سراغ بھی مٹا دیا جو ان کی سازش سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ اس سراغ کو مٹانے کے لیے انہوں نے ایک لاچار ماں کا واحد سہارا بھی اس سے چھین لیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ سراغ مٹانے والے کون ہیں۔ اس حوالے سے سوچتے ہی ذہن میں پھر وہی تین نام ۔۔۔ آجاتے تھے۔ برونا وہ مشکوک شخص تھا جس (یعنی اس کے ساتھی) کو کئی واردات اور سدرت ۔۔۔ کیا قبول کروا چکے تھے۔ پر اب تک پاتامہ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اور پاتامہ کی موت سے جن کے مفاد وابستہ ہو سکتے تھے۔ اب ان میں ایک کردار پاتامہ کی بیوی کیرولین کا بھی شامل ہو گیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ کیرولین اپنے شوہر کی جان لے سکتی ہے۔

میں اور سدرت دیر تک بندی خانے کے ایک بند کمرے میں بیٹھے رہے اور خانوں کی موت پر تبصرہ کرتے رہے۔ سدرت بہت مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ اسی دوران میں پاتامہ کی بیوی کیرولین بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکے کے قتل سے آگاہ ہو چکی ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور نیلی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ آتے ہی سدرت پر پھٹ پڑی۔ وہ مقامی زبان بول رہی تھی۔ الفاظ تیروں کی طرح سنسناتے ہوئے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ سدرت کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ ترکی بہ ترکی جواب دینے سے گریز کر رہا تھا۔ مقامی زبان بولتے بولتے کیرولین ایک دم انگریزی بولنے لگی' اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ سدرت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی "یہ لوگ دل سے میرے شوہر کے وفادار نہیں' ان کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہے۔ یہ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے اور ۔۔۔ میرے شوہر کی موت کا انتظار کرتے رہیں گے۔ جو کچھ اس لڑکے کے ساتھ ہوا ہے۔ میرے منہ میں خاک وہ میرے شوہر کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور ہونا ہے' ان کی بلا سے۔ میں سوچتی ہوں کہ دشمن جب میرے شوہر کے ۔۔۔ تب بھی انہیں۔" کیرولین نے آخری الفاظ زور سے چیخ کر کہے تھے۔

سدرت اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا "مادام! آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی شان میں گستاخی کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

کیرولین میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں۔ وہ دلشگاف لہجے میں بولی "مسٹر شاہ جہاں! میں ایک بار پھر تم سے کہتی ہوں میرے شوہر کا دشمن یہ شیطان ہے۔ یہ میرے شوہر کی آستین کا سانپ ہے۔ میں تمہیں ۔۔۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اسے گرفتار کر کے بندی خانے میں ڈالو اور اس سے پوچھو کہ اس نے کیا کیا سازش کی ہے۔"

میں نے کہا "مادام! میں آپ کی وادی کے قانون کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے آپ لوگوں کے باہمی تعلقات کا زیادہ علم ہے لیکن اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہے کہ سدرت جیسے شخص پر ہاتھ ڈالنے کا اختیار صرف محترم پاتامہ کو ہے۔"

کیرولین کا جوش کچھ تھم چکا تھا۔ کہنے لگی "مگر پاتامہ تو وادی میں نہیں ہیں۔ ہم کب تک ان کا انتظار کریں گے؟"

میں نے کہا "اس سوال کا جواب مجھ سے بہتر آپ جانتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے۔"

اسی دوران میں سدرت کا ایک ملازم اندر داخل ہو گیا اور کیرولین خاموش ہو گئی۔

○☆○

اگلے روز شام کو یعنی سورج ڈوبنے سے کوئی دو گھنٹے پہلے میں اپنی قیام گاہ پہنچا تو دیکھا کہ اپنے بچھونے پر نیم دراز گنگنا رہا تھا۔ امارا پیار بھی تو ہے' یہ بہار بھی نو ہے تو ہی نظروں میں جانا تھا ۔۔۔ میری آہٹ پا کر تو ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا "استاد صیب! تم آم بہت خوش ہے۔"

"کیوں کیا ہوا۔ کیا کلثوم نے پھر گندا انڈا مارا ہے؟"

"او نئیں استاد صیب! اس کا اتنا ہمت کہاں۔ اب تو وہ امارے لئے پاگل ہے اور ام اس کے لئے پاگل ہے ۔۔۔ بات یہ ہے کہ آج ام نے صدر صاحب سے بات کی ہے۔"

"وہ آیا تھا یہاں؟"

"نہیں' ڈاک کی بات ہوا ہے۔"

راکی ٹاکی میں نے کوٹھری کے اندر ہی چھپا رکھا تھا اور زریں گل کو اس کے ٹھکانے کا علم تھا۔ "کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "خو پہلے تو ام نے اسے اپنے عشق کا مختصر کہانی سنایا۔ پھر کچھ ادھر ادھر کا باتیں ہوا۔ سید صاحب نے ام کو بتایا کہ اسے ایک خاص کامیابی ملا ہے۔ وہ ایک دو دن میں ام سے ملے گا اور خوش خبری سنائے گا۔"

میں نے واکی ٹاکی آن کر کے دیکھا۔ اس کی آواز بہت کمزور ہو گئی تھی "تیرا بیڑا غرق زریں گل" میں نے کہا "تجھے کس الو کے پٹھے نے کہا تھا کہ اتنی لمبی بات کرے۔ ساری بیٹری خرچ کروا دی ہے تو نے۔"

وہ بولا "بات پیار محبت کا ہو تو تھوڑا سا لمبا ہو ہی جاتا ہے جی۔ خیر آپ چھوڑیں اس بات کو۔ لاہور جا کر ام آپ کو دس بارہ بیٹریاں اپنے خرچے سے لے دے گا۔۔۔ آپ یہ بتائیں کہ اس لاش کا کیا چکر ہے جو کھڈے سے ملی ہے۔ سنا ہے کہ یہ اسی لڑکے کی لاش ہے جس نے پاناما کی گھوڑا گاڑی کا بیڑا غرق فرمایا تھا۔"

"ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا "مجھے بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔ اب تھوڑا سا سونے دو مجھے۔"

"سو نہیں جی سوئیں۔ آپ سو سکتے ہیں۔ ام کو تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہوگا۔ یہی قسمت اماری ہے۔"

"اللہ تمہاری بدروح کو سکون اور صبر جمیل عطا فرمائے۔" میں نے کہا اور سر تک کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سونے کا تو صرف بہانہ تھا، میں زریں گل کی کائیں کائیں سے جان چھڑانا چاہتا تھا اور ذرا یکسوئی سے حالات کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میرا دل چاہ رہا تھا میں ایک بار پھر کوکی دادا سے ملوں۔ میرے اس خیال کی دو وجوہات تھیں۔ زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ میں دوبارہ جون چارلس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جون چارلس سے ملاقات میرے لیے باقی سارے کاموں سے زیادہ اہم تھی۔ یہ جون چارلس ہی تھا جس کے چکر میں گرفتار ہو کر ہم اس وادی تک پہنچے تھے۔ کوکی دادا سے ملنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے وہ زخم یاد آ رہا تھا جو میں نے کوکی دادا کی گردن پر دیکھا تھا۔ میں اس زخم کو زیادہ غور سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ میرے ذہن میں بار بار یہ وہم سر اٹھا رہا تھا کہ کہیں یہ وہی زخم تو نہیں جو مقتول لڑکے خانوں نے اپنے قاتل کے جسم پر لگایا تھا اور جس کا ثبوت اس کے ناخنوں میں پھنسا ہوا گوشت تھا۔

میں نے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ بیٹھا۔ زریں گل بڑے شوق سے بٹر رسٹ کھا رہا تھا۔ بٹر بیٹ یہاں مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا اور خاصا لذیذ تھا۔ مگر یہ بہت تھوڑی مقدار میں بنتا تھا اور کسی کسی کو کھانا نصیب ہوتا تھا۔ زریں گل بٹر بیٹ کے ساتھ کچے دودھ کے گھونٹ بھی لے رہا تھا، کچھ دودھ اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہا تھا۔

میں نے کہا "تم خون دینے والے مجنوں نہیں، دودھ پینے والے مجنوں ہو زریں گل۔"

وہ بولا "پیٹ میں کچھ نہ ہوگا تو عشق کیا خاک ہوگا۔ نظریہ تو یہ ہے کہ جسم میں جتنا حرارت ہو عشق میں اتنا ہی گرمی ہے۔ جو لوگ ٹھنڈا خوراک کھاتا ہے، ان کا عشق بھی ٹھنڈا ہے۔ لسی پینے والے کا عشق نہاری کھانے والے کے عشق کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ سبزی کھانے والا کا عشق ڈھیلا ڈھالا اور سست رفتار ہوتا ہے۔ پسنجر ٹرین کے ماتی ایسا چلتا ہے کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی مسافر اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ مرغی مچھلی کھانے والوں کا عشق ایک دم تیز گام ہوتا ہے۔ ادھر اسٹیشن سے چھوٹا ادھر منزل پر پہنچ گیا۔۔۔"

"یا پھر پٹڑی سے اتر گیا اور سب کچھ [illegible] صاحب۔" میں نے لقمہ دیا۔

"جناب زندگی ہے کتنی؟ اس میں ایسا رسک تو لینا ہی ہے۔"

"اچھا تم اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ بلکہ اس کی پٹی بنا کر بغل میں لے لو۔ میں کوکی دادا کی طرف جا رہا ہوں۔ رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔"

"استاد صاحب! زیادہ دیر مت لگانا۔ حالات اچھا نہیں ہے۔ ایک بوڑھا گم ہو گیا ہے، ابھی تک نہیں ملا۔ پتا نہیں کس کا نمبر تھا۔"

میں ان سنی کر کے باہر آ گیا۔ سرنگ سے باہر موسم خوشگوار تھا۔ پر جلیوں والے درخت کے پاس دو تین بوڑھے گم سم بیٹھے تھے۔ ٹھٹھری ہوئی دھوپ مغربی چوٹیوں کے پیچھے سمٹ رہی تھی۔ ابھی ایک گھنٹا دن باقی تھا لیکن وادی میں روز مرہ کے معمولات ختم ہو چکے تھے اور وہی ماحول تھا جو ہمارے ہاں شام سات آٹھ بجے کے بعد ہوتا ہے۔ پاناما اس وادی کا حکمران تھا۔ اس کا کام لوگوں کو تحفظ دینا تھا، ان کے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا کرنا تھا لیکن وہ خود تشویش ناک حالات کا شکار تھا۔ نجانے دشمن جو بہت عیار بھی تھے اس کی جان کے درپے ہو رہے تھے۔ ایسے میں یقینی بات تھی کہ عام لوگوں میں بھی بے چینی پائی جا رہی تھی۔ وہ دبی سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ بعض لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ پاناما وادی سے باہر نہیں گیا بلکہ یہیں کہیں روپوش ہے۔

میں پہلے مترجم صدر خان کے ٹھکانے پر پہنچا، وہاں سے اسے ساتھ لیا اور کوکی دادا کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ کوکی دادا شراب کے نشے میں دھت بیٹھا تھا۔ اس کے قریب چار پانچ افراد بھی تھے۔ ایک شخص کوئی ساز بجا رہا تھا، دوسرا دردناک آواز میں گا رہا تھا۔ یہ کوئی لوک گیت قسم کی چیز تھی۔ کوکی دادا کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گانے کے بولوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کے گوشے سے آنسو نکل کر رخسار تک پہنچ رہے تھے۔ ہم اس محفل میں

بیٹھے تو گانے والا خاموش ہو گیا۔ سازندے نے بھی اپنے ساز پر ہاتھ روک لیے۔ کوکی دادا نے اپنی گہری سرخ آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ناگواری نظر آئی لیکن پھر فوراً اس ناگواری کو مصنوعی خوش اخلاقی سے ڈھانپ لیا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ میری نگاہ کوکی دادا کی گردن کے زخم پر جمی تھی۔ یہ معمولی سا زخم تھا اور اب مندمل ہو رہا تھا۔۔۔ یہ زخم قابل غور تھا۔ ایسا زخم دھینگا مشتی میں آ سکتا تھا۔ خصوصاً جب جلد پر گہری خراشیں آ جائیں۔ یہ خراشیں لمبے ناخنوں کی وجہ سے بھی آ سکتی تھیں۔ لیکن ایک بات تھی۔ یہ زخم کچھ پرانا دکھائی دے رہا تھا۔ قریباً آٹھ دس روز پرانا۔ خانوں کو قتل ہوئے اتنا وقت نہیں گزرا تھا۔

کوکی دادا نے دیگر آدمیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب میرے اور مترجم کے سوا کمرے میں اور کوئی نہیں تھا "کیسے آئے ہو؟" اس نے مترجم کی وساطت سے پوچھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔"

"ہاں ہاں کہو" کوکی دادا نے حوصلہ بخش لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "آپ یہ نہ سمجھیں کہ میرے سوالوں کا محرم پاناما اور انہیں پیش آنے والے واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تو یونہی ایک بات میرے ذہن میں آ گئی تھی۔ پچھلی ملاقات میں مجھے یہاں آپ کے ڈیرے پر ایک غیر ملکی نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے اور گلے میں زنجیر تھی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟"

کوکی دادا بولا "یہ سوال تم کس حیثیت سے پوچھ رہے ہو۔؟"

میں نے کہا "عام حیثیت سے۔۔۔ آپ کے دوستانہ رویے نے ہی مجھے یہ سوال پوچھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ اگر آپ جواب دینا پسند نہیں کریں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ بولا "میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ تم یہ بات ذاتی حیثیت سے پوچھ رہے ہو۔ تم اس وادی میں اجنبی ہو۔ یہاں کے رہن سہن اور رسم و رواج سے تمہیں زیادہ واقفیت نہیں۔ یقیناً تمہیں یہاں کی کئی باتیں عجیب لگتی ہوں گی۔ کبھی تم ہمیں بے وقوف گردانتے ہو گے، کبھی ظالم، کبھی جاہل اور جنگلی۔ لیکن تمہیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم ہر اچھے یا برے کام کو اپنے معیار پر پرکھتے ہیں اور یہ معیار تمہارے معیاروں سے بہت مختلف ہے۔ جس نوجوان کو تم پوچھ رہے ہو وہ ایک مادار تھا اور میں نے اسے قیمتاً خریدا تھا۔ مجھے ایک ایسا نوجوان چاہیے تھا جو پوری طرح صحت مند ہو اور جس کے جسم پر کوئی داغ وغیرہ نہ ہو۔ چاند میں تین قیدیوں کے اندر سے اس کا انتخاب ہوا تھا۔"

میں نے کہا "محترم دادا! یہاں تک تو مجھے بھی علم ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

کوکی دادا بولا "ہمارے ہاں مصیبت ٹالنے کے لیے تین طرح کی قربانی دی جاتی ہے۔ نباتات کی قربانی، جانور کی قربانی اور انسان کی قربانی۔ نباتات کی قربانی سے مطلب یہ ہے کہ قربانی دینے والا اپنی کوئی کھیتی یا اپنا پھل دار درخت ایک موسم کے لیے مہاش دیوتا کے نام وقف کر دیتا ہے۔ جانور کی قربانی مرغی یا بھیڑ بکری کی ہوتی ہے۔ انسان کی قربانی سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو شخص مہاش دیوتا کے سامنے انسانی قربانی کا اہتمام کرتا ہے اس کی ہر دلی مراد پوری ہوتی ہے لیکن اس قربانی کے لیے بہت سی شرطیں ہیں۔ قربانی مادار کی ہونی چاہیے۔ مادار نوجوان لڑکا یا لڑکی ہونی چاہیے۔ وہ غیر شادی شدہ اور خوش شکل ہو، اس کے جسم پر کسی طرح کا معمولی سا داغ بھی نہ ہو اور پھر یہ کہ اس کے والدین میں سے کوئی زندہ نہ ہو اور کم از کم یہ کہ وادی میں موجود نہ ہو۔ ایسے مادار کی تلاش بہت مشکل اور مہنگی ہوتی ہے۔ عام لوگ یہ ساری شرائط پوری نہیں کر سکتے لہٰذا ایسی قربانیاں بہت ہی کم تعداد میں ہوتی ہیں۔ تم نے جس مادار کو دیکھا تھا وہ میں نے جازو (عبادت گاہ) سے حاصل کیا تھا۔ تم اس کی قیمت کا اندازہ یوں لگا سکتے ہو کہ جتنی قیمت میں میں نے اسے خریدا ہے اس قیمت میں میں پچاس دودھ دینے والی بکریاں خرید سکتا ہوں یا پھر دو سو درختوں والا "خوبانی" کا باغ میری ملکیت ہو سکتا ہے لیکن مجھے اب ان چیزوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر میری ساپینہ میرے پاس نہیں۔ اگر وہ اپنے غموں میں گھل گھل کر مر رہی ہے تو میں کیا کروں گا یہ سب کچھ۔"

"تو آپ یہ قربانی ساپینہ کی خاطر ہی دے رہے ہیں۔" میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

"ہاں اگر اس کے لیے مجھے اپنا سر بھی دینا پڑے تو ریوناؤس کی قسم ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ ایک لمحے کی تاخیر نہیں۔"

کوکی دادا کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں کے گوشے پھر بھیگ گئے۔ کوکی دادا اپنی گفتگو میں جون چارلس کے لیے بار بار "تھا" کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ مجھے عجیب سا خدشہ ہوا۔ میں نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا "وہ نوجوان اب کہاں ہے؟"

میرا اشارہ جون چارلس کی طرف تھا۔ کوکی دادا نے شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "وہ اب یہاں نہیں ہے۔ وہ جا چکا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"قربان گاہ کی طرف۔ شاید وہ اب تک قربانی کے عمل سے گزر چکا ہو۔"

میں تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے پورے جسم میں سنسناہٹ کی لہر پھیل گئی تھی۔ میں یہاں اطمینان سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور جون چارلس موت کے منہ میں جا چکا تھا یا جانے والا تھا۔ پھر میرے ذہن میں لینگ ہن کی صورت چمکی۔ وہ سادہ دل لڑکی جو دل و جان کی گہرائیوں سے جون چارلس کو پیار کرتی تھی اور دن رات

اس کے خیالوں میں گم رہتی تھی۔ کوکی دادا کی بچی سا پینہ کی طرح وہ بھی نوسیکہ کی بچی تھی۔ میں ایک دم پلٹ کر کمرے سے باہر نکلا اور صحن کی طرف دوڑا۔ وسیع صحن کے پھاٹک میں سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے اندھا دھند راستہ بناتا ہوا باہر نکل آیا۔ اردگرد کے لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کوکی دادا کو دیکھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے کمرے سے نکل رہا تھا اور مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ میں گلی میں پہنچا اور پوری احتیاط سے جانزو کی طرف بھاگنے لگا۔ جانزو کا فاصلہ قریباً تین فرلانگ تھا۔ میں نے ہوا میں اڑتے ہوئے یہ فاصلہ طے کیا اور جانزو کے بلند و بالا دروازے میں داخل ہو گیا۔ جانزو کی پتھریلی سیڑھیوں پر ایک بوڑھے سے میرا تصادم ہوا اور وہ لڑھک کر دور جا گرا۔ جانزو میں بہت سے لوگ موجود تھے وہ سب خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سنگِ مرمر کے اس چبوترے پر پہنچ گیا جہاں لمبی داڑھی والا ایک فربہ اندام واعظ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میرا ارادہ واعظ پر جھپٹنے کا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ اپنی پنڈلی کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں نو انچ لمبے پھل والا قاتل چھرا موجود تھا لیکن اس سے پہلے کہ میرا دایاں ہاتھ چھرا نکالتا اور بایاں ہاتھ آگے بڑھ کر فربہ اندام واعظ کی گردن دبوچ لیتا" کوئی ہرن کی رفتار سے میرے سامنے آئیا۔ میں دیکھ کر ششدر رہ گیا" وہ صفدر تھا۔ اس نے دس بارہ روز سے شیو نہیں کی تھی اور پہلے سے کچھ دبلا نظر آ رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہیں؟" وہ غرایا۔

پھر اس نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ عبادت گاہ کے احاطے میں موجود لوگ اب چاروں طرف سے ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ ان میں سے کچھ ابھی تک خوف زدہ تھے اور کچھ غضب ناک نظر آ رہے تھے۔ غضب ناک نظر آنے والوں نے غالباً یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں واعظ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صفدر مجھے کھینچتا ہوا ایک اندھیری کوٹھڑی میں لے گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ "یہ آپ کیا کرنے لگے تھے؟" اس نے ناراض لہجے میں کہا "وہ نائب پجاری ہے اس جانزو کا۔۔۔ آپ اس پر ہاتھ ڈالتے تو یہ لوگ آپے سے باہر ہو جاتے۔"

"کچھ کرو صفدر، کچھ کرو۔" میں نے بے تابی سے کہا "جون چاؤل کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"جج۔۔۔ جون چاؤل۔۔۔ کیا ہوا اسے؟"

"وہ لوگ اسے بھینٹ چڑھانے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ کیا تم نے کسی کو دیکھا نہیں؟"

"بھینٹ چڑھانے کے لیے۔" صفدر نے بے خیالی میں میرے الفاظ دہرائے۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ لوگ آئے تو ہیں یہاں۔ تہ خانے میں اترے ہیں۔ بڑا پجاری بھی ان کے پیچھے گیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ اس کے چہرے اور سر کے بال اور بھویں وغیرہ بالکل صاف تھیں۔ اسے زنجیر ڈال کر لایا گیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی۔" میں نے بے تابی سے کہا "وہی جون چاؤل ہے۔"

"اوہ خدایا۔" صفدر کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔ اس نے چند لمحے سوچا" پھر مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے کے عقبی دروازے سے ہم باہر نکلے اور ایک پیچ در پیچ غلام گردش میں دوڑنے لگے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ عبادت گاہ میں جوتوں کا داخلہ منع تھا۔ صفدر کے پاؤں بھی ننگے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چند لمحے کے لیے رک کر جوتے اتار پھینکے۔ صفدر مجھے دوڑاتا ہوا ایک زینے تک لے آیا۔ چھوٹے چھوٹے روشن دان اس زینے میں روشنی کر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں براہ راست زینوں پر پڑ رہی تھیں۔ ابھی ہم نے زینے پر پاؤں نہیں دھرا تھا کہ نیچے تہ خانے کا دروازہ کھلا اور بہت سی ملی جلی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا اور آوازیں معدوم ہو گئیں۔ جو لوگ تہ خانے کا دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ وہ سامنے آئے تو پتا چلا کہ وہ سب جانزو کے خاص خادم ہیں۔ ان کے لباس مختلف تھے لیکن سب کے سروں پر ایک جیسی زرد اونی ٹوپیاں تھیں۔ ان لوگوں نے ہاتھوں میں ایک اسٹریچر نما چیز اٹھا رکھی تھی۔ اس اسٹریچر نما چیز پر کوئی شخص موجود تھا جسے کمبل سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسٹریچر کے نیچے سے خون کے چھوٹے چھوٹے قطرے گر کر سیڑھیوں کے سنگِ مرمر کو داغ دار کر رہے ہیں۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دل سے یہ آواز چیخ بن کر ابھری کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے جون چاؤل اپنے الم ناک انجام سے دوچار ہو چکا ہے۔ صفدر کا چہرہ بھی بالکل سفید نظر آنے لگا تھا۔ میں نے غور سے اسٹریچر کو دیکھا اور میری ذرا سی ڈھارس بندھی۔ اسٹریچر پر موجود جسم قد کاٹھ میں جون چاؤل سے کم نظر آتا تھا۔ میں نے لپک کر اسٹریچر سے کمبل ہٹایا لیکن پھر فوراً دوبارہ ڈال دیا۔ اسٹریچر پر ایک کم عمر لڑکی کی لاش موجود تھی۔ بمشکل بارہ تیرہ سال عمر ہو گی اس کی۔

اس نو عمر بدنصیب لڑکی کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور رخسار پر خون کے چھینٹے تھے لیکن میں نے ایک بات نوٹ کی۔ مجھے بدنصیب لڑکی کے چہرے پر موت کی دہشت اور جاں گسل اذیت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ایک لمحہ اسٹریچر کے پاس رکنے کے بعد میں زینے اترا اور تہ خانے کے دروازے پر جھپٹا۔ دروازہ پھر بند ہو چکا تھا۔ "دروازہ

کھولو" میں پورے زور سے چلایا اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ دیا۔ لکڑی کا بھاری بھرکم دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور زرد ٹوپی والا ایک پستہ قد شخص سامنے نظر آیا۔ میں اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک ہال نما پختہ تہ خانہ تھا۔ چاروں طرف روزن تھے اور قدرتی روشنی اندر پہنچ رہی تھی۔ تہ خانے میں بیس کے قریب افراد موجود تھے۔ یہ سب جانزو کے خادم یا پجاری تھے۔ میری نگاہ سب سے پہلے مذہبی ساخت کے ایک مجسمے پر پڑی۔ یہ مجسمہ فرش سے قریباً پانچ فٹ اونچا تھا۔ یہ پتھر، لکڑی کا مجسمہ نہیں تھا۔ نہ ہی کسی دھات یا شیشے کا تھا۔ یہ پھولوں کا مجسمہ تھا۔ بڑے بڑے چھوٹے بڑے پھولوں کو جمع کر کے مجسمے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہ رنگین رنگوں کے پھول تھے اور یقیناً مقامی طور پر پائے جاتے تھے کیوں کہ تر و تازہ تھے۔ مجسمے کے بعد جون چاؤل میری نگاہ میں آیا۔ وہ لباس سے بے نیاز ایک چوبی تختے پر چت لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر کوئی خوشبو دار چیز ملی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے جان لیا کہ وہ گہری بے ہوشی میں ہے۔ یقیناً اسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی تھی۔ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بھینٹ چڑھانے جانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ جوں ہی میں اور صفدر رگبٹ کیپر کو دھکیل کر اندر داخل ہوئے' تہ خانے میں موجود تمام افراد ہمیں دیکھنے لگے۔ ان لوگوں میں خاران بھی تھا جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ وہ عبادت گاہ کا بڑا پجاری ہے۔ مجھے دیکھ کر خاران کے ہاتھی جیسے جسم میں زلزلہ پیدا ہوا اور اس کا سفاک چہرہ تپ اٹھا۔ اس نے تڑپ کر مجھ سے کچھ پوچھا۔ ڈاکٹر بنرجی نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا "کیوں آئے ہو تم یہاں؟"

میں نے کہا "میں اس بھینٹ کو رکوانے آیا ہوں جو آپ لوگ چڑھا رہے ہیں۔"

میرا جواب ڈاکٹر بنرجی نے حاضرین تک پہنچایا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" خاران نے کڑک کر کہا۔

میں نے اپنے بازو پر بندھی ہوئی مرشد والی خاران کو دکھائی اور کہا "محترم پناسہ کے کارندے کی حیثیت سے مجھے یہ اختیار حاصل ہے۔"

"تمہیں جو اختیار حاصل ہے وہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔" ایک دوسرا پجاری بولا "تم محترم پناسہ کی گھوڑا گاڑی کو پیش آنے والے حادثے کا کھوج لگا رہے ہو۔ مذہبی معاملات میں مداخلت کی اجازت تمہیں نہ محترم پناسہ نے دی ہے نہ ہم دے سکتے ہیں۔"

"میں آپ کے مذہبی معاملے میں دخل نہیں دے رہا ہوں۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گھوڑا گاڑی والے معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس شخص کا زندہ رہنا ضروری ہے جسے آپ لوگ ذبح کرنے والے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" خاران نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "اس حادثے کا گاڑی والے معاملے سے کیا تعلق تھا؟"

"تعلق ہو سکتا ہے۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ کچھ معلوم کرنا ہے اس سے۔"

اسی دوران میں کوکی دادا اور اس کے دو تین ساتھی آندھی طوفان کی طرح تہ خانے میں داخل ہو گئے۔ یقیناً کوکی دادا اپنے گھر سے میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ آتے ہی بلند آواز میں بولنے لگا۔ جانزو کے پجاریوں اور کوکی دادا میں نصف منٹ تک مکالمہ ہوا پھر کوکی دادا میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنی بیساکھی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم کون ہوتے ہو یہ بھینٹ رکوانے والے۔ یہ رسم ادا ہو گی اور ابھی ہو گی۔" ڈاکٹر بنرجی نے یہ بات انگریزی میں مجھ تک پہنچائی۔

میں نے کہا "کوکی دادا! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم مشکوک افراد کی فہرست میں شامل ہو۔ میں تم سے پوچھ گچھ کا حق رکھتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں یا تمہاری تحویل میں ہیں۔"

"تم بے پر کی ہانک رہے ہو۔" کوکی دادا دہاڑا "ذرا ایک بات کان کھول کر سن لو۔ یہ قیدی میں نے تجھے خریدا ہے۔ اس کی منہ مانگی رقم دی ہے۔ میں اس کے ساتھ اور اس کی زندگی کے ساتھ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "کوکی دادا! میں تم سے اس شخص کی جان بخشی کی درخواست نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دو روز کے لیے اس رسم کو ملتوی کر دو تاکہ میں اس سے پوچھ گچھ کر سکوں۔"

"یہ نا ممکن ہے۔" کوکی دادا اٹل لہجے میں بولا "تم دیکھ رہے ہو۔ دیوتا کا یہ پھولوں والا مجسمہ کتنی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ دو دن لگے ہیں یہ مجسمہ تیار ہونے میں۔ بھینٹ صرف اسی مجسمے کے سامنے چڑھائی جا سکتی ہے۔ ہم نئے سرے سے سارا انتظام نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے بہتری ہے کہ تم یہاں سے باہر چلے جاؤ اور ہماری رسم خراب مت کرو۔"

میں نے دیکھا جانزو (عبادت گاہ) کے خادم اس چوبی تختے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے جس پر جون چاؤل کا بے ہوش جسم دھرا تھا۔ وہ بے بس تھا لیکن اس کی بے بسی ان لوگوں کے لیے بالکل قابلِ غور نہیں تھی۔ چوبی تختے کے نیچے پہیے لگے تھے۔ خادمین نے تختے کو دیوتا کے مجسمے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ مجسمے کے قدموں میں قربان گاہ کی ڈھلوان مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ ڈھلوان خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ یقیناً یہ خون اسی بدنصیب لڑکی کا تھا جو ابھی میرے سامنے بے جان ہو کر یہاں سے رخصت ہوئی تھی۔

اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آرہی تھی کہ لڑکی کے چہرے پر موت کی اذیت اور دہشت کی کیفیت کیوں نہیں تھی۔ یقینی طور پر وہ بھی حالتِ بے ہوشی میں ہلاک کی گئی تھی۔ غالباً یہ یہاں کا دستور تھا کہ قربان ہونے والے کو بے ہوشی کی نیند سلا دیا جاتا تھا۔

میں نے اپنے جانِ جگر صفدر کی طرف دیکھا۔ اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور آنکھوں میں دلیری کی چمک تھی۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں صفدر کو اشارہ کیا اور وہ بالکل چوکس ہو گیا۔ میں جون چارلس کو بچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ جون چارلس کو بچانے کی راہ مجھے کوکی واوا نے خود ہی دکھائی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ نادانستہ اس نے میری مدد کر دی ہے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور تیزی سے جون چارلس کی طرف گیا۔ میری توقع کے عین مطابق دو خادموں نے میرا راستہ روکا، ایک کے جبڑے پر میں نے مکہ رسید کیا اور دوسرے کے سینے پر جھک کر کندھے سے ٹکر ماری۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا، ڈگراتا ہوا ان بلوری مرتبانوں پر جا گرا جن میں مختلف رنگوں کے محلول بھرے تھے۔ کئی مرتبان ٹوٹ گئے اور محلول جو تیل سے مشابہ تھا فرش پر بہہ نکلا۔ دوسری طرف صفدر نے اپنے قریب کھڑے ڈنڈا بردار محافظ کو کندھے پر اٹھایا اور چند قدم بھاگ کر کوکی واوا پر دے مارا۔ بیساکھی کوکی واوا کی بغل کے نیچے سے نکل گئی اور وہ چلاتا ہوا فرش بوس ہو گیا۔ تہ خانے میں ایک دم زلزلہ سا آگیا تھا۔ خادمین میں سے ایک نے اپنے لبادے کے نیچے سے قریباً دو فٹ لمبی کٹار نکال لی۔ حلق سے جنگلیوں جیسی لرزہ خیز آواز نکال کر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن صفدر نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔ اس کا مہلک وار بچا کر صفدر نے اس کی کمر پر ٹانگ رسید کی اور دور پھینک دیا۔ چھرا تو میری ٹانگ کے ساتھ بھی بندھا ہوا تھا لیکن میں فی الحال اسے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹتا ہوا روباش کے اس مجسمے کے قریب پہنچ گیا جس کی بناوٹ میں ہزاروں جنگلی پھول استعمال کیے گئے تھے۔ ایک ڈنڈا بردار اپنا وزنی ڈنڈا خطرناک انداز میں اٹھائے مجھ پر جھپٹا۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر یہ وار خالی دیا اور ڈنڈا بردار کو بازو سے تھپک کر "گل بدن" روباش پر دے مارا۔ یہ ٹکر "گل بدن" روباش کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ایک جھٹکے سے اس کا جسم اچھلا اور سیکڑوں رنگ برنگے پھول تہ خانے میں بکھرے نظر آئے۔ چند لمحوں کے لیے جادو کے پجاری اور خادم سکتے میں کھڑے رہ گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ان کا مہادیو جو پھولوں سے بنایا گیا تھا تتر بتر ہو کر بکھر گیا تھا۔ کوکی واوا نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ بھینٹ کی رسم ابھی ادا ہونا ضروری ہے۔ اس کی وجہ کوکی واوا نے یہ بتائی تھی کہ یہ رسم اسی مخصوص سانڈ (روباش) کے سامنے ادا ہو سکتی ہے جو پھولوں کی مدد سے بنایا جاتا ہے۔ وہ سانڈ اب بکھر گیا تھا۔ وقتی طور پر جون چارلس کی جان بچ گئی تھی، اور یہی میں چاہتا تھا۔

تہ خانے میں موجود تمام افراد بھنائے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ شاید ہماری تکہ بوٹی کر ڈالتے لیکن انہیں معلوم تھا کہ ان کا حاکم پاتامہ ہم دونوں پر مہربان ہے، اور میرے بازو پر تو وہ مہر شدہ پٹی بھی موجود تھی جو میری خصوصی حیثیت کو ظاہر کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہم دونوں کو مار پیٹ تو سکتے ہیں لیکن کسی طرح کا شدید جانی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ابھی تک چھرا استعمال نہیں کیا تھا۔ دو افراد نے اچانک عقب سے آ کر صفدر کو دبوچ لیا۔ میں نے صفدر کو آنکھ ماری۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شدید مزاحمت نہ کرے اور تھوڑی سی مار کھا کر خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دے۔ مجھے یقین تھا کہ صفدر میرا اشارہ سمجھ گیا ہے۔ اسی دوران میں ایک شخص نے میرے جبڑے پر زبردست مکہ رسید کیا، میں تیورا کر قربان گاہ کے قریب گرا۔ میرا ایک ہاتھ قربان گاہ کے خون میں لتھڑ گیا۔ دو تین افراد مجھ پر پل پڑے۔ میں نے ایک دو جوابی ضربیں لگائیں اور پھر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ دوسری طرف صفدر کو بھی چھینٹی لگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا اس قسم کی چھینٹی صفدر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ایسی چھوٹی موٹی ماریں تو ہم لوگ شوق شوق میں کھا لیا کرتے تھے۔ میرے جسم پر بھی ٹھوکروں اور مکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے صرف اپنی بائیں جانب کی پسلیوں کو بچا رکھا تھا باقی سب خیریت تھی۔ بڑے پجاری غاران کے حکم پر مجھے اور صفدر کو ایک کوٹھری میں پھینک کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ کوٹھری اس ہال نما تہ خانے کے اندر ہی واقع تھی۔ کھڑکی میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

کوکی واوا کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ دیر ناقابلِ فہم آواز میں غراتا رہا پھر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

پھولوں سے بنے ہوئے مجسمے کے بکھر جانے کے بعد قربانی کی رسم ملتوی ہو گئی تھی۔ پجاریوں اور خادموں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ بہت غضبیلی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پر وہ زیادہ برہم نظر آتے تھے جن کو ہم نے چوٹیں لگائی تھیں ۔۔۔ چوٹیں تو ہمیں بھی لگی تھیں۔ صفدر کی آنکھ نیلی ہو رہی تھی۔ گریبان پھٹا ہوا تھا اور ایک کندھے پر بھی ضرب آئی تھی۔ میرے منہ میں بھی خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سر کے پچھلے حصے سے بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"کیا حال ہے آپ کا؟" صفدر نے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس۔" میں نے جواب دیا "طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی ہے اور تمہارا کیا حال ہے؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس آنکھ میں ذرا زیادہ موچ آگئی ہے۔" وہ مسکرایا۔ ہم کھڑکی سے تھوڑا ہٹ کر فرش پر بیٹھ گئے۔ صفدر نے کہا "مجھے یقین نہیں آرہا کہ ہم جون چارلس تک پہنچ چکے ہیں۔"

"نہ صرف پہنچ چکے ہیں بلکہ اسے بچا بھی چکے ہیں۔" میں نے

جواب دیا۔

"لیکن کب تک، وہ لوگ کل یا پرسوں تک پھر مجسمہ تیار کر لیں گے۔ جونہی مجسمہ تیار ہوا، وہ اسے بھینٹ چڑھا دیں گے۔"

"مجھے امید ہے صفدر، پرسوں تک کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ میں پاتامہ کی بیوی کیرولین سے مداخلت کی درخواست کروں گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پرسوں تک پاتامہ خود ہی آجائے۔"

"لیکن اگر یہ دونوں کام نہ ہو سکے تو؟ میرا مطلب ہے کہ نہ پاتامہ آیا اور نہ ہم ہی مسز کیرولین سے رابطہ کر سکے۔ ہم مسز کیرولین سے رابطہ کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ مجھے نہیں امید کہ یہ لوگ جلدی ہمیں یہاں سے نکلنے دیں گے۔"

"میرے خیال میں ہمارا نکلنا ضروری نہیں۔" میں نے جواب دیا "میرے پکڑے جانے کی اطلاع مسز کیرولین تک خود ہی پہنچ جائے گی۔ جس وقت میں کوکی واوا کے پاس پہنچا، میرے ساتھ ایک مترجم بھی تھا۔ یہ مترجم کیرولین نے ہی مجھے دیا ہوا ہے۔ یہ مترجم میرے لاپتا ہونے کی اطلاع ضرور کیرولین تک پہنچائے گا اور پھر ڈاکٹر ہنری بھی یہیں موقع پر موجود تھا۔ وہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

جلد ہی پوری وادی کی طرح اس تہ خانے کو بھی گھٹا ٹوپ تاریکی نے ڈھانپ لیا۔ اس رات میں اور صفدر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہماری باتیں جون چارلس اور اس کی قلوپائی محبوبہ بنک بن کے ارد گرد گھوم رہی تھیں۔ اس کے علاوہ پاتامہ اور ان کو درپیش خطرات کے بارے میں بھی ہم نے سیر حاصل بحث کی۔ میری طرح صفدر کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر ہم پاتامہ کے پُراسرار دشمن یا دشمنوں کا سراغ لگا لیں تو ہمیں پاتامہ کی نگاہوں میں اہم مرتبہ حاصل ہو جائے گا۔ اس "مرتبے" کی بدولت ممکن ہے کہ ہمیں اس وادی سے نکلنے میں سہولت ہو جائے۔

میں نے صفدر سے پوچھا "زریں گل نے کہا تھا کہ تم کوئی خوشخبری سنانا چاہتے ہو۔"

"ہاں میں نے کہا تھا۔" صفدر کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ "میرا خیال ہے کہ میں اس شخص کو پہچان سکتا ہوں جس کے ساتھ مقتول لڑکا اپنی گمشدگی سے چند گھنٹے پہلے دیکھا گیا تھا۔" صفدر کی اطلاع اہم تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ صفدر نے کہا "میری معلومات کے مطابق مقتول لڑکا خانوں آٹھ تاریخ کی شام کو لاپتا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ آٹھ تاریخ کو دوپہر کے وقت میں اس سے ملا تھا۔"

"ونڈر فل۔" میں نے کہا۔

صفدر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں یہاں عبادت گاہ کے بیرونی احاطے میں مقامی لڑکوں کو دست بدست لڑائی کی تربیت دیتا ہوں۔ اس روز بھی میں اپنے اسی کام میں مصروف تھا۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکا آیا، اس نے اپنا نام خانوں بتایا اور کہا کہ وہ بھی تربیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ تربیت کم عمر لڑکوں کے لیے ہے۔ وہ بڑا ہے اس لیے یہاں تربیت نہیں پا سکتا۔ وہ بضد رہا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو مترجم کے ذریعے ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لڑکا مایوس ہو کر دور جا کھڑا ہوا اور دوسرے لڑکوں کو ورزش کرتے دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں ایک شخص آیا۔ وہ اوورکوٹ میں تھا۔ سخت سردی کے سبب اس نے اونی ٹوپی پہن رکھی تھی اور گردن کے گرد مفلر نما کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر لڑکا کچھ سہم سا گیا۔ میں نے سمجھا، یہ لڑکے کا باپ یا بڑا بھائی ہے۔ دونوں کچھ دیر گفتگو کرتے رہے۔ اوورکوٹ والے نے ایک دو مرتبہ لڑکے کو ڈانٹا بھی پھر وہ دونوں ایک طرف چلے گئے۔ مجھے اس وقت بھی یوں محسوس ہوا تھا کہ لڑکا خوف زدہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری یادداشت کی تعریف کرنی چاہیے کہ لڑکے کا نام تمہیں یاد رہا۔ لیکن یار! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور خانوں ہو۔"

"میرے دماغ میں بھی یہ بات آگئی تھی۔" صفدر نے کہا "مگر کل جب میں نے مقتول کی لاش دیکھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی لڑکا ہے۔ چہرہ مسخ ہو چکا تھا پھر بھی کچھ نہ کچھ پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ لڑکے کے جسم پر وہی لباس تھا جو آٹھ تاریخ کو میں نے دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "تمہاری اطلاع کو یقیناً خوشخبری کہا جا سکتا ہے۔ میری نظروں میں کچھ مشکوک افراد موجود ہیں۔ ہم پولیس والوں کے انداز میں یہاں شناخت پریڈ کروا سکتے ہیں ۔۔۔ تمہیں یقین ہے کہ تم اس شخص کو پہچان پاؤ گے؟"

"انشاء اللہ، لیکن پہلے ہمارا یہاں سے رہا ہونا ضروری ہے اور رہائی کے آثار مجھے دور دور تک نظر نہیں آرہے ہیں۔"

"پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔" میں نے کہا۔

تہ خانے میں سخت سردی تھی۔ ہم جیسے کسی فریزر میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی گرم کپڑا بھی نہیں تھا جو ہماری ہڈیوں کو ٹھٹھرنے سے بچا سکتا۔ ہم نے ساری رات سوتے جاگتے میں گزار دی۔ نیم خوابی کے عالم میں میرے تصور کا پنچھی اس خونی وادی میں سے پرواز کر کے دور نکل گیا۔ وہ آزاد فضاؤں میں اڑنے لگا۔ اسلام آباد کی پہاڑیوں پر، پنجاب کے لہلہاتے کھیتوں پر، لاہور کی رنگین فضاؤں میں، جہاں شفق رنگ شام اپنا آنچل لہراتی ہے۔ نیلے آسمان پر قوسِ قزح کے رنگوں والی پتنگیں رقص کرتی ہیں، گھروں کی چھتوں پر حسین چہرے مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں۔ مجھے لاہور کے گلی کوچے یاد آئے اور انہی گلی کوچوں میں بسا ہوا وہ گھر بھی یاد آیا، جہاں فرزانہ رہتی تھی۔ وہ میرے لیے آج بھی فرزانہ تھی، صرف فرزانہ۔ میں اسے کیوں نہیں بھول سکا تھا؟ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود میں کیوں اسے یاد رکھنے پر مجبور تھا؟ ایک بے نام سی، موہوم سی آس کیوں اب بھی میرے دل میں موجود تھی۔ میں اس غلط فہمی میں کیوں مبتلا

تھا کہ ایک دن میں اُٹھ اور ذہن کے ان سارے سمندروں کو عبور کر جاؤں گا جنہوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ جب میں ایسا کر چکوں گا تو غزالہ سراپا منتظر میرے سامنے کھڑی ہوگی۔ میں اس کا ہاتھ تھاموں گا اور کسی انجانے ملک کے انجانے شہر کی طرف نکل جاؤں گا.....؟ پھر میرے تصور کے پنچھی نے پنکھ پھڑپھڑائے اور کلکتہ کے کسی مکان میں گھومنے لگا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمارے بعد ہمارے ساتھیوں پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ امریکہ کا ادب چی مسٹر جی کلارک، پاکستان کے میدانِ سیاست کا چابک شہسوار جنیئی کنور، جمشید کا خطرناک جاگیردار قادر زماں، "آفت کی پڑیا" سروج، وہ سب لوگ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہ پُراسرار سانپ نانی بھی جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔

دن چڑھے تہ خانے میں کچھ گرمی محسوس ہوئی۔ خوشگوار حرارت پاکر میں اور صندور بے خبر سو گئے۔ دوپہر کے بعد آنکھ کھلی تو کھانا ہمارے انتظار میں تھا۔ یہ داری کا من پسند کھانا تھا۔ شروع میں میں اس کھانے پر بہت ناک بھوں چڑھاتا تھا لیکن اب اسی رغبت سے کھاتا تھا جس رغبت سے کبھی لاہور کی گوالمنڈی سے مچھلی کھایا کرتا تھا یا لکشمی چوک کے مرغ چنے اڑایا کرتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بھوکے شخص کو کھانے کے لیے جو بھی دے دیا جائے وہ لذیذ ہوتا ہے۔

کھانے کے دوران میں صندور نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ کل جس جگہ دیوتا شکا کا پھولوں والا مجسمہ تھا اب وہاں پردہ تان دیا گیا ہے۔ یہ پردہ اس جگہ کو تین سمتوں سے ڈھانپ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مختصر لباس والی خوش شکل عورتیں تیزی سے ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں پھولوں سے بھرے ہوئے تھال تھے۔ وہ یہ تھال لے کر پردے کے پیچھے جاتی تھیں اور خالی تھال لے کر باہر آتی تھیں۔ یہ بات واضح تھی کہ کل جو گل بدن مجسمہ ہماری لڑائی میں بکھر گیا تھا اسے دوبارہ بنانے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ یقینی بات یہ تھی کہ جونہی مجسمہ کھڑا ہو گیا انسانی قربانی کی گھناؤنی رسم ادا کر دی جائے گی۔ میری آنکھوں میں رات بھر رہ رہ کر اس مقتول بچی کی صورت گھومتی رہی تھی جسے اس تہ خانے میں بھینٹ چڑھایا گیا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ کیا آنے والے دنوں میں ہمیں جون چاؤل کو بھی اسی المناک حالت میں دیکھنا ہوگا۔

صندور نے آخری لقمہ لے کر اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! بستی کی "خبر" پھر شروع ہو گئی ہے اور آپ کی کمک ابھی تک نہیں پہنچی۔"

"اس سلسلے میں میں بھی پریشان ہوں۔" میں نے کہا "یوں لگتا ہے کہ کسی کو ہماری فکر ہی نہیں ہے۔"

پردے کے پیچھے سارا دن کام ہوتا رہا۔ شام سے تھوڑا پہلے پردہ ہٹا دیا گیا۔ سفید، سیاہ اور سرخ پھولوں سے بنا ہوا مجسمہ تھا۔ یہ قریباً اسی شکل و صورت اور جسامت کا تھا جو کل ہم نے دیکھا تھا۔ پھولوں کو باہم ملائے رکھنے کے لیے انہیں دھاگوں میں پرویا جاتا تھا اور مجسمے کا ڈھانچہ بنانے کے لیے شاخوں وغیرہ سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ یقیناً میری طرح صندور کے دل کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ ہمیں اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں ابھی چاؤل کو "بھینٹ" کے عمل سے نہ گزارا جائے۔ بہرحال یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہو رہی تھی کہ قربان گاہ کے ارد گرد کل والے انتظامات نہیں ہیں۔ بہت سی دیگر اشیا کے علاوہ شیشے کے وہ بڑے بڑے مرتبان بھی نظر نہیں آ رہے تھے جن میں سے تیل جیسا محلول گرایا گیا تھا اور جون چاؤل کے برہنہ جسم پر ملا گیا تھا۔

اسی دوران میں میری نظر خاوان پر پڑی۔ وہ ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا ایک طرف سے برآمد ہوا اور نئے تیار شدہ مجسمے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے آواز دے کر اسے پاس بلایا۔ وہ پہلے تو ان سنی کرتا رہا لیکن جب میں نے اسے پکارنا جاری رکھا تو وہ ایک مترجم کے ہمراہ کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ "کیوں کتے کی طرح چلا رہے ہو۔" اس نے مترجم کے ذریعے پوچھا۔

میں نے کہا "میں مسز کیرولین سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا "مسز کیرولین کے پاس اتنا وقت نہیں کہ تم جیسے ڈھوروں سے ملتی پھریں۔"

"تم لوگ میرا پیغام ان تک پہنچا سکتے ہو۔"

"ہمارے پاس کوئی ایسا پیامبر نہیں جو مادام تک تمہارا پیغام پہنچا سکے۔"

"تو پھر میری ملاقات محترم پاما کے روحانی سدرت سے کرا دی جائے۔"

"محترم سدرت وادی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" میں نے جھلا کر کہا "اور اگر تمہارے اس جھوٹ کی وجہ سے کسی کی جان گئی تو ذمہ دار صرف تم ہو گے۔ تم ایک ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو ہمیں محترم پاما کے دشمنوں کا سراغ دے سکتا ہے۔ تم اس شخص کی جان لے کر بالواسطہ محترم پاما کی زندگی بھی خطرے میں ڈال رہے ہو۔"

"ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔" خاوان نے غرا کر کہا "ہم جانتے ہیں کہ بھینٹ چڑھنے والے کا محترم پاما کے معاملات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔" خاوان نے سو فیصد درست بات کی تھی لیکن میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جون چاؤل کو بچانے کی کوشش جاری رکھوں۔ اسی دوران میں تہ خانے کا داخلی دروازہ کھلا اور ہمیں بیساکھی کی ٹھک ٹھک سنی۔ کوکی دادا اندر داخل ہوا۔ خاوان پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اس کی

پتھر کی طرح سخت اور غم ناک تھیں۔ اس وادی کے عام لوگوں کی طرح یہ شخص بھی ظالم اور بے حس تھا لیکن اس کے دل میں ایک نرم گوشہ بھی موجود تھا۔ اس گوشے میں کوکی دادا نے اپنی بیٹی کی محبت پال رکھی تھی۔ میں نے کوکی دادا کے اسی نرم گوشے کو چھیڑنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے کوکی دادا سے پوچھا "تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو دادا؟" وہ خاموش رہا اور مجھے گھورتا رہا۔ میں نے کہا "تم یہ سب اسی لیے کر رہے ہو نا کہ تمہارے دل میں اپنی بیٹی سابینہ کی محبت ہے۔ تم اسے دکھی نہیں دیکھ سکتے ہو۔ وہ ہر روز اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر اس شخص کا انتظار کرتی ہے جو اس کا جیون ساتھی ہے۔ تم اس کا انتظار، اس کا کرب اور اس کی مایوسی برداشت نہیں کر سکتے ہو۔ تم ایک جیتے جاگتے شخص کو دیوتا کی بھینٹ چڑھا رہے ہو۔ اس تمنا کے ساتھ کہ تمہاری بیٹی کی مشکلیں دور ہوں۔ بتاؤ، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

کوکی دادا کے ماتھے پر بل تھے۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا "ہاں یہی کر رہا ہوں میں۔ اب بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "کوکی دادا! اسی بستی میں ایک اور بیٹی بھی ہے۔ بالکل تمہاری بیٹی جیسی۔ اسی کی طرح لاچار اور غم زدہ بھی...... وہ بھی کسی سے پیار کرتی ہے۔ سابینہ کی طرح وہ بھی دن رات دہلیز پر کھڑی رہتی ہے اور ہر شام امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ جانتے ہو تمہاری بیٹی جیسی اس بیٹی کو کس کا انتظار ہے؟"

"کس کا؟" کوکی دادا نے مترجم کے ذریعے پوچھا۔

"اسی قیدی کا جسے تم کل پھانسی دے رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" کوکی دادا نے چونک کر پوچھا۔

"میرا مطلب تم سمجھ گئے ہو۔ جون چاؤل نامی یہ نوجوان جو تمہارے لیے قربانی کا جانور ہے، کسی کا محبوب ہے۔ کوئی اس کا نام لے لے کر جیتا ہے...... کیا تم چاہتے ہو کہ اس بے بس دوشیزہ کی آہ تم پر اور تمہاری بیٹی پر پڑے۔ جو اپنے محبوب کے انتظار میں ایک ایک پل گن رہی ہے۔ کیا تم اپنی سابینہ کا انتظار ختم کرنے کے لیے کسی دوسری سابینہ کو زندہ درگور کر دو گے؟"

کوکی دادا کے چہرے پر ہلچل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس کی فالج زدہ آنکھ خشک تھی لیکن دوسری آنکھ میں نمی تیرنے لگی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم میری طرف دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "کون ہے وہ لڑکی؟"

"جون چاؤل کی ساتھی کورین۔ وہ جون چاؤل کے ساتھ ہی قید ہو کر یہاں پہنچی تھی۔ اس کا نام فینگ من ہے۔"

وہ بولا "کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جسے آبے کے لیے دلہن بنا دیا گیا تھا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا "یہ وہی لڑکی ہے۔ اگر تم دیوتاؤں کو مانتے ہو تو تمہیں مان لینا چاہیے کہ تقدیر بھی اس کے ساتھ ہے۔ شادی کی رات آبے اپنے دشمن کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا اور فینگ من شادی کے نام پر پامال ہونے سے بچ گئی تھی۔ سنا ہے کہ اب وہ ڈاکٹر بشری کے گھر میں ہے۔"

مجھے کوکی دادا کی آنکھوں میں تبدیلی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی قدرے نرم پڑ گیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ایک اور چوٹ لگائی۔ میں نے کہا "کوکی دادا تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ جون چاؤل کنوارا ہے۔ وہ کنوارا نہیں ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ اپنی محبوبہ سے اس کا جسمانی تعلق رہا ہے۔ یہ لوگ جس قسم کے معاشرے میں رہتے ہیں وہاں ایسا تعلق قائم ہو جانا عام سی بات ہے۔" کوکی دادا حیرانی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا جون چاؤل نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کنوارا ہے؟"

"نہیں، اس نے انکار کیا تھا۔ لیکن قیدی اکثر ایسا کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھینٹ چڑھائے جانے والے ہیں اور وہ جان بچانے کے لیے اپنے کنوارے پن سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس مسئلے کا حل فال میں ہے۔ خاص طریقے سے پانچ مرتبہ فال نکالی جاتی ہے۔ اس فال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بھینٹ کے لیے منتخب ہونے والا جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔"

"کیا اس فال کا نتیجہ ہمیشہ درست ثابت ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھار کی قسم نہیں کھائی جاتی، بہرحال اکثر یہ فیصلہ درست ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "کوکی دادا! تو پھر یہ فیصلہ بھی "کبھی کبھار" کے زمرے میں آتا ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری فال غلط ہے۔ جون چاؤل تمہاری "بھینٹ کی شرائط" پر پورا نہیں اترتا۔"

کوکی دادا کی پیشانی پر گہری سلوٹیں تھیں۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ جون چاؤل کے زندہ بچنے کے قوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

○☆○

کوکی دادا نے جون چاؤل کو بھینٹ چڑھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ میرے اور صندور کے لیے خوشی کی بات تھی اور بہت بڑی کامیابی تھی۔ اگلے روز صبح سویرے مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میں نے صندور کی رہائی کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ خاوان (بڑے پجاری) کا کہنا تھا کہ میرا ساتھی (یعنی صندور) عبادت گاہ کا قیدی خادم ہے اور اس کی رہائی یا سزا کا فیصلہ بھی عبادت گاہ کی انتظامیہ ہی کرے گی...... میری رہائی بھی صرف اس لیے ہو رہی تھی کہ میرے بازو پر مرشد رپی موجود تھی۔

عبادت گاہ کے تہ خانے سے چھوٹ کر میں سیدھا مسز کیرولین کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی رہائش گاہ میں جسے تخت کہا جاتا تھا موجود تھی۔ کیرولین سے مجھے سخت شکوہ تھا۔ قریباً اڑتالیس گھنٹے گزرنے

کے باوجود اس نے مجھے چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کیرولین سے اس بارے میں پوچھا تو وہ حیران نظر آنے لگی۔ بولی "مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم کسی کام سے نکلے ہوئے ہو۔"

"آپ کو محترم صمد خان نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"بالکل نہیں۔" کیرولین نے کہا۔ پھر جیسے ایک دم اس کے ذہن میں ایک بات آئی بولی "کل صبح اس کا پیغام آیا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں مصروف تھی اس لیے مل نہ سکی۔ دوپہر کے بعد صمد خان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تمہارے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہے ورنہ میں فوراً ملتی۔"

میں نے کہا "چلو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب مسئلہ یہ ہے مادام کہ ہمیں ایک چھوٹی سی شناخت پریڈ کروانا ہوگی۔ شناخت پریڈ سمجھتی ہیں ناں آپ۔ پولیس والے یہ اصطلاح عام استعمال کرتے ہیں۔" مسز کیرولین نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "مادام! ایک شخص ایسا مجھے ملا ہے جو ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔ اس نے مقتول لڑکے خانوں کو لاپتا ہونے سے دو تین گھنٹے پہلے دیکھا تھا اور اس شخص کو بھی دیکھا تھا جو لڑکے کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے لڑکے کو جان سے مارا ہے۔ اگر ہم تمام مشکوک افراد کو ایک جگہ جمع کر کے شناخت پریڈ کروالیں تو مجرم پکڑے جانے کے قوی امکانات موجود ہیں۔"

کیرولین نے پوچھا "وہ شخص کون ہے جس نے لڑکے اور مشکوک بندے کو دیکھا تھا؟"

"اگر آپ برا نہ منائیں تو میں فی الحال اس کی شناخت چھپانا چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" مسز کیرولین نے کہا "مجھے تو صرف اس بات سے غرض ہے کہ میرے شوہر کی زندگی جلد سے جلد محفوظ ہو جائے۔ یقین کرو مسٹر شاد جہاں۔ اگر کچھ عرصہ مزید یہی صورت حال رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

میں نے کہا "پھر شناخت پریڈ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تینوں مشکوک افراد یعنی انجہانی تابے، سدوت اور کوگی وارا کے علاوہ بھی قریبی ساتھیوں اور کارندوں کو اس پریڈ میں شامل کیا جائے اور ان کے علاوہ بھی جن افراد پر کسی بھی طرح شبہ کیا جا سکتا ہے انہیں شامل کر لیا جائے۔"

کیرولین بولی "یہ کام تو میرے شوہر ہی کر سکتے ہیں۔"

میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا "لیکن وہ واپس کب آئیں گے؟"

کیرولین نے ایک طویل سانس لی اور اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی "مسٹر شاد جہاں! دراصل بات یہ ہے کہ پاناسہ کہیں نہیں گئے۔ وہ وادی میں ہیں۔ جانرو کے سب سے بڑے پجاری محترم خاران نے انہیں کچھ دن کے لیے روپوش ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ محترم خاران کی غیب دانی اس وادی میں مسلمہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ چاند راتوں میں چلّہ کاٹتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیش گوئی کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ پاناسہ پر اگلے بیس روز بہت بھاری ہیں۔ ان بیس پچیس دنوں کے لیے انہیں منظر سے ہٹ جانا چاہیے اور جانرو میں گوشہ نشین رہنا چاہیے کیوں کہ وہ امن و آشتی کی جگہ ہے۔ پاناسہ رضامند نہیں تھے اور اسے بزدلی سمجھ رہے تھے۔ بہرحال جانرو کے پجاریوں نے کہہ سن کر انہیں مجبور کر دیا۔"

"اب وہ کہاں ہیں؟"

"جانرو کی عمارت کے نیچے تہ خانے میں موجود ہیں۔ ان تہ خانوں کو دیوتاؤں کی آرام گاہ کہا جاتا ہے۔ پاناسہ بھی وہیں موجود ہیں۔ اگر تم ان سے ملنا چاہتے ہو تو میں تمہیں ایک تحریر دے دیتی ہوں۔ یہ تحریر جا کر جانرو کے منتظم کو دکھا دینا۔ وہ تمہارا پیغام پاناسہ تک پہنچا دے گا۔ اگر وہ تم سے ملنا چاہتے ہوں گے تو اندر بلا لیں گے......"

مسز کیرولین نے مجھے انگریزی میں تحریر لکھ دی۔ اس تحریر کے نیچے ویسی ہی مہر لگی تھی جیسی میری چرمی پٹی پر تھی۔ وہ بولی "اپنے مترجم صمد خاں کو ساتھ لے جاؤ۔ منتظم یہ تحریر از خود نہیں پڑھ سکے گا۔"

میں نے مسز کیرولین کا شکریہ ادا کیا۔ اسی دوران میں ننھی سانچا ماما ماما پکارتی اندر آ گئی اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کے معصوم چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ ماں کی ٹانگوں میں گھسنے لگی۔ میں نے اسے پیار کیا۔ اس کے بازو اور سر کی پٹی اب کھل چکی تھی "میرے پاپا کب آئیں گے؟" اس نے توتلی زبان میں پوچھا۔

"بہت جلد۔" میں نے جواب دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں جانرو کے ایک سجے سجائے تہ خانے میں پاناسہ کے روبرو موجود تھا۔ اس تہ خانے کو گرم رکھنے کے لیے دیواروں کو قالینوں سے ڈھانپا گیا تھا اور فرش پر بھی دبیز قالین تھے۔ پاناسہ نے ایک گاؤن پہن رکھا تھا اور پاؤں نصف پنڈلیوں تک ننگے تھے۔ وہ نیم دراز تھا اور اس کے سرہانے ایک ریڈیو بج رہا تھا۔ یقیناً اس تہ خانے میں موجود بہت سی دوسری چیزوں کی طرح یہ ریڈیو بھی لوٹ کے مال کا حصہ تھا۔ کمرے میں پاناسہ کے علاوہ تین چار خوب رو خادمائیں بھی موجود تھیں۔ ان خادماؤں کا تعلق جانرو سے تھا اور اس کا ثبوت وہ زرد اونی ٹوپیاں تھیں جو میں نے مولازموں کے سروں پر دیکھی تھیں۔ پاناسہ کے ننگے پاؤں ایک پرات نما برتن میں دھرے تھے اور ایک لڑکی انہیں کسی سبز محلول سے دھو رہی تھی۔ دوسری لڑکی پاناسہ کی پشت پر کھڑی تھی اور اس

کے کندھے دبا رہی تھی۔ یہ ساری لڑکیاں نو عمر تھیں اور کنواری تھیں۔ پاناسہ نے مجھے دیکھ کر گمبھیر لہجے میں کہا "ان لڑکیوں کی یہاں موجودگی کا کوئی غلط مطلب نہیں ہے۔ ان سب کو جانرو کے پجاریوں نے مجھ پر مسلط کر رکھا ہے۔ یہ کنواری دوشیزائیں ہیں۔ جانرو کے پجاریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کے گرد کنواری دوشیزائیں موجود ہوں وہ موت کے خطرے سے دور رہتا ہے۔"

"اور آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس نے دیوار پر لگی 270 بور وِنا ئفل کی طرف اشارہ کیا اور بولا "میرا خیال یہ ہے کہ جس کے پاس حوصلہ اور ہتھیار ہو موت اس سے دور رہتی ہے۔"

وہ بے شک بے خوفی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ انجانی موت کا خوف اسے گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔ اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور لہجے میں ایک خاص قسم کی مایوسی اور نقاہت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے نزدیک آنے والے ہر شخص کو شبے کی نگاہ سے دیکھتا ہو گا بلکہ بے جان چیزوں پر بھی بھروسا کرنا اس کے لیے دشوار ہو گا۔ وہ کسی قاتلانہ حملے میں مرجاتا تو شاید اتنے بڑے کرب سے نہ گزرتا۔ مگر اتفاق یہ ہوا تھا کہ اس پر مسلسل قاتلانہ حملے ہوئے تھے اور وہ مسلسل بچتا رہا تھا۔

میں نے کہا "محترم پاناسہ! میں آپ کے پاس ایک اچھی اطلاع لے کر آیا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ اچھی اطلاع بہت جلد خوش خبری میں بدل جائے گی۔"

پاناسہ نے وضاحت چاہی۔ میں نے پچھلے پانچ روز میں پیش آنے والے تمام واقعات بے کم و کاست بیان کر دیے۔ میں نے پاناسہ کو بتایا کہ میرا ساتھی صفدر اس شخص کو دیکھ چکا ہے جو مقتول لڑکے کے ساتھ آخری روز دیکھا گیا تھا اور وہ اسے پہچان سکتا ہے۔ پاناسہ کی گہری سلیٹی آنکھوں میں امید کی کرنیں نمودار ہو گئیں۔ اس نے میری درخواست پر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک حکم نامہ لکھ دیا۔ اس حکم نامے کی رو سے وادی کے تمام مقام سرداروں کو پابند کیا گیا کہ وہ ان تمام افراد کو ایک جگہ جمع کرنے کا انتظام کریں جن کے بارے میں میں کہوں۔

میں نے پاناسہ سے کہا "میرا ساتھی ابھی تک محترم خاران کی تحویل میں ہے۔ اسے آزاد کرنے کا حکم بھی جاری کیا جائے۔"

پاناسہ نے کہا "میں جانرو کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ بہرحال میں تمہارے ساتھی کے لیے خصوصی ہدایت جاری کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے خاران اسے نظرانداز نہیں کرے گا۔"

پاناسہ کا حکم نامہ لے کر میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔ صفدر کو آزاد کرانے میں مجھے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اس کے بعد ہم وادی کے تمام مقام سرداروں یا قبیلہ نما خاران کے پاس پہنچ گئے۔ اسی روز سہ پہر کے وقت ہم وہ "شناخت پریڈ" منعقد کرانے میں کامیاب ہو گئے جس کے لیے یہ ساری بھاگ دوڑ کی گئی تھی۔ شناخت پریڈ میں قریباً سائٹھ افراد شامل کیے گئے تھے۔ ان میں تابے، سدوت اور کوگی وارا کے متعلق دار تھے۔ اس کے علاوہ بھی وادی کے چند جرائم پیشہ افراد شامل تھے۔ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شناخت کون کرے گا۔ صفدر کا نام میں نے جان بوجھ کر راز میں رکھا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ صفدر کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ مجرم جو کوئی بھی تھا ہمارے درمیان ہی موجود تھا۔ وہ صفدر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

تمام افراد کو تین قطاروں میں کھڑا کیا گیا تھا۔ عین موقع پر میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر ایک قطار کے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر دوسری قطار کی طرف چلا گیا۔ وہ کسی کسی شخص کے سامنے رک جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوپی تھی۔ وہ ٹوپی اس شخص کے سر پر پہناتا۔ مختلف زاویوں سے اسے دیکھتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ دوسری قطار کا معائنہ بھی مکمل ہو گیا۔ اب ہماری ساری امیدیں آخری قطار سے تھیں۔ صفدر نے ایک طائرانہ نظر سے پوری قطار کا جائزہ لیا۔ پھر ایک ایک چہرے کو دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ میں بڑی بے چینی سے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ معائنہ مکمل کرنے کے بعد صفدر چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے میری طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"شناخت پریڈ" ناکام ہو گئی تھی۔ جس شخص کی ہمیں تلاش تھی وہ ان لوگوں میں نہیں تھا۔ پاناسہ کا دوست سدوت برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے ملازموں اور قریبی ساتھیوں کو شناخت پریڈ میں شامل کر کے اس کی توہین کی گئی ہے۔ وہ بار بار اپنی اور پاناسہ کی بے داغ اور بے مثال دوستی کا حوالہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف کوگی وارا کا پارا بھی عروج پر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پاناسہ نے اس کے خلاف کھلی جنگ شروع کر دی ہے اور اس جنگ کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ صفدر نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا لیکن اس شناخت پریڈ میں ایک چھوٹا سا کام مجھے بھی کرنا تھا۔ شناخت پریڈ میں شامل افراد کی تینوں قطاریں اپنی جگہ موجود تھیں۔ میں نے ان افراد کے سامنے سے گزرنا شروع کیا۔ میں ہر شخص کا لباس اوپر اٹھاتا۔ اس کے سینے پیٹ اور گردن کا معائنہ کرتا اور آگے بڑھ جاتا۔ مجھے ان خونی خراشوں کی تلاش تھی جو مقتول لڑکے نے ایک انمٹ ثبوت کی طرح اپنے قاتل کے جسم پر چھوڑی تھیں۔ اگر وہ خراشیں مل جاتیں تو اس واردات کا ایک اہم ترین سراغ ہاتھ لگ جاتا۔۔۔۔ تمام افراد کا معائنہ کرنے میں مجھے قریباً ایک گھنٹا لگا لیکن یہ ساری محنت رائیگاں گئی۔ مطلوبہ نشانات کسی جسم پر نظر نہیں آئے۔

○☆○

جون چارلس رہائش دیوتا کی بھینٹ چڑھنے سے تو بچ گیا تھا لیکن اسے آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدستور کوکی رادا کا غلام تھا۔ کوکی رادا نے اس پر بہت بھاری رقم خرچ کی تھی' وہ یہ رقم وصول کیے بغیر اسے کسی اور کی تحویل میں نہیں دے سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب جون چارلس کسی بھی صورت ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔ اسی سلسلے میں صفدر سے مشورہ کرنے کے لیے میں جاترو (عبادت گاہ) کی طرف جا رہا تھا۔ میں ایک تنگ سی سنسان گلی سے گزر رہا تھا جب ایک لڑکی پیچھے سے بھاگ کر آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ نینگ ہن تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ وہ میری پشت سے چمٹے چمٹے بولی "شاہ جہاں صاحب! آپ ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آپ نے جون چارلس کو بچا کر جو احسان مجھ پر کیا ہے میں وہ زندگی بھر بھول نہیں سکوں گی۔"

میں نے بمشکل اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا "بھلی مانس! مجھے بانس پر مت چڑھاؤ۔ رحمت کا فرشتہ تو بہت دور کی بات ہے' میں تو ٹھیک سے انسان بھی نہیں ہوں۔ تم ابھی میرے بارے میں جانتی ہی کیا ہو۔"

وہ بولی "میں جو جانتی ہوں وہی بہت ہے۔ انکل ہنری نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ نے جون چارلس کو اس وقت بچایا جب وہ قربان گاہ پر لٹایا جانے والا تھا۔ آپ نہ ہوتے...... آپ نہ ہوتے تو میں بھی اب تک جون چارلس کے ساتھ مر چکی ہوتی۔" اس کا گلا رندھ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہم سرِعام کھڑے تھے۔ میں نے اسے بمشکل چپ کرایا۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی ایک قریبی دروازے میں گھس گئی۔ یہ ڈاکٹر ہنری کے مکان ہی کا دروازہ تھا۔

میں دھیمے قدموں سے چلتا جاترو کے وسیع و عریض احاطے میں پہنچ گیا۔ صفدر یہیں مقیم تھا۔ اب وادی کی شام ہو چکی تھی۔ سورج ننگا پربت کے برف پوش سلسلے کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ ہڈیوں کا گودا جما دینے والی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اتر رہے تھے۔ ان ریوڑوں کی رکھوالی پہاڑی کتے کر رہے تھے۔ کہیں کہیں کھلا ڈلا بردا دھچوا بے بھی نظر آ رہے تھے۔ احاطے میں ابھی چہل پہل تھی۔ اس وادی کے بہت سے لوگ اب مجھے جاننے لگے تھے۔ میری شناخت کے دو حوالے تھے۔ ایک تو گھوڑا گاڑی والا واقعہ جس میں، میں نے ننھی سانجا کی جان بچائی تھی اور دوسری وہ مرشدہ پٹی جو میرے بازو سے بندھی رہتی تھی۔ صفدر مجھے جاترو کے عقبی احاطے میں مل گیا۔ یہ جان کر مجھے دھچکا لگا کہ اس کے پاؤں سے پھر آہنی گولا باندھ دیا گیا ہے۔ وہ ایک جگہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا "یہ کیا ہے؟" میں نے آہنی گولے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا "جناب! میری جگہ زریں گل ہوتا تو کہتا نوکر ہاروز آداب غلامی ہے ابھی۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تمہیں چار روز پہلے والی مستی کی سزا دی گئی ہے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہے...... اور میرے خیال میں یہ سزا بھی ہے۔ شاید پاناما کا لحاظ کیا گیا ہے۔ ورنہ جاترو کے پجاری قصور وار لوگوں کی کھال اتار لیتے ہیں اور یہ بات میں کلوڈ دیتا نہیں حقیقتاً کہہ رہا ہوں۔ وہ دو نقارے جو سامنے پڑے ہیں ان پر انسانی کھال منڈھی ہوئی ہے۔"

میں غیر ارادی طور پر نقاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر ہم ان انوکھے نقاروں کی بات کرتے رہے پھر گفتگو کا رخ جون چارلس اور اس کے آقا کوکی رادا کی طرف مڑ گیا۔ صفدر اس حوالے سے میرا ہم خیال تھا کہ جون چارلس کو اب ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے۔ وہ ہمارا گوہرِ مقصود تھا۔ وہ نوادرات اور زر و جواہر کے ایک عظیم الشان ذخیرے کا رازدار تھا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک صفدر بری طرح چونک گیا۔ اس کی نگاہ ایک سمت میں مرکوز تھی۔ کوئی شخص بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا اور صفدر کی نگاہ اس کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ ایک دم وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ہیجانی کیفیت میں اس نے قدم اٹھانے کی کوشش کی لیکن زنجیر نے کھٹک کر اسے احساس دلایا کہ وہ آزاد نہیں ہے۔

"کیا بات ہے صفدر؟" میں نے اس کا شانہ تھاما۔

"شاہ جہاں صاحب۔ اس شخص کے پیچھے جائیں۔" صفدر نے کانپتے لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی بیرونی دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

میں نے صفدر کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ اب شام گہری ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ بیرونی دروازے کے قریب مجھے ایک ہیولا نظر آیا۔ وہ درمیانی رفتار سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ باہر نکل گیا۔ صفدر نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! یہی ہے وہ شخص۔"

میں صفدر کو چھوڑ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہ شخص ایک درخت سے اپنا گھوڑا کھول رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام تھام کر وہ پیدل ہی ایک طرف چل دیا۔ پہلے تو میرے دل میں آئی کہ بھاگ کر اسے دبوچ لوں۔ لیکن پھر سوچا' دیکھنا چاہیے کہ وہ جا کہاں رہا ہے۔ وہ سر تا پا گرم لباس میں لپٹا ہوا تھا۔ سر پر بھی اونی ٹوپی تھی۔ بھاری بھرکم کپڑوں کی وجہ سے اس کے ڈیل ڈول کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یخ بستہ ہوا میں سکڑے سمٹے راہ گیر اپنی اپنی منزلوں کی طرف گامزن تھے۔ اونی ٹوپی والا اپنے حال میں مگن گھوڑے کی لگام تھامے چلا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رخ

سرنگ کی طرف ہے۔ سرنگ کا دہانہ گہری تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ پہرے دار اپنی اپنی جگہوں پر چوکس کھڑے تھے۔ وہ شخص سرنگ میں داخل ہو گیا' میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ سرنگ کے اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں روشنی کرنے اور آگ جلانے کی اجازت تھی۔ پاناما کی رہائش گاہ "تخت" بھی اسی حصے میں واقع تھی۔ سرنگ میں ایک مقررہ مقام پر اس شخص نے اپنا گھوڑا لکڑی کے بلے کے ساتھ باندھ دیا اور پیدل آگے بڑھنے لگا۔ میں بڑی احتیاط سے اس کا تعاقب جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خدشہ جاگا کہ کہیں یہ شخص پاناما کو نقصان پہنچانے تو نہیں جا رہا۔ لیکن پھر فوراً مجھے یاد آیا کہ پاناما تو جاترو کے تہ خانے میں مقیم ہے۔ وہ شخص ان رہائشی کمروں کی طرف چلا گیا جو پاناما کی رہائش گاہ کی پشت پر واقع تھے۔ ان کمروں میں پاناما کے قریبی ساتھی اور مشیر وغیرہ قیام کرتے تھے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ اس شخص کی صورت دیکھ لوں لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

میں اس کمرے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ یہ سرنگ کا وہ علاقہ تھا جہاں روشنی اور آگ کی پابندیاں نہیں تھیں۔ یہاں پاس ہی بستی کا واحد جوا خانہ موجود تھا اور وہ تماشا گاہیں بھی جہاں گانا بجانا ہوتا تھا اور ناٹک دکھائے جاتے تھے۔ اس وقت بھی ایک قریبی تماشا گاہ کی جانب سے میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ اس میوزک کے ساتھ کچھ لوگ وحشیانہ انداز میں ہاؤ ہو کر رہے تھے (یہاں کے دو مخصوص ساز تنبل اور سرنا تھے لیکن انہیں اتنے بے ڈھنگے طریقے سے بجایا جاتا تھا کہ ان کا سارا حسن غارت ہو جاتا تھا) بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بھی کبھی کبھی نتھنوں سے ٹکرا جاتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا اور اس شخص کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا جو کمرے میں گھس گیا تھا۔ میں دو تین بار اس بند دروازے کے سامنے سے گزرا۔ یہاں صرف ایک کھڑکی تھی جو اندر سے بند تھی۔ کمرے میں چراغ یا لالٹین کی مدھم روشنی موجود تھی۔ کبھی کبھی کھٹ پٹ کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ یہ امکان بھی موجود تھا کہ جو شخص اندر گھسا تھا وہ اسی کمرے میں رہتا ہو اور اب صبح تک یہیں گھسا رہے۔ میرے دل میں آئی کہ کیوں نہ اپنے مترجم صدر خان کی طرف جاؤں اور اس سے دریافت کروں کہ اس کمرے میں کون رہائش پذیر ہے۔ لیکن اس میں یہ خطرہ موجود تھا کہ میری غیر موجودگی میں وہ شخص یہاں سے نکل کر چلا جائے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔

میرا انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی لیکن وہ شخص باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دھیرے دھیرے قرب و جوار میں خاموشی چھانے لگی۔ جس راہداری میں، میں کھڑا تھا وہ بھی بالکل سنسان ہو گئی۔ تماشا گاہ کی طرف سے جو تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی وہ بھی معدوم ہو گئی۔ قمار خانے کا رخ دوسری طرف تھا لہٰذا وہاں کی روشنی اس راہداری تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کمرے کی بتی بھی بجھ گئی جہاں میرا مطلوب شخص داخل ہوا تھا۔ میں گھٹاٹوپ تاریکی میں دبے پاؤں دروازے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ دروازے کے نیچے ایک درز موجود تھی۔ میں اوندھے منہ فرش پر لیٹ گیا اور اپنا کان اس درز کے بالکل قریب پہنچا دیا۔ رات کے سناٹے میں مجھے کمرے کے اندر سے کچھ آوازیں ابھرتی محسوس ہوئیں۔ یہ ایک مرد اور عورت کی آوازیں تھیں۔ دونوں بہت آہستہ بول رہے تھے لہٰذا آوازیں شناخت کرنا مشکل تھا۔ عورت کی دبی دبی ہنسی ابھری "نہیں پلیز...... بس اب میں جاتی ہوں۔"

"مگر تھوڑی دیر......" ایک بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

چند لمحے بعد عورت پھر منمنائی۔ اس کے الفاظ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آئے۔ حیران کن طور پر یہ سرگوشیاں انگلش زبان میں ہو رہی تھیں۔ میں درز سے کان لگائے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اندر مرد اور عورت کی وہی صدیوں...... صدیوں پرانی مصروفیت جاری تھی۔ مجھے اس "مصروفیت" سے کوئی غرض نہیں تھی اور ویسے بھی ایسی خوش فعلیاں اس نیم وحشی بستی میں انوکھی بات نہیں تھیں۔ مجھے صرف اس شخص سے غرض تھی جو اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور جس کے بارے میں صفدر نے یہ سنسنی خیز شک بیان کیا تھا کہ یہ شخص خانوں کا قاتل ہے۔

اب میرے لیے مزید انتظار ممکن نہیں تھا۔ میں فرش سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دم اندر سے ہلچل کی آوازیں آئیں۔ لیکن کسی نے دستک کا جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک بار پھر دروازے پر طبع آزمائی کی۔ اس مرتبہ چند لمحے کے وقفے کے بعد کسی نے بھاری آواز میں کچھ کہا۔ بولنے والے شخص نے مقامی زبان استعمال کی تھی لہٰذا میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا...... یہ آواز کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ اسی اثنا میں کمرے میں روشنی ہوئی اور دروازہ کھول دیا گیا۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ میرا مترجم صدر خان تھا۔ نوجوان خوب رو صدر خان' جس کے بارے میں میرا تجزیہ تھا کہ وہ عورتوں کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔ صدر خان نے مجھے بے حد حیرت سے دیکھا۔ اس حیرت میں ہلکا سا خوف بھی شامل تھا۔

"آپ یہاں؟" اس نے اردو میں کہا۔

"تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں؟" میں نے اجنبی لہجے میں کہا۔

"ہم...... میں اکیلا ہوں لیکن آپ کیوں...... پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے دیکھا' صدر خان نے پتلون پہن رکھی تھی لیکن بالائی جسم عریاں تھا اور اس عریانی کو ڈھانپنے کے لیے اس نے کندھوں پر

ایک بڑا سا تولیہ ڈال لیا تھا۔ میں نے صدر خاں کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں مہک تھی۔ میرا دھکا لگتے ہی صدر خاں لڑکھڑا گیا اور اس نے ایک تپائی کا سہارا لیا۔ سہارا لینے کی کوشش میں تولیہ اس کے کندھوں سے ڈھلک گیا تھا۔ اس کا بالوں بھرا جسم لالٹین کے بالکل سامنے تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔ میں ایک چیز دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ صدر خاں کے سینے پر دائیں طرف چار گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ خراشیں کسی کے ناخنوں سے آئی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی صدر خاں کے جسم پر چند چھوٹی بڑی خراشیں موجود تھیں۔۔۔ میرا ذہن سنسنا اٹھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کمرے میں میری ملاقات صدر خاں سے ہو گی اور میں اس کے جسم پر خانوں کے قتل کا ناقابلِ تردید ثبوت دیکھوں گا۔ ایک دم صدر خاں کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کے سینے کی خراشوں پر غور کر رہا ہوں۔ اس نے جلدی سے تولیہ دوبارہ کندھے پر درست کرنا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری بھرپور ٹانگ اس کے سینے پر پڑی اور وہ اچھل کر کمرے کے وسط میں جا گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ اس کے جسم میں خاصی قوت تھی۔ اس نے میرے نیچے سے نکلنے کی زبردست کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنا ہاتھ لکڑی کے اس چوکے کے نیچے گھسانے کی کوشش کر رہا ہے جس پر اس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا وہاں ایک رائفل پڑی تھی۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے رائفل دور دھکیل دی پھر صدر خاں کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میں اسے مکہ رسید کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے پہلو بدل گیا۔ اس کا گھٹنا میرے سینے سے ذرا نیچے لگا اور میں تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ بڑی نازک چوٹ تھی۔ بالکل یوں محسوس ہوا کہ سانس بند ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی ایک ٹھکانے کی چوٹ ہی بندے کو مٹی کا ڈھیر کر دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا تھا۔ میں تیورا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں سانس کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سانس پھیپھڑوں میں داخل نہیں ہو رہا تھا۔ مدمقابل نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور وار کیا اور میری گردن پوری قوت کے ساتھ اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لی۔ اس کی رگوں میں ایک وحشی قبیلے کا وحشی خون دوڑ رہا تھا۔ بے پناہ سخت تھی اس کی گرفت۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ گئیں اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میں کبھی سانس نہیں لے سکوں گا۔ ذہن میں ایک دم تاریکی سی چھانے لگی تھی۔ میں نے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اچانک میرا ہاتھ اس بالی پر پڑ گیا جو صدر خاں نے مقامی دستور کے مطابق کان میں پہن رکھی تھی۔ چاندی یا سونے کی یہ موٹی بالی کان کے نچلے حصے کی بجائے عین درمیان میں پروئی جاتی تھی۔ جونہی میری انگلیاں اس بالی میں داخل ہوئیں۔ میں نے بالی کو پورے زور سے کھینچا اور صدر خاں کا کان چرتا چلا گیا۔ شدت کرب سے وہ کراہ اٹھا۔ اس کی گرفت میری گردن پر خود بخود ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے اس کے پیٹ میں ایک طاقت ور گھونسا رسید کیا اور اپنی گردن چھڑا لی۔ گردن چھوٹتے ہی میرا سانس بحال ہو گیا تھا۔ صدر خاں کی بالی اب میرے ہاتھ میں تھی اور اس کے کان سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس نے بدحواسی میں مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں نے باآسانی یہ وار بچا کر اس کے جبڑے پر دائیں اور بائیں ہاتھ سے دو گھونسے رسید کیے۔ ان مسلک مکوں کی "مہربانی" سے وہ چاروں شانے چت فرش پر گر گیا۔ میں نے چوکے کے نیچے گھس کر رائفل نکال لی۔ یہ خطرناک رائفل "اے کے 56" تھی اور لوڈ تھی۔ میں نے کیچ ہٹا کر رائفل کی سرد نال صدر خاں کی پیشانی پر رکھ دی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا چلا گیا۔

"یہ لڑکی کون تھی تمہارے ساتھ؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کون۔۔۔ کون لڑکی؟" صدر خاں نے حیران نظر آنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے چہرے پر ٹھوکر لگائی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ کمرے میں ایک اور دروازہ بھی موجود تھا۔ یہ دروازہ اب کھلا تھا۔ لڑکی یا عورت اسی دروازے سے نکل کر گئی تھی۔ میں نے رائفل صدر خاں کی طرف سیدھی رکھی اور دروازے میں سے جھانکا۔ یہاں ایک اور کمرہ نظر آ رہا تھا اور وہ بھی بالکل خالی تھا۔ یقیناً لڑکی اس دوسرے کمرے کے بیرونی دروازے سے نکل بھاگی تھی۔

میں نے کمرے کے دونوں دروازے اندر سے بند کر لیے اور صدر خاں کو حکم دیا کہ وہ اٹھ کر لکڑی کے چوکے پر بیٹھ جائے۔ اس کے کان سے خون ٹپک ٹپک کر اس کے بالوں بھرے کندھے اور بازو کو بھگو رہا تھا۔ لمبے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "صدر خاں تم خانوں کے قاتل ہو۔ تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس قتل کا اعتراف کر لو اور پھر یہ بھی بتا دو کہ تم محترم پانامہ کی جان کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو۔۔۔؟"

"تم۔۔۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ ٹھیک نہیں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں کسی کی جان لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور۔۔۔ محترم پانامہ کی جان کا دشمن میں کیوں بنوں گا۔ وہ تو میرے آقا ہیں میرے ولی نعمت ہیں۔"

"تم نے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔ شاید تم ان خراشوں کی وجہ سے شبہے میں پڑ گئے ہو۔" اس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ خراشیں تو۔۔۔"

"خاموش" میں نے اسے جھاڑا "مجھے کچھ بتانے کی ضرورت

نہیں۔ کچھ بھی نہیں بتاؤ مجھے۔۔۔ اگر کچھ کہنا چاہتے ہو تو خانوں کے قتل کا اعتراف کر لو۔" مجھ پر وہی وحشت سوار ہوتی جا رہی تھی جو مجھے شاہ جہاں سے جانی استاد بناتی تھی اور اپنی بے رحمی پر خود مجھے بھی افسوس ہونے لگتا تھا۔

صدر خاں اپنی بات پر اڑا رہا۔ وہ اس تبدیلی سے بے خبر تھا جو میرے اندر رونما ہو رہی تھی۔ میں رائفل سمیت اٹھ کر اس کے عقب میں گیا اور پھر ایک دم اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے مخصوص داؤ میں جکڑ لی تھی۔ وہ شکنجے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ میں نے گردن پر دباؤ ڈالا تو اس کے حلق سے خرخر کی کربناک آواز نکل گئی۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز ندارد تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی ہیں اور پیشانی کی نس پھٹ پڑنے کے قریب ہے۔

"بتاؤ تم نے لڑکے کو قتل کیا یا نہیں؟"

اس نے ایک بار پھر چیخنا چاہا لیکن اس کی سانس سینے میں گم ہو چکی تھی اور ہونٹ نیلے پڑنے جا رہے تھے۔ اگلے دس بارہ سیکنڈ صدر خاں کی زندگی کے کربناک ترین لمحات تھے "بتاؤ تم نے لڑکے خانوں کو قتل کیا یا نہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

صدر خاں کے نیلے ہونٹوں کے درمیان سے جھاگ نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی سخت کوشش کر کے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔۔۔

میں نے اس کی گردن پر سے گرفت ذرا سی نرم کی۔ ایک پھنسی پھنسی چیخ نما آواز کے ساتھ ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک سیکنڈ بعد گرفت پھر سخت کر دی۔

"کیا اس لڑکے نے تمہارے کہنے پر گھوڑا گاڑی خراب کی تھی؟"

صدر خاں کے ہونٹ لرزے اور اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہاں تمہارے ساتھ موجود لڑکی کون تھی؟ جواب دو کون تھی؟"

میں نے اندازہ لگایا کہ اس سوال کا جواب صدر خاں کے لیے خاصا مشکل ہے۔ اس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ ہراس نظر آنے لگا تھا۔

میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھایا "جواب دو۔"

صدر خاں کا منہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کے منہ کی طرح کھلا تھا۔ وہ ایک سانس کے لیے تڑپ رہا تھا۔ زندگی بخش ہوا اور صدر خاں کے پھیپھڑوں کے درمیان میرا بازو حائل تھا۔ میں اس کی مطلوبہ ہوا اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے میرے سوال کا جواب درکار تھا۔ موت کو اپنے روبرو دیکھ کر صدر خاں نے اپنے لب ہلائے۔ وہ بولنا چاہ رہا تھا۔ میں نے گرفت ذرا نرم کی۔ صدر خاں

جادو نگار

ایم۔ اے راحت

کے قلم کی جادوگری

باغی

ایک بیٹے کی کہانی جس نے ماں کی توہین کرنے والے باپ کو آنسوؤں کا سبق دیا۔ آنسوؤں اور قہقہوں کی آغوش میں رقصاں دلچسپ داستان جسے شروع کر کے آپ آخری سطر تک پڑھے بغیر نہ رہ سکیں گے

دو حصوں میں مکمل سیٹ -/80

پارس

اپنی تلاش میں سرگرداں ایک سرپھرے کا فسانۂ عجیب

عشق، جرم اور جنون کی ہنگامہ خیز یادگار

مکمل -/45

ایم اے راحت

کے قلم سے دونوں ناول شائع ہو چکے ہیں

ڈاک خرچ فی کتاب -/16 روپے۔ تینوں کتب اکٹھی منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔ نوٹ: رقم پیشگی ارسال کریں

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

20۔ عزیز مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور فون 7247414

اسٹاکسٹ

علی بک اسٹال

چوک میو ہسپتال۔ نسبت روڈ لاہور

فون: 7223853

کے حلق سے ناقابلِ شناخت آواز برآمد ہوئی۔ وہ کسی کا نام لے رہا تھا۔۔۔ میں نے غور کیا تو یہ نام میری سمجھ میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ مسز کیرولین کا نام لے رہا تھا۔۔۔ پاماسہ کی چہیتی بیوی۔ اس کی بچی کی ماں۔ پاماسہ کی زندگی کے بارے میں ہر آن فکرمند رہنے والی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یقین نہیں آیا کہ اس کمرے میں جو نسوانی خوشبو ہے وہ مسز کیرولین کی ہے' اس بستر پر جو سلوٹیں ہیں وہ مسز کیرولین کے جسم سے بنی ہیں۔

میں نے صدر خاں کی گردن چھوڑ دی۔ وہ لڑکھڑا کر دھڑام سے بستر پر گرا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ وہ ابکائیاں لے رہا تھا اور اس کے حلق سے لیس دار مادہ برآمد ہو رہا تھا۔ میں رائفل تھام کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس ذرا بحال ہوئی تو وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ وہ خاصا سخت جان شخص تھا' اس کا یوں رونا عجیب لگ رہا تھا۔ بہرحال میں نے اسے رونے دیا۔ اس کے دل کا غبار ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور کان سے خون رس رہا تھا۔ وہ جانتا تھا' میرے ہاتھ میں برسٹ مارنے والی رائفل ہے اور میری انگلی کے ایک اشارے پر اس کا جسم چھلنی ہو جائے گا۔ مجھے مسز کیرولین کا وہ انداز یاد آ رہا تھا جب اس نے صدر خاں کو بطور مترجم میرے ساتھ لگایا تھا۔ اس وقت میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیرولین اور صدر خاں اس سازش کے بنیادی کردار ہیں۔

میں نے کہا "صدر خاں! اب جب کہ تم نے تسلیم کر لیا ہے کہ کیرولین ایک بے وفا عورت ہے اور اس نے تمہارے ساتھ مل کر پاماسہ کو قتل کرنے کی سازش کی ہے۔۔۔۔ کیا تم میرے چند سوالوں کا جواب دینا پسند کرو گے؟"

وہ اپنی سرخ گردن مسلتا رہا اور نم ناک نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے سوال کا جواب دے گا۔ درحقیقت وہ ذہنی طور پر ہتھیار پھینک چکا تھا اور جان چکا تھا کہ میرے شکنجے سے بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ اب اس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ ہر طرح کی مزاحمت ترک کر دے۔

میں نے پوچھا "خانوں نے تمہارے اور کیرولین کے کہنے پر ہی گاڑی کے نٹ بولٹ ڈھیلے کیے تھے؟"

"ہاں" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

"کتنی رقم دی تھی تم نے اسے؟"

"سو پال" (پال سے مراد ایک فیروزی پتھر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ایک فیروزی پتھر کی قیمت تقریباً پانچ روپے تھی)

میں نے کہا "کیرولین خود بھی لڑکے خانوں سے ملی تھی؟"

"ہاں ایک مرتبہ ملی تھی۔ لیکن ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ جس وقت خانوں نے واردات کی اور گاڑی کو حادثہ پیش آیا' کیرولین کی اکلوتی بچی سانچا بھی گاڑی میں موجود تھی۔ کیرولین نے واردات کے روز بچی کو پاماسہ کے ساتھ کیوں جانے دیا؟"

"یہ کیرولین کی نہیں' خانوں کی غلطی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"پروگرام کے مطابق خانوں کو ایک دن بعد کارروائی کرنا تھی۔ مگر اچھا "موقع" دیکھ کر وہ پہلے ہی یہ کام کر گزرا۔"

یہ ایک عجیب اتفاق ہوا تھا۔ مقتول لڑکے خانوں سے جو غلطی ہوئی اس کی وجہ سے تفتیش کا رخ بالکل غلط سمت میں مڑ گیا۔ اپنے شوہر کی دشمن کیرولین میرے آس پاس موجود رہی لیکن میں یہ سوچ کر اس پر شک نہ کر سکا کہ وہ شوہر کے ساتھ اپنی لاڈلی بچی کو موت کے منہ میں کیسے دھکیل سکتی ہے۔۔۔۔؟

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرم اپنی غلطیوں کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں لیکن یہاں یہ ہوا کہ مجرموں کی ایک غلطی کی وجہ سے ان کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔

میں نے صدر خاں سے پوچھا "کیرولین نے اپنے شوہر کے دوست سدرت کو پھنسانے کی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ اس کا سبب کیا تھا؟"

"میں اس بارے میں ٹھیک سے کچھ نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شروع سے ایک دوسرے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ۔۔۔۔"

اچانک صدر خاں خاموش ہو گیا۔ میں بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی نے مدھم انداز میں دستک دی تھی۔ میں نے رائفل صدر خاں کی طرف سیدھی کی اور سرگوشی میں کہا "پوچھو کہ کون ہے اور خبردار کوئی چالاکی مت دکھانا۔"

صدر خاں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مقامی زبان میں پوچھا کہ کون ہے۔

جواب میں کسی شخص نے پشتو آمیز اردو میں کہا "یہ میں ہوں زمانی۔"

صدر خاں کا زرد رنگ کچھ اور زرد پڑ گیا۔ میں نے کہا "صدر خاں! میں ساتھ والے کمرے میں ہوں۔ یاد رکھو تمہاری ایک غلط حرکت تمہارے جسم میں دو درجن روشن دان بنا دے گی۔۔۔۔ چلو دروازہ کھولو۔"

صدر خاں نے مرے مرے انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی تمام تن فن ختم ہو چکی تھی "چلو کھولو دروازہ۔" میں نے پھنکار کر کہا۔

صدر خاں اپنے زخمی کان کو مفلر سے ڈھانپ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ساتھ والے تاریک کمرے میں گھس گیا۔ درمیانی

دروازہ میں نے تھوڑا سا کھلا رہنے دیا تھا۔

دروازہ کھولنے سے پہلے صدر خاں نے بستر پر جھک کر کوئی چیز اٹھائی اور جیب میں ڈال لی۔ یہ بالوں میں لگانے والا ایک کلپ تھا جو "بھاگنے والی" چھوڑ گئی تھی۔ صدر خاں نے تھکے ہارے انداز میں دروازے کی کنڈی گرائی۔ جونہی دروازہ کھلا' ایک چمکیلی آنکھوں والا شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے سر کی زرد ٹوپی دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ عبادت گاہ سے آیا ہے۔ آنے والے کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس کے چہرے کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی ناک کٹی ہوئی تھی اور کٹی ہوئی ناک کے بدنما سوراخ کو چھپانے کے لیے اس نے چہرے کی ایک پٹی چہرے پر باندھ رکھی تھی۔ ایسے دو تین افراد میں نے پہلے بھی اس وادی میں دیکھے تھے۔ یہاں زنا کی سزا ناک کاٹنا بھی تھی۔

ناک کٹے شخص نے اندر آتے ہی کہا "کام ہو گیا جی۔۔۔۔ ابھی ایک گھنٹے میں آپ کو خبر مل جائے گی۔"

اس کے لہجے میں عجیب سی لرزش تھی۔ میرا دھیان فوراً پاماسہ کی طرف چلا گیا۔ پاماسہ عبادت گاہ میں تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا' پاماسہ کی زندگی خطرے میں ہے۔

میں نے دروازے کو ٹھوکر رسید کی اور رائفل سمیت کمرے میں گھس آیا۔ مجھے دیکھ کر "ناک کٹے" شخص کا منہ بھاڑ کی طرح کھل گیا۔ وہ کبھی حیرت سے صدر خاں کی طرف دیکھتا تھا کبھی میری طرف۔ صدر خاں مجرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ میں نے رائفل کی نال ناک کٹے شخص کے سر سے لگائی اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم نے کیا کیا ہے پاماسہ کے ساتھ؟ کہاں ہے پاماسہ؟"

"پپ۔۔۔ پاماسہ۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تمہارا والد صاحب بھی بتائے گا۔" میں نے کہا اور رائفل کا دستہ زور سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور بے حد دہشت زدہ نظر آنے لگا۔

صدر خاں پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ شاید وہ ابھی تک یہی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں کسی ہوئی ہے۔ میں ان دونوں کو رائفل کے زور پر کمرے سے باہر لے آیا۔ رات کے اس پہر سرنگ میں تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ شراب خانے کی طرف سے ابھرنے والا شور بہت مدھم پڑ چکا تھا۔ میں نے کمرا چھوڑنے سے پہلے ایک گرم چادر کی بکل اوڑھ لی تھی اور "اے کے 47" رائفل اس چادر میں چھپ کر رہ گئی تھی۔ سرنگ کے دہانے تک ہماری کسی سے مڈھ بھیڑ نہیں ہوئی۔ سرنگ سے باہر شدید سردی تھی۔ پرتلیوں والے پُراسرار درخت تلے دو گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک گھوڑا گاڑی وہی تھی جس پر ناک کٹا شخص عبادت گاہ سے یہاں پہنچا تھا۔ میں نے ان دونوں کو گھوڑا گاڑی پر سوار کرایا پھر خود بھی پچھلی نشست پر رائفل تان کر بیٹھ گیا۔ "چلو جاترو (عبادت گاہ) چلو۔" میں نے ناک کٹے کو حکم دیا۔

میرے تیور اور میری رائفل دیکھنے کے بعد "ناک کٹے" شخص کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ میرے حکم پر بے چون و چرا عمل کرتا۔ گاڑی نے موڑ کاٹا اور جاترو کی طرف دوڑنے لگی۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر دن کے وقت ہجوم ہوتا تھا مگر اب کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اکا دکا گاڑی بان اور چوکیدار دیواروں سے لگے کھڑے تھے۔ ہم تین چار منٹ میں جاترو تک پہنچ گئے۔

مجھے یقین تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے "ناک کٹے" شخص نے صدر خاں کو جو اطلاع دی ہے وہ پاماسہ ہی کے بارے میں ہے اور یہ بھی یقین تھا کہ پاماسہ جاترو میں ہی موجود ہوگا۔ دو تین منٹ بعد میرے یہ دونوں اندازے بالکل درست ثابت ہو گئے۔ میں جب دونوں افراد کو رائفل کے زور پر جاترو کے زیریں دروازے میں لایا تو یہاں میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک بند دروازے کے پیچھے سے دھوئیں کے مرغولے برآمد ہو رہے تھے۔ پوری بستی کی طرح جاترو میں بھی مکمل تاریکی تھی۔ اگر ایک بڑے روزن سے چاند کی روشنی تہ خانے میں نہ پہنچ رہی ہوتی تو میں یہ دھواں ہرگز نہ دیکھ سکتا۔ یہ جان کر میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی کہ دھواں اسی کمرے کے اندر سے برآمد ہو رہا ہے جہاں میں نے چار روز پہلے پاماسہ کو دیکھا تھا۔ سوچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ دھواں پتھر کوئلوں کا ہے۔ بند کمرے کے اندر سے پتھر کوئلوں کا دھواں برآمد ہونا خطرے کی علامت تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ یہی موقع تھا جب ناک کٹے شخص اور صدر خاں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور ایک ساتھ اٹھ بھاگے۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور دو فائر کیے۔ ان میں سے ایک فائر صدر خاں کی ٹانگ میں لگا اور وہ لڑھکتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ ناک کٹا شخص بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فائر ہوتے ہی جاترو یکدم جاگ اٹھی۔ تہ خانے کی چھت پر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازے تیزی سے کھلنے اور بند ہونے لگے۔ ہر طرف چیخ و پکار ہونے لگی تھی۔ میں نے دروازے کو باہر کی طرف کھینچا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ درحقیقت اسے کنڈی لگائی ہی نہیں گئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی گاڑھے دھوئیں کے مرغولے میرے چہرے سے ٹکرائے اور میں بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے کھانستے کھانستے پاماسہ کو دو تین آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ پا کر میں اندر گھس گیا اور اندھوں کی طرح پاماسہ کو ٹٹولنے لگا۔ جلد ہی میرے ہاتھ کسی جسم سے ٹکرائے لیکن یہ نرم و نازک جسم تھا' یقیناً کسی خادمہ کا تھا۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ میں اسے فرش پر گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ اب دھواں دھواں کمرے کے سامنے بہت سے افراد جمع ہو چکے تھے

اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے جھنجوڑا اور پشتو زبان میں پوچھا کہ محترم پاناسہ کہاں ہیں۔ میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور پھیپھڑوں میں سانس بھر کر واپس کمرے میں گھس گیا۔ اس مرتبہ میرے متلاشی ہاتھ پاناسہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب رہے۔ وہ ابھی تک ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسے گاؤن سے پکڑ کر کندھے پر ڈالا اور باہر لے آیا۔ پاناسہ کو اسی روزن کے عین سامنے لٹایا گیا جہاں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ کندھے پر سے پاناسہ کا ریشمی گاؤن جلا ہوا ہے اور گوشت بھی پگھل گیا ہے۔ اس جلے ہوئے گوشت کی سڑاند دھوئیں میں صاف طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ پاناسہ کا چہرہ کم روشنی کے باوجود صاف نظر آ رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ہلدی کی طرح زرد ہے۔ میں نے اس کے سینے سے کان لگا کر دھڑکن سننے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ سانس کی آمد و رفت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بند کمرے میں کوئلوں کی زہریلی گیس اسے شدید نقصان پہنچا چکی تھی اور یہی حال اس خادمہ کا تھا جسے میں نے کمرے سے نکالا تھا۔

میں نے پشتو داں شخص سے کہا۔ "انہیں فوراً شفا خانے پہنچاؤ۔ ورنہ یہ مر جائیں گے۔"

پشتو داں شخص نے میری یہ بات مقامی زبان میں منتقل کر کے حاضرین تک پہنچائی۔ لوگوں میں ایک دم ہلچل نظر آنے لگی۔ اسی دوران میں کچھ افراد ایک اور بے ہوش خادمہ کو دھواں دھواں کمرے سے نکال لائے۔ تینوں بے ہوش افراد کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر باہر کھڑی گھوڑا گاڑیوں تک پہنچایا گیا اور یہ گاڑیاں سرنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں واپس نہ خانے میں پہنچا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ صدر خان بھاگ نہ جائے۔ وہ اسی طرح زخمی حالت میں ایک ستون کے پاس پڑا تھا۔ گولی اس کے کولہے سے ذرا نیچے لگی تھی اور خون نے اس کی سادی پتلون بھگو دی تھی۔ دا تعلق میرے ہاتھ میں تھی لہٰذا سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ فائر میں نے ہی کئے ہیں اور صدر خان میرے ہی ہاتھوں زخمی ہوا ہے لیکن کسی نے مجھ سے باز پرس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے بازو پر گھروالی چھری کی پٹی موجود تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ میری حیثیت پاناسہ کے خاص کارندے کی ہے۔

ان واقعات کے بعد تقریباً پوری بستی ہی جاگ اٹھی تھی۔ سخت سردی میں لوگ یہاں وہاں ٹولیوں میں کھڑے تھے اور چہ میگوئیاں کرتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے صدر خان کی مشکیں کس کے اسے پاناسہ کے خاص کارندوں کے حوالے کر دیا اور خود پاناسہ کی حالت دریافت کرنے شفا خانے پہنچ گیا۔ شفا خانہ سرنگ کے اندرونی حصے میں واقع تھا اور یہ وہی مخصوص حصہ تھا جہاں روشنی کرنے اور آگ جلانے کی اجازت تھی۔ شفا خانے سے باہر بھی بہت سے افراد جمع تھے۔ لمبے بال، غلیظ چہرے اور کانوں میں بڑے بڑے بالے۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ وہ سب اپنے سردار کی زندگی کے بارے میں فکرمند نظر آتے تھے۔ وہ سب بے حد پریشان بھی تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سردار نے جو قانون کا محافظ بھی ہے، خود ہی قانون کی خلاف ورزی کیوں کی۔ اس نے جاڑے میں آگ کیوں جلائی۔ وہ سازش کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاناسہ نے خود یا اس کے کسی کارندے نے سخت سردی میں کمرے کو گرم کرنے کے لئے انگیٹھی دہکائی تھی اور اس معاملے کو راز رکھنے کے لئے کمرا چاروں طرف سے بند کر دیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمرے میں موجود افراد بے ہوش ہو گئے تھے۔

میں ڈاکٹر ہنری سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اس شفا خانے کا انچارج تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ پاناسہ کی زندگی بچانے کے لئے کیا کر رہا ہے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سرنگ کے ایک گوشے سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں اور پتا چلا کہ پاناسہ جانبر نہیں ہو سکا۔ یہ اندوہناک خبر سن کر میں اپنی جگہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ چار روز پہلے جو شخص مجھ سے خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہا تھا اور جس کے ہاتھ بڑی دلیری سے اپنی دا تعلق کو تھپک رہے تھے چپ چاپ موت کی وادی میں اتر چکا ہے۔ آخر وہ موت اس تک پہنچ ہی گئی تھی جو گیس مادے سے دھیرے دھیرے اس کی طرف کھسک رہی تھی۔ میرا سینہ غم سے لبریز ہو گیا۔ کاش میں تھوڑی دیر پہلے اس تک پہنچ سکتا۔ مقامی لوگ اپنے سردار کی موت پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کچھ دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے اور کچھ سر کے بال نوچ رہے تھے۔ ہر طرف ماتمی فضا نظر آ رہی تھی۔ اچانک کسی نے زور سے مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یہ پاناسہ کا جگری دوست سدرت تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یہ حادثہ نہیں ہے، یہ سازش ہے... یہ سازش ہے، میرے یار کو قتل کیا گیا ہے..."

میں اسے بازوؤں میں لے کر اس کی پشت تھپکتا رہا۔ جب اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں اسے ہجوم کے اندر سے نکال کر سرنگ کے ایک نیم تاریک گوشے میں لے گیا۔ میں نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو سدرت! پاناسہ حادثے کا نہیں سازش کا شکار ہوا ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ سازش کا شکار ہوا ہے تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس سازش میں اس کی بیوی بھی شریک ہو گی..."

"تمہاری یہ بات بھی بالکل درست ہے۔" میں نے کہا۔

میرے جواب نے سدرت کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ غالباً اسے امید نہیں تھی کہ میں اتنے یقین کے ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں گا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پاناسہ کی قاتل کیرولین ہے اور اس کا ساتھی صدر خان ہے۔"

سدرت ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولا۔ "تم یہ بات... اتنے یقین سے... کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"صدر خان تو ایسا نہیں لگتا تھا۔" سدرت نے بے حد حیرانی سے کہا۔

"وہ اپنے جرم کا اقرار کر چکا ہے۔ کیرولین کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" سدرت نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں اسے باندھ کر محافظوں کے حوالے کر آیا ہوں۔"

"اور وہ فاحشہ کیرولین؟"

"وہ اپنی خوابگاہ میں ہو گی۔"

اچانک ایک شخص ہانپتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اس نے مقامی زبان میں سدرت سے کچھ کہا۔ سدرت کے چہرے پر بھی شدید ہیجان نظر آنے لگا۔ میرے پوچھنے پر سدرت نے کہا۔ "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جو نوجوان محافظوں نے صدر خان کو مار دیا ہے۔ صدر خان نے ان کے سامنے بھی اقرار کر لیا ہے کہ وہ پاناسہ کے قتل کی سازش میں شریک ہے۔ اس نے کیرولین کا نام بھی لیا ہے۔ اب یہ بات پوری بستی میں پھیل گئی ہے۔ کچھ لوگ بڑے غصے میں کیرولین کی خوابگاہ کی طرف گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے نقصان پہنچائیں۔"

"کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

"چلو اور دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے؟" سدرت نے کہا۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے سرنگ کے اس رہائشی حصے کی طرف گئے جسے "سنت" کہا جاتا تھا۔ گیس لیمپس کی روشنی میں دور تک راہداری صاف نظر آ رہی تھی جو "تخت" کے بیرونی دروازے تک جاتی تھی۔ یہاں لوگوں کا اژدہام نظر آیا۔ وہ سب مشتعل تھے اور اپنی زبان میں نعرہ زنی بھی کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیوں اور لاٹھیاں وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جلد ہی ہم پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ ایک مشتعل گروہ تخت کا بیرونی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکا ہے اور کیرولین کو جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ ہم دونوں ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے تخت کے بیرونی دروازے تک جا پہنچے۔ لکڑی کے مضبوط دروازے کا ایک پٹ ٹوٹا پڑا تھا۔ عین دہلیز پر ایک شخص کی لاش نظر آئی۔ اس کے سر پر کلہاڑے کا ایسا بھرپور وار کیا گیا تھا کہ سر دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص کیرولین کے دو ذاتی محافظوں میں سے ایک تھا اور اس نے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ محافظ کی لاش دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ کیرولین کی جان بھی شدید خطرے میں ہے۔

"کیا کرنا چاہئے؟" میں نے سدرت سے پوچھا۔

"لوگ قانون ہاتھ میں لے رہے ہیں۔ انہیں روکنا ہو گا۔"

"مگر کیسے؟"

اس سے پہلے کہ سدرت کوئی جواب دیتا میں نے اندر سے افراد کی ایک ٹولی دیکھی۔ وہ کسی چیز کو گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ طیش سے بھری ہوئی آوازوں میں چیخ رہے تھے۔ ان کی آوازیں سرنگ میں دور تک گونج رہی تھیں۔ سدرت نے غور سے اس ٹولی کی طرف دیکھا اور سرسرائی آواز میں بولا۔ "انہوں نے کیرولین کو قتل کر ڈالا ہے۔"

چند ہی لمحے بعد اس خبر کی تصدیق ہو گئی۔ جس سیاہ مائل چیز کو زمین پر گھسیٹا جا رہا تھا وہ کیرولین کی لاش تھی۔ لاش ہماری نزدیک پہنچی تو میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ کیرولین کے نازک جسم پر کلہاڑی کے لمبے چوڑے اور گہرے زخم تھے۔ اس کے پیٹ، چھاتی اور گردن پر گہرے گھاؤ تھے اور ایک ٹانگ کا جوڑ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ کیرولین کی گردن میں سن کی رسی تھی اور یہ رسی بھی خون آلود تھی۔ میں ان وحشیوں کے وحشیانہ ردعمل کو دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سردار کا بے دریغ انتظار کرنے والے لوگ تھے۔ جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ کیرولین ہی ان کے سردار کی قاتل ہے تو انہوں نے اسے تھوڑی دیر کے لئے بھی "زندہ" برداشت نہیں کیا تھا۔

میں حیرت میں گم کیرولین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہی عورت تھی جو ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے تک اپنے آشنا صدر خان کے ساتھ تنہائی میں موجود تھی اور رنگین لمحات گزار رہی تھی۔ اب وہ اپنے عوت انگیز جسم، اپنی نیلی آنکھوں اور خوبصورت نقش سمیت خاک ریزن میں لوٹ رہی تھی۔ کل تک اس کے ریشمی جسم نے تعفن چھوڑ دینا تھا۔ پھر بے شک وہ کسی ویرانے میں پڑی رہتی۔ کسی مرد نے اسے ہاتھ تو کیا لگانا تھا، اسے نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں تھا۔ جسم ناپائیدار ہوتا ہے اور جسم کی محبت بھی۔ پائیدار محبتیں وہی ہوتی ہیں جو جسم سے نہیں دل سے کی جاتی ہیں۔

یکایک میں چونک گیا۔ مجھے صدر خان کا خیال آیا۔ عین ممکن تھا کہ مشتعل لوگ اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کر چکے ہوں یا کرنے والے ہوں۔ میں نے سدرت سے کہا۔ "تو بازر کی طرف چلیں۔ وہاں صدر خان بھی ایسے ہی مارا جا سکتا ہے۔"

سدرت نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور ہم اس پُرشور ہجوم سے نکل کر بازر کی طرف روانہ ہو گئے۔

○☆○

پچھلے 48 گھنٹے کے اندر وادی میں زبردست تبدیلیاں آئی تھیں اور واقعات تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ غم و غصے میں بھرے ہوئے لوگوں نے کیرولین کی لاش جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے کے لئے پہاڑ پر پھینک دی تھی۔ پاناسہ کی لاش کو مقامی دستور کے مطابق لکڑی کے منقش تابوت میں بند کر کے قبرستان میں رکھ دیا گیا تھا۔ پاناسہ کی آخری رسومات میں لوگوں نے بھرپور شرکت کی تھی۔ وہ غم سے نڈھال نظر آتے تھے اور بلند آواز میں رو رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدروحوں کے گرد ماتمی رقص بھی کر رہے تھے۔ اس

رقص کے لئے ساز فراہم کرنے کے لئے ایک بانسری قسم کا ساز نوجوان کی شکل میں بجایا جاتا تھا۔ پامسہ کی ذاتی اشیاء جن کو اٹھایا جا سکتا تھا، وہ بھی اس کے ساتھ ہی تابوت میں بند کر دیے گئے تھے۔

پامسہ کی آخری رسومات ادا ہوتے ہی نئے سردار کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ یہ اعلان کرنے والے جانزد (عبادت گاہ) کے پانچ بڑے پجاری تھے۔ ان میں خاران بھی شامل تھا۔ پجاریوں نے پامسہ کے قریبی دوست اور دست راست سدرت کو نیا سردار چن لیا تھا۔ سدرت اس منصب کے لئے تیار نہیں تھا لیکن اسے پجاریوں اور رائے عامہ کے سامنے سر جھکانا پڑا تھا۔

ایک روز میں اپنے کوٹھری نما کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ زریں گل آ دھمکا۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے لاتعلق اپنے عشق میں مست تھا۔ نیز ھی مانگ نکال کر اس نے بال بڑے اسٹائل سے کانوں پر ڈال رکھے تھے۔ کلف لگی قمیص پر جیکٹ پہن رکھی تھی اور دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ کہنے لگا۔

"استاد صاحب! ام بہت شرمندہ ہے۔ ام کلثوم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی بہت شرمندہ ہوں کہ تم میرے دوست ہو۔ خدا کے لئے! تمہیں کوئی اور بات بھی آتی ہے؟"

"باتیں تو بہت آتا تھا استاد صاحب...... لیکن کلثوم سے ملنے کے بعد امارا بولتی بند ہو گیا ہے۔ اب آپ کو کیا بتاؤں۔ وہ کیا لڑکی ہے۔ اس کے جنگلی حسن میں بڑی کشش ہے۔ وہ اچھے بھلے آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔"

"اور تم ذہنی پاگل۔"

"ہاں ام پاگل ہے استاد صاحب! ام کو لگتا ہے کہ کلثوم پیار کا ایک بہت بڑا سمندر ہے۔ ام اس سمندر میں ڈوب کر مر جانا چاہتا ہے۔"

"اللہ تمہاری مرادیں آسان کرے۔ ویسے آج کل بہت گہرے پانیوں میں تیر رہے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"وہ پڑیا کیا ہے استاد صاحب! اف خدایا! اتنا کیا بتا سکتے۔ وہ نشے کا بندوبست ہے۔ اپنا ہونٹ بس ذرا سا لگتا ہے۔ نشہ لگتے ہی جسم دھواں ہو جاتا ہے۔"

"اور تم نے......؟" میں نے زریں گل پر آنکھیں نکالیں۔

"نہیں استاد صاحب! ام زیادہ مثال دے رہا ہے۔" زریں جلدی سے بولا۔ "اب بات تو غلط طرف لے جا رہا ہے۔ آپ جانتا ہے ام ایسا آدمی نہیں ہے۔ ام تو اس پھول کا خوشبو سونگھتا ہے۔"

"اور بھی کبھار نظر بچا کر ایک آدھ پتی توڑ لیتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہرگز نہیں۔ پھول تو صرف سونگھنے کے لئے ہوتا ہے۔"

"اور وہ پھول ہے۔"

"پھول بھی کوئی ایسا ویسا نہیں جناب۔ نایاب جنگلی پھول! امارا عقل بڑی چھوٹا ہے۔ ام آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتا۔

کاش ام قیس اور فیض ہوتا اور زاغا پہاڑ کی اس شہزادی پر کوئی بھڑکتا ہوا غزل لکھ سکتا۔ آپ یوں سمجھ لیں جناب! کہ جسم ذرا سا اس کے بال لے لئے جائیں۔ وادی سے آنکھیں لے لی جائیں۔ نیلو سے چال، سلونی سے جسم اور دریا سے مسکراہٹ لے لی جائے اور ان سب کو ملا کر ہنستی گلابوں کے عرق اور شہد میں گوندھ لیا جائے تو کلثوم بنے گا...... آہ! ام کتنا شرمندہ ہے اس سے...... ام اس کا مجرم ہے۔ اس کا گنہگار ہے۔ ام اس سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔"

"لیکن الّو کے پٹھے۔ تم نے کیا کیا ہے جو معافی کے طلب گار ہو رہے ہو؟"

وہ کچھ دیر ہچکچاتا رہا پھر بولا۔ "بس امارا ہاتھ اس کو لگ گیا تھا۔"

"ہاتھ لگ گیا تھا۔ کیا مطلب...... کب لگا تھا؟"

"وہ جی آپ کو معلوم ہی ہے کہ پرسوں محترم پامسہ کی آخری رسمیں ادا کی گئی تھیں۔ یہاں موت پر ناچ گانا بھی ہوتا ہے۔ بستی کا سب عورتیں اور مرد اپنے بال کھول لیتا ہے اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتا ہے۔ ام بھی اس ناچ میں شامل ہو گیا تھا۔ ناچنے والوں میں کلثوم بھی شامل تھا۔ ام لوگوں میں سے راستہ بنا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ام کو اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوا اور لوگوں کی نظر بچا کر تھوڑا سا مسکرایا بھی لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ ام کو ذرا سا ٹھوکر لگا اور ام اس کے اوپر گر گیا۔ وہ ایکدم سے پیچھے ہٹ گیا اور ام سے خفا نظر آنے لگا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ام نے شرارت کیا ہے۔ ام اب چاہتا ہے کہ اس کو راضی کر لے۔ امارا پروگرام ہے کہ رات کو اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر جائے گا۔ ام کو اس کھڑکی کا معلوم ہے جو کلثوم کے کمرے میں کھلتا ہے۔ ام اس کو کھڑکی پر دستک دے گا۔ وہ کھڑکی کھول دے گا اور ام اس سے معافی مانگ لے گا۔"

"کتنا شوق ہے تمہیں معافی مانگنے کا۔" میں نے کہا۔

زریں گل مسکرا کر بولا۔ "خوبصورت لڑکیوں سے معافی مانگنے کا مزہ ہی اور ہوتا ہے استاد صاحب! اور پھر کلثوم سے معافی مانگنے کے لئے تو ام غلطی بھی دوبارہ کر سکتا ہے اور پھانسی بھی چڑھ سکتا ہے۔"

میں نے غور سے زریں گل کو دیکھا۔ "کہیں یہ غلطی بھی تو تم نے جان بوجھ کر نہیں کیا؟"

زریں گل کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت ابھری اور ایک دم اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "خوب! کبھی کبھی آپ واقعی استاد نظر آتا ہے۔ امارے دل کا بات پکڑ لیتا ہے...... سچا بات یہ ہے کہ ام نے جان بوجھ کر اسے ناراض کیا ہے تاکہ اس سے معافی مانگ سکے۔ آخر اس نے بھی تو گندا انڈا مارنے پر ام سے معافی مانگا تھا۔ ام اس معاملے میں اس سے کیوں پیچھے رہے...... اور پہلے کی بات یہ ہے استاد صاحب کہ عاشقی کے کام میں فائدہ بھی مزے کا ہی

تاوان ☆ 189 ☆ چھٹا حصہ

ہوتا ہے چاہے وہ عورت سے معافی مانگے چاہے عورت کو معافی دے۔"

"لعنت تیرے فلسفے کی۔" میں نے بیٹھے بیٹھے زریں گل کی پنڈلی پر لات رسید کی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا پھر ایکدم میری ٹانگ پکڑ کر مٹھیاں بھرنے لگا۔

"سوری۔ استاد صاحب! وری سوری۔ اگر آپ کو امارا بات برا لگا ہے تو ام آپ سے بھی معافی مانگتا ہے۔"

"معافی کے بچے! کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کر۔"

"ڈھنگ کا بات؟ ہاں ایک ڈھنگ کا بات بھی سن لیجئے۔" وہ جلدی سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "آپ کو وہ شخص یاد ہے جس کی وجہ سے صدر خاں اور فرنگی میم (کیرولین) کا بھانڈا پھوٹا تھا۔ امارا مطلب اس ناک کٹے سے ہے جس نے پامسہ کے بند خانے میں گیس چھوڑا تھا اور اس کی موت کا سامان کیا تھا۔"

"ہاں ہاں یاد ہے...... کیا ہوا اسے؟"

"وہ حرامی آپ کی گولی سے بچ کر بھاگ گیا تھا لیکن قدرت کے انتقام سے نہیں بھاگ سکا۔ وہ اس وادی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ محافظوں نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس کا لاش عبرت عام کے لئے لکڑی کے پل پر رکھ دیا گیا ہے۔ ام ابھی دیکھ کر آ رہا ہے۔"

زریں گل کی اطلاع اہم تھی۔ ناک کٹے شخص کا نام زمانی تھا۔ اس کے بھاگ جانے کا مجھے بے حد افسوس ہوا تھا۔ زمانی نے صدر خاں اور کیرولین کے "آلہ کار" کا کردار ادا کیا تھا۔ زمانی سزا یافتہ تھا لیکن ایک پجاری سے رشتے داری کی وجہ سے وہ عبادت گاہ میں بطور خادم بھرتی ہو گیا تھا۔ پامسہ چونکہ عبادت گاہ میں پناہ گزین تھا لہٰذا زمانی جیسے شخص کے لئے آسان تھا کہ وہ پامسہ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔ صدر خاں نے زمانی سے رابطہ کیا تھا اور بھاری معاوضہ دے کر اسے پامسہ کے قتل کی سازش میں شریک کر لیا تھا۔ واردات کی رات زمانی نے چپکے سے کوئلے دہکا کر پامسہ کے کمرے میں رکھ دیے تھے اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔ پامسہ کے ساتھ دو خادمائیں بھی موجود تھیں۔ وہ تینوں سو رہے تھے۔ بند کمرے میں گیس بھر جانے کے بعد وہ تینوں متاثر ہوئے۔ خادمائیں تو بے ہوش ہو گئیں لیکن پامسہ میں سکت باقی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ تیورا کر سنگے کوئلوں کی انگیٹھی پر گر گیا۔ بعد ازاں زمانی نے کمرے کا دروازہ باہر سے کھول دیا اور بھاگم بھاگ سرنگ میں پہنچا تاکہ سازش کے بڑے کردار صدر خاں کو اپنی کامیابی کی اطلاع دے سکے۔ صدر خاں میری تحویل میں تھا لہٰذا زمانی بھی قابو میں آ گیا۔ اس المیے کا ایک المناک پہلو یہ تھا کہ دونوں نوخیز خادمائیں بھی پامسہ کے ساتھ ہی ہلاک ہو گئی تھیں۔ یعنی اب زندہ ملزم صدر خاں پر ایک نہیں تین افراد کے قتل کا مقدمہ چلنا تھا۔ بہت سی دوسری باتوں کی طرح اب یہ بات بھی صاف ہو

گئی تھی کہ عبادت گاہ میں میری اور صفدر کی گرفتاری کے بعد کیرولین نے ہمیں چھڑانے کی فوری کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ وہ یہ کوشش کیوں کرتی۔ اس کے اور ہمارے درمیان وہی رشتہ تھا جو مجرم اور پولیس والے کے درمیان ہوتا ہے۔

صدر خاں اور کیرولین کے بارے میں بھی اب تمام صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ صدر خاں سفاکی تھا لیکن کسی طرح پڑھ لکھ گیا تھا۔ اس میں مردانہ کشش بھی در پردہ تھی۔ کیرولین اس کی طرف مائل ہو گئی اور دھیرے دھیرے دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ پامسہ کا کوئی بھائی یا بیٹا موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اگر پامسہ کو کچھ ہو جاتا تو مقامی قانون کے مطابق کیرولین کو اس وادی میں فرمانروائی کی حیثیت حاصل ہو سکتی تھی۔ صدر خاں اور کیرولین نے مل کر منصوبہ بنایا اور پامسہ کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ بظاہر پامسہ اور کیرولین میں بے حد محبت تھی۔ کیرولین ہر وقت اپنے شوہر کی سلامتی کے بارے میں فکرمند نظر آتی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ درحقیقت وہی اپنے شوہر کی جان کے درپے ہو رہی ہے۔

زریں گل مجھے زمانی کے انجام سے آگاہ کر کے چلا گیا۔ میں وہیں کمرے میں بیٹھا رہا اور خیالات کے بھنور میں چکراتا رہا۔ بظاہر ہمارا ان برف زاروں میں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ہم نے فلپائن کے گمشدہ کوہ پیماؤں کو ڈھونڈ لیا تھا اور ان میں ہمارا گوہر مقصود جون چاڈل بھی شامل تھا۔ ہمارے بس میں ہوتا تو اب ہم ایک پل بھی اس لاپتا وادی میں نہ رکتے لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔ درحقیقت اس وادی سے نکلنا ہی سب سے مشکل کام تھا۔

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وادی کا نیا سردار سدرت لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ پامسہ اور کیرولین کی بچی سانچا زرغونہ تھی۔ (باپ اسے سانچا کہا کرتا تھا جبکہ باقی سب زرغونہ کہتے تھے۔) اس کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے اور لباس خستہ حال تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے زاروقطار روتی رہی ہے۔ وہ اب بن ماں باپ کی بچی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ میں نے اسے پیار کیا اور پاس بٹھایا۔

"کیا ہوا اسے؟" میں نے سدرت سے پوچھا۔

وہ بولا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن جو ہونے والا ہے وہ بہت برا ہے۔ اس بچی کو ناکردہ جرم کی سزا ملنے والی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جانزد کے پجاریوں کا خیال ہے کہ یہ کیرولین کی جائز بچی نہیں ہے۔ چونکہ کیرولین کے تعلقات صدر خاں سے تھے لہٰذا اس بچی کی ولدیت بھی مشکوک ہو چکی ہے۔ یہاں کے قانون کے مطابق ناجائز بچے کو سخت ناپاک اور نجس خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے بچوں کے لئے وادی میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ انہیں بے رحمی سے موت

سے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔"

میں سناٹے میں تھا اور سدورت کی بات سن رہا تھا۔ میں نے تیز و تند لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس بچی کو بھی۔۔۔؟"

وہ بولا۔ "یہ دو طرح کی صورت حال ہوتی ہے۔ ایک صورت حال یہ کہ بچے کے ناجائز ہونے کے بارے میں شک ہو۔ دوسری یہ کہ بچہ ناجائز ثابت ہو جائے۔ اگر وہ ناجائز ثابت ہو جائے تو پھر اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے ناجائز ہونے کے بارے میں شک ہو تو پھر ایک قدیم رسم ادا کی جاتی ہے جسے مقامی زبان میں "واہی" کہا جاتا ہے۔ میرے ذاتی خیال میں یہ رسم قتل کی رسم سے بھی زیادہ سفاکانہ ہے۔ یہ رسم اس وقت ادا کی جاتی ہے جب مشکوک بچے یا بچی کی عمر چار سال سے زائد ہو۔ اگر عمر کم ہو تو پھر اس وقت تک انتظار کیا جاتا ہے جب عمر چار سال ہو جائے۔ رسم کے مطابق بچے کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے اور اس کے ہاتھ پشت پر کس دیے جاتے ہیں۔ بستی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر دشوار گھاٹیوں میں "زپال" دیوتا کا ایک مجسمہ ہے۔ ہمارے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ مجسمہ انسانی ہاتھوں نے نہیں بنایا بلکہ ہزاروں سال صرف کر کے ہواؤں اور بارشوں نے تراشا ہے۔ لوگ وہاں منتیں ماننے بھی جاتے ہیں، خاص طور سے بے اولاد لوگ اس مجسمے کے سامنے ماتھے ٹیکتے ہیں۔ بدنصیب بچے کو رات کے وقت اس مجسمے کے قریب چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر وہ بچہ صبح تک بستی میں یا بستی کی حدود میں واپس پہنچ جائے تو یہ تصور کیا جاتا ہے کہ "زپال" دیوتا نے اس کی "بے گناہی" اور پاکیزگی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے اور اسے وادی میں زندہ رہنے کا حق دے دیا جاتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ بچہ دشوار گھاٹیوں میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے یا شدید زخمی ہو جاتا ہے، دونوں صورتوں میں موت اس کا مقدر ہوتی ہے۔"

"لعنت ہے تمہارے عقیدوں اور تمہاری رسموں پر۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ سدورت نے میرے تبصرے کا برا نہیں منایا۔ بس خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ پاشا کی طرح سدورت بھی مذہبی پنڈتوں کے زیر اثر ہے اور ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے مشوروں کو رد نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس وادی کے اصل حکمران وہی کم گو پجاری تھے جو جاترو کے نیم گرم تہ خانوں میں بیٹھے مناجات پڑھتے رہتے تھے یا پھر خوش خوراکی کا مظاہرہ کرتے تھے اور نشہ آور مشروب کے بلوری پیالوں سے چسکیاں لیتے تھے۔

میں نے سدورت سے کہا۔ "اگر تم اس وادی کے حکمران ہو کر اس بچی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو پھر کیا فائدہ تمہارے حکمران ہونے کا۔"

وہ بولا۔ "جو کر سکتا ہوں وہ کر تو رہا ہوں۔ بچی کو جاترو سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں اور تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔"

"میرے حوالے؟ وہ کیوں؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں چاہتا ہوں شاہ جی! تم اس کے لئے کچھ کرو۔ اسے اس کے المناک انجام سے بچاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمہارے پاس زیادہ محفوظ رہے گی۔ تم نے پہلے بھی اس کی جان بچائی تھی، اب اسے پھر تمہاری ضرورت ہے۔"

"لیکن!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم چار روز کے لئے اسے اپنے پاس رکھو تو پھر میں اس کے لئے کوئی انتظام کر لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن مجھے ایک بات بتا دو۔ اگر اس کی حفاظت کرتے ہوئے مجھے کوئی بندہ مارنا پڑے تو پھر؟"

"بندہ پھڑکانے کی حمایت میں نہیں کروں گا!" سدورت نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہاں قاتل کو پکڑنے کے لئے پوری وادی کی مشینری حرکت میں آجاتی ہے؟"

"لیکن مجھے تمہارے خصوصی اہلکار کی حیثیت بھی تو حاصل ہے؟" میں نے بازو پر بندھی مُہر شدہ پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک اس پٹی کی وجہ سے تمہیں رعایتیں حاصل ہوتی ہیں مگر بہتر یہی ہے کہ تم کسی ایسے امتحان میں نہ پڑو۔"

سدورت بہت جلدی میں تھا۔ مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر وہ اسی تیزی سے باہر نکل گیا جس تیزی سے آیا تھا۔ بچی کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ماں باپ کی موت کے ساتھ ہی اس کی ساری شوخی و شرارت بھی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ کسی غریب مسکین کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ دو آنسو جو اس نے کچھ دیر پہلے بہائے تھے اس کے گلابی رخساروں پر سفید لکیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کا منہ سر چومنے لگا۔ اس دوران میں زریں گل بھی آگیا۔ وہ بچی کو دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بچی کی یہاں موجودگی کے بارے میں بتایا۔ بچی کی ماں انگریزی بولتی تھی اور اس نے بچی کو بھی مادری زبان سکھائی تھی۔ اس دور دراز غیر مہذب وادی میں اس بچی کو شستہ انگریزی بولتے سن کر عجیب سا لگتا تھا۔ وہ بالکل گم سم تھی۔ میری سخت کوشش کے باوجود اس نے صرف ایک دو لفظ بولے۔ میں نے اسے بسکٹ دیے اور زریں گل اس کے لئے دودھ پتی لینے قہوہ خانے کی طرف چلا گیا۔

زریں گل کے باہر نکلتے ہی مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ قدموں کی یہ چاپ کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہوگی۔ سدورت کو یہاں سے گئے ہوئے بمشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ اس نے دور دراز کے اندیشوں کا اظہار تو کیا تھا لیکن فوری خطرے کے متعلق کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ قدموں کی چاپ کچھ غیر مانوس سی تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے بچی کو ایک

بڑی الماری کے پیچھے چھپا دیا اور اسے کہا کہ وہ خاموش کھڑی رہے۔ وہ کم سن ہونے کے باوجود خاصی سمجھدار تھی۔ میرا اشارہ سمجھ گئی۔ میں نے دروازہ کھولا، سامنے جاترو کے نوکدار ٹوپیوں والے دو گرگے تھے۔ ان کے ساتھ موٹی توند اور فربہ گردن والا ایک پجاری بھی تھا۔ مجھ سے اجازت لئے بغیر دونوں خادم اور پجاری اندر گھس آئے۔ وہ تفتیشی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرے کمرے کے اندر سے ایک دروازہ کھلتا تھا۔ یہ اس دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جہاں زریں گل سوتا تھا۔ رائفل اور ایمونیشن ہم نے اسی دوسرے کمرے میں چھپا رکھی تھیں۔ دونوں خادم اس کمرے میں بھی گئے اور اچھی طرح جائزہ لے کر واپس آئے۔ ایک خادم نے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے پشتو میں مجھ سے پوچھا۔

"یہاں کوئی آیا تھا؟"

"سردار سدورت آئے تھے۔"

"ان کے علاوہ؟"

"میرا دوست زریں گل۔"

"اس کے علاوہ؟"

"کوئی نہیں۔"

مترجم تفتیشی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ الماری کے پیچھے موجود زرغونہ کوئی آہٹ نہ کرے۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد فربہ اندام پجاری اور خادم بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ واپس جا رہے تھے۔ بدقسمتی سے اسی وقت زریں گل بھی دندناتا ہوا واپس آگیا۔ بچی کو بہلانے کے لئے دودھ پتی کے علاوہ وہ ایک چھوٹا سا کھلونا بھی لے آیا تھا۔ یہ کسی بکرے کے گلے سے اترے ہوئے گھنگرو تھے جنہیں کاٹ کر دو چھوٹی چھوٹی پازیبوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس قسم کی پازیبیں یہاں اکثر بچیوں کے پاؤں میں نظر آتی تھیں۔ زریں گل یہ پازیب اپنی انگلی میں جھلاتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاتھ میں بسکٹ اور چاکلیٹ بھی تھے۔

زریں گل کو دیکھ کر جاترو کے تینوں ایک بار پھر ٹھٹک گئے۔ انہوں نے بڑے غور سے پازیبوں کا جائزہ لیا پھر زریں گل سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

زریں گل نے پشتو کا جواب پشتو میں دیا اور بتایا کہ یہ گھنگرو ہے۔

"کس کے لئے لائے ہو؟" مترجم نے پھر پوچھا۔

زریں گل سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا یہ انداز شک میں مبتلا کر دینے والا تھا۔ اسی دوران میں دوسرا خادم ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا تھا۔ اس مرتبہ اس کا دھیان سیدھا الماری کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ الماری کی طرف بڑھا اور میری نس نس میں تہلکہ خیز سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ جاترو کے خادم اکثر اسلحہ لے کر نہیں چلتے تھے لیکن اس وقت الماری کی

طرف بڑھنے والے خادم کے کندھے پر رائفل نظر آ رہی تھی۔ پاشا کی بے آسرا بچی اس رائفل کی زد پر تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے کہ خادم الماری کے عقب میں جھانکتا، رائفل اس کے کندھے سے اتر چکی تھی۔ وہ تڑپ کر میری طرف مڑا، زریں گل کی دھواں دھار ٹکر اس کی عین ناک پر پڑی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ دوسرے خادم نے جھپٹ کر رائفل پر ہاتھ ڈالنا چاہا۔ میں نے رائفل بچائی اور ٹانگ اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ پُرشور آواز کے ساتھ الماری سے ٹکرایا۔ الماری کے پیچھے سے زرغونہ چیختی ہوئی نکلی۔ فربہ اندام پجاری نے یہ سب کچھ بھول بھال کر زرغونہ کو دبوچنا چاہا۔ اس کی حالت اس پتنگ باز کی سی تھی جو یہ بھول کر کہ قدموں کے نیچے چھت ختم ہو چکی ہے، پتنگ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے رائفل کی نال پجاری کی گردن میں گھسیڑ دی اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

"خبردار! جان سے مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

مترجم جو ایک بار پھر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا تھا، میری آواز سن کر جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

پجاری کی توند دھونکنی کی طرح پھول پچک رہی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ زرغونہ نے یہ منظر دیکھ کر ایک اور چیخ مارنا چاہی تاہم زریں گل نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور اس کا منہ ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اس دھینگا مشتی کے دوران میں زپال دیوتا کا ایک چوبی مجسمہ طاق سے لڑھک کر فرش پر آ گرا تھا اور پجاری کے قدموں میں پڑا تھا۔ یعنی بجائے اس کے کہ پجاری دیوتا کے قدموں میں ہوتا، دیوتا پجاری کے قدموں میں تھا لیکن پجاری کو احساس تک نہیں تھا۔ احساس ہوتا بھی کیسے، اسے اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ وہ مجسمے کو اپنے پاؤں میں لڑھکتے دیکھ رہا تھا مگر دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر مجسمے کو اٹھایا اور تپائی پر رکھ دیا۔

چند لمحے تک ہم خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ کمرے میں ہونے والی دھماچوکڑی نے قرب و جوار میں موجود کسی شخص کو اس طرف متوجہ کر لیا ہو اور وہ صورت حال جاننے کے لئے یہاں پہنچ جائے۔ بہرطور خیریت گزری۔ میں نے دونوں خادموں کو حکم دیا کہ وہ فرش پر اوندھے لیٹ جائیں۔ معمولی تذبذب کے بعد انہوں نے اس حکم پر عمل کیا۔ میں نے زریں گل کو اشارہ کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور ان کے منہ کھول کر ان میں کپڑا بھی گھسیڑ دیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکیں۔ اس کارروائی کے دوران میں زرغونہ سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی رہی تھی۔ ایک ہچکی سی بار بار اس کے ننھے سے سینے کو ہلا دیتی تھی پھر بھی عمر کے مقابلے میں اس کی ذہانت قابل داد تھی۔ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ اگر روئے گی تو اس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو نقصان پہنچے گا۔

جونہی زوبی گل نے اپنا کام مکمل کیا۔ میں نے رائفل کی نال پجاری کے جسم سے جدا کی اور اس کی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی۔ وار کے سبب اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ میرے بازو کے مخصوص جھٹکے نے فربہ اندام شخص کو چند گھنٹوں کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ اس کی گردن میرے شکنجے میں تھی اور نچلا جسم توری کی طرح لٹکنے لگا تھا۔ زوبی گل نے اس کے صفا چٹ سر پر ایک چپت لگائی۔ "میاں سو گئے اتارے پاؤں میں تم اب ہوش میں آنا مشکل ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارا یہاں سے نکلنا بھی مشکل ہے۔ بچی ہمارے ساتھ ہے۔ ہم کیسے چھپائیں گے اسے؟"

وہ بولا۔ "ہم بچی کو بستر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈال لیتا ہے۔ دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ بستر لے جا رہا ہے؟"

"تم نے بھولے نہیں ہیں یہاں کے لوگ اور پھر تمہاری شکل تو ویسے بھی مشکوک سی ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل بردہ فروش لگتے ہو۔"

وہ بولا۔ "استاد صیب! یہ بڑا نازک وقت ہے' ورنہ ام شاگرد ہونے کے باوجود آپ کو کوئی اچھا سا جواب دیتا۔ بہرحال اب آپ بتائیں کیسے لے جانا ہے بچی کو؟"

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ تھوڑا سا انتظار کر لیں۔ شام ہونے والی ہے۔ ابھی اندھیرا پھیل جائے گا۔ روشنی تو اس پاس ہی ہے۔ باقی سرنگ میں دہانے تک تاریکی ہو گی؟"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلو تم دہانے کا جائزہ لے کر آؤ۔ بلکہ ٹھہرو میں خود ہی جاتا ہوں۔ تم یہاں بالکل چوکس رہنا۔"

زوبی گل نے اپنا ہلکے سا سر اثبات میں ہلایا۔ میں نکلا اور قریباً ایک فرلانگ سرنگ طے کر کے باہر آ گیا۔ سورج کی روشنی بلند و بالا چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہو چکی تھی۔ وادی کی طویلی سرد رات شروع ہونے والی تھی۔ یوطیوں والے درختوں تلے دو چھکڑے اور ایک گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ میں نے گھوڑا گاڑی والے کو اپنے بازو کی مُرشدہ چمڑے کی پٹی دکھائی اور اسے بتایا کہ مجھے اس کی گاڑی کی ضرورت ہے۔ وہ بلا چون و چرا راضی ہو گیا۔ قانون کے راستے میں آنے کا یہاں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں گاڑی کو بیس تیس گز سرنگ کے اندر لے گیا اور تاریکی میں روک دیا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں منظر جوں کا توں تھا۔ دونوں خادم اپنے بندھے ہاتھوں کے ساتھ بے حس و حرکت پڑے تھے۔ جس خادم کی ناک پر زوبی گل کی ٹکر لگی تھی۔ اس کے نتھنوں سے خون رس رہا تھا۔ پجاری یا جازی گوشت کے ایک بڑے لوتھڑے کی طرح کمرے کے عین درمیان نظر آ رہا تھا۔ وادی کے تمام پجاریوں کی طرح وہ بھی کلین شیو تھا اور اس کا منڈھا ہوا سر لالٹین کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ زوبی گل زرل نو واقف تھا۔ پجاری کے قریب یوں کھڑا تھا جیسے اس سے جنگلی بھینسے کا وار

ہوا اور اس کے قریب کھڑے ہو کر تصویر اتروانا چاہتا ہو۔ زوفی سہمی ہوئی بستر پر بیٹھی تھی۔

میرے ذہن میں یہ واضح نہیں تھا کہ اس کمرے سے نکل کر اور گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر ہمیں کہاں جانا ہے۔ بس میں زوفی کو لے کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جاتروکے خونخوار پنڈتوں کو زوغونہ درکار تھی۔ وہ اپنے جاہلانہ عقیدے کے مطابق اسے کسی کڑے امتحان سے دوچار کرنا چاہتے تھے۔ اور انہیں یہ شک ہو چکا تھا کہ زوغونہ میرے پاس آئی ہے۔

جونہی شام گہری ہوئی اور "تخت" کی حدود سے آگے سرنگ میں تاریکی کا بسیرا ہوا میں اور زوبی گل' زرغونہ کو لے کر اپنی قیام گاہ سے نکل آئے۔ میں نے زرل نو وا کفل کو ان لوڈ کر کے پجاری کے قریب پھینک دیا تھا۔ زوبی گل ساتھ والے کمرے سے واکی ٹاکی اور سیون ایم ایم رائفل اٹھا لایا تھا۔ یہ دونوں اشیا ہم نے بڑے سلیقے سے اپنے لباس میں چھپا لیں۔ اندھیرا ہوتے ہی تخت (سرداور کی رہائش گاہ) کے ارد گرد روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ لالٹینیں' لیمپس' شمع' ان ہی کی طرح کی روشنیاں تھیں۔ قمار خانے میں ابھی رونق کا آغاز نہیں ہوا تھا لیکن قہوہ خانے میں لوگ رونق اور ہلا گلا کر رہے تھے۔ ہم نے سرنگ کا روشن علاقہ چند قدموں سے پار کیا اور پھر تاریکی میں آ گئے۔ تاریکی میں آ کر مکمل سکون اور تحفظ کا احساس ہوا۔ ابھی گھوڑا گاڑی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی کہ عقب سے شور و غل کی آواز آنے لگی۔ کوئی چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ یہ آواز پوری سرنگ میں گونجی اور پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یقینی طور پر یہ آواز ان خادموں میں سے ایک کی تھی جنہیں ہم کمرے میں باندھ آئے تھے۔ وہ کسی طرح اپنے ہاتھ کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب باہر نکل کر گلا پھاڑ رہا تھا۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھا لیکن سرنگ کی بناوٹ ایسی تھی کہ آواز بآسانی ہم تک پہنچ رہی تھی۔

زوبی گل نے میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گھوڑے کی باگیں سنبھال لیں اور خالص فلمی انداز میں چابک گھما کر ٹخ ٹخ کی آواز نکالی۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ سرنگ تاریک تھی لیکن دہانہ روشن نظر آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آسمان پر کچھ روشنی ابھی باقی تھی۔ گھوڑا تیزی سے روشن دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب ہمیں اپنے عقب میں بھاگتے قدموں اور چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ گھوڑا گاڑی نے بیس تیس گز کا فاصلہ پلک جھپکنے میں طے کیا اور سرنگ سے باہر آ گئی۔

"کدھر جانا ہے؟" زوبی گل نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"جدھر کو تمہاری ناک ہے۔ بس ناک کی سیدھ میں چلو۔" میں نے جواب دیا۔

"سیدھ آپ رکھئے' چاتا ام جائے گا۔" اس نے کہا اور ایک بار پھر ماہرانہ انداز میں چابک گھمایا۔

عقب سے ابھرنے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک

دو گھوڑا گاڑیاں ہمارے پیچھے روانہ ہو گئی ہیں۔ گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ سرنگ کے دہانے پر سواری کے گھوڑے بھی موجود تھے اگر کوئی شخص گھوڑا سنبھال لیتا تو وہ برق رفتاری سے ہم تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا۔ میگزین چیک کیا اور اسے استعمال کرنے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ اچانک زریں گل کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ گھوڑا گاڑی کی اگلی نشست کے نیچے سے کوئی برآمد ہوا تھا اور زریں گل کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔ زریں گل کی طرح میں نے بھی آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ گیلا پتلا جسم' لمبے بال اور کتابی چہرہ۔ لڑکی کے حلیے میں سب سے حیران کن چیز اس کا لباس تھا۔ وہ وہی لباس پہنے ہوئے تھی جو مشہور فلم "ون ملین ایئرز بی سی" میں ہیروئن راکیل ویلچ نے پہنا تھا۔ کپڑے کے دو ٹکڑے تھے جنہوں نے اسے مکمل برہنگی سے بچا رکھا تھا۔ ایسی سردی میں ایسی "درویشی"؟ بڑے دل گردے کی بات تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں چیخی۔ "اس راستے پر... اسی راستے پر... راستہ محفوظ ہے۔"

زریں گل پر تو جیسے سکتہ طاری تھا۔ وہ مشین کی طرح بس کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔ گھوڑا ناک کی سیدھ میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی نے از خود گھوڑے کی باگوں کو کھینچا اور راستہ بدل لیا۔ یہ ناہموار راستہ تھا۔ گاڑی بے طرح اچھلی اور الٹتے الٹتے بچی۔ زریں گل ڈگمگا کر پہلے لڑکی کی گود میں گرا پھر وہاں سے پائیدان پر آ رہا۔ میں نے بھی خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی تھی۔ طوفانی ہچکولوں کے سبب زرغونہ کے سر میں بھی چوٹ لگی اور اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ نشستوں کے درمیان پھنسی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میری ٹانگوں سے چپک گئی۔ یہ ایک نشیبی راستہ تھا اور اس کے دونوں کناروں کو خودرو جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے گاڑی پانچ دس سیکنڈ تک اس بھیانک راستے پر دوڑی تو ہم دونوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے لڑکی کے ہاتھوں سے باگیں چھیننے کی کوشش کی۔

اس نے میرا ہاتھ جھٹکا۔ "جو کر رہی ہوں ٹھیک کر رہی ہوں۔" وہ سخت ہچکولوں میں پتھر کے بت کی طرح جمی بیٹھی تھی۔ اس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ میری مزاحمت خود بخود ختم ہو گئی۔

ایک موڑ مڑتے ہی لڑکی نے اتنے زور سے باگیں کھینچیں کہ یوں لگا جیسے گھوڑے کی "ہینڈ بریک" لگا دی گئی ہے۔ اس کے پچھلے پاؤں پتھریلی زمین پر رگڑتے ہوئے اگلے پاؤں سے جا ملے اور اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں پھر گھوڑا پہلو کے بل گرا اور دس پندرہ فٹ دور تک گھسٹ گیا۔ گاڑی آگے کی طرف الٹ گئی تھی۔ میں نشست سے نیچے پھسل گیا تھا اور زریں گل قلابازی کھا کر گھوڑے کے اوپر سوار ہو گیا تھا۔ زرغونہ کا سر ایک

بار پھر کسی چیز سے ٹکرایا تھا اور وہ بلند آواز سے رونے لگی تھی۔

"آئندہ نیچے۔" وہ مجھے کھینچتے ہوئے بولی۔

میرے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرے میں میں نے زرغونہ کو اٹھایا اور چھلانگ لگا کر گاڑی سے اتر آیا۔ زریں گل بھی تڑپ کر گھوڑے سے اتر آیا تھا اور اس کی ٹانگیں تو صاف بچ نکلا تھا۔ لڑکی نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جھاڑیوں میں بھاگنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ ہم پیچھے آئیں گے اور اس کا یقین غلط نہیں تھا۔ ہمیں قریباً دو فرلانگ بھاگنے کے بعد وہ اونچی نیچی چٹانوں میں داخل ہو گئی۔ یہاں پہنچ کر لڑکی نے ایک اور حیران کن کام کیا۔ اس نے اپنے لباس میں سے ٹارچ نکال لی۔ ایسے مختصر لباس میں سے ٹارچ نکالنا جادو کا کھیل محسوس ہوا۔ لڑکی نے ٹارچ کا روشن دائرہ زمین پر مرکوز کر رکھا تھا۔ ہمیں اس دائرے میں چلاتی ہوئی وہ ایک تنگ نشیب میں رکی۔ اس نشیب میں بلندی سے گرنے والی کسی چٹان کا ملبہ پڑا تھا۔ پتھر کی دو بڑی سلیں ایک دوسرے پر یوں ابھری تھیں کہ ان کے درمیان ایک قدرتی گھروندا سا بن گیا تھا۔ کثرت سے اُگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ نے اس گھروندے میں داخل ہونے والے راستے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ یہ مقام لڑکی کا اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ وہ بلا جھجک ہمیں اندر لے گئی۔ اس نے ٹارچ ایک اونچی جگہ پر اس زاویے سے رکھ دی کہ پوری کھوہ روشن ہو گئی۔

یہ مقامی لڑکی تھی۔ عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ اس کے نقوش میں جنگلی پن تو تھا تاہم ایک طرح کی خوبصورتی بھی تھی۔ اس کے سرکش جسم پر مختصر لباس ایسے ہی تھا جیسے ہوا کے طوفانی تھپیڑوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے دو بادبان پھڑپھڑا رہے ہوں۔ یہ پہلی مقامی عورت تھی جس کی پیشانی پر مجھے کوئی سفید دھاری نظر نہیں آئی۔ اس کے کانوں میں بالیاں بھی نہیں تھیں۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا' وہ خود ہی بول پڑی۔ "اگر میں تمہیں اس راستے پر نہ لاتی تو تم ضرور پکڑے جاتے۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں تمہیں آ لیتے۔"

"لیکن تم ہو کون اور ہماری گھوڑا گاڑی میں کیسے پہنچی ہو؟"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ دوسرے کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے گاڑی سرنگ کے اندر اندھیرے میں کھڑی کی تھی تو میں اس میں گھس گئی تھی۔" وہ بدستور شکستہ انگریزی بول رہی تھی۔

"یعنی تمہیں معلوم تھا کہ ہم اس گاڑی پر سوار ہو کر یہاں سے نکلیں گے اور یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے؟"

"بے شک مجھے معلوم تھا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم ہے۔"

"مثلاً کیا؟"

"مطلب یہ کہ محترم سدرت نے یہ بچی تمہارے حوالے کی ہے اور تمہارے ذمے یہ کام لگایا ہے کہ اسے جاتریوں (پجاریوں) سے دور رکھو۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارا تعلق محترم سدرت سے ہے۔"

"میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ بے باکی سے بال جھٹک کر بولی۔ "تم مجھے خدائی فوجدار سمجھ سکتے ہو۔ میں اس بچی کے سلسلے میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں وادی کے جاتریوں اور ان کے فیصلوں سے نفرت کرتی ہوں۔"

"کس قسم کے فیصلوں سے نفرت کرتی ہو؟"

"ہر قسم کے فیصلوں سے۔ چاہے وہ اچھے ہوں یا برے۔" وہ ٹھم ٹھونک کر بولی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بغاوت کی چنگاریاں نظر آئیں۔

میں نے پوچھا۔ "جاتریوں سے تمہیں کیا عناد ہے؟"

وہ بولی۔ "زیادہ بھولے مت بنو۔ تم بھی سب کچھ جانتے ہو۔ یہ ظالم اور مکار لوگ ہیں۔ جادو اور دیوتاؤں کی آڑ لے کر من مانیاں کرتے ہیں۔ لوگوں کو من گھڑت باتوں سے بے وقوف بناتے ہیں اور جو بے وقوف نہیں بنتے ان کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ ہمارے سردار تو بے کار میں بدنام ہوتے ہیں اصل سکہ تو ان لوگوں کا ہی چلتا ہے۔"

"بہت خلاف ہو تم جاتریوں کے؟"

"کاش میں ان میں سے ایک ایک بدمعاش کو چن سکتی اور نشان پر لٹا کر اسے ذبح کر سکتی۔ اب تم اس بچی کی مثال ہی لے لو۔ اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تازہ تازہ یتیم ہوئی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے سر پر محبت کا ہاتھ رکھا جاتا' الٹا اسے بھیانک رسم کی بھینٹ چڑھانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ذرا سوچو تم۔ کیا ان لوگوں کی عقل پر پتھر نہیں پڑ گئے؟ اس معصوم بچی کے ہاتھ اور آنکھیں باندھ کر تاریکی میں خطرناک ویرانے میں چھوڑ دیا جائے گا اور صرف اسی صورت میں اسے والدین کی جائز اولاد قرار دیا جائے گا جب یہ زندہ سلامت بستی میں پہنچ جائے گی۔ میں کہتی ہوں کہ اگر جائز یا ناجائز ہونے کی یہی شرط ہے تو پھر اس وادی کے سارے جاتری حرامی قرار پائیں گے۔ ان میں سے کسی کے ہاتھ اور آنکھیں باندھ کر ان کھائیوں میں چھوڑ دو' اگر کر نہ مرے تو میرا نام ناتا نہیں۔" اس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔

"تو تمہارا نام ناتا ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس کا تنا ہوا چہرہ ذرا نرم پڑ گیا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے پتھر سے ٹیک لگائی اور نیم دراز ہو گئی۔ اس کا جسم تو بے شکن زاویوں سے نمایاں ہو رہا تھا بہرحال اس کی بے باکی دیکھ کر زریں گل نے کئی بار لاحول پڑھی ہو گی۔ وہ اپنے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں ناتاشا ہی میرا نام ہے لیکن ناموں میں کیا رکھا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو کام ہوتا ہے اور دیکھو میں نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔"

پھر اچانک جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی۔ وہ اٹھی اور کھوہ کے ایک گوشے میں چلی گئی۔ یہاں ایک پتھر کے پیچھے بہت سی خشک لکڑیاں پڑی تھیں۔ ان لکڑیوں کے پاس سے ہی لڑکی نے ایک لائٹر بھی ڈھونڈ نکالا۔ وہ کچھ لکڑیاں کھوہ کے وسط میں لے آئی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سردی سے بچاؤ کے لئے آگ جلانا چاہ رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہیں معلوم ہے' آگ جلانا..."

"ہاں مجھے معلوم ہے آگ جلانا منع ہے۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "لیکن جب میں ان جاتریوں کے قانون قاعدے مانتی ہی نہیں تو آگ کیوں نہ جلاؤں۔ جب کہ یہاں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ کوئی دیکھ نہیں رہا... بلکہ وہ لوگ ہمیں ہی تو ڈھونڈ رہے ہیں' تم آگ جلاؤ گی تو انہیں سراغ مل جائے گا۔"

"تم یہاں نئے آئے ہو' میں بائیس برسوں سے ہوں۔ اس علاقے سے ایسے ہی واقف ہوں جیسے تم اپنے ہاتھ کی لکیروں سے واقف ہو۔ میں جانتی ہوں یہاں جلنے والی آگ کی روشنی باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

"پھر بھی ہمیں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ یہاں سے روشنی کی کرن بھی نکلے گی تو میلوں دور دیکھی جائے گی۔"

"لیکن..."

"ہمارا نہیں تو اس بچی کا خیال کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی پھر مسکرانے لگی۔ "تم تو بچی سے بھی زیادہ ڈرے ہوئے ہو۔"

اس نے لائٹر ایک طرف پھینک دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس نے آگ جلانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ رائفل چھپا کر لانے کے لئے میں نے ایک چادر کی بغل لپیٹ رکھی تھی۔ یہ چادر میں نے ناتاشا کے نیم عریاں جسم کو پیش کر دی۔ اگر یہ چادر واقعی جسم ڈھانپنے کے لئے دی گئی ہوتی تو شاید وہ قبول نہ کرتی لیکن یہ پیشکش چونکہ اسے سردی سے بچانے کے سلسلے میں تھی لہٰذا اس نے قبول کر لی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ یہ پناہ گاہ ہمارے لئے ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور ہم دو تین روز تک یہاں بڑے سکون سے رہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "ہم یہاں سکون سے رہنے کے لئے نہیں آئے۔

ہمارا مقصد اس بچی کو جاتریوں سے بچانا ہے۔ اس سلسلے میں تم کیا تجویز پیش کر سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "تجویز تو میرے پاس بے مثال ہے لیکن میں صبح بتاؤں گی۔"

"اور اگر صبح ہونے سے پہلے ہی ہمارا نیٹوارا لیا گیا؟"

"میں تمہیں بتا رہی ہوں نا کہ کچھ نہیں ہو گا۔ یہ جگہ بالکل محفوظ ہے۔ ان بدمعاشوں کو ہماری چھوڑی ہوئی گھوڑا گاڑی مل بھی گئی تو بھی وہ ہمارا کھوج نہیں پا سکیں گے۔ اور دیکھو اس گدھے کے بچے سے کہو کہ مجھے یوں مت گھورے ورنہ میں آنکھیں پھوڑ دیا کرتی ہوں۔" اس کا اشارہ واضح طور پر زریں گل کی طرف تھا۔

زریں گل بے خبر تھا کہ اسے انگریزی الفاظ میں کتنے اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیا گیا ہے۔ وہ بونتوں کی طرح منہ کھولے خاموش بیٹھا تھا۔

میں نے زریں گل کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "برا مت مانتا' تم نے لباس بھی تو ایسا پہن رکھا ہے کہ کسی کی نگاہ بس میں نہیں رہتی۔"

وہ تنک کر بولی۔ "یہ میرا اپنا جسم ہے۔ میں جس طرح چاہوں اسے رکھ سکتی ہوں۔ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو۔ اپنے گندے خواب اور اچھے برے کی میں خود ذمے دار ہوں... اور خبردار آئندہ ایسی بات نہ کرنا ورنہ میں بھڑک اٹھوں گی۔"

وہ بڑی بے باک اور تند مزاج لڑکی تھی۔ جاتروں کے مذہبی ٹھیکیداروں اور ان کی بنائی ہوئی رسموں اور لگائی ہوئی پابندیوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ شاید اس نفرت کے پیچھے کوئی خاص واقعہ تھا یا پھر ویسے ہی اس کی فطری آزاد خیالی نے اسے رسم و رواج کے خلاف کر دیا تھا۔ ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی تھی لیکن ہمارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ یہ کھوہ حیران کن طور پر ہوا کی کاٹ اور سردی کی شدت سے محفوظ تھی۔ رات گئے ہم اپنے اپنے گرم لبادوں میں لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ زرغونہ کو سردی سے بچانے کے لئے میں نے اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ وہ میری بانہوں میں چھپ کر سو گئی۔ سیون ایم ایم رائفل کا ایک حصہ بھی میری گود میں تھا۔ لڑکی بظاہر تو قابل اعتماد اور ہمدرد نظر آتی تھی لیکن اتنی جلدی اس پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رات کے آخری پہر کسی وقت مجھے نیند آ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو تاریکی اجالے میں بدل رہی تھی۔ اس وادی کا دن تاریکی کم ہونے ہی شروع ہو جاتا تھا۔ اس حساب سے دن شروع ہو چکا تھا۔ زرغونہ بدستور میری گود میں سو رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ رائفل میری گود میں نہیں۔ میں نے ٹھٹک کر دیکھا۔ سامنے "ناتاشا" نظر آئی۔ اس کی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ بالائی جسم کو چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے اس کی آنکھیں شعلہ بار دکھائی دیں۔ وہ بالکل بدلی ہوئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ ایسی لڑکی جو وقت پڑنے پر مرنے اور مار دینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "بچی میرے حوالے کر دو۔"

"کیوں؟"

"تمہارے کیوں کا جواب کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ چھوڑو بچی کو" اس نے رائفل میری طرف سیدھی کر لی۔ ننھی زرغونہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ناتاشا نے رائفل کی نال میرے سر سے لگائی اور کمال پھرتی سے زرغونہ کو کھینچ کر مجھ سے دور لے گئی۔ نواز بیگ اور زریں گل بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

"تم یہ کیوں کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم اس قابل نہیں ہو کہ بچی کی حفاظت کر سکو۔" وہ ترش کر بولی۔

"کیوں؟ مجھ میں ایسی کیا بات نظر آئی ہے تمہیں؟"

"تم میں خوبی کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ تم مرد ہو۔" وہ تڑخ کر بے ترکی بولی۔

زرغونہ نے خوفزدہ ہو کر منہ بسورنا شروع کر دیا۔ ناتاشا ایک ہاتھ سے اس کا گال سہلانے لگی اور محبت بھرے انداز میں پچکارنے لگی۔ رائفل کا دستہ اس کی بغل میں تھا اور انگلی ٹریگر پر۔ وہ پلک جھپکنے میں ہم دونوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد چست اور تند و تیز لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا تاہم پاؤں میں بڑے زبردست قسم کے ٹریکنگ شوز نظر آ رہے تھے۔

"یہ کتیا کیا بھونک رہی ہے؟" زریں گل نے پوچھا۔

میں نے زریں گل کے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے ناتاشا سے کہا۔ "میرا ساتھی پوچھ رہا ہے کہ محترمہ ہم سے بچی کیوں چھین رہی ہیں۔"

"میرا اسے بتاؤ کہ کیوں چھین رہی ہوں۔"

"مجھے خود معلوم نہیں' اسے کیا بتاؤں؟"

وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بلا کی چمک اور طراری تھی ان آنکھوں میں۔ وہ بولی۔ "تم مرد اندر سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہو۔ بودے اور کچے۔ تم لوگ اپنے دماغ سے نہیں سوچتے' اپنی مونچھوں سے' اپنے بازوؤں کے پٹھوں اور چوڑے چکلے جسم سے سوچتے ہو۔ یہی سبب ہے کہ تمہاری سوچ اکثر غلط ہوتی ہے اور تم بے موت مارے جاتے ہو۔ میں یہ بات بغیر تجربے کے نہیں کر رہی ہوں۔ تمہارے جیسے بددماغ مردوں کو میں نے ان گنت دفعہ ناکوں چنے چبوائے ہیں۔" اس کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ ایک لمحہ توقف کر کے اس نے میرے تاثرات کا جائزہ لیا اور بولی۔ "یوں حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو۔ میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ کسی کو نیچا دکھانے کے لئے جسمانی طاقت ضروری نہیں ہوتی' نہ ہی مونچھیں

ضروری ہوتی ہیں' نہ بازوؤں کے پٹھے' نہ چوڑی چھاتی اور پہلوانوں جیسا جسم۔ طاقت جسم میں نہیں یہاں ہوتی ہے۔" اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے اپنی کنپٹی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ "لگتا ہے کہ مردوں کے سخت خلاف ہو تم؟"

"سب مردوں کے نہیں۔ صرف تم جیسے مردوں کے جو خود کو بم چیز سمجھتے ہیں۔ ایسے مردوں کو نیچا دکھا کر مجھے لطف آتا ہے۔"

"لیکن میں نے کب خود کو "بم چیز" کہا ہے؟"

"کہا تو نہیں لیکن تم خود کو یہی سمجھتے ہو۔ تمہارا کارنامہ صرف یہ ہے کہ تم نے ایک الٹی ہوئی گھوڑا گاڑی میں سے محترم پاناسہ اور اس بچی کو نکالا تھا۔ تمہاری جگہ اس وادی کا کوئی بھی شخص ہوتا تو یہی کرتا۔ میں خود بھی ہوتی تو یہی کرتی لیکن اس کے بعد تم نے چالاکی اور چاپلوسی سے محترم پاناسہ کا قرب حاصل کیا اور محترم پاناسہ کو باور کرایا کہ اس وادی میں تم سا دلیر اور قابل شخص کوئی ہے ہی نہیں۔ محترم پاناسہ کی بدقسمتی کہ وہ تمہاری باتوں میں آگئے اور انہوں نے تمہیں اپنے خصوصی کارندے کی حیثیت دے دی لیکن اس جوڑ توڑ میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم مرد ہوتے ہی ایسے ہو۔ مطلبی' خود غرض اور ہر وقت فائدے کے متلاشی۔ کسی کو دس پال (پچاس روپے) کا فائدہ پہنچائیں تو اس سے سو پال کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں اگر تم اس لائق نہیں تھے تو تم نے کیوں یہ دعویٰ کیا کہ ان خطرات کا کھوج لگاؤ گے جو محترم پاناسہ کو لاحق ہیں اور کیوں ان کی حفاظت کی ذمے داری قبول کی؟"

"میں نے کسی کی حفاظت کی ذمے داری قبول نہیں کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں پاناسہ کو درپیش خطرات کا کھوج لگانے کی کوشش کروں گا اور میرا خیال ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے۔"

"لعنت ہے اس کامیابی پر۔" وہ بھڑک کر بولی۔ "کھوج اس وقت لگا جب محترم پاناسہ جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ اگر کامیابی اسے کہتے ہیں تو پھر ذلت آمیز ناکامی کیا ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی تمہارا قصور نہیں۔ تم مرد ہوتے ہی ایسے دروغ گو ہو۔"

"میرے خیال میں۔۔۔"

"تمہارے خیال میں کچھ نہیں۔" اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ "تمہارے جیسے لوگ کبھی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ وہ ناکام ہوئے ہیں۔ اپنی چرب زبانی کے ذریعے وہ بڑی ڈھٹائی سے اپنی ہر شکست کو فتح میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی گزشتہ ذلتوں سے سبق حاصل کریں' سینہ تان کر نئی ذلتوں کا سامان کرنے نکلتے ہیں۔"

"نئی ذلتوں کا سامان؟ میں سمجھا نہیں۔"

وہ آتش ناک لہجے میں بولی۔ "یہ ذلت نہیں تو اور کیا ہے۔ پاناسہ کے بعد اب تم اس معصوم بچی کی حفاظت کی ذمے داری لے رہے ہو۔ کیا اس کی بھی جان لینے کا ارادہ ہے۔ تمہیں شرم نہ آئی چاہئے اپنے آپ پر۔ خبردار۔" اچانک وہ زور سے چیخی۔ زریں گل جو اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا سوچ رہا تھا' ٹھٹک کر رہ گیا۔ تاشا نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ٹانگ چلائی۔ اس کے بوٹ نے فٹ بال کی طرح ایک پتھر کو ٹھوکر لگائی۔ انڈے سے ذرا بڑا یہ پتھر اڑتا ہوا زریں گل کی پنڈلی پر لگا اور وہ کراہ کر تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

وہ سفاک لہجے میں بولی۔ "تم جیسے کیچوے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں پاؤں تلے مسل دیتی ہوں تم جیسوں کو۔ خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو۔"

ذوغونہ کا ایک بازو تاشا کی گرفت میں تھا اور دوسرے ہاتھ کی گرفت رائفل پر بے حد مستحکم تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور کڑک کر بولی۔ "تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ چلو جلدی کرو۔ ورنہ ابھی کوئی تماشا ہو جائے گا یہاں؟"

زریں گل کھا جانے والی نظروں سے تاشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تاہم یہ بات اسے بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ لڑکی گولی چلانے میں تاخیر نہیں کرے گی۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز گواہ تھا کہ وہ نہ صرف اسلحہ شناس ہے بلکہ اسے استعمال کرنے کی جرأت بھی رکھتی ہے۔

"میں نے کیا بکواس کی ہے؟" وہ پھر دہاڑی۔ "تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کی خوبصورت آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ میں نے زریں گل سے کہا۔ "اٹھ جا پیارے اور گھوم جا دیوار کی طرف ورنہ یہ ہنٹروالی تیرا میرا قصہ پاک کر دے گی۔"

"کیا کہہ رہی ہے یہ؟" زریں گل نے تنک کر پوچھا۔

"کہہ نہیں رہی' فرما رہی ہے اور اس کا فرمایا ہوا پتھر پر لکیر ہے۔ چل میرا بچہ گھوم جا دیوار کی طرف۔"

زریں گل پیچ و تاب کھاتا کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت کو پیٹھ دکھانا اسے بہت گراں گزر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ کہیں وہ جوش ایمانی میں آ کر ہی نہ بول دے۔ میں نے اسے آنکھ ماری۔ مطلب یہی تھا کہ وہ کھوپڑا ٹھنڈا رکھے اور دیوار کی طرف گھوم جائے۔ ہم دونوں نے اپنے رخ دیوار کی طرف پھیر لئے۔

"ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھو۔" اس نے نیا حکم جاری کیا۔

میں نے ہاتھ سر پر رکھ لئے۔ زریں گل نے بھی تقلید کی۔

وہ بولی۔ "پیچھے مڑ کر دیکھا تو گولی آئے گی۔"

پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ہم کئی گولیاں نہیں کھیلے تھے کہ یونہی کھڑے رہتے۔ میں جانتا تھا کہ تاشا باہر نکل چکی ہے اور اب بڑی تیزی سے غائب ہونے کی کوشش کرے گی۔ میں اور زریں گل ایک ساتھ مڑے' کھوہ خالی تھی۔ ہم نے کھوہ کے وسط سے دہانے تک بیس پچیس فٹ کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا۔ کھوہ سے نکلنے کا

راستہ بہت تنگ تھا۔ اس میں سے پہلے نکلنے کی کوشش میں زریں گل کی جیکٹ ایک جھاڑی میں بری طرح اٹک گئی۔ میں نے اسے دھکیل کر بمشکل باہر نکالا اور خود بھی نکل آیا۔ تاشا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے اور بچی کو ایک دم زمین نے نگل لیا ہے۔ ہم نشیب میں تھے لہٰذا آس پاس کا علاقہ دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ جھاڑیوں اور خود رو درختوں نے بھی نظر کا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ ہم خشک جھاڑیوں میں سے گزر کر ذرا بلندی پر آ گئے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کوئی کھوج نہیں ملا۔ ہم چار پانچ منٹ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اچانک زریں گل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "ادھر آئیں استاد صیب۔ یہ دیکھیں' یہ ہے وہ حرامی لڑکی۔"

وہ بڑے غور سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

"کہاں ہے؟" میں نے اس کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

"یہ دیکھیں۔ اس حرامی کے جوتے کا نشان۔" زریں گل نے اپنے سامنے برف کی پٹی کی طرف اشارہ کیا۔

یہ نرم برف تھی جو ایک دو روز پہلے ان پہاڑیوں پر گری تھی۔ برف پر جوگر نما جوتے کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ نشانات ابھی تھوڑی دیر پہلے ثبت ہوئے تھے۔ میں اور زریں گل ان نشانات کے ساتھ ساتھ چل دیئے۔ ہم اپنے اردگرد سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ اگر وہ آفت زادی کہیں آس پاس جھاڑیوں میں چھپی تھی تو ہمارے لئے سخت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میرے لباس میں چھرا موجود تھا' وہ میں نے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ دن اب پوری طرح نکل آیا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر دور تک اجالا پھیلا تھا۔ برف پر تاشا کے قدموں کے نشانات ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ قریباً دو فرلانگ آگے جا کر ان نشانات کے ساتھ کچھ اور نشانات بھی شامل ہو گئے۔ یہ ذوغونہ کے پاؤں کے ننھے منے نشانات تھے۔ یہاں تک تاشا' ذوغونہ کو اٹھا کر لائی تھی۔ یہاں آ کر اس نے بچی کو نیچے اتار دیا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر برف کی پٹی ناپید ہو گئی۔ سنگلاخ پتھروں پر قدموں کے نشانات معدوم ہو گئے۔ یہاں چاروں طرف اونچی نیچی چٹانیں بکھری تھیں۔ ایک لڑکی تو کیا یہاں درجنوں افراد روپوش ہو سکتے تھے۔ میں اور زریں گل ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ زریں گل دانت کچکچا رہا تھا۔ تاشا نے اسے جو پتھر لڑھکا کر مارا تھا اس نے زریں گل کی پنڈلی پر گومڑ بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھ اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کرنے کا خیال بھی زریں کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ چنڈال ہم سے بچی چھین کر لے گئی تھی اور ہم اپنے حال پر شرمسار رہ گئے تھے لیکن یہ سارے بدلے تو تب چکائے جا سکتے تھے جب وہ لڑکی دستیاب ہو جاتی۔ یہاں تو اس کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے کہا۔ "کیوں زریں گل' کسی فلم میں یہ سچویشن بھی دیکھی ہے تم نے؟"

"چھوڑیں جی سچویشن کو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "یہ خانہ خراب لڑکی تو ہمارا ناک کاٹ گئی ہے۔ ہمارا اتنا بے عزتی پشاور میں ہوا ہوتا تو ام لاؤنڈا دریائے اٹک میں کود کو مر جاتا۔"

میں نے زریں گل کو دلاسا دیا اور ہم محتاط قدموں سے اونچی نیچی چٹانوں میں گھومنے لگے۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے تھا۔ خشک درختوں کے درمیان کہیں کہیں سبزہ بھی نظر آ رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر مجھے فاصلے سے ملی جلی آوازیں آئیں۔ ہوا کے دوش پر کبھی یہ آوازیں واضح اور کبھی مدھم ہو جاتی تھیں۔ میں غور سے سننے لگا۔ قریباً نصف فرلانگ کی دوری پر کچھ افراد موجود تھے۔ ہم نے اپنا محتاط انداز برقرار رکھا اور دھیرے دھیرے ان آوازوں کی سمت بڑھنے لگے۔ یہ عین ممکن تھا کہ ہم جن لوگوں کی طرف جا رہے تھے وہ ہمیں ہی تلاش کر رہے ہوں اور جونہی ہم ان کے پاس پہنچیں' دھر لئے جائیں لیکن تجسس بجائے انسانی اندیشوں کی شدتوں کو کم کر دیتا ہے۔ ہم بھی خطرہ محسوس کرنے کے باوجود آگے بڑھ رہے تھے۔

جونہی ہم نے ایک "چڑھائی" طے کی' سامنے نشیب کے درختوں میں نقل و حرکت نظر آئی۔ ہم درختوں کے ایک جھنڈ میں تھے لہٰذا دیکھے جانے سے محفوظ تھے۔ میں نے دور ہی سے ڈاکٹر ہنری کے سر کے سفید بال پہچان لئے۔ اس کے ساتھ چار پانچ مزید افراد تھے۔ وہ جیسے کسی شے کی تلاش میں تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر ہنری جڑی بوٹیوں کو کشید کر کے ادویات بناتا ہے۔ یقیناً اس ویرانے میں ان لوگوں کی موجودگی اسی سلسلے میں تھی۔ ہم شاخوں میں چھپے بغور ان کی کارروائی دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر ہنری کا فاصلہ ہم سے بمشکل بیس تیس گز رہا ہو گا۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا اور کسی مخصوص نباتات کی تلاش میں گھاس پھونس میں ہاتھ چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھی ذرا فاصلے پر تھے۔ میرا دل چاہا کہ ڈاکٹر کو اپنی طرف متوجہ کروں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اسے متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے کھنکارنے کی آواز نے اسے میری طرف دیکھنے اور چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چند قدم چل کر ہماری طرف آیا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ درست کر کے اس نے غور سے جھاڑیوں میں دیکھا اور مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایکدم ہراساں نظر آنے لگا۔ اس نے ہمیں کوئی مبہم اشارہ کیا اور واپس اپنے ساتھیوں میں چلا گیا۔ پانچ دس منٹ مزید وہ لوگ مصروف رہے پھر ہنری نے اپنے ساتھیوں سے مختصر گفتگو کرنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا۔ ہنری کچھ دیر موقع پر موجود رہنے کے بعد تیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا۔ درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر اس نے ہم دونوں کو سراپا گھورا اور تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "یہ تم دونوں کیا کرتے پھر رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ضرور جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "تم نے جانند کے سپاہیوں سے ٹکر لے کر اچھا نہیں

کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں کہ یہ لوگ کتنے طاقتور ہیں۔"

"لیکن بات کیا ہے؟"

"بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم نے جاتروں کے ایک معزز پجاری اور دو خادموں سے مار پیٹ کی ہے اور کیو لین کی اس بچی کو اغوا کرلیا ہے جس کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کل رات پجاریوں نے کرنا تھا۔"

"ہم اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔"

"تمہارے تردید کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا۔ "پجاری اگر یہ بھی کہہ دیں کہ تم نے برف میں آگ لگائی ہے یا آگ میں سے پانی نکالا ہے تو بستی والوں کو ماننا پڑے گا اور میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ پجاری تمہارے سلسلے میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم نے یقیناً بچی کو اغوا کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر ہنری! اگر ایسا ہوا بھی ہے تو نیک مقصد کے لئے ہوا ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ میں جانتا ہوں لیکن ان وحشیوں کو کون سمجھائے گا۔ وہ جب تک اس معصوم کی جان نہیں لے لیں گے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کے نزدیک اپنی رسم کی قدر و قیمت انسانی جان سے کہیں زیادہ ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے کچھ آگے زیادہ گھنے درختوں میں چلے گئے۔ ڈاکٹر ہنری کے جھریوں بھرے چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔ یہ تفکر یقیناً ہمارے لئے تھا۔ وہ اس تاریک وادی کا روشن خیال باسی تھا۔ اس حوالے سے ہمارے ساتھ اس کی ہمدردی فطری تھی۔ ہم وہیں درختوں کے درمیان تھوڑی سی دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر ہنری نے بتایا کہ ہماری تلاش سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ وہ بچی اب کہاں ہے۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو پچھلے آٹھ دس گھنٹوں میں ہم پر گزرا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کوئی بات ڈاکٹر سے چھپائی ہو۔ وہ حیرت آمیز دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ناشا نام کی اس لڑکی کو جانتا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "اس لڑکی کا پورا نام ناشا جیت ہے۔ وہ بے حد تیز و طرار اور زبردست مکار لڑکی ہے۔ غصے میں آ جائے تو جنگلی جانور کی طرح خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اس نے شادی کی ایک تقریب صرف اتنی سی بات پر الٹ دی تھی کہ چند براتیوں نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ اس نے براتیوں کے منہ نوچ لئے تھے۔ دولہا کے کپڑے تار تار کر دیئے تھے اور شادی کے پنڈال کو آگ لگا کر بھاگ گئی تھی اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں، ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ لڑکی زبردست شکاری بھی ہے اور غضب کا نشانہ رکھتی ہے۔ موسم بہار کے آغاز میں یہاں شکار اور نشانہ بازی کے مقابلے ہوتے ہیں جن میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ پچھلے دو برسوں سے یہ لڑکی بہترین نشانہ باز منتخب ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "حیرت کی بات ہے کہ یہ لڑکی عبادت گاہوں اور پجاریوں کے خلاف کھلے عام نفرت کا اظہار کرتی پھرتی ہے۔ ننگ دھڑنگ لباس پہنتی ہے اور مردوں کو دعوت عام دیتی ہے پھر بھی برابر بستی میں موجود ہے اور پجاریوں کے غضب سے محفوظ بھی؟"

ڈاکٹر ہنری زیر لب مسکرایا اور بولا۔ "اس کی ایک وجہ ہے۔ یہ لڑکی بستی کے سب سے بڑے پجاری خاران کی بڑی بیٹی ہے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ یہ میں کیا سن رہا تھا۔ یہ تو وہی مثال تھی "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔" سب سے بڑے پجاری کی بیٹی ہی پجاریوں کی سب سے بڑی مخالف تھی۔ ڈاکٹر ہنری اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "باپ نے اس سے قطع تعلق کر رکھا ہے۔ وہ ایک علیحدہ گھر میں رہتی ہے۔ بالکل تن تنہا..... وہ کہتی ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے اسے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ بس ایک کتے کی ضرورت ہے جو اس نے پال رکھا ہے.... آزاد خیال عورتیں اس کی دلیری کی تعریف کرتی ہیں لیکن بستی کے اکثر لوگ اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خاص طور سے پجاری۔ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ اسے زندہ دفن کر دیں۔"

"خاصا دلچسپ کردار ہے۔" میں نے کہا۔

"اور خطرناک بھی۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم اس کے ہاتھوں کسی طرح کا نقصان اٹھانے سے محفوظ رہے ہو۔ بہرحال اس کی ایک بات صحیح ہے۔ محترم پناہ کی بچی اس کی تحویل میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ چھپا دے جہاں جاتروں کی انتظامیہ اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ لیکن پھر بھی۔" ڈاکٹر ہنری کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اس کی خاموشی طویل ثابت ہوئی۔

"آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔" میں نے اسے اکسایا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "لیکن وہ کہاں تک چھپائے گی اس بچی کو۔ آخر تو اسے پکڑے ہی جانا ہے۔ اس وادی میں رہ کر وہ کب تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ وادی سے نکل جائے۔" میں نے کہا۔

"یہی تو تمہاری بھول ہے۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا۔ "تمہارے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہیں بیٹھی کہ اس منحوس وادی سے نکلنا ناممکن ہے۔ تمہیں ان انتظامات کی سختی کا اندازہ نہیں جو اس وادی نے "فرار کے عمل" کو روکنے کے لئے کئے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو جب فرار ہونے کی کوشش کریں گے تو نزدیک سے پتا چل جائے گا۔"

"یہ تجربہ تمہارے لئے بے حد مہنگا ثابت ہو گا۔" ڈاکٹر ہنری نے پیش گوئی کی۔

"پھر کیا کریں ہم؟ کیا ہمیشہ کے لئے یہیں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیں۔ آپ کی طرح شادی کریں، قبیلہ بنائیں اور چین کی بانسری بجائیں۔"

"یہ فیصلہ تم نے نہیں کرنا۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا۔ "یہ فیصلہ وہ لوگ کریں گے جن کے تم قبضے میں ہو اور میرے خیال میں وہ فیصلہ کر بھی چکے ہوں گے۔ اس مرتبہ جب تم پکڑے جاؤ گے تو تمہارے پاؤں میں پھر آہنی بیڑیاں ڈال دی جائیں گی۔ ممکن ہے کہ کوئی کڑی سزا بھی دی جائے تمہیں۔ یہاں کسی جاتری پر ہاتھ اٹھانا بڑے جرائم میں شمار ہوتا ہے۔"

"کیا نیا سردار مسعود بھی ہمارا دفاع نہیں کرے گا؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں بیٹے! کہ یہاں کا سردار اتنا بااختیار نہیں ہوتا جتنا نظر آتا ہے۔ اس کی اصل طاقت جاتریوں کی طاقت ہے اور وہ جاتروں سے ٹکرانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"پھر ہمارے لئے آپ کا کیا مشورہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں کے مذہبی ٹھیکیداروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا ہی عقلمندی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تم خود کو نئے سردار کے حوالے کر دو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے لئے رعایتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔"

"مگر جاتری ہم سے بچی مانگیں گے؟"

"تم ساری کہانی ان کے سامنے کھول کر بیان کر دینا۔ "سچ" اپنا گواہ آپ ہوتا ہے۔"

میں نے ڈاکٹر ہنری سے کہا کہ ہم اس سلسلے میں ایک آدھ دن تک فیصلہ کر لیتے ہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر ہنری سے نینگ ہن کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہے اور اس بات پر بہت خوش ہے کہ جون چارلس "جہنمی" چڑھنے سے بچ گیا ہے۔ وہ کوکی دارا کے ہاں جا کر ایک مرتبہ جان چارلس سے مل بھی چکا ہے۔

ڈاکٹر ہنری سے رخصت ہونے کے بعد میں اور زریں گل ایک بار پھر ویران نشیب و فراز میں گھومنے لگے۔ دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ۹۰ درجے کی وہ عمودی ڈھلوان نظر آ رہی تھی جو اس وادی کی قدرتی حد تھی۔ اس ڈھلوان پر کوئی کوئی مقام ایسا بھی تھا جہاں سے رستوں کے بغیر اوپر چڑھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی مگر اس عمودی ڈھلوان سے آگے "موت کا علاقہ" تھا۔ وہ ہزاروں بارودی سرنگیں جو بیج کی طرح اس علاقے میں بکھیری گئی تھیں۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ زمین کے کس چپے پر موت ہے اور کس پر زندگی۔ ہم گھومتے گھومتے ایک نسبتاً بلند جگہ پر پہنچے تو دو چوٹیوں کے عقب سے ہمیں نانگا پربت دکھائی دینے لگی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کا فاصلہ ہم سے کتنا ہے۔ شاید تیس پینتیس میل، شاید ساٹھ ستر میل۔ نانگا پربت کی صرف بالائی نوک (پیک) ہمیں نظر آ رہی تھی۔ دھوپ میں یہ نوک چاندی کی طرح دمک رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ نانگا پربت کا "روپل فیس" ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم گیپال سے جنوب مشرق کی جانب موجود ہیں۔

ہم چوٹی کو ایسے زاویے سے دیکھ رہے تھے جو بالکل غیر متاثر کن تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ پاکستان کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے اور اس کی بلندی آٹھ ہزار میٹر سے بھی زیادہ ہے..... لیکن ہمیں معلوم تھا کہ جونہی ہم ذرا بلندی پر جائیں گے یہ چوٹی کسی دیومالائی عفریت کی طرح اپنی شان اور رعنائی نمایاں کرے گی اور آسمان کو چھوتی محسوس ہو گی۔ دوپہر کے وقت ہم اخروٹ کے ایک خزاں رسیدہ جنگل میں پہنچے۔ یہاں زمین پر برف کی موٹی تہہ موجود تھی اور پہاڑوں کا بارعب سناٹا ہر طرف گونجتا محسوس ہوتا تھا۔ زریں گل کا موڈ اب قدرے بہتر ہو چکا تھا۔

کہنے لگا۔ "استاد صیب! ڈاکٹر ہنری نے تو زبردست انکشاف کیا ہے۔"

"کون سا انکشاف؟"

"یہی کہ یہ بدبخت لڑکی خاران کا بچی ہے اور اماری رنگ کلثوم کا بہن ہے۔"

"ہاں انکشاف تو واقعی زبردست ہے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ اس لڑکی کی شکل کس سے ملتی ہے؟"

"ہاں ام کو بھی بہت جانا پہچانا لگتا تھا لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آیا استاد صیب! یہ انگلش بولتا ہے۔"

"لیکن جیسا لولا لنگڑا بولتا ہے وہ بھی تمہارے سامنے ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یہ آزاد خیال لڑکی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی اسی آزاد خیالی نے اسے انگلش سیکھنے پر مجبور کیا ہو۔ جو لوگ معاشرے کے باغی ہوتے ہیں وہ اکثر ایسے ہی کام کرتے ہیں۔"

"لیکن یہاں اسکول تو کوئی نہیں؟"

"اگر مڑا اسکول میں جانے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ یہاں غیر ملکی مادار (قیدی) عام پائے جاتے ہیں۔ کسی ایسے ہی مادار سے سیکھ لی ہو گی اس نے۔"

زریں بولا۔ "ویسے استاد صیب! کتنا عجیب بات ہے۔ کلثوم نے ام سے کبھی اپنی بڑی بہن کا ذکر نہیں کیا۔"

"کوئی تعریف کی بات ہوتی تو ذکر کرتی۔ اس کے لئے تو بڑی شرم کا مقام ہو گا کہ اس کی بڑی بہن بس دو گرہ کا کپڑا پہن کر چلتی پھرتی ہے اور باپ کی عزت خراب کر رہی ہے۔"

زریں گل بولا۔ "واقعی اس حساب سے دیکھا جائے تو کلثوم ایک نیک پروین نظر آتا ہے۔ ماں باپ کا فرمانبردار ہے۔ تمام رسم و رواج کا پابندی کرتا ہے۔ زمین آسمان کا فرق ہے دونوں بہنوں میں۔"

"لیکن آنکھ مٹکا تو وہ بھی کرتی ہے۔"

"وہ تو بڑا شریفانہ آنکھ مٹکا ہے استاد صیب۔" زریں نے کہا اور کلثوم کے تصور میں کھو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تین منٹ لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا پھر کہنے لگا۔ "استاد صیب! امارا دل چاہتا ہے کہ کسی پتھر پر بیٹھ کر کلثوم کو یاد

کرے اور قلم بھر رانجھا کا یہ مشہور گانا گوئے۔ "ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں' ملو تو آنکھ چرائیں' ہمیں کیا ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تیری آواز پر ہیر تو نہیں آئے گی لیکن کوئی کیدو ضرور پہنچ جائے گا اپنے چیلوں چانٹوں کے ساتھ۔ مار مار کر تمہیں ادھ موا کرے گا اور پھر تم کو پکڑ کر لے جائے گا بستی میں۔"

"لے جانا ہے تو لے جائے۔ کم از کم کھانا تو ملے گا۔ ام کو تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہزاروں برس سے ام نے کھانا نہیں کھایا۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں زہر ٹھیک ہے۔ کاڑ کا ڈالو اور کھاڑ کھانا۔"

کھانے کے ذکر پر زریں گل کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور بولا۔ "استاد صیب! آپ کو معلوم نہیں آج ام کو پشاور کا چپلی کباب کتنا یاد آ رہا ہے۔ خوا مارا دل چاہتا ہے ان سامنے والے درختوں پر گرما گرم چپلی کباب اور سیخ کباب لگ جائے۔ ام ادھر دیکھے تو کلثوم نظر آئے' اس کے ہاتھ میں گرم گرم روغنی نانوں کی چنگیر ہو۔ ساتھ میں پودینے اور دہی کا چٹنی ہو جس میں باریک باریک ٹماٹر کاٹ کر ڈالا گیا ہو۔ ام جلدی جلدی درختوں پر سے بہت سا کباب توڑے اور روغنی نان پر رکھ کر دے۔ آپ ذرا سوچیں کتنا مزہ آئے۔ سبحان اللہ' واہ واہ۔"

زریں گل نے "واہ واہ" کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس کی رال گرنے گرنے بچی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ بھوک میں وہ بالکل باؤلا سا ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب میں سے نوٹوں کے چند ٹکڑے اور چوکلیٹ کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات تھی' بہرحال میں نے یہ چیزیں زریں گل کو پیش کر دیں۔

مجھے یقین تھا کہ نتاشا بی بی کے ساتھ کہیں دور نہیں گئی اور ان نشیب و فراز میں ہی کہیں چھپی ہوئی ہے۔ اس علاقے میں چونکہ برف موجود تھی لہٰذا یہ امکان بھی تھا کہ کہیں اس کے قدموں کے نشان مل جائیں' ہم شام تک وہاں گھومتے رہے پھر کسی مناسب ٹھکانے کی تلاش میں واپس روانہ ہو گئے۔

شام ہوتے ہی پہاڑوں کے دیو ہیکل سائے زمین پر بچھ گئے تھے اور دھوپ کو نگلنے چلے جا رہے تھے۔ ہم ایک تنگ راہ گزر پر آگے پیچھے جا رہے تھے جب اچانک کچھ آوازوں نے ہمیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ یوں لگا جیسے چند افراد تیز آواز میں بحث کر رہے ہوں۔ بولنے والے اسی تنگ راہ گزر میں چلتے ہماری طرف آ رہے تھے۔ درمیانی فاصلہ سو ڈیڑھ سو گز کے لگ بھگ تھا۔ میرے ساتھ زریں گل بھی ٹھٹک گیا۔ اس رہ نما راستے سے ہٹنا آسان نہیں تھا۔ اگر ہم یہ چاہتے تھے کہ آنے والوں سے ہمارا سامنا نہ ہو تو ہمیں الٹے قدموں واپس جانا تھا۔ ہم نے پانچ دس سیکنڈ فیصلہ کرنے میں صرف کر دیے۔ آوازیں اب قریب تر ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں کسی عورت کی آواز بھی شامل ہے۔ ہم تیزی سے واپس روانہ ہوئے اور رہ نما راستے سے باہر نکل آئے۔

گمان غالب یہی تھا کہ یہ وہی افراد ہیں جو بستی کے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں اور ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایک چھرے کے سوا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر ہم ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو مقابلہ آسان نہ ہوتا۔ ارد گرد کوئی جائے پناہ بھی نہیں تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اس کھوہ کے بالکل قریب ہیں جہاں ہم نے رات گزاری تھی۔ میں زریں گل کے ساتھ کھسکتا ہوا کچھ اور پیچھے درختوں میں آ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ہمیں ان لوگوں کے ہیولے نظر آ گئے۔ شام کے جھٹپٹے میں ان کی صحیح تعداد کا تعین تو مشکل تھا۔ تاہم وہ کسی طرح بھی ایک درجن سے کم نہیں تھے۔ ان کے کندھوں پر کلہاڑے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً ایک دو کے پاس رائفلیں بھی ہوں گی۔ وہ متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھ رہے تھے۔ یکایک مجھے شک ہونے لگا کہ کہیں انہوں نے برف پر ہمارے پاؤں کے نشان نہ دیکھ لیے ہوں۔ شام تو ہو گئی تھی لیکن ابھی اتنی تاریکی نہیں پھیلی تھی کہ نشان نظر ہی نہ آ سکتے۔ میں نے زریں گل کا کندھا دبایا۔ ہم بڑی احتیاط سے درختوں کے پیچھے سے نکلے اور پنجوں کے بل اپنی کھوہ کی طرف بڑھنے لگے۔ موجودہ صورت حال میں کھوہ ہی ہماری پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم کھوہ کے تنگ دہانے میں سے جسم پھنسا کر گزرے اور اندر پہنچ گئے۔ نتاشا نے رات کو کھوہ میں جلانے کے لیے جو لکڑیاں اکٹھی کی تھیں وہ ابھی تک کھوہ کے وسط میں پڑی تھیں۔ ہم دہانے کے قریب جا کر خاموش کھڑے ہو گئے اور باہر سے آنے والی آوازیں سننے لگے۔ وہ لوگ آس پاس ہی موجود تھے اور یوں لگتا تھا کہ آہستہ آہستہ کھوہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بڑی تشویشناک صورت حال تھی۔ اگر ان لوگوں کے پاس کوئی ٹارچ وغیرہ موجود تھی تو وہ قدموں کے نشانات "ٹریس" کرتے ہوئے دہانے تک پہنچ سکتے تھے اور یہ پناہ گاہ ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "زریں گل کے بچے۔ تیری زبان بڑی کالی ہے۔ لگتا ہے تیری خواہش پوری ہونے والی ہے۔ آج تجھے ہی تڑ تڑ چھتر کباب کھانے کو ملیں گے۔"

زریں گل بولا۔ "آپ کے ہوتے ہوئے ام کو چھتر کباب کوئی نہیں کھلا سکتا' یہ بات ام اچھی طرح جانتا ہے۔"

"کیوں میرے سر پر سینگ ہیں؟"

"ہاں آپ کے سر پر سینگ ہے۔ آپ ان سینگوں سے آٹھ دس بندوں کا پیٹ باآسانی پھاڑ سکتا ہے پھر ام آپ کا شاگرد ہے۔ دو تین بندوں کو ام بھی سنبھال لے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آج تمہاری ساری خوش فہمی دور ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

ہمارے اندیشے بتدریج درست ثابت ہو رہے تھے۔ باتیں کرنے والے ہمارے بالکل پاس پہنچ گئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ کسی

محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک لازوال ناول

● جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی معاشرتی اور رومانی داستان۔

● محبت کیا ہے؟ اس ناول میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا۔

دل پارہ پارہ

قیمت: ۱۲۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۲

[illegible]

بھی وقت کھوہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اب زریں گل بھی گم صم نظر آنے لگا تھا۔ میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور کھوہ کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ یہ کھوہ چونکہ چٹانوں کے گرنے سے وجود میں آئی تھی۔ لہٰذا اس کی بناوٹ عجیب سی تھی۔

کھوہ کے آخری سرے پر پتھر کی ایک چھ سات انچ موٹی سِل جو قریباً بارہ فٹ مربع رہی ہوگی یوں رُکی تھی کہ اس کے پیچھے ایک تنگ سا خلا بن گیا تھا۔ اس خلا میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ دو افراد سمٹ سمٹا کر لیٹ سکیں۔ یہاں بالکل تاریکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ خطرہ موجود تھا کہ یہاں حشرات الارض ہوں گے بہرحال یہ "رسک" اب ہمارے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ زریں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے پہلے میں اندر گھسا۔ میرے گھستے ہی وہ بھی اندر آگیا۔ جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہو کہ جہ باداں دوزخ جہ باداں جنت۔ اس خلا میں مکڑی کے جالے لگے تھے اور سیلن بھی تھی۔ دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ آنے والوں کی آوازیں اب دہانے کے عین سامنے سے ابھر رہی تھیں پھر ان میں سے کوئی شخص اندر آگیا۔ وہ بڑے کرخت لہجے میں مقامی زبان بول رہا تھا۔ چند سیکنڈ وہ تنہا کھوہ میں کھڑا رہا پھر باقی افراد بھی ایک ایک کر کے اندر گھس آئے۔ ہم صحیح معنوں میں چوہے دان کے اندر تھے۔ ان لوگوں کے اندر آتے ہی کھوہ کا مختصر خلا بدبودار جسموں کی سڑاند سے بھر گیا تھا اور "آوازوں" سے گونجنے لگا تھا۔ اگر ان لوگوں کے پاس روشنی کا انتظام موجود تھا تو پھر ہمارے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اس مختصر خلا میں جھانکیں گے اور ہمیں دبوچ لیں گے۔ میں اور زریں دم سادھے لیٹے رہے اور آوازیں سنتے رہے۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ کھوہ میں گھسنے والے افراد میں جو عورت شامل ہے وہ ناشا جیت ہے پھر مجھے بچی زرغونہ کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ تو کوئی اور ہی چکر نکل آیا تھا۔ بھاری آواز والا ایک شخص جھگڑنے والے انداز میں بول رہا تھا۔ یقیناً وہ ناشا سے مخاطب تھا۔ جواب میں کبھی کبھی ناشا کی تیکھی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ہماری موجودگی سے قطعی بے خبر ہیں۔

میں وہیں تنگ خلا میں لیٹا لیٹا قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ شاید یہی کچھ ہوا تھا کہ "آفت کی پرکالہ" ناشا ڈاری کے محافظوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور وہ اسے بچی سمیت پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اسے کسی پوچھ گچھ کے لئے یہاں لائے ہوں۔ بچی بے شک ناشا سے برآمد ہوئی تھی لیکن اسے غائب کرنے والے تو ہم تھے۔ ناشا کو یہ بتانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا کہ اس نے بچی کس سے اور کیسے حاصل کی۔ میں نے زریں گل کے کان میں سرگوشی کی اور کہا کہ وہ ان لوگوں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرے۔

زریں گل نے اپنا بڑا سا سر اثبات میں ہلایا اور جوابی سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "ام کو بھی کچھ کچھ پتا چل رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے!"

"وہ کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لوگ ام کو پکڑنے کے لئے یہاں آیا ہے۔ ان کو پتا ہے کہ لڑکی ناشا یہاں لایا ہے اور ناشا کو یہ لوگ یہاں لائے ہیں۔"

"تمہاری بکواس میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے زریں کے عین کان میں سرگوشی کی۔

وہ میرے کان میں بولا۔ "دراصل یہ لوگ جانزو کا محافظ ہے۔ انہوں نے ابھی دو گھنٹا پہلے ناشا کو بچی سمیت پکڑا ہے۔ وہ ناشا سے امارے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ تنگ آکر ناشا ان کو یہاں لے آیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ام کو صبح کے وقت یہاں چھوڑ کر گئی تھی مگر وہ لوگ ناشا کے بیان پر یقین نہیں کر رہا۔ ان کا پکا خیال ہے کہ ناشا امارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے۔ بھاری آواز والا بندہ محافظوں کا انچارج ہے۔ وہ ناشا کو گالیاں دے رہا ہے اور ناشا اس کو گالیاں دے رہا ہے۔"

ہم ایک بار پھر خاموش ہو گئے اور ان کی باتیں سننے لگے۔ زریں گل اور میں ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ زریں کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل پاس تھا۔ اس کے منہ سے نسوار کی بو آ رہی تھی اور میرے دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک جوں کے توں لیٹے رہے۔ سخت سردی کے سبب اعضا اکڑ گئے تھے اور بھوک کے سبب پیٹ میں بل پڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کھوہ میں موجود افراد نکلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ مسلسل باتوں میں مصروف تھے اور کبھی کبھی ناشا سے جھگڑنے لگتے تھے۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ میں نے زریں گل کے کان میں سرگوشی کر کے پوچھا۔

"استاد صیب؟" وہ بولا۔ "محافظوں کے انچارج کا نام مستان ہے۔ وہ اپنے پانچ چھ ساتھیوں کو لے کر چلا گیا ہے۔ خبر نہیں کہ لوٹتا بھی ہے یا نہیں۔ اب اس کھوہ میں ناشا کے علاوہ کل پانچ بندے ہیں۔"

"اور بچی؟"

"خو بچی بھی مستان کے ساتھ گیا ہے۔"

"کچھ اندازہ ہوا کہ ان کے پاس کیا کیا اسلحہ ہے؟"

"ٹھیک سے تو پتا نہیں لیکن اسلحہ ان کے پاس ضرور ہے۔ مستان بھی اپنا رائفل یہاں پر ہی چھوڑ گیا ہے۔" بات کرتے کرتے ایک دم زریں کے کان کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگا۔ "استاد صیب! ایک منٹ ٹھہرو! ام کو ان کا بات سننے دو۔"

میں خاموش ہو گیا۔ زریں گل پوری توجہ سے کھوہ میں ہونے والی گفتگو سننے لگا۔ ہم ایک گھنٹے سے بے حس و حرکت لیٹے تھے ذرا سی آہٹ کھانسی یا چھینک ہمارا راز فاش کر سکتی تھی۔ یہ بڑی

نازک صورت حال تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ان لوگوں کے پاس روشنی کا انتظام نہیں تھا (اور اگر ہوتا تو وہ بستی کے قوانین کے مطابق روشنی کر نہیں سکتے تھے) ورنہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اس مختصر خلا میں جھانکتا اور ہمیں دیکھ لیتا۔

زریں گل نے تھوڑی دیر بعد میرے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ والی ناشا بہت کھلا ڈلا لڑکی ہے۔ مردوں کے ساتھ لفنگی باتیں کر رہا ہے۔ لگتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے محافظوں کے انچارج سے بھی اس کا تعلقات رہا ہے۔"

وہ رات ہم نے جیسے تیسے کاٹی۔ کھوہ کے مختصر خلا میں جسموں کی گرمی کی وجہ سے قدرے حرارت ہو گئی تھی۔ ہم نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے لہٰذا رات پچھلے پہر اونگھ آگئی۔ کھوہ میں موجود کم از کم دو افراد ساری رات جاگتے رہے تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم کھوہ سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ امید یہی تھی کہ ہمیں صبر کا پھل ملے گا۔ صبح یہ لوگ جلد ہی کھوہ سے نکل جائیں گے اور ہم بھی اس "چوہے دان" سے چھٹکارا پالیں گے لیکن صبح سویرے ایک اور ہی چکر چل گیا۔ زریں گل نے مجھے ٹہوکا دے کر جگایا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

"یہ بڑا خرانٹ لڑکی ہے۔ زبردست چکر چلا رہا ہے؟"

"کیا کر رہا ہے؟"

"اب ام آپ کو کیا بتائے کہ کیا کر رہا ہے۔ ایسا گندی باتیں کر رہا ہے کہ انڈیا کی ننگی فلموں میں بھی نہیں ہوتا ہوگا اور وہ پاگل کے بچے مزے لے لے کر سن رہے ہیں اور رالیں ٹپکا رہے ہیں۔"

"کس پر؟"

"اس حرامزادی پر اور کس پر۔ ام کو پکا یقین ہے کہ ایک آدھ گھنٹے میں یہ لڑکی ضرور ان کا بیڑا غرق فرمائے گا اور یہاں سے بھاگ جائے گا۔"

میں نے بے حد آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور پیٹ کے بل رینگ کر خلا سے باہر جھانکنے لگا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی تاہم اندھیرے میں اُجالے کی آمیزش ہو چکی تھی۔ اس اجالے کی وجہ سے کھوہ کے اندر بھی مدھم روشنی ہو گئی تھی۔ چار انسانی ہیولے پندرہ بیس فٹ کی دوری پر نظر آئے۔ ان میں ناشا بھی شامل تھی۔ وہ اپنے لمبے بالوں کی وجہ سے پہچانی گئی۔ اس کے جسم پر ایک اونی لبادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی اور کھوہ کی چھت تک پہنچ رہے تھے پھر ایک مرد کی آواز آئی۔ اس آواز میں کل جیسی تلخی اور برہمی نہیں تھی۔ تب ایک اور شخص بولا۔ اس کے لہجے سے خوشامد ٹپک رہا تھا۔ وہی خوشامد جو مرد کے لہجے سے پسندیدہ عورت کے لئے ٹپکتا ہے۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ میں وہیں پندرہ فٹ کا درمیانی فاصلہ تیزی سے طے کر سکتا تو ان لوگوں پر کاری وار کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ باقی کے افراد نظر نہیں آ رہے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ سرنگ کے دہانے پر موجود ہوں اور سامنے آ کر پانسا پلٹ دیں۔ ان کے پاس جدید رائفلیں بھی تھیں۔ بہتر یہی تھا کہ کسی طرح کا رسک لینے کے بجائے کچھ دیر مزید انتظار کر لیا جائے۔

میں پھر زریں گل کے قریب لیٹ گیا۔ میں نے زریں سے پوچھا۔ "یہ لوگ لڑکی کو لے کر یہاں سے جاتے کیوں نہیں؟"

"جہاں تک ام کو سمجھ آ رہا ہے یہ بھی ایک چکر ہے۔" زریں گل نے کہا۔ "آپ جانتا ہی ہے کہ لڑکی سب سے بڑے بچا جی کا بیٹی ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو بستی لے جائے گا تو پھر سختی کر کے اس کا زبان نہیں کھلوا سکے گا۔ یہاں کھوہ میں یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اگر اسے مار پیٹ نہیں سکتا تو ڈرا دھمکا تو سکتا ہے۔ یہ بالکل وہی کارروائی ہے جو امارے ہاں پولیس والا کرتا ہے۔ جب کوئی تعلقات والا بندہ پکڑا جاتا ہے تو اسے کسی دور دراز کے تھانے میں لے جاتا ہے تاکہ سفارشیں آنے سے پہلے پہلے اس سے پوچھ کچھ کر لیا جائے۔ امارا مطلب ہے....."

"ہاں ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ لڑکی تو کوئی اور ہی چکر چلا رہی ہے۔"

"ہاں وہ بہت چنڈال ہے۔ بالکل خوفزدہ نہیں بلکہ شیطان کا بچی الٹا محافظوں کو ڈانواں ڈول کر رہا ہے۔ ان سے ہنسی مذاق کر رہا ہے۔"

میں نے اپنے کان ایک بار پھر باہر سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگ شراب نوشی میں مصروف ہیں۔ ان کی آوازوں میں ہلکا سا بھاری پن آگیا تھا اور یہ بھاری پن ناشا کی آواز میں بھی موجود تھا۔ کسی وقت وہ دلکش انداز میں ہنستی اور چہک کر بجلی سی چیخ مارتی، کسی وقت تیز تیز بولنے لگتی پھر یکایک کھوہ سے دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ کسی کے سر پر وزنی چیز سے ضرب لگی اور وہ دھڑام سے کھوہ کے وسط میں گرا پھر ناشا کی کڑکتی بجلی جیسی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور کھوہ اس آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے لیٹ کر اپنی پناہ گاہ سے باہر جھانکا۔ مجھے ناشا نظر آئی۔ اس کے جسم پر وہی مختصر ترین لباس تھا۔ جسم کسی کمان کی طرح تنا ہوا تھا اور ہاتھوں میں خودکار رائفل تھی۔ لمبے بالوں والا ایک شخص اس کے قدموں میں تڑپ رہا تھا۔ اس کا چمکدار پھل والا کلہاڑا بھی قریب ہی پڑا تھا۔ ایک دوسرا شخص دیوار سے لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور اس نے اپنا لہولہان گھٹنا دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ یقیناً گولی اسے ہی لگی تھی۔ ناشا کی پشت میری طرف ہوتی تو میں کوئی کارروائی کر سکتا تھا مگر وہ سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔

ناشا نے کڑک کر کوئی حکم دیا۔ کھوہ کے ایک نیم تاریک گوشے سے ایک فربہ اندام شخص ہاتھ اٹھائے برآمد ہوا اور زخمی گھٹنے والے کے قریب آن کھڑا ہوا۔ ناشا نے غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک زوردار لات فربہ اندام شخص کے

سینے میں مار دی۔ وہ ڈکرایا اور تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ ناشا پھر گر گئی۔ دونوں افراد دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ بالکل جیسے کل صبح ہم کھڑے ہوئے تھے۔ ناشا نے اپنے بوٹ کی ایک ٹھوکر نیچے پڑے شخص کے منہ پر بھی رسید کی اور اسے اٹھنے پر مجبور کرنے لگی۔ اسی دوران میں وہ اسے قدموں چلاتی دہانے کے قریب پہنچی۔ غالباً اس نے کوئی آہٹ سی تھی اور اس کی وجہ جاننا چاہی تھی۔ اس کے انداز میں جو کتا پلی کی سی چستی تھی۔ زاویہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ وہ مجھے بھی دیکھ سکتی تھی۔ میں تھوڑا سا مزید نیچے کھسک گیا۔ جونہی ناشا دہانے کے قریب پہنچی میری نگاہوں میں بجلی سی چمک گئی۔ ایک ہاتھ پھرتی سے ناشا کی رائفل پر آیا اور دوسرے نے اس کے بال دبوچ لیے۔ ایک ساعت کے لیے زبردست کشمکش ہوئی اور پھر ناشا پشت کے بل پتھریلی زمین پر گری۔ وہ اکیلی نہیں گری تھی۔ اس کے ساتھ ایک "جسیم" سایہ بھی تھا۔ گرنے کے ساتھ ہی ناشا پھر اٹھی اور اس رائفل کی طرف لپکی جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ ناشا رائفل تک پہنچتی فربہ اندام شخص نے ٹھوکر مار کر رائفل کو دہانے کے قریب پہنچا دیا۔ میں اب "جسیم" سائے کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ محافظوں کا انچارج مستان تھا۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ مستان واپس آ گیا تھا اور ایسے موقع پر آیا تھا جب ناشا اس کے ساتھیوں پر بجلی بنی ہوئی تھی۔ اٹھتے ساتھ ہی مستان نے ناشا کو عقب سے دبوچ لیا۔ وہ اس کی گرفت میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپی اور ٹانگ کی ضرب فربہ اندام شخص کے تھوبڑے پر لگائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا۔ یعنی اب وہ مستان کے روبرو تھی۔ بڑی پھرتی سے اس نے مستان کو گھٹنا مارا۔ یہ گھٹنا اس کے پیٹ میں کہیں لگا۔ مستان نے بھنا کر اسے زمین پر گرانا چاہا لیکن ناشا نے اسے ایسا اڑنگا لگایا کہ وہ خود ہی پہلو کے بل گرا۔ فربہ اندام شخص کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ اس نے ایک ٹوٹی ہوئی بوتل سے ناشا پر حملہ کیا۔ بوتل ناشا کے عریاں بازو پر لگی۔ اس زخم کا صلہ فربہ اندام شخص کو ایک خونی چوٹ کی صورت میں ملا۔ یہ چوٹ ناشا نے اپنے سر سے تو مقابل کے منہ پر لگائی تھی۔ چوٹ کی آواز سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ فربہ اندام کے دو تین دانت ضرور لقمۂ اجل بن گئے ہوں گے۔ اسی دوران میں مستان نے اٹھ کر پھر ناشا کو دبوچ لیا۔ اس مرتبہ ایک اور شخص بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ ناشا ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے۔ ایک تیسرے شخص نے ناشا کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ جا کر وہ بھی پکڑنے کی کوشش میں کامیاب ہو سکا۔ لمبے بالوں والا ایک بدبودار مقامی "ٹیگو" دہانے پر رائفل سونتے کھڑا تھا۔ یہ وہی رائفل تھی جو کل ناشا نے میری گود سے اٹھائی تھی اور اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب یہ سیون ایم ایم رائفل ناشا سے محافظوں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ میں اس رائفل کی ہلاکت آفرینی سے آگاہ تھا لہٰذا اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔

کھوہ کا خلا اب غضب ناک آوازوں سے گونج رہا تھا۔ یہ آوازیں مستان اور ناشا کی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے اور زوریں کے بقول ایک دوسرے کو مغلظ گالیاں دے رہے تھے۔ ناشا بے بس ہو چکی تھی۔ تاہم اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی پھر میں نے دیکھا کہ اس نے مستان کے منہ پر تھوک دیا۔ جواباً مستان نے بھی اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ محافظوں کی گرفت میں مچلی اور ان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک شخص شو بچانی میں استعمال ہونے والی رسی لے کر آیا اور اس کی مدد سے ناشا کی ٹانگیں باندھ دیں پھر اسے زمین پر پٹخ دیا گیا اور بازو بھی پشت پر باندھ دیے گئے۔ ناشا کی زخمی کلائی مسلسل خون اگل رہی تھی۔ چونکہ پتھریلی زمین میں یہ خون جذب نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا دھبوں کی صورت میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ مستان کی سرخ آنکھوں میں حیوانی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تند و تیز لہجے میں بول رہا تھا اور بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے زوریں گل کے کان میں سرگوشی کی۔ "کیا کہہ رہا ہے؟"

"خو یہ ناشا کا پرانا عاشق ہے۔ یہ شیطان کا بچہ ناشا بھی اس سے ملتا رہا ہے۔ بہرحال اب یہ دونوں ایک دوسرے کا پکا دشمن بنا ہوا ہے۔ بالکل اینٹ اور کتے کا مافق۔ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہا ہے۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مستان کے سوا سارے محافظ باہر نکل گئے۔ مستان نے ایک بوتل میں بچی کچی شراب حلق میں انڈیلی اور کسی غضب ناک جانور کی طرح ناشا پر جھپٹ پڑا۔ ناشا ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ اس نے مستان کی زبردست مزاحمت کی اور اپنی بندھی ہوئی ٹانگوں سے اسے پے در پے ضربیں لگائیں۔ مستان پر جیسے دیوانگی طاری تھی۔ وہ جسیم ہی نہیں خاصا زور آور بھی تھا۔ نشے و غضب نے اس کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ ہر طریقے سے ناشا پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناشا کے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو شاید وہ دیر تک مزاحمت کرتی لیکن موجودہ صورت حال میں اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ جلد ہی وہ بے بس ہو گئی۔

اس پر عورت کی وہی ازلی کمزوری غالب آنے لگی جو اسے لاچاری سے رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ رونے لگی۔ میں اپنی جگہ سے حرکت کر کے اس کے آنسو پونچھ سکتا تھا لیکن میں نے اسے رونے دیا۔ بہتر تھا کہ اسے تھوڑا سا سبق اور مل جاتا۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے بلا امتیاز ہر مرد پر طعن کی تھی اور خاص طور سے ہمیں طنز کا نشانہ بنایا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم بودے اور ڈرپوک ہیں اور بچی کی حفاظت کے لائق نہیں۔ اب وہ خود بچی کی حفاظت نہیں کر سکی تھی بلکہ اپنی

حفاظت کے سلسلے میں بھی بے بس ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی انسان کا کہا کتنی جلدی اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ جو کل صبح بگولے کی طرح اس کھوہ میں چکرا رہی تھی۔ اب سنگلاخ زمین پر پڑی تھی اور اپنے جیسے ایک جنگلی کی گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ کسی بھی وقت وہ بدترین ذلت سے دوچار ہو سکتی تھی۔ وہ اسے کتے کی طرح نوچ کھسوٹ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد میں نے بے آہستگی اپنی جگہ سے حرکت کی اور خلا میں سے باہر نکل آیا۔ نو انچ لمبا چمکدار چھرا میرے ہاتھ میں تھا۔ مستان کی پشت میری طرف تھی لیکن ناشا مجھے دیکھ سکتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور تاثرات چہرے پر منجمد ہو گئے تھے۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مستان پلٹا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے چھرے کا وار اس کی ران پر کیا۔ پھل دستے تک اندر گھس گیا۔ مستان تڑپ کر جھکا تو اس کی گردن خود بخود میری گرفت میں آ گئی۔ میں نے بازو کی مخصوص حرکت سے گردن کی نسوں پر دباؤ ڈالا۔ مستان ایک بار زور سے مچلا پھر یکایک اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔

ناشا پھٹی ہوئی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ چھ فٹا چنگھاڑتا اور پھنکارتا شہ زور مستان ایک ہی جھٹکے میں مٹی کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی لیکن آواز اس کے حلق سے نکل نہیں رہی تھی۔ اس کی کلائی مسلسل خون اگل رہی تھی۔ اسی دوران میں زوریں گل بھی باہر نکل آیا۔ میں نے خون آلود چھرے سے ناشا کی بندشیں کاٹیں تو وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم ایک بار پھر کمان کی طرح تن گیا تھا۔ اس تنی ہوئی کمان پر اس نے جلدی سے اپنا اونی لبادہ ڈال لیا۔

"کتنے افراد ہیں یہاں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"پانچ" وہ بولی۔ "دو رائفلیں ان کے پاس ہیں' ایک رائفل اس پتھر کے پیچھے پڑی ہے۔"

میں نے زوریں گل کو اشارہ کیا۔ اس نے پتھر کے پیچھے سے رائفل قبضے میں لے لی اور اس کا میکنزم چیک کر لیا۔ کھوہ سے باہر اب دھوپ چمک رہی تھی۔ کھوہ کے اندر نیم تاریکی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جو شخص بھی ایک دم باہر سے اندر آئے گا فوری طور پر اسے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے گا۔ میں نے زوریں گل اور ناشا کو سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہوں نے غور سے میری ہدایات سنیں اور عمل کے لیے تیار ہو گئے۔

میں دہانے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ نئی نویلی رائفل میں نے زوریں گل کو تھما دی تھی۔ میرے اشارے پر زوریں گل نے ہوائی فائر کیا۔ دھماکے سے کھوہ گونج اٹھی۔ دھماکے کے ساتھ ہی ناشا نے زوردار چیخ ماری۔ چیخ کے فوراً بعد دہانے سے باہر بھگدڑ کی آواز آئی۔ ایک شخص رائفل سونتے کھوہ میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایک فربہ اندام شخص بھی پھنس پھنسا کر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے ایک نیم گنجے سر والا شخص اندر آیا۔ میں نے جھپٹ کر پہلے شخص کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ "شاباش" میری آواز کھوہ میں گونجی۔

تینوں افراد ہکا بکا کھڑے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اندر ایسی صورت حال سے پالا پڑے گا۔ وہ تو مستان اور ناشا کو کھوہ میں چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کا چوتھا ساتھی رائفل بردار تھا۔ اس نے باہر سے اندر جھانکا اور خطرہ بھانپ کر تیزی سے واپس پلٹا۔ یقیناً کہیں پوزیشن لینا چاہ رہا تھا۔ زوریں گل اس کے سواگت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے دہانے سے باہر نکل کر بھگوڑے پر فائر کیا اور اسے مار گرایا۔ بھگوڑے کا آخری ساتھی نہتا تھا' زوریں گل نے باآسانی اس پر قابو پا لیا اور اسے رائفل کے نشانے پر رکھ کر اندر لے آیا۔ بھگوڑے رائفل بردار کی ٹانگوں میں گولی لگی تھی۔ اس کی رائفل بھی زوریں گل اندر لے آیا تھا۔ یہ ساری کارروائی قریباً تین منٹ میں مکمل ہو گئی تھی۔

انچارج مستان کے بعد فربہ اندام شخص قدرے سینئر نظر آتا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف سیدھی کی اور ناشا سے کہا کہ وہ اس سے زوخونے کے بارے میں پوچھے۔

ناشا نے کہا۔ "تم لاکھ بھی کوشش کرو' یہ ایسے کچھ نہیں بتائیں گے۔ بہت موٹی کھال ہے ان کی۔"

"تو پھر کیسے بتائیں گے؟"

"ان کے جسم کی بوٹی بوٹی علیحدہ کرنی پڑے گی۔" وہ وحشیانہ انداز میں بولی اور اس نے تیز دھار چھرا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ بڑے خطرناک انداز میں وہ فربہ اندام کی طرف بڑھی تھی جب اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ ناشا کے ساتھ ہم بھی ٹھٹک گئے تھے۔ نشیب کی طرف سے ہلکی ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ جیسے کچھ لوگ تیزی سے ہماری طرف آ رہے ہوں۔ یہ بات فراموش کرنے والی نہیں تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں دو فائر ہو چکے ہیں۔ پہلا فائر جو ہوائی تھا' کھوہ میں ہوا تھا۔ دوسرا فائر زوریں گل نے کھوہ سے باہر نکل کر بھگوڑے جنگلی پر کیا تھا۔ ان دونوں فائروں کی آواز یقیناً دور تک گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ کچھ لوگ یہ آواز سن چکے ہوں اور اب آواز کے ماخذ کی طرف آ رہے ہوں۔ ناشا چھرے سمیت تیزی سے باہر نکلی اور پھر جلدی سے واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

مجھ سے کہنے لگی۔ "معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ قریباً دو درجن محافظ بڑی تیزی سے اس طرف آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں تم دونوں کو بھاگ جانا چاہیے۔"

"اور تم؟" میں نے پوچھا۔

"میری خیر ہے۔ میں سنبھال لوں گی سب کچھ۔"

"مگر!"

"مگر کچھ نہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "وقت ضائع نہ کرو ورنہ پچھتاؤ گے۔" اس نے آگے بڑھ کر رائفل میرے ہاتھ سے لے لی اور چھرا مجھے تھما دیا۔ چھرے کا دستہ ناشا کی اپنی ہی کلائی کے خون سے نم ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "مگران میں سے کم از کم ایک بندے کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"تو لے جاؤ جسے لے جانا ہے بلکہ اس حرامزادے کو لے جاؤ۔" اس نے بے سُدھ پڑے مستان کی طرف اشارہ کیا۔ زوریں گل مستان کے سرہانے رائفل سونتے کھڑا تھا اور اس نے کمرہ میں موجود ہر شخص کو "کور" کر رکھا تھا۔ مستان کا وزن کافی تھا۔ تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ اس کا پیٹ میرے کندھے پر تھا جب کہ بازو پیچھے کی طرف اور ٹانگیں آگے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ بالکل جیسے قسائی ذبح شدہ بکرا سائیکل کے ہینڈل پر لٹکاتا ہے۔

"تم کدھر جاؤ گی؟" میں نے ناشا سے پوچھا۔

"میں یہیں رہوں گی اور ان کتوں کو رائفل کے نشانے پر رکھوں گی۔ تم میری فکر نہ کرو بس نکلو یہاں سے۔" وہ جتنی غصیلی تھی اتنی ہی دلیر بھی تھی۔ چند منٹ پہلے اسے جس بے بسی نے گھیر رکھا تھا اب اس کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔

میں اور زوریں گل الٹے قدموں دہانے کی طرف بڑھے۔ جب ہم دہانے کے قریب پہنچے تو وہ بولی۔ "ٹھہرو ایک سیکنڈ۔" ہم رک گئے۔ "تمہارے پاس کوئی رومال وغیرہ ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے حیران ہو کر نفی میں جواب دیا۔ وہ بولی۔ "کوئی اور کپڑا؟"

"ایک مفلر ہے۔" میں نے کہا۔

"لاؤ مجھے دے دو۔" اس نے کہا۔

میں نے جیکٹ کا گریبان کھولا اور مفلر اسے دے دیا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال سوال جواب کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں مستان کو لے کر دہانے سے نکل آیا۔

زوریں گل میرے پیچھے تھا۔ صاف چمکیلی دھوپ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ برف کی تہ کے باوجود موسم زیادہ ٹھنڈا نہیں تھا۔ آوازیں اب بالکل قریب سے آ رہی تھیں۔ میں اور زوریں گل آوازوں کی مخالف سمت میں دوڑے۔ راستہ ہموار تھا پھر بھی مستان کے وزن کے ساتھ بھاگنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ اسے پھینک ہی دوں لیکن یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ مجھے اس بچی کا پتا چلانا ہے جو سردار سدورت نے میری تحویل میں دی تھی۔ وہ بچی اب کہاں تھی، یہ مستان ہی بتا سکتا تھا۔

ابھی ہم بمشکل نصف فرلانگ ہی گئے تھے کہ تعاقب میں آنے والے غیر معمولی پھرتی سے ہمارے نزدیک پہنچ گئے۔ زوریں گل بھاگتے بھاگتے بولا۔ "استاد صیب! وہ بدبخت امارے قریب پہنچ گیا ہے۔ کہیں فائر نہ مار دے۔"

زوریں کی بات ابھی منہ میں تھی کہ کوئی ہمارے عقب میں زور سے چیخا۔ اس کے ساتھ کسی آٹومیٹک رائفل نے برسٹ مارا۔ کم از کم دو گولیاں میری پشت میں لگیں اور مجھے ان کا دھچکا صاف محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لئے آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا تھا کہ یہ گولیاں مجھے لگی ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ گولیاں میری پشت پر سر کے بل جھولتے ہوئے مستان کو لگی تھیں۔ ایک تیسری گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی نکل گئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مستان کو نیچے پھینکا۔ بھاگتے بھاگتے میں اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ گولی نے کنپٹی کے اوپر سے اس کے سر کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مستان کو پھینکتے ہی میں ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ ایک طویل جست لگا کر میں نے ایک کھائی پار کی اور زوریں کے پہلو بہ پہلو بھاگنے لگا۔ زوریں گل نے دوڑتے ہوئے مڑ کر فائر کیا۔ جواب میں ایک ساتھ دو رائفلیں گرجیں۔ تاہم خوش قسمتی سے کوئی گولی ہمیں نہیں لگی۔ ایک موڑ کاٹتے ہی ہم عقب میں آنے والوں کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے رائفل زوریں کے ہاتھ سے لے لی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اس کا بے دریغ استعمال نہ کرے۔ کوئی ایک بندہ بھی ہمارے ہاتھوں مر جاتا تو ہماری مصیبتیں دوگنا ہو جاتیں۔ قدرت ہماری مدد کر رہی تھی، ہم جس سمت بلا سوچے سمجھے بھاگ اٹھے تھے۔ وہاں اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان جنگل کی طرح درخت پھیلے ہوئے تھے۔

آدھ پون گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد ہم متعاقب افراد کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں ہم جس جگہ پہنچے تھے وہاں چاروں طرف دیار اور پڑتل کے بلند و بالا درخت تھے جنگل کا سا سماں تھا۔ زمین تک دھوپ نہیں پہنچتی تھی لہٰذا کئی جگہ برف کی تہ موجود تھی۔ ایک جگہ ہمیں بندر کا جوڑا نظر آیا جو چھلانگیں لگاتا ہوا بہت تیزی سے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم گھنے تاریک درختوں میں کچھ اور آگے چلے گئے۔ یہ جگہ ہمارے نقطۂ نظر سے زیادہ محفوظ تھی۔

میری نگاہوں میں ابھی تک مستان کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ اوپر والا مسبب الاسباب ہے۔ میں مستان کو لے کر نہ بھاگتا تو اسے موت سے ہمکنار کرنے والی گولیاں میری پشت میں پیوست ہو جاتیں اور شاہ جہاں المعروف جہانی استاد معلوم دنیا سے دور ایک گمنام وادی میں برف پر گرتا اور ایک ہچکی لے کر خاموشی سے دم توڑ دیتا۔ ایک دھواں دھار کہانی کا یہ کیسا روکھا پھیکا اور مایوس کن انجام ہوتا۔ زوریں گل تھک کر ایک تنے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اس کے قریب جگہ سنبھال لی۔ اپنے لباس میں سے خون آلود چھرا نکال کر میں نے برف پر صاف کیا تو برف کی سفیدی پر مستان کے خون کی سرخی نمایاں نظر آنے لگی۔

زوریں گل گہری سانس لے کر بولا۔ "استاد صیب! یہ امارے

ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ام خواہ مخواہ کس چکر میں پھنس گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خواہ مخواہ تو نہیں پھنسے۔ جیسے بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ ایسے واقعات میں سے واقعات نکل آتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم اس معصوم بچی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ کل جب ناشا نے اسے ہم سے جدا کیا تھا، وہ کیسی حسرت بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا تم گوارا کرو گے کہ یہ عقل کے اندھے جازی اس معصوم کی آنکھیں باندھیں اور ایک تاریک رات میں اسے ویران پہاڑوں پر چھوڑ آئیں۔ کیا ایسی بات سن کر تمہارا دل نہیں لرزتا؟"

"لیکن ام کیا کر سکتا ہے استاد صیب! یہاں کی پرانی رسموں سے ٹکرانا اور انہیں ختم کرنا امارے اختیار میں نہیں اور ایک دو دن میں یہ کام کیا بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے لئے تو ایک عمر چاہئے۔ یہ تو ایک دور دراز علاقہ ہے استاد صیب! امارے قبائلی علاقوں میں بھی ایسا بے ہودہ رسمیں ہیں کہ آپ سنے تو دنگ رہ جائے۔"

میں نے کہا۔ "زوریں بے شک ہم ایک دن میں کایا نہیں پلٹ سکتے لیکن جو ہم کر سکتے ہیں وہ تو کرنا چاہئے۔ اور میں کروں گا۔ میں نے تہیہ کیا ہے کہ اس یتیم بچی کو بے آسرا نہیں چھوڑوں گا۔ جو کچھ ہو سکا کروں گا اس کے لئے۔"

زوریں گل بولا۔ "آپ کے فیصلے پر امارا جان قربان استاد صیب! ام نے تو ویسے ہی ایک بات کیا تھا۔"

ہم بہت دیر ادھر ادھر گھومتے رہے یہاں تک کہ دن ڈھل گیا اور درختوں کے سائے طویل ہونے لگے۔ رات سر پر تھی اور ہم بھوکے پیاسے بے ٹھکانا تھے۔ زوریں گل کی بھوک اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ وہ کوئی بھی دستیاب چیز کھانے کو تیار تھا۔ اس سلسلے میں اسے مذہبی حکم بھی یاد آ گیا تھا کہ انسان کی جان کو خطرہ ہو تو بقدر ضرورت حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے۔ بہرحال یہاں تک نوبت نہیں آئی۔ گھنے درختوں میں ہمیں ایک ایسا درخت مل گیا جس پر اسٹرابری کی طرح کا چھوٹا چھوٹا پھل لگا تھا۔ اندر سے یہ پھل پھیکا تھا اور ذائقہ وہی تھا جو "کول ڈوڈے" کے مغز کا ہوتا ہے۔ عام حالات میں ہم یہ پھل کبھی نہ کھاتے کیونکہ ہمیں اس کے خواص کا علم نہیں تھا مگر بھوک کی شدت نے تمام اندیشے بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیا۔ ہم جھجکتے بھی رہے اور کھاتے بھی رہے۔ میں نے تو کچھ دیر بعد ہاتھ روک لیا مگر زوریں گل نے پیٹ بھر کر دم لیا۔ کھانے کے بعد ہمارے ٹھکانے کا بندوبست بھی فوراً ہو گیا۔ یہ بڑا عجیب بندوبست تھا۔ چیڑ اور پڑتل کے تناور درختوں میں ہمیں ایک جگہ ایک بوسیدہ مچان نظر آیا۔ زمین سے اس کی بلندی قریباً پندرہ فٹ تھی۔ اس مچان میں شاخیں استعمال کی گئی تھیں اور دو لمبی خشک گھاس تھی جو دیکھنے میں پرال کی طرح لگتی تھی۔ مچان کی چھت پر برگزن کی شاخیں ڈالی گئی تھیں۔ یقیناً یہ مچان کسی جنگلی جانور کے شکار کے لئے بنایا گیا تھا۔ اب یہ عرصے سے ویران پڑا تھا اور "مرمت طلب" نظر آ رہا تھا۔

میں اور زوریں گل مچان پر چڑھ گئے۔ آدھ گھنٹے کے اندر ہم نے اس کی دیواروں کے سوراخ بند کر لئے اور اسے ہر طرح رہنے کے قابل بنا لیا۔ نامعلوم پھل کھا کر جسم میں حرارت پیدا ہو گئی تھی اور قدرے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے واکی ٹاکی پر منصور سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن حسب توقع رابطہ نہیں ہو سکا۔ شاید فاصلہ زیادہ تھا یا پھر بیٹری ہی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ رابطہ ممکن نہیں رہا تھا۔ جب میں منصور سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو زوریں گل بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے قرار سا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ مری مری آواز میں بولا۔ "استاد صیب! سنا ہے کچھ جنگلی پھل زہریلا بھی ہوتا ہے؟"

"کچھ کیا، اکثر جنگلی پھل زہریلا ہوتا ہے۔" میں نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔

"کہتے ہیں کہ کچھ زہر دماغ پر بھی اثر کرتا ہے اور بندہ پاگل ہو جاتا ہے۔"

"ہو جاتا ہو گا لیکن تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" زوریں نے آنکھیں نکالیں "کیا آپ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ام پہلے سے پاگل ہے۔"

"بھئی عاشق بھی تو پاگل ہی ہوتا ہے نا۔ پرسوں تم خود ہی گا رہے تھے۔ دل دیوانہ ہے، دل تو دیوانہ ہے۔"

"وہ اور بات ہے استاد صیب! ام سوچتا ہے اگر اس جنگل میں کوئی الٹ پلٹ چیز کھا کر ام کو کچھ ہو گیا تو کلثوم بے چاری کا کیا ہو گا۔۔۔ وہ تو بے موت مر جائے گا۔"

"اگر خدانخواستہ تمہارے پلّے بندھ گیا تو بھی تو بے موت مرے گا۔"

"تو آپ ام کو اتنا برا آدمی سمجھتا ہے!"

"اس سے بھی زیادہ برا۔" میں نے کہا۔

زوریں گل نے گھور کر مجھے دیکھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ میں زیر لب مسکرا رہا ہوں تو وہ بھی مسکرا دیا۔ اس کا موڈ قدرے خوشگوار ہو گیا، کہنے لگا۔ "استاد صیب! ام کو پاگل ہونے کا اتنا افسوس نہیں ہو گا جتنا افسوس اس بات کا ہو گا کہ ام اس وادی میں پاگل ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تم کہاں پاگل ہونا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "استاد صیب! ام چاہتا ہے کہ اگر ام پاگل ہو تو اس وقت ہو جب وہ حرامزادہ 'الو کا پٹھا' سروج امارے آس پاس موجود ہو۔ ام پاگل ہوتے ہی سب سے پہلے اس پر چڑھائی کرے اور اس کا بوٹی بوٹی کر دے۔ آپ کو یاد ہے نا کہ اس خانہ خراب نے ام کو بمن کا گالی نکالا ہوا ہے۔ ام اس کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ام اس سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لئے ام کو

پاگل ہونا پڑے۔"

"پاگل ہو جاؤ گے تو لوگ پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔ تمہارا انتقام پھر ادھورا رہ جائے گا۔"

"آپ کبھی اچھی دعا نہ مانگیں۔ آپ یہ دعا بھی مانگ سکتے ہیں کہ پاگل خانے جانے سے پہلے ام سروج کا قصہ تمام کر کے اپنا مقصد حاصل کر لے۔"

"اچھا بھئی میں دعا کرتا ہوں کہ تم پاگل خانے جانے سے پہلے اپنا مقصد حاصل کر لو۔ اب چھوڑو میری جان اور سونے کی تیاری کرو۔"

میں نے زریں گل کا کمبل کھینچا اور اس میں خود کو گھسیڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جنگل میں گہری شام اُتر چکی تھی۔ درختوں پر چہچہانے والے پرندے بھی خاموش ہو چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مچان شکاریوں کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ شکاری مچانوں پر ہوتے ہیں اور شکار نیچے لیکن اس مچان میں ترتیب الٹ گئی تھی۔ شکاری کہیں نیچے گھوم رہے تھے اور جنہیں وہ شکار کرنا چاہتے تھے وہ اس مچان میں چھپے ہوئے تھے۔

○☆○

اگلے روز سہ پہر کے وقت زریں گل پھر اسٹرابری نما پھل توڑنے درخت پر چڑھ گیا۔ اسے یہ پھل کچھ راس نہ آیا تھا لیکن بھوک تو کسی نہ کسی طور مٹانا ہی تھی۔ اس نے جھولی بھر کر اچھی طرح کر اکانی اور درخت پر چڑھ کر مچان پر آ گیا۔ کل کے برعکس آج وہ ہاتھ روک کر کھا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنا گلا بھی مسلتا جا رہا تھا۔ پھل کھانے سے گلا ایکدم خشک سا ہو جاتا تھا۔ اچانک ایک آواز نے ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ کتے کے بھونکنے کی آواز تھی۔ کافی فاصلے سے ہوا پر تیر کر آنے والی یہ آواز خاصی مدھم تھی لیکن سنی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس آواز پر کان لگا دیئے۔ یوں لگتا تھا کہ آواز لحظہ بہ لحظہ نزدیک آ رہی ہے۔ قریباً دو تین فرلانگ کی دوری پر پہنچ کر آواز اچانک شمال کی طرف نکل گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ پھر واپس آئی اور جنوبی سمت پر سنائی دینے لگی۔ آواز بھٹک رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ آگے بھی بڑھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کھوجی کتوں کی مدد سے کسی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے علاوہ اور کسے تلاش کیا جاتا تھا۔ میں اور زریں پوری طرح چوکس ہو گئے تھے۔ میں نے رائفل تیار کر کے گود میں رکھ لی تھی اور درپیش حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر یہ آواز بالکل قریب پہنچ گئی۔ اب یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ ایک ہی کتے کی آواز ہے۔ وہ کتا اپنے مالک یا مالکوں کے ساتھ آس پاس کے درختوں میں گھوم رہا تھا اور پھر ہمیں اپنے "دشمن" کی جھلک نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ہم دونوں ششدر رہ گئے۔ وہ تاشا تھی۔ اس نے گاؤن ٹائپ اونی لبادہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بازو نسل کے کتے کی زنجیر تھی۔ سردی سے بچانے کے لئے کتے پر اونی غلاف بھی چڑھا دیا گیا تھا۔ یہ چاق و چوبند کتا بڑی تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ اس کی حساس تھوتھنی زمین کے چپے چپے کو سونگھ رہی تھی۔ تاشا کی متحرک آنکھیں بڑی سرعت سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بہت جلد تاشا کی نگاہیں مچان پر پڑ گئیں اور اس پر الجھن نظر آنے لگی۔ اس دوران میں، میں بھی قرب و جوار کا جائزہ اچھی طرح لے چکا تھا۔ تاشا کے آس پاس اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں مچان سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر تاشا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ تاشا کے ہاتھ میں وہی مفلر ہے جو کل اس نے مجھ سے لیا تھا۔ کل سے میں کئی بار سوچ چکا تھا کہ تاشا نے مجھ سے یہ مفلر کیوں مانگا تھا؟ اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔ وہ کتے کو اسی مفلر کی بو پر لگا کر یہاں تک لائی تھی۔ یقیناً یہ ایک شاندار [illegible] تھا۔

ہم نیچے اترنا چاہتے تھے مگر تاشا نے ہمیں روک دیا۔ اس نے کتے کو پچکار کر ایک درخت سے باندھا پھر اپنی زخمی کلائی کے باوجود پھرتی سے درخت پر چڑھ آئی۔ کھلے لبادے کے اندر سے بھی اس کے جسم کا تناؤ نمایاں نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک کڑی کمان ہے اور ابھی ایک جان لیوا تیر چھوڑ دے گی۔ میں نے زریں گل کی محبوبہ گل نوبہار کو بھی دیکھا تھا لیکن اس میں یہ تیزی طراری اور بے باکی نہیں تھی۔ وہ کسی حد تک رسم و رواج کی پابند اور سمجھوتا کرنے والی لڑکی تھی لیکن اس کی یہ بہن تو ایک تلوار کی طرح تھی جس کا کام ہی ٹکرانا اور کاٹنا ہوتا ہے۔ اس کے اندر جیسے کوئی آتش فشانی عمل جاری تھا اور وہ لاوے کی طرح پتھریلی رکاوٹ کو توڑ کر نکل جانا چاہتی تھی۔

اس نے میرا مفلر مجھے واپس دیتے ہوئے کہا۔ "بس اس کی ضرورت اب ختم ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بستی میں کیا صورت حال ہے؟"

وہ بولی۔ "وہی جو پہلے تھی۔ تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ جازیوں کو تم دونوں پر بے حد غصہ ہے۔"

"اور تم پر؟"

"غصہ تو مجھ پر بھی ہے لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرے ایک ساتھی نے میرے خلاف بیان دینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا ہے کہ اگر وہ لوگ مجھ پر الزام تراشی کریں گے تو میں بھی یہ بیان دوں گی کہ ان سب نے مجھ پر دست درازی کی ہے۔"

"اور رستان کی موت کا ذمے دار کون ٹھہرا ہے؟"

"ظاہر ہے وہی لوگ ٹھہرے ہیں جنہوں نے تم پر گولی چلائی تھی۔ اس کی موت سر میں گولی لگنے سے ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ نہیں

ہوئی؟"

"جو سب کچھ میں نے سنبھال لیا ہے۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

زریں گل نے پوچھا کہ بچی زرغونہ کا کچھ پتا چلا۔ میں نے زریں گل کا سوال انگریزی کے قالب میں ڈھال کر تاشا تک پہنچایا۔ تاشا نے کہا۔ "میں اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تاشا! میرا خیال ہے کہ نان نے ابھی بچی کو جازیوں تک پہنچایا نہیں تھا۔ وہ اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر چھوڑ آیا تھا اور کھوہ میں واپس آ کر تم سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اگر اس نے بچی جازیوں کے حوالے کر دی ہوتی تو پھر اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ بچی کہاں سے اور کیسے ملی ہے۔"

"میرا اپنا خیال بھی یہی ہے۔" تاشا نے کہا۔

تاشا کا کتا مسلسل بھونک رہا تھا اور وہ اس کی طرف سے پریشان تھی۔ بولی۔ "میں جنگل میں بہت دیر بھٹکنے کے بعد یہاں تک پہنچی ہوں۔ کافی وقت ہو گیا ہے۔ اب میں واپس جاؤں گی۔ اور یہ ٹھکانا بھی تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ ایک تو یہاں سردی ہے دوسرے تم کسی وقت بھی محافظوں کی نظر میں آ سکتے ہو۔ میں نے تمہارے لئے ایک بہت اچھا سا ٹھکانا سوچ لیا ہے۔ کل میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گی۔"

زریں گل مری مری آواز میں بولا۔ "اور کھانے کے لئے بھی کچھ ضرور لانا۔"

میں نے زریں گل کی بات تاشا تک پہنچا دی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ہمیں رات گزارنے کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات دے کر نیچے اتر گئی۔

اگلے روز تاشا علی الصباح آ دھمکی۔ آج کتا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ محتاط انداز میں اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی۔ جسمانی مشقت کے سبب اس کے رخسار سرخ ہو رہے تھے اور وہ ہانپ رہی تھی۔ وہ ہمارے لئے تھوڑا سا پھل اور بسکٹ لائی تھی۔ یہ غذا ہمارے لئے قطعی ناکافی تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ وہ کہنے لگی۔ "آج کل وادی میں خوراک کی بہت کمی ہو گئی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بس پندرہ بیس دن میں لوگوں کو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

میں نے وجہ پوچھی تو وہ بتانے لگی کہ ڈیڑھ دو ماہ سے باہر سے لوٹ کا سامان (مال غنیمت) نہیں آ سکا اور اگر آیا بھی ہے تو معمولی مقدار میں۔ وادی میں باغات اور فصل کی حالت بھی بہت خراب ہے۔

زریں گل کو مچان میں بیٹھ کر پھل اور بسکٹ کھانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بولا۔ "استاد صیب! کتنا اچھا ہو اگر اس لڑکی کی جگہ اس کا چھوٹا بہن ہوتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے ام کو دانہ دنکا کھلاتا اور اس گھونسلے میں بیٹھ کر اتنا خوش ہوتا کہ سارا زندگی یہاں گزار دیتا۔"

"اور انڈے دیتا رہتا۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

"شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی۔"

"اور تمہارے لئے تو شرع سے باہر بھی کوئی شرم نہیں۔ پتا نہیں کتنی لڑکیوں کے ساتھ ایسے ہی انڈے... میرا مطلب ہے اسکینڈل بنا چکے ہو۔"

تاشا بیزاری سے بولی۔ "میری موجودگی میں اس اجنبی زبان میں بات مت کیا کرو۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم مرد ہیں نا۔ ہماری اکثر باتیں بری ہی ہوتی ہیں۔"

وہ چمک کر بولی۔ "چوٹ مت کرو مجھ پر۔ اگر تم نے میری مدد کی تھی تو میں بھی تمہاری مدد کر رہی ہوں۔ میں احسان لینے کی عادی نہیں ہوں اور خاص طور سے کسی بددماغ مرد کا احسان تو مجھے کسی طور قبول نہیں ہے۔"

"تم زریں گل کو بددماغ کہہ رہی ہو یا مجھے؟"

"تمہیں، تمہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔ "اس بندر میں دماغ کہاں جو اسے بددماغ کہوں۔"

اس نے سینہ تان کر بال جھٹکے اور تیزی سے نیچے اتر گئی۔

زریں نے تلملاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "اس نے ہمارے بارے میں کچھ کہا تھا؟"

"ہاں، ہاں کہہ رہی تھی کہ یہ شخص تو مجھے بالکل واج گور لگتا ہے۔"

زریں گل نے کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی لیکن اس سے پہلے ہی نیچے سے تاشا بول اٹھی۔ "چلو جلدی کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں تمہارے ٹھکانے پر پہنچا رہی ہوں۔"

میں اور زریں گل نیچے اتر آئے۔ وہ ہمیں لے کر روانہ ہو گئی۔ بنور کی رائفل زریں نے اپنے کمبل کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر وہ اس رائفل کو آگ برسانے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ تاشا کے کھلے لبادے کے نیچے بھی کوئی ریوالور یا ماؤزر قسم کی شے موجود ہے۔ میں اس سیلانی لڑکی پر ابھی کلی طور پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔

تاشا ہمیں گنجان درختوں والے راستوں سے گزارتے ہوئے قریباً دو میل آگے لے آئی۔ وہ اس علاقے سے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح واقف تھی۔ اب ہم جس جگہ سے گزر رہے تھے وہاں چٹانیں اور کھائیاں کثرت سے تھیں۔ اچانک وہ ایک چھوٹے سے کھنڈر کے سامنے رک گئی۔ یہ پتھروں کا بنا ہوا ایک مستطیل کمرا تھا۔ اس کی چھت گنبد نما تھی۔ شاہ بلوط کی لکڑی کے دروازے پر سانپ کی شبیہ کندہ تھی۔ دروازے کی کنڈی گرا کر تاشا اندر داخل ہو گئی۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کمرے میں

مہینوں سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ چھت اور دیواروں پر جالے لگے ہوئے تھے۔ عقب میں ایک کھڑکی کھلتی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اس کھڑکی سے ایک گہری کھائی کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کمرے کی دیواروں پر روغن سے مقامی دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔

ناشا نے کہا۔ "یہاں تم جب تک چاہو پوری حفاظت سے رہ سکتے ہو۔ بس یہ کوشش کرنا کہ دروازہ کم سے کم کھولا جائے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ کمرا ہے کیا؟"

وہ بولی۔ "بس کمرا ہے اور کیا ہے۔ ادھر کوئی آتا جاتا نہیں، بالکل ویران جگہ ہے اس لئے خالی پڑا ہے۔ جب تک تم اپنا آئندہ کا لائحہ عمل نہیں سوچتے، یہاں رہ سکتے ہو۔ میں کوشش کروں گی کہ روزانہ کم از کم ایک بار تمہیں کھانے کو کچھ ملتا رہے۔"

"اور اگر کوئی تمہارے پیچھے لگ کر یہاں پہنچ گیا تو؟"

"میرے دماغ میں بھس نہیں بھرا ہوا۔"

"اچھی اطلاع ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک بری اطلاع بھی ہے۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟"

"زرغونہ کو جاتریوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ "کب کی بات ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"کل شام کی۔" ماشا نے جواب دیا۔ "وہ اب تک مستان کے ایک چچا کے پاس تھی۔ مستان کا چچا بچی کو نئے سردار مدرت کے سپرد کر آیا تھا۔ مدرت سے اسے جاتری لے گئے ہیں۔"

"او گاڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "اب وہ کیا کریں گے اس کے ساتھ؟"

"اس کا فیصلہ بھی ایک دو روز میں ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ تاخیر ہو جائے۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ خوراک کی کمی کا ہے۔ بستی کے سب "بڑے" جن میں جاتری بھی شامل ہیں، سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔" پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ بولی۔ "ویسے وہ بچی تمہیں بہت یاد کرتی ہو گی۔ جب وہ میرے پاس تھی تو بار بار تمہارے بارے میں پوچھتی رہی تھی۔ اس کے معصوم ذہن میں یہ بات جنمی ہوئی ہے کہ وہ تمہارے پاس محفوظ رہے گی۔ شاید اس لئے کہ تم نے پہلے بھی اس کی جان بچائی تھی۔" میری نگاہوں میں زرغونہ گھومنے لگی۔

کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھ کر ناشا چلی گئی۔ ہم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس بند کمرے میں ہمیں دیکھنے والا کون تھا۔ اس رات ہم نے کمرے کو گرم کرنے کے لئے چوری چھپے آگ بھی جلائی۔ دہکتے ہوئے کوئلے ایک بہت بڑی نعمت محسوس ہوئے۔ آگ تاپنے کا جو مزہ اس رات آیا پوری زندگی میں نہیں آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت دنوں بعد آگ تاپی تھی یا پھر دانا اس کا یہ قول درست ثابت ہوا تھا کہ گناہ اور جرم کے کاموں میں زیادہ مزہ ہوتا ہے۔ اس وادی میں آگ جلانا جرم تھا۔ لہٰذا یہ جرم بہت لذت انگیز محسوس ہوا۔ زریں گل تو آگ پر صدقے واری جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ کپڑے اتار کر کوئلوں میں کود پڑتا۔ ہمارے چاروں طرف خطرناک کھائیاں تھیں اور کھڑی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ ایک طویل رات کے سناٹے میں ہم کسی کہانی کے دو بھٹکے ہوئے کرداروں کی طرح آگ کے گرد بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ پاکستان کی باتیں، لاہور کی باتیں، لاہور کے گلی کوچوں کی باتیں اور ان گلی کوچوں میں رہنے والوں کی باتیں۔ ان لوگوں کی باتیں جو ہمارے اپنے تھے لیکن ہم سے بہت بہت دور تھے۔ میری بہن منتھا، ساہی صاحب، ان کی شوخ بیٹی فریال، انجم اور غزالہ۔ یوں لگتا تھا کہ غزالہ سے بچھڑے برسوں بیت گئے ہیں۔ میں اسے یاد نہیں کرتا تھا کیونکہ یاد اسے کیا جاتا ہے جو بھول چکا ہو۔ وہ تو ہر وقت ہر گھڑی مجھے یاد رہتی تھی۔ کسی نہ کسی بہانے میری سوچوں پر قبضہ جمائے رہتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس نے شیخ عاصم سے شادی صرف اس لئے کی تھی کہ وہ میری اور اپنی محبت زندہ جاوید کرنا چاہتی تھی اور اگر واقعی ایسا تھا تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ میں نے غزالہ کو کھو کر پا لیا تھا۔ وہ اب ہر وقت میرے پاس رہتی تھی۔ بے شک وہ میری دلہن نہیں بنی تھی، میرے ہاتھوں نے اس کے حنائی ہاتھوں کو نہیں چھوا تھا۔ اس کے لب و رخسار مجھ سے چھین لئے گئے تھے لیکن وہ ایک ایسا گداز میرے دل میں چھوڑ گئی تھی جو تکلیف دہ تھا لیکن مجھے دنیا کی ہر راحت سے بڑھ کر عزیز تھا۔ کسی وقت میرا تصور پر لگا کر اڑتا تھا اور گلبرگ لاہور کی اس کوٹھی میں پہنچ جاتا تھا جہاں غزالہ اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھتا کہ میں ایک کالجیٹ لڑکے کی طرح دیوار پھاند کر غزالہ کے گھر میں گھس گیا ہوں اور پھر اس کمرے میں پہنچ گیا ہوں جہاں غزالہ بیٹھی میڈیکل کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ لرز جاتی ہے۔ کہتی ہے۔ "شاہ جہاں، اب کیوں آئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں اب شادی شدہ عورت ہوں۔"

میں کہتا ہوں۔ "غزالہ، اپنے دل پر میرا بس نہیں۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

وہ کہتی ہے۔ "پہلے بھی تو دل پر آپ کا بس نہیں تھا۔ آپ میرے قریب نہیں آ سکے تھے۔"

"ہاں غزالہ، یہ دل پاگل ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں۔ میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

میں آگے بڑھ کر اس کا نرم و ملائم ہاتھ تھام لیتا ہوں۔ اس کے بدن میں جھرجھری جاتی ہے۔ پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھرتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی پھر ہارے ہوئے سے انداز میں وہ اپنا بازو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے۔ جیسے اس بازو کو میرے حوالے کر دیا ہو اور اپنے باقی جسم کے ساتھ کہیں دور ہٹ گئی ہو۔

میں اس بازو کو کسی مقدس صحیفے کی طرح چومنے لگتا ہوں اور آنسوؤں سے بھگونے لگتا ہوں۔

نجانے کیوں کسی وقت میں اندیشے سے لرز جاتا تھا کہ میرے تصور کا یہ منظر حقیقت کا روپ دھار لے گا اور میں شاہ جہاں ایل ایل بی جو بہت سے لوگوں کی نگاہ میں ایک وننگ اور رومانس شخص ہوں، اپنے دل کے ہاتھوں تنکے کی طرح حقیر ہو جاؤں گا۔ آہ، اس ایک لڑکی نے میری زندگی کو کس بری طرح متاثر کیا تھا اور کر رہی تھی۔

اگلے روز ماشا دوپہر کے وقت آئی۔ وہ آج پھر ہمارے لئے کچھ بچا کھچا کھانا لے آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ مقدر اور جون چاؤل کی خیر خیریت معلوم کر کے آئے۔ وہ یہ کام کر آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ دونوں خیریت سے ہیں۔ میں نے کہا۔ "ناشا، میں بہت فکر مند ہوں زرغونہ کے بارے میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دیکھتے رہ جائیں اور جاتری کسی رات خاموشی سے وہ منحوس رسم ادا کر دیں؟"

"توقع نہیں کہ ایسا ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اس وقت وادی میں سب سے اہم مسئلہ خوراک کا ہے۔ کسی کو کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔"

"پھر بھی یہ ایک انسانی جان کا معاملہ ہے جو چلی گئی تو واپس نہیں آ سکے گی۔ ہمیں بچی کے بارے میں کسی طرح کا رسک نہیں لینا چاہئے۔"

کمرے میں کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ہم تینوں ہی اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے پھر میں نے ناشا سے پوچھا۔ "وہ مجسمہ کہاں ہے جہاں بچے کو چھوڑا جاتا ہے؟"

وہ بولی۔ "وہ تو زیادہ دور نہیں۔ ہم اس مقام کے قریب ہی ہیں۔"

اس نے اٹھ کر کمرے کی عقبی کھڑکی کھولی۔ سامنے دور تک کھائیاں اور چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ وہ آہنی سلاخوں کے درمیان سے بازو نکال کر بولی۔ "وہ سامنے جو سرسبز ٹیلا نظر آ رہا ہے اس کے عقب میں نرپال دیوتا کا مجسمہ ہے۔"

"یہ تو بہت نزدیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بستی بھی زیادہ دور نہیں ہے؟"

"ہاں، اڑھائی میل کا فاصلہ ہو گا۔" وہ بولی۔

"اگر کوئی گھومتا پھرتا ہماری اس پناہ گاہ کی طرف آ گیا تو؟"

"میں نے کہا ہے نا، ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ جاتریوں نے کسی بھی شخص کو ادھر آنے سے منع کر رکھا ہے۔ دو تین سال پہلے تک اس کمرے کو دیویوں کا بچھت کہا جاتا تھا۔ لوگ یہاں آتے تھے اور عقیدت سے اس کی دیواروں کو بوسے دیتے تھے اور اس کے سائے میں لیٹنا بہت ہی بابرکت سمجھا جاتا تھا لیکن پھر یہاں ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک جوان لڑکی اس کمرے کی پچھلی کھڑکی سے گہری کھائی میں گر کر مر گئی۔ اس حادثے کے بعد جاتریوں نے اعلان کیا کہ بچھت پر عام لوگوں کی آمد و رفت سے دیویاں ناراض ہو گئی ہیں لہٰذا آئندہ کوئی اس جگہ کا رخ نہیں کرے گا۔ پچھلی کھڑکی میں سلاخیں لگا دی گئیں۔ لوگوں نے یہاں آنا جانا بند کر دیا اور یہ جگہ ویران ہو گئی۔ یہ پچھلے برس سردیوں کی بات ہے۔ جاتریوں کو پتا چلا کہ کچھ لوگ اب بھی چوری چھپے یہاں آتے ہیں اور دیواروں کو باہر سے چوم چاٹ کر اور منتیں مان کر چلے جاتے ہیں۔ جاتریوں کے مشورے پر سابق سردار پامہ نے یہاں کی نگرانی کروائی اور رات کے وقت یہاں آنے والے کئی افراد کو پکڑا۔ پکڑے جانے والوں میں زیادہ تر بستی کے بڑے بوڑھے تھے۔ تمہیں پتا ہی ہے اکثر بوڑھے بڑے کٹر ہوتے ہیں۔ خاص طور سے مذہبی معاملوں میں۔ وہ جو کام ساری زندگی کرتے رہے ہوتے ہیں اسے آخری وقت میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ جاتریوں کے منع کرنے کے باوجود وہ یہاں پہنچ جاتے تھے۔ ان دنوں پامہ کے حکم پر اس مقام کے ارد گرد شکاری پھندے لگا دیئے گئے تاکہ انسان تو انسان کوئی جانور بھی بچھت کے قریب نہ پھٹکے۔ یہ آہنی پھندے گھاس پھونس میں دبائے گئے تھے۔ ان کی وجہ سے کئی افراد پکڑے گئے اور جنگلی جانور بھی اسیر ہوئے۔ بعد ازاں یہ پھندے یہاں سے ہٹا لئے گئے تھے کیونکہ لوگوں کی آمد و رفت بالکل ختم ہو گئی تھی۔"

میں حیرت سے اس کمرے کو دیکھنے لگا جسے "دیویوں کا بچھت" کہا گیا تھا۔ بڑا افسانوی سا ماحول تھا یہ۔ اور ماحول سے بڑھ کر افسانوی تھا جس میں یہ "بچھت" واقع تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ کمرے کی دیواروں پر ایک نہائی اور ایک بال نچوڑتی ہوئی دیوی کی تصویریں کیوں بنائی گئی تھیں۔

میرے لئے ایک بات بہت خوش آئند تھی اور وہ یہ کہ نرپال دیوتا کا وہ مجسمہ یہاں سے قریب ہی تھا جہاں بھیانک رسم کا شکار ہونے والے بچے کو چھوڑا جاتا تھا اور بچے کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں نرپال دیوتا سے "فیصلہ" مانگا جاتا تھا۔ میں نے بھی دل ہی دل میں ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اور زریں گل نرپال کے مجسمے کے آس پاس کوئی مناسب جگہ ڈھونڈیں گے اور وہاں سے ہر رات دوسرے پہر تک نرپال کے مجسمے کی نگرانی کریں گے۔ یہ فیصلہ بظاہر کچھ عجیب سا لگتا تھا لیکن ننھی زرغونہ کو کسی دردناک انجام سے بچانے کے لئے اس کے سوا کوئی کوشش میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ماشا کے جانے کے بعد میں نے زریں گل کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ اسے بھی یہ تجویز پسند آئی۔ ابھی سورج غروب ہونے میں قریباً دو گھنٹے باقی تھے۔ میں اور زریں گل اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور محتاط قدموں سے ڈھلوان پر اترنے لگے۔ آس پاس کا علاقہ بالکل سنسان تھا۔ ہم نے آدھ گھنٹے میں ایک پہاڑی کا کنارا کاٹا اور مجسمے تک پہنچ گئے۔ مجسمے کے قریب بھی کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ مجسمہ زمین سے

تقریباً پندرہ فٹ بلند تھا۔ اس کے نقوش مدھم اور مٹے مٹے تھے۔ ایک بازو بھی ندارد تھا۔ انسانی شکل کے اس مجسمے کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ قدرتی طور پر وجود میں آیا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ مجسمہ یقیناً انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ماہ و سال کی سختیوں نے اس کی شکل بگاڑ دی تھی۔ مجسمے کے سامنے ڈیڑھ دو فٹ اونچا ایک وسیع چبوترا تھا اور یہیں جاتری کے بیٹھنے کے لئے پتھر کی ایک کرسی نما نشست بھی بنی ہوئی تھی۔

ہم مجسمے کے قریب نہیں گئے۔ اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا۔ پانچ دس منٹ بعد ہمیں ایک مقامی شخص نظر آیا۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ مقامی شخص نے مجسمے کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بچے کو فرش پر لٹایا۔ کچھ مناجات پڑھیں اور پھر بچے کو اٹھا کر اپنے ٹھکانے کی طرف واپس چلا گیا۔۔۔ ہم نے مجسمے کے آس پاس کی جگہوں کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ایک ایسی جگہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہے جہاں گھات لگا کر مجسمے کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ یہ جگہ مجسمے سے اتنی قریب نہیں تھی کہ باآسانی ہم کسی کی نظر میں آ سکتے اور نہ اتنی دور تھی کہ ہم اندھیرے میں مجسمے کے آس پاس نقل و حرکت محسوس نہ کر سکتے۔ یہاں ہوا کی کاٹ سے بھی محفوظ رہا جا سکتا تھا اور خطرے کے وقت راہ فرار اختیار کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس شب میں اور زریں گل رات تقریباً گیارہ بجے تک مجسمے کے قریب موجود رہے پھر اپنی پناہ گاہ پر واپس آ گئے۔ اگلی شب میں اکیلا گیا۔ بہتر نہیں تھا کہ ہم دونوں ہی بے آرام ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ ڈیوٹی میں اپنے ذمے لے لوں گا لیکن زریں گل رضامند نہیں ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجسمے کی نگرانی وہ کرے اور اگر ایسا نہیں تھا تو ہم دونوں باری باری یہ ڈیوٹی انجام دیں۔ باہمی رضامندی کے ساتھ ہم نے ایک ایک دن مقرر کر لیا۔ یہ ایک نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن کام تھا۔ کمبل لپیٹ کر پتھروں کے درمیان اس امید پر بیٹھے رہنا کہ کچھ لوگ بستی سے چل کر ویرانے میں آئیں گے اور ایک بچی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے یہاں چھوڑ جائیں گے۔ بظاہر عجیب سا لگتا تھا لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر ہماری کوشش بار آور ہوئی اور ہماری نگرانی کے دوران میں واقعی کوئی رات ایسی آئی جب کسی ننھی زرغونہ کو یہاں لایا گیا تو ہم اسے حفاظت کے ساتھ بستی کی حدود میں واپس پہنچا دیں گے تاکہ بے ہودہ مقامی رسم کے مطابق وہ اپنے "جان لیوا امتحان" میں کامیاب قرار پائے اور "جانزا دلار" تسلیم کر لی جائے مگر اس میں خدشات بھی تھے عین ممکن تھا کہ توہم پرست جاتری اور ان کے جاہل پیروکار بچی کی جان لینے کے لئے کوئی اور وجہ ڈھونڈ لیں یا پھر یہ راز ہی راز نہ رہ سکے کہ بچی از خود بستی میں واپس نہیں پہنچی بلکہ اسے پہنچایا گیا ہے۔ اس حوالے سے ناسمجھ بچی خود بھی ہمارے بارے میں کوئی بیان دے سکتی تھی۔ ان خدشات کے پیش نظر زریں گل کا مشورہ تھا کہ اگر بچی ہمیں مل جائے تو ہم اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔ جاتری اور ان کے پیروکار یہی سمجھیں گے کہ بچی کسی کھائی میں گر کر مر گئی! کوئی جنگلی جانور اسے گھسیٹ کر لے گیا۔

ہم نے ان دونوں پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا تھا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بچی کو اپنی تحویل میں رکھنے کا خیال بہتر نہیں ہے۔ ہم بستی کے مفرور تھے اور جگہ جگہ بھٹک رہے تھے۔ خوراک کی صورت حال بھی زیادہ بہتر نہیں تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آئندہ دنوں میں ہمیں کن مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ ان حالات میں ہمارے ساتھ بچی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس کے برعکس اگر ہم اسے بستی میں پہنچا دیتے تو عین ممکن تھا کہ مقامی عقائد کے مطابق نہ صرف اس کی زندگی محفوظ ہو جاتی بلکہ وہ کوئی قابل عزت مقام بھی پا جاتی۔۔۔ بہرحال یہ سب کچھ تو تب ہوتا تھا جب بچی ہمیں ملتی۔ فی الوقت تو یہی لگ رہا تھا کہ ہم اس ویرانے میں بیٹھ کر بے کار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

ناشا کبھی روزانہ اور کبھی ایک دن چھوڑ کر ہمارے پاس آ جاتی تھی۔ اس کے دل میں اپنے باپ سمیت تمام جاتریوں کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا لیکن وہ کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ اگر کر سکتی تھی تو صرف یہ کہ جاتریوں کے احکامات کا مذاق اڑا سکتی تھی۔ اپنے جسم کی نمائش کر سکتی تھی اور اپنے لہجے کی گرمی سے مردوں کے جذبات بھڑکا سکتی تھی اور ایک آزادانہ زندگی گزار کر اپنے باپ کے سینے پر مونگ دل سکتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وادی میں اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جو جاتریوں کی فرسودہ رسموں اور من مانیوں سے بیزار ہیں لیکن اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں۔ ان میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ جاتریوں کے احمقانہ احکامات کو کھلے عام رد کر سکیں لیکن وہ اتنی جرأت رکھتی ہے اور اس جرأت کا مظاہرہ بھی کر رہی ہے۔

مجھے اس کی جرأت سے انکار نہیں تھا لیکن کبھی کبھی لگتا تھا کہ وہ اپنی مخالفت میں حد سے آگے نکل گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انتہا پسند ہو گئی ہے۔ یہ انتہا پسندی ہی تھی کہ وہ کبھی کبھی اچھے برے کی تمیز بالکل کھو دیتی تھی۔ ایک روز وہ حسب معمول دوپہر کے وقت ہمارے پاس آئی۔ برا بھلا کھانا وہ ساتھ لائی تھی۔ ہم پیٹ کی آگ کو کسی حد تک سرد کر چکے تو وہ بولی۔ "تم دونوں میں سے آج کمرے میں کون رہے گا؟"

میں نے کہا۔ "آج زریں گل کی ڈیوٹی ہے، میں کمرے میں ہوں گا۔"

کہنے لگی۔ "شام کے فوراً بعد تم ایک گھنٹے کے لئے کہیں جا نہیں سکتے؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس کمرے کی ضرورت ہے۔ بس اب یہ نہ پوچھنا کیوں؟"

"ٹھیک ہے نہیں پوچھتا۔"

وہ بولی۔ "شام کے بعد میں ایک شخص کے ساتھ آؤں گی۔ کچھ دیر یہاں رہوں گی پھر چلی جاؤں گی۔ میرے جانے کے بعد تم کمرے میں واپس آ سکتے ہو۔"

میں نے اسے زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی اور رضامندی ظاہر کر دی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے زریں گل رائفل اور کمبل لے کر نشیب کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اسے نرمال کے مجسمے کے پاس رات گیارہ بجے تک بیٹھنا تھا اس کے ساتھ ہی میں بھی "دیویوں کے پگھٹ" سے نکل آیا اور گھاٹیوں میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ سورج کی آخری کرنیں افق سے اوجھل ہو رہی تھیں جب میں نے ایک چٹان کی اوٹ سے ناشا کو دیکھا۔ وہ حسب معمول ڈھیلے ڈھالے اونی لبادے میں تھی۔ گریبان خطرناک حد تک کھلا تھا۔ شہد رنگ بال شانوں پر لہرا رہے تھے اس کے ساتھ ایک جوان مرد تھا۔ مرد کا صفا چٹ سر اور چوغہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا تعلق جاترو (عبادت گاہ) سے ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یقیناً وہ کوئی نائب جاتری تھا۔ اس کے چہرے پر پشیمانی اور خجالت دور ہی سے پڑھی جاتی تھی۔ یہ واضح طور پر ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو اپنی اندرونی طغیانی پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی گناہ کرنے جا رہا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ کچھ متذبذب نظر آیا اور رک گیا تھا۔ اس نے کوئی بات بھی کی لیکن پھر وہ دونوں دروازے کی طرف آگے بڑھ گئے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جاترو کے پوتر جاتری کی یہاں موجودگی حیرت انگیز اور معنی خیز تھی۔

میں وہیں پتھروں میں دبکا بیٹھا رہا اور اس افلاطونی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا باپ وادی کا سب سے بڑا جاتری تھا۔ لوگوں کو دیوتاؤں کے سامنے سرنگوں ہونے کی تلقین کرتا تھا لیکن اس کی اپنی تینوں بیٹیاں بے راہروی کی طرف مائل تھیں۔ خاص طور سے ناشا تو ہر حد کو پھلانگ چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ دیر اپنے پھنسائے ہوئے مرغے کے ساتھ کمرے میں رہے گی لیکن چار پانچ منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ صفا چٹ جاتری دروازے سے یوں برآمد ہوا جیسے توپ سے گولہ نکلا ہے۔ یقیناً اسے پیچھے سے ٹھیک ٹھاک ضرب لگی تھی۔ وہ پتھریلی زمین پر دور تک لڑھک گیا۔ اس کے عقب میں ناشا چیختی ہوئی نمودار ہوئی۔ غالباً وہ مقامی زبان میں جاتری کی زبردست "عزت افزائی" کر رہی تھی۔ جاتری کے قریب پہنچ کر اس نے جاتری کی پیٹھ پر زبردست ٹھوکر لگائی اور پھر بے رحمی سے اس کی "ٹانگوں" میں ہاتھ دے دیا۔ بے پناہ کرب کے سبب جاتری ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ اس کی زندگی ناشا کی گرفت میں تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ناشا ابھی اس کی جان لے لے گی۔ سانسیں باقی تھیں جو وہ تڑپ پھڑک کر چھوٹ گیا۔ ناشا نے اسے ٹھوکروں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جاتری کا بالائی لباس تار تار ہو گیا اور زیریں لباس بھی خطرے میں نظر آنے لگا۔ جاتری بدحواس ہو کر بھاگا تو ناشا اس کے پیچھے بھاگی۔۔۔ اور نجانے اسے کتنی دور چھوڑ کر واپس آئی۔ اس کے گال تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ بظاہر شدید غصے میں نظر آتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک آسودہ سی کیفیت بھی تھی جیسے دبی دبی سی مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی کوئی پہیلی ہو۔

"یہ کیا کیا تم نے اس کے ساتھ؟"

"جو ہونا چاہئے تھا۔" وہ بولی اور میرے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ "آج نہیں جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے اندر تو غصے کا الاؤ بھڑک رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "یہ الاؤ اپنے لئے نہیں ہے۔ ان جاتریوں کے لئے ہے اور ان کے پیروکاروں کے لئے ہے اور ان سب لوگوں کے لئے ہے جو دیوتاؤں کے نام پر پاگل بن رہے ہیں اور دوسروں کو بنا رہے ہیں۔ جیسے یہ خنزیر کا بچہ تھا۔"

"مگر یہ تھا کون؟"

"یہ نیا نیا جاتری بنا ہے۔ اس کا نام راشو ہے۔"

"تم نے تو اسے بڑے احترام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ رخصت کیا ہے۔"

"وہ اسی لائق تھا۔"

پھر وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بتانے لگی کہ "وہ اس لائق" کیوں تھا۔ جو کچھ ناشا کی باتوں سے پتا چلا اور جو کچھ میں نے اپنے طور پر اخذ کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ "ناشا نے اپنے حسن کی چکاچوند اور ادا اس کی بے باکی دکھا کر اس جاتری کا بیڑا غرق کیا تھا۔ ناشا کی جسمانی کشش نے جاتری کے ہوش و خرد پر بجلی گرائی تھی اور اس کی ساری تعلیمات دو چار روز میں ناشا میں نقش ہو گئی تھیں۔ ناشا نے بھی جاتری کی پارسائی سے کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسے کچے دھاگے سے باندھ کر یہاں لے آئی تھی۔ یہ جگہ ایسی "مصروفیات" کے لئے بہت محفوظ تھی اور پھر ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ ناشا جاتری کا ایک اور امتحان لینا چاہتی تھی۔ جاتری کے نقطۂ نظر سے یہ جگہ "دیویوں کا پگھٹ" تھی اور مقدس تھی۔ وہ اس مقام پر نوجوان جاتری کے ساتھ کھل کھیلنا چاہتی تھی۔ اس خواہش میں یقیناً وہ لاشعوری نفرت بھی کارفرما تھی جو ناشا کے رگ و پے میں رچی بسی تھی۔ "پگھٹ" میں آ کر جاتری کی ہمت جواب دے گئی تھی اور شدید طور پر مغلوب الجذبات ہونے کے باوجود وہ اس جگہ کو "بھرشٹ" کرنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ نتیجے میں ناشا نے اسے تھپڑ مارے تھے اور پھر ذلیل و خوار کر کے بھگا دیا تھا۔"

اس کا طیش ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اپنے ہیجان پر قابو پانے کے لئے اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے کے اندر سے ہلکی

قسم کی شراب کی چھوٹی بوتل نکالی اور بے باکی سے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ "حرام کے جنے! یہ سمجھتے ہیں کہ سارے جہان کی عقل ان میں ہی سمٹ آئی ہے۔ جو یہ کہیں وہ درست باقی سب غلط۔ پتھر کے بت کے گرد چار پھیرے لگوا لو تو جس لڑکی کی عزت چاہے لوٹ لو۔ وہ چاہے روتی رہے "پٹتی رہے" مرتی رہے "تم پر کوئی گناہ نہیں۔ دیوتا تم سے خوش ہی خوش ہیں۔ میں تو کہتی ہوں دیوتاؤں کی رضامندی دراصل ان جاتروں کی رضامندی ہی کا نام ہے۔"

میں نے آگ جلا دی۔ وہ پیتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ وہ نیم دراز ہو گئی اور اس نے بے تکلفی سے اپنی پشت میرے کندھے سے ٹیک دی۔ بوتل میں جو آخری گھونٹ بچ گیا تھا وہ اس نے مخمور انداز میں دیوار پر اچھال دیا۔ بال نچوڑتی ہوئی دیوی کے بالوں سے بچ بچ قطرے گرنے لگے۔ کمرے سے باہر سنسان تاریکی تھی اور ناتگا پربت کو چھو کر آنے والی سرد ہوا دیودار اور چیڑ کے درختوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

اچانک ناشا نے مخمور لہجے میں کہا۔ "کیا تم بھی واسو کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ یہ جگہ پاک پوتر ہے؟"

اس معنی خیز سوال نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ دل کی دھڑکن رکتی ہوئی سی محسوس ہوئی تاہم اگلے ہی لمحے میں سنبھل گیا۔ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "میں ایسا نہیں سمجھتا اور وہ بھی نہیں سمجھتا جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس نے انگڑائی لی اور کچھ اور ڈھے سی گئی۔ اس کے پاؤں دیوار پر بنی دیوی کی تصویر کو چھو رہے تھے۔

"مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔"

وہ ایک دم پینترا بدلتے ہوئے بولی۔ "کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر مجھے کسی مرد میں دلچسپی ہو بھی تو میں یہ بات اپنے دل سے نہیں لگاتی۔ میں جانتی ہوں" مرد کی ذات سے وفا کی امید رکھنا حماقت ہے۔ مرد سراپا جسم ہوتا ہے، عورت سراپا دل ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی سراپا جسم ہو؟"

وہ بولی۔ "جسم تھی نہیں، جان بوجھ کر بنی ہوئی ہوں لیکن یہ جسم ایسا نہیں کہ ہر کسی کی اس تک پہنچ ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم جاتریوں کی مخالفت میں انتہا پسند ہو گئی ہو۔ کچھ ایسے کام بھی کر رہی ہو جن کے لئے تمہاری تعریف نہیں کی جا سکتی۔"

"مجھے انتہا پسند بنانے والے جاتری ہیں کیونکہ وہ خود بھی انتہا پسند ہیں" اس نے کہا اور اپنے اونی گاؤن کی ڈوریاں باندھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

ذرا ہی دیر بعد وہ تند ہوا کے بگولے کی طرح کمرے سے نکل چکی تھی۔ میں حرارت بخش آگ کے سامنے تنہا بیٹھا تھا۔

O☆O

رات کے وقت نرپال کے مجسمے کے سامنے ڈیوٹی دیتے ہوئے ہمیں بیس بائیس روز گزر چکے تھے۔ وادی میں قحط کی صورت حال برقرار تھی۔ ناشا وقتاً فوقتاً ہماری پناہ گاہ میں پہنچتی رہتی تھی۔ وہ خوراک کے علاوہ تازہ خبریں بھی لاتی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اب تک یہ نہیں جان سکی تھی کہ ننھی زرغونہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ناشا کے ذریعے منصور سے بھی مدد لینا چاہی تھی لیکن ناکامی ہوئی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ زرغونہ کے بارے میں جاتریوں کا فیصلہ تبدیل ہوا ہے یا نہیں۔ عجیب مخمصے کی کیفیت تھی۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ شاید پامہ کی طرح اس کی بیٹی بھی المناک انجام سے دوچار ہو جائے گی۔

ایک روز ناشا آئی تو زریں گل کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کا خیال تھا کہ بستی کے مضافات سے ہمارا وادی تک کام کرنے لگے گا اور ہم منصور سے بات کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ بستی کی بیرونی حدود میں ناشا کی ایک بیوہ سہیلی کا گھر تھا۔ وہ زریں گل کو وہیں لے کر گئی تھی۔ زریں گل رات کے اندھیرے میں گیا تھا اور اب اسے اگلے روز رات کے اندھیرے میں ہی واپس آنا تھا۔ شام کے بعد میں نرپال کے مجسمے کی طرف چلا گیا اور حسب معمول وہاں سخت سردی میں ڈھائی تین گھنٹے گزار کر واپس آ گیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ خواب ناک چاندنی نے القریب نشیب و فراز کو روشن کر رکھا تھا۔ بہت دور بلندی پر ناتگا پربت کی "چوٹیاں" برف کا سپید لباس پہنے خاموش کھڑی تھیں۔ ڈھلوانوں پر چھوٹے بڑے گلیشیر چمک رہے تھے۔ کہیں کہیں بلندی پر برف کی آبشاریں سی پھیلی نظر آتی تھیں۔ میں اس منظر کی دلکش ہیبت میں کھو سا گیا تھا اور اپنی پناہ گاہ کے اردگرد درختوں میں ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں کچھ دور چیڑ کے ان بلند درختوں کی طرف نکل گیا جن کی بالائی شاخوں پر چاند کسی گول سنہری پتنگ کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ اچانک میرے جسم کو انتہائی شدید جھٹکا لگا اور میں سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر پہلو کے بل خشک پتوں پر گرا۔ چند لمحوں کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے پھر یوں لگا کہ ایک خنجر سا میری پنڈلی کے نچلے حصے میں اتر چکا ہے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور پنڈلی کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ میرا پاؤں ایک خطرناک آہنی شکنجے میں تھا۔ شکنجے کے طاقتور اسپرنگ کے ذریعے ایک نوکیلی سلاخ نے حرکت کی تھی اور پنڈلی سے آر پار ہو گئی تھی۔ اب وہ دس بارہ کلو وزنی شکنجہ کسی خطرناک کیکڑے کی طرح میری پنڈلی سے چمٹا ہوا تھا۔ میرے کانوں میں ناشا کے وہ الفاظ گونج اٹھے جو اس نے دو ہفتے پہلے کہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک برس پہلے اس "مقدس مقام" پر انسانوں اور جانوروں کی

مداخلت روکنے کے لئے آہنی پھندے لگا دیئے گئے تھے۔ یقیناً یہ شکنجے کی یادگار ہے۔ ایک قدیم پھندا چیڑ کے ان درختوں کے نیچے چھپا ہوا تھا اور آج میرے لئے ایک بھیانک مصیبت بن گیا تھا۔ ایک بار اپنی پنڈلی کو دیکھنے کے بعد دوبارہ میری ہمت نہیں ہوئی کہ ادھر دیکھ سکوں۔ میں جانتا تھا کہ پنڈلی میں "ٹیبیا" اور "فی بولا" دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ آہنی سلاخ ان ہڈیوں کے درمیان سے گزر گئی ہے۔ یہ ایسا روح فرسا احساس تھا کہ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ میں نے دانت پر دانت جمائے اور ٹانگ میں اٹھنے والی درد کی بے پناہ لہر کو برداشت کرتے ہوئے پاؤں کو اپنی طرف کھینچا۔ غیر متوقع طور پر آہنی شکنجہ میرے پاؤں کے ساتھ ہی گھسٹ آیا۔ وہ زمین سے پیوست نہیں تھا یا پھر ایک مدت گزر جانے کے سبب وہ اکھڑ چکا تھا۔ میں نے اپنی رائفل پکڑی۔ پہلے اٹھ کر بیٹھا اور پھر درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس مختصر عمل کے دوران میں مجھے ایسے دردناک عذاب سے گزرنا پڑا جس کا اظہار لفظوں میں ناممکن ہے۔ "دیویوں کا چشمہ" یعنی میری پناہ گاہ قریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ میری سب سے پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے تھی کہ میں کسی طرح اپنی پناہ گاہ تک پہنچ سکوں۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے ایسے شکاری شکنجوں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل تھیں۔ کسی اکیلے آدمی کے لئے اوزار کے بغیر اس شکنجے کو کھولنا آسان نہیں تھا اور یہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ زریں گل ناشا کے ساتھ جا چکا تھا اور اسے کل شام سے پہلے واپس نہیں آنا تھا۔ مجھے کہیں کی دیکھی ہوئی انگلش فلم "دی ٹریپ" یاد آ گئی۔ فلم کا مرکزی کردار ایک برفانی رات میں ایسے ہی ایک شکنجے میں پھنس جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کردار کے گرد بھیڑیوں کا غول ہوتا ہے۔ میرے گرد بھیڑیے نہیں تھے لیکن حالات بھی تو کبھی کبھی بھیڑیوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

قریباً تیس گز کا فاصلہ میں نے پناہ گاہ کی طرف طے کیا اور پسینے میں نہا گیا۔ ٹانگ میں ٹخنے سے لے کر کولہے تک درد کی ایک سرکش لہر اٹھ رہی تھی۔ ہر قدم ایک "طویل مسافت" تھا جو میں بے پناہ جبر کے ساتھ طے کر رہا تھا۔ جوں جوں چوٹ ٹھنڈی ہو رہی تھی، تکلیف دوچند ہوتی جا رہی تھی... یہی وقت تھا جب ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے لگا زمین آسمان میری نگاہوں میں گھوم گئے ہیں اور چیڑ کی ٹہنیوں میں الجھا ہوا چاند دھڑام سے نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا ہے۔ میری تمام حسیں سمٹ کر کانوں میں آ گئیں اور میں نے پوری توجہ کے ساتھ ایک بار پھر آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں، مجھے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ وہ آواز موجود تھی اور جاگتی ہوئی دنیا میں میرے کان اسے سن رہے تھے۔ وہ آواز ایک ننھی بچی کی تھی۔

وہ ان ویران پہاڑوں کی تاریکی میں رو رہی تھی اور ان احمق جاتریوں کی انسانیت کا ماتم کر رہی تھی جو اسے ایک بے معنی بھینٹ کی بھینٹ چڑھا کر موت کے منہ میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ یقیناً زرغونہ تھی۔ ہم ہفتوں اس کے انتظار میں رہے تھے۔ آج وہ اپنی بدقسمتی کی انگلی تھام کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اپنی زخمی پنڈلی کی طرف دیکھا اور اپنی چوٹ کا غم میرے دل میں سوگنا ہو گیا۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ کیا ان دونوں مصائب کو ایک ساتھ ہی آنا تھا؟ ایسا کیوں ہوا تھا۔ کاش یوں نہ ہوا ہوتا۔

میں نے اپنے آپ پر بے پناہ جبر کر کے رخ پھیرا اور آواز کی سمت بڑھا۔ ایک بار پھر ہر قدم ایک "مسافت" بن گیا۔ تکلیف کی انتہا کو پہنچ کر تکلیف کا احساس ذرا سا کم ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ گھٹنے کے نیچے ٹانگ سن ہوتی جا رہی ہے۔ پاؤں کو اٹھا کر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا اسے اونچی نیچی جگہوں پر گھسیٹنا پڑ رہا تھا۔ جھٹکوں کے سبب پورے جسم میں درد کی لہریں پھیل رہی تھیں۔ نجانے کتنی دیر میں نے یہ جاں گسل کوشش جاری رکھی۔ شاید دس پندرہ منٹ، شاید بیس پچیس منٹ اور پھر میں نے خود کو ایک دردناک منظر کے روبرو پایا۔ میں ایک عرصہ لاہور میں گزار چکا ہوں۔ پاکستان میں اور بھی بے شمار لوگ ہیں جو خاصے ایڈوانس علاقوں میں رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے، روشن خیال اور باخبر ہیں۔ ان لوگوں کے لئے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو گا کہ ہماری دور دراز کوہستانی وادیوں میں ابھی تک اور ایسے رسم و رواج موجود ہیں جن کا وجود صدیوں سے جوں کا توں برقرار ہے۔ میں نے اس چاندنی رات میں جو منظر دیکھا وہ بھی کسی صدیوں پرانی تہذیب کا حصہ محسوس ہوتا تھا... میں نے پانچ چھ سالہ زرغونہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ایک سفید پٹی سے بندھی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ بھی پشت پر موڑ کر سفید پٹی سے باندھ دیئے گئے تھے۔ وہ "نرپال دیوتا" کے مجسمے سے پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر یوں کھڑی تھی جیسے تاریکی اور سردی کے سمندر پر ایک تنکا تیر رہا ہو۔ ان جان لیوا گھاٹیوں کے درمیان وہ اکیلی تھی... بالکل اکیلی۔ وہ رو رہی تھی۔ کبھی دس قدم ایک طرف چلتی، کبھی دوسری طرف۔ وہ اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ کو پکار رہی تھی۔

"ماماں... بابا... بابا..." اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ جنہیں وہ پکار رہی تھی وہ یہاں نہیں تھے۔ وہ کہیں بھی نہیں تھے۔ ان دونوں میں سے ایک گنہگار تھا اور ایک بے گناہ... لیکن وہ دونوں اسے ہمیشہ کے لئے دنیا کے دکھوں کے حوالے کر کے چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور آگے بڑھ کر اس ننھی منی گڑیا کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

میں ایک بار اس کی زندگی کا وسیلہ بن چکا تھا۔ آج پھر مجھے وسیلہ بننے کی کوشش کرنی تھی۔

جوں ہی میں نے ننھی زرغونہ کو گلے سے لگایا‘ اس نے خوف کے مارے چیخ ماری۔ یہ چیخ ان ویران پہاڑوں کے سناٹے میں دور تک گونجی۔ میں نے جلدی جلدی اس کی آنکھوں کی پٹی کھولی اور کہا ”یہ میں ہوں تمہارا انکل! مجھے پہچانا نہیں تم نے؟“

چمکیلی چاندنی میں مجھے زرغونہ کے خدوخال صاف نظر آ رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے چوں کہ اچانک پٹی اتری تھی لہٰذا وہ کچھ بھی دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ اس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے ”گردوپیش“ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے بڑے دھیان سے میرا چہرہ دیکھا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی ”آپ۔۔۔ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہیں؟“

”میں نہیں لایا۔ کچھ اور لوگ لائے تھے لیکن وہ اب بھاگ گئے ہیں۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے اسے بھر بانہوں میں لے لیا۔ میری پنڈلی میں بے حد شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں بولتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آواز لڑکھڑا رہی ہے ”وہ مجھے کیوں لائے تھے یہاں؟“ زرغونہ نے روتے ہوئے کہا ”میں اپنے ماماں‘ پاپا کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ۔۔۔ مجھے لے جائیں گے ان کے پاس؟“

مجھ پر یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ زرغونہ ابھی تک اپنے والدین کی موت سے بے خبر ہے۔ میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا ”ہاں ہاں۔ جو تم کہو گی‘ وہی ہوگا لیکن یہ رونا بند کرو۔ یہ نہ ہو کہ جو لوگ تمہیں پکڑ کر یہاں لائے ہیں‘ وہ تمہاری آواز سن کر پھر واپس آ جائیں۔“

میری اس بات نے ننھی زرغونہ پر فوری اثر کیا۔ وہ ایک دم سہم کر خاموش ہوگئی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ انہیں کھولنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے سفید پٹی کی گرہیں کھول کر اس کے ہاتھ آزاد کر دیے۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرے پاؤں سے وزنی شکنجہ پیوست تھا اور گھٹنے سے نیچے ٹانگ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ کاش آج رات زریں گل میرے ساتھ ہوتا۔ مجھے اس کی کمی بے حد شدت سے محسوس ہوئی۔

میرے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ زرغونہ کو لے کر اپنی پناہ گاہ یعنی اس کھنڈر میں چلا جاؤں جسے دیویوں کا پن گھٹ کہا جاتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر اپنے پاؤں کا شکنجہ کھولنے کی کوشش کروں اور اس کے ساتھ ساتھ زریں گل کا انتظار بھی کروں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ جیسے تیسے آگے بڑھوں اور زرغونہ کو ان گھاٹیوں سے نکال کر بستی کی بیرونی حدود میں پہنچا دوں۔ زرغونہ سمجھ دار تھی۔ میں اسے سمجھا سکتا تھا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے کہ وہ از خود بستی میں نہیں پہنچی بلکہ اسے پہنچایا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ بستی والے اسے قبول کر لیں اور اس کی جان بچ جائے۔ یقیناً زرغونہ پہلی بچی تو نہیں ہوگی جو اس رسم کی بھینٹ چڑھنے سے بچے گی۔ اس سے پہلے بھی کچھ خوش نصیب بچے اس بے رحم آزمائش پر پورے اترے ہوں گے۔ زرغونہ کو بھی ان میں سے ایک سمجھ لیا جائے گا۔

دھیمی دھیمی ہوا چلنی شروع ہوگئی تھی۔ یہ ہوا تیز دھار خنجر کی طرح ہمارے کپڑوں سے آر پار ہو رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بدلیاں بھی آسمان پر تیرنے لگی تھیں اور کبھی کبھی چاند ان میں چھپ کر جاتا تھا۔ میں نے ٹانگ سے اٹھنے والی درد کی بے پناہ لہروں پر جبر کیا اور کھڑا ہو گیا۔

”آؤ زرغونہ چلیں۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔

”کہاں؟“

”تمہارے گھر۔“

”ماں پاپا کے پاس؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

میں نے اثبات میں جواب دیا اور اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔ مجھے بری طرح لنگڑاتے اور کراہتے دیکھ کر زرغونہ کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ مجھ سے میری لنگڑاہٹ کا سبب پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن جھجک رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاؤں میں لوہے کا شکنجہ ہے اس لیے چلنے میں دشواری ہو رہی ہے۔

”شکنجہ“ کا لفظ زرغونہ کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ یہاں ماداروں کے پاؤں میں ایسے شکنجے اور بیڑیاں وغیرہ دیکھتی ہی رہتی تھی۔ اس نے مجھ سے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں قدم اٹھاتا تھا۔۔۔ شکنجے کا وزنی لوہا پتھروں پر گھسٹتا تھا اور ایک منحوس آواز پیدا ہوتی تھی۔ میں نے جوگر ٹائپ جوتے پہن رکھے تھے۔ میں صاف محسوس کر سکتا تھا کہ میرا بایاں جوتا خون میں لتھڑ گیا ہے اور پاؤں جوتے کے اندر ”چپچپا“ رہا ہے۔۔۔ آٹھ دس قدم اٹھانے کے بعد میں رک جاتا۔ سانس درست کرتا اور پھر چلنے لگتا۔ سخت سردی کے باوجود پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا اور منہ بالکل خشک ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی چکرا کر گر جاؤں گا لیکن قوت ارادی آگے بڑھائے چلے جا رہی تھی۔

قریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد میں بیٹھ گیا۔ درد سے ہارا ہوا ذہن بار بار یہ مشورہ دے رہا تھا کہ اپنی پناہ گاہ کی طرف مڑ جاؤں۔ پہلے اس منحوس شکنجے سے چھٹکارا پانے کی کوشش کروں اس کے بعد کچھ اور سوچوں لیکن جب بچی کی طرف دیکھتا تھا تو درد سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ بچی کو اپنے پاس رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے ساتھ ساتھ اس کی جان کے لیے بھی شدید خطرات پیدا کر دیے جائیں۔ چار پانچ منٹ دم لے کر میں پھر اٹھ کھڑا ہوا اور زرغونہ کے ساتھ چل پڑا۔ درد کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے میں نے زرغونہ کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ گھاٹیوں سے نکلنے کے بعد میں اس کے ہاتھ دوبارہ باندھ دوں گا اور آنکھوں پر پٹی بھی چڑھا دوں گا۔ وہاں سے بستی کے مکانات زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ وہ سیدھی چلتی جائے گی تو ذرا سی

دیر میں پہرے داروں تک پہنچ جائے گی۔ پہرے دار اسے واپس بستی میں۔۔۔ جائیں گے۔

وہ میری پوری بات سن کر بولی ”اور میرے ماں پاپا؟“

”وہ دونوں بھی بستی میں ہیں۔ پہرے دار تمہیں ان سے ملوائیں گے۔“

”وہ نہیں ملوائیں گے۔ میں پہلے بھی گئی رہی ہوں۔ مجھے میرے ماماں پاپا سے کوئی نہیں ملواتا۔“

”اس دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے طفل تسلی دی۔

وہ بولی ”آپ بہت اچھے ہیں انکل! آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ آپ میرے ساتھ ماں پاپا کے پاس چلیں۔“

میں نے اسے پچکارا ”بیٹا جی! میں ابھی نہیں جا سکتا۔ میں جاؤں گا تو پہرے دار مجھے گولی مار دیں گے۔ میں قیدی ہوں نا۔ میرے پاؤں میں یہ شکنجہ اسی لیے تو ہے۔“

وہ بولی ”میرے پاپا آپ کو بچا لیں گے۔ سارے پہرے دار ان سے ڈرتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گی۔ وہ آپ کو کچھ نہیں ہونے دیں گے۔“

میں نے اسے کہا ”فی الحال تمہارے پاپا بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ پہلے میں ان کی ناراضگی دور کر لوں‘ پھر تم سے بھی ملوں گا اور تمہارے پاپا سے بھی۔“

”وہ کیوں ناراض ہیں آپ سے؟“ اس نے نیا مسئلہ چھیڑ دیا۔

”یہ ساری باتیں تمہارے سمجھنے والی نہیں ہیں۔“ میں نے ذرا جھنجلا کر کہا۔

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ مجھے اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ درحقیقت درد کی شدت نے میرا دماغ ماؤف کر رکھا تھا اور برداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں بچی کا بازو تھام کر چلتا رہا اور رائفل کی نال میرے زخمی پاؤں کو سہارا دیتی رہی۔ رائفل کے دستے پر میری گرفت مضبوط تھی‘ اس لیے کہ یہ رائفل میرے لیے بیساکھی کا کام کر رہی تھی اور اس لیے بھی کہ کسی بھی وقت اس رائفل کے ”اصلی استعمال“ کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ میں اس لعنتی رسم کی تفصیلات سے بے خبر تھا۔ ممکن تھا کہ بدنصیب بچے کو نرپال دیوتا کے قریب چھوڑ کر کچھ لوگ آس پاس موجود رہتے ہوں اور بچے کی نگرانی کرتے ہوں۔ اگر ایسا تھا تو کسی بھی وقت کسی بدگوار جنگلی سے میری ملاقات ہو سکتی تھی۔۔۔ قدم اٹھاتے ہوئے کسی وقت میرے منہ سے کراہ نکل جاتی تو زرغونہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگتی۔ میری تکلیف جیسے براہ راست اس کے دل و دماغ پر اثر کر رہی تھی۔ وہ میرے بازو سے یوں چمٹی ہوئی تھی کہ بازو کا ایک حصہ محسوس ہوتی تھی۔

قریباً ڈیڑھ میل کا وہ سفر میری زندگی کا طویل ترین سفر تھا۔ ہر قدم اٹھانے کے لیے مجھے اپنے آپ سے ”دیوانہ وار“ جنگ کرنی پڑتی تھی۔ بالآخر ”درد“ کا یہ لامتناہی سفر ختم ہوا اور سوا ڈیڑھ سو گز کی دوری پر مجھے وہ درخت نظر آنے لگے جو بستی کی بیرونی حد بناتے تھے۔ یہاں درختوں پر ہیرک نما کمرے تھے۔ ان کمروں میں مسلح پہرے دار رات بھر موجود رہتے تھے۔ ایسے ہیرک نما کمرے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بستی کے چاروں طرف موجود تھے۔

چاند گہری بدلیوں میں چھپ گیا تھا۔ قرب و جوار تاریک نظر آنے لگے تھے۔ اس تاریکی کا فائدہ اٹھا کر میں زرغونہ کو بستی کی حدود سے کچھ مزید قریب لے گیا۔ وہ کسی طور دوبارہ آنکھوں پر پٹی بندھوانے کے لیے تیار نہیں تھی‘ اس کے لیے یہ بھی بے حد مشکل تھا کہ وہ اس سنسان تاریکی میں تن تنہا ہیرکوں کی طرف جائے۔ میں نے ایک تناور درخت کی اوٹ میں بیٹھ کر اسے مسلسل سمجھایا۔ یہاں تک وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔ اسے نیم رضامند کر لینا بھی میری بہت بڑی کامیابی تھی۔ تاہم اس کامیابی میں زرغونہ کی غیر معمولی ذہانت اور کوشش کو بھی دخل تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ زرغونہ کی جگہ کوئی اوسط صلاحیتوں والا بچہ ہوتا تو وہ کبھی میری خواہش کے مطابق عمل نہ کر سکتا۔

میں نے زرغونہ کے ننھے ہاتھ جو گرم دستانوں کے باوجود یخ ہو رہے تھے‘ اس کی پشت پر باندھے پھر دستی سفید پٹی اسی انداز میں اس کی آنکھوں پر چڑھا دی جس انداز میں جاتریوں نے چڑھائی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں تسلی تشفی کے بول ڈال کر اس کی پیشانی چومی اور ہیرکوں کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ہیرکوں کی طرف بڑھی‘ میں دل ہی دل میں اس کی زندگی اور سلامتی کی دعا کرنے لگا۔ ان لمحات میں میں اپنے پاؤں کی تکلیف یکسر بھول گیا تھا۔ شاید یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں شدید طور پر زخمی ہو چکا ہوں اور میرے پاؤں میں دس پاؤنڈ کا لوہا پرویا ہوا ہے۔ ہیرکوں کا فاصلہ اب ستر اسی گز کے قریب تھا۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ زرغونہ کس طرف گئی ہے۔ میری ہدایت کے عین مطابق کچھ آگے جا کر زرغونہ نے اونچی آواز میں پکارنا شروع کر دیا ”کوئی ہے۔۔۔ کوئی ہے۔“

پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ انتظار اور فکرمندی کی یہ گھڑیاں میرے لیے بہت طویل تھیں۔ ہیرکوں کی طرف سے کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد چاند کے چہرے سے بدلی کا سیاہ نقاب سرک گیا۔ اس نقاب کے سرکتے ہی نشیب و فراز روشن ہو گئے اور ان نشیب و فراز پر لہلہاتی ہوئی تمام نباتات بھی چمک اٹھیں۔ میں نے دیکھا‘ چیڑ کے ایک بلند درخت کے قریب تین انسانی ہیولے موجود تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ مسلح محافظ ہیں۔ ان میں سے ایک نے کسی بچے کو بانہوں میں اٹھا رکھا تھا۔ یقیناً وہ زرغونہ تھی۔ چند لمحے بعد وہ لوگ ہیرک نما کمرے کی طرف چلے گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے لیکن اس بوجھ کے ہٹتے ہی ٹانگ کی تکلیف شدت سے جاگ اٹھی۔ میں نے اس تکلیف کو سہتے ہوئے اپنی جگہ سے حرکت کی اور رائفل کے سہارے نشیب

کی طرف بڑھنے لگا۔ اس موقع پر میں خصوصی احتیاط کر رہا تھا کہ شکنجے کے کھلنے کی آواز پیدا نہ ہو۔ یہ آواز پہرے والوں کو میری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

ہوا ہی میں ہوا وہ جگہ سے گزر کر دوبارہ گھاٹیوں میں داخل ہوا میرا سفر شوار ترین مرحلے میں داخل ہو گیا۔ چڑھائی چڑھنا بے حد مشقت طلب اور اذیت ناک تھا۔ ویسے بھی زرغونہ کو اس کے ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد میں خود کو ایک دم نڈھال محسوس کرنے لگا تھا۔ ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے یوں لگا جیسے آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔ میں ذرا سانس لینے کے لیے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نیم تاریکی میں غور سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ سفید بوٹ سیاہی مائل نظر آ رہا تھا۔ یقیناً وہ میرے ہی خون میں بھیگا ہوا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے شکنجے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا لوہا برف کی طرح سرد تھا اور تقریباً دس ملی میٹر موٹی سلاخ میری پنڈلی سے آر پار تھی۔ درحقیقت اس شکنجے میں تین سلاخیں تھیں جو طاقت ور اسپرنگ کے ذریعے ایک ساتھ حرکت کرتی تھیں۔ بارودی سرنگوں کی طرح ایسے شکنجے بھی مخصوص دباؤ کے بعد حرکت میں آتے ہیں۔ میرے پاؤں کے دباؤ سے اسپرنگ کا کھٹکا کھل گیا تھا اور تینوں سلاخیں بے پناہ قوت سے حرکت میں آ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نوکیلی سلاخ میری پنڈلی میں گھسنے سے دو تین انچ اوپر پیوست ہوئی تھی۔ مجھے چند ماہ پہلے کا وہ واقعہ یاد آ رہا تھا جو سری لنکا میں پیش آیا تھا۔ ہم ایک ٹاؤن سے واپس آتے ہوئے بم بالس کے ایک گھنے جنگل میں رکے تھے۔ تامل گوریلے کا بھائی راموں ہمارے ساتھ تھا اور انسپکٹر شاہ بھی۔ ہاتھیوں سے ڈر کر بھاگتے ہوئے انسپکٹر شاہ کا پاؤں ایک ایسے ہی شکنجے میں پھنس گیا تھا۔ ایک دیو ہیکل ہاتھی نے اسے کچل کر رکھ دیا تھا۔

کچھ دیر پتھر کے سہارے دم لینے کے بعد میں نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک لڑکھڑا کر گر گیا۔ میرا سر بڑے زور سے کسی سخت چیز کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تاریک چادر کچھ اور تاریک ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔

○☆○

ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی حالت نجانے کتنی طویل تھی۔ مختلف چہرے میرے تصور پر یلغار کر رہے تھے۔ بابا سرنگ سے معذور گوگی وارا، اس کی غم زدہ بجی سا حیدہ اور رنگین مزاج کیرولین۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں ایک یخ بستہ ویرانے میں پڑا ہوں اور برفانی ہوا میرے جسم کو چھیدتی ہوئی گزر رہی ہے لیکن ہوا کی یہ اذیت ناک کاٹ اور پنڈلی سے اٹھنے والی درد کی لہریں دل و دماغ پر وہ اثر نہیں کر رہی تھیں جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ یعنی "تکلیف" انتہا پر پہنچ کر اپنا اثر کھو رہی تھی۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن کو ایک گہری تاریکی نے مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اسی کھنڈر نما کمرے میں پایا جسے دیوبوں کا چیکسٹ کہا جاتا تھا اور جس میں زریں گل اور دیگر پچھلے بارہ تیرہ روز سے مقیم تھے۔ میں فرش پر چت لیٹا تھا لیکن فرش ٹھنڈا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے قریب ہی سرخ انگاروں والی خوش نما اور حرارت بخش آگ جل رہی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ کمرے کی سلاخ دار کھڑکی سے آگے جنگلوں آسمان صاف نظر آ رہا تھا۔ زریں گل کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ رات کے واقعات ایک ایک کر کے میرے ذہن میں تازہ ہوئے۔ پھر ایک دم اٹھ کر میں نے اپنی پنڈلی کی طرف دیکھا۔ منحوس شکنجہ وہاں موجود نہیں تھا۔ پنڈلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں ننگے تھے اور زخمی پنڈلی والا پاؤں کچھ سوجا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"یہاں کون لایا مجھے؟" میں نے زریں گل سے پوچھا۔

"میں اور زریں گل۔" کمرے کے ایک گوشے سے آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہاں منصور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ منصور کو دیکھ کر میں اپنی ساری کوفت بھول گیا اور سخت نقاہت کے باوجود اٹھ بیٹھا۔

"ارے۔۔۔ لیٹے رہیے آپ! کچھ تو پروٹوکول دیجئے اپنی بیماری کو۔" منصور نے کہا۔

"میں بیمار ویمار نہیں ہوں۔" میں نے کہا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

منصور کے ہاتھ میں گرم گرم دودھ کا گلاس تھا۔ اس نے یہ گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے دودھ پی کر گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ زریں گل بولا "استاد صیب! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے کیا کیا ہے۔ ہمارا تو سوچ سوچ کر دماغ پاگل ہو رہا ہے۔"

منصور نے زریں کو گھور کر دیکھا اور مجھ سے کہا "فی الحال آپ آرام کریں جناب۔۔۔ یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

میں نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں اور خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ میرا خیال ہے میں نیچے گھاٹیوں میں نڈھال ہو کر گر گیا تھا۔"

"گر نہیں گئے تھے آپ بالکل بے ہوش پڑے تھے۔" زریں گل نے جوش سے کہا "یہ تو ہمارا قسمت اچھا تھا اور آپ کا بھی اچھا تھا کہ ہم نے رات کو واپس آنے کے بجائے صبح منہ اندھیرے آنا اچھا سمجھا۔ ہم اور صیدر صاحب سیدھا اس کمرے میں آیا تھا۔ یہاں آپ کا نام و نشان نہیں ملا۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا، اتنے میں دن نکل آیا۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ ادھر نیچے چیڑ کے درختوں میں ایک جگہ صیدر صاحب کو خون کا دھبا نظر آیا۔ ایسا دھبا کئی جگہ موجود تھا۔ ایک دو جگہ تو بانکا بوٹ کا نشان بنا ہوا تھا۔ ہم فوراً سمجھ گیا کہ یہ آپ کے بوٹ کا نشان ہے۔ خدا کی قسم ہمارے دل میں ایک دم گڑبڑ ہو گیا۔ ہم نے سوچا کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم اس ساری بستی کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ ہم

اور صیدر صاحب کے ساتھ مل کر خون کے دھبوں کا پیچھا کیا اور ہم ڈھلانوں میں اتر گئے۔ قریباً ایک گھنٹے کے اندر ہمارا محنت رنگ لایا اور ہم نے آپ کو دیکھ لیا۔ آپ کا برا حال تھا۔ آپ کے پاس اور آپ کا پاؤں خون میں لت پت تھا۔ یہ ہمارا اندازہ نہیں ہے نا آپ۔۔۔ بالکل اسی طرح رنگ ہو رہا تھا آپ کا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ بہت سخت جان ہے۔ بالکل بدو منیر کے آپ کی جگہ کوئی اور تین چار گھنٹے اسی طرح سردی میں پڑا رہتا تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔۔۔ ابھی ہم آپ کو وہاں سے اٹھانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کچھ لوگوں کا آوازیں آیا۔ ہم اونچائی پر تھا اور نیچے آنے والوں کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ سات آٹھ بندے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں اور لالٹین بھی تھا۔ وہ کسی چیز کو کھوجتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ صیدر صیب کا خیال ہے کہ ادھر دوسری طرف بھی آپ کے قدموں کا نشان موجود تھا اور وہ لوگ اسی کا پیچھا کرتے ہوئے آ رہا تھا۔ صیدر صیب نے بڑا ہوشیاری دکھایا۔ فوراً آپ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور وہاں سے چل نکلا۔ تھوڑا دور جا کر ہم درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں چھپا رہا۔ ہم وہاں کوئی ایک گھنٹا گزارا جب ہم کو پورا پورا تسلی ہو گیا کہ آس پاس کوئی نہیں اور وہ سارا کتے کا بچہ واپس جا چکا ہے تو ہم وہاں سے نکلا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس یہاں پہنچ گیا۔ اسی دوران میں وہ بدمعاش کا بچہ تاشا بھی وہاں پہنچ گیا۔ آپ کی ٹانگ میں اٹکے ہوئے شکنجے کو دیکھ کر وہ بھی ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ شکنجہ کہیں آس پاس سے ہی آپ کے پاؤں کو لگا ہے۔ اس وقت آپ تھوڑا تھوڑا ہوش میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ تاشا نے کہا کہ آپ کا ہوش میں آنا ٹھیک نہیں کیونکہ شکنجہ نکالتے وقت آپ کو تکلیف ہوگا۔ وہ فوراً ہی بستی واپس چلا گیا اور کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس کے پاس اوزار تھا اور ایک چھوٹا سا انجکشن بھی تھا جس میں نیند کا دوائی تھا۔ ہم نے اس دوائی کا چند قطرہ آپ کے منہ میں ٹپکا دیا اور جب آپ پھر سے لمبا لمبا سانسیں لینے لگا تو اوزاروں کی مدد سے آپ کے پاؤں سے شکنجہ نکال لیا۔۔۔ وہ دیکھیں، وہ پڑا ہے شکنجہ۔" زریں گل نے لکڑیوں کے چھوٹے سے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، قریباً دس بارہ کلو وزنی زنگ آلود شکنجہ میرے خون سے داغ دار تھا۔ زریں گل نے نسوار کی چٹکی منہ میں رکھتے ہوئے کہا "صیدر صاحب! اب باقی کا بات آپ بتائیں۔"

منصور نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "باقی کی بات یہ ہے جناب کہ زریں گل نے کوئی بات باقی ہی نہیں چھوڑی۔"

تکلیف کے باوجود میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے ٹانگ کو حرکت دی تو زخم سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ میں نے منصور سے پوچھا "ہڈی تو بچ گئی ہے نا؟"

"سو فیصد!" منصور نے یقین سے کہا "بہرحال خون کافی زیادہ بہہ گیا ہے۔ آپ کو مکمل آرام کرنا ہوگا۔"

"ہم آپ کو خون دینے کے لیے تیار ہے۔ آپ ہمارے خون کا آخری قطرہ تک لے سکتا ہے۔" زریں گل نے قصہ ختم کیا اور جذباتی انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن یہاں خون تیرا باپ لگائے گا مجھے۔"

"خون لگانا کوئی ضروری تو نہیں ہوتا۔ ویسے بھی خون سے طاقت آ سکتا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں ہمارے دادا نے ایک زخمی سردار کو اپنا خون دیا تھا۔ بس پیالہ بھر کر پیش کر دیا تھا۔ وہ غٹاغٹ چڑھا گیا تھا۔"

"وہ ضرور فوراً ہی مر گیا ہوگا۔"

"نہیں جناب! وہ قبائلی تو سن 72 تک زندہ رہا ہے۔ اس کے بیٹے نے سرحد سے الیکشن لڑا تھا، اب اس بیٹے کی اولاد بھی اسمبلی میں ہے۔ وہ سب لوگ بڑے بڑے عہدوں پر ہے۔"

"یعنی خون کی ایسی چاٹ لگی کہ اب بھی خون ہی پی رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس حساب سے تو یہ سارا قصور ہی زریں کے دادا کا ہے۔" منصور نے لقمہ دیا۔

زریں گل نے ناراض لہجے میں کہا "دیکھیں صیدر صیب! ہم آپ کا دل سے عزت کرتا ہے۔ آپ ہم سے مذاق کیا کرو۔"

منصور نے کہا "شاہ جہاں صاحب! اب آپ ہی بتا دیں کیا سمجھے کیوں کہ زریں گل میری تو دل سے عزت کرتا ہے۔" زریں گل منہ کھول کر اس جملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منصور نے پلٹ دی "شاہ جہاں صاحب! اصل بات سے میری توجہ ہٹ رہی ہے اور شاید میرے ساتھ ساتھ زریں گل کی بھی۔۔۔"

میں منصور کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ میرے زخم کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا اور ان حالات کے بارے میں بھی جو مجھے نیچے گھاٹیوں میں لے کر گئے۔۔۔ میرا ذہن پریشانی کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ خاص طور سے یہ جان کر کہ کچھ لوگ میرے زخمی پاؤں سے رسنے والے خون کا تعاقب کرتے ہوئے ان گھاٹیوں تک آئے تھے۔ بہرطور میں نے فوراً اپنی اس پریشانی کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔

میں نے زریں گل کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ کل رات "وہ کچھ" ہوا تھا جس کا انتظار ہم پچھلے دو ہفتوں سے کر رہے تھے۔ یعنی زرغونہ ان پہاڑوں میں لائی گئی تھی۔

"ہم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" زریں گل آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"کل رات یہاں زرغونہ کی آواز سن کر مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا تو یقین کرنا پڑا تھا۔ میں زخمی ہو چکا تھا اور تکلیف سے بے حال تھا مگر زرغونہ کو بے یار و مددگار چھوڑنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔"

پھر میں نے منصور اور زریں کو تفصیل سے وہ سب کچھ بتایا جو کل رات دوسرے پہر سے تیسرے پہر تک پیش آیا تھا۔ وہ حیرت سے گم سنتے رہے اور کبھی کبھی سوالات بھی کرتے رہے۔ میں نے کہا "ایک بات مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہے۔"

"کون سی بات؟" زریں نے پوچھا۔

میں نے کہا "رات ٹانگ میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ سدھ بدھ قائم نہیں رہی تھی۔ اب خیال آتا ہے کہ میرے پاؤں سے رسنے والا خون میرے ہاتھوں میں بھی لگا ہوگا۔ میں یہ ہاتھ زرغونہ کو بھی لگاتا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ زرغونہ کے کپڑوں پر خون دیکھ کر ہی پہرے دار شک میں پڑے ہوں اور صبح سویرے گھاٹیوں میں پہنچ گئے ہوں۔"

"آپ کے اندیشے میں کافی وزن ہے۔" منصور نے کہا "یقیناً وہ لوگ کسی شک کے تحت ہی گھاٹیوں میں پہنچے تھے۔ راستے میں جب انہیں آپ کے پاؤں کے نشانات مل گئے تو وہ مزید ہوشیار ہو گئے۔ مجھے تو شک ہے کہ وہ ابھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے۔"

میں نے منصور سے پوچھا "تم زریں کے ساتھ کیسے چلے آئے۔ میں تو تمہیں جاتود میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تمہارے پاؤں سے گولا باندھ دیا گیا تھا۔"

"یہ سب نئے سردار سدورت کی مہربانی ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ آپ کا دوست بھی ہے۔"

"دوست تو بے شک ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اس نے حیلے بہانے کے ساتھ مجھے جاتریوں سے حاصل کر لیا تھا۔ جاتود سے نکال کر وہ مجھے تخت (سدورت کی رہائش گاہ) پر لے آیا تھا۔ چھ سات روز پہلے میرے پاؤں سے گولا بھی نکال دیا گیا اور دیگر پابندیاں بھی نرم کر دی گئیں۔ ایک دو دفعہ سردار مجھ سے بے تکلفی کے ماحول میں بات چیت بھی کر چکا ہے۔ اس بات چیت کا اہم موضوع آپ اور زریں گل ہی رہے ہیں۔"

"میں اور زریں گل؟ وہ کیوں؟"

منصور نے ایک طویل سانس لی اور لوہے کی سلاخ سے آگ کو کریدتے ہوئے بولا "سردار سدورت آپ دونوں کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ میرے خیال میں اسے خطرہ ہے کہ جاتریوں کی طرف سے آپ کو نقصان پہنچ جائے گا۔ وہ اس وادی میں جاتریوں کی طاقت سے بخوبی واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ ایک دفعہ جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کی جان نہیں چھوڑتے۔ سردار سدورت کا خیال ہے کہ آپ وادی میں ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے خود کو انتظامیہ کے حوالے کر دیں۔ آپ پر ابھی تک قتل کا الزام نہیں لگا ہے لہٰذا کسی سنگین سزا کا خطرہ بھی نہیں۔ ایک بار جب آپ خود کو محافظوں کے حوالے کر دیں گے تو پھر سردار سدورت بھی اس پوزیشن میں ہوگا کہ آپ کے لیے جاتریوں سے رعایت حاصل کر سکے یا کسی اور ڈھنگ سے آپ کی مدد کرے۔"

میں نے منصور سے پوچھا "یہ بات تم سے سردار سدورت نے کہی ہے یا تم نے خود اندازہ لگایا ہے؟"

"یہ ساری باتیں سردار نے خود مجھ سے کہی ہیں۔ سردار کے ذہن میں یہ امکان موجود تھا کہ آپ یا زریں گل کسی ذریعے میرے ساتھ رابطہ کریں گے۔ ایسے میں میں سردار کا نقطۂ نظر آپ تک پہنچا دوں گا۔ کل رات جب میرے واکی ٹاکی پر زریں کا بھیجا ہوا سگنل موصول ہوا اور میں نے اس سے بات کی تو فیصلہ کر لیا کہ آپ سے ملوں گا۔ میں رات کو ہی اس مکان پر آ گیا تھا جہاں زریں گل ناشا کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ علی الصباح منہ اندھیرے ہم گھاٹیوں کی طرف چلے آئے تھے۔"

منصور نے بات ختم کی اور ہم تینوں اپنی اپنی سوچ میں ڈوب گئے۔ کچھ دیر بعد زریں گل بولا "واپس جانے کو تو ہمارا بھی بہت جی چاہتا ہے استاد صیب! لیکن ہم کو ہر بات پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ یہاں پر جاتریوں کی شان میں زرا سا گستاخی بھی برداشت نہیں کیا جاتا اور ہم نے تو سرنگ سے نکلتے وقت عزت مآب جاتری کو اچھا خاصا چینٹی لگا دیا تھا۔ وہ لوگ ہم کو سو گنا چینٹی لگائے گا اور پھر بھی ان کا تسلی نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ ہماری کارروائی کے دوران میں ایک قتل بھی ہو چکا ہے۔"

منصور بولا "شاید آپ کا اشارہ مستان نامی اس کارندے کی طرف ہے جسے آپ کندھے پر اٹھا کر بھاگے تھے اور پیچھے سے چلنے والی ایک گولی اس کے سر میں لگی تھی؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "میری رائے میں اس واقعے کی طرف سے آپ کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس قتل کا الزام آپ پر نہیں آئے گا۔ بے شک یہ لوگ جنگلی ہیں لیکن ہمارے پڑھے لکھے مہذب لوگوں کی طرح قانون کی من مانی تشریحات نہیں کرتے۔ بہت سے قبائلی قوانین کی طرح ان کے قوانین بھی بے لچک اور دو ٹوک ہیں۔"

زریں گل بولا "منصور صیب! اگر واقعی ایسا ہے تو یہ بہت اچھا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ یہاں کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کوئی اپنی پسند کی لڑکی کو بھگا کر لے جائے تو اس کے ساتھ زیادہ کھینچا تانی نہیں کیا جاتا اور لڑکی کا باپ بعد میں اپنے داماد کو معاف کرتا ہے۔ شرط صرف اتنا ہوتا ہے کہ لڑکی شادی شدہ نہ ہو۔"

"زریں گل! بے موقع بات مت کیا کرو۔" میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ پھر سر کھجاتے ہوئے بولا "استاد صیب! ہم معافی چاہتا ہے۔ پتا نہیں اس جنگلی پھل میں کیا اثر تھا۔ ہم کو لگتا ہے ہمارا دماغ واقعی کچھ ہل گیا ہے۔ ہم جس طرف بھی دیکھتا

ہے ہم کو لگتا ہے کلثوم کھڑی ہے۔"

میں نے منصور سے کہا "اگر خدا نخواستہ جاتری واقعی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ زرغونہ از خود بستی میں واپس نہیں پہنچی تو کیا ہوگا؟"

"یقیناً اچھا نہیں ہوگا۔" منصور نے کہا "ممکن ہے کہ 'واپسی' کی رسم دوبارہ ادا کی جائے یا پھر بچی کو کسی اور آزمائش میں ڈال دیا جائے۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی دروازے سے باہر آہٹ ہوئی۔ زریں گل تڑپ کر اٹھا اور رائفل بدست دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ منصور بھی ایک دم چوکس نظر آنے لگا تھا۔ دروازے کی باریک جھریوں میں سے باہر جھانکنے کے بعد زریں نے دروازہ کھول دیا۔ جنگلی گھوڑی جیسی مُکلی پکی اور چوکس ناشا زندانی اندر آ گئی۔ وہ حسبِ معمول موٹے اونی گاؤن میں تھی۔ پاؤں میں ہائیکنگ کے لیے استعمال ہونے والے بوٹ تھے۔

"ہیلو۔ اب کیسے ہو؟" اس نے میری مزاج پرسی کی۔

میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا کہ ٹھیک ہوں۔ وہ طویل راستہ طے کر کے آئی تھی لہٰذا سردی کے باوجود گرم ہو رہی تھی۔ پھر کمرے میں بھی آگ کی حدت موجود تھی۔ اس نے اپنا گاؤن اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔ اندر سے وہی چُست جینز اور شرٹ تھی جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ نجانے کیوں اس کے جسم کو دیکھ کر ایک ایسی کڑی کمان کا تصور ذہن میں آتا تھا جس سے ہزاروں تیر بھی چلا لیے جائیں تو اس کا تناؤ برقرار رہتا ہے۔ اس کے مختصر بالوں پر دو تین جگہ پیوند کاری کی گئی تھی۔ اس مرمت کی ضرورت اسے وحشیانہ نوچ کھسوٹ کی وجہ سے پیش آئی تھی جو چند روز پہلے مستان نے غار میں اس سے کی تھی۔ اس ہوس کاری کے آدھ پون گھنٹے بعد ہی مستان ہلاک ہو گیا تھا۔

گاؤن اتار کر بڑے مردانہ انداز میں وہ ہمارے قریب بیٹھ گئی اور میرے زخمی پاؤں کا معائنہ کرنے لگی۔ میں نے پاؤں کو ہلانے کی کوشش کی تو ایک بار پھر درد کی ٹیسوں نے پورے جسم کو جھنجھوڑ دیا۔ ناشا اپنے ساتھ ایک تھیلے میں ہمارے لیے کھانا لائی تھی اور اس کے علاوہ کچھ دوائیں تھیں۔ اینٹی بائیوٹک اور درد کش گولیاں تھیں۔ اس کے علاوہ زخم پر لگانے کے لیے دوا تھی۔ ظاہر ہے یہ سامان بھی کسی لاپتا سیاح یا کوہ پیما سے "تعلق" رکھتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ منصور اور زریں گل کی طرح وہ بھی کل رات کے واقعات جاننے کے لیے بے چین ہوگی مگر ایسا نہیں تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بستی سے کچھ اہم باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ بولی "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری ساری محنت اکارت گئی ہے۔ زرغونہ کے کپڑوں پر خون کے نشانات پائے گئے ہیں۔ ان حرامی جاتریوں کو پورا یقین ہے کہ کسی نے "رسم" خراب کی ہے اور بچی کو گھاٹیوں سے اٹھا کر بستی کی حدود میں پہنچایا ہے۔ ایسی جرأت کوئی مقامی شخص کر ہی نہیں سکتا ہے۔ بستی میں

طاہر جاوید مغل کے قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے

قیمت:
جلد اوّل: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۰۳

یہ بات عام کی جا رہی ہے کہ یہ "تم دونوں" کا ہی کام ہے۔ جاتری کی گمشدگی کے بعد یہ دوسرا بڑا جرم ہے جو تمہارے ہاتھوں ہوا ہے۔ جاتری تمہارے خلاف اور بھڑک گئے ہیں۔ جن گھاٹیوں میں تمہارے پاؤں کے نشان ملے ہیں وہاں کا چپا چپا کھنگالا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں تو اب یہ "دیوتوں کا اپنا گھٹ" بھی تمہارے لیے زیادہ محفوظ نہیں رہا۔"

"زرغونہ اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے جاتریوں کے پاس ہوگی۔ اس کی زندگی بھی اب خطرے میں ہے۔"

میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ معصوم آنکھیں میرے تصور میں چمکیں جن میں ننھی کے آنسو لرزتے تھے۔ ان آنکھوں پر چند روز پہلے تک ماں باپ کے بوسے سجتے تھے۔ اب وہ ساون بھادوں کی طرح رو رہی تھیں اور انہیں پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ کے بعد بچے کا کیا حال ہوتا ہے' یہ درد مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اور میری بہن نے چھوٹی سی عمر میں ماں باپ کی دائمی جُدائی سہی تھی۔ ہم نے جل کوٹ کی گلیوں میں ننگے پاؤں اپنے امی ابو کو ڈھونڈا تھا' چلچلاتی گرمیوں اور کڑکتی سردیوں میں جب مرغیاں بھی بچوں کو پروں میں سمیٹ لیتی ہیں ہم تن تنہا کونے کھدروں میں چھپ کر رویا کرتے تھے۔ ہم نے ہتھیلیوں پر گرم چمٹوں کے داغ لیے تھے' ہم نے بھوکے پیٹ ظالم چچی کے دھکے کھائے تھے۔ ہاں۔۔۔ ہم سے بڑھ کر یہ درد کون سمجھ سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ میرے سامنے زرغونہ نہیں شمشا ہے۔ مجھے اسے گود میں اٹھا کر جل کوٹ سے نکلنا ہے اور دور تک بھاگنا ہے۔

میں نے بمشکل خود کو فرش سے اٹھایا۔ درد کے سبب جسم سنسنا اٹھا۔ ایک اچھا دوست چہرے سے اپنے دوست کے احساسات بھانپ لیتا ہے۔ صفدر نے بڑے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں شاہ جہاں صاحب! آپ آرام سے لیٹیں۔ میں جو ہوں۔ میرے اور زریں گل کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہوگا بچی کو۔ ہم اس کا بال بیکا نہیں ہونے دیں گے۔"

زریں گل کا چہرہ بھی ایک دم تمتما اٹھا تھا۔ اس کے اندر وہی پختون مردِ بیدار ہو گیا تھی جو اسے سنگین ترین خطرات سے نبرد آزما ہونے پر اکساتی تھی۔

ناشا نے اپنے سر کو جھٹک کر پیشانی سے بال ہٹائے اور بولی "میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے اس اجنبی زبان میں بات مت کیا کرو۔"

"مجھے افسوس ہے۔" صفدر نے کہا۔ پھر ناشا کو بتانے لگا کہ ہم زرغونہ کے بارے میں کیا بات کر رہے تھے۔

ناشا نے اپنے مخصوص لہجے میں وادی کے تمام جاتریوں کو ایک کلاسیکل گالی دی اور بولی "۔۔۔۔ یہ سب کے سب اپنے بالوں کے ساتھ ساتھ اپنی عقل بھی منڈوا کر پھینک دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وادی میں خوراک کی کمی کی وجہ یہ بچی ہے کیونکہ یہ ناجائز ہے اور ناجائز بچے کا بوجھ پوری بستی پر پڑتا ہے۔ میں جاتریوں سے پوچھتی ہوں' ان میں سے کتنے ہیں جنہیں اپنے باپ کا ٹھیک پتا ہے۔ اگر قحط کی وجہ یہی ہے جو جاتری سمجھتے ہیں تو بہت دیر پہلے یہاں کے مکینوں کو بھوکا مر جانا چاہیے تھا۔"

کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھ کر اور جاتریوں کی شان میں "قصیدے" پڑھ کر ناشا واپس چلی گئی۔ اس نے کہا کہ وہ اگلے روز میں یہ جاننے کی سرتوڑ کوشش کرے گی کہ بچی کو کہاں رکھا گیا ہے اور اب اس کے بارے میں جاتریوں کے ارادے کیا ہیں۔ جاتے جاتے ایک دفعہ پھر اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ جگہ اب ہمارے لیے زیادہ محفوظ نہیں ہے۔

ناشا کے جانے کے بعد ہم تینوں سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بچی کہاں ہے۔ پھر اس کی حفاظت کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا تھا۔ یہ بات بھی ہرگز ڈھکی چھپی ہوئی نہیں تھی کہ سردار سدرت بچی کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ جاتریوں کی طاقت سے ڈرتا تھا اور ان کی ہٹ دھرمی سے بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بچی کی حمایت میں کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم سردار سدرت کو مکمل طور پر اعتماد میں لے لیں اور اس کے ساتھ مل کر بچی کو بچانے کی کوشش کریں لیکن اس صورت میں ضروری تھا کہ ہم سب سے پہلے خود کو انتظامیہ کے حوالے کریں۔۔۔ سوچ بچار کے باوجود ہم کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ پائے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد مجھے دوا وغیرہ کھلا کر صفدر بھی باہر چلا گیا۔ ناشا کی طرح اس نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ کل تک بچی کا کھوج لگانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

اس کھنڈر میں ہم نے چوبیس گھنٹے مزید گزار دیے۔ ایک بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے کمرا ہر طرف سے برفانی ہوا کی زد میں تھا۔ اگر ہم مقامی قانون کا احترام کرتے ہوئے آگ جلانے سے پرہیز کرتے تو یقیناً منجمد ہو کر راہیِ عدم ہو جاتے۔ ہم نے جو بیس تیس میں کوئی جو توانائی سن لکڑیاں تو جلائی ہوں گی۔ اب مزید لکڑیوں کی ضرورت تھی لیکن زریں گل باہر جانے سے کترا رہا تھا۔ اس گریز کی ایک وجہ تو سردی تھی' دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے زخمی کرنے والے تیندوے سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اسے بجا طور پر اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اردگرد جھاڑیوں میں کوئی اور تیندوا موجود ہوگا اور بہ زبانِ خاموشی پکار رہا ہوگا "بچہ جا دادا! آ بھی جا۔"

زریں گل سر مڑتے ہوئے کونوں کے قریب سمٹ کر بیٹھ گیا اور بولا "استاد صیب! آپ ہمارا ایک کام کر دیں۔"

"اس حالت میں میں کیا کام کر سکتا ہوں۔" میں نے زخمی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

"خوچہ! یہ چلنے پھرنے والا کام نہیں ہے۔ بس بات کرنا ہے۔ ام کو انگلش منگلش نہیں آتا ورنہ ام خود ناشا سے پوچھ لیتا کہ اس کی چھوٹی ہمشیرہ کا کیا حال احوال ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ابھی ناشا آئی ہے تو میں تمہاری طرف سے پوچھ دوں گا کہ اس کی چھوٹی بہن کا کیا حال چال ہے اور اس نے تمہارے نام کوئی خط پتر دیا ہے یا نہیں؟"

"نن۔۔۔ نہیں جناب! خط پتر کا نہیں پوچھنا ہے۔ پھر تو سارا بات ہی کھل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی ابا دا سر بھی کھل جائے۔ بس ڈھکا چھپا بات کرنا ہے جی! جو مزہ ڈھکے چھپے بات میں ہے "ڈارلن" بات میں کہاں۔ قسم ہیر رانجھا میں اگر ڈھکا چھپا بات کیا تھا فردوس سے۔ اگر اوپر سے وہ بابا نہ آجاتا تو کاوے کھیت میں ایک دم دونوں کا معاملہ فٹ ہو جاتا۔۔۔۔"

"کون بابا؟"

"وہی جناب! جس کی ٹانگ میں پولیو تھا۔۔۔ ہاں یاد آیا "کیدو" نام تھا اس کا۔"

"بڑی تحقیق کی ہے بھئی تم نے۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ "کیدو" پولیو کی وجہ سے لنگڑا ہوا تھا۔"

انہی دوران میں دروازے کے قریب آہٹ ہوئی۔ دستک کی آواز نے واضح کر دیا کہ آنے والی ناشا ہے۔ زریں گل نے دروازہ کھولا۔ ناشا کے ہاتھ میں حسبِ معمول کھانا تھا "خوچہ۔ گرم گرم کھانا آ گیا۔" میں نے کہا۔

"اس کے ساتھ ایک گرما گرم خبر بھی ہے۔" ناشا نے کہا۔

"اگر اچھی خبر ہوگی تو یقیناً زرغونہ کے بارے میں ہوگی۔" میں نے خوش فکری کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ بولی "یہ اچھی خبر نہیں ہے اور زرغونہ کے بارے میں بھی نہیں ہے۔۔۔ کسی دل جلے نے رات بڑے پجاری خاوان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ وہ جاتروں (عبادت گاہ) کے پیچھے۔ خانے میں دسترخوان سجائے بیٹھا تھا۔ کوئی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا اور چھرے سے خاوان پر حملہ کر دیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی فاقہ زدہ ہوگا۔ خاران کی موٹی تازہ اور ہاتھی جیسی گردن دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوگا۔"

"اب کہاں ہے خاوان؟" میں نے پوچھا۔

"شفا خانے میں۔ وہ ہائی خون نکلا ہے اس کے اندر سے' ابھی پتا نہیں کتنی بالٹیاں اندر ہے۔ یہ سب جاتری خون سے بھرے ہوئے ہیں اور یہ عام لوگوں کا چوسا ہوا خون ہے۔"

خاران' ناشا کا سگا باپ تھا لیکن وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کسی اجنبی کے بارے میں کی جاتی ہے۔ وہ سر تا پا ایک باغی لڑکی تھی۔ میں نے کہا "تم نے اس خبر کا تعارف بری خبر کے طور پر کرایا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اندرونی طور پر تمہیں باپ کے زخمی ہونے کا افسوس ہوا ہے۔"

"قطعاً نہیں۔" وہ پورے یقین کے ساتھ بولی "مجھے دکھ ہوا ہے لیکن ایک اور بات سے ہوا ہے اور اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ ایک بری خبر ہے۔"

"کیا بات ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "پانچوں بڑے جاتریوں کی حفاظت کا زبردست انتظام کر دیا گیا ہے۔ سردار کے حکم کے مطابق ان کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکے گی۔ ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہو جائے گا کہ بچی کس جاتری کی تحویل میں ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔"

زریں گل بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ ناشا کیا بتا رہی ہے۔ میں نے کہا "تمہارا ہونے والا سسر شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا ہے۔ اللہ نے تمہاری سن لی ہے۔"

"کک۔۔۔ کلثوم کا باپ؟ کیا ہوا اسے؟"

میں نے مختصر الفاظ میں زریں کو بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ زریں حیران نظر آنے لگا۔

اسی دوران میں کھنڈر سے باہر بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ پھر کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ صفدر تھا۔ زریں گل نے دروازہ کھولا تو صفدر توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اندر آ گیا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ کو ابھی پانچ دس منٹ میں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہاں سے جانا ہوگا یا پھر خود کو سردار کے حوالے کرنا ہوگا۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آج صبح سدرت کو بڑے جاتریوں نے عبادت گاہ میں بلایا تھا۔ انہوں نے سردار پر زور دیا ہے کہ آس پاس کی ساری گھاٹیوں میں آپ لوگوں کو تلاش کیا جائے۔ عبادت گاہ سے واپس آ کر سردار سدرت نے مجھے بتایا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کی تلاش شروع ہونے والی ہے۔ یہ ایک طرح سے سردار کی طرف سے اشارہ ہے کہ اگر میں آپ کے بارے میں کچھ جانتا ہوں تو آپ کو خبردار کر دوں۔ سردار سدرت بار بار یہ کہہ چکا ہے کہ آپ کو ادھر ادھر چھپنے اور بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یقیناً اب بھی اس کی مرضی یہی ہوگی کہ آپ خود کو محافظوں کے حوالے کر دیں۔"

میرے نقطۂ نظر سے یہ ایک بہت اہم اطلاع تھی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ہنری بھی ہمیں یہی مخلصانہ مشورہ دے چکا تھا کہ ہم ادھر ادھر بھاگنے کے بجائے خود کو جاتریوں کے حوالے کر دیں۔ اس کا کہنا تھا کہ جب ہم اس وادی سے نکل نہیں سکتے تو پھر چھپ کیسے سکتے ہیں اور کب تک چھپ سکتے ہیں۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کہیں نیچے جا چکا تھا۔ ہم بھوکے پیاسے کب تک ان گھاٹیوں میں بھٹک سکتے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ناشا کی طرف دیکھا۔ جاتریوں کی زبردست مخالف ہونے کے باوجود وہ بھی تذبذب میں

نظر آرہی تھی۔ شاید دل ہی دل میں وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ہمیں وقتی طور پر سرنگوں ہو جانا چاہیے۔ باہمی صلاح مشورے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں یعنی مجھے اور زریں گل کو سردار سدورت کی بات مان لینا چاہیے۔ زریں گل کو اس فیصلے سے اختلاف تھا اور پٹھانی خون اس کی رگوں میں جوش مار رہا تھا مگر میرے فیصلے کے سامنے اس کو سر جھکانا پڑا۔ ہم کھنڈر میں سے نکل آئے۔ تاہم کھنڈر چھوڑنے سے پہلے ہم نے وہاں اپنی موجودگی کے بیشتر آثار مٹا دیے۔ ہمیں یہ بات بہر صورت چھپانی تھی کہ ہم قریباً تین ہفتے دیوتاؤں کے چبوترے میں موجود رہے ہیں۔ جاتری پہلے ہی ہمارے خلاف بھرا ہوا تھا، اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم نے مقدس چبوترے کو بھرشٹ کیا ہے تو ان کا غصہ آسمان کو چھو جاتا۔

○☆○

پوری بستی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ جاتری کو زدوکوب کر کے بچی کو اٹھالے جانے والے دونوں "مجرم" پکڑے گئے ہیں۔ ہم پر دو الزام اور بھی تھے۔ پہلا یہ کہ ہماری غیر قانونی کارروائی کے دوران میں مستان نامی محافظ ایک دوسرے محافظ کی گولی سے ہلاک ہوا اور دوسرا یہ کہ ہم نے "واپسی" نامی انتہائی اہم مذہبی رسم کو خراب کرنے کی شرمناک جسارت کی۔

تنہائی میں سردار سدورت نے ہم دونوں سے دوستانہ لہجے میں بات کی اور ہمیں بتایا کہ اگر ہمیں جاتریوں کے سامنے پیش کیا گیا تو ہمیں کیا بیانات دینے ہیں۔ اسے پوری امید تھی کہ وہ جاتریوں سے ہماری سزا میں تخفیف کرانے میں کامیاب رہے گا۔ سردار سدورت سے ملاقات کے بعد مجھے اور زریں گل کو اسی بندی خانے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس سے پہلے مقتول لڑکے خازن کی ماں کو رکھا گیا تھا۔ یہاں باقاعدہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کوٹھریوں میں قیدیوں کو زنجیریں وغیرہ لگا کر رکھا جاتا تھا۔ ہم دونوں سے یہ خاص رعایت کی گئی کہ ہمیں زنجیر نہیں لگائی گئی۔ صرف دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا گیا۔

بستی میں پہنچ کر ہمیں یقین آ گیا کہ واقعی وادی میں قحط کی سی حالت پائی جاتی ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ہمیں صرف ایک بار کھانا دیا گیا۔ یہ سوکھے اشنوں اور ریشے کا وہی بیاتی بالکل ملغوبا سا تھا جو ہم سیکڑوں بار کھا چکے تھے۔ بندی خانے کے دیگر قیدی بھی لاغر اور کمزور نظر آتے۔ ہمارا خیال تھا کہ جاتریوں کے مطالبے پر ہمیں جلد ہی ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ ہمیں جاتری میں لے جائیں گے اور گن گن کر بدلے چکانا شروع کر دیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سدورت کی حکمت عملی کام کر گئی ہے اور وہ کسی طور منہ زور جاتریوں کو ہینڈل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

سو گھنٹے کی قید کے دوران میں صرف دو جاتریوں نے ہمیں اپنی منحوس شکل دکھائی۔ ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا۔ وہ ہم سے مختلف سوال پوچھتے رہے۔ ننھی بچی ہم تک کیسے پہنچی تھی۔ ہم اسے کس نیت سے اٹھالے گئے تھے۔ ہم نے "واپسی" کی رسم خراب کرنے کی کوشش کیوں کی اور کیسے کی؟ ان میں سے اہم ترین سوال یہی تھا کہ بچی ہم تک کیسے پہنچی تھی۔ اس کا جواب ہم نے سدورت کی ہدایت کے عین مطابق دیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ وہ اتفاقاً سردار سدورت کی رہائش گاہ (تخت) سے نکل آئی تھی۔ وہ ادھر اُدھر گھوم رہی تھی اور ماما، پاپا پکار رہی تھی۔ ہم اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ باقی تمام سوالات کے لیے یہ جواب موزوں ترین تھا کہ ہم صرف انسانی ہمدردی کے تحت بچی کو بستی سے باہر لے گئے تھے۔ ہمیں ایک مقامی شخص کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ بچی کی ولدیت پر شبہ کیا جا رہا ہے اور اس شبے کو دور کرنے کے لیے اسے ایک کڑی آزمائش سے گزارا جائے گا۔

معلوم نہیں ہمارے جوابات نے جاتریوں کو کس حد تک مطمئن کیا بہرحال وہ واپس چلے گئے تھے۔ اگلے روز سردار سدورت ہم سے ملنے خود بندی خانے پہنچا۔ وہ قیمتی لباس میں تھا۔ مسلح محافظ جن کے کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے اسے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ سردار سدورت نے ہم سے تنہائی میں ملاقات کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ جاتری ہمیں کوڑوں کی سزا دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ پاؤں کی تین تین انگلیاں قطع کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ وہ کسی طور انہیں سمجھانے بجھانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بہرحال اب ہمیں پہلے جیسی رعایتیں حاصل نہیں رہی تھیں اور سخت نگرانی میں قید بامشقت بھگتنا تھی۔

میں نے پوچھا "یہ قید بامشقت ہمیں کہاں بھگتنا ہوگی؟"

وہ بولا "اس کا فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔ میں تم دونوں کو بڑے جاتری ناتوب مالکی کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ ذرا کم غصیلا اور معقول شخص ہے۔ درحقیقت مہان جاتری خاران کی علالت کے بعد وہ مہان جاتری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اپنے گھر میں رکھے گا۔ وہاں تمہیں چھوٹا موٹا کام کرنا پڑے گا۔ بہرحال تمہارے پاؤں میں بیڑیاں رہیں گی اور تم بدلتے سزا بھی طے کی ہے۔"

میں نے کہا "کیا بہتر نہیں تھا کہ ہمیں کسی جاتری کے سپرد کرنے کے بجائے تم اپنے پاس رکھتے بابا جی۔"

"میں نے اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کیا ہے۔" سدورت نے بات کاٹی "دراصل مجھے ڈر ہے کہ تم دونوں کو وہ جاتری نہ مانگ لے جس سے تم مارپیٹ کر چکے ہو۔ اگر وہ تم دونوں کو اپنے لیے مارار کی حیثیت سے طلب کرلے تو میرے لیے انکار بے حد مشکل ہو جائے گا۔ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ میں تمہیں اس کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اگر تم اس کی تحویل میں چلے گئے تو وہ گن گن کر بدلے لے گا۔ پیش بندی کے طور پر میں تمہیں

[نات]وب کے حوالے کر رہا ہوں۔ ناتوب چوں کہ بڑا جاتری ہے لہٰذا [وہ] اس کے مارار کو اپنی خدمت کے لیے حاصل نہیں کر سکتا۔"

یہ بات واقعی سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے اس معاملے کو [سد]ورت کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ گفتگو کے دوران میں میں نے [سد]ورت سے زرغونہ کے متعلق بھی پوچھا۔ سدورت نے بتایا کہ بچی [و]ہاں نو میں رکھا گیا ہے۔ اس کے بارے میں فی الحال ٹھیک سے پتا [نہ]یں چل رہا کہ وہ کس کی تحویل میں ہے۔

اسی روز سر شام ہم اپنے نئے آقا کے "دولت کدے" پر پہنچ [گئ]ے۔ مسلح محافظوں نے پہلے کی طرح زریں کے پاؤں میں ایک آہنی [بیڑ]ی ڈال دیا۔ میرے حصے میں ایک زنگ آلود بیڑی آئی۔ اس بیڑی [کی] لمبائی بمشکل ایک فٹ تھی۔ یعنی میں ایک ایک فٹ کے [چھ]وٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتا تھا۔۔۔۔ ناتوب پچاس ساٹھ سال کا [بھار]ی اندام شخص تھا۔ خاران کی طرح وہ بھی بے ڈول تھا۔ خاران [اگ]ر ہاتھی تھا تو یہ بھینسا تھا۔ سر اور چہرے کے بال بالکل صاف [تھ]ے۔ آنکھیں سوئی سوئی تھیں جنہیں اپنی بزرگی کے اظہار کے لیے [اس] نے مزید خوابیدہ بنا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موٹے زرد [د]انوں کی ایک تسبیح بھی نظر آئی۔ اس تسبیح کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ فٹ [تھ]ی اور یہ خاصی مضبوط تھی۔ ناتوب مالکی کی رہائش گاہ کے [پچ]ھواڑے ایک وسیع احاطہ تھا۔ یہاں اندازاً چار درجن گائے بھینس اور بکریوں کا ایک ریوڑ موجود تھا۔ قحط کی وجہ سے یہ جانور [کمز]ور لاغر نظر آرہے تھے۔ ان جانوروں کے درمیان مرغیاں اور بطخیں چکراتی پھرتی تھیں۔ اس مال و متاع سے اندازہ ہوتا تھا کہ ناتوب مالکی ایک کھاتا پیتا شخص ہے بلکہ وہ مہان پجاری خاران سے بھی خوش حال نظر آتا تھا۔

جوں ہی ہمیں اس سرسبز احاطے میں پہنچایا گیا میں سمجھ گیا کہ ہمیں مال مویشی کی دیکھ بھال کی خدمت سونپی جائے گی۔ زریں گل ناک بھوں چڑھانے لگا۔ یہ خدمت اگر اسے مہان پجاری خاران کے گھر میں کرنی پڑتی تو کوئی بات بھی تھی۔ بیبر کے گھر میں رانجھے نے بھی تو بھینسوں کی دیکھ بھال کی تھی لیکن یہ خاران کا گھر نہیں تھا اور نہ یہاں کلثوم رہتی تھی۔ یہاں جانوروں کا گوبر اور پیشاب سونگھ کر زریں گل کا چہرہ ایک دم لٹھے مٹھ ہو گیا۔

"کیا بات ہے پیارے!" میں نے کہا "تم جان کیوں ہو رہے ہو۔ استاد جہانی کے ساتھ چلو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے۔"

"ام کو مزے کرنے سے انکار تو نہیں ہے جی لیکن کوئی ایسا کام ہو، جس میں اما را دل لگتا۔"

"اس میں بھی دل لگے گا پیارے۔۔۔۔ ضروری تو نہیں کہ یہاں ہم کو گوبر ہی اٹھانا پڑے۔ ممکن ہے کہ کوئی اور کام ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ مثلاً چارا کترنا۔ بھیڑوں کی اون اتارنا۔ گائیوں کا دودھ دوہنا۔ کبھی دودھ دوہا ہے تم نے؟"

"بالکل نہیں جناب! ام کو تو پہلے پہل یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دودھ کس کا دوہتے ہیں، گائے کا یا بیل کا اور ام کو ایسے کاموں سے ابھی بہت ڈر لگتا ہے۔"

احاطے میں ایک طرف چار چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ پتھر کی چپٹی سلوں کو چوڑائی کے رخ ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر دیواریں چنی گئی تھیں اور آٹھ نو فٹ کی بلندی پر چھت ڈال دی گئی تھی۔ یہ گھروندا نما ڈربے یقیناً ان ملازموں کے لیے تھے جو جانوروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان میں سے ایک ڈربا ہمارے حوالے کر دیا گیا۔

جاتری ناتوب بستی کے چار پانچ خوش حال ترین افراد میں سے تھا۔ اس کے پاس پالتو جانوروں کی قابل ذکر تعداد موجود تھی۔ وادی میں قحط کی سی صورت حال تھی، تاہم اس چاردیواری میں قحط کا اثر بہت کم نظر آتا تھا۔ تین چار روز میں ہم یہاں کے ماحول سے مانوس ہو گئے۔ کافی محنت طلب کام تھا لیکن بہرطور ہمیں کرنا تھا۔ چارے کے بڑے بڑے گٹھے ہمارے سامنے پھینک دیے جاتے۔ ہم دستی ٹوکوں کی مدد سے انہیں گھنٹوں کترتے رہتے اور لکڑی کی بڑی بڑی کھرلیوں میں ڈالتے رہتے۔ یہ چارا بھینسوں کے استعمال میں آتا تھا۔ گائیں اور بکریاں خود ہی گھوم پھر کر چر لیتی تھیں۔ دوسرا اہم کام دودھ جمع کرنا تھا۔ بکریوں، بھیڑوں اور گائے بھینسوں کا دودھ علیحدہ علیحدہ برتنوں میں جمع ہوتا تھا۔ دودھ دوہنے کے لیے تین افراد موجود ہوتے، وہ چھوٹی چھوٹی بالٹیوں میں دودھ نکالتے، ہم یہ بالٹیاں بڑی بڑی ناندوں میں انڈیلتے جاتے۔ پاؤں میں موجود بندشوں کی وجہ سے یہ نقل و حرکت خاصی دشوار تھی۔ اس "ڈیری فارم" میں ہمارے علاوہ پانچ افراد مزید کام کرتے تھے۔ ایک کے سوا یہ تمام مارار تھے۔ ان میں سے دو کے پاؤں میں ہماری ہی طرح بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ جن دو کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں تھیں ان میں سے ایک کا نام بشیر خان تھا۔ یہ گلگت کا ہی ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ تین چار برس پہلے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شکار کے لیے نکلا تھا۔ راستہ بھٹک کر پہاڑوں میں کھو گیا اور پھر ان خوں خوار لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ بڑے صاف لہجے میں پشتو اور ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بولتا تھا۔

وہ تین رند ناتوب مالکی سے بھی ہماری ملاقات ہو چکی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی ایسے حاجی صاحب کا خیال ذہن میں آتا تھا جو دین داری کے ساتھ ساتھ دنیا داری میں زبردست طاق ہوں، دونوں ہاتھوں سے ثواب بھی سمیٹتے ہوں اور دولت بھی۔ ناتوب مالکی نے جاتروں اور مال مویشی دونوں کی ذمے داریاں سنبھال رکھی تھیں اور بڑی شاطرانہ ہوشیاری سے دونوں کے تقاضے پورے کرتا تھا۔ ہر وقت زرد دانوں والی مالا اس کے ہاتھ میں رہتی تھی اور وہ ہونٹوں میں کچھ بدبداتا رہتا تھا، تاہم اس بدبدانے کے ساتھ ساتھ وہ "ڈیری فارم" کے سارے معاملات بھی نمٹاتا جاتا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ زبردست حافظے کا مالک تھا۔ میرے اندازے

کے مطابق اسے اپنے ہر جانور کی عادات اور خصوصیات سے پوری پوری آگاہی تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اسے روزانہ کتنی آمدن دیتا ہے۔

مالداروں سے بات کرنے کے لیے اکثر ایک مترجم ناقوب کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک روز وہ فارم میں آیا تو ایک خوب صورت رنگ دار چغہ پہنے ہوئے تھا۔ بالوں سے بے نیاز سر پر خاص طور سے خوش بودار تیل لگایا گیا تھا اور یہ تیل لگا سر طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں چم چم کر رہا تھا۔ ناقوب نے ہم سب مالداروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور مترجم کی وساطت سے بتایا کہ قمری کیلنڈر کے مطابق آج "برف باری" کا تہوار ہے۔ مقامی رواج کے مطابق اس روز صاف ستھرا لباس پہن کر دوپہر کے وقت رہائش دیوتا کی عبادت کی جاتی ہے۔ وہ کہنے لگا "میں جانند جا رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں میں سے کوئی اپنی خوشی کے ساتھ عبادت میں شریک ہونا چاہے تو میرے ساتھ جا سکتا ہے۔"

ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ناقوب نے ہم سے مذہبی معاملے میں بات کی تھی۔ وہ باتوں باتوں میں ایسی باتیں کرتا رہتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ جارزی کی حیثیت سے اپنے مذہب کی تبلیغ کا فرض پورا کر رہا تھا۔ ہم سارے ہی جانند جانے کے لیے رضامند نظر آنے لگے۔ اور کچھ نہیں تو سیر و تفریح تو حاصل ہو ہی سکتی تھی لیکن پھر فوراً ناقوب کے چہرے پر ہی سرد مہری طاری ہو گئی جو ایسے موقعوں پر کاروباری لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بولا "لیکن کام کا حرج نہیں ہونا چاہیے۔ سہ پہر کو واپس آ کر تمہیں رات گئے تک کام کرنا پڑے گا۔"

ایک دم سب کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ بشیر خاں نے لاتعلقی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ناقوب بولا "ٹھیک ہے۔ پھر کسی دن سہی۔ آج کام بھی تو بہت زیادہ ہے۔"

فارم کا ایک مختصر چکر لگا کر وہ مترجم اور محافظ کے ساتھ واپس چلا گیا۔ احاطے کے بیرونی دروازے پر ایک سجی سجائی گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ ناقوب سیدھا گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحے بعد گھر کے اندر سے ایک خوب رو لڑکی برآمد ہوئی اور ناقوب کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ بمشکل بائیس چوبیس سال کی ہوگی۔ زرق برق لباس کے باوجود وہ سنجیدہ صورت نظر آتی تھی۔

میں نے اپنے مالدار ساتھی بشیر خاں سے پوچھا "یہ ناقوب کی لڑکی ہے؟"

"نہیں بیوی ہے خبیث کی۔ خوچہ! یہ تیسرا شادی ہے اس کا۔" بشیر خاں نے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ" زریں کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "اللہ جب دیتا ہے تو پھر چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے اور جب نہیں دیتا تو ہماری طرح چکھنے کو بھی نہیں دیتا۔"

بشیر خاں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "ایک غریب گھر کی بیٹی ہے۔ ناقوب اس کے باپ کو بڑی عیاری کے ساتھ قرض دیتے رہا۔ جب وہ پوری طرح دب گیا تو اس سے بیٹی کا رشتہ مانگ لیا۔"

"پہلی دو بیویاں کہاں ہیں؟"

"سنا ہے ایک تو مر گیا ہے۔ دوسرا بیمار رہتا ہے۔"

"بیمار شمار بھی رہتا ہے تو کیا ہے۔" زریں گل نے کہا "بیوی کے بیمار رہنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تیسرا شادی بنا لیا جائے۔ ویسے بھی بندہ اس سے پوچھے اتنا عمر ہو گیا ہے تمہارا۔ قبر میں پاؤں لٹکنے والا ہے۔ اب کیوں شادی بنانا ہے۔"

جانند سے ناقوب ماکی کی واپسی سہ پہر کے وقت ہوئی۔ وادی میں سہ پہرے مراد دوپہر بارہ بجے کا وقت تھا۔ ہم نے ایک بار پھر ناقوب کی کمسن بیوی کو دیکھا۔ وادی میں پردے کا رواج نہیں تھا لیکن لڑکی نے پھر بھی ایک اوڑھنی سر پر لے رکھی تھی وہ مقامی تھی۔ ماتھے پر دو سفید دھاریاں تھیں اور ناک میں ایک بڑا سا نتھ نما زیور جھول رہا تھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ اس لڑکی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا اور اتنی جلدی ملے گا۔ یہ اگلے روز کا واقعہ ہے۔ میں اور زریں گل گھاس پھونس کے ایک بڑے ڈھیر میں سے چارے کے لیے کارآمد گھاس علیحدہ کر رہے تھے۔ اچانک وہ ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک مقامی خادمہ بھی تھی۔ خادمہ کے ہاتھ میں ایک طشتری تھی جس میں پنیر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے۔ وہ یہ پنیر مالداروں میں بانٹنے لگی۔ میرے اور زریں گل کے حصے میں بھی دو دو ٹکڑے آئے۔ اچانک لڑکی کی نگاہ میری پنڈلی کے زخم پر گئی۔ مرہم پٹی نہ ہونے کی وجہ سے زخم بگڑ رہا تھا۔ زخم کے اردگرد جلد سرخ ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ "پس" نہ پڑ جائے۔ لڑکی نے غور سے زخم دیکھا، پھر مقامی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھنے لگی۔ مجھ سے کیے جانے والے سوال کا جواب زریں گل نے دیا۔ لڑکی نے پھر کچھ پوچھا۔ غالباً یہ پوچھا تھا کہ ہم پشتو سمجھ سکتے ہیں۔ زریں گل نے اثبات میں جواب دیا۔ اس مرتبہ لڑکی نے عجیب وضع کی پشتو میں بات کی اور مجھ سے دریافت کیا کہ میں ٹانگ میں درد تو محسوس نہیں کر رہا ہوں۔

میں نے کہا "درد تو بہت ہوتا ہے۔ خاص طور سے چلتے پھرتے وقت۔"

اس کے چہرے پر تأسف نظر آنے لگا۔ وہ زریں گل سے بولی "اپنے اس ساتھی کو سہارا دے کر میرے پیچھے پیچھے لاؤ۔"

زریں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سست روی سے چلتے فارم میں سے نکلے اور رہائشی حصے میں داخل ہو گئے۔ یہ جگہ خاصی صاف ستھری تھی۔ صحن کے عین بیچ سانڈ کا ایک مجسم جسیم مجسمہ نصب تھا اور اس کے گلے میں پھولوں کے بہت سے باسی ہار جھول رہے تھے۔ دو تین "جنگلی صورت" خادمائیں بھی یہاں موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں بھدے اور...

رنگت۔ لڑکی کے اشارے پر میں اور زریں گل گھر کے برآمدے میں زمین پر بیٹھ گئے۔ لڑکی اندر گئی اور شیشے کی دو کھلے منہ والی بوتلیں اٹھا لائی۔ ان میں کوئی سیاہی مائل تارکول جیسا محلول تھا۔ لڑکی کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے ٹانگ ننگی کرنے کا حکم دیا۔ میں نے تعمیل کی۔ وہ بڑے انہماک سے میرا زخم صاف کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر کسی طرح کی کراہت نظر نہیں آ رہی تھی۔

پوچھنے لگی "کیا نام ہے تمہارا؟"

"شاد جہاں" میں نے جواب دیا۔

وہ چونک گئی "تم وہی ہو جس نے سردار پاتامہ کی بچی کو کھڈ میں گرنے سے نکالا تھا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب بڑے دھیان سے مجھے اور زریں گل کو دیکھ رہی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر خوش گواری اور ناگواری کے تاثرات ابھر آتے تھے۔ آخر بولی "تم لوگوں نے خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالا ہے۔ تمہیں کیا ضرورت تھی بچی کو بیزار ہونے کی اور پھر "رسم" خراب کرنے کی۔"

زریں گل نے پشتو میں جواب دیا "ام سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں ہو سکا تھا۔ ام بچی کو بچانا چاہتے تھے۔"

"تم نے بے وقوفی کی۔ ایسی کوشش میں کیا فائدہ جس کا انجام ہلاکت اور ذلت علیحدہ سے اٹھانی پڑے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "یہاں وادی میں تمہاری اچھی خاصی عزت بن گئی تھی۔ سردار پاتامہ زندہ رہتا تو یقیناً تمہیں یہاں کوئی عزت والا مقام ملتا۔"

میں نے کہا "بس جو قسمت میں لکھا تھا۔"

وہ بولی "مخترم جارزیوں کے علاوہ بستی کے اکثر لوگوں کو بھی تم پر غصہ ہے۔ وہ پاتامہ کی بچی کو ناجائز سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر "واپسی" کی رسم ٹھیک سے ادا ہو جاتی تو وادی پر سے قحط ٹل جاتا۔ تم نے رسم خراب کر کے دیوتاؤں کے غضب میں اضافہ کر دیا ہے۔"

"پھر اب یہ غضب کیسے ٹھنڈا ہوگا؟"

"رسم دوبارہ ادا کی جائے گی۔" وہ پورے یقین سے بولی "لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بچی زندہ سلامت بستی کی حدود میں واپس آ گئی ہے۔ بے شک وہ پاتامہ سے آئی ہے مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ دیوتاؤں کی مدد سے ہوا ہو۔ لہٰذا رسم دوبارہ نہیں ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "میں تمہارا نام نہیں جانتا لیکن ہمدردی کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے۔ تم ایک ہمدرد لڑکی ہو۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اس ننھی بچی کے ساتھ جائز سلوک ہو رہا ہے؟"

وہ بولی "بات جائز یا ناجائز کی نہیں۔ ہمارے مذہب اور ہماری نسل کی ہے۔ ہم اپنے اصولوں کو توڑ نہیں سکتے۔ کسی صورت توڑ نہیں سکتے اور اصول یہی ہے کہ ناجائز بچے کی نحوست سے بستی کو بچانے کے لیے اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اگر بچے کا ناجائز ہونا مشکوک ہو تو پھر "واپسی" کی رسم ادا کی جاتی ہے۔"

"مگر رسم تو ادا ہو چکی؟"

"میں نے بتایا ہے نا کہ اب بستی میں دو طرح کی رائے پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسم ادا ہو چکی ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ ادا نہیں ہوئی۔ بستی میں خوراک کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر دو چار روز تک یہی حالت رہی تو یقیناً یہ شور مچ جائے گا کہ بچی کے بارے میں دوبارہ نرپال دیوتا کی منشا معلوم کی جائے۔ یعنی رسم دوبارہ ادا ہو۔"

میں اور زریں گل تقریباً آدھ گھنٹا اس لڑکی کے ساتھ موجود رہے۔ اس کا نام ناموس تھا۔ وہ بستی کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ پشتو اس وجہ سے جانتی تھی کہ اس کی ماں پختون تھی۔ لڑکی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دکھی ہے اور اپنے حال پر اندر ہی اندر کڑھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ادھ کھلے پھول کو ڈالی سے توڑ کر ایک پیر تسمہ پا کے گلے کا ہار بنا دیا گیا تھا۔ یہ مجبوری کے سودے ہوتے ہیں اور جہاں مجبوری ہو وہاں خوشی کا گزر کم کم ہی ہوتا ہے۔ لڑکی بھرپور جوان تھی۔ بہتر خوراک اور خوش حالی کی زندگی نے اس کے جوبن کو اور بھی جوبن دے دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے لباس کے اندر جسم نہیں طوفان چھپا رکھا ہے مگر اس کی آنکھیں بہت گہری تھیں۔ طوفان اپنے سمندروں سمیت ڈوب جائیں مگر آنکھوں میں ایک لہر تک نظر نہ آئے۔۔۔ ایک بھنور تک دکھائی نہ دے۔

واپس آ کر میں نے بشیر خاں سے لڑکی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ اس نے بتایا ناموس واقعی ایک ہمدرد لڑکی ہے۔ خاوند کی نظر بچا کر مالداروں کے لیے کھانا وغیرہ بھیجتی رہتی ہے۔ اس کی شادی کو تین برس گزر چکے ہیں لیکن بچہ وچہ کوئی نہیں۔ درحقیقت ناقوب ماکی بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ بیوی سے زیادہ اسے ایک خوش نما ذاتی خادمہ کی ضرورت تھی جو اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھ سکے، رات دن اس کے قریب رہے اور اس کی پہلی بیوی کی تیمارداری بھی کرے۔

اگلے روز دوپہر کے وقت ہم نے بہت سے گھڑسوار دیکھے۔ یہ سارے مقامی لوگ تھے۔ وحشی صورت 'بدکردار' بے ڈھنگے لباس پہنے ہوئے۔ کندھوں پر چمک دار کلہاڑے اور رائفلیں۔ وہ بہت تھکے ماندے تھے جیسے کسی لمبے سفر سے لوٹے ہوں۔ بشیر خاں نے مجھے بتایا کہ یہ گھڑسوار وادی کے "کمانڈ چتروں" میں سے ہیں۔ یہ سب کے سب انتہائی خطرناک جنگ جو اور بے رحم افراد ہیں۔ وادی سے باہر نکل کر لوٹ مار کرنا ان لوگوں کا پیشہ ہے۔ ان میں ہر ایک رہائش دیوتا کے سامنے قسم کھاتا ہے کہ وہ پکڑے جانے کی صورت میں خودکشی کر لے گا۔ جب یہ لوگ مہم پر روانہ ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ زہر کی چھوٹی چھوٹی پڑیاں بھی رکھتے ہیں۔ یہ زہر ایک

خاص طریقے سے شہد کی مکھی سے حاصل کیا جاتا ہے۔

میں نے بشیر سے پوچھا "کیا یہ لوگ کسی مہم سے واپس آئے ہیں؟"

بشیر بولا "ایسے ہی لگتا ہے اور یہ بھی لگتا ہے کہ مہم ناکام رہی ہے۔ ان لوگوں کے پاس سامان وغیرہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

گھڑسوار ناتوب ماگی کی رہائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد سردار سدورت بھی اپنی شان دار گھوڑا گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ بڑے بڑے چہروں اور چوڑی ٹھوڑیوں والے مسلح محافظ رہائش گاہ سے باہر پہرا دینے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ اندر کوئی خاص نوعیت کی بات چیت ہو رہی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس بات چیت کا تعلق اس "مہم" سے ہو جو ناکام ہو گئی تھی۔

بستی کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں ناتوب کی رہائش گاہ کے باہر جمع ہونے لگے تھے۔ ان کے تاثرات میں تجسس کا عنصر نمایاں نظر آتا تھا۔ یقیناً وہ بھی اس "مہم" کا نتیجہ جاننا چاہ رہے تھے۔ وہ سب کے سب فاقہ زدہ اور سکڑے سمٹے نظر آتے تھے۔ ان میں خستہ لباس عورتیں بھی شامل تھیں اور لاغر بچے بھی۔ انہیں دیکھ کر جانوروں کے ایک فاقہ زدہ غول کا تصور ذہن میں آتا تھا..... ایک ایسا غول، جو کسی بھی شکار پر جھپٹنے اور اس کی بوٹی بوٹی کرنے کے لیے تیار تھا..... ناتوب ماگی کی رہائش پر ہونے والی گفتگو قریباً دو گھنٹے بعد ختم ہوئی پھر رہائش گاہ پر موجود افراد باہر نکلنا شروع ہوئے۔ ان میں سردار سدورت بھی شامل تھا۔ وہ کچھ گم صم نظر آ رہا تھا۔ جلدی سے اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ناتوب ماگی بھی باہر نکل آیا۔ اس کے گرد مسلح پہرے دار موجود تھے۔ موقع پر موجود لوگ ناتوب کے گرد جمع ہو گئے۔ ناتوب ایک اونچے پتھر پر کھڑا ہو گیا اور مجمع کے سامنے تقریر کے انداز میں بولنے لگا۔ بولنے کے دوران میں زرد دانتوں کی مالا اس کی انگلیوں میں مسلسل گردش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ خوابیدہ ہو گئی تھیں۔ لمبے بالوں والے بدبودار لوگ بڑی عقیدت سے اس کے فرمودات سن رہے تھے اور اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔ میں نے زریں گل سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

وہ بولا "کہہ نہیں رہا، بکواس فرما رہا ہے۔ ہاتھ دھو کر بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ ہماری بستی میں کوئی نہ کوئی ناجائز بچہ موجود ہے اور جب تک یہ بچہ موجود ہے ہم پر سے قحط کا وبال نہیں ٹلے گا۔ اس کا سوئی بار بار پانامہ کی بیٹی زرغونہ پر اٹکتا ہے۔ کہتا ہے کہ بے شک وہ بچی ہمارے پہلے سردار کا اولاد ہے مگر دیوتاؤں کا قانون ہر کسی کے لیے ایک سا ہے۔ اگر ہم کو اس بچی پر شک ہے تو اس اسے "واپسی" کی رسم سے گزارنا ہی پڑے گا۔"

میں نے پوچھا "لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

وہ بولا "یہاں موجود لوگوں کی رائے تو آپ بھی دیکھ سکتا ہے۔ ان سب کا سر دماغ سے خالی ہے اس لیے بیل کے مافق ادھر جا رہا ہے۔"

ناتوب کی تقریر اب کلائمیکس پر پہنچ چکی تھی۔ وہ ہوا میں چلا رہا تھا اور جوش میں تھوک اڑا رہا تھا۔ زرد دانتوں والی اس نے کلائی کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

O☆O

میرا اور زریں گل کا دھیان رات دن زرغونہ کی ا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کب وہ اپنے دردناک انجام سے ہو جاتی۔ یوں لگ رہا تھا کہ سدورت بھی اس سلسلے میں بے اور مصلحت آمیز خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ میرا دل کہ سدورت سے ایک ملاقات ہو لیکن ملاقات کے لیے کو وسیلہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ آجا کے صندوق کا سہارا تھا اور یہ تو کہ شاید وہ کچھ کرے۔ زرغونہ کی معصوم صورت بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی۔ اس کا امید بھری نظروں سے میری دیکھنا، میری بانہوں میں آ کر خود کو محفوظ اور پرسکون محسو سب کچھ مجھے یاد آ رہا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل کہتا تھا کہ ناجائز نہیں ہے۔ اس کے خدوخال میں مجھے پانامہ کی شباہت آتی تھی۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں کے رنگ اور نقو بناوٹ میں۔ بے شک زرغونہ کی ماں کیرولین بے راہ روی ہو گئی تھی لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ زرغونہ اس کی بے را ی کا نتیجہ ہو۔ زرغونہ کی عمر ساڑھے چھ برس کے لگ بھگ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زرغونہ کی پیدائش کے کیرولین اور صدو خان کے تعلقات تھے یا نہیں۔ یہ ساری اور غور کرنے کی باتیں تھیں لیکن جاتریوں کے پاس سوچنے کے لیے دماغ ہوتا تو وہ جاتری کیوں ہوتے۔ وہ بس لوٹی جا اور حکم دینا جانتے تھے۔ ان کے عقیدت مند ان سے اندھے بہرے تھے۔ وہ سب کے سب اپنی روز افزوں بھوک معصوم بچی کی موت میں ڈھونڈنے لگے تھے۔

ناتوب کی بیوی ناموس ہر روز میری ٹانگ کی پٹی کرتی زخم اب پہلے سے بہتر تھا۔ میں ہر روز دوپہر کے وقت میں ا گھسیٹتا ہوا ناتوب کی رہائش گاہ پر چلا جاتا۔ وہ پہلے سے میری ہوتی۔ مرہم پٹی کے علاوہ وہ اکثر مجھے کھانے کے لیے بھی کچھ دیتی۔ وہ مجھ سے ہمدردانہ سلوک کر رہی تھی لیکن یہ سلوک ا تھا جیسے کوئی شخص اپنے پالتو جانور سے کرتا ہے یا کوئی آقا لاچار غلام سے۔ میں نے یہ اندازہ بھی لگایا تھا کہ بوڑھا ناتوب اپنی بیوی کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی بات ٹالتا نہیں۔ ظاہر ہے وہ ایک جوان بیوی کا بوڑھا شوہر اسے یہی کچھ کرنا تھا جو وہ کر رہا تھا۔ اس کسی وقت اس کا جاتری جوش مارتا تھا اور وہ ناموس پر حکم چلانے کی کوشش کرتا تھا۔ روز میری موجودگی میں ہی یہ واقعہ پیش آیا۔ وہ مقامی زبا

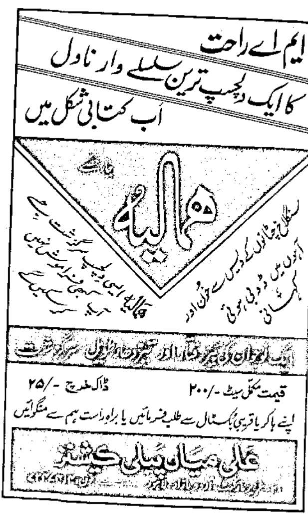

ناموس کے ساتھ بلند آواز میں بولنے لگا۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ کیا ہر روز ایک غیر مرد کو چار دیواری میں بلاتی ہے اور اس کی خاطر داری کرنے لگتی ہے۔ جواب میں ناموس ایک دم ناراض نظر آنے لگی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔ میں بھی اپنی بیساکھی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا واپس آگیا تھا۔ اگلے روز ناتوب جتنی نفیس ہمارے ازالہ کرنے میں آز تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا تھا اور خود بیوی کے پاس پہنچایا تھا۔ دونوں میاں بیوی راضی باضی نظر آرہے تھے لیکن تعجب کی بات تھی کہ اس راضی نامے سے پہلے جنگ وجدل ہو چکا ہے۔ اس جنگ وجدل میں عمر رسیدہ شوہر پر نوخیز بیوی کا پلہ بھاری رہا تھا۔

میں زرغونہ کے بارے میں ناموس سے تقریباً روزانہ ہی پوچھتا تھا۔ ناموس نے بتایا تھا کہ "واپسی" کی رسم اور اس طرح کی دوسری رسمیں بڑھتے چاند کی راتوں میں ادا نہیں کی جاتیں لہٰذا چند روز تک بچی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں اپنی زخمی ٹانگ پر مرہم رکھوانے رہائشی حصے میں پہنچا۔ اتفاقاً گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ گھوڑا گاڑی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک ادھیڑ عمر خادمہ برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور وہ سوئی دھاگے سے کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ یہ خادمہ بہری تھی لہٰذا میری آمد سے قطعی بے خبر رہی۔ اسے آہنی بیساکھی کی وہ کھنک بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جو زمین پر رگڑ کھانے سے پیدا ہو رہی تھی۔ میں اس کے بالکل عقب میں پہنچ کر رک گیا۔ بالکل اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور تن بدن میں لہری دوڑ گئی۔ میں نے تیز نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ آثار دکھا رہے تھے کہ گھر میں اس خادمہ اور بیمار عورت کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ بیمار عورت یعنی ناتوب کی پہلی بیوی ایک اندرونی کمرے میں پڑی مسلسل کھانس رہی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر خادمہ کی گردن دبوچی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی اس کا سر ایک طرف ڈھلک چکا تھا۔ میں نے اپنا مخصوص داؤ استعمال کرتے ہوئے اسے کم از کم ایک گھنٹے کے لیے [illegible] کردیا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے وہیں لٹا دیا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ یقیناً ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ پتہ نہ چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ صرف گردن پر نیلگوں ابھار پیدا ہو جاتا اور سہلاتے ہوئے جیسے اٹھتیں لیکن اس چوٹ کے بارے میں بآسانی یہ سوچا جاسکتا تھا کہ یہ تیورا کر گرنے کے سبب آئی ہے۔

اپنی بیساکھی کو آہستگی سے گھسیٹتے ہوئے میں اس کمرے میں داخل ہو گیا جسے ناموس کا ذاتی کمرا کہا جاسکتا تھا۔ یہاں طاقوں میں دیوی دیوتاؤں کی چوبی اور سنگی مورتیاں نظر آرہی تھیں۔ کمرے کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لیے دیواروں اور چھت پر کھالیں منڈھ دی گئی تھیں۔ کمرے میں لکڑی کے بنے ہوئے دو تین صندوق موجود تھے۔

اس کے علاوہ اخروٹ کی بنی ہوئی ایک منقش الماری تھی۔ میرا تخمینہ تھا کہ مجھے اور زریں گل کو پہنائی جانے والی بیڑیوں کی چابیاں اسی کمرے میں کہیں ہوں گی۔ کوئی ایسا آلہ نہیں تو مجھے بیڑی سر کرنے کے لیے کارآمد ثابت ہوتا۔ میں نے پہلے الماری کا تفل کھولا اور سامان کی تلاشی لینے لگا۔ یہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا مگر اتفاقاً زنانہ کپڑوں کی تہ میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی چابی ہاتھ لگ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ چابی یقیناً کسی بہت اہم تالے کی ہے۔ کمرے میں موجود تین تالوں پر میں نے یہ چابی آزمائی۔ یہ چابی ایک ایسے چوبی صندوق کو لگ گئی جو الماری کے پیچھے پہلو کے ساتھ دکھا گیا تھا۔ کاٹھ کباڑ میں رکھا ہوا یہ صندوق گرد آلود تھا۔ میں نے جلدی سے تالا کھول کر ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں ناموس کے ذاتی استعمال کی چیزیں تھیں۔ چاندی کے پرانے گہنے، رنگ برنگے بٹن، بالوں میں اڑسے جانے والے دو تین پنکھ، دھاگے کی رنگ دار نلکیاں، ایک گڑیا جو یقیناً اس کے بچپن کی نشانی تھی اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی مورتی۔ میں اس مورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا___ کہنے کو تو یہ ایک مورتی تھی لیکن اس میں مجسموں کو یکجا کیا گیا تھا۔ ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ مرد لمبے بالوں اور جنگلی شباہت والا صفائی شخص تھا، نوجوان عورت بھی سفاہی تھی۔ نیم عریاں عورت نیم عریاں مرد کی بانہوں میں تھی۔ دونوں دو قالب یک جان نظر آرہے تھے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ میں آب نوس سے تراشی گئی اس ننھی سی مورتی کو حیرت سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ "شہ پارہ" ناموس کے ذاتی سامان میں کیوں پڑا ہے۔ مورتی کے قریب ہی مجھے دو گجرے بھی نظر آئے۔ یہ گجرے خوش نما جنگلی پھولوں سے بنائے گئے تھے۔ کسی وقت یہ بالکل تر و تازہ ہوں گے اور خوش بو سے مہکتے رہے ہوں گے لیکن اب وہ بالکل خشک ہو چکے تھے۔ اگر میں انھیں ان کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کرتا تو وہ بکھر جاتے۔ معلوم نہیں کتنے مہینوں یا سالوں سے یہ مورتی کے قریب یوں ہی رکھے تھے۔

صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ ان دونوں اشیا کا تعلق ناتوب مالکی سے نہیں۔ وہ تو اٹھتے بیٹھتے دیوتاؤں کا نام جپتا تھا اور [illegible] دیتا تھا۔ وہ ناموس کو ایسے تحائف کہاں دے سکتا تھا___ تو پھر ان اشیا کا تعلق کس شخص سے تھا؟ یہ ممکن تھا کہ یہ اشیا ناموس کے ماضی کی نشانی ہوں۔ ماضی جو نوخیز تھا، حسین تھا اور امنگوں سے بھرپور تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان اشیا کا تعلق ناموس کے حال سے ہو۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ اپنی موجودہ زندگی سے نامطمئن ناموس نے جسمانی و ذہنی آسودگی کے لیے کوئی چور راستہ ڈھونڈ رکھا ہو۔ ایسا راستہ جس کے بارے میں بجا طور پر ناتوب تصور بھی نہ کر سکتا ہو۔

میں نے تمام اشیا کو ٹھکانے پر رکھ کر صندوق دوبارہ بند کر دیا۔ شاید میں مزید تلاشی بھی لیتا مگر اسی دوران میں ناتوب کی بیمار بیوی کی

خادمہ کو آوازیں دینے لگی۔ اس کی یہ آوازیں میرے لیے خطرے کی گھنٹی ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا۔ صحن بدستور خالی تھا۔ برآمدے میں بہری خادمہ بے ہوش پڑی تھی۔ جو کپڑا وہ سی رہی تھی وہ اس کے گھٹنوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں اپنی آہنی بیساکھی کے ساتھ بے آواز چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

اس رات میں دیر تک ناموس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ان بد نصیب لڑکیوں میں سے تھی جو اپنی غربت کے سبب امیر اور عمر رسیدہ بڈھوں کے ساتھ بیاہ دی جاتی ہیں۔ ان کی قسمت میں اپنے ہی جذبات کی آگ میں جلنا لکھ دیا جاتا ہے۔ ہر رات ان کے پہلو میں خراٹے گونجتے ہیں اور رنج بستہ وحشت کی قربت ان کی رگوں میں مایوسی انڈیلتی ہے۔ یک بیک میں اپنے خیالوں میں چونک اٹھا۔ مجھے رہائشی حصے کی طرف ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ زریں گل بے خبر سو رہا تھا۔ میں بہ آہستگی اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا، عین اس وقت مجھے ایک ہیولا نظر آیا۔ وہ ناتوب کی رہائش گاہ سے نکلا تھا اور پلک جھپکنے میں گلی کے اندر غائب ہو گیا تھا۔ یہ ہیولا ناموس کا ہرگز نہیں تھا، نہ ہی ناتوب کا تھا۔ ناتوب بھاری بھرکم تھا اور ناموس دبلی پتلی۔ یہ ہیولا درمیانے جسم کا تھا اور دراز قد بھی تھا۔

میں نے تین چار روز پہلے بھی اس ہیولے کو دیکھا تھا۔ ٹانگ کی تکلیف ان دنوں زیادہ تھی اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ادھ کھلے دروازے میں سے میں نے ایک پرچھائیں دیکھی تھی۔ یہ پرچھائیں رہائشی حصے کی طرف سے نمودار ہو کر گلی کی طرف نکل گئی تھی۔ اس وقت میں پرچھائیں کی جسامت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید یہ ناتوب ہوگا لیکن اگلے روز بشیر خاں کی زبانی مجھے معلوم ہوا تو کہ ناتوب تو رات کے وقت [illegible] میں ہوتا ہے۔ ہاں دن میں وہ فارغ ہوتا ہے اور سہ پہر تک گھر میں رہتا ہے___ آج اتفاقاً میں نے پھر یہ پرچھائیں دیکھ لی تھی اور دیکھی بھی ایسے موقع پر تھی جب میں پہلے سے ناموس کے متعلق شک میں مبتلا تھا۔

نیند جو پہلے ہی آنکھوں سے اڑی ہوئی تھی اب بالکل اڑ گئی۔ میں زریں گل کے قریب نیم دراز ہو گیا اور لحاف خوب اچھی طرح اوڑھ لیا۔ ابھی مجھے لیٹے بمشکل پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ آدھی رات گئے اس غریب خانے پر کون تشریف لا سکتا تھا۔ گرم لحاف سے نکل کر پھر دروازے پر پہنچا۔ مدھم آواز ابھری "یہ میں ہوں ناشا___ دروازہ کھولو۔"

یہ کہاں سے آن ٹپکی؟ میں نے حیرت سے سوچا پھر بہ آہستگی دروازہ کھول دیا۔ وہ پھرتی سے اندر آگئی۔ تاریکی کے سبب ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے تاہم ناشا کی ہانپتی ہوئی سانسیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

"تمہیں کسی پہرے دار نے روکا نہیں؟"

"اس وادی میں کوئی پہرے دار اتنا ہوشیار نہیں کہ ناشا کو روک سکے اور پھر ان جاتروں کے پہرے دار تو ان ہی کی طرح مغز کے بغیر ہوتے ہیں۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہیں یہاں دیکھوں گا۔"

"خیر دیکھ تو تم اب بھی نہیں رہے ہو۔ ہاں محسوس کر سکتے ہو۔"

"ہاتھوں سے محسوس کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میری طرف سے تو اجازت ہے لیکن میں جانتی ہوں، تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"تم تو دلوں میں جھانک لیتی ہو۔"

"اسی لیے ہر شخص سے بیزار رہتی ہوں۔"

وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں کوئی چیز تھمائی۔ یہ لوہا کاٹنے والی دو آریاں تھیں۔ بولی "بڑی مشکل سے ملی ہیں۔ سنبھال کر رکھو کسی وقت کام آئیں گی۔"

"کام آئیں بھی تو کیا فائدہ؟ جب تمہارے نزدیک یہ طے ہے کہ ہم اس وادی سے نکل نہیں سکتے تو پھر بیڑیاں کاٹ کر کیا کریں گے۔"

"اتنی دور کی مت سوچو۔ جو مل رہا ہے اسے سنبھال لو۔"

"زرغونہ کا کچھ پتا چلا؟"

"ہاں___ وہ جاتروں کے تہ خانوں میں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ناتوب کی ہی تحویل میں ہے۔ کاش ناتوب پر میرا بس چل سکے۔ اسے دانقل کے زور پر اغوا کر کے کہیں لے جاؤں اور اس کے بدلے بچی کو چھڑوا لوں۔"

"تو کر گزرو ایسا۔"

"ضرور کر گزرتی مگر میرے نالائق باپ نے زخمی ہو کر سب ستیاناس کر دیا۔ نہ وہ پیٹ میں خنجر کھاتا، نہ جاتریوں کی حفاظت کے اتنے سخت انتظام کیے جاتے اور نہ میں یوں بے بس ہوتی___ مجھے تو لگتا ہے کہ بچی کے دن ہی پورے ہو چکے ہیں۔ یہ جاتری اسے چھوڑیں گے نہیں۔ خاص طور سے ناتوب تو گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کر رہا ہے کہ بستی میں قحط کی وجہ گناہ کا وہ بوجھ ہے جو ناجائز بچی کی صورت ہماری گردنوں پر رکھا ہے___ ہو سکتا ہے کہ چاند کی پہلی تاریخ کو ہی یہ لوگ بچی کو بھینٹ چڑھا دیں۔"

"آج کیا تاریخ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ خیال ہے کہ مہینہ ختم ہونے میں پانچ چھ روز ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

"سردار سدوت کا کیا رویہ ہے؟"

"ظاہر ہے وہ اس کے مرنے والے دوست کی بچی ہے۔ وہ اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور کر بھی رہا ہے لیکن یہاں ہوگا وہی جو سب سر پھرے جاتری چاہیں گے۔"

میرا ذہن تیزی سے مصروف تھا۔ میں نے کہا "ناشا ایک کام کرو۔"

"کیا؟"

"تم ناقوب کی بیوی کو جانتی ہو.... چھوٹی بیوی کو؟"

"ہاں.... کسی حد تک.... اس کا نام ماموس ہے۔"

"تمہارے خیال میں وہ کیسی عورت ہے؟"

"کم از کم مجھ سے تو بہت اچھی ہے۔ میں اس کی جگہ ہوتی تو بہت پہلے بڈھے ناقوب کا ٹینٹوا دبا چکی ہوتی۔ وہ کام سے کام رکھنے والی لڑکی ہے۔ بڑی خاموشی اور صبر سے غربت کی سزا جھیل رہی ہے اور اپنی جوانی برباد کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "لیکن.... مجھے اس لڑکی پر ایک.... شک ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے مختصر الفاظ میں ناشا کو بتایا کہ میں نے تین چار روز پہلے اور پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اس تلاشی کی روداد بھی ناشا کو سنا دی جو میں نے آج "چوہوں" کی غرض سے لی تھی۔ ناشا حیرت اور تجسس سے سنتی رہی۔ آخر میں میں نے ناشا سے کہا کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کیا واقعی ناقوب کے گھر میں کوئی آتا ہے یا یہ میرا وہم ہے۔

ماشا اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ایک دو دن میں یہ کام کر گزرے گی۔ اس کے بعد وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

ماشا سے مجھے فنگ، بن، جون جاپائل اور مندور کی خیر خیریت بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس ملاقات کے بعد میں خود کو خاصا مطمئن محسوس کرنے لگا۔

دو دن مزید گزر گئے۔ ماشا کے لیے میرا انتظار شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ آخر تیسری رات اس انتظار کا صلہ مل گیا۔ میں اور زریں گل دونوں جاگ رہے تھے۔ دروازے کے بالکل قریب مدھم آہٹ سنائی دی۔ زریں گل بے اختیار بولا "اوم کو لگتا ہے ہمارا سالی آیا۔"

"اس کے سامنے مت کہنا ورنہ وہ تیرا ناریل توڑ دے گی۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

جونہی دروازے پر مدھم دستک ہوئی اور ناشا کی دبی دبی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ خاصی پُرجوش نظر آ رہی تھی۔ چھوٹتے ہی کہنے لگی "تمہاری بات بالکل ٹھیک نکلی۔ ماموس کسی ایک آدمی سے ملتی ہے۔ اس کا نام وائیل ہے.... وہ اس وقت بھی ماموس کے پاس موجود ہے۔"

"تم نے خود دیکھا ہے اسے؟"

"میں اسی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئی ہوں۔ وہ ابھی میرے سامنے گھر میں گھسا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ڈھائی گھنٹے یہاں رہے گا۔"

"یہ ہے کون؟"

"یہیں پاس ہی رہتا ہے۔ لکڑی کی مورتیاں بناتا ہے۔ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اونچا لمبا جوان ہے.... اگر تم چاہو تو ہم ابھی جا کر ان دونوں کو پکڑ سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں سوچ میں پڑ گیا "نہیں ابھی نہیں۔ مجھے اس بارے میں غور کرنے دو۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر ماشا اور میں اس نئی صورتِ حال کے بارے میں غور کرتے رہے۔ ماشا آج میرے لیے ایک بڑا پستول بھی لے کر آئی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹی سی ٹارچ بھی۔ یہ دونوں اشیا اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے نکال کر میرے حوالے کر دیں اور کہا کہ میں انہیں کوٹھری کے اندر ہی کہیں چھپا لوں۔

میں نے اسے مشورہ دیا کہ فی الحال وہ واپس چلی جائے اور کل سارا دن وائیل نامی اس نوجوان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے۔

ناشا واپس چلی گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور سوچنے لگا کہ ٹارچ اور پستول کہاں چھپائے جائیں۔ بمشکل پانچ دس "سیکنڈ" ہی ہوئے تھے کہ احاطے کے پھاٹک کی طرف سے کسی مقامی شخص کا گونج دار للکارا سنائی دیا۔ پھر یوں لگا کہ کوئی شخص چوبی پھاٹک سے ٹکرایا ہے۔ احاطے کے مغربی گوشے میں بندھے ہوئے کتے زور و شور سے بھونکنے لگے۔ ایک فائر ہوا اور "دوڑو پکڑو" کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں یقیناً ناقوب کے مسلح پہرے داروں کی تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ماشا احاطے سے باہر نکلتے ہوئے کسی مصیبت کا شکار ہو گئی ہے۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ وہ جس طرح دندناتی ہوئی چلی آتی ہے، کوئی مسئلہ کھڑا کرے گی۔ آج یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور جھری میں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ کچھ دیر شور و غل سنائی دیتا رہا پھر آوازوں کا آہنگ دھیما پڑ گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ پہرے داروں کو ناکامی ہوئی ہے اور ناشا یا جو کوئی بھی تھا وہ بھاگ گیا ہے۔ اسی دوران میں ہماری ساتھ والی کوٹھری کا دروازہ پُرشور آواز سے کھلا۔ ناقوب کے مسلح پہرے دار بشیر خان اور اس کے ساتھی بلند آواز میں باتیں کرنے لگے اور گالیاں دینے لگے۔ پھر ساتھ والی کوٹھری کا دروازہ بھی کھل گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں زریں گل سے پوچھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کچھ افراد ہماری ہی کوٹھری کی طرف بڑھے۔ میں نے پستول اور ٹارچ جلدی سے چھت کی کڑیوں میں چھپا دیے۔ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ زریں گل نے دروازہ کھولا۔ ایک مجسم پہرے دار نے زریں کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر

تاریکی میں جا گرا۔ ایک دوسرے پہرے دار نے مجھے بھی ایسے ہی باہر کھینچ لیا۔ زمین پر گرنے سے زریں گل کی ایک کنی تازہ گوبر میں لتھڑ گئی تھی۔ وہ سیخ پا نظر آتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ مزاحمت فضول ہے۔ پہرے داروں کا انچارج لمبی چوٹی والا پشتو بول سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا گریبان مٹھی میں جکڑا اور بولا "تمہارے کمرے سے نکلا ہے وہ لڑکی؟"

"کون لڑکی؟ مجھے تو کوئی پتا نہیں۔"

"تو پھر کس کو پتا ہے.... کس کو پتا ہے؟" وہ چیخنے لگا اور میرے چہرے پر بے دریغ گھونسے برسانے لگا۔ دوسرے پہرے دار نے زریں گل کی پٹائی شروع کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چیڑ کی موٹی شاخ تھی۔ وہ شاخ سے زریں کو مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔ میرے پاؤں میں جکڑن تھی، ڈنڈا گھونسوں کی ضربات نے مجھے بھی پشت کے بل گرنے پر مجبور کر دیا۔ پہرے دار نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پہرے دار ناشا کو پکڑ نہیں پائے بلکہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پائے۔ اسی لیے وہ اس کے لیے "لڑکی" کا لفظ استعمال کر رہے تھے۔ چند منٹ بعد مجھے گریبان پکڑ کر اٹھا لیا گیا اور دوسرے ناداروں کے ساتھ دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا گیا۔ ہم کل پانچ نادار تھے۔ کیچڑ میں لت پت زریں گل بھی ہم میں شامل تھا۔ میری اور زریں گل کی طرح دیگر ناداروں سے بھی مار پیٹ کی گئی تھی۔ وہ سب ہانپتے کانپتے نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ناقوب مالک بھی موقع پر پہنچ گیا۔ یقیناً وہ ہنگامے کی خبر سن کر جاتو سے دوڑا آیا تھا۔ پہرے داروں نے سوجانہ لہجے میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ غضب ناک نظر آنے لگا۔ کھڑے کھڑے اس نے بشیر خان کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور مقامی زبان میں غرانے لگا۔ پھر وہ میری اور زریں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مترجم کی وساطت سے اس نے مجھ سے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی جوان لڑکی یہاں سے نکل کر گئی ہے۔ یقینی بات ہے کہ وہ تم پانچوں میں سے ہی کسی سے ملنے آئی تھی۔ اس چھوکری کے ساتھ جس نے بھی رنگ رلی کی ہے صاف صاف بتا دے ورنہ تم پانچوں کو سخت عذاب جھیلنا پڑے گا۔"

"ہماری کوٹھری میں ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا "اور میرا خیال ہے کہ ساتھ والی کوٹھریوں میں بھی ایسی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اتفاق سے میں جاگ رہا تھا۔ مجھے کوئی آہٹ یا آواز سنائی نہیں دی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی کسی اور جانب سے آئی ہو اور احاطہ پار کر کے نکل گئی ہو یا پھر...."

میں بات کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا مگر ہوشیار ناقوب نے میرے دل کی بات پکڑ لی۔ طنزیہ لہجے میں بولا "یا پھر ہو سکتا ہے کہ میرے پہرے داروں میں سے ہی کسی نے لڑکی کے ساتھ بسترِ گرم کیا ہو؟"

"نہیں۔ میں یہ بات تو نہیں کہہ سکتا لیکن اگر لڑکی واقعی یہاں سے نکلی ہے تو پھر کہاں سے نکلی ہے۔"

"تمہاری کوٹھریوں میں سے نکلی ہے۔" وہ چیخ کر بولا "اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ تمہاری کوٹھری سے نکلی ہے۔"

اس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور ہاتھ میں پکڑی موٹے دانوں کی تسبیح اس زور سے میرے چہرے پر رسید کی کہ رخسار میں انگارے سے اتر گئے۔ وہ مکوں اور ٹھوکروں سے مجھے بے دریغ پیٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ نامعلوم زبان میں گالیاں بھی دے رہا تھا۔ پھر وہ پیچھے ہٹ گیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ اتنی ہی مشقت نے اس کے کہن سال جسم کو نڈھال کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ قدرے پُرسکون ہوا تو میری طرف انگلی اٹھا کر بولا "تم ان سب سے زیادہ خطرناک ہو اور اس بستی کے لیے سب سے زیادہ نحس بھی۔ یہ تم ہی ہو جس نے "واپسی" کی رسم خراب کی اور ہماری بستی کی مصیبتوں میں اضافہ کیا۔ تم اب بھی باز نہیں آ رہے ہو اور میری پاک چار دیواری میں گندا کھیل کھیل رہے ہو۔ میں اب پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ عورت تمہاری کوٹھری میں سے نکل کر گئی ہے۔ کسی اور نادار میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ناقوب کی چار دیواری میں ایسا شیطانی کام کرے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے وزنی تسبیح پھر میرے منہ پر رسید کی۔

میرا دل چاہا، چیخ کر کہوں "تیری چار دیواری میں شیطانی کام میں نہیں کر رہا، تیری چہیتی بیوی کر رہی ہے اور جس کے ساتھ کر رہی ہے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تیرے بستر پر موجود تھا۔"

لیکن ایسا کہنا کم ظرفی تھی۔ میری بات سے اس لڑکی پر حرف آتا تھا جو جیسی بھی تھی لیکن ہمارے ساتھ ہمدردی کر چکی تھی اور دیکھا جاتا تو وہ "جو کچھ کر رہی تھی" اس میں اس سے زیادہ خود ناقوب قصوروار تھا۔ اس نے ایک نوجوان لڑکی کو اپنی خزاں رسیدہ زندگی سے وابستہ کر کے اس کی امنگوں اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ اس پر مذہب اور رسم و رواج کے پہرے بٹھائے تھے اور اونچی چار دیواری میں مقید کر دیا تھا۔ ایسی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ایسی ہی بجلیاں چمکا کرتی ہیں۔ ایسی ہی تر چار دیواریوں کے تاریک کونے کھدروں سے ایسی ہی برہنہ مورتیاں ملا کرتی ہیں جیسی ماموس کے مقفل صندوق سے ملی تھی۔ لکڑی کی وہ چھوٹی سی حشر ساماں مورتی میری نگاہوں میں چمکنے لگی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماشا نے مجھے بتایا تھا کہ ماموس سے تعلقات قائم کرنے والا وائیل نامی نوجوان لکڑی کی مورتیاں بناتا ہے۔ یقیناً صندوق سے برآمد ہونے والی مورتی بھی اسی کے جذبات کا شاہکار تھی۔

ناقوب نے اپنے پہرے داروں کو حکم دیا کہ ہم پانچوں ناداروں کو چھت سے الٹا لٹکا دیا جائے اور مسلسل بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ صبح ہوتے ہی اس حکم پر عمل کیا گیا۔ ہمیں سخت سردی میں ننگے درختوں سے الٹا لٹکا دیا گیا اور گاہے گاہے چیڑ کی شاخوں سے دنا

گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ جان گسل سزا دیر تک جاری رہے گی لیکن بعد از دوپہر ہماری جان خلاصی ہو گئی۔ شاید بھیجے کی حیثیت رکھنے والے ناقوب کے کھوپڑے میں یہ بات آگئی تھی کہ اگر ہمیں طویل سزا دی جائے گی تو فارم کا کام کاج کون کرے گا۔ اس نے ہمارے لیے تھوڑی اذیت کو زیادہ جانا اور ہمیں فارم کے کام پر لگوا دیا گیا۔

شام کو جب ہم کوٹھری میں پہنچے تو زریں گل کا موڈ سخت خراب تھا۔ ایک تو وہ چوٹیں جو اس کے سارے جسم پر بارش کی طرح برسی تھیں اور دوسرے بے عزتی کا وہ احساس جس نے اس کے پٹھانی خون میں ابال پیدا کر رکھا تھا۔ یہی دو وجوہات تھیں جن کے سبب اس کا منہ "رر گے منہ" ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا موڈ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مجھے تمہارا سنایا ہوا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ پوچھو کون سا؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "ام بھی بے سہارا، تم بھی بے سہارا ۔۔۔ بڑے منہ تمہارا اپنے منہ ہمارا۔"

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا گزر تک نہیں ہوا۔ بے حد سنجیدگی سے بولا "استاد صیب! ام سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن بے عزتی ام سے برداشت نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "جس راستے پر چل نکلے ہو یہاں یہ سب کچھ چلتا ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔"

"ام اپنا بات نہیں کر رہا استاد صیب! آپ کا بات کر رہا ہے۔ آپ کا بے عزتی ام کو کسی طرح ہضم نہیں ہوتا ہے۔ امارا دل چاہتا ہے آپ پر ہاتھ اٹھانے والے کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ اگر آج امارے پاؤں میں یہ لوہے کا گولا نہ ہوتا تو شاید ام آپ کا ساری ہدایتیں بھول جاتا اور ان بدبودار جانوروں پر جھپٹ پڑتا۔"

"مجھے تمہارے خیالات سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔" میں نے کہا "تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ یہ جرم و سزا کی دنیا ایک میدان ہے۔ اس میں موت کا کھیل ہوتا ہے۔ کھیل میں عزت و مرتبہ نہیں دیکھا جاتا، صرف کھیلا جاتا ہے۔ جب پولو کھیلتے ہوئے قطب الدین ایبک اپنے غلام سے گیند چھینتا تھا تو غلام اس کے سامنے کورنش بجا نہیں لاتا تھا۔ پوری طاقت کے ساتھ اس سے بھڑ جاتا تھا۔ موت کے کھیل میں بھی یہی اصول ہوتے ہیں۔ کل اس کھیل میں نہ جانے ہمیں کس کس کو الٹا لٹکانا پڑے۔ اس دن کی بے رحمی کے لیے ہمارے کام بھی بے رحمی آنے کی ہو ... ہم پر ہوئی ہے۔"

وہ میرے "فلسفے" کو نظر انداز کر کے میری زخمی ٹانگ دیکھ رہا تھا۔ مار پیٹ کے سبب پنڈلی کے زخم سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ بولا "آج آپ کا پٹی بھی نہیں ہو سکا ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ پٹی والا سلسلہ اب ختم ہوا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ناموس اب پٹی وٹی نہیں کیا کرے گی۔ تم جانتے ہی ہو کہ اگر میں سہ پہر تک نہیں جاتا تھا تو وہ مجھے بلانے کے لیے خادمہ بھیج دیا کرتی تھی۔ آج اس نے بلانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ میرا خیال ہے کہ ناقوب نے اسے سختی سے منع کر دیا ہوگا۔"

"لیکن آپ تو کہتے تھے کہ وہ ناموس کو بڑے لاڈ سے رکھتا ہے؟"

"یہ بھی لاڈ پیار علیحدہ بات ہے۔ کل رات سے ہم پر لنگڑے پن اور لوفریت کا الزام عائد ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی صورت یہ رسک نہیں لے سکتا کہ ہم میں سے کوئی اس کی چار دیواری میں داخل ہو۔"

"ہو سکتا ہے آپ کا بات درست ہو۔"

"ہو سکتا نہیں ۔۔۔ ہے۔ اگر نہیں کوئی شک ہے تو کل تک کنفرم ہو جائے گا۔"

واقعی اگلے روز بھی میری زخمی پنڈلی کی پٹی نہیں ہوئی۔ میں گیا اور نہ ہی ناموس نے کوئی خادمہ بھیجی۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ناموس میری ہمدردی میں اس سے زیادہ اور کہاں تک جا سکتی تھی۔ اپنے شوہر سے پنگا تو نہیں ڈال سکتی تھی۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ ہمیں نظر آئی۔ ہم اس وقت دن بھر کی بیگار کے بعد کوٹھری میں واپس آ رہے تھے۔ سارا دن چارے کی کھرلیوں کی صفائی ہوتی رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں تھکن سے شل تھے۔ آہنی بیڑیاں جس جگہ ٹخنوں سے رگڑ کھاتی تھیں وہاں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں اور زریں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ میں نے ناموس کو دیکھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر موٹی اوڑھنی تھی۔ وہ ایک دیگ نما برتن میں سے دودھ کے پیالے بھر بھر کر فاقہ کش لوگوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا۔ کتنی سادہ اور خاموش طبع نظر آ رہی تھی وہ۔ مقامی معیار کے مطابق ایک گھریلو خاتون۔ کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ رات کی تاریکی میں اس کا کوئی اور روپ بھی ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے جنگ کر کے ہار جاتی ہے تو کسی فاتح کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ شام ہی سے آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ سردی اپنے عروج پر تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت برف باری شروع ہو جائے گی اور صبح جب ہم دیکھیں گے تو زاقرم دور دور تک سفید نظر آئے گی۔ ہماری کوٹھری کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں بخاری بھر کر لحاف لپیٹے زریں گل کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ زریں گل کبھی اونگھنے لگتا تھا کبھی ایک دم ہوشیار ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ اچانک مجھے تاریکی میں وہ سایہ نظر آیا جو میں اس سے پہلے بھی دو دفعہ دیکھ چکا تھا۔ ناقوب کے گھر کے دروازے کے سامنے

شہرۂ آفاق سلسلہ وار کہانی

شہ زور

تحریر
ایم اے راحت

دو حصوں میں مکمل

ایک ایسی خاتون رپورٹر کی داستان
جو قانون پرست، رحم دل، دلیر
اور انسانیت کی قدردان تھی

قیمت مکمل سیٹ -/100 ڈاک خرچ -/25

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز
[illegible]

پہنچ کر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ وہ دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے اور زریں گل نے دس پندرہ منٹ انتظار کیا' پھر میں نے زریں سے کہا کہ وہ چھت کی کڑیوں میں چھپا ہوا پستول اور ٹارچ نکال لے۔ زریں نے یہ دونوں اشیا میرے حوالے کر دیں۔ میں نے زریں کو ضروری ہدایات دیں اور بہ آہستگی باہر نکل آیا۔ سرد ہوا نے میرا استقبال کیا۔ مویشیوں کے طویل سائبان کے نیچے سے گزرتا ہوا میں رہائشی حصے کی طرف آ گیا۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا۔ جو دروازہ "ساحرے" کو کھلا ملا تھا وہ میرے لیے بند تھا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے پہلو میں پہنچ گیا۔ پاؤں میں گھنگھرو بیڑیوں کے ساتھ چار دیواری عبور کرنا خاصا مشکل کام تھا لیکن میں کسی نہ کسی طور کر گزرا۔ مکان کے پچھواڑے مسلح پہرے دار موجود تھے۔ میں صحن میں کودا تو بیڑیوں کی کھن کھناہٹ نے کسی پہرے دار کو میری طرف متوجہ کر لیا۔ یہ اندرونی چار دیواری تھی اور اس چار دیواری سے بہت نیچی تھی جس نے فارم اور مکان کو احاطے میں لے رکھا تھا۔ پہرے دار اچک کر دیوار پر چڑھ آیا اور اپنی تسلی کے لیے صحن میں جھانکنے لگا۔ میں دیوار کی جڑ میں مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ میری انگلی پستول کی لبلبی پر تھی۔ پہرے دار مجھے دیکھ لیتا تو یہ انگلی حرکت میں آ جاتی اور ایک ایسا ہنگامہ شروع ہو جاتا جس کی انتہا کا کسی کو علم نہیں تھا مگر پہرے دار مجھے دیکھنے سے قاصر رہا۔ جوں ہی وہ دیوار سے اترا اور باہر کی طرف گیا میں محتاط قدموں سے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا برآمدے میں داخل ہوا اور پھر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ یہاں یقیناً کوئی سو رہا تھا۔ سونے والے کی بھاری بھرکم سانسیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ سونے والی یقیناً کوئی خادمہ ہو گی کیوں کہ میں "جن" کی تلاش میں تھا وہ یہاں سونے کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے۔

میں بیوقوفی کی رفتار سے چل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ میری بیڑیوں سے معمولی سی آہٹ بھی پیدا نہ ہو۔ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں اور مجھے در و دیوار کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ایک اندرونی کمرے کے دروازے پر دباؤ ڈالا' وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے کنڈی کو جھٹکا دیا۔ وہ معمولی آواز کے ساتھ کھل گئی۔ ایک ڈری ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ مقامی زبان میں کچھ پوچھا گیا تھا یقیناً یہی پوچھا گیا ہو گا کہ کون ہے۔ جواب میں' میں نے اپنی انگلی کو حرکت دی۔ ٹن کی آواز نئی اور کمرا روشن ہو گیا۔ میرے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے کی ناہموار پتھریلی دیوار پر پڑ رہا تھا اور پورے کمرے کے خدوخال میرے سامنے واضح ہو رہے تھے۔ میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ ناموس اپنے بستر پر تھی۔ اس نے لحاف اوڑھ رکھا تھا اور لحاف میں سے اس کے عریاں شانے نظر آ رہے تھے۔ بستر پر کوئی اور بھی موجود تھا لیکن جوں ہی ٹارچ جلی تھی' وہ اٹھ رہا تھا اور تڑپ کر ایک الماری کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

اس کمرے میں روشنی ہونا ایسا ہی تھا جیسے آسمان کسی کے سر پر ٹوٹ پڑے یا سورج ایک دم لڑھک کر سوا نیزے پر آ جائے۔ یہاں کوئی روشنی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فرضِ محال' ناموس کا شوہر بھی یہاں پہنچ جاتا تو اپنی بیوی کا گناہ پکڑ نہیں سکتا تھا۔ شام کے بعد یہ داری تاریکی کا سمندر بن جاتی تھی اور اس سمندر میں کبھی کوئی چھوٹی سی کرن بھی نہیں چمک سکتی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا اور اپنے دونوں پاؤں کو ایک ساتھ حرکت دے کر یوں اچھلا کہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت الماری کے پیچھے چھپا ہوا شخص جھپٹ کر سامنے آیا۔ اس کے لمبے بال چہرے پر بکھرے تھے اور ان بالوں میں سے آنکھیں یوں نظر آتی تھیں جیسے جھاڑیوں میں کوئی سہما ہوا درندہ چھپا ہو۔ وہ تیزی سے مجھ پر جھپٹا ۔۔۔ خدا کی پناہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا۔ میرا پہلو ایک انچ کے فرق سے محفوظ رہا۔ وہ اپنے زور میں لڑکھڑا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر گرا۔ ایکا ایکی اس نے مزاحمت کا ارادہ ترک کیا اور تڑپ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ "خبردار" میں نے چیخ کر کہا اور پستول اس کی طرف سیدھا کیا لیکن وہ راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔

بوڑھی خادمہ یقیناً ان آوازوں سے بے خبر ہو گی۔ دوسری خادمہ غالباً بہت گہری نیند سو رہی تھی۔ کمرے میں پیدا ہونے والی آوازوں اور آہٹوں کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ناموس سکتے کی سی حالت میں بستر پر بیٹھی تھی۔ لحاف اس کی گردن تک کھنچا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس کے چہرے پر مرکوز کیا اور پستول سمیت اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بہت خوب" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "جانباز ناقوب کی بیوی خاوند کی غیر حاضری کا زبردست فائدہ اٹھا رہی ہے۔"

ناموس کا چہرہ مردوں کی طرح زرد تھا۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔ آخر بمشکل ہمت کر کے بولی "میں کہتی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہیں آنے کی ۔۔۔ ہمت کیسے ہوئی؟"

"جیسے رامیل کو ہمت ہوئی۔"

"ک ۔۔۔ کون رامیل؟" وہ صاف مکر جانے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔

میں نے پستول والا ہاتھ جھکا کر وہ بوسیدہ کوٹ اٹھایا جو رامیل یہاں چھوڑ گیا تھا' اس کے علاوہ مفلر اور جوتے بھی تھے۔ میں نے کوٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "یہ رامیل ۔۔۔ تم مکر نہیں سکتی ہو اور اگر مکرنے کی کوشش کرو گی تو میں ناکام بنا دوں گا۔ آج صبح ساری بستی کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جانباز ناقوب کی بیوی کتنی باوفا اور پارسا ہے۔" اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکایا اور پھر ایک دم رونے لگی۔ ہچکیوں سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں ختم ہو گئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے لباس

کے ساتھ "مصروفِ کار" ہے۔ میں اس کے ہر قدم اور ہر لمحے پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور اسے بتا چکا تھا کہ پستول میرے ہاتھ میں ہے جو اس کی کسی غلط حرکت پر شعلہ اگل سکتا ہے۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی "تمہیں ۔۔۔ میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ۔۔۔ کیا یہی صلہ ہے میری ہمدردی کا۔"

"ہاں یہ تمہاری ہمدردی کا ہی صلہ ہے کہ میں تمہاری خادماؤں اور تمہاری سوتن کو نہیں جگا رہا اور ناقوب کو جا کر تم سے طلب نہیں کر رہا۔ اگر میں چاہتا تو اب تک تو سبھی تمہاری "مصروفیت" سے آگاہ ہو چکی ہوتیں۔"

"تت ۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" وہ بچے کی طرح ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ جو میں چاہتا ہوں ۔۔۔ وہ تم پورا کر سکتی ہو۔"

وہ کچھ دیر گم صم رہی پھر لرزاں آواز میں بولی "اگر وہ کام میرے بس کا ہوا تو ضرور کروں گی۔"

میں نے کہا "وہ کام تمہارے بس کا ہے۔ تمہارا بوڑھا شوہر تمہاری بات مانتا ہے۔ تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے وہ بہت دور تک جا سکتا ہے' تم ۔۔۔ اسے مجبور کر سکتی ہو کہ وہ پارسہ کی بچی کی جان لینے کا خیال ذہن سے نکال دے۔ وہ اس وقت مہمان جا رہی ہے۔ وہ بچی کے بارے میں جو فیصلہ بھی کرے گا' حتمی ہو گا۔"

میں تاریکی میں ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن یقیناً ناموس پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر وہ طویل سانس کھینچ کر بولی "تم نے غلط اندازہ لگایا ہے ۔۔۔ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ مالک (ناقوب) عبادت گاہ کے معاملوں میں کسی کی نہیں سنتے۔"

"اگر یہ کام آسان ہوتا تو میں تمہیں کیوں کہتا۔ بہرحال یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ دوسری صورت میں وہی ہو گا جو میں نے کہا ہے۔ گناہ کا الزام اس بچی پر لگایا جا رہا ہے' وہ میں تم پر لگاؤں گا۔ میں ساری بستی کو بتاؤں گا کہ بستی پر ٹوٹنے والے قحط کی "وجہ" ناقوب کے گھر میں موجود ہے۔ وہ لوگ جس گناہ کی تلاش میں معصوم بچی کو موت کے حوالے کر رہے ہیں وہ گناہ مہان جانباز کے گھر میں پروان چڑھ رہا ہے ۔۔۔ مجھے بتاؤ ۔۔۔ مجھے بتاؤ تم ۔۔۔ کیا تمہارے شکم میں رامیل کا ناجائز بچہ موجود نہیں؟"

آخری فقرہ میں نے اچانک ادا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ ناموس کے چہرے پر پھینک دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم خوف کی یلغار ہو گئی تھی اور ہونٹ پھڑک کر رہ گئے تھے۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ناموس واقعی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ میں نے ٹارچ بجھا دی اور اسے رونے دیا۔ روتے روتے وہ آپوں آپ ہی بولنے لگی "ہاں میں گناہ گار ہوں۔ مار ڈالو مجھے۔ کیا حق ہے مجھے جینے کا۔ میرا گلا تو اسی رات گھونٹ دینا چاہیے تھا جب میں پیدا ہوئی تھی۔ جو ماں باپ بچے کے جسم کو کپڑا اور اس کے پیٹ کو کھانا نہ دے سکیں انہیں کیا حق ہے ایک بھوکی ننگی روح کو دنیا میں لانے کا۔ کاش میں دیوتاؤں کے پاس ہی رہ گئی ہوتی۔ نہ آئی ہوتی اس دنیا میں۔"

میں نے پوچھا "کون تھے تمہارے ماں باپ؟"

جواب میں وہ دھیرے دھیرے بولنے لگی۔ الفاظ جیسے رک رک کے دریا میں بہہ کر خود بخود اس کے ہونٹوں سے برآمد ہو رہے تھے۔ اندھیرا اسے بولنے میں مدد دے رہا تھا۔ کسی وقت یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کلامی کر رہی ہے۔ درمیان ہی میں میں نے اس سے تین چار سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کا لبِ لباب یہ ہے۔ ناموس غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ چھکڑا بان تھا اور باربرداری کا کام کرتا تھا۔ ناموس سے چھوٹے چار بہن بھائی اور تھے۔ چار سال پہلے ایک بڑا پرانا تودہ گرنے سے بستی کے تین مزدور ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ زخمی ہونے والوں میں ناموس کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی چٹخ گئی تھی اور وہ دس ماہ بستر پر رہا تھا۔ بستی کے اکلوتے ڈاکٹر "مسٹر بشری" نے علاج کر کے اسے چلنے پھرنے کے قابل تو بنا دیا لیکن اس علاج پر اتنی رقم خرچ ہو گئی تھی کہ ناموس کے باپ کا بال بال قرض میں جکڑا گیا تھا۔ اس قرض کے علاوہ گھر میں بھوک ننگ کا بھی دور دورہ تھا۔ یہی حالات تھے جب ناموس کے باپ نے ناموس کی شادی اپنے قرض خواہ ناقوب مالکی سے کر دی۔ اس شادی کے صلے میں جہاں ناقوب نے اپنی رقم کا تقاضا ختم کر دیا وہاں ناموس کے بہن بھائیوں کی حالت سدھارنے کے لیے مالی مدد بھی کی۔

ناقوب سے شادی کے بعد نوجوان ناموس ایک بنجر صحرا میں کھو گئی تھی۔ سیکڑوں میل دور تک اس کا کوئی ساتھی تھا اور نہ ہم سفر۔ وہ محرومیوں کی اس جلتی ریت پر برہنہ پا چلنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی خوش حالی کے لیے وہ ہر مصیبت جھیلنے کو تیار تھی ۔۔۔ اور جھیل رہی تھی مگر پھر دھیرے دھیرے اس کے اندر چھپی ہوئی عورت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی۔ طویل بے لمس راتوں کے عذاب اس کی جان نچوڑنے لگے' اس کی گود کسی معصوم کی چہلاہٹ کے لیے ترسنے لگی۔ منہ زور جذبوں کی یلغار سے ٹوٹی تو پھر ٹوٹتی اور بکھرتی چلی گئی۔ دیوتاؤں کا خوف' رسموں کی دیواریں' سماج کی زنجیریں کچھ بھی اسے روک نہ سکا۔ ان کے گھر کے قریب ہی رہنے والا ایک نوجوان چوب تراش رامیل اس کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ اب اس کے ملاپ کے بعد ناموس کے وجود میں ایک نیا وجود جنم لے چکا تھا۔ ناقوب اس بات سے بے خبر' تامہ کی بچی کو ناجائز قرار دینے پر تلا ہوا تھا اور بستی کے دگرگوں حالات کو بچی سے منسوب کر رہا تھا۔

ناموس کی ساری روداد سننے کے بعد میرے دل میں اس کے لیے موجود نرم گوشہ کچھ اور وسیع ہو گیا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو کھائے گا کیا؟ ناموس کے بارے میں ہمدردانہ جذبات رکھنے کے باوجود میں اس سے سودے بازی کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے کہا "دیکھو ناموس! کچھ بھی ہے' میں اس بچی کو بچانا چاہتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے اور میرے پاس اتنی قوت ہوتی کہ میں جاتریوں کا مقابلہ کر سکتا تو میں اس بچی کی زندگی کے لیے آخری سانس تک لڑتا لیکن تم جانتی ہو ایسا نہیں ہے۔ موجودہ حالات میں صرف تم ہو جو بچی کو اپنے شوہر اور دیگر جاتریوں کے ستم سے بچا سکتی ہو اور تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔ ورنہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کو بتانے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ اگر بستی میں قحط کی وجہ ناجائز بچہ ہے تو وہ کون ہے۔"

ناموس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ہنک کر بولی "میں یہ کام نہیں کر سکوں گی۔ میں جانتی ہوں مالک (ناقوب) میری بات نہیں مانیں گے۔ ہرگز نہیں مانیں گے۔"

"تم اپنی قدروقیمت سے واقف نہیں ہو۔ تم جانتی ہو کہ وہ بڈھا تمہاری بات کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔"

"میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں کرنا ہو گا۔" میں نے بے رحم لہجے میں کہا "جس طرح بھی ہو۔ جس ڈھنگ سے بھی ہو۔"

"تم...... مجھے خودکشی پر مجبور کر رہے ہو۔"

"جان گنوانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر جان ہی گنوا سکتی ہو تو اٹھو اور چھین لو مجھ سے یہ پستول۔"

وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی اور گھٹنوں میں سر دے کر آنسو بہاتی رہی۔ باہر سرد ہوائیں شائیں شائیں کرتی رہیں اور دور کہیں کوئی شب بیدار جانور باریک آواز میں چیختا رہا۔ میں نے کہا "میں جا رہا ہوں۔ تین دن بعد چاند کی پہلی تاریخ ہو گی۔ تین دن بعد کسی بھی وقت زرتوتہ کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اگر اس کی زندگی خطرے میں پڑی تو تمہارا راز' راز نہیں رہ سکے گا اور یاد رکھنا یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔"

میں نے وائسیل کا چھوڑا ہوا کوٹ اٹھایا۔ دونوں جوتے اس کی جیبوں میں ٹھونسے اور مفلر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

○☆○

مجھے یقین تھا کہ ناموس ایک ایسا کام کر گزرے گی جو کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ وہ ناقوب کی چہیتی بیوی تھی اور بڑے جاتری غاران کے زخمی ہونے کے بعد ناقوب کو بڑے جاتری کا رتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس کا کہا پتھر پر لکیر تھا اور اس کے فرمان کو کوئی ٹال نہیں سکتا تھا سردار سدورت بھی نہیں۔

اس رات والے واقعے کے بعد ناشا کا کوئی پتا نہیں تھا۔ جب سے ناشا نے آنا بند کیا تھا' باہر کے حالات کے بارے میں ہماری جانکاری بھی منقطع ہو گئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ مقدر اور جون چانل وغیرہ کس حال میں ہیں۔ جوں جوں چاند طلوع ہوا تو میری اور زریں گل کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ اب کوئی بھی رات زرتوتہ کے لیے قیامت کی رات ثابت ہو سکتی تھی۔ ویران اندھیرے میں روتی بلکتی بچی کا تصور میرے ذہن میں آیا اور سینے میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا توتلی زبان میں کہا ہوا "انکل" میری سماعت میں گونجنے لگا اور سوچوں کو گھائل کرنے لگا۔

اگلے روز بشیر خاں نے مجھے یہ بتا کر قدرے پرسکون کیا کہ فی الحال بچی کی "رسم" ادا نہیں کی جا رہی اور دو روز بعد پانچوں بڑے جاتری اس سلسلے میں حتمی صلاح مشورہ کریں گے۔ بشیر خاں کو یہ بات ایک پہرے دار سے معلوم ہوئی تھی۔ درحقیقت وہ لوگ جو سردار ہمانہ کی زندگی میں اس کے بہت قریب رہے تھے' دبے لفظوں میں اس بات کی مخالفت کر رہے تھے کہ معصوم بچی کو دوبارہ "رسم" کی کڑی آزمائش میں ڈالا جائے۔ جاتری "رسم" سے پہلے ان مٹھی بھر لوگوں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے اور اس کوشش میں خاصے کامیاب بھی ہوئے تھے۔ جاتریوں کا اثرورسوخ دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ وہ من مانی کر کے رہیں گے۔

دوسری طرف مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ ناموس نے میری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ بشیر خاں ہی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ دو روز پہلے کسی بات پر ناموس اور اس کے بڈھے شوہر میں جھگڑا ہوا ہے اور ناموس ناراض ہو کر والدین کے پاس چلی گئی ہے۔ بشیر خاں کو یہ باتیں اسی پہرے دار سے معلوم ہوئی تھیں جو اس کا رازدار تھا۔ ان دونوں میں ایک بار میں نے بھی ناقوب کو دیکھا تھا۔ وہ پژمردہ اور گم صم نظر آتا تھا۔ یہی ممکن تھا کہ اس کی یہ کیفیت گھریلو جھگڑے ہی کی وجہ سے ہو۔ غالباً چاند کے حساب سے وہ تیسری چوتھی تاریخ تھی جب ایک رات پھر ناشا سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی وجہ دلچسپ حیران کن تھی۔ پچھلی دفعہ وہ پہرے داروں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب فارم میں داخل ہونے کا رسک نہیں لے گی لیکن اس میں تو نہ جانے کیسی روح حلول کر چکی تھی۔ وہ سراپا احتجاج اور بغاوت تھی اور خاص طور سے جاتریوں کے لیے۔ میں جانتا تھا اسے مجھ سے یا زرتوتہ سے بہت زیادہ ہمدردی نہیں ہے لیکن حالات نے چونکہ ہمیں جاتریوں کے مقابل لا کھڑا کیا تھا لہٰذا وہ ہمارے شانے سے شانہ ملا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس بار وہ واکی ٹاکی کا سیٹ اپنے ساتھ لائی تھی۔ ایسا ہی دوسرا سیٹ منصور کے پاس تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں مقدر سے بات کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "میں کل "تحت" میں تمہارے دوست سے ملی ہوں۔ وہ تمہارے بارے میں بڑا پریشان تھا اور سوچتا تھا کہ پتا نہیں جاتری تمہارے ساتھ کیا

سلوک کر رہے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی ہے۔ یہ واکی ٹاکی اسی نے مجھے دیا تھا۔ کہتا تھا تم تک پہنچا دوں۔"

"اور تم لے کر دوڑتی ہوئی یہاں پہنچ گئیں؟"

"تو میں کسی حرامی سے ڈرتی ہوں۔"

"عجیب لڑکی ہو تم۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مصیبت میں ڈالتی ہو۔ کچھ پتا ہے تمہیں پچھلی دفعہ تمہاری وجہ سے کتنی اما بی ہو گئی ہمارے ساتھ؟"

"تو زندہ ہو ماما ابا رنے ہے۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ تم ورنیس ہو داروں سے نفرت کرتے ہو۔ یا پھر بیرو اندر سے زندہ۔ اگر...... تم جرکے کے تاقی ہوتے تو ناس زندگی ہارتا۔" پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "اگر بچی کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ورنہ رہنے دو۔ کچھ ہو سکا تو خود کروں گی اور اگر کچھ نہ ہو سکا تو آنکھ والی زرداں کی بیاہی لے کر اپنی جان دے دوں گی۔" اس نے غصے اور نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

میں نے کہا "تم مجھے طعنہ دیتی ہو کہ میں خود کو "ہیم چیز" سمجھتا ہوں لیکن یہ بات تم پر صادق آتی ہے۔"

وہ تنک کر بولی "ہاں...... میں ہوں ہیم چیز۔ جاؤ کسی سے پوچھ کر دیکھو کہ ناشا کیا ہے۔ کیا کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ ناشا سے ٹکر لے سکے۔ جاتریوں کے خوف سے تمہاری پتلون گیلی ہوتی ہے اور میں ان جاتریوں کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کلائی تھام کر اسے بمشکل بٹھایا اور سمجھایا کہ میں غافل نہیں ہوں۔ بچی کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ تنک کر بولی "کیا کر رہے ہو؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ کس طرح میں نے ناموس کو ٹریپ کیا ہے اور اس کے ذریعے ناقوب ماگی پر دباؤ ڈلوا رہا ہوں...... میری بات ناشا کے دماغ میں آ گئی۔ اس کا ہیجان قدرے کم ہو گیا اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے واکی ٹاکی سے "ٹپ۔ ٹپ" کی مدھم آواز ابھرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی ننھا سا سرخ بلب اسپارک کرنے لگا...... یقیناً یہ مقدر کا بلاوا تھا۔ میں نے واکی ٹاکی آن کیا۔ مقدر کی آواز میری سماعت میں رس گھول گئی۔

"ہیلو میں شار جہاں بول رہا ہوں۔" میں نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

"شکر ہے آپ کی آواز تو سنی۔" وہ بولا۔

"جلد ہی صورت بھی دیکھو گے۔ تم سناؤ کیا صورت حال ہے؟"

وہ بولا "میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ وہ کام کر لوں جو ہم کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ میرا مطلب جون چانل سے ہے۔ میں اس کوشش میں تھا کہ اسے کوئی دوا دے کر حاصل کر لیا جائے۔ سردار سدورت کے کہنے پر میں کوئی راوا کو جون چانل کے عوض خاصی بڑی رقم کی پیشکش کر چکا ہوں لیکن وہ بھی ایک ہٹ دھرم ہے۔ بلکہ اس کے لیے "کبیلی" کا لقب زیادہ مناسب رہے گا۔ وہ جون چانل کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے جب میری مرضی ہو گی اسے بغیر کسی معاوضے کے آزاد کروں گا۔"

"اور اگر اس نے اپنی مرضی کرتے ہوئے اسے پھر دیوتا کے چرنوں میں قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تو؟"

"یہی ڈر تو مجھے ہے۔" مقدر نے کہا "جون چانل اپنے سینے کے قیمتی راز سمیت لاپتا ہو جائے گا۔ یہ تو ایسا ہی ہو گا جیسے سات زبانیں بولنے والا مینا ذبح کر کے کھا لیا گیا تھا۔"

"بلکہ اس سے بھی بڑی ٹریجڈی ہو گی۔ بہرحال تم اپنی کوشش جاری رکھو...... اور زرتوتہ کے متعلق بتاؤ۔ کچھ پتا چلا اس کے بارے میں؟"

"جی ہاں۔ سردار سدورت نے بتایا ہے کہ کل جاتروں میں ہونے والی بات چیت میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا "مہمان جاتری" ناقوب بوجوہ اس بات چیت میں شریک نہیں ہو سکا تھا' اب اتوار کے روز جاتروں میں پھر مذاکرہ ہو گا۔ اس میں فیصلہ کیا جائے گا کہ بچی کے لیے "واپسی" کی رسم کب ادا کی جائے گی۔"

میرے بعد زریں گل نے بھی مقدر سے چند باتیں کیں۔ مقدر سے بات کر کے میرے اطمینان میں اضافہ ہوا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ ناقوب نے جان بوجھ کر جاتروں میں ہونے والی بات چیت میں شرکت نہیں کی۔ یعنی وہ اس معاملے کو لٹکانا چاہ رہا ہے۔ اگر وہ بے حد پُرجوش ہونے کے باوجود اب اس معاملے کو لٹکانا چاہ رہا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ ناموس اپنی تمام تر قوت اور صلاحیت کے ساتھ ناقوب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

ناشا قریباً ایک گھنٹا ہمارے پاس موجود رہی۔ وہ بہت تپی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے کہا "مجھے ڈر ہے کہ باہر نکلتے ہوئے تم کہیں پھر نہ پکڑی جاؤ۔"

وہ پھنکار کر بولی "ان پہرے داروں کی تو...... (اس سے آگے انگریزی کی ایک مردانہ گالی تھی) ان میں اتنی ہمت کہاں کہ مجھے ہاتھ لگا سکیں۔ وہ تو میری ہی غلطی تھی۔ میں باہر نکلنے سے پہلے ایک گائے کا دودھ پینے اس کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اچھل کود شروع کر دی۔ قریب لیٹا ہوا پہرے دار جاگ گیا۔ ورنہ ان کی کیا مجال کہ میری ہوا کو بھی چھو سکیں۔" اس نے اپنا اونچا لبادہ ٹانگ سے اوپر تک اٹھایا اور ران سے بندھے ہوئے ایک خنجر کی طرف اشارہ کر کے بولی "پورے انتظام کے ساتھ آئی ہوں۔ آج کوئی حرامی سامنے آیا تو ایسی جگہ خنجر ماروں گی کہ لاش بھی شرماتی پھرے گی۔"

وہ اٹھی۔ کچھ دیر دروازے کے ساتھ لگی کھڑی رہی' پھر "چھلاوے" کی طرح باہر نکل گئی۔ میں اور زریں گل دھڑکتے دلوں کے ساتھ دم سادھے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ

ایسے سخت پہرے سے بچ کر نکل جائے گی لیکن جب پانچ دس منٹ گزر گئے اور کوئی ہلچل نہیں ہوئی تو زرینے سکھ کا سانس لیا۔ زریں گل نیم دراز ہوتے ہوئے بولا "اس چھوکری کو دیکھ کر ام کو لگتا ہے کہ یہ لڑکی نہیں بلکہ باریک سا لال دوپٹا ہے جو ہوا میں ادھر سے ادھر اڑتا پھرتا ہے۔۔۔ کاش۔۔۔ اس کا بہن کلثوم بھی اس کے مافق لال دوپٹا ہوتا۔ ام اس کو گولا بنا کر بغل میں لیتا اور پورے زور سے دیا کر پشاور کی طرف دوڑ لگا دیتا۔"

"تو پھر لگا دو دوڑ۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ لال دوپٹا نہیں ہے۔ وہ تو موٹا کھدر والا کھیس ہے۔ بس ہمارے سسر کی چار دیواری میں پڑا رہتا ہے۔۔۔ شرمایا شرمایا سا۔ گھبرایا گھبرایا سا۔ ام اس سے بہت تنگ ہے۔ ام یہاں سے چھوٹ گیا تو اس سے پیار بھرا ملاقات کرے گا۔۔۔ ایسا پیار بھرا ملاقات کرے گا کہ اس کا سارا شرم بھاگ کر نانگا پربت پر چڑھ جائے گا۔"

"اور نانگا پربت سے تو کوئی کم ہی واپس آتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔" زریں گل نے کہا اور لحاف میں سر دے کر ٹھنڈی سانسیں لینے لگا۔

اگلے روز مجھے معلوم ہوا کہ ناموس بیمار ہے اور آج صبح اسے بستی کے شفا خانے میں لے جایا گیا ہے۔ یہ اطلاع خوش کن نہیں تھی تاہم حوصلہ افزا ضرور تھی۔ ممکن تھا کہ ناموس کی بیماری کی وجہ وہ دباؤ ہو جو میں نے اس پر ڈالا تھا۔ اس کی بیماری کی وجہ سے ناقوب کو دن میں تارے نظر آسکتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی چہیتی بیوی کی صحت یابی کی خاطر اس کی بات پر غور کرنے کو تیار ہو جاتا۔

ناقوب کے پہرے دار سے ہمارے یار رسا ساتھی بشیر خاں کی دوستی بڑی کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔ گاہے گاہے مجھے باہر کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ اسی روز شام کو بشیر خاں کی زبانی پتا چلا کہ ناقوب کی بیوی ناموس پچھلے چھ روز سے بیمار ہے۔ اس کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا اور چونکہ وہ "ناقوب کے بچے" کی ماں بننے والی ہے لہٰذا ناقوب اس کے لیے سخت پریشان ہے۔

ناقوب کے بچے کی اصل حقیقت تو مجھے ہی معلوم تھی۔ وہ ناقوب کا بچہ نہیں تھا۔ وہ اس ناانصافی کا بچہ تھا جو فرسودہ رسم و رواج کے نام پر ایک غریب لڑکی سے کی گئی تھی۔ وہ اس "محسن مانی" کا بچہ تھا جو ریوتاس کی آڑ میں ریوتاس کے ایک بوڑھے پجاری نے کی تھی۔ ایسے لاولد بچے صدیوں سے جنم لیتے رہے ہیں اور شاید لیتے رہیں گے۔

اگلے روز باہر سے جو اطلاعات ملیں ان سے میرے اندازوں اور توقعات کی تصدیق ہو گئی۔ ناقوب نے اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ کسی ماہر سیاست داں کی طرح اس نے گولی قلابازی کھائی تھی اور اب اپنی زبان سے ایسے خیالات کا اظہار کر رہا تھا جنہیں وہ اس سے پہلے سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بچی زرغونہ کو اب پھر سے زہال دیوتا کی آزمائش سے گزارنے کی ضرورت نہیں۔

اس روز سہ پہر کو ہم نے ایک بار پھر ناقوب کے گھر کے سامنے ایک بڑا مجمع دیکھا۔ ناقوب جنگیوں کے اس بدبودار گروہ کے سامنے اظہار خیال فرمانے کے لیے ایک اونچے پتھر پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد مسلح محافظ موجود تھے۔ نہ جانے کس کتاب میں غوطہ زن ہو کر ناقوب نے یہ فتویٰ ڈھونڈ نکالا تھا کہ اگر زہال دیوتا کے سامنے پیش کیے جانے والے بچے کی عمر ایک مقررہ حد سے کم ہو تو پھر اس کی مشکوک واپسی بھی مشکوک نہ سمجھی جائے گی اور اسے امتحان سے بری الذمہ قرار دے کر دنیاوی لذتوں سے ہم کنار ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ زرغونہ کی عمر ساڑھے چھ سال تھی اور مقررہ حد سے کم تھی۔

میں نے دیکھا، ناقوب بڑے عالمانہ انداز میں ہاتھ نچا نچا کر اور تھوک اڑا اڑا کر اپنی نئی رائے کے حق میں دلائل دے رہا تھا۔ موٹے دانوں کی مالا اس کے ہاتھ میں تھی اور برق کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی۔ پتھر کے دیوتا کے پجاری کا یہ روپ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا، پھر بھی میرے ہونٹوں پر ان چاہی مسکراہٹ کی جھلک نمودار ہو رہی تھی۔ ناقوب کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس مقرر کا تصور ابھر رہا تھا جسے ایک ہی مباحثے میں پہلے موضوع کے حق اور پھر مخالفت میں بولنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ اس کے عقیدت مند ایک بار پھر اس کے فرمودات کو بڑے انہماک سے سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ناقوب اپنی چرب زبانی کے پیچھے کیا چھپا رہا ہے۔ وہ کون سی سنگین وجہ ہے جو اسے پینترا بدلنے پر مجبور کر رہی ہے۔ وہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ معمر پجاری نے ریوتاس کی ہدایت کے مطابق اپنی رائے تبدیل کی ہے۔

O☆O

بچی درحقیقت ناقوب کی تحویل میں ہی تھی۔ ناقوب نے اسے جانوروں کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا۔ بچی کو کمسنی کی رسم سے بچانے کی لڑائی ہم ایک قطرہ خون بہائے بغیر جیت چکے تھے۔ جب معمر جاتری ہی رسم کی ادائیگی کے خلاف ہو گیا تھا تو پھر چھوٹے بڑے جاتری اور دیگر دنیا پسند کیا کر سکتے تھے۔۔۔۔ تین چار دن بعد بچی کو رسم سے مستثنیٰ قرار دے کر سردار سدورت کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ میرے اور زریں گل کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری کا دن تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آج ہم نے اس وادی میں جاتریوں کی احمقانہ پیش قدمی روک دی ہے اور اب ان کی پسپائی شروع ہونے والی ہے۔

وہ دن ہمارے نقطۂ نظر سے بڑا مبارک تھا۔ اس روز شام کو

اپنے وقت کا ایک مشہور سلسلہ اب کتابی شکل میں

بساط

ایم اے راحت

ایک ایسے شوریدہ سر کی داستان جس نے معاشرے کو انسان نما درندوں سے پاک کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

عدالتی کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں سے اٹھکیلیاں کرنے والے سچ کے متلاشی کی داستان

قیمت مکمل سیٹ -/۲۴۰ ——— ڈاک خرچ -/۲۵

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز

ہمیں صفدر کی طرف سے ایک اور خوش خبری ملی۔ یہ خوش خبری واکی ٹاکی کے ذریعے ہم تک پہنچی تھی۔ صفدر نے بتایا کہ سردار سدوت مسلسل اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اب اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ ہم دونوں یعنی میری اور زریں کی قید با مشقت کو قید تخفیف میں تبدیل کروا دیا جائے۔ جہاں ہمارے شب و روز زیادہ آسانی سے گزر سکیں..... ہمارا نیا آقا خود سردار سدوت بھی ہو سکتا تھا۔

صفدر نے زرغونہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا "بچی اب تک میں سردار سدوت کے پاس ہے۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ انکل نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ مجھے میرے ماما پاپا سے ملائیں گے۔ وہ ہر وقت مجھ سے پوچھتی رہتی ہے کہ انکل کہاں ہیں؟"

میں نے صفدر سے پوچھا "جان چارلس کا کیا بنا؟"

وہ بولا "کوئی راز اہٹ کا بڑا بکا ہے۔ ایسا کوئی شخص جھانا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جان چارلس کی رہائی کے سلسلے میں زیادہ زور دیں تو وہ اس کا قصہ ہی تمام کروا لے۔ آج کل میں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دن ترنگ میں آ کر وہ خود ہی اسے آزاد کروا لے۔"

اس ڈیری فارم میں صبح تین بجے سے شام چار بجے تک جان توڑ مشقت کرتے ہم نے دو ہفتے مزید گزار دیے۔ میری پنڈلی اب ٹھیک ہو چکی تھی۔ ناتوب کی بیمار بیوی بھی اب گھر واپس آ چکی تھی۔ میں نے ایک دن اسے دور سے دیکھا۔ وہ اب بھی زرد اور کمزور تھی لیکن چل پھر سکتی تھی۔ مجھے اس کی بیماری کا دلی افسوس تھا کیونکہ میں جانتا تھا، اس بیماری کا اصل سبب اس پر مبرا رباؤ تھا۔ اسے اپنی ذلت و رسوائی اپنے سامنے نظر آئی تھی اور اس سے بچنے کے لیے اسے اپنی تمام تر قوت سے شوہر کے سامنے ڈٹ جانا پڑا تھا۔ معلوم نہیں اس نے زرغونہ کو بچانے کے لیے شوہر کے سامنے کیا موقف اختیار کیا تھا۔ ممکن تھا کہ صرف انسانی ہمدردی اور اپنی نرم دلی کو بنیاد بنا کر اس نے شوہر سے کہا ہو کہ وہ ہر صورت بچی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔ بہرحال وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس کی کوشش بستی کے ہر فرد کے لیے سربستہ راز تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ناتوب ماکی نے راتوں رات اپنا موقف کیوں تبدیل کیا۔ یقیناً اس شخص کو بھی نہیں جو اس کہانی کا بنیادی کردار تھا یعنی ناموس کے ہونے والے بچے کا اصل باپ۔

ایک روز صبح سویرے چند محافظ ڈیری فارم پر آئے۔ میں انہیں صورتوں سے پہچانتا تھا۔ وہ سردار سدوت کے اردگرد دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے میرے پاؤں سے بیڑی نکلوائی، زریں کے پاؤں کو آہنی گولے سے آزاد کروایا اور ہم دونوں کو لے کر ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھے۔ ایک محافظ نے ٹوٹی پھوٹی پشتو میں ہمیں بتایا کہ ہم اب ناتوب ماکی کی خدمت سے آزاد ہو گئے ہیں۔

"اب کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" میں نے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ شاید ہم سردار سدوت کے پاس واپس پہنچ جائیں گے لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ محافظ نے بتایا کہ ہمارے نئے "آقا" کا نام کالام خاں ہے۔ وہ اس بستی کے واحد جوئے خانے کا مالک ہے۔ گھوڑا گاڑی بستی کے مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ہمارے نئے ٹھکانے پر جا رکی۔ بستی کے بہت سے مکانوں کی طرح یہ مکان بھی پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا اور زرا سی خراش کے ذریعے اسے خوش نما شکل دی گئی تھی۔ ہمارا نیا مالک کالام خاں ایک غیر معمولی طور پر لمبا شخص تھا۔ سات فٹ سے کم قد کیا رہا ہوگا اس کا۔ جسم مضبوط تھا لیکن چوڑائی پر لمبائی غالب نظر آتی تھی۔ وہاں کے دیگر باشندوں کی طرح وہ بھی بورا رقعا اور بال لیے تھے تاہم وہ زیادہ فصیلا نظر نہیں آتا تھا۔ گھر میں اس کے علاوہ اس کی ماں بھی رہتی تھی اور ایک ملازمہ عورت تھی۔ جوئے خانے میں خورد و نوش کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ یعنی یہ جوا خانہ ایک ہوٹل بھی تھا۔ ہر روز کم و بیش تین سو افراد کا کھانا پکتا تھا۔ گھر ہی کے ایک حصے کو کچن کی شکل دی گئی تھی۔ یہاں چولہوں پر بڑے بڑے سیاہ دیگچے رکھے تھے اور قریباً ایک درجن خادم مصروف کار نظر آ رہے تھے۔ بھیڑ اور دُنبے کے گوشت کے بڑے بڑے پارچے کاٹے جا رہے تھے۔ ایک ناند میں خمیر شدہ آٹے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ آگ کی موجودگی کے سبب یہ جگہ خاصی گرم تھی اور دیگچوں میں بھونے جانے والے مسالوں کی خوشبو دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ خاص طور سے یہاں آ کر زریں گل کی تو باچھیں کھل گئی تھیں۔ وہ ڈیری فارم کی جان لیوا سردی اور گوبر پیشاب کی بو کو یکسر بھول گیا تھا۔ اگر ہمارے لیے اس "نئے آقا" کا انتخاب سدوت نے کیا تھا تو خوب کیا تھا۔ اس قحط زدہ سردی میں اس مطبخ سے بھلی جگہ اور کیا ہو سکتی تھی۔

یہ سرنگ کا وہی علاقہ تھا جہاں آگ جلانے اور روشنی کرنے کی اجازت تھی۔ عجیب بات تھی کہ جوا خانہ "تماشا گاہ" اور سدوت کی رہائش گاہ "تخت" یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔ یہاں پہنچ کر ہمارے پاؤں میں پھر بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس مرتبہ میری طرح زریں کے حصے میں بھی بیڑیاں ہی آئیں۔ رات ہم نے ایک نیم گرم کمرے میں پُرسکون نیند سو کر گزاری۔ اگلے روز ہمیں کام پر لگا دیا گیا۔ کام زریں گل کی منشا کے مطابق تھا۔ ہمیں چاولوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو چُننا تھا۔ پھر خشک انجیروں کا ایک ڈھیر تھا۔ اس میں سے صاف صاف انجیریں نکال کر چاولوں میں ڈالنا تھیں اور ان دونوں اشیا کو رم کرکڑ کے شربت میں بھگونا تھا۔ غالباً یہ کوئی مقامی پکوان تھا۔ زریں گل کے لیے یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ وہ پہرے دار کی نگاہ بچا کر گاہے بگاہے دو تین انجیریں منہ میں ڈال لیتا تھا۔ چند بار اس نے چاول بھی پھانکے۔ کہنے لگا "استاد صیب! اگر ہم کو اس کرما گرم جگہ پر ساری زندگی بھی بیٹھنا پڑے تو ہم بیٹھ سکتا ہے۔ بس یہ چاول اور انجیر کا دونوں ڈھیرا ہمارے سامنے ہونا

چاہیے۔"

"اور کلثوم؟"

"وہ بڑ۔ پورا سا گے پر سوتا ہے۔"

"سا گے پر سو نہیں سونے پر سہاگا ہوتا ہے۔"

"اوپر نیچے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہوتا تو اچھا بات ہی ہے نا....."

"ہوتا تو اچھا ہی ہے لیکن "اوپر نیچے" سے بہت فرق پڑتا ہے۔"

ہم شام تک اپنے کام میں مصروف رہے۔ اندھیرا ہوتے ہی لالٹینیں اور لیمپ وغیرہ جل اٹھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس گھر ہی داری میں نہیں بلکہ گلگت یا سکردو کے کسی حصے میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے اپنے نئے مالک کالام کو دیکھا۔ وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ ہمارے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ اتنا لمبا تھا کہ ہم اس کے پاس کھڑے ہوئے بھی بیٹھے ہوئے لگتے تھے بلکہ زریں تو لیٹا ہوا لگتا تھا۔ وہ کوشش کر کے پشتو کے الفاظ بول لیتا تھا۔ اس نے الفاظ اور اشاروں کی مدد سے ہمیں سمجھایا کہ اگر ہم یہاں دل لگا کر کام کریں گے اور چالاکی وغیرہ دکھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو ہمیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے پوچھا "تم شادی شدہ ہو؟"

وہ بولا "اتنے لمبے اور بے ڈھنگے سے شادی کون کرے گا؟"

"اور وہ عورت جو تمہارے گھر میں ہے؟"

"وہ ماما ہے۔ اس میں سے پیدا ہونے والے بچے میرے نام و نسب کو آگے نہیں چلا سکتے۔"

اگلے روز کالام ہی کے ایک کارندے نے ہمیں یہ کہہ کر چونکا دیا کہ آج شام سردار سدوت ہم سے ملنے یہاں پہنچیں گے۔ اس نے ہماری بیڑیاں بھی کھلوا دیں۔

ہم بے چینی سے سدوت کا انتظار کرنے لگے۔ اندھیرا ہونے پر جب سرنگ کی بھول بھلیوں میں روشنیاں جل اٹھیں تو سدوت آ گیا۔ اس کے ساتھ ننھی زرغونہ بھی تھی۔ وہ پہلے سے کمزور اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ اس کی ذہانت بھری نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا۔ سدوت نے بھی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ بولا "یہ زرغونہ کی ضد تھی کہ وہ آج ہی تم سے ملے گی۔" پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس کا خیال ہے کہ تم اسے ماما پاپا سے ملا سکتے ہو۔ کیا تم نے کوئی ایسی بات کی تھی؟"

میں نے کہا "نہیں..... میں نے خاص طور سے تو کوئی بات نہیں کی۔ بس جیسے تم مصلحت آمیز جھوٹ بولتے ہو، میں نے بھی بول دیا تھا۔"

"لیکن یہ تم پر بے پناہ اعتبار کرتی ہے۔ تمہاری بات اس کے دل میں اتر چکی ہے۔"

ہم "پشتو" میں بول رہے تھے لہٰذا زرغونہ ہماری گفتگو سے لاعلم تھی۔ بس اپنی گہری گہری آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے خاموش کھڑی تھی۔ میں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ پھر بھی گم صم رہی۔ "کیا بات ہے؟" میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

وہ روہانسی آواز میں بولی "آپ مجھے میرے ماما پاپا کے پاس لے کر چلیں گے نا؟"

"ہاں ہاں۔ تم سمجھو تو سہی۔"

"آپ..... آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے نا؟"

"اس سے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے تم سے؟"

اسی دوران میں ہمارا نیا مالک "کالام" بھی آ گیا۔ وہ سردار سدوت کے سامنے مودب نظر آ رہا تھا۔ اس نے سردار کی خاطر تواضع کا خاص طور انتظام کر رکھا تھا۔ سبز زرائپ پر پہلے دودھ اور خشک پھل چنے گئے پھر کھانا لگایا گیا۔ گوشت کے بھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ انہیں مقامی انداز میں دنبے کی چربی میں پکایا گیا تھا۔ میٹھا بھی تھا۔ دنبے اور بیسن کی بنی ہوئی ایک کونہ نما چیز تھی۔ چاولوں کی کھچڑی تھی اور رسا تو میں ملی تھی۔ یہ ایک ہی قسم کی دوا تھی اور اس کا سائز سا گیاں کے پینے سے تھوڑا ہی کم ہوگا۔ سرنگ کی خوش گوار حرارت میں بیٹھ کر کھایا ہوا یہ کھانا یادگار تھا۔ میں اور زریں گل سردار سدوت اور کالام کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اس کا صاف مطلب تھا کہ اس گھر میں ہماری "قیدی کی حیثیت" فقط دکھاوے کی ہے۔ سردار سدوت نے صرف جاتریں کو دکھانے کے لیے ہمیں پابند سلاسل کر رکھا تھا ورنہ ناتوب سے چھٹکارا پاتے ہی ہماری سختی کے دن ختم ہو چکے تھے۔

کھانے کے بعد سدوت نے بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! اسے تم اپنے پاس ہی رکھو اور کوشش کرو کہ کسی طرح یہ بہل جائے۔"

میں نے انگلش میں زرغونہ سے پوچھا "میرے پاس رہو گی؟"

"ہاں میں آپ کے پاس ہی رہوں گی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

مجھے دیکھنے کے بعد وہ ایک پل بھی مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اس رویے کے دو سبب تھے۔ ایک تو وہ میرے پاس خود کو زیادہ محفوظ محسوس کرتی تھی، دوسرے اسے توقع تھی کہ میں اسے ماما پاپا سے ملا سکوں گا۔ اپنے والدین کو دیکھنے کے لیے اس کی آنکھیں ترس گئی تھیں اور گزرنے والے ہر پل کے ساتھ اس کی بے چینی اور الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

سدوت کے جانے کے بعد میں نے زرغونہ کو اپنے پاس بٹھایا اور محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ آہستہ آہستہ اسے ذہنی طور پر تیار کر لوں کہ وہ ایک بری خبر سننے ... لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ معصوم زرغونہ کا حساس دل اتنی بڑی خبر کا بوجھ

برداشت نہیں کر پائے گا۔ والدین کی مسلسل جدائی اور ان کے ملنے کی مسلسل آس نے بچی کے اعصاب کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ خاص طور سے اپنے والد کی جدائی کو وہ بے طرح محسوس کر رہی تھی۔ بریانی کے اندر سے وہ اپنے پاپا کا ذکر نکال لیتی تھی۔ مثلاً میں نے پوچھا کہ اسے چاول اچھے لگے ہیں؟ وہ بولی "بہت اچھے ہیں۔ میرے پاپا بھی بہت پسند کرتے ہیں۔" میں نے اس کی ننھی منی رسٹ واچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا وقت ہوا ہے؟" وہ جواب میں شرما کر بولی "ابھی مجھے وقت دیکھنا نہیں آتا لیکن میرے پاپا کہتے ہیں میں تمہیں سکھاؤں گا۔" میں نے کہا "سردار سعود اچھے ہیں نا۔" وہ کہنے لگی "میرے پاپا کے دوست ہیں نا۔ میرے پاپا کے سارے دوست اچھے ہیں اور صاف ستھرے بھی رہتے ہیں۔ میرے پاپا اور ماماں خود بھی بہت صاف ستھرے رہتے ہیں۔"

پھر وہ ضد کرنے لگی کہ میں اسے ماماں اور پاپا سے ملواؤں۔ وہ تنگ رہی تھی اور اس پر عجیب سی جھنجھلاہٹ سوار ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی "آخر وہ مجھ سے ملتے کیوں نہیں؟" میں نے اسے بڑے دھیمے پن سے سمجھاتے ہوئے کہا "زرغونہ! بات دراصل یہ ہے کہ تمہارے ماماں پاپا وادی میں موجود نہیں ہیں۔ وہ کسی بہت ضروری کام سے نکلے ہیں اور ابھی تک نہیں لوٹے شاید برف باری کے سبب کہیں پھنس گئے ہیں۔"

وہ ایک دم تنک کر بولی "میرے پاپا کہتے تھے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ آپ اتنے بڑے ہو کر جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرے ماماں پاپا کہیں نہیں گئے۔ وہ پھر جھیل پر گم ہو گئے ہیں...." یکایک وہ رونے لگی۔ روتے روتے بولی "مجھے پتا چل گیا ہے وہ جھیل پر گم ہو گئے ہیں۔"

اس کا پورا جسم ہچکیوں کی زد میں تھا اور آنسو گالوں پر بہے چلے جا رہے تھے.... "تم کس جھیل کی بات کر رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس آنکھوں اور ناک سے پانی بہاتی رہی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر ہمارا ملک کلام بھی کمرے کے دروازے پر نظر آنے لگا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا اور پوچھا کہ جھیل کا کیا معاملہ ہے۔ بچی کہہ رہی ہے کہ اس کے ماماں پاپا جھیل پر گم ہو گئے ہوں گے۔"

کلام کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔ پھر جیسے ایک دم اسے کچھ یاد آ گیا۔ بولا "ہاں جی۔ وہ دو برس پہلے کی بات کر رہی ہے۔ اسی موسم میں آنجہانی سردار پاہامہ اور اس کی بیوی کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ منجمد جھیل پر شکار کے لیے گئے تھے۔ وہاں ایک حادثہ ہو گیا تھا اور وہ دو روز گم رہے تھے۔ بچی کی فراست اور ذہانت غضب کی ہے۔ وہ اپنے والدین کی غیر موجودگی سے نتیجہ نکال رہی ہے کہ اب بھی اسی طرح کا کوئی واقعہ ہے۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے واقعے کی تفصیل جاننا چاہی۔

کلام بولا "وادی کے انتہائی شمال میں جہاں مغربی دیوار کے ساتھ ہی نانگا پربت کی ایک ستیلی چوٹی کی برفانی زعفران شروع ہو جاتی ہے، ایک قدرتی جھیل ہے۔ اس جھیل کو مقامی زبان میں اونچی جھیل کہا جاتا ہے۔ موسم سرما شروع ہوتے ہی یہ منجمد ہو جاتی ہے۔ اس جھیل میں ایک چھوٹی سی سیاہ مچھلی پائی جاتی ہے جو حرارت اور طاقت میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ بعض مقامی مہم جو منجمد جھیل میں اس کا شکار کرتے ہیں۔"

"منجمد جھیل میں شکار؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ بڑا دلچسپ طریقہ ہے۔" کلام نے جواب دیا "جھیل پر جمی ہوئی برف کھود کر سوراخ کیے جاتے ہیں۔ نیچے بہتے پانی میں مچھلی موجود ہوتی ہے۔ وہ روشنی دیکھ کر سوراخ میں آتی ہے اور مختلف طریقوں سے پکڑی جاتی ہے۔"

میں نے پوچھا "پاہامہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"ایوالانچ (برفانی ریلا) کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ لوگ جھیل پر شکار کھیل رہے تھے کہ بلندی سے ایوالانچ آتی دکھائی دی۔ بچنے کے لیے وہ لوگ ایک قریبی کھوہ میں گھس گئے۔ بدقسمتی سے ایوالانچ کی سیکڑوں ٹن برف اس کھوہ کے دہانے پر جم گئی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سردار پاہامہ اپنی بیوی اور تین ساتھیوں کے ساتھ کہاں گئے۔ بہت سے لوگوں کو خدشہ تھا کہ وہ مہلک ایوالانچ تلے دب کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ کھوہ کے دہانے پر جو برف جمی تھی اس کی موٹائی پندرہ سولہ فٹ تھی۔ حسنِ اتفاق سے پاہامہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس برف کھودنے کے لیے "آئس پوکر" وغیرہ موجود تھے۔ وہ برف میں راستہ بنانے کی کوشش میں لگے رہے اور کامیاب ہو گئے۔ اس واقعے میں سردار پاہامہ کا ایک ساتھی شدید زخمی ہوا تھا اور بعد میں چل بسا تھا۔ یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں میں اب بھی خوف جگاتا ہے۔ میرے خیال میں بچی کے ذہن میں بھی یہی خوف بیٹھا ہے۔"

کلام خان سے معلومات حاصل کر کے میں واپس زرغونہ کے پاس آیا۔ وہ روتے روتے بڑے لاڈ سے میرا بازو کھینچنے لگی اور مجبور کرنے لگی کہ میں اس کے ساتھ جھیل پر چلوں اور اس کے ماماں پاپا کو تلاش کروں۔

میں نے کہا "بیٹا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے ماماں پاپا کو بستی سے گئے ایک مہینے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ وہ اتنی دیر تک کہاں گم رہ سکتے ہیں۔"

وہ آنسوؤں سے بوجھل آواز میں بولی "وہ پتھروں کے نیچے پھنس گئے ہوں گے۔ بس آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم ان کو ڈھونڈ نکالیں گے۔" وہ ہذیانی انداز میں رونے لگی اور میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔

اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ مجھے اس پر بے انتہا ترس آ رہا تھا۔ زریں گل بھی منہ موڑ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے

زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی ذہین اور حساس بچے سے اس کی حقیقت چھپانا کتنی بڑی غلطی ہے۔ مسلسل فریب کا شکار ہو کر وہ نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کا ننھا سا جسم روئی کی طرح کانپ رہا ہے اور رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا ہے۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس کے ساتھ اٹھ کھڑا نہ ہوا تو وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی اور مرگی کے مریض کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں مڑ جائیں گے۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا "چلو آؤ چلیں۔" میں نے کہا "تم جہاں کہو گی ہم جائیں گے۔"

وہ مجھے کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ زریں گل بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم سرنگ کے ایک چھوٹے دہانے سے باہر نکلے۔ انتہائی سرد اور تاریک رات نے وادی کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ اس وقت اونچی جھیل پر جانے کا کون سوچ سکتا تھا۔ ہم صرف زرغونہ کی تسلی کے لیے سرنگ سے نکل آئے تھے۔ سوئے اتفاق آس پاس کوئی گھوڑا گاڑی بھی نظر نہیں آئی۔

میں نے زرغونہ کو سمجھایا "دیکھو کتنا اندھیرا ہے۔ کوئی سواری بھی نہیں ہے۔ ایسے میں ہم کہاں جائیں گے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ صبح میں تمہارے ساتھ اونچی جھیل پر جاؤں گا اور جیسے تم کہو گی ویسے کروں گا۔"

"اور ماما بھی۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔

زرغونہ کچھ متذبذب نظر آ رہی تھی۔ یہ تذبذب نیم رضامندی کی علامت تھا۔ ہم اسے اٹھا کر واپس سرنگ میں لے آئے۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھی "آپ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے؟" میں ہر بار نفی میں جواب دے رہا تھا۔ مجھے لگا وہ سراپا ایک وحشت ناک بخار میں تپ رہی ہے۔ اسی دوران میں کلام خان بھی وہاں آ گیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم بچی کو کہاں لے گئے تھے۔ میں نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اس کے چہرے پر بھی بچی کے لیے ترحم کے تاثرات نظر آنے لگے۔ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہنے لگا "مجھے تو لگتا ہے اس پر بد ارواح کا سایہ ہو گیا ہے۔ دیکھو کیسی زرد رنگت ہو گئی ہے۔ دیوتا اس پر اپنا رحم کریں۔ میں نے سنا ہے کہ کچھ کٹر قسم کے جارزی اب بھی اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وادی پر سے مصیبت ٹالنے کے لیے "واپسی" کی رسم ہر صورت میں مکمل ہونی چاہیے تھی۔ یہ لوگ درپردہ بچی کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے کلام سے پوچھا۔

"مجھے میری ایک خاص ملازمہ نے بتایا ہے۔ وہ روزانہ اجرت پر میرے قمار خانے میں رقص کرتی ہے۔"

"رقاصہ کا جارزیوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی چیزوں کے تعلقات جارزیوں سے ہی تو ہوتے ہیں۔" کلام نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "جارزیوں میں برہنہ عبادت کے طور پر جو رقص ہوتا ہے اس میں شامل ہونا بڑے اعزاز کی بات سمجھا جاتا ہے۔ عام رنڈیاں اور رقاصائیں اس رقص کے لیے منتخب ہونے کی خاطر بڑھ چڑھ کر تیاری کرتی ہیں۔ رقاصاؤں کو منتخب کرنے کا کام جارزی انجام دیتے ہیں۔ جاتروں کے نیچے تہ خانوں میں وہ رقاصاؤں کی آزمائش کرتے ہیں۔ اس آزمائش کے دوران میں انہیں منہ مانگے کافی مواقع مل جاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم بھی جارزیوں کے خلاف ہو؟"

"ایک بہت بڑا طبقہ جارزیوں کے خلاف ہے لیکن جارزیوں پر کھلے عام تنقید کرنے کی جرأت بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔ جارزی ایسے لوگوں کے بارے میں خطرناک فتوے دیتے ہیں اور ان کا ناطقہ بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

"کیا بڑے جارزیوں کو معلوم نہیں کہ ان میں سے کچھ لوگ بچی کو نقصان پہنچانا چاہ رہے ہیں؟"

"اگر انہیں معلوم ہے تو انہیں بھی معلوم ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہے ہوں۔ درحقیقت یہاں جارزی ناقوب کا فیصلہ بہت سے جارزیوں کے لیے حیران کن ہے۔ اس فیصلے کو دل سے قبول نہیں کیا گیا۔"

علی الصباح زرغونہ بیدار ہو گئی اور میرا بازو ہلا ہلا کر مجھے بھی جگا دیا۔ میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ ابھی صرف چار بجے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ صبح کے شوق میں رات بھر سوئی ہی نہیں۔ اس نے میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "انکل صبح ہو گئی۔ اب چلیں میرے پاپا کے پاس۔"

میں نے زریں گل کو جگایا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور کلمہ شہادت پڑھنے لگی۔ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اگر ہم زرغونہ کو واقعی جھیل تک لے جانا چاہتے تھے تو یہ وقت مناسب تھا۔ ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر بستی سے باہر نکل سکتے تھے۔ زرغونہ کی پیہم ضد دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اسے مزید نہیں ٹالا جا سکتا۔ میں کلام کے محافظ سے اجازت لے کر کلام کی خواب گاہ میں پہنچا۔ وہ دلدار عورت کے ساتھ محوِ خواب تھا۔ بے وقت جگائے جانے کے باوجود وہ برافروختہ نہیں ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ زرغونہ کیا چاہتی ہے اور ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس نے کمال فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیں زرغونہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ تاہم کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سارا دن گزار کر اندھیرا پڑے بستی میں واپس آئیں۔ اس کے علاوہ اپنے چہرے بھی اونی ٹوپیوں میں چھپا کر رکھیں تاکہ ہمارے پہچانے جانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اس نے اپنا ایک مسلح محافظ بھی ہمارے ساتھ کر دیا۔

زرغونہ سمیت ہم چاروں گھوڑا گاڑی پر سرنگ سے روانہ ہوئے اور "اونچی جھیل" کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں دو تین

ہمیں وادی کے مسلح محافظوں نے زرد کا اور کالام کے محافظ کو پہچان کر آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ دشوار گزار راستے سے گزر کر ہم جس وقت منجمد جھیل کے نواح میں پہنچے، سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہم نے گاڑی ایک جگہ درختوں کے نیچے روک دی اور پیدل آگے بڑھنے لگے۔ منجمد جھیل واقعی دیکھنے لائق جگہ تھی۔ برف کا ایک ہموار میدان نظر آ رہا تھا جس کی ایک جانب وادی کی عمودی دیوار تھی اور دوسری طرف گھنے درخت۔ اس عمودی دیوار کو دیکھ کر وادی کی عجیب و غریب ساخت کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ وادی درحقیقت ایک بہت بڑے بیضوی کنویں کی طرح تھی۔ اس کنویں کے کناروں پر خونخوار مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ ہم زرغونہ کو صرف دل بہلاوے کے لیے یہاں لائے تھے ورنہ ہمیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ فی الواقع کہاں ہیں۔ کبڑولین کی نوچی کھسوٹی لاشیں جنوبی کنارے کی چٹانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور پاپامہ کا جسم منقش صندوق میں بند بستی کے قبرستان میں رکھا تھا۔

جھیل کی منجمد سطح پر چلتے ہوئے اچانک میں ٹھٹک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی دائیں جانب کے درختوں میں ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اس سے پہلے گھوڑا گاڑی میں بھی مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی ہمارے اردگرد موجود ہے۔ کوئی گھڑ سوار یا کوئی گھوڑا گاڑی؟ میں نے زریں کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی بے خبر نظر آ رہا تھا۔ مسلح محافظ ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ یکایک درختوں سے چار افراد نکلے اور وحشی جانوروں کی طرح ہم پر جھپٹے۔ انہوں نے اپنے چہرے اونی ٹوپیوں اور مفلر نما کپڑوں میں چھپا رکھے تھے۔ ان کے لباس بے ڈھنگے تھے اور ہاتھوں میں چمک دار کلہاڑے۔ مجھے وہ لمحات یاد آ گئے جب ان جنگجوؤں نے ہمیں اسی وادی کے نواح سے پکڑا تھا۔ وہ اپنے ہلاکت خیز کلہاڑوں کے ساتھ اسی طرح اچانک ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ایک مجسم جثیم شخص تیر کی طرح میری طرف آیا اور اس نے زرغونہ کو مجھ سے چھیننا چاہا۔ میں نے دھکا دے کر اسے دور ہٹا دیا۔ ایک دوسرا شخص زرغونہ کی طرف جھپٹا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے کلہاڑے سے مجھے دھمکانے کی کوشش کی۔ زرغونہ میرے بازو سے چمٹ گئی اور چیخنے لگی۔ میں زرغونہ کو لے کر تیزی سے پیچھے ہٹا۔ ایک بڑے سے شخص نے مجھے عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ایک اور شخص نے کمال پھرتی کے ساتھ ہمارے ساتھ آنے والے مسلح پہرے دار سے اس کی بارہ بور رائفل چھین لی تھی اور پہرے دار کے ساتھ ساتھ زریں گل کو بھی نشانے پر لے لیا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ لوگ زرغونہ کے لیے آئے ہیں۔ میرے کانوں میں کالام خان کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے کل کہا تھا کہ چند کٹر قسم کے جاتری ابھی تک زرغونہ کی جان کے درپے ہیں۔ یہ لوگ جو ہم پر حملہ آور ہوئے تھے چہرے چھپا کر آئے تھے مگر صاف پتا چل رہا تھا کہ ان کا تعلق بانڈے سے ہے۔ ان میں سے ایک شخص کی آواز بھی میں نے واضح طور پر پہچان لی تھی۔ یہ ساری باتیں ایک سیکنڈ کے مختصر وقت میں میرے ذہن میں آئیں۔ اگلے ہی لمحے میں نے نیچے جھک کر اپنے جسم کو جھٹکا دیا۔ مجھے عقب سے دبوچنے والا شخص میرے کندھے پر سے ہوتا ہوا میرے سامنے گرا۔ اسے یوں اچھلتے اور گرتے دیکھ کر میرے سامنے کھڑے شخص نے بڑی درندگی اور وحشت کے ساتھ مجھ پر کلہاڑے کا وار کیا۔ جیسے کوئی بلے باز جان لیوا باؤنسر سے اپنا سر بچاتا ہے، میں تیزی سے نیچے جھکا۔ کلہاڑے کا چمکیلا پھل میرے سر کے اوپر سے گزرا۔ میں نے کلہاڑا بردار کی چھاتی پر ٹانگ رسید کی اور اسے کئی گز پیچھے دھکیل دیا۔ یہی لمحات تھے جب میں نے زریں گل کو دیکھا۔ وہ کسی صحت مند جنگلی بلے کی طرح اچھلا تھا اور رائفل بردار پر جا پڑا تھا۔ ایک دم اس منجمد جھیل پر گھمسان کا رن پڑ گیا۔ ہم تینوں نقاب پوش حملہ آوروں سے بھڑ چکے تھے۔ ایک کلہاڑا بردار کو نشیب میں لڑھکانے کے بعد میں نے روتی چیختی زرغونہ کو اٹھایا اور درختوں کی طرف بھاگا مگر چند ہی قدم گیا تھا کہ کلہاڑے کا اچٹتا سا وار پشت پر لگا۔ موٹے کپڑوں کے سبب جسم زخم سے محفوظ رہا تاہم دھکا لگنے سے میں زرغونہ سمیت اوندھے منہ گرا۔ تھوڑی سخت برف سے ٹکرائی اور آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ دو بدبودار افراد جنگلی جانوروں کی طرح مجھ سے لپٹ گئے اور زرغونہ کو چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ میرے بازوؤں میں محصور تھی اور اس نے اپنا چہرہ میری بغل میں چھپا رکھا تھا۔ وہ ننھا سا چیختا چلاتا جسم میرے جسم ہی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ میں جانتا تھا مجھے زرغونہ کو بچانا ہے۔ یکایک میرے جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنے قریب ہی کہیں ناشا کی آواز سنی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ چیختی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس کا اونی لبادہ اوورکوٹ کی طرح ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جو میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی اس لڑائی میں کود گئی۔ اس باغی لڑکی کا یہ جارحانہ روپ متاثر کن تھا۔ وہ لڑنے کے ساتھ ساتھ جاتروں کی شان میں "قصیدے" بھی پڑھ رہی تھی۔ میں نے سر کی زوردار ٹکر سے ایک حملہ آور کی ناک کی ہڈی کا کڑاکا نکالا اور دوسرے کے پیٹ میں پاؤں جما کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ ہموار برف پر اسکیٹنگ کے انداز میں دور تک پھسل گیا۔ اسی دوران میں مجھے دو افراد مزید نظر آئے۔ یقینی طور پر وہ بھی حملہ آوروں کے ساتھی تھے۔ کلہاڑے سونتے وہ ہماری طرف آئے۔ میں نے یہ منظر دیکھ کر اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا چھرا کھینچ لیا۔ نو انچ لمبے پھل کا چھرا دھندلی روشنی میں "چشم اجل" کی طرح چمکا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی کھنچتی چلی جا رہی تھی۔ ناشا نے میرے ہاتھ میں چھرا دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دم سے سہم گئی تھی۔ اسی حالت میں وہ چیخی "کسی کو قتل مت کرنا شاہ جہاں..... بھاگ جاؤ یہاں سے..... بچی کو لے کر بھاگ جاؤ۔"

اس کی آواز میں وہ خوف پنہاں تھا جو جاتریوں کے حوالے سے یہاں ہر فرد کے دل میں موجود تھا۔ ناشا ایک باغی لڑکی تھی مگر اس کے دل میں بھی یہ خوف موجود تھا۔ اس اندیشے سے کہ میں کسی جاتری کو قتل کر کے بھیانک سزا کا حقدار نہ ٹھہر جاؤں، وہ مجھے روک رہی تھی لیکن اب رکنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے بہت صبر کر لیا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب زرغونہ کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ میری ٹانگ سے چمٹی ہوئی تھی اور رو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اب ایک لمحے کی سستی بھی زرغونہ کی زندگی کو آندھی کی طرح اڑا لے جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ شاید ہماری زندگیوں کو بھی۔ اب ان جاتریوں کا مزید "احترام" میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے چھرے کا پہلا وار ایک کوتاہ قد جاتری کے پیٹ پر کیا۔ ناف میں لگنے والا چھرا اس کے پیٹ کو سینے تک چاک کر گیا اور ایک سیکنڈ میں لہو رنگ ہو کر باہر نکل آیا۔ ایک دوسرا حملہ آور دہشت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا جب میرے چھرے نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی شہ رگ بھی کاٹ دی۔ ناشا اور زرغونہ کی دہشت زدہ چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ دو افراد کو اپنے ہی خون میں تڑپتے دیکھ کر حملہ آور ٹھٹک گئے تھے۔ پھر دو افراد نے ایک ساتھ اپنی رائفلیں سیدھی کیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ اس وادی کے مکین "فائرنگ" انتہائی ضرورت کے وقت ہی کرتے تھے اور یہ "ضرورت کا وقت" تھا۔ وہ رسک لینے پر مجبور تھے۔ ایک رائفل کے نشانے پر میں تھا اور دوسری رائفل ہمارے ساتھی پہرے دار کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میں نے خود کو نشیب پر گرا لیا تھا لیکن ہمارا ساتھی پہرے دار بروقت ایسا نہیں کر سکا۔ لونگ رینج گولی اس کا سینہ چیر کر گزر گئی۔ زریں گل بلائے ناگہانی کی طرح اس رائفل بردار پر جھپٹا جس نے مجھ پر فائر کیا تھا اور اسے لیتا ہوا نشیب میں لڑھک گیا۔ میں نے دوسرے رائفل بردار پر چھلانگ لگائی اور پوری وحشت سے چھرا اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اسی دوران میں نشیب سے فائر کی آواز آئی۔ دھوئیں کا چھوٹا سا مرغولہ درختوں کی طرف محو پرواز ہوا اور میں نے زریں گل کو فاتحانہ انداز میں نشیب سے نمودار ہوتے دیکھا۔ یقیناً اس نے رائفل بردار سے رائفل چھین کر اسے نشانہ بنایا تھا۔ اس کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے اور ان لمحات میں وہ "زریں گل" کے بجائے جنگ جُو پٹھان نظر آ رہا تھا۔ جان جس کی ہتھیلی پر رہتی ہے اور بارود کا دھواں جس کے لیے جاں فزا مشک کی طرح ہوتا ہے۔ نشیب سے برآمد ہوتے ہی اس کی نگاہ خون آلود چھرے پر پڑی اور اس کا حوصلہ دس گنا بڑھ گیا۔ اس نے حملہ آوروں کو للکارا اور یکے بعد دیگرے کئی فائر کیے۔ اس فائرنگ سے ایک کلہاڑا بردار زخمی ہوا اور باقی وحشت زدہ انداز میں بھاگ گئے، اخروٹ اور چیڑ کے درختوں میں روپوش ہو گئے۔

ناشا زمین پر گری پڑی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا اوپر کلہاڑے کا پھل لگا تھا اور گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ اس کی ناک سے بھی مسلسل خون رس رہا تھا۔ کوئی عام لڑکی ہوتی تو اپنی ران کے زخم کا سفید سفید گوشت دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی۔ لیکن وہ نیم وحشی لڑکی تھی۔ اپنا خون دیکھ کر اس پر عجیب طرح کی وحشت آمیز مستی سوار ہو گئی تھی۔ ہمارے اردگرد کا منظر لرزہ خیز تھا۔ سپید برف پر خون کی دہشت ناک گلکاری نظر آ رہی تھی۔ دو تین منٹ کے اندر چار افراد نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے تھے اور دو افراد ابھی تک زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں ہمارا ساتھی پہرے دار بھی شامل تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور پشت سے چمڑے کی سیاہ جیکٹ پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ باقی تین افراد میں سے ایک زریں گل کی چلائی ہوئی گولی کا شکار ہوا تھا اور دو کی جان میرے چھرے نے لی تھی۔ زخمیوں میں سے بھی ایک کے پیٹ کو میرے چھرے نے "بوسہ" دیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا رکھا تھا اور برف پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ زریں گل نے آگے بڑھ کر اس کی اونی ٹوپی کھینچی۔ نیچے سے جو جاں بہ لب چہرہ برآمد ہوا اس کے سر اور داڑھی کے بال بالکل صاف تھے۔ بلاشبہ اس شخص کا تعلق جاتروں سے تھا۔ مجھے لگا جیسے آج ہمارے مرحوم صحافی دوست شاہد خان نے بھی یہ منظر دیکھا ہے اور اپنے کچھ قاتلوں کو خون میں لت پت دیکھ کر اس کی روح کو تھوڑا سا سکون ملا ہے۔

"پانچ بندے مر گئے ہیں۔ جاتری قیامت اٹھا دیں گے۔" ناشا نے لرزاں لہجے میں کہا۔

"پانچ نہیں چار۔" میں نے تصحیح کی۔

"نہیں پانچ۔" اس نے زور دے کر کہا "وہ دیکھو۔" اس کی انگلی ایک جانب اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے دیکھا، وہاں منجمد جھیل کی سطح پر دراڑیں سی نظر آ رہی تھیں اور برف کے تین چار بڑے بڑے ٹکڑے ہولے ہولے ڈول رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کسی دباؤ کے سبب برف کی نو دس انچ موٹی تہہ ٹوٹ گئی ہے۔ ناشا نے کہا "ایک جاتری اس کے نیچے ڈوب گیا ہے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ صورت حال میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک حملہ آور یہاں کی منجمد سطح توڑ کر نیچے چلا گیا تھا۔ اس کے اوپر برف کے بڑے بڑے ٹکڑے پھر برابر ہو گئے تھے اور وہ برف کی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔ ناشا میرا بازو کھینچتے ہوئے بولی "چلو..... یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ کتوں کی طرح اس طرف دوڑے آئیں گے۔ پھر ہمارا نکلنا محال ہو جائے گا۔"

زرغونہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ایک مسلسل ہچکی اس کے جسم کو دہلا رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھایا۔ زریں گل نے زخمی ناشا کو سہارا دیا اور ہم تیزی سے گھنے درختوں کی طرف

بڑھے۔ ناشا کی ٹانگ زخمی تھی اس کے باوجود وہ ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔ زریں گل کی طرح میرے ہاتھ میں بھی حملہ آوروں سے چھینی ہوئی را تفل موجود تھی اور ہم ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

چیڑ، اخروٹ اور دیودار کے فلک بوس درختوں کے نیچے دھند پھیلی ہوئی تھی اور ہمارے قدموں تلے خزاں رسیدہ پتے چرمرا رہے تھے۔ ناشا ان راستوں کے پیچ و خم سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ وہ کبھی ہمیں لے کر کسی جھنڈ میں سے گزرتی اور کبھی کسی نیم تاریک کھائی میں اتر جاتی۔ بیس پچیس منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم نے اچانک خود کو بستی کے نواح میں پایا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہ ایک سنسان جگہ تھی۔ خزاں رسیدہ درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک تنہا مکان نظر آ رہا تھا۔ قریب قریب مکانوں کی طرح اس مکان کی چھت پر بھی کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ زریں گل نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ام نے مہندر سنگھ سے واکی ٹاکی پر بات کیا تھا۔ یہاں ناشا کا سہیلی رہتا ہے۔"

ہم مکان میں داخل ہو گئے۔ یہاں سرنگ نما لمبے لمبے کمرے تھے۔ ناشا کی سہیلی ناشا ہی کی طرح ایک لمبی تڑنگی اور جنگلی عورت تھی۔ بہرحال وہ ناشا کی طرح خوش شکل نہیں تھی اور اس کی عمر بھی کچھ زیادہ تھی۔ اس کا نام "راختی" معلوم ہوا۔ وہ بیوہ تھی۔ وہ اس مکان میں اپنے چار بچوں کے ساتھ رہائش رکھتی تھی۔ ایک چھوٹا سا باغ ان کا ذریعہ معاش تھا۔

اس پناہ گاہ میں پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے ناشا کی مرہم پٹی کا انتظام کیا۔ زریں گل کی ایک انگلی پر بھی سخت چوٹ لگی تھی اور وہ دو مہان سے نیلی ہو رہی تھی۔ اپنی اپنی چوٹیں سہلانے کے بعد ہم ایک اندرونی کمرے میں چلے گئے۔ ناشا کی سہیلی ایک چھوٹے بچے کو لے کر باہر چلی گئی۔ وہ دیکھنے گئی تھی کہ جھیل پر ہونے والے خونی واقعے کے متعلق لوگوں کی کیا رائے ہے۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی اور اس نے بتایا کہ جانزو کے پانچ بندے مارے جانے پر بستی میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے اور جانزو میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ ہلاک ہونے والوں میں مہمان جارزی "تانوب" کا ایک بھتیجا بھی شامل تھا۔

O☆O

تین دن ہم نے اس مکان میں بڑی خاموشی سے گزارے۔ اب ہم جاتریوں کے قاتل تھے اور ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ زرغونہ حد درجہ ڈری سہمی تھی اور اسی ڈر کی وجہ سے اسے بخار ہو گیا تھا۔ اس ننھی سی جان نے خود کو قاتل کلہاڑوں کی زد میں دیکھا تھا اور پھر پانچ افراد کی بھیانک موت دیکھی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ وقتی طور پر ماں باپ سے ملنے کی "ضد" بھی بھول گئی تھی۔ بار بار کبھی رات کو سوتے میں اس کے زرد ہونٹ تھرا

اٹھتے اور وہ "بابا۔۔۔ بابا" پکارتی۔ جب کبھی اس کی بڑبڑاہٹ مقامی زبان میں ہوتی، میں سمجھنے سے قاصر رہتا۔

ان تین دنوں میں "میں" نے ایک عجیب بات محسوس کی تھی۔ اس مکان کے عقبی حصے میں ایک اندھیری کوٹھڑی سی تھی۔ کوٹھڑی تک پہنچنے کے لیے ایک تنگ گلی سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس گلی میں ایک نالی تھی جس میں کسی چشمے سے نکلنے والا پانی بہتا رہتا تھا۔ گلی میں بہت سا جھاڑ جھنکاڑ پڑا تھا (یا جان بوجھ کر پھینک دیا گیا تھا) کوٹھڑی تک پہنچنے کے لیے رکوع کے بل جھک کر اس جھاڑ جھنکاڑ کے نیچے سے گزرنا پڑتا تھا۔ بظاہر یہ کوٹھڑی ویران پڑی تھی اور اس کے دروازے پر زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کوٹھڑی کے اندر کوئی رہتا ہے۔ میں نے شب کی تاریکی میں دو تین بار ناشا کی سہیلی کو اس اندھیری گلی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ کبھی کبھار کوئی آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ایک شام بستی کی طرف سے نوبت بجنے جانے کی آواز آئی۔ یہ نوبت ایک خاص انداز میں بجائی جا رہی تھی۔ کبھی اس کا آہنگ بلند اور کبھی دھیما ہو جاتا تھا۔ نوبت کی آواز سنتے ہی گھر میں ہلچل نظر آنے لگی۔ راختی کے فاقہ زدہ بچوں کے چہروں پر اُمید کی کرن نمودار ہوئی اور وہ باہر کو بھاگے۔ راختی بھی جلدی جلدی کمروں کے دروازے بند کر کے بستی کی طرف روانہ ہوئی۔ جاتے جاتے وہ مقامی زبان میں زریں گل سے کچھ کہہ گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر زریں گل نے بتایا "خوا ہمارا سمجھ میں تو اتنا ہی آیا ہے کہ بستی میں کھانا وغیرہ تقسیم ہوگا۔ شاید بستی کا ڈاکو لوگ کہیں پر ڈاکا مارنے میں کامیاب رہا ہے۔"

میرا ذاتی خیال بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ سب آناً فاناً نکل گئے تھے اور گھر ایک دم بھائیں بھائیں کرنے لگا تھا۔ میں اور زریں گل اپنے کمرے میں بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ زرغونہ سو رہی تھی۔ قریباً ایک گھنٹا گزر گیا مگر کوئی واپس نہیں آیا۔ اچانک مجھے لگا کہ جھاڑ جھنکاڑ کے پیچھے چھپی ہوئی کوٹھڑی میں کوئی رو رہا ہے۔ میں نے غور سے سنا، میرے کان دھوکا نہیں کھا رہے تھے۔ کوئی شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ بول رہا تھا۔ میں اور زریں کمرے سے باہر نکلے اور نیم تاریک گلی میں پہنچ گئے۔ آوازیں اب واضح تر ہو گئی تھیں۔ پھر ایک دم ۔۔۔ کوٹھڑی میں موجود شخص دروازے پر مکے برسانے لگا۔ میں اور زریں جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر کر دروازے تک پہنچے۔ اتفاقاً میری نگاہ دروازے سے اوپر دیوار کے ایک چھوٹے سے طاق میں پڑی۔ یہاں دروازے کے قفل کی چابی موجود تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے مقفل دروازہ کھول دیا۔ مجھے ایک حیرت ناک منظر دکھائی دیا۔ کمرے کے وسط میں ایک شخص اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور ماتم کناں انداز میں رو رہا تھا۔ اس کے جسم پر انتہائی بوسیدہ لباس تھا اور بال جناؤں کی صورت چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ

محمود احمد مودی کا سسپنس، اسرار اور لہو میں ڈوبا تحیر خیز ناول

لہو کا سراغ

ایک شیطان صفت قاتل اور پر اسرار قوت کی مالک نرم و نازک لڑکی کے مقابلے کی دلچسپ روئیداد

اپنے قریبی بک سٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

قیمت 80/- روپے
ڈاک خرچ 20/- روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ۔

ناشر۔ علی میاں پبلی کیشنز۔ 20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 7247414

سٹاکسٹ:۔ علی بک سٹال۔ نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ 7223853

اس کی پیشانی پر پرانے زخم کا ایک نہایت بدنما داغ تھا۔ اس داغ کے سبب اس کی ایک آنکھ چھوٹی نظر آتی تھی اور دونوں ابرو آپس میں مل گئے تھے۔ بادی النظر ور ایک کریہہ شخص تھا اور اسے ماند عبرے میں اچانک دیکھ کر کوئی بھی خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیں دیکھے بغیر بولتا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا کرب سمٹا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کی نگاہ ہم پر پڑی اور وہ ششدر رہ گیا۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دروازہ کھولنے والے ہم ہوں گے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مقامی زبان میں تیز تیز بولنے لگا۔

زریں گل اس کی باتیں کسی حد تک سمجھ رہا تھا اور بار بار اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر زریں گل نے اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ بدنما شخص قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

زریں گل کی زبانی مجھے پتا چلا کہ یہ شخص شراب کا سخت رسیا ہے۔ وادی میں قحط سالی کی وجہ سے مقامی اور غیر مقامی شراب ناپید ہو گئی ہے۔ اب شراب کی جان توڑ طلب نے اس شخص کو ہلکان کر رکھا ہے اور یہ دیواروں سے سر ٹکرا رہا ہے۔

شراب کو اپنی کمزوری بنا لینے والے لوگوں کو جب یہ انگور کی بیٹی دستیاب نہیں ہوتی تو ان کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ تاہم بدنما شخص کی آنکھوں میں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ شخص بستی کے عام افراد کی طرح بدتہذیب شرابی نہیں۔ کوئی اندرونی آگ ہے جسے وہ سیال آتش سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی دوران میں خاتون خانہ یعنی ناشا کی سہیلی راخشی اپنے بچوں کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئی۔ ہمیں بند کوٹھری میں بدنما شخص کے ساتھ پا کر وہ بری طرح چونکی۔ پھر وہ ہمارے پاس آئی اور قینچی کی طرح زبان چلانے لگی۔ اس کا مخاطب زریں تھا کیوں کہ وہی یہ دھواں دھار زبان سمجھتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ راخشی کے بچوں کے ہاتھ میں کھانے پینے کی مختلف اشیا تھیں۔ مثلاً بسکٹ، ڈبل روٹی، خشک خوبانی اور خشک خوراک کے ڈبے۔ اس کے علاوہ بڑا بچہ ایک جہازی ساخت سوئٹر بھی اٹھائے ہوئے تھا۔ ان اشیا کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کوہ پیما مہم کا مال و متاع ہے جو فوں ویزا کالونی میں ان لوگوں کے ہاتھ لگا ہے۔

زریں سے بات کرنے کے بعد راخشی قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں سفید شراب کی ایک بوتل تھی۔ یہ بوتل اس نے بدنما شخص کے حوالے کی اور تسلی تشفی کی کچھ باتیں کرنے کے بعد اسے دوبارہ کمرے میں بھیج کر دروازہ بند کر دیا۔ بعد ازاں وہ ہمارے ساتھ صحن میں آ گئی۔ چند منٹ تک زریں سے اس کی گفتگو ہوئی اور پھر وہ واپس چلی گئی۔ میں نے زریں سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔

زریں نے بتایا "یہ شخص ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ اس کے ماتھے پر کیسا برا داغ ہے۔ راخشی نے اسے اپنے گھر میں رکھ کر اس کا علاج معالجہ کیا تھا۔ بس تب سے یہ اسی گھر میں پڑا ہے۔ جب یہ زخمی ہوا تو اس کی شادی ہونے والی تھی لیکن اب یہ شادی کرانا چاہتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں کے سامنے جانا چاہتا ہے۔ پچھلے سات آٹھ ماہ سے وہ اس کوٹھری سے نکلا ہی نہیں تھا۔ خراب وہ شراب اور دیگر نشوں کی لت میں بھی گرفتار ہو گیا ہے اور دن رات مدہوش رہنا چاہتا ہے۔ اس کے پاس رقم موجود ہے، وہ اپنا خرچہ خود اٹھاتا ہے۔ راخشی نے بس اسے رہنے کے لیے کوٹھڑی دی ہوئی ہے۔"

اس رات راخشی نے ہم کو ذرا بہتر کھانا دیا۔ اس میں دودھ بھی شامل تھا جو یقیناً ملک پاؤڈر سے بنایا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں صحن میں ٹہلنے کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو زریں گل ابھی تک کھانے کے خالی برتنوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کی نگاہیں اپنی زخمی انگلی پر مرکوز تھیں اور وہ بے خیالی میں ہولے ہولے انگلی کو ہلائے جا رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ انگلی اس لیے زخمی ہوئی ہے کہ تم اس سے بہت غلط کام لیتے رہے ہو۔"

"کس سلسلے میں؟" زریں نے پوچھا۔

"اپنی محبوبہ کلثوم کے سلسلے میں ___ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ اپنی کوٹھڑی کی کھڑکی میں بیٹھ کر تم اسی انگلی سے اس کو اشارے کرتے تھے اور اپنے پاس بلاتے تھے۔"

"استاد صیب! آپ کیسا بات کرتا ہے۔ ام اس انگلی کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہے۔ ام کسی اور بارے میں سوچ رہا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے بتاؤ شاید میں تمہارا مسئلہ حل کر سکوں۔"

وہ بولا "آج شام جب راخشی اس بند کوٹھڑی والے بندے سے بات کر رہا تھا تو راخشی نے اس کا نام "آمن" لیا تھا۔ ام کو لگتا ہے کہ ام نے کچھ دن پہلے یہ نام کہیں سنا تھا۔"

"آمن" میں نے زیر لب دہرایا۔ فوری طور پر تو کچھ یاد نہیں آیا لیکن چند سیکنڈ بعد ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آمن اس لڑکے کا نام تھا جس نے کوکی دادا کی بیٹی سابینہ سے خفیہ شادی کی تھی اور پھر ایک روز اچانک گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ کوکی دادا کی بیٹی سابینہ اپنے معصوم بچے کو گود میں لے کر برسوں اپنے محبوب کی واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی اور ہر شام مایوس اور نڈھال ہو کر سو جاتی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ اس کا محبوب روزگار کی تلاش میں گیا ہوا ہے اور جلد ہی لوٹ آئے گا لیکن اس کے باپ کوکی دادا کا کہنا تھا کہ وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ وہ سابینہ کو دھوکا دے کر فرار اختیار کر چکا ہے ___ یہ ساری باتیں ایک سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میرے ذہن میں گھوم گئیں ___ تو کیا یہ وہی آمن تھا؟ کیا یہ وہی! اکبر چوہدری کا شاگرد تھا جو کسی "کامل چاندنی" نامی جڑی بوٹی کی تلاش میں نکلا ہوا تھا!

زریں گل بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "خو صی

ب کچھ پریشان ہو گیا ہے۔"

میں نے زریں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "زریں! کہیں یہ وہی آمن تو نہیں جس نے کوکی دادا کی بیٹی سے خفیہ شادی کی تھی۔"

ایک دم زریں کے چہرے پر بھی ہیجان کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ہونٹ سکوڑ کر بولا "او خدایا! ام کو یاد آ گیا۔ یہی نام تو بتایا تھا سابینہ نے ___ اوہو! ادا دماغ بھی ایک دم ٹھس ہے۔"

میں نے کہا "زریں گل! اگر یہ وہی آمن ہے تو ہمارے کئی مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔"

"مثلاً کیا؟" زریں گل نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ذرا واکی ٹاکی نکالو۔ میں صفدر سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔"

زریں نے بستر کے نیچے چھپایا ہوا واکی ٹاکی نکال لیا۔ یہ واکی ٹاکی ہم نے مسلسل اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا اور چار دن پہلے جب ہم کالام خان کے "گھر" سے روانہ ہوئے تھے تو واکی ٹاکی زریں کے لباس میں موجود تھا۔ میں نے صفدر سے رابطہ کرنا چاہا تو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ بستی کے مختصر حالات معلوم کرنے کے بعد میں نے صفدر کو ہدایت کی کہ وہ فوراً ناشا کو تلاش کرے اور اسے "راخشی" کے گھر بھیجے۔

میری اس کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ناشا میرے سامنے بیٹھی تھی۔

رسمی بات چیت کے بعد میں نے ذرا ڈرامائی انداز میں ناشا سے کہا "ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس گھر میں راخشی کے علاوہ اور کون رہتا ہے۔" ناشا بری طرح ٹھٹک گئی۔ میں نے کہا "اس کا نام آمن ہے اور وہ کوکی دادا کا ہونے والا داماد ہے۔"

ناشا نے اپنے دلی تاثرات چھپائے اور انجان بن کر بولی "کون آمن؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے ناشا کو سمجھایا کہ ٹال مٹول سے کچھ حاصل نہیں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ وہی آمن ہے جس سے سابینہ محبت کرتی تھی اور اب جس کے انتظار میں رو رو کر وہ اپنی آنکھیں گنوا رہی ہے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ اور تھوڑے سے تذبذب کے بعد ناشا مان گئی۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بڑے "مردانہ" انداز میں اپنی زخمی ران کو سہلایا اور بولی "ہاں یہ وہی آمن ہے ___ لیکن ایک بات یاد رکھو۔ اس شخص کو یہاں کسی نے زبردستی نہیں رکھا ہوا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ زبردستی یہاں رہ رہا ہے۔ اس نے دو تین بار پہلے راخشی کو دھمکی دی تھی کہ اگر راخشی نے اسے نکالنے کی کوشش کی یا اس کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ خودکشی کر لے گا۔ درحقیقت ___ وہ بہت پیار کرتا تھا اس لڑکی سے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس لڑکی کا سامنا اس حالت میں کر سکے۔ وہ مر جائے گا لیکن بستی میں واپس نہیں جائے گا۔"

"مگر اسے ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ابھی تک اس نے ٹھیک سے نہیں بتایا ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ چھ سات ماہ بستی سے غائب رہنے کے بعد واپس آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بڑے شوق اور جوش و خروش کے ساتھ واپسی کے دن گن رہا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ میرے خیال میں آمن کسی کھائی میں گرا ہے۔ پتھر لگنے سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں تو یہ اس نوجوان کی بڑی بے وقوفی ہے کہ وہ اپنوں میں واپس جانے کے بجائے خود کو نشے میں برباد کر رہا ہے۔"

"میں نے بتایا ہے ناکہ وہ اس لڑکی کو اپنی صورت نہ دکھانے کی قسم کھا چکا ہے جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔"

میں نے کہا "ناشا! تم بھی ایک عورت ہو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ آمن ٹھیک کر رہا ہے؟" ناشا خاموش رہی۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "جہاں تک میں عورت کو سمجھتا ہوں، ایک اچھی عورت اپنے شوہر کی شکل و صورت سے زیادہ اس کی ذات سے پیار کرتی ہے۔ اس وجود سے پیار کرتی ہے جو اسے "ماں" بناتا ہے اور اس کی نسوانیت کو اپنی محبت سے مکمل کرتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم، تم کیا انٹ شنٹ بول رہے ہو۔ بہرحال میرا بھی یہ خیال ہے کہ آمن زبردست ذہنی الجھنوں کا شکار ہے۔ مرد ایسے ہی بے کار ہوتے ہیں۔ شاید تم بھی ایسے ہی ہو ___ اگر آمن حوصلہ کرے اور اپنے پاگل پن پر قابو پا کر اس لڑکی کے پاس چلا جائے تو وہ یقیناً اسے قبول کر لے گی۔ اسے محبت بھی دے گی، اس کے بچے بھی پیدا کرے گی اور وہ سب کچھ کرے گی جو گھریلو عورت کا نصیب ہوتا ہے۔"

میری نگاہوں میں سابینہ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی وہ آنکھیں یاد آ رہی تھیں جن میں اپنے محبوب کا انتظار منجمد ہو چکا تھا۔ اس کے مہر بلب ہونٹ یاد آ رہے تھے ___ یہ بات ضرور تھی کہ آمن کا مسخ چہرہ دیکھ کر سابینہ کو زبردست جھٹکا لگتا لیکن زخمی چہرے والے آمن کا ملاپ اس جدائی سے بہت بہتر تھا جو سابینہ کو اب جھیلنا پڑ رہی تھی۔ وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح سوکھتی جا رہی تھی اور قریب قریب مرجھا کر ختم ہونے والی تھی۔ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس طرح اچانک سابینہ کے گم شدہ محبوب سے ملاقات ہو جائے گی۔ بلکہ میں اس واقعے کو بہت حد تک بھول ہی چکا تھا۔ اب وہ سب کچھ پھر سے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

میرے کانوں میں وہ الفاظ گونج رہے تھے جو آمن نے بوقت رخصت سابینہ سے کہے تھے "سابینہ! اپنے آمن پر بھروسا رکھنا۔ میں جا رہا ہوں لیکن بہت جلد واپس آؤں گا۔ واپس آتے ہی میں

پوری شان اور عزت سے تمہیں بیاہ کر اپنے گھر لے آئیں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ جب سردیاں ہٹ جائیں اور چشموں میں پانی بہنے لگے اور درختوں پر پتے آجائیں تو میرا انتظار شروع کر دینا۔"

اور وہ انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کہا ہے نا کہ محبت کرنے والوں کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ایک نرم گوشہ موجود رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں بھی اس جذبے کا ڈسا ہوا ہوں۔ میرے دل کی گہرائیوں میں بھی ایک نام زخم کی طرح درج ہے۔ میرے دل میں آمن کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور آمن سے ہمدردی کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اسے احساسِ کمتری اور محرومی کی دلدل سے نکال کر سابینہ کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا۔ وہ جیسا بھی تھا جس حال میں بھی تھا اپنی محبوبہ کے سامنے آجاتا۔

میں اور ناشا دیر تک مصروفِ گفتگو رہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع آمن اور سابینہ ہی تھے۔ آخر میں نے خود سر ناشا کو قائل کر لیا کہ وہ سابینہ کو رازداری سے یہاں لے آئے اور ہم اسے آمن کے سامنے لا کھڑا کریں۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ کسی بات پر ناشا کا رنگ پیلا پڑا ہے۔ وہ بولی "اگر اس خود ماغ نے سچ مچ خود کشی کر لی تو؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ناشا میرے پاس سے اٹھ گئی۔ وہ اس سلسلے میں اپنی سہیلی راخشی سے بھی مشورہ کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے کہا "تم اس معاملے میں راخشی کو مت گھسیٹو۔ ہم راخشی کو اس وقت بتائیں گے جب معاملہ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔"

نجانے کیسے میری بات ناشا کی سمجھ میں آگئی اور وہ مجھ سے یہ وعدہ کر کے کہ جلد از جلد سابینہ کو یہاں لے آئے گی، واپس چلی گئی۔

زریں گل بولا "استاد صیب! یہ آپ کیا گڑ بڑ گھوٹالا فرما رہا ہے۔ ام کو کیا ضرورت پڑا ہے عاشقوں اور معشوقوں کو ملانے کا......"

میں نے کہا "ہم صرف عاشق اور معشوق کو ہی نہیں ملا رہے اپنا الو بھی سیدھا کر رہے ہیں۔"

"اپنا الو۔ وہ کس طرح؟"

"وہ اس طرح کہ اگر ہم کوکی دادا کے گم شدہ داماد کو واپس لے آئے تو سابینہ کے ساتھ ساتھ یہ کوکی دادا پر بھی ہمارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ اگر کوکی دادا ہمارا احسان مند ہوگیا تو ہم اس سے کام بھی لے سکیں گے جو وہ اب کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔"

"کون سا کام استاد صیب؟"

"کاٹھ کے بندر! وہی کام جو ہم کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ ہم جون چاؤلی کو کوکی دادا سے حاصل کر سکیں گے۔ وہ اپنی تمام تر ہٹ دھرمی کے باوجود جون چاؤلی کو آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پھر جون چاؤلی اور لینگ ہن کو لے کر ہم واپس کابا بانا بنیں گے۔"

بات زریں گل کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ زور زور سے اپنا سر ہلانے لگا۔

صرف ایک گھنٹہ بعد مجھے ناشا کی صورت دوبارہ نظر آئی۔ وہ بیرونی دروازے سے لنگڑاتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ جو دوسری لڑکی تھی وہ سابینہ تھی۔ سو فیصد سابینہ تھی۔ وہی دوشیزہ جو اپنے باپ سے بے مثال محبت کرتی تھی اور اپنے محبوب سے بھی۔ وہ ان دو شدید محبتوں کے درمیان یوں تقسیم ہوئی تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی محبت کی نشانی۔ اس کا بچہ گود میں ہے اور وہ حیران سی ناشا کے ساتھ چلی آ رہی ہے۔ دونوں لڑکیاں ہمارے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔

کچھ دیر ہمارے درمیان ایک گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ناشا نے سابینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ پوچھ رہی ہے کہ تم نے اسے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

یہ نازک سوال تھا مگر اس سوال کا جواب مجھے دینا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر اس نیم تاریک گلی کی طرف دیکھا جس کے آخر میں ایک بند دروازہ تھا۔ اس دروازے کے پیچھے وہ شخص موجود تھا جسے سابینہ کبھی اپنا محبوب کہتی تھی۔ اس شخص کے بارے میں اب تک بستی میں بہت قیاس آرائیاں کی گئی تھیں اور بے شمار اندازے لگائے گئے تھے۔ اس کی گمشدگی اب تک ایک سوال بنی ہوئی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس سوال کا جواب بستی کے ہی ایک گھر میں موجود ہے۔ میں نے ناشا اور سابینہ کو ساتھ لیا اور جھاڑ جھنکار میں چھپے ہوئے بند دروازے کی طرف بڑھا۔

●●●●●●●●●●●●●●●●

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں بلاحظہ فرمائیں۔

محیّ الدین نواب

کا

نیا مجموعہ

شعلوں کی سیج

قیمت -/۱۵۰

ڈاک خرچ -/۲۰

قارئین کے وسیع حلقے میں محیّ الدین نواب کا نام جانا پہچانا ہے

محیّ الدین نواب نے بے شمار معاشرتی اور سماجی کہانیاں لکھی ہیں

شعلوں کی سیج

ایک ایسی کہانی جس میں محیّ الدین نواب نے معاشرے کی صحیح عکاسی کی ہے۔

پبلشرز

اقراء پبلشرز اینڈ بکسیلرز

فون ۷۲۲۳۸۵۳

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

ملنے کا پتہ

علی میاں پبلی کیشنز

فون ۷۲۴۷۴۱۴

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

تاوان

بار اول ــــــ ۱۹۹۹ء

مطبع ــــــ یُوایڈمی پرنٹرز لاہور

کمپوزنگ ــــــ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر لاہور

قیمت ــــــ ۶۰/- روپے

ISBN 969-8429-34-4

اسٹاکسٹ

علی بُک سٹال

نیست روڈ، چوک میو ہسپتال

لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۳

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت

سابینہ کی حیران نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ غالباً وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں اسے کہاں لے جا رہا ہوں۔ ہم جہاز جھنکار کے نیچے سے گزرے اور بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ اس دروازے کی چابی ناشا کے پاس تھی۔ میرے اشارے پر وہ آگے بڑھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ آمن کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا اور کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ آمن کے جسم پر کپڑوں کے بجائے چیتھڑے لٹک رہے تھے اور وہ بے حد خستہ حال نظر آتا تھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا پھر اس کی نگاہ سابینہ پر پڑی اور وہ تڑپ کر دیوار کی طرف چلا گیا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ زور سے دہاڑنے لگا۔ یقیناً ہمیں یہاں سے دفع ہو جانے کا کہہ رہا تھا۔

میں نے دیکھا سابینہ بھی سکتے کی کیفیت میں تھی۔ مسخ چہرے کے باوجود اس نے آمن کو پہچان لیا تھا اور اس کی آواز بھی شناخت کر لی تھی۔ ناشا نے سابینہ کو دلاسا دیا اور اسے بتایا کہ جو چہرہ اس نے دیکھا ہے وہ اس کے محبوب آمن کا ہی ہے۔ سابینہ نے اپنی گود کا بچہ ناشا کو تھمایا اور لپکتی ہوئی آمن کے پاس پہنچ گئی "آمن..... آمن" وہ اسے کندھوں سے تھام کر فریاد کناں آواز میں چیخی۔

آمن نے اسے اپنا چہرہ دکھائے بغیر اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ وہ کمرے کے نزدیک ترین گوشے میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے دبی دبی کراہیں نکل رہی تھیں۔ اچانک وہ زخمی جانور کی طرح پلٹا اور اپنا چہرہ چھپائے چھپائے گلی کی طرف بھاگا۔ میں نے جھپٹ کر اسے تھام لیا۔ اس نے بہت زور مارا لیکن میں نے اسے بازوؤں سے نکلنے نہیں دیا۔ بالآخر اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ سابینہ، ناشا، زوبی گل اور دراخش، سب اس کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ سابینہ نے آمن کا بگڑا ہوا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور گلوگیر لہجے میں بولنے لگی۔ اس کی باتیں میری سمجھ نہیں آ رہی تھیں، تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آمن سے اس چٹا کے بارے میں پوچھ رہی ہے جس کے سبب اسے چوٹ لگی اور وہ زخمی ہوا۔ آمن جواب میں زاروقطار رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اب تک جس سے اپنا چہرہ چھپا رہا تھا وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دن کی روشنی میں اس کے خدوخال کا ہر ہر زاویہ دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کا بدنما داغ، اس کے آپس میں ملے ہوئے ابرو، اس کی ایک آنکھ جو بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی اور جس کے نیچے اُبھار سا بن چکا تھا۔ پھر ہم نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ اس منظر سے ان تمام خدشات کی نفی ہو گئی جو اب تک آمن کے دل میں پلتے رہے تھے اور ان تمام اندازوں کی تصدیق ہو گئی جو میں نے پچھلے چند گھنٹوں میں سابینہ کے بارے میں لگائے تھے۔ سابینہ آگے بڑھی اور ہماری موجودگی کی پروا کیے بغیر آمن سے لپٹ گئی۔ اس کے ہونٹ آمن کے چہرے کو دیوانہ وار چومنے لگے..... اور چومتے چلے گئے۔ چند لمحے بعد آمن کے بازو بھی متحرک ہوئے اور اس نے سابینہ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ دونوں بلند آواز میں رو رہے تھے۔ ان کا ملاپ جذباتی تھا اور رقت آمیز بھی۔ آمن کا معصوم بچہ ناشا کی بانہوں میں تھا اور اپنی ننھی منی ستارہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

O☆O

سب کچھ ہماری منشا کے مطابق ہوا تھا۔ آمن کا وہ خوف ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا جس نے پچھلے کئی ماہ سے اسے ایک تاریک کوٹھری میں محبوس کر رکھا تھا۔ اس کا یہ خوفناک اندیشہ بالکل باطل ثابت ہوا تھا کہ سابینہ اس کی بگڑی ہوئی صورت دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لے گی اور ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جائے گی۔ وہ اس وفا کی پتلی کو نہیں جانتا تھا جو ہر عورت کے اندر چھپی رہتی ہے۔ جو صرف ایک بار پیار کرتی ہے اور پھر اس پیار کے چرنوں میں اپنا جیون بِتا دیتی ہے۔ سابینہ نے ہماری موجودگی میں آمن کے چہرے پر جو لاتعداد بوسے دیے تھے وہ اس بات کے گواہ تھے کہ آمن اس کے لیے اب بھی "آمن" ہے۔ وہ اسے دل و جان سے خوش آمدید کہہ رہی ہے اور اس کی دید کو اپنی ان گنت فراق راتوں کا صلہ سمجھتی ہے..... وہ واقعہ بھی متاثر کن تھا جس کے سبب آمن کا چہرہ

مسخ ہوا اور نتیجے میں اسے کئی ماہ گوشہ نشین رہنا پڑا۔ آمن کے مطابق وہ وادی کے گردونواح میں مطلوبہ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ اس کا گزر دیوداور کے ایک سنسان جنگل سے ہوا۔ یہاں اسے ایک درمیانی عمر کا شخص ملا۔ اس نے اپنا نام راغب خان بتایا۔ وہ گلگت کے نواحی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر کسی تارک الدنیا جنگل واسی کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ بالوں میں اس کا تین چوتھائی چہرہ چھپا ہوا تھا۔ اس شخص کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ آمن کے ساتھ دوستانہ انداز میں پیش آیا اور اس تاریک کھوہ میں لے گیا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے آمن کو کھانا کھلایا اور اپنی درد بھری روداد سنائی۔ اس روداد کے مطابق وہ ایک خونریز خاندانی تنازع کا شکار ہو کر اپنے گاؤں سے بھاگا تھا۔ ساتھ میں اس کی نوبیاہتا بیوی بھی تھی۔ دشمنوں سے جان بچانے کے لیے وہ لوگ اس علاقے میں دور تک گھس آئے اور دیودار کے جنگل میں آکر اس تاریک کھوہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اسی کھوہ میں آکر راغب خان نے پہلی بار غور سے اپنی دلہن کی شکل دیکھی تھی اور اسی ویرانے میں انہوں نے اپنی سہاگ رات منائی تھی لیکن ان کی یہ خوشیاں بالکل عارضی ثابت ہوئیں۔ صرف پانچ دن بعد رات کے وقت ان پر کلہاڑا بردار جنگلیوں نے حملہ کیا۔ راغب خان اپنی بیوی کو لے کر بھاگا۔ کلہاڑا برداروں نے ان کا پیچھا کیا۔ راغب خان نے ایک جھنڈ میں اپنی بیوی کو دھکیلا اور خود حملہ آوروں کو اپنے پیچھے لگا کر بھاگتا چلا گیا۔ کچھ آگے جا کر اتفاقاً اسے بھی چھپنے کی ایک جگہ میسر آگئی۔ حملہ آور اس کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ یخ بستہ سردی میں وہ کئی گھنٹے منتظر رہا کہ حملہ آور ان دونوں کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلے جائیں۔ اس کی دعا "آدھی" قبول ہوئی۔ راغب خان کو تو نہ ڈھونڈا جا سکا لیکن اس کی بیوی حملہ آوروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کی لاش علی الصباح راغب خان کو اسی کھوہ سے ملی جہاں وہ دونوں پانچ روز سے مقیم تھے۔ لاش دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ حملہ آوروں نے رات بھر اسے زیادتی کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ جاتے ہوئے اس کے زیورات اس کے کپڑے اور اس کا وہ ایک دانت تک اکھاڑ کر لے گئے تھے جس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ راغب خان نے اپنی نوبیاہتا بیوی کی لاش دفن کی تھی اور ہمیشہ کے لیے اس کی قبر کے آس پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ اپنی روداد کے آخر میں اس نے آمن کو بتایا کہ وہ اب تک وقتاً فوقتاً تین کلہاڑا بردار جنگلیوں کو ہلاک کر چکا ہے اور اب چوتھے کی باری ہے۔

"چوتھا کون ہے؟" آمن نے پوچھا۔

"چوتھے تم ہو" راغب خان اطمینان سے بولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ہی جنونی چمک نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے لبادے کے اندر سے ایک چھوٹی کلہاڑی نکالی اور آمن پر پل پڑا۔ آمن، راغب خان کے مقابلے میں نوجوان تھا اور اس میں جسمانی طاقت بھی زیادہ تھی لیکن راغب خان کے اندرونی ہیجان نے اسے

شہ زور بنا رکھا تھا۔ اس نے آمن کو تھوڑی دیر کے لیے بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ دونوں کلہاڑیوں سے لڑتے ہوئے کھوہ سے کافی دور نکل گئے۔ ایک جگہ اچانک آمن کا پاؤں پھسلا۔ وہ ایک ڈھلوان پر لڑھکا اور لڑھکتا چلا گیا۔ یہ جھاڑ جھنکاڑ اور نباتات سے اٹی ہوئی ایک کھائی تھی۔ کھائی میں گرتے ہی آمن بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ ساری رات بے ہوش رہنے کے بعد اگلے روز دوپہر کے بعد اپنے حواس میں آیا۔ اس نے اپنے زخموں سے چور جسم کو سمیٹا اور رینگتا ہوا اس جگہ سے دور نکل گیا جہاں ایک انسانی خطرناک شخص سے دوبارہ مڈبھیڑ ہونے کا امکان تھا۔

بے تحاشا خون نکل جانے کے بعد آمن کی جان کیسے بچی اور وہ وادی میں واپس کیسے پہنچا یہ ایک علیحدہ کہانی تھی۔

اب یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ آمن اور سابینہ کی خزاں رسیدہ زندگیوں میں پھر سے بہار کی آمد ہو گئی تھی۔ اس خوشگوار تبدیلی میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت حصہ ہمارا بھی تھا۔ تاشا نے سابینہ کو سمجھا دیا تھا کہ ہم اپنے اس "تعاون" کے صلے میں کیا چاہتے ہیں اور سابینہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جون جاول کو اپنے باپ کی قید سے آزاد کرانے کی بھرپور کوشش کرے گی۔

ہماری اور سابینہ کی اس "انڈر اسٹینڈنگ" کا نتیجہ چھٹے ساتویں روز نکلا۔ سابینہ بڑی رازداری کے ساتھ ہماری اس مضافاتی پناہ گاہ میں پہنچی۔ میں اور زوریں گل سو رہے تھے۔ سابینہ نے ہمیں جگایا۔ وہ ہمارے لیے بھنا ہوا گوشت اور ذرا ئی فروٹ لائی تھی۔ قحط کے ان دنوں میں یہ اشیا بہت بڑی نعمت تھی۔ گوشت دیکھتے ہی زوریں گل کی "آنکھوں" سے رال ٹپکنے لگی تھیں۔ وہ گوشت سے نزدیک تر ہو کر بیٹھ گیا اور نتھنے پھلا پھلا کر خوشبو سونگھنے لگا۔ سابینہ نے ایک چمکدار کپڑے کا لباس اور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس لباس کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کوئی کیلاش لڑکی ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہاں کے رہن سہن میں کسی نہ کسی حد تک کیلاش لوگوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ سابینہ نے بتایا کہ دونوں بستیوں میں ہماری تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ سابینہ نے کہا کہ منجمد جھیل پر مرنے والے افراد کے وارثوں نے آج صبح "تخت" کے سامنے ایک بڑا مظاہرہ کیا ہے اور سردار سدوت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ قاتلوں کو گرفتار کرے۔ سابینہ نے بتایا "کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ سردار سدوت قاتلوں کی گرفتاری میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا کیونکہ وہ ان کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔"

ہمیں بیرونی حالات سے آگاہ کرنے کے بعد سابینہ اصل موضوع پر آگئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ باپ بیٹی کا رشتہ پھر سے بحال ہو گیا ہے۔ رواج کے مطابق آمن نے اپنے سسر کوکی دادا کے پاؤں میں گر کر معافی مانگ لی ہے اور کوکی دادا نے اسے معاف کر دیا ہے۔ اپنی لاڈلی بیٹی کے ننھے منے بیٹے کی صورت میں کوکی دادا کو ایک خوبصورت کھلونا مل گیا تھا اور وہ ہر وقت اسے گود میں

اٹھائے پھرتا تھا۔ (وادی میں "ناجائز" صرف اس بچے کو سمجھا جاتا تھا جو شادی شدہ عورت یا مرد کے گناہ سے پیدا ہوتا تھا) کل شام سابینہ نے کوکی دادا سے جون جاول کے بارے میں بات کی تھی۔ اس نے کوکی دادا سے کہا تھا۔

"میں نے نرپال دیوتا کے سامنے منت مانی تھی کہ اگر آمن مجھے مل گیا تو میں اس وادی کا سب سے قیمتی مادار (غلام) خرید کر آزاد کروں گی۔ آج میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وادی کا سب سے مہنگا مادار تو ہمارے پاس ہی ہے۔ میرا مطلب جون جاول سے ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو" کوکی دادا نے جواب میں کہا تھا "سردار سدوت اس مادار کے لیے پندرہ ہزار رپال تک کی پیش کش کر چکا ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے بابا! میری منت پوری کر دیجئے۔ اسے آزاد کر دیجئے۔ میں زندگی بھر آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

کوکی دادا نے سابینہ کو بانہوں میں لے لیا تھا اور لگاتار اس کا سر چومتے ہوئے بولا تھا "تجھ پر ایسے ایک ہزار مادار قربان، میری بچی۔"

سابینہ اب ہمیں یہی خوشخبری سنانے آئی تھی کہ جون جاول آزاد ہے اور ہم جب چاہیں اسے اپنی تحویل میں لے سکتے ہیں۔

یہ ایک نہایت خوش کن اطلاع تھی۔ ہمیں سرتاپا مسرور کر گئی۔ میں نے سابینہ سے اپنے مترجم زوریں گل کی مدد سے پوچھا "تمہارا باپ پوچھے گا نہیں کہ مادار اب کہاں جا رہا ہے؟"

وہ بولی "جب مادار آزاد ہو جائے تو کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وادی سے باہر بھی؟"

"وادی سے باہر تو کوئی گیا ہے اور نہ جا سکتا ہے۔"

"اور اگر جانا چاہے تو؟"

"اسے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ بات پتھر پر لکیر ہے۔"

"آخر ایسی بات کیا ہے اس وادی میں؟"

"سب سے بڑی بات اس کی ساخت ہے۔ تم نے وہ قدرتی کناڑ نہیں دیکھے جو اس وادی کو ارد گرد کے علاقے سے جدا کرتے ہیں۔ وہ پتھر کی سپاٹ عمودی دیواریں ہیں جن پر رسے اور میخوں کے بغیر چڑھنا ناممکن ہے۔ شب و روز یہ دیواریں سخت پہرے میں رہتی ہیں۔ ان دیواروں کی حفاظت کو یہاں عبادت کا درجہ دیا جاتا ہے اور کوئی اس عبادت سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ وادی کا وہ حصہ جہاں یہ دیواریں عمودی نہیں ہیں' بارود بچھا دیا گیا ہے۔ اس بارودی سرحد سے زندہ سلامت گزرنا کسی کے بس میں نہیں۔"

"پھر بھی یہ وادی ہے' جیل نہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسا راستہ تو ہو گا جو فرار ہونے والوں کو مدد کر سکے۔"

وہ بولی "تم لوگوں کی وجہ سے میری برباد زندگی آباد ہوئی ہے' میں تمہیں ہرگز یہ مشورہ نہیں دوں گی کہ تم یہاں سے فرار ہونے

کی کوشش کرو۔"

"پھر کیا کریں۔ خود کو جانڑوں کے حوالے کر دیں؟"

"نہیں۔ تم اب یہ بھی نہیں کر سکتے۔ تم پانچ افراد کو ہلاک کر چکے ہو۔ وہ تمہیں عبرتناک موت ماریں گے۔"

"لیکن ہم اس پناہ گاہ میں بھی تو زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتے۔"

سابینہ کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں ابھریں۔ وہ بولی "کبھی کبھی تو سوچتی ہوں کہ بابا کو تمہارے بارے میں بتادوں اور ان سے پوچھوں کہ تمہیں اب کیا کرنا چاہیے۔ بابا کی عقل سمجھ ہم سب سے زیادہ ہے۔"

"یہ غضب نہ کرنا" میں نے کہا "تمہارا بابا کٹر وطن پرست ہے۔ وہ جانڑوں سے یہ بات چھپا نہیں سکے گا۔ ایک گھنٹے کے اندر وہ لوگ ہمیں دھر لیں گے۔"

"لیکن وہ مجھ سے جتنی محبت کرتے ہیں' دیوتاؤں سے بھی نہیں کرتے۔"

"پھر بھی اس میں خطرات ہیں۔"

میں نے سابینہ سے کہا کہ وہ فی الحال جون جاول کو اپنی تحویل میں رکھے۔ ہم جلد ہی اس سے رابطہ کریں گے۔ وہ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی زوریں گل بھنے ہوئے گوشت پر ٹوٹ پڑا۔

اسی سہ پہر تاشا بھی صفدر کو لے کر ہماری پناہ گاہ میں پہنچی۔ وہ حسب معمول فتنہ خیز لباس میں تھی۔ اس کی ٹانگ کا زخم اب ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ پہلے کی طرح تن تنا کر چلتی تھی۔ مجھے صفدر کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ وہ میرا یار تھا۔ میں اس کے تاثرات سے اس کی دلی کیفیت بھانپ لیتا تھا۔ یقیناً وہ کوئی اہم خبر لایا تھا۔

سلام دعا کے بعد ہم سب اکٹھے بیٹھ گئے۔ صفدر حسب سابق پتلون قمیص میں تھا۔ اوپر سے اس نے سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ایک اسمارٹ شخص تھا لیکن اس وادی میں آکر اس کی "اسمارٹ نیس" اندوے کم ہو گئی تھی اور صفدر ہی کیا' ہم سب کا یہی حال تھا۔ ہفتوں سے ہمارے حجامتیں نہیں بنی تھیں۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے۔ سخت سردی کے سبب ہونٹ پھٹ گئے تھے اور چہرے سنولا گئے تھے۔ شاید کوئی باہر کا آدمی دیکھتا تو بادی النظر میں ہمیں بھی مقامی ہی سمجھتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارے کانوں میں بالے نہیں تھے اور ہمارے کندھوں پر کلہاڑے نہیں تھے۔

صفدر نے پہلے تو سابینہ کی طرح ہمیں بیرونی حالات سے آگاہ کیا۔ پھر کہنے لگا "پچھلے سات آٹھ روز میں وادی کے اندر زبردست تبدیلی آئی ہے۔ آپ کو معلوم ہوا ہی ہو گا کہ یہ لوگ مسلسل "شکار" کی تلاش میں تھے اور پچھلے ہفتے ان کی ایک مہم زبردست طور پر کامیاب ہوئی ہے۔ اس مرتبہ ان لوگوں نے وادی سے کافی دور جا کر ہاتھ مارا ہے اور "موزنجو پاس" کے قرب و جوار سے ایک

بڑی "ہائی کنگ" پارٹی پکڑی ہے۔ اس پارٹی میں کم و بیش ڈیڑھ سو سیاح اور پورٹرز شامل ہیں۔ پورٹرز تو ظاہر ہے گلگت اور چیلاس وغیرہ کے لوگ ہی ہیں۔ ہائیکرز میں کوئی ڈیڑھ درجن پاکستانی اور ایک درجن سری لنکن شامل ہیں۔ دراصل یہ ایک فلمی یونٹ ہے جو کسی مطلوبہ لوکیشن کی تلاش میں تھا اور بلا اجازت ویرانے میں بھٹک رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس سے بڑی مقدار میں خوراک اور شراب وغیرہ برآمد ہوئی ہے۔ اندوہناک خبر یہ ہے کہ اس پارٹی کے قریباً ساٹھ افراد کو موقع پر ہی قتل کر کے ان کی لاشیں ایک برفانی کھائی میں دفن کر دی گئی تھیں۔ مرنے والوں میں فلمی یونٹ کا فلمساز اور ہدایت کار بھی شامل تھے۔ کوئی دو درجن افراد جن میں زیادہ تر پورٹرز تھے' جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ ساٹھ ستر افراد کو پکڑ کر وادی میں لایا گیا ہے۔ ان میں فلم کی دو ہیروئنیں' ایک ہیرو اور کئی ایکسٹرا شامل ہیں۔"

صفدر کی باتیں سن کر میرے کانوں میں نوبت کی وہ آواز گونجنے لگی جو میں نے چند روز پہلے سنی تھی۔ وہ آواز سنتے ہی ہماری میزبان راخشی اور اس کے فاقہ زدہ بچے لپکتے ہوئے باہر بھاگ گئے تھے۔ پھر جب وہ واپس آئے تھے تو ان کی آنکھوں میں چمک اور ہاتھوں میں کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ یقیناً ان اشیائے خوردنی کا تعلق انہی بدنصیب لوگوں سے تھا جو پچھلے ہفتے پکڑے اور مارے گئے تھے اور جن کا ذکر اب صفدر کر رہا تھا۔

میں نے صفدر سے پوچھا "وہ لوگ اب کہاں ہیں؟"

"ان میں سے کچھ کو بندی خانے میں رکھا گیا ہے اور کچھ جاتر و میں ہیں۔ وادی کے لوگوں کو اس مہم کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا گیا ہے۔ غالباً انتظامیہ نہیں چاہتی کہ بھوکے ننگے لوگوں میں بے چینی کی لہر دوڑے اور وہ زیادہ خوراک اور سامان کا مطالبہ کرنے لگیں۔"

"پکڑے جانے والوں میں عورتیں کتنی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے نا' ان میں دو تو ہیروئنز ہیں۔ ایک پاکستانی لڑکی ہے' دوسری سری لنکن۔ اس کے علاوہ چودہ پندرہ ایکسٹرا لڑکیاں ہیں۔ شاید کسی گانے کی پکچرائزیشن بھی ہونا تھی۔ مقامی دستور کے مطابق یہ ساری لڑکیاں ناوادہا کر بستی کے سرکردہ لوگوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ یقیناً ان کے ساتھ بہت ناروا سلوک ہوا ہوگا۔ فلم کی پاکستانی ہیروئن' جو براؤن آنکھوں والی ایک نوخیز لڑکی "روشنی" ہے' بڑے جاتری غازان کو سونپی گئی ہے۔"

"لیکن وہ حرامزادہ تو شدید زخمی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ فی الحال تو زخمی ہی ہے مگر اُمید پر دنیا قائم ہے۔ اس بدبخت کو بھی بہت سی اُمیدیں ہوں گی۔ قائم مقام مہا جاتری ناقوب نے دیوتاؤں کے حوالے سے پیش گوئی کی ہے کہ غازان "جشن پیدائش" تک بالکل بھلا چنگا ہو جائے گا اور اپنے ہاتھ سے رسم ادا کرے گا۔ اس رسم کا تعلق جشن پیدائش سے ہوتا ہے۔"

"خوام کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا" زریں گل تنک کر بولا "یہ جشن پیدائش کیا ہے؟"

صفدر نے کہا "عیاش دیوتا کو ایک ایسے دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا ہے جس کا کوئی نام نہیں۔ جس روز اس بے نام دیوتا کے گھر میں عیاش کی پیدائش ہوئی تھی اس روز یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں۔ اس جشن کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ وادی کے طول و عرض میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے اور مرد و زن سرِعام رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اس جشن کی تاریخ قریباً تین ہفتے پہلے گزر چکی ہے لیکن ان دنوں وادی میں قحط کی حالت زیادہ شدید تھی اور پینے کے لیے شراب بھی نایاب تھی' لہٰذا بڑے جاتری ناقوب نے دیوتا سے "مشورہ" کرنے کے بعد جشن ملتوی کر دیا تھا۔ اب چونکہ کچھ باغات سے کچا پکا پھل حاصل ہونے لگا ہے اور "سوزیو پاس" کے قریب چھاپا مار مہم بھی زبردست کامیاب رہی ہے لہٰذا "جشن پیدائش" منانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ابھی حتمی تاریخ تو طے نہیں ہوئی تاہم غالب امکان ہے کہ یہ جشن پانچ چھ روز کے اندر ہی بپا ہوگا۔"

زریں گل نے پوچھا "صفدر صیب! کیا اس موقع پر جاترو میں لڑکیاں بھی ناچے گا؟"

"پتا نہیں کیا کچھ ہوگا" صفدر نے کہا۔

"لیکن ام کو کیا فائدہ" زریں ایک دم بجھ سا گیا "ام تو چوہے کے مافق اس چوہے دان میں پڑا ہے۔"

"تم کو بہت فائدہ ہے زریں گل! بہت فائدہ ہے" صفدر نے دبے دبے جوش سے کہا۔ پھر ہمارے کچھ اور قریب کھسک آیا۔

ناشا کی آنکھوں میں بھی مخصوص چمک نظر آتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے پاس آنے سے پہلے وہ اور صفدر آپس میں تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔ صفدر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا "بات یہ ہے شاہ جہاں صاحب! کہ اگر ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس کوشش کے لیے بہترین موقع وہ ہوگا جب یہاں جشن منایا جائے گا اور شراب پانی کی طرح بہائی جائے گی" صفدر نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک بڑا کاغذ نکال کر ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ یہ اس وادی کا ہاتھ سے بنایا ہوا نقشہ تھا اور صفدر نے خود بنایا تھا۔ نقشہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس پر بڑی عرق ریزی کی گئی ہے۔ صفدر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "یہ نقشہ میری دو درجن یخ بستہ راتوں کی آوارہ گردی کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ باغی لڑکی نے بھی اس سلسلے میں میری مدد کی ہے۔"

"باغی لڑکی کون ہے؟" زریں گل نے پوچھا۔

صفدر نے مسکرا کر ناشا کی طرف اشارہ کیا "میں اسے باغی لڑکی ہی کہتا ہوں۔ یہ بھی اس خطاب پر رضامند ہے۔"

ہم سب اس قلمی نقشے پر جھک گئے۔ یہ وادی واقعی ایک عجوبہ تھی۔ اپنے قرب و جوار سے بالکل الگ تھلگ اور کسی کنویں کی طرح گہری اور ناقابلِ عبور۔ اس نقشے میں لکڑی کے اس پل کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جو ایک تند و تیز آبی گزرگاہ پر بنایا گیا تھا اور

وہ ہیبت ناک دراز بھی دکھائی گئی تھی جس میں پیدل چلنے والے کے قدموں کی آواز دیر تک گونجتی تھی اور سوفٹ اوپر آسمان ایک نہر کے مانند نظر آتا تھا۔ اس دراز پر لمبائی کے رخ میں تین جگہ سرخ نقطے لگائے گئے تھے۔ صفدر نے پہلے ہمیں دراز کے بارے میں بتایا پھر نقطوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! یہ وہ تین مقامات ہیں جہاں اس راستے کی حفاظت کرنے والے پہرے داروں کی چوکیاں ہیں۔ پہلی چوکی پر آٹھ' دوسری چوکی پر بارہ اور تیسری چوکی پر آٹھ پہریدار موجود ہوتے ہیں۔ پہلی چوکی دراز سے باہر واقع ہے۔ یہاں ایک بند کمرے کے اندر روشنی کا انتظام موجود ہے۔ وادی سے باہر جانے والے کی شناخت کی جاتی ہے۔ اجازت نامہ دیکھا جاتا ہے اور زبردست چھان بین کی جاتی ہے۔ باقی دونوں چوکیاں دراز کے اندر واقع ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' درمیان والی چوکی یا پوسٹ پر بارہ پہریدار موجود رہتے ہیں۔ ان کے پاس جدید ترین رائفلیں ہیں۔ درحقیقت یہی اس راستے کی مضبوط ترین چوکی ہے۔ اس چوکی کے پہریدار خونخواری اور جانبازی کے اعتبار سے منتخب ہوتے ہیں۔ تیسری چوکی دراز کے بیرونی سرے پر ہے۔ یہاں بھی مسلح اور چوکس پہریدار موجود رہتے ہیں۔ چہرے اور اجازت نامے شناخت کرنے کے لیے روشنی کا انتظام اس چوکی پر بھی موجود ہے۔۔۔۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم کسی طرح ان تین چوکیوں کو تہ و بالا کر سکیں تو یہاں سے بچ نکلنے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔"

کچھ دیر ہم چاروں نے انہی چوکیوں کے حوالے سے گفتگو کی پھر میں نے صفدر سے پوچھا "کوئی سیکنڈ آپشن بھی ہے؟"

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا اور نقشے کو کچھ اور پھیلا کر شمالی گوشے کی طرف چلا گیا۔ یہاں آبی گزرگاہ پر بنا ہوا چوبی پل دکھایا گیا تھا۔ یہاں بھی چار پانچ مقامات پر سرخ نقطے تھے جو مسلح پہریداروں کی موجودگی ظاہر کرتے تھے۔ صفدر نے ہمیں پل اور اس کے گرد و نواح کے متعلق تفصیلات بتائیں۔ پل کے ایک سرے پر سرخ دائرہ سا کھینچا گیا تھا۔ صفدر نے کہا "یہاں پل کے نیچے دو آہنی چرخیاں موجود ہیں۔ مجھے ان زنگ آلود چرخیوں کی موجودگی سمجھ میں نہیں آئی۔ ناشا بھی بے خبر ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی ایمرجنسی ضرورت کے وقت ان چرخیوں کو استعمال کیا جاتا ہوگا۔"

نقشے پر بات کرنے کے بعد صفدر نے ہمیں اپنی عسکری قوت یعنی اسلحے کے بارے میں بتایا۔ اس حوالے سے بھی اس نے گرانقدر کام کیا تھا۔ ناشا کے ساتھ مل کر وہ اب تک تین رائفلیں اور وافر ایمونیشن مہیا کر چکا تھا۔ ان میں سے ایک رائفل "اے کے ۵۶" تھی اور وار وھاڑ میں ہماری زبردست معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ ان تین رائفلوں کے علاوہ دو رائفلیں ہمارے پاس بھی تھیں۔ ان میں سے ایک لانگ رینج رائفل تھی جس نے ہمارے "مالک" کالام کے پہریدار کے سینے میں سوراخ کیا تھا۔ اس اسلحے کے ساتھ اور ان معلومات کے ساتھ ہم "فرار" کی ایک زبردست کوشش کے بارے میں سوچ سکتے تھے اور ہمیں سوچنا بھی چاہیے تھا۔ اب ہم جاتریوں کے قاتل تھے اور اس وادی میں زمین کے اوپر ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

○☆○

ننھی زرغونہ مجھ سے بہت مانوس ہو چکی تھی۔ اس کا بخار بھی اب اتر گیا تھا۔ ماں اور پاپا سے ملنے کی ضد وہ اب بھی کرتی تھی لیکن میں کسی حیلے وسیلے سے اسے بہلا لیتا تھا۔ اسے بہلانے کا سب سے اہم ذریعہ زریں گل تھا۔ وہ گھوڑا بن کر اسے پیٹھ پر بٹھا لیتا اور پورے کمرے میں چکراتا پھرتا۔ گاہے گاہے وہ گھوڑے کی طرح ہنہناتا بھی تھا اور پچھلے پاؤں پر بھی کھڑا ہوتا تھا لیکن پچھلے دو روز سے یہ گھوڑا کچھ اداس ہو گیا تھا اور سارا دن منہ لٹکائے رہتا تھا۔ اس کے لٹکے ہوئے منہ کی وجہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ گل ثوم یا کلثوم کا عشق اس پر بھوت کی طرح سوار تھا۔ جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ ہم اس وادی سے "فرار" کے بارے میں سوچ رہے ہیں' اس کے سینے سے آہوں کی بھاپ خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کلثوم سے اس کا عشق ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ اس عشق کے بارے میں اس کے پروگرام بڑے لمبے تھے۔ اسے یہ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے کہ اس عشق کو قبل از وقت اناپ لگنے والا ہے۔ وہ کلثوم سے ملنا چاہتا تھا اور اس کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا تھا۔ ہم اس چار دیواری سے باہر نکلتے ہی موت کی زد میں آ سکتے تھے۔

زرغونہ نے اپنی توتلی انگلش میں مجھ سے پوچھا "انکل! یہ چھوٹے انکل اب گھوڑا کیوں نہیں بنتے؟"

"یہ بہت اداس ہیں۔"

"کیا گھوڑے بھی اداس ہوتے ہیں انکل؟"

"ہاں ہوتے ہیں۔ جب ان کی مادہ نہیں ملتی۔"

"یہ مادہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ اچھے بھلے بندے' میرا مطلب ہے گھوڑے کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔"

زریں تڑخ کر بولا "خو آپ کر لیں مذاق۔ جب پتا چلے گا کہ زریں گل نے خودکشی کر لیا تو آپ کو یقین آئے گا کہ ام کلثوم کے بارے میں کتنا سنجیدہ تھا۔"

"خودکشی تو تمہاری عادت ثانیہ بن چکی ہے یار۔ ہر بار نیا جنم لے کر آ جاتے ہو نیا عشق کرنے۔"

"بس یہ آخری جنم ہے" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "ام کو پکا یقین ہے' ام اس جگہ سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"چلو' مُردہ لے جائیں گے۔ وہاں لاہور جا کر میں پرانی انارکلی سے تمہاری لاش حنوط کرواؤں گا اور اپنے گھر میں رکھوں گا۔ لاش کے نیچے لکھا ہوگا' 'لالے کمدھیر کا حنوط شدہ پرستار جو اپنے اُنچاسویں عشق کی ناکامی کے بعد سچ مچ مر گیا۔ ویسے مجھے یقین ہے تم دیر تک مُردہ نہیں رہ سکو گے۔ جب میں تمہاری لاش کے سامنے بیٹھ

بر روز گرما گرم سیخ کباب، روغنی نان کے ساتھ کھاؤ۔ گاؤ، ایک روز تم بول ہی اٹھو گے، خوچے تھوڑا سا ام کو بھی چکھاؤ نا۔"

اس دوران میں بیرونی دروازے سے ناشا کی آواز آئی۔ وہ ابھی ابھی یہاں پہنچی تھی اور ہماری ہی طرف آرہی تھی۔ زریں گڑبڑا کر بولا "اچھا بھئی! اب بس کرو۔ کلثوم کا بڑا بہن آرہا ہے۔"

میں نے کہا "اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تم خود ہی تو کہا کرتے ہو، جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ میرا خیال ہے آج کھل کر بات ہو ہی جانے دو۔ ایسے تڑپ تڑپ کر کتنے دن جیو گے۔"

"او خدایا.... ام کو معافی دو۔ اپنا منہ بند رکھو۔" زریں نے گھبرا کر باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

اس دوران میں ناشا اندر آگئی۔ زریں کو دیکھ کر بولی "یہ کاٹھ کا بندر تمہارے سامنے ہاتھ کیوں جوڑ رہا ہے؟"

میں نے بے دھڑک وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے کہے جانے سے زریں گل ڈر رہا تھا۔ ناشا حیرت سے سنتی رہی۔ میں جانتا تھا، ناشا ایک آزاد خیال بلکہ باغی لڑکی ہے۔ اسے ان تمام پابندیوں اور قیود سے نفرت تھی جو مردوں اور خاص طور سے جازیوں نے عورتوں پر لگا رکھی تھیں۔ اگر اس کی چھوٹی بہن اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی مرد سے آنکھ لڑا رہی تھی تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ دل ہی دل میں خوش ہوگی۔ میرا یہ خیال بالکل درست نکلا۔ زریں اور کلثوم کے معاشقے کا سن کر ناشا نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بس خاموشی سے زریں کو گھورتی رہی اور پھر باہر نکل گئی۔

ناشا اور میرے درمیان ساری گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی، لہٰذا زریں گل تفصیل سے بے خبر رہا تھا۔ ہاں یہ اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا کہ میں نے ناشا کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے اور ساری رام کہانی سنا دی ہے۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور آنکھیں گھبراہٹ میں ابل گئی تھیں۔ جونہی ناشا باہر نکلی، وہ لرزاں لہجے میں بولا "تم کیا چاہتے تھے تا آپ کہ ام ایک زنانی کے ہاتھوں مارا جائے۔ ابھی جب وہ واپس آکر ام کو گولی مارے گا تو آپ کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"کون گولی مارے گا؟"

"کلثوم کا بڑا بہن اور کون؟ کیا آپ یہ سمجھتا ہے کہ وہ امارے لیے پھولوں کا ہار لینے گیا ہے۔ وہ ضرور بندوق، صندوق لینے گیا ہے۔ لیکن ام بھی مرد بچہ ہے۔ ام اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔"

"مگر تڑپ تڑپ کر مرے گا" میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

وہ روٹھی ہوئی بیوی کی طرح منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

ویسے خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ ناشا اچانک کہاں چلی گئی ہے۔ اگر وہ یہاں آئی تھی تو کسی مقصد سے آئی ہوگی لیکن اس نے ہم سے کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔

یہ معما کوئی ایک گھنٹے بعد اس وقت حل ہوا جب شام کی تاریکی در و دیوار کو ڈھانپ چکی تھی۔ ناشا چادر میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ یہ دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے کہ وہ اس کی بہن کلثوم یا گل ثوم تھی۔ زریں گل پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا تھا اور آنکھیں بالکل گول ہو گئی تھیں۔

ناشا بے باکی سے بولی "اگر یہ کاٹھ کا بندر گل ثوم سے پیار کرتا تھا تو مجھے پہلے بتاتا۔ میں ہر طرح اس کی مدد کرتی۔"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "یہ ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم بھڑک اٹھو گی اور کلہاڑا مار کر اس کا منکا توڑ دو گی۔"

"ہنہ.... سب مرد ایک جیسے ہوتے ہو۔ اندر سے ڈرپوک، اوپر سے بہادر۔ اندر سے عاشق، اوپر سے بے پروا۔ گھات لگا کر اور گونگے بن کر بیٹھے رہتے ہو۔ یہ سوچتے رہتے ہو کہ عورت خود تمہارے پاس آئے گی اور تمہیں اپنا دل اور محبت پیش کرے گی۔ منافق کہیں کے۔"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں بھی زریں کی طرح حیران کھڑا تھا۔ زریں نے تھوک نگل کر ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا "یہ کیا کہہ گئی ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری شان میں قصیدے پڑھ گئی ہے۔ کہتی ہے، تم دونوں جیسے بہادر مرد میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے۔"

"کیا واقعی!" زریں بے یقینی سے بولا۔

"ہاں.... لیکن اس تعریف کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کمرے میں بیٹھ کر رضیہ بٹ کا رومانی ناول لکھنا شروع کر دو۔ بس ایک آدھ چھوٹی سی غزل لکھو اور ختم کرو۔"

"کیا مطلب۔ ام سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ دو چار منٹ میں اپنی یہ عشقیہ ملاقات ختم کرو اور باہر آجاؤ" میں نے وضاحت کی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اب کلثوم اور زریں کمرے میں اکیلے تھے۔ ناشا باہر صحن میں کھڑی تھی۔ اس کے لمبے بال یخ بستہ ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگی "تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔"

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ اطلاع جشن کے بارے میں ہوگی۔"

"تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ جشن ٹھیک دو روز بعد چاند کی دسویں تاریخ کو منایا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر تم نے یہ موقع گنوا دیا تو تمہیں پورا ایک برس انتظار کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں یہ موقع گنوانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ناشا بولی "میں نے صفدر کے ساتھ مل کر پروگرام بنالیا ہے۔ جشن کا عروج شام کے وقت ہوگا۔ تاریکی ہوتے ہی جشن ختم ہو جائے گا اور نشے میں چُور لوگ نڈھال ہو کر رہ جائیں گے۔ ہمارے لیے حرکت میں آنے کا وہ بہترین وقت ہوگا۔ جشن کے دوران میں ہی ساجینہ، جون چاڑل کو تمہارے پاس چھوڑ جائے گی۔ میں ٹینگ بن کو لاؤں گی۔ ٹینگ بن کا دوسرا ساتھی بھی وانگ

بھی اب چلنے پھرنے کے قابل ہے۔ سردار سدرت اسے شفاخانے سے اپنی رہائش گاہ پر لے گیا ہے۔ صفدر کا خیال ہے کہ وہ لی وانگ کو اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوپہر تک تمہارے تمام ساتھی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ میں نے دو گھوڑوں والی ایک بڑی گاڑی کا انتظام کر لیا ہے۔ اسلحہ اور ایمونیشن اس میں رکھ دیا گیا ہے۔"

"اور خوراک؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق میں نے چھ آدمیوں کے لیے تین دن کی خوراک بھی گاڑی میں رکھوا دی ہے۔ یہ تین تھیلوں میں ہے جو بآسانی کندھوں پر لٹکائے جا سکتے ہیں۔"

ناشا ہمارے لیے بڑی بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ جازیوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے لیے اس کے دل میں ازلی نفرت موجود تھی۔ یہ نفرت اسے ہمارے قریب لے آئی تھی اور وہ ہمارے لیے ہر مشکل سہنے کو تیار ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ بڑے جازی خاران کی بیٹی تھی لہٰذا وادی کے منتظم اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے۔ وہ بلا روک ٹوک ہر جگہ آتی جاتی تھی اور کسی نہ کسی طور اپنا مقصد حاصل کر لیتی تھی۔ میں نے کہا "ناشا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھی ہمارے ساتھ ہی یہاں سے نکل چلو۔"

وہ حسبِ عادت اکھڑے لہجے میں بولی "میرا دماغ خراب نہیں کہ جوانی میں خودکشی کا سوچوں۔"

"یعنی ہم خودکشی کر رہے ہیں؟"

"سو فیصد" وہ اطمینان سے بولی "میں تمہیں پہلے بھی کہتی رہی ہوں اور اب بھی کہہ رہی ہوں، تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔"

"پھر ہمارا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟"

"تمہارا ساتھ تمہارے کہنے پر ہی دے رہی ہوں۔"

"اچھا..... اگر میں یہ کہوں کہ میں سب کچھ تم پر چھوڑتا ہوں، تم فیصلہ کرو۔ تو پھر؟"

اس کی آنکھوں میں کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ بے دلی سے بولی "میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ تم لوگوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ میں تو بار بار منع کرتی رہی ہوں کہ یہاں کسی کے خون سے ہاتھ مت رنگنا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جھیل پر لڑائی کے وقت بھی، تمہارے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر میں نے چیخ پکار کی تھی لیکن تم نے ایک نہ سنی۔ اب تم بری طرح پھنس چکے ہو۔ اس وادی میں رہو گے تو بھی موت ہے اور بھاگو گے تو بھی..... لیکن چوہے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ انسان کوشش کرے۔"

"تم ہمارا حوصلہ توڑنے والی بات کر رہی ہو۔"

"میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو افسانہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"ہو سکتا ہے" وہ بے پناہ مایوسی سے بولی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں رہی پھر کہنے لگی "قتل کا الزام تم دونوں پر ہے۔ چونکہ صفدر تمہارا ساتھی ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی سزا کا مستحق ٹھہرے لیکن باقی تین افراد جنہیں تم اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو، مجرم نہیں۔ وہ یہاں بڑی بھلی زندگی گزارنے کے قابل ہیں۔ تمہاری وجہ سے ان تینوں کی زندگیاں بھی شدید خطرے میں پڑ جائیں گی۔"

"یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ ہم ان تینوں کو یہیں چھوڑ جائیں؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔ میں نے کہا "میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تینوں یہاں سے نکلنے کے لیے ہم سے زیادہ بے چین ہیں۔ ان کی کوہ پیما پارٹی ان کی تلاش میں ابھی تک قراقرم رینج میں بھٹک رہی ہے اور ان کے عزیز و اقارب رات دن ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ تم ٹینگ بن سے ہی پوچھ کر دیکھ لو کہ وہ یہاں سے نکلنے کے لیے کیا قربانی دے سکتی ہے؟"

"میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی" وہ بیزاری سے بولی "تم مردوں کے دماغ سے برتری کا خناس کبھی نہیں نکل سکتا۔"

زرغونہ کمرے میں ہی موجود تھی۔ بظاہر کھیل رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ ہماری باتیں بھی سن رہی تھی "یہ خناس کیا ہوتا ہے؟" اس نے توتلی زبان میں پوچھا۔

"یہ تمہارے کام کی بات نہیں" ناشا نے اسے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جھڑکا۔ پھر مجھ سے بہ آہستگی مخاطب ہو کر بولی "اس بچی کا اب کیا کرنا ہے؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا "اسے تم کل سردار سدرت کے پاس لے جانا۔"

"لیکن یہ تو ذرا دیر بھی تم سے دور رہنا نہیں چاہتی۔"

"میں کل تک اسے سمجھا لوں گا" میں نے کہا۔

اچانک ہم دونوں بری طرح چونک گئے۔ کمرے کے اندر سے کلثوم کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم کچھ دیر تو صورتحال سمجھنے کی کوشش کرتے رہے پھر دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے زریں کو آواز دی اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ناشا کا رنگ بھی فق ہو رہا تھا۔ یہ بات تو یقین کرنے والی نہیں تھی کہ تنہائی میں زریں گل نے کوئی "ناجائز فائدہ" اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ میں اب تک اسے اچھی طرح جان چکا تھا۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کا رومان پسند شخص تھا۔ محبوب کے ساتھ ہلکی پھلکی شوخی اور چھیڑ چھاڑ سے آگے بڑھنے والا نہیں تھا۔ پھر کلثوم کیوں چلا رہی تھی۔ ناشا نے پُرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "یہ تمہارا دوست کیا کر رہا ہے گل ثوم کے ساتھ؟"

"یہ تو اوپر والا ہی جانتا ہے" میں نے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک بار پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس مرتبہ زریں گل نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ کلثوم زمین پر بیٹھی تھی اور اپنا ایک پاؤں پکڑے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا اسے؟" میں نے پوچھا۔

"استاد صیب! ام اپنی ماں کا قسم کھاتا ہے، ام کو کچھ پتا نہیں۔ یہ اچھا بھلا امارے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کو کسی چیز نے کاٹ کھایا ہے۔"

"تمہارے علاوہ کاٹنے والی اور کون سی چیز ہے یہاں؟" میں نے فوراً کہا..... پھر آگے بڑھ کر کلثوم کا پاؤں دیکھا۔

"امارا خیال ہے کسی کیڑے نے کاٹا ہے۔"

زریں گل کی بات درست معلوم ہوتی تھی۔ کلثوم کے سفید پاؤں پر ٹخنے کے قریب ڈنک کا نشان نظر آرہا تھا۔ نشان زدہ جگہ پھولی ہوئی تھی۔ اردگرد کی جلد سرخ اور نیلی تھی۔ میں نے گلے سے مفلر نکالا اور لڑکی کی پنڈلی پر کس کے باندھ دیا۔

"اسے شفاخانے لے جانا ہوگا" میں نے کہا۔

"نہیں شفاخانے جانے کی ضرورت نہیں۔ میں..... میں خود ہی اسے ٹھیک کرلوں گی" ناشا تشویش ناک لہجے میں بولی۔

"کیا کروگی؟"

"تمہارا خنجر کہاں ہے؟"

میں نے چھرا پنڈلی سے کھول کر ناشا کو تھما دیا۔

ناشا اپنی سہیلی راخشی کو آوازیں دینے لگی۔ راخشی بھاگی بھاگی وہاں پہنچی۔ دونوں کچھ دیر مقامی زبان میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ تب راخشی ساتھ والے کمرے میں گئی اور شیشے کی ایک کھلے منہ والی بوتل اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس میں پارے جیسا شفاف محلول ہلکورے لے رہا تھا۔

دونوں عورتوں نے مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میں باہر آکر زریں گل کے پاس کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کلثوم نے درد میں ڈوبی چیخیں بلند کیں، پھر خاموشی چھا گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد راخشی کسی تھکے ماندے سرجن کی طرح باہر نکلی۔ اس نے بتایا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ میں نے زریں گل کے ذریعے راخشی سے تفصیل پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا اور ہمیں ہدایت کی کہ ہم اپنے کمرے میں جائیں اور صبح سے پہلے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔

میں زریں گل کو ٹھوڑی سے پکڑ کر کمرے میں لے آیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

زریں گل حیران پریشان تھا۔ سر کھجا کر کہنے لگا "استاد صیب! امارا قسمت ہی خراب ہے۔ جب بھی ام کسی لڑکی کے قریب جاتا ہے اور امارے طلب کا کوئی صورت نکلتا ہے کوئی امارے درمیان آجاتا ہے۔"

"تمہاری مراد اس نامعقول کیڑے سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں استاد صیب! آپ بھی کیا آدمی ہے۔ ام اور بات کررہا ہے۔ ام یہ کہہ رہا ہے کہ کلثوم ام سے محبت کرتا ہے لیکن اس وادی کا اونچا اونچا دیواریں امارے درمیان آگیا ہے۔ ام کلثوم کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن کلثوم یہ کہتا ہے کہ ام اس کے پاس ادھری رہے۔ اب آپ ہی بتائیں ام یہاں کیسے رہ سکتا ہے۔ ام نے آپ کے ساتھ مل کر پانچ بندوں کو قتل فرمایا ہے۔ یہ لوگ ام کو دیکھتے ہی نشانے سے گولی مارے گا۔ ام کو ایک منٹ میں لنڈا شکار کرے گا۔ کلثوم سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہوجائے گا۔ اس لیے ام نے کہا تھا کہ وہ امارے ساتھ پاکستان چلے۔ امارا درخواست سن کر وہ آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا۔ اس نے اشاروں سے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے ام کو جو کچھ سمجھایا اور جو کچھ اماری سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ وہ یہاں سے جا نہیں سکتا۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ وادی دیوتاؤں نے ان کو انعام میں دیا ہے۔ جو اس انعام کو ٹھکرا کر کہیں جائے گا وہ فوراً سے پہلے دیوتاؤں کو پیارا ہوجائے گا۔ اب آپ ہی سوچیں۔ وہ یہاں سے جا نہیں سکتا۔ ام یہاں رہ نہیں سکتا۔ مسئلہ حل ہو تو کیسے ہو۔"

میں نے زریں گل کے انداز میں کہا "مجھے اس سچویشن پر ایک فلم یاد آگئی ہے۔ وحید مراد اور رانی کی فلم تھی....."

وہ تڑخ کر بولا "گولا ماریں جی آپ فلم کو۔ ادھر اماری جان پر بنا ہوا ہے۔ آپ کوئی حل سوچیں۔"

میں نے کہا "حل تو تم نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے بلکہ وہ گانا بھی سوچ رکھا ہے جو تمہاری روانگی کے وقت کلثوم نے پہاڑیوں میں بھاگتے ہوئے گانا ہے۔ اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم۔"

زریں گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس دردناک پوز بنا کر بیٹھا رہا۔

اگلے روز صبح سویرے ناشا ہماری رہائش گاہ پر آئی اور اس نے مجھے ایک بات بتا کر حیران کردیا۔ اس نے کہا کہ کل گل ثوم (کلثوم) نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں، اسے بچھو نے نہیں کاٹا تھا۔ اس نے زہریلا کانٹا اپنی رگ میں چبھویا تھا۔ ہمارے ہاں یہ بھی خودکشی کا ایک طریقہ ہے۔ ایک مقامی پودے کے کانٹے کو ایک تیز اثر زہر کے محلول میں کئی روز تک ڈبویا جاتا ہے۔ پھر اس کانٹے کو ٹخنے کی ابھری ہوئی رگ میں اتار دیا جاتا ہے۔ اکثر یہ طریقہ کامیاب اور مسل ثابت ہوتا ہے۔ لیکن گل ثوم نے جو کانٹا اپنی رگ میں چبھویا تھا وہ زیادہ زہریلا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ بچ گئی۔ ہم نے کل ہی چیرا دے کر اس کے پاؤں سے زہر نکال دیا تھا۔"

یہ اطلاع فی الواقع حیرت ناک تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ لڑکی زریں کے بارے میں اتنی "سیریس" ہوگی..... دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں، انسانی جذبوں میں مماثلت نظر آہی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی نوجوان لڑکیاں لڑکے عشق و محبت کے چکر میں خودکشی کی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے نیلا تھوتھا کھالیا، کبھی خواب آور دوا لے لی اور کئی زیادہ سنجیدہ عاشق آتشیں ہتھیار تک استعمال کرجاتے ہیں۔ زریں کی محبوبہ نے بھی ایک ایسا ہی "کارنامہ" انجام دیا تھا۔ یہ کوشش بے شک "نیم سنجیدہ" تھی لیکن متاثر کن تھی۔ اگر لڑکی کو مقامی انداز میں فوراً طبی امداد نہ ملتی تو وہ جان سے بھی جاسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہوگئی تھی کہ یہ لڑکی زریں گل کے ساتھ واقعی گہری وابستگی رکھتی تھی۔ سچی اور والہانہ۔ لیکن اب ماڈرن اور روشن خیال

لوگوں میں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ یہ خوبیاں اگر کہیں ہیں تو ان لوگوں میں ہیں جنہیں عرفِ عام میں "خوار زرتیانوسی اور غیر مہذب کہا جاتا ہے۔

میں نے ناشا سے پوچھا "اب اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟"

وہ حسبِ معمول خشک لہجے میں بولی "کرنا کیا ہے، میں نے اس پاگل کتیا کو زبردست جھاڑ پلائی ہے۔ اس جھاڑ سے اسے کافی افاقہ ہوا ہے۔ جو کسر رہ گئی ہے وہ بھی ایک دو دن میں نکال دوں گی۔ دیوتاؤں کی مار ہو اس عشق بازی پر۔ جب بھی اس کام میں بربادی ہوتی ہے، عورت ہی کی ہوتی ہے۔ مرد کا کام تو بس "کام" نکالنا ہی ہے۔ ایک سے کام نکل گیا تو دوسری پر فریفتہ ہوگیا۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ اگر دنیا میں رہنا ہے تو کیسے رہنا ہے۔"

"کیسے رہنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے رہنا ہے" اس نے پاؤں اٹھا کر جوتا میرے سامنے لہرایا اور بولی "اس جوتے کی نوک پر رکھنا ہے تم مردوں کو۔ جب جی چاہا منہ لگایا۔ جب جی چاہا ٹھوکر ماری۔"

"تو کیا وہ سمجھ گئی؟"

"سمجھ جائے گی۔ نہ سمجھے گی تو اپنا بیڑا غرق کرے گی۔"

میں نے کہا "اسے سمجھ ہی جانا چاہیے۔ اب اس مسئلے کا اور کوئی حل تو ہے نہیں۔ زریں گل اس وادی میں نہیں رہ سکتا اور تمہاری بہن اپنے عقیدے کے مطابق وادی سے باہر نہیں جاسکتی۔ یعنی ناکیں ناکیں ٹش۔"

"عقیدے کی بات چھوڑو۔ وہ اس وادی سے باہر جا ہی نہیں سکتی اور نہ ہی تم جاسکتے ہو" وہ تنک کر بولی "یہ سب تمہارے خیالی پلاؤ ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے رحم آرہا ہے تم سب پر۔ تمہارے فرار کے منصوبے پر مجھے تمہارے ہی خون کا چھڑکاؤ نظر آتا ہے۔ کاش میں تمہیں سمجھا سکتی!"

"کاش میں سمجھ سکتا!" میں نے مسکرا کر کہا "ویسے میرا ایک خیال اور بھی ہے۔ اگر فرضِ محال میں کسی طرح تمہیں اس بات کی گارنٹی دے دوں کہ تم اور ہم سب بالکل بحفاظت یہاں سے نکل جائیں گے تو بھی تم ہمارے ساتھ جانا پسند نہیں کروگی۔ اب تم پوچھوگی کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تمہیں ان جابروں سے، جن میں تمہارا باپ بھی شامل ہے، اتنی نفرت ہے کہ تم ان سے دور بھی نہیں جاسکتی ہو۔ تمہیں یہاں رہنا اور جابروں کے سینے پر مونگ دلنا اچھا لگتا ہے۔ ان کی تعلیمات کا سرِعام مذاق اڑا کر تم سکون اور راحت محسوس کرتی ہو اور تمہاری یہ راحت اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب لوگ تمہیں دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ گناہ گار، گمراہ لڑکی سب سے بڑے جابر زی خاران کی بیٹی ہے۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے اس کے دل کی بات کہی ہے۔ اس دوران میں مجھے زریں گل نظر آیا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی کھول کر جھانکا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "ویسے عاشق تو تمہاری بہن کو خوب ملا تھا۔ دل کی خاطر مرنے مارنے والا آدمی ہے۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ کلثوم نے اس کی خاطر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اگر معلوم ہوجائے تو جوشِ محبت اور فرطِ غم کے سبب یہ دھماکے سے پھٹ جائے اور یہ دھماکا ایسا زوردار ہوگا کہ اس وادی کے سارے مکینوں کے کان ایک سال تک ٹیں ٹیں کرتے رہیں۔"

"کیا مطلب۔ اسے معلوم نہیں کہ کل کیا ہوا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ میری طرح یہ بھی اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ کلثوم کو کسی کیڑے وڑے نے کاٹا ہے..... اور میرے خیال میں اگر ہم نے اس کی یہ غلط فہمی دور کی تو یہ ہماری زبردست غلطی ہوگی۔ اس کے عشق کی آگ پر ایسا تیل گرے گا کہ ساری وادی کی برف جل کر کوئلا ہوجائے گی۔"

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اس منحوس آگ میں تیل گرانے کی" وہ منہ بنا کر بولی اور بڑی بے باکی سے ٹانگ عریاں کرکے اپنی ران کا زخم سہلانے لگی۔

○☆○

وہ سرد لیکن پرسکون رات تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ یہ لاہور یا کراچی نہیں تھا کہ مطلع صاف ہونے کے باوجود گرد و غبار سے آسمان ڈھکا ہوتا۔ یہ حسنِ فطرت سے سجا ہوا قراقرم کا شفاف دامن تھا۔ آسمان پر پہلے عشرے کا چاند تھا اور تارے دمک رہے تھے۔ جیسے کسی مقامی حسینہ نے اپنے بالوں میں بے شمار موتی ٹانک رکھے ہوں اور اپنے محبوب کا انتظار کررہی ہو۔ اگلی صبح جشن کی صبح تھی اور یہی صبح ہمارے امتحان کی بھی تھی۔ لہٰذا قرب و جوار میں چھائی ہوئی خاموشی کو طوفان سے پہلے کی خاموشی کہنا بہت مناسب تھا۔

زرغونہ کو گود میں اٹھائے میں مکان کے صحن میں نکل آیا۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے دستانہ پوش ہاتھ میرے کندھوں پر دھرے تھے۔ میں نے اوپر ستاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پتا ہے، یہ ستارے کیا ہوتے ہیں؟"

"کیا ہوتے ہیں؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ہمیں بہت پیارے ہوتے ہیں لیکن ہم سے بہت دور جاچکے ہوتے ہیں۔ دیوتاؤں نے انہیں اپنے پاس آسمانوں پر بلا لیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ آسمان پر ستارے بن کر چمکتے ہیں اور ہمیں دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم اگر اچھے کام کریں تو وہ خوش ہوتے ہیں اور اگر برے کام کریں تو وہ غمزدہ ہوجاتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں۔"

وہ بولی "یہ اوس ان کے آنسو ہوتے ہیں کیا؟"

"ہاں، یہ ان کے آنسو ہوتے ہیں اور جب وہ خوش ہوتے ہیں تو جھلمل کرنے لگتے ہیں۔"

ننھی زرغونہ خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں دور برفانی چوٹیوں کے چمکدار ہیولوں پر جمی تھیں۔ وہ بڑی گہرائی سے کچھ سوچ رہی

تھی۔ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی "انکل! آپ نے کہا تھا میرے ماما پاپا بھی بہت دور چلے گئے ہیں۔ کہیں.... کہیں.... وہ بھی تو ستارے نہیں بن چکے؟"

میں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا "ہاں زرغونہ.... وہ بھی ستارے بن چکے ہیں" میں نے اشک بار لہجے میں کہا۔

زرغونہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بس میرے گلے سے چمٹی رہی۔ بالکل بے حس و حرکت اور خاموش۔ میں اس کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ آج وہ اس اندوہناک خبر سے آگاہ ہو گئی تھی جو ڈیڑھ ماہ سے اس سے چھپائی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کے سینے میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ میں اس کی پیٹھ تھپکتا رہا اور دلاسا دیتا رہا۔ وہ روتے ہوئے بولی "میرے ماما' پاپا اب کبھی واپس نہیں آئیں گے؟"

"لیکن وہ تمہیں دیکھتے رہیں گے زرغونہ.... ان کی نظریں ہر وقت تمہارے اوپر رہیں گی۔ اگر تم آنسو بہاؤ گی تو وہ دکھی ہو جائیں گے' اگر تم خوش رہو گی اور بڑوں کا کہنا مانو گی تو وہ خوش ہو جائیں گے۔"

"اور جھلملانے لگیں گے؟" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ اور اپنے ساتھی ستاروں سے کہیں گے دیکھو ہماری بیٹی کتنی اچھی اور بہادر ہے۔"

میں بہت دیر تک زرغونہ کو لے کر صحن میں ٹہلتا رہا اور اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ میری توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ سنبھل گئی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر خود کو ایسی صورتِ حال کے لیے تیار کر چکی تھی لیکن اس کے معصوم دل کو ابھی ایک صدمہ اور سہنا تھا۔ میں اسے یہ بتانے پر مجبور تھا کہ کل صبح وہ واپس سردار سدورت کے پاس جا رہی ہے اور میں کچھ دن تک اس سے نہیں مل سکوں گا۔ "کچھ دن" کی بات بھی طفل تسلی ہی تھی۔ زرغونہ سے اب دوبارہ ملنے کے امکانات بہت کم تھے۔ ہم بے حد غیر یقینی حالات کا شکار تھے۔ جب تک کل کا دن گزر نہ جاتا' کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہمارے حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔

وہ جب قدرے سنبھل گئی تو میں نے دھیمے دھیمے الفاظ میں اسے بتانا شروع کیا کہ کل اسے تاشا کے ساتھ سردار سدورت کے پاس سرنگ میں جانا ہے اور کچھ دن وہیں رہنا ہے۔ وہ میرے ساتھ کچھ اور چمٹ گئی' جیسے بہ زبانِ خاموشی انکار کر رہی ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ سرنگ میں یہ شدید سردی نہیں ہو گی' وہ ہنگ ناپ سکے گی۔ ناٹک دیکھ سکے گی اور اچھا کھانا کھا سکے گی۔

میرا خیال تھا کہ وہ میری باتیں سن رہی ہے لیکن اس کا ذہن تو کسی اور ہی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے پہنچنے والے صدموں نے اسے اعصاب شکنی کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ میں نے اسے خود سے جُدا کیا اور مدھم چاندنی میں غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا منہ مضبوطی سے بند تھا اور آنکھوں میں کالی پتلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اسے ایسی ہی اعصاب شکنی کی حالت میں دیکھ چکا تھا لیکن اس دفعہ کیفیت شدید تھی۔

"زرغونہ.... زرغونہ" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی گردن کے پچھلے پٹھے کھنچتے جا رہے ہیں اور سر پیچھے کی طرف جھک رہا ہے۔ یہ تشنج کی سی کیفیت تھی۔ میں اسے لے کر بھاگتا ہوا کمرے میں آیا۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ زریں گل دُہرے لحاف میں لپٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہوا استاد صیب؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"زریں! ٹارچ جلاؤ" میں نے تیزی سے کہا۔

"لیکن روشنی کرنا....."

"بکواس مت کرو۔ ٹارچ جلاؤ" میں نے دہاڑ کر کہا۔

زریں نے بستر میں چھپی ہوئی ٹارچ نکالی اور جلا دی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ زرغونہ کے چہرے پر مرکوز کیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور ہاتھ پاؤں مڑ رہے تھے۔ جبڑے بڑی سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے منہ میں انگلی دے کر جبڑے کھولے اور اپنا رومال تہ کر کے منہ میں دے دیا۔ ہماری آوازیں سن کر راخشی بھی بھاگی ہوئی موقع پر پہنچ گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی دیکھ کر وہ یقیناً حواس باختہ ہوئی ہو گی (روشنی کرنے کا مطلب تھا انتہائی "سخت سزا" کو دعوت دینا) مگر زرغونہ کی حالت دیکھ کر اسے ہماری مجبوری کا اندازہ ہو گیا تھا۔ میں اور زریں گل' زرغونہ کے ہاتھ پاؤں کی مالش کر رہے تھے۔ راخشی بھاگتی ہوئی باہر گئی اور شیشے کی ایک بوتل اٹھا لائی۔ اس میں سرخی مائل دوا تھی۔

ہم قریباً آدھ گھنٹے تک زرغونہ کو ہر ممکن طبی امداد پہنچاتے رہے.... آخر بتدریج وہ ہوش میں آ گئی۔ اس کا رنگ اب بھی ہلدی کی طرح زرد تھا۔

زریں گل بظاہر جتنا سخت اور بے پروا تھا' اندر سے اتنا ہی حساس تھا۔ زرغونہ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو تیر رہے تھے۔ گلوگیر لہجے میں بولا "استاد صیب' ام کو اتنا ظلم نہیں کرنا چاہیے۔ ام کو اس بچہ لوگ کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہیے۔ یہ یہاں رہا تو مر جائے گا۔"

زرغونہ کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ کل ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنا تھی اور یہ کوشش آگ اور خون کے دریا میں کودنے کے مترادف تھی مگر زرغونہ کی حالت دیکھ کر میں خود بھی مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ بے شک زرغونہ کو اپنے ساتھ رکھنے میں خطرات تھے لیکن اسے یہاں چھوڑنے میں زیادہ خطرات تھے۔

علی الصباح ساجینہ جون چارلس کو لے کر ہمارے پاس پہنچ گئی۔ جون چارلس سے اب تک ہماری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ہمارے بارے میں قریباً سبھی کچھ جان چکا تھا۔ ہماری وہ

ساری کارروائیں اور بھاگ دوڑ اس کے علم میں تھی جو ہم اس کی آزادی کے لیے کر رہے تھے۔ جب میں نے جون چارلس کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اس کا سر مونڈا ہوا تھا اور کوکی دارا کے گھر کی ایک کوٹھری میں پابہ زنجیر' چوپائے کی طرح پانی پی رہا تھا۔ اب اس کی جسمانی حالت قدرے بہتر تھی۔ سر پر تھوڑے تھوڑے بال بھی آ چکے تھے۔ تاہم گلے میں اس چرمی "پٹے" کا نشان موجود تھا جو کوکی دارا نے "غلام" کی حیثیت سے اس کے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ شستہ انگریزی بول سکتا تھا۔ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہم سے ملا۔ اسی دوران میں تاشا' جون چارلس کے دونوں ساتھیوں ینگ ہن اور لی وانگ کو لے کر پہنچ گئی۔ ینگ ہن اپنے محبوب جون چارلس کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی اور دونوں بغل گیر ہو گئے۔ وہ رو رہے تھے اور قبائلی زبان میں ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔ پھر جذبات سے مغلوب جون چارلس نے ینگ ہن کا ایک طویل بوسہ لینے کے لیے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

لی وانگ بھی ایک خوبرو اور صحت مند کوہ پیما تھا لیکن اس کی تمام خوبصورتی اور صحت مندی اس وادی میں آنے کے بعد گہنا گئی تھی۔ اس وادی میں پہنچنے سے پہلے ہی لی وانگ کی ٹانگ میں گولی لگ گئی تھی۔ مقامی شفا خانے میں یہ ٹانگ کاٹنا پڑی تھی۔ اب لکڑی کی ایک بھدی سی ٹانگ لی وانگ کے گھٹنے سے منسلک تھی۔ وہ چلتے ہوئے واضح طور پر لنگڑاتا تھا۔

لی وانگ کو صفدر کے ساتھ آنا تھا لیکن کچھ رکاوٹوں کی وجہ سے صفدر نے اسے تاشا کے ساتھ بھیج دیا تھا.... اب ہمیں پوری شدت سے صفدر کا انتظار تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں نہیں پہنچ سکا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہمارے خدشات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کے بغیر اپنی کارروائی کا آغاز کریں گے۔ دن کے دس بجے کے لگ بھگ تاشا وہ گھوڑا گاڑی بھی لے آئی جس نے ہمیں رتہ تبار راستے تک پہنچانا تھا۔ یہ توانا گھوڑوں والی ایک مضبوط گاڑی تھی اور سامان ڈھونے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کھلی چھت والی اس گاڑی میں اوپر تک خشک لکڑیاں چنی ہوئی تھیں لیکن یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ گاڑی کے اگلے حصے میں چار فٹ ضرب سات فٹ کا ایک خلا موجود تھا۔ اس خلا میں چھ افراد با آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ہماری پانچوں رائفلیں اور ایمونیشن بھی یہیں رکھ دیا گیا تھا۔ بوقتِ ضرورت ہم سائیڈ پر چنی ہوئی لکڑیاں گرا کر تیزی سے باہر نکل سکتے تھے۔

زرغونہ کی حالت اب قدرے بہتر تھی لیکن میں جانتا تھا' اگر ہم نے اسے یہاں چھوڑنے کی کوشش کی تو وہ پھر شدید ذہنی "شاک" کا شکار ہو جائے گی۔ لہٰذا سوچ بچار کے بعد اور مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہم نے اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تھا.... میں جون چارلس' ینگ ہن اور لی وانگ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ یہاں سے ہمارے فرار کی کوشش نہایت خطرناک اور جان لیوا ہے۔ ہمیں یہ کوشش ہر صورت میں کرنی ہے کیونکہ یہاں رہ کر بھی ہم بچ نہیں سکتے لیکن ان تینوں کے لیے صورتِ حال مختلف ہے۔ وہ اب بھی اچھی طرح سوچ سمجھ لیں کہ انہیں اس کوشش میں شریک ہونا ہے یا نہیں۔ تینوں نے یک زبان کہا کہ وہ بڑے سے بڑا رسک لے کر بھی یہاں سے نکلنا چاہیں گے۔ اس جواب کے بعد مزید کسی انکوائری کی گنجائش نہیں رہی تھی.... صفدر کا طویل انتظار دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ ختم ہوا۔ جونہی صفدر ہماری پناہ گاہ میں داخل ہوا ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ خاص طور سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رگ رگ میں نئی طاقت و توانائی بھر گئی ہے۔ ایک دوسرے کا ساتھ پا کر ہم ایسے ہی پُرجوش ہو جایا کرتے تھے۔ خطرات کے بڑے بڑے بھوت ہمیں ننھے منے بونے محسوس ہوتے تھے جنہیں روندتے ہوئے گزر جانا ہمیں بالکل آسان محسوس ہوتا تھا۔

مجھ سے بغل گیر ہونے کے بعد صفدر مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ سردار سدورت' ہمارے فرار کے منصوبے سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "سردار سدورت کو شک تو تین چار روز سے تھا لیکن کل سے اس کا شک یقین میں بدل چکا ہے۔ اس نے آج صبح مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ ہم دونوں میں نہایت اہم اور طویل گفتگو ہوئی ہے۔ میرے تاخیر سے یہاں پہنچنے کی وجہ بھی یہی گفتگو ہے.... سردار سدورت ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جاتری خاران کی بیٹی تاشا ہماری مدد کر رہی ہے۔ اس کے باوجود سردار نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ دل سے ہمارے ساتھ ہے لیکن وہ اس حق میں ہرگز ہرگز نہیں کہ ہم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ اس کا خیال ہے کہ اس کوشش میں ناکامی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہم میں سے جو افراد زندہ پکڑے جائیں گے' جاتری ان کے ساتھ عبرت ناک سلوک کریں گے.... میں نے بہت کوشش کے بعد سردار سدورت کو یہ سمجھایا کہ یہاں رہنے کی صورت میں بھی اب ہماری موت یقینی ہے تو کیوں نہ ہم ایک بھرپور کوشش کر کے دیکھ لیں۔ سردار سدورت شروع میں تو میری ہر دلیل رد کرتا رہا' آخر قدرے قائل ہو گیا۔ اس نے کہا' ٹھیک ہے' ہم جو چاہتے ہیں کریں' وہ اس سلسلے میں قطعی غیر جانبدار رہے گا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہمارے منصوبے سے "پیشگی باخبر" ہونے کا کوئی فائدہ نہیں اٹھائے گا لیکن ہمیں محافظوں کی طرف سے کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ بستی اور درّے کے محافظ ہمارے ساتھ وہی کریں گے جو انہیں مفرور ماراؤں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ویسے بھی درّے کے محافظ سردار سدورت کی حقیقی کمان

میں نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جاتزو سے ہے اور وہ براہِ راست جاتزو سے احکامات لیتے ہیں۔"

صفدر کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سردار صدرت شدید تذبذب کا شکار ہے۔ ایک طرف وہ ہمارے لیے اور اپنے آنجہانی دوست پاتامہ کی بچی کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا، دوسری طرف وہ اپنی منصبی ذمے داریاں بھی پوری کرنا چاہتا تھا۔ ان ذمے داریوں کے حوالے سے جہاں اسے جاتزیوں کا خوف تھا، وہاں کسی نہ کسی حد تک دیوتاؤں کا خوف بھی تھا۔ بے شک ان جنگلیوں میں روشن خیال لوگ بھی موجود تھے۔ جیسے پاتامہ، صفدر خاں، ناشا اور خود سردار صدرت مگر اس روشن خیالی کے باوجود ان کے دل کی گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں دیوتاؤں کا ڈر موجود تھا۔ وہی ڈر جو انسانی ذہن میں روزِ ازل سے پایا جاتا ہے۔ جب وہ خود کو حقیر اور حالات کو زبردست و زور آور پاتا ہے تو آپوں آپ اس کے اندر کسی بلند و برتر ہستی کے وجود کا احساس جاگتا ہے۔ ایسی ہستی جس کے سامنے وہ سر جھکا سکے۔ اپنی عاجزی و انکسار کا اظہار کر سکے۔ اپنے تمام تر "لبرل ازم" کے باوجود سردار صدرت بھی کسی نہ کسی درجے میں ہولناک دیوتا (سانشا دیوتا) کے غضب سے ڈرتا تھا اور اس دیوتا کا "فرمان" یہ تھا کہ موت کی اس وادی میں باہر کی دنیا کا فرد آتو سکتا ہے، یہاں سے جا نہیں سکتا۔

O☆O

سہ پہر کے تین بجے تھے جب ہم پوری تیاری کے ساتھ اپنی سنسنی خیز و پُرخطر مہم پر روانہ ہوئے۔ مال بردار گھوڑا گاڑی میں ہمیں بٹھانے سے پہلے راخشی اور ناشا نے پُرنم آنکھوں سے ہمیں "الوداع" کہا۔ ناشا نے بڑی بے باکی سے آگے بڑھ کر مجھے اور صفدر کو بوسہ بھی دیا۔ میں نے ایک بار پھر دل کی گہرائی سے کہا "ناشا! ہمارے ساتھ چلو۔"

اس نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور بولی "ہم اس بستی میں سب قربان ہو رہے ہیں، کسی ایک باغی کو تو یہاں رہنے دو۔"

صفدر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "اچھا باغی لڑکی! خدا کرے تم ہمیشہ یہاں رہو۔ لمبی عمر پاؤ اور ان جاتزیوں کو ناکوں چنے چبواتی رہو۔"

زریں گل بہت مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی متلاشی نظریں اردگرد کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن جسے وہ ڈھونڈ رہی تھیں وہ کہیں نہیں تھا۔ میدانِ عشق کے سپاہی نے غم کا ایک اور تمغا سینے پر سجا لیا تھا۔ یقیناً وہ اس سے بڑا تمغا لے سکتا تھا لیکن ہم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اس کی سرپھری محبوب نے آخری ملاقات میں کون سی "نامعقول حرکت" کی تھی۔

ہم گھوڑا گاڑی کے اگلے حصے میں موجود خلا میں بیٹھے اور گاڑی بان نے بھربھرے خشک لکڑیاں پہلو میں چُن دیں۔ اس خلا میں رائفلوں اور ایمونیشن کے علاوہ ایک بیگ بھی موجود تھا۔ کینوس کے اس بیگ میں ڈیڑھ دو کلو وزنی ایک تھیلی نظر آئی۔ اس تھیلی کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نما آلہ اور دو تین تار منسلک کیے گئے تھے۔ میں نے تھیلی کو ٹٹول کر دیکھا اور یہ جان کر حیران ہوا کہ اس میں دھماکا خیز مواد موجود ہے۔ ناشا نے بتایا کہ یہ تھیلی درحقیقت ایک ریموٹ کنٹرول بم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہمارے کسی کام آجائے۔ ہمارے ساتھ جانے والے گاڑی بان کا نام رشمت تھا اور یہ وادی کے سرکش و آزاد خیال لوگوں میں سے تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس سال تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح رشمت سے بھی ناشا کی گہری دوستی تھی۔ اس دوستی میں کچھ عرصہ مرد و زن کا تعلق بھی شامل رہا تھا۔ بہرحال اب وہ دونوں کبھی کبھار ہی ملتے تھے۔ رشمت بھی اس وادی سے فرار کا خواہاں تھا اور اس وسیع و عریض دنیا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو اس وادی سے باہر موجود تھی۔ کسی مارار سیاح سے حاصل ہونے والے بہت سے پکچر کارڈ اس کے پاس موجود تھے۔ یہ کارڈ پولی تھین کے ایک لفافے میں اس نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے اور ہر وقت یہ لفافہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ ان میں سے کچھ پکچر کارڈز پر لاہور کی تصویریں تھیں، کچھ پر کراچی اور پشاور کی۔ کچھ یورپی ممالک کے کارڈز بھی اس کے پاس موجود تھے۔ رشمت نامی یہ گاڑی بان اسی قمار خانے کا ملازم تھا جس کے طویل قامت مالک نے مجھے اور زریں کو خرید رکھا تھا۔ رشمت باورچی خانے کے لیے خشک لکڑیاں سرنگ میں پہنچاتا رہتا تھا لہٰذا وہ پہرے داروں کی نگاہ میں مشکوک نہیں ٹھہر سکتا تھا لیکن وہ یہ کام دن کی روشنی میں کرتا تھا، لہٰذا ہمیں ہر صورت اندھیرا ہونے سے پہلے سرنگ تک پہنچنا تھا۔ سرنگ میں پہنچ کر رشمت نے گھوڑا گاڑی کسی محفوظ مقام پر کھڑی کرنی تھی اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی ہمیں سرنگ کی ایک کشادہ شاخ میں قریباً ایک میل فاصلہ طے کرنا تھا اور اس درّے کے قریب جا نکلنا تھا جہاں وادی کے محافظوں سے ہمارا فیصلہ کن معرکہ ہونے کی توقع تھی۔

ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی بان رشمت نے اپنی نشست سنبھال لی اور گھوڑے دُلکی چال چلتے راخشی کے مکان سے باہر نکل آئے۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ سردی غیر معمولی طور پر کم محسوس ہو رہی تھی۔ بالکل وہی موسم تھا جو راولپنڈی، اسلام آباد میں دسمبر، جنوری میں ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس وادی میں دن اور رات کے درجۂ حرارت میں نمایاں فرق ہے۔

آٹھ دس منٹ کے اندر گھوڑا گاڑی بستی کے بارونق علاقے میں پہنچ گئی۔ خشک لکڑیوں کے درمیان رخنے موجود تھے اور ہم ان رخنوں میں سے کسی حد تک باہر کا نظارہ کر سکتے تھے۔ ہمیں بہت سے راہ گیر نظر آئے۔ وہ سب خوش باش دکھائی دیتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ کسی کے کندھے پر کلہاڑا یا رائفل نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید یہ بھی "جشنِ پیدائش" کی کوئی روایت تھی۔ پھر ہمیں منچلوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ وہ سب نشے میں مدہوش تھے اور تالیاں بجانے کے ساتھ ساتھ رقص کر رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک لڑکی نہایت مختصر لباس میں موجود تھی اور وہ بھی ناچ رہی تھی۔ ایک جگہ "پانی کی سبیل" کا سا منظر نظر آیا لیکن یہ بڑی غیر متبرک "سبیل" تھی۔ پلاسٹک کے بڑے بڑے نیلے ڈرموں میں مقامی پھل سے کشید کی گئی شراب بھری تھی۔ یہ شراب بڑے بڑے ڈونگوں میں بھر کر ہر کس و ناکس میں تقسیم کی جا رہی تھی۔ مدہوش و نیم عریاں مرد و زن جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور وحشیانہ قہقہے بکھیر رہے تھے۔ ان میں سے کئی کی حرکات شرمناک تھیں۔

جلد ہی ہم بستی کے بڑے چوراہے پر پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک راستہ سرنگ کے بڑے دہانے کی طرف جاتا تھا اور دوسرا درّے کی طرف۔ اس چوراہے میں ہمیں ایک لاش لٹکی نظر آئی۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دو تین دن پرانی ہے۔ مرنے والے کو لکڑی کے ایک اسٹینڈ پر باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔ پھانسی لگنے سے اس کی گردن لمبی ہو چکی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ لاش پر پھانسی سے پہلے یا بعد میں سنگ زنی بھی کی گئی تھی۔ مرنے والے کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور شکل پہچاننا مشکل تھا۔ پھر بھی مجھے اس کے نقوش کچھ جانے پہچانے لگے۔ میرے پوچھنے پر صفدر نے بتایا "یہ سردار پاتامہ کے قاتل اور کیرولین کے محبوب صدر خاں کی لاش ہے۔ اسے پرسوں سرِعام موت کی سزا دی گئی تھی۔"

ایک دم صدر خاں سے وابستہ تمام باتیں میرے ذہن میں آگئیں۔ صدر خاں نے کیرولین کے ساتھ مل کر پاتامہ کے خلاف سازش کی تھی اور کوئلوں کی گیس کے ذریعے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ صدر خاں کو پکڑ کر محافظوں کے حوالے کرنے والا میں ہی تھا۔ اچھا ہوا تھا کہ اس کا انجام میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ صفدر مجھے اس بارے میں تفصیلات بتانے لگا...

ایک جگہ مسلح محافظوں نے گھوڑا گاڑی کو روکا لیکن خیریت گزری اور تلاشی کی نوبت نہیں آئی۔ جلد ہی ہم عظیم الشان سرنگ کے دہانے سے اندر داخل ہو گئے۔ تاریک حصہ طے کر کے جب ہم سرنگ کے اس حصے میں پہنچے جہاں روشنی کرنے اور آگ جلانے کی اجازت تھی تو جشن کا اصل جوش و خروش ہمارے مشاہدے میں آیا۔ وادی کے مکین جیسے نیم پاگل ہو رہے تھے۔ کثرتِ شراب نوشی سے ان کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑی تھیں اور وہ بے وجہ ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ گوشت کے بڑے بڑے پارچے وہ منہ میں ڈالتے اور حلق میں اتارتے چلے جاتے۔ کچھ وحشی صورت بجلی اونی سالم رانیں بھنبھوڑ رہے تھے۔ خواب گاہوں کی طرف سے موسیقی کی تیز آواز آ رہی تھی اور اس آواز پر نوجوانوں کے قدم آپوں آپ متحرک رہے تھے۔ یہاں راستوں میں اور کونے کھدروں میں ہمیں "رنگین" منظر بھی نظر آئے۔ مرد و زن ایک دوسرے میں محو تھے اور گرد و پیش کی ہر چیز کو فراموش کر چکے تھے۔ کھلے راستے ان کے لیے خواب گاہوں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور وہ بلا جھجک دادِ عیش دے رہے تھے۔ یہاں ہمیں ہر مرد کے بازوؤں میں کم از کم ایک عورت نظر آئی۔ یقیناً ان بے شمار عورتوں میں وہ عورتیں بھی شامل ہوں گی جو ایکسٹرا اداکاراؤں کے طور پر فلمی یونٹ کے ساتھ اس علاقے میں آئی تھیں اور جنگلیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ چند ہی لمحے بعد میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ میں نے ایک قبول صورت سرخی شکن لڑکی کو دیکھا۔ وہ فطری لباس میں تھی۔ لمبے بالوں والا ایک بدبودار شخص اسے کلائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں سرنگ کی نیم تیرگی میں اوجھل ہو گئے۔

یہاں فضا میں خوشگوار حرارت تھی اور مختلف پکوانوں کی خوشبو دھوئیں سے لپٹ کر چاروں طرف چکرا رہی تھی۔ اس ماحول میں کبھی کبھی عورتوں کے کھنکتے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ گاڑی بان رشمت نے گاڑی سرنگ کے ایک نیم روشن گوشے میں کھڑی کر دی تھی اور خود بھی جشن منانے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مقامی شراب کا ایک پیالہ چڑھایا۔ پھر ایک نوخیز لڑکی کو اس کے ساتھی مرد سے جُدا کیا اور اسے گود میں اٹھا کر ناچنے لگا۔ جس مرد سے لڑکی کو جُدا کیا گیا تھا وہ بلا تردد ایک دوسری لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سرنگ کے اندر ہی ایک کشادہ جگہ پر سوباش دیوتا کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ اس مجسمے کے گرد جشن منانے والوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں ایک ٹولی کورس کے انداز میں کوئی مذہبی گیت بھی الاپ رہی تھی۔ پہلے ایک مغاچیف جاتزی مناجات کے انداز میں کچھ کہتا، پھر وہ ٹولی ردھم کے ساتھ ان الفاظ کو دہراتی۔ ان الفاظ میں (پشتو سے ملتا جلتا) ایک فقرہ بار بار استعمال ہو رہا تھا۔ شاید یہ ٹیپ کا مصرع تھا۔ "ہم اس وادی کے مکیں۔ ہم تیرے بیٹے، ہم تیری بیٹیاں۔"

گاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی اور ہم انتظار کرتے رہے کہ ہمارے اردگرد ابلیس کا ننگا ناچ ختم ہو اور یہ جشنِ خرافات اپنے انجام کو پہنچے۔ ہم نے اپنے اردگرد کے ماحول سے آنکھیں بالکل بند کر لی تھیں اور ان اعصاب شکن لمحات کے بارے میں سوچ رہے تھے جو ہمیں پیش آنے والے تھے۔ ہمارے پاس موجود رائفلوں میں ایک نیو رائفل "اے کے ۵۶" تھی۔ ایک برنو رائفل تھی۔ ایک لانگ رینج جرمن تھی اور دو سیون ایم ایم تھیں۔ ان میں سے صرف لانگ رینج رائفل کا ایمونیشن ناکافی تھا۔ باقی سارے ہتھیار ہم کفایت شعاری کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے استعمال کر سکتے تھے۔ پروگرام کے مطابق درّے سے دو فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ کر رشمت نے گاڑی کے صحت مند گھوڑوں کو انتہائی رفتار سے بھگا دینا تھا اور پہلی پوسٹ پر موجود پہرے داروں کو یہ تاثر دینا تھا کہ

گھوڑے بے قابو ہو کر بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ یقینی بات تھی کہ اس پوسٹ کے پہرے دار فوری طور پر گھوڑا گاڑی پر فائر کھولنے کا فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچیں گے گاڑی دوسری پوسٹ تک پہنچ چکی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گھوڑوں کی سرکشی دیکھ کر اور رخشت کی چیخ و پکار سن کر دوسری پوسٹ کے پہرے دار بھی تذبذب کا شکار ہو جاتے۔ ہمیں چند لمحوں کی مہلت بھی ملتی تو ہم دس بارہ افراد کو بھون کر رکھ دیتے۔

اچانک ایک نسوانی چیخ نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ یہ چیخ تماشا گاہوں کی طرف سے ابھری تھی۔ کوئی لڑکی کسی بدمست جنگلی کی دست برد کا شکار تھی اور چیخ رہی تھی "بچاؤ... مجھے بچاؤ۔"

اس کا لب و لہجہ صاف تھا اور وہ اردو بول رہی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ یہاں کی کوئی پرانی بارادہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسی فلمی یونٹ کی رکن ہو جو چند روز پیشتر بدقسمتی کا شکار ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھی اس کی آواز ہمارے دل پر اثر کر رہی تھی۔ اس دور افتادہ اجنبی وادی میں وہ ہماری جانی پہچانی آواز میں فریاد کر رہی تھی۔ ہمارا متاثر ہونا یقینی تھا۔ زریں گل کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر کی پختون روح بے قرار ہو گئی تھی اور اس کی انگشت شہادت اپنی سلک رائفل کی لبلبی پر حرکت کرنے کے لیے مچلنے لگی تھی۔

اس نے نتھنے پھلا کر سرگوشی کی "اب ام سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا استاد صیب۔ یا تو ام کو یہاں سے لے جاؤ یا ام کو اجازت دو کہ ام باہر نکل کر اس مجبور لڑکی کا مدد کرے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں زریں گل! فی الحال اپنی غیرت کو دبوچ کر بیٹھے رہو۔ ابھی آدھ پون گھنٹے میں تمہیں اپنے جوہر دکھانے کا اور غیرت آزمانے کا پورا موقع ملے گا۔"

"لیکن یہ لڑکی...؟"

"اس ایک لڑکی کا مت سوچو" میں نے اس کی بات کاٹی "ان سب لوگوں کا سوچو جو یہاں پہنچے ہیں اور اذیتوں کا شکار ہوتے ہیں۔"

زریں گل تلملا کر رہ گیا۔ باہر سے آنے والی آوازوں کو اپنے کانوں تک پہنچنے سے روکنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔

کم و بیش ایک گھنٹا ہم اس جشنِ خرافات کے نرغے میں رہے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ سرگرمیاں ماند پڑنے لگیں۔ تماشا گاہوں کی طرف موسیقی کی لے مدھم ہو گئی۔ مرد و زن کے بدمست قہقہے ماند پڑنے لگے۔ شراب پینے والوں کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ ڈھلتے نشے کی کوفت سے بچنے کے لیے نیند کی آغوش میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ میں نے لکڑی میں موجود رخنوں میں سے دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر کئی افراد بے ترتیب پڑے تھے اور بے سدھ تھے۔ بالکل جیسے آوارہ کتے کارپوریشن کی "دعوتِ شیراز" کا شکار ہوئے ہوں۔ سرنگ میں موجود اندھیرا اب ہر لحظہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ تاریکی اس امر کی نشاندہی کر رہی تھی کہ سرنگ سے باہر سورج غروب ہو چکا ہے۔ پھر میں نے گاڑی بان رخشت کو دیکھا، وہ تیزی سے گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ ہمارے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔

رخشت نے گاڑی پر سوار ہونے کے بعد پوچھا کہ کیا ہم تیار ہیں۔ یہ سوال زریں گل کی وساطت سے ہم تک پہنچا۔ ہم نے اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیا۔ ہم پوری طرح تیار تھے۔ تمام رائفلوں کے چار چار پانچ پانچ میگزین ہم نے بھر لیے تھے۔ ان میں سے ایک ایک میگزین رائفل سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ میں نے "اے کے ۴۷" سنبھال لی تھی۔ صفدر کے پاس سیون ایم ایم تھی۔ قاتل تو ہم ٹھہر ہی چکے تھے۔ اب ہم یہاں موت کی بارش بھی کر دیتے تو کیا فرق پڑتا تھا۔

رخشت نے گھوڑوں کو چابک دکھایا اور گاڑی تاریک سرنگ میں سفر کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ زرغونہ خواب آور دوا کے زیر اثر تھی اور اونگھ رہی تھی۔ اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ تاشا نے ایک بہت کمال کا کام کیا تھا۔ اس نے کہیں سے ایک بہت پرانی بلٹ پروف جیکٹ ڈھونڈ نکالی تھی۔ اس جیکٹ میں معمولی تبدیلی کرنے کے بعد ہم نے اسے اس قابل بنا لیا تھا کہ اسے زرغونہ کے بدن پر چڑھایا جا سکتا۔ اب یہ جیکٹ زرغونہ کے بدن پر تھی اور اسے تحفظ فراہم کر رہی تھی۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہم دروازے کے قریب پہنچ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دل کی دھڑکنیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ سرنگ کے اندر ہمارا سفر ختم ہوا تو ہم نے خود کو اخروٹ اور چیڑ کے گنجان درختوں میں پایا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا اور آسمان پر ستارے روشن اور نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ایک بل کھاتا راستہ دروازے کی طرف جاتا تھا۔ قرب و جوار کی طرح اس راستے پر بھی مکمل خاموشی تھی۔ ایک جگہ رخشت نے گھوڑا گاڑی روک دی۔ ہم نے آخری بار اپنی تیاری کا جائزہ لیا۔ رخشت نے زریں گل کے توسط سے ہمیں بتایا کہ اب وہ گھوڑوں کو سرپٹ بھگانے والا ہے۔ جون جاڈل کا ساتھی لی وانگ کچھ سہما سہما محسوس ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ابھی اپنے زخموں سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا اور بھاگ دوڑ سے خوف کھا رہا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ٹنگ ہن اور جون جاڈل نے جذباتی انداز میں ایک دوسرے کا بوسہ لیا اور اپنی رائفلیں مضبوطی سے تھام لیں۔ ایک بلند آواز کے ساتھ رخشت نے گھوڑوں پر اندھا دھند چابک برسائے اور انہیں سرپٹ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، اس نے گاڑی بانوں کا ایک خاص طریقہ آزمایا تھا اور گھوڑوں کو انتہائی رفتار تک پہنچانے کے لیے ان کی پشت پر تیز دھار

خنجر سے چرکے بھی لگا دیے تھے۔ راستہ زیادہ ہموار نہیں تھا۔ گھوڑا گاڑی، اچھلتی اور ڈولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گھوڑوں کے بھاگنے، رخشت کے چیخنے چلانے اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے قیامت خیز شور پیدا ہو رہا تھا اور سناٹے کو مجروح کر رہا تھا۔ لکڑیاں جو بڑی احتیاط سے گاڑی پر چنی گئی تھیں، زوردار جھٹکوں کے سبب دائیں بائیں گر رہی تھیں۔ رخشت غضب کی اداکاری کر رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار اور اس کے انداز سے واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گھوڑے اس کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور گاڑی کو اڑائے لیے چلے جا رہے ہیں۔ پھر ہمیں اپنے بالکل قریب سے محافظوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ یقیناً یہ پہلی پوسٹ کے محافظ تھے اور اس اچانک افتاد سے گھبرا کر واویلا کر رہے تھے۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی ان کے قریب سے گزر گئی۔ ہم پر کوئی فائر ہوا اور نہ کسی نے راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ہم اس "مہم" کے پہلے سخت مرحلے سے باآسانی گزر گئے تھے۔ جونہی ہم دراڑ میں داخل ہوئے، گھوڑوں کی ٹاپیں اور رخشت کی چیخ و پکار دور دور تک گونجنے لگی۔ یہ دراڑ نیچے سے کشادہ اور اوپر سے تنگ تھی۔ اس میں پیدا ہونے والی آواز دیر تک گونجتی تھی۔ دونوں گھوڑے برق رفتاری سے محافظوں کی دوسری پوسٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ صفدر اور تاشا کی اطلاعات کے مطابق یہاں سخت ترین مزاحمت کا سامنا تھا لیکن ایک امید دل میں موجود تھی۔ رخشت کا واویلا بے حد متاثر کن تھا۔ اس واویلے سے بعینہٖ یہی تاثر پیدا ہوتا تھا کہ گھوڑے قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور گاڑی بان کی سرتوڑ کوشش کے باوجود من چاہی سمت میں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ایک بے قابو گاڑی پر اندھا دھند سیدھا فائر کھول دینا آسان کام نہیں تھا۔

دوسری پوسٹ تک کا درمیانی فاصلہ پلک جھپکتے میں طے ہوا اور پھر ہم نے محافظوں کی چیخ و پکار سنی۔ اس کے ساتھ ہی تڑاتڑ کئی فائر ہوئے اور دراڑ اس آواز سے گونج اٹھی۔ یقیناً یہ ہوائی فائرنگ تھی کیونکہ ہمارے گھوڑے زخمی ہوئے اور نہ گاڑی میں گولیاں لگیں۔ میں نے دو قوی ہیکل محافظوں کو اچھل کر پتھریلی دیوار سے ٹکراتے دیکھا۔ یقیناً انہوں نے گھوڑوں کو روکنے یا ان پر سوار ہونے کی کوشش کی تھی... ہمیں ہرگز امید نہیں تھی کہ ہم اس دراڑ کی دوسری پوسٹ سے بھی اتنی سرعت کے ساتھ گزر جائیں گے۔ اب ہم دراڑ کے اس حصے میں داخل ہونے والے تھے جو زیادہ تنگ تھا اور جہاں سے گھوڑا گاڑی ہرگز نہیں گزر سکتی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں گھوڑا گاڑی کو دراڑ کے تنگ سرے پر یوں روکنا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ بند ہو جائے۔ اپنے سامنے چنی ہوئی لکڑیاں گرا کر ہمیں گاڑی سے اترنا تھا اور باقی فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ اگر ہم آخری پوسٹ کے محافظوں کو تہ تیغ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو وادی سے نکل کر باہر کے گھنے جنگل میں روپوش ہونا ہمارے لیے خاصا آسان ہو جاتا۔ یہ ایک تاریک رات تھی اور نشے میں مدہوش محافظوں کے لیے آسان نہ ہوتا کہ وہ "روشنی" کیے بغیر ہمیں ڈھونڈ سکیں... اور روشنی کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

دوسری پوسٹ سے گزر کر ابھی ہم نے سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک ایک گڑگڑاہٹ ابھری اور ہماری ساری پلاننگ ریت کے گھروندے کی طرح مسمار ہو گئی۔ شروع میں تو ہم کچھ سمجھ نہ پائے۔ رخشت نے بڑے زور سے گھوڑوں کی باگیں کھینچی تھیں۔ گھوڑے چلتے چلتے فرش پر رکنے کی کوشش میں پھسلتے چلے جا رہے تھے۔ پھر وہ پُرشور آواز کے ساتھ کسی آہنی چیز کے ساتھ ٹکرائے۔ بری طرح لڑکھڑائے اور پھر انہوں نے تڑپ کر اپنا رخ پھیر لیا۔ اب ہمارا منہ اسی سمت میں تھا جس سمت سے ہم آئے تھے۔ تصادم کے سبب ایک تہائی خشک لکڑیاں گاڑی پر سے گر چکی تھیں اور ہم سب کو چوٹیں آئی تھیں۔ درحقیقت ہمارا راستہ روکنے والا ایک مضبوط آہنی پھاٹک تھا۔ یہ پھاٹک کسی جادوئی چیز کی طرح اچانک ہی نمودار ہوا تھا اور ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اس کا میکنزم یقیناً دراڑ کی دونوں دیواروں میں پوشیدہ تھا اور یہ بالکل خفیہ میکنزم تھا۔ صفدر نے بہت عرق ریزی سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان میں کسی ایسے منحوس پھاٹک کا ذکر نہیں تھا۔ حتیٰ کہ یہاں کی باسی تاشا نے بھی کسی ایسی رکاوٹ کی نشاندہی نہیں کی تھی۔ یقیناً گاڑی بان رخشت کے لیے بھی یہ افتاد قطعی غیر متوقع ثابت ہوئی تھی۔

زرغونہ زبردست جھٹکے کے بعد رونے لگی تھی۔ لی وانگ کے حلق سے بھی ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے زرغونہ کو صفدر کی گود میں ڈالا اور خود کھڑا ہو کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ تاریکی میں کچھ بھی واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن یہ اندازہ یقیناً ہو رہا تھا کہ دوسری پوسٹ کے خونخوار [illegible] جنہوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی اور گھوڑوں کو روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے، اب تیزی سے ہماری طرف آ رہے ہیں۔ لازمی بات تھی کہ ان کے پیچھے پہلی پوسٹ یا چوکی کے محافظ بھی ہوں گے۔ یہ لوگ یہاں پہنچ جاتے تو ہم بے موت مارے جاتے۔ میں نے زریں گل کے ذریعے رخشت کو حکم دیا کہ وہ اب واپسی اختیار کرے اور ایک بار پھر گھوڑوں کو سرپٹ بھگا دے۔ رخشت اپنی حرکات و سکنات سے ایک جی دار اور "خطرات پسند" شخص نظر آتا تھا۔ شراب کے چند پیالوں نے اس کی جولانی طبع کو ہوا دے رکھی تھی۔ اس نے ایک زوردار للکار مار کر چابک لہرایا اور گھوڑوں کو دوبارہ حرکت میں لے آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑے ایک بار پھر طوفانی رفتار سے بھاگنے لگے۔ دوسری پوسٹ کے محافظوں نے ایک بار پھر چیخ و پکار اور ہوائی فائرنگ کی لیکن گھوڑوں کو روکنے میں ناکام رہے لیکن اس مرتبہ یہ ہوا کہ ان میں سے کچھ گھڑ سوار تیزی سے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور سواروں کی چیخ و پکار نے درّے کو گونج

دار خلا میں کہرام بپا کر رکھا تھا۔ پہلی پوسٹ پر بھی چند محافظ گھوڑوں پر سوار تھے' انہوں نے گھوڑا گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کر دیا۔

زریں گل نے چیخ کر مجھ سے کہا "استاد صیب' گاڑی بان پوچھتا ہے' اب ام کیا کرے؟"

میں نے کہا "اس سے کہو کہ سیدھا جاترو کی طرف چلے۔"

جاترو کی عمارت دُرّے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بمشکل نصف میل کا فاصلہ تھا۔ رشمت نے فوراً گاڑی کا رخ جاترو کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ گھڑسوار محافظ اندازہ لگا چکے تھے کہ گھوڑے بے قابو ہو کر نہیں بھاگ رہے بلکہ انہیں بھگایا جا رہا ہے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ رشمت کا چابک بار بار ہوا میں لہرا رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ان کے انداز میں ایک دم تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر تحکمانہ لہجے میں رشمت سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گاڑی سے قریب تر آنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ پھر میں نے ایک گھڑسوار کو دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ بھاگتے گھوڑے کی لگام پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ رائفل کے رخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گھوڑوں یا گاڑی بان کو نشانہ بنانا چاہ رہا ہے۔ میں نے خطرناک "ٹامی گن" اس کی طرف سیدھی کی۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہ پہلا فائر تھا جو میں نے اس دارخلا میں پہنچنے کے بعد براہ راست کسی شخص پر کیا۔ ایک دھماکا ہوا اور گھڑسوار اچھل کر تاریکی میں گرا۔ اسی دوران میں صفدر نے بھی اپنے آتشیں ہتھیار کا دہانہ کھول دیا۔ سیون ایم ایم کے ایک برسٹ نے ان دو سواروں کو بھون کر رکھ دیا جو گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

"گاڑی تیز بھگاؤ" میں اردو میں ہی رشمت پر چیخا۔

الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آئے ہوں گے لیکن مفہوم سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گھوڑوں کو اندھا دھند چابک رسید کرنے شروع کر دیے۔ گھوڑے پوری جان سے دوڑ رہے تھے۔ دوسری طرف ہمارے اور گھڑسواروں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس فائرنگ نے سناٹے کا ٹیشہ چکنا چور کر دیا تھا اور نیم خوابیدہ دھرتی میں غلغلہ سا مچنے لگا تھا۔ آناً فاناً ہم جاترو کی وسیع عمارت کے قریب پہنچ گئے "زر استاد صیب! اب کیا کرنا ہے؟" زریں نے چیخ کر پوچھا۔

"چھوٹے والے گیٹ سے گاڑی اندر گھسا دو" میں نے ہدایت جاری کی۔

چھوٹے والا گیٹ' اصل گیٹ سے پچاس ساٹھ گز دور تھا لیکن وہاں سیڑھیاں نہیں تھیں۔ چوبی گیٹ بھی کمزور تھا۔ اگر وہ بند تھا تو بھی عظیم جثے گھوڑے اسے توڑتے ہوئے اندر گھس سکتے تھے۔ زریں نے میرا پیغام رشمت تک پہنچایا' رشمت نے دلیری اور چابک دستی سے اس پیغام پر عمل کیا اور گھوڑا گاڑی لکڑی کا پھاٹک توڑتی ہوئی طوفانی رفتار سے اندر گھس گئی۔ وسیع صحن میں اِکا دُکا عقیدت مند اور پجاری موجود تھے۔ گھوڑا گاڑی کی صورت میں ایک بلائے ناگہانی کو مقدس صحن میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ لوگ چیختے چلاتے بھاگے۔ غضب ناک گھڑسوار بھی گھوڑوں سمیت ہمارے پیچھے صحن میں داخل ہو گئے تھے۔ زریں کی رائفل کا ایک برسٹ آیا اور میں نے بائیں جانب والے ایک گھوڑے کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ گھوڑے کے گرتے ہی گاڑی بھی خطرناک زاویے سے اپنے پہلو پر جھک گئی اور دور تک گھسٹتی چلی گئی۔ ایندھن کی لکڑیاں تاریک صحن میں چاروں طرف بکھر گئیں۔ ہمیں گاڑی سے اترنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی تھی کیونکہ ایک آدھ کے سوا ہم سب گاڑی میں سے باہر لڑھک گئے تھے۔ یہی موقع تھا اپنی بھرپور "فائر پاور" کا مظاہرہ کرنے کا۔ زر فونہ صفدر کی بانہوں میں تھی۔ میں نے صفدر کو اپنی اوٹ میں لیا اور ایم سولہ کے "56" کا دہانہ کھول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی اور گھڑسوار تڑپ تڑپ کر بھاگنے اور پناہیں ڈھونڈنے نظر آئے۔ کم از کم دو افراد کو میں نے اپنی آنکھوں سے زمین بوس ہوتے دیکھا۔ دوسری طرف زریں گل اور جون چاؤل نے بھی اندھا دھند برسٹ مارے تھے۔

"پیچھے ہٹو۔ سیڑھیوں کی طرف جاؤ" میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور خود بھی الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ دھماکا خیز مواد والا بیگ میں نے فرش سے اٹھا لیا تھا۔

فائر کرتے ہوئے ہم تہ خانوں کی سیڑھیوں تک پہنچے۔ اس دوران میں ہمارے گاڑی بان رشمت کو ایک گولی لگی اور گردن چیر کر نکل گئی۔ وہ پیٹ سے میرے قدموں میں گرا۔ میں نے اس کا ایک بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا.... چند لمحوں کے لیے ہم محافظوں کی اندھا دھند فائرنگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا' بڑا جاتری ناتوب ماکلی اس وقت ان تہ خانوں میں ہی کہیں موجود ہو گا۔ ہم اس تک پہنچ جاتے تو موت اور زندگی کی اس جنگ میں ہمارا پلڑا بھاری ہو سکتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے' خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ مجھے صرف ناتوب ماکلی کی خواہش تھی لیکن جو کچھ ملا وہ بہت زیادہ تھا۔ بلکہ شاید میں اس سے زیادہ کی خواہش ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک ہمارے پہلو میں ایک مضبوط چوبی دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور مجھے نیم تاریکی میں ایک سرمنڈے جاتری کا ہیولا نظر آیا۔ یقیناً وہ صورتِ حال جاننے کے لیے باہر نکلا تھا۔ میں نے رائفل کا بٹ اس کے تھوبڑے پر رسید کیا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے میرے تمام ساتھی بھڑا مار کر اندر آ گئے۔ صفدر نے پھرتی سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جاترو کے اندر ہونے والی یہ کارروائی چند ہی سیکنڈ میں ختم ہو گئی تھی۔

گھپ اندھیرے میں ہم کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ اس ہال نما تہ خانے میں تین چار درجن خوابیدہ اور

نیم خوابیدہ افراد موجود ہیں۔ یقیناً ان میں اکثریت جاتریوں کی تھی۔ وہ بدحواس آوازوں میں بول رہے تھے اور ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے اپنی رائفل سے ایک ہوائی برسٹ مارا تو ہال نما تہ خانہ لرز اٹھا اور وہاں موجود ہر فرد کو سانپ سونگھ گیا۔

"ٹارچیں جلاؤ" میں نے صفدر اور زریں گل کو حکم دیا۔

چند لمحے بعد ٹارچیں روشن ہو گئیں اور تہ خانے کی تاریکی نیم اُجالے میں بدل گئی۔ تہ خانے کا منظر غیر معمولی طور پر حوصلہ افزا تھا۔ بڑے جاتری خاران اور قائم مقام جاتری ناتوب سمیت یہاں قریباً بیس اہم ترین جاتری موجود تھے۔ اس کے علاوہ دوارے کے دو معزز اور متمول افراد تھے جنہیں جاتریوں سے خاص قرب حاصل تھا۔ یہ سب لوگ نشے میں مدہوش تھے۔ کچھ کچی نیند سے جاگے تھے اور کچھ شاید ابھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک بھرپور جشن خرافات کے بعد وہ سب نڈھال نظر آ رہے تھے۔ اب ان کی اس کیفیت میں بے پناہ خوف کی کیفیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ پہلے انہوں نے جاترو کے صحن سے اندھا دھند فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں اور اب مسلح افراد نے زبردستی یہاں گھس کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی بھی وجہ سے اور کسی بھی حالت میں ان کے ساتھ ایسی "بدتمیزی" ہو سکتی ہے۔

تہ خانے کا بند دروازہ اب زور زور سے کھٹکھٹایا جانے لگا تھا اور باہر سے غضب ناک محافظوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ زریں گل شدید زخمی رشمت کو بھی اٹھا کر اندر لے آیا تھا۔ اس کے لہو سے تہ خانے کا دبیز قالین سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک جاتریوں کے ایک جوشیلے عقیدت مند نے جون چاؤل سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے بے دریغ اس پر فائر کیا۔ سینے پر دو گولیاں کھا کر وہ پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا پھر مردہ چھپکلی کی طرح پیٹ سے قالین پر گر گیا۔ تہ خانے میں موجود ہر شخص کا چہرہ ایک دم "موت کا منظر" پیش کرنے لگا۔ جو جہاں تھا وہیں پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔

"خبردار" میں نے دہاڑ کر کہا "جو حرکت کرے گا' اس کا یہی انجام ہو گا۔ جس کسی کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار ہے وہ دروازے کے پاس رکھ دے۔"

زریں گل نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں میرے الفاظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ تہ خانے میں موجود افراد میں سے کسی نے حرکت نہیں کی اور نہ کوئی ہتھیار پیش کیا۔

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے میں رشمت کو دیکھا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ گولی اس کا نرخرا چیر کر گزر گئی تھی۔ اس کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ زریں گل اور جون چاؤل دونوں کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ دیگر ساتھیوں کے چہروں پر بھی ہلکی پھلکی خراشیں موجود تھیں۔ یہ خراشیں اور چوٹیں دروازے کے آہنی پٹ تک سے ہونے والے تصادم کی نشانی تھیں۔ روشنی میں ہم پہلی بار ایک دوسرے کے چہرے دیکھ رہے تھے لہٰذا ان چوٹوں سے آگاہ ہو رہے تھے۔

میں نے زریں گل سے کہا "باہر موجود محافظوں کو بتاؤ۔ تہ خانے میں بڑے جاتریوں سمیت ہر شخص ہمارے نشانے پر ہے۔ اگر دروازہ توڑنے کی کوشش کی گئی تو ان میں سے ایک حرامی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

زریں گل بند دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس نے یہ بات بڑے جوش و خروش سے محافظوں تک پہنچائی۔

یقیناً زریں گل کی بات سمجھ لی گئی تھی کیونکہ اس کے بعد دروازے پر باہر سے کی جانے والی اندھا دھند زور آزمائی ختم ہو گئی۔

میں نے خاران سمیت پانچوں بڑے جاتریوں کو حاضرین میں سے علیحدہ کر دیا اور ان کی جامہ تلاشی لینے کے بعد انہیں ہال کے ایک گوشے میں زمین پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد صفدر رائفل بدست ان کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ میرے کہنے پر زریں گل نے حاضرین کو سمجھا دیا کہ ان میں سے کسی کی بھی غلط حرکت کا مطلب یہ ہو گا کہ پانچوں بڑے جاتری جان سے جائیں گے۔

میرے اس اعلان نے حاضرین میں ہلچل مچا دی۔ ان میں سے کچھ کے چہرے جوش سے تمتمانے لگے اور کچھ کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔ خوف یقیناً اس بات کا تھا کہ ہم بلند مرتبت اور عظیم الشان جاتریوں کی شان میں زبردست "گستاخی" کر رہے تھے اور اس گستاخی سے دیوتاؤں کا غضب جوش میں آ کر یہاں موجود ہر ذی نفس کو خاکستر کر سکتا تھا۔ جن حاضرین کے چہروں پر جوش نظر آ رہا تھا وہ یقیناً ہمیں ہماری گستاخی کی سزا دینا چاہتے تھے لیکن صورتِ حال کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ان میں سے موٹی گردن اور سرخ چہرے والا ایک شخص پشتو جانتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور دوران طیش سے بولا "تم لوگ ہر حد پار کر رہے ہو۔ ہمارے سامنے ہمارے مقدس بزرگوں کی توہین کرو گے تو ہم چپ نہیں رہ سکیں گے۔ تم اگر یرغمال بنانا چاہتے ہو تو ہمیں بناؤ لیکن محترم جاتریوں کو یہاں سے جانے دو ورنہ ہمیں...."

اس کے منہ کی بات منہ میں ہی رہی۔ میری رائفل سے نکلنے والے سنگل شاٹ نے اس کی پیشانی کے عین درمیان سوراخ کر دیا تھا۔ وہ پشت کے بل اپنے ساتھیوں پر گرا۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار نکلی اور چند سیکنڈ میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ مجھ پر یہ وحشت سوار ہو چکی تھی۔ جو درندگی' سفاکی اور بے رحمی میں نے یہاں آ کر دیکھی تھی' وہ ساری میری آنکھوں میں رقصاں ہو گئی تھی اور اب میرے دل میں یہاں موجود کسی شخص کے لیے رحم کی ایک رمق بھی موجود نہیں تھی۔

پیشانی پر گولی کھانے والا پشتو داں جنگلی' چند لمحوں میں یوں بے

جان ہو گیا تھا جیسے کبھی وہ زندہ تھا ہی نہیں۔ بس اس کے دونوں پاؤں ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ آٹھ دس سیکنڈ میں وہ بھی بالکل ساکت ہو گئے۔ اس دوسری موت نے حاضرین کی رہی سہی ہمت بھی سلب کر لی تھی۔ وہ پتھریلی مورتیوں کی طرح اپنی اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ چند لمحے پہلے کچھ چہروں پر جو جوش و خروش نظر آیا تھا وہ بھی یک دم معدوم ہو گیا۔

ہم نے گنتی کی۔ تہ خانے میں موجود کل افراد کی تعداد اٹھارہ تھی۔ (ان میں وہ دو خونچکاں لاشیں شامل نہیں تھیں جو پچھلے پانچ منٹ کے دوران میں میرے ہاتھوں سے گری تھیں) ان میں سے تیس اس وادی کے اہم ترین جاتری تھے۔ وہ اپنے مخصوص لبادوں اور صفاچٹ چہروں اور سروں کی وجہ سے علیحدہ ہی پہچانے جاتے تھے۔ میں نے ان سب کو دیواروں کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ معمولی تذبذب کے بعد انہوں نے اس حکم پر عمل کیا۔ زریں گل، جون چارلس اور لی وانگ نے ان سب افراد کی جامہ تلاشی لی۔ دو خم دار خنجروں کے سوا کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا۔ تہ خانے کی دیواروں پر تو بڑاں چار عدد منقش کلہاڑیاں بھی قبضے میں لے لی گئیں۔ ان تمام افراد کو گیارہ گیارہ کی تین ٹولیوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بٹھا دیا گیا۔ ان سب کے چہرے دیوار کی طرف تھے۔

ہماری اس کارروائی کے دوران میں ہمارا پُرجوش ساتھی گازی بان رشمت آخری سانس لے چکا تھا۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون قالین پر دور تک بکھرا تھا اور پتھرائی ہوئی بے نور آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں یا شاید وہ چھت سے آگے ان دل پسند مناظر کو دیکھ رہی تھیں جو اس نے پکچر کارڈز پر دیکھے تھے اور سنبھال کر اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ پشاور کا قصہ خوانی بازار، لاہور کا شالامار باغ، کراچی کا کلفٹن، پیرس کا ایفل ٹاور، لندن کا ہائیڈ پارک اور نیویارک کی فلک بوس عمارتیں۔ وہ تو اس یخ بستہ وادی سے نہیں نکل سکا تھا، شاید اس کی روح نکل گئی تھی اور اپنے خوابوں کی "سرزمینوں" پر پرواز کر رہی تھی۔

جاترو کے صحن میں ہونے والے ہنگامے میں ٹینگ ہن کے بازو میں بھی کارتوس کے دو چھرے لگے تھے لیکن کہنی کے قریب سے گوشت چھیدتے ہوئے گزر گئے تھے۔ جون چارلس نے ٹینگ ہن کے زخم کا خون بند کر کے مضبوطی سے پٹی باندھ دی تھی۔ وہ پہاڑوں کی بلندیاں سر کرنے والی باہمت لڑکی تھی۔ اس زخم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ تاہم میرا خیال تھا کہ چوٹ ٹھنڈی ہو جانے پر وہ خاصی تکلیف محسوس کرے گی۔

یہ تہ خانہ قریباً پچیس ضرب پچاس فٹ کا تھا۔ اس میں دو دروازے تھے۔ ایک تو وہی دروازہ تھا جس سے ہم داخل ہوئے تھے۔ دوسرا ایک پہلو میں تھا اور اندرونی حصوں کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرے پہلو پر ایک مستطیل کھڑکی تھی۔ یقیناً یہ کھڑکی اس زمین دوز "مورشن" کی کسی راہداری میں کھلتی ہوگی۔ کھڑکی کے پٹ مضبوط لکڑی کے تھے اور اندر سے بند تھے۔ تہ خانے کے فرش پر دبیز قالین تھا اور حسبِ رواج دیواروں پر بھی قالیچے منڈھ دیے گئے تھے۔ یوں یہ تہ خانہ آتش دان یا انگیٹھی کی غیر موجودگی میں بھی نیم گرم تھا۔

میں نے صفدر کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہلاک ہونے والے دونوں مقامی افراد کی لاشیں باہر نکال دی جائیں۔ جون چارلس نے کھڑکی کا ایک پٹ کھولا اور صفدر نے زریں کے ساتھ مل کر دونوں لاشیں یکے بعد دیگرے باہر پھینک دیں۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ لاشیں وصول کرنے کے بعد باہر کے لوگوں میں ایک بار پھر اضطراب کی لہر جاگی۔ پہلے کھسر پھسر سنائی دیتی رہی پھر کچھ لوگ بلند آواز میں بولنے لگے۔ کسی شخص کے رونے کی آواز بھی آئی۔

ہم نے رشمت کی لاش اٹھا کر کمرے کے ایک تاریک گوشے میں ڈال دی اور اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد میں نے بڑی احتیاط سے کمرے کا بغلی دروازہ کھولا۔ سامنے ایک تنگ راہداری نظر آئی۔ ٹارچ کی روشنی میں راہداری کی چھت بہت نیچی نظر آ رہی تھی اور یہ بھی دکھائی دے رہا تھا کہ فرش پر قالین بچھا ہے۔ رائفلیں سونت کر میں اور زریں گل بڑی احتیاط سے اس راہداری میں آگے بڑھے۔ دو خم کھانے کے بعد یہ راہداری ایک اور دروازے تک پہنچی۔ دروازے کو ہماری طرف سے بولٹ چڑھا ہوا تھا۔ ہم کچھ دیر کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرتے رہے۔ کسی طرح کی آواز سنائی نہیں دی۔ بہ آہستگی بولٹ ہٹا کر ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں بھنے ہوئے گوشت اور الکحل کی تیز بو محسوس ہوئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ دائرے کی شکل میں ایک کشادہ جگہ تھی۔ اس دائرے کے عین درمیان ساہڈ یعنی رواباش دیوتا کا قریباً چار فٹ اونچا مجسمہ نصب تھا۔ دیکھنے میں وہ طلائی نظر آتا تھا یا پھر اس پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ ایک مرد اور عورت کی سنہری مورتیاں اس مجسمے کے سامنے سجدہ ریز تھیں۔ فرش پر جگہ کی مناسبت سے گول قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف دسترخوان بچھا تھا جس پر ابھی تک خالی پلیٹیں اور ولایتی شراب کی استعمال شدہ بوتلیں موجود تھیں۔ دوسری طرف رقص و موسیقی کے مقامی آلات پڑے تھے۔ ان میں "تنبل"، ہارمونیم اور ایک لمبوتری سی ڈھولکی زیادہ نمایاں تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ جشن کے دوران میں محترم جاتری کھانے کے ساتھ ساتھ رقص سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔

اس دائرہ نما جگہ میں مجھے ایک ہی جیسے پانچ دروازے نظر آئے جو مختلف اطراف میں کھلتے تھے۔ ان میں سے صرف ایک دروازہ قدرے مختلف تھا۔ اس کی سیاہی مائل لکڑی منقش تھی اور اس میں چمکدار میخیں ٹھونکی گئی تھیں۔ دائیں میرے ہاتھ میں اور

انگلی لبلبی پر تھی۔ اس انگلی کو حرکت میں لانے کے لیے میں دل و جان سے تیار تھا۔ میرے اشارے پر زریں گل نے ٹارچ کا روشن دائرہ اس منقش دروازے پر مرکوز کیا۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ بے آواز اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

"کک۔۔۔ کون ہے؟" ایک ڈری سہمی سی آواز تاریکی سے ابھری۔

زریں نے ٹارچ کا رخ آواز کی سمت کیا۔ منظر چونکا دینے والا تھا۔ ایک آرام دہ مسہری پر ایک خوش شکل لڑکی موجود تھی۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی اور نہ لیٹی ہوئی تھی بلکہ ان دونوں حالتوں کی درمیانی حالت میں تھی۔ اس کی پریشان نظریں ہماری طرف لگی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس پاکستانی ہیروئن کا خیال آیا جو فلمی یونٹ کے ساتھ پکڑی گئی تھی اور اس وادی میں پہنچی تھی۔ صفدر نے بتایا تھا کہ وہ ایک نوخیز لڑکی ہے اور چونکہ زیادہ خوبصورت ہے اس لیے مقامی دستور کے مطابق بڑے جاتری خاران کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔ یقیناً یہ وہی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری بھوری تھیں اور وہ بنی بنائی ہیروئن نظر آتی تھی۔ وہی ہیروئن جسے عرفِ عام میں پاکستانی فلموں کا ڈیکوریشن پیس کہا جاتا ہے، جو چھ گانے گاتی ہے، ایک دفعہ بارش میں بھیگتی ہے، ایک دفعہ اغوا ہوتی ہے اور ایک دفعہ اپنی مرضی سے ہیرو کے ساتھ بھاگتی ہے۔ وہی ہیروئن اس مرتبہ سچ مچ اغوا ہو گئی تھی اور ایک ہاتھی نما ولن کے قبضۂ ستم میں تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی زریں گل نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں اسلحے کی موجودگی محسوس کر کے وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔ میں نے کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

وہ ہمارے بے تحاشا بڑھے ہوئے بال دیکھ رہی تھی اور یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم مقامی لوگ ہیں لیکن اب ہمارے لب و لہجے نے اسے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہماری طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

"تت۔۔۔ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ ہم وہیں کے رہنے والے ہیں جہاں کی تم رہنے والی ہو اور جہاں کے فلم اسٹوڈیوز میں کام کرتی ہو۔ اے شہر لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام۔"

اس کی براؤن آنکھیں حیرت اور خوشی سے کھل گئیں "تو۔۔۔ تم۔۔۔ لاہور کے رہنے والے ہو؟"

"ایک سو دس فیصد" میں نے کہا۔

"لیکن یہاں کیسے پہنچ گئے تم؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تمہاری فلم کی طرح تین گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہوگی اور اس وقت ہمارے لیے ہر لمحہ قیمتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم صرف ہمارے سوالوں کے جواب دو۔ تمہارے سوالوں کے جواب پھر کبھی دے کر ہم تمہارا قرض اتار دیں گے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔"

"آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام تو شاہدہ ہے لیکن فلم میں آ کر روشنی ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، روشنی ہی چلے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارے علاوہ یہاں اور کون موجود ہے؟"

وہ تھوک نگل کر بولی "اس کمرے میں تو صرف میں اکیلی ہوں۔ باقی کمروں میں بھی عورتیں ہی ہیں۔"

"کون عورتیں ہیں؟"

"تین تو مقامی ہیں۔ ایک ہمارے یونٹ کی لڑکی ہے۔ اس کا نام نیلم ہے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے یہاں جو جشن ہو رہا تھا اس میں نیلم نے رقص کیا تھا۔"

"کون تھے رقص دیکھنے والے؟"

"وہی پانچ بڑے پجاری۔ یہ پانچوں کمرے ان کے ہی ہیں۔"

میں نے زریں کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اچھی طرح اس کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کمرا قریباً اسی طرح کا تھا جس میں، میں نے اس سے پہلے آنجہانی سردار پاتامہ کو دیکھا تھا۔ یہاں آرام دہ مسہری کے علاوہ قالین اور قالیچے موجود تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک چھوٹا سا حمام بھی دستیاب تھا۔ ایک علیحدہ کمرے میں کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ ان میں شراب اور ڈرائی فروٹ سے لے کر جیم، اور جوس تک ہر شے موجود تھی۔ یہ ایک عجب خیز امر تھا کہ اس قحط زدہ وادی میں جہاں لوگ چند نوالوں کے لیے ذلیل و خوار ہو رہے تھے، "رواباش دیوتا" کے پجاریوں کو ہر ضروری و غیر ضروری چیز میسر تھی۔ جاترو کے صحن میں لوگ بلک بلک کر اپنے بچوں کے لیے اناج مانگتے تھے اور اسی صحن کے نیچے جاتری عیش و آرام کرتے تھے۔

میں نے روشنی سے پوچھا "تمہارے یونٹ کے باقی لوگ کہاں ہیں؟"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "ان میں سے بہت سے تو مارے گئے اور جو باقی ہیں وہ یہاں سخت مصیبت کا شکار ہیں۔"

"کیا تم نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہے؟"

وہ بولی "دو تین لڑکی نیلم کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے انہیں "بیگار کرنے والوں" کی حیثیت سے مقامی لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔"

میں نے روشنی سے یہاں کے حدود اربعہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولی "ان کمروں تک آنے جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ یہ وہ سرخ چوبی دروازہ ہے جو سیڑھیوں کے عین سامنے کھلتا ہے۔"

روشنی یقیناً اس دروازے کا ذکر کر رہی تھی جس سے ہم تہ خانوں میں داخل ہوئے تھے۔ اب یہ دروازہ ہمارے قبضے میں تھا۔

میں نے روشنی کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ ایک "دل گردے" والی لڑکی ہے اور ہر قسم کے حالات میں خود کو ایڈجسٹ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ایک فلمی نٹل تھی۔ ایسی لڑکیاں "آزمائش" کے کئی مرحلوں سے گزر کر ہیروئن کے منصب تک پہنچتی ہیں' لہٰذا اپنی عزت و آبرو کا وہ تصور روشنی کے ذہن میں نہیں تھا جو ایک شریف گھریلو لڑکی کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اپنے جسمانی استحصال کے سلسلے میں وہ زیادہ پریشان نہیں تھی بلکہ شاید وہ اس مسئلے کو خاطر میں ہی نہیں لا رہی تھی۔ وہ صرف زندہ رہنا چاہتی تھی اور اس بدبودار داڑی کے بدبودار لوگوں سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ مدہوش خاران کوئی دو گھنٹے پہلے تک اس کے پاس یہاں موجود تھا۔ اب سارے جاتری کسی مذہبی رسم کی ادائیگی کے لیے گئے ہیں' ممکن ہے کہ اب خاران بھی صبح سے پہلے واپس نہ آئے۔

میں نے روشنی کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ معمولی تذبذب کے بعد تیار ہو گئی۔ ہم جو بھی تھے اور جیسے بھی تھے' روشنی کے لیے بہرحال ان حیوان صفت لوگوں سے بہتر تھے۔ اس نے کہا "میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ یہ جانتی ہوں کہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ بہرحال ہم وطن ہونے کے ناتے میں آپ پر اعتبار کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔"

"ہم تمہارے اعتبار پر پورے اتریں گے" میں نے جواب دیا۔

وہ بولی "آپ دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر مجھے خوف آ رہا ہے۔ کہیں کوئی خون خرابا تو نہیں ہونے والا؟" میں نے اسے تسلی دی۔ وہ کہنے لگی "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم نیلم کو بھی ساتھ لے چلیں۔"

"وہ ضرور جائے گی" میں نے کہا "تم اس کمرے کی نشاندہی کرو جہاں وہ موجود ہے" روشنی سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پھر اپنی کچھ ضروری اشیا سمیٹ کر ایک اٹیچی میں رکھیں اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ اٹیچی یقیناً اس کا اپنا ہی تھا اور اسی کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا۔

ہم بڑے محتاط انداز میں کمرے سے نکلے۔ تمام دروازے بند تھے اور کہیں سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس خاموشی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس زنان دروز حصے میں باہر سے آنے والی کوئی آواز نہیں پہنچی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہنگامہ جو ایک گھنٹا پہلے جاتروں کے صحن میں بپا ہوا تھا' روشنی کو بیدار کر دیتا اور ان دیگر عورتوں کو بھی جو اس زنان خانے میں موجود تھیں۔ باہر نکل کر روشنی نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ جہاں رقاصہ لڑکی نیلم موجود تھی۔ اس نے بھی روشنی کی طرح ہماری آمد پر حیرت اور خوف کا مظاہرہ کیا مگر ہمارے ساتھ روشنی کو دیکھ کر وہ فوراً سنبھل گئی۔ نیلم کے ساتھ اس کمرے میں ایک ادھیڑ عمر خادمہ بھی موجود تھی۔ نیلم کے بقول وہ کچھ دیر پہلے تک اس کی مٹھی چاپی کرتی رہی تھی۔ اب گہری نیند سو رہی تھی۔ غالباً اس گہری نیند میں تھوڑا بہت ہاتھ نشے کا بھی تھا۔ ہم نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ نیلم کو لے کر ہم بے آواز چلتے اس عشرت گاہ سے باہر نکل آئے.... تھوڑی دیر بعد ہم واپس اپنے ۳۸ عدد یرغمالوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ پانچ بڑے جاتریوں کو نکال کر وہ ۳۳ تھے اور گیارہ گیارہ کی تین ٹولیوں میں بیٹھے تھے۔

زرغونہ بدستور ایک گوشے میں محوِ خواب تھی۔ صفدر' جون جاوئل اور دی راتک رائفلیں تانے چوکس کھڑے تھے۔ صفدر بھی میری طرح مقامی زبان سے بالکل نا آشنا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ میرے اشارے پر زریں گل نے دروازے سے کان لگائے اور اس چیخ و پکار کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھاری آواز والا ایک شخص مسلسل بولتا جا رہا تھا۔

زریں نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "یہ اُلّو کا پٹھا پوچھتا ہے کہ ام نے محترم جاتریوں کی شان میں گستاخی کیوں فرمایا ہے۔ آخر ام کیا چاہتا ہے جو ام نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں اس کا کیا جواب ہونا چاہیے؟"

وہ بولا "ہمارے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ ام کو دیوتاؤں نے یہاں بھیجا ہے تاکہ ام ان گناہ گار بندروں کی دُم میں پلیدہ فٹ کرے جو خود کو درویش جاتری کہتے ہیں لیکن یہ خانوں میں گھس کر سالم بکرے ڈکارتے ہیں اور نت نئی عورتوں کے ساتھ سوتے ہیں۔"

میں نے کہا "مناسب جواب تو یہی ہے لیکن ہمیں کچھ اور باتیں بھی سوچنی ہیں.... تم ایسا کرو' ان یرغمالیوں میں سے کوئی ایسا بندہ ڈھونڈو جو پشتو ٹھیک سے لکھ سکے۔"

زریں بولا "استاد صیب! کیا تم ام کو چٹا اَن پڑھ سمجھتا ہے۔ ام پشتو لکھ سکتا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا" میں نے کہا۔

میرے پاس ایک قلم موجود تھا۔ قلم ایکٹریس روشنی کے اٹیچی کیس سے ایک ڈائری مل گئی۔ ڈائری میں سے دو ورق پھاڑ کر ہم نے اس پر اپنے مطالبے لکھے۔ یہ مطالبے کچھ اس طرح تھے۔

"ہم اس وادی سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر تم لوگ ہمیں یہاں سے نکلنے دو گے تو جاتریوں اور دیگر یرغمالیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

جو لوگ پندرہ روز پہلے پکڑے گئے ہیں' ان میں فلمی یونٹ کے اٹھارہ ارکان بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کو رہا کیا جائے اور ہماری تحویل میں دیا جائے۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ہمیں کم از کم ایک ایسا شخص فراہم کیا جائے جو اس علاقے کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو اور ہماری رہنمائی کر سکے۔

ہمارے لیے کم از کم چار دن کے رختِ سفر کا انتظام کیا جائے۔

یرغمالیوں میں سے دس افراد ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ان میں دو بڑے جاتری بھی شامل ہوں گے۔ ان لوگوں کو رہبر سمیت ہم اس وقت چھوڑیں گے جب ہم خود کو محفوظ فاصلے پر تصور کریں گے۔

ہم امن پسند لوگ ہیں اور خواہ مخواہ کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔ اگر ہماری جان بچ جاتی ہے اور ہم یہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں تو ہم ان واقعات کو یکسر بھول جائیں گے۔ باہر کے لوگوں کو اور پولیس وغیرہ کو ہرگز یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہم کن حالات سے گزرے ہیں اور کہاں رہے ہیں۔ تم لوگوں کو ہمارے اس وعدے پر اعتبار کرنا ہوگا۔"

اس کے علاوہ بھی چند چھوٹے چھوٹے مطالبات تھے۔ مثلاً یہ کہ ہمیں تین لالٹینیں یا گیس لیمپ فراہم کیے جائیں۔ ٹارچوں کے لیے ایک درجن سیل دیے جائیں۔ اپنی زخمی ساتھی کی مرہم پٹی کے لیے ضروری سامان مہیا کیا جائے۔

آخر میں واشگاف الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ "ہم رائفل بدست" جاتریوں کے سر پر کھڑے ہیں۔ اگر زنان خانے میں گھسنے کی کوشش کی گئی تو پانچوں بڑوں سمیت ایک جاتری بھی زندہ نہیں بچے گا۔

مطالبے کے کاغذات دروازے کی نچلی درز سے باہر سرکا دیے گئے۔ ہمارے مطالبات میں کسی حد تک خود غرضی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ یعنی ہم صرف اپنی اور اپنے چند ساتھیوں کی جان بچانا چاہتے تھے۔ باقی لوگوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی اور نہ اس بات سے کوئی مطلب تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

خود غرضی کی یہ جھلک میں نے ان مطالبات میں جان بوجھ کر رکھی تھی۔ اس سے ہمارے دشمنوں کو یہ تاثر مل سکتا تھا کہ اگر ہماری جان چھوٹ گئی تو ہم کسی اور جھمیلے میں نہیں پڑیں گے اور یہاں پیش آنے والے واقعات کو ماضی کا حصہ سمجھ کر صبر شکر کر لیں گے۔

اپنے مطالبات پیش کرنے کے بعد ہم نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ پانچ دس منٹ گزرے تھے کہ اچانک بڑے جاتری خاران کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ ہماری طرف منہ پھیر کر زور زور سے چلّانے لگا۔ اس کا لہجہ دھمکی آمیز اور آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔

میں نے زریں سے پوچھا "کیا کہہ رہا ہے تیرا سابقہ سسر؟"

زریں نے کہا "پاگل ہو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ام سب عبرت ناک موت مریں گے اور کتوں کی طرح بستی کی گلیوں میں گھسیٹے جائیں گے۔"

میں نے کہا "زریں گل! ایک تو تیری رلنے والی داڑھی مار گئی ہے اگر یہ تیرا سابقہ سسر نہ ہوتا تو ابھی اسے مرغا بنا کر کوکوں پر دوست کر دیتا۔"

زریں گل بیزاری سے بولا "جی اب کیا رشتہ داری ہے۔ جس بے وفا سے جڑ گیا تھا رہی اپنی نہ رہی۔"

صفدر زندہ دلی سے بولا "زریں گل' یہاں دوگانا بہت فٹ آتا ہے' رقا جن سے کی بے وفا ہو گئے۔ وہ وعدے محبت کے کیا ہو گئے.... ویسے اب مسئلہ کیا ہے بھئی؟ سب کچھ اپنے بس میں ہے۔ اگر تو چاہتا ہے تو ابھی وہ تیرے ساتھ جاگے سے بندھ کر ساتھ چلی آئے گی۔"

"نہیں صفدر صیب" زریں نے ٹھنڈی سانس لی "جہاں پیار ہوتا ہے وہاں زبردستی نہیں ہوتی اور جہاں زبردستی ہوتی ہے وہاں پیار نہیں ہوتا۔ اگر ہمارے پیار میں طاقت ہوتا تو وہ ہماری خاطر یہ وادی چھوڑنے کو تیار ہو جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

صفدر بولا "یار کیا بات کرتا ہے۔ اگر تیرے پیار میں طاقت نہ ہوتی تو...."

میں نے فوراً انگلی کے اشارے سے صفدر کو خاموش کرا دیا۔ غالباً وہ گل ثوم کی ناکام خودکشی کا ذکر کرنے جا رہا تھا۔ اسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے یہ بات زریں سے چھپا رکھی ہے۔ صفدر سمجھ گیا اور اس نے صفائی سے بات بدل دی۔

ہاتھی نما خاران ایک بار پھر ہاتھ نچا نچا کر چلّانے لگا تھا۔ فرطِ غضب سے اس کا سارا جسم تھل تھل کر رہا تھا۔ میں نے سوچا' اس کی تکلیف رفع کر دینی چاہیے۔ میں رائفل بدست اس کے سر پر پہنچا۔ اس نے نہ صرف حکم عدولی کرتے ہوئے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا تھا بلکہ اٹھ کر کھڑا بھی ہو چکا تھا۔ اس کا صفا چٹ چہرہ ٹارچ کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ اس کے پیٹ کا زخم شاید ابھی کچا تھا۔ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا اس کا ایک ہاتھ مستقل پیٹ پر دھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اس کی چیخ پکار کا جواب دیا۔ یہ جواب ایک اچانک حرکت کی شکل میں تھا۔ رائفل کا وزنی دستہ بڑے زور سے خاران کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر قالین پر جا گرا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکل گئی تھی۔ دونوں نقوں نے معتوب جگہ کو دبا رکھا تھا۔ صفدر میرے ارادے کو پہلے سے بھانپ لیتا تھا۔ اس مرتبہ بھی بھانپ گیا تھا اور میرے قریب کھڑا تھا۔ بڑا جاتری کو یوں تڑپتے دیکھ کر دو جواں سال جاتری خود پر قابو نہ رکھ سکے اور چیختے ہوئے مجھ پر جھپٹے۔ ایک جاتری نے منہ پر صفدر نے رائفل کا کندہ اس زور سے مارا کہ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز پورے زنان خانے میں گونجی۔ دوسرے جاتری کے سینے میں تیزی سے جھک گیا اور اسے سر سے بلند کر کے دیوار پر دے مارا۔ جاتری کے ہاتھ میں موٹے دانوں کی مالا تھی' ٹوٹ کر سارے زنان خانے میں بکھر گئی۔ یہ سارا واقعہ چشمِ زدن میں رونما ہوا تھا۔ یرغمالیوں میں ایک دم ہلچل پیدا ہوئی۔ شاید ان میں سے چند اور رونگٹے بھی اپنی جگہ سے حرکت کرتے

چاہتے تھے مگر ہم قاتل نہیں تھے۔ ہماری رائفلیں ایک لمحے میں موت کا بازار گرم کر سکتی تھیں۔ ہمارے خطرناک تاثرات دیکھ کر وہ اپنی جگہ تھمگا کر رہ گئے "نیچے لیٹ جاؤ.... نیچے لیٹ جاؤ" میں نے دہاڑ کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک یرغمالی کو بالوں سے کھینچ کر اوندھے منہ قالین پر لٹا دیا۔

زریں نے میری "ہدایت" کا ترجمہ ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں کیا اور رائفل کے سفاک اشاروں سے چار پانچ مزید یرغمالیوں کو اوندھے منہ لیٹنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی سارے افراد قالین پر لیٹ گئے.... ان کی یہ پوزیشن ہمارے لیے زیادہ محفوظ اور اطمینان بخش تھی۔ جن دو جاتریوں نے ہم پر حملہ بولا تھا' انہیں جون چارلی اور منصور گھسیٹ کر ایک گوشے میں لے گئے اور رائفل کے دستوں سے ٹھیک ٹھاک پٹائی کی۔ جب ان کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا اور وہ منت سماجت پر اتر آئے تو انہیں نیم جان کتوں کی طرح گھسیٹ کر دوسرے لوگوں کے درمیان لٹا دیا گیا.... یہ بے رحم اور سفاک لوگ تھے۔ عہد قدیم کے فرمانرواؤں کی طرح یہ خدا کے پیدا کردہ آزاد انسانوں کو پابند کرتے تھے۔ اپنی راحت کے لیے ان کا خون چوستے تھے اور اپنے شغل کی خاطر ان کی ہڈیاں چباتے تھے۔ وہ کسی طور رحم کے قابل نہیں تھے۔ بے شک وہ سارے ایک جیسے نہیں تھے لیکن ان کی اکثریت ایسی ہی تھی اور یہی اکثریت تمام معاملات کو کنٹرول کرتی تھی۔

قصر ایکٹریس روشنی اور نیلم اس صورت حال سے بہت خوفزدہ تھیں اور گوشے میں سکڑی سمٹی کھڑی تھیں۔ یقیناً یہاں پہنچنے سے پہلے وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھیں کہ جانندو کے عزت مآب و بلند مرتبت جاتریوں کو پیٹ کے بل فرش پر لیٹے دیکھیں گی۔ وہ فضا میں خون کی بو سونگھ چکی تھیں اور ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔

ہمارے مطالبات کا جواب قریباً ایک گھنٹے بعد آیا۔ حسب توقع یہ جواب تحریری شکل میں تھا۔ اس جواب سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وادی کے مکین سخت خوف و ہراس کا شکار ہیں اور ہر صورت اپنے جاتریوں کی باعزت رہائی چاہتے ہیں۔ تحریری جواب سردار سدرت کی طرف سے تھا۔ زریں گل نے یہ جواب پڑھ کر سنایا۔ سردار سدرت نے لکھوایا تھا۔

"تم لوگوں نے جو کچھ کیا وہ "انتہا" سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس اقدام کے بعد کسی شخص کے دل میں تمہارے لیے کوئی ہمدردی باقی نہیں رہی۔ تم نے جو مطالبات پیش کیے ہیں' ہم ان پر غور کر رہے ہیں اور صبح تک تمہیں اس بارے میں آگاہ کر دیں گے۔ تم جانتے ہو سرنگ کے مخصوص علاقے کے سوا کہیں روشنی کرنے کی اجازت نہیں' بہرحال ہم تمہارے مطالبے پر تمہیں گیس لیمپ فراہم کر رہے ہیں۔ بیٹری سیل اور مرہم پٹی کا سامان بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم لوگ بڑے جاتری محترم خاران کو فوراً رہا کر دو۔ وہ زخمی ہیں اور ان کی حالت خراب ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ناتوب ماکی بھی عمر رسیدہ اور بیمار ہیں۔ امید ہے تم ان دونوں کے سلسلے میں دانشمندانہ فیصلہ کرو گے۔"

مجھے سدرت کے دستخط تھے اور وہی ناقابل فہم مُہر تھی جو میں نے سب سے پہلے اپنی جری پٹی پر دیکھی تھی۔ اس تحریر کے ساتھ وہ اشیا بھی کھڑکی کے راستے ہم تک پہنچا دی گئیں جو ہم نے مانگی تھیں۔

ہماری مطلوبہ اشیا کے بدلے میں سردار نے جو مطالبہ کیا تھا وہ کسی طور ہمارے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ خاران اور ناتوب ماکی کو رہا کر دیا جاتا تو اپنے دشمنوں پر ہمارا دباؤ ایک تہائی رہ جاتا۔ ان دونوں "محترم حضرات" کو بیمار اور زخمی بتایا جا رہا تھا لیکن چند گھنٹے پہلے وہ نہ خانے کے سب سے آرام دہ حصے میں موجود تھے۔ جام لنڈھا رہے تھے اور خوبصورت عورتوں کے "تعاون" سے دیوتا کو خوش کر رہے تھے۔

میں نے منصور' زریں اور جون چارلی سے مشورہ کیا۔ اس مشورے میں فیصلہ ہوا کہ چند بوڑھے اور غیر اہم افراد کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس جواں سال جاتری کو بھی چھوڑ دیا جائے جو مار پیٹ کے بعد سے نیم بے ہوش تھا اور جس کی ناک سے گاہے گاہے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔

یہ کُل سات افراد تھے۔ بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ ان کو یکے بعد دیگرے کھڑکی نے ایک در سے باہر نکال دیا گیا۔ ان افراد کی رہائی کے بیس منٹ بعد ہی سردار سدرت بنفس نفیس تہ خانے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے آواز دے کر مجھے بلایا اور بند دروازے کی دوسری جانب سے بولا "میں بغیر کسی ہتھیار اور محافظ کے یہاں کھڑا ہوں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ تم بغیر کسی محافظ اور ہتھیار کے ہو؟"

وہ بولا "تم جیسے چاہو تسلی کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم کھڑکی کی طرف آؤ اور اپنے آدمیوں کو دروازے اور سیڑھیوں سے دور ہٹا دو۔"

سدرت نے فوری ہٹانے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں نے دروازے کے کی ہول میں سے جھانکا۔ باہر تاریکی تھی' تاہم قدموں کی چاپ اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مسلح افراد پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ دو گیس لیمپس روشن کروانے کے بعد میں نے کھڑکی کا ایک پٹ کھلوا دیا اور سردار سدرت کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی سدرت کا ہیولا کھڑکی میں نظر آیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی اور قریب چلا گیا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا اور کھڑکی بند کر دی۔

سردار سدرت نے سمور کی کھال کا ایک اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی اور قیمتی پتھروں سے مزین لمبے بال' شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سدرت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں' تاہم بھنی کے

دوسرے مکینوں کی طرح اس کا نشہ بھی ہرن ہو چکا تھا۔ وہ بلاے ناک سے سرہلا کر بولا "جو کچھ ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "پہلے کون سا اچھا تھا۔"

وہ بولا "کیا یہ بہتر نہ تھا کہ تم محترم خاران اور محترم ناتوب کو رہا کر دیتے؟"

میں نے کہا "پھر اپنی رہائی کے بدلے تمہیں دینے کے لیے ہمارے پاس کیا رہ جاتا؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تم سے اکیلے میں بات کروں؟" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

اس نے قالین پر ایک طرف سوئی پڑی زرغونہ کا گال چھو کر اسے پیار کیا اور میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم بغلی دروازے سے نکل کر تنگ راہداری میں پہنچے اور پھر اس کمرے میں آ گئے جہاں کچھ دیر پہلے تک قلم ایکٹریس روشنی موجود تھی۔

میں نے ٹارچ مناسب زاویے سے ایک بلند جگہ پر رکھ دی اور سردار سدرت کے سامنے بیٹھ گیا۔ سردار سدرت کی آنکھوں میں غم کی جھلک تھی۔ وہ بولا "ستار جہاں! مجھے یہ مسئلہ خون خرابے کے بغیر حل ہوتا نظر نہیں آتا۔"

"تم سردار ہو۔ جو کچھ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے۔"

اپنی سرداری کا خیال آتے ہی اس کے چہرے پر نظر آنے والی تنہائی اور جھل ہو گئی اور وہ سو فیصد اس بستی کا سردار نظر آنے لگا۔ وہ سردار جو اپنے قبیلے کے رسم و رواج اور قوانین کا پابند تھا اور ان سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ بے لچک لہجے میں بولا "میں اپنے قبیلے کے سامنے بے اختیار ہوں۔ مجھے وہی کرنا ہے جو قبیلے والے کہیں گے۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ قبیلے والوں سے زیادہ اہمیت تمہارے نزدیک ان دو درجن جاتریوں کی ہے جو اس وادی کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ تم ان کی خوشنودی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اپنی تمام تر روشن خیالی اور دانشوری کے باوجود تم اندر سے وہی جنگلی ہو جو ریواش دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے اور اس کے سامنے زندہ انسانوں کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ تم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ اپنے ہی دل سے ابھرنے والی آواز سن سکو۔ تم سے زیادہ دانشمند تو وہ آبرو باختہ ناشا ہے جو علی الاعلان دیوتاؤں کے خلاف اعلان بغاوت کرتی ہے۔"

سدرت کی پیشانی پر الجھن' ناگواری کی شکنیں تھیں۔ وہ کچھ دیر اپنے کان کے نقرئی بالے کو سہلاتا رہا پھر بولا "میں جیسا بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ میں تمہارے کہنے پر خود کو بدل نہیں سکتا اور نہ ہی قبیلے والے بدل سکتے ہیں۔ اپنی عبادت گاہ کی توہین اور جاتریوں کی بے عزتی پر وہ سب بیچ و تاب ہیں۔ اگر ان میں سے کچھ لوگ جاتریوں کے خلاف بھی تھے تو تمہارے انتہائی اقدام کے سبب وہ اپنی مخالفت بھول گئے ہیں۔ سارا قبیلہ اس مسئلے پر متحد ہے۔"

"کیا کہتا ہے تمہارا قبیلہ؟"

"میرے لوگ کہتے ہیں کہ تمہیں ہر صورت غیر مشروط طور پر تمام جاتریوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ تمہارے قبیلے والوں کے کہنے سے نہیں بنے گا سردار سدرت.... راستہ ہم خود بنائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر جاتریوں کے نام پر قبیلے والوں کے ہاتھ میں وہ لاشیں آئیں گی جن کے ایک ایک چپے پر گولیوں کے دس دس سوراخ ہوں گے.... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

سردار سدرت کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے مزید کہا "اور تم جاتروں کی توہین کی بات کس منہ سے کر رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں' اس غلاظت خانے میں جہاں ہم بیٹھے ہیں' کیا کچھ ہوتا ہے۔ لاؤ قبیلے کے سرکردہ افراد کو اور دکھاؤ انہیں یہ عشرت کدہ۔ یہ شراب کی بوتلیں' یہ بھرے پڑے دسترخوان۔ یہ مسہریاں' یہ عورتیں' یہ ناچ گانے کے آلات۔"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا شار جہاں.... ایک بات طے ہے' تمہارے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اب تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہونا ہے' اسی وادی میں ہونا ہے۔ اگر تم غیر مشروط طور پر یرغمالیوں کو چھوڑ دیتے ہو تو ممکن ہے تمہیں کچھ رعایتیں مل جائیں۔ ہم اس سلسلے میں غور کر رہے ہیں۔ اگر تم جاتریوں کو نہیں چھوڑتے تو پھر یہ کھلی جنگ ہے۔ قبیلے والوں کے جذبات کو قابو میں رکھنا کسی کے بس میں نہیں ہو گا۔"

"میں کب کہتا ہوں' تم ان کے جذبات کو قابو میں رکھو۔ انہیں اپنے ارمان نکالنے دو۔ ہم ان کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ یرغمالیوں کے علاوہ جتنی لاشیں بھی گریں گی وہ ہمارے لیے "بونس" ہوں گی۔"

"تو تم جاتریوں کو چھوڑنے سے انکاری ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ میں انہیں چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں ہمیں یہاں سے نکالنے کا انتظام کرنا ہو گا۔"

سردار سدرت نے مایوسی میں سرہلایا "تم یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ یہاں آ کر چلے جانا ممکن نہیں۔ جو کام آج تک نہیں ہو سکا وہ اب کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارا مطالبہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنا وجود ختم کر لیں۔"

میں نے کہا "سردار سدرت' یہ ساری باتیں جو تم اب کہہ رہے ہو' تمہیں اس وقت بھی سوچنی چاہیے تھیں جب تم نے جاتریوں سے ڈر کر اپنے دوست کی بچی کو ہمارے حوالے کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم بھی جانتے ہو۔ یہ سب کچھ جو ہوا ہے اس کی شروعات زرغونہ سے ہی ہوئی تھی۔ زرغونہ کی وجہ سے ہی ہم نے جاتری سے مارپیٹ کی اور اس کے اغوا کے مجرم ٹھہرے۔ جھیل پر ہمارے ہاتھوں جو افراد قتل ہوئے وہ بھی اس وجہ سے ہوئے کہ ہم وہ ذمے داری پوری کرنا چاہتے تھے جو تم نے ہمیں سونپی تھی۔ ہم ننھی زرغونہ کو وحشی قاتلوں سے بچانا چاہتے تھے۔ ہم نے اسے بچایا ہے اور اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی بچائیں گے لیکن تم سے مجھے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی جو تم کررہے ہو۔"

سدرت کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ تاہم جلد ہی وہ سنبھل گیا اور بولا "دیکھو شاہ جہاں میں نے تم سے پہلی بات ہی یہ کہی تھی کہ تم زرغونہ کی حفاظت کرتے ہوئے کسی کو قتل نہیں کرو گے اگر ایسا ہوگیا تو میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ جاتری کی مارپیٹ تک تو میں سنبھال سکتا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حد سے زیادہ ہے۔ تمہیں ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی خود کو محافظوں کے حوالے کردینا چاہیے تھا لیکن تم ایسا کیوں کرتے تمہارے ذہن میں تو فرار کا منصوبہ پرورش پارہا تھا۔"

میں نے کہا "فرار کا منصوبہ بنانا ہمارا حق ہے اور اس کے علاوہ بھی میں نے جو کچھ کیا ہے میں اس پر ہرگز شرمندہ نہیں ہوں۔ وہ سب کچھ وقت کی ضرورت تھا۔"

میرے اور سدرت کے درمیان کافی دیر بحث ہوئی۔ اس بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور سردار سدرت بے انتہا اندیشے آنکھوں میں سمیٹ کر واپس چلا گیا۔

○☆○

اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے اپنے ۳۰ یرغمالیوں کے ساتھ اسی تہ خانے میں گزارے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ چند مزید افراد کو رہا کردیں گے لیکن سردار سدرت کا بے لچک رویہ دیکھنے کے بعد میں نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ قرب و جوار میں ایک پُراسرار اور اعصاب شکن خاموشی طاری تھی۔ ہمیں معلوم تھا اس خاموشی کے پیچھے طوفان پل رہا ہے۔ یہ خاموشی تادیر رہنے والی نہیں تھی۔ باہر سے ہمیں خوراک کی پیشکش کی گئی تھی لیکن ہم نے انکار کردیا تھا۔ پانچ بڑے جاتریوں کے عشرت کدے میں اتنی خوراک موجود تھی جو ہم چالیس افراد کے لیے ایک ہفتے تک کافی ہوتی۔

ہماری ہدایت کے مطابق یرغمالیوں نے زیادہ تر وقت لیٹ کر گزارا تھا۔ ہاتھی نما خاران نے رائفل کی زوردار چوٹ کھانے کے بعد دوبارہ زبان نہیں کھولی تھی۔ بس کبھی کبھی وہ تکلیف کی وجہ سے کراہتا تھا اور اتنی دھیمی آواز میں بڑبڑاتا تھا کہ ہم سن نہیں سکتے تھے۔ مہاجاتری ناتوب لیٹا لیٹا سونے والوں کی مالا چلاتا رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں گاہے گاہے مجھ پر جم جاتی تھیں جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے دیوتاؤں کے عتاب سے ڈرا رہی ہوں۔ یہ وہی بوڑھی بنجر آنکھیں تھیں جنہیں ناتوب اپنی جوان بیوی ناموس کے حسن سے سیراب کرنے کی لاحاصل کوشش کرتا تھا۔ اپنا انجام سامنے دیکھ کر یہ آنکھیں اب کچھ اور بھی گدلی اور دھندلی نظر آرہی تھیں۔ اگر ناتوب اس ہنگامے میں مارا جاتا تو مجھے ذرا بھی قلق نہ ہوتا۔ بلکہ شاید خوشی ہوتی کہ مجبور ناموس کی جان ایک پیرِ تسمہ پا سے چھوٹ گئی ہے اور وہ اپنے شکم میں کوئی اور ناجائز بچہ پالنے سے بچ گئی ہے۔

یرغمالیوں کے ہجوم میں کوکی داوا بھی شامل تھا۔ وہی کوکی داوا جو وادی کے معزز افراد میں شامل ہوتا تھا اور سابینہ کا باپ تھا۔ کوکی داوا سردار کی نسبت جاتریوں سے زیادہ قریب تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس تہ خانے میں پایا گیا تھا۔ وہ اب تک بالکل گم صم اور الگ تھلگ رہا تھا۔ دیگر یرغمالیوں کی طرح اس کے چہرے پر بھی اندیشوں اور پریشانیوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے سمیت اس کمرے کا ہر فرد موت کی زد پر تھا۔ یہ موت کسی بھی وقت کسی بھی حیلے بہانے سے ہم پر جھپٹ سکتی تھی۔۔۔ میں منصور اور زریں گل ذہنی طور پر ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار ہوچکے تھے۔ ہم نے یہ طے کرلیا تھا کہ اگر محافظوں نے جاتریوں کی جان کی پروا کیے بغیر تہ خانے پر ہلّہ بولنے کی کوشش کی تو ہم جاتریوں سمیت تمام افراد کو قتل کردیں گے۔ بعد میں کیا ہوگا یہ بعد کی بات تھی۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ اس وادی کی دونوں بستیاں اپنے بدترین افراد سے پاک ہوجائیں گی۔

ہم نے خود کو گروپس میں تقسیم کرلیا تھا۔ رات پہلے پہر کی وانگ اور میں نے آرام کرلیا تھا۔ نصف شب کے بعد منصور اور ٹینگ ہن کچھ دیر کے لیے سوگئے تھے۔ اب ذریں اور جون چارلس سوئے ہوئے تھے۔ یوں ہمیں ریسٹ بھی مل رہا تھا اور ہمارا "دفاع" بھی برقرار تھا۔ نصف شب کے بعد سردار سدرت کے ایک پشتوراں "مشیر" سے ہماری گفتگو ہوئی تھی۔ اس مختصر گفتگو میں بھی ہم نے اس شخص کو یہی باور کرایا تھا کہ "وادی چھوڑنے" کے مطالبے سے ہم کسی صورت دستبردار نہیں ہوں گے۔ وہ شخص یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا تھا کہ علی الصباح دوبارہ ملاقات ہوگی۔

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ زرغونہ بیدار ہوگئی۔ ٹینگ ہن جلدی سے اس کے پاس چلی گئی۔ رائفل ایک طرف رکھی اور زرغونہ کا سر اپنی گود میں لے کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہی زرغونہ کو سنبھالتی رہی تھی۔ بالکل جیسے ایک ماں اپنے بچے کا خیال رکھتی ہے۔ شاید قدرت نے عورت کے دل میں یہ جذبہ ازل سے موجود رکھا ہے۔ اپنے بچے کے ساتھ ساتھ ہر اس بچے کی طرف اس کا دل کھنچتا ہے جو بے آسرا ہوتا ہے۔ ٹینگ ہن شادی شدہ نہیں تھی لیکن زرغونہ کو دیکھ کر اس کے اندر پوشیدہ ممتا جاگ اٹھی تھی۔

اس نے زرغونہ کو بسکٹ کھلائے پھر اس کے بالوں میں

انگلیاں پھیر پھیر کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسی دوران میں جون چارلس بھی بیدار ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ لیٹے لیٹے نیم باز نظروں سے ٹینگ ہن کی مصروفیت دیکھنے لگا۔ ٹینگ ہن جو اس کی محبوبہ تھی اور جس کی دید نے ایک طویل عرصے بعد اس کی نگاہوں کو سیراب کیا تھا۔ چند لمحے ٹینگ ہن کو دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب جا بیٹھا۔ پہلے اس نے زرغونہ کی پیشانی چومی پھر ٹینگ ہن کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کا طویل بوسہ لیا۔ جس ماحول اور معاشرے میں وہ رہتے تھے وہاں یہ بے تکلفی انوکھی نہیں تھی۔ دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ان سرگوشیوں کے دوران میں کبھی کبھی ٹینگ ہن کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔

یقیناً اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہورہا ہوگا جب سردار سدرت نے قبیلے والوں کی طرف سے نئی تجاویز پیش کیں۔ یہ تجاویز لے کر آنے والا پشتوراں مشیر تھا۔ فطرت تو اس کی بھی جنگلیوں جیسی تھی لیکن بول چال کے اعتبار سے وہ قدرے مختلف نظر آتا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے۔

قبیلے کے سرکردہ افراد نے سردار سدرت کی سربراہی میں فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں وادی سے جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تاہم وادی میں رہتے ہوئے ہم کچھ خصوصی رعایتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔ ہم میں سے جن افراد کے ہاتھوں قتل کا جرم سرزد ہوا ہے ان کا معاملہ بڑے جاتریوں کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ان سے نرمی برتنے کی درخواست کی جائے گی۔

فلمی یونٹ کے ارکان کو چھوڑ دیا جائے گا اور وہ اس وادی میں آزادی سے جہاں چاہے رہ سکیں گے۔

پاتامہ کی بچی زرغونہ کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا اور وہ اپنی خوشی سے جس کے پاس چاہے رہ سکے گی۔ یہ بات اب وادی کے سب لوگوں کے لیے تسلیم شدہ ہے کہ زرغونہ ناجائز اولاد نہیں ہے۔

ان اہم تجاویز کے علاوہ بھی کچھ رعایتوں کی طرف اشارہ دیا گیا تھا۔ اگر میں ان کی تفصیل میں گیا تو پڑھنے والوں کو طوالت محسوس ہوگی۔

یہ ڈھاک کے وہی تین پات والی مثال تھی۔ ہمارا اہم ترین مطالبہ "وادی سے نکلنا" تھا لیکن یہ مطالبہ مانا نہیں جارہا تھا۔ مجھے احساس لگ رہا تھا جیسے یہ لوگ جان بوجھ کر معاملے کو طول دے رہے ہیں۔ شاید درونِ خانہ کسی مہم جوئی کا پروگرام بن رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس تہ خانے کے اردگرد مسلح افراد کی موجودگی میں اضافہ ہوگیا ہے اور کچھ لوگ بار بار دروازے اور کھڑکی کے قریب منڈلانے لگتے ہیں۔

یہ نئی تجاویز سننے کے بعد نجانے کیوں میرا پارا چڑھ گیا۔ میں نے پیام لانے والے کو فوراً واپس جانے کا حکم دیا۔

وہ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر بولا "کیا بات ہے صاحب! آپ بہت غصے میں نظر آتے ہو؟"

میں نے کہا "شاید تم لوگ یہی چاہتے ہو کہ ہم غصے میں نظر آئیں۔ ٹھیک ہے ایسے ہی سہی۔ اب ہم یہاں سے نکلیں گے۔ میں دیکھتا ہوں تم میں سے کون ہمیں روکتا ہے۔"

"آپ جلد بازی کررہے ہو" وہ بولا۔

"یہ جلد بازی ہے تو صبر تحمل کسے کہتے ہیں۔ جاکر اپنے سردار سے کہہ دو کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر فلمی یونٹ کے آدمیوں کو ہماری تحویل میں دے دے اور یہاں سے ہماری روانگی کے لیے تین بڑی گھوڑا گاڑیوں کا انتظام کردے۔ اگر مقررہ وقت میں یہ دونوں کام نہ ہوئے تو ہم یرغمالیوں کو ایک ایک کرکے گولی مارنا شروع کردیں گے۔"

میرے تاثرات دیکھ کر پشتوراں شخص کا رنگ پیلا پڑگیا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن منصور نے ٹوک دیا "بس ہم کچھ اور سننا نہیں چاہتے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

وہ گھبرایا ہوا سا باہر نکل گیا۔

○☆○

ایک گھنٹے کے لیے کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہوگیا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اگر ایک گھنٹا پورا ہونے کے باوجود ہمارا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا اور کوئی تاخیری حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو میں کم از کم ایک جاتری کو گولی سے اڑا کر باہر پھینک دوں گا۔

صورتِ حال ہر لمحہ سنگین ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے ساتھ ساتھ یرغمالیوں کو بھی احساس ہوچکا تھا کہ یہ معاملہ خون خرابے کے بغیر نمٹنے والا نہیں۔ ان کے چہروں پر وحشت اور خوف کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے لی وانگ خاصا نروس محسوس ہوتا تھا۔ درحقیقت وہ شروع سے ہی نروس تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ابھی ابھی طویل بیماری سے صحت یاب ہوا تھا۔ ٹانگ کا مسئلہ اس کے لیے بے حد گمبھیر تھا۔

ہیروئن روشنی اور رقاصہ نیلم کی حالت سب سے پتلی تھی۔ فلموں میں گولیوں کی بوچھار سے بچ نکلنے والی ہیروئن اصل "ایکشن" کے چکر میں پھنسی تو سراپا زرد نظر آرہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اس جان لیوا ہنگامے سے خاران کی قید ہی بہتر تھی۔ ممکن تھا کہ فضا میں خون اور بارود کی بو سونگھ کر اسے خاران کی بدبودار سانسیں ہی اچھی لگنے لگی ہوں۔۔۔ رقاصہ نیلم کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اے کے ۴۷ میری گود میں تھی اور اس کے چار بھرے ہوئے میگزین جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہاں سے دروازہ براہِ راست میری زد میں تھا۔ کسی بھی ایکشن کی صورت میں میں دروازے اور دروازے

سے گزرنے والی ہر چیز کو چھلنی کر سکتا تھا۔ صفدر کا ٹارگٹ کھڑکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یرغمالیوں پر بھی ایک دو طویل برسٹ مار سکتا تھا۔ اطراف میں گہری خاموشی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ سانسوں کی آوازیں تہ خانے میں گونج رہی ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے حرکت میں تھیں۔ ینگ ہن آئی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کھوئی کھوئی سی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی "شاہ جہاں صاحب' آپ نے جون چارلس کو نہیں بچایا تھا' میری زندگی بچائی تھی۔ اگر زندہ رہی تو آپ کے احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گی۔ اگر مر گئی تو میری روح آپ کی مشکور رہے گی۔"

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا ینگ" میں نے محبت سے کہا "تم زندہ رہو گی۔ جون چارلس بھی زندہ رہے گا۔ اللہ کو منظور ہوا تو ہم سب زندہ رہیں گے۔ جہاں تک احسان کی بات ہے' میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا' یہی کرتا۔"

"یہ آپ کی بڑائی ہے شاہ جہاں صاحب" اس نے آہستگی سے کہا۔ پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولی "مسٹر صفدر نے بتایا تھا' آپ بھی کسی لڑکی سے محبت کرتے تھے لیکن وہ آپ سے بچھڑ گئی۔ میرے دل سے بار بار دعا نکلتی ہے کہ آپ کو بھی مرحلے اور جس طرح آپ نے مجھے اور جون چارلس کو ملایا' آپ کی محبوبہ بھی آپ سے مل جائے۔"

میں نے چونک کر ینگ کی طرف دیکھا۔ اس کی ستارہ آنکھوں میں آنسو تھے اور دعا کا رنگ تھا۔ نجانے کیوں یکبارگی غزالہ کا چہرہ میرے تصور میں چمک گیا۔ کیا معلوم' وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ شاید اس برفانی وادی سے سینکڑوں میل دور کسی خوشگوار دھوپ میں اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی اور سرگوشیاں کر رہی تھی یا پھر کسی اداس چھت پر ٹہل رہی تھی اور بیت جانے والے سہانے دنوں کو یاد کر رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ ہم موت کی دہلیز پر ہیں۔ کسی بھی وقت ہمارے جسم گولیوں سے چھلنی ہو سکتے ہیں اور ہماری مٹی بے نام و نشان ہونے کے لیے اس وادی کی برف میں دفن ہو سکتی ہے۔

دھیرے دھیرے گھڑی کی سوئیاں اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں وہ اعلان کر رہی تھیں کہ ساڑھے آٹھ بج گئے ہیں۔ ڈیڈ لائن ہم نے دی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ میں دروازے پر پہنچا اور پشتو میں پکار کر پوچھا کہ کوئی ہے؟

جواب میں ایک پشتو بولنے والے شخص نے کہا "ہاں ہم ہیں' کہو کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "ایک گھنٹا گزر چکا ہے اور ہمارے مطالبات ابھی پورے نہیں ہوئے۔"

وہ شخص ملائمت سے بولا "سردار اس سلسلے میں مشورہ کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں بتا دیا جاتا ہے۔"

ایسے ہی جواب ہم کل شام سے سن رہے تھے۔ میں نے صفدر اور زریں گل کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی رائفلیں سونت کر چوکس کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر جون چارلس اور ینگ بھی الرٹ نظر آنے لگے تھے۔ میں نے اپنا شکار پہلے سے تاڑ رکھا تھا۔ یہ درمیانی عمر کا ایک موٹی گردن والا جاتری تھا۔ اس کے چہرے پر بنا سا ساتھ میں اسے شناخت کر چکا تھا۔ یہی شخص تھا جو ہمارے صحافی دوست مرحوم شاہد خاں کو گھسیٹتا ہوا موت کے کنویں تک لایا تھا۔ وہ موت کا کنواں جس میں بپھرے ہوئے سانڈ بدقسمت افراد کی ہڈیاں توڑنے اور لاشیں روندنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

میں نے اس جاتری کو گریبان سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ اسے میرے ارادے کا علم نہیں تھا پھر بھی اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ینگ نے زرغونہ کا چہرہ گود میں چھپا لیا تھا۔ روشنی اور نیلم بھی رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں نے رائفل کی نال جاتری کے سینے پر دل کے مقام پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ یکے بعد دیگرے دو گولیاں جاتری کی پسلیاں توڑتی ہوئی نکل گئیں۔ وہ ایک دردناک کراہ کے ساتھ آگے کی طرف جھکا اور اوندھے منہ قالین پر گر گیا۔ یرغمالیوں میں سے دو تین افراد احتجاجی انداز میں چیخے لیکن اتنی ہمت کسی کو نہیں ہوئی کہ صفدر یا زریں گل پر جھپٹنے کی کوشش کرتا۔ وہ اس سے پہلے تین جیتے جاگتے افراد موت کے گھاٹ اترتے دیکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ ہم کو رعایت نہیں کریں گے۔

جاتری کی لاش تیزی سے خون اگل رہی تھی' وہ تین بار پھڑک کر رہ ساکت ہو گیا۔ میں نے اس کی لاش کھڑکی میں سے باہر پھنکوا دی۔ فائرنگ کی آواز سن کر مسلح افراد دروازے اور کھڑکی کے سامنے آموجود ہوئے تھے۔ ہم نے کھڑکی کھولی تو وہ افراد ہمیں سامنے نظر آئے۔ لاش دیکھ کر ان کے چہرے اتر گئے۔ ان میں پشتو والا شخص بھی شامل تھا۔

میں نے پشتو میں کہا "ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ایک ایسی ہی لاش تمہیں ملے گی اور پھر... ہر آدھ گھنٹے بعد ایک لاش ملتی رہے گی۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے کھڑکی بند کر دی۔

تہ خانے کے اندر ایک ہولناک خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ ہر چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ شاندار قالین جگہ جگہ خون سے داغدار تھا۔ ایک ادھیڑ عمر جاتری بار بار ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا بددعا کے انداز میں کچھ بڑبڑانے لگا تھا۔ یقیناً اس کی آہ و بکا کا تعلق موجودہ صورتِ حال سے تھا۔

صفدر اور زریں گل اس بات سے متفق تھے کہ یہ لوگ کوئی چکر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں لہٰذا اب ہمیں کسی طرح کی کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد ایک اور لاش کا تحفہ باہر والوں کو پیش کر دیں گے۔

بہرحال اس کی نوبت نہیں آئی۔ ہمارا شدید جارحانہ رویہ محسوس کرتے ہوئے آدھ پون گھنٹے کے اندر ہمارا پہلا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ وہ اٹھارہ ارکان جن کا تعلق فلمی یونٹ سے تھا' ہمارے پاس تہ خانے میں پہنچ گئے۔ ان میں سات مرد اور گیارہ عورتیں تھیں۔ عورتوں میں زیادہ تر ایکسٹرا لڑکیاں تھیں۔ وہ سب اجڑی پجڑی اور ستم زدہ نظر آتی تھیں۔ ان میں سے دو تین کے بازوؤں میں مجھے وہ نشانات بھی نظر آئے جو آہنی گولے کی رگڑ سے گھٹنے سے فوراً ابھر جاتے تھے۔ لڑکیوں میں خوشنما سری لنکن ہیروئن لوسانجی بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ کھچڑی بالوں والی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ یہ روشنی کی خالہ ہے اور ٹرنٹ اور رشونگٹن میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ فلم کا ہیرو' ماضی کے ایک مشہور کریکٹر ایکٹر کا بھتیجا تھا۔ یہ اٹھارہ انیس سال کا ایک شرمیلا سا کم گو نوجوان نظر آتا تھا۔ فلم میں یہ یقیناً ہیرو ہوتا ہوگا لیکن اس رئیلٹی میں "زیرو" تھا۔ مجھے اس کے گورے چٹے چہرے پر اذیت کے نشانات بھی نظر آرہے تھے۔

روشنی اور نیلم اپنی ساتھی فنکاروں سے خوب رو رو کر ملیں۔ وہ ایک دوسرے کا حال پوچھ رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ روشنی کی خالہ روشنی کو سینے سے لگائے مسلسل اس کا سر چوم رہی تھی۔ وہ سب خوش تھے لیکن اس خوشی پر آنے والے لمحوں کا مہیب خوف یوں طاری تھا کہ بس خوف ہی خوف نظر آرہا تھا۔ اور یہ خوف صرف ان لوگوں کے چہروں پر ہی نہیں تھا' اس تہ خانے کی ہر شے سے ٹپک رہا تھا۔ داغدار قالین سے' یرغمالیوں کے چہروں سے' کالزی بان رشمست کی اکڑی ہوئی لاش سے' ہماری رائفلوں سے اور اس بند دروازے سے جس کے پیچھے ہمارے دشمن موجود تھے۔

ہماری دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے پہلے پہلے ہمارا دوسرا مطالبہ بھی پورا کر دیا گیا۔ پشتو والے شخص نے دروازے پر پہنچ کر بتایا کہ ہماری سواری کے لیے تین بڑی گھوڑا گاڑیاں جاترو کے دروازے پر پہنچا دی گئی ہیں۔ گاڑیاں پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری کارروائی کا نازک ترین مرحلہ شروع ہو گیا ہے۔ ہمارے لیے اس محفوظ تہ خانے سے نکلنے میں زبردست رسک تھا اور یہ بات ہمارے دشمن بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں ہوں۔ ایک دو جاتریوں کی موت کا خطرہ مول لے کر وہ ہم پر ہلہ بول سکتے تھے۔

فلمی یونٹ کے تمام لوگوں کے علاوہ ہم نے پندرہ جاتریوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ان میں پانچوں بڑے جاتریوں سمیت دس اہم ترین جاتری شامل تھے۔ درحقیقت یہی جاتری تھے جو پس منظر میں رہ کر اس وادی کے سارے نظام کو کنٹرول کیے ہوئے تھے۔ میں نے زریں گل اور جون چارلس کو ان کمروں میں بھیجا جہاں سے روشنی اور نیلم کو لایا گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے بستر کی چادریں وغیرہ لے آئے۔ ان چادروں سے پندرہ میں پٹیاں پھاڑی گئیں اور ان جاتریوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے جنہیں ہم اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ باقی تمام مقامی افراد جن میں کوکی دارا بھی شامل تھا' کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے وقت کوکی دارا نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے' کوکی دارا کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود ہم اس کی بات نہیں مان سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے آخری مشورہ کیا۔ جون چارلس کا خیال تھا کہ تمام جاتریوں کو ایک ہی گھوڑا گاڑی میں سوار کروا دیا جائے اور اس گھوڑا گاڑی میں وہ دھماکا خیز مواد رکھ دیا جائے جسے ریموٹ کنٹرول سے چلایا جا سکتا ہے۔

صفدر کا خیال ذرا مختلف تھا' وہ چاہتا تھا کہ یرغمالیوں کو تینوں گاڑیوں میں ہونا چاہیے تاکہ گاڑیاں محافظوں کے حملے سے محفوظ رہیں۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ جاتریوں کو ایک ہی گاڑی میں سوار کیا جائے لیکن اپنے تحفظ کے لیے دو دو جاتریوں کو باقی دونوں گاڑیوں میں بھی رکھا جائے۔

تہ خانے سے نکلنے کے لیے ہم نے تین گروپس بنائے۔ تینوں گروپس میں جاتری آگے تھے اور مکمل طور پر ہماری رائفلوں کی زد میں تھے۔ خاص طور سے دو بڑے جاتریوں خاران اور داتوب کو یوں گن پوائنٹ پر رکھا گیا تھا کہ رائفل کا بیرل ان کی کھوپڑی سے لگا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے ہم نے تسلی کر لی کہ ہماری ہدایت کے مطابق مسلح افراد کو دروازے اور سیڑھیوں سے پیچھے ہٹا لیا گیا ہے۔

تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد ہم تہ خانے سے نکلے اور زینے طے کر کے جاترو کے وسیع و عریض صحن میں آگئے۔ یہ ایک صاف چمکیلا دن تھا۔ قریباً دس بج چکے تھے۔ صحن بالکل خالی نظر آرہا تھا۔ ہاں کافی فاصلے پر ستونوں کی اوٹ میں مسلح افراد موجود تھے اور بغور ہماری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ فضا میں زبردست تناؤ پایا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا' ابھی کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ جائے گی اور ہر طرف کہرام مچ جائے گا۔

سیڑھیوں کے قریب تین گھوڑا گاڑیاں موجود تھیں۔ ہمارے مطالبے کے مطابق یہ بند گھوڑا گاڑیاں تھیں اور کافی بڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ یرغمالیوں سمیت ہم کل ۴۳ افراد تھے۔ ہر گاڑی میں ۱۴ افراد سوار ہو سکتے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہم نے گیارہ جاتریوں کو ایک ہی گاڑی میں سوار کرایا' اور دھماکا خیز مواد والی تھیلی مع آلات ایک نشست کے نیچے چھپا دی۔ اس تھیلی سے تعلق رکھنے والا "کنٹرول ڈوائس" ایک چھوٹے سے واکی ٹاکی کی شکل کا تھا۔ جب میں نے اس ڈوائس کو "تیار حالت" میں کیا تو ایک سرخ بتی اس پر روشن ہو گئی۔ یہ بتی اس بات کی علامت تھی کہ ریموٹ کنٹرول اور ریسیور سمیت سب کچھ ٹھیک حالت میں ہے اور ایک بٹن دباتے ہی دھماکا خیز مواد میں اسپارک ہو جائے گا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول بڑی احتیاط سے اپنی

جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ باقی دونوں گاڑیوں میں بھی تمام افراد طے شدہ ترتیب کے مطابق داخل ہو گئے۔ زرغونہ کو ینگ ہن نے مسلسل اپنے بازوؤں میں اٹھا رکھا تھا۔ میں نے ینگ ہن اور زرغونہ کو اس گاڑی میں سوار کرایا جس میں میں خود تھا۔ صفدر جاتریوں والی گاڑی میں تھا اور زریں گل تیسری گاڑی میں۔ ہم نے تہ خانے میں سے اشیائے خورد و نوش کے چند تھیلے بھی بھر لیے تھے اور یہ تھیلے اب ہمارے ساتھ تھے۔

جاتریوں والی گاڑی کو سب سے آگے رکھا گیا۔ میں سب سے پچھلی گاڑی میں تھا۔ ابھی گاڑیاں روانہ نہیں ہوئی تھیں کہ پشتو داں پیامبر ایک جانب سے نمودار ہوا۔ اس نے دور ہی سے قریب آنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دی تو وہ پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ اس پر پشتو کی تحریر تھی اور نیچے سردار سدورت کی مخصوص مہر لگی ہوئی تھی۔ اپنی آخری کوشش کے طور پر سردار سدورت نے لکھا تھا "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ محترم جاتریوں کو رہا کردو۔ ہم تمہیں یہاں سے نکلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ دوسری صورت میں ہم تمہاری بھرپور مزاحمت کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' چند محترم جاتریوں کی جان چلی جائے لیکن تمہیں اور تمہاری عورتوں کو ایسی اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

یہ ایک غیر متاثر کن تحریر تھی اور ہمارے حریفوں کی منتشر خیالی کو ظاہر کرتی تھی۔ میں نے پشتو داں پیامبر کو وہ ریموٹ کنٹرول دکھایا جس کا تعلق دو کلو دھماکا خیز مواد سے تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری انگلی کی ایک حرکت اس گاڑی کے پرخچے اڑا دے گی جس میں جاتری سوار ہیں۔ پھر میں نے ان دو جاتریوں کی صورتیں بھی پیامبر کو دکھائیں جو ہمارے ساتھ گاڑی میں سوار تھے اور اسے بتایا کہ دو بڑے جاتری اگلی گاڑی میں بھی موجود ہیں۔

پیامبر کی آنکھوں میں حیرتوں اور اندیشوں کے سائے کچھ اور گہرے ہو گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ کوئی گوشت پوست کا انسان ان کے جاتریوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں نے سدورت کی مہر والے پرچے کے ٹکڑے کرکے پھینک دیے اور گاڑی بان کو گاڑی آگے بڑھانے کی ہدایت کی..... تینوں گاڑیاں حرکت میں آئیں اور اس چوبی پل کی طرف بڑھنے لگیں جو اس وادی سے باہر نکلنے کا دوسرا اہم ترین راستہ تھا۔ ہم یہ بات پہلے سے طے کرچکے تھے کہ اگر ہمیں درّے کی طرف سے ناکامی ہوئی تو چوبی پل کی طرف سے باہر نکلنے کی کوشش کریں گے۔ چوبی پل کی طرف سے جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہم گھوڑا گاڑیوں سمیت وادی میں سے نکل سکتے تھے۔

ہم جہاں جہاں سے گزرے گلیاں ہمیں سنسان ہی نظر آئیں۔ تاہم یہ بات ہم واضح طور پر محسوس کررہے تھے کہ بہت سی آنکھیں ہماری نگرانی کررہی ہیں اور محافظوں کے گھڑ سوار دستے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمیں دکھائی دے رہے تھے اور کچھ نہیں۔ ینگ ہن میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس کا بازو زخمی تھا پھر بھی وہ بلند ہمت دکھائی دے رہی تھی۔ زرغونہ کو اس نے اپنی بانہوں کے حصار میں لے رکھا تھا۔ ینگ ہن فلپائنی تھی' زرغونہ اطالوی' ڈاکو تھی' میں پاکستانی تھا' ہمارے قریب بیٹھا ہوا ایکسٹرا سری لنکن تھا' ہم مختلف ممالک اور مذاہب کے لوگ تھے لیکن صورت حال نے ہمیں یک جان و یک رنگ کردیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم مدتوں کے شناسا ہیں۔

ہم نے جاتریوں والی گھوڑا گاڑی سب سے آگے رکھی تھی' مقصد یہی تھا کہ اگر پل کی طرف سے فائرنگ ہو تو جاتری زد میں آئیں لیکن جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع تھا۔ ہم اس وقت چوبی پل اور اس کی گزرگاہ سے قریباً ڈیڑھ سو گز دور تھے جب اچانک ہمارے دونوں پہلوؤں کی طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ چٹانوں کی آڑ لے کر کی جارہی تھی۔ اس فائرنگ میں ہلکی رائفلوں کے علاوہ "جی تھری" کی گونج دار آواز بھی شامل تھی۔ ہم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس فائرنگ کا جواب دیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اپنے اپنے ہدف کی طرف بڑھنے لگیں۔ میری ہدایت پر گاڑی میں موجود افراد نے خود کو فرش پر گرا لیا تھا۔ ہم نے لکڑی کے موٹے تختوں کے پیچھے آڑ لے لی تھی اور مزید حفاظت کے لیے خوراک کے تھیلے اپنے سامنے رکھ لیے تھے۔ ڈی رانگ میرے قریب ہی لیٹا ہوا تھا۔ بدحواسی میں اس نے سر اٹھایا تو جی تھری کا ایک پورا برسٹ اس کے چہرے اور گردن پر لگا۔ میں نے اسے بے جان ہو کر ایک جاتری کے اوپر گرتے دیکھا۔ ینگ ہن نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھا تو اس کے حلق سے کربناک چیخ نکل گئی۔ اسی دوران میں تڑ تڑ برسنے والی گولیوں نے دو ایکسٹرا لڑکیوں کو بھی چھلنی کردیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کے خون کے چھینٹے میرے پورے چہرے کو بھگو گئے تھے۔

فائرنگ ہو رہی تھی اور گاڑیاں بھی دوڑتی جارہی تھیں۔ ۲ منٹ کے اندر اندر میں نے اپنی رائفل کے چار میگزین خالی کیے۔ یہ فائرنگ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی تھی پھر بھی میں نے دو تین سواروں کو شدید زخمی ہو کر نیچے گرتے دیکھا۔ جونہی ہم چوبی پل پر پہنچے' دو طرفہ فائرنگ شدت اختیار کرگئی۔ یقینی بات تھی کہ محافظ ہمیں ہر صورت پل سے ادھر روکنا چاہتے تھے..... کم از کم ایک درجن رائفلیں ایک ساتھ ہمیں نشانہ بنا رہی تھیں' بہرحال یہ فائرنگ پہلے کی طرح جان لیوا نہیں رہی تھی۔ ہماری گاڑیاں اب چٹانوں کی اوٹ میں تھیں۔ فائرنگ کے دوران میں میری نگاہ اس گاڑی کی طرف اٹھی جس پر زریں گل سوار تھا۔ اس گاڑی کے دونوں گھوڑے ہلاک ہوچکے تھے اور گاڑی خطرناک زاویے سے آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ میں نے واکی ٹاکی پر صفدر سے کہا کہ وہ اپنی گاڑی زریں گل والی گاڑی کے قریب لائے اور اس گاڑی

کی سواریاں اپنی گاڑی میں منتقل کرلے۔ صفدر والی گاڑی جس میں جاتری بھی سوار تھے' کافی بڑی تھی اور اس میں ناکارہ گاڑی کی سواریاں منتقل ہوسکتی تھیں۔ میری ہدایت موصول کرنے کے بعد صفدر اپنی گاڑی' الٹی ہوئی گاڑی کے قریب لے آیا۔ میں نے اپنے گاڑی بان کی طرف دیکھا تو وہ موقع سے غائب تھا۔ فائرنگ کے دوران میں وہ نجانے کس وقت چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا تھا۔ اس موقع پر جون چارلس نے بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی رائفل ینگ ہن کو تھمائی اور لپک کر گھوڑوں کی باگیں تھام لیں۔ گاڑی بان کی نشست پر بیٹھ کر وہ شدید فائرنگ کی زد میں آگیا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے چلا کر جون چارلس سے کہا کہ وہ گاڑی کو پل کی طرف لے جائے..... جون چارلس پل کی طرف بڑھا۔ میں گاڑی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور تابڑ توڑ فائرنگ کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک بدقسمت ایکسٹرا لڑکی کی لاش کے اوپر بیٹھا ہوں اور میرا ایک گھٹنا نیم گرم خون سے تر ہو رہا ہے مگر میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں ان باتوں پر زیادہ توجہ دے سکتا۔ میری نگاہ اپنے ٹارگٹس پر تھی اور انگلی لبلبی پر مسلسل حرکت کررہی تھی۔ ہم پل کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے جب میری آنکھوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ ایک طویل چیخ جیسی آواز بلند ہوئی اور کوہی نالے پر بنا ہوا لکڑی کا طویل پل اپنی جگہ سے حرکت میں آگیا۔ پل کا ایک سرا بتدریج نیچے کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ میری نگاہ ان بڑی بڑی زنگ آلود چرخیوں پر پڑی جو پل کے نیچے واقع تھیں۔ یہ چرخیاں گھوم رہی تھیں اور انہی کے سہارے پل نیچے کی طرف جھک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے صفدر کا بنایا ہوا وہ نقشہ گھوم گیا جس میں اس پل کی تفصیل بھی بیان کی گئی تھی۔ صفدر نے ان چرخیوں کا ذکر کیا تھا اور ان کے گرد ایک سرخ دائرہ بھی لگایا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ ان چرخیوں کا مقصد کیا ہے اور نہ ہی اسے کسی اور سے معلوم ہوسکا تھا۔

اب سب کچھ ہمارے سامنے آگیا تھا۔ وہ پل ہمارے قدموں کے نیچے سے نکال دیا گیا تھا جو ہمیں اس وادی سے نکلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس پل کا وہ سرا جو ہمارے سامنے تھا' کنارے سے قریباً پندرہ فٹ نیچے جاچکا تھا اور ابھی مزید نیچے جارہا تھا۔ یہ ایک نہایت مایوس کن منظر تھا۔ مجھے اپنے سینے میں ناکامی کی دھند پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ دوسرا شدید ترین جھٹکا تھا جو ہمارے "فرار کے منصوبے" کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے جب ہم درّے سے قریباً نکل چکے تھے' ایک آہنی گیٹ نے ہمارا راستہ روکا تھا۔ اب پھر ویسا ہی "سرپرائز" ہمیں ملا تھا اور ہم نے ایک نازک ترین مرحلے میں خود کو بالکل بے دست و پا پایا تھا۔ شاید سردار سدورت' ناشا اور ڈاکٹر جتری ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس وادی سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ٹھنڈے دل سے سوچا جاتا تو وادی کی حدود سے نکل کر بھی ہم خود کو محفوظ تصور نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے بعد بھی جدوجہد کے کئی مرحلے تھے جو ہمیں طے کرنے تھے لیکن یہ تو تب کی بات تھی جب ہم یہاں سے نکل سکتے۔ میں عالم بے بسی میں تھا۔ کوہی نالے کا عمیق کنارہ ہم سے صرف آٹھ دس گز کی دوری پر تھا لیکن پل بہت دور جاچکا تھا۔ چرخیاں گھومنے کی آواز ایک طویل چیخ کی صورت میں بلند ہو رہی تھی اور قرب و جوار میں پھیل رہی تھی۔ یکایک "جی تھری" پھر گرجی اور چند گولیاں ہماری گھوڑا گاڑی کے مختلف حصوں میں لگیں۔ ٹم ایکسٹرا روشنی کی چیخ بلند ہوئی۔ گولی اس کی ٹانگوں میں کہیں لگی تھی۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا بھی تڑپ کر اوندھے منہ گر گیا اور گاڑی ایک طرف جھک گئی۔

ناکامی کا احساس زہر کی طرح میرے لہو میں گھل گیا تھا۔ اوّلین لمحوں میں اس احساس نے مایوسی کو جنم دیا پھر یہ مایوسی بتدریج غم و غصے میں ڈھلنے لگی..... مجھے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا عبرتناک انجام سامنے نظر آنے لگا تھا لیکن اس عبرتناک انجام سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا تھا۔ وہی کام جس کا میں نے سردار سدورت اور اہل قبیلہ سے وعدہ کیا تھا..... ان کے ۱۵ عدد جاتریوں کی لاشوں کا وعدہ۔ ان شیطان صفت درویشوں کی موت کا وعدہ جو اس وادی کے اصل کرتا دھرتا تھے۔

یہی وقت تھا جب میرے واکی ٹاکی پر صفدر کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری "شاہ جہاں صاحب! بڑا زوردار فائر آیا ہے۔ زریں

گل والی گاڑی سے بندے اتریں گے تو فوراً فائرنگ کے سامنے آجائیں گے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ انہیں اپنی گاڑی میں ہی رہنے دو۔ اب پروگرام بدل گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جاتریوں کو ختم کرنا ہے" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "تم زریں سے کہو کہ وہ اپنی گاڑی کے دونوں حرامزادوں (جاتریوں) کو تمہاری گاڑی میں بھیج دے۔ میں بھی اپنی گاڑی کے دونوں حرامزادے لے کر آرہا ہوں۔"

صفدر سے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں نے دونوں جاتریوں کو گریبانوں سے پکڑا اور وحشیانہ انداز میں کھینچ کر نیچے اتار لیا۔ ینگ ہن رو رہی تھی اور اس کی گود میں زرغونہ رو رہی تھی۔ ینگ روتے روتے بولی "یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں جاتریوں کو فائرنگ کے رخ پر رکھتے ہوئے' صفدر والی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا.... دونوں جاتری معمول کی طرح میرے ساتھ چلے آرہے تھے۔ وہ میری آنکھوں میں یہ پیغام پڑھ چکے تھے کہ جہاں انہوں نے کوئی چالاکی یا دلیری دکھانے کی کوشش کی میں انہیں قتل کر دوں گا۔ جاتریوں کی اوٹ کے سبب میں فائرنگ سے محفوظ تھا' لہٰذا چند ہی لمحوں میں صفدر والی گھوڑا گاڑی تک پہنچ گیا۔ میرے پہنچنے تک صفدر نے اس گاڑی میں تیرہ عدد جاتری پورے کر لیے تھے۔ دو عدد میرے بھی شامل ہو گئے تو وہ پورے پندرہ ہو گئے۔ پندرہ جاتری اور دو گھوڑے جو دو کلو ٹی این ٹی کی زد میں تھے' ریموٹ کنٹرول کے سرخ بٹن پر میری انگلی کی ایک جنبش ان تمام نفوس کو چیتھڑوں میں تبدیل کر سکتی تھی۔ صفدر اس گاڑی کے گھوڑوں کو کھینچ کر گاڑی کو کچھ فاصلے پر لے گیا۔ مقصد یہی تھا کہ اگر آخری اقدام کے طور پر ہمیں اس گاڑی کو اڑانا ہی پڑے تو اس دوسری گاڑی کو نقصان نہ پہنچے جو دونوں گھوڑے ہلاک ہونے کے سبب سامنے کے زاویے سے زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ قلمی یونٹ کے زیادہ تر ارکان اسی گاڑی میں سوار تھے۔

میں نے دیکھا' زریں گل اور جون چارلس نے ایک برف پوش پتھر کے پیچھے پناہ لے رکھی ہے اور ڈٹ ڈٹ کر فائر کر رہے ہیں۔ میں جانتا تھا' ان کا ایمونیشن ختم ہونے والا ہے۔ خود میرے اور صفدر کے پاس بھی زیادہ راؤنڈ نہیں رہے تھے۔ صفدر کے پاس تقریباً دو درجن گولیاں رہ گئی تھیں' جب کہ میری رائفل میں آخری میگزین لگا ہوا تھا۔ یقیناً پانچ چھ راؤنڈ ہی اس میگزین میں باقی تھے۔ ہم بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں تھے' تاہم میں محسوس کر رہا تھا کہ وادی کے مسلح خونخوار' ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ گھیرا مزید تنگ ہو گیا۔ پھر ہمارے بالکل سامنے تقریباً پچاس گز کی دوری سے ایک خاکستری چٹان کی اوٹ سے کسی کی گرجتی ہوئی آواز ابھری۔ وہ پشتو میں بولا تھا "یہ تمہارے آخری موقع ہے۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ بہت اذیت سہہ کر مرو گے۔"

میں نے کہا "تمہارے لیے بھی یہ آخری موقع ہے۔ میں تمہارے جاتریوں کو دھماکے سے اڑا رہا ہوں۔"

"جاتریوں کی حفاظت کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ جاتریوں کی حفاظت ریوتا کریں گے" وہ مذہبی جوش و خروش سے بولا "تم جیسے ایک ہزار بھی ہوں تو ریوتاؤں کی منشا کے بغیر ان کا [illegible] نہیں بگاڑ سکتے۔"

"پاگل مت بنو۔ جاتریوں کی موت کی ذمہ داری صرف تم پر ہوگی۔"

اس نے والہانہ جوش سے ہم سب کو ایک مشترکہ گالی دی اور بولا "تم محترم جاتریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم نے ان پر ہاتھ اٹھایا تو تمہارے ہاتھ ٹوٹ کر گر جائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی خودکار رائفل کا ایک برسٹ آیا۔ زریں تڑپ کر اوندھے منہ گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر ڈھلوان پر دور تک پھسل گئی۔ گولیاں میرے سر کے بالوں کو بھی چھوتی ہوئی نکل گئی تھیں۔

یہ انتہا تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کٹر دیوتا پرست جوش و خروش میں اندھے ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ کوئی ان کے جاتریوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جو بگاڑنے کی کوشش کرے گا' ریوتا اسے بھسم کر دیں گے۔ اس سے ملتی جلتی بات تہ خانے میں بھی ہم سے کہی گئی تھی۔ ان مذہبی جنونیوں کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ مقدس جاتریوں کا ایک ایسا گروہ جس میں پانچ اعلیٰ ترین جاتری بھی شامل ہیں' موت کے گھاٹ اتر سکتا ہے یا کسی میں اتنی سکت ہو سکتی ہے کہ وہ انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے۔ وہ پاگل ہو رہے تھے اور ہمارے قریب پہنچتے آ رہے تھے۔ اب یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ روپانی ریوتا کے "مقدس جاتری" مر سکتے ہیں۔ ان کے چیتھڑے فضا میں بلند ہو سکتے ہیں۔ ان کے ٹکڑے جل کر راکھ ہو سکتے ہیں.... ہاں مجھے یہ ثابت کرنا تھا اور قطعی طور پر بے بس ہو جانے سے پہلے کرنا تھا۔ ایک خوفناک ضد کی لہر میرے رگ و پے میں لپک گئی۔ میں نے زریں کو دیکھا۔ وہ جہاں گرا تھا وہیں پڑا اینٹھ رہا تھا۔ صفدر اور جون چارلس مایوسی کے عالم میں اپنے آخری راؤنڈ فائر کر رہے تھے۔ عقب سے کوہی نالے کا شور بلند ہو رہا تھا اور چرخیوں کی وہ طویل چیخ تھی جو ابھی تک آہستہ آہستہ گھوم رہی تھیں۔ سامنے چٹانیں تھیں۔ یہاں وہ خونخوار کلہاڑا بردار اور رائفل بردار تھے جو ہر لحظہ قریب آ رہے تھے اور جنونی لہجے میں اپنے کسی دیوتا کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ میں نے کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔

بٹن دبتے ہی چمک نمودار ہوئی اور سماعت شکن دھماکے نے قرب و جوار کو لرزا دیا۔ وہ بہت خوف ناک دھماکا تھا۔ میں نے جاتریوں والی گھوڑا گاڑی کو گھوڑوں سمیت کسی کھلونے کی طرح فضا میں بلند ہوتے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ وہ سیکڑوں ٹکڑے تھے۔ ان میں گھوڑا گاڑی کے علاوہ انسانی جسم کے چیتھڑے بھی شامل تھے۔ یہ جلتے ہوئے چیتھڑے فضا میں بلند ہونے کے بعد دور جا گرے۔ ایک کٹا ہوا بازو لڑھکتا ہوا آیا اور مجھ سے چند گز کی دوری پر رک گیا۔ وہ جل رہا تھا۔

پانچ دس سیکنڈز کے لیے ہر چیز پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ پتھرا اور ہر جسم مجسمہ تھا۔ ان لمحات میں جیسے چیختی چنگھاڑتی ہوا بھی تھم گئی تھی.... ایک حیرت ناک خاموشی تھی جو یہاں سے وہاں تک سنسنا رہی تھی۔ ایک سوال تھا جو ان نشیب و فراز میں گونج رہا تھا۔ کیا واقعی اس وادی کے پندرہ معزز ترین افراد فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں؟ کیا یہ جلتے ہوئے پرخچے ان عالی مقام جاتریوں کے ہیں جو اس وادی میں سیاہ و سفید کے مالک تھے؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ زمین اب تک پھٹی کیوں نہیں؟ یہ آسمان ٹوٹ کر گرا کیوں نہیں؟ کیوں دیوتاؤں نے ابھی تک پہاڑوں کو ریزہ ریزہ نہیں کیا اور اس وادی کی دونوں بستیوں پر شعلوں کی بارش نہیں کی؟

آخر شدید حیرت و استعجاب کے یہ چند لمحے بیت گئے۔ اس خوف آمیز حیرت کی جگہ ایک بے پایاں غضب اور طیش نے لے لی۔ میں نے دیکھا' روپانی دیوتا کے چند پجاری خوں خوار آوازوں میں دہاڑتے ہوئے پتھروں کی اوٹ سے نکلے اور دیوانہ وار میری طرف لپکے۔ ان کے چہرے غم و غصے کی شدت سے بھیانک ہو رہے تھے۔ وہ موت کے چہرے تھے۔ اذیت ناک موت جو اب ہمیں حصار میں لینے والی تھی لیکن یہ جو کچھ بھی تھا' زندگی اور موت کے کھیل کا حصہ تھا اور ہمیں اس کا سامنا کرنا تھا۔ میری طرف لپکنے والے افراد کی تعداد آٹھ دس کے قریب تھی۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور چمک دار کلہاڑے تھے۔ درمیانی فاصلہ بمشکل بیس گز تھا۔ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور آخری راؤنڈ اس جنونی ٹولی پر فائر کر دیے۔ شاید ایک دو افراد زخمی ہو کر گرے تھے مگر ان کے گرنے سے یہ حملہ رکا نہیں۔ میں نے خالی رائفل ایک طرف پھینکی اور پنڈلی سے چھرا کھینچ لیا.... اگلے ہی لمحے میں وحشی [illegible] کے نرغے میں تھا۔ میں جانتا تھا' موت میری شہ رگ پر بیٹھی ہے لیکن مجھے آخری وقت تک مزاحمت کرنا تھی کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد یہی سیکھا تھا اور میرے نزدیک یہی مزاحمت' زندگی کی اساس تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مرنے سے پہلے ان میں سے کم از کم نصف درجن افراد کو ضرور لقمۂ اجل بناؤں گا۔ دو کلہاڑے برق کی طرح میرے سر پر چمکے۔ میں نے ڈائی دے کر خود کو بچایا اور میرے چھرے نے ایک جواں سال [illegible] کی آنتیں برف پر ڈھیر کر دیں۔ اس دوران میں میں نے ایک

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ :
ناشر : علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ ، اُردو بازار لاہور
فون :۔ ۷۲۴۷۴۱۴

سٹاکسٹ : علی بک سٹال
نسبت روڈ ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون : ۷۲۲۳۸۵۳

حملہ آور جاتری کو راکفل سمیت اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ اسے صفدر نے عقب سے گولی ماری تھی۔ شاید یہ صفدر کا آخری فائر تھا کیوں کہ اس کے بعد وہ اور جون چارلس بھی میری طرح وحشی تاگوں کے نرغے میں آنے والے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پھنکارتے ہوئے بدبودار جنگلی مجھے زندہ پکڑنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے دائیں بائیں سے مجھے دبوچنے کی کوشش کی' میں نے بے دریغ ان کے درمیان چھرا چلایا۔ دو زخمی ہوئے اور چلاتے ہوئے پیچھے ہٹے لیکن یہ پسپائی دیرپا نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے ان کے کلہاڑے پھر میری طرف بڑھے۔ میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹا' پاؤں پھسلا اور میں پشت کے بل گرا۔ یہ ایک ڈھلوان تھی' میں نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ میں تیزی سے گر رہا تھا۔ جو آخری آوازیں میں نے سنیں وہ دو طرح کی تھیں۔ ایک گھومتی ہوئی چرخیوں کی طویل چیخ' دوسرے حملہ آوروں کے غضب ناک نعرے جو اب بلندی سے سنائی دے رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ چھرا میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی ذہن میں لپکا کہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں یا پھر دارفانی سے کوچ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ظاہر ہے' یہ تکلیف دہ احساسات تھے لیکن ان احساسات کے ساتھ ایک بے پایاں اطمینان بھی منسلک تھا اور یہ اطمینان اس بات کا کہ میں نے راری کے اہم ترین جاتریوں کو قتل کردیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں میرے ذہن میں آیا۔ پھر میرے حواس کو ایک گہری ناقابل مزاحمت تاریکی نے ڈھانپ لیا۔

○☆○

معلوم نہیں' میں کتنی دیر دنیا ومافیہا سے بے خبر رہا۔ زمان ومکاں کا ہر احساس میرے ذہن سے محو ہوچکا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ بے ہوشی مختصر ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ بہت طویل ہو۔ میں پشت کے بل زمین پر پڑا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے چھت نہیں تھی' نیلی چھتری تھی۔ وہی نیلا بیکراں آسماں جو ہر جگہ ہمارے ساتھ چلتا ہے اور ہم جس کے نیچے سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اس آسمان کو تکتا رہا پھر اپنے جسم کو حرکت دی۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ یکایک یہ خیال میرے ذہن میں لپکا کہ میں کیسے اور کب بے ہوش ہوا تھا۔ خوں خوار قاتل آنکھیں مجھ پر شعلے برسا رہی تھیں اور چمکدار کلہاڑے میرا خون پینے کے لیے میری طرف بڑھے تھے۔ پھر کیا ہوا تھا.....؟ شاید میرا پاؤں پھسلا تھا۔ میرے نتھنوں میں بارود کی رچی بو گھس آئی جو دھماکا خیز مواد کے پھٹنے سے فضا میں پھیلی تھی۔ اس بو میں جلے ہوئے گوشت کی سڑاند بھی شامل تھی۔ یہ ان جاتریوں کے گوشت کی سڑاند تھی جو میرے ہاتھوں لقمۂ اجل بنے تھے۔ ایک پل کے لیے میں نے سوچا کیا یہ سڑاند واقعی میرے نتھنوں میں گھس رہی ہے؟ لیکن نہیں..... ایسا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف اس دھواں دھواں فضا کا تصور تھا۔

میں کوشش کرکے اٹھ بیٹھا۔ کہاں تھیں وہ برفیلی چٹانیں اور وہ لکڑی کا پل؟ کہاں تھے لمبے بالوں والے وہ خوں خوار لوگ؟ کیا وہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا؟ کیا میں اب تک سویا رہا تھا؟ میں اپنے قرب وجوار کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چٹانوں اور برف کے بجائے یہاں ہریالی تھی۔ فضا میں وہ خنکی بھی نہیں تھی جو بلند ترین پہاڑوں پر محسوس کی جاتی ہے۔ میرے آس پاس میرے چند ساتھی موجود تھے۔ میں نے زریں گل اور ژینگ ہن کی صورتیں دیکھیں۔ قلم ایکسٹریس روشنی کو میں نے اس کے لباس سے پہچانا' میں ایک بے ساختہ حرکت کے تحت اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ میری ایک ٹانگ میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں اور سر کا پچھلا حصہ درد سے پھٹنے لگا۔ غیر ارادی طور پر میں نے سر کو چھوا۔ یہاں کسی زخم پر دوائی رکھ کر پٹی باندھی گئی تھی۔ ایسی ہی پٹی میری ایک کہنی پر بھی نظر آرہی تھی۔ میں اسی گرم لباس میں تھا جس میں جنگیوں سے نبرد آزما ہوا تھا۔ میری چرمی جیکٹ پر ابھی تک اس ایکسٹرا لڑکی کے خون کے چھینٹے موجود تھے جو میری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی ہوئی تھی۔ میں لپک کر زریں گل کے پاس پہنچا "زریں..... زریں۔" میں نے اسے جھنجوڑا اور زور لگا کر سیدھا کردیا۔

وہ بے ہوش تھا یا بہت گہری نیند میں تھا۔ اس نے جیکٹ اس طرح پہن رکھی تھی کہ ایک بازو جیکٹ سے نکلا ہوا تھا۔ اس بازو کے کندھے پر خون آلود "بینڈیج" نظر آرہی تھی۔ یقیناً زریں کو گولی لگی تھی جس کے نتیجے میں اس کی مرہم پٹی کی گئی تھی۔ میں نے صفدر کی تلاش میں نگاہ دوڑائی لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ فلمی یونٹ کے کیمرا مین رضوی کے قریب ہی مجھے ننھی زرغونہ نظر آئی۔ وہ گرم کپڑوں میں لپٹی بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا سر ایک پتھر پر ایسے ٹکا ہوا تھا جیسے سرہانے پر رکھا ہو۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس کی تحویل میں ہیں۔ گرد وپیش اجنبی اور نامانوس دکھائی دے رہے تھے۔ حد یہ تھی کہ نانگا پربت دکھائی دیتی تھی اور نہ اس کی سنگی چوٹیاں۔ ایک دم ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم اس وادی میں نہیں ہیں جہاں اب تک موجود تھے۔ یہ احساس ایک سنسنی خیز لہر کی طرح میرے پورے جسم میں پھیل گیا۔ دل میں خوشی کو اور دھڑکنیں جاگیں اور اس کے ساتھ ہی شدید حیرت نے سراپا جکڑ لیا۔ کیا واقعی ایسا ہوچکا تھا؟ کیا ہم اس ناقابل عبور دلدلی سے نکل چکے تھے جس کے متعلق یہ بات طے شدہ تھی کہ وہاں صرف داخل ہوا جاسکتا ہے؟ میرے ذہن نے فوراً میرے خیال کی نفی کردی۔ یقیناً میں خوش فہمی کا شکار ہو رہا تھا۔ ہم اس دلدلی ہی کے کسی سرسبز حصے میں موجود تھے۔ غالباً زیادہ گہرائی کی وجہ سے ہمیں نانگا پربت نظر نہیں آرہی تھی اور ماحول اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک ایک ہلکی سی کراہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ ژینگ ہن کی آواز تھی۔ وہ ہوش میں آرہی تھی۔ میں لپک کر اس

کے پاس پہنچا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ژینگ نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی آواز نکلی "مت مارو..... خدا کے لیے مت مارو۔ چھوڑ دو اس کو۔ میرے جون کو چھوڑ دو۔" وہ کسمسا رہی تھی۔

میں نے اس کے گال تھپکے "ہوش میں آؤ ژینگ! یہ میں ہوں شاہ جہاں..... تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے یہاں۔"

میں نے دیکھا' ژینگ کی کلائیوں پر رسی کی سخت بندش کے نیلے نشان ہیں۔ ایسے ہی نشان ہم میں سے کئی ایک کے ہاتھ پاؤں پر موجود تھے..... میں نے ژینگ کو دو تین بار قدرے زور سے ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ بہت مدھم آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔ یقیناً یہی پوچھ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے اور جون چارلس کہاں ہے۔ جب اس کے ہونٹوں سے "جون" کا نام نکلا تو چہرے پر زبردست تشویش ابھر آئی۔

"جون بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے اسے جھوٹی تسلی دی "ابھی تھوڑی دیر میں تم اسے دیکھ سکو گی۔"

"مجھے دکھاؤ' پلیز مجھے دکھاؤ۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"وہ زندہ ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں" آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ اسے پکڑ کر لے گئے ہیں۔ وہ اسے مار ڈالیں گے۔ پلیز شاہ جہاں! آپ نے پہلے بھی اسے بچایا تھا۔ آپ ہی اس کے لیے کچھ کرسکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں' میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ ہذیانی انداز میں بولتی چلی جارہی تھی۔

میں نے اسے تسلی تشفی دینے کی کوشش کی۔ اس دوران میں زریں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کراہ کر بولا "استاد صیب! ام کہاں ہے۔ یہ کون سا جگہ ہے؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زریں گل اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا زخمی کندھا تھام رکھا تھا۔

زریں گل کو ہوش میں آتے دیکھ کر میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ زریں گل کے قریب ہی وہ خودکار راکفل بھی پڑی ہے جو شروع میں اس کے پاس تھی۔

ہم یکے بعد دیگرے بیدار ہو رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم سب کسی تیز دوا کے زیر اثر تھے۔ اب اثر ختم ہو رہا تھا اور ہماری بے ہوشی' نیند یا بیداری میں بدل رہی تھی۔ میں نے ژینگ ہن کو لڑھکی لٹایا اور زریں گل کے پاس پہنچا۔ زریں گل نے راکفل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی اور ہر قسم کے "خطرے"

سے نمٹنے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ غالباً ابھی اسے قطعی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ہم "میدان جنگ" سے دور آچکے ہیں' بلکہ شاید اس وادی سے بھی دور آچکے ہیں جہاں قاتل کلہاڑوں کی شکل میں موت ہم پر سایہ فگن تھی۔

وہ بولا "استاد صیب! یہ سب کیسے ہوا ہے۔ وہ لوگ..... تو ام کو کسی صورت زندہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ام نے تو یہ سمجھ کر آنکھیں بند کیا تھا کہ اب کبھی آنکھیں کھولنا نصیب نہ ہوگا۔"

"آنکھیں بند کیا تھا؟ کیا مطلب؟"

"وہ سب حرامی ام کو پکڑ کر تماشا گاہ کی طرف لے گیا تھا۔ وہی تماشا گاہ جہاں بڑا بڑا سانڈ بدبخت قیدیوں کو فٹ بال کی طرح اچھالتا ہے۔ صفدر صیب' جون چارلس' ژینگ ہن سب امارے ساتھ تھا۔ اُف خدایا! کیسا دردناک نظارہ تھا وہ..... یقین کرو استاد صیب! ام کو تو اب بھی یہی لگ رہا ہے کہ ام وفات پاچکا ہے اور جنت شریف میں آپ سے ملاقات کر رہا ہے۔"

لگ رہا تھا کہ زریں گل ابھی تک خواب آور دوا کے اثر میں ہے۔ اس کی باتوں میں تسلسل نہیں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر ایک پتھر پر بٹھایا۔ حرکت کرنے سے اس کے زخم میں تکلیف ہوئی اور رنگ زرد پڑگیا۔ ہمارے اردگرد کم وبیش دس افراد موجود تھے۔ ان میں فلمی یونٹ کی ایکسٹرا گرلز تھیں' ٹیکنیکل کارکن تھے' اس کے علاوہ دو تین سری لنکن ایکٹر بھی تھے۔ تاہم سری لنکن ہیروئن لوسانچی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ صفدر اور جون چارلس کے بارے میں میں پہلے ہی بتا چکا ہوں' وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ زریں گل نے دریافت کیا "یہ سب لوگ یہاں کیسے پہنچا' اور ان کو ہوا کیا ہے؟"

میں نے کہا "فی الحال میں بھی تمہاری طرح بے خبر ہوں۔"

زریں گل کی آنکھیں حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ گزرے ہوئے واقعات یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں آرہے تھے اور چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ وہ بولا "استاد صیب! ام کو یہاں کندھے میں دو گولیاں لگا تھا۔ ام اوندھے منہ گر گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ام کو کچھ پتا نہیں چلا کہ امارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ پھر ام نے دیکھا کہ بہت سے جنگیوں نے صفدر صیب کو پکڑا ہوا ہے۔ صفدر صیب کے سر سے بہت زیادہ خون نکل رہا تھا۔ جون چارلس اور دوسرے لوگ بھی پکڑے گئے تھے۔ ان سب کو برف پر گرا دیا گیا تھا اور ان کا مشکیں باندھا جارہا تھا۔ ژینگ ہن کا قمیص تار تار تھا اور اوپر کا جسم بالکل ننگا ہو رہا تھا' وہ بے چاری پھر بھی زرغونہ کو اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔ امارے سامنے کچھ حرامیوں نے ژینگ ہن کے بال پکڑ کر اسے زمین پر گرایا اور زرغونہ کو اس سے چھین لیا۔ اس کے بعد ژینگ ہن کو اٹھا اٹھا کر پتھروں پر مارا گیا۔ یہی سلوک دوسری عورتوں کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ خوبچے وہ سب لڑکیاں چیخ رہا تھا اور منتیں سماجتیں کر رہا تھا۔ پھر ان کو بھی رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ دوسری لنکن

لڑکوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو انہیں کلہاڑے مار مار کر ام سب کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ کئی لڑکیاں یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ام سب کو برف پر گھسیٹ کر گھوڑا گاڑیوں میں ڈالا گیا اور سرنگ کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ام کو وہ سارا منظر خواب کے مافق لگ رہا ہے استاد صیب! ہمارے ارد گرد جنگیوں کا ہجوم تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگ خوف ناک نعرے لگا رہے تھے اور ہمارا تکا بوٹی کرنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر بعد جب ام کو گاڑیوں سے باہر نکالا گیا تو ام اس تماشا گاہ میں تھا جہاں ایک دفعہ پہلے بھی گیا تھا۔ وہی گہرا خشک تالاب جہاں قیدیوں کا پنجرا اتار لیا جاتا ہے اور ان پر موٹا موٹا سانڈ چھوڑا جاتا ہے۔ ام کو ایک کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ یہاں بالکل اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آتا تھا اور جگہ اتنا تنگ تھا کہ ام ایک دوسرے کے اوپر جا گرتا تھا' بالکل ایندھن کی لکڑیوں کے مافق۔ کوٹھری سے باہر سیکڑوں لوگ نعرے لگا رہا تھا اور چیخ چلا رہا تھا۔ یہاں حیدر صیب نے ام کو بتایا کہ آپ نے سارے بڑے جاتریوں کو بارود سے اڑا دیا ہے اور آپ خود بھی شدید زخمی ہو گیا ہے۔ خو ام سمجھ گیا' اب ہمارا مرنا بھی یقینی ہے۔ ام بچ نہیں سکے گا۔ ام خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگا۔ اسی دوران میں ہماری کال کوٹھری سے باہر سردار سدورت کا آواز آیا۔ ام کو یوں لگا جیسے وہ کسی سے جھگڑ رہا ہے۔ بہت سا لوگ تیز تیز آوازوں میں بول رہا تھا۔ کبھی کبھی سردار سدورت کا آواز بھی بہت اونچا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ باتیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچا۔ جاتریوں میں سے کچھ لوگ ایسا تھا جو ام کو فوراً قتل کرنا چاہتا تھا لیکن سردار سدورت کا کہنا تھا کہ ضروری نہیں کہ یہ کام فوراً کیا جائے۔ وہ جاتریوں کو تھوڑی دیر صبر کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ جھگڑتے ہوئے ام سے دور چلا گیا اور ام کو ان کا آواز آنا بند ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پوری وادی میں ہلچل سا مچا ہوا ہے۔ چیخ پکار سنائی دے رہا تھا اور لوگ بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ام کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ آپ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ بچہ لوگ زرغونہ آپ کا نام لے لے کر رو رہا تھا اور ٹینک بن اسے چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی روتا جا رہا تھا۔ ہمارا خیال ہے' ام انھورس گھنٹے اس کال کوٹھری میں بند رہا تھا۔ پھر ایک دم ام کو یوں لگا جیسے کوئی تیز گیس ہمارے ناک میں گھس رہا ہے۔ ام نے سانس روکنے کا کوشش کیا لیکن زیادہ دیر نہیں روک سکا۔ ہمارے دماغ میں اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ام سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بہت زہریلا قسم کا گیس ہے جو اس کوٹھری میں چھوڑا گیا ہے۔ ام نے آنکھیں بند کر لیا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا...... لیکن اب ہوش آیا ہے تو خود کو یہاں پا رہا ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ہمارے ساتھیوں میں سے کچھ اور لوگ کسمسانے اور کراہنے لگے تھے۔ زرغونہ تو باقاعدہ اٹھ بیٹھی تھی اور منہ بسور رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور پچکارنے لگا۔ وہ بالکل گم صم تھی' نہ کچھ بول رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ اس ننھی جان نے اپنی معصوم آنکھوں سے اتنے ہول ناک مناظر دیکھے تھے کہ دل دماغ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ زرغونہ کی اس ننھی سی رسٹ واچ کا ڈائل ٹوٹ چکا تھا جس پر اس کے بدنصیب بابا نے اسے "ٹائم دیکھنا" سکھایا تھا۔ میں نے وہ رسٹ واچ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لی۔

زرغونہ کے قریب ہی مجھے اپنی رائفل بھی نظر آ گئی' اس کے علاوہ کچھ بیگ وغیرہ تھے جن میں ہمارا سامان تھا۔ اچانک میری نگاہ زرغونہ کے پی پی کوٹ پر پڑی۔ اس کوٹ کی جیب میں سے ایک کاغذ جھانک رہا تھا۔ کاغذ پولی تھین میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کاغذ پر پشتو کی تحریر تھی۔ سب سے اوپر میرا نام لکھا تھا۔ لکھنے والے کا نام سردار سدورت تھا۔ یہ دراصل ایک طویل خط تھا جس کے آخر میں سردار سدورت کے نام کی مہر لگی ہوئی تھی۔

میری طرح زریں گل بھی اس خط کو دیکھ کر بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے خط نکالا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا۔ خط کے مندرجات کچھ یوں تھے۔

"شاہ جہاں! جب تم یہ الفاظ پڑھو گے' تم اس وادی سے اور ہم سے بہت دور جا چکے ہو گے۔ ہم نے تمہیں یہاں سے نکالنے کا پورا انتظام کر لیا ہے اور اب میرے آدمی میرے آخری حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ یوں تم اور تمہارے ساتھی وہ پہلے لوگ ہیں جنہیں اس وادی میں آنے کے بعد واپس جانا نصیب ہو رہا ہے۔ شاہ جہاں! یہ پہلا اور شاید آخری واقعہ ہے جو اس وادی میں رونما ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت اس وادی کے مکین سخت تذبذب اور زبردست حیرانی کا شکار ہیں۔

شاہ جہاں! تمہیں اب یقین آ جانا چاہیے کہ میں ہمیشہ تمہارا دوست رہا ہوں۔ بے شک اس دوستی میں کچھ دیر کے لیے بدگمانیاں پیدا ہوئیں لیکن وہ صرف بدگمانیاں تھیں اور اس کا ثبوت تمہاری رہائی ہے۔ میں نے اس وادی کے ہر قاعدے اور ضابطے کو ایک طرف رکھ کر تمہیں یہاں سے روانہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جو فیصلہ میں نے کیا ہے شاہ جہاں! وہ بے حد مشکل تھا۔ اس کے لیے مجھے کئی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کئی مشکلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ ایک رسک ہے جو تمہاری ذات پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم میرے اعتماد پر پورے اترو گے۔ میں یہ ساری نیک نامی خود لینا نہیں چاہ رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم نے اس سلسلے میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کیا ہے اور خود کو خصوصی سلوک کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ میں وہ سنگین اور نازک ترین لمحات کبھی نہیں بھول سکتا جب تمہیں چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا اور تمہیں ایک اہم ترین فیصلہ کرنا تھا۔ جاتریوں کو دھماکے سے اڑا دینا تھا یا رعایتیں حاصل کرنے کی بے کار امید میں خود کو محافظوں کے حوالے کر دینا تھا۔ اس موقع

پر تم نے احتیاط اور بزدلی کے بجائے بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔ تم نے نتائج سے بے پروا ہو کر جاتریوں کو اڑا دیا۔ یوں خوف اور دہشت کا وہ بت پاش پاش کر دیا جو اس وادی کے مکین مدتوں سے پوج رہے تھے۔ شاہ جہاں! تمہیں علم نہیں' یہاں کے لوگ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی ان جاتریوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ انہیں دیوتاؤں کا سایہ سمجھتے تھے اور ان کے ہر گناہ اور ظلم کو چپ چاپ سہنا اپنا فرض گردانتے تھے۔ جاتریوں نے انہیں یہ باور کرا رکھا تھا کہ وہ دنیا کے ہر انسان سے بڑھ کر افضل اور اعلیٰ ہیں۔ ان کی طرف میلی نظر سے دیکھنے والا دردناک عذاب کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ لیکن آج صبح جب لوگوں نے ان کے ٹکڑے فضا میں اڑتے دیکھے اور ان کے کٹے پھٹے اعضا آگ میں جلتے دیکھا تو وہ سکتے کی حالت میں رہ گئے۔ اور پھر جب یہ سکتہ ختم ہوا تو وہ خوف بھی ریزہ ریزہ ہو گیا جو جاتریوں کے حوالے سے ان کے دلوں میں موجود تھا۔ یہ تبدیلی اتنی تیزی سے اور ایسے عجیب طریقے سے آئی ہے کہ مجھ جیسے لوگ ششدر رہ گئے ہیں۔ لوگوں نے بچے کھچے جاتریوں کے ساتھ بڑا ذلت آمیز سلوک کیا ہے اور وہ منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ جازو... کے نیچے تہ خانے میں موجود پانچ بڑے جاتریوں کے عشرت کدے کو تاراج کر دیا گیا ہے اور وہاں موجود لٹی پٹی لڑکیوں کو برآمد کر لیا گیا ہے۔

شاہ جہاں! مجھے حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں۔ میں تمہارا اور تمہارے جاں نثار ساتھیوں کا احسان مند ہوں۔ تم لوگوں کے طفیل آج یہ وادی جاتریوں کے بہیمانہ طلسم سے آزاد ہو گئی ہے۔ آج پہلی بار میں نے خود کو واقعی اس وادی کا "سردار" محسوس کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وادی کے مکین ان دیکھے اور انجانے خوف سے محفوظ نظر آتے ہیں۔ یکا یک یہ تبدیلی ہے جس نے تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے کا حوصلہ دیا ہے اور میں نے صرف ایک شرط عائد کر کے تمہاری آزادی کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔

میرے اس فیصلے پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا تھا کہ تمہاری آزادی کا مطلب یہ ہو گا کہ اس وادی تک پہنچنے والے راستے اجنبی قدموں کی زد میں آ جائیں گے اور ہماری سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میں نے اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اس مسئلے کا حل یہ نکالا ہے کہ تم لوگوں کو بے ہوشی کی حالت میں اس وادی سے نکالا جائے اور ایک "محفوظ" فاصلے پر لے جا کر چھوڑا جائے۔ ہم نے دوسری احتیاط یہ کی ہے کہ تمہارے ساتھیوں میں سے کچھ افراد کو یہاں روک لیا ہے۔ ان کی تعداد بارہ ہے اور ان میں تمہارے ساتھی منصور اور جون چارلس شامل ہیں۔ وہ دونوں زخمی ہیں لیکن یہ زخم سنگین نوعیت کے نہیں۔ اگر آئندہ حالات ہماری خواہش کے مطابق ہوئے تو ہم ان بارہ افراد کو بھی جلد ہی رہا کر دیں گے۔ یہاں میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جاتریوں کے محافظوں کا تمہارے ساتھ جو آخری معرکہ ہوا تھا اس میں تمہارے آٹھ مزید ساتھی ہلاک ہو گئے تھے۔

شاہ جہاں! اب میں اس اکلوتی شرط کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے پورا ہونے پر تمہارے باقی ساتھی بھی رہا ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائیں گے اور ہمارے تمہارے درمیان کسی طرح کا تعلق واسطہ باقی نہیں رہے گا۔ شرط (جو کہ شاید تم جان ہی چکے ہو گے) یہ ہے کہ تم لوگ ہمیں ہماری اس جنم بھومی میں اسی طرح رہنے دو گے جیسے ہم اب تک رہ رہے تھے۔ تم لوگ خود ہمارا کھوج لگانے کی کوشش کرو گے نہ ہمارے بارے میں کسی کو بتاؤ گے۔ میرے خیال میں یہ کوئی انوکھی شرط نہیں ہے۔ رہا ہونے سے پہلے تم خود بھی یہ پیشکش کر چکے ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد تم ان واقعات کو یکسر بھول جاؤ گے اور تمہاری وساطت سے کبھی بھی کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ ان پہاڑوں میں ایک نامعلوم وادی کے اندر ایک بستی آباد ہے۔

میرے دوست! اس شرط کے بدلے میں بھی تم سے ایک عہد کرتا ہوں۔ بلکہ میرے خیال میں مجھے "میں" کے بجائے "ہم" کا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ یہ عہد بہت سوچ بچار اور باہمی مشورے کے بعد کیا جا رہا ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم اسے نبھائیں گے۔ وہ عہد یہ ہے کہ آئندہ اس وادی کا کوئی بھی مکین اس وادی سے نکل کر کسی طرح کی لوٹ مار نہیں کرے گا۔ نہ ہم کسی غیر ملکی کو نقصان پہنچائیں گے' نہ مقامی کو۔ اگر یہ لوگ ہماری حدود سے دور رہتے ہیں تو ہم ان سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے جو ہم نے کیا ہے۔ شاید ایک روز پہلے تک ہم کسی ایسے فیصلے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگر کوئی ایسا سوچتا تو جاتری زندہ حالت میں اس کی کھال اتار لیتے۔ وہ ان معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے لیکن اب چوں کہ جاتریوں کا تسلط یکسر ختم ہو گیا ہے لہٰذا ہم ایسے کلیدی فیصلے کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ اس لحاظ سے بھی مشکل تھا کہ وادی میں پہلے ہی قحط کے آثار موجود ہیں۔ صورت حال بہتر ہو چکی ہے لیکن ابھی اتنی بہتر نہیں ہوئی کہ ہم مکمل طور پر مقامی پیداوار پر گزارہ کر سکیں۔ پھر بھی ہم نے اپنے عہد کو نبھانے کا تہیہ کیا ہے اور دیوتاؤں نے چاہا تو ہم اپنے ارادے میں کامیاب ہوں گے۔

میرے دوست! میرا یہ خط میرے دل کی آواز ہے۔ مجھے امید ہے' تم یہ آواز سنو گے۔ میں بحیثیت سردار باہر کی دنیا سے ایک نئے تعلق کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اور یہ تعلق ہے "بے تعلقی" کا۔ نہ کوئی باہر سے ہمارے معاملات میں دخل دے' نہ آئندہ ہم کسی کے مال و جان کے لیے خطرہ بنیں گے۔ تم ہمیں ہمارے حال میں زندہ رہنے دو' ہم تم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ تم اس معاملے سے کیسے نمٹو گے اور باہر کے لوگوں کو اپنی گم شدگی کے

بارے میں کیا بتاؤ گے' یہ سب تمہاری ذمہ داری ہے۔ اور اس کے علاوہ یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے کہ تمہارے دیگر ساتھی اس فیصلے میں تمہارا ساتھ دیں۔ یقیناً یہ ایک مشکل کام ہوگا لیکن تمہاری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میں امید کرسکتا ہوں کہ تم یہ کام کر گزرو گے۔ دعا نہ کریں کہ دوسری صورت پیش آئے' اگر ایسا ہوا تو بہت نقصان ہوگا۔ ہمیں زیر کرنے والوں کو اس وادی کے چپے چپے پر اپنی لاشیں گرانا ہوں گی۔ خون کا دریا بہا کر بھی وہ شاید ہمیں مکمل طور پر فتح نہ کرسکیں گے۔ یہ بلند پہاڑ ہماری پناہ گاہیں ہیں۔ ہم ان میں مورچابند ہو جائیں تو کوئی لشکر بھی ہمیں نیچا نہیں دکھا سکتا۔

پیارے دوست! میری ان باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور فیصلہ کرنا کہ تم لوگوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس وادی میں تمہارے کئی ساتھیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے' مجھے ان کی موت کا از حد افسوس ہے۔ خاص طور سے شاہد خاں' ٹی وی اینگ اور فلم کمپنی کے جواں سال ہیرو لمان کی موت نے مجھے رنج پہنچایا ہے۔ بہرحال اندھا دھند لڑائی میں ایسے نقصانات تو ہوتے ہی ہیں۔ ہمارے محافظوں میں سے بھی کم و بیش تیس افراد مارے گئے ہیں' زخمی ہونے والے اس کے علاوہ ہیں۔

خیر سگالی کے ثبوت میں' میں تمہارا وہ اسلحہ اور دیگر سامان واپس کر رہا ہوں جو گرفتاری کے وقت تمہارے پاس تھا۔ فلم والوں کا کچھ سامان بھی واپس کیا جا رہا ہے۔ بڑی اشیا جن میں دو کیمرے اور جنریٹر وغیرہ ہیں ابھی ہمارے پاس ہیں۔ جب تمہارے باقی ماندہ بارہ ساتھی چھوڑے جائیں گے تو یہ سامان ان کے ساتھ ہوگا....

پاناسہ کی بچی زرغونہ تم لوگوں سے بہت مانوس ہو چکی ہے۔ میں اسے تمہارے ساتھ ہی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے' وہ تمہارے پاس زیادہ محفوظ اور خوش رہے گی۔ آخر میں مہاجاتری خاران کی بیٹی ناشا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تمہارے لیے بے حد نیک خواہشات رکھتی ہے۔ اب' جب کہ میں یہ خط لکھوا رہا ہوں' وہ میرے پاس ہی بیٹھی ہے۔ جارزیوں کے اس اچانک زوال پر جتنی خوشی اسے ہوئی ہے شاید کسی کو نہ ہوئی ہو۔ اس وادی کا رہن سہن تبدیل کرنے کے لیے میں جو اقدامات کرنے والا ہوں ان میں ناشا کے مفید مشورے بھی شامل ہوں گے۔

بہت زیادہ نیک تمناؤں کے ساتھ الوداع۔ تمہارا خیر خواہ اور دوست سدرت!"

یہ ایک سنسنی خیز خط تھا۔ خط پڑھنے کے بعد میں اور زریں گل کتنی ہی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ ارد گرد کی ہر شے کو اب ہم ایک نئے زاویے سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ہم اس منحوس وادی سے نکل چکے ہیں۔ مسرت کی ایک لہر رگ وپے میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ لیکن اس لہر میں ... ہلکے سے غم کی آمیزش بھی تھی۔ منور اور جون چاپل سمیت بارہ افراد ابھی وہیں پر تھے جہاں سے ہم آئے تھے۔

زریں گل بے اختیار میرے گلے سے لگ گیا اور خوشی سے رندھی ہوئی آواز میں بولا "استاد صیب! ام کو یقین نہیں آرہا کہ ام ان لعنتی پہاڑوں سے باہر آچکا ہے۔"

میں نے کہا "یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا لیکن ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ یہ علاقہ اس وادی کا ہرگز نہیں ہے۔"

"استاد صیب! آپ امارا استاد ہے' برا مت مانے گا۔ ام آپ کو شاباشی دینا چاہتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ہے' آپ کی ہمت سے ہوا۔ اگر آپ ڈر جاتا اور ان جارزیوں کو قتل نہ کرتا تو ام ہرگز وہاں سے چھوٹ نہ سکتا۔"

میں نے کہا "تم اسے عقل مندی نہیں کہہ سکتے۔ عقل مندی تو تب ہوتی جب مجھے اس کے نتیجے کا پتا ہوتا۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے بے خوفی سے کام لیا اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تقدیر کا کھیل تھا۔"

زریں نے پُرسوچ لہجے میں کہا "استاد صیب! کیا سردار سدرت حیدر صیب کو اور باقی لوگوں کو بھی چھوڑ دے گا۔"

"امید تو بہت ہے۔" میں نے کہا۔

ہم نے ایک بار پھر دھیان سے خط پڑھنا شروع کر دیا۔ خط پڑھنے کے بعد ہم اپنے ان ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے جو ابھی تک بے ہوشی اور غنودگی کے درمیان لٹک رہے تھے۔ زریں گل انہیں بیدار کرنے کی کوششیں کرنے لگا اور میں وہ سامان سمیٹنے لگا جو ہمارے ارد گرد بکھرا تھا۔ ان میں ہماری رائفلوں اور ایمونیشن کے علاوہ سائبان اور خوراک کے تین بڑے تھیلے بھی تھے۔ اس کے علاوہ یونٹ والوں کے چار "بیگ" تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ آٹھ دس گھنٹے پہلے رات کے وقت ہمیں خچروں اور گھوڑوں کے ذریعے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ ہمارے قریب ہی ایک دو جگہ کوئلے اور راکھ وغیرہ موجود تھی۔ ممکن تھا کہ یہ آگ اس لیے جلائی گئی ہو کہ ہماری بے ہوشی کے دوران میں کوئی جنگلی جانور ہم سے "چھیڑ خانی" نہ فرمائے۔ اس کے علاوہ یہ آگ ہمیں حرارت بھی فراہم کرتی رہی تھی۔

شروع میں ہم بالکل سمجھ نہیں پائے تھے کہ یہ کون سا وقت ہے۔ شام ہو رہی ہے یا دن نکل رہا ہے لیکن اب حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ سورج اب افق سے اٹھ کر کافی بلندی پر آگیا تھا بلکہ نصف النہار کے قریب پہنچنے والا تھا۔ قرب وجوار بالکل سنسان اور خاموش تھے۔ ایک دو کے سوا ہمارے قریباً تمام ساتھی اب بیدار ہو چکے تھے اور اپنے اپنے ڈھب کے سوالات پوچھ چکے تھے۔ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات ملنے کے باوجود ان کی آنکھوں میں حیرتوں کے سائے تھے۔ زرغونہ خاص طور سے بہت ڈری سہمی تھی اور مسلسل میری بانہوں میں سمٹی ہوئی تھی۔ جون چاپل کی غیر موجودگی نینگ کو مسلسل آنسو بہانے پر مجبور کر رہی تھی۔ فلم اسٹار روشنی اپنے ہیرو لمان اور تین ایکسٹراؤں کی موت

پر سوگوار تھی۔ اس طرح تین چار کے سوا ہر شخص کسی نہ کسی رنج سے ملول نظر آرہا تھا۔ ان کے چہرے ویران اور آنکھیں خواب ناک تھیں۔ کچھ افراد کو متلی بھی ہو رہی تھی۔ میں بھی زخمی اور غم زدہ تھا لیکن میرے کندھوں پر بھاری ذمے داری آن پڑی تھی۔ میں نے پہلے خود کو مجتمع کیا پھر اپنے ساتھیوں کو کمپوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ خوش خبری بہرحال اپنی جگہ موجود تھی کہ ہم اس وادیٔ موت سے زندہ سلامت یہاں پہنچ چکے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب ہم کس سمت میں سفر کریں۔ جب کوشش بسیار کے بعد بھی سمت کا انتخاب نہ ہوسکا تو اس جانب چل پڑے جدھر سبزہ زیادہ اور پہاڑیاں کم بلند تھیں۔ دو گھنٹے کی مسلسل جادہ پیمائی کے بعد بھی ہمیں کہیں کوئی متنفس نظر آیا اور نہ آبادی کا نشان ملا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے اردگرد ویران پہاڑوں' خزاں رسیدہ درختوں اور ایک چکردار نالے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہ نالا کچھ دیر کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا پھر کسی موڑ پر اچانک ہی سامنے آجاتا۔ نالے کی ہر دم بڑھتی ہوئی چوڑائی ہمیں احساس دلا رہی تھی کہ ہم بلندی سے نشیب کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ نشیب کا سب سے بڑا ثبوت پانی کا بہاؤ تھا۔

سہ پہر سے ذرا پہلے ہمیں ایک مقام پر پگڈنڈی سی نظر آئی۔ یہ پگڈنڈی انسانی زندگی کی علامت تھی اور ہمارے لیے امید کی لکیر تھی۔ ہم ایک نئے ولولے سے اس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تھوڑا آگے جاکر اس پگڈنڈی پر کسی باربردار جانور کا نقش بھی نظر آنے لگا۔ ہمیں امید ہو گئی کہ بہت جلد ہم کوئی انسانی چہرہ دیکھ سکیں گے اور پھر یہ امید بر آئی۔ سب سے پہلے میں نے ہی کسی انجن کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ کوئی جیپ نما گاڑی تھی۔ آواز سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ جیپ ہماری طرف آرہی ہے یا دور جا رہی ہے۔ زریں کا خیال تھا کہ جیپ والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ہم ہوائی فائر کریں لیکن میں نے یہ خیال رد کر دیا۔ فائرنگ سے فائدے کے بجائے نقصان ہوسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ جیپ والے چونک جاتے اور ہماری جھلک دیکھتے ہی نو دو گیارہ ہو جاتے۔ ہم نے ایک ڈھلوان تیزی سے طے کی اور بلندی پر آگئے۔ اسے خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے کہ جوں ہی ہم بلندی پر پہنچے' ہمیں جیپ نظر آگئی۔ وہ نشیب میں قریباً ایک میل کی دوری پر تھی اور کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جیپ کے ساتھ ایک اسٹیشن ویگن بھی تھی۔ دونوں گاڑیوں کی سرخ چھتیں ڈھلتے سورج کی دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ گاڑیاں جنوب سے شمال کی طرف سست روی سے حرکت کر رہی تھیں۔ ہم مشرق سے مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ اگر ہم اپنی اپنی سمت میں بڑھتے رہتے تو بہت جلد ایک دوسرے کے نزدیک پہنچ جاتے۔

میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ زریں کو چلنے میں سخت دشواری ہو رہی تھی لیکن وہ خود پر جبر کیے ہوئے تھا۔ فلم اسٹار روشنی کا پاؤں بھی زخمی تھا۔ اسے ایک ایکسٹرا اداکار نے جو "ذوقِ رشوق" سے سہارا دے رکھا تھا اور غالباً اپنی "قسمت" پر ناز بھی کر رہا تھا۔ روشنی کا لچکیلی شاخ جیسا بدن ایکسٹرا اداکار کے کندھے پر قریباً لدا ہوا تھا۔

قریباً دس منٹ میں ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ہمارا فاصلہ گاڑیوں سے بہت کم رہ گیا۔ اب اگر ہم مزید انتظار کرتے تو فاصلہ پھر سے بڑھنا شروع ہو جاتا۔ یہ ایسا فاصلہ تھا کہ ہم آوازیں دے کر اور ہاتھ ہلا کر گاڑی سواروں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتے تھے۔ ہم سب نے بیک وقت چیخنا اور ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ ہماری تدبیر کارگر رہی۔ اندازہ ہوا کہ دونوں گاڑیاں رک گئی ہیں۔ پھر ان کے دروازے کھلے اور کچھ افراد باہر نکل آئے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم ایک بار پھر تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ چار پانچ منٹ بعد ہم گاڑی سواروں کو بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہوگئے۔ وہ اپنے لباس اور ڈیل ڈول سے پٹھان یا قبائلی نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص خاصا ارنچا لمبا اور دبنگ دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً وہ لوگ بھی اب ہمیں بہتر طور پر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے اپنی رائفلیں چھپائی تھیں۔ ہمارے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عورتوں کی موجودگی ہمارے حق میں بہتر تھی۔ ہم ایک ٹیلی کی طرح نظر آرہے تھے اور جرائم پیشہ ہونے کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فلم اسٹار روشنی کی خاطر' روشنی کے سلسلے میں بے حد محتاط اور چوکس تھی۔ اس نے ایک ایکسٹرا گرل کی میلی کچیلی چادر روشنی کے سر پر ڈال دی تھی اور روشنی نے خود کو اس چادر میں چھپا لیا تھا۔ یہ احتیاط وقت کا تقاضا تھی۔ معلوم نہیں' ہمارا پالا کیسے لوگوں سے پڑنے والا تھا اور ان کی تعداد کیا تھی۔ ایسے موقعوں پر ضرورت سے زیادہ خوب صورت عورت اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی مصیبت بن جاتی ہے.... میں نے سب لوگوں کو سمجھایا کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں گے۔ جو بات چیت بھی کرنا ہوگی صرف ایک آدمی کرے گا اور باقی سب اس کی تائید کریں گے۔

گاڑیوں سے نکلنے والے افراد ہمارے پاس آگئے۔ ان میں سب سے آگے ایک چوہدری نما شخص تھا۔ اس کا جسم درمیانہ لیکن قد غیر معمولی طور پر لمبا تھا۔ ساڑھے چھ پونے سات فٹ سے کم کیا ہوگا وہ۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ طویل قامت جنگلی یاد آگیا جس کا نام "کالام" تھا اور جس نے وادی میں ہمیں آخری بار خریدا تھا۔ لمبے چوہدری کی عمر اندازاً چالیس سال تھی۔ کنپٹیوں پر چند بال سفید بھی نظر آرہے تھے۔ اس نے سفید پاپلین کی کلف لگی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ قمیص کے اوپر نہایت قیمتی سرخ واسکٹ تھی۔ کندھوں پر گرم چادر تھی اس کا رنگ بھی سرخ تھا۔ اس کے ساتھ اسی ٹائپ کے دو افراد اور تھے۔ ایک گن مین لینڈ کروزر جیپ کے قریب کھڑا تھا اور عقابی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا

تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ اسٹیشن ویگن کے اندر بھی پانچ چھ افراد موجود ہیں۔ یہ سولہ نشستوں والی "سپر کسٹم زیرو" تھی۔ ایسی گاڑی میں تھوڑی سی دقت کے ساتھ اٹھارہ بیس افراد بٹھائے جاسکتے ہیں۔ اسٹیشن ویگن میں بیٹھے افراد کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ سب سیرو تفریح کے لیے نکلے ہوئے بے فکرے لوگ ہیں۔ ان کا تعلق شمالی پنجاب کے کسی دیہی علاقے سے تھا۔ بہرحال ایک دو بندے ایسے بھی تھے جو حلیے اور لباس سے شہری نظر آتے تھے۔ اسٹیشن ویگن کے اندر بلند آواز میں میوزک بج رہا تھا۔

لمبے قد کا شخص ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیز نگاہ ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس کی نگاہ میرے چہرے پر جم گئی۔ غالباً وہ جان گیا تھا کہ میں بھی اس کی طرح پنجابی ہوں۔ اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولا "ہاں بھئی کون لوگ ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "ہماری کہانی بڑی دردناک ہے چوہدری صاحب! یوں سمجھ لیں کہ موت کے منہ سے نکل کر یہاں تک آئے ہیں۔"

"کہیں ڈاکو شاکو تو نہیں پڑ گئے تھے؟" وہ ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بولا۔

"کچھ اس سے ملتی جلتی بات ہی ہوئی ہے جی!" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ تفصیل جاننا چاہے گا لیکن وہ ایک دم لاتعلق نظر آنے لگا "ہم سے کیا چاہتے ہو؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"ہمیں آپ کی مدد درکار ہے جی۔۔۔ اگر آپ ہمیں کسی نزدیکی آبادی تک لفٹ دے سکیں تو۔۔۔" میں نے بات جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔

"سوری بھائی! لفٹ تو ہم نہیں دے سکتے۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ۔" اس نے تلخ سا جواب دیا۔

اسی دوران میں اس کا ایک اور چوڑا چکلا ساتھی اسٹیشن ویگن کی کھڑکی سے جھانکنے لگا تھا۔ اس ادھیڑ عمر شخص کے کندھے پر ہولسٹر دکھائی دے رہا تھا۔ لمبے آدمی کی طرح وہ بھی تو مند بیزار اور آتش مزاج نظر آتا تھا۔ مجھے سرتاپا گھور کر طنز سے بولا "یار تم سارے تندرست بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے دو دو ٹانگیں دے رکھی ہیں۔ تھوڑا سا پیدل چل لو۔ آبادی زیادہ دور نہیں ہے۔۔۔ بس پانچ چھ میل ہی چلنا پڑے گا۔" پھر وہ لمبے آدمی سے مخاطب ہو کر بولا "آؤ یار بخت آور! کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ بیٹھو گاڑی میں۔"

لمبے شخص نے جس کا نام بخت آور لیا گیا تھا ایک بار پھر ہم سب کو شک آمیز نگاہوں سے گھورا۔ بے پروائی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس گاڑی کے پچھلے حصے میں مجھے ایک شکار شدہ جانور بھی نظر آیا۔ وہ بکرے سے ملتا جلتا تھا۔۔۔ زریں گل نے آگے بڑھ کر التجائیہ لہجے میں کہا "خوام آپ کا مسلمان بھائی ہے چوہدری صیب! ام زخمی ہے اور امارے ساتھ عورتیں بھی ہے۔ ان پہاڑوں میں رات ہو گیا تو ام کو بڑا مشکل پیش آئے گا۔ آپ کا بڑا مہربانی اگر تھوڑا سا مہربانی فرما دیں۔ آپ کی دونوں گاڑیوں میں اتنا گنجائش ہے کہ ام سب سما کر بیٹھ سکتا ہے۔"

لمبے شخص یعنی چوہدری بخت آور نے اپنی اندرونی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "میں نے کہا ہے نا خان! ہم لفٹ نہیں دے سکتے۔ راستہ خراب ہے، کوئی گاڑی جواب دے گئی تو تمہارے ساتھ ہم بھی یہیں رہ جائیں گے۔"

"لیکن اگر آپ۔۔۔" زریں گل کی بات ادھوری رہ گئی کیوں کہ جیپ کا آٹومیٹک شیشہ بند ہو گیا تھا۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ لوگ ہم "خستہ حالوں" کو اپنی صاف ستھری گاڑیوں میں لفٹ دے کر خواہ مخواہ کی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک طرح سے ان کی دانش مندی ہی تھی لیکن یہ دانش مندی ہماری مصیبت میں اضافہ کر رہی تھی۔ ابھی میں اپنے ردعمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ آخری کوشش کے طور پر روشنی آگے بڑھی۔ اس نے بڑی شائستگی کے ساتھ جیپ والے سے لفٹ کی درخواست کی۔

روشنی کو دیکھ کر دراز قد بخت آور کا تنا ہوا چہرہ ایک دم نرم پڑ گیا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرایا اور دبی دبی حیرت سے روشنی کو دیکھنے لگا۔ اس کا گن مین بھی ایک دم حیران نظر آنے لگا تھا۔ اس حیرانی میں شناسائی کی جھلک بھی موجود تھی۔ بخت آور نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں روشنی کو مخاطب کیا "آپ۔۔۔ آپ فلم ایکٹریس روشنی ہیں؟"

"اتفاق سے میرا جواب "ہاں" میں ہے۔" روشنی کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ کھیلی۔

"اوہ!" بخت آور کے ہونٹ تعجب سے سکڑ گئے۔

اس نے انجن بند کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اسٹیشن ویگن کے دروازے بھی یکے بعد دیگرے کھلنے لگے۔

"ہم آپ کو یہاں دیکھ کر حیران ہو گئے ہیں۔" بخت آور نے شائستگی سے کہا "آپ تو نامی مشہور فلم اسٹار ہیں۔ آپ یہاں کیسے؟"

"فلم اسٹاروں کے ساتھ ہی تو ایسا کچھ ہوتا ہے۔" روشنی نے جواب دیا۔

"اوہ' میرا خیال ہے کہ آپ کسی فلم کی شوٹنگ پر نکلی ہوئی ہیں۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"لیکن آپ کے کپڑے وغیرہ؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جی! کسی ٹھکانے پر پہنچ جائیں تو پھر آپ کو بتاتے ہیں۔" روشنی نے جواب دیا۔

گھنی مونچھوں والا ایک شخص پنجابی لہجے میں بولا "لگتا ہے کہ

آپ لوگوں کے ساتھ بھی کوئی فلمی پارٹ ہو گیا ہے۔ آپ میں دو تین بندے زخمی بھی نظر آ رہے ہیں۔"

"میں تو خود زخمی ہوں جی!" روشنی نے پارس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

روشنی کا زخمی پارس دیکھ کر ہمارے کرم فرماؤں کی "ہمدردی" پوری شدت سے جاگ اٹھی۔ بخت آور نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی اور روشنی سے مخاطب ہو کر بولا "آپ یہاں بیٹھ جائیں جی!" اس نے جیپ کا ایک دروازہ روشنی کے لیے کھول دیا تھا۔

"نہیں' میں یہاں ٹھیک ہوں۔" روشنی نے ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟" ایک شخص بولا۔

روشنی کی سوالیہ نظر میری طرف اٹھی۔ وہ جیسے پوچھ رہی تھی کہ اب کیا جواب دیا جائے۔ میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ اب جواب دیے بغیر چارہ نہیں۔ اگر ہم ان لوگوں سے لفٹ لینا چاہتے تھے تو پھر کچھ نہ کچھ بتانا ضروری تھا۔ بہتر تھا کہ ہم وہی کچھ بتاتے جو یہ لوگ ہم سے سننے کی توقع کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم سب ایک فلمی یونٹ کے ارکان ہیں اور کسی افتاد کا شکار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ اگر ان کے اس اندازے کی تصدیق ہو جاتی تو وہ مطمئن ہو جاتے اور ہمارا بھی کوئی نقصان نہ ہوتا۔ میں نے اب تک اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کر لیا تھا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ میں نے یہی "نیم سچا خاکہ" ان لوگوں کو سنا دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا، زریں اور ذیشان کا تعلق فلمی یونٹ سے نہیں۔ ہم لوگ گلگت کے نواحی علاقے میں کیمپنگ کر رہے تھے۔ ادھر رات کے وقت کچھ نامعلوم مقامی لوگوں نے ہم پر حملہ کیا اور پکڑ کر ساتھ لے گئے۔ اسی دوران میں فلمی یونٹ والوں پر بھی حملہ کیا گیا اور انہیں بھی مارپیٹ کر اغوا کر لیا گیا۔ ان حملہ آوروں نے جو اپنے وطن سے تو کل نظر آتے تھے' ہمیں دو دن اپنے ڈیرے پر رکھا۔ مردوں کو مارا پیٹا گیا اور عورتوں کو ہراساں کیا گیا۔ کل شام ہمیں اغوا کرنے والے آپس میں ہی لڑ پڑے۔ ان میں کسی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں سے ایک گروہ ہمیں چھوڑ دینا چاہتا ہے اور دوسرا مخالفت کر رہا ہے۔ کل رات ہمیں کھانے میں کوئی تیز خواب آور دوا کھلا دی گئی۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلا کہ ہم کہاں اور کس حال میں ہیں۔ آج صبح ہم نے خود کو یہاں سے چودہ میل دور ویران پہاڑیوں میں پایا۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس طرف جائیں گے تو آبادی تک پہنچیں گے۔ بس ہم ظن و اندازے سے چل پڑے اور یہاں پہنچ گئے۔

میں نے یہ روداد مناسب طریقے سے بیان کی تھی اور میرے بیان کے دوران میں روشنی گاہے گاہے میری تائید کرتی رہی تھی۔ ہم سے چند ایک سوالات پوچھنے کے بعد چوہدری بخت اور اس کے ساتھی مطمئن نظر آنے لگے۔ کم از کم اس حد تک ضرور مطمئن نظر آنے لگے کہ ہمیں لفٹ دے سکیں۔ ہم نے انہیں اپنی واقفوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ دراندلیں ہم لاہور سے ساتھ لے کر چلے تھے۔ ہمارے حلیے اور ہماری سرخ آنکھیں اور ہمارے زخم اس طویل بیان کی تصدیق کر رہے تھے جو میں نے دیا تھا۔

تمام گاڑی سوار افراد روشنی کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں روشنی کے لیے دبی دبی دلچسپی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ خاص طور سے چوہدری بخت روشنی کی شخصیت اور حسن سے مرعوب نظر آتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک طرف جا کر کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کھسر پھسر کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔ روشنی کی موجودگی نے ان لوگوں کے پتھر دلوں کو موم بلکہ پانی کر دیا تھا۔

تبادلۂ خیال کے بعد چوہدری بخت آور ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "آپ فن کار لوگ ہیں اور ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ آپ کی قدر نہ کریں۔ خاص طور سے روشنی صاحبہ کے تو ہم پرستار ہیں۔ میں بہت کم فلمیں دیکھتا ہوں لیکن اتفاق سے ان کی پہلی فلم میں نے بھی دیکھی ہے اور پسند کی ہے۔ آپ سب لوگوں کی مدد کر کے ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔ گاڑیوں میں جگہ کم ہے۔ چار پانچ بندوں کو اسٹیشن ویگن کی چھت پر بیٹھنا پڑے گا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ہم پکی سڑک تک پہنچ ہی جائیں گے۔"

روشنی نے کہا "آپ کا بے حد شکریہ چوہدری صاحب! آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔"

میں نے پوچھا "ویسے چوہدری صاحب! ہم اس وقت ہیں کس جگہ؟"

چوہدری بخت آور بولا "بیسال کا نام سنا ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کان کھجا کر بولا "براوائی کے بارے میں جانتے ہو؟"

یہ نام میں نے کہیں سنا ہوا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو کچھ کچھ یاد آگیا۔ میں نے کہا "یہ جگہ تو شاید "ناران" کے آس پاس ہے۔"

وہ بولا "بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے۔ ہم بھی اس وقت ناران کے آس پاس ہیں۔ یہاں سے چالیس پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے ناران۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ہم کہاں سے کہاں آپہنچے تھے۔ نانگا پربت کی جان لیوا بلندیوں سے چل کر ہم اپنے جانے پہچانے علاقوں سے قریب تر آ گئے تھے۔

روشنی اور زریں گل وغیرہ کے لیے بھی ناران اور وادی کاغان کوئی اجنبی جگہ نہیں تھی۔ میری طرح وہ بھی حیرت زدہ نظر آنے لگے تھے۔ چوہدری بخت نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "وہ شکار شدہ جانور جو تم نے ویگن میں دیکھا ہے' برفانی بکرا (SNOW IBEX) کہلاتا ہے۔ ہم اسی کی تلاش میں بیسال کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں قریب ہی ایک جھیل بھی ہے۔ سنا تھا کہ وہاں

ٹراؤٹ مچھلی پائی جاتی ہے۔ ہم دو دن وہاں مچھلی کے ناکام شکار میں مصروف رہنے کے بعد آج ہی لوٹے ہیں۔"

چوہدری بخت جو تفصیلات بتا رہا تھا ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا ذہن تو اپنی حیران کن واپسی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ وادیٔ موت جہاں ہم اب تک گرفتار رہے یہاں سے کم و بیش ساٹھ ستر میل کی دوری پر تھی۔ ہم نے یہ دشوار فاصلہ مکمل بے خبری کی حالت میں طے کیا تھا اور ہمیں یہ فاصلہ طے کرانے والے اپنا کام کر کے خاموشی سے واپس سدھار گئے تھے' انہی فلک بوس پہاڑوں کے درمیان جہاں سمتیں اوجھل اور راستے ناپید ہو جاتے تھے۔

ہمیں چوہدری بخت آور کی گاڑیوں میں لفٹ مل گئی۔ روشنی' اس کی خالہ اور میں چوہدری بخت آور کے ساتھ اس کی وسیع و عریض جیپ میں بیٹھے۔ ہمارے علاوہ زریں گل' کیمرا مین رضوی اور دو مزید افراد جیپ میں گھس گئے۔ باقی افراد اسٹیشن ویگن میں ٹھونس دیے گئے۔ تین افراد کو چھت پر بھی بیٹھنا پڑا۔ چھت پر کیریئر فکس کیا گیا تھا۔ اس کیریئر پر خیمے' رسیاں' بستر اور کیمپنگ کا دیگر سامان لدا ہوا تھا۔ اونچے نیچے پتھریلے راستے پر سست روی سے ہمارا سفر شروع ہوا۔ گاڑی کو لگنے والے ہر جھٹکے کے ساتھ زریں گل کے ہونٹوں سے آہ نکل جاتی تھی۔ روشنی بھی گاہے گاہے اپنے زخمی پاؤں کی وجہ سے سسکاری بھرتی تھی۔ وہ جیپ میں پھیلے ہوئے دھوئیں کی وجہ سے بھی بیزار تھی...... یہ دھواں ایک گڑگڑی (چھوٹے حقے) کا تھا۔ گڑگڑی پینے والا ہٹا کٹا پٹھان جیپ کی سب سے پچھلی نشست پر پھیل کر بیٹھا تھا اور ہر چیز سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ روشنی کے خیرہ کن حسن سے بھی۔

راستے میں روشنی چوہدری بخت سے گفتگو بھی کرتی رہی۔ موجودہ صورت حال میں روشنی کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور ہم سب لوگ پس منظر میں چلے گئے تھے۔ چوہدری کے ساتھ روشنی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا تعلق ضلع سیالکوٹ سے ہے۔ پسرور کے ایک گاؤں "ترنگ والی" کے قریب چوہدری بخت کی بہت سی زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے مربعے اس نے "لیز" پر بھی لے رکھے تھے۔ زمینوں کی آمدن کے علاوہ وہ اپنے علاقے میں ایک فیکٹری بھی چلا رہا تھا۔ یہاں فٹ بال کا خام مال تیار کرنے اور جوڑنے کا کام ہوتا تھا۔ مقامی لوگ ہر روز ہزاروں کی تعداد میں فٹ بال جوڑتے تھے اور چوہدری بخت آور کے بینک بیلنس میں اضافہ کرتے تھے۔ علاقے میں چوہدری کی حویلی مشہور ترین تھی۔ اسے لال کوٹھی کہا جاتا تھا۔ لال کوٹھی کی تاریخ بڑی پرانی تھی۔ کسی وقت یہاں سیر و شکار کے لیے آنے والے انگریز افسران ٹھہرا کرتے تھے۔ اب یہ "دیسی انگریزوں" کے استعمال میں تھی۔ چوہدری بخت کے معزز دوست اور ہم نوالہ و ہم پیالہ یہاں قیام کرتے تھے۔ چوہدری بخت ماضی میں ایم پی اے رہ چکا تھا' اب ایک بار پھر الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پچھلی جمعرات کو وہ اور اس کے چند دوست شکار کے لیے سیالکوٹ سے روانہ ہوئے تھے۔ یہاں بالاکوٹ میں چوہدری بخت کا ایک مقامی دوست ملک گل ریز خان رہتا تھا (یہ وہی چوڑا چکلا پٹھان تھا جو لینڈ کروزر میں بیٹھ کر بڑے طنطنے سے گڑگڑی پی رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ شخص گونگا تھا) موجودہ "شکاری مہم" کا سارا انتظام اسی ملک گل ریز نے کیا تھا۔ ساتھ میں اس کا بھائی بھی شامل تھا۔ یہ لوگ یہاں چھ سات روز سے مسلسل شکار کھیل رہے تھے۔ دو روز پہلے ملک گلریز خان کے بھائی کو پیٹ میں درد کی شکایت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بالاکوٹ واپس چلا گیا تھا۔ اب اپنا ٹور مکمل کر کے یہ لوگ بھی واپس جا رہے تھے۔ میں نے ٹوہ لینے کی کوشش کی اور مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کو جیسلاس اور کیپال وغیرہ کے حالات کے بارے میں واجبی سی معلومات حاصل ہیں۔ انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ کوئی کوہ پیما ٹیم وہاں لاپتا ہو گئی ہے اور اس کی تلاش بڑی سرگرمی کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹیم کس ملک سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ فلمی یونٹ کی گمشدگی کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم "جیپ ٹریک" تک پہنچ گئے۔ یہ ٹریک نہایت خستہ حالت میں تھا۔ جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں راستہ بالکل ناپید تھا۔ سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ چوہدری بخت اور اس کے دوست ملک گلریز کی کوشش تھی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے یہ مختصر قافلہ ہموار راستے پر پہنچ جائے۔ وہ برساتی نالا جو شروع میں ہمارے ساتھ تھا' اب بھی کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا جاتا تھا۔ اس دوران میں ہمیں ایک ہیلی کاپٹر بھی نظر آیا۔ وہ دور جنوبی پہاڑیوں پر نیچی پرواز کر رہا تھا۔ اس کی پھٹ پھٹ ہوا کے دوش پر تیرتی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ بے اختیار میں نے سوچا' کیا پتا اس ہیلی کاپٹر کا تعلق کسی نہ کسی طور ہماری تلاش سے ہی ہو۔

تیز خواب آور دوا کے اثر سے ہمارے کئی ساتھیوں کے دل ابھی تک متلا رہے تھے' ان میں زریں بھی شامل تھا۔ بار بار وہ اپنے دانت کچکچاتا تھا اور ابکائی روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ ملک گلریز نے زریں کو ایک "مشروم" جیسی چیز کھانے کے لیے دی اور اشاروں کنایوں میں بتایا کہ یہ اس کے ہاضمے کے لیے بہت مفید ثابت ہو گی۔ زریں گل کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جب سے اس نے وادی میں نامعلوم جنگلی پھل کھایا تھا' اسے ہر جڑی بوٹی سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جنگلی پھل کی وجہ سے اس کے دماغ پر برا اثر پڑا ہے۔ یادداشت ختم ہو گئی ہے اور ہر وقت الا بلا خیالات آتے رہتے ہیں۔

اب گہری شام گرد و پیش کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی' جب ہم کاغان کے جانے پہچانے علاقے میں داخل ہوئے۔ ہمارا پروگرام یہی تھا کہ صرف کاغان تک لفٹ لیں گے۔ وہاں کسی ہوٹل یا گھر میں قیام کریں گے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچیں گے لیکن کاغان میں داخل ہوتے ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ہمیں مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک جگہ ہمیں سبز پلیٹ والی ٹویوٹا گاڑی نظر آئی اور سرحد پولیس کے مسلح نوجوانوں نے ہمیں روک لیا۔ تین چار دوسری گاڑیاں بھی یہاں رکی ہوئی تھیں۔ بڑی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ درحقیقت ہم ابھی آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہوئے تھے۔ ہم اپنے علاقے میں اور اپنے لوگوں میں پہنچ چکے تھے لیکن ابھی ہمیں وہی کرنا تھا جو سیکڑوں میل دور نامعلوم پہاڑوں میں بیٹھا ہوا سردار سدورت چاہتا تھا اور اس کے ساتھی چاہتے تھے۔ ابھی ہماری شہ رگ ان کے قبضے میں تھی۔ ہمارے ساتھی ان کی تحویل میں تھے اور وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ سردار سدورت کی خواہش تھی کہ ہم اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو سربستہ راز کی طرح اپنے سینے میں دفن کر لیں۔ کسی کو کچھ نہ بتائیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ لیکن اگر ہم سرکاری اہلکاروں تک پہنچ جاتے اور ان لوگوں تک پہنچ جاتے جو ہماری تلاش میں رات دن ایک کیے ہوئے تھے تو پھر ان واقعات کو راز رکھنا ممکن نہ رہتا۔ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ بتانا پڑتا اور پھر جب قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں باخبر ہو جاتیں تو وہ اپنی مرضی سے حرکت کرتیں۔ ہم یہ کہہ کر انہیں کبھی نہ روک سکتے کہ ان کی کارروائیوں سے ہمارے بارہ ساتھیوں کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ جب پولیس والوں کے اشارے پر میں نے جیپ کو رکتے دیکھا تو میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ صورتِ حال نازک تھی۔ کوئی اور نہ بھی پہچانا جاتا تو ٹینگ پہچانی جا سکتی تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ اس کے علاوہ سری لنکن افراد کو بھی غیر ملکیوں کے طور پر پہچانا جا سکتا تھا۔ زریں گل کا زخم اور روشنی کی چکا چوند کرنے والی خوب صورتی بھی "چیک پوسٹ" کے اہلکاروں کو شبے میں ڈال سکتی تھی۔ سب سے اہم چیز وہ بلا لائسنس رائفلیں تھیں جو ہم ساتھ لیے پھر رہے تھے۔ ان رائفلوں کے ساتھ ڈیڑھ دو سو راؤنڈ بھی موجود تھے۔ جیپ اور اسٹیشن ویگن کی تلاشی ہوتی تو ہم ضرور دھر لیے جاتے۔

تلوار مار کا موچھوں والے ایک سخت گیر اہلکار نے سلام کے بعد جیپ میں جھانکا اور سرد لہجے میں بولا "مہربانی فرما کر گاڑی سے نیچے آ جائیں جی! تلاشی ہو گی۔"

"تلاشی کس بات کی؟" چوہدری بخت نے بارعب لہجے میں پوچھا۔

"اوپر سے سخت آرڈر ہیں جی!" اہلکار نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

وہ گن مین دونوں طرف چوکس کھڑے ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں تلوار مار کا موچھوں والے اہلکار کی نگاہ پچھلی نشست پر گڑگڑی پیتے ملک گلریز خان پر پڑ گئی۔ وہ ایک دم مودب نظر آنے لگا۔ اس کا ہاتھ خود بخود سلام کے لیے ماتھے پر پہنچ گیا تھا۔

"اوہو ملک صاحب ہیں۔" اس نے دانت نکال کر کہا "بڑی معافی چاہتا ہوں جی! دراصل...... آپ کو تو پتا ہی ہے۔ جب سے ایجنسی (گلگت) میں لوگ گم ہوئے ہیں' بڑی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ ویری سوری جناب! بہت معذرت۔" ملک گلریز نے اپنا ہلکا سا سر اثبات میں ہلایا۔ اہلکار نے کھڑکی سے چہرہ ہٹانے کے بعد باقاعدہ سلیوٹ کیا۔ چوہدری بخت کے ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسٹیشن ویگن بھی بلا روک ٹوک نکل آئی۔

چوہدری بخت نے تلوار مار کا موچھوں والے اہلکار سمیت پوری انتظامیہ کو ایک سیر حاصل گالی دی...!

آخری الفاظ ادا کر کے اس نے تائیدی نظروں سے روشنی کی طرف دیکھا۔ چوہدری کی گالم گلوچ نے روشنی کو بدمزہ کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی ناگواری دیکھ کر چوہدری کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی موجودگی میں نہایت بدصورت گالی دے چکا ہے۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور توجہ ہٹانے کے لیے گاڑی کے ڈیک میں نئی کیسٹ ٹھونسنے لگا۔ عالم لوہار کی خوب صورت آواز گاڑی میں گونجنے لگی "ولا میریا کے دے نال پیار نہ کریں۔"

چوہدری بخت کے پاس پنجابی گانوں کی اچھی کولیکشن تھی۔ اس سلسلے میں وہ کسی حد تک باذوق نظر آتا تھا مگر روشنی اور زریں گل سمیت ہم سب کے ذہن فی الوقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اچھے گانوں سے لطف اندوز ہو سکتے۔ اس ناکے سے گزرنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ اچھی طرح ہو گیا تھا کہ ہم آسانی سے نقل و حرکت نہیں کر سکیں گے۔ ہماری تلاش ناگا پربت کے آس پاس ہی نہیں' پورے علاقے میں ہو رہی تھی۔ اب مجھے اپنا یہ خیال زیادہ وزنی محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید "بیسال" کے قریب جو ہیلی کاپٹر ہم نے دیکھا تھا وہ ہماری ہی تلاش میں ویران پہاڑوں میں بھٹک رہا تھا۔

راستے میں چوہدری بخت ہمیں ایک سے زائد بار یہ پیشکش کر چکا تھا کہ ہم اگر لاہور جانا چاہتے ہیں تو گوجرانوالہ تک اس کے ساتھ ہی سفر کریں۔ بلکہ وہ تو ہمیں لاہور لے جانے کو بھی تیار تھا۔ ناکے سے گزرنے کے بعد میں نے اس کی پیشکش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

چوہدری بخت نے جیسے میرے دماغ میں رینگنے والا خیال پڑھ

ایم اے راحت کے قلم سے
پرواز
ایک محبِ وطن کی انوکھی اور عجیب داستان۔ جو نہ جانے کیا کیا خواب لیکر اپنے وطن آیا مگر؟
قیمت -/50
ڈاک خرچ -/20

کیا بولا "میں تم لوگوں سے زبردستی نہیں کر سکتا' صرف مشورہ ہی دے سکتا ہوں اور میرا مشورہ یہی ہے کہ سیدھے لاہور چلو۔ جو بھی قانونی اور غیر قانونی کارروائی کرنی ہے' وہیں جا کر کرو۔ یہاں رکو گے تو پھر کسی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔" پھر روشنی سے مخاطب ہو کر ملائم لہجے میں بولا "روشنی صاحبہ! اندازاً کتنا نقصان ہوا ہے آپ کا؟"

وہ بولی "دو بڑے کیمرے تھے' جنریٹر تھا' شوٹنگ کا تقریباً سارا سامان تھا' اس کے علاوہ ہمارے ذاتی استعمال کی چیزیں تھیں۔ میرے خیال میں ڈیڑھ دو لاکھ سے کم کیا گیا ہو گا۔"

چودھری بولا "بس خدا کا شکر ادا کرو جی! جان بچ گئی ہے۔ مال تو آنی جانی چیز ہے۔ ویسے بھی آپ جیسے ہنرمند لوگوں کے لیے یہ کوئی بڑا نقصان نہیں۔ اللہ پورا کرے گا۔ ذرا سوچو جی' اگر وہ لوگ تاوان وغیرہ مانگ لیتے یا خدا نخواستہ اُدھر یار لوگ پار لے جاتے آپ کو تو کیا ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں' جو کچھ ہو گیا اس پر مٹی ڈالیں۔ قانونی فرض پورا کرنے کے لیے بس رپورٹ لکھوا دیں لاہور جا کر۔ اللہ اللہ خیر سلا۔" چودھری کو ہم نے اپنے پیچھے رہ جانے والے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

O☆O

وہ رات ہم نے بالا کوٹ میں ملک گلریز خان کے وسیع و عریض مکان میں گزاری۔ مکان کے صحن میں لمبی لمبی کیاریاں تھیں اور ان میں بے تحاشا پودینہ اگا ہوا تھا۔ ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ جتنا بڑا یہ مکان تھا اتنا ہی بڑا یہاں کا دستر خوان تھا۔ بہت دنوں بعد زریں گل کو بھی دل اور معدے کی حسرت نکالنے کا موقع ملا۔ خاص طور سے شکار شدہ (SNOW IBEX) کا تلا ہوا گوشت اسے بہت پسند آیا۔ اس کے دل میں کلثوم کا غم ابھی تازہ تھا اور غم کی حالت میں اس کی بھوک چار گنا بڑھ جاتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اپنے بڑے بھائی کی وفات پر وہ سٹریلیاؤں کی تومی دیگ ڈکار گیا تھا اور دور دراز سے افسوس کے لیے آنے والوں کو بھوکے پیٹ واپس جانا پڑا تھا۔ اس روز مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی ایسا ہوا ہو گا۔

ملک گلریز کے مکان میں ہمیں مرہم پٹی کی بڑی مناسب سہولت میسر آ گئی۔ جن ساتھیوں پر ابھی غنودگی طاری اور حسّی وغیرہ کی شکایت تھی انہیں بھی نرست منہ دی گئی۔ ذرغونہ جو ایک بار بیدار ہونے کے بعد پھر گہری اور طویل نیند سو گئی تھی' رات گیارہ بارہ بجے بیدار ہو گئی اور کھانا وغیرہ کھا کر پھر سو گئی۔ میں مسلسل جاگ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے خونی واقعات کے مناظر بھوتوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ہم کم و بیش تین ماہ دیکھتے رہے تھے۔ بد قسمت شاہد خان اور بد مست سائیوں کا الم ناک تماشا' مہاجاتری غاران کی رہائش گاہ پر ہماری بامشقت نظر بندی' مہاجاتروکے تہ خانوں میں انسانی قربانی' سوا وپانامہ کا بے جان چہرہ اور بے وفا کیرولین کی کٹی پھٹی لاش' یہ سارے مناظر قطار در قطار میرے تصور میں داخل ہوئے اور اودھم مچانے لگے۔ میرے کانوں میں ایک معصوم چیخ گونجی۔ یہ ذرغونہ کی چیخ تھی۔ سرد تاریک پہاڑوں میں ماما پاپا پکار رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ [illegible] نے کس طرح اسے رات کی تاریکی میں کھتی تک پہنچایا تھا اور میرے پاؤں میں پروئے ہوئے آہنی شکنجے نے مجھ پر کیا کیا عذاب توڑے تھے۔ پھر محمد جمیل پر ہونے والا خونی معرکہ میرے تصور میں آیا اور آخر میں آگ اور خون کی وہ ہولی تصور کے پردے پر جلانے لگی جو تین روز پیشتر وادی کے محافظوں اور ہمارے درمیان کھیلی گئی تھی۔ ایک ایک کر کے سب چہرے میرے ذہن میں آئے۔ ڈاکٹر ہنری' شیلاس' تابے' مستان' تاقوب' ماکی' اس کم عمر یوری ناموس --- اور پھر تاشا --- تاشا مجھے اس وادی میں ملنے والا سب سے عجیب اور منفرد کردار تھی۔ وہ ایک لڑکی نہیں تھی' ایک احتجاجی چیخ تھی جو مذہبی ٹھیکے داروں کے رویے کے خلاف بلند ہوئی تھی اور وادی کے نشیب و فراز میں گونج رہی تھی۔ اس کا کردار خامیوں سے پُر تھا لیکن اس کی ایک خوبی سب خامیوں پر حاوی تھی' وہ منافق نہیں تھی۔۔۔ منصور اور جون چاپوں کے تصور نے مجھے بے قرار کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ سردار سدروت مجھ سے کیے ہوا وعدہ پورا کرے گا اور انہیں رہا کر دے گا' لیکن کب؟ اس کا انحصار کئی باتوں پر تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم سردار سدروت اور اس کے قبیلے کی تلاش میں نکلنے کے بجائے خاموشی سے وقت کا انتظار کریں۔

میرے کمرے کی لائٹ آن تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ میں ابھی سویا نہیں۔ رات دو بجے کے لگ بھگ زریں گل' روشنی کی خالہ اور کیمرا مین رضوی میرے کمرے میں آ گئے۔ ان کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں ہمیں چودھری بخت کی پیشکش کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور پنجاب تک کا سفر اس کی معیت میں کرنا چاہیے۔ وہ ایک بارعب شخص تھا' ایم پی اے رہ چکا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی لینڈ کروزر پورے پنجاب میں ایک جانی پہچانی گاڑی ہے۔ کسی پولیس والے میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس گاڑی کو روک سکے۔۔۔ ہمیں ایسی ہی گاڑی درکار تھی۔ بلکہ میرا تو ارادہ یہ تھا کہ ہم ناک کی سیدھ میں لاہور جانے کے بجائے فی الحال چودھری بخت کے ساتھ سیالکوٹ جائیں۔ چند دن کے لیے اس کی مضافاتی حویلی ہمارے لیے بہترین قیام گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس دوران میں ہم ساہی صاحب سے رابطہ قائم کر سکتے تھے اور ان تمام اچھے یا برے حالات سے باخبر ہو سکتے تھے جو ہمارے ارد گرد موجود تھے۔

میری یہ تجویز روشنی کی خالہ مہتاب بانو کے علاوہ سب کو پسند آئی۔ مہتاب بانو کا خیال تھا کہ سیالکوٹ جانے کے بجائے لاہور ہی میں خاموشی سے کسی جگہ قیام کیا جا سکتا ہے۔ در حقیقت مہتاب بانو

کو اپنی اور روشنی کی سلامتی سے سروکار تھا۔ اگر فلمی یونٹ کے کچھ ارکان وادی میں رہ گئے تھے اور ان کی جان کو خطرہ تھا تو وہ اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ بہر طور اکثریت کی رائے کے سامنے مہتاب بانو کو بھی سر جھکانا پڑا۔

علی الصباح جب ہم نے اپنے پروگرام سے چودھری بخت کو آگاہ کیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ نرم و نازک روشنی سیدھی اس کے دل پر لگی تھی اور وہ اس کے قرب سے کماحقہٗ لطف اندوز ہو رہا تھا۔۔۔ چودھری بخت کے ساتھ سات کارندے بھی سیالکوٹ سے یہاں پہنچے تھے۔ ہمارے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے چودھری بخت نے فیصلہ کیا کہ یہ کارندے بذریعہ بس بالا کوٹ سے ایبٹ آباد اور ایبٹ آباد سے سیالکوٹ پہنچیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چودھری بخت کے دو قریبی دوستوں چودھری مشتاق اور خواجہ عاطف کے علاوہ دونوں گاڑیوں میں ہم ہی ہم ہوں گے۔ اس نئی صورت حال میں ہم سب کے لیے با آرام سفر کی خاطر خواہ گنجائش پیدا ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ درمیانے قد کی دُبلی پتلی روشنی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ "جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے" والا معاملہ تھا۔ چودھری بخت روشنی کے سامنے بچھ بچھ رہا تھا اور اپنی اس کیفیت کو وہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ اپنے سفر کا اگلا مرحلہ شروع کرنے سے پہلے میں نے اور زریں گل نے "شریفانہ شکل و صورت" میں آنے کے لیے حجامت بنوائی اور شیو کروائی۔ اس مقصد کے لیے ملک گلریز نے حجام گھر میں ہی بلوا لیا تھا۔ دن دس بجے کے قریب ہم بالا کوٹ سے روانہ ہوئے۔ بالا کوٹ سے مانسہرہ تک قریباً تیس کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے مانسہرہ پہنچ گئے۔ مانسہرہ میں ایک بار پھر ہمیں پولیس ناکے کا سامنا ہوا۔ مگر تگڑے ملک گلریز خاں نے اپنا ایک "نمبر ٹو" کارندہ ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ راستہ بھر ہوس ناک نظروں سے روشنی کے نشیب و فراز کو گھورتا رہا اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ ایک دیوانی سی بے ساختگی بلکہ سادگی تھی اس کے انداز میں۔ بہرحال اس کی ناکا پھلانگی کا صلہ ہمیں ملا۔ اس کارندے کے سبب اس ناکے پر بھی بغیر چھان پھٹک ہمیں پروانۂ راہداری مل گیا۔

جوں جوں ہم گلگت اور چلاس سے دور ہو رہے تھے' ہمارے لیے یہ خطرہ کم ہو رہا تھا کہ ہمیں راستے میں کہیں دھر لیا جائے گا۔ ایبٹ آباد کراس کرنے کے بعد یہ خطرہ مزید کم ہو گیا۔ پھر جب ہم نے صوبۂ سرحد کی حد کراس کی اور پنجاب میں داخل ہوئے تو یہ خطرہ دس فیصد رہ گیا۔ راستے میں ہم نے دو تین اخبارات بھی خریدے تھے۔ ایک اردو روزنامے میں ہمیں اپنے بارے میں ہلکی سی خبر مل گئی تھی۔ یہ خبر گم شدہ فلم پارٹی کوہ پیماؤں کے بارے میں تھی۔ نامہ نگار نے لکھا تھا کہ تین فلم پارٹی کوہ پیماؤں اور امدادی ٹیم کے چار ارکان کو لاپتا ہوئے اب چار مہینے ہونے کو آئے ہیں۔ لاستے میں تلاش کی کارروائیاں جاری ہیں لیکن جوں جوں موسم خراب ہو رہا ہے' تلاش کا کام سست پڑتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لاپتا افراد کے زندہ بچ رہنے کی امید بھی ختم ہو رہی ہے۔ امکان ہے کہ بہت جلد یہ الم ناک گمشدگیاں بھی سرد خانے کی نذر ہو جائیں گی۔ فلمی یونٹ کی گمشدگی کا ذکر اس خبر میں نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی تک کسی کو احساس ہی نہیں کہ فلمی ٹیم کے ارکان کو گلگت کے برف زاروں میں ایک خوف ناک سانحہ پیش آ چکا ہے۔ اس سانحے کو پیش آئے اب کم و بیش پندرہ روز ہو چلے تھے مگر یہاں بے خبری سی بے خبری تھی۔

بالا کوٹ سے سیالکوٹ تک ہمارا سفر خاصا طویل تھا۔ ایسے سفر میں' جب کئی طرح کے خوف بھی شامل ہوں تو راستہ مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ بہرحال راستے میں زریں کی دلچسپ باتوں' چودھری بخت کے پسندیدہ پنجابی گانوں اور ذرغونہ کی معصوم گفتگو کے سبب اس سفر کی سنگینی ہم پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی۔ زریں گل آہستہ آہستہ اپنی پرانی فارم میں لوٹ رہا تھا۔ ہر بات پر اسے کوئی شعر یاد آ جاتا تھا' کوئی دردناک فلمی گانا اس کے ہونٹوں سے ابل پڑتا تھا۔ کسی وقت وہ نشست سے ٹیک لگا کر ٹھنڈی ٹھار آہیں بھرتا۔ کبھی کھڑکی سے باہر دیکھتا اور بکتا چلا جاتا۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "کلثوم یاد آ رہی ہے؟"

وہ بولا "استاد صیب! یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھولا ہوا ہو۔ وہ خانہ خراب تو امارے دماغ میں خنجر کے مافق گھس گیا ہے۔ ام کو نہیں معلوم' اب اماوا انجام کیا ہو گا۔"

"جو بھی ہو گا' بہت برا ہو گا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کہا آپ نے؟" وہ چونک کر بولا۔

میں نے کہا "یار! لاہور جا کر اب تم چار دن نہاری کھاؤ گے اور حلوا پوری کا ناشتا کرو گے تو تمہارے سر کی ساری خشکی دور ہو جائے گی۔ تم پھر سے سمجھ داری کی باتیں کرنے لگو گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ تم نے پہاڑوں پر جنگلی بیر کھا لیے تھے اور تمہارے دماغ میں گرمی کی وجہ سے موج آ گئی تھی۔"

"دماغ میں موج؟"

"یہ بھی بیماری ہے لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔۔۔ اللہ شفا دینے والا ہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! اگر یہ بیماری ہے تو ام کو جان سے پیاری ہے۔ ام عمر بھر اس بیماری کا شکار رہنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "پیارے! یہی بیماری تو تیری قسمت میں ہی نہیں لکھی۔ تو کتنا بھی بیمار ہو جا' ڈھائی تین مہینے میں تجھے صحت یاب ہو ہی جانا ہے۔"

اگلے روز صبح کے سات بجے تھے جب ہم چند [illegible] فٹ چوڑی ہموار سڑک پر سفر کرنے اس شان دار عمارت کے سامنے پہنچے جسے لال کوٹھی کہا جاتا تھا۔۔۔ چودھری بخت کی دونوں گاڑیاں دھول میں اٹی ہوئی تھیں اور گاڑیوں کے ساتھ ساتھ

ہمارے چہرے بھی۔ میرا خیال تھا کہ لال کوٹھی کسی الگ تھلگ مقام پر واقع ہوگی۔ اسے چاروں طرف سے گھنے درختوں اور کھیتوں کھلیانوں نے گھیر رکھا ہوگا لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ لال کوٹھی اس قصبے کے بیچوں بیچ واقع تھی جسے "رنگ والی" کہا جاتا تھا۔ لال کوٹھی کی تعمیر یقیناً سن ۱۹۰۰ء سے پہلے ہوئی تھی' تاہم آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال مسلسل کی جاتی رہی ہے۔ عمارت کے اردگرد واقع مکانات بھی قدیم طرز کے تھے۔ ان مکانات کے درمیان کہیں کہیں گاؤں کے مخصوص کچے کوٹھے بھی موجود تھے۔ پختہ مکانوں میں بیشتر کے دروازے محرابی تھے اور دیواروں میں نانک شاہی اینٹیں استعمال کی گئی تھیں۔

گاڑیاں حویلی کے وسیع پھاٹک سے اندر داخل ہوئیں تو سرخ پگڑیوں والے ملازمین نے پھرتی سے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ استقبال کرنے والوں میں اچھے قد کاٹھ کا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان بھی تھا۔ اپنی اچھی صحت اور گھنی مونچھوں کے سبب وہ عمر سے کچھ بڑا نظر آتا تھا۔ وہ چوہدری بخت کو "بھائی جان۔۔۔ بھائی جان" کہہ رہا تھا اور بڑی محبت سے اس کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چوہدری بخت کا چھوٹا بھائی ذیشان ہے۔ چوہدری بخت کی طرح وہ بھی گورا چٹا اور وجیہہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چوہدری بخت کی وجاہت اور جوانی ڈھل چکی تھی جب کہ چوہدری ذیشان بھرپور جوان نظر آتا تھا۔

حسب توقع اس حویلی کا صحن بہت بڑا تھا۔ رنگین پایوں والی بڑی بڑی چارپائیاں' موڑھے' پیتل کے پیندے والے حقے' کورے گھڑے' دیواروں پر رنگین نقش و نگار' یہ سارے مناظر اس وسیع صحن کا حصہ تھے۔ حویلی کی اندرونی سجاوٹ میں ہر جگہ پنجاب کے کلچر کی خوب صورت جھلک نظر آتی تھی۔ ایک چیز یہاں پہنچ کر میں نے خاص طور سے نوٹ کی۔ حویلی کی سجاوٹ میں اور یہاں کے ملازمین کے لباس میں اور دیگر بہت سی چیزوں میں سرخ رنگ نمایاں تھا۔ جن دو گاڑیوں میں ہم آئے تھے وہ سرخ رنگ کی تھیں' چوہدری بخت کے لباس میں بھی سرخی غالب تھی اور اس حویلی کا تو نام ہی لال کوٹھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سرخ رنگ اس حویلی کے کسی مکین کا پسندیدہ رنگ ہے۔

ہم عمارت کی شاندار نشست گاہ میں پہنچے۔ یہاں فرش پر سرخ رنگ کا دبیز قالین تھا اور دیواروں پر ان جانوروں کے سروں کی نمائش تھی جو نامعلوم جنگلوں پر اور نامعلوم اوقات میں ان چوہدریوں کے دست ہائے ستم کا شکار ہوئے تھے۔ جوں ہی ہم نشست گاہ میں پہنچے' چوہدری کے چاق و چوبند ملازمین ہماری خاطر تواضع میں لگ گئے۔ جن لوگوں نے نہانا تھا انہیں غسل خانوں کا راستہ دکھایا گیا۔ جنہوں نے منہ دھونا تھا انہیں نیم گرم خوشبودار پانی فراہم کیا گیا۔۔۔ اس کے بعد آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہمیں ناشتا فراہم کر دیا گیا۔۔۔ یہ ناشتا دیسی گھی کے پراٹھوں' انڈوں' اچار' لکّی کی میٹھی روٹی اور بادام کے حلوے پر مشتمل تھا۔ ناشتا کرنے کے دوران میں میری نگاہ بار بار ایک ملازم کے چہرے پر جمتی رہی۔ یہ کھچڑی بالوں اور سرمہ لگی آنکھوں والا ایک ادھیڑ عمر ملازم تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ چہرہ میں نے کہیں دیکھا ہوا ہے اور بڑی اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس ملازم کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ بھی میری ہی طرح اپنی یادداشت کو ٹٹول رہا تھا۔ ناشتا بے حد مزے دار تھا۔ اس کے بعد الائچی والی سبز چائے پیش کی گئی۔ چائے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ چوہدری بخت نے کہا "یہ چائے میری ایل پی نے اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے۔ بڑی اچھی چائے بناتی ہے۔"

"یہ ایل پی کیا ہے؟" روشنی نے بے اختیار پوچھا۔

"ایل پی سے مراد ہے لائف پارٹنر۔ میری گھر والی۔" چوہدری مسکرایا "بڑی بھلی مانس عورت ہے۔ شہر کے صاف ستھرے ماحول میں پلی بڑھی ہے' گریجویٹ ہے لیکن مجھ جیسے میٹرک کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔ بڑی خوبیوں کی مالک عورت ہے۔ میں ملواؤں گا تمہیں اس سے۔"

چائے کے بعد ہم آرام کرنے کے لیے اندرونی کمروں میں چلے گئے۔ کمرے بے حد صاف ستھرے اور آرام دہ تھے۔ فرنیچر روایتی طرز کا مگر بے حد نفیس تھا۔ فرنیچر سمیت ہر چیز پر سرخ رنگ کی چھاپ نظر آتی تھی۔ یہاں دیواروں پر اور راہداریوں میں مجھے ایسی تصویریں بھی نظر آئیں جن سے میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ چوہدری بخت کو موسیقی سے خاص لگاؤ ہے۔

تین چار گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں اٹھا تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ طبیعت ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ سر کے پچھلے حصے کا گومڑ ابھی کم تکلیف دے رہا تھا' تاہم ایک ٹانگ بدستور سوجی ہوئی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھونے غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل خانہ قدیم طرز کا تھا مگر ہر سہولت سے آراستہ تھا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے میں نے کسی کی چیخیں سنیں۔ یہ کسی نوعمر لڑکے یا لڑکی کی چیخیں تھیں۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں نے ایک پائپ پر پاؤں رکھا اور عقبی روشن دان کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ میری یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ مجھے حویلی کے پچھلے صحن کا ایک حصہ نظر آیا۔ میں نے ایک نوعمر لڑکی کو دیکھا۔ بمشکل تیرہ چودہ سال عمر رہی ہوگی اس کی۔ اسے غالباً سزا دی گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دیوار کے ساتھ کھڑی تھی' اور رو رہی تھی۔ لڑکی اپنے معمولی لباس اور حلیے سے حویلی کی ملازمہ لگتی تھی۔ ایک جاذب نظر عورت جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور جس نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا' ہاتھ میں چھڑی لیے لڑکی کے قریب موجود تھی۔ میرے سامنے اس نے لڑکی کی پنڈلیوں پر تین چار زوردار ضربیں لگائیں اور چیخ کر بولی "مجھے صرف ایک بات کا جواب دو۔ تم نے بتایا کیوں نہیں؟ اگر تمہارا قصور نہیں تھا تو تمہیں کیا ضرورت تھی چھپانے کی۔ کیا ضرورت تھی؟" لڑکی ہاتھ جوڑنے لگی اور منت سماجت کرنے لگی۔ عورت نے لڑکی کے ہاتھوں پر چھڑیاں رسید کیں اور چیخ کر بولی "ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔۔۔ اوپر اٹھاؤ ہاتھ۔"

لڑکی نے پھر سہم کر ہاتھ سر سے بلند کر دیئے۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک اور ملازمہ صورت عورت وہاں پہنچ گئی۔ اس نے لجاجت بھرے انداز میں مالکن سے کچھ کہا۔ غالباً لڑکی کو معاف کرنے کی سفارش کی تھی۔ نفیس کپڑوں والی جو یقیناً مالکن ہی تھی' غصے سے بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ سفارش کرنے والی ملازمہ پر ٹوٹ پڑی اور اسے چھڑی سے بے دریغ پیٹنے لگی۔ ملازمہ بدحواس ہو کر وہاں سے کھسک گئی۔ فرط غضب سے چھڑی والی کا رنگ لال گلابی ہو رہا تھا اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ یقیناً پرکشش عورت تھی کیوں کہ اتنے غصے کی حالت میں بھی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اسی دوران میں میری نگاہ چوہدری بخت پر پڑی۔ وہ ایک طرف سے نمودار ہوا تھا اور چھڑی والی کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"بھئی ہوا کیا ہے؟ کیوں اتنا پارا چڑھ گیا ہے۔" چوہدری بخت کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ مسکراتا ہوا لڑکی اور "چھڑی والی عورت" کے درمیان کھڑا ہو گیا تھا۔

جواب میں عورت نے کچھ کہا۔ آواز دھیمی تھی لہٰذا میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ چوہدری بخت نے عورت کے ہاتھ سے چھڑی لینے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس مرتبہ چوہدری ذرا بلند آواز سے بولا "لیکن بھئی' کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔"

عورت نے ذرا اونچی آواز میں کہا "وجہ یہ ہے جی۔۔۔۔ کہ مالی کا لڑکا افضل دو ماہ سے اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اسے چھیڑتا ہے' تنگ کرتا ہے' اس کے کمرے میں گھس جاتا ہے' لیکن یہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے ہوئے ہے۔ یہ تو مجھے کل چوکی دار کی بیوی شریفاں نے بتایا کہ اس خبیث نے گند مچا رکھا ہے یہاں۔ کل شام میں نے اس کی بھی کھچائی کی ہے لیکن میرے خیال میں اصل قصور اس کا ہے۔ یہ کیوں چپ رہی۔ کیوں اس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ اس کا مطلب ہے کہ اندر سے اس کی نیت بھی بد تھی۔"

لڑکی روتے ہوئے بولی "نہیں بیگم جی! میں قسم کھاتی ہوں۔ میرا کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتا تھا' کسی کو بتایا تو میں تمہاری جان نکال لوں گا۔"

چوہدری بخت نے لڑکی کی طرف داری کی "بھئی! یہ جیسماں ایسی تو نہیں۔ یہ ساری اسی حرامی کی کارستانی ہوگی۔۔۔۔ وہ ہے کہاں؟"

قریب کھڑا ایک ملازم ادب سے بولا "وہ جی باپ کے ساتھ کام پر گیا ہوا ہے۔ میں نے انہیں کارخانے بھیجا ہے' باغیچی ٹھیک کرنے کے لیے۔"

چوہدری بخت نے چھڑی والی عورت سے مخاطب ہو کر کہا "صفیہ! یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ میرے خیال میں اس بے چاری کڑی کی جگہ اس حرامی افضل کو ہونا چاہیے تھا۔"

عورت بولی "میں نے کہا ہے نا' رات کو اسے بھی پھینٹی لگائی ہے لیکن میں اس لڑکی سے پوچھتی ہوں' یہ کیوں چپ رہی؟ میں اسے گناہ پر نہیں' اس کی بزدلی پر مار رہی ہوں۔ آپ پلیز۔۔۔ اس معاملے میں نہ آئیں۔ آپ جائیں یہاں سے۔"

وہ ایک بار پھر لڑکی کو چھڑی سے پیٹنے لگی۔ لڑکی چیخ رہی تھی اور ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں سے چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف بکھرتی نظر آ رہی تھیں۔۔۔ چوہدری بخت نے بمشکل لڑکی کی جان بچائی اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر برآمدے کی طرف چلا گیا۔ ایک دوسری عورت نے جو خاصی فربہ اندام تھی اور حویلی کی ہی فرد نظر آتی تھی' چھڑی والی عورت کو سنبھال لیا اور اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

پھر اس تماشے کے صرف تین گھنٹے بعد میں نے چھڑی والی عورت کو دوبارہ دیکھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر بدلی ہوئی عورت نظر آئی۔ پرسکون' بااخلاق اور مہمان نواز۔ وہ کھانے کی طویل میز پر ہمارے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کی نشست چوہدری بخت کے برابر میں تھی۔ چوہدری نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "بھئی! یہ ہیں ہماری ایل پی صاحبہ۔ ان کا نام صفیہ ہے۔ حویلی میں انہیں بیگم جی کہا جاتا ہے۔ آپ بھی چاہیں تو اسی نام سے پکار سکتے ہیں۔"

صفیہ بیگم نے ہم سب کو سلام کیا اور حال چال پوچھا۔ میں نے توجہ سے اس عورت کو دیکھا۔ عمر تیس سال کے قریب تھی لیکن وہ نسبتاً کم عمر نظر آتی تھی۔ وہ بھاری بھرکم زیورات اور کام دار لباس سے لدی پھندی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ امیرانہ تکلفات اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتے۔ وہ پردے کی صرف اس حد تک پابند تھی کہ آنچل اس کے سر پر نظر آ رہا تھا۔ اس کے رویے میں اکھڑ پن اور رکھ رکھاؤ نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے خوب صورت اس کے ہونٹ تھے۔ آگے کی طرف خم کھائے ہوئے گداز ہونٹ۔ یہ ہونٹ خاموشی میں بولتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور جب وہ بولتی تھی تو لگتا تھا کہ آواز اس کے گلے سے نہیں' ان ہونٹوں سے نکل رہی ہے۔ چوہدری بخت نے کھانے کے دوران میں بے تکلفی کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ہلکی پھلکی بات چیت شروع کر دی۔ کہنے لگا "ہماری ایل پی کا نام تو صفیہ ہے لیکن میں اسے رضیہ سلطانہ کے وزن پر صفیہ سلطانہ بھی کہتا ہوں۔ ایک زبردست حاکم کی طرح اس نے پورے گھر کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔"

صفیہ بیگم نے برجستہ کہا "کھانے کے دوران میں بات نہیں کرنی چاہیے اور جھوٹی بات تو بالکل نہیں۔"

سب نے ہلکا سا زیرلبی قہقہہ لگایا۔ چوہدری بخت اپنی بیگم کو

ان حالات سے آگاہ کرنے لگا، جن کا شکار ہو کر ہم یہاں پہنچے تھے۔ وہ حیرت آمیز دلچسپی سے سنتی رہی اور اس کا چہرہ مختلف رنگ بدلتا رہا۔ اس نے گاہے گاہے سوالات بھی پوچھے۔ وہ یہ بات جان کر ازحد حیران ہوئی کہ ہمارے ساتھ آنے والی خوب صورت لڑکی ایک مشہور فلم ایکٹریس ہے۔ اس نے بڑی توجہ سے روشنی کو دیکھا اور جب وہ ایسا کر رہی تھی، مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں پریشانی اور رقابت کی جھلک نظر آئی پھر فوراً ہی یہ جھلک اس خوب صورت مسکراہٹ کے پیچھے اوجھل ہو گئی جو ایک نرم پھوار کی طرح ہم سب پر برس رہی تھی۔ چوہدری نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا "ہماری ایل پی گانا بھی بہت اچھا گاتی ہے۔ اگر آپ لوگ دو چار دن یہاں رہے تو اس خوب صورت آواز کا تعارف آپ سے کروائیں گے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ گانے کے علاوہ یہ ڈانٹتی بھی بہت اچھا ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں کمرے میں تھا، میں نے کسی کی ڈانٹ ڈپٹ سنی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ یہ ان ہی کی آواز تھی۔"

چوہدری بجنت نے قہقہہ لگایا "ہاں بھئی، تم نے خوب پہچانا ہے۔ یہ اسی کی آواز تھی' ایک ملازمہ لڑکی پر برس رہی تھی۔"

پھر چوہدری اپنی بیگم کی ناگواری کو خاطر میں لائے بغیر بے تکلفی سے وہ واقعہ ہمیں سنانے لگا۔ اس نے تقریباً ساری بات من و عن بیان کر دی تھی۔

میں نے کہا "بیگم صاحب! گستاخی معاف...... اگر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟"

"ہاں جی' اب کہہ ہی دیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

میں نے کہا "میں چوہدری صاحب سے اتفاق کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ چوہدری صاحب سے ہی اتفاق کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ لڑکی بے چاری تو مظلوم تھی لیکن آپ نے سارا غصہ اسی پر نکالا ہے۔"

صفیہ بیگم ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ گہری سانس لے کر بولی "بات یہ نہیں بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ ہم لڑکیاں اور ہم عورتیں زیادتی کیوں برداشت کرتی ہیں؟ بے قصور ہوتے ہوئے بھی چپ کیوں رہتی ہیں؟ میرا تو ایمان ہے کہ ایسی زیادتیوں پر احتجاج نہ کرنا سب سے بڑی زیادتی ہے اور جو عورت یہ زیادتی کر کے مردوں کا حوصلہ بڑھاتی ہے وہ ہر عورت پر زیادتی کرتی ہے۔ میرا بس چلے تو ایسی ساری بزدل عورتوں کو مار مار کر ان کی چمڑیاں ادھیڑ دوں۔ اگر آپ یہ سوچیں کہ......"

"بس بھئی بس۔" چوہدری بجنت نے ہاتھ اٹھا کر صفیہ بیگم کی بات کاٹ دی "کھانا تو بدمزہ نہ کرو۔ ابھی تم خود کہہ رہی تھیں کہ کھانے پر بولنا ٹھیک نہیں۔"

"میں تو ان کی بات کا جواب دے رہی تھی۔"

"جواب مل گیا ہم کو...... سو فیصد مل گیا۔" چوہدری بجنت نے کسی ریفری کی طرح ہاتھ اٹھائے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "ہماری ایل پی سے کوئی نہیں جیت سکتا بھئی...... کوئی بھی نہیں۔"

"اور آپ سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔" صفیہ بیگم نے خاموش ہوتے ہوتے بھی گرہ لگا دی۔

میاں بیوی کی عمروں میں خاصا فرق نظر آتا تھا اور شاید یہ فرق ان کے مزاجوں میں بھی تھا۔ پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے درمیان ایک گہرا قلبی تعلق موجود ہے۔ خاص طور سے صفیہ بیگم کی آنکھوں میں اس تعلق کی جھلک بہت نمایاں تھی۔ وہ جب چوہدری کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں محبت کی آنچ محسوس کی جا سکتی تھی۔ چوہدری بجنت آٹھ دس سال پہلے تک کافی خوب صورت رہا ہوگا۔ اب بھی اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی بے اعتدالی سے گزار رہا ہے اور چالیس بیالیس سال کی عمر میں ہی ڈھلا ہوا نظر آنے لگا ہے۔ اس کی کنپٹیوں سے بال سفید ہو چکے تھے۔ مونچھوں میں بھی ہلکی سی سفیدی تھی۔ کندھے جھکے جھکے نظر آتے تھے۔ گردن کی جھریاں چھپانے کے لیے اس نے شلوار قمیص کے ساتھ اسکارف باندھ رکھا تھا۔ شاید چوہدری خود بھی اپنے جسمانی زوال سے آگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے لباس اور اپنی حرکات و سکنات سے جوان نظر آنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے لباس میں اور گرد و پیش میں یہ جو سرخ رنگ اتنی فراخ دلی سے استعمال کیا گیا تھا اس کے پیچھے بھی یہی نفسیاتی وجہ ہے۔

کھانے کی میز پر چوہدری بجنت کا چھوٹا بھائی ذیشان بھی موجود تھا۔ وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہا۔ بڑے بھائی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا مؤدب ہو جاتا تھا۔ چوہدری بجنت نے ذیشان کے بارے میں بتایا کہ اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ آگے بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن گاؤں میں زمینوں اور فیکٹری کے کام کا اتنا بوجھ ہے کہ اسے شہر سے واپس آنا پڑا۔

ذیشان کے ماتھے پر کسی پرانے زخم کا نشان تھا۔ وہ لڑائی جھگڑے میں پیش پیش رہنے والا نوجوان نظر آتا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ بی اے کر چکا ہے۔ یا پھر "بی اے" نے اس کا بگاڑا کچھ نہیں تھا۔ مجھے اس کی گفتگو میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ بہرحال چوہدری بجنت کی طرح جاگیردارانہ ذہانت کی چمک دمک اس کی آنکھوں میں بھی موجود تھی۔

...... اس رات زرغونہ میرے پاس سو گئی تھی۔ وہ سو گئی تو میں اسے اٹھا کر فیتک بی کے پاس چھوڑ آیا۔ فیتک بی' روشنی اور مہتاب ایک کمرے میں سوئی تھیں جب کہ میں' زریں گل اور کیرا مین رضوی دوسرے کمرے میں۔ اسی طرح دیگر افراد بھی وسیع

مہمان خانے کے مختلف کمروں میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کمروں میں سردی سے بچانے کے لیے مٹی کی بڑی بڑی انگیٹھیاں موجود تھیں اور اس کے علاوہ بھی تمام سہولیات میسر تھیں۔ کیرا مین رضوی "ڈرنک" کرتا تھا۔ انڈین شراب کی نصف بوتل چڑھاتے ہی وہ بے خبر ہو گیا۔ زریں گل نے بھی کندھے کی تکلیف کی وجہ سے خواب آور گولی کھائی تھی۔ رہ جاموں شا نے چپت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ میں کچھ دیر جاگنا چاہتا تھا اور "مراقبے" میں جا کر حالات پر غور کرنا چاہتا تھا لیکن جوں ہی میں بستر پر لیٹا، خیالات منتشر ہونے لگے۔ اس منتشر خیالی کی وجہ وہ پرسوز آواز تھی جو لال کوٹھی کے پچھواڑے میں کہیں سے برآمد ہوئی تھی اور در و دیوار میں گونجنے لگی تھی۔ ہارمونیم' ستار اور طبلے کی سنگت میں کوئی مغنیہ دل کش آواز میں گا رہی تھی "اساں بھوک پکن رہی جاناں...... ازلاں دا پیار بھاناں۔"

لال کوٹھی کے محرابی دروازے، خاموش دالان اور رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکیاں اس آواز کے سحر میں جکڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ معلوم نہیں یہ آواز لال کوٹھی کے کس حصے سے ابھر رہی تھی اور کن طویل راہداریوں میں سفر کر کے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ ان لمحات میں نجانے کیوں مجھے یہ کوٹھی ایک بھیدوں بھری پراسرار عمارت نظر آئی...... رفعتاً دروازہ "چراؤں" کی آواز سے کھلا اور میں چونک گیا...... میرے سامنے وہی ادھیڑ عمر ملازم کھڑا تھا جس کی صورت میں نے آج کئی بار دیکھی تھی اور پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ ملازم نے ادب سے جھک کر مجھے سلام کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ پر بازی لے گیا ہے اور مجھے شناخت کر چکا ہے۔

"بیٹھ جاؤ بھئی۔" میں نے رنگین کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ذرا سا جھک کر وہ شخص بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "میں ابھی تک سوچ رہا ہوں کہ تمہیں کہاں دیکھا ہے۔"

وہ بولا "لیکن مجھے تو زیادہ نہیں سوچنا پڑا۔ میں نے صبح ہی پہچان لیا تھا کہ آپ ماسٹر جانی ہیں۔"

"ماسٹر جانی!" کے الفاظ نے میرے سر میں دھماکا سا کر دیا "ماسٹر" کا لفظ اس دور کی یادگار تھا جو میں نے اٹک جیل میں کاٹا تھا۔ وہاں میرا وفادار ساتھی کالو جانی بڑی عقیدت سے مجھے "ماسٹر" کہا کرتا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی بیرک کے کئی قیدی مجھے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔ میں نے ایک دن کالو سے کہا تھا "کالو! تم تو مجھے اس لیے ماسٹر کہتے ہو کہ میں نے تمہیں خنجر چلانے اور لڑنے بھڑنے کے گر سکھائے ہیں لیکن یہ اُلو کے پٹھے مجھے کس حساب میں ماسٹر کہتے ہیں۔"

وہ اس نے اپنے بے حد سفید دانت نکالے تھے اور کہا تھا "یہ گنجے کے تخم آپ کو اس لیے ماسٹر بولتے ہیں کہ وہ آپ کے خطرناک گُروں سے بچ سکیں۔"

ایک دم ہی بے شمار یادیں میرے ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں اور میں حیرت سے ادھیڑ عمر ملازم کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا۔ میرے سامنے میرا جیل کا ساتھی کرم دین کھڑا تھا۔ کرم دین ہماری ہی بیرک میں رہتا تھا۔ میرا نمبر ۳۳ تھا اور کرم دین کا ۴۴۔ وہ شریف آدمی تھا۔ پڑوسیوں سے ہونے والے جھگڑے میں اتفاقیہ قاتل بن گیا تھا۔ اس کا دھکا کھا کر ایک عمر رسیدہ شخص چھت سے گر گیا تھا اور راہی عدم ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ کرم دین کے گاؤں ضلع گوجرانوالہ میں پیش آیا تھا۔ کرم دین کو چار سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ وہ بڑا نفس کم اور منکسار تھا۔ بڑی نیک چلنی سے قید کاٹ رہا تھا۔ اس کے حوالے سے بہت سی یادیں میرے ذہن میں گھس آئیں۔

کرم دین اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس سے کالو کے بارے میں پوچھا۔

کرم دین نے کہا "وہ آپ کو بہت بہت یاد کرتا تھا ماسٹر۔ آپ کی جدائی نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا، جبار عادل خاں نے آپ کے ساتھ ساتھ اسے بھی بری طرح مارا تھا۔ اس کی کمر پر سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اس کا ایک گردہ سوج گیا تھا اور پیشاب میں خون آتا تھا۔ جب تکلیف زیادہ ہوئی تو اسے اسپتال بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ ڈیڑھ دو مہینے رہا پھر ایک روز بھاگ گیا۔ اس بات کو اب خاصا عرصہ گزر چکا ہے، تب سے اس کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کرم دین سے پوچھا کہ وہ کب رہا ہوا۔ کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ان سوالوں کے مختصر جواب دیے اور بتایا کہ اسے سزا یافتہ ہونے کے سبب کہیں نوکری نہیں ملتی تھی' لہٰذا وہ اپنا آبائی شہر گوجرانوالہ چھوڑ کر یہاں سیالکوٹ چلا آیا۔ اب وہ یہاں لال کوٹھی میں نوکر ہے اور اس کی بیوی بھی یہاں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔

میں اور کرم دین دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس حویلی میں کرم دین سے یہ اتفاقیہ ملاقات بڑی مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ یہاں کے تاریک اور انجانے گوشوں سے نقاب اٹھا سکتا تھا۔ کرم دین نے مجھے یہ بتایا کہ صفیہ بیگم چوہدری صاحب کی اکلوتی بیوی نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ صفیہ بیگم دوسری ہے اور وہ آٹھ دس سال پہلے ایک مشہور گلوکارہ رہی ہے۔ اس کے گانے ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بجتے تھے' لوگ اس نئی گلوکارہ کی آواز کے دیوانے ہو رہے تھے اور فلم والوں نے اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا تھا لیکن ایک دن اچانک اس نے گانا ختم کر دیا اور چوہدری بجنت کی بیوی بن کر لال کوٹھی میں آ گئی۔

میں نے کرم دین سے پوچھا "چوہدری کی پہلی بیوی کہاں ہے؟"

وہ بولا "یہیں ہے جی! اسے موتاپے کی بیماری ہے۔ دیواروں کا سارا اسے لے کر اٹھتی اور بیٹھتی ہے۔ شام کے بعد جب آپ کھانا کھا رہے تھے' وہ برآمدے میں بیٹھی وضو کر رہی تھی۔"

مجھے یاد آ گیا' یہ وہی فربہ اندام چوہدرائن تھی جسے آج سہ پہر میں نے حویلی کے پچھلے صحن میں بھی دیکھا تھا۔ جب صفیہ بیگم غصے سے بے قابو ہو کر لڑکی کو پیٹ رہی تھی تو یہ چوہدرائن بھی وہیں موجود تھی۔ کرم دین نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اس بیوی سے چوہدری صاحب کی ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ دونوں لڑکے ولایت میں اپنے بڑے چاچو کے پاس رہتے ہیں۔ لڑکی لاہور میں پڑھتی ہے۔ چوہدری صاحب کی یہ بیوی خاندان سے ہے اور اپنے ساتھ بے شمار جائیداد بھی لائی ہوئی ہے۔ چوہدری صاحب اس کی عزت کرنے پر مجبور ہیں۔"

"مجبور ہیں؟ کیا مطلب؟"

"مجبوری ہی ہوئی نا جی!" کرم دین آواز دبا کر بولا "جیسے عام چوہدری لوگ ہوتے ہیں' چوہدری بخت صاحب بھی شوقین طبیعت کے مالک ہیں۔ رات دو رات اور ہفتے دو ہفتے کے لیے عورتیں یہاں آتی رہتی ہیں۔ بیگم صاحب (صفیہ بیگم) تو بڑی صابر شاکر طبیعت کی مالک ہیں۔ وہ تو کبھی بولتی نہیں لیکن بڑی چوہدرائن جی کبھی کبھار غصے ہو جاتی ہیں۔ بہرحال اونچی آواز میں بات کبھی انہوں نے بھی نہیں کی ہے۔ چوہدری صاحب سے اونچی آواز میں بات کرنے کے لیے بندے کے سینے میں شیر کا دل ہونا چاہیے جی!"

"کیا بہت غصے والے ہیں چوہدری صاحب؟"

"آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے آپ کو کچھ پتا نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ چوہدری سے تعارف ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔"

کرم دین بولا "چوہدری صاحب کا غصہ نظر نہیں آتا ہے مگر جب یہ غصہ اپنا کام دکھاتا ہے تو بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ اللہ ایسی مصیبت میں کسی کو نہ ڈالے۔"

میں نے کہا "تم نے تو ساری باتیں حیران کرنے والی کی ہیں۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری بخت عورتوں کا شوقین ہو گا۔"

کرم دین ہنس دیا "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جی! یہ تو سب جانتے ہیں۔ اچھی آواز چوہدری صاحب کی کمزوری ہے اور "اچھی آواز والیاں" بھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔ اگر نہ جانتے تو چوہدری صاحب کے لیے تحفہ کیوں ساتھ لاتے۔"

"تحفہ؟ کیا مطلب؟"

"مطلب وہ لڑکی جی! جسے آپ فلم ایکٹریس بنا رہے ہیں۔"

مجھے ایک دم غصہ آ گیا لیکن میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا "تم سے کس نے کہا ہے کہ وہ تحفہ ہے؟"

"میں نے ۔۔۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جی!" کرم دین سرگوشی کے لہجے میں بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے بیگم جی اور چوہدری صاحب میں باتیں ہو رہی تھیں۔"

"کیسی باتیں؟"

کرم دین نے اٹھ کر کھڑکی بند کی اور آہستگی سے بولا "آپ کے ساتھ بہت پرانا ناتا ہے جی۔ جیل کے زمانے میں کالو کی طرح میں بھی آپ کی تی داری کا عاشق رہا ہوں۔ دل نہیں چاہتا کہ آپ سے کوئی بھی بات چھپاؤں۔۔۔۔ دراصل آج جب اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھا تو فوراً میرا دل چاہا کہ آپ کے بارے میں معلوم کروں کہ آپ یہاں کیوں اور کیسے آئے ہیں۔ شام سے تھوڑی دیر بعد میں زنان خانے کی طرف گیا تو چوہدری اور بیگم جی کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ یہاں کوئی اور ہی بات چل رہی تھی۔ آپ کے ساتھ آنے والی میڈم جی (روشنی) کا ذکر ہو رہا تھا۔۔۔ چوہدری صاحب اس کے ساتھ دل بہلانا چاہ رہے ہیں لیکن بیگم جی اعتراض کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں' ایک طرف آپ الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں' دوسری طرف اپنی من مانیاں بھی کرتے جا رہے ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم الیکشن تک اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں۔ ان دنوں کوئی ایسی ویسی بات اڑ گئی تو آپ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ چوہدری صاحب نشے میں تھے۔ ہنس کر بولے کہ لال کوٹھی سے بات اڑ کر کہاں جائے گی اور پھر میں کون سا کسی سے زبردستی کر رہا ہوں۔ یہ تو من مرضی کا سودا ہے' اگر وہ خالہ بھانجی مانیں گی تو ٹھیک ہے ورنہ ہمارا کون سا کام رکا ہوا ہے۔"

کرم دین کی بات سن کر مجھے دھچکا تو لگا لیکن زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ میں راستے میں ہی یہ محسوس کر چکا تھا کہ چوہدری بخت' روشنی پر مسلسل رال ٹپکا رہا ہے۔ درحقیقت اس نے ہمیں لفٹ ہی روشنی کی وجہ سے دی تھی۔ وہ ایک مشہور فلم اسٹار تھی۔ ایسی تتلیاں تو لاہور کے فلم اسٹوڈیوز میں ہی نظر آتی ہیں۔ چوہدری بخت کی طرح دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے ہاتھ ان نازک تتلیوں تک کہاں پہنچتے ہیں۔ یہ تو چوہدری کی لاٹری نکل آئی تھی کہ سینما اسکرین کا جگمگاتا ستارہ اس کی حویلی میں چمکنے لگا تھا۔ چوہدری غالباً اس نادر موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے یہ سب کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔

علی الصباح ناشتے سے پہلے میں روشنی اور اس کی خالہ مہتاب سے ملا۔ روشنی ابھی ابھی جاگی تھی۔ وہ میک اپ کے بغیر بھی خاصی خوب صورت تھی۔ چہرہ تروتازہ نظر آتا تھا اور نوخیز جسم کسی کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی بھید بھری گہری بادامی آنکھیں کسی بھی مخلص کا بیڑا غرق کر سکتی تھیں۔ چند روز پہلے فلمی یونٹ کے ساتھ پیش آنے والے المناک واقعات کا کوئی اثر اس کے چہرے پر نظر آتا تھا اور نہ مہتاب کے چہرے پر۔

میں نے روشنی کی خالہ مہتاب سے پوچھا "رات چوہدری نے تم سے کوئی بات کی ہے؟"

"کیسی بات؟" مہتاب نے چونک کر پوچھا۔

"روشنی کے بارے میں۔"

"نن ۔۔۔ نہیں' کوئی بات نہیں کی۔"

"اگر وہ کوئی ایسی ویسی بات کرے تو مجھے بتانا۔"

جہاں دیدہ عورت معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ تیوری چڑھا کر بولی "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ خواہ مخواہ کے چکروں میں نہ پڑو۔ سیدھے لاہور چلو۔ تم لوگوں نے میری بات ہی نہیں مانی۔"

"فضول میں خود کو پریشان نہ کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "میں اپنی ذمے داری پر تمہیں یہاں لایا ہوں۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔"

مہتاب کو مزید بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم خالی خولی باتیں نہیں کرتے۔ وادی میں وہ ہمیں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے دیکھ چکی تھی۔ قتل و غارت کے وہ وحشت ناک مناظر ابھی تک اس کی آنکھوں میں جمے ہوئے تھے۔ خاص طور سے روشنی مجھ سے کافی مرعوب نظر آتی تھی۔ وہ اب تک ہر کام میرے مشورے سے کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ میں نے برا منایا ہے' وہ جلدی سے بولی "خالہ! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ یہ جو کریں گے' ہمارے حق میں اچھا ہی کریں گے اور پھر ان کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی سے کیا ڈر خطرہ ہے۔"

"ہم ۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو چاہتی تھی ۔۔۔۔"

مہتاب کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ چوہدری بخت لمبے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ کرتہ بہت لمبا تھا۔ ایک گرم چادر سے اس نے بڑے اسٹائلش انداز میں اپنا ایک کندھا ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم سب کو نظرانداز کرتے ہوئے روشنی سے بولا "روشنی جی! آؤ آپ لوگوں کو لال کوٹھی کی سیر کرائیں۔ اتنی دیر میں ناشتا بھی تیار ہو جائے گا۔"

"آپ لوگوں" سے چوہدری بخت کی مراد روشنی اور اس کی خالہ تھیں۔ میں اور دیگر لوگ تو کسی زمرے میں ہی نہیں آتے تھے۔ چوہدری بخت ہم لوگوں میں سے روشنی کو وہی اہمیت دے رہا تھا جو ایک ہدایت کار ایکسٹرا اداکاروں میں ہیروئن کو دیتا ہے۔۔۔۔ ہیروئن یعنی روشنی نے سوالیہ نظروں سے خالہ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا ارادہ ہے؟ چوہدری صاحب کے ساتھ جانا ہے یا نہیں؟ خالہ نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں جی ۔۔۔ ہاں جی ۔۔۔ کیوں نہیں۔ آپ کی یہ لال کوٹھی دیکھنے کا شوق کسے نہیں ہو گا۔"

"تو پھر آؤ جی! ہو جائے ایک چکر۔" چوہدری نے کہا۔

خالہ نے ایک نفیس گرم شال روشنی کے کندھوں پر ڈالی اور اسے لے کر چوہدری کے ساتھ چل دی۔ میں اور ٹوبنگ ابن وہیں کھڑے تھے۔ دروازے کے قریب جا کر روشنی مڑی اور بولی "آپ کیوں کھڑے ہیں شاہ جہاں صاحب ۔۔۔۔ آپ بھی آئیے نا۔"

چوہدری بخت کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری نظر آئی پھر وہ مصنوعی مسکراہٹ سے بولا "آؤ نا جوان' یہاں کوئی پردہ شردہ تو نہیں ہے۔ آجاؤ شاباش۔"

میں بھی ان تینوں کے ساتھ چل دیا۔ لال کوٹھی واقعی ایک عجوبہ تھی۔ وہ ایک دیہی علاقے میں واقع تھی لیکن اس کی تعمیر کسی پرانی مغلیہ عمارت جیسی تھی۔ لمبی لمبی راہداریاں' غلام گردشیں' بڑے بڑے چوکور کمرے جن میں سے کچھ ہوادار اور کچھ اتنے تاریک کہ دن میں بھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اس لال کوٹھی میں بہت سے تہ خانے تھے اور جابجا ایسے چھوٹے چھوٹے صحن بھی تھے جن میں ہوا کا گزر ہوتا تھا اور نہ دھوپ کا۔ عمارت کا اندرونی حصہ بے حد پُرپیچ تھا' بالکل گورکھ دھندے کی طرح۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کدھر سے جا رہے ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں۔ دالانوں کے اندر دالان تھے اور کمروں کے اندر کمرے گھسے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ان کمروں کی محفوظ تنہائی میں چوہدری بخت اور اس کے باپ دادا کیا کیا کرتے رہے تھے اور آئندہ یہاں کیا کچھ ہونا تھا۔ لال کوٹھی کے اندرونی حصے میں ایک بہت بڑا مستطیل کمرا تھا۔ یہاں فرش پر چاندنی بچھی تھی اور ریشمی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں موجود آلاتِ موسیقی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں راگ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑی پینٹنگ نے میری توجہ خاص طور سے اپنی طرف مبذول کی۔ یہ ایک نرم و نازک مغنیہ کی تصویر تھی۔ مغنیہ کی گردن غیر معمولی طور پر لمبی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیاں ستار کے تاروں پر تھیں اور وہ بہت ڈوب کر کوئی گیت گا رہی تھی۔ ایک نوجوان جو اپنے حلیے اور لباس سے "تخت ہزارے" کا رانجھا نظر آتا تھا' مغنیہ پر جھکا ہوا تھا اور اس کی لمبی گردن کو بوسہ دے رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ تصویر ایک "فن پارہ" ہونے کے ساتھ ساتھ چوہدری بخت کے مزاج کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ وہ "اچھی آواز" کے ساتھ ساتھ "اچھی آواز والیوں" کا بھی شیدائی تھا۔ ہم دیر تک لال کوٹھی میں گھومتے رہے۔ روشنی کا پاؤں ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا' وہ لنگڑاتی ہوئی ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔

○☆○

دوپہر کے وقت میں لال کوٹھی کے فون سے لاہور رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں ساہی صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے گھر کا فون مل رہا تھا نہ آفس کا۔ تھک ہار کر میں نے غزالہ کے فون نمبر کے لیے کال بُک کرا دی۔ کال بُک کرانے کے بعد میرے دورانِ خون میں اضافہ ہو گیا۔ ایک مدت کے بعد میں غزالہ یا چچی فاخرہ کی آواز سننے والا تھا۔ غزالہ جو میرے جسم کی روح تھی اور چچی فاخرہ جو میری روح کا کرب تھی۔ دونوں ماں بیٹی نے کتنے مختلف انداز میں متاثر کیا تھا میری زندگی کو۔ میں یادوں کے اسی پُرشور دریا میں غرقاب ہو گیا جس کا سرچشمہ غزالہ کا نام تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد جب گھنٹی بجی تو ایک دم دل

میں سرکش دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ آپریٹر نے فون نمبر پوچھنے کے بعد کہا "لیجیے لاہور سے بات کیجیے۔"

"ہیلو کون؟" دوسری طرف سے وہی مترنم آواز ابھری جو میرے دل و جان کو ہلا رہی تھی "ہیلو کون" پھر پوچھا گیا۔

"میں نے مستحکم لہجے میں کہا "میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

"کون؟" بے حد تحیر سے پوچھا گیا۔ پوچھنے والی کی آواز میں ایک عجیب لرزش پیدا ہو چکی تھی۔

"میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔" میں نے اپنے الفاظ دہرائے۔

دوسری طرف ایک دم سناٹا طاری ہو گیا۔ بس ایک تیز سانس کی آواز تھی جو کچھ سمجھا رہی تھی اور شہ بتا رہی تھی۔ پھر ماؤتھ پیس کو ہاتھ سے ڈھانپ لیا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوسری آواز ابھری جو میرے کانوں میں شہد کے بجائے تیزاب ٹپکاتی تھی۔ یہ چچی فاخرہ کی آواز تھی "کون ہے؟" بے حد چوکنے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

اس آواز کا تیزاب میرے جسم کی تمام رگوں میں دوڑ گیا۔ میں نے اتنے زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخا کہ اونگھتا ہوا زریں گل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "کیا ہوا استاد صیب؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"خو چے اس کچھ نہیں کا مطلب یہ ہے کہ کچھ ہوا ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے آج لاہور جانا پڑے گا۔ کافی کوشش کے بعد بھی ساہی صاحب سے رابطہ نہیں ہو سکا۔"

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ کر بولا "لیکن موسم تو بڑا خراب ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی۔ پھر اس کا کچا راستہ کیچڑ سے بھر جائے گا۔"

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا' بارش کے آثار تو واقعی موجود تھے۔ اسی دوران میں دوپہر کا کھانا آ گیا۔ چچی فاخرہ کی کرخت و عیار آواز سننے کے بعد طبیعت اتنی بدمزہ تھی کہ کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ بہرحال میز پر تو بیٹھنا ہی تھا۔ کھانے کے بعد ملائی اور الائچی والی سبز چائے کا دور چلا' اسی دوران میں زریں گل کی پیش گوئی کے عین مطابق بارش شروع ہو گئی۔

چوہدری بخت بولا "مہمانو! یہ جمعرات کی جھڑی ہے۔ اس جھڑی کو پرانے لوگ سوت کی لڑی کہتے ہیں۔ جب شروع ہوتی ہے تو پھر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مطلب یہ ہے کہ اب دو چار روز تم لوگ یہاں سکون سے گزارو' خاطر مدارات کراؤ اور آرام کرو۔ آج رات ہم تمہیں اپنی پیاری پیاری بی بی کا بہت پیارا گانا بھی سنائیں گے۔"

اس رات لال کوٹھی کے اندرونی ہال۔۔۔۔ میں گانے کی محفل جمی۔ گلدانوں میں گلاب کے سرخ پھول مہک رہے تھے' اگربتیاں جل رہی تھیں اور صاف ستھری جوان نوکرانیاں ہاتھوں میں گجرے سجائے اپنے رنگین پراندے پر اسرار مسکاتی پھر رہی تھیں۔ ان نوکرانیوں میں مجھے وہ نوعمر لڑکی بھی نظر آئی جسے کل سہ پہر صفیہ بیگم نے بے دردی سے پیٹا تھا۔ اس کی کلائیوں میں اب نئی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پنجابی طرز کا چکن اور شلوار کرتہ پہنے ہوئے تھی اور خوش نظر آ رہی تھی۔ مٹھائی والی تھالی لے کر وہ صفیہ بیگم کے پاس سے گزری تو صفیہ بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کے بالوں کا جوڑا درست کیا اور شفقت آمیز لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے کل کے سنگدلانہ رویے پر وہ خود بھی شرمندہ ہے۔ وہ اس مزاج کی عورت نہیں لگتی تھی۔ معلوم نہیں کل اسے کیا ہوا تھا۔

موسیقی کی یہ محفل قریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ پہلے لال کوٹھی کے دو فن کار ملازموں نے چمٹے پر ٹپے وغیرہ گائے۔ پھر تین لڑکیوں نے ڈھولکی پر شادی بیاہ کے گیت گائے اور رقص کا مظاہرہ بھی کیا۔ روشنی نے بھی ایک فلمی گیت سنایا۔ اس کی آواز رسیلی تھی مگر کانپتی راجی سی تھی۔ آخر میں صفیہ بیگم نے محفل لوٹ لی۔ اس نے اپنی آواز کے جادو سے چوہدری سمیت سب کو مسحور کر دیا۔ لوک گیتوں کے علاوہ اس نے دل سوز آواز میں ہیر بھی سنائی۔ ہیر سناتے ہوئے اس کی آواز درد سے کراہ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنے سینے میں غم کا کوئی سمندر چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی آواز سن کر مجھے وہ گیت بھی یاد آیا جو کل رات لال کوٹھی کے کسی حصے سے ابھرا تھا اور در و دیوار میں گونجنے لگا تھا۔ یقیناً وہ گیت بھی صفیہ بیگم ہی گا رہی تھی۔

یہ اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ جمعرات کی جھڑی واقعی سوت کی لڑی ثابت ہو رہی تھی۔ ہر طرف پانی بہہ رہا تھا۔ لال کوٹھی سمیت اس گاؤں کا رابطہ ارد گرد کے علاقے سے کٹا ہوا تھا۔ راستے بند' ٹیلی فون بند' بجلی بند۔۔۔ لال کوٹھی میں جنریٹر موجود تھا ورنہ مصیبت ہو جاتی۔ لال کوٹھی کے اصطبل کی طرف سے کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں۔ یہ بڑے خونخوار قسم کے کتے تھے اور رات کو ہی نہیں' دن کے وقت بھی پہرے پر موجود رہتے تھے۔

زرغونہ میرے ساتھ چپٹ کر لیٹی ہوئی تھی اور کہانی سن رہی تھی۔ ان دو ستاروں کی کہانی جو دور دراز پہاڑوں سے چل کر ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچ گئے تھے اور ہر دم زمین کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ وہ اپنی پیاری بیٹی کو دیکھتے تھے اور جب وہ مسکراتی تھی تو وہ بھی مسکرانے لگتے تھے۔۔۔۔ اچانک میں چونک گیا۔ زریں گل تیز قدموں سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی کہنے لگا "استاد صیب! ام ایسی بے غیرتی برداشت نہیں کر سکتا۔ ام اس چوہدری صاحب کا کھوپڑا توڑ دے گا۔ بعد میں جو بھی ہو گا' دیکھا جائے گا۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟"

"یہ پوچھو جناب' کیا نہیں ہوا۔" وہ آواز دبا کر بولا "وہ چوہدری کا بچہ۔۔۔ روشنی کو اٹھا کر اپنے بیڈروم میں لے گیا ہے۔

ام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہے۔"

"اٹھا کر لے گیا ہے۔۔۔؟ کیا مطلب ہے؟"

"اٹھا کر لے جانے کا مطلب یہی ہے کہ اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس بدبخت نے امارے سامنے لڑکی کو کندھے پر اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔"

"کیا بک رہے ہو زریں گل؟"

"ام کو پتا تھا' آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ خود ام کو بھی نہیں آیا تھا۔ ام ٹہلتا ہوا پچھلے کمروں کی طرف چلا گیا تھا۔ ام کو چوہدری کے ہنسنے کی آوازیں آیا۔ یہ آوازیں اسی کمرے سے آ رہا تھا جہاں کل ام نے گانا بجانا سنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چوہدری نشے میں تھا۔ ام نے ایک کھڑکی میں سے دیکھا' وہاں چوہدری کے علاوہ روشنی اور اس کی خالہ بھی موجود تھا۔ چوہدری ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہا تھا جیسے اسے کسی کا ڈر خطرہ ہی نہ ہو۔ وہ روشنی کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ روشنی بی بی کشش و پنج میں تھا۔ کبھی چوہدری کی طرف دیکھ رہا تھا' کبھی خالہ کی طرف۔ پھر خالہ نے کہا "چلی جاؤ بیٹا' چوہدری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔" روشنی بی بی چوہدری کے ساتھ چل رہا۔ روشنی کا خالہ بولا "چوہدری صاحب! ذرا خیال رکھنے گا' بچی ہے۔" چوہدری بولا کہ امارا دل' اماری جان' اماری آنکھیں سب اس کے قدموں میں ہے۔ روشنی بی بی ذرا سا لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ چوہدری نے اسے بازوؤں میں اٹھا لیا اور ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ام تو یہ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گیا ہے۔ ایسا بیہودہ دلیری' ایسا بے خوفی۔"

زرغونہ اردو نہیں جانتی تھی لہٰذا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بس لحاف میں بیٹھی یک ٹک ہماری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ میں نے زریں گل کو اس کے پاس چھوڑا اور روشنی کی خالہ مہتاب بانو کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ میں کیا سن رہا ہوں مہتاب بانو۔۔۔۔۔ روشنی کہاں ہے؟"

وہ بولی "جب تم جان ہی گئے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ چوہدری صاحب اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"کیوں کیا ہے تم نے ایسا؟"

"نہ کرتی تو کیا کرتی۔ جان گنوا لیتی اپنی بیٹی کی اور اپنی بھی؟ یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ اس حویلی میں وہی کچھ ہو گا جو چوہدری صاحب چاہیں گے۔"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ چوہدری نے زبردستی کی ہے۔" میری رگوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

"زبردستی کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بھاجی۔۔۔ اگر ہم۔۔۔۔"

مہتاب کی بات ادھوری رہ گئی۔ کرم دین دروازے پر نظر آیا۔ اس نے کہا "جناب! میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ ایک منٹ کے لیے میری بات سن سکتے ہیں؟"

کرم دین کا معنی خیز انداز دیکھ کر میں ٹھٹکا اور اس کی بات سننے کے لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ کرم دین مجھے برآمدے میں لے گیا۔ یہاں ہوا ٹھنڈی تھی اور گارڈینیا کے پتوں پر بارش کے گرنے سے مسلسل آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ایک بڑے ستون کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کرم دین بہ آہستگی بولا "ماسٹر شاہ جہاں! آپ کس فریبی عورت سے بات کر رہے ہیں۔ اس نے چوہدری صاحب سے لمبے نوٹ لیے ہیں۔ پچاس ساٹھ ہزار سے کم کیا کمائے ہوں گے اس نے۔۔۔۔ میری گھر والی نے خود دیکھا ہے چوہدری صاحب کو سیف سے نئے نوٹوں کی گڈیاں نکالتے ہوئے اور اس "فرازن" کے کمرے میں جاتے ہوئے۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں جی! یہ لوگ ہوتے ہی بکنے کے لیے ہیں۔ فلموں میں کام شام کرنے کا تو بس بہانہ ہوتا ہے ورنہ ان کی اصل آمدنی یہی ہوتی ہے۔ جتنا بڑا نام ہوتا ہے' اتنی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ اب دیکھ لیں' ہم ساری زندگی بھی لگے رہیں تو پچاس ساٹھ ہزار نہ کما سکیں۔ یہ بڈھی بھینس دو چار روز میں کما کر لے جائے گی۔ لعنت ہے ایسی کمائی پر۔"

میں مہتاب کی دیدہ دلیری اور عیاری پر حیران ہو رہا تھا۔ صبح تک وہ کہہ رہی تھی کہ چوہدری کو اپنی بچی کی طرف آنکھ بھی اٹھانے نہیں دے گی اور اب نوٹ گننے کے بعد اسے خود چوہدری کے ساتھ روانہ کر چکی تھی۔ چوہدری کی بے باکی اور سینہ زوری بھی قابل داد تھی۔ وہ اپنی دو بیویوں اور درجنوں ملازموں کی موجودگی میں کھل کھیل رہا تھا۔ کرم دین کی بات سن کر اور اس سے مل کر مجھے یقین ہو گیا کہ روشنی اور مہتاب بانو سے کوئی زبردستی نہیں کی گئی ہے۔۔۔ اور اس یقین کے بعد میری پریشانی بھی ایک دم سو سے صفر پر آ گئی۔

مہتاب کے مکروہ چہرے پر نگاہیں ڈالے بغیر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ کرم دین بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ میری واپسی تک زریں گل زرغونہ کو سلا چکا تھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ہم دونوں انگیٹھی کے نزدیک بیٹھ گئے۔ میں نے کرم دین سے کہا کہ دروازہ بند کر کے وہ بھی آ جائے۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد ہمارے پاس آ بیٹھا۔

میں نے کرم دین سے پوچھا "چوہدری کی بیویاں چوہدری کی ان خرمستیوں کو چپ چاپ برداشت کر لیتی ہیں؟"

وہ بولا "بڑی بیوی کو تو آپ کسی گنتی میں ہی نہ لائیں۔ وہ اتنی سوئی اور سست ہو چکی ہے کہ اسے اپنے آپ سے ہی فرصت نہیں۔ باقی رہیں بیگم جی' تو انہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔ نو دس سال پہلے وہ چوہدری کے لیے "سب کچھ" چھوڑ کر یہاں چلی آئی تھیں۔ اب چوہدری انہیں چھوڑ کر "سب کچھ" کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتی ہیں لیکن "سی" نہیں کرتیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ چوہدری کی ہر بات مانتی ہیں' یہاں تک کہ کبھی کبھی چوہدری کی عیاشی کے لیے آنے والی عورتوں کو اپنے ہاتھ سے سجاتا

کر چوہدری کے کمرے میں بھیجتی ہیں۔ آپ کی اطلاع کے عرض ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ چوہدری کے حکم پر فرسٹ ایکسپریس روشنی کو گوٹے کناری والا لال جوڑا پہنا رہی تھیں...... لال رنگ بڑا پسند ہے ہمارے چوہدری جی کو۔ ان کا بس چلے تو اپنے گلے دوالے کی ہر شے کو لال رنگ کرا دیں۔"

میں کرم دین کی باتیں سن رہا تھا اور اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا۔ ایک نقاہت اور لاتعلقی سی دل و دماغ میں سرایت کر گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ یہ حویلی جتنی پیچیدہ ہے اتنے ہی پیچیدہ اس کے لوگ بھی ہیں۔

تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھ کر کرم دین واپس چلا گیا۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ حویلی کا کوئی فرد اسے ہمارے پاس دیکھ لیتا تو خواہ مخواہ شک میں پڑ جاتا...... زریں گل ابھی تک غصے میں تھا۔ انگیٹھی کی روشنی میں اس کا سرخ چہرہ کچھ اور بھی سرخ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا "تم ہر وقت فلم والوں کی باتیں کرتے رہتے ہو۔ دیکھ رہے ہو فلم والوں میں کیسے کیسے بُرے لوگ بھی ہوتے ہیں۔"

وہ بیزاری سے بولا "اور بڑا بڑا اچھا لوگ بھی تو ہوتا ہے۔ آپ لالہ سدھیر کو، بدر منیر کو، محمد علی صاحب کو کیوں بھول رہا ہے...... لو وحید مراد صاحب...... وہ تو ام کو بالکل فرشتہ لگتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں فلمی لوگوں میں سے ایسے لوگوں کو تو فرشتہ ہی کہنا چاہیے۔"

وہ بولا "آپ پھر کوئی ہیر پھیر والا بات کر گیا ہے لیکن ام اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہے۔"

وہ اٹھ کر بستر پر لیٹ گیا اور گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں وہیں آگ کے سامنے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ طبیعت سخت مکدر ہو رہی تھی۔ پیکٹ میں صرف تین سگریٹ تھے، وہ ختم ہو گئے تو میں نے فالیدہ وزفونہ کو کندھے سے لگایا اور ینگ من کے پاس چھوڑنے ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔ مہتاب بانو سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھی یا سو رہی تھی۔ ینگ ابھی جاگ رہی تھی۔ چوہدری کی فطرت کا علم ہونے کے بعد ضروری تھا کہ ینگ اپنی طرف سے ہوشیار اور چوکس رہتی۔ میں نے ینگ کو سمجھایا کہ وہ رات کے وقت کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھے اور کسی اجنبی کے لیے دروازہ نہ کھولے۔

میں واپس روانہ ہوا تو ہال نما کمرے کی جانب سے ستار کی مدھم آواز سنائی دی۔ کوئی کومل سُروں میں بڑی آہستگی کے ساتھ ستار بجا رہا تھا۔ میرے قدم اس طویل راہداری کی طرف مڑ گئے جس کے آخری سرے پر "راگ رنگ" کا ہال نما کمرا موجود تھا۔ کمرے کا منقش دروازہ ادھ کھلا تھا۔ سفید چاندنی پر ہلکی زرد ضیا روشنی میں ایک اداس مورتی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس کی انگلیاں درد بھرے انداز میں ستار کے تاروں پر گردش کر رہی تھیں۔ شاید اس کے پورے جسم میں صرف یہ انگلیاں ہی تھیں جن میں زندگی کے آثار تھے۔ یہ چوہدری بخت کی اہلیہ صفیہ بیگم تھی۔ وہ جو دھن بجا رہی تھی وہ میں اٹک جیل میں کئی بار سن چکا تھا۔ اس کے بول کچھ اس طرح تھے "کدی آ مل رانجھن رے، میں دکھ نیر بہانواں۔ ایتھے سب پیر سے دیری وے کنہوں اپنا حال سنانواں" اٹک جیل کی تنہائی بیرکوں میں یہ قیدیوں کا پسندیدہ ترین گیت تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا جیسے یہ لال کوٹھی بھی ایک جیل ہے جس کی صاف ستھری بیرک میں بیٹھ کر صفیہ بیگم یہ گیت الاپ رہی ہے۔

میری آہٹ سن کر وہ ایک دم چونک گئی تھی۔ تاروں پر اس کی انگلیاں رک گئیں اور وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ اتنی رات گئے میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔

میں نے کہا "معافی چاہتا ہوں جی...... آپ کے ستار کی آواز مجھے یہاں لے آئی۔ آپ بہت اچھا بجاتی ہیں۔"

"شکریہ۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"ضرور بیٹھئے لیکن میں کسی کی موجودگی میں بجا نہیں سکتی۔"

"لیکن کل رات آپ نے گیت تو سنائے تھے۔"

"وہ اور بات تھی۔"

اسی دوران میں میں جوتے اتار کر اندر آ چکا تھا۔ یونہی بات چلانے کے لیے میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں نے چند سال پہلے آپ کو ٹیلی وژن پر بھی دیکھا ہے۔ کوئی بلیک اینڈ وائٹ پروگرام چل رہا تھا۔"

"یہ سب گئے زمانے کی باتیں ہیں بھائی صاحب!" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی "اب تو یہ حویلی، یہ گاؤں اور یہاں کے لوگ ہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔"

میں نے کہا "معاف کرنا جی، ذرا ذاتی قسم کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ زندگی میں...... آپ نے بہت صدمے اٹھائے ہیں اور ان صدموں اور دکھوں نے آپ کی آواز میں ایک خاص درد بھر دیا ہے۔"

وہ بولی "بھائی صاحب! صدمے اور دکھ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے۔"

میری نگاہ راہداری پار کر کے اس دروازے پر جم گئی جس کے پیچھے لمبا تڑنگا چوہدری بخت، مختصر مختصری لیکن خوب صورت روشنی کے ساتھ موجود تھا۔ ایک عورت کے لیے اس بند دروازے کا منظر کتنا درد انگیز ہوتا ہے جس کے پیچھے اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا ہے۔ میرے دل میں آئی کہ اس دروازے کی طرف اشارہ کروں اور کہوں "میں ان صدموں کی بات کر رہا ہوں صفیہ بیگم! جو اس بند دروازے کے پیچھے رینگتی اندھیرے میں تمہارے لیے جنم لیتے ہیں۔" لیکن یہ بات بالکل ذاتی

ہو جاتی لہٰذا میں زبان پر نہ لا سکا۔

صفیہ بیگم کی ذہین نگاہیں جیسے میرے سینے سے پار ہو گئیں اور انہوں نے میرے دل میں جھانک لیا۔ وہ بولی "آپ کا اشارہ جن دکھوں کی طرف ہے، میں سمجھ رہی ہوں لیکن میں انہیں دکھ نہیں سمجھتی ہوں۔ شاید انہیں دکھ سمجھنا بھول گئی ہوں۔ یہ واقعات تو میری روز مرہ کی زندگی میں شامل ہو چکے ہیں اور میرے جیسی ہر چوہدرائن کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ چوہدری صاحب مجھے ہر ایک سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں میری جو جگہ ہے وہ صرف میری ہے۔"

"مگر یہ سب کچھ......"

"آپ کسی اور ماحول کی بات کر رہے ہیں، ہم کسی اور ماحول کے رہنے والے ہیں۔ یہاں تو یہ سب کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔"

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے؟"

"میرے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو یہاں مدتوں سے ٹھیک ہے، وہ اب بھی ٹھیک ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔"

"پھر آپ کس وجہ سے دکھی اور......"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ صفیہ بیگم چونک کر کوئی آواز سننے لگی تھی۔ میں نے بھی غور کیا تو یہ مدھم آواز میری سماعت تک پہنچ گئی۔ یوں لگا جیسے کوئی ہلکے سے کراہا ہے پھر مختلف آہٹیں سنائی دینے لگیں جیسے دو افراد آپس میں دھینگا مشتی کر رہے ہوں۔ یہ آوازیں کسی قریبی کمرے سے سنائی دے رہی تھیں۔ صفیہ بے تاب ہو کر اٹھی اور ہال...... سے نکل کر ننگے پاؤں آوازوں کی سمت بڑھی۔ اسے اپنے دوپٹے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا جو فرش پر گھسٹتا جا رہا تھا۔ میں بھی غیر ارادی طور پر صفیہ بیگم کے ساتھ چل دیا۔ جوں ہی ہم ایک سنسان راہداری میں مڑے، آہٹیں زیادہ واضح سنائی دینے لگیں۔ صفیہ بیگم نے یکایک ایک دروازے کو دھکا دیا اور ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اندر آیا تھا۔ ڈور کلوزر نے دروازہ اپنے آپ بند کر دیا۔ کمرے کا منظر حیرت ناک تھا۔ دو افراد قالین پر گتھم گتھا تھے۔ ان میں سے ایک چوہدری بخت کا چھوٹا بھائی چوہدری ذیشان تھا، دوسرا ایک ہم عمر نوجوان تھا۔ چوہدری ذیشان بڑی وحشت کے عالم میں کسی شے سے اپنے مدِمقابل کا گلا دبا رہا تھا۔ میں نے دیکھا، یہ بجلی کا موٹا تار تھا۔ چوہدری ذیشان کا مدِمقابل اوندھے منہ پڑا تھا اور ذیشان اس کی پشت پر سوار تار سے اس کا گلا بھینچتا جا رہا تھا۔

صفیہ، ذیشان کو جھنجوڑنے لگی "چھوڑ دو...... چھوڑ دو اسے، کیا کرتے ہو۔ یہ مر جائے گا۔"

ذیشان نے کندھے کے زور سے صفیہ کو دور ہٹا دیا۔ صفیہ ایک بار لڑکھڑانے کے بعد بھرائی آواز میں ذیشان کی منت سماجت کرنے لگی۔ ذیشان پر درندگی سوار تھی۔ میں نے صفیہ کا ساتھ دیا اور اس کے ساتھ مل کر دونوں نوجوانوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ نیچے والا نوجوان سیدھا ہوا تو صفیہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ نوجوان کا بایاں پہلو خون سے تربتر تھا اور قالین بھی داغ دار ہو رہا تھا۔ یقیناً اسے کسی تیز دھار آلے سے زخم لگایا گیا تھا۔ پھر اس آلے پر بھی میری نظر پڑ گئی۔ یہ نو دس انچ لمبا چیچ کس تھا جو شیشے کی ٹوٹی ہوئی تپائی کے قریب پڑا تھا۔ چیچ کس کا اگلا حصہ خون آلود نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا کر دیا تم نے۔ یہ کیا کر دیا ذیشان۔" صفیہ خوف سے لرزتی آواز میں بولی۔

مضروب نوجوان نیم بے ہوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور گلے سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ چوہدری ذیشان اب پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا مگر اس کی خوں خوار نظریں ابھی تک زخمی نوجوان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی چند لمحے بعد پھر نوجوان پر پل پڑے گا اور اس کے جسم سے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لے گا۔ شاید صفیہ نے بھی خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے جلدی سے خون آلود چیچ کس اٹھایا اور اسے ایک اونچی الماری کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک بار پھر ہراساں نظروں سے زخمی نوجوان کو دیکھنے لگی۔ نوجوان کے گلے سے اب آواز نکلنا بند ہو گئی تھی۔ صفیہ کانپ کر بولی "ہائے اللہ، اب کیا ہوگا۔ اگر یہ مر گیا تو......"

"بڑا ڈھیٹ تخم ہے اس کا۔ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔" چوہدری ذیشان پھنکار کر بولا۔

"خون تو دیکھو کتنا نکل گیا ہے۔" صفیہ رو دینے کے قریب تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا اسے، ذرا سا زخم آیا ہے وکھی (پہلو) میں...... تم خواہ مخواہ واویلا شروع نہ کر دینا۔"

صفیہ ایک دم سہم کر چپ ہو گئی۔ ذیشان نے بڑی بے رحمی سے مضروب نوجوان کو ایک بار پھر اوندھا کر دیا۔ مجھ سے کہنے لگا "ادھر آ بھئی۔ اس کے دونوں بازو موڑ کر رکھ۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے الماری سے ایک ازار بند نکالا اور نوجوان کے ہاتھوں کو پشت پر بڑی مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں صفیہ سے کہا کہ وہ الماری سے دوسرا ازار بند ڈھونڈے۔ ڈری سہمی صفیہ نے کسی معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ایک ریشمی ازار بند ڈھونڈ لائی۔ اس ازار بند سے نوجوان کے پاؤں باندھے گئے۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

"اندر غسل خانے سے کپڑا لا کر یہ خون صاف کرو اور پھر اس پر غالیچہ بچھا دو۔" ذیشان نے صفیہ کے لیے نیا حکم جاری کیا۔

صفیہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اثبات میں سر ہلایا اور کپڑا لینے کے لیے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

رشتے کے لحاظ سے وہ ذیشان کی بھابی تھی لیکن وہ اسے بڑے رعب سے مخاطب کر رہا تھا۔ وہ بھی ذیشان سے مرعوب نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ اس منظر کا نتیجہ تھا جو ہمارے سامنے تھا۔

صفیہ کپڑے سے قالین صاف کرتے ہوئے لرزاں آواز میں بولی "آپ کیا کرنے لگے ہو اس کے ساتھ؟"

"تہ خانے میں لے جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"ایسوں کے لیے ایسی جگہیں ہی ٹھیک ہوتی ہیں۔"

"لل..... لیکن ہوا کیا تھا؟"

"بہت کچھ ہوا تھا۔ ابھی ٹھہر کے بتاؤں گا۔"

پھر وہ بڑے اکھڑ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "چل بھئی..... تو ذرا میری مدد کر..... اس کو کندھے پر اٹھا اور میرے ساتھ آ۔"

اس کے حاکمانہ انداز نے میرا خون کھولا دیا لیکن یہ موقع تن فن دکھانے کا نہیں تھا۔ میں نے چوہدری ذیشان کے ساتھ مل کر بے ہوش نوجوان کو کھڑا کیا اور کندھے پر لاد لیا۔ وہ خاصا صحت مند تھا۔ اس نے نفیس کپڑے کی نیلی شلوار قمیص اور دوسالی اسٹائل کی چمک دار واسکٹ پہن رکھی تھی۔ بالوں میں خوب تیل لگا ہوا تھا۔ جب میں نے اسے کندھے پر اٹھایا تو میری نگاہ اس کے ہاتھ کی پشت پر پڑی۔ یہاں اَن مٹ نیلی روشنائی سے چھوٹا سا پھول بنا تھا اور ایک نام لکھا ہوا تھا۔ یہ ذیشان کا نام تھا۔

چوہدری ذیشان نے اپنی سیاہ گرم چادر قالین سے اٹھائی اور جھاڑ کر دوبارہ کندھوں پر رکھ لی۔ اس کے چہرے پر بھی چوٹوں کے مدھم نشان نظر آ رہے تھے۔ اپنی قمیص کی جیبیں ٹٹول کر اس نے چابیوں کا ایک وزنی گچھا نکالا اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کی ہدایت جاری کی۔ کمرے کے ایک بغلی دروازے سے نکل کر ہم تنگ و تاریک راہ داری میں پہنچے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بلند و بالا راہ داری بہت کم استعمال کی جاتی ہے۔ اس لال کوٹھی میں ایسی راہ داریاں اور غلام گردشیں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک گورکھ دھندا تھا، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ خاموش راہ داری میں ہمارے قدموں کی آواز گونج رہی تھی اور ہم یوں آگے پیچھے چلے جا رہے تھے جیسے مالک کے پیچھے ایک ادنیٰ نوکر بوجھ اٹھا کر چلتا ہے۔ ایک مقام پر راہ داری ختم ہو گئی۔ یہاں دیوار پر سنہری دستوں والی دو بڑی بڑی برچھیاں کراس کی شکل میں آویزاں کی گئی تھیں۔ اس کراس کے عین نیچے تہ خانے کا دروازہ موجود تھا۔ ذیشان نے ایک لمبی چابی سے دروازے کا بھاری بھرکم قفل کھولا اور مجھے لے کر سیڑھیوں پر آ گیا۔ تاریک دیوار پر ہاتھ پھیر کر اس نے لائٹ کا سوئچ آن کیا تو تہ خانے کا منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ نیچی چھت والا یہ ایک نہایت محفوظ قسم کا تہ خانہ تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ایک اور بھاری بھرکم دروازہ موجود تھا۔ تہ خانے میں پرانے دیہاتی فیشن کے دو نواڑی پلنگ پڑے تھے اور چند ایک بوسیدہ لحاف نظر آ رہے تھے۔ نوجوان چوہدری کی ہدایت پر میں نے زخمی کو ایک پلنگ پر ڈال دیا۔

نوجوان چوہدری ذیشان کی آنکھوں سے انگارے دہک رہے تھے۔ غالباً میرے سمیت اسے اپنے اردگرد کی ہر شے چیونٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر جگر پاش نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "سگریٹ پیو گے۔"

"نہیں شکریہ!"

"پی لو یار!" اس نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "جاؤ وہاں الماری سے نکال لاؤ۔ نیچے والے لمبے دراز میں پڑے ہیں۔"

میں نے الماری کا نیچے والا طویل دراز کھولا۔ یہاں گولڈ لیف سگریٹ کا ایک پیکٹ اور چاندی کا لائٹر موجود تھا۔ یہ دونوں چیزیں دو بڑی بڑی سی تھری رائفلوں کے اوپر رکھی تھیں۔ رائفلوں کے ساتھ ان کے درجنوں راؤنڈ بھی موجود تھے۔ سگریٹ کا تو بہانہ تھا ورنہ چوہدری ذیشان نے مجھے اپنے "طور طریقوں" اور اپنی طاقت کی ایک جھلک دکھائی تھی۔

میں سگریٹ لے کر مڑا تو وہ بولا "میں بہت اچھا بندہ ہوں لیکن جب میرا دماغ گھوم جاتا ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں رہتا۔ تم بھائی جان کے مہمان ہو اور پہلے ہی بڑی مشکل کاٹ کر آئے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ایک اور بڑی مشکل میں پڑ جاؤ۔ اس کا ایک ہی حل ہے۔ تم کو اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں چھوٹے چوہدری! کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔"

"کچھ کچھ نہیں، پوری بات سمجھو۔" وہ ایک دم غرا کر بولا۔ اس کی آنکھیں دہک اٹھی تھیں "تم نے یہاں کچھ نہیں دیکھا۔ کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ایک بات..... ایک بات بھی تمہاری زبان سے نکلی تو پھر پچھتانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"میں کچھ نہیں بولوں گا چوہدری صاحب!"

"بولنا بھی نہیں اور سوچنا بھی نہیں" چوہدری کا پارا چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے جنونی انداز میں میرے بال مٹھی میں جکڑے اور سر کو ہلاتے ہوئے بولا "یہ جو بندے کا سر ہوتا ہے نا' یہ بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ اس میں چلنے والا کیڑا بندے کی مٹی خراب کراتا ہے اور کبھی کبھی کتے کی موت مرواتا ہے۔ بس زبان کے ساتھ ساتھ اس سر کو بھی قابو میں رکھنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانا ضروری سمجھا۔

زخمی نوجوان کو اٹھانے سے میرے کندھے پر بھی کچھ خون لگ گیا تھا۔ ذیشان نے مجھے ایک چادر دی تاکہ میں کندھے پر ڈال سکوں اور ہدایت کی کہ اپنے کمرے میں جاتے ہی میں یہ لباس بدل لوں۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ذیشان نے مجھے ایک سگریٹ پلایا اور پھر تہ خانے سے نکال کر دروازہ بند کر لیا۔

O☆O

اگلی صبح نو بجے روشنی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی نکھری نکھری اور چنچل چنچل نظر آتی تھی۔ تاہم آنکھوں کی "سرخی" رت جگے کی چغلی بھی کھا رہی تھی۔ یقیناً اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ہم اس کے رات کے "کاروبار" سے آگاہ ہو چکے ہیں لہٰذا وہ مجھ سے اور زریں سے آنکھ ملاتے ہوئے کترا رہی تھی۔ روشنی کے برعکس اس کی خالہ کے چہرے پر کسی طرح کی خجالت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اسی طرح چٹاخ پٹاخ باتیں کر رہی تھی۔ شاید اس کے نزدیک بیٹی کا رات بھر غائب رہنا ایسا ہی تھا جیسے وہ نائٹ شوٹنگ میں مصروف رہی ہو۔ چوہدری بخت کی مونچھیں آج کچھ زیادہ تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں کی آوارگی بھی پہلے سے سوا نظر آتی تھی۔ وہ بات بے بات قہقہہ لگاتا تھا اور اپنے ہاتھ کی پشت سونگھنے لگتا تھا جہاں اس نے کوئی تیز قسم کا عطر لگا رکھا تھا۔ وہ عام سے قد کی روشنی کے قریب بیٹھا طویل قامت جن لگتا تھا۔ چوہدری کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سنگین واقعے سے آگاہ ہے جو رات چھوٹے چوہدری ذیشان کے کمرے میں پیش آیا ہے اور چوہدری ہی کیا حویلی کے کسی بھی فرد یا ملازم کو دیکھ کر یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے۔ وہ سب بالکل ویسے ہی نظر آ رہے تھے جیسے کل تھے۔

آسمان اب بھی گہرے سیاہ بادلوں میں ڈھکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو جاتی تھی۔ الیکشن کی تیاری کے سلسلے میں چوہدری بخت نے ایک "میٹنگ" بلائی تھی۔ علاقے کے معززین کی یہ میٹنگ لال کوٹھی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں ہونا تھی۔ صبح ہی سے پجیرو، لینڈ کروزر، ہونڈا کاریں، جیپیں وغیرہ لال کوٹھی کے صحن میں جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ دس گیارہ بجے تک قریباً تیس افراد ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہو چکے تھے۔ کلف لگی شلوار قمیص' موٹی موٹی گردنیں' عذاب من فضل ربی قسم کی توندیں۔ چند ایک خالص دیہاتی لباس یعنی تہبند قمیص اور پگڑی میں بھی تھے۔ ان میں سے کئی کے گن مین اور حقے بردار بھی ساتھ تھے۔

جب چوہدری بخت اور ذیشان وغیرہ ان لوگوں سے طویل میٹنگ میں مصروف ہو گئے تو میں نے زرغونہ کو انگلی سے لگایا اور وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ رات والا واقعہ بار بار نگاہوں کے سامنے گھومتا تھا اور ذہن شدید الجھن کا شکار ہو جاتا تھا۔ ایک بات مجھے خاص طور سے حیران کر رہی تھی۔ رات میں نے زخمی نوجوان کے ہاتھ کی پشت پر ذیشان کا نام اَن مٹ روشنائی سے لکھا دیکھا تھا۔ صفیہ کی باتوں سے بھی یہ اندازہ ہوا تھا کہ زخمی نوجوان اور چوہدری ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں' پھر نجانے کیا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے ہو گئے تھے۔

اچانک میری نگاہ ان کشادہ سیڑھیوں کی طرف اٹھ گئی جو چھت کی طرف جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے آخری سرے پر مجھے صفیہ بیگم کی جھلک نظر آئی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ چھت کی طرف اوجھل ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ میں نے دو تین منٹ کا وقفہ دیا پھر زرغونہ کو ساتھ لے کر ٹہلنے والے انداز میں لال کوٹھی کی وسیع و عریض چھت پر پہنچ گیا۔ لال کوٹھی کی طرح چھت بھی بہت سے نشیب و فراز اور بہت سے حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کہیں چمنیاں نظر آ رہی تھیں، کہیں بُرجیاں اور کہیں ہموار چھتیں تھیں۔ ایک سائبان کے نیچے صفیہ کھڑی تھی اور بظاہر بارش کی رم جھم سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر زرغونہ کو پیار کیا اور اس کی تعریف میں ایک دو کلمات کہے' پھر ایک دم لہجہ بدل کر بے حد سنگین انداز میں بولی "بھائی صاحب! جتنی جلدی ہو سکتا ہے' آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ جانتے نہیں کہ کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ چھوٹا چوہدری بہت خطرناک شخص ہے۔ وہ زہری سانپ کی طرح ڈنک مارتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی یہاں رہنے کا شوق نہیں۔ ہم صرف موسم کی وجہ سے رُک گئے تھے۔"

وہ تیزی سے بولی "موسم کے چکر میں نہ پڑیں..... میں نے آپ سے جو کہنا تھا' کہہ دیا ہے" اس کے ساتھ ہی وہ بچی کو پیار کر کے تیزی سے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے الفاظ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا رہے تھے اور اس کا سنگین لہجہ خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ برساتی کے سائبان تلے گزارنے کے بعد میں بھی نیچے آ گیا۔

چوہدری بخت کی سیاسی میٹنگ میں شریک ہونے والے مہمانوں میں سے تین' رات گزارنے کے لیے لال کوٹھی میں ہی رک گئے تھے۔ شاید یہ ان کی "موجودگی" ہی تھی جس کے سبب رات کے کھانے میں خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ مچھلی اور بٹیر کا گوشت تھا' بکرے کی ران کی یخنی تھی اور گاجر کا اسپیشل حلوا تھا جس میں اُبلے ہوئے دیسی انڈے شامل کیے گئے تھے۔ کھانے کے بعد چوہدری اور اس کے قریبی دوست گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں چوہدری' روشنی کا تعارف اپنے دوستوں سے کرانے کا پروگرام نہ بنا لے۔ ظاہر ہے کہ ایک مشہور فلم ایکٹریس اس کی حویلی میں تھی اور وہ ایک رات پہلے اسے "فتح" کر چکا تھا۔ ایسے میں وہ شیخی بگھارنے پر مائل ہو سکتا تھا۔ ایسا ہوتا تو یہ ہم سب کے لیے خطرناک ہوتا۔ بہرحال خیریت گزری اور چوہدری نے ایسی کوئی حماقت نہیں کی۔

رات دس بجے کے بعد کرم دین سے پھر ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے اپنی ٹانگیں دبانے کے بہانے سے بلایا تھا۔ یہ ایک اچھا بہانہ تھا اور اس کی آڑ میں ہمیں دیر تک اور کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا..... کرم دین نے اپنے ایک عجیب و غریب شک کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ کبھی کبھی اسے لگتا ہے کہ صفیہ بیگم' چوہدری

صاحب کی منکوحہ بیوی نہیں ہے بلکہ رکھیل کی طرح اس گھر میں رہتی ہے۔ اس نے اپنے شک کے حق میں کئی ایک دلیلیں بھی دیں۔ ایک دلیل یہ تھی کہ چوہدری کی پچھلی بیوی یعنی چوہدرائن جی اپنے جہیز میں بے شمار جائداد لے کر آئی تھی۔ اگر کسی وجہ سے چوہدری، چوہدرائن کو طلاق دے دیتا ہے یا وہ خلع لے لیتی ہے تو چوہدری اس جائداد سے محروم ہو جائے گا کیونکہ وہ جائداد ابھی تک چوہدرائن کے نام ہے۔ اس کے علاوہ صفیہ بیگم کے بطن سے چوہدری کا کوئی بچہ نہ ہونا بھی اس بات کی علامت ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

نجانے کیوں کرم دین کی باتیں سن کر مجھے بھی یہ شک گزرنے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ چوہدری کا رویہ صفیہ سے ایسا نہیں تھا جیسا شوہر کا بیوی سے ہوتا ہے بلکہ ایسا تھا جیسے عاشق کا محبوبہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ گفتگو کے دوران میں اس نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ یہ میری بیوی ہے۔ وہ صفیہ کے لیے "ایل پی" یعنی لائف پارٹنر کا لقب استعمال کرتا تھا۔ چوہدری کی آٹھ دس سال پہلے کی ایک تصویر میں نے لال کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں دیکھی تھی۔ ان دنوں وہ بہت خوب صورت تھا اور یقیناً یہی وہ دور تھا جب اس نے صفیہ کو اپنے دامِ محبت میں پھنسایا تھا۔ وہ اپنا کیریئر، فن اور شہرت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چوہدری کے ساتھ اس حویلی میں اٹھ آئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری سے اس کی یہ غیر مشروط محبت ابھی تک برقرار ہے۔

اس حویلی کے سارے کردار بے حد الجھے ہوئے اور بھید بھرے تھے، بالکل اس حویلی کے پیچ و خم کی طرح..... اور ان میں سے ایک کردار چوہدری ذیشان کا بھی تھا۔ کرم دین کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ دونوں بھائیوں یعنی چوہدری بخت اور ذیشان میں گہرا سلوک ہے۔ وہ اکثر کام مشورے سے کرتے ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ چوہدری بخت میں تو تحمل آ چکا ہے لیکن چوہدری ذیشان بڑا گرم مزاج ہے۔ سب اس کی "ایک دم بھڑک جانے والی" طبیعت سے ڈرے رہتے ہیں۔ وہ بہت خاموش طبع ہے اور عام ملازموں سے بہت کم بات چیت کرتا ہے۔ میں نے کرم دین سے پوچھا "وہ لڑکا کون ہے جس کے بال گھنگھریالے ہیں اور جس کے ہاتھ پر ذیشان کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔"

"آپ نے اسے کب دیکھا تھا؟"

"شاید کل شام کو دیکھا تھا چھوٹے چوہدری کے کمرے میں۔" میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

"ان کا نام ملک ناظم ہے جی! چھوٹے چوہدری کے بڑے پکے دوست ہیں۔ نہر پار کے گاؤں "شادکی" کے رہنے والے ہیں۔ ناظم ڈیری فارم کا نام شاید آپ نے سنا ہو۔ یہ مشہور فارم ان کا ہی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا آج کل بھی دونوں میں دوستی ہے؟"

"یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔"

کرم دین بولا "یہ بڑی پرانی دوستی ہے جی۔ ویسے آج کل دونوں ذرا کم ہی ملتے ہیں۔ ناظم صاحب اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ وہاں ڈیڑھ دو ماہ رہ کر پچھلے ہفتے واپس آئے ہیں۔" پھر ذرا توقف سے بولا "ویسے آپ چھوٹے چوہدری سے زیادہ گل بات نہ کرنا، بالکل سر پھرے ہیں۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کب کیا کہہ دیں۔"

زریں گل بولا "ہمارا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا! ام کب کیا کر دے۔ تم اپنے چوہدری صیب کو ذرا باندھ کر رکھنا۔ وہ اماری ٹانگ پر منہ مارے گا تو ام بھی اس کا کھوپڑا توڑنے میں دیر نہیں لگائے گا۔"

"کیوں خان صاحب! کوئی بات ہو گئی ہے؟" کرم دین نے پوچھا۔

"بات تو کوئی نہیں ہوا لیکن وہ دیکھتا ام سب کو ایسے ہی ہے جیسے ام اس کے باپ کا نوکر ہو۔ اس کافر کی آنکھوں میں کسی کے لیے کوئی عزت ہی نہیں ہے۔"

"آہستہ بولیں جی! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" کرم دین نے تنبیہہ کی۔

پھر کرم دین کے واپس جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد زریں گل بھی سو گیا۔ میں وہیں انگیٹھی کے پاس نیم دراز ہو گیا اور دو روز پرانا اخبار دیکھنے لگا۔ یہ باسی اخبار بھی میرے لیے بالکل تازہ ہی تھا کیونکہ ہم قریباً تین ماہ ہر قسم کی خبروں سے دور رہے تھے۔ اس اخبار کی ہر خبر میرے لیے نئی تھی۔ ملک میں الیکشن کا شور و غل شروع ہو چکا تھا اور اس حوالے سے گرما گرم خبریں چھپ رہی تھیں۔

اخبار پڑھتے پڑھتے میں ایک دم چونک گیا۔ اخبار پر کسی کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، میرے سامنے چوہدری ذیشان کھڑا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا، گلے میں سونے کی موٹی زنجیر چمک رہی تھی۔ چوہدریوں کے مخصوص انداز میں اس نے سیاہ گرم چادر شانوں پر ڈال رکھی تھی۔

"السلام علیکم چوہدری صاحب!" میں نے کہا اور مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام..... تم تھوڑی دیر کے لیے فارغ ہو؟"

"اتنی رات گئے کیا کام ہو سکتا ہے جی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے دماغ میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔

"چلو آؤ ذرا میرے ساتھ۔ اس بندے کی تھوڑی سی مرہم پٹی کرنی ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ صفیہ کی وارننگ اور کرم دین کی باتوں کو مدِنظر رکھا جاتا تو اس وقت میں شدید خطرے میں تھا۔ مجھے چوہدری

ذیشان کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا لیکن یہ باتیں تو میں تب سوچتا جب مجھے خطرے سے بچنا ہوتا۔ میں نے جیکٹ پہنی اور خاموشی سے چوہدری کے ساتھ چل دیا۔ نوجوان چوہدری کے ہر انداز سے نخوت اور برتری کا احساس جھلکتا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں اس علاقے کا سب سے اتھرا اور خطرناک چوہدری تھا۔

حویلی کے ایک بغلی دروازے سے وہ مجھے صحن میں لے آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا بند صحن تھا۔ گملوں میں لگی چھوٹی کھجوروں کے پتوں پر تواتر سے بارش کی بوندیں گر رہی تھیں۔ ہم دوسری طرف والے دروازے میں داخل ہوئے اور تھوڑا سا چل کر اس تہ خانے کے بھاری بھرکم دروازے پر پہنچ گئے جہاں کل رات ہم نے زخمی ملک ناظم کو پہنچایا تھا۔ درحقیقت آج ہم ایک شارٹ کٹ راستے سے آئے تھے۔ یہ شارٹ کٹ اتنا "شارٹ" تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ درحقیقت یہ لال کوٹھی ایسے ہی "گھماؤ پھراؤ" راستوں سے بھری ہوئی تھی۔ چوہدری ذیشان نے بھاری بھرکم دروازے کا قفل کھولا اور ہم زینے طے کر کے اور دوسرا دروازہ کھول کر نیم روشن تہ خانے میں آ گئے۔ چوہدری ذیشان نے بالائی دروازے کی طرح نیچے والا دروازہ بھی اندر سے بولٹ کر دیا..... میرے سامنے پلنگ پر ملک ناظم کی لاش پڑی تھی۔ وہ مر چکا تھا..... میں نے چونک کر چوہدری کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔

"یہ..... یہ کیا ہے چوہدری صاحب۔ یہ بندہ تو مر چکا ہے۔"

"ہاں، مر گیا ہے کتی کا بچہ..... خون زیادہ نکل گیا تھا۔ دوپہر کے وقت ختم ہو گیا۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ مرہم پٹی کرنی ہے۔"

"غلط کہا تھا میں نے..... دراصل اس کی لاش ٹھکانے لگانی ہے۔"

"کک..... کیسے جی؟"

"وہ دیکھو اوپر پڑچھتی پر۔ وہ بڑا سا جستی صندوق پڑا ہے نا، وہ نیچے اتار لاؤ۔"

میں نے دیکھا۔ چوہدری جسے پڑچھتی کہہ رہا تھا وہ گیلری تھی۔ اس پر بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ رنگین شیشوں والی ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں، گلے سڑے قالین، ناکارہ پنکھے، عمر رسیدہ کرسیاں، گھوڑوں کے پرانے ساز اور ان سب کے درمیان وہ بڑا جستی ٹرنک جسے عرفِ عام میں پیٹی بھی کہا جاتا ہے۔ چوہدری مجھے یہی پیٹی اتارنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کا ارادہ واضح تھا۔ وہ مقتول ملک کی لاش کسی لحاف وغیرہ میں لپیٹ کر اس پیٹی میں بند کر دیتا اور یہ پیٹی اس تاریک تہ خانے کے کسی تاریک ترین گوشے میں پڑی رہتی۔ یہ تہ خانہ اس لاش کے لیے ایک گہری قبر سے بھی زیادہ محفوظ تھا۔ ایسے ان گنت تہ خانے اس حویلی میں موجود تھے اور ان میں سے نجانے کتنے ایسے تھے جنہیں مدتوں سے کھولا نہیں گیا تھا۔

میں انجان بچہ نہیں تھا۔ چوہدری کے تاثرات دیکھ کر اور اس کے لہجے میں چھپی ہوئی سفاکی پڑھ کر بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ گیلری میں پڑے ہوئے اس جستی صندوق میں آج دو لاشیں بند کی جائیں اور ان میں ایک لاش میری ہو۔ تہ خانے میں داخل ہونے کے بعد چوہدری ذیشان کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک نمودار ہو چکی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ مستقل طور پر اپنی گرم چادر کے نیچے تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس ہاتھ میں ریوالور یا ماؤزر وغیرہ ہے۔

لوہے کی ایک زنگ آلود سیڑھی گیلری سے لگی ہوئی تھی۔ چوہدری نے مجھے حکم دیا کہ میں سیڑھی چڑھ کر پڑچھتی پر چلا جاؤں اور کاٹھ کباڑ ہٹا کر صندوق نیچے اتار لاؤں۔ میں اب تک ہر حکم کی تعمیل بے چون و چرا کر رہا تھا لیکن اب میں نے تھوڑا سا اڑنا ضروری سمجھا۔

میں نے کہا "چوہدری جی! یہ تو سراسر غیر قانونی کام ہے۔ میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہ کرائیں۔"

"تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔" وہ جھنجلا کر بولا "ہمارے ہوتے تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"لیکن یہ پولیس والے تو جی....."

"بکواس بند کرو۔" چوہدری نے ایک دم چیخ کر میری بات کاٹی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور والا ہاتھ گرم چادر سے باہر نکال لیا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ یہی شعلہ فشاں آنکھیں میں نے کل بھی دیکھی تھیں۔ "چلو..... اوپر چڑھو سیڑھی کے۔" وہ ایک غلیظ گالی دے کر بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے پہلو میں ٹانگ رسید کر دی۔

وہ اپنے اصل روپ میں آ گیا تھا اور میں اس کا یہی روپ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس تہ خانے میں یوں گرج برس رہا تھا جیسے اس لال کوٹھی میں ہم دونوں کے سوا کوئی موجود ہی نہیں۔ اسے ذرا بھی اندیشہ نہیں تھا کہ اس کی آواز کوئی سن لے گا۔ اس کا اعتماد بجا تھا۔ یہ تہ خانہ خاصی گہرائی میں واقع تھا اور لال کوٹھی کے ایک سنسان حصے میں تھا۔ لکڑی کے دو بھاری بھرکم دروازوں نے اسے قریباً قریباً ساؤنڈ پروف بنا رکھا تھا۔

چوہدری کے خطرناک اشاروں کی تعمیل کرتے ہوئے میں سیڑھی چڑھ کر سیلن زدہ گیلری میں پہنچ گیا۔ کاٹھ کباڑ ہٹانے اور رسی سے باندھ کر صندوق نیچے اتارنے میں مجھے قریباً آدھ گھنٹا لگ گیا۔ چوہدری ذیشان اس دوران میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا رہا اور گولڈ لیف سگریٹ پھونکتا رہا۔ گیلری میں سے میں نے دیکھا کہ چوہدری کے قریب ہی ایک "بیگ" بھی پڑا ہے۔ میں یہ خوب صورت ہینڈ بیگ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ فلم اسٹار ریشمی کا تھا۔ اس بیگ کی یہاں موجودگی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

گیلری سے اترنے کے بعد میں نے چوہدری ذیشان سے اس

بیگ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "ہاں یہ اُسی کنجری کا ہے۔ کل رات بڑے نوٹ کمائے تھے اس نے۔۔ وہی نوٹ ہیں اس بیگ میں اور اس کے علاوہ سرخی پاؤڈر اور رنگ برنگے زنانہ کپڑے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ یہ بیگ یہاں کیسے؟"

چوہدری ڈرامائی لہجے میں بولا "یہ بیگ تم چرا کر بھاگے ہو اور ایسے بھاگے ہو کہ گھوڑے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے ہو۔ پورے ضلع کی پولیس تمہیں جگہ جگہ ڈھونڈتی پھرے گی لیکن تم ہاتھ نہیں آؤ گے۔ پھر کوئی حرامی تھانے دار تمہارے گھر والوں کو پکڑ کر لے جائے گا اور چھترول شترول کرے گا۔ تمہاری کوئی جوان بہن یا بیوی وغیرہ تو نہیں ہے؟ اشتہاری ملزموں کی عورتوں کے ساتھ بڑا بُرا سلوک کرتے ہیں یہ پولیس والے۔"

میں نے کہا "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری جی! میں کہاں چوری کر کے بھاگا ہوں۔ میں تو۔۔۔ یہاں۔۔۔ آپ کے پاس موجود ہوں۔"

"یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔" چوہدری نے عجب ڈرامائی لہجے میں کہا "تم اب کہیں موجود نہیں ہو۔ کہیں بھی موجود نہیں ہو۔" چوہدری ایک خطرناک دھمکی دے رہا تھا۔

میری انگلیوں کی پوروں میں سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ میرے اندر کا جہانی استاد انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ چوہدری خوں خوار نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ زرد بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ سو فیصد قاتل کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ بھیانک اور غیر انسانی۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ گرم سیاہ شال کے نیچے اس کے ہاتھ نے حرکت کی ہے۔ غالباً اس نے اپنا ریوالور دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔ پھر جیسے اچانک درندہ اپنی جگہ سے زقند بھرتا ہے' چوہدری کرسی سے یوں اچھلا جیسے طاقت ور اسپرنگوں نے اسے اچھال دیا ہو۔ وہ بلا کی رفتار سے میری طرف آیا تھا۔ میں کسی ایسی صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور چوہدری کی وہ کلائی تھام لی جس میں ایک لمبے پھل کا کمانی دار چاقو چمک رہا تھا۔ اس چاقو نے میرے پیٹ کو نشانہ بنانا چاہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو ملک ناظم کی طرح میرا خون بھی سفید نواڑی پلنگ پر اچھل گیا ہوتا۔ کلائی تھام کر میں نے بازو کو پورے زور سے مروڑا دیا تو زیشان کی پشت میرے سینے اور پیٹ سے لگ گئی۔ میں نے ایک ساعت ضائع کیے بغیر اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اسے اتنی سخت مزاحمت کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھالا لیا اور پوری طاقت کے ساتھ مجھ سے بھڑ گیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُبل رہا تھا۔ تھوڑی دیر فرش پر گتھم گتھا رہنے کے بعد اتفاقاً چوہدری کا ایک راز کھل گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں میرے پیٹ سے جوڑیں اور دور اُچھال دیا۔ کمانی دار چاقو ابھی تک چوہدری کے ہاتھ میں تھا لیکن اپنا زیادہ اہم ہتھیار وہ کھو چکا تھا۔ میری مراد ریوالور سے ہے۔ میری مزاحمت نے چوہدری کو اتنا "شاک" پہنچایا تھا کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور پلنگ پر جا گرا تھا۔ میں نے دیکھا' پیارا ریوالور ملک ناظم کی لاش پر اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان پڑا ہے۔ میں نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا۔ چوہدری کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ پانسا اتنی تیزی سے اور اس انداز میں پلٹے گا۔ وہ تو مجھے بھیگی بلی سمجھ کر اس تہ خانے میں لایا تھا اور میرا پیٹ چاک کر کے مجھے بھی ملک ناظم کے ساتھ ہی دفن کر دینا چاہتا تھا تاکہ "راز" اور رازداں دونوں ایک ہی صندوق میں محفوظ ہو جائیں۔

چوہدری ذیشان کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ کر میرے اندر کا کھلنڈرا "فائٹر" جاگ اٹھا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ اس محفوظ تہ خانے کی خاموشی میں پُرغرور چوہدری کو تھوڑا سا سبق سکھایا جائے۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ لگا کر اسے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا اور چوہدری کے سامنے کھلی جگہ پر آ گیا۔ چوہدری کے چاقو پکڑنے کا انداز مجھے یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ کوئی ماہر چاقو زن نہیں۔ اس کا ہاتھ دستے پر اُچھلا تھا اور انگوٹھا بھی دستے کے آخری سرے پر نہیں تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ وہ بڑے معمولی انداز میں کھڑا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے اسے خود پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ایک دم جیسے اس کا سکتہ ٹوٹا اور وہ چنگھاڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے بڑی آسانی سے اس کا وار خالی دیا۔ دوسرا وار اس نے میرے چہرے پر کیا تھا۔ یہ وار بے پناہ نفرت اور غصے کی نشانی ہوتا ہے۔ یہ وار جتنا تند تھا اتنی ہی آسانی سے جھک کر میں نے بچایا۔ تیسرے حملے میں چوہدری نے اپنے بازو کے ساتھ ساتھ جسم کی پوری قوت بھی صرف کر دی تھی لہٰذا اب میں نے یہ وار بچایا تو چوہدری کسی اندھے بھینسے کی طرح لڑھک کر دیوار سے ٹکرایا اور گر گیا۔

میں نے ابھی تک وار بچانے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں نے "رنگ والی" کے خوں خوار چوہدری کو اٹھنے کا پورا موقع دیا۔ میں نے دیکھا' چوہدری کا تمتمایا ہوا چہرہ زرد پڑ رہا ہے۔ یکے بعد دیگرے اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے' چہرہ زرد نہ پڑتا تو کیا ہوتا۔ درحقیقت وہ نفسیاتی طور پر اسی وقت ہار گیا تھا جب میں نے بھرا ہوا ریوالور استعمال کرنے کے بجائے جیب میں ڈالا تھا۔ اب تو ایک وحشیانہ "فارمیلٹی" تھی جو وہ پوری کر رہا تھا۔ اس نے مجھ پر پے در پے چار پانچ حملے مزید کیے لیکن مجھے چھو بھی نہیں سکا۔ اس کے آخری ناکام حملے کے بعد میں نے اس کی پیٹھ پر ٹانگ جمائی۔ وہ ڈگمگاتا ہوا اس کرسی پر جا گرا جس پر روشنی کا ہینڈ بیگ رکھا تھا۔ ہینڈ بیگ فرش پر گر گیا اور اس میں سے میک اپ کا سامان اور نوٹوں کے رول وغیرہ نکل کر دور دور بکھر گئے۔

چوہدری فرش پر تھا اور ریس ہارنے والے موٹے گھوڑے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غصے اور بے بسی کی انتہا نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر ایک دم وہ تڑپ کر اٹھا اور الماری کی طرف بھاگا۔

اس کی اس چال بازی کے لیے میں پہلے سے تیار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آخری حربے کے طور پر وہ الماری کی طرف جھپٹے گا۔ اس الماری کے نچلے دراز میں بھری ہوئی جی تھری رائفلیں موجود تھیں۔ جوں ہی۔۔۔ وہ دراز پر جھکا' میں نے لپک کر اس کی پیٹھ پر ٹانگ جمائی۔ اس کا سر زور دار آواز کے ساتھ الماری سے ٹکرایا۔ ملک ناظم زندہ ہوتا تو اس موقع پر ضرور تالی بجاتا۔ سر پر چوٹ لگتے ہی چوہدری دہاڑا اور اس نے ایک بار پھر چاقو گھمایا۔ اس مرتبہ میں نے "عدم تشدد کا راستہ" ترک کرتے ہوئے چاقو والی کلائی کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ چوہدری کے ہاتھ کی پشت فرش کی طرف تھی۔ میں نے نیچے سے اس کی کہنی پر گھٹنے کی ایک طوفانی ضرب لگائی۔ بالکل ویسی آواز پیدا ہوئی جو ایک صحت مند گنا ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کہنی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور بازو درمیان سے اوپر کی طرف چلا گیا۔ یہ دہشت ناک نظارہ تھا۔ آج تک چوہدری کی کہنی اوپر کی طرف حرکت کرتی رہی تھی' اب نیچے کی طرف بھی حرکت کر رہی تھی۔ چوہدری ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا اور چاقو اس کے ہاتھ سے فرش پر گر گیا۔ میں نے ٹوٹے ہوئے بازو سے گھما کر اسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ وہ فرش پر گرا اور اندھا دھند گالیاں دینے لگا۔ مگر اب اس کی گالیوں میں کڑک نہیں تھی' کسی ماتم کناں بڑھیا جیسی آہ و بکا تھی۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے بوٹ کی نوک سے چوہدری کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ چوہدری کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ بے پناہ حیرت بھی گُھلی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بے حد سرد لہجے میں پوچھا "اپنے دوست ناظم کو کیوں مارا ہے تم نے؟"

"میں نے۔۔۔ کسی کو نہیں مارا؟" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

اس کے بعد شاید وہ گالی دینا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اس کا ٹوٹا ہوا بازو تھام لیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ میں نے صاف محسوس کی تھی۔ میں نے کہا "ماں صدقے' آج تو تم وہ وہ جرم بھی قبولو گے جو تم نے سوتے میں کیے ہیں اور وہ بھی جن کے خواب دیکھے ہیں۔" چوٹ اب ٹھنڈی ہونے لگی تھی' کہنی نے حرکت کی تو وہ تڑپنے لگا۔ میں نے کہا "مرے کو مارنا مردانگی نہیں لیکن تم زبان نہیں کھولو گے تو مجھے اپنی مردانگی پر یہ حرف لینا پڑے گا۔"

اس کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور پورا جسم کانپنے لگا تھا۔ اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے وہ بولا "دیکھو۔۔۔ تم جو کر رہے ہو۔۔۔ اس کے لیے بڑا پچھتانا پڑے گا تمہیں۔ میں۔۔۔ میں پورے ضلع کی پولیس تمہارے پیچھے لگوا دوں گا۔ ڈی آئی جی قزلباش کو جانتے ہو۔ وہ سارا حشر خراب کر دے گا۔"

میں نے کہا "واہ! ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو تم خود بہت بڑے تیس مار خاں بنے ہوئے تھے۔ اب شریفوں کی طرح پولیس کو بیچ میں لا رہے ہو۔ چلو کوئی بات نہیں۔ پولیس سے بھی نمٹ لوں گا۔ اتفاق سے قانون کی ڈگری لے رکھی ہے میں نے۔ تھوڑا بہت تھانہ کچہری جانتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کا بازو کھینچا۔ بالکل جیسے پتنگ کو ٹھمکا مارتے ہیں۔

وہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا اور بلند آواز سے چیخنے لگا۔ سخت سردی میں اس کے ہر مسام سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ انسان کتنا سخت جان اور دلیر بنتا ہے لیکن اپنی نزاکت اور بے بسی کی انتہا کو نہیں جانتا۔ ایک اکھڑے ہوئے ناخن یا ٹوٹے ہوئے بازو کی تکلیف اسے ہر عقیدے' آدرش اور رشتے سے بے گانہ کر سکتی ہے "تم نے اپنے دوست ناظم کو کیوں قتل کیا تم نے؟" میں نے سفاک لہجے میں پوچھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" اس کی آواز پورے تہ خانے میں گونج رہی تھی۔

"تم بتاؤ گے۔۔۔ اور اگر تمہارا کوئی "باپ ہے" تو وہ بھی بتائے گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولا "میرا بازو چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں' بازو چھوڑ دو ورنہ میں۔۔۔ ورنہ میں۔۔۔"

"ورنہ تم گالیاں نکالو گے۔ ہم سب کی ماں بہن ایک کرو گے۔ ٹھیک ہے' نکالو گالیاں۔"

میں نے بازو کو جھٹکا دیا۔ اس کی چیخیں فلک شگاف ہو گئیں۔ درد کے سبب وہ دیوار سے سر ٹکرا رہا تھا۔

○☆○

ٹھیک دس منٹ بعد چوہدری زیشان نے ہتھیار پھینک دیے۔ وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح فر فر بولنے لگا اور وہ سب کچھ بتانے لگا جو میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اس کا بُرا حال تھا۔ منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں' ہونٹ لکڑی کی طرح خشک تھے اور ناک سُوج کر کُپا ہو رہی تھی۔ اس سرد ابر آلود رات میں اس نیم تاریک تہ خانے کے اندر بیٹھ کر چوہدری زیشان نے جو کچھ مجھے بتایا وہ جتنا حیرت انگیز تھا' اتنا ہی غیر متوقع بھی تھا۔ چوہدری کے بیان کے دوران میں' میں مختلف سوالات بھی کرتا رہا۔ کہیں کہیں چوہدری اٹکتا رہا اور اسے رواں کرنے کے لیے مجھے اس پر سختی کرنی پڑی۔ چوہدری زیشان کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ صفیہ بیگم چوہدری بخت کی منکوحہ بیوی نہیں ہے اور عرصہ دس سال سے نکاح کے بغیر ہی اس کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو تھا اور جن کو تھا وہ بھی اپنے شبہے کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔

چوہدری زیشان نے جو دوسرا سنسنی خیز انکشاف (یا اقبالِ جرم) کیا وہ یہ تھا کہ صفیہ بیگم سے زیشان نے ناجائز مراسم قائم کر رکھے تھے۔ ان مراسم کی تفصیل بڑی سنگین تھی۔ زیشان ایک طرح سے صفیہ بیگم کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ صفیہ بیگم چوہدری بخت کی منظورِ نظر تھی اور لال کوٹھی میں چوہدری بخت کی بیوی کی حیثیت سے رہتی تھی۔ بڑے بھائی کی "ایل پی"

ہونے کے سبب وہ زیشان سے ہزاروں لاکھوں میل دور تھی۔ شاید یہ ناقابلِ عبور دوری تھی جس نے زیشان کے اندر شوق کی آگ تیز کی اور وہ دن رات صفیہ بیگم کے ہجر میں جلنے لگا۔ وہ ایک ناممکن کو ممکن کر کے دکھانا چاہتا تھا لیکن اس کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں تھیں۔ اپنی تمام برائیوں کے باوجود زیشان اپنے بڑے بھائی کی عزت کرتا تھا اور اس کا ہر حکم مانتا تھا۔ اپنے قابلِ عزت بھائی کی محبوبہ پر ہاتھ ڈالنا اس کے لیے آسان نہیں تھا...... پھر یہ بات بھی تھی کہ صفیہ بیگم چوہدری بخت سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور اس سے بے وفائی کا خیال بھی ذہن میں نہیں لا سکتی تھی۔ بے شک چوہدری ایک عورت باز شخص تھا مگر صفیہ صرف اور صرف چوہدری کی ہو کر رہنے کے لیے لال کوٹھی میں آئی تھی۔ ایک اہم حقیقت یہ بھی تھی کہ صفیہ چوہدری زیشان کو اپنے دیور کی طرح سمجھتی تھی اور دونوں کی عمروں میں فرق بھی کافی تھا۔ زیشان بیس بائیس سال کا تھا جب کہ صفیہ تیس سالہ عورت تھی۔

بہر طور زیشان جس راستے پر چل نکلا تھا وہاں سے واپس آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی کوشش میں لگا رہا۔ ایک دو بار اپنی حرکتوں کی وجہ سے اسے صفیہ بیگم سے جھاڑ بھی پڑی مگر وہ باز نہیں آیا۔ صفیہ بیگم اگر اس موقع پر چوہدری بخت کو سب کچھ بتا دیتی تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی لیکن وہ اس امید پر چپ رہی کہ شاید مصیبت ٹل جائے۔ وہ جانتی تھی کہ دونوں بھائی غصے کے انتہائی تیز ہیں۔ وہ ان کے درمیان کوئی فساد برپا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی مسلسل خاموشی سے زیشان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور پھر ایک رات جب لال کوٹھی کے مکین کسی شادی میں شرکت کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے اور زنان خانے میں صفیہ بیگم کے سوا اور کوئی نہیں تھا' زیشان اس کی خواب گاہ میں گھس گیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے صفیہ کو چائے میں کوئی خواب آور دوا پلا دی تھی جس کے سبب اس کی مزاحمت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اس نے صفیہ پر مجرمانہ حملہ کیا اور اس کی عزت پامال کر دی۔ بعد میں اس نے واشگاف الفاظ میں صفیہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے یہ بات بھائی جان تک پہنچائی تو وہ ان کی جان لے لے گا اور اس کے بعد خود کشی کر لے گا۔

صفیہ جانتی تھی' زیشان کس قماش کا شخص ہے۔ اسے معلوم تھا' یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ وہ جنونی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بڑے بھائی کے قتل کا سوچ کر وہ لرز گئی۔ اسے چوہدری بخت کی زندگی ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اتنا بڑا سانحہ گزر جانے کے باوجود وہ چپ رہنے پر مجبور ہو گئی۔

صفیہ کی اس "خوف زدہ چپ" نے اسے مستقل طور پر زیشان کی ہوس کا شکار کر دیا۔ کبھی منت سماجت سے' کبھی دھمکیوں کے زور پر وہ اس کی عزت سے کھیلتا رہا۔ تنہائی میں وہ صفیہ بیگم کو سمجھاتا کہ اس نے خود کو کیوں بھائی جان کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ صفیہ کو باور کراتا کہ اس میں بھائی جان کی دلچسپی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ وہ نت نئی عورتوں سے دل بہلاتے ہیں' ان کے گانے سنتے ہیں اور ان کی آواز کی تعریفیں کرتے ہیں۔ وہ ایک بے کار چیز کی طرح گھر کے کونے میں پڑی رہتی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی دھمکی کی بھی تجدید کرتا رہتا۔ اس کی دھمکی میں اثر تھا اور اس اثر کی وجہ یہ تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ وہ ٹھان چکا تھا کہ جس روز بھی صفیہ نے زبان کھولی' وہ بڑے بھائی جان کی جان لے کر صفیہ کی محبت کا خاتمہ کر دے گا۔

صفیہ اس کے جنون سے خوف زدہ تھی اور یہ خوف زدگی اب تک قائم دائم تھی۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ لال کوٹھی کی پر پیچ تاریکیوں میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اگر کسی کے دماغ میں شک تھا بھی تو وہ اسے زبان پر لانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ خود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا حالاں کہ میں نے یہ سب کچھ زیشان کی زبان سے سنا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ کس طرح چوہدری بخت کے آگے پیچھے "بھائی جان" کہتے ہوئے گھومتا تھا اور کس طرح ہر وقت اس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھا رہتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے دل میں ایک دھمکی پوشیدہ ہے اور اس دھمکی کی "قاتل انگلی" ہر وقت ریوالور کے ٹریگر پر رہتی ہے۔

مجھے وہ منظر یاد آیا جب زیشان کے کمرے میں ملک ناظم کا زخمی جسم پڑا تھا اور زیشان مجھے اور صفیہ کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست تحکم پایا جاتا تھا اور صفیہ اس تحکم کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ ایک بے نام خوف نے اسے سر تا پا جکڑ رکھا تھا...... اب اس خوف کی حقیقت بڑی حد تک مجھ پر کھل چکی تھی۔ میں نے زیشان سے پوچھا "ملک ناظم تمہارا دوست تھا' اس کے ساتھ تمہارے جھگڑے کی کیا وجہ تھی؟"

زیشان نے خالی خالی نظروں سے نواڑی پلنگ کی طرف دیکھا جہاں ناظم کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اپنے کرتے کی آستین سے ناک کا خون پونچھتے ہوئے وہ بولا "ناظم سے جھگڑے کی وجہ بھی یہی عورت (صفیہ) تھی۔"

"کیا مطلب؟ ناظم سے تمہارا جھگڑا صفیہ نے کرایا تھا؟"

"صفیہ نے نہیں کرایا تھا لیکن صفیہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ ناظم کچھ عرصہ پہلے تک میرا گہرا دوست تھا۔ میں نے اسے رازدار بنایا ہوا تھا۔ وہ میرے اور صفیہ کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا...... لیکن اب وہ بدل گیا تھا۔ مجھے دھمکیاں دیتا تھا کہ میرا راز فاش کر دے گا۔"

"کیوں؟ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟"

"بس' اس کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ اس نے لاہور کے ریس کورس میں جا جا کر بہت سی رقم ہاری ہوئی تھی۔ اس نقصان کی وجہ سے اس کا زرعی فارم تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ کاروبار ٹھیک کرنے کے

لیے اس نے مجھ سے رقم ادھار لی تھی...... یہ رقم واپس کرنے کے بجائے اب وہ مزید ادھار مانگ رہا تھا۔ میں نے پہلی والی رقم کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ وہ رقم تو ہم نے مشترکہ طور پر ریس کورس میں ہاری تھی۔ بس اسی بات پر جھگڑا بڑھ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ صاف سیدھے الفاظ میں مجھے دھمکیاں دینے لگا۔ وہ مجھے صفیہ والے معاملے سے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ راز کھلنے کے ڈر سے میں اس کی ہر بات مان لوں گا۔ آج کل وہ مجھے بار بار "الیکشن میں بدنامی" کا ڈراوا بھی دے رہا تھا۔"

"کل رات کیا ہوا تھا؟"

"وہ خود ہی یہاں آیا تھا۔ صلح صفائی کی بات کرنا چاہتا تھا لیکن باتوں باتوں میں پھر جھگڑا ہو گیا...... اس نے ایسی بات کہی کہ مجھے خود پر قابو نہ رہا۔ قریب ہی پیچ کس پڑا تھا۔ وہ میں نے اٹھا کر اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔"

میں نے پوچھا "صفیہ کو معلوم ہے کہ ناظم مر چکا ہے؟"

وہ بولا "نہیں۔ ابھی میں نے اسے نہیں بتایا۔"

صفیہ کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ وہ ایک پرکشش اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ اس کی خوب صورت آواز نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رکھے تھے لیکن یہ "چار چاند والی شخصیت" اس لال کوٹھی میں آ کر اندھیروں میں غرق ہو گئی تھی۔ اس عمارت کے ماحول اور یہاں کے کرداروں نے ایک عرصے سے اسے "چپ باز" کر رکھا تھا۔ چوہدری بخت اس کا محبوب تھا اور اس کی زندگی کے لیے وہ بہت ناروا سلوک برداشت کر رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ گیا جب میں نے صفیہ کو ایک نو عمر ملازمہ پر غضب ناک ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اسے چھڑی سے بے دریغ پیٹ رہی تھی اور چیخ رہی تھی "مجھے ایک! صرف ایک بات کا جواب دو۔ تم نے بتایا کیوں نہیں۔ تمہارا قصور نہیں تھا تو تمہیں کیا ضرورت تھی چھپانے کی' کیا ضرورت تھی چپ رہنے کی۔"

مجھے لگا جیسے وہ اس دن لڑکی کو نہیں' اپنے آپ کو پیٹ رہی تھی۔ خود سے پوچھ رہی تھی "اگر تمہارا گناہ نہیں تھا تو تمہیں کیا ضرورت تھی چھپانے کی......" واقعی یہ سوال خود صفیہ پر بھی تو صادق آتا تھا۔ اگر وہ زیشان کے سلسلے میں شروع ہی سے سخت رویہ اختیار کرتی اور اس کی حرکتوں سے چوہدری بخت کو آگاہ کر دیتی تو شاید یہ بات اتنی نہ بڑھتی لیکن صنفِ نازک کی فطری کم ہمتی اس پر غالب آئی اور وہ ایک دلدل میں پھنستی چلی گئی۔ شاید اس روز وہ اس نو عمر لڑکی کو پیٹ پیٹ کر غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو ہی سزا دے رہی تھی۔

اچانک ایک عجیب سی آہٹ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی سیڑھیوں کے بالائی دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اس مدھم آواز نے میرے ساتھ ساتھ چوہدری زیشان کو بھی چونکا دیا۔ اگر ملک ناظم زندہ ہوتا تو وہ بھی ضرور چونکتا۔

میں نے چوہدری سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

وہ ذرے ڈرے انداز میں بولا "پتا نہیں۔ شاید کوئی دروازے پر ہے۔"

میں نے نیچے والے دروازے کا بولٹ گرایا اور سیڑھیوں پر آ گیا۔ چند لمحے بعد دوبارہ آواز آئی۔ اب یہ آواز واضح تھی۔ کوئی بالائی دروازے پر موجود تھا اور بڑے محتاط انداز میں دستک دے رہا

خون آشام

مُصنّف : ایم اے راحت

ایک سنگ صفت، شعلہ ساماں نوجوان کی سرگزشت

ایک سالخوردہ بوڑھا جو صدیوں سے زندہ تھا۔ وہ اُس بہادر نوجوان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا

سسپنس، خوف سے بھرپور ایک عجیب و غریب داستان

قیمت -/۵۰ ڈاک خرچ -/۲۰

— ناشر —
علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اُردو بازار
لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

— اسٹاکسٹ —
علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال
لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

تھا۔ میں نے چوہدری ذیشان کو اس کے خون آلود بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے اوپر چلنے کو کہا۔ چوہدری ذیشان اتنی بری طرح کٹ پٹ چکا تھا کہ میرے حکم پر عمل کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی میرے ہاتھ میں ریوالور تھا اور اس ریوالور کی مزاحمت کرنا چوہدری کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ کراہتا ہوا حرکت میں آگیا۔

ہم طویل زینے طے کر کے بالائی دروازے پر پہنچے۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں نے چوہدری کو اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب سمجھتے ہوئے چوہدری نے دروازے سے منہ لگایا اور درد ناک آواز میں بولا "کون ہے؟" پہلی مرتبہ چوہدری کی آواز سنی نہیں گئی لیکن جب دوسری بار اس نے اپنا سوال دہرایا تو باہر سے ایک مدھم نسوانی آواز ابھری۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن اندازہ ہو گیا کہ یہ "صفیہ بیگم" ہی کی آواز ہے۔ میں ریوالور تھام کر دیوار کے ساتھ لگ گیا اور چوہدری سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ درد کی شدت سے چوہدری کا برا حال تھا۔ ایک ہاتھ کی مدد سے دروازہ کھولنا اس کے لیے خاصا دشوار ثابت ہوا۔ بہرطور کسی نہ کسی طرح وہ یہ کام کر گزرا۔ دروازہ کھلتے ہی صفیہ جلدی سے اندر آگئی۔ اس نے اپنی پشت پر دروازہ خود ہی بند کر دیا تھا۔ پھر تہ خانے کی مدھم روشنی میں اس کی نگاہ چوہدری ذیشان کے چہرے پر پڑی "ہائے میں مرگئی۔ یہ کیا ہوا تمہیں؟" وہ گھبرا کر بولی۔ اسی دوران میں وہ دیوار کی طرف مڑی اور اس نے مجھے بھی دیکھ لیا۔ ایک بار پھر اس کے منہ سے "ہائے اللہ" کی چیخ نکل گئی۔

میں نے پھرتی کے ساتھ دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔ صفیہ میرے اور ذیشان کے درمیان کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ باری باری ہمیں گھور رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بولی "یہ..... یہ تم نے کیا کیا ہے اسے؟" اس کا اشارہ ذیشان کی طرف تھا۔

میں نے اطمینان سے کہا "ایسوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

چوہدری بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ شدت کرب سے اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ چہرہ خون آلود تھا۔ کڑھائی دار قمیص تار تار تھی اور اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو اس نے دوسرے ہاتھ سے بمشکل سہارا دے رکھا تھا۔

"ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیا کر دیا ہے تم دونوں نے۔" وہ چیخ کر بولی۔ پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ وہ چوہدری کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی "ذیشان! لگتا ہے تیرے برے دن آگئے ہیں۔ ناظم کے گھر والے آئے ہیں۔ ساتھ پولیس کا بندہ بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ناظم کل سے نہیں مل رہا۔ انہیں شک ہے کہ وہ تم سے ملنے یہاں آیا تھا۔"

چوہدری ذیشان اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ پے در پے صدموں نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔ شکرے جیسی بے رحم اور چمکدار آنکھوں کے بلب فیوز نظر آ رہے تھے۔ صفیہ چوہدری کو جھنجھوڑ کر بولی "ذیشان! اب کیا کرنا ہے تو نے۔ چھوٹے بھائی نے کہا ہے کہ ذیشان حویلی میں ہی ہے۔ اگر تو ان کے سامنے نہ گیا تو وہ اور شک میں پڑ جائیں گے۔ یہ تو نے اپنا کیا حلیہ بنا لیا ہے۔ آخر یہ ہوا کیا ہے؟ کیا تم دونوں..... لڑے ہو آپس میں؟" اس نے آخری الفاظ مجھ سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

"ظاہر ہے، بندے کا ایسا ناک نقشہ لڑنے کے بعد ہی بنتا ہے۔" میں نے سرنگوں چوہدری کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ..... یہاں سے۔ کیوں نہ گئے تم..... ؟" وہ مجھ پر چیخی۔

میں نے کہا "میں تو جانا چاہ رہا تھا۔ یہ چوہدری صاحب ہی مجھے یہاں لے آئے۔ یہ لاش دکھانے کے لیے۔"

"کک..... کون سی لاش؟" صفیہ لرز کر بولی۔

پھر وہ جھپٹتی ہوئی نواڑی پلنگ کے پاس پہنچی۔ اس نے ملک ناظم کا نوچا کھسوٹا چہرہ دیکھا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئی تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ لاش کو گھورتی رہی پھر چوہدری ذیشان کو دیکھنے لگی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور خوب صورت چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بولی تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ اس زخم زخم لہجے میں ایک مدت سے چھپی ہوئی بے پناہ نفرت اور کدورت موجود تھی۔ وہ ایک دم جذبات سے مغلوب ہو کر چوہدری پر پل پڑی۔ اس کے زوردار تھپڑوں سے تہ خانہ گونج اٹھا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی۔ "کتے کمینے۔ تیرا انجام یہی ہونا تھا۔ یہی ہونا تھا تیرا انجام، بدمعاش حرامی۔ کاش میں اس کے ساتھ ساتھ تیری لاش بھی یہاں دیکھتی۔ کاش میں دیکھتی۔"

چوہدری نے اپنے سلامت ہاتھ سے صفیہ کی کلائی پکڑی اور اسے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ وہ جیسے پاگل ہو رہی تھی۔ شاید اپنی ہر ہر رسوائی اس کی آنکھوں میں رقصاں تھی "میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی تجھے۔" وہ چلائی اور لپک کر میرے ہاتھوں سے ریوالور لینا چاہا۔

میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا لہٰذا اس کی کوشش ناکام رہی۔ وہ مجھ سے زور آزمائی کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے دھکیل کر اسے دور ہٹا دیا۔ اس کی چوڑیاں فرش پر دور تک بکھر گئیں۔ میں نے اسے سمجھایا "تم اس کتے کا خون کیوں اپنے سر لیتی ہو۔ اب یہ خود ہی پھانسی چڑھے گا..... تم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

لیکن وہ تو کسی طور قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ غم و غصے کی بلند لہر تھی جو مصلحت کا ہر بند توڑ کر نکل رہی تھی اور بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ یکایک وہ چاقو اس کے ہاتھ میں آگیا جو چوہدری ذیشان کے ہاتھ سے گرا تھا.....

پلک جھپکتے میں اس نے چاقو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ذیشان پر جھپٹی۔ اس کا انداز نہایت خطرناک تھا۔ ان لمحوں میں ذیشان بپھری ہوئی صفیہ کے سامنے بالکل بے بس نظر آیا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ یقیناً چاقو ذیشان کے جسم میں گھونپ دیتی۔ میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی تھام لی۔ وہ مچلنے لگی۔ میں اسے دھکیلتے ہوئے دیوار تک لے گیا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کی چست عورت تھی۔ غیظ و غضب نے اس کے جسم میں بجلی بھر رکھی تھی۔ اسے سنبھالنے میں مجھے کافی دشواری پیش آئی۔ وہ ذیشان پر چیخ رہی تھی اور چیخیں جاری تھیں۔ اس کے بال منتشر تھے، سینہ ہانپ رہا تھا اور رخسار سرخ ہو رہے تھے۔

میں نے کہا "تم اس کی جان لے کر اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا کیوں ڈالنا چاہتی ہو۔ اس کی ساری سزاؤں کے لیے یہ لاش ہی کافی ہے جو ہمارے سامنے پڑی ہے۔" میرا اشارہ نوجوان ملک ناظم کی لاش کی طرف تھا۔

وہ بولی "تم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں۔ پتا نہیں یہ حرام زادہ ایسی کتنی لاشیں گرا چکا ہے۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ مجھے اس سے اپنی رسوائیوں کا بدلہ لینے دو۔"

"بدلہ تمہیں ملے گا اور ضرور ملے گا مگر اس بدلے کے بدلے" میں تم اپنی جان کیوں گنواتی ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ یہ اپنی سزا ضرور پائے گا۔"

میں نے کوشش کر کے صفیہ کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور اسے کھینچ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ ہاتھ سے چاقو چھن جانے کے بعد صفیہ کا جنون ایک دم کم ہو گیا۔ اس نے نڈھال ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کی آواز میں کرب کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "یہ انسان نہیں حیوان ہے۔ جنگلی ہے۔ وحشی ہے۔ اسے پھانسی بھی لگ گئی تو میرے دل کو سکون نہیں ملے گا۔ میرا کلیجا تو تب ٹھنڈا ہو گا جب یہ میرے سامنے کتے کی موت مرے۔"

میں نے کہا "جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔ بس تم حوصلہ رکھو۔"

میں نے اسے پینے کے لیے پانی دیا۔ وہ قدرے پرسکون نظر آنے لگی۔ میں جان بوجھ کر ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ صفیہ کی نگاہ ذیشان پر نہ پڑے۔ ممکن تھا کہ اس کی صورت دیکھ کر وہ پھر مشتعل ہو جاتی۔ صفیہ سے چاقو چھین کر میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور ٹریگر پر رکھی ہوئی میری انگلی ذیشان کی کسی بھی غلط حرکت پر جنبش میں آسکتی تھی۔ ذیشان جہاں گرا تھا وہیں پڑا تھا۔ بازو کی تکلیف نے اس کا سارا دم خم نچوڑ لیا تھا اور اس کا چہرہ مردے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے صفیہ سے کہا "کیا بات ہے۔ لگتا ہے تمہیں چھوٹے چوہدری پر بہت غصہ ہے۔"

"تو کیا مجھے خوش ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے دوست کو قتل کر دیا ہے؟"

"لیکن میرے خیال میں بات کوئی اور ہے۔ تم نے جس طرح اسے بددعائیں دی ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا دل اس کی طرف سے بہت دکھا ہوا ہے۔"

"ایسی..... کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

میں جانتا تھا وہ غلط کہہ رہی ہے۔ چھوٹے چوہدری کے حوالے سے اس کے سینے پر جتنے بھی زخم لگے ہوئے تھے وہ ایک دم سے ہرے ہو گئے تھے۔ صفیہ کے اندر ایک ہیجان برپا تھا۔ اس ہیجان پر وہ بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے تھی۔ میں ذیشان کے "اعتراف جرم" کی بات کرتا تو صفیہ کا ہیجان قیامت خیز ہو جاتا۔ میں نے اس سلسلے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے صفیہ کو سمجھایا کہ اس کا زیادہ دیر یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ ممکن ہے کہ چوہدری بخت اسے ڈھونڈنا شروع کر دے۔ ذیشان کی غیر موجودگی بھی اسے پریشان کر رہی ہو گی لہٰذا وہ باہر چلی جائے اور چوہدری کو ذیشان کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کہ چوہدری کو کیا بتایا جائے۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب کو بتا دو کہ ذیشان اپنے کمرے میں نہیں۔ شاید کسی کام سے باہر گیا ہے۔"

رازدان
موت سے پنجہ کشی
کرنے والے سرفروشوں
کی دل ہلا دینے
والی داستان
ایسے گمنام مجاہدوں کی داستان جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کا عزم رکھتے تھے
ایم اے راحت کا ایک شاہکار ناول
قیمت -/۳۰۰
ڈاک خرچ -/۲۰
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ـــــ فون ۷۲۴۷۴۱۴

"لیکن گاڑیاں تو ساری یہاں ہیں۔ چوہدری صاحب پوچھیں گے کس پر گیا ہے؟"

"بھئی تمہیں کوئی معقول بہانہ تو بنانا ہی پڑے گا۔ تم یہاں رہتی ہو۔ تم زیادہ اچھا جواز ڈھونڈ سکتی ہو۔"

وہ اب اپنے حواس میں آگئی تھی اور اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی۔ پھر اس نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی زیشان پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ شاید اسے بھی وہی اندیشہ تھا جو مجھے تھا۔ یعنی وہ ڈرتی تھی کہ زیشان کی صورت دیکھ کر اپنے تند و تیز جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔ ہاں...... اس نے ایک دو بار کن انکھیوں سے لاش کی طرف ضرور دیکھا تھا اور جب بھی دیکھا تھا اس کی نگاہوں میں خوف ابھر آیا تھا۔ تہ خانے کے بالائی دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور بولی "موقع ملتے ہی میں پھر آؤں گی۔"

"اوکے! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ میں نے اسے تہ خانے سے باہر نکال دیا۔

زیشان اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے تندرست ہاتھ سے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو سہارا دے رکھا تھا۔ درد کی شدت سے اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ میں نے چاقو کی نوک سے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر کہا "اب کیا ارادے ہیں چوہدری صاحب؟"

اس کے خون آلود ہونٹ تھرائے "تم...... اچھا...... نہیں کر رہے ہو۔ بڑی بری طرح پچھتانا پڑے گا تمہیں۔"

"یہ بات پچھلے ایک گھنٹے میں تم دس بار کہہ چکے ہو۔"

ایک دم اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا "دیکھو' تم جوان جہان ہو اور بہادر بھی ہو۔ میں ایسے لوگوں کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ اگر تم میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ تو کبھی بھی گھاٹے میں نہیں رہو گے۔"

میں نے ملک ناظم کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بھی تو تمہارا دوست تھا۔ جیسے اسے ڈنک مارا ہے' مجھے بھی مارو گے۔"

"تم...... تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔ مجھے دھمکا رہا تھا۔"

میں نے کہا "یہی پھندا تمہارا میرے ساتھ بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں تمہارے اہم ترین رازوں سے واقف ہو چکا ہوں جن میں ملک ناظم کا قتل بھی شامل ہے۔ کسی بھی وقت میری نیت میں فتور آ سکتا ہے۔ میں تمہیں بلیک میل کر سکتا ہوں اور اگر ایسا نہ بھی کروں تو تمہیں یہ خدشہ لاحق ہو سکتا ہے کہ میں ایسا کروں گا اور جب تمہیں خدشہ لاحق ہو گا تو تم میرے پیٹ میں اس سے بڑا چاقو گھونپو گے اور لال کوٹھی کی کسی ایسی ہی اندھی قبر میں مجھے دفن کر دو گے۔"

"تم الٹے دماغ سے سوچنے والے آدمی ہو۔" وہ درد سے کراہتے ہوئے بولا "اگر تمہیں دوستی والی بات منظور نہیں تو پھر...... مجھ سے سودا کر لو۔ جتنی قیمت تم چاہو میں دے دیتا ہوں۔ تم یہاں سے چپ چاپ نکل جاؤ۔ ایک ہی دفعہ جو کچھ لینا ہے لے لو' میں تمہیں...... سادہ چیک دے دیتا ہوں اور اگر نقد چاہئے کی بات ہے تو میں تمہیں نقد دینے کو تیار ہوں۔"

"کتنا ہے بڑا مال ہے تمہارے پاس۔" میں نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم بات کو لمبا نہ کرو۔ درد سے میرا برا حال ہے۔ میں دو حرفی فیصلہ چاہتا ہوں۔ بتاؤ یہ مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟"

"بڑی آسانی سے۔" میں نے کہا۔

"کیسے؟" اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

میں نے کہا "مجھے تمہارے باقی کے جرموں کا تو پتا نہیں' بس تم اتنا کرو کہ ملک ناظم کو زندہ کر دو اور صفیہ کی لٹی ہوئی عزت اسے واپس کر دو۔ اگر یہ دونوں کام ہو جائیں تو میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں۔ میں ابھی تمہیں سلیوٹ مار کر یہاں سے چلا جاتا ہوں' بلکہ تمہاری "جاگیر" سے ہی نکل جاتا ہوں۔"

"لیکن...... تم اس معاملے میں کیوں کود رہے ہو۔ کیا پریشانی ہے تمہیں۔ میرا مطلب ہے......"

"میں خدائی فوج دار ہوں اور میری پریشانی یہ ہے کہ مجرم کو اس کے کیے کی سزا دلواؤں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"میں نے تو تمہیں پیچ ٹھیک کرنے کا پورا موقع دیا تھا۔ یہ چاقو اب بھی سامنے پڑا ہے۔ ایک بار پھر اٹھا لو...... اور اگر تم صرف پیچ کس سے ہی پیچ کس سکتے ہو تو میں وہ بھی مہیا کر دیتا ہوں۔"

زیشان کے چہرے پر ایک بار پھر غضب اور قہر کے تاثرات ابھرنے لگے۔ اس کے بس میں ہوتا تو چار اکائنے والے ٹوکے سے میرا قیمہ بنا دیتا' اپنی جیپ کے پیچھے باندھ کر کھیتوں میں اتنا گھسیٹا کہ آٹھ دس مرحلوں میں میرے جسم کے ٹکڑے بکھرے جاتے لیکن ٹوٹے پھوٹے جسم کی اذیت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مجھے صرف گھور سکتا تھا اور زہری سانپ کی طرح بس کھول سکتا تھا۔

"آنکھ نیچی کرو۔" میں نے بیٹھے بیٹھے اس کے منہ پر ٹانگ رسید کی۔

اس کے چہرے پر شعلے لپک گئے۔ حلق سے غضب ناک غراہٹ نکلی اور ایک ساعت کے لیے وہ سب کچھ بھول گیا۔ غصے سے پاگل ہو کر اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر بآسانی خود کو بچا لیا۔ وہ اوندھے منہ پختہ فرش پر گرا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ پتا نہیں وہ کیا کیا بک رہا تھا۔ تکلیف اور غصے کی زیادتی سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

مجھے لگا کہ یہی حالت رہی تو وہ بچے کچے حواس کھو دے گا۔ جونہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی' میں نے عقب سے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور ایک بے بے جھٹکے سے اس کی کئی مشکلات آسان کر دیں۔ ایک دم اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اپنے ٹکڑے ہوئے بازو سمیت وہ نیم گھٹنے کے لیے اتنا غلیل ہو گیا تھا۔

جس رسی کی مدد سے میں نے صندوق گیلری سے اتارا تھا وہ خاصی لمبی تھی۔ میں نے اس رسی کے دو لمبے ٹکڑے کاٹے اور چوہدری زیشان کو جکڑ دیا۔ بعد ازاں اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ میری رسٹ واچ پر اب رات کے دو بج رہے تھے۔ صبح ہونے میں چار پانچ گھنٹے ہی باقی تھے۔ میں نہیں جانتا تھا ان چار پانچ گھنٹوں میں صورتِ حال کیا رخ اختیار کرے گی۔ صفیہ اور زیشان کا باہمی تعلق نفرت اور دشمنی کا تعلق تھا۔ اس تعلق کے بارے میں جاننے کے بعد مجھے یقین تھا کہ صفیہ مجھے اپنے خیر خواہوں میں شمار کرے گی اور کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے مجھے یا میرے ساتھیوں کو نقصان پہنچے۔ صبح تک مجھے زریں گل کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ گھوڑے بیچ کر سویا تھا اور صبح تک اسے سونے کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔ امید تھی کہ زریں کی طرح دوسرے لوگ بھی میری غیر موجودگی سے بے خبر رہیں گے۔

اب میرے پاس فارغ وقت تھا۔ میں نے گھوم پھر کر اس وسیع تہ خانے کا جائزہ لیا۔ اس میں سیڑھیوں کے سوا آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ملک ناظم کی لاش اکڑی ہوئی تھی لیکن ابھی اس میں سے بو اٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ لاش کے قریب ہی کچھ دوائیں رفیہ بھی پڑی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چوہدری زیشان اپنے طور پر ناظم کی جان بچانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ناظم کے جسم پر کئی زخم تھے تاہم اس کی موت پیچ کس کے مہلک گھاؤ سے واقع ہوئی تھی۔ مقتول کے ہینڈ بیگ سے نکلنے والی اشیا ابھی تک فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ میک اپ کے سامان اور ٹشوز وغیرہ کے علاوہ ان میں چند چھوٹے چھوٹے جڑاؤ گہنے بھی شامل تھے۔ میں نے یہ ساری اشیا مع نقدی سمیٹ کر دوبارہ ہینڈ بیگ میں رکھیں اور ہینڈ بیگ ایک الماری میں سنبھال دیا۔

صفیہ کی آمد میری توقع سے بہت پہلے ہو گئی۔ گھڑی نے ابھی پانچ نہیں بجائے تھے کہ بالائی دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں اوپر پہنچا اور صفیہ کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میری طرح وہ بھی مسلسل جاگتی رہی ہے۔ صفیہ کی آمد سے پہلے ہی میں نے ناظم کی لاش ایک کمبل سے ڈھانپ دی تھی۔ چوہدری زیشان کا رسیوں میں جکڑا ہوا جسم تہ خانے کے ایک تاریک گوشے میں پڑا تھا۔ زیشان ابھی تک بے ہوش تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" صفیہ زیشان کو دیکھ کر ڈری ڈری آواز میں بولی۔

"بے فکر رہو۔ ایسے شیطان اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔" میں نے کہا۔

"تم نے اسے پیٹا ہے؟"

"نہیں نشے والی دوا دی ہے" میں نے لمبی بحث کے بجائے چھوٹا سا جھوٹ بول دیا۔

صفیہ بولی "چوہدری صاحب سخت پریشان ہیں۔ ناظم کا والد بہت چیخ چلا کر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو اس کی ذمے داری صرف اور صرف زیشان پر ہو گی۔ زیشان پر اس کا شک بہت پختہ ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی سوچتا کہ اگر زیشان بے قصور ہے تو پھر اچانک کسی کو بتائے بغیر حویلی سے کہاں چلا گیا ہے۔"

"حویلی کی تلاشی لینے کی بات نہیں ہوئی؟"

"یہ بات کرنی آسان نہیں۔ کم از کم ایسے شخص کے لیے تو ہرگز نہیں جو اس حویلی کے پیچ و خم اور بھول بھلیوں کو جانتا ہو۔ یہاں کسی گمشدہ بندے کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے برابر ہے۔"

"پھر کیا فیصلہ ہوا ہے؟"

"ملک ناظم کا باپ ملک خدا بخش اعلان کر کے گیا ہے کہ اگر کل شام تک اس کا بیٹا نہیں ملا تو وہ چوہدری صاحب اور زیشان پر اغوا کا کیس درج کرائے گا۔"

"چوہدری صاحب کیا کہتے ہیں؟"

"وہ خود بھی الجھن میں ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ رات گیارہ بجے تک زیشان حویلی میں تھا۔ رات بارہ بجے ملک ناظم کا باپ آیا تھا۔ اس کے آتے ہی زیشان کا غائب ہونا چوہدری صاحب کو شک شبہ میں ڈال گیا ہے۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا۔

صفیہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی۔ پچھلے چند گھنٹے سوچ بچار میں گزارنے کے بعد وہ جیسے کسی اہم فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ گمبھیر آواز میں بولی "زیشان' چوہدری صاحب کا چھوٹا بھائی ہے لیکن میری نظر میں وہ ایک ایسا شیطان ہے جس کا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں۔ وہ صرف اپنی خواہشوں کا بندہ ہے۔ تم نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر بھی اس شخص سے بہت دکھ پہنچے ہیں۔ میرا دل اس کمینے بدذات کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میں نے آج تک چوہدری صاحب سے چھپائے رکھی ہیں لیکن آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چوہدری صاحب سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے مگر مجھے کرنا پڑا ہے۔ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب بھی چپ رہوں گی تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی نہیں......" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ جن زیادتیوں کا ذکر کر رہی تھی میں ان سے باخبر تھا۔ بہرحال میں نے اسے جتانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا "میں تم لوگوں کے ذاتی معاملات

میں دخل دینا نہیں چاہتا مگر ایک خدشے کا اظہار ضرور کروں گا۔ تم چوہدری صاحب کو ذیشان کے کرتوتوں سے آگاہ کرنا چاہتی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ الٹا تم پر کوئی الزام آجائے۔ میرا مطلب ہے یہ چوہدری لوگ ہیں۔ انہیں صرف اپنی آبرو کا پاس ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے کی عزت کو عزت سمجھتے ہیں۔"

"میں یہاں دس سال سے ہوں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی "چوہدری صاحب کو کسی بھی شخص سے زیادہ جانتی ہوں۔ بے شک ان میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں لیکن ان کی ایک خوبی میرے نزدیک ان کی ساری کمزوریوں پر حاوی ہے۔ وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں اور جس سے پیار کیا جاتا ہے اس پر شک نہیں کیا جاتا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہاری زبان سے ذیشان کے کرتوت سننے کے بعد چوہدری صاحب ذیشان سے کیا سلوک کریں گے؟"

"اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "اس بدذات کے ساتھ جو بھی ہو جائے کم ہے۔"

"لیکن تم مجھے بھول رہی ہو۔ جب ساری روداد چوہدری صاحب کے سامنے آئے گی تو وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ میں ضرورت سے زیادہ جان چکا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں ملک ناظم کے قتل سے باخبر ہو چکا ہوں۔ کیا چوہدری صاحب یہ برداشت کریں گے کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ عین ممکن ہے کہ وہ لال کوٹھی کی بات لال کوٹھی میں ہی رکھنے کے لیے ہمیں بھی لال کوٹھی میں رکھ لیں۔ زندہ یا پھر مردہ حالت میں۔"

"نن..... نہیں نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ دونوں ہاتھ نفی میں ہلا کر بولی "تم نہیں جانتے" چوہدری صاحب مجھ پر کتنا بھروسا کرتے ہیں۔ میں ان سے جو کہوں گی وہ مان جائیں گے۔ میں انہیں تمہاری طرف سے ضمانت دوں گی کہ تم نے یہاں جو کچھ دیکھا اور سنا ہے وہ ہمیشہ کے لیے تمہارے سینے میں دفن رہے گا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "کیا تمہیں یقین ہے کہ میں رازداری کے معیار پر پورا اتر سکوں گا۔ میرا مطلب ہے کہ آخر میں بندہ بشر ہوں۔ کسی نہ کسی وقت میری زبان اس راز کو اگل سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے اچانک قانون پسندی کا بخار ہو جائے۔ آخر میں نے یہاں ایک قتل ہوتے دیکھا ہے۔"

وہ عجیب سے یقین کے ساتھ بولی "مجھے بھروسا ہے تم ایسا نہیں کرو گے۔ اگر تم نے وعدہ کرلیا تو تم وہ وعدہ نبھاؤ گے۔"

میں نے سگریٹ سلگا کر دو گہرے کش لیے اور سوچتے ہوئے لہجے میں کہا "پھر بھی میں نہیں چاہوں گا کہ تم یہ "رسک" لو۔ اگر صرف میری بات ہوتی تو میں اتنی احتیاط نہ کرتا لیکن میرے ساتھ میرے چودہ ساتھی ہیں جن میں ایک معصوم بچی بھی ہے۔ ہم کلی طور پر اس حویلی کے اسیر ہیں۔ اگر چوہدری صاحب کی ذہنی رو ہمارے خلاف چل نکلی تو ہم اس حویلی سے نکل نہیں سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم نے جو کچھ بھی کرنا ہے حویلی سے ہمارے جانے کے بعد کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ آج سہ پہر تک اپنے ساتھیوں سمیت حویلی چھوڑ جاؤں۔ میرے خیال میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ چوہدری صاحب کا اصل مسئلہ "ظلم استاد روشنی" تھی۔ وہ مسئلہ انہوں نے دو تین راتوں میں اچھی طرح "حل" کرلیا ہے۔ اب وہ ہمارے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کریں گے۔ ہمارے جانے کے بعد تم چوہدری صاحب کو تہ خانے میں لے آنا۔"

"لیکن وہ ناراض ہو جائیں گے۔ کہیں گے کہ میں نے یہ واقعہ اس وقت کیوں نہ بتایا جب تم لوگ حویلی میں تھے۔"

"تم میرا نام لے سکتی ہو۔ کہہ سکتی ہو کہ میں نے تمہیں اس سلسلے میں مجبور کیا تھا۔ دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے زبان کھولی تو حویلی میں بہت خون خرابا ہوگا اور ذیشان کی جان بھی چلی جائے گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ آخر گہری سانس لے کر اس نے میری بات سے اتفاق کرلیا۔ میری رسٹ واچ اب ساڑھے پانچ کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے صفیہ سے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے اب جلد از جلد اپنے کمرے میں پہنچ جانا چاہیے۔ ذرین کل اٹھ گیا تو وہ مجھے تلاش کرنا شروع کردے گا۔ ہو سکتا ہے دوسرے ساتھی بھی پریشان ہو جائیں۔"

"میں انہیں دیکھ کر آرہی ہوں۔ وہ سب بے خبر سوئے ہوئے ہیں۔"

"چوہدری صاحب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟"

"آٹھ بجے سے پہلے نہیں اور آج تو وہ حرافہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ آج......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

میں اس ادھوری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج روشنی بھی چوہدری کی خواب گاہ میں ہے۔ آج وہ دیر تک سوئے گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ابھی میں یہیں رکا رہوں۔"

"ہاں..... میں ایک چکر باہر کا لگا آؤں۔ صبح سویرے صفائی کرنے والے آتے ہیں۔ وہ ہو جائیں تو پھر میں آتی ہوں۔"

اسی دوران میں تہ خانے کے تاریک ترین گوشے میں ہلکی ہلکی آہٹ ہونے لگی۔ یقیناً یہ چوہدری ذیشان تھا جو اب ہوش میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ ان آہٹوں کو صفیہ نے بھی نوٹ کیا اور وہ پریشان نظر آنے لگی۔ میں نے کہا "گھبرانے کی بات نہیں۔ میں نے اس کا منہ اور ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ رکھے ہیں۔"

صفیہ نے ایک بار پھر مجھے چوہدری ذیشان کی طرف سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ یہ خطرناک زہری سانپ ہے۔ میں جانتا تھا وہ اسے خطرناک سانپ کیوں کہہ رہی ہے۔ یہ سانپ ایک عرصے سے اس کی عزت و آبرو پر کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا' بے شمار دفعہ اسے ڈس چکا تھا۔

صفیہ نے باہر جانے کے لیے زینے طے کیے اور بالائی دروازے پر پہنچ گئی۔ کچھ دیر سن گن لینے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ جونہی اس نے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھایا' یک دم ٹھٹکی اور اندر آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ پھر بند کر دیا تھا۔ اس کا یہ انداز تشویش ناک تھا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ کسی نے اسے دروازے سے نکلتے دیکھ لیا ہے۔ چند ہی لمحے بعد اس خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ دروازے پر کسی بھاری ہاتھ کی دستک ہوئی اور اس کے ساتھ ہی مدھم آواز سنائی دی۔

میں نے دیکھا' صفیہ کا رنگ فق ہو گیا ہے اور وہ سکتے کی سی حالت میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ بے ساختہ بولی "ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟"

"کسی نے دیکھ لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... خبیث لال دین ہے۔ نوکر ہے حویلی کا۔"

ہم دونوں ساکت کھڑے رہے۔ دروازے پر دو تین بار دستک ہوئی۔ پھر یوں لگا کہ دستک دینے والا لوٹ گیا ہے۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لال دین سیدھا جا کر چوہدری صاحب کو بتائے گا۔ میرا خیال ہے مجھے فوراً ان کے پاس پہنچنا چاہیے۔ تم فی الحال دروازہ اندر سے بند کرلو۔" صفیہ نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

معاملہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ جن واقعات کا علم چوہدری کو ہمارے جانے کے بعد ہونا چاہیے تھا وہ ابھی اس کے علم میں آنے والے تھے۔ میں بے چینی سے تہ خانے میں ٹہلنے لگا اور سوچنے لگا کہ چوہدری کا ردعمل کیا ہوگا۔ صفیہ مجھے ہر لحاظ سے قابل اعتبار نظر آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چوہدری کو کوئی ایسا کام نہیں کرنے دے گی جس سے ہمیں نقصان پہنچنے کا ڈر ہو لیکن پھر بھی خطرات اپنی جگہ موجود تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ چوہدری اپنی "ایلی بی" کی بات کس حد تک مانے گا۔ ابھی مجھے چوہدری کی اصلیت کا پتا نہیں تھا اور نہ اس وسیع حویلی کے اسرار و رموز سے پوری آگاہی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد تہ خانے کے دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ صفیہ کی آواز پہچان کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے صفیہ کے علاوہ چوہدری بخت اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک گوریلا نما شخص کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بے حد سیاہ تھا اور چوہدری بخت اسے "کالی" کے نام سے پکارتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق "کالی" چوہدری کے قریب ترین ملازموں میں سے تھا۔ ان تینوں نے اندر آکر دونوں دروازے بند کر لیے اور میرے ساتھ تہ خانے میں آگئے۔ صفیہ کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ جو کچھ دیر پہلے تک طوفان کی زد میں رہا ہے۔ میں اس طوفان کی حقیقت جانتا تھا۔ یقیناً صفیہ نے چوہدری کو ذیشان کے تمام کالے کرتوتوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ چوہدری کا چہرہ سپاٹ تھا' جیسے وہ گوشت پوست کا نہیں پتھر کا چہرہ ہو۔ اس کی آنکھیں بہت گہرائی میں اتری ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے پہلے ملک ناظم کی لاش کا جائزہ لیا پھر تہ خانے کے اس تاریک گوشے میں پہنچ گئے جہاں "رنگ رالی" کا اترا چوہدری رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ وہ اب ہوش میں آچکا تھا۔ میں نے اسے یوں باندھا تھا کہ وہ گٹھری سا بن کر رہ گیا تھا۔ اس خون آلود گٹھری میں دو خوف زدہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چوہدری بخت خالی خالی نظروں سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگا۔ صفیہ کی جلتی نگاہ بھی ذیشان پر تھی۔ صفیہ کا سارا جسم اندرونی ہیجان سے لرز رہا تھا۔ چوہدری نے مجھے اپنے ملازم کالی کے ساتھ تہ خانے سے باہر جانے کو کہا۔ جب میں کالی کے آگے آگے زینے طے کر کے بالائی دروازے پر پہنچا' مجھے چوہدری بخت کی غضب ناک دھاڑ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جذبات سے بے قابو ہو کر ذیشان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ذیشان کا بندھا ہوا جسم چوہدری کی غضب ناک ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ صفیہ چیخ کر چوہدری کے سامنے آگئی "نہ کریں بخت آپ..... نہ کریں۔ پہلے میری بات سنیں..... آپ نے کہا تھا۔ میری بات سنیں....." چوہدری نے دھکا دے کر صفیہ کو دور ہٹا دیا۔

میں ٹھٹک کر رک گیا اور یہ ہنگامہ دیکھنے لگا۔

"نہیں جی۔ آپ باہر چلیں۔" کالی نے کہا اور مجھے تقریباً دھکیلتا ہوا تہ خانے سے باہر آگیا۔ تہ خانے کا بھاری بھرکم دروازہ میرے عقب میں بند ہو گیا اور ہر قسم کی آوازیں تہ خانے کے اندر ہی رہ گئیں۔

OOO

مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ لال کوٹھی کے خفیہ گوشوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اب دوپہر ہونے والی تھی۔ تہ خانے سے نکلنے کے بعد مجھے چوہدری بخت نظر آیا تھا اور نہ صفیہ۔ ذیشان کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ ایک بھیدوں بھری خاموشی نے در و دیوار کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس خاموشی کو بس کبھی کبھی حویلی کے گیٹ پر بھونکنے والے کتوں کی آواز توڑتی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں صفیہ کا بدترین اندیشہ ابھر آتا تھا۔ صفیہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر چوہدری بخت کو چھوٹے بھائی کے اصل کرتوت کا پتا چل گیا تو حویلی میں سخت خون خرابا ہوگا' عین ممکن ہے کہ دونوں میں سے ایک قتل ہو جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ موجودہ صورت حال میں چوہدری بخت نے واقعی ذیشان کو جان سے مار دیا ہو۔ صبح مجھے چوہدری نے کالی کے ساتھ تہ خانے سے نکال دیا تھا۔ بعد میں خبر نہیں کیا ہوا تھا؟ کئی طرح کے وسوسے میرے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔

سہ پہر کے وقت مجھے ایک اہم کامیابی حاصل ہوئی۔ خلاف توقع طور پر میں ٹیلی فون پر ساحی صاحب سے بات کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری آواز پہچان کر ساحی صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔ کتنی ہی دیر تک تو انہیں یقین نہیں ہوا کہ یہ میں ہی بول رہا ہوں اور جب یقین ہو گیا تو انہوں نے سوالوں کی بوچھار کردی۔ میں کہاں ہوں' کہاں غائب رہا ہوں۔ میرے ساتھی کہاں ہیں' میں خیریت سے تو

ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "ساہی صاحب! میں اس وقت سیالکوٹ میں پسرور کے ایک قریبی دیہہ سے بول رہا ہوں۔ ایک مقامی چوہدری ہے۔ اس کی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ چند ساتھی بھی ہمراہ ہیں۔"

"اُف! بھئی عجیب چکر ہے تمہارے پاؤں میں۔ ہم لوگ تو تمہیں گلگت اور چیلاس میں تلاش کر کر کے ہلکان ہو رہے ہیں۔ خدا جانتا ہے' اتنی پریشانی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا لیکن..... اگر تم گلگت سے آ ہی گئے تھے تو پھر لاہور کیوں نہیں آئے۔ وہاں سیالکوٹ میں کیوں اٹک گئے ہو؟"

"یہ ایک لمبا چکر ہے جناب! بہت سی باتیں کرنی ہیں آپ سے اور بہت سے انکشاف بھی لیکن یہ تو تب ہے جب آمنے سامنے ملاقات ہو۔"

"ہم..... ملاقات۔" ساہی صاحب نے تیزی سے کہا "بھئی! میں تو اسی وقت سر کے بل چل کر آنے کو تیار ہوں۔ تم بتاؤ تو سہی ہو کہاں؟"

"میں آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتا' میں خود آ رہا ہوں۔ بلکہ ساتھیوں سمیت آ رہا ہوں۔ بس آپ یہ اہتمام کر دیں کہ ہماری آمد کی کسی کو خبر نہ ہو۔ آپ کی وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی خالی ہے نا؟"

"ہاں بھئی خالی ہے۔ نہ بھی ہوتی تو خالی کرا لیتا۔ کیا تم وہاں ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

"ٹھہرنا تو میں کسی زیادہ محفوظ جگہ پر چاہتا ہوں۔ بہرحال وہ کوٹھی بھی چلے گی لیکن ساہی صاحب پلیز..... وہاں کوئی نوکر یا چوکیدار وغیرہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے سوا کسی کو ہماری آمد کی خبر ہو۔"

"معاملہ سنگین لگتا ہے۔"

"سنگین تو ہے جی! بلکہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہم یہاں سے نکل ہی نہ سکیں۔ جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں بھی ایک گڑبڑ چل رہی ہے۔ آپ ایسا کریں کہ..... میں آپ کو یہاں کا ایڈریس لکھوا دیتا ہوں' اگر ہم کل دوپہر تک آپ کے پاس نہ پہنچیں یا میری طرف سے آپ کو کوئی اطلاع نہ ملے تو آپ اس ایڈریس سے رجوع کریں۔"

میں نے ساہی صاحب کو اپنا موجودہ ایڈریس لکھوا دیا۔ اس میں گاؤں کا نام اور چوہدری کا نام بھی شامل تھا۔ ساہی صاحب نے بھی مجھے ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کا فون نمبر دے دیا۔

ساہی صاحب نے کہا "تم بے فکر رہو۔ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو گا۔ بہرحال اگر حالات ٹھیک رہے تو تم کب تک لاہور پہنچ جاؤ گے؟"

"غالباً آج رات کسی وقت۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ماڈل ٹاؤن میں خود تمہارا انتظار کروں گا۔"

کچھ ضروری باتیں کرنے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

زریں گل میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! اس کا مطلب ہے کہ ام آج ہی یہ حویلی چھوڑ کر جا رہا ہے؟"

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں بھی کسی سے آنکھ شانکھ تو نہیں لڑ گئی۔"

"نہیں استاد صیب! ام اور بات کر رہا ہے۔ امارا دل چاہ رہا تھا کہ ام دو چار دن مزید اس حویلی میں رہے۔ یہ بڑا عجیب جگہ ہے حیران کرنے والا اور پُراسرار قسم کا..... کل ام نے یہاں ایک بڑا عجیب چیز دیکھا۔ آپ بھی دیکھے گا تو حیران ہو جائے گا۔ ذرا آئیں میرے ساتھ۔"

"نہیں پہلے بتاؤ..... بات کیا ہے؟" میں نے احتیاطاً کہا۔

وہ بولا "کل دوپہر ام حویلی کے پچھلے باغ میں گیا تھا۔"

"کیوں گئے تھے؟" میں نے فوراً اس کی بات کاٹی "تمہیں کہا بھی تھا' تم گمشدہ بھینس کی طرح اِدھر اُدھر نہیں گھومو گے۔"

"خو استاد صیب! پہلے امارا پورا بات تو سن لو۔ دراصل ام تجسس سے مجبور ہو گیا تھا۔"

"تجسس؟ یہ کیا بلا ہوتی ہے؟"

"خو یہ تجسس یعنی فکر..... کھوج..... جیسے تجسس ڈائجسٹ۔"

"میرا خیال ہے تم سسپنس کہنا چاہتے ہو۔ خیر بتاؤ' کیوں سسپنس پیدا ہوا تمہیں؟"

وہ بولا "ام نے حویلی کے ایک ملازم کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ہارمونیم لے کر باغ کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ام نے ایک ملازم کو ڈھولکیاں لے جاتے بھی دیکھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا' کل دوپہر کے وقت ہلکا ہلکا بارش ہو رہا تھا۔ ام حیران تھا کہ اس بارش میں یہ ہارمونیم وغیرہ باغ کی طرف کیوں جا رہا ہے۔ ام ٹہلتا ٹہلتا حویلی کے پچھواڑے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا ہی ہو گا' باغ کتنا گھنا ہے۔ آم اور کینو کا درخت تو بے تحاشا اگا ہوا ہے۔ ام باغ میں تھوڑا سا آگے گیا تو ڈھولک بجنے کا مدھم مدھم آواز آیا۔ ام حیران ہو رہا تھا کہ اس بارش میں اور اتنی سردی میں یہاں بیٹھ کر کون گانا گا رہا ہے۔ ام درختوں کے اندر سے راستہ بناتا آگے بڑھنے لگا۔ گہرے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ امارا سارا کپڑا بھیگ گیا تھا لیکن ام آگے بڑھتا رہا۔ ایک جگہ ام کو جھونپڑی بنا ہوا نظر آیا۔ یہ جھونپڑی سفید موٹی کاغذ (پولی تھین) کا بنا ہوا ہے۔ اس جھونپڑی میں بیٹھ کر چوہدری بخت بارش کا نظارہ لے رہا تھا اور گانا سن رہا تھا۔ گانے والی روشنی تھی۔ وہ گانے کے ساتھ ساتھ ستار بھی بجا رہی تھی۔ ساتھ میں اس کی موٹی خالہ تھی۔ وہ ڈھولک پر سنگت دے رہی تھی اور پان چبا رہی تھی۔ چوہدری آنکھیں پھیلا کر بیٹھا تھا اور واہ واہ کر رہا تھا۔ ان تینوں کے سوا باغ کے اس ویران حصے میں اور کوئی نہیں تھا۔ قسم سے امارا دل چاہا کہ ان تینوں پر حملہ کر دے اور جس طرح شہ میر صیب نے قلم خون ناحق میں چھریاں چلایا تھا' ام بھی چھریاں چلا کر ان کا ستیاناس کر دے۔ اتنا بے غیرتی؟ اتنا بے غیرتی ہضم کرنے کے لیے تو کسی فرنگی کا کلیجا چاہیے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر اس موٹی بھینس کو امارا ڈر نہ ہو تو وہ

بھابی کے ساتھ ہی چوہدری کے کمرے میں سونا شروع کر دے۔"

میں نے کہا "کچھ اور بھی بتانا ہے کہ بس یہی اسٹوری ہے؟"

وہ بولا "خو اصل بات تو ام آپ کو اب بتانے لگا ہے۔ ام باغ کے جس حصے میں چھپا ہوا تھا وہاں کھاد اور مٹی کا ڈھیر لگا ہے۔ اس ڈھیر کے پاس ہی ایک جگہ بہت سے انجکشن پڑے ہوئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سفید شیشیاں ہیں۔ دو تین سو تو ام نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ زمین میں بھی دبی ہوئی ہوں۔ ام کو بڑا حیرانی ہو رہا ہے۔ بار بار خیال آ رہا ہے کہ کہیں یہ نشے وغیرہ کا انجکشن تو نہیں..... " زریں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا وائل سامنے رکھ دیا۔

یہ ایک عام سا اینٹی بائیوٹک ٹیکا تھا۔ اس ٹیکے میں دوا پاؤڈر کی شکل میں ہوتی ہے۔ ٹیکے پر ایک مشہور دوا ساز کمپنی کا لیبل لگا ہوا تھا۔ ٹیکے کی "سیل" وغیرہ بھی ٹھیک تھی مگر اس کی بناوٹ میں مجھے عجیب طرح کی خامی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے یہ اصل ٹیکا نہیں۔

زریں گل نے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہیں استاد صیب؟"

میں نے کہا "فی الحال تو ٹیکا ہی دیکھ رہا ہوں۔ آئندہ جو تم دکھاؤ گے دیکھ لیں گے۔"

وہ بولا "تو آئیں امارے ساتھ۔"

ہم دونوں کمرے سے نکلے اور ایک تنگ راہداری استعمال کر کے حویلی کے پہلو میں نکل آئے۔ آج مطلع صاف تھا اور ہلکی دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ حویلی کے در و دیوار اور پھول بوٹے نکھرے نکھرے نظر آتے تھے۔ تقریباً نصف فرلانگ فاصلہ طے کر کے ہم حویلی کے عقبی باغ میں آ گئے۔ زریں گل بڑی ہوشیاری سے مجھے مطلوبہ مقام تک لے گیا۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں گتے کے تین چار کارٹن نظر آ رہے تھے۔ ان میں ٹیکے موجود تھے جو مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ کارٹن مٹی میں دبائے گئے تھے۔ پچھلے دنوں ہونے والی تیز بارشوں کے سبب زمین میں گڑھا سا پڑ گیا تھا اور کارٹن ظاہر ہو گئے تھے۔ یہی ممکن تھا کہ جتنے ٹیکے نظر آ رہے تھے اس سے کئی گنا نیچے موجود ہوں۔ یہ سارے ایک ہی قسم کے اینٹی بائیوٹک ٹیکے تھے۔ میں نے دو مزید وائل اٹھائے اور صاف کر کے جیب میں ڈال لیے۔

سامنے ہی وہ جھونپڑی بھی نظر آ رہی تھی جس کا ذکر زریں گل نے کیا تھا۔ اب جھونپڑی خالی تھی۔ مونگ پھلی کے چھلکوں' سگریٹ کے ٹکڑوں اور شراب کی ایک خالی بوتل کے سوا وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ آس پاس کے درختوں پر مجھے دو تین جھولے بھی نظر آئے۔ ہم واپس اپنے کمرے میں پہنچے تو چوہدری کا ملازم خاص "کالی" بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے باؤ جی؟" وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔

"تمہارے چاچے کے لیے لیموں ڈھونڈنے گئے تھے۔" زریں نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔ کالی کا پیٹ چونکہ کافی پھولا ہوا تھا لہٰذا زریں کا فقرہ بہت چست بیٹھا۔ خیریت گزری کہ کالی بات کی تہ تک نہیں پہنچا۔

اس نے خطرناک نظروں سے زریں کو گھورا۔ پھر اسے نظر انداز کر کے مجھ سے مخاطب ہوا "باؤ جی! آپ کو چوہدری صاحب بلا رہے ہیں۔"

کالی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونک گیا۔ میں نے زریں کو وہیں رکنے کی ہدایت کی اور خود کالی کے ساتھ چل دیا۔ بہت سی حبس زدہ راہداریوں اور غلام گردشوں سے گزار کر کالی مجھے ایک وسیع کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرا میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ یہاں سیاہ و سفید ٹائلوں کا فرش تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ ساتھ بہت سی کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر آٹھ دس افراد بیٹھے تھے۔ شکل و صورت سے وہ سادے دیہاتی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک دو کے سوا سارے اسی حویلی کے ملازم تھے۔ کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ بھی چار پانچ ملازم موجود تھے لیکن یہ ملازم بڑی تکلیف کی حالت میں تھے۔ وہ سب کے سب مرغے بنے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر کئی کئی اینٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ غالباً انہیں مارا پیٹا بھی گیا تھا۔ ان کے لباس پھٹے ہوئے تھے اور جہاں جہاں سے جسم عریاں تھا وہاں چھتری یا ہنٹر وغیرہ کے نیلگوں نشان نظر آ رہے تھے۔ مرغا بنے ہوئے یہ افراد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والے اچھے خاصے ڈشکرے تھے۔ کوئی عام بندہ انہیں دیکھتا تو فوراً جگا ٹیکس دینے پر تیار ہو جاتا لیکن اس وقت وہ معمولی کیچوے نظر آ رہے تھے۔ مشقت کے سبب ان کے جسم لرزاں تھے اور پیشانیوں سے پسینے کے قطرے نچڑ نچڑ کر ٹائلوں کے فرش کو بھگو رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ لوگ کس جرم کی سزا بھگت رہے تھے۔

میں نے ٹٹولنے والی نگاہ سے ان ملازموں کو دیکھا جو کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ بے حد سہمے ہوئے اور خوف زدہ تھے۔ کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ ان ڈرے سہمے ملازمین میں مجھے کرم دین بھی نظر آیا۔ چوہدری کے ملازم خاص کالی نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی آج ضرورت سے زیادہ مشوش اور چوکس نظر آ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ کمرے میں موجود زیادہ تر افراد کی نگاہیں لکڑی کے ایک بھاری بھرکم دروازے پر لگی ہیں۔ یہ دروازہ کسی اندرونی کمرے میں کھلتا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ چوہدری بخت اس کمرے میں موجود ہے اور لال کوٹھی کے ملازمین کی زبردست "کلاس" لے رہا ہے۔ چند لمحے بعد اندر سے چیخنے چنگھاڑنے کی بہت مدھم آواز بھی سنائی دینے لگی۔ یہ آواز یقیناً چوہدری بخت کی ہی تھی۔ دو تین منٹ یہ آواز آتی رہی۔ پھر لکڑی کا وہ بھاری بھرکم دروازہ کھلا اور ایک جسیم ملازم کی شکل نظر آئی۔ اس نے اپنے چوڑے چکلے ہاتھوں میں ایک دبلے پتلے شخص کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ یہ دبلا پتلا شخص لال کوٹھی کا ایک ادھیڑ

عمر خانساماں تھا۔ اس کی عمر یقیناً پچپن سال کے لگ بھگ رہی تھی۔ اسے بھی بری طرح پیٹا گیا تھا۔ غالباً اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا تھا اور تھوڑی خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ دبلا پتلا شخص بھی باہر نکلتے ہی مرغا بن گیا اور لحیم شحیم ملازم نے بڑی چابک دستی سے چار پانچ اینٹیں اس کی کمزور پشت پر رکھ دیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ لحیم شحیم شخص کے پاؤں ننگے تھے۔ جو ادھیڑ عمر خانساماں باہر نکلا تھا اس کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے کے قریب بہت سے جوتے پڑے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس کمرے میں چوہدری بخت موجود ہے وہاں داخل ہونے کے لیے جوتے اتارنے پڑتے ہیں۔

بوڑھے کی کمر پر اینٹیں رکھنے کے بعد لحیم شحیم رائفل بردار شخص نے میری طرف دیکھا۔ کالی کے ساتھ آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات ہوئی پھر اس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ کالی مجھے جوتوں کے بارے میں ہدایت دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے پہلے ہی جوتے اتار لیے۔ اب ہم جس کمرے میں داخل ہوئے یہ لال کوٹھی کے کئی کمروں کی طرح بالکل کورا تھا۔ یہاں ایک بڑے صوفہ سیٹ اور ایک میز کے سوا کسی قسم کا فرنیچر نظر نہیں آ رہا تھا۔ صوفے پر چوہدری بخت پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں شکاری درندے کی طرح روشن تھیں۔ وہ واقعی غضب ناک حالت میں تھا۔ اس کے قدموں میں ایک پالتو بلی گم صم حالت میں بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے مالک کے نہایت خراب موڈ نے اسے بھی متاثر کیا ہے اور وہ دم سادھے ہوئے ہے۔

چوہدری بخت کے عین پیچھے دیوار پر کسی پگڑی پوش بھاری بھرکم زمیندار کی پینٹنگ نظر آ رہی تھی۔ اس بڑی پینٹنگ کی دونوں طرف دو دو تصویریں اور بھی تھیں۔ یہ تصویریں گھنی مونچھوں اور عقابی آنکھوں والے دبنگ حضرات کی تھیں۔ یقیناً یہ سارے بارعب چہرے چوہدری بخت کے بزرگوں کے تھے۔ ان تمام تصویروں کے فریم چوڑے اور گہرے سرخ تھے۔

چوہدری نے مجھے جلتی نظروں سے دیکھا۔ ایک عجیب سی حدت اور زہرناکی تھی ان نظروں میں اور وہ سرخی بھی جو اس لال کوٹھی کی ہر شے میں نظر آتی تھی۔ میں چوہدری کو اس روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ عام حالات میں وہ صرف ایک رنگین مزاج چوہدری نظر آتا تھا۔ گانے سے اور "گانے والیوں" سے پیار کرنے والا" سیر و شکار سے دلچسپی رکھنے والا اور سیاست بازی کا شوقین۔ جس کی محفلوں میں زیادہ تر بے فکرے خواتین و حضرات شامل ہوتے تھے۔ آج پہلی بار میں چوہدری کا وہ غصیلا پن دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں مجھے کرم دین نے خاص طور سے بتایا تھا اور بے اختیار دعا کی تھی کہ اللہ ہر کسی کو ایسی مصیبت سے بچائے۔

چوہدری کے دائیں ہاتھ صاف شفاف میز پر شراب کی بوتل اور جام رکھا تھا۔ وہ ہنٹر بھی قریب ہی موجود تھا جس کی بے رحم ضربیں میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مصیبت زدہ ملازمین کے جسموں پر دیکھی تھیں۔ شراب کی یہ بوتل "ہنٹر" یہ تصویریں اور یہ چوہدری صاحب کتنا "میچ" کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ یہ سارے لوازمات تھے اس وحشت کے جو وڈیروں اور زمینداروں کے زیر سایہ سانس لینے والے لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔ میں وحشت کے اس آتشیں سمندر سے کئی بار گزرا تھا۔ اس سمندر کے سارے گرداب اور ساری لہریں میری دیکھی ہوئی تھیں۔ حرص کا ہر طوفان اور ہوس کا ہر جوار بھاٹا میرا جانا پہچانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری کا یہ خطرناک روپ دیکھ کر مجھے زیادہ تعجب نہیں ہوا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ چوہدری ایک دم ہنٹر اٹھائے گا اور چیختا ہوا مجھ پر پل پڑے گا ...... یا شاید یہ میرا وہم ہی تھا۔ بہرطور ایسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی۔ چوہدری نے مجھے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چوہدری کلف لگی شلوار قمیص میں تھا۔ میری طرح اس کے پاؤں بھی ننگے تھے (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا خاندانی بزرگوں کی تصویروں والے کمرے میں ہر شخص ننگے پاؤں اور ننگے سر داخل ہوتا تھا)

چوہدری گمبھیر آواز میں بولا "تمہارا نام شاہ جہاں ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"لاہور کا۔"

"فلموں میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! میں نے عرض کیا تھا کہ میرا تعلق فلموں سے نہیں۔ ہم لوگ تو یونہی "کیمپنگ" کے لیے کاغان گئے تھے۔ فلم والوں کے ساتھ ہی پکڑے گئے۔"

"اوہ! اچھا..... مجھے یاد آیا" تم نے بتایا تھا۔" چند لمحے توقف کر کے چوہدری نے "ریڈ وائن" کے چند گھونٹ لیے اور بولا "مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو۔ میں نے صرف ایک بات کہنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"جی میں سن رہا ہوں۔"

وہ خشک لہجے میں بولا "صرف سننا ہی نہیں" سمجھنا بھی ہے اور اس پر عمل بھی کرنا ہے۔" میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔

وہ غرایا "سر مت ہلاؤ ..... زبان سے جواب دو۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔ میں ایسا ہی کروں گا۔"

وہ بولا "ہماری ذات موچھ ہے لیکن علاقے کے لوگ ہمارے خاندان کو "گل زبان" کہتے ہیں۔ یہ لفظ "گل زبانی" سے نکلا ہے۔ جانتے ہو "گل زبانی" کا مطلب کیا ہے؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی منہ سے بھی کہا "نہیں۔"

وہ بولا "گل زبانی پنجابی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے" بات نبھانی یا قول پورا کر کے دکھا دینا۔ پشتوں سے ہمارے خاندان کی شہرت یہی ہے کہ ہم بات نبھاتے ہیں۔ جو کچھ ہماری

زبان سے نکلتا ہے اسے جان دے کر بھی پورا کرتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟"

"جی ہاں۔"

وہ شراب کا گھونٹ بھر کر بولا "جان دے کر قول پورا کرنے کی کئی مثالیں ہمارے خاندان میں موجود ہیں لیکن اس وقت میں نے تمہیں وہ کہانیاں سنانے کے لیے یہاں نہیں بلایا۔ میرے پاس وقت تھوڑا ہے اور میں تم سے صرف ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"جی میں سن رہا ہوں۔" میں نے اطاعت مندی سے کہا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "تم نے آج یہاں کچھ نہیں دیکھا۔ نہ ملک ناظم کی لاش دیکھی ہے' نہ وہ تہہ خانہ دیکھا ہے اور نہ یہ کہ میں نے اپنے بھائی سے مار پیٹ کی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں۔"

"اگر آج ..... یا آج سے دس بیس سال بعد یا کبھی بھی تمہارے منہ سے اس بارے میں ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں ڈھونڈوں گا اور قتل کر دوں گا۔"

چوہدری بخت کے الفاظ میں بے پناہ زور تھا۔ میں اس کے لہجے کی شدت اور حدت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہے گا لیکن اس نے اپنی بات کو دہرانا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اپنے لہجے کی اثر انگیزی سے آگاہ تھا۔

"میں کبھی آپ کو ایسا موقع نہیں دوں گا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ تم مجھ پر نہیں' خود پر احسان کرو گے۔"

"میں سمجھتا ہوں جی!"

وہ بولا "آج شام تک لال کوٹھی چھوڑ دو۔"

"بہت بہتر جی۔"

"ابھی تھوڑی دیر میں ایک فلائنگ کوچ یہاں پہنچ جائے گی۔ تم جہاں کہو گے' تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔"

"بہت شکریہ جناب!"

چوہدری نے نیا جام بھرنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب میں کمرے سے رخصت ہو جاؤں۔ میں سلام کر کے باہر نکل آیا۔ کالی دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ اس نے کمرے میں جھانکا۔ چوہدری کے سر کا خفیف اشارہ پا کر اس نے مجھے ساتھ لیا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ مستطیل کمرے میں بے زبان ملازم ابھی تک سزا بھگت رہے تھے۔ جب میں دروازے سے نکل رہا تھا' میں نے ڈرے سہمے کرم دین کو دیکھا..... اب اس کی پیشی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتا ہوا چوہدری صاحب کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

معلوم نہیں یہ ملازمین کیوں عتاب کا شکار تھے۔ چوہدری بخت کے غصے نے ان کا خون نچوڑ رکھا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں چونک سا گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس مار پیٹ اور سزا کا تعلق فلم اسٹار روشنی کے ہینڈ بیگ سے ہو۔ میں اس ہینڈ بیگ کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ درحقیقت تہہ خانے سے نکلنے کے فوراً بعد میرا ذہن کئی سمتوں میں مصروف ہو گیا تھا اور یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تہہ خانے میں کیا کیا کچھ ہوا تھا۔

میں نے رائفل بردار کالی سے پوچھا "یار! چوہدری صاحب نوکروں پر بہت غصہ ہو رہے ہیں۔ کیا بات ہوئی ہے؟"

وہ بے رخی سے بولا "مجھے خود معلوم نہیں۔"

"کہیں کوئی چوری وغیرہ کا چکر تو نہیں؟"

کالی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کالی کی طرف دیکھا۔ اس کے سیاہ فام چہرے پر الجھن تھی اور نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ میں نے کہا "کہیں یہ فلم اسٹار روشنی کے ہینڈ بیگ والا معاملہ تو نہیں ہے؟"

کالی ٹھٹک کر رک گیا "ہت تیرے..... تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرا خیال ہے ..... تو واپس چلیں۔ میں چوہدری صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کالی غرایا "اگر ..... تمہیں معلوم تھا تو اب تک خاموش کیوں تھے تم؟"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

کالی چند لمحے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا پھر واپس چوہدری کے کمرے کی طرف چل دیا۔ مستطیل کمرے سے گزر کر ہم گول کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ یقیناً کرم دین سے پوچھ گچھ شروع ہو چکی تھی۔ کالی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

"اندر نہیں چلو گے؟" میں نے پوچھا۔

"دو منٹ صبر کرو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "دو منٹ میں اندر والے بے چارے کی چمڑی ادھڑ جائے گی۔"

کالی مجھے خوف زدہ انداز میں روکتا رہ گیا لیکن میں نے دروازے پر دستک دے دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا اور لحیم شحیم ملازم نے حیرت آمیز غصے سے باہر جھانکا "کیا بات ہے جی؟" اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔

"مجھے چوہدری صاحب سے بات کرنی ہے۔"

یقیناً وہ دیوہیکل داروغہ مجھے چوہدری کے "دربار" میں داخل ہونے سے روک لیتا لیکن اس دوران میں چوہدری نے مجھے دیکھ لیا اور بارعب لہجے میں اندر بلا لیا۔ کرم دین پاؤں کے بل فرش پر بیٹھا تھا اور سراپا عجز و انکسار نظر آ رہا تھا۔ چوہدریوں اور جاگیرداروں کے سامنے اس انداز سے بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ میں نے دیکھے تھے۔ ان کے ہاتھ آپوں آپ جڑ جاتے تھے' ان کے دانت منت

ساجت کے انداز میں نکل آتے تھے اور بھیک مانگتی آنکھوں میں دنیا جہان کی عاجزی سمٹ آتی تھی۔ ان فریادیوں میں، میں نے بچے بھی دیکھے تھے، مرد بھی، جوان خوب رو عورتیں بھی اور باریش بوڑھے بھی۔ داناؤں نے درست کہا ہے، مظلوم کی بے چارگی دیکھ کر ظالم کے ظلم کو ہوا ملتی ہے اور جوں جوں ظلم کو ہوا ملتی ہے مظلوم ذلت اور رسوائی کے گڑھے میں گرتا چلا جاتا ہے۔ منہ زبانی منت ساجت کرنے والا ہاتھ جوڑنے لگتا ہے۔ ہاتھ جوڑنے والا پاؤں پکڑنے لگتا ہے۔ پاؤں پکڑنے والا قدموں پر سر رکھ دیتا ہے اور ٹھوکریں بھی کھاتا جاتا ہے۔ اس ناتوانی اور بے بسی کی کہیں انتہا نہیں ہوتی۔ میں نے ایسے زیر عتاب لوگوں کو کتوں کے ساتھ پانی میں منہ ڈال کر پانی پیتے دیکھا ہے۔ جوتیوں کے تلوے چاٹتے دیکھا ہے' برہنہ جسم ناچتے دیکھا ہے اور ایسے مرد بھی دیکھے ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی بہن بیٹی یا بیوی کو ظالم کی خلوت میں پہنچایا..... ہاں اس ذلت کی کہیں انتہا نہیں ہوتی۔ اس ذلت کو یا ابتدا میں روکا جاتا ہے یا کبھی نہیں روکا جاتا۔

مجھے دیکھ کر چوہدری بخت نے کرم دین اور اپنے رائفل بردار ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ بھاری بھرکم دروازہ بند ہوا تو ہم دونوں کمرے میں ایک بار پھر تنہا رہ گئے۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل کل رات سے واقعات اتنی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں کہ دماغ چکرا کر رہ گیا ہے۔ اس افراتفری نے شاید بیگم صاحبہ (صفیہ) کو بھی پریشان کیا ہے۔ وہ آپ کو ایک اہم بات بتانا بھول گئی ہیں۔ یا شاید انہیں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ وہ آپ سے یہ بات کہہ سکیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" چوہدری نے ترشی سے پوچھا۔

"میں مس روشنی کے ہینڈ بیگ کی بات کر رہا ہوں۔" چوہدری بری طرح چونک گیا۔ میں نے کہا "میں نے بیگم صاحبہ کو ہینڈ بیگ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ تہ خانے میں ہے۔ گیلری کے نیچے لوہے کی بڑی الماری میں۔"

چوہدری نے مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ کر کہا "وہاں کس نے پہنچایا بیگ؟"

میں نے کہا "میں نے اس بارے میں سب کچھ بیگم صاحبہ کو بتا دیا تھا۔ یہ بیگ چھوٹے چوہدری ذیشان تہ خانے میں لے کر گئے تھے..... بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو چوہدری ذیشان مجھے بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ میری اور ملک ناظم کی لاشیں ایک ہی صندوق میں بند کر کے تہ خانے میں چھپا دی جائیں۔ یہ قیمتی ہینڈ بیگ اس لیے اٹھایا گیا تھا کہ میری "گمشدگی" کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ اگر میں تہ خانے میں مارا جاتا تو چوہدری ذیشان یقیناً کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دیتے کہ میں ہینڈ بیگ لے کر فرار ہو گیا ہوں۔"

چوہدری بخت میرے انکشافات کو بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ بیگ کی اطلاع ملنے سے اس کے چہرے کی درشتی قدرے کم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے قابل اعتماد ملازم کالی کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ کالی ادب سے سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی قریباً دس منٹ بعد ہوئی..... روشنی کا ہینڈ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ چوہدری بخت نے بیگ کھول کر سامان چیک کیا۔ جڑاؤ گہنے' نقدی سب کچھ بیگ میں موجود تھا۔ چوہدری نے بیگ بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور کالی سے کہا کہ ملازموں کو جانے کی اجازت دے دی جائے۔ کالی روبوٹ کی طرح سر جھکا کر اور گھوم کر باہر نکل گیا۔ میں نے چوہدری کے چہرے کو بغور دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اپنے ملازموں کو بے وجہ ذلیل کرنے کا "ملال" یا کسی طرح کی ندامت اس کے چہرے پر نظر آئے لیکن یہ چہرہ تو شاید "ندامت پروف" تھا۔ وہی تنی ہوئی مونچھیں' وہی نیم باز آنکھیں' وہی اکڑی ہوئی گردن۔

چوہدری مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم ایمان دار شخص ہو اور کسی حد تک دلیر بھی ہو۔ ہم ایسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔" پھر ذرا توقف سے بولا "کوئی ایسا بندہ میرے ہاتھوں نقصان اٹھا جائے تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔"

چوہدری کے بظاہر دھیمے الفاظ میں وہی خوف ناک دھمکی پوشیدہ تھی جو وہ اس سے پہلے بھی زبان پر لا چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے تنبیہہ کی تھی۔ اگر مجھے اپنی خیریت اور زندگی مطلوب ہے تو میں لال کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! تعریف کا شکریہ۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ میری وجہ سے آپ کو "ناراض" نہ ہونا پڑے۔"

چوہدری نے اپنا بڑا سا سر اثبات میں ہلایا۔ میں سلام کر کے باہر آ گیا۔

حویلی سے مجھے جانے کی اجازت دے کر چوہدری نے ایک دلیرانہ فیصلہ کیا تھا۔ ایسا فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اپنی قوتِ بازو اور اپنے "لمبے ہاتھوں" پر اعتماد ہو۔ اس نے میرے بارے میں زیادہ چھان پھٹک بھی نہیں کی تھی بلکہ شاید ابھی اسے ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں لاہور میں کس جگہ رہتا ہوں لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جب چاہے گا مجھ تک پہنچ جائے گا اور میرا ٹینٹوا دبا لے گا۔

یقیناً یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی تھی۔ انگریزی میں اس کے لیے بڑا مناسب لفظ "اوور کون فی ڈنس" ہے۔ چوہدری اپنی خاندانی اور سیاسی طاقت کے نشے میں سرشار تھا۔ اسے اپنے ارد گرد کا ہر شخص چیونٹی نظر آتا تھا اور یقیناً میں بھی ان چیونٹیوں میں شامل تھا۔ دور دراز علاقوں میں رہنے والے اور ہر وقت خوشامدیوں میں گھرے رہنے والے زمیں دار اور وڈیرے اکثر اس قسم کے تکبر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر چربی چڑھ جاتی ہے اور آہستہ آہستہ ان کی نگاہ کوڑے کے گڑھے میں تمیز کرنا بھی

چھوڑ دیتی ہے۔

میں زریں گل کے پاس پہنچا تو وہ بولا "خو استاد صیب! کچھ سنا ہے آپ نے؟ یہاں حویلی میں بہت سا نئی نئی خبریں سننے میں آ رہا ہے۔"

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً یہ کہ فلم اسٹار روشنی کا چوری ہو گیا ہے۔ کسی نے اس کا ہینڈ بیگ غائب کر دیا ہے اس میں زیور تھا اور وہ نقدی تھا جو اس نے یہاں رات دن "محنت" کر کے کمایا ہے۔"

میں نے کہا "یہ خبر تو اب پرانی ہو گئی ہے۔ وہ ہینڈ بیگ مل گیا ہے۔"

"کب..... کیسے؟" وہ اپنا زخمی کندھا دباتے ہوئے بولا۔

"اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ بہرحال ابھی میں وہ ہینڈ بیگ چوہدری بخت کے پاس دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

زریں گل نے ہونٹ سکوڑے پھر بولا "دوسرا خبر یہ ہے کہ چھوٹا چوہدری ذیشان حویلی سے غائب ہے۔ پتا چلا ہے کہ کل اس کا کوئی دوست یہاں آیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر چلا گیا۔ ابھی تک ان دونوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔ حویلی میں بہت زیادہ پریشانی پھیلا ہوا ہے۔ ام نے سنا ہے کہ چوہدری صیب چھوٹے بھائی کے غائب ہونے پر پرچہ درج کروا رہے ہیں..... آپ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کیا چوہدری صیب نے؟"

"نہیں..... مجھے تو بس یہی کہا ہے کہ ہم جانے کی تیاری کر لیں اور شام سے پہلے یہاں سے چلے جائیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک فرما رہا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے ام نے ایک فلائنگ کوچ کو پھاٹک سے اندر آتے دیکھا ہے۔ کیمرا مین رضوی صیب کو ایک نوکر نے بتایا ہے کہ یہ کوچ امیں لاہور لے جانے کے لیے آیا ہے۔ امارا خیال ہے کہ امیں اتنی افراتفری میں اس لیے یہاں سے بھیجا جا رہا ہے کہ حویلی میں کوئی گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "پھر کیا خیال ہے۔ ہمیں جانا چاہیے یا ہمیں گڑ بڑ میں رہنا چاہیے؟"

وہ بولا "جانا تو اب پڑے گا جی..... ویسے پتا نہیں کیوں ام کو یہ حویلی بڑا اور طرح کا لگتا ہے۔ یہاں ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔"

"کالا نہیں کالی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی کالی اس ڈشکرے کا نام ہے جو ہر وقت چوہدری کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔"

"چلو جی کالی ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ ہے نا۔ ام کو اس حویلی میں سے کسی چکر کا بو آ رہا ہے۔ سچ استاد صیب! کبھی کبھی امارا دل چاہتا ہے کہ ام ہر بات کی تہ میں اتر جائے۔ ہر بات کا کھوج لگائے۔"

میں نے کہا "یہ کام تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔ جہاں کوئی لڑکی دیکھتے ہو اس کی تہ میں اتر جاتے ہو۔ کھوج لگانے لگتے ہو کہ کپڑوں کے اندر لڑکی اصلی ہے یا ربڑ پلاسٹک کی ہے....."

"خو استاد صیب! ام اس کھوج کا بات نہیں کرتا۔ ام تو تحقیق کا بات کر رہا ہے' جانچ پڑتال کا بات کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ام سوچتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر ام شروع میں اپنے باپ کی بات مان لیتا اور پشاور میں چپل کباب لگانے کے بجائے پولیس میں بھرتی ہو جاتا۔"

میں نے کہا "پولیس میں بھرتی ہو جاتے تو بھی کچھ نہ کر سکتے۔ تم نے زیادہ سے زیادہ یہی کرنا تھا کہ بہت سی خوب صورت لڑکیوں کو ہتھکڑی لگانا تھی اور ایک ایک کر کے ان سے عشق بھگارنا تھا..... پانچویں چھٹے عشق کے بعد لوگوں نے تھانے کو آگ لگا دینی تھی اور تمہیں سنگسار کر دینا تھا۔ بعد میں قصہ خوانی بازار میں تمہاری یادگار بننا تھی جس پر لکھا جانا تھا "ایک عاشق مزاج تھانے دار" جسے عورتوں کا شکاری سمجھ کر غلطی سے فوارہ چوک میں سنگسار کر دیا گیا۔"

میری بات سن کر زریں کی زبان میں بھی کھجلی ہونے لگی تھی۔ کہنے لگا "تھانے دار بن کر عورت کو ہتھکڑی لگانے کا آئیڈیا امارے ذہن میں بھی کئی بار آیا ہے لیکن جس عورت کو ام ہتھکڑی لگائے گا وہ کوئی اور نہیں، آپ کی چہیتی سروج عرف آلو کی پٹھی ہو گی۔ اللہ جارک تعالیٰ کوئی ایسا موقع لائے۔ ام اس کو بار بار کر کھی بنائے گا۔ اس پر ڈی ڈی ٹی چھڑکے گا اور کسی خارش زدہ کتے پر بٹھا کر "واہگہ بارڈر" پار کراوے گا۔"

میں نے کہا "اور اگر اس کے گرو سائیں خالی نے تجھے مکھی بنا دیا تو؟"

سائیں خالی کے ذکر پر زریں چونک سا گیا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا آیا تھا۔

"اچھا جی ام اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہے۔ آپ تو اخبار والوں کی طرح بات کا بتنگڑ بناتا ہے۔" زریں گل نے کہا اور نسوار تھوکنے کے لیے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

میں نے مذاق مذاق میں زریں کی بات رد کی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس حویلی کے صبح و شام مجھے بھی میلے میلے نظر آتے تھے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ یہاں کوئی غیر قانونی کام ہو رہا ہے..... کوئی ایسا فعل جو ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے دوائیوں کے وہ کارٹن بھی اہم تھے جو آج میں نے مخفی باغ میں دیکھے تھے اور جن کی نقاب کشائی تین چار دن کی زوردار بارش سے ہوئی تھی۔ یہ کارٹن دیکھنے کے بعد مجھے ایک اور بات یاد آ گئی تھی۔ حویلی میں قیام کے پہلے دن جب ہم چوہدری بخت کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے کی طویل سیر پر گئے تھے تو ایک جگہ مجھے نامانوس سی بو محسوس ہوئی تھی۔ یہ بو ایسی تھی جیسی اسپتالوں سے یا فارمیسی وغیرہ کے قریب سے آتی ہے۔ یہ مدھم بو چند لمحوں کے لیے میرے نتھنوں

سے ٹکرا کر اوجھل ہو گئی تھی لیکن اس کا تاثر ابھی تک میرے حافظے پر نقش تھا۔

سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ ہم لال کوٹھی سے لاہور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم کل پندرہ افراد تھے جن میں زرغونہ اور زادیں گل کے علاوہ روشنی اور اس کی چنڈال خالہ بھی شامل تھی۔ میں روشنی کی خالہ کا رویہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ ایک زبردست بحران سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔ یخ بستہ "راوی کو موت" میں فلمی یونٹ کے درجنوں افراد لاپتا و جاں بحق ہو گئے تھے۔ یقیناً ان بدنصیبوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کا شمار مہتاب بانو (روشنی کی خالہ) کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہو گا لیکن ان کی جدائی کا عکس تک مہتاب کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ ہشاش بشاش نظر آتی تھی اور اس کے بس میں ہوتا تو وہ چوہدری کی "فتح بخش قربت" میں چند روز مزید گزار لیتی..... ہاں روشنی کسی حد تک بیزار نظر آتی تھی۔ غالباً چوہدری کی "سخت ڈیوٹی" دے دے کر وہ اکتا گئی تھی۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو طویل لیکچر دیا اور انھیں بتایا کہ ہمیں کیسے لاہور پہنچنا ہے۔ لاہور میں ہمیں کیا خطرات درپیش ہو سکتے ہیں اور ہمیں ان خطرات کا سدِباب کیسے کرنا ہے۔ مہتاب کے علاوہ سب میری رائے سے متفق دکھائی دیتے تھے۔

چوہدری بہت مصروف تھا لیکن عین ہماری روانگی کے وقت وہ دو تین منٹ کے لیے نظر آیا اور اس نے ہمیں خدا حافظ کہا۔ میرا خیال تھا صفیہ بھی ضرور دکھائی دے گی لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ صبح سے صفیہ کی جھلک تک دکھائی نہیں دی تھی۔ چوہدری ذیشان کا غائب ہونا تو سمجھ میں آتا تھا کہ چوہدری بخت نے مقتول ناظم کے وارثوں پر جوابی پرچہ کٹوانے کے لیے اسے کہیں چھپا دیا ہو لیکن صفیہ کے اوجھل ہونے میں کیا حکمت تھی؟

چوہدری کے ساتھ اس کی پہلی بیوی ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھی۔ اسے دیکھ کر کسی چھوٹی موٹی ہتھنی کا خیال ذہن میں آتا تھا۔ ایسی ہتھنی جس نے کسی میلے ٹھیلے میں بچوں کو خوش کرنے کے لیے زرق برق لباس پہن رکھا ہو۔ شاید موٹاپے کے علاوہ اسے مالیخولیا بھی تھا۔ وہ مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ اپنے دیور ذیشان کی "گمشدگی" نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ علی الاعلان کہہ رہی تھی کہ ذیشان کے غائب ہونے میں ملکوں کے لڑکے ناظم کا ہاتھ ہے۔ وہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے اور اگر جلدی اسے چھڑایا نہ گیا تو وہ "معصوم" ذیشان کو جان سے مار ڈالے گا۔

روشنی نے اپنی کھنک دار آواز میں پوچھا "لیکن باجی! دشمنی کیا تھی؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولی "دشمنی وہی پیسے کی اور کیا؟ گھٹنے واگھڑا! ہمارے بھولے بھالے ذیشان سے رقمیں لے لے کر جوئے میں ہارتا رہا۔ اب اور رقم مانگ رہا تھا۔ اس وچارے نے انکار کیا تو بس پیچھے پڑ گیا ہاتھ دھو کر۔"

کچھ دیر بعد ہم فلائنگ کوچ میں بیٹھ کر لال کوٹھی کے وسیع گیٹ سے نکلے اور "رنگ والی" گاؤں کے نیم پختہ راستوں پر آگے بڑھنے لگے۔ گاؤں کے درودیوار پر چوہدری بخت کے نام کے پوسٹر کثرت سے نظر آ رہے تھے۔ ان میں چوہدری کی ایک تصویر تھی جس میں اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی اور کالی شیروانی زیب تن کی ہوئی تھی۔ پوسٹرز پر اس قسم کے الفاظ تھے۔ "صاف گو' بے باک' بلند کردار' حق کا علم بردار چوہدری بخت آور۔ آپ کا نمائندہ۔"

چوہدری کی صاف گوئی' راست بازی اور حق پرستی لال کوٹھی کی تاریک بھول بھلیوں میں بند تھی اور اتفاقاً میں اس کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا۔ میں نے خوب رو روشنی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھی۔ میری طرح وہ بھی غور سے ان پوسٹرز اور بینرز کو دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ یہ کس بلند کردار اور صاف گو چوہدری کا ذکر ہے۔

O☆O

یہ ماڈل ٹاؤن کی ایک خاموش اور سنسان کوٹھی تھی۔ منظر اس کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ پچھلے [illegible] گھنٹے سے میں اور ساہی صاحب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں [illegible]

Scanned by Waqar Azeem Uploaded By Nadeem

[illegible] واقعات سنا رہا تھا۔ ساہی صاحب کے چہرے پر حیرت سی حیرت تھی۔

ایک طویل بیان کے بعد میں خاموش ہوا تو ساہی صاحب وہ تقریباً سب کچھ جان چکے تھے جو میرے علم میں تھا۔ میری پریشانیاں اب ان کی پریشانیاں بن چکی تھیں اور میرے اندیشوں نے ان کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا۔ وہ خط ہمارے سامنے میز پر پڑا تھا جو سردار صدرت نے میرے نام لکھا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ خط مجھے زرغونہ کی جیب سے ملا تھا۔ میری طرح ساہی صاحب بھی اس خط کو کئی بار پڑھ چکے تھے۔ ساہی صاحب سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولے "تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اگر وادی کے مکینوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تو یرغمالیوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ ایسے ہی کچھ واقعات پہلے بھی رونما ہو چکے ہیں۔ درحقیقت وہ سارا علاقہ "ممنوعہ حیثیت" رکھتا ہے۔ جتنے بھی ملکی اور غیر ملکی افراد ان علاقوں میں سیاحت کے لیے جاتے ہیں انھیں خصوصی طور پر وارننگ دی جاتی ہے کہ وہ ممنوعہ علاقوں سے دور رہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حوالے سے حکومت اور انتظامیہ نے اپنے فرائض سے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر فلمی یونٹ کے لوگ کسی ایسے ممنوعہ علاقے میں گئے ہیں تو انھوں نے سنگین غلطی کی ہے اور جو اتنا بڑا نقصان ہوا ہے اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔ اسی طرح غلبا پچی کوہ پیماؤں کو بھی بلا سوچے سمجھے ویرانے میں نہیں بھٹکنا

چاہیے تھا۔"

ساہی صاحب نے اٹھ کر ایک الماری کھولی اور اس کی دراز میں سے ایک کتابچہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کتابچے کا عنوان تھا "پاکستان ٹریکنگ گائیڈ" اس کتابچے میں "ٹریکرز" اور دیگر مہم جو حضرات کے لیے بہت سی بیش قیمت معلومات و ہدایات درج تھیں۔ اس کے علاوہ نقشے بھی دیے گئے تھے۔ ساہی صاحب نے مجھے نقشے دکھائے اور ان واضح ہدایات کے بارے میں بتایا جو ممنوعہ علاقوں کے بارے میں درج تھیں۔ ایک ایسی ہی ہدایت کی عبارت کچھ اس طرح تھی "ٹریکر حضرات مندرجہ بالا نقشے میں دکھائی گئی حدود سے آگے ہرگز سفر نہ کریں۔ یہاں جارح قسم کے پہاڑی لوگ گھومتے ہیں جو ٹریکرز اور سیاح حضرات کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیز ٹریکنگ پرمٹ کے بغیر ہرگز سفر پر روانہ نہ ہوں۔"

ساہی صاحب نے بے قراری کے عالم میں سگریٹ پھونکتے ہوئے کہا "میں تمہاری اس رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ محترم مجتبیٰ کنور اور مسٹرجی کلارک سے فوری رابطہ کیا جائے اور انھیں اعتماد میں لے کر ساری بات بتا دی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی رائے بھی یہی ہو گی کہ فی الحال قبائلیوں کے خلاف کسی طرح کا ایکشن نہ لیا جائے۔"

میں نے [illegible] آئی [illegible] صاحب کہاں ہیں؟

"وہیں گلگت میں۔" ساہی صاحب نے جواب دیا "مسٹرجی کلارک صاحب تو مستقل طور پر وہیں ہیں۔ مجتبیٰ کنور صاحب کو چونکہ الیکشن کی مصروفیت بھی ہے اسی لیے وہ کبھی آ جاتے ہیں کبھی چلے جاتے ہیں۔ دو تین دن سے وہ پھر گلگت میں ہیں۔"

"پھر آپ کب بلوا رہے ہیں انھیں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ میں ابھی ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

میں ساہی صاحب سے فریال کے علاوہ شفتا اور انجم کا حال احوال بھی پوچھ چکا تھا۔ وہ دونوں بخیریت تھیں اور ساہی صاحب نے انھیں جس محفوظ ٹھکانے پر رکھا ہوا تھا وہاں کے ماحول سے مانوس ہو چکی تھیں۔ میں نے ساہی صاحب سے درخواست کی کہ میں شفتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ بولے "وہ بھی بہت بے چین ہے۔ دن میں کئی بار تمہارے بارے میں سوچتی ہے اور روتی ہے۔ پانچ چھ روز پہلے میں اس سے ملا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح ضد کرنے لگی تھی۔"

میں نے پوچھا "کیا ہم آج اس سے مل سکتے ہیں؟"

"نہیں۔" انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "تم نہیں جانتے جلد بازی میں کتنے خطرات ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں ابھی تم کچھ دن مزید اپنے سینے پر پتھر رکھو۔ شیخ عاصم ایک آسیب کا نام ہے۔ میں نے کئی دفعہ محسوس کیا ہے کہ وہ ہمارے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ تم جانتے ہی ہو شیخ عاصم کی سب سے بڑی ضد شفتا ہے۔ وہ اس تک پہنچنے کے لیے بڑے سے بڑا رسک لے سکتا ہے۔ اگر تم شیخ کی طرف سے غفلت برتو گے تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جناب! لیکن اپنے دل کا کیا کروں؟"

ساہی صاحب اٹھے اور الماری میں سے ایک بڑا لفافہ نکال لائے۔ اس لفافے میں ایک شان دار سوئٹر تھا۔ وہ سوئٹر میرے سامنے پھیلاتے ہوئے بولے "یہ شفتا نے تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے بنا ہے۔ کہتی ہے' بھائی جان کو پہنا دیں اور اس سوئٹر میں ان کی ایک تصویر اتار کر میرے لیے لائیں۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ تم اس وقت تک گلگت پہنچ چکے تھے اور تمہارا کوئی اتا پتا نہیں چل رہا تھا۔ تمہاری اور صفدر کی گمشدگی سے شفتا اور انجم دونوں بے خبر ہیں۔ میں جب شفتا سے ملتا تھا تصویر کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بنانا پڑتا تھا۔"

میں نے سوئٹر دیکھا' لاجواب تھا۔ مختلف رنگوں کی اون سے اتنے باریک ڈیزائن بنائے گئے تھے کہ میں دنگ رہ گیا۔ اس سوئٹر کے ایک ایک تار میں میری پیاری بہن کی خوشبو رچی بسی تھی۔ میں نے اسی وقت جیکٹ اتار کر ایک طرف رکھ دی اور سوئٹر پہن لیا۔

Scanned by Waqar Azeem Uploaded By Nadeem

[illegible] نے تھرماس میں سے چائے انڈیلی اور بولے "تم نے سب کے بارے میں پوچھ لیا اور حال احوال بھی دریافت کر لیا لیکن ایک کے بارے میں نہیں پوچھا۔"

"کس کے بارے؟"

"غزالہ کے بارے میں۔"

میرا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ پچھلے دو گھنٹے میں غزالہ کا نام کئی بار میرے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں' غزالہ کے حوالے سے میرے اندر عجیب سی جھجک پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں..... کیسی ہے وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ کلینک میں بیٹھتی ہے۔ گلبرگ میں اس کی پریکٹس اچھی چل نکلی ہے لیکن اور بہت سی پریشانیوں نے اسے گھیر رکھا ہے۔"

"شوہر کے ساتھ اس کی صلح ہوئی یا نہیں؟"

"شوہر!" ساہی صاحب نے زہرخند لہجے میں کہا "وہ کہاں ہے اس کا شوہر۔ وہ تو صرف اور صرف تمہارا دشمن ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے صرف تمہاری دشمنی میں اٹھاتا ہے۔"

"لیکن جناب! غزالہ نے اس کے ساتھ شادی اپنی خواہش اور رضا سے کی تھی۔"

"بے شک وہ رضا تھی لیکن اس رضا کی بنیاد ایک سازش پر تھی۔ وہ سازش جو تمہارے عیار دشمن نے تمہیں ایک اور چرکا لگانے کے لیے تیار کی تھی۔"

میں نے کہا "لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ اس سازش کے

حال تک کیسے پہنچی۔ چچا جلیس اور چچی فاخرہ نے دولت اور اسٹیٹس دیکھ کر اس کی شادی ایک غلط کار سے کردی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک ناکارہ شخص نکلا اور بیوی کو فروخت کرنے کی راہ پر چل نکلا۔ اگر اس کی بیوی کو شیخ عاصم نہ خریدتا تو کوئی اور بدکار خرید لیتا۔"

ساہی صاحب میرے لہجے کی تپش کو محسوس کرکے بولے "بہرحال یہ ایک لمبی بات ہے۔ کسی وقت اطمینان سے کریں گے۔"

"فرزانہ کو میری آمد کا پتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ آج کل لاہور میں نہیں۔ ریلیف کیمپ میں گئی ہوئی ہے۔"

"ریلیف کیمپ؟"

"ہاں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ بے موسمی بارش کا سلسلہ کتنے زور شور سے جاری ہے۔ شمالی پنجاب میں تو کچھ خاصی آفت آئی ہے۔ کئی برساتی نالے اچھل گئے ہیں۔ وسیع رقبہ زیرِ آب آگیا ہے۔ جہاں سیلاب آتا ہے وہاں وبائیں بھی پھیلتی ہیں۔ کئی علاقوں میں نمونیا، انفلوئنزا اور ٹائیفائیڈ وبا کی شکل اختیار کرگیا ہے۔ اسی سلسلے میں ریلیف کا کام ہو رہا ہے۔"

میں ساہی صاحب سے شیخ عاصم اور شیطان ابن شیطان شکرا شکرا کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں ڈی آئی جی کی کال آگئی اور ساہی صاحب اپنے آفیسر کے ساتھ طویل گفتگو میں مصروف ہوگئے۔

○☆○

اگلے چھ سات روز بے حد مصروف گزرے۔ میں ان دنوں کی تفصیلات سنانے میں لگ گیا تو کئی صفحات بھر جائیں گے۔ مجتبیٰ صاحب اور مسٹر جی کلارک صاحب گلگت سے لاہور تشریف لا چکے تھے۔ ان کے چہروں سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ تھکے ماندے ہیں اور پچھلے چند ہفتے انہوں نے ایک لاحاصل کوشش میں گزارے ہیں۔ مجتبیٰ کنور نے مجھ سے باقاعدہ معانقہ کیا۔ مسٹر جی کلارک صاحب نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ساہی صاحب انہیں بہت سی باتیں فون پر بھی بتا چکے تھے پھر بھی تجسس دونوں کے چہروں سے عیاں تھا۔ ان دونوں کے ساتھ میری ایک طویل نشست ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح میں اور میرے تینوں ساتھی "نو مین لینڈ" میں پہنچے اور وحشی صورت کلہاڑا برداروں کے ہتھے چڑھے۔ کیسے ہمیں ایک گمنام وادی میں پہنچایا گیا اور کیسے وہاں حیرت خیز واقعات کا سلسلہ پیش آیا۔ اخبار نویس شاہد خان کی دردناک موت، سردار پاپامہ کے ساتھ میری دوستی، سردار پاپامہ کو درپیش خطرات کا ذکر اور بالآخر سردار کا قتل..... میں نے سب کچھ تفصیل سے بیان کیا۔ اس کے بعد کہانی کا رخ پاپامہ کی بچی زرغونہ کی طرف مڑ گیا۔ وہ خونی رسم جو بچی کے سر پر تلوار کی طرح لٹک رہی تھی، بچی کی خاطر جاتریوں سے میرا ٹکراؤ، جاتریوں کی عیاریاں اور آخر میں

وہ دھواں دھار معرکہ جس میں پندرہ بڑے جاتریوں کے ٹکڑے دھماکے سے فضا میں بکھر گئے۔ میں نے لفظوں کی مدد سے اس ساری صورتِ حال کا نقشہ بیان کردیا۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہے اور سنتے رہے۔ آخر میں میں نے..... سردار سدورت کا خط دونوں حضرات کو پیش کردیا۔ زریں گل اس خط کا لفظ بہ لفظ ترجمہ سنانے کے لیے موجود تھا۔ اس موقع پر ساہی صاحب بھی ہماری میٹنگ میں شریک ہوگئے۔

خط پر طویل غور و خوض کے بعد مسٹر جی کلارک صاحب نے پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ حسبِ معمول وہ انتہائی قیمتی لباس میں تھے۔ ان کی انگلیوں میں دنیا کے مہنگے ترین ہیرے جگمگا رہے تھے۔ ان کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا انداز بے حد متاثر کن ہوتا تھا۔ گہری سانس لے کر وہ بولے "شاد جہاں! میں تمہاری اس رائے سے متفق ہوں کہ اس "سدورت" نامی سردار کے وعدے پر بھروسا کیا جائے اور اس بات کا انتظار کیا جائے کہ جون چارلی اور دیگر یرغمالی پندرہ ہفتوں تک بخیریت ہمارے پاس پہنچ جائیں۔"

بات ختم کرکے وہ سوالیہ نظروں سے مجتبیٰ، ساہی صاحب اور زریں کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تینوں بالکل خاموش تھے۔ خاموش رہنے اور "ہاں" میں سر ہلانے کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ کلارک صاحب کی موجودگی "حاضرینِ محفل" کو اسی طرح مرعوب کردیا کرتی تھی۔ میں نے ان کی محفل میں اکثر لوگوں کو صرف "ہاں" میں سر ہلاتے ہی دیکھا تھا۔ بس مجتبیٰ کنور تھا جو کبھی کبھی ان کی بات سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتا تھا یا پھر مجھے یہ توفیق نصیب ہوئی تھی۔ شروع شروع میں میری دخل اندازی نے کلارک صاحب کو حیران کیا تھا اور مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ ناراض ہوگئے ہیں مگر تین چار ملاقاتوں کے بعد انہیں اندازہ ہوا تھا کہ میری مداخلت سے شروع ہونے والا مکالمہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر زیرِ نظر مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر ہمارے درمیان گفتگو ہوئی۔ مجتبیٰ کنور کا خیال تھا کہ کوئی بھی بات چھپا کر نہ رکھی جائے۔ کل صبح پریس کانفرنس کی جائے جس میں ساری روداد وضاحت کے ساتھ بیان کردی جائے۔ مجتبیٰ کنور کا خیال تھا کہ قراقرم رینج میں پیش آنے والے واقعات اور جانی نقصان کے سلسلے میں حکومت کو کسی طور ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ جو لوگ بھی حادثات کا شکار ہوئے ہیں انہوں نے قانون اور ضابطوں کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے ممنوعہ علاقوں میں سفر کیا ہے۔

مجتبیٰ کنور کی بات اپنی جگہ درست تھی مگر کلارک صاحب کو اندیشہ تھا کہ جب اتنے وسیع پیمانے پر جانی نقصان کی پبلسٹی ہوجائے گی تو عوامی حلقے برداشت نہیں کریں گے کہ انتظامیہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی اور یرغمالیوں کی رہائی کا انتظار کرے۔ انتظامیہ پر دباؤ ڈالا جائے گا کہ وہ ان ممنوعہ علاقوں میں گھسے اور ان لٹیروں

کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائی کی جاسکے۔

ان دونوں نکات پر سوچ بچار کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ فی الحال اس معاملے کو پریس رپورٹس کے لیے "اوپن" نہ کیا جائے بلکہ مجتبیٰ کنور صرف ان چند اہم لوگوں کو اعتماد میں لے جو تلاش کی کارروائی سے منسلک رہے ہیں اور جنہیں اعتماد میں لیا جانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں سے مکمل رازداری کا پختہ وعدہ بھی لیا جائے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ میں اور میرے تمام چودہ ساتھی ابھی تک ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں مقیم تھے۔ فلمی یونٹ کے ارکان جلد سے جلد اپنے گھروں کو جانا چاہتے تھے لیکن مجتبیٰ کنور ابھی دو دن انہیں مزید اس کوٹھی میں رکھنا چاہتا تھا۔ مجتبیٰ کنور کی ہدایت کے مطابق میں انہیں سمجھا بجھا کر واپس آرہا تھا کہ ساہی صاحب سے برآمدے کے عین درمیان ملاقات ہوگئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک کیمرا تھا۔ ساہی صاحب کا ڈرائیور بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے کیمرا ڈرائیور کو دیتے ہوئے کہا "جاؤ..... صاحب کے ساتھ کمرے میں جاؤ اور صاحب کی تصویر اتار کر لاؤ۔"

"تصویر؟" میں نے حیرانی سے پوچھا پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ ساہی صاحب شناخت کے لیے میری تصویر اتارنا چاہتے ہیں۔

میں ڈرائیور کے ساتھ کمرے میں چلا گیا اور رنگ دار سوبر کے ساتھ دو تین تصویریں کھنچوا لیں۔ اسی دوران میں دروازہ زور زور سے بجنے لگا۔ دروازہ کھولا تو سامنے مجتبیٰ کنور کھڑا تھا "ہاں بھئی کیا چکر چل رہا ہے؟" وہ حسبِ عادت جاگیردارانہ نخوت سے بولا "بڑے کیمرے شمرے چمک رہے ہیں۔ کوئی انٹرویو وغیرہ تو نہیں دے رہے۔"

"آپ کے ہوتے انٹرویو دینے کی جرأت کون کرسکتا ہے۔"

"ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔" وہ مونچھوں کو سہلا کر بولا "مگر ہمارے ساتھ رہو گے تو تم بھی سیکھ جاؤ گے۔ آؤ ایک اور انٹرویو کرائیں تمہارا۔"

"اب کون ہے؟" میں نے اپنی بیزاری چھپاتے ہوئے کہا۔

"ڈی سی صاحب ہیں مالاکنڈ کے۔ بڑی شدت کے ساتھ ذاتی دلچسپی لی ہے انہوں نے اس کیس میں..... کئی روز خود گلگت جا کر بیٹھے رہے ہیں۔"

پچھلے چند روز میں اسی قسم کے کئی معزز حضرات سے مجتبیٰ کنور نے میری ملاقات کرائی تھی۔ ہر بار شروع سے آخر تک ساری رام کہانی مجھے دہرانی پڑتی تھی۔ اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو گھنٹا گھنٹا بھر جاری رہتا تھا۔ میں اکتا کر رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں کسی مشہور و معروف "ریس" میں حصہ لینے والا گھوڑا ہوں اور مجتبیٰ کنور مجھے ہر یار دوست کو دکھا کر میری پیٹھ تھپک رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ میرا گھوڑا ہے۔ لینڈ لارڈز کا اس قسم کا رویہ مجھے بہت برا لگتا تھا۔ بے حد ذہین سیاست داں ہونے

کے باوجود مجتبیٰ کنور یہ بات فراموش کر رہا تھا کہ اسے کم سے کم افراد کو "ہم راز" بنانا چاہیے تاکہ معاملہ وقت سے پہلے لیک آؤٹ نہ ہو..... ویسے بھی اس وقت میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے مجتبیٰ سے کہا "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان صاحب سے آپ خود ہی بات کرلیں۔"

"بھئی مجھ سے تو وہ روز ملتا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"دراصل میرے سر میں درد ہے۔"

مجتبیٰ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ سگار کا گہرا کش لے کر بولا "کیا بات ہے شاد جہاں! میں دو تین دن سے دیکھ رہا ہوں تم کچھ..... میرا مطلب بیزار سے نظر آتے ہو۔"

"بیزار تو نہیں ہوں، کچھ تھکا ہوا ضرور ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح رات دن ایک ہی کہانی سنا رہا ہوں۔"

مجتبیٰ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں وہی عقابی چمک نمودار ہوئی جو اسے ایک خطرناک ذہین سیاست داں اور نہایت طاقت ور حاکم ظاہر کرتی تھی لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پایا اور سپاٹ آواز میں بولا "ٹھیک ہے تم..... آرام کرو۔" اس کے ساتھ ہی وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

مجتبیٰ نے میرے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ میں اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنی طبیعت کے ہاتھوں بھی مجبور تھا۔ رسمی ملاقاتیں، سیاسی گفتگو اور تکلفات مجھ سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوتے تھے۔ اس چار دیواری میں رہتے ہوئے مجھے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ پھر ایک بات اور بھی تھی۔ لال کوٹھی کا ہیولا اور وہاں کا ماحول بار بار میرے ذہن پر یلغار کر رہا تھا۔ میری متجسس طبیعت میرے ذہن میں کئی سوال ابھار رہی تھی۔

شام کے وقت میں نے مجتبیٰ کنور کو اس کی کوٹھی پر فون کیا۔ پہلے اپنے رویے پر معذرت چاہی پھر اسے بتایا کہ میں دو تین دن کے لیے ماڈل ٹاؤن سے جانا چاہتا ہوں۔

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔ بس سمجھ لیں ہوا خوری....."

"سیالکوٹ تو کوشش نہیں کر رہا؟"

"فی الحال تو نہیں..... لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔"

"تمہارا یہی بیلانی پن تمہیں کوئی کام ڈھنگ سے کرنے نہیں دے رہا۔"

"بوڑھے طوطے کو پڑھا رہے ہیں آپ۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی۔" مجتبیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا "بہرحال جانے سے پہلے محترم کلارک صاحب سے بات کرلینا۔"

"او کے!" میں نے کہا۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے کلارک صاحب سے بھی بات کرلی اور ٹینگ بن کو بھی بتا دیا۔ دیگر ساتھیوں کی طرح ٹینگ بھی ابھی تک ساہی صاحب کی کوٹھی میں تھی۔ اپنے والد محترم راموس

اور ٹیم کے باقی ساتھیوں سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ سب لوگ بہت خوش تھے۔ تاہم چند وجوہات کی بنا پر ابھی انہیں واپس فلپائن نہیں بھیجا جا رہا تھا۔ زوفونہ ینگ سے بہت مانوس ہو چکی تھی۔ شاید میری ذات میں اس نے اپنے والد کو تلاش کر لیا تھا اور ینگ کی ذات میں اپنی ماں کو۔ حالانکہ میرے اور ینگ کے درمیان ہمدردی کے سوا اور کوئی رشتہ نہیں تھا۔

کیپٹن کنور کے افسر شاہی ماحول اور اس کے ڈپلومیٹ دوستوں سے پیچھا چھڑا کر نکل جانے کا احساس میرے لیے بڑا خوش کن تھا۔ بغیر کسی تکلف اور مداخلت کے میرا دل آزاد پھرنے کو چاہ رہا تھا۔ بالکل ایک عام شخص کی طرح۔ تن تنہا' لوگوں کی بھیڑ میں گم' آوارہ' بے سمت' بلا مقصد یہاں تک کہ میں زریں گل کو بھی اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے مزاج آشنا زریں گل نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ پوچھنے لگا "کیا آپ اکیلے جائیں گے؟"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ میرا نکاح تو نہیں ہوا۔"

وہ ہنس کر بولا "خو بے نکاح والا لوگ ہی تو اکیلا جاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر ام کو ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ ایک شخص نے دوسرے سے کہا "یار! آج کل تمہارا صحت اور تمہاری بیوی کا صحت بہت اچھا ہے۔ کیا کرتے ہو؟" وہ بولا کہ ام دونوں شام کے بعد سیر کے لیے نکل جاتا ہے۔ پہلے شخص نے پوچھا کہ کہاں جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا' ام تو لارنس گارڈن جاتا ہے' اس کا پتا نہیں۔"

میں نے کہا "یار! میں اس وقت لطیفے سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

وہ بولا "ام کو تو لگتا ہے کہ آپ کسی بھی موڈ میں نہیں ہے۔ بالکل غیب دماغ اور اکھڑا اکھڑا ہے آپ۔ ایسی حالت میں آپ کو اکیلے بالکل نہیں جانا چاہیے۔"

"دو غائب دماغوں سے ایک غائب دماغ بہتر ہوتا ہے۔" میں نے کہا "تم مجھے اکیلے ہی جانے دو۔"

"تو کیا ام غائب دماغ ہے؟"

"غائب دماغ ہی نہیں بلکہ کھسکے ہوئے بھی ہو۔ میرا خیال ہے کہ جنگلی بیوں کا اثر ابھی تک باقی ہے۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ام کو ڈراتا ہے۔ آخر غائب دماغی والا کون سا حرکت فرمایا ہے ام نے؟"

میں نے کہا "یہی اپنی انگلی دیکھ لو۔ ہر وقت سیدھی رکھتے ہو۔ لگتا ہے انتخابات پر بیٹھے ہو۔ کبھی کبھی بے خیالی میں اسے ہلاتے بھی رہتے ہو۔"

"وہ تو جناب! چوٹ لگا ہے' آپ بھی جانتا ہے۔"

"یہ چوٹ نہیں لگی' یہ تمہیں سزا ملی ہے۔ کلثوم کو انگلی سے اشارے کرنے کی سزا۔"

"او خدایا! آپ تو امارے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ ام نے اشارے بازی ہی کیا تھا نا' لوگ تو بہت کچھ کرتا ہے اور پھر۔۔۔ اشارے بازی تو ام آنکھوں سے بھی کرتا تھا۔"

"گھبراؤ مت۔ باری باری تمہارے جسم کے ہر اس عضو کو سزا ملے گی جس کا تعلق تمہاری عشق بازی سے ہے۔"

"دیکھیں دیکھیں' اب آپ بے تُکی کی باتیں فرما رہا ہے۔"

"بے تُکی نہیں یہ چور کی داڑھی میں تنکا ہے۔"

زریں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "ویسے کب تک آ جائیں گے آپ؟"

"دو تین دن میں۔"

"اگر مجتبیٰ صاحب زیادہ ناراض ہوئے تو کیا کہوں؟"

"تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود نمٹ لوں گا۔"

میں نے ڈریسنگ روم میں جا کر پینٹ کوٹ اتار کر پھینکا۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص پہنی اور شتا والا سویٹر زیب تن کیا۔ پنڈلی سے بندھے ہوئے غلاف میں رام پوری خنجر لگایا۔ جیب میں ڈیڑھ دو ہزار روپے کے نوٹ ڈالے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

زریں کسی فکر مند بیوی کی طرح بولا "خو پچے ریوالور لینا نہ بھولنا۔ پتا نہیں کیوں امارے دل میں بہت سا وسوسہ آ رہا ہے۔ ساہی صب نے کہا تھا وہ بدبخت شیخ عاصم امارے اردگرد موجود ہے اور وہ کنجر کا تخم۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟۔۔۔۔ ہاں شکر شکرا' وہ بھی تو شیخ عاصم کا دُم چھلا بنا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "وہ آج تک ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے' اب بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"لیکن جناب ریوالور تو۔۔۔۔؟"

"ریوالور ادھر ہی رہ گیا تھا۔ لال کوٹھی میں۔"

پہلے تو زریں کو یقین نہیں آیا اور جب میں نے یقین دلایا تو وہ حیران رہ گیا "اوہ خدایا!" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا "ام ٹھیک کہتا ہے نا کہ آج کل آپ کا دماغ کہیں سیر سپاٹا کرنے گیا ہوا ہے۔ وہ اتنا مہنگا ریوالور تھا۔ امارا خیال ہے چار ہزار سے کم قیمت نہیں ہو گا اس کا۔۔۔ آپ کو مفت مل گیا تھا نا اس لیے قدر نہیں کیا۔"

"اچھا کبھی سیالکوٹ کا چکر لگا تو پتا کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔

زریں برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔۔۔۔ میں نے دیکھا کہ زریں کے ہاتھ میں ابھی تک وہ انگوٹھی موجود ہے جو گل نوم نے اسے دی تھی۔ زریں کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ گل نوم نے اس کے لیے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ معلوم ہو جاتا تو پتا نہیں وہ کیا طوفان مچاتا۔

پانچ بجے کا وقت ہو گا جب میں خاموشی کے ساتھ کوٹھی سے نکل آیا۔ ایک ٹیکسی رکوائی اور شہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتا مال روڈ پہنچا۔ لاہور کی شامیں مجھے ہمیشہ سے خوب صورت لگتی ہیں' خاص طور سے مال روڈ اور اس کے اردگرد کا علاقہ' یہاں کے ریستوران'

سینما ہال' عجائب گھر' بازار سب میری روح میں بسے ہوئے ہیں اور میری یادوں کا حصہ ہیں۔ میں نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور ایک پی کیپ یوں پیشانی پر جھکا رکھی تھی کہ بالائی چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ چھ بجے کے قریب میں نے الفلاح سینما میں انگلش فلم دیکھی۔ نو بجے چائنیز ریستوران سے کھانا کھایا پھر لبرٹی مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔ یہاں سے میں نے ایک گرم چادر اور مفلر خریدا۔ اس "شاپنگ" سے فارغ ہوا تو میکلوڈ روڈ کی گہما گہمی میں آ گیا۔ سینماؤں میں آخری شو چل رہا تھا۔ کہیں کہیں انٹرول ہو چکا تھا اور خوانچے والے چیخ و پکار کر رہے تھے۔ پاس ہی کسی ہوٹل میں زور و شور سے پنجابی فلم کا گانا بج رہا تھا۔ چھ ادل ٹٹ جائے چدی گل مک جائے۔۔۔

یہ آوازیں' یہ منظر' یہ ہنگامے' یہ سب میرے اپنے تھے۔ یہ میرا لاہور تھا۔ میں اس لاہور کو دیکھ رہا تھا' سن رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور تھا۔ بہت دور سیالکوٹ سے آگے اس دور افتادہ گاؤں میں جہاں ایک لال کوٹھی تھی' جہاں ایک صفیہ تھی اور ایک چوہدری تھا۔ نجانے کیوں بار بار میرا دھیان لال کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کی طرف چلا جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ صفیہ کسی مصیبت میں ہے۔ ایک انجانی کشش تھی جو مجھے مسلسل لال کوٹھی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں ایک سوال درجنوں بار میرے ذہن میں آ چکا تھا۔ جب ہم لال کوٹھی سے روانہ ہو رہے تھے تو صفیہ چوہدری بخت کے ساتھ کیوں نظر نہیں آئی تھی۔ کیا وہ بیمار تھی یا لال کوٹھی سے باہر گئی ہوئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ صورتِ حال میرے اندازے سے کہیں زیادہ سنگین ہو۔ صفیہ نے چوہدری بخت کے سامنے اس کے چھوٹے بھائی کا "سیاہ کارنامہ" کھول کر بیان کر دیا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لال کوٹھی ایک بھونچال کی زد میں آ گئی تھی اور یہ صورتِ حال صفیہ سمیت کسی کی بھی جان لے سکتی تھی۔

میکلوڈ روڈ پر گشت کرتے کرتے اچانک میری سوچ بچار حتمی نتیجے پر پہنچ گئی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ سیالکوٹ واپس جاؤں گا۔ سیالکوٹ واپس جانے کے لیے مجھے جو بہانہ درکار تھا' وہ میرے پاس موجود تھا۔ یہ بہانہ میں نے شروع میں ہی تیار کر لیا تھا۔ وہ ریوالور جو بالا کوٹ میں مجھے ملک گریز نے تحفے میں دیا تھا واقعی بہت قیمتی تھا۔ وہ بھولنے والی چیز نہیں تھا۔ اگر میں بھول گیا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ میں واپس لال کوٹھی جانے کا راستہ کھلا رکھنا چاہتا تھا۔۔۔ میں میکلوڈ روڈ سے پیدل ہی اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے سیالکوٹ جانے والی بس پکڑ لی۔ میں رات تین بجے منزل پر پہنچ گیا تھا۔ سیالکوٹ شہر سے چھ سات میل ادھر ہی میں بس سے اتر گیا۔ یہاں سے ایک برانچ روڈ رنگ والی گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ تقریباً چودہ پندرہ میل کا سفر تھا۔ میں کچھ دیر تک پیدل چلتا رہا پھر ایک ٹریکٹر ٹرالی والے نے لفٹ دے دی۔ یہ ٹرالی کسی مقامی کاشت کار کی تھی۔ غالباً چارا وغیرہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ٹرالی پر تین افراد سوار تھے۔ دو درمیانی عمر کے تھے اور ایک نوجوان لڑکا تھا۔ بمشکل سولہ سترہ سال عمر رہی ہو گی اس کی۔ وہ کچھ گھبرایا گھبرایا اور شرمایا سا نظر آتا تھا۔ جیسے کوئی چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ باقی دونوں افراد خوش باش تھے اور ہنسی مذاق کے موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں جا رہا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے بتایا کہ گوجرانوالہ کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ ہمارا مالک رنگ والی کے پٹواری کا رشتے دار ہے۔ پٹواری ہمارے مالک کے لیے دیسی گھی جمع کر چھوڑتا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد میں جا کر گھی لے آتا ہوں۔ اب بھی گھی لینے آیا تھا۔ راستے میں بس خراب ہو گئی اس لیے وقت پر گاؤں نہ پہنچ سکا۔

ٹریکٹر چلانے والے کا نام دلدار تھا۔ وہ ٹریکٹر چلانے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ حقے کے کش بھی لگا رہا تھا۔ کہنے لگا "نہریں میل کے پاس ہمارا ڈیرا ہے۔ ہم وہاں تک تمہیں لے جاتے ہیں۔ آگے رنگ والی تک بس ڈھائی تین میل کا پینڈا ہے۔ پیدل چلے جانا۔"

میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور دلدار کی فرمائش پر خود بھی حقے کے کش لگانے لگا۔ میں نے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلدار سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

بولا "ارائیوں کا چھورا ہے۔ اپنا جمن بیلی ہے۔ اس نے آج تک کبڈی نہیں کھیلی۔ اسے کبڈی کھیلانے لے جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"ڈیرے پر۔ وہاں باغ کے اندر بڑی کھلی جگہ ہے۔ کبھی کبھار کبڈی بھی ہوتی ہے۔"

میں نے لڑکے سے کہا "بیٹا جی' اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ تم تو ایسے بیٹھے ہو جیسے سسرال جا رہے ہو۔"

دلدار بولا "کہتا ہے مجھے جانگیا پہننا پڑے گا' میرا پنڈا ننگا ہو گا۔ بھائی پنڈا ننگا ہو گا تو کیا ہوا۔ کوئی زنانی تو نہیں ہو تم؟"

دلدار کا ساتھی منظور بولا "بات زنانی یا مرد کی نہیں۔ اصل میں یہ اپنی سنگل پسلی سے شرماتا ہے۔"

لڑکا بھاری آواز میں بولا "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے شرمانے کی۔ تم دونوں تو خواہ مخواہ میرا "توا" لگا رہے ہو۔"

دلدار اور منظور قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ مجھے لگا جیسے وہ لوگ ڈھکے چھپے انداز میں کوئی اور بات کر رہے ہیں۔ بہرحال مجھے کیا ضرورت تھی کریدنے کی۔ میں جس کام سے جا رہا تھا اسی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ جوں جوں رنگ والی گاؤں سے میرا فاصلہ کم ہو رہا تھا' اعصاب میں کشیدگی نمودار ہو رہی تھی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ لگتا تھا کہ تیز ہوا کے جھونکے جسم سے آر پار ہونے لگتے تھے۔ ٹریکٹر ٹرالی میں ٹیپ ریکارڈ بھی موجود تھا۔ نور جہاں کی پھٹی پھٹی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ اس آواز میں گانا کم اور شور زیادہ تھا' بس اتنا ہی پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی پنجابی گانا ہے۔

آخر وہ مقام آگیا جہاں ٹریکٹر ٹرالی والے مجھے اتار کر آگے بڑھ گئے۔ میں کچھ دیر ٹریکٹر اور بے چارے نور جہاں کا دور جاتا شور سنتا رہا پھر اپنے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ لاہور سے گوجرانوالہ تک ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔ اس سے آگے موسم خشک تھا لیکن یہاں پھر بارش کے آثار نظر آرہے تھے۔ اندھیرے میں رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی تو میرے چاروں طرف دور دور تک کھیت اور درختوں کے جھنڈ روشن ہو جاتے تھے...... پی کیپ اور چشمہ تو میں نے اتار کر بس میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب میں نے لفافے میں سے نئی چادر نکال کر اوڑھ لی اور مفلر لپیٹ کر قریباً قریباً "مقامی" نظر آنے لگا۔ نیم پختہ راستے پر کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ بہت سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں سے دس دن پہلے ہم فلائنگ کوچ پر گزرے تھے اور لاہور پہنچے تھے۔ آج رات کی تاریکی میں میں پیدل رواں دواں تھا۔ بمشکل میں ایک فرلانگ ہی چلا ہوں گا کہ ایک دم زوردار تریڑا پڑنے لگا۔ رات کو ہونے والی بارش ایسے ہی آناً فاناً ٹوٹ پڑتی ہے۔ بجلی زور سے چمکی تو مجھے کھیتوں کے درمیان ایک تنگ راستہ نظر آیا۔ میں پناہ کی تلاش میں قریبی درختوں کی طرف دوڑا۔ پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ میں نے حتی الامکان تیزی سے طے کیا اور پیپل کے ایک گھیردار درخت کے نیچے پناہ لے لی۔

یہ پناہ بڑی کارآمد ثابت ہوئی کیونکہ چند ہی لمحے بعد بارش کے ساتھ اولے بھی برسنے لگے۔ یہ اولے چھوٹے سائز کے تھے تاہم پتوں سے ان کا ٹکراؤ زوردار آواز پیدا کرتا تھا۔ یہ آواز بارش کی آواز سے یکسر مختلف تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ یہاں مجھے مٹی کی ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار بھی نظر آئی۔ دیوار کے ساتھ کسی بیل گاڑی کا ناقابل استعمال پہیا پڑا تھا۔ میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اس دیوار کی طرف چلا گیا۔ اس طرف درخت زیادہ گھنا تھا اور بوند تک نیچے نہیں ٹپک رہی تھی۔

مجھے یہاں کھڑے پانچ چھ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک عقب میں سرسراہٹ سی سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر دیکھتا، کسی نے لپک کر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرے دونوں بازو بھی حملہ آور کی گرفت میں آگئے تھے اور یہ خاصی مضبوط گرفت تھی۔ ابھی میں اپنے ردعمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے بھی ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ "ٹرچ" کی آواز آئی اور ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں اس پوزیشن میں تھا کہ ٹانگ چلا کر ٹارچ والے کو کئی گز دور پھینک سکتا تھا...... لیکن میں نے ذرا توقف کرنا مناسب سمجھا۔ یہ توقف فائدہ مند ثابت ہوا۔ ایک آواز میرے کانوں میں پڑی "اوئے! یہ تو وہی ہے۔"

میں نے بھی آواز پہچان لی۔ یہ ٹریکٹر ڈرائیور ولدار کی آواز تھی۔ مجھے پیچھے سے جکڑنے والے نے اپنی گرفت ختم کردی اور میرے سامنے آگیا۔ وہ ولدار کا ساتھی منظورا تھا۔

"اوئے تم یہاں کیسے آگئے؟" منظورے نے پوچھا۔

میں نے کہا "یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔"

وہ بولا "یہ...... یہ تو ڈیرا ہے ہمارا۔ ہم اوپر سے چکر کاٹ کر آئے ہیں۔ تم شاید کھیتوں کے درمیان سے نکل کر آگئے ہو۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ولدار نے کہا "چلو اب آگئے ہو تو پھر آؤ ہمارے ساتھ...... تم نے تو ہمارا "تراہ" ہی نکال دیا تھا۔ ہم نے سمجھا پتا نہیں کون گھس آیا ہے یہاں۔"

وہ دونوں مجھے ساتھ لے کر دیوار کی دوسری طرف آگئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم ایک باغ میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہاں درخت چھدرے تھے لہٰذا بارش کی بوچھاروں سے بچنے کے لیے ہمیں بیس تیس قدم بھاگ کر جانا پڑا۔ اسی دوران میں بجلی چمکی تو مجھے ایک پختہ دیوار کے ساتھ ٹریکٹر ٹرالی بھی کھڑی نظر آگئی۔ درختوں کے نیچے سے گزر کر ہم ایک خستہ حال برآمدے میں پہنچے تھے۔ یہاں پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور دو تین بھینسیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ لالٹین جھول رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عمارت کسی پرانے کولڈ اسٹوریج کی ہے۔ اب ایک مدت سے یہ اسٹور بند پڑا تھا اور پھلوں و سبزیوں کے بجائے یہاں پرالی کے ڈھیر لگا دیے گئے تھے اور مویشی باندھ دیے گئے تھے۔ ایک برآمدے سے گزر کر ہم عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں تین بڑی بڑی چارپائیاں رکھی تھیں۔ چارپائیوں پر لحاف وغیرہ بھی موجود تھے۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ مجھے وہ لڑکا بھی نظر آیا جو ٹرالی میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ گھونگھریالے بالوں والا ایک کوتاہ قامت شخص بھی یہاں موجود تھا۔ وہ نشے میں نظر آتا تھا۔

ایک چارپائی پر دو اخبار کھول کر رکھے گئے تھے۔ ان اخباروں پر تلی ہوئی مچھلی، پکوڑے اور ادھ کھائے نان رکھے تھے۔

"آؤ بھائی! کھانا کھاؤ تم بھی۔" ولدار نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

میں نے انکار کیا لیکن انہوں نے کھینچ کر مجھے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ منظورو میرا تعارف کوتاہ قد شخص سے کرانے لگا۔ وہ اس بات پر پختہ ایمان لا چکے تھے کہ میں گوجرانوالہ کی کسی فیکٹری میں کام کرنے والا کوئی درمیانے درجے کا مزدور ہوں اور "دیسی گھی" لینے رنگ والی جا رہا ہوں۔ رہی سہی کسر میں نے اپنے لب و لہجے اور بات چیت کے انداز سے پوری کردی۔ تھوڑی دیر میں ہم سب بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ علاقوں کی باتیں شروع ہوئیں تو پھر "رنگ والی" کے چوہدری بخت آور کا ذکر بھی آیا۔ بخت آور کے حوالے سے مجھے دو بہت اہم اطلاعات ملیں۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ چوہدری بخت آور کو دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ چار پانچ روز لاہور کے بڑے اسپتال میں رہنے کے بعد کل ہی گاؤں واپس آیا تھا۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ چوہدری بخت کا چھوٹا بھائی

زیشان اور اس کا دوست ملک ناظم ابھی تک "غائب" تھے۔ چوہدری بخت کا گھرانا یہ الزام لگا رہا تھا کہ ملک ناظم نے ساتھیوں سے مل کر چوہدری زیشان کو اغوا کرلیا ہے۔ "ملک" یہی الزام چوہدری زیشان پر لگا رہے تھے۔ دونوں فریقوں نے تھانے میں پرچے درج کرائے تھے۔ میں چونکہ ان واقعات کا چشم دید گواہ تھا لہٰذا مجھے معلوم تھا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ چوہدری بخت نے چھوٹے بھائی کو روپوش کردیا تھا اور مخالفوں پر اغوا کا الزام لگا دیا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ چوہدری کو دل کا دورہ کیوں پڑا تھا اور زیشان اب کہاں تھا اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

ادھر اُدھر کی گفتگو کے دوران میں ہی ہماری بے تکلفی اس حد تک پہنچ گئی کہ میز پر دیسی شراب کی بوتل آگئی اور گلاس وغیرہ بج گئے۔ "نہ نہ" کرنے کے باوجود مجھے بھی اس نہایت بدذائقہ شراب کو منہ لگانا پڑا۔ درحقیقت میں چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ تھوڑا سا گھل مل جاؤں۔ میں ان لوگوں کے "اصل کارنامے" سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ میرا یہ شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ یہاں کوئی زبردست قسم کی عیاشی ہو رہی ہے اور یہ نوعمر لڑکا بھی اسی عیاشی میں شرکت کے لیے یہاں پہنچا ہے۔

اس "عیاشی" کا شک مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب میں نے ٹرالی میں لڑکے کو دیکھا تھا اور ولدار وغیرہ سے بات کی تھی...... بعد میں اچانک ہونے والی بارش سے بچنے کے لیے میں ان درختوں میں چلا آیا۔ یہاں میری موجودگی کو محسوس کر کے ان لوگوں نے جو "ری ایکشن" دیا تھا وہ بھی قابل غور تھا۔ انہوں نے اتنی پھرتی سے مجھے دبوچا تھا جیسے میں پولیس کا کوئی مخبر ہوں اور شراب کی چالو بھٹی پہ چھاپا مروانے یہاں آیا ہوں۔

مجھے ان لوگوں سے کوئی خاص غرض نہیں تھی۔ اگر وہ شراب پی رہے تھے یا کسی بازاری عورت کو یہاں لائے ہوئے تھے تو یہ پولیس کا کام تھا کہ انہیں پکڑتی...... اور اگر نہ بھی پکڑتی تو یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ ان دور دراز دیہاتی علاقوں میں ایسے مشاغل پولیس کی ناک کے نیچے بھی جاری رہتے ہیں۔ مجھے صرف اس لڑکے کو دیکھ کر ترس آرہا تھا جس کی مسیں بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں اور اسے "گناہ کا مزہ" چکھایا جا رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ سگریٹ اور حقہ پی رہا تھا بلکہ "کچھ اور" بھی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد یہ بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ چند لمحے ولدار اور پستہ قد شخص آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے، پھر لڑکے کو لے کر پرالی کے ان بڑے بڑے ڈھیروں کی طرف چلے گئے جو ایک ہال نما کمرے میں چھت تک چلے گئے تھے۔ لڑکے کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے منظورے سے پوچھا "یہ کدھر گئے ہیں؟"

وہ ایک آنکھ دبا کر بولا "کبڈی۔"

"کبڈی؟ کیا مطلب؟"

"یار تمہیں بتایا تھا نا کہ اس چھورے نے کبھی کبڈی نہیں کھیلی۔"

"لیکن یہاں کبڈی کس جگہ ہوگی؟"

منظور لفنگے پن سے مسکرایا "یار تو بھی بڑا سیدھا ہے...... لا ایک سگریٹ پلا مجھے بھی۔"

میں نے اسے سگریٹ نکال کر دیا۔ وہ میرے پہلو میں آ بیٹھا اور ایک جلتی ہوئی لکڑی سے سگریٹ سلگا لیا۔ میری گھڑی ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ باہر بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ منظورا رازداری سے بولا "یہاں ایک زنانی لے کر آیا ہوا ہے رنگا......"

"زنانی؟" میں نے چہرے پر حیرت سجائی۔

"آہو یار! کوئی بیچ کر گیا ہے رنگے کو...... بڑی سوہنی ہے۔"

"یہ...... رنگا کون ہے؟"

"یار ابھی یہاں تو بیٹھا تھا تیرے سامنے۔"

"اچھا وہ ٹنڈی بکرا؟"

"او دے کھوتے! وہ ٹنڈی بکرا نہیں۔ بڑی زبردست شے ہے۔ اس باغ کا ٹھیکا اسی کے پاس ہے۔ بڑا مال کماتا ہے لیکن ہے بڑا کنجوس۔ کسی کو دمڑی نہیں چھوڑتا۔ ہم کو بھی نہیں چھوڑتا۔ باقاعدہ پیسے لیتا ہے۔"

"کس کام کے؟"

"اس کام کے۔" منظورے نے پرالی کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور پھر آنکھ دبائی۔

میں منظورے کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کی بات میں کیا "دعوت" پوشیدہ ہے۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں مجھے پیشکش کر رہا تھا کہ اگر میں بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا چاہتا ہوں تو دھو سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ بڑا کھاگ شخص تھا یہ منظورا، بلکہ مجھے تو پستہ قد رنگے سے بھی کھاگ نظر آتا تھا۔ کھاگ ہونے کے علاوہ وہ لالچی بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رنگے کو یونہی درمیان لا رہا ہے ورنہ جو عورت یہاں موجود ہے وہ ان تینوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔

میں نے الائچی کی خوشبو والی خانہ ساز شراب کا ایک تلخ گھونٹ لیا اور مخمور انداز میں منظورے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ میں منظورے کی بات سمجھ گیا ہوں۔ وہ کمینے پن سے مسکرایا اور بولا "کیا ارادہ ہے۔ کرنا ہے موج میلہ......؟"

"لیکن؟"

"یار زنانی بڑی چست ہے۔" منظورے نے میری بات کاٹی "اور بالکل سدھائی ہوئی ہے۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

میں نے چند سیکنڈ تک متذبذب نظر آنے کی کوشش کی پھر گہری سانس لے کر کہا "لیکن یار! میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

مشکل سے ڈیڑھ سو روپیہ ہے۔ اس میں سے واپسی کا کرایہ بھی دینا ہے۔"

منگورے نے میری آنکھوں میں جھانکا "کمی کے پیسے بھی تو ہوں گے تیرے پاس!"

"لیکن وہ تو کمی والے کو دینے ہیں۔"

"دیکھ لے بھئی۔۔۔ موقع بڑا اچھا ہے۔ چار پانچ سو روپیہ ادھر ادھر کر سکتا ہے تو کر لے۔ بندے کے ساتھ سودا کچ پچ ہو جاتی ہے۔ بیب کٹ جاتی ہے۔ بس میں اترتے چڑھتے گر سکتے ہیں۔ کہیں کسی کو دینے ہی پڑ جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "تین سو سے کام چل جائے گا؟"

وہ بولا "ہیں تو بہت تھوڑے۔ پر تو اپنا مہمان بھی تو ہے۔ تیری خاطر رستے کو منا لیتا ہوں۔ لا نکال پیسے۔"

میں نے تین سو کے نوٹ منگورے کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اس کے چھائیوں بھرے چہرے پر کمینگی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد مجھے ولدار آتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ نو عمر لڑکا بھی تھا۔ لڑکے کی نگاہ زمین پر گڑی تھی اور بال بکھرے بکھرے تھے۔ ولدار اور منگورے نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی بات کی اور لوفرانہ انداز میں مسکرانے لگے۔

اس بار منگورے نے مجھے ساتھ لیا اور پرالی کے بڑے بڑے ڈھیروں کی طرف آ گیا۔ اوپر نیچے پرالی کے گٹھے رکھے تھے اور یہ سلسلہ چھت تک چلا گیا تھا۔ بظاہر ان گٹھوں کے درمیان معمولی سا راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ایک جانب دیوار کے بالکل ساتھ راستہ موجود تھا۔ میں نے منگورے کے اشارے پر سگریٹ بجھا دیا اور پھنس پھنسا کر اس تنگ راستے میں داخل ہو گیا۔ ہم آٹھ دس گز تک آگے پیچھے چلتے رہے، پھر ایک سوراخ میں سے گزر کر نسبتاً کشادہ جگہ پر آ گئے۔ پرالی کے ڈھیروں کے درمیان یہ ایک خلا سا تھا، جیسے کسی پرندے کا گھونسلا ہو۔ نیچے اور اطراف میں ہر طرف پرالی ہی پرالی تھی۔ بس اوپر سے کچھ جگہ خالی تھی۔ اس مختصر خلا میں ایک چشم کشا منظر میرا منتظر تھا۔ یہاں ایک جسم بندھا پڑا ہے۔ وہی بنتِ حوا کا جسم جو صدیوں سے بندھا پڑا ہے۔ زخم زخم ہے اور سسک رہا ہے۔ میں اس برہنہ جسم کو دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوا مگر اس جسم پر جو چہرہ تھا وہ مجھے حیران کر گیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں میں اس چہرے کو سکتے کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں یقین کرنے سے انکار کر رہی تھیں اور دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ صفیہ بیگم کا چہرہ تھا۔ وہی صفیہ بیگم جو لال کوٹھی کی شان تھی، جو چوہدری بخت کی باری "امل بی" تھی اور جسے صرف دس روز پہلے میں لال کوٹھی میں چھوڑ کر لاہور گیا تھا۔

حیرت کا پہلا شدید ترین ریلا گزر گیا تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر ایک بار نہایت غور سے صفیہ کو دیکھا۔ نائیلون کی رسی سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ٹانگیں بھی جکڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بال بڑی بے دردی سے کاٹے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے قینچی چلائی گئی ہے۔ جگہ جگہ کٹ لگے ہوئے تھے۔ بال کہیں بھی نصف انچ سے زیادہ لمبے نہیں تھے۔ صفیہ کی دونوں بھویں بھی استرے کی مدد سے مونڈ دی گئی تھیں۔ چہرے پر کالک ملی گئی تھی، یقیناً یہ پختہ سیاہی تھی۔ کئی جگہ سے صاف ہو گئی تھی پھر بھی آثار موجود تھے۔ صفیہ کے کان سے خون رس رس کر گردن پر جم چکا تھا۔ پیشانی پر بھی چوٹ کا نیلگوں ابھار نظر آ رہا تھا۔

"یہ۔۔۔۔ کیا ہوا ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"کچھ نہیں۔ بالکل بھلی چنگی ہے۔ بس تھک کے پڑی ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔" منگورے نے معنی خیز لہجے میں کہا اور واپسی کے لیے مڑا۔ پھر ایک دم رک کر بولا "لیکن سگریٹ نہیں پینا شہزادے۔ سب پرالی ہے، ایک سیکنڈ میں آگ پکڑ لے گی۔ بلکہ لاؤ۔ سگریٹ اور ماچس مجھے ہی دے دو۔"

اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے دونوں چیزیں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ وہ جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

صفیہ نیم جان تھی۔ یوں لگتا تھا کئی دنوں سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ مجھے شک گزرا کہ اسے کوئی خواب آور دوا بھی دی گئی ہے۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا تو اس کے ہونٹوں سے سسکاری سی نکلی لیکن اس کی آنکھیں نیم وا ہی رہیں۔ قریب ہی نیلے رنگ کی ایک دھوتی نما چادر پڑی تھی۔ میں نے یہ چادر پھیلا کر صفیہ کا جسم ڈھانپ دیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کا سر ہلانے لگا اور سرگوشیوں میں پکارنے لگا۔ کتنی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور خالی خالی نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے لالٹین اٹھا کر اپنے چہرے کے پاس کی تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ مجھے پہچاننے میں صفیہ نے قریباً ایک منٹ صرف کر دیا اور جب پہچان لیا تب بھی اس کے ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ بس ایک تھرتھراہٹ سی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن رونے کے لیے آنسو درکار ہوتے ہیں اور آواز درکار ہوتی ہے لیکن یہ دونوں چیزیں کثرتِ گریہ سے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔

"یہ سب کیا ہوا صفیہ۔۔۔۔ کیسے ہوا؟" میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بہت مدھم آواز میں پانی طلب کیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ پرالی کے اس "گھونسلے" کے اندر ہی ایک جگہ سوراخ سا نظر آیا۔ اس سوراخ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا تھا۔ تختے پر سلولائیڈ کا جگ اور گلاس موجود تھا۔ میں نے صفیہ کو چند گھونٹ پانی پلایا۔ سوراخ میں کوئی پھول دار کپڑا بھی ٹھونسا گیا تھا۔ میں نے یہ کپڑا باہر نکالا۔ یہ صفیہ کی قمیص تھی۔ باقی لباس بھی مع جوتی اسی سوراخ کے اندر موجود تھا۔

صفیہ مسلسل روئے گئی تھی۔ لگتا تھا جو پانی اسے نے پیا ہے وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں آ گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ کلائیوں پر رسی کی بندش بہت مضبوط تھی۔ اس کے ہاتھ نیلے ہو رہے تھے۔ میں نے ہاتھ کھول دیئے تاہم رسی کو دوبارہ نرمی سے کلائیوں پر لپیٹ دیا۔

وہ روتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! خدا کے لیے میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالو۔"

اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا "کیا کرتی ہو۔ وہ سن لیں گے۔"

وہ شدتِ کرب سے اپنا سر اپنے گھٹنوں سے ٹکرانے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے چادر اس کے جسم سے پھسل گئی لیکن اسے اپنی عریانی کی مطلق پروا نہیں تھی۔ میں نے دیکھا اس کی کمر پر ضربات کے نشان ہیں۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ شراب کی حدت سے میرا جسم تو گرم ہے لیکن صفیہ یقیناً سردی محسوس کر رہی ہوگی۔ قریب ہی کھدر کا ایک لحاف پڑا تھا۔ میں نے لحاف سے اس کے شانے ڈھانپ دیئے۔ وہ کسی بچی کی طرح بلک کر میرے شانے سے لگ گئی۔ میں اس کا سر سہلانے لگا۔ چند روز پہلے تک وہ تیس سال کی ایک خوب رو اور باوقار عورت تھی لیکن اس وقت وہ تنکے کی طرح ہلکی اور بے وقعت نظر آتی تھی۔ میرے خیال میں اس کے گھر کا کوئی فرد بھی اسے دیکھتا تو مشکل سے ہی پہچان سکتا۔

وہ روتے روتے بولی "مجھے اس درندے نے کہیں کا نہیں چھوڑا شاہ جہاں۔۔۔۔ میں بے موت مر گئی ہوں۔ خدا کے لیے اب میری لاش پر مٹی ڈال دو۔ مجھے اور رسوا نہ کرو۔"

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کتے کی جسے میں اپنے دیوروں کی طرح سمجھتی تھی۔ جسے میں نے دس سال اپنے ہاتھوں سے روٹیاں پکا پکا کر کھلائی ہیں۔ جس کے لیے مزاروں پر منتیں مانی ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ چوہدری ذیشان کی بات کر رہی ہے۔ مجھ پر پے در پے انکشافات ہو رہے تھے۔ جب میں لال کوٹھی سے روانہ ہوا چوہدری ذیشان رسیوں سے بندھا پڑا تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ چوہدری بخت غصے میں تھا تو چوہدری ذیشان کو قتل کر بیٹھے گا لیکن اب چوہدری بخت کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور چوہدری ذیشان نے صفیہ کو اس لرزہ خیز حالت تک پہنچا دیا تھا۔

میں نے صفیہ کو سنبھلنے کا پورا پورا وقت دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے حواس میں آ جائے اور مجھے ٹھیک سے اپنی بپتا سنا سکے۔ مجھے تھوڑا سا انتظار کرنا پڑا لیکن یہ انتظار رائیگاں نہیں گیا۔ جلد ہی صفیہ ڈھنگ سے بات کرنے کے قابل ہو گئی۔ سب سے پہلے اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور کن لوگوں کے قبضے میں ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ رنگ والی سے زیادہ دور نہیں۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اسے اپنے ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔

"چوہدری صاحب کا کیا حال ہے؟" وہ سسک کر بولی۔

"وہ اب ٹھیک ہیں اور اسپتال سے واپس لال کوٹھی پہنچ چکے ہیں۔"

اس کا سینہ غم کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس شدت کو کم کرنے کے لیے وہ اپنے دکھ میرے سامنے بیان کرنے لگی۔ اس نے بتایا "چوہدری صاحب بہت غصے میں تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ذیشان کو جان سے مار ڈالیں گے۔ میں بار بار ان کا راستہ روک رہی تھی۔ آخر وہ مجھ پر بھی پھٹ پڑے۔ انہوں نے مجھے دھکے دے دے کر تہ خانے سے باہر نکال دیا اور حکم دیا کہ میں اپنے کمرے سے باہر نہ نکلوں۔۔۔۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تہ خانے میں کیا ہو رہا ہے نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ چوہدری صاحب کی حکم عدولی کروں اور کمرے سے باہر نکلوں۔۔۔۔ میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ یا خدا! اس حویلی میں آج ایک اور خون نہ ہو جائے۔۔۔۔ سہ پہر کے وقت چوہدری صاحب دو منٹ کے لیے میرے کمرے میں آئے۔ وہ اس وقت بھی بہت غصے میں تھے۔ میں نے ان کی منت کی کہ وہ اپنے غصے پر قابو رکھیں، یہ نہ ہو کہ ان کے غصے سے ذیشان کی جان چلی جائے اور وہ خود قانون کی پکڑ میں آ جائیں۔ انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ کہنے لگے "مجھے سبق مت پڑھاؤ۔ میں جانتا ہوں مجھے جو کرنا ہے۔" جاتے جاتے انہوں نے پھر مجھے سختی سے کہا کہ میں کمرے سے باہر نہ نکلوں۔

صبح سویرے ایک ملازمہ نے کھڑکی میں سے آواز دے کر مجھے جگایا۔ اس نے بتایا کہ بڑے چوہدری صاحب کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے اور منشی اور ڈرائیور انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ باہر سے بند ہے۔ دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں چیخنے چلانے لگی اور دہائی دینے لگی کہ دروازہ کھولو لیکن کسی نے میری آواز نہیں سنی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے چیخنا بند نہیں کیا تو ملازمہ نوری اور اس کا خاوند کرم دین وہاں پہنچ گئے۔ میں نے پوچھا کہ دروازے کی چابی کس کے پاس ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں کچھ پتا نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کالی کہاں ہے۔ نوری بولی کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے چھوٹے چوہدری کے ساتھ گاڑی پر گیا ہے۔ شاید وہ دونوں بڑے چوہدری صاحب کے پیچھے گئے ہیں۔ اس جواب سے مجھے کم از کم اتنی تسلی تو ہو گئی کہ ذیشان خیریت سے ہے۔ میں نے کرم دین سے کہا کہ کالی جب بھی آئے اسے میرے پاس بھیجو۔ ہو سکتا ہے کہ دروازے کی چابی اس کے پاس ہو۔

پتا نہیں کالی اور ذیشان کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے شام تک ان کا انتظار کرنا پڑا۔ شام کو کالی کی صورت نظر آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے؟ وہ بولا "ابھی بتاتا ہوں بی بی۔"

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ بار بار دل میں خیال آتا تھا کہ اللہ نہ کرے چوہدری صاحب کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ اسی کشمکش میں کالی مجھے حویلی کے ایک ویران تہ خانے میں لے آیا۔"

یہاں تک کہتے کہتے صفیہ کی گھگی بندھ گئی اور وہ ایک بار پھر زاروقطار رونے لگی۔ کوشش کے باوجود اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ آواز دور تک نہ جائے۔ اس کا رونا ذرا کم ہوا تو میں نے اسے پانی پلایا۔ اسی دوران میں پرالی کے ڈھیروں میں سرسراہٹ ہوئی اور منکورے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہیں پاس سے ہی مجھے آواز دے رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی منحوس آواز پر ایک ہزار بار لعنت بھیجی اور کہا "میں آ رہا ہوں۔"

کھوکھلا نما خلا سے نکل کر میں تنگ راستے میں پہنچا اور ترچھا ہو کر کھسکتا ہوا ہال کے دروازے تک آ گیا۔ یہاں منکورا بڑی شریر نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا "یار! تُو تو چھپا رستم نکلا ہے۔ چپک کر ہی رہ گیا ہے وہاں۔"

میں نے آنکھوں کو نیم باز کرتے ہوئے کہا "یار! واقعی بڑی بم چیز کمائی ہے تُو نے...... میرا تو کلیجا نکل گیا ہے۔"

وہ کاروباری انداز میں بولا "اور ادھر رنگے کا کلیجا نکل رہا ہے۔ اپنے نفع نقصان کا بڑا خیال رہتا ہے اسے۔"

"نفع نقصان؟"

"ہاں ایک اور شوقین بھی بیٹھا ہوا ہے انتظار میں۔ رنگے کو ڈر ہے کہ کہیں اکتا کر چلا نہ جائے۔"

میں نے جیب سے تین اور نوٹ نکال کر منکورے کے "ملائچی ہاتھ" پر رکھ دیے۔

"مال ٹھیک ہے نا؟" وہ خالص دلالوں والے انداز میں بولا۔

"مال تو بہت ٹھیک ہے لیکن یار تم نے اس کا حال کیا کر رکھا ہے۔ یہ تو اغوا کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ یہی زنانی کہیں بن ٹھن کر بیٹھی ہوتی تو قسم سے کچھ مر نکال دیتی دل کا...... جدھر نظر اٹھاتی دھڑام سے ایک عاشق پھڑک کر گرتا۔"

وہ بولا "میرے شہزادے تم پیڑ مت گنو۔ بس آم کھاؤ۔" میرا شانہ تھپک کر وہ باہر چلا گیا۔

میں نے ایک کھڑکی میں سے جھانکا۔ دن کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ بارش بھی اب رکی رکی تھی تاہم مطلع ابر آلود ہی نظر آتا تھا۔ میں تنگ راستے سے گزر کر واپس صفیہ کے پاس جا بیٹھا۔ ذرا سے توقف کے بعد ہماری گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ صفیہ نے کہا "تہ خانے میں جاتے ہی کالی کے تیور بدل گئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بالکل حیوان بن گیا۔ اس نے مجھے اٹھا کر دیواروں سے پٹخا اور نیم بے ہوش کر دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ میرے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ رہا ہے۔ میں چیخ رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ میرا گناہ کیا ہے؟ وہ بالکل گونگا بہرا بن گیا تھا۔ اس کا چہرہ کسی جلاد کا چہرہ نظر آتا تھا۔ جب میں نے چیخنا بند نہیں کیا تو اس نے میرے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔

کالی چوہدری صاحب کا وفادار ہے لیکن ذیشان سے بھی اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ اس کا رویہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ چوہدری صاحب کو دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ سراسر ذیشان کے حکم کا بندہ بن گیا ہے۔ اس "بے رحم" نے قینچی کے ساتھ میرے سر کے بال کاٹے اور استرے سے میرے ابرو بھی صاف کر دیے۔ پھر اس نے میرے چہرے پر چکنی سیاہی مل دی اور تہ خانے کی چھت کے ساتھ مجھے الٹا لٹکا دیا۔ پھر وہ بید کی چھڑی سے مجھے پیٹنے لگا۔ میرا منہ کھلا ہوتا تو شاید میری چیخیں تہ خانے سے باہر بھی پہنچ جاتیں لیکن اب یہ چیخیں میرے گلے میں ہی گونج رہی تھیں۔ میں اتنی تکلیف برداشت کر رہی تھی کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ پھر آہستہ آہستہ میرا دماغ سن ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جسم بھی۔

مجھ پر وہ قہر پورے چار دن ٹوٹتا رہا۔ میں موت کی دعا مانگ مانگ کر تھک گئی تھی لیکن مجھے موت نہیں آ رہی تھی۔ رات کے وقت کالی مجھے فرش پر گرا دیتا اور صبح ہوتے ہی پھر چھت سے لٹکا دیتا۔ ان چار دنوں میں ایک لقمہ میرے منہ میں نہیں گیا تھا۔ بس پانی کے چند گھونٹ میں نے لیے تھے، وہ بھی پتا نہیں کب لیے تھے اور کیسے لیے تھے۔

ایک رات میرے پیٹ میں شدید درد ہوا۔ میں چیخنے چلانے لگی، پھر گھسٹتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور دروازہ پیٹنے لگی۔ کالی کہیں پاس ہی سویا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور بڑبڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

"کہاں ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کلیجے کے پاس ہاتھ رکھ کر بتایا۔ اس ظالم نے زور سے وہاں ٹھوکر ماری اور مجھے نیچے گرا دیا۔ پھر وہ بے دریغ مجھے پیٹنے لگا۔ یہ میرے ماتھے پر جو نشان ہے اسی مار پیٹ کا ہے۔ میرے منہ اور ناک سے خون نکلنے لگا تو وہ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ گہری نیند سے اٹھ کر آیا تھا اور شاید اسی وجہ سے زیادہ غصے میں بھی تھا۔ جب وہ باہر نکل گیا تو اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کو باہر سے تالا لگانا بھول گیا ہے۔ میں پانچ دس منٹ اپنی جگہ بیٹھی رہی اور سوچ میں مبتلا رہی۔ پھر اپنے بندھے پاؤں اور ہاتھوں کے ساتھ گھسٹتی ہوئی دوبارہ دروازے پر پہنچی۔ میں نے ہینڈل گھما کر دیکھا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ دروازہ "لاک" نہیں تھا۔

میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور دانتوں کی مدد سے اپنے ہاتھوں کی رسی کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی محنت سے میں اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔

میں جانتی تھی کہ اس وقت چوہدری صاحب اسپتال میں ہیں اور حویلی میں ذیشان نے سب کو کنٹرول کیا ہوا ہے۔ میری بچت اسی میں تھی کہ میں کسی طرح حویلی سے نکل جاتی اور لاہور میں والدین کے پاس پہنچ جاتی یا چوہدری صاحب کے پاس۔ بڑی کشمکش و گنج کے عالم میں، میں تہ خانے سے نکلی اور راہداری میں آ گئی۔ میرا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے تھے اور سر پر چادر تک نہیں تھی۔ حویلی کے اندرونی حصے سے نکلنے کے لیے میں نے ایسے راستے استعمال کیے جو سنسان رہتے ہیں۔ تین چار منٹ میں، میں حویلی کے سامنے والے برآمدے میں پہنچ گئی۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ چوہدرائن جی کے پاس چلی جاؤں اور انہیں بتاؤں کہ ذیشان کے ہاتھوں مجھ پر کیا بیتی ہے لیکن پھر اچانک میری نظر ایک تانگے پر پڑی۔ یہ تانگا تھوڑی ہی دور حویلی کے صحن میں کھڑا تھا۔ شاید یہ تانگا تم نے بھی دیکھا ہو۔ اس پر چاروں طرف بڑے بڑے بورڈ (ہورڈنگ) لگے ہوئے ہیں۔ ان پر چوہدری صاحب کی تصویریں ہیں اور الیکشن کے نعرے وغیرہ لکھے ہوئے ہیں۔ اس تانگے پر اسپیکر لگا کر کنویسنگ کی جاتی ہے۔ حویلی سے نکلنے کے لیے یہ تانگا میرے بہت کام آ سکتا تھا۔ میں کوشش کر کے تانگے میں گھس گئی اور خود کو پچھلی سیٹ کے نیچے چھپا لیا...... رات کا باقی حصہ میں نے سخت سردی میں اور درد سے تڑپتے ہوئے گزارا۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازیں مجھے ڈراتی رہیں اور پہرے دار میرے آس پاس گھومتے رہے۔ صبح سویرے تانگا حویلی سے نکل گیا۔ پہلے رنگ والی میں چکر لگاتا رہا پھر کسی سڑک کی طرف چل پڑا۔ کوچوان کا ساتھی اسپیکر پر مسلسل بولتا بھی جا رہا تھا۔ سیٹ کے نیچے مختصر جگہ میں بیٹھے بیٹھے میرا جسم سن ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ تانگا پھر رنگ والی کی طرف واپس جا رہا ہے۔ ایک جگہ موقع دیکھ کر میں تانگے سے اتر گئی۔ یہ یہی باغ تھا جہاں میں اب ہوں۔ میں نے خود کو درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا لیا اور رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ اتنے میں یہی کتا وہاں پہنچ گیا جسے یہ لوگ رنگا کہتے ہیں۔ میری حالت فقیروں جیسی ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے دبوچ لیا اور کہا کہ میں پھل توڑنے کے لیے یہاں چھپی بیٹھی ہوں۔ میں نے منت سماجت کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ اسی دوران میں اس کے دونوں ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ مجھے پکڑ کر اس گودام میں لے آئے اور...... باندھ دیا۔"

صفیہ کی آواز بھرا گئی اور دلدوز سسکیاں اس کے ہونٹوں سے نکلنے لگیں۔ اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا اور روہانسے لہجے میں بولی "کاش میں حویلی سے ہی نہ نکلتی۔ میری جان چلی جاتی لیکن عزت تو اس طرح برباد نہ ہوتی۔ مجھ سے انہوں نے بڑا برا سلوک کیا ہے...... بڑا برا سلوک کیا ہے۔ پتا نہیں...... پتا نہیں کون کون یہاں آتا رہا ہے...... اور مجھے نوچتا رہا ہے۔ اللہ کرے مجھے موت آ جائے میں یہیں بیٹھی بیٹھی مر جاؤں۔"

اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔ میں فی الوقت اسے دلاسا ہی دے سکتا تھا۔ اس کے آنسو ذرا تھمے تو میں نے پوچھا "تم نے بدمعاشوں کو بتایا نہیں کہ تم لال کوٹھی کی بیگم صاحبہ ہو؟"

وہ بولی "بتایا تھا لیکن وہ ہنستے رہے اور میرا مذاق اڑاتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں یا میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔"

میں نے پوچھا "ان تینوں کے علاوہ کوئی اور بھی یہاں رہتا ہے؟"

وہ بولی "ایک موٹا سا آدمی اور ہے۔ وہ ہر وقت پستول اپنے پاس رکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔"

"پستول کے علاوہ بھی کوئی اسلحہ ہے ان کے پاس؟"

"ہاں ایک رائفل بھی میں نے دیکھی ہے۔ شروع میں یہ لوگ رائفل تان کر ہی مجھے یہاں تک لائے تھے۔"

میں نے پوچھا "کچھ اندازہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں؟"

وہ بولی "یہ زمیندار نہیں ہیں۔ بس آس پاس کی کچھ زمین ہے جو ٹھیکے پر کاشت کرتے ہیں۔ ٹریکٹر ٹرالی بھی ان کی اپنی نہیں ہے۔"

تھوڑی ہی باتیں کر کے ہی صفیہ ہانپ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا جسم ہی نہیں روح بھی زخم زخم اور بدحال ہے۔ زندگی سے بہت دور اور موت سے بہت قریب نظر آتی تھی وہ۔

میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس سے کہا کہ وہ اپنا حوصلہ بلند کرے۔ میں اسے یہاں سے نکالنے کے لیے آیا ہوں۔

وہ نوحہ کناں آواز میں بولی "مجھے یہاں سے مت نکالو۔ بس میری جان لے لو۔ میں اب کہیں بھی جانا نہیں چاہتی۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔" میں نے اسے محبت سے ڈانٹا "یہاں جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ اگر کوئی قصور ہے تو لال کوٹھی کے مکینوں کا ہے۔ چوہدری ذیشان کا ہے جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا۔ تمہیں دعویٰ ہے کہ چوہدری بخت تم سے محبت کرتا ہے۔ اگر یہ دعویٰ سچ ہے تو پھر چوہدری بھی وہی کچھ کہے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔"

میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا اور اس کے اندر حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا۔ وہ مجھے سن کر بھی نہیں سن رہی تھی۔ اپنی بے آبروئی اور ذلت کا احساس رہ رہ کر اس کے سینے سے ایک ہچکی بن کر ابھرتا تھا۔

مجھے یہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ خدشہ تھا کہ وہ "دلال صفت منکورا" پھر یہاں آ ٹپکے گا۔ میں نے صفیہ کو لحاف سے اچھی طرح ڈھانپ دیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سو جائے۔ خود میں واپس اس ہال نما کوٹھڑی کے پاس پہنچ گیا۔ نو عمر لڑکا بے خبر سو رہا تھا۔ دلدار بھی اونگھ رہا تھا تاہم منکورا اور رنگا

پوری طرح چوکس تھے۔ منکورا نے پھر مجھے شرارتی نظروں سے دیکھا اور کچھ شیطانی فقرے میری طرف اچھالے۔

وہ نیا "شوقین" کہیں نظر نہیں آرہا تھا جس کا منکورے نے ذکر کیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ نئے شوقین کی آمد کے بارے میں منکورے نے غلط بیانی کی تھی۔ دراصل وہ مجھ سے کچھ اور پیسے نکلوانا چاہتا تھا۔ لگتا تھا کہ جھوٹ بولنا منکورے کی خصلت ہے۔ جب سے میں یہاں آیا تھا اس نے لگاتار جھوٹ بولے تھے اور ان میں سے ایک جھوٹ یہ بھی تھا کہ رنگے نے صفیہ کو کسی سے خریدا ہے۔ صفیہ کے بیان سے ثابت ہوگیا تھا کہ یہ بات غلط ہے۔ میرا دل چاہا کہ ابھی کھڑے کھڑے اس جھوٹے کی گردن مروڑ دوں لیکن اگر میں ایسا کرتا تو یہ "جلد بازی" ہوتی۔ کوئی بھی ایکشن لینے سے پہلے مجھے اپنے گرد و پیش کو اور صفیہ کی حالت کو بھی نظر رکھنا تھا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بات چیت کرنے لگا۔ میں نے باتوں باتوں میں انھیں باور کرادیا کہ "زنانی" پر میرا دل بری طرح آگیا ہے اور میں دیسی گھی کے سارے پیسے اس گھمسن ملاقاتی جیسی عورت پر لگانے کو تیار ہوگیا ہوں۔ میرے "ارادے" بھانپ کر ان تینوں کی اور خاص طور سے منکورے کی باچھیں کھل گئیں۔ ان تینوں کی مالی حالت خاصی پتلی نظر آتی تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ آج کل ایک ایک پیسے کی انھیں ضرورت ہے۔

منکورے نے مجھے فراخ دلی سے مشورہ دیا کہ میں ایک آدھ دن یہیں رہ جاؤں۔ بلکہ اگر میرا کوئی قابلِ بھروسا ساتھی پیسے خرچ کرسکتا ہے تو اسے بھی یہاں کی سیر کراؤں۔

شام تک میں تین چار بار صفیہ کے پاس پہنچا۔ میں اسے مسلسل حوصلہ دے رہا تھا۔ رنگے سے اجازت لے کر میں نے صفیہ کے ہاتھ پاؤں کھول دیے تھے۔ میرے مجبور کرنے پر نہ صرف صفیہ نے کپڑے پہن لیے تھے بلکہ ایک گلاس گرم دودھ کا بھی پیا تھا۔ شام کے وقت میں نے اصرار کرکے اسے تھوڑے سے چاول بھی کھلائے۔ اس کی جسمانی طاقت کسی حد تک عود کر آئی تھی۔ میں نے اسے قائل کرلیا تھا کہ وہ میرے ساتھ یہاں سے نکلے گی۔ بے شک وہ رفی الحال چوہدری کے پاس نہ جائے لیکن اس جہنم سے تو پیچھا چھڑائے۔ وہ نیم رضامند نظر آنے لگی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ رات کو کسی وقت اپنی کارروائی کا آغاز کروں گا۔ وہ واتقل جس کا ذکر صفیہ نے کیا تھا مجھے ابھی تک کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اندرونی کمرے میں ہوگی۔ وہ واتقل میرے ہاتھ لگ جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ میں نے سوچا کہ اگر رات کو رنگا اور اس کے دونوں ساتھی جلد سو گئے تو میں وہ واتقل تلاش کروں گا اور صفیہ کو لے کر کمرے سے نکل جاؤں گا لیکن شام کے وقت اچانک سارا پروگرام الٹ پلٹ ہوگیا۔ رنگے کا چوتھا ساتھی سجاول بھی ڈیرے پر پہنچ گیا۔ یہ شخص کافی موٹا تھا مگر

لباس سے مفلوک الحال ہی نظر آتا تھا۔ اس بدبخت کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ وہ دونوں بھی شکل سے مُسَنڈے نظر آتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کسی قریبی قصبے کے دکان دار ٹائپ افراد تھے اور سجاول انھیں رنگ بازی کے لیے یہاں لایا تھا۔ یہ لوگ کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے پھر ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔ نئے آنے والے دونوں افراد کی آنکھوں میں واضح طور پر ہوس کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب مزید تاخیر نہیں کی جاسکتی۔

پانچ دس منٹ کی گپ شپ کے بعد نئے آنے والے دونوں افراد میں سے ایک نے انگڑائی لی اور کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے حرکت میں آنے کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ فوراً انداز میں سجاول نے لوفرانہ انداز میں اس کی کمر میں بازو ڈالا اور اسے لے کر گودام نما کمرے کی طرف بڑھا۔ وہی گودام نما کمرا جہاں پرالی کے عظیم الشان ڈھیر میں ایک گمنام آلود خلا موجود تھا۔

جس وقت سجاول یہاں آیا تھا میں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا کہ پستول اس کی قمیص کے نیچے دائیں جانب ہے۔ اس کا ہیولا واضح طور پر بھاری نظر آرہا تھا۔ قمیص کے ابھار اور ابھار کے حجم سے مجھے پستول کی پوزیشن کا بھی اندازہ ہوچکا تھا۔ جونہی سجاول نئے مہمان کو لے کر میرے پاس سے گزرا میں نے تیزی سے حرکت کی۔ میرا دایاں ہاتھ اس کی قمیص کے نیچے گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا پستول ہولسٹر سے نکل کر میرے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ سجاول ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیوار سے پشت لگائی اور کڑک کر کہا "خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔"

وہ سحر زدہ سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحے میں ان کے چہروں سے خون نچڑ گیا تھا۔ صرف منکورا تھا جو کسی حد تک حواس میں نظر آتا تھا "یار..... کیوں مذاق کرتے ہو۔" وہ دہشت زدہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

میرے منہ سے اس کے لیے بے ساختہ گالی نکلی۔ ایک قدم بڑھا کر میں نے زوردار ٹھوکر اس کے سینے پر جمائی اور وہ لڑکھڑا کر خوابیدہ لڑکے پر جاگرا۔ لڑکا بھی بڑبڑا کر اٹھ گیا اور چند حیاتی ہوئی نظروں سے یہ ذرامائی منظر دیکھنے لگا۔

"بب..... بھراجی! بات کیا ہوئی ہے؟" سجاول نے بھیک مانگنے والے انداز میں پوچھا۔

"تیری ماں کا سر ہوا ہے..... تجھے نہیں پتا کیا ہوا ہے۔ کس بہن کے لیے لے کر آیا ہے ان کتے کے تخموں کو۔"

میں نے پستول اس کی کھوپڑی کی طرف سیدھا کیا۔ پستول دیسی تھا لیکن اچھا بنا ہوا تھا۔ اس کا وزن بتاتا تھا کہ وہ کچھ لوڈڈ ہے۔ میری انگلی ٹریگر پر دیکھ کر سجاول کے چہرے پر موت ناچنے لگی۔ مجھے لگا جیسے ابھی اسے دل کا دورہ پڑے گا اور وہ فرش پر گر کر ہاتھ پاؤں

جھٹکنے لگے گا۔ اتنی بڑی لاش کے اندر بہت چھوٹا سا دل تھا اور سجاول تنہا نہیں یہاں "سارے بُہر کی کھال میں بکری" تھے۔ ان کی تکلیف دہ وہی تھیں کہ ان کے کپڑے گیلے ہونے میں تھوڑی ہی کسر رہ گئی ہے۔ صرف منکورا تھا جو اپنے حواس قائم رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے لڑکے کو اٹھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ بھی دوسروں کے پاس دیوار کے ساتھ کھڑا ہوجائے۔ جب لڑکا دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا تو منکورے نے تڑپ کر مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ پیچھے سے آیا تھا اور ایک دم جونک کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ اس کی عیاری سے ایسی ہی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور بڑی قوت سے منکورے کو پشت دیوار سے ٹکرادیا۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی دردناک آواز نکلی اور میرے جسم پر گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میں نے پہلو جھٹک کر اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں رنگے نے بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بے دریغ فائر کیا۔ گولی اس کے کندھے میں لگی اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ دوسری گولی میں نے رنگے کی ٹانگ میں ماری۔ گولیوں کی آواز سے باہر بندھی بھینسیں اچھل کود کرنے لگیں۔

میری چلائی ہوئی ان دو گولیوں نے میرے حریفوں کا پانی پانی کردیا۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ نوعمر لڑکا باقاعدہ رونے لگ گیا تھا۔ سجاول نے بڑی عاجزی سے پوچھا "کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "کچھ زیادہ نہیں۔ ٹریکٹر کی چابی میرے حوالے کردو۔"

"لل لیکن۔"

"لیکن اگر تکرار کرو گے تو تیسری گولی چلے گی اور وہ تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔" سجاول نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر منکورے کی طرف دیکھا۔ منکورا ان سب میں سے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اتفاقاً ٹریکٹر کی چابی بھی اسی کے پاس تھی۔ اس کی چھوٹی آنکھیں بڑی تیزی سے اس مسئلے کا کوئی حل سوچ رہی تھیں لیکن کوئی حل ہوتا تو اس کی سمجھ میں آتا۔ میرے تاثرات اور پستول کی خطرناک حرکت کو دیکھتے ہوئے اسے چابی میرے حوالے کرنی پڑی۔

میں نے کہا "چلو اس سامنے والے کمرے میں داخل ہو جاؤ اور اس نیڈی بکرے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" میرا اشارہ فرش پر پڑے زخمی رنگے کی طرف تھا۔

"لیکن..... تم..... چاہتے کیا ہو؟" منکورے نے ہمت کر کے پوچھا پھر جلدی سے بولا "اگر زنانی لے جانی ہے تو لے جاؤ۔ ہم تمہارا راستہ نہیں روکیں گے۔"

"کمرے میں بند ہو جاؤ گے تو پھر راستہ کیسے روکو گے۔ چلو گھس جاؤ کمرے میں۔" میں نے خطرناک لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے متذبذب رہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف

سمٹنے لگے۔ منکورے کی پیشانی پر ابھی تک بل تھے۔ میرا دل تو چاہتا تھا کہ یہ بل اچھی طرح نکال دوں مگر میرے پاس وقت کم تھا۔ بہرحال اس کی اکڑفوں کم کرنے کے لیے میں نے اسے دو تین کڑک گالیاں دیں اور جب وہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو اس کی پنڈلی پر ٹھوکر بھی جمادی۔ فوری انداز میں سجاول نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا اور اپنے ساتھ زخمی رنگے کو بھی گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا تھا۔ دونوں نئے مہمان ڈرے ہوئے الوؤں کی طرح دیدے گھما رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جن آنکھوں میں ہوس انگڑائیاں لے رہی تھی وہاں اب دہشت کا کرفیو لگا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ سرگرم ذاتے ہی اولے پڑنے والی بات ہوئی تھی۔ جب وہ سارے کمرے میں گھس گئے تو میں نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگادی۔

اس کے بعد میں صفیہ کے پاس پہنچا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں اس تک بھی پہنچی تھیں۔ وہ چمٹری کی طرح سمٹی ہوئی تھی اور سخت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان نمودار ہوا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور پرالی میں بنے ہوئے تنگ راستے سے گزر کر باہر لے آیا۔ پرالی کا یہ ذخیرہ واقعی ایک زبردست "کیموفلاج" تھا۔ اگر کوئی صفیہ کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ بھی جاتا تو کبھی اس کا سراغ نہ لگا سکتا۔ نقاہت اور صدموں کے سبب وہ بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ بالکل اُجڑی بچھڑی اور مفلوک الحال نظر آتی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر باہر لایا۔

میرے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں ٹریکٹر کی چابی تھی۔ بیرونی کمرے میں چارپائیوں پر دو چادریں پڑی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک گرم چادر صفیہ کے گرد لپیٹ دی اور دوسری کمبل کو باہر کرکے باہر باغ میں آگیا۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گہری تاریکی میں سرد ہوا فراٹے بھرتی گزر رہی تھی۔ ٹریکٹر ٹرالی وہیں کھڑی تھی جہاں اسے کل رات میں نے دیکھا تھا۔ میں نے ٹریکٹر کو ٹرالی سے جدا کیا اور صفیہ کے ساتھ ٹریکٹر پر بیٹھ گیا۔ اس دور دراز ڈیرے پر ٹریکٹر جیسی سواری کا مل جانا بھی غنیمت تھا۔ جب میں ٹریکٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا اندر سے دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ پھر یوں لگا جیسے وہ دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اسی دوران میں ٹریکٹر کا طاقت ور انجن ایک جھرجھری لے کر بیدار ہوگیا۔ میں نے انجن گرم کرنے کے بعد گیئر لگایا اور ٹریکٹر آگے بڑھادیا۔

"کہاں چلو گے؟" صفیہ منمنائی۔

"کہاں چلیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ بس رنگے والی سے دور چلے جاؤ۔ اس علاقے میں زمیندار کے بندے موجود ہوں گے۔ ہم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو پھر مرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "لیکن یہاں چوہدری صاحب کے بندے بھی تو ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سیدھے چوہدری صاحب کے پاس پہنچ

جائیے۔"

وہ کراہ کر بولی "مجھے مت لے جاؤ ابھی چوہدری صاحب کے پاس۔ پلیز۔۔۔ مجھے ابھی کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

ٹریکٹر زور سے اچھلا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھال لیا ورنہ شاید وہ لڑھک جاتی۔۔۔۔ ابھی ہم ڈیرے سے بمشکل سو گز دور ہی آئے تھے کہ مجھے بریک لگانے پڑے۔ سامنے باغ کے درختوں تلے ایک پرانے ماڈل کی کرولا گاڑی کھڑی تھی۔ میں چونک گیا۔ یقیناً سجاول کے ساتھ آنے والے دونوں مہمان اسی کار میں یہاں پہنچے تھے۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو ٹریکٹر کے بجائے کار کی چابی حاصل کرتا۔ اب واپس جانا بھی خطرناک تھا۔ میرے دل میں آرہا تھا کہ شاید میں نے ان لوگوں کو اسی کمرے میں بند کردیا ہے جہاں رنگے کی رائفل موجود تھی۔ جس طرح انہوں نے ایک دم دروازے پر زور آزمائی شروع کردی تھی اس سے بھی اس شک کو تقویت ملتی تھی۔ میں چھلانگ لگا کر ٹریکٹر سے اترا اور ٹریکٹر کی چابی کار کے مقفل دروازوں پر آزمانے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

میں دوبارہ ٹریکٹر پر آبیٹھا اور اونچے نیچے راستے پر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ جونہی ہم پختہ راستے پر پہنچے ٹریکٹر کی رفتار تیز ہوگئی۔ یہ ایک میسی فرگوسن ۲۴۰ تھا۔ اس کے انجن کی طاقت پچاس ہارس پاور کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ میں ایک دفعہ گاؤں میں ایسا ٹریکٹر چلا چکا تھا۔ ریورس کے علاوہ اس کے تین گیئر ہوتے ہیں۔ ہر گیئر کے ساتھ "لو" گیئر بھی لگایا جاسکتا ہے "لو" گیئر کے ساتھ پہیّا گھومنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔۔۔ میں ایکسیلریٹر دباتا چلا گیا اور ٹریکٹر کی رفتار ۲۰ میل فی گھنٹہ سے بھی بڑھ گئی۔

ہم نے شمال کے رخ پر تقریباً چار پانچ فرلانگ فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ مجھے ٹریکٹر کے عقب نما آئینے میں ایک کار کی ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ روشنیاں ڈیرے کی طرف سے نمودار ہوئی تھیں اور تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھیں۔ میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ رنگا اور اس کے ساتھی دروازہ توڑنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور یہ روشنیاں اسی کار کی ہیں جو میں نے درختوں تلے دیکھی تھی۔ یہ تشویش ناک صورت حال تھی۔ وہ پانچ بندے تھے۔ اگر ان کے پاس رائفل بھی تھی تو وہ ہمیں خاطر خواہ نقصان پہنچا سکتے تھے۔ میں نے ٹریکٹر کو ٹاپ گیئر میں ڈال کر ایکسیلریٹر پورا دبا دیا۔ رفتار تیز ہوئی اور ٹریکٹر بری طرح اچھلنے کودنے لگا۔ صفیہ نے لوہے کے ایک پائپ کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ گاہے گاہے میں بھی ایک ہاتھ سے اسے سہارا دے دیتا تھا۔ وہ زخم زخم تھی اور کراہ رہی تھی۔ وہ خوب صورت آواز جو کانوں میں رس گھولتی تھی، ایک سسکی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ نغمہ جو کبھی بے شمار دلوں کی دھڑکن تھا، آہ و بکا کے گرداب میں تھا۔ اسے اس حال تک پہنچانے والا کون تھا۔ چوہدری بخت کی محبت تھی۔۔۔۔ محبت جو عورت کے سینے میں کونپل کی طرح پھوٹتی ہے اور پھر امر بیل بن کر اس کے تن من کو جکڑ لیتی ہے۔ پھر نفع نقصان، شہرت بدنامی، زندگی موت سب اس محبت کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مذہب کے بڑے بڑے ٹھیکیدار، وحشت کی علامت بڑے بڑے جابر بادشاہ اور عیّاری میں یکتا شہرۂ آفاق حیلہ ساز اس محبت کے ہاتھوں شکست کھاتے ہیں اور مورخ کے قلم سے دشمنی مول لیتے ہیں۔ محبت ہار بھی جائے تو جیت جاتی ہے اور جیت بھی جائیں تو رُسوا ہوجاتے ہیں۔

کار ہر لحظہ قریب آرہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ رفتار میں ٹریکٹر اور کار کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ پھر راستہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ٹریکٹر کی کمزور ہیڈلائٹس میں ہم کسی بھی وقت کسی گڑھے میں سجدہ ریز ہوسکتے تھے۔ اچانک ایک دھماکا ہوا اور تھری ناٹ تھری کی گولی سیٹیاں بجاتی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہمارے تعاقب میں آنے والوں کے پاس رائفل موجود تھی۔ یہ فائر انہوں نے یقیناً ہمیں دھمکانے کے لیے کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم رک جائیں لیکن رکنا ہماری موت تھا۔ ڈیڑھ دو میل دور کھیتوں کے درمیان مجھے کچھ روشنیاں سی نظر آرہی تھیں۔ میں نے ٹریکٹر کو ایک تنگ کچے راستے پر ڈال دیا اور ان روشنیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کرولا کار بھی اسی راستے پر مڑ گئی۔ وقفے وقفے سے کار میں سے تین فائر مزید ہوئے۔ ان میں سے ایک گولی ٹریکٹر کی باڈی میں بھی لگی۔ تھری ناٹ تھری کا فائر خاصا طاقت ور ہوتا ہے۔ ٹریکٹر کا ٹائر نشانہ بنتا تو ہم بے دست و پا ہو کر رہ جاتے۔ کار اب صرف پچاس ساٹھ گز کی دوری پر تھی۔ "رفتار" میں بے شک ہم نہیں جیت سکتے تھے لیکن خاص قسم کے راستے پر ہمیں برتری حاصل ہوسکتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے ٹریکٹر کو کھیتوں میں گھسا دیا۔ یہاں چارے کے کھیت تھے۔ کہیں کہیں فصل نہیں تھی اور خالی ہل چلائے گئے تھے۔ ٹریکٹر کسی بکتر بند گاڑی کی طرح اچھلتا کودتا اور ڈگمگاتا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ کار بھی پیچھے آرہی تھی مگر اب گڑھوں کی وجہ سے اس کی رفتار بہت کم رہ گئی تھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ کار کسی کھڈے یا کھائی میں پھنس جائے لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔۔۔۔ کار نے کسی نہ کسی طور ہمارا تعاقب جاری رکھا۔ یہ بڑی اعصاب شکن دوڑ تھی۔ کار والے ہم تک پہنچ جاتے تو ان کا پلّہ ہر صورت بھاری رہتا۔ میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک زخم زخم عورت تھی۔ جو دیسی پستول میرے پاس تھا اس میں صرف چار گولیاں تھیں جن میں سے دو میں رنگے پر چلا چکا تھا۔۔۔۔ یکایک مجھ پر ایک زبردست انکشاف ہوا۔ ہمارا رخ لال کوٹھی کی طرف تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو ہم لال کوٹھی سے صرف تین چار فرلانگ دور رہ گئے تھے۔ میں نے صفیہ کو مضبوطی سے بیٹھنے کی ہدایت کی اور ٹریکٹر کی رفتار کچھ اور تیز کردی۔ وہ ہائے ہائے کررہی تھی۔ کسی وقت اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکل جاتی تھی۔۔۔ اچانک صفیہ کو بھی اندازہ ہوگیا کہ ہم لال کوٹھی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ کراہ کر بولی "ہم تو لال کوٹھی کی طرف جارہے ہیں۔"

"ہمیں اتفاقاً ایسا ہوگیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر ان لوگوں سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر لال کوٹھی کی طرف ہی جانا ہوگا۔"

"وہاں۔۔۔ ذیشان ہوگا۔"

"لیکن چوہدری صاحب بھی تو واپس آچکے ہیں۔ وہ سنبھال لیں گے سب کچھ۔"

اتنے میں دھماکا ہوا اور ایک گولی ہمارے سروں پر سے سنسناتی گزر گئی۔ ہم دونوں کے سر خود بخود نیچے جھک گئے تھے۔ کار والے ہم تک پہنچ نہیں پارہے تھے اور ان پر جھلاہٹ سوار ہوتی جارہی تھی۔ جونہی کھیت ختم ہوئے اور ہم دوبارہ پختہ راستے پر آئے "رنگے" والی گاؤں کے مکانات سامنے نظر آنے لگے۔ ٹریکٹر پوری رفتار سے لال کوٹھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔۔ ابھی ہم لال کوٹھی سے ایک فرلانگ دور تھے کہ تعاقب میں آنے والی کرولا کار میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یقیناً وہ کسی کچے راستے پر مڑ گئی تھی یا واپس چلی گئی تھی۔ میں ٹریکٹر کو سیدھا لال کوٹھی کے مین گیٹ پر لے گیا۔ رکھوالی کے کتے زور شور سے بھونکنے لگے اور دو مسلح افراد بھاگتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے۔ صفیہ نے اپنا منہ سرگرم چادر میں چھپالیا تھا۔ ایک شخص نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "کون ہو تم؟"

دوسرے پہرے دار نے مجھے پہچان لیا "او ہو جی۔۔۔ آپ؟ اس وقت؟"

میں نے کہا "چوہدری صاحب کہاں ہیں؟"

"اندر ہی ہیں جی!" پہرے دار نے جواب دیا۔

"اور چوہدری ذیشان؟"

"وہ تو۔۔۔ وہ تو حویلی میں نہیں ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ گیٹ کھولو اور چوہدری صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دو۔ ایمرجنسی کام ہے۔"

پہرے دار نے کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد اثبات میں سر ہلایا اور گیٹ کھول دیا۔ میں ٹریکٹر سمیت اندر احاطے میں چلا گیا۔

ایک بار پھر بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے پودوں پر ٹپاٹپ مینہ برسنے لگا تھا۔ ٹریکٹر کی گرج دار آواز سننے کے بعد دو تین اور ملازم بھی کونوں کھدروں سے نمودار ہوگئے تھے۔ وہ مجھے پہچان چکے تھے لیکن صفیہ "چادر پوش" ہونے کے سبب ان کی نگاہ سے اوجھل تھی۔ وہ متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے مگر ابھی تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھتا۔ ایک پہرے دار نے ہمیں برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بٹھادیا، دوسرا چوہدری صاحب کی طرف چلا گیا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ صرف آٹھ ہی بجے تھے۔ یقینی بات تھی کہ چوہدری جاگ رہا ہوگا۔

کچھ خبر نہیں تھی کہ اب چوہدری کی حالت کیسی ہے۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ چوہدری کو صفیہ کی گمشدگی کا علم ہے یا نہیں۔ عین ممکن تھا کہ بیماری کی وجہ سے چوہدری کو صفیہ کے بارے میں بے خبر رکھا گیا ہو۔۔۔۔ جہاں تک صفیہ کی گمشدگی کا تعلق تھا تو یہ بات یقینی تھی کہ سب سے زیادہ پریشانی ذیشان کو ہی ہوگی۔ اگر صفیہ کے ساتھ تہ خانے میں انسانیت سوز سلوک کرانے والا وہی تھا تو پھر اس کی بقا اسی میں تھی کہ صفیہ تہ خانے میں ہی مرکھپ جاتی۔ اس کا لال کوٹھی سے نکل بھاگنا ذیشان کے لیے شدید خطرات اور بدنامی کا باعث تھا۔ یقینی بات تھی کہ ذیشان کے ہرکارے پورے علاقے میں صفیہ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود بھی اسی چکر میں نکلا ہوا ہو۔

اگر چوہدری بخت کو صفیہ کے لاپتا ہونے کے بارے میں بتادیا گیا تھا تو پھر یقیناً اس پر بہت سی الزام تراشیاں بھی کی گئی ہوں گی، بالفاظ دیگر ذیشان نے صفیہ کو چوہدری بخت کی نظر سے گرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہوگی۔ بہرطور ان ساری باتوں کا پتا تو چوہدری بخت سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا۔ ویسے میں اپنی طرف سے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر کالی یا ذیشان کے کسی اور کارندے نے صفیہ کو حویلی میں کسی طرح کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد چوہدری بخت کی طرف جانے والا شخص واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ چوہدری صاحب اپنے کمرے میں ہیں اور انہوں نے آپ کو وہیں بلایا ہے۔

میں کھڑا ہوگیا لیکن صفیہ اپنی جگہ جمی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ایک طویل گھونگھٹ میں چھپا رکھا تھا۔ گھونگھٹ لرز رہا تھا اور پورا جسم بھی جنبش میں تھا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ مسلح شخص نے پوچھا "آپ کے ساتھ یہ بی بی جی کون ہیں؟"

میں نے کہا "ان کے بارے میں، میں چوہدری صاحب کو ہی بتاؤں گا۔"

"چلو اٹھو۔" میں نے صفیہ کو شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

میں نے بمشکل اسے کھڑا کیا اور سہارا دے کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ صفیہ کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ با آواز بلند رونے لگی۔ پورے جسم میں تلاطم برپا ہوگیا۔ معلوم نہیں کسی ملازم نے اس کی آواز پہچانی یا نہیں لیکن سب چونک ضرور گئے تھے۔ میں صفیہ کو تقریباً کھینچتا ہوا ایک راہداری سے گزرا اور چوہدری بخت کے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہ کمرا برآمدے کے قریب ہی

تھا۔ چوہدری بخت گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' اس کے قریب تپائی پر دوائیں وغیرہ رکھی تھیں۔ پالتو بلی اس کی بغل میں گھسی بیٹھی تھی۔ مجھے اور صفیہ کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں حیرت کی فراوانی نظر آئی۔ اس نے صفیہ کو آواز سے پہچان لیا تھا۔ وہ کچھ دیر سکتے کی سی کیفیت میں رہا پھر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ صفیہ چوہدری کی طرف دیکھے بغیر اوندھے منہ بستر پر گر پڑی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

چوہدری نے ایک نظر میری طرف دیکھا' پھر آگے بڑھ کر صفیہ کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ یقیناً ایک شدید حیرت نے اسے سراپا جکڑ لیا ہوگا۔ صفیہ ایک دلکش عمارت کے بجائے برباد شدہ کھنڈر نظر آ رہی تھی اور اس عمارت کو کھنڈر بننے میں برسوں نہیں لگے تھے صرف ڈیڑھ ہفتہ لگا تھا "تم کہاں چلی گئی تھیں؟" چوہدری عجیب سے پھٹے پھٹے لہجے میں بولا۔ صفیہ نے رونے کے سوا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ چوہدری نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا "بولو۔۔۔۔ بولتی کیوں نہیں ہو تم؟"

پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں اس کی تیز نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ ایک ملازم دروازے سے کچھ فاصلے پر چوکس کھڑا تھا۔ وہ مجھے واپس ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

صفیہ چوہدری کے پاس پہنچ گئی تھی تو مجھے کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا۔ پھر بھی میری فکر مندی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔ میں صفیہ کے قریب ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کی ایک کھڑکی کھول لی اور صوفے پر ایسے زاویے سے بیٹھ گیا کہ چوہدری کے کمرے کا دروازہ مجھے نظر آتا رہے اور اندر آنے جانے والے ہر شخص پر میری نظر رہے۔ اسی دوران میں ایک ملازمہ چائے لے آئی۔ خوش ذائقہ سبز چائے اس حویلی میں بڑی کثرت سے استعمال کی جاتی تھی۔ چائے لانے والی ملازمہ پنجابی لباس میں تھی اور یہ چمک دار لباس اس لباس سے ملتا جلتا تھا جو ہماری پنجابی فلموں میں نظر آتا ہے۔ پنجاب کی ثقافت تو کبھی کسی پنجابی فلم میں نظر نہیں آئی لیکن اب فلموں کی ثقافت "پنجاب" میں نظر آنے لگی ہے۔ ایسی ہی بنی سنوری لڑکیاں میں نے "رانگ رنگ" والے کمرے میں بھی مہمانوں کے آگے پیچھے گھومتی دیکھی تھیں۔ ان کے گریبان اتنے کشادہ تھے کہ قریب آ کر چائے پیش کرتی تھیں تو لگتا تھا خود پیش ہو رہی ہیں۔ زریں گل نے حویلی میں قیام کے دوران میں ان لڑکیوں پر بہت ناک بھوں چڑھائی تھی اور دبے الفاظ کی جھڑپوں میں سے انہیں دیکھ دیکھ کر ان کی بے حیائی پر "کڑھتا" رہا تھا۔ ابھی کلثوم کا جان لیوا غم اس کے دل میں تازہ تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ ان لڑکیوں میں سے کسی کو اپنے عشق میں گرفتار کر کے اس کا چال چلن اور عاقبت سنوارنے کی کوشش کرتا۔

چائے پینے کے بعد میں صوفے کے ہتھے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ میں ۴۸ گھنٹے سے سویا نہیں تھا۔ ایسے میں بندے کو اونگھ آ ہی جاتی ہے لیکن میں جس قسم کی صورتِ حال میں یہاں آیا تھا' مجھے اونگھ نہیں آنی چاہیے تھی۔ ویسے بھی یہ اونگھ کچھ عجیب ہی طرح کی تھی۔۔۔ بالکل آخری وقت پر۔۔۔۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔۔۔۔ لیکن یہ احساس ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح گھپ تاریکی میں ڈوب گیا۔

○☆○

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو صوفے کے بجائے کسی نہایت سخت چیز پر دراز تھا۔ فوراً ہی اندازہ ہوا کہ ٹھنڈا ہوا فرش ہے۔ میرا سر منوں بھاری ہو رہا تھا۔ زبان پر جیسے ابھی تک سبز چائے کی مٹھاس موجود تھی۔ مجھے یاد آیا کہ حویلی کے ڈرائنگ روم میں' میں نے سبز چائے پی تھی اور اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ صفیہ کا خیال برق کی طرح میرے ذہن میں لہرایا اور میں نے اٹھنا چاہا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں اور سن ہو رہے ہیں "کیا صفیہ کی طرح میں بھی ذیشان کے دستِ ستم کا شکار ہو گیا ہوں؟" یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا اور نکل گیا۔ میری تمام تر توجہ ایک دم ایک لرزہ خیز چیخ کی طرف منعطف ہو گئی تھی۔ یہ چیخ میری بائیں جانب سے بلند ہوئی تھی۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں' میں پہچان گیا کہ یہ صفیہ کی چیخ ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور سکتے میں رہ گیا۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔ ویسا ہی تہ خانہ جس میں دس بارہ روز پہلے میرے اور ذیشان کے درمیان زبردست جھڑپ ہوئی تھی۔ تہ خانے کی سیلن زدہ چھت پر ایک بلب روشن تھا' بلب کی زرد روشنی میں مجھے صفیہ نظر آ رہی تھی۔ وہ چھت سے الٹی لٹکی تھی۔ اس کے پاؤں جو پہلے ہی زخمی تھے نائیلون کی رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور یہ رسی چھت کے آہنی کنڈے میں سے گزار کر ایک گول ستون کے ساتھ باندھ دی گئی تھی۔ شلوار کھسک جانے سے اس کی نصف پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں۔ تاہم قمیص کو اس طرح گرہ دے دی گئی تھی کہ الٹا لٹکے ہونے کے باوجود اس کا پیٹ عریاں نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے زخم زخم ہاتھ دونوں طرف لٹک رہے تھے۔ ایک عورت کی یہ تذلیل جگر چھلنی کر دینے والی تھی۔ میں نے سیاہ چہرہ کالی کو دیکھا۔ وہ عہدِ قدیم کے کسی گونگے بہرے جلاد کی طرح ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا تھا۔ اسی ہنٹر کی بے رحم ضرب نے صفیہ کو پاگلوں کی طرح چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔۔۔۔ آہ' یہ کیا ہو رہا تھا اس عورت کے ساتھ؟ کن گناہوں کی سزا مل رہی تھی اسے؟ وہ اپنا زخم زخم جسم سمیٹ کر اس حویلی میں پہنچی تھی لیکن یہاں اس کے جسم کو مرہم ملنے کے بجائے مزید زخم مل رہے تھے۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا۔

کالی کا ہنٹر ایک بار پھر لہرایا اور صفیہ ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخی۔ پھر وہ پکارنے لگی "چوہدری صاحب۔۔۔ چوہدری صاحب مجھے بچاؤ۔۔۔ چوہدری صاحب میں مر گئی۔"

"چوہدری صاحب میں مر گئی۔" کالی کے ہونٹوں سے زہریلی

سرگوشی برآمد ہوئی "چوہدری صاحب تجھے اس وقت یاد نہیں آئے تھے جب اسی چھت کے نیچے بدکاری کر رہی تھی۔"

جاں بہ لب ہونے کے باوجود صفیہ بدکاری کا طعنہ برداشت نہیں کر سکی۔ وہ اپنے جسم کی رہی سہی توانائی سمیٹ کر چیخی "اکواس بند کر کتے۔۔۔۔ میں تیری۔۔۔ زبان۔۔۔۔ کھنچوا۔۔۔۔ دوں گی۔۔۔۔ میں تیری۔۔۔۔" اس کی آواز گلے میں پھنس گئی اور چیخ بن گئی۔

"کس سے کھنچوائے گی زبان؟ چوہدری صاحب سے کھنچوائے گی؟" کالی نے دانت پیس کر پوچھا۔ پھر ذرا توقف کر کے بولا "وہی ہیں تجھے یہاں الٹا لٹکوانے والے۔ پچھلی دفعہ بھاگ گئی تھی' اب نہیں بھاگ سکے گی۔ یہیں پر مرد سڑے گا تیرا۔"

اس نے ہنٹر کی ایک اور ضرب صفیہ کے جسم پر رسید کی۔ صفیہ کے حلق سے کربناک چیخ نکلی اور پورے تہ خانے میں گونج گئی۔ شاید ایسی ہی ایک چیخ میرے اندر سے بھی بلند ہوئی تھی اور میرے جسم میں گونجی تھی۔ یہ چیخ ایک سوال کی شکل میں تھی "کیا واقعی حقیقت وہی ہے جو میں نے سنی ہے؟ کیا واقعی صفیہ کو زندہ درگور کرنے والا ذیشان نہیں' چوہدری بخت ہے؟" اس سوال کا جواب بھی میرے اندر سے ہی آیا اور یہ جواب اثبات میں تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ کالی نے جو انکشاف کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ صفیہ اب تک دھوکے میں رہی ہے۔ جس محبت کو وہ اپنا ایمان سمجھتی تھی وہ شک دشبے کی تیز آندھی میں اڑ چکی ہے اور ایک سفاک چوہدری سراپا عتاب بن کر اس کے سامنے کھڑا ہے۔

صفیہ کی چیخوں نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔ وہ بین کرنے والے انداز میں کہہ رہی تھی "تو جھوٹ بول رہا ہے کتے۔۔۔۔ چوہدری صاحب ایسا نہیں کر سکتے۔ تو جھوٹا ہے' فریبی ہے۔"

کالی نے صفیہ کی گردن ہنٹر میں لپیٹی اور گلا گھونٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ نیچے سے سر پر گھٹنے کی زوردار ضربیں بھی لگا رہا تھا۔ ہر ضرب پر صفیہ کا جسم ہچکولا کھاتا تھا اور اس کے حلق سے غیر انسانی چیخ نکل جاتی تھی۔ مجھے لگا کہ اگر یہ بدقسمت عورت بچ بھی گئی تو اس کا دماغ ضرور خراب ہو جائے گا۔ پھر ایک پانی جیسی نے اس کے حلق سے نکلی اور فرش کو بھگو گئی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں کہ اچانک خاموشی چھا گئی۔ صدمے اور اذیت کی انتہا پر پہنچ کر صفیہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔ اس کا جسم سرسبز بیل سے گری ہوئی سوکھی توری کی طرح فضا میں جھول رہا تھا۔ یہ عورت کا جسم تھا۔ خوب صورتی اور نزاکت کی علامت جسم۔۔۔ جو ہر روپ میں قابلِ احترام اور لائقِ محبت ہوتا ہے' جو کائنات میں رنگ بکھیرتا ہے' جو دلوں میں گداز جگاتا ہے۔ وہی جسم میرے سامنے الٹا لٹکا تھا اور پارہ پارہ تھا۔

جلاد نما کالی ایک جگ میں پانی لے آیا اور بے ہوش صفیہ کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ وہ اسے اذیت پہنچانے کے لیے اس کے ذہن کو پھر سے بیدار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب مجھے بھی ہوش میں آ جانا چاہیے "کوئی ہے۔۔۔ کوئی ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

کالی ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ صفیہ کو نظر انداز کر کے وہ میری طرف بڑھا "کیا تکلیف ہے؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے بڑے زور کا پیشاب آیا ہے۔"

کالی نے گالی دی اور میرے پیٹ میں زوردار ٹھوکر رسید کی "کرا لیتا ہوں تجھے بھی پیشاب۔"

میں نے کہا "مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا' جلدی کرو۔"

وہ گالیاں بکنے لگا اور میرے سر پر پے در پے کئی ٹھوکریں ماریں۔ پھر وہ بھناتا ہوا تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ کسی کو بلانے گیا ہے۔ پیشاب تو مجھے آ رہا تھا لیکن کوئی ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری بندشیں کھولیں اور ٹوائلٹ تک لے جائیں۔ ظاہر ہے یہ سارا کام انہوں نے رائفل کے زیرِ سایہ کرنا تھا' پھر بھی مجھے ہاتھ پاؤں چلانے کا کوئی موقع مل سکتا تھا۔ ٹوائلٹ اس تہ خانے کے اندر ہی ایک نیم تاریک کونے میں واقع تھا اور نلکے سے کسی بالٹی میں قطرے گرنے کی مدھم آواز میں سن رہا تھا۔

بہرحال میری توقع پوری نہیں ہوئی۔ مجھے وہیں لیٹے لیٹے پیشاب کرا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے وہی چھوٹا سا "پاٹ" استعمال ہوا جو اسپتالوں میں ہوتا ہے۔ تاہم اس کارروائی کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔۔۔۔ کرم دین سے میری ملاقات ہو گئی۔ مجھے پیشاب کرانے والا کرم دین ہی تھا۔

کالی کی موجودگی کے سبب وہ بے حد ڈرا سہما اور خاموش تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ کرم دین چلا گیا تو تھوڑی دیر بعد کالی بھی تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے اس نے سر کے بل جھولتی صفیہ کو فرش پر اتار دیا تھا اور اس کے پاؤں کھول دیے تھے۔ تاہم اب پاؤں کی جگہ اس کے ہاتھوں کو "قید" بھگتنا پڑی تھی۔ ایک آہنی ہتھکڑی سے اس کے ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے تھے۔ وہ نیم بے ہوش تھی' بے خبری کی حالت میں کبھی کبھی اس کے ہونٹوں سے ایک دل دوز "ہائے" نکل جاتی تھی۔

نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ صفیہ کو اس تہ خانے سے زندہ نکلنا نصیب نہیں ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی قتل کر کے مدعا غائب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ درحقیقت مجھے شروع سے ہی چوہدری بخت کے کردار پر شک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے صفیہ کو ہوشیار کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ ذیشان کے ہاتھوں اپنی ذلت کی روداد چوہدری بخت نہ سنائے' چوہدری ایک روایتی زمیندار ہے' یہ نہ ہو کہ وہ اسے کسی "جرمِ بے گناہی" میں پکڑ لے۔ صفیہ نے

بڑے "یقین" سے کہا تھا کہ وہ دس سال سے چوہدری کو جانتی ہے...... آج اس کا یقین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ہنٹروں کی مار سے ہی بے ہوش ہوئی ہو لیکن نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اس جانکاہ خبر کے صدمے سے بے ہوش ہوئی ہے جو کالی نے اسے سنائی ہے اور جس میں چوہدری بخت کے اصل روپ کا ذکر ہے۔

بے ہوشی کے بعد میری مکمل تلاشی لی گئی تھی۔ پستول نقدی گھڑی سب کچھ لے لیا گیا تھا۔ گھڑی نہ ہونے کے سبب میں بالکل اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ کیا وقت ہے اور میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں..... ڈیڑھ دو گھنٹے میں نے اسی حالت میں گزار دیئے۔ تب ایک بار پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے کرم دین کو دیکھا۔ وہ کھانے کی چنگیر لیے داخل ہوا تھا۔ پہلے وہ صفیہ کے پاس رکا لیکن جب دیکھا کہ وہ آنکھیں بند کیے بے سُدھ پڑی ہے تو میری طرف چلا آیا۔ چنگیر میں تندور کی روٹیاں تھیں اور آلو میتھی کا سالن تھا۔ کرم دین نے چنگیر میرے پاس رکھ دی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ غالباً اس کی ڈیوٹی تھی کہ وہ میرے ہاتھ کھولے بغیر مجھے کھانا کھلائے۔ میں نے کہا کہ وہ کھانا ایک طرف ہٹا دے، میرا دل متلا رہا ہے۔ کرم دین نے چنگیر ایک طرف ہٹا دی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا "یہ سب کیا ہو رہا ہے کرم دین؟"

اس نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بولا "یہاں لال کوٹھی میں بہت زیادہ گڑبڑ ہے ماسٹر جہانی..... کسی کو کچھ پتا نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"تمہیں بھی پتا نہیں؟"

"سارا پتا تو مجھے بھی نہیں لیکن دوسروں سے کچھ زیادہ جانتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری ڈیوٹی اس تہ خانے میں لگائی گئی ہے۔"

"مثلاً کیا جانتے ہو تم؟"

"بہت کچھ...... اور شاید کچھ بھی نہیں۔"

"یار پہیلیاں مت بجھواؤ۔"

وہ بولا "ماسٹر جہانی! لال کوٹھی کے ملازموں کو سب کچھ جانتے ہوئے بھی چپ رہنا پڑتا ہے ورنہ آپ جانتے ہی ہیں اس حویلی میں کتنے تہ خانے ہیں۔ کوئی ساری عمر بھی سر ٹکراتا رہے تو نہ جان سکے کہ غائب ہونے والا ملازم کہاں گیا اور کیا ہوا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے ماسٹر جہانی! آپ کی خاطر میری اور میری بیوی کی جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔"

"اگر جان جانے کا معاملہ ہے تو پھر مت بتاؤ۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "چوہدری ذیشان کا اپنے ایک دوست ملک ناظم سے کسی بات پر جھگڑا چل رہا تھا۔ ملک ناظم غائب ہے اور چوہدری ذیشان بھی۔ دونوں کے غائب ہونے سے مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ ملکوں کا گھرانا کہتا ہے کہ ذیشان نے ملک ناظم کو اغوا کرا دیا ہے۔ چوہدری بخت صاحب کہہ رہے ہیں کہ ملک ناظم نے ذیشان کو غائب کیا ہے۔ دونوں دھڑوں میں زبردست کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ ملکوں کے بندے جگہ جگہ چوہدری ذیشان کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں لیکن اصل بات کچھ اور ہے جی....."

آخری الفاظ کہتے کہتے کرم دین نے آواز دھیمی کر لی اور میرے کچھ مزید قریب کھسک آیا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "چوہدری ذیشان لال کوٹھی میں نہیں ہے، نہ ہی رنگ والی میں ہے بلکہ وہ اس ملک میں ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چوہدری بخت صاحب نے اسے انگلینڈ بھجوا دیا ہے.... میری بیوی نوری نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کوئی ایک ہفتہ پہلے کی۔ زنان خانے کے ایک کمرے میں چوہدری بخت اور ذیشان میں باتیں ہو رہی تھیں۔ چوہدری ذیشان کا ایک بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ چوہدری بخت چوہدری ذیشان پر سخت غصے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے تھپڑ بھی مارے۔ ورنہ ان میں بڑا سلوک تھا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ملک ناظم چھوٹے چوہدری کے ہاتھوں قتل ہی نہ ہو گیا ہو۔ بہرحال چوہدری صاحب نے چھوٹے چوہدری کو بہت سے کاغذات دیئے اور کہا کہ یہ اس کا پاسپورٹ اور روپیہ وغیرہ ہے۔ وہ اسی وقت پاکستان سے دفع ہو جائے اور آئندہ انہیں اپنی صورت نہ دکھائے۔ چھوٹا چوہدری اسی روز یہاں سے چلا گیا تھا۔"

کرم دین کی اطلاع واقعی حیران کن تھی مگر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں اس سارے واقعے کا پس منظر جانتا تھا۔

میں نے کرم دین کو ٹٹولنے کے لیے پوچھا "لیکن باریہ بیگم صاحبہ کا کیا معاملہ ہے؟"

وہ بولا "مجھ سے زیادہ آپ کو پتا ہو گا، آپ ہی تو انہیں لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تو یہ ایک ڈیرے سے ملی ہے۔ وہاں کچھ لوگوں نے اسے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بے چاری کا دماغ ٹھیک نہیں۔ میں چھڑا کر یہاں لے آیا۔"

کرم دین کی آنکھوں میں گہری الجھن اور تشویش کے آثار تھے۔ بولا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ پتا نہیں حویلی میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ چوہدری بخت صاحب کا غصہ بڑی خطرناک شے ہے۔ اللہ ہر کسی کو اس غصے سے بچائے۔"

"ہاں۔ کہا تو تھا تم نے۔"

"بس آپ دیکھ لیں اس غصے کا نتیجہ۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، میں نے چوہدری صاحب کو ہمیشہ بیگم صاحبہ سے ہنس کر بات

کرتے دیکھا ہے۔ لگتا تھا کہ بیگم صاحبہ پر انہیں کبھی غصہ آیا ہی نہیں۔ اب دیکھ لیں، ایک دم وہ کتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی دل کو یقین نہیں آ رہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں تو آج دن میں دو تین بار رو چکا ہوں۔ پتا نہیں اللہ تعالیٰ بندے کے مقدر میں اتنی تکلیف کیوں لکھ دیتا ہے، پھر اتنی تکلیف کے بعد زندگی مل جائے تب بھی ہے..... اگر تڑپ تڑپ کر بھی موت ہی ملنی ہے تو پھر....." کرم دین کا گلا رندھ گیا اور وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا "کیا تمہیں یقین ہے کہ بیگم صاحبہ کی یہ حالت چوہدری بخت کے کہنے پر ہی کی گئی ہے؟"

وہ بولا "یقین نہ کرنے والی کوئی بات ہی نہیں۔ ابھی آپ کے ہوش میں آنے سے پہلے چوہدری صاحب خود یہاں آ چکے ہیں۔ وہی کالی کو ساری ہدایتیں دے کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد کالی، بیگم صاحبہ کو یہاں لے آیا تھا۔" فقرہ ختم کر کے کرم دین کچھ دیر گہری سوچ میں رہا۔ پھر کہنے لگا "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے بیگم صاحبہ کے معاملے اور ملک ناظم والے معاملے میں کوئی سانجھ (تعلق) ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سب کچھ ایک ساتھ ہی کیوں ہوتا۔"

میں جانتا تھا کہ کرم دین جو اندازہ لگا رہا ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ چوہدری ذیشان نے صفیہ بیگم سے زبردستی تعلق قائم کیا تھا۔ اس تعلق کی خبر ذیشان کے لنگوٹیے دوست ملک ناظم کو بھی تھی۔ بعد میں جب روپے کے لین دین پر ذیشان اور ملک ناظم میں تنازع پیدا ہوا تو ملک ناظم صفیہ والے معاملے پر ذیشان کو بلیک میل کرنے لگا۔ اس بلیک میلنگ کی وجہ سے تنازع اتنا بڑھا کہ ملک ناظم ذیشان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

بڑے چوہدری بخت آور کے لیے ناظم کا قتل اتنا اہم نہیں تھا جتنا اس قتل کی بنیادی وجہ اہم تھی۔ بنیادی وجہ صفیہ اور ذیشان کا "تعلق" تھا۔ اس تعلق کا علم ہونے پر چوہدری کے دل و دماغ میں زلزلے برپا ہو گئے تھے۔ صفیہ اس کی بیوی نہیں تھی لیکن بیوی سے کم بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ذیشان کا تعلق چوہدری بخت کو نیم پاگل بنا گیا تھا۔ روایتی چوہدریوں کی طرح اس نے اپنے سر کو خون چڑھا لیا تھا..... چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کرتا جس کا یہ سب کیا دھرا ہے لیکن بھائی کو قتل کرنا آسان نہیں تھا اور ویسے بھی بھائی وڈیرا تھا اور وڈیرے تو پیدا ہی ایسے کاموں کے لیے ہوتے ہیں۔ چوہدری بخت کا سارا قہر اس عورت پر ٹوٹا تھا جو چوہدری سے محبت کرتی تھی اور جو اس سارے معاملے میں بالکل بے قصور تھی۔ اپنے بھائی کو اس نے مار پیٹ کر اور لعن طعن کر کے ملک بدر کر دیا تھا مگر صفیہ کو بدکار قرار دے کر کالی کے حوالے کر دیا تھا تاکہ وہ اسے عقوبت خانے میں لے جائے اور سسکا سسکا کر جان لے لے۔ کیا بہترین انصاف کیا تھا "ظلِ دیوان" چوہدری نے!

لہو کا سراغ
محمود احمد مودی
قیمت -/150 ڈاک خرچ -/20

کرم دین بڑی دکھی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہیں رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ میری سلامتی کی طرف سے حد درجہ مایوس ہو چکا ہے۔ میں اس تہ خانے میں تھا اور میرے سامنے صفیہ بیگم کو ترسا ترسا کر مارا جا رہا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ صفیہ کی طرح مجھے بھی تہ خانے سے زندہ نکلنا نصیب نہ ہو گا مگر سوال یہ تھا کہ چوہدری بخت نے مجھے مارنے کا ارادہ کیوں کیا تھا۔ میں نے تو ابھی تک اس وعدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی جو میرے اور چوہدری کے درمیان ہوا تھا۔ میں نے لاہور جاتے ہوئے چوہدری سے یہ غیر مشروط وعدہ کیا تھا کہ لال کوٹھی میں پیش آنے والے تمام واقعات کو اپنے سینے میں دفن کروں گا اور ابھی تک میں اپنے وعدے پر قائم تھا۔ سیالکوٹ میرا واپس جانا بھی "مجبوری" کے تحت تھا۔ میں اپنا "ریوالور" یہاں بھول گیا تھا۔ وہ لینے آ رہا تھا کہ راستے میں اتفاقاً صفیہ سے اور صفیہ کو پکڑنے والوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میرا یہ بیان بڑا ٹھوس اور اثر انگیز تھا لیکن چوہدری نے تو سرے سے کوئی بیان لینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ٹھا ٹھا مجھے اس یخ بستہ تہ خانے میں پہنچا دیا تھا۔ چوہدری کا یہ رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔

کرم دین نے آزردہ لہجے میں کہا "ماسٹر جہانی! مجھے نہیں معلوم یہاں بیگم صاحبہ کے ساتھ اور آپ کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے..... کاش میں اس قابل ہوتا کہ آپ کی کوئی مدد کر سکتا۔" کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا "اگر آپ کہیں تو میں یہ سالن والی پلیٹ یہاں چھوڑ جاتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا کنارہ ایک طرف سے بہت تیز ہے۔ بالکل چاقو کی طرح..... آپ کوشش کرتے رہیں تو آپ کے ہاتھوں کی رسی کٹ سکتی ہے۔"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "اگر تمہاری مدد کی ضرورت ہوئی تو میں بتاؤں گا۔"

اسی دوران میں ایک عجیب گونج دار سی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز بہت دھیمی لیکن مہیب سی تھی۔ جیسے فرش پر کوئی بھاری چیز گھسیٹی جا رہی ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کرم دین کی طرف

دیکھا۔ وہ بولا "شاید بارش تیز ہو گئی ہے......"

لیکن یہ بارش کی آواز نہیں لگتی تھی۔ خود کرم دین کو بھی یقین نہیں تھا کہ یہ بارش کی آواز ہے۔ بارش کتنی بھی تیز ہوتی تہ خانے تک آواز کیسے پہنچ سکتی تھی۔ کرم دین نے برتن سمیٹے اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ رات کے نو بج چکے ہیں۔

میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا اور صفیہ کے بے حرکت جسم کو دیکھتا رہا۔ گونج دار آواز مسلسل آرہی تھی، کبھی مدھم پڑ جاتی تھی کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ کسی وقت یوں لگتا تھا جیسے تہ خانے کی چھت پر سے کوئی بھاگ کر گزر رہا ہو۔ کبھی کسی وزنی شے کے گھسیٹے جانے کا شور ابھرتا تھا۔ میں ان آوازوں کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ دھیرے دھیرے میرا دھیان صفیہ پر مرکوز ہو گیا۔ میں پہلو کے بل ہو گیا اور گھسٹتا ہوا صفیہ کے پاس پہنچ گیا۔ اسے قریب سے دیکھ کر دل میں ہوک اٹھی۔ بلب کی زرد روشنی میں وہ قابلِ رحم نظر آتی تھی۔ سر مونڈا ہوا تھا۔ ابرو غائب تھے۔ دونوں ہونٹ سوج کر نہایت خوف ناک شکل اختیار کر چکے تھے۔ بن ہاتھ لگائے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کی ایک آنکھ پھول کر کُپا ہو چکی تھی۔ ضائع ہو چکی تھی یا ضائع ہونے والی تھی۔ میں نے اپنی ٹھوڑی کی مدد سے اس کا شانہ بار بار ہلایا تو اس کی ٹھیک آنکھ کے پپوٹے میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"چوہدری...... صاحب... آپ... آ گئے۔ آپ کہاں...... چلے گئے تھے۔" وہ عجیب ٹوٹی پھوٹی ناقابلِ شناخت آواز میں بولی۔

میں نے اپنا چہرہ کچھ اور قریب کر لیا "میں چوہدری نہیں ہوں۔ میں شاہ جہاں ہوں۔"

وہ میری آواز سن کر بھی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے ہونٹ پھر ہلے "چوہدری صاحب آپ نے... کھانا... کھا لیا ہے نا...... بھروی...... بڑی...... ہے...... نوری...... کہتی ہوں...... انڈا...... اُبال دیتی...... ہے۔"

یوں لگا جیسے وہ اپنے ناتواں جسم کو سمیٹ کر اٹھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ ایک ناکام کوشش تھی۔ وہ کہاں اٹھ سکتی تھی۔ میرا سینہ غم کی شدت سے جل اٹھا۔ وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر وہ اپنے حواس کھو رہی تھی۔ یہ کیسا انقلاب آیا تھا اس بدقسمت کی زندگی میں...... وہ ایک خوب صورت، خوش لباس عورت تھی۔ وہ اپنے "چوہدری صاحب" کے لیے خود کو سنوارتی تھی، ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں کاجل لگاتی تھی۔ ہاتھوں میں گجرے اور پاؤں میں پازیب پہنتی تھی۔ آج اس کے جسم پر چوہدری کے دیے ہوئے زخموں کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... اور وہ پھر بھی چوہدری کا نام لے رہی تھی۔ اپنی ہی رَو میں تھتھری ہوئی وہ کتنی بدصورت نظر آرہی تھی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں وہ مجھے پہلے ہی کی طرح حسین نظر آئی۔

میں اس کے قریب ایک گول ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سخت تلاشی کے باوجود میری پنڈلی سے بندھا ہوا رام پوری خنجر محفوظ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کرم دین کی طرف سے کسی طرح کا تعاون قبول نہیں کیا تھا۔ خواہ مخواہ کرم دین کو چوہدری کا "مجرم" بنانا ٹھیک نہیں تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ تھوڑی سی کوشش کر کے میں نے یہ ہاتھ خنجر تک پہنچائے اور اسے غلاف میں سے کھینچ لیا۔ خنجر کو ایک خاص تکنیک سے ہاتھ میں لے کر کلائیوں کی رسی کاٹنے کا تجربہ میں ایک دو بار پہلے بھی کر چکا تھا۔ میں اس تجربے کو ایک بار پھر دہرانے لگا۔ خنجر کی دھار بڑے بھلے انداز میں لیکن مسلسل نائیلون کی رسی سے رگڑ کھانے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک میں مسلسل مصروف رہا۔ پھر میں نے دونوں ہاتھ آپس میں پیوست کر کے زور لگایا۔ تڑ تڑ کی آواز سے رسی کئی جگہ سے ٹوٹ گئی۔ میں نے کلائیوں کو مسل کر ہاتھوں میں خون کی روانی بحال کی اور جلدی جلدی اپنے پاؤں بھی کھول لیے۔ صفیہ زخمی آواز میں "پانی پانی" پکار رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا تاکہ اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا سکوں۔ جب میں نے اسے اٹھانے کے لیے کندھوں کے نیچے ہاتھ ڈالا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پینے کے لیے پانی نہیں مانگ رہی' بلکہ یہ بتا رہی ہے کہ اس کے نیچے پانی ہے۔ میں جس جگہ بیٹھا رہا تھا وہ جگہ عام فرش سے پانچ چھ انچ بلند تھی' لہٰذا مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ تہ خانے کے فرش کا کچھ حصہ گیلا ہو چکا ہے۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ ٹوائلٹ کا نلکا کھلا ہے اور وہاں کا پانی باہر چلا آیا ہے' لیکن دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ پانی سیڑھیوں کی طرف سے آرہا تھا۔ شاید بھاری بھرکم دروازے کی نچلی درز سے آرہا تھا...... وہ گونج دار آواز جو کچھ دیر پہلے تک سنائی دیتی رہی تھی اب خاموش ہو چکی تھی لیکن یہ خاموشی بھی کچھ عجیب سی تھی۔ کوئی انوکھا پن تھا اس سکوت میں...... میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے خبردار کرنے لگی۔ میں نے اپنے مفلوج پیروں کو حرکت دی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ابھی میں تہ خانے کے دروازے سے سات آٹھ زینے دور تھا کہ کڑکڑاہٹ سنائی دی جیسے لکڑی ٹوٹی ہو یا کہیں سے دروازے کے قبضے اکھڑے ہوں...... پھر جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ دروازہ ایک دھماکے سے اکھڑا اور میرے قریب سے اُڑتا ہوا تہ خانے کے فرش پر جا گرا۔ دروازے کے پیچھے ایک آبشار تھا۔ پانی کا ایک طوفانی ریلا تھا جو بے انتہا تندی کے ساتھ تہ خانے میں داخل ہونا شروع ہوا تھا۔ اس آٹھ فٹ بلند ریلے کی منہ زور ضرب نے مجھے سیڑھیوں سے لڑھکا کر فرش پر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی تہ خانہ گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر پہلے سنی ہوئی نامانوس آواز میری سماعت میں گونجی۔ مجھ پر اچانک انکشاف ہوا کہ چوہدری بجنت کی لال کوٹھی سیلابی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

تاریکی چھاتے ہی صفیہ زور زور سے چیخنے لگی۔ تہ خانے میں پانی گرنے سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بے حد پُرشور تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا آبشار زبردست گونج پیدا کر رہا ہو۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ یہ تصور ہی نہایت لرزہ خیز تھا کہ لال کوٹھی سیلابی پانی میں ڈوبی ہوئی ہے اور اب یہ پانی تہ خانے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو رہا ہے۔ یہ سو فیصد موت کی آمد تھی۔ یہ پانی نہیں تھا فرشتۂ اجل کی لپیٹ تھی۔ جس سے بچ نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔

صفیہ کی چیخیں تہ خانے میں مسلسل گونج رہی تھیں۔ میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلائے اور بالآخر صفیہ تک پہنچ گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں فرش پر تقریباً ایک فٹ پانی کھڑا ہو گیا تھا اور اس کی سطح تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔ صفیہ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتی۔ میں نے اس کے بازوؤں کے نیچے ہاتھ ڈالے اور اٹھا کر سیڑھیوں تک لے آیا۔

"چوہدری صاحب میں مرگئی...... چوہدری صاحب میں مرگئی۔" وہ مسلسل اسی فقرے کی تکرار کیے جا رہی تھی۔

میں نے پانچ چھ زینے طے کیے اور رک گیا۔ دروازے میں سے اندر داخل ہونے والے پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا...... صرف چند سیکنڈ میں فرش پر جمع ہونے والا پانی پھر ہمارے پاؤں تک پہنچ گیا۔ پانی کی سطح خطرناک تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔ یہاں سے باہر نکلنے کا واحد راستہ دروازہ تھا اور یہی دروازہ تھا جس سے پانی کا طوفانی ریلا اندر داخل ہو رہا تھا۔ صرف دو تین منٹ میں یہ ریلا تہ خانے کو مکمل طور پر غرقاب کرنے والا تھا۔

صفیہ کو الٹی ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ زخموں سے چور تھی' ایسے میں اگر وہ تیرنا جانتی بھی تھی تو نہیں تیر سکتی تھی۔

گہری تاریکی' پانی کا شور اور موت کے کھلے جبڑے' یہ تین چیزیں تھیں جنھوں نے ہمیں اس تہ خانے میں گھیر رکھا تھا۔ یہ آفات اتنی تیزی سے ٹوٹی تھیں کہ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی ہمارے کندھوں تک پہنچ گیا۔ پھر میرا اور صفیہ کا جسم زینوں سے اٹھ گیا۔ ہم تیرنے یا ڈوبنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں نے امدادی کارکنوں کے مخصوص انداز میں صفیہ کے بازوؤں کے نیچے سے یوں ہاتھ ڈالا کہ صفیہ کا رخ تہ خانے کی چھت کی طرف ہو گیا۔ اب میرا دایاں ہاتھ اور دونوں پاؤں آزاد تھے۔ میں نے تیرنا شروع کر دیا۔ میرے بائیں بازو نے صفیہ کو پانی پر سہارا دے رکھا تھا۔

صفیہ کی چیخیں کسی طور رکنے میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ بالکل مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی اور اپنے طور پر خود کو ڈوبنے سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ پانی کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی اور تہ خانے میں موجود لکڑی کی اشیا اور دیگر ہلکی پھلکی چیزیں ہمارے اردگرد تیر رہی تھیں۔ ہمیں اب ایسی تکلیف دہ موت کا سامنا تھا جس کا تصور ہی انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ ہم پانی کے ساتھ ساتھ بلند ہو رہے تھے۔ چند لمحوں کی بات تھی کہ ہمارے سر تہ خانے کی چھت سے چھونے والے تھے۔ پانی اور چھت کے درمیان یہ مختصر خلا جو ہمیں آکسیجن فراہم کر رہا تھا ختم ہونے والا تھا اور پھر...؟ پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا تھا۔ جو مر گیا اس کے لیے قیامت آ گئی...... اور ہماری قیامت ہم سے بس چند بالشت کے فاصلے پر تھی۔

امید ایک ایسی چیز ہے جو بدترین حالت میں بھی انسانی ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں موجود رہتی ہے۔ موت کی آخری ہچکی تک اس کا رشتہ ٹوٹتا نہیں ہے۔ میرا بھی آس اور امید سے رشتہ جڑے ہوئے تھا۔ بار بار ایک خیال گھٹا ٹوپ رات میں ستارے کی طرح ٹمٹماتا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی سبب بن جائے گا۔ سیلاب کا پانی چھت تک اونچا نہیں ہو گا۔ کسی وجہ سے اس کی بلندی ٹھہر جائے گی یا پھر کوئی ہمیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھے گا اور یہاں سے نکال لے جائے گا لیکن ان امید بھرے خیالات کی عمر بہت زیادہ نہیں تھی۔ چند ہی لمحے بعد میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ ہم چھت تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم پانی کی قبر میں تھے اور یہ قبر بند ہونے والی تھی۔

تیرنا ایک مشقت طلب کام ہوتا ہے۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے لیے جو کبھی کبھار تیرتے ہیں' اور مجھے تو تیرنے کے ساتھ ساتھ ایک انسانی جسم کو سہارا بھی دینا پڑ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے اور سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔ میں پورا منہ کھول کر بھرپور سانس لے رہا تھا پھر بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی لیکن یہ غیر تسلی بخش سانس بھی بہت جلد مجھ سے بچھڑنے والی تھی...... بے بسی اور اذیت کے وہ لمحے ناقابلِ فراموش تھے۔ کوئی جان دار ڈوبنے لگتا ہے تو اپنا سر پانی سے باہر نکالتا ہے لیکن ہم اپنا سر کہاں نکال سکتے تھے۔ ہمارے اوپر تہ خانے کی ٹھوس چھت "اٹل مقدر" کی طرح موجود تھی۔ جب میرا سر مکمل طور پر چھت سے لگ گیا تو میں نے ٹھوڑی اوپر اٹھائی تاکہ چھت اور پانی کے درمیان جو معمولی سا خلا باقی رہ گیا تھا اس کی "آکسیجن" بھی استعمال کر سکوں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ اپنی جان بچانے کا فطری تقاضا زندگی میں تو انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا...... چند لمحے مزید گزرے اور پھر پانی ہمارے سروں سے گزر گیا۔ چھت اور پانی کا ملاپ ہو چکا تھا۔ ہم مکمل طور پر غرقاب تھے۔

ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ میں نے سوچا' کیا یہ اختتام ہے؟ کیا یہ "زندگی کے فقرے" کا فل اسٹاپ ہے۔ ونگ والی گاؤں کی یہ پُر پیچ لال کوٹھی اور اس کوٹھی میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سیلابی پانی اور اس سیلابی پانی کی گہرائی میں ایک منحوس تہ خانہ...... کیا یہ سب

ہماری موت کا سامان ہے؟ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ چند روز بعد ایک چمکیلی دوپہر کو موٹر پمپ کے ذریعے لال کوٹھی میں سے پانی کھینچا جا رہا تھا۔ اس تہ خانے میں سے دو پھولی ہوئی ناقابلِ شناخت لاشیں برآمد ہوتی ہیں۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ پھر یہ لاشیں ڈھانپ کر لال کوٹھی کے احاطے میں رکھ دی جاتی ہیں...... تو...... کیا یہی انجام تھا اس سفر کا جو میں آج تک کرتا رہا تھا۔

ان انتہائی مایوس کن خیالات کے دوران میں ہی یہ خیال بھی میرے ذہن میں چمکا کہ دروازے کی طرف سے آنے والے پانی میں اب بہاؤ نہیں رہا ہے۔ ظاہر ہے تہ خانہ بھر چکا تھا' اب بہاؤ برقرار کیسے رہ سکتا تھا۔ یعنی وہ طوفانی دھارا اب تھم چکا تھا جس نے مجھے اور صفیہ کو باہر جانے سے روکا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے ادھ مرے ذہن اور شل ہوتے ہاتھ پاؤں میں ایک برقی رو جاگی۔ میں نے اپنے جسم کی آخری رہی سہی توانائی جمع کی اور اندازے سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا بایاں ہاتھ بدستور صفیہ کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ صفیہ میرے ساتھ ہی پانی میں غرق تھی۔ نجانے اب تک کتنے لٹر پانی اس کے پیٹ میں اور پھیپھڑوں میں جا چکا تھا۔ وہ ایسے لمحے تھے جن میں مجھے صفیہ کے وجود کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ تڑپ رہی ہے' ساکت ہے' الٹی ہے یا سیدھی ہے؟ زندہ ہے یا مردہ؟ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ میرے بازو میں ہے۔

گزرنے والی ہر ساعت کے ساتھ میرا دم گھٹتا جا رہا تھا اور میں دروازے تک پہنچنے کے لیے اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میں نے ایک اندازہ قائم کیا تھا کہ دروازہ اُس طرف ہے۔ اگر یہ اندازہ غلط تھا تو پھر یہ میری زندگی کی آخری غلطی تھی۔ اس غلطی کا مداوا کرنے کے لیے میرے پاس وقت تھا اور نہ توانائی بچی تھی۔ میرا سینہ ہوا کی طلب میں پھٹا جا رہا تھا۔ جب میرا پاؤں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا تو میری قوتِ برداشت آخری حد کو چھو کر پھر پلٹ آئی۔ میرا پاؤں زینے سے ٹکرایا تھا۔ زینے کا کنارہ میں نے اپنے تلوے میں چبھتا ہوا محسوس کیا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میں تہ خانے کے دروازے کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں ایک دو سیکنڈ سے زیادہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میرے ہونٹ خود بخود کھل جائیں گے اور بے تحاشا پانی فراٹے بھرتا ہوا میرے جسم میں داخل ہو جائے گا۔ اس کے بعد نہ تو میں نیم جان صفیہ پر اپنی گرفت قائم رکھ سکوں گا اور نہ دروازہ پار کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا سکوں گا۔

لیکن پھر نجانے کیسے میں اپنے ہونٹ بند رکھنے میں کامیاب رہا۔ جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ کر میں نے چند فٹ کا فاصلہ مزید طے کیا اور...... ایک دم مجھے اندازہ ہوا کہ میں تہ خانے سے باہر ہوں۔ میرے پاؤں ہموار زمین سے ٹکرائے تھے۔ میں نے پاؤں کی انگلیوں سے فرش کو زور سے پش کیا۔ میرا سر پانی سے باہر نکل آیا۔ پھیپھڑوں سے بچھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار سینے میں گھسی۔ یہ ہوا نہیں زندگی تھی جو پھر سے میرے مردہ جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ سانس اور ذہن میں کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے سانس سینے میں نہیں میرے دماغ میں داخل ہو رہی ہے اور ہر حیات بخش سانس کے ساتھ دماغ پر چھائی ہوئی تاریکی چھٹ رہی ہے۔

چار پانچ گہری سانسیں لینے کے بعد ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میرے ساتھ صفیہ بھی ہے۔ میں نے جلدی سے اس کا سر ٹٹولا۔ اس کا منہ پانی سے باہر تھا لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ میرے دونوں ہاتھوں نے اسے جھنجوڑا "صفیہ...... صفیہ۔" میں نے اس کے کانوں میں تیز سرگوشی کی۔

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی "شاید وہ مر چکی ہے۔" یہ خیال برچھی کی طرح میرے سینے میں گھس گیا۔

میں اب لال کوٹھی کی ایک راہداری میں تھا۔ پانی اب بھی سات فٹ سے کم گہرا نہیں تھا۔ یعنی میرے پاؤں فرش سے قریباً دو فٹ دور تھے۔

میں نے صفیہ کو ساتھ لیے لیے تیرنا شروع کر دیا۔ دس پندرہ گز کا فاصلہ طے کر کے میں راہداری سے نکلا اور ایک چھوٹے سے صحن میں آ گیا۔ لال کوٹھی کی پیچ در پیچ راہداریوں کے درمیان ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے صحن تھے۔ یہاں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ تازگی کے بجائے یہاں حبس کا احساس ہوتا تھا۔ میں صحن پار کر کے دوسری طرف کی راہداری میں آ گیا۔ اس راہداری کا فرش بلند تھا۔ میرے پاؤں زمین پر لگ گئے۔ یوں مجھے اس جاں گسل مشقت سے چھٹکارا ملا جو پچھلے پانچ منٹ سے مجھے ہلکان کر رہی تھی۔ اس راہداری میں پانی کی بلندی پانچ ساڑھے پانچ فٹ کے قریب تھی۔ لال کوٹھی کا بہت سا سامان پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔ کرسیاں' تپائیاں' فریم شدہ تصویریں' چھوٹے بڑے برتن اور گھریلو استعمال کی دیگر بہت سی چیزیں۔ یوں لگتا تھا کہ سیلاب نے اچانک لال کوٹھی کو آ لیا ہے اور مکینوں کو بہت سا سامان کوٹھی میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا ہے۔

میں اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتا رہا۔ امید تو نہیں تھی کہ اس طوفانِ نوح کے بعد کوٹھی میں کوئی موجود ہو گا' پھر بھی احتیاط لازم تھی۔ اگر کوئی آس پاس موجود تھا تو پانی میں میرے چلنے کی آواز سے خبردار ہو سکتا تھا۔ جونہی میں نے راہداری پار کی خود کو لال کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں پایا۔ آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیاں تیر رہی تھیں۔ درمیانی راتوں کا چاند کبھی چھپتا تھا کبھی ایک دم روشن ہو جاتا تھا۔ چاند کی روشنی میں' میں نے دور دور تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی دیکھا۔ صرف چند گز کے فاصلے پر مجھے وہ تانگا نظر آیا جس کو چوہدری بخت کے انتخابی نعروں اور تصویروں سے سجایا گیا تھا۔ تین چار روز پہلے صفیہ نے اسی تانگے میں چھپ کر راہِ

فرار اختیار کی تھی۔ تانگا پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف اس کی چھت نظر آ رہی تھی۔ تانگے سے تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک تختہ سا نظر آیا۔ دیکھنے میں لگتا تھا کہ یہ سیاہی مائل تختہ پانی پر ٹھہرا ہے۔ میں صفیہ کو کھینچتا ہوا اس تختے تک جا پہنچا۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ ایک گاڑی کی چھت تھی۔ یہ پجارو گاڑی پوری کی پوری پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کر کے صفیہ کو چھت پر لٹا دیا اور ارد گرد دیکھنے کے بعد خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ سرد ہوا جسم سے آر پار ہونے لگی۔ گاڑی پر چڑھنے کے بعد میں لال کوٹھی کی چار دیواری سے باہر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ چاندنی میں دور تک پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ کچے پکے مکان' نصف سے زائد پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ٹھاٹھیں مارتے پانی میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے۔ کہیں بھی کسی متنفس کی موجودگی کا اندازہ نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا رنگ والی گاؤں خالی ہے۔ حاتم طائی کی کہانی کی طرح گلیاں' بازار اور مکانات سب اپنی جگہ موجود تھے لیکن انسان کہیں نہیں تھا۔

میں نے صفیہ کے سینے سے کان لگایا۔ دھڑکن بے حد مدھم تھی اور سانس قریباً رک چکی تھی۔ میں نے اسے اوندھا لٹایا اور اس کے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں زور لگاتا تھا تو گاڑی ہل جاتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ پانی کی قوت جو نیچے سے اثر کر رہی ہے' گاڑی کو الٹ دے گی۔ گاڑی کے ہچکولے کھانے سے پانی میں لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور احاطے میں دور تک جا رہی تھیں۔

میں قریباً دس منٹ تک نیم جان صفیہ کو ابتدائی طبی امداد دیتا رہا۔ اس کے پیٹ میں سے توقع سے زیادہ پانی نکلا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سانس بحال ہو گئی اور وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔ صفیہ کا جسم بھرا بھرا تھا اور بہت نرم و نازک بھی لیکن یہ خوب صورت جسم لوتھوں کے شکنجے میں تھا۔ زخم زخم اور داغ داغ۔ ہر انگ مظلومیت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر بار بار اپنی کلائیوں کو جھٹکا دیتی تھی جیسے خود کو ہتھکڑی سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی ہو۔

جب وہ قدرے سنبھل گئی تو میں نے اسے کندھے پر لاد لیا اور پانچ فٹ گہرے پانی میں چلتا دھیرے دھیرے لال کوٹھی کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ صفیہ کا وزن مجھے نہ ہونے کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پانی میں تھا۔

یہ بات واضح تھی کہ میں لال کوٹھی سے جتنا دور چلا جاؤں گا خطرے سے بھی اتنا ہی دور ہو جاؤں گا' یہی وجہ تھی کہ وقت ضائع کیے بغیر میں چل پڑا تھا۔ لال کوٹھی سے نکل کر گلی میں پہنچا تو دو مردہ بھینسیں پانی پر تیرتی نظر آئیں۔ ان کے منہ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ کھونٹے سے بندھی ہوئی تھیں اور بروقت انہیں کھولا نہیں جا سکا تھا۔ یہاں بھی پانی میں چھوٹی موٹی گھریلو اشیا تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ چاند اب بار پھر گہری بدلیوں میں چھپ گیا تھا اور ہر طرف گھٹا ٹوپ تاریکی پھیل گئی تھی۔ ابھی میں گاؤں کے چوراہے سے بیس تیس گز دور ہی تھا کہ کھیتوں کی جانب سے کچھ نامانوس آوازیں آئیں۔ غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ چپو چلنے کی آوازیں ہیں۔ میں نے ایک دیوار کی اوٹ سے دیکھا' چھوٹی سی کشتی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ ایک سینے تک پانی میں ڈوبا ہوا ساتھ چل رہا تھا۔ یقیناً یہ لوگ میری موجودگی سے آگاہ ہو چکے تھے اور میری ہی طرف آ رہے تھے۔

"کون ہے بھئی؟" کسی نے دیہاتی لہجے میں پوچھا۔

"راہ گیر ہوں' پانی میں پھنس گیا ہوں۔" میں نے بھی دیہاتی لہجے میں جواب دیا۔

"ساتھ کون ہے؟"

"گھر والی...... بے ہوش ہے بے چاری۔"

پیدل شخص میرے بالکل قریب پہنچ گیا اور دھیان سے جائزہ لینے لگا۔ وہ گھنی مونچھوں والا ایک کڑیل شخص تھا۔ سردی کا موسم تھا اور وہ سرتاپا بھیگا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کی آواز میں لرزش نہیں تھی۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے افراد بھی دیہاتی تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ مونچھوں والا کڑیل شخص بولا "کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "کریم بخش کے گھر جانا ہے۔ ترکھانوں کی گلی میں رہتا ہے۔"

کریم عرف کریمو لال کوٹھی کا مالی تھا اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ وہ ترکھانوں والی گلی میں رہتا ہے' لہٰذا اس بات کا خدشہ ہی نہیں تھا کہ میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔

کشتی والوں نے کریم بخش کے بارے میں کوئی وضاحت طلب نہیں کی حالانکہ میرے علم کے مطابق گاؤں میں ایک اور کریم بخش بھی تھا اور وہ بھی اسی گلی میں رہتا تھا۔ اس بات سے مجھے شک گزرا کہ شاید کشتی والوں کا تعلق اس گاؤں سے نہیں ہے۔

کڑیل شخص بولا "سارا گاؤں نوہڑ (سیلاب) میں ڈوبا ہوا ہے۔ کوئی بندہ بشر نہیں ہے یہاں...... سب قصبے کی طرف نکل گئے ہیں۔ تم کہاں جاؤ گے؟"

کشتی میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا "آؤ بیٹھ جاؤ۔ تمہیں قبرستان کے پاس اتار دیں گے۔ آگے زیادہ پانی نہیں ہے۔ چل کر قصبے تک پہنچ جانا۔"

میرا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ میں جلد از جلد رنگ والی سے دور نکلنا چاہتا تھا۔ پیدل چلنے میں بے شمار خطرات پوشیدہ تھے جن میں ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ بہت ٹائم لگے گا اور میں کسی کی نگاہ میں آ جاؤں گا۔ میں نے نیم بے ہوش صفیہ کو کشتی میں لٹایا اور ایک شخص سے چادر مانگ کر اس پر ڈال دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کشتی

سوار افراد صفیہ کی شکل دھیان سے دیکھ سکیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کوئی اسے پہچان ہی لیتا۔ پھر صفیہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ ہتھکڑی کشتی سواروں کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھار سکتی تھی۔

صفیہ کو سوار کرا کے میں خود بھی کشتی پر بیٹھ گیا۔ کشتی دھیرے دھیرے گاؤں کی مخالف سمت میں بڑھنے لگی۔ گاؤں کے کھیت کھلیان گڑھے اور جوہڑ سب پانی میں برابر ہو رہے تھے۔ مجھے کشتی میں بہت سی اشیا نظر آئیں۔ ان میں برتنوں کے علاوہ دو تین صندوق' ایک ٹیلی ویژن اور ایک ٹیبل فین بھی تھا۔ یہ سامان دیکھ کر مجھے شک گزرا کہ کشتی سوار افراد کسی امدادی کارروائی میں نہیں "تخریبی کارروائی" میں مصروف ہیں۔ وہ رات کی آفت زدہ تاریکی میں کشتی لے کر خاموشی سے یہاں چلے آئے تھے اور ادھر اُدھر بھٹکتی ہوئی لاوارث اشیا اکٹھی کر رہے تھے۔

میں نے ایک کشتی سوار سے پوچھا "بھائی صاحب! یہ سب ہوا کیسے ہے۔ ایسا سیلاب تو ساون بھادوں میں بھی نہیں آتا۔"

وہ بولا "برساتی نالے کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ تیس سال میں پہلی بار ایسا ہوا ہے۔ دراصل بارشوں سے پہلے اس بند کو پکا کر دیا جاتا ہے مگر اس بار تو سردیوں میں بارشیں ہو رہی ہیں اور ایسی ہو رہی ہیں کہ گرمیوں میں کیا ہوں گی۔ بس ٹوٹ گیا بند۔ میں تو کہتا ہوں یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

میں نے سوچا' یہ واقعی قیامت کی نشانیاں ہیں' تم آفت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کا سامان پار کر رہے ہو۔

جس بند کا ذکر دیہاتی کر رہا تھا' وہ میں نے بھی دیکھا تھا۔ برساتی نالے کی گزرگاہ بلندی پر تھی اور رنگ والی گاؤں کی زمینیں اور اردگرد کے چند دیہات نشیب میں تھے۔ ایک طرح سے وہ بند ان سارے دیہات کی سخت ترین ضرورت تھا۔ اگر واقعی وہ بند ٹوٹا تھا تو پھر نتیجہ یہی ہونا تھا جو ہمارے سامنے تھا۔

میں نے پوچھا "بند ہے کس طرف؟"

وہ بولا "قبرستان کے ساتھ۔ ان درختوں کے پچھواڑے۔"

دس پندرہ منٹ میں ہم قبرستان تک پہنچ گئے۔ اس دوران میں اس کے سوا اور کوئی واقعہ نہیں ہوا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے دیہاتی نے چپو کی مدد سے ایک سانپ کو مارا۔

قبرستان تک پہنچتے پہنچتے پانی کی گہرائی بہت کم رہ گئی۔ یہاں تک کہ کشتی کا پیندہ زمین سے رگڑ کھانے لگا۔

یہاں ہم کشتی سے اتر آئے۔ کریل شخص کی مدد سے میں نے صفیہ کو پھر کندھے پر لاد لیا۔ وہ غنودگی کے عالم میں زور زور سے کراہنے لگی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ دردناک پھٹی پھٹی آواز چوہدری بخت کی "ایل پی" کی ہے..... وہ ایل پی جس کے رسیلے گیت ہر شام لال کوٹھی میں گونجتے تھے۔

کریل شخص کو اس کے "کشتی سوار" ساتھی برکت کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ برکت اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا "چلو آؤ تمہیں پتے تک چھوڑ آئیں۔"

میں نے شکریہ ادا کیا۔

برکت میرے ساتھ چل دیا۔ بلکہ باقی افراد بھی کشتی کو ایک درخت سے باندھ کر میرے ساتھ چل دیے۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اگر میری رہنمائی ہی کرنا تھی تو ایک شخص میرے ساتھ آ سکتا تھا۔ چاروں افراد کو کشتی چھوڑ کر میرے ساتھ چلنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے اعصاب تن گئے اور میں ذہنی طور پر ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ پانی بتدریج کم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ پنڈلیوں تک آیا اور پھر ختم ہو گیا۔ اب ہم قبرستان کے اندر تھے۔

"یہ زنانی کون ہے؟" برکت کے ہانو نامی ساتھی نے ذرا اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"میری..... گھر والی ہے..... اور کون ہے؟"

"کیوں جھوٹ بول رہا ہے یار۔" ہانو نے تلخی سے کہا "ہم تجھے اندھے نظر آ رہے ہیں کیا؟ زنانی ساری خون خون ہو رہی ہے اور پھر اس کے کپڑے بتا رہے ہیں کہ کسی امیر کبیر گھر کی ہے۔"

"یار! پتا نہیں تم کیوں شک میں پڑ گئے ہو۔ اس کے کپڑے اچھے ہیں تو میرے کیا برے ہیں اور چوٹیں تو راستے میں لگی ہیں۔ چلتے تانگے سے گر پڑی ہے۔ میں نے تو....."

"زیادہ زر زر نہ کر۔" برکت نے غرا کر کہا "زنانی کو نیچے اتار کر ادھر گھاس پر لٹا دے۔"

برکت کا انداز حاکمانہ تھا۔ یہ انداز بتا رہا تھا کہ اس بے تکے دیہاتی کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہے۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے صفیہ کو کندھے سے اتار کر بہ آہستگی نیچے لٹا دیا۔

برکت نے اپنے لباس کے نیچے سے ایک ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں پہلے غور سے مجھے اور پھر صفیہ کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ اس کے تاثرات بدل گئے ہیں۔ ایک دم اس کے ہاتھ میں پستول نظر آنے لگا۔ جونہی اس نے پستول نکالا' باقی تینوں افراد بھی پوری طرح چوکس نظر آنے لگے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی بیٹوں والی لاٹھیاں تھیں۔ میں چاہتا تو اس موقع پر اپنی اسپیٹ فائٹنگ کی صلاحیت استعمال کر سکتا تھا اور عین ممکن تھا کہ ان لوگوں کو زیر بھی کر لیتا لیکن پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کا ارادہ کیا ہے۔

برکت نے بڑے دبدبے سے کہا "چل اوئے..... آگے لگ۔ تجھ سے ڈیرے پر چل کر بات ہو گی۔"

"لیکن بھرا جی! میرا قصور کیا ہے؟" میں نے عاجزی سے کہا۔

"قصور بھی بتاتے ہیں تجھے۔ فی الحال تو چلنے والی بات کر۔"

برکت نے مجھے پستول سے باقاعدہ ٹھوکا دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ برکت کی آواز کسی اندرونی جوش کی وجہ سے لرز رہی ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ کہیں ان لوگوں نے صفیہ کو بیگم جی کے طور پر پہچان تو نہیں لیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ صفیہ عام لوگوں کے سامنے تو نہیں آتی ہو گی۔ ویسے بھی وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر بے چاری کی صورت بگڑی ہوئی تھی۔ یہ لوگ اتنی جلدی اسے کیسے پہچان سکتے تھے۔

یہاں قریب ہی درختوں کے نیچے ایک ریڑھا موجود تھا۔ اس پر چارے کے تین چار گٹھے لدے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے گٹھے نیچے پھینکے اور دو افراد نے نیم بے ہوش صفیہ کو اٹھا کر ریڑھے پر لٹا دیا۔ تلاشی لینے کے بعد مجھے بھی ریڑھے پر سوار ہونے کا حکم دیا گیا۔ میں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ہانو نامی نوجوان نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور پیدل ہی چل دیا۔ باقی تینوں افراد بھی ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ ان میں سے برکت کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا اور وہ مجھ پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میں نے راستے میں ایک دو بار پھر اپنے "قصور" کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے خرافات بکنی شروع کر دی۔

ہم نے ایک چھوٹی سی نہر کا پُل پار کیا اور ایک نیم پختہ راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ نہر کی اس جانب سیلاب کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ آگے جانے کے بعد مجھے ایک جگہ درختوں میں "ناظم ڈیری فارم" کا لمبا چوڑا بورڈ نظر آیا۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے کرم دین کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ ملک ناظم نہر پار کے گاؤں شاد کی کا رہنے والا ہے اور گاؤں کے پاس ملکوں کا بہت بڑا ڈیری فارم ہے۔ ڈیری فارم کا بورڈ میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاد کی گاؤں بھی قریب ہی ہے۔ اچانک مجھے اپنے خیالات سے چونکنا پڑا۔ درختوں کے عقب سے چھ سات افراد برآمد ہوئے۔ وہ سب دیہاتی لباس میں تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں جب کہ تین کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ یہ لوگ برکت اور ہانو وغیرہ کے ساتھی تھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ ڈیری فارم کے اندر سے ہی برآمد ہوئے تھے۔

ہانو ان کے قریب چلا گیا اور کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس کھسر پھسر کے بعد سب لوگ ریڑھے کے گرد یوں جمع ہو گئے جیسے انہوں نے دشمن ملک کا کوئی جاسوس پکڑ لیا ہو اور اب اس کی تکا بوٹی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔ ان کی جلتی ہوئی نگاہیں میرا اور خاص طور سے صفیہ کا طواف کر رہی تھیں۔ یہ بڑی مخدوش صورتِ حال تھی اور ایک دم ہی پیدا ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ برکت' ہانو اور اس کے ساتھیوں کا تعلق چوہدری بخت کی مخالف پارٹی سے ہے اور ان لوگوں نے صفیہ کو بطور بیگم جی پہچان لیا ہے۔ دو تین منٹ پہلے تک میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یوں اچانک ایک سنگین مشکل کا سامنا ہو جائے گا۔

برکت اور اس کے ساتھی بڑی احتیاط سے ہمیں ایک حویلی میں لے گئے۔ یہ حویلی شاد کی گاؤں میں واقع تھی۔ وسیع احاطہ تھا اور احاطے کے آخر میں روشن کمروں کی دو قطاریں اور برآمدے وغیرہ تھے۔ لال کوٹھی کے مقابلے میں یہ حویلی بہت چھوٹی تھی۔ بالکل جیسے لاہور کے مقابلے میں رائے ونڈ یا کوئی دوسرا مضافاتی قصبہ۔ مجھے اور صفیہ کو ایک کشادہ کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں ٹائیلوں کا فرش تھا۔ تین چار بڑی چارپائیاں' چند گاؤ تکیے' ایک لمبی نال کا حقہ اور ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن۔ یہ تھا اس کمرے کا کل اثاثہ۔ صفیہ کو دو افراد اٹھا کر لائے تھے۔ اسے پہلو کے بل ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ کمرے میں گیس لیمپ روشن تھے۔ ان کی روشنی میں صفیہ قابل رحم نظر آ رہی تھی۔ اس کی ناک اور ہونٹ سوج کر کپا ہو چکے تھے۔ آنکھ کی حالت بھی مخدوش تھی۔ چہرے کے علاوہ پورا جسم بھی زخم زخم تھا۔ ہتھکڑی بدستور اس کی کلائیوں میں تھی۔

چند لمحے بعد دھوتی کرتے میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی۔ انگلیوں میں سونے کی بھاری انگوٹھیاں اور کلائی میں کڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ناظم مرحوم کا باپ ملک خدا بخش ہے۔ اسے خدا بخش وڈیرا بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی شکل میں واضح طور پر ناظم کی جھلک تھی۔ کچھ دیر بعد میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

برکت کی طرح ملک خدا بخش نے بھی بڑے دھیان سے نیم بے ہوش صفیہ کو دیکھا اور اس کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ مجھے آتشیں نظروں سے گھور کر بولا "کہاں سے ملی ہے تمہیں یہ عورت؟"

"میں نے بتایا ہے نا....."

"تم نے غلط بتایا ہے۔" اس نے گرج کر میری بات کاٹی "بالکل بکواس کر رہے ہو تم..... یہ عورت چوہدری بخت کی رکھیل ہے۔ میں پوچھتا ہوں' یہ کہاں سے ملی ہے تمہیں؟"

خدا بخش وڈیرا نے باقاعدہ میرا گریبان پکڑ لیا اور طیش کے عالم میں جھنجھوڑنے لگا۔

میں نے خدا بخش وڈیرا کی چوڑی چکلی کلائی پکڑ لی اور بڑے نارمل انداز میں اسے اپنی مضبوط گرفت کی پہچان کرائی۔ خدا بخش وڈیرا کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار ابھرے۔ اس کی کلائی کی رگیں بری طرح مسلی گئی تھیں۔ میرا گریبان خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑی نرمی سے کہا "خدا بخش صاحب! میں آپ کا دشمن نہیں دوست ہوں۔ آپ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر میرے ساتھ بات کر لیں۔ میں آپ کو سبھی کچھ بتا رہا ہوں۔"

میرے ہاتھ کی غیر معمولی گرفت نے ملک کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے شعلوں کو اچانک سرد کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر طیش کی جگہ اب حیرت نظر آنے لگی تھی۔ اس نے چور نظروں سے اپنے

ساتھیوں کو دیکھا' جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس کی اذیت اور بے بسی کو کسی اور نے تو محسوس نہیں کیا۔ اس سلسلے میں وہ یقیناً خوش قسمت ہی رہا تھا۔ جس وقت میں نے اس کی کلائی سے "محبت" کی تھی اور اس کے چہرے پر دردناک تاثرات ابھرے تھے۔ اس کا رخ میری طرف تھا اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

اسی دوران میں ایک بھاری بھرکم عورت بھی اندر آگئی۔ اس نے مقامی رواج کے مطابق کالی دھوتی اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں سونے کا کنٹھا اور کانوں میں وزنی کانٹے تھے۔ یہ عورت عمر کے لحاظ سے ملک خدا بخش وڈیرا کی بیوی اور مقتول ناظم کی ماں لگتی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی عورت کی نظر صفیہ پر گر گئی۔ صفیہ اب ہوش میں آچکی تھی اور خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ خوش پوش عورت نے دھیان سے صفیہ کو دیکھا۔ چند لمحے ساکت کھڑی رہی' پھر بلی کی طرح غراتی ہوئی صفیہ پر پل پڑی۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی "میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ایک ایک کا خون پی جاؤں گی۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟ بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے؟"

وہ زخم زخم صفیہ کو بے دردی سے جھنجھوڑ رہی تھی اور اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر رہی تھی۔ وہ اتنے ہوش میں تھی کہ صفیہ کی حالت بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ بھی نہیں سوچ رہی تھی کہ جسے وہ مار رہی ہے وہ تو پہلے ہی جاں بہ لب ہے۔

"اسے روکیں خدا بخش صاحب!" میں نے چیخ کر کہا۔

خدا بخش آگے بڑھا اور اس نے اپنی بیوی کو پیچھے سے تھام کر کھینچ لیا "حوصلہ کر رسول بی بی..... حوصلہ کر..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

خوش پوش عورت مسلسل واویلا کر رہی تھی۔ خدا بخش وڈیرا عورت کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ ہاشو نے دروازہ بند کر دیا۔

صفیہ بے چارگی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس میں تو شاید اب اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی اذیت کو محسوس کرتی۔ تازہ چوٹوں کے سبب اس کی ناک اور ہونٹوں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔

خدا بخش وڈیرا کی واپسی پانچ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس نے ایک ملازمہ کو صفیہ کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ اس کا گیلا لباس تبدیل کرا دیا جائے۔ پھر وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرا حویلی کی اندرونی بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں اہل خانہ کی چند تصویریں لگی تھیں۔ ان میں نوجوان ناظم کی تصویر بھی تھی..... وہ ناظم جو راہیِ عدم ہو چکا تھا لیکن ابھی اس کے لواحقین اس غم ناک حقیقت سے بے خبر تھے۔

بیٹھک میں داخل ہونے سے پہلے لمبے تڑنگے برکت نے ایک بار پھر میری تلاشی لی تھی۔ اب بھی وہ کسی چوکس محافظ کی طرح بیٹھک کے دروازے پر موجود تھا۔ خاصا ہوشیار اور تیز شخص نظر آتا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی ملک خدا بخش وڈیرا نے مجھ سے سوال کیا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"شاہ جہاں۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔"

"یہ زنانی تمہیں کہاں سے ملی ہے؟"

"لال کوٹھی سے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم لال کوٹھی میں کیسے پہنچے؟"

"میں چند روز پہلے چوہدری بخت کا مہمان رہا ہوں۔ چوہدری سے ہماری ملاقات تاران سائیڈ پر ہوئی تھی۔"

"تم تو فلمی یونٹ والے ہو۔"

"نہیں میرا اور میرے ایک ساتھی کا تعلق فلمی یونٹ سے نہیں تھا۔ ہم وہاں ویسے ہی سیر کرنے گئے تھے۔"

"لیکن تم لوگ دو ہفتے پہلے واپس چلے گئے تھے؟"

"جی ہاں' چلے گئے تھے لیکن میرا ایک ریوالور یہاں رہ گیا تھا۔ وہی لینے واپس آیا تھا۔ یہ بدھ کے دن کی بات ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کل رات میں اتفاقاً گھومتا پھرتا لال کوٹھی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہاں ایک دروازے کے پیچھے سے مجھے مدھم چیخوں کی آواز آئی۔ میں دروازے کے ساتھ کان لگا کر یہ چیخ و پکار سن رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور چوہدری کے ایک کارندے نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔۔۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔" میں نے ذرا توقف کیا اور لرزاں لہجے میں بات جاری رکھی "تہ خانے میں بیگم صاحبہ رسیوں سے جکڑی پڑی تھیں۔ چوہدری کا ہم راز ملازم "کالی" بیگم صاحبہ پر تشدد کر رہا تھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ چوہدری صاحب کے دو تین کارندے میرے گرد اکٹھے ہو گئے اور مجھے بے دریغ مارنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ میں یہاں جاسوسی کر رہا ہوں۔ میں نے بہت دہائی دی لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور رسیوں سے باندھ دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ ٹھیک سے میری تلاشی نہ لے سکے اور ایک چاقو میرے لباس میں رہ گیا۔ شام کے بعد میں نے اس چاقو کی مدد سے اپنی رسیاں کاٹ لیں۔ بعد میں جب سیلاب آیا اور سب لوگ لال کوٹھی سے بھاگ گئے تو میں اور یہ بیگم صاحبہ تہ خانے میں اکیلے رہ گئے۔ بیگم صاحبہ زخموں سے چور تھیں اور دیوانوں جیسی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ بیگم صاحبہ چوہدری کے غضب کا کیوں شکار ہوئی ہیں..... نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ تہ خانے سے باہر کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ مجھے حقیقت کا پتا اس وقت چلا جب کوئی دو گھنٹے پہلے تہ خانے کے فرش پر پانی جمع ہونا شروع ہوا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک زوردار آواز سے تہ خانے کا دروازہ اکھڑ گیا۔۔۔ میں جس طرح اس زخمی عورت کو لے کر تہ خانے سے نکل سکا ہوں اور گاؤں کے چوراہے

تک پہنچا ہوں یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

ملک خدا بخش بے حد ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی ایک سوالات کیے۔ ان میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ایکا ایکی چوہدری بخت کی اپنی بیوی یا رکھیل کے ساتھ کیا دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔

میں اس سوال کا جواب اچھی طرح جانتا تھا لیکن یہ..... بات خدا بخش وڈیرا کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کر دی۔ خدا بخش وڈیرا نے مجھ سے اپنے بیٹے ناظم کے حوالے سے بھی سوالات کیے۔ اس نے مجھے ناظم کی فریم میں لگی ہوئی تصویر دکھائی اور پوچھا کہ میں نے اپنے قیام کے دوران میں اس نوجوان کو لال کوٹھی میں دیکھا ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔

اسی دوران میں ہال نما کمرے کی طرف سے ایک بار پھر چیخ و پکار کی آواز آنے لگی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ آواز خدا بخش وڈیرا کی بیوی ہی کی تھی۔ وہ موقع دیکھ کر ایک بار پھر صفیہ پر جھپٹ پڑی تھی یا جھپٹنے والی تھی۔ میں نے خدا بخش وڈیرا سے کہا "ملک صاحب! صفیہ بیگم آپ لوگوں کی نفرت کی نہیں' محبت کی حق دار ہے۔ اگر آپ چوہدری بخت کے ڈسے ہوئے ہیں تو وہ بھی چوہدری سے ڈنک کھا کر آئی ہے۔"

میری بات ایسی ہرگز نہیں تھی کہ سمجھ میں نہ آتی۔ میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہال کی طرف لپکا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زنانی کی بھری ہوئی آواز آنا بند ہو گئی۔ یقیناً خدا بخش اسے سمجھانے بجھانے میں کامیاب رہا تھا۔ مجھے کافی دیر تک خدا بخش وڈیرا کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ واپس آیا تو کچھ فکر مند تھا۔ بولا "زنانی کی حالت ٹھیک نہیں..... ڈاکٹر شاکٹر کو بلانا پڑے گا۔"

میں نے کہا "اگر ضروری ہے تو بلا لیں۔"

وہ بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا' چوہدری بخت نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ منہ سر موڑ دیا ہے۔ چہرے پر کی سیاہی مل دی ہے۔ کوئی جانور کو بھی اس طرح نہیں مارتا جیسے اسے مارا گیا ہے اور تو اور چوروں ڈاکوؤں کی طرح ہتھکڑی بھی لگائی ہوئی ہے بے چاری کو۔"

میں نے کہا "یہ ہتھکڑی کھولنے کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے؟"

وہ بولا "ایک بندہ ہمارے گاؤں میں ہی ہے۔ میں نے اسے بلا بھیجا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گا۔"

"اور ڈاکٹر؟"

"ڈاکٹر کو ساتھ والے گاؤں سے آتا ہے۔ اچھی طرح واقف ہے میرا۔ میں ابھی اس کی طرف بندہ بھیجتا ہوں' اگر سیلابی پانی اس طرف نہیں گیا تو ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاکٹر یہاں پہنچ جائے گا۔ بڑا سیانا چھوکرا ہے۔ مردے میں جان ڈال دیتا ہے۔"

میں نے رات کا باقی حصہ جاگتے ہوئے ہی گزارا تھا۔ صبح سویرے خدا بخش وڈیرا نے مجھے پُرتکلف ناشتا دیا۔ ناشتے کے دوران میں خدا بخش وڈیرا نے مجھے بتایا کہ رات پچھلے پہر ڈاکٹر آکر صفیہ کو دیکھ گیا ہے۔ اس کی ناک اور ایک آنکھ پر گہری چوٹیں آئی ہیں۔ صحیح علاج تو شہر جا کر ہی ہو سکتا ہے بہرحال اس نے پٹی وغیرہ کر دی ہے اور دوائیں بھی لکھ دی ہیں۔ اب وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہے۔ خدا بخش وڈیرا صفیہ کی ہتھکڑی کھلوانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ صفیہ کے منہ سے میرے بارے میں یا ناظم کے قتل کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ نکل جائے۔ میں نے خود کو ناظم اور چھوٹے چوہدری ذیشان کے معاملے سے بالکل بے خبر ظاہر کیا تھا۔ اگر صفیہ یہ کہہ دیتی کہ ناظم اور ذیشان کا جھگڑا میرے سامنے ہوا تھا تو میں جھوٹا ثابت ہو جاتا اور خدا بخش وڈیرا میری کسی بات پر بھی اعتبار نہ کرتا۔

دوپہر کے وقت خدا بخش وڈیرا میرے اصرار سے مجبور ہو گیا اور مجھے صفیہ سے ملانے زنان خانے میں لے گیا۔ صفیہ کا چہرہ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ صرف ایک آنکھ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کچھ سنبھلی ہوئی لگتی تھی' ورنہ اس سے پہلے تو وہ مجھے ہی چوہدری صاحب سمجھنے لگی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی۔

"میں کہاں ہوں..... تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔ مجھے بتاؤ۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

اس وقت کمرے میں میرے اور صفیہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا "صفیہ! میں تمہیں لال کوٹھی سے نکال لایا ہوں۔ اب تم بالکل محفوظ ہو۔ چوہدری بخت اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

چوہدری بخت کے ذکر پر صفیہ کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ سسکی "یہ کیسے ہو سکتا ہے شاہ جہاں..... میرا دماغ ابھی تک یہ بات نہیں مان رہا۔"

میں نے کہا "صفیہ! لال کوٹھی کے ملازم کرم دین نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو میں نے تم سے کہہ دی ہے۔ بہرحال ابھی اس معاملے پر بات کرنے کا موقع نہیں۔"

وہ سر دائیں بائیں ہلانے لگی اور ایک بار پھر اول فول بکنے لگی "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ چوہدری صاحب..... چوہدری صاحب بھی مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ میرا کوئی نہیں' میں لاوارث ہوں' میں ایک بازاری چیز ہوں۔ میں رنڈی ہوں۔"

میں نے صفیہ کو شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اس کا ہسٹریا ذرا کم ہو گیا۔ میں نے کہا "دیکھو ہم ملک خدا بخش وڈیرا کی تحویل میں ہیں۔ یہاں میرے اور اپنے بارے میں کوئی فالتو بات نہیں کرنا۔

ورنہ ہم سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ کھنڈر کی طرح ویران تھا۔ اسی دوران میں خدا بخش وڈیرا اندر آگیا۔ اور مجھے چند لمحے تک پُراسرار سی باتیں کر کے کمرے سے باہر آنا پڑا۔

○☆○

ہم دو روز تک خدا بخش وڈیرا کی حویلی میں رہے۔ یہاں ہماری موجودگی ایک سربستہ راز کی طرح تھی۔ بس خاص خاص ملازموں کو معلوم تھا کہ لال کوٹھی کی چھوٹی بیگم زخمی حالت میں اس حویلی میں مقیم ہے۔

برساتی نالے سے آنے والے سیلاب نے "رنگ والی" گاؤں کے علاوہ تین چار قریبی دیہات کو بھی زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ کھڑی فصل تباہ ہوگئی تھی۔ مویشی ہلاک ہوئے تھے اور چار پانچ انسانی جانیں بھی ضائع ہوئی تھیں۔ یہ سیلاب رات نو اور دس بجے کے درمیان آیا تھا۔ پہلا ریلا اتنا اچانک اور شدید تھا کہ لوگ بوکھلا کر رہ گئے تھے۔ رنگ والی گاؤں چونکہ سب سے پہلے ریلے کی زد میں آیا تھا لہٰذا سب سے زیادہ نقصان بھی وہیں ہوا۔ دو افراد کی موت کے علاوہ بے شمار مالی نقصان بھی ہوا۔ اور تو اور لال کوٹھی کا نقصان بھی کم نہیں تھا۔ مکین صرف نقدی، زیورات اور کچھ قیمتی چیزیں ہی نکال سکے تھے۔ لاکھوں روپے کا فرنیچر اور دیگر گھریلو سامان تباہ ہوگیا تھا یا بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ایک اصطبل میں بندھے ہوئے چوہدری بخت کے تین قیمتی گھوڑے بھی نذرِ سیلاب ہوئے تھے۔ نالے کا حفاظتی بند اتنا مضبوط تھا کہ کوئی اس کے ٹوٹنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ پچھلے تیس پینتیس سال میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ نالے نے اچھل کر ان دیہات کو زیرِ آب کر دیا تھا۔ بعض لوگ یہ خیال آرائیاں بھی کر رہے تھے کہ شاہی گاؤں اور اردگرد کے چند دیہات نے اپنی فصلیں بچانے کے لیے بند توڑا ہے اور اس سازش میں ملکوں کا بھی کردار ہے۔

خدا بخش وڈیرا کی زبانی مجھے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ "ملک ناظم" کا ابھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ چوہدری ذیشان بھی غائب ہے۔ دونوں پارٹیوں نے تھانوں میں رپورٹیں درج کرائی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف خطرناک بیانات دے رہے تھے۔ "رنگ والی" میں ایک افواہ یہ بھی اڑی ہوئی تھی کہ جمعے کی شب اچانک آنے والے سیلاب کے وقت چھوٹی بیگم لال کوٹھی میں سے نہیں نکل سکیں اور ابھی تک لاپتا ہیں۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ خدا بخش وڈیرا اور میں بیرونی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ خدا بخش طویل نال والا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ ایک غریب صورت کارندہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں کھینچ کھینچ کر پٹاخے نکال رہا تھا۔ خدا بخش نے گمبھیر لہجے میں کہا "چوہدری بخت نے جو کچھ اپنی رکھیل کے ساتھ کیا ہے یہ لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔ اس طرح تو کوئی پاگل جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا جس طرح اس عورت کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس کے نعرے سنو تو لگتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس سے مخلص اور نیکوکار کوئی بندہ ہے ہی نہیں۔ پوسٹروں پر لکھا ہے 'دیانت دار، باکردار، سچا مسلمان' آپ کا ہمدرد اور آپ کے ووٹوں کا صحیح حق دار ۔۔۔ ووٹوں کا یہ صحیح حق دار لال کوٹھی میں جو کچھ کرتا ہے وہ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ انہیں پتا لگنا چاہیے کہ جو شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ ایسا ظلم کر سکتا ہے وہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ کیا نہیں کر سکتا۔"

"آپ نے کیا سوچا ہے اس بارے میں؟" میں نے خدا بخش سے پوچھا۔

وہ بولا "میں نے اور شاہی کے چوہدری صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ اس عورت کو انصاف دلائیں گے۔ تھانے میں اس کی رپورٹ درج ہوگی اور پریس والوں کے سامنے بھی سب کچھ لایا جائے گا۔ یہ عورت تو ایک ایسا ثبوت ہے جسے چوہدری بخت جھٹلا ہی نہیں سکتا۔ جب یہ بات چلے گی تو پھر یہ بھی پتا چلے گا کہ یہ عورت چوہدری کی بیوی تھی یا رکھیل تھی۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

وہ کچھ دیر پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "اگر کوئی موقع آیا تو تم چوہدری کے خلاف گواہی دو گے؟"

"آپ بڑے لوگ ہیں جی۔ میں چھوٹا بندہ ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ رگڑا لگ جائے گا۔"

وہ مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا "گھبراؤ نہ جوان۔ ہم یاروں کے یار ہیں۔ جس کا ساتھ دیتے ہیں اس کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ بے شک چوہدری بخت مجھ سے بڑا چوہدری ہے لیکن وہ اکیلا ہے جب کہ ہمارے ساتھ تین دیہات کے چوہدری ہیں۔ یہ سب لوگ چوہدری بخت کی حرکتوں سے بھرے بیٹھے ہیں۔" اچانک خدا بخش ٹھٹک کر خاموش ہوگیا۔ میں بھی چونک گیا تھا۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کی طرف سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ لوگ دھاڑیں مار رہے تھے اور بین کرنے والے انداز میں آہ و بکا کر رہے تھے۔

خدا بخش وڈیرا باہر لپکا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ برآمدے سے گزر کر ہم وسیع صحن میں پہنچے۔ پھاٹک کے قریب سنسنی خیز منظر نظر آرہا تھا۔ ملک خدا بخش وڈیرا کا بڑا بیٹا دیواروں سے ٹکریں مار رہا تھا۔ کچھ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ پھر میں نے ناظم کی ماں کو دیکھا۔ وہ چلاتی ہوئی ایک اندرونی کمرے سے نکلی اور غش کھا کر صحن میں گر گئی۔ یہ ایک دل دوز منظر تھا۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ "ملکوں" کو ناظم کے قتل کا پتا چل گیا ہے اور وہ یہ بدترین خبر سن کر نوحہ کناں ہو گئے ہیں۔

ذرا سی دیر میں حویلی کا صحن مردوزن سے بھر گیا۔ ہر طرف چیخ وپکار مچی ہوئی تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا "ملک ناظم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس بات کا پتا لال کوٹھی کے ایک ملازم سے چلا ہے۔ اس ملازم نے وہ جگہ بھی بتا دی ہے جہاں لاش کو دفن کیا گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس لاش برآمد کرنے والی ہے۔"

"کہاں دبائی گئی ہے لاش؟"

"لال کوٹھی کے اندر ہی ایک تہ خانے میں۔ یہ قتل دس پندرہ روز پہلے اسی دن ہوگیا تھا جب ملک ناظم غائب ہوئے تھے۔ چوہدری ذیشان نے صلح صفائی کے بہانے ملک ناظم کو لال کوٹھی میں بلایا تھا۔ وہاں چوہدری بخت اور چوہدری ذیشان نے ملک ناظم کو جان سے مار دیا۔ بعد میں چوہدری ذیشان کو ملک سے باہر بھجوا دیا گیا اور مشہور یہ کر دیا گیا کہ ملک ناظم کے ساتھ ساتھ چوہدری ذیشان بھی غائب ہے۔"

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاعات تھیں۔ چوہدری بخت نے بیچ بڑے پردے ڈالے تھے لیکن آخر وہ ظاہر ہو کر رہا تھا۔ حویلی کے صحن میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ موقع سے ہٹ جاؤں۔ اس حویلی میں ہماری موجودگی فی الحال راز ہی رہنی چاہیے تھی۔

اگلے دو روز بے حد ہنگامہ خیز رہے۔ ملک ناظم کی لاش لال کوٹھی سے برآمد ہوگئی تھی۔ پوسٹ مارٹم اور دیگر قانونی کارروائیوں کے بعد اسے شاہی گاؤں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا تھا۔ خدا بخش وڈیرا کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لال کوٹھی والوں کے خلاف اس کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ چوہدری بخت کا بے پناہ اثر و رسوخ کام کر رہا ہے اور لاش برآمد ہونے کے باوجود پولیس نے چوہدری کو گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سارے کا سارا ملبا چوہدری کے چھوٹے بھائی ذیشان پر ڈالا جا رہا تھا اور ذیشان پاکستان سے باہر تھا۔ چوہدری بخت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسے یہ خبر بھی نہیں کہ ناظم اور ذیشان کا جھگڑا کب ہوا، قتل کی واردات کب ہوئی اور کب ذیشان ملک سے باہر چلا گیا۔ چوہدری بخت نے پولیس کو یہ بیان بھی لکھوایا تھا کہ چھوٹے بھائی ذیشان کی غیر ذمے دارانہ حرکات سے وہ سخت نالاں تھا اور آئے دن جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔

چوہدری بخت گھڑا ہوا سچ بول رہا تھا۔ یہ بات تو درست تھی کہ چوہدری ذیشان کے ہاتھوں ناظم کا قتل چوہدری بخت کی بے خبری میں ہوا لیکن اس کے بعد کے واقعات سے چوہدری لاعلم نہیں تھا۔ لال کوٹھی کے ایک اندرونی تہ خانے کا فرش کھود کر مقتول ناظم کی لاش چھپانے کا کام چوہدری بخت کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری ذیشان کو ملک سے باہر بھی چوہدری بخت نے ہی بھجوایا تھا۔

بہرحال چوہدری بخت کا اثر و رسوخ ہر شبہے سے بالاتر تھا۔ اس کی لال کوٹھی کے وسیع ڈرائنگ روم کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہاں صوبے کی حکومت اور سیاست سے تعلق رکھنے والے سپر اسٹارز فروکش ہوتے تھے۔ چوہدری بخت کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ ایک ایسے قتل کے کیس سے صاف بچ جاتا جو اس نے خود نہیں کیا۔

مقامی پولیس کی سست روی اور جانب دارانہ رویے کو محسوس کر کے خدا بخش وڈیرا بہت مایوس نظر آرہا تھا۔ اس کے ہم نوا بھی چپکے چپکے پولیس افسران کو کوس رہے تھے۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ انہیں اپنے مقتول کا بدلہ خود ہی لینا ہے۔ ایسا احساس بہت خطرناک ہوتا ہے لیکن یہ احساس پیدا کرنے کی ذمے دار اکثر ہماری پولیس ہی ہوتی ہے۔ وہ طاقت ور کی مدد کرتی ہے اور جو کمزور ہوتا ہے وہ مسلسل زک اٹھانے کے بعد لاقانونیت کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ ملک ناظم کا قتل ثابت ہو چکا تھا۔ اگر پولیس خانہ پُری کے لیے لال کوٹھی کے دو تین کارندوں کو گرفتار کرنے کے بجائے چوہدری بخت پر ہاتھ ڈالتی تو یقیناً خدا بخش وڈیرا کی دلداری ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا ۔۔۔ اور پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ ملک ناظم کی تدفین کے بعد تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ میں منیبہ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھ کی پٹی کھل گئی تھی۔ آنکھ ابھی تک سرخ انگارا تھی۔ پتلی میں خون جما ہوا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ نگاہ بچ گئی تھی۔ ناک کی ہڈی ایک مقامی جراح نے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ابھی تک پوری ہوش مندی کی بات نہیں کر رہی تھی۔ بات کرتے کرتے ایک دم رونے لگتی تھی اور پھر روتی چلی جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ رو رہی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ آئینہ دیکھنا چاہتی ہے۔ میں اسے سمجھا بجھا رہا تھا۔ اچانک دو گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے حویلی کے احاطے میں داخل ہوئیں۔ ایک جیپ تھی اور دوسری کار۔ گاڑیوں میں سے کچھ لوگ چلانگیں لگا کر نکلے۔ شام گہری ہو چکی تھی، میں صرف ہیولے ہی دیکھ سکتا تھا۔ پھر مجھے ایک تیز سُریلی چیخ سنائی دی۔ یہ کوئی نوعمر لڑکی تھی جو پھٹی پھٹی آواز میں چلائی تھی۔ ایک دل ہلا دینے والی تڑپ اور فریاد تھی اس آواز میں۔

میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ دو افراد ایک نوعمر لڑکے کو کھینچ کر گاڑی سے اتار رہے تھے۔ وہ ٹانگیں چلا رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ لڑکا شہری لباس میں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ بیس سال کے قریب تھی۔ پھر میں نے اس لڑکی کو دیکھا جس کی چیخیں احاطے میں گونج رہی تھیں۔ ایک شخص نے بے دردی سے اس کے سر کے بال پکڑ رکھے تھے۔ دوسرے نے اس کا بازو تھام رکھا تھا اور کھینچ کر کار سے اتار رہا تھا۔ دو تین افراد نے رائفلیں تان رکھی تھیں اور کسی

بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ ان مسلح افراد میں مجھے مقتول ناظم کا بڑا بھائی قیوم بھی نظر آیا۔ وہ طیش سے بھرا ہوا تھا اور مرنے مارنے پر تیار نظر آ رہا تھا۔ مسلح افراد لڑکی اور لڑکے کو کھینچتے ہوئے کھڑکی کے سامنے سے گزرے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ لڑکے کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون اس کی سفید جرسی کو بھگو رہا تھا۔ لڑکی کے پاؤں میں صرف ایک جوتی تھی۔ اس کی قمیص آستین سے پھٹی ہوئی تھی۔ لڑکی بمشکل پندرہ سولہ برس کی دکھائی دیتی تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یہ سنسنی خیز خیال آیا کہ کہیں یہ چوہدری بخت کے بچے تو نہیں۔ لال کوٹھی میں ملازم کرم دین نے مجھے بتایا تھا کہ چوہدری بخت کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے ولایت میں پڑھتے ہیں اور اپنے چاچے کے پاس رہتے ہیں۔ ایک لڑکی لاہور میں پڑھتی ہے۔ اگلے دس منٹ کے اندر اندر میرے اس بھیانک شبے کی تصدیق ہو گئی۔ ملک خدا بخش نے مجھے خود بتایا کہ یہ دونوں چوہدری بخت کے بچے ہیں۔

چوہدری بخت کا چھوٹا لڑکا ریحان انگلینڈ سے پاکستان آیا ہوا تھا۔ "ونگ والی" گاؤں میں چونکہ سیلاب کا پانی کھڑا تھا لہٰذا وہ کچھ دن کے لیے لاہور میں اپنی خالہ کے پاس چلا گیا تھا۔ ریحان کو وہیں سے اغوا کیا گیا تھا۔ اتفاقاً واردات کے وقت ریحان کی بہن ثمن بھی موقع پر موجود تھی۔ انتقام میں اندھے افراد نے اسے بھی اٹھا کر کار میں ڈال لیا تھا اور یہاں لے آئے تھے۔ اس واردات میں کرائے کے بدمعاش استعمال ہوئے تھے اور ہر طرح سے یہ خیال رکھا گیا تھا کہ اس واقعے میں قانونی طور پر ملک فیملی کی شمولیت ثابت نہ ہو سکے۔

مجھے ملک خدا بخش کے ارادے بے حد خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لوگ مقتول ناظم کے بدلے چوہدری بخت کے بیٹے ریحان کو جان سے مار ڈالیں گے اور لاش یوں غائب کریں گے کہ قیامت تک سراغ نہیں ملے گا۔ ریحان کے ساتھ ساتھ اس کی بہن کی عزت اور جان کو بھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ یہ لوگ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے اور اس اندھے پن میں جو بھی کر جاتے کم تھا۔

مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ لوگ چوہدری بخت کے بچوں کو اغوا کر کے اپنی حویلی میں کیوں لے آئے ہیں۔ ظاہر ہے اس واردات کے سلسلے میں پولیس کا دھیان سب سے پہلے ملک خدا بخش کی طرف ہی جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس کی بھاری نفری اس حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیتی۔

مجھے اپنے سوال کا جواب پندرہ منٹ کے اندر ہی مل گیا۔ ملک خدا بخش دوڑا دوڑا میرے پاس آیا اور بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم اور صفیہ حویلی سے کہیں اور چلے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر میں پولیس یہاں چھاپا مارے۔ ایسی صورت میں تمہارا نظروں میں آنا ٹھیک بات نہیں۔ میں نے گاڑی منگوائی ہے، تم اس میں بیٹھ جاؤ۔ برکت تمہیں ایک محفوظ جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔"

میں نے کہا "اور جس کڑی منڈے کو آپ یہاں لائے ہیں ان کا کیا کریں گے؟"

"وہ بھی تمہارے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں گاڑی میں پہنچا دیا ہے۔ بس اب تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ تم صفیہ کو تیار کرو، میرا خیال ہے کہ اسے چارپائی پر ہی گاڑی تک لے جاتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ فی الحال مجھے وہی کرنا پڑے گا جو خدا بخش وڑائچ کہہ رہا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی بہت بپھرے ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے سر کو خون چڑھا ہوا تھا۔ ایسے میں ان کی کسی بھی بات کو رد کرنا یا کوئی اعتراض کرنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے صفیہ کو بتایا کہ ہم حویلی سے کہیں اور جا رہے ہیں۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا ذہن سوچ سے خالی ہو چکا ہے یا اس نے سوچنے سمجھنے کا سارا کام میرے ذمے لگا دیا ہے۔

ہم صفیہ کو چارپائی سمیت احاطے میں لائے۔ یہاں ایک مزدا لوڈر کھڑا تھا۔ یقیناً یہ گاڑی ناظم ڈیری فارم سے دودھ وغیرہ ڈھونے کے لیے استعمال ہوتی ہوگی۔ مجھے اور صفیہ کو گاڑی کے پچھلے حصے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ترپال بچھی ہوئی تھی۔ ترپال پر لڑکا ریحان اور لڑکی ثمن بے سدھ پڑے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید وہ بے ہوش ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ہوش میں تھے لیکن اس بری طرح بندھے ہوئے تھے کہ بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں باندھنے کے علاوہ ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے گئے تھے۔ اگر وہ کوشش بھی کرتے تو منہ سے مدھم غوں غاں کے سوا کوئی آواز نہیں نکال سکتے تھے۔

اس لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر پستول بردار برکت بھی موجود تھا۔ لوڈر حویلی سے روانہ ہوا اور قریباً آدھ گھنٹے تک انتہائی خستہ راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد گھنے درختوں کے نیچے رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں کسی ویران جگہ یا ڈیرے وغیرہ پر پہنچایا جائے گا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ ہم جہاں پہنچے وہ ایک رہائشی مکان تھا۔ درحقیقت یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جس مکان میں ہم پہنچے تھے یہ کافی وسیع تھا اور گاؤں سے تھوڑا سا ہٹ کر تھا۔ دو تین منٹ بعد لوڈر مکان کے وسیع احاطے میں داخل ہو گیا۔ اب رات کے قریباً نو بج رہے تھے۔ مکان کے اندرونی حصے میں کوئی لالٹین جل رہی تھی اور اس کی روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ مسلح افراد نے لڑکے اور لڑکی کو آٹے کی بوریوں کی طرح کندھے پر لادا اور اندرونی حصے کی طرف لے گئے۔ بعد ازاں صفیہ کے لیے چارپائی منگوائی گئی۔ چارپائی پر بستر پہلے سے بچھا دیا گیا تھا۔ بڑی احتیاط سے اسے ایک کشادہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ برآمدے سے

گزرتے ہوئے میں نے ایک کھڑکی دیکھی۔ جالی کے پیچھے چند خوف زدہ آنکھیں ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک عورت تھی اور دو تین بچے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اہل خانہ ہیں۔

مجھے اور صفیہ کو ایک ہی کمرے میں ٹھہرایا گیا.... یہاں ایک الماری اور بان کی دو کرسیوں کے علاوہ دو چارپائیاں بھی تھیں۔ صفیہ کی تمام دوائیں اور انجکشن وغیرہ میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔ یہ چیزیں میں نے الماری میں رکھ دیں۔

مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ لڑکے اور لڑکی کو مکان کے کس حصے میں رکھا گیا ہے۔ ان کی آواز وغیرہ بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے ان دونوں کی طرف سے سخت تشویش تھی۔ گاڑی میں صفیہ نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں دیکھنے کے بعد وہ گم صم سی تھی۔ میں ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے دلی جذبات کیا ہیں۔ کچھ دیر بعد چھوٹی چھوٹی داڑھی اور دبلے پتلے جسم والا ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اپنا نام ریاض بتایا اور کہا کہ وہ مالک مکان ہے اور ہم دونوں اس کے مہمان ہیں۔ اس نے ہم سے ہماری ضروریات کے بارے میں دریافت کیا اور یہ کہتے ہوئے باہر چلا گیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں ہمارے لیے کھانا بھیجتا ہے۔

میں نے اردگرد کی صورت حال پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اگر اس چار دیواری میں میرے ہوتے ہوئے لڑکے یا لڑکی کے ساتھ کوئی ظلم ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ میں باہر برآمدے میں آ گیا اور مسلح افراد کی سرگرمیوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ لوگ واپس لوڈر کی طرف جا رہے تھے۔ صرف برکت ان میں نہیں تھا۔ غالباً لڑکے اور لڑکی کی حفاظت کے لیے اسے یہیں رہنا تھا۔ جب مسلح افراد واپس چلے گئے تو میں نے شکر کا سانس لیا۔ کم از کم وقتی طور پر تو لڑکی لڑکے کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ مجھے اب تک کسی فائر کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی جس کی وجہ سے مجھے یہ خدشہ لاحق ہوتا کہ خدانخواستہ ان دونوں میں سے کسی کو قتل کیا گیا ہے۔

صورت حال عجیب رخ اختیار کر گئی تھی۔ میں لاہور سے واپس سیالکوٹ اس لیے آیا تھا کہ مجھے صفیہ کی طرف سے ایک انجانا سا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ لال کوٹھی پہنچنے سے پہلے ہی یہ خطرہ حقیقت بن گیا تھا۔ لال کوٹھی پہنچ کر صورت حال مزید سنگین ہو گئی تھی اور صفیہ کے ساتھ ساتھ میں بھی ایک زمین دوز عقوبت خانے میں قید ہو گیا تھا۔ اگر اس رات برساتی نالے کا طوفانی ریلا "ونگ والی" گاؤں میں داخل نہ ہوتا تو پتا نہیں ہمارے ساتھ وہاں کیا بنتا۔ طوفانی ریلے کے سبب ہم چوہدری بخت کے دست ستم سے بچ گئے تھے اور اب ایک ایسے شخص کے مہمان تھے جو پچھلے دو ہفتوں میں چوہدری بخت کا جانی دشمن بن چکا تھا۔

اگر بات یہیں تک رہتی تو بھی مضائقہ نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ملک خدا بخش سے باہمی مشورے کے بعد میں صفیہ کو لاہور لے جاؤں گا۔ وہاں وہ حفاظت سے بھی رہے گی اور اس کا مناسب علاج معالجہ بھی ہو سکے گا۔ بعد میں جب چوہدری بخت کے خلاف قانونی کارروائی شروع ہوگی تو صفیہ کو عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ لیکن اب اچانک ہی سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ چوہدری بخت کی طرح ملک خدا بخش بھی قانون شکنی میں پیچھے نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے دشمن کی نوجوان لڑکی اور لڑکے کو اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا۔ اب کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ یہاں سے نکلوں اور کسی قریبی قصبے میں پہنچ کر شاہ صاحب یا مجتبیٰ وغیرہ سے رابطہ قائم کروں لیکن اس میں بھی خطرہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے واپس آنے تک لڑکی یا لڑکے کے ساتھ کچھ ہو جاتا۔ وہ بالکل بے بس تھے اور اس تنہا مکان کے کسی اندرونی کمرے میں ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بے شک مسلح افراد چلے گئے تھے لیکن کسی بھی وقت وہ واپس آ سکتے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد ہمارا میزبان ہمارے لیے کھانا لے آیا۔ وہ دوسری بار کمرے میں آیا تھا اور دونوں بار مجھے اس کے کپڑوں سے ایک خاص قسم کی بو آتی تھی اور یہ بو اس شخص کے کپڑوں میں ہی نہیں پورے گھر میں موجود تھی۔ یہ بارود کی بو تھی۔ میں اس بو کو ہزاروں بوؤں میں پہچان سکتا تھا۔ کھانے کی ٹرے میں آلو گوبھی کا سالن تھا۔ گڑ والے چاول تھے اور روٹی تھی۔ مجھے ان تمام اشیا میں سے بھی یہی بو آئی۔ میں نے اپنے میزبان سے اس بو کے بارے میں دبے لفظوں میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں آتش بازی تیار کی جاتی ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے برآمدے میں ایک جگہ بہت سے رنگ برنگے کاغذ پڑے دکھائی دیے تھے۔ ایسے کاغذ عموماً آتش بازی کے سامان میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔

خود کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ میں نے کوشش کر کے صفیہ کو بھی چاولوں کے چند نوالے کھلائے۔ کھانے کے بعد میں نے اسے دوا دی اور خود ہی انجکشن بھی لگا دیا۔ میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چوہدری بخت کے بیٹے اور بیٹی کے بارے میں کوئی بات کرے گی یا کوئی سوال پوچھے گی۔ لیکن وہ بالکل خاموش رہی۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے ساتھ ایک پریشان کرنے والا موضوع چھیڑوں۔

میں دوبارہ کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور وہاں سے بیرونی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ یقینی طور پر اس گھر میں ہمارا میزبان ریاض اپنے بیوی بچوں سمیت رہتا تھا۔ یہ لوگ کسی قریبی کمرے میں سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ بس کسی وقت خاتون خانہ کی دبی دبی آواز سنائی دیتی تھی۔ وہ کسی بچے کو ڈانٹتی تھی یا اپنے شوہر کے ساتھ کوئی بات کرتی تھی جو برآمدے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

میرے پاس اپنا محبوب ہتھیار رام پوری خنجر ابھی تک موجود تھا۔ تہ خانے میں اپنے ہاتھوں کی رسیاں کاٹنے کے بعد میں نے خنجر

کو دوبارہ پنڈلی میں اڑس لیا تھا۔ اب اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو ہتھیار کے طور پر یہ خنجر ہی میرا سہارا تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں بیٹھے بیٹھے خنجر کو پنڈلی سے نکالا اور اس کی دھار پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ خم دار دھار میری دوست تھی۔ میرے کٹھن ترین لمحات کی ساتھی تھی۔ یہ خم دار دھار میرے دشمنوں کا لہو چکھ چکی تھی اور بدترین حالات میں مجھے دفاع فراہم کرتی تھی۔ چاقو زنی کا فن میں نے بمبئی میں سیکھا تھا۔ ان دنوں غنڈوں کے ایک بدنام گروہ "چاؤلی گینگ" نے بمبئی میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ چاؤلی اس گروہ کا سرغنہ اور چاقو زنی میں استاد مانا جاتا تھا۔ بمبئی کے ریڈ لائٹ ایریا کے ایک ناچ گھر میں چاؤلی گینگ اور ایک دوسرے گروہ میں زبردست مارا ماری ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں اتفاقاً مجھے یہ "اعزاز" حاصل ہوگیا تھا کہ میں نے چاؤلی کی جان بچائی تھی۔ اس احسان کے بدلے چاؤلی نے مجھے خنجر زنی میں طاق کردیا تھا۔ بعد میں چاؤلی اور اس کی ایک دوست لڑکی کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔

بمبئی کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ مجھے شنکر شکرا کے ساتھ اپنی وہ مشہور و معروف لڑائی یاد آئی جس کے نتیجے میں ایک لڑکی کی عزت بچی تھی اور شنکر سے میری کبھی ختم نہ ہونے والی دشمنی شروع ہوئی تھی۔ شنکر میرا ازلی دشمن تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میرا مشکل ترین حریف تھا۔ شنکر شکرا کی دہشت، اس کی عیاری اور اس کی "فائیٹنگ" کے طوفانی انداز کے بارے میں سوچتے سوچتے نجانے کب مجھے اونگھ آگئی۔ میں کل ساری رات بھی نہیں سو سکا تھا اس لیے اونگھ ذرا طویل ہوگئی۔ میری آنکھ ایک تیز شور سے کھلی تھی۔ یہ چیخوں کا شور تھا۔ ان میں نسوانی چیخیں بھی تھیں اور مردانہ گرج بھی۔ میرا ہاتھ خود بخود پنڈلی تک پہنچا اور میری گرفت خنجر کے محبوب دستے پر قائم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہ چارپائی کی طرف اٹھی تھی۔ وہاں صفیہ موجود نہیں تھی۔ وہ تو بغیر سہارے کے چل بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ میں لپک کر باہر نکلا۔ برآمدے میں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ایک اندرونی کمرے میں لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی اور سارا ہنگامہ وہیں مرکوز تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا تیزی سے اس روشن کمرے تک پہنچا۔ میں نے صفیہ کو دیکھا۔ وہ کچے فرش پر گری ہوئی تھی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی زمین بوس تھا۔ ایک شخص رائفل تانے ان دونوں کے سر پر کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "چھوڑ دے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دے..... ورنہ گولی ماردوں گا۔"

یہی وقت تھا جب ایک رائفل میری طرف بھی سیدھی ہوگئی۔ میری طرف رائفل سیدھی کرنے والا لمبا تڑنگا برکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ناک چمک تھی، وہ غرایا "خبردار، تم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

میں برکت کی دھمکی اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھلونے سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ مگر وقتی طور پر میں پیچھے ہٹا اور دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا لیکن اس انداز سے تھا کہ برکت کو نظر نہیں آرہا تھا۔ اب زیادہ بہتر طور سے کمرے کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ صفیہ جس جسم سے لپٹی ہوئی تھی وہ چوہدری بخت کی بیٹی سمن کا تھا۔ صفیہ نے خود کو سمن پر گرالیا تھا اور اسے دو ہٹے کٹے افراد سے بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ بالکل جیسے مرغی چوزے کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے، صفیہ نے سمن کو چھپا رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سمن عریاں ہے۔ اس کے بدن کے زیریں حصے پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے اس شخص کی صورت بھی پہچان لی جس کے ایک ہاتھ میں خودکار رائفل اور دوسرے میں صفیہ کے بال تھے۔ وہ مقتول کا فسیلا بھائی قیوم تھا۔ وہ صفیہ کو سمن کے اوپر سے کھینچنے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ پوری جان سے چوہدری کی بیٹی کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ پھر دو افراد نے زور لگا کر صفیہ کو سمن سے پیچھا ہٹا دیا۔ سمن چیخ رہی تھی "چھوٹی امی..... مجھے بچاؤ..... چھوٹی امی....."

صفیہ اپنے نڈھال جسم کے ساتھ پوری کوشش کررہی تھی لیکن پکڑنے والوں نے آہنی ہاتھوں سے پکڑا تھا۔ ایک لمحے میں تمام صورت حال میری سمجھ میں آگئی۔ وہی ہوا تھا جس کا خطرہ تھا۔ مقتول کا بڑا بھائی قیوم جوش انتقام میں بھرا ہوا یہاں پہنچا تھا اور لڑکی سمن سے دست درازی شروع کردی تھی۔ صفیہ نے سمن کی آواز سنی تھی اور اپنی حالت کی پروا کیے بغیر باہر نکل آئی تھی۔ جس طرح سمن کی ڈھال بنی تھی وہ نظارہ ناقابل فراموش تھا۔

اب میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ مزید خاموش تماشائی بنا رہتا۔ برکت بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں مجھ سے صرف دو گز کی دوری پر کھڑا تھا۔ رائفل کی نال تین چار فٹ کے فاصلے پر تھی۔ وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ میں کتنی تیزی اور آسانی سے اس کی رائفل چھین سکتا ہوں۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرا بایاں ہاتھ رائفل کی نال پر آیا اور نال اوپر اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری ٹانگ برکت کی بغل میں لگی تھی۔ رائفل ہاتھ سے نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر دور جاگرا۔ یہ منظر دیکھ کر قیوم کا ایک ساتھی مجھ پر جھپٹا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں خنجر ہے۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کی ران پر وار کیا۔ وہ کراہا۔ میں نے سر کی ٹکر سے اسے دور پھینک دیا۔

قیوم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے رائفل سیدھی تو کرلی تھی لیکن فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ فائر کرے یا نہیں۔ اس کے لمحاتی تذبذب کا سمن نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے تڑپ کر رائفل پکڑی اور اپنے دانت قیوم کی کلائی میں گاڑ دیے۔ وہ تکلیف کی شدت سے دوہرا ہوا تو میں نے رائفل کا دستہ اتنے زور سے اس کی پیشانی پر مارا کہ وہ پشت کے بل زمین پر گرگیا لیکن رائفل اس نے پھر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ گرتے وقت اس کی

انگلی نے ٹریگر دبا دیا۔ یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے اور گولیاں چھت میں گھس گئیں۔ یہ دو نالی رائفل تھی اور میں جانتا تھا کہ "ری لوڈ" ہونے تک اب یہ بے کار ہے۔ میں نے اپنی توجہ باقی بچے افراد کی طرف کی۔ چند سیکنڈ کے اندر ان میں سے ایک نیم بے ہوش ہوکر گرگیا تھا، ایک بھاگ گیا اور ایک میرے ہاتھ میں پکڑی رائفل کی زد پر ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوگیا تھا جو ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہوا تھا وہ قیوم تھا۔ اس کے ناک منہ سے خون چھوٹ رہا تھا۔ جبڑا ٹوٹ گیا تھا اور وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ شاید اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ میں اتنی تیزی اور آسانی سے پانسا پلٹ دوں گا۔

صفیہ نے بستر کی ایک چادر سمن کے نیم عریاں جسم کے گرد لپیٹ دی تھی اور اسے کھینچتے ہوئے دوسری طرف لے گئی تھی۔ اب وہ ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں اور ان کی سہمی سہمی آنکھیں مجھ پر اور قیوم وغیرہ پر لگی تھیں۔ بظاہر تو کھیل ختم ہوگیا تھا اور میں نے یہاں موجود افراد پر قابو پالیا تھا لیکن نہیں..... ابھی ایک کردار باقی تھا۔ یہ ہمارا دبلا پتلا میزبان ریاض تھا۔ اس خبیث نے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ میں ذرا سا چوک جاتا تو وہ اپنا کام دکھا جاتا۔ وہ اچانک دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لمبے دستے والی کلہاڑی تھی۔ بڑی بے جگری سے اس نے کلہاڑی کا وار میرے ہاتھوں پر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مقصد یقیناً یہی تھا کہ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ میں نے آخری لمحے میں خود کو بچایا اور ریاض کی پشت پر ٹانگ رسید کی۔ وہ اپنی ہی جھونک میں ساتھ والے کمرے میں جاگرا۔ میں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔ وہ کمرے میں مقید ہوچکا تھا۔ یہ سارا عمل بمشکل تین سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ اسی دوران میں قیوم کو موقع مل گیا کہ وہ ادھ کھلے دروازے سے نکل بھاگے۔ میں نے اسے للکارا اور اس کا پیچھا کیا۔ وہ دس پندرہ قدم برآمدے کے اندر بھاگا اور پھر ایک دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ کمرے میں گھسنے سے پہلے میں نے اس پر ایک فائر کیا لیکن گولی برآمدے کی کچی دیوار میں لگی۔ جب میں کمرے کے دروازے پر پہنچا تو وہ ایک کھڑکی میں سے کود کر باہر نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس پر فائر کرنے کے لیے رائفل سیدھی کی لیکن نجانے کیوں میری انگلی ٹریگر پر دبتے دبتے رہ گئی۔ کچھ ہی لمحے وہ کھڑکی سے باہر تھا۔ تاہم اس کا سر مجھے اب بھی نظر آرہا تھا۔ میں فائر کرسکتا تھا، مگر میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا اور اسے بھاگتے دیکھتا رہا۔ وہ عقبی کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچا اور تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔

میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا جس کی کھڑکی میں سے قیوم باہر گیا تھا۔ وہ سارا کمرا آتش بازی کے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ عقبی کمرے میں بھی آتش بازی کے ڈھیر لگے تھے۔ ہوائیاں، پھلجھڑیاں، پٹاخے، بم، مہتابیاں اور پتا نہیں کیا کیا..... خدانخواستہ میں جوش میں قیوم پر فائرنگ کرتا اور ایک آدھ گولی بھٹک کر اس آتش بازی میں جا لگتی تو جو نتیجہ نکلتا وہ بہت خوف ناک ہوتا۔ اس گھر میں مالک مکان ریاض کے علاوہ اس کی بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ ان سب کی زندگی کو شدید ترین خطرہ لاحق ہوجاتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے بروقت میرے دماغ میں یہ بات ڈال دی اور میری انگلی ٹریگر پر جنبش کرتے کرتے رہ گئی۔ میں نے طائرانہ نظروں سے اس "بارود خانے" کا جائزہ لیا اور ایک دم ٹھٹک گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں چٹائی بچھی تھی۔ اس چٹائی پر کوئی موجود تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ سمن کا بھائی ریحان تھا۔ وہ اسی حالت میں تھا جس میں ہم نے اسے لوڈر میں دیکھا تھا۔ یعنی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پہلے ریحان اور سمن کو ایک ہی کمرے میں رکھا گیا تھا، لیکن جب کچھ دیر پہلے قیوم نو عمر سمن پر مجرمانہ حملے کے شرم ناک ارادے سے اس مکان میں پہنچا تو ریحان کو اٹھا کر اس "آتش بازی والے کمرے" میں ڈال دیا گیا۔

ریحان مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ میں نے رائفل ایک طرف رکھی۔ پہلے اس کے منہ سے کپڑا نکالا، پھر اس کی بندشیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ یہ بات تو دوران سفر میں ہی اس کی سمجھ میں آچکی تھی کہ میں اس کی سوتیلی ماں کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔

میں نے کہا "میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں۔ تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے آیا ہوں۔"

اس نے پوچھا "ہماری چھوٹی امی آپ کے ساتھ تھیں۔ وہ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "وہ بھی یہیں ہیں۔"

"کیا انہیں بھی ان لوگوں نے اغوا کیا ہے؟"

"نہیں یہ ایک اور معاملہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کمرے سے باہر لے آیا۔ جس کمرے میں قیوم کے کارندوں سے میری جھڑپ ہوئی تھی وہاں صورت حال جوں کی توں تھی۔ ریاض کمرے میں بند تھا۔ ایک شخص کچے فرش پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سر سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ صفیہ اور سمن ڈری سہمی ایک گوشے میں دبکی ہوئی تھیں۔ بس تھوڑا سا فرق یہ پڑا تھا کہ جسمانی مشقت کے بعد صفیہ بالکل نڈھال نظر آنے لگی تھی۔ اس کی سانس سینے میں الجھ رہی تھی۔ سمن نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا رکھا تھا اور اس کے گلے کو سہلا رہی تھی۔

اگلے دس منٹ کے اندر اندر ہم یہ مکان چھوڑنے کے لیے بالکل تیار ہوچکے تھے۔ ہم نے گھر میں موجود تمام افراد کو ایک ہی کمرے میں بند کردیا تھا۔ یہ مکان دیگر آبادی سے الگ تھلگ تھا۔

یہ خدشہ نہیں تھا کہ یہ لوگ چیخ پکار سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے۔ بلکہ میرے خیال میں کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ان دو "فائروں" کی آواز کسی کو ضرور متوجہ کرتی جو ابھی کچھ دیر پہلے ہوئے تھے۔ مکان کے بیرونی دروازے کے پاس وہ جیپ موجود تھی جس پر ملک قیوم اور اس کے ساتھی آئے تھے۔ ملک قیوم کے ایک ساتھی کے پاس سے جیپ کی چابی بھی برآمد ہو گئی تھی۔ میں نے اور ریحان نے پہلے صفیہ کو سہارا دے کر جیپ میں بٹھایا، پھر ثمن بیٹھی۔ آخر میں ریحان اور میں بھی سوار ہو گئے۔ اسٹیرنگ ریحان کے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے ساتھ والی نشست سنبھال رکھی تھی۔ قیوم کے ساتھی سے چھینی ہوئی خود کار رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ اس بات کا زبردست خدشہ موجود تھا کہ قیوم اپنے نامعلوم ساتھیوں کی کمک کے ساتھ یہاں پہنچ جائے اور ہمیں بزورِ بازو یہاں روک لیا جائے۔

ثمن ابھی تک خوف اور شرم سے کانپ رہی تھی۔ یقیناً وہ رونے لگتی لیکن وہ اپنی "چھوٹی امی" کی دگرگوں حالت دیکھ رہی تھی اور اس حالت کی وجہ سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ صفیہ کو ہم نے نشست پر لٹا دیا تھا۔ وہ بے چارگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ مندا ہوا سر، سیاہی مائل چہرہ اور زخمی جسم۔ میں جانتا تھا صفیہ کے حوالے سے ریحان اور ثمن کے ذہن میں سیکڑوں سوال کلبلا رہے ہیں لیکن فی الحال وہ خود پر ضبط کیے ہوئے تھے۔

تاریک کھیتوں میں بل کھاتے کیچڑ آلود راستوں پر ہم نے قریباً پون گھنٹہ سفر کیا۔ ریحان کا خیال تھا کہ ہم سیدھے لال کوٹھی کی طرف چلیں۔ اس کے نزدیک موجودہ صورتِ حال میں ہمارے لیے لال کوٹھی سے بہتر کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں ریحان کی بات سے کیسے اتفاق کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ لال کوٹھی میں پہنچ کر ریحان اور ثمن تو شاید محفوظ ہو جائیں لیکن صفیہ بدترین عذاب سے دوچار ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی آڑے ہاتھوں لیا جائے گا۔ میں نے ریحان کو بتایا کہ فی الحال ہم لال کوٹھی نہیں جا سکتے۔

"لیکن کیوں؟"

"اس "کیوں" کا جواب خاصا طویل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر تمہیں بتاؤں۔"

"پھر کہاں جائیں گے؟"

"فی الحال ہم گوجرانوالہ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر سوچیں گے کہ کہاں ٹھہرنا ہے۔"

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا "میں آپ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا ہوں لیکن پتا نہیں کیوں آپ پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"بہت شکریہ۔"

وہ بولا "ویسے آپ نے بہت بروقت فیصلہ کیا۔ میں آپ کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔"

"کون سا فیصلہ بھئی؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لال سوئٹر والے کا پیچھا کرتے آتش بازی والے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ آپ اس پر گولی چلا سکتے تھے لیکن آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ واقعی اگر آپ کی چلائی ہوئی گولی بھٹک کر آتش بازی میں لگ جاتی تو وہ کچھ ہو جاتا! جس کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے بڑی تیزی سے اور بہت درست فیصلہ کیا۔"

"تعریف کا شکریہ۔"

پچھلی نشست سے ثمن منمنائی "چھوٹی امی کی حالت دیکھ کر میرا تو کلیجا پھٹا جا رہا ہے۔ یہ سب کیسے ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

میں نے کہا "جس طرح تم سوال کر رہی ہو، اسی طرح مجھے تم سے کئی سوال کرنے ہیں۔ ہم یہ سارے سوال و جواب کہیں اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔"

اچانک ریحان کو بڑے زور سے بریک لگانے پڑے۔ سامنے ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ بریک لگے تو جیپ کیچڑ میں پھسلتی ہوئی ایک کنارے جا لگی۔ رائفل پر میری گرفت سخت ہو چکی تھی۔ سایے میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ ہیڈلائٹس کی روشنی میں آ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ سر کے بالوں اور داڑھی کو مہندی لگائی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبا سا سیاہ چوغہ پہن رکھا تھا۔ کھڑکی کے قریب آ کر بولا "میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ کو حضرت جی یاد کر رہے ہیں۔" بولنے والے کا لہجہ ٹھیٹ پنجابی تھا۔

"کون حضرت جی؟" میں نے پوچھا۔

"جاپان والے حضرت جی۔" اس نے روانی سے کہا "انہوں نے کہا ہے کہ جیسے ہی آپ کی گاڑی یہاں سے گزرے، میں آپ کو روک لوں اور ان کے پاس لے آؤں۔"

"لیکن اگر ہم نہ جانا چاہیں تو۔ میرا مطلب ہے کہ ہم کسی جاپان والے حضرت جی کو نہیں جانتے۔ بلکہ ہم تو کسی مقامی حضرت جی کو بھی نہیں جانتے۔"

"لیکن وہ تو آپ کو جانتے ہیں نا..... اور باقی رہی حضرت جی کے پاس جانے کی بات تو اس میں سراسر آپ ہی کا فائدہ ہے۔ حضرت جی کا کہنا ہے کہ آپ جس خطرے سے بھاگ رہے ہیں اس خطرے سے امان آپ کو یہیں پر ملے گی۔"

نو وارد حیران کن باتیں کر رہا تھا۔ ویسے بھی وہ بڑے یقین کے ساتھ جیپ کے سامنے کھڑا تھا۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ بالآخر ہمیں اس کی بات ماننا ہی پڑے گی۔

میں نے پوچھا "کہاں ہیں تمہارے حضرت جی؟"

اس شخص نے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں کسی چار دیواری میں مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے درختوں کی طرف

سے "حق ہو" کا نعرہ سنائی دیا۔ اس نعرے کو سن کر میرے رگ و پے میں برق سی دوڑ گئی۔ یہ آواز میری جانی پہچانی تھی۔ میں اس چاورنی لہجے کو قیامت کے شور میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ وہی آواز تھی جو میرے کانوں میں گونجتی تو کبھی اچانک کہیں گم ہو جاتی تھی۔ پھر کسی موڑ پر اچانک یہ دوبارہ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی اور میرے شب و روز میں تہلکہ مچا دیتی تھی۔ یہ سائیں حالی کی آواز تھی۔ میں جیپ سے اترا اور بے ساختہ اس آواز کی طرف بڑھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور سیاہ چوغے والا میرے ساتھ تھا۔ میں نے لکڑی کا ایک پھاٹک نما دروازہ دیکھا۔ دروازے پر بڑے بڑے حروف میں شفا خانہ لکھا تھا۔ ایک قریبی چھت پر زرد رنگ کا بہت بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس جھنڈے سے کچھ فاصلے پر ایک سبز رنگ کا جھنڈا تھا۔ میں پھاٹک میں داخل ہوا تو سامنے ہی ایک حجرہ نما کمرے میں سائیں حالی نظر آیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ گلے میں مالائیں اور بے شمار گھنیاں۔ وہ ہمیشہ کی طرح غلیظ اور خستہ حال نظر آتا تھا۔

مجھے دیکھ کر اسے قطعی حیرانی نہیں ہوئی۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ حجرے میں اگربتیوں کی خوشبو تھی اور لالٹین کی زرد روشنی میں ہر شے خواب ناک نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "سائیں حالی! تم یہاں؟"

وہ ذرا توقف بولا "ہاں۔ چار پانچ روز پہلے ہی میں یہاں آیا ہوں۔ دراصل میں دو تین ماہ کے لیے جاپان چلا گیا تھا۔ شاہ جنات بڑی ضد کر رہا تھا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ جاپان کے لوگ جنوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ جاپان کے جن کیسے ہوتے ہیں۔ وہ ایک پاکستانی کے روپ میں میرے ساتھ جاپان چلا گیا۔ جاپانیوں کی محنت اور کاریگری دیکھ کر وہ واقعی بہت حیران ہوا۔ مگر اپنا روپ اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ ہر کوئی اسے شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر وہ خانہ خراب کیا کہتے ہیں انہیں..... امیگریشن والے، وہ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کسی پاکستانی ٹیم کا کھلاڑی ہے جو یہاں آ کر غائب ہو گئی تھی۔ مجبوراً اسے فرانسیسی کا روپ دھارنا پڑا لیکن اس روپ میں مصیبت یہ ہوئی کہ ایک جاپانی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی......" سائیں حالی خود ہی قہقہہ لگا کر ہنسا اور تالی بجا کر دائیں بائیں سر ہلانے لگا۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "یہ جاپانی چھوکری کمپیوٹر پروگرامر تھی۔ وہ شاہ جنات کو بھی BASIC سکھانے میں لگ گئی۔ تمہیں پتا ہے جن تو پھر جن ہوتا ہے۔ جس طرف بھی اس کا رجحان چل نکلے۔ شاہ صاحب کو بھی کمپیوٹر میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ سارا سارا دن وڈیو گیم کھیلتے تھے۔ میں مجبور تھا کیونکہ شاہ جنات کو چھوڑ کر واپس بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تو بھلا ہو کوہ قاف اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر کا۔ اس نے شاہ جنات کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ترتھلی مچا دی..... ترتھلی سمجھتے ہو نا تم؟" میں خاموشی سے سائیں حالی کی طرف دیکھتا رہا "بھئی وہی جسے تم لوگ سیاسی عدم استحکام کہتے ہو۔ کوہ قاف میں بھی لوٹا کریسی زوروں کا چکر موجود ہے۔ وہاں وزیراعظم تو بس نام کا ہے، اصل سکہ تو شاہِ جنات کا چلتا ہے۔ دراصل شاہ جنات نے امریکا کو مطمئن کرنے کے لیے برائے نام جمہوریت قائم کر رکھی ہے..... ارے کھامڑا! امریکا کے نام پر تم چونک کیوں گئے ہو۔ شاید تم سمجھتے ہو کہ امریکی کوہ قاف میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ نہیں بھئی نہیں۔ یہ بڑی پہنچی ہوئی چیز ہیں..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ شاہِ جنات تو کوہ قاف میں تھا نہیں۔ اپوزیشن لیڈر راتوں رات "توڑ" کر دارالخلافہ پہنچا اور تمام اہم لیڈروں کو دانہ ڈال دیا۔ کسی طرح شاہِ جنات کو بھی اس جوڑ توڑ کی خبر ہو گئی اور وہ کمپیوٹر دوشیزہ پر لعنت بھیج کر واپس کوہِ قاف پہنچ گیا۔ میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور یہاں آ گیا....."

سائیں حالی کی بے سروپا باتیں نجانے طول پکڑتیں لیکن گہرے سیاہ چوغے والا اندر آ گیا اور سائیں حالی کو چپ ہونا پڑا۔ سیاہ چوغے والے نے سر جھکا کر پوچھا "حضرت سائیں! گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟"

سائیں حالی بولا "انہیں بھی یہاں لے آؤ۔ ان کے کھانے پینے اور آرام کا انتظام کرو۔"

میں سائیں حالی کی بات اکثر رد کر دیا کرتا تھا۔ لیکن چند ایک تجربات کے بعد میرا رویہ کچھ بدل گیا تھا۔ خاص طور سے شاہین کے قتل والا واقعہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ جب میں غم و غصے میں نیم دیوانہ ہو کر قاتل عیسیٰ جان کی تلاش میں نکلا تھا تو سائیں حالی نے ایک نیم پلیٹ مجھے دی تھی۔ یہ نیم پلیٹ حیرت انگیز طور پر اس گھر سے اکھاڑی گئی تھی جہاں نواب ہلری شاہین کا قاتل موجود تھا۔ نجانے اب کیوں کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ سائیں حالی عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اپنی تمام تر حقیقت پسندی کے باوجود مجھے سائیں حالی میں ماورائی صلاحیتیں نظر آنے لگی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب سائیں نے ریحان، ثمن اور صفیہ کو اندر لانے کی ہدایت کی تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد ریحان اور ثمن ڈرے ڈرے اندر داخل ہوئے۔ ان کے عقب میں ایک چارپائی پر صفیہ تھی۔ سائیں حالی بڑے دھیان سے صفیہ کی طرف دیکھنے لگا..... ہمیں ایک کشادہ کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ فرش اور دیواریں کچی تھیں لیکن ان پر بڑی نفاست سے گارے اور بھوسے کا لیپ کیا گیا تھا۔ یہ کمرا اور ارد گرد کے کمرے بہت صاف ستھرے نظر آ رہے تھے۔

ہمارے کمرے میں مٹی کی ایک بڑی انگیٹھی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کوئلوں کی وجہ سے بڑی خوشگوار حدت محسوس ہو رہی تھی۔ اب تک رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ہم سب تھکن سے نڈھال تھے لیکن جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے تھے، آرام کرنا بھی محال تھا۔ وہ ساری رات جاگتے

اور صفیہ کی تیمارداری کرتے ہوئے گزر گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ریحان اور سمن کو اپنی چھوٹی امی یعنی صفیہ سے بے حد انس ہے۔ صفیہ کی حالت انہیں غم زدہ کر رہی تھی۔ ریحان جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ صفیہ اس حالت کو کیونکر پہنچی ہے اور اس کا ذمے دار کون ہے۔

صفیہ کی دوائیں میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔ انجکشن لگانے کے بعد میں نے اسے خواب آور گولی کھلا دی اور کچھ دیر "ہائے ہائے" کرنے کے بعد وہ سو گئی۔ ریحان اور سمن میرے قریب بیٹھ گئے۔ ان کی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا "تم دونوں کا کیا خیال ہے۔ صفیہ کو اس حال تک پہنچانے والا کون ہے؟"

ریحان بولا "یوں تو علاقے میں ڈیڈی کے بہت سے بدخواہ ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ ڈیڈی کی تازہ ترین دشمنی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہی لوگ جنہوں نے انکل ذیشان کو اور ہمیں اغوا کیا ہے انہوں نے ہی چھوٹی امی کو اس حال تک پہنچایا ہے۔"

ریحان کی آنکھوں میں نوجوان خون کی سرخی تھی۔ سمن کا ملیح چہرہ بھی تمتمایا ہوا تھا۔ میں نے ریحان سے کہا "یقیناً تمہارا اشارہ خدا بخش وڈیرا کی طرف ہے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا اندازہ غلط ہے۔ تمہاری چھوٹی امی کو اس حالت تک پہنچانے والے خود تمہارے ڈیڈی ہیں۔"

ریحان اور سمن کے سر پر جیسے ہزار پاؤنڈ کا بم پھٹ گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر پھٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر ریحان بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈیڈی تو..... ڈیڈی تو بہت پیار کرتے ہیں چھوٹی امی سے..... یقیناً آپ کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جائے اسے غلط فہمی کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارے ڈیڈی اور تمہارے چچا ہی اس بربادی کے ذمے دار ہیں۔"

"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

میں نے کہا "میرے خیال میں تمہیں ثبوت کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ میں ایک غیر متعلق شخص ہوں۔ میری تمہارے ڈیڈی سے کوئی دشمنی ہے اور نہ خدا بخش وڈیرا سے میرا کوئی تعلق ہے۔ بہرحال تم جتنے ثبوت چاہو گے وہ بھی مل جائیں گے۔"

اس کے بعد میں نے وہ سب کچھ ریحان اور سمن کے گوش گزار کر دیا جو لال کوٹھی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ بھی بتایا کہ ان کے چچا ذیشان نے ان کی چھوٹی امی سے ڈرا دھمکا کر ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ ریحان کی آنکھوں میں بے یقینی تھی لیکن اس بے یقینی کے باوجود اس کی آنکھوں میں خون بھی اتر رہا تھا۔ ریحان کا ردعمل بتا رہا تھا کہ اپنے چچا ذیشان کے متعلق اس کے خیالات پہلے بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ سمن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر صفیہ کے پاس چلی گئی تھی۔

ریحان مجھ سے ان واقعات کی مزید تفصیل پوچھنے لگا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈول رہا تھا۔ وہ نئی نسل کا نمائندہ تھا۔ اپنے باپ اور چچا سے زیادہ روشن خیال اور حقیقت پسند تھا' لیکن وہ یہ بات ہضم نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کا باپ اور چچا اس حد تک جا سکتے ہیں۔ چچا اس عورت کو بے آبرو کر سکتا ہے جسے وہ چھوٹی امی کہتے ہیں اور باپ بے انصافی کی لاٹھی تھما کر ظالم کے بجائے مظلوم کو عبرت بنا سکتا ہے۔ اس کے سر اور چہرے کے بال مونڈ سکتا ہے۔ چہرے پر کالک تھوپ سکتا ہے اور اسے الٹا لٹکا کر جانوروں کی طرح مار سکتا ہے۔ یہ سارے مناظر ریحان کے تصور میں سما نہیں پا رہے تھے۔ بہرحال حقائق کی فطری قوت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی اور وہ میری باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک انجانا سا رشتہ قائم ہو رہا تھا۔ اس گفتگو کے دوران میں' میں نے ریحان کو اس پُراسرار کھیل کے بارے میں بتایا جو لال کوٹھی میں کھیلا جا رہا تھا اور جس کا تعلق جعلی انجکشنوں اور دیگر ادویات سے تھا۔

میری بات سن کر ریحان کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ مجھے لگا کہ اس حوالے سے ریحان کے ذہن میں پہلے بھی کسی طرح کا شک موجود ہے۔ میں نے ریحان کا مثبت رویہ محسوس کیا تو مزید کھل کر بات کی۔ میں نے ریحان کو ان انجکشنوں میں سے ایک انجکشن بھی دکھایا جو شدید بارش کے بعد لال کوٹھی کے عقبی باغ میں زریں گل نے دیکھے تھے۔ ریحان کے چہرے پر الجھن ہی الجھن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بولا "آپ نے تمام الزامات کا رخ ڈیڈی اور چھوٹے انکل کی طرف موڑ دیا ہے۔ کیا آپ ہمارے اغوا کے سلسلے میں بھی انہیں ہی ذمے دار ٹھہرائیں گے؟"

میں نے کہا "یہ ایک مختلف معاملہ ہے لیکن بالواسطہ طور پر اس کی ذمے داری بھی تمہارے انکل ذیشان پر آتی ہے۔ نہ وہ ملک خدا بخش وڈیرا کے بیٹے ملک ناظم کو جان سے مارتا اور نہ خدا بخش وڈیرا بدلے میں تم دونوں کو اغوا کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں بہت خوش قسمت ہو جو اس مصیبت سے بچ نکلے ہو۔ دشمنی کی آگ سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آتش باز ریاض کے مکان میں تم دونوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔"

ریحان کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ ریحان کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زائد نہیں تھی مگر وہ ذہین تھا اور اس نے یورپ میں کافی وقت بھی گزارا تھا۔ میں اس کے چہرے پر اس کی عمر

سے زیادہ دانائی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "میں اسی وقت ڈیڈی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ میں ڈیڈی سے چھوٹی امی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر انہوں نے چھوٹی امی کے ساتھ ایسا کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟ دوسرے میں ڈیڈی کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ میں اور سمن خدا بخش کے چنگل سے بچ نکلے ہیں۔ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ ڈیڈی کو اب تک میرے اور سمن کے اغوا کی اطلاع ہو چکی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو آئندہ تین چار گھنٹوں میں کسی بھی وقت دونوں پارٹیوں میں زبردست تصادم ہو سکتا ہے۔"

ریحان جو بات کہہ رہا تھا وہ بالکل درست تھی' لیکن اس کا یہ مطالبہ درست نہیں تھا کہ وہ چوہدری بخت سے ملنا چاہتا ہے۔ میں جانتا تھا اس ملاقات میں کتنے خطرات پوشیدہ ہیں۔ ریحان کتنا بھی ہوشمند سہی لیکن چوہدری بخت کے لیے دودھ پیتا بچہ تھا۔ چوہدری اسے چٹکیوں میں اڑا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ریحان کو کسی چکر میں لا کر اس سے ہمارا پتا پوچھ لیتا۔ ایسے میں میرے اور صفیہ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے ریحان کو سمجھایا کہ فی الوقت اس کا ڈیڈی کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔ اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ ریحان کے نزدیک زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ باپ کو اپنے بچ نکلنے کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنے والد کے نام ایک خط لکھ دے۔ میں یہ خط کسی طرح "رنگ والی" پہنچا دیتا ہوں۔

تھوڑی سی بحث کے بعد ریحان اس بات پر تیار ہو گیا۔ اس نے باپ کے نام اپنی خیر خیریت لکھ دی لیکن اپنے موجودہ پتے سے آگاہ نہیں کیا۔ میں نے یہ رقعہ سائیں عالی کو دکھایا اور کہا کہ کسی طرح یہ تحریر رنگ والی کے چوہدری بخت کو پہنچا دی جائے۔ سائیں عالی میری توقع سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ میری بات سمجھ گیا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ رقعہ جلد از جلد اور محفوظ ترین طریقے سے مطلوبہ شخص تک پہنچ جائے گا۔

سائیں عالی بڑی ترنگ میں تھا۔ وہ رہ رہ کر نعرۂ مستانہ بلند کرتا تھا اور آگے پیچھے جھومنے لگتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ جاپان واپان کہیں نہیں گیا۔ بس بے پر کی اڑا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اب تک عیسیٰ جان کے چکر میں رہا ہو۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ نواب زادی شاہین کے دردناک قتل کا سائیں عالی کو بھی بہت دکھ ہوا ہے۔ میں سائیں عالی سے عیسیٰ جان کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ حجرے میں' میں نے ایک دو بار بات شروع بھی کی لیکن وہ ادھر ادھر کی مارنے لگا۔ اس کی چیلی سروج عرف الو کی پٹھی بھی اس کے ساتھ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے سروج کے بارے میں پوچھا تو سائیں وجدانی انداز میں بولا "وہ ایک بے سکون آتما ہے۔ میں نے اسے انڈیا بھیج دیا ہے۔"

پتا نہیں سائیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ بہرحال اگر وہ انڈیا میں تھی تو یہ اچھی بات ہی تھی۔ سائیں نے اچانک حق ہُو کا نعرہ بلند کیا اور ادھ جلی انگیٹھی کی طرف جھکا۔ اس کے ہاتھ میں گرم گرم دودھ کا گلاس تھا۔ گلاس میں اس نے بہت سی راکھ ملائی اور غٹاغٹ پی گیا۔ سائیں کا نظریہ تھا کہ لذت انسان کو تباہ کرتی ہے' لذیذ اور لذیذ چیز بھی بدمزہ کر کے کھاتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار ایسی حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ کبھی سالن میں چینی ڈال لیتا تھا۔ کبھی چاولوں میں ریت ملا لیتا تھا' کبھی سویوں پر مٹی ڈال کر کھا جاتا تھا۔ سردی گرمی میں اس کے جسم پر ایک ہی لباس نظر آتا تھا۔ سخت کھردرے فرش پر سونا سائیں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنی ذات میں ایک عجوبہ تھا یہ شخص..... اب تک مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے پتا چلا تھا کہ یہ ڈیرا جسے شفا خانہ بھی کہا جاتا ہے ایک مقامی پیر قلندر سیاہ پوش کا ہے۔ یہ پیر تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتا ہے۔ اس شخص نے ڈیرے کے احاطے میں ایک بڑا سا بورڈ بھی لگا رکھا تھا۔ اس بورڈ کے مطابق سیاہ پوش کے پاس نزلہ زکام سے لے کر کینسر اور پاگل پن تک ہر مرض کا علاج موجود تھا۔ مرض کے سامنے ایک خانے میں علاج کی مدت اور دوسرے خانے میں "نذرانے" کی نوعیت بھی لکھی گئی تھی۔ کہیں نقد رقم کا تقاضا تھا اور کہیں یہ نذرانہ اجناس یا اشیا کی شکل میں تھا۔ اس ڈیرے پر سائیں عالی کی حیثیت ایک معزز مہمان کی تھی۔ یہ "چوہوں کو پڑ گئے مور" والا معاملہ تھا۔ قلندر سیاہ پوش خود ایک بڑا پیر تھا لیکن سائیں عالی کے سامنے وہ "کل کا لونڈا" ثابت ہوا تھا۔ وہ اسے حضرت جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور بڑے ادب سے پیش آتا تھا۔ معلوم نہیں سائیں عالی نے اس جادوگر پر اپنا کون سا جادو آزمایا تھا۔

یہ دوسری رات کا واقعہ ہے۔ میں ڈیرے کے ایک زمین دوز کمرے میں محو خواب تھا۔ اس کمرے کا فرش اور دیواریں کچی ہونے کے باوجود بھی بہت صاف ستھری تھیں۔ اگربتیوں لوبان اور عطر وغیرہ کی خوشبو ان دیواروں میں رچ بس چکی تھی۔ میری آنکھ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ کھلی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ خوشبو کی لپٹیں سی میرے اردگرد پھیل رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو اونچی کی..... میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ میرے بستر پر میرے بالکل قریب سروج موجود تھی۔ وہ میرے ساتھ قریباً لیٹی ہوئی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جسم پر جو لباس تھا وہ دیوداسیوں کے لباس سے ملتا جلتا تھا۔ کمر عریاں تھی اور بازو بھی کہنیوں سے اوپر تک ننگے نظر آ رہے تھے۔ اس کے بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے اور جوڑے میں موتیے کے پھول مہک رہے تھے۔ زرق برق لباس اور گہنوں کے ساتھ وہ کسی ہوشربا طلسم کی چمکتی دمکتی ہیروئن نظر آئی تھی۔

"تم یہاں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی "یقین نہیں آرہا تو چھو کر دیکھ لو۔"

میں نے غیر ارادی طور پر اسے تھوڑا سا پیچھے ہٹایا' وہ میرے اوپر گری پڑ رہی تھی۔ میں نے کہا "لیکن سائیں عالی تو کہہ رہا تھا کہ تم انڈیا میں ہو۔"

"انڈیا میں۔" سوروج نے زیرِ لب دُہرایا۔ پھر چونک کر بولی "ہاں۔۔۔ وہ آتما کی بات کر رہے ہوں گے۔"

"یہ آتما کون ہے؟"

وہ کھکھلا کر ہنسی تو خواب ناک ماحول میں جلترنگ سے بج اٹھے "تم تنے بھولے تو نہیں ہو تم سب کچھ جانتے بوجھتے ہو۔ آتما کا مطلب ہے روح۔۔۔ ہر شریر میں یہ روح ہوتی ہے۔ سائیں جی نے میری روح کو کچھ دنوں کے لیے بمبئی بھیج دیا تھا۔ یہاں بس میرا شریر تھا جو سائیں عالی کی سیوا کر رہا تھا۔ اب تم پوچھو گے کہ سائیں جی نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ پوچھو گے نا؟"

"اچھا چلو پوچھ لیا۔ اب کرو بکواس۔"

وہ نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ایک حسین و جمیل لڑکی تھی۔ وہ انڈیا کی کئی سیکنڈ کلاس ہیروئنوں سے زیادہ پُرکشش تھی۔ معلوم نہیں قسمت نے اس کی یاوری کیوں نہ کی۔ یا پھر وہ خود ہی شارٹ کٹ کے چکر میں پڑ گئی اور بالی ووڈ میں قسمت آزمائی چھوڑ کر دفینے کی تلاش میں نکل پڑی۔ اس کی خوب صورتی اور جسمانی موزونیت دیکھ بھال اور توجہ کی محتاج نہیں تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ عام حالات اور غیر موزوں لباس میں بھی خوب صورت نظر آتی تھی۔۔۔ اور آج تو بات ہی مختلف تھی۔ اس نے خوب صورت نظر آنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ وہ میرے قریب سرک آئی اور بولی "میں بہت نراش رہتی تھی لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ کیوں نراش رہتی ہوں۔ پھر ایک دن مجھے جان کاری ہوئی کہ میری پریشانیوں کی وجہ تم ہو۔ میں لاعلمی میں تمہاری دوری کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے سائیں جی کو اپنی اس کیفیت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ساری رات مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھا اور پڑھ پڑھ کر کچھ پھونکتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ انہوں نے میری آتما کو میرے شریر سے نکال کر بہت دور بھیج دیا ہے۔ شریر اور آتما علیحدہ ہو گئے ہیں اس لیے شریر بے قراری محسوس نہیں کرے گا۔ انہوں نے اور بھی بہت کچھ بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ بہرحال اس دن کے بعد سے میں کافی پُرسکون ہو گئی۔ کل صبح سویرے سائیں جی نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے میری آتما میرے شریر کو واپس لوٹا دی ہے۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ تمہاری آمد کا سن کر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میرا دل چاہا' اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں لیکن سائیں جی نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے رات تک انتظار کرنا ہو گا۔ آتما اور شریر کے اس کھیل میں۔۔۔"

"بھاڑ میں جائے تمہاری آتما اور تمہارا شریر۔" میں نے سوروج کی بات کاٹی اور اسے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا۔

یقیناً تھوڑی بہت چوٹ بھی لگی ہو گی لیکن وہ والہانہ انداز میں مسکراتی رہی۔ ایک انگڑائی سی لے کر وہ وہیں فرش پر لیٹ گئی اور ایک تکیہ اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں۔ بے باکی سے بولی "تم مجھ سے دور کیوں بھاگتے ہو؟"

"تم بار بار میرے قریب کیوں آتی ہو؟"

"یہ سائیں جی کا حکم ہے۔ سائیں جی کا فرمان ہے کہ جب تک ہم دونوں ایک نہیں ہوں گے' کامیابی ہمارا مقدر نہیں بنے گی۔ ہم ہزار سال بھی دفینے کی تلاش جاری رکھیں تو صرف جھک ماریں گے لیکن اگر تم میرے ہو جاؤ تو وہ دفینہ خود چل کر ہمارے قدموں میں پہنچ جائے گا۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ میرے اور تمہارے ملاپ سے دفینے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ صرف سائیں عالی کا دیوانہ پن ہے۔"

"یہ دیوانہ پن نہیں شاہ جہاں۔۔۔ یہ بہت گہرائی کی باتیں ہیں۔ میں اور تم اور ہم جیسے عام لوگ ایسی باتوں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے اور ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ یہ دیوانہ پن ہی ہے۔۔۔ تو اس میں تمہارا کیا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم کوئی بہت بڑے پارسا نہیں ہو اور نہ ہی عورت تمہارے لیے کوئی انوکھی چیز ہے۔ تمہاری زندگی میں ایسے کئی مرحلے آ چکے ہیں۔ بمبئی کے نائٹ کلبوں میں تمہاری رنگین مزاجی کے چند قصے اب بھی وہاں کے لوگوں کو یاد ہیں۔"

"وہ سب ماضی کی باتیں ہیں' میں انہیں بھول چکا ہوں۔"

"نہیں یہ سب ماضی کی باتیں نہیں۔۔۔ کیا تم نواب زادی شاہین کو ماضی کہہ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ نواب زادی شاہین حال ہے۔ اگر حیدر آباد کی اس ریشمی رات کو نواب زادی شاہین تمہارے قریب آ سکتی ہے تو آج میں کیوں نہیں آ سکتی؟"

"تم اپنا موازنہ شاہین سے مت کرو۔ تم کیچڑ ہو۔ وہ شبنم کی طرح صاف شفاف تھی۔ میں اسے بیوی بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ میری شریکِ حیات بننے والی تھی۔"

"لیکن ابھی بنی تو نہیں تھی اور جب بیوی بننے سے پہلے وہ تمہاری تنہائی کی ساتھی بن گئی تو پھر وہ شبنم رہی اور نہ گنگا جل۔"

"تم مجھ سے بحث کر کے کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا پیار۔" وہ ڈھٹائی سے بولی اور میرے ہاتھ تھام لیے۔

"میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

اس کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی' پھر پھنکار کر بولی "تم انتہا درجے کے بددماغ اور گھمنڈی شخص ہو؟"

"تمہارے دلی جذبات جان کر خوشی ہوئی۔"

"تم۔۔۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں تمہیں۔ کیا ہے تمہارے پاس جس کے لیے اتنا غرور کرتے ہو تم؟ اگر اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے تو دور کر لو۔ بمبئی میں آ کر دیکھو۔ تمہارے جیسے میری جوتیاں سیدھی کرتے نظر آئیں گے۔"

میں نے کہا "تو جا کر ان سے جوتیاں سیدھی کرواؤ۔ یہاں بار بار کیوں مجھ سے "عزت افزائی" کرواتی ہو۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ بلی کی طرح پنجے نکال کر مجھ پر جھپٹ پڑے گی لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا اور اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ تین ٹانگوں والی گول میز پر شیشے کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔ اس کے تمتماتے ہوئے رخسار قدرے ماند پڑ گئے۔ چند لمحے بعد وہ بولی تو اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ کہنے لگی "میں تو اس لیے یہاں آئی تھی کہ تم سے نواب زادی شاہین کے قتل کے بارے میں بات کروں گی اور اس شخص کے بارے میں جس نے نواب زادی کو قتل کیا۔۔۔ بہرحال تمہیں تو میری صورت دیکھ کر ہول آنے لگتا ہے۔ میری بات کہاں سنو گے تم۔۔۔ ویری ساری ٹو ڈسٹرب یو۔"

وہ جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑی۔ اس کی کمر لالٹین کی روشنی میں ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔ کم بخت نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ نواب زادی کے قتل کو اب چھ مہینے ہونے کو آئے تھے لیکن میں ایک لمحے کے لیے بھی نواب زادی کو اور اس کے قاتل کو بھولا نہیں تھا۔ قراقرم رینج کے برف پوش پہاڑوں میں گھر کر بھی ہر لحظہ یہی سوچتا رہا تھا کہ کب مجھے یہاں سے رہائی نصیب ہو اور کب میں شاہین کے لہو لہو جسم کا قرض اتار سکوں۔ میں نے ایک دم اٹھ کر سوروج کا بازو تھام لیا۔ اس نے بازو چھڑانے کے لیے بالکل ہلکی سی مزاحمت کی۔ جیسے بازو چھڑانا چاہ رہی ہو اور اس بات سے بھی ڈر رہی ہو کہ کہیں میں چھوڑ ہی نہ دوں۔ میں اسے دوبارہ کمرے کے وسط میں لے آیا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔

"کیا جانتی ہو تم شاہین کے قاتل کے بارے میں؟"

"بہت کچھ۔۔۔ لیکن بتاؤں گی نہیں۔"

"کیوں؟"

"تم مجھے اتنا ستاتے ہو' کیا میں تھوڑا سا بھی نہیں ستا سکتی۔"

"سوروج میں تم سے ہمدردی رکھتا ہوں' تمہاری بہتری چاہتا ہوں لیکن تمہارا رویہ۔۔۔؟"

"کیا ہوا ہے میرے رویے کو۔۔۔ کون سی انوکھی بات کہہ دی ہے میں نے۔۔۔ یہ جیون بہت مختصر ہے شاہ جہاں اور تیزی سے گزر رہا ہے۔ رو کر گزاریں گے تو بھی گزر جائے گا ہنس کر گزاریں گے تو بھی۔۔۔ اور کون ہے جو ہنسنا نہیں چاہتا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں مختلف طرح کے خوف بٹھا رکھے ہیں۔ اگلے جنم کا خوف' نرگ کا خوف' بھگوان کی پکڑ کا خوف' اور ان خداؤں کا خوف جن کے منہ سے ہر وقت شعلے نکلتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں شاہ جہاں۔۔۔ ان دور دراز کی مصیبتوں سے خوف کھا کر جیون کے حسن سے منہ موڑ لینا بزدلی ہے۔۔۔۔"

میں نے کہا "اگر تمہاری بات مان لی جائے تو۔۔۔ پھر تو گناہ اور ثواب کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

"میں کوئی فلسفی نہیں ہوں شاہ جہاں۔۔۔ اور نہ ہی اس معاملے میں تم سے بحث کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے وہ میرے کچھ اور قریب سرک آئی۔ اس کی جلتی نگاہیں میری نگاہوں سے پیوست تھیں۔ سینے کا زیر و بم اس تلاطم کی چغلی کھا رہا تھا جو اس کے حسین پیکر میں بپا تھا۔ وہ خواب ناک لہجے میں بولی "شاہ جہاں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ شروع میں' میں صرف اس لیے تمہارے قریب آئی تھی کہ یہ سائیں جی کا حکم تھا۔۔۔ لیکن اب یہ صرف سائیں جی کا حکم نہیں' میرے اندر کی چاہت بھی ہے۔ تمہارے مسلسل گریز نے میرے اندر تمہاری خواہش بیدار کر دی ہے۔ ایک بے نام پیاس ہے شاہ جہاں جو مجھے تمہارے لیے ہر آن بے چین رکھتی ہے۔ تمہاری خواہش مجھے ایک مرض کی طرح لاحق ہو گئی ہے شاہ جہاں۔۔۔ اور اس مرض کی دوا تمہارے پاس ہے۔"

وہ مجھ سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہلکی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے کہا "ابھی تو تم مجھ میں سرخاب کا پر ڈھونڈ رہی تھیں اور میری خوش فہمی دور کر رہی تھیں؟"

"ابھی تم بھی تو بہت کچھ کہہ رہے تھے۔" اس نے نرکی بہ نرکی جواب دیا۔ اس کی سرمریں بانہیں میرا گھیراؤ کر رہی تھیں۔ ایک ایسی خود سپردگی طاری تھی اس پر جو مجھے اپنے ساتھ بہا لے جانے کے لیے بے تاب تھی۔ ان لمحات میں وہ سراپا ایک جسم تھی۔ ریشمی رات میں لپٹا ہوا ایک چمچاتا رعنا' نوبہ شکن جسم۔ شاید اس جسم کے لیے میں ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ جسم اس قلعے پر متعدد ناکام حملے کر چکا تھا۔ اب ایک بار پھر کیل کانٹے سے لیس ہو کر حملہ آور ہوا تھا۔

میں نے کہا "سوروج! تم کیا جانتی ہو صبئی جان کے بارے میں۔۔۔؟"

"وہ سب کچھ جو تم جاننا چاہتے ہو۔" وہ سرگوشی میں بولی۔

"تو بتاؤ نا۔"

"ابھی نہیں۔ پلیز ابھی نہیں۔"

وہ مجھ میں مدغم ہوتی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ سائیں عالی مجھے کچھ بتا کر نہیں دے گا۔ میں نے دو تین مرتبہ اس سے بات کی

تھی لیکن وہ بے پر کی اُڑانے لگا تھا' جاپان اور کوہ قاف کی خبریں سنانے لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے سروج سے ہی کچھ پوچھنا ہوگا۔ شاید یہ بھی سائیں کی کوئی حکمتِ عملی تھی۔ وہ جان بوجھ کر آئیں بائیں شائیں کر رہا تھا تاکہ میں سروج کے سامنے "دستِ سوال" پھیلاؤں اور وہ ان معلومات کے عوض مجھ سے کوئی "شرط" منوا سکے۔

مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ جی چاہا اسے اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دوں یا پھر...... توڑ پھوڑ کر رکھ دوں لیکن یہ دونوں کام انتہا پسندی کے زمرے میں آتے تھے اور انتہا پسندی میرے نزدیک بجائے خود ناقابلِ معافی حماقت رہی ہے۔ میں اس طوفان سے الجھ رہا تھا جو مجھے غرقاب کرنے کے لیے ہر آن اپنی شدت بڑھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ فرار کی کوئی راہ سوچ رہا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے اپنے رویے پر غور کیا اور سوچا کہ میں کیوں مسلسل کئی ماہ سے سروج سے گریز کر رہا ہوں۔ جو ہو رہا ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تو پھر جو ہو رہا ہے وہ ہو جائے لیکن اگلے ہی لمحے مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ میں سروج کی پیش قدمیوں کی مزاحمت اس لیے کرتا تھا کہ لاشعوری طور پر میں اسے غزالہ کی دشمن سمجھتا تھا۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے جب فرید کوٹ کے نواح میں ایک ویران "کھنڈر" کے اندر سائیں عالی نے غزالہ کو صرف اس لیے بے عزت کیا تھا کہ وہ غزالہ کو مجھ سے دور کر کے سروج کو مجھ پر مسلط کرنا چاہتا تھا اور وہ بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ سائیں عالی کی تیز ترش' توہین آمیز باتیں ہی تھیں جنہوں نے غزالہ کو تیزی کے ساتھ مجھ سے دور کیا تھا اور پاکستان واپس آکر اس نے فوری طور پر شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ غزالہ مجھ سے دور ہوگئی تھی اور سائیں عالی اپنے منصوبے کے دوسرے حصے کو عملی جامہ پہنانے میں لگا ہوا تھا۔ وہ بار بار مجھے اور سروج کو رنگین تنہائیاں فراہم کر رہا تھا۔ بے شک سائیں عالی میں حیران کن صلاحیتوں کا سراغ ملتا تھا اور میں میرے میرے ان صلاحیتوں کا معترف بھی ہو رہا تھا لیکن سروج کے حوالے سے سائیں کا رویہ مجھے دل سے پسند نہیں تھا۔

مجھے لگا کہ میرے سینے میں غم کا گاڑھا دھواں پھیل رہا ہے۔ یہ ہوشربا لڑکی جو میرے بہت قریب' میری بانہوں میں تھی میری محبت کی دشمن تھی۔ مجھے میری غزالہ سے دور کرنے میں اس کا بھی اہم کردار تھا...... کیا میں احساسِ زیاں سے اتنا ہی عاری ہو چکا ہوں کہ آج سب کچھ بھول کر اس کی مرمریں بانہوں میں گم ہو جاؤں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میں ایسے سیکڑوں حسین جسم غزالہ کی محبت کے احترام میں ٹھوکر سے اڑا سکتا ہوں...... جونہی یہ سوچ میرے ذہن میں ابھری' سروج کا بے پایاں ہیجان مجھ پر بے اثر ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو تیز کردی۔ یہی وقت تھا جب بند دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ سروج ٹھٹک کر رہ گئی۔ کوئی گھبراتا ہوا سندر اس کے اندر یک لخت منجمد ہو گیا تھا۔ اس نے لالٹین بجھائی اور اپنے اوپر چادر کھینچ لی۔ میں دروازے پر پہنچا۔ باہر ریحان کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے ریحان؟" میں نے پوچھا۔

"آپ سو رہے تھے؟"

"نہیں کوشش کر رہا تھا۔"

"افسوس کہ میں نے آپ کو بے وقت ڈسٹرب کیا۔ دراصل...... مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ یہ رات ایک پہاڑ بن جائے گی اور میں عمر بھر اسے کاٹ نہیں سکوں گا۔" وہ بہت جذباتی بلکہ آبدیدہ نظر آرہا تھا۔

میں نے اسے ساتھ لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر بالائی کمرے میں آبیٹھا۔ گھڑی کی سوئیاں رات گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ڈیرے کے اندر اور باہر مکمل خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھی رکھوالی کا کتا بھونکتا تھا یا پھاٹک کے قریب لگے ہوئے زرد اور سبز جھنڈے سرد ہوا کے زور سے پھڑپھڑاتے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں صحن کے قریب صفیہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر تھی پھر بھی کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔

ریحان نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں اسی وقت ونگ والی جاؤں گا۔ میں وہ فیکٹری دیکھنا چاہتا ہوں جہاں ڈیڈی اور انکل ذیشان فٹ بال بنواتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر آپ کی اطلاع درست ہے اور ڈیڈی واقعی جعلی دوائیں بنانے میں ملوث ہیں تو پھر یہ کام ضرور فیکٹری میں ہوتا ہوگا۔"

"تمہارے اس شک کی کوئی وجہ ہے؟"

"جی ہاں۔ وجہ بھی ہے اور اگر نہ بھی ہوتی تو میں اپنا شک رفع کرنے کے لیے فیکٹری ضرور دیکھتا۔"

"لیکن اتنی رات گئے فیکٹری کیسے پہنچو گے تم اور وہاں کون گھسنے دے گا تمہیں؟"

"آپ بھول رہے ہیں کہ میں چوہدری جنت کا بیٹا ہوں۔ مجھے فیکٹری میں جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی میرے پاس فیکٹری کے ایک عقبی دروازے کی چابی موجود ہے۔ سیلاب آنے سے ایک دن پہلے میں اپنے چند لاہوری دوستوں کو فیکٹری دکھانے گیا تھا۔ بارشوں کی وجہ سے فیکٹری کا مین گیٹ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم عقبی دروازے سے گئے تھے۔"

ریحان نے مجھے جیب سے چابی نکال کر دکھائی "یہ دیکھیں۔ یہ ہے وہ چابی اور یہ دوسری چابی اس گاڑی کی ہے جو میں نے سائیں جی سے ادھار مانگی ہے۔"

"ادھار مانگی ہے؟"

"ہاں ونگ والی جانے کے لیے۔ سائیں جی بڑے گڈ آدمی ہیں اور بڑے دلچسپ بھی۔ انہوں نے نہ صرف گاڑی دے دی بلکہ پیٹرول ڈلوانے کے لیے پیسے بھی دیے ہیں۔ پتا ہے کتنے؟" میں

سوالیہ نظروں سے ریحان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا "پچاس پیسے۔ کہتے تھے یہ گاڑی بہت کم تیل کھاتی ہے۔ دو روپے میں ایران اور چھ روپے میں ترکی جا سکتی ہے۔"

یہ چابی ایک ڈاٹسن کار کی تھی۔ چار پانچ سال پرانا ماڈل تھا۔ یقیناً قلندر سیاہ پوش کو کسی عقیدت مند مریض نے نذرانے میں دی ہوگی۔ اب چھ سات روز میں گاڑی سمیت ڈیرے کی ہر شے پر سائیں عالی کو تصرف حاصل ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ ڈیرے کا اصل مختار وہی ہے۔ قلندر سیاہ پوش کی گاڑی کو وہ اپنا ہی مال سمجھ رہا تھا اور بڑی فراخ دلی سے ریحان کو عاریتاً دے رہا تھا۔

ریحان نے نہایت سنجیدگی سے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا "کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟"

"مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہو؟"

"مجھے آپ کی موجودگی سے بہت سہارا ملے گا۔"

اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھرلی۔ صرف آدھ گھنٹے بعد میں اور ریحان کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ڈاٹسن کار میں ڈیرے سے روانہ ہو رہے تھے۔

O☆O

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ تاہم کبھی کبھی بادلوں کے گہرے سائے گرد و پیش کو ڈھانپ لیتے تھے۔ ڈرائیونگ میں کر رہا تھا۔ ہم نے پسرور سیالکوٹ روڈ پر قریباً آٹھ میل سفر کیا تھا۔ اس کے بعد ہم اس ذیلی سڑک پر مڑ گئے تھے جو مختلف دیہات کے درمیان سے گزرتی "ونگ والی" جاتی تھی۔ ہمیں ونگ والی نہیں جانا تھا بلکہ دو تین میل ادھر ہی اس فیکٹری میں رک جانا تھا جو چوہدری جنت کی ملکیت تھی اور جہاں فٹ بال تیار ہوتے تھے اب ہم منزل کے قریب پہنچنے والے تھے۔ اس علاقے میں سیلاب کے آثار ابھی تک موجود تھے۔ پانچ چھ روز گزرنے کے باوجود کئی جگہوں سے پانی ابھی اترا نہیں تھا۔ کھیتوں میں فصل لیٹی ہوئی نظر آتی تھی اور فضا میں مردہ مچھلیوں کا تعفن تھا۔ جونہی ہمیں دور فاصلے پر فیکٹری کی وسیع عمارت کا ہیولا نظر آیا' ہم نے گاڑی بند کی اور نیچے اتر آئے۔ نجوم کے ساتھی سے چھینی ہوئی خودکار رائفل میرے پاس موجود تھی۔ سردی سے بچنے اور رائفل چھپانے کے لیے میں نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کے علاوہ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر بھی موجود تھا۔

ریحان نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک ٹارچ نکال کر جلائی اور ہم احتیاط سے پگڈنڈی پگڈنڈی آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے ارد گرد گنے اور چاول کے کھیت تھے۔ چاول کے کھیتوں کو خاص طور سے نقصان پہنچا تھا۔ ایک دو جگہ مویشیوں کی لاشیں بھی نظر آئیں۔ ایک طویل چکر کاٹ کر ہم فیکٹری کے عقب میں پہنچ گئے۔ یہاں لوہے کی چادر کا ایک بڑا گیٹ موجود تھا۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ فیکٹری میں آمد و رفت کے لیے یہ راستہ شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں چوکیدار کے لیے چھوٹا سا پختہ کیبن بھی بنا ہوا تھا مگر کیبن میں روشنی تھی اور نہ چوکیدار۔ آہنی گیٹ کا قفل کھول کر ہم اندر داخل ہو گئے اور گیٹ دوبارہ بند کر دیا۔ قفل اس لیے نہیں لگایا کہ شاید ہمیں جلدی میں یہاں سے نکلنا پڑے۔

فیکٹری کے احاطے میں خام چمڑے کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک شیڈ کے نیچے پلاسٹک کے بے شمار ڈرم رکھے تھے یقیناً ان میں کیمیکلز وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ریحان فیکٹری کے پیچ و خم سے بخوبی واقف ہے۔ وہ مجھے ایک تنگ و تاریک راہداری سے گزار کر ایک چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں لایا۔ اس کمرے میں لوہے کی ایک وزنی الماری موجود تھی۔ ہم دونوں نے اس الماری کو ہٹایا تو پیچھے ایک کھڑکی موجود تھی۔ کھڑکی سے گزر کر ہم ایک بلند و بالا ہال نما کمرے میں آگئے۔ یہاں چھوٹی بڑی کئی مشینیں موجود تھیں۔ چمڑے کے بے شمار رنگ برنگے ٹکڑے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ٹارچ کی روشنی کچھ دیر اس ہال میں گردش کرتی رہی پھر ایک چوبی دروازے پر جا کر ٹھہر گئی۔ دروازے پر ایک بڑا قفل موجود تھا۔ ریحان نے سرگوشی میں کہا "ہمیں یہ قفل توڑنا ہوگا۔"

ہم دونوں نے دھیان سے قفل کا معائنہ کیا۔ قفل توڑنے کی نسبت کہیں زیادہ آسان کام یہ تھا کہ دروازے کی کنڈی اکھاڑ لی جائے۔ میں نے مشینوں کے قریب سے ایک بڑا پیچ کس ڈھونڈا۔ پانچ دس منٹ کی محنتِ شاقہ کے بعد ہم یہ کنڈی اکھاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا...... اندر دو دروازے تھے۔ ایک ملحقہ باتھ روم کا تھا۔ دوسرا ایک مستطیل کمرے میں کھلتا تھا۔ جونہی ہم اس کمرے میں داخل ہوئے' میرے نتھنوں میں وہی بو گھسنے لگی جس کا تجربہ اسپتالوں کی راہداریوں میں ہوتا ہے۔ یہ مختلف ادویات کی ملی جلی بو تھی۔ ریحان کا اندازہ سو فیصد درست نکلا تھا۔

جعلی ادویات کی تیاری کا کام اسی فیکٹری میں انجام پا رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد ہم نے خود کو ایک اور ہال میں پایا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ چاروں طرف حرکت کر رہا تھا اور ہماری آنکھیں حیرت سے کھلتی جا رہی تھیں۔ یہ ایک مکمل فارماسیوٹیکل یونٹ تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ دواؤں کے بے شمار کارٹن چنے ہوئے تھے۔ ان کارٹنوں پر دو تین مشہور کمپنیوں کے لیبل نظر آرہے تھے۔ میں نے ایک فلنگ مشین کے قریب پڑے کارٹن کو کھولا۔ اس میں ایک اینٹی بائیوٹک کے انجکشن تھے۔ لیبل پر معروف کمپنی کا نام تھا لیکن یہ انجکشن اس دیہاتی فیکٹری کے اس نیم تاریک کمرے میں تیار ہو رہے تھے۔

میں نے دیکھا' ریحان کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ ٹارچ اس کے ہاتھوں میں کانپ کانپ جا رہی تھی "آئی کانٹ بلیو اٹ" اس نے بے خیالی میں سرگوشی کی...... پھر وہ جیسے بے دم سا ہو کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اپنے چوہدری باپ اور چچا کے بارے

میں اس کے خوب صورت تصورات کا بت چکنا چور ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے اس عورت کی عبرت ناک حالت دیکھی تھی جسے وہ چھوٹی امی کہتا تھا اور جسے چوہدری بخت بڑی محبت سے ایل بی پکارتا تھا' اب اس نے اپنے باپ کا وہ روپ بھی دیکھ لیا تھا جو انسانی زندگیوں سے کھیلتا تھا۔ یہ روپ دوا کے لیے ترستے ہوئے لوگوں میں موت بانٹتا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھ ساتھ ریحان بھی چوہدری کے اس روپ کو بدترین روپ سمجھ رہا ہے۔ لال کوٹھی میں صفیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ قابلِ صد ملامت تھا لیکن پھر بھی اس کے بد اثرات ایک دو افراد تک محدود تھے۔ اس فیکٹری کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ایک قتلِ عام تھا۔ ایک درندگی تھی جس پر جتنے بھی آنسو بہائے جاتے کم تھے۔ کوئی اس بیمار بچے کا تصور کرے جس کا مفلس باپ قرض مانگ کر دوا لاتا ہے اور بچے کے منہ میں ٹپکاتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ وہ دوا لایا ہے کہ سادہ پانی لایا ہے' زہر لایا ہے۔ دولت بٹورنے کی انسانیت کے ساتھ ایسا سفاک مذاق تو آسمان کا سینہ بھی شق کر دیتا ہوگا.... میرا جی چاہا' چوہدری بخت میرے سامنے ہو اور میں نتائج سے بے پروا ہو کر اسے قتل کر دوں یا پھر اسی ہال کی چھت سے رسا لٹکاؤں اور ان مشینوں کے درمیان اسے پھانسی دے دوں.... سچ کہتے ہیں لالچ کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔

چوہدری بخت ایک لینڈ لارڈ تھا۔ وسیع جائداد تھی۔ کاروبار تھا اور کاروبارِ سیاست بھی تھا۔ پھر بھی وہ جعلی ادویات کے اس مذموم دھندے میں ملوث تھا.... میں نے ثبوت کے طور پر کچھ دواؤں کے نمونے ایک شولڈر بیگ میں ڈال لیے۔

اچانک سناٹے میں ایک گرج دار آواز گونجی "کون ہے؟.... اوئے میں پوچھتا ہوں کون ہے" اس کے ساتھ ہی فائر ہوا اور کسی شاٹ گن کے چھرے قریبی کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے نکل گئے۔

ریحان نے ٹھٹک کر ٹارچ بجھا دی اور ہم دونوں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی اور باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگا۔ کسی کے بھاگتے قدموں کی دھپ دھپ ابھری پھر رائفل کی تڑتڑاہٹ سے خاموش فضا میں تہلکہ مچ گیا۔ ریحان ستون کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ فائرنگ کا ہدف ہم نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ للکار ہمارے لیے تھی جو تھوڑی دیر پہلے سنائی دی تھی۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔

میں نے ریحان کا بازو تھاما اور ہم دونوں جھک کر بھاگتے ہوئے 'دفتر نما کمرے' کی طرف بڑھے۔ اس کمرے میں پہنچ کر ہم نے خود کو زیادہ محفوظ محسوس کیا۔ میں نے ایک کھڑکی کھولی تو باہر کا دھندلا منظر بھی دکھائی دینے لگا۔ دو سائے تیزی سے بھاگتے ہوئے کھڑکی کے سامنے سے گزر گئے۔ پھر فضا میں چنگاریاں سی چھوٹیں اور کوئی شخص چیخ کر بلندی سے پلاسٹک کے ڈرموں پر گرا۔ ایکا ایکی سنسان و تاریک فیکٹری ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھی۔ یکے بعد دیگرے لائٹس آن ہو رہی تھیں۔ دروازے کھل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فائرنگ بھی ہو رہی اور چیخ پکار بھی بلند ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون لوگ گولیاں چلا رہے ہیں" ریحان نے لرزاں آواز میں مجھ سے پوچھا۔

میں کیا جواب دیتا۔ مجھے خود بھی ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ پھر ایک دم ہم بری طرح چونک گئے۔ کھڑکی کے قریب ہی ملک خدا بخش وڈیرا کی للکارتی ہوئی آواز گونجی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "باہر نکل بخت تورے۔ اپنے باپ کا ہے تو باہر آجا۔ میں بھی دیکھوں' میرے بیٹے کے قاتل کے بازوؤں میں کتنا زور ہے؟"

پھر ایک دوسری آواز گونجی "یہ باہر نہیں نکلے گا۔ بھون دو حرام زادے کو اندر ہی۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دو سگتے کے" فوراً بعد بالائی منزل کے ایک کمرے سے خودکار رائفل کا برسٹ آیا۔ میں نے کھڑکی کے قریب کھڑے ایک سائے کو تڑپ کر نیچے گرتے دیکھا۔ کچھ گولیاں کھڑکی میں بھی لگی تھیں اور جالی توڑ کر شیشے کو چکنا چور کر گئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چوہدری بخت بالائی منزل کے ایک کمرے میں موجود ہے۔ خدا بخش وڈیرا اور اس کے ساتھیوں نے چوہدری کو گھیرے میں لے لیا ہے اور جان سے مارنے کے درپے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے فیکٹری کے اس حصے میں اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ کی شدت سے پتا چلتا تھا کہ چوہدری بخت بھی اکیلا نہیں ہے۔ اس کے کارندے ساتھ ہیں اور پوری توانائی سے مخالف پارٹی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ میں اور ریحان اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے اور ایک محفوظ پوزیشن سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ ہنگامہ ناقابلِ فہم نہیں تھا۔ چوہدری بخت نے خدا بخش وڈیرا کے بیٹے کو بھائی کے ساتھ مل کر ٹھکانے لگایا تھا۔ نتیجے میں خدا بخش وڈیرا نے چوہدری بخت کے نوجوان بیٹے اور بیٹی کو اغوا کر لیا تھا۔ اب دونوں "بیٹا بیٹی" اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے اور اس کے انتقام کے شعلے ایک بار پھر بھڑک کر اس فیکٹری تک پہنچ گئے تھے۔

تقریباً دو منٹ تک شدید فائرنگ ہوئی پھر ہمیں اندازہ ہوا کہ خدا بخش وڈیرا اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ کہیں پاس سے ہی ہمیں چوہدری بخت کے خاص کارندے "کالی" کی دہاڑ بھی سنائی دی۔ وہ اپنے کسی ساتھی کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہا تھا۔ کھڑکی کے سامنے سے دو سائے لپکتے ہوئے گزر گئے پھر ایک دم خاموشی چھائی تھی لیکن یہ مستقل خاموشی نہیں تھی۔ یہ اندھا دھند لڑائی کے دوران میں آنے والا وہ وقفہ تھا جس میں متقابل گروہ اپنی پوزیشن تبدیل کرتے ہیں۔ اپنے ہتھیار "ری لوڈ" کرتے ہیں اور نئی حکمتِ عملی سوچتے ہیں۔

دو تین منٹ میں یہ وقفہ گزر گیا اور تب حسبِ توقع ایک دم دوبارہ زبردست فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ فائرنگ کا زیادہ زور

ہماری بائیں جانب تھا۔ ٹریل ٹو' سیون ایم ایم' تھری ناٹ تھری' ماؤزر بہت کچھ فائر ہو رہا تھا۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ خدا بخش وڈیرا اور اس کے ساتھیوں نے چال چلی ہے۔ جان بوجھ کر پسپا ہوئے ہیں اور جب چوہدری بخت اور اس کے ساتھی اپنی محفوظ پوزیشنوں سے نکل آئے ہیں تو ان پر شدید ترین ہلہ بول دیا ہے۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ دفعتاً ایک لرزہ خیز دھماکا ہوا' یوں لگا جیسے خیرہ کن چمک کے ساتھ کوئی بم پھٹا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیز سرخ روشنی فیکٹری میں پھیلتی محسوس ہوئی.... میں نے دیوار سے پشت لگائی اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ پلاسٹک کے وہ ڈرم جن میں کیمیکلز رکھے جاتے ہیں' دھڑا دھڑ جل رہے تھے اور آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ یقیناً کوئی بھٹکی ہوئی گولی کام دکھا گئی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند اور [illegible] زبردست دھماکوں سے آگ بھڑکی اور شعلوں کا پھیلاؤ ایک دم دو گنا ہو گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ یکایک دروازے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ کوئی للکارا "پکڑو حرامی کو۔"

میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور تیزی سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا' دو سائے ایک تیسرے سائے پر جھپٹ رہے ہیں۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ آگے بھاگنے والا سایہ چوہدری بخت کا تھا۔ بھاگتے بھاگتے چوہدری کو ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گرا۔ دونوں سائے وحشیانہ انداز میں اس پر جھپٹے۔ میں نے آگے بڑھ کر مداخلت کی۔ میری ٹانگ بڑے زور سے ایک حملہ آور کے سینے پر لگی' وہ ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ دوسرے حملہ آور نے گولی چلانے میں بڑی پھرتی سے کام لیا' لیکن زیادہ جلدی کا کام بھی شیطان کا ہوتا ہے۔ ٹریگر دبنے کے باوجود گولی نہیں چلی۔ معلوم نہیں رائفل کا میگزین خالی ہو چکا تھا یا پھر کوئی تکنیکی خرابی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے گالی نکلی' اس گالی کا تسلی بخش جواب اسے اپنے جبڑے پر ایک طوفانی مُکے کی صورت میں ملا۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہایت سخت جان قسم کا فائٹر ہے۔ میرے مُکے کو خاطر میں لائے بغیر اس نے کسی اڑنے بھینسے کی طرح سر جھکایا اور بجلی کی رفتار سے میری طرف آیا۔ اگر میں غافل ہوتا تو ایک "سینہ پھاڑ" قسم کی ٹکر مجھے اپنی پسلیوں پر برداشت کرنی پڑتی لیکن میں پوری طرح تیار تھا۔ میں نے خود کو بچایا اور حملہ آور کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی خمیدہ گردن کب میرے بازو کی مخصوص گرفت میں آگئی ہے۔ اس نے گالی دی اور گردن چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ناقابلِ شکست گرفت میں ہے' اس گرفت سے جتنا الجھے گا اتنا ہی نقصان اٹھائے گا اور پھر یہی ہوا اس نے اندھا زور لگایا اور میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ اپنی رائفل سمیت پیٹ کے بل فرش پر گرا۔ یہ سارا عمل بمشکل دس سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔

جس شخص نے سینے پر ٹانگ کھائی تھی وہ اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا تھا' کم از کم مجھے تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چوہدری بخت جہاں گرا تھا' وہیں پڑا تھا۔ اس کے حلق سے دردناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ زخمی ہے۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے فرش پر گھسیٹا اور ایک محفوظ آڑ میں لے آیا۔

"ریحان.... ریحان۔" میں نے کئی آوازیں دیں لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں آیا۔

معلوم نہیں کہ اس تک آواز نہیں پہنچ رہی تھی یا وہ آگے پیچھے ہو گیا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا لیکن اسی وقت "بھک بھک" کی زوردار آوازوں سے قریبی کمروں نے آگ پکڑ لی۔ ہر طرف جلے ہوئے چمڑے اور کیمیائی مادوں کی بُو پھیل رہی تھی۔ سخت سردی ایک دم شدید گرمی میں بدل گئی تھی اور میرے جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہنے لگا تھا۔ اکا دکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ مجھے لگا کہ چند لمحے مزید یہاں رہا تو گھنے دھوئیں کی لپیٹ میں آجاؤں گا۔ چوہدری بخت نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک چوڑے ستون کے پیچھے پڑا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا' پھر کندھے پر لادا اور اس تنگ راہداری کی طرف بھاگا جو مجھے فیکٹری کے عقبی گیٹ کی طرف لے جا سکتی تھی۔ اس راہداری میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ یہی وقت تھا جب مجھے کچھ فاصلے سے پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ یہ گاڑیاں پختہ سڑک سے فیکٹری کے مین گیٹ کی طرف آرہی تھیں۔ میں نے باقی ماندہ فاصلہ تیزی سے طے کیا اور فیکٹری کے اس عقبی گیٹ تک پہنچ گیا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ میری احتیاط کام آگئی تھی۔ اگر جاتے وقت ہم گیٹ مقفل کر جاتے تو اب مصیبت ہو جاتی کیونکہ چابی ریحان کے پاس تھی۔

گیٹ سے نکل کر میں نے تیس چالیس گز فاصلہ تیزی سے طے کیا اور گنے کے ایک کھیت میں داخل ہو گیا۔ یہ کھیت کافی دور تک چلا گیا تھا۔ میں کھیت کے اندر ہی اندر چلتا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے عقب میں شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فیکٹری کا ایک حصہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور چمڑے کی بُو ہر طرف پھیل رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور کندھے پر لال کوٹھی کا بڑا چوہدری۔ میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میرے دل میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ ریحان کسی طرح گاڑی تک پہنچ گیا ہو۔ لیکن گاڑی تک پہنچ کر یہ امید ٹوٹ گئی۔ گاڑی میں ڈرائیو کر کے لایا تھا اور چابی بھی میرے پاس تھی۔ میں نے نیم بے ہوش چوہدری بخت کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈالا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا.... ہیڈ لائٹس جلانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے تاریکی میں ہی "ڈرائیو" کرنے کا فیصلہ کیا۔

○☆○

قلندر سیاہ پوش کے ڈیرے کا منظر تھا۔ ایک اندرونی کمرے میں چوہدری بخت چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ سرخ رنگ چوہدری بخت کی کمزوری تھا۔ اس وقت بھی چوہدری نے سفید شلوار قمیص پر گہری سرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ اس جرسی پر خون کے دھبے تھے اور سفید شلوار قمیص بھی خون میں تربتر ہو رہی تھی۔ گولی چوہدری کے کولہے سے ذرا نیچے ران میں لگی تھی اور ابھی جسم میں ہی تھی۔ صفیہ کے انجکشنوں میں سے ایک خواب آور اور ایک درد کش انجکشن میں نے چوہدری کو لگا دیا تھا۔ مناسب طبی امداد ملنے تک اس کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ خون بے تحاشا بہنے کے بعد خود ہی رک گیا تھا' اب چوہدری کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ یہاں ڈیرے پر پہنچتے ہی چوہدری نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا کہ صفیہ کدھر ہے۔ میں نے کہا تھا' تمہاری توقع کے برخلاف وہ ابھی قبر میں نہیں پہنچی ہے۔ چوہدری مجھ سے بدکلامی کرنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے ملک خدا بخش وغیرہ سے مل کر فیکٹری پر حملہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریحان اور سمن کی گمشدگی میں بھی مجھے ملوث کر رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

مجھے ریحان کی فکر تھی۔ جونہی چوہدری پر گہری غنودگی طاری ہوئی' میں باہر نکل آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ریحان کی تلاش میں نکلوں۔ سمن بھی بے حد پریشان تھی۔ کہنے لگی کہ وہ میرے ساتھ جائے گی۔ میں نے اسے ڈانٹا اور صفیہ کے پاس رہنے کی تلقین کی۔ ابھی میں ڈیرے کے گیٹ سے نکلا ہی تھا کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ میں نے ریحان کو دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف آ رہا تھا۔

ریحان ایک موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لے کر یہاں پہنچا تھا۔ وہ بالکل خیریت سے تھا۔ دراصل آگ اور دھوئیں کی لپیٹ سے بچنے کے لیے وہ کھڑکی سے کود کر فیکٹری کے برآمدے کی طرف چلا گیا تھا اور بعد ازاں شدید افراتفری کا فائدہ اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ چنگاریوں کی وجہ سے اس کے کپڑوں میں سوراخ ہو گئے تھے اور آنکھیں دھوئیں سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں اسے لے کر ڈیرے میں آ گیا۔

اپنے باپ کو چارپائی پر بے سُدھ پڑے دیکھ کر ریحان کی آنکھوں میں تحیر کے آثار ابھرے لیکن اس تحیر میں دکھ یا پریشانی کی آمیزش نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی لاتعلقی اور غیریت نظر آ رہی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "چوہدری صاحب کو کولہے میں گولی لگی ہے۔ نیند کا انجکشن لگایا ہے جس کی وجہ سے بے سُدھ پڑے ہیں۔" ریحان نے اس بارے میں اور کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ سمن بھی آنسو پونچھتی ہوئی اس کے پیچھے چلی گئی' اتنے میں گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں سروج کھڑی تھی۔ وہ ابھی تک اسی زرق برق لباس میں تھی جس میں اسے

چھوڑ کر گیا تھا۔ زیورات بھی جوں کے توں تھے۔ اس کی آنکھوں میں غصہ ہی غصہ تھا۔ میں اس غصے کی وجہ بخوبی سمجھتا تھا۔ خاصی دیر پہلے میں اسے بتائے بغیر اچانک کمرے سے نکل گیا تھا اور اب صبح ہونے والی تھی۔ یقیناً وہ میرا انتظار کرتی رہی تھی اور اپنے آپ میں کھولتی' ابلتی رہی تھی۔

"یہ کس مردے کو اٹھا لائے ہو؟" اس نے چوہدری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مردہ نہیں..... علاقے کا سب سے بڑا چوہدری ہے۔ ایم پی اے کا الیکشن لڑ رہا ہے۔ چوہدری بخت آور آف رنگ والی۔"

"ہو گا..... لیکن اسے ہوا کیا ہے؟"

"کولہے میں گولی لگی ہے۔ کافی خون نکل گیا ہے۔ گولی ابھی اندر ہی ہے۔"

سروج بولی "سائیں جی سے کہو۔ دیکھ نہ کچھ کر دیں گے۔"

اتنے میں گھنگھروؤں بجنے کی آواز سنائی دی اور سائیں عالی جھومتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اپنی نیم وا آنکھیں میچ کر چوہدری بخت کو دیکھا اور پیلے پیلے دانت نکال کر ہنسنے لگا "پکڑا گیا نا..... آخر کو پکڑے ہی جانا تھا۔ آخر کو پکڑے ہی جانا تھا بچے..... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ساری کسر نکل جائے گی۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

سروج نے مؤدب لہجے میں کہا "سائیں جی! اس کی ٹانگ میں گولی ہے۔ برابر خون نکل رہا ہے۔"

وہ بولا "تم جاؤ..... نکل جائے گی گولی۔ خود بخود نکل جائے گی۔"

میں نے کہا "سائیں عالی! گولی لگتی خود بخود ہے' نکلتی خود بخود نہیں ہے۔"

"اچھا تو میں گولی نکالنے والے کو بلا لوں گا۔ ایک اے سی ہے میرا واقف۔"

"اے سی یعنی اسسٹنٹ کمشنر کیا وہ گولی نکالے گا؟"

"کیا اسسٹنٹ کمشنر ڈاکٹر نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ اب تو بہت سے سرکاری افسر ڈاکٹر اور انجینئر بھی ہوتے ہیں۔ وہ پہلے انجینئرنگ یا ڈاکٹری کرتے ہیں۔ جب روٹی کے لالے پڑتے ہیں تو مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر سرکاری افسر بن جاتے ہیں۔ اور تو اور کوہ قاف میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر جن میرا مرید ہے۔ بچپن سے اس کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بن کر دکھی جنات کی خدمت کرے لیکن اب وہ بھی مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ سرکاری افسر بننے کی خواہش کسی جن کی طرح اس سے چمٹ گئی ہے۔"

سروج نے دبی دبی آواز میں کہا "جن ڈاکٹر صاحب کا آپ نے ذکر فرمایا ہے وہ کب تک یہاں پہنچ جائیں گے؟"

اس سوال نے سائیں عالی کو ایک دم مشتعل کر دیا۔ وہ کبھی کبھی یونہی بلاوجہ بھڑک جاتا تھا۔ کڑک کر بولا "تیری ماں کا خصم

ہے وہ؟ تجھے کیوں اتنی فکر پڑی ہے۔ چل یہاں سے ورنہ ابھی چھتر اتارتا ہوں۔" اس نے باقاعدہ اپنے شکستہ جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

سروج کان لپیٹ کر وہاں سے نکل گئی۔ سائیں عالی نے مجھے بھی باہر نکلنے کا حکم دیا "چل شفیع محمد..... تو بھی باہر چل۔" اس نے مجھے میرے مخصوص نام سے پکارا تھا۔

میں تذبذب میں تھا۔ سائیں عالی کا کیا بھروسا تھا۔ وہ تنہائی میں چوہدری بخت کو ایذا دینے کے بعد میں ہنس کر دکھا دیتا۔ یا کہہ دیتا کہ چوہدری بخت شاید جنات کے ریلے میں چلا گیا ہے۔ یا کوئی سبز پری اسے اغوا کر کے لے گئی ہے۔ بہرحال سائیں سے زیادہ تکرار بھی مناسب نہیں تھی۔ میں چوہدری کو سائیں کی تحویل میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔

دوپہر تک حالات میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ پھر مجھے سروج کی زبانی پتا چلا کہ سائیں عالی کی ہدایت پر قلندر سیاہ پوش نے کسی ڈاکٹر کو ڈیرے پر بلایا تھا اور اس نے چوہدری بخت کی گولی نکال کر مرہم پٹی کر دی ہے۔ میں چوہدری بخت کو دیکھنے ڈیرے کے وسطی کمرے میں پہنچا تو وہاں ریحان پہلے سے موجود تھا۔ وہ بڑے تیز لہجے میں چوہدری بخت سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بے دھڑک بلند آواز میں بول رہا تھا "آپ ظالم ہیں ڈیڈی' آپ ظالم ہیں..... خدا کی قسم' مجھے شرم آ رہی ہے کہ آپ میرے باپ ہیں۔"

"تم جانتے نہیں ریحان! تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔" چوہدری کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے ڈیڈی! مجھے بتائیں کیا قصور تھا چھوٹی امی کا جس کی اتنی بڑی سزا دی ہے آپ نے۔ آپ نے ظلم کی انتہا کی ہے۔ کاش میں آپ کا بیٹا نہ ہوتا اور آپ کا گریبان پکڑ کر آپ سے اپنی چھوٹی امی کا گناہ پوچھ سکتا......"

چوہدری بولا "وہ عورت اس قابل نہیں کہ تم اسے چھوٹی امی کہہ سکو۔"

ریحان نے آتش فشاں لہجے میں کہا "لیکن میں سمجھتا ہوں' آپ اس قابل نہیں کہ میں آپ کو باپ کا احترام دوں اور نہ چچا ذیشان اس قابل ہے کہ اسے چچا کہا جائے۔ مجھے چچا ذیشان کے کردار کا پتا چل گیا ہے اور اس سلوک کا بھی جو لال کوٹھی میں چھوٹی امی سے ہوتا رہا ہے۔" چوہدری بخت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا لیکن ریحان بولتا چلا گیا "آپ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے ڈیڈی..... بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ آپ کے جرم اتنے زیادہ ہیں کہ دلیلوں اور وضاحتوں کے انبار بھی آپ کا کچھ نہیں سنوار سکتے۔ میں نے کل رات آپ کی فیکٹری میں وہ کارخانہ بھی دیکھا ہے جہاں بے گناہ لوگوں کے لیے "موت" تیار ہوتی ہے۔ پتا نہیں اب تک کتنے لوگ آپ کی اس

"خدمتِ خلق" کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ آپ قاتل ہیں ڈیڈی۔"

اس اثنا میں سمن بھی آنسو پونچھتی ہوئی اندر آ چکی تھی۔ ریحان کی بلند آواز سن کر قلندر سیاہ پوش کے تین چار مرید بھی دروازے کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ چوہدری بخت کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔

ریحان نے کوٹ کی آستین سے آنسو پونچھے اور ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "ڈیڈی! میں نے جو کچھ یہاں آ کر دیکھ لیا ہے اس کے بعد میں آپ اور آپ کے لوگوں سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ میں جا رہا ہوں اور آئندہ آپ کو شکل نہیں دکھاؤں گا۔ زندگی بھر نہیں۔"

چوہدری بخت کراہا "سمن بیٹی! تم اسے سمجھاؤ۔"

ریحان بولا "اگر یہ سمجھا سکتی تو آپ کو سمجھاتی۔ لیکن آپ کے کالے کارنامے دیکھ کر اس کی زبان گنگ ہو چکی ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی یہاں سے جا رہی ہے۔ ہم دونوں چھوٹی امی کو بھی لے جا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اب آپ کبھی ہماری شکل نہیں دیکھیں گے۔"

"سمن! یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

سمن نے چوہدری کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ریحان آگے بڑھا اور اس نے چھوٹی بہن کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا "چلو سمن!" اس نے کہا۔

وہ ریحان کے ساتھ چل دی۔

"سمن!" چوہدری حلق کے بل دہاڑا۔

اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا "تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ باپ کو اس حالت میں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ شرم کرو۔ میں کہتا ہوں واپس آ جاؤ۔ ریحان..... سمن!"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ٹانگ میں اٹھنے والی ٹیسوں کے سبب تڑپ کر رہ گیا۔ اس کا رنگ ایک بار پھر ہلدی ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں سائیں عالی دھمال ڈالنے کے انداز میں ناچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور حق ہُو کے زوردار نعرے لگانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا لیکن اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بس کسی کسی لفظ کا پتا چلتا تھا۔ لال کوٹھی' کنجر خانہ' پھانسی گھاٹ' مسٹر ٹارزن.....

ریحان لاہور جانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ وہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا' وہ ایک مشہور صنعت کار کا بیٹا تھا۔ کروڑپتی لوگ تھے۔ ریحان فی الحال اپنے اس دوست کے ہاں قیام کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ لاہور میں صفیہ کا ابتدائی علاج کرائے گا اور جب اس کی حالت کچھ سنبھل جائے تو اسے اپنے ساتھ ہی انگلینڈ لے جائے گا۔ وہ اب اپنی بہن سمن کو بھی یہاں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

صفیہ کے لیے ریحان اور سمن کی محبت حیران کن تھی۔ یوں

لگتا تھا کہ سگی ماں سے کہیں زیادہ انہیں صفیہ کی پروا ہے۔ ایسی محبتیں آسانی سے پروان نہیں چڑھتیں۔ انہیں خونِ جگر پلانا پڑتا ہے اور زندگی کی عزیز ترین خوشیاں ان کے لیے قربان کرنا پڑتی ہیں۔ یقیناً گزرے ہوئے ماہ و سال میں صفیہ نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ اس نے چوہدری بخت کے بچوں کو سگی ماں سے بڑھ کر محبت دی تھی۔ ان کے دکھوں اور خوشیوں میں شریک ہوئی تھی۔ ایک "رکھیل" ہونے کے باوجود اس نے اپنے او پر ماتا طاری کی تھی۔ آج یہ اس حسنِ سلوک کا ہی صلہ تھا کہ چوہدری کے بچے ایک بے حیثیت اور تہی دامن عورت کے لیے عیاش باپ کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ بے شک وہ بھی چوہدری خاندان سے تھے۔ بے شک انہوں نے بھی لال کوٹھی کی شان و شوکت میں آنکھ کھولی تھی لیکن ان کی نسل تک پہنچتے پہنچتے چوہدراہٹ پر انسانیت غالب آ گئی تھی۔

سہ پہر تک ریحان اپنی بہن اور "چھوٹی ماں" کو لے کر ڈیرے سے چلا گیا۔ صفیہ کو ایمبولینس پر لے جایا گیا تھا۔ احتیاط کے طور پر قلندر سیاہ پوش کے دو کارندے بھی ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں ساتھ گئے تھے۔ چوہدری بخت نے بہت چیخم دھاڑ کی تھی لیکن جانے والے رکے نہیں تھے۔

رات کو چوہدری کی فیکٹری میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی خبر بھی پورے علاقے میں پھیل ہوئی تھی۔ فیکٹری میں ہونے والی آتش زدگی سے عمارت کا ایک پورشن جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ خام مال کے علاوہ بہت سی مشینیں بھی تباہ ہو گئی تھیں۔ اس ہنگامے میں تین افراد کے ہلاک ہونے کی خبر تھی۔ زخمیوں کی تعداد بھی درجنوں میں بتائی جا رہی تھی۔ سب سے اہم "اطلاع" یہ تھی کہ فیکٹری پر حملہ خدا بخش وڑائچ اور اس کے کارندوں نے کیا ہے اور وہ جاتے جاتے چوہدری بخت کو "اغوا" کر کے لے گئے ہیں۔

یہ اطلاع میرے لیے تسلی بخش تھی۔ اس اطلاع کا مطلب تھا کہ چوہدری بخت پر گزرنے والے سانحے کا کسی کو علم نہیں اور وہ اس ڈیرے پر بالکل محفوظ ہے۔

○☆○

تیسرے دن چوہدری بخت کو زخم میں شدید تکلیف ہونے لگی۔ میں نے دیکھا زخم کے اردگرد کی جگہ سرخ ہے اور تپ رہی ہے۔ یہ انفیکشن کی علامت تھی۔ چوہدری ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس کر رہا تھا۔ بخار کی وجہ سے اس کے مزاج کی گرمی مزید بڑھ گئی تھی اور وہ ہر ایک کو کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ میں نے کہا "چوہدری! جس طرح خوشی زندگی کا حصہ ہے اسی طرح تکلیف بھی ہے۔ خوشی بھوگی ہے تو تکلیف بھی برداشت کرو۔"

وہ بولا "مجھے لیکچر مت دو۔ میں جانتا ہوں کہ کیا کرنا ہے مجھے۔"

"کیا کرنا ہے تمہیں؟"

"یہ وقت آنے پر بتاؤں گا۔" وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا "تم نے میرے اور میرے بچوں کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔"

"اور جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا وہ اچھا تھا؟ زنجیریں ڈال کر مرنے کے لیے تہ خانے میں پھینک دیا تھا۔"

"وہ ہماری مجبوری تھی۔ تم ضرورت سے زیادہ جان چکے تھے لیکن تمہیں نقصان پہنچانے کا میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تمہیں چند دن اپنی حویلی میں رکھتا۔ جب ناظم اور صفیہ والی بات ٹھنڈی ہو جاتی تو تمہیں چھوڑ دیتا۔ بلکہ ۔۔۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ تمہیں اپنے ساتھیوں میں شامل کروں لیکن تم نے وہ کر دکھایا جو میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔"

"تم کوّے کو سفید ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو چوہدری۔۔۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ تہ خانہ جہاں سے ہمیں سیلاب نے نکالا، میری اور صفیہ کی قبر بننے والا تھا۔"

"تم ایک بدگمان شخص ہو شاہ جہاں۔۔۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ مجھے تم پر بے اعتباری ہوتی یا میں نے تمہیں مارنا ہوتا تو تمہیں ناظم کے قتل کے بعد لال کوٹھی سے جانے ہی کیوں دیتا۔ میں چاہتا تو تمہارے سمیت فلمی یونٹ کا کوئی بندہ واپس لاہور نہ جا سکتا۔"

"مجھے چھوڑنا تمہاری غلطی تھی اور یقیناً تم بعد میں پچھتائے بھی ہو گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں دوبارہ لال کوٹھی آیا تو تم نے مجھے بند کرنے میں ذرا دیر نہیں کی۔"

چوہدری کے جنگجو خون نے جوش مارا اور اس کا چہرہ اس کی جرسی کی طرح سرخ ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے گالی نکلی اور اس نے اپنی صحت مند ٹانگ چلا کر وہ میز دور پھینک دی، جس پر دودھ کا گلاس اور ڈبل روٹی وغیرہ رکھی تھی۔ برتن چھناکے سے ٹوٹ گئے اور دودھ بکھر گیا۔ سروج بھاگی ہوئی اندر آئی "کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"چوہدری صاحب اپنی زخمی ٹانگ کی طاقت دیکھ رہے تھے۔" میں نے جواب دیا اور چوہدری کے لیے انجکشن بھرنے لگا۔

مجھے انجکشن بھرتے دیکھ کر چوہدری غرایا "میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں یہاں علاج نہیں کرواؤں گا۔ میں جیسا ہوں بس ٹھیک ہوں۔"

میں نے کہا "لیکن ہم اپنے دل کا کیا کریں۔ آپ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے اور پھر ہم کوئی اپنی طرف سے علاج تو نہیں کر رہے ہیں۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب بتا کر گئے ہیں وہی دے رہے ہیں۔ یہ نسخہ آپ کے سرہانے رکھا ہے، خود ملاحظہ فرما لیں۔"

درد کی وجہ سے چوہدری کا برا حال ہو رہا تھا ورنہ وہ یقیناً مزید بحث کرتا۔ میں نے چوہدری کی شلوار تھوڑی سی نیچے کھسکائی اور اسی کی "فیکٹری" کا بنا ہوا انجکشن اس کی چوتڑ میں ٹھونک دیا۔ یہ ایک اینٹی بایوٹک انجکشن تھا اور ان بہت سی ادویات میں شامل تھا جو میں اور ریحان فیکٹری کے خفیہ کمرے سے لائے تھے۔

چوہدری کے خلاف میرے سینے میں غم و غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ شخص ایک بے رحم قاتل تھا۔ اس کے لیے بدترین سے بدترین سزا تجویز کی جا سکتی تھی۔ میں نے جو سزا تجویز کی تھی یہ تو کچھ بھی نہیں تھی۔ بس چوہدری کے ہی فارماسیوٹیکل پلانٹ کے بنے ہوئے انجکشن تھے جو میں اسے لگا رہا تھا۔ نسخہ ڈاکٹر نے لکھا تھا اور انجکشن چوہدری نے خود بنوائے تھے۔ میرا کام تو صرف ایک ڈسپنسر کا تھا۔

تین چار دن کے "علاج" کے بعد چوہدری کی حالت کافی ابتر ہو گئی۔ انفیکشن بڑھتی جا رہی تھی۔ ذرا سا دبانے پر زخم کے ٹانکوں میں سے پیپ برآمد ہونے لگتی تھی۔ درد اس کی پوری ٹانگ میں پھیل گیا تھا اور بخار میں بھی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ جو درد کا انجکشن میں چوہدری کو لگاتا تھا وہ چوہدری کی "چور فیکٹری" کا بنا ہوا تھا۔ ایک انجکشن کی جگہ تین لگانے پڑتے تھے پھر بھی درد پوری طرح رفع نہیں ہوتا تھا۔

سروج بھی اپنے "کام" پر لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس رات سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے دوبارہ جوڑا جائے۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں ہزاروں بار اس لمحے کو کوس چکی ہوگی جب اس کا ہوشربا حسن میری "مزاحمت" سے ٹکرا رہا تھا اور اچانک دروازے پر دستک ہو گئی تھی۔ سروج کا خیال تھا کہ سارا بنا بنایا کام دستک نے بگاڑا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ "دروازے" سے پہلے میرے دل پر دستک ہو چکی تھی اور ریحان نہ بھی آتا تو سروج اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوتی۔

سروج کی ہر ادا ایک کھلی دعوت کی طرح تھی اور میں اس دعوت کو کامیابی سے نظرانداز کر رہا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ سروج سے مجھے مطلب بھی تھا۔ میں اس سے عینی جان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور ان حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جن میں سائیں عالی یا سروج عینی سے ملے تھے۔ سروج میری اس کمزوری کو سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت بااعتماد نظر آتی تھی۔ وہ اپنے پتے بڑی سمجھ بوجھ اور تحمل سے کھیل رہی تھی۔

ڈیرے پر آنے کے چھٹے یا ساتویں روز میں نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ یہ فون کرنے کے لیے مجھے رات کے وقت چار پانچ میل دور ایک زمیں دار کی رہائش گاہ پر جانا پڑا۔ یہ زمیں دار بھی سیاہ پوش کے مریدوں میں سے تھا۔ اس زمیں دار کے گھر آنے جانے کے لیے میں نے سائیں عالی کی اجازت سے سیاہ پوش کی ڈاٹسن استعمال کی۔

لاہور میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں زریں گل نے فون ریسیو کیا "او استاد صیب! آپ ایک دم غلط کام کرتا ہے۔ نہ کسی کو کچھ بتاتا ہے اور چل دیتا ہے۔۔۔۔۔ دو تین دن پہلے اخبار میں صوبائی اسمبلی کے امیدوار چوہدری بخت آور کے اغوا وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ اس دن سے ام اور بڑے صیب (ساہی صاحب) سخت پریشان ہے۔ دل میں بہت برا برا خیال آ رہا تھا۔"

میں نے کہا "اچھے اچھے خیال تمہارے دل میں کبھی آتے ہی نہیں۔۔۔ ورنہ لڑکیوں کے پیچھے کیوں بھاگتے۔"

"آپ مذاق مت فرمائیں استاد صیب۔۔۔ سچ پوچھیں تو آپ ام کو کسی فلمی کہانی کے مافق لگتا ہے۔ فلم شروع ہوتے ہی کہانی صاحب غائب ہو جاتا ہے اور اس وقت نظر آتا ہے جب فلم ختم ہونے والا ہوتا ہے۔ آپ بھی اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ اب کہاں سے فون کر رہا ہے آپ؟"

"پسرور کے قریب ایک گاؤں سے۔۔۔ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟"

"بالکل خیریت ہے جی۔ بس بچہ لوگ زرغونہ آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ ابھی تو بی بی ینگ یہاں ہے۔ وہ اسے سنبھالے رکھتا ہے۔ ایک دو دن میں وہ چلا گیا تو پھر سخت مشکل ہو جائے گا۔۔۔ بہرحال یہ تو سارا بعد کا باتیں ہے۔ فی الحال ام کو آپ سے ایک بالکل خاص الخاص بات کرنا ہے۔ یہ بات ٹیلی فون پر بالکل نہیں ہو سکتا ہے۔ ام اتنا پریشان تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا فون آ گیا۔ اب یا تو آپ خود تشریف لے آئیں۔ یا ام کو اپنا ایڈریس لکھوائیں۔ ام فوراً سے پہلے آپ کے پاس پہنچتا ہے۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ کوئی اشارہ تو دو۔"

"یہ اشارے مشارے والا بات نہیں ہے جی۔ ایک دم خاص ہے۔ بہت بمبار منٹ ہے۔"

"بمبار منٹ کا کیا مطلب؟ شاید تم امپارٹنٹ کہنا چاہ رہے ہو؟"

"جی ہاں وہی۔ بس آپ اپنا ایڈریس لکھوائیں۔"

زریں گل کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے نوٹس لینا پڑا۔ ذرا سے تذبذب کے بعد میں نے اسے ایڈریس لکھوا دیا اور سمجھا بھی دیا۔ یہ قلندر سیاہ پوش کے ڈیرے کا ایڈریس تھا۔

میں رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر واپس پہنچا۔ قلندر سیاہ پوش اپنے حجرے میں موجود تھا اور لالٹین کی روشنی میں اپنے دو مریضوں کے ساتھ مصروفِ کار نظر آ رہا تھا۔ ایک درمیانی عمر کا مرد تھا جو غالباً گردے کی تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کی بیوی تھی۔ دونوں ایمرجنسی میں یہاں پہنچے تھے۔ سیاہ پوش نے مرد کو پہلو کے بل لٹا رکھا تھا اور اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے کے ساتھ ساتھ منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ عملیات کے علاوہ وہ اپنے مریضوں کو دیسی ادویات بھی دیتا تھا۔ رات دن اس کے پاس مریض آتے رہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ بھی ہے، لوگوں کو یہاں سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ ڈیرے پر لہرانے والے دونوں جھنڈوں کے بارے میں سیاہ پوش نے مجھے بتایا کہ زرد جھنڈا اس راستے پر لگا ہے جو ڈیرے میں داخل ہوتا ہے

اور یہ جھنڈا بیماری و تکلیف کی علامت ہے' سبز جھنڈا نکاسی کے راستے پر نصب کیا گیا ہے اور سبز رنگ کا مطلب صحت یابی ہے۔ یعنی بیمار لوگ یہاں آتے ہیں اور تندرستی لے کر جاتے ہیں۔ میں سب سے پہلے چوہدری بخت کے کمرے میں پہنچا۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی انجکشن لگانے کے لیے سرنج اٹھائی تو چوہدری بخت کراہنے لگا "میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں یہ انجکشن نہیں لگواؤں گا۔ میرے لیے دوسرا انجکشن لاؤ' بازار سے۔"

چوہدری جان چکا تھا کہ میں اسی کی فارماسیوٹیکل فیکٹری میں بنے ہوئے جعلی انجکشن استعمال کر رہا ہوں۔

میں نے کہا "چوہدری! اگر لگوانا ہے تو لگواؤ ورنہ میں جا رہا ہوں۔"

چوہدری کے چہرے سے طیش آمیز بے بسی جھلکنے لگی۔ دانت پیس کر بولا "شاہ جہاں! اتنا ظلم کرو جتنا برداشت کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ کسی وقت تم موت کی بھیک مانگو اور موت بھی نہ ملے۔"

میں نے کہا "میں تم پر کوئی ظلم نہیں کر رہا۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق تمہارا علاج کر رہا ہوں۔ وقت پر دوا دے رہا ہوں' ہر طرح دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ کون سی کوتاہی کی ہے میں نے......"

"تم...... تم!" وہ غصے سے پھنکارا لیکن الفاظ اس کے منہ میں ہی سرپٹخ کر رہ گئے۔

"بولو انجکشن لگوانا ہے یا نہیں؟" میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ جعلی انجکشن پندرہ بیس فیصد سے زیادہ اثر نہیں کرتا لیکن مجبوری تھی کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور میں نے انجکشن لگا دیا۔

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ایک اور لگا دو۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

"فرق کیوں نہیں پڑے گا۔ چالیس روپے والا ٹیکا ہے۔ کوئی پانچ چھ روپے والا نہیں۔ چلو سو جاؤ اب چپ کر کے۔"

چوہدری کے دانت کچکچانے کی آواز میں فاصلے سے بھی سن سکتا تھا۔

درد کا ٹیکا تو اس نے پھر بھی لگوا لیا تھا لیکن اینٹی بائیوٹک ٹیکا لگواتے ہوئے وہ بہت شور مچاتا تھا۔ چوہدری کو معلوم تھا' وہ بالکل بے کار ٹیکا ہے۔ اس سے فائدہ ہونا ناممکن اور نقصان ہونا عین ممکن تھا۔ میرے ہاتھ میں ٹیکا دیکھ کر وہ سٹپٹا جاتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا اور بستر سے اٹھنے کی ناکام کوشش کرتا تھا۔ ایسے میں قلندر سیاہ پوش کے دو تین چیلے اسے دبوچ لیتے تھے اور شلوار کھینچ کر مسکرانے لگتے تھے۔ اینٹی بائیوٹک کا ٹیکا وہ یوں لگواتا تھا جیسے زہر کا ٹیکا لگوا رہا ہو۔ ایک روز تو وہ اتنا تڑپا مچلا تھا کہ سوئی گوشت کے اندر ہی ٹوٹ گئی تھی اور بعد میں سرجیکل بلیڈ سے "کٹ" دے کر نکالنی پڑی تھی۔ اس دن کے بعد سے چوہدری کی مزاحمت قدرے ہلکی پڑ گئی تھی۔ بہرحال دھمکیوں اور گالم گلوچ کا سلسلہ جاری تھا۔

چوہدری کو انجکشن لگا کر میں اپنے "دشمن دوست" کمرے میں آیا تو ہلکی سی خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے نیم جاں ہو رہی میاں نہیں دیا اور لالٹین کی لو اونچی کر کے لالٹین ایک پڑچھتی پر رکھ دی۔ تھکاوٹ بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ جوتے اتارتے ہی میں بستر کی طرف بڑھا۔ اچانک اندازہ ہوا کہ لحاف کے نیچے کوئی موجود ہے۔ خطرے کے احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے پھرتی سے لحاف کھینچا۔ ایک پرانا دشمن یہاں موجود تھا اور پوری طرح مسلح بھی تھا۔ یہ سروج تھی۔ اس کا اسلحہ اس کا حسن اور بناؤ سنگھار تھا۔ وہ اسی زرق برق لباس میں تھی جو گھاگرے اور چولی سے ملتا جلتا تھا۔ کمر اپنی آخری حدوں تک عریاں تھی۔ اس کے علاوہ بازو اور پنڈلیاں بھی لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ وہ اپنے نشیب و فراز کو نمایاں کیے پڑی تھی اور جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

میں نے اسے جھنجھوڑا "اٹھو...... یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"میں سوئی ہوئی ہوں۔" وہ اداسے بولی۔

میں نے اسے بازو سے کھینچ کر بٹھا دیا۔ اس کا چہرہ قریب آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے ایک ترنگ چڑھا رکھی ہے۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" میرا اشارہ الکحل کی بو کی طرف تھا۔

وہ بولی "یہ حماقت نہیں۔ امپورٹڈ وسکی ہے۔ اصلی فرانس کی بنی ہوئی۔ اس ویران علاقے میں اور اس موادوڑیرے پر کوئی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

اس نے چارپائی کے نیچے ہاتھ گھمایا اور چمکتی دمکتی بوتل نکال کر تپائی پر رکھ دی۔ ساتھ میں دو گلاس بھی تھے۔

"پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔"

"چلو میں بھی تمہارا ساتھ دیتی ہوں۔"

"تم اپنا ساتھ اپنے کمرے میں جا کر دو۔ پوری بوتل چڑھاؤ اور صبح تک مدہوش باقی ہو جاؤ۔ مجھے بڑی مسرت ہو گی۔"

"تم کیول مذاق کرنا جانتے ہو۔ کسی کے من میں جھانکنا تمہیں نہیں آتا۔ شاید اسی لیے تم نے غزال جیسی لڑکی کھو دی۔"

"ہاں مجھے اپنی نالائقیوں کا احساس ہے۔ تم بھی خواہ مخواہ دیوار سے سر مت پھوڑو۔ جاؤ آرام کرو اور مجھے بھی کرنے دو۔"

"ہائے رام! کیسی بات کرتے ہو تم۔ آرام کرنے ہی تو آئی ہوں۔ ابھی دیکھنا کتنے آرام سے سو جاؤں گی۔"

باتوں کے دوران میں ہی اس نے گلاس میں چند گھونٹ ڈال کر چڑھا لیے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ میں نے بہت کوشش کی تھی لیکن سروج نے ابھی تک عیسیٰ جان کے حوالے سے مجھے کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ وہ ہر بار صفائی سے ٹال رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ترنگ میں آ کر اس کی زبان چل پڑتی اور وہ کچھ بتا رہی۔ بہتر تھا کہ وہ اس آتشیں سیال کے کچھ اور گھونٹ حلق میں اتار لیتی۔

وہ بولی "کو چنو تا تم بھی۔ جب دلیپ کمار جیسا سنجیدہ شخص پی سکتا ہے' راجیش کھنہ جیسا تیس توی پی سکتا ہے' میرے بابا روپ کمار جیسا بزدل مزید شخص پی سکتا ہے تو تم کیوں نہیں پی سکتے؟"

میں نے سوچا کتنے "معتبر" لوگوں کا نام لے کر قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یقیناً اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے میں نے بھی چھوٹے چھوٹے دو گھونٹ لیے۔ مجھے ہم پیالہ دیکھ کر وہ مزید کھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا اور اعضا خاموشی کی زبان بولنے لگے تھے۔ اس کی کلائیوں میں طلائی چوڑیاں تو پہلے بھی کھنک رہی تھیں لیکن اب ان کا آہنگ جدا ہو گیا تھا۔ یہ چوڑیاں اب گنگنانے لگی تھیں۔

پھر اس نے بے باکی سے میرا ہاتھ پکڑا اور چارپائی سے اٹھا دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ رقص کرنا چاہتی ہے اور مجھے اپنا ہم رقص بنانا چاہتی ہے۔ میں ہاتھ چھڑا کر واپس چارپائی پر بیٹھ گیا تو وہ اکیلی ہی محو رقص ہو گئی۔ ساز کے بغیر رقص کو ایسے سمجھا جاتا ہے جیسے ہوا کے بغیر پتنگ اڑانے کی کوشش کی جائے لیکن جو ماہر ہوتے ہیں وہ ہوا کے بغیر بھی اڑا لیتے ہیں۔ سروج بھی "ماہرین" میں سے تھی۔ اگر "ماہرین" میں نہ ہوتی تو انڈین فلم انڈسٹری میں اپنی پہچان کیسے پیدا کرتی۔ وہ اپنی پازیبوں کی چھنا چھن' اپنی ایڑیوں اور چٹکیوں سے ساز کا کام لے رہی تھی۔ اس کا جسم پارے کی طرح مچل رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ لباس اس جسم کی سرکشی کے سامنے بے بس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہانپتی ہوئی آئی اور میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے بازو میرے گلے میں تھے۔ میں نے اس کی مخمور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "سروج! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ عیسیٰ جان میرے بالکل آس پاس کہیں موجود ہے۔ وہ ایک دم سے میرے سامنے آئے گا اور اپنا گریبان پھاڑ کر مجھے اپنے بھائی کی وہ خون آلود قمیص دکھانے لگے گا جو وہ ہر وقت پہنے رہتا ہے۔"

وہ بولی "تمہیں صرف عیسیٰ جان کی خبر رہتی ہے۔ یہ پتا نہیں چلتا کہ کوئی اور بھی تمہارے آس پاس موجود ہے۔ بلکہ بہت ہی پاس موجود ہے۔"

میں نے کہا "سروج! تمہاری بات اور ہے۔ وہ دشمن ہے۔ کسی بھی وقت موت بن سکتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں تم اتنا تر نوالہ نہیں ہو۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم لوہے کے چنے ہو۔" اس نے آخری الفاظ ادا کرتے کرتے' چنے دانت میرے بازو کے گوشت میں گاڑ دیے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور سروج ٹھٹک کر رہ گئی۔ پہلے اس کے چہرے پر مایوسی اور پھر جھلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے "کون ہے؟" میں نے آواز کو نیند سے بوجھل بنا کر پوچھا۔

"خوچہ! آپ کا شاگرد ارجمند ہے...... بقلم خود۔" باہر سے زریں گل کی آواز آئی۔

"ہائے رام۔" سروج نے سینے پر ہاتھ رکھا "یہ کتے کا پلا کہاں سے آ گیا۔"

میں بھی حیران تھا۔ صرف تین ساڑھے تین گھنٹے پہلے زریں گل سے فون پر بات ہوئی تھی۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی یہاں پہنچ جائے گا...... اور پہنچے گا بھی ایسے وقت جب اسے ہرگز نہیں پہنچنا چاہیے۔

سروج دانت پیس رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے بوتل اور گلاس چارپائی کے نیچے رکھے اور لحاف میں گھستے ہوئے بولی "اس حرامی کو جلدی سے دفع کرو یہاں سے۔" میں دروازے کی طرف بڑھا تو لالٹین کی لو بہت مدھم کر دی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ زریں گل کسی بگولے کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ اس کے داخل ہونے میں کچھ اس کی پھرتی کو دخل تھا اور کچھ میری "ڈھیل" کو۔ سروج کا رویہ دیکھنے کے بعد مجھے یہی مناسب لگا تھا کہ زریں گل دخل در معقولات کر ہی دے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ زریں اور سروج کا آمنا سامنا اتنا ہنگامہ خیز ثابت ہو گا۔

اندر داخل ہوتے ہی زریں کی نگاہ لحاف پر پڑی تھی "خوچے' ادھر کون لیٹا ہے؟"

سروج اپنی جگہ خاموش پڑی رہی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ زریں گل آگے بڑھا اور لحاف کا کونا کھینچنے لگا۔ ایک سیکنڈ کے لیے تو سروج نے لحاف نیچے سے تھام کر رکھا پھر جھنجلا کر اس نے لحاف دور پھینک دیا اور بلی کی طرح غراتی ہوئی زریں گل پر جھپٹی۔ زریں اس افتاد کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ الٹ کر پشت کے بل کچے فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا سروج اس کے سینے پر سوار تھی اور طیش کے عالم میں منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نشے نے اس کی حرکات و سکنات میں دلیری بھر دی تھی۔ زریں گل کے منہ سے پہلے توڑی دری آوازیں نکل گئیں۔ پھر اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے سروج کو دیکھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سروج کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے تھامیں اور زور لگا کر اپنے اوپر سے گرا دیا۔ قریب ہی پانی کا زنگی جگ رکھا تھا۔ سروج نے جگ اٹھایا اور بے دریغ زریں کے سر پر توڑنا چاہا۔ زریں نے تیزی سے جھک کر یہ وار بچایا۔ جگ دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہوا۔ زریں تڑپ کر کونے کی طرف گیا۔ بالکل آخری وقت پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رائفل پکڑنے جا رہا ہے۔ یہ وہی رائفل تھی جو میں نے ملک عظیم کے ایک ساتھی سے حاصل کی تھی اور آج کل میرے استعمال میں تھی۔ جونہی زریں نے رائفل پکڑی' سروج کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں جانتا تھا کہ

رائفل "ان لوڈ" ہے۔ مجھے گولی چلانے کا خطرہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ خطرہ موجود تھا کہ کہیں سروج کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر رائفل تھامی اور زریں کو ڈانٹا کہ وہ ذرا اپنے حواس میں آئے۔

سروج کا مُکا لگنے سے زریں کے منہ پر چوٹ آئی تھی اور ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ ایک دم آگ بگولا ہو رہا تھا۔ گرج کر بولا "آپ سامنے سے ہٹ جائیں استاد صیب! اگر پٹھان بچہ عورت سے مار کھائے تو وہ پٹھان ہی نہیں ہوتا۔ ام ابھی اس حرامی عورت کا ٹانگیں چیر کر پھینکتا ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ' آپ پیچھے ہٹ جائیں۔"

میں ان کے درمیان آگیا تھا لہٰذا سروج کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔ وہ سنبھل کر بولی۔

"ہاں چلانے دو اسے گولی۔ میں بھی دیکھوں کتنی شکتی ہے اس کے ہاتھوں میں۔"

زریں چیخا "تو بدکار عورت ہے اور جو بدکار ہوتا ہے اس کے سینے میں گیدڑ کا دل ہوتا ہے۔ اب تو اپنی پلید زبان چلا رہی ہے تو اس لیے کہ استاد صیب تیرے سامنے کھڑا ہے۔"

"حرام کے جنے! تو نے کیا بدکاری دیکھی ہے مجھ میں۔" سروج حلق کے بل چیخی۔

"اور یہاں رات کے اس پہر تُو استاد صیب کے کمرے میں چرخہ کات رہی ہے؟ کتے کی بچی! تیرے تو منہ پر حرام لکھا ہوا ہے۔"

یہ ہنگامہ سن کر ڈیرے کے کئی مکین کمرے سے باہر جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب سیاہ پوش کے چیلے تھے۔ ان میں ایک عورت بھی نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے سائیں عالی کی جھلک دیکھی وہ "حق ہو" کا نعرہ لگا کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر سروج کو حوصلہ ہوا۔ تاہم اس کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان رک گئی۔ زریں گل بھی نجانے کیوں ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ سائیں عالی' اپنی چیلی سروج کی حمایت میں زریں کو ڈانٹے ڈپٹے گا یا حسب معمول کوئی الٹی سیدھی حرکت کر کے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے گا' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سائیں عالی نے صرف ایک بار زریں کو گھور کر دیکھا' پھر آنکھوں آنکھوں میں سروج کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر چلی گئی تو سائیں بھی باہر نکل گیا۔ سائیں کے تاثرات دیکھ کر سب لوگ دائیں بائیں ہو گئے اور پھر سے اپنے نیم گرم بستروں میں جا گھسے۔ یقیناً اس ہنگامے ہی کی وجہ سے چوہدری بخت کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ قریبی کمرے سے اس کی "ہائے ہائے" مسلسل سنائی دینے لگی تھی۔ گاہے گاہے اس کے منہ سے "ہائے ربا" بھی نکل جاتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تکلیف میں بڑے بڑے فرعونوں کو خدا یاد آجاتا ہے۔ چوہدری کا زخم روز بہ روز خراب ہوتا جا رہا تھا اور مسلسل بخار چوبیس گھنٹے اس کی ہڈیاں توڑ رہا تھا۔ یہ سب اس کے "علاج" کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ چوہدری کے حوالے سے ایک عجیب سی بے رحمی میرے دل و دماغ میں بھر گئی تھی۔ میں اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور زریں گل کمرے میں تنہا رہ گئے۔ ہمارے چاروں طرف شیشے کے جگ کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ زریں گل ابھی تک مشتعل تھا لیکن اب چونکہ سروج سامنے سے ہٹ گئی تھی' زریں کے لیے اپنے اشتعال پر قابو پانا آسان ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "او تے لکڑی کے باندر! یہ تُو نے کیا کیا۔ نہ تو دیکھتا ہے نہ تاڑ۔ بس جوئے بازی کا پیچ ڈال لیتا ہے اپنی اس ماسی سے.... کسی دن تم دونوں میں سے ایک ضرور مقتول کا رتبہ پائے گا۔"

زریں گل کراہا "بس استاد صیب! ام سے اس کسبی عورت کا شکل برداشت نہیں ہوتا۔"

"تو تم سے کس نے کہا ہے برداشت کرنے کو۔ کیوں تمہاری جان ہر وقت آفت میں آئی رہتی ہے؟ اب یہ دیکھو دو بجے ہیں رات کے.... اور تم لاہور سے سرپٹ بھاگتے یہاں پہنچ گئے ہو اور آتے ہی سارا کام چوپٹ کر دیا ہے۔"

"چوپٹ کر دیا ہے؟ کیا مطلب؟" زریں حیران رہ گیا "ام کو تو یہ خوش فہمی رہا ہے ہمیشہ کہ وہ الو کا پٹھا آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور آپ اسے منہ نہیں لگاتا ہے۔ اب آپ کوئی اور بات کر رہا ہے۔"

"نسوار کھا کھا کر تمہاری سمجھ دانی کا بھٹا بیٹھ گیا ہے۔ ہر بات کا الٹا مطلب لیتے ہو۔"

"ام اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔"

میں نے مختصر الفاظ میں زریں گل کو سمجھایا کہ سروج اس وقت میرے کمرے میں کیوں موجود تھی اور میں اس سے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس گفتگو کا ذکر بھی کیا جو چند روز پہلے میرے اور سروج کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں سروج نے انکشاف کیا تھا کہ وہ شاہین کے قاتل عیسیٰ جان کے بارے میں اہم معلومات رکھتی ہے۔

زریں گل کی آنکھیں گول گول گھومنے لگیں۔ وہ بولا "استاد صیب! امارا بھی یہی خیال ہے کہ امارے گلگت جانے کے بعد سائیں عالی اور وہ الو کا پٹھا.... عیسیٰ جان کے چکر میں ہی گھومتا رہا ہے اور کچھ نہ کچھ اس کے بارے میں جانتا ہو گا۔"

"لیکن تم نے یہاں آکر اور سروج سے ہاتھا پائی کر کے سارا کام چوپٹ کر دیا ہے۔ جی چاہتا ہے ہنکا توڑ دوں تمہارا۔"

زریں گل کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا "استاد صیب! امارا خیال ہے کہ اب آپ کو اس کتیا کی چاپلوسی

کا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھیں کھڑے کھڑے اس پر دس دفعہ لعنت ارسال فرمائیں۔ بالکل جیسے فلم سوسائٹی گرل میں غلام محی الدین صاحب نے سائیڈ ہیروئن پر ارسال فرمایا تھا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

زریں گل بولا "آپ نے ام سے ابھی تک اس اطلاع کے بارے میں نہیں پوچھا جو ام آپ کو دینے کے لیے یہاں سرپٹ بھاگا آیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تمہاری اطلاع کا.... عیسیٰ جان سے کیا تعلق؟"

"بے حد گہرا تعلق ہے جناب۔" زریں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

دبا دبا جوش زریں کے پورے جسم میں لہریں لے رہا تھا۔ وہ سرگوشی کرنے والے انداز میں میری طرف جھک گیا۔ اس کے ہونٹوں سے جو بات نکلی' وہ میرے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوئی۔ میں اپنی جگہ سن کھڑا رہ گیا۔

زریں گل نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا "استاد صیب! آپ کو مبارک ہو۔ عیسیٰ جان کا سراغ لگ گیا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کہاں لگا ہے سراغ؟"

"استاد صیب! آپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ کو امارا بات پر یقین نہیں آیا۔ ام سچ کہہ رہا ہے۔ سو فیصد سچ۔"

"لیکن کچھ بتاؤ بھی نا.... کہاں ہے وہ حرام زادہ؟" مجھے اپنی آواز لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

زریں گل بولا "وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے جناب! اسے گوجرانوالہ کے قریب دیکھا گیا ہے۔ گوجرانوالہ سے پسرور کی طرف آئیں تو کچھ فاصلے پر ایک گاؤں "تتلی والا" آتا ہے۔ یہاں ایک پٹرول پمپ بھی ہے۔ اس پٹرول پمپ کے پاس سے عیسیٰ کو دو تین دفعہ گزرتے دیکھا گیا ہے۔"

"دیکھا کس نے ہے؟"

"پولیس کے ایک مخبر نے۔ اس نے گوجرانوالہ کے ایس پی کو اطلاع دیا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایس پی سے امارے ساہی صیب کو پتا چلا ہے۔"

"مجھے پوری بات بتا یار۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

زریں گل منہ میں نسوار کا چٹکا رکھ کر بولا "آپ کو پتا ہی ہے پولیس کا مخبر اکثر جگہ موجود ہوتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایس پی صیب کا ایک مخبر "تانی والا" گاؤں کے پاس پٹرول پمپ پر موجود ہے۔ یہ شخص چار پانچ سال سے وہاں کام کر رہا ہے اور بہت بھروسے کا آدمی ہے۔ اس کا دونوں پاؤں گھٹنوں کے اوپر سے کٹا ہوا ہے۔ یہ پمپ پر جو گاڑیاں تیل بھروانے آتا ہے یہ ان پر کپڑا پھیرا مارتا ہے۔ اگر کوئی اپنی خوشی سے روپیہ دو روپیہ دے تو لے لیتا ہے۔ اس کا اصل کام پولیس کا مخبری ہے۔ خو سچ! اس شخص نے پچھلے دس دن میں کم از کم تین بار عیسیٰ جان کو دیکھا ہے۔ تینوں دفعہ وہ ایک سفید کار میں سوار تھا۔ پہلی دفعہ تو مخبر امانت علی خاں کو شک گزرا کہ وہ عیسیٰ جان تھا لیکن دو ہی روز بعد یہ شک یقین میں بدل گیا۔ اس مرتبہ بارش اور کیچڑ کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم تھا۔ امانت علی خاں نے بڑے دھیان سے اور تسلی سے عیسیٰ کو دیکھا اور پہچانا۔ اس کے سر کے بال' داڑھی اور مونچھوں کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے سر پر پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور کالے شیشوں والا عینک بھی لگا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنا حلیہ بدلنے کا کوشش کیا ہے۔ مخبر امانت علی نے عیسیٰ کو اس کے ہاتھ کے ایک پرانے زخم کی وجہ سے پہچانا۔ گاڑی کا نمبر لاہور کا تھا۔ مخبر امانت علی نے مقامی ایس ایچ او کو اطلاع دیا اور ایس ایچ او نے گوجرانوالہ کے ایس پی صیب کو اطلاع دیا۔ ایس پی صیب نے کہا کہ یہ بڑا اہم خبر ہے۔ اس کا اچھی طرح تصدیق ہونا چاہیے۔ انہوں نے سادہ لباس میں دو اے ایس آئی بھی پٹرول پمپ پر لگا دیا۔ اس دوران میں گاڑی کا نمبر بھی چیک کرایا گیا۔ دفتر والوں نے بتایا کہ یہ نمبر جعلی ہے۔ چوتھے یا پانچویں روز عیسیٰ جان ایک بار پھر اس گاڑی میں سڑک سے گزرا۔ سفید پوش پولیس والوں نے ایک پک اپ میں اس کا پیچھا کیا۔ بدقسمتی کا بات یہ ہوا کہ دو تین میل پسرور کی طرف جانے کے بعد پک اپ کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور عیسیٰ جان والا گاڑی غائب ہو گیا.... اس معاملے میں ساہی صیب ذاتی دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ عیسیٰ جان کو آپ کے ساتھ اور امارے ساتھ پرانا دشمنی ہے۔ انہوں نے لاہور سے ایک پولیس افسر کو اسپیشل طور پر ادھر گوجرانوالہ بھیجا ہے اور وہ سادہ لباس میں پٹرول پمپ پر موجود ہے۔ ام کو پکا یقین ہے کہ ایک آدھ دن میں عیسیٰ جان پکڑا جائے گا۔"

زریں گل کی اطلاع اہم اور سنسنی خیز تھی لیکن ابھی مجھے پوری طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے زریں گل سے پوچھا "جس مخبر کا تم ذکر کر رہے ہو وہ عیسیٰ کو کیسے پہچانتا ہے؟"

"ام نے آپ کو بتایا ہے نا کہ وہ بہت بھروسے کا بندہ ہے۔ وہ سرحد پولیس میں انسپکٹر کے طور پر بھی کام کر چکا ہے۔ عیسیٰ جان کو اور زورے مشت کے اور کئی ڈاکو لوگوں کو وہ شکل سے پہچانتا ہے۔ خاص طور سے عیسیٰ جان کے ساتھ تو اس کا کئی دفعہ مڈھ بھیڑ ہو چکا ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں نئی بات آئی۔ زریں گل اطلاع دے رہا تھا کہ عیسیٰ جان گوجرانوالہ کے آس پاس کہیں موجود ہے۔ ہم بھی گوجرانوالہ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ کیمپ میں' سائیں عالی اور

سوئج رفیو بھی گوجرانوالہ کے مضافات میں پائے جاتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سائیں عالی اور سوئج بھی صینی کے ہی چکر میں یہاں موجود ہوں۔ یقیناً..... یہی بات تھی۔ تبھی تو سوئج نے اشارہ دیا تھا کہ وہ صینی کے متعلق بہت کچھ جانتی ہے۔

میں نے زریں سے پوچھا "تمہیں ٹھیک ٹھیک پتا ہے کہ وہ پٹرول پمپ کہاں ہے؟"

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے استاد صیب..... ام "تالی والا" گلرس کا پوچھ لے گا تو زور بخود وہاں پہنچ جائے گا۔ گوجرانوالہ سے چار پانچ میل آگے نکل کر ہے وہ گاؤں۔"

ایکا ایکی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ رات ایک پہاڑ بن گئی ہے اور مجھے اپنی جان پر بہت سے عذاب جھیل کر اس پہاڑ کو عبور کرنا ہے..... میرے جسم کا ایک ایک رواں صبح کا منتظر ہوگیا تھا۔ میں جلد از جلد اس مقام تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں صینی جان کے لیے گھات لگائی گئی تھی۔ صینی جان' جس کے خون کی پیاس میرے جسم میں کسی صحرا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں اس کی سفاک آنکھوں میں جھانکنے کے لیے بے تاب ہوگئیں اور میرے ہاتھ اس کی گردن تک پہنچنے کے لیے تڑپ اٹھے۔ وہ سارے زخم تازہ ہوگئے۔ جو صینی جان کے حوالے سے میرے جسے پر لگے تھے اور جن کی چبھن میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کرپاتا تھا۔ حیدر قابر کے اس مکان میں گونجنے والی وہ چیخیں میری سماعت سے ٹکرائیں جو نواب زادی شاہین کے حلق سے برآمد ہوئی تھیں۔ نواب زادی کا لہو لہو نیم برہنہ جسم میری نگاہوں میں بجلی کی طرح چمکا۔ پھر اس اسپتال کا منظر میرے پردہ تصور کو جلانے لگا جہاں نواب زادی نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ آخری باتیں کی تھیں اور آخری بار مجھے چھوا تھا..... "کیا تم مجھے رلس بنا سکتے ہو شاہ جہاں!" اس کی گمشدہ آواز آخری التجا بن کر میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میرا سینہ جلنے لگا۔

زریں گل بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا دوست اور غم خوار تھا۔ میرے دلی جذبات سمجھتا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! امارا دل چاہتا تھا کہ ام اُڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائے' بلکہ آپ کے پاس بھی نہ پہنچے' سیدھا اس خنزیر کے بچے صینی جان کے پاس پہنچے جس نے نواب زادی شاہین کا جان لیا اور آپ کو نہ بھولنے والا دکھ دیا۔ ام سوئی دھار کی چھری سے اس کا سر کاٹنا چاہتا ہے اور آپ کے قدموں میں ڈالنا چاہتا ہے۔ ام اپنے دل کا بات کہتا ہے استاد صیب! صینی جان کو قتل کرنے کے لیے امارا جان ہر وقت ہتھیلی پر رکھا ہوا ہے۔"

○☆○

علی الصباح میں اور زریں گل اس پٹرول پمپ کی تلاش میں نکلے جہاں بقول زریں گل' ساہی صاحب کا ایک زرخرید رائکٹ موجود تھا اور صینی جان کا انتظار کررہا تھا۔ ہم پہلے بس کے ذریعے گوجرانوالہ پہنچے پھر وہاں سے ٹیکسی لے کر تالی والا کی طرف آگئے۔ گاؤں اور پٹرول پمپ تلاش کرنے میں ہمیں مطلق دشواری نہیں ہوئی۔ پٹرول پمپ پر پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہاں سادہ لباس میں کم از کم تین پولیس اہلکار موجود ہیں اور وہ مسلح ہیں۔ پولیس والوں کے افسر کو بھی میں نے پہچان لیا۔ وہ میرا جانا پہچانا چہرہ تھا۔ بہت دن اس شخص سے دور رہ کر بھی میں اسے بھولا نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ وہ چوہدری ٹائپ پولیس افسر ایس پی برکت تھا۔ سر پر تیل لگانے والا' مونچھوں کو دیسی گھی کا تاؤ دینے والا اور بات بات پر گالی نکالنے والا۔ میں اسے کبھی کبھی بے تکلفی کے ساتھ برکت چاچا بھی کہتا تھا۔ ایس پی برکت کے ساتھ میری آخری ملاقات سری لنکا میں ہوئی تھی اور یہ بڑی روکھی پھیکی مختصر سی ملاقات تھی۔ ایس پی برکت نے مجھے دور ہی سے پہچان لیا اور پہچانتے ہی اس کی تیوریوں پر بل پڑگئے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے میں اور مصیبت ساتھ ساتھ ہی آتے ہیں۔ بہرحال یہ بات بھی اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ میں ساہی صاحب کے بہت قریب ہوں اور ان سے ہر بات منوا لیتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے دبا ہوا رہتا تھا۔

علیک سلیک کے بعد ایس پی برکت نے پوچھا کہ میں کیوں اور کیسے وارد ہوا ہوں۔

میں نے کہا "میری وجہ نزول بھی وہی ہے جو آپ جناب کی ہے۔"

وہ بولا "یار! جلیبی جیسی گول بات مت کیا کر۔ میرے بھوتنی دے کان ترس گئے ہیں تیری سیدھی بات سننے کو۔"

میں نے زبردستی مسکرا کر کہا "سیدھی بات یہ ہے کہ صینی جان کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"کیا معلوم کرنا ہے؟"

"جو کچھ آپ کو اب تک معلوم ہوا ہے۔"

وہ بیزاری سے بولا "جتنا تمہیں معلوم ہے اس سے کم ہمیں معلوم ہے۔ چار دن ہوگئے ہیں یہاں جھک مارتے ہوئے مرد "کیے" کھاتے ہوئے۔ وہ بس کار نہ نظر آیا ہے اور نہ اس کا کوئی اتا پتا ملا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے شیشے کے اس کمرے میں آگئے جو دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایس پی برکت نے پٹرول پمپ کے مالک کو اشارہ کردیا تھا۔ وہ ہمیں تنہائی فراہم کرنے کے لیے فوراً باہر نکل گیا تھا۔ ایس پی برکت نے پچھلے چار دنوں کی کارروائی کا احوال بتایا۔ معلوم ہوا کہ چوبیس گھنٹے مسلسل نگرانی کی جارہی ہے لیکن مطلوبہ کار یہاں سے نہیں گزری۔ کار کا تعاقب کرنے کے لیے ایک موٹر سائیکل اور ایک کار بالکل تیار حالت میں یہاں موجود تھی۔

میں نے ایس پی برکت کو مشورہ دیا کہ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کے بجائے کیوں نہ گھوم پھر کر بھی مطلوبہ کار ڈھونڈی جائے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے کہ اردگرد کے دیہات اور ڈیروں وغیرہ پر دیکھا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ کار کا کھوج لگ جائے۔ دو تین یہاں پٹرول پمپ پر رہیں باقی گھوم پھر کر تلاش کریں۔"

بات ایس پی برکت کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے خود بھی یہی بات سوچی ہو لیکن وہ فطری طور پر ذرا حرام تھا۔ نیلند میں نکل کر کام کرنا اس کے لیے موت تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ایک ہی جگہ بیٹھ کر حکم چلاتا رہے۔ کہنے لگا "ربھو شاہ جہاں! میں نے تو وہی کرنا ہے جو اوپر سے آرڈر ہوا ہے۔ اب میں پٹرول پمپ چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگوں اور وہ بھوتنی دا صینی جان پھر نظر آکر غائب ہو جائے تو....."

میں نے کہا "آپ یہاں سے کیوں جاتے ہیں؟ آپ یہیں رہیں۔ بس ایک گاڑی کا انتظام کردیں اور دو کانسٹیبلوں کو یہاں سے فارغ کردیں۔ میں ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ ہم چپا چپا چھان ماریں گے۔"

"اور پٹرول کون بھروائے گا؟"

"یعنی..... اس کا مطلب ہے کہ گاڑی کا انتظام ہو جائے گا۔"

وہ بولا "ہاں..... یہ بس کار ہر کس مرض کی دوا ہے؟"

"کون بس کار؟"

"یہی پٹرول پمپ والا۔ اس کے پاس پرانے ماڈل کی ٹویوٹا گاڑی ہے۔ وہ ماں یہاں کھڑی کیا کررہی ہے..... وہ لے جاؤ۔"

"تو بس ٹھیک ہے جی۔ پٹرول پمپ والا گاڑی دے گا تو پٹرول کیوں نہ دے گا۔ اس نے کون سا خرید کر دینا ہے۔"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔" ایس پی برکت نے کہا "بھوتنی دا دس لیٹر کے آٹھ لیٹر ڈالتا ہے اور وہ بھی ملاوٹی۔ ٹھیک ہے تم گاڑی لے جاؤ اور پٹرول بھی ڈلوا لو اسی سے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد میں اور زریں گل دو کانسٹیبلوں کے ساتھ پٹرول پمپ سے روانہ ہورہے تھے۔ دونوں کانسٹیبل سادہ لباس میں تھے تاہم مسلح تھے۔ میرے پاس بھی ریوالور موجود تھا۔ ہم نے علاقے میں گھومنا شروع کردیا۔ بظاہر ہم بے مقصد چکرا رہے تھے لیکن ہماری نگاہیں بڑی بے تابی سے مطلوبہ سفید کار کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہم کئی زمین داروں سے ملے۔ کئی ڈیروں پر گئے۔ چار پانچ دیہات میں بھی گشت کیا لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ علاقے میں کئی سفید گاڑیاں موجود تھیں' ان میں ایک کرونا گاڑی بھی تھی لیکن اس کا ماڈل اور نمبر وہ نہیں تھا جو مخبر امانت علی نے بتایا تھا۔ ہم اندھیرا پھیلنے پر پٹرول پمپ واپس آگئے۔

وہ رات میں نے پٹرول پمپ پر ہی گزاری۔ اگلے روز ہم نے اپنا مشن جاری رکھا۔ اس مرتبہ ہم پسرور سائیڈ کی طرف نکل گئے اور "ستراہ" نامی قصبے تک گھوم کر واپس آئے۔ شام تک ہم تھک کر چور ہوچکے تھے اور ایک طرح کی مایوسی غالب آرہی تھی۔ دوسری طرف پٹرول پمپ پر بھی ایس پی برکت نے سوائے بوتلیں پینے' مرغیاں پھاڑنے اور لوگوں کو گھورنے کے کچھ نہیں کیا تھا۔

اتنی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا نظر آرہا تھا یا جتنا زریں گل نے سمجھا تھا۔ بے شک وہ کار اس سے پہلے دو تین دفعہ پٹرول پمپ کے سامنے سے گزری تھی لیکن کیا پتا تھا کہ اب وہ کہاں ہے۔ ہم اسے یہاں ڈھونڈ رہے تھے' ممکن تھا کہ وہ کہیں راولپنڈی میں یا ملتان میں گھوم رہی ہو' یا کراچی کے کسی گیراج میں کھڑی ہو۔

تیسرے روز میں نے زریں گل سے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے مطابق زریں گل تو وہیں پٹرول پمپ پر ایس پی برکت کے ساتھ رہا جب کہ میں قلندر سیاہ پوش کے ڈیرے پر واپس آگیا۔ یہاں سائیں عالی' سوئج اور چوہدری بخت وغیرہ شدت سے میرے منتظر تھے۔ زیادہ انتظار چوہدری بخت کو تھا۔ اس کی حالت روز بہ روز بگڑتی جارہی تھی۔ زخم خراب ہوگیا تھا اور اسے مسلسل بخار رہنے لگا تھا۔ یہ بات چوہدری بخت بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کی اپنی دوا ساز فیکٹری کے بنے ہوئے انجکشن ہی اس کا ستیاناس کر رہے ہیں۔

جب میں چوہدری کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ بخار سے سرخ ہورہا تھا اور اس کی "ہائے ہائے" پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے نفرت اور غصے کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ شاید اس کے بس میں ہوتا تو وہ اچھل کر مجھ سے چمٹ جاتا اور مجھے گلیوں اور سڑکوں پر گھسیٹتا ہوا اپنی لال کوٹھی میں لے جاتا۔ پھر وہاں کوئی تاریک تہہ خانہ میرے لیے عقوبت خانہ بن جاتا۔ میرے جسم کے ہر ہر مسام سے علیحدہ علیحدہ جان نکالی جاتی اور میرے ٹکڑے جنگلی جانوروں کی "دعوتِ شیراز" کے لیے ویرانے میں پھینک دیے جاتے لیکن یہ سب کچھ چوہدری کے بس میں نہیں تھا۔ وہ تو اپنی مرضی سے اٹھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا پیشاب پاخانہ سب کچھ بستر پر ہی ہوتا تھا۔ وہ مجھے صرف خونی نظروں سے دیکھ سکتا تھا اور دانت کچکچا سکتا تھا۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔ مجھے توقع تھی کہ..... وہ حسب معمول گالیاں بکنے لگے گا اور مجھے عبرت ناک انجام کی دھمکیاں دینے لگے گا لیکن اچانک وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ اور آنکھوں کی سرخی بھی اوجھل ہوگئی۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا اور پہلی بار نرم لہجے میں بولا "شاہ جہاں! تم کیوں کررہے ہو یہ سب کچھ؟"

"میں کچھ بھی نہیں کررہا۔ بس تمہارا علاج کررہا ہوں..... لیکن تمہیں یہ کیا ہوگیا ہے۔ تم تو گالی کے سوا بات نہیں کرتے ہو۔

یہ بکری کی طرح کیوں منمنا رہے ہو۔"

چوہدری کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "میں بہت تکلیف میں ہوں شاہ جہاں! ایک تڑپتے ہوئے بیمار شخص کے ساتھ تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔"

"اپنی بیماری اور تڑپ کا بہت خیال ہے تمہیں۔"

"یہ طنز کرنے کا وقت نہیں ہے شاہ جہاں۔ میری حالت بہت خراب ہے۔۔۔ مم۔۔۔۔ میری جان بھی جا سکتی ہے۔"

جان کسی کی بھی ہو جان ہوتی ہے۔ تمہیں ان سینکڑوں ہزاروں جانوں کا خیال کیوں نہ آیا جنہوں نے تمہاری وجہ سے اذیت جھیلی اور موت کا چہرہ دیکھا۔ وہ سب لوگ بھی تو بیمار تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ وہ تمہارے زہر کو دوا سمجھ کر خریدتے رہے اور شفا سمجھ کر پیتے رہے۔ کتنا زہرناک دھوکا کیا تم نے ان سے۔"

چوہدری بری طرح کراہ رہا تھا اور اپنا سینہ مسل رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بالکل سیاہ ہو چکے تھے اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ ہائے ہائے کرتے ہوئے بولا "پرانی باتیں مت چھیڑو شاہ جہاں! جو ہو گیا سو ہو گیا۔ مجھے اب خود بھی۔۔۔۔ افسوس ہو رہا ہے۔"

"صرف افسوس۔" میں نے حیرت سے کہا "تمہیں تو اپنے ہی پسینے میں ڈوب مرنا چاہیے۔ چوہدری بخت۔۔۔ تم نے ناقابلِ معافی جرم کیا ہے۔ قانون تمہیں دس بار بھی پھانسی دے تو کم ہو گا لیکن میں تمہیں قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں تم بڑی پہنچ والے ہو۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں تمہارے۔۔۔ میں یہیں تمہارا "علاج" کروں گا۔ زندگی یا موت۔۔۔۔ جو کچھ بھی تمہارے مقدر میں ہوا تمہیں یہیں ملے گا۔"

چوہدری کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ایک دم اس کے اندر کا پُرغرور انسان ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپے اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "میں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ تم۔۔۔۔ جو ہرجانہ کہو میں دینے کو تیار ہوں۔ دس لاکھ' پندرہ لاکھ' بیس لاکھ۔ اس کے بعد میں قانون کا سامنا بھی کروں گا لیکن اب۔۔۔ اب یہ تکلیف مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے شہر کے اسپتال لے چلو۔ مجھے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو!؟"

"پھر مجھے جان سے مار دو۔ زہر کی گولی دے دو یا پستول کا فائر مار دو۔ میں اب اور نہیں برداشت کر سکتا۔"

میں نے کہا "چوہدری! میں نے تمہیں لوگوں کو ذلت آمیز سزائیں دیتے دیکھا ہے۔ بستر سے ان کی کھال اُدھڑتے دیکھا ہے۔ تمہاری لال کوٹھی کے دہشت خانے دیکھے ہیں جہاں بندے کے لیے زندگی موت سے بھی زیادہ مشکل اور خوفناک بنا دی جاتی ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم خود بھی کوئی بہت خوفناک قسم کی چیز ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم کسی کمی کمین کی طرح گڑگڑا رہے ہو۔ یہ سب کچھ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے چوہدری بخت۔ شیر ہو اگر جو ہر سو ہمیں صلواتیں سناؤ۔"

چوہدری کا چہرہ ایک بار پھر خون کے دباؤ سے سرخ ہونے لگا۔ آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ بس ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ وہ بے بسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ نہ بول سکتا تھا' نہ چپ رہ سکتا تھا۔ پھر ایک دم نجانے اسے کیا ہوا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور مجھ پر چیخنے لگا "دفع ہو جاؤ۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔" اس نے اپنا سر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ میں چوہدری کو اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میرے پاس چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ یہ بہت اہم ٹیپ ریکارڈر تھا۔ میں نے اسے تالا بند الماری میں رکھ دیا۔ شام کے وقت میں نے دیکھا' سروج اپنے گرو سائیں عالی کے ساتھ ایک حجرہ نما کمرے میں موجود تھی۔ ڈیرے کے تمام کمروں کی طرح یہ حجرہ بھی خوب صاف ستھرا اور لیپا پوتا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ڈیرا آباد ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ سائیں عالی چت لیٹا تھا' سروج اس کی مٹھی چاپی کر رہی تھی۔ سائیں کی گندی غلیظ پنڈلیوں پر دھرے ہوئے سروج کے موم جیسے خوب صورت ہاتھ زبردست تضاد پیش کر رہے تھے۔ وہ ٹانگیں دباتے ہوئے آگے پیچھے حرکت کرتی تھی تو لگتا تھا' یہ بھی کسی رقص کا انداز ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا' سائیں عالی کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ یہ شعلہ صفت لڑکی دن رات اس کے ساتھ رہتی ہے۔ کبھی کبھی راتوں کی تنہائی میں بھی دو اکیلے ہوتے ہیں۔ وہ اس کی جوتیں نکالتی ہے' اس کے جسم کی مالش کرتی ہے' اس کا سر دباتی ہے لیکن وہ اس سے اتنا ہی دور ہے جتنا مشرق سے مغرب۔ یقیناً یہ عجیب بات تھی لیکن غور کیا جاتا تو کچھ ایسی عجیب بھی نہیں تھی۔ یہ ملنگ اور درویش قسم کے لوگ کبھی کبھی اپنے من کو اتنا مار لیتے ہیں کہ پھر ان کے اندر کسی طرح کی خواہش ہی باقی نہیں رہتی۔ کام و دہن کی لذت ہو یا عورت کا قرب' دولت کا معاملہ ہو یا آرام و آسائش کی راحت' کوئی شے بھی انہیں متاثر نہیں کرتی۔

سائیں اور سروج کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے ڈیرے پر واپس آئے قریباً چوبیس گھنٹے ہو چلے تھے۔ سروج نے ابھی تک مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ درحقیقت وہ اکڑ دکھا رہی تھی۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہ عیسیٰ جان کے بارے میں اہم باتیں جانتی ہے۔ اب اسے توقع تھی کہ میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہوں گا اور خوشامد وغیرہ کر کے اس سے عیسیٰ کے بارے میں پوچھوں گا۔ اگر میں ایسا کرتا تو یقیناً سروج کا پلڑا بھاری ہو جاتا اور وہ مجھ سے اپنی مرضی کی "شرطیں" منوا لیتی۔۔۔۔ وہ شرطیں جن کا تعلق رات کے وحشی اندھیرے اور سروج کے مرمریں جسم سے تھا۔

اگر نزویں کل لاہور سے یہاں نہ پہنچا ہوتا اور اس نے مجھے

عیسیٰ جان کے حوالے سے تازہ ترین صورت حال نہ بتائی ہوتی تو شاید مجھے سروج کی خوشامد کا راستہ اختیار کرنا پڑ جاتا لیکن اب میں چند دن انتظار کر سکتا تھا۔ میری یہ توقع ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ "تالی والا" کے ہزول پمپ پر کی جانے والی نگرانی کا مثبت نتیجہ نکلے گا اور عیسیٰ جان کا کھوج لگ جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ سروج اپنی جگہ حیران ہے۔ وہ سوچ رہی ہے کہ میں اتنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہوں۔۔۔ شام سے تھوڑی دیر بعد سروج سائیں کی مٹھی چاپی کر کے فارغ ہوئی اور سیدھی میرے پاس چلی آئی۔ آنچل میرے سامنے بیٹھتے ہی اس کے جسم کے بلاکن زاویے جیسے خود بخود نمایاں ہو جاتے تھے۔ مجھے ٹٹولنے والی نظر سے دیکھ کر بولی "کہاں رہے ہو دو دن؟"

"بس ایک ضروری کام تھا۔"

"وہ کتے کا بچہ ہی کہیں لے کر گیا ہو گا۔" سروج کا اشارہ نزویں کی طرف تھا۔

"وہ انسان کا بچہ ہے' جیسے تم انسان کی بچی ہو لیکن نہ تم میری سمجھ میں آتی ہو اور نہ وہ۔"

"مجھے سمجھنے کی کوشش نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ بس اس جانور کو سمجھتے رہو۔"

میں نے دل میں سوچا کہ تمہیں سمجھنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو ہر کسی کے لیے کھلی کتاب ہو لیکن یہ الفاظ کہیں میری زبان پر آ جاتے تو وہ ایک دم ایٹم بم کی طرح پھٹ پڑتی۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "کیا حال ہے تمہارے سائیں جی کا؟"

"بالکل ٹھیک ہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "ویسے آج کل وہ تم سے بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں تم جو کر رہے ہو اچھا کر رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"سائیں جی کا خیال ہے کہ چوہدری بخت کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا جو کچھ ہو رہا ہے۔ بلکہ وہ تو اس سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔ کل رات وہ نیند میں بڑبڑاتے رہے تھے "چوہدری قاتل ہے۔ اس کی فاتحہ پڑھو۔ اس کا پلاؤ پکاؤ یا بھرا ہے چیں ڈالو' سرمہ بنا کر آنکھوں میں لگاؤ۔"

میں نے کہا "چلو شکر ہے۔ کسی معاملے میں تو میری اور سائیں کی رائے ملی۔"

سروج بولی "کیا واقعی یہ چوہدری جعلی دواؤں کا دھندا کرتا تھا؟"

"کیا تمہیں شبہ ہے؟"

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ اتنا بڑا زمین دار ہو کر ایسا گندا دھندا۔ اسے دھن دولت کی کیا کمی تھی۔"

میں نے کہا "بہت سے لوگوں کو دھن دولت کی کمی نہیں ہوتی لیکن وہ مزید دولت کے لیے گندے دھندے کرتے ہیں۔"

سروج کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ وہ جان گئی تھی کہ میرا اشارہ اس کی طرف ہے لیکن یہ غلط اشارہ نہیں تھا اور سروج بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اچانک چوہدری بخت بلند آواز میں کراہنے لگا۔ اس کی درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز دور تک گونج رہی تھی "ہائے ربا میں مر گیا' ہائے میری لت' اوئے میرا کچھ کرو۔ اوئے خدا کو لوں ڈرو۔"

وہ نیم غنودگی کی حالت میں واویلا کر رہا تھا۔ چیخنے چلانے کے باوجود جب کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تو اس نے ٹانگ مار کر تپائی الٹا دی اور شیشے کا جگ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

میں اور سروج چوہدری کے کمرے میں پہنچے۔ "انفیکشن" کی شدت سے اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہونٹ بالکل سیاہ ہو رہے تھے۔ وہ اپنا سر تکیے پر پٹخ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ میں نے اس

ایم اے راحت
کا ایک خوبصورت ناول
سوکھے گلاب
قیمت -/۱۸۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲۰ روپے
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

نے لیے درد کا انجکشن بھرنا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "اوئے مجھے یہ ٹیکا نہ لگاؤ۔ مجھے کوئی اور ٹیکا لگاؤ۔ اوئے میں درد سے مر جاؤں گا۔"

میں نے کہا "یہ درد کا ہی ٹیکا ہے۔"

"میں نے یہ نہیں لگوانا۔"

"اچھا میں دو لگا رہا ہوں۔"

"تم مجھے ایک ہی لگاؤ لیکن اصلی لگا دو۔"

"یہ بھی اصلی ہے۔ پیکنگ' بوتل' لکھائی سب کچھ اصلی ہے' ذرا سا بھی فرق نہیں ہے۔ کون مائی کا لال کہہ سکتا ہے کہ یہ نقلی ہے۔"

"اوئے خدا کا خوف کرو۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ یا مار دو۔"

میں نے کہا "اس سے زیادہ خدا کا خوف کیا ہو گا۔ بغیر پیسے لیے تمہارا بہترین علاج کر رہے ہیں۔"

میں نے اسے ٹیکا لگا دیا۔ پھر اوپر تلے دو ٹیکے مزید لگا دیے۔ ان تین دو نمبر ٹیکوں کا اثر مشکل سے ایک اصلی ٹیکے کے برابر تھا لیکن یہ ٹیکے چونکہ مسلسل لگ رہے تھے لہٰذا چوہدری بخت پر ان کا اثر بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ تین سوئیاں چبھنے کے باوجود اس کی ٹانگ کے درد میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور وہ بلند آواز سے ہائے واویلا کرتا رہا۔ اس کمرے سے اب بدبو آنے لگی تھی۔ یہ مختلف دواؤں اور پیشاب وغیرہ کی ملی جلی بو تھی۔ یہ لال کوٹھی کا وہ چوہدری تھا جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ موسیقی اور سرو شکار جس کے مشغلے تھے اور زندگی کی رنگینیاں جس کے گرد تتلیوں کی طرح منڈلاتی تھیں۔ جو سلوک اس نے اپنی "ایل پی" کے ساتھ کیا تھا وہی سلوک اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ تو یہ سلوک چپ چاپ برداشت کر گئی تھی لیکن چوہدری آہ و بکا کر رہا تھا۔ شاید ایک اعلیٰ ظرف اور کم ظرف میں یہی فرق ہوتا ہے۔

سچ کہتے ہیں جان ہے تو جہان ہے۔ اس وقت دنیا کی حسین ترین گلوکارہ بھی چوہدری بخت کے روبرو ہوتی تو وہ اس کی طرف سے کراہ کر منہ پھیر لیتا۔ نہ اس کی آواز سنتا نہ اس کی شکل دیکھتا۔ سیر و شکار تو دور کی بات ہے' اپنی سیاست بھی اس کی نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میری معلومات کے مطابق "آج الیکشن کا دن تھا۔ ساوا دن چوہدری کے ذہن میں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آج پولنگ ہو رہی ہے۔ وہ ہزاروں لاکھوں روپیہ جو وہ اپنے الیکشن پر خرچ کر چکا تھا اس کے نزدیک قطعی غیر اہم ہو گیا تھا۔ اپنے آرام اور تندرستی کے سوا ہر چیز اس کے لیے بے معنی تھی۔

اچانک ایک آواز نے مجھے اور سروج کو چونکا دیا۔ یہ کسی کار کے رکنے کی آواز تھی۔ چند لمحے بعد سائیں عالی کی آواز آئی۔ وہ کسی سے اونچے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ سروج صورت حال جاننے کے لیے باہر چلی گئی۔ قریباً ایک منٹ بعد وہ واپس آئی اور سرگوشی میں بولی "ری عورت آئی ہے۔"

"کون؟"

"تم چوہدری کی بیوی بنا رہے تھے۔"

میں ٹھٹک گیا۔ باہر نکل کر دیکھا تو برآمدے میں صفیہ کھڑی تھی۔ اسے ایک طرف سے ریحان اور دوسری طرف سے سیاہ پوش کے چیلے نے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ اب پہلے سے کچھ بہتر نظر آتی تھی۔ آنکھ ابھی تک گہری نیلی تھی لیکن سوجن کچھ کم ہو چکی تھی۔ ناک سے پٹی چپکی ہوئی تھی۔ منڈا ہوا سر' منڈے ہوئے ابرو اور زخم زخم جسم' وہ اب بھی بے بسی کی تصویر تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا "تم یہاں صفیہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں شاہ جہاں۔ میں... مجھے آنا پڑا۔"

"لیکن کیوں۔ تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ تم سفر کرتیں۔"

ریحان بولا "میں نے بھی بہت منع کیا تھا جی۔ لیکن یہ کسی صورت مانی ہی نہیں۔ دو دن مسلسل روتی رہی ہیں۔ مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"یہ سب کیا ہے صفیہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ روتے ہوئے بولی "میں بخت آور کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا "تم کیوں دیکھنا چاہتی ہو اسے؟ کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ کون سا ظلم ہے جو اس نے تم پر نہیں توڑا۔ اپنے پاؤں پر تو چل نہیں سکتی ہو تم...."

وہ بولی "میں کیا کروں۔ میں اپنے دل کا کیا کروں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"واقعی کچھ ہو گیا ہے تمہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا "ورنہ اتنے زخم کھانے کے بعد تمہارے ہونٹوں پر چوہدری کا نام نہ ہوتا۔"

صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس روتی رہی۔ ریحان بڑی محبت سے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کرب ناک آواز میں بولی "پلیز شاہ جہاں مجھے ایک بار اس کے پاس لے چلو۔"

اسی دوران میں اندر سے چوہدری کی "ہائے ہائے" ابھری۔ صفیہ بے چین ہو گئی اور بے اختیار چوہدری کے کمرے کی طرف بڑھی۔ میں نے اسے جانے دیا۔ چوہدری کی حالت دیکھ کر صفیہ کا "بے آواز رونا" باآواز رونے میں بدل گیا۔ چوہدری بھی آبدیدہ نظروں سے صفیہ کو دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ بے بسی' عاجزی اور نقاہت کا مجسمہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات اور آواز میں چوہدراہٹ کی جگہ مسکینی ہی مسکینی بھری تھی۔ اس کے آنسو خاموشی کی زبان میں دہائی دے رہے تھے "صفیہ! اگر مجھے یہاں سے نکال سکتی ہو تو نکال لو۔ اگر میری جان یہاں سے چھڑا سکتی ہو تو چھڑا دو۔"

روتے روتے ایک دم صفیہ کو چکر سا آ گیا۔ وہ لڑکھڑائی۔ ایک طرف سے ریحان نے اور دوسری طرف سے میں نے اسے مضبوطی

سے تھام لیا۔

ہم اسے سہارا دے کر باہر لائے اور ایک قریبی کمرے میں چارپائی پر لٹا دیا۔ گلوکوز والا پانی پینے کے بعد اس کی طبیعت قدرے سنبھلی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ریحان نے اسے اٹھایا اور دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر بٹھا دیا۔ صفیہ نے اپنی بھیگی نگاہیں میری نگاہوں میں گاڑیں اور روندھے ہوئے لہجے میں بولی "شاہ جہاں! اب بس کرو' بہت ہو چکی۔"

میں نے کہا "تم بہت نرم دل ہو۔ اس لیے تھوڑے کو بھی بہت سمجھ رہی ہو۔ یہ بندہ اس قابل نہیں کہ اس کے لیے دل میں تھوڑا سا بھی رحم دکھایا جائے۔"

"میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔" وہ بولی "لیکن میں نہیں چاہتی کہ جو سلوک میرے ساتھ ہوا وہ میری وجہ سے چوہدری کے ساتھ ہو۔"

"لیکن یہ صرف تمہارا ہی مجرم تو نہیں۔ معلوم نہیں کتنے معصوم لوگ اس کے لالچ کی بھینٹ چڑھے ہیں۔"

"میں تمہاری بات دل سے مانتی ہوں" اور یہ جانتی ہوں کہ اگر چوہدری نے جرم کیے ہیں تو اسے قانون کے مطابق ان جرموں کی سزا ملے۔ اس کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ اس سلسلے میں پولیس کارروائی کرے..... مگر تم اس کا قانون اپنے سر نہ لو۔"

ریحان بولا "چھوٹی امی! آپ کی قانون والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ شخص جسے باپ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے قانون کو لال کوٹھی کی لونڈی سمجھتا ہے اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔"

صفیہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ وہ بس آنسو بہاتی چلی جا رہی تھی۔ صفیہ کے دل کی حالت میں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں ایک عورت کا دل تھا۔ وہ دل جس میں محبت ایک بار داخل ہوتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے مجسم ہو جاتی ہے۔ ہزار زخم سہہ کر بھی' ہزار بے وفائیاں جھیل کر بھی یہ محبت دل سے ختم نہیں ہوتی۔ صفیہ چوہدری کی بے وفائیوں اور درندگی کے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی' پھر بھی وہ اس پر ہمیشہ کے لیے لعنت نہیں بھیج سکی تھی۔ اپنے پارہ پارہ جسم کو سمیٹ کر وہ یہاں چلی آئی تھی اور چوہدری کو فوری انجام سے بچانا چاہ رہی تھی۔ وہ حقیقت در ایک وقت چوہدری سے شدید نفرت بھی کر رہی تھی اور اس کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی رکھتی تھی۔

مجھے وہ ٹیپ ریکارڈر یاد آ گیا جو میں نے اپنے کمرے کی تالا بند الماری میں رکھا ہوا تھا۔ یہ بہت اہم ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس میں وہ کیسٹ موجود تھی جس میں میں نے لال کوٹھی کے درندہ صفت چوہدری کا طویل انٹرویو محفوظ کیا تھا۔ اس انٹرویو میں چوہدری نے اپنی دوا ساز فیکٹری اور دوسرے کالے کرتوتوں کے بارے میں ایسے ناقابل تردید ثبوت چھوڑے تھے جن کو جھٹلانا کسی بھی ذی ہوش شخص کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ انٹرویو میں نے چوہدری کو بتا کر نہیں لیا تھا' نہ ہی یہ باقاعدہ انٹرویو کہلا سکتا تھا۔ بس روتے کراہتے چوہدری کی ایک طویل گفتگو تھی جو میں نے وقتاً فوقتاً اس کی بے خبری میں ریکارڈ کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ گفتگو رے راوا فراز تک پہنچ گئی تو کسی کے لمبے سے لمبے ہاتھ بھی چوہدری کو بچا نہیں سکیں گے۔ کچھ نہیں تو "پندرہ بیس سال قید" کا تحفہ تو اسے ضرور مل جائے گا۔

چوہدری بخت کو جان سے مارنا میرا مقصد نہیں تھا۔ شاید صفیہ اس ڈیرے پر نہ بھی آتی تو میں مزید تین چار روز چوہدری کی چیخیں نکلوا کر اسے لاہور کے کسی اچھے اسپتال روانہ کر دیتا۔ اس کی حالت کافی ابتر تھی لیکن اتنی ابتر بھی نہیں تھی کہ مناسب علاج اور دیکھ بھال کے ساتھ اس کی جان نہ بچائی جا سکتی۔

صفیہ کے آ جانے سے چوہدری کو تین چار روز پہلے رہائی مل رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک خوش آئند بات تھی۔ چوہدری نے دیکھ لیا تھا کہ صفیہ تمام تکلیفیں سہنے کے باوجود اور تمام ذلتیں برداشت کرنے کے باوجود اس کے پاس آئی تھی اور اس کی رہائی کے لیے میرے سامنے آنسو بہائے تھے۔ اب اگر چوہدری بخت میں ذرہ بھر بھی انسانیت موجود تھی تو اپنی باقی ماندہ زندگی میں وہ صفیہ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔

وہ رات صفیہ اور ریحان نے قلندر سیاہ پوش کے ڈیرے پر ہی کاٹی۔ اگلے روز میں نے چوہدری بخت کو اس گاڑی میں لٹا دیا جس میں رات کو ریحان اور صفیہ یہاں پہنچے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی۔ میرے ساتھ قلندر سیاہ پوش کا ایک مسلح چیلا بیٹھ گیا۔ قلندر سیاہ پوش کی گاڑی میں صفیہ کو لٹا دیا گیا۔ ریحان بھی اس گاڑی میں موجود تھا۔ قلندر سیاہ پوش کا ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔ یہ ڈرائیور سیاہ پوش کا چیلا بھی تھا۔ سیاہ پوش کے اکثر چیلے اپنے گرو کی طرح ایک بڑا سا رومال اپنے سر پر رکھتے تھے۔ یہ رومال پگڑی کے اوپر سے گزرتا تھا اور چہرے کو دونوں طرف سے ڈھانپ لیتا تھا۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے گھونگھٹ نکال رکھا ہے۔

یہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ڈیرے سے روانہ ہوئیں اور "تالی والا" پہنچ گئیں۔ حسب توقع پٹرول پمپ پر ایس پی برکت اپنے سادہ پوش عملے کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے چوہدری بخت کو ایس پی برکت کے حوالے کیا اور اس کے بارے میں تمام صورت حال اسے بتا دی۔ جعلی دواؤں کے نمونوں کے علاوہ وہ اہم کیسٹ بھی ایس پی برکت کے حوالے کر دی جس میں چوہدری بخت کا کچا چٹھا موجود تھا۔ اس کے بعد میں نے پٹرول پمپ کے ٹیلی فون سے سائیں صاحب سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بتایا کہ ایس پی برکت کے ہاتھ میں کس شخص کو اور کن ثبوتوں کے ساتھ لاہور بھیج رہا ہوں۔ یہ اطلاع سائیں صاحب کے لیے بہت سنسنی خیز تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دو ہفتے میں لال کوٹھی کا یہ چوہدری اخباروں کے ذریعے خاصا

مشہور ہو چکا تھا۔ اخباروں نے چوہدری بخت کے بارے میں جو خبریں اور سرخیاں چھاپی تھیں ان کا مفہوم کچھ اس طرح تھا "حلقہ فلاں فلاں سے صوبائی اسمبلی کے اہم امیدوار چوہدری بخت آور کی فیکٹری کو آگ لگا دی گئی ہے اور انہیں پُراسرار طور پر اغوا کر لیا گیا ہے۔ پولیس جگہ جگہ ان کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔" اس سلسلے میں ملک خدا بخش کے بلاوہ چوہدری کے ایک مخالف امیدوار کے خلاف بھی پرچہ کاٹا گیا تھا۔ کئی افراد کی گرفتاری بھی عمل میں آ چکی تھی۔

چوہدری بخت کے بارے میں جان کر ساہی صاحب کا جذباتی ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ اس بارے میں پوری تفصیل جاننے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ میں چوہدری کے ساتھ ہی لاہور پہنچوں۔ میں نے ساہی صاحب کو یقین دلایا کہ ایک دو دن میں لاہور پہنچ جاؤں گا اور اگر کسی وجہ سے نہ بھی پہنچ سکا تو بذریعہ فون انہیں مکمل حالات سے آگاہ کروں گا۔

ساہی صاحب جانتے تھے کہ میں عیسٰی جان کے پیچھے ہوں اور عیسٰی جان کا کھوج لگنا میرے لیے باقی ہر کام سے زیادہ اہم ہو چکا ہے۔ میری مجبوری سمجھتے ہوئے انہوں نے میرے فوراً لاہور آنے پر زیادہ زور نہیں دیا۔ ساہی صاحب سے گفتگو مکمل کرنے کے بعد میں نے ڈبلیو ایس پی برکت کو تھما دیا تاکہ وہ ساہی صاحب سے براہِ راست بات کر سکے۔

زریں گل بھی پچھلے ۲۴ گھنٹے سے پٹرول پمپ پر ہی تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! یہ ایس پی برکت تو بہت خطرناک افسر ہے۔ ہر بندے پر رعب جماتا ہے اور جو اس کے رعب میں نہ آئے اسے پانچ پانچ گالیاں دیتا ہے۔ خوچے ام کو تو اس سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"تم تو کہتے ہو تم کسی سے نہیں ڈرتے۔"

"خوچے ام ایس پی برکت سے نہیں ڈرتا۔ ام اپنے الٹے کھوڑے سے ڈرتا ہے۔ اگر ایس پی نے ام کو گالی دے دیا تو ام تو کبھی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ امارا ہاتھ اپنے آپ اٹھ جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ بہت برا ہو گا۔ وہ مارا جائے گا یا ام شہادت کا رتبہ پائے گا۔"

میں نے کہا "بات تو تمہاری ٹھیک ہی ہے۔ چاچے برکت کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ اس نے ٹھیک ٹھاک زندگی گزار لی ہے لیکن تم نے ابھی کیا دیکھا ہے۔ تمہارے تو ابھی کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تم چھوڑ دو میرا پیچھا اور واپس چلے جاؤ پشاور۔ میں تمہیں کلارک صاحب سے لاکھ دو لاکھ روپیہ لے دیتا ہوں۔ پشاور جا کر مسرت شاہین جیسے کسی پٹولے سے شادی کرو۔ قصہ خوانی کے تکے کباب کھاؤ، ترکی دنبے کا کڑاہی گوشت پھڑکاؤ، رات کو فلموں کے آخری شو دیکھو اور مسالے دار نسوار کھا کھا کر ننھے منے زریں گل پیدا کرو۔ اگر کسی وقت پٹے گلی کی حویلی کا دو

بدبخت دفینہ امارے ہاتھ لگ گیا تو میں تمہیں تمہارا حصہ تمہارے ایڈریس پر "رجسٹرڈ پارسل" کے ذریعے بھیج دوں گا۔"

"آپ تو مذاق کا بات فرماتا ہے استاد صیب۔۔۔۔ لیکن ام سچ کہتا ہے۔ اماری آخری محبت نے ام کو بہت دکھ دیا ہے۔ کلثوم کو کھو کر اب کسی کو پانے کا حسرت امارے دل میں نہیں رہا۔ ام نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ام کبھی اپنا گھر نہیں بسائے گا، بس ساری زندگی۔۔۔۔"

"مسرت شاہین کی تصویریں دیکھ دیکھ کر گزارا کرے گا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں استاد صیب! اب تو امارا دل فلم دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا۔"

"اوئے توبہ استغفار کر زریں گل۔ فلموں سے منکر ہو جائے گا تو پھر کرے گا کیا؟ تیرے پاس تو جینے کا اور کوئی سہارا بھی نہیں۔ دیواروں سے باتیں کر کر کے اُکّا مُکّا پاگل ہو جائے گا۔"

"اُکّا مُکّا کیا ہوتا ہے استاد صیب؟"

"کالے سو عمر کی فلمیں دیکھتا ہے اور تجھے اُکّا مُکّا کا پتا نہیں۔ یہ ٹھیٹ پنجابی لفظ ہے اس کا مطلب ہے۔۔۔۔ بالکل۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے ام بالکل پاگل ہو جائے گا۔"

"اور نہیں تو کیا۔۔۔۔ اچھا خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ مجھے یہ بتا کہ یہاں کی کیا رپورٹ ہے۔"

"رپورٹ ابھی تک ٹھس ہے استاد صیب، بلکہ اُکّا مُکّا ٹھس ہے۔ بالکل جیسے رنگیلا کی فلم کبڑا عاشق ٹھس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کتے کا بچہ اپنا منحوس تھوبڑا دکھا کر کہاں غائب ہو گیا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ اس منحوس حرامی کو شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یا تو کہیں دبک کر بیٹھ گیا ہے یا پھر ویسے ہی اس علاقے سے نکل گیا ہے۔ امارے حساب کے مطابق پورے سات روز سے رات دن اس سڑک کا نگرانی ہو رہا ہے۔ آس پاس کا علاقہ بھی ام نے چھان مارا ہے۔ اب اور کیا کیا جا سکتا ہے لیکن مایوسی کا بات پھر بھی نہیں۔ ام کو پکا یقین ہے کہ وہ ملے گا ضرور۔"

عیسٰی جان کا تذکرہ شروع ہوتے ہی میرے رگ و پے میں عجیب سی سنجیدگی اور تیزابیت گھل گئی تھی۔ میں نے زریں گل کو تسلی تشفی دی اور کہا کہ اس قسم کی نگرانیاں کبھی کبھی مہینوں تک جاری رکھنا پڑتی ہیں۔ میں نے اسے مچان کی مثال دی اور بتایا کہ مچان میں بیٹھنے والے شکاری کی اصل بہادری اور دلیری یہی ہوتی کہ وہ صبر و تحمل کے ساتھ اپنے شکار کا انتظار کرتا ہے۔ بوریت اور اکتاہٹ سے نبرد آزما ہوتا ہے اور مایوسی کو خود پر غالب نہیں ہونے دیتا۔

زریں گل بولا "استاد صیب! مثال تو آپ نے واقعی بہت اچھا دیا ہے۔ یہ شخص بھی تو ایک خطرناک درندہ ہی ہے۔ وہ اس سامنے والی سڑک سے گزر کر گیا ہے اور ام اس پٹرول پمپ کی مچان میں

بیٹھ کر اس کے دوبارہ گزرنے کا انتظار کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "میری مثال تمہیں پسند آئی ہے تو باقی باتیں بھی پسند آئی ہوں گی۔"

"آپ کا ہر بات ام کو پسند ہے۔ جناب!" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

عیسٰی جان کے لیے اس کی آنکھوں میں نفرت کی بجلی کوند رہی تھی۔ اس نے نسوار کا ایک بڑا سا چٹکا یوں منہ میں ڈالا جیسے رائفل میں گولیوں سے بھرا ہوا میگزین ڈال رہا ہو۔ ذرا ہی دیر بعد وہ پچ پچ کی آواز سے برسٹ مارنے لگا اور مجھے وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ میں شام سے تھوڑی دیر پہلے ڈیرے پر واپس پہنچ گیا۔ ڈیرے کے احاطے میں نیم کے درختوں کے نیچے ایک گاڑی دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ چند لمحوں کے لیے تو اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ یہ سفید رنگ کی وہی کرولا کار تھی جسے ہم پچھلے کئی روز سے دیوانہ وار تلاش کر رہے تھے۔ اس کرولا کار کا ماڈل، نمبر، حلیہ سب کچھ وہی تھا جو مختار امانت علی نے بیان کیا تھا۔

میں اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پاتا ڈیرے کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ قدرتی طور پر میرے ذہن میں یہ تجسس جاگ اٹھا تھا کہ اس کار میں یہاں کون آیا ہے۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے میں نے قلندر سیاہ پوش کے حجرے میں جھانکا۔ موٹی توند اور فربہ گردن والا ایک سرخ و سپید شخص سیاہ پوش کے پاس بیٹھا تھا اور دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ یہ عیسٰی جان ہرگز نہیں تھا۔ عیسٰی جان کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں بے قرار تھیں۔ ایک عجیب سی بے تابی میرے دل و دماغ میں سما گئی تھی۔ میں برآمدے میں پہنچ کر واپس پلٹا اور حجرے کے بالکل پاس سے گزرا۔ اس مرتبہ میں نے بغور طور پر حجرے میں جھانکا۔ سیاہ پوش اور سرخ و سپید شخص کے سوا اندر اور کوئی موجود نہیں تھا۔

اگلے دو منٹ کے اندر میں نے پورا ڈیرا چھان مارا لیکن کوئی بھی نیا چہرہ نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کرولا کار پر سرخ و سپید شخص ہی یہاں پہنچا ہے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا اور گہری نظروں سے کار کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا اور میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو سائیں عالی کھڑا تھا۔ اس کی گرد آلود آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر بولا "کیا دیکھتے ہو شفیع محمد؟"

"کک۔۔۔۔ کچھ نہیں۔"

"میں جانتا ہوں تم اس سفید کار کو دیکھ رہے ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ پتا لگانا چاہتے ہو کہ اس کار میں کون آیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ سب پتا چل جائے گا بچہ۔۔۔۔ سب پتا چل جائے گا لیکن محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی تمہیں۔۔۔۔ اس کار کا پیچھا کرنا ہو گا۔"

"لیکن کیسے؟"

"سیاہ پوش کی گاڑی پر۔۔۔۔ اور کیسے؟"

"مگر گاڑی کا تو ڈرائیور ولے کر گیا ہوا ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ میں ابھی شاہ جنات کے سیکرٹری کو بھیج کر منگوا لیتا ہوں۔"

اس نے آنکھیں بند کیں اور منہ میں کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔۔۔۔ قریباً تین چار منٹ اسی طرح گزرے، پھر میں نے دیکھا کہ گاڑی گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ یقیناً یہ ایک اتفاق تھا مگر اس اتفاق کی وجہ سے سائیں عالی بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ہوا میں ہاتھ چلا چلا کر کسی نادیدہ مخلوق سے کچھ باتیں کیں۔ یہ باتیں وہ کسی ناقابلِ فہم زبان میں کر رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب طرز کی گفتگو ختم ہوئی تو میری طرف دیکھ کر بولا "شاہ جنات کا سیکرٹری تھا۔ بتا رہا تھا کہ گاڑی پنکچر ہو گئی تھی۔ ڈرائیور سے جیک نہیں لگ رہا تھا۔ شاہ جنات کے سیکرٹری نے ایک بے کٹے گوجر جوان کے روپ میں آ کر گاڑی اٹھائی اور ڈرائیور نے پہیا بدلا۔"

کچھ دیر سائیں عالی کی اوٹ پٹانگ باتیں جاری رہیں پھر وہ چونک سا گیا۔ وہ ڈیرے کے تاریک احاطے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ قلندر سیاہ پوش اور سرخ و سپید چہرے والا شخص سفید کرولا گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ سرخ و سپید شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، قلندر سیاہ پوش ساتھ والی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ایک چیلے نے بڑے ادب سے کار کا دروازہ بند کیا۔ کار اسٹارٹ ہوئی اور دھیمی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھ ماری اور میرا بازو پکڑ کر احاطے کی طرف بڑھا۔ قلندر سیاہ پوش کی ڈاٹسن کار گیٹ کے قریب ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور اپنی نشست پر بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس کا سر "ہیڈ ریسٹ" سے لگا تھا اور منہ کھلا ہوا تھا۔ سائیں عالی نے دو ہنٹر مار کر اسے جگایا اور کار سے نیچے اتار دیا۔ پھر اس سے چابی لی اور مجھے تھما کر بولا "چلو کرو ڈرائیونگ۔" گاڑی اسٹارٹ ہونے تک سائیں عالی بھی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ گاڑی گیٹ سے نکالی اور نیم پختہ راستے پر ڈال دی۔ راستہ بالکل سیدھا تھا۔ تاریکی میں دور کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر کسی گاڑی کی "ٹیل لائٹس" نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ سفید کرولا کار ہی تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی اور جلد ہی اپنا اور سفید کار کا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک بار یہ تسلی کرنے کے بعد کہ ہم سفید کار کا ہی تعاقب کر رہے ہیں، میں نے درمیانی فاصلہ سو گز تک بڑھا دیا اور اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی بند کر دیں۔ ہتھیار کے طور پر میرے پاس ریوالور تھا۔ اس کے علاوہ پنڈلی سے خنجر لگا ہوا تھا اور ایک پنسل ٹارچ بھی پتلون کی جیب میں موجود تھی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روڑی پسرور سائیڈ کی طرف جا رہی تھیں۔ سائیں کسی پُراسرار سائے کی طرح میرے پہلو میں بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ حسب عادت وہ نشست کے بجائے گاڑی کے فرش پر براجمان ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے وہ ونڈ اسکرین کے پار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اسے اچک کر اوپر ہونا پڑتا تھا اور وہ بار بار ایسا کر رہا تھا۔ یکایک اس کی گمبھیر آواز میرے کانوں میں گونجی "عیسیٰ جان کو دیکھا تم نے؟"

"نن..... نہیں تو۔"

"قلندر سیاہ پوش کو نہیں دیکھا؟"

"قلندر سیاہ پوش کو تو دیکھا ہے۔"

"بے وقوف یہی تو عیسیٰ جان ہے۔"

میری سماعت میں جیسے ایک دم دونوں بم پھٹ گئے تھے۔ میں حیرت سے سائیں عالی کی طرف دیکھنے لگا۔ شکر ہے کہ میرا سکتہ زیادہ دیر نہیں رہا' ورنہ گاڑی یقیناً کچے میں اتر جاتی یا کسی درخت سے ملاقات کر لیتی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو سائیں عالی؟" میں نے حیرت میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔

"وہی کہہ رہا ہوں جو سچ ہے۔ شاید تم نے قلندر سیاہ پوش کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ یہی بدبخت عیسیٰ جان ہے۔ میں چار ماہ سے اس کتے کا پیچھا کر رہا ہوں۔ پولیس بھی اس کے پیچھے ہے۔ یہ بھیس بدل کر یہاں چھپا بیٹھا ہے' لیکن مجھ سے چھپ کر کہاں جا سکتا تھا۔"

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ قلندر سیاہ پوش کا حلیہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ میں نے صرف ایک بار اس شخص سے بات کی تھی اور وہ بھی چند منٹ کے لیے۔ سیاہ پوش کا وہ نسائی چہرہ گھنی مونچھوں' داڑھی اور پگڑی میں چھپا رہتا تھا' رہی سہی کسر اس رومال نے پوری کر دی تھی جو ایک گھونگھٹ کی طرح سیاہ پوش کے چہرے پر لہراتا تھا لیکن ان ساری رکاوٹوں کے باوجود میں عیسیٰ جان کو پہچان سکتا تھا۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں نہیں پہچان سکا تھا..... شاید اس نے کسی طور میک اپ کا سہارا لیا تھا اور اپنے چہرے میں تھوڑی بہت تبدیلی کی تھی۔ قلندر سیاہ پوش کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو پھر اس کی آواز بھی میری سماعت میں گونجنے لگی۔ اس نے مجھ سے پنجابی میں بات کی تھی لیکن اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس پنجابی میں کسی طرح کی کمی محسوس ہوئی تھی۔ غالباً یہ لب و لہجے کی کمی تھی۔ انسان کوشش کر کے اپنی آواز تو تبدیل کر سکتا ہے لیکن لب و لہجے کی کمزوری پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ اگر یہ واقعی عیسیٰ جان تھا تو پھر ہم ایک زبردست معرکے کی طرف بڑھ رہے تھے..... میں نے لرزاں لہجے میں سائیں عالی سے پوچھا "کیا عیسیٰ جان کی داڑھی مونچھ اصلی ہے..... میرا مطلب ہے کہ پہلے تو اس کے بال اتنے کالے نہیں تھے اور نہ ہی داڑھی مونچھ اتنی پھیلی ہوئی تھی۔"

"مجھے اصلی نقلی کا تو کوئی پتا نہیں' لیکن یہ ہے عیسیٰ جان ہی..... اب ملو گے تو تمہیں فوراً پتا چل جائے گا۔"

میں کتنی ہی دیر اپنی ان دھڑکنوں سے الجھتا رہا جو میرے سینے میں گونج رہی تھیں' لیکن جن کی دھمک میری کنپٹیوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ میں ہیڈ لائٹس کے بغیر چل رہا تھا لہٰذا مجھے بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے سائیں عالی سے پوچھا "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"لوگ..... کون سے لوگ۔" سائیں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی جو سفید کار میں ہیں۔"

"اوہ..... یہ لوگ تھوڑے ہی ہیں۔ یہ تو شیطان کے بچے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں شرافت کا خون پینے نکلے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہر بات کا مطلب مت پوچھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا..... وہ دیکھو..... وہ دیکھو' وہ گاڑی موڑ رہے ہیں۔"

سفید گاڑی نے دائیں طرف ٹرن لیا تھا اور ایک ایسی سڑک پر آ گئی تھی جس کی دونوں طرف کچے پکے مکان موجود تھے۔ درحقیقت یہ ایک قصبے کی آبادی تھی۔ جس جگہ کھیت اور مکان آپس میں ملتے تھے وہاں ایک دو منزلہ عمارت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ یہ عمارت پرانی طرز کی تھی اور اس کے پھاٹک کے اوپر ایک کمزور سا بورڈ بھی آویزاں تھا۔ سفید کار اسی پھاٹک کے سامنے جا کر رک گئی۔ ہم نے اپنی گاڑی کافی فاصلے پر روک لی تھی۔ ہیڈ لائٹس تو پہلے ہی بجھی ہوئی تھیں۔ میں نے انجن بھی فوراً بند کر دیا تھا..... اب رات کے نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ مضافاتی علاقوں میں یہ وقت "رات گئے کا وقت" تصور کیا جاتا ہے۔ جس قصبے میں ہم پہنچے تھے وہ بھی سنسان نظر آ رہا تھا۔ اکا دکا مکانوں کے سوا چاروں طرف تاریکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سفید کرولا کار کی عقبی بتیاں حرکت میں آئیں اور پھر اوجھل ہو گئیں۔ کار یقیناً عمارت کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ سائیں عالی بھی کار کے ادھ کھلے دروازے سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ سرد ہوا کھیتوں میں سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور ہاتھ پاؤں کو یخ کر رہی تھی۔ تاہم سائیں عالی پر یہ ہوا بھی بے اثر تھی۔

میں نے اکتا کر پوچھا "اب کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا "ضروری نہیں کہ بندہ ہر وقت کچھ کرتا ہی رہے۔ کسی وقت تسلی سے بیٹھ کر اپنے کرتوتوں پر بھی غور کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "کرتوتوں پر غور کرنے کے لیے کیا یہ نیا کرتوت کرنا ضروری تھا۔ میرا مطلب ہے یہ کام ہم ڈیرے پر بیٹھ کر بھی تو کر سکتے تھے۔"

"رات کو کھلی ہوا میں بیٹھ کر شرمندہ ہونے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔" سائیں عالی نے کہا اور آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھولنے لگا۔

کافی دیر جھولنے کے بعد سائیں عالی نے باز کی جُو والی ایک لمبی ڈکار لی۔ میں نے بے اختیار اپنا سر کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ سائیں چونک کر بولا "باہر کیا دیکھتے ہو' اندر دیکھو..... اپنے اندر جھانکو۔ اس جانور سے باتیں کرو جو تمہارے اندر رہتا ہے۔ درندگی کرتا ہے' خون بہاتا ہے۔ بے گناہ لوگوں پر شب خون مارتا ہے' گوشت کے ایک ٹکڑے کے لیے اپنے ساتھی کا ٹینٹوا چباتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے اندر رہتا ہو گا ایسا جانور۔ اپنے اندر تو میں خود رہتا ہوں۔"

وہ بولا "میں تمہاری بات نہیں کرتا' میں سب کی بات کرتا ہوں۔ ان سب میں' میں بھی شامل ہوں۔ میرے اندر بھی جانور ہے۔"

میں نے دل میں سوچا' تم تو خود بھی جانور سے کم نہیں۔

حیرت ناک طور پر سائیں نے میرے دل کی بات بھانپ لی۔ بولا "دیکھو..... تم مجھے جانور کہہ رہے ہو۔ میرا خیال ہے تم ناراض ہو گئے ہو..... خیر چھوڑو ان باتوں کو..... مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس مکان کے بارے میں جانتے ہو؟"

"کس مکان کے بارے میں؟"

"اوئے یہی مکان جس میں یہ سفید گاڑی داخل ہوئی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ سائیں عالی بولا "اس مکان میں آپی جی رہتی ہے۔"

"یہ..... آپی جی کون ہے؟"

"اس قصبے کے لوگوں میں سب سے سندر اور سب سے نیک لڑکی ہے۔ اپنی شادی کے دو ہی دن بعد یہ بیوہ ہو گئی تھی۔ دشمنوں نے اس کے خاوند کو قتل کر دیا اور خاوند کے سارے گھر والوں کو بھی۔ اللہ کی قدرت کہ یہ بچ گئی۔ یہ اپنے میکے واپس آ گئی۔ ماں باپ کے بہت اصرار کے باوجود اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ باپ کی طرف سے اسے تھوڑی سی زمین ملی تھی۔ اس زمین پر وہ پرانی حویلی بھی تھی جو سامنے نظر آ رہی ہے۔ لڑکی نے اس حویلی کو خدمت خلق کے لیے استعمال کیا اور یہاں بے سہارا لڑکیوں کے لیے ایک ادارہ کھول لیا۔ یہاں لڑکیوں کو نہ صرف سلائی کڑھائی سکھائی جاتی تھی بلکہ بے ٹھکانا لڑکیوں کو ٹھکانا بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ یہ تقریباً چار سال پرانی بات ہے۔ ان چار سالوں میں یہ لڑکی اور یہ ادارہ بہت نیک نامی کما چکے ہیں۔ قصبے کے تمام چھوٹے بڑے لڑکی کو آپی جی کہہ کر بلاتے ہیں اور بے حد عزت کرتے ہیں۔ وہ ان کے

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دل گداز داستان

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون:۔ ۷۳۳۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور۔

فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۲

نزدیک نیکی اور محبت کی علامت بن چکی ہے' تم جانتے ہی ہو اس طرح کی عزت اور نیک نامی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ دن رات اپنا لہو جلانا پڑتا ہے اور اس لڑکی نے یہ سب کچھ کیا ہے مگر......" سائیں عالی کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مگر یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ کسی کو بھی معاف نہیں کرتی۔ اچھے سے اچھے انسان کو بھی جلد یا بدیر اپنا اصل روپ دکھا کر رہتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو اچھے لوگ یہاں زیادہ مصیبت جھیلتے ہیں بالکل جیسے بارش اور کیچڑ میں سفید کپڑے زیادہ برباد ہوتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ لڑکی بھی کسی مصیبت میں ہے۔"

"بالکل مصیبت میں ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اگر تمہارے پاس تھوڑی بہت عقل ہے تو تمہیں بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو رات کے اندھیرے میں عیسیٰ جان جیسا شخص جس کے پاس جائے گا وہ مصیبت میں نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔"

"بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں اکثر ٹھیک بات کہتا ہوں...... تمہارے پاس وقت کیا ہوا ہے؟"

میں نے رسٹ واچ دیکھی "تین بج کر پانچ منٹ۔"

"بس ٹھیک ہے۔ اب تم نکلو یہاں سے۔ تمہاری چالاکی اور پھرتی کا امتحان ہے۔"

"کون لے گا یہ امتحان؟"

"عیسیٰ جان اور کون؟" تمہیں اس مکان میں داخل ہونا ہے' اور کسی کی نظر میں آئے بغیر یہ دیکھنا ہے کہ عیسیٰ جان اور اس کا ساتھی وہاں کیا کر رہے ہیں۔ اگر تم کامیاب ہوئے تو شاہ جنات تمہاری ترقی بائیسویں گریڈ میں کر دے گا۔"

"تم یہیں گاڑی میں رہو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ان شاء اللہ۔"

میں نے اپنا ریوالور چیک کیا اور بے آہستگی گاڑی سے اتر کر روانہ ہو گیا۔ وہ مطلوبہ مکان تک کا فاصلہ میں نے احتیاط سے طے کیا۔ پھاٹک کے اوپر محراب کی شکل میں جو بورڈ آویزاں تھا اس پر "اپی سلائی اسکول اینڈ ہوسٹل" کے الفاظ لکھے تھے۔ مکان کے گرد سات آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ میں چار دیواری کے ساتھ ساتھ عقبی سمت میں پہنچا۔ یہاں قصبے کے دیگر مکانات موجود تھے لیکن کہیں بھی روشنی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں اپنے پاؤں پر اچھلا اور چار دیواری پار کر کے اندر کود گیا۔ اندر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ اصل عمارت سے ذرا ہٹ کر سات آٹھ مرلے کا ایک اور مکان بھی موجود ہے۔ یہاں ایک دو کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ مکان شہری طرز کا تھا اور اسے بنے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ پورچ میں وہی سفید گاڑی کھڑی تھی جس کا تعاقب

کرتے ہوئے میں اور سائیں عالی یہاں پہنچے تھے۔ سامنے کی طرف پلائی ووڈ کا خوب صورت دروازہ تھا اور ایک لمبی چوڑی گیلری کھڑکی تھی۔ یہاں میں نے ایک شخص کو کرسی پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ یقیناً وہ چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مجھ سے اس کا فاصلہ بمشکل دس قدم تھا۔ ذرا سی آہٹ بھی اسے متوجہ کر سکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چوکیدار کو بائی پاس کر کے مکان میں گھسنا ناممکن ہے۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور دبے پاؤں اس شخص کی طرف بڑھا۔ تین چار قدم کا فاصلہ باقی تھا جب یہ شخص چونکا اور اس نے مڑ کر میری طرف دیکھنا چاہا مگر اس سے پیشتر کہ اس کی گردن پوری طرح گھومتی' میں نے اسے جا لیا۔ میرا بازو اس کی گردن سے لپٹا اور وہ آواز نکالے بغیر میرے بازو میں ہی جھول گیا۔ وہ ایک نوعمر شخص تھا۔ اس کی دو نالی رائفل بھی قریب ہی رکھی تھی۔ میں نے بے ہوش شخص کو کرسی پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ تھکن بیدار کرلیتا ہوا یا سویا ہوا نظر آئے۔ اس کی رائفل اٹھا کر میں نے لے لی تیز پر پھینک دی۔ دروازے کی ناب گھما کر اسے دھکیلا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اندر ہلکی روشنی تھی۔ کسی قریبی کمرے سے مجھے باتوں کی مدھم آواز آئی۔ میں کچن کے سامنے سے گزر کر آواز کی سمت بڑھا۔ اچانک میری نگاہ ایک مستطیل کمرے میں گئی۔ یہاں صوفے پر وہی سرخ و سپید شخص دراز تھا جو سفید کرولا گاڑی ڈرائیو کر کے یہاں لایا تھا۔ وہ کوئی میگزین پڑھ رہا تھا۔ میں دبے پاؤں دروازے کے سامنے سے گزرا۔ باتوں کی آواز کسی اندرونی کمرے سے آ رہی تھی۔ یہ بھاری مردانہ آواز تھی۔ غالباً "قلندر سیاہ پوش" بول رہا تھا۔ ایک تنگ راہداری سے گزر کر میں اس کھڑکی کے قریب آ گیا جس کے عقب سے آواز بلند ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھانکنا ناممکن تھا۔ میں نے گرل کا سہارا لیا اور روشن دان تک پہنچ گیا۔ روشن دان ادھ کھلا تھا۔ اندر کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ میں نے دیکھا قلندر سیاہ پوش پھیل کر ایک مسہری پر لیٹا ہوا تھا۔ حسب معمول اس نے رات کے وقت بھی سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ مسہری کے بازو پر ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس کے بال گھنے تھے اور چوٹی نیچے تک لہرا رہی تھی۔ لڑکی نے معمولی سا سوتی لباس پہنا ہوا تھا تاہم اس لباس میں وہ باوقار نظر آتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی "آپی جی" ہے۔

میں نے بڑے غور سے قلندر سیاہ پوش کا چہرہ دیکھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سائیں عالی نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے۔ اس چہرے میں سے منحوس عیسیٰ جان جھانکنے لگا۔ یقیناً میک اپ کے ذریعے چہرے کو تیس چالیس فیصد تک تبدیل کر لیا گیا تھا لیکن وہ سفاک آنکھیں کیسے تبدیل ہو سکتی تھیں جنہوں نے نواب زادی شاہین کا خون پیا تھا۔ پیشانی اور رخسار بھی عیسیٰ جان کے تھے۔ ہاں

ناک اور ہونٹوں کی ساخت واضح طور پر بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ عیسیٰ جان کی جھاڑ جھنکاڑ قسم کی داڑھی اور مونچھیں بھی اصلی نہیں تھیں۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز کو کچھ اور بھاری بھرکم بنا لیا تھا اور پنجابی بول رہا تھا لیکن اس کی پنجابی میں لب و لہجے کی کہیں کہیں جھلک دکھائی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا "لیکن میں تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا۔ جو وعدہ تم سے کیا تھا اس پر قائم ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔"

"مگر...... میں یہ کیسے کر سکتی ہوں۔" لڑکی روتے ہوئے بولی "یہ میری بچیاں ہیں۔ مجھے ماں کی طرح سمجھتی ہیں۔ ایک ماں اپنی بچی سے ایسی بات کیسے کہہ سکتی ہے۔"

عیسیٰ جان بولا "یہ سب پاگل پن کی باتیں ہیں۔ تم ان کی ماں ہو نہ وہ تمہاری بچیاں ہیں اور یہ بات بھی دماغ سے نکال دو کہ وہ سب کی سب معصوم اور پاک صاف ہیں۔ ان میں بڑی بڑی چھپی رستم ہوں گی۔ بس کسی ایسی ہی رستم کو میرے پاس بھیج دو۔"

سوتی ساڑی والی لڑکی نے لرز کر ہاتھ جوڑ دیے "خدا کے لیے...... خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔ تم جو کچھ کر چکے ہو وہی بہت ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔"

عیسیٰ جان کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولا "رحم ہی تو کر رہا ہوں کہ لڑکی کا چناؤ تم پر چھوڑ رہا ہوں۔ کوئی بھی چالو قسم کی لڑکی تم بھیج سکتی ہو۔ اگر میں کسی پر انگلی رکھ دیتا تو پھر کیا کر لیتیں تم؟"

"یہاں...... کوئی...... چالو...... لڑکی نہیں ہے۔" سوتی ساڑی والی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی "یہ بے سہارا' یتیم مسکین بچیاں ہیں۔ عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کے لیے محنت کر رہی ہیں' ہنر سیکھ رہی ہیں۔"

"پھر وہی بچیاں۔" عیسیٰ جان طنز سے بولا "ان میں سے کون سی بچی ہے۔ سب تمہاری طرح جوان جہان ہیں...... اور ان کی عزت آبرو بھی میں خوب سمجھتا ہوں۔ جو لڑکی اس طرح دربدر بھٹک کر کسی یتیم خانے یا دارالامان میں پہنچتی ہے وہ آبرو والی کہاں ہوتی ہے۔ وہ کئی تجربے کر چکی ہوتی ہے اور یہاں آ کر بھی اس کے تجربے کہاں ختم ہوتے ہیں؟ ایسے یتیم خانے اور دارالامان بہت دیکھے ہیں میں نے...... یہاں سے رات کے اندھیرے میں لڑکیاں سپلائی کی جاتی ہیں۔ خانے داروں' سرکاری افسروں اور پیسے والوں کی راتیں گرم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔"

"چپ ہو جاؤ۔ میں کہتی ہوں چپ ہو جاؤ۔" لڑکی زور سے بولی۔

"چیخو مت۔" عیسیٰ جان دھاڑا اور اس نے لڑکی کو کسی چڑیا کی طرح دبوچ لیا۔ اس کے بال عیسیٰ جان کی مٹھی میں تھے اور اس کا چہرہ چھت کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا "جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ ورنہ تمہاری نیک نامی رہے گی اور نہ تمہارا یہ یتیم خانہ۔ جو لوگ تمہیں "اپی جی" "آپی جی"

کہتے ہیں کل صبح تم پر تھوکیں گے اور دھکے دے کر قصبے سے نکال دیں گے۔"

لڑکی کی وہی حالت تھی جو سانپ کی دہشت سے مبہوت رہ جانے والے بدقسمت شخص کی ہوتی ہے۔ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔

عیسیٰ جان نے اس کے بال چھوڑے اور اس کے سر پر پلو درست کرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں بولا "جاؤ شاباش' جو کہہ رہا ہوں' وہی کرو۔ یہی بہتر ہے تم سب کے لیے۔ اپنی مرضی کی ایک لڑکی بھیج دو اور تھوڑا سا کھانے پینے کا سامان بھی۔"

لڑکی بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ نجانے عیسیٰ جان نے کیسا جال پھینک رکھا تھا اس پر...... اپنی ہچکیاں روکنے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ چند لمحے شدید تذبذب کے عالم میں عیسیٰ جان کے پاس کھڑی رہی' پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ عیسیٰ جان فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور مسہری پر پھیل کر لیٹ گیا۔

عیسیٰ جان کی صورت دیکھ کر میرے رگ رگ میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جی چاہ رہا تھا' ساری مصلحتیں ایک طرف رکھ کر کمرے میں داخل ہو جاؤں اور ریوالور کی چھ گولیاں عیسیٰ جان کے منحوس کھوپڑے میں اتار دوں لیکن سائیں عالی کی بات بھی یاد آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں صرف اندرونی حالات کا جائزہ لے کر آؤں۔ بالفاظ دیگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی طرح کی مداخلت کروں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عیسیٰ جان یہاں کیسے پہنچا ہے اور اس نے اس سلائی اسکول کی "اپی جی" نامی انچارج کو کیسے قابو کیا ہے۔ لگتا تھا کہ ماضی قریب میں "آپی جی" عیسیٰ جان کی دست برد کا شکار ہو چکی ہے اور اب عیسیٰ جان "آپی جی" کو وسیلہ بنا کر مزید لڑکیوں کو شکار کرنا چاہ رہا ہے...... میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور ادھ کھلے روشن دان سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ کمرا کسی نواب کا گھر تھا۔ فرنیچر معمولی اور سادہ تھا۔ سامنے والی دیوار پر چند فریم شدہ فوٹو گراف لگے ہوئے تھے۔ ان فوٹو گرافس میں سوتی ساڑی والی "آپی جی" ادارے کی لڑکیوں اور بچیوں کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ ایک تصویر میں کوئی منسٹر قسم کا شخص افتتاحی فیتہ کاٹ رہا تھا اور "اپی جی" دیگر افراد کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھی۔ ایک تصویر میں "اپی جی" تقریر کر رہی تھی اور بڑے بڑے معززین بڑے ادب و احترام سے تقریر سن رہے تھے۔ اس تصویر میں اسٹیج پر ایک شناسا صورت بھی نظر آ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔ اسٹیج پر پھولوں کے ہار پہن کر بیٹھا ہوا شخص یقیناً چوہدری جنت تھا۔ دو تصویریں پکنک یا پالس کی تھیں۔ اپی جی ادارے کی لڑکیوں میں گھلی ملی نظر آتی تھی اور یوں لگتا تھا کہ لڑکیوں کی انچارج نہیں بلکہ ہم عمر ساتھی ہے۔

عیسیٰ جان سگریٹ پھونک رہا تھا اور گاہے گاہے اٹھ کر ٹہلنے

لگتا تھا۔ میں اس کا بہروپ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ عیار شخص نے اپنا حلیہ ہی نہیں بول چال بھی بدل رکھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ عیسیٰ جان عورتوں کا رسیا ہے۔ خوب صورت عورت کی بھوک عیسیٰ جان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ اکثر اس بھوک کو مٹانے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں روشن دان میں سے کمرے کو نہیں ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہا ہوں اور اس اسکرین پر ایک سنسنی خیز ڈراما چل رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ڈرامے کا اگلا منظر کیا ہوگا۔ میں زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ عجیب انداز سے دیوار کے ساتھ چپکے چپکے میرا ایک پاؤں بالکل شل ہو گیا تھا۔ ویسے بھی میں پورچ میں چوکیدار کو بے ہوش چھوڑ آیا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے دیکھ لیتا تو زبردست گڑبڑ ہو جاتی۔

چار پانچ منٹ مزید اسی طرح گزر گئے پھر مجھے راہداری کی طرف سے قدموں کی مدھم آواز سنائی دی۔ ایڑی کی ٹھک ٹھک سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی لڑکی ہے۔ چند لمحے بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے سوتی ساڑی والی "آپی جی" کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس ٹرے میں کھانا اور کچھ پھل وغیرہ تھے۔ لڑکی نے ٹرے میز پر رکھ دی اور خاموش کھڑی ہو گئی۔

عیسیٰ جان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا "پھر اکیلی آگئی ہو "لڑکی کہاں ہے؟" سوتی ساڑی والی "آپی جی" خاموش کھڑی رہی۔ عیسیٰ جان اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک عیسیٰ جان نے زور سے قہقہہ لگایا "اوہ اچھا..... اب سمجھا۔ واہ واہ..... بہت خوب..... یعنی خود آئی ہو تم..... میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ لڑکی سامنے کھڑی ہے اور پوچھ رہا ہوں 'لڑکی کدھر ہے۔ آؤ بیٹھو۔ ادھر بیٹھو نا۔" اس نے لڑکی کو بازو سے تھام کر مسہری پر بٹھا لیا۔ کچھ دیر اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا "لیکن تمہارے آنے سے میرے "وعدے" پر کوئی حرف نہیں آیا ہے۔ میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ مجھے تو تنہائی کا ساتھی چاہیے تھا' کوئی بھی ہو جاتا۔ اب تم خود یہاں ہو تو اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ تم میرے دل و دماغ میں سمائی ہوئی ہو۔"

وہ جھنجلا کر بولی "بند کرو یہ باتیں..... بند کرو۔"

عیسیٰ جان نے کہا "میں کوئی غلط بات تو نہیں کر رہا۔ میں اپنے وعدے کی بات کر رہا ہوں۔ تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تم سے جو وعدہ بھی کیا ہے پورا کیا ہے۔ بولو کیا ہے یا نہیں۔"

"ہاں۔ کیے ہیں پورے تم نے وعدے۔" وہ سسک کر بولی۔ پھر عیسیٰ جان کی تیز نگاہوں کی تپش سے بچنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ کا سوئچ آف کر دیا۔

کمرے میں گہری تاریکی پھیل گئی تھی۔ اب رکنا فضول تھا۔ میں بہ آہستگی روشن دان سے ہٹا اور کھڑکی کی گرل میں پاؤں پھنسا کر نیچے اتر آیا۔ واپسی کے لیے میں نے وہی راستہ اختیار کیا جس راستے سے یہاں پہنچا تھا۔ لمبوترے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی۔ سرخ و سپید شخص بھی صوفے پر نیم دراز تھا لیکن اب وہ سو چکا تھا۔ کھلا ہوا میگزین اس کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں کچن کے سامنے سے گزرا اور محتاط انداز میں مکان کا ایک چکر لگایا۔ ایک دیہاتی مرد اور عورت کے سوا یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں یقیناً ملازم تھے۔ ایک کمرے کے فرش پر وہ گدا بچھائے اور رضائیاں لیے سو رہے تھے۔ شیر خوار بچہ ان دونوں کے درمیان باؤنڈری لائن کا کام دے رہا تھا۔ پلائی ووڈ کا بیرونی دروازہ کھول کر میں باہر نکلا۔ پورچ میں چوکیدار کرسی پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ اس کی رائفل شیڈ سے اتار کر اس کے پاس رکھی اور پھر باہر کی دیوار پھاند کر سائیں عالی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں سائیں عالی کے پاس پہنچا تو اسے عجیب حالت میں پایا۔ وہ نرم گرم گاڑی میں سے نکل کر یخ بستہ زمین پر لیٹا ہوا تھا' اور دو چھوٹے کتے بڑی محبت سے اس کا منہ چاٹ رہے تھے۔ میں نے کتوں کو شتکار کر سائیں عالی کو اٹھایا۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھا اور طویل جماہی لے کر بولا "ہاں شفیع محمد! کیا دیکھا اور کیا سنا؟"

میں نے کہا "تمہاری بات درست ہے سائیں۔ وہ عیسیٰ جان ہی ہے۔ وہ اندر ایک عورت کے ساتھ موجود ہے۔"

سائیں نے مجھ سے عورت کا حلیہ پوچھا۔ میں نے حلیہ بتایا تو وہ اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا "ہاں یہی ہے "آپی جی" بڑی اچھی لڑکی ہے لیکن جتنی اچھی لڑکی ہے اتنی بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا اصل نام راحت ہے۔"

میں نے کہا "لگتا ہے عیسیٰ جان نے اسے کسی زبردست چکر میں پھنسا رکھا ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔"

"میرا خیال ہے سائیں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس مکان میں سلائی کڑھائی کا اسکول ہے اور یہاں "آپی جی" نام کی لڑکی رہتی ہے۔"

وہ بولا "یہ سب معرفت کی باتیں ہیں شفیع محمد..... اور معرفت تکلیفیں سہنے سے ملتی ہے۔ تم بھی لحظہ بھر ننگی زمین پر سونا سیکھ لو۔"

"اچھا کسی وقت مشق کروں گا۔" میں نے کہا "اب یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں ٹھہر کر عیسیٰ جان کا انتظار کرنا ہے یا اندر گھس کر اسے پکڑنا ہے۔"

وہ بولا "ان دونوں میں سے کوئی کام بھی نہیں کرنا۔ عیسیٰ جان کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ اسے ہم پھر بھی پکڑ لیں گے۔ فی الحال ہمیں اس لڑکی سے ملنا ہے۔"

"کس لڑکی سے؟"

"جسے اندر اندھیرے میں چھوڑ کر آئے ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ اندھیرے میں چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے کہ عیسیٰ جان کے پاس چھوڑ کر آئے ہو۔ عیسیٰ جان بھی تو اندھیرا ہی ہے۔" میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر سائیں عالی نے زور سے "حق ہو" کا نعرہ لگایا اور گاڑی کو عقب سے دھکا دے دیا۔ گاڑی ایک کچی ڈھلوان کے پاس ہی کھڑی تھی۔ دھکا لگنے سے وہ ڈھلوان پر لڑھک گئی اور بیس تیس گز کا فاصلہ طے کر کے شڑاپ سے کیکر اور جنڈ کے گھنے درختوں میں گھس گئی۔

"یہ کیا کیا ہے تم نے۔" میں نے پوچھا "اگر ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی تو؟"

وہ بولا "ٹوٹ پھوٹ ہوتی تو کون سی قیامت آجاتی..... چلو آؤ اب اطمینان سے بیٹھیں گاڑی میں۔ وہاں کسی راہ گیر کی نظر پڑے گی اور نہ عیسیٰ جان کی۔"

بات تو سائیں ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گاڑی جہاں جا کر رکی تھی وہ جگہ درختوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہم وہاں اطمینان سے بیٹھ کر عیسیٰ جان کی واپسی کا انتظار کر سکتے تھے۔

گاڑی میں پہنچ کر سائیں عالی حسب عادت فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن گاڑی میں گھستے ہی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور یوں ظاہر کر رہا تھا کہ گہرے مراقبے میں چلا گیا ہے۔ اس کا موڈ دیکھ کر میں بھی گاڑی کی پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا' اور درپیش حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ عیسیٰ جان کو دیکھنے کے بعد ایک عجیب سی تڑپ میری رگ جاں میں سما گئی تھی' اور یہ تڑپ ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

رات کا باقی حصہ ہم نے اسی گاڑی میں گزار دیا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو درختوں پر پرندے چہچہانے لگے۔ یہی وقت تھا جب ہم نے سفید کرولا کار کے انجن کی آواز سنی۔ یہ آواز "سلائی اسکول" کی طرف سے آ رہی تھی۔ یقیناً عیسیٰ جان "شکار" کے بعد واپس اپنے ڈیرے پر جا رہا تھا۔ سفید کرولا کار ہمارے سامنے سے گزری۔ ہم چونکہ نشیبی درختوں میں تھے لہٰذا کسی کی نگاہ میں نہیں آئے۔

جونہی کرولا کے انجن کی آواز دور جانے کے بعد معدوم ہوئی' سائیں عالی اپنا لباس جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا "چلو آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا۔

"کہاں؟"

"تھوڑی سی سلائی کڑھائی ہم بھی سیکھ لیں۔" سائیں نے جواب دیا۔

پتا نہیں سائیں کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے اسکول کی عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ میرے ذہن میں اتھل پتھل سی مچی ہوئی تھی۔ ذہن مسلسل مصروف تھا اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ پچھلے تین چار ماہ میں سائیں عالی مسلسل عیسیٰ جان کا کھوج لگاتا رہا تھا۔ آخر کار وہ اس ڈیرے تک آپہنچا تھا جہاں عیسیٰ جان پولیس کی پکڑ سے بچنے کے لیے قلندر سیاہ پوش کے بہروپ میں چھپا ہوا تھا۔ عیسیٰ یہاں طویل قیام کا ارادہ رکھتا تھا' اسی لیے اس نے ڈیرے کو روحانی شفا خانے کی حیثیت دی تھی اور اپنے مستقل گاہک بنانے شروع کیے تھے۔ یقیناً اس سلسلے میں اسے کسی مقامی شخص کا تعاون بھی حاصل رہا تھا اور میرے خیال میں یہ مقامی شخص وہی سرخ و سپید موٹا تھا جو عیسیٰ جان کے ساتھ کار میں "سلائی اسکول" پہنچا تھا..... سائیں عالی شکل و صورت سے عیسیٰ جان کو پہچانتا تھا لیکن عیسیٰ جان' سائیں عالی کو نہیں پہچانتا تھا۔ سائیں عالی نے ڈیرے پر پہنچ کر عیسیٰ جان کو اپنے کرشموں اور الٹی باتوں سے مرعوب کر دیا تھا۔ یوں وہ عیسیٰ جان کا بھی "باپ" بن بیٹھا تھا اور ڈیرے پر اس کا حکم چلنے لگا تھا۔ اسی دوران میں سائیں عالی نے ہمیں بھی ڈیرے پر بلا لیا تھا۔ یہ واقعہ بڑا انوکھا تھا۔ یعنی ہمیں راہ چلتے روکا گیا تھا اور ڈیرے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ سائیں عالی کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم اسی خاص رات کے دوسرے پہر ایک جیپ پر ڈیرے کے قریب سے گزریں گے؟ یہ ایک اہم سوال تھا لیکن ایسے بہت سے اہم اور حیران کن سوال سائیں عالی کے حوالے سے موجود تھے اور حقیقت تو یہ تھی کہ میں نے اب سائیں عالی کے انوکھے پن کو تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ باتیں سوچتے ہوئے ایک اور بات بھی بار بار میرے ذہن میں آ رہی تھی۔ میں پچھلے تقریباً پندرہ روز سے قلندر سیاہ پوش (عیسیٰ جان) کے ڈیرے پر موجود تھا۔ میں نے تو اسے آج رات پہچانا تھا لیکن وہ یقیناً پہلے دن سے مجھے پہچانتا تھا۔ میں اس کے خون کا پیاسا تھا اور وہ میری لاش گرانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اس کے ڈیرے پر کئی شب و روز گزارنے کے باوجود میں اب تک محفوظ تھا۔ شاید اس میں بھی سائیں کی کسی حکمت عملی کو دخل تھا یا پھر عیسیٰ جان کی کوئی مجبوری تھی کہ وہ فوری طور پر میرے "خون" سے ہاتھ نہیں رنگ رہا تھا۔

یہ سارے خیالات ایک منٹ کے اندر اندر میرے ذہن سے گزر گئے۔ اب ہم اسکول کی عمارت کے قریب پہنچنے والے تھے۔ میں نے سائیں عالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

"کیا بات ہے؟" سائیں نے پوچھا۔

میں نے کہا "پھاٹک کی طرف ایک چوکیدار موجود ہے۔ ایک چوکیدار اندر بھی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" سائیں عالی نے درویشانہ انداز میں سر کو حرکت دی۔

"لیکن ایک گڑبڑ اور بھی ہے۔" میں نے کہا "اندر والے چوکیدار کو میں نے دھوبی پٹکا مارا ہے۔ گردن مسل کر بے ہوش کر دیا تھا اسے..... اب اگر وہ ہوش میں آچکا ہے تو یہاں رہنے والے سب لوگ چوکس ہو چکے ہوں گے۔ ہر آنے جانے والے کو

شک کی نظر سے دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ہمارے شفیع محمد! میں جو کہتا ہوں کہ تو فکر مت کر۔۔۔ چوکیدار کا کیا کام ہے کہ ہمیں روکے۔"

"چوکیدار کا تو کام ہی روکنا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن سائیں عالی کو روکنا نہیں ہوتا۔ تم دیکھنا اگر چوکیدار ہوا تو کس طرح ہمیں خوش آمدید کہتا ہے۔ قدموں میں نہ بچھ جائے تو نام نہیں۔"

سائیں عالی جو کہہ رہا تھا وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔ پلک جھپکنے میں لوگوں کو شیشے میں اتارنا اور آناً فاناً انہیں "عقیدت مند" بنا لینا سائیں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہرحال ہم سلائی اسکول کے گیٹ پر پہنچے تو کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔۔۔ غیر متوقع طور پر پھاٹک چوکیدار سے خالی تھا۔ ہم دندناتے ہوئے اندر چلے گئے۔ اسکول کی اصل عمارت میں اب اِکا دُکا کھڑکیاں روشن نظر آ رہی تھیں لیکن کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چھوٹا سا نو تعمیر شدہ مکان جس میں "آپی جی" رہتی تھی اصل عمارت سے ملحق ہونے کے باوجود علیحدہ نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ چوکیدار بھی اپنی پوسٹ پر موجود نہیں تھا جسے میں رات کو انٹا غفیل کر کے کرسی پر لٹا گیا تھا۔ اس کی رائفل اور گلاس وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

"کدھر ہے وہ لڑکی؟" سائیں عالی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں سائیں عالی کے آگے آگے چل دیا۔ پلائی ووڈ کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ کچن کی بتی جل رہی تھی اور سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ دیہاتی ملازم اور ملازمہ ابھی تک محو خواب تھے۔ شیر خوار بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا اور اس کے عریاں پیٹ پر ٹانگیں رسید کر رہا تھا۔ میں سائیں کو لے کر تنگ راہداری سے گزرا اور اس خواب گاہ تک پہنچ گیا جہاں چھ گھنٹے پہلے راحت عرف آپی جی کو ایک جابر اندھیرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔

میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ناب گھما کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے مقفل تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں سائیں سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے دروازے پر مدھم دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی' پھر لڑکی کی سہمی ہوئی باریک آواز سنائی دی "کون ہے؟"

میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ دروازہ "کلک" ہوا اور کھل گیا۔ لڑکی کی جھلک نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ حیران ہوتی یا چیختی میں نے دروازے کو دھکیلا۔ لپک کر اس کا منہ بند کیا اور کھینچتا ہوا خواب گاہ کے وسط میں لے گیا۔ میرے پیچھے سائیں بھی تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس نے دروازہ بولٹ کر دیا۔ یہ سب کچھ دو سیکنڈ کے اندر اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔ بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا' لڑکی کا نصف چہرہ' میری ہتھیلی کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے میرے دوسرے ہاتھ میں سیاہ ریوالور دیکھ لیا تھا اور میرے دھمکی آمیز تاثرات بھی دیکھ لیے تھے۔

میں نے سرگوشی میں کہا "آواز نکالنے کی کوشش کرو گی تو ڈھیر ہو جاؤ گی۔ ہم تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آئے ہیں' صرف چند باتیں پوچھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد خاموشی سے واپس چلے جائیں گے۔"

میری بات سن کر لڑکی کا لکڑی کی طرح اکڑا ہوا جسم ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سراپا لرز رہی تھی۔

میں نے اسے سمجھایا بجھایا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹا لیا۔ وہ آفت زدہ نظر آ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک مصیبت اس پر پڑ رہی تھی۔ میرے کہنے پر وہ مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس کی خوف زدہ نظریں بدستور میرے ہاتھ میں چمکتے ریوالور پر لگی تھیں۔ قریب ہی میز پر خالی برتن پڑے تھے۔ ان میں جگ اور گلاس بھی تھا۔ میں نے لڑکی کو پینے کے لیے پانی دیا۔ وہ بمشکل گلاس تھام کر ہونٹوں تک لے جا سکی۔ اس کا بے تاب چہرہ اُجڑا اُجڑا اور بے کشش نظر آتا تھا۔ جیسے کوئی طوفان رات ہی رات میں گلشن کو اُجاڑ گیا ہو۔ ٹوٹی ہوئی شاخیں' بکھرے ہوئے پھول' آوارہ پتے۔ یہ عیسیٰ جان ایک تیز رفتار طوفان ہی تو تھا۔ وہ اپنے ساتھ آگ' پتھر اور انگارے لے کر چلتا تھا۔ اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیتا تھا۔ خاص طور سے خوب صورت عورتوں کے لیے اس کی تاثیر بلا کی تھی۔ وہ انہیں ویران کر کے رکھ دیتا تھا۔

میز کے اردگرد سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور راحت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں تمہارے ساتھ اور کون تھا۔"

راحت عرف آپی جی کا رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا۔ پھنسی پھنسی آواز میں بولی "کک۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔ یہ ٹکڑے تو شاید عبدل گرا گیا ہے۔ وہ ملازم ہے یہاں۔"

"وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"کک۔۔۔ کل شام کمرے کی لائٹ ٹھیک کر رہا تھا۔"

راحت کا جھوٹ اس کے بے وزن لہجے سے عیاں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر اس نے پلکیں جھکا لیں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "دیکھو بی بی! جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے وہ سب ہمیں معلوم ہے اور ہمارے پاس ثبوت بھی ہیں۔"

"کیا۔۔۔ مطلب۔" وہ ہکلائی۔

میں نے کہا "ہمیں معلوم ہے کہ آج رات نو بجے سفید کرولا کار میں کون کون یہاں پہنچا تھا۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر کون لیٹا رہا تھا اور تمہارے پاس اس خواب گاہ میں کون آیا تھا۔ اس

نے تم سے کیا مطالبہ کیا تھا۔۔۔ اور تم نے اس کا مطالبہ کیسے پورا کیا ہے۔ سب کچھ ہمیں معلوم ہے۔ اگر تم سننا پسند کرتی ہو تو ہم ایک ایک تفصیل بھی بتا سکتے ہیں۔ کیا چاہتی ہو۔ میں بتاؤں وہ سب کچھ؟"

راحت کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ وہ سکتے کی کیفیت میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ بے ہوش ہو کر نہ گر جائے۔ میں نے اس کا خوف کم کرنے کے لیے ریوالور میز پر رکھ دیا اور اسے سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ہم اس کی خیر خواہی میں یہاں آئے ہیں۔ اگر وہ تعاون کرے تو ہماری آمد اس کے لیے بے حد مفید ثابت ہو گی۔ دوسری صورت میں وہ بڑے سے بڑا نقصان بھی اٹھا سکتی ہے۔ اس موقع پر سائیں عالی نے بھی میری مدد کی۔ اس کے روحانیانہ جملے اور لب و لہجے نے راحت کا خوف کم کرنے میں کافی مدد کی۔ سائیں عالی نے کہا "میری بچی! ہم جانتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کیا سخت مجبوری کی حالت میں کیا۔ تم نے آج اپنی قربانی دے کر ان بچیوں کی آبرو بچائی ہے جو تمہیں سب کچھ سمجھتی ہیں' ماں سے بھی اونچا رتبہ دیتی ہیں۔ تجھ پر کوئی دوش نہیں ہے میری بچی۔ تیرا دامن گندگی سے صاف ہے۔"

ہمدردی کے بول پا کر راحت ہچکیوں سے رونے لگی۔ سادہ ہونے کے باوجود وہ ایک باوقار اور پُر تمکنت لڑکی تھی لیکن ان لمحوں میں قطعی بے بس اور لاچار نظر آ رہی تھی۔۔۔ محبت اور خوف دونوں ہتھیار ہمارے پاس موجود تھے۔ دھیرے دھیرے لڑکی زبان کھولنے لگی۔ پھنسی پھنسی آواز میں وہ میرے سوالوں کے جواب دینے لگی۔

سب سے پہلے میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں کمرے میں کوئی آنے والا تو نہیں؟ وہ بولی "کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اگر میں کمرے سے باہر نہ نکلوں تو ملازمہ نسرین سات بجے تک دروازہ کھٹکھٹا دیتی ہے۔"

"لیکن آج تو چھٹی کا دن ہے۔"

"ہاں آج چھٹی ہے۔ شاید وہ دیر سے آئے۔"

میں نے پوچھا "گھر کے بیرونی دروازے سے باہر ایک چوکیدار ہوا کرتا ہے۔ آج وہ موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ باہر کے گیٹ پر بھی کوئی بندہ نہیں۔"

وہ بولی "چوکیدار کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ دوسرا چوکیدار اسے اسپتال لے کر گیا ہے۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"پپ۔۔۔ پتا نہیں۔ کہتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گیا ہے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا مطلب تھا کہ چوکیدار اپنے اوپر گزرنے والے "حادثے" کا پتا نہیں چلا سکا۔ میری آہٹ سن کر اس نے گردن موڑی تھی لیکن پھر کچھ بھی دیکھنے سے پہلے انٹا غفیل ہو گیا تھا۔ ممکن تھا' ہوش میں آنے کے بعد اس نے سوچا ہو کہ کسی بھوت پریت نے اس کا یہ حال بنایا ہے۔

میں نے گفتگو کو نازک موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا "یہ شخص جسے تم قلندر سیاہ پوش کہہ رہی ہو پہلی بار کب اور کہاں تمہیں ملا؟"

راحت نے ناک سے سوں سوں کی آواز نکالی۔ اس کے چہرے پر کرب ناک تاثرات پھیل گئے تھے۔ کچھ دیر اپنے ذہن میں مناسب الفاظ جمع کرتی رہی پھر بولی "میری بدقسمتی کی شروعات کوئی دو مہینے پہلے بڑی عید کے موقع پر ہوئی تھی۔ دراصل علاقے کا ایک بااثر شخص ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے بے تحاشا تنگ کر رہا تھا' زندگی عذاب بنا رکھی تھی اس نے۔ میں نے قلندر سیاہ پوش کی شہرت سنی تو اپنا یہ مسئلہ لے کر اس کے ڈیرے پر پہنچی۔۔۔"

"ایک منٹ۔" میں نے راحت کو ٹوکا "تم نے وعدہ کیا ہے کہ سب کچھ صاف صاف بتاؤ گی اور ہم نے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری بتائی ہوئی ہر بات اپنے تک محفوظ رکھیں گے پھر ادھوری بات کیوں کر رہی ہو تم۔ میرا مطلب ہے کہ اس شخص کا نام کیا تھا جو تمہیں پریشان کر رہا تھا؟"

راحت تھوڑی دیر سخت تذبذب میں رہی' پھر ہارے ہوئے لہجے میں بولی "اس کا نام سخاوت علی ہے' عام طور پر اسے سخا پہلوان کہا جاتا ہے۔ سخا پہلوان بالج پور کلرس کا ایک کھاتا پیتا شخص ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے بھی اس کا نام سنا ہو۔"

میں نے انکار میں جواب دیا۔

راحت اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "سخا پہلوان زمین داری کرتا ہے' اس کے علاوہ اس کا ایک فارم بھی ہے جہاں چھوٹی مکھیاں اور شہد کی مکھیاں وغیرہ پالی جاتی ہیں۔ علاقے کے ایک مشہور زمین دار سے بھی سخا پہلوان کے تعلقات ہیں۔ سخا پہلوان سیاسی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے سخا پہلوان کو ایک فنکشن میں مہمان بنایا تھا۔ وہیں سے وہ بدذات کمینہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ بہانے بہانے سے سلائی اسکول کے چکر لگانے لگا اور مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی بدمعاشی میں کمی نہیں آئی' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلیری بڑھتی گئی اور وہ میرے لیے زیادہ تکلیف دہ ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اگر میں راضی نہ ہوئی تو وہ اغوا کر کے علاقہ غیر میں لے جائے گا۔ سخا پہلوان کا پریشان کن خیال کسی آسیب کی طرح میرے دل و دماغ سے چمٹ چکا تھا۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس کی منحوس آنکھیں خیال میں رہتی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ سلسلہ کچھ دن مزید چلتا رہا تو میں ہوش و حواس کھو بیٹھوں گی یا اعصابی مریض

بن جاؤں گی۔

انہی دنوں میری بدقسمتی مجھے گھیر کر قلندر سیاہ پوش کے ڈیرے پر لے گئی۔ میں نے سیاہ پوش سے اپنا مسئلہ بیان کیا اور روحانی مدد چاہی۔ شروع میں مجھے ایسا لگا کہ سیاہ پوش واقعی "کرنی والا" فقیر ہے اور مجھے فائدہ پہنچائے گا۔۔۔ لیکن دو تین ملاقاتوں کے بعد میرا "یقین" شک میں بدلنے لگا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ قلندر سیاہ پوش بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کی آڑ میں مصیبت زدہ لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں پیچھے ہٹ جاتی' ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میرے بدترین خدشات کو حقیقت بنا دیا اور میری جیتی جاگتی زندگی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ سیاہ پوش اس قماش کا شخص نکلے گا اور میرے لیے اتنا خطرناک ثابت ہوگا۔ وہ ایک ابر آلود سہ پہر تھی۔ میں سیاہ پوش کے پاس ڈیرے پر آئی تو بارش شروع ہوگئی۔ میری باری بھی سب سے آخر میں تھی۔ میں سیاہ پوش کے حجرے میں پہنچی تو اس نے مجھے آگ کے سامنے دو زانو بٹھا دیا اور میرے لیے ایک طویل عمل شروع کر دیا۔ اس کے سامنے پیالے میں کوئی رنگ دار محلول تھا۔ وہ بار بار اس پر کچھ پھونک رہا تھا۔ دو تین بار اس نے مجھے محلول کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھی پلائے۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ میری عقل پر نجانے کیسے پردہ پڑ گیا تھا۔ میں کسی ان پڑھ اور توہم پرست دیہاتی عورت کی طرح ایکٹ کر رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں اور سیاہ پوش کا چہرہ نظروں میں دھندلاتا جا رہا تھا۔ شروع میں میں نے سمجھا کہ شاید واقعی سیاہ پوش کا عمل مجھ پر اثر کر رہا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ سیاہ پوش کی نسبت سے میرے دل میں پیدا ہونے والا شک ایک دم جوان ہوگیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا سر زور سے چکرایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں فرش پر گری ہوں۔"

یہاں تک بتا کر راحت سسکیاں بھرنے لگی۔ ماضی کا درد' تصور کے پردے پر آکر ایک بار پھر زندہ ہو گیا تھا۔ چند لمحے آنسو بہانے کے بعد وہ بولی "مجھے دوبارہ ہوش آیا۔۔۔۔ تو سیاہ پوش کے چہرے پر غلیظ مسکراہٹ تھی۔ میں نے کپڑے پہنے اور رونے لگی۔ سیاہ پوش نے مجھے واضح الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی سے ذکر کیا تو اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ میری عزت خاک میں مل جائے گی اور زندگی' موت سے زیادہ خوفناک ہو جائے گی۔۔۔۔ میں واپس آگئی۔ جی چاہتا تھا خودکشی کر لوں' لیکن میں اکیلی نہیں تھی۔ مجھ پر ان درجنوں لڑکیوں کی ذمے داری تھی جو میرے اسکول میں کام سیکھتی تھیں اور ہاسٹل میں رہتی تھیں۔ میں ان سے بہت زیادہ بڑی نہیں ہوں لیکن وہ مجھے ماں جیسی عزت دیتی تھیں۔ ان کی ساری امیدوں اور تمناؤں کا مرکز میں تھی۔ میں خودکشی جیسا گھناؤنا فعل کیسے کر سکتی تھی' لیکن زندہ رہنا بھی آسان نظر نہیں آتا تھا۔ آٹھ دس روز میں میرا صدمہ تھوڑا سا کم ہوا تھا کہ سیاہ پوش کے ایک خط نے مجھے پھر سولی پر چڑھا دیا۔ یہ خط سیاہ پوش کا کوئی کارندہ براہ راست میرے گھر کے لیٹر بکس میں ڈال کر گیا تھا۔ اس خط کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی۔ یہ تصویر میری بے ہوشی کے دوران میں اتاری گئی تھی۔ خط میں سیاہ پوش نے مطالبہ کیا تھا کہ میں اگلے روز دوپہر کے بعد اس کے ڈیرے پر آؤں۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی تھی کہ اس طرح کی کئی اور تصویریں اتاری گئی ہیں اور اگر میں نے بات نہ مانی تو میری ساری نیک نامی مٹی میں مل جائے گی اور میں علاقے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک نہایت خوفناک جال میں پھنس چکی ہوں۔ میں رات دن روتی رہی' نہ آرام کیا' نہ کچھ کھایا پیا۔ اسکول کی لڑکیاں میری حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں اور ہر وقت میری دل جوئی میں لگی رہتی تھیں۔ تیسرے چوتھے روز سیاہ پوش کی طرف سے ایک اور خط ملا۔ اس خط میں بھی بہت سی دھمکیاں تھیں اور مجھے ڈیرے پر طلب کیا گیا تھا۔ اسی روز رات کو سیاہ پوش خود یہاں آدھمکا۔ اس کے ساتھ وہی سرخ رنگ والا شخص تھا جو آج رات آیا تھا۔ یہ شخص سیاہ پوش کا ہمراز دوست تھا۔ دونوں سفید کار میں یہاں پہنچے تھے۔ مقامی لوگ میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ اتنی عزت کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا' ان کے دماغ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ "آپی جی" سے کوئی جرم یا خطا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھ پر کسی طرح کا شک بھی نہیں کر سکتے۔ فرض کریں کہ کوئی اجنبی شخص رات کے بارہ بجے بھی میرے گھر سے نکلتا ہے تو کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ یہ شخص یہاں کیا کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات آئے گی کہ یہ شخص کسی اچھے مقصد سے یہاں آیا تھا۔۔۔۔ سیاہ پوش اور اس کا سرخ سپید ساتھی بہادر علی یہاں آئے تو بھی کسی کو الجھن یا تشویش نہیں ہوئی۔ بہادر علی باہر ہی کھڑا رہا تھا۔ سیاہ پوش نے اندر آکر ڈرائنگ روم میں مجھ سے بات کی اور خطرناک دھمکیاں دیں۔ وہ بولا کہ میں نے اس کی بات نہ مانی تو آج وہ سب کچھ ہو جائے گا جس سے وہ مجھے ڈرا رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھ تصویروں کا ایک بنڈل لایا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج رات قصبے کے ہر گھر میں ایک تصویر پھینک دی جائے گی۔ وہ مسلح تھا اور مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہتھیاروں سے بھی ڈرا رہا تھا اور اپنے سفلی علم کی طاقت سے بھی۔۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے میرا دیرینہ مسئلہ حل کر دیا ہے یعنی سکا پہلوان سے میرا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھڑا دیا ہے؟ اس کام کے معاوضے کے طور پر وہ مجھ سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت منت سماجت کی لیکن وہ ایک نہیں مانا۔ اس کی آنکھیں انسان کے بجائے کسی جانور کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔۔۔۔ جب میں بہت روئی دھوئی تو وہ بولا "چلو" میں تمہارے

ساتھ خاص رعایت کرتا ہوں۔ میں صرف آج کی رات تمہارے پاس گزاروں گا' اس کے بعد تمہیں کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔۔۔ ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ یہ میرا قلندرانہ وعدہ ہے تم سے۔۔۔ وہ مجھے اس طرح ہر طرف سے گھیر چکا تھا کہ میں بے بس ہوگئی۔ بس اس آس کے سہارے کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے گا' میں نے وہ غلاظت اور ذلت قبول کر لی جو سیاہ پوش کے پاس میرے لیے موجود تھی۔

صبح سویرے وہ چلا گیا۔ میں دو تین روز تک کمرے سے باہر نہ نکلی۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اپنی اوپر کی کھال کھرچ کر پھینک دوں۔ جب اپنے لیے لوگوں کا ادب و احترام دیکھتی تھی تو گناہ کا احساس اور شدید ہو جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا اپنی جان لے لوں۔ میری اکیلی جان ہوتی تو شاید میں لے بھی لیتی لیکن میں نے بتایا ہے ناکہ میرے ساتھ بہت سی جانیں بندھی ہوئی ہیں۔۔۔"

چند لمحے توقف کر کے اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بولی "آپ جانتے ہی ہیں' آج رات نو بجے سیاہ پوش اور بہادر علی پھر یہاں آدھمکے تھے۔ یہ سب کچھ میرے اندیشوں کے عین مطابق ہوا تھا۔ نجانے کیوں یہ وسوسہ ہر وقت میرے دل میں رہتا تھا کہ وہ پھر آئیں گے اور رات کو وہ آگئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے۔ سیاہ پوش چاہتا تھا کہ میں اپنے اسکول کی کوئی لڑکی اس کے پاس بھیج دوں۔ یہ کام میرے لیے مرنے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ وہ میری بچیاں ہیں۔ میں ان کے لیے۔۔۔۔ میں ان کے لیے۔۔۔۔ سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی اور کمرے کی گمبھیر فضا' گمبھیر تر ہو گئی۔

اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ عیسٰی جان نے رات کو راحت سے کس وعدے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس نے راحت سے کیا ہوا ہر وعدہ پورا کیا ہے۔ یقیناً وہ سکاوت عرف سکا پہلوان کی ہی بات کر رہا تھا۔ وہ راحت کو بتا رہا تھا کہ اس نے اپنے سفلی علم کے ذریعے سکا پہلوان سے اس کا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھڑا دیا ہے۔۔۔۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو یقیناً عیسٰی جان نے سکا پہلوان کے خلاف کوئی بدمعاشی ہتھکنڈا استعمال کیا ہوگا۔ ممکن تھا کہ اس نے سکا پہلوان کو بری طرح ڈرا دھمکا دیا ہو۔ یا پھر اسے کوئی ایسا لالچ دیا ہو کہ وہ بہ رضا و رغبت راحت عرف آپی جی کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا ہو۔ بہرحال راحت کے لیے یہ تبدیلی بھی بدقسمتی کا دوسرا نام تھی۔ وہ گڑھے سے بچی تو کھائی میں گر گئی تھی۔

سائیں عالی نے عجیب مجذوبانہ انداز میں راحت عرف آپی جی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "تم بڑے حوصلے والی ہو بچہ۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔ کوئی ذرا بانی نہیں رہے گا۔"

سائیں نے راحت کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ شاید قلندر "سیاہ پوش" کے ستم کا شکار ہونے کے بعد وہ ہر فقیر صورت شخص سے ڈرنے لگی تھی۔ سائیں عالی نے ہوا میں کچھ اشارے کیے۔ کسی خیالی پیکر کو ناقابل فہم زبان میں جھڑکی دی۔ پھر نرم لہجے میں راحت سے مخاطب ہو کر بولا "تو بچہ جی! میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل جن کو تمہاری حفاظت پر لگا دیا ہے۔ بڑا چوکس جن ہے یہ۔ آدم زاد اس کے سامنے کیا چیز ہے۔ بڑے بڑے ڈاکو جنات کو ہتھکڑیاں لگوا چکا ہے۔"

سائیں عالی کی باتیں سن کر راحت کچھ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ سائیں عالی اس کا دھیان ہٹانے کے لیے بولا "ہاں بچہ جی! میں نے تم سے سکا پہلوان کا ٹھکانا تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس بدبخت کے گاؤں کا۔"

"باغ پور" راحت نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"باغ پور۔۔۔" سائیں نے زیر لب دہرایا۔ پھر ایک دم اس کے ہاتھ پاؤں تن گئے اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ زور سے میرا ہاتھ دبا کر بولا "آؤ شیخ محمد!"

"کہاں؟"

"سکا پہلوان کی خبر لیں۔"

وہ مجھے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ راحت حیرت سے ہمیں دیکھتی رہ گئی۔ سورج اب کافی اوپر آگیا تھا۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں راحت کے کمرے سے کسی نے نکلتے نہیں دیکھا۔ تاہم جب ہم احاطے میں پہنچے تو وہاں پھاٹک کے پاس کئی افراد نظر آئے۔ ایک ہٹا کٹا شخص کرسی پر بیٹھا تھا۔ دو ملازم صورت لڑکے اس کے کندھے دبا رہے تھے۔ ایک شخص اسے پانی میں کوئی دوا وغیرہ گھول کر پلا رہا تھا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ میرا مریض ہے۔ یہ وہی رات والا چوکیدار تھا جس کی گردن پر میں نے طبع آزمائی کی تھی۔ دور فاصلے پر ہوسٹل کی کچھ لڑکیاں ایک بالکونی میں کھڑی تھیں اور ترس آمیز نظروں سے اپنے چوکیدار کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہم لوگوں کے پاس سے ہو کر پھاٹک میں سے نکلے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس کچے پکے راستے پر جا رہے تھے جو کچھ آگے جا کر سکا پہلوان کے گاؤں جانے والی سڑک سے ملتا تھا۔

میری سمجھ سے باہر تھا کہ سائیں عالی کیا چکر چلا رہا ہے۔ اس سارے بکھیڑے کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے تو صرف عیسٰی جان درکار تھا۔ میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ عیسٰی جان کے وجود سے اس زمین کو پاک کر دوں۔ خود مر جاؤں یا اسے مار دوں۔ عیسٰی کو دیکھنے کے بعد ایک ایک پل گزارنا میرے لیے جانکاہ عذاب تھا۔۔۔ اور سائیں عالی مجھے کسی اور ہی طرف کھینچ کر لیے جا رہا تھا۔ میں نے سفر کے دوران میں ایک دو بار اسے ٹوکنا چاہا لیکن وہ ہر بار طرح دے گیا۔ دس پندرہ منٹ میں ہم پختہ سڑک تک پہنچ گئے۔ یہ چھوٹی سی سڑک تھی۔ ٹریکٹر ٹرالیوں نے کناروں کی بجی

زمین پر بچھے ہوئے گڑھے بنا رکھے تھے۔ دونوں طرف مکئی اور گنے کے کھیت تھے۔ یہاں اکا دکا دیہاتی لوگ کام کرتے نظر آرہے تھے۔ چھ سات میل کا فاصلہ طے کرکے ہم "باغ پور" گاؤں پہنچ گئے۔ گاؤں کے بچے گاڑی دیکھ کر جمع ہوگئے۔ انہوں نے سائیں عالی کو گاڑی کے فرش پر بیٹھے دیکھا تو بہت حیران ہوئے۔ رہی سہی کسر سائیں عالی کے حلیے اور حق ہُو کے نعروں نے پوری کردی۔ میں نے ایک نوجوان سے ستا پہلوان کے بارے میں پوچھا۔ اس نوجوان نے انگلی سے جامن کے چند گھنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ہوا لمبا چوڑا مکان نظر آرہا تھا۔ وہ بولا "ستا پہلوان وہاں رہتے تھے۔"

وہ ماضی کا صیغہ استعمال کررہا تھا۔ میں نے چونک کر پوچھا "کیا وہ چلے گئے ہیں؟"

نوجوان کے چہرے پر حیرت نظر آئی "آپ کو نہیں پتا جی...؟ پچھلے اتوار وہ فوت ہوگئے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا "کک.... کیا ہوا تھا انہیں؟"

"انہیں شہد کی مکھیوں نے کاٹ لیا تھا۔ پورے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ لاہور کے میو اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ لیکن دو گھنٹے بعد ہی فوت ہوگئے تھے۔"

میرے سینے سے طویل سانس نکل گئی۔ مجھے یاد آیا کہ راحت نے بھی بتایا تھا کہ سخاوت عرف ستا پہلوان کا ایک بڑا فارم ہے اور اس نے وہاں شہد کی مکھیاں بھی پال رکھی ہیں۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ نجانے کیوں میرے اندر سے یہ آواز ابھری تھی کہ اگر ستا پہلوان واقعی مرچکا ہے تو طبعی یا حادثاتی موت نہیں مرا۔ ضرور اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔ عینی جان کا خونخوار چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا تھا اور اس کی وہ آنکھیں تصور میں چمکنے لگی تھیں جو سو فیصد سفاک قاتل کی آنکھیں تھیں۔

میں نے سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ میں کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر گاڑی جامن کے گھنے درختوں کی طرف بڑھادی.... ستا پہلوان کا گھر کم وبیش ایک کینال میں تھا۔ گھر کے ساتھ ایک وسیع باغ بھی تھا۔ اس میں امرود' آم' جامن اور بیری کے پیڑ کثرت سے نظر آرہے تھے۔ گھر کے سامنے ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ کچھ دریاں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی گئی تھیں۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ کل تک یہاں کوئی شامیانہ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ اگر ستا پہلوان کا انتقال پچھلے اتوار ہی کو ہوا ہے تو کل اس کی رسم دسواں تھی۔ میں نے مکان کے سامنے گاڑی روکی اور نیچے اتر آیا۔ غیر متوقع طور پر سائیں عالی بھی باہر آگیا۔ ہم دونوں "افسوس کرنے" والے انداز میں دری پر جا بیٹھے۔ یہاں پہلے سے چار پانچ افراد موجود تھے۔ تعزیت کی غرض سے گپیں ہانک رہے تھے اور حقے گڑگڑا رہے تھے۔ میں نے دیہی انداز میں افسوس کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ میرے ساتھ باقی افراد نے بھی یہ رسم پوری کی لیکن سائیں عالی اپنے حال میں مگن بیٹھا رہا اور دری پر چپکے ہوئے گل کے چاول اتار اتار کر کھاتا رہا۔ ایک معمر شخص جس نے دیہی انداز میں پگڑی گلے میں ڈال رکھی تھی مجھ سے میرا تعارف چاہا۔ میں نے سائیں عالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے یہی لے کر آئے ہیں۔ ایک دو مرتبہ ستا پہلوان ڈیرے پر آکر سائیں جی سے مل چکے ہیں۔ کل سے سائیں جی بار بار کہہ رہے تھے کہ میرا دل ستا پہلوان کی طرف سے بڑا پریشان ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

معمر شخص نے عقیدت بھری نظروں سے سائیں عالی کو دیکھا۔ اس کے پاؤں چھوئے اور ہتھی آنکھوں کو لگائی۔ دکھوا لہجہ بنا کر بولا "سائیں جی! میں سخاوت کا بڑا بھائی ہوں۔ سخاوت بڑی تکلیف سہہ کر دنیا سے گیا ہے۔ آپ اس کے لیے دعا کریں۔"

سائیں نے ہوا میں کچھ اشارے کیے اور قہقہہ مار کر خاموش ہوگیا۔ سب افراد سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "سائیں جی بڑی نظر والے ہیں۔ کچھ دیکھ کر ہی خوش ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر کرم کرے گا۔"

دو افراد فرط عقیدت میں سائیں عالی کو مٹھیاں بھرنے لگے لیکن سائیں عالی نے زور سے جھڑکا تو وہ ڈر گئے اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے معمر شخص سے پوچھا "سخاوت پہلوان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟"

وہ بولا "بس جی سانس پورے ہوگئے ہوں تو پھر کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جاتا ہے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوجائے گا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا کہ مکھیوں کے لیے لکڑی کے چھوٹے مکس خانے بنائے جاتے ہیں۔ سخاوت نے ان دنوں ایک نیا تجربہ کیا تھا۔ اس نے ایک بڑے سائز کا چھتا بنایا تھا جس میں کئی ہزار مکھیاں تھیں۔ یہ چھتا کسی مکس خانے کے بجائے کھلی جگہ اگایا گیا تھا۔ ایسا چھتا اگانے کے لیے کسی پرانے چھتے کے ٹکڑے گرم موم کے ذریعے چھت سے چپکا دیے جاتے ہیں۔ مکھیاں خود بخود وہاں ٹھکانا بنالیتی ہیں۔ سخاوت کا چھتا حیران کن طور پر بڑا تھا۔ وہ اس کی بڑی نگہداشت کررہا تھا۔ ایسے چھتے سے شہد نکالنے کے لیے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے مکھیوں کو دھونی دی جاتی ہے اور جب وہ بے سُدھ ہوجاتی ہیں تو چھتے کے کچھ حصے کاٹ کر شہد نچوڑ لیا جاتا ہے۔ مگر احتیاط یہ کی جاتی ہے کہ دھونی دینے کے دوران میں شعلہ پیدا نہ ہو' ورنہ مکھیاں غصے میں آجاتی ہیں اور سخت نقصان پہنچاتی ہیں۔ یہ کام اکثر رات کو ہی کیا جاتا ہے۔ ستا بھی رات ہی کو گیا تھا مگر پتا نہیں اس سے کیا بے احتیاطی ہوگئی کہ مکھیاں بھڑک اٹھیں اور اس پر حملہ کردیا۔ وہ چیختا ہوا باہر بھاگا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ یہ مکھی بڑی ظالم شے ہوتی ہے بھائی صاحب! نہ ڈانگ سوٹا اس پر اثر کرتا ہے نہ پستول بندوق کوئی کام دیتی ہے۔ چھوٹا سا کیڑا ہے۔ پر بندے کو بے بس کرکے رکھ دیتا ہے۔ سخاوت

کے پاس بھی تین چار بندے موجود تھے لیکن کوئی اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ سب اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ جب مکھیاں اڑ گئیں تو سخاوت کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالا گیا۔ پہلے گاؤں کے ڈاکٹر کو دکھایا گیا' پھر گاڑی میں لٹا کر لاہور روانہ کردیا گیا۔ ہم سارے راستے سخاوت کے جسم سے مکھیوں کے ڈنک نکالتے رہے مگر زہر اس کے جسم کو چڑھ چکا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے سوجتا جارہا تھا۔ لاہور کے اسپتال میں پہنچ کر اس نے مشکل سے دو ڈھائی گھنٹے نکالے۔"

معمر شخص کا نام رمضان علی تھا۔ اس کی باتوں سے اور وہاں موجود دوسرے افراد کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس واقعے کو سراسر اتفاقی حادثہ سمجھ رہے ہیں اور کسی کو اس سلسلے میں شک نہیں ہے۔ میں نے اس واقعے پر افسوس کا اظہار کیا اور دیہی انداز میں چند سوالات بھی پوچھے۔ متوفی کے بڑے بھائی رمضان نے ان سوالوں کے جواب سیدھے سادے انداز میں دیے۔ چند مزید افراد بھی ہمارے ارد گرد آکر بیٹھ گئے تھے اور نئے سرے سے ستا پہلوان کی موت کا واقعہ سن رہے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ سائیں عالی میرے ساتھ موجود نہیں۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ واقعی وہاں نہیں تھا۔ رمضان اور دیگر افراد کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کب وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا ہے۔

"سائیں جی کہاں گئے؟" رمضان نے چونک کر پوچھا۔

بعد میں آنے والا ایک شخص بولا "وہ ویہڑے (صحن) کی طرف گیا ہے۔"

میں اور رمضان ایک ساتھ اٹھے اور اس طرف دیکھنے لگے جدھر دیہاتی نے اشارہ کیا تھا۔ سائیں عالی وہاں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے رمضان سے کہا "وہ مجذوب ہیں۔ ان کا اکیلے پھرنا ٹھیک نہیں۔"

رمضان کے چہرے پر خوف سا لہرا اٹھا۔ شاید وہ یہ سوچ کر گھبرا گیا تھا کہ کہیں یہ مجذوب گھر کے زنان خانے کی طرف نکل گیا اور ننگا ہوکر دکھانے لگا یا انہیں چلانے لگا تو کیا ہوگا۔

وہ میرے ساتھ دوڑا ہوا گیا۔ میں دروازے پر کھڑا رہا۔ وہ زنان خانے میں سے گھوم پھر کر باہر آگیا۔ سائیں عالی اندر نہیں تھا۔ اس دوران میں میری نگاہ سائیں عالی کے پاؤں کے نشانات پر پڑ گئی۔ سائیں کے پاؤں کے نشان پہچاننا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ننگے پاؤں رہتا تھا اور اس کے پاؤں ضرورت سے زیادہ پھیلے ہوئے بھی تھے۔ سائیں کا رخ فارم کی طرف تھا۔ میں رمضان کے ساتھ فارم کی طرف بڑھا۔ دو لاٹھی بردار نوجوان بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ ایک طرف نیڈی بکریوں کے لیے بڑا احاطہ تھا۔ دوسری طرف گھنے درختوں کے نیچے سبز اور سرخ رنگ کے بہت سے چوبی مکس خانے (ڈبے) رکھے تھے۔ ان میں موجود مکھیوں کی تعداد یقیناً لاکھوں میں تھی۔ یہاں پہنچ کر میں نے سائیں عالی کو زور زور سے آوازیں دیں۔ سائیں کو ڈھونڈتے ہوئے ہم ایک کھلے احاطے میں داخل ہوگئے۔ یہاں مکھیوں کے لیے بہت سے چھوٹے بڑے مکس خانے بنائے جارہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ستا پہلوان اپنا کام وسیع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جامن اور آم کے پیڑوں کے نیچے لکڑی کا برادہ بکھرا ہوا تھا۔ یہیں ایک جگہ سائیں عالی بھی نظر آگیا۔ وہ ایک نیڈی بکری کو لے کر بڑے مشکوک انداز میں جھاڑیوں کے اندر گھسا ہوا تھا۔ بکری ممیا رہی تھی اور اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ سائیں نے اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں بڑی مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھیں۔ ہم نے قریب جاکر دیکھا تو سائیں دودھ پینے کی کوشش کررہا تھا۔ شاید تھوڑا بہت دودھ اس نے پیا بھی تھا۔ اس کی مونچھوں پر سفید قطرے نظر آرہے تھے۔

رمضان نے عقیدت سے کہا "اوہ.... سائیں جی نے دودھ پینا ہے؟ ایسا تھا تو آپ ہمیں بتاتے۔ ہم آپ کے لیے نیلی بھینس کا دودھ لے کر آتے۔"

سائیں نے کہا "نیلی بھینس کا دودھ تو اپنی ماں کو پلا۔ اپنی بہن کے خصم کو پلا۔ یا خود پی۔"

بے عزت ہوکر بھی رمضان بالکل بدمزہ نہیں ہوا۔ بدستور جاہلانہ عقیدت اس کے چہرے پر سجی رہی۔ جھک کر بولا "اگر سائیں جی بکریوں کا دودھ پئیں گے تو میں نکلوا دوں۔"

سائیں بولا "کھوتے کے پتر! بکریوں کا دودھ تو ایسے پوچھ رہا ہے جیسے بکروں کا دودھ بھی ہوتا ہے۔"

"یعنی بکروں' میرا مطلب ہے بکریوں کا دودھ ہی پئیں گے آپ" رمضان نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں.... سیر ڈیڑھ سیر لے آؤ۔ تھوڑا سا شہد اور تھوڑا سا سرسوں کا تیل بھی ملا لانا۔"

"سس.... سرسوں کا تیل!" رمضان کے ایک کارندے نے حیران ہوکر پوچھا۔

میں نے اسے آنکھ مار کر سمجھایا کہ سائیں جیسا کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو۔

رمضان کا کارندہ دودھ لینے چلا گیا تو سائیں نے بکری کے چھوٹے سے تھن کو لمبا چوسا لگا کر چھوڑ دیا۔ آزاد ہوتے ہی بکری تیر کی طرح بھاگ نکلی۔ اچانک میری نگاہ ایک چھ سات فٹ اونچے ڈبے پر پڑی۔ یہ ڈبا ایک درخت کے نیچے رکھا تھا۔ قریب ہی بہت سا برادہ اور لکڑیاں وغیرہ بکھری ہوئی تھیں۔ ابھی یہ ڈبا پوری طرح مکمل نہیں ہوا تھا۔ پانچ فٹ اونچے دروازے کے قبضے اور ہینڈل وغیرہ لگنے باقی تھے۔ اس ڈبے کے چاروں طرف باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ عجیب وغریب ڈبا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے رمضان سے پوچھا "یہ کیا چیز ہے؟"

وہ ایک دم چونک سا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا "مجھے خود معلوم نہیں۔ شاید سخاوت کے کسی دوست نے پرندوں کے لیے بنوایا

ہے۔"

میں نے کہا "اتنا مضبوط اور بھاری بھرکم پنجرہ پرندوں کے لیے تو نہیں ہو سکتا۔ شیر یا چیتا وغیرہ بند کرنا ہو تو اور بات ہے لیکن اگر کوئی بڑا جانور ہے تو پھر جالی کے بجائے لوہے کی سلاخیں ہونی چاہئیں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ رمضان کو جالی دار پنجرے میں میری دلچسپی زیادہ پسند نہیں آئی۔ وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا "سائیں جی ہماری بات تو مانتے نہیں' آپ ہی سفارش کر دیں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"سائیں جی سے کہیں کہ سخاوت کی قبر پر فاتحہ پڑھ دیں اور بخشش کی دعا کر دیں۔"

میں نے رمضان کی بات سائیں عالی تک پہنچا دی۔ سائیں نے پہلے تو ارنے بھینسے کی طرح ناک سے سوں سوں کی آواز نکالی' پھر زور سے نعرہ لگایا "ہاول دھڑ کا قاتل کا..... ہاول دھڑ کا قاتل کا" پھر اٹھ کر ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے بولا "ہم دعا کریں گے' لیکن ابھی نہیں' رات کے بارہ بجے کریں گے۔"

میں نے رمضان سے کہا "سائیں جی چاہتے ہیں کہ وہ رات یہیں گزاریں۔"

رمضان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تذبذب کے آثار نظر آئے۔ پھر وہ بولا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ سائیں جی کا اپنا گھر ہے۔ ہم ان کے خادم ہیں۔ نوکر چاکر ہیں۔"

سائیں بولا "چلو پھر نوکرو! سب غائب ہو جاؤ یہاں سے۔ صرف ایک نوکر ہمارے پاس رہے اور ہماری ٹانگیں دبائے" سائیں کا اشارہ رمضان علی کی طرف تھا۔

اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سارے افراد تتر بتر ہو گئے صرف رمضان ہمارے پاس رہا۔ وہ خاصا گہرا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں سے سفید ہو چکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ تاہم اپنی توہم پرستی کے سبب وہ سائیں عالی سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ سائیں عالی ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔ اس دوران میں ایک ترکھان آیا۔ میں نے اس کے لباس پر پڑے ہوئے برادے اور کان میں اٹکی ہوئی پنسل سے پہچانا کہ وہ ترکھان ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ اس نے لفافے میں سے ایک مضبوط آہنی ہینڈل اور کھٹکا نکالا۔ ان دونوں چیزوں کو جالی دار ڈربے کے دروازے پر رکھ کر دیکھا۔ پھر رمضان سے پوچھنے لگا "چاچا جی' یہ ہینڈل ٹھیک رہے گا؟"

"ہم..... مجھے کیا پتا؟" رمضان گڑبڑا کر بولا "خود ہی دیکھ لو جو دیکھنا ہے۔"

رمضان کا انداز میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے عجیب ساخت کے ڈربے سے اپنی لاتعلقی اور لاعلمی ظاہر کر چکا تھا لیکن ترکھان کی بات اس شک کو یقین میں بدل رہی تھی کہ اس ڈربے کا تعلق رمضان سے ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سائیں عالی جان بوجھ کر ان درختوں میں پہنچا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آؤں اور یہ عجیب وضع کا ڈربا دیکھ لوں۔ سائیں عالی کے اکثر بے تکے کاموں کے پیچھے کوئی حکمت عملی موجود ہوتی تھی۔ ممکن تھا کہ یہ بھی کوئی حکمت عملی ہی ہو۔

وہ رات ہم نے باغ پور گاؤں میں مرحوم سخا پہلوان کے فارم پر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ فارم میں ہی دو تین کمروں کی ایک کچی پکی رہائش گاہ بھی موجود تھی۔ مرحوم سخا پہلوان کے بڑے بھائی رمضان نے ہمیں ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی بکریوں کے فارم کی طرف کھلتی تھی۔ بکریوں کے ممیانے کی آواز بڑے تسلسل سے آ رہی تھی۔ لیکن تھوڑے فاصلے سے آنے والی یہ باریک آواز بری نہیں لگتی تھی۔ ان آوازوں میں ننھے میمنوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ معصومیت سے بھرپور یہ آوازیں پرندوں کی چہچہاہٹ کی طرح خوبصورت لگتی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر یکبارگی مجھے ننھی زرغونہ یاد آ گئی۔ کتنی انسیت ہو گئی تھی اسے مجھ سے۔ ماں باپ سے بچھڑنے کے بعد اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں یہ "سہارا" بن کر اس کے سامنے آیا تھا اور وہ بڑی مضبوطی سے میرے کندھے سے چمٹ گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور اپنی ہر محرومی کا مداوا میرے کندھے میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ اب میں یہ کندھا بھی اس سے چھین لایا تھا۔ آج اٹھارہ بیس دن ہونے کو آئے تھے۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں۔ وہ نئی جگہ ٹھیک سے سوئی بھی ہے یا نہیں۔ ابھی آب و ہوا میں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ مجھے یقین تھا کہ میں اسے یاد کر رہا ہوں تو وہ بھی مجھے یاد کر رہی ہو گی یہ "انسیت" بھی کیا رشتہ ہے جو دو انسانوں کے درمیان خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاید حیوانوں میں بھی ایسے رشتے موجود ہوتے ہیں..... بھی تو یخ بستہ رات کے سناٹے میں یہ ننھے چھوٹے میمنے ممیا رہے تھے اور اپنے مطلوب تک اپنا پیغام پہنچا رہے تھے۔

اچانک سائیں عالی کی آواز نے مجھے چونکایا "جانتے ہو وہ ڈولا (ڈربا) کیا تھا؟"

میں سوالیہ نظروں سے سائیں کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور گاہے گاہے اپنے نادیدہ جنات سے اشارے بازی کرنے لگتا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ گرج کر بولا "کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو.... بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بولوں۔ تم خود ہی بتا دو نا۔"

"ہر بات خود ہی بتادوں..... آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ عیسیٰ جان سے دشمنی میری نہیں تمہاری ہے۔"

"ڈولے سے عیسیٰ جان کی دشمنی کا کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔ لیکن ایسے "تعلق" وہی دیکھ سکتے ہیں جو اندر کی آنکھ رکھتے ہیں۔ کیا سمجھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں عیسیٰ جان کے ڈیرے پر رہتے ہوئے اب قریباً پندرہ دن ہونے کو آئے ہیں۔ چلو تم تو اسے نہ پہچان سکے لیکن اس نے تو تمہیں پہچان لیا تھا۔ پھر اتنا آسان موقع ملنے کے باوجود اس نے تمہارا قصہ تمام کیوں نہ کیا؟"

"ہاں یہ بات تو مجھے بھی الجھن میں ڈال رہی ہے۔"

"اس الجھن کا حل یہ ڈولا (ڈربا) ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ ڈولا تمہارے لیے بنایا گیا ہے۔ بنوانے والا عیسیٰ جان ہے۔ وہ تمہیں اس میں بند کرے گا اور مکھی کا ناچ نچوائے گا۔ مکھی کا ناچ کبھی دیکھا ہے تم نے؟"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں" سائیں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تمہیں اس ڈولے میں بند کیا جائے گا اور شایان شان طریقے سے مارا جائے گا۔ تم عیسیٰ جان کے گھیرے میں ہو۔ وہ کسی بھی وقت تمہاری جان لے سکتا تھا۔ اگر تمہیں زندہ رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ عیسیٰ جان کو ڈولا مکمل ہونے کا انتظار تھا۔"

"پھر وہی ڈولا..... ڈولا۔ یہ کیا رٹ لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے ڈولے میں بند کر کے کیا کرے گا عیسیٰ جان؟"

"قبائلی علاقوں میں مجرموں کو دی جانے والی سزا مکھیائی کے متعلق کچھ سنا ہے تم نے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ سائیں عالی اپنی چھوٹی انگلی ناک میں گھماتے ہوئے بولا "مکھیائی کی سزا کا تعلق شہد کی مکھیوں سے ہوتا ہے۔ جس عورت یا مرد کو سزا دینا مقصود ہوتی ہے۔ اسے لکڑی کے ڈولے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس ڈولے کے چاروں طرف جالی لگی ہوتی ہے تاکہ لوگ مجرم کے تڑپنے پھڑکنے کا نظارہ کر سکیں۔ اگر مجرم مرد ہو تو مکھیائی کی سزا کے لیے اسے بعض اوقات عریاں بھی کر دیا جاتا ہے۔ مجرم کو ڈولے میں بند کر کے ڈولے کو کسی درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس ڈولے میں شہد کی مشتعل مکھیاں موجود ہوتی ہیں۔ وہ بدقسمت شخص پر حملہ آور ہوتی ہیں اور کاٹ کاٹ کر اس کا حشر خراب کر دیتی ہیں۔ مجرم کی چیخ و پکار اس بہت بڑے ڈھول کی آواز میں دب جاتی ہے جو ڈولے کے قریب پورے زور سے بجایا جاتا ہے۔ مجرم بے ہوش ہو کر گر جائے تو پانی کے چھینٹوں سے اسے ہوش دلایا جاتا ہے۔ اکثر دو تین دفعہ تازہ دم مکھیاں ڈولے میں داخل کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مجرم تڑپ تڑپ کر ختم ہو جاتا ہے۔"

سائیں عالی کا لہجہ ڈرامائی تھا۔ میں حیرت میں ڈوب کر یہ باتیں سن رہا تھا۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ سائیں کی باتوں کو بکواس کہہ کر نظر انداز کر دوں۔ کبھی یہ باتیں حقیقت سے قریب نظر آتی تھیں اور بدن میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتی تھیں۔ ڈربے اور سزا والی بات پر تو میں یقین نہیں کر سکتا تھا لیکن اتنی بات ضرور سمجھ میں آ رہی تھی کہ عیسیٰ جان کا تعلق سخا پہلوان کی موت سے یقیناً تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عیسیٰ جان نے سخا کو مارنے کے لیے باغ پور کے ہی کسی شخص کو بطور آلہ کار استعمال کیا ہو۔ ایسے کام اندر کے آدمی بڑی آسانی اور خوبی سے کر گزرتے ہیں۔ رمضان علی کی مثال بھی دی جا سکتی تھی۔ بے شک وہ مرحوم سخا پہلوان کا بڑا بھائی تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اندرونی طور پر دونوں بھائیوں میں اختلافات موجود ہوں۔ عیسیٰ جان نے رمضان کو شیشے میں اتار لیا ہو اور رمضان نے ہی وہ چکر چلایا ہو جس کے نتیجے میں سخاوت عرف سخا کی جان گئی ہو۔ شہد کے فارمز میں مکھیاں عموماً نیوکن ٹائپ باکسز میں پالی جاتی ہیں لیکن سخاوت جن مکھیوں کا شکار ہوا ان کا چھتا گودام کی چھت پر لگا ہوا تھا۔ سخاوت کو اپنے ہاتھوں سے شہد نکالنے کا شوق تھا۔ عین ممکن تھا کہ جب وہ گودام میں اپنا شوق پورا کر رہا ہو' رمضان نے سازش کے تحت مکھیوں کو مشتعل کر دیا ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ فائر کر سکتا تھا یا کوئی اور آزمودہ طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔

بہرحال اس فارم میں آنے کا مجھے کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا تھا۔ سوائے اس بات کے کہ ہمیں سخا پہلوان کی موت کا پتا چل گیا تھا۔ لیکن موت کا پتا چلنے سے کیا ہوتا تھا۔ ہم عیسیٰ جان کے خلاف کیس تو درج نہیں کرا سکتے تھے۔ ایسے نہ جانے کتنے خونی کیس وہ جیب میں لیے پھرتا تھا۔ وہ ایک مفرور ڈکیت تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت خوفناک اور طویل تھی۔ میرے سینے میں شعلے سے شعلے تھے اور دھواں ہی دھواں تھا۔ نواب اور شاہین کا سفاک قاتل میرے سامنے آ چکا تھا لیکن تاحال میرے ہاتھ اس کی گردن سے دور تھے۔ تاحال میرے خنجر کو اس کے خون کی پیاس تھی۔ میرے اندر کی بے چینی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی آواز بار بار میرے کانوں میں کہتی تھی "شاہ جہاں! میں کب تک انصاف کا انتظار کروں گی۔ میری جان اور آبرو کا قاتل کب تک زمین پر دندنائے گا۔"

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر ڈیرے پر پہنچ جاؤں۔ عیسیٰ جان کو بدترین ناموں سے للکار کر اس پر حملہ کر دوں۔ خود مر جاؤں یا اس کے ٹکڑے کر دوں۔ لیکن سائیں عالی مُصر تھا کہ وہ رات یہیں گزارے گا۔ خبر نہیں وہ یہ ضد کیوں کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جو بات ایک بار سما جاتی تھی وہ آسانی سے نکلتی نہیں تھی' شاید یہ بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بیٹھا بیٹھا خراٹے لینے لگا۔

پھر اس نے اپنا سر چارپائی کے بازو سے نکالا اور گہری نیند سو گیا۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں ستا پہلوان کے بھائی رمضان کے حوالے سے مختلف شکوک سر اٹھا رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر رمضان کے بارے میں تھوڑی سی تفتیش کروں۔ ویسے بھی سونے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ ذہن جوالا مکھی بنا ہوا تھا اور ہر طرح کے خیالات کی یورش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنا ریوالور چیک کیا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ فارم اور مکان کا حدود اربعہ میں دن کے وقت ہی اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رمضان علی مکان کے کس حصے میں رہتا ہے اور اس وقت وہ کس کمرے میں مل سکتا ہے۔ میرا ارادہ "ڈائریکٹ ایکشن" کا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ رمضان کی خواب گاہ میں گھسوں۔ اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھوں اور گھسیٹ کر طویلے میں لے جاؤں۔ طویلہ بالکل خالی تھا۔ گھوڑے بھی نہیں تھے۔ وہاں اطمینان کے ساتھ رمضان سے پوچھ گچھ کی جاسکتی تھی۔

میں نے چھ فٹ اونچی چار دیواری باآسانی پھاندی اور احاطے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرا قریب ہی تھا جہاں میرے اندازے کے مطابق رمضان علی محو خواب تھا۔ پانچ پٹ والی کھڑکی احاطے کی طرف تھی۔ میں نے کھڑکی کا معائنہ کیا تو ایک پٹ کھلا ہوا مل گیا۔ اندر کی طرف جالی بھی موجود نہیں تھی۔ میں احتیاط سے چوکھٹ پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ کمرے میں حقے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تاریکی میں کسی کے مدھم خراٹے بھی سنائی دیئے۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور روشن کرلی۔ چوڑی چکلی مسہری پر رمضان علی پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ نیند کی حالت میں اس کی دھوتی اوپر چڑھ گئی تھی اور گھٹنے عریاں ہو رہے تھے۔ حقے کی نال ابھی تک رمضان کے ہاتھ میں تھی۔ لگتا تھا کہ اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کمرے میں ایک طرف بہت سی بوریاں اوپر تلے رکھی تھیں۔ یقیناً ان میں اناج یا بیج وغیرہ تھا۔ میں نے دیواروں کا جائزہ لیا اور ایک دیوار پر الماری کے قریب رمضان کا بڑا سا پستول لٹکا نظر آگیا۔ میں نے سب سے پہلے پستول کی گولیاں نکالیں پھر اسے الماری کے نیچے تاریک خلا میں کھسکا دیا۔ دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھی ہوئی تھی۔ ایک کے سوا تمام کھڑکیاں بھی بند تھیں۔ میں نے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد مسہری کی طرف قدم بڑھایا۔ میرا ارادہ رمضان کو جگانے کا تھا لیکن ایک دم میں اچھل پڑا۔ دروازے پر ہونے والی دستک جتنی اچانک تھی اتنی ہی گونج دار بھی تھی۔ پہلی دستک پر رمضان علی کے خراٹے رک گئے اور وہ کسمسایا۔ میں نے بھاگ کر بوریوں کے پیچھے پناہ لی۔ دوسری دستک کے ساتھ ہی رمضان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "اوئے کون ہے بھئی؟"

"میں سلطان ہوں چاچا جی۔۔۔ آپ سے بہادر صاحب ملنے آئے ہیں۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ بہادر کا نام سنتے ہی رمضان کی نیند پوری طرح کھل گئی ہے اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔ مسہری کی چوں چاں سنائی دی۔ پھر رمضان کی بڑبڑاہٹ میرے کانوں تک پہنچی "بہادر علی اس وقت کیسے آگیا؟"

کمرے کی لائٹ جل گئی تھی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور چاپ سے اندازہ ہوا کہ رمضان اپنی دیسی جوتی گھسیٹتا برآمدے کی طرف گیا ہے۔ میں نے بوریوں کے درمیان موجود رخنے سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ رمضان اتنی دور ہرگز نہیں گیا تھا کہ میں اس کمرے سے نکل کر کہیں اور چھپنے کی کوشش کرتا۔ بہادر کا نام میرے ذہن میں مسلسل گونج رہا تھا۔ یہ نام شاید میں نے آج ہی کہیں سنا تھا۔ پھر ایک دم مجھے یاد آگیا۔ یہ تو عیسیٰ جان کے سرخ و سفید پنجابی ساتھی کا نام تھا۔ سلائی اسکول کی انچارج راحت عرف آپا جی نے یہ نام بتایا تھا۔ میری رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عیسیٰ جان اور بہادر دونوں یہاں آئے ہوں۔

یہ خیال آتے ہی ریوالور پر میری گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی اور اعصاب پوری طرح تن گئے۔ صرف چند سیکنڈ بعد مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ بوریوں کے درمیان واضح باریک درز سے میں نے دیکھا کہ رمضان کے ساتھ عیسیٰ جان اور بہادر علی اندر داخل ہو رہے ہیں۔ عیسیٰ جان اسی "گیٹ اپ" میں تھا جس میں وہ ڈیرے پر نظر آتا تھا۔ کل رات راحت عرف آپا جی کی خوابگاہ میں بھی وہ اسی حلیے میں نظر آیا تھا۔ جھاڑ جھنکار داڑھی نصف پیشانی کو چھپاتی ہوئی پگڑی اور رات کے وقت بھی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک۔ عیسیٰ جان کے چہرے اور لباس پر گرد تھی۔ لگتا تھا کہ وہ تھکا ماندہ ہے اور کہیں دور سے آیا ہے۔ بہادر علی کا بھی یہی حال تھا۔

عیسیٰ جان اور بہادر کے اندر آنے کے بعد رمضان نے اپنے ملازم سلطان کو گرما گرم کھانے کا آرڈر دیا۔ اس آرڈر میں مچھلی اور مرغی کا سالن، سوجی کا حلوا اور پراٹھے وغیرہ تھے۔۔۔ عیسیٰ جان کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ رمضان سے مخاطب ہو کر شستہ اردو میں کہہ رہا تھا "ایک بندے سے ملنے راجکے گاؤں گئے ہوئے تھے۔"

رمضان بولا "او ہو۔ وہ تو بڑا خراب راستہ ہے۔ گاڑی کے ساتھ بندے کا انجر پنجر بھی ڈھیلا ہو جاتا ہے۔"

بہادر بولا "گاڑی کا پنجر کیا ڈھیلا ہونا تھا، وہ تو واپسی میں تین میل چل کر ہی لم لیٹ ہو گئی۔ کوئی ایکسل وغیرہ ٹوٹ گیا ہے اس کا۔۔۔ وہاں سے پیدل آنا پڑا۔"

"یہ تو بہت برا ہوا" رمضان نے کہا "خیر میں ابھی جیپ پر بندے بھیج دیتا ہوں۔ وہ باندھ کر لے آئیں گے۔ وہاں

مکینکوں اور اسپیئر پارٹس کی دکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ صبح تک گاڑی فٹ ہو جائے گی۔"

بہادر نے عیسیٰ جان سے مخاطب ہو کر کہا "خان جی! میرا خیال ہے نہا دھو کر تازہ ہو جائیں۔ اتنے میں کھانا بھی بن جائے گا۔"

"میں تو تازہ دم ہی ہوں" عیسیٰ جان نے کہا "تم نے نہانا ہے تو نہالو" بہادر نے عیسیٰ جان کو رمضان کی موجودگی میں قلندر جی کے بجائے خان جی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہ صرف بہادر، عیسیٰ جان کی اصلیت سے واقف ہے بلکہ ان دونوں نے رمضان سے بھی کچھ نہیں چھپا رکھا۔ (جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا بہادر علی اور رمضان آپس میں دوست تھے۔ بہادر علی کی مدد سے ہی عیسیٰ جان نے رمضان سے رابطہ کیا تھا اور رمضان کو اپنا آلہ کار بنایا تھا)

بہادر نہانے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ رمضان، عیسیٰ جان سے باتیں کرنے لگا۔ بہادر کی طرح وہ بھی عیسیٰ کو خان جی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میرے کانوں میں گلاسوں کی کھن کھن گونجی اور پھر الکحل کی بو کمرے میں پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں انگور کی بیٹی سے دل بہلانے لگے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں ان سے چند قدم کی دوری پر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ زور سے سانس بھی لوں گا تو انہیں خبر ہو جائے گی۔

"ڈولا مکمل ہو گیا؟" عیسیٰ جان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میرا سر دھماکوں سے گونج اٹھا۔

اس کا مطلب تھا، سائیں عالی نے جو قیاس لگایا وہ بالکل درست تھا۔ وہ عجیب وضع کا ڈولا کسی اور نے نہیں عیسیٰ جان نے بنوایا تھا۔ حیرت کا یہ دھچکا بہت شدید تھا۔ میں اس دھچکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ عیسیٰ جان اور رمضان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ عیسیٰ جان کہہ رہا تھا "کل ہر صورت ڈولا ڈیرے پر پہنچ جانا چاہیے اور دوسرا سامان بھی۔ میں اس موقع کو یادگار بنانا چاہتا ہوں۔"

رمضان نے پوچھا "بندے کتنے ہیں خان جی؟"

"بندہ تو ایک ہی ہے۔"

رمضان نے حیرت سے کہا "یعنی ایک بندے کے لیے آپ یہ سارا انتظام کروا رہے ہیں۔"

"شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لالے" عیسیٰ جان نے کہا۔

"اس کے بعد کیا کریں گے اس ڈولے کا؟"

"تمہیں دے جاؤں گا۔ تم نے جس کاریگر کا دماغ درست کرنا ہوا اسے بند کروا دیا کرنا۔ کسی کو قتل کرنا ہو تو بھی اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ قتل کا قتل اور تماشے کا تماشا۔"

"خیال تو آپ کا ٹھیک ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" عیسیٰ جان نے کھردرے لہجے میں کہا "کسی جانی دشمن کو اپنے سامنے تڑپ تڑپ کر سسکتے دیکھنے میں جو نشہ ہوتا ہے وہ دنیا کی کسی شراب میں نہیں۔ اس نشے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ زمین آسمان آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں لالے۔۔۔ ہر چیخ کانوں میں رس گھولتی ہے۔ ہر فریاد سن کر سیروں خون بڑھتا ہے۔ جب دشمن روتا بلکتا ہے، اپنے ہی لہو میں ڈوب کر ناچتا ہے، زمین سے سر پٹختا ہے تو دل جھوم اٹھتا ہے، اور دشمن کی آخری ہچکی تک جھومتا چلا جاتا ہے۔ اب تجھے کیا بتاؤں؟ کیونکہ تو نے تو شاید یہ سواد چکھا ہی نہیں ہے۔"

عیسیٰ جان بڑی صاف اردو بول رہا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ "پنجابی" بولنے میں بھی اس نے کافی مہارت حاصل کرلی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے کئی مہینوں سے وہ زبان دانی پر خاص توجہ دیتا رہا ہے۔

رمضان نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا "لیکن خان جی! وہ بد بخت ہے کون جس نے آپ سے دشمنی مول لی؟"

"ہے ایک بد بخت۔ اگر تم نے دیکھنا ہے اور اس کا تماشا بھی دیکھنا ہے تو کل ڈولے کے ساتھ ہی ڈیرے پر چلے آنا۔ رات کو زبردست جشن منائیں گے۔"

ایک بار پھر گلاسوں کی کھن کھن گونجی۔ عیسیٰ جان کی مخمور آواز سنائی دی۔

"لالے کوئی چھوکری موکری بھی یہاں ہے کہ نہیں؟ میرا مطلب ہے کوئی رنگیل چھبیل، کوئی جوان نوکرانی یا پھر کوئی۔۔۔" عیسیٰ جان نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ نجانے وہ کیا چاہتا تھا۔

رمضان بولا "چھوکریاں تو بڑی ہیں، لیکن اس وقت۔۔۔۔۔۔ بہرحال آپ کا حکم تو نہیں ٹالا جاسکتا۔ میں ابھی سلطانے کو بھیجتا ہوں۔ ایک مزارعہ ہے فدا حسین۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ کل ہی بیوی کو سلام کرانے لایا تھا۔ میں یہاں تھا نہیں۔۔۔ اب اس سے کہتا ہوں کہ ابھی آکر "سلام" کرا جائے۔"

رمضان قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ بھی قہقہے میں ساتھ دے گا لیکن عیسیٰ چپ رہا۔ ایک ڈیڑھ سال گزرنے کے باوجود میں نے اس کی ہنسی نہیں سنی تھی۔ رمضان کیسے سن سکتا تھا۔

میں عیسیٰ اور رمضان کی گفتگو سن رہا تھا لیکن دماغ میں طوفان برپا تھے۔ کیا واقعی عیسیٰ جان جس جانی دشمن کی باتیں کر رہا تھا وہ میں ہی تھا۔ کیا واقعی سائیں عالی کا قیاس درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو میرے دل نے گواہی دی۔ یہ سارا تانا بانا میرے گرد ہی بنا جا رہا تھا۔ یہ میں ہی تھا جسے "دردناک موت" دینے کے لیے عیسیٰ چپکے چپکے تیاری کر رہا تھا۔ میں اس کی درندگی اور اذیت پسندی سے بخوبی آگاہ تھا۔ میں جانتا تھا اپنے دشمن کو تڑپا تڑپا کر مارنا عیسیٰ جان کو کتنا محبوب ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا یقیناً اپنی فطرت

کے عین مطابق کر رہا تھا۔ مارنے کو تو وہ مجھے اسی دن مار سکتا تھا جس دن میں صفیہ، محسن اور ریحان کے ساتھ ڈیرے پر وارد ہوا تھا۔ لیکن مجھے آنا فانا موت دینے سے اس کی درندگی کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ اس "تسکین" کے لئے اس نے میرے "اعزاز" میں فاؤل طرز کا ایک خصوصی "پروگرام" ترتیب دیا تھا اور کل مجھے اس "پروگرام" میں شرکت فرمانی تھی۔

عیسٰی جان کا سفاک دوست بہادر علی نہا دھو کر کمرے میں واپس آگیا تھا۔ وہ پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت کر رہا تھا۔ رمضان نے جواب دیا "بہرا جی! ابھی آپ کو گرم گرم کھانا کھلا کر گرم گرم بستر دے رہے ہیں تو ساری سردی دور ہو جائے گی۔"

بہادر علی معنی خیز لہجے میں بولا "مجھے تو زیادہ گرم بستر کی ضرورت نہیں۔ لیکن تمہیں پتا ہی ہے، خان جی گرم بستر کے بغیر رات نہیں گزار سکتے۔"

دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ پھر رمضان کی آواز آئی۔ وہ عیسٰی جان سے مخاطب ہو کر بولا "خان جی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ آپ نے بتایا ہے کہ وہ بندہ خود بخود آپ کے ڈیرے پر آگیا تھا اور وہ آپ کو اس حلیے میں پہچانتا بھی نہیں ہے۔"

"شاد جہاں کی بات کر رہے ہو؟" عیسٰی نے تصدیق چاہی۔

"آہو جی" رمضان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اپنا نام سن کر میری دھڑکنیں مزید تیز ہو گئی تھیں۔ عیسٰی جان بولا "یہ بڑا مزے دار چکر چلا ہے۔ یہ کوئی تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میرے ڈیرے پر ایک ملنگ صورت شخص رات گزارنے کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ بڑی خوبصورت چھوکری بھی تھی۔ وہ ہندو تھی اور ملنگ صورت شخص اسے "سروج" کے نام سے پکارتا تھا۔ ملنگ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی کوئی زبردست شے ہے۔ بندے کو باتوں باتوں میں اپنا مطیع بنا لینا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں ان پیروں فقیروں کو زیادہ منہ نہیں لگاتا لیکن وہ ملنگ بالکل اور طرح کا شخص ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بے ٹھکانا ہے۔ اس کے ساتھ جوان جہان لڑکی بھی تھی۔ میں نے اسے دعوت دی کہ وہ میرے ڈیرے پر ہی رہے۔ اس نے یہ دعوت قبول کرلی..... وہ ہر وقت ہوا میں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس کی ہندو چیلی کا کہنا تھا کہ سائیں جی جنات سے باتیں کرتے ہیں۔ ایک رات سائیں کو بیٹھے بٹھائے جانے کیا ہوا کہ اس نے مجھے بلایا اور کہنے لگا کہ میں فوراً سڑک پر پہنچوں۔ وہاں سے ایک سفید جیپ گزرنے والی ہے۔ جیپ پر دو آدمی اور ایک نوعمر لڑکی سوار ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بیمار عورت بھی ہے۔ میں انہیں روکوں اور ڈیرے پر لے آؤں۔ حیرت ناک طور پر سائیں کا کہا درست ثابت ہوا۔ سفید جیپ وہاں سے گزری۔ اس پر بیمار عورت کے علاوہ تین بندے سوار تھے۔ جن میں ایک لڑکی تھی۔ ایک بندے کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ شاد جہاں تھا۔ اس بندے سے میری دشمنی کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ کسی وقت بہادر علی تمہیں اطمینان سے بتائے گا..... بہر حال میں شاد جہاں کو پہچان گیا لیکن وہ میرے حلیے کی وجہ سے مجھے نہیں پہچان سکا۔ میں ان چاروں کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا۔ سائیں نے بند کمرے میں ان سے بات کی۔ اور انہیں کچھ اس طرح شیشے میں اتارا کہ وہ ڈیرے پر رہنے کو تیار ہو گئے..... بیمار عورت کی حالت بہت بری تھی۔ کسی نے اس سے بدترین انتقام لیا تھا۔ اس کی آنکھوں اور سر کے بال مونڈ دیئے تھے۔ اس کی ناک ٹوٹی ہوئی تھی اور پورا جسم زخم زخم تھا۔ شاد جہاں اس عورت کی دوائیں وغیرہ بھی ساتھ ہی لایا تھا اور باقاعدگی سے کھلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چکر بھی چل گیا اور میرا خیال ہے کہ یہ چکر بھی سائیں نے ہی چلوایا ہے۔ میں نے بتایا ہے ناکہ سائیں کے ساتھ آنے والی ہندو چیلی بڑی دھماکا خیز لڑکی ہے۔ پتا نہیں اس نے کیا جادو چلایا ہے کہ شاد جہاں کے ساتھ اس کا معاملہ فٹ ہو گیا ہے۔ میں نے دو تین بار انہیں کمرے میں بند دیکھا ہے۔ ایک بار میں ان کی خرمستی دیکھنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر گرے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے وہسکی پی رہے تھے۔ شاد جہاں تو کوئی چیز نہیں، وہ لڑکی کسی بھی خشک سے خشک بندے میں کرنٹ پیدا کر سکتی ہے۔"

"پھر تو دیکھنے کی چیز ہوگی" رمضان نے کہا اور خباثت بھرا قہقہہ لگایا۔

عیسٰی جان نے اس مرتبہ بھی رمضان کا ساتھ نہیں دیا اور اسے جلدی سے چپ ہونا پڑا۔ عیسٰی جان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بارہ تیرہ روز پہلے ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ شاد جہاں رات کے وقت ڈیرے سے باہر گیا اور ایک زخمی شخص کو لے آیا۔ اس کے کولہے میں گولی لگی تھی اور بہت سا خون نکل چکا تھا۔ اس شخص کا آپریشن ڈیرے پر ہی کرایا گیا اور گولی نکالی گئی۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ یہ شخص موضع رنگ والی کی لال کوٹھی کا مالک چوہدری بخت تھا۔"

"واقعی؟" رمضان کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہاں..... یہ اس رات کا واقعہ ہے جب چوہدری کی فٹ بال فیکٹری میں آگ لگی تھی اور ہنگامے میں تین بندے مارے گئے تھے۔"

"اور چوہدری بخت؟" رمضان نے پوچھا۔

"چوہدری ڈیرے پر ہی رہا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق شاد جہاں اسے دوا وغیرہ دیتا رہا۔ علاج کے باوجود چوہدری کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شاد جہاں، چوہدری بخت کو جعلی انجکشن لگا رہا ہے اور یہ کام چوہدری کو سبق سکھانے کے لیے کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ جعلی انجکشن چوہدری کی اپنی ہی "دوا کی فیکٹری" کے بنے ہوئے ہیں..... چند روز پہلے جب چوہدری کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ نیم پاگل نظر آنے لگا تو

اس کا بیٹا اپنی "چھوٹی امی" کے ساتھ آیا اور چوہدری کو اپنے ساتھ لے گیا..... بہر حال مجھے اس سارے معاملے سے کسی طرح کی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے صرف شاد جہاں سے دلچسپی ہے اور اس بات سے دلچسپی ہے کہ میں اس کا انجام یادگار بنا سکوں۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے عیسٰی جان کے مخمور لہجے میں ایک بار پھر خاص قسم کی درندگی عود کر آئی۔ جیسے کسی لذیذ کھانے کو دیکھ کر بہت بھوکے شخص کی رال ٹپکنے لگے۔ وہ خراب ناک لہجے میں بولا "بڑا مزہ ہے دشمن کو خوار کر کے مارنے میں۔ بندہ ایسے چند ایک مزے لے لے تو پھر مرنے کا کیا غم؟"

رمضان نے کہا "خان جی! لیکن میرا سوال وہیں پر ہے۔ میرا مطلب ہے کہ شاد جہاں نام کے اس بندے کو آپ نے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ یہاں سب ڈرا ہوا سے ہیں۔ وہ اگر غائب ہو گیا تو پھر؟"

"کہاں نہیں ہو گا غائب۔ تمہیں بتایا ہے ناکہ وہ ڈیرے پر آکر لڑکی کے چکر میں پھنس گیا ہے۔ ابھی ایک دو ہفتے تک تو وہ کہیں جانے والا نہیں۔ اس معاملے میں میں بالکل بے فکر ہوں۔"

رمضان نے حقہ گڑگڑا کر کہا "خان جی! کیا آپ یہ سمجھتے ہو کہ اس ملنگ نے آپ کی مدد کی ہے اور کسی عمل شمل کے زور سے آپ کے دشمن کو آپ کے قدموں میں لا پھینکا ہے؟"

عیسٰی بولا "کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ اس بات پر یقین کرلوں۔ یہ مان لوں کہ وہ ملنگ صورت بندہ واقعی کوئی پہنچی ہوئی شے ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی دماغ میں آتا ہے کہ شاید یہ ملنگ کوئی چکر چلا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بڑا گہرا شخص ہو اور شاد جہاں سے اس کی پرانی شناسائی ہو۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ شاد جہاں سے اس کی پرانی شناسائی ہے اور اس نے شاد جہاں کو ڈیرے پر بلا کر میری نہیں بلکہ شاد جہاں کی مدد کی ہے تو پھر شاد جہاں ابھی تک میری اصلیت سے بے خبر کیوں ہے۔ میں پورے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ابھی تک مجھے قلندر وسایا ڈوگر ہی سمجھتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو سمجھ میں آنے والی ہے" رمضان نے کہا۔

بہادر علی بولا "یار اب تو تجھے خان جی کی ہر بات سمجھ میں آنی چاہیے۔ خان جی نے تیرے دماغ میں ڈیڑھ کروڑ روپے کا بلب روشن کر کے تیری عقل کو چار چاند لگا دیے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"پیارے! ڈیڑھ کروڑ سے کم کی جائیداد کیا ہوگی یہ..... سخاوت کے بعد اب یہ سب رکھ تمہارا ہی ہے" بہادر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

رمضان رسمی انداز میں ہنسنے لگا اور بہت مدھم لہجے میں کوئی بات کہی۔

بہادر علی کے فقروں نے میرے دماغ میں مچی ہوئی کھلبلی میں اضافہ کر دیا۔ ان فقروں سے اس سازش کی بو آ رہی تھی جس کے نتیجے میں سکا پہلوان زہریلی کھمبیوں کا شکار ہوا تھا۔ میرا یہ شک یقین میں بدل رہا تھا کہ سکا کے قتل میں رمضان، عیسٰی جان کا آلہ کار رہا ہے۔ اس سازش کی بنیادی وجہ "آپی سلائی اسکول" کی انچارج زبی ہی تھی۔ اس بے چاری کو پتا بھی نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے باغ پور گاؤں کی ایک چار دیواری میں کیا اکھاڑ پچھاڑ ہوئی ہے۔

واقعات کے دائرے اسی طرح از خود آپ ایک دوسرے سے ملتے جاتے ہیں۔ یہ زندگی ایک مسلسل کہانی ہے اور ایک ایسی کہانی جس کا کوئی موضوع متعین نہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ حادثے سے حادثہ اور واقعے سے واقعہ جڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی کی بے ترتیبی اور ناہمواری ہی اس کی پہچان ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے سے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن میں پہلو تک نہیں بدل سکتا تھا۔ رمضان اور عیسٰی جان کی گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ موضوع گفتگو ایک بار پھر سائیں عالی اور اس کی خوبرو ہندو چیلی تھا۔ رمضان بولا "ہمارے فارم میں بھی کل سے ایک سائیں آیا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ میں سخاوت کا پیر ہوں۔ مجھے تو پریشانی ہو رہی ہے کہ کہیں کوئی چکر ہی نہ چلا دے۔"

بہادر علی بولا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یار۔ اتنا ہی پیر تھا تو سکا کو بچا کیوں نہ لیا اس نے۔ ایسے بڑے پیر خوار ہوتے پھرتے ہیں یہاں وہاں۔"

بہادر علی بے خبر تھا کہ رمضان بھی اسی سائیں کی بات کر رہا ہے جس کی باتیں عیسٰی جان کر رہا تھا۔

اچانک دروازے کی طرف آہٹ ہوئی اور رمضان کو خاموش ہونا پڑا۔ ملازم سلطاناں کھانا لے کر اندر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بندہ بھی تھا۔ بھنے ہوئے گوشت، تلی ہوئی مچھلی اور گرم گرم پراٹھوں کی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی..... رات کے وقت پراٹھے کھانے کے شوقین میں نے پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔

دس پندرہ منٹ تک برتنوں کی کھنکھناہٹ اور عیسٰی جان کی چپڑ چپڑ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ مرغ کی ہڈیاں بھی ایسے چباتا تھا جیسے دشمن کی ہڈیاں چبا رہا ہو۔ دونوں ملازم کمرے کے اندر موجود تھے اور مہمانوں کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ کوئی کسی بھی کام سے اس کونے کی طرف آسکتا تھا اور بوریوں کے پیچھے جھانک سکتا تھا۔ ایسے میں میرے پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اگر کوئی میری پناہ گاہ کی طرف چلا آتا تو نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ میں نظر آجاؤں گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا یہ سب حالات پر منحصر تھا۔ کھانے کا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ اس دوران میں دروازے کے قریب کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر چوڑیوں کی چھن چھن گونجی اور مجھے اندازہ ہوا کہ عیسٰی جان کے لیے "شب بسری" کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں نے بوریوں میں واقع روزن سے جھانکنے کی

کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ درز کے عین سامنے رمضان کے چوڑے چکلے ملازم کی پشت نظر آ رہی تھی۔ رمضان کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ گفتگو دروازے سے باہر ہو رہی تھی۔ لہٰذا واضح طور پر مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ پھر رمضان کمرے کے اندر آ گیا۔ اس کی خباثت بھری آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ کمرے میں موجود لڑکی سے مخاطب تھا۔

"پریشان کیوں ہو بھئی! یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ آرام تسلی سے بیٹھو" پھر وہ ملازم سلطانے سے بولا "جا اوئے! تو یہاں کھڑا کیا منہ دیکھ رہا ہے۔ جا بی بی کے لیے دودھ سوڈا لا۔"

سلطان عقبی دروازے کی طرف بڑھا تھا جب اچانک رمضان کی متحیر آواز سنائی دی "اوئے سلطانے' یہاں دیوار پر میرا پستول تھا وہ کدھر گیا؟"

"مجھے تو نہیں پتا جی" سلطانے کی آواز ابھری۔

میری رگوں میں خون کی رفتار بڑھ گئی۔ پستول کو دیوار سے اتار کر الماری کے پیچھے چھپانے والا میں ہی تھا۔ اب رمضان کو پستول کی غیر موجودگی کا علم ہوا تھا اور وہ پریشان ہو رہا تھا۔

کمرے سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے مختلف چیزوں کو الٹا پلٹا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ رمضان کی بڑبڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ اضطراب کے عالم میں پستول تلاش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ اب میری پناہ گاہ بھی محفوظ نہیں۔ کسی بھی لمحے رمضان یا اس کا کوئی کارندہ پستول کی تلاش میں بوریوں کے پیچھے جھانک سکتا تھا۔ اپنے ریوالور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

رمضان کی سٹپٹائی ہوئی آواز سنائی دی "آخر گیا کہاں۔ شام کے بعد میں نے خود یہاں لٹکایا تھا۔ میں تو کمرے سے باہر بھی نہیں گیا۔"

پھر بھاری قدموں کی آواز بوریوں کی طرف آئی۔ اگلے ہی لمحے میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ رمضان نے بوریوں کے پیچھے جھانکا۔ جونہی اس کی نگاہ میری نگاہ سے ٹکرائی' اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختا یا کوئی اور رد عمل ظاہر کرتا' میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ اضطراری طور پر گھوما' جیسے مڑ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آئی اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

جونہی میں بوریوں کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ عیسیٰ جان یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کسی زبردست اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ اس کا ہاتھ اپنے لبادے کے نیچے تھا۔ وہ کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ عیسیٰ پھرتی سے جھکا اور فائر بے کار گیا۔ اگلے ہی لمحے چھوٹی نال کی خطرناک جرمن رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے کچھ اور تو نہیں سوجھا۔ میں نے چوڑے چکلے رمضان کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور رمضان سمیت عیسیٰ جان پر جا پڑا۔ عیسیٰ جان کی رائفل سے سنگل شاٹ فائر ہوا تھا اور گولی رمضان کی ٹانگ میں کہیں پیوست ہو گئی تھی۔ عیسیٰ جان رمضان کے نیچے دب گیا تھا لیکن ایک ہی سیکنڈ میں وہ اس بوجھ تلے سے نکل آیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں نے جست کی اور اسے پھر دبا لیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ عیسیٰ جان کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا لیکن قد کی کمی جسم کی غیر معمولی چوڑائی اور مضبوطی نے پوری کر دی تھی۔ وہ کسی گوریلے ہی کی طرح زور آور اور سخت جان تھا۔ میرا جسم اس کے جسم سے ٹکرایا تو ایک بجلی سی کوند گئی۔ یہی وہ بے رحم جسم تھا جس نے نرم و نازک شاہین کو پامال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی کلائیاں موڑی تھیں۔ اس کا گلا دبایا تھا۔ اسے اپنے تلے روندا تھا۔ میرے سینے میں ایک آتش فشاں پھٹ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں عیسیٰ کی رائفل کی نال تھامی اور اس کا رخ اپنے چہرے کی طرف سے پھیر دیا۔ عیسیٰ نے جوابی زور لگایا اور ایک بار پھر مجھے رائفل کی زد میں لانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ٹریگر دب گیا اور برسٹ کی شکل میں کئی گولیاں نکلیں۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ پگھلے ہوئے سکے نے کس طرف پرواز کی ہے' بس اتنا معلوم تھا کہ یہ سکہ یا سیسہ میرے جسم میں نہیں اترا۔ میں نے زور لگا کر رائفل عیسیٰ کے سر سے بلند کر دی' اب اس کے چہرے اور میرے چہرے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے سر کی دو انتہائی شدید ضربات عیسیٰ کے چہرے پر رسید کیں۔ پلک جھپکتے میں اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ یہ بڑی شدید ٹکریں تھیں۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے حواس میں نہ رہ سکتا لیکن وہ بدبخت عیسیٰ جان تھا۔ روئے دشت کا آسیب۔ ہر وقت آگ اور بارود کا دھواں پھانکنے والا اور خون ناحق کو شیر مادر سمجھ کر پینے والا۔ رمضان کے ملازم سلطانے نے ایک لاٹھی سے مجھ پر وار کیا۔ میں نے یہ وار جھک کر بچایا۔ گھومتی ہوئی لاٹھی رمضان کے حقے کا صفایا کر گئی۔ اسی دوران میں عیسیٰ نے مست گینڈے کی طرح زور مارا اور مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ میں نے رائفل پر گرفت پھر بھی ختم نہیں کی۔ میں جانتا تھا کہ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تو جسم میں درجنوں سوراخ ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ جونہی میری پشت دیوار سے لگی میں نے دونوں ٹانگیں جوڑ کر عیسیٰ کے ڈھائی فٹ چوڑے سینے پر ماریں اور اسے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ مجھے ایک زبردست کامیابی ملی تھی اور وہ یہ کہ جرمن ساختہ خودکار رائفل میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ عیسیٰ جان نے بھی اپنے خالی ہاتھ دیکھ لیے تھے' دروازے سے باہر گرتے ہی وہ اسپرنگ کی طرح اچھلا اور تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا۔ لیکن دو گولیاں دروازے سے داخل ہوئیں اور سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ فائرنگ عیسیٰ کے سرخ

سفید پنجابی ساتھی بہادر علی نے کی تھی۔ وہ عیسیٰ سے پہلے ہی کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک میز پر رکھے خالی برتنوں میں لگی تھی اور اسٹیل کا ایک جگ دیوار سے ٹکرا کر لٹو کی طرح گھومنے لگا تھا۔ میں جلدی سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اب اگر دروازے کی طرف سے فائر ہوتا بھی تو مجھے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اچانک مجھے اپنے قدموں میں پڑی' سرخ رنگ کی ایک گٹھری سی نظر آئی جس میں سے سرخ خون بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ میں بری طرح چونک گیا۔ یہ ایک غریب صورت لڑکی کی لاش تھی۔ کم از کم تین گولیاں اس کے سینے اور گردن سے پار ہو چکی تھیں۔ میرے لیے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ یہ وہی بدقسمت نوبیاہتا ہے جسے اس کا غریب اور لاچار شوہر سلام کرانے کے بہانے چھوڑ گیا ہے۔ کیسی کیسی مجبوریاں ہوتی ہیں روزگار کی۔ اور یہ مجبوریاں انسان کے ضمیر کو کس کس انداز سے مردہ کرتی ہیں۔ یہ وہ شوہر تھا جو کسی کی بیٹی کو عزت آبرو والی زندگی دینے کے وعدے پر اپنے ساتھ لایا تھا اور اب صرف چار پانچ روز بعد اپنی مجبوریوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہا تھا۔ میری نگاہ ان ہاتھوں پر پڑی جن پر ابھی سہاگ کی مہندی نمایاں تھی۔

میں نے جھک کر لڑکی کی آنکھیں دیکھیں۔ اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ اپنے سستے لباس' سستے زیور اور گھٹیا میک اپ کی طرح اس کی زندگی بھی بڑی سستی ثابت ہوئی تھی۔ بے وجہ ختم ہو گئی تھی۔ لڑکی کو ختم کرنے والا یقیناً وہی برسٹ تھا جو میرے ساتھ زور آزمائی کے دوران میں عیسیٰ کی رائفل سے نکلا تھا۔ دروازے کی طرف سے تین چار فائر مزید ہوئے اور مجھے اوندھے منہ خون آلود فرش پر گرنا پڑا۔ ان "فائرز" سے مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ ہاں ایک فائدہ ضرور ہو گیا۔ کمرے کی اکلوتی ٹیوب لائٹ چکنا چور ہو گئی اور کمرا گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ میں یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر کمرے میں گھسا رہا تو یہ کمرا چوہے دان بن جائے گا۔ میں نے پانچ پٹ والی کھڑکی کی طرف توجہ دی۔ ایک پٹ کھول کر اردگرد کا جائزہ لیا اور باہر کود گیا۔ میرا رخ فارم کی طرف تھا۔ میں سائیں عالی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فارم اور رہائشی حصے کے درمیان قریباً سو گز کا فاصلہ تھا۔ ابھی میں بکریوں والے احاطے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ میرے قدموں میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی خوفناک "تڑتڑ" سے فضا گونج اٹھی تھی۔ بھاگتے بھاگتے میں نے بے اختیار چھلانگ لگائی اور احاطے کی چار فٹ اونچی باڑ پار کر کے بکریوں کے درمیان گرا۔ خوابیدہ بکریاں اور ان کے خوابیدہ میمنے ممیاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگے۔ میرے نتھنوں میں پیشاب' مینگنیوں اور باسی چارے کی ملی جلی بو گھسی۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک بار پھر عیسیٰ جان کو دیکھا۔ اس کی جھلک ایک نو تعمیر شدہ دیوار کی اوٹ سے نظر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موٹی نال کی رائفل بھی تھی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے عیسیٰ جان پر فائرنگ کی۔ اس کا سر جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ جوابی طور پر عیسیٰ جان نے جو برسٹ مارا اس نے میرے اردگرد موجود کئی بکریوں کے چیتھڑے اڑا دیے۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ سب مشین گن کا برسٹ تھا۔ سب مشین گن کو مشین پسٹل اور مشین کاربین بھی کہا جاتا ہے۔ عرصہ دراز سے اسے ایک نہایت مؤثر اور تباہ کن ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ گن کے بیرل کے اردگرد سوراخ دار خول ہوتا ہے اور میگزین ایک چھوٹے سے "ڈرم" کی شکل میں ہوتا ہے۔ لیکن جو گن عیسیٰ جان کے ہاتھ میں نظر آئی تھی وہ یورپی اسٹائل کی تھی اور اس کا میگزین چوڑی پٹی کی شکل میں تھا۔

میں نے خوف کے عالم میں دیکھا۔ میرے عین سامنے ایک بکری کا بھیجا اڑا ہوا تھا۔ ایک دوسری بکری کی گردن کا نصف حصہ غائب ہو گیا تھا اور وہ ایک مردہ میمنے کے قریب پڑی تڑپ رہی تھی۔ میں رکوع کے انداز میں جھک گیا اور ہراساں جانوروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا مکھیوں کے فارم کی طرف بھاگا۔ سائیں عالی وہیں ایک کمرے میں موجود تھا۔ میں نے بمشکل آٹھ دس قدم ہی طے کیے تھے کہ سب مشین گن کا ایک اور برسٹ آیا۔ نو ایم ایم کی گولیوں نے میرے اردگرد چنگاریاں چھوڑیں اور کئی بے زبان جانور لقمہ اجل بنے۔ میں نے ایک میمنے کو کئی فٹ اچھل کر گھاس کے ڈھیر میں گرتے دیکھا۔ وہ معصوم آوازیں جو کچھ دیر پہلے تک مجھے پرندوں کی چہچہاہٹ کی طرح خوبصورت لگی تھیں' اب موت کی چیخیں بن گئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک دم عیسیٰ جان ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ بے دریغ فائر کرنے لگا۔ اس نے نیا میگزین چڑھا لیا تھا۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر اس نے کم از کم تیس راؤنڈ فائر کیے اور کئی جانوروں کو ڈھیر کر دیا۔ میں مختلف چیزوں کی آڑ لے کر بھاگتا ہوا فارم کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے باڑ پار کر کے میں اس مکان میں داخل ہو سکتا تھا جہاں سائیں عالی کو محو خواب چھوڑ آیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں باڑ پھلانگتا' اس طرف سے بھی فائر ہونے لگا۔ میں دوڑ کر اس نیچی چھت والے کوٹھے میں چلا گیا۔ جو احاطے کے اندر ہی واقع تھا۔ یہ تاریک کوٹھا اندر سے خالی تھا۔ ایک دروازے اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کے سوا اس میں آنے جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑکی اور دروازہ آمنے سامنے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بوقت ضرورت دونوں طرف فائر کر سکتا ہوں۔ میں نے چھوٹی نال کی جرمن رائفل کو دھیان سے دیکھا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھی۔ میگزین میں اب بھی کچھ بیس پندرہ راؤنڈ موجود تھے۔ میں احتیاط سے فائر کرتا تو کافی دیر گزارا کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے اندازے کے مطابق اس میں میرے ریوالور کی گولیاں بھی استعمال ہو سکتی تھیں اور ریوالور کی تین درجن گولیاں میرے پاس موجود تھیں۔ صورت حال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ رمضان کے کارندے عیسیٰ جان کے ساتھ مل کر مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے

اور ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اس فارم کے محل وقوع اور نشیب و فراز کو جتنی اچھی طرح وہ جانتے تھے میں نہیں جانتا تھا۔ ساتھیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فارم سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا لیکن ساتھیوں کو اس مصیبت میں چھوڑ جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

چند لمحے بعد کھڑکی کی طرف آہٹ سنائی دی۔ پھر عیسیٰ جان کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں! تم گھیرے میں آچکے ہو۔ خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ' ورنہ اندر ہی بھون ڈالیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی زبردست گھن گرج کے ساتھ ایک برسٹ آیا اور لکڑی کی وزنی کھڑکی کا ایک حصہ ٹوٹ کر کمرے میں گر گیا۔

میں نے کھڑکی کے سوراخ میں سے جھانکا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ عیسیٰ جان کہاں ہے' لیکن بالکل ناکامی ہوئی۔ وہ ایک خطرناک حریف تھا اور یہاں موجود لوگوں میں سے سب سے زیادہ خطرہ بھی مجھے اسی کی طرف سے تھا۔ وہ میرے بالکل قریب موجود تھا لیکن نظر نہیں آرہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو سب مشین گن اس کے پاس ہے اس میں بیس گولیوں والا "باکس میگزین" چڑھا ہے۔ نئے میگزین میں سے اس نے ابھی صرف پانچ چھ راؤنڈ فائر کیے تھے۔ میں اگر عیسیٰ کی فائرنگ پر توجہ دیتا تو یہ جان سکتا تھا کہ اس کا میگزین کب خالی ہوتا ہے۔

عیسیٰ جان کو تاؤ دلانے کے لیے میں نے وہی زبان استعمال کی جو وہ میرے لیے کر رہا تھا۔ میں نے اسے چند گالیاں دیں اور اندازے سے ایک برسٹ اس کی جانب مارا۔ حسب توقع جواب میں فوراً ایک برسٹ آیا۔ کھڑکی کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ عیسیٰ جان کی گن کے میگزین میں سے چار پانچ گولیاں مزید کم ہو گئیں۔ اس کے علاوہ مجھے اس مقام کا اندازہ بھی ہو گیا جہاں عیسیٰ نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ وہ مجھ سے بمشکل پندرہ گز کی دوری پر ایک ٹرالی کے پیچھے موجود تھا۔ جو گن وہ فائر کر رہا تھا وہ سو میٹر کے دائرے میں تباہی پھیلا رہی ہے۔ یہاں تو فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ عیسیٰ جان کی چلائی ہوئی گولیوں نے کمرے کی دیواروں کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اور جو گولی بھی کھڑکی میں لگی پار ہو گئی۔

میں اپنا اور عیسیٰ جان کا درمیانی فاصلہ نظروں ہی نظروں میں تولنے لگا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا عیسیٰ جان کے میگزین بدلنے کے دوران' میں بھاگ کر اس تک پہنچ سکتا ہوں؟ یہ کرکٹ کے کھیل میں وکٹوں کے درمیان بھاگنے جیسی صورت حال تھی۔ بیٹسمین کو اپنا ذہن تیزی سے استعمال کرنا ہوتا ہے اور یہ بھانپنا ہوتا ہے کہ وہ گیند واپس پہنچنے سے پہلے پہلے "رن" بنا سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن وہ کھیل ہوتا ہے' یہ جنگ تھی۔ اس میں "رن آؤٹ" ہونے کا مطلب موت تھا۔ نو ایم ایم کی گولیاں جو جسم سے آر پار ہو سکتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد عیسیٰ جان نے ایک برسٹ اور مارا۔ اس برسٹ کے ساتھ بہت سی ناگفتنی گالیاں بھی شامل تھیں۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مقتول بھائی کا نام لے رہا تھا اور مجھے بتا رہا تھا کہ آج وہ اس کی قبر ٹھنڈی کر کے رہے گا۔ اسے بس وہ قبر یاد رہ گئی تھی۔ اپنے سارے ستم وہ بھول چکا تھا۔ زور نے مشت کا قتل عام' قیدی پولیس اہلکاروں کے سروں پر فائرنگ سے شیشیاں توڑنے کا کھیل' نوابزادی شاہین کی المناک موت۔۔۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ شاید ہر ظالم کا حافظہ اس حوالے سے ایسا ہی کمزور ہوتا ہے۔۔۔

اگلے دو منٹ کے اندر مجھ پر کم از کم پندرہ راؤنڈ فائر ہوئے۔ ان میں سے کچھ راؤنڈ تو دائیں جانب سے بہادر علی اور رمضان کے کسی کارندے نے فائر کیے تھے۔ باقی کے راؤنڈ ایک برسٹ کی شکل میں عیسیٰ جان نے چلائے تھے۔ اس آخری برسٹ کے بعد سو فیصد یقینی بات تھی کہ عیسیٰ جان کی گن کا میگزین خالی ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ ایک ایک ساعت قیمتی تھی۔ میں عیسیٰ جان کی پوزیشن کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا چکا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھولے اور عیسیٰ پر چارج کرنے کے لیے قدم بڑھایا لیکن اچانک مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ بکریوں کے باڑے کے عین سامنے بلب کی روشنی موجود تھی۔ اس روشنی میں مجھے بہادر علی کی سفید کرولا کار نظر آئی۔ وہ ابھی ابھی مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ کار کو دیکھ کر میرے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔۔۔ اور میں نے عیسیٰ جان پر جھپٹنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بالکل جیسے بیٹسمین آخری موقع پر کریز چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دے۔

رمضان نے بتایا تھا کہ بہادر علی کی خراب کرولا کو فیروز والا کی طرف لے جایا جائے گا اور وہاں سے باغ پور لایا جائے گا۔ میں اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر کار اسی راستے سے یہاں تک پہنچی تھی تو پھر ایک زبردست امکان موجود تھا اور وہ امکان یہ تھا کہ کار' اس پیٹرول پمپ کے سامنے سے گزری ہے جہاں ایس پی برکت اور اس کا سفید یونی فارم عملہ کئی دن سے گھات لگائے بیٹھا ہے' اور ان لوگوں نے کار کو دیکھ لیا ہے۔ اگر انہوں نے کار کو دیکھ لیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ وسیع فارم اور رہائشی مکان پولیس کے زبردست گھیرے میں آنے والا ہے۔ یعنی صورت حال پلٹا کھانے والی ہے اور مجھے گھیرنے والے خود گھیرے جانے والے ہیں۔

بہر طور فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کار توقع سے بہت پہلے یہاں پہنچ گئی تھی۔ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ فیروز والا کی طرف گئی ہی نہ ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ فیروز والا پہنچ کر اس کا نقص معمولی ثابت ہوا ہو اور وہ فوراً باغ پور کی طرف روانہ ہو گئی ہو۔ سفید کار کے پیچھے ہی پیچھے وہ جیپ بھی اندر آچکی تھی جو رمضان نے کار کو کھینچ کر لانے کے لیے بھیجی تھی۔ جونہی کار یہاں رکی تھیں' رمضان کے کارندے بلند آواز میں بولنے لگے تھے۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کو یہاں کی صورت حال کے بارے میں بتا رہے تھے اور ہدایت کر رہے تھے کہ وہ فائرنگ کی رینج سے دور رہیں۔

میں نے نیا میگزین رائفل سے اٹیچ کر لیا اور وقفے وقفے سے سنگل فائر کرنے لگا۔ تازہ صورت حال کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کروں۔ اگر واقعی پولیس نے سفید کرولا کار کو ٹریس کر لیا تھا تو اس بات کے روشن امکانات تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں اس فارم پر زبردست چھاپا پڑ جائے گا۔

قریباً پندرہ بیس منٹ فارم میں ہونے والی آنکھ مچولی جاری رہی۔ پھر جو کچھ ہوا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ پہلے میں نے دو پولیس موبائلز کے سائرن سنے۔ پھر پولیس کا ایک ٹرک بیرونی پھاٹک توڑتا ہوا اندر گھس آیا۔ نیم پختہ راستے پر دندنانے کے بعد یہ ٹرک باڑے کے عین سامنے آرکا۔ میں نے پولیس کے مسلح جوانوں کو چھلانگیں لگا کر ٹرک سے اترتے اور پوزیشنیں سنبھالتے دیکھا۔ ان میں باوردی پولیس اہلکاروں کے علاوہ سفید پوش بھی تھے۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں باڑے کے ساتھ ساتھ مختلف جگہوں پر چھپ گئے۔ سوبائل گاڑیاں چکر کاٹ کر فارم کے پچھواڑے جانا چاہتی تھیں لیکن انہیں فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا جس کے بعد وہ مین گیٹ سے باہر نکل گئیں اور ان کی ہیڈ لائٹس سے اندازہ ہوا کہ وہ باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ چل کر فارم کے عقبی کھیتوں میں پہنچ گئی ہیں۔

عیسیٰ جان اور رمضان کے کارندے جو تھوڑی دیر پہلے بڑے جارحانہ موڈ میں نظر آتے تھے یکایک دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ نہ صرف میری پناہ گاہ سے پیچھے ہٹ گئے بلکہ اندھا دھند فائرنگ سے بھی باز آ گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب وہ باڑے کی طرف جمع ہو گئے ہیں۔۔۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ ایس پی برکت پر پڑی۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ نکالا اور چیخ کر ایس پی برکت کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

میری آواز سن کر وہ چونکا پھر کھڑکی کی طرف جھپٹ پڑا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا' وہ دونوں جھک کر بھاگتے ہوئے میری پناہ گاہ میں پہنچ گئے۔ میں نے کمرے کی لائٹ روشن کر دی تاکہ ایس پی برکت مجھے اچھی طرح دیکھ سکے۔ برکت کے ہاتھ میں اس کا سرکاری ریوالور تھا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت خیز تازگی ہو گئی تھی۔ "اوئے تم یہاں؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

برکت کے ساتھ جو دوسرا شخص بھاگتا ہوا اندر آیا تھا وہ زریں گل تھا۔ اس کا چہرہ جوش و جذبے سے سرخ ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! ام نے کہا تھا ناکہ اب عیسیٰ جان زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔ ام نے اس کی سفید کار کا کھوج لگایا ہے۔ ام سب اسی کا پیچھا کر کے یہاں پہنچا ہے۔"

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "میں بھی عیسیٰ جان کے لیے ہی یہاں ہوں۔"

اسی دوران میں برکت کی نظر میری خون آلود قمیص پر پڑ گئی۔ وہ بولا "اوئے یہ بھوتنی دا خون کہاں سے لگ گیا ہے تمہیں۔"

"بس لگ گیا ہے" میں نے کہا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ "بھوتنی" دا خون نہیں' یہ اس بدنصیب نوبیاہتا کا خون ہے جو رمضان علی کی خوابگاہ میں زندگی ہار کر بے سُدھ پڑی ہے۔ ہاتھوں پر مہندی سجائے' ساٹن کا سرخ جوڑا پہنے۔ اس کے غریب چہرے پر سستا سا سرخی پاؤڈر ہے۔ اور اس کے جسم پر پیتل اور رولڈ گولڈ کے معمولی گہنے ہیں۔ لیکن وہ کتنی بھی معمولی تھی' اس کی جان تو معمولی نہیں تھی۔ وہ جان جو چلی گئی تھی اور کروڑوں اربوں روپیہ خرچ کر کے بھی نہیں مل سکتی۔۔۔ اس معمولی عورت کے ساتھ نجانے کیا کچھ مر گیا تھا۔ سہاگ موسم کی رنگیلی راتیں مر گئی تھیں' اچھڑنے اور ملنے کی ادائیں مر گئی تھیں۔ ننھے منے بچے مر گئے تھے۔ بچوں کی مسکراہٹیں مر گئی تھیں۔ ایک بھرے پرے آنگن کی رونقیں مر گئی تھیں اور یہ سب کچھ عیسیٰ جان کے ایک برسٹ سے ہوا تھا۔

شاید کچھ لوگ دنیا میں آتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کے دم سے خلق خدا کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں اضافہ ہو۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر عیسیٰ جان انہی فتنہ پرور لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایک ایسا درندہ تھا جس کے منہ کو انسانی جان و آبرو کا خون لگ چکا تھا۔ وہ خون کی یہ ازلی پیاس بجھانے کے لیے مدام حرکت میں رہتا تھا۔ نجانے قدرت کی کیا مصلحت ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسے انسانوں کی رسی ڈھیلی کرتی ہے اور کرتی چلی جاتی ہے۔ اتر ہوسٹسوں کے اغوا اور آبروریزی والے واقعے کا ڈراپ سین مجھے ابھی تک یاد تھا۔ عیسیٰ جان شدید طور پر زخمی ہوا تھا اور مجھے پانچ فیصد توقع بھی نہیں تھی کہ وہ بچ جائے گا۔ لیکن وہ نہ صرف زندہ رہا تھا بلکہ پہلے سے زیادہ خباثت اور شیطانیت اوڑھ کر میدان میں آگیا تھا۔

فارم میں اور اردگرد خاموشی تھی۔ صرف کبھی کبھی کسی زخمی یا خوفزدہ بکری کی ممیاہٹ سنائی دے جاتی تھی۔۔۔ لیکن یہ خاموشی طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ ایک چیخ' ایک گرج یا ایک دھماکے کے ساتھ یہ خاموشی کسی بھی وقت ٹوٹنے والی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور ٹانگوں سے معذور ایک شخص پھرتی سے اندر داخل ہوا۔ ٹانگوں کے بغیر اس کا قد بمشکل تین فٹ تھا۔ وہ ہاتھوں کے بل چلتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا۔ یہ پولیس کا مخبر امانت خان تھا۔ سب سے پہلے اس علاقے میں عیسیٰ کی موجودگی کی اطلاع امانت نے ہی دی تھی۔ ایک طرح سے امانت نے ایک مہینہ پہلے اس کارروائی کا آغاز کیا تھا جو آج نقطۂ عروج پر پہنچی تھی۔

ایس پی برکت نیچے بیٹھ گیا۔ مخبر امانت نے اس کے کان میں پُرجوش لیکن ذرا سی سرگوشی کی۔ یہی وقت تھا جب ہم سب کو ایک نامانوس آواز سنائی دی۔ یہ آواز سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ آواز بھگدڑ کی تھی۔ جیسے ایک ساتھ بہت سے مویشی سرپٹ بھاگے چلے آرہے ہوں۔ ان کے سموں کی ضربات سے زمین دہل رہی تھی اور ایک دم بھونچال سا آگیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ایس پی برکت کی طرف دیکھا' وہ بھی مجھے ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم صورت حال سمجھنے کے لیے باہر نکل آئے۔ تاریکی کے سبب کچھ دکھائی نہیں دیا' لیکن آواز حیران کن تیزی سے قریب آرہی تھی' اس کے ساتھ ہی شور شرابے اور زمین کے ارتعاش میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ صرف تین چار سیکنڈ کی بات ہے پھر تو کچھ بھی ہماری طرف آرہا ہے' وہ ہمارے سر پر پہنچ جائے گا' اور ممکن ہے کہ ہمیں روند کر گزر جائے۔ اسی دوران میں مجھے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی اور یہ انکشاف ہوا کہ ہماری طرف بڑھنے والا ریلا فارم کے گھوڑوں کا ہے۔ فارم میں دو وسیع و عریض طویلے موجود تھے۔ ان میں سے ایک طویلہ میں خود دیکھ چکا تھا۔ وہ بالکل خالی پڑا تھا۔ یہ گھوڑے یقیناً دوسرے طویلے کے تھے۔ مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔

"بھاگو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

زریں گل' ایس پی برکت اور میں مڑ کر بھاگے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ٹانگوں سے معذور تجبر امانت علی بھی ہمارے ساتھ ہے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ سکتے کی سی حالت میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کتنی بھی کوشش کرے خطرے کی حد سے نہیں نکل سکتا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا لیکن بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ ابھی میں تاریکی میں آٹھ دس قدم ہی بھاگا تھا کہ سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا' وہ بیسیوں گھوڑے تھے اور یہ وہ تھے جو مجھے دکھائی دیے تھے۔ جو دکھائی نہیں دے رہے تھے ان کی تعداد نجانے کتنی تھی۔ انہیں سرپٹ بھگانے کے لیے ان کے عقب میں فائرنگ کی گئی تھی اور اکا دکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ مجھے ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور میں تجبر امانت علی سمیت لڑھکتا ہوا کئی گز دور جا گرا۔ یہ موت کا دھکا تھا۔ میں جانتا تھا' ایک سیکنڈ میں درجنوں جانور مجھے روندتے ہوئے گزر جائیں گے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں عقل کام نہیں کرتی۔ انسان کے بس میں صرف اضطراری حرکات رہ جاتی ہیں۔ میں نے بھی اضطراری حرکت کے تحت تیزی سے دو تین پلٹیاں کھائیں۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ ٹانگوں سے معذور امانت میری بانہوں میں ہے اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی ہے۔ ہم لڑھک کر ایک مضبوط تنے سے ٹکرائے تھے۔ ہماری دونوں اطراف سے گھوڑے برق رفتاری سے گزر رہے تھے۔ اگر ہم محفوظ تھے تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس درخت کا بھی کوئی کمال نہیں تھا جس کی ہم نے اوٹ لے رکھی تھی' درخت کے تنے کا قطر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ فٹ ہوگا۔ ڈیڑھ فٹ کی آڑ ہمیں "روندے جانے" سے کیسے بچا سکتی تھی۔

آٹھ دس سیکنڈ کے اندر یہ طوفان بلا خیر گزر گیا۔ ہمارے اردگرد بس گرد و دھول رہ گئی جو گھوڑوں کے سموں نے اڑائی تھی اور چیخ و پکار کی آوازیں رہ گئیں۔

میں نے ایس پی برکت اور زریں گل کو پکارا۔ زریں گل کی طرف سے فوراً ہی جواب آیا۔ یہ جواب قدرے بلندی سے آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ زریں گل کسی قریبی درخت پر چڑھنے میں کامیاب رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایس پی برکت کی آواز بھی سنائی دے گئی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں نے جواب دیا اور اندازے سے اس کی طرف بڑھا۔ ایس پی برکت کی آواز میں درد کا تاثر موجود تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے کہیں چوٹ وغیرہ لگی ہے۔ یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو ایس پی برکت نے اپنے ایک خون آلود بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ لباس بھی کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ پولیس اہلکار جو گھوڑوں کی یلغار سے گھبرا کر تتر بتر ہو گئے تھے' اب پھر اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حسن اتفاق سے وہ قریباً سب کے سب محفوظ رہے تھے صرف دو کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئی تھیں۔ بہرحال یہ چوٹیں گننے کا وقت نہیں تھا۔ ہمیں یہ دیکھنا تھا کہ پولیس کا گھیرا ٹوٹ چکا ہے یا برقرار رہا ہے۔

مجھے صورت حال کچھ زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آرہی تھی۔ عیسٰی جان ایک خطرناک شخص کا نام تھا۔ بھاگنے اور روپوش ہونے کے لیے اسے صرف چند سیکنڈ کی مہلت درکار تھی اور یہ مہلت اسے مل چکی تھی۔ دو ڈھائی سو گھوڑے برق رفتاری سے بھاگتے ہوئے طویلے سے نکلے تھے۔ قریباً نصف منٹ کے لیے سب کچھ تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس دوران میں عیسٰی جان کیا نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال ایس پی برکت کی سوچ مختلف تھی۔

وہ اپنی پاٹ دار آواز میں ماتحتوں پر گرج برس رہا تھا اور انہیں پوزیشن سنبھالنے کی ہدایت دے رہا تھا "اوئے خیرو! بھوتنی دے۔ تو اور معظم اپنے بندے لے کر گیٹ کی طرف چلے جاؤ اور وہ بھن کا ویر وفات کدھر ہے' اسے کہو کہ اپنی پارٹی کے ساتھ دیوار کے ساتھ ساتھ پوزیشن سنبھالے۔" پھر وہ کسی حوالدار نذیر حسین کو آوازیں دینے لگا۔ نذیر حسین سرپٹ بھاگتا ہوا آیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ ایس پی برکت نے اسے بھی تیز لہجے میں کچھ ہدایات دیں۔ پھر وائرلیس سیٹ پر چیخ و پکار کرنے لگا۔

نجانے کیوں ایس پی برکت کی یہ ساری پھرتیاں بے کار نظر آرہی تھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عیسٰی جان ایک بار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ایس پی برکت تیزی طراری دکھا کر فارم کے چند ملازموں اور رمضان کے ساتھیوں کو تو شاید گرفتار کر لیتا مگر عیسٰی جان کا ملنا اب مشکل تھا... طویلے سے طوفان کی

طرح برآمد ہونے والے گھوڑے اب پورے فارم میں چکراتے پھر رہے تھے۔ ہر طرف ان کی لمبی باریک آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ فارم سے نکل کر تاریکی میں گم ہو چکے تھے۔ یقیناً صبح رمضان کے کارندوں کو یہ گھوڑے اکٹھے کرنے کے لیے زبردست بھاگ دوڑ کرنا تھی۔

میں دوڑتا ہوا باڑے کی طرف آیا۔ درختوں کی اوٹ میں کھڑے پولیس اہلکار ایک بار پھر اکا دکا فائر کرنے لگے تھے۔ ایک سب انسپکٹر میگا فون تھامے ایک جیپ کی اوٹ میں موجود تھا اور بلند آواز میں وہ مشہور و معروف فقرے بول رہا تھا جو پولیس والے اکثر ایسے موقعوں پر بولا کرتے ہیں۔ یعنی "تم چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔ بہتر ہے کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دو" وغیرہ وغیرہ۔

ایک کار درختوں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی موجود تھا۔ یہ وہی کار تھی جو پیٹرول پمپ پر عیسٰی جان کے تعاقب کے لیے موجود رہتی تھی۔ ڈرائیور ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا اور مجھے پہچانتا تھا۔ میں دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا تو ہیڈ کانسٹیبل نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی "کہاں چلنا ہے صاحب؟"

"فارم سے نکلو۔" میں نے کہا۔

اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی فارم کے مین گیٹ سے نکلی۔ فارم سے باہر چار سو اندھیرا تھا۔ قصبے کی آبادی گہری تاریکی میں اونگھ رہی تھی۔ یقیناً لوگ گھروں میں دبک گئے تھے اور جاگتے ہوئے بھی خود کو زاہد ظاہر کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر کون مصیبت مول لینا پسند کرتا ہے۔ میں نے ڈرائیور کے ساتھ قصبے کی مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑائی۔ ذہن میں یہ موہوم سی امید موجود تھی کہ شاید کہیں عیسٰی جان یا اس کے پنجابی ساتھی بہادر علی کی پرچھائیں نظر آجائے لیکن یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ یہ کوئی چٹیل میدان یا ریگستان نہیں تھا جہاں گاڑی پر بھاگ دوڑ کر کے ہم عیسٰی جان کا کھوج لگا سکتے۔ یہ ایک بھرا پرا قصبہ تھا۔ عیسٰی جان کسی بھی گھر میں کود کر جائے پناہ ڈھونڈ سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب تک قصبے سے میلوں دور پہنچ چکا ہو۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں فارم میں واپس آگیا۔ یہاں صورت حال ایس پی برکت کے قابو میں آچکی تھی۔ رمضان سمیت قریباً بیس افراد گرفتار ہو چکے تھے۔ ان میں سے تین چار تو رمضان کے اہل خانہ میں سے تھے باقی فارم پر کام کرنے والے کارندے تھے یا رمضان کے مسلح ساتھی تھے۔ عیسٰی اور بہادر گرفتار شدگان میں شامل نہیں تھے۔ ہلاک ہونے والی نوبیاہتا لڑکی کی لاش برکت نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ پولیس کے ساتھ کاؤنٹر فائرنگ کے دوران میں بھی ایک شخص ہلاک ہوا تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر سائیس تھا۔ جس جگہ سائیس کی لاش پڑی تھی وہاں قریب ہی سائیں مالی بھی بیٹھا تھا۔ وہ بھوتوں کی طرح... نجانے بھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی اپنا پیٹ کھجانے لگتا تھا اور کبھی اڑ چلا جاتا تھا۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

فارم کا مالک رمضان زخمی حالت میں تھا۔ جب کمرے میں عیسٰی جان نے مجھ پر فائر کرنا چاہا تھا تو میں نے عیسٰی جان پر چھلانگ لگا دی تھی اور اس چھلانگ کے دوران میں رمضان کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ عیسٰی کی چلائی ہوئی گولی رمضان کی ران میں لگی تھی اور گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ رمضان کو طبی امداد دی جا رہی تھی اور ایس پی برکت اپنی نگرانی میں یہ کام کروا رہا تھا۔ طبی امداد دینے والا ایک جوان سال ڈاکٹر تھا۔ پولیس والے یقیناً اسے قصبے کے ہی کسی مکان سے پکڑ کر لائے تھے۔ ڈاکٹر کی آنکھیں ابھی تک نیند سے سرخ تھیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ غصے کی سرخی ہو۔ ظاہر ہے' ڈاکٹر کو بے وقت بے آرام کیا گیا تھا اور "بغیر فیس کے" بے آرام کیا گیا تھا۔ ایسے میں غصہ تو آتا ہی ہے لیکن ڈاکٹر یہ غصہ پولیس والوں پر ظاہر کر کے اپنی مٹی پلید کرانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ لہٰذا خاموشی سے اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ اس نے زخم کو پہلے سن کیا تھا پھر اس میں ٹانکے لگائے تھے۔ اب بینڈیج کر رہا تھا۔

ایس پی برکت نے میری طرف دیکھ کر تاسف سے کہا "وہ کتے کا بچہ چکر دے کر نکل گیا ہے۔"

"کون کتے کا بچہ؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"وہی ماماں ہم سب کا..... جس کے انتظار میں دو ہفتے سے یہاں جھونپڑے جوڑے کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"آپ کا مطلب عیسٰی جان سے ہے؟"

"تو اور کس بھوتنی دے سے ہے۔"

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ وہ اب یہاں نہیں ملے گا۔" میں نے ایس پی برکت کی جھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "میں تو سارے قصبے کا چکر بھی لگا آیا ہوں۔"

"خوا مخواہ پیٹرول پھونکا ہے۔ اس کا فائدہ بھلا کیا ہونا تھا؟"

میں اور ایس پی برکت باتیں کرتے ہوئے اس وسیع و عریض طویلے کی طرف چلے آئے جہاں سے گھوڑے نکلے تھے اور فائرنگ کے دھماکوں سے ڈر کر سرپٹ بھاگے تھے۔ اس طویلے کا بڑا پھاٹک ان کچے کیکروں کے پاس ہی تھا جہاں عیسٰی جان نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ گھوڑوں کو طویلے سے نکالنے والی اسکیم عیسٰی جان نے خود لڑائی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ گھوڑے ڈر کر بھاگیں گے تو سیدھے بکریوں کے باڑے کی طرف جائیں گے اور باڑے کے اردگرد پولیس والوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ قریباً ڈھائی سو بدکے ہوئے گھوڑوں کی یلغار معمولی نہیں ہوتی۔ وہ سب کے سب باڑے اور بیرونی حد بندی کے درمیانی خلا سے گزرے تھے اور یہ خلا بمشکل پچاس فٹ چوڑا تھا۔ اسے خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا ورنہ پولیس والوں نے جس طرح پوزیشنیں لے رکھی تھیں ان میں سے کئی روندے جا سکتے

تھے۔

ایس پی برکت نے مونچھیں موڑتے ہوئے کہا "مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ دونوں بھوتنی دے گھوڑوں کے ساتھ ہی نکل گئے ہیں۔" برکت کا اشارہ عیسٰی جان اور اس کے پنجابی ساتھی بہادر کی طرف تھا۔ میں نے برکت کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اچانک جیسے برکت کو کچھ یاد آگیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "لیکن تم یہاں کیسے؟"

"بس جس طرح آپ کو عیسٰی جان کا کلیو ملا اسی طرح مجھے بھی مل گیا تھا۔"

ایس پی برکت مجھے گھورنے لگا۔ سگریٹ کا کش لے کر بولا "ہمیں تو مخبر امانت علی سے کلیو ملا تھا۔ تمہیں کیسے ملا؟"

میں نے کہا "میرا بھی ایک مخبر ہے۔ آپ بھی اسے جانتے ہیں۔ سائیں عالی نام ہے اس کا۔"

"تو تمہیں سائیں عالی نے بتایا تھا کہ عیسٰی جان اس فارم میں موجود ہے؟"

"بتایا تو نہیں تھا لیکن اس نے ہر اشارہ دیا تھا اس پر چلتے چلتے میں یہاں پہنچ گیا۔"

ایس پی برکت بولا "تمہاری طرح تمہارا سائیں بھی بڑی گہری شے ہے۔۔۔ اب وہ کہاں ہے؟"

میں نے کہا "میرے ساتھ ہی یہاں آیا ہے۔ یہیں کہیں ہوگا۔"

ایس پی برکت پولیس والوں کے انداز میں بولا "اس سے "سلام دعا" کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ بہت کچھ جانتا ہو اور ہمیں بھی کوئی اشارہ وغیرہ دے دے۔"

میں نے کہا "یہ تو اس کی مرضی کی بات ہے۔ بڑی دکھری ٹائپ کا سائیں ہے وہ۔"

"چلو تو دیکھ لیتے ہیں اس کی ٹائپ بھی۔" ایس پی برکت نے کہا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ان کمروں میں پہنچے جہاں رمضان نے ہمیں بطورِ مہمان ٹھہرایا تھا۔ سائیں عالی کمرے میں موجود تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں یوں پھیلا رکھے تھے جیسے گود میں بچہ اٹھا رکھا ہو۔

میں نے آواز دی تو سائیں نے ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر مجھے خاموش کیا اور سرگوشی میں بولا "دیکھتا نہیں سو رہا ہے۔ جاگ گیا تو قیامت برپا کر دے گا۔ جن کا بچہ ہے۔ ہولے سے بھی چیخ مارے گا تو لاہور تک آواز جائے گی۔"

ایس پی برکت بولا "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر۔۔۔"

"اگر مگر کے بتر چپ کر۔ نہیں تو ایک بھانپڑ ماروں گا اٹھ کر۔" سائیں پھنکارا "دیکھتا نہیں بچہ سو رہا ہے۔"

بے عزتی کے احساس سے ایس پی برکت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید وہ سائیں کے خلاف تھانے دار کی زبان استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتا لیکن میں نے آنکھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے سائیں سے پوچھا "کب تک فارغ ہو جاؤ گے تم؟"

وہ بولا "مجھے کیا پتا۔ اس کی ماں کوہ قاف کی بازار مارکیٹ سودا لینے گئی ہے۔ کہتی تھی ابھی آ جاؤں گی آدھ گھنٹے میں۔۔۔ پاگل کی بچی نے پیمپی بھی نہیں باندھی ہوئی بچے کو۔ جن کا بچہ ہے' پیشاب کرے گا تو گوجرانوالے تک دھار جائے گی۔"

میں نے کہا "اچھا سائیں عالی! ہم باہر بیٹھے ہیں۔ تم بچے سے فارغ ہو جاؤ تو بتانا۔ ایس پی صاحب نے تم سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔"

"اس نے کیا پوچھنا ہے مجھ سے؟" سائیں تڑخ کر بولا "میں کوئی پوشیدہ امراض کا علاج کرتا ہوں۔ جاؤ پرانی انارکلی میں کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو دکھاؤ اسے۔"

ایس پی برکت کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اسے سمجھایا کہ فی الحال سائیں کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ ہم دونوں باہر آ گئے۔ ایس پی برکت جھلائے ہوئے لہجے میں بولا "یہ کس طرف سے پیر فقیر ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ بھوتنی دے کو پاگل کتے نے کاٹا ہوا ہے۔"

"آہستہ بولو جی' یہ بہت دور سے سن لیتا ہے۔ کہتا ہے' میرے جن چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے فراڈیا۔" ایس پی برکت نے کہا "ایسوں کے جن میں نے بہت بھگائے ہوئے ہیں۔"

برکت کے انداز سے ظاہر تھا کہ اگر اس کے بس میں ہو تو وہ سائیں کو چھتری لگانے سے بھی باز نہ آئے لیکن ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سائیں میرے ساتھ یہاں آیا ہے اور میری پہنچ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سگریٹ کے تین چار گہرے کش لے کر وہ بولا "رمضان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ عیسٰی کو ڈھونڈنے میں کیا مدد کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "مدد تو شاید وہ کر سکتا ہو لیکن بڑے طریقے سے پوچھنا پڑے گا۔"

"طریقے سے کیسے؟" ایس پی ہنس کر بولا "اس کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں لے جاؤں۔ لنچ کھلاؤں اور پھر پوچھوں کہ حضور والا اگر جان بخشی کا وعدہ کریں تو آپ سے قاتل کا نام دریافت کرلوں۔۔۔؟ نہیں بھئی نہیں۔ مجھ سے تو یہ سب کچھ نہیں ہوگا اور نہ ہی ہمارے پاس یہ سب کچھ کرنے کا ٹائم ہے۔ ذرا سی دیر ہو گئی تو عیسٰی جان کہیں سے کہیں نکل جائے گا۔ میں تو سیدھا سادہ طریقہ اختیار کروں گا۔ سب کو لمبا لٹاؤں گا۔ سب کی چھترول ہوگی تو کوئی نہ کوئی ہوئی کا خصم تو بولے گا۔"

میں نے ایس پی برکت کو روکنا چاہا لیکن وہ تند بگولے کی طرح باڑے کی طرف چلا گیا۔ وہاں سارے گرفتار شدگان ایک قطار میں

کھڑے تھے۔ کچھ کو ہتھکڑیاں لگی تھیں اور کچھ کو پولیس والوں نے ویسے ہی کالروں وغیرہ سے پکڑ رکھا تھا۔ رمضان کی مرہم پٹی ہو چکی تھی۔ وہ زمین پر نیم دراز ہائے ہائے کر رہا تھا۔ برکت نے جاتے ہی چھڑی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور خالص پنجابی لہجے میں بولا "اوئے کاکا لیکی! جان کی امان چاہتے ہو تو بندے کے پتروں کی طرح پٹھان (عیسٰی جان) کا پتا بتا دو ورنہ تو کچھ تمہارے ساتھ ہو گا وہ تمہیں قبر کے کنڈے تک یاد رہے گا۔"

رمضان جواب میں بس ہائے ہائے کرتا رہا۔ درد تو اسے یقیناً ہو رہا ہو گا لیکن وہ پولیس کی تفتیش سے بچنے کے لیے کچھ زیادہ ہی تکلیف ظاہر کر رہا تھا۔ ملزمان یہ ہتھکنڈا عام استعمال کرتے ہیں۔ گھاگ پولیس والے بھی ایسے مکرو فریب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ (ظاہر ہے پولیس والوں سے زیادہ مکرو فریب اور کون سمجھ سکتا ہے) ایس پی برکت بھی ایک گھاگ پولیس والا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ رمضان سے دھوکا کھا جاتا۔ اس نے رمضان کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی اور ٹھیٹ پنجابی گالی دے کر بولا "۔۔۔ چل اٹھ یہاں سے۔ تھانے چل کر دیکھ لیتے ہیں تیرے بھوتنی دے درد کو بھی۔"

اس نے رمضان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور مقامی ایس ایچ او کو ہدایت کی کہ وہ رمضان کو جیپ میں لے جائے۔

رمضان کے علاوہ اس کے تین چار قریبی ساتھیوں کو بھی تھانے لے جانے کے لیے جیپ میں ٹھونس دیا گیا۔ یقینی بات تھی کہ اب ایس پی برکت کے ہاتھوں ان افراد کی زبردست درگت بنے گی۔ ایس پی برکت صحیح معنوں میں انگریز کے زمانے کا روحانی پولیس افسر تھا۔ اتفاقاً ایس پی بن جانے کے باوجود اس کی ذہنیت ایک سب انسپکٹر یا انسپکٹر کی تھی۔ اس کی تفتیش کا ہر طریقہ گالم گلوچ سے شروع ہو کر چھترول پر ختم ہوتا تھا۔ دھمکی' دھونس' دبدبہ یہ ساری تھانے دارانہ صفات ایس پی برکت میں موجود تھیں۔

ایس پی برکت نے فارم کے ملزمان کو مقامی ایس ایچ او کی نگرانی میں تھانے بھجوا دیا اور خود گھوم پھر کر فارم کا جائزہ لینے لگا۔ فارم میں قریباً آدھ گھنٹے تک فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ سے دو انسانی جانوں کے علاوہ کئی غیر انسانی جانیں بھی ضائع ہوئی تھیں۔ میری مراد فارم کی ان بکریوں سے ہے جو براہِ راست عیسٰی جان کی فائرنگ کی زد میں آئی تھی۔ باڑے میں ہر طرف ان کا خون اور مردہ اجسام بکھرے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کم و بیش آٹھ دس جانور تلف ہوئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

پولیس والے فارم کے چپے چپے کا جائزہ کر رہے تھے۔ مختلف لوگوں کے بیانات لے رہے تھے۔ زمینی نشانات ڈھونڈ رہے تھے اور نقشے وغیرہ بنا رہے تھے۔ مقتول لڑکی اور ہلاک ہونے والے ساتھیوں کی تصاویر وغیرہ بھی اتاری گئیں۔۔ پھر ان کی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے ایک گاڑی پر گوجرانوالہ روانہ کر دیا گیا۔

سائیں عالی ابھی تک کمرے میں ساکت تھا۔ اب وہ دیوار کے سہارے سر ٹیکے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں ورزش کر رہا تھا یا وظیفہ۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔ میں نے تمام حالات کو اپنے ذہن میں ایک بار پھر نئے سرے سے ترتیب دیا۔ آج رات جو سنگین تصادم یہاں ہوا تھا اس کی شروعات قصبے کے آپی سلاتی اسکول سے ہوئی تھی۔۔۔ عیسٰی جان عورت کے حوالے سے جنم جنم کا بھوکا تھا۔ ان دنوں وہ آپی سلائی اسکول کی جواں سال انچارج راحت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ راحت کے پیچھے ایک اور شخص بھی پڑا ہوا تھا اور اس کا نام تھا ستا رسلوان۔

راحت ستار سلوان سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں عیسٰی جان کے دستِ ہوس کا شکار ہو گئی تھی۔ بہرحال عیسٰی جان نے ستا رسلوان سے راحت کا پیچھا چھڑا دیا تھا اور یہ کام اس نے ستا کو قتل کروا کے کیا تھا۔ ستا کو قتل کرانے کے لیے عیسٰی جان نے ستا کے بڑے بھائی رمضان کی مدد لی اور میرے خیال میں قتل کا طریقۂ کار بہادر علی کے مشورے سے اختیار کیا گیا۔ یہ بات میرے ذہن میں اس لیے آرہی تھی کہ عیسٰی جان تو براہِ راست کارروائی کرنے والا شخص تھا۔ وہ لمبے چوڑے چکروں میں نہیں پڑتا تھا بس ٹریگر دبانا تھا اور موت تقسیم کرتا تھا۔ نجانے اب تک کتنے خون اس کے کھاتے پر چڑھ چکے تھے۔ اگر وہ اپنے اسٹائل سے ستا کو قتل کرتا تو یقیناً سیدھے سیدھے گولی مار دیتا۔ یہ کھیل ہوا لاز چکر یقیناً عیسٰی کے پنجابی دوست بہادر علی کا ہی چلایا ہوا تھا۔ اس نے رمضان سے بات کی ہوگی۔۔۔ رمضان کو ستا کی جائیداد کا لالچ تھا جبکہ عیسٰی اور بہادر علی کو ستا کی لاش درکار تھی۔ لہٰذا باہمی مشورے سے ستا کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ قتل اس طرح کیا گیا تھا کہ بظاہر ایک حادثہ نظر آتا تھا۔

اب سب سے اہم مسئلہ اور اصل سوال یہ تھا کہ عیسٰی جان کہاں ہے؟ یہ بات تو عیاں تھی کہ وہ قلندر سیاہ پوش کے بھیس میں واپس ڈیرے پر نہیں جائے گا کیونکہ قلندر سیاہ پوش والا بھیس آشکار ہو چکا تھا اور عیسٰی جان یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ اس کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ ہو چکا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اب وہ یہ علاقہ ہی چھوڑ جاتا۔ وہ بدبخت اردو بولنے میں خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ حلیہ بدلنے کے ابتدائی طور طریقوں سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ کسی بھی ماحول میں کوئی نیا بھیس بنا کر گم ہو سکتا تھا۔

لیکن پھر میرا دھیان راحت عرف آپی جی کی طرف چلا گیا۔ عیسٰی جان اپنی من پسند عورت کا پیچھا آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ اپنے شکار سے جونک کی طرح چمٹ جاتا تھا اور آسانی سے اسے آزاد نہیں کرتا تھا۔ راحت عرف آپی جی کو کیسے آزاد کر سکتا تھا۔ آپی سلائی اسکول کی صورت میں عیسٰی جان کے ہاتھ ایک زبردست شکار گاہ آگئی تھی۔۔۔ وہاں نوجوان لڑکیاں تھیں۔

بے شک وہ سب کی سب عیسٰی جان نے لیے ترلفہ نہیں تھیں لیکن عیسٰی جان اپنی کیٹنگی کے زور پر ان میں سے کئی ایک پر ہاتھ صاف کرسکتا تھا۔ اسکول کی انچارج اس کے جال میں آنچکی تھی۔ فی الحال تو وہ مزاحمت کر رہی تھی اور اپنی اسٹوڈنٹس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی تھی لیکن جلد یا بدیر عیسٰی اس ڈھال کو چکنا چور کرسکتا تھا۔ ان حالات کو دیکھا جاتا تو یہ امکان پیدا ہوتا تھا کہ شاید عیسٰی جان اسی علاقے میں موجود رہے اور موقع محل دیکھ کر ایک بار پھر آپی سلاتی اسکول کا رخ کر لے۔ وہ کوئی معمولی چور یا ڈکیت نہیں تھا کہ پولیس کی یلغار سے لرزہ براندام ہو جاتا۔ وہ دوردراز کے علاقے کا بدنام ترین ڈاکو اور قبائلی علاقوں کا نسب تھا۔ قانون نافذ کرنے والوں سے "خونی آنکھ مچولی" کھیلنا اس کا برسوں پرانا شوق تھا۔ وہ اب یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ ان دنوں "میری موت" کو اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔ اس نصب العین کو چھوڑ کر وہ کہاں جا سکتا تھا.... ہاں یہ ضرور ہو سکتا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے وہ "آپی اسکول" جیسی کسی شکارگاہ میں چھپ چھپا کر بیٹھا رہے اور جب پولیس کی سرگرمیاں ذرا ماند پڑ جائیں تو پھر میدان میں آ جائے۔ حیدرآباد کے معرکے میں عیسٰی جان نے اپنا گریبان پھاڑ کر مجھے اپنے بھائی کی خون آلود قمیص دکھائی تھی اور پھنکارتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس کے بھائی کا قاتل ہوں اور میرے خون کی پیاس اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ عیسٰی جان سچ کہہ رہا ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس بدبخت کی پیاس بجھنے والی نہیں ہے۔ یہ پیاس میرے خون سے بجھے گی یا عیسٰی جان کے اپنے خون سے۔

اچانک بیٹھے بٹھائے میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا.... ایس پی برکت رمضان وغیرہ کو قصبے کے پولیس اسٹیشن میں لے گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ ان لوگوں پر سختی کرے گا اور لمبی چوڑی پوچھ گچھ کرے گا۔ عین ممکن تھا کہ تشدد کی تاب نہ لا کر رمضان سب کچھ اگل دیتا۔ رمضان پر تو جانتا ہی تھا کہ ستا کو عیسٰی نے قتل کروایا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس قتل کی وجہ بھی جانتا ہو۔ اسے معلوم ہو کہ عیسٰی جان نے راحت عرف آپی جی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یہ قتل کروایا ہے۔ ایسے میں رمضان کی زبان پر راحت کا نام آ سکتا تھا اور وہ بھی شامل تفتیش ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو راحت کے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ جس گھر کے دروازے پر ایس پی برکت جیسا اکھڑ پولیس افسر دستک دے دے اس کے مکینوں پر تو بھی قیامت ٹوٹ جائے در کم ہوتی ہے۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ ایس پی برکت خوف زدہ راحت پر رعونت جما رہا ہے اسے دھمکا رہا ہے گالیاں دے رہا ہے سوالوں کی بوچھاڑ کر رہا ہے۔ وہ سکتے کی حالت میں بیٹھی ہے اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی چلی جا رہی ہے۔ میرے دل میں راحت کے لیے خیر خواہی پیدا ہو چکی تھی اور یہ کوئی جذباتی رویہ نہیں تھا۔ اس کی معقول اور نہایت سنجیدہ وجہ تھی۔ ایک دکھی لڑکی نے اپنے دکھوں کا رونا رونے کے بجائے دوسروں کے دکھ بانٹنے اور ان کا سہارا بننے کا عزم کیا تھا۔ وہ اپنے علاقے اور اپنے لوگوں میں قابلِ احترام تھی۔ لوگ دل سے اس کی عزت کرتے تھے اور اسے پیار دیتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اور بات کیا ہوگی کہ اس بیس سال لڑکی کو بڑے بوڑھے بھی آپی جی کہہ کر پکارتے تھے۔ اگر وہ اس مرتبے تک پہنچی تھی تو یقیناً اس کے کردار میں متاثر کن خوبیاں تھیں لیکن ایک ہوس کار ڈاکو نے اپنی حرص و ہوس کا زہر اس کی زندگی میں داخل کیا تھا اور اس کے کردار کی ہر خوبی کو قتل کرنے پر تل گیا تھا.... راحت کی عزت ناموس اور نیک نامی سب کچھ داؤ پر لگ گیا تھا۔ اب اگر پولیس بھی اس کے دروازے پر دستک دے دیتی تو باقی کیا رہ جاتا.... پھر اس سے ایک اور بھی بہت بڑا نقصان ہوتا۔ اگر پولیس "آپی سلاتی اسکول" پر جا دھمکتی تو اس بات کا امکان بالکل ختم ہو جاتا کہ عیسٰی جان دوبارہ اسکول کا رخ کرے گا اور یوں میرا یہ "اسکوپ" بھی ختم ہو جاتا کہ میں عیسٰی جان کو سلائی اسکول میں جا دبوچوں گا۔

میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ "آپی سلائی اسکول" کو ایس پی برکت کی "خطرناک دستک" سے بچانے کی کوشش کروں گا۔ سائیں عالی ابھی تک سر نیچے ٹانگیں اوپر کیے کھڑا تھا۔ میں نے کہہ سن کر اسے اصل حالت میں آنے پر آمادہ کیا۔

پوچھنے لگا "کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "تھانے میں۔ ایس پی برکت کے پاس۔"

وہ بولا "یہ ایس پی برکت وہی "بغلول" ہے جو تھوڑی دیر پہلے یہاں بک بک کر رہا تھا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ سائیں بولا "اس چغد کو تو بات کرنے کا پتا نہیں۔ اگر اس نے اب مجھ سے بدتمیزی کی تو میں اس کی بہن کا نکاح پڑھوا دوں گا۔"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی بہت خبیث جن سے۔" سائیں نے جواب دیا "ایسے بچوں کا ماماں بنے گا وہ کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ بدبخت کہیں کا۔ بات کرتا ہے تو لگتا ہے منہ سے پتھر جھڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے اگر وہ بدتمیزی کرے گا تو دیکھ لیں گے اسے۔"

سائیں عالی اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔ فارم کے احاطے میں پولیس والوں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ان پولیس اہلکاروں میں سے بیشتر یہ جانتے تھے کہ میں ایس پی برکت کا آدمی ہوں۔ کسی نے مجھے اور سائیں عالی کو روکنے کی کوشش نہیں کی.... ہم فارم کے بیرونی گیٹ سے نکل کر باہر آ گئے۔ جونہی ہم باہر آئے کسی کونے کھدرے سے زریں گل بھی نکل کر ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ ایس پی برکت کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ بڑے جوش

میں تھا لیکن اب اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی عیسٰی جان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

وہ بولا "استاد صیب! امارا بھیجا ہانڈی کے مافق ابل رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ عیسٰی جان امارے سامنے ہو اور ام گولیاں مار مار کر اس کا چھلنی بناوے۔"

میں نے کہا "امارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

زریں بولا "اللہ تعالیٰ بھی کبھی کبھی پتا نہیں کیا کرتی ہے۔ اس نے ظالموں کے لیے اتنا لمبا وقت رکھا ہوا ہے کہ وہ کراچی سے کابل تک بھاگا بھاگا پھرتا ہے اور وقت ختم نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "یہ باتیں اگر تمہاری سمجھ میں آنے لگیں تو تم "پہنچی ہوئی ہستیاں" نہ بن جائیں۔"

"کہاں پہنچی ہوئی؟"

"کالا شاہ کاکو پہنچی ہوئی.... یہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ خواہ مخواہ دماغ کی چولیں ڈھیلی مت کرو۔"

"دماغ کا چولیں کیا ہوتا ہے.... یہ فقرہ ہم نے ندیم صیب کی کسی فلم میں بھی سنا تھا۔"

"فلم میں سنا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"اب یاد نہیں آ رہا ہوگا کہ کون سی فلم تھی؟"

"جی ہاں۔"

"بس یہی ہوتا ہے "دماغ کا چولیں ڈھیلی ہونا۔""

وہ بولا "واقعی استاد صیب! کسی وقت امارے کو لگتا ہے کہ امارے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے۔ دراصل یہ سارا ان جنگلی بیروں کا چکر ہے جو ام نے پہاڑی علاقے میں کھائے تھے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اس میں کوئی شک و شبہ والی بات ہے۔ بھائی میرے تمہارا دماغ سلک چکا ہے اور یہ ہنڈرڈ پرسنٹ درست بات ہے۔"

زریں گل مسکرایا "پھر تو استاد صیب! عیسٰی جان کو امارے ہاتھوں ہی قتل ہونا چاہیے۔ ام پر کوئی کیس بھی نہیں بنے گا۔ اس کے علاوہ سروج عرف الو کا پٹھی سے بدلہ چکانے کا بھی یہ اچھا موقع ہے۔"

میں نے کہا "تم باتوں میں سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اتنے پاگل بھی نہیں ہو۔ تمہارے "پاگل پن" کی صحت کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

ہم قصبے کی ایک سنسان سڑک پر پیدل چلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ زریں گل نے بتایا کہ کس طرح آج رات بارہ بجے کے لگ بھگ پیٹرول پمپ پر کی جانے والی "طویل نگرانی" رنگ لائی اور مطلوبہ سفید کار دکھائی دی۔ سفید کار کے تعاقب سے لے کر فارم تک پہنچنے کا سارا احوال مع فلمی حوالوں کے زریں گل نے مجھے سنا دیا۔

قریباً دس منٹ کے پیدل مارچ کے بعد ہم باغ پور کے وسیع و عریض تھانے میں داخل ہو رہے تھے۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی اور مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی کچھ کروٹوں پر پرندے چہچہانے لگے تھے۔ یہ ایک خوب صورت منظر تھا لیکن تھانے کے اندرونی کمروں سے بلند چیخیں اس منظر کا ستیاناس کر رہی تھیں۔ یہ رمضان علی اور اس کے ساتھیوں کی چیخیں تھیں۔ ایس پی برکت ان پر اپنے تھانیدارانہ ہتھکنڈے آزما رہا تھا۔ میں سائیں عالی اور زریں کے ساتھ اس دروازے پر پہنچا جس کے پیچھے یہ مشق ستم جاری تھی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے روکنا چاہا لیکن قریب ہی موجود اے ایس آئی نے اشارے سے کانسٹیبل کو منع کر دیا۔ میں اور سائیں عالی کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک درمیانے سائز کا کمرا تھا۔ دیواروں پر سفیدی تھی۔ ایک طرف آہنی اسپرنگوں والے دو پلنگ پڑے تھے۔ پلنگوں کے پاس ہی ایک بڑا سا آہنی ٹرنک تھا۔ ٹرنک کے عین اوپر دیوار پر کسی سپاہی کی وردی اور ٹوپی وغیرہ لٹکی تھی۔ کمرے کے وسط میں کھجور کی دو چٹائیاں بچھی تھیں۔ ان چٹائیوں پر رمضان اور اس کا ایک ساتھی اوندھے لیٹے تھے۔ تین تین سپاہیوں نے ان کے بازو اور ٹانگیں دبوچ رکھی تھیں۔ دو تشکرا ٹائپ کانسٹیبل ہاتھوں میں چمڑے کے بڑے بڑے چھتر لیے کھڑے تھے اور اچھل اچھل کر ضربیں لگا رہے تھے۔ ہر ضرب پر مضروب چٹائی پر تڑپ جاتا تھا اور عید قربان کے بکرے کی طرح چلانے لگتا تھا۔ ایس پی برکت ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کرسی پر بیٹھا تھا اور بڑے اطمینان سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

سردی میں بھی رمضان کے چہرے سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ سوج گئے تھے اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ یہی وہ شخص تھا جو چند گھنٹے پہلے اپنے فارم کے محفوظ کمرے میں عیسٰی جان اور بہادر علی کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا' مرغن کھانا کھا رہا تھا اور ایک غریب مزدور کی بیوی سے "خراجِ غربت" وصول کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

ایس پی برکت نے جوتے کی نوک سے رمضان علی کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور غرا کر پوچھا "ہاں بھئی رمضانے! کچھ بتاتا ہے کہ ابھی اور لتّر (جوتے) کھانے ہیں؟"

"میں کیا بتاؤں۔ میں کیا بتاؤں۔" رمضان کراہتے ہوئے بولا۔

"تم یہ بتاؤ کہ عیسٰی جان نے تمہارے ہاتھوں ستا کو قتل کیوں کروایا۔"

"میں نے کہا ہے نا' مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے.... بہادر علی سے.... پوچھا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس نے بتایا بھی ہوگا اور تم نے سنا بھی ہوگا لیکن اب تم یہ سب کچھ چھپائے بیٹھے ہو۔ جب مرغی انڈا دبائے بیٹھی رہتی ہے لیکن مجھے انڈا دلوانا آتا ہے۔"

"میں... بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں... مجھے مسجد میں لے جاؤ' مجھے کچھ پتا نہیں۔"

رمضان کے جوابات سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ستا کے قتل کا اعتراف کر چکا ہے۔ ایس پی برکت نے رمضان کو تجربہ کار نظروں سے گھورا۔ پھر مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا "اچھا یہ بتا' ستا کی زیادہ یاری دوستی کن لوگوں سے تھی؟"

"میں نے... میں نے آپ کو بتایا ہے۔ دو تین بندے ہی اس سے زیادہ ملتے تھے ایک صادق پہلوان ہے' اچھڑوالی گاؤں میں رہتا ہے۔ ایک چوہدری امین اسی قصبے کا ہے ایک سلطاناں ارائیں ہے' اور ایک اس کا بھائی ہے نذیر چڑاوی۔"

ایس پی برکت نے کہا "یہ تو مرد ہو گئے۔ کسی زنانی شنانی سے بھی یاری تھی اس کی کہ نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی لڑکی وغیرہ۔"

رمضان کراہتے ہوئے بولا "لاہور کی ایک طوائف ہے نگینہ بانو... ستا کبھی کبھی اس سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ...."

"ہاں ہاں کہو۔" ایس پی بے چینی سے بولا۔

"اس کے علاوہ... تو مجھے کسی کا پتا نہیں۔" رمضان نے تھوک نگل کر کہا۔

"میرا خیال ہے تمہیں اور لتّر کھانے پڑیں گے۔" ایس پی برکت نے کہا۔

"رّب سوہنے پیر کی قسم میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"اس بھوتنی دے دماغ پر زور دو۔" ایس پی برکت نے پھنکار کر کہا "اگر وہ حرامی لاہور میں جا کر منہ مارتا تھا تو یہاں آس پاس بھی کچھ نہ کچھ کرتا ہوگا۔ اس قصبے میں یا آس پاس کے کسی گاؤں میں۔"

میں نے دیکھا کہ رمضان کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا تھا۔ نجانے کیوں میرے دل نے کہا کہ رمضان کے منہ سے اب وہی بات نکلنے والی ہے جس کا اندیشہ مجھے یہاں تھانے میں لے کر آیا ہے۔ اگر میرے اندیشے کے مطابق واقعی عفت بی بی جی کا نام رمضان کی زبان پر آجاتا تو اس بے چاری لڑکی کے لیے ایک قیامت برپا ہو جاتی... میں دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ کمرے کی اکلوتی ٹیوب لائٹ کا سوئچ میرے قریب ہی تھا۔ میں نے بڑی صفائی سے سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ باہر سے بھی روشنی نہیں آ رہی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور چارپائی پر اوندھے لیٹے ہوئے رمضان علی تک پہنچ گیا۔ میرا دایاں بازو اس کی گردن سے لپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا یا منہ سے کوئی آواز نکالتا' میں نے بازو کو مخصوص حرکت دی۔ گردن کی اہم رگوں پر ناقابل برداشت دباؤ پڑا اور رمضان علی ایک جھرجھری لے کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کارروائی میں تین چار سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ کمرے میں اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے تمام افراد پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ ابھی کسی نے ریوالور نکالا تھا اور نہ جیب وغیرہ ٹٹول کر ماچس نکالنے کی کوشش کی تھی۔ صرف ایس پی برکت کی بڑبڑاہٹ سنائی دی تھی' اس نے بتی چلے جانے کے بارے میں کوئی تبصرہ کیا تھا۔ سوئچ آف کرنے سے پہلے ہی میں نے ٹیوب لائٹ کی لوکیشن دیکھ لی تھی۔ ٹیوب لائٹ فرش سے قریباً سات آٹھ فٹ کی بلندی پر تھی۔ جہاں تک میرا ہاتھ بآسانی پہنچ سکتا تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ تک ہاتھ پہنچایا اور راڈ کو ایک طرف کی ساکٹ میں سے یوں نکال دیا کہ وہ بظاہر ساکٹ کے اندر ہی موجود رہا۔ اس کے بعد میں نے پھرتی سے ٹیوب لائٹ کا سوئچ آن کر دیا۔ سوئچ آن ہونے کے باوجود ٹیوب لائٹ روشن نہیں ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے؟ ایک سرا ساکٹ سے نکل چکا تھا۔

اسی دوران میں ایک شخص کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ تھانہ محرر کے کمرے میں بلب روشن تھا۔ اس بلب کی روشنی کمرے میں آنے لگی۔ تھانے کے ایک شخص نے ٹیوب لائٹ کا سوئچ دیکھا' وہ آن تھا۔ اس نے ٹیوب کو ہلایا جلایا۔ راڈ کی دونوں پنیں دوبارہ ساکٹ میں چلی گئیں اور ٹیوب لائٹ روشن ہو گئی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ سائیں عالی بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ٹیوب لائٹ کو بجھایا گیا ہے۔ ٹیوب لائٹس کے ساتھ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ از خود بجھ جاتی ہیں اور راڈ کو گھمانے پھرانے سے دوبارہ روشن ہو جاتی ہیں۔ اس واقعے کو بھی اسی نوعیت کا سمجھ لیا گیا تھا۔

میں نے دیکھا رمضان علی چارپائی پر اوندھا لیٹا ہے اور بے سدھ پڑا ہے۔ ایس پی برکت نے جوتے کی نوک سے پھر اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور چہرے کو دائیں بائیں ہلایا۔ رمضان کی آنکھیں بند ہی رہیں۔ ایس پی غرایا "مکر نہیں چلے گا رمضانے! جب تک بھوتنی دی زبان نہیں کھولے گا' تیری جان نہیں چھوٹے گی۔"

میں نے پوچھا "کیا ہوا ہے اسے؟"

ایک اے ایس آئی بولا "پھر غشی کی ایکٹنگ کر رہا ہے۔"

اس نے ہٹے کٹے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے حسب سابق اچھل کر چمڑے کا چھتر نما ٹکڑا رمضان کی پنجو پر رسید کیا۔ "ٹاخ" کی آواز سے کمرا گونج اٹھا لیکن اس مرتبہ اس آواز کے ساتھ مضروب کی چیخ شامل نہیں تھی۔ چیخ تو دور کی بات ہے' رمضان کے جسم میں جنبش تک نہیں ہوئی تھی۔ ایس پی برکت کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر رمضان کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے بال پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ گالوں پر تھپڑ رسید کیے۔ ماں بہن کی تین چار گالیاں دیں۔ پوٹے اٹھا کر آنکھیں دیکھیں۔ پھر اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی۔ اس نے ایک سفید لباس والے کو اشارہ

کیا۔ وہ جلدی سے جگ میں پانی لے آیا۔ رمضان کے چہرے پر چھینٹے مارے گئے۔ اس کی ناک بند کی گئی تاکہ وہ سانس لینے کے لیے منہ کھولے اور اس کے جسم میں حرکت نمودار ہو لیکن یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ کمرے میں موجود تمام افراد کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی تھی۔ رمضان کا وہ ساتھی جسے رمضان کے ساتھ ہی چھینٹی لگائی جا رہی تھی بلند آواز میں رونے لگا۔

ایس پی برکت کے حکم پر رمضان کو چارپائی سے اٹھا کر اسپرنگوں والے پلنگ پر لٹایا گیا۔ دو افراد اس کی ہتھیلیوں اور تلوؤں کی مالش کرنے لگے۔ ایک شخص اس کے منہ میں پانی ٹپکانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ یہ صورت حال مجھے محظوظ کر رہی تھی۔ کمرے میں موجود کسی فرد کو شبہ نہیں ہوا تھا کہ لائٹ کے بجھنے اور رمضان کے اتنا غفیل ہونے میں کوئی تعلق ہے۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آئی کہ ان دونوں واقعات میں ربط ہے۔ درحقیقت رمضان پر بے دریغ تشدد کیا گیا تھا۔ اب اس کی اچانک بے ہوشی نے ایس پی برکت سمیت سب کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد رمضان کی گردن پر پڑنے والے دباؤ کا نشان ابھر آئے گا اور نظر آنے لگے گا' لیکن ایسا ہو بھی جاتا تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ کسی کا دھیان اس طرف جا ہی نہیں سکتا تھا کہ رمضان کی بے ہوشی گردن کی اس چوٹ کی وجہ سے ہے۔ گرفتاری کے وقت رمضان کو چوٹیں آئی تھیں' اور اس کی ناک سے بھی مسلسل خون رس رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ گردن کی چوٹ کو بھی انہی چوٹوں میں شمار کر لیا جائے گا۔

میں نے ایس پی برکت کو اشارہ کیا اور اسے لے کر کمرے سے باہر آ گیا "کیا بات ہے؟" برکت نے پوچھا۔

میں نے کہا "مجھے اس بندے کی حالت اچھی نہیں لگتی۔ بہتر ہے ڈاکٹر کو بلا لیا جائے؟"

ایس پی نے بے پروا نظر آنے کی کوشش کی اور بولا "کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔" میں نے جواب دیا "آپ نے دیکھا نہیں' سانس لیتے ہوئے اس کا پیٹ کیسے ہل رہا تھا۔ ویسے یہ بندہ پرانا عیاش ہے۔ ایسے لوگ اندر سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔ کل رات بھی حقہ پیتے ہوئے اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ آنکھیں الٹ گئی تھیں اور سانس بند ہو گیا تھا۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"میں پچھلے چھ دن سے اس فارم میں ہوں۔" میں نے ایس پی برکت کو اطلاع دی۔

وہ بولا "عیاش تو ٹھیک ٹھاک ہے حرامزادے کی۔ پتا نہیں ہوا کیا ہے۔"

میں نے کہا "عرض تو کر رہا ہوں جناب جی کہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے۔ اوپر سے آپ نے رگڑے بھی ٹھیک ٹھاک لگائے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔"

ایس پی برکت کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ وہ مونچھوں کو سہلاتے ہوئے بولا "تمہارے خیال میں اب کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا "میرے پاس آپ کے لیے ایک تجویز ہے اگر آپ اسے قابل قبول سمجھیں تو۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ایس پی برکت فراخ دلی سے بولا "عیسیٰ جان ہمارا سانجھا (مشترکہ) مسئلہ ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "جہاں تک میں سمجھا ہوں چاچا جی! آپ رمضان سے جو کچھ پوچھ چکے ہیں اس سے زیادہ نہیں پوچھ سکیں گے۔ اس نے ستا پہلوان کو قتل تو کیا ہے اور عیسیٰ جان سے ملتا جلتا بھی رہا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عیسیٰ جان نے ستا کو قتل کیوں کروایا تھا۔ یہ اندر کی بات ہے اور میرے خیال میں عیسیٰ جان اور بہادر علی کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔"

ایس پی برکت بولا "بھاڑ میں جائے ستا کا قتل اور قتل کی وجہ۔ یہ بات تو ویسے ہی چل نکلی تھی۔ مجھے تو صرف عیسیٰ جان سے غرض ہے۔"

میں نے کہا "رمضان سے آپ کی یہ غرض بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ جانتے ہی ہیں عیسیٰ جان پرانا پاپی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا' قبائلی علاقے میں وہ ہمیں کیسے کیسے چکر دیتا رہا ہے۔ وہ اتنا کچا نہیں کہ رمضان جیسے بندے کو اپنے خاص ٹھکانوں کے بارے میں بتا دے۔ ان دونوں کی دوستی نہ تو پرانی ہے اور نہ گہری۔ ایسی دوستی میں اندر کی باتیں اپنے اندر ہی رکھی جاتی ہیں۔"

"تم کسی تجویز کی بات کر رہے تھے؟" ایس پی برکت نے کہا۔

"میں اسی طرف آ رہا ہوں جناب عالی۔" میرے لہجے میں اپنائیت تھی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر میں نے کہا "بات یہ ہے کہ مجھے شفا خانے میں آنے جانے والے چند ایک زمینداروں اور چوہدریوں پر شبہ ہے۔"

"شفا خانہ؟" برکت نے حیرانی سے کہا "یہ کیا شے ہے؟"

"یہ عیسیٰ جان کے اس ڈیرے کا نام ہے جہاں وہ قلندر سیاہ پوش کے بھیس میں رہتا تھا۔ یہ ڈیرا نالی والا گاؤں کے پاس ہی ہے۔ شاید آتے جاتے آپ کی نظر سے بھی گزرا ہو۔ اس پر دو بڑے بڑے جھنڈے لگے ہیں' ایک کا رنگ سبز اور دوسرے کا زرد ہے۔"

ایس پی برکت نے اپنا گھڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ابھی اس کتے کے بچے رمضان نے بتایا تو ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اسے شفا خانہ کہتے ہیں۔ کیا وہاں عیسیٰ جان علاج معالجے کا ڈراما کرتا تھا۔"

"ڈرامے سا ڈراما جی۔" میں نے کہا "ٹھیک ٹھاک فیس

وصول کرتا تھا اپنے شکار سے.... اس نے وہاں ایک بڑا سا بورڈ لگا رکھا ہے جس پر ہر مرض کے نام کے سامنے اس کی فیس درج ہے۔ جس طرح علاج کے طریقے ہوتے ہیں ایلوپیتھک' ہومیوپیتھک وغیرہ اسی طرح قلندر سیاہ پوش کے بھی طریقے تھے۔ علاج بذریعہ عملیات اور علاج بذریعہ جڑی بوٹی۔ مثلاً شوگر کے سامنے تحریر تھا۔ علاج بذریعہ عملیات دو ہزار روپیہ نقد اور ایک بھینس۔ علاج بذریعہ نسخہ جات تین ہزار روپیہ نقد اور ایک بھینس۔ موٹاپا' السر' تپ دق' کینسر' دماغی خلل' جسمانی کمزوری' غرض ہر مرض کا علاج "شفا خانے" میں ہو رہا تھا اور دھوم دھام سے ہو رہا تھا۔ فیسیں زیادہ تھیں اس لیے عام طور پر کھاتے پیتے لوگ ہی قلندر سیاہ پوش سے "فیض" حاصل کر پاتے تھے۔ "شفا خانے" کے قریبی دیہات کے درجنوں چوہدری اور زمیندار "قلندر" کے عقیدت مندوں میں شامل ہو چکے تھے اور میرے اندازے کے مطابق اس سلسلے نے بہت زور پکڑنا تھا۔ تین چار ماہ میں "قلندر" نے ٹھیک ٹھاک مرغے پھنسا لیے تھے' اس کا مطلب ہے کہ سال دو سال میں تو وہ پورا ڈیری فارم کھول لیتا۔"

ایس پی برکت بولا "تو تمہارا مطلب ہے کہ قلندر یعنی عیسیٰ کے عقیدت مند چوہدریوں میں سے ہی کسی نے اسے پناہ دے رکھی ہوگی۔"

میں نے کہا "میں صرف اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔"

برکت بولا "تمہاری رائے میں وزن ہے۔ یہ لوگ جس پر اعتبار کرتے ہیں' اندھا اعتبار کرتے ہیں۔ وہ کوے کو سفید کہنا شروع کر دے تو یہ بھی کہنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے پیروں فقیروں پر یقین رکھنے والے بڑے بڑے جغادری دیکھے ہیں میں نے...."

برکت کو میری بات پر یقین آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس یقین کو مزید مضبوط کرنے کے لیے میں نے کہا "ان چوہدریوں میں گوجرانوالہ پولیس کا ایک ڈی ایس پی بھی شامل ہے۔ رب نواز نام ہے اس کا.... تاپی والا گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ قلندر سیاہ پوش کے بھیس میں عیسیٰ جان کو ہر طرح کا تحفظ دے رہا ہے۔ ورنہ کسی نئے علاقے میں کسی نئے پیر فقیر یا عامل کا اتنی جلدی پاؤں جما لینا آسان نہیں ہوتا۔"

برکت کی آنکھوں میں نظر آنے والی چمک نمایاں تر ہو گئی.... میں نے گوجرانوالہ کے ڈی ایس پی کا نام یونہی نہیں لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ گوجرانوالہ پولیس کے افسروں سے ایس پی برکت کی پرانی پرخاش چل رہی ہے۔ یہ پرخاش ایک ایس ایچ او کے تبادلے سے شروع ہوئی تھی اور شدت اختیار کر گئی تھی۔ اندر ہی اندر ایک سرد جنگ تھی جو ان لوگوں میں مخاصمانہ سطح پر جاری تھی۔ اس بارے میں مجھے رجال شاہی صاحب نے بتایا تھا۔

ایس پی برکت زور و شور سے سر ہلانے لگا اور ارادہ ظاہر کرنے لگا کہ وہ اس سلسلے میں فوری کارروائی کرے گا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا زخمی بازو بھی سہلاتا جا رہا تھا۔

مجھے اطمینان ہو گیا کہ فی الوقت آپی سلائی اسکول کی انچارج راحت پر سے مصیبت ٹل گئی ہے۔ دوسری طرف ایس پی برکت کو بھی ایک "معقول مصروفیت" مل گئی تھی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں نے راحت پر سے مصیبت ٹالنے کے لیے ایس پی برکت کی تفتیش کو غلط رخ پر ڈال دیا ہو' میں نے جو معلومات ایس پی کو فراہم کی تھیں' وہ بہت حد تک درست تھیں اور یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ اگر عیسیٰ جان آپی سلائی اسکول کی طرف نہیں گیا تو اپنے زمیندار مریدوں میں سے ہی کسی کے پاس چلا گیا ہو۔ ایس پی برکت اپنی روایتی تندی و تیزی سے تفتیش کرتا تو عیسیٰ کا کھوج لگا سکتا تھا۔

○☆○

ایس پی برکت "قتل کیس" کے بڑے ملزم رمضان سے مزید پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ مسلسل بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے برکت نے بہتر سمجھا کہ میرے مشورے کے مطابق عیسیٰ جان (قلندر سیاہ پوش) کے شفا خانے کا رخ کیا جائے اور وہاں موجود افراد سے تفصیلی پوچھ گچھ کی جائے۔ برکت مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن مجھے فوراً آپی سلائی اسکول کی طرف جانا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ میں ایس پی برکت سے کوئی معقول بہانہ کر لیتا۔ میں نے سائیں عالی کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایس پی برکت سے کہا کہ میں فی الوقت سائیں عالی کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ اسے خوش رکھوں۔ عین ممکن ہے کہ وہ عیسیٰ جان کے حوالے سے میری کوئی مدد کرے۔

ایس پی برکت تنک کر بولا "ابھی تم قلندر سیاہ پوش کے عقیدت مندوں کو جاہل اور وہم پرست قرار دے رہے تھے۔ وہ ایسے ہیں تو پھر تم کیا ہو۔ تم بھی تو اس بدبودار سائیں کے آگے پیچھے پھر رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ سائیں عام پیروں فقیروں سے بہت مختلف ہے جناب.... ابھی آپ نے اس کے کرتب نہیں دیکھے۔"

"تو تم بھی یقین رکھتے ہو کہ اس کے پاس جنات وغیرہ ہیں اور وہ بیٹھ کر ان پر حکم چلاتا رہتا ہے۔"

"جنات کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس کے تعلقات ایسے بندوں سے ہیں جو جنات سے زیادہ حیران کن کام کرتے ہیں۔ یہ جہاں پہنچتا ہے اپنے عقیدت مند پیدا کر لیتا ہے.... یہاں پاکستان میں آئے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لاہور میں اس کے تعلقات انتظامیہ کے ایسے افسروں سے ہوں گے جن کے سامنے آپ کو بھی سلیوٹ کرنا پڑتا ہو گا۔"

"کیا تم مجھے اس بھوتنی دے سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"آپ اب تک کسی سے ڈرے ہیں جو اب ڈریں گے۔ وہ تو آپ کی باتوں سے بات نکل آئی ہے۔"

ایس پی برکت نے کہا کچھ نہیں لیکن مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھ لوں گا تمہیں اور تمہارے سائیں کو بھی۔

میں نے ڈبیں گل کو ایس پی برکت کے ساتھ ہی عیسیٰ جان کے "شفا خانے" بھیج دیا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو میں سائیں عالی کے ہمراہ خاموشی سے آپی سلائی اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔

قریباً نو دس میل کا سفر ایک سالم تانگے میں طے کر کے جب ہم دو ڈھائی گھنٹے بعد "آپی سلائی اسکول" پہنچے تو دن کے دس بج رہے تھے۔ گیٹ پر بھاری بھرکم پٹھان چوکیدار موجود تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ اس چوکیدار کا بھائی تھا جس کی گردن میں نے ایک دن پہلے مسلی تھی۔ چوکیدار نے مجھے اور سائیں عالی کو روکا۔ سائیں عالی اپنے مجذوبانہ انداز میں چوکیدار سے تکرار کرنے لگا۔ اسی دوران میں ایک اندرونی کمرے سے راحت عرف آپی جی نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ ہمیں دیکھ کر بھی انجان بن جائے گی اور خود کو چھپا لے گی لیکن پھر اس نے دانش مندی کا ثبوت دیا اور اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کو بھیجا تاکہ وہ ہمیں دفتر میں لے آئے۔

راحت کا دفتر بیرونی گیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ دفتر اسکول کی عمارت اور راحت کی مختصر رہائش گاہ کے درمیان واقع تھا۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ دیواروں پر سلائی کڑھائی کے نمونوں کو ڈسپلے کیا گیا تھا۔ اس سارے کام میں پنجاب کی ثقافت اور مقامی رنگ ڈھنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے دو خواتین بھی دفتر میں موجود تھیں۔ راحت نے انہیں فوراً باہر بھیج دیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگی تھی۔ آج میں اسے دن کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بالوں کو بھی سلیقے سے باندھ رکھا تھا۔ خاصی دلکش شخصیت کی مالک تھی وہ.... اگر سجا پہلوان اس کے لیے دیوانہ ہوا تھا تو یقیناً دیکھ بھال کر ہوا تھا۔

سائیں عالی نے کہا "بچی جی! تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہمارے بعد؟" راحت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور نفی میں سر ہلا دیا۔ سائیں جھوم کر بولا "تکلیف ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ ایک لمبا چوڑا جن تمہاری حفاظت کر رہا تھا اور جن بھی وہ جو ہیڈ کانسٹیبل ہے.... ہیڈ کانسٹیبل تو انسان بھی ہو تو ایک آفت ہوتا ہے۔ بڑی طاقت ہوتی ہے ہیڈ کانسٹیبلی میں۔"

راحت نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کہاں گئے تھے آپ؟"

"باغ پور.... سخاوت پہلوان عرف سجا کے فارم پر۔" میں نے جواب دیا۔

راحت خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سجا کا ناپسندیدہ نام زبان پر لانا نہیں چاہتی اور چاہتی ہے کہ میں خود ہی سجا کے بارے میں اسے بتاؤں۔

میں نے راحت سے چائے پلوانے کی فرمائش کی۔ اس نے گھنٹی بجا کر چائے کا آرڈر دے دیا تو میں نے سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور راحت سے پوچھا "تم نے سجا کو کتنے دن سے نہیں دیکھا؟"

وہ بولی "ڈیڑھ دو ہفتے پہلے وہ آیا تھا لیکن میں اس سے ملی نہیں تھی۔ چوکیدار نے اسے گیٹ پر سے ہی واپس بھیج دیا تھا۔ وہ چوکیدار کو میرے لیے شہد کی دو بڑی بوتلیں دے گیا تھا۔ میں نے یہ شہد اسی وقت باہر پھنکوا دیا تھا۔"

میں نے راحت سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ سجا اب تمہیں تنگ کرنے کے لیے کیوں نہیں آتا؟"

وہ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بولی "شش.... شاید قلندر سیاہ پوش نے اسے سمجھا دیا ہے.... یا دھمکا دیا ہے۔"

میں نے کہا "بات یہ نہیں ہے.... بات کہیں زیادہ سنگین ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے قلندر سیاہ پوش نے سجا کو قتل کر دیا ہے' کل باغ پور میں سجا کی رسم دسواں تھی۔"

راحت کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت زدہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا تھا "یہ.... یہ کیسے ہو سکتا ہے!" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ ہو چکا ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "اور جسے تم قلندر سیاہ پوش کہہ رہی ہو' وہ قلندر شکندر نہیں ہے۔"

"آ.... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" وہ ہکلائی۔

میں نے کہا "وہ شخص جو یہاں قلندر سیاہ پوش کے بھیس میں رہ رہا ہے وہ ایک نامی گرامی ڈاکو اور قاتل ہے۔ پورے پنجاب اور سرحد کی پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم پڑھی لکھی ہو کر بھی ایک توہم پرست عورت کی طرح پیری فقیری کے چکر میں پڑ گئیں اور پیر بھی ایسا چنا جو سر سے پاؤں تک شیطان ہے۔" راحت عرف آپی جی نے بمشکل تھوک نگلا اور اپنے کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ان کی لرزش چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سائیں عالی نے فرش سے اٹھ کر بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "گھبرانے کی بات نہیں بچی جی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے راحت سے پوچھا "پرسوں رات کے بعد تو قلندر سیاہ

پوش نے تم سے رابطہ نہیں کیا؟" راحت نے خوف زدہ انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا "مجھے شک ہے کہ وہ ایسا کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم باغ پور سے سیدھے تمہارے پاس آئے ہیں۔ ہم نے ابھی پولیس کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ہم نہیں چاہتے کہ معاملے میں تمہاری نیک نامی اور عزت پر کوئی حرف آئے۔"

راحت رونے لگی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔"

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ملازمہ چائے لے کر آ رہی تھی۔ راحت نے جلدی سے آنسو پونچھے اور نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ان منتظمین میں سے تھی جو اپنے ماتحتوں کے سامنے ہمیشہ باوقار اور نارمل دکھائی دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ چائے لانے والی ادھیڑ عمر ملازمہ کو شک تک نہیں گزرا تھا کہ اس کی آمد سے چند سیکنڈ پہلے "آپی جی" زار و قطار رو رہی تھی۔ بعض لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سمندر کی طرح گہرے اور وسیع برداشت رکھنے والے۔ ان کے باطن پر جو کچھ بھی بیت جائے ان کا ظاہر ہنستا مسکراتا ہی رہتا ہے۔ پرسوں رات ہوس پرست عیسیٰ جان کے ہاتھوں راحت عرف آپی جی پر جو قیامت گزری تھی اس کا میں چشم دید گواہ تھا لیکن آج اس صاف ستھری شائستہ لڑکی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سڑی ہوئی کیچڑ کے طوفان میں محصور رہی ہے۔

ملازمہ نے چائے پیالیوں میں ڈال دی تو راحت نے ملازمہ سے کہا "ماسی صغراں ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔ کسی کو اندر نہ بھیجنا۔"

"جی آپی جی۔" ملازمہ نے مودب ہو کر کہا اور باہر چلی گئی۔

راحت نے اشک بار آواز میں کہا "میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں لیکن اتنا یقین ہے کہ آپ بھلے لوگ ہیں۔ کیا.... آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

"ہاں ہاں کہو۔"

"پلیز آپ مجھے سچ سچ بتائیں۔ کیا.... کیا واقعی فاندہ سیاہ پوش نے سخا کو قتل کر دیا ہے۔"

"ہاں یہ ہو چکا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہم سخا کے گھر سے ہو کر آئے ہیں۔"

"ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟" راحت کے لہجے میں آنسوؤں کا سیلاب تھا اور بدترین اندیشوں کی آندھی تھی "اگر واقعی سخا قتل ہو گیا ہے تو سیاہ پوش پکڑا جائے گا اور پولیس یہاں تک بھی پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "فوری طور پر تو پولیس کے پہنچنے کا خطرہ نہیں لیکن جب ایسا ہوگا تب بھی اس میں بہت زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہوگی.... تم گھبراؤ مت۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں' تمہارا پورا ساتھ دیں گے۔"

"اکیلی عورت کا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا۔ وہ تنِ تنہا ہوتی ہے۔"

"تم غلط سوچتی ہو۔ تم نے کون سا غیر قانونی کام کیا ہے کہ خود کو تنہا سمجھ رہی ہو۔ تم اس سارے معاملے میں بالکل بے قصور ہو۔ سخا ایک بدکار شخص تھا اور اس نے ایک ڈاکو کے ہاتھوں اپنے اعمال کی سزا پائی ہے۔"

"لیکن اس ڈاکو سے میرا تعلق بھی تو ثابت ہوگا۔ لوگوں کو پتا چلے گا کہ اس ڈاکو نے میری وجہ سے سخا کو قتل کیا ہے اور وہ میرے ساتھ....."

ایک دلدوز ہچکی راحت کے سینے کو ہلا گئی اور وہ شرم کے سبب بات مکمل نہ کر سکی۔

میں نے کہا "اس میں بھی تمہارا کوئی گناہ نہیں ہے۔ سیاہ پوش نے تمہیں بے بس کر رکھا تھا۔ تم اپنی اسٹوڈنٹس کی جان اور آبرو کے خوف سے چپ رہنے پر اور ہر دکھ سہنے پر مجبور تھیں۔ تمہاری جگہ کوئی بھی شریف سے شریف اور نیک سے نیک لڑکی اس حال میں ہوتی تو یہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور ہاں.... یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ ساری باتیں منظر عام پر آ ہی جائیں۔ عیسیٰ ایک مفرور قاتل ہے۔ سیکڑوں خون اس کی گردن پر ہیں۔ وہ آسانی سے گرفتار ہونے والا نہیں۔ اسی فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا جائے گا لیکن اگر وہ گرفتار ہوتا بھی ہے تو ہم ایسا انتظام کر سکتے ہیں کہ اس سارے معاملے سے تمہارا ذکر بالکل گول کر دیا جائے۔"

راحت کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں "یہ.... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر سائیں عالی کی طرف اشارہ کیا "سائیں جی کے ہوتے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ بڑی پہنچ والے ہیں۔ پولیس کے کئی بڑے بڑے افسران کے پاؤں دباتے ہیں۔"

راحت کی آنکھوں میں نئے آنسو لرزنے لگے۔ وہ آفت زدہ نظر آ رہی تھی اور آفت زدہ شخص کا دل بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ اچانک اٹھی اور سائیں عالی کے پاؤں میں بیٹھ گئی "سائیں جی! میرے لیے کچھ کریں.... میرے اور میری بچیوں کے لیے کچھ کریں۔" وہ جھک پڑی۔

سائیں عالی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا "سب ٹھیک ہو جائے گا بچہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "تو تحقیق محمد سے بات کر۔ یہ ہوا کرے گا۔ میں دعا کروں گا۔"

راحت سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ سائیں عالی فرش پر بیٹھا بیٹھا اپنا پسندیدہ نعرہ لگانے لگا "ہامل دھڑکا قاتل کا ہامل دھڑکا۔"

اس کا بلند نعرہ سن کر ادھیڑ عمر ملازمہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر خوف زدہ نظروں سے اندر جھانکا۔ راحت نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ دو تین منٹ بعد سائیں عالی کی نعرے بازی ختم ہوئی تو راحت نے دبی آواز میں کہا "کہیں آپ.... میرا مطلب ہے آپ کا تعلق بھی تو پولیس سے نہیں۔"

میں نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا اور راحت کو یقین دلایا کہ پولیس یا کسی دوسری ایجنسی سے ہمارا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

وہ بولی "لیکن آپ سیاہ پوش کو پکڑنا تو چاہتے ہیں نا۔"

"بالکل پکڑنا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہمیں اس سے اپنے کچھ پرانے حساب چکانے ہیں اور پھر سیاہ پوش جیسے درندے کو قانون کی گرفت میں لانے کے لیے ہر شریف شہری کو کوشش کرنی چاہیے۔"

وہ بولی "کیا آپ میری ایک التجا مان سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں نے بتایا ہے نا کہ ہم دل سے تمہارے خیر خواہ ہیں۔ جس کام میں تمہارا بھلا ہوگا' اس میں ہمارا نقصان بھی ہوگا تو ضرور کریں گے۔"

وہ بولی "میں آپ کا نقصان کرنا ہرگز نہیں چاہوں گی۔ بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ آپ قانون اور جرم کی یہ لڑائی میرے اس اسکول میں نہ لڑیں۔ مجھ پر اور میری اسٹوڈنٹس پر رحم کریں۔ یہ اسٹوڈنٹس مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں' ان میں سے کسی کی جان چلی گئی تو شاید میں بھی زندہ نہ رہ سکوں۔ ویسے بھی اگر یہاں فائرنگ وغیرہ ہو گئی تو پورے علاقے میں بدنامی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اخباروں میں شہ سرخیاں لگ جائیں۔ ایسے اداروں کے لیے اس قسم کی بدنامی ان کی موت ہوتی ہے۔ سیاہ پوش کے کچھ اور ٹھکانے بھی ہوں گے۔ آپ اسے وہاں بھی "ٹریپ" کر سکتے ہیں.... یا پھر اسکول سے دور کہیں راستے میں ناکا لگا لیں.... مم.... میرا خیال ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں۔ میں.... اپنے اسکول کو اس آگ سے بچانا چاہتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' سائیں عالی نے زور سے نعرہ لگایا "ہامل دھڑکا قاتل کا ہامل دھڑکا" پھر اس نے قریبی کھڑکی کھولی اور کود کر باہر بھاگ گیا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ درختوں کے پیچھے اوجھل ہو چکا تھا۔

راحت خوف آمیز حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "کوئی خاص بات نہیں۔ یہ مجذوب ہیں۔ ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے ابھی دندناتے ہوئے واپس آجائیں۔ ہو سکتا ہے آٹھ دس روز بعد کسی قبرستان میں سوئے ہوئے پائے جائیں۔ بہرحال یہ گم نہیں ہوں گے۔ گم ہونا انہیں آتا ہی نہیں ہے اور ان کی حرکتیں بے معنی بھی نہیں ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی چھوٹا بڑا مقصد ضرور ہوتا ہے۔"

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ راحت نے سر پر آنچل درست کیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اچانک دفتر کا دروازہ تیزی سے کھلا اور میں نے اپنے سامنے عیسیٰ جان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور ہاتھوں میں وہی سب مشین گن تھی جس کے ساتھ وہ دس بارہ گھنٹے پہلے فارم سے فرار ہوا تھا۔ عیسیٰ جان کی مشین گن کا رخ میرے سینے کی طرف تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ میں ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" عیسیٰ جان زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا۔ میں نے ہاتھ کندھوں سے اوپر کر دیے "کھڑکی کے سامنے پردہ کھینچ دو۔" عیسیٰ جان نے راحت کے لیے حکم جاری کیا۔ راحت نے کھڑکی کی چٹخنی لگائی اور سامنے پردہ کھینچ دیا "دیوار کی طرف منہ کر لو۔" عیسیٰ جان نے نہایت خطرناک لہجے میں مجھے ہدایت جاری کی۔

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مرنے یا مارنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ میں کتنی بھی تیزی دکھاتا سب مشین گن کا ٹریگر دبنے سے پہلے ریوالور نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ عیسیٰ جان نے بڑی مہارت سے سب مشین گن کی نال میری بائیں پسلیوں سے لگائی اور تیزی سے میرے جسم پر ہاتھ گھمایا۔ تیس سیکنڈ کے اندر اندر میرا ریوالور اور رام پوری خنجر اس کے قبضے میں تھے.... رام پوری خنجر کے بارے میں وہ بدبخت بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خنجر میری پنڈلی سے کیسے پیوست رہتا ہے۔ پشاور کے نواح میں کچھ عرصہ پہلے عیسیٰ جان سے میرا اور نوریں گل کا خونی ٹاکرا ہوا تھا۔ اس ٹاکرے میں میرے خنجر نے عیسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو خاطر خواہ نقصان پہنچایا تھا۔ وہ نزپال سے بھٹکی ہوئی کھودیں دیوانہ وار مجھ سے لپٹے ہوئے تھے جب میرے خنجر نے اچانک ان کے پیٹ چاک کرنے شروع کر دیے تھے۔ غالباً اس خونی واقعے کی یاد عیسیٰ کے ذہن میں موجود تھی اور اس نے تلاشی کے دوران میں خنجر بازیاب کرنے پر سب سے زیادہ توجہ دی تھی۔

مجھے غیر مسلح کرنے کے بعد اس نے تحکمانہ لہجے میں راحت سے کہا "تم یہیں دفتر میں رہو اور اپنے آپ کو نارمل کرو۔ کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں کچھ ہوا ہے۔"

راحت نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر دفتر کا ایک بغلی دروازہ کھول دیا۔ پلائی ووڈ کے اس چھوٹے سے دروازے کے پیچھے ایک نیم روشن راہداری تھی۔ میں اور عیسیٰ

جان راہداری میں داخل ہوئے تو راحت نے دروازہ بند کر دیا۔ راحت کے رویّے سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ عیسیٰ جان میری آمد سے پہلے ہی اسکول میں موجود تھا اور راحت اس کی موجودگی کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ میرے سامنے جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔

عیسیٰ جان مجھ پر پوری طرح حاوی تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور وہ مجھے کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دس بارہ گز لمبی راہداری سے گزر کر ہم اسی رہائشی حصے میں آگئے جو حال ہی میں بنا تھا اور اسکول کی قدیم عمارت کے ساتھ اٹیچ ہوا تھا۔ یہ جگہ میری دیکھی بھالی تھی۔ پرسوں رات میں یہاں دو دفعہ آ چکا تھا۔ یہیں وہ منحوس کمرا تھا جس کے روشن دان میں سے میں نے عیسیٰ جان کو راحت پر "جال" پھینکتے اور اسے بےبس کرتے دیکھا تھا۔

عیسیٰ جان مجھے ایک مختصر کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے کا فرنیچر ایک بیڈ اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں تین دروں والی ایک کھڑکی تھی اور اس میں جالی کے علاوہ مضبوط گرل بھی لگی ہوئی تھی۔ عیسیٰ جان کی جلتی آنکھوں میں جنونی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی وہ ٹریگر دبا دے گا اور میرے جسم میں فولادی بیئرنگ کے درجنوں سوراخ ہو جائیں گے۔ وہ ممّی میں ذکر میں نے پہلی بار رمضان سے عیسیٰ جان کو دیکھا۔ وہ ابھی تک قلندر سیاہ پوش والے گیٹ اپ میں تھا۔ کرتا پاجامہ، پگڑی اور ایسی بھاری بھرکم داڑھی جس نے چہرے اور رخساروں کا بیشتر حصہ چھپا لیا تھا۔ یہ سو فیصد مصنوعی داڑھی تھی۔ چہرے پر اور بھی جنونی موٹی تبدیلیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ وہ سیاہی مائل عینک بھی چہرے پر موجود تھی جو سیاہ پوش کے گیٹ اپ کا حصہ تھی۔

وہ پھنکار کر بولا "بہت بھاگ چکے ہو۔ اب آرام کرنے کا وقت ہے۔ لمبا آرام کرنے کا وقت۔ حشر تک تمہیں کوئی نہیں جگائے گا۔"

میں نے کہا "اگر اپنے باپ کے تخم ہو تو یہ گن ایک طرف رکھ کر بات کرو۔"

عیسیٰ جان کے چہرے پر بجلی سی تڑپ گئی۔ لیکن وہ ایک گھاگ دشمن تھا۔ میری چال میں آکر مشتعل نہیں ہوا۔ تاہم اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کی حدت کچھ اور بڑھ گئی۔ کہنے لگا "بہت رو رو کر مرو گے تم... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

اس کے ساتھ ہی عیسیٰ جان نے باہر نکل کر دروازہ زور سے بند کر دیا۔ کی ہول سے چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر کوتاہ قد لیکن چوڑا چکلا عیسیٰ جان اپنے پاؤں سے فرش کو کوٹتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

O☆O

میں سارا دن اس کمرے میں بند رہا۔ یوں لگتا تھا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں۔۔۔ ہاں ساتھ والے اسکول کی طرف سے کبھی کبھی لڑکیوں کی مدھم آوازیں آ جاتی تھیں۔ شام کے وقت آوازوں اور آہٹوں سے اندازہ ہوا کہ راحت اسکول سے لوٹ آئی ہے۔ کبھی کبھی گھریلو ملازمہ کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ بہرحال میرے کمرے کی طرف کوئی نہیں آیا۔ وہ لوگ جیسے مجھے بالکل نظرانداز کر چکے تھے۔

راحت کا رویہ مبہم سا تھا۔ وہ بظاہر ہمیں اپنا خیرخواہ مان رہی تھی اور ہمارے سامنے عیسیٰ جان کے خوف سے آنسو بھی بہاتی رہی تھی لیکن اس نے ہم سے یہ بات چھپائی تھی کہ عیسیٰ جان یہاں موجود ہے۔ وہ کم از کم اتنا تو کر ہی سکتی تھی کہ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانے کا مشورہ دے دیتی۔ ممکن تھا کہ عیسیٰ کے خوف نے اس کے ہونٹوں پر مہر لگا دی ہو مگر ہم قریباً ایک گھنٹے تک اس کے ساتھ دفتر میں تنہا موجود رہے تھے۔ عیسیٰ جان اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ کچھ اور نہیں تو اشاروں کنایوں میں ہی وہ ہمیں خطرے سے آگاہ کر سکتی تھی۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔

ساتھی عالی کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ پارا صفت نکل کر نجانے کس طرف چلا گیا تھا۔ اس کا اچانک غائب ہونا بھی کرتے سے کم نہیں تھا۔ شاید وہ خطرے سے آگاہ ہو گیا تھا کیونکہ اس کے جاتے ہی عیسیٰ جان آدھمکا تھا۔ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ دل میں عیسیٰ جان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بےتاب تھا لیکن وہ مجھے اس انتہائی گھٹیا کمرے میں بند کر کے اوجھل ہو چکا تھا۔

رات آٹھ نو بجے کے لگ بھگ مجھے کھڑکی میں عیسیٰ جان کے پنجابی دوست بہادر علی کی سرخ و سپید صورت نظر آئی۔ اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا اور کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا "الماری میں بسکٹ کے دو ڈبے پڑے ہیں۔ بسکٹ کھا کر پانی پی لو اور خبردار کوئی چالاکی شالاکی کھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ٹائم سے پہلے رخصت ہو جاؤ گے۔"

"وہ تمہارا باپ عیسیٰ جان کدھر ہے؟" میں نے پوچھا لیکن بہادر علی سنی ان سنی کر کے جا چکا تھا۔

رات دس گیارہ بجے کے لگ بھگ مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ میں نے الماری کھولی۔ اس میں تولیے، صابن اور چند بے کار کاغذات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بالائی خانے میں دو ناکارہ سلائی مشینیں پڑی تھیں اور ان کے قریب ہی ایک ٹوکری میں دھاگے کی رنگ برنگی نلکیوں کے درمیان بسکٹ کے دو ڈبے بھی رکھے تھے۔ دونوں ڈبے پہلے سے کھلے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک ایک دو دو بسکٹ نکالے گئے تھے۔ میں نے ایک ڈبے میں سے دو کریم بسکٹ نکالے لیکن ان پر بہت سی زرد چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ دوسرے ڈبے کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ میں نے ڈبے واپس الماری میں رکھ دیئے۔ باتھ روم سے ٹھنڈا ٹھار پانی پیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ نجانے آج کیوں غزالہ پھر بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اسے دیکھے ہوئے بہت دن گزر گئے تھے۔ بقول شاعر "آپ

سے بچھڑے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔" اب تو اس کے خدوخال بھی نگاہوں میں دھندلانے جا رہے تھے۔ میں نے پچھلے دس بارہ سال میں جب بھی آنکھیں بند کر کے غزالہ کا تصور کھینچا تھا وہ میری سوچوں میں مجسم ہو گئی تھی۔ اپنے چہرے کی ہر ہر تفصیل کے ساتھ اور اپنے پیکر کی ہر ہر ادا کے ساتھ۔ لیکن اب کچھ دنوں سے ایسا تھا کہ میں کوشش کے باوجود اس کی شباہت کو ذہن میں نہیں لا پاتا تھا... اپنی یہ ناکامی میرے لیے سوہان روح تھی۔ ایسا کیوں تھا۔ کیا غزالہ کے بعد اب اس کا تصور بھی مجھ سے روٹھنے والا تھا۔ شاید یہ طویل جدائی کے اثرات تھے۔ طویل جدائی جو دھیرے دھیرے غم کی دھار کو کند کرتی ہے اور جذبات اپنی شدید ترین حدت کھونے لگتے ہیں لیکن میرے جذبات کی حدت کم کہاں ہوئی تھی۔ میرے لیے تو وقت ابھی تک گاؤں کی اس بیری کے نیچے ٹھہرا ہوا تھا جس کی چھاؤں میں "میں نے پہلی بار غزالہ کی نازک کمر میں ہاتھ ڈالے تھے اور اسے اچھال کر ایک شاخ پر چڑھایا تھا۔ یہ وہی بیری تھی جس کی ٹہنیوں سے میں اور غزالہ جھولتے تھے۔ آگے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک دوسرے کے جسم کو چھوتے تھے اور حیران ہوتے تھے.... برسوں بیت گئے تھے لیکن میں آج بھی انہیں باغوں "انہی کھڑکیوں اور گلیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ میرے لیے وقت وہاں جامد تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے سچ مچ ایسا ہی لگتا تھا کہ وقت وہاں جامد ہے۔ "ابھی میری مسیں تشنہ ہران نہیں ہوئیں" ابھی استاد جمالی نے جنم نہیں لیا۔ ابھی لاہور اور اٹک جیل کے در و دیوار میری صورت سے ناآشنا ہیں۔" ابھی غزالہ کی شادی نہیں ہوئی۔ ابھی شیخ ناصم جیسا درندہ غزالہ کی زندگی میں نہیں آیا۔ ابھی تو میں لڑکپن اور جوانی کے درمیان کھڑا مستقبل کے سہانے سپنے دیکھ رہا ہوں۔ ایک ایسے گھر کی تمنا کر رہا ہوں جہاں میں اور غزالہ گلاب کے پودوں کو پانی دیں گے۔" رم جھم بارشوں میں گیت سنیں گے۔ وہ کب ابتدائی سہانی شاموں کو ایک دوسرے میں گم ہو جانے کے لیے بےتاب ہو جایا کریں گے.... بہت دیر میں انہی خیالوں میں گم رہا اور غزالہ کو اپنے تصور میں لانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ نجانے کس وقت مجھے نیند آگئی۔

صبح سات آٹھ بجے کے لگ بھگ آنکھ کھلی۔ قرب و جوار میں پھر گہری خاموشی طاری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ راحت ناشتا وغیرہ کر کے اسکول جا چکی ہے اور گھریلو ملازمہ بھی آس پاس موجود نہیں۔ باتھ روم سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ میری کلائی کی گھڑی نے دس بجا دیے لیکن کسی نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے یہاں بند کرنے والے بے حد محتاط ہیں اور کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتے۔ مجھے کھانا وغیرہ پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ دروازہ کھولا جائے اور دروازہ کھولنے میں کئی طرح کے خطرات تھے۔ لہٰذا مجھے "الماری میں رکھے" بسکٹس کے بارے میں بتا کر یہ لوگ فارغ ہو گئے تھے.... اس صورت حال سے ایک اور بات کا سراغ بھی ملتا تھا۔ شاید عیسیٰ جان یہاں موجود نہیں تھا۔ اس کے ماتحت میرے سلسلے میں جس قسم کی احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کی ایک وجہ عیسیٰ کی غیر موجودگی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ یہاں ہوتا تو اپنی نگرانی میں مجھے ناشتا فراہم کر سکتا تھا۔

وہ سارا دن بھی میں نے بوسی کمرے میں پڑے پڑے گزار دیا۔ شام کے وقت ایک بار پھر گھر میں چہل پہل کے آثار نمودار ہوئے۔ بہرحال یہ چہل پہل میرے کمرے سے دور ہی رہی۔ کل تو عیسیٰ جان کے پنجابی ساتھی بہادر کی صورت نظر آگئی تھی آج وہ بھی نہیں آیا۔ میں نے زور زور سے دروازہ پیٹا۔ پھر عیسیٰ اور بہادر کا نام لے لے کر انہیں آوازیں دیں لیکن کوئی میرے کمرے کی طرف نہیں آیا۔

میں دن میں کئی بار اس کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ ایک دروازے کے سوا اس میں آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ لکڑی کا مضبوط سنگل ڈور تھا اور اس میں چینی قفل لگا ہوا تھا۔ قفل کے علاوہ باہر سے چٹخنی وغیرہ بھی چڑھائی گئی تھی۔ اس دروازے کو توڑ کر نکلنا یا اکھاڑنے کی کوشش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ میرے پاس کوئی اوزار بھی نہیں تھا۔ کھڑکی میں جالی کے علاوہ لوہے کی مضبوط گرل تھی اور اسے توڑنے یا اکھاڑنے کے لیے بھی بھاری بھرکم اوزار درکار تھے۔ میرے پاس اوزار تھے اور نہ ایسی تنہائی میسر تھی کہ میں یہ کام کر سکتا۔ چار و ناچار مجھے کسی کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔

وہ رات اور اس سے اگلا سارا دن بھی گزر گیا۔ صورت حال میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ذہن میں آیا کہ شاید عیسیٰ جان مجھے بھوکا پیاسا رکھ کر مارنا چاہتا ہے۔ پیاسا تو خیر میں نہیں تھا۔ باتھ روم کی ٹونٹی سے منہ لگا کر میں کئی بار پانی پی چکا تھا لیکن پانی خوراک کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتا۔ پچھلے قریباً 48 گھنٹے سے میرے منہ میں اناج کا دانہ تک نہیں گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بھوک کے سلسلے میں مجھ میں کافی قوت برداشت موجود ہے۔ میں اکثر دوپہر کا کھانا گول کر جاتا تھا اور پھر شام کو بھی ضروری نہیں تھا کہ اہتمام سے ہی کھایا جائے۔ کبھی چلتے پھرتے کچھ کھا لیا۔ کبھی بیٹھ کر دھیان کسی مسئلے میں الجھا رہا اور جلدی جلدی چند نوالے ٹھونس کر اٹھ گئے۔ بہرحال جو فاقہ کشی مجھے اس کمرے میں مقید ہونے کے بعد کرنی پڑ رہی تھی وہ واقعی تکلیف دہ تھی۔ رگ و پے میں نقاہت اتر گئی تھی اور یہ نقاہت مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جب بھی پانی پیتا تھا لگتا تھا کہ بھوک کی شدت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے.... تیسرے روز شام تک نوبت یہ آگئی کہ میں ان بسکٹس کے بارے میں سوچنے لگا جو چیونٹیوں کے نرغے میں تھے اور جنہیں شروع میں "میں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ سچ ہے کہ کسی چیز کے انتخاب کا دارومدار انسان کے معیار سے زیادہ طلب کی شدت پر

ہوتا ہے۔ اگر طلب شدید ترین ہو تو "جنرل راز" پینے والا شخص ہر بڑ کا پانی پینے پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔ بہت دیر تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے الماری کھول کر بسکٹ نکالے۔ ایک ڈبے میں سے چند بسکٹ نکال کر ان کی بھوسیاں جھاڑیں۔ تین بسکٹس میں چیونٹیوں نے سوراخ کر رکھے تھے۔ دو تین بسکٹس قدرے محفوظ نظر آتے تھے۔ وہ میں نے علیحدہ کر لیے۔ اس سے پہلے کہ میں زرد چیونٹیوں کے برباد کیے ہوئے بسکٹس کھانے یا نہ کھانے کا فیصلہ کرتا' دروازے سے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ عیسٰی جان کے قدموں کی آواز تھی۔ میں نے بسکٹ واپس الماری میں رکھے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ تو نہیں کھلا تاہم کھڑکی میں عیسٰی جان کا منحوس چہرہ نظر آ گیا۔ وہ اسی حلیے میں تھا جس میں تین دن پہلے نظر آیا تھا۔ ہاتھ میں مشین گن تھی۔ اس کے بھاری بھرکم بازوؤں اور ہاتھوں میں یہ سب مشین گن کھلونے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ عیسٰی جان کا لبا کھانا کھا کر آیا تھا۔ اس کی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں دو تین چاول نظر آ رہے تھے اور ہونٹوں پر قورمے وغیرہ کی زردی تھی۔ وہ ایک کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ایک زوردار ڈکار لے کر بولا "ہاں بھئی استاد جہانی! اب کیا صلاح ہے تیری؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کا تجھے بھی پتا ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ مجھے نہیں پتا تو؟"

"پھر تجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔ تُو نے عیسٰی جان سے دشمنی مول لی ہے۔ اس کا سگا بھائی قتل کیا ہے۔ دس کے کئی ساتھیوں کا خون کیا ہے۔ اب بھی اگر تجھے پتا نہیں کہ تجھے اس چار دیواری میں کتے کی موت مرنا ہے تو پھر تیری عقل کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ بہرحال اگر تو مجھے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر صلاح کیسی لے رہا ہے۔ پھانسی پانے والے سے تو کوئی صلاح نہیں لی جاتی۔"

"لیکن میں تجھے پھانسی کہاں دے رہا ہوں۔ وہ بھی کوئی طریقہ ہے مارنے کا۔ پھندا لگا اور بندہ ختم۔ میں تو تجھے بڑی شان سے مارنا چاہتا ہوں۔ کم از کم دو تین گھنٹے تک تو تماشا چلنا چاہیے تیرا....."

میں نے کہا "اپنے طریقے تو تیرے جیسے اذیت پسند خونی ہی سوچ سکتے ہیں۔"

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا "کیوں شرمندہ کرتا ہے جہانی۔ میں جانتا ہوں کمپنی میں تو نے بڑے بڑے خون خرابے کیے ہیں۔ منصف بن کر پھرتا تھا گلیوں میں اور چاچا کی گینگ کے بدمعاشوں سے ہاتھ مل کر بدلا لیں لگاتا تھا..... آج ایک عدالت اپنے لیے بھی لگا اور فیصلہ کر کہ میرے بھائی کے قتل کی سزا تیرے لیے کیا ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا "اپنی درندگی اور ہوس کاری کا مقابلہ بمبئی کے لاابالی جھگڑوں سے مت کر۔ وہ لڑائی جھگڑے حق سچ کے لیے تھے اور مظلوموں کی داد رسی کے لیے تھے۔ تیری درندگی اپنے خونی تسلط اور اپنی ہوس کاری کو دوام دینے کے لیے ہے۔ خلق خدا کو اذیت دے کر خوش ہونا شاید تو نے اپنی بدبخت ماں کی گود سے ہی سیکھ لیا تھا۔ اگر آج تو مجھے مارنے کے لیے کوئی اذیت ناک طریقہ سوچ رہا ہے تو یہ تیری فطرت کے عین مطابق ہے۔ مجھے اس پر کوئی حیرانی نہیں۔"

وہ اپنے بدصورت دانتوں میں پھنسے ہوئے گوشت کے ریشے نکالتا رہا اور پرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ آخر ایک گہری سانس لے کر بولا "اس کا مطلب ہے کہ تو کچھ نہیں بتائے گا..... کوئی مشورہ نہیں دے گا؟" میں نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ وہ زہرخند لہجے میں بولا "بہرحال یوں جھولا لگانے کی ضرورت نہیں..... میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔ تیری موت تیری شان کے مطابق ہوگی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک تو ضرور تماشا چلے گا تیرا..... کبھی کھسانی کا نام سنا ہے تو نے؟"

"نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "یہ ہمارے قبائلی علاقے کی بڑی شاندار رسم ہے۔ اس میں شہد کی مکھیاں کام کاتی ہیں اور ایک آدمی ناچتا ہے۔ اس ناچ میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ ناچنے والا رکنے کا نام نہیں لیتا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ اسے پانی وغیرہ کے چھینٹے دے کر پھر ہوش میں لایا جاتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی وہ دوبارہ ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ ناچتا رہتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے۔"

عیسٰی جان کی منحوس آواز میرے کانوں میں زہر پکار رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا بات کر رہا ہے۔ چار دن پہلے یہ ساری گفتگو میں نے فارم کے ایک کمرے میں سنی تھی اور "کھسانی" نامی رسم کا ذکر بھی سنا تھا۔ لکڑی کا وہ عجیب و غریب ڈولا بھی مجھے یاد تھا جو فارم کے ایک ویران گوشے میں گھنے درختوں کے نیچے تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ ڈولا تو یقیناً عیسٰی جان وہیں چھوڑ آیا تھا لیکن اس جیسا نیا ڈولا تیار کرانا بھی ناممکنات میں سے نہیں تھا۔

عیسٰی جان نے کھڑکی کی گرل پر زور سے ہاتھ مار کر مجھے چونکایا اور بولا "کس سوچ میں پڑ گئے ہو جہانی استاد؟"

میں نے کہا "سوچ رہا ہوں کہ تیری ماں کا خون گندا تھا یا تیرے باپ کے تخم میں کوئی خرابی تھی۔"

عیسٰی جان کا چہرہ ایک دم آگ کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے اچانک مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے ساتھ ہی دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے گن میری طرف تان لی تھی۔ اندازہ ایسا ہی تھا جیسے مجھے شوٹ کر دے گا لیکن میں بھانپ چکا تھا کہ وہ مجھے اتنی جلدی شوٹ نہیں کرے گا۔ میری موت کو وہ اپنے لیے اتنا دو کھا پھیکا اور بدمزہ نہیں بنا سکتا تھا۔ مجھے زبانے دے لیے اباچتا ابال پیدا ہو رہا تھا اس کے دماغ میں۔ وہ کسی وحشی درندے کی طرح دھاڑ رہا

تھا۔ اس کے غصے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ پنجابی یا اردو بھول کر وہ سیدھی پشتو بولنے لگا تھا۔

میں نے کہا "تو کتے کی طرح چلا تو سکتا ہے لیکن مجھے گولی نہیں مار سکتا۔ کیونکہ تو اوپر سے مرد اور اندر سے ہیجڑا ہے۔"

وہ دہاڑا "تو ر کھاؤں تمہیں اپنی مردانگی! لا اپنی کسی ہوتی سوتی کو میرے سامنے۔"

میں نے کہا "تیرے کنجر باپ کے سامنے تیری ہوتی سوتی ماں موجود تھی لیکن وہ اپنی مردانگی نہ دکھا سکا اور تو حرام زادہ پیدا ہو گیا۔ تو کیا مردانگی دکھائے گا۔"

یہ سب کچھ عیسٰی جان کی برداشت سے باہر تھا۔ اب تک وہ دوسروں پر ہی دہاڑتا رہا تھا۔ ایسے ترکی بہ ترکی جواب شاید اس نے کبھی سنے ہی نہیں تھے۔ وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر تو کسی گناہ کی پیداوار نہیں تو یہ گن چھوڑ اور مردوں کی طرح میرے سامنے آ۔ آج میں بھی دیکھوں کہ کتنا زور ہے تیرے اس سینے میں جسے اصیل مرغ کی طرح پھلائے پھرتا ہے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو پھر پاگل کتے کی طرح چلانا چھوڑ دے اور لاہور کی ہیرا منڈی میں کسی کوٹھے پر چلا جا اور منہ پر سرخی پاؤڈر تھوپ کر بیٹھ جا۔ گندا خون گندے خون میں مل جائے گا اور گھر کی بات گھر ہی میں رہے گی۔"

ہماری بلند آوازیں سن کر راحت بھی وہیں پہنچ گئی تھی اور ڈری سہمی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر اندر وہ جان گئی کہ میں عیسٰی جان کو کھلے مقابلے کی دعوت دے رہا ہوں اور وہ سب مشین گن سونتے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ جہاندیدہ عیسٰی جان میری شعلہ کلامی کے باوجود کپڑوں سے باہر نہ ہوتا اور میری طرف سے دست بدست لڑائی کی دعوت قبول نہ کرتا مگر ایک خوبرو لڑکی کی موجودگی میں یہ ذلت اس سے مزید برداشت نہیں ہوئی۔ اس کا پورا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا اور آنکھوں میں خونی بادل تیرنے لگے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سب مشین گن کا طویل میگزین گن سے جدا کیا اور اسے ایک قریبی الماری میں رکھ دیا۔ گن ایک دیوار کے ساتھ افقی رخ پر کھڑی کر دی گئی۔ فری اسٹائل کشتی میں حصہ لینے والے کسی پہلوان کی طرح عیسٰی جان نے اپنا وہ طویل لبادہ اتار دیا جو "سیاہ پوش" کے بہروپ کا حصہ تھا۔ قلندر سیاہ پوش کی نقلی داڑھی مونچھیں بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیں اور اپنا سیاہ چشمہ لرزتی کانپتی راحت کو تھما دیا۔ راحت خوف زدہ اور حیران تو ضرور تھی لیکن اس کی حیرانی میں نقلی "داڑھی مونچھوں" کی حیرانی شامل نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عیسٰی جان کا اصل چہرہ پہلے ہی دیکھ چکی ہے۔ ظاہر ہے عیسٰی جان نے راحت سے جس قسم کے "تعلقات" قائم کر رکھے تھے ان میں نقلی داڑھی مونچھوں کا بھرم کہاں تک رہ سکتا تھا۔ سیاہ لبادے کے نیچے

عیسٰی جان نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ایک اونی جیکٹ تھی۔ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر عیسٰی جان نے کمرے کی چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ مجھے بالکل یوں لگا جیسے کوئی مشتعل درندہ جھاڑیوں سے نکل کر میرے روبرو پہنچ گیا ہے..... میں تین دن سے بھوکا تھا اور جسم میں نقاہت اتری ہوئی تھی لیکن یہ موقع اپنی نقاہت یا ناتوانی کے بارے میں سوچنے کا نہیں تھا۔ یہ موقع تھا اپنے دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا۔ وہ دشمن جو قبائلی علاقوں کا آسیب تھا۔ جس نے ذورے مشت میں قتل عام کیا تھا۔ جس نے بشاورت نامی معصوم کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جس نے پشاور میں مجھ سے ہمدردی کرنے والے مقامی بدمعاشوں کو چھلنی کیا تھا..... اور جس نے نواب زادی شاہین کے جسم سے زندگی کشید کی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی عیسٰی جان نے چنگھاڑ کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے خود کو بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے باوجود عیسٰی جان کا کندھا میرے کندھے سے ٹکرایا۔ بعین یوں محسوس ہوا جیسے توپ کا گولا کندھے پر آ لگا ہے۔ عیسٰی کے جسم میں فولادی سختی اور بے پناہ قوت تھی۔ میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور پشت کے بل گرا۔ عیسٰی جان بھی دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ سنبھل کر وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا لیکن اس مرتبہ میں پوری طرح تیار تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی۔ عیسٰی جان کو گریبان سے پکڑا اور اپنی ٹانگوں پر اچھال کر اپنے اوپر سے گزار دیا۔ وہ شور آواز کے ساتھ پچھلی دیوار پر لگا۔ اس کے حلق سے عجیب سی ہوائی غراہٹ برآمد ہوئی تھی۔ دو اور میں ساتھ ساتھ اٹھے اور ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ ہمارے ہاتھ اطراف میں پھیلے ہوئے تھے' نگاہیں ایک دوسرے پر جمی تھیں اور جسم کے ساتھ ساتھ ذہن بھی پوری طرح مصروف کار تھا..... کمرے سے باہر راحت سکتے کی حالت میں کھڑی تھی۔ گھریلو ملازمہ اور اس کا دبلا پتلا خاوند بھی موقع پر پہنچ چکے تھے اور خوف آمیز حیرت کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے..... اگلا وار عیسٰی جان نے حیران کن پھرتی سے کیا تھا۔ اس نے ایک دم جھکائی دی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ٹانگوں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے' میں نے غیرارادی طور پر اپنا بالائی دھڑ آگے کو جھکایا تھا تاکہ عیسٰی کو اپنی ٹانگوں کی طرف جانے سے روک سکوں لیکن اس نے بڑی تیزی سے اپنی ٹانگ چلائی تھی۔ لڑائی بھڑائی کا نو دس سالہ تجربہ ہونے کے باوجود میں خود کو اس ضرب سے نہ بچا سکا۔ بھاری بھرکم پشاوری جوتی کی ٹھوکر میرے جبڑے پر لگی اور آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ میں لڑکھڑا کر چوبی الماری پر جا گرا تھا اور الماری اپنے تمام بوجھ سمیت دھڑام سے فرش بوس ہو گئی تھی۔ عیسٰی جان کی تباہ کن ضرب نے میرے نچلے ہونٹ کو بھی نقصان پہنچایا تھا اور منہ میں تیزی سے خون کا نمکین ذائقہ گھلتا جا رہا تھا۔ یہ چوٹ کھانے کے بعد میرا دماغ بھی بھنا

اٹھا۔ میں نے گرنے کے بعد دو اپنی نگاہیں عیسیٰ جان پر مرکوز رکھی تھیں۔ جونہی وہ میری طرف آیا میں نے لیٹے لیٹے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور وہ پیچھے کو جا گرا۔ ہم قریباً ایک ساتھ اٹھے اور پوری وحشت سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ عیسیٰ جان کے جسم میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں یکساں تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور میرے جسم کو نشانہ بنا رہے تھے۔ میں اپنا بچاؤ کر رہا تھا اور موقع دیکھ کر ایک آدھ نسلی بخش ضرب لگا دیتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح عیسیٰ جان کی گردن میرے مخصوص داؤ میں آ جائے لیکن لگتا تھا کہ عیسیٰ جان میرے ارادے سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس کی سرتوڑ کوشش بھی یہی ہے کہ میرے اس خطرناک داؤ سے خود کو بچائے رکھے۔ میرا بازو کسی زاویے سے بھی عیسیٰ کی گردن کی طرف بڑھتا تھا وہ اسے روک دیتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنی گردن اور میرے بازو سے غافل نہیں تھا۔ عیسیٰ کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کے سر کی ضرب تھی۔ وہ کوتاہ قد تھا لہٰذا وہ جب بھی سر کی ضرب لگانے میں کامیاب ہوتا تھا یہ ضرب میرے سینے کے آس پاس لگتی تھی اور اذیت ناک ہوتی تھی۔ میں تین دن سے بھوکا تھا۔ میرے جسم کو شدید ترین مشقت کے بجائے آرام اور غذا کی ضرورت تھی لیکن صورتِ حال کے جبر نے مجھے ایک نہایت خطرناک دشمن کے روبرو لا کھڑا کیا تھا.... جسمانی حملوں کے ساتھ ساتھ عیسیٰ جان مجھ پر زبانی حملے بھی کر رہا تھا۔ سنگین دھمکیاں اور فحش گالیاں اس کی زبان سے پانی کے تیز دھارے کی طرح نکل رہی تھیں۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی دباؤ تھا جو وہ مجھ پر ڈال رہا تھا۔

میرے منہ سے بہنے والے خون نے میری قمیص کو سامنے سے داغ دار کر دیا تھا۔ عیسیٰ جان کا ایک ابرو بھی پھٹ گیا تھا اور خون اُگل رہا تھا۔ اچانک عیسیٰ جان نے بگولے کی طرح اندھا دھند زور مارا اور میں بستر پر گر گیا۔ بظاہر یہ عیسیٰ جان کی برتری تھی لیکن اس برتری کے پردے میں اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ مجھے اپنی دائیں ٹانگ چلانے کا آزادانہ اور بھرپور موقع ملا۔ میں نے عیسیٰ جان کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ وہ تڑپ کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ناقابلِ برداشت اذیت نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا تھا۔ یہیں عیسیٰ جان سے وہ غلطی ہوئی جس سے وہ اب تک بچا ہوا تھا۔ غصے اور اذیت سے بے قابو ہو کر اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کی تباہ کن ضرب میرے سینے پر لگانی چاہی۔ بے پناہ نقاہت کے باوجود میں تیار تھا۔ میں نے خود کو عیسیٰ جان کی زد سے بچایا اور میرا بازو اس کی فربہ گردن سے لپٹ گیا.... یہ ایک بڑی کامیابی تھی لیکن مکمل کامیابی نہیں تھی۔ میری گرفت تکنیکی طور پر درست نہیں تھی۔ بالکل آخری ساعت میں عیسیٰ جان اپنا ہاتھ میرے بازو اور اپنی گردن کے درمیان حائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے گردن پر دباؤ ڈالنا شروع کیا تو اس نے اپنی آہنی انگلیاں میرے بازو

نے گوشت میں گاڑ دیں اور دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال جکڑ لیے۔ جوں جوں میں اس کی گردن پر دباؤ ڈال رہا تھا وہ بال کھینچ کر میرا سر فرش کی طرف جھکاتا چلا جا رہا تھا۔ میری گردن ایسے خطرناک زاویے سے جھک رہی تھی کہ ہڈی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ قوت اور قوتِ برداشت کی سخت ترین آزمائش تھی۔ یہ خونی لڑائی ہم دونوں میں سے کسی کی موت پر بھی منتج ہو سکتی تھی.... میری آنکھیں بند تھیں اور نتھنوں میں عیسیٰ جان کے ہانپتے ہوئے جسم کی حیوانی بو گھس رہی تھی.... یہی وہ بدبودار جسم تھا جس نے حیدر آباد کے ایک مکان میں نواب زادی شاہین کے نازک جسم کو روندا تھا۔ اپنی غیر معمولی قوت اور سختی کے ساتھ اسے پامال کیا تھا۔ ہاں یہی وہ جابر بازو تھے جن کی مزاحمت شاہین کی کمزور کلائیوں نے کی تھی۔ یہی وہ تنومند گردن تھی جس کا شاہین کے نازک ہاتھ کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر میرے جسم میں دوڑنے لگی اور میں عیسیٰ جان کی گردن پر اپنے فاقہ کش جسم کی پوری قوت صرف کرنے لگا۔ دوسری طرف عیسیٰ جان بھی ذرہ بھر کمزوری نہیں دکھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کا شکنجہ میرے سر کو عجیب زاویے سے فرش کی طرف جھکاتا چلا جا رہا تھا.... یہی موقع تھا جب میں نے راحت کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ کوئی چیز اٹھائے تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا یہ "چیز" وہی اَن لوڈڈ گن تھی جو عیسیٰ جان باہر چھوڑ آیا تھا۔ راحت نے یہ گن بیرل کی طرف سے پکڑ رکھی تھی۔ وہ کچھ بول بھی رہی تھی لیکن میری سماعت میں اپنی ہی دھڑکنوں کا اتنا شور تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اب تک راحت کو ایک کمزور لڑکی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس قسم کی دلیری دکھا سکتی ہے۔ وہ ہماری طرف آ رہی تھی لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا کرے گی۔ پھر میں نے دیکھا اس نے ضرب لگانے کے انداز میں آہنی گن اپنے سر سے اوپر اٹھائی ہے.... یہ دیکھ کر میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی کہ راحت کی ضرب کا نشانہ عیسیٰ جان نہیں 'میں' تھا۔ ایک ہیجانی چیخ کے ساتھ راحت نے میرے سر کو نشانہ بنایا۔ یک لخت در و دیوار میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ عیسیٰ جان کی گردن میرے بازو کی گرفت سے نکل گئی ہے۔ میں فرش کی طرف جھک رہا تھا۔ میں نے عیسیٰ جان کو خود پر جھپٹتے دیکھا۔ میرا جسم عیسیٰ جان کے وحشیانہ مکوں اور ٹھوکروں کی زد میں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی پھیلتی چلی گئی۔

○☆○

تو مجھ یوں لگتا ہے کی نیم بے ہوشی کے بعد میرے حواس بحال ہو گئے تھے۔ عیسیٰ جان اس وقت تک وہاں سے جا چکا تھا۔ دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ کھڑکی ادھ کھلی تھی لیکن

عشق مجازی عشق حقیقی میں کیسے بدلتا ہے
[illegible]

عشقِ کا عین (۴)

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کیساتھ

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

قیمت: ۱۲۰ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

راہداری میں کسی متنفس کی صورت نظر نہیں آئی۔ میرے جسم پر چوٹوں کے کئی نشان تھے۔ ہونٹوں سے بہنے والا خون ٹھوڑی پر جما ہوا تھا۔ سر پر جس جگہ راحت نے گن کے آہنی دستے سے چوٹ لگائی تھی وہاں گومڑ نمودار ہو چکا تھا اور ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ لکڑی کی الماری اسی طرح الٹی پڑی تھی' اس میں سے نکلنے والا سامان پورے کمرے میں بکھرا ہوا تھا۔

ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے میں شدید بھوک محسوس کر رہا تھا لیکن اب یہ کیفیت بھی موجود نہیں تھی۔ شاید اپنی انتہا کو پہنچ کر بھوک بھی دم توڑ گئی تھی۔ بس ایک نقاہت سی تھی جو رگ رگ میں اتری ہوئی تھی۔ میں بکھری ہوئی اشیا کے درمیان بیٹھا رہا اور راحت عرف آپا جی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ اس کا رویہ ناقابل فہم تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا جیسے وہ دوہرے کردار کی مالک ہے۔ لڑائی کے دوران میں جب وہ گن سونت کر ہماری طرف بڑھی تھی تو میرا خیال تھا کہ وہ ایک بے رحم ذہنیت کے جبر سے چھٹکارا پانے کے لیے میری مدد کرے گی' لیکن جو کچھ ہوا وہ برعکس تھا۔

شام اب رات کے قالب میں ڈھل چکی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے سرکتی رہیں اور میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھے یہاں بند ہوئے اب 72 گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے لیکن رہائی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس ٹھکانے کا علم میرے اور سائیں عالی کے سوا اور کسی کو نہیں تھا... اور سائیں عالی ایک سیلانی شخص تھا۔ خبر نہیں کہ وہ منہ اٹھا کر کدھر نکل گیا تھا۔ صرف ایک امکان تھا کہ شاید سائیں عالی اپنی چہیتی چیلی سروج کو "آپی سلائی اسکول" کے بارے میں کچھ بتا دے اور سروج سے یہ اطلاع پولیس تک پہنچ جائے۔

اس وقت گھڑی رات کے گیارہ بجا رہی تھی جب مجھے کسی اندرونی کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آنے لگی۔ ان میں ایک آواز عیسیٰ جان کی تھی اور دوسری کسی عورت کی۔ ذرا غور کیا تو اندازہ ہو گیا کہ یہ دوسری آواز راحت کی ہے۔ وہ بے تکلفی کے انداز میں عیسیٰ سے باتیں کر رہی تھی۔ کبھی کبھی عیسیٰ کی ہنسی بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میرا یہ یقین پختہ ہو رہا تھا کہ عیسیٰ جان کے بارے میں راحت کے خیالات وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ شاید ان میں کوئی سودے بازی ہو گئی تھی۔ راحت ہر طرح عیسیٰ جان کو تحفظ فراہم کر رہی تھی اور یقیناً اس کی "راتوں کی ساتھی" بھی بنی ہوئی تھی... تھوڑی دیر بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی میں سے جھانکا۔ عیسیٰ جان اور راحت خواب گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ عیسیٰ جان کا بازو راحت کی کمر میں تھا۔ راحت کا انداز بھی "رضا و رغبت" کا تھا۔ وہ مجبوری اس کے رویے میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جس کا مشاہدہ میں نے چند روز پیشتر کیا تھا۔ راحت کے لیے میرے دل میں خیر خواہی کے جذبات ایک دم ماند پڑ گئے۔ میں اس کے لیے کیا سوچتا رہا تھا اور وہ کس ڈگر پر چل نکلی تھی۔ میں نے پولیس کی تفتیش کا رخ "آپی سلائی اسکول" کی طرف سے صرف اس لیے موڑا تھا کہ راحت کی نیک نامی پر حرف نہ آئے۔ انیس پی برکت کو "شفا خانے" کی طرف بھیج کر میں تن تنہا یہاں آیا تھا۔ یہ خطرے کی بات تھی لیکن راحت کو بدنامی و رسوائی سے بچانے کے لیے میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ یہاں یہ ہو رہا تھا کہ راحت نے میرے خلاف عیسیٰ جان کی بھرپور مدد کی تھی اور آئندہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

عیسیٰ جان اور راحت کے خواب گاہ میں چلے جانے کے بعد کچھ دیر تو ملازمہ کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ ایک پُراسرار سکوت تھا جس نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس سکوت میں بس کبھی کبھی ملازمہ کے شیر خوار بچے کی نیند میں ڈوبی ہوئی کھانسی سنائی دیتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ کھانسی بھی تھم گئی۔ میں جاگ رہا تھا اور میرے معدے میں تین چار دن پرانی بھوک جاگ رہی تھی۔ یہ بھوک آج شام کچھ دیر کے لیے جسم میں تحلیل ہو گئی تھی لیکن اب پھر معدے میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑنے لگی تھی۔ کہتے ہیں شیر کتنا بھی بھوکا ہو لیکن گھاس نہیں کھاتا۔ یعنی مرنا مر جاتا ہے لیکن اپنے معیار سے نیچے نہیں اترتا لیکن انسان شیر کی سمجھ بوجھ کو معیار تو نہیں بنا سکتا۔ وہ اشرف المخلوقات ہے اور اسے اپنے ذہن سے سوچنا ہوتا ہے۔ میں نے بھی اپنے ذہن سے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بھوک کے ہاتھوں جاں بہ لب ہونے کے بجائے بہتر ہے کہ جو چیز بھی میسر ہے کھائی جائے۔ وہ ناقص بسکٹ جن کی طرف شروع میں مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا اب میرے لیے قابل قبول ہو گئے تھے۔ میں نے آٹھ دس نسبتاً بہتر بسکٹ چھانٹ کر ایک طرف کیے اور انہیں پانی کے ساتھ کھا لیا...

کچھ دیر بعد آنکھوں میں روشنی اور جسم میں حرارت لوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جسم سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی اب قدرے ماند پڑ گئی تھیں۔ میں ٹانگوں تک لحاف کھینچ کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی اس طرح لیٹے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کھڑکی کی طرف مدھم آہٹ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آہنی گرل کی دوسری طرف کوئی موجود تھا۔ غور سے دیکھا تو جسم سنسنا اٹھا۔ وہ راحت تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے جنہیں اس نے ایک سوتی ربن میں سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کھڑکی کی گرل سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

میں بستر سے نکل کر اس کے قریب پہنچا۔ وہ اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں سے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی "کیسے ہیں آپ؟"

"کیوں۔ ابھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟" میں نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔

وہ جیسے سسک پڑی "آپ نے بہت بڑی غلطی کی ہے یہاں آ کر۔ آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "ہاں میں نے واقعی غلطی کی ہے۔ مجھے یہاں آنا چاہیے تھا اور نہ تم پر اعتماد کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ... میری مجبوری نہیں سمجھ رہے۔"

"میرا نہیں خیال کہ تم مجبور ہو۔ میں نے تمہیں سیاہ پوش کے ساتھ ہنستے کھیلتے دیکھا ہے۔ شاید کوئی لمبا چوڑا منصوبہ طے پا گیا ہے تم دونوں کے درمیان۔"

اس کی آنکھیں بہنے لگیں "میں ضروری نہیں سمجھتی کہ آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں بہرحال جو میں بتا رہی ہوں وہی حقیقت ہے۔ آپ شکل سے سمجھ دار نظر آتے ہیں لیکن... آپ نے تن تنہا یہاں آ کر بے وقوفی کی ہے۔ کیا ضرورت پڑی تھی خواہ مخواہ اپنی جان کا رسک لینے کی۔ یہ خبیث آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز گندھ گئی۔ وہ جمع کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا سیاہ پوش کے علاوہ کوئی اور بھی یہاں موجود ہے؟"

"میں تو رو رہی ہوں۔" راحت نے کہا "یہ کل پانچ لوگ ہیں۔ چار اسکول کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں اور ہر وقت چوکس رہتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ انہیں ذرا بھی خطرے کا احساس ہوا تو وہ ناگوں کا روپ دھار لیں گے۔ میری ساری اسٹوڈنٹس ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ وہ ایک منٹ میں انہیں ختم کر سکتے ہیں۔ اب آپ بتائیں... میں کیا کروں؟ کس طرف جاؤں؟"

ایک دم وہ ٹھٹک کر خاموش ہو گئی۔ خواب گاہ کی جانب سے مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ راحت لرز کر رہ گئی اور کچھ دیر تشویش ناک انداز میں خواب گاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ یقیناً وہ عیسیٰ جان کے سونے کے بعد یہاں آئی تھی۔ اب ہر گھڑی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں عیسیٰ جان اس کی غیر موجودگی محسوس نہ کر لے۔

چند لمحے سن گن لینے کے بعد وہ پھر میری طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ ہمدردانہ نظروں سے میرے چہرے اور سر کی چوٹوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کہنے لگی "مجھے بڑا دکھ ہے کہ میں نے آپ کے سر پر گن ماری۔ لیکن میں کیا کرتی۔ آپ اکیلے ہیں۔ آپ سیاہ پوش سے جیت بھی جاتے تو کیا ہوتا؟ صرف خون خرابا ہوتا۔ سیاہ پوش کے ساتھی بپھر جاتے اور پتا نہیں کیا کر گزرتے... ایک استاد ہونے کے ناتے اپنی اسٹوڈنٹس کی جان اور آبرو کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔ اپنی طرف سے میں نے یہی ذمے داری نبھائی ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح تم اپنی اسٹوڈنٹس کو مشکلات سے بچانے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟"

وہ بولی "لیکن اس کے سوا میرے پاس اور چارہ بھی کیا ہے۔ سیاہ پوش (عیسیٰ جان) نے کہا ہے کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی صرف پانچ چھ روز یہاں ٹھہریں گے۔ جونہی حالات سازگار نظر آئے وہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس دوران میں وہ لوگ اسکول کے صرف دو پچھلے کمروں تک محدود رہیں گے' کسی کو ان کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "اس قسم کا وعدہ تو سیاہ پوش نے تم سے بھی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اب وہ کبھی تمہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اس وعدے کا کیا ہوا؟"

"وہ تو... وہ تو میں۔" راحت ہکلا کر رہ گئی۔

میں نے کہا "چند دن بعد سیاہ پوش نے خود ہی اس وعدے کی دھجیاں اڑا دیں۔ تمہاری اسٹوڈنٹس پر رال ٹپکانے لگا۔ مجبوراً تمہیں ایک بار پھر خود کو چارے کے طور پر اس کے سامنے ڈالنا پڑا۔ بتاؤ ایسے ہوا یا نہیں؟"

راحت سے کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیاں مروڑتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا "آزمائے ہوئے کو بار بار آزمانا نہیں چاہیے۔ مجھے نہیں یقین کہ ان درندوں کی یہاں موجودگی میں تمہاری اسٹوڈنٹس اور تم زیادہ دیر محفوظ رہو گے۔"

وہ روہانسے لہجے میں بولی "دیکھیے' آپ اس سلسلے میں مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ یہاں بند ہیں لیکن میں باہر ہوں اور سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں صورت حال کو آپ سے بہتر سمجھ رہی ہوں۔ ابھی تک مجھے سیاہ پوش کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ چار روز گزر چکے ہیں' زیادہ سے زیادہ دو دن وہ اور یہاں رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دو دن بھی اللہ خیریت سے گزار دے گا۔ مم... مجھے صرف..." بات کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی پھر ذرا سنبھل کر بولی "مجھے صرف آپ کی طرف سے خدشہ ہے۔ ان لوگوں کے ارادے آپ کے بارے میں ٹھیک نہیں ہیں۔ بس... پتا نہیں وہ کیا کریں گے۔ کاش آپ نے خود کو مصیبت میں نہ ڈالا ہوتا۔"

میں نے کہا "میری طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے بڑے بکھیڑوں سے گزرا ہوا ہوں میں۔"

وہ بولی "آپ کے ساتھ جو سائیں جی تھے' ان کا بھی کوئی پتا نہیں۔"

"سائیں جی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نے تو تین دن سے کھانا بھی نہیں کھایا۔" راحت کی آواز بھرا گئی۔

"تمہاری یہی بڑی مہمان نوازی ہے کہ تم نے اس بارے میں سوچا۔"

"میں مجبور ہوں۔ اس نے (سیاہ پوش نے) سختی سے منع کر رکھا ہے کہ آپ کے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اور ویسے بھی دروازے کی دونوں چابیاں اسی کے پاس ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

راحت نے مجھے ان بسکٹس کے بارے میں بتایا جو الماری میں موجود تھے۔ میں نے کہا کہ میں نے بسکٹس کھائے ہیں اور ابھی آدھے سے زیادہ موجود ہیں۔ وہ مجھے غمزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی خوابگاہ میں واپس چلی گئی۔ واپس اسی بستر پر جو اس کا مقدر بنا ہوا تھا۔

○☆○

یہ اگلے روز شام کا واقعہ ہے۔ میں بستر پر نیم دراز تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس منحوس کمرے سے نکلنے کے لیے اب کوئی ہنگامہ خیز قدم اٹھانا پڑے گا.... اچانک راہداری کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ ایڑی کی ٹھک ٹھک سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی عورت ہے۔ میں چونک کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ دو سیکنڈ بعد میں نے راحت کی صورت دیکھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ کوئی سنسنی خیز واقعہ رونما ہوا ہے۔ راحت بھاگتی ہوئی نمودار ہوئی تھی' پھر وہ تیز تیز چلنے لگی۔ کمرے کے دروازے تک آخری چار پانچ قدم کا فاصلہ اس نے بھاگ کر طے کیا اور دروازے کے قفل میں چابی گھمانے لگی۔

جونہی دروازہ کھلا' وہ تیر کی طرح اندر آئی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ وحشت سے بگڑی ہوئی آواز میں بولی "خدا کے لیے کچھ کرو۔ وہ ان کو مار دیں گے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی اوڑھنی کے نیچے سے ایک ریوالور نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیا ہوا ہے۔ کون مار دیں گے؟" میں نے اسے شانوں سے تھام کر پوچھا۔

"اسی کمینے کے ساتھی۔" وہ لرزتی آواز میں بولی "وہ لڑکیوں کو کمرے میں لے گئے ہیں۔ وہ ان کو بہت خراب کریں گے.... ان کا ایک ساتھی کھانے والے کمرے میں کھڑا ہے۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔"

وہ بے ربط انداز میں بول رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ صرف اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ عیسیٰ جان اور اس کے ساتھی اپنی اصلیت پر آگئے ہیں اور اسکول کی لڑکیوں پر زبردستی کررہے ہیں۔

مجھے آزاد اور مسلح کرنے کے بعد راحت باہر کی طرف بھاگی۔ میں نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا "کدھر جاتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے جانے دو۔" وہ مچلی "مجھے چھت پر جانے دو۔"

"کیا کرو گی؟"

"شور مچاتی ہوں۔ لوگوں کو اکٹھا کرتی ہوں۔" وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

وہ بہت خوفزدہ تھی اور ساری احتیاط بالائے طاق رکھ چکی تھی۔

"حوصلہ کرو۔ ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔" میں نے سختی سے کہا اور اسے سیڑھیوں کی طرف جانے سے روک دیا۔ "سیاہ پوش کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے.... اس کے تین ساتھی ابھی تھوڑی دیر پہلے کھانے والے کمرے میں گھس آئے ہیں۔ وہاں سب لڑکیاں اکٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ انہوں نے ہم پر رائفلیں تان لیں اور تین لڑکیوں کو زبردستی کھینچ کر نیچے اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔ میں نے بڑی کوشش کی لیکن انہیں روک نہیں سکی۔"

"ان کا چوتھا ساتھی کدھر ہے؟"

"وہ باہر کے گیٹ پر کھڑا ہو گیا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس نے چوکیدار کو رسیوں وغیرہ سے باندھ دیا ہے۔ ایک بندہ کھانے والے کمرے میں لڑکیوں پر رائفل تانے کھڑا ہے۔ باقی دو بندے تینوں لڑکیوں کو کمرے میں لے گئے ہیں۔" راحت کے لہجے میں اضطراب اور خوف کا سمندر تھا۔ اس کی گردن پر تازہ خراشیں بھی نظر آرہی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے لڑکیوں کو بچانے کی کوشش کی ہے۔

میں نے ریوالور دیکھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو تین دن پہلے عیسیٰ جان نے میری جامہ تلاشی سے حاصل کیا تھا۔ ریوالور پوری طرح لوڈ تھا۔ ریوالور ہاتھ میں لیتے ہی انگلیوں میں وہی سنسناہٹ جاگ اٹھی تھی جو مجھے خطرات سے بیگانہ کرتی تھی اور میں بڑے سے بڑا رسک لینے کو تیار ہو جاتا تھا۔ میں نے راحت کا بازو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا "دیکھو! جیسا میں کہوں ویسا ہی کرتی جاؤ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں یہ چار غنڈے تمہارا اور تمہاری اسٹوڈنٹس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

میرے لہجے کی مضبوطی اور حدت نے راحت کو چونکا دیا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھنے لگی' پھر بے اختیار اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پوچھا "کھانے والا کمرا کس طرف ہے؟"

وہ میرے ساتھ راہداری میں آگئی۔ راہداری سے گزر کر ہم اسکول کے آفس میں داخل ہو گئے۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے عیسیٰ جان مجھے ہینڈز اپ کرا کے لایا تھا۔ آفس میں تاریکی تھی۔ راحت نے کانپتے ہاتھوں سے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور انگلی سے دوسری منزل کی ایک روشن کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "وہاں ہیں ساری لڑکیاں۔" راحت نے کہا۔

میں نے راحت کو ساتھ لیا۔ آفس سے نکل کر ہم نے ایک مختصر لان پار کیا اور سیڑھیوں پر آگئے۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے تو ڈائننگ روم کا دروازہ سامنے ہی نظر آرہا

تھا۔ ایک کھڑکی کے شیشوں میں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بقول راحت' اس کمرے میں کم و بیش بیس لڑکیاں اور بچیاں موجود تھیں لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ کمرے میں کوئی متنفس موجود نہیں۔ بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"آپ.... آپ کیا کرنے جارہے ہیں.... کہیں وہ شخص فائر نہ کردے۔" راحت نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی انگلیاں میرے بازو میں دھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ کی ہول میں آنکھ لگا کر اندر جھانکا تو کمرے کا ایک حصہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے عیسیٰ جان کے پنجابی دوست بہادر علی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔ وہ ایک میز پر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ زمین پر تھی اور دوسری لٹک رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کچھ کھا بھی رہا تھا۔ جس میز پر وہ بیٹھا ہوا تھا وہ خاصی طویل تھی۔ اس پر کھانے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ کی ہول میں سے مجھے دس بارہ لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے کچھ دیوار کے سہارے سکڑی سمٹی بیٹھی تھیں اور کچھ اِدھر اُدھر کھڑی تھیں۔ ان سب کے چہروں پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ میز پر موجود بچے کھچے کھانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ عیسیٰ جان کے ساتھی کھانے کے دوران میں ہی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور لڑکیوں کو رائفلوں کے نشانے پر رکھ لیا تھا۔

زینے طے کرتے ہی جو کھڑکی ہمیں نظر آئی تھی وہ دروازے کی دائیں طرف والی دیوار میں تھی۔ کھڑکی کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے ایک دو پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ کھڑکی میں جالی یا گرل وغیرہ نہیں تھی۔ صرف پٹ کو دھکیل کر اندر کودنے کا راستہ بنایا جاسکتا تھا.... میں نے اپنے ہونٹ راحت کے کان سے لگائے اور اسے سرگوشی میں بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے' اس کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ بے حد تشویشناک لہجے میں بولی "ایسا مت کریں۔ وہ انہیں جان سے مار دے گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا انہیں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

راحت کو دروازے کے سامنے کھڑا کر کے میں کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق راحت نے دروازے پر زور زور سے دستک دی اور ساتھ ہی چیخنا شروع کردیا "دروازہ کھولو.... پلیز دروازہ کھولو۔"

کھڑکی کے شیشے ایسے تھے کہ میں اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم تصور کی نگاہ سے میں دیکھ سکتا تھا کہ بہادر علی کہاں ہے اور دروازہ کھٹکھٹائے جانے کے بعد اس نے کیا ردعمل اختیار کیا ہے۔ یقیناً اس کا رخ دروازے کی جانب ہو گیا تھا اور کھڑکی کی طرف اس کی پشت تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ تین چار قدم چل کر دروازے کی طرف بھی گیا ہو۔ اگلے ہی لمحے میرے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اندر سے بہادر علی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی "کون ہے؟" یہ آواز دروازے کے قریب سے آئی تھی۔

یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے تیزی سے کھڑکی کھولی اور اندر کود گیا۔ بہادر علی مجھ سے تقریباً دس قدم کی دوری پر تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں حتی الامکان تیزی سے بہادر علی پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا رخ پوری طرح میری سمت پھیرتا اور پھر رائفل کی نال میرے سینے کی سمت اٹھاتا' میں اسے دبوچ چکا تھا۔ میرے کانوں میں چند لڑکیوں کی دبی دبی چیخیں گونجیں۔ میں جانتا تھا کہ لڑکیاں اب کھڑکی کی طرف بھاگیں گی۔ لیکن میری ہدایت کے مطابق راحت کھڑکی پر موجود تھی۔ وہ نہ صرف لڑکیوں کو باہر نکلنے سے روک سکتی تھی بلکہ پُرسکون بھی کرسکتی تھی۔

بہادر علی پر جھپٹتے ہی میں نے اس کی رائفل پر بھرپور ہاتھ مارا تھا۔ چونکہ رائفل اس نے ایک ہاتھ میں تھام رکھی تھی لہٰذا وہ چھوٹ گئی۔ میں نے اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا' جونہی وہ کراہ کر جھکا' میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں دبوچی اور دو ہلکے ہلکے جھٹکوں کے ساتھ اسے روحانی نعمتوں کے لیے خلاص کردیا۔ وہ مُردہ چھپکلی کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گیا تھا۔ اپنے کردار اور وحشت کے لحاظ سے وہ صرف نام کا "بہادر" ثابت ہوا تھا۔ جب میں نے اسے فرش پر لٹایا تو اس کا انگارے کی طرح سرخ چہرہ راکھ کی طرح بے رونق نظر آرہا تھا۔

لڑکیوں کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی لیکن راحت نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر چیخنے چلانے سے باز رکھا۔ لڑکیوں کا شور ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ شور نچلی منزل کے عقبی کمروں تک پہنچ جاتا تو وہ دونوں بدمعاش ہوشیار ہو سکتے تھے جو لڑکیوں کو رنگ رلیاں منانے کے لیے نیچے لے گئے تھے۔ بہادر بے ہوش ہو چکا تھا لیکن لڑکیاں ابھی تک اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ بلا ہے اور یہ بلا ابھی اٹھ کر ان سے چمٹ جائے گی۔ میں نے ریوالور جیب میں ڈال کر بہادر کی رائفل قبضے میں لے لی۔ کمرے میں موجود زیادہ تر لڑکیاں جوان تھیں' ان میں سے صرف چھ سات بچیاں تھیں۔ یہ سب کی سب "آپا اسکول" کی غریب اور نادار اسٹوڈنٹس تھیں۔ معمولی کپڑے' معمولی صحت اور دیہاتی طور اطوار۔ وہ سب آنسو بہا رہی تھیں۔ میں نے راحت عرف آپا جی سے کہا کہ وہ یہیں رہے اور ان لڑکیوں کو تسلی تشفی دے۔

راحت بولی "آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"نیچے۔" میں نے جواب دیا "تم ان میں سے ایک سمجھ دار لڑکی میرے ساتھ کردو۔"

"لیکن.... آپ کریں گے کیا؟" وہ کانپتی آواز میں بولی۔

"یہ سوال جواب کا وقت نہیں۔ جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔"

راحت چند لمحے تذبذب میں رہی پھر اس نے ایک لڑکی کو

دبے لفظوں میں کچھ سمجھایا۔ وہ میرے قریب تن کر کھڑی ہو گئی۔ راحت نے التجا آمیز لہجے میں کہا "اسے کچھ ہو گا تو نہیں نا!" اس کا اشارہ لڑکی کی طرف تھا۔

میں نے کہا "ان سب لڑکیوں کو کچھ ہوا ہے؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک ایسی فکرمند ماں کی طرح نظر آئی جو اپنے بچوں کی سلامتی کو ہر شے سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ چھوٹی سی عمر میں بے شمار ذمے داریاں ڈالی ہوئی تھیں اس نے اپنے اوپر۔

میں نے لڑکی کو اپنے ساتھ لیا۔ وہ بیس بائیس برس کی ایک قبول صورت اور ذہین لڑکی نظر آتی تھی لیکن خوف اس کے چہرے پر بھی موسلادھار بارش کی طرح برس رہا تھا اور بات تھی بھی خوف کی۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے غنڈے ان میں سے تین لڑکیوں کو یوں چھانٹ کر لے گئے تھے جیسے مرغ فروش کا ہاتھ دڑبے میں سے مرغیوں کو کھینچ کر لے جاتا ہے اور ابھی یہ بھی واضح نہیں تھا کہ باقی لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ ان کی قسمت میں کل کا سورج دیکھنا لکھا ہے یا نہیں۔

میں اور لڑکی دبے پاؤں زینے اتر کر نیچے آئے۔ راحت نے اس عقبی کمرے کی نشاندہی کر دی تھی جہاں وہ غنڈے لڑکیوں کے ساتھ بند تھے۔ یہ کمرا دوسرے کمروں میں گھرا ہوا تھا۔ قدیم طرز کا اکلوتا محرابی دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ بلند چھت والے برآمدے میں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں لڑکی کو ایک بڑے گول ستون کے پاس لے آیا اور اسے کہا کہ وہ لیٹ جائے۔

میری ہدایت سن کر لڑکی مزید خوف زدہ نظر آنے لگی۔ وہ جانے نہیں کیا مطلب لے رہی تھی۔ خوف ناک ماحول میں تو خشک پتے کی آہٹ بھی خوف ناک ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور پہلو کے بل فرش پر لٹا دیا۔ اس کا رخ دروازے کی مخالف سمت میں تھا۔ میں نے پروین نامی اس لڑکی کو ہدایت کی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ بے سدھ پڑی رہے اور حرکت نہ کرے۔ اپنی رائفل میں نے ستون کے قریب رکھ دی۔

اس کے بعد میں نے زور زور سے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے بار بار پوچھا گیا کہ کون ہے لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ پانچویں چھٹی دستک پر کوئی دروازے کی طرف آیا۔ میں ایک گول ستون کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھلا پھر کسی نے محتاط انداز میں باہر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

"کون ہے؟" ریوالور بردار نے بے حد کڑے انداز میں پوچھا۔

پھر اس کی نگاہ چند گز دور فرش پر بے سدھ لیٹی لڑکی پر پڑی۔ وہ ایک دم چونک گیا۔ ریوالور سونتے ہوئے وہ باہر نکلا اور لڑکی کی طرف بڑھا۔ جونہی وہ اس پر جھکا میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ اس مرتبہ حریف توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا اور میری ٹائمنگ تھوڑی سی غلط ہو گئی۔ حریف کی گردن تو میرے شکنجے میں نہ آسکی تاہم اس کے سر کے بال میری مٹھی میں جکڑے گئے۔ میرے دوسرے ہاتھ نے اس کا ریوالور نیچے جھکا دیا۔ دو شدید جھٹکوں کے ساتھ میں نے اپنے حریف کا سر گول ستون سے ٹکرایا اور اسے نیم جان کر دیا۔ پھر گردن پر لگنے والی ایک شدید ضرب نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔

بہرحال یہ کام زیادہ صفائی سے نہیں ہو سکا تھا۔ ریوالور بردار کا سر ستون کے ساتھ ٹکرانے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مضروب کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ کمرے میں موجود دوسرے غنڈے کو گڑبڑ کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔۔۔ یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ اگلے ہی لمحے اندر سے ایک بھاری بھرکم آواز برآمد ہوئی "کون ہے۔۔۔ میں پوچھتا ہوں کون ہے۔ خبردار کوئی گڑبڑ کیا تو ام چھوکریوں کو بھون کر رکھ دے گا۔"

پھر اندر موجود شخص نے دھماکے سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ مجھے اندر موجود لڑکیوں کی دبی دبی چیخیں اور آوازیں سنائی دیں۔ شاید وہ جھبلی جان کے ساتھی کی منت سماجت کر رہی تھیں۔

کمرے میں موجود کسی ٹیپ ریکارڈر پر فحش قسم کا انڈین گانا بج رہا تھا۔ چند لمحے بعد گانا بند ہو گیا اور اندر موجود غنڈے کی للکارتی ہوئی آواز آئی "خبردار، جو کوئی بھی ہے کھڑکی میں آکر اپنا چہرہ دکھائے۔ ورنہ ام چھوکریوں کا ملیدہ کر دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی وہ شخص زور زور سے کسی اکبر لال کو آوازیں دینے لگا۔ اکبر لال یقیناً اس شخص کا نام تھا جو گیٹ کی رکھوالی کر رہا تھا۔۔۔۔ اچانک میری نگاہ ان کھڑکیوں پر پڑی جن سے اتر کر میں اور پروین نیچے آئے تھے۔ یہ کھڑکیاں کمرے کے روشن دان کے بالکل پاس سے گزرتی تھیں۔ میں نے پروین کو کھڑکیوں کے نیچے محفوظ خلا میں چھپایا اور خود تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر روشن دان کی طرف آگیا۔ میں نے ایک ٹانگ زینے پر رہنے دی اور دوسری پھیلا کر چار پانچ فٹ دور روشن دان کے چوکھٹے پر رکھ دی۔ اندر جھانکا تو کمرے کا منظر صاف نظر آیا۔ میں مکمل تاریکی میں تھا لہٰذا خدشہ نہیں تھا کہ اندر سے مجھے دیکھا جا سکے گا۔ تینوں لڑکیاں دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ بوسیدہ کپڑوں کے بجائے انہوں نے دلہنوں جیسے کامدار جوڑے پہن رکھے تھے۔ یہ جوڑے یقیناً اسی سلائی کڑھائی اسکول میں تیار کیے گئے تھے اور ان غنڈوں نے زبردستی لڑکیوں کو پہنائے تھے۔ شاید انہیں کچھ وقت ملتا تو وہ ان لڑکیوں کو بناؤ سنگھار پر بھی مجبور کرتے اور یوں اپنی اس عیاشی کو چار چاند لگانے کی کوشش کرتے۔

کمرے میں موجود غنڈا اپنے حلیے اور بول چال سے قبائلی نظر آتا تھا۔ اس کا اسلحہ دیکھ کر میں سٹپٹا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چینی

جان والی سب مشین گن تھی۔ اس گن کے بارے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ گول ڈبے جیسے میگزین والی مشہور سب مشین گن PPSH-41 اور چینی جان والی گن میں صرف اتنا فرق تھا کہ چینی والی گن میں میگزین لمبے باکس کی شکل میں تھا۔ ورنہ اپنی تیزی اور ہلاکت آفرینی میں یہ دونوں گنیں ایک تھیں۔ قبائلی کی انگلی ٹریگر پر دبنے کی دیر تھی کہ لڑکیاں چھلنی ہو سکتی تھیں۔ اس نے گن کے بیرل کا رخ تینوں لڑکیوں کی طرف کر رکھا تھا اور ہیجانی انداز میں چیخ رہا تھا "ام کہتا ہے کہ جو کوئی بھی ہے اپنے ہتھیار کے ساتھ کھڑکی میں آجائے ورنہ ام ان لڑکیوں کو جان سے مار دے گا۔"

قبائلی کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ واقعی بے حد خطرناک موڈ میں ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ ایک بار چیخا "امارے ہاتھ میں سب مشین گن ہے۔ ام کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ سامنے آجاؤ۔"

میں نے سیون ایم ایم سیدھی کی اور روشن دان میں سے قبائلی کے سر کا نشانہ لے لیا۔ یہ سنگل شاٹ فائر کرنے والی رائفل تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس صرف ایک گولی چلانے کا موقع ہے۔ اگر یہ گولی خالی گئی یا صحیح ترین مقام پر نہ لگی تو قبائلی زندہ رہے گا اور کمرے میں موت ناچ جائے گی۔ میں نے قبائلی کی پیشانی کا نشانہ لیا تھا کیونکہ یہی "صحیح ترین" مقام تھا۔ میں بڑے خطرناک زاویے سے کھڑا تھا۔ روشن دان میں رکھا ہوا پاؤں ذرا سا پھسلتا تو میں دس بارہ فٹ نیچے جا گرتا۔ سانس روک کر میں نے فائر کیا۔ گولی دائیں آنکھ سے ذرا اوپر پیشانی میں لگی۔ گن بردار جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور پشت کے بل فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ دھماکے سے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔ کمرے میں موجود لڑکیاں چیختی چلاتی دروازے کی طرف بھاگیں۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر تھیں۔ ان کا یوں باہر نکلنا سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہاں ہونے والے فائر کی آواز اسکول کے بڑے گیٹ پر موجود اس چوتھے شخص تک بھی پہنچی ہو گی جسے ہلاک ہونے والا قبائلی "اکبر لال" کہہ کر آوازیں دے رہا تھا۔ اب کسی بھی لمحے وہ شخص یہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس شخص کا لڑکیوں سے آمنا سامنا ہو جاتا تو لڑکیوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں نے چیخ کر لڑکیوں سے کہا کہ وہ واپس کمرے میں گھس جائیں۔ وہ واپس کمرے میں تو نہیں گھسیں لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ لان کی طرف دوڑنے کے بجائے وہ ایک قریبی راہداری میں گھس گئیں۔ تقریباً یہی وقت تھا جب ایک لمبا تڑنگا سیاہی مائل شخص دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف سے آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور گرم چادر اس کے کندھوں پر کسی پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ کھلی جگہ پر تھا۔ میں نے خود کو ایک ستون کی اوٹ میں کیا اور پکار کر کہا "خبردار اپنی جگہ سے ذرا دور۔ گولی مار دوں گا۔"

وہ ٹھٹک کر آوازوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے وہ بھاگ کر کسی چیز کی اوٹ لینا چاہتا ہے۔ میں نے اوپر تلے دو فائر اس کے پاؤں میں کیے۔ اس کے قدموں میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ان چنگاریوں میں یقیناً ان ٹائلوں کی کرچیاں بھی تھیں جن سے یہ قدیم فرش بنا ہوا تھا۔

اکبر لال نامی یہ شخص ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا "رائفل پھینکو" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اس حکم کی تعمیل کے سوا اس کے پاس چارہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ خود کو بہت بڑا چغد محسوس کر رہا تھا جو یوں بلا تردد بھاگتا ہوا میرے نشانے پر آگیا تھا۔ اس نے رائفل اپنے قدموں میں پھینک دی۔ میں نے اسے ایک شاندار گالی سے نوازنے کے بعد کہا کہ وہ رائفل کو خود سے دور پھینکے۔ اس نے رائفل لان میں رکھے ہوئے گملوں کے پیچھے پھینک دی۔ میں نے نیچے اتر کر اسے قابو کر لیا۔ اسی دوران میں بالائی منزل سے راحت اور اس کی چند اسٹوڈنٹس بھی بھاگتی ہوئی نیچے آگئیں۔ اکبر نامی اس شخص کو زمین پر گرا کر اس کی مشکیں کس دی گئیں۔ وہ ایک کرخت چہرے والا بھاری آدمی تھا اور ہم سب کو زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ بندھا ہوا تھا پھر بھی لڑکیاں اس سے خوف زدہ نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ان کا خوف دور کرنے کے لیے اس شخص کو رائفل کے کندے سے تھوڑی سی "چھینٹی" لگائی۔ جب وہ چیخنے لگا تو اسے گھسیٹ کر اسی اندرونی کمرے میں پہنچا دیا جہاں قبائلی کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔ اس کمرے میں میں نے راحت کے سوا کسی لڑکی کو داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ قبائلی کی ادھ کھلی آنکھوں والی لاش دیکھ کر راحت کی چیخ نکل گئی۔ اکبر لال کا چہرہ بھی ہلدی کی طرح زرد نظر آنے لگا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جسے یہ لوگ آج رات عیاشی کے لیے استعمال کرنے والے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر کے علاوہ یہاں کھانے پینے کا سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں ابھی تک سگریٹوں کا دھواں اور الائچی سپاری پانوں کی خوشبو تھی۔ ایک طرف بہت سے رنگ برنگے زنانہ لباس بکھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے عشرت کدہ نظر آنے والی یہ جگہ عبرت نگاہ بنی ہوئی تھی۔

اکبر لال کو لاش کے پاس چھوڑنے کے بعد میں نے گیٹ پر پہنچ کر خان چوکیدار کو رسیوں کی بندش سے آزاد کرایا۔ پھر ہم نے دونوں بے ہوش غنڈوں کو اٹھایا اور اسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں اکبر لال اور راحت وغیرہ موجود تھے۔

اب رات کے ڈیڑھ دو بج چکے تھے۔ اسکول میں فائرنگ ہوئی تھی اس کی آواز یقیناً بستی میں بھی سنی گئی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ بستی میں سے کچھ لوگ ضرور اسکول کے گیٹ پر پہنچ چکے ہوں گے اور ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ فائرنگ کیوں ہوئی

ہے۔ میں نے چوکی دار خان محمد کو گیٹ پر بھیج دیا کہ وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ "آپی سلائی اسکول" کے حوالے سے لوگوں کو کسی بھی ہنگامے کی خبر ملے۔ چوکی دار لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ فائرنگ اس کی رائفل سے اتفاقاً ہوئی تھی یا وہ رائفل ٹھیک کر رہا تھا' وغیرہ وغیرہ۔

ایک شخص کے ہلاک ہونے کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ پولیس کو اطلاع دے دی جاتی۔ آپی سلائی اسکول میں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ میں نے بذریعہ ٹیلی فون لاہور میں ساہی صاحب سے رابطہ کیا۔ حسب توقع وہ میرے سلسلے میں پریشان تھے۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ میں تین چار دن سے بغیر اطلاع کے غائب تھا۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا "جناب! اس سلسلے میں آپ کو بعد میں وضاحت سے بتاؤں گا۔ فی الحال آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا تھی۔ یہاں موضع داجکے کے قریب لڑکیوں کے ایک ٹریننگ اسکول میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص مارا گیا ہے اور باقی پکڑے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ متعلقہ تھانے والے اپنی کارروائی مکمل کر لیں۔"

ساہی صاحب بولے "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں ایس پی برکت کو بھیج دیتا ہوں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے جناب۔" میں نے جلدی سے کہا "چاہے برکت کو نہیں بھیجنا۔ وہ خواہ مخواہ "ایفی شینسی" دکھانے میں لگ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے بھروسے کا کوئی افسر بھیج دیں۔ وہ سادہ لباس میں آئے اور اس کے ساتھ اگر عملہ ہو تو وہ بھی سادہ لباس میں ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس ٹریننگ اسکول کے بارے میں مقامی لوگوں میں کسی طرح کے شکوک و شبہات جنم لیں۔"

میں نے ساہی صاحب کو یہ بھی بتایا کہ میں عیسیٰ جان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہوں اور اُمید ہے کہ وہ جلد ہی پکڑا جائے گا۔

ساہی صاحب سے تمام ضروری امور پر بات کرنے کے بعد میں اس کمرے میں واپس آ گیا جہاں عیسیٰ جان کے تین ساتھی بندھے پڑے تھے اور ہلاک ہونے والے قابل کی لاش پر چادر ڈالی جا چکی تھی۔

راحت نے بتایا تھا کہ عیسیٰ جان یہاں موجود نہیں ہے۔ پھر بھی اپنا شبہ دور کرنے کے لیے میں نے سلائی اسکول کے تمام کمروں کا معائنہ کیا اور راحت کے رہائشی پورشن کا بھی ایک چکر لگایا۔ اس کوشش میں اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا کہ مجھے اپنا رام پوری خنجر مل گیا۔

میں نے راحت سے پوچھا "عیسیٰ جان کب گیا تھا؟"

"کل کون...."

"بھئی وہی سیاہ پوش۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اس کا اصل نام عیسیٰ جان ہی ہے۔"

راحت بولی "وہ آج دوپہر کے وقت کہیں نکلا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گوجرانوالہ گیا تھا۔"

"گوجرانوالہ میں کیا کام تھا؟"

"وہ وہاں لکڑی کی کسی دکان سے کوئی ڈربا وغیرہ بنوا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک شاندار ڈربا بنوا رہا ہوں۔ اس میں ایک شاندار تماشا کرواتا ہے۔ پتا نہیں کس چکر میں پڑا ہوا تھا۔"

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جنونی شخص ابھی تک "کھبائی" نامی رسم کے چکر میں ہے۔ اس بدذات کی "فطرت" اسے سفاکی کی انتہا پر دیکھنا چاہ رہی تھی۔

راحت بولی "وہ ایک ڈیڑھ بجے کے قریب گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد چاروں غنڈوں کی نظریں بدلی بدلی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس سے پہلے وہ چاروں پچھلے دو کمروں کے اندر ہی رہتے تھے لیکن آج شام وہ احاطے میں اور برآمدے میں گھومتے رہے تھے اور لڑکیوں کو گھورتے رہے تھے۔"

میں نے کہا "شاید تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ اگر عیسیٰ جان یہاں ہوتا تو اس کے ساتھی یہ کچھ نہ کرتے جو انہوں نے کیا ہے۔ میرے خیال میں تمہارے سوچنے کا انداز بالکل غلط ہے۔ بلکہ شاید تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ عیسیٰ جان کی مرضی اور اس کی اجازت سے ہوا ہے۔ وہ جان بوجھ کر موقع سے ہٹ گیا تھا کہ تم اس کے سامنے داد فریاد نہ کر سکو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ شخص جتنا ظالم ہے اتنا ہی ناقابلِ اعتبار بھی ہے۔ تم کچھ بھی کر لیتیں تو اس نے لڑکیوں پر ظلم توڑنا ہی توڑنا تھا۔"

راحت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اپنے پاؤں کو گھورتی رہی۔ شاید ذہنی طور پر وہ میری بات کو درست تسلیم کر رہی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ پولیس کے آنے سے پہلے پہلے عیسیٰ کے ساتھی اکبر لال سے پوچھ گچھ کر لوں۔ میں نے چوکی دار خان محمد کی مدد سے اکبر لال کو اٹھوایا اور ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ یہاں سے اکبر لال کی چیخ و پکار باہر نہیں جا سکتی تھی.... میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میری پھینٹی سے وہ پہلے ہی کافی ڈرا ہوا تھا لیکن وہ پھینٹی تو صرف "ٹریلر" تھی۔ جب میں نے اصل فلم دکھائی تو اکبر لال کا پتا پانی ہو گیا.... پانچ چھ منٹ کے اندر اس کی ناک اور منہ سے خون پھوٹ گیا۔ دو انگلیاں ٹوٹ گئیں اور منہ پر لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر نے اس کی نصف بتیسی ہلا دی.... اکبر لال نے مجھے عیسیٰ جان کے بارے میں کئی مفید باتیں بتائیں۔ ان باتوں سے راحت کے اس اندازے کی بھی تصدیق ہوئی کہ عیسیٰ جان لکڑی کا کوئی کام کروانے کے سلسلے میں گوجرانوالہ گیا ہوا ہے.... اکبر لال نے اس بات کا اعتراف کیا کہ آج رات لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس میں عیسیٰ جان کی مرضی شامل تھی۔ عیسیٰ جان نے خود بھی دو تین لڑکیوں پر نظر رکھی ہوئی تھی اور انہیں "شکار" کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اکبر لال نے بتایا کہ عیسیٰ جان کل

صبح نو دس بجے کے قریب واپس لوٹے گا۔

O☆O

رات گئے لاہور سے ایک ڈی ایس پی صاحب آ گئے۔ مقامی تھانے دار کے ساتھ مل کر انہوں نے نہایت خاموشی و رازداری سے اسکول کے اندر اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ لاش کو ایک بند گاڑی میں پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ میں نے بہادر علی سمیت عیسیٰ جان کے تینوں ساتھیوں کو پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ تین پولیس اہلکار سادہ لباس میں میرے ساتھ ہی رہ گئے' باقی ملزمان کو لے کر لاہور روانہ ہو گئے۔

اب عیسیٰ جان کی واپسی کا انتظار شروع ہوا۔ یہ ایک تکلیف دہ اور صبر آزما انتظار تھا۔ ایک ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے اس راستے پر متعین کیا تھا جو گوجرانوالہ سے موضع داجکے کی طرف آتا تھا۔ ایک مسلح اے ایس آئی میرے ساتھ موجود تھا۔ ہمارے درمیان واکی ٹاکی پر رابطے کا انتظام بھی تھا۔ میں نے راحت کو ہدایت کر دی تھی کہ صبح اسکول میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آنی چاہیے۔ سب لڑکیاں اور محلے کی عورتیں روزمرّہ کے کام کریں۔ کسی کو شبہ تک نہ ہو کہ رات اسکول میں کوئی واقعہ ہوا ہے.... لڑکیاں اور بچیاں بہت خوف زدہ تھیں لیکن مجھے امید تھی کہ حوصلہ مند راحت انہیں سنبھالنے اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے میں کامیاب رہے گی۔

صبح آٹھ بجے کے بعد جب اسکول میں کلاسیں وغیرہ لگ گئیں تو ہمارے انتظار کی کیفیت شدت اختیار کر گئی۔ ہم ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہے تھے۔ نو بجے اور پھر دس بج گئے لیکن عیسیٰ جان کا دور دور پتا نہیں تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہماری اُمید مایوسی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہم راحت کے دفتر کے پاس ہی ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے ہماری نظریں گیٹ کی طرف لگی تھیں لیکن ان نظروں کی تسکین کا سامان نہیں ہو رہا تھا۔ واکی ٹاکی پر بھی ابھی تک کوئی مثبت اشارہ نہیں آیا تھا۔

دو ڈھائی بجے تک ہم نے عیسیٰ کا انتظار کیا۔ اس کے بعد مجھے یقین ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ عیسیٰ جان ایک نہایت عیار شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسے اسکول میں ہونے والی کایا پلٹ کا پتا چل گیا ہو۔ ظاہر ہے رات کو اسکول میں فائرنگ ہوئی تھی۔ صبح فجر کی اذان تک گاڑیوں کی آمدورفت بھی جاری رہی تھی۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ عیسیٰ جان کا کوئی مخبر یا ہمدرد اسکول کے آس پاس موجود ہو اور اس نے عیسیٰ کو مشکوک حالات کے متعلق اطلاع پہنچا دی ہو۔

بہرطور ہم نے رات گئے تک عیسیٰ جان کا انتظار کیا اور اگلے روز بھی دوپہر تک اس کے استقبال کے لیے تیار رہے۔ دوپہر کے بعد میں نے فون پر ساہی صاحب سے رابطہ کیا اور باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ عیسیٰ جان کے انتظار کے ساتھ ساتھ محتاط انداز میں اس کی تلاش بھی کی جائے۔

اس فیصلے کے فوراً بعد ساہی صاحب نے گوجرانوالہ کی پولیس سے رابطہ کیا اور علاقے میں تمام تھانوں اور چوکیوں کے علاوہ مخبروں کو بھی چوکس کر دیا گیا.... اسی روز شام کو ایس پی برکت سادہ لباس میں "آپی اسکول" پہنچا۔ زرین گل بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک پرائیویٹ کار میں آئے تھے۔

ایس پی برکت سخت ناراض دکھائی دیتا تھا۔ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر بولا "بڑے افسوس کی بات ہے شاہ جہاں! مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی؟"

"میرا قصور جناب؟"

"زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔ تم نے مجھے پاگل بنایا ہے۔ مجھے ڈیرے پر بھیج کر خود اس اسکول میں آ گئے ہو۔ تمہیں پتا تھا کہ وہ بھوتنی دا عیسیٰ جان یہیں پر مل سکتا ہے۔ میں نے پورے چار دن ڈیرے پر جو کھے کھائی ہے اس کی ساری ذمے داری صرف اور صرف تم پر ہے۔" وہ بولنے کے ساتھ ساتھ اپنے زخمی بازو کو سہلاتا بھی جا رہا تھا۔

میں نے کہا "جناب! آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ آپ اتنے پرانے پولیس افسر ہیں پھر بھی ایسی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے تفتیش کبھی ایک لائن پر نہیں ہوتی۔ کئی لائنوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا اچھا مجھے زیادہ پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتا ہوں جو تم نے کیا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے اور میرے عملے کو کسی کھوہ (کنویں) میں دھکا دے دیتے اور لوگوں سے کہتے کہ ان بلولوں کو چھڑا دو۔"

زرین گل نے پوچھا "ہم معافی چاہتا ہے جناب! یہ بلول کیا ہوتا ہے؟"

"بلول تیری بے بے کا سر ہوتا ہے۔" ایس پی برکت نے بھنا کر کہا۔

"بے بے؟ یہ بے بے کیا ہوتا ہے جی؟"

زرین گل کو بے بے کے معنی معلوم ہو جاتے تو ایک طوفان کھڑا ہو جاتا۔ میں نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے زرین گل کو بری طرح ڈانٹا اور اسے کہا کہ جب کوئی بڑا افسر بات کر رہا ہو تو اس طرح بیچ میں نہیں بولا کرتے۔ زرین گل کان لپیٹ کر نکل گیا۔ ایس پی برکت نے بدستور غصیلے لہجے میں کہا "تم دل کے کھوٹے ترین ہو۔ اگر تمہاری یہ بات مان بھی لی جائے کہ تم اتفاقاً اس سلائی اسکول میں آ گئے تھے اور تمہیں یقین نہیں تھا کہ عیسیٰ جان کا کھوج اسی اسکول سے ملے گا تو بھی تمہارا کھوٹا پن ثابت ہوتا ہے۔ جب تمہیں پتا چل گیا تھا کہ عیسیٰ جان کے ساتھی بھوتنی دے اسی اسکول میں موجود ہیں تو تمہیں چاہیے تھا کہ مجھ سے رابطہ کرتے لیکن تم نے فوراً ساہی صاحب کو فون کیا اور اپنے اس ماسے ڈی ایس پی

ارشاد کو یہاں بلایا۔ وہ بس کا ور کیا لگتا ہے اس کمبخت کا.... اور میرے منہ سے نکلنے لگا تھا کچھ..... ساہی صاحب کو کیا ضرورت پڑی تھی اسے یہاں بھیجنے کی۔"

میں نے ایس پی برکت کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا "جناب! اس وقت فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اسی کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہیں ایک بندے کی لاش پڑی تھی اور تین بندوں کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ میں نے آپ کی طرف چوکی دار خان محمد کو بھیجنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن آپ کے آتے آتے بہت دیر ہو جاتی۔"

ایس پی برکت کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح میں اس کا پارا تھوڑا سا نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران میں ساہی صاحب کی طرف سے مجھے ایک نہایت اہم اطلاع مل گئی۔ یہ اطلاع ایک مخبر کے ذریعے ساہی صاحب کو ملی تھی اور اس کا تعلق عیسٰی جان سے تھا۔

ساہی صاحب نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ آج سہ پہر تین چار بجے کے لگ بھگ عیسٰی جان کو دیکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ چند دیگر افراد بھی تھے۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار موضع ونگ والی کی طرف جا رہے تھے۔ مخبر نے ایک بائیسکل پر ان کا پیچھا کیا اور انہیں علاقے کی ایک مشہور و معروف عمارت میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔

مشہور و معروف عمارت کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں اس نام سے اور نام کی خصوصیات سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ مخبر نے لال کوٹھی کا ذکر کیا تھا۔ وہی انوکھی عمارت جو اپنی اندرونی بناوٹ کے لحاظ سے ایک عجوبہ تھی۔ محرابی دروازے 'تیم تاریک دالان' بھول بھلیوں جیسی طویل نیم اسرار راہداریاں 'مانگ چندی اینٹوں کے مسند نشین' اور تحت الثریٰ میں اترے ہوئے تاریک تہ خانے۔ یہ اسی چوہدری بخت آور کی لال کوٹھی تھی جو آج کل اپنے عبرت ناک اعمال کی سزا بھگت رہا تھا۔ اپنی ہی دواساز فیکٹری کی جعلی دواؤں نے اسے جان کے لالے ڈال رکھے تھے اور وہ دوبارہ سے زندگی کی طرف لوٹنے کے لیے لاہور کے ایک جدید اسپتال میں زیر علاج تھا۔ لال کوٹھی کا نام آتے ہی ذہن میں اور بھی بہت سی حالیہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں حیران ہوا کہ عیسٰی جان کا لال کوٹھی سے کیا تعلق نکل آیا ہے۔

ساہی صاحب کی اس اطلاع نے میرے دل و دماغ پر وہی اثر کیا جو ایک خاموش جھیل میں گرنے والا بہت بڑا پتھر کرتا ہے۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ آخری اطلاعات کے مطابق عیسٰی جان لال کوٹھی کے اندر ہی موجود ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں فوراً لال کوٹھی پہنچ جاؤں اور سادہ لباس میں پولیس اہلکاروں کو بھی ساتھ لے جاؤں۔

میں نے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، مجھے لال کوٹھی کے اندر داخل ہونا چاہیے؟"

وہ بولے "میری رائے میں اشد ضرورت کے بغیر داخل نہیں ہونا چاہیے۔ میں بھی دو ڈھائی گھنٹے تک موقع پر پہنچ رہا ہوں پھر دیکھتے ہیں کہ عیسٰی کو پکڑنے کا مناسب طریقہ کیا ہے۔"

میں نے کہا "اگر اس دوران میں عیسٰی جان لال کوٹھی سے نکل کر کہیں جانے کی کوشش کرے تو؟"

وہ بولے "پھر تم اپنی صوابدید کے مطابق کارروائی کر سکتے ہو۔"

ونگ والی کا فاصلہ "آبی اسکول" سے چودہ پندرہ میل کے قریب تھا۔ اس سفر کے لیے ہم نے وہی گاڑی استعمال کی جس میں ایس پی برکت اور دو دیگر لوگ یہاں پہنچے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اپنے جانے پہچانے راستوں پر سفر کرنے کے بعد ہم ونگ والی گاؤں پہنچ گئے۔ سیلاب کا پانی مکمل طور پر اتر چکا تھا لیکن دور دور تک اس کے آثار باقی رہ گئے تھے۔ گرے ہوئے گھروندے دوبارہ تعمیر ہو رہے تھے۔ زمین بوس ہو جانے والے درختوں کو کاٹا جا رہا تھا۔ ہم نے گاڑی فاصلے پر روک دی۔ گاؤں کی آبادی میں لال کوٹھی یوں نظر آ رہی تھی جیسے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان کوئی پہاڑ کھڑا ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ساہی صاحب کے آنے تک ہم لال کوٹھی کے نزدیک جائیں لیکن پھر ایسی بات سامنے آئی کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ایک باوردی اے ایس آئی دوڑتا ہوا ہمارے پاس پہنچا۔ وہ ایس پی برکت کو پہچانتا تھا۔ اس نے کھٹاک سے ایس پی برکت کو سلیوٹ کیا اور یہ اطلاع پہنچائی کہ مقامی تھانے کی پولیس نے لال کوٹھی کو اپنی نگرانی میں لے رکھا ہے۔ اے ایس آئی کا اپنا تعلق بھی مقامی تھانے سے تھا۔

میں اس اطلاع پر ششدر رہ گیا۔ مقامی ایس ایچ او نے کارکردگی دکھانے کے چکر میں باوردی پولیس لال کوٹھی کے سامنے جمع کر دی تھی اور یوں نادانستگی میں عیسٰی جان کو ہوشیار باش کر دیا تھا۔

اے ایس آئی سینہ پھلائے کھڑا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ ہم اس اطلاع پر اسے شاباش دیں گے۔ میں نے اپنا غصہ بمشکل چھپایا۔ ایس پی برکت نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ تھانہ انچارج کو بلا کر لائے..... اے ایس آئی گیا اور تین چار منٹ بعد ایک دوہرے جسم والے دیہاتی تھانے دار کو لے کر آ گیا۔ ایس پی برکت نے پہلے تو پولیس والوں کی مخصوص زبان استعمال کرتے ہوئے تھانے دار کو جھاڑا کہ اس نے بلا اجازت باوردی پولیس لال کوٹھی پر کیوں لگائی ہے۔ پھر اس سے نفری کی تعداد اور اسلحے وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

میں نے تھانے دار سے پوچھا "عیسٰی جان کے علاوہ لال کوٹھی میں اور کون ہے؟"

وہ بولا "آپ کو پتا ہی ہو گا کہ چوہدری بخت صاحب تو بیمار ہو کر اسپتال میں ہیں۔ چھوٹے چوہدری ذیشان صاحب کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ انگلینڈ جا چکے ہیں۔ چوہدری بخت صاحب کا بڑا

مہمان پاکستان میں ہے لیکن وہ چوہدری صاحب کی بیماری کی وجہ سے لاہور گیا ہوا ہے۔ چوہدری بخت صاحب کی دوسری بیوی جنہیں بیگم جی کہا جاتا ہے وہ بھی بیمار ہے اور لاہور کے ہی ایک پرائیویٹ کلینک میں زیر علاج ہے۔ دیکھا جائے تو چوہدریوں میں سے کوئی بھی ذمے دار شخص اس وقت لال کوٹھی میں موجود نہیں۔"

"تو پھر کون ہے یہاں؟"

وہ بولا "میری اطلاع کے مطابق جناب! چوہدری بخت کا کوئی منصور خان نامی قریبی دوست ہے۔ وہ آج کل بطور مہمان یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ کوئی بڑی بم قسم کی چیز ہے یہ شخص.... سنا ہے کہ کوہاٹ کے نواحی علاقوں میں اس شخص کا بے پناہ اثر و رسوخ ہے اور حالیہ الیکشن میں یہ بلامقابلہ منتخب ہوا ہے۔ اب یہ شخص صوبائی وزیر بننے والا ہے۔" کہنے کو تو وہ لال کوٹھی میں مہمان ٹھہرا ہوا ہے لیکن لگتا یہ ہے کہ اصل مالک یہی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے ملازم پر اس کا حکم چلتا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی بڑے ٹھاٹ سے یہاں رہ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا یہ شخص پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے؟"

"جی ہاں۔ پچھلے سال بھی آیا تھا۔ دراصل چوہدری بخت اور منصور خان کی دوستی سیر اور شکار کی دوستی ہے۔ چوہدری بخت کونجوں کا شکار کرنے کے لیے کوہاٹ اور بنوں وغیرہ کی طرف جاتا ہے۔ منصور خاں صاحب مرغابی اور سؤر کے شکار کے لیے یہاں آتا ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ منصور خاں صاحب اب بھی لال کوٹھی میں ہی ہے؟"

تھانے دار نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے ایک سفید پوش ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور ایس پی برکت سے "وقتی" اجازت لے کر لال کوٹھی کی طرف بڑھا۔ یقینی بات تھی کہ لال کوٹھی کے پھاٹک پر پولیس کو دیکھ کر عیسٰی جان ہوشیار ہو چکا ہو گا۔ اب اسے مزید ڈھیل دینا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ میں کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو جانے پہچانے چوکی دار سے ملاقات ہوئی۔ اس کا نام ہمایوں تھا۔ میں نے ہمایوں کے مؤدبانہ سلام کا جواب دیا لیکن جب اندر جانا چاہا تو ہمایوں نے روک دیا "معافی چاہتا ہوں جی۔ صاحب نے کسی کو بھی اندر بھیجنے سے روک رکھا ہے۔ ان سے اجازت لینی پڑے گی۔"

"کون صاحب۔ تمہارے صاحب تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"میں جناب منصور خاں صاحب کی بات کر رہا ہوں۔ آج کل انہی کا آرڈر چل رہا ہے۔"

"کون ہے یہ شخص؟"

"بڑے چوہدری صاحب کے بہت پرانے دوست ہیں جی۔۔۔ تھوڑے دنوں میں منسٹر وغیرہ بھی بننے والے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ اسے اطلاع دو کہ لاہور سے ایک ایس پی صاحب اسے ملنے آئے ہیں۔"

میں نے ایس پی برکت کا نام ایک چٹ پر لکھ کر اسے تھما دیا۔ ایک رائفل بردار شخص چٹ لے کر اندر گیا اور قریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کے ساتھ بہت بڑی پگڑی اور چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک سرخ و سپید پٹھان تھا۔ اس نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص منصور خان صاحب کا منیجر ہے۔ وہ دیکھنے میں شائستہ شخص نظر آتا تھا لیکن اس نے بڑے اکھڑ لہجے میں بات کی اور کہا کہ "بڑے صاحب" اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔

ایس پی برکت بھی اب گیٹ پر پہنچ چکا تھا اور میرے شانے سے شانہ ملائے کھڑا تھا۔ ایس پی برکت نے کہا "میرا ملنا بہت ضروری ہے۔ میں لاہور سے خاص طور پر اسی لیے آیا ہوں۔"

منیجر بولا "اگر ایسا ہی ضروری کام تھا تو پہلے سے وقت لیا ہوتا۔"

ایس پی برکت کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ کڑوے لہجے میں بولا "اگر پولیس وقت لینے کے چکر میں پڑ جائے تو پھر کوئی مجرم پکڑا جائے اور نہ کسی کا جان مال محفوظ ہو۔"

منیجر بولا "منہ سنبھال کر بات کرو ایس پی صاحب۔ یہاں کوئی مجرم نہیں ہے۔ یہاں چوہدری بخت کا ایک معزز مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ہمارا خیال ہے کہ معزز مہمان کے ساتھ کچھ غیر عزت دار لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔"

"تو پھر جاؤ وارنٹ لے کر آؤ۔ چلو جاؤ شاباش۔" اس نے بدتمیزی کا رویہ اختیار کیا اور چوکی دار ہمایوں کو اشارہ کیا کہ وہ گیٹ بند کر دے۔

ہمایوں گیٹ بند کرنے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے اپنی ٹانگ دہلیز پر رکھ کر اسے روک دیا۔

ایک دم بائیں جانب سے دو رائفل بردار نمودار ہو گئے۔ یقیناً وہ منصور خاں کے ذاتی گارڈ تھے میں نے اس سے پہلے لال کوٹھی میں ان کی صورتیں نہیں دیکھی تھیں۔ ایک گارڈ کی رائفل میرے سینے سے لگی اور اس نے مجھے پیچھے کی طرف دھکیل دیا "چلو باہر نکلو۔" وہ غرایا۔

زریں گل بے تاب ہو کر آگے بڑھا لیکن میں نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ اس موقع پر کشیدگی بڑھانا ٹھیک نہیں تھا۔

منیجر غرایا "جاؤ کام کرو اپنا..... اگر بات کرنی ہے تو اپنے کسی بڑے افسر کو لے کر آؤ۔"

"میں بھی تمہیں افسر نظر نہیں آ رہا ہوں۔" ایس پی برکت نے بھڑک کر کہا۔

"تیرے جیسے افسروں پر ہم کتے چھوڑتے ہیں۔" منیجر نے برکت سے بھی زیادہ بلند آواز میں کہا۔

جونہی فیجر بلند آواز سے بولا مسلح گارڈز نے ایس پی برکت کی طرف بڑھنا چاہا لیکن فیجر نے انہیں روک لیا اور لال کوٹھی کا پھاٹک دھماکے سے بند کر دیا۔

معاملہ سنگین ہو رہا تھا۔ میں نے مقامی تھانے دار اور ایس پی برکت سے مشورہ کیا۔ فیصلہ ہوا کہ موقع پر موجود تمام نفری کو لال کوٹھی کے اردگرد پھیلا دیا جائے تاکہ کسی کے بھاگ نکلنے کا چانس کم ہو سکے۔

پورے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی تھی اور لوگ چھتوں پر کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ یہ لال کوٹھی ان گنت برسوں سے نت نئی کہانیوں کو جنم دے رہی تھی' آج ایک اور کہانی کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ساہی صاحب بھی لاہور سے پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ پولیس کے دو درجن باوردی اور سادہ پوش افراد موجود تھے۔ اب رات کے آٹھ بج چکے تھے اور گاؤں کی آبادی ایک سہمی ہوئی تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ میں نے اور ایس پی برکت نے ساہی صاحب کو تمام صورت حال بتائی۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ساہی صاحب زیادہ ذمے داری محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ خود جا کر ایم پی اے کے آدمیوں سے بات کر سکتے ہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ وہ لوگ سخت بدتمیزی سے پیش آئیں گے' اور ساہی صاحب اپنی بے حد تحمل مزاجی کے باوجود معاملہ سنبھال نہیں سکیں گے۔ بہرحال میرے منع کرنے کے باوجود ساہی صاحب مصر رہے۔ میں نے اور ایس پی برکت نے ساتھ جانا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور صرف ایک کانسٹیبل کے ساتھ لال کوٹھی کے گیٹ کی طرف چل دیے۔ ہم قریباً پچاس گز دور سے گیٹ کا منظر دیکھ رہے تھے۔ گیٹ کے اوپر دو بڑے بلب روشن تھے لہٰذا ساری نقل و حرکت صاف نظر آتی تھی۔ ساہی صاحب نے پہلے گیٹ کیپرز سے بات کی پھر منصور خاں کے سخت گیر نیجر کی شکل نظر آئی۔ کافی دیر تک تکرار ہوتی رہی پھر ایک بلند و بالا شخص نظر آیا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہی ایم پی اے منصور خاں ہے۔ وہ ساہی صاحب سے بحث کرنے لگا۔ آواز تو ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی' تاہم ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں طرف سے تکرار ہو رہی ہے۔ پھر یکدم تیز آواز بھی ہم تک پہنچنے لگی۔ یہ آواز یقیناً منصور خاں کی تھی۔ وہ بڑے طمطراق سے بول رہا تھا... آٹھ دس منٹ بعد ساہی صاحب واپس آ گئے۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کے شخص تھے۔ میں پہلی بار انہیں اس قدر جذباتی دیکھ رہا تھا۔ غصے سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا اور ہاتھ پاؤں میں لرزش نمودار ہو گئی تھی۔

"قانون کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ جب اور جیسے چاہا اپنے حق میں استعمال کر لیا..." وہ بڑبڑائے۔

"کیا ہوا ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"بس وہی ہٹ دھرمی... ہم کسی کو اندر نہیں گھسنے دیں گے..."

"پھر جناب! اب کیا کرنا ہے۔" ایس پی برکت نے پوچھا۔

ساہی صاحب کانپتی آواز میں بولے "میں لاہور میں ذرا آئی جی صاحب سے بات کر لوں' پھر دیکھتا ہوں یہ کیسے ہٹ دھرمی نہیں چھوڑتے۔"

ساہی صاحب اعلیٰ افسر سے بات کرنے کے لیے اس سرکاری جیپ کی طرف چلے گئے جو سڑک کے پار سرکنڈوں میں چھپائی گئی تھی۔ اس جیپ میں وائرلیس کا انتظام موجود تھا۔ جب ساہی صاحب وائرلیس کر رہے تھے' میں نے ایس پی برکت سے مشورہ کیا اور ساہی صاحب کے ساتھ آنے والی ساری نفری کو لال کوٹھی کے اردگرد اہم ٹھکانوں پر متعینات کر دیا۔ پولیس اہلکاروں کو ہدایت کر دی گئی کہ اگر کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو وارننگ دینے کے بعد اس کی ٹانگ میں گولی مار دیں۔

ابھی یہ ہدایت جاری ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ مین گیٹ کی طرف سے دو اسکوٹر سوار افراد نے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ گیٹ کے عین سامنے موجود انسپکٹر نے ان افراد کو روکا اور کہا کہ جو کوئی فیصلہ ہونے تک لال کوٹھی سے باہر نہیں جا سکتے۔ تھوڑی سی تکرار ہوئی اور پھر اسکوٹر سوار افراد میں سے ایک نے اپنی چادر کے نیچے سے ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ گولی انسپکٹر کی ران میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ ایک سیکنڈ کے اندر پولیس والوں نے پوزیشنیں سیدھی کر لیں۔ دوسری طرف منصور خاں کے ذاتی گارڈز بھی مرنے مارنے پر آمادہ ہو گئے۔ اسکوٹر سوار تو بھاگ کر واپس لال کوٹھی میں گھس گئے لیکن دونوں طرف سے رائفلوں کے منہ کھل گئے اور تابڑتوڑ فائرنگ ہونے لگی۔ غنیمت تھا کہ دونوں طرف سے فائر کرنے والے محفوظ آڑ میں تھے' دو منٹ کی مسلسل فائرنگ کے باوجود جانی نقصان کی نوبت نہیں آئی۔

اندر سے فائر آنا بند ہو گیا تو پولیس اہلکاروں نے بھی فائرنگ روک دی۔ فائرنگ کی آواز نے پورے گاؤں میں پھیلی ہوئی سنسنی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ لوگوں نے بتیاں بجھا دی تھیں اور گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے تھے... لال کوٹھی کے اندر سے جو مزاحمت ہوئی تھی وہ ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ منصور خاں ضرورت سے زیادہ ہٹ دھرمی اور بھونڈے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایسی جرأت وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون شکن ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب اختیار بھی ہوتے ہیں۔ وہ قانون کو غریب عوام کے لیے استعمال کرتے ہوئے فولادی ڈنڈے کی شکل دے لیتے ہیں لیکن اپنے لیے استعمال کرتے ہوئے موم کی ناک بنا لیتے ہیں اور جدھر چاہیں موڑ لیتے ہیں۔

بہرحال ساہی صاحب بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے اور پھر یہ ان کا کوئی ذاتی معاملہ نہیں تھا' یہ قانون کی سربلندی اور ایک سفاک قاتل کی گرفتاری کا معاملہ تھا۔ ساہی

صاحب نے آ کر بتایا کہ انہوں نے آئی جی صاحب کے علاوہ اعلیٰ حکام سے بھی بات کی ہے۔ مزید براں جگنی کنور صاحب سے بھی ان کی بات ہوئی ہے اور عین ممکن ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے میں جگنی کنور صاحب خود یہاں پہنچ جائیں۔

مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ساہی صاحب نے یقیناً آئی جی صاحب سے ڈائریکٹ ایکشن کی اجازت مانگی ہو گی۔ آئی جی صاحب نے ڈائریکٹ ایکشن کی اجازت نہیں دی تھی۔ اگر انہوں نے اجازت نہیں دی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ لال کوٹھی پر "ریڈ" کا فیصلہ کرنا آئی جی صاحب کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

اگلے دو ڈھائی گھنٹے سخت کشیدگی میں گزرے۔ پھر وائرلیس پر ساہی صاحب کو پیغام موصول ہوا کہ منصور خاں ایک معزز شخص اور اہم سیاسی شخصیت ہے۔ اس کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔ پولیس صرف مفرور مجرم عیسیٰ جان پر نگاہ رکھے۔ لال کوٹھی سے باہر جانے والے اور کسی شخص کو روکا نہ جائے۔

یہ اطلاع یقیناً مایوس کن تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ منصور خاں نے اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلائی ہیں اور کسی اہم سیاسی شخصیت کے فون نے آئی جی صاحب کو رویہ بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہرحال یہی غنیمت تھا کہ عیسیٰ جان کو نظر انداز کر دینے کی ہدایت نہیں کی گئی تھی۔ سابقہ احکامات کے مطابق عیسیٰ جان کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا حکم تھا اور یہ حکم ابھی تک قائم تھا۔

رات پچھلے پہر تین بجے کے لگ بھگ جگنی کنور بھی اپنی شاندار کیڈلک کار میں موضع رنگ والی پہنچ گیا۔ ایک وزارت کے سیکرٹری صاحب اور سرحد کے ایک ڈپٹی کمشنر نے واقعات کی تفصیل سنی پھر ایم پی اے منصور خاں سے مذاکرات کے لیے لال کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ یہ مذاکرات خاصے طویل ثابت ہوئے۔ دن چڑھ گیا اور ایک سنہری دھوپ نے لال کوٹھی سمیت پورے رنگ والی گاؤں کو جگمگا دیا۔ لیکن اس رنگ میں اندیشوں کی تیز بجلیاں بھی کوند رہی تھیں۔ نہ باہر سے کوئی خبر اندر جا رہی تھی اور نہ اندر سے باہر آ رہی ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ منصور خاں اپنے موقف پر اڑا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عیسیٰ جان یہاں موجود نہیں اور اگر ہوتا بھی تو وہ اسے مقامی پولیس کے حوالے نہ کرتا۔ وہ قبائلی ہے اور اس کا فیصلہ قبائلی قانون کے مطابق ہو گا۔

منصور خاں کی منطق نرالی تھی۔ وہ بس اپنے خاندان کی سیاسی طاقت اور اثر و رسوخ پر گھمنڈ کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق عیسیٰ جان کے منصور خان سے کوئی پرانے تعلقات نہیں تھے۔ ڈی سی اسکول کے گھیرے میں آنے کے بعد عیسیٰ جان کو علاقے کے اندر ہی کسی نئی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ یہ پناہ گاہ اسے لال کوٹھی کی شکل میں میسر آ گئی تھی' منصور خاں اس کا بہت بڑا حمایتی بن گیا تھا اور اب عیسیٰ جان کی خاطر خواہ مخواہ تماشا کھڑا کر رہا تھا۔ صبح کے نو بجے تھے کہ دو گاڑیاں موقع پر پہنچیں۔ ان شاندار گاڑیوں پر سبز نمبر پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ گاڑیوں سے اترنے والے بارعب افسران کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ منصور خاں نے پشاور سے کمک منگوائی ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان نئے آنے والوں میں ڈی سی پشاور کے علاوہ پولیس اور انتظامیہ کے چند اہم افسر شامل تھے۔ یہ لوگ پشاور سے بائی ائیر آئے تھے اور لاہور ائیرپورٹ سے سرکاری کاروں پر یہاں پہنچے تھے۔ ان کے چہروں پر کشیدگی کے آثار دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ طول پکڑ گیا ہے۔ کوئی فریق بھی اپنے موقف سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

مذاکرات کے اس نئے دور میں شرکت کے لیے ساہی صاحب کو بھی لال کوٹھی میں بلا لیا گیا۔ دو تین دن کی سردی کے بعد یہ سنہری دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ لال کوٹھی سے آنے والوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ گفت و شنید لال کوٹھی کی چھت پر ہو رہی ہے۔ دھوپ میں کرسیاں بچھائی گئی ہیں اور چائے وغیرہ کا دور چل رہا ہے۔ تاہم ماحول سخت کشیدہ ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اے ایس آئی آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ ساہی صاحب نے مجھے اندر بلوایا ہے۔ میں اس حکم پر لال کوٹھی میں داخل ہوا۔ برآمدے میں واقع طویل زینے چڑھ کر ہم لال کوٹھی کی وسیع و عریض چھت پر آ گئے۔ یہ چھت نہیں تھی بلکہ چھوٹی بڑی چھتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ یہاں بہت سی برجیاں

ایم۔ اے راحت کے قلم سے ایک نیا دھماکہ خیز ناول

عصر حاضر کی عکاسی

سرفروش

دو جلدوں میں مکمل

یکسر انداز کی داستان جس کا مرکزی کردار جنون کے ... سے ... ہو گا

مصنف نے ... عکاسی کی ہے ...

جرم و سزا کی ایسی داستان جو معاشرے کی کمزور روایات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

☆ ☆

اپنے قریبی بک اسٹال سے خریدیں یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں

قیمت - مکمل سیٹ ۳۲ روپے ——— ڈاک خرچ ۱۵/- روپے

فرم یا ایجنسی پیشگی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ معاف

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰ - عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ——— فون: ۷۲۳۴۱۳

چمنیاں اور روشندان نظر آ رہی تھیں۔ ایک ایسی ہی وسیع برساتی کے قریب بہت سی کرسیوں پر اعلیٰ افسران براجمان تھے اور دھواں دھار گفتگو کر رہے تھے۔ مسلح سپاہی اور لال کوٹھی کے خادم ان افسران کے عقب میں مؤدب کھڑے تھے.... میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ان حضرات میں عیسیٰ جان بھی موجود تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک مجسم تخمینہ شخص کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ پینتالیس پچاس سال کا یہ بارعب شخص یقیناً منصور خاں تھا۔ کہنے کو تو وہ صرف ایم پی اے تھا لیکن اپنے علاقے کی سیاست میں اس کی جڑیں بہت مضبوط اور گہری نظر آتی تھیں۔ عیسیٰ جان کو یوں سر عام دیکھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا۔ عیسیٰ اب اپنے اصلی روپ میں تھا۔ وہ ڈی سبز میک اپ اور مصنوعی دراز مونچھوں کے بغیر اس کا چہرہ بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مجھے سرحد سے آنے والے ڈی سی صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کڑے لہجے میں مجھ سے چند سوالات کیے۔ انداز وہی تھا جو ملزم پر مخالف وکیل کی جرح کا ہوتا ہے۔ عیسیٰ جان کو میں نے روحانی شفا خانے میں کب دیکھا تھا؟ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ عیسیٰ جان ہی تھا؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ سلاتی کرحاتی اسکول میں نظر آنے والا بھی عیسیٰ جان ہی تھا؟

میں نے ناپ تول کر پوری احتیاط سے ان سوالات کے جواب دیے۔ ڈی سی صاحب اور منصور خاں نے ذیلی سوال شروع کر دیے۔ جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ یہ لوگ اس بات کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کر رہے کہ پچھلے چار ماہ کے دوران میں عیسیٰ جان نے اپنا "مبارک قدم" پاکستان میں رکھا ہے۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ جس شخص کو قلندر سیاہ پوش کہا جا رہا ہے اور جو مقامی پولیس کو مطلوب ہے وہ کوئی اور شخص ہے۔ عیسیٰ جان تو صرف دوران چشتر آزاد علاقے سے پنجاب میں آیا ہے' اور چونکہ اس کے خلاف جو بھی مقدمات ہیں وہ سرحد میں ہیں لہٰذا اس امر کا کوئی جواز موجود نہیں کہ مقامی پولیس عیسیٰ جان کو گرفتار کرے۔

مجتبیٰ کنور اور مقامی پولیس افسران کا مؤقف یہ تھا کہ یہی تو فیصلہ کرنا ہے کہ قلندر سیاہ پوش اور عیسیٰ جان ایک ہی شخص کے دو نام تھے یا نہیں؟ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ عیسیٰ جان کو گرفتار کر کے تفتیش کی جائے۔

اس مؤقف کی مخالفت میں منصور خاں نے تین چار قانونی نکتے ابھار رکھے تھے۔ وہاں ہونے والی گفتگو کو سن کر میں نے محسوس کیا کہ عیسیٰ جان کی گرفتاری میں ایک دو قانونی رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ سرکاری طور پر دو روز تعطیل تھی۔ عدالتیں بھی بند تھیں۔ وارنٹ گرفتاری جاری کرانا بہت دشوار تھا اور اگر وارنٹ جاری ہو بھی جاتا تو چوبیس گھنٹے کے اندر ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ عدالتیں بند ہونے کی وجہ سے ملزم کو پیش کیا جا سکتا تھا اور نہ ریمانڈ کی درخواست دی جا سکتی تھی..... بہرحال ان نکات سے

کہیں زیادہ اہم وہ اثر و رسوخ اور دباؤ تھا جو منصور خاں مقامی انتظامیہ پر ڈال رہا تھا اور اوپر سے بھی ڈلوا چکا تھا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ فی الحال عیسیٰ جان پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکے گا۔ اس کی قسمت ایک بار پھر اس کی یاوری کر رہی تھی۔ مجھے اپنے سینے پر ایک بار پھر پتھر رکھنا تھا..... لیکن کب تک؟ اب یہ بوجھ میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دن کا چین اور راتوں کا آرام عیسیٰ جان کی موت سے مشروط ہو چکا تھا۔ میری نگاہ عیسیٰ جان سے ملی۔ اس کی آنکھوں میں ناز دلانے والی حیوانی چمک تھی۔ وہ بے زبان خاموشی کہہ رہا تھا "تو شکاری نہیں شکار ہے اور شکار بے بس ہوتا ہے۔ یہ شکاری کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ کب اور کہاں اپنے شکار کو دبوچے گا۔ ابھی تجھے دبوچنے کا موقع نہیں آیا۔ جا ابھی چند دن اور آزاد پھر لے۔ میں بہت جلد اپنے قانونی بندھن توڑ کر پھر نکلوں گا اور کسی تاریک رات کو کسی جانے پہچانے شہر کے جانے پہچانے گلی کوچے میں تجھے آ پکڑوں گا۔ تجھے اسی سزا کے عمل سے گزارنے کے لیے جسے کھبائی کہتے ہیں۔ جس میں شہد کی مکھیاں گنگناتی ہیں اور برہنہ جسم رقص کرتا ہے۔"

اعلیٰ افسران کی پیچیدہ گفتگو پندرہ بیس منٹ مزید جاری رہی۔ مجتبیٰ کنور' سیکرٹری صاحب اور ساہی صاحب کے چہروں پر پسپائی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں چند اہلکاروں کے ساتھ کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا تھا لہٰذا یہ گفتگو وضاحت سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر سب حضرات چہروں پر دبی دبی کشیدگی لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ رسمی مصافحے کیے گئے۔ مجتبیٰ کنور دھیمے قدموں سے چلتا میرے پاس آیا۔ وہ حسب معمول نہایت نفیس سوٹ میں تھا۔ پاؤں میں اسپورٹس جوتے انگارے مار رہے تھے۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے لہجے میں بولا "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں جوان! ہم اس قاتل کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ میں پرسوں اپنے وکیلوں سے مشورہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ اس کے گرد جلد سے جلد گھیرا کیسے تنگ کیا جا سکتا ہے۔ منصور خاں اسے پشاور تو لے جا سکتا ہے لیکن اس کی گردن دو فٹ لمبی ہونے سے نہیں بچا سکتا۔"

ایک چھوٹی سی برجی کے پاس منصور خاں کھڑا تھا۔ اس کے آس پاس مسلح گارڈز تھے۔ اس برجی میں ہلکے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ دراصل یہ ایک طرح کا روشن دان تھا جو لال کوٹھی کی تاریکی کو چھت کے راستے روشنی فراہم کرتا تھا۔ اس قسم کی برجیاں چھت پر اور بھی کئی جگہ موجود تھیں۔ میں نے عیسیٰ جان کو دیکھا' اس نے منصور خاں کی طرف جھک کر کوئی بات کہی۔ دونوں ہولے سے مسکرا دیے۔ پھر عیسیٰ کی یہ مسکراتی ہوئی نظریں مجھ سے ٹکرائیں۔ نواب زادی شاہین کا قاتل مسکرا رہا تھا' میری آنکھوں کے سامنے تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کے گرد مسلح گارڈز تھے اور اس کی خیر خواہی کرنے والے اعلیٰ افسران تھے۔ عیسیٰ جان کی مسکراہٹ نے اچانک میرے اندر ایک چنگاری کو بھڑکا دیا۔ شعلہ

بنا دیا۔ پھر یہ شعلہ بلا کی رفتار سے پھیلا اور میرے پورے جسم کو آتش فشاں بنا گیا۔ ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں میں ہر اندیشے اور مصلحت سے بیگانہ ہو گیا۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور کیوں کھڑا ہوں۔ سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ منصور خاں' ڈی سی پشاور' سیکرٹری صاحب' مسلح گارڈز' ان کی عقابی نظریں اور مہلک رائفلیں۔ سب کچھ ایک سرخ چادر کے پیچھے دھندلا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مجتبیٰ کنور اور ساہی صاحب کے چہرے بھی جو واپس جاتے جاتے ٹھٹک گئے تھے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے صرف عیسیٰ جان نظر آ رہا تھا اور اس کی منحوس مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے تقریباً دس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے یہ دس قدم کیسے اور کب طے کیے۔ صرف اتنا یاد ہے کہ مسلح گارڈز کو چیر کر میں نے عیسیٰ جان پر جست لگائی تھی اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا شیشے کی برجی پر گرا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق شیشے ٹوٹ گئے تھے اور میں عیسیٰ جان کے ساتھ ہوا میں تیرتا ہوا تقریباً بیس فٹ نیچے لال کوٹھی کی ایک نیم تاریک راہداری میں گرا تھا۔ یہ لال کوٹھی کا نچلا اور غیر آباد حصہ تھا۔ یہاں کچھ حصوں میں ابھی تک سیلابی پانی' کیچڑ اور گارا موجود تھی۔ میں اور عیسیٰ جان اس سڑی ہوئی کیچڑ میں گرے تھے۔ پھر میرا ہاتھ میکانکی انداز میں اپنی پنڈلی تک گیا تھا اور رام پوری خنجر میرے ہاتھ میں آ گیا تھا..... میں نے پہلا وار عیسیٰ جان کے پیٹ میں کیا۔ خنجر دستے تک اندر گیا۔ میں نے اسے اوپر کی طرف کھینچا اور تقریباً ایک فٹ تک عیسیٰ جان کا پیٹ چاک کر دیا۔ عیسیٰ جان بھیانک آواز میں چلایا اور مچھلی کی طرح تڑپ کر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی آنتیں لٹک رہی تھیں۔ میں نے اسے آنتیں سنبھال کر راہداری کے خم کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اوپر ٹوٹی ہوئی برجی میں سے گارڈز اور سپاہیوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گارڈز اور سپاہی آپس میں گتھم گتھا ہو گئے ہیں..... چند قدم دوڑ کر عیسیٰ جان کیچڑ میں پھسلا' میں نے اسے پھر دبوچ لیا۔ میری ہر سوچ ایک ساعت شکن شور میں دب چکی تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ میں نے آج عیسیٰ جان کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں میرے خنجر نے عیسیٰ جان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس کے جسم سے گرم خون کے فوارے پھوٹ نکلے تھے۔ عیسیٰ جان کی آخری چند چیخیں بڑی بھیانک تھیں۔ اچانک میرے دل نے گواہی دی کہ عیسیٰ جان موت کے طرف روانہ ہو چکا ہے۔ یہی وقت تھا جب مجھے کسی قریبی راہداری میں بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں میری طرف آ رہی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی برجی میں سے ساہی صاحب کی بلند آواز سنائی دی "بھاگ جاؤ شاہ جہاں..... بھاگ جاؤ۔"

میرے سامنے لال کوٹھی کی وہ راہداریاں تھیں جو بھول بھلیوں سے زیادہ پیچیدہ اور طویل تھیں۔

خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا' میں نے اسے ہاتھ میں ہی رہنے دیا اور ناک کی سیدھ میں بھاگتا چلا گیا۔ میرا لباس اور جسم کیچڑ میں لتھڑ چکا تھا۔ یقیناً لباس اور جسم پر عیسیٰ جان کے منحوس خون کے چھینٹے بھی موجود تھے۔ جس راہداری میں میں بھاگ رہا تھا وہ تیس چالیس گز آگے جا کر تین راہداریوں میں تقسیم ہو گئی۔ یعنی اب میں ایک سہ راہے پر تھا اور مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ کس راہ پر جانا ہے۔ یہ بات میں صاف طور پر محسوس کر چکا تھا کہ منصور خاں کے مسلح گارڈز بلا کی رفتار سے میرے پیچھے آ رہے ہیں اور کسی بھی لمحے میں ان کی رائفلوں کی زد میں آ جاؤں گا۔ یقینی بات تھی کہ عیسیٰ جان جہنم واصل ہو چکا ہے۔ اس کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے محافظوں کا گھیرا توڑ کر عیسیٰ جان کو دبوچا تھا اور سب کے سامنے اس کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ اب منصور خاں کے محافظ میرے ساتھ جو بھی کر گزرتے کم تھا۔ میرے پاس ریوالور موجود تھا لیکن یہ ریوالور درجنوں رائفلوں کا مقابلہ کب تک کر سکتا تھا۔ لہٰذا میری کامیابی اسی میں تھی کہ منصور خاں کے گارڈز سے میرا سامنا نہ ہو۔

میں نے بس یونہی اندازے سے دائیں طرف والی راہداری منتخب کی اور اس میں دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں کیچڑ نہیں تھی۔ کسی روزن سے ہلکی ہلکی روشنی بھی اس راہداری میں داخل ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پیچھے بھاگنے والے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ میں ان کے قدموں کی گونج اور زور زور سے بولنے کی آوازیں صاف سن رہا تھا۔ وہ قبائلی زبان میں گالیاں دے رہے تھے اور للکارے مار رہے تھے۔ پھر مجھ پر پہلا فائر ہوا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے خود کو فرش پر گرایا' قمیص کے نیچے سے اپنا ریوالور کھینچا اور پلٹ کر دو فائر اپنے عقب میں کیے۔ دو سائے لپک کر کسی چیز کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے پیٹ کے بل رینگ کر خود کو راہداری کے خم تک پہنچایا اور دیوار کی اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ گارڈز کی طرف سے تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی تھی۔ میں نے بھی جواب میں تین چار فائر کیے۔ دھماکوں سے قدیم حویلی کے در و دیوار گونج اٹھے اور یوں لگا کہ تاریک گوشوں میں برسوں سے خوابیدہ بد روحیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ہیں اور چیخ دھاڑ مچانے لگی ہیں۔ یہ بڑی خوفناک صورت حال تھی۔ یہ راہداریاں میرے لیے موت کا جال بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ امید کی صرف یہی کرن تھی کہ مجتبیٰ کنور کی ہدایت پر پولیس اہلکار منصور خاں کے گارڈز کو روکنے کی کوشش کریں گے لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس اور مسلح محافظوں کے درمیان خونریز تصادم ہو جاتا۔ ایسے واقعات اکثر رونما ہو جاتے ہیں۔ خاص طور سے جب مزاحمت کرنے والی پولیس تعداد میں زیادہ نہ ہو تو مسلح گارڈز حق نمک ادا کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اگر مسلح تصادم کی نوبت آتی تو بہت نقصان ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے پولیس ملازمین یا محافظین کی

جانوں کو خطرہ لاحق ہو۔ وہ دونوں تنخواہ دار لوگ تھے۔ آپس میں ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ مجھ سے بھی ان کی کوئی دشمنی یا دوستی نہیں تھی پھر میری وجہ سے وہ کیوں ایک دوسرے کا خون کرتے۔ میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا لیکن کیسے۔ میرے چاروں طرف راہداریوں کا جال تھا۔ چھوٹے چھوٹے دالان' غلام گردشیں تھیں' ایسی بھول بھلیاں تھیں جن میں چلنے والا گھوم پھر کر پھر وہیں آجاتا تھا جہاں سے چلتا تھا۔ نہ جانے بنانے والوں نے اس لال کوٹھی کو کیا بنایا تھا۔

میں نے ریوالور میں دوبارہ گولیاں بھریں اور اکا دکا فائر کرتا ہوا پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ اچانک ایک سایہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے ہاتھ مار کر میرا ریوالور گرانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اپنے ہاتھ پر اس کے فولادی ہاتھ کی چوٹ کھا کر میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور گھما کر پوری طاقت سے راہداری کی دیوار کے ساتھ دے مارا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے رونما ہوا تھا کہ حملہ آور گارڈ معمولی سی مزاحمت بھی نہ کر سکا تھا۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ آگے کی طرف جھکا تو میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اس دوسری راہداری کے سامنے جا گرا جہاں مسلح گارڈز موجود تھے۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھے اور پہچانے بغیر اس پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا بے حرکت جسم فرش پر اچھلا اور اس کے گرد چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ میں پلٹ کر دوڑا۔ بغلی راہداری سے ایک اور قبائلی دوڑتا ہوا سامنے آیا۔ میں اس پر فائر کر سکتا تھا لیکن اسے خالی ہاتھ دیکھ کر میں نے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی اور پھر "راؤنڈ پنچ" کے انداز میں اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ایک تاریک گوشے میں گرا۔

مسلح محافظ اب راہداری کے خم تک پہنچ چکے تھے۔ میں کسی بھی لمحے پھر ان کی زد میں آنے والا تھا۔ میں پلٹا اور ایک بار پھر اندھا دھند بھاگنے لگا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کس رخ پر جا رہا ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ میں لال کوٹھی کے شمال کی طرف بڑھ رہا ہوں لیکن سرخ پتھر کی ایک جانی پہچانی نشست دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میرا رخ مشرق کی طرف ہے۔ مسلح گارڈز اور سپاہیوں کی آوازیں کبھی دور ہو جاتی تھیں۔ کبھی نزدیک آجاتی تھیں۔ وہ جیسے پوری لال کوٹھی میں پھیلے ہوئے تھے اور مجھے ڈھونڈ رہے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ میں خود بھی اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی کھڑکی یا جھروکا نظر آئے تاکہ میں اپنی سمت کا تعین کر سکوں لیکن بے در دیواروں کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک بار پھر کسی کیچڑ زدہ راہداری میں تھا۔ ایک دم میں لرز گیا۔ مجھے اپنے سامنے عیسیٰ جان کی لاش نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے دماغ گھوم گیا۔ کیا یہ لاش اڑ کر میرے راستے میں آگئی

تھی؟ لیکن نہیں۔ یہ تو وہی جگہ تھی جہاں میں نے عیسیٰ جان کو خنجر گھونپے تھے۔ اوپر چھت پر شیشے کی ٹوٹی ہوئی بتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کیچڑ میں خون کے لوتھڑے تھے اور شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ عیسیٰ جان کا منہ خوفناک انداز میں کھلا تھا اور بے نور آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ اوپر چھت سے مختلف آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سارا منظر ایک لمحے کے لیے میری نگاہ میں چمکا اور میں یہ سوچ کر لرز گیا کہ میں پھر جائے واردات کے قریب کھڑا ہوں۔ اگلے ہی لمحے میں تیزی سے ایک بغلی راہداری میں گھس گیا۔

یہ جو کچھ ہوا تھا سب ان بھول بھلیوں کا کرشمہ تھا جو اس لال کوٹھی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں بالکل ایک جیسی راہداریوں میں دوڑتا ہوا پھر اسی مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے دوڑنا شروع ہوا تھا۔ بلکہ میرے خیال میں تین چار منٹ پہلے جو قبائلی گارڈ اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک ہوا اس کی موت کا سبب بھی یہی بھول بھلیاں بنی تھیں۔ مسلح گارڈز تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی ساتھی یوں اچانک سامنے سے نمودار ہو جائے گا۔

میں بغلی راہداری میں چند قدم ہی بھاگا تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ یہ نوری کی آواز تھی۔ نوری میرے جیل کے ساتھی کرم دین کی بیوی تھی اور کرم دین اس کوٹھی میں ملازم تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' نوری ایک دروازے میں سے نکلی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور کھینچ کر دروازے کے اندر کر لیا۔ یہ کوئی اسٹور روم قسم کا کمرا تھا۔ نوری نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ کمرے کے روزن میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میری طرح نوری بھی بری طرح ہانپی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ بھی بھاگتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ اسٹور روم میں بہت سا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ سیلابی پانی میں ضائع ہو جانے والی دیواری پینٹنگز' جھاڑ فانوس' تباہ حال قالین اور آرائش کی دیگر اشیا۔

"ادھر آئیں صاحب جی۔" نوری میرا بازو پکڑ کر لرزتی آواز میں بولی۔

سامنے ہی ایک تہ خانے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ تقریباً تین فٹ چوڑی سیڑھیاں اسٹور روم سے شروع ہو کر گہری تاریکی میں اوجھل ہو رہی تھیں۔ نوری مجھے لے کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ خوف اور گھبراہٹ کے سبب اس کا سارا جسم ڈول رہا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک دراز قد عورت تھی۔ شکل معمولی تھی لیکن ڈیل ڈول اچھا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ وہ مجھے اس تہ خانے میں چھپانے جا رہی ہے لیکن چند لمحے بعد یہ اندازہ غلط نکلا۔ ہم تہ خانے میں اترے ضرور مگر وہاں ٹھہرے نہیں۔ لال کوٹھی کے بہت سے تہ خانوں کی طرح اس تہ خانے میں بھی ایک بغلی دروازہ موجود تھا۔ اس دروازے سے گزر کر ہم ایک اور تہ خانے میں آگئے اور سیڑھیاں طے کر کے پھر ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ یہ راہداری

مجھے کچھ جانی پہچانی نظر آئی۔ یہاں قبائلی محافظوں کی آوازیں بھی نہیں پہنچ رہی تھیں۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں اس راہداری میں سے پہلے بھی گزر چکا ہوں۔ ایک مرتبہ زریں گل مجھے یہاں لایا تھا۔ ہم اس راہداری سے گزر کر لال کوٹھی کے عقبی باغ میں پہنچے تھے اور وہاں ان انجکشنز کے کارٹن دیکھے تھے جو بعد میں جعلی ثابت ہوئے تھے۔ اس راہداری میں تیس چالیس قدم بھاگنے کے بعد ہم ایک دروازے سے باہر نکل آئے۔ میں نے خود کو لال کوٹھی کے عقبی باغ میں پایا۔ ایک لمحے کے لیے تو یقین نہیں آیا کہ میں واقعی لال کوٹھی کی جان لیوا بھول بھلیوں سے نکل چکا ہوں۔ نوری لرزتی آواز میں بولی "یہاں سے بھاگ جائیے صاحب جی۔ وہ دیکھیے سامنے دیوار کے ساتھ بجری کا ڈھیر لگا ہے۔ اس پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگا دیں۔"

نوری کی تجویز قابل عمل تھی۔ اگر میں بیرونی دیوار تک بیس تیس گز کا فاصلہ بحفاظت طے کر لیتا تو بجری پر چڑھ کر باہر کود سکتا تھا۔ میں بیرونی دیوار کی طرف قدم بڑھانے ہی والا تھا' جب اچانک ٹھٹک گیا۔ مجھے چوکیداروں کی شکل نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک قبائلی گارڈ بھی تھا۔ وہ دونوں ایک دیوار کی اوٹ سے بھاگتے ہوئے نکلے تھے۔ یقیناً میری ہی تلاش میں تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اور نوری کو باغ کے کنارے کھڑے دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ قبائلی گارڈ یا چوکیداروں کی رائفل سیدھی ہوتی' میں نے اوپر تلے دو فائر کیے۔ ایک گولی قبائلی گارڈ کے پیٹ میں لگی۔ وہ کراہ کر روش پر اوندھا ہو گیا۔ دہاوں تڑپ کر دیوار کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ مجھے اس کی بلند آواز سنائی دی۔ وہ بھاگتا ہوا برج کی طرف جا رہا تھا اور دیگر پہرے داروں کو پکار رہا تھا۔ بھاگنے کے لیے یہ موقع بہترین تھا۔ نوری نے کہا "بھاگ جائیں صاحب جی۔"

میں نے کہا "میری آنکھوں میں کیچڑ ہے' مجھے ٹھیک سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے درختوں میں بھگاتی ہوئی دیوار کی طرف لے چلی۔ یہ حقیقت ہے کہ عیسیٰ جان سے لڑائی کے دوران میں میرا چہرہ کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ یہ کیچڑ آنکھوں میں ہی نہیں' ناک منہ اور کانوں میں بھی گھس چکی تھی لیکن یہ بات غلط تھی کہ اس کیچڑ کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ غلط بیانی میں نے ایک خاص مقصد سے کی تھی۔

جونہی میں اور نوری دوڑتے ہوئے بجری کے ڈھیر تک پہنچے' میں نے نوری سے کہا "چلو آؤ' تم بھی آؤ۔"

"م.... میں۔" وہ ہکلائی "میں کیوں آؤں؟"

"یہ لوگ اب تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ تم نے بھاگنے میں میری مدد کی ہے۔" میں نے انکشاف کیا۔

"ک.... کس نے دیکھا ہے؟" نوری نے پوچھا۔ اس کا چہرہ تاریک تر ہو گیا تھا۔

"چوکیداروں نے۔" میں نے کہا اور نوری کو کھینچتا ہوا دیوار تک لے آیا۔

وہ شدید تذبذب میں تھی۔ ان لمحوں میں اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میں نے نہ صرف خود دیوار پھلانگی بلکہ نوری کو بھی پلک جھپکتے میں دوسری طرف اتار لیا۔

یہی وقت تھا جب لال کوٹھی کا عقبی باغ دوڑتے قدموں اور چیخ پکار کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ رکھوالی کے کتے بھی زور و شور سے بھونکنے لگے۔ منصور خاں کے گارڈز بھوکے بھیڑیوں کی طرح باغ کی طرف لپکے تھے.... لیکن ان کی بھاگ دوڑ کی آوازوں سے ایک حوصلہ افزا نتیجہ بھی نکل رہا تھا۔ ان لوگوں کے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہم باغ پار کر کے کوٹھی سے باہر نکل چکے ہیں۔ دیوار سے آگے دس پندرہ فٹ کا کچا راستہ تھا اور پھر کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ یہ گنے کے کھیت تھے۔ میں اور نوری کسی کی نگاہ میں آئے بغیر ان کھیتوں میں گھس گئے۔ نوری بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ زرد اور پسینے سے شرابور نظر آتا تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔ ہم کیا کریں گے۔" وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

"گھبراؤ نہیں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر کرم دین کا کیا ہو گا؟" وہ کراہی۔ شوہر کے خیال نے اسے تڑپا دیا تھا "نہیں میں واپس جاؤں گی۔" اس نے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔

"پاگل مت بنو۔" میں نے اسے ڈانٹا "جو کچھ تم کر چکی ہو اس کے بعد تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے اسے کھینچا اور کھیت میں بڑی احتیاط کے ساتھ چلتا مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔ کھیت میں اس طرح چلنا کہ باہر والوں کو خبر نہ ہو سکے' بڑا جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔ جونہی پودے سرسراتے ہیں' بندہ پکڑا جاتا ہے لیکن ہم بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں منصور خاں کے گارڈز اور لال کوٹھی کے پہرے دار ہمارے تعاقب میں باہر نکلنے والے تھے۔ گنے کا کھیت کافی دور تک چلا گیا تھا۔ ہم اندر ہی اندر چلتے تقریباً ایک فرلانگ دور نکل گئے۔ یہاں سے ایک چوڑے پاٹ کا برساتی نالا گزرتا تھا۔ نالے کی دونوں طرف سرکنڈے کے بلند و بالا پودے لہلہا رہے تھے۔ یہ سرکنڈے ہمارے لیے بہترین آڑ فراہم کر سکتے تھے۔ ہم سرکنڈوں کے پیچھے ہی پیچھے جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ جوں جوں لال کوٹھی سے ہمارا فاصلہ بڑھ رہا تھا خطرے کا احساس کم ہو رہا تھا۔ ایک جگہ نالے کے کنارے صاف پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ میں نے یہاں بیٹھ کر اپنی کیچڑ آلود قمیص اتاری اور اسے اچھی طرح پانی میں دھویا۔ شلوار اور جوتوں کو بھی حتی

الامکان کیچڑ سے صاف کیا۔ سر منہ اچھی طرح دھونے کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ کسی کو اپنی صورت دکھا سکوں۔ قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور اس پر عینی جان کے لہو کے چھینٹے بھی تھے۔ نوری کے سر پر دوپٹے کے علاوہ گرم چادر بھی تھی۔ اس نے یہ چادر مجھے دے دی اور میں نے کندھوں سے لپیٹ لی۔

تھوڑا آگے جا کر ایک دیہاتی تانگا بان نے ہمیں سوار کرا لیا۔ نہایت ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتے ہوئے ہم نے قریباً ایک میل فاصلہ طے کیا پھر تانگے سے اتر گئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نوری کی طرح یہ تانگا بان بھی میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ ویسے بھی تانگا بان کی منزل آ گئی تھی اور اگر وہ ہمیں مزید آگے لے جاتا تو اسے واپسی کا کشٹ بھی اٹھانا پڑتا۔

ہمارا تانگے سے اترنا بہتر ثابت ہوا لیکن یہ بہتری ہمارے لیے نہیں تانگا بان کے لیے تھی کیونکہ اگر تانگا بان ہمارے ساتھ ہوتا تو ہماری طرح وہ بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ تانگے سے اتر کر ہم نے جوار کے ایک کھیت کی طرف چند قدم ہی طے کیے تھے کہ اچانک ایک فیاٹ کار دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ نیلے رنگ کی یہ کار میں لال کوٹھی کے پورچ میں کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ کار دھول اڑاتی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اور نوری واپس درختوں میں گھس گئے لیکن ایک ہی لمحے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کار والے ہمیں دیکھ چکے ہیں اور اب ان درختوں میں خود کو چھپا لینا ایسے ہی ہے جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر کا آنکھیں بند کرنا۔ میں نے نوری کو لیا اور ایک بار پھر خود رو جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں دوڑنا شروع کر دیا۔

میرا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ نیلی فیاٹ میں موجود افراد دن کی روشنی میں ہمیں صاف دیکھ چکے تھے۔ میں نے اپنے عقب میں کار کے انجن کا شور سنا۔ وہ ہمارے پیچھے لپک رہی تھی۔ ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے درخت گھنے اور راستہ دشوار ہو رہا تھا۔ یہ بات حوصلہ افزا تھی۔ کار والے ہمارا تعاقب جاری نہیں رکھ سکتے تھے اگر وہ تعاقب جاری رکھنا چاہتے تو انہیں کار سے اترنا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کار کا انجن خاموش ہو گیا اور چیخ و پکار کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ پاپیادہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔

میں تو ابھی بھاگ دوڑ کا عادی تھا لیکن نوری کا برا حال ہو رہا تھا۔ خوف کے سبب اس کا چہرہ زرد تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کی جوتی اتر چلی تھی اور پاؤں الٹے سیدھے پڑ رہے تھے۔ شاید وہ دل ہی دل میں پچھتانے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس نے میری مدد کر کے خود کو مصیبت میں ڈالا۔ ایک جگہ وہ بالکل ہانپ گئی اور ملتجی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "بس تھوڑی دور اور۔۔۔ وہ سرکنڈے دیکھ رہی ہو۔ وہ ندی نالے سے

سرکنڈے ہیں۔"

اس نے ایک بار پھر ہمت جمع کی اور میرے ساتھ بھاگنے لگی۔ جوں جوں ہم نشیب کی طرف بڑھ رہے تھے زمین دلدلی ہوتی جا رہی تھی۔ فضا میں مردار مچھلیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ وہ سیلابی پانی تھا جو چند ہفتے پہلے نشیبی مقامات پر جمع ہوا تھا۔ اب یہ خشک ہو گیا تھا مگر دلدل ابھی باقی تھی۔ سرکنڈوں تک پہنچتے پہنچتے ہم کمر کمر سرد پانی میں ڈوب چکے تھے۔

"ہائے میں مر گئی۔" نوری ایک جگہ رکتے ہوئے بولی "مجھ سے اور نہیں چلا جاتا۔"

میں نے کہا "اب چلنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے یہیں پہنچنا تھا۔" میں نے ریوالور کی گولیاں رومال میں لپیٹ کر گردن سے باندھ لی تھیں تاکہ بھیگنے سے محفوظ رہیں۔ کوشش کر کے میں ریوالور کو بھی بھیگنے سے بچائے ہوئے تھا۔ یہاں سرکنڈے بے حد گھنے تھے۔ میں اور نوری ان سرکنڈوں میں بڑے اچھے طریقے سے کیموفلاج ہو سکتے تھے۔

اگلے تین چار گھنٹے ہم دونوں کے لیے ایک بھیانک خواب کی طرح تھے۔ نامعلوم افراد ہمارے اردگرد موجود تھے اور پوری تندہی سے ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ ایک دو بار تو وہ اتنے قریب پہنچ گئے کہ ہمیں ان کی باتیں اور پانی میں چلنے کی آواز صاف سنائی دی۔ یہ وہ لمحے تھے جب نوری خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگی اور خوف زدہ سسکیاں اس کے ہونٹوں پر مچل گئیں۔ میں نے اسے بمشکل قابو میں رکھا ورنہ شاید وہ جنونی انداز میں چلا ہی اٹھتی۔ شدید اعصابی تناؤ میں سرد پانی کے اندر یوں چار پانچ گھنٹے بے حرکت کھڑے رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ خاص طور سے نوری کا برا حال تھا۔ شروع میں تو وہ میرا سہارا لینے سے کتراتی رہی لیکن جب اس کا زیریں دھڑ اکڑ گیا اور وہ ڈگمگانے لگی تو میں نے از خود اسے سہارا دیا۔ کسی وقت اپنی ٹانگوں کو آرام دینے کے لیے ہم خود کو سینے تک پانی میں ڈبو لیتے۔ ایسے میں ٹانگوں پر بوجھ کم ہو جاتا۔ ہم پاؤں کو آہستہ آہستہ پانی کے نیچے ہلاتے اور اپنے منجمد جوڑوں کو چالو کرنے کی کوشش کرتے۔ غلیظ پانی میں حشرات الارض اور مینڈک وغیرہ بھی "بافراط" موجود تھے۔ یہ جاندار نوری کے لیے سخت خوف و ہراس کا باعث تھے۔

میرے ذہن میں وہ وہ کر دور منظر کوند رہا تھا۔ جب میں نے عینی جان پر جست کی تھی اور اسے لے کر تاریک راہداری میں گرا تھا۔ میرے ہاتھ نے عینی جان کے پیٹ میں خنجر اتارتے ہوئے جو راحت محسوس کی تھی وہ ابھی تک میرے بازو میں لرزیاں لے رہی تھی۔ عینی جان کی آخری چیخیں میرے کانوں میں دلنشیں نغمے کی طرح گونج رہی تھیں۔ یہ نغمہ اس دکھ کا اثر زائل کر رہا تھا جو کئی ماہ سے میرے سینے میں بپا تھی۔ نوابزادی شاہین کے زخم دیکھ کر جو آتش انتقام میرے سینے میں بھڑکی تھی اس کو عینی جان کے خون

کے چھینٹوں نے آج سرد کر دیا تھا۔ آج میں نے زونے مشت کے اس آسیب کو فنا کر دیا تھا جس نے ان گنت زندگیاں برباد کی تھیں اور بے شمار لوگوں کو اپنی وحشت تلے روندا تھا۔ آج وہ شکاری خود شکار ہو گیا تھا جو خوب صورت عورتوں پر اپنی عیاری کی مچان سے ہوس کا تیر چلاتا تھا اور انہیں تڑپتے دیکھ کر خوشی سے نہال ہوتا تھا۔ آج راحت کا آپی سلامی اسکول ایک وحشی کے خوف سے آزاد ہو گیا تھا۔۔۔ اور وہ سب لوگ بھی آزاد ہو گئے تھے جنہوں نے مستقبل میں اسیر ہوس ہونا تھا۔

دھیرے دھیرے سرکنڈوں اور درختوں کے سائے طویل ہونے لگے۔ شام کی دھندلاہٹ تیزی سے گردوپیش کو ڈھانپنے لگی۔ اندھیرا ہمارے لیے امید کی کرن تھا۔ ہاں کبھی کبھی اندھیرا بھی کرن بن جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ہماری تلاش زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکے گی۔ کم از کم ندی نالے کے کنارے پھیلے ہوئے ان گھنے سرکنڈوں میں تو تلاش ختم کرنی پڑے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جونہی ہمارے اردگرد تاریکی پھیلی قرب و جوار سے آنے والی آوازیں اور آہٹیں بھی معدوم ہو گئیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے اس ٹھٹھرے ہوئے ویرانے میں ہمارے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں۔ چار سو خاموشی تھی۔ بس جھینگروں کی مسلسل آواز تھی جو ماحول ہی کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور روہی کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

قریباً بیس منٹ کے نہایت محتاط سفر کے بعد ہم سرکنڈوں سے نکل آئے اور اس تاریک کچے راستے پر چل دیے جو موضع رتن پور کی طرف جاتا تھا۔ رتن پور میں پولیس اسٹیشن موجود تھا اور اس وقت یہ پولیس اسٹیشن ہی ہماری پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا ورنہ جو حالات نظر آ رہے تھے ان سے صاف پتا چلتا تھا کہ منصور خان کے مسلح گارڈ اور لال کوٹھی کے محافظ اس پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہمیں زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔

بھاگتے ہوئے نوری کے پاؤں میں کوئی شیشہ لگ گیا تھا۔ وہ بری طرح لنگڑا رہی تھی۔ بھیگے کپڑوں سے جب ٹھنڈی ہوا نے چھیڑ خانی شروع کی تو سردی کی شدت دوگنا ہو گئی۔ موضع رتن پور کی روشنیاں کافی فاصلے سے بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں تک پہنچ کر میں اور نوری منصور خان کے خطرناک قبائلی گارڈز کی وحشت سے محفوظ ہو سکتے تھے۔ یہ سفر گو زیادہ طویل نہیں تھا لیکن ہمیں یہی لگا جیسے قطب شمالی کا برفستان پا پیادہ عبور کر رہے ہیں۔ میرے جسم پر ابھی تک پھٹا ہوا خون آلود لباس تھا۔ اس لباس کو چھپانے کے لیے میں نے نوری کی اوڑھنی لپیٹ رکھی تھی۔ نوری کے منہ سے بار بار "ہائے" نکل جاتی تھی۔ یہ سوال وہ مجھ سے قریباً ایک درجن مرتبہ پوچھ چکی تھی کہ تھانہ کتنی دور ہے؟

میں ہر بار کہتا تھا کہ بس تھوڑا سا سفر باقی ہے۔ اس کو باتوں

طاہر جاوید مغل کے دل گداز قلم سے ایک خوبصورت ناول
پرستش
قیمت ۱۵۰ روپے
محبت کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک پُراثر کہانی
بہترین گردوپیش
عمدہ طباعت کے ساتھ
براہِ راست منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۳۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۲۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میوہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳
اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

میں لگانے کے لیے میں نے پوچھا کہ جب لال کوٹھی میں فائرنگ شروع ہوئی تو کرم دین کہاں تھا؟

وہ بولی "ہمیں باغ کے ساتھ والے ویہڑے (صحن) میں دھوپ سینک رہی تھی۔ ایک دم ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں آنے لگیں۔ اتنے میں کرم دین بھاگا ہوا آیا۔ کہنے لگا کہ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ماسٹر شاہ جہاں نے ایک بندہ قتل کر دیا ہے۔ منصور خاں کے غنڈے اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں ماسٹر شاہ جہاں کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ وہ آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہے' اس نے مجھ سے کہا کہ میں بھی آپ کو ڈھونڈوں۔ ہم دونوں آپ کی تلاش میں نکلے۔ کرم دین اگلے حصے کی طرف گیا' میں اندر کے کمروں کی طرف بھاگی۔ پھر ایک دم میں نے آپ کو دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "گھبرانے کی بات نہیں۔ کرم دین ہوشیار بندہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا ہو اور ہمارے ساتھ ہی لال کوٹھی سے نکل آیا ہو۔"

"لیکن اگر۔۔۔ وہ پکڑا گیا تو کیا ہو گا اس کا۔۔۔؟" نوری کی آواز میں اَن گنت اندیشے ہونک رہے تھے "چوہدری صاحب تو اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

میں نے کہا "چوہدری جنت کی طرف سے فکر مند ہونے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ وہ آج کل اسپتال میں تشریف رکھتا ہے اور اللہ کا شکر گزار بندہ بن چکا ہے۔ اس کا بیٹا ریحان بھی اپنا دوست ہے۔ تم گھبراؤ مت۔ سب اچھا ہو جائے گا۔"

"لیکن۔۔۔ چوہدری صاحب کو ہوا کیا تھا؟" نوری نے پوچھا۔

"چوہدری کو اس کی اپنی ہی بنائی ہوئی دوائیں لگ گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

اس سے پہلے کہ میں نوری کو اس بات کا جواب دیتا' ایک آواز نے ہمیں خاموش ہونے پر مجبور کر دیا "کون ہے اوئے؟" یہ آواز ہماری دائیں جانب جھاڑیوں سے آئی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' ایک موٹا تگڑا شخص ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی تھا۔ دونوں نے خاکی پتلونیں پہن رکھی تھیں اور بالائی جسم پر گرم چادریں لپیٹی ہوئی تھیں' پاؤں میں بوٹ تھے۔ مجھے یہ بھانپنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پولیس کے آدمی ہیں۔ اپنی ٹوپیاں اتار کر انہوں نے یقیناً جیبوں میں ٹھونسی ہوئی تھیں۔ فربہ اندام شخص نے ٹارچ کی روشنی پہلے میرے اور پھر نوری کے چہرے پر پھینکی۔ اس کے بعد وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولا "میری جان فتح دیناں! مجھے تو یہ چڑی چڑا لگتے ہیں۔"

فتح دین جو اپنے حلیے سے کانسٹیبل نظر آ رہا تھا' رُخ کر بولا "اوئے بولتے کیوں نہیں ہو۔ کون ہو تم؟"

میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم دونوں کون ہو؟"

موٹا ہنسا "واہ بھئی واہ' دیکھ رہے ہو فتح دیناں! لاٹ صاحب ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ ہم کون ہیں۔ یعنی ہم سے شناخت مانگ رہے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے نوری کی موجودگی کی پروا کیے بغیر ایک شیطانی گالی دی اور اپنی گرم چادر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا "دیکھ لو لاٹ صاحب! میں تمہارا نوکر اچیز بندہ حوالدار صدیق ہوں۔ یہ میرا کانسٹیبل نفری فتح دین ہے۔ اگر آپ جناب کو اب بھی کوئی شبہ ہو تو حکم کریں' تھانے سے اپنے اپنے کاغذات لا کر دکھا دیتے ہیں آپ کو۔"

میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایک حوالدار کے سامنے ہی اپنی اصل حیثیت بیان کر دوں۔ کسی طرح کی گڑبڑ بھی ہو سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ پہلے ہم تھانے پہنچیں اور وہاں ایس ایچ او کو اپنی شناخت کرائی جائے۔

میں نے حوالدار کے طنزیہ کلمات کے جواب میں کہا "کیوں شرمندہ کر رہے ہیں سرکار! ہماری جرات کہ آپ کی شناخت پوچھیں۔ ہم تو خود ہی آپ کی طرف آ رہے تھے۔ کچھ بندے ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان سے خطرہ ہے۔"

وہ بولا "چوروں کو ایسے خطرے تو ہوتے ہی ہیں میری جان۔"

میں نے کہا "ہم چور نہیں ہیں جی! ہم تو۔۔۔"

"اوئے "ہم تو" کے بچے۔ یہ کڑی کون ہے تیرے ساتھ۔ کیا بہن لگتی ہے تیری؟"

"بہن ہی سمجھ لیں جی۔ دراصل میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔۔۔"

میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ حوالدار نے زوردار قہقہہ لگایا اور طنزیہ لہجے میں بولا "او دیکھو فتح دیناں! یہ قیامت کی نشانیاں ہیں کہ نہیں۔ پولیس کے ڈر سے عاشق فوراً بھائی بن جاتے ہیں۔ جسے موج اُڑانے کے لیے لایا ہے اسے بہن کہہ رہا ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو حوالدار جی۔"

"تیری ماں کا سر غلط سمجھ رہا ہوں؟" حوالدار غرایا "پتر جی جتنی تیری عمر ہے اتنا میرا تجربہ ہے۔ میرے جانو! میں تو زنانی کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتا ہوں کہ بہن ہے کہ معشوق ہے۔ ابھی تھانے چل کر جب تجھے منجی لگائیں گے تو یہ ماں کی۔۔۔ اپنے منہ سے کہے گی کہ تیری معشوق ہے اور یہ بھی بتائے گی کہ اب تک کتنی بار تیرے ساتھ سو چکی ہے۔"

حوالدار کی خطرناک باتیں سن کر نوری رونے لگی۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا "نہ رو بی بی! اب رونے سے کچھ نہیں ہو گا۔ جب پھنس چکی تو پھر کیا رونا۔"

کانسٹیبل بولا "رونا دھونا ہے تو اخبار والوں کے سامنے رونا۔ بڑی اچھی تصویریں چھاپیں گے تیری۔ لگے گا فردوس فلم ہیر رانجھا میں رو رہی ہے۔"

اتنے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی جھاڑیوں سے نکل کر آ گیا۔ وہ

مکمل وردی میں تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل بھی تھی۔ یہ رائفل اس نے ڈرانے والے انداز میں ہماری ہی طرف سیدھی کر رکھی تھی۔ اس کے پہنچتے ہی حوالدار نے میرے جسم سے چادر کھینچ کر ایک طرف پھینکی اور میری تلاشی شروع کر دی۔ ریوالور اور گولیاں میری جیکٹ کی جیب میں تھیں' یہ دونوں چیزیں برآمد ہو گئیں تو تینوں پولیس والے اور زیادہ ہوشیار اور چوکس نظر آنے لگے۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ قواعد و ضوابط کی پروا کیے بغیر حوالدار نے نوری کی تلاشی بھی لی اور آزادی سے اس کے جسم پر ہاتھ گھمایا۔ وہ ڈری سہمی کھڑی رہی۔۔۔ ہیڈ کانسٹیبل نے میرا منہ سونگھا۔ اگر ہیڈ کانسٹیبل کی جگہ میں پولیس والا ہوتا تو یقیناً ہیڈ کانسٹیبل کا چالان ہو جاتا' کیونکہ اس کے منہ سے چرس کی بُو آ رہی تھی۔

تلاشی کے بعد وہ تینوں ہمیں لے کر فوراً تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اب اس معاملے کو بڑی سنجیدگی سے لے رہے تھے۔ شاید اسلحہ برآمد ہونے سے پہلے اور میری خون آلود قمیص دیکھنے سے پہلے ان کا خیال تھا کہ وہ کہیں ویرانے میں ہم سے کسی طرح کا لین دین کر لیں گے لیکن اب وہ تھانے جانے سے پہلے ہم سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھے۔۔۔ موضع رتن پور کا تھانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پھر بھی کم از کم سب انسپکٹر کو تو وہاں ہونا چاہیے تھا لیکن یوں لگ رہا تھا کہ افسروں کی غیر موجودگی میں حوالدار ہی یہاں کا ایس ایچ او بنا ہوا ہے۔ وہ بڑے طمطراق سے ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ حوالدار کے علاوہ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے لیکن ہمیں کھڑا رکھا گیا۔

میں نے کہا "ایس ایچ او صاحب کہاں ہیں؟"

وہ حسب معمول طنز سے بولا "فتح دیناں! لاٹ صاحب تھانے کے معائنے پر تشریف لائے ہیں۔ ایس ایچ او صاحب کو اطلاع نہیں دی تم نے؟"

تینوں کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر حوالدار نے کڑک کر نوری سے کہا "ادھر آ کڑیے' ادھر میرے سامنے بیٹھ آ کے۔"

نوری سراپا لرز گئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ حوالدار گرجا "اس ماے کی طرف کیا دیکھ رہی ہے۔ ادھر بیٹھ۔۔۔ میں تجھے کہہ رہا ہوں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا "ہاں۔۔۔ کہاں سے بھگا کر لایا ہے تجھے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے تھانے دار جی۔" نوری منمنائی۔

"مجھے پتا ہے جو کچھ ہے اور یہ بھی پتا ہے کہ تم دونوں جو کچھ ہو۔ میں یہاں بیٹھ کر گھاس نہیں کاٹتا ہوں۔" حوالدار گرجا۔ اس فقرے میں مناسب جگہوں پر فحش گالیاں نگینوں کی طرح فٹ تھیں۔

ہیڈ کانسٹیبل نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا "فتح دیناں! اس رانجھے کو باہر لے جاؤ۔ اس کے ہوتے اس کی ہیر کچھ نہیں بتانے کی۔"

کانسٹیبل نے اٹھ کر مجھے باہر کی طرف دھکیلا۔ نوری بھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دروازے کے قریب تھی۔ حوالدار میز پر چھڑی مار کر غرایا "بیٹھ جا تو! ہم تجھے کھا نہیں جائیں گے اور نہ ہی۔۔۔"

اس سے آگے فحش کلامی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔۔۔ میرا میٹر گھومنے لگا تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گڑبڑ ہوتی' بھاری بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ حوالدار سمیت کانسٹیبل ایک دم اٹین شین کھڑے ہو گئے۔ ایک دراز قد سب انسپکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کی پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ حوالدار سمیت تینوں افراد نے کھٹاک سے سلیوٹ کیا۔ سب انسپکٹر نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھا لیکن پھر اچانک اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اس کے چہرے کا یہ اُتار چڑھاؤ میری نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکا۔ اس کے ساتھ ہی ایک انجانے خطرے کا احساس ہوا۔

انسپکٹر سلیوٹ کا جواب دے کر باہر نکل گیا۔ ذرا دیر بعد دوسرے کمرے سے اس کی آواز آئی۔ وہ حوالدار کو صدیق کہہ کر آواز دے رہا تھا۔ صدیق اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہیڈ کانسٹیبل بھی حوالدار صدیق کے پیچھے چلا گیا اور کمرے میں صرف کانسٹیبل فتح دین رہ گیا۔ فتح دین کی آنکھیں شکرے کے مانند تھیں اور وہ بہت تیز طرار دکھائی دیتا تھا۔ لگتا ہے کہ اس کی جلتی ہوئی نگاہ نوری کے سراپا پر رینگنے لگی تھی اور یہ عمل بالکل غیر ارادی اور لاشعوری طور پر سرزد ہوتا ہے۔ خبر نہیں کہ یہ شکرا چشم کانسٹیبل تصور ہی تصور میں نوری کے ساتھ کیا سلوک کر چکا تھا۔۔۔ عورت کے دم سے کائنات میں رنگ ہے۔ داناؤں کے نزدیک عورت کرۂ ارض کا ایک خوب صورت پھول ہے اور پھول کی ساری کشش اس کی مسکراہٹ اور تازگی میں ہوتی ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیا بات ہے کہ کچھ لوگ ہنستی مسکراتی عورت کے بجائے مجبور اور روتی بسورتی عورت میں زیادہ دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اخباروں کی چیختی چنگھاڑتی خبریں وجود میں کیسے آتیں۔ نازک جسم سگریٹوں سے کیوں داغے جاتے' گینگ ریپ کیوں ہوتے' گھروں کے آنگنوں سے نوچی ہوئی کلیاں بازارِ حسن کے گلدانوں میں کیوں سجتیں۔ حوا نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا' شاید حوا کی کچھ بیٹیاں ابھی تک ابنِ آدم کے ہاتھوں اس کی سزا بھگت رہی ہیں۔

نوری کانسٹیبل کی آتشیں نگاہوں کے سامنے بدن چرا رہی تھی اور گاہے گاہے بے بسی سے میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوتی تھی۔ دل اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ زبردست گڑبڑ ہو چکی ہے۔ جس تھانے کو میں پناہ گاہ سمجھتا رہا ہوں

وہ پناہ گاہ نہیں کمین گاہ ہے" اور وہاں مجھے شکار کرنے والے شکاری بیٹھے ہیں اور اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ کسی ایک تھانے کی کہانی نہیں تھی۔ علاقے کے بلکہ اس پورے ضلع کے تھانے میرے خلاف الرٹ ہو چکے تھے۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ کوئی بجلی کوندے بھی زیادہ با اختیار اور طاقت ور شخص حرکت میں آ چکا ہے اور اس کی موجودگی میں مجنی کنور اور ساہی صاحب میری حمایت میں کوئی قدم اٹھانے سے معذور ہو گئے ہیں۔۔۔ یعنی میں اب صرف مفرور جہانی استاد تھا اور میرے جرائم کے کھاتے میں عیسیٰ جان کا قتل جلی حروف میں چمک رہا تھا۔

لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ سب میرا وہم ہو۔ موجود غیر یقینی حالات کی وجہ سے میرا ذہن خواہ مخواہ اندیشہ ہائے دور دراز میں الجھ رہا ہو۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ایک وہم میں الجھ کر پولیس والوں سے متھا لگانا کسی طور مناسب نہیں تھا لیکن اگر یہ "وہم" نہیں تھا تو پھر میری تاخیر مجھے لوہے کے جال میں پھنسا سکتی تھی۔ ایسا جال جس میں سے نکلنے کے لیے مجھے پھانسی کے پھندے کو چومنا پڑتا۔ اگر ایک بار پولیس والے مجھ پر ہاتھ ڈال دیتے تو پھر شاید ساہی صاحب اور مجنی کنور بھی مجھے نہ بچا سکتے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ حوالدار صدیق کو مشورے کے لیے باہر بلانے والا سب انسپکٹر کسی بھی وقت واپس کمرے میں داخل ہو سکتا تھا اور بہت ممکن تھا کہ واپسی کے وقت اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور ہوتا اور اس کی خون بار نگاہیں میری آنکھوں میں پیوست ہوتیں۔۔۔ مجھے چند سیکنڈ کے اندر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔۔۔ اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا۔

اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھوں والا کانسٹیبل فتح دین مجھ سے صرف پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ میں بظاہر نوری سے کوئی بات کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور آگے کی طرف جھکا تھا۔۔۔ فتح دین کو پتا ہی نہیں چلا کب میں نے اس پر جھپٹا مارا اور کب اس کی توانا گردن میرے بازو کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے اپنی پوری مہارت استعمال کرتے ہوئے گردن کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ بالکل آخری لمحے میں شکرا زدہ فتح دین کے ہونٹوں سے "اوغ" کی آواز نکلی اور ایک دم اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میری یہ حرکت دیکھ کر نوری کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکل گئی تھی۔ فتح دین کے ہونٹوں سے نکلنے والی "اوغ" سے یہ چیخ زیادہ بلند اور خطرناک تھی۔ میں نے اچانک معطل ہو جانے والے فتح دین کا سر ایس ایچ او کی میز پر ٹکایا اور جلدی سے اس رائفل کو قبضے میں کیا جو فتح دین کی گود سے فرش پر گر گئی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ سیمی ایکشن رائفل لوڈ تھی۔ رائفل اٹھانے ہی میں سامنے والی دیوار سے چپک گیا۔ اگر کوئی کمرے میں داخل ہوتا تو فوری طور پر مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ برآمدے کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ پھر سب انسپکٹر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر پر تھا لیکن

سرکاری ریوالور ابھی اس نے نکالا نہیں تھا۔ مجھے دو لمحوں کی مہلت مل گئی تھی اور یہ مہلت میرے لیے بہت تھی۔ میں نے لپک کر رائفل کی نال سب انسپکٹر کے سر سے لگائی اور غرا کر کہا "خبردار۔۔۔ گولی مار دوں گا۔"

سب انسپکٹر کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ ہولسٹر تک اس کا پہنچا ہوا ہاتھ بھی نیچے لٹک گیا تھا۔ سب انسپکٹر کے پیچھے ہی پیچھے دو ہیڈ کانسٹیبل بھی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے تیور خطرناک تھے لیکن اپنے ایس ایچ او کو میرے نشانے پر دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ ایس ایچ او یعنی سب انسپکٹر خوف آمیز حیرت سے اپنے کانسٹیبل فتح دین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی دو منٹ پہلے اس کانسٹیبل کو اچھا بھلا کمرے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اب وہ کسی مردے کی طرح میز پر اوندھا پڑا تھا۔ نہ گولی چلی تھی نہ کوئی آواز آئی تھی۔ نہ کانسٹیبل کے جسم پر چوٹ وغیرہ نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں موٹا حوالدار صدیق بھی اپنی حماقت کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے کمرے کے دروازے سے نمودار ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بھی اندر بلا لیا اور کانسٹیبلان کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

سب انسپکٹر نے سنبھل کر کہا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ پاگل تو نہیں ہو گئے تم؟ نیچے کرو اس رائفل کو۔"

میں نے کہا "رائفل تو نیچے کر لوں گا لیکن اس کی نال کا سوراخ تمہاری کنپٹی شریف پر ہی رہے گا۔"

سب انسپکٹر غرایا "یہ تھانہ ہے۔ یہاں یہ مسخری اور بدمعاشی نہیں چلے گی۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تم اس تھانے سے بچ کر نکل سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے تھانے سے نکلنا کون کافر چاہتا ہے۔ میں یہیں رہوں گا اور تمہاری مہمان نوازی کا پورا لطف اٹھاؤں گا۔ بس شرط صرف ایک ہی ہے۔ مجھے یہاں سے رجال ساہی صاحب کو ٹیلی فون کرا دو۔"

"ٹل۔۔۔ لیکن ٹیلی فون تو۔۔۔"

"خراب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

جلد بازی میں دیا ہوا اس کا یہ جواب سارا پول کھول گیا۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میرے اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے۔ میں نے رجال ساہی صاحب کا نام لیا تھا۔ اصولی طور پر تو سب انسپکٹر کو حیرت کا اظہار کرنا چاہیے تھا اور پوچھنا چاہیے تھا کہ ساہی صاحب سے میرا کیا تعلق واسطہ ہے لیکن اس کے منہ سے ٹیلی فون کی خرابی کی بات نکلی تھی۔۔۔ یعنی وہ پہلے سے جانتا تھا کہ میں کون ہوں اور ساہی صاحب سے میرا کیا تعلق ہے۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "استاد جہانی سے جھوٹ بولو گے تو ساری عمر پچھتاؤ گے۔"

"کک۔۔۔ کون استاد جہانی؟" اس مرتبہ اس نے عقل مندانہ

رد عمل کا مظاہرہ کیا لیکن اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

میں نے کہا "وہی استاد جہانی جسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے احکامات تمہیں مل چکے ہیں۔ جسے "بھاگنے" کا پروگرام بنانے کے لیے تم اور حوالدار صدیق ساتھ والے کمرے میں گئے تھے۔"

سب انسپکٹر کا جبڑا لٹک گیا۔ کچھ دیر بدلی بدلی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر مرعوب لہجے میں بولا "استاد جہانی! تمہارے بارے میں جیسا سنا تھا۔ ویسا ہی پایا لیکن اس مرتبہ تم بہت برے پھنسے ہو۔ مجھے نہیں امید کہ وہ تمہیں چھوڑیں گے۔ تم نے کام بھی تو بڑا دھماکا خیز کیا ہے۔"

"کون سا کام؟"

"قبائلی عیسیٰ جان کا قتل۔ اس کی پشت پناہی پشاور اور اسلام آباد کے چند بڑے بڑے لوگ کر رہے ہیں۔ جناب ساہی صاحب تو دور کی بات ہے میرا خیال ہے کہ مجنی کنور صاحب بھی تمہاری مدد کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے بارے میں احکامات کہاں سے ملے ہیں؟"

"ڈائریکٹ۔۔۔ ڈی آئی جی صاحب سے۔ میرا خیال ہے کہ وفاقی پولیس اور ایف ایس ایف بھی تمہارے خلاف حرکت میں آ چکی ہیں۔"

سب انسپکٹر کا اب و لہجہ ہمدردانہ تھا لیکن پھر بھی میں اس کی طرف سے غافل ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ رائفل کی نالی بدستور سب انسپکٹر کے سر کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور میری نگاہیں کمرے میں ہونے والی ہر حرکت نوٹ کر رہی تھیں۔ نوری ڈری سہمی بیٹھی تھی اور یوں لگتا تھا کہ کرسی کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ کسی سکتہ زدہ شخص کا چہرہ نظر آتا تھا۔

سب انسپکٹر کی نوکری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے اپنے لہجے میں کچھ اور نرمی لاتے ہوئے کہا "جہانی صاحب! میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ آپ سے غائبانہ تعارف ہے۔ بہت کچھ سنا ہے اور پڑھا ہوا ہے آپ کے بارے میں۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح اپنے ہی تھانے کی چار دیواری میں آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے کسی اور وقت اور مختلف حالات میں ملاقات ہوتی تو خوشی ہوتی۔ بہرحال اب بھی آپ مجھے اور میرے عملے کو اپنا بدخواہ نہ سمجھیں۔ ہم اپنے فرض سے اور افسروں کے حکم سے مجبور ہیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ وردی اتار کر میرے ساتھ خود بھی اشتہاری ہو جاتے" میں نے فقرہ مکمل کیا۔

کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ شاید میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل نے ان کی رگ ظرافت کی "گم" کر دی تھی۔

سب انسپکٹر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بیٹھ کر سکون سے بات کریں۔"

میں نے کہا "تم نے ابن انشاء کا وہ شعر نہیں سنا۔ وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا۔"

حوالدار صدیق نے غیر ارادی طور پر زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "چاچا جی! لگتا ہے تم نے یہ شعر سنا ہے۔ تم ہی اپنے ایس ایچ او کو سمجھاؤ کہ مجھے سکون کی نہیں زندگی کی ضرورت ہے۔"

سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا "ٹھیک ہے جہانی صاحب! آپ رائفل ہاتھ میں ہی رکھیں لیکن میرے عملے کو باہر جانے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے اور نہ تھانے سے باہر جائیں گے۔"

شاید ایس ایچ او اکیلے میں کوئی خاص بات کہنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ جب تک میری رائفل کے نشانے پر تھا اس کے ماتحت "سہم جوئی" کا نہیں سوچ سکتے تھے۔ میں نے موٹے حوالدار سمیت تینوں افراد کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔

سب انسپکٹر کا لہجہ مزید دوستانہ ہو گیا۔ وہ بولا "میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ جیسے بھی ہو آپ اس علاقے سے نکل جائیں۔ آپ کے خلاف بڑے سخت احکامات ہیں۔ آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے کہ آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا آرڈر ہے۔"

میں نے پوچھا "تمہیں یہ کیسے اندازہ ہوا کہ مقامی پولیس پر اسلام آباد کے حکام نے دباؤ ڈالا ہے۔"

وہ بولا "ہم تو چھوٹے ملازم ہیں۔ ہم تو بس اندازہ ہی لگا سکتے ہیں اور اندازہ یہی کہہ رہا ہے کہ آرڈر جاری کرنے والے افسر چکر میں پڑے رہے ہیں۔ پہلے ایس ایس پی صاحب کا حکم آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایک مفرور ڈکیت عیسیٰ جان" نثار جہاں عرف استاد جہانی سے لڑائی میں مارا گیا ہے" عیسیٰ جان کے مسلح ساتھی استاد جہانی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ ان کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہے۔ یہ قبائلی افراد اگر تھانے کے علاقے میں دیکھے جائیں تو انہیں گرفتار کیا جائے۔۔۔ اس حکم کے ایک گھنٹے بعد ہی دوسرا حکم آ گیا۔ اس حکم میں آپ کو گرفتار کرنے کی بات تھی۔ آپ کے حلیے اور لباس کی بھی مکمل نشاندہی کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک جواں سال عورت بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کو یہاں بیٹھے ہی میں نے پہچان لیا۔"

میرے اور سب انسپکٹر کے درمیان پانچ دس منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ سب انسپکٹر خود کو میرا ہمدرد ظاہر کر رہا تھا اور مشورہ دے رہا تھا کہ میں فوراً یہاں سے نکل جاؤں لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ میرا ہمدرد ہی ہوتا۔ وہ میرے نشانے پر تھا اور میری انگلی کی ایک حرکت اسے زندگی سے محروم کر سکتی تھی۔ ایسے میں وہ اس کے علاوہ اور کیا مشورہ دے سکتا تھا۔

میں نے اپنا وہ ریوالور دوبارہ حاصل کر لیا جو حوالدار صدیق نے تلاشی کے دوران میں میرے لباس سے نکالا تھا۔ ریوالور کی تین درجن گولیاں بھی ساتھ تھیں۔ تھانے میں ٹھہرا زیادہ دیر ٹھہرنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے سب انسپکٹر کو بدستور اپنے نشانے پر رکھا اور اسے باہر چلنے کو کہا۔

وہ بولا "سنو جمالی! آپ مجھ پر بھروسا رکھیں۔ یہ رائفل ہٹا لیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "اس رائفل کا تمہاری طرف اٹھا رہنا میرے لیے ہی نہیں تمہارے لیے بھی بہتر ہے۔ تمہارے سارے عملے کو معلوم ہو جائے گا کہ تم نے سخت مجبوری کی حالت میں مجھے یہاں سے جانے دیا ہے۔ تمہارے لیے یہ اندیشہ باقی نہیں رہے گا کہ تمہارے ماتحتوں میں سے کوئی تمہاری شکایت کر دے' اور تمہارے افسروں کو پتا چلے کہ تم نے ازراہِ مروت اسنو جمالی کو یہاں سے نکلنے کا موقع دیا ہے۔"

سب انسپکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید میری بات اس کے دل کو لگی تھی یا شاید وہ یہ بات پہلے سے ہی جانتا تھا اور خواہ مخواہ مجھے ورغلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ذہن میں جھانکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بظاہر وہ میرا ہمدرد اور پرستار نظر آ رہا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایسا نہ ہو۔ وہ اپنی نرم ملائم باتوں سے مجھے بانس پر چڑھا رہا ہو اور پھر اچانک نیچے سے بانس کھینچ لے۔

میں نے نوری کو اٹھایا۔ وہ پہلے کرسی سے چپکی ہوئی تھی اب میرے بازو سے چپک گئی۔ غالباً ارد گرد کے سارے مناظر اسے خواب کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس کی وحشت زدہ نگاہیں گاہے گاہے میز پر اوندھے پڑے کانسٹیبل فتح دین کے جسم پر جم جاتی تھیں۔ یہی چھل کانسٹیبل تھا جو کچھ دیر پہلے تک اسے کچا کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک نجانے کیا ہوا تھا کہ اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آئی تھی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے میز پر گر گیا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر نوری کی آنکھوں میں جو ہراس پیدا ہوا تھا وہ ابھی تک اس کی آنکھوں میں منجمد تھا۔ سب انسپکٹر کو اپنی رائفل کے نشانے پر رکھے رکھے میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ ایک تاریک رات تھی۔ اس دیہاتی تھانے کو روشن رکھنے کے لیے لالٹینیں استعمال کی گئی تھیں۔ تھانے کا عملہ سات آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ یہ سب لوگ یہاں وہاں دیواروں سے لگے کھڑے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ موجود تھا اور یقیناً وہ سب کے سب بزدل بھی نہیں تھے لیکن ان کا ایس ایچ او مصیبت میں تھا۔ طاقتور رائفل کی نال اس کے سر سے لگی ہوئی تھی اور میرے تیور یہ بات واضح کر رہے تھے کہ میں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کروں گا۔ یقینی بات تھی کہ اپنے ایس ایچ او کی طرح وہ سب بھی میرے "نام اور کام" سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ میرے بارے میں جاننے کے بعد یہ بات ان کے لیے اور بھی مشکل تھی کہ وہ مزاحمت کا راستہ اختیار کریں۔

سب انسپکٹر کو قدم قدم چلاتا میں تھانے کے صحن میں پہنچا۔ یہاں پرانے ماڈل کی ایک جیپ کے علاوہ ایک موٹر سائیکل بھی موجود تھی۔ میں نے سب انسپکٹر سے جیپ کی چابی حاصل کی۔ پھر اسی کی جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور موٹر سائیکل کے دونوں پہیوں کی ہوا نکال دی۔ نوری میری ہدایت کے مطابق جیپ میں سوار ہو چکی تھی' موٹر سائیکل کو ناقابلِ استعمال بنانے کے بعد میں بھی الٹے قدموں چلتا جیپ تک پہنچ گیا۔ سب انسپکٹر میرے ساتھ تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور خطرے کی حدود سے نکلنے کے بعد چھوڑوں گا لیکن جس وقت ہم جیپ میں سوار ہو رہے تھے' اچانک سب انسپکٹر کا داؤ چل گیا۔ میں نے سب انسپکٹر کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا تھا لیکن در چالاکی رکھا گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے اچانک پلٹ کر میری رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ میری انگلی ٹریگر پر نہیں تھی۔ رائفل کی نال اوپر کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر سر کی ٹکر رسید کی اور وہ لڑکھڑا کر تین چار گز پیچھے جا گرا۔ اسی دوران میں تھانے کے برآمدے کی طرف سے رائفل کا فائر آیا۔ ایک گولی جیپ کے پچھلے شیشے میں لگی دوسری انگارے کی طرح میرے دائیں بازو کے گوشت میں اتر گئی۔ میں نے بھنا کر سب انسپکٹر کی ٹانگوں پر تین فائر کیے اور اسے تڑپتا چھوڑ کر جیپ میں کود گیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ لہراتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی۔ عقب سے چار پانچ فائر مزید ہوئے مگر خوش قسمتی سے جیپ کے ٹائر نشانہ بننے سے محفوظ رہے۔ تھانے کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی میں نے تیسرا گیئر لگایا اور ایکسیلریٹر کو آخری حد تک دبا دیا۔

O☆O

وہ رات جتنی تاریک اور حبس زدہ تھی اتنی ہی لرزہ خیز اور پریشان کن بھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے لیے یہ رات وقف ہے۔ گولی میرے بازو میں کہنی سے ذرا نیچے لگی تھی۔ درد کی لہریں پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ میں گوشت کو ہاتھ سے ٹٹول کر گولی کا ابھار محسوس کر سکتا تھا۔ شاید گولی ذرا قریب سے لگتی تو میرے حق میں بہتر ہوتا کیونکہ وہ گوشت پھاڑ کر نکل جاتی۔ نوری نے اپنی اوڑھنی سے ایک لمبی پٹی پھاڑی تھی اور یوں کس کے میرے زخم پر باندھ دی تھی کہ خون کا اخراج رک گیا تھا۔

بازو کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اور ایک اور آفت بھی نازل ہو گئی تھی۔ میرے سینے کا سویا ہوا درد جاگ اٹھا تھا۔ بالکل جیسے اچانک کوئی خوابیدہ آتش فشاں انگڑائی لے کر بیدار ہو جائے اور اپنی آتشیں پھنکاروں سے زمین کو دہلانے لگے۔ کئی ماہ سے یہ درد بالکل خاموش تھا اور اب تو میں بھولنے ہی لگا تھا کہ میرے سینے میں

ایک درد' ایک منحوس الیکٹرانک ڈیوائس کی شکل میں پوشیدہ ہے اور شیخ عاصم کے بقول کسی بھی وقت مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے۔ پاکستان' انڈیا اور پھر سری لنکا میں اس جان لیوا درد کے ساتھ گزارے ہوئے سب دروز اب میرے حافظے سے محو ہونے لگے تھے' درد کی وہ جانکاہ لہریں میری یادداشت سے ہٹنے لگی تھیں جو شیخ عاصم کی موجودگی میں پیہم میری کلائی پر ضربیں لگاتی تھیں۔ کئی ماہ پہلے شیخ عاصم نے اس ڈیوائس کا آپریٹنگ سسٹم آف کر دیا تھا اور مجھے یہ نوید سنائی تھی کہ میں آزادی سے جہاں چاہے گھوم پھر سکتا ہوں..... اور میں گھوم پھر رہا تھا لیکن آج نجانے کیا ہوا تھا۔ جب ابھی کچھ دیر پہلے سب انسپکٹر نے میری رائفل پر جھپٹا مارا تھا تو میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا تھا اور سب انسپکٹر کی کہنی زور سے میری پسلیوں سے ٹکرائی تھی' شاید یہی ضرب اس منحوس درد کو جگانے کا بہانہ بن گئی تھی۔ اس درد کی تلخ یادوں نے مجھے ہلا دیا۔ یہاں تک کہ بازو کی تکلیف بھی مجھے بے معنی محسوس ہونے لگی۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے ہیں۔

نوری نے میری کیفیت بھانپ لی "بہت درد ہو رہا ہے صاحب جی؟" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"نہیں اتنا زیادہ نہیں۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

میرا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا' دوسرے سے میں نے اپنی زخمی کہنی تھام رکھی تھی۔ کوئی "تیسرا" ہاتھ بھی ہوتا تو میں یقیناً اسے اپنے پہلو پر رکھ لیتا۔ جیپ سخت ناہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو نوری کا سر چھت سے جا ٹکراتا تھا اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل جاتی تھی۔ ان مسلسل جھٹکوں کے سبب میری تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی واضح "منزل" نہیں تھی۔ فی الوقت ذہن میں صرف یہی بات تھی کہ مجھے رتن پور اور رتن پور کے تھانے سے دور نکل جانا ہے۔

ایکا ایکی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیپ کا تیل ختم ہو رہا ہے۔ دو تین بار جیپ کو مخصوص جھٹکے لگے پھر ایک ہچکی کے ساتھ انجن خاموش ہو گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات تھی۔ ان کربناک گھڑیوں میں یہ جیپ بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میں نے ایک دو بار اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی پھر نوری کو لے کر نیچے اتر آیا۔ کھیتوں میں سفر کرنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ کھیتوں میں پاؤں کے نشان ڈھونڈنا مشکل ہوتے ہیں۔ میں اور نوری پہلے جوار کے کھیت میں گھسے پھر کماد کی لامتناہی فصل میں داخل ہو گئے۔ بازو اور سینے کا درد اتنا شدید تھا کہ جلد ہی میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں' اور منہ خشک لکڑی ہو گیا۔ نوری پہلے ہی بے حد ڈری ہوئی تھی۔ اگر اسے میری حالت کا پتا چل جاتا تو شاید وہ بالکل ہمت ہار دیتی۔ میں حتی المقدور اپنی کیفیت اس سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاش یہاں کوئی کلینک یا چھوٹا موٹا دواخانہ نظر آ جاتا' اور کچھ نہیں تو میں تین چار گولیاں ڈسپرین یا پیراسٹامول کی پھانک لیتا۔ ان لمحوں میں نجانے کیوں مجھے ساہی صاحب کی بنی فریال یاد آئی۔ اس کی ہو بہو آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں درد کش گولیاں ہر وقت اپنے پرس میں رکھوں کیونکہ میرے پہلو کا منحوس درد کسی بھی وقت دوبارہ جاگ سکتا تھا۔ شروع کے ایک دو مہینوں میں' میں نے اس ہدایت پر عمل بھی کیا تھا لیکن پھر گلگت کے برف زاروں میں جا کر سب کچھ بھول گیا تھا..... آج اس تاریک رات کو چاروں طرف پھیلے ہوئے جوار' گنے اور سرسوں کے کھیتوں کے درمیان اس جان لیوا درد نے مجھے پوری طرح جکڑ لیا تھا اور میرے لیے ایک ایک قدم ایک ایک مسافت بن گیا تھا۔

قریباً ایک میل تک ہم اسی طرح چلتے رہے۔ ہم جن کھیتوں میں چل رہے تھے' وہ نشیب میں واقع تھے اور کچھ ابھی تک سیلاب کی تباہ کاری سے متاثر تھے۔ ایک دو جگہ ہمیں روڈ کی پمپ بھی نظر آئے جو کسی جگہ سے پانی کے نکاس کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میری ہمت جواب دینے کے قریب تھی جب کچھ فاصلے پر مجھے مدھم روشنیاں نظر آئیں۔ یہ روشنیاں کسی گاؤں کی نہیں لگتی تھیں کیونکہ یہ زمین پر بچھی بچھی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے رائفل زمین پر ٹیک کر غور سے ان روشنیوں کو دیکھا اور پھر بکھری ہوئی ہمت جمع کر کے دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ سو ڈیڑھ سو گز آگے جا کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ روشنیاں ایک کیمپ کی ہیں۔ بہت سے خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک دو گاڑیاں بھی یہاں کھڑی تھیں۔ پہلی بات میرے ذہن میں یہی آئی کہ یہ سیلاب زدگان کی امداد کے لیے لگایا جانے والا کوئی امدادی کیمپ ہے۔ اگر یہ واقعی امدادی کیمپ تھا تو ممکن تھا کہ یہاں طبی سہولتیں بھی موجود ہوں۔ یہ خیال میرے لیے بہت خوش آئند تھا۔ اس وقت چند چن کلر گولیاں میرے لیے دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر تھیں۔ تھانے سے حاصل کی ہوئی رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ رائفل میں نے قریب ہی ایک کھیت میں چھپائی اور تمام اندیشے بالائے طاق رکھ کر نوری کے ساتھ خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے باقی کا فاصلہ کیسے طے کیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ سر گھوم رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ اس دن مجھے ٹھیک سے یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر کو مسیحا کیوں کہا جاتا ہے اور ایک مسیحا ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر پر کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کیمپ میں پہنچتے ہی ایک رضاکار..... نے مجھے سہارا دیا اور ایک کشادہ خیمے میں پہنچا دیا۔ یہاں دری بچھی تھی اور ایک میز کے علاوہ چھ سات کرسیاں رکھی تھیں۔ چھت پر دو بلب روشن تھے۔ ان کی روشنی میں چار پانچ نوجوان ڈاکٹر گفتگو میں مصروف تھے۔ میز پر چائے کی پیالیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ ایک ڈاکٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا اور قریب ہی

ایک اسٹریچر پر لٹا دیا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میری پسلیوں میں شدید درد ہو رہا ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کوئی چوٹ وغیرہ لگی ہے؟" ایک لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نن۔۔۔ نہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ بس درد ہو رہا ہے۔"

"لیکن تمہاری قمیص پر تو خون لگا ہے؟"

"راستے میں۔۔۔ دو اچکوں نے گھیر لیا تھا' مار پیٹ ہو گئی ہے۔ یہ پسلیوں کا درد بھی۔۔۔ شاید اسی وجہ سے جاگا ہے۔"

"یہ کنپٹی پر کیا ہوا ہے؟" لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔

"گگ۔۔۔ گولی لگی ہے؟" نوری نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"انہی اچکوں نے فائر کر دیا تھا۔" میں نے وضاحت کی۔

ایک کمپاؤنڈر غالباً درد کش انجکشن بھر رہا تھا۔ میرا جواب سن کر ڈاکٹر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا "یہ تو بھئی میڈیکو لیگل کیس ہے۔" اس نے پیشہ ورانہ سرد مہری سے کہا۔

"لیکن۔۔۔ میرے لیے درد ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔"

"ہم مجبور ہیں بھئی' اوپر سے سخت احکامات ہیں۔ کوئی ٹریٹ منٹ نہیں دے سکتے۔" پھر وہ نوری سے مخاطب ہو کر بولا "بی بی! یہ تیرا کون لگتا ہے؟"

"مم۔۔۔ میرے کچھ نہیں لگتے جی۔۔۔ میرے خاوند کے دوست ہیں۔"

"کہاں سے آئے ہو تم؟" نوری نے موضع رنگ والی کا نام لیا۔ ڈاکٹر ناک پر عینک جماتے ہوئے بولا "بی بی! یہ پولیس کیس ہے۔ پہلے پرچہ درج ہو گا پھر ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔"

"پپ۔۔۔ پرچہ کہاں درج ہو گا؟" نوری نے پوچھا۔

"شاہ پور تھانے میں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ "فارمیلٹیز" پوری کر رہے ہیں اور یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو درد کم کرنے والا انجکشن تو مجھے لگا دیں۔"

ڈاکٹر خشک لہجے میں بولا "بھئی اچھے پڑھے لکھے ہو تم۔ جس کام کی ہمیں "پرمیشن" نہیں وہ کیسے کریں۔"

"بہت بے حس ہیں آپ۔" مجھے ایک دم تاؤ آ گیا اور میں اسٹریچر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔" ڈاکٹر غرایا "ہم تمہارے نوکر چاکر نہیں کہ تمہاری جھڑکیاں سنیں۔"

نجانے کیوں مجھے لمبی ناک والے اس عینک پوش ڈاکٹر پر بے تحاشا غصہ آ گیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ عینک اچھل کر دور جا گری۔ نوری کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ یہ منظر دیکھ کر ایک دوسرے ڈاکٹر نے مجھے جیکٹ کے کالر سے پکڑا اور پیچھے کی طرف کھینچا۔ عینک والا ڈاکٹر زور زور سے چلانے لگا "غلام نبی! پولیس کو فون کرو۔"

میری ٹانگ لگنے سے اسٹریچر دور لڑھک گیا تھا اور ایک اسٹینڈ پر رکھی بہت سی دوائیاں زمیں بوس ہو گئی تھیں۔ اچانک ایک سرو قد لیڈی ڈاکٹر تیزی سے چلتی ہوئی خیمے میں داخل ہوئی "ذعات از گوئنگ آن۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیل رہی تھی۔ اس دھند میں آنکھیں پھاڑ کر میں نے دیکھا۔ اندر آنے والی ڈاکٹر کا باوقار چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ میری زندگی کا مانوس ترین اور محبوب ترین چہرہ تھا۔ وہ غزالہ کا چہرہ تھا۔ وہ رعب دار لہجے میں بولی "کیا کر رہے ہو۔۔۔ چھوڑو اسے۔"

پھر اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حیرت کی برسات ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ ایک خوب صورت مجسمے کی طرح کھڑی رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر حضرات جو مجھے مارنے پیٹنے پر آمادہ نظر آتے تھے ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئے۔ غزالہ چند قدم چل کر میرے قریب آئی' اس کے ہونٹ تھرائے۔ یوں لگا جیسے وہ خود فراموشی کے عالم میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کمپاؤنڈر سے بولی "ان کو لٹایئے۔"

کمپاؤنڈر نے آہستگی کے ساتھ مجھے اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اسٹریچر سے اٹھتے اور دوبارہ لیٹتے وقت پورے سینے میں درد کی زبردست لہریں دوڑ گئی تھیں۔۔۔ غزالہ کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجی۔ وہ نوری سے مخاطب تھی "کیا ہوا ان کو؟"

نوری نے کہا "گگ۔۔۔ گولی لگی ہے جی۔ راستے میں کچھ لفنڈروں نے گھیر لیا تھا۔"

غزالہ کی نرم مہربان انگلیاں میری کنپٹی کو ٹٹولنے لگیں۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ کنپٹی کی پٹی کھولی جا رہی ہے۔ دوا لگنے سے پہلے ہی جیسے مجھے آرام ملنے لگا تھا۔ پھر میں نے غزالہ کا ہاتھ اپنے سینے پر رینگتا محسوس کیا۔ وہ ہولے ہولے دبا رہی تھی اور پوچھ رہی تھی "یہاں درد ہوتا ہے؟"

"نہیں تھوڑا اوپر۔"

"یہاں؟"

"نہیں' کچھ اور اوپر۔"

پھر میں نے اپنے بازو میں انجکشن کی چبھن محسوس کی۔ دو تین منٹ بعد عجیب سی غنودگی میرے حواس پر طاری ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اس کے بعد کے واقعات ایک خوابناک دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ دھند کبھی چھٹ جاتی تھی اور کبھی زیادہ گہری ہو جاتی تھی۔ ایک بار یہ دھند چھٹی تو مجھے

اندازہ ہوا کہ میرے بازو میں سے گولی نکالی جا چکی ہے اور اب بینڈیج کی جا رہی ہے۔ میرے ارد گرد دو تین ڈاکٹر موجود تھے۔ ان میں غزالہ بھی تھی۔ میرے اوپر خیمے کی چھت تھی اور سو واٹ کا بلب ہوا سے ہولے ہولے جھول رہا تھا جیسے وہ کسی درخت سے لگا ہوا طلسمی سیب ہو اور اس میں سے شعاعیں پھوٹتی ہوں۔۔۔ چند لمحے بعد میں پھر گہری نیند سو گیا تھا۔ میرے کانوں میں گونجنے والی سرجری کے اوزاروں کی کھنکناہٹ مدھم ہوتی ہوئی بالکل معدوم ہو گئی تھی اور اسپرٹ کی تیز بو آہستہ آہستہ ہواؤں میں تحلیل ہو گئی تھی۔ غالباً یہ نیند اور بے ہوشی کی درمیانی حالت تھی' میں نے خود کو ایک لہو رنگ وادی میں دیکھا' یہاں پتھروں سے خون بہتا تھا اور درختوں پر زخم تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جھلسا دینے والی تیز ہوا جب ان درختوں پر کوڑے برساتی تھی تو وہ بین کرنے والے انداز میں روتے تھے اور ان کی چیخیں سن کر شاخوں پر بیٹھے ہوئے منحوس گدھ پھڑپھڑا کر اڑ جاتے تھے۔ میں اس جلتی بلتی وادی میں برہنہ پا بھاگ رہا تھا۔ میرے ارد گرد شعلے رقصاں تھے اور میرے عقب میں شیخ عاصم' مظفر شکرا اور قادر زماں جیسے درندہ صفت لوگ بھاگ رہے تھے۔ پھر اچانک میں نے دیکھا کہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہے۔ اس خوب صورت نسوانی ہاتھ میں سبز رنگ کی چوڑیاں دمک رہی تھیں۔ ایسا سبز رنگ جس میں سے ٹھنڈک اور طمانیت پھوٹتی تھی۔ میں نے پہچان لیا یہ غزالہ کا ہاتھ تھا۔ میں اس ہاتھ کو پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن جھجک رہا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے اور تمام اندیشوں کو ایک طرف رکھ کر میں نے اس ہاتھ کو تھام لیا۔ اس ہاتھ کو تھامتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں اوپر بہت اوپر صاف شفاف ہواؤں میں اٹھ گیا ہوں۔ جیسے غزالہ ایک پری زاد ہو اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ہواؤں میں اڑا رہی ہو۔ میں نے غزالہ کی آواز سنی۔ وہ میرے کان سے ہونٹ لگا کر سرگوشی میں بول رہی تھی "میرا ساتھ دیں گے؟"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ اب تم کسی اور کی بیوی ہو۔"

وہ بولی تو یوں لگا جیسے کسی قدیم معبد میں مقدس گھنٹیاں بج رہی ہیں "آپ کس شادی کی بات کر رہے ہیں۔ شادی تو دو دلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ شادی کا تو مطلب ہی خوشی ہے پھر اس کی بنیاد کسی مجبوری یا محرومی پر کیسے رکھی جا سکتی ہے۔"

"شیخ عاصم تمہارا شوہر نہیں ہے؟"

"وہ کسی کا کچھ نہیں ہے۔ وہ صرف تمہارا دشمن ہے۔ اس نے مجھے شکار کیا تھا' اب اس کی نگاہیں ایک دوسرے شکار پر ہیں۔ میرے منہ میں خاک' وہ شفتا تک پہنچنا چاہتا ہے۔"

"یہ کبھی نہیں ہو سکے گا غزالہ!" میں پورے اطمینان سے کہتا ہوں "اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں دنیا کی ہر بلا کا منہ موڑ دوں گا' ہر فتنے کے دانت کھٹے کر دوں گا۔"

"میں۔۔۔ تو ہمیشہ سے آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ عجیب خود سپردگی کے عالم میں کہتی ہے۔ میں ہاتھ پھیلاتا ہوں' وہ مجھے نظر نہیں آتی لیکن میرے بازوؤں میں سما جاتی ہے۔ اس کا مانوس لمس میرے دریدہ تن کے ہر زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے۔۔۔ پھر میں خود کو ایک سرسبز وادی میں پاتا ہوں۔ ہوا خوشبو سے لدی ہوئی ہے اور درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھک رہی ہیں۔ ایک چمکتے پانی کے کنارے ایک خیمہ موجود ہے لیکن یہ کسی سیلاب زدہ علاقے کے امدادی کیمپ کا خیمہ نہیں۔ یہ خیمہ تو ایک حسین و جمیل منظر کا حسین و جمیل حصہ ہے۔ میں اور غزالہ اس خیمے میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں شفتا موجود ہے۔ وہ غزالہ کو دیکھتی ہے اور کھل اٹھتی ہے۔ بھاگ کر غزالہ سے لپٹ جاتی ہے اور اس کے کندھے کے اوپر سے مجھے دیکھ کر کہتی ہے "بہت بہت شکریہ بھائی جان۔۔۔ مجھے ایسی ہی بھابی چاہیے تھی۔"

یکایک خیمے کا پردہ ہلتا ہے۔ میں شیخ عاصم کو دیکھتا ہوں' اس کا چہرہ غضب سے تمتما رہا ہے۔ اس کے لمبے شکاری بوٹوں میں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ اس شعلہ فشاں وادی سے بھاگتا ہوا یہاں پہنچا ہے اسی لیے اس کے جوتے جل رہے ہیں۔ پھر یہ آگ شیخ عاصم کے پورے وجود کو لپیٹ میں لے لیتی ہے اور وہ سراپا شعلہ بن کر شفتا سے لپٹ جاتا ہے۔ شفتا کی چیخیں بہت دردناک ہیں۔۔۔ میں چھلانگ لگا کر اپنی بہن تک پہنچتا ہوں اور اس کے جسم کو شعلوں سے جدا کرنے کی کوششیں کرتا ہوں۔

اچانک بالکل قریب سے آنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ غزالہ ہی کی آواز تھی۔۔۔ وہ مجھے پکار رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں دوا کھا لوں۔ میں نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں۔ سرسبز وادی' خیمے اور دریا کے سارے نظارے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی متحرک ایمبولینس میں ہوں۔ غزالہ میرے پاس ہی موجود تھی۔۔۔ نوری میرے پاؤں کی طرف بیٹھی تھی۔ میرے بازو سے گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی "دوا کھا لیں۔" غزالہ نے ایک بار پھر کہا۔

میں نے غزالہ کی ہتھیلی پر سے سرخ اور سیاہ کیپسول اٹھایا اور پانی کے ساتھ نگل لیا۔

سینے کا درد اب کافی کم ہو گیا تھا۔ میں نے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں لیکن غزالہ نے مجھے اٹھنے سے روک دیا "میں اب کافی بہتر ہو چکا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ بہتری پین کلر انجکشن کی وجہ سے ہے۔" وہ بولی "آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔"

میں نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"لاہور۔" غزالہ نے جواب دیا۔ "آپ کو فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔"

"لیکن۔۔۔ گولی تو نکل چکی ہے۔"

"میں آپ کے سینے کے درد کی بات کر رہی ہوں۔ آپ کی حالت آپ کی توقع سے زیادہ خراب ہے۔"

میں چند لمحے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ آج میں کم و بیش سات ماہ بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ ہماری آخری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ جب میں اسے سری لنکا سے لایا تھا اور اس کی والدہ کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے شوہر نامدار شیخ عاصم کے رویے سے سخت نالاں تھی۔ شیخ عاصم اسے سخت بیماری کی حالت میں بے آسرا چھوڑ کر آدھی رات چلا گیا تھا اور ایسی اطلاعات ملی تھیں جن سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ وہاں سیر و شکار میں مصروف ہے۔ غزالہ ان دنوں اپنی ازدواجی زندگی کے حوالے سے مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اس کے ذہن نے اس بات کو تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا کہ شیخ عاصم کے ساتھ اس کی شادی میں کسی سازش کا عمل دخل تھا۔ اب ان باتوں کو سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ اب غزالہ کے خیالات اپنے شوہر کے بارے میں کیا تھے۔

غزالہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "آپ کا کیا خیال ہے' آپ کے متعلق ساہی صاحب کو اطلاع دے دی جائے۔"

"نہیں ابھی نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"کیوں؟ کوئی خطرہ ہے؟"

"شاید۔" میں نے کہا۔

"لیکن' آپ نے ایسا کون سا کام کیا ہے' جس کی وجہ سے آپ کو پولیس سے چھپنا پڑے۔ آپ نے ... عیسیٰ جان کو ہلاک کیا ہے' اور وہ ایک ڈاکو تھا۔"

میں نے چونک کر پوچھا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

اس نے اخبار میرے سامنے کھولتے ہوئے کہا "آج سارے اخباروں میں یہ خبر نمایاں نظر آ رہی ہے۔"

میری نگاہ عیسیٰ جان کی تصویر پر پڑی۔ اس کا چہرہ خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ آنکھیں جیسے ابھی تک لال کوٹھی کی ٹوٹی ہوئی بتی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک ننگی چارپائی پر پڑا تھا۔ سرخی کچھ اس طرح تھی "سرحد کے بدنام ڈکیت عیسیٰ جان کو پولیس کی حراست میں قتل کروا دیا گیا۔" ذیلی سرخیاں اس طرح تھیں "واقعہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں رنگ والی میں ہوا۔ عیسیٰ جان کے قتل کے حوالے سے شاہ جہاں عرف استاد جہانی کا نام لیا جا رہا ہے۔ پولیس استاد جہانی کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔"

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

غزالہ نے پوچھا "یہ سب کیا ہے؟"

میں نے کہا "یہی تمہارے پہلے سوال کا جواب ہے۔ میں نے ایک ڈکیت کو ہلاک کیا ہے لیکن کچھ پردہ نشینوں کو یہ "ہلاکت" بہت شاق گزری ہے اور ان کی نظروں میں 'میں نے جرم کیا ہے۔"

"لیکن ساہی صاحب تو ایسا نہیں سمجھتے ہوں گے اور پھر مجتبیٰ کنور سے بھی آپ کے تعلقات ہیں۔"

"وہ لوگ یقیناً ایسا نہیں سمجھتے ہوں گے لیکن ان سے "اوپر والے" ایسا سمجھ رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ یہ "اوپر والے" ساہی صاحب اور مجتبیٰ کنور وغیرہ پر بھی نظر رکھے ہوئے ہوں۔ ساہی صاحب کا فون ایک بار پہلے بھی ٹیپ ہوتا رہا ہے' ممکن ہے کہ اب بھی ہو رہا ہو۔ ادھر تم میرے بارے میں ساہی صاحب کو اطلاع دو اور ادھر یہ خبر ہر جگہ پہنچ جائے۔"

غزالہ سوچ میں گم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ دبلی نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ اس بھاری ذمے داری کا نتیجہ تھا جو وہ کئی روز سے سیلاب زدگان کے امدادی کیمپ میں نبھا رہی تھی۔ کچھ روز پہلے جب میں لاہور گیا تھا تو مجھے ساہی صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ غزالہ ان دنوں کسی امدادی کیمپ میں ڈیوٹی دے رہی ہے۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ امدادی کیمپ موضع رنگ والی کے قریب ہو گا اور چند دن بعد میں زخمی ہو کر اسی کیمپ میں جا پہنچوں گا۔

غزالہ نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا "اگر ساہی صاحب کو اطلاع نہ دی جائے تو پھر کیا کیا جائے؟"

میں نے کہا "میرے مسئلے کا بہترین حل یہی ہے کہ تم مجھے کچھ پین کلر گولیاں دے دو یا پھر کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دو' اور اس لڑکی سمیت مجھے یہیں کہیں سڑک کے کنارے اتار دو۔ میں اپنے حالات سے خود نمٹ لوں گا۔ میں اب خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں.... اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرو گی تو خود کو مصیبت میں ڈالو گی اور میری مصیبت میں بھی کوئی کمی نہیں ہو گی۔"

غزالہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ان میں آنسوؤں کی ہلکی سی چمک بھی تھی۔ غصہ بھی تھا اور شکوہ بھی تھا۔ وہ جیسے بزبانِ خاموشی کہہ رہی تھی "ایسی بات کہتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔ کیا آپ میرے اور اپنے رشتے کو اتنا ہی کمزور اور حقیر سمجھتے ہیں۔"

لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ حسب عادت میری آنکھوں میں جھانکنے کے بعد منہ پھیر لیا۔ میں نے کہا "میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے حالات تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ساہی صاحب کے گھر کی طرح میرے تمام ممکنہ ٹھکانوں کی نگرانی ہو رہی ہو۔ ان ٹھکانوں میں تمہارا گھر بھی شامل ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم مجھے اپنے گھر یا کلینک وغیرہ لے جانے کی غلطی نہیں کرو گی۔"

غزالہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اب میری بات سن کر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

○☆○

بعد ازاں ہم گلبرگ کے ایک پرائیویٹ کلینک میں جا پہنچے۔ یہاں پندرہ بیس بستروں کا ایک جدید اسپتال بھی تھا۔ غزالہ مجھے ایک آرام دہ کمرے میں لے آئی۔ کمرے میں خوشگوار حرارت تھی۔ کھڑکیوں سے باہر دور تک سبزہ اور پھول دار پودے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں مریض کے علاوہ تیماردار کے لیے بھی ایک بیڈ موجود تھا۔ اس کے علاوہ طویل صوفہ تھا جس پر ایک شخص بآسانی سو سکتا تھا۔ میں اپنے قدموں پر چل کر یہاں آنا چاہتا تھا لیکن غزالہ زبردستی وہیل چیئر پر لائی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میری صحت کے بارے میں بہت فکر مند ہے۔ نوری بھی ایک ملازمہ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ تھی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ اپنے علاوہ اسے شوہر کی فکر بھی لاحق تھی۔ وہ عیسیٰ جان کی خبر والے اخبار کو بار بار گھورنے لگتی تھی جیسے اس میں اپنے شوہر کے بارے میں پڑھنا چاہتی ہو۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کلینک غزالہ کی ایک سابق استاد ڈاکٹر رقیہ شاہ کا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر رقیہ شاہ ماہر امراض سینہ و جگر تھیں۔ ان کا شمار ملک کے گنے چنے ماہرین میں ہوتا تھا.... کلینک میں پہنچتے ہی غزالہ نے کہیں سے میرے لیے ایک عدد شلوار قمیص کا انتظام کر دیا تھا۔ یوں میں نے اپنے پھٹے پرانے خون آلود کپڑوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اگلے دو تین روز تک غزالہ نے بڑی تندہی سے میری تیمارداری کی۔ جب تیماردار ڈاکٹر بھی ہو تو تیمارداری میں کیا کسر رہ سکتی ہے۔ میرے قریباً نصف درجن ایکسرے ہوئے' کیسٹرو اسکوپی ہوئی' الٹرا ساؤنڈ ہوئی' خون اور پیشاب کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ میں پریشان تھا کہ اتنا زیادہ بیمار تو میں نہیں ہوں جتنی مجھ پر "ریسرچ" کی جا رہی ہے۔ بس سینے میں معدے کی طرف کسی وقت ہلکا سا درد اٹھتا تھا جو پندرہ بیس منٹ بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے معدے کی اندرونی جھلی میں ایک خاص تکنیک سے چھوٹا سا ایک الیکٹرانک آلہ چپکا ہوا ہے' یہ آلہ ریموٹ کنٹرول سے کام کرتا ہے اور بوقتِ ضرورت ایسی شعاعیں خارج کر سکتا ہے جو مجھے ہلاک کر دیں۔ ان شعاعوں کے اخراج کا تعلق میرے اور شیخ عاصم کے درمیانی فاصلے سے تھا۔ یعنی ان ہلاکت بخش شعاعوں کی وجہ سے میں شیخ عاصم کے قریب آ سکتا تھا اور نہ زیادہ دور جا سکتا تھا۔ اگر میں ان حدود کی پابندی نہ کرتا تو یہ الیکٹرانک ڈیوائس میرے معدے کے اندر ایک دھماکے سے پھٹ جاتا اور یقینی موت کا سبب بنتا۔ اگر اس آلے کو سرجری کے ذریعے میرے جسم سے نکالنے کی کوشش کی جاتی تو بھی یہ دھماکا خیز مواد پھٹ جاتا۔ یہ ساری باتیں میری طرح غزالہ بھی اچھی طرح جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سارا کیا دھرا اس کے شوہر نامدار شیخ عاصم کا ہے۔ سری لنکا سے آدھی رات روانہ ہوتے وقت شیخ عاصم نے میری "سہولت" کی خاطر کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس آلے کا "سسٹم" جامد کر دیا تھا۔ بالفاظِ دیگر میرے گلے سے رسی نکال دی تھی تاکہ میں کچھ دیر یہاں وہاں گھوم کر گھاس پر منہ مار سکوں۔

غزالہ اس آلے کے حوالے سے بہت تشویش میں مبتلا نظر آتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ لگاتار میرے ٹیسٹ کروا رہی تھی۔ تین دن میں دو مرتبہ غزالہ کی استاد ڈاکٹر رقیہ شاہ بھی مجھے دیکھ چکی تھیں۔ وہ ساٹھ پینسٹھ سال کی ایک مہربان اور شفیق خاتون نظر آتی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایک اُجالا سا جھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایک روز گہری نیند سے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں مدھم آواز میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ غزالہ اور پروفیسر ڈاکٹر رقیہ شاہ کی آوازیں تھیں۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی میرے ہی بارے میں ڈسکس کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر رقیہ شاہ انگریزی میں کہہ رہی تھیں "گھبرانے کی بات نہیں ہے بچی! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کوئی فوری خطرہ تو نہیں ہے؟" غزالہ نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کوئی فوری خطرہ نہیں۔" ڈاکٹر رقیہ شاہ نے اعتماد سے کہا "بلکہ میرے خیال میں تو چھ سات مہینے تک کوئی مسئلہ درپیش نہیں آئے گا۔ سوجن ہے جو انشاءاللہ دوائیوں سے ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ بہرحال اس چیز کا کوئی مستقل حل ضرور ہونا چاہیے' ورنہ پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"مستقل حل' آپ کی نظر میں کیا ہو سکتا ہے؟"

ڈاکٹر رقیہ شاہ نے کہا "وہی بات ہے جو ہم پہلے بھی ڈسکس کر چکے ہیں۔ یہ کوئی نارمل کیس نہیں ہے جس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکے۔ اس بارے میں حتمی رائے وہی شخص دے سکتا ہے جس کا یہ سب کیا دھرا ہے۔ اگر ہم اس کی وارننگ کو نظر انداز کریں گے تو بہت بڑی حماقت کریں گے۔ جن لوگوں نے اتنا حساس آلہ تیار کیا ہے وہ یقیناً یہ انتظام بھی کر سکتے ہیں کہ آلے کو معدے سے نکالنے کی کوشش کی جائے تو وہ بلاسٹ ہو جائے.... کم از کم میں تو ایسا رسک لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو سکتی اور میرے خیال میں تم بھی ایسا نہیں سوچ سکتی ہو....."

دونوں خواتین کچھ دیر مزید باتوں میں مصروف رہیں' پھر ڈاکٹر رقیہ شاہ باہر چلی گئیں اور غزالہ میری طرف آ گئی۔ نوری کی آواز آئی۔ وہ غزالہ سے مخاطب ہو کر بولی "ڈاکٹر صاحب! صاحب جی کو جگا دیں' دوائی کا وقت ہو گیا ہے۔"

غزالہ نے کہا "نہیں۔ سو رہے ہیں تو سونے دو۔"

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ غزالہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔ جیسے پرکھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں اب جاگا ہوں یا پہلے سے جاگ رہا تھا۔ نوری نے مجھے دوا کھلائی اور پھر دوپہر کا کھانا میرے سامنے رکھ دیا۔ کھانے میں چپاتی' فلو فیبر اور سلاد وغیرہ تھی۔ گولی میرے دائیں بازو میں لگی تھی لہٰذا کہنی موڑتے ہوئے بہت دقت پیش آتی تھی۔ مجبوراً مجھے بائیں ہاتھ سے کھانا

پڑتا تھا۔ نوری بائیں ہاتھ سے کھانے کو بہت برا سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے دن ہی مجھے ٹوک دیا تھا۔ کہنے لگی تھی "نہیں صاحب جی! بائیں ہاتھ کے ساتھ شیطان کا ہاتھ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ بخشے میرے ابا جی کہا کرتے تھے' دائیں ہاتھ میں برکت اور صحت ہوتی ہے۔"

میں نے کہا تھا "دایاں ہاتھ کام نہ کرے تو پھر بندہ بھوکوں مر جائے۔"

"ہائے ہائے کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولی تھی "ہم جو ہیں یہاں آپ کی خدمت کے لیے۔"

پھر اس نے اپنے گورے چٹے ہاتھ صابن سے دھو کر مزید گورے چٹے کر لیے تھے اور اپنے ہاتھ سے لقمے بنا بنا کر مجھے کھلانے لگی تھی۔

یہ سلسلہ اب تک جاری تھا۔ اب بھی اس نے فٹافٹ ہاتھ دھوئے اور میرے لیے نوالے بنانے شروع کر دیے۔ میں نے کہا "میری اتنی زیادہ ٹہل سیوا نہ کرو۔ عادتیں خراب ہو جائیں گی میری..... ایک دو روز میں تم اپنے کرم دین کے پاس چلی جاؤ گی تو پھر مجھے کون کھلائے گا۔"

وہ غزالہ کی طرف اشارہ کر کے بولی "ڈاکٹر صاحبہ جو ہیں۔ مجھ سے سو گنا زیادہ خیال رکھتی ہیں آپ کا۔"

غزالہ بولی "پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم تمہیں جانے ہی نہیں دیں گے۔ پہلے تمہارے شوہر کا پتا چل جائے کہ وہ کہاں ہے اور یہ پتا چل جائے کہ حالات ٹھیک ہو گئے ہیں تو اس کے بعد ہی تمہیں یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ ان تین چار دنوں میں وہ غزالہ سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور اس کی ہر بات بلا چون و چرا تسلیم کرتی تھی۔ وہ بڑی عقیدت سے اسے ڈاکٹر صاحبہ یا ڈاکٹر جی کہہ کر بلاتی تھی۔ غزالہ کی باتوں سے نوری کی بہت ڈھارس بندھی تھی اور اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر جہاں بھی ہو گا صحیح سلامت ہو گا۔ غزالہ نے اسے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ فی الحال اس کے لیے بہترین پناہ گاہ یہ کلینک ہی ہے اور یہ بات درست بھی تھی۔ میرے اور نوری کے لیے اس پرائیویٹ کلینک کا یہ کمرا از حد محفوظ تھا..... دو دن پہلے نوری یہاں سے جانے کے لیے اور اپنے شوہر کے پاس پہنچنے کے لیے بہت بے چین نظر آتی تھی۔ اگر ہم اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی۔ یقینی بات یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے گی جو مجھے تلاش کر رہے ہیں' اور جونہی ایسا ہو گا میرے لیے پرائیویٹ کلینک کی یہ پناہ گاہ قطعی غیر محفوظ ہو جائے گی۔

جب نوری مجھے کھانا کھلا رہی تھی' غزالہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ نوری نے پوچھا "صاحب جی! ایک بات پوچھوں؟"

میں نے کہا "اگر ایک بات ہے تو پوچھ لو۔"

وہ بولی "ڈاکٹر صاحبہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟"

"وہ میری ڈاکٹر لگتی ہے اور میں اس کا مریض لگتا ہوں۔ بس یہی رشتہ ہے۔"

"نہیں..... کوئی اور رشتہ بھی ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگی "انہوں نے جس طرح آپ کے لیے دن رات ایک کر رکھا ہے کون کرتا ہے اور پھر..... پھر آپ کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں اور ان کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آ جاتا ہے۔ میں تو پہلے پہل سمجھی تھی کہ شاید وہ آپ کی کوئی منگیتر شنگیتر ہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے خشک لہجے کہا۔

وہ بڑے انہماک سے نوالہ بناتے ہوئے بولی "ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا تھا کہ وہ کسی اور اسپتال میں کام کرتی ہیں..... لیکن وہ آپ کی خاطر اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر یہاں پڑی ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں ان کا اپنا گھر بھی ہو گا' وہاں گھر والے بھی ہوں گے۔ پتا نہیں ڈاکٹر صاحبہ نے ان کو کیا بتایا ہو گا کہ وہ آج کل راتیں کہاں گزار رہی ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں ان مسئلوں کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ حسب عادت جرح کرتے ہوئے بولی "لیکن ڈاکٹر صاحبہ کے والدین پریشان تو ہوں گے نا۔ آخر وہ جوان جہان ہیں..... اور آپ کو پتا ہی ہے' زمانہ کتنا خراب ہے؟"

میں نے کہا "اس کے والدین یہاں نہیں ہیں اور اب تم چپ رہو اور خاموشی سے کھانا کھلاؤ۔ ورنہ باہر چلی جاؤ۔"

میرا موڈ دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔ نوری کو یہ "اطلاع" میں نے بالکل درست دی تھی کہ غزالہ کے والدین یہاں نہیں تھے۔ وہ ان دنوں کراچی گئے ہوئے تھے اور یہاں کے حالات کے بارے میں انہیں زیادہ علم نہیں تھا۔

رات کو دو بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ پانچ چھ فٹ دور دیوار کے ساتھ غزالہ کا بیڈ تھا۔ ایک انگلش میگزین دیکھتے دیکھتے وہ سو گئی تھی۔ میگزین اس کے پیٹ پر اوندھا پڑا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ وہ صوفہ تھا جس پر نوری سوئی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ لیٹا لیٹا' نیم وا آنکھوں سے غزالہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک خوابیدہ تصویر نظر آتی تھی۔ ایسی تصویر جس میں نزاکت تھی' رنگ تھے اور موزونیت تھی۔ بالوں کی ایک پریشان لٹ اس کی پیشانی اور ناک سے گزر کر ٹھوڑی کو چھو رہی تھی۔ دونوں ہاتھ دو مومی شمعوں کی طرح روشن نظر آتے تھے اور میگزین پر دھرے تھے۔ سری لنکا میں بیماری کے دوران میں وہ بہت دبلی پتلی ہو گئی تھی بلکہ ایک موقع پر تو صرف ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی لیکن اب پھر اس کا جسم بھر گیا تھا اور گزشتہ بیماری کے آثار اس کے جسم اور چہرے پر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ اسے یوں بے باکی سے سراپا دیکھتے ہوئے ایک طرح کا احساس جرم میرے

دل میں پیدا ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے میں کوئی چوری کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور ان تلخ یادوں کو کریدنے لگا جن کا تعلق غزالہ کی بیماری اور سری لنکا کے بے مہر روز و شب سے تھا۔ مجھے یاد تھا کہ کس طرح شیخ عاصم غزالہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر امارات چلا گیا تھا' اور شارجہ میں اونٹوں کی ریسیں دیکھتا رہا تھا۔ یہ وہی غزالہ تھی جس کے حسن کے قصیدے شیخ عاصم نے شب و روز پڑھے تھے اور جس کے ساتھ اپنی ہنی مون مناتے ہوئے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا' لیکن یہی غزالہ جب زخمی ہو کر گری تھی اور اس کی پشت کی چوٹ نے اسے مفلوج کر دیا تھا تو شیخ عاصم کے سارے جذبات سرد پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ جوں جوں غزالہ کی بیماری بڑھتی گئی تھی شیخ عاصم اس سے بیگانہ ہوتا گیا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ میں غزالہ کو ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں بازوؤں میں اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا اور پرائے دیس میں میرے پاس اتنی نقدی بھی نہیں تھی کہ غزالہ کے لیے دوا ہی خرید سکتا۔ میں وہ جھونپڑا کیسے بھول سکتا تھا جس کے باہر بے رحم سمندری ہوائیں بانسوں کو نچا رہی تھیں۔ اس جھونپڑے کے اندر ناریل کے تیل کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور چراغ ہی کی طرح ایک لڑکی کی زندگی بھی ٹمٹما رہی تھی۔ میں نے اس دم توڑتی مدقوق لڑکی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر اپنی سانس اس کے سینے میں داخل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر چیخیں مار کر سنہالیوں سے التجائیں کی تھیں کہ وہ ایک جاں بہ لب لڑکی کی زندگی بچانے کے لیے جھونپڑے کا دروازہ کھول دیں۔ وہ لڑکی غزالہ ہی تو تھی۔ میں وہ سب کچھ نہیں بھولا تھا یقیناً غزالہ بھی نہیں بھولی تھی۔

چین کلر گولی کھائے کافی ٹائم ہو چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سینے میں پھر ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ میں نے دراز میں گولیاں ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ملیں۔ نوری کو جگانے کے لیے میں نے دو تین بار ہلکی ہلکی آواز دی لیکن وہ بے فکر ہو کر دیہاتی نیند سو رہی تھی۔ جب میں نے تیسری بار نوری کو پکارا تو غزالہ بیدار ہو گئی اور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"جی کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا دوا کھا لوں۔"

غزالہ نے الماری کے ایک نچلے خانے سے دوا ڈھونڈ نکالی اور پانی کے ساتھ کھلا دی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں بستر سے اٹھا اور کمرے کا بالکونی کی طرف والا دروازہ کھول دیا۔ یہ کمرا دوسری منزل پر واقع تھا۔ بالکونی سے نیچے سڑک تھی۔ سڑک سے آگے ایک سبزہ زار تھا اور سبزہ زار کے اطراف میں ایک خوب صورت مارکیٹ کی روشنیاں تھیں۔ میں بالکونی میں ہی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ غزالہ نے ایک گرم شال لا کر میرے شانوں پر پھیلا دی۔

میں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا "غزالہ! تم مجھ سے بالکل تیمارداروں جیسا سلوک کر رہی ہو۔"

وہ بولی "احتیاط ہر حالت میں اچھی ہوتی ہے۔"

میں نے پوچھا "اور کتنے دن یہاں رہنا ہو گا؟"

"تین چار دن میں آپ کی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن میرے خیال میں آپ جتنے دن بھی یہاں رہ لیں یہ آپ کی سکیورٹی کے لیے بہتر ہے۔"

"میرے خیال میں چار پانچ ہزار روپیہ روز کا خرچ ہو رہا ہو گا۔"

"آپ ان حسابوں میں نہ پڑیں۔ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔"

حسب عادت سگریٹ ڈھونڈنے کے لیے میں نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن جیب خالی تھی۔ غزالہ بولی "آپ کا پیکٹ اب وارڈ بوائے کی جیب میں ہے۔ جب تک آپ یہاں ہیں سگریٹ نہیں پئیں گے اور بہتر ہے کہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔"

"جو چیزیں بہت دیر تک ہمارے ساتھ رہتی ہیں' انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔"

"بری چیزوں کو منہ لگانا ہی نہیں چاہیے۔" وہ بولی۔

"برائی یا اچھائی کی حد بندی اتنی سہل نہیں ہوتی۔ اصل بات تو دل کی ہوتی ہے۔ دل کے فیصلے ہمیشہ اپنے ہوتے ہیں اور اکثر عجیب ہوتے ہیں۔" میں نے بھی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"جو انسان اپنے ہی دل کو نہ سمجھ سکے' اس سے زیادہ ناقابلِ اعتبار اور کون ہو سکتا ہے۔"

میں نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "شیخ عاصم کہاں ہے؟"

"وہ پاکستان میں نہیں ہیں۔"

"تمہاری آپس کی غلط فہمیاں دور ہوئیں یا نہیں؟"

"کچھ ہو گئیں' کچھ ابھی باقی ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ اس میں اداسی بھی تھی اور مشکل بیانی بھی۔

مدھم ہوا غزالہ کے لانبے بالوں کو دھیرے دھیرے اڑا رہی تھی۔ وہ بالکونی کے جنگلے پر کہنیاں ٹیکے کھڑی تھی۔ جیسے کوئی لچک دار شاخ پھولوں کے بوجھ سے خمیدہ ہو گئی ہو۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ بینڈ باجے کی آواز تھی۔ میں نے آگے جھک کر دیکھا' نیم خوابیدہ سڑک پر سے ایک برات گزر رہی تھی۔ کاروں کی طویل قطار بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ سب سے اگلی کار پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ رات تین بجے کا وقت تھا یقیناً یہ لوگ دلہن لے کر آ رہے تھے۔ خواتین کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق غزالہ آگے کو جھک کر دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ان لمحوں میں ایک سنجیدہ ڈاکٹر اس کے اندر کہیں چھپ گئی تھی اور اس کے اندر کی معصوم الھڑ لڑکی باہر آ گئی تھی اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ بینڈ ایک پرانے گانے کی دھن بجا رہا تھا "راجا کی آئے گی بارات' رنگیلی ہو گی

رات۔"

ایسی ہی برائیں ہمارے آبائی گاؤں جل کوٹ میں بھی تو آئی تھیں۔ ایسے گیت وہاں بھی تو گونجا کرتے تھے۔ اس وقت یہ سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا' شاید اس لیے کہ تب ہمارے سامنے مستقبل کے خواب تھے۔ شاید ان لمحات میں غزالہ نے بھی وہی کچھ سوچا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ وہ جیسے چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمیں ایک ساتھ وہ برائیں یاد آگئی تھیں جو ہم نے بچپن میں جل کوٹ کے گلی کوچوں میں دیکھی تھیں' دور لہنیں' وہ دولہے' وہ چھکنے ہوئے سکے جنہیں لوٹنے کے لیے ہم ایک دوسرے کے اوپر گر پڑتے تھے۔ زندگی چہکتی ہوئی چڑیا کی طرح کتنی حسین تھی ان دنوں۔۔۔ یکایک میرے سینے میں ہونے والا درد تیز ہوگیا۔ پہلے ایک لہر اٹھی' پھر دوسری' پھر تیسری۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیا۔ میں غزالہ کو بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کتنی پرامید تھی میری صحت یابی کے بارے میں۔۔۔ آج سارا دن وہ بہت خوش رہی تھی۔ میری ٹیسٹ رپورٹس دیکھ کر اس نے مجھے مبارک باد بھی دی تھی۔۔۔ لیکن یہ کیا ہو رہا تھا۔ یہ کیسا درد تھا جو اپنے نوکیلے پنجوں سے میرے معدے کو کھرچ رہا تھا۔ میں نے چند گہرے سانس لیے اور نارمل نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" غزالہ نے مجھے ذرا غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ایک طویل سانس لی اور ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "اس برات کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے شوکت لوہار کا بیٹا ناجی یاد آگیا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو ایک دفعہ وہ برات میں پیسے لوٹتے لوٹتے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے آگیا تھا۔ ساری ٹانگ چھل گئی تھی بے چارے کی۔"

غزالہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "ہاں۔۔۔ اور گھوڑا بھی تو الٹ گیا تھا دولہے سمیت۔۔۔ اور سرہالا اماں وھین کے صحن میں جا گرا تھا۔"

"بعد میں تھوڑی سی گرما گرمی بھی ہوگئی تھی براتیوں اور لڑکی والوں میں۔"

غزالہ بولی "گرما گرمی کا تو پتا نہیں لیکن اتنا پتا ہے کہ اسی برات میں ہمارے نوکر فتری کی آنکھ پر چاندی کا روپیہ اتنے زور سے لگا تھا کہ آنکھ کئی دن نیلی رہی تھی۔"

اس واقعے کے تصور سے غزالہ کے ہونٹوں پر ہنسی مچلنے لگی تھی لیکن پھر ایک دم جیسے وہ اپنے آپ میں آگئی۔ اس کے چہرے کو ماضی کے خیال نے جو مسکراہٹ بخشی تھی' حال کی سنجیدگی نے دھانپ لی۔ وہ ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "شوکت لوہار کا بیٹا ناجی آپ ہی کا ہم عمر تھا نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "ناجی آج کل لاہوری میں کام کرتا ہے۔ ہیبال گراؤنڈ میں سرجیکل کے اوزاروں کی دکان ہے اس کی۔ اب تو تین بچوں کا باپ ہے۔

تھوڑے ہی دن پہلے ملاقات ہوئی ہے اس سے۔"

میں نے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کہیں۔۔۔ تم مجھے یہ تو نہیں سمجھانا چاہ رہی ہو کہ ناجی کا ہم عمر ہونے کی وجہ سے مجھے بھی شادی شدہ ہونا چاہیے۔"

وہ نظریں چرا کر بولی "میں کون ہوتی ہوں آپ کو سمجھانے والی۔ آپ نے ہمیشہ اپنی مرضی کی ہے۔"

ایک بار پھر شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا "طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی ؟" غزالہ مجھے ذرا دھیان سے دیکھ کر بولی۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" میں نے نارمل لہجے میں کہا "بس کسی وقت چبھن ہوتی ہے۔"

"اس کی کوئی بات نہیں۔" وہ حوصلہ بخش لہجے میں بولی "اللہ نے چاہا تو یہ بھی ایک دو دن میں جاتی رہے گی۔"

وہ بے چاری جانتی نہیں تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے اور میں کس طرح خود پر قابو رکھے ہوئے ہوں۔ درد کا طوفان تھا جو میرے پہلو میں برپا ہوگیا تھا۔ شاید اب تک غزالہ مجھے جو غیر معمولی احتیاط کرا رہی تھی وہ ٹھیک ہی کرا رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھی اور میری تکلیف کو مجھ سے زیادہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے ہیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں۔ میں کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ اس وقت غزالہ کو اندازہ ہوا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔

"شاہ جہاں! کیا بات ہے؟" اس نے مجھے کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھے سہارا دے کر بستر تک لائی اور لٹا دیا "کیا زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟" اس نے قریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کچھ زیادہ ہی ہے۔" میں نے کراہ کر بمشکل جواب دیا۔

"نوری۔۔۔ نوری۔" اس نے نوری کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا کہ وہ جلدی سے گلاس میں پانی لائے پھر وہ تیزی سے ایک انجکشن بھرنے میں مصروف ہوگئی۔

مجھے کوئی محلول پلا کر اور انجکشن لگا کر وہ ڈاکٹر رقیہ شاہ کے نمبر ڈائل کرنے میں مصروف ہوگئی۔ اس نے ڈاکٹر رقیہ شاہ کو بتایا کہ میری حالت اچانک خراب ہوگئی ہے۔۔۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر رقیہ شاہ اسپتال پہنچ گئیں۔ اس وقت تک میرا درد قدرے کم ہو چکا تھا لیکن دل بری طرح متلا رہا تھا۔ ڈاکٹر رقیہ نے فوراً میری گیسٹرو اسکوپی کرائی۔ اس ٹیسٹ میں ایک ننھا سا نائی ری کیمرا معدے میں داخل کیا جاتا ہے۔ کیمرے کے ساتھ روشنی کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ کیمرے کی منظر کشی ایک چھوٹی سی اسکرین پر دیکھی جاتی ہے۔ اس ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر رقیہ شاہ اور غزالہ زیادہ متفکر نظر آنے لگی تھیں۔ وہ کچھ دیر دھیمی آواز میں باتیں کرتی رہیں پھر ڈاکٹر رقیہ نے میرے لیے کچھ نئی دوائیں لکھیں اور مجھے تسلی تشفی دے کر واپس

چلی گئیں۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ ساری رات میں تڑپتا رہا۔ میری تکلیف غزالہ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی' کبھی بے قرار ہو کر میرا سر آغوش میں لے لیتی۔ پریشانی کے عالم میں اس نے رات بھر ڈاکٹر رقیہ کو بھی بے آرام رکھا اور دو تین بار انہیں ٹیلی فون کیا۔ ان دونوں کے درمیان جو باتیں ہوتی رہیں ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ الیکٹرانک ڈوائس کی وجہ سے میرے معدے میں جو انفیکشن پیدا ہوئی ہے وہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مرحلے پر ضروری محسوس ہو رہا ہے کہ آپریشن کر کے وہ منحوس ڈوائس میرے جسم سے نکال لیا جائے لیکن آپریشن کرنے میں شدید خطرات ہیں' غزالہ اور ڈاکٹر رقیہ دونوں یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ غزالہ نے اوورسیز کال بک کرائی ہے۔ شاید وہ امارات میں یا کسی اور جگہ شیخ عاصم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ درحقیقت اس مسئلے کا اگر کوئی حل تھا تو وہ غزالہ کے شوہر نامدار شیخ عاصم کے پاس ہی تھا۔ وہی اس بدبخت شخص سے رابطہ کر سکتا تھا جس نے الیکٹرانک ڈوائس ڈیزائن کیا تھا اور میرے جسم میں نصب کروایا تھا۔ دو مرتبہ کوشش کے باوجود غزالہ اوورسیز کال کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

صبح نو دس بجے کے لگ بھگ مجھے معمولی افاقہ محسوس ہوا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غزالہ کراہ کر بولی "کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔"

"نہیں' اٹھنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ نوری یہیں دھلا رہی ہے۔ پلیز شاہ جہاں! سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس وقت آرام آپ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ اپنی تکلیف کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہیں' اور یہ آپ کے لیے بہت نقصان دہ ہوگا۔"

اس نے زبردستی کر کے مجھے بستر سے نیچے اترنے نہیں دیا۔ میں نے بہت ہلکا سا ناشتا کیا لیکن اس ناشتے کے ساتھ ہی تکلیف میں پھر اضافہ ہوگیا۔ شب بیداری کی وجہ سے غزالہ کی آنکھیں سرخ تھیں اور لباس شکن شکن تھا۔ بقول شاعر یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو' تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نوری نے دروازہ کھولا۔ میں اپنے سامنے چچا جلیس اور چچی فاخرہ کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ غزالہ کو بھی کم حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر ابو کو دیکھنے لگی "آپ یہاں؟" اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بھئی بہت پریشان کیا ہے تم نے۔" چچا جلیس نے شکوہ کناں لہجے میں بیٹی سے کہا۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"یہ کہو کیا نہیں ہوا" حسب عادت چچی فاخرہ تڑخ کر بولی "کل شام کی فلائٹ سے ہم نے واپس آنا تھا۔ سارا دن کراچی سے تمہیں فون کرتے رہے لیکن اسپتال والوں نے بتایا کہ تم ابھی تک ریلیف کیمپ میں ہو۔ لیکن شام کو یہاں آکر ڈاکٹر حسنات کی زبانی پتا چلا کہ تم ریلیف کیمپ سے تین چار دن پہلے ہی چلی گئی تھیں اور کسی کو بتایا بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے ہم نے پریشان ہونا تھا۔ ساری رات تمہیں ڈھونڈتے رہے ہیں' جگہ جگہ فون کیے۔ خود بھی مارے مارے پھرتے رہے۔"

غزالہ بولی "امی' آپ کو پتا ہی ہے کہ میرا "پروفیشن" کیسا ہے۔ بندے کے ساتھ کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی ہو سکتی ہے۔"

چچا جلیس قدرے نرمی سے بولے "لیکن بیٹی' یہ تو بہت بے پروائی کی بات ہے۔ تمہیں کسی نہ کسی کو تو بتانا چاہیے تاکہ تم کہاں ہو۔"

"سوری ابو جان۔ میں۔۔۔ بہت پریشان تھی۔" پھر ذرا توقف سے بولی "مگر اب آپ کو کیسے پتا چلا؟"

چچا جلیس بولے "بھئی! تمہاری ماں ساری رات تو ٹیلی فون کے سامنے بیٹھی رہی ہے۔ تمہاری تلاش میں درجنوں فون کیے ہوں گے اس نے۔۔۔ اتفاقاً ڈاکٹر رقیہ شاہ کو بھی فون کر دیا۔ رقیہ شاہ کی زبانی پتا چلا کہ تم ان کے کلینک میں ہو اور اپنے ایک کزن کی تیمار داری کر رہی ہو۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ کزن شاہ جہاں ہوگا۔۔۔"

"ہوا کیا ہے اسے؟" چچی فاخرہ نے چڑچڑے انداز میں پوچھا۔

"بہت بیمار ہیں۔ سینے میں کوئی تکلیف ہے۔"

"کیا تکلیف ہے؟" چچی نے پوچھا۔

چچا اور چچی کو کیا خبر تھی کہ یہ تکلیف انہی کے لاڈلے داماد شیخ عاصم کی دی ہوئی ہے۔ وہی زہریلا ناگ ہے جس نے ایک ہی وار میں ان کی بیٹی کو ڈسا ہے اور ان کے بھتیجے کو بھی۔

چچی فاخرہ کی زبان قینچی کی طرح چلنا شروع ہوگئی تھی' لہٰذا غزالہ میرے سکون کی خاطر اسے بہانے بہانے باہر لے گئی تھی پھر بھی دروازے کے باہر سے اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی' وہ غزالہ سے کہہ رہی تھی "بی بی! اگر وہ بیمار تھا تو کسی ملازم کو اس کی دیکھ بھال کے لیے یہاں بھیج دیا ہوتا' تمہیں۔۔۔ خود کیا ضرورت تھی یہاں ڈیرا ڈالنے کی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ تو عجیب سی بات لگتی ہے۔"

آواز دھیرے دھیرے مدھم ہوگئی۔ غزالہ ماں کو کچھ اور دور لے گئی تھی۔

میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ چچا جلیس اور چچی فاخرہ اپنے گھر سے یہاں کلینک میں پہنچے تھے۔ اگر میرے اندازے کے مطابق ان کے گھر کی بھی نگرانی ہو رہی تھی تو پھر یہ کلینک میرے لیے کسی بھی طرح محفوظ نہیں رہا تھا۔ ایک انجانے خدشے کے تحت میں نے خود کو کہنیوں کے بل بستر سے اٹھایا اور نیچے اتر

آیا۔ درد کی شدید لہروں نے میرے پورے جسم کو جھنجوڑ دیا تاہم میں دھیمے قدموں سے چلتا اس دروازے تک پہنچ گیا جو بالکونی کی طرف کھلتا تھا۔ اس ادھ کھلے دروازے سے میں نے نیچے سڑک کا جائزہ لیا۔ خاصی گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا رہا' پھر بری طرح چونک گیا۔ میں نے اسپیشل پولیس کی دو گاڑیوں کو دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے آگے پیچھے دوڑتی ہوئی آئیں اور کلینک کے احاطے میں پہنچ کر رک گئیں۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی پوری شدت سے بج اٹھی۔ مجھے لگا کہ میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا ہے۔ غزالہ کے گھر کی نگرانی ہو رہی تھی اور پولیس والے غزالہ کے والدین کا تعاقب کر کے یہاں پہنچ گئے ہیں۔

"نوری۔" میں نے چیخ کر کہا۔ وہ بھاگی ہوئی آئی "جاؤ' ڈاکٹر صاحبہ کو بلاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔

وہ بوکھلائی ہوئی باہر گئی اور چند ہی سیکنڈ بعد غزالہ کو لے آئی۔ میں نے کہا "غزالہ! معاملہ خراب ہو گیا ہے۔" وہ ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے نیچے پارکنگ میں پولیس کی گاڑیاں دکھائیں اور وہ مسلح افراد دکھائے جو تیزی سے نیچے اتر رہے تھے' ان میں سے کچھ باوردی تھے اور کچھ سادہ لباس میں۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارے گھر کی نگرانی ہو رہی تھی۔ تمہارے امی ابو کا پیچھا کر کے یہ لوگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"او مائی گاڈ۔" غزالہ کی آنکھیں فکر اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر مجھ سے پوچھا "اب کیا ہو گا؟"

میں نے کہا "وہی ہو گا جو میں نے پہلے تم سے کہا تھا۔ مجھے یہاں سے جانے دو ورنہ سب پر مصیبت آ جائے گی۔"

وہ تڑپ کر بولی "نہیں' میں آپ کو نہیں بھیج سکتی۔ آپ جانتے نہیں آپ کی حالت کتنی خراب ہے۔ آپ کی سخت جانی ہے جو یہ سب جھیل رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟ پکڑوا دو گی مجھے؟"

غزالہ کا ذہن بہت تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ اتنے میں چچا جلیس بھی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے "کیا بات ہے بیٹی؟ کیا مسئلہ ہے؟"

غزالہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "ابو جان! کچھ لوگ شاہ جہاں کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں انہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ آپ امی کو لے کر جلدی سے نیچے چلے جائیں۔"

چچا جلیس حیران نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ نوری سے مخاطب ہو کر بولی "نوری! تم پروفیسر صاحب کے کمرے میں چلی جاؤ۔ جب تک پروفیسر صاحب نہ آئیں تم وہاں سے باہر نہیں نکلنا۔ پتا ہے نا' تمہیں ان کے کمرے کا؟"

نوری نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"آیئے۔" غزالہ نے میرا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

ہم کمرے سے باہر نکلے۔ لفٹ بالکل ساتھ ہی تھی۔ ہم لفٹ میں بیٹھے اور نیچے پہنچ گئے۔ لفٹ کے عین سامنے ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔ غزالہ نے پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے ایمبولینس میں دھکیل دیا۔ خود وہ تیزی سے گھوم کر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر جا بیٹھی۔ میں نے تیزی سے گاڑی کے اندرونی پردے کھینچ دیے تھے۔ ایمبولینس کا ڈرائیور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک تجیم شحیم شخص تھا۔ وہ حیرت سے کبھی میری طرف اور کبھی غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غزالہ نے کہا "ڈرائیور جلدی چلو' ایک بہت سیریس مریض کو فوراً لانا ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحبہ! میں تو میت لے کر جا رہا ہوں۔ وہ لوگ اندر گئے ہیں "ڈیڈ باڈی" لینے کے واسطے۔"

غزالہ نے تحکم سے کہا "میت تو بعد میں بھی چلی جائے گی۔ جو زندہ ہے اس کو میت میں نہیں بدلنا چاہیے۔ جلدی کرو تم۔"

"لل..... لیکن ڈاکٹر صاحبہ۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مریض ڈاکٹر رقیہ صاحبہ کا قریبی عزیز ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو دو منٹ میں یہاں سے تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔ چلو..... جلدی کرو۔"

ڈرائیور چند لمحے شدید تذبذب میں نظر آیا۔ پھر غزالہ کے چہرے پر ہیجانی کیفیت دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ غالباً ڈرائیور کو قائل کرنے میں ڈاکٹر رقیہ کے نام نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ کلینک کے مین گیٹ سے نکل کر ایمبولینس تیزی سے چکنی سڑک پر پھسلنے لگی۔ اس کا "HOOTER" بلند آواز سے بج رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ گیٹ کے قریب سے ایک سرخ سوزوکی کار نے تیزی سے ٹرن لیا اور ایمبولینس کے پیچھے لگ گئی۔ میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ یقیناً سوزوکی کار میں بیٹھے ہوئے دو افراد کسی ایجنسی کے تھے۔ انہوں نے ایمبولینس کی اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی غزالہ کو پہچان لیا تھا اور فوراً ایمبولینس کے تعاقب میں چل پڑے تھے۔ سوزوکی کار کے ٹرن لینے تک ایمبولینس تقریباً فرلانگ بھر دور پہنچ چکی تھی۔ بہرحال کار والوں نے اپنی اسپیڈ بڑھائی اور جلد ہی نزدیک آ گئے۔ خطرے کے شدید احساس نے میرے دل و دماغ میں تہلکہ مچا دیا۔ میں تو مصیبت میں تھا ہی' غزالہ نے جذبات میں آ کر خود کو بھی مصیبت میں ڈال لیا تھا۔ اب جو لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے انہوں نے نجانے کیا ہنگامہ مچانا تھا۔ ان مشکل ترین حالات میں بھی مجھے غالب کا شعر یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ میں بھی خطرناک حالات کا شکار ہوا تھا تو قوت برداشت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نہ صرف سینے کی شدید تکلیف برداشت کر

رہا تھا بلکہ پیش آنے والے حالات سے نمٹنے کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

غزالہ نے اگلی نشست سے پکار کر کہا "شاہ جہاں آپ لیٹ جائیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے درد والی جگہ کو دبا کر رکھیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں یونہی ٹھیک ہوں۔"

ڈرائیور بولا "ہم مریض کو لینے جا رہے ہیں یا مریض کو لے کر جا رہے ہیں؟"

غزالہ بولی "لے کر جا رہے ہیں' اور لینے بھی جا رہے ہیں۔ تم اس چکر میں مت پڑو' اپنا دھیان ڈرائیونگ کی طرف رکھو۔"

ڈرائیور جز بز سا نظر آنے لگا تھا۔ ڈرائیور کی طرح یقیناً غزالہ بھی بے خبر تھی کہ کلینک سے ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی ہے اور رش میں سے تیزی کے ساتھ راستہ بنا کر ہمارے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک دم بیٹھے بٹھائے میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں غزالہ کی جذباتیت سے فائدہ اٹھاؤں اور وہ ان مشکل ترین حالات میں میرا سہارا بننے کا خطرہ مول لے..... میں نے غزالہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ جتنی تیزی سے ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے اس پر عمل بھی ہوا۔ ایک نہایت شاندار موقع آپوں آپ سامنے آ گیا تھا۔ ایمبولینس گلبرگ مین مارکیٹ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ چوک کے قریب ذیلی سڑک پر رش تھا۔ ایمبولینس کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ سرخ گاڑی ابھی پچاس ساٹھ گز پیچھے تھی اور وہ بھی گاڑیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ ڈرائیور اور غزالہ کی تمام تر توجہ سامنے کی طرف تھی۔ "ہوٹر" کے علاوہ ڈرائیور بھی مسلسل ہارن دے رہا تھا' میں نے آہستگی سے پچھلا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ سینے میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں لیکن میں برداشت کرتا ہوا ایک بغلی گلی کی طرف لپکا۔ میری شدید خواہش تھی کہ ایمبولینس سے میرے نکلنے اور روپوش ہونے کا منظر سرخ کار والوں کی نگاہ سے اوجھل رہے۔ گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا میں بغلی گلی میں پہنچا۔ یہ مین مارکیٹ کا عقبی حصہ تھا' یہاں سبزی' پھل اور گوشت وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ روز مرہ کی مصروفیات جاری تھیں۔ میرا ایک ہاتھ اپنے "زخمی" پہلو پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چالیس پچاس قدم آگے جا کر میں نے عقب میں دیکھا۔ شدید ذہنی دھچکا محسوس ہوا۔ میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں سرخ کار والوں کی نگاہ سے محفوظ رہوں۔ میں گرم شرمئی چادر والے اس دراز قد شخص کو صاف دیکھ سکتا تھا جو تیزی سے میرے پیچھے آ رہا تھا۔ یقیناً اس کا ساتھی بھی ہمراہ تھا۔ میں نے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ یہی شرمئی چادر والا سرخ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ میرا زخمی بازو بار بار دکھ رہا تھا اور سینے کا درد ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ دراز قد شخص اب مزید قریب آ گیا تھا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ اس کا ساتھی دو قدم پیچھے تھا اور وہ بھی بھاگ رہا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی بھاگنا پڑا۔

دراز قد شخص عقب سے چلایا "پکڑو..... پکڑو۔"

کچھ اور آوازیں بھی ابھریں "پکڑو' جانے نہ پائے۔"

ایک بینک کے سامنے کھڑا مسلح چوکیدار ان آوازوں سے الرٹ ہو گیا۔ وہ اپنی رائفل کے زعم میں دوڑ کر میرے سامنے آیا۔ خطرے میں گھر کر میرے جسم میں بجلی سی دوڑنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ چوکیدار مجھے روکنے کی کوشش کرتا' میرے سر کی انتہائی شدید ضرب اس کے چہرے پر لگی۔ وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑھکا اور بینک کا ایک بیرونی شیشہ توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ اس کا اہم ترین نقصان یہ ہوا تھا کہ اس کی رائفل میرے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ یہ سارا واقعہ چشم زدن کا تھا۔ چوکیدار کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ اس کی دلیری کا اتنا فوری اور "شدید" نتیجہ نکلے گا۔ راہ گیر چیختے چلاتے دائیں بائیں بھاگ گئے تھے۔ ان میں گلبرگ کی کوٹھیوں سے شاپنگ کے لیے آنے والی بڑی بڑی بیگمات بھی تھیں' ان کے نوکر چاکر بھی تھے اور مقامی آبادی کے لوگ بھی..... پلک جھپکنے میں بازار سنسان نظر آنے لگا' میں نے عقب میں دیکھا۔ دراز قد شخص نے اپنی گرم چادر کے نیچے سے دس گولی والا ماؤزر برآمد کر لیا تھا اور میرا نشانہ لینے کے لیے ہاتھ اٹھا رہا تھا' میں نے دوڑ کر ایک میوزک سینٹر میں پناہ لی۔ سینٹر کا مالک میرے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی راہ فرار اختیار کر چکا تھا۔ یکایک دھماکوں سے در و دیوار لرز اٹھے۔ ماؤزر سے اوپر تلے تین فائر کیے گئے تھے۔ گولیاں میوزک سینٹر کی دیواروں میں لگیں۔ شیشے کی شیلفوں میں سجی ہوئی کیسٹیں اچھل اچھل کر فرش پر بکھرنے لگیں۔ گرم چادر والا دراز قد شخص اندھا دھند میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا جوش و خروش اس کے لیے موت کا پیغام تھا۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ تڑپ کر ایک پھل فروش کے خوانچے میں گرا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو گرتے دیکھا تو للکارا مار کر میری طرف لپکا۔ وہ بھی اپنے ساتھی والی غلطی دہرا رہا تھا۔ میں نے تاک کر اس کی ٹانگوں پر فائر کیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے لڑکھڑایا اور اوندھے منہ گر گیا۔ میں میوزک سینٹر سے نکلا اور ایک تین فٹ چوڑی سرنگ نما گلی پار کر کے پھر بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے دو ہوائی فائر کیے۔ بس اسٹاپ کے قریب کھڑے لوگ خوف زدہ پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے نجانے کہاں اوجھل ہو گئے۔ میں نے اطمینان سے چوک کو جانے والی سڑک عبور کی اور کوٹھیوں کی طویل قطاروں میں گھس گیا۔

"شاہ جہاں..... شاہ جہاں۔" ایک آواز میرا تعاقب کر رہی تھی۔

میں حیران رہ گیا۔ یہ غزالہ کی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر

دیکھا۔ وہ میرے پیچھے بھاگی آرہی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کی سبز ساڑی میں صاف پہچان سکتا تھا۔

میں جھنجلا گیا۔ اس نے ابھی تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور خود کو خطرات میں جھونکتی چلی جارہی تھی۔ میں زیادہ دور تک بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تکلیف کے سبب میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اُڑنے لگی تھیں۔ میں نے خود کو ایک سائیڈ روڈ پر موڑا۔ دس پندرہ قدم کے فاصلے پر ایک وسیع کوٹھی کا چھوٹا سا سیاہ دروازہ کھلا نظر آرہا تھا۔ میں بلا تردد اس دروازے میں گھستا چلا گیا۔ کوٹھی کی بیرونی دیوار خاصی اونچی تھی۔ اگر غزالہ نے مجھے دروازے میں گھستے ہوئے نہیں دیکھا تھا تو وہ ہرگز نہیں جان سکتی تھی کہ میں اس کوٹھی میں داخل ہوگیا ہوں۔ بہرحال یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے موڑ مڑنے سے پہلے میں کوٹھی میں داخل ہوا ہوں یا نہیں۔ میں رائفل بدست کوٹھی کے سبزہ زار میں کھڑا تھا۔ سامنے ایک خوبصورت پرام تھی۔ پرام میں بیٹھا ہوا شیر خوار بچہ بڑے اطمینان سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے گلابی گال دھوپ میں تپ کر کچھ اور بھی گلابی نظر آرہے تھے۔ اس کی آیا یا والدہ شاید کسی کام سے اندر گئی تھی۔ میری نگاہ اندر کے بجائے باہر تھی' میں دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا' یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ میں غزالہ کو دھوکا دینے میں کامیاب رہا ہوں یا نہیں۔ تین چار سیکنڈ کشمکش کی سولی پر گزرے۔ پھر کھٹ کے ساتھ کا وہ چھوٹا دروازہ تیزی سے کھلا اور غزالہ اندر داخل ہوئی۔ ایک لمحے دروازے پر ساکت رہنے کے بعد وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔ اس نے میرے دونوں کندھے تھام لیے۔ لرزتی کانپتی اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولی "شاہ جہاں! یہ کیا کررہے ہیں آپ..... خدا کے لیے کچھ ہوش کریں۔"

یہی وقت تھا جب کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے ایک تیز تیلی چیخ سنائی دی۔ ایک سرو قد عورت وحشت ناک انداز میں چلائی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا دودھ کا فیڈر نیچے گر گیا تھا اور سائبان کے فرش پر لڑھکتا چلا جارہا تھا۔ پھر ایک درمیانی عمر کا مرد باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور چہرے پر خوف آمیز حیرت کی بارش ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے اور غزالہ کو دیکھ کر کوئی ردِعمل ظاہر کرتا' میں چیختا چلاتا بھاگتا' میں نے آگے بڑھ کر جھٹکے سے چوکی دار کی رائفل اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"خبردار۔ آواز نکلی تو بھیجا دیوار سے چپکا دوں گا۔"

وہ اپنی جگہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔ عورت کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا' وہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔ میں ان دونوں کو دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک سجا سجایا کمرا تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ عورت رو دینے والے لہجے میں بولی "میرا بچہ۔"

میں نے غزالہ کو اشارہ کیا اور وہ پرام سمیت بچے کو اندر لے آئی۔ کمرے کے باتھ روم میں کوئی شخص نہا رہا تھا۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے' وہ شخص باتھ روم کے اندر سے پکارنے لگا "ابھی شلوار دو.... او نے میں کہتا ہوں شلوار دو۔"

اس نے دو تین بار یہ آواز لگائی۔ جب کوئی جواب نہیں آیا تو تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک دم حیرت سے پھیل گئیں لیکن حیرت کا یہ حملہ اسی پر نہیں ہوا' مجھ پر بھی ہوا۔ بھیگے ہوئے سر اور چہرے کے ساتھ جو شخص باتھ روم کے اندر سے جھانک رہا تھا وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹا کے غور سے مجھے دیکھا اور دو تین لمحے بعد وہ بھی مجھے پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی حیرت دو گنا ہوگئی۔ اسی حیرت کے عالم میں اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اس بھیگے ہوئے جیم شحیم فربہ اندام شخص کا نام عالم قریشی تھا۔ اس وقت عالم قریشی کے زیریں جسم پر صرف ایک تولیا تھا اور پورے جسم سے ٹپ ٹپ پانی کے قطرے گر رہے تھے۔

وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت گھلی ہوئی تھی "شاہ جہاں! تم یہاں؟ اور..... یہ..... یہ تمہارے ہاتھ میں رائفل..... لیکن تمہیں میرے گھر کا پتا کیسے چلا؟"

میں نے کہا "اسی رائفل کے زور پر چل گیا۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا یار! تو کیا کہہ رہا ہے۔ بہرحال پہلے گلے تو مل لے ظالم۔ میں نے تو یہ امید ہی چھوڑ دی تھی کہ تجھ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

وہ بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا اور اس کی توند اپنی تمام تر لچک اور گداز کے ساتھ میرے پیٹ سے ٹکرائی۔ اس کے بازوؤں نے بڑی محبت سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں فرطِ جذبات میں اس کا تولیا ہی نہ گر جائے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کے تولیے کو سہارا دیا اور ایک بار بھینچ کر اسے بہ آہستگی پیچھے ہٹا دیا۔ ہمارے اردگرد کھڑے تمام افراد حیران تھے' حتیٰ کہ غزالہ بھی ششدر نظر آرہی تھی..... یہ اتفاق تھا ہی ایسا کہ خود میں بھی ورطۂ حیرت میں رہ گیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں رائفل بدست جس کوٹھی میں گھسا ہوں وہ میرے ایک پرانے شناسا کی نکل آئے گی۔ یقیناً عالم قریشی نے بھی تصور نہیں کیا ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو شلوار میں آزار بند ڈالنے کے لیے کہے گا اور جب شلوار لینے کے لیے باتھ روم کا دروازہ کھولے گا تو شاہ جہاں المعروف استاد جہانی سے ملاقات ہو جائے گی۔

عالم قریشی سے میری ملاقات کوئی ایک سال پہلے لاہور ہی میں ہوئی تھی۔ میں ساہی صاحب کے گھر سے نکلا تھا اور مجتبیٰ کو درے ملنے اس کی نہر والی کوٹھی جا رہا تھا۔ رات دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ نہر کے کنارے عالم قریشی کی نئی نکور ٹویوٹا کار کھڑی تھی اور تین افراد اس کے قریب موجود تھے۔ میں نے پہلی نظر میں بھانپ لیا تھا

کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے اپنی سوزوکی کار درختوں میں روک دی تھی اور پیدل ہی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ وہ تینوں حضرات مسلح ڈاکو نکلے تھے۔ اس ویرانے میں وہ عالم قریشی کی صحت مند بیوی کی کلائیوں سے سونے کی چوڑیاں اُتروا رہے تھے۔ چوڑیاں پھنس پھنس کر اتر رہی تھیں اور چوڑیوں کے پھنسنے کی وجہ سے ڈاکو پھنس گئے تھے۔ ان نیم تجربہ کار نوعمر ڈاکوؤں کو پھینٹی لگا کر بھگانا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ مال مسروقہ بھی وہ لوگ وہیں پھینک گئے تھے۔ ان میں مسز عالم قریشی کے زیورات کے علاوہ عالم قریشی کی پچاس ہزار کی راڈو گھڑی بھی تھی۔ اگر میں اس روز موقع پر نہ پہنچتا تو عالم اور اس کی بیوی نے مزنگ چونگی سے جو درجن چوڑیاں خریدی تھیں وہ انہیں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے فی درجن کے حساب سے پڑتیں اور اگر گاڑی بھی چلی جاتی تو ان چوڑیوں کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔ بہرحال یہ واقعہ میری اور عالم قریشی کی شناسائی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ آنے والے دنوں میں' میں جب تک لاہور میں رہا تھا' عالم سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ عالم کا جیل روڈ پر کاروں کا خاصا بڑا بزنس تھا۔ وہ من موجی' خوش خوراک اور یاریاں نبھانے والا شخص تھا۔ دو شادیاں کرچکا تھا اور تیسری کے لیے پر تول رہا تھا۔

یہ سارے خیالات چند لمحے کے اندر اندر میرے ذہن سے گزر گئے۔ مجھ سے معانقہ کرنے کے بعد عالم قریشی نے بستر سے شلوار اٹھائی اور فراپ سے دوبارہ باتھ روم میں گھس گیا۔ یقیناً وہ مزید معانقے کرنے سے پہلے بالباس ہونا چاہتا تھا۔ میں نے رائفل نیچے رکھ دی اور نڈھال سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اہل خانہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی کھسر پھسر کی طرف توجہ دوں۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ کم از کم وقتی طور پر میں محفوظ ہوگیا ہوں' پہلو کا درد پوری شدت سے ابھر آیا تھا۔ یہ درد کسی وحشی جانور کی طرح اپنے نوکیلے پنجوں سے میرے معدے کو کھود رہا تھا۔ اس وقت غزالہ تیزی سے آگے بڑھی اور اپنا رومال میرے بازو کی پٹی پر باندھنے لگی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ بھاگ دوڑ میں کہنی کے زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں اور خون کے قطرے مسلسل فرش پر گر رہے ہیں۔ غالباً یہ زخم اس وقت کھلا تھا جب جینک کا چوکی دار مجھ سے ٹکرایا تھا۔

جب تک غزالہ نے رومال باندھا' عالم قریشی کپڑے پہن کر باتھ روم سے نکل آیا۔ عالم قریشی کی بیوی نے بچے کو بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا اور زاروقطار رو رہی تھی۔ شوہر سے بولی "یہ کیسے دوست ہیں آپ کے..... انہوں نے تو ہماری جان ہی نکال لی تھی۔ کسی ڈاکو کی طرح رائفل تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ آپ باہر نہ آتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔"

میں نے کراہتے ہوئے کہا "میں آپ سب سے معافی چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہرگز آپ کو نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ کچھ لوگ میری جان کے درپے ہو رہے ہیں' میں ان سے بچنے کی کوشش میں یہاں گھس آیا تھا۔"

عالم قریشی بولا "صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بھائی! میں جانتا ہوں کہ کوئی وجہ ہوگی جو تم نے یوں دیوار پھاندی ہے۔ اب اسے انہونی کہا جائے یا کرشمہ کہا جائے کہ جو دیوار تم نے پھاندی ہے وہ تمہارے اس خاکسار عالم قریشی کی ہے۔"

میں نے کہا "میں نے دیوار شیوار نہیں پھاندی۔ اس چھوٹے سے گیٹ سے آیا ہوں۔ وہ کھلا تھا۔"

غزالہ بولی "پلیز! آپ زیادہ باتیں نہ کریں لیٹ جائیں۔ آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

عالم قریشی کمرے کی طرف مڑتے ہوئے بولا "میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور غزالہ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا کہ یہ بھی ڈاکٹر ہے۔ کچھ نہ کچھ کر لے گی میرا۔

عالم قریشی بولا "ڈاکٹر جی! آپ ان کو اندر کمرے میں لے آئیں۔"

کمرے میں پہنچ کر میں نیم جان سا بستر پر لیٹ گیا۔ غزالہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک گولی نکال کر مجھے کھلائی' پھر کاغذ پر ایک دو دوائیں لکھیں۔ عالم قریشی یہ دوائیں لینے کے لیے خود بازار تک بھاگا گیا اور پانچ دس منٹ میں واپس آگیا۔ دوائیں وہ لے آیا تھا لیکن اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ کہنے لگا "سنا ہے' مین مارکیٹ میں فائرنگ وغیرہ ہوئی ہے۔ ایک بندہ شدید زخمی ہوا ہے' دوسرے کی ٹانگوں میں گولیاں لگی ہیں۔"

میں نے کہا "ٹانگوں میں گولیاں نہیں گولی لگی ہے اور مجھے اس لیے پتا ہے کہ میں نے خود ماری ہے۔"

عالم قریشی کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ کہنے لگا "پھر تو بھئی بڑی احتیاط شیاط کی ضرورت ہے تمہیں۔ پولیس والے مارکیٹ میں اور آلے دوالے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔" یہ بات اس نے اتنی آہستہ سے کہی تھی کہ دیگر گھر والے نہ سن سکیں۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا "اور احتیاط کیا ہو۔ یہاں کمرے میں تو ہوں۔ کیا کسی تہ خانے میں اتاروگے۔"

وہ بولا "تہ خانہ تو نہیں لیکن کافی محفوظ قسم کے کمرے بھی ہیں یہاں۔"

غزالہ بولی "ان کی کہنی سے مسلسل خون بہتا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ پولیس والے اس خون سے کوئی آئیڈیا نہ لگا لیں۔"

عالم قریشی بولا "فکر کی بات نہیں۔ میں ابھی کوٹھی کے آلے دوالے دیکھ لیتا ہوں۔" پھر ذرا توقف سے بولا "ویسے کسی نے تمہیں اندر داخل ہوتے تو نہیں دیکھا؟"

میں نے کہا "امید تو نہیں' لیکن اگر تمہارے برے دن آہی گئے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

وہ بولا "تمہاری وجہ سے آنے والے دن میرے لیے کبھی برے نہیں ہو سکتے۔ بہرحال تم اپنی حالت پر ترس کھاتے ہوئے زیادہ نرنر نہ کرو۔ میں نوکروں کو سمجھا بجھا کر ابھی آتا ہوں۔"

وہ اپنے توانا جسم کو تیزی سے حرکت دیتا ہوا باہر نکل گیا اور ساتھ ہی اپنی بیوی بچے کو بھی لے گیا۔ اب صرف اس کا بھائی ہمارے پاس تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی کنپٹی پر میں نے رائفل رکھی تھی۔ یہ معمولی قد کاٹھ کا شخص درمیانی عمر کا نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں عالم قریشی سے چھوٹا تھا۔ عالم قریشی کی عمر پینتیس چھتیس سال تھی جبکہ یہ بمشکل اٹھائیس تیس سال کا تھا لیکن جس طرح برگد کے نیچے کوئی اور پودا پھلتا پھولتا نہیں' اسی طرح اینگ عالم قریشی کے نیچے اس کا بھائی' اصغر قریشی بکر سمٹ کر رہ گیا تھا۔ شکل و صورت' قد کاٹھ' ذہانت غرض ہر لحاظ سے وہ ایک معمولی شخص نظر آتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا ایک سال پہلے اصغر سے بھی ایک دوبار آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ ان دنوں عالم قریشی ٹاؤن شپ میں رہائش پذیر تھا۔ گلبرگ کی یہ کوٹھی نئی بیوی کے ساتھ حال ہی میں عالم قریشی کے "استعمال" میں آئی تھی۔

عالم قریشی کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ اب وہ قدرے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں بادشاہو! محلے میں کسی کو کوئی خبر نہیں ہے۔ سڑک کے موڑ پر خون کے تین چار قطرے نظر آئے تھے' وہ میں نے صاف کر دئیے ہیں۔ اس کے سوا اور کہیں خون کا نشان نہیں ہے۔ گھر میں اس وقت صرف دو نوکر ہیں۔ انہیں بھی میں نے بڑے اچھے "طور طریقے" سے سمجھا دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

عالم قریشی کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ میرے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اس کوٹھی تک کیونکر پہنچا ہوں لیکن میری تکلیف کے پیش نظر وہ خاموش تھا..... سہ پہر دو تین بجے کے قریب ہی میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے از خود عالم قریشی کو اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتایا۔ میری توقع کے عین مطابق' آدھی بات تو وہ بھی جانتا تھا کہ چند روز قبل میرے ہاتھوں بدنام ڈاکو عیسیٰ جان کیفر کردار کو پہنچا ہے۔ یہ بات اسے اخباری خبروں کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ باقی کی تفصیل میں نے خود عالم قریشی کو بتا دی۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی ہی نہیں جسے خاص طور سے چھپانے کی کوشش کی جاتی۔ عیسیٰ جان کی موت پر کچھ بار سوخ لوگوں نے جس حتمی رد عمل کا اظہار کیا تھا اس کا تذکرہ اخباروں میں بھی آیا تھا اور یہ بات بھی کھل کر لکھی گئی تھی کہ شاہ جہاں کے خلاف صوبائی انتظامیہ پر اوپر سے دباؤ ڈالا گیا ہے۔

عالم قریشی لڑائی جھگڑے سے بچ کر رہنے والا امن پسند شخص تھا۔ عام بزنس مین کی طرح وہ خواہ مخواہ کسی پھڈے میں پڑنا پسند نہیں کرتا تھا' لیکن اگر وہ چاروناچار برے حالات میں گھر جاتا تھا تو پھر حوصلہ مندی کا ثبوت دیتا تھا۔ میرے جیسے شخص کو پناہ دینا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ یہ کام کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چھاتی پر ہاتھ مار کر کہنے لگا "جگرا تیرے اور بھرجائی کے لیے جیل بھی جانا پڑے تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے کراہتے ہوئے کہا "نہیں یار! وہ تیری بھرجائی نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو بن جائے گی یار۔ ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہوتی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہا ہے بھئی۔ یہ صرف ڈاکٹر ہے اور شادی شدہ ہے۔"

"اوہو.... سوری یار۔" عالم قریشی نے ہونٹ سکوڑے۔

اس رات دیر تک میں آنکھیں کھولے بستر پر پڑا رہا۔ درد میں افاقہ تھا لیکن طبیعت میں بے چینی سی تھی۔ ایک دردمند ڈاکٹر کی حیثیت سے غزالہ ہر پل میرے ساتھ تھی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ میرا بستر تھا اور دوسری دیوار کے ساتھ اس کا..... نائٹ بلب کی بہت مدھم روشنی میں وہ اپنے بستر پر نیم دراز تھی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی..... بہت گم صم نظر آتی تھی وہ۔

ایک طویل وقفے کے بعد میں نے پوچھا "مجھ سے ناراض ہو تم؟"

"میں نے کہا ہے نا آپ چپ چاپ لیٹے رہیں۔ بولنا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔" وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے بولی۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں خاموش رہوں تو پھر تم بولو۔"

"کیا بولوں؟"

"وہی جو میں نے پوچھا ہے' مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"کس بات پر؟"

"میں نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی۔ چلتی ایمبولینس سے اتر گیا۔ تمہیں یقیناً..... ٹھیس پہنچی ہو گی۔"

"ٹھیس پہنچنے سے کیا ہوتا ہے۔ بندہ مر تو نہیں جاتا۔"

"میری طرف سے تمہیں ہمیشہ دکھ ہی ملے ہیں۔"

"چلو کچھ نہ کچھ تو ملا ہے نا۔"

اس نے بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ اس موضوع کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ کافی دیر کمرے میں بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر میں نے وضاحتی لہجے میں کہا "غزالہ! میرا مقصد صرف تمہاری بھلائی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اس طرح مجھے لئے لئے پھرو اور پولیس والے شکاری کتوں کی طرح ہمارا پیچھا کریں۔ تم عورت ذات ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو کہ موجودہ حالات میں تمہارا میرے ساتھ رہنا تمہارے لیے کتنی مصیبتیں پیدا کرے گا۔"

وہ بولی "کیا یہ حالات سری لنکا کے حالات سے بھی زیادہ خراب ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"سری لنکا میں' میں بھی تو بیمار ہوئی تھی' جیا سنگھ کے قتل کی وجہ سے سنہالی غنڈے میرے اور عاصم کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ہر طرف پہرے لگے ہوئے تھے۔ کیا اس وقت آپ نے موت کے ڈر سے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا؟ نہیں ایسا نہیں ہوا تھا۔ آپ میری لاش کو اٹھا کر بھاگے پھرے تھے۔ رات رات بھر میرے سرہانے جاگتے رہے تھے' میری دواؤں کے لیے میلوں پیدل سفر کیا تھا آپ نے۔ اگر آج میں آپ کی تیمارداری کرنا چاہتی ہوں تو آپ کو اعتراض کیوں ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ میرے سائے سے بھی دور بھاگنا چاہتے ہیں۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

میں نے کہا "غزالہ! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم ایک شادی شدہ عورت ہو۔ تمہارا یوں میرے ساتھ....."

"معاف کیجئے' میں سری لنکا میں بھی شادی شدہ تھی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی "بات یہاں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ کی نہیں ہے۔ آپ اس معاملے کو کیوں خواہ مخواہ درمیان گھسیٹ رہے ہیں..... مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ آپ تن تنہا ہیں اور بیمار ہیں۔ یہ بیماری کسی بھی وقت خطرناک شدت پکڑ سکتی ہے۔ آپ کی تکلیف ایسی نہیں کہ کوئی بھی ڈاکٹر اس کا علاج کر سکے۔ یہ ایک خاص تکلیف ہے اور اس کا علاج ایک خاص فرد ہی کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہو تم؟"

وہ بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "جو کچھ کر سکتی ہوں' ضرور کروں گی۔"

اگلے روز صبح سویرے تازہ اخبار پر میری نظر پڑی۔ اس میں کل کے واقعے کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ تشویشناک اطلاع یہ تھی کہ میرے ہاتھوں سینے پر گولی کھانے والا شخص اسپتال میں مر گیا تھا۔ اس کا نام ضامن خان تھا۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ کل مین مارکیٹ میں میرے مقابل آنے والے دونوں افراد پولیس اہلکار نہیں تھے۔ ان کا تعلق منصور خان ایم پی اے کے ذاتی گارڈز سے تھا۔ یہ گارڈز ان پولیس اہلکاروں کے ساتھ شامل تھے جنہوں نے کل سویرے میری گرفتاری کے لیے ڈاکٹر رقیہ کے کلینک کا محاصرہ کیا تھا۔ اتفاقاً ان کی نگاہ ایمبولینس میں بیٹھی غزالہ پر پڑ گئی تھی اور ان کی "معیت" انہیں کھینچ کر ہمارے پیچھے لے آئی تھی۔ اخباری اطلاع میں اس خبر کو بہت مرچ مسالے لگا کر بیان کیا گیا تھا۔ میرے اندیشے کے عین مطابق ایک رپورٹر بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے انکشاف کیا تھا کہ ڈاکٹر غزالہ شاہ جہاں کی کزن بھی ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ جو شاہ جہاں کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کر رہی ہے اور ہر قسم کے خطرات مول لے رہی ہے تو اس کو شاہ جہاں سے کوئی خاص تعلق بھی ہو۔

میں نے اخبار دیکھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ طبیعت میں عجیب سی جھنجلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود غزالہ نے خود کو اس معاملے میں ملوث کر لیا تھا۔ اخبار والوں کا کیا تھا۔ کل وہ "ملکی مفاد کے اس اہم موضوع" پر لمبا چوڑا فیچر بھی چھاپ سکتے تھے۔ اسی دوران میں' میں غزالہ کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سست قدموں سے باتھ روم تک گیا اور واپس آیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے دیکھا غزالہ ساتھ والے کمرے میں موجود تھی اور ہاتھ میں فون کا ریسیور لیے عجیب کشمکش کے عالم میں بیٹھی تھی۔ میں نے کل شام بھی اسے اسی کیفیت میں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہیں فون کرنا چاہ رہی ہے اور نہیں بھی چاہ رہی۔ شاید وہ شیخ عاصم سے رابطہ کرنے کی فکر میں تھی۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اپنے خاوند شیخ عاصم سے غزالہ کے تعلقات کس نہج پر جا رہے ہیں۔ ان کی ناراضگی دور ہوئی ہے یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک؟ میں نے ایک دو بار غزالہ سے پوچھنا بھی چاہا تھا لیکن اس نے گول مول جواب دے دیا تھا۔

اس دن دوپہر کے وقت میری طبیعت تھوڑی سی خراب ہوئی لیکن پھر شام تک ٹھیک رہی۔ سارا دن عالم قریشی کی دلچسپ باتیں سننے میں گزر گیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا لہٰذا عالم کو شوروم جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ عالم قریشی ٹھیٹ لاہوریا تھا۔ دہی کی پیڑوں والی لسی پینے والا' مزنگ چونگی سے کڑاہی گوشت اور چرغے کھانے والا' نہاری کا دلدادہ' شام کو راوی کی سیر کرنے والا اور ہفتے میں کم از کم دوبار مزاحیہ تھیٹر دیکھنے والا۔ وہ اردو بھی پنجابی کے لہجے میں بولتا تھا اور طویل قہقہہ تو اس کی گفتگو کی جان تھا۔ ایک ایسا ہی قہقہہ بلند کر کے اس نے ایک آنکھ میچی اور رازداری سے بولا "بیوی کو ہمیشہ دبا کر رکھنا چاہیے۔ میرا مطلب ہے کہ ویسے دبا کر رکھنا چاہیے' یعنی رعب کے نیچے۔ بیوی رعب میں ہو تو پھر چاہے ایک چھوڑ تین بیویاں کر لو کوئی فرق نہیں پڑتا' لیکن اگر رعب نہیں ہے تو پھر ایک بھی دو کانوں میں سر کر دیتی ہے۔ لیکن بادشاہو! اس سے تم یہ مطلب نہ لینا کہ میں ایک اور بیوی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ بس جو کچھ ہے اتنا ہی بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ہی قابو میں رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو تم کامیاب نظر آتے ہو۔"

"کامیابی کیوں نہ ہو یار! بڑی محنت کرتا ہوں۔ ترازو میں تول کر سلوک کرتا ہوں دونوں سے۔ کیا مجال ہے کہ چھٹانک آدھی چھٹانک کا فرق بھی آ جائے۔ بلکہ میں تو اگر ایک کو کسی بات پر جھاڑتا ہوں تو فوراً جا کر دوسری کو بھی جھاڑ آتا ہوں' چاہے کوئی بات ہوئی ہو یا نہ ہو۔" پھر وہ خود ہی زور سے قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

عالم قریشی کی اس وسیع کوٹھی میں میں خود کو بالکل محفوظ تصور

کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پولیس ہفتوں بھی سر پٹختی رہی تو میرا کھوج نہیں لگا سکے گی۔ یہ اعلیٰ طبقے کا رہائشی علاقہ تھا اور بالکل پُرسکون تھا... اسی رات ایک بڑا یادگار واقعہ ہوا۔ کوئی ناول نگار ہوتا تو اس منظر کی یادگار منظر کشی کرتا۔ یا پھر کیمرا اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور مختلف زاویوں سے فلم بند کر کے لازوال کر دیتا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا منظر تھا اور یونہی اتفاقاً وجود میں آگیا تھا لیکن اس میں چھپی ہوئی بے پناہ نزاکت اور خوب صورتی صرف محسوس کرنے کی چیز تھی۔

میں کافی دیر تک درد سے ہولے ہولے کراہتا رہا تھا۔ رات نو بجے کے لگ بھگ غزالہ نے مجھے دوا دی تھی اور پھر میرے بیڈ کے پاس ہی قالین پر کشن ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ ایک میڈیکل کا میگزین اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ نجانے کس وقت درد میں افاقہ ہوا اور مجھے نیند آگئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو وال کلاک رات دو بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ کمرے میں باتھ بلب کی نیلگوں روشنی تھی۔ ایک کھڑکی تھوڑی سی کھلی رہ گئی تھی۔ اس میں سے نیم خنک ہوا اندر داخل ہو رہی تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔ مخمل کے دودھیا پردوں والی کھڑکی کے پیچھے سے درمیانی راتوں کا چاند نظر آرہا تھا۔ جیسے وہ کوئی چنچل اجنبی ہو اور رات پچھلے پہر شہر کے دریچوں میں تانکا جھانکی کر رہا ہو۔ پھولوں کی بھینی بھینی مہک پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ غزالہ کا سر میرے شانے سے چھو رہا ہے۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ میرے بالکل قریب موجود تھی اور قالین پر بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی۔ اس کا سر میرے بستر پر دھرا تھا اور لمبے ریشمی بال میرے چہرے اور کندھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں ششدر رہ گیا اور مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ خوابیدہ حسن چاند کے روبرو تھا اور چاند سے بڑھ کر حسین نظر آرہا تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ غزالہ کے طویل بالوں کی کچھ لٹیں میرے پہلو کے نیچے بھی ہیں... یکایک ساری بات میری سمجھ میں آگئی... میرے سونے کے بعد غزالہ میگزین دیکھ رہی تھی۔ وہ بستر کے بالکل قریب موجود تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی لٹیں ہوا سے اڑ کر بستر پر پھیل گئی تھیں۔ اسی دوران میں میں نے کروٹ بدلی تھی اور وہ لٹیں میرے پہلو اور زخمی بازو کے نیچے دب گئی تھیں۔ مریض کی نیند بہت اہم ہوتی ہے۔ غزالہ نے اسی خیال سے اپنے بال میرے نیچے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میرا زخمی بازو دکھ جائے گا اور میں جاگ جاؤں گا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح بیٹھی رہی تھی، پھر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ میرے بازو سے مس ہو رہا تھا اور پیشانی کی رگ ابھر کر روشن شعاع کی طرح نظر آرہی تھی۔ وہ ایک باوقار اور سنجیدہ ڈاکٹر تھی، لیکن ان لمحوں میں وہ بے حد معصوم نظر آرہی تھی۔ کسی ایسی من موہنی ہرنی کی طرح جس کا پاؤں دام میں الجھ گیا ہو اور وہ وہیں ابھی ابھی سو گئی ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے پیار کا سمندر اُچھل گیا۔ جی چاہا وقت کی گردش تھم جائے۔ میں یونہی لیٹا رہوں اور وہ میرے شانے سے سر ٹکائے یونہی محوِ خواب رہے۔ اس کی مہکی ہوئی سانس میرے بازو سے ٹکراتی رہے اور میرے جسم میں داخل ہوتی رہے۔ میرا دوسرا ہاتھ بے اختیار حرکت میں آیا اور غزالہ کے بالوں میں رینگنے لگا۔ اس کے شفاف ملائم رُخسار کو سہلانے لگا۔ اس کے ہونٹ ادھ کھلے گلاب تھے۔ کوئی بے پناہ کشش مجھے ان ہونٹوں کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ان ہونٹوں میں پوشیدہ حلاوت اور شیرینی کے سمندر مجھے پکار رہے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا، یہ ہونٹ کسی اور کے ہیں۔ یہ رُخسار، یہ گیسو کسی اور کی ملکیت ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہی وقت تھا جب غزالہ کی پلکیں لرزیں اور وہ جاگ گئی۔ اس نے جلدی سے سیدھا ہونا چاہا۔ بال میرے نیچے دبے ہوئے تھے، اس کے سر کو جھٹکا لگا اور ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ میں نے جلدی سے پہلو بدل کر اس کے بال اپنے بوجھ تلے سے نکال دیے۔

وہ خوابیدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی "کچھ چاہیے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

دل نے حسرت سے سوچا، کاش اس کے سوال کا کوئی خوب صورت جواب دیا جا سکتا... لیکن خوب صورت سوالوں اور جوابوں کا وقت تو میں خود کھو چکا تھا۔ کتنا آسان تھا کسی وقت یہ سب کچھ... لیکن میں نے خود اسے مشکل بنا دیا تھا۔ اپنی نادانیوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی بے پرواہیوں سے، اپنی ایک بے جا ضد سے میں نے قدم قدم چل کر سیکڑوں میل کا فاصلہ پیدا کر لیا تھا اپنے اور غزالہ کے درمیان... میں جہانی استاد تھا لیکن اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی میں نے اپنی حماقتوں سے ہاری تھی۔ کبھی کبھی تنہائیوں میں، میں خود کو جی بھر کر ملامت کرتا تھا، لیکن کوئی وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود کو ملامت کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ میں اپنے خدا سے شکوہ کناں ہو جاتا تھا۔ اس سے پوچھتا تھا، اے قادرِ مطلق تو ہی ذہنوں اور سوچوں کو تخلیق کرنے والا ہے۔ تو نے میرے ذہن کو ایسا کیوں بنایا۔ پہلے ایک لڑکی کی محبت میرے ذہن میں داخل ہوئی اور جب یہ محبت جان کا حصہ بن گئی تو اپنے ماں باپ کی موت کے حوالے سے میں اس لڑکی سے نفرت کرنے لگا لیکن یہ نفرت بھی نفرت نہ تھی، اس میں ہزار ہا محبتوں کی شدت شامل تھی۔

غزالہ محویت سے میری طرف دیکھ رہی تھی "زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی۔" اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے غزالہ۔"

"کس بات پر؟"

"حتت... تمہارے بال میرے نیچے آگئے تھے... تم نے مجھے

جگا دیا ہوتا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ میں بے آرام ہوئی ہوں؟"

"جس طرح تم سو رہی تھیں اس طرح کوئی آرام سے تو نہیں ہو سکتا۔"

"افسوس تو مجھے کرنا چاہیے کہ آپ کی تیمارداری کرنے کے بجائے میں سو گئی، اُلٹا آپ افسوس کر رہے ہیں۔"

"نہیں غزالہ۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں اب کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ تم جا کر لیٹ جاؤ۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی، وہیں قالین پر بیٹھی رہی اور میگزین میں سے مجھے ایک آرٹیکل پڑھ کر سنانے لگی۔

○☆○

اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ میری آنکھ کھلی۔ عالم قریشی ناشتا لیے میرے سرہانے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے یار! آج شوروم نہیں گئے؟"

"بس نہیں گیا... آج کچھ گڑبڑ ہے۔"

"شہر میں؟"

"نہیں میرے پیٹ میں۔ بدہضمی سی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو شہری ہے۔" خوراک کا جلوس "گزرا ہوگا، کہیں ٹریفک جام ہو گئی ہوگی۔"

"جام نہیں ہوئی یار، کچھ زیادہ رواں ہو گئی ہے۔ رات ایک دوست آیا تھا، زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ پرانی انارکلی میں فالودہ پیچ بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں کچھ زیادہ ہی پی گئے۔"

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق تو فالودہ کھایا جاتا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے یار۔ ربڑی والا دودھ، فالودہ، قلفی، بس ناموں کا ہیر پھیر ہوتا ہے۔ یار! ویسے وہ کم بخت فالودہ بناتا بڑا زبردست ہے۔ کھوتے میں جان ڈال دیتا ہے۔"

میں نے کہا "اور جان نکال بھی تو لیتا ہے۔ میں دس دن سے بیمار ہوں اور میرا رنگ اتنا زرد نہیں ہوا جتنا تمہارا ایک رات میں ہو گیا ہے۔"

"ایک رات میں ٹھیک بھی ہو جائے گا بھائی میرے۔ یہ چھوٹی موٹی بدہضمیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ویسے بھی یہ میٹھے سے ہونے والی بدہضمی ہے۔ اس کا علاج کراری چیز میں ہے۔ تمہاری چھوٹی بھرجائی سے میں نے کریلے پکوائے ہیں قیمے سے بھرے ہوئے۔ اللہ دی قسم بڑا ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں اور قیمے والے کریلوں کو تو قیامت بنا دیتی ہے۔ چوتھے گھر خوشبو جاتی ہے کریلوں کی اور دو تک روپ ایسا ہوتا ہے کہ بندہ دیکھے اور پھڑک جائے۔"

"یعنی آج تمہارا پھڑکنے کا ارادہ ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"ایک طرف کہتے ہو کہ پیٹ میں ٹریفک رواں دواں ہو گئی ہے، دوسری طرف کریلے کھا رہے ہو۔"

"یار! تم بڑے ہی بدذوق آدمی ہو۔ خوراک کی باریکیاں اور اس کی نفسیات سمجھتے ہی نہیں ہو۔"

"نفسیات نہیں خصوصیات۔"

"ہاں ہاں وہی... یہ ایک جانی پہچانی ہوئی بات ہے کہ میٹھے کی بدہضمی کراری چیز سے دور ہوتی ہے۔"

"واہ بھئی مان گئے تمہیں۔ بڑے کاریگر بندے ہو۔ خوراک کھا کر بیمار ہوتے ہو اور اس کا علاج بھی خوراک سے ہی کرتے ہو... تمہیں بھلا کون دھوکا دے سکتا ہے۔"

وہ بولا "کیا بات ہے۔ آج زبان بہت چل رہی ہے۔ لگتا ہے کہ جناب کی طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔"

"خیر اتنی ٹھیک بھی نہیں۔ تمہاری صورت دیکھ کر بہتر ہو جاتی ہے۔"

"میری صورت میں کیا دھرا ہے۔ کسی اور کی صورت دیکھتے ہو گے... ویسے... وہ تمہاری ڈاکٹر صاحبہ پتا نہیں آج سویرے سویرے کہاں چلی گئی ہیں۔"

مجھے بھی غزالہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے پوچھا "کب گئی ہے؟"

"ابھی کوئی دس منٹ پہلے۔ تم سوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ کہنے لگیں ضروری کام ہے۔ گیارہ بجے تک آجاؤں گی... میں نے کہا گاڑی لے جائیں، پہلے تو شش و پنج میں پڑی رہیں، پھر تیار ہو گئیں۔ میں نے سوزوکی دے دی، ڈرائیور نشان علی کو بھی ساتھ کر دیا۔"

"یار کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرا مطلب ہے اگر کسی نے پہچان لیا تو۔"

"امید تو نہیں ہے۔" عالم قریشی نے پُرسوچ لہجے میں کہا "وہ برقع پہن کر گئی ہیں۔ چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔"

"برقع کہاں سے ملا؟"

"تمہاری چھوٹی بھرجائی کبھی کبھی پہنتی ہے یار۔"

میں سوچنے لگا کہ غزالہ اچانک کہاں چلی گئی ہے۔ یقیناً کوئی ضروری کام ہوگا، ورنہ وہ باہر نکلنے کی کوشش نہ کرتی۔ اسی ادھیڑبن میں، میں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ عالم قریشی نے مجھے دوا کھلا دی۔ تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی تھی، میں لیٹ گیا۔ عالم قریشی بھی کھڑکیوں پر پردے برابر کر کے اور لائٹ آف کر کے باہر چلا گیا۔ پانچ دس منٹ بعد ہی معدے میں شدید اینٹھن محسوس ہونے لگی۔ یہ اینٹھن رات میں وقفے وقفے سے کئی بار ہوئی تھی، پہلی مرتبہ یہ تکلیف دو تین دن میں ہو رہا تھا۔ اس اینٹھن کے لیے غزالہ ایک سرخ رنگ کی لمبوتری گولی دیتی تھی۔ میں کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا لیکن جب اینٹھن بڑھ گئی تو اٹھ کر الماری کی دراز کھولی۔ گولیاں

والا بیگ تو موجود تھا لیکن گولی نہیں تھی۔ آخری گولی میں نے رات کو فزالہ کو بتائے بغیر نگل لی تھی۔ یہ بڑی مشکل صورتِ حال تھی۔ میں نے چار پانچ منٹ تک درد کو مزید برداشت کیا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور گولیوں کی تلاش میں اس الماری تک پہنچ گیا جو فزالہ کے استعمال میں تھی۔ یہاں بھی ایک لفافے میں کچھ دوائیں موجود تھیں۔ میں نے یہ دوائیں دیکھیں لیکن سرخ لمبوتری گولی یہاں نہیں تھی پھر مجھے یاد آیا کہ فزالہ کبھی کبھار کوئی دوا اپنے شولڈر بیگ میں بھی رکھ لیتی ہے۔ اتفاقاً شولڈر بیگ الماری میں ہی موجود تھا۔ میں نے شولڈر بیگ کھولا۔ اس میں کئی خانے تھے۔ تین چار جگہ زپ بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بڑی زپ کھولی تو اس کے اندر ایک چھوٹی زپ بھی تھی۔ اس چھوٹی جیب کے اندر سے چند کاغذات نکلے۔ دو تو فزالہ کے پرائیویٹ کلینک کے یوٹیلٹی بل تھے اور دو تین خط تھے۔ یہ تینوں خط انگلش میں تھے۔ ایک خط جو نسبتاً مختصر تھا' فزالہ کی ہینڈ رائٹنگ میں تھا اور بالکل تازہ تازہ لکھا گیا تھا۔ اس پر صرف ایک دن پہلے کی تاریخ درج تھی۔ باقی دو خط امارات سے فزالہ کے گھر کے پتے پر آئے تھے۔ ان خطوط کے لفافے بڑے شخیم تھے اور یہ خطوط ارجنٹ میل کے ذریعے پہنچے تھے۔ ایک خط پر چار مہینے پہلے کی تاریخ درج تھی اور دوسرے پر پانچ مہینے پہلے کی۔ خط دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ شیخ عاصم کی تحریر ہے۔ رائٹنگ پیڈ بے حد قیمتی تھا اور اس کی ہلکی گلابی سطح پر کنول کے پھول بنے ہوئے تھے۔ دونوں خط اس طرح شروع کیے گئے تھے "مائی سویٹ ہارٹ' مائی ڈارلنگ فزالہ۔"

کسی کے ذاتی خطوط پڑھنا بہت معیوب بات سمجھی جاتی ہے' لیکن میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا اور فزالہ جس طرح میری مشکلات میں اضافے کا باعث بنتی جا رہی تھی' مجھے ضروری محسوس ہوا کہ میں فزالہ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کروں۔ درد رفع ہو بھول کر میں نے کمرے کا اکلوتا دروازہ اندر سے بند کیا اور پہلا خط پڑھنے لگا۔ اس خط کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"فزالہ! مجھے امارات واپس پہنچے چار دن ہو گئے ہیں' ان چار دنوں میں سخت پریشان رہا ہوں۔ یقین کرو تمہاری صورت ہر وقت نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ فزالہ! تمہیں یقین کرنا پڑے گا کہ شادی کے دن سے آج تک میرے لیے تمہاری چاہت میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا۔ یہ ایک ناخوشگوار اتفاق ہے کہ جن دنوں سری لنکا میں تمہیں بیماری نے گھیرا۔ انہی دنوں میں بھی یہاں "بیم کیس" والے بے بنیاد کیس میں پھنس کر گرفتار ہو گیا۔ لہٰذا یہ میں جانتا ہوں یا میرا دل جانتا ہے کہ تمہاری جدائی کی وہ گھڑیاں میں نے کیسے گزاریں' بہرحال میں کوئی روایتی عاشق نہیں ہوں کہ تمہاری غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے قسموں اور وعدوں کے انبار لگا دوں۔ مجھے اپنے دل کی سچائی پر اعتبار ہے۔ بے شک تم مجھ سے بے رخی اختیار کر رہی ہو لیکن میں جانتا ہوں یہ بے رخی تادیر برقرار نہیں رہ سکے گی۔ تمہیں میری پر خلوص محبت کا اعتبار کرنا ہی ہوگا۔ اپنے والد اور والدہ محترمہ کو میری طرف سے بہت بہت سلام کہنا۔ انہیں کسی طرح فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں' اور نہ تمہیں دل میں کوئی ایسا ویسا خیال لانا چاہیے۔ میں کل بھی تمہارا تھا اور آئندہ بھی تمہارا رہوں گا۔

فقط تمہارا منتظر شوہر شیخ عاصم"

دوسرے خط پر ایک ماہ بعد کی تاریخ تھی۔ اس خط کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

"مسلسل کو تمہارے گھر اور کلینک کے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کلینک کے فون پر تم نے "ہیلو" کہنے کے بعد فون بند کر دیا۔ اس سے ایک دن پہلے تمہارا خط ملا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اپنے ذہن میں کیسے کیسے بے بنیاد وہم کھڑے کر لیے ہیں۔ معمولی باتیں ہیں جنہیں تم نے پہاڑ بنا لیا ہے۔ کچھ اور نہیں تو خالہ جان کی بیماری کا خیال کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے صحت یاب نہیں ہو رہیں۔ تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ مجھے تمہاری ذات سے نہیں صرف تمہارے جسم سے دلچسپی تھی اور سری لنکا کے علاقے میں جب بیماری نے تمہارا جسم تم سے چھین لیا تو میری محبت بھی فنا ہو گئی لیکن اب تم موت کی سرحدوں کو چھو کر لوٹ آئی ہو' تمہارا جسم اور صحت تمہیں واپس مل گئے ہیں' لہٰذا اب میں پھر تم میں دلچسپی لے رہا ہوں۔

ڈارلنگ بہت غلط سوچ ہے تمہاری۔ اگر میں صرف جسموں کا پجاری ہوتا تو کیا چیز مجھے میسر نہیں ہے۔ کون سی خوب صورتی ہے جو میں حاصل نہیں کر سکتا لیکن میں تو تمہیں چاہتا ہوں فزالہ۔۔۔ خوب صورتی کے ساتھ بھی اور خوب صورتی کے بغیر بھی۔ محبوبہ تو بہت سی عورتیں ہوتی ہیں لیکن جو عورت بیوی ہو کر بھی محبوبہ ہو وہ خوش قسمت ہوتی ہے اور تم بیوی ہو کر بھی میری محبوبہ ہو۔ میں تمہیں دل کی انتہائی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ تم نے ایک چھوٹی سی بات کو کسوٹی بنایا ہے۔ اگر آزمانا تھا تو کسی بڑی بات پر آزمایا ہوتا۔ تمہارا شوہر شیخ عاصم بن ارشد تمہارے لیے تن من دھن لٹا دیتا۔ بہرحال تمہاری مسلسل بے رخی دیکھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں مزید ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ بے شک مجھے ہر وقت تمہاری واپسی کا انتظار رہے گا۔ اب حالات کو بگاڑنے یا سدھارنے کی ذمے داری تم پر ہے۔ میں تو بس اتنا کہوں گا کہ تم میری چاہت ہو اور رہو گی۔ والد اور والدہ کو میری طرف سے سلام دینا۔

فقط تمہارا منتظر شیخ عاصم"

تیسرا اور تازہ ترین خط فزالہ کا تھا اور یہ مختصر خط صرف ایک دن پہلے لکھا گیا تھا۔ فزالہ رقم طراز تھی۔

"عاصم!

چار ماہ سے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں۔ نہ اپنی خیر

محی الدین نواب کے نشترِ قلم سے ایک لازوال ناول

● جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی معاشرتی اور رومانی داستان۔

● محبّت کیا ہے؟ اِس ناول میں آپ کو محبّت کا صحیح فلسفہ ملے گا۔

دِلِ پارہ پارہ

قیمت: ۱۲۵ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ!

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۲۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال

نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

اور نہ میری خبر لی۔ کیا یہی محبت تھی آپ کی جس کے دعوے کرتے تھے... ناراضگی میرا حق تھا لیکن آپ نے یہ حق بھی چھینا ہے۔ مجھے نہ بھولنے والے دکھ بھی دیے ہیں اور منہ بھی موڑا ہے۔ ہیں نا او مرد کبھی قصوروار نہیں ہوتا۔

میں آج کل کلینک نہیں جا رہی۔ پچھلے دنوں یہاں کچھ دیہی علاقوں میں سیلاب آیا تھا' اسی سلسلے کے ایک امدادی کیمپ میں کام کر رہی ہوں۔ آج ہی فارغ ہوئی ہوں۔ آپ کو فون کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ لہٰذا خط لکھ رہی ہوں۔

والسلام"

نیچے رابطے کے لیے دو فون نمبر درج تھے۔ یہ دونوں نمبر عالم قریشی کی اسی رہائش گاہ کے تھے۔

یہ تینوں خط دیکھنے میں مجھے بمشکل چار پانچ منٹ لگے۔ خط جلدی جلدی بیگ میں واپس رکھ کر میں نے دروازہ کھول دیا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ ذہن میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خط دیکھنے کے بعد صورت حال کا ایک واضح نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ شیخ عاصم کی فطرت اب میرے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہی تھی۔ وہ ایک رنگین مزاج امیرزادہ ہی نہیں تھا' ایک بے حد عیار اور بے پروا دشمن بھی تھا۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے وہ ہر روپ دھار سکتا تھا اور ہر رنگ میں ڈھل سکتا تھا۔ میں پورے دل سے اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ شیخ عاصم نے غزالہ سے اپنی مطلب برآری کے لیے شادی رچائی تھی۔ وہ اس سے ایک فیصد بھی مخلص نہیں تھا۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا تھا کہ میں اس کے رقیب کی حیثیت رکھتا تھا' یہ میرے دل کی گہرائیوں سے برآمد ہونے والی وہ سچائی تھی جس پر اب غزالہ بھی کسی حد تک یقین کرنے لگی تھی اور اگر نہیں کر رہی تھی تو اسے یقین کرنا چاہیے تھا۔ میرے تجزیے کے مطابق شیخ عاصم نے غزالہ سے شادی مجھے اذیت پہنچانے کے لیے کی تھی اور اپنی اس کوشش میں وہ توقع سے زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ میں وہ دن کیسے بھول سکتا تھا جب میرے ہاتھوں پر نہ کھلنے والے دستانے چڑھائے گئے تھے اور میں اس کوٹھی میں "بحیثیت ملازم" کے فرائض انجام دے رہا تھا جہاں عاصم اور غزالہ اپنی "ہنی مون" منا رہے تھے۔ محبت میں ہارے ہوئے شخص کے لیے اس سے بڑی اذیت کیا ہو سکتی ہے اور "سری لنکا" میں یہ اذیت میں نے جھیلی تھی۔

اس بات کا امکان موجود تھا کہ غزالہ کے حسن سے سیراب ہونے کے بعد شیخ عاصم روایتی شیوخ کی طرح اس کی طرف سے منہ پھیر لے گا۔ لیکن ابھی تک اس نے منہ نہیں پھیرا تھا اور غزالہ میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ میرے تجزیے کے مطابق اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ غزالہ سے کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا' جن میں سب سے بڑا فائدہ سنتا کا کھوج لگانا اور اس تک پہنچنا تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ بدبخت شیخ عاصم کا سب سے بڑا ٹارگٹ میری بہن سنتا تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس شیطان لعین نے اس ٹارگٹ کو اپنی منحوس حیات کا نصب العین بنا رکھا تھا تو غلط نہ ہو گا۔ شیخ عاصم کو ابھی تک توقع تھی کہ وہ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے کسی نہ کسی طور غزالہ سے مدد حاصل کر سکے گا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ غزالہ کی خوب صورتی اور اس کی دلکش شخصیت شیخ عاصم پر اثر کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ غزالہ نے جان لیوا خزاں کے بعد پھر بہار دیکھ لی ہے۔ اس کے جسم کو آہستہ آہستہ پھر وہی شادابیاں اور رعنائیاں مل گئی ہیں جنہوں نے عاصم کو اندھا اور پھر سری لنکا میں دیوانہ کیے رکھا تھا۔ ان رنگین دنوں کی یادیں عاصم کے شوق کو جگا رہی تھیں' وہ غزالہ کے حوالے سے اپنا حق زوجیت استعمال کرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ غزالہ کے قرب سے عاصم کو دو طرح کی راحتیں ملتی تھیں۔ وہ غزالہ کے جادو اثر حسن کی تاثیر سے مدہوش ہوتا تھا' دوسری طرف وہ ایک رقیب کی حیثیت سے مجھے ایسی اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ اس پہلو سے دیکھا جاتا تو غزالہ کی وہ بات بالکل صحیح تھی جو اس نے چار ماہ پہلے اپنے خط میں لکھی تھی۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ عاصم کو اس کی ذات سے نہیں اس کے سراپا سے دلچسپی ہے۔ ایسی بات کوئی عورت آسانی سے نہیں کہتی۔ اسی وقت کہتی ہے جب وہ حتمی نتیجہ نکال لیتی ہے۔

میرے تجزیے کے مطابق یہی دو وجوہات اہم تھیں جو میں نے اوپر بیان کی ہیں۔ بہرحال یہ بھی ہو سکتا تھا کہ غزالہ میں عاصم کی موجودہ دلچسپی کا باعث کوئی ایک وجہ نہ ہو بلکہ دونوں وجوہات ہوں۔ اچانک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا۔ پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کا دودھیا پردہ تھوڑا سا سرکایا' برآمدے میں مجھے غزالہ نظر آئی۔ وہ برقع میں ملبوس تھی اور گاڑی سے اتر کر تیزی سے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی۔ عالم قریشی نے کہا تھا کہ وہ ڈھائی تین گھنٹے بعد واپس آئے گی لیکن وہ پون گھنٹے میں ہی پلٹ آئی تھی۔ میں جلدی سے دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ چند لمحے بعد وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ سیاہ برقع اس کے جسم پر بہت سج رہا تھا۔ نقاب نے نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور باقی چہرہ آدھے چاند کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ وہ ہونٹوں سے نقاب ہٹا کر بولی "کیسے ہیں آپ؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے درد چھڑ گیا تھا۔ وہ لال گولی بھی نہیں تھی میرے پاس۔"

"ایک گولی تو تھی؟"

"وہ میں نے رات کو کھائی تھی۔"

"اوہ۔ ویری سوری۔" وہ افسوس سے بولی اور اپنے چھوٹے

پرس میں سے چند گولیاں نکال کر تپائی پر رکھ دیں۔

"کہاں گئی تھیں تم؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ضروری خط پوسٹ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کے لیے ایک دو انجکشن لانے تھے۔ مال روڈ پر فضل دین میڈیکوز سے ملیں گے۔"

"تو ابھی تم گئی نہیں ہو وہاں؟"

"بس جلدی میں وہ خط یہیں بھول گئی تھی' وہی لینے آئی ہوں۔" اس نے کہا۔

مجھے سرخ گولی کھلانے کے بعد اس نے جلدی جلدی شولڈر بیگ سے خط نکال کر پرس میں رکھا اور مجھے ضروری ہدایات دے کر ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئی۔ میں نے خط کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا' اس نے بھی کسی طرح کی وضاحت نہیں کی۔

بہرطور غزالہ کی وضاحت کے بغیر بھی سب کچھ مجھ پر واضح ہو چکا تھا۔ وہ جو خط پوسٹ کرنے جا رہی تھی وہ عاصم کے لیے تھا۔ اپنی انا اور خودداری کو پس پشت ڈال کر وہ اس شخص سے رابطہ کر رہی تھی جس نے قدم قدم پر اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اس کے اعتماد کو قتل کیا تھا... اور وہ یہ سب کچھ کسی لالچ یا ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہی تھی۔ ذاتی مفاد کی بات ہوتی تو شاید اب وہ زندگی بھر اس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی جو اس کا شوہر ہونے کا دعوے دار تھا... وہ یہ سب کچھ میرے لیے کر رہی تھی (اور میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا) وہ شیخ عاصم سے مل کر میری صحت یابی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی' شاید اس بدبخت سرجن تک پہنچنا چاہتی تھی جس نے یہ منحوس آلہ میرے جسم میں رکھا تھا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کچھ کر سکتا تھا تو شیخ عاصم ہی کر سکتا تھا۔

O☆O

یہ چوتھے روز صبح کی بات ہے۔ عالم قریشی نے مجھے بتایا کہ رات انہیں بیرون ملک سے ڈاکٹر صاحب کی کال آئی تھی۔ وہ بند کمرے میں کافی دیر باتیں کرتی رہی ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹا۔

"اب کہاں ہیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اپنے کمرے میں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔"

اسی دوران میں غزالہ دروازے پر نظر آئی۔ عالم قریشی فوراً اٹھ بیٹھا "آئیے ڈاکٹر صاحبہ' تشریف لائیے' آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔"

"کیوں خیریت ہے؟" وہ مسکرائی۔

"ہاں جی... ہے تو خیریت ہی۔"

"پھر ایک ڈاکٹر کا ذکر کیوں ہو رہا تھا؟" وہ برجستہ بولی۔

عالم قریشی نے بلند قہقہہ لگایا "واہ جی! آپ بات بڑی اچھی کرتی ہیں۔ آپ کی بات سن کر تو مجھے انور راٹھور آم یاد آ جاتا ہے۔ اوپر سے یونہی سا لگتا ہے لیکن اندر سے... اندر سے ایسا نکلتا ہے کہ بندہ پھڑک جاتا ہے۔"

میں نے کہا "بات کسی کی بھی ہو' تجھے اس پر کھانے کی بات ہی یاد آتی ہے۔ میرے خیال میں تو اب تیرے لیے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔"

وہ بولا "فی الحال یہاں ڈاکٹر صاحبہ ہیں۔ اس بات کا جواب میں تجھے بعد میں دوں گا اور بڑا تسلی بخش دوں گا۔"

عالم قریشی کے باہر جانے کے بعد کمرے میں کچھ دیر گہری سنجیدگی طاری رہی۔ پھر غزالہ نے دھیمے لہجے میں کہا "شاہ جہاں! اب آپ کی طبیعت پہلے کے مقابلے میں سنبھلی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ آج کی رات تو بالکل سکون سے کٹی ہے۔ ویسے بھی یہاں آپ بالکل حفاظت سے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہاں سے جاؤں لیکن ایک دو بھی کام ایسے ہیں کہ جائے بغیر چارہ نہیں۔ ویسے میں لاہور میں ہی رہوں گی اور ٹیلی فون پر آپ سے رابطہ بھی کروں گی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ چھ روز تک واپس آ جاؤں گی۔ آپ... محسوس تو نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "جب تم فیصلہ کر ہی چکی ہو تو پھر میرے محسوس کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہو گا۔"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو نہیں جاتی۔"

"نہیں بھئی! اگر ضروری ہے تو ضرور جاؤ۔ میں واقعی اب کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں' لیکن کیا اس ضروری کام کی نوعیت نہیں بتاؤ گی۔"

وہ کہیں کھو سی گئی "بتاؤں گی... لیکن ابھی نہیں۔"

اس کے لہجے نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

وہ بولی "میں نے اپنی ایک دوست ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ آپ کا کیس بھی اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ وہ روزانہ صبح اور شام آ کر آپ کو دیکھ لیا کرے گی۔ بوقت ضرورت وہ مجھ سے رابطہ بھی قائم کر لے گی۔"

میں خاموشی سے غزالہ کی باتیں سنتا رہا۔ میں جانتا تھا وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے۔ شیخ عاصم پاکستان پہنچ چکا تھا یا پہنچنے والا تھا۔

غزالہ مجھ سے رخصت ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور رنشان علی نے آ کر اطلاع دی کہ ٹیکسی آ چکی ہے۔ غزالہ مجھے الوداعی نظر سے دیکھ کر واپس چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہا تھا۔ میں نے عالم قریشی کو آواز دی۔ وہ بھاگا ہوا آیا۔ میں نے تیزی سے کہا "یار! اس ٹیکسی کا پیچھا کرو لیکن بڑی احتیاط سے۔"

وہ فوراً بات سمجھ گیا اور سر ہلا کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ جب تک ٹیکسی ٹیوٹن لے کر گیٹ سے باہر نکلی' عالم قریشی کی گاڑی بھی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

عالم قریشی کی واپسی قریباً دو گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ پہلے وہ شادمان کی ایک کوٹھی میں پہنچی۔ وہاں انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک شیراڈ ڈبل میں سوار ہو کر نکلیں۔ یہ گاڑی ان کی کسی دوست کی تھی اور وہی گاڑی چلا رہی تھی۔ یہ گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی ڈیفنس کے پوش زین علاقے کی طرف نکل گئی۔ یہاں شیراڈ کار نے ایک زبردست کوٹھی کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو ڈراپ کیا اور واپس آ گئی۔ کوٹھی پر عبدالجبار کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی ہے۔

عبدالجبار کا نام سن کر میرا ہر خیال یقین میں بدل گیا۔ جبار کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ شیخ عاصم کے قابل اعتماد اور با اختیار کارندوں میں سے ایک تھا۔ لاہور کے علاوہ ایک دو اور شہروں میں بھی جبار کے نام سے شیخ کی پراپرٹی موجود تھی۔ یہ بات مجھے ایک دفعہ شیخ کے سری لنکن منیجر نے بتائی تھی..... اس کا مطلب تھا کہ غزالہ اپنی "ضرورت" کی ڈور سے بندھ کر ایک بار پھر اپنے مطلب پرست شوہر کے پاس پہنچ چکی تھی۔ غزالہ کی ضرورت وہ جذباتیت تھی جو ایک دوسرے کے حوالے سے ہمارے خون میں رچ بس چکی تھی۔

اگلے دو روز بھی میری طبیعت ٹھیک رہی۔ غزالہ کی ڈاکٹر دوست کشور ایاز صبح شام آ کر میری خبر گیری کر رہی تھی۔ وہ ایک ڈبل شیراڈ کار میں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہی غزالہ کی وہ سہیلی تھی جو اسے شیخ عاصم کی کوٹھی پر چھوڑ کر آئی تھی۔

اخبارات بھی روزانہ میری نظر سے گزر رہے تھے۔ تقریباً روز ہی عیسیٰ جان اور میرے حوالے سے چھوٹی موٹی خبر موجود ہوتی تھی۔ میری تلاش ہنوز جاری تھی۔ قبائلی گارڈ کے ہلاک ہونے کے بعد میرا کیس اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ غنیمت تھا کہ میرے اور غزالہ کے حوالے سے خبروں میں کوئی مرچ مسالا نہیں لگا تھا۔ مقامی پولیس کے علاوہ ایف ایس ایف بھی میری تلاش میں سرگرمی دکھا رہی تھی۔ غزالہ کے "سچ" کے ڈاکٹروں کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ شاہ سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی' اس کے علاوہ غزالہ کے والدین سے بھی تفتیش جاری تھی۔ نوری کے بارے میں یہ اطلاع تھی کہ پولیس کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا تھا اور یہ اطلاع تسلی بخش تھی۔

درد میں افاقہ رہنے کے باوجود میری بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ یہ بے چینی جسمانی کے بجائے ذہنی تھی۔ ہر پل یہ سوچ ذہن میں گھسی رہتی تھی کہ غزالہ نے میری محبت کی تلاش میں ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جو اس کے لیے نہایت ناپسندیدہ ہے۔ وہ اپنی "انا" کو اپنے ہاتھوں چکنا چور کر کے شیخ عاصم کے پاس گئی ہے۔ یہ احساس میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ میں کیوں اتنا مجبور ہو گیا تھا کہ غزالہ کو میرے لیے میرے دشمن سے رعایتیں مانگنی پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے شیخ عاصم سے رابطہ کرتی تو اور بات ہوتی بلکہ شاید میرے لیے اس میں اطمینان کا پہلو ہوتا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ کسی وقت میں آنکھیں بند کر لیتا تو نہایت اذیت بخش مناظر میرے پردہ تصور پر نمودار ہو جاتے۔ میں غزالہ اور اس کے برائے نام "شوہر" کو یکجا دیکھتا۔ وہ نازک اندام' بھوکے بھیڑیے جیسے شیخ عاصم کی بانہوں میں نظر آتی۔ وہ اس کے بد ہونٹوں پر اپنے اختیار کی مہر لگاتا۔ اس کے ریشمی بدن سے کھیلتا' اس کے باغ حسن سے خوشہ چینی کرتا' اس کی "ہوس" غزالہ کو روندتی ہوئی چلی جاتی۔ وہ سانس بند کیے' آنکھیں بند کیے' ہونٹ بند کیے یہ سب کچھ سہتی۔ کس کے لیے؟ ایک ایسے شخص کے لیے جواب اس کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن جس کی تکلیف کو وہ اپنے لیے سوہان روح بنائے بیٹھی تھی۔ یہ کیسا موڑ آیا تھا ہماری زندگی میں۔

شاید یہ تیسری یا چوتھی رات کا واقعہ ہے۔ غزالہ اور شیخ عاصم کے بارے میں سوچتے سوچتے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ شیخ عاصم کی رقابت اور دشمنی زہر بن کر میرے رگ و پے میں پھیل گئی۔ میں نے سوچا' کیا میں زمین کو شیخ عاصم کے منحوس بوجھ سے چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔ کیا میں اسے قتل نہیں کر سکتا..... وہ مجھ سے طویل فاصلے پر نہیں تھا۔ چند میل کی دوری تھی میرے اور اس کے درمیان..... ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں' خواب گاہ کے ریشمی اندھیرے میں وہ غزالہ کے ساتھ موجود تھا۔ کیا میرے ہاتھ اتنے ہی کمزور تھے کہ اس کی شہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس سے پہلے انڈیا اور سری لنکا میں شیخ عاصم میرے بہت قریب موجود رہا تھا لیکن میں اسے قتل نہیں کر سکا تھا۔ اس شاطر نے چال ہی ایسی چلی تھی۔ میرے ہاتھوں پر دستانے پہنا دیے تھے اور میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا تعلق اپنی کلائی کی گھڑی سے جوڑ لیا تھا۔ میرے لیے ایک حد متعین تھی۔ میں اس بات پر مجبور تھا کہ شیخ عاصم سے اپنا کم از کم فاصلہ تین میٹر اور زیادہ سے زیادہ دس کلومیٹر رکھوں۔ اگر میں ان حدوں کے نزدیک جاتا تھا تو میری کلائی پر تکلیف دہ برقی جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے تھے۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا ان جھٹکوں کی شدت بڑھتی جاتی تھی اور گھڑی کے ڈائل پر سرخ روشنی کی اسپارکنگ تیز ہوتی جاتی تھی۔ پھر "موت" کی حد آ جاتی تھی' اس حد سے تجاوز کرنے کا مطلب یہ تھا کہ میرے جسم میں موجود الیکٹرانک ڈیوائس دھماکے سے پھٹ جاتا۔ یہ ساری باتیں ایک بھیانک خواب کی طرح مجھے یاد تھیں۔ اب کئی ماہ سے الیکٹرانک ڈیوائس اور اس کا منحوس سسٹم سویا ہوا تھا۔ سری لنکا چھوڑنے سے

پہلے شیخ عاصم نے اس سسٹم کو آف کر دیا تھا۔ اب میرے ہاتھوں پر دستانے بھی نہیں تھے جن کی وجہ سے میں ہاتھوں میں کوئی نشیں ہتھیار یا نیزہ دھار آلہ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اب میرے اور شیخ عاصم کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک دم میرے اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اچانک ایک میرے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ شیخ عاصم کو بھی وہیں پہنچا دوں جہاں چند دن پہلے خونخوار عیسیٰ جان کو پہنچا چکا ہوں اور یہ کام کرنے سے پہلے اس شیطان صفت کو اس بات پر مجبور کر دوں کہ وہ مجھ پر ڈھائے جانے والے ستم کی تلافی کرے۔ وہ منحوس آلہ میرے جسم سے نکلوائے جس نے مجھے درد کے سمندر میں ڈبو رکھا ہے۔ ایک لہری جسم میں بلند ہوئی اور میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ درد نہیں تھا' پھر بھی میں نے احتیاطاً درد کش گولیاں نگل لیں اور وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں ڈیفنس کے علاقے میں موجود تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شام سے ہی وقفوں وقفوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں پولیس ناکوں کا زیادہ خطرہ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ان دنوں یہ رواج عام نہیں ہوا تھا۔ میں ذیلی سڑکوں پر عالم قریشی کی گاڑی دوڑاتا بحفاظت ڈیفنس پہنچ گیا تھا اور اب عبدالجبار کی نیم پلیٹ والی کوٹھی سے قریباً پچاس گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ میری توقعات کے برخلاف پوری کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے باؤنڈری وال سے اندر جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ پورچ یا ڈرائیو وے پر کوئی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ آثار یہی بتا رہے تھے کہ کوٹھی خالی ہے۔

آخر کہاں گئے تھے وہ لوگ۔ شیخ عاصم نے ٹھکانا بدل لیا تھا یا وہ لوگ لاہور سے ہی باہر چلے گئے تھے۔ ایک شدید قسم کی مایوسی میرے حواس پر چھانے لگی۔ رگوں میں اچھلتا ہوا آتشیں لاوا جو شیخ عاصم کے لیے سر پٹخ رہا تھا' بتدریج سرد پڑنے لگا۔ ایک دم ہی مجھے وہ 38 بور کا ریوالور بے کار محسوس ہونے لگا جو میں عالم قریشی سے ادھار مانگ کر لایا تھا اور جسے میں نے کپڑے میں لپیٹ کر نشست کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ قریباً دس منٹ تک میں گاڑی میں بیٹھا تاریک کوٹھی کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ واپس چلا جاؤں..... لیکن پھر سوچا' ایک دفعہ کوٹھی کا جائزہ لینے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چال ہو۔ میں نے نشست کے نیچے سے ریوالور نکالا۔ سڑک پر پہنچ کر محتاط انداز سے ارد گرد دیکھا اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ بارش کی بوندیں تواتر سے انگور کی بیل پر گر رہی تھیں۔ برآمدہ بھی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں کوئی آواز یا آہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں بہت محتاط قدموں سے اس وسیع کوٹھی کے اندر گھومنے لگا۔ دیوار پھاندنے کی وجہ سے پہلو دکھ سا گیا تھا' کنپٹی میں بھی ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا لیکن فی الوقت ان تکالیف کی کوئی اہمیت نہیں تھی.....

اچانک میں چونک گیا۔ برآمدے کے قریب ایک راہداری میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ اس کی رائفل قریب ہی پڑی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے فکر سو رہا تھا۔ راہداری کی دوسری جانب کوٹھی کا عقبی صحن نظر آ رہا تھا۔ وہاں کسی گاڑی کی موجودگی کا احساس بھی ہوا۔ میں نے صحن میں جا کر دیکھا۔ یہ ایک مرسیڈیز تھی۔ ایک دروازہ لاک نہیں تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھول کر چار پانچ سیکنڈ کے لیے اندرونی لائٹ جلائی۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر شیخ عاصم کے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ موجود تھے۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر موتیے کا ایک خوب صورت گجرا بھی پڑا تھا۔ میں لائٹ آف کر کے باہر نکلا اور گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ رکھا۔ اس میں ابھی تک حرارت کی رمق موجود تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے تک اس گاڑی میں شیخ عاصم اور غزالہ موجود تھے اور اب وہ اسی چار دیواری میں کہیں محو خواب ہیں..... رگوں میں سرد پڑنے والا لاوا ایک بار پھر سرخ انگارا ہو کر رواں ہو گیا۔

قارئین پر اپنی گرفت سخت کرتی ہوئی داستان

پرواز

ایم اے راحت

ایک محب وطن کی انوکھی اور دلچسپ سرگزشت

کیا اُسے وطن سے محبت کرنے کی سزا ملی؟

وطنِ عزیز کے گلی کوچے جب اُس پر نامہرباں ہوئے

تو وہ اندر سے ٹوٹ ہی گیا مگر ہمت اور قوت سے فتح

اُس کا مقدر ٹھہری۔ قیمت /- ڈاک خرچ -/2

علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

میں نے ریوالور جیب سے نکالا اور احتیاط سے کوٹھی کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھا۔ میرے چاروں طرف خطرات بارودی سرنگوں کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اچانک ایک بھاری آواز نے میرے قدم جکڑ لیے "کون ہے؟" یہ آواز برآمدے کی طرف سے آئی تھی۔

شاید یہ وہی چوکیدار تھا جسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دار داری میں محو خواب دیکھا تھا یا پھر یہ اس کا کوئی ساتھی تھا۔ بہرحال اس آواز کا ردعمل مجھ پر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ میں یکبارگی سراپا لرز گیا اور میرے تمام حواس چونک کر کسی ممکنہ خطرے کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ آواز بلند ہوتے ہی میں نے خود کو ایک دروازے کی اوٹ میں چھپایا۔ ایک قریبی کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں ابھریں پھر بتی روشن ہو گئی۔ میرے اندازے کے مطابق یہی شیخ عاصم کی خواب گاہ تھی۔ ایک بار پھر برآمدے کی طرف سے گرج دار آواز ابھری "اوئے میں پوچھتا ہوں کون ہے؟"

اسی دوران میں خوابگاہ سے شیخ عاصم کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ اس نے چیخ کر انگلش میں پوچھا تھا "کون ہے باقر خان؟"

باقر خان یقیناً کسی چوکیدار یا گارڈ کا نام تھا۔ کوٹھی میں ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ اچانک پوری کوٹھی کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہ جگہ بھی روشنی میں نہا گئی۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک کھڑکی میں سے شیخ عاصم کی جھلک دیکھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس کی خمار آلود' سرخ انگارا آنکھیں ایک ساعت کے لیے میری آنکھوں سے ملیں' دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کھڑکی سے اوجھل ہو گیا۔ چہرہ اوجھل ہوتے ہی شیخ عاصم کی دہاڑیں پوری کوٹھی میں گونجنے لگیں "باقر خان' شہزاد علی! کہاں ہو تم؟ کہاں ہو تم سب؟"

اچانک یوں لگا جیسے کئی افراد سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سب شیخ عاصم کے ذاتی گارڈ تھے۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس بظاہر سنسان اور تاریک کوٹھی میں اچانک اتنی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پھر مجھے بھاگتے ہوئے بھاری قدموں کی گونج سنائی دی۔ یقیناً یہ شیخ عاصم تھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ انتہائی خطرناک لمحات تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور تیزی سے واپس پلٹا۔ کوٹھی کے پہلو میں بھاگتے ہوئے میں نے دس پندرہ میٹر کا فاصلہ طے کیا اور ایک سرونٹ کوارٹر میں گھس گیا۔ سرونٹ کوارٹر خالی تھا۔ اس کی عقبی دیوار میں ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ سرونٹ کوارٹر میں چھپنے کی حرکت مجھ سے اضطراری طور پر سرزد ہوئی تھی' ورنہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ جگہ چھپنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ابھی مجھے سرونٹ کوارٹر میں پوزیشن لیے چار پانچ سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ کسی کمرے سے شیخ عاصم کی دھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ وہ چوکیدار باقر خان سے مخاطب تھا "باقر خان! وہ سرونٹ کوارٹر میں ہے' جلدی کرو۔"

چند ہی لمحے بعد خود کار رائفل سے فائر ہوا اور گولی سرونٹ کوارٹر کے دروازے میں لگی۔ دھماکے سے قرب و جوار گونج اٹھے تھے اور قریبی کوٹھیوں میں رکھوالی کے کتے زور و شور سے بھونکنے لگے تھے۔ چار پانچ سیکنڈ کے وقفے سے دو فائر مزید ہوئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ فائر سنائپر گن کے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ چوکیدار باقر خان کے علاوہ بھی اس کوٹھی میں مسلح افراد موجود تھے۔ یہ سرونٹ کوارٹر عن قریب میرے لیے چوہے دان ثابت ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں لاچار ہو جاتا' مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کوارٹر کی عقبی کھڑکی کھولی اور باہر کود گیا۔ کوٹھی کی بیرونی چاردیواری صرف دو تین گز کے فاصلے پر تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بڑے سائز کے گملے پڑے تھے۔ میں نے ایک گملے پر پاؤں رکھا اور دیوار پھاند کر دوسری طرف کود گیا۔ جونہی میرے پاؤں زمین پر ٹکے' ایک شخص لپک کر میری طرف آیا۔ یہ کسی قریبی کوٹھی کا نوعمر چوکیدار تھا اور فائرنگ کی آواز سن کر دوڑتا ہوا آیا تھا۔ وہ دبلا پتلا تھا اور خالی ہاتھ تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے دبوچنا چاہا۔ اس کی دلیری قابلِ داد تھی لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اسے شاباش دے سکتا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر (راؤنڈ پنچ کے انداز میں) ایک بھرپور مکا رسید کیا۔ اس "نازک جان" کے لیے یہ مکا کافی سے زیادہ تھا۔ اس انداز کا بھرپور مکا کھانے کے بعد میں نے صرف ایک شخص ایسا دیکھا تھا جو اپنے پاؤں پر کھڑا رہا تھا اور وہ تھا شنکر شکرا۔ یہ لڑکا شنکر شکرا نہیں تھا بلکہ اس کا ایک فیصد بھی نہیں تھا۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ سر کے پچھلے حصے میں شدید ضرب آئی۔ وہ تیورا کر پٹ سے زمین پر گر گیا۔ اس کے گرنے تک میں کار کی طرف پندرہ بیس میٹر فاصلہ طے کر چکا تھا۔ کار کے دروازے میں نے لاک نہیں کیے تھے۔ کار میں بیٹھنے اور اسے اسٹارٹ کرنے میں مجھے چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس سے پہلے کہ کوٹھی میں موجود مسلح افراد میرے تعاقب میں کوٹھی سے باہر آتے' میں گاڑی کو طوفانی رفتار سے آگے بڑھا چکا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں عالم قریشی کی محل نما کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روک رہا تھا۔ گاڑی کی آواز سنتے ہی عالم قریشی برآمدے میں نکل آیا تھا۔ غالباً میرے جانے کے بعد سے وہ جاگ رہا تھا۔ میں نے جاتے وقت اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ ایک جاں نثار دوست کی طرح اس نے بھی کچھ نہیں پوچھا تھا' نہ ہی یہ دریافت کیا تھا کہ میں نے اس کا ریوالور کیوں مانگا ہے۔ ظاہر ہے' میں نے ریوالور مانگا تھا تو کسی خطرناک کام کے لیے ہی مانگا تھا۔ عالم قریشی نے صرف اتنی نصیحت کی تھی کہ میری حالت زیادہ اچھی نہیں۔ میں کوئی مار دھاڑ والا کام نہ کروں۔

اب میری بخیر و عافیت "واپسی" دیکھ کر اس کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ مجھے سراپا گھور کر بولا "کیا بات ہے۔ بڑی جلدی واپسی ہوئی ہے۔ کہیں رستے میں ہی تو کوئی پھڈا نہیں پڑ گیا۔ میرا مطلب ہے پولیس وغیرہ....."

"نہیں رستے میں تو پھڈا نہیں پڑا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کہاں پڑا ہے؟"

"جہاں نہیں پڑنا چاہیے تھا' ایک بندے کا جھٹکا کرنا تھا۔ اس کی کوٹھی میں گھسا ہی تھا کہ وہ بدبخت جاگ گیا۔"

عالم قریشی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "تو تم کسی کو قتل کرنے گئے تھے!"

"تو کیا آدھی رات کو کرکٹ میچ دیکھنے گیا تھا۔"

"یار! بڑے واہیات ہو تم۔ میری گاڑی' میرا ریوالور' میری کوٹھی اور تم بندے کا جھٹکا کرنے چلے گئے۔ اگر پکڑے جاتے تو میں تو بے موت مارا جاتا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں اس کینڈے کا آدمی نہیں ہوں۔ بڑا گھبراتا ہوں ایسے چکروں سے۔"

"تو تمہیں کس پاگل نے کہا تھا کہ مجھے پناہ دو۔ ایسے کاموں کے ایسے ہی نتیجے نکلتے ہیں۔"

"بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ویسے یہ باتیں تمہارے جیسے دوست بنانے سے پہلے سوچنی چاہئیں۔ چلو کوئی بات نہیں۔ تمہاری خاطر پھانسی پر چڑھ کر بھی دیکھ لیں گے۔ دو عورتیں ہی بیوہ ہوں گی نا؟"

میں نے کہا "دو بھی کیا' ایک ہی ہوگی' ایک کو تو تم نے پہلے ہی بیوہ کر رکھا ہے۔ ہفتوں اسے صورت نہیں دکھاتے ہو۔"

"دیکھو دیکھو' ایسی بات مت کرو۔" عالم قریشی انگلی اٹھا کر دارننگ دینے والے انداز میں بولا "ساری دنیا جانتی ہے کہ میں دونوں سے پورا انصاف کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں' بہرحال تمہیں اپنی پھانسی کے سلسلے میں اتنا مغموم ہونے کی ضرورت نہیں.... اگر میں قتل کرتا بھی تو بڑی احتیاط سے ہاتھ پاؤں بچا کر کرتا اور تم پر تو کوئی آنچ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر پکڑا جاتا تو میں فوراً پولیس کے روبرو تسلیم کر لیتا کہ یہ ریوالور اور گاڑی زبردستی چھینی گئی ہے۔"

"اور پولیس یہ بات مان لیتی؟"

"کیوں نہ مانتی۔ اس معاملے میں میری "ریپوٹیشن" بہت اچھی ہے۔"

غیر متوقع طور پر درد میں افاقہ تھا۔ تھوڑی دیر تک عالم قریشی سے مصروف گفتگو رہ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ شیخ عاصم کی کوٹھی میں قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ کوٹھی میں میری آمد راز نہیں رہ سکی تھی اور پھر غیر متوقع طور پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نقصان یہ بھی ہوا تھا کہ شیخ عاصم نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ شیخ عاصم ایک بے حد عیار اور شاطر شخص کا نام تھا۔ میرے ذہن میں بار بار یہ وسوسہ سر اٹھانے لگا کہ کہیں میں اپنے سینے میں موجود الیکٹرانک ڈیوائس کے سلسلے میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ میرا تجربہ یہ تھا کہ الیکٹرانک ڈیوائس کا سسٹم آف ہے اور میں اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر شیخ عاصم کی گردن ناپ سکتا ہوں مگر یہ بات عین ممکن تھی کہ شیخ عاصم پاکستان پہنچتے ہی اس خوابیدہ سسٹم کو بیدار کر چکا ہو۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر میں موت کے دہانے پر تھا۔ میری کلائی پر وہ گھڑی موجود نہیں تھی جو الارمنگ سگنل دیتی تھی۔ وہ گھڑی مجھے بتاتی تھی کہ مجھے شیخ عاصم سے کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی دور رہنا ہے۔ اگر میں ان حدود سے بے خبر رہتا تو انجام مجھ پر واضح تھا۔ الیکٹرانک ڈیوائس میں رکھا گیا نہایت مہلک "ٹی این ٹی" میرے معدے میں پھٹ جاتا اور اندرونی اعضا کے چیتھڑے اڑ جاتے۔

فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے سب سے پہلے اپنی کلائی پر وہ گھڑی باندھنی چاہیے جو میری حفاظت کی ضامن ہے۔ وہ گھڑی میں نے سری لنکا سے انڈیا روانہ ہونے سے کچھ دن پیشتر ایس پی برکت کو دی تھی اور کہا تھا کہ وہ پاکستان جاتے ہی یہ گھڑی ساہی صاحب کے حوالے کر دے۔ اس کے ساتھ وہ دوسری گھڑی بھی تھی جو شیخ عاصم کی کلائی پر رہا کرتی تھی۔ شیخ عاصم نے مجھے ایک مرتبہ یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی تھی کہ ایک دفعہ ڈیوائس کا سسٹم آن ہو جائے تو پھر آف نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب دونوں گھڑیاں ایک خاص مدت تک تین میٹر سے کم فاصلے پر رہتی تھیں تو ڈیوائس کا سسٹم خود بخود آف ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ عاصم نے سری لنکا میں اپنی گھڑی بھی میرے حوالے کر دی تھی.... اب مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں گھڑیاں کس کے پاس ہیں۔ گلگت سے واپس آنے کے بعد میں ساہی صاحب سے ملا تھا اور ایس پی برکت سے بھی لیکن گھڑیوں کی بابت انہوں نے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی مجھے پوچھنا یاد رہا تھا۔ اب ضرورت پڑی تھی تو مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ ایس پی برکت سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ گھڑیاں کہاں ہیں۔ ساہی صاحب کی طرح ایس پی برکت سے ملنے میں بھی خطرہ موجود تھا لیکن یہ خطرہ بہرحال کم درجے کا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں ایس پی برکت کے گھر جاؤں گا۔ اس کا گھر موہنی روڈ پر تھا اور میں ایک دفعہ پہلے بھی وہاں جا چکا تھا۔

سوچتے سوچتے ایک دم میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور اضطراب کی لہر جسم میں دوڑ گئی۔ اگر شیخ عاصم واقعی الیکٹرانک

ذوائس کا سسٹم دوبارہ آن کر پاتا تو پھر میں لاہور میں کہیں بھی ہوتا زیادہ دیر اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ دس کلو میٹر کے دائرے میں وہ ہر وقت میری پوزیشن سے باخبر رہ سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھی میری پوزیشن سے باخبر ہو سکتا ہے اور اس کوٹھی پر پہنچ کر میری گردن ناپ سکتا ہے۔ یہ تشویش ناک سوچ تھی لیکن اطمینان کے دو پہلو بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ شیخ عاصم نے ابھی الیکٹرانک ڈوائس کا سسٹم آن ہی نہ کیا ہو۔ یہ امکان زیادہ قوی تھا کیونکہ میری بے خبری میں سسٹم آن ہونے کا مطلب میری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں ابھی یہاں سے اٹھ کر راولپنڈی روانہ ہو جاتا تو رسٹ واچ کی عدم موجودگی میں مجھے مطلق خبر نہ ہوتی کہ خطرے کی حد کب آن پہنچی ہے۔ ایسی صورت میں یقینی بات تھی کہ دریائے راوی کا پل کراس کرتے کرتے میں دس کلو میٹر کی حد سے نکل جاتا اور واصلِ عدم ہو جاتا۔۔۔ اور شیخ عاصم تو۔۔۔۔ مجھے زندہ رکھ کر لمحہ بہ لمحہ مارنا چاہتا تھا۔ اطمینان کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اگر شیخ عاصم نے فرضِ محال ڈوائس کا سسٹم چالو کیا بھی ہے اور وہ میری پوزیشن سے باخبر بھی ہے تو شاید وہ مجھ پر چھاپا مارنے میں زیادہ دلچسپی نہ لے۔ میرے اندازے کے مطابق فی الوقت وہ اپنے حال میں مگن تھا۔ کئی مہینوں بعد اسے پھر سے غزالہ کا قرب ملا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ فرصت اور تنہائی کے ان لمحات سے پورا پورا لطف اٹھانا چاہے گا، یہ کوشش کرے گا کہ ان شب و روز میں اس کی خواہشات اور غزالہ کے حسن و جمال کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ اگر وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تو اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ سب سے پہلے تو غزالہ ہی اس کی مخالفت کرتی، پھر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں تر نوالہ نہیں ہوں "الیکٹرانک ڈوائس" کے جال میں جکڑا ہونے کے باوجود میں آسانی سے اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے پکڑنے کی کوشش کرتا اور نتیجے میں ہنگامہ ہو جاتا تو غزالہ کے ساتھ شیخ عاصم کا یہ "دوسرا ہنی مون" تباہ ہو کر رہ جاتا۔

میں تو ہر وقت اس کی دسترس میں تھا۔ وہ کسی بھی وقت مجھ پر چڑھائی کر سکتا تھا لیکن اپنی خوبرو بیوی کی رضا اور خود سپردگی اسے جس انداز میں ملی تھی وہ شاید دوبارہ نہ ملتی اور ملتی بھی تو نجانے کب۔

میرا یہ خیال سو فیصد درست ثابت ہوا کہ شیخ عاصم فوری طور پر مجھ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگلے بارہ گھنٹے بخیر و عافیت گزر گئے۔ بہرحال اپنے ناکام حملے کا افسوس میرے دل میں موجود رہا۔ مجھے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ میری اس ناکام کوشش کی وجہ سے غزالہ کے لیے بھی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ شیخ عاصم اس کی طرف سے شک میں پڑ سکتا تھا۔ سوچ سکتا تھا کہ مجھے اس کی خفیہ رہائش گاہ کے متعلق اطلاع دینے والی غزالہ ہی ہے۔ اگر اس قسم کا شک شیخ عاصم کے ذہن میں پیدا ہو جاتا تو پھر غزالہ وہ مقصد بھی ہرگز حاصل نہ کر پاتی جس کے حصول کے لیے وہ شیخ عاصم کے پاس پہنچی تھی۔ وہ کسی طرح شیخ عاصم کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے الیکٹرانک ڈوائس کی "عمر قید" سے آزاد کرے۔۔۔۔

O☆O

اگلے روز غزالہ کی ڈاکٹر سہیلی کشور ایاز مجھے دیکھنے آئی۔ وہ میری حالت سے مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کسی طرح ڈاکٹر رقیہ شاہ مجھے دیکھ سکتی ہیں۔ بشرطیکہ پولیس ان کی نگرانی وغیرہ نہ کر رہی ہو۔

وہ بولی "میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ پولیس ابھی تک حرکت میں ہے۔ بہرحال میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گی۔"

کشور ایاز نے میرا پیغام ڈاکٹر رقیہ شاہ تک پہنچا دیا۔ میرا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی دے دیا لیکن رقیہ شاہ کی طرف کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ظاہر ہے وہ میرے چکر میں پڑ کر کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے ایک بار انہیں فون کرنے کا ارادہ بھی کیا لیکن پھر ملتوی کر دیا۔ عین ممکن تھا کہ ڈاکٹر رقیہ شاہ کا فون بھی ٹیپ ہو رہا ہو اور میرے فون کی وجہ سے پولیس عالم ترینی کی کوٹھی پر آ دھمکے۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے۔ مجھے زبردست حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ رات قریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ عالم ترینی نے مجھے نیند سے جگا کر بتایا کہ ایک خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں حیران ہوا کہ اتنی رات گئے میری دید کی مشتاق کون خاتون ہو سکتی ہیں۔ سلیپنگ گاؤن پہنچا ہوا میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ڈاکٹر رقیہ شاہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک سبز اسٹیشن ویگن میں یہاں پہنچی تھیں۔ گاڑی پورچ میں کھڑی تھی اور ڈرائیور گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ آپ؟"

وہ بولیں "تم نے بلایا، میں چلی آئی۔"

"یہ تو آپ نے بڑی زحمت کی۔" میں نے کہا۔

میں واقعی حیران تھا۔ ڈاکٹر رقیہ سے وقت لینے کے لیے لوگوں کو ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔

وہ بولیں "کوئی زحمت نہیں۔ غزالہ اور تم میرے بچوں کی طرح ہو۔ شاید تم نہ بھی بلاتے تو میں یہاں آ کر تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتی، بہرحال بہت خطرہ تھا، داؤ بچ بچا کر آئی ہوں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ یقین کریں، میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں؟"

وہ مسکرائیں "پھر وہی تکلف۔"

ان کی مسکراہٹ سے مسیحائی کا نور جھلکتا محسوس ہوتا تھا "کیسے ہو اب؟" انہوں نے مجھے ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"گزشتہ روز سے کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "ابھی

کسی وقت ہاتھ لگانے سے درد ہوتا ہے۔"

انہوں نے اپنا میڈیکل باکس کھولا اور کہا "لیٹ جاؤ۔"

میں وہیں صوفے پر دراز ہو گیا۔ وہ بڑی محبت اور تسلی سے معائنہ کرنے لگیں۔ معائنے کے دوران میں انہوں نے کئی سوالات بھی پوچھے۔ ان کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس معائنے سے مطمئن ہیں۔ کہنے لگیں "وہ دوائیں جو معدے کی انفیکشن کے لیے کھائی جاتی ہیں اکثر موثر ثابت ہوتی ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری انفیکشن بہتر ہونا شروع ہو گئی ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے میرے نسخے میں سے ایک دو دوائیں کاٹیں اور ایک دو نئی دواؤں کا اضافہ کر دیا۔ غذا وغیرہ کے بارے میں بھی ضروری ہدایات دیں۔ اسی دوران میں خانساماں چائے لے آیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کے لیے خود چائے بنائی۔ وہ محبت سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میں نے کپ ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے کہا "وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔"

"کون؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"غزالہ!" ڈاکٹر رقیہ شاہ نے جواب دیا۔ میں ان کی اس بات پر مبہوت رہ گیا۔ وہ عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے بولیں "وہ میری بڑی پیاری شاگرد ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں اسے بیٹیوں کی طرح چاہتی ہوں تو بے جا نہ ہو گا۔ وہ ہے ہی اس قابل کہ اسے چاہا جائے۔ میں حیران ہوں کہ تم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں پھر بات بدل کر بولیں "کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم دونوں ایک ہو جاتے۔ بڑی خوبصورت جوڑی رہتی تمہاری۔ بہرحال ہونا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ انسان خواہ مخواہ حالات کو دوش دیتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "لگتا ہے ڈاکٹر صاحبہ! آپ میرے بارے میں پہلے سے جانتی ہیں۔"

"ہاں۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولیں "بہت پہلے سے جانتی ہوں۔ اس وقت سے جب تم ابھی جیل نہیں گئے تھے اور غزالہ سے تمہاری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے بتایا ہے ناکہ غزالہ میری بڑی پیاری شاگرد رہی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت سچی اور صاف بات کرنے والی لڑکی ہے۔ ان دنوں وہ کبھی کبھی شعر بھی لکھا کرتی تھی۔ یہ شعر وہ کبھی کبھی مجھے بھی سنایا کرتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ وہ خود بھی اس بات کو چھپاتی نہیں تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا "میڈم! میں اسے بہت زیادہ چاہتی ہوں۔ اور یہ سوچ کر ڈرتی بھی ہوں کہ کہیں اتنی زیادہ محبت کر کے میں گناہ تو نہیں کر رہی۔" ان دنوں وہ سوتے جاگتے تمہارے خیالوں میں گم رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ ایم بی بی ایس کا امتحان ہی پاس نہ کر سکے۔ میں اکثر اسے ڈانٹا کرتی تھی، کبھی پیار سے سمجھاتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ تم جیل چلے گئے۔ تم نے امارات سے آئے ہوئے کسی رئیس زادے کو قتل کیا تھا اور پولیس تین برس سے تمہارے

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔
قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰-عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۳۰

غائب میں تھی۔ آخر اپنی بہن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے تم نے جنو کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ تمہارے جیل جانے کا صدمہ غزالہ کے لیے جانکاہ تھا۔ کئی ماہ تک تو اسے اپنے آپ کا ہوش نہیں رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر دی اور اپنے امتحانات میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔

وہ اکثر مجھ سے اور اپنی ہمراز سہیلی کشور سے کہا کرتی تھی کہ شاد جہاں کی بربادیوں کی اصل ذمے دار وہ خود ہے۔ اس نے کشور کو اپنے لڑکپن کا وہ واقعہ سنایا تھا جس کے نتیجے میں تمہاری مصیبتوں کا آغاز ہوا اور تمہاری بہن شفقا غیروں کے رحم و کرم پر آ گئی تھی۔"

"کون سا واقعہ؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے آبائی قصبے جل کوٹ کا واقعہ۔" ڈاکٹر رقیہ شاد نے جواب دیا۔

پھر ڈاکٹر رقیہ نے مجھے اس واقعے کی تفصیل بتائی جس کا ہر ہر منظر میرے دل و دماغ پر ابدی نقش قائم کر چکا تھا۔ میرے ہاتھوں غلطی سے غزالہ کی قمیص کا پھٹنا۔ "بڑے غرور" غزالہ کا والدین سے شکایت کرنا۔ اس شکایت کے نتیجے میں ایک زبردست ہنگامے کا برپا ہونا۔ شدید پریشانی کے عالم میں میرے والد صاحب کو ہارٹ اٹیک ہونا اور والد کے ساتھ ساتھ میری والدہ کا بھی چند روز بعد ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ جانا۔ وہ سارے ناقابل فراموش واقعات ڈاکٹر رقیہ شاد کو بھی معلوم تھے۔ وہ بولیں "غزالہ نے جو کچھ کیا نا سمجھی کی عمر میں کیا تھا لیکن اس کے دل و دماغ پر ان واقعات کا گراں بوجھ ہے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی 'کاش مجھ سے یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ میری وجہ سے تایا ابا اور تائی اماں کی زندگی ختم نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں اپنی بہن کے ساتھ در بدر نہ ہونا پڑتا۔' وہ گزرے دنوں کو یاد کر کے بہت رویا کرتی تھی لیکن اس کے دل میں ایک امید بھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک روز کہیں نہ کہیں وہ تم سے ملے گی 'پھر اس کی محبت کی طاقت سے تمہارا دل پسیج جائے گا۔ تم اسے معاف کر دو گے اور ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے لیکن افسوس اس کی یہ آس پوری نہ ہو سکی۔ تم اسے ملے بھی لیکن وہ تمہارے دل سے مایوسی اور نفرت کے جذبات کو کھرچ نہ سکی۔ اسی دوران میں تم جیل چلے گئے تھے۔ جب تم جیل سے باہر نکلے تو غزالہ نے ایک بار پھر تمہاری محبت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان دنوں کینیڈا میں مقیم ایک نہایت کامیاب پاکستانی ڈاکٹر کا رشتہ اس کے لیے موجود تھا اور غزالہ کی والدہ غزالہ کی منتیں کر رہی تھیں لیکن غزالہ نے سب کچھ تمہارے لیے فراموش کر دیا۔ ان دنوں تمہارے سوا اسے کچھ یاد نہیں تھا اور نہ وہ یاد رکھنا چاہتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا حالات تھے جن سے مجبور ہو کر بالآخر غزالہ نے کسی اور سے شادی کر لی۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ وہ بے حد غیر معمولی حالات ہی ہوں گے۔ معاف کرنا مسٹر شاد جہاں! میں یہ سمجھتی ہوں کہ غزالہ کی زندگی جن مشکلات کا شکار ہوئی ہے ان میں سے زیادہ تر تمہاری پیدا کردہ ہیں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تم بھی سمجھدار نظر آتے ہو۔ کاش تم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکتے۔"

ڈاکٹر رقیہ شاد کی باتیں مجھے بے چینی میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ماضی کا تصور مجھے ہمیشہ ایسے ہی "ہانٹ" کرتا تھا۔ میں یہ موضوع بدلنا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر رقیہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ کہنے لگیں "شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ غزالہ تقریباً ہر مہینے ایک بار جل کوٹ ضرور جاتی ہے۔ وہ اپنے تایا تائی یعنی تمہارے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتی ہے۔ پھر ایک دن اور رات جل کوٹ میں ہی گزارتی ہے۔ وہاں اس نے ایک چھوٹا سا کلینک بنا رکھا ہے۔ اپنے قیام کے دوران میں وہ جل کوٹ کے مستحق لوگوں کا مفت معائنہ کرتی ہے اور مشورے وغیرہ دیتی ہے۔ پچھلے چار پانچ برس سے اس کا یہی معمول ہے۔"

ڈاکٹر رقیہ شاہ کافی دیر میرے پاس بیٹھی رہیں اور غزالہ کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ ان کے لہجے میں عجیب سی اثر انگیزی تھی۔ مخاطب ان کی باتوں سے' ان کے چھوٹے چھوٹے فقروں کی پھوار سے جیسے بھیگتا چلا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ زبان سے نہیں دل سے بات کرتی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک اپنے اور غزالہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک عجیب سا مدوجزر پیدا ہو گیا تھا میرے اندر۔ یقیناً یہ مدوجزر اچانک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کے پیچھے پچھلے کئی مہینوں کی کشمکش اور اضطرابی کیفیت تھی۔ غزالہ کو کھو کر میں اس کے اور قریب آ گیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ شیخ عاصم کی بیوی بن کر غزالہ میری نگاہوں میں غیر اہم ہو جاتی لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ پچھلے چھ سات ماہ میں میں نے غزالہ کے بارے میں اتنا سوچا تھا جتنا شاید چھ سات سال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا میرے ساتھ... شاید پیار کرنے والے کی سرشت ایسی ہی ہوتی ہے۔ یعنی محبوب جتنا ناقابل حصول ہوتا ہے اس کی طلب اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ چند روز پہلے میں نے غزالہ اور شیخ عاصم کے خط بھی دیکھے تھے۔ ان خطوط کے حوالے سے جو صورت حال میرے سامنے آئی تھی وہ بالکل واضح تھی۔ عاصم انہی لوگوں میں سے تھا جو بستر کی چادر کی طرح بیوی بدل ڈالتے ہیں۔ غزالہ بھی اس کے نزدیک بستر کی چادر تھی۔ وہ بیماری کے داغوں سے آلودہ ہو گئی تھی تو عاصم نے اسے بستر سے کھینچ کر ایک کونے میں پھینک دیا تھا اور کوئی نئی چادر بچھالی تھی لیکن پھر جب وہی چادر دھل کر اور صاف چمکدار ہو کر دوبارہ اس کے سامنے آئی تھی تو وہ پھر اسے بستر پر بچھانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ غزالہ یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھتی تھی اور یہ بات بھی اب اس کے ذہن میں جگہ بنانے لگی تھی کہ شیخ عاصم کے ساتھ اس کی شادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ مجھ سے دشمنی چکانا چاہتا تھا۔ وہ میرے "بدلے" غزالہ سے لینا چاہتا تھا۔ میری محبت کو اپنے بستر پر روند کر اپنی انا کی تسکین چاہتا تھا۔

میں ساری رات سگریٹ پھونکتا رہا اور کمرے میں چہل قدمی

کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کھڑکیوں سے باہر صبح کا اُجالا نمودار ہونے لگا اور پائیں باغ سے پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی۔ بہت عرصے بعد میں یوں دھیرے دھیرے صبح کو جلوہ نما ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک ایسا ہی اُجالا میرے تاریک سینے میں بھی پھوٹ رہا ہے۔ اس نامانوس اُجالے میں مجھے بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ ماہ و سال جو رائیگاں گئے تھے' وہ زندگی جو نامراد گزر گئی تھی۔ وہ مہربان لمحے جو مجھے بہت کچھ دے سکتے تھے لیکن جو میری گرفت میں نہیں آئے تھے۔ وہ حسین صبحیں اور گلابی شامیں جو میں نے بمبئی کی تاریک کھولیوں میں 'جیل کی بیرکوں میں گزار دی تھیں۔ عمرِ رواں' وقت کی تیز آندھی میں مشت خاک کی طرح اُڑی چلی جا رہی تھی اور میں کھڑا دیکھ رہا تھا... دل و دماغ ایک عجیب سی کیفیت میں جکڑے گئے تھے۔

اس شام میں لاہور سے قریباً ڈھائی سو میل دور اپنے آبائی گاؤں جل کوٹ میں تھا۔ لاہور سے ساہیوال اور پھر جل کوٹ تک کا سفر میں نے عالم قریشی کے ساتھ ایک بند گاڑی میں کیا تھا۔ پچھلے چند روز میں 'میں نے ایک بار بھی شیو نہیں بنائی تھی۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی نظر آ رہی تھی۔ اپنا حلیہ مزید بدلنے کے لیے میں نے آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک لگائی تھی اور سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ لباس بھی سندھی تھا۔ یعنی شلوار قمیص اور اجرک۔ جس وقت ہم جل کوٹ پہنچے' سورج مغربی افق پر جھک رہا تھا اور شام کی لالی در و دیوار پر منعکس ہو رہی تھی۔ میں آج برسوں بعد جل کوٹ آیا تھا۔ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن بہت کچھ ایسا بھی تھا جو نہیں بدلا تھا۔ بابے کرموں کا باغ... باغ کے درخت' جن سے میں کچے آم توڑا کرتا تھا۔ قصبے کی طرف جاتا ہوا کچا راستہ۔ اس راستے پر سے گزرتا ہوا بکریوں کا ریوڑ' ریوڑ کی اُڑائی ہوئی گرد' جو ڈوبتے سورج کی روشنی میں سنہری غبار کی شکل اختیار کر رہی تھی اور پھر اس غبار کے پس منظر میں نظر آنے والا جوہڑ' جوہڑ میں تیرتی ہوئی بطخیں اور کنارے پر کیچڑ میں گھومتی ہوئی مرغیاں۔ یہ سارے منظر میرے دیکھے بھالے تھے۔ او میرے جل کوٹ... میں کتنا رویا ہوں تیرے لیے۔ آ میرے دوست' میرے سینے سے لگ جا۔ اپنے کچے مکانوں اور کھیت کھلیانوں سمیت میرے اندر جذب ہو جا۔ میں تیرے گلی کوچوں پر اپنے ہونٹوں کی مُہر ثبت کرنا چاہتا ہوں۔ آ میرے یار! اپنی بانہیں میرے لیے کھول دے۔ میں عجیب خود فراموشی کے عالم میں جل کوٹ کے اندر گھومنے لگا۔ ایک ایک مکان' ایک ایک شخص کو دیکھنے لگا۔ لوگ مجھے حیرت سے تک رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ عالم قریشی کو بھی۔ شاید وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ میں کون ہوں اور دیوانوں پاگلوں کی طرح ان در و دیواروں کو کیوں گھور رہا ہوں۔ شاید یہ قصبہ واقعی ایک جگری یار تھا جو برسوں پہلے مجھ سے بچھڑ گیا تھا پھر میں اس مکان کے سامنے رُکا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ لکڑی کے اونچی دہلیز والے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن وہ بالکونی ویسی ہی تھی جہاں بیٹھ کر میں غزالہ کے چوبارے کا نظارہ کیا کرتا تھا اور وہ مین دروازہ بھی وہی تھا جس کی آہنی کنڈی سے سیکڑوں بار میرے ہاتھ چھوئے تھے۔ ان گنت دفعہ اس کنڈی کو میرے ماں باپ کے ہاتھوں نے کھولا تھا اور بند کیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کنڈی پر ابھی تک میری ماں کے ہاتھوں کا لمس چمک رہا ہے۔ میری انگلیاں بے اختیار اس کنڈی کو سہلانے لگیں... ہاں یہ میری جنم بھومی تھی۔ یہاں ہر ہر چپے پر میری یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے قریب کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا کہ اس مکان میں اب کون رہتا ہے۔

وہ بولا "کوئی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "چھ سات برس پہلے یہ مکان لاہور کی ایک ڈاکٹر صاحبہ نے خرید لیا تھا۔ وہ مہینے میں ایک دو بار یہاں آتی ہیں۔ وہ سامنے بیٹھک کا دروازہ ہے۔ اس بیٹھک میں انہوں نے دوا خانہ بنا رکھا ہے۔ وہ جب بھی آتی ہیں' قصبے کے مریضوں کو مفت دوائیں دیتی ہیں اور نسخے وغیرہ لکھتی ہیں۔"

میرے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ یہ نوجوان لڑکا' غزالہ کا ذکر کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ تو یہ مکان اب غزالہ کی ملکیت تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ غزالہ نے کبھی مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ بتایا تھا کہ وہ جل کوٹ جایا کرتی ہے۔

اس دوران میں قصبے کے چند دیگر افراد بھی وہاں آ گئے۔ ان میں سے ایک بوڑھا شخص سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص مجھے کچھ جانا پہچانا لگا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ بوڑھے کو ایک طرف لے گیا اور اس سے اپنا مکمل تعارف کرا دیا۔ بوڑھے کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میرا حلیہ سندھی تھا اس کے باوجود وہ میرے خدوخال میں ماضی کی شباہت ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند لمحے وہ یک ٹک مجھے دیکھتا رہا پھر لرزتی آواز میں بولا "تو تم بابو وقار کے بیٹے شاد جہاں ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے تھے۔ وہ بولا "میں اللہ دتا ہوں۔ لوہار اللہ دتا۔"

میں نے ذہن پر زور دیا اور کسی حد تک اسے پہچان لیا۔ میں نے بانہیں کھولیں اور وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے لگ کر مجھے یوں لگا جیسے میں جل کوٹ کے سینے سے لگ گیا ہوں۔ قصبے کی ساری خوشبو' محبت اور خوب صورتی اللہ دتا کے سینے میں موجود تھی۔ وہ میرا گال چوم کر مسلسل بولنے لگا۔ پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز جوش اور پیار کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ اس کی باتوں میں سے بس یہی بات میری سمجھ میں آئی کہ

میرے اس آبائی مکان کی دیکھ بھال اللہ دتا کی ذمے داری تھی۔ غزالہ یہاں سے واپس جاتے ہوئے چابی اللہ دتا کے حوالے کر جاتی تھی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اللہ دتا نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کا قفل کھولا اور مجھے اندر لے گیا۔ گھر کو بڑے اچھے طریقے سے رکھا گیا تھا۔ دیواروں اور دروازوں پر رنگ و روغن موجود تھا اور صحن میں پھول مہک رہے تھے۔ ایک دو کمرے تو بالکل اسی انداز میں سجے ہوئے تھے جیسے میرے بچپن کے زمانے میں تھے۔ بیٹھک کے ساتھ ایک کمرا اور بنا دیا گیا تھا۔ اس کمرے کے دروازے پر چھوٹی سی تختی لگی تھی۔ تختی پر درج تھا "مردوں کے لیے" ایک ایسی ہی تختی اس کمرے کے دروازے پر بھی تھی جو کبھی میرے والد کا اسٹڈی روم تھا۔ اس تختی پر "مردوں کے لیے" کے الفاظ درج تھے۔ بیٹھک کو "مشورے کے کمرے" کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے افراد وہاں جمع ہوگئے۔ میں نے اللہ دتا کو یہ بات پہلے ہی سمجھا دی تھی کہ وہ میرے بارے میں کسی کو بتائے گا نہیں۔ یہ سب لوگ مجھے غزالہ کا ہی کوئی ساتھی ڈاکٹر یا عزیز سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کی باتوں سے اس محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوا جو وہ لوگ غزالہ سے رکھتے تھے۔

ایک بوڑھا بولا "جلیس کی بیٹی تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ہے۔ اس نے دوبار میری بیٹی کی جان بچائی۔"

"خدا کرے اسے میری عمر بھی لگ جائے۔" ایک دوسرے شخص نے کہا "بڑی ہمدرد ڈاکٹر ہے۔ منت دیکھتی ہے بلکہ ضرورت مند کو اپنے پاس سے دوائیں بھی دیتی ہے۔ ہر مہینے لاہور سے چل کر یہاں آتی ہے۔ شہر جا کر کون اپنے گاؤں کو اس طرح یاد رکھتا ہے۔"

چند عورتیں بھی وہاں آگئیں اور مجھے غزالہ کا ساتھی سمجھ کر مجھ سے اس کی خیر خیریت دریافت کرنے لگیں۔

میں اپنے گھر میں کھڑا تھا اور غزالہ کے پرستاروں میں گھرا ہوا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس گھر کی ایک ایک اینٹ کو دیکھوں اور دیکھتا چلا جاؤں لیکن لوگوں کے آجانے کی وجہ سے مجھے جلدی وہاں سے نکلنا پڑا۔ میں نے عالم قریشی کے علاوہ صرف اللہ دتا کو ساتھ لیا اور قبرستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں ماں باپ کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا چاہتا تھا۔ قبرستان کچھ دور تھا۔ ہم اسٹیشن ویگن پر وہاں پہنچے، سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا اور افق پر سرخ اجالا باقی رہ گیا تھا۔ جیسے وقت اوجھل ہو جاتا ہے اور نشانیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ والدہ اور والد کی قبریں ڈھونڈنے میں مجھے دشواری پیش آئے گی اسی لیے میں اللہ دتا کو ساتھ لایا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی میں نے پہچان لیا۔ جو قبریں سب سے صاف ستھری تھیں، جن کے کتبے بالکل سلامت تھے اور جن کے قریب پرندوں کے لیے باجرہ اور چاول وغیرہ کے پیالے رکھے تھے وہ میرے والدین کی تھیں۔ کسی نے ان لاوارث قبروں کو بے نشان ہونے سے بچایا تھا۔ یقیناً وہ غزالہ ہی تھی۔ اپنے گھر کی طرح اپنے والدین کی قبروں کے پاس بھی مجھے غزالہ کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے جل کوٹ میں میرا ہر قدم اس کے نقش قدم پر پڑ رہا ہے۔ میں ماں کی قبر سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا اور اس کی مٹی کو آنکھوں سے لگایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بچھڑا ہوا بچہ ہوں۔ برسوں بعد اپنی ماں سے ملا ہوں اور اس کی بانہوں میں سمٹ کر رو رہا ہوں۔ میں سسک اٹھا "ماں! دیکھ دنیا نے تیرے شاہ جہاں کو کیا سے کیا بنا دیا۔ وہ جو چیونٹی تک نہیں مسلتا تھا آج بے دریغ انسانوں کو مسلنے پر مجبور ہے۔ موت ہر جگہ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتی ہے۔ تو کیوں چھوڑ کر گئی تھی اس کو۔ کس کے سہارے چھوڑ کر گئی تھی؟"

عالم قریشی میری پیٹھ سہلانے لگا اور تسلی کے بول بولنے لگا۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں مجھے شفقتا بھی یاد آگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے ماں باپ کی قبروں پر تنہا آکر میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ ان کی لاڈلی بچی کو بھی ساتھ لے کر آتا۔ وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر یہاں آنسو بہاتی اور دعا کرتی۔ میں نے دل میں عہد کیا کہ بہت جلد شفقتا کو بھی یہاں لاؤں گا اور اسے یہ قبریں دکھاؤں گا۔

رات گہری ہو چکی تھی جب عالم قریشی، اللہ دتا اور میں قبرستان سے واپس لوٹے۔ اللہ دتا نے ہمارے لیے رات گزارنے کا انتظام اسی گھر میں کیا تھا جہاں میں نے سولہ سال تک ہزاروں سانی راتیں گزاری تھیں۔ برسوں بعد آج میں پھر اسی چھت تلے لیٹا ہوا تھا۔ جل کوٹ پہنچنے کے بعد یادیں مجھ پر اتنی شدت سے حملہ آور ہوئی تھیں کہ ان سے کہیں پناہ نہیں تھی۔ گھر کے در و دیوار میں والد، والدہ اور شفقتا کی گم گشتہ آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ آوازیں... جن میں ہمیشہ کے لیے روٹھ جانے والی مسرت اور چہکار تھی... پھر میرا دھیان غزالہ کی طرف چلا گیا۔ رہ رہ کر دل کو یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ میں نے شیخ عاصم کو زیر کرنے کی نیت سے اس کے گھر میں داخل ہو کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ میرے اس اقدام کا سارا نزلہ مجبور و بے کس غزالہ پر گر سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں تھی۔ پریشان کن سوچوں اور یادوں کے نرغے میں، میں آدھی رات تک کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا، پھر بے چین ہو کر باہر نکل آیا۔ صحن میں چاند کی روشنی تھی اور فضا میں کھیتوں کھلیانوں اور باغیچوں کی مہک تھی۔ میں بالکونی میں چلا گیا اور اس دو منزلہ حویلی نما مکان کو دیکھنے لگا جو کبھی غزالہ کا مسکن تھا۔ وہ مکان ابھی تک چچا جلیس کی ملکیت تھا۔ بالائی منزل پر کوئی کارخانے دار جوتوں کی ایڑیاں وغیرہ بناتا تھا۔ نچلی منزل کے ایک حصے میں کسی مستحق گھرانے کو سر چھپانے کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ اگر غزالہ چاہتی تو اپنا کلینک اسی مکان میں بھی کھول سکتی تھی لیکن اس نے اس کام کے لیے میرا گھر منتخب کیا تھا اور بقول اللہ دتا، سابق مالکوں سے منہ مانگی قیمت پر یہ مکان خرید لیا تھا۔ وہ اپنے کلینک سے ایک پیسہ نہیں

کماتی تھی لیکن مکان کی دیکھ بھال پر ہر سال تین چار ہزار روپیہ خرچ کر دیتی تھی۔ بقول اللہ دتا "بڑی محبت تھی اسے اس مکان سے۔ میں بالکونی میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور کئی برسوں بعد خود کو یادوں کے تیز دھارے پر کسی تنکے کی طرح بہتا پایا۔

اس رات آخری پہر میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ فیصلہ آپوں آپ مجھ سے ہو گیا۔ شاید بہت سے فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں زندگی بھر ہم یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ ہم نے کیے تھے لیکن حقیقت میں وہ فیصلے حالات نے کیے ہوتے ہیں۔ یہ بھی حالات ہی کا فیصلہ تھا۔ وہ بات جو کبھی بہت مشکل نظر آتی تھی، ایک دم آسان نظر آنے لگی تھی۔ اس گھڑی غزالہ میرے سامنے ہوتی تو میں بڑے اعتماد سے اس کا ہاتھ پکڑتا اور کہتا "غزالہ! ہم دونوں اپنے آپ سے بہت بھاگ چکے ہیں، بہت جھوٹ بول چکے ہیں... اب مزید جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ہر رکاوٹ کو توڑ کر ایک ہو جائیں گے۔ گئے ہوئے وقت کو آواز دیں گے اور ایک نئے سفر کا آغاز کریں گے۔"

ہاں، کتنا آسان لگ رہا تھا یہ ساری باتیں کہنا۔ شاید دل میں پڑی ہوئی ایک قد بھر گرہ تقدیر کے ناخنوں نے چپکے چپکے کھول دی تھی۔ یا ہجر جدائی کی مسلسل آنچ نے اس گرہ کو غیر محسوس طور پر راکھ کر ڈالا تھا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا، یہ عمل کب ہوا اور کیسے ہوا مگر نتیجہ میرے سامنے تھا۔ وہ غیر مرئی دیوار کھوکھلی ہو کر ڈھے چکی تھی جس نے اب تک مجھ کو غزالہ سے دور رکھا ہوا تھا۔ غزالہ کی کوششیں، محبتیں اور معذرتیں جس خلا کو پر نہیں کر سکی تھیں، وہ وقت نے نہایت خاموشی سے آپوں آپ بھر دیا تھا۔ دانا ٹھیک کہتے ہیں۔ بعض فیصلوں کے لیے بعض وقت مقرر ہوتے ہیں۔ ایک دم میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں پرواز کر سکتا ہوں اور ہر رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر اڑ کر غزالہ تک پہنچ سکتا ہوں اور رکاوٹ تھی بھی کیا؟ شیخ عاصم رکاوٹ نہیں ریت کی ایک دیوار تھا۔ وہ غزالہ کا شوہر نہیں اس کی مجبوریوں کا خریدار تھا اور اس نے اپنے قول و فعل سے خود کو خریدار ثابت کیا تھا۔ سری لنکا والے تلخ ترین تجربے کے بعد غزالہ شاید زندگی بھر اس کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھتی۔ اب اگر وہ اس برائے نام شوہر کے پاس تھی تو صرف میری اذیت اور تکلیف کی وجہ سے تھی۔ یہ ایک عارضی ملاپ تھا۔ بلکہ "ڈیل" تھی جس کے لیے غزالہ نے خود کو نجانے کیسے آمادہ کیا تھا۔ میں یہ ساری باتیں اچھی طرح جانتا تھا اور اگر کوئی شک شبہ تھا بھی تو وہ غزالہ کے خطوط پڑھنے کے بعد نہیں رہا تھا۔

یہ بات طے شدہ تھی کہ شیخ عاصم جیسے لوگ عورت کو اپنی مستقل مجبوری نہیں بناتے۔ ان کی اصل دلچسپی عورت سے نہیں بستر سے ہوتی ہے۔ جس طرح وہ اپنی خواہش پر عورت کو حاصل کرنے میں دیر نہیں لگاتے ایسے ہی خواہش پوری ہونے پر عورت کو چھوڑنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔ عین ممکن تھا کہ شیخ عاصم بھی غزالہ کو بخوشی آزاد کر دیتا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھی یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اخلاقی حوالے کے علاوہ قانونی حوالے سے بھی اس کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ وہ ایک سزا یافتہ شخص تھا۔ امارات میں کئی اور مقدمے بھی اس پر چل رہے تھے۔ وہ سری لنکا میں سخت بیمار بیوی کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس بات کے ٹھوس ثبوت موجود تھے۔ ایسے بے شمار حقائق کی موجودگی میں غزالہ کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ عاصم سے خلع حاصل کر لیتی۔

غزالہ اور شیخ عاصم کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا دھیان الیکٹرانک ڈیوائس کی طرف چلا گیا اور یکایک ایک ناروا سی جسم میں اتر گئی۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ شیخ عاصم کے خلاف کسی بھی طرح کی جسمانی یا قانونی مزاحمت کرنے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں اس زنجیر سے چھٹکارا حاصل کروں جو شیخ عاصم نے الیکٹرانک آلے کی صورت میں مجھے پہنا رکھی تھی۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو شیخ عاصم نے میرے خلاف حاصل کر رکھی تھی۔ اس آلے کی موجودگی میں شیخ عاصم کو ہر جگہ اور ہر وقت مجھ پر ناقابل شکست برتری حاصل تھی۔

میں بہت دیر ان سوچوں میں غلطاں رہا پھر دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اس بالکونی میں آرام کرسی پر نیم دراز میں آنکھ کھلی تو نرم سنہری دھوپ ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ چھتوں پر کہیں کہیں رنگین پتنگیں لہرا رہی تھیں۔ نیلگوں آسمان کے پس منظر میں سفید کبوتر اڑتے پھر رہے تھے۔ برساتیاں، منڈیریں، چھجے... نجانے ان دروبام میں کتنے "شاہ جہاں اور غزالہ" موجود تھے اور یہ لوگ شوخ و معصوم جذبوں کی زبان میں محبت کی وہی صدیوں پرانی کہانی دہرا رہے تھے۔ لوگ بدل گئے تھے، وقت بدل گیا تھا مگر منظر تو وہی تھا۔ میری نگاہ ان چھتوں سے پھسلتی ہوئی بہت آگے... شہر لاہور کی چھتوں سے جا ملی۔ ہزاروں لاکھوں چھتوں والا وہ شہر پوری جولانیوں کے ساتھ میرے تصور میں آگیا۔ ان ہزاروں لاکھوں چھتوں میں سے ہی کوئی ایک چھت ایسی بھی تھی جہاں غزالہ شیخ عاصم کے ساتھ موجود تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ شیخ عاصم ہر وقت غزالہ کے پاس نہیں رہتا ہوگا، وہ ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے والا شخص نہیں تھا... (ویسے بھی لاہور میں اس کے خاص قسم کے کاروباری دوست موجود تھے) غزالہ اور شیخ عاصم کا ساتھ بقیناً رات کا ہوتا ہوگا۔ دن کے وقت شیخ عاصم اپنے سو کام نمٹاتا ہوگا۔ ایسے وقت فون پر غزالہ سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ غزالہ کا فون نمبر حاصل کرنے میں کشور میری مدد کر سکتی تھی۔ یقینی بات تھی کہ میرے فون پر غزالہ فوراً چلی آئے گی۔ میں نے تصوراتی نظر سے دیکھا۔ عالم قریشی کی کوٹھی میں ایک تنہا کمرے کے اندر میں اور غزالہ آمنے سامنے ہیں۔ میں غزالہ سے کہہ رہا ہوں

"تو ہم اپنے آپ سے جھوٹ بولنا چھوڑ دیں۔ تو ہم سچائی کو اپنائیں اور سچائی کو اپنانے کے لیے تمام جھوٹے اور برائے نام رشتوں کو مسمار کر دیں۔" پھر میں اپنے ہاتھ غزالہ کی طرف بڑھاتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگا اٹھتے ہیں۔ وہ برسوں کی پیاس لے کر میری بانہوں میں سمٹ آتی ہے۔ میں اسے بھینچ لیتا ہوں۔ اسے دیوانہ وار چومتا چلا جاتا ہوں۔ بے حال ہو جاتا ہوں اور اسے بھی بے حال کر دیتا ہوں۔ دل و دماغ پر صدیوں سے جمی ہوئی برف ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک دیوانی محبت کے چشمے سینے کے صحرا کو جل تھل کرنے لگتے ہیں۔

جل کوٹ کی مانوس فضاؤں سے اُمنگ ترنگ کے نئے خزانے لے کر میں اُسی روز رات کو لاہور واپس پہنچ گیا۔ میرا مسکن وہی عالم قریشی کی کوٹھی تھی۔ اب میں جلد از جلد غزالہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس سے پہلے ایس پی برکت سے ملنا ضروری تھا۔

○☆○

اگلے روز علی الصباح میں بذریعہ ٹیکسی موہنی روڈ پر ایس پی برکت کی رہائش گاہ پر جا دھمکا۔ جب میں وہاں پہنچا تو تقریباً پانچ بجے کا وقت تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پولیس ناکے ختم ہو چکے ہوتے ہیں اور قانونی یا غیر قانونی نقل و حرکت میں کسی طرح کی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی۔ ایس پی برکت رات دیر سے گھر لوٹا تھا لہٰذا لمبی تان کر سو رہا تھا۔ اس کی بیوی مجھے پہچانتی نہیں تھی۔ میں نے اس پر رعب گانٹھا کہ میں برکت کا دیرینہ دوست ہوں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ منٹ بعد برکت آنکھیں ملتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا۔ مجھے پہچان کر اس کا منہ مٹی کے ٹوٹے پیالے جیسا ہو گیا۔ پہلے تو لگا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے تحمل سے کام لیا۔ مجھے تو گالی نہیں دے سکتا تھا لہٰذا خود کو ہی ایک دو گالیاں دے کر غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ حیران تھا کہ پولیس مجھے پورے شہر میں ڈھونڈ رہی ہے اور میں سلیمانی ٹوپی پہن کر یہاں آ دھمکا ہوں۔ میں نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور ان گھڑیوں کے متعلق پوچھا جو چند ماہ پہلے میں نے اسے سونپی تھیں۔ ایس پی برکت نے بتایا کہ وہ گھڑیاں ساہی صاحب نے موصول نہیں کیں بلکہ انہوں نے کہا تھا کہ گھڑیاں لاکرز میں رکھوا دی جائیں۔

"اب وہ گھڑیاں کہاں ہیں؟"

"لاکر میں۔"

"لاکر کس کے نام ہے؟"

"میرے نام ہی ہے۔"

"مجھے وہ گھڑیاں فوری طور پر درکار ہیں۔" میں نے ایس پی برکت سے کہا۔

برکت نے شروع میں ٹال مٹول کی کوشش کی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں غیر معمولی حالات سے گزر رہا ہوں اور ساہی صاحب نے اسے تاکید کر رکھی ہے کہ میری ہر ممکن مدد کی جائے۔ لہٰذا کچھ دیر وہ اوپر نیچے ہونے کے بعد راہِ راست پر آ گیا۔ وہ مجھ سے میری گمشدگی کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن میں کچھ بتانے والا نہیں تھا۔ میں ٹالتا رہا۔ بہت جلد برکت سمجھ گیا کہ مجھ سے سر کھپانا فضول ہے۔ بولا "میں ہی بھوتنی دا ہوں۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

صبح دس بجے کے قریب برکت نے دونوں گھڑیاں لا کر مجھے دے دیں۔ سری لنکا میں 'میں نے ان عجوبۂ روزگار گھڑیوں کے بارے میں برکت کو کافی کچھ بتا دیا تھا۔ برکت حیران تھا کہ جب دونوں گھڑیاں میرے پاس موجود ہیں تو شیخ عاصم ڈوائس کے نظام کو دوبارہ چالو کیسے کرے گا۔

میں نے برکت کو بتایا کہ وہ اس تیسری گھڑی کے بارے میں بھول رہا ہے جو شیخ عاصم اور ٹھکر شکرا کے زیرِ استعمال رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ گھڑی اس وقت شیخ عاصم کی کلائی میں ہو اور وہ میری ہر حرکت سے باخبر ہو رہا ہو۔

موہنی روڈ سے واپسی کا سفر خطرناک تھا لہٰذا میں ایس پی برکت کے ساتھ اس کی سرکاری گاڑی میں چھپ چھپا کر گلبرگ پہنچا۔ احتیاطاً میں عالم قریشی کی کوٹھی سے کافی فاصلے پر ہی اتر گیا تھا۔ میں نے ایس پی برکت کو سمجھا دیا تھا کہ وہ فی الحال ساہی صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائے 'میں بہت جلد ہی ان سے ملوں گا۔

گھڑی کلائی پر باندھنے کے بعد مجھے عجیب سے تحفظ کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ غیر یقینی کیفیت ختم ہو گئی تھی جس نے کئی دن سے مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا.... مجھے گھر پہنچے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک فون کال نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ کال غزالہ کی طرف سے تھی۔ غزالہ کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں کسی پبلک بوتھ سے فون کر رہی ہے۔ میری آواز پہچانتے ہی اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا "شاہ جہاں! آپ کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ابھی ابھی عاصم نے مجھے باتوں باتوں میں بتایا ہے کہ وہ آپ کے سینے میں موجود الیکٹرانک ڈوائس کا سسٹم آن کر رہے ہیں... عاصم کو خدشہ ہے کہ آپ انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے... میرے خیال میں عاصم نے جان بوجھ کر مجھے ڈوائس والی بات بتائی ہے۔ شاید وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہیں اس بارے میں خبردار کر دوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ آپ بے خبری میں کوئی نقصان اٹھا جائیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"تمہاری بات سمجھ رہا ہوں اور عاصم کی بھی۔"

"وہ سگنل دینے والی گھڑی آپ کے پاس موجود ہے نا؟"

"ہاں.... ہے۔"

"شکر ہے خدایا۔" غزالہ کے منہ سے نکلا "اچھا خدا حافظ" اس نے افراتفری میں کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اسی روز یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ دشمنِ جاں شیخ عاصم ڈوائس کا سسٹم آن کر چکا ہے۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ دو کیپسول نگلنے کے بعد میں نے ٹمپریچر لینے کے لیے بیج اٹھایا تو اچانک کلائی پر وہی مخصوص برقی جھٹکا محسوس ہوا جو چند

ماہ پہلے میرے لیے عذاب بنا رہا تھا۔ ایک منحوس ارتعاش تھا جو کلائی سے کہنی تک پھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گھڑی کے ڈائل پر سرخ بلب نے اسپارک کیا۔ پہلے جھٹکے کے ایک سیکنڈ بعد دوسرا جھٹکا لگا اور پھر سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہلکے ہلکے جھٹکے میرے بازو کو جھنجوڑنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ شیخ عاصم کہیں جا رہا ہے۔ وہ نو کلومیٹر کی حد پار کر چکا تھا اور اب دس کلومیٹر تک میری کلائی پر مسلسل جھٹکے لگنے تھے۔ اگر وہ دس کلومیٹر کی حد بھی پار کر جاتا تو پھر میرے لیے موت کا دروازہ کھل جاتا۔ تین چار منٹ تک جھٹکے لگنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ شاید شیخ عاصم نے الارمنگ سسٹم کو چیک کیا تھا یا پھر وہ ویسے ہی غزالہ کے ساتھ لبی ڈرائیونگ پر نکلا تھا اور جھٹکے شروع ہونے کے بعد واپس آ گیا تھا۔ جادو کے طوطے کی طرح میری جان شیخ عاصم کی مٹھی میں تھی۔ بے بسی کا عجیب سا احساس مجھ پر طاری ہو گیا۔

میرے درد میں خاطر خواہ افاقہ تھا۔ بازو پر گولی سے آنے والا زخم بھی تیزی سے اچھا ہو رہا تھا۔ پہلو کے منحوس درد میں ایسے مختصر افاقے پہلے بھی ہوئے تھے لیکن نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے اس مرتبہ خوش خبری سنا رہی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ افاقہ طویل ثابت ہو گا اور میں پھر سے معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آؤں گا۔ شاید بیمار کے اندر کوئی ایسی حس ہوتی ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ اب تم مزید بیمار ہونے والے ہو یا صحت مند ہونے والے ہو.... شام کو میں نے کئی روز بعد رغبت سے کھانا کھایا اور کوٹھی کے وسیع باغیچے میں چہل قدمی بھی کی۔ رات کو تسلی بخش نیند آئی۔

اگلے روز صبح سویرے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ عالم قریشی جھومتا جھامتا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے آیا تھا۔ لقمہ اتنا بڑا تھا کہ مشکل سے جبڑا ہل رہا تھا۔ بولا "تیرا فون ہے یار! وہی ڈاکٹر صاحبہ بول رہی ہیں۔"

میرے سینے میں خوش گوار دھڑکنیں جاگ اٹھیں۔ میں غزالہ کو یاد کر رہا تھا اور غزالہ ہی کا فون آ گیا تھا۔ شاید میں اس وقت کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔ میں ساتھ والے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر کے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے غزالہ کی آواز آئی "کیسے ہیں آپ؟"

"پہلے سے بہت بہتر.... اور تم کیسی ہو؟" میرے دل کا اندیشہ زبان پر چلا آیا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بولی "بہرحال پچھلی رات آپ نے بڑا نامناسب اور خطرناک کام کیا۔"

"کون سا؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"بنئے مت۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔" اس کے لہجے میں غصے اور اضطراب کی جھلک تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ یقیناً چند روز پہلے والے واقعے کی طرف ہے۔ میں عاصم کی نشاط گاہ میں گھس گیا تھا اور پھر یہ امر

محمود احمد مودی کا ایک شاہکار ناول
سمندر
۱۵۰/-
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

مجبوری وہاں سے پسپا ہوا تھا۔ بہرحال فون پر تفصیل بات کرنا مناسب نہیں تھا۔

"ہیلو' سن رہے ہیں آپ؟" غزالہ نے میری خاموشی توڑنے کے لیے کہا۔

"ہاں سن رہا ہوں۔"

وہ بولی "میں معاملہ سدھارنے کی کوشش کر رہی ہوں اور آپ بگاڑنے کی۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا "میرا خیال ہے غزالہ! اب معاملات سدھرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"پتا نہیں آپ کن معاملات کی بات کر رہے ہیں۔"

"ایسے معاملات جن کا تعلق ہماری زندگی سے بہت گہرا ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔" غزالہ کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"کیا تم اپنی زندگی کے معاملات کو نہیں سمجھتی ہو؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر غزالہ کی لرزاں آواز ابھری "شاہ جہاں 'کیا بات ہے۔ آپ کا لہجہ کچھ... بدلا بدلا ہے۔"

"لہجہ ہی نہیں بہت کچھ بدلنے والا ہے غزالہ۔" میں نے کہا۔

ایک بار پھر خاموشی کا وقفہ آیا۔ اس وقفے کے بعد غزالہ نے کہا "شاہ جہاں.... مم... میرا خیال ہے 'ہمیں فون پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی۔"

"میں بھی تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔"

"یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو فون کر لیا۔"

"پھر کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

وہ ذرا توقف سے بولی "ٹھیک ہے 'میں آپ کے ہاں آ جاتی ہوں۔ عالم قریشی کے سوا کوئی اور تو نہیں ہے وہاں؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگی "رات آٹھ بجے کے بعد آپ گھر پر ہی رہیے گا۔"

"او کے! میں انتظار کروں گا۔"

خدا حافظ کہنے کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ہفتے کی رات والے واقعے کے حوالے سے میرے ذہن میں بہت سے اندیشے تھے۔ جن میں ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں شیخ عاصم یہ نہ سمجھ لے کہ میں غزالہ کی ملی بھگت سے اس کی کوٹھی میں داخل ہوا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو غزالہ بڑی سے بڑی مصیبت میں پھنس سکتی تھی لیکن اب غزالہ کا فون سننے کے بعد میرے بہت سے اندیشے باطل ثابت ہو گئے تھے۔ غزالہ کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح معاملے کو ہینڈل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر شیخ عاصم نے میرے خلاف جوابی کارروائی نہیں کی تو اس میں غزالہ کی کوشش شامل تھی۔ اب وہ مجھ سے ملنے بھی آرہی تھی۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ صورت حال پر اسے کنٹرول حاصل ہے۔

غزالہ کا فون سننے کے بعد میرے ذہن میں یہ امکان پھر سے روشن ہو گیا تھا کہ شاید غزالہ نے ہفتے کی رات والے واقعے کے باوجود شیخ عاصم کو قائل کر لیا ہو۔ وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا ہو کہ الیکٹرانک ڈوائس میرے جسم سے نکال دیا جائے..... کاش ایسا ہوتا اور میں کھلے میدان میں شیخ عاصم سے دو دو ہاتھ کر سکتا۔ میرے دل میں شیخ عاصم کے لیے بڑے ارمان تھے لیکن منحوس ڈوائس نے میرے ہاتھ یوں باندھ رکھے تھے کہ میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس روز غزالہ کے انتظار میں عجیب طرح کی لذت تھی۔ وہ لذت جو میں نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔ یوں لگتا تھا کہ آج ایک ایسی دیوار میرے اور غزالہ کے درمیان موجود نہیں جس نے ہمیں برسوں سے جدا رکھا ہوا تھا۔ میں آج غزالہ کے ساتھ مل کر بھولی بسری یادیں تازہ کرنا چاہتا تھا۔ جل کوٹ کے زمانے کی باتیں کرنا چاہتا تھا اور پھر..... پھر بڑی محبت سے اسے چھونا چاہتا تھا۔ وہی محبت جو برسوں پہلے میرے لمس سے روٹھ گئی تھی۔

ایک دم میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے ایک بہت خاص بات یاد آئی تھی۔ آج ۱۳ تاریخ تھی۔ صرف ایک دن بعد غزالہ کی سالگرہ تھی۔ غزالہ کی سالگرہ کا دن بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا۔ ہر سال یہ دن میرے احساس کو چھو کر گزرتا تھا۔ جل کوٹ میں جل کوٹ سے بہت دور دکمروڈیکا کے گاؤں میں 'بمبئی کے ہنگاموں میں اور جیل کی بیرکوں میں۔ جہاں کہیں بھی یہ دن آیا تھا میں نے اسے محسوس کیا تھا۔ اس دن سے وابستہ یادوں کو تازہ کیا تھا۔ یہ دن میں صرف ایک مرتبہ غزالہ کے ساتھ منا سکا تھا۔ یہ میرے لڑکپن کی بات تھی۔ میں اس وقت غالباً ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں غزالہ کے لیے کہانیوں کی ایک بڑی خوب صورت کتاب لایا تھا۔ یہ کتاب میں غزالہ کو سالگرہ پر دینا چاہتا تھا لیکن چچی کی ڈانٹ سے ڈرتا بھی تھا۔ بہت سوچ سوچ کر میں نے یہ کتاب غزالہ کے بجائے اس کے چھوٹے بھائی نبو کو دے دی تھی۔ نبو نے کہا تھا 'بھائی جان یہ کتاب تو مجھے پڑھنی نہیں آتی۔' میں نے کہا تھا 'کوئی بات نہیں 'غزالہ تمہیں پڑھ کر سنایا کرے گی۔ پھر جب شام کو میں نے غزالہ کے ہاتھ میں اپنی دی ہوئی کتاب دیکھی تھی تو مجھے ایک ایسی خوشی حاصل ہوئی تھی جسے یاد کر کے آج بھی میں کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ یہ غزالہ کی سالگرہ پر میرا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ ایسا تحفہ جس کے بارے میں غزالہ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اسے دیا گیا تھا۔

ذہن میں یہ خیال آتے ہی کہ کل غزالہ کی سالگرہ ہے میرے دل میں آئی کہ آج کی ملاقات میں اسے کوئی تحفہ پیش کروں۔ کیا پتا کل ملاقات ہو یا نہ ہو۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کیا دوں۔ کوئی بہت قیمتی پرفیوم 'کوئی بیش قدر گھڑی' کوئی نایاب پینٹنگ' میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی نوجوان لڑکے کی طرح سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ایک اشارے پر عالم قریشی لاہور میں موجود مہنگی سے مہنگی چیز میرے لیے مہیا کر دے گا جو کسی کو تحفے کے طور پر دی جا سکتی ہے لیکن مجھے اس سلسلے میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ برائے نام ہی سہی لیکن غزالہ کسی کی بیوی تھی۔ میرے تحفے سے اس کے کسی خفتہ جذبے کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی۔ غور و فکر کے بعد میں نے عالم قریشی کے مالی کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ باغ میں سے سرخ و سفید گلاب کے ترو تازہ پھولوں سے ایک شاندار گلدستہ تیار کرے (گلدستہ تیار کرنے میں اس مالی کو دور نزدیک شہرت حاصل تھی) میری توقع کے عین مطابق اس نے ایک حسین و جمیل گلدستہ تیار کیا اور آرائشی کاغذ میں لپیٹ کر میری میز پر رکھ دیا۔ میں نے سات بجے سے ہی غزالہ کی آمد کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ آئی۔ مرسیڈیز پورچ میں رکی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ شیخ عاصم بھی غزالہ کے ساتھ تھا۔ وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ غزالہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے برقع پہن رکھا تھا۔ راستے میں یقیناً اس نے نقاب گرائے رکھا ہو گا مگر اب اٹھا ہوا تھا۔ ایک دم ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے دراز سے بھرا ہوا ریوالور نکالا۔ پھر میں نے ایک اور بات نوٹ کی اور بری طرح چونک گیا۔ میرا اور شیخ عاصم کا درمیانی فاصلہ بمشکل پندرہ بیس فٹ کے قریب تھا لیکن میری کلائی پر کسی طرح کے جھٹکے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ الیکٹرانک ڈوائس کا "الارمنگ سسٹم" بند ہے۔ جی چاہا کہ کھڑکی میں سے نشانہ لے کر شیخ عاصم کو شوٹ کر دوں لیکن فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ شیخ عاصم یہاں کیوں اور کس مقصد سے آیا ہے۔ اگلے ہی لمحے شیخ عاصم اور غزالہ نشست گاہ کے اندر تھے۔ غزالہ اتنی نکھری نکھری اور دلکش نظر آرہی تھی کہ نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ گلابی ساڑی میں تھی اور اس کے سراپا میں سے خوب صورتی شعاعوں کی طرح پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ شیخ عاصم حسب معمول نیوی بلیو سوٹ میں تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے سگار دیوں جھانک رہا تھا جیسے تاریک درختوں

کے اندر سے توپ کا دہانہ نظر آ رہا ہو۔ ان دونوں کی ایک ساتھ آمد نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ بہرحال میں نے سنبھالا لیا اور کمرے سے نشست گاہ میں آ گیا۔ شیخ عاصم سے آنکھیں چار ہو گئیں..... وہی سمندر سی گہری آنکھیں جن کی تہ سے کچھ ڈھونڈ کر لانا ناممکن نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے میری طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ تک میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا رہا' پھر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ میرے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنا ہاتھ بڑھا دوں "ہاؤ ڈو یو ڈو؟" اس نے پوچھا۔

"فائن۔" میں نے بھی رسمی جواب دیا۔

میرے اور غزالہ کے درمیان بھی رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ غزالہ کے چہرے پر شادابی اور سکون تھا۔ عالم قریشی نے غزالہ اور شیخ عاصم کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ شیخ عاصم نے بے تکلفی سے کہا "غزالہ! تم بیٹھو۔ مجھے شاہ جہاں کے ساتھ چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔" پھر وہ عالم قریشی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ آپ ہمارے میزبان ہیں؟"

عالم قریشی نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا "کیا مجھے اور مسٹر شاہ جہاں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہائی مل سکتی ہے؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" عالم قریشی نے خوش دلی سے جواب دیا اور ہمیں نشست گاہ کے عقب میں واقع ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا۔ شیخ عاصم اور میں صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ شیخ عاصم بظاہر غیر مسلح نظر آتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ میری کیفیت کو محسوس کر کے وہ بولا "شاہ جہاں! میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ تم بھی چاہو تو اپنے ریوالور کے بوجھ سے آزاد ہو کر بیٹھ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "آتشیں ہتھیاروں کا بوجھ تو میری زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ باقی تم یہ بھی غلط کہہ رہے ہو کہ تم مسلح نہیں ہو۔ تمہاری کلائی کی گھڑی سے بڑا ہتھیار اور کیا ہو گا۔ تم ایک بٹن دبا کر الیکٹرانک ڈوائس کا سسٹم آن کر سکتے ہو۔ میرا اور تمہارا فاصلہ اتنا زیادہ ہرگز نہیں کہ سسٹم آن ہونے کے باوجود میں زندوں میں شمار ہو سکوں۔"

شیخ عاصم ہولے سے مسکرایا۔ اس نے کلائی کی گھڑی اتاری اور دور ایک کشن پر پھینک دی "اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولا۔

"کہو کیسے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بہت بڑا مقصد لے کر۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایک بہت بڑا مقصد تو ہر وقت تمہارے پیش نظر رہتا ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرے مقصد کا تعلق دشمنی سے نہیں' دوستی سے ہے۔ میں آج اپنے اور تمہارے تعلقات کی نوعیت بدلنے کے لیے آیا ہوں۔ ایک ایسے تنازع پر کھلے دل سے بات کرنے کے لیے آیا ہوں جس نے پچھلے کئی برسوں سے ہماری زندگیوں میں زہر گھول رکھا ہے۔"

میری رگوں میں وہی وحشت سر اٹھانے لگی جس نے آج سے آٹھ نو سال پہلے میرے دل و دماغ میں زلزلے برپا کر دیے تھے اور مجھے ایک پڑھے لکھے وکیل سے قاتل بنا دیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا "مسٹر عاصم! اس تنازع کے بارے میں بات نہ ہی کی جائے تو اچھا ہے۔ میرے خیال میں وہ تنازع ختم ہو چکا ہے۔ تمہارے بڑے بھائی نے امارت اور طاقت کے زعم میں میری بہن کی طرف اپنے ناپاک ہاتھ بڑھائے تھے۔ میں نے اسے قتل کر دیا..... بس وہ بات ختم ہو گئی۔"

"یہ تم کہتے ہو کہ بات ختم ہو گئی لیکن رواج' سماج اور قانون اس بات کو نہیں مانتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا قبائلی نظام اس بات کو نہیں مانتا۔ تم نے شیخ راشد بن ارشد کو قتل کیا اور تم ابھی تک زندہ ہو۔ یہ بات ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔"

"کیا تم یہی سب کچھ بتانے کے لیے یہاں آئے ہو؟"

شیخ عاصم نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور ملائمت سے بولا "نہیں شاہ جہاں! آج میں کچھ اور خیالات لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ اگر تم میرے ان خیالات کو غور سے سنو گے اور ٹھنڈے دماغ سے غور کرو گے تو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے کم از کم دشمن نہیں سمجھو گے اور آنے والے دنوں میں تمہاری یہ سوچ پختہ تر ہوتی چلی جائے گی۔"

"میرا خیال ہے۔ تم کھل کر بات کرو تو اچھا ہے۔"

وہ بولا "میں تو خود کہہ رہا ہوں کہ میں آج تم سے کھل کر بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میں وہ سب کچھ تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں جو میرے دل میں ہے۔ اچھا ہے یا برا ہے لیکن اپنا ہر خیال تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ اگر واقعی میرے اندر یہ تبدیلی آئی ہے تو پھر کیسے آئی ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ بہرحال اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی۔ میں نے پچھلے کئی ماہ سے قدم قدم اس تبدیلی کی طرف سفر کیا ہے۔ بتدریج اور مسلسل میں "تغیر" کے عمل سے گزرا ہوں۔ نجانے کیوں اس وقت مجھے منگولوں کے بارے میں لکھی ہوئی ہیرالڈ لیمب کی ایک کتاب یاد آرہی ہے۔ اس کتاب میں لیمب نے لکھا تھا کہ عورت نے بڑے بڑے واسخ العقیدہ اور سخت گیر مردوں میں اپنی دل توڑ نسوانیت کے ذریعے ایسے خاموش انقلاب برپا کیے ہیں کہ تاریخ کے راستے بدل دیے ہیں۔ شاید وہ ان مسلمان عورتوں کا ذکر کر رہا تھا جو سمرقند و بخارا اور بغداد کی بربادی میں منگولوں کے ہاتھ لگی تھیں اور ان کے حرم میں داخل ہوئی تھیں۔ بعد ازاں ان عورتوں ہی کی وجہ سے ایسے انقلاب کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ کیا

تم نے تاریخ کا وہ حصہ پڑھا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "مسٹر عاصم! کیا یہ بہتر نہیں کہ حاشیہ آرائی کے بجائے تم دو ٹوک بات کرو۔"

وہ بدمزہ ہوئے بغیر مسکرایا اور بولا "ابھی! میں تو آیا ہی دو ٹوک بات کرنے کے لیے ہوں۔ اگر تمہیں کوئی بات بری لگے تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔" چند لمحے توقف کر کے اس نے نیا سگار سلگایا اور بولا "شاہ جہاں! یہ حقیقت ہے کہ میں آج تک تمہارے خون کا پیاسا رہا ہوں۔ تمہیں مارنا اور اذیت ناک طریقے سے مارنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ جب میں اذیت ناک طریقے سے مارنے کی بات کرتا ہوں تو اس میں جسمانی اذیت ہی نہیں ذہنی اذیت بھی شامل ہے۔ آج مجھے یہ اعتراف کرنے دو کہ غزالہ کے ساتھ شادی کرتے وقت میرے ذہن میں یہ خیال بھی موجود تھا کہ میں اس طرح تمہاری ذہنی اذیت کا اہتمام کر رہا ہوں۔ میں نے سری لنکا میں ہنی مون مناتے ہوئے تمہیں اپنے ساتھ رکھا اور پل پل رقابت کی آگ میں جلایا۔ شاید یہ کھیل سری لنکا میں دیر تک چلتا لیکن پھر غزالہ بیمار ہو گئی اور مجھے بھی مقدمے کی وجہ سے واپس امارات جانا پڑا۔ میرے خیال میں تم یہ ساری باتیں بخوبی سمجھتے ہو اور اس کے علاوہ وہ بات بھی سمجھتے ہو جس کا تعلق تمہارے اپنے گھر سے ہے۔ اگر تم مجھے معاف کرو تو میں یہ اعتراف کھلے الفاظ میں کروں گا کہ پاکستان پہنچنے کے بعد میرا اصل نشانہ تمہاری چھوٹی بہن شگفتہ تھی۔ میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ چولستان کے صحرا میں جس لڑکی کے لیے میرا بھائی قتل ہوا میں اس لڑکی تک پہنچوں گا اور جیسے بھی ہوا اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ مجھے اعتراف ہے شاہ جہاں کہ میں نے عداوت اور نفرت کی پستیوں میں گر کر بڑی بے رحمی سے اس بارے میں سوچا تھا اور جن دنوں میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا ان دنوں غزالہ میری بیوی نہیں تھی۔ تمہارے لیے اذیت کا ایک ذریعہ تھی اور تمہاری بہن تک پہنچنے کے لیے میرے قدموں کی سیڑھی تھی.... مگر پھر بتدریج میرے خیالات تبدیل ہونے لگے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کب بڑی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ غزالہ میرے لیے اہم ہونا شروع ہو گئی۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے وہ میری ضرورت بنتی گئی اور میں اس سے دور رہنے کے باوجود اس کے خیالوں میں مبتلا رہنے لگا.... اور آج.... آج حالات اس موڑ پر آ چکے ہیں شاہ جہاں کہ میں غزالہ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو لڑکی ایک انتقام کی لپیٹ میں آ کر میری زندگی میں داخل ہوئی تھی وہ میری زندگی کا حصہ بننے لگی ہے۔ میں اس کے لیے.... میں اس کے لیے بہت کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں اور جو چھوڑ نہیں سکتا اس کے سلسلے میں بات کرنے کو تیار ہوں۔ کوئی درمیانی راستہ نکالنے کے لیے آمادہ ہوں اور اسی درمیانی راستے کے لیے آج میں تمہارے پاس پہنچا ہوں۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم پھر اپنے بھائی کے قتل کی بات کر رہے ہو۔"

ایک گہری سانس لے کر شیخ عاصم نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں شاہ جہاں! میں اسی قتل کی بات کر رہا ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، یہ قتل صرف میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میرے پورے خاندان اور قبیلے کا مسئلہ بھی ہے۔ میں اکیلا چاہوں بھی تو اس مسئلے کو ختم نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ضرور کر سکتا ہوں کہ اس مسئلے کو کسی ایسے احسن طریقے سے حل کیا جائے کہ نہ تمہاری انا اور عزت کو کوئی ٹھیس پہنچے اور نہ میرے لوگوں کے دلوں میں رنجش باقی رہے۔ ایک ایسا باعزت اور شاندار تصفیہ ہو جس سے دونوں فریق مطمئن ہو جائیں۔"

میں شیخ عاصم کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ کچھ باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ نہیں۔ وہ یہ بات کہہ رہا تھا کہ آج وہ میری اور اپنی دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی بتا رہا تھا کہ اسے اس مفاہمت کی طرف لانے والی ہستی غزالہ کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ غزالہ کی سحر انگیز شخصیت سے متاثر ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔

شیخ عاصم ایک بہت گہرا شخص تھا لیکن غزالہ سے "متاثر" ہونے والی بات ناممکنات میں سے بھی نہیں تھی۔ کم از کم اتنا تو ضرور سوچا جا سکتا تھا کہ بے شمار دوسری عورتوں کے برعکس غزالہ سے ابھی تک شیخ عاصم کا دل بھر نہیں سکا۔ میں نے سری لنکا کے قیام کے دوران میں بھی یہ بات محسوس کی تھی۔ خاص طور سے قیام کے آخری دنوں میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ غزالہ کے بارے میں سوچتے ہوئے شیخ عاصم کی بے پناہ سفاکی اور سنگدلی کچھ کم ہو جاتی ہے۔ شاید غزالہ ان خوش بخت عورتوں میں سے تھی جنہیں حاصل کرنے والے مرد انہیں حاصل کرنے کے باوجود ان کے طالب رہتے ہیں اور بعض اوقات یہ طلب گھٹنے کے بجائے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ عورتیں ایک ایسی حسین عمارت کی طرح ہوتی ہیں جن میں صرف ایک دروازہ ہوتا ہے اور یہ داخلے کا دروازہ ہوتا ہے۔ مرد اس دروازے میں داخل ہوتا ہے اور پھر ایک طویل مدت تک وہاں سے نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ محبت کی دھیمی دھیمی پھوار میں بھیگتا چلا جاتا ہے۔ لب و رخسار کی چاہت، گل بدنی کا خمار اور نسوانیت کا طلسم اس کی رگ جاں میں گہرائی تک اترتا چلا جاتا ہے۔

اسی دوران میں چائے بھی آ گئی۔ چائے کے ساتھ تمام لوازمات تھے۔ عالم قریشی کو اچھا کھانے کا ہی نہیں اچھا کھلانے کا بھی شوق تھا۔ ڈرائی فروٹ، تلے ہوئے بادام، انگلینڈ کے بسکٹ اور پتا نہیں کیا کیا تھا اس چائے کے ساتھ۔ چائے آئی تو غزالہ بھی ہمارے پاس آ بیٹھی۔ وہ چپ چپ تھی لیکن چہرے سے کسی طرح کی افسردگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ خانساماں چائے بنانے لگا۔ غزالہ بولی "نہیں۔ میں بناتی ہوں۔"

"ہاں۔ "بنانے" کا کام تم خوب کرتی ہو۔" شیخ عاصم ہلکے

پھلکے انداز میں بولا۔

"اور باتیں بنانے کا کام آپ خوب کرتے ہیں۔" وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔

"بناتا تو نہیں تھا ڈاکٹر صاحبہ۔ شاید اب بنانے لگا ہوں۔"

غزالہ کے خوب صورت ہاتھ برتنوں سے مصروف کار تھے۔ اس کی طلائی چوڑیاں ہولے ہولے کھنک رہی تھیں۔ میں بے خیالی میں ان ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اور میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ غزالہ کے آنے سے پہلے میں کیا سوچ رہا تھا، کیسے کیسے ارادے باندھ رہا تھا اور اب کیا سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا.... حالات میں بہت بڑی تبدیلی محسوس ہوئی تھی مجھے.... وہ بات جو برسوں بعد میری زبان پر آنے والی تھی پھر میرے دل میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ حسین سرگوشی جو میں نے غزالہ کے کان میں کرنا تھی، ایک دم خاموشی کی چادر اوڑھ کر پھر دل کے کسی تاریک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔ میں غزالہ اور شیخ عاصم کی ازدواجی زندگی کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ وہ روپ جو پہلے روپ سے بہت مختلف تھا۔ یوں لگتا تھا کہ چند دنوں کے اندر غزالہ کے خیالات میں نمایاں تبدیلی آئی ہے اور وہ جو ایک مجبوری کے تحت شیخ عاصم کے پاس گئی تھی بتدریج ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی ہے یا پھر وہ کسی مجبوری کے تحت گئی ہی نہیں تھی۔ یہ صرف میری خوش فہمی تھی کہ وہ مجبوری کے تحت گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ شیخ کے پاس واپس جانے کے لیے لاشعوری طور پر کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی ہو اور میری تکلیف نے اسے بہانہ فراہم کر دیا ہو.... کچھ بھی تھا آخر وہ ایک مشرقی عورت تھی.... وہ مشرقی عورت جس کے لیے ازدواجی رشتے سے بڑھ کر اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ وہ اس رشتے کو سلامت رکھنے کے لیے بڑا دکھ جھیلتی ہے، ان گنت صدمے سہتی ہے اور آخری دم تک کوشش کرتی ہے کہ یہ بندھن ٹوٹنے نہ پائے۔ شوہر کتنا بھی ناقابل برداشت ہو وہ اس کی مہربانیوں کی منتظر رہتی ہے۔ روٹھا ہوا مجازی خدا اس کی طرف ایک قدم بڑھائے تو وہ دس قدم بڑھاتی ہے.... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی شیخ عاصم نے جو باتیں مجھ سے کی ہیں ان میں سچائی کتنے فیصد ہے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ غزالہ اپنے رویے سے ان باتوں کی مکمل تصدیق کر رہی ہے۔ یہ خاموش تصدیق میں اس کی ہر ادا میں دیکھ رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد وہ خانساماں کو بلانے کے بہانے اٹھی اور واپس نہیں آئی۔ میں اور شیخ عاصم ایک بار پھر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

شیخ عاصم نے کہا "شاہ جہاں! آج جس طرح میں تم سے ہر بات کہہ رہا ہوں، امید ہے کہ تم بھی کچھ نہیں چھپاؤ گے۔" پھر ذرا توقف۔ "یہ بتاؤ کیا تم یہ بات تسلیم کرتے ہو کہ جلنے کی رات تم سن ڈیفنس والی کوٹھی میں داخل ہوئے تھے؟"

میں نے کہا "میرے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم جانتے ہو کہ میں داخل ہوا تھا۔"

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"ہاں میں داخل ہوا تھا۔ تم خود تسلیم کر چکے ہو کہ میرا اور تمہارا رشتہ دشمنی کا ہے۔ اس دشمنی کے ناتے تم میرے خون کے پیاسے تھے۔ میرے خیال میں اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی مجھ تک پہنچتے اور مجھے زیر کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔"

"تم نے درست کہا ہے۔ جنگ اور محبت میں سب چلتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اور ویسے بھی اب ہمیں ماضی قریب یا بعید کی باتوں کو حال میں نہیں گھسیٹنا چاہیے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میرا خیال تم سے ملتا جلتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "شاہ جہاں۔ اپنے بھائی کے قتل کے سلسلے میں بات کرنے سے پہلے میں اس الیکٹرانک ڈوائس کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں جو کچھ عرصہ قبل تمہارے جسم میں رکھوایا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اس سلسلے میں میری زبان سے کچھ نہ کچھ سننا چاہو گے۔"

میں نے کہا "میں تو اور بھی بہت کچھ سننا چاہتا ہوں۔ بہرحال تم جو کچھ سنانا چاہتے ہو، سنا دو۔"

وہ اپنی خالی کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "جیسا کہ شنکر شکرا تمہیں انڈیا میں بتا چکا ہے، یہ الیکٹرانک ڈوائس ایک جاپانی انجینئر کا تیار کردہ ہے اور دو ماہر سرجنوں کی مدد سے تمہارے معدے میں رکھا گیا تھا۔ اس ڈوائس کو ایسے طور پر تیار کیا گیا ہے کہ کوئی بھی سرجن جاپانی انجینئر کی عدم موجودگی میں اسے اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا.... میں جانتا ہوں پچھلے دنوں اس ڈوائس کے سبب تمہیں بے حد تکلیف سہنا پڑی ہے اور تم اسپتال میں بھی داخل رہے ہو۔ تمہاری بیماری کے متعلق مجھے غزالہ کی زبانی سب کچھ معلوم ہوا ہے.... مجھے ملنے والی اطلاعات واقعی تشویش ناک ہیں اور میں نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ ڈوائس فی الفور تمہارے جسم سے نکلوا دوں گا۔" ایک لمحہ توقف کر کے شیخ عاصم نے میرے چہرے سے میرے دلی جذبات جانچنے کی کوشش کی۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آج یہاں آنے سے پہلے ناگاساکی میں جاپانی ماہر کی بیوی سے بات ہوئی ہے۔ وہ جاپانی ماہر الیکٹرانکس انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ ہے اور اسی سلسلے کے کسی سیمینار میں شرکت کرنے کے لیے آسٹریا گیا ہوا ہے۔ فی الحال اس سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ جونہی رابطہ ہوا، میں اس سے یہاں پاکستان پہنچنے کی درخواست کروں گا۔ تمہیں اب اس سلسلے میں بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ الیکٹرانک ڈوائس تمہارے جسم سے مکھن کے بال کی طرح نکال لیا جائے گا۔ انتظار صرف اس بات کا ہے کہ جاپانی ماہر سے رابطہ قائم ہو جائے۔"

میں خاموشی سے شیخ عاصم کی باتیں سن رہا تھا۔ شیخ عاصم نے

مجھ سے میری تکلیف کے بارے میں پوچھا اور اس سلسلے میں مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس کے لہجے سے ہمدردی جھلک رہی تھی۔ پھر گفتگو کا رخ اس درمیانی راستے کی طرف مڑ گیا جس کا ذکر شیخ عاصم نے شروع میں کیا تھا۔ میری اور اپنی دیرینہ عداوت ختم کرنے کے لیے وہ ایک "درمیانی راستے" کی بات کرنے لگا۔ اس نے کہا "شاہ جہاں! فی الوقت ہم دونوں یہاں تنہا بیٹھے ہیں اور ہر مسئلے پر کھل کر گفتگو کر رہے ہیں۔ میں تمہیں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس تجویز کو ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر تم نہیں بھی مانو گے تو مجھے تم سے شکوہ نہیں ہوگا اور میں پھر بھی اپنے اور تمہارے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہوں گا اور اگر مان لو گے تو..... میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ایک پیچیدہ مسئلہ نہایت خوش اسلوبی اور باعزت طریقے سے حل ہو جائے گا۔" گہری سوچ میں ڈوب کر اس نے مناسب الفاظ تلاش کیے اور بولا "ہمارے ہاں کے قبائلی نظام میں دیرینہ دشمنیاں ختم کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے رشتے داری۔ جس خاندان کا فرد قتل ہوتا ہے وہ لوگ وقتی طور پر زبردست اشتعال میں ہوتے ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ غم و غصہ کم ہوتا جاتا ہے اور پھر صرف رسمی انتقام کا جذبہ رہ جاتا ہے لیکن یہ رسمی جذبہ اتنا دیرپا ہوتا ہے کہ بعض اوقات نسلوں تک خون بہتا رہتا ہے۔ اس جذبے کی روک تھام کے لیے قبائلی نظام میں یہ روایت چلی آئی ہے کہ دونوں متحارب خاندان رشتے داری کی ڈور میں باندھ دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر مرنے والے کے خاندان میں سے کسی لڑکے کا رشتہ مارنے والے کے خاندان کی کسی لڑکی سے کر دیا جاتا ہے۔ یوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ایک دوسرے کے خیر خواہ اور پیارے بن جاتے ہیں..... خود میرے ایک چچا کی لڑکی کا رشتہ اسی حوالے سے عشارب قبیلے میں ہو چکا ہے اور ایک خطرناک دشمنی جڑ سے اکھاڑی جا چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری باتیں سمجھ رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اپنی دشمنی کو محبت اور بھائی چارے میں بدلنے کے لیے ایک اہم فیصلہ کریں۔ تم اپنی بہن شفتا کا رشتہ میرے خاندان کے ایک پڑھے لکھے نہایت شریف لڑکے سے کر دو۔ اس لڑکے کا نام ایاز ہے اور وہ رشتے میں میرا سگا بھتیجا ہے۔"

کمرے کے اندر جیسے کوئی چیز زبردست چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ میں کھلی کھلی آنکھوں سے شیخ عاصم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ کیسی بات کہہ دی تھی..... وہ میری بہن کا ذکر کر رہا تھا اور بڑے اطمینان سے کر رہا تھا۔ اسے یہ جرأت کیونکر ہوئی تھی۔ کیا وہ واقعی اپنی دانش کے مطابق یہ بات نیک نیتی سے کہہ رہا تھا..... یا پھر پرانا شکاری بھیس بدل کر آیا تھا، میری بہن کو شکار کرنے کے لیے اسے اس پناہ گاہ سے نکالنے کے لیے جہاں وہ ایک مدت سے چھپی ہوئی تھی۔ اس پناہ گاہ کا علم ساہی صاحب کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ خود مجھے بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک محفوظ تھی، کسی ظالم کے سفاکی ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکے تھے لیکن شیخ عاصم کی یہ تجویز بھی اس ناکامی کا ردعمل تو نہیں تھی جو اسے شفتا تک پہنچنے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو شاہ جہاں؟" شیخ عاصم کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

"سوچ رہا ہوں کہ تمہاری بات پر کیا ردعمل ظاہر کروں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم بیسویں صدی کے آخری مرحلے میں ہو۔ ایک ماڈرن، روشن خیال اور تعلیم یافتہ معاشرے کے فرد ہو۔ تمہارے منہ سے قدیم قبائلی رسم و رواج کی بات سن کر عجیب سا لگا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے تھری پیس سوٹ میں کوئی بدّو میرے سامنے بیٹھا ہے۔"

شیخ عاصم نے کہا "تمہیں قبائلی رسم و رواج پر اعتراض ہے یا میری تجویز پر؟"

"مجھے دونوں پر اعتراض ہے۔" میں نے کہا "اور تمہارے لب و لہجے پر بھی..... تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری دشمنی سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنی بہن کی قربانی دوں گا اور اسے ایک ایسے جہنم میں جھونک دوں گا جہاں وہ ہر وقت قاتل کی بہن ہونے کے طعنے سہے اور اس نفرت کا نشانہ بنے جو تمہارے اور تمہارے خاندان کے دل و دماغ میں رچ بس چکی ہے۔ خدا کی قسم میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنے کے وعدے پر میری بہن کو کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی دی جائے۔"

شیخ عاصم بولا "شاہ جہاں، تم جذباتی ہو رہے ہو۔ میں نے تم سے وعدہ لیا ہے کہ تم میری تجویز کا برا نہیں مانو گے۔ میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ تم ہر معاملے میں مکمل تسلی سے سوچ سکتے ہو اور نہ سوچنا چاہو تو بھی مجھے اعتراض نہیں۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "شیخ عاصم! آئندہ کبھی بھی میں اس معاملے میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی سننا پسند نہیں کروں گا۔ تم چل کر میرے پاس آئے ہو اور میں میزبان کی حیثیت رکھتا ہوں، ورنہ میرا جواب تمہاری توقع سے کہیں زیادہ سخت ہو سکتا تھا۔"

میں کھڑا تھا اور شیخ عاصم بیٹھا تھا۔ بالفاظ دیگر میں گفتگو ختم کر چکا تھا اور شیخ عاصم سے کہہ رہا تھا کہ وہ بھی اٹھ کھڑا ہو۔ یقیناً شیخ عاصم نے بڑی سبکی محسوس کی ہوگی۔ تاہم اس نے خود پر ضبط کیا اور نارمل لہجے میں بولا "بیٹھ جاؤ شاہ جہاں! ابھی تم سے عیسیٰ جان کے بارے میں بھی بات کرنی ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ "بات" تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہوگی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم بیٹھو تو کچھ سمجھاؤں بھی۔"

میں نے غم و غصے کی کیفیت پر قابو پایا اور بادل ناخواستہ بیٹھ گیا۔ شیخ عاصم نے کہا "میں جانتا ہوں کہ عیسیٰ جان کے قتل کے بعد کچھ بڑے لوگ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہر جگہ تمہاری تلاش ہو رہی ہے اور پولیس کا محکمہ انک سے تنگ کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ بیوروکریسی میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور بعض اوقات بختی کنور جیسے سیاست داں بھی ان لوگوں کے سامنے بے بسی محسوس کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی پوزیشن یہاں بھی بنی ہوئی ہے۔ تمہارے مخالفین میں ایک سیکریٹری یا چیف سیکریٹری کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ ان لوگوں نے باقاعدہ محاذ بنا لیا ہے۔ موقف یہ ہے کہ تم نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ملزم کو پولیس کی حراست میں قتل کیا اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانے کے بعد فرار ہو گئے۔"

میں نے کہا "میں یہ سب باتیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ بولا "تو پھر یہ بھی جانتے ہو گے کہ تم اس کوٹھی میں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں آ دھمکے گی اور تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے میزبان بھی دھر لیے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ فزالہ نے جو "کام" تمہارے بھلے کے لیے کیا تھا وہی تمہاری مشکلات کا باعث بن جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں!"

وہ بولا "چند دن پہلے تمہاری حالت ایسی تھی کہ فزالہ نے تمہارے لیے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرنا ضروری سمجھا۔ یہاں سے جاتے وقت وہ اپنی دوست کشور ایاز کی ذمے داری لگا گئی کہ وہ تمہیں آ کر دیکھ جایا کرے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک غلطی تھی اور یہی وہ غلطی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر پولیس یہاں پہنچ سکتی ہے۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پولیس ڈاکٹر رقیہ شاہ اور فزالہ کے ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ کل کوئی پولیس اہلکار سروسز اسپتال بھی پہنچا تھا اور وہاں ڈاکٹر کشور کے بارے میں معلوم کر رہا تھا۔ اگر پولیس ڈاکٹر کشور سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور گھبراہٹ میں اس کے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نکل جاتی ہے تو وہ پھنس جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ایف ایس ایف کے شکرے اسے نچوڑ کر رکھ دیں گے۔ ایسے ہی اور بھی کئی امکانات موجود ہیں جو کسی طرح بھی تمہارے حق میں نہیں جاتے۔ پولیس اور دیگر ایجنسیاں جن لائنوں پر تفتیش کر رہی ہیں ان میں ایک لائن یہ بھی ہے کہ تم ابھی تک اسی علاقے کی کسی کوٹھی میں چھپے ہوئے ہو..... اور تم جانتے ہو کہ یہ بالکل درست لائن ہے۔ بالفرض اس بلاک کو گھیرے میں لے کر گھر گھر تلاشی شروع کر دی جائے تو تمہارے لیے سخت مشکل پیش آ سکتی ہے۔"

شیخ عاصم کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں اور وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"تمہارے لیے حالات اس شہر میں بلکہ اس ملک میں اب سازگار نہیں ہیں۔ یہ لوگ تمہیں پکڑنے اور بے رحمی سے قانون کی چکی میں پیسنے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تم منظر سے اوجھل ہو جاؤ۔ عیسیٰ جان کے قتل سے پیدا ہونے والا وقتی اشتعال بھی دب جائے گا اور بختی کنور اور رجال ساہی وغیرہ کو بھی موقع مل جائے گا کہ وہ تمہاری حمایت میں اپنی پوزیشن بہتر بنا سکیں۔"

میں نے کہا "خطرات تو ہر جگہ ہیں۔ اگر میں پاکستان سے نکلنے کی کوشش کروں گا تو کیا اس میں خطرات نہیں ہوں گے؟"

وہ بولا "یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں تمہیں یہاں سے یوں نکالوں گا کہ کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی۔ میں اور فزالہ کچھ دنوں کے لیے جاپان جا رہے ہیں۔ جاپان کافی بڑا ملک ہے۔ تم کہیں بھی روپوش ہو سکتے ہو۔ پھر وہاں تمہارا ایکسڑا ٹک ڈوانس والا مسئلہ بھی بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ جونہی جاپانی ماہر سے رابطہ ہوگا، تمہاری چھوٹی سی سرجری کر دی جائے گی....." میں خاموش رہا۔ شیخ عاصم کچھ دیر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا "لیکن کسی طرح کی مجبوری نہیں ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ جاپان نہ جانا چاہو تو کہیں اور بھی جا سکتے ہو..... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے پاکستان میں نہ رہو اور میری اس رائے میں فزالہ کی رائے بھی شامل ہے۔"

"ہمدردی کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا "لیکن میں ابھی کہیں باہر جانے کا نہیں سوچ سکتا۔"

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ میں ششدر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے زریں گل بول رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ کھڑکی میں سے مین گیٹ نظر آ رہا تھا اور مین گیٹ پر زریں گل موجود تھا۔ وہ کوٹھی کے پٹھان چوکیدار کے ساتھ ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے پشتو بول رہا تھا۔ چوکیدار بھی زور زور سے سر ہلاتا چلا جا رہا تھا۔ پھر زریں گل کاغذ کی ایک پرچی چوکیدار کو دکھانے لگا اور اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ زریں گل کی یہاں موجودگی میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ جب میں لال کوٹھی میں عیسیٰ جان کو ہلاک کرنے کے بعد فرار ہوا تھا تو زریں گل ایس پی برکت کے ساتھ تھا۔ ایس پی برکت اور دوسرے اعلیٰ پولیس افسر کوٹھی کے سامنے مورچا لگائے ہوئے تھے اور مذاکرات کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ نتیجہ عیسیٰ جان کی دردناک موت کی صورت میں نکلا تھا اور لال کوٹھی کے اندر اور باہر تہلکہ مچ گیا تھا۔ اس ہنگامے میں مجھے کچھ خبر نہیں رہی تھی کہ زریں گل کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔ اب جبکہ بائیس روز بعد میں اچانک اسے اپنی پناہ گاہ میں دیکھ رہا تھا۔ شیخ عاصم سے معذرت کر کے میں تیزی سے باہر نکلا۔ زریں گل نے مجھے دیکھا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ حسب عادت وہ بازو پھیلا کر میری طرف لپکا اور بغل گیر

ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک اخبار بھی تھا جس پر بہت سی چکنائی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کاغذ کی چھوٹی سی پرچی میری آنکھوں کے سامنے لہرائی اور بولا "یہ دیکھئے استاد صیب۔ ام بالکل ٹھیک پہنچ گیا ہے نا؟"

میں نے پرچی دیکھی۔ اس پر عالم ترینی کا مکمل ایڈریس تھا اور اسے نہیں کھینچ کر بھی پتا سمجھایا گیا تھا۔ میں نے کہا "اوئے زریں گل! یہ تجھے کہاں سے ملا۔"

"استاد صیب! ام آپ کو سارا حقیقت بتائے گا' اور الف سے یے تک بتائے گا لیکن ام کو ذرا' دم تو لینے دو۔"

"تو میرے ساتھ۔" میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم ایک علیحدہ کمرے میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے کہا "اوئے بد بخت! کہیں کسی کو اپنے پیچھے لگا کر تو یہاں نہیں لے آیا؟"

"ام اتنا بھی پاگل نہیں ہے استاد صیب! گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے ام نے۔۔۔ دلن لوگوں کے بیرا! پیچ کا ام لوگ ہے۔"

"لیکن ہیرو کے بچے! یہ ایڈریس تمہیں کہاں سے ملا؟"

زریں نے قہقہہ لگایا "ہیرو کے بچے کا لفظ آپ نے خوب استعمال کیا ہے۔ استاد محترم! ہیرو کا بچہ تو ہوتا ہی نہیں۔ کیونکہ ہیرو کا بچہ ہو جائے تو پھر وہ ہیرو کہاں رہتا ہے۔ ہیرو تو خود بچہ ہوتا ہے جو ہر وقت ہیروئن کی گود میں گھسنے کو مچلتا رہتا ہے۔ آپ نے وحید مراد کا وہ فلم دیکھا تھا جس میں وہ شبنم کی گود میں سر رکھ کر لیٹتا ہے اور گھاس کے تنکے چباتا ہے۔"

میں نے کہا "گھاس کے تنکے تو اس نے ایک سو فلموں میں چبائے ہوں گے۔ پتا نہیں تم کس فلم کی بات کر رہے ہو اور اب یہ بکواس بند کرو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میرا ایڈریس کہاں سے ملا تمہیں؟"

وہ بولا "ام آپ کو ابھی بتاتا ہے لیکن اس سے پہلے ام آپ کو ایک مبارک باد دینا چاہتا ہے۔"

"کیسی مبارک باد؟"

"عیسیٰ جان کو ہلاک کرنے کی۔" زریں نے کہا اور ایک بار پھر میرے گلے سے لگ گیا۔

میں نے کہا "اچھا اب ایڈریس کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "ایک دن آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے سائیں عالی کے بارے میں حیران ہونا چھوڑ دیا ہے' امارا خیال ہے کہ آپ نے ٹھیک کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ام کو پہلے پہل یقین نہیں آیا تھا لیکن اب ام کو بھی لگ رہا ہے کہ وہ کوئی بد روح وغیرہ ہے۔ ایک ایسا بد روح جو اپنی چیلی کے ساتھ ہر وقت شہر کے گلی کوچوں میں چکراتا رہتا ہے اور کسی بھی وقت آپ سے ٹکرا سکتا ہے۔ ویسے استاد صیب! کیا آپ بد روحوں وغیرہ پر یقین رکھتے ہیں؟"

میں نے کہا "یقین کی کیا بات ہے میں تو ہر وقت بد روحوں میں گھرا رہتا ہوں۔ ایک تو ابھی میرا کھوج لگاتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔"

زریں گل نے کہا "آپ مذاق کر رہے ہیں استاد صیب' ام کو تو سچ مچ سائیں عالی سے خوف آنے لگا ہے۔ یہ آج چھ سات بجے کا بات ہے۔ ام گلستان سینما سے فلم "رنگیلا" دیکھ کر نکلا ہی تھا کہ سامنے سوہج عرف الو کی پٹھی پر نظر پڑ گیا۔ خدا کی قسم ایک نمبر کا بہروپن ہے وہ۔ ایک دم بھکاری نظر آ رہا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک جلیبی والے کے پاس کھڑا تھا اور جلیبی لے رہا تھا۔ ام خاموشی سے اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چھ روپے کا جلیبی لیا اور دو روپے دیا۔ جلیبی والا بولا "باقی چار روپے۔" وہ الو کی پٹھی کہنے لگا "دو روپیہ اللہ کے نام پر چھوڑ دو سمیا۔" وہ کہنے لگا "اچھا' دو روپیہ اللہ کے نام پر چھوڑ دیا۔ باقی دو روپیہ؟" وہ حرام زادی کہنے لگی "باقی دو روپے کا ام کو چٹکی کاٹ لو۔" جلیبی والا ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا' شاید چٹکی کاٹنے کے لیے موقع دیکھ رہا تھا' اتنے میں سائیں عالی نمودار ہو گیا۔ اس نے پیچھے سے اماری گردن پر زور سے دو ہتڑ مارا۔ ام تیل کی کڑاہی میں گرتے گرتے بچا۔ ام اس کو دیکھ کر حیران تھا لیکن وہ بالکل حیران نہیں تھا' ام سے کہنے لگا کہ ام یوں گمشدہ جینس کے مافق اِدھر اُدھر نہ گھومے ورنہ پولیس والا ام کو پکڑ لے گا اور بوچڑ خانے لے جائے گا پھر اس نے کہا کہ اپنے استاد صیب سے ملنا چاہتے ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ام نے فوراً ہاں میں جواب دیا۔ سائیں عالی نے ایک بابو سے قلم مانگا اور اس پرچی پر ام کو آپ کا ایڈریس لکھ دیا۔ پھر اس نے الو کی پٹھی کے ہاتھ سے جلیبی لیا اور ام کو دیتے ہوئے بولا کہ کھاتے جاؤ اور چلتے جاؤ' شام تک ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے۔۔۔ ام سائیں عالی سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی گدڑی میں سے پانچ پانچ سو روپے کا دو کڑکتا ہوا نوٹ نکال کر جلیبی والے کو دیا اور الو کی پٹھی کو ساتھ لے کر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔۔۔ ام پرچی پر لکھے ہوئے ایڈریس کے مطابق آپ کو ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچ گیا۔ باقی آپ کو فکر کرنے کا کوئی ضرورت نہیں۔ ام اپنے پیچھے سے بالکل ہوشیار رہا ہے۔"

زریں گل کی اطلاعات چونکا دینے والی تھیں۔ ایک بار پھر سائیں عالی ہمیں حیرت کا جھٹکا لگا گیا تھا۔ زریں گل مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ یہ ایڈریس یقیناً اسے سائیں عالی نے ہی دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سائیں عالی میرے ٹھکانے اور میرے روز و شب سے آگاہ تھا۔ نہایت پوشیدہ معلومات تک سائیں عالی کی رسائی ہو جاتی تھی اور ایسے تجربات مجھے پہلے بھی ہو چکے تھے۔ سائیں عالی کے ذرائع مادی تھے یا روحانی؟ یہ ایک ایسا سوال تھا'

اکثر میرے ذہن میں گھومتا تھا اور میری سوچوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ میں روحانیت کا منکر نہیں تھا' شاید یہی وجہ تھی کہ سائیں عالی کے بارے میں میرے خیالات تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ میں اب لاشعوری طور پر اس کی باتوں کو اہمیت دینے لگا تھا۔ کوئی چیز تھی اس کے اندر جو حقیقت تھی۔ اور "پُراسرار حقیقت" تھی میں نے زریں گل کے ہاتھ میں پکڑے اخبار کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ بولا "یہی اخبار ہے جی' جس میں جلیبیاں ڈالا گیا تھا اور یہی اخبار ہے جس نے ام کو زیادہ چکر چڑھائے ہوئے ہیں۔ جلیبیاں کھاتے کھاتے امارا نظر اخبار پر پڑا اور امارا دماغ شریف گھوم کر رہ گیا۔ ام کو پکا پکا یقین ہونے لگا ہے جی کہ یہ سائیں عالی کوئی بہت گڑبڑ شخص ہے۔"

زریں گل نے اخبار پر ایک جگہ انگلی رکھی اور اخبار میرے سامنے کر دیا۔ ایک خبر دیکھ کر میں بھی چونک گیا۔ یہ دو روز پرانی خبر چار کالمی تھی اور کچھ اس طرح تھی۔ "عیسیٰ جان قتل کا شاخسانہ۔ شاہ جہاں کیس کے حوالے سے بیور کریٹس اور مجتبیٰ کنور میں اختلافات بڑھ گئے۔ فلپائنی کوہ پیماؤں کی گمشدگی کی پرانی فائلیں بھی کھل گئیں۔ قراقرم رینج میں واقع ایک دور دراز وادی کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات" ان سرخیوں کے نیچے خبر کچھ اس طرح تھی "شاہ جہاں کے حوالے سے مقامی انتظامیہ اور اعلیٰ وفاقی افسران کے درمیان پائے جانے والے اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مجتبیٰ کنور اور پولیس کے کچھ افسران کافی عرصے سے شاہ جہاں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس پشت پناہی کا نتیجہ چند روز پہلے عیسیٰ جان کے قتل کی صورت میں نکل چکا ہے۔ یہ بات بھی اب حقیقت نظر آتی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے فلپائنی کوہ پیماؤں کی گمشدگی اور پھر برآمدگی کو معمہ بنانے میں بھی انہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔ ان لوگوں نے کچھ نہایت اہم حقائق صرف اس وجہ سے عوام کے سامنے نہ آنے دیے کہ ایسا کرنے سے ان کے اپنے مفادات کو نقصان پہنچتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تین فلپائنی کوہ پیماؤں کو اغوا کرنے' انہیں بے جا میں رکھنے اور ان میں سے ایک کو قتل کرنے والے لوگوں کا تعلق قراقرم کی ایک دشوار گزار وادی سے ہے۔ یہاں کے لوگ پرلے درجے کے سفاک اور غیر مہذب ہیں۔ اب تک بے شمار سیاح' کوہ پیما اور مقامی لوگ ان "وحشی پہاڑی لوگوں" کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ایک اہم ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ملزم شاہ جہاں کا ایک قریبی ساتھی تاحال انہی پہاڑی لوگوں کی قید میں ہے۔ اس شخص کو بچانے کے لیے ہی مجتبیٰ کنور اور دیگر افسران نے ان پہاڑی لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دی۔ بالفاظِ دیگر اس خطرے کی وجہ سے کہ ایک شخص کو نقصان نہ پہنچ جائے' بے شمار لوگوں کی جان و مال کے لیے ایک سنگین خطرہ قبول کر لیا گیا ہے۔ اب اعلیٰ حکام نے فیصلہ کیا ہے کہ دو روز کے اندر اندر اس معاملے کی مکمل چھان بین کی جائے گی اور اگر ضروری سمجھا گیا تو مذکورہ وادی کے قانون شکن پہاڑیوں کے خلاف سخت ترین کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ ابھی اس سلسلے میں مزید تفصیلات سامنے آ رہی ہیں۔"

اس خبر کے نیچے "باکس" میں ایک اور خبر بھی موجود تھی۔ اس خبر کا تعلق فلپائنی کوہ پیما ٹیم کے سربراہ راموس سے تھا۔ مسٹر راموس نے ٹیلی فون پر دیے گئے بیان میں کہا تھا۔ "حالات بڑے غلط رخ پر جا رہے ہیں' جو لوگ اس بات کی حمایت کر رہے ہیں کہ مذکورہ وادی کے غیر مہذب پہاڑی لوگوں کے خلاف مسلح کارروائی کی جائے وہ غلطی پر ہیں۔ وہ ایک مشکل ترین علاقہ ہے اور وہاں کارروائی کرنے والوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس بات کا بھی شدید خدشہ موجود رہے گا کہ وادی کے لوگ یرغمالی افراد کو قتل کر دیں۔"

میں نے ان خبروں کو بے حد حیرت سے دیکھا۔ اتفاقاً میں ایک دو دن اخبارات کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ ورنہ یہ سرخیاں میری نگاہ میں ضرور آتیں۔ یہ بے حد تشویش ناک خبریں تھیں۔ مجھے اس سلسلے میں پہلے ہی اندیشہ تھا۔ ساہی صاحب نے مجتبیٰ کنور کے ساتھ مل کر بڑی دانش مندی سے وہ خبریں چھپائی تھیں جن کا تعلق گلگت میں پیش آنے والے واقعات سے تھا۔ اعلیٰ سطح کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ کم از کم اس وقت تک یہ واقعات راز رہنے چاہئیں جب تک تمام یرغمالی بحفاظت وادی سے واپس نہیں آ جاتے لیکن اب افسران اور بااختیار افراد کی باہمی چپقلش کی وجہ سے یہ فیصلہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ سب باتیں اخباروں کی زینت بن رہی تھیں جو چند نہایت ذمے دار افراد تک محدود رہنی چاہئے تھیں۔ ان خبروں میں سب سے پریشان کن اطلاع یہ تھی کہ اعلیٰ حکام اُن قانون شکن لوگوں کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہے تھے جو قتل اور اغوا وغیرہ کی وارداتیں کر رہے تھے۔

میں جانتا تھا کہ یہ کتنا خوف ناک فیصلہ ہے۔ یہ بم کو لات مارنے کی کارروائی تھی۔ زریں گل محویت سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! آپ کی طرح امارا حیرت بھی بالکل گم ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ام کو انا خانم کا وہ گانا یاد آ گیا "دنیا میں نہیں کوئی بارود فوارے۔۔۔۔"

میں نے کہا "اچھا تم یہیں بیٹھو۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرنا۔ یہاں ایک مہمان آیا ہوا ہے' میں اسے رخصت کرنے کے بعد آؤں گا۔"

وہ بولا "آپ امارا طرف سے بالکل بے فکر رہیں۔ آپ نے عیسیٰ جان کا جھٹکا فرما کر امارا روح شاد کر دیا ہے۔ آپ کا حکم ہو تو ام ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر قیامت تک آپ کا انتظار کرے گا۔"

زریں گل کو کمرے میں چھوڑ کر میں واپس شیخ عاصم کے پاس

پہنچا۔ وہ بھی زریں گل کی آمد کا نظارہ کرچکا تھا۔ کہنے لگا "کہیں یہ وہی پٹھان تو نہیں جو انڈیا اور سری لنکا میں بھی تمہارے ساتھ تھا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ شیخ عاصم نے کہا "یہ شخص ہمیشہ غلط وقت پر آتا ہے۔ اس وقت بھی اس نے ہماری گفتگو کا تسلسل ختم کردیا۔ میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان چھوڑنے میں تمہاری بہتری ہے۔ یہ بیوروکریسی بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔ ایک بار جس کے پیچھے پڑجاتی ہے اس کا ناطقہ بند کر کے چھوڑتی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق تمہارے گرد بھی گھیرا تنگ کیا جارہا ہے۔ مختلف لوگوں سے شہادتیں اور ثبوت اکٹھے کیے جارہے ہیں۔ ایک مقامی صحافی کے ذریعے سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ کل ایک فلمی یونٹ کے حوالے سے بھی سنسنی خیز خبر اخبار میں چھپ رہی ہے۔ فلمی یونٹ کے ارکان نے انکشاف کیا ہے کہ گلگت میں شوٹنگ کے دوران میں ان کے جو افراد ہلاک اور لاپتا ہوئے ہیں وہ سب کے سب ایک مقامی قبیلے کے ڈاکوؤں کا شکار ہوئے ہیں اور ڈاکوؤں کا یہ منظم گروہ ہی ہے جس نے فلپائنی کوہ پیماؤں کے علاوہ بے شمار دوسرے سیاحوں کو اغوا اور قتل کیا ہے۔ فلمی یونٹ والوں نے الزام لگایا ہے کہ اعلیٰ حکام کے شدید دباؤ کے تحت انہوں نے واقعات کو مختلف انداز میں پیش کیا اور اپنے بیانات میں وادی کے منظم فقیروں کا ذکر نہیں کیا۔ فلمی یونٹ میں موجود فلمی ہیروئن کی سرپرست مہتاب نامی عورت نے کہا ہے کہ شاہ جہاں کا ایک نہایت قریبی دوست صفدر ابھی تک ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے شاہ جہاں کے ایما پر اعلیٰ حکام نے اصل واقعات سامنے نہیں آنے دیے۔" سگار کا ایک طویل کش لیتے ہوئے شیخ عاصم نے کہا "مجھے معلوم ہے شاہ جہاں! اس بیان بازی میں بہت سی جھوٹی باتیں بھی شامل ہوں گی لیکن جھوٹ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ تمہیں بھی معلوم ہیں۔"

زریں گل کی آمد سے پہلے میں شیخ عاصم کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی دانست میں مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے لیکن اب محسوس ہورہا تھا کہ معاملات میری توقعات سے کہیں زیادہ بگڑ چکے ہیں اور کچھ لوگوں نے میرے اور میرے ہم خیالوں کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا رکھا ہے اور اسی محاذ آرائی کے سبب وہ ایک ایسی سنگین غلطی کے بارے میں سوچ رہے ہیں جو انہیں ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اگر یہ لوگ اپنی طاقت کے زعم میں نانگا پربت کے برف زاروں میں گھس جاتے اور مذکورہ وادی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو ایسے عذاب کا شکار ہوجاتے جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا پھر اس کے ساتھ ساتھ ان تمام یرغمالیوں کی زندگی بھی موت کے شکنجے میں آجاتی جو آزادی اور واپسی کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

صورت حال ایک دم ہی دھماکا خیز ہوگئی تھی۔ میں پچھلے ہفتوں سے وہ تمام حیرت ناک واقعات فراموش کیے ہوئے تھا جو گلگت کی وادی میں پیش آئے تھے۔ بس کبھی کبھی صفدر کی یاد ذہن پر یلغار کرتی تھی لیکن اب زریں گل اور شیخ عاصم کی فراہم کردہ اطلاعات نے وہ سارے ہولناک مناظر پردۂ تصور پر نمایاں کردیے تھے۔ حالات کا رخ بہت صاف نظر آرہا تھا۔ اعلیٰ افسران اور حکام کی باہمی لڑائی کی وجہ سے وہ راز فاش ہوگیا تھا جسے یرغمالیوں کی رہائی تک ہرگز فاش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس راز کے فاش ہونے کے بعد کچھ عاقبت نااندیش یہ پروگرام بنا رہے تھے کہ نامعلوم وادی کا سراغ لگایا جائے اور وہاں کے لوگوں کی بیخ کنی کی جائے۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔

میں نے شیخ عاصم سے کہا "افسروں کی چپقلش اور اخباری خبروں کے بارے میں تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے کیا تمہاری بیوی کو بھی معلوم ہے؟"

شیخ عاصم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "وہ ابھی تک بے خبر ہے۔"

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال تھا۔ اگر وہ باخبر ہوتی تو کبھی یہ نہ چاہتی کہ میں موجود حالات میں تمہارے ساتھ جاپان چلا جاؤں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جو حالات تم نے بتائے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قراقرم کے گردونواح میں پھر کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔ میرے قریبی دوست صفدر کے علاوہ دیگر کئی ایسے افراد وہاں یرغمال بنے ہوئے ہیں جن کی جان بچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس حالت میں ملک سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

شیخ عاصم دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "اس میں جلد بازی والی کوئی بات نہیں ہے بھئی۔ تم اطمینان سے سوچ سمجھ لو۔"

دونوں میاں بیوی کچھ دیر مزید میرے پاس ٹھہرے۔ رات گیارہ بجے کے قریب چائے اور کافی کا ایک دور مزید چلا پھر وہ واپس چلے گئے۔ جاتے وقت شیخ اپنی گھڑی پہننا نہیں بھولا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میں کچھ دیر اپنے کمرے میں گم صم بیٹھا رہا۔ غزالہ کے آنے سے پہلے کے تمام خیالات اب ایک سراب معلوم ہوتے تھے۔ ایک ایسا سراب جس کو بیکراں صحرا نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ میٹھا میٹھا درد اور سہانا سا احساس ناپید ہوچکا تھا جو آج شام مجھ پر طاری رہا تھا۔ اس احساس کی جگہ ایک اضطراب آمیز غم دل و دماغ پر مسلط ہورہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ الماری کھولی اور سرخ و سفید گلاب کا گلدستہ اٹھا کر بیزاری سے "ڈسٹ بن" میں پھینک دیا۔ ان لمحات میں نجانے کیوں مجھے اپنے خیالات پر شرمندگی ہورہی تھی جو پچھلے دو دن میں غزالہ کے متعلق میرے ذہن میں آئے تھے۔ میں نے کیوں سوچا تھا اس انداز میں؟ مجھے کیا حق پہنچتا تھا اس انداز میں سوچنے کا..... میں غزالہ کو خوش دیکھنا

چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش تھی اور یہ خوشی دیرپا ہوسکتی تھی تو پھر اس سے اچھی بات اور کیا تھی۔ بے ساختہ میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ ایسا ہوجائے۔ شیخ عاصم کی کایا واقعی پلٹ جائے، وہ غزالہ کو دل سے ایک بیوی کی عزت دینے لگے اور اس کے ساتھ (مجھ سے کہیں بہت دور) آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جی چاہا کہ غزالہ کے خیال کو ہمیشہ کے لیے دل سے کھرچنے کا تہیہ کرلوں۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اڑ کر سائیں صاحب کے پاس پہنچ جاؤں۔ ان سے پوچھوں کہ یہ سب کیا ہورہا ہے اور اس صورت حال میں صفدر اور دیگر یرغمالیوں کی جان بچانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ رات میں نے جیسے تیسے گزاری۔ علی الصباح میں نے عالم قریشی کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ سائیں صاحب کا پتا کرائے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

عالم قریشی کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا۔ بہت سے کارآمد لوگوں سے بھی اس کی علیک سلیک تھی۔ اس کے گھر میں آئے دن لمبی چوڑی دعوتیں ہوتی تھیں۔ بسنت منائی جاتی تھی، ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھے جاتے تھے اور تاش کی بازیاں جمتی تھیں۔ مختصر الفاظ میں عالم قریشی لاہور کی رنگین ثقافت کا ایک زندہ دل کردار تھا۔ سہ پہر تک میں عالم قریشی کی رپورٹ کا انتظار کرتا رہا اور اپنے خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ سائیں عالی کا تصور بھی رہ رہ کر ذہن پر حملہ آور ہورہا تھا۔ سائیں عالی نامعلوم وجوہ کی بنا پر دفینے کو مقصد حیات بنائے ہوئے تھا۔ اس وقت ہمارے پاس دفینے کا واحد سراغ جون چاولی تھا اور وہ اس وقت وادی میں تھا۔ اگر وادی میں کارروائی ہوجاتی تو جون چاولی کے ساتھ ہی یہ سراغ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا۔ ان حالات میں سائیں عالی کا فعال ہونا سمجھ میں آتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے عالم قریشی نے میری مطلوبہ معلومات مجھ تک پہنچا دیں۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ گلگت والے واقعات کو اچھالنے اور بڑھانے چڑھانے کا زیادہ کام سرحد کا سینئر صوبائی وزیر منصور خاں انجام دے رہا ہے۔ منصور احمد خاں نامی یہ سینئر صوبائی وزیر مختلف ذرائع سے پولیس افسران اور متعلقہ کورکمانڈر پر دباؤ ڈلوا رہا تھا اور خاص طور سے سائیں صاحب کو کارنر کرنے کی کوششیں کررہا تھا۔ اسی شخص کی تگ و دو کا نتیجہ تھا کہ قراقرم رینج کی اس وادی تک پہنچنے اور وہاں کے لوگوں کا صفایا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تیاری ہورہی تھی۔ عالم قریشی کی اطلاعات سے یہ بھی پتا چلا کہ وزارتِ داخلہ کے ایک مشیر سے زوردار جھڑپ کے بعد سائیں صاحب نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے اور تمام سرکاری مراعات بھی واپس کردی ہیں۔

یہ تشویش ناک خبر تھی اور اس خبر سے بحران کی شدت کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے عالم قریشی کو شادمان اسٹوڈیوز کے علاقے کا ایک ایڈریس دیا اور سامان کی ایک چھوٹی سی لسٹ دی۔ عالم قریشی نے دو گھنٹے کے اندر یہ سامان مجھ تک پہنچا دیا۔ اسٹوڈیوز میں شوٹنگ کے لیے ریڈی میڈ میک اپ کی ضرورت اکثر پیش آتی ہے۔ یہ شعبہ باقاعدہ میک اپ آرٹسٹ کے سپرد ہوتا ہے۔ اچھے میک اپ آرٹسٹ عموماً اعلیٰ کوالٹی کے سامان کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سامان مختلف شاپس سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں نے عالم قریشی کو ایک ایسی ہی شاپ کا پتا دیا تھا۔ یہ کافی مہنگا لیکن امپورٹڈ سامان تھا۔ جلد کو رنگنے والے کیمیکل "لوشن"، آئی لینز اور داڑھی مونچھیں وغیرہ اس سامان میں شامل تھیں۔ اس رات زریں گل کے ساتھ مل کر میں تقریباً دو گھنٹے آئینے کے سامنے مصروف رہا اور اپنا حلیہ خاصی حد تک تبدیل کرلیا۔ اب میرا رنگ گردن سے نیچے تک سیاہی مائل سانولا تھا۔ ہاتھ بھی اسی رنگ کے تھے۔ بالوں اور داڑھی کا رنگ بھی یکسر بدل گیا تھا۔ آنکھیں خاصی چھوٹی نظر آنے لگی تھیں اور ان کی دونوں طرف "کرو پاز" (جھریوں کے نشان) واضح تھے۔ بنظر غائر میں اپنی عمر سے چودہ پندرہ سال بڑا نظر آرہا تھا۔ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے چہرے کو بدلنا اتنا مشکل نہیں ہوتا مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ چہرے پر نظر آنے والی تبدیلی حقیقت کے قریب تر نظر آئے۔ پاس سے دیکھنے والے کو بھی یہ احساس نہ ہو کہ خدوخال کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ سائیں صاحب ہر صبح چار بجے کے لگ بھگ گھر سے نکلتے ہیں اور گلبرگ والی نہر کے ساتھ ساتھ جاگنگ کرنے کے بعد چھ بجے کے قریب واپس آتے ہیں۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ کم از کم میں نے کبھی اس معمول میں تبدیلی نہیں دیکھی تھی..... بلکہ مجھے یاد تھا کہ ایک دفعہ بخار کی حالت میں بھی وہ جاگنگ کے لیے نکل گئے تھے اور ڈریاں بے حد سپٹائی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سائیں صاحب کا یہ معمول آج کل بھی برقرار ہوگا اور علی الصباح نہر کے کنارے دھند میں لپٹے ہوئے درختوں کے درمیان ان سے ملاقات ہوسکے گی۔

صبح تین بجے میں نے عالم قریشی کی گاڑی لی اور نہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں ایک دو جگہ پولیس کے اہلکار نظر آئے لیکن پولیس والے ہنڈا جیسی بارعب گاڑیوں کو روکنے کی زحمت کم ہی کرتے ہیں۔ پونے چار بجے میں جیل روڈ کے پل کے قریب پہنچ گیا اور ایک مناسب جگہ پر گاڑی روک کر بیٹھ گیا۔ میرا انتظار طویل ثابت ہوا لیکن رائگاں نہیں گیا۔ تقریباً پانچ بجے تھے جب میں نے نہر کے کنارے واقع خوبصورت فٹ پاتھ پر سائیں صاحب کا ہیولا دیکھا۔ میری توقع کے برخلاف وہ جاگنگ نہیں کررہے تھے بلکہ چہل قدمی والے انداز میں دھیرے دھیرے چلے آرہے تھے۔ وہ خاصے کمزور بلکہ بیمار دکھائی دیتے تھے۔ میں نے انہیں اپنے بالکل سامنے سے گزرتے دیکھا۔ درمیانی فاصلہ بمشکل پانچ گز کا تھا۔

ساہی صاحب نے بریک سوٹ پہن رکھا تھا' ہاتھ میں چھوٹی سی اسٹک تھی لیکن وہ چستی اور اسٹک نظر نہیں آرہی تھی جو ساہی صاحب کے مزاج کا حصہ تھی۔ میں نے انہیں اپنے سامنے سے گزرنے دیا۔ جب وہ کافی دور نکل گئے تو میں گاڑی چلا کر پھر ان کے عقب میں پہنچ گیا لیکن یہ کام اس طرح ہوا کہ ساہی صاحب کو بالکل شک نہیں گزرا۔ در حقیقت میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ ساہی صاحب کی نگرانی تو نہیں ہو رہی۔ فٹ پاتھ پر چند اور لوگ بھی جاگنگ کر رہے تھے لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جس پر کسی طرح کا شبہ کیا جا سکتا۔ قرب و جوار میں کوئی گاڑی وغیرہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں اپنی گاڑی ساہی صاحب کے قریب لایا۔ وہ گاڑی رکنے کا انداز دیکھ کر بری طرح چونکے۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ نکالا۔ ساہی صاحب کی نگاہیں تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ فوری طور پر مجھے پہچاننے میں ناکام رہے تھے۔ اگر ایک جہاں دیدہ پولیس افسر مجھے فوری طور پر شناخت نہیں کر سکا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میرا بہروپ کامیاب ہے۔ میں نے کہا "ساہی صاحب! یہ میں ہوں۔"

ساہی صاحب نے میری آواز پہچانی اور ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں "آئیے۔" میں نے ساتھ والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ساہی صاحب چند لمحے تذبذب سے میری طرف دیکھتے رہے پھر قدم بڑھا کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ ان کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد ہم جلو موڑ کی طرف چند گھنے درختوں کے نیچے موجود تھے۔ ہم نہر کے کنارے سے اتر کر فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کھیتوں کی طرف آ چکے تھے۔ چاروں طرف کلر اور چاول کے سرسبز کھیت تھے جن پر اوس موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔

ساہی صاحب نے کہا "تم بہت خطرناک کام کر رہے ہو شاہ جہاں! وہ شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ بے شک تم نے حلیہ بدل رکھا ہے لیکن تمہیں اس طرح باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں جناب! کہ میں چوہے کی طرح بل میں گھس کر بیٹھا رہوں اور وہ جو چاہے کرتے رہیں' وہ جو کچھ کرنے والے ہیں' سراسر قتل عام ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ وادی میں کارروائی ہوگی تو بیر غالیوں میں سے کوئی بھی زندہ بچ سکے گا۔"

"شاہ جہاں! تم جذباتی ہو رہے ہو۔" ساہی صاحب نے کہا "ابھی کارروائی نہیں ہو رہی صرف کارروائی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ فرض کرو کارروائی ہوئی بھی تو فراترم کے انتہائی دشوار گزار راستوں پر چل کر اس وادی کو کھوجنا آسان نہیں ہوگا۔ تمہیں بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے ابھی ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔ مجتبیٰ کنور اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ کارروائی کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ میں بھی اس سلسلے میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "آپ کیا کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ایک کونے میں بٹھا دیا گیا ہے اور مجبوراً آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔"

ساہی صاحب کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ تاہم وہ سنبھل کر بولے "ایک میرے مستعفی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پولیس لائن میں آئی جی تک ہمارے ہم خیال ہیں۔ وہ اس معاملے کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

ساہی صاحب یہ بات کہنے کو تو کہہ رہے تھے لیکن اپنے لہجے کا کھوکھلا پن شاید انہیں خود بھی محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ساہی صاحب بے بس اور مایوس نظر آئے۔ ان کی کیفیت دیکھ کر میرا دل کٹ گیا۔ ساہی صاحب کے لیے میرے دل میں بڑی عزت تھی اور یہ عزت یونہی نہیں تھی۔ مجھے ان کے کردار میں ایسی خوبیاں دکھائی دی تھیں جنہوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے ان کی شخصیت میں اپنے مرحوم والد کی جھلک نظر آتی تھی اور مجھے یوں لگنے لگتا تھا جیسے میرے سر پر ابھی ایک مشفق اور مہربان ہاتھ کا سایہ موجود ہے۔ میں نے کبھی ساہی صاحب پر اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اتنی بات تو میں بھی جانتا تھا کہ ساہی صاحب مجھے اپنے گھر کا ہی ایک فرد سمجھتے ہیں۔ ایک قریبی بزرگ ہی کی طرح میرے بارے میں متفکر رہتے ہیں اور آج یہ قریبی بزرگ ہزیرانوں کی طرح چوکس تھا' بے حد تھکا ماندہ اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا... اس کا چہرہ اور لب و لہجہ گواہ تھا کہ اس پر سب پناہ دباؤ ہے۔ اس کو تنقید' توہین اور عداوت کے خار زاروں سے گزارا گیا ہے... یہاں تک کہ وہ ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ کس کی وجہ سے ہوا تھا؟ میری وجہ سے ہوا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ ساہی صاحب مجھ سے کھل کر باتیں کریں۔ وہ تمام حالات بتائیں جن سے وہ گزر رہے ہیں۔ پہلے تو وہ کنی کتراتے رہے لیکن میرے پیہم اصرار نے ان کی خاموشی کو کسی حد تک توڑ دیا۔ ساہی صاحب کی باتوں سے تصدیق ہوئی کہ حکام کے مخالف رویے کا سربراہ سرحد کا سینئر وزیر منصور خاں ہے۔ منصور خاں نے حال ہی میں (عیسیٰ جان کی ہلاکت کے بعد) وزارت کا حلف اٹھایا تھا۔ منصور خاں کا تعلق ایک نہایت طاقتور سیاسی خاندان سے تھا۔ خاص طور سے بیوروکریسی میں ان لوگوں کو زبردست عمل دخل حاصل تھا۔ منصور خاں کی اصل طاقت ایک صوبائی وزیر سے کہیں زیادہ تھی۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ سرحد سے تعلق رکھنے والے کچھ بڑے بیوروکریٹس اور سیاسی شخصیات اس کی بھرپور ہمنوائی کر رہی ہیں۔ یہ لوگ ذرائع ابلاغ کو بھی مسلسل دھواں دھار بیانات دے رہے ہیں اور گلگت میں پیش آنے والے پراسرار

واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔ وادی میں ہلاک ہونے والے صحافی شاہد خان کی وجہ سے صحافی طبقے کے کچھ لوگ بھی ان کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ ساہی صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ سارا جھگڑا عیسیٰ جان کے قتل کے بعد شروع ہوا ہے۔ عیسیٰ جان بدنام ڈکیت اور قاتل ہونے کے باوجود سرحد کی کچھ اعلیٰ شخصیات کا لاڈلا تھا۔ اس کی موت سے ان کے پیٹ میں مروڑ اٹھے۔ وہ عیسیٰ جان کی ہلاکت پر تو زیادہ شدت سے آواز بلند نہیں کر سکتے تھے' انہوں نے زہر افشانی کے لیے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈ لیا۔ یعنی گلگت والے واقعات کو بنیاد بنا کر پولیس فورس اور خاص طور سے ساہی صاحب کو نشانہ بنانا شروع کیا اور بعد ازاں مجتبیٰ کنور کے خلاف بھی محاذ کھڑا کر دیا۔

ساہی صاحب نے بتایا "جب تم نے عیسیٰ جان پر خنجر سے وار کیے تو دوسروں کی طرح میں بھی چھت سے دیکھ رہا تھا۔ منصور خاں کے ایک کارندے نے تم پر رائفل کا فائر کرنا چاہا تو میں نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔ بعد میں' میں نے تمہیں آواز دے کر کہا کہ شاہ جہاں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ پشاور کے ڈپٹی کمشنر سمیت میرا یہ فقرہ سب نے سنا۔ بس اسی لمحے سے ان لوگوں نے میری دشمنی پر کمر باندھ لی تھی۔"

میں ساہی صاحب سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن وہ بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے میرے حالات پوچھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں عالم قریشی اور اپنی پناہ گاہ کے متعلق بتایا۔

ساہی صاحب بولے "تم نے مجھ سے رابطہ کر کے بڑا رسک لیا ہے۔ میرے گھر کی نگرانی کی جاتی ہے اور اکثر اوقات گاڑی کا تعاقب بھی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "جناب! میں تسلی کر کے ہی آپ کے پاس گاڑی لایا تھا۔ کم از کم اس وقت تو کوئی آپ کے پیچھے نہیں ہے۔"

"پھر بھی میرا زیادہ دیر اوجھل رہنا مناسب نہیں۔ وہ لوگ چونک جائیں گے اور میری تلاش میں نکل پڑیں گے۔"

میں نے ساہی صاحب سے شفتا اور انجم کی خیریت دریافت کی۔ ساہی صاحب نے ان دونوں کی طرف سے مجھے اطمینان دلایا اور بولے "میں ایک بار پھر کہتا ہوں شاہ جہاں! تم اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالو۔ کچھ دیر کے لیے پس منظر میں چلے جاؤ۔ تم نہیں جانتے شفتا کتنی محبت کرتی ہے تم سے۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گی۔ تمہاری جدائی کا ایک ایک پل گن کر گزار رہی ہے وہ۔"

میں نے کہا "میں بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں جناب.... لیکن مفرور' جون چارٹل اور دیگر بے گناہ لوگوں کی دردناک موت کے بدلے مجھے زندگی قبول نہیں۔ مجھ سے.... مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔ میں کروں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟"

"میں.... میں وہ خط "پریس" کے سامنے پیش کر دوں گا جو سردار سدورت نے میرے نام لکھا تھا۔ اس خط میں سردار سدورت نے قبیلے کے لوگوں کی طرف سے یہ حتمی وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ لوگ کبھی بھی وادی کی حدود سے نکل کر لوٹ مار نہیں کریں گے اور اگر باہر کی دنیا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے تو دوبارہ کبھی بھی ان کی سرگرمیوں کے بارے میں نہیں سنے گی۔ پھر اس خط میں وہ وجوہ بھی بیان کی گئی ہیں جن کے سبب اس سے پہلے لوٹ مار کی وارداتیں ہوتی رہی ہیں۔ ان وارداتوں کا اصل محرک وادی کے مذہبی پیشوا یعنی "جاڑی" تھے۔ وہ تمام جاڑی اپنے مہان جاڑی سمیت بارودی دھماکے سے ہلاک ہو چکے ہیں' اب وادی پر صحیح معنوں میں وہاں کے عام لوگوں کی مرضی چلتی ہے اور یہ لوگ غیر مہذب ہونے کے باوجود قناعت پسند اور پرامن ہیں۔ انہیں جاڑیوں کی طرح لوٹ مار کی عورتوں اور شرابوں کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی وہ سیاحوں سے چھینے ہوئے بیش قیمت کپڑوں کے شوقین ہیں۔ وہ کھیتی باڑی اور شکار کے ذریعے سے ایک سادہ زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں اور اگر ان میں سے چند ایک مختلف ذہن رکھتے بھی ہیں تو اکثریت کے سامنے کچھ نہیں کر سکتے۔"

ساہی صاحب نے کہا "میں یہ ساری باتیں جانتا ہوں شاہ جہاں! اور میں نے ذمے دار افراد کو یہ سب کچھ بتایا بھی ہے لیکن تم جانتے ہو جب بے جا مخالفت اور بیان بازی کی آندھی چلتی ہے تو ہر دلیل' ہر منطق کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ کوئی کسی کی کچھ نہیں سنتا... میرے خیال میں ان معاملات کو مزید بگاڑنے میں کچھ ہاتھ مہتاب نامی اس عورت کا بھی ہے جو فلمی یونٹ کے ساتھ تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہیروئن روشنی کی خالہ ہے۔ وہ بے حد لالچی عورت ہے۔"

مہتاب کا نام سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اس کا فربہ چہرہ اور پان سے رنگے ہوئے ہونٹ گھوم گئے۔ ساہی صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ بے حد موقع پرست اور لالچی عورت تھی۔ لال کوٹھی میں جب ہمیں جان کی فکر پڑی ہوئی تھی' اس نے بڑی چابک دستی سے تین چار راتوں کے لیے "روشنی" کو چوہدری بخت کے پاس فروخت کر دیا تھا... میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کیا کیا ہے مہتاب نے؟"

وہ بولے "وہ بڑی خرانٹ عورت ہے۔ اخباروں میں فلمی یونٹ کے بارے میں جو خبریں چھپی ہیں' سب اسی کی وجہ سے چھپی ہیں۔ اس نے کافی مال بنایا ہے اس چکر میں۔ اب مزید مال بنانے کی فکر میں ہے۔ فلمی یونٹ کا اسسٹنٹ کیمرا مین بدری اس عورت مہتاب کا چھوٹا بھائی ہے۔ بدر الدین عرف بدری تمہارے ساتھ ہی وادی سے واپس آیا تھا۔ بدری کیمرا مین رضوی کا اسسٹنٹ ہے۔ اب یہی شخص بار بار اسلام آباد کے چکر لگا رہا ہے اور اعلیٰ

افسروں کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی مہم قراقرم رینج کی طرف روانہ کی گئی تو اس میں یہ شخص شامل ہوگا اور روای کی "تلاش" میں مدد دے گا۔"

میرا خون کھول رہا تھا۔ ان لوگوں کی خاطر میں نے بے پناہ خطرات مول لیے تھے۔ کئی بار ان کے لیے اپنے جسم کو ڈھال بنایا تھا اور یہ خیال تک اپنے دماغ میں پیدا نہیں ہونے دیا تھا کہ انہیں وادی میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ جان بچانے والی ذات خدا کی ہے لیکن میں نے وسیلہ بننے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اب یہی لوگ احسان فراموشی بلکہ دشمنی پر اترے ہوئے تھے۔ میری نگاہوں میں مہتاب بانو کا چہرہ گھوما اور سینے میں آگ سی سلگ اٹھی۔

صبح سات بجے کے قریب میں نے ساہی صاحب کو دھرم پورہ کے قریب قبر بارکیٹ میں چھوڑ دیا۔ وقتِ رخصت ساہی صاحب نے ایک بار پھر مجھے ضروری ہدایات دیں اور نصیحت کی کہ میں چند دنوں کے لیے بالکل پس منظر میں رہوں۔ نصیحت کرنا ساہی صاحب کا فرض تھا اور سننا میرا فرض۔۔۔ لیکن میں نے کرنا وہی تھا جو میں طے کر چکا تھا۔ دھرم پورہ سے میں سیدھا ملتان روڈ پر پہنچا اور وہاں سے لاہور کے فلمستان کی طرف آ گیا۔ شادمان اسٹوڈیو کے قریبی "سولہ مو ایکڑ اسکیم" میں مہتاب بانو کی نو تعمیر شدہ کوٹھی واقع تھی۔ اس کوٹھی کا اتا پتا خود روشنی نے مجھے بتایا تھا اور ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ معمولی کوشش کے بعد میں اس کوٹھی تک جا پہنچا۔ میں نے گاڑی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی۔ جیکٹ کے اندر اپنا ریوالور چیک کیا اور کوٹھی کے مین دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ دو تین بار "بیل" دی تو ایک چوکی دار نما شخص نظر آیا۔

"کس سے ملنا ہے جی؟"

"میڈم مہتاب سے۔"

"وہ تو ابھی سو رہی ہیں۔ آپ بارہ بجے کے بعد آئیں۔"

چوکی دار کا جواب توقع کے مطابق تھا۔ فلم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ صبح تین چار بجے سوتے ہیں اور صبح آٹھ بجے کا وقت ان کے لیے "آدھی رات" کا ہوتا ہے۔ میں نے کہا "میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں' تم جا کر انہیں بتاؤ کہ شاد جہاں آیا ہے۔"

چوکی دار نما شخص کچھ دیر مجھے سراپا دیکھتا رہا پھر اندر چلا گیا۔ وہ دروازہ بند نہ کرنے کی فاش غلطی کر چکا تھا۔ میں نے دو تین سیکنڈ تک سوچا پھر اس کے پیچھے ہی پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔ کوٹھی کا لان سنسان پڑا تھا۔ ایک سفید مور کالی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ پورچ اور برآمدہ بھی سنسان تھے۔ میں نے چوکیدار کو ایک کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ برآمدے سے گزر کر میں بھی اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اندر سے چوکی دار کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی کو "بیگم صاحب" کہہ کر پکار رہا تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

درمیانے قد کے پنجابی چوکی دار نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں "خبردار آواز نکالی تو۔" میں نے ریوالور اس کے سر سے لگا دیا۔ اس کی گھگی بندھ گئی۔

چوکی دار ایک اندرونی کمرے کے بند دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی بیگم صاحب یقیناً اسی کمرے میں موجود تھیں۔ میں نے دروازے پر زور سے دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے ایک بار پھر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور فلم اسٹار روشنی کی خالہ مہتاب میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ساہی صاحب کی طرح وہ بھی مجھے پہچان نہیں سکی تھی۔ تاہم میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں "کک۔۔۔ کون ہو تم؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"بڑی جلدی بھول گئی ہو!" میں نے ریوالور اس کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔

وہ چونک گئی اور بڑے غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میری آواز اسے کچھ یاد دلا رہی تھی "تت۔۔۔ تمہیں کہیں دیکھا ہے۔" اس نے میری طرف انگلی اٹھائی پھر ایک دم اس کے چہرے کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا اور ہونٹ کانپ اٹھے "تم شاد جہاں ہو۔"

وہ یوں بولی جیسے مجھ پر انکشاف کر رہی ہو۔

میں نے کہا "سو فیصد شاد جہاں ہوں اور تم جانتی ہو بندے کو لاش میں تبدیل کرنا میرے لیے کتنا آسان ہے۔"

وہ لڑکھڑا گئی۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے چوکھٹ کا سہارا لیا۔ مہتاب کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب تھی۔ جسم بھی فربہ تھا۔ تاہم رنگ سفید تھا اور نین نقش اچھے تھے۔ قد زیادہ ہونے کی وجہ اس کا موٹاپا کسی حد تک چھپ گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ دس پندرہ سال پہلے یہ عورت اچھے بھلے مردوں کا ستیاناس کرتی ہوگی۔ اب اس پر زوال آ چکا تھا مگر ماضی کی رنگ رلیاں اب بھی اس سے جدا نہیں ہوئی تھیں اور اس کا ثبوت میں اپنی آنکھوں کے بالکل سامنے دیکھ رہا تھا۔ پچاس ساٹھ سال کا ایک ہٹا کٹا سیاہ رو شخص ڈبل بیڈ پر پھیل کر سویا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تکیے پر پھیلا ہوا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ مہتاب تکیے کے بجائے اس بازو پر سے سر اٹھا کر بستر سے اتری ہے۔ میں نے چوکی دار اور مہتاب کو اس خواب گاہ میں دھکیلا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھٹ پٹ کے باوجود خوابیدہ شخص بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نشے میں ہے اور مہتاب کی موجودگی سے "مستفید" ہو کر گہری نیند سو رہا ہے۔ دیواروں پر مہتاب بیگم کی

جوانی اور درمیانی عمر کی بہت سی تصویریں لگی تھیں اور ایک الماری میں ایوارڈز کی مورتیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اب معلوم نہیں یہ روشنی کے حاصل کردہ ایوارڈ تھے یا مہتاب بیگم کے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ روشنی نے تو حال ہی میں صرف ایک فلم میں کام کیا تھا۔ ان ایک درجن ایوارڈز کا تعلق یقیناً مہتاب بیگم سے تھا۔

"اس گھر میں اور کون کون ہے؟" میں نے چوکی دار سے پوچھا "اور دیکھو سچ بتانا' ورنہ تمہاری مالکن جانتی ہے کہ میں کتنی جلدی گولی چلاتا ہوں۔"

چوکی دار نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ اپنی پینٹی خان مالکن کا خوف دیکھ کر اس کے خوف میں دس گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مینڈک جیسی ٹراتی ہوئی آواز میں بولا "روشنی بی بی کے علاوہ دو ملازم اور ہیں جی۔ دونوں رات دو بجے روشنی بی بی کے ساتھ ہی آئے تھے' اب سرونٹ کوارٹر میں بے خبر سو رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا "اس وقت کسی اور کو آنا جانا تو نہیں؟" چوکی دار بڑی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

میری گفتگو کے دوران میں مہتاب نے چالاکی دکھائی اور تھوڑا سا پیچھے کو کھسک گئی۔ یوں اس کا ہاتھ سائیڈ بورڈ کی ایک ادھ کھلی دراز کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اس کی یہ حرکت نوٹ کر لی لیکن انجان بنا رہا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس دراز کے اندر ایمرجنسی کال بیل کا بٹن لگا ہوا تھا۔ یہ بیل سرونٹ کوارٹرز کے علاوہ پڑوسیوں کے گھر میں بھی بجتی تھی۔۔۔۔ جونہی مہتاب نے بیل کا بٹن دبانے کے لیے اپنا ہاتھ آہستگی سے دراز میں اتارا' میں نے لپک کر اسے جا لیا۔ اپنے بازو کی مدد سے میں نے دراز ایک جھٹکے سے بند کر دی۔ مہتاب کا ہاتھ دراز کے اندر آ گیا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس وقت میرا خیال یہی تھا کہ شاید وہ دراز سے ریوالور وغیرہ برآمد کرنا چاہتی ہے۔ میں نے دراز کو پورے زور سے دبائے رکھا اور مہتاب بیگم درد سے بے تاب ہو کر تڑپنے لگی "ہائے میں مر گئی' میرا ہاتھ' خدا کے واسطے میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ ہائے میری ہڈی ٹوٹ گئی۔"

میں نے کہا "مہتاب بیگم! تیری ہڈی بڑی ڈھیٹ ہے' آسانی سے نہیں ٹوٹے گی۔"

اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہتی ہے۔ جونہی چیخنے والے انداز میں اس نے منہ کھولا' میں نے ریوالور کی سرد نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ ریوالور کے لمس نے مہتاب بیگم پر سکتہ طاری کر دیا اور اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ چوکیدار لڑکا تھر تھر کانپ رہا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی پتلون گیلی۔۔۔۔ ہونے سے بمشکل بچائے ہوئے ہے۔۔۔۔ مہتاب نے کافی بلند آواز میں آہ و زاری کی تھی۔ ڈبل بیڈ پر سویا ہوا شخص کسمسایا' پھر اس نے اپنی ایک ٹانگ ہوا میں لہرائی اور بائیں طرف کروٹ لی۔ اسٹائل سے پتا چلتا تھا کہ وہ غنودگی میں مہتاب بیگم سے لپٹنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن مہتاب بیگم وہاں نہیں تھی۔ سیاہ فام موٹا کچھ دیر مضحکہ خیز حرکتیں کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے اس نے ارد گرد دیکھا۔ چار پانچ سیکنڈ کے بعد صورت حال اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا رنگ مٹی ہو گیا۔ وہ کوئی فلمساز یا فنانسر قسم کا شخص تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں باتھ روم کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چلو باتھ روم کے اندر۔"

وہ پہلے تو میری بات کو مذاق سمجھا لیکن جب میں نے پوری سنجیدگی سے اسے باتھ روم میں گھسنے کی ہدایت کی تو اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ دروازے کے علاوہ باتھ روم میں صرف ایک چھوٹا سا روشن دان تھا۔ موٹا باتھ روم میں داخل ہو گیا تو میں نے چوکی دار لڑکے سے کہا کہ وہ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دے۔

مہتاب بیگم کا ہاتھ ابھی تک دراز میں تھا اور میری ٹانگ کے دباؤ نے اس کی کلائی جکڑی ہوئی تھی۔ ایک دم مہتاب بیگم دھمکیوں پر اتر آئی۔ وہ مجھے کوسنے دینے لگی اور انکشاف کرنے لگی کہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں اور وہ مجھے چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گی۔

میں نے کہا "تعلقات تو تمہارے ضرور ہوں گے۔ تمہارا پیشہ ہی ایسا ہے لیکن تعلقات تو تب استعمال کرو گی جب زندہ رہو گی۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے دراز پر ٹانگ کا دباؤ بڑھایا' مہتاب بیگم تڑپنے لگی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن چیخ نہیں سکتی تھی۔ ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے لگی ہوئی تھی اور میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ وہ گلگت کی وادی میں کلہاڑا بردار جنگلیوں کے ساتھ میرا آخری معرکہ دیکھ چکی تھی اور اچھی طرح میرے مزاج سے آگاہ تھی۔

میں نے کہا "ہاں مہتاب بیگم! بتاؤ کتنے میں سودا کیا ہے' پر فمالیوں کی جان کا۔ کتنی رقم ملی ہے منصور احمد خان سے؟"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کسی سے کوئی رقم نہیں لی۔" وہ کراہ کر بولی۔

میں نے دراز پر ٹانگ کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ پہلو کے بل قالین پر گر گئی اور لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اس کا خمیرے آٹے جیسا جسم غل غل کر رہا تھا اور رنگ ہلدی ہو گیا تھا "ہائے میں مر گئی۔۔۔۔ ہائے ظالم نے میری ہڈی توڑ دی۔" وہ بلکنے لگی۔

میں نے کہا "ہڈی ٹوٹی نہیں لیکن جلد ہی ٹوٹ جائے گی۔ اگر ہڈی تڑوانا نہیں چاہتی ہو تو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔۔۔ اور سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تمہارا حرامی بھائی بدری کدھر ہے جو گائیڈ بن کر گلگت جا رہا ہے؟"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ شش۔۔۔ شاید آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے۔۔۔۔ نن۔۔۔۔ نتھیا گلی گیا ہوا ہے۔ تمہیں کسی پیر بزرگ کا واسطہ' میرا ہاتھ چھوڑ دو' میری ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

میں نے کہا "اپنی بڑی کی تمہیں بڑی فکر ہے لیکن تمہارے لالچ کی وجہ سے جن لوگوں کی جانیں جانے والی ہیں ان کی کوئی پروا نہیں۔ بتاؤ بدری کدھر ہے؟"

میں نے دراز پر دباؤ مزید بڑھایا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ گئی "اچھا بتاتی ہوں لیکن میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

میں نے دباؤ تھوڑا سا کم کردیا۔ وہ ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرنے لگی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ دراز کی صورت میں ایک بڑا اچھا "تفتیشی ہتھکنڈا" میرے ہاتھ آگیا تھا۔ اپنی مالکن کی حالت دیکھ دیکھ کر چوکی دار لڑکے نے باقاعدہ رونا شروع کردیا تھا لیکن میری ہدایت کے مطابق آواز اس کے حلق سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ مہتاب بیگم کے کلف لگے بال قالین پر بکھرے ہوئے تھے اور پان میں رنگے ہونٹ کانپتے چلے جارہے تھے۔

وہ بولی "بدری اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ وزیر صاحب سے ملنے۔"

"یہ لوگ گلگت کب روانہ ہورہے ہیں؟"

"ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ پروگرام بنتا بھی ہے یا نہیں۔"

"تم نے اخبار میں بیان کیوں دیا۔ حالانکہ تمہیں پتا تھا کہ یہ بڑا خطرناک کام ہے۔"

"بس کسی طرح بات نکل گئی تھی۔ ایسی باتیں زیادہ دیر کب چھپی رہتی ہیں۔"

"کیا بات نکل گئی تھی؟"

"یہی کہ گلگت میں مرنے والوں کو ڈاکوؤں نے قتل نہیں کیا بلکہ ایک قبیلے کے لوگ ان کو باقاعدہ پکڑ کر اپنے علاقے میں لے گئے تھے اور یہ لوگ بڑے عرصے سے اس طرح کی وارداتیں کررہے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اسلام آباد سے دو افسر میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات تفصیل سے اخبار والوں کو بتاؤں۔ میں نے انکار کیا لیکن پھر وہ لوگ فلم انڈسٹری کے دو تین بڑے لوگوں کو لے کر آگئے۔ مجبوراً مجھے بیان دینا پڑا۔"

میں نے کہا "تم ہر کام مجبوراً ہی کرتی ہو۔ لال کوٹھی میں "روشنی" کے ذریعے پیسے کمانے کا کام بھی تم نے مجبوراً ہی کیا تھا اور آج رات اس سوّر کے ساتھ بھی شاید تمہیں مجبوراً ہی سونا پڑا تھا۔" ایک دم میں نے دراز پر دباؤ بڑھا دیا "بتاؤ کیا لالچ دیا تھا تمہیں منصور خاں اور اس کے ساتھیوں نے؟"

وہ بڑی تیزی سے جھوٹی قسمیں کھانے لگی اور اپنے دوسرے ہاتھ سے دراز کو کھولنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

اسی دوران میں دروازے کی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں چونک گیا۔ ریوالور کا رخ مہتاب بیگم کے بجائے دروازے کی طرف ہوگیا تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ہیروئن روشنی چھپاک سے اندر آگئی۔ اس کے بال کھلے تھے اور جسم پر نہایت باریک سلیپنگ گاؤن تھا۔ روشنی کو دیکھ کر بالکل یوں لگا جیسے دیکھتے دیکھتے لفظوں والی رنگین کتاب اچانک آنکھوں کے سامنے کھل گئی ہو۔۔۔ یقیناً کمرے میں داخل ہوکر روشنی کے سامنے بھی ایک کتاب کھل گئی ہوگی مگر اس کتاب کے لفظ موت کی طرح سرد اور خوف کی طرح تاریک تھے۔ روشنی کی ڈینگ خالہ لاچاری کی حالت میں قالین پر پڑی تھی اور تکلیف سے بے حال ہوکر ہاتھ پیر پھینک رہی تھی۔ یقیناً بڑے بڑے دھانسو لوگوں سے اس عورت کا رابطہ تھا اور اس کے ایک ٹیلی فون پر ہر بند دروازہ کھل سکتا تھا مگر اس وقت اس کا سارا جاہ و جلال اور دبدبہ مٹی میں ملا ہوا تھا۔ اس کے اشارے پر ناچنے والی عصمت فروش لڑکیاں اس کی حالت دیکھ لیتیں تو دنگ رہ جاتیں۔

روشنی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اس نے تیزی سے باہر جانے کی کوشش کی مگر میرا ریوالور اس کی طرف سیدھا ہوچکا تھا "خبردار۔" میں نے گرج کر کہا۔

وہ سہم کر رک گئی اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ میری شکل یا آواز پہچاننے میں ناکام رہی تھی "کیا۔ چاہتے ہو تم؟" وہ ہکلا کر بولی۔

"تمہیں دیکھ کر کوئی اور کیا چاہ سکتا ہے؟"

اس نے غیر ارادی طور پر اپنے کشادہ گریبان پر ہاتھ رکھ لیے۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "گھر میں زیادہ کیش نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے تم لے جاسکتے ہو۔ ہم۔۔۔ ہم تمہارا ہاتھ نہیں روکیں گے۔"

میں نے کہا "کیش لے جانے سے بہتر نہیں ہے کہ میں کیش بنانے والی مشین اپنے ساتھ لے جاؤں۔ تمہاری خالہ کو ایک یادگار سبق بھی مل سکے گا۔"

"کون سی مشین؟"

میں نے ہنستے ہوئے مہتاب بیگم سے کہا "دیکھو' مشین پوچھ رہی ہے کون سی مشین۔"

روشنی اب تھوڑا سا چونک گئی تھی۔ میری طرف انگلی اٹھا کر بولی "تت۔۔۔ تمہاری آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا تعلق فلمی دنیا سے ہے' چہروں اور آوازوں کی تو بہت پہچان ہوتی ہے تم لوگوں کو۔"

ایک دم روشنی کے چہرے کا رنگ بدل گیا' لرزتی آواز میں بولی "تم۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ آپ شاہ جہاں ہیں۔"

"اتنی عزت سے مت بلاؤ۔" میں نے کہا "تمہاری خالہ اس عزت کا بھی بل بنا کر مجھے دے دے گی۔"

روشنی ایک دم میرے قریب آگئی۔ اس کے چہرے پر اب

خوف کی جگہ حیرت اور تجسس کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ وہ میرے گیٹ اپ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مہتاب جانتی تھی کہ روشنی میری عزت کرتی ہے اور میں بھی کبھی کبھی اس کی بات مان لیتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی کو قریب پاکر وہ اور زور سے واویلا کرنے لگی "ہائے میں مرگئی' ہائے میری جان نکل گئی۔ اللہ کا واسطہ میری کلائی چھوڑ دو۔"

روشنی نے التجا کے لہجے میں کہا "پلیز شاہ جہاں صاحب! خالہ کو چھوڑ دیں۔ آپ نے جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں۔ میں آپ کو بتاؤں گی۔ جس قسم کی مدد آپ چاہتے ہیں۔ میں آپ کو دوں گی۔"

میں نے دراز سے اپنا پاؤں ہٹالیا۔ مہتاب بیگم نے تڑپ کر ہاتھ باہر نکالا۔ کلائی پر گہرا نیل نظر آرہا تھا۔ نچلی طرف سے کھال چھل گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔ وہ کلائی کو دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ میں نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا "چلو کھڑی ہوجاؤ۔ اور باتھ روم کے اندر چلی جاؤ۔ تمہارا موٹا یار بھی وہیں ہے۔"

مہتاب بیگم پہلے تو اڑی کھڑی رہی لیکن جب میں نے سختی سے کہا تو وہ منہ میں بڑبڑاتی ہوئی اور آنسو بہاتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ میرے اشارے پر چوکی دار نے باتھ روم کا دروازہ پھر باہر سے بند کردیا۔

چوکی دار لڑکے کو میں نے ایک اسٹور روم میں منتقل کیا اور روشنی کے ساتھ نشست گاہ میں آگیا۔ روشنی نے کہا "سنا ہے آپ نے ایک بہت بڑے ڈاکو کو پولیس کی حراست میں قتل کیا ہے اور پولیس آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے؟"

میں نے کہا "میرا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کر تمہیں یقین ہوجانا چاہیے کہ یہ بات درست ہے؟"

وہ بولی "سنا ہے وہ ڈاکو ڈھائی سو افراد کا قاتل تھا' پھر اس کی موت پر پولیس آپ کے خلاف اتنا زبردست ایکشن کیوں لے رہی ہے۔"

"اس لیے کہ کچھ لوگ اس کی موت پر زبردست طوفان اٹھا رہے ہیں۔"

"مگر کیوں۔ روزانہ سیکڑوں بے گناہ بندے مارے جاتے ہیں' ان کی موت پر تو کوئی طوفان نہیں اٹھتا۔"

"تم کافی شریف النفس ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک کامیاب اداکارہ نہیں بن سکو گی۔ جو باتیں تم سوچ رہی ہو' وہ تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ اب اپنی خالہ کو ہی دیکھ لو۔ وہ جن لوگوں کی وجہ سے "موت کی وادی" سے بچ کر نکلی ہے اب انہی کی موت کا سامان کررہی ہے۔ جو لوگ وادی پر چڑھائی کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں ان سے تعاون کررہی ہے اور اس کا بھائی بدری گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ تم جانتی ہو' اگر یہ سب کچھ ہوگیا تو فلمی یونٹ کے باقی لوگ اور تمام یرغمالی بے موت مارے جائیں گے۔ سری لنکن ہیروئن لوسانچی بھی وہیں ہے۔ وہ تمہاری سہیلی تھی۔ کیا تم پسند کروگی کہ وہ جنگیوں کے ہاتھوں اذیتیں جھیل جھیل کر ہلاک ہوجائے۔ اسی طرح میں اپنے دوست مسعود اور جون چاول کے بارے میں بھی یہ بھیانک خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

روشنی کے چہرے پر گہرا تفکر نظر آرہا تھا۔ وہ بولی "خالہ نے آپ کو کیا بتایا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ماموں بدری کے متعلق اور اسلام آباد میں بننے والے پروگرام کے متعلق؟"

"وہ تو کہتی ہے کہ ابھی صرف غور و فکر کیا جارہا ہے اور یہ بھی خبر نہیں کہ گلگت روانگی کا پروگرام بنتا بھی ہے یا نہیں۔"

روشنی کے چہرے پر گہری تشویش نظر آرہی تھی۔ نفرت آمیز لہجے میں کہنے لگی "خالہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"تو پھر سچ کیا ہے؟"

روشنی نے ایک لمحے توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں بولی "کل رات سے وہ لوگ اسلام آباد سے گلگت کے لیے روانہ ہوچکے ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"وہی لوگ جنہوں نے گلگت سے آگے پہاڑوں میں سفر کرنا ہے اور وادی تک پہنچنا ہے۔ وہ لوگ بڑے لمبے چوڑے انتظام کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ پولیس اور مسلح افراد سے بھری ہوئی چار بڑی بسیں ہیں۔ ایک ٹرک میں اسلحہ اور ایمونیشن ہے۔ گلگت سے بھی کچھ لوگوں نے اس مہم میں شامل ہونا ہے۔ ان لوگوں کے پاس لمبے چوڑے نقشے ہیں اور ہیلی کاپٹروں کی امداد بھی انہیں حاصل ہوگی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ روشنی کی اطلاعات نہایت سنسنی خیز تھیں اور بے حد تشویش ناک بھی۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ میں نے پوچھا "اور کیا معلوم ہے تمہیں؟"

وہ بولی "گلگت سے کچھ فاصلے پر "کیپال" میں اس مہم کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا جارہا ہے۔ یہاں ایک ہیلی پیڈ بنایا گیا ہے اور وائرلیس وغیرہ کی سہولتیں بھی یہاں موجود ہوں گی۔ یہ سارے انتظام بڑی رازداری سے کیے گئے ہیں اور بہت کم لوگوں کو اس بارے میں معلوم ہے۔"

"لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے دو تین دن پہلے اتفاقاً ماموں بدری اور خالہ کی باتیں سن لی تھیں۔ ماموں بدری اسلام آباد جارہا تھا اور اپنا کچھ سامان لینے گھر آیا تھا۔ میرا دل ان کی باتیں سن کر بہت ڈرا تھا۔ میں نے سوچا تھا' کاش میں کسی طرح آپ سے رابطہ قائم کرسکوں اور جو کھچڑی یہاں پک رہی ہے اس کے بارے میں بتا سکوں لیکن میرے پر تو خالہ اور ماموں بدری نے کاٹ رکھے ہیں' ایک پل بھی مجھے نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے سچ کہا ہے' میں ان کے

لیے پیسے بنانے کی مشین ہوں۔ دن کو بھی جلتی ہوں اور...." وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا "تمہارے خیالات مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں لیکن اس بارے میں پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال مجھے کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے چند رہ بیس منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھول دینا اور یاد رکھو' ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں خالہ کو پتا نہ چلے۔ اس کو یہی باور کرانا کہ تم نے تھوڑا اتار کر زیادہ چھپا لیا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں' میں ہینڈل کر لوں گی۔ لیکن.... آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بولی "کچھ نہ کچھ ضرور کریں شاہ جہاں۔ میں زیادہ باخبر لڑکی نہیں ہوں لیکن اتنا مجھے بھی پتا ہے کہ جو لوگ وادی میں کارروائی کرنا چاہتے ہیں وہ خطرناک بے وقوفی کر رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ انہیں سمجھانے والا بھی کوئی نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اپنی ساری تیاریوں کے باوجود وہ لوگ زبردست حادثے کا شکار ہوں گے اور پھر جو لوگ قبیلے کی قید میں ہیں ان کے ساتھ نجانے کیا ہو۔"

مونتی کو ضروری ہدایات دے کر میں سولہ سو ایکڑ اسکیم کی اس وسیع کوٹھی سے نکل آیا۔ کار باہر موجود تھی۔ اب میرا رخ عالم قریشی کے گھر کی طرف تھا۔

O☆O

عالم قریشی کے گھر پہنچتے ہی میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بے حد فکر مند نظر آنے لگا۔ فکر مندی اس بات کی نہیں تھی کہ میں اس سے دس پندرہ ہزار روپے مانگ رہا تھا اور غیر معینہ مدت کے لیے اس کی گاڑی بھی لے جا رہا تھا۔ اسے فکر یہ تھی کہ میری طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی اور بھاگ دوڑ والے کاموں سے میں پھر درد کے شکنجے میں جکڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے لڑ جھگڑ کر اور کسی حد تک منت کر کے اسے مطمئن کر دیا۔

زریں گل کو جب میں نے بتایا کہ ہم ابھی اور اسی وقت گلگت کے لیے روانہ ہو رہے ہیں تو وہ سکتے میں رہ گیا۔ جب سکتہ ٹوٹا تو اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ "وادیٔ مرگ" سے باہر آنے کے چند ہی ماہ بعد ہمیں دوبارہ گلگت کا رخ کرنا پڑے گا۔ گلگت جس کی فضاؤں میں کلثوم کے سانسوں کی مہک تھی۔ جس کے پانیوں میں وہ اپنی محبت کا عکس ڈھونڈ سکتا تھا۔ اپنی یادیں تازہ ہونے کا احساس زریں کے لیے بڑا فرحت بخش تھا۔

صرف دو گھنٹوں میں ہم نے روانہ ہونے کی مکمل تیاری کر لی۔ اس "تیاری" میں زریں گل کا ریڈی میڈ میک اپ بھی شامل تھا۔ چھوٹی سی داڑھی' گھنی بھنویں اور براؤن آئی لینز لگانے کے بعد

زریں گل حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔ زریں کا عام لباس شلوار قمیص اور واسکٹ تھا۔ حلیہ تبدیل کرنے کے بعد میں نے اسے پتلون قمیص اور سویٹر پہنا دیا۔ وقت رخصت عالم قریشی نے مجھے دیگر ہدایات کے علاوہ خوراک کے متعلق بھی زبردست لیکچر دیا۔ اس نے نصیحت کی کہ ڈاکٹر کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے کہ انڈا مچھلی اور مرغی وغیرہ گرم غذائیں ہیں لیکن میں یہ چیزیں کھا کر ان کا توڑ دودھ' لسی اور ربڑی وغیرہ سے کر سکتا ہوں۔ اسی طرح دیسی گھی اور مکھن کے بارے میں اس نے ہدایت کی کہ میں یہ چیزیں کسی بھی حالت میں ترک نہ کروں' ڈاکٹروں نے خواہ مخواہ دیسی گھی کے مخالف محاذ بنا رکھا ہے ورنہ اس ایک نعمت میں ایک سو ایک بیماریوں کا علاج موجود ہے۔ پتا نہیں اس نے اور بھی کیا کچھ بتایا لیکن میری سمجھ میں بس یہی باتیں آسکیں۔

بارہ بجے کے لگ بھگ ہم عالم قریشی کے گھر سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ عالم قریشی بولا "یار! تم تو ایسے بھاگ رہے ہو جیسے تمہیں کہیں جا کر آگ بجھانی ہے۔ تمہاری چھوٹی بھابی بڑے چاؤ سے دیسی بکرے کے پائے پکا رہی ہے۔ کھا کر جاؤ گے تو گلگت تک سرور باقی رہے گا۔"

میں نے کہا "سفر میں گاڑی چلانا منع ہے۔"

وہ بولا "اوئے زریں گل' تو ہی چکھ جا۔"

زریں گل بولا "خو چکھنے سے کیا فائدہ' جب ام کھائے گا تو کھل کھلا کر کھائے گا اور آپ کا ہانڈی خالی کر دے گا.... ویسے ایک بات ہے جناب۔ کل آپ فرما رہا تھا کہ آپ کو پیشاب جل کر آ رہا ہے۔ یہ گرمی کا نشانی ہوتا ہے پھر آپ نے پائے کیوں پکا لیا؟"

"یہ حکمت کی باتیں ہیں زریں گل۔ تو نہیں سمجھے گا.... دیکھو جب ہم سری پائے کھائے گا تو ہم کو خوب پیاس لگے گا۔ شام تک ہم دس بارہ جگ شکنجوی پی جائے گا۔ دس بارہ جگ پیشاب آئے گا تو گرمی کا تو قتل عام ہو جائے گا۔ کیوں بھئی شاہ جہاں؟"

"یہ شکنجوی کیا ہوتا ہے؟" زریں نے پوچھا۔

"اوئے یار! وہی اسکنجبین.... لیموں پانی۔ تم تو چٹے ان پڑھ لگتے ہو۔"

"چٹا ان پڑھ ام نہیں ہے جناب.... ام تو بڑے پتے کی بات کر رہا ہے۔ ام یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ زیادہ پیشاب آنے سے تو بندے کو کمزوری ہو جاتا ہے۔ نکمیات جو خارج ہو جاتا ہے۔"

"اوئے نکمے.... نکمیات نہیں نمکیات۔" میں نے صحیح کی۔

"ہاں ہاں وہی۔" زریں گل نے کہا۔

عالم قریشی ہنس کر بولا "نمکیات خارج ہو جائیں گے تو پھر کیا ہوا۔ ہم صبح ناشتے میں دو بوتلے سالن کے اور کھا لے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "لیکن شاہ جہاں' آج تیری اس ڈاکٹر نے بھی تو آنا تھا اپنے شوہر صاحب کے ساتھ' دو بجے کا وقت بتایا تھا

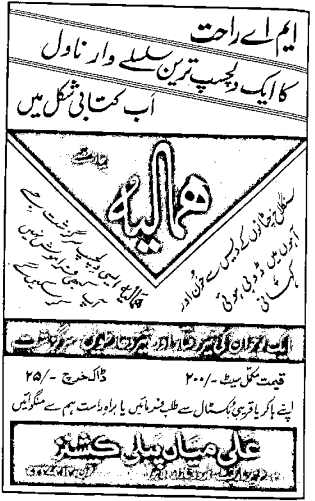

انہوں نے۔"

میں نے بجھے دل سے کہا "بس تم ان سے مل لینا۔ میری طرف سے کہہ دینا کہ کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ اگر واپسی ہوئی بھی تو دس بارہ دن سے پہلے نہیں ہو گی۔" نجانے کیا بات تھی۔ یوں لگتا تھا کہ غزالہ کی طرف سے میرا دل اچاٹ ہو گیا ہے۔ (یا شاید یہ میرا وہم ہی تھا....) اس سے ملاقات کا تصور کر کے ہی مجھے تھکن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ بیماریٔ عشق کے لیے یہ اچھی علامت تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ علامت اب برقرار رہے۔ غزالہ کی ازدواجی زندگی میں جو ایک مثبت تبدیلی آئی تھی وہ میرے لیے بڑی اہم تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ ہم عالم قریشی کے گھر سے روانہ ہوئے اور لاہور کی بھری پری سڑکوں سے گزر کر جی ٹی روڈ پر آگئے۔ زریں گل کی خواہش تھی کہ گاڑی وہ ڈرائیو کرے۔ وہ ایک اچھا ڈرائیور تھا۔ اس سے پہلے بھی میں کئی مرتبہ اس کے ساتھ سفر کر چکا تھا اور آج تو زریں گل کی ڈرائیونگ میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اس کا رخ تمال کی طرف تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ کلثوم (گل ثوم) سے اس کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا ہے حالانکہ ابھی ہم شاہدرہ سے کچھ زیادہ آگے نہیں نکلے تھے۔ اپنے خوشگوار موڈ کو مزید خوشگوار بنانے کے لیے اس نے گاڑی کے ڈیک میں کلبش کی غزلوں کی کیسٹ گھسیڑنے کی کوشش کی۔ کیسٹ گھسیڑنے میں وہ اتنا مگن تھا کہ اس لمبی جیگوار کار کو نہ دیکھ سکا جو سائیڈ روڈ سے اچانک مین روڈ پر آئی تھی۔ ہماری ہنڈا زوردار دھماکے سے جیگوار کی سائیڈ میں لگی۔ میں نے جیگوار کے شیشوں کو ٹوٹتے اور چادر کو پچکتے دیکھا پھر وہ دونوں گاڑیاں گھسٹتی ہوئی قریباً پچاس گز تک چلی گئیں اور سڑک سے اتر کر کچے کی دھول میں گم ہو گئیں۔

ٹھیک ٹھاک حادثہ ہوا تھا۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا تھا لہٰذا چوٹ سے بالکل محفوظ رہا۔ صرف ایک ہاتھ اور کنپٹیوں پر معمولی خراشیں آئیں۔ زریں گل کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور ناک سے نکسیر پھوٹ نکلی تھی۔ ٹھوڑی پر بھی زخم آیا تھا۔ زیادہ نقصان جیگوار کا ہوا تھا۔ جیگوار کا نمبر اسلام آباد کا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی سفارت کار کی گاڑی ہے۔ چند لمحے بعد یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ گاڑی کے اندر سے ایک باوردی ڈرائیور اور دو لمبے چوڑے افراد باہر نکل آئے۔ انہیں بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے تھری پیس سوٹ کے اوپر عمامہ باندھ رکھا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق مڈل ایسٹ کے کسی ملک سے ہے۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی اس نے زریں گل کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر کار سے باہر نکال لیا۔ قصور یقیناً زریں گل کا تھا لیکن جیگوار والوں نے بھی محتاط ڈرائیونگ کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ زریں گل کو مصیبت میں دیکھ کر میں بھی تیزی سے باہر نکلا۔ عمامے والا بے حد طیش میں تھا۔ قریب تھا کہ وہ زریں گل پر تھپڑوں کی بارش کر دیتا کہ میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ میں نے کہا "سر! آپ معقول شخص نظر آتے ہیں" اس طرح کی دھینگا مشتی آپ کو زیب نہیں دیتی۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں آرام سے بات کر لیں۔"

وہ انگلش میں دہاڑا "کیا آرام سے بات کرو گے تم۔ اندھے ڈرائیور رکھ کر سڑک پر آتے ہو اور دوسروں کو تمیز سکھاتے ہو۔"

میں نے کہا "محترم! آپ آرام سے بات کریں' خواہ مخواہ تماشا لگانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

اس نے بڑی بے پروائی سے میرا بازو پکڑ لیا اور اپنی گاڑی کی طرف کھینچتے ہوئے بولا "یہ دیکھو کیا حال کیا ہے تم نے نئی گاڑی کا۔ اوپر سے نصیحت کر رہے ہو کہ آرام سے بات کریں۔"

جیگوار والوں کا کافی نقصان ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہمارا نقصان دس فیصد بھی نہیں تھا۔ ہائی وے سے گزرنے والی کئی گاڑیاں حادثے کا نتیجہ دیکھنے کے لیے لبِ سڑک رک گئی تھیں۔ کچھ لوگ کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے اور کچھ مکالمے بازی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمارے قریب چلے آئے تھے۔ عمامے والے کے قیم شحیم ساتھی نے ہماری گاڑی کے اگنیشن میں سے چابی نکالنا چاہی تو زریں گل نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ اس نے زریں گل کو زور سے دھکا دیا۔ زریں گل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے زریں گل کا گریبان قیم شحیم شخص سے چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے بڑی بدتمیزی سے مجھے بھی دھکا دے دیا۔ اب پانی سر سے گزرتا جا رہا تھا۔ میں نے قیم شحیم شخص کا بازو پکڑ کر ذرا طاقت سے بھینچا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ میں نے مخصوص انداز میں بازو کو انگوٹھے کی طرف موڑ کر زریں گل کا گریبان آزاد کرا دیا۔ مدِ مقابل کے چہرے پر تکلیف کے علاوہ جاہ و جلال بھی نظر آ رہا تھا" اس نے بڑے شاہانہ انداز میں میرے چہرے پر زناٹے کا تھپڑ رسید کرنا چاہا۔ اگر وہ دس گنا تیزی کا مظاہرہ بھی کرتا تو اس کا ہاتھ میرے رخسار تک نہ پہنچ سکتا۔ میں نے راستے میں ہی اس کی کلائی دبوچ لی اور زور سے دھکیل کر ایک درخت کے ساتھ دے مارا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے۔ میں نے کہا "لگتا ہے جیگوار میں بیٹھ کر انسان چیونٹیوں کی طرح نظر آتے ہیں تمہیں.... اپنی نظر ٹھیک کراؤ۔"

اسی دوران میں عمامے والے سفارت کار نے ہاتھ کے اشارے سے پولیس کی ایک گشتی گاڑی کو روک لیا۔ ٹریفک پولیس کی ایک جیپ مجمع دیکھ کر از خود رک گئی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد ہم نے خود کو پولیس کے نرغے میں پایا۔ سفیر صاحب ابھی تک کار کے اندر ہی بیٹھے تھے۔ ان کے سر پر بھی عمامہ تھا" آنکھوں پر سیاہ گلاسز اور

انگلیوں میں بیش قیمت ہیرے تھے۔ وہ تسبیح بھی شاید موتیوں کی ہی تھی جو ان کے ہاتھوں میں مسلسل گردش کر رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے جیگوار کی کھڑکی میں جھک کر بڑے احترام کے ساتھ سفیر صاحب سے بات کی۔ پولیس انسپکٹر گاڑی میں بیٹھے شخص کو ہز ہائی نس کہہ کر پکار رہا تھا۔ غالباً سفیر نے اپنا شناختی کارڈ وغیرہ انسپکٹر کو دکھایا تھا۔

سفیر سے گفتگو کرنے کے بعد انسپکٹر اور ٹریفک سارجنٹ میرے پاس آگئے۔ میں نے اپنا نام عالم قریشی بتایا۔ زریں گل کا نام نشان علی بتایا۔ یہی عالم قریشی کے ڈرائیور کا نام تھا۔ لائسنس پر لگی ہوئی نشان علی کی تصویر زریں گل کے موجودہ حلیے سے ملتی جلتی تھی۔ ہمارے کاغذات کی پڑتال کے دوران میں پولیس والے کوئی نقص نہ نکال سکے۔ اس کے باوجود ہماری پوزیشن کمزور تھی۔ ایک تو زریں گل نے غلط لین پر جا کر گاڑی ماری تھی' دوسرے ماری بھی سفارت کار کی کار میں تھی۔

انسپکٹر نے ایک ملک کا نام لے کر بتایا کہ یہ وہاں کے اتاشی ہیں۔ ضد پر آگئے تو تمہیں جیل کی ہوا کھلا دیں گے۔ قصور بھی سراسر تمہارا ہی ہے' اگر ان کے ساتھ کوئی معاملہ کر سکتے ہو تو کر لو۔"

میں نے کہا "یوں تو ہماری گاڑی کا نقصان بھی ہوا ہے۔ بہرحال میں معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں۔"

ٹریفک سارجنٹ نے تنقیدی نظروں سے گاڑی کو دیکھتے ہوئے کہا "بالکل نئی گاڑی ہے۔ کچھ نہیں تو لاکھ سوا لاکھ کا نقصان ہو گیا ہے۔ اتنے پیسے بھر دو گے؟"

زریں گل تنک کر بولا "ہمارے پاس حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ ویسے بھی تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتا۔ اس حادثے میں یہ لوگ بھی برابر کا قصوروار ہے' یہ اور بات ہے کہ ہمارا نقصان کم ہوا ہے۔ آپ کسی اچھے مکینک کو بلا لے" وہ جو بھی مرمت کا پیسہ بتائے گا ام ادا کرے گا۔ اگر نہیں تو ہمارے ساتھ بلال گنج چلو" وہاں ہماری پھوپی کا سالا موٹر مکینکی کرتا ہے۔ یہ تو کار ہے۔ وہ تو اڑن طشتری کا پرزہ بھی بلال گنج سے ڈھونڈ کر لے آتا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں گاڑی کو بالکل فٹ کر دے گا...."

میں نے زریں گل کو گھورا کہ وہ اپنی چونچ بند رکھے۔ وہ برا سا منہ بنا کر اپنی ناک اور ٹھوڑی کا خون صاف کرنے لگا۔

میں نے پولیس انسپکٹر سے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ ان لوگوں سے بات کریں۔ ہم معقول ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں۔"

پولیس انسپکٹر اور سارجنٹ سفیر کی طرف چلے گئے۔ بیس تیس سیکنڈ تک دھیمے لہجے میں بات ہوئی پھر سفیر صاحب بلند آواز میں بولنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی کا پچکا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ وہ بڑے طیش میں تھے اور فرما رہے تھے کہ وہ ہیسوں پر ایک ہزار بار لعنت بھیجتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر صورت جیل کی ہوا کھلا کر دم لیں گے۔

شاید وہ چاہتے تھے کہ ہم نقصان پورا کرنے کے علاوہ معافی بھی مانگیں یا پھر واقعی انہیں معاوضے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال معاملہ الجھتا جا رہا تھا۔ سفیر صاحب بڑی رواں انگلش میں ٹریفک کے سنہری اصولوں اور قانون پسندی کی باتیں کر رہے تھے۔ حالانکہ قانون کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے گاڑی کی کھڑکیوں پر نیلگوں پردے لگا رکھے تھے اور یہ تو وہ خلاف ورزی تھی جو نظر آ رہی تھی' ایسی نہ جانے کتنی خلاف ورزیاں وہ ہر روز کرتے تھے۔ ایسے "قانون پسند" لوگوں کے نابالغ بچے عموماً بڑی بڑی گاڑیاں اسلام آباد کی سڑکوں پر دوڑاتے نظر آتے ہیں۔

میں نے خود سفیر صاحب سے بات کی لیکن وہ کسی طور مفاہمت پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ فرما رہے تھے کہ گاڑی کا جو نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہماری نہایت غیر محتاط ڈرائیونگ کی وجہ سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہوا' اور اپنی غلطی پر معافی مانگنے کے بجائے ہم نے ان سے بدتمیزی کی۔

سفیر صاحب کا متکبرانہ رویہ میرے ذہن میں بغاوت کی چنگاری سلگا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تو پھر یہ آٹھ دس پولیس والے اور سفیر صاحب کا عملہ سر پاؤں رکھ کر بھاگتا نظر آئے گا۔ میں تو پہلے ہی پھانسی کا "حق دار" تھا میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا لیکن جو حالات مجھے درپیش تھے وہ تقاضا کر رہے تھے کہ میں کسی خطرناک معاملے میں نہ الجھوں۔ قانون شکن قبیلے کی سرکوبی کے لیے ایک بڑی مہم اسلام آباد سے قلات روانہ ہو چکی تھی۔ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ قراقرم کے برف زاروں میں ایک بار کارروائی کا آغاز ہو جاتا تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہنا تھا.... اس حادثے والے معاملے کو کسی بھی صورت نمٹنا چاہیے تھا۔ ضرورت کے وقت تو انسان گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔ میرے دل میں آئی کہ سفیر صاحب سے معافی مانگ لی جائے اور جو ہرجانہ وہ کہیں" عالم قریشی سے منگوا کر جان چھڑائی جائے لیکن ایک امکان یہ بھی تھا کہ ہمارے معافی مانگنے کے باوجود سفیر صاحب ہمیں معاف نہ کریں۔ یوں عزتِ سادات بھی جائے اور ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔ سفیر صاحب کی تیوری تو یہی بتا رہی تھی کہ وہ ہٹ کے بڑے پکے ہیں۔

اچانک میرے ذہن میں شیخ عاصم کا خیال آیا.... آج کل وہ دیرینہ دشمنی ختم کر کے دوستی کی داغ بیل ڈالنے کی باتیں کر رہا تھا۔ پرسوں وقتِ رخصت اس نے بار بار کہا تھا کہ اگر اس کے لائق کوئی خدمت ہو تو میں یاد کروں۔ بس خواہ مخواہ کے معاملے میں ہم پھنس گئے تھے اس میں شیخ عاصم ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی عربی تھا۔ اس کے علاوہ وہ مڈل ایسٹ کے بہت سے سفارت کاروں سے اس کے گہرے روابط تھے۔ ابھی ہم لاہور سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ شیخ عاصم سے فون پر بات ہو جاتی تو وہ آدھ پون گھنٹے میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک بڑا ریسٹورنٹ نظر آ رہا تھا۔ میں نے

عالم قریشی کی کوٹھی کا نمبر ملایا۔ عالم قریشی سے بات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ غزالہ اور شیخ عاصم ابھی نہیں آئے۔ اس مرتبہ میں نے ذہنس میں شیخ عاصم کے گھر رنگ کیا۔ غزالہ نے فون اٹھایا۔ میری آواز پہچان کر بولی "بس ہم نکلنے ہی والے ہیں۔ میں پچیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ عاصم نے تو لمبا پروگرام بنا رکھا ہے۔ کہتے تھے کہ آج رات کا کھانا کہیں باہر کھائیں گے۔"

میں نے کہا "تمہیں اصل حالات کا علم نہیں ہے غزالہ اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ صفدر سمیت کچھ لوگوں کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ میں گلگت جا رہا ہوں۔۔۔ بلکہ راستے میں ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔ آپ گھر سے نہیں بول رہے؟"

"نہیں۔۔ میرا خیال ہے کہ تم تھوڑی سی فرصت نکال کر پچھلے دو تین روز کے اخبارات دیکھ لو۔ تمہاری بے خبری کچھ کم ہو جائے گی۔۔"

غزالہ بے تاب ہو گئی۔ وہ مجھ سے تفصیل پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ وہ بس شیخ عاصم سے میری بات کرا دے۔ چند لمحے بعد شیخ عاصم کی آواز فون پر سنائی دی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنا مسئلہ بتایا اور کہا کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔

شیخ عاصم نے پوچھا "اس وقت کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"شاہدرہ سے کچھ آگے جی ٹی روڈ پر ایک پرانا سا ریلوے پھاٹک ہے۔ اس پھاٹک کے پاس ہی ہوا ہے حادثہ۔"

"او کے! میں آدھ گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" شیخ نے ہموار لہجے میں کہا۔

آدھ پون گھنٹے بعد شیخ عاصم کی چمکتی دمکتی مرسیڈیز برق رفتاری سے آتی دکھائی دی۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک اور شخص بھی شیخ کے ساتھ تھا۔ مجھے پہچاننے میں شیخ عاصم کو دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں تبدیل شدہ حلیے میں ہوں۔

شیخ عاصم گاڑی سے اترتے ہی سب سے پہلے سفیر صاحب کی طرف گیا۔ دونوں نے معانقہ کرنے کے بعد رسمی انداز میں ایک دوسرے کے رخسار چومے۔ یہ دیکھ کر مجھے ۔۔۔۔۔۔۔ تسلی ہوئی کہ شیخ عاصم کو دیکھ کر سفیر صاحب کے تنے ہوئے نقوش کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ دوسرے افراد نے بھی خوش دلی کے ساتھ شیخ عاصم سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کے رخسار چومے۔

شیخ عاصم نے دونوں گاڑیوں کا معائنہ کیا، پھر میرے ساتھ مختصر بات کرنے کے بعد سفیر صاحب کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ صرف پانچ چھ منٹ کے "مذاکرات" کے بعد وہ دونوں باہر نکل آئے۔ ان کے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ "مذاکرات" کامیاب رہے ہیں، بلکہ بہت کامیاب رہے ہیں۔ تھانے اور معافی کے علاوہ ہرجانے سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ سفیر صاحب نے میرے ساتھ بھی مصافحہ کیا، اس کے بعد شیخ عاصم اور سفیر صاحب دیر تک عربی بولتے رہے۔ غالباً شیخ عاصم، سفیر کو آفر کر رہا تھا کہ وہ اس کی گاڑی میں اسلام آباد چلے جائیں۔ سفیر صاحب شکریے کے ساتھ انکار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس انکار کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ وزارت خارجہ کی ایک گاڑی سفیر صاحب کو لینے پہنچ گئی۔ پولیس والے ابھی تک ہمارے اردگرد موجود تھے۔ سفیر صاحب نے زبانی کلامی ہمارے لیے "این او سی" جاری کر دیا اور ہم پولیس سے بھی فارغ ہو گئے۔

شیخ عاصم بولا "چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی جہاں تم جا رہے تھے اور کہاں۔"

"یعنی گلگت؟"

"ہاں گلگت جانا چاہتے ہو تو بھی ٹھیک ہے، ورنہ اسلام آباد تک تو میں تمہیں لے ہی جاؤں گا۔ وہاں مجھے کام بھی ہے۔"

تھوڑی دیر متذبذب رہنے کے بعد میں تیار ہو گیا۔ مسئلہ عالم قریشی کی کار کا تھا۔ شیخ عاصم نے مجھ سے کار کی چابی لے کر اپنے ساتھ آئے ہوئے کارندے کو دے دی اور اسے عالم قریشی کا ایڈریس دیتے ہوئے کہا کہ ضروری مرمت کے بعد کار اس پتے پر پہنچا دی جائے۔

ہم شیخ عاصم کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں ہی یہ پروگرام طے پا گیا کہ اگر اسلام آباد سے ہمیں گلگت کے لیے ہوائی جہاز کی دو نشستیں مل گئیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ہم شیخ عاصم کے ساتھ بائی روڈ ہی گلگت پہنچیں گے۔

شیخ عاصم بے حد ایثار اور بھائی چارے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس رویے کے پیچھے سچائی تھی یا کوئی مفاد؟ میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ شیخ عاصم نے میرے الیکٹرانک آلے کا سسٹم بھی آن نہیں کر رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے حوالے سے اس کے ذہن میں جو خوف تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔۔۔۔ یا اس نے دبا لیا تھا۔۔

حسب توقع ہمیں کوشش کے باوجود اسلام آباد سے گلگت کے لیے فلائٹ نہیں مل سکی۔ رات دس بجے کے قریب ہم اسلام آباد سے بائی روڈ روانہ ہو گئے۔۔۔ شیخ عاصم کا کہنا تھا کہ وہ عرصے سے گلگت اور سکردو وغیرہ دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا، چلو اس بہانے یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ وہ غزالہ کو ساتھ کیوں نہیں لے آیا۔

○☆○

قریباً سوا گھنٹے بعد ہم ایک بار پھر گلگت کی یخ بستہ فضاؤں میں تھے۔ وہ شہر گل جو خشک پہاڑوں کی آغوش میں کسی گلدستے کی طرح رکھا تھا۔ ہم شہر کے مضافات میں ہی ایک گمنام ریسٹورنٹ میں ٹھہر گئے تھے۔ ریسٹورنٹ کے اکلوتے گیراج میں شیخ عاصم کی چمچاتی گاڑی بند ہو گئی تھی، جیسے ایک خوب صورت دلہن کسی بلند و بالا کوٹھی کے بجائے کچی بستی کے کسی تاریک گھر میں اتر جائے۔

یہ بات تو طے تھی کہ اسلام آباد سے روانہ ہونے والی فورس گلگت پہنچ چکی ہے۔ اب وہ گلگت سے نانگا پربت کی طرف روانہ

ہوئی تھی یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر یہ فورس ابھی تک گلگت میں ہی تھی تو اس کا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سرکاری ریسٹ ہاؤسز کے علاوہ دو تین عمارتیں ہی ایسی تھیں جہاں یہ لوگ قیام کر سکتے تھے۔ ان جگہوں پر پولیس اور دیگر ایجنسیوں کی موجودگی باآسانی محسوس کی جا سکتی تھی۔

شام ہوتے ہی میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل گیا۔ بھرا ہوا کولٹ پسٹل میرے کوٹ کے نیچے موجود تھا۔ گلگت کا بڑا بازار ایک ہی ہے۔ یہ بازار خم کھاتا ہوا شہر کے اندر سے گزرتا ہے۔ موسم معتدل تھا اس لیے شام کے وقت بازار میں خاصی رونق تھی۔ مقامی امرا کے علاوہ ٹورسٹوں کی گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ دکانوں پر رش تھا۔ اچانک ایک درمیانے قد کے گٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ وہ فلمی نایکا مہتاب بیگم کا بھائی بدری تھا۔ اس کا رنگ قدرے سانولا اور ہونٹ سیاہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عیاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بدری ایک بڑے ریستوران میں سے نکلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو بھاری بھرکم لفافے تھے۔ یقیناً ان میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ بدری کا یوں سر راہ مل جانا میرے لیے بے حد کارآمد تھا۔ ایک دکان پر رک کر بدری نے ٹرپل فائیو سگریٹ کے سات آٹھ پیکٹ لیے اور ایک بار پھر روانہ ہو گیا۔ میں نے احتیاط سے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں تبدیل شدہ حلیے میں تھا پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ ایک فرلانگ آگے جا کر بدری ایک بغلی بازار میں مڑ گیا۔ یہاں فروٹ اور اسنیکس وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ بدری کے سفر کا اختتام ایک چھوٹے سے ہوٹل کے دروازے پر ہوا۔ اس ہوٹل کے دروازے پر اور آس پاس کئی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اگر ان گاڑیوں سے اترنے والے لوگ واقعی اس درمیانے معیار کے ہوٹل میں گئے تھے تو اچنبھے کی بات تھی۔ ہوٹل کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ یہاں ضرور کوئی گڑبڑ گھوٹالا تھا۔ ایک گرانڈیل شخص کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا گہری نظر سے ہر آتے جاتے کو دیکھ رہا تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں بدری کے شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھنے لگا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ میں بدری کے ساتھ آیا ہوں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے بدری کو سلام کیا۔ بدری نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور سیڑھیوں کے نیچے واقع ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی بلا تردد اس کے ساتھ رہا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہم ایک وسیع "بیسمنٹ" میں کھڑے تھے۔ یہاں نیم دائرے کی شکل میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، ایک اسٹیج پر سبز اور سرخ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ دروازے پر اندر کی طرف بھی ایک چوکیدار موجود تھا لیکن مجھے بدری کے شانہ بشانہ دیکھ کر اس نے کوئی باز پرس نہیں کی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فلموں کی ایک مشہور ڈانسر ہیجان خیز لباس میں اسٹیج پر موجود تھی اور رقص کر رہی تھی۔ گاہے گاہے ہال میں سے کوئی سیٹھ نما شخص اٹھتا تھا اور رقاصہ کی پتلی کمر میں بازو ڈال کر توند مٹکانے لگتا تھا۔ پوری محفل پر سرور و نشاط کی کیفیت طاری تھی۔ الکحل کی بو اور سگریٹ کا دھواں ہر شے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ میں نے محفل کے شرکا کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ان میں آٹھ دس سیٹھوں اور دو تین فلمی چہروں کے علاوہ چند بیوروکریٹس ٹائپ افراد بھی موجود تھے۔ وہ اپنے کھچڑی جیسے بالوں، گنجے سروں اور موٹے شیشے کی عینکوں سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ ان میں سے صوبائی وزیر منصور خاں کو میں نے صاف پہچان لیا۔ وہ بڑے سرور کے عالم میں سگار کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا اور گھٹنے پر ہاتھ مار کر رقاصہ کے گیت کو تھاپ دے رہا تھا۔ اس کے بالکل پاس ایک موٹا فلمی سیٹھ ایک چوزے جیسی نازک لڑکی کو بغل میں دبوچے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بار بار لڑکی کے چہرے پر جھک جاتا تھا اور اس کا موٹا بھدا ہاتھ لڑکی کے گریبان کے قریب جا کر کہیں گم ہو جاتا تھا۔ دو تین اور لڑکیاں بھی اس محفل میں موجود تھیں اور اپنے حسن سے محفل کو گرما رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا۔ میں بھی منصور خاں کے عین عقب میں ایک نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے بیٹھے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ بدری بھی وہاں پہنچ گیا۔ منصور خاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کچھ پتا چلا سفید کار کا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔" بدری نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "آج دوپہر سفید مرسیڈیز کو ایک اور آدمی نے بھی دیکھا ہے۔ نمبر بھی لاہور کا تھا۔"

منصور خاں نے کہا "تو پھر اس بات پر یقین رکھو کہ اس کار کا تعلق شیخ عاصم بن ارشد سے ہی ہے۔ اگر شیخ عاصم یہاں ہے تو پھر یہ بات بھی ممکن ہے کہ شاہ جہاں بھی یہاں پہنچ چکا ہو۔"

"سر! گستاخی معاف، مجھے یقین نہیں آ رہا۔ وہ تو۔۔۔ پولیس سے چھپتا پھرتا ہے۔"

ایک دم منصور خاں کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا شراب کا گلاس فرش پر پٹخا اور چیخ کر بولا "یو ڈیم فول۔۔۔ باسٹرڈ! میں جو کہہ رہا ہوں، بکواس کر رہا ہوں کیا؟ وہ خونی قاتل ہے، مفرور ہے، خطرناک ڈکیت ہے۔ ایسے لوگ پولیس سے نہیں چھپتے، پولیس ان سے چھپتی ہے۔ وہ جس نے عیسیٰ جان کو پولیس کی گود میں سے کھینچ کر چیر دیا۔ وہ یہاں کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ وہ پہنچ سکتا ہے یہاں اور تمہاری شہ رگ کاٹ سکتا ہے۔"

منصور خاں کی بلند آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سازندے خاموش ہو گئے اور رقاصہ کے پاؤں بھی تھم گئے۔ بدری مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

منصور خاں چیخا "جاؤ یہاں سے۔ اب کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو.... اسے زمین بوس کر دو ورنہ وہ ہم سب کو تگنی کا ناچ نچا دے گا۔"

سانولے سلونے بدری نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ موٹے شیشوں کی عینک والا ایک گنجا شخص منصور خاں کے پاس پہنچا۔ وہ دیکھنے میں ہی کسی محکمے کا سکریٹری وغیرہ لگتا تھا۔ منصور خاں سے مخاطب ہو کر اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا "منصور صاحب! آپ نے اس شار جہاں کا خوف اپنے ذہن پر کچھ زیادہ ہی سوار نہیں کر لیا؟"

منصور خاں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "غوری صاحب! میں خوف نہیں کھا رہا' احتیاط کر رہا ہوں' اور میرے خیال میں شار جہاں جیسے شخص کے سلسلے میں جتنی بھی احتیاط کی جائے کم ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ خوں خوار شخص ہے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ جب بھی قانون کے ہتھے چڑھ گیا' پھانسی سے کم میں اس کی جان نہیں چھوٹے گی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جرم بے دھڑک کر رہا ہے۔"

"کوئی گینگ وغیرہ بھی بنا رکھا ہے اس نے؟" غوری صاحب نے پوچھا۔

"گینگ بنایا ہوتا تو آسانی سے پکڑا جاتا۔" منصور خاں نے جواب دیا "ساتھیوں میں سے کوئی نہ کوئی تو پولیس کے ہتھے چڑھتا اور سارا کھٹا کر بک دیتا لیکن وہ تو تن تنہا آفت مچائے ہوئے ہے۔ لال کوٹھی میں اس نے جو کچھ کیا ہے' آپ بھی جانتے ہیں۔ موقع پر میرے دس باڈی گارڈز موجود تھے۔ اس کے علاوہ وہیں چند وردی پولیس والے بھی تھے' وہ سب کے درمیان سے عیسیٰ جان کو کھینچ کر لے گیا اور قتل کر دیا۔"

غوری صاحب چندیا کھجا کر بولے "بھئی' ایسی بات تھی تو تمہیں اس مہم پر نکلنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پہلے کوشش کر کے اسے ہتھکڑی لگوا لیتے پھر یہ کام بھی ہو جاتا۔"

"اپنی طرف سے تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی غوری صاحب! اب بھی تلاش جاری ہے مگر یہ کام جو ہم کر رہے ہیں' اس میں بھی تو زیادہ تاخیر نہیں کی جا سکتی۔"

میں ان لوگوں سے صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور اپنے بارے میں کی جانے والی گفتگو سن رہا تھا۔ اس گفتگو میں ایک دربار سیکریٹری اعظم خاں کا ذکر بھی کیا گیا۔ یہ وہی وفاقی سیکریٹری تھا جو اس سارے معاملے میں منصور خاں کے ساتھ پیش پیش تھا۔ میں نے ابھی اس بد باطن شخص کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن جو کچھ سنا تھا اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ بے حد کرپٹ اور ہنگامہ پسند شخص ہے۔ محفل میں جو افراتفری پیدا ہوئی تھی' اب ختم ہو گئی تھی۔ سازندے پھر سے ساز سنبھالنے لگے تھے۔ رقاصہ بھی رقص کے لیے تیار نظر آتی تھی۔ چوزے جیسی لڑکی پر جھکے ہوئے موٹے

سیٹھ کا ہاتھ ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔ بلوری جام جو دو تین منٹ کے لیے ساکت ہو گئے تھے اب دوبارہ گردش میں نظر آ رہے تھے۔ اچانک ایک ہاتھ آہستگی سے میرے کندھے پر آیا۔ میرے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ گیٹ کیپر میرے قریب کھڑا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے پوچھا "خو آپ کس کے ساتھ تشریف لایا ہے جی؟"

میں چند لمحے اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا رہا پھر میں نے اطمینان سے اپنا کولٹ پسٹل جیب سے نکالا اور اسے تھپک کر بولا "میں اس کے ساتھ تشریف لایا ہوں۔"

"جی؟" گیٹ کیپر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

جواب میں میرا بھرپور مکا مسلح گیٹ کیپر کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ منصور خاں کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا کرسیوں کے درمیان خالی جگہ پر گرا۔ اس کے گرتے ہی "بیس مینٹ" میں ایک دم کہرام مچ گیا۔ رقاصہ نے سریلی چیخ ماری اور سازندوں کو پھلانگ کر پردے کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ وہ لڑکیاں جو محفل میں موجود مختلف حضرات کی آغوش گرم کر رہی تھیں' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ میں نے پسٹل کی نال منصور خان کے سر سے لگا دی اور چیخ کر کہا "خبردار' اگر کسی نے حرکت کی تو وزیر صاحب کا بھیجا اڑا دوں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ میری یہ دھمکی کارگر رہے گی اور چند لمحوں کے لیے حاضرین محفل کے اعصاب مفلوج ہو جائیں گے۔ اس دوران میں' میں اپنی پوزیشن مزید بہتر بنا سکتا تھا لیکن سارا کام ایک گارڈ نے خراب کر دیا۔ وہ نشے میں تھا اور نشے سے پیدا ہونے والی دلیری کے سبب وہ اندھا دھند مجھ پر حملہ آور ہوا۔ منصور خاں کی قسمت اچھی تھی کہ میری انگلی ٹریگر پر نہیں دب گئی' ورنہ گارڈ کی دلیری منصور خاں کی جان لے سکتی تھی۔ گارڈ کی ٹکر سے میں لڑکھڑا کر کرسیوں پر جا گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' چار پانچ افراد مجھ پر پل پڑے۔ میں نے دو فائر کیے لیکن پھر پسٹل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اتنے میں مزید افراد موقع پر پہنچ گئے اور میں ان کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ میرے جسم پر ٹھڈے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں نے حملہ آوروں کے نرغے سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی پھر میرا ہاتھ اپنی پنڈلی کے خنجر کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ خنجر میرے ہاتھ میں آتا اور حملہ آوروں کو لینے کے دینے پڑتے' دو پولیس افسران نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ پشت پر موڑے اور ہتھکڑی پہنا دی۔ ہتھکڑی پہنانے والے افسر کا رویہ بے حد کرخت تھا۔ مجھے لگا کہ میں اسے تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہوا تھا۔ اپنی بے بسی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں جھلا اٹھا۔ بہت عرصے بعد ایسا ہوا تھا کہ میں نے خود کو یوں لاچار محسوس کیا تھا۔ ضربیں ابھی تک میرے جسم پر لگ رہی تھیں۔ ہاتھ اب آزاد نہیں تھے لہٰذا میں چہرے کا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ

ہونٹوں سے اور پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ منصور خاں آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مارکٹائی کے دوران میں میرے چہرے کا ریڈی میڈ میک اپ بھی تتر بتر ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بیس مینٹ میں موجود بعض افراد مجھے پہچان گئے تھے۔ اس "شناخت" کے فوراً بعد ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ یقیناً منصور خاں بھی ان افراد میں شامل تھا۔ وہ میرے قریب پہنچا اور بالکل فلمی انداز میں تالی بجا کر بولا "بہت خوب' بھئی واہ۔ کیا ناٹک رچایا ہے تم نے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے میری ایک لٹکتی ہوئی مونچھ کو چٹکی میں پکڑ کر پولیس آفیسر کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ لڑکیاں جو دہشت زدہ ہو کر باہر بھاگ گئی تھیں' اب تماشا دیکھنے کے لیے دوبارہ بیس مینٹ میں آ گئی تھیں۔ ان میں بے حد رنگیلی کروالی فلمی رقاصہ بھی تھی۔ آج تک وہ ایسے مناظر سلور اسکرین پر دیکھتی رہی تھی لیکن یہ جیتی جاگتی زندگی کا حقیقی منظر تھا۔ پولیس والے اصلی تھے' میرے ہاتھوں میں لگی ہوئی اسٹیل کی ہتھکڑی اصلی تھی' مجھ سے ہاتھا پائی کرنے والوں کے پھٹے ہوئے کپڑے' میرے جسم سے بہتا ہوا خون اور گارڈز کے ہاتھوں میں دمکتی ہوئی رائفلیں سب کچھ اصلی تھا.... میں نے جو دو فائر کیے تھے ان میں سے ایک اسی تابل گارڈ کی ٹانگ میں لگا تھا جس نے سب سے پہلے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اسے دو افراد اٹھا کر باہر لے جا چکے تھے۔ خون کی ایک پتلی لکیر بیس مینٹ کے وسط سے بیرونی دروازے تک چلی گئی تھی۔

میرے اعصاب پر شدید جھنجلاہٹ کا غلبہ تھا۔ میں نے چلا کر کہا "منصور خاں! تم اچھا نہیں کر رہے۔ تمہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تمہارے اس ایڈونچر میں جتنے بندے مریں گے ان سب کا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔"

"بہت خوب۔" منصور خاں نے زہریلا قہقہہ لگایا "میری گردن کی بڑی فکر ہے تمہیں۔ اتنی فکر اپنی گردن کی کرتے تو تمہارے لیے اچھا ہوتا۔"

"تم ایک بنا بنایا کام بگاڑ رہے ہو منصور خاں۔ جو منصوبہ تم نے بنایا ہے اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔"

"تم اپنا جوتش اپنے پاس رکھو تو بہتر ہے۔"

"یہ جوتش نہیں منصور خاں! میں تمہیں آنکھ دیکھی بات بتا رہا ہوں۔ اپنی طاقت کے زعم میں مت رہو' وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ تم لوگوں کو جنگل میں بھگا بھگا کر مار ڈالیں گے۔ کیوں اپنے ساتھ ساتھ ان سب کی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔"

ہر شخص مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی دوسرے سیارے سے براہ راست گلگت کے اس تہہ خانے میں اترا ہوں۔ شاید ان لوگوں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ منصور خاں بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ یقیناً اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس شخص کے حوالے سے وہ شب و روز خوف کا شکار ہے وہ یوں اچانک گرفت میں آ جائے گا۔ واقعی جو کچھ ہوا تھا بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ زندگی غالباً اسی ناہمواری اور بے ترتیبی کا نام ہے۔ کس لمحے میں کیا چھپا ہے ہم کچھ نہیں جان سکتے۔

میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ چاروں طرف سے گارڈز نے دبوچ رکھا تھا اور دو تین رائفلیں بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ہر شخص متوحش اور چوکس نظر آ رہا تھا۔ جیسے ابھی میں ہوا بن کر اڑ جاؤں گا یا اس تہہ خانے کی دیواریں میرے جاں نثار ساتھیوں کو اگل دیں گی اور وہ گولیوں کی بوچھار کرنے کے بعد بزور طاقت مجھے چھڑا کر لے جائیں گے۔

منصور خاں نے تہہ خانے کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا اور تہہ خانے کے ایک گوشے میں پولیس افسران کے ساتھ سر جوڑ کر صلاح مشورہ کرنے لگا۔ ان سب کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ جن گارڈز نے مجھے دبوچ رکھا تھا انہوں نے میرے لباس کی مکمل تلاشی لی اور پنڈلی سے لگا ہوا خنجر بھی نکال لیا.... پانچ دس منٹ کے صلاح مشورے کے بعد مجھے بیس مینٹ سے باہر لایا گیا۔ ہوٹل میں موجود افراد حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحے میں سڑک پر بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک دم جمگھٹا سا لگ گیا۔ مسلح افراد گرج برس کر لوگوں کو پیچھے ہٹانے لگے۔ میرے ارد گرد ایک عجیب سنسنی خیز ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ منصور خاں کے گارڈز مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایک پرائیویٹ جیپ تک لے آئے۔ دو پولیس گاڑیاں بھی قریب ہی موجود تھیں لیکن ان گاڑیوں کے بجائے مجھے پرائیویٹ جیپ میں بٹھایا جانا سنگین خطرے کی نشان دہی کرتا تھا' بہرطور میں اس وقت احتجاج کرنے کی پوزیشن میں تھا اور نہ شور شرابا کر سکتا تھا۔ پرائیویٹ گاڑی کے آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس کے علاوہ مسلح محافظ بھی تھے۔ جونہی یہ قافلہ شہر کے مضافات میں پہنچا' ایک جگہ گاڑی روک کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

ان گاڑیوں نے پختہ اور نیم پختہ راستوں پر قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سفر کیا اور پھر رک گئیں۔ یہاں میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹالی گئی۔ میں نے خود کو ایک الگ تھلگ عمارت کے احاطے میں دیکھا۔ عمارت ایک گہری کھائی کے کنارے واقع تھی۔ اطراف میں چیڑ اور دیودار کے بلند و بالا درخت تھے۔ قرب و جوار میں مہیب خاموشی اور ویرانی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں بجلی موجود تھی۔ اس وسیع عمارت میں داخل ہوتے ہوئے میں نے سوچا کیا میں یہاں سے زندہ نکل سکوں گا؟ کیا یہ در و دیوار اسی انتظار میں تھے کہ میں تیز رفتار حالات کا شکار ہو کر یہاں پہنچوں اور یہاں مجھ سے عیسیٰ جان کے قتل کا انتقام لیا جائے؟ میرے جسم کی پور پور سے جان کشید کی جائے اور میری لاش تاریک کھائیوں میں جنگلی

جانوروں کا لقمہ بننے کے لیے پھینک دی جائے پھر مجھے شیخ عاصم اور زریں گل کا خیال آیا۔ انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے۔ خود میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ گلگت پہنچتے ہی یوں اچانک میں منصور خاں کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔ درحقیقت ہیں منٹ میں جو کچھ ہوا بالکل غیر متوقع تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہ اندازہ نہ لگا سکتا کہ یوں اچانک اتنے زیادہ گارڈز نمودار ہو جائیں گے۔

عمارت کا وسیع و عریض صحن پختہ تھا۔ یہاں مجھے دو تین ٹرک اور کچھ جیپیں کھڑی نظر آئیں۔ چند افراد بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس فورس کے ... اہلکار ہیں۔ ان لوگوں نے بھی مجھے بڑے تجسس سے دیکھا۔ محرابی دروازوں اور بلند و بالا چھت والے ایک برآمدے سے گزر کر مجھے عمارت کے اندرونی حصے میں لے جایا گیا۔ یہاں کہیں کہیں بلب روشن تھے۔ عمارت کا یہ حصہ کسی قدیم کھنڈر کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ کمرے جیل کی بیرکوں جیسے تھے۔ سلاخ دار کھڑکیوں اور بڑے بڑے آتش دانوں کے نیچے جالے لٹک رہے تھے۔ روشن دانوں میں پرندوں کے گھونسلے تھے اور کہیں کہیں چمگادڑوں کے آثار بھی نظر آتے تھے۔ عجب یاس انگیز ماحول تھا۔ مجھے عمارت کے ایک اندرونی کمرے میں دھکیل دیا گیا اور آہنی دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے کرخت چہرہ پولیس انسپکٹر سے کہا "تم لوگ مجھے اس طرح بند کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اگر مجھے لے جانا ہے تو تھانے لے جاؤ۔"

وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا "گھبراؤ مت۔ یہ جگہ تمہارے لیے تھانے سے زیادہ "تسلی بخش" ثابت ہوگی۔"

میں نے کہا "تم لوگ منصور خاں یا سیکرٹری اعظم خاں کے ملازم نہیں ہو۔ تمہیں اپنی اس من مانی کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ نہ ہو کہ میرا اغوا تمہارے گلے میں پھندا بن کر پھنس جائے۔"

"تمہیں کسی نے اغوا نہیں کیا۔ تم تو گلگت آئے ہی نہیں ہو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا اور ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر واپس چلا گیا۔

یہ ایک سیلن زدہ بدبودار کمرا تھا۔ فرش پر دو تین انچ پانی کھڑا تھا۔ لیٹنا تو کجا یہاں بیٹھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اب رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ سردی میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے بلب کی زرد روشنی میں تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ جیکٹ کی زپ ٹوٹ چکی تھی۔ قمیص کا گریبان بھی ادھڑا ہوا تھا۔ ہونٹوں اور پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ باقی جسم پر بھی چوٹیں اور خراشیں تھیں۔ شروع میں تو محسوس نہیں ہوا تھا لیکن اب یہ چوٹیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ الٹی ہتھکڑی بندے کو بے بس کر دیتی ہے۔ یہی بے بسی اور جھنجلاہٹ مجھ پر بھی طاری تھی۔ اچانک آہنی دروازہ گڑگڑاہٹ کی آواز سے کھلا اور منصور خاں تین چار مسلح گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ شاید عیسیٰ جان کے قتل کا "انتقام" اس کی آنکھوں میں خون بن کر اتر آیا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی ایک زوردار ٹانگ میرے سینے پر جمائی۔ میں کیچڑ آلود فرش پر پھسل کر گر گیا۔ منصور خاں بھوکے درندے کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے وہ بے دریغ ٹھوکریں رسید کرتا رہا پھر ایک گارڈ کے ہاتھ سے رائفل لے کر جھپٹ پڑا۔ ساتھ ساتھ وہ اندھا دھند گالیاں بھی بک رہا تھا۔ پانی اور کیچڑ میں اس کے سفید بے داغ کپڑے برباد ہو گئے تھے لیکن اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ تین آٹو میٹک رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس حالت میں مزاحمت کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تحمل کے ساتھ یہ ضربیں اور گالیاں برداشت کی جائیں۔ منصور خاں مار مار کر ہانپ گیا تو اس نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ ان میں سے گٹھے ہوئے جسم کا خطرناک شخص آگے بڑھا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جس نے مجھے ہتھکڑی لگائی تھی۔ میں دیر سے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا' ایک دم مجھے یاد آ گیا۔ اس شخص کا تعلق پنجاب پولیس سے تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ ملزموں کی زبان کھلوانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ پولیس کے حلقوں میں اسے ارباب نامادری کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ لاہور جیل میں اپنی قید کے دوران میں' میں نے اس شخص کی بے رحمی اور گرم مزاجی کے بارے میں کئی بار سنا تھا۔ اس وقت میں نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ ایک یخ بستہ رات کو ایک ویران عمارت کے کیچڑ آلود کمرے میں خود کو اس نامہرباں شخص کے رحم و کرم پر پاؤں گا۔ وہ میری طرف بڑھا تو اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا لیکن اس بے تاثر چہرے میں چھپی ہوئی حیوانیت کا احوال لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ اپنے شکنجے میں آئے ہوئے شکار کو موت کے لیے تڑپا تڑپا کر زندہ رکھنا اس شخص کا دل پسند مشغلہ ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے اندر خوف کی ایک لہر جاگی۔ خوف اس بات کا نہیں تھا کہ یہ شخص مجھے تشدد کے شکنجے میں جکڑے گا۔ خوف اس بات کا تھا کہ اس شخص کو دیکھ کر میرے اندر جو نفرت جاگی تھی وہ میرے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھڑا دے گی اور میں خودکار رائفلوں کی موجودگی کے باوجود میں مزاحمت پر آمادہ ہو جاؤں گا۔ ظاہر ہے اگر ایسا ہو جاتا تو جانی نقصان لازمی تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ جانی نقصان میرا ہی ہوگا۔ ہتھکڑی کی وجہ سے میں بے بس تھا' اور "بے بسی" جذبات میں اکثر بڑا نقصان اٹھاتی ہے۔ اس شخص نے آتے ساتھ ہی ایک زوردار ٹھوکر میری پسلیوں میں ماری' پھر پھنکار کر بولا "اوئے ساتھی کہاں ہیں تیرے؟"

"میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی نہیں تھا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"کوئی نہیں۔" میں نے پھر کہا۔

"اچھی طرح سوچ لو۔" وہ خوف ناک انداز میں بولا "ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں اپنا بیان بدلنا پڑے گا۔"

میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ میں پانی اور کیچڑ میں سرا بور تھا لیکن جسم میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہ آگ اس شخص کے لب و لہجے نے جگائی تھی۔

"کیا کرنا چاہیے؟" یہ سوال ہتھوڑے کی طرح ذہن پر برس رہا تھا۔

ارباب نامادری نامی اس پولیس انسپکٹر نے ایک اور ٹھوکر میری پسلیوں میں لگائی۔ یہی وقت تھا جب کمرے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک پولیس مین نے اندر آ کر انسپکٹر نامادری کو سیلوٹ کیا اور بولا "سر جی! بندہ پکڑا گیا ہے۔"

"کہاں سے؟" نامادری نے پوچھا۔

"بازار سے..... شاپنگ کر رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نثار نے پہچان لیا۔"

"کہاں ہے؟"

"لے آئے ہیں جی۔ ابھی جیپ میں ہی ہے۔ یہی پوچھنے آیا ہوں کہ کہاں رکھنا ہے اسے؟"

انسپکٹر ارباب نامادری نے سوالیہ نظروں سے منصور خاں کی طرف دیکھا وہ بولا "یہیں لے آؤ حرام کے تخم کو۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا "تو تو کہتا تھا کہ تیرا کوئی ساتھی نہیں؟"

میں نے کہا "مجھے کیا پتا تم نے کسے پکڑا ہے۔"

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" منصور خاں نے مونچھیں مروڑ کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد تین مسلح افراد زریں گل کو رائفلوں کے زور پر دھکیلتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔ زریں گل اپنی اصل شکل میں نظر آ رہا تھا۔ یعنی میری طرح اس کا چہرہ بھی ریڈی میڈ میک اپ سے محروم ہو چکا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی زریں کو زور سے دھکا دیا گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا اور پھسل کر گر گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ انگارا ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی اس کے اندر والے سدھیر یا بدھ سنگھ کی روح جاگ اٹھے گی اور وہ بڑھک مار کر رائفل برداروں سے لپٹ جائے گا۔ شاید وہ ایسا کر بھی گزرتا لیکن مجھے سامنے دیکھ کر اس پر حیرت کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دو نیل نظر آ رہے تھے۔ قمیص بھی سامنے سے پھٹی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میری طرح اسے بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا ہے۔ آنکھوں کے پاس سے اس کی جلد بالکل سرخ ہو رہی تھی۔

منصور خاں نے رعب دار لہجے میں ایک پولیس اہلکار سے پوچھا "شیخ صاحب کے بارے میں کیا پتا چلا؟"

پولیس اہلکار بولا "لگتا ہے شیخ صاحب کو خطرے کی خوشبو آ گئی تھی۔ ان کی سفید گاڑی ڈاک خانے کے قریب کھڑی ملی ہے مگر شیخ صاحب کا کہیں اتا پتا نہیں۔ ان کے ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے۔ بس اڈے کے قریب ایک درمیانے درجے کا ہوٹل ہے۔ وہیں یہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔"

منصور خاں چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے مجھے اور زریں گل کو گھورتا رہا۔ تب اس نے پولیس اہلکاروں کو اشارہ کیا اور انہیں ساتھ لیتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ کمرے کا آہنی دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ پانچ دس سیکنڈ تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی' پھر خاموشی چھا گئی۔

زریں گل نے کہا "استاد صیب! آپ یہاں کیسے؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے رخسار کی چوٹ سہلا کر بولا "استاد صیب! امارے ساتھ تو عجب ڈراما ہوا ہے۔ ام ذرا بازار دیکھنے نکلا تھا....."

میں نے کہا "پہلے تو یہ بتاؤ کہ بازار دیکھنے کیوں نکلے تھے۔ میں نے منع نہیں کیا تھا؟"

"آپ نے منع فرمایا تھا لیکن ام نہیں ہوا۔ اس کا انجام آپ دیکھ رہا ہے۔ دراصل ام نے سوچا ام کون سا اپنی اصل شکل میں ہے۔ کوئی ام کو پہچان نہیں سکے گا۔ اتنے میں ایک فرنگی میم امارے پاس سے گزرا۔ پتا نہیں یہ لوگ عورت ہو کر نکر کیوں پہنتا ہے۔ ام فرنگی میم کا چال دیکھتا دیکھتا اس کے پیچھے چھوٹے بازار میں گھس گیا۔ ایک دم ایک شخص ام سے ٹکرایا۔ وہ کافی موٹا شخص تھا۔ امارا بھیجا ابل گیا۔ ام نے کہا "دیکھ کر نہیں چلتا۔" وہ بولا "ام معافی چاہتا ہے لیکن ام کو تمہارا آواز کچھ جانا پہچانا لگا ہے۔ کہیں دیکھا سنا ہے تم کو۔" ام نے بہت انکار کیا۔ یہاں تک کہہ دیا کہ ام نو دس سال کویت میں رہ کر پچھلی جمعرات کو واپس آیا ہے لیکن وہ ایک نہیں مانا پھر ایک دم تین چار آدمی اور آ گیا۔ ان میں دو پولیس والا بھی تھا۔ اب ام کو خطرے کا احساس ہوا لیکن بہت دیر ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے ایک دم ام کو دبوچ لیا۔ ام نے ایک دو کی ناک پر ٹکر مارا مگر پھر امارا حال خراب ہو گیا' ام نیچے اور وہ سب امارے اوپر۔ ام کو پتا چلا کہ ام پولیس کے گھیرے میں ہے۔ وہ ام کو بندوق کے زور پر یہاں لے آیا۔ آپ کو پتا ہے ام بندوق کے زور پر کہیں آنے جانے والا نہیں لیکن آپ کا حکم ام کو یاد تھا کہ کوئی پنگا فساد نہیں کرنا۔"

میں نے کہا "تم حکم یاد رکھنے والے ہوتے تو گھر سے ہی نہ نکلتے۔ میرا خیال ہے کہ وہ موٹا شخص تم سے اتفاقاً نہیں ٹکرایا ہوگا۔ وہ پہلے سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوگا۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے استاد صیب! امارا تو ایمان ہے جی کہ

کوئی کام بھی آپ کے لیے مشکل نہیں ہے۔ آپ ہر مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔"

"تمہاری غلط فہمی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں سب سے پہلے تمہارا حل نکالتا۔"

"ام مسئلہ نہیں ہے جناب۔ ام تو آپ کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ آپ کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہے۔"

"اچھا قربان علی! اب ذرا اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

زریں بولا "لیکن استاد صیب! ام کو یہ تو بتائیں کہ آپ یہاں کیسے پہنچا اور آپ کا یہ حالت۔ آپ تو بالکل لت پت ہو رہا ہے۔ چونٹیں بھی کافی آیا ہے۔ خدا کی قسم امارا تو خون جوش مارنے لگا ہے۔"

"خون ہوش نہیں جوش مارتا ہے۔" میں نے کہا "ویسے بات ایک ہی ہے۔ تمہارے جیسے سرپھرے کا خون جب جوش مارتا ہے تو ہوش بھی مار دیتا ہے۔"

"واہ کیا اچھا بات کیا آپ نے۔ ام کو "آگ کا دریا" کا وہ گانا یاد آ گیا، زندگی ہوش میں ہے جوش ہے ایمانوں میں۔ اے وطن ام ہے تیری شمع کے پروانوں میں۔"

زریں گل سنگین ترین حالات میں بھی مسکرانے کا فن جانتا تھا۔ اس کی موجودگی نے میرے اندر کی شدید تلخی اور جھنجلاہٹ کسی حد تک کم کر دی مگر پھر بھی اپنی بے بسی مجھے شاک گزر رہی تھی۔ میری طرح زریں بھی کمرے کے فرش پر کھڑے پانی کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس پانی کے سبب ہم مستقل کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔ بو عفونت ناک میں دم کر رہی تھی۔ زریں گل نے جلد ہی اس پانی کا کھوج لگا لیا۔ یہ پانی باتھ روم کا گٹر بند ہونے کے سبب جمع ہوا تھا۔ ٹونٹی رستی تھی۔ تھوڑا تھوڑا پانی جمع ہوتے ہوتے پورے فرش پر پھیل گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی کوشش سے زریں نے نہ صرف گٹر کھول دیا بلکہ ایک بورے کی مدد سے فرش بھی صاف کر دیا۔ ایک پرانی وضع کی پرچھتی سے دو ایک بوسیدہ لحاف زریں گل کو مل گئے تھے۔ یوں ہم اس قابل ہو گئے تھے کہ کمرے کے ایک کونے میں سمٹ کر رات گزار سکیں۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے دیکھا تو لحاف کے نیچے زنانہ استعمال کی کچھ چیزیں پڑی تھیں۔ ایک پف پاؤڈر تھا ایک لپ اسٹک دو جھمکے۔ میں یہ چیزیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ رات ہم دونوں کے سوا یہاں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ کون نہ جبیں یہاں لحاف میں رات گزار گئی تھی۔ پھر اچانک میری سمجھ میں آیا کہ یہ اشیا زریں گل کی کسی جیب سے گری ہیں۔ میں نے نیم خوابیدہ زریں کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "اوئے لکڑی کے باندر! یہ جیب میں کیا اسلحہ لیے پھرتا ہے؟"

زریں نے چونک کر زنانہ اشیا کو دیکھا پھر ذرا جھینپ گیا۔ اشیا دوبارہ جیب میں ٹھونس کر بولا "وہ... دراصل یہ امارا سامان ہے جی۔ ام نے بازار سے خریدا تھا۔"

"یعنی اب تم لپ اسٹک لگاؤ گے اور جھمکے وغیرہ پہنو گے؟"

"او استاد صیب! آپ تو مذاق فرماتا ہے۔ یہ چیزیں ام نے اپنے لیے نہیں اس کے لیے خریدا ہے۔" زریں کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"یہ اس... کون ہے؟"

"وہی اپنا کلثوم جی۔ ام نے سوچا تھا کہ اس کے لیے کوئی چیز لے جائے۔ وہ خوش ہوگا۔ ام کو کیا پتا تھا کہ سب کچھ اوپر نیچے ہو جائے گا۔ ام اپنے معشوق کے وطن روانہ ہونے کے بجائے اس کوٹھری میں آن پہنچے گا۔"

میں نے کہا "ان لوگوں نے تمہیں یہاں لانے سے پہلے تمہاری تلاشی ضرور لی ہو گی پھر یہ چیزیں کیسے بچ گئیں؟"

"بس جی حق حلال کے پیسے تھے اس لیے بچ گئیں۔"

"حق حلال کے پیسے؟" میں نے حیرت سے کہا "حق حلال کے پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

وہ سٹپٹا کر بولا "تو آپ ام کو ایسا سمجھتا ہے استاد صیب۔ ام حرام کا پیسہ کمانے والا نہیں ہے اور اپنی کلثوم کے لیے تو ام حرام کے پیسے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔" وہ ناراض نظر آنے لگا تھا۔

میں نے کہا "مذاق کرنے کا حق تمہارا ہی نہیں ہے۔ میں بھی کر سکتا ہوں۔" اچانک میری نظر لحاف کے نیچے گئی۔ وہاں پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نظر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا یہ ایک فلمی ہیرو ہیروئن کی تصویر تھی۔ ہیرو بدر منیر کو تو میں پہچانتا تھا... ہیروئن کا معلوم نہیں تھا۔ دونوں نیم دراز اور ہیجان خیز انداز میں لیٹے ہوئے تھے۔ زریں گل پر ایک بار پھر شرمندگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا "اوئے لوفر اعظم! یہ کیا ہے؟"

"تت... تصویر ہے جی۔"

"یہ تو مجھے نظر آ رہا ہے لیکن یہ تیری جیب سے کیوں نکلی ہے۔ کیا یہ بھی اپنی کلثوم کے لیے لے کر جا رہا تھا؟"

"جج... جی ہاں... نن نہیں جی۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"اوئے بالکل بچے! ایک جواب دے۔"

وہ چند لمحے تو متذبذب رہا پھر بولا "سچی بات تو یہی ہے استاد صیب کہ ام نے یہ تصویر کلثوم کے لیے لیا تھا۔"

"ماشاء اللہ... مرحبا بلکہ آفرین۔ بہت اعلیٰ خیالات پائے ہیں۔ ایک سیدھی سادی معصوم قبائلی لڑکی کو بدر منیر اور مسرت شاہین کی "ایسی" تصویریں دکھا دکھا کر "ایڈوانس" کیا جا رہا ہے۔"

زریں گل نے کانوں کو ہاتھ لگائے "یہ مسرت شاہین نہیں ہے جی... یہ تو... یاسمین خان ہے۔"

"تو یہ کون سی حاجن نمازن ہے۔ دیکھو کیسے گھسی جا رہی ہے اپنے ہیرو کی بغل میں... میں پوچھتا ہوں کہ بچوں اور بوڑھوں کو پریشان کرنے والی یہ خطرناک تصویر تو نے خریدی کیوں؟"

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور وہ واقعی پریشان تھا۔ تھوک نگل کر بولا "دراصل استاد صیب! بات یہ ہے کہ ام چاہتا ہے کہ کلثوم کو تھوڑا دنیا کا ہوا لگے۔ وہ بالکل سیدھا سادہ ہے۔ اس کو کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میاں بیوی ایک گھر میں رہتا ہے، کھانا پکاتا ہے، سوتا ہے اور پھر خود بخود بچے پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے... اتنا سادگی بھی تو ٹھیک نہیں۔ کم از کم یہ تو پتا ہونا چاہیے کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ باتیں شادی کے بعد بھی سمجھائی جا سکتی ہیں۔ تم ابھی کیوں سمجھانا چاہتے ہو۔ کہیں اسے عملی سبق دینے کا ارادہ تو نہیں۔"

"ام... سمجھا نہیں!"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ تم کیوں ہلکان ہو رہے ہو۔ جس سے اس کی شادی ہوگی وہ خود ہی سمجھا دے گا کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔"

زریں گل نے طویل آہ بھری "استاد صیب! ایسا باتیں مت کریں۔ امارا دل سینے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کہ جب تم ہوٹل سے نکلا اس وقت شیخ عاصم کدھر تھا؟"

"اس وقت تو جناب وہ کمرے میں تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا اور کھڑکی میں سے وادی کا نظارہ کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ امارے جانے کے بعد وہ بھی گھر سے نکل آیا تھا۔"

"زریں یہ جو کچھ ہو رہا ہے، بہت برا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "ان لوگوں نے ناکا پربت جا کر قبائلیوں کے خلاف کارروائی کی تو خود بھی نقصان اٹھائیں گے اور قبائلیوں کی جان بھی لیں گے۔"

زریں بھی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! امارا تو منصور صیب کے بارے میں سوچ کر کلیجا منہ کو آتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ کچھ ہو گیا تو..."

"زریں ہمیں ہر صورت یہ کوشش کرنی ہے کہ یہ لوگ قبائلیوں کے خلاف کارروائی سے باز رہیں مگر اس کوشش کے لیے ہمارا آزاد ہونا ضروری ہے... کسی بھی طرح ہمیں اس چاردیواری سے نکلنا ہوگا۔"

اچانک باتھ روم کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ میں اور زریں گل اٹھ کر باتھ روم کی طرف گئے۔ یہ پانچ ضرب دس فٹ کا ایک غلیظ سا باتھ روم تھا۔ باتھ روم کی ایک دیوار میں قریباً دس انچ بائی چار انچ کا ایک چھوٹا سا جھروکا نظر آ رہا تھا۔ اس جھروکے کو آہنی پلیٹ سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ پہلے جب ہم نے دیکھا تھا تو پلیٹ جھروکے کے آگے تھی لیکن اب پلیٹ ہٹی ہوئی تھی۔ باہر سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ جھروکے میں سے ایک شخص کی بڑی بڑی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس شخص نے سلوا اندر

کی ایک لمبوتری ٹرے خلا میں سے اندر پہنچا دی۔ ٹرے میں ہمارا ناشتا تھا۔ میرے ہاتھ میں تو ہتھکڑی تھی۔ زریں نے آگے بڑھ کر ناشتا وصول کیا۔ غلیظ باتھ روم کے اندر سے ناشتا وصول کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لگا۔ بہرحال اعتراض کی گنجائش کہاں تھی۔ ایک لفظ کہے سنے بغیر ناشتا پہنچانے والے نے سلائیڈنگ پلیٹ کو حرکت دے کر جھروکا بند کر دیا۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ ٹرے میں انڈے اور روٹی کے علاوہ گلاس وغیرہ بھی تھے۔ ایک لمبی سی چابی بھی ٹرے میں موجود تھی۔ یقیناً یہ میری ہتھکڑی کی چابی تھی۔ معمولی کوشش کے بعد زریں گل نے میری ہتھکڑی کھول دی اور میں اس قابل ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے ناشتا کر سکوں۔ ٹرے ہمارے سامنے تھی لیکن ہم جھجک رہے تھے۔ کیا کہا جا سکتا تھا کہ اس ناشتے میں کیا ہے۔ خواب آور دوا، بے ہوشی کی دوا، اعصاب شکن دوا یا پھر زہر وغیرہ۔ سو طرح کے امکانات تھے۔ بے ذائقہ اور بے رنگ دواؤں کی موجودگی کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے موقع پر سب کچھ قدرت کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔

ابھی ہم نے بمشکل ناشتا ہی کیا تھا کہ دو تین گاڑیاں یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوئیں۔ بھاری انجنوں کی آواز عمارت کے اس اندرونی حصے تک واضح سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ وہی گاڑیاں تھیں جو میں نے کل رات احاطے میں کھڑی دیکھی تھیں پھر ایک دو چھوٹی گاڑیاں بھی اسٹارٹ ہوئیں اور ان کے ہارن وغیرہ سنائی دیے۔ عمارت کے طول و عرض میں ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک تشویش ناک خیال آیا۔ کہیں یہ لوگ اس عمارت سے اپنی مہم پر تو روانہ نہیں ہو رہے تھے۔ شاید ایسی ہی بات تھی ورنہ ایک ساتھ ان لوگوں کو کہاں جانا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہو گئی جیسے کوئی بہرا شخص کسی آفت کو دیکھ لے اور لوگوں کو اس آفت سے خبردار کرنا چاہے لیکن معذوری کے سبب کر نہ سکے۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا، میں باتھ روم میں داخل ہو گیا اور اس خلا کی آہنی پلیٹ کو زور زور سے بجانے لگا جس میں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں ناشتا ملا تھا۔ ساتھ ساتھ میں بلند آواز میں پہرے دار کو پکارنے بھی لگا۔ میری کوشش نتیجہ خیز رہی۔ چند سیکنڈ بعد آہنی پلیٹ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور پہرے دار کی نامہربان آنکھیں نظر آئیں "کیا تکلیف ہے؟" پھنکار کر پوچھا گیا۔

میں نے کہا "منصور صاحب کہاں ہیں؟"

"کون منصور صاحب؟"

"منصور علی خاں صاحب۔"

"اچھا نسٹر صیب! وہ کسی کام کو جاتی ہے۔ تو چپ! تم نے ان سے کیا بولنا ہے؟"

"بہت ضروری بات ہے۔ اگر وہ میری بات سنے بغیر چلے گئے تو ان کا بہت نقصان ہوگا۔"

"وہ اپنا نفع نقصان خوب اچھی طرح جانتی ہے۔ تم کو زیادہ پنگا لینے کا ضرورت نہیں ہے۔"

"دیکھو اگر منسٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے ان سے ملنے کو کہا تھا اور تم نے ملانے سے انکار کیا تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

وہ ایک لمحے کو تذبذب میں نظر آیا لیکن پھر وہی ہٹ دھرمی اس پر طاری ہوگئی "اوئے خانہ خراب کا بچہ! زیادہ ہوشیاری ہوشیاری مت دکھاؤ۔ ام سب جانتا ہے کہ منسٹر کس بات پر ناراض ہوتی ہے اور کس پر ترتی۔"

میں نے زریں گل کو اشارے سے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے پختون بھائی سے اپنی زبان میں بات کرے۔

میری اجازت ملتے ہی زریں گل پہرے دار کے روبرو پہنچا اور پشتو کا دریا بہا دیا۔ دوسری طرف سے بھی پشتو میں جوابات ملنے شروع ہوگئے۔ تین چار منٹ کی یہ دھواں دھار گفتگو بہت مفید ثابت ہوئی۔ پہرے دار چلا گیا تو زریں نے بتایا کہ بات بن گئی ہے۔ پہرے دار ہمارا پیغام منسٹر منصور خاں تک لے گیا ہے۔ اب منسٹر صاحب آتا ہے یا نہیں یہ ہماری قسمت ہے۔

نتیجہ ہمارے حق میں نکلا۔ تین چار منٹ بعد منصور خاں مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بجائے وہ سلاخ دار کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ وہ سیاہ پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ گلے میں سرخ رنگ کا اسکارف تھا اور آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک۔۔۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورنے کے بعد بولا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "بات وہی ہے جو میں کل بھی تم سے کہہ چکا ہوں۔ تم لوگ اس کو اہمیت نہیں دے رہے ہو لیکن یہ رویہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔۔۔ دیکھو منسٹر صاحب! میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنو۔ تم ایک بالکل نامعلوم علاقے میں جا رہے ہو۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں وہاں کیا حالات پیش آسکتے ہیں۔ مہتاب بیگم کے جس بھائی کو تم نے رہنما بنایا ہے وہ خود وہاں ایک چوہے کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے نکالنے والا میں ہوں۔ میں تمہیں اس سے سو گنا بہتر مشورہ دے سکتا ہوں اور میرا مشورہ یہی ہے کہ یوں جلد بازی میں ادھر کا رخ مت کرو۔ یہ بہت اطمینان سے سوچ سمجھ کر کرنے والا کام ہے۔"

"ہم بہت اطمینان سے سوچ سمجھ کر ہی کریں گے۔" منصور خاں بھاری بھرکم آواز میں بولا "تم ہماری فکر میں دبلا ہونے کی کوشش نہ کرو۔"

"یعنی تم اپنی مرضی کر کے رہو گے؟"

"یہ صرف میری مرضی نہیں ہے۔ اعلیٰ سطح پر اس کا فیصلہ ہوا ہے اور دوسری بات یہ کہ تم اپنا لب و لہجہ ٹھیک کرو۔ غالباً اپنے بارے میں کافی خوش فہمیاں ہیں تمہیں۔" وہ ایک دم بھڑک گیا "کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو۔۔۔ بہت بڑے تیس مار خاں ہو تم۔ یعنی جو تم نے کہہ دیا وہ حرف آخر ہوگیا۔ آئی تھنک یو آر اے سوئیم فول۔ تم دیکھو گے کہ ہم اپنا مقصد کس طرح حاصل کرتے ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ انسپکٹر تاتاری اس وقت تک تمہیں زندہ رہنے دے گا۔"

منصور خاں کے آخری الفاظ ایک خطرناک دھمکی سے مشابہ تھے۔ میں نے بولنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن وہ اس سے پہلے ہی پاؤں پٹختا ہوا واپس جا چکا تھا۔ اس کی چال میں منسٹری کی شان و شوکت کے علاوہ بلا مقابلہ منتخب ہونے والے ایم پی اے کی نخوت بھی شامل تھی۔

"منسٹر صاحب! میں پھر کہہ رہا ہوں کہ ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔" میں نے پکار کر کہا۔

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی منصور خاں ایک محرابی دروازے کے پیچھے اوجھل ہو چکا تھا۔ میری آواز بلند چھتوں والی عمارت میں گونج کر رہ گئی تھی۔ میری جھنجلاہٹ انتہا کو چھونے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔۔۔ نڈھال سا ہو کر میں فرش پر بیٹھ گیا۔ احاطے کی طرف گاڑیوں کے انجن مسلسل شور مچا رہے تھے پھر اندازہ ہوا کہ گاڑیاں احاطے سے باہر نکل رہی ہیں۔ چار پانچ منٹ بعد عمارت میں اور عمارت کے اردگرد مکمل خاموشی چھا گئی۔ میں نہ جانے کب تک اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ زریں گل ادھر ادھر کی باتیں کر کے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیخ عاصم نچلا نہیں بیٹھے گا۔ وہ اثر و رسوخ اور وسائل والا شخص ہے۔ وہ ہر صورت ہمیں تلاش کرائے گا اور عین ممکن ہے کہ اس سلسلے میں وہ اپنے خطرناک ترین مہرے کو بھی استعمال کرے۔ زریں گل کی مراد شیطان ابن شیطان 'شنکر شکرا' سے تھی۔ سری لنکا میں قیام کے دوران میں ہی شیخ عاصم نے شنکر شکرا کی خدمات حاصل کرلی تھیں اور شنکر اس کا اہم ترین ہرکارہ بن گیا تھا۔

زریں گل کا اندازہ درست تھا۔ یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ ہماری تلاش کے سلسلے میں شیخ عاصم 'شنکر شکرا' کو میدان میں لے آئے۔ وہ شخص ناممکنات کو ممکن کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اسے جاننے والے یقین رکھتے تھے کہ وہ کٹھن ترین حالات میں بھی اپنی صلاحیت دکھا سکتا ہے مگر یہ سب تو تب ہوتا اگر شیخ عاصم واقعی مجھے تلاش کرانا چاہتا۔ ابھی تک میں شیخ عاصم کے بدلے ہوئے رویے کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔ شیخ عاصم میری اور اپنی دشمنی دفن کرنے کی باتیں کر رہا تھا لیکن حقیقت کیا تھی اس کا فیصلہ وقت ہی کر سکتا تھا۔

○☆○

اگلے چار پانچ روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ عمارت میں موجود لوگ چند ایک کے سوا یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ تاہم کسی وقت احاطے میں ایک دو

گاڑیوں کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ باتھ روم کی دیوار میں واقع چھوٹے سے خلا کے ذریعے ہمیں نیم وقت کھانا مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بیرونی دنیا سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان در و دیوار سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ موسم تو دور کی بات ہے، رات دن کا اندازہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا تھا۔ میری اور زریں کی چوٹیں مرہم پٹی کے بغیر ہی آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی تھیں۔ انسپکٹر تاتاری آسیب کی طرح ہمارے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ اصل میں "ارباب تاری" تھا لیکن اپنی تعصبات کی وجہ سے ارباب تاتاری کہلوانے لگا تھا۔

زریں گل کوشش کر رہا تھا کہ کھانا لانے والے پختون پہرے دار کو پشتو والی کے حوالے سے اپنے قریب کرلے مگر ابھی تک اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ زریں گل میرے اندر موڈ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ کوشش میں لگا رہتا تھا کہ میرا دھیان بٹائے یا مجھے ہنسانے کی کوشش کرے۔ کبھی وہ اپنے دادا مرحوم کا کوئی واقعہ سنانے لگتا۔ اس کا دادا ہرفن مولا تھا اور اس نے بے شمار طرح کے کام کیے تھے، ان میں کاروبار عشق بھی شامل تھا۔ کبھی زریں کسی فلم کی اسٹوری لے کر بیٹھ جاتا۔ بعض فلموں کا ایک ایک مکالمہ اسے یاد تھا۔ خاص طور پر دیا کی فلموں کو تو اس نے درجنوں بار دیکھا تھا۔

ایک رات میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن باتھ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور زریں گل باتھ روم میں تھا۔ اندر سے کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں کافی دیر انتظار کرتا رہا لیکن زریں گل باہر نہیں نکلا۔ میں نے دیکھنا چاہا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ابھی میں نے کمرے کی لائٹ جلائی ہی تھی کہ زریں گل خود ہی باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔

میں نے پوچھا "اوئے! کیا کر رہے تھے اندر؟"

"کک۔۔۔ کچھ نہیں استاد صیب۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بالکل جناب۔"

"تو پھر اتنی دیر کہیں مجھ سے چھپ کر بدر منیر والی تصویر تو نہیں دیکھ رہے تھے۔"

وہ ہنس دیا "نہیں جناب! اب ایسی بھی بات نہیں۔ تصویر تو ام آپ کے سامنے بھی دیکھ سکتا ہے۔ ام کو پتا ہے آپ ام کو کچھ نہیں کہے گا۔ آخر بالغ ہے ام۔"

"اوئے تو پھر کیوں جاگ رہے ہو؟"

"وہ دراصل۔۔۔ گڑبڑ ہو گیا تھا جناب! ام نے سوچا آپ بے آرام نہ ہوں۔"

میں نے فرش کی طرف دیکھا۔ واقعی توقع سے زیادہ فرش گیلا ہو رہا تھا۔ پانی میرے بستر کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد واپس گیا تھا۔ زریں گل نے مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا اور خود ہی کوشش کر کے گٹر کھولا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ایک بازو کہنی سے اوپر تک گیلا تھا اور خراشیں صاف نظر آرہی تھیں۔ میرے دل میں بے اختیار زریں کے لیے محبت کے جذبات امڈ آئے۔ وہ ایک جاں نثار ساتھی تھا اور اب تک ہر قدم پر اس نے اپنی افادیت ثابت کی تھی۔

میں نے کہا "زریں گل مجھے جگا دیا ہوتا۔"

"استاد صیب! آپ کیسی باتیں کرتا ہے۔ زریں کے ہوتے ہوئے آپ کے آرام میں خلل پڑے تو لعنت ہے زریں پر۔"

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "یار! تمہیں کیا ملتا ہے میرے ساتھ رہ کر۔ میری تو قسمت ہی میں دربدر بھٹکنا ہے۔ تم کیوں ہر وقت میری مصیبتوں میں حصے دار بنے رہتے ہو۔"

وہ اطمینان سے بولا "آپ کا خیال ہے کہ ڈیڑھ سو کروڑ روپے کا خزانہ آپ اکیلا ہی ہضم کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ ام ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔"

میں نے کہا "زریں گل! میں جانتا ہوں تو لالچی نہیں ہے۔ اس دولت کی حیثیت تیرے نزدیک ایک تنکے کے برابر بھی نہیں۔"

"یہ آپ کا وہم ہے جناب! اور وہم کا علاج۔۔۔ وہم کا علاج تو امارے دادا کے پاس بھی نہیں تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ باتھ روم میں گھس گیا۔ غالباً ہاتھ وغیرہ دھونے گیا تھا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور اس سر پھرے شخص کے بارے میں سوچتا رہا۔ جس کا نام زریں گل تھا اور جو اپنے ہر رشتے ناتے سے منہ موڑ کر میرا سایہ بنا ہوا تھا۔ ہر وقت میرے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔

اندر سے زریں گل کی آواز آئی "استاد صیب! سونا نہیں۔ ام آپ کو ابھی ایک خاص بات بتاتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ جاگ رہا ہوں۔"

چند منٹ بعد زریں گل میرے قریب آ بیٹھا اور بولا "استاد صیب! ام جو سرخی پاؤڈر کلثوم کے لیے لایا تھا اس کا ام نے بہت اچھا استعمال کیا ہے۔"

میں نے کہا "اس کال کوٹھری میں اس کا اچھا استعمال کیا ہو سکتا ہے۔"

"خو چہ! اچھا استعمال کال کوٹھری کے اندر نہیں باہر کیا ہے ام نے۔۔۔ ام نے وہ سارا سامان 'دستور خاں' کو دے دیا ہے اس کی بیوی کے لیے۔ اس کا نیا نیا شادی ہوا ہے نا۔"

"یہ دستور خاں کون ہے؟"

"وہی جناب! جو ام دونوں کے لیے کھانا لاتا ہے۔ اب اس کے ساتھ امارا تھوڑا تھوڑا یاری ہو گیا ہے۔ اس نے آج ام کو کئی باتیں بتایا ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے جب آپ سو رہا تھا ام اس سے باتیں کر رہا تھا۔ دستور خاں نے ام کو بتایا ہے کہ یہ عمارت اب

تقریباً خالی پڑا ہے۔ ایک تھانے دار ایک حوالدار اور چار پانچ قبائلی محافظوں کے سوا اب یہاں اور کوئی نہیں لیکن یہ سب بڑا سخت گیر لوگ ہے۔ وہ ہر وقت چوکس اور چوکنا رہتا ہے۔ امارا خیال ہے کہ دستور خاں نے اس تھانیدار کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں آپ فرماتا ہے کہ وہ چنگیز خاں کا سالا ہے۔"

میں نے پوچھا "دستور خاں کا کیا خیال ہے۔ کیا یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جاسکتی ہے؟"

زریں بولا "ابھی دستور خاں سے امارا اتنا بے تکلفی نہیں ہوا لیکن اس کی باتوں سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ وہ ام سے پوچھ رہا تھا کہ کیا باہر تمہارا کوئی ساتھی لوگ نہیں ہے۔ شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ باہر سے آنے والی مدد کے بغیر امارا یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ یہاں سے نکلنے میں کسی طرح ہماری مدد کرسکتا ہے؟"

"ام ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔ ویسے اگر وہ ام سے بے تکلف ہوجائے تو اس سلسلے میں بات کیا جاسکتا ہے۔۔۔ ام نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا ام کو کوئی اخبار وغیرہ مل سکتا ہے۔ وہ بولا 'اخبار تو نہیں مل سکتا لیکن ام کوشش کرے گا۔"

کچھ دیر ہم لحاف لپیٹے بیٹھے رہے اور دستور خاں کے سلسلے میں باتیں کرتے رہے۔ اس چار دیواری سے باہر یقیناً رات کا اندھیرا تھا' سردی تھی اور جنگل کی بیابانی تھی۔ کبھی کبھی کسی نامعلوم جانور کی دور افتادہ آواز بھی ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ میرا دھیان ایک بار پھر شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ شیخ عاصم اگر ہمیں تلاش کرنا چاہتا تو اس کے لیے بہت آسانی پیدا ہوسکتی تھی۔ میرے جسم میں موجود الیکٹرانک آلے کا تعلق شیخ کی رسٹ واچ سے تھا۔ دس کلو میٹر کے دائرے میں' میں جہاں بھی ہوتا' شیخ عاصم کو علم ہوسکتا تھا۔ یعنی وہ میری تلاش میں نکلتا تو اس کی آنکھ دس کلو میٹر کے دائرے میں دیکھ سکتی تھی۔ معلوم نہیں وہ اس آنکھ کو استعمال میں لا بھی رہا تھا یا نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ گلگت میں ہے یا لاہور واپس جاچکا ہے۔

اگلے روز حسب معمول آٹھ بجے کے قریب ہمیں ناشتا پہنچایا گیا۔ ناشتا عمدہ اور وافر ہوتا تھا۔ یقیناً یہاں موجود پولیس والے اور دیگر گارڈز خوش خوراک واقع ہوئے تھے۔ ہاف فرائی انڈے' مکھن' چائے اور پہاڑی طرز کی نمکین خمیری روٹی ناشتے میں موجود تھی۔ اچانک میری نگاہ ٹرے میں پڑی۔ ٹرے میں ناشتے کے نیچے اخبار کا ایک ورق تہ کرکے بچھایا گیا تھا۔ میں نے دیکھا' یہ ایک دن پہلے کا اخبار تھا۔ دستور خاں نے زریں سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا تھا۔ بے شک یہ ایک ورق ہی تھا لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔ سیاسی خبریں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں' میں نے پورا ورق دیکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے میں پھر ٹرے میں ایک ورق بچھا ہوا تھا۔ یہ بھی کل ہی کے اخبار کا تھا۔ دونوں ٹکڑوں کو ملا کر چار صفحے مکمل ہوگئے۔ دوپہر کو ملنے والے ورق میں ایک خبر ہمارے مطلب کی موجود تھی۔ یہ چھوٹی سی خبر تھی۔ لکھا تھا "امارات کے شیخ کو ابھی تک اپنے گمشدہ ساتھیوں کی تلاش ہے۔ یاد رہے کہ یہ دونوں افراد قریباً ایک ہفتہ قبل شیخ کے ساتھ نجی سیاحت پر گلگت آئے تھے۔ نو تاریخ کی شام وہ بازار گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ انہیں کسی جرائم پیشہ گروہ نے تاوان کے لیے اغوا کرلیا ہے۔ تاہم ابھی تک تاوان کے سلسلے میں کسی نے رابطہ قائم نہیں کیا ہے۔ دوسری طرف ایک نامعلوم شخص نے پولیس کو اطلاع دی ہے کہ نو تاریخ کی رات آٹھ بجے کے قریب ہوٹل "لگژری" کے اندر سے سفید پوش پولیس اہلکاروں نے کسی شخص کو گرفتار کیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ شخص گمشدہ افراد میں سے ہو۔"

یہ خبر بیرونی حالات کی ایک دھندلی سی تصویر ہی دکھا سکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اگر دستور خاں کے ساتھ زریں کا رابطہ برقرار رہا تو ہمیں باہر سے مزید خبریں بھی ملیں گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں سے جلدی رہائی کی کوئی صورت بھی نکل آتی لیکن تین چار روز بعد ہی یہ سارے امکانات ایک دم ختم ہوگئے۔ دستور خاں کو تبدیل کروا دیا گیا اور اس کی جگہ سرخ انگارا آنکھوں والا ایک کرخت چہرہ بنگش ہمیں کھانا پہنچانے کا کام انجام دینے لگا۔ یہ شخص بالکل خاموش رہتا تھا۔ جہاں دس لفظ بولنے کی ضرورت ہوتی تھی وہاں صرف ایک لفظ سے کام چلاتا تھا۔ دستور خاں نجانے کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔

روز و شب ایک ہی ڈگر پر آگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ ہماری کال کوٹھری کے اردگرد ویرانی اور خاموشی کا راج رہتا۔ میں اور زریں گل سرِ شام ہی لحافوں میں لپٹ کر سوجاتے۔ سرد طویل رات ختم ہونے میں نہ آتی اور صبح سویرے ہی آنکھ کھل جاتی۔ ناشتے سے پہلے میں ہلکی پھلکی ورزش کرتا۔ ناشتے کے بعد ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ باتوں سے اکتا جاتے تو لیٹ جاتے۔ لیٹنے سے تھک جاتے تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ الیکٹرانک ذرائع سے تعلق رکھنے والی رسٹ واچ بدستور میری کلائی پر تھی۔ بہرحال اس چار دیواری میں' میں اس گھڑی سے ٹائم دیکھنے کے علاوہ اور کیا کام لے سکتا تھا۔

کبھی کبھی غزالہ کا خیال میرے ذہن میں آتا اور مجھے یہ سوچ کر اطمینان ہوتا کہ میں ایک بہت بڑی غلطی کرتے کرتے بچ گیا ہوں.... وہ ایک سنگین غلطی ہی تو تھی جو میں کرنے جارہا تھا۔ برسوں کی خاموشی توڑ کر میں غزالہ کو یہ بتانے جارہا تھا کہ میں آج بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ آج بھی ہر پل مجھے اس کا خیال رہتا ہے۔ اگر میں یہ بات کہہ دیتا تو وہ پہلے سے بھی دکھی ہوجاتی کیونکہ غزالہ اس انداز میں نہیں سوچ رہی تھی جس انداز میں' میں نے سوچا تھا۔ وہ

شیخ عاصم کی تمام تر خامیوں کے باوجود ایک شوہر کی حیثیت سے اسے قبول کرچکی تھی۔ ان کے درمیان جو خلیج حائل ہوئی تھی وہ وقتی تھی۔ اب وہ پھر ایک تھے۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ان کی زندگی کو درہم برہم کروں۔ بہت دکھ برداشت کرچکی تھی غزالہ۔ اب اسے سکھ کی ضرورت تھی۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب اس پر کبھی اپنا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔ جو پردہ برسوں سے میرے اور غزالہ کے درمیان حائل تھا اسے برقرار رکھنے میں ہی ہماری بھلائی تھی۔ وہ دور بھی تھی تو کیا ہوا۔ وہ میرے تصورات میں تو میرے قریب تھی۔ ہر صبح اس کا خیال اجالے کے ساتھ میرے سرہانے اترتا تھا اور میرے بالوں میں انگلیاں چلاتا تھا' ہر رات وہ اپنی حسین آنکھوں سے مجھے شب بخیر کہتی تھی۔ بس اتنا ہی بہت تھا۔۔۔ ہاں اتنا ہی بہت تھا۔

دو مہینے ہم نے اسی زنداں میں بند ہوکر گزار دیے۔ اردگرد کی دنیا سے ہم بالکل کٹے ہوئے تھے۔ باہر کے حالات کی ہوا تک ہمیں نہیں لگی تھی۔ اس دوران میں موسم نمایاں طور پر تبدیل ہوچکا تھا۔ رات کو خنکی ہوتی تھی لیکن دن کے وقت درجۂ حرارت ٹھیک ہی رہتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا' اپنی بے خبری میرے لیے تکلیف دہ ہوتی جارہی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہوا ہے۔ مسٹر منصور خاں اور اسلام آباد کے بیوروکریٹس کی مہم کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ صفدر اور جون چاؤل وغیرہ پر کیا بیتی ہے۔ ساجی صاحب کہاں اور کس حال میں ہیں؟

میں نے اور زریں گل نے اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کے بارے میں بہت سوچا تھا لیکن یہ سوچیں ایک دائرے میں ہی گھوم کر رہ گئی تھیں۔ آہنی دروازے اور سلاخ دار کھڑکی کے سوا اس کمرے میں کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ تقدیر کی طرح اٹل اور ناقابلِ شکست تھیں۔ زندگی کی کچھ حقیقتیں ایسی ہی لاچار کرنے والی ہوتی ہیں۔

وہ ایک نیم گرم دوپہر تھی۔ زریں گل کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ رات کو کمرے میں کیڑے رینگتے دیکھے تھے' کوئی ایسا ہی رینگنے والا دشمن اسے کاٹ گیا تھا۔ جسم پر دو تین جگہ سرخی تھی اور بخار ہوگیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے دیوار سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ گاہے گاہے وہ لمبی سی آہ بھرتا تھا۔ لگتا تھا کہ پورے کمرے کی آکسیجن ایک ہی آہ میں خرچ کرڈالے گا۔

میں نے کہا "اوئے زریں کے بچے! یہ کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ نہیں استاد صیب! ام مزہ لے رہا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"بخار کا۔"

"اوئے بادر! بخار بھی مزہ لینے والی چیز ہے؟"

"ام کو آرہا ہے نی مزہ۔ جب سردی لگ کر بخار چڑھتا ہے' انگڑائیاں سی آتی ہیں اور بدن ٹوٹتا ہے تو عجیب طرح کا سرور پیدا ہوجاتا ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے دماغ کے پیچ ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ بیماری بھی مزہ لینے والی چیز ہے بھلا۔"

وہ بولا "استاد صیب! آپ امارا محاسبات (نفسیات) کو سمجھتا ہی نہیں۔ آپ کی موجودگی میں امارے دل کا موسم ایک دم بدل جاتا ہے۔ مزہ دینے والا چیز تو مزہ دیتا ہی ہے' تکلیف دینے والا چیز بھی مزہ دیتا ہے۔ حالانکہ یہ قید تکلیف دینے والا چیز ہے لیکن ام آپ کے ساتھ ہنسی خوشی یہ قید جھیل سکتا ہے۔ بلکہ شاید اگر ام چھوٹ جائے تو امارا دل میلا ہوجائے اور ام یہ گانا گانے پر مجبور ہوجائے گا "قید مانگا تھا' رہائی تو نہیں مانگا تھا۔ ام نے اپنے استاد صیب سے جدائی تو نہیں مانگا تھا۔"

میں نے ایک ٹھوکر اس کے کولہے پر رسید کی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے بولا "نہ استاد صیب! اگر آپ کو برا لگا ہے تو ام اپنا گانا' میرا مطلب ہے اپنا الفاظ واپس لیتا ہے۔"

میں نے کہا "الفاظ بھی واپس لو اور خود بھی واپس ہو۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ تمہاری نحوست کی وجہ سے ہی ہم ابھی تک یہاں سے نکل نہیں سکے۔ اوئے بادر! اگر یہاں سے نکلنے کی سبیل نہیں کرسکتا تو کم از کم اپنی سوچ تو نکلنے کی رکھ۔"

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "آپ کا بات تو ٹھیک ہے استاد صیب لیکن ام نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ ام مختصر ترین الفاظ میں بس یہ کہے گا۔ دل دل پیار دیا رام کیا جانے رے.... جانے تو جانے بس اتنا کہ ام تجھے اپنا جانے رے۔"

اچانک دروازے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ دو مہینے میں دوسری یا تیسری مرتبہ کوئی فرد دروازے کی طرف سے ہمارے کمرے میں آرہا تھا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید انسپکٹر ارباب تاتاری کسی بہشتی کو لے کر آیا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی وہ باتھ روم کا بند گٹر کھولنے کے لیے ایک بہشتی کو یہاں لاچکا تھا۔ وہ خود ناک تان کر باہر کھڑا رہا تھا اور بہشتی کو اندر داخل کیا تھا.... اب پھر دو دن سے گٹر بند تھا۔ میرے ذہن میں قدرتی طور پر بہشتی کا خیال آیا لیکن جو شخص ہمارے کمرے کے سامنے نمودار ہوا وہ بہشتی تھا اور نہ انسپکٹر تاتاری۔ یعنی نہ بہشتی نہ جہنمی۔ وہ شخص سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل تھے۔ ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا مجھے دور ہی سے نظر آگیا۔ سفاری سوٹ والا بظاہر سخت گیر نظر آتا تھا لیکن وہ بڑے ملائم لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"شاہ جہاں صاحب! میرا نام نشرت ہے۔ میں درجۂ اول مجسٹریٹ ہوں۔ میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی بلڈنگ میں کچھ لوگ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

اس نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر آہنی دروازے کا منحوس قفل کھول دیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی ہمیں اس نیم تاریک قفس سے نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ زریں گل سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں لیکن یہ رائفلیں ان کے کندھوں سے لٹک رہی تھیں۔ جس شخص نے خود کو مجسٹریٹ کہا تھا وہ بھی شائستہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ہم اپنے قید خانے سے نکل کر ایک طویل برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کی دونوں جانب بلند و بالا محرابی دروازے تھے۔ ایک ایسے ہی دروازے سے گزر کر ہم کھلی جگہ پر آ گئے۔ دو مہینے بعد آسمان دیکھا، سنہری دھوپ دیکھی اور تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے۔ یہ ساری چیزیں ہر وقت ہمیں میسر رہتی ہیں لیکن ہم ان کی قدر و قیمت سے اس وقت آگاہ ہو پاتے ہیں جب کچھ عرصہ ان سے محروم رہتے ہیں۔ دھوپ میں نکل کر آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔ زریں گل کے سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے۔ یقیناً میرا حال بھی ایسا ہی تھا۔ دونوں کے لباس انتہائی خستہ ہو چکے تھے۔ چالیس پچاس قدم چل کر ہم ایک راہداری میں پہنچے۔ عمارت کا یہ حصہ صاف ستھرا اور رہائش کے قابل تھا۔ راہداری کی دونوں جانب کمرے تھے۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں نہانے دھونے کی سہولت موجود تھی۔ ایک وارڈ روب میں بہت سے مردانہ لباس اور جوتے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرے میں ایک حجام بھی موجود تھا۔ مجسٹریٹ نے کہا "آپ حجامت بنوانا چاہیں تو بنوا لیں۔ یہ سامنے باتھ روم ہے۔ اس الماری میں آپ کے سائز کے کپڑے موجود ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آدھ گھنٹے تک تیار ہو جائیں۔"

"ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا "ہم اب گند میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ نہا کر بھی ہمارے جسم سے گندگی کی بو آتی رہے گی۔"

مجسٹریٹ بولا "آپ جو بھی شکوہ شکایت کریں گے درست ہوگا لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے آپ اپنا حلیہ ٹھیک کر لیں۔"

حجام نے ہم دونوں کی خواہش کے مطابق بال کاٹ دیے۔ نہانے اور کپڑے وغیرہ بدلنے میں ہمیں آدھ گھنٹا مزید لگ گیا۔ جونہی ہم تیار ہوئے، مجسٹریٹ صاحب کانسٹیبلوں کے ساتھ آ دھمکے۔ چند قدم راہداری میں چلانے کے بعد ہمیں ایک اور کمرے میں لایا گیا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کمرے میں مجتبیٰ کنور بڑے اطمینان سے ایک طویل صوفے پر بیٹھا تھا۔ تین اور افراد بھی کمرے میں موجود تھے۔ ان میں ایک تو کوئی ڈاکٹر تھا۔ دوسرے دو شکل و صورت سے سول افسر نظر آتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک خوبرو لڑکی بھی موجود تھی۔ اس کے بال شہد رنگ تھے۔ عمر تقریباً بائیس تئیس سال رہی ہوگی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ لڑکی کے ہاتھ اور بازو چرمی پٹیوں STRAPS میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بار بار جھٹکا رہی تھی جیسے چرمی پٹیوں کی گرفت سے نکلنا چاہتی ہو لیکن وہ منہ سے کچھ بول نہیں رہی تھی۔ اس کے ہونٹ مضبوطی سے بند تھے اور آنکھیں جیسے کہیں دور بہت دور خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ لڑکی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔

مجھے دیکھ کر مجتبیٰ کنور بے تابانہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بانہیں کھولیں اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کی گرفت میں گرم جوشی اور اپنائیت تھی۔ میرے بعد اس نے زریں گل کو گلے سے لگایا اور اس کی پیٹھ تھپکی۔

میں نے کہا "میں یہ سب کیا دیکھ رہا ہوں مجتبیٰ صاحب؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے شاہ جہاں۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا "میں ابھی تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتاتا ہوں۔" پھر وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ دیر سنسنی خیز نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا "اس لڑکی کو پہچانتے ہو شاہ جہاں؟"

میں نے کہا "شکل تو کچھ جانی سی لگتی ہے۔ شاید کہیں اخبار میں تصویر وغیرہ دیکھی ہے۔"

مجتبیٰ کنور بولا "یہ مشہور صنعت کار اعجاز رائے کی بیٹی نائلہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے صوبائی وزیر منصور خاں کے ساتھ اس کا نام اخباروں میں آتا رہا ہے۔ اب سات آٹھ ماہ سے نائلہ 'مسز نائلہ منصور' بن چکی تھی۔"

مجھے کچھ یاد آیا۔ شاید ایک آدھ بار میں نے اس بارے میں خبر پڑھی تھی۔ سرحد کے ایک بااثر شخص کے ساتھ ایک صنعت کار کی بیٹی کا افیئر چلا تھا اور وہ اس کی دوسری بیوی بن گئی تھی۔ میں نے پوچھا "اس لڑکی کو ہوا کیا ہے؟"

مجتبیٰ کنور بولا "یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ شاید تمہیں یہ سن کر دھچکا لگے کہ منسٹر منصور خاں اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا۔ دو ماہ پہلے منصور خاں ہمیں اس عمارت میں پابجولاں کر کے گیا تھا اور اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ جس کام کو میں مشکل کہہ رہا ہوں وہ با آسانی انجام پا جائے گا اور میں اگر زندہ رہا تو اس سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

مجتبیٰ کنور نے کہا "منسٹر کی لاش تقریباً آٹھ دن پہلے کھجال سے پچاس میل آگے ایک [illegible] کے پاس سے ملی ہے۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔"

"تاں گلوا!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اور باقی لوگ؟"

"باقی لوگوں کے بارے میں بھی میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔" مجتبیٰ کنور نے کہا "فی الحال میں اس لڑکی کے بارے میں تم سے کچھ

اپنے وقت کا ایک مشہور سلسلہ اب کتابی شکل میں

بساط

ایم اے راحت

ایک ایسے شوریدہ سر کی داستان جس نے معاشرے کو انسان نما درندوں سے پاک کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔

عدالتی کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں سے اٹھکیلیاں کرنے والے سچ کے متلاشی کی داستان

قیمت مکمل سیٹ -/۲۰۰ ——— ڈاک خرچ -/۲۵

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز

پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ لڑکی دس روز پہلے کچھ مقامی لوگوں کو نہایت بری حالت میں ملی ہے۔ اس کی دماغی حالت اب تک ٹھیک نظر نہیں آتی۔ اس وقت بھی ایسی ہی تھی۔ اسے گلگت میں لایا گیا تھا۔ پولیس اہلکاروں نے پہچان لیا کہ یہ مسٹر منصور خاں کی اہلیہ ہے۔ اس کی دستیابی کے بعد ہی منصور خاں کی تلاش شروع ہوئی تھی اور اس کی لاش بازیاب کی گئی تھی۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ منصور خاں اپنی اہلیہ کے ساتھ گلگت کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ راستے میں شدید خراب موسم نے آلیا۔ وہ پہلے ہی زخموں سے چور اور نیم جان تھا۔ خراب موسم نے اس کی رہی سہی مزاحمت بھی ختم کردی اور وہ برف زار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا۔ اس کی بدنصیب بیوی ادھر ادھر بھٹکتی رہی اور آخر مقامی لوگوں تک پہنچ گئی۔ اس لڑکی کے لباس سے ایک مڑا تڑا خط ملا ہے۔ وہ بھی میں تمہیں ابھی دکھاتا ہوں۔ فی الحال میں تمہیں ایک اور چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ شاید تم اس بارے میں کچھ بتا سکو۔۔۔ یہ دراصل ایک نشان ہے جو اس لڑکی کے جسم پر نظر آرہا ہے۔ ممکن ہے اس نشان کا تعلق انہی لوگوں سے ہو جنہوں نے منصور خاں کی جان لی ہے اور ممکن ہے کہ منصور خاں کی جان لینے والے وہی لوگ ہوں جن کے ساتھ اس سے پہلے تمہارا واسطہ پڑ چکا ہے۔"

میں نے کہا "مجتبیٰ صاحب! میری سمجھ میں اس وقت تک کچھ نہیں آئے گا جب تک آپ مجھے تمام حالات سے آگاہ نہیں کریں گے اور سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ میرا دوست مندور اور کوہ پیما جون جاڈل تو خیریت سے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کے بارے میں تو کوئی۔۔۔"

گنجے سر والے ایک افسر نے میری بات کاٹی اور بولا "مسٹر شاہ جہاں! آپ بے فکر رہیں۔ آپ کے دوستوں کے بارے میں کوئی ایسی خبر نہیں جسے تشویشناک کہا جاسکے۔ اللہ نے چاہا تو وہ خیریت سے ہوں گے۔ باقی جہاں تک حالات کے بارے میں آگاہی کی بات ہے، ہم آپ کو ضرور آگاہ کریں گے اور تفصیل سے کریں گے۔ فی الحال ہم آپ سے صرف اس نشان کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔"

اس شخص کے اشارے پر "مجسٹریٹ" کانسٹیبل اور نرس دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب ڈاکٹر اور مجتبیٰ سمیت کمرے میں کل پانچ افراد تھے۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر لڑکی کے گریبان کے بٹن کھولے اور سینہ عریاں کردیا۔ بلب کی روشنی میں لڑکی کی بے داغ جلد دمک اٹھی۔ اس کے سینے پر عین وسط میں لوہے یا کسی اور دھات سے داغے جانے کا نشان تھا۔ یہ نشان پچاس پیسے کے سکے سے تھوڑا سا بڑا تھا اور سیاہی مائل ہوچکا تھا۔ نشان کے عین درمیان کسی پرندے کی شبیہ بنی ہوئی تھی اور کسی نامعلوم زبان کے تین چار حروف لکھے تھے۔ میں نے ایسا نشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں تحریر کچھ مانوس سی لگتی تھی۔ شاید "شینا" ہی کی کوئی قسم تھی۔ شینا سے ملتی جلتی زبان اس وادی میں بولی جاتی تھی جہاں ہم نے ناقابل فراموش چار ماہ گزارے تھے۔ تاہم اس موقع پر میں نے ضروری سمجھا کہ احتیاط کا دامن تھاموں اور اس بارے میں کسی طرح کا اظہار خیال نہ کروں۔ کمرے میں موجود افراد کی سوالیہ نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ میں نے مجتبیٰ کنور کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا "ایسا نشان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے لڑکی کا گریبان برابر کرکے بٹن بند کردیے۔ مجتبیٰ کنور نے چند لمحے تک ڈاکٹر اور دیگر افراد سے کھسر پھسر کی پھر مجھے لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم عمارت کے ایک دوسرے کشادہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ فرش پر قالین بچھا تھا اور دیواروں کے ساتھ صوفے لگے تھے۔ میرا تجسس انتہا کو چھو رہا تھا۔ منصور خاں کی موت کی غیر متوقع خبر نے مجھے ہلا دیا تھا۔ میرے ذہن میں پلنے والے بھیانک ترین اندیشے منہ پھاڑ کر میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے اور میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ نانگا پربت کی طرف جانے والی مہم کا انجام کیا ہوا۔

مجتبیٰ کنور نے سگار سلگایا اور ہلکے پھلکے کش لیتے ہوئے بولا "شاہ جہاں! تمہاری غیر موجودگی میں کچھ غیر معمولی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جیسا کہ تمہیں پتا ہے مسٹر منصور خاں اور اس کے ہم نواؤں نے ہمارے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔ اس محاذ میں سیکریٹری اعظم خاں بھی پیش پیش تھا۔ یہ لوگ ہر صورت میں یہ چاہتے تھے کہ ترازم وج کے قانون شکن قبائلیوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ ہم نے اس منصوبے کی سخت مخالفت کی تھی اور متعلقہ لوگوں کو تمام نتائج و عواقب سے آگاہ کیا تھا۔ تم ان دنوں لاپتا تھے ورنہ تم بھی یقیناً یہی لائحہ عمل اختیار کرتے۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود اسلام آباد میں اس مہم کا منصوبہ ختم نہ ہوسکا۔ احتجاجاً ساجی صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے بھی حتی الامکان سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ مختصر یہ کہ یکم تاریخ کو یہ آپریشن شروع ہوا تھا اور اس آپریشن میں حصہ لینے والی ٹولی گلگت سے نانگا پربت کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ اس مہم میں کئی گائیڈوں کے علاوہ مختلف ایجنسیوں کے قریباً تین سو مسلح افراد شامل تھے۔ اس کے علاوہ فوجی ہیلی کاپٹروں کی خدمت بھی مستعار لی گئی تھی۔ دو تاریخ کو یہ لوگ بنوداس سے نانگا پربت کے بیس کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کے اس مرحلے میں بھاری گاڑیاں چھوڑ دی گئیں اور خچروں اور پورٹرز کے ذریعے سامان کی نقل و حمل کا انتظام کیا گیا۔ اس مہم کی رہنمائی کرنے والوں میں بدری نام کا ایک شخص بھی شامل تھا۔ اس کا تعلق فلم لاتن سے ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مجتبیٰ کنور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "مسٹر منصور خاں خود بھی مہم جو شخص تھا۔ سیر و شکار اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اپنی سرکاری

مصروفیات کے باوجود وہ بھی اس مہم میں شامل تھا۔ یہ لوگ بدری کی رہنمائی میں قریباً تین ہفتے تک قراقرم رینج میں بھٹکتے رہے لیکن اس وادی کا سراغ نہ پاسکے جہاں تم چار ماہ گزار کے آئے ہو۔ اس مہم جوئی پر ڈیڑھ لاکھ روپے روزانہ کے حساب سے خرچ اٹھ رہا تھا۔ اخباروں میں بھی کافی لے دے ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس مہم جوئی کا نتیجہ پیسے کے زیاں کے سوا اور کچھ نہیں نکلے گا۔ اسی دوران میں ایک ہیلی کاپٹر سخت خراب موسم کے سبب فضائی حادثے میں بال بال بچا۔ مہم کے کرتا دھرتا لوگوں نے فیصلہ کیا کہ مہم کا پھیلاؤ کم کردیا جائے۔ یعنی چالیس پچاس کے ایک گروپ کے علاوہ باقی سب لوگوں کو مع ساز و سامان گلگت میں واپس بلا لیا جائے۔ پچھلے مہینے کی ۳۰ تاریخ کو اس فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور مہم پر جانے والے کم و بیش ڈھائی سو افراد واپس آگئے۔ باقی افراد نے تلاش کا کام جاری رکھا۔ کیمپال میں ہیڈکوارٹر قائم کیا گیا تھا۔ اس ہیڈکوارٹر کے ساتھ متلاشی پارٹی کا رابطہ بذریعہ وائرلیس قائم تھا۔ کوشش کے باوجود یہ لوگ ابھی تک کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکال سکے تھے۔ خراب موسم بھی بار بار راستے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ مسٹر منصور خاں واپس آگیا تھا، تاہم آٹھ دس روز آرام کرنے کے بعد وہ پھر مہم میں شامل ہوگیا۔ غالباً اس کی موت ہی اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس مرتبہ مسٹر منصور خاں کے ساتھ اس کی الٹرا ماڈرن بیوی بھی تھی۔ یہ لوگ "مینہ جو باس" کے قریب متلاشی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اس مہینے کی دس تاریخ کو شام کے وقت اچانک متلاشی پارٹی کا رابطہ "کیمپال" کے ہیڈکوارٹر سے منقطع ہوگیا۔ وائرلیس پر متلاشی پارٹی کا جو آخری پیغام موصول ہوا وہ یہ تھا۔"

مجتبیٰ کنور نے کوٹ کی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور ٹائپ کیے ہوئے الفاظ پڑھ کر سنانے لگا "ہمیں ایک آبادی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ایک امید سی پیدا ہوئی ہے کہ شاید ہم کچھ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔۔۔ یہاں درخت بہت ہیں۔ ہر طرف برف جمی ہوئی ہے۔ "کمپاس" کے مطابق ہمارا رخ بیس کیمپ سے ۸۰ ڈگری شمال مشرق کی طرف ہے۔۔۔"

مجتبیٰ نے کہا "اس پیغام کے فوراً بعد ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کچھ لوگ آپس میں گتھم گتھا ہوگئے ہوں۔ وائرلیس پر ایک پولیس کمانڈو کی آواز صاف سنی گئی۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں چیخ رہا تھا "وہ آگئے ہیں۔ انہوں نے جھگڑا شروع کردیا ہے۔" اس کے بعد دو تین فائر ہوئے اور مکمل خاموشی چھا گئی۔

کوشش کے باوجود دوبارہ رابطہ بحال نہیں ہوسکا۔ وائرلیس پر نشر ہونے والے آخری پیغام کو مدنظر رکھتے ہوئے متلاشی پارٹی کو ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی۔ ہیلی کاپٹروں کی مدد بھی لی گئی لیکن کوئی کھوج نہیں ملا۔ اگلے روز موسم بہت خراب ہوگیا اور فضائی تلاش یکسر ختم کرنا پڑی۔ تاہم زمینی تلاش جاری رہی اور آخری اطلاعات آنے تک جاری ہے۔ یہ لڑکی جو تم نے ابھی دیکھی ہے منصور کی بیوی ہے اور کیمپال کے قریبی علاقے میں مقامی لوگوں کے ہاتھ لگی ہے۔ اس لڑکی کی دستیابی کے بعد ایجنسیوں نے ارد گرد کا علاقہ چھان مارا لیکن مسٹر منصور خاں کی لاش کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اس لڑکی کی حالت تم دیکھ ہی چکے ہو۔ کچھ کھاتی پیتی ہے نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ شاید تم سوچو کہ اس کی یہ حالت شوہر کی دردناک موت کی وجہ سے ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ لڑکی کسی پُراسرار کیفیت کے اثر میں ہے۔ تم نے ابھی دیکھا ہوگا اس کا چہرہ دائیں طرف تھا یعنی مشرق کی طرف۔۔۔ اسے کسی رخ بھی بٹھا دیں وہ اسی خاص سمت میں دیکھتی ہے۔ آنکھ جھپکنا تو شاید وہ بھول ہی چکی ہے۔ اسے ایک پل کے لیے بھی قرار نہیں۔ جتنی دیر جاگتی رہتی ہے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے وہ پتنگ کی طرح ہے جسے کوئی ڈور بار بار جھٹکے لگاتی ہے اور اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسلام آباد سے کل ہی ایک "سائیکالوجسٹ" آئی ہے۔ اس نے لڑکی کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ لڑکی کی ذہنی حالت غیر معمولی ہے اور اگر وہ زیادہ عرصہ اس حالت میں رہی تو شاید زندہ نہ رہ سکے۔ ہمارے ایک ایم پی اے صاحب کسی مقامی عامل کو پکڑ لائے تھے۔ وہ اور طرح کی باتیں بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ لڑکی ہوائی چیزوں کے اثر میں ہے اور ضروری ہے کہ ہر وقت اس کی نگہداشت کی جائے۔ بہرحال میں تو ان باتوں کو نہیں مانتا۔ میرا خیال یہی ہے کہ لڑکی کو شدید ذہنی شاک پہنچا ہے۔"

میں نے مجتبیٰ کنور کی ساری باتیں اطمینان سے سنیں۔ لڑکی کے معاملے نے مجھے بھی حیرت زدہ کیا۔ اس کے چہرے پر عجیب وارفتگی اور والہانہ پن نظر آتا تھا جیسے وہ لوہے کا کوئی ذرہ ہے جو ایک بڑے مقناطیس کی طرف کھنچا چلا جارہا ہے۔ پیراسائیکالوجی اور ایڈوانس نفسیاتی علوم میں ایسی کیفیات کا ذکر ملتا ہے۔ بعض اوقات انہیں "ہپناٹزم" برین واشنگ یا مخصوص ٹرانس وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

مجتبیٰ کنور نے جن حالات کا ذکر کیا تھا وہ یقیناً سنسنی خیز تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہی فلم "ری وائنڈ" ہوگئی ہے جو اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہم بھی تو صحافی شاہد خاں کے ہمراہ اسی طرح خونخوار قبائلیوں کی بھینٹ چڑھے تھے۔ سنسان جنگل میں ایک دم کلہاڑا بردار ہم پر حملہ آور ہوئے تھے اور ہمیں کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مسٹر منصور خاں کی قیادت میں جو طاقتور فورس قبائلیوں سے نبرد آزما ہونے گئی تھی وہ ہر طرح کیل کانٹے سے لیس تھی۔ تمام خدشات اور امکانات کو ان لوگوں نے پیش نظر رکھا تھا لیکن ہوا یہ تھا کہ تین ہفتوں کی مسلسل تلاش اور ناکام کوششوں کے بعد اس فورس کا جوش اور ولولہ برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ حوصلے ماند پڑ گئے تھے اور آخر یہ ہوا تھا کہ بیشتر فورس واپس بلا لی گئی تھی۔ جو افراد باقی رہ گئے تھے وہ بھی خراب موسم کے سبب اکتائے ہوئے تھے۔

ایسے میں وہ اچانک دبوچ لیے گئے تھے۔ ان کا مواصلاتی رابطہ کٹ گیا تھا اور ان کا انجام بھی دیگر افراد کے انجام کی طرح سوالیہ نشان بن گیا تھا لیکن اس تفصیل میں ایک نکتہ ایسا تھا جو مجھے زبردست الجھن میں مبتلا کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گمشدہ پارٹی کی طرف سے جو آخری پیغام موصول ہوا ہے اس میں کوئی گڑبڑ ہے۔ بہرحال اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

میں نے مجتبیٰ سے اس خط کے بارے میں پوچھا جو لڑکی کے لباس میں سے نکلا تھا۔ مجتبیٰ نے ایک چھوٹا لفافہ نکالا۔ اس میں ایک مڑا تڑا کاغذ تھا۔ کاغذ پر فاؤنٹین پین سے چند لفظ گھسیٹے گئے تھے۔ یہ کاغذ برف باری اور بارش کی وجہ سے بھیگ گیا تھا اور سیاہی پھیل گئی تھی۔ صرف چند ہی لفظ پڑھے جا سکتے تھے۔ جو سطور پڑھی جاتی تھیں وہ اس طرح تھیں "...بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں راستے میں ہی کہیں دم توڑ جاؤں۔ موسم ہر گھڑی خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد چند سطور ضائع ہو گئی تھیں۔ پھر لکھا تھا "مارچ کے پہلے دس روز بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا اس سے پہلے کرنا ہوگا۔ اگر ایک بار رابل چل پڑا تو پھر اسے روکنا ممکن نہیں ہوگا۔"

خط کے آخر میں بھی دو تین سطریں جزوی طور پر سلامت تھیں۔ ان میں اپیل کی گئی تھی کہ جس کسی کو بھی یہ خط ملے وہ اسے فوراً پولیس یا انتظامیہ کے ذمے دار شخص تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ آخر میں منسٹر منصور خاں کا نام اور پتا بھی پڑھا جا رہا تھا۔

میں نے اس الجھے سلجھے خط کو دو تین بار پڑھا اور ہر مرتبہ مزید الجھ گیا۔ ادھورا پن انسان میں ہمیشہ تجسس ابھارتا ہے۔ یہ خط بھی بے پایاں تجسس ابھار رہا تھا۔ سب سے پہلے تو یہی تجسس کی بات تھی کہ منصور خاں کیسے زخمی ہوا تھا اور کیوں اپنی زندگی سے اس قدر مایوس ہو گیا تھا کہ "وصیت نامے" جیسا خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مارچ کے پہلے دس روز کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ خطرناک ہیں اور اگر رابل چل پڑا تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ "رابل" کس بلا کا نام تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا' مجھے رابل نام کا کوئی شخص یاد نہیں آیا۔ عین ممکن تھا کہ یہ "رابل" کسی شخص کا نام نہ ہو۔ تو پھر یہ کیا چیز تھی۔ کوئی کمیشنر کوئی برفانی طوفان یا کوئی اور آفت۔ ایسے ہی بہت سے سوال ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ تھوڑی دیر مجتبیٰ کنور سے اس معاملے پر ڈسکشن ہوتی رہی۔ خط کے حوالے سے اسے بھی اتنا ہی معلوم تھا جتنا ابھی ابھی میں نے معلوم کیا تھا۔ اب تک کی تحقیق میں جو اندازہ قائم کیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ منسٹر منصور خاں اپنی اہلیہ کو کسی بڑی آفت سے بچا کر واپس گلگت لا رہا تھا۔ وہ سخت زخمی تھا۔ وہ لوگ خراب موسم میں راستہ بھٹک گئے اور منصور خاں ہلاک ہو گیا۔

مجتبیٰ کنور نے وہ خط دوبارہ بڑی احتیاط سے جیب میں ڈال لیا۔

مجتبیٰ کنور سے گفتگو کے دوران میں میرا دھیان بار بار سائی صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں لاہور سے گلگت آیا تھا' سائی صاحب ملازمت سے استعفیٰ دے چکے تھے اور مختلف اقسام کے دباؤ کی وجہ سے نڈھال نظر آتے تھے۔ میں نے مجتبیٰ کنور سے پوچھا "سائی صاحب کہاں ہیں؟"

مجتبیٰ کنور بولا "وہ کل کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اچھی اطلاع یہ ہے کہ ان کا استعفیٰ منظور نہیں کیا گیا اور انہوں نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لی ہے۔ ان کی صحت بھی اب بہتر ہے۔"

میں نے پوچھا "اخبارات آج کل کیا کہہ رہے ہیں؟"

مجتبیٰ کنور نے کہا "منصور خاں کی موت کی اطلاع شہ سرخیوں سے شائع ہوئی تھی۔ ایک بار پھر گمشدگیوں اور خونریز وارداتوں کا مسئلہ پوری شدت سے ابھر آیا ہے۔ بعض لوگ ایک بڑے آپریشن کا مطالبہ کر رہے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ آپریشن والی غلطی دہرائی نہیں جانا چاہیے اور یہ معاملہ قبائلیوں کے ساتھ افہام و تفہیم سے حل ہونا چاہیے.... کل ہی نوراز مخشری کی طرف سے ایک بیان آیا ہے' ترجمان کا کہنا ہے کہ "طاقت کے استعمال" سے صورت حال سنبھلنے کے بجائے بگڑے گی۔ اگر قبائلیوں نے مزاحمت کا فیصلہ کر لیا تو اس انتہائی دشوار گزار علاقے میں وہ بڑی سے بڑی فورس کو سخت مصیبت میں ڈال دیں گے۔

میں نے پوچھا "جو بیورو کریٹس زور و شور سے منصور خاں کی تائید کر رہے تھے وہ اب کیا کہتے ہیں؟"

"ان میں اب آنکھ ملانے کی جرأت نہیں۔" مجتبیٰ نے کہا اور ان سب کو ایک مشترکہ گالی بھی دے ڈالی۔ پھر سگار کا کش لے کر بولا "در حقیقت ان میں زیادہ وہ لوگ تھے جن کے منصور خاں کی فیملی سے ذاتی تعلقات تھے یا پھر وہ اس فیملی کا حصہ تھے۔ تم جانتے ہی ہو' بیورو کریسی میں منصور خاں کے خاندان کو زبردست تائید حاصل ہے' اب یہ سب لوگ منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں پر غیر ذمے داری اور اختیارات سے تجاوز کرنے کے کیس بھی بن سکتے ہیں اور میرے خیال میں یہ کیس بننے چاہئیں۔ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے منسٹر کی جان گئی ہے اور درجنوں افراد کی زندگیاں شدید خطرے میں ہیں۔ اس معاملے کا سنگین پہلو یہ ہے کہ یہ سب کچھ پارٹی بازی کے نتیجے میں ہوا ہے۔ منسٹر منصور خاں اور اس کے ہم نواؤں کو اصل دکھ یہ تھا کہ تمہارے ہاتھوں عبنی جان کی ہلاکت ہوئی تھی۔ اس ہلاکت کا غصہ نکالنے کے لیے ہی ان لوگوں نے میرے اور سائی کے خلاف یہ "فراق رینج والا" محاذ کھولا تھا۔ پرسوں ایک اخبار نے تمہارا ذکر بھی کیا ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ بے شک شاہ جہاں قانون کو مطلوب ہے اور اسے اپنے جرائم کی سزا ملنی چاہیے لیکن ہمیں یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ وہ انتہائی کٹھن حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں نانگا پربت سے درجن افراد کی جانیں بچا کر لے آیا

تھا۔ اس معاشرے میں وہ تعریف کا حق دار تھا لیکن ہم نے اس کے پیچھے پولیس لگا دی۔ زخمی حالت میں اسے دربدر بھٹکایا اور اب وہ لاپتا ہے۔ معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں ہے۔"

میں نے مجتبیٰ کنور سے شیخ عاصم کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "تمہارا شیخ گلگت میں ہی ہے۔ مع اہلیہ ایک پرائیویٹ بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ تمہارے بارے میں میاں بیوی بہت فکر مند ہیں۔"

"شیخ عاصم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں' ابھی تھوڑی دیر میں ہم گلگت روانہ ہو رہے ہیں۔ شیخ عاصم اور اس کی اہلیہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تمہیں ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ یقیناً وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوں گے۔"

میں نے مجتبیٰ سے پوچھا "یہ لڑکی یہیں رہے گی؟"

"نہیں۔" مجتبیٰ نے انکار میں سر ہلایا "اسے رازداری کی غرض سے یہاں لایا گیا تھا۔ خیال تھا کہ تسلی کے ساتھ اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی لیکن یہ تو پوچھ گچھ کے قابل ہی نہیں ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو اس کی پوزیشن۔"

مجتبیٰ کنور سے باتوں کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ جس عمارت میں ہم دو ماہ قید رہے ہیں۔ اس کا تعلق ایف ایس ایف سے ہے۔ ماضی میں یہاں انتہائی خفیہ قسم کی "میٹنگز" ہوتی تھیں۔ خاص الخاص قیدیوں کو رکھنے کے لیے بھی یہ عمارت استعمال کی جاتی ہے۔ اس عمارت کو شپ ہاؤس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ میں اس شخص سے ملنا چاہتا تھا جس کا نام ارباب تاتاری تھا اور جو پچھلے دو مہینوں میں آسیب کی طرح ہمارے ذہنوں پر سوار رہا تھا لیکن مجتبیٰ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ یہاں موجود نہیں۔ منصور خاں کی موت کے ساتھ ہی وہ لمبی رخصت لے کر چلا گیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر صبر کیا کہ یار زندہ صحبت باقی۔

اس روز شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم گلگت پہنچ چکے تھے اور اس شاندار بنگلے میں موجود تھے جہاں غزالہ اور شیخ عاصم پچھلے قریباً پانچ ہفتے سے قیام پذیر تھے۔ شپ ہاؤس سے گلگت تک کا فاصلہ ہم نے سرکاری جیپوں میں طے کیا تھا۔ شروع کا قریباً پندرہ کلو میٹر راستہ بالکل کچا تھا پھر پتھروں کی ٹوٹی پھوٹی سڑک شروع ہو جاتی تھی جو بلند پہاڑوں کے درمیان سے بل کھاتی گزرتی تھی۔ اس راستے سے گزرنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ الیکٹرانک ذرائع کے باوجود شیخ عاصم مجھے تلاش کیوں نہیں کر سکا۔ شیخ عاصم کا خیال یقیناً یہی رہا ہوگا کہ میں گلگت میں یا کسی قریبی قصبے میں محفوظ ہوں اور وہ انہی علاقوں میں مجھے تلاش بھی کرتا رہا ہوگا جب کہ میں گلگت سے آگے قریباً تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور راستہ نہایت کٹھن تھا۔

کچھ دیر بعد شیخ عاصم سے مل کر میرے ان خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ شیخ سے ملاقات اس کے بنگلے پر ہوئی۔ غزالہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ شیخ نے بتایا "میں نے تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈا ہے شاہ جہاں! اور سچی بات یہ ہے کہ غزالہ نے بھی میرے ساتھ اپنی جان ہلکان کر رکھی تھی۔ ہم نے بارہ بارہ گھنٹے جیپ پر گھومتے ہوئے گزارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے ہماری بدقسمتی ہی کہنا چاہیے' ہم ان پہاڑوں کی طرف بھی گئے تھے جہاں یہ عمارت سیپ ہاؤس واقع ہے۔"

"سیپ ہاؤس نہیں' شپ ہاؤس۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں۔ ہم قریباً سترہ اٹھارہ کلو میٹر تک گئے تھے۔ اگر تین چار کلو میٹر کی ہمت مزید کر لیتے تو یقیناً میری واچ پر سگنل موصول ہو جاتا۔ اس وقت رات ہونے والی تھی' لہٰذا ہم واپس آ گئے۔"

غزالہ نے کہا "پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا تھا کہ ہمیں پھر اس طرف جانا چاہیے لیکن بارشیں شروع ہو چکی تھیں اور راستہ ایسا نہیں تھا کہ بارش میں ادھر کا رخ کیا جاتا۔"

غزالہ تھکی تھکی نظر آتی تھی لیکن آنکھوں میں رونق تھی اور چہرے پر ہمیشہ کی طرح اجالے کی سی کیفیت۔ اس کے کندھوں پر گلابی رنگ کی شال تھی جو آتش دان کی روشنی میں کچھ اور بھی گلابی نظر آ رہی تھی۔ مجتبیٰ کنور بھی وہیں پر موجود تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگار اور دوسرے میں کافی کا مگ تھا۔ وہ تینوں مجھ سے پچھلے دو مہینوں میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اسی دوران میں فون پر اطلاع ملی کہ سائی صاحب بھی گلگت پہنچ گئے ہیں (وہ پروگرام سے ایک دن پہلے ہی پہنچ گئے تھے) مجتبیٰ کنور نے سائی صاحب کو بھی شیخ عاصم کی قیام گاہ پر ہی بلا لیا۔ دس پندرہ منٹ بعد سائی صاحب مجھ سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ وہ سفر سے نڈھال تھے۔ سابقہ علالت کے آثار بھی ان کے چہرے پر موجود تھے۔ تاہم ان کی آنکھوں میں پُرمسرت عزم کی جھلک تھی۔

وہ رات میں نے اور زریں گل نے شیخ عاصم کی قیام گاہ پر ہی گزاری۔ رات دیر تک شیخ عاصم مجھ سے محو گفتگو رہا۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ بالکل بدل چکا ہے اور اب میں آنکھیں بند کر کے اسے اپنے خیر خواہوں میں شمار کر سکتا ہوں۔ اس کی گفتگو میں گاہے گاہے غزالہ کا ذکر بھی آیا اور اس نے ایک بار پھر اعتراف کیا کہ اسے بدلنے میں غزالہ کی شخصیت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ وہ کہنے لگا "شاہ جہاں! میں بہت مختلف قسم کا آدمی تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ "عورت" میرے لیے ان بہت سی دوسری "اشیا" کی طرح تھی جو میرے روز مرہ استعمال میں رہتی ہیں لیکن غزالہ نے میرے دل کی گہرائیوں کو چھوا ہے اور میرے احساسات کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں شاہ جہاں کہ تمہارے اور غزالہ کے درمیان بہت انڈر اسٹینڈنگ رہی ہے اور تم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے متعلق سوچتے رہے ہو' بہر طور ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو چاہے' اسے مل بھی جائے۔ اب حالات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ میں اور غزالہ شادی کے بندھن

میں بندھ چکے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی سب بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ میں، تم اور غزالہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوسکتے ہیں۔ یقین کرو، تمہاری غیر موجودگی کے دوران میں ہم تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچتے رہے ہیں۔ غزالہ کی طرح میرا مشورہ بھی تمہارے لیے یہی ہے کہ تم ان خطرناک ترین حالات سے اپنا پیچھا چھڑالو جو تمہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی دلدل ہے شاہ جہاں! جو تمہیں کبھی بھی باہر نہیں نکلنے دے گی۔ میں پھر تم سے کہوں گا کہ تم کچھ عرصے کے لیے پاکستان سے باہر چلے جاؤ۔ میں تمہاری روانگی کا مکمل انتظام کروں گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے کہا "یہ بات نہیں کہ میں اپنے حالات سے مطمئن ہوں اور خود ان سے پیچھا چھڑانا نہیں چاہتا لیکن کچھ معاملے ایسے ہیں جنہیں طے کیے بغیر گزارا نہیں۔"

اسی دوران میں غزالہ بھی اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں دو تین بڑے سائز کے لفافے تھے۔ لفافے میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی "یہ لیجئے، کپڑے تیار ہیں۔"

"کس کے کپڑے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کے اور زریں گل کے۔ یہ دو جوڑے ہیں۔ امید ہے آپ کو پسند آئیں گے۔"

"لیکن کس لیے؟"

"یہ ان سے پوچھئے۔" وہ شوہر کی طرف اشارہ کر کے بولی اور زیر لب مسکرا کر باہر چلی گئی۔

میں سوالیہ نظروں سے شیخ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا "میں چاہتا ہوں کہ تمہاری رہائی اور بخیریت واپسی کی خوشی منائی جائے پرسوں جمعہ ہے۔ بجنتی کنور، ایس ایس پی ساہی اور ان کے کچھ قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ لوگ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔"

میں نے کہا "میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن میرے خیال میں محفل آرائی کے لیے یہ موقع مناسب نہیں۔ جب تک لاپتا ہونے والے افراد کا سراغ نہیں ملتا اور یرغمالی رہا نہیں ہوتے ہمیں اس قسم کا تاثر نہیں دینا چاہیے۔"

وہ بولا "ہم کوئی جشن یا بینڈ باجے تو نہیں بجا رہے۔ سادہ سا گیٹ ٹو گیدر ہے۔ اس سے تم لوگوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملے گا اور مسائل کے بارے میں بھی گفتگو ہوسکے گی۔"

شیخ عاصم کے لہجے میں اپنائیت اور خلوص کی جھلک تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ خلوص اور اپنائیت کی یہ جھلک حقیقی ہے یا مصنوعی۔ شیخ عاصم ایک پیچیدہ شخص تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں ابھی تک نفرت اور عداوت کا وہی لاوا جوش مار رہا ہو جو مجھے نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب شیخ عاصم اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

اِس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں بلاحظہ فرمائیں۔

داستان گوئی میں ایک نئی طرز کا آغاز

احمد اقبال کے شعلہ بار قلم سے وطن کے پرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی ہوشربا داستان

۱۰ حصے شائع ہوگئے ہیں

مداری

قیمت فی حصہ 60 روپے

◇ اس شہید کا قصہ جس نے اپنی لاش اپنے ہاتھوں دفن کی تھی۔

◇ اسے اس ملک کی اعلیٰ ترین کرسی کی خواہش تھی اور اسے حاصل کرنے کیلئے وہ کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھا۔

◇ خواہشوں کا مداری ڈگڈگی بجا رہا تھا اور وہ اس کی تال پر بندر کی طرح ناچ رہا تھا۔

◇ دنیا کے سٹیج پر آتے جاتے رہنے والے کرداروں کی داستان ہوشربا۔

◇ چہرے پر چہرا چڑھائے اور بیک وقت کئی کئی زندگیاں گزارنے والوں کے فسانے۔

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

07247414

تاوان
8

اس شخص کی داستان
جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا۔
[illegible] رکھا گیا مگر
[illegible] کڑی
[illegible] جرم کی دنیا
کے بڑے بڑے روشن نام [illegible] بجھ گئے۔ خاندان کے [illegible]
کے لیے وہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن [illegible] لڑکی کے لیے اس
نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔ لاہور [illegible] جیل کی
[illegible] لیکن گردشِ حالات کو ابھی کچھ اور
[illegible] ناوان کی [illegible]
حالات کی ایک نئی کروٹ نے [illegible]
[illegible] مجبور رہا۔

بلکہ صبح تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پچھلے دو مہینے میں میری کال کوٹھری سے باہر جو حالات پیش آئے تھے وہ دل و دماغ میں اُتھل پتھل مچا رہے تھے۔ مسٹر منصور خاں کا چہرہ بار بار نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ صحت مند وہنگ شخص جو بے پناہ اثر و رسوخ کا مالک بھی ہے' یوں آناً فاناً موت کے جبڑوں میں چلا جائے گا۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا بیتی تھی پھر اس کی بیوی نائیلہ کا چہرہ تصور میں آیا تو بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ کیا وہ واقعی آسیب زدہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا پھر وہ نکتہ میرے ذہن میں آیا جو مجھے کل سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مجتبیٰ کنور کی اطلاعات کے مطابق "آپریشن" کا بیس کیمپ "کیپال" میں قائم کیا گیا تھا۔ جہاں سے منصور خاں کی لاش ملی وہ جگہ "کیپال" سے ۱۳۰ ڈگری کے زاویے پر شمال مشرق کی طرف تھی۔ میرے نزدیک یہ ایک نہایت اہم پوائنٹ تھا۔

اگلے روز ناشتے کے بعد میں سو گیا۔ ایک بار نیند آئی تو پھر شام سے پہلے آنکھ نہیں کھلی۔ زریں گل نے مجھے بتایا کہ ساہی صاحب آئے تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔ مجتبیٰ کنور کا بھی فون آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جب میں جاگ جاؤں تو فون کر لوں۔ زریں نے مجتبیٰ کنور کا فون نمبر بھی دیا۔

میں نے مجتبیٰ کو فون کیا۔ وہ منسٹری کے گیسٹ ہاؤس سے بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ منصور خاں مرحوم کی نوجوان بیوی گیسٹ ہاؤس میں ہے اور ڈاکٹر ارشاد اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں' تاہم لڑکی کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ساہی صاحب بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ مجتبیٰ کنور نے کہا "ابھی کچھ دیر پہلے ایف ایس ایف کے دو افسران "آئی جی کے ساتھ گیسٹ ہاؤس آئے تھے۔ وہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ انہیں کہیں سے یہ اطلاع ملی تھی کہ تمہارا سراغ لگا لیا گیا ہے اور تم اس وقت ہماری تحویل میں ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ اطلاع بے بنیاد ہے۔ وہ منہ لٹکا کر واپس چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری گرفتاری کے چکر میں تھے۔"

میں نے کہا "آپ کب تک بچائیں گے مجھے گرفتاری سے؟"

مجتبیٰ کنور نے مجھے گرفتار کرنے والوں کو ایک زبردست قسم کی گالی دی اور بولا "میرے ہوتے ہوئے کوئی مائی کا لال تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

"لیکن آخر تو یہ سب کچھ ہونا ہی ہے۔"

"جب ہوگا تب دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

چند لمحے لائن پر خاموشی رہی پھر مجتبیٰ کنور کی آواز آئی "میں شاید نو بجے کے بعد تمہارے پاس آؤں۔ ساہی صاحب بھی ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ کا لائحہ عمل بنانے کے لیے تفصیل سے بات کی جائے اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں اپنے پرانے

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ــــــ ۱۹۹۹ء
مطبع ــــــ یُو اینڈ می پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ ــــــ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر لاہور
قیمت ــــــ ۶۰/- روپے

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۲

ISBN 969-8429-35-2

دوستوں سے پھر رابطہ کرنا چاہیے تو اس کا طریقہ طے کرلیا جائے۔"

"پرانے دوستوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"وہی قبائلی جنہوں نے یہ آفت بپا رکھی ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے ان کے سردار کا؟"

"موجودہ سردار کا نام تو سدورت ہے۔"

"ہاں، میں بھی اسی کی بات کررہا ہوں۔ جو خط تم وہاں سے لائے تھے، میرا مطلب ہے کہ جو بچی کے لباس سے ملا تھا اس کی تحریر سے تو سردار سدورت کے خلوص اور نیک ارادوں کی گواہی ملتی ہے۔ اس نے تمہیں اپنے دوست کی حیثیت سے مخاطب کیا ہے اور تمہارا احسان مند بھی نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس وقت یہ شخص ہمارے بہت سے مسائل کا حل پیش کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "سردار سدورت کے بارے میں آپ کے خیالات ایسے غلط نہیں ہیں لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"مثلاً کیا؟"

"مجھے ایک شک سا ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں فون پر یہ بات مناسب نہیں۔ رات کو جب آپ آئیں گے تو تفصیل سے بات ہوگی۔۔۔ یا پھر آپ کل کا ہی پروگرام رکھ لیں۔ کل دوپہر کا کھانا آپ نے یہاں شیخ عاصم کے ساتھ کھانا ہے۔"

"ہاں شیخ نے بتایا تو تھا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ صبح نو دس بجے کے قریب آجائیں۔ میں بھی اس بارے میں کچھ مزید غور کرلوں۔"

رسمی کلمات کے بعد مجتبیٰ کنور نے سلسلہ منقطع کردیا۔

زریں گل بولا "استاد صیب! یہ آپ لڑکی کا کیا بات کررہا تھا۔ اس کا حالت کچھ ٹھیک ہوا یا نہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔"

وہ بولا "ہمارا تو خیال ہے استاد صیب! کہ اس کا یادداشت چلا گیا ہے۔ ہم نے بہت فلموں میں ایسا دیکھا ہے۔ بلکہ ایک دور میں تو ہم صرف وہی فلمیں دیکھا کرتا تھا جن میں یادداشت جاتا تھا۔ پھر ہم کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں ہمارا اپنا یادداشت ہی روانہ نہ ہوجائے اسی لیے ہم نے چھوڑ دیا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر ہم کو یہی لگتا ہے کہ اس کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گرا ہے یا پھر اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی عزت پر کسی بدمعاش نے۔۔۔"

"یار! تم اپنی چونچ بند نہیں کرسکتے؟" میں نے جھلا کر کہا۔

وہ ایک دم خاموش ہوگیا لیکن ایک منٹ بعد اس کی زبان میں پھر کھجلی ہونے لگی۔ بولا "ویسے استاد صیب، اگر یہ یادداشت والا معاملہ نہیں تو پھر یقیناً اس لڑکی پر کسی چیز کا اثر ہے۔ ہمارے پھوپھا پر بھی ایک دفعہ ایسا ہی اثر ہوگیا تھا۔ ہمارا دادا تھوڑا بہت تعویذ گنڈا بھی جانتا تھا۔ اس نے ہمارے پھوپھا کو الف ننگا کرکے چارپائی سے باندھ دیا تھا اور تین روز تک شہتوت کے ڈنڈے سے دھنائی مارا تھا۔۔۔ جو ہوائی چیز ہمارے پھوپھا کو چمٹا ہوا تھا وہ بھی بہت ڈھیٹ تھا۔ آخر ہمارے دادا نے ہوائی چیز کو للکار کر کہا تھا "یہ مت سمجھنا کہ ہم اس ڈنڈے کو صرف مارنے کے لیے ہی استعمال کرتا ہے، ہم اس کا ایک اور بہت اچھا "استعمال" بھی جانتا ہے۔" بس یہ بات سننا تھا کہ ہمارا پھوپھا پھڑکا اور ہوائی چیز اسے چھوڑ کر اور دُم دبا کر بھاگ گیا۔ چوتھے روز وہ بالکل ٹھیک ہوچکا تھا۔"

"تو کیا تم اس لڑکی کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں استاد صیب! یہ تو زنانی لوگ ہے۔ ایسا سلوک کہاں برداشت کرے گا۔ اس کا ہوائی چیز تو مولا بخش کے بغیر ہی اتارنا پڑے گا۔ پتا نہیں کیوں ہمارے دماغ میں بار بار سائیں عالی کا خیال آتا ہے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ اگر سائیں عالی یہاں آجائے تو وہ اس لڑکی کا کچھ کرسکتا ہے۔ سچا بات ہے استاد صیب! ہم کو تو سائیں عالی پر یقین سا ہوتا جارہا ہے۔"

اس کے بعد زریں گل نے سائیں عالی کی تعریفوں کے پل باندھنے تھے لہٰذا میں اٹھ کر بیڈ روم میں آگیا۔ یہاں غزالہ نے میرے استعمال کی ہر چیز بڑے قرینے سے رکھ چھوڑی تھی۔ باتھ روم میں ٹوتھ پیسٹ، تولیا، میرا پسندیدہ صابن، پلنگ کے نیچے آرام دہ چپل، وارڈ روب میں لباس اور دوسرے۔ میرے برانڈ کے سگریٹ بھی سائیڈ ٹیبل پر موجود تھے اور ایک نہایت نفیس ایش ٹرے ٹیبل پر جگمگا رہی تھی۔ اس ٹرے پر چمکدار حروف میں پرنٹ کیا گیا تھا "کوشش کریں کہ مجھے استعمال نہ کرنا پڑے۔"

تھوڑی دیر بعد انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف غزالہ ہی تھی۔ شیریں آواز میں بولی "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "عاصم پوچھتے تھے، آپ ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟"

"کچھ خاص نہیں۔ جو بھی ہوگا ٹھیک ہے۔"

"لیکن لنچ کے بارے میں تو کچھ ضرور بتائیں۔ مجتبیٰ کنور صاحب اور ساہی صاحب بھی آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ بھی پکالیں۔۔۔ اگر کچھ پوچھنا ہی ہے تو زریں گل سے پوچھ لو۔"

وہ ہنسی "زریں گل سے پوچھ لیا ہے۔ اس نے صرف ان چند چیزوں کے نام بتائے ہیں جو وہ "کھانا" نہیں چاہتا، باقی سب کچھ ہم بنا سکتے ہیں۔ واقعی بہت دلچسپ فرد ہے۔"

"اچھا، کچھ اور کہنا ہے یا بس۔"

"تھینک یو۔" اس نے کہا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا ذہن گھڑدوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ غزالہ کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی میرا

دھیان کسی اور طرف تھا۔۔۔۔ ایک عجیب سی بے کلی اعصاب پر طاری تھی۔ میں کچھ کرنا چاہ رہا تھا، کیا کرنا چاہ رہا تھا، یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ بس ایک خاکہ سا ذہن میں ابھر رہا تھا اور بار بار مٹ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کھڑکیوں سے باہر سرد رات نشیب و فراز پر خیمہ زن تھی۔ کبھی کبھی ہوا چلتی تھی تو چیڑ اور سرو کے درخت جھومنے لگتے تھے۔ دور شمال مشرق میں کہیں تاریک پہاڑوں کے سائے تھے۔ وہی عظیم الشان پہاڑ جن کی برفانی بلندیوں پر ان گنت بھید چھپے ہوئے تھے۔ میرا یار منصور انہی بلندیوں اور بھول بھلیوں میں کہیں گم تھا۔ کہاں تھا وہ؟ کیا کررہا تھا؟ شاید وہ بھی اس وقت میرے بارے میں سوچ رہا ہو۔ اپنے تخیل کے زور پر میری شبیہ بنا رہا ہو اور اس سے پوچھ رہا ہو "کہاں چلے گئے دوست۔ کیا اپنی دنیا میں جا کر بھول گئے مجھے اور میری مصیبتوں کو؟" میرا تن بدن سلگنے لگا۔ ایک آتشیں سیال رگوں میں دوڑتا محسوس ہوا۔

جب ہم اس وادیٔ مرگ سے واپس لوٹے تھے اور مجھے ننھی زرغونہ کے لباس سے سردار سدورت کا خط ملا تھا تو میرا خیال یہی تھا کہ اب ہمیں ان جان لیوا برف زاروں میں واپس نہیں جانا پڑے گا جہاں کوہساروں کی بلندی فسوں بن کر انسانی اعصاب کو مفلوج کرتی ہے اور ہیبت ناک کھائیوں میں موت کی پرچھائیاں رینگتی ہیں، ہاں وہی مہیب پہاڑ جن کی پُراسرار خاموشی میں دل کی دھڑکنیں نیا آہنگ اختیار کرلیتی ہیں اور انسان مظاہرِ قدرت کی وسعت کے سامنے چیونٹی کی طرح حقیر نظر آنے لگتا ہے۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ سردار سدورت اپنے وعدے کی پاسداری کرے گا اور چند ماہ بعد منصور سمیت تمام یرغمالی خاموشی سے رہا کردیے جائیں گے لیکن مسٹر منصور خان اور اس جیسے کچھ اور عاقبت نااندیش لوگوں کی وجہ سے سارا معاملہ چوپٹ ہوگیا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ ان بلند پہاڑوں کے پیچھے کیا ہوا ہے اور کیا نہیں۔۔۔ میرے دھیان میں ایک بار پھر وہی مجہول الحواس لڑکی آگئی جو خضری کے گیسٹ ہاؤس میں تھی مگر ہر پل خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس کے جسم کے پوشیدہ حصے پر ایک نشان تھا۔۔۔۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ ارادے کی ایک لہر سی سینے سے بلند ہوئی اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

یہی وقت تھا جب زریں گل کمبل میں لپٹا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مونگ پھلی سے بھرا ہوا لفافہ تھا۔ غالباً وہ میرے ساتھ آتش دان کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکنا چاہتا تھا لیکن میرے دل و دماغ کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر ٹھٹکا "کیا بات ہے استاد صیب؟"

میں نے کہا "زریں گل! میں خضری کے گیسٹ ہاؤس جارہا ہوں۔"

"اس وقت استاد صیب؟ بہت سردی ہے باہر۔ آپ باہر نکلے گا تو پتا چلے گا۔"

میں نے کہا "مجھے موسم کا حال مت سناؤ۔ اگر تم ساتھ جانا چاہتے ہو تو جاسکتے ہو ورنہ میں اکیلا جارہا ہوں۔"

زریں گل ٹھٹکا "آپ تو ایسے بات کررہا ہے جیسے جلدی واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"کچھ ایسا ہی سمجھو۔ ہوسکتا ہے، دو چار روز لگ جائیں۔"

"دو چار روز؟" زریں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں "لیکن ادھر تو مس غزالہ۔۔۔۔ سوری مسز غزالہ ہمارے لیے دعوت کا انتظام فرما رہا ہے۔ بہت سا کھانا پکا رہا ہے۔ کیا آپ یہ سب کچھ۔۔۔۔"

"زریں گل" میں نے اس کی بات قطع کی "بحث مت کرو۔ اگر ساتھ جانا چاہتے ہو تو جیکٹ پہن لو اور آجاؤ۔"

وہ میرا موڈ دیکھ کر گڑبڑا گیا "ایک منٹ استاد صیب! ہم ابھی تشریف لا رہا ہے۔ بس ایک منٹ میں۔۔۔۔"

"لیکن گھر میں کسی کو کچھ نہیں بولنا۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ بازار جارہے ہو۔"

زریں گل نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجتبیٰ کنور کا دیا ہوا پسٹل میں نے نئی گولیوں کے ساتھ قمیص کے نیچے لگایا۔ اوپر سے جیکٹ پہن لی۔ اس جیکٹ کے اوپر سر اور چہرے کو ڈھانپنے والا غلاف بھی تھا۔ یہ غلاف میرے لیے بہت مفید تھا کیونکہ چہرہ چھپانے کا کام دے سکتا تھا۔ زریں گل کی جیکٹ بھی اسی قسم کی تھی۔ سردی سے بچنے کا پورا انتظام کرکے ہم گھر سے نکل آئے۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میں خضری کے گیسٹ ہاؤس میں مجتبیٰ کنور اور ساہی صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔۔۔ کچھ ہی فاصلے پر نائیلہ نامی لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ بیڈ پر چت لیٹی تھی۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا سلیپنگ گاؤن تھا۔ ہاتھ پاؤں بیڈ سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ کسی خواب آور انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔ یقیناً کچھ عرصے پہلے تک وہ بہت دلکش لڑکی رہی ہوگی۔ نقوش کے علاوہ اس کے جسمانی اعضا میں زبردست قسم کا تناسب موجود تھا۔ وہی تناسب جو خوب صورتی کی بنیاد ہوتا ہے لیکن یہ ساری خوب صورتی لڑکی کی عجیب و غریب بیماری نے گہنا رکھی تھی۔ رخساروں پر زردی کھنڈی تھی اور ہونٹ خشک پپڑیوں جیسے ہوگئے تھے۔ مجتبیٰ کنور کی اجازت سے میں لڑکی کے پاس پہنچا۔ اس کے سلیپنگ گاؤن کی ڈوری کھولی اور غور سے اس نشان کا معائنہ کرنے لگا جو لڑکی کے سینے پر موجود تھا۔ مجتبیٰ سے اجازت لے کر میں نے زریں کو بھی اندر بلالیا۔ ایک نیم برہنہ لڑکی کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر زریں گل بری طرح سٹپٹایا۔ اس کی نگاہ خود بخود فرش میں گڑ گئی تھی۔ میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بستر کے قریب لے آیا۔ اس دوران میں زریں گل کچھ سنبھل گیا تھا۔ میں نے لڑکی کا نشان زریں گل کو دکھایا اور اس سے نشان کے حروف کے بارے میں پوچھا۔ وادی میں قیام کے دوران میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی تھی کہ زریں نہ

۔۔۔ ب "اپنا" زبان سمجھتا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھ بھی سکتا ہے۔ وہ صاحب! یہ ہے احسان ہے ان حروف کو دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں وہ جیسے کسی طرح لڑکی کی بُم یہ بچگی کو تقریباً فراموش کر چکا تھا۔ کسی اپنے سرجن کی طرح جو مریض کو فراموش کر کے مرض کی پیچیدگی میں الجھ پڑا ہو۔

قریباً دو منٹ بعد زریں گل نے سر اٹھایا۔ سرگوشی میں بولا "استاد صیب! یہ حرف تو ہماری زبان کے ہیں مگر لفظ کی سمجھ نہیں آتی۔ ان حرفوں سے "بازر" لفظ بنتا ہے۔ قبائلی زبان میں بازر "جادو" کو بھی کہتے ہیں اور اگر الف کے بغیر پڑھا جائے تو "بنذر" بنتا ہے۔ اس کا مطلب آزادی ہوتا ہے۔ بس ہم تو اتنا ہی بتا سکتا ہے جی۔ اگر کچھ اور پوچھنا ہو تو کسی پرانے بلتستانی سے پوچھ لیں جو اسی زبان بہت اچھی طرح جانتا ہو۔"

مجتبیٰ کنور اور ساہی صاحب آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے مجتبیٰ کنور سے پوچھا "جناب! لڑکی کا طبی معائنہ ہوا ہے؟"

مجتبیٰ نے اثبات میں سر ہلایا "تمہارا اشارہ غالباً مجرمانہ حملے کی طرف ہے۔ رپورٹ کچھ واضح نہیں ہے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ لڑکی کے جسم پر ایک دو جگہ گہری خراشیں اور چوٹیں وغیرہ نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نشانات برف پر گرنے اور چلنے سے آئے ہوں۔ ویسے بھی مجرمانہ حملے کی صورت میں طبی معائنہ اگر دیر سے ہو تو وہ بے سود ہوتا ہے۔ بہرحال لڑکی کے تکو۔۔۔ سے مسلسل سفر اور سخت سردی کی وجہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ایک گھٹنے پر بھی چوٹ کا نشان ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور زریں گل کو باہر بھیج دیا۔ مجتبیٰ کنور نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہارا ذہن کسی خاص لائن پر سوچ رہا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"کچھ بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "مجتبیٰ صاحب! مجھے ٹریکنگ کے مکمل سامان کی ضرورت ہے....."

ساہی صاحب نے کہا "کیا مطلب؟ کہیں جانا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کتنے افراد کا سامان چاہیے؟"

"تین افراد کا۔"

"کون کون جائے گا؟"

"میں، زریں گل اور....."

"اور کون؟"

"یہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجتبیٰ کنور اور ساہی صاحب حیران نظر آنے لگے۔ ان کی یہ حیرت غیر متوقع نہیں تھی۔۔۔۔ میں جیسے لہجے میں انہیں بتانے لگا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیوں۔۔۔ شروع شروع میں تو مجتبیٰ کنور اور ساہی صاحب کے چہروں پر الجھن نظر آئی مگر پھر بتدریج یہ الجھن ماند پڑنے لگی۔ وہ مجھ سے سوالات پوچھنے لگے۔ میں نے ان سوالات کے تسلی بخش جواب دیے۔ قریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہم حتمی فیصلے پر پہنچ گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

O☆O

لمبی چوڑی بحث و غور و فکر کے بعد جو پروگرام طے ہوا وہ یہ تھا کہ لڑکی نائیلہ کو واپس کیجال لے جایا جائے اور وہاں سے پرانے ہم جا کر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ وہ کدھر جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک رسک ہی تھا۔ لڑکی مخبوط الحواس تھی اور ضروری نہیں تھا کہ اس کا پیچھا کرنا ہمارے لیے مفید ہی ثابت ہوتا پھر ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ یہ لڑکی ایک باثر گھرانے کی بہو تھی اور ایک بااثر گھرانے کی بیٹی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ لوگ ہمارے پروگرام کو یکسر رد کر دیتے۔ بہرطور مجتبیٰ کنور نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس قسم کے تمام مسائل پر قابو پالے گا اور میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ کر گزروں۔ مجتبیٰ نے اسی وقت ٹیلی فون پر ایک دو جگہ بات کی اور خاصی حد تک مطمئن نظر آنے لگا۔

اسی روز صبح ۷ بجے اندھیرے ہم لوگ گلگت سے ہنزواس کے لیے روانہ ہو گئے۔ مجتبیٰ کے علاوہ ساہی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم صبح دس بجے ہنزواس کے مقام پر پہنچے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں نانگا پربت کی طرف جانے والے سیاحوں کو گاڑیاں چھوڑنا پڑتی ہیں اور پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔ بار برداری کے لیے قلی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ہنزواس سے آگے جیپ پر جانا چاہے تو بمشکل چھ سات میل تک اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے آگے بہرصورت اپنی ٹانگوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے ہنزواس سے ہی پورٹرز (قلیوں) کا انتظام کر لیا۔ مخبوط الحواس نائیلہ کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا تھا۔ ورنہ کچھ سنتی تھی نہ سمجھتی تھی۔ اسے نیند آور انجکشن دیا گیا اور ڈولی جیسی ایک پالکی میں بٹھا کر دیا مرائی پہنچایا گیا۔ دیا مرائی میں رات قیام کرنے کے بعد ہم براستہ نکوٹ کیجال پہنچ گئے۔ کیجال منصور خاں مرحوم کے "آپریشن کلین اپ" کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں ایک ہیلی پیڈ بنایا گیا تھا۔ دو عارضی کمرے تعمیر کیے گئے تھے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا گیا تھا۔ اب یہ ہیڈ کوارٹر اجڑ چکا تھا اور ان تمام انتظامات کے بس آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔ ہیڈ کوارٹر کے انچارج کو ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ ٹریکنگ کے لیے جو سامان ہمیں درکار تھا وہ اکٹھا کرلیا گیا تھا۔ اس میں اسکی پولز، کلائمبنگ شوز، سلیپنگ بیگز، اینٹی گلیئر گلاسز اور مخصوص جیکٹس شامل تھیں۔ اس سامان کے علاوہ میں نے مجتبیٰ کنور سے چار اشیا مزید مانگی تھیں۔ اپنے لیے ایک سیون ایم ایم گن اور ایک چھوٹا سا برنا پسٹل۔ زریں گل کے لیے

ایک شکاری رائفل اور لڑکی نائیلہ کا وہ لباس جو اس نے اپنے شوہر کی موت کے وقت پہن رکھا تھا۔ یہ چاروں اشیا مجھے فراہم کردی گئی تھیں۔ میری ہدایت پر یہ چیزیں ہمارے سفری تھیلوں میں پیک کردی گئیں۔ پروگرام کے مطابق ہمیں پورٹرز کے بغیر ہی سفر کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل اور کٹھن کام تھا مگر اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ کیجال میں ایک رات قیام کر کے ہم صبح سویرے روانہ ہو گئے۔ نائیلہ جو ہر دم بے قرار تھی، آزاد کردی گئی۔ آزاد ہوتے ہی وہ مشینی انداز میں چل پڑی۔۔۔ میں اور زریں اس کا سایہ بن گئے۔

ہمارے چاروں طرف پہاڑ تھے اور ان پر رکھی ہوئی برف کی چادر تھی۔ یہ چادر شمال مشرق کی طرف بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ ہزاروں فٹ دور نانگا پربت کی چوٹی تک۔۔۔ یہ چوٹی اپنے اندر عجیب سی ہیبت رکھتی تھی۔ اس کی مہیب خاموشی میں سیکڑوں بھید چھپے ہوتے تھے۔ ان گمنام افراد کی ارواح اس "کلر ماؤنٹین" کے اردگرد گھومتی محسوس ہوتی تھیں، جنہوں نے مختلف اوقات میں اس چوٹی کی تختیاں اپنے جسموں پر جھیلی تھیں اور اس کے بے رحم برفستانوں میں اپنی جانیں گنوائی تھیں... مطلع صاف تھا، لیکن "پیک" پھر بھی بادلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ زریں گل ٹکٹکی باندھے اس منظر کو دیکھتا چلا جارہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! یہ سوچنا کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال سے بلکہ جب سے یہ دنیا بنا ہے اس چوٹی پر چند گنے چُنے لوگ ہی جاسکا ہے۔ اس چوٹی کے راستے میں کئی چوٹیاں ایسی ہوں گی جن پر آج تک کسی بندے کا قدم ہی نہیں پڑا۔"

ایک دم نائیلہ کو ٹھوکر لگی اور وہ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھالا۔ حسب سابق وہ میرا ہاتھ جھٹکنے سے ایک دم بیزار نظر آنے لگی اور خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ گونگوں کی طرح اس کے ہونٹوں سے دبی دبی آوازیں نکل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ میں نے اسے کچھ دیر مزید تھامے رکھا تو وہ چیخنے لگ جائے گی۔ میں نے اس کے شانوں پر سے ہاتھ ہٹالیے۔ وہ ایک بار پھر کسی معمول کی طرح چلنے لگی۔ اس کے چلنے کا انداز بڑا عجیب تھا۔ وہ اپنے سامنے دیکھنے کے بجائے ذرا بلندی کی طرف دیکھتی تھی۔ پاؤں میکانکی انداز میں اٹھ رہے تھے جیسے وہ خواب میں چل رہی ہو۔ کسی وقت جب پاؤں اٹھاتے سید ہا جاتا تھا یا وہ نیچے پھسلنے لگتی تھی تو اس کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی جھلائی ہوئی سی آواز بلند ہوتی تھی جیسے وہ اپنے آپ سے جھگڑ رہی ہو۔ کبھی کبھار وہ اردگرد بھی دیکھتی تھی اور ہمارے چہروں پر بھی نظر ڈالتی تھی لیکن یہ بالکل خالی نظر ہوتی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جس چیز پر نگاہ ڈال رہی ہے اسے نہیں دیکھ رہی بلکہ اس سے بہت آگے کسی اور شے کو دیکھ رہی ہے۔

ہم قریباً تین گھنٹے مسلسل چلتے رہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی رکی اور نہ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نظر آئے۔ زیادہ دو بجے کے قریب میں نے اسے بمشکل رکنے اور بیٹھنے پر مجبور کیا۔ خوراک کے نام پر پچھلے دو روز میں اس نے صرف چند لقمے لیے تھے اور وہ بھی اسے زبردستی کھلائے گئے تھے۔ وہ جسمانی طور پر کمزور نظر آرہی تھی۔ اس پر بلا کی سردی اور مسلسل سفر۔ مجھے ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں وہ بے ہوش ہو کر گر ہی نہ جائے۔

ہمارے پاس کھانے پینے کا وہی سامان تھا جو "ٹریکرز" اور کوہ پیماؤں کے پاس ہوتا ہے۔ اس میں ٹن فوڈ تھا۔ پاؤڈر فارم میں جوس تھے، بسکٹس، انرجی بارز اور ڈرائی فروٹس تھے۔ میں اور زریں گل نے نائیلہ کے عین سامنے بیٹھ کر لنچ کیا۔ خیال یہی تھا کہ شاید ہمیں کھاتے پیتے دیکھ کر اس کی بھوک بھی چمک اٹھے لیکن اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ کبھی سر کھجانے لگتی، کبھی دمے کے مریض کی طرح لمبی لمبی سانسیں لینے لگتی۔ میں نے زریں گل کو اشارہ کیا۔ وہ بڑی آہستگی سے نائیلہ کے عقب میں پہنچا پھر اچانک اس نے نائیلہ کو دبوچ لیا۔ نائیلہ کے کندھوں کو اپنے گھٹنوں میں دبا کر اس نے اس کا سر پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح نائیلہ کا چہرہ اوپر اٹھ گیا۔ وہ مچلی لیکن زریں نے اسے چھوڑا نہیں۔ میں نے سیال خوراک (ملک شیک) کا ٹن کھولا۔ پھر ایک ہاتھ سے نائیلہ کے رخساروں کو کسی بچے کے رخساروں کی طرح دبایا اور خوراک اس کے منہ میں انڈیلنے لگا۔ اس نے پہلے تو مزاحمت کی لیکن پھر خوراک نگلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹن خالی ہو گیا۔ زریں گل نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی۔ منہ سے بہنے والی خوراک اس کی ٹھوڑی پر نظر آرہی تھی۔ میں نے رومال سے اس کی ٹھوڑی صاف کی۔ وہ جیسے جھرجھری سی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک بار پھر اپنی پسندیدہ سمت میں سفر شروع کردیا۔

میں نے اور زریں گل نے جلدی جلدی اپنی اشیا سمیٹیں اور اس کے پیچھے روانہ ہو گئے..... یہ سفر بغیر کسی وقفے کے شام سے پہلے تک جاری رہا۔ نائیلہ کے پاؤں بالکل مشینی انداز میں حرکت کر رہے تھے۔ کوئی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس سفر میں ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں برف بہت سخت اور قدرے ڈھلوان تھی۔ ایسی جگہوں پر ٹریکرز اور کوہ پیماؤں کو اسکی پولز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنے اسکی پولز نکال لیے اور انہیں برف میں گاڑ گاڑ کر آگے بڑھنے لگے لیکن مخبوط الحواس نائیلہ ایسی کسی سہولت سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ نہیں تھی۔ سخت برف کی وجہ سے وہ بار بار پھسلنے لگی۔ اس کے گھٹنے پر پہلے چوٹ لگی تھی۔ بار بار گرنے سے یہ چوٹ مزید تکلیف دہ ہو سکتی تھی اور عین ممکن تھا کہ وہ چلنے کے قابل ہی نہ رہتی۔ نائیلہ کی مزاحمت کے باوجود میں نے اور زریں گل نے اسے سہارا دیا اور چلنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ جب برف کی سفید چادر شام کے ہاتھوں میلی ہونے لگی تو ہم نے ضروری سمجھا کہ اب "نائٹ اسٹاپ" نائیلہ کو روک لیا جائے

دوسری طرح کوشش کر کے ہم نے اسے رکنے اور بیٹھنے پر مجبور کیا۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے دو خیمے گاڑے۔ ایک بڑا خیمہ ہم تینوں کے لئے تھا۔ دوسرے خیمے میں سامان رکھ دیا گیا۔ سامان کے بوجھ سے کندھے پھوڑے کی طرح دکھنے لگے تھے۔ سامان اتار کر یوں لگا جیسے ہم ہوا سے ہلکے ہو گئے ہیں۔ میں نے پا تفل چیک کر کے اپنے پاس رکھ لی۔ زوبی گل نے گیس لیمپ روشن کیا۔ ایک چھوٹا سا اسٹوو بھی ہمارے پاس موجود تھا۔ دیگچی نما ٹن کی ایک بڑی شاندار ڈش ہمارے سامان رسد میں تھی۔ ٹن میں محفوظ اس ڈش میں تھوڑا سا پانی (برف) ملا کر آگ پر گرم کیا تو تازہ اور سالن تیار ہو گیا۔ بڑی اشتہا انگیز خوشبو تھی لیکن نائلہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کھانے کے بعد ہم نے اسے پھر زبردستی سیال غذا دینے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ دو تین گھونٹ سے زیادہ پلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

وہ مسلسل بے قرار نظر آ رہی تھی اور قفس میں قید کسی پرندے کی طرح بار بار پھڑپھڑا اٹھتی تھی۔ اس پھڑپھڑاہٹ کا انتظام ہم اپنے "بیس کیمپ" سے کر کے چلے تھے۔ میرے پاس ایک ہتھکڑی موجود تھی۔ جس برف پر ہمارا خیمہ لگا تھا وہ پتھر کی طرح سخت تھی۔ اس برف کے نیچے پتھر بھی تھے۔ میں نے ایک پتھر ڈھونڈ کر وہاں لوہے کی میخ ٹھونکی۔ ہتھکڑی کی زنجیر اس میخ سے منسلک کی اور ہتھکڑی نائلہ کی کلائی میں پہنا دی۔

وہ ہتھکڑی کو زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔ عجیب سی جھنجلاہٹ سوار تھی اس پر۔ پھر وہ ایکدم چلانے لگی۔ اس کی چیخوں میں بے بسی اور جھلاہٹ نمایاں تھی۔ تاہم وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ انسانی چیخیں ہی نہیں ہیں۔ آٹھ دس منٹ بعد وہ دھیرے دھیرے خاموش ہو گئی۔ سیال غذا کے جو چند گھونٹ میں نے اسے پلائے تھے اس میں خواب آور دوا کے چند قطرے بھی شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد نائلہ کی بے قرار آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں نیم دراز ہو گئی۔ جب وہ سو گئی تو میں نے زوبی گل کے ساتھ مل کر اسے سلیپنگ بیگ میں پہنچا دیا۔

زوبی گل بولا۔ "استاد صیب! اس کا چیخیں سن کر تو ہمارا دل ہل رہا تھا۔ ہم کو یقین ہونے لگا ہے کہ اس پر کسی ہوائی چیز کا اثر ہے۔ سائیں عالی جیسا کوئی بندہ اس پر تعویذ گنڈا کرے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائے۔"

"تو پھر جاؤ ڈھونڈ لاؤ سائیں عالی کو۔"

"ہم مذاق نہیں کر رہا استاد صیب! اس کا آخری دو چیخیں تو ابھی تک ہمارے کانوں میں ریل کا سیٹی کے مافق بج رہا ہے۔ کوئی ہم کو اس حال میں دیکھ لے تو کیا سوچے۔ ہم نے اس خوبصورت لڑکی کو ہتھکڑی لگا کر اس خیمے میں باندھا ہوا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی رشتہ بھی نہیں۔ جو سوچے گا یہی سوچے گا کہ ہم اس کو خراب کر رہا ہے۔"

"تمہیں دیکھ کر تو یہی سوچے گا کیونکہ تمہاری شکل ہی ایسی ہے۔"

"لیکن اگر ہمارا شکل اچھا ہوتا تو بھی یہ پوزیشن بڑا خطرناک ہے اور جہاں تک شکل کا بات ہے تو اسلم پرویز کا شکل کون سا برا تھا لیکن اس نے ونا جہاں کا کالک اپنے منہ پر مل لیا تھا، خدا اس کا مغفرت فرمائے۔ آپ کو پتا ہے فلم "تیغ" میں اس نے میڈم نور جہاں کے ساتھ کیا کیا تھا، اس کا یہ ایک گناہ ہی اس کی آخرت کا ستیاناس کر سکتا ہے۔ شکل اکثر دھوکا دیتا ہے استاد صیب! اب اپنے سلطان راہی صیب کو دیکھ لیں، لگتا ہے کہ وہ خاندانی بدمعاش ہے۔ راہ جاتے بندے کو لوٹ لیتا ہوگا اور عورت کو دیکھتے ہی چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیتا ہوگا اور جنگل میں لے جاتا ہوگا لیکن آفرین ہے اس ماں پر جس نے اس کا ایسا تربیت فرمایا۔ کوٹ کوٹ کر اس میں نیکی اور رحم دلی بھر دیا اور جا اور ایسا کہ ایک بڑے سے بڑے مصطفیٰ قریشیوں کو آگے لگا لے۔۔۔"

"یہ باتیں مختصر کرو، تم چاہتے کیا ہو؟"

"ہم تو کچھ نہیں چاہتا استاد صیب! کلثوم کے سوا اب ہم کسی کو چاہ ہی نہیں سکتا، ہم تو صرف ایک بات کر رہا تھا۔ ہمارا مطلب ہے کہ اتنا خوبصورت لڑکی، یہ ہتھکڑی اور ہم دونوں۔۔۔ اگر یہاں کوئی بستی ہو اور وہ لوگ ہم کو دیکھ لے تو؟"

میں نے کہا۔ "پریشانی کی کیا بات ہے۔ دیکھنے والوں کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ لڑکی پاگل ہے اور ہم نے حفاظت کے خیال سے اسے ہتھکڑی لگا رکھی ہے۔"

وہ کبوتروں کی طرح نکتہ اٹھا کر بولا۔ "لیکن لوگ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے کہ لڑکی پاگل کیوں ہوا ہے؟ ہو سکتا ہے ان کے دماغ میں یہ بات آئے کہ ہم نے لڑکی کے ساتھ ظلم کیا ہے جس کی وجہ سے اس کا یادداشت روانہ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب تک تیرے دماغ سے "فلمیں" نہیں نکلیں گی، تیری سوچ ایسی ہی واہیات رہے گی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور سنجیدگی سے بولا۔ "استاد صیب! کہیں یہ نہ ہو کہ یہ لڑکی ہم کو یونہی ویرانے میں گھماتی رہے۔ خود کہیں پہنچے نہ ہم کو پہنچائے۔"

"ایسے کاموں میں ایسے رسک تو لینے ہی پڑتے ہیں۔"

"ہم یہ بات اس لئے کہہ رہا ہے استاد صیب! کہ ابھی تک تو لڑکی کا رخ ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ ہم کو جس طرف لے جا رہا ہے وہ "طرف" وادی کو ہرگز نہیں جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب ہمیں خود ٹھیک سے معلوم نہیں کہ وادی کو جانے والا راستہ کون سا ہے تو پھر ہم نائلہ کے راستے کو غلط کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آگے جا کر وہ اپنا رخ بھی صحیح کر لے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" زوبی نے چونک کر پوچھا۔

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ نائلہ ہمیں اس وادی کی طرف لے جا ہی نہ رہی ہو۔"

زوبی گل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

میں نے کہا۔ "یہ بات ناممکن نہیں کہ نائلہ اور اس کے شوہر منصور خان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ "وادی" کے بجائے کہیں اور پیش آیا ہو، یہ برفستان قراقرم رینج میں اور رینج سے باہر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، ان میں وادیاں ہیں، تنگ و تاریک گھاٹیاں ہیں، نشیب کے گھنے جنگل ہیں، ضروری نہیں کہ یہاں صرف سردار سدوت اور اس کا قبیلہ ہی آباد ہو۔ کچھ اور دور افتادہ بستیاں بھی یہاں ہو سکتی ہیں، تمدن سے دور اور فطرت کے قریب۔۔۔"

"آپ بہت مشکل لفظ بول رہا ہے استاد صیب!" زوبی نے شکوہ کیا۔ "بہرحال ہم آپ کا مطلب سمجھ رہا ہے۔ آپ یہ فرمانا چاہ رہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ منصور خان اور اس کا یہ خوبصورت بیوی کسی ایسی مصیبت کا شکار ہوا ہو جس کے بارے میں ہم کو کچھ معلوم نہیں ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور جیبی نقشہ گیس لیمپ کی روشنی میں کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو یہ ہے "کیجال" میں اس آپریشن کا بیس کیمپ اور یہ وہ راستہ جس پر چل کر ہم وادی کی طرف گئے تھے۔ اب اس کیمپ سے شمال مشرق کی طرف یہ وہ مقام ہے جہاں سے وزیر منصور خان کی لاش ملی تھی۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان دونوں مقامات کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ منصور خان کی موت سے چند دن پہلے وائرلیس سیٹ پر متلاشی پارٹی کا جو آخری پیغام موصول ہوا تھا اس کے مطابق وہ لوگ بیس کیمپ یا ہیڈ کوارٹر سے 40 ڈگری شمال مشرق کی طرف تھے۔ یہ مقام بھی تقریباً اس مقام کے آس پاس ہے جہاں سے منصور خان کی لاش ملی تھی۔ یہ دونوں نکتے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ شاید اس نئے معاملے میں سردار سدوت اور اس کے لوگ ملوث نہیں ہیں۔"

زوبی گل کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں پھیل گئی تھیں اور گول گول آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔ شاید اس تفکر میں یہ غم بھی شامل تھا کہ اس کا کلثوم سے ملنے کا چانس اور بھی کم ہو گیا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اب اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہمارا مختصر خیمہ بخوبی ہوا کا مقابلہ بڑی کامیابی سے کر رہا تھا۔ تاہم کوئی تیز جھونکا خیمے کو یکبارگی پھڑپھڑانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ خیمے سے باہر درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے قریباً 25 درجے نیچے تھا لیکن اپنے مخصوص لباس اور سلیپنگ بیگز کے اندر ہم خود کو پرسکون محسوس کر رہے تھے۔

اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ ہم نے اپنا مختصر ڈیرا اٹھایا اور نائلہ کی "رہنمائی" میں اپنا سفر پھر شروع کر دیا۔ یہ دن بھی کم و بیش پہلے دن جیسا ہی گزرا، نائلہ اپنی مخصوص سمت میں آہنی ارادے کا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ لگتا تھا کہ اگر ہم اسے زبردستی رکنے پر مجبور نہ کریں تو وہ چلتی رہے اور چلتے چلتے جان دے دے۔

شاید وہ چکور تھی جو نامعلوم چاند کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی یا پھر اس "وحشی" کی مثال تھی جو اپنے مالک کے اشارے پر سرپٹ بھاگتا رہتا ہے اور بالآخر گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ وہ ایک معما تھی اور ہم اس معمے کو سلجھانے کے لئے مسلسل اس کے تعاقب میں تھے۔ بھاری سامان اور بھاری لباس کے ساتھ دشوار راستوں پر سفر کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن ہم یہ کام کر رہے تھے۔ ہمارے لئے یہ سفر اس لئے بھی زیادہ مشکل تھا کہ ہم ایسے راستوں کا زیادہ تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ آسیب زدہ لڑکی بھی نہیں رکھتی تھی لیکن اس کے اندر نجانے کیا ہیجان برپا تھا کہ وہ گرتی پڑتی چلی رہتی تھی۔ جب ہم تھک جاتے تھے تو اسے پکڑ کر زبردستی بٹھا لیتے تھے۔

اپنے سفر کے چوتھے روز شام کے وقت ہم کیجال سے ستر اسی کلومیٹر آگے نکل چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ہمارا رخ نانگا پربت کے "رول فیس" کی طرف تھا یعنی موزیبا ہمارے دائیں رخ پر تھا اور رول بائیں رخ پر۔ ہمارے چاروں طرف برف تھی اور برف کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ روئے زمین پر برف کی سفید بے داغ چادر کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کچھ دیر کے لئے نانگا پربت بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، ہم ایک بلند ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہونے لگا کہ نائلہ کی رفتار میں نمایاں تیزی آ گئی ہے۔ اس کے قدم زیادہ تیزی سے اٹھنے لگے تھے اور چہرے کی ہیجانی کیفیت بھی شدید ہو گئی تھی۔

میں نے زوبی گل سے پوچھا۔ "زوبی! تم بھی وہ دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟"

وہ بولا۔ "ہاں، ہم دیکھ رہا ہے کہ اس لڑکی کا بیٹری پھر سے چارج ہو گیا ہے۔ ہم کو لگتا ہے کہ یہ ہم کو اسی طرح چلا چلا کر دوسری دنیا میں لے جائے گا۔"

اچانک میں اور زوبی گل ٹھٹک گئے۔ کہیں بالکل قریب ہی ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی تھی۔ پچھلے چار روز میں یہ پہلی آواز تھی جو ہم نے سنی تھی۔ ہمارے قدم خودبخود آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ نائلہ بھی اسی طرف جا رہی تھی، یہ بلندی کا سفر تھا لہٰذا ہم بری طرح ہانپ رہے تھے۔ یکایک میں نے ایک انسانی ہیولا دیکھا۔ اس شخص کے بال لمبے تھے اور جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ وہ ایک کدال نما آلے سے برف کھودنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا کہ شاید بھاگ جائے گا لیکن وہ بھاگا نہیں۔ بس کدال زمین پر ٹیک کر حیران نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ میرا ہاتھ غیر محسوس طور پر اپنی جیکٹ کی جیب میں رینگ گیا تھا اور پستول کے دستے پر میری گرفت مضبوط

ہو گئی تھی۔

ہم اس شخص کے قریب رکنا چاہتے تھے لیکن نائلہ اپنے جنون میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے بمشکل روکا۔ وہ بے دم سی ہو کر برف پر بیٹھ گئی اور ہانپنے لگی۔ اجنبی بڑی گہری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ خاص طور سے نائلہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ابھر آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس شخص کی عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ تھی۔ بلند اور سرد علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی طرح اس کے چہرے پر بہت سی جھریاں تھیں۔ داڑھی اور سر کے بال کھچڑی تھے۔ رخسار پر زخم کا پرانا نشان تھا جو داڑھی کے اندر جا کر کہیں چھپ گیا تھا۔ زریں گل نے ٹوٹی پھوٹی پشتو زبان میں اجنبی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ زریں گل کے چھ سات فقروں کے جواب میں اجنبی نے صرف دو تین لفظ بولے۔ یہ لفظ بھی پیچھا چھڑانے والے انداز میں بولے گئے تھے اور ان میں ہراس کا عنصر نمایاں تھا۔

زریں گل کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن وہ جو اشارے کر رہا تھا ان سے یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اجنبی کو لڑکی کے بارے میں بتا رہا ہے۔ اسے کہہ رہا ہے کہ ہم اس لڑکی کو لے کر اوپر چوٹی کی طرف جا رہے ہیں۔

اجنبی نے ڈری ہوئی نظروں سے چوٹی کی طرف دیکھا۔ پھر وارننگ دینے کے انداز میں تین چار الفاظ بولے۔ وہ واضح طور پر ہمیں ہدایت کر رہا تھا کہ ہم چوٹی کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔

زریں گل مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اجنبی نے بڑی عجلت میں ہم سے پیچھا چھڑایا اور کدال سمیت نشیب میں کہیں گم ہو گیا۔ میں نے دیکھا جہاں وہ برف کھود رہا تھا وہاں لکڑی کا ایک پرانا تنا دبا ہوا تھا۔ یقیناً وہ اسی تنے کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہاں آبادی کے آثار موجود ہیں۔ ایک دو جگہ ہمیں برف پر قدموں کے نشان بھی نظر آئے۔ ایک ڈھلوان پر کسی جانور کی مینگنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جوں جوں ہم بلندی کی طرف جا رہے تھے شمال مغرب کی طرف نامعلوم فاصلے پر عظیم الشان ناگا پربت ابھرتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا عفریت دھند کے سمندر سے نمودار ہو رہا ہو۔ نائلہ کی وارفتگی اور بے قراری دیکھ کر ہمارے دلوں کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

ہم جس پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اس کی چوٹی دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دو عظیم الشان نوکیلی چٹانیں جیسے کوئی اژدہا منہ آسمان کی طرف کھولے ہو۔ چار پانچ سو میٹر اوپر جانے کے بعد ہمیں چند گھروندے نظر آئے۔ یہ گھروندے پتھر وغیرہ جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ ہم گھروندوں کے قریب پہنچے تو بہت سے افراد کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، بچے بھی اور عورتیں بھی۔ ان لوگوں نے جانوروں کی کھال کے لباس پہن رکھے تھے۔ زیادہ تر کی پنڈلیاں اور پاؤں ننگے نظر آتے تھے۔ ان میں سے چند جوان افراد کے پاس کلہاڑیاں اور آتشیں اسلحہ بھی دکھائی دیا۔ سردار سدورت کے قبیلے کی طرح ان لوگوں کے بال بھی لمبے تھے اور لباس غلیظ بلکہ غلیظ ترین لیکن ان لوگوں میں ایک فرق نمایاں نظر آتا تھا۔ ان کے جسموں پر لوہار کا لباس نہیں تھا اور نہ ہی ان کے کانوں میں بالے تھے۔ ہمیں بڑی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ زریں گل نے آگے بڑھ کر ایک عمر رسیدہ شخص سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ جلدی سے واپس پلٹ گیا۔ اسے دیکھ کر اور بھی کئی مرد و زن پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے چہروں پر خوف نمایاں تھا۔ ان میں سے کئی ایک اپنے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیے۔ جو باقی رہ گئے وہ ہمیں پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے ادھر ادھر ہٹ گئے۔

جب ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا تو آگے بڑھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج عقبی پہاڑوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ برف کی چادر میلی ہوئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ پڑاؤ کا وقت تھا لیکن نائلہ کے قدموں میں آج غیر معمولی تیزی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اگر آج ہم نے اسے روکنے کی کوشش کی تو ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ زریں گل سے مشورے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک نائلہ چلتی رہے ہم بھی چلتے رہیں۔ یہ مسلسل چڑھائی کا سفر تھا۔ چاندنی رات میں گردو پیش دیومالائی منظر پیش کر رہے تھے۔ برف نیلگوں ہو گئی تھی اور قرب و جوار کی بلند چوٹیاں چاندنی میں دمک رہی تھیں۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ اگر ہم رک جاتے تو شاید اکڑ کر رہ جاتے۔ مشقت ہمارے جسموں کو نیم گرم رکھے ہوئے تھی۔ وہ بڑی کٹھن اور پرتجسس رات تھی ہم ساری رات چلتے رہے اور اگلے روز دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف دیکھنے کا تجربہ ناقابل فراموش تھا۔ سیکڑوں میل تک کے مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے کھل گئے تھے۔

چوٹی کی دوسری جانب بھی برف موجود تھی مگر اس طرف چونکہ دھوپ رہتی تھی لہٰذا کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں درخت بھی موجود تھے۔ گہرائی تک پہنچتے پہنچتے یہ درخت کافی گھنے ہو جاتے تھے۔ ان درختوں کے اندر ہمیں آبادی کے آثار نظر آئے۔ ہم پوری طرح چوکس ہو گئے۔ نائلہ بدستور حرکت میں تھی۔ چونکہ اب وہ بلندی سے نشیب کی طرف جا رہی تھی لہٰذا اس کی چال میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ جلد ہی ہمیں مقامی لوگوں کی صورتیں نظر آئیں۔ لمبے بال اور غلیظ لباس ان کی پہچان تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نے بھیڑ کی اون کی صدریاں پہن رکھی تھیں۔ بعض کے جسموں پر کھال کے لباس تھے۔ پنڈلیاں تقریباً سب کی عریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ ہونقوں کی طرح رہ گئے پھر ان کی نگاہیں نائلہ پر مرکوز ہو گئیں۔ نائلہ کو دیکھ کر ان کی

آنکھوں میں عجیب سی حیرت نمودار ہو گئی تھی۔ ایک بوڑھا نائلہ کے سامنے اوندھا لیٹ گیا اور اس نے اپنے ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیے۔ بوڑھے کی تقلید میں اور بھی کئی مرد اوندھے لیٹ گئے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ نائلہ کو تعظیم وغیرہ پیش کر رہے ہیں۔

ایک وسیع و عریض بستی تھی جو درختوں کے نیچے نیچے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بستی کا انداز وہی تھا جو سردار سدورت کے قبیلے کی بستی کا تھا۔ مکانوں کی چھتیں نیچی تھیں۔ ان پر گھاس پھونس اگا دیا گیا تھا۔ کسی کسی چھت پر مکئی کی فصل بھی نظر آ رہی تھی۔ نائلہ کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری بستی میں پھیل گئی۔ مرد و زن اور بچے اپنے اپنے کام چھوڑ کر ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ ہمیں حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے جبکہ نائلہ کو دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک پُراسرار کیفیت نمودار ہو جاتی تھی۔ وہ جھک کر اور لیٹ کر نائلہ کو تعظیم پیش کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بستی میں پہنچ کر نائلہ کافی پُرسکون ہو گئی ہے۔ اس کی پلکیں بوجھل بوجھل تھیں اور خوبرو چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ جیسے وہ طویل سفر کے بعد سونا چاہ رہی ہو۔

اچانک ایک طرف سے شور سنائی دیا۔ تین گھڑ سوار ہماری طرف آ رہے تھے۔ درمیان والے گھوڑے پر ایک کوتاہ قد شخص سوار تھا، اس کی دونوں جانب دو محافظ تھے، ان کے کندھوں سے خودکار رائفلیں جھول رہی تھیں۔ گھوڑے ہمارے سامنے پہنچ کر رکے۔ کوتاہ قد شخص جست لگا کر گھوڑے سے اترا۔ اس کا قد بمشکل ساڑھے چار فٹ ہو گا۔ جسامت درمیانی تھی تاہم سر باقی جسم کے مقابلے میں کافی بڑا تھا۔ وہ ایک جیم شیم شخص کا سر تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ جسم پر سفید ریچھ کی کھال کا لباس تھا۔ اس کی کمر سے ایک جدید امریکن پستول بندھا ہوا تھا۔ کوتاہ قد شخص نے اپنے ساتھ آنے والے ایک محافظ کو اشارہ کیا۔ اس نے پشتو میں ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور یہ لڑکی ہمیں کہاں سے ملی ہے۔

میں اس سوال کا جواب زریں گل کو پہلے ہی رٹا چکا تھا۔ زریں گل نے کہا۔ "ہم شکاری ہیں۔ پانچ چھ روز قبل کیجال کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ لڑکی بھٹکتی ہوئی مل گئی۔"

زریں کا جواب مترجم نے کوتاہ قد شخص تک پہنچایا۔ وہ کچھ دیر تک مترجم سے تبادلۂ خیال کرتا رہا پھر ہم سے پوچھا "کیا یہ لڑکی اکیلی تھی؟"

زریں گل نے کہا۔ "جس وقت ہمیں ملی اس وقت تو اکیلی ہی تھی۔"

مترجم نے کہا۔ "سردار رابیل پوچھتے ہیں، کیا یہ لڑکی خود تمہیں یہاں لائی ہے؟"

زریں نے کہا۔ "جی ہاں، ہم بس اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے ہیں۔"

سردار رابیل کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ لفظ "رابیل" میں نے پہلے بھی کہیں سنا تھا۔ پھر ایک دم مجھے یاد آ گیا۔ جو خط نائلہ کے لباس میں سے ملا تھا اس میں یہ نام موجود تھا۔ مرحوم صوبائی وزیر منصور خان نے لکھا تھا، اگر رابیل ایک بار مچل پڑا تو پھر اسے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

مترجم نے کہا۔ "سردار رابیل پوچھتے ہیں کہ لڑکی کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ کیا اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟"

میں نے اور زریں گل نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اپنے رک سیک (سفری تھیلے) میں سے نائلہ کا وہ لباس نکالا جو اس نے اپنے شوہر کی موت کے وقت پہنا ہوا تھا۔ اس لباس کو دیکھ کر سردار رابیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ لباس مجھ سے لے لیا۔ رابیل نے مترجم کے ذریعے مجھ سے پوچھا کہ لڑکی کے جسم پر اب جو لباس موجود ہے وہ کہاں سے آیا؟ زریں نے جواب میں بتایا کہ یہ ہماری ایک ساتھی لڑکی کا لباس ہے اور اسی نے تبدیل کرایا تھا۔

کچھ دیر مترجم اور سردار آپس میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ وہ ایک ناقابل فہم زبان بول رہے تھے۔ شاید یہ وہی زبان تھی جو سردار سدورت کا قبیلہ بولتا تھا، اس میں پشتو کے بہت سے الفاظ بھی شامل تھے۔

سردار رابیل کے اشارے پر مترجم ہماری طرف بڑھا اور نرم لہجے میں بولا۔ "آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو ہمیں دے دیں۔" میں نے سفری تھیلے میں سے اپنی طاقتور رائفل اور گولیاں وغیرہ نکال کر مترجم کے حوالے کر دیں۔ زریں نے بھی اپنی شکاری رائفل مترجم کو سونپ دی۔ بہرحال وہ مختصر لیکن طاقتور پستول جو میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا میرے پاس ہی رہا۔ اس کے علاوہ میرا مخصوص خنجر بھی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ دونوں محافظوں نے خود بھی ہمارے سامان کی تلاشی لی۔ پھر ہمیں دوستانہ انداز میں بستی کے اندر لے جایا گیا۔ نائلہ ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ اسے کوتاہ قامت شخص جسے رابیل کہا جا رہا تھا ساتھ لے گیا تھا۔ رابیل بظاہر ایک غیر اہم شخص نظر آتا تھا اور اس کی شخصیت پہلی نظر میں کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی تھی لیکن اس سے بات چیت کرنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑے دل و دماغ کا شخص ہے۔ اس کے لب و لہجے اور خصوصاً آواز میں خاصا رعب موجود تھا۔

ہمیں نیچی چھت والے ایک کشادہ کمرے میں لایا گیا۔ یہاں فرش پر جانوروں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کو بھی اونی نمدوں سے ڈھانپا گیا تھا (یہی طریقۂ رہائش ہمیں سردار سدورت کی وادی میں بھی نظر آیا تھا۔ وہاں آگ نہیں جلائی جاتی تھی اور کمروں کو گرم رکھنے کے لیے اسی قسم کے انتظامات کیے جاتے تھے۔

آگ جلانے کے لئے ایک خصوصی جگہ مقرر تھی اور یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے دھواں نظر آتا تھا اور نہ روشنی۔ یعنی رہی شیطان کی آنت جیسی سرنگ جہاں ایک رات میں نئے رنگ رلیوں اور سرمستیوں کا مون دیکھا تھا)

جس کمرے میں مجھے اور زریں گل کو ٹھہرایا گیا' وہاں دروازے کے علاوہ صرف ایک سلاخ دار کھڑکی تھی۔ ہوا کی یورش سے بچنے کے لئے یہ کھڑکی بند کر دی گئی تھی۔ دروازے پر ایک رائفل بردار پہرے دار موجود تھا۔ بظاہر وہ اس لئے کھڑا تھا کہ ہماری دید کے مشتاق لوگوں کو ہم سے دور رکھ سکے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ہم پر پہرے دار مقرر کیا گیا ہو۔ دو عام شکل و صورت کی عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان میں سے ایک نوجوان تھی اور دوسری ادھیڑ عمر' دونوں نے پیتل اور چاندی کے بے شمار زیور پہن رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں کھانے کے لئے خشک پھل اور پینے کے لئے کوئی قہوے جیسی چیز دی۔

اسی دوران میں مترجم پھر ہمارے پاس پہنچ گیا' وہ زریں گل سے مختلف معاملات کی ٹوہ لینے لگا۔ مثلاً یہ کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں؟ لڑکی ہمیں کیسے اور کن حالات میں ملی؟ ہمارے دماغ میں یہ کیوں آیا کہ ہمیں لڑکی کو اس کی منزل تک پہنچانا چاہئے؟ اور سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا ہمارے دوسرے ساتھی بھی ہمارے ساتھ یہاں پہنچے ہیں؟

میری ہدایت پر زریں گل نے آخری سوال کا جواب انکار میں دیا اور زور دے کر یہ بات کہی کہ لڑکی کے ساتھ ہم دونوں کے سوا اور کوئی یہاں نہیں پہنچا اور اگر وہ چاہیں تو ہر طرف اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔

رات کا کھانا کافی پر تکلف تھا۔ اس کھانے کو میں "رات کا کھانا" کہہ رہا ہوں لیکن اصل میں یہ ہمیں سرِشام ہی دے دیا گیا تھا۔ غالباً اس بستی میں بھی رات دن کے قانون وہی تھے جو سوار سدرت کی وادی میں تھے۔ یعنی سورج غروب ہوتے ہی رات شروع ہو جاتی تھی۔ لوگ اپنے تمام کام سورج غروب ہونے سے پہلے نمٹا لیتے تھے اور پھر سو جاتے تھے کیونکہ بستی میں کہیں بھی روشنی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ (سرِشام سونے والوں کی نیند ظاہر ہے رات کے آخری پہر پوری ہو جاتی تھی' شاید یہی وجہ تھی کہ دن کے کام کاج کا آغاز سورج نکلنے سے پہلے ہی ہو جاتا تھا۔) کھانے میں نان' دودھ' انڈے' ولیا اور پھل وغیرہ شامل تھے' اس کے علاوہ بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت بھی تھا۔ دہی سے تو ہمیں گرما گرم قہوہ بھی ملا تھا۔ یہ "عیاشی" سوار سدرت کی وادی میں دستیاب نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ ان لوگوں کے ہاں آگ وغیرہ جلانے کا کوئی محفوظ انتظام موجود ہے۔ لہٰذا یہ "کچی خوراک" کھانے پر مجبور نہیں ہیں۔ "کچی خوراک" کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے تصور میں کچے قیمے' انڈے اور سبزی کا وہ سیاہی مائل ملغوبہ آگیا جو ہمیں وادی میں زہر مار کرنا پڑتا تھا۔ اس ملغوبے کی بو ابھی تک ذہن میں کراہیت جگاتی تھی۔

پچھلے قریباً چوبیس گھنٹے سے ہم نے آنکھ تک نہیں جھپکی تھی اور نائلہ کے ساتھ مسلسل محوِ سفر رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب پیٹ کو کھانا ملا اور جسم کو آرام دہ بچھونے میسر آئے تو ہم سب کچھ بھول بھال کر گہری نیند سو گئے۔

اگلے روز نور کے قریب آنکھ کھلی۔ کل کے واقعات خواب و خیال کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ بہرحال کل کے واقعات نے میرا یہ اندازہ سو فیصد درست ثابت کر دیا تھا کہ نائلہ اور اس کے شوہر کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ سوار سدرت کے علاقے میں نہیں ہوا.... سورج ابھی زیادہ اوپر نہیں آیا تھا لیکن بستی کے لوگ اپنے اوقات کے حساب سے تو ساری گزار چکے تھے۔ وہ روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بہت فاصلے پر برفانی چوٹیاں اُن داستانی شہزادیوں کی طرح نظر آتی تھیں جنہوں نے نقرئی تاج پہن رکھے تھے اور جنہیں کسی طلسم نے پتھر کر رکھا تھا۔ کہیں قریب سے موسیقی کی آواز بھی سنائی دی۔ بانسری' طبلہ' ڈھول' بہت کچھ بج رہا تھا۔ ان سازوں کی سنگت میں کچھ لوگ گا بھی رہے تھے۔ یہ سب کے سب مرد تھے۔

جب سے ہم یہاں آئے تھے' مقامی لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی لیکن یہ گانا بجانا جو ہمارے کانوں تک پہنچ رہا تھا کسی اور نوعیت کا تھا۔ الفاظ تو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی "ترانہ" قسم کی چیز ہے۔ رجز کا سا انداز تھا۔ لب و لہجے میں جوش اور جذبہ نمایاں نظر آتا تھا۔

زریں گل بولا۔ "اجازت صیب! لوگ سچ کہتے ہیں' موسیقی سے طاقت ہوتا ہے۔ اب دیکھ لیں' یہ گانا ہماری سمجھ میں نہیں آیا لیکن پھر بھی ہم میں جوش سا بھرتا جا رہا ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ کسی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔ بس..... لڑ پڑے کسی کے ساتھ۔"

"لڑائی شروع کرنے کے لئے ایک عدد دشمن ضروری ہوتا ہے برادر...... یہاں کس کو اپنا دشمن سمجھو گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو واقعی سوچنے کی ہے" زریں نے کہا "یہاں تو سب میزبان بنے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ چھری سے ذبح کرنے والے لوگ ہوں۔"

اتنے میں مترجم آتا دکھائی دیا' اس نے زریں کو اپنا واحدی بتایا تھا۔ وہ کل بھی زریں گل کو کھوجنے کی کوشش میں لگا تھا' آج پھر اس کی آمد اسی سلسلے میں دکھائی دیتی تھی' وہ اور زریں گل باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پشتو میں کافی حد تک سمجھنے لگا لہٰذا گاہے گاہے میں بھی گفتگو میں حصہ لیتا رہا۔ میں نے واحدی

سے پوچھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟

واحدی نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا "تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "ہمیں تو لگتا ہے کہ لڑکی کا دماغ ٹھیک نہیں۔ شاید اس کا بچہ وغیرہ چھین لیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ماری ماری پھر رہی ہے۔"

واحدی بولا "یہ بچے والی عورت نہیں۔"

"تو پھر اس پر کسی تعویذ گنڈے کا اثر ہو گا' میرا مطلب ہے کہ آسیب وغیرہ۔"

واحدی بولا۔ "تم تو بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ ہو' ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے ہو۔"

"یعنی تم کہنا چاہتے ہو کہ یہ لڑکی واقعی آسیب زدہ ہے۔"

"پتا نہیں تم لوگ آسیب زدہ کسے کہتے ہو' تمہاری دنیا اور ان ویران پہاڑوں کی دنیا میں بہت فرق ہے۔ ممکن ہے کہ جو باتیں تمہارے لئے ناقابلِ فہم ہوں' وہ اس بلندی پر اور اس ویران خاموشی میں پہنچ کر قابلِ فہم ہو جاتی ہوں۔"

اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے سلاخ دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور فاصلے پر پتھر کی ایک دیوار نظر آ رہی تھی۔ جیسے کسی قدیم قلعے کی فصیل ہو۔ یہ دیوار فاصلے پر ہونے کے علاوہ کافی بلندی پر بھی تھی' بظاہر کوئی دروازہ یا رخنہ نظر نہیں آتا تھا بلکہ اگر غور سے نہ دیکھا جاتا تو دیوار بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بس یوں لگتا تھا کہ پہاڑ ہی کا ایک ہموار حصہ ہے۔ واحدی بولا۔ "جس کو تم آسیب کہتے ہو یا نہ دکھائی دینے والی مخلوق کہتے ہو' ہمارے نزدیک وہ روشنی ہے۔ وہ روشنی..... وہ سنہری روشنی جو اس دیوار کے عقب میں موجود ہے۔ ہم اس روشنی کو دل کی گہرائیوں سے مقدس سمجھتے ہیں۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو' اس روشنی کا لڑکی سے کیا تعلق؟"

"بہت گہرا تعلق ہے' لیکن یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم انہیں افسانہ کہو گے۔ دل ہی دل میں مذاق اڑاؤ گے مگر سب سے بڑا حقیقت کشا وقت ہے۔ کچھ دنوں بعد تم خود بخود جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے لگو گے۔"

زریں پشتو میں بولا۔ "تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے ہمیں یہاں کافی دیر رہنا ہے۔"

واحدی عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ نجانے کیوں مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا بلکہ میرے خیال میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم فانی لوگ ہیں۔ ہمیں اگلی گھڑی کا پتا نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ ہم مستقبل کے فیصلے کیسے کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم نے تو فلسفہ شروع کر دیا ہے۔ ہم تم سے لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے تھے۔"

"لڑکی بڑے مزے میں ہے۔" وہ بولا۔ "اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی گئی ہے' سر میں خوشبو دار تیل رچایا گیا ہے' شام کو وہ گرم چشمے کے پانی سے نہائے گی۔ بہترین لباس پہنے گی۔ تم اس کی چمک دمک دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ ہمارے چشمے کا پانی بے مثال ہے۔ میل کچیل کے ساتھ بیماری اور تھکاوٹ کو بھی دھو ڈالتا ہے۔ اگر تمہیں موقع ملے تو یہ تجربہ ضرور کرنا۔"

اتنے میں ایک شخص واحدی کو زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ واحدی ہم سے معذرت کر کے واپس چلا گیا۔ اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔

حسبِ توقع سورج غروب ہونے سے قریباً دو گھنٹے پہلے کاروبارِ حیات ٹھپ ہو گیا۔ یہ ان لوگوں کی شام تھی۔ سورج غروب ہونے سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے واحدی ہمارے پاس آیا۔ بولا۔ "آؤ میں تمہیں سائی سے ملاؤں۔"

"یہ سائی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

واحدی مسکرایا۔ "سائی کا لفظ یہاں سنہری عقاب کی دلہن کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔"

"سنہری عقاب' یہ کیا پہیلی ہے؟"

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اور زریں گل اٹھ کھڑے ہوئے' دور دراز علاقوں میں بسنے والے قبائل سے میرا واسطہ پہلے بھی پڑا تھا۔ ایسے علاقوں کی عجیب و غریب رسمیں اور ان رسموں پر لوگوں کا والہانہ یقین..... دیکھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی تکلیف دہ سادگی پر حیرت ہوتی ہے اور کبھی غصہ بھی آتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی پیش آ رہی تھی' سنہری عقاب کی دلہن' کسی طلسمی کہانی کا عنوان لگتا تھا لیکن یہ شخص بے حد سنجیدگی سے بتا رہا تھا کہ یہ کسی عورت کا لقب یا نام ہے۔ ہم واحدی کے ساتھ اپنی قیام گاہ سے باہر آئے اور بستی کے وسطی حصے کی طرف چل دیئے۔

سورج اپنے سفر کے آخری مرحلے میں تھا۔ درختوں کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ گھروندوں کے درمیان لوگوں کی چہل پہل تھی۔ ایک مقامی عورت پہاڑی بکریاں ہانکتے ہوئے ہمارے سامنے سے گزری۔ چند افراد خشک لکڑیاں پھاڑ رہے تھے' ایک چبوترے کے پاس گھوڑا گاڑی مرمت کی جا رہی تھی۔ ہم چھوٹوں کی چار پانچ فٹ اونچی ایک چار دیواری میں پہنچ کر رک گئے۔ چیڑ کے ایک تناور پیڑ کے نیچے اونی دری بچھی تھی۔ اس دری پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کو چند عورتوں نے گھیر رکھا تھا۔ لڑکی بسنتی کپڑوں میں تھی اور اس کے گلے میں زعفرانی کلیوں کا ہار تھا۔ میں چونک گیا۔ یہ منصور خان کی بیوہ نائلہ تھی۔ وہ دلکش نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل' لبوں پر ہلکی سرخی' بالوں کے جوڑے میں موتیے جیسے سفید پھول تھے۔ ایسے ہی پھولوں کا زیور اس کے گلے اور کانوں میں بھی نظر آ رہا تھا۔ درخت کے اردگرد اگربتیوں کی خوشبو جیسی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوشبو نے ماحول کو ایک پُراسرار رنگ دے دیا تھا۔ جس وقت ہم احاطے میں پہنچے' نائلہ بناؤ سنگھار کر کے تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ عورتوں نے اسے اٹھایا اور چند قدم چلا کر احاطے

کے دروازے پر لے آئیں۔ یہاں چند مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ یہ لوگ بستی ہی کے رہنے والے تھے۔ ان میں سے کسی نے نائلہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بس خاموشی سے نائلہ کے اردگرد چلنے لگے۔ نائلہ کو جیسے معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ وہ احاطے سے نکلی اور دھیمے قدموں سے بستی کے شمالی حصے کی طرف روانہ ہوگئی۔

واحدی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہی ہے سائی...... سنہرے عقاب کی دلہن۔"

"یہ کیا واہیات بک رہے ہو؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تم لوگ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"ہم کچھ کرنے نہیں جا رہے' ہم کرنے والے کون ہوتے ہیں' اور تم اپنی آواز ذرا پست رکھو۔ کوئی سن لے گا تو مصیبت آجائے گی تمہارے لئے۔"

میں نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن واحدی نے انگلی کے اشارے سے مجھے خاموش کر دیا۔ اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ میرے پہلو میں چلنے والا ایک خطرناک صورت شخص بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ نائلہ دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ ہیجانی کیفیت اب نظر نہیں آتی تھی جو گلگت سے یہاں پہنچنے تک اس پر طاری رہی تھی۔ اس کیفیت کی جگہ ایک عجیب سی مدہوشی اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ اس کا جسم سراپا شباب تھا اور وہ چلتی تھی تو لگتا تھا کہ ایک شاخ پھولوں کے بوجھ سے جھک رہی ہے۔

ہم بستی کے بیچ سے گزر رہے تھے' اردگرد اور لوگ بھی موجود تھے لیکن وہ اس منظر میں بہت زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے' وہ چند لمحے کے لئے اپنی مصروفیت ترک کر کے نائلہ کی طرف دیکھتے تھے پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ منظر وہ پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان میں سے بعض نے جھک کر نائلہ کو تعظیم پیش کی۔

قریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے یہ مختصر قافلہ اس سنگی دیوار کے قریب پہنچ گیا جو ہم نے کھڑکی میں سے دیکھی تھی۔ یہ دیوار میرے اندازے سے زیادہ بلند تھی۔ کم و بیش تیس فٹ اونچائی رہی ہوگی۔ اس کی پتھر کی بڑی بڑی سلیں اس طرح ایک دوسرے پر جمی تھیں کہ درمیان میں کوئی رخنہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ پتھر نجانے کتنے زمانوں سے اسی طرح موجود تھے۔ یہ دیوار بظاہر پہاڑی کا حصہ معلوم ہوتی تھی اور اس میں کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دیوار کی لمبائی ہماری نگاہوں سے اوجھل تھی کیونکہ چالیس پچاس گز کے سوا دیوار کا باقی حصہ درختوں میں اوجھل تھا۔ ہمارا مختصر قافلہ دیوار سے قریباً پچاس گز کی دوری پر پہنچ کر رک گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے اور دیوار کے درمیان ایک گہری کھائی حائل تھی۔ کھائی کی گہرائی کسی طرح بھی سو گز سے کم نہیں ہوگی۔ اس کی تہ میں خودرو جھاڑیاں تھیں۔ کھائی کی چوڑائی میرے اندازے کے مطابق تیس چالیس گز تھی۔ اس کھائی کو لکڑی کے ایک جھولتے ہوئے پل کے ذریعے پاٹا گیا تھا۔

نائلہ پل پر پہنچ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی پھر اس نے پل پر قدم رکھ دیئے اور دونوں طرف سے رسا پکڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ باقی سب افراد وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ پل کا دوسرا سرا مخالف سمت میں تھا' کافی بلند تھا۔ نائلہ کو ڈھلوان پل پر پاؤں جما کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے چلنے سے سارا پل ہولے ہولے جھولنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نائلہ بلند و بالا دیوار کے سائے میں پہنچ گئی۔ نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دیوار میں نادیدہ دشمن موجود ہیں اور کچھ آنکھیں ان رخنوں میں سے مسلسل ہمیں گھور رہی ہیں۔ خبر نہیں' یہ وہم تھا یا ماحول کا اثر۔ میں ان نگاہوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں دیوار کے سامنے کھڑی بسنتی لباس والی نائلہ بڑی انوکھی لگ رہی تھی۔ پل پر پاؤں رکھنے کے بعد اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اب سپاٹ دیوار کے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی دیوار میں سما کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ یکایک ایک مہیب گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ جیسے وزنی پتھر کو فرش پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ دیوار میں سے ایک سل پلائی کے دروازے کے مانند پیچھے کی طرف چلی گئی۔ گہرے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا کہ سل کیسے ہٹی ہے۔ نائلہ خلا کے اندر چلی گئی اور سل پھر برابر ہو گئی۔

نائلہ کو پل تک پہنچانے والے لوگ واحدی سمیت واپس لوٹ آئے۔

واحدی نے مجھ سے پوچھا۔ "سنہری عقاب دیکھا؟"

"کون سا سنہری عقاب؟"

وہ سٹپٹا گیا "تو پھر تم نے دیکھا کیا ہے؟"

اس نے میرا رخ دیوار کی طرف موڑا اور بولا۔ "وہ دیکھو۔ سنہری عقاب۔"

میں نے واحدی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ دیوار کے اوپر واقعی کسی پرندے کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ شاید پتھر سے بنایا گیا تھا' اگر وہ واقعی عقاب کا مجسمہ تھا تو اصل سے کافی بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پر اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ اچانک میری حیرت کی انتہا نہ رہی' پرندے کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پروں کو پورا کھولا' ایک دو بار حرکت دی اور پھر فضا میں بلند ہو گیا۔ عقاب کی طویل چیخ فضا میں دور دور تک گونجی۔ اس نے فضا میں ایک چھوٹا سا چکر لگایا اور دیوار کے پیچھے تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔

عقاب' شاہین اور شکرے وغیرہ کے خاندانوں میں سے سنہرا عقاب سب سے جسیم اور طاقتور پرندہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہمالیہ کا عقاب بھی کہا جاتا ہے۔ پہاڑوں کا یہ پرندہ پہاڑوں میں نظر آ

تا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن ہمارا مترجم واحدی اس واقعے کو پُراسرار رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کی کوشش کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

○○○

رات کو دیر سے سونے کے باوجود صبح بہت جلدی میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے مناظر ایک خواب کی طرح یاد تھے۔ نائلہ کا بسنتی جوڑا' اس کے لباس سے اٹھتی ہوئی اگربتیوں کی خوشبو' اس کے گلے میں زعفرانی کلیوں کے ہار' یہ سب کیا تھا۔ اور پھر وہ عقاب جو شام کے جھٹپٹے میں سنگی دیوار پر نظر آیا تھا۔ کیا واقعی میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

زریں گل کو سوتا چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ سورج نے ابھی اپنا رخ روشن نہیں دکھایا تھا لیکن پوری بستی بیدار ہو چکی تھی اور روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھی۔ ایک چھکڑے میں لوکاٹ کی طرز کا کوئی پھل لدا ہوا تھا۔ یہ چھکڑا گاڑی دھیمی رفتار سے بستی کے شمال کی طرف جا رہی تھی۔ میں اس گاڑی کے پیچھے پیچھے چلتا ایک بار پھر اس پتھریلی دیوار کے قریب پہنچ گیا جہاں رات نائلہ نے لکڑی کا پل پار کیا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اب پھر لکڑی کے پل کے پاس کچھ افراد جمع ہیں' ان کی تعداد چھ یا سات تھی' ان میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہ سب افراد کسی کے منتظر دکھائی دے رہے تھے' ان کی نگاہیں بے خیالی میں بار بار سنگی دیوار کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ میرے ذہن میں آیا' کہیں وہ نائلہ کے ہی انتظار میں تو نہیں؟ میں بھی ایک قریبی درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ مجھے وہاں کھڑے بمشکل پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ رات والا منظر دوبارہ نظر آیا۔ پتھریلی دیوار کی ایک بڑی سل اپنی جگہ سے ہٹی اور ایک ہیولا سا برآمد ہو کر لکڑی کے پل پر آگیا۔ یہ نائلہ تھی۔ اس کا بسنتی لباس سنہری دھوپ میں دور سے چمک رہا تھا۔ وہ بڑے دھیمے قدموں سے پل پر آگئی اور ہماری طرف بڑھنے لگی۔ وہ تھکی ماندی نظر آتی تھی۔ بال منتشر تھے۔ دوپٹا لٹک رہا تھا' وہ قریب پہنچی تو اس کا چہرہ بھی ستا ہوا نظر آیا۔ کاجل پھیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں شب بیداری کی جھلک تھی۔ گلے میں زعفرانی رنگ کی کلیوں کا ہار بکھر چکا تھا۔ پل سے اترتے ہی نائلہ نے اس مقام کا رخ کیا جسے یہ لوگ اپنی زبان میں گرم چشمہ کہتے تھے۔ پل کے نشیبی سرے پر موجود مرد و زن نائلہ کے ساتھ ہی چشمے کی طرف چلے گئے۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن بہت سی باتیں سمجھ میں آ بھی رہی تھیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ زمین و آسمان کے قلابے مل گئے ہیں۔ آنکھوں میں تارے ناچ گئے تھے۔ کوئی بھاری بھرکم شے یوں اچانک میری گردن پر گری تھی کہ مجھے اپنے بچاؤ کا ذرا سا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ میں لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ جو افتاد مجھ پر پڑی تھی وہ میری پشت پر سوار تھی اور گردن سے چمٹی ہوئی تھی۔ بدبو کا ایک بھبکا سا میرے نتھنوں میں گھستا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ بو میری جانی پہچانی ہے۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ جو شے کسی کیکڑے کی طرح میری گردن سے لپٹی ہوئی تھی وہ سائیں عالی تھا۔ اپنی تمام گندگیوں' مالاؤں اور میل کچیل سمیت وہ میرے جسم سے پیوست تھا' پیر تسمہ پا کی طرح اس نے اپنی غلیظ ٹانگیں میری کمر کے گرد کس لی تھیں اور بازو میرے گلے میں حائل کر دیئے تھے۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے جھٹکنا چاہا لیکن یہ کوشش بے کار گئی۔ حیرت کے ابتدائی شدید حملے سے سنبھلنے کے بعد میں نے سائیں عالی کو ڈانٹا "سائیں! یہ کیا حرکت ہے۔ پیچھے ہٹو۔"

سائیں نے میری گردن پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کر دی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے حلق سے عجیب آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ اردگرد موجود لوگ تعجب سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر سائیں کو اپنے اوپر سے جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا پھر زور لگا کر اپنی گردن کو سائیں کے "پنجوں" سے آزاد کرا لیا۔

میری گردن پر گرفت ختم ہوتے ہی سائیں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ بے انتہا پھرتی سے اس نے اپنی بھاری بھرکم لاٹھی اٹھائی۔ اس سے پہلے کہ میں سائیں کا ارادہ بھانپتا' اس نے بلا کی تیزی سے مجھ پر وار کیا۔ میں نے سر جھکا کر یہ وار بچایا۔ سائیں نے بلا توقف دوسرا وار کیا۔ اس مرتبہ شیشم کی ملک لاٹھی میری کنپٹی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ "سائیں! یہ کیا حماقت ہے؟" میں زور سے چیخا۔

سائیں تو جیسے گونگا بہرا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی' میں اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ اندھادھند مجھ پر لاٹھی چلانے لگا۔ میں خود کو بچا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سائیں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں سے سنگین چوٹ کھا لے۔ جب وہ کسی طرح باز نہیں آیا تو میں نے جھکائی دے کر اس کی لاٹھی پکڑ لی۔ ایک جھٹکا دیا تو سائیں لڑکھڑاتا ہوا پرے جا گرا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔

سائیں کو گرتے دیکھ کر دو مقامی نوجوان بڑے طیش سے میری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نے بلا دریغ مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خود کو اس کی زد سے بچایا اور ایک زوردار ٹانگ اس کے سینے پر جمائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر تین چار مزید افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے لاٹھی کو دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ حملہ آور بے حد طیش میں تھے اور ان کے انداز میں بے جگری بھی تھی لیکن لڑائی بھڑائی کی باریکیوں سے وہ زیادہ آشنا نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے پلک جھپکنے میں دو افراد کو زمین بوس کر دیا۔ یہی وقت تھا جب میں نے اپنے پہلو میں ایک بھیانک آواز سنی۔ کسی رائفل کا لیور کھینچ کر اسے "لاک" کیا گیا تھا۔ اب اگلی آواز گولی چلنے کی ہو سکتی تھی۔

میں تیزی سے گھوما۔ رائفل کی سیاہ نال مجھے دکھائی دی۔ نالی کا تاریک سوراخ جس میں سے کسی بھی وقت شعلہ نکل سکتا تھا۔ یہ بے بسی کا لمحہ تھا۔ پھر میں نے ایک پرچھائیں دیکھی۔ وہ تڑپ کر رائفل بردار سے لپٹ گئی تھی۔ یہ سائیں عالی تھا۔ وہ رائفل بردار کو دھکیل کر دور لے گیا۔ رائفل بردار کی رائفل کا رخ بھی بدل گیا تھا۔ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا وہ ایک لمحے کے لیے غافل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر سر کی ضرب رسید کی۔ "دھائیں" کی آواز آئی اور وہ ڈھلوان برف پر دور تک پھسل گیا۔

اسی دوران میں ایک کرخت چہرہ شخص نے ایک برچھا نما آلے سے مجھ پر حملہ کیا۔ بے انتہا پھرتی اور مہارت سے اس نے دو وار کیے۔ یہ وار بچانے میں مجھے دانتوں پسینہ آ گیا۔ جب میں نے اس کا دوسرا وار خالی دیا تو وہ اپنی جھونک میں میرے کندھے سے ٹکرایا۔ میں نے اسے اپنے کندھے کے اوپر سے گزار کے برف پر پٹخ دیا۔ سائیں عالی بدستور رائفل بردار سے لپٹا ہوا تھا اور چیخ رہا تھا "انہیں بالکل نہیں، چھوڑو رائفل۔"

رائفل بردار ہکا بکا نظر آ رہا تھا۔ پھر سائیں عالی نے رائفل اس سے لے لی۔ ایک گھروندے کے اندر سے دو تین مزید افراد نمودار ہو گئے۔ ان میں سے ایک وہی ٹھگنا تھا جس کا جسم منحنی لیکن سر کافی بڑا تھا۔ اسے یہ لوگ رابل کہتے تھے۔ سردار رابل نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ دوسرے دو افراد کی نظر میں بھی ستائش تھی۔ ان دو افراد میں سے ایک مترجم واحدی تھا۔ وہ مسکرا کر بولا "تم واقعی دلیر ہو۔ یہ لڑائی بھڑائی جو ابھی ہوئی ہے یہ دراصل تمہاری آزمائش تھی۔ میرا خیال ہے کہ تم اس آزمائش میں کامیاب رہے ہو۔"

میں نے کہا "آزمائش تھی یا قاتلانہ حملہ تھا۔ مجھ پر فائر کرنے کی کوشش کی گئی اور ابھی جس شخص نے مجھ پر برچھا چلایا ہے اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"ہاں یہ لوگ بے خبر تھے۔"

میں نے کہا "بڑے سنگ دل میزبان ہو تم لوگ۔ مہمان کو موت کے منہ میں جھونک کر اس کی آزمائش کرتے ہو۔"

واحدی بولا "یہ سب کچھ ان سائیں صاحب کے کہنے پر ہوا ہے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ تم اپنا دفاع کر لو گے اور با آسانی کر لو گے۔"

اتنے میں سائیں عالی بھی میری طرف چلا آیا۔ میرا شانہ تھپک کر بولا "شفیع محمد! تم نے میرے کہے کا بھرم رکھا ہے۔ میں تم سے خوش ہوا اور..... میرے جنات بھی تم سے خوش ہوئے..... وہ دیکھو وہ جن کس طرح منہ پھاڑ کر ہنس رہے ہیں۔ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے ورنہ تمہارا سیروں خون بڑھ جاتا۔"

میں حیرت زدہ انداز میں سائیں کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس افلاطون کی افلاطونی بات کا جواب دوں۔ وہ جب بھی آتا تھا اتنی حیرتیں لے کر آتا تھا کہ ذہن چکر بن جاتا تھا۔ میں نے کہا "سائیں! یقین نہیں آ رہا کہ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

وہ بولا "یہی تو تم جیسے لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ تم دماغ سے سوچتے ہو، پرکھتے ہو اور پھر یقین اور بے یقینی کے چکروں میں جاتے ہو۔ اتنی دیر میں اندھا یقین رکھنے والا ایک جن کوہ قاف دنیا کے درمیان سات چکر لگا لیتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کیسے پہنچے ہو یہاں!"

"چھوڑو یہ 'کیوں' 'کیسے' اور 'کب' کا چکر..... اس چکر سے نکل شفیع محمد! فلاح پا جاؤ گے۔ یقین کرنا سیکھو۔ اگر تم یقین کرنا سی تو میں اپنے ذاتی جنوں میں سے تین چار ایسے جن تمہیں دوں تمہاری زندگی سنوار دیں گے۔ مثال کے طور پر اس ملک کے سیاست دانوں کو میں نے ایسے چار جن دے رکھے ہیں۔ ان میں ایک جن لوگوں کو لالچ سے سیاست دان کی طرف کھینچتا ہے، دوسرا ڈرا کر کھینچتا ہے، تیسرا اسے الیکشن لڑانے کے لیے اسپانسر ہے، چوتھے کا کام سب سے اہم ہے، جب سیاست دان الیکشن جاتا ہے تو یہ جن اسے دونوں کی نظروں سے اور ان کے غیظ بچاتا ہے....."

مترجم نے مداخلت کرتے ہوئے سائیں سے ٹوٹی پھوٹی میں پوچھا "سائیں صاحب! سردار رابل کہتے ہیں کہ وہ تمہ صلاحیتوں سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ ہمارے لیے کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔"

"تمہارے سردار نے یہ کہہ کر مجھ پر کوئی احسان نہیں" سائیں نے بیزاری سے کہا "جو اچھا ہوتا ہے وہ نظر آتا ہے۔ لکڑی کا پتلا جسے تم لوگوں نے سر پر چڑھا رکھا ہے ایک بندہ نہیں۔ اس پر لعنت بھیج دو۔"

مترجم نے سائیں کی بات سردار رابل تک پہنچائی۔ وہ میں سہلاتا رہا۔ اس کے انداز سے یہ بات ظاہر تھی کہ سائیں کی کرشماتی بات چیت نے اسے بھی شیشے میں اتار رکھا ہے۔

سردار نے آگے بڑھ کر میرا شانہ تھپکا اور دوستانہ انداز میں کچھ کہا۔ مترجم بولا "سردار رابل چاہتے ہیں کہ تم ان کے مہمان خانے میں چلو۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سائیں عالی بول پڑا "کسی کی ضرورت نہیں۔ یہ ابھی میرے ساتھ جائے گا۔ میں ایکسرے کر لوں۔ پھر سوچیں گے کیا کرنا ہے۔"

"ایکسرے؟" مترجم نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں..... روحانی ایکسرے۔ تم لوگوں کو اس کی سمجھ اگر سمجھ ہوتی تو تم بھی سائیں عالی ہوتے۔"

مترجم نے یہ بات سردار رابل تک پہنچائی۔ سردار کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ناگواری کی شکن نظر آئی مگر پھر اس نے اپنے چہرے پر رضامندی طاری کر لی۔

سائیں عالی مجھے لے کر روانہ ہوا اور اسی مکان میں آ گیا جہاں میں اور زریں گل ٹھہرے ہوئے تھے "یہی ہے نا تمہارا ٹھکانا؟" اس نے پوچھا۔

"جب تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔"

"ناراض ہو گئے ہو۔" اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں زیادہ زور سے گرا ہوں تمہارے اوپر۔"

"تمہاری کسی بات پر احتجاج کرنا فضول ہے۔" میں نے کہا۔

سائیں نے قہقہہ لگایا "یہ بڑی اچھی بات کہی۔ اگر تم ایسے ہی بات مانتے رہو تو تمہاری زندگی سنور جائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ سوہج سے بھی میاں بیوی والے تعلقات قائم کر لو۔ اس میں بھلائی ہے تم دونوں کی۔"

ایک دم مجھے سوہج کا خیال آ گیا۔ سوہج تو سائیں عالی کا دُم چھلا تھا مگر اس وقت یہ دُم چھلا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سائیں سے پوچھا تو وہ بولا "وہ بھی یہیں ہے۔ کہہ رہی تھی چیچی کولا پینی ہے۔ میں نے ایک جن کے ساتھ اسے لبنان بھیجا ہے۔ وہاں سے ابھی پی کر آتی ہے چیچی کولا۔"

سائیں کی باتیں ایسی ہی اوٹ پٹانگ ہوتی تھیں۔

اتنی دیر میں زریں گل بھی باہر نکل آیا۔ سائیں عالی کو دیکھ کر وہ سخت حیرت زدہ بلکہ وحشت زدہ ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر بڑی عقیدت سے سائیں عالی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ سائیں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ وہ کچھ دیر بے حد الجھن سے سائیں کو دیکھتا رہا پھر بولا "آپ یہاں بھی پہنچ گئے سائیں صیب؟"

"کیوں..... یہاں صرف تم ہی پہنچ سکتے ہو؟"

"نن..... نہیں۔ اَمارا مطلب یہ نہیں تھا۔ اَم تو بہت خوش ہوا آپ کو دیکھ کر۔"

"تو وہ سوہج کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"سس..... سوہج..... وہ تو..... شاید..... ابھی آپ فرما رہا تھا کہ وہ لبنان گیا ہوا ہے۔"

"گئی تو ہوئی ہے مگر ابھی آ جائے گی۔ چیچی کولا پینے گئی ہے۔"

"مم..... چیچی کولا..... لبنان میں؟"

"تمہیں کیوں حیرت ہو رہی ہے۔ تم چاہو تو میں تمہیں تربوز کھانے کے لیے مصر بھیج سکتا ہوں یا برگر کھانے کے لیے مغربی جرمنی روانہ کر سکتا ہوں۔ میں نے کون سا رکشے ٹیکسی پر بھجوانا ہے۔ بھئی جنات ہیں میرے پاس۔"

میں نے کہا "سائیں عالی! لبنان میں تو دہشت گردی ہو رہی ہے اور تم نے سوہج کو وہاں ٹھنڈا پینے بھیج دیا ہے۔ اگر کوئی گولی شولی لگ گئی اسے تو پھر.....؟"

وہ بولا "پھر کیا ہو گا۔ تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور تمہارے اس پٹھان دوست کا ایک دشمن کم ہو جائے گا۔"

زریں گل آج کل سائیں عالی سے بڑا مرعوب تھا۔ کانپ کر بولا "نہیں سائیں جی! اَم کو سوہج سے کوئی دشمنی نہیں۔ بس اس نے اَم کو ایک دو ایسا بات کہا ہوا ہے جس کا اَم کو بہت رنج ہے۔ ہم اس رنج کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتا۔ اَم بہت مجبور ہے۔"

سائیں عالی نے کہا "جس بندے کو اپنے نفس پر قابو نہ ہو اس سے مجبور اور کوئی نہیں ہوتا۔"

پھر اس نے حق ہُو کا نعرہ لگایا اور دھمال ڈالنے والے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا کر چکرانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ وجد کے عالم میں نعرہ لگا رہا تھا۔ "یا دل دھڑکا مجبور کا..... یا دل دھڑکا۔"

سائیں پر وجد کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر دھمال ڈالنے کے بعد وہ زمین پر بیٹھ گیا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ زریں اس کے قریب بیٹھ گیا اور ٹانگیں دبانے میں مصروف ہو گیا۔ جھومتے جھومتے سائیں نے کہا "تکیہ لے کر آؤ۔"

میں نے پوچھا "تکیے کا کیا کرو گے؟"

"زمین پر رکھوں گا اور اس کے اوپر اپنا سر رکھوں گا۔"

"سر رکھو گے؟"

"ہاں..... سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ یہ میرے مراقبے کا وقت ہے۔"

میں نے زریں سے کہا کہ وہ تکیہ لے آئے۔ زریں ساتھ والے کمرے سے تکیہ لانے گیا لیکن واپس نہیں آیا۔ میں نے جا کر کہا "اوئے بادر! تکیہ نہیں لایا؟"

وہ بولا "استاد صیب! ایک منٹ اس کونے میں آ کر اَمارا بات سنیں۔" میں کونے میں پہنچا تو وہ بولا "استاد صیب! یہ تو بڑا بے شرمی کا بات ہے۔ سائیں عالی اَم سب کے سامنے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر فرمائے گا۔"

"بے شرمی کی کیا بات ہے؟"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں جناب۔ سائیں صیب نے چوغہ پہن رکھا ہے۔ جب وہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرے گا تو..... بالکل گڑبڑ ہو جائے گا۔ ادھر لڑکی لوگ بھی موجود ہے۔ وہ کیا سوچے گا۔" (لڑکی لوگ سے زریں کی مراد وہ ملازمہ تھی جو اکثر گھر میں گھومتی رہتی تھی)

"تو تمہارا کیا خیال ہے، سائیں نے صرف چوغہ پہن رکھا ہے؟ نیچے اس نے چڈی پہن رکھی ہو گی یا لنگوٹ وغیرہ باندھ رکھا ہو گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یعنی آپ کو یقین ہے کہ لنگوٹ ہے؟"

"ہاں بھئی ہاں..... جاؤ تکیہ لے کر۔"

زریں نے تکیہ پکڑا اور بڑی عقیدت سے جا کر سائیں کو پیش

کردیا۔ سائیں نے فوراً اٹھ کر ورزش کرنے والے انداز میں گردن کو دائیں بائیں حرکت دی۔ پھر اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ زریں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے تھی۔ غالباً اسے ابھی تک خطرہ لاحق تھا کہ سائیں نے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا۔ بہرحال جلدی اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوگیا۔ سائیں نے شلواروں کے انداز میں ایک بالکل چھوٹی سی لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔

سائیں نے پکار کر کہا "بالکے تو بھی اسی آسن میں آجا۔"

بالکے سے سائیں کی مراد زریں تھی۔ وہ جس طرح مجھے شفیع محمد کے نام سے پکارتا تھا اسی طرح زریں کو بالکے کہتا تھا۔

زریں گل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا "استاد صیب! یہ آسن کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "ایک آسن تو شلوار کا ہوتا ہے لیکن یہ دوسرے والا آسن ہے۔ سائیں صیب فرماتے ہیں کہ تو بھی ان کی طرح سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرلے۔"

زریں کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا لیکن سائیں نے دو تین بار کہا تو زریں کو چاروناچار یہ کرنا ہی پڑا۔ وہ کمرے میں سے دوسرا تکیہ لایا اور اسے سائیں کے برابر رکھ کر سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرلیں۔ دو سیکنڈ سیدھا رہنے کے بعد وہ دھڑام سے دوسری طرف گرا۔ مقامی لڑکی جو اندرونی کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی بمشکل ہنسی روک سکی۔ زریں نے دوسری کوشش کی تو گردن ایک طرف مڑ گئی۔ تیسری کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب ہوسکا اس کا سارا دھڑ بری طرح لرز رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے لگا کہ زریں کے چہرے پر چونکنے کے تاثرات ابھرے ہیں۔ اس کے چونکنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دو تین منٹ بعد سائیں عالی بولا "بس بالکے! آج تیرے واسطے اتنا سبق ہی کافی ہے۔"

زریں گل ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر سیدھا ہوگیا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ وہ میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا "وہ دیکھیں استاد صیب!" اس کا اشارہ چھت کی طرف تھا۔

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ زریں گل چھت کے ایک چھوٹے سے روشن دان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ روشن دان تقریباً دو مربع ڈیڑھ فٹ کا تھا۔ اس میں موٹی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ روشن دان چونکہ چھت میں تھا لہٰذا اسے ڈھانپنے کے لیے لکڑی کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی اس کے اوپر رکھ دی گئی تھی۔ روشن دان کا مقصد ہوا اور روشنی کی آمد و رفت تھا۔ زریں گل بولا "ابھی جب ام نے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کی تو ام کو یہاں کوئی نظر آیا تھا۔ جونہی ہمارا نظر اس سے ملا وہ پیچھے ہٹ گیا...... اس کے علاوہ ہمارا ایک اور خیال بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ روشن دان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا "ہم کو لگتا ہے اسے اکھاڑنے کا کوشش کیا گیا ہے۔ وہ دیکھیں ایک طرف سے اس کا چوکھٹ نیچے کو کھسک آیا ہے۔"

زریں بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ روشن دان کی چوکھٹ سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ بہرحال سائیں عالی کی موجودگی میں میں نے اس بات پر زیادہ توجہ دینی مناسب نہیں سمجھی۔ مقامی لڑکی بھی تو پاس ہی موجود تھی اور ہماری یہ حرکت نوٹ کرسکتی تھی۔

بہرحال جب ڈیڑھ دو گھنٹے بعد سائیں ایک کونے میں سمٹ کر سو گیا اور مقامی لڑکی بھی کسی کام سے باہر چلی گئی تو زریں گل اور میں نے ایک بار پھر روشن دان کو اچھی طرح دیکھا۔ کل رات یقیناً اس روشن دان سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی اور یہ بات صرف روشن دان کی ہی نہیں تھی بلکہ دو تین بار مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی نادیدہ شخص میرے اردگرد موجود ہے اور اس کی نگران آنکھ مجھے گھور رہی ہے۔ سائیں عالی کی بے معنی حرکتوں میں سے اکثر کوئی کام کی بات نکل آتی تھی۔ جیسے یہ سر نیچے ٹانگیں اوپر والا معاملہ تھا۔ زریں گل کو جو چیز نظر آئی تھی شاید وہ عام حالات میں نظر آتی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سائیں عالی بے زبان خاموشی ہمیں ہدایت دے رہا ہے کہ ہم اپنے اردگرد سے چوکس رہیں۔ وہ چھوٹا سا پستول ابھی تک میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں موجود تھا جو میں لاہور سے لے کر چلا تھا۔ اس کے علاوہ خنجر بھی ہمہ وقت میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ رات کو میں اور زریں گل اپنے کمرے کا دروازہ اکلوتی کھڑکی اچھی طرح بند کرکے سوتے۔ نیند میری آنکھوں سے کافی فاصلے پر تھی۔ میں خیالوں کے تانے بانے میں الجھ گیا۔ نہایت دور دراز اور الگ تھلگ قبائلی بستی میں کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ مرحوم وزیر منصور خان نے یہ کیوں لکھا تھا کہ اس بستی کے حوالے سے مارچ کے پہلے دس روز بہت اہم ہیں اور اگر راحیل بڑا تو اسے روکنا ناممکن ہوجائے گا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ لوگ کسی طرح کی لڑائی کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ہر طرف جوش و خروش اور بھاگ دوڑ کی کیفیت تھی۔ کہیں منصور خان کا مطلب یہی تو نہیں تھا کہ یہ لوگ اپنے جیسی کسی دوسری بستی پر حملہ کرنے والے ہیں اور اگر ایک بار حملہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے پھر انہیں روکنا مشکل ہوجائے گا۔ آج صبح لکڑی کے پل کے پاس جو ہنگامہ ہوا تھا وہ بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگر راحیل نے یہ میری آزمائش کی تھی تو کس مقصد سے کی تھی۔ کیا وہ مجھ سے کام لینا چاہتا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ میری آنکھ کسی آہٹ سے کھلی تھی یا شاید وہ میرا وہم تھا۔ میرا ہاتھ تکیے کے نیچے اپنے پستول تک پہنچا۔ پستول کو جیب میں رکھ کر میں گرم لحاف میں سے باہر نکلا اور بہ آہستگی دروازے کی کنڈی گرائی۔ باہر یخ بستہ سردی تھی، ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ساری غنودگی ہوا کردی۔ میں نے احتیاط سے باہر جھانکا، تا

خاموشی تھی ٹھٹھرا ہوا چاند بھی جیسے اپنی جگہ منجمد نظر آتا تھا۔ دور بہت دور برفیلی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ اس یخ بستہ ہوا میں صحن کے بیچوں بیچ سائیں عالی مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ نہ اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا تھا اور نہ پاؤں میں جوتے۔ پتا نہیں وہ موسموں کی شدید ترین سختیاں کیسے برداشت کرلیتا تھا۔ اس کی نگاہ دور اس چاند پر تھی جو چوٹیوں کے اوپر معلق نظر آرہا تھا۔

"سائیں کیا کر رہے ہو یہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

میرا خیال تھا کہ سائیں حسب عادت کوئی اوٹ پٹانگ جواب دے گا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا "میں سوچ رہا ہوں شفیع محمد۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ مجھے کیا سوچنا چاہیے؟"

"پھر کیا نتیجہ نکلا؟"

"یہی کہ انسان کو ضرور سوچنا چاہیے۔ ورنہ وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا۔ وہ دنیا اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے جو اس دنیا میں موجود ہے لیکن نظر نہیں آتی۔"

"کیا مطلب؟ کون سی دنیا نظر نہیں آتی؟"

"ہے ایک دنیا شفیع محمد..... وہ دنیا اسی دنیا میں موجود ہے لیکن ابھی ہمارا علم، ہمارا ذہن اس تک نہیں پہنچے۔ شاید ابھی ایک ہزار سال تک وہاں نہ پہنچے۔ شاید چالیس پچاس ہزار سال تک وہاں نہ پہنچے۔ لیکن وہ دنیا موجود تو ہے۔"

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں شفیع محمد کہ سوچا کرو۔ اس کائنات میں بے شمار ایسی قوتیں ہیں جو ہمارے علم میں نہیں لیکن ہر گھڑی ہم پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ وہ بے شمار اور بیکراں ہیں۔ ہمارے دانش ور اور سائنس دان جو بڑی بڑی کامیابیوں کے دعوے کرتے ہیں، ابھی لامحدود طاقتوں کا ایک سرا بھی تھام سکے ہیں اور شاید وہ کبھی نہیں تھام سکیں۔ یہ انگریزی اردو کے موٹے موٹے لفظ 'ٹیلی پیتھی' 'ہپناٹزم' 'مسمریزم' 'حاضرات' اور 'ہپراسائیکل' یہ کوئی بامعنی لفظ نہیں ہیں۔ یہ تو ہم نے اپنی حیرت اور تجسس کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ شاید آج سے پانچ سو سال بعد لوگ ان لفظوں اور ان سے وابستہ کہانیوں کو پڑھ کر مسکرائیں۔" مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ سائیں ایسی سنجیدہ گفتگو بھی کرسکتا ہے۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو کچھ نہیں کہنا چاہ رہا۔ میں تو بس یہاں کھڑا سوچ رہا ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ سنہری روشنی کیا ہے جسے یہ لوگ بہت اہمیت دے رہے ہیں۔"

ایک دم سائیں عالی کی بوجھل بوجھل آنکھیں کچھ اور خوابیدہ

محمود احمد مودی
کے جادو اثر قلم سے ایک خوبصورت
ناول
کنارہ
قیمت ۱۵۰/- روپے
ایک آدم زاد کی عبرتناک داستان
جسے اولادِ آدم نے ڈس لیا تھا
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰-عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

ہو گئیں۔ اس کی نگاہ دور اس دیوار کی طرف اٹھی ہوئی تھی جو کسی قلعے کی فصیل جیسی دکھائی دیتی تھی۔ مدھم چاندنی میں یہ دیوار ایک ہیولا سا نظر آتی تھی۔ سائیں عالی کے ہونٹ تھرائے۔ آواز بہت مدھم تھی لیکن میرے کانوں تک پہنچ گئی۔ "کچھ نہ کچھ ہے۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دشمنی ہے..... جو تمہیں رانی آنکھ کے لیے پُراسرار کشش رکھتی ہے۔ کیا تم جانتے ہو کشش کو؟"

"کشش..... کیسی کشش؟"

سائیں نے مجھے سرتاپا دیکھا پھر ایک دم اس کے چہرے پر بیزاری نظر آنے لگی "اچھا..... تم جاؤ شفیع محمد..... آرام کرو..... مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"اگر میں نہ جاؤں تو؟"

"تو کھڑے رہو ایک ٹانگ پر بگلے کی طرح لیکن تمہیں حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ الٹا تمہارا نقصان ہو سکتا ہے۔"

"کون کرے گا نقصان؟" میں نے پوچھا "کوئی بندہ بشر یا کوئی ایسی چیز جو مجھے نظر نہیں آتی لیکن تمہیں نظر آ رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ بندہ بشر ہی ہے لیکن کسی بدروح کی طرح خطرناک ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ بہت احتیاط کرو۔ بہت احتیاط کرو۔" سائیں نے مجذوبانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی اشارہ تو دو۔" میں نے کہا۔

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس پر ایک بار پھر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اوپر اٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھولنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گردان کر رہا تھا "ہا دل دھڑکا قاتل کا..... ہا دل دھڑکا۔"

O☆O

دوسرے روز ناشتے کے فوراً بعد ہم نے مترجم واحدی کو اپنے روبرو پایا۔ اس کے ساتھ دو مقامی محافظ بھی تھے۔ ان کے کندھوں سے دونالی رائفلیں جھول رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اس بستی میں آتشیں اسلحہ بہت کم مقدار میں ہے۔ صرف خاص خاص افراد کے پاس رائفل یا پستول نظر آتا تھا۔ ہاں..... کلہاڑے اور برچھے وغیرہ عام تھے۔ ان لوگوں کا برچھا چینی قبض سے ملتا جلتا تھا۔ لمبائی چینی قبض سے تھوڑی سی کم اور چوڑائی زیادہ تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا مقامی زبان میں اسے "قبضہ" کہا جاتا تھا۔ یہی ہتھیار ہم نے اس سے پہلے سوار صدرت کی بستی میں بھی دیکھا تھا۔ کلہاڑے مختلف اقسام اور سائز کے تھے۔ ان میں بچوں کے استعمال میں آنے والی ہلکی پھلکی خوب صورت کلہاڑی سے لے کر "موٹے تنے" پھاڑنے والے بھاری بھرکم کلہاڑے تک ہر سائز کے آلے شامل تھے۔ مترجم واحدی نے گرمجوشی سے ہمارا حال

چال پوچھا۔ پھر ہمیں بتایا کہ سوار رابل نے ہمیں یاد کیا ہے۔ وہاں بستی کے "چار بڑے" بھی موجود ہیں۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ اہم نوعیت کی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

میں اور زریں گل مترجم کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سورج ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ تاہم بستی میں روز مرہ کی مصروفیات عروج پر نظر آتی تھیں۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ غیر معمولی طور محنتی اور جفاکش ہیں۔ وہ "سردار صدرت کی داری" کے لوگوں کی نسبت کافی صاف ستھرے بھی تھے۔ راستے میں دکھائی دینے والے لوگوں میں سے اکثر نے ہمیں دلچسپی سے دیکھا۔ خصوصاً وہ مجھے بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ کل لکڑی کے پل کے پاس مقامی محافظوں سے میری جو لڑائی ہوئی تھی اس نے مجھے مقامی لوگوں میں معروف کر دیا ہے۔ وہ لڑائی مختصر ہونے کے باوجود بڑی زوردار تھی۔ مترجم واحدی نے بتایا تھا کہ وہ لڑائی دراصل میری آزمائش کے لیے تھی۔ ظاہر ہے اگر وہ آزمائش تھی تو پھر بستی کے منتخب فائٹر ہی میرے مقابل آئے ہوں گے۔ مجھے ان لوگوں کو پچھاڑنے میں مطلق دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

قریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک قابلِ دید مقام پر پہنچے۔ یہ ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ قطر عام کنویں سے قریباً دس گنا ہوگا۔ گہرائی بھی کافی زیادہ تھی لیکن جوں جوں نیچے جاتے تھے کنویں کا گھیرا تنگ ہوتا جاتا تھا۔ آخر میں قطر بمشکل پچیس تیس فٹ رہ جاتا تھا۔ کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چکردار سیڑھیاں تھیں جو تہہ تک چلی گئی تھیں۔ کنواں پتھریلا تھا اور یہ سیڑھیاں بھی پتھر کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ حفاظت کے لیے سیڑھیوں کے ساتھ لکڑی کا جنگلا لگا دیا گیا تھا۔ کنویں کی پتھریلی دیواروں کے پتھروں میں سرخ اور نارنجی پتھر بھی شامل تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ دو آنکھیں ہمیں آس پاس سے گھور رہی ہیں اور کوئی خاموش قدموں سے ہمارے تعاقب میں ہے۔ ہم سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ یہاں تک کہ پچاس ساٹھ فٹ نیچے تہہ میں پہنچ گئے۔ ایک جانب لکڑی کے موٹے تختوں کا چوکور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے دو پٹ تھے اور ہر پٹ پر ایک تصویر کندہ تھی۔ ایک پٹ پر سرتاپا برہنہ لڑکی کی تصویر تھی جس کے سر پر عقاب بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں گھنی مونچھوں والا مسلح پہریدار موجود تھا۔ اس نے مقامی انداز میں تعظیم پیش کی۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک کشادہ جگہ نظر آئی جو پتھروں کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ ایک مختصر راہداری سے گزر کر ہم ایک رہائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ رہائش گاہ کی صفائی ستھرائی اور سجاوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہی سوار رابل کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں دیواروں پر اونی غالیچے نہیں تھے۔ اس کے باوجود خوش گوار حرارت کا احساس ہوا۔ میں نے قیافہ لگایا کہ یہ جگہ اس مقام سے قریب تر ہے جہاں آگ جلائی جاتی ہے۔ ایک کشادہ کمرے میں قالین پر سوار رابل اور اس کے عمر

رسیدہ معتمد ساتھی خالص قبائلی انداز میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ یہی وہ چار بڑے تھے جن کا ذکر ابھی واحدی نے کیا تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے اور کسی کی عمر بھی ساٹھ ستر سے کم نہیں تھی۔ مترجم کے ذریعے سوار رابل سے میری جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح تھی۔

سوار رابل نے کہا "سائیں عالی نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ تم اس تعریف پر پورے اترے ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اس بستی میں ایک معزز مہمان کی حیثیت دی جائے۔ تمہارے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ اس کے بدلے ہم صرف یہ چاہیں گے کہ تم ہمارے چند منتخب نوجوانوں کو فنِ حرب سے آشنا کرو۔ سائیں عالی نے بتایا ہے کہ تم ایک مانے ہوئے خنجر زن ہو۔ اس ہنر میں شاید ہی کوئی تمہارا مقابلہ کر سکتا ہو۔ ہمارے ہاں بھی خنجر نما آلے کا استعمال عام ہے۔ اسے ہم "قبضہ" کہتے ہیں۔ قبضہ چلانے والے کئی ماہر افراد ہماری بستی میں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم ان کا فن دیکھو اور انہیں بہتر مشورے دو۔"

میں نے کہا "سوار رابل! تم نے میری تعریف کرنے میں کچھ زیادہ ہی مہمان نوازی سے کام لیا ہے۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ ہاں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ خنجر زنی میں مجھے کچھ سوجھ بوجھ حاصل ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ میں یہاں کے لوگوں کو سکھانے کے قابل ہوں یا مجھے ان سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔"

سوار رابل نے مسکراتے ہوئے کہا "میں کہہ رہا ہوں تاکہ تم سکھانے کے قابل ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ لوگوں کو کسی طرف سے خطرہ لاحق ہے؟"

"خطرہ لاحق نہ بھی ہو تو قبائلی زندگی میں اپنا رعب برقرار رکھنے کے لیے قبیلے کا دفاع مضبوط ہونا چاہیے۔" سوار نے جواب دیا۔

میں نے کہا "سوار رابل! اگر تم گستاخی نہ سمجھو تو میں یہ کہوں گا کہ میں نے یہاں آکر کچھ عجیب سی فضا محسوس کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی جنگی تیاری ہو رہی ہے۔"

سوار رابل نے ذرا توقف کیا پھر بولا "تم ٹھیک سمجھے ہو۔ کچھ لوگوں نے ہم پر لڑائی مسلط کر رکھی ہے۔"

"کوئی قبیلہ ہے؟"

"اسے قبیلہ ہی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بدمعاشوں کا ایک گروہ ہے۔ ان میں منتخب بدمعاشوں کا ایک جتھا طارق کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بہترین ہتھیاروں سے مسلح رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "سوار رابل! لیکن تم تو خنجر زنی اور دست بدست لڑائی کی بات کر رہے ہو۔ آتشیں ہتھیاروں کے مقابلے میں تو یہ سب بے معنی ہوتا ہے۔ تمہارے پاس بھی "سب مشین گن" پڑی ہے۔ یہ ایک سیکنڈ میں دس گولیاں نکالتی ہے۔ ایسے ہتھیاروں کے سامنے خنجر زن اور کلہاڑا بردار کیا کر سکتے ہیں۔"

"یہ ایک خاص مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق تمہیں بعد میں بتایا جائے گا۔" سوار رابل نے نرمی سے کہا۔

میں نے گہری سانس لی "ٹھیک ہے سوار محترم! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں اور میرا ساتھی ذاتی طور پر کسی جھگڑے میں شریک ہونا نہیں چاہیں گے۔ اس کے علاوہ ایک درخواست اور ہے۔ ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ ہم تو صرف انسانی ہمدردی کے تحت اس لڑکی کے ساتھ یہاں چلے آئے ہیں جسے آپ "سمانی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہمارے لواحقین کو کچھ خبر نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ دو تین ہفتے تو وہ انتظار کر لیں گے مگر اس کے بعد ان کو شدید پریشانی لاحق ہو جائے گی۔"

سوار رابل بولا "تمہیں کسی بھی سلسلے میں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ بہرحال واپسی کے متعلق تم اپنے مرشد سائیں صاحب سے بات کر لینا۔"

یہ نشست قریباً ایک گھنٹے تک رہی۔ سوار رابل اور اس کے عمر رسیدہ ساتھی میرے ساتھ ہونے والی گفتگو سے مطمئن نظر آتے تھے۔ آخر میں سوار رابل نے مترجم کی وساطت سے کہا "اب تم دونوں کی حیثیت میرے مہمان کی ہے۔ لہٰذا تم پہلے والی رہائش گاہ پر نہیں رہو گے۔ تمہاری نئی رہائش گاہ یہاں پاس ہی واقع ہے۔ امید ہے کہ تمہیں وہاں زیادہ آرام اور راحت ملے گی۔ تم کافی دور سے یہاں پہنچے ہو۔ تین چار روز آرام کرو۔ پھر تمہیں تمہارا کام بتایا جائے گا۔"

میں نے کہا "ہم شکاری لوگ ہیں۔ ہمارا تو کام ہی جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومنا ہے۔ تھکن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ لوگ جو کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں آج ہی کر سکتے ہیں۔"

سوار مسکرایا "پھر بھی ایک دو روز تو تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ بے شک یہ ایک دور دراز جگہ ہے۔ تمہاری دنیا جیسی سہولتیں اور راحتیں یہاں میسر نہیں لیکن مہمانوں کے لیے ہمارے دل بہت کشادہ ہیں۔"

ہم مترجم واحدی اور مسلح افراد کے ساتھ اس زمین دوز عمارت سے باہر آ گئے۔ وسیع و عریض کنویں کی سیڑھیاں طے کر کے ہم باہر نکلے۔ زریں گل مڑ مڑ کر کن انکھیوں سے دروازے پر نقش ہوشربا شبیہہ کو دیکھ رہا تھا۔ کنویں سے باہر چہل پہل تھی۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ وہی موسم تھا جو وسطی پنجاب میں نومبر دسمبر کے دوران میں ہوتا ہے۔ عجیب وضع کے کنویں کے پاس ہی ایک پختہ مکان ہماری رہائش گاہ ٹھہرا۔ دیگر مکانات کی طرح یہ مکان بھی چیڑ، اخروٹ اور دیودار کے گھنے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہ رہائش گاہ خاصی آرام دہ اور گرم تھی۔ فرش پر مقامی طور پر تیار کردہ موٹے اونی نمدے بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیے لگے تھے اور مسہریاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے آٹھ دس سال کا ایک خوب صورت لڑکا ہاتھ میں تانبے کا ایک تھال لیے ہمارے

سامنے آیا۔ اس تھال میں مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔ نئی رنگوں اور شکلوں کی مٹھائی تھی' برفی کی طرح مستطیل' جلیبی کی طرح گول اور کچھ نیزے کی میزی سی بھی۔ لڑکے نے تھال میرے سامنے کیا۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ زریں گل نے بھی تکلف سے ہاتھ بڑھایا لیکن اس وقت تک لڑکا تھال سمیت اپنا رخ بدل چکا تھا۔ مترجم واحدی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھے لے کر مکان کے اندرونی حصے میں آگیا۔ یہاں دو لڑکیاں ہماری خدمت گزاری پر مامور تھیں۔ ان کے بالوں میں پیچیدگی کے ساتھ باریک گرہیں ڈالی گئی تھیں۔ وہ گردن سے پاؤں تک کھلے لبادوں میں ملبوس ہوئی تھیں لیکن یہ لبادے اونی تھے اور ان کی کئی تہیں تھیں جس کے سبب یہ لباس بہت گرم رہتا تھا۔ لڑکیاں درمیانی شکل و صورت کی تھیں تاہم صاف ستھری نظر آتی تھیں۔ (تمام باشندے بھی صاف ستھرے تھے۔ کم از کم سردار سدورت کے قبیلے کے لوگوں سے تو زیادہ صاف ستھرے تھے) یہ جان کر زریں گل کو بے حد مسرت ہوئی کہ ان میں سے ایک لڑکی بڑی بھلی پشتو جانتی ہے۔ زریں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کسی بات پر ناراض نظر آتا تھا۔ اس کی گفتگو ختم ہوئی تو میں نے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

وہ بولا "ام اس سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے ام کو ہمارے استاد صیب سے علیحدہ کرا کیوں دیا ہے۔ ام دونوں ایک ساتھ رہے گا۔"

"تو پھر کیا جواب دیا اس نے؟"

"کہہ رہی ہے کہ آپ ان کا معزز مہمان ہے۔ آپ کی حیثیت لشکری سردار کی سی ہو گئی ہے اس لیے آپ کی خاطر تواضع لازمی ہے۔"

میں نے کہا "خاطر تواضع کیا کریں گے۔ کیا سونے کے نوالے کھلائیں گے۔"

"ام کو کیا پتا جی۔ ان سے پوچھیں۔"

"میں کیا پوچھوں۔ میری تو کچھ بھی نہیں۔ تم ہی پوچھو۔ کہو اس سے کہ ہم علیحدہ علیحدہ نہیں رہیں گے' اور جو روکھی سوکھی ہوگی اکٹھے ہی کھائیں گے۔"

میرے ریمارکس نے زریں گل کی دل جوئی کی۔ اس نے میری کہی ہوئی بات خادمہ کے سامنے دہرائی۔

وہ ہنسنے لگی۔ اس کے سفید دانت اور گلابی مسوڑے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اس نے زریں گل سے کچھ کہا اور زریں گل ایک بار پھر جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔

"اب کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ فرماتی ہے کہ آپ ان کا خاص مہمان ہے اور ام چاہے بھی تو آپ کے ساتھ ایک کمرے میں نہیں رہ سکتا۔ ویسے ان کی طرف سے بالکل اجازت ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں نے کہا "تم چاہو بھی تو کیوں نہیں رہ سکتے۔"

"خو پتا نہیں کیا بات ہے۔ بس ہماڑوں کے ماتی فسق جارہا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس ہنسی کا راز بھی مجھ پر کھل گیا۔ میں زریں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ سات آٹھ عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ وہ سب ست رنگے اونی لباس میں ملبوس تھیں۔ گلے میں ہار' کانوں میں جھمکے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ پہلے سے طے شدہ ترتیب کے ساتھ وہ میرے دائیں بائیں کھڑی ہو گئیں۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ پتا نہیں کیا کرنے جا رہی تھیں۔ پھر ہم آواز ہو کر گانے لگیں۔ گانے کے ساتھ وہ اپنے کنگن بجا کر آہنگ بھی پیدا کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ گانا گاتے گاتے ایک دم رک جاتی تھیں اور تالیاں بجاتی تھیں پھر ایک لڑکی نے لکڑی کے رنگ برنگے پھولوں سے بنا ہوا ایک ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایسے ہار میں پہلے بھی کچھ افراد کے گلے میں دیکھ چکا تھا۔

زریں بولا "استاد صیب! یہ آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ام کو تو لگتا ہے کہ کسی کے ساتھ آپ کے دو بول پڑھوائے جا رہے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں پنجابی میں' ہاتھ پیلے کیے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی کچھ ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟ جب مولوی صاحب تین مرتبہ فرمائے گا کہ قبول ہے قبول ہے تو آپ "ہاں" میں جواب دے گا؟"

"وئے لکڑی کے باندر' یہاں کوئی مولوی نہیں ہوتا اور نہ قبول وغیرہ ہوتا ہے۔ ان کا کوئی اپنا ہی تماشا ہے۔"

"لیکن استاد صیب! گستاخی معاف۔ اس تماشے کے بعد جو تماشا ہوگا وہ تو ہر جگہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے نا۔ امارا مطلب آپ سمجھ رہا ہے نا۔" وہ شرارت سے بولا۔

میں نے کہا "تیری رال کیوں ٹپک رہی ہے۔ زیادہ پریشانی ہے تو تیرے لیے بھی سردار رانل سے رابطہ کر لیتے ہیں۔"

ہم بات کو مذاق میں ٹال رہے تھے لیکن اگر واقعی یہ سنجیدہ مسئلہ تھا تو پریشانی کی بات تھی۔ میں ہرگز پسند نہ کرتا کہ مجھے تماشا بنایا جائے یا کسی عورت کو میرے ساتھ منسوب کرنے کی کوشش کی جائے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے مترجم نظر آیا تو میں نے اسے پاس بلایا۔

"واحدی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے گاتی بجاتی لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

میری آواز لڑکیوں کی آواز میں دب گئی تھی لہٰذا مجھے بلند آواز میں اپنا سوال دہرانا پڑا۔ مترجم واحدی بھی جواباً بلند آواز میں بولا "یہ یہاں کی رسم ہے بھائی! آپ کو واہراج یعنی مہتو تھائی سوار" کا منصب دیا گیا ہے۔ اس منصب کی وجہ سے قبیلے کی ایک خوب صورت لڑکی "عزت" کے طور پر آپ کو پیش کی جا رہی ہے۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میرا اور زریں کا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا "لیکن اگر میں یہ

عزت افزائی نہ چاہوں تو؟"

"لیکن اس کا فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ آپ نے یہ عزت افزائی خود قبول کی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے لڑکے نے تانبے کے تھال میں آپ کو جو مٹھائی پیش کی تھی وہ ایک طرح کا شگون تھی۔ اس تھال میں موجود ہر مٹھائی ایک دوشیزہ سے منسوب تھی۔ آپ نے جو مٹھائی اٹھائی ہے اس سے منسوب دوشیزہ آپ کی خلوت میں پیش کی جا رہی ہے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میں نے کہا "لیکن اگر میں شکریے کے ساتھ انکار کر دوں تو۔"

"اسے برا شگون سمجھا جائے گا۔" واحدی نے کہا "اس سے سردار رانل اور چار بڑوں کی دل شکنی ہوگی۔۔۔ ویسے بھی یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک جوان مرد ایک خوب صورت لڑکی کا ساتھ پسند نہ کرے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس قسم کا رد عمل ظاہر نہ کریں۔"

اسی دوران میں میری نگاہ سردار رانل پر پڑ گئی' وہ ابھی ابھی بیرونی دروازے سے داخل ہوا تھا۔ دور سے وہ ایک بچہ ہی نظر آتا تھا لیکن اس بچے کی چال ڈھال اور نشست و برخاست میں بے پناہ شان و شوکت تھی۔ اسے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ اپنی قامت اور ڈیل ڈول کے حوالے سے اس میں ذرہ بھر بھی احساس کمتری نہیں ہے۔ وہ لباس فاخرہ میں ملبوس کمر سے پستول لگائے اکڑ اکڑ کر چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چند افراد اور تھے۔ اس کے علاوہ ایک سجا سجایا خوب صورت پہاڑی خچر تھا۔ جانور کے گلے میں ہار اور گھنٹیاں وغیرہ تھیں۔ پشت پر سرخ مخمل بچھا ہوا تھا۔ اس مخمل پر ایک لڑکی براجمان تھی۔ وہ دونوں ٹانگیں اطراف میں لٹکائے بیٹھی تھی۔ خچر کی طرح لڑکی کا لباس بھی زرق برق تھا۔ اس کی سنہری ٹوپی سے موتیوں کی باریک جھالریں لٹک رہی تھیں جو نقاب کا کام دیتی تھیں۔ خچر کی لگام ایک مسلح محافظ نے تھام رکھی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر لڑکی ایک عورت کی مدد سے خچر سے اتری اور خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ سردار رانل نے مترجم کی وساطت سے کہا "میری طرف سے یہ لڑکی تمہارے لیے انعام ہے۔ امید ہے کہ یہ تمہیں خوش رکھے گی۔"

اس کے بعد سردار رانل اور دیگر افراد جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس چلے گئے۔ لڑکی کو چند عورتوں نے اندر کمرے میں پہنچا دیا۔ جو عورتیں میرے اردگرد کھڑی تھیں ان کے چہرے پہلے سے زیادہ تمتمانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے گانے بجانے میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

یہ عجیب ناٹک شروع ہو گیا تھا۔ جب میں نے زریں گل کے ساتھ نیپال سے سفر شروع کیا تھا ذہن میں بے شمار اندیشے تھے۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہماری مہم کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا۔ کن لوگوں سے ملاقات ہوگی اور نائیلہ سمیت ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا لیکن یہاں پہنچ کر حالات بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا توقعات کے خلاف ہو رہا تھا۔ ہم یہاں معزز مہمانوں کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ہر دستیاب سہولت ہمیں میسر تھی بلکہ عیش و عشرت بھی مہیا ہو رہی تھی۔

جونہی سورج غروب ہوا اور تاریکی نمودار ہوئی اس بستی کی طویل رات شروع ہو گئی۔ مترجم واحدی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ایک لڑکی شب بسری کے لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر میری حیرت میں کمی ہونے کے بجائے کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ میرے نامعقول کرم فرماؤں نے اس کمرے کو واقعی کسی حجلۂ عروسی کی شکل دے دی تھی۔ دیواروں پر پھولوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ مسہری پر ایک شاندار اونی نمدہ بچھا تھا اور مہک دار گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

لکڑی کی ایک منقش تپائی پر خشک پھل سجائے گئے تھے اور مقامی طور پر تیار کی گئی چاول کی شراب بلوری صراحی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ یہاں بھی مجھے اگربتیوں کی وہی خوشبو محسوس ہوئی جو اس سے پہلے نائیلہ کے آس پاس سے آئی تھی۔ یہ ایک مقامی خوشبو تھی اور اس کا اپنا ہی انداز تھا۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اپنے ہی سر پر چپت لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آناً فاناً اس قسم کی صورت حال پیش آ جائے گی اور کسی مقامی رواج کے نتیجے میں "شادی" سے ملتے جلتے حادثے کا شکار ہو جاؤں گا۔ مجھے اس صورت حال پر ہنسی آ رہی تھی اور جھلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شوخ آنکھوں والی لڑکیاں ابھی تک کمرے کے سامنے موجود تھیں اور شریر انداز میں تاکا جھانکی کر رہی تھیں۔ ان کی مسلسل ہنسی سے مجھے بیزاری محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور خالی خالی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔ سرخ رنگ کا ایک باریک سا کپڑا اس کے سر پر یوں ڈال دیا گیا تھا کہ وہ سرتاپا اس میں چھپ گئی تھی۔ اس انداز میں بیٹھی ہوئی وہ واقعی دلہن لگتی تھی۔ ایک ایسی دلہن جس کا نکاح ہوا اور نہ ہی نکاح جیسی کوئی رسم ادا ہوئی تھی۔

یقیناً یہ شادی نہیں تھی۔ یہ لڑکی غالباً خیر سگالی کے اظہار کے لیے تحفے کے طور پر مجھے دی گئی تھی۔۔۔ اگر یہ "شادی قسم" کی کوئی رسم ہوتی تو بہت لمبا چوڑا پروگرام ہوتا۔ قبائلی رہن سہن میں شادی بیاہ کرتے ہوئے بے شمار رسمیں ادا کی جاتی ہیں اور "کھانا" ان رسموں کا بنیادی جزو ہوتا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جو لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے' کون ہے' کس عمر کی ہے' کیسی ہے۔ میں نے موتیوں کی جھالروں میں سے بس اس کی ایک جھلک ہی

ریشمی تھی۔ یقیناً وہ خوب صورت اور جوان ہی ہوگی۔۔۔ لیکن میں اپنے دل میں کسی طرح کے جذبات محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میرا ذہن اس خوب صورت قبائلی لڑکی اور اس دعوت انگیز ماحول سے کوسوں دور تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیل جانے سے اب تک کے عرصے میں میری زندگی میں نواب زادی شاہین کے سوا کوئی عورت نہیں آئی تھی اور وہ بھی جس طرح آئی تھی وہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔

اچانک بند دروازے پر دستک ہوئی۔ میں جھلا اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دستک انہی لڑکیوں میں سے کسی نے دی ہے جو دروازے سے باہر موجود تھیں اور پچھلے ایک گھنٹے سے ہونقوں کی طرح ہنستی جا رہی تھیں۔ میں نے جھٹکے سے دروازہ کھولا لیکن لڑکیوں کے بجائے اپنے سامنے مترجم واحدی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تبسم تھا لیکن ایک طرح کی سنجیدگی بھی تھی۔ کہنے لگا "جناب! مجھے سردار رائل نے بھیجا ہے۔"

"اب کیا حکم ہے؟" میں نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"حکم نہیں جناب! مشورہ ہے۔ سردار رائل چاہتے ہیں کہ آپ ذرا محتاط رہیں۔ قبیلے کے کچھ جرائم پیشہ نوجوان آج کل وارداتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پکڑے گئے ہیں لیکن دو چار ابھی آزاد ہیں۔ آپ رات کو دروازہ وغیرہ بند کر کے سوئیں۔"

"یہ ہدایت نامہ تو میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

واحدی نے اپنی صدری کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور رومال میں لپٹا ہوا ایک ریوالور مجھے تھمادیا "یہ سردار رائل نے دیا ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

"میری طرف سے سردار کو شکریہ بولنا" میں نے کہا۔

مترجم واحدی نے مجھے سلام کیا اور واپس چلا گیا۔

میں دروازہ بند کر کے ایک بار پھر قالین پر آبیٹھا۔ سردار رائل نے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر یہ ریوالور مجھے بھیجا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں چھوٹے سائز کا ایک طاقتور پسٹل موجود ہے۔ اس کے علاوہ میرا خنجر بھی میرے پاس تھا۔ اب ہتھیاروں کے سلسلے میں میری پوزیشن بہتر ہوگئی تھی۔ میں اپنا چھوٹا پسٹل ذریں گل کو دے سکتا تھا۔

نہ جانے مترجم واحدی نے کس خطرے کی بات کی تھی۔ ویسے یہ بات تو میں بھی محسوس کرتا تھا کہ یہاں خطرات موجود ہیں۔ پچھلی رہائش گاہ میں بھی کسی نے آہنی روشن دان اکھاڑ کر کمرے میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ کئی بار مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی "بدنگاہ" ہمارے آس پاس موجود ہے۔

کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں اس نازک اندام کی طرف متوجہ ہوا جو پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ سورج ابھی غروب ہوا ہی تھا۔ تاہم اس کی روشنی موجود تھی اور کمرے میں ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ ہمارے حساب سے یہ شام کا وقت تھا لیکن اس بستی کے حساب سے شام ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے اور اب خواب گاہوں میں جانے کا وقت تھا۔ پوری بستی میں خاموشی اور سکوت کا راج تھا۔ وہ لڑکیاں اور عورتیں بھی غالباً اپنے گھروں کو جا چکی تھیں جنہوں نے یہاں غل مچائے رکھا تھا۔

میں نے لڑکی کے پاس پہنچ کر وہ سرخ کپڑا اٹھایا جو خیمے کی طرح اس کے سر پر تنا ہوا تھا۔ وہ گھٹنے سمیٹے سے جوڑے بیٹھی تھی۔ موتیوں کی جھالریں چہرے پر نقاب کا کام دے رہی تھیں۔ یہ جھالریں ٹوپی سے منسلک تھیں۔ میں نے اس کے سر سے ٹوپی علیحدہ کی تو یہ جھالریں بھی چہرے سے ہٹ گئیں۔ وہ ایک خوش شکل متناسب لڑکی تھی۔ عمر بہ مشکل اٹھارہ سال رہی ہوگی لیکن چہرے کی معصومیت اور نقوش کی وجہ سے کم عمر نظر آتی تھی۔ وہ کسی کی مٹھی میں آ جانے والی چڑیا کی طرح لرز رہی تھی۔ اس نے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر ایک ساعت کے لیے میری طرف دیکھا پھر پلکیں جھکالیں۔ اس کی شفاف آنکھوں میں شرم اور مجبوری کی کیفیت تھی اور اس سے بھی نمایاں کیفیت شکایت کی تھی۔۔۔ پتہ نہیں اسے کس سے شکایت تھی؟ مجھ سے؟ اپنے قبیلے کی جاہل رسموں سے یا اپنی کمزوری اور ناتوانی سے۔

اس نے اپنا دودھیا ہاتھ گود میں ڈالا اور کپڑے کی ایک لمبی ریشمی پٹی نکال لی۔ اس پٹی کی چوڑائی بہ مشکل ایڑھ انچ ہوگی۔ اس پٹی کا ایک سرا لڑکی کی کلائی سے بندھا ہوا تھا۔ ربن کی طرح خاص گرہ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوسرا سرا میری کلائی سے باندھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے اور ریشمی پٹی پھسل پھسل جا رہی تھی۔ پھر وہ میری طرف اور کلائی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا سر شرم کے سبب جھکا ہوا تھا۔ وہ کتنی دیر میری کلائی سے الجھی رہی۔ جو مخصوص گرہ وہ لگانا چاہ رہی تھی وہ لگ نہیں پا رہی تھی۔ یقیناً یہ کوئی رسم تھی جسے پورا کرنا وہ بہت ضروری سمجھتی تھی لیکن رسم تو تب پوری ہوتی جب اس کے ہاتھ اس کا ساتھ دیتے۔ ایک دم وہ رونے لگی۔ اس کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ شاید یہ بے بسی کے آنسو تھے۔

میں نے ریشمی پٹی اپنی کلائی سے علیحدہ کر دی۔ اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا اور اشاروں میں بتایا کہ اس پٹی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور کوئی کاجل جیسی چیز رخساروں پر پھیل گئی تھی۔ وہ بڑے بے ڈھنگے طریقے سے بیٹھی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے مسہری سے اٹھا کر قالین پر لے آؤں تاکہ وہ آرام دہ طریقے سے بیٹھ سکے۔ میں نے اسے بازو سے تھام کر اٹھانا چاہا تو وہ کسمسا گئی۔ پتہ نہیں کیا سمجھی تھی۔ اس کے رونے میں تیزی آ گئی اور وہ بری طرح ہچکیاں لینے لگی۔ وہ غیر محسوس انداز میں اپنا آپ مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی اشک بار نظریں اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں فریاد ہی فریاد تھی۔۔۔ پھر وہ عجیب انداز میں کچھ بولنے لگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کا لب ولہجہ مجھے سب کچھ سمجھا رہا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ بے بس ہے۔ نہ مزاحمت کی طاقت رکھتی ہے نہ ورنہ حق۔۔۔ وہ خود کو بچانا چاہ رہی تھی۔ وہی جبلت جو ہر جاندار میں موجود ہے۔

مجھے اس معصوم لڑکی پر بے تحاشا ترس آیا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ ایک کونے میں سمٹ گئی اور اپنی زبان میں معلوم نہیں کیا کیا کہنے لگی۔ میں نے اسے بولنے دیا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے اشاروں کنایوں میں اسے سمجھایا کہ مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

وہ میری بات سمجھ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کرب بے یقینی تھی۔ میں نے شراب کی صراحی وہاں سے ہٹا دی اور قریب پڑی چھری سے سیب کاٹ کاٹ کر اس کے سامنے رکھنے لگا "کھاؤ" میں نے اشاروں میں اسے سمجھایا۔ وہ انکار کرتی رہی لیکن میں نے سختی سے کہا تو جلدی جلدی قاشیں اٹھا کر منہ میں رکھنے لگی۔ ایک ہچکی گاہے گاہے اب بھی اس کے سینے سے بلند ہو رہی تھی۔ ہچکیوں کے درمیان سیب کھاتی ہوئی وہ بڑی سادہ اور معصوم لگی۔

میں نے اسے مسہری سے اٹھا کر قالین پر بٹھایا۔ اس کے سے ور بدا اونی لبادہ اور زیورات کا وزن شاید اس کے اپنے وزن سے بھی زیادہ تھا۔ میں نے ہنسلی اور ٹمبنے وغیرہ کے یہ زیورات اس کے جسم سے اتروائے اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر اشاروں میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ اشاروں کی زبان آفاقی ہے۔ میں اسے سمجھانے لگا کہ اسے مجھ سے کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں۔ وہ یہاں آرام سے بیٹھ سکتی ہے۔ کھا پی سکتی ہے اور سو سکتی ہے۔ میرے ہمدردانہ رویے نے اسے ایک بار پھر سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے میری باتوں پر یقین آ رہا تھا۔ بے شک وہ کم عمر تھی مگر عورت تھی اور عورت کی حس ایسے معاملوں میں بہت تیز ہوتی ہے۔

اب کمرے کا اجالا گہری تاریکی میں بدل چکا تھا۔ اشاروں کی زبان میں بات کرنا بھی اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے چھری لے لی اور خود پھل کاٹ کاٹ کر رکابی میں رکھنے لگی۔ اندھیرے میں اس کے ہاتھوں کے کنگن چھن چھن بج رہے تھے۔ اس کے نوخیز بدن کی بہت پاکیزہ مہک کمرے کی ہر خوشبو پر حاوی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں چاند نکل آیا اور اس کی کرنوں نے روزنوں میں سے داخل ہو کر کمرے میں مدھم اجالا بکھیر دیا۔ میں نے اشاروں میں لڑکی کو سمجھایا کہ وہ بے فکر ہو کر مسہری پر سو جائے۔۔۔ لیکن وہ انکار میں سر ہلاتی رہی۔ میرے سینے پر انگلی رکھ کر مجھے سمجھانے لگی کہ میں سو جاؤں۔

میں نے اشاروں میں اس سے کہا کہ اگر اسے اب بھی کوئی ڈر ہے تو میں کمرے کا دروازہ کھول دوں۔ وہ تیزی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

میں وہیں قالین پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے دل میں نجانے کیا آئی کہ میرے پاؤں دبانے لگی۔ بڑی معصوم بے ساختگی تھی اس کے انداز میں۔۔۔ ممنونیت کا اظہار بھی۔ میں نے اسے منع کرنا چاہا لیکن وہ منع نہیں ہوئی۔ مجھے لگا کہ وہ پھر رو دے گی، لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔ سردار رائل کا دیا ہوا ریوالور جیکٹ کی اندرونی جیب میں بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے یہ ریوالور نکال کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

بہ مشکل تین چار منٹ گزرے ہوں گے۔۔۔ بالکل اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس بند کمرے میں میرے اور لڑکی کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میرا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے تکیے کے نیچے گیا اور ریوالور میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس وقت میں نے اپنے سامنے صرف چھ سات فٹ کے فاصلے پر کسی کا ہیولا دیکھا۔ یہ ہیولا کمرے کی نیم تاریکی میں سے کسی آسیب کی طرح نمودار ہوا تھا۔ لڑکی کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔

میں نے ریوالور ہیولے کی طرف سیدھا کیا "کون ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

یہ چوڑے چکلے مرد کا ہیولا تھا۔ اس کے بالائی جسم پر کسی جانور کی کھال کا لباس تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک پھل کا وہی برچھا تھا جسے یہ لوگ "تفنگ" کہتے تھے۔ وہ بے حرکت کھڑا تھا۔ اس نے "تفنگ" بڑی آہستگی سے قالین پر پھینک دیا۔ دو قدم چل کر وہ روشنی میں آیا تو اس کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک کرخت چہرے والا شخص تھا۔ کسی وقت وہ طیش میں ہوتا ہوگا تو بہت خوف ناک نظر آتا ہوگا لیکن اب اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں ملامت کی جھلک تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ میں اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لڑکی کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔

"میرا نام جواداں ہے۔ اسی بستی کا رہنے والا ہوں۔" وہ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولا۔

"لیکن تم اندر آئے کہاں سے ہو؟"

"میں پچھلے دو تین گھنٹے سے اسی کمرے میں موجود ہوں۔" اس نے انکشاف کیا۔

میں حیرت زدہ رہ گیا "کہاں چھپے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کمرے کے ایک گوشے میں رکھی لکڑی کی قد آدم الماری کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ماچس جلا کر اس گوشے کا معائنہ کیا۔ الماری کے پیچھے خلا موجود تھا اور وہاں با آسانی چھپا جا سکتا تھا۔ ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا اور میں نوارد کی ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ تاہم اس کے رویے سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کرے گا۔۔۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک

رم خوف کا جو حملہ ہوا تھا وہ پسپا ہو گیا تھا۔ اب اس کی نظروں میں نوواندو کے لیے شناسائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

میں نے نوواندو سے پوچھا "تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟" اس نے اثبات میں جواب دیا "اور یہ لڑکی بھی جانتی ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ بھی جانتی ہے۔" ٹوٹی پھوٹی پشتو میں جواب ملا۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"چشمہ۔"

"تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"یہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔"

"کیا تم اس کی وجہ سے یہاں چھپے ہوئے تھے؟"

"تم کہہ سکتے ہو لیکن تم سے میری دشمنی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔"

"کیسی دشمنی؟ میں نے تو یہاں کسی کا نقصان نہیں کیا۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں میرا۔"

"یہ بات تو غلط ہے کہ تم نے کسی کا نقصان نہیں کیا۔ تم نے میرا نقصان کیا ہے۔"

"کیسا نقصان؟"

"جس طرح تم یہاں راہراج (جو تھائی سردار) بنے ہو، میں بھی راہراج ہوں۔ تم کہو گے کہ میں اپنی تعریف کر رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے اس بستی کا سب سے دلیر اور جنگجو راہراج سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر قبضہ چلانے میں میری مہارت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ حملے کے لیے جو تیاری ہو رہی ہے اس میں سردار رابل نے مجھے ایک ذمے داری سونپی تھی۔ میں ان سو لڑکوں کو تربیت دے رہا ہوں جو ہمارے "لشکر" کا ہراول دستہ ہیں..... مگر" وہ خاموش ہو گیا۔

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مگر تمہارے بعد مجھے اس ذمے داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے اور میرے لڑکوں کو تمہارے سپرد کر دیا گیا ہے..... سردار رابل اور دیگر ذمے دار افراد یہ سمجھتے ہیں کہ تم اس کام کے مجھ سے زیادہ اہل ہو۔"

"مجھے اس شخص کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے تمہیں دیکھا ہے۔"

اس نے بلا توقف کہا "میں ان چار افراد میں شامل تھا جنہوں نے تین روز پہلے پل کے پاس تم پر حملہ کیا تھا۔ میری تھوڑی پر نظر آنے والی چوٹ اسی لڑائی کی نشانی ہے..... میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم لڑائی بھڑائی کے فن میں ماہر ہو۔ میں نے اپنے خاص داؤ کے ذریعے تمہیں تین بار "قبضے" سے زخمی کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناکام رہا۔ شاید تم میری زندگی میں آنے والے دوسرے یا تیسرے شخص ہو جو اس طرح میرے قبضے سے محفوظ رہے ہو۔"

جواتاں نامی اس شخص کی بات سن کر مجھے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ یہ شخص ٹھیک کہہ رہا تھا۔ لڑائی کے دوران میں اس نے تیز دھار آلے سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ تیز دھار آلے کے وہ خطرناک وار مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ اس کے علاوہ مجھے سائیں عالی کی ایک بات بھی یاد آ گئی تھی۔ پل پر ہونے والی لڑائی کے بعد سائیں عالی نے سروار وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا تھا "چھوڑو اس لکڑی کے چرسے کو۔ وہ کیا چیز ہے۔" یقیناً سائیں کا اشارہ اسی مقامی "تریز" کی طرف تھا۔

جواتاں کا رویہ دیکھنے کے بعد میں نے ریوالور دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ وہ اور میں آمنے سامنے قالین پر بیٹھ گئے۔ لڑکی جس کا نام چشمہ معلوم ہوا تھا، ابھی تک سہمی کھڑی تھی۔ میں نے اسے بھی بیٹھنے کی ہدایت کی۔

اس نے گہری سانس لی اور گمبھیر لہجے میں بولا "میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں دو تین دن سے تمہارے پیچھے تھا۔ میرے ارادے تمہارے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ بہت برا سوچ رکھا تھا میں نے تمہارے بارے میں۔"

"شاید تم نے اس مکان میں بھی گھسنے کی کوشش کی تھی جہاں ہم پہلے رہ رہے تھے۔"

جواتاں نے اثبات میں سر ہلایا "میرا دل تمہارے خلاف غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ ایک آگ سی بھڑک رہی تھی میرے اندر جس پر قابو پانا میرے لیے مشکل تھا۔ تم نے نہ صرف مجھے نیچا دکھایا تھا بلکہ میں سردار کی نظروں میں بھی گر گیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں تمہیں تمہارے ساتھی سمیت ہلاک کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

مدھم چاندنی میں جواتاں کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی سکوت تھا جو بہت مضبوط ارادے کے لوگوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا "تمہاری نفرت ضرورت سے کچھ زیادہ نہیں تھی؟"

"شاید زیادہ تھی..... شاید زیادہ نہیں تھی" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "درحقیقت باہر سے آنے والے لوگوں کے متعلق میری رائے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر کو میں نے آوارہ مزاج اور بدعہد پایا ہے۔"

"تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا سے اکثر بھولے بھٹکے لوگ یہاں پہنچتے رہتے ہیں۔"

"تم نے بالکل غلط اندازہ لگایا ہے۔" جواتاں نے آہستگی سے کہا "ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی اردگرد کی چوٹیوں کو سر کر کے اس نشیب تک پہنچے، بہت ہی کم ہوتا ہے ایسا۔"

"پھر تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ باہر سے آنے والے سب کے سب لوگ برے ہوتے ہیں۔"

"بس مجھے جو بھی تجربہ ہوا، اچھا نہیں ہوا..... تمہارے بارے میں میرے خیالات اور بھی برے تھے۔ وجہ وہی ہے جو میں نے

تمہیں ابھی بتائی ہے۔ پھر جب مجھے پتا چلا کہ "تحفے" کی رسم میں تمہیں پیش کرنے کے لیے میرے قریبی دوست راجو کی بیٹی کو چنا گیا ہے تو میرا غم و غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چشمہ کو ہر صورت اس ظلم سے بچاؤں گا۔ میں تمہارے پہنچنے سے کافی پہلے ہی اس کمرے میں آ کر چھپ گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ آج یہ قبضہ (برچھا) تمہارے سینے سے آر پار کر دوں گا..... لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میرے لیے اپنے ارادے کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہے نہ کچھ بتانے کی۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور محسوس کر چکا ہوں۔ یہاں سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا لیکن تم نے اپنی نیکی ثابت کر دی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمہاری عزت کرتا ہوں۔ اس لڑکی چشمہ سے جو سلوک تم نے کیا ہے اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

میں حیرت سے جواتاں نامی شخص کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ایک خطرناک برچھے کی صورت میں موت میرے کتنے قریب موجود ہے..... میں کچھ دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہا۔ پھر میں نے جواتاں سے پوچھا "ابھی تم نے کہا تھا کہ تم اپنے دوست کی بیٹی کو اس "ظلم" سے بچانا چاہتے تھے۔ کیا تمہارے نزدیک یہ ظلم تھا؟"

"تو ظلم اور کیا ہوتا ہے؟" جواتاں نے پوچھا۔

"محترم واحدی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ رسم تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ یہ مقدس سنہری روشنی کی منشا ہے کہ جس بیرونی شخص کو قبیلے کا کوئی منصب پیش کیا جائے، اس کی عزت افزائی کے لیے اسے ایک خوب رو لڑکی کا تحفہ دیا جائے۔"

"یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔" جواتاں نے دبے دبے لیکن تلخ لہجے میں کہا "یہ ان لوگوں کے اپنے دل کی باتیں ہیں جنہیں یہ لوگ "مقدس روشنی" کے نام سے جوڑ دیتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لیے، اپنی سہولت کے لیے۔ اگر یہ مقدس روشنی کا حکم ہوتا تو قبیلے کے ہر فرد کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہوتا۔ میرا ذہن اس بات کو نہیں مانتا۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔"

"ہاں" جواتاں نے کہا "اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ برسوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ قریباً دو سو سال سے..... یہ قبیلہ دو قسم کے لوگوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ جو حکم چلاتے ہیں، دوسرے وہ جو حکم مانتے ہیں۔ اس قبیلے کے افراد دو بھائیوں کی اولاد ہیں۔ بڑے بھائی کا نام خان رازی اور چھوٹے بھائی کا نام راماث خان تھا۔ ان دونوں کی اولادوں کو رازی اور ماث کہتے ہیں۔ ماث برادری کے لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ درخت کاٹتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بھیڑیں پالتے ہیں۔ رازی برادری کے لوگ تعداد میں بہت کم ہیں لیکن وہ بستی پر چھائے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر کھیت ان کی ملکیت ہیں۔ انہوں نے گھوڑے پال رکھے ہیں۔ سردیوں میں جب خوراک کی کمی ہو جاتی ہے تو وہ شکار وغیرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بستی کی حفاظت بھی ان کی ذمے داری ہے۔ لشکر میں سو میں سے پچانوے افراد رازی برادری کے ہوتے ہیں۔"

"تمہارا تعلق رازی برادری سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں میں ماث ہوں لیکن چند خوش قسمتوں میں سے ہوں جو لشکر میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ میں نہ صرف لشکر میں پہنچا ہوں بلکہ سردار بھی بنا ہوں۔"

"سردار رابل رازی ہے؟"

"ہاں..... اور بستی کے وہ معزز افراد بھی جنہیں "چار بڑے" کہا جاتا ہے۔ جسے ہم لوگ مقدس روشنی کہتے ہیں اس کا تعلق سردار رابل اور چار بڑوں سے ہی ہے۔ یہی لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ مقدس سنہری روشنی کی منشا کیا ہے۔ وہ ہم سے کیا چاہتی ہے اور کیا نہیں چاہتی۔ بستی کے تمام لوگ سردار رابل اور چار بڑوں کے بیانات پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ جو بات ان لوگوں کے منہ سے نکلتی ہے وہ پوری بستی کے لیے پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ چار پانچ ہزار افراد کی بستی میں مجھ سمیت تین چار بندے ہی ایسے ہوں گے جو سردار رابل اور اس کے مشیروں پر اندھا یقین نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی بستی والوں پر ٹھونس دیتے ہیں۔"

"تم سنہری روشنی کو مانتے ہو؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

جواتاں کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا "مقدس روشنی کے وجود سے کوئی دیوانہ ہی انکار کر سکتا ہے..... وہ ہے اور اس کی طاقت پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن سردار رابل تو ایک جیتا جاگتا گوشت و پوست کا انسان ہے..... وہ ہماری طرح غلطی کر سکتا ہے، غلط بیانی کر سکتا ہے، خوف کھا سکتا ہے، لالچ میں آ سکتا ہے..... اب اس لڑکی چشمہ کی مثال ہی لے لو جو تمہارے پاس بھیجی گئی ہے۔ اس کا تعلق ماث برادری سے ہے۔ اس قسم کی ہر رسم کے لیے ماث برادری کی عورتیں ہی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ ابھی پچھلی سردیوں میں جب قحط پیدا ہو گیا تھا تو مقدس دیوار کے نیچے دو کنواری لڑکیوں کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔ شروع میں کہا گیا کہ ان میں سے ایک کا تعلق رازی برادری اور دوسری کا ماث سے ہو گا لیکن بعد میں فیصلہ بدل دیا گیا اور دونوں لڑکیاں ماث برادری کی چنی گئیں۔"

"لوگوں نے اعتراض نہیں کیا؟"

"اعتراض کرنا تو یہاں کے لوگ جانتے ہی نہیں۔ جو کچھ بھی بیت جائے، صبر سے سہتے ہیں بلکہ ہر مرتبہ ان کی عقیدت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔"

ابھی تھوڑی دیر پہلے جواناں کے منہ سے بڑی روانی میں ایک بات نکل گئی تھی۔ اس نے کہا تھا' حملے کے لیے جو تیاری ہو رہی ہے اس میں مجھے ایک اہم ذمے داری سونپی گئی ہے۔ خبر نہیں اس نے کس حملے کی بات کی تھی۔ میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے کہا "تمہارے خیال میں حملہ کب ہو رہا ہے؟"

"شاید اگلے مہینے کے شروع میں ہو۔ تب تک برف پگھل چکی ہوگی اور ـــــ" اچانک وہ خاموش ہوگیا۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول رہا تھا۔ مجھے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا "تمہیں حملے کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟"

میں نے کہا "مترجم ہوا مدی نے بتایا تھا۔ ویسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں بستی میں پہنچتے ہی ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مقامی لوگ کسی معرکے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

وہ بولا "تمہیں اس بارے میں سردار دانیل ہی بتا سکتا ہے۔ اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ یہاں کے اندرونی معاملات کے بارے میں تم سے بات کرے۔"

"لیکن اگر میں وعدہ کروں کہ یہاں میرے اور تمہارے درمیان جو بات ہوگی وہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی تو پھر؟"

"پھر بھی نہیں۔" جواناں نے کہا "ہم پر لازم ہے کہ ہم مقدس روشنی کی ہدایات پر دل و جان سے عمل کریں۔"

"چاہے یہ ہدایات سردار دانیل نے اپنی طرف سے جاری کررکھی ہوں؟"

"ساری ہدایتیں تو سردار دانیل اپنی طرف سے جاری نہیں کرتا۔ چند ایک معاملے ایسے ہیں جن میں اسے اپنی مرضی شامل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہوا ہی ہوگا' ہم ایک لڑکی کو لے کر یہاں آئے ہیں۔ اس لڑکی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور چلی گئی تھی لیکن واپس کھنچتی ہوئی یہاں آگئی ہے۔ اس کا کیا معاملہ ہے؟"

جواناں بولا "یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ جن خوش بخت لوگوں کو مقدس روشنی پسند کرلیتی ہے پھر ان کی نگاہ میں کوئی اور مقام جچتا نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی چلے جائیں' بے چین اور بے قرار رہتے ہیں۔ مقدس روشنی کی دوری انہیں ہر وقت تڑپاتی رہتی ہے۔"

"تو کیا اس لڑکی کو مقدس روشنی کی نگاہ میں مقام مل چکا ہے؟"

"ہاں۔" جواناں نے بڑے یقین سے جواب دیا "اب وہ تمہاری دنیا میں واپس نہیں جائے گی۔ کبھی نہیں جائے گی۔ اس کا ٹھکانا اب ان ہی پُرسکون پہاڑوں کی بلندیاں ہے۔ اگر کوئی اسے زبردستی واپس لے جائے گا تو وہ تڑپ تڑپ کر مرجائے گی۔"

جواناں کے لہجے میں تیر جو اٹل یقین کی ایسی جھلک تھی کہ میرے جسم میں سوئی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ قبائلی ہونے کے باوجود اچھا بھلا سمجھ دار تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں کے معیار کے مطابق تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔ اس کی باتوں میں حقیقت پسندی اور خود فکری کی جھلک ملتی تھی لیکن وہ مقدس روشنی کا لفظ اتنے احترام سے استعمال کر رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔

میں نے پوچھا "کیا تم کبھی مقدس روشنی کے قریب گئے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے اس پتھریلی دیوار کے پار گئے ہو' جہاں تمہارے کہنے کے مطابق مقدس روشنی کا بسیرا ہے۔"

وہ ہنسا "جس قسم کا سوال تم پوچھ رہے ہو ایسے سوال پہلے بھی پوچھے گئے ہیں۔ یہ سوال پوچھنے والے وہی اکا دکا بھولے بھٹکے لوگ تھے جو مختلف اوقات میں یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ جب مقدس روشنی کے کرشمات کے بارے میں سنتے تو دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ ان باتوں کو جاہل قبائلیوں کی لاف زنی سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی عقل سمجھ کے مطابق حقیقت کا کھوج لگانا چاہتے ہیں اور اس قسم کے سوالات کرتے ہیں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس بارے میں کوئی سوال نہ پوچھوں۔"

"میرے خیال میں تمہیں سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" جواناں نے ڈرامائی لہجے میں کہا "بہت جلد سب کچھ خود ہی تمہارے سامنے آنے والا ہے۔"

جواناں کے لہجے سے جھلکنے والے بے پناہ اعتماد نے ایک مرتبہ پھر میری بنیادیں ہلا دیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں واقعی کچھ تحیر خیز واقعات کا سامنا کرنے والا ہوں۔ میں نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مجھے اس دیوار کے پار لے جایا جائے گا؟"

"شاید" جواناں نے کہا "یہاں کا یہ رواج بہت پرانا ہے۔ جب کبھی بھی باہر سے کوئی شخص اس بستی تک پہنچتا ہے' اسے مقدس روشنی کا دیدار کرانے کے لیے دیوار سے پار لے جایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیوار کا راستہ سال میں صرف چار مرتبہ کھولا جاتا ہے۔ ہر تین چاند کے بعد ایک روز مقدس روشنی کچھ خاص نوجوانوں کو اپنے قریب بلاتی ہے۔ پھر ان میں سے جو خوش نصیب ہوتے ہیں وہ دیوار کے پار رہنے کے لیے چن لیے جاتے ہیں۔"

"خاص نوجوان سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

جواناں نے ایک گہری سانس لی۔ روزن سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں اس کا چوڑا چکلا سراپا نظر آرہا تھا۔ لڑکی چشمہ اپنی جگہ گم صم بیٹھی تھی۔ وہ اس خاموشی اور سکوت کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی جو پوری بستی میں پھیلا ہوا تھا۔ جواناں نے کہا "پچھلے پچاس برس سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ جو لڑکی اور لڑکا بالغ ہوتا ہے' وہ مقدس روشنی کا دیدار کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی

تمنا ہوتی ہے کہ مقدس روشنی کو ان پر پیار آجائے لیکن ہر کسی کے نصیب میں یہ عزت نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو کسی کے حصے میں بھی یہ عزت نہیں آتی۔ بلکہ دو دو برس گزر جاتے ہیں اور کسی خوش نصیب کا چناؤ نہیں ہوتا۔"

میں نے پوچھا "جس کا چناؤ ہو جاتا ہے وہ وہیں دیوار کے پار رہ جاتا ہے؟"

جواناں نے نفی میں سر ہلایا "شروع میں سب افراد واپس آجاتے ہیں۔ پھر جس کا چناؤ ہو چکا ہوتا ہے' دو تین دن بعد اس کے دل میں خود ہی "بات" پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دیوار کے پار جانے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ بستی والے اسے تیار کرکے دیوار تک لے جاتے ہیں۔ راستہ خود بخود کھل جاتا ہے اور وہ اندر چلا جاتا ہے۔"

مجھے لگ رہا تھا جیسے میں کسی تیز نشے کے اثر میں ہوں اور یہ ساری باتیں مدہوشی میں سن رہا ہوں۔ عجیب سی صورت حال تھی۔ جواناں کی اس بات نے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی تھی کہ بستی میں' باہر سے آنے والے ہر شخص کو مقدس سنہری روشنی کا دیدار کرایا جاتا ہے۔

میں نے جواناں سے پوچھا "یہ لڑکی جو ہمارے ساتھ یہاں پہنچی ہے کیا اسے بھی "روشنی" کا دیدار کرایا گیا تھا؟"

"ہاں ایسا ہوا تھا۔" جواناں نے جواب دیا "شاید تمہیں معلوم نہ ہو' یہ لڑکی یہاں اکیلی نہیں پہنچی تھی۔ اس کے ساتھ دس بارہ افراد اور بھی تھے۔ ان میں لڑکی کا شوہر بھی تھا۔ وہ بہت رعب داب شخص تھا اور خود کو کوئی سردار قسم کی چیز بتاتا تھا۔ یہ سب لوگ مقدس روشنی کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ ان میں سے اس لڑکی کو سالنی بننا نصیب ہوگیا۔ "سالنی" یہاں سنہری عقاب کی دلہن کو کہا جاتا ہے۔ سنہری عقاب اور مقدس سنہری روشنی دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ شاید ابھی تمہیں یہ باتیں عجیب لگیں لیکن بہت جلد تم انہیں دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرنے لگو گے۔"

میں نے کہا "تمہارے بیان کے مطابق اگر یہ لڑکی مقدس روشنی کی نگاہ میں مقام پاکر سالنی بن گئی تھی تو پھر یہاں سے واپس کیسے گئی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے' اور اس کہانی کی ساری تفصیل خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ اگر معلوم ہوگی تو پھر تمہیں بتاؤں گا۔"

میں نے کہا "کچھ اشارہ تو دو' میں اس بارے میں ساری ساری رات سوچتا رہا ہوں۔"

وہ بولا "بس یہ سمجھو کہ لڑکی کا شوہر لڑکی کو زبردستی مقدس روشنی کی پناہ سے نکال کر لے گیا تھا۔ قبیلے کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس شخص کا تعاقب کیا جائے لیکن مقدس روشنی کی طرف سے حکم آیا کہ اسے جانے دیا جائے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔"

اچانک کمرے کی عقبی دیوار پر کسی نے "دھپ دھپ" سے ہاتھ مارا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز کافی واضح سنائی دی۔ جواناں کے ساتھ ساتھ میں بھی چونک گیا۔ جواناں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ دادا قدموں سے دیوار تک گیا۔ پھر اس نے بھی آہستہ سے دیوار کو تھپتھپا دیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا "یہ میرا ساتھی ہے۔ مجھے اشارہ دے رہا ہے کہ گلی میں پہریدار موجود نہیں۔ اگر میں یہاں سے نکلنا چاہوں تو نکل سکتا ہوں۔"

"تم جانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "اوپر والے نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔"

اس نے اپنی زبان میں لڑکی چشمہ سے چند باتیں کیں۔ وہ تسلی آمیز انداز میں اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ جواناں کا تبحر بھی پھیا ابھی تک نمدے پر پڑا تھا۔ اس نے تبحر اپنے لباس کے نیچے چھپایا۔ پھر بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

O☆O

صبح زریں گل مجھے بڑی تفتیشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! رات کیسا گزرا۔"

میں نے کہا "جیسا ایک شریف' بھلے مانس آدمی کا گزرنا چاہیے۔"

وہ ایک دم خوش ہوگیا "ام کو آپ سے یہی امید تھا جناب۔ ام کو یقین تھا کہ جو شخص سورج جیسی بلا کے تابڑ توڑ حملے ناکام بنا سکتا ہے' وہ اتنا کمزور نہیں ہے۔ وہ اس گناہ گار رات کے امتحان سے بھی کامیاب گزرے گا۔ ام کو آپ پر فخر ہے استاد صیب!"

"اچھا زیادہ مسکے مت لگاؤ۔ یہ بتاؤ تمہاری رات کیسی گزری۔"

وہ بولا "امارا رات تو ایک دم برباد ہوگیا استاد صیب! کاش رات آیا ہی نہ ہوتا۔ نہ یہ رات آتا' نہ ام اس کالی بلی کا منہ دیکھتا جو نحوست کا چلتا پھرتا تصویر ہے۔ ام قسم کھاتا ہے استاد صیب اگر ام کو آپ کا اور سائیں علی کا خیال نہ ہوتا تو ام اپنی شرافت کو ذبح فرما کر اس عورت کا ایسا بیڑا غرق کرتا ـــــ ایسا بیڑا غرق کرتا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

میں سمجھ گیا وہ سورج کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ اطلاع واقعی انکشاف انگیز تھی۔ میں نے کہا "یہ ذکرِ خیر سورج کے علاوہ کس کا ہو سکتا ہے۔ وہ کہاں مل گئی تھی تجھے؟"

"یہیں ملی تھی اور کہاں ملنا تھا۔ شاید آپ کے لیے یہ بات بہت حیرت کا باعث ہو کہ وہ اس ساتھ والے مکان میں رہتا ہے۔ سائیں علی صیب بھی سارا دن ادھر اُدھر گھوم کر شام کو وہیں آجاتا ہے۔ یہاں اس الو کی پٹھی نے عجیب چکر چلا رکھا ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایک دم پاگل بنا رکھا ہے۔"

"اس کی خوب صورتی ہے ہی پاگل کرنے والی۔" میں نے کہا۔

"یہ خوب صورتی کا بات نہیں ہے۔ یہ بالکل اور معاملہ ہے۔

وہ الو کی پٹھی دھوکا بازی فرما رہا ہے۔ یہاں لوگوں پر جھاڑ پھونک کر رہا ہے۔ خود کو پہنچی ہوئی ہستی بتا رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کل رات ام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب آپ اپنے کمرے میں چلا گیا تو ام یہاں برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک ام کو کسی عورت کے رونے کا آواز آیا۔ ام نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر دیکھا تو ساتھ والے مکان کا صحن صاف نظر آنے لگا۔ آپ کو پتا ہے درمیانی راتوں کا چاند تھا۔ کافی روشنی تھی۔ ام نے دیکھا کہ ایک چھپر کے نیچے آٹھ دس عورتیں اور مرد بیٹھا ہے۔ ان کے درمیان لکڑی کی ایک اونچی چوکی پر ایک لڑکی بیٹھا ہے۔ وہ ایک روتی ہوئی عورت کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ ام نے غور سے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ لکڑی کی چوکی پر بیٹھا ہوا عورت سروج تھا۔ سائیں عالی کی طرح اس کے گلے میں بھی بہت سی مالائیں اور گھنٹیاں وغیرہ نظر آرہا تھا۔ لباس بھی سائیں عالی کی طرح ملنگوں جیسا تھا۔ وہ عورت کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے ساتھ ساتھ منہ میں کچھ پڑھ بھی رہا تھا..... تھوڑی دیر بعد عورت اٹھ گیا اور ایک مرد سروج کے قدموں میں آبیٹھا۔ اس کافر کے بچے نے حرام زادی کے پاؤں کو چوما اور بیمار کتے کی طرح سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ الو کی پٹھی اس شخص پر بھی کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگا____ خدا کا قسم استاد صیب! ام سے تو بالکل برداشت نہیں ہوا۔ ایک ایسا ناپاک لڑکی جو اپنا عزت ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے "پیر صیب" بنا کر بیٹھا ہوا تھا اور لوگوں کو پاگل بنا رہا تھا۔ ام سیڑھیوں سے نیچے اترا اور گلی میں آکر فرنٹ سے ساتھ والے مکان میں داخل ہو گیا۔ خو چے ام کو روبرو دیکھ کر الو کی پٹھی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا آنکھیں حیرت سے پھیل کر آلو بخارے کے مافق ہو گیا تھا۔ کہنے لگا "تم یہاں کیسے آیا؟" ام نے جواب دیا "ام کو یہاں قدرت نے بھیجا تاکہ لوگوں کے سامنے تمہاری پیری فقیری کا راز فاش کرے۔" وہ ہم سے جھگڑنے لگا۔ ام نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جھگڑا لمبا ہو گیا۔ اس نے ام کو مارنے کے لیے اپنا چپل اتارنا چاہا لیکن ام نے تو پہلے ہی اپنا چپل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ ام نے دور سے کھینچ کر مارا۔ وہ اس کی کنپٹی پر لگا۔ اس کے بعد تو وہ جیسے پاگل ہو گیا۔ خارش زدہ بندر کی طرح اچھلنے کودنے لگا۔ اپنے عقیدت مندوں سے کہنے لگا کہ وہ ام کو پکڑیں اور اماری درگت بنائیں لیکن عقیدت مند تو سارے کا سارا رام بنو کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جس نے اتنی بڑی بی بی کو جوتا کھینچ مارا ہے وہ خود کتنا بڑا ..... مایوس ہو کر اس بندریا کو خود ہی امارے سامنے آنا پڑا۔ ام ہاتھا پائی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ تو کود کر ام پر جھپٹ رہا تھا۔ اسی دوران میں سائیں عالی صیب بھی کہیں سے آگئے۔ آپ کو پتا ہے ام سائیں عالی کا عزت فرماتا ہے۔ اسی عزت عزت میں اس حرام زادی نے ہم کو دو تین جھانپڑ لگا دیے۔ بہرحال سائیں عالی صیب نے بیچ بچاؤ کرا دیا____"

"شاباش" میں نے زریں گل کی پیٹھ تھپکی "بڑی اچھی کارکردگی ہے تمہاری.... کبھی کبھی تو مجھے تمہاری جنس پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اوپر سے تم مرد ہو لیکن تمہارے اندر گوالمنڈی کی کوئی لڑاکا عورت چھپی ہوئی ہے۔"

"گوالمنڈی؟ یہ کون سا قبیلہ ہے۔"

"قبیلہ نہیں بھائی.... یہ لاہور کا ایک علاقہ ہے۔ یہاں کی لڑائیاں بڑی مشہور ہیں۔ کسی وقت یہاں بڑے بڑے پھنے خاں رہا کرتے تھے۔"

"اوہ___ ام سمجھا شاید یہ کوئی قبیلہ ہے جیسے آفریدی، نیازی، یوسف زئی، گوالمنڈی..... ہاں تو ام سروج اور سائیں عالی کی بات کر رہا تھا____"

میں نے کہا "بات کرنی ہے تو آہستہ کرو۔ اگر تمہارے بیان کے مطابق سروج اور سائیں واقعی ساتھ والے مکان میں ہیں تو تمہاری "پشتے ڈھول جیسی آواز" ان کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔"

"خو چے ام کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔" زریں گل بدستور بلند آواز میں بولا "رات والی لڑائی کے بعد تو امارا ڈر بالکل ختم ہو گیا ہے۔ امارے اندر ایک دم جوش بھر گیا ہے۔ آپ کو فلم گائیڈ وحیدہ رحمان کا وہ گانا یاد ہے نا "آج پھر لڑنے کی تمنا ہے آج مرنے کا ارادہ ہے۔" بالکل یہی حال ہے امارا۔"

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھورا تو وہ گڑبڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہتا' دروازے پر دستک ہوئی۔

زریں گل نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے محترم راعدی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی تھے۔ علیک سلیک اور چند رسمی باتوں کے بعد راعدی اصل موضوع پر آگیا۔

کہنے لگا "راہراج کا رتبہ ملنے کے بعد آپ ہمارے لیے معزز مقام پر ہیں۔ آپ بتائیں کہ ہم لوگ آپ کو کس انداز سے مخاطب کریں۔"

میں نے کہا "اسی انداز میں جس انداز میں پہلے کرتے رہے ہو۔ بلکہ اگر تم چاہو تو مجھے میرے نام "شاہ جہاں" سے بھی پکار سکتے ہو۔ میرے ساتھی کا نام زریں گل ہے۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد راعدی مجھے "شاہ جہاں صاحب" کہنے پر آمادہ ہو گیا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! میں آپ کو پہلے بھی مقدس روشنی اور اس پرندے کے متعلق بتا چکا ہوں جس کی ہمارے ہاں پوجا کی جاتی ہے۔ یہ پرندہ سنہری عقاب ہے اور سنہری روشنی کا تعلق اسی پرندے سے ہے۔ سنہری عقاب کو ہماری زبان میں سالوس کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے سنہری عقاب کے مسکن کو "سالی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ان گنت برسوں سے یہ رواج ہے کہ بستی میں باہر سے آنے والے افراد کو

سالوس اور اس کی سنہری روشنی کا دیدار کرایا جاتا ہے۔ اس رواج کے مطابق آپ کو بھی دیدار کے لیے مقدس دیوار کے پار لے جایا جائے گا۔ سردار راعل نے کہا ہے کہ یہ رسم کل دوپہر کو ہوگی۔ سب کو اس مقصد کے لیے خاص قسم کا لباس پہننا ہوگا اور تھوڑی بہت مزید تیاری کرنی ہوگی۔"

میں نے کہا "آپ..... سے تمہاری کیا مراد ہے۔ یعنی میرے علاوہ اور کون کون ہوگا؟"

وہ بولا "آپ کا محترم ساتھی زریں گل، سائیں صاحب اور ان کی خدمت گار جس نے اپنا نام سروج بتایا ہے۔"

میں نے کہا "میں اپنی اور زریں گل کی طرف سے رضامندی ظاہر کر سکتا ہوں لیکن ان دونوں کی مرضی تم ان دونوں سے پوچھ لو۔"

راعدی نے تسلیمی انداز میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سائیں عالی اور سروج کی طرف چلا گیا۔

جراتاں مجھے رات کو ہی بتا چکا تھا کہ جلد یا بدیر ہمیں مقدس دیوار کے پار لے جایا جائے گا اور سنہری روشنی کا دیدار کرایا جائے گا۔ لہٰذا راعدی کی اطلاع سے مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ زریں گل کے لیے البتہ یہ اطلاع نئی تھی۔ اس کے چہرے پر تجسس نظر آرہا تھا۔ وہ مجھ سے اس سلسلے میں جاننا چاہ رہا تھا۔ میں نے کنی کترانے کی کوشش کی لیکن اس کی سوئی وہیں اٹکی رہی۔ میں نے مختصر الفاظ میں زریں گل کو بتایا کہ یہ رسم کس نوعیت کی ہے۔ زریں گل حیرت میں ڈوب کر سنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ غیر یقینی انداز میں سر ہلانے لگتا۔ یہ سن کر اسے سخت تعجب ہوا کہ مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق جس مرد یا عورت کو مقدس روشنی "پسند" کرتی ہے وہ شخص واپس آنے کے بعد چند روز کے اندر دوبارہ مقدس روشنی (سالوس) کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس کے اندر ایسی بے چینی، بے قراری پیدا ہوتی ہے کہ وہ پھر کہیں اور رہ ہی نہیں سکتا۔

زریں گل نے آنکھیں گھمائیں اور بولا "اس کا مطلب ہے کہ نائیلہ نامی لڑکی بھی کسی ایسے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔"

"ظاہر تو یہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

زریں گل بولا "خدا استاد صیب! امارا دادا کہا کرتا تھا کہ خوشبو لگا کر قبرستان سے گزریں تو جن چمٹ جاتا ہے۔ امارے دادا کی باتوں پر امارا ایک پڑوسی بہت عمل کرتا تھا۔ اس نے فوراً اپنی جھگڑالو بیوی کے کپڑوں پر خوشبو لگایا اور اسے لے کر کئی بار قبرستان سے گزرا تھا۔ آخر اسے جن چمٹ کر رہا تھا۔ خو وہ بھی بیٹھی بیٹھی ایک دم کھڑی ہو جاتی تھی اور باہر کو بھاگنے لگتی تھی۔ ام کو تو لگتا ہے کہ یہ نائیلہ بی بی والا چکر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" پھر ایک دم زریں گل کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگا "زہے استاد صیب! اس سارے معاملے میں ایک بات خوشی کا بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھیں ناں جی، وہ الو کی پٹھی سروج بھی امارے ساتھ جائے گا۔ اس کی چمڑی چٹی ہے اور ویسے بھی جوان جہان ہے۔ ام کو یقین ہے کہ اب اس پر ضرور سایہ ہو جائے گا____"

"تو اندر سے بڑا کھوٹا ہے زریں گل.... کبھی اچھی بات بھی سوچا کر۔"

"ام ہر ایک کے لیے اچھا سوچتا ہے استاد صیب لیکن اس سفید گھیا کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتا۔ یہ امارے بس میں ہی نہیں ہے.... آپ نے "دیوار کی دوسری طرف" کی جو باتیں بتائی ہیں' اگر وہ واقعی سچ ہیں تو اماری دلی تمنا ہے کہ سروج پر آسیب کا اثر ہو جائے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم سائیں عالی کو بھول رہے ہو.... وہ اپنی چیلی کو اتنی آسانی سے پاگل نہیں ہونے دے گا۔"

زریں گل ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا "ہاں یہ بات تو ہے۔"

○☆○

اگلا دن بے حد ابر آلود تھا۔ دن میں ہی رات کا سماں نظر آرہا تھا۔ بہرحال کافی دیر سے بادل تھما کھڑا تھا۔ ایک بوند تک نہیں گری تھی۔ دور ناٹا پربت کی بلندیاں مکمل طور پر بادلوں میں گھری ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی بادلوں کے مرغولے اتنی کم بلندی پر آجاتے تھے کہ چیڑ اور دیودار کے درختوں سے ٹکرانے لگتے تھے۔ خنکی آج ہمیشہ سے زیادہ تھی۔ بستی کے باشندے اونی لبادوں اور جانوروں کی کھالوں میں لپٹے اور سہمے سمٹائے نظر آتے تھے۔

ہم مقدس دیوار کے پاس ایک چار دیواری میں موجود تھے۔ یہ ایک عام سا مکان تھا لیکن بہت صاف ستھرا تھا۔ پورے مکان سے ایک مہک اٹھ رہی تھی۔ یہ وہی اگربتیوں جیسی مہک تھی جو میں نے اس سے پہلے بھی نائیلہ کے ارد گرد محسوس کی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی اس مہک میں جو انسان کے دل پر براہِ راست اثر کرتی تھی۔ جیسے صندل کے جنگل میں بارش ہو اور مٹی کی سوندھی خوشبو صندل میں مل کر ایک تیسری خوشبو کو جنم دے رہی ہو۔ اس خوشبو کو سونگھ کر ذہن کا کوئی حصہ جاگ اٹھتا تھا یا شاید سو جاتا تھا۔ ہم چاروں کو بسنتی رنگ کے لمبے لمبے چوغے پہنا دیے گئے تھے۔ ان چوغوں کا کپڑا اونی ہونے کے باوجود چمک دار تھا اور اس میں ملائمت بھی تھی۔ تعجب کی بات تھی کہ سائیں عالی نے بھی بغیر کسی اعتراض کے یہ چوغہ پہن لیا تھا اور خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ سائیں عالی کا ہاتھ منہ دھلانے اور سر میں کنگھی کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ ہم چاروں کے لباس پر خوشبو لگائی گئی اور چمڑے کے خصوصی جوتے پہنائے گئے۔ سروج کو دو مقامی عورتوں نے خاص طور سے

تیار کیا۔ اس کی آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر لالی لگائی گئی۔ اس کے گلے میں جنگلی پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے جو میں نے اس سے پہلے نائیلہ کے گلے میں دیکھے تھے۔ اس کے سر میں ہلکا سا تیل لگایا گیا تھا جس سے بال چمک دار ہو گئے تھے۔ یہ تیاری دیکھ کر میرے ذہن میں عجیب سے اندیشے جاگ اٹھے تھے۔ یہ سوچ کر دل ہول گیا کہ کہیں ذریں گل کی ذات میں کوئی ہولی بات نہ ہو جائے۔ اگر سوچ کی کیفیت بھی نائیلہ سے ملتی جلتی ہو جاتی تو ہم کیا کر سکتے تھے۔

یہاں آنے سے پہلے مترجم واحدی نے ہدایت کی تھی کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ریوالور جو ایک رات پہلے سردار رابل نے میرے لیے بھجوایا تھا' واحدی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور کہا تھا کہ واپسی پر ریوالور مل جائے گا۔ وہ چھوٹا پستول جو میں نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں چھپا رکھا تھا اب بھی "میزبانوں" سے پوشیدہ تھا۔ میں نے اسے جیکٹ سے نکال کر چھت کی کڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ بہرحال تیز دھار خنجر دستور میری پنڈلی سے پیوست تھا اور بوقتِ ضرورت کام آ سکتا تھا۔

جوں جوں مقدس دیوار کی طرف ہماری روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا' ہمارے تجسس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک طرح کی سنسنی تھی جو رگ و پے میں پھیلتی محسوس ہو رہی تھی.... عقل اور سائنس جن باتوں کو تسلیم نہیں کرتی ان کا ملاحظہ کرنا ہمیشہ سے انسانی فطرت کے لیے بے حد تجسس آمیز اور سنسنی خیز رہا ہے۔ اچانک ایک منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ ہمارے ہی جیسے لباسوں اور خوشبو میں بسے ہوئے سات آٹھ افراد چار دیواری میں داخل ہوئے۔ وہ سب کے سب نوجوان تھے۔ ان میں تین لڑکیاں اور باقی لڑکے تھے۔ قدرے گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں نے مترجم واحدی سے پوچھا...."یہ کون ہیں؟"

واحدی کے جواب نے جواہل کے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس نے بتایا "ہر تین چاند (تین مہینے) کے بعد مقدس دیوار کا راستہ کھولا جاتا ہے اور ان لڑکیوں اور نوجوانوں کو سانوس کا دیدار کرایا جاتا ہے جو بلوغت کی حد پر پہنچے ہوں۔ آج اسی رسم کا دن ہے۔ سردار رابل کے فیصلے کے مطابق آپ چاروں کو بھی ان نوجوانوں کے ساتھ ہی سانوس کا دیدار کرایا جا رہا ہے۔ امید ہے یہ کارروائی آپ کے لیے معلومات افزا اور تحیر خیز ہوگی۔ آپ یہاں سے جانے کے بعد بھی برسوں اس واقعے کو یاد رکھیں گے۔"

"مگر ہم میں سے کوئی یہاں رہ گیا تو....؟"

"تو وہ خوش قسمت ہوگا۔ اس کی زندگی دوسروں کے لیے اور اس کے اپنے لیے بھی قابلِ رشک ہو جائے گی۔" واحدی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد سردار رابل بھی ایک عمر رسیدہ شخص کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ یہ بوڑھا کوئی عامل یا کاہن قسم کی چیز نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انسانی جسم کی سب سے لمبی ہڈی یعنی ران کی ہڈی تھی۔ اس ہڈی کو ہوا میں گردش دے کر اس نے کچھ ناقابلِ فہم دعائیں ادا کیں۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں ہمیں "مقدس" دیوار کی طرف روانہ کیا گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا لیکن گھمبیر بادلوں کے سبب تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ اب ہلکی بوندیں گرنا شروع ہو گئی تھیں۔ تقریباً سو قدم کی دوری پر لکڑی کا جھولD ہوا پل تھا اور اس پل کے پار وہ سنگی دیوار تھی جو کسی قلعہ کی فصیل کی طرح بہت پُر ہیبت اور ناقابلِ عبور نظر آتی تھی۔ جو افراد ہمارے ارد گرد چل رہے تھے ان کے ہاتھوں میں نفیریاں اور ڈھول تھے۔ وہ بڑے منظم طریقے سے کوئی ستائی دھن بجا رہے تھے۔ اس دھن کو سن کر میرے ذہن میں نہ جانے کیوں پرانی خانقاہوں' کلیسائی عمارتوں اور ان بلند و بالا مندروں کا تصور ابھر آیا جس میں بجنے والی گھنٹیاں عجیب سی گونج پیدا کرتی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے لکڑی کا پل پار کیا اور دیوار کے نیچے پہنچ گئے۔ جلوس پل کی دوسری جانب ہی رہ گیا اور وہ مسلح محافظ بھی جو پل تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ دیوار کے اوپر سے کچھ نادیدہ آنکھیں ہمارا جائزہ لے رہی ہیں۔ ہماری ہر ہر حرکت نوٹ کر رہی ہیں۔ ایک دم ہمارے قدموں کے نیچے ارتعاش پیدا ہوا اور گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز سے دیوار کے ایک حصے میں خلا نمودار ہو گیا۔ خلا میں جو پہلی جھلک مجھے نظر آئی وہ ایک خوب صورت درخت کی تھی جو چھتری کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ منظر ایسا خوب صورت تھا کہ میں مبہوت رہ گیا۔ درخت کے نیچے دور تک سرسبز گھاس بچھی ہوئی تھی اور کیاریوں میں پھول جھلک دکھا رہے تھے۔ ہم دیوار کی دوسری جانب پہنچے تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک انتہائی دل فریب منظر ہمارے سامنے تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس منظر اور بستی کے منظر میں زمین آسمان کا فرق تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ زمین کا ایک جنت نظیر ٹکڑا ہمارے روبرو تھا۔ دور تک گھاس تھی' پھولوں کے تختے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پھول دار جھاڑیاں تھیں جو بہار کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ ایک نہایت دل فریب آبشار تھا جس کا پانی چمکتے پتھروں پر اٹھکیلیاں کرتا نشیب میں کہیں اوجھل ہو جاتا تھا۔ آبشار کی آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بھی درخت اور پھول تھے۔ میں نے لمبے بالوں والے ایک ہرن نما چوپائے کو دیکھا جو چوکڑی بھر کر ایک پتھر کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ یہ سب کچھ بادلوں کے مرغولوں میں چھپا ہوا تھا اور بہت خواب ناک نظر آ رہا تھا۔ بادل تیزی سے ہر چیز کو ڈھانپتے چلے جا رہے تھے۔ شاید ہم چند منٹ بعد یہاں پہنچتے تو ارد گرد کے سحر انگیز مناظر دیکھنے سے محروم رہ جاتے۔

چند بیس گز کی دوری پر ایک پہاڑی ڈھلوان کے پہلو میں' کھوہ نما غار نظر آ رہا تھا۔ جوں ہی ہم اس خلا کے قریب پہنچے' سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص ہمارے سامنے آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یک ٹک ہماری طرف دیکھتا رہا۔ بادلوں کے

دھندلکے میں ساکت کھڑا وہ ایک مجسمہ نظر آتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن اس نے زبان ہلانے کے بجائے سر کو جنبش دی اور ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم اس کے پیچھے ہی پیچھے کھوہ میں داخل ہوئے۔ یہاں خوش گوار حرارت تھی۔ کسی پکوان کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ یہ کھوہ خاصی طویل تھی۔ اس کی کچھ ذیلی شاخیں بھی تھیں۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کھوہ کی یہ توسیع انسانی ہاتھوں کی مرہونِ منت ہے۔ پوری کھوہ میں وہی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس کا تجربہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔ یہ ایک جدا خوشبو تھی' اس پُراسرار تاثر کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ ہم جوں جوں سرنگ نما کھوہ میں آگے بڑھ رہے تھے یہ خوشبو تیز ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہمارے حواس پر بھی ایک سرور انگیز دھند چھاتی جا رہی تھی۔ ذریں گل نے کھلی کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ دوسروں کی طرح اس کے چہرے پر بھی خوف آمیز تجسس تھا۔ صرف سائیں عالی تھا جو اب تک اپنے حال میں مست نظر آ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہر چیز کو خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور چہرے سے بے پروائی عیاں تھی۔

ہماری رہنمائی کرنے والا بلا توقف چلتا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ کھوہ کے اندرونی حصے میں روشنی کا انتظام تھا۔ سنگلاخ دیواروں کے ساتھ تیل کے چھوٹے چھوٹے لیمپ روشن تھے۔ کھوہ کے کچھ حصوں میں افراد کی نقل و حرکت بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ سب سفید کپڑوں میں تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ وہ بڑی خاموشی سے سنگی دیواروں کے بیچ آ جا رہے تھے۔ ان کی چال میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ ہر حرکت نپی تلی تھی۔ وہ بولتے تھے تو ان کی مدھم آواز کھوہ میں گردش کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں سے کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ ایک موڑ پر ہم ایک جوڑے کے بالکل قریب سے گزرے۔ مرد کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی' عورت کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ دونوں ایک پتھریلی بینچ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ عورت کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ سفید براق کپڑوں میں وہ بڑے خوب صورت نظر آئے۔ ان کے چہروں پر مجھے عجیب سی طمانیت اور روحانی مسرت دکھائی دی۔ ان کی نگاہیں صرف دو لمحوں کے لیے ہماری طرف اٹھیں پھر وہ اپنے حال میں مگن نظر آنے لگے۔ ان کے قریب ہی ڈھائی تین سال کا ایک بہت خوب صورت بچہ کھیل رہا تھا۔ یہ بچہ بھی بالکل سفید لباس میں تھا۔ کھوہ میں بیس تیس گز مزید فاصلہ طے کر کے ہم ایک کشادہ جگہ پہنچ گئے۔ یہ جگہ بھی انسانی ہاتھوں سے تراش کر بنائی گئی تھی۔ یہاں چھت کافی اونچی تھی۔ دیواریں کسی طریقے سے رگڑ کر ملائم کر دی گئی تھیں.... سائیں عالی نے یہاں کھانسی کی تو اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ شاید اونچی چھت کی وجہ سے۔ یہاں وہ مخصوص صندلی خوشبو بہت تیز تھی۔ اتنی تیز خوشبو حواس پر بُرا اثر کرتی ہے اور بعض اوقات سر میں درد بھی ہونے لگتا ہے مگر یہ خوشبو جتنی تیز ہو رہی تھی اتنی ہی بھلی لگ رہی تھی۔ خبر نہیں اس خوشبو کا منبع کیا تھا۔ یہ در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کشادہ جگہ ایک بیضوی ہال جیسی تھی۔ ہمیں ایک خمیدہ دیوار کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ بیٹھنے کے لیے پتھر کی نشستیں تھیں۔ ان نشستوں کے سامنے میز کی شکل میں ایک پتھریلی پٹی دور تک چلی گئی تھی۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ سفید کپڑوں میں ملبوس دو خوبرو نوجوان وارد ہوئے۔ ان کے رنگ سرخ و سپید اور ہونٹوں پر مسحور کن تبسم تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خشک میوے سے لدی ہوئی طشتریاں تھیں۔ یہ طشتریاں ہمارے سامنے رکھ کر وہ واپس چلے گئے۔ چند لمحے بعد دوبارہ آئے تو تازہ پھل کی طشتریاں لے آئے۔ ایک تیسرے شخص کے ہاتھ میں بلوری صراحی تھی اور اس میں ایک گلابی محلول ہلکورے لے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دودھ میں گلابی رنگ ملا دیا گیا ہے۔ یہ اشیائے خورد و نوش ہمارے سامنے رکھ کر ہمارے میزبان خاموش کھڑے ہو گئے۔ ایک لڑکے نے اشارے سے درخواست کی کہ ہم کچھ تناول کریں۔ سب سے پہلے سائیں عالی نے سیب اٹھایا۔ اس کے بعد ہم سب نے طشتریوں میں سے تھوڑا تھوڑا پھل لیا۔ مشروب کا گھونٹ بھی سب سے پہلے سائیں عالی نے بھرا۔ اس کے تاثر سے اندازہ ہوا کہ یہ ایک فرحت بخش مشروب ہے۔ سوچ اور ذریں مشروب کی طرف ہاتھ بڑھانے سے کترا رہے تھے لیکن جب سائیں کے بعد میں نے پیش رفت کی تو وہ بھی بلوری پیالوں میں سے ایک ایک گھونٹ لینے پر آمادہ ہو گئے۔ مشروب کی تاثیر بھی خوشبو کی طرح عجیب و غریب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ تازہ پھلوں کے رس میں دودھ' شہد اور مغز وغیرہ ملا کر ایک فرحت بخش اور مقوی شربت کی شکل دے دی گئی ہے۔ مقامی لوگ بلا جھجک کھا پی رہے تھے۔

چند منٹ بعد محسوس ہوا کہ ہمارے حواس پر چھائی ہوئی فرحت بخش دھند کچھ اور گہری ہو گئی ہے۔ ذریں اور سوچ کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی گھبراہٹ میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ وہ اب دلچسپی سے ارد گرد کی اشیا کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے ہموار دیوار پر ایک کافی بڑی پینٹنگ نظر آ رہی تھی۔ یہ سنہری عقاب کی تصویر تھی۔ عقاب کے پروں کا پھیلاؤ دس بارہ فٹ کے قریب تھا۔ عقاب کے نیچے ایک کھیت تھا۔ اس کھیت میں ایک مرد' ایک عورت اور ایک بچہ چلچلاتی دھوپ میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے مشقت کی اذیت اور طمانیت کا اظہار ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔

اچانک ایک خوبرو سفید پوش دوشیزہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر ملکوتی حسن تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ذریں

گل کو اٹھنے کے لیے کہا۔ معمولی تذبذب کے بعد زریں گل اٹھ کھڑا ہوا اور خوبرو دوشیزہ کے پیچھے پیچھے چلتا ایک راہداری میں روپوش ہوگیا۔۔۔ ہم بیٹھے رہے اور زریں گل کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ زریں کی واپسی تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بالکل خاموش تھا اور خاموشی سے اپنی جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نظر نہیں آرہا تھا۔

زریں کے بعد سورج کی باری تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے کبھی میری اور کبھی سائیں عالی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سفید پوش دوشیزہ سے اشاروں میں کہا کہ کیا میں اس کے ساتھ جاسکتا ہوں۔ وہ دل نشیں انداز میں مسکرائی اور مجھے انگلی کے اشارے سے منع کردیا۔ سورج خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ایک دم سائیں عالی نے سورج پر اپنا عصا تان لیا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں نکالیں اور تیز سرگوشی میں بولا "جا دفع ہو۔ منہ کیا دیکھتی ہے۔"

سورج مزید خوف زدہ ہوگئی اور جلدی سے لڑکی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ سورج کی واپسی بھی پچیس تیس منٹ سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ تیسرا نمبر میرا تھا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوچکی تھی۔ مشروب اور خوشبو نے مل جل کر حواس پر عجیب سی بے خودی طاری کردی تھی۔ ارد گرد کی ہر شے خواب ناک نظر آرہی تھی۔ سفید پوش دوشیزہ کے پیچھے چلتا میں ایک نیم تاریک راہداری میں داخل ہوا۔ ہمارے قدموں کی مدھم چاپ بھی گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اچانک مدھم گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پتھر کی ایک چوکور سِل بالکل اسی طرح دیوار میں سے سرک گئی جیسے پل کے قریب ہوئی دیوار سے سرکی تھی۔ میں لڑکی کے پیچھے چلتا اندر داخل ہوا۔ یہ بھی ایک بیضوی کمرا تھا لیکن پہلے کمرے سے قدرے چھوٹا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے لڑکی کے ساتھ ساتھ میں نے بھی اپنے جوتے اتار لیے تھے۔ سامنے ایک بہت بھاری اور وسیع و عریض مخملی پردہ نظر آرہا تھا۔ اس چھت تلے بے پناہ خاموشی اور عجیب سی ہیبت کا احساس ہوتا تھا۔ لڑکی مجھے پردے کے مقابل کھڑا کرکے واپس چلی گئی۔

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ یہاں فانوس روشن تھا اور اس کی تیز روشنی در و دیوار کو نمایاں کررہی تھی۔ بیضوی کمرے کے عین وسط میں ایک جھونپڑی سی نظر آرہی تھی۔ یہ جھونپڑی درحقیقت ایک باریک ریشمی کپڑا تھا جو چھت سے جھول رہا تھا اور کسی مسہری یا پلنگ کے گرد خیمے کی شکل میں تن گیا تھا۔ اس خیمے کے اندر جھانکنا ممکن نہیں تھا۔ ہاں یہ احساس ہورہا تھا کہ کوئی اس کے اندر موجود ہے لیکن وہ جو کوئی بھی تھا بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور شاید بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ کوئی بہت تیز نگاہ تھی جو مجھے اپنے سراپا پر رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مخصوص صندلی خوشبو جو ہر جگہ میرے ساتھ رہی تھی، یہاں بھی موجود تھی۔ اب خوشبو اتنی شدید تھی کہ مجھے اپنے جسم کے اندر سے بھی پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ ریشمی کپڑے کے خیمے کے اندر کچھ روشنی نمودار ہونے لگی۔ یہ روشنی بتدریج طلوع ہورہی تھی۔ جیسے ریگولیٹر کے ذریعے کسی بلب کو روشن تر کیا جارہا ہو۔ یہ مسحور کن روشنی تھی۔ کوئی مبہوت کردینے والی کیفیت تھی اس روشنی کے اندر۔ یا شاید یہ کیفیت روشنی کے بجائے میرے اندر تھی۔ میں اس روشنی کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا تھا کہ لاشعوری طور پر متاثر ہورہا تھا۔ روشنی کی نمو نے مجھے اپنی جگہ جامد کرکے رکھ دیا تھا۔ روشنی جب خاصی تیز ہوگئی تو مجھے ریشمی کپڑے کے خیمے میں بیٹھا ہوا ہیولا صاف نظر آنے لگا۔ خدا کی پناہ! وہ ایک جواں سال تھا اور اتنا خوب صورت کہ آنکھوں کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک مسہری پر تھا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا حسن و جمال ریشمی پردے کے اندر سے یوں چھلک رہا تھا جیسے چلمن کے پیچھے کوئی کافوری شمع روشن ہو۔ مردانہ وجاہت اور دل کشی کا ایسا مکمل نمونہ شاید ہی انسانی آنکھ نے کبھی دیکھا ہو۔ وہ سفید تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا نیلا تھا اور یہ رنگ ریشمی پردے کے اندر سے بھی بہت نمایاں نظر آرہا تھا۔ یہ سحر آنکھیں میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

وہ بولا تو اس کی آواز اس کے جادوئی لہجے سے ہم آہنگ بیضوی کمرے میں گونج گئی۔ اس گونج نے آواز کی گرج اور تاثر میں بے حد اضافہ کردیا۔ وہ پشتو میں بولا تھا "آپ کا نام؟"

"شاہ جہاں" میں نے جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"لاہور کا۔"

"انگلش سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

اس مرتبہ انگلش میں پوچھا گیا "ہماری یہ وادی کیسی تمہیں؟"

"بہت اچھی۔ بہت محنتی لوگ ہیں یہاں کے اور شاید لیے خوش حالی بھی ہے۔"

"خوش حالی ایک ایسا قفل ہے جس کی کلید محنت ہے۔" فلسفیانہ انداز میں بولا۔ اس کی پشتو سے اس کی انگلش بہتر تھی۔ انگلش کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ برطانیہ یا ہمسایہ ملک کا رہنے والا ہے۔

"کیا تم اپنے بارے میں، اپنے وطن کے بارے میں اور مسکن کے بارے میں کچھ بتانا پسند کروگے؟"

"میں اس سلسلے میں گھنٹوں بول سکتا ہوں۔ آپ کیا سننا پسند کریں گے؟"

"کیا کرتے ہو؟"

"پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں لیکن ایسا وکیل ہوں کہ اپنی ہی وکالت ٹھیک سے نہ کرسکا اور جرمِ بے گناہی میں کئی سال جیل میں سڑتا رہا، اب آزاد ہوں لیکن اس آزادی پر موت اور اذیت کے سائے ہیں۔"

"شادی شدہ ہو؟"

"جی نہیں۔"

"کسی سے محبت کی ہے۔ میرا مطلب ہے کبھی عورت کو چاہا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"محبت کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ محبت اور محنت ہی تو زندگی کے اہم ترین جزو ہیں۔"

"محنت سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"یہ بہت اچھا سوال ہے اور ابھی تک بہت کم لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے۔ میں اس کا جواب ذرا تفصیل کے ساتھ دینا چاہوں گا۔ میرے نزدیک محنت اس جسمانی اور ذہنی تکلیف کا نام ہے جو انسان اپنی اور دوسروں کی سہولت کے لیے اٹھاتا ہے۔ میرے نزدیک محنت یعنی تکلیف کے بغیر آرام اور سکون کا کوئی تصور نہیں۔ ایک بالکل عام سی مثال ہے جو تم نے پہلے بھی سنی ہوگی۔ شیریں چیز کا لطف نمکین چیز کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر ہم صرف شیرینی کھاتے رہیں تو جلد ابکائیاں لینے لگیں گے۔ بعینہٖ اسی طرح جو شخص راحت اور خوشی کا متلاشی ہو اسے اپنا سینہ محنت مشقت کے لیے کھول دینا چاہیے۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف! یہ تو ایک عام سی بات ہے اور سب لوگ جانتے ہیں۔"

"لیکن یقین نہیں رکھتے۔" خوب صورت شخص کی آواز کمرے میں گونجی "اگر یقین آجائے تو لوگوں کی زندگیاں سنور جائیں۔ یہ اتنی ہی یقینی بات ہے جتنی یہ کہ تم میرے سامنے کھڑے ہو اور سانس لے رہے ہو۔ اس کے علاوہ ایک باریک نکتہ اور بھی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے نزدیک محنت کا مطلب تکلیف ہے، اور تکلیف کے بغیر راحت کا تصور بے معنی ہے۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتایا ہے کہ محنت یعنی تکلیف دو طرح کی ہوتی ہے۔ جسمانی اور ذہنی۔ اگر کوئی شخص سکون اور راحت چاہتا ہے تو اسے تکلیف تو ہر صورت میں سہنی ہے۔ اب یہ اس کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ ذہنی تکلیف پسند کرتا ہے یا جسمانی تکلیف۔ میرے خیال میں جسمانی تکلیف زیادہ موزوں ہے۔ جوں جوں ہماری تہذیب ترقی کے مدارج طے کررہی ہے، جسمانی تکلیف یعنی جسمانی مشقت کا رواج ختم ہورہا ہے۔ لامحالہ ہماری ذہنی پریشانیاں عروج پر پہنچی ہوئی ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ انسان کی حقیقی خوشی کا راز صرف اور صرف ان تھک جسمانی مشقت میں ہے۔"

میں خوبرو پردہ نشین کی باتیں سن کر حیران ہورہا تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو میرا خیال کچھ اور تھا۔ ذہن کہہ رہا تھا کہ بھولے بھالے قبائلیوں کو بہکانے والے کسی خود ساختہ "دیوتا" سے پالا پڑنے والا ہے۔ یہ کوئی عیاش اور شعبدہ باز قسم کا شخص ہوگا۔ اس کا "ڈیرا" کوئی عشرت کدہ ہوگا جہاں نیم برہنہ لڑکیاں تھرکتی ہوں گی۔ شراب کے جام لنڈھائے جاتے ہوں گے اور باادب خدام بے آواز قدموں سے چلتے پھرتے نظر آتے ہوں گے لیکن یہ تو ایک اور ہی ماحول تھا۔ یہاں کوئی خادم نظر نہیں آتا تھا۔ گردوپیش سادہ لیکن صاف ستھرے تھے۔ یہاں موجود لوگوں کے چہروں سے عجیب سی سرشاری پھوٹ رہی تھی۔ مجھے یہ لوگ کسی اور ہی دنیا کے نظر آرہے تھے۔

میں نے کہا "محترم! آپ کے حوالے سے میرے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہورہے ہیں لیکن ایک سوال ایسا ہے جو میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" ملائمت سے پوچھا گیا۔

"محترم! کچھ لوگ یہاں آتے ہیں تو یہیں کے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اگر وہ کسی طرح یہاں سے دور چلے بھی جائیں تو پھر کھنچے ہوئے واپس چلے آتے ہیں۔۔۔ شاید میں اس بات پر یقین نہ کرتا لیکن۔۔۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ چکا ہوں۔"

وجیہہ شخص کی بارعب آواز اس اونچی چھت والے کمرے میں گونجی "یقیناً تم اس ساتھی کی بات کررہے ہو جسے لے کر تم یہاں پہنچے ہو۔"

"جی ہاں جناب! میری معلومات کے مطابق وہ اپنے شوہر اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ بھٹک کر یہاں پہنچی تھی۔۔۔ مگر پھر یہیں کی ہوکر رہ گئی۔"

"افسوس ہے، میں تمہیں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا۔" پردہ نشین کی فیصلہ کن آواز ابھری۔ اس آواز میں کوئی ایسی کیفیت تھی کہ مجھے پھر سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"کیا میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھ تو رہے ہو۔" ملائم لہجے میں جواب ملا۔

"میرا مطلب ہے، میں آپ کو اس پردے کے بغیر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر آواز آئی "اس کے لیے کچھ لوگ مخصوص ہوتے ہیں۔ تم ان میں سے نہیں ہو۔"

"کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے؟"

"نہیں میں کوئی اور بات کررہا ہوں۔ شاید وہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔"

"کیا ہم یہاں موجود لوگوں سے مل سکتے ہیں؟"

مل سکتے ہو لیکن تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ تم سے کوئی بات کریں گے نہ کسی بات کا جواب دیں گے۔ ہاں تم ان کا رہن سہن دیکھ سکتے ہو لیکن وہ بھی دور سے۔"

"یہ لوگ یہاں کیا کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" پردہ نشین نے مجھ سے الٹا سوال کیا۔

میں نے چند لمحے کے توقف سے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ کے پاس ---- ایک فلسفۂ حیات ہے اس فلسفے کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آپ نے کچھ منتخب لوگوں کو یہاں جمع کیا ہے۔"

پردہ نشین نے پہلی مرتبہ ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بے حد نیلی، خوب صورت آنکھیں، پردے کو چیرتی ہوئی میری نگاہوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایک بار مجھے پھر جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ پردہ نشین کی آواز ابھری "تمہاری بات بہت حد تک درست ہے لیکن میرا کوئی فلسفۂ حیات نہیں ہے۔ یہ تو ایک سیدھی سادی بات ہے، اندھیرا اجالا، پریشانی اور بے فکری، اذیت اور راحت لازم و ملزوم ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم راحت حاصل کرنے کے لیے کون سی اذیت منتخب کرتے ہیں۔ ذہنی یا جسمانی ---- یا دونوں۔ یہاں کے لوگوں نے جسمانی اذیت منتخب کر رکھی ہے اور وہ بے حد خوش ہیں۔ وہ اپنے بازوؤں سے زمین کو چیر کر اس میں اپنا پسینہ بوتے ہیں اور رزق حاصل کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کسی کی مدد نہیں لیتے، کسی کا سہارا قبول نہیں کرتے۔ ان کی زندگی سہل اور ان کا رہن سہن سادہ ہے۔ وہ خوش ہیں اور دنیا میں جنت کا مزہ پا رہے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان میں سے کسی شخص کو یہاں سے لے جانا چاہو تو وہ اپنی جان دے دے گا لیکن واپس نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا گیا ہو۔"

"جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو" خوبرو پردہ نشین نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ ہپناٹزم یا "کمپیشن" کی کوئی قسم ہو۔ کوئی شخص اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے زور پر کچے ذہن کے نوعمر افراد کو اپنے جال میں پھانس رہا ہو اور پھر یہاں اس طرح ان کی برین واشنگ کی جاتی ہو کہ وہ اپنے ماضی کو، اپنے لواحقین اور اپنے ماحول کو بالکل فراموش کر دیتے ہوں۔"

"تم بہت سخت الفاظ استعمال کر رہے ہو لیکن میں برا نہیں مانوں گا کیونکہ تم لاعلم ہو۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ ان پہاڑوں کے اس گوشے میں زندگی حسین اور خوب صورت ہے اور تم اس کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔"

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میرے بولنے سے پہلے ہی روشنی "خیمے" کے اندر روشنی کم ہونا شروع ہو گئی۔ بالکل جیسے سورج آہستہ آہستہ بادلوں کے پیچھے چھپتا جا رہا ہو۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا لیکن مجھے کسی طرح کی حیرت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ یہ "روشنی کا غروب ہونا" میکانزم کا نتیجہ ہے۔ ذرا ہی دیر میں "خیمے" کے اندر نظر آنے والا منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ انتہائی خوبرو شخص یقیناً ابھی مسہری پر موجود تھا لیکن مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سرسراہٹ کے ساتھ پتھر کی چوکور سل اپنی جگہ سے ہٹی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وسیع و عریض ہال پر دوبارہ اجالا ہوا! سفید پوش لڑکی اپنی جھلک دکھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں اس جھلک کا مطلب بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے سانوس سے ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں اٹھا اور سفید پوش لڑکی کے پیچھے پیچھے اس چھوٹے بیضوی کمرے سے باہر نکل آیا۔

میرے بعد ایک مقامی نوجوان کی باری تھی۔ اس کے بعد ایک مقامی لڑکی نے اندر جانا تھا۔ پھر دو مقامی نوجوان تھے۔ ان کے بعد سائیں عالی کی باری آنا تھی۔ خاصا وقت تھا ہمارے پاس میرا دل چاہا یہاں گھوم پھر کر دیکھا جائے۔ میں زریں کو ساتھ لے کر اٹھا اور ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم نے اس صاف شفاف کھوہ میں اور کھوہ سے باہر بہت کچھ دیکھا۔ ایک انوکھا ماحول اور اس ماحول میں بسے ہوئے انوکھے لوگ ہمارے سامنے آئے۔ وہ سب کے سب سفید یا خیالے سلیٹی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ ان میں سے نوے فیصد توانا اور خوش شکل تھے، بلکہ خوش شکلی تو شاید سو فیصد تھی۔ لباس، غذا، رہائش غرض پورا رہن سہن بالکل سادہ تھا۔ میں نے اس کھوہ کو دور تک دیکھا۔ اس سے پہلے میں سردار سدوت کی بستی میں واقع وسیع و عریض سرنگ کو بھی دیکھ چکا تھا لیکن یہ کھوہ اپنی مثال آپ تھی۔ اسے انسانی ہاتھوں نے تراشا تھا اور بے مثال بنا دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت کمرے تھے جن میں روشنی اور ہوا کی آمدورفت کا انتظام تھا۔ ان کمروں کے دروازے منقش لکڑی کے تھے۔ بیشتر کمروں میں اونی نمدے بچھے ہوئے تھے اور بہترین صفائی نظر آتی تھی۔ یہاں موجود لوگوں کی کل تعداد ڈیڑھ سو سے زائد نہیں تھی، بیشتر افراد جوڑوں کی صورت میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض کے بچے بھی تھے۔ میں نے چند سفید پوش عورتوں کو دیکھا۔ وہ دستی چکی پر اناج پیس رہی تھیں۔ ایک جگہ کچھ لوگ ہاتھ کی کھڈیوں پر سفید سوتی اور اونی کپڑا بنتے نظر آئے۔ یقیناً یہاں مختصر پیمانے پر کھیتی باڑی اور باغبانی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ممکن تھا کہ بھیڑیں اور مرغیاں وغیرہ بھی پالی جاتی ہوں۔ یہ لوگ ایک ہی بڑے گھرانے کے افراد کی طرح مل جل کر کام کرتے نظر آئے۔ میں جوں جوں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے بارے میں تجسس بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ انہیں مزید قریب سے دیکھا جائے۔ ان کی ذہنی کیفیت اور ان کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کون سی قوت

ہے جس نے ان لوگوں کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہ انوکھا رہن سہن اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔

مگر ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں اور زریں گل اس وقت کھوہ کے دہانے پر کھڑے تھے اور رم جھم برستی بارش کو دیکھ رہے تھے جب منڈے ہوئے سر والا وہی سفید پوش شخص ہمارے پاس پہنچا جو ہماری رہنمائی کر کے ہمیں سانوس کی خلوت تک لے گیا تھا۔ اس نے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے واپس اس کشادہ جگہ پر پہنچ گئے جو بیضوی شکل میں تھی اور جہاں پیدا ہونے والی ہلکی سی نواز دیر تک گونجتی رہتی تھی۔ شام کے قریباً چار بجے تھے لیکن اس بستی کے رواج کے مطابق "رات کے کھانے" کا وقت ہو چکا تھا۔ ہمیں کھانا کھلایا گیا۔ گندم کی روٹی تھی، سبزی اور دال تھی۔ اس کے علاوہ پہاڑی چاول تھے جو تھوڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ یہ کھانا بہت سادہ تھا لیکن لطف آیا۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے مقامی لڑکے لڑکیوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی کھایا۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد ہم بلند و بالا پتھریلی دیوار کے سائے میں کھڑے تھے۔ یہی دیوار جس کی ایک جانب قبائلی بستی آباد تھی اور دوسری طرف ایک خواب ناک ماحول میں کچھ خوبرو سفید پوش ایک انوکھے ڈھنگ کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ مقدس سنہری روشنی کے دائرۂ اثر میں تھے۔ میں نے آج اپنی آنکھوں سے روشنی کو دیکھا تھا اور میرے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی دیکھا تھا۔ مجھے اپنے تاثرات تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن دوسروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں اس تجربے نے متاثر کیا ہے، وہ خوبرو پردہ نشین جو ایک نورانی ہالے میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے، کوئی عام شخص نہیں ہے۔ کوئی بات ہے اس کے اندر جو دیکھنے والی آنکھ کو کشش کرتی ہے۔ میں جب دیوار کے چوکور راستے سے گزر کر بستی میں واپس آ رہا تھا تو مجھے اپنے خیالات میں تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ بستی کے لوگ جو پہلے میری نگاہ میں قطعی جاہل اور توہم پرست تھے اب ایسے نہیں رہے تھے۔ بے شک ان کے عقائد اور رسم و رواج جاہلانہ تھے اور بعض باتوں کو وہ اپنے انداز میں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے مگر کچھ غیر معمولی حقائق بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ میں نے بستی کے لوگوں میں ان تھک محنت کا وصف بھی دیکھا تھا۔ یقیناً اس وصف کا سرچشمہ سانوس کا فلسفۂ حیات ہی تھا۔ یعنی شدید جسمانی مشقت اور اس کے بدلے خوشی کا حصول۔ سائیں عالی بھی مقدس روشنی کے دیدار کے بعد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جو ہر وقت جنات سے اشارے بازی کرتا رہتا تھا، بالکل خاموش تھا۔ بس گاہے گاہے اس کے ہونٹ بڑبڑانے والے انداز میں حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ سائیں کی یہ بات بار بار میرے ذہن میں گونج رہی تھی "کچھ نہ کچھ ہے شیخ محمد ---- زیادہ نہیں تو کم ہے ---- مگر ہے۔"

○☆○

منظر ہماری رہائش گاہ کے ایک کمرے کا تھا۔ زریں گل اور سورج میں صلح ہو رہی تھی۔ وہ دونوں آفت کے پرکالے تھے۔ صلح صفائی کی طرف کہاں آتے۔ سائیں عالی کا حکم تھا جس کی وجہ سے وہ "مذاکرات" کی طرف آئے تھے۔ سائیں عالی نے سورج کو حکم دیا تھا اور دوسری طرف زریں گل سے کہا تھا کہ وہ دونوں صلح کریں ورنہ شاہ جنات کا پرائیویٹ سیکرٹری جو پارٹ ٹائم جادوگر بھی ہے ان دونوں کو مکھی بنا کر گھوڑے کی لید پر بٹھا دے گا۔

سائیں عالی خود کمرے میں موجود نہیں تھا۔ صلح صفائی کرانے کے لیے میرے اور مترجم واحدی کے علاوہ ایک مقامی سیانا بھی کمرے میں تشریف فرما تھا۔ زریں گل کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ انگلی اٹھا کر بولا "بس جناب! ام زیادہ بات نہیں کرے گا۔ امارا بات بس یہی ہے کہ اس عورت نے ام کو بہن کا گالی دے رکھا ہے ---- ام پٹھان ہے۔ ام بدلہ ضرور لیتا ہے اور بالکل انصاف سے لیتا ہے۔ ام بھی اس عورت کو بہن کا گالی نکالے گا، پھر امارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا ---- بس۔"

مترجم واحدی بولا "لیکن تم خود بتا رہے ہو کہ ان کی کوئی بہن ہی نہیں ہے۔ اگر تم گالی نکالو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تو پھر چھوڑو اس بات کو مٹی ڈالو۔"

"یہی تو سارا بات ہے۔" زریں گل نے آنکھیں نچائیں "ام پکا پٹھان ہے۔ کچی گولیاں نہیں کھیلا ام نے۔ ام انتظار کرے گا کہ اس کا کوئی بہن دنیا میں آئے اور ام اس کو گالی نکال کر اپنا بدلہ لے۔"

"اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو؟"

"پھر ام اگلے جہان میں اپنا حساب چکائے گا لیکن چھوڑے گا نہیں اس کو۔"

"قبائلی رسم و رواج میں اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ یہ بی بی جان جنہوں نے تمہیں گالی دی ہے، کسی لڑکی کو اپنا منہ بولا بہن بنائے۔ تم اسے گالی دے کر اپنا بدلہ چکا لو۔ یہ طریقہ اچھا تو نہیں سمجھا جاتا لیکن جب کوئی اور ----"

"ام بھی اس کو بالکل اچھا نہیں سمجھتا۔" زریں نے تیزی سے بات کاٹی "جب ام کو پتا ہو گا کہ یہ لڑکی اس عورت کا اصل بہن نہیں ہے تو ام کو غصہ نہیں آئے گا اور جب غصہ نہیں آئے گا تو پھر گالی دینے کا فائدہ۔"

سورج سخت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اگر اسے سائیں عالی کے حکم کا خیال نہ ہوتا تو شاید پنجے نکال کر زریں پر جھپٹ پڑتی۔ وہ غصے کے گھونٹ بھر رہی تھی اور بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی۔

میں نے کہا "زریں گل! تم کئی مہینے سے اس "بہن کی گالی" کو لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔ یہ سوچو کہ اس گالی کے نتیجے میں تم دونوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں اس میں کیسی کیسی غلیظ گالیاں تم نے ایک دوسرے کو نکالی ہیں۔"

"اس لیے تو ام اس گالی کو بھول نہیں سکتا' جو کچھ ہوا ہے اسی گالی کی وجہ سے ہوا ہے....."

"اچھا اگر سروج تم سے معافی مانگ لے تو؟" میں نے رائے پیش کی۔

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا "پھر ام بھی اس سے معافی مانگ لے گا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" مترجم واحدی نے سراہا۔

"آپ غلط سمجھ رہا ہے۔" زریں نے فوراً ٹوکا "ام اس بات پر معافی مانگے گا کہ ام اس کو معاف نہیں کر سکتا۔"

سروج نے بھڑک کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے اس کی پسلیوں میں انگلی چبھو کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسی دوران میں سائیں عالی بھی دندناتا ہوا عقبی کمرے سے نکل آیا۔ اس کے گلے میں آویزاں گھنٹیاں جھنجنا رہی تھیں اور ہاتھ میں پکڑا عصا ٹھک ٹھک فرش سے ٹکرا رہا تھا۔

وہ آتے کے ساتھ ہی سروج پر گرجا "چل اٹھ کتیا! معافی مانگ بالکے سے۔"

سروج لرز کر کھڑی ہو گئی۔ سائیں نے اس کی پشت کے نرم ترین مقام پر زور سے لاٹھی رسید کی۔ وہ بڑبڑا کر زریں کے سامنے آگئی "مم..... مجھے چھما کر دو۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

سائیں دہاڑا "ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ اور یہ بھی بتا کہ کس لیے مانگ رہی ہے۔"

سروج کا چہرہ لال گلابی ہو رہا تھا۔ تاہم سائیں کا حکم ٹالنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی "مجھے معاف کر دو ..... زریں گل۔"

زریں گل کو سروج کی "توقیر" کا مزہ تو آرہا تھا۔ تاہم وہ بدستور منہ بنائے بیٹھا تھا۔ اس مرتبہ سائیں عالی نے زریں پر چڑھائی کی "چل لونڈے بالکے۔ معاف کر اس کو..... بول کہ میں نے تجھے معاف کیا۔"

زریں کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ خودداری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سائیں عالی نے اپنا موٹا ڈنڈا تان لیا۔ کڑک کر بولا "اوئے خبیث! تو نے سنا نہیں' میں کیا کہہ رہا ہوں۔ چل معاف کر دے..... معاف کر نہیں تو آیا ہے ڈنڈا سر پہ۔"

زریں گل کی حالت یہ تھی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ سائیں نے ایک ہاتھ سے زریں کا گلا دبوچ لیا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ دانت پیس کر بولا "کر معاف اس کو ..... جلدی کر..... ورنہ آیا ہے ڈنڈا سر پہ۔"

زریں کو اس آفت نے گڑبڑا دیا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ میں نے اپنی ہنسی بہ مشکل ضبط کی اور آنکھ سے کہا "یار کر دے معاف..... کیوں جان سے جاتا ہے۔"

سائیں عالی پر جنون طاری تھا اور وہ زریں پر اپنا دباؤ بڑھا رہا تھا۔ زریں نے بڑی مسکینی سے سائیں کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بات ماننے کو تیار ہے۔

سائیں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور بولا "چلو ایک بار میں معاف کر دو اسے۔" سائیں کا ڈنڈا بدستور ہوا میں اٹھا ہوا تھا۔ زریں کی نظریں ابھی تک ڈنڈے پر جمی تھیں۔ شاید اسے لگ رہا تھا کہ اگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈنڈے سے ہٹائی تو وہ کھٹاک سے اس کے سر پر آ لگے گا۔ وہ ہکلا کر بولا "سائیں صب! یہ ڈ..... ڈنڈا۔"

"چلو میں اسے نیچے کر لیتا ہوں"۔ سائیں نے کہا "معاف کرو اس کو۔ بلند آواز سے کہو کہ میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تمہیں معاف کیا۔"

زریں نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ام نے ڈنڈے کو..... ام..... امارا مطلب ہے کہ خدا حاضر ناظر جان کر تم کو معاف کیا۔"

سائیں عالی تحکم سے بولا "چلو اب یہ معاملہ ختم ہوا۔ دونوں اب میرے ساتھ چھت پر تو اور مل جل کر میرے سر سے جوئیں نکالو۔ چلو شاباش اٹھو۔" وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ سروج بار بار اپنا ہاتھ پیچھے کو لے جا رہی تھی۔ شاید پیٹھ سہلانا چاہتی تھی لیکن سب کے سامنے سہلا نہیں پا رہی تھی۔ سائیں نے کافی زور سے ڈنڈا رسید کیا تھا اسے۔ سائیں اس سے مخاطب ہو کر بولا "لیکن ابھی تھوڑی سی کسر باقی ہے۔ تمہیں زوبیں کا دل دکھانے کے لیے کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ تھوڑی سی خیر خیرات کرنی ہو گی۔" سروج نے سر تسلیم خم کر دیا۔

اچانک ایک مقامی عورت دوڑی دوڑی اندر آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے مترجم واحدی کے کان میں کچھ کہا۔ واحدی غور سے اس کی بات سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ پھر اس نے عورت کو واپس بھیج دیا۔ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

"آپ آئیں میرے ساتھ۔ میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

"کہاں جانا ہو گا؟"

"پاس ہی۔" واحدی نے جواب دیا۔

میں اس کے ساتھ اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلا اور گلی میں آگیا۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن یہ اس بستی کی شام تھی۔ روزہ کرنے والوں کے چہرے تھکے ماندے نظر آتے تھے "سانوس کے دیدار" والا واقعہ تقریباً چھ دن پہلے پیش آیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں آج اپنی رہائش گاہ سے نکلا تھا۔ ان چھ دنوں میں' میں نے آرام کیا تھا اور آرام کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ خوب صورت

مقامی لڑکی چشمہ بدستور میری تحویل میں تھی۔ وہ اب میری طرف سے بالکل مطمئن تھی اور "منظرے" سے بے پروا ہو کر یوں آرام سے میرے کمرے میں سو جاتی تھی جیسے اپنے اہل خانہ کے درمیان سو رہی ہو۔ میں اور واحدی آگے پیچھے چلتے ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اندر سے عورتوں کے بلند آواز میں بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی وقت کسی عورت کی ہائے ہائے بھی سنائی دے رہی تھی۔

مترجم واحدی اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے بھی اندر لے گیا۔ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک نوجوان مقامی لڑکی بستر پر پڑی تھی۔ وہ بری طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی حدت سے تمتما رہا تھا۔ تین چار عورتوں نے لڑکی کے پاؤں اور بازو تھام رکھے تھے۔ ایک عمر رسیدہ عورت گاہے گاہے ایک پتلی چھڑی سے اس کی پیشانی پر ہلکی سی ضرب لگاتی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے نائلہ کی کیفیت یاد آگئی۔ گلگت میں نور ازم مشنری کے گیسٹ ہاؤس میں' میں نے نائلہ کو بھی یونہی مضطرب اور بے چین دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر پارا ابل رہا ہو۔

مترجم واحدی نے سرگوشی کی "اس لڑکی کو پہچانتے ہیں آپ؟"

میں نے ذرا دھیان سے دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔ جو..... تین لڑکیاں ہمارے ساتھ سانوس کے دیدار کے لیے گئی تھیں یہ انہی میں سے ایک تھی۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ سانوس کے دیدار کے بعد یہ لڑکی مقدس دیوار کے پار جانے کے لیے منتخب ہو چکی ہے۔ میں نے ایک بار پھر غور سے لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہرگز اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اس کے ارد گرد موجود عورتوں کے چہروں پر جہاں غم و اندوہ کی پرچھائیاں تھیں وہاں ایک طرح کی مسرت بھی نظر آرہی تھی۔ بالکل جیسے دلہن کی رخصتی کے وقت اہلِ خانہ بیک وقت خوش ہوتے ہیں اور اشک بار بھی۔ میں بے پناہ حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ ایک دم لڑکی نے زور مارا اور خود کو چھڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ مقامی زبان میں تیزی سے کچھ بول رہی تھی۔ جو عورت لڑکی کے سر پر چھڑی کی ہلکی ہلکی ضربیں لگا رہی تھی اس نے لپک کر لڑکی کو بازوؤں سے جکڑ لیا۔ اس کا منہ' سر اور ماتھا چومنے لگی اور کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ لڑکی چند لمحوں کے لیے پر سکون نظر آئی لیکن جلد ہی وہ پھر مچلی اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چاک کر دیا۔ پھٹی ہوئی قمیص سے اس کا دودھیا بدن جھلکنے لگا۔ میں اور مترجم واحدی عورتوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر گھر سے باہر آگئے۔

اگلے روز میں آٹھ نو بجے کے قریب سو کر اٹھا۔ زریں گل میرے سرہانے ہی بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! تجھے معلوم ہے کیا ہوا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ زریں بولا "کچھ لوگ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک لڑکی کو لے کر پہاڑی کی طرف گیا ہے۔ وہ لڑکی خوب بنا سنورا ہوا تھا۔ بالکل مسرت شاہین کے مافق۔ اس کے ارد گرد ڈھول تاشے والے کو بجا رہے تھے۔ امارا خیال ہے کہ اس لڑکی کو اُدھر دیوار کے پاس لے جایا جائے گا۔ بالکل نائلہ بی بی کے مافق۔"

میں سمجھ گیا کہ زریں گل کس لڑکی کی بات کر رہا ہے۔ یہ وہی تھی جسے کل شام میں نے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دیکھا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ پُراسرار معاملہ ہے اور اس کا تعلق براہِ راست سانوس کی ذات سے ہے۔ مجھے ایک بار پھر سانوس کی انتہائی چمک دار نیلی آنکھیں یاد آگئیں۔ وہ آنکھیں بے حد دل نشین ہونے کے باوجود کسی تلوار کے مانند تھیں۔ ایسی تلوار جو ریشمی پردے کے درمیان تھی۔ اگر وہ ننگی ہوتی تو یقیناً آنکھوں کے راستے دماغ سے پار ہو جاتی۔ میں سوچنے لگا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جن لوگوں کو مقدس روشنی یعنی سانوس کا دیدار پردے کے بغیر ہوتا تھا وہ اس کی سحرکار آنکھوں کے اثر میں آجاتے تھے اور دھیرے دھیرے ایک بے خودی کی سی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ یہ بات غیر معمولی ضرور تھی لیکن بعید از قیاس نہیں تھی۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر زریں گل بولا "استاد صیب! ام کو لگتا ہے کہ ام منافق ہو گیا ہے۔ ام نے سروج سے صلح تو کر لیا ہے لیکن امارا دل اس کے متعلق صاف نہیں ہے۔ ام اپنے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہی نہیں۔ آپ نے وہ گانا نہیں سنا..... یہ دل دیوانہ ہے' دل تو دیوانہ ہے۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ تمہارے باپ سائیں عالی کو پتا چل گیا تو ابھی ڈنڈا لے کر آ جائے گا اور..... وہ ڈنڈے کے بڑے بڑے غلط استعمال بھی جانتا ہے۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور واحدی اندر آگیا۔ کہنے لگا "جناب۔ آج سے آپ کی ڈیوٹی شروع ہو رہی ہے۔ روزانہ صبح سویرے آپ نوجوانوں کے ایک دستے کو ٹریننگ دیا کریں گے۔"

میں نے کہا "سردار راٹل کے مطابق تو یہ کام تین چار دن پہلے شروع ہو جانا چاہیے تھا۔"

وہ بولا "بس جی ایک مسئلہ ہو گیا تھا۔ لڑکوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی' ان کا خیال تھا کہ ان کے پہلے استاد "جواناں" کی توہین کی گئی ہے اور اسے زبردستی ذمے داری سے فارغ کیا گیا ہے۔ وہ نئے استاد یعنی آپ سے تربیت لینے پر آمادہ نہیں تھے۔"

"پھر کیسے آمادہ ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

واحدی بولا "بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔ آپ کے بدخواہ نے ہی آپ کے راستے کی رکاوٹ دور کی ہے۔ میرا مطلب "جواناں" سے ہے۔ پتا نہیں اس کا دل کیسے پھرا ہے۔ کل اس نے سب لڑکوں کو جمع کیا تھا۔ وہ دیر تک انہیں سمجھاتا رہا کہ اسے نئے استاد سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ اس نے لڑکوں کو ہدایت کی بلکہ زور دیا کہ وہ نئے استاد کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔ جواناں ایک خود سر شخص

ہے۔ اس سے ایسے رویے کی توقع کسی کو بھی نہیں تھی۔"

واحدی نہیں جانتا تھا کہ جواناں کے رویے میں تبدیلی کیونکر رونما ہوئی ہے۔ وہ اس رات کے واقعات سے بے خبر تھا جب جواناں تیز دھار آلے سمیت میری خواب گاہ میں چھپا ہوا تھا اور اس نے میری "طاقت" کا مشاہدہ کیا تھا۔

مجھے اور زریں گل کو واحدی کے ساتھ ہی تربیت گاہ کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ ہماری رہائش گاہ سے تربیت گاہ کا فاصلہ قریباً دو فرلانگ تھا۔ یہ ایک کھلا احاطہ تھا اس میں ہموار گھاس تھی۔ کچھ درخت تھے جن سے رسے وغیرہ جھول رہے تھے۔ نشانہ بازی اور تلوار بازی کے لیے علیحدہ جگہ مخصوص تھی۔ میں واحدی کے ساتھ تربیت گاہ کی چاردیواری میں داخل ہوا تو سب سے پہلے "جواناں" نے ہی میرا استقبال کیا۔ گھاس کے قطعے پر قریباً ایک سو لڑکے تین قطاروں میں بیٹھے تھے۔ ان سب نے التی پالتی مار رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان سب نے مقامی زبان میں کوئی نعرہ لگایا اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ان سب نے مختلف کپڑے پہن رکھے تھے لیکن ان کے سروں پر ایک جیسی سرخ پگڑیاں تھیں۔ ان پگڑیوں سے انہوں نے سر کے علاوہ چہرے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔ سامنے دو تپائیوں پر بہت سے تیز دھار آلات پڑے تھے جن میں مختلف سائز کے برچھے (تیغے) نمایاں تھے۔

نوجوانوں کی عمریں سولہ اور بیس کے درمیان تھیں۔ ان کے جسم مضبوط، سینے چوڑے اور پیشانیاں روشن تھیں۔ ان کے جسم دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ چیتوں کی طرح پھرتیلے اور تیز رفتار ہیں۔ شاید واحدی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان نوجوانوں کو ایک خاص حملے کے لیے چُنا گیا ہے۔

میں نے پہلے روز نوجوانوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب کے سب "تیغہ" چلانے میں مہارت رکھتے تھے، تاہم ان میں سے کم و بیش پچاس ایسے تھے جنہیں مزید تربیت کی ضرورت تھی۔ انہیں تکنیک کا پتا تو تھا لیکن وہ اسے مہارت سے استعمال نہیں کر پاتے تھے۔ حملے سے زیادہ ان کا دفاع کمزور تھا۔ وہ جب حملہ کرتے تھے تو یہ بات ذہن میں نہیں رکھتے تھے کہ ان کا وار خالی بھی جا سکتا تھا۔ وار خالی جانے کی صورت میں وہ اپنا توازن کھو دیتے تھے اور مدمقابل تیغ زن (تیغہ زن) کی زد میں آجاتے تھے۔ ایسے دو چار لڑکوں سے میں نے خود بھی فائٹ کی اور انہیں ابتدائی باتیں بتائیں۔ زبان کا مسئلہ درپیش تھا، تاہم واحدی کی موجودگی میں اس مسئلے نے زیادہ شدت اختیار نہیں کی۔ اشاروں کنایوں سے بھی کسی حد تک ابلاغ ہو جاتا تھا۔

پہلے روز ہی لڑکے مجھ سے کافی متاثر ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی ان سے متاثر ہوا۔ وہ خاصے سخت جان اور پرجوش تھے۔ اہم بات یہ تھی کہ بستی کے دیگر افراد کی طرح ان میں سخت کشی کی صفت موجود تھی۔

میں اور زریں گل دوپہر کے وقت تربیت گاہ سے واپس آئے۔ زریں گل بولا "استاد صیب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ امہ کو بھی ان لڑکوں میں شامل کر لے اور ان کے ساتھ ساتھ امارا ٹریننگ مریننگ بھی ہو جائے۔"

میں نے کہا "یار! ان لڑکوں کے مقابلے میں تو تم بڈھے لگو ہو۔ وہ تم سے تیرہ چودہ سال چھوٹے ہیں۔ ویسے بھی تم موٹے ہو چکے ہو۔ اب کم کام کے نہیں رہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! بڈھا تو ام ہرگز نہیں ہے۔ ام تو ساری رات جاگتا ہے۔"

"بڈھے بھی تو جاگتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ان کا جاگنا اور ہوتا ہے۔ وہ کھانسی سے جاگتا ہے، ام امارے اندر کا حرارت جگاتا ہے۔ باقی جہاں تک امارے موٹا ہونے کی بات ہے وہ ام بھی مانتا ہے لیکن یہ سراسر قصور امارا یادداشت کا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"ام جب بھی کھانا کھانے بیٹھتا ہے اپنے دل میں فیصلہ کرتا ہے کہ ام اتنے لقمے لے گا۔ اس سے زیادہ نہیں لے گا مثلاً ام نے فیصلہ کیا کہ پندرہ لقمے لے گا لیکن بیچ میں کہیں ام گنتی بھول جاتا ہے اور پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایک بار ام نے بہت بڑا قسم کھایا تھا کہ ام دن میں صرف دو مرتبہ کھانا کھایا کرے گا لیکن پانچ چھ روز بعد ام بھول گیا کہ ام نے کون سا قسم کھایا تھا۔ پھر جب قسم ہی بھول گیا تو اسے نبھانے سے فائدہ۔"

میں نے کہا "بس زریں گل، تیرا کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو اسی طرح کھا کھا کر موٹا ہوتا رہے گا..... تاج کو ضرورت ہی نہیں پڑے گی تیرے اور کلثوم کے بیچ میں آنے کی۔ تیرا موٹاپا ہی تم دونوں کے بیچ میں آجائے گا۔"

کلثوم کے ذکر پر زریں گل ایک دم اداس ہو گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور منہ لٹکا لیا۔ اسی دوران میں جشنہ ہمارے لیے کھانا لے آئی۔ کھانا خادمائیں تیار کرتی تھیں لیکن پیش بیبہ جشنہ کرتی تھیں۔ وہ میرے رویے سے بہت خوش تھی۔ کم سن ہونے کے علاوہ وہ معصوم بھی بہت تھی۔ ذرا سی بات پر خوش ہو جاتی تھی اور تالی بجا اٹھتی تھی۔ وہ ایک غرفہ کھل چکی تھی، ابھی اسے جوانی کی دھوپ میں مسکرانا تھا، شباب کی ہواؤں میں جھومنا تھا، اسے محبت کی شبنم نے بوسے دینے تھے لیکن قبیلے کے فرسودہ رسم و رواج نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک غیر مرد کے حوالے کر دیا تھا۔ پتا نہیں اس سے پہلے کتنی معصوم جشنائیں ایسے ہی رواجوں کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔

کھانا گرم اور مزیدار تھا۔ عالم قریشی کی طرح زریں گل بھی کھانا دیکھ کر نیم دیوانہ سا ہو جاتا تھا اور غم کے موقع پر تو زریں کو اتنی بھوک لگتی تھی کہ حشر ہو جاتا تھا۔ اس نے خود بتایا تھا کہ اپنے

والد کی موت پر وہ اتنا دکھی ہوا کہ سیر پلاؤ کی دیگ اکیلا ہی چٹ کر گیا تھا اور دور دراز سے افسوس کے لیے آنے والے بھوکے رہ گئے تھے۔ اس وقت بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ کلثوم کے ذکر نے زریں کو آزردہ کر دیا تھا۔ فرط غم سے زریں کی رال ٹپکنے لگی۔ وہ بڑے دکھ سے قیمے والے پراٹھے زہر مار کرنے لگا اور پھر کرتا چلا گیا، واقعی کلثوم کے لیے اس کے دل میں بڑی جگہ تھی۔

شام کو حسب معمول میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شروع میں میں نے بہت کوشش کی تھی کہ جشنہ مسہری پر لیٹ جایا کرے اور میں نیچے اونی نمدے پر بستر لگا لیا کروں لیکن وہ کسی صورت نہیں مانی تھی۔ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے لگتی تھی۔ اسی کی ضد تھی کہ وہ نیچے نمدے پر سوئے گی جب کہ میں اوپر مسہری پر لیٹوں۔ آج بھی وہ میرے قریب ہی نمدے پر بستر بچھائے پڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ افسردہ اور گم صم ہے۔ ابھی کمرے میں اجالا موجود تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اس کی سرخ آنکھیں متورم تھیں۔ میں نے اشاروں میں پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ پہلے تو مسلسل انکار میں سر ہلاتی رہی لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو اشاروں کنایوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ آدھی بات تو میری سمجھ میں پہلے ہی آچکی تھی کہ وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ اس لڑکے نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی ہے اور اس کے رخسار پر زخم کا چھوٹا سا گول نشان ہے۔ یہ ساری باتیں جشنہ نے مجھے اشاروں کنایوں میں اور بہت شرما شرما کر بتائی تھیں۔ آج وہ بتا رہی تھی کہ وہ لڑکا اس سے بے حد..... بے حد ناراض ہے اور کہتا ہے کہ وہ خودکشی کر لے گا یا یہاں سے کہیں بہت دور چلا جائے گا۔

میں نے پوچھا "کیوں؟"

جشنہ نے پہلے اپنے سینے پر انگلی رکھی پھر میرے سینے پر رکھی پھر دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی کو آپس میں گرہ دے کر کھینچا۔ اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ لڑکے کی ناراضگی کا سبب یہ غلط فہمی ہے کہ میں اور جشنہ "ایک" ہو چکے ہیں۔

اس قسم کے بہت سے اشارے کر کے جشنہ نے مجھے سمجھایا کہ لڑکا کسی طور اس کی بات پر یقین نہیں کر رہا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ غیر مرد کے پاس رہ کر بے آبرو ہو چکی ہے۔ اس کا جسم ایک اجنبی کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں رہی کہ وہ اب بھی ایک کنواری لڑکی ہے۔ بالکل جیسے وہ پہلے تھی۔

جشنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور سمجھایا کہ میں اس لڑکے کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا..... ہم کافی دیر تک اشاروں کی زبان میں بات کرتے رہے یہاں تک کہ کمرے میں پھیلنے والی تاریکی نے ہمیں گونگا کر دیا۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مترجم واحدی پھر ہماری قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ کھانا وغیرہ کھا کر ہم تربیت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں کئی دن سے مترجم واحدی کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ان نوجوانوں کو کس مقصد کے لیے تیغہ چلانے کی تربیت دی جاری ہے اور مارچ کے پہلے دس دن کا کیا چکر ہے۔

لیکن واحدی بھی ایک کائیاں تھا۔ چکنے گھڑے کی طرح اس پر ایک بوند نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ ہر بار بڑی صفائی سے بات بدل جاتا تھا۔ تربیت گاہ میں چاق و چوبند لڑکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے چہروں کا دبا دبا جوش ظاہر کرتا تھا کہ ان میں کچھ سیکھنے اور کر دکھانے کی زبردست خواہش موجود ہے۔ کل کی طرح ایک بار پھر تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے لڑکوں کو دو گروپس میں تقسیم کیا۔ آپس میں ان کی "فائٹ" کرائی اور ان کی خامیوں کی نشاندہی کی۔ پھر میں نے خود جواناں سے فائٹ کی۔ لڑکوں نے اس فائٹ کو بڑی دلچسپی و توجہ سے دیکھا اور سراہا۔ اس قسم کی تمام فائٹس لکڑی کے "تیغوں" سے ہوتی تھیں۔

لڑائی کے دوران میں ہی میری نظر ایک داڑھی والے لڑکے پر پڑی۔ وہ سب سے پچھلی قطار میں کھڑا تھا اور بہت پژمردہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور چونک گیا۔ اس کے رخسار پر زخم کا چھوٹا سا گول نشان تھا جیسے سگریٹ سے داغ دیا گیا ہو۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ لڑکا ہے جس کا ذکر رات جشنہ نے کیا تھا۔ وہ میری توقع کے خلاف کافی اونچا لمبا تھا۔ عمر بیس سال سے کم تھی۔ جواناں سے لڑائی کے بعد میں لڑکے کے قریب چلا گیا۔ وہ ایک دم بیمار نظر آرہا تھا۔ میں نے مترجم واحدی کے ذریعے لڑکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نوشاب۔" مختصر جواب ملا۔

"تمہارے والد کا نام؟"

"اپنے والد کا نام مجھے معلوم نہیں۔" زہرخند لہجے میں جواب ملا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

نوشاب نے اس سوال کا جواب نہیں دیا اور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "اچھا تم اتنے گم صم کیوں ہو؟"

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے جی۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"اگر تم چھٹی کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے کہا اور سر جھکا کر قطار سے باہر نکل گیا۔

دوسرے لڑکوں کے برعکس اس میں کوئی امنگ ترنگ نظر نہیں آرہی تھی..... ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ یہ آواز تربیت گاہ کی شمالی جانب سے آئی تھی۔ ایک دم شور و غوغا سا پیدا ہوا تھا اور یوں لگا تھا جیسے بہت سے افراد ہراساں ہو کر بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ چند ہی لمحے بعد اور کے

کی فائر ہوئے اور تربیت گاہ کے اندر بھی بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں نے حرجم راعدی کی طرف دیکھا، وہ خود بھی حیران تھا۔ مجھے اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آیا۔ اچانک خود کار رائفل کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ میں نے قریب کھڑے دو لڑکوں کو تڑپ کر زمین پر گرتے دیکھا۔ میں نے جست کی اور خود کو لکڑیوں کے ایک بڑے گٹھے کے عقب میں گرایا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ درجنوں گھڑ سوار جن کے ہاتھوں میں چمکیلے کلہاڑے اور آتشیں ہتھیار تھے، برق رفتاری سے تربیت گاہ میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا انداز نہایت خطرناک تھا۔ ان کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ان کے کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے اور جسموں پر غلیظ لباس تھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے ذہن میں فوراً سردار سدورت کی وادی کا خیال آیا۔ ایسے جانور نما لوگ میں نے سب سے پہلے اسی جگہ دیکھے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑ سواروں نے پوری وحشت کے ساتھ تربیت گاہ کے لڑکوں پر حملہ کر دیا۔ ان کی رائفلیں گرجیں، خوف ناک چمک والے کلہاڑے بلند ہوئے اور ہر طرف کشت و خون شروع ہو گیا۔ میں نے اپنا طاقتور پسٹل نکال لیا اور گھڑ سواروں پر فائر کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر میں نے کم از کم چار گھڑ سواروں کو نشانہ بنایا۔ پھر اچانک دو گرانڈیل حملہ آور مجھ سے لپٹ گئے۔ ان کے جسموں سے اٹھنے والی بو نے دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ پسٹل میں نے پھینک دیا کیونکہ وہ خالی ہو چکا تھا۔ میرا ہاتھ پنڈلی کے خنجر تک پہنچا۔ اگلے ہی لمحے ایک حملہ آور نے مجھ پر وزنی کلہاڑا چلایا۔ میں نے جھکائی دی۔ کلہاڑے کا رستہ میرے کندھے سے ٹکرا کر گزرا۔ میں نے رامپوری خنجر حملہ آور کے پیٹ میں گھسایا۔ خنجر کی دھار اوپر کی طرف تھی۔ میں نے ایک شدید جھٹکے سے اسے سینے تک چیر ڈالا۔

تربیت گاہ کے لڑکے اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق حملہ آوروں سے بھڑ گئے تھے لیکن خونخوار گھڑ سواروں کے سامنے ان کی ایک نہیں چل رہی تھی۔ گھڑ سواروں کے خوف ناک کلہاڑے ان کو زبردست اور ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے۔ دو نوخیز لڑکے میرے سامنے کلہاڑوں سے شدید زخمی ہو کر پتھریلی زمین پر گرے اور گھوڑوں کے سموں تلے بری طرح روندے گئے۔ اتنے گھڑ سوار نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ وہ تربیت گاہ کے وسیع احاطے میں سیلابی ریلے کی طرح داخل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے زریں گل کی چیخ سنائی دی "استاد صیب!" میں نے مڑ کر دیکھا اور [illegible] رہ گیا۔ دو حملہ آور برق رفتاری سے میری طرف دوڑے آ رہے تھے۔ ایک کلہاڑا بردار کو تو راستے میں ہی زریں گل نے دبوچ لیا۔ دوسرے کو میں نے سر سے اچھال کر سنگلاخ زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل جس پر باقاعدہ سنگین چڑھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے رائفل سنبھال لی۔ اس رائفل کی پہلی گولی نے اس شخص کی زندگی کا چراغ گل کیا جو اس رائفل کا مالک تھا۔ مگر چار گولیوں نے حملہ آوروں کو نقصان پہنچایا لیکن یہ نقصان ایسا ہی تھا جیسے کسی مشتعل جنگلی بھینسے کو چاقو سے زخم لگایا جائے۔ حملہ آور گھڑ سوار تربیت گاہ میں چاروں طرف موت بن کر لپک رہے تھے۔ لڑکوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ان سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ اتنا فاناً ہوا تھا کہ مزاحمت کی راہ ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ رائفل کی گولیاں ختم ہو گئیں تو میں نے اسے لاٹھی کی طرح نال کی طرف سے پکڑا اور گھما کر ایک گھڑ سوار کے منہ پر دے مارا۔ وہ الٹ کر گھاس پر گرا لیکن پھر پیچھے سے مجھے ایک تیز رفتار گھوڑے کا دھکا لگا اور میں لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ میں اوندھے منہ گرا تھا۔ میرے اوپر سے سیون ایم ایم اور ٹرپل ٹو کی کئی گولیاں سنسناتی ہوئی گزریں۔ ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ اسی کہرام میں، میں نے ایک گھڑ سوار کی جھلک دیکھی اور پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ یہ میری جانی پہچانی صورت تھی، میں سیکڑوں ہزاروں میں اسے پہچان سکتا تھا۔ صفدر تھا۔ میرا یار، میرا غم گسار، میرے ہر دکھ سکھ کا ساتھی۔

میں نے چیخ کر کہا "صفدر۔"

میری آواز تربیت گاہ کے خوف ناک ہنگامے میں دب کر رہ گئی۔ میں صفدر کے پیچھے لپکا "صفدر۔۔۔ صفدر۔" میں سینے کی پوری قوت سے اسے پکار رہا تھا لیکن وہاں تو حشر برپا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر طرف بارود اور خون کی بو تھی اور موت کی دہاڑیں تھیں۔ اچانک ایک لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کا سر کلہاڑے کے زخم سے لہولہان ہو رہا تھا۔ خونخوار حملہ آور اس کے تعاقب میں تھے۔ میں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر مخالف سمت میں بھاگا۔ بپھرے ہوئے کلہاڑا بردار ہمارے پیچھے آئے۔ میں لڑکے کو اندھا دھند کھینچتا ہوا تربیت گاہ کے کمرے میں گھس گیا۔ یہاں دیواروں پر بہت سے برچھے (نیزے) آویزاں تھے۔ میں نے ایک نیزہ کھینچا اور پلٹ کر اس حملہ آور پر کھینچ مارا جو دروازے کے عین سامنے پہنچ چکا تھا۔ نیزہ دور تک اس کے سینے میں گھس گیا۔ وہ دروازے کے سامنے گرا اور تڑپنے لگا۔ دوسرے حملہ آور نے ساتھی کا حشر دیکھ کر اندر گھسنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک درخت کی اوٹ لے کر کھڑا ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب میں نے محسوس کیا کہ حملہ آور واپس جا رہے ہیں۔ وہ جس طوفانی انداز میں اندر داخل ہوئے تھے اسی طوفانی انداز میں باہر نکل رہے تھے لیکن اپنے پیچھے وہ کئی چھوٹی لاشوں اور دم توڑتے زخمیوں کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑ گئے تھے۔ میں نے کمرے کی دیوار سے ایک دو نالی رائفل اتاری اور حملہ آوروں پر چند فائر کیے۔ کافی فاصلہ تھا، یہ فائر حملہ آوروں کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ چند ہی لمحے میں تربیت گاہ کا احاطہ حملہ آوروں سے خالی تھا۔

پوری بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ حملہ آوروں کے باہر نکلتے ہی

پندرہ بیس مقامی گھڑ سوار احاطے میں داخل ہو گئے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنے میں کوتاہ قد سردار رانل بھی گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ سیاہ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ آتشیں ہتھیاروں سے مسلح آٹھ دس مزید افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ سردار رانل نے چیخ کر کچھ کہا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے گھڑ سواروں کے ساتھ حملہ آوروں کا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ تیزی سے باہر کی طرف لپکے تو میں نے بھی ایک خالی گھوڑے کی لگام تھامی اور اس پر سوار ہو گیا۔

تربیت گاہ بستی کے بالکل آخری سرے پر واقع تھی۔ اس سے آگے ایک پہاڑی راستہ تھا جو بتدریج نشیب میں اترتا چلا جاتا تھا۔ گھوڑے آگے پیچھے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ میں سب سے پیچھے تھا۔ سردار رانل کا مشکی گھوڑا سب سے آگے تھا۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکا ہوا کسی بچے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ایک نہایت مشاق گھڑ سوار ہے۔ اچانک ہم سب کو رکنا پڑا۔ آگے راستہ بند تھا۔ برف کے کئی بڑے بڑے تودے گرے تھے اور انہوں نے راستہ قریباً مسدود کر دیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ حملہ آور ان تودوں کو کیسے عبور کر گئے۔ یقیناً یہ تودے ان کے گزرنے کے بعد گرے تھے۔۔۔ بلکہ شاید گرائے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ سارا کام بڑی منصوبہ بندی کے تحت ہوا تھا۔ حملہ آوروں کا تعاقب کرنے والے چکرا کر رہ گئے تھے۔ سردار رانل نے اپنا گھوڑا راستے سے اتارا اور ڈھلوان کی جھاڑیوں میں گھسا دیا۔ دوسرے سواروں نے بھی سردار کی تقلید کی۔ یہ راستہ سخت ناہموار اور دشوار گزار تھا۔ گھڑ سوار الجھ کر رہ گئے۔ قریباً دس پندرہ منٹ کی تاخیر سے وہ دوبارہ راستے پر چڑھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک حملہ آور بہت دور جا چکے تھے۔ فاصلے تک ان کا نام نشان نظر نہیں آتا تھا۔

دو تین میل آگے جانے کے بعد سردار رانل اپنے ساتھیوں سمیت بستی کی طرف واپس آ گیا۔ میرے ذہن میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی سپنا دیکھا ہے اور اس سپنے میں مجھے صفدر کی شکل نظر آئی ہے۔ یہی منظر بار بار میرے ذہن میں کوند رہا تھا اور ہر بار میری حیرت دوگنا ہو جاتی تھی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ صفدر سے اس طرح ملاقات ہو گی۔۔۔ صفدر کو دیکھنے کے بعد ذہن میں ایک دریچہ سا کھل گیا تھا اور اس دریچے میں سے حالات کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آنے لگی تھی۔ سب سے پہلا انکشاف تو مجھ پر یہ ہوا تھا کہ سردار سدورت کی بھیانک وادی یہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ حملہ آوروں کے غلیظ حلیے اور ان کے چمکیلے کلہاڑے دیکھ کر ہی میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا، پھر صفدر کی جھلک دیکھنے کے بعد اس امر میں شک کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہ حملہ آور سردار سدورت کی وادی سے ہی آئے ہیں۔ ایک دوسری حقیقت جو مجھ پر عیاں ہوئی وہ یہ تھی کہ بستی میں جس حملے کی تباہیاں ہو رہی ہیں اس کا تعلق سردار سدورت کی وادی سے ہے۔ شاید سردار سدورت اور اس کے حواریوں کو اس حملے کی خبر پہلے سے ہو گئی تھی اور انہوں نے "شب خون" مار کر اپنے دشمنوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے تربیت گاہ کا منظر دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ یقیناً وہاں حشر برپا ہو چکا تھا۔ ہم گھوڑے دوڑاتے تربیت گاہ میں پہنچے تو وہی منظر نظر آیا جس کی توقع تھی۔ تربیت گاہ کے اندر کہرام مچا ہوا تھا۔ عورتوں کے بین، جوانوں کی چیخ و پکار اور زخمیوں کی دہائیں، ایک قیامت بپا تھی۔ وہ سب نوجوان تھے، ان میں سے کئی ایک کی مسیں بھی ابھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں۔۔۔ میدان میں بکھری ہوئی ان کی لاشیں حسرت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ کسی کا سر دو نیم تھا، کسی کی گردن خون اگل رہی تھی، کسی کو خود کار رائفل کی گولیوں نے چھلنی کیا تھا۔ یہ سب کے سب ابھی تھوڑی دیر پہلے زندہ اور پرعزم تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور سینے زندگی کی حرارت سے معمور تھے۔ وہ کچھ بننا چاہتے تھے اور کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے لیکن اب وہ خاک و خون میں لت پت بے نور آنکھوں سے خلاؤں میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی مائیں اور بہنیں ان سے لپٹ کر بین کر رہی تھیں اور ان کے نوحے زمین کا سینہ دہلا رہے تھے۔ یہ مائیں نہ "تات" برادری سے تعلق رکھتی تھیں اور نہ "رازی" سے۔ یہ صرف مائیں تھیں۔

میں نے سردار رانل کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے۔ وہ میدان کے بیچوں بیچ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ جس مقامی لڑکے کی میں نے جان بچائی تھی وہ کسی طرف سے بھاگتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کا سینہ ہچکیوں کی شدت سے دہل رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر خود سے جدا کیا اور اشاروں میں سمجھایا کہ وہ جائے اور اپنے زخمی سر کی مرہم پٹی کرائے۔ میری نگاہیں زریں گل کو تلاش کر رہی تھیں۔ جلد ہی مجھے وہ نظر آ گیا۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا سب کچھ خون سے تر تھا۔۔۔ لیکن یہ اس کا اپنا خون نہیں تھا۔ اس نے کسی شدید زخمی کو اٹھا کر گھوڑا گاڑی تک پہنچایا تھا۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولا "یہ کیا ہو گیا استاد صیب! اتنا زیادہ جانی نقصان ہو گیا اور سب کا سب جوان لڑکا۔ امارا تو سینہ پھٹا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں تو خود کچھ نہیں آ رہا۔"

وہ بولا "ام کو شک ہو رہا ہے استاد صیب کہ سردار سدورت والا وادی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور یہ جو حملہ آور تھا اسی علاقے سے آیا تھا۔ ام کو تو کچھ بندوں کا شکل جانا پہچانا لگ رہا تھا۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

اتنے میں ہمارا حرجم راعدی بھی ہانپتا کانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے بازو پر کلہاڑے کا زخم آیا تھا اور خون روکنے کے لیے اس نے ایک کپڑا بازو پر باندھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

آنسو تھے۔ وہ اشک بار لہجے میں بولا "سب کچھ ختم ہو گیا جناب، سب کچھ برباد ہو گیا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہیں۔" وہ سرتاپا کانپ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "واحدی! کیا یہی لوگ ہیں جن سے لڑنے کی تیاری تم لوگ کر رہے تھے؟"

اس نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا "ہاں یہی لوگ ہیں جنہوں نے اس بستی کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ یہ خونی قاتل ہیں۔ ان کا پیشہ ہی مارنا، کاٹنا اور لوٹنا ہے۔ ہم ان لوگوں سے مرنے کی حد تک تنگ آچکے ہیں اور آج۔۔۔ آج جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد تو یہ فیصلہ ہو کر رہے گا۔۔۔ یا یہ رہیں گے یا ہم۔"

گردوپیش کے مناظر واقعی رقت آمیز تھے۔ اس طوفانی ہلّے میں صرف چار پانچ منٹ کے اندر کم و بیش ستر اسی نوجوان موقع پر مارے گئے تھے اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ حملہ آوروں کی صرف پانچ لاشیں گری تھیں۔ یقیناً ان کے چند ساتھی زخمی بھی ہوئے ہوں گے لیکن وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ سارا کام بڑی پلاننگ سے ہوا تھا۔ یقیناً حملہ آوروں نے حملے سے پہلے ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ تربیت گاہ کس وقت کھلتی ہے۔۔۔ وہاں حفاظت کے انتظامات کیا ہیں اور ان انتظامات کو کیسے ناکام بنایا جاسکتا ہے۔ انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کارروائی کے بعد ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے انہوں نے راستہ مسدود کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ان کے گھڑسوار راستے کے کنارے بلندی پر چھپے ہوئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے پتھر اور برف کے تودے لڑھکا کر راستہ بند کر دیا تھا۔

○☆○

بستی کی رات بے حد ماتمی تھی۔ مرنے والوں کی لاشیں مقامی دستور کے مطابق لکڑی کے تابوتوں میں رکھ کر دفن کی جاچکی تھیں۔ مرگ والے گھروں سے گاہے گاہے رونے پیٹنے کی آوازیں ابھی تک بلند ہو رہی تھیں۔ کبھی کسی عورت کا بلکتا ہوا نوحہ تاریکی کا سینہ چیر جاتا، کبھی کسی ماں کی ہچکیاں ماتم کناں فضا کو اور سوگوار کر دیتیں۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں زریں گل کے کمرے میں موجود تھا۔ ہم دونوں اونی لبادے پر نیم دراز تھے اور خاموش تھے۔ بڑی دیر بعد زریں گل کی گمبھیر آواز ابھری "کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ صدر صیب ہی تھے؟"

"سو فیصد" میں نے کہا۔

"ٹھیک۔۔۔ لیکن صدر صیب نے ایسا کیوں کیا؟"

"میرے خیال میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے حملہ آور جتھے میں شریک نہیں ہوا ہو گا۔ وہ تو ان لوگوں کے پاس یرغمال ہے۔ وہ اس سے جو کام لینا چاہیں، لے سکتے ہیں۔"

زریں گل نے پُرسوچ لہجے میں کہا "کہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں تھا کہ اس جتھے کا قیادت صدر صیب ہی کر رہا ہو؟"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ہو اس لیے سکتا ہے کہ صفدر کو وادیِ راخان میں بہت اہمیت حاصل ہے (راخان اس خونی وادی کا نام تھا جسے ہم سردار سدورت کی وادی کہتے تھے ہمیں وادی کا اصل نام حرتجم واحدی سے صرف ایک دن پہلے معلوم ہوا تھا۔) صفدر وادی میں وہی کام کر رہا ہے جو ہم نے اس بستی میں شروع کیا ہے۔ وہ وہاں قبائلی لشکروں کو جدید طریقے سے لڑائی بھڑائی کی تربیت دے رہا ہے۔ انہیں دستی لڑائی کے اسرار و رموز سکھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس حوالے سے جتھے کا سربراہ بن کر یہاں آیا ہو۔۔۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سربراہ نہ ہو۔ وادیِ راخان میں ایک سے بڑھ کر ایک جنگجو بھرا پڑا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو یہاں کی اونچ نیچ سے واقف بھی ہیں۔"

زریں گل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بہرحال جو کچھ بھی ہوا ہے بہت غلط ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو، جوانان بھی شدید زخمی ہوا ہے۔ کلہاڑے کے وار سے اس کی گردن کی ہڈی تک کٹ گئی ہے۔ وہ بستی کے شفاخانے میں ہے۔۔۔ معلوم نہیں بچتا بھی ہے یا نہیں۔"

زریں گل کی اطلاع نے مجھے مزید افسردہ کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر بے ڈھنگی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم سسکیاں بھری تاریکی میں نابیناؤں کی طرح پلکیں جھپک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد زریں گل کی پُراندیشہ آواز ابھری "اب کیا ہوگا استاد صیب! بستی والے تو بے حد طیش میں نظر آتے ہیں۔ آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شاید کل ہی وادی پر حملہ کر دیں۔ ام کو سخت خون خرابے کا بو آرہا ہے۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد زریں نے کہا "استاد صیب! اگر ایسا ہوا تو صدر صیب کا کیا ہوگا اور جون جاوئل۔۔۔ اور کلثوم۔۔۔" وہ چند لمحے میرے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر خود ہی بولا۔

"کسی طرح یہ خون خرابا ٹل نہیں سکتا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی ٹھیک طرح سے معلوم نہیں کہ ان لوگوں میں جھگڑا کیا ہے؟"

"واحدی نے کیا بتایا ہے؟"

"بس یہی کہ وہ لوگ اکثر یہاں آکر لوٹ مار کرتے ہیں۔ پچھلے مہینوں سے یہ واقعات کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔"

زریں گل بولا "خو استاد صیب! کہیں ایسا تو نہیں کہ سردار سدورت نے ام سے جو وعدہ کیا تھا اس وعدے کی وجہ سے اس بستی کا شامت آگیا ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ بولا "دیکھیں ناجی۔ سردار سدورت نے وعدہ کیا تھا کہ اب وادی کا لوگ لوٹ مار نہیں کرے گا۔ کوہ پیما اور سیاح وغیرہ ان کی کارروائیوں سے بالکل محفوظ رہے گا۔ ظاہر ہے جب یہ کارروائیاں ختم ہوئی ہوں گی تو بستی کے لوگ کی ضروریات کی چیزیں حاصل کرنے میں بہت دشواری پیش آیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں وادی کے لوگ نے اس بستی کا رخ کر لیا ہو اور

یہاں لوٹ مار کی وارداتیں زیادہ ہونے لگا ہو۔"

"میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میرے خیال میں اب یہ بات کھل گئی ہے کہ بستی میں جس "حملے" کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ حملہ سردار سدورت کی وادی پر ہی ہونا تھا لیکن یہاں ایک اہم سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ وہ وادی قدرتی طور پر کتنی محفوظ ہے۔ کسی حملہ آور کے لیے طاقت کے زور پر وادی میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔"

"یہ بات تو ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کوئی طریقہ سوچ رکھا ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وادی میں ہی کچھ لوگ ان لوگوں سے مل گیا ہو۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ زریں گل توقف سے بولا "سردار سدورت آپ سے دوستی کا دم بھرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ اس سے ملیں تو اس معاملے کو سلجھانے کی کوئی صورت نکل آئے۔۔۔"

اچانک ہی قریبی کمرے سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ میں اور زریں گل چونک گئے۔ یہ آواز میری خواب گاہ سے آرہی تھی اور یقیناً چشمہ کی تھی۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ میں فوراً خواب گاہ میں پہنچا۔ نرم و نازک چشمہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر رکھا تھا۔ میں نے کمرا اندر سے بند کیا۔ کھڑکی سے اندر آنے والی چاندنی نے کمرے کا ایک گوشہ روشن کر رکھا تھا۔ میں چشمہ کو اس گوشے میں لے آیا اور اشاروں کنایوں میں اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ وہ اب اشاروں کنایوں کو بہتر طور پر سمجھنے لگی تھی اور اس کے اشارے کنایے بھی میری سمجھ میں آنے لگے تھے۔ اس نے سسکیاں لیتے اور آنسو پونچھتے ہوئے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اپنے محبوب نوشاب کی طرف سے بے حد پریشان تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ سخت مایوسی کے عالم میں کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی جان لے لے۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی اور یقین دلایا کہ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔۔۔ وہ میری بات سمجھ رہی تھی لیکن اس کا رونا کسی طور بند نہیں ہو رہا تھا۔

میں اس وقت حرتجم واحدی کے گھر پہنچا۔۔۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں آہستہ آہستہ اجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ بستی میں چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ میری توقع کے مطابق واحدی جاگ چکا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر میرا استقبال کیا، پھر مجھے اندر لے گیا۔ اس کی بیوی کسی مرگ والے گھر گئی ہوئی تھی۔ بچے ابھی سو رہے تھے۔ میں واحدی کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر چکا تھا لہٰذا میں نے اسے نوشاب اور چشمہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔۔۔ وہ میری بات سن کر بہت حیران ہوا۔

اس نے مجھے بتایا "نوشاب، چشمہ کا چچا زاد ہے۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ ہیں۔ میں انہیں کئی دفعہ اکٹھے دیکھ چکا ہوں لیکن یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہوگا اور اتنا گہرا ہوگا۔"

میں نے واحدی سے کہا "میں نوشاب سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں اسے بتاؤں گا کہ چشمہ میرے ساتھ رہنے کے باوجود ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔۔۔"

واحدی خاموش تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر افسردگی سی نظر آرہی تھی۔ کہنے لگا "آپ نے بہت دیر کر دی جناب۔"

"کیا مطلب؟" میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔

وہ بھاری لہجے میں بولا "نوشاب چلا گیا ہے۔۔۔ آج رات سردار رازل کی رہائش گاہ پر ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی ہے۔ اس میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ راخان کے قبیلوں پر پوری طاقت سے کاری ضرب لگائی جائے۔ اس سلسلے میں سردار رازل نے "مقدس سنہری روشنی" کی رضا بھی معلوم کر لی ہے۔ شاید آپ کے لیے یہ اطلاع اہم ہو کہ آج کسی وقت وادیِ راخان کے قلعوں پر زبردست ہلہ بولا جائے گا۔ رات ہی رات میں تمام منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے۔ یہ بہت مکمل منصوبہ ہے اور ہمیں قوی امید ہے کہ ہم راخان کے مضبوط دفاع کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر یہ دفاع ٹوٹ گیا تو آج کا دن راخان کے قلعوں پر بہت بھاری ہوگا۔۔۔"

"تم نوشاب کی بات کر رہے تھے" میں نے واحدی کو یاد دلایا۔

وہ بولا "ہاں۔۔۔ منصوبے کے مطابق بستی کے لوگوں میں سے چار ایسے جاں نثاروں کی ضرورت تھی جو اپنی جان کا نذرانہ دے کر راخان پر حملے کا راستہ ہموار کریں۔۔۔ جو چار دلیر افراد اس کام پر گئے ہوئے ان میں سے ایک نوشاب بھی تھا۔ یہ چاروں افراد نصف شب کے بعد راخان کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اب تک وہ اپنا کام کر چکے ہوں گے۔۔۔ مم۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی بستی میں واپس نہیں لوٹے گا۔"

میرے جسم میں مایوسی کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے کہا "تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو تم لوگ۔۔۔ مجھے اپنے سردار رازل کے پاس لے چلو۔۔۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ لڑائی رکوائی جاسکتی ہے۔"

حرتجم واحدی نے بڑے اطمینان سے نفی میں سر ہلا دیا "آپ ان قبائلی جھگڑوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے جناب۔۔۔ یہ لڑائی اب کوئی نہیں رکوا سکتا۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔"

کہیں دور سے جنگی ترانے کی آواز آرہی تھی جو میں یہاں آنے کے بعد کئی بار سن چکا تھا۔

واحدی کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔ ان دونوں قبیلوں میں اب لڑائی ہو کر رہے گی۔ ایک خون ریز لڑائی کا سوچ کر میرا دل دکھ آمیز مایوسی سے بھر گیا۔ پھر میری نگاہوں میں نوجوان نوشاب کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کی خوب صورت آنکھیں، کشادہ پیشانی، بھرا بھرا جسم۔ یہ کوئی عمر تھی اس کے مرنے کی مگر.... لیکن حزیم واحدی بتا رہا تھا کہ وہ ان چار نوجوانوں میں شامل ہے جو کسی نہایت خطرناک مشن پر روانہ ہوئے ہیں۔ وہ مشن کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بڑی شدت سے میرے ذہن میں کلبلانے لگا۔

میں نے واحدی سے پوچھا "کیا تم بتاؤ گے نہیں، وہ چاروں کس کام سے گئے ہیں؟"

واحدی نے ایک گہری سانس لی اور بولا "راخان کی وادی نہایت دشوار گزار ہے۔ اس کے دفاع کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا ہے۔ وادی میں داخل ہونے کے صرف اور صرف دو راستے ہیں۔ ایک تو پہاڑی درہ ہے جس کی چوڑائی ایک گھوڑا گاڑی سے بھی کم ہے۔ دوسرا ایک چوبی پل ہے۔ یہ پل ایک گہرے اور تیز رفتار پہاڑی نالے پر بنا ہوا ہے۔ ان دونوں راستوں پر وادی کے خطرناک ترین قلنگری پہرا دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی مورچا بندی اس انداز سے کر رکھی ہے کہ انہیں روند کر آگے بڑھنا بے حد مشکل ہے۔ خاص طور سے طویل درے سے گزرنا تو ناممکن ہے۔ ہماری توجہ لکڑی کے پل کی طرف ہے۔ اس پل میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں لوہے کی چار بڑی بڑی چرخیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان چرخیوں کے ذریعے یہ پل اوپر نیچے حرکت کر سکتا ہے۔ پل کے مسلح پہرے دار بیرونی حملے کی صورت میں بوقت ضرورت اس پل کو نیچے لے جاتے ہیں اور یوں وادی میں داخل ہونے کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔"

میں یہ ساری باتیں جانتا تھا لیکن میں نے اپنی "باخبری" واحدی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کی "معلومات" بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ واحدی بولا "ہمارے جو چار جانباز آج رات وادی کی طرف گئے ہیں ان کا کام چوبی پل کی چرخیوں کو بے کار کرنا ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو پل کی طرف سے وادی پر ایک کامیاب حملہ کیا جا سکے گا۔"

"چرخیوں کو بے کار کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چرخیوں کو جام کر دیا جائے گا۔" وہ بولا "دو چرخیاں پل کے اوپر ہیں اور دو نیچے نالے کے اندر۔ ہمارے جوان ان نیچے والی دو چرخیوں تک پہنچیں گے اور انہیں ناکارہ کر دیں گے۔"

"لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو؟"

"تو بھی حملہ تو ہو گا ہی۔ اب تو یہ سر دھڑ کی بازی ہے۔"

"حملے کے وقت اگر پہرے داروں نے پل نیچے گرا دیا تو؟"

"ہمارے جانبازوں کے پاس کمندیں ہوں گی۔ وہ فوری طور پر چڑھنے کی کوشش کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حملہ اتنا تند ہو کر محافظوں کو پل نیچے لے جانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔"

"اگر پل کی طرف سے تمہارا حملہ ناکام ہو گیا تو پھر؟"

"پھر درے کی طرف سے حملہ کیا جائے گا۔ میں نے کہا ہے کہ اب یہ سر دھڑ کی بازی ہے۔ سب لوگوں نے جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے۔ آج کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

واحدی چلا گیا تو میں نے فوری طور پر زریں گل سے مشورہ کیا۔ ان حالات میں ہمیں کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ حالات بتا رہے تھے کہ زبردست قسم کا خون خرابا ہونے والا ہے۔ یہ خون خرابا ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو بھی متاثر کر سکتا تھا۔ منور، جون چاڈل، سائیں عالی، سورج وغیرہ بھی اس کی زد میں آ سکتے تھے۔ کل رات میں نے واحدی سے دیر تک بات چیت کی تھی۔ اس بات چیت سے مجھے کئی کام کی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ایک کام کی بات یہ تھی کہ مجھے وادی راخان کا حدود اربعہ معلوم ہو گیا تھا۔ وادی کا فاصلہ یہاں سے قریباً تیس کلومیٹر تھا۔ دس پندرہ کلومیٹر تک ڈھلوان راستہ تھا، پھر چڑھائی شروع ہو جاتی تھی۔ کئی جگہوں پر گھوڑے یا خچر کی لگام تھام کر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ آخری چار پانچ کلومیٹر پھر ہموار تھے..... میں نے واحدی سے راستے کے تمام نشیب و فراز جان لیے تھے۔ یہ معلومات اس وقت مجھے بہت کام دے سکتی تھیں۔ میں نے زریں گل سے کہا "زریں .... آؤ چلیں۔"

"کہاں استاد جیب؟"

"وہاں، جہاں جانے کے لیے تم دن رات تڑپ رہے ہو۔"

"ہم آپ کا بات نہیں سمجھا۔"

"ہم وادی راخان جا رہے ہیں۔ ابھی اور اسی وقت۔" زریں گل کا منہ کھلا رہ گیا۔

O☆O

ہمارے گھوڑے درمیانی رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ بات نہیں تھی کہ ہمیں گھڑ سواری نہیں آتی تھی۔ میں اور زریں گل دونوں اچھے گھڑ سوار تھے لیکن ڈھلوان راستہ اتنا خطرناک تھا کہ ذرا سی غلطی کے سبب ہم قلابازی کھا سکتے تھے۔ ہم بڑی خاموشی سے بستی سے نکلے تھے اور اب تک ہمارا سفر بالکل محفوظ رہا تھا۔ راستے میں ہمیں برف پر اکثر جگہ گھوڑوں کے سموں کے نشان ملے تھے۔ زریں گل نے ان نشانات کو دیکھ کر بڑے یقین سے کہا تھا کہ یہ انہی گھوڑوں کے نقش پا ہیں جن پر رات کسی وقت بستی کے چار منتخب نوجوان سوار ہو کر وادی راخان کی طرف گئے ہیں۔ اس معاملے میں زریں گل تھا تجربہ کار نظر آتا تھا۔ وہ ہر گھوڑے پارس کا نقش علیحدہ علیحدہ پہچان رہا تھا۔

تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی اور سورج کی شعاعیں برف پر منعکس

ہو کر آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا، روئے زمین پر برف کی سفید چادر اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ تنہائی اور یہ خاموشی عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بارعب بھی تھی۔ زریں گل کے پاس ریوالور تھا۔ میرے پاس پسٹل کے علاوہ چھوٹی نال کی روسی رائفل تھی۔ یہ رائفل میں نے اپنے سموری لبادے میں یوں چھپا رکھی تھی کہ باہر سے نظر نہیں آتی تھی۔ بستی سے وادی راخان تک کا سفر یوں تو صرف تیس کلومیٹر تھا لیکن یہ سفر ہمارے لیے بے حد طویل اور کٹھن ثابت ہوا۔ ہر گھڑی گمان ہوتا تھا کہ راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ انسانی قدموں اور گھوڑے کے سموں کے نشانات یہاں کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان نشانات میں سے ان نشانات کو ڈھونڈنا کار دارد تھا جن کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ دوپہر ہونے والی تھی جب چیڑ کے درختوں میں گھری ہوئی ایک بلندی سے مجھے لکڑی کے پل کی جھلک نظر آئی۔ میں یہ منظر ہزاروں منا ظر میں پہچان سکتا تھا۔ یہ وادی راخان کا منظر تھا۔ وہی وادی موت جو وحشی قلندر کھاڑا پہرے داروں کا مسکن تھی۔ چند ماہ پہلے اس وادی میں ہم نے جاتریوں اور ان کے حواریوں کے خلاف ایک خون ریز جنگ لڑی تھی۔ یہی وہ پل تھا جس کے قریب میں نے جنونی جاتریوں سے لدی ہوئی گھوڑا گاڑی کو دھماکے سے اڑایا تھا۔ فضا میں جیسے ابھی تک اس ہولناک دھماکے کی گونج باقی تھی۔ چند معزز ترین جاتریوں کے ٹکڑے جیسے ابھی تک ہوا میں معلق تھے۔ وادی کو جانے والے پل کی جھلک دیکھ کر وہ سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے تھے جو چند ماہ پہلے یہاں پیش آئے تھے اور اس کے ساتھ اپنے پیارے دوست منور کا چہرہ بھی تصور میں اجاگر تر ہو گیا تھا۔ میں اور زریں گل درختوں کے درمیان مبہوت کھڑے تھے۔ شاید زریں بھی میری طرح چند لمحوں کے لیے ماضی قریب کے تصور میں گم ہو گیا تھا۔

وہ بولا "استاد جیب! ہم کو یقین نہیں آتا کہ ہم پھر سے اسی جگہ پہنچ گیا ہے۔"

"یقین تو کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ جلدی سے کر لو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

چند لمحے توقف کر کے ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور تیزی سے وادی راخان کی طرف بڑھنے لگے۔ پل سے ہمارا فاصلہ قریباً تین کلومیٹر تھا.... دو ڈھائی کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے تیزی سے طے کیا لیکن پھر ڈھلوان کی وجہ سے رفتار سست ہو گئی۔ یہ عجیب ساخت کی وادی ہمیں ایک گہرے پیالے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس پیالے کی دیواریں ناقابل عبور اور عمودی تھیں۔ ان دیواروں کو دیکھ کر ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ کوئی شخص رسے وغیرہ کی مدد سے ان پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو چیونٹی سے زیادہ حقیر نظر آتا۔ اس پیالے کی ایک جانب خلا موجود تھا۔ یہ وہی خلا تھا جس کے سامنے سے گہری نالا گزرتا تھا۔ اس نالے پر لکڑی کا پل تھا۔ ہم اسی پل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی ہمیں وادی کے ان خونخوار پہرے داروں کی جھلک نظر آئی جو وادی کی بیرونی حدود پر پہرا دیتے تھے۔ وہ سفید برف پر دور سے سیاہ دھبوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ دھبے وادی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ جلد ہی ہم ان دھبوں میں سے کچھ کے نزدیک پہنچ گئے۔ لمبے بالوں اور ریچھ وار لباسوں والے کرخت چہرے، کلاڑا بردار رنڈناتے ہوئے ہمارے سامنے آ گئے۔ ان کی آنکھیں اور تیور خطرناک تھے۔ زریں گل نے ٹوٹی پھوٹی مقامی زبان میں انہیں بتایا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں اور فوری طور پر سردار سردرت سے ملنا چاہتے ہیں۔

خبر نہیں کہ زریں گل کی بات کس حد تک ان لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ بہرحال انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور بے حد چوکس نظر آنے لگے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں اب کلہاڑوں کی جگہ رائفلیں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ ہمیں لے کر پل کی طرف بڑھے۔ پل دور سے جتنا مختصر نظر آتا تھا حقیقت میں اتنا نہیں تھا۔ اس کی چوڑائی کسی طرح بھی پندرہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ لمبائی کا اندازہ دو ڈھائی سو فٹ تھا۔ اس کی دو بالائی چرخیاں دور سے بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ پل کی سرے پر ایک پتھریلی چار دیواری تھی۔ اس کے اندر دو تین کمرے دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی سی عمارت "چیک پوسٹ" کا کام دیتی تھی۔ جونہی ہم اس چار دیواری میں پہنچے ایک لمبا تڑنگا شخص مست گینڈے کی طرح جھومتا جھومتا ہمارے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کسی بدقسمت سیاح کی شاندار سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم پر براؤن کارڈرائے کا

مقبول عام مصنف ایم۔ اے۔ راحت کے سدا بہار
قلم سے شاہکار ناول

پارس

اُس شخص کا قصہ جو اپنی تلاش میں نکلا تھا۔
عشق، جرم اور جنون سے جنم لینے والا ہنگامہ خیز ناول۔

آغاز سے انجام تک ------- سطر سطر ہنگامہ
اول تا آخر ------- بیان سے باہر

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور- 7247414
اسٹاکسٹ- علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور- 7223893

کوٹ تھا۔ اس کی کمر سے "ہولسٹر" بندھا تھا اور دونوں طرف ریوالور لگے ہوئے تھے۔ سورج کی سنہری دھوپ میں اس کے کالوں کے چمکیلے بال بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ اس کے تاثرات دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ اس کے چہرے پر بے پناہ حیرت نظر آرہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا پھر ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولا "تم یہاں؟"

میں نے کہا "میرا یہاں آنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں فوری طور پر سردار سدورت سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن ..... تم ..... تم یہاں کیسے پہنچے؟ میرا مطلب ہے یہاں کا راستہ؟" اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے کہا "میں یہ سب کچھ سردار سدورت کو بتاؤں گا۔ تم جلدی سے مجھے ان کے پاس لے چلو۔ یہ ایک فوری نوعیت کا معاملہ ہے۔"

نیم حکیم شخص کی آنکھوں میں بہت سے شبہات تیرنے لگے تھے۔ اس نے بڑی کڑی نظروں سے مجھے اور وزریں کو سر تا پا دیکھا۔ پھر کچھ فاصلے پر جا کر اپنے ساتھیوں سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ دوبارہ میرے پاس آیا "کیا تم دونوں اکیلے یہاں پہنچے ہو؟"

"تم جس طرح چاہو، میں تمہاری تسلی کرا سکتا ہوں لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

وہ بولا "کیا تم لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں؟"

میں نے زریں گل کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے ہتھیار نکال کر پہرے داروں کے حوالے کر دیے۔ نیم حکیم شخص نے جو اس چوکی کا انچارج تھا، اپنے دو ماتحتوں کو زیر لب کچھ ہدایات دیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

"یہ کہاں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سردار سدورت کو بلانے۔" نیم حکیم شخص نے کہا۔

"سردار کے آنے میں وقت ضائع ہو گا۔ یہ بہت اچھا ہو گا اگر تم ہمیں اس کے پاس لے چلتے۔ میں ان کے لیے بہت اہم اطلاع لے کر آیا ہوں۔"

"سردار کے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" انچارج نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہاں سے روانہ ہونے والے دونوں افراد سردار کی طرف نہیں گئے۔ عین ممکن تھا کہ وہ گرد و نواح کا جائزہ لینے گئے ہوں۔ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ ہمارے ساتھ کوئی اور تو یہاں نہیں پہنچا ہے۔

صورت حال نازک تھی۔ در حقیقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ سردار راہل اپنے بپھرے ہوئے لشکریوں کے ساتھ کسی بھی وقت اس وادی پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ یہ گرد و پیش سیکڑوں گھوڑوں کی ٹاپوں اور جنگی للکاروں سے گونجنے والے تھے اور اس اہم ناکے پر موجود یہ خود ساختہ انچارج میری کسی بات کا اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس کے لیے بس یہی ایک بات تشویش ناک تھی کہ ہم پر پیچ راستوں سے گزر کر اس وادی تک کیسے پہنچ گئے ہیں۔ جب پہلی دفعہ ہم اس وادی میں آئے تھے تو ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ یہ پٹی وادی کے اندر پہنچ کر کھولی گئی تھی۔ وادی سے واپسی پر ابھی بھی بے ہوشی کی حالت میں ہوئی تھی۔ جب ہماری آنکھ کھلی تھی تو ہم وادی سے بیسیوں میل کے فاصلے پر تھے۔ ان حالات میں انچارج کی تشویش اور حیرت بجا تھی۔ یقیناً اسے ہماری آمد سے کسی سازش کی بو آرہی تھی۔

میں انچارج کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا "دیکھو برادر، تم لوگ شدید خطرے میں ہو۔ کل سردار راہل کی بستی میں جو قتل عام ہوا ہے اس کا بہت خوف ناک نتیجہ نکلنے والا ہے۔ سردار راہل اپنے قبیلے کے تمام مردوں کے ساتھ اس وادی پر حملہ کرنے آرہا ہے۔"

انچارج کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ بولا "تم کیسے جانتے ہو سردار راہل کے بارے میں اور ..... قتل عام کے بارے میں؟"

"میں تم لوگوں کو تمام تفصیل بتاؤں گا مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ تم مجھے فوراً بڑے سردار کے پاس لے چلو۔"

انچارج کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار نظر آرہے تھے۔ یہی وقت تھا جب کچھ نامانوس آوازوں نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ آوازیں کافی فاصلے سے آرہی تھیں۔ جیسے بہت سے لوگ چیخ پکار کر رہے ہوں۔ ایک گونج سی تھی جو بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یقیناً یہ سردار راہل اور اس کے لشکریوں کی "آمد" کا اعلان تھا۔

انچارج نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے دانت پیس کر کہا "دیکھ لیا نا؟"

انچارج سنی ان سنی کر کے باہر کی طرف بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے آیا۔ یہاں موجود پہرے داروں نے بھی یہ غیر مانوس شور سن لیا تھا۔ ان کے چہروں پر ہراس کی کیفیت تھی اور بے شمار سوالات تھے۔

شور اب واضح ہو گیا تھا اور ایک مہیب گونج کے ساتھ زمین بھی لرزنے لگی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ سیکڑوں گھڑ سوار بلا تیزی سے پل کی طرف بڑھ رہے ہیں ..... اور پھر تھوڑی بلندی پر ہمیں ان کی جھلک نظر آئی۔ وہ ڈھلوان پر دکھائی دے رہے تھے۔ کسی سیلابی ریلے کی طرح وہ تیز رفتاری سے نشیب کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔

انچارج نے چیخ کر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیں اور خود بھی اندھا دھند پل کی طرف بھاگا۔ یہاں پتھروں سے بنی ہوئی وہ مضبوط پناہ گاہ تھی جس کی دیواروں میں مورچے کی طرح سوراخ تھے اور برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ پناہ گاہ زمین سے بیس پچیس فٹ بلند تھی۔

بہ مشکل دو تین منٹ کے اندر بلندی سے اترنے والا ٹڈی دل پل کے ناکے پر پہنچ گیا۔ پہلے اکا دکا فائر ہوئے پھر ایک دم شدید فائرنگ کی گھن گرج سے چٹانیں لرز اٹھیں۔ میں نے زریں گل کا

ہاتھ تھاما اور اندھا دھند بھاگتا ہوا جنوب کے رخ پر گیا۔ یہاں ڈھلوان پر درختوں کے درمیان بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ ان کے عقب میں ہمیں پناہ میسر آسکتی تھی۔ چڑھائی پر قریباً سو ڈیڑھ سو گز بھاگنے کے بعد ہم ان چٹانوں تک پہنچ گئے۔ یہاں نشیب میں پل اور اس کے ارد گرد کا علاقہ صاف نظر آرہا تھا ..... یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ ایک ایسا ہی جاں گسل منظر جو آنکھوں کے راستے دل پر سلسلی بن کر اترا اور نقش ہو گیا۔ وہ ہو بہو میدان جنگ کا منظر تھا۔ میں نے درجنوں گھڑ سواروں کو دیکھا جو جتھوں کی صورت میں دیوانہ وار پل پر حملہ آور ہو رہے تھے اور شدید فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک یا زخمی ہو رہے تھے۔ پل کے ناکے پر مضبوط مورچہ گاہوں میں بیٹھے ہوئے محافظ خود کار اسلحے سے بے دریغ فائرنگ کر رہے تھے اور آگے بڑھنے والوں کو کامیابی سے روک رہے تھے۔ پستول اور ریوالور سے لے کر "ایم جی" تک ہر قسم کا آتشیں اسلحہ استعمال ہو رہا تھا۔ گاہے گاہے زوردار دھماکوں سے بھی قرب و جوار لرز اٹھتے تھے۔ یہ دستی بموں کے دھماکے تھے۔ گھمسان کے رن میں یک سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ دستی بم کس طرف سے پھینکے جا رہے ہیں۔

چار پانچ منٹ جاری رہنے والے شدید زمینی حملے کے بعد سردار راہل کے لشکری پل کے محافظوں کو روند کر پل پر چڑھ گئے۔ یہ بات یقینی تھی کہ سردار راہل نے رات کو جو اہم "مشن" بانٹا تھا، وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اگر سردار رہت کے لشکری پل کو حرکت دے سکتے تو اب تک دے چکے ہوتے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پل کو حملے سے پیچھے لے جانے والا میکنزم ناکارہ ہو چکا تھا اور اسے ناکارہ کرنے والے وہی چار نوجوان تھے جنہوں نے رات اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی۔

سردار راہل اور اس کے بپھرے ہوئے لشکری نصف پل طے کر چکے تھے جب انہیں ایک بار پھر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ غالباً پل کے سرے پر موجود محافظ شکست کھانے سے پہلے اپنا کام کر گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اتنا وقت فراہم کر دیا کہ وہ منظم اور مسلح ہو کر موقع پر پہنچ جائیں۔ مجھے اور زریں گل کو پل پر دست بدست لڑائی کے مناظر نظر آرہے تھے۔ کلہاڑوں کے خوف ناک پھل چمک رہے تھے۔ برچھے چل رہے تھے۔ کم از کم سولہ سترہ افراد کو میں نے اپنی آنکھوں سے ہلاک یا زخمی ہو کر نیچے نالے میں گرتے ہوئے دیکھا۔ چیخ پکار اور فائرنگ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

زریں گل نے کہا "استاد صیبا! کیوں نہ ہم بھی شریک ہو جائیں؟"

"مگر کس کی طرف سے؟"

"سردار راہل کی طرف سے اور کس کی طرف سے۔" وہ ناگواری سے بولا "ان کا پلڑا بھاری ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی وادی میں گھسنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں۔ ابھی تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو ..... اور ویسے بھی ہم کیوں خود کو خطرے میں ڈالیں۔"

"استاد صیبا! خطرے والا بات نہیں ہے۔ سردار راہل کے ساتھ بہت زیادہ نفری ہے۔ ام کو لگتا نہیں کہ ان لوگوں کو روکا جا سکے گا۔"

"میں نے کہا نا کہ اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔"

زریں گل بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ جنگجو شخص تھا۔ اپنی آنکھوں کے عین سامنے ہونے والی سنسنی خیز قبائلی لڑائی نے اس کا لہو گرما دیا تھا۔ وہ خود بھی اس معرکہ آرائی کا ایک حصہ بننا چاہ رہا تھا۔

پل پر ہونے والی لڑائی اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ہم کافی فاصلے پر تھے، پھر درمیان میں ٹیلے اور درخت بھی تھے۔ سب کچھ صاف صاف تو نظر نہیں آرہا تھا بہر طور اتنا ضرور دکھائی دے رہا تھا کہ دست بدست لڑائی ہو رہی ہے اور سردار راہل کے لشکری وادی کے محافظوں کو مارتے کاٹتے اور دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس جنگ میں دست بدست لڑائی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سردار راہل نے دست بدست لڑنے والے نوجوانوں کی ایک ٹولی تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ (کل یہ ٹولی تربیت گاہ میں خون میں نہا گئی تھی) فائرنگ کی گھن گرج اور زخمیوں کی چیخ پکار میں گاہے گاہے نعروں کی گونج بھی شامل ہو جاتی اور بالکل یوں لگتا تھا جیسے ہم پردے پر کسی قدیم لڑائی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سردار راہل کے گھڑ سوار دستے بھی پل پر پہنچ گئے۔ پل پر حملہ آور قبائلیوں کا دباؤ ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ قریباً دوسرے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ ایک بار تو میرے دل میں یہ بات بھی آئی کہ کیوں نہ ہم حملہ آور قبائلیوں کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن پھر میری چھٹی حس نے مجھے روک دیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس وادی کے خونخوار جنگجو اتنی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ یہ وادی مدتوں سے ناقابل تسخیر تھی۔ اس کا وقوع اپنی مثال آپ تھا اور اس کے مکین وہ سفاک لوگ تھے جن کا پیشہ ہی قتل و غارت اور لوٹ مار تھا۔ انہیں ایک زوردار لڑائی لڑنے کے لیے کسی بھی طرح کی ذہنی تیاری کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسری طرف مقدس سنہری روشنی کا پجاری قبیلہ تھا جو سردار راہل کی قیادت میں یہاں پہنچا تھا۔ یہ لوگ بالکل مختلف طرز کے تھے۔ (حالانکہ یہ دونوں قبائل ایک ہی علاقے میں رہتے تھے۔ ان کی شکل و صورت کے علاوہ ان کا رہن سہن، ان کی زبان اور بہت سے رسم و رواج ملتے جلتے تھے۔) سردار سدورت کا قبیلہ جنگجو تھا اور مار دھاڑ میں طاق بھی جبکہ سردار راہل کے لوگ کھیتی باڑی اور شکار کرنے والے محنت کش تھے۔ ان پر "تنگ آمد بجنگ آمد" والا محاورہ صادق آتا تھا ..... اگر رادی داخان کے لوگ ان کا جینا حرام نہ کرتے تو شاید وہ کبھی جنگ و جدل کی طرف نہ آتے۔

ہم ایک ایسی پوزیشن میں تھے جہاں سے میدان جنگ "کاغذی نقشے" کی طرح ہمارے سامنے بچھا ہوا تھا۔ کافی فاصلے سے بھی سوار رابل کے لوگ اپنی پگڑیوں اور داڑھیوں کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ وہ اب پل عبور کر کے وادی میں داخل ہو گئے تھے اور پل کے دوسرے سرے پر تابڑ توڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ میدان کے اس حصے میں یقیناً گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ تین چار منٹ اسی طرح گزرے پھر اچانک فائرنگ کی آوازوں میں بھاری مشین گن کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ یہ بڑی خوف ناک آواز تھی اور برف پوش پہاڑوں میں دور تک گونج رہی تھی۔ بھاری مشین گن چلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سوار رابل کے لشکریوں میں افراتفری کے آثار نمودار ہوئے...... مجھے یوں لگا کہ میدان جنگ کا نقشہ بدل رہا ہے۔ حملہ آور دستوں کے دائیں بائیں سے لمبے بالوں والے تیز رفتار گھڑ سوار نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے حملہ آوروں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ حملہ آور قبائلیوں کے لیے یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ جو قبائلی پل سے پار جا چکے تھے وہ اپنے باقی ساتھیوں سے یکلخت کٹ گئے تھے۔ پھر اکا دکا پل پر بھی زبردست مزاحمت دیکھنے میں آئی۔ لمبے بالوں والے بدست کلہاڑا بردار پیچھے چنگھاڑتے پل پر چڑھ آئے تھے اور اندھا دھند حملے کر رہے تھے۔ سوار رابل کے وہ ساتھی جو گھیرے میں آنے سے بچ گئے تھے اس اچانک شورش سے گھبرا کر الٹے قدموں واپس ہٹنے لگے۔ ان کے پرجوش جنگی نعرے اور ترانے ایک سراسیمہ خاموشی میں بدل گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں کو پل سے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ سوار رابل کے ساتھیوں کے پاؤں ایک بار اکھڑے تو پھر اکھڑتے چلے گئے۔ ان کی تنظیم درہم برہم ہو گئی تھی۔

سوار رابل کے ساتھی تعداد میں بے شک زیادہ تھے لیکن ان کے پاس آتشیں اسلحے کی کمی تھی۔ فن حرب میں بھی وہ وادی کے لوگوں سے پیچھے نظر آتے تھے۔ ان پر بھرپور حملہ ہوا تو وہ ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہمارے بالکل پاس سے ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا گزرا۔ اس کی رکاب میں ایک پگڑی پوش قبائلی کا پاؤں پھنسا ہوا تھا اور وہ اسے پتھروں پر گھسیٹتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور ہمارے عین سامنے پشت پر گولی کھا کر گرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے پیچھے آنے والا ایک "ساتھی گھڑ سوار" ہی اسے روندتا ہوا چلا گیا۔ میں اور وزیر گل اپنے ہتھیار پل کے عظیم انجام کے حوالے کر چکے تھے۔ اب ہم نہتے تھے۔ میدان کار زار کا دائرہ پھیل گیا تھا اور ہم لڑائی کی زد میں آ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ہمارا نہتا ہونا ہمارے لیے سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جو قبائلی ہمارے سامنے گولی کھا کر گرا تھا اس کی نفری نات تھری رائفل پاس ہی پڑی تھی۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر پتھر کی اوٹ سے نکل کر رائفل اپنے قبضے میں کر لی۔ قبائلی کے کندھے پر گولیوں والی بیلٹ بھی تھی۔ میں بیلٹ اتارنے کی کوشش کر رہا تھا جب تین گھڑ سوار بلائے ناگہانی کی طرح میرے سر پہنچ

گئے۔ ان تینوں کا تعلق وادی سے تھا۔ ان کے الجھے ہوئے اور کالوں کے بڑے بڑے بالے ان کی شناخت کے لیے کافی تھے۔ ان میں سے ایک نے گرج کر مجھے رائفل پھینکنے کا حکم دیا۔

یہ حکم ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے رائفل پھینک دی۔ ایک مسلح گھڑ سوار نے وزیر گل کو بھی چٹان کی اوٹ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چند لمحے میں کئی اور کلہاڑا بردار جنگلی پہنچے اور ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ سوار رابل کے ساتھیوں کو مکمل طور پر شکست ہو چکی تھی۔ جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جو نہیں بھاگ سکتے تھے انہیں گھیر گھیر کر پکڑا جا رہا تھا۔ لڑائی اب تھم گئی تھی لیکن اس کی شدت پہلے سے بہت کم فضا میں دستی بموں کا دھواں تھا اور بارود کی تیز بو تھی۔ میرا خیال تھا کہ سوار رابل کے وہ تمام ساتھی مارے اور پکڑے گئے جو پل کے پار پہنچ کر گھیرے میں آئے تھے۔

O☆O

ایک بار پھر وہی مناظر آنکھوں کے سامنے تھے جو چند ہمارے دل و دماغ میں ذخیرے ہوا کر چکے تھے۔ ہم پھر اسی موت میں تھے جہاں بچے بچے پر حیرتیں اور انہونیاں بکھری تھیں۔ ہمارے سامنے اس عظیم الشان سرنگ کا دہانہ تھا اور "تخت" یعنی سردار کی رہائش گاہ واقع تھی۔ اس سرنگ کو کیسے بھول سکتے تھے۔ اس کی بھول بھلیوں میں ہم نے گزارے تھے۔ اسی سرنگ میں ہم نے وہ جشن ترانا دیکھا تھا جس میں شراب پانی کی طرف لنڈھائی گئی تھی اور عریانیوں کی انتہا کر دی گئی تھی۔ اس سرنگ کے دہانے کے سامنے وہ صدیوں پرانا تناور درخت تھا جس کی شاخوں سے پراسرار بوٹیاں جھولتی تھیں اور رہائش دیوتا کی شبیہ بنے ہوئے سانپ کی شکل میں تھی۔ اسی سرنگ کے دہانے پر... سرنگ کے دہانے کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا۔ سب اسی میدان میں موجود تھے۔ "سب" سے میری مراد قیدی ہیں جو لڑائی میں وادی والوں کے ہتھے چڑھے تھے۔ مترجم واحدی اور سوار رابل کے چھوٹے بھائی کے علاوہ کئی پہچانے چہرے نظر آ رہے تھے۔ سب کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئی تھیں اور اکثر کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے۔ تاہم میرے اور وزیر گل کے ہاتھ آزاد تھے۔ قیدیوں سے برآمد ہونے والا اسلحہ ایک بڑے ذخیرے کی صورت میں پڑا تھا۔ اس میں آتشیں ہتھیاروں کے علاوہ برچھے کلہاڑے وغیرہ بھی شامل تھے۔ پکڑے جانے والے تمام گھوڑے اور خچر بھی ایک جگہ جمع کر دیے گئے تھے۔ قیدیوں کی تعداد سو سے کم نہیں تھی۔ ہمارے سمیت وہ سب کے سب تھے۔ ان میں سے کئی ایک زخموں سے چور تھے اور بعض مر رہے تھے۔ قیدیوں کے ارد گرد سرخ انگارا آنکھوں والے پہرے دار بھوکے شیروں کی طرح ٹہل رہے تھے۔ جو

جانتے تھا وہ تماشا دردناک تھا۔ لڑائی میں مارے جانے والے حملہ آوروں کی لاشوں کو گھوڑوں سے باندھ کر پتھریلے میدان میں گھسیٹا جا رہا تھا اور مختلف طریقوں سے لاشوں کی بے حرمتی کی جا رہی تھی۔ اس کھیل میں وادی کے عام مرد و زن بھی شامل تھے۔ ایک لاش کو درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی تھی۔ دو لاشوں کے سر کاٹ کر علیحدہ کر دیے گئے تھے اور لوگ انہیں یوں ٹھوکریں رسید کر رہے تھے جیسے وہ انسانی سر نہ ہوں فٹ بال ہوں...... یہ سارے نظارے وحشت ناک تھے۔

اچانک میں نے ایک جانا پہچانا چہرہ دیکھا۔ وہ سردار سدرت تھا۔ چند دیگر افراد کے ساتھ وہ قیدیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں تیزی تھی۔ چند ہی لمحے میں وہ اپنے ایک درجن مسلح محافظوں کے ساتھ ہمارے سامنے موجود تھا۔ مجھے اور وزیر گل کو پہچان کر اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت امڈ آئی۔ اس حیرت میں انتہا درجے کی الجھن بھی شامل تھی۔ جو شخص سردار کو اپنے ساتھ ہمارے پاس لایا تھا اس نے مقامی زبان میں سردار سے کچھ کہا۔ سردار نے الجھن آمیز انداز سے نفی میں سر ہلایا پھر ایک محافظ کو حکم دیا کہ ہماری بیڑیاں کھول دی جائیں۔

میرے اور وزیر گل کے پاؤں آزاد کر دیے گئے۔ سردار سدرت نے ایک لفظ کہے بغیر ہمیں اپنے ساتھ لیا اور میدان سے نکل کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ کی جانی پہچانی تاریکی اور بو باس نے ہمارا استقبال کیا۔ جلد ہی ہم نے خود کو سردار سدرت کی جانی پہچانی رہائش گاہ "تخت" کے ایک آراستہ حصے میں پایا۔

سرنگ کے اس حصے میں روشنی کرنے اور آگ جلانے کی اجازت تھی لہٰذا یہاں روشنی کے علاوہ خوشگوار حرارت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ تنہائی ملتے ہی سردار سدرت نے کہا "شاہ جہاں! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ میں تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جو ہمارے دشمن ہیں۔ یہ سب کیسے ہوا اور کیوں؟"

میں نے کہا "سردار سدرت! کبھی کبھی آنکھ دھوکا بھی تو کھاتی ہے۔ جو نظر آ رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں نہیں ہوتا۔"

"مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ شاہ جہاں! مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟ یہ کھیل کیا ہے تم نے ایسا؟ میں نے تو اپنے خط میں سب کچھ لکھ دیا تھا تمہیں..... تم سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی تھی کہ واپس یہاں آنے کی کوشش نہ کرنا اور..... یہ بھی یقین دلایا تھا تمہیں کہ اگر تم میرے کہے پر عمل کرو گے تو تمہارے ساتھی بھی واپس پہنچ جائیں گے۔ کیا وہ خط نہیں ملا تھا تمہیں؟"

"مجھے وہ خط مل گیا تھا۔" میں نے اطمینان سے کہا "اور وہ ساری باتیں بھی سمجھ میں آ گئی تھیں جو تم سمجھانا چاہتے تھے۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ تم اپنے وعدے پر عمل کرو گے۔ میں دوبارہ یہاں آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن پھر حالات کچھ

ایسے ہوئے کہ مجھے سوچنا پڑا۔ کچھ بہت اہم لوگوں کی گمشدگی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں پھر اس ویرانے کا رخ کروں۔"

"کس کی گمشدگی کی بات کر رہے ہو تم؟" سردار سدرت غرایا "ہم نے اپنے عہد کی ایک بار بھی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس وادی کا کوئی فرد اپنے علاقے کی حدود سے باہر نہیں نکلا۔ کسی کو پکڑنا یا لوٹ مار کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"یہ لوٹ مار تمہارے لوگوں نے نہیں کی تھی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تو پھر کس نے کی تھی؟" سدرت نے پوچھا۔

"انہی لوگوں نے جنہوں نے آج تم پر چڑھائی کی ہے۔"

"سوار رابل کا قبیلہ؟" سدرت نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "بہت خوب" سردار سدرت نے دبے دبے طنز کے ساتھ کہا "لگتا ہے کہ تم کوئی لمبی چوڑی کہانی سنانا چاہ رہے ہو۔ رابلی قبیلے کے حوالے سے۔"

"لمبی تو ہے لیکن غلط نہیں ہے۔ میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور دوست سے کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ جو کچھ بھی پیش آیا ہے میں تمہیں من و عن بتا دینا چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سدرت کے گوش گزار کر دیا۔ مجھے پشتو بولنا پڑ رہی تھی۔ بعض فقرے کئی کئی مرتبہ دہرانے پڑے لہٰذا روداد سنانے میں کافی وقت لگا۔ میں نے سدرت کو بتایا کہ کس طرح ایک بدنام ڈاکو صیفی جان کے قتل کے بعد میرے اور ایک وزیر منصور خان کے درمیان چپقلش پیدا ہوئی اور کس طرح اس چپقلش نے دشمنی کا روپ دھار لیا۔ میں نے سدرت کو بتایا کہ اس وزیر نے انتظامیہ کے کئی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور لمبی چوڑی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اس منصوبہ بندی کے مطابق ایک ٹاسک فورس قائم کی گئی تھی اور اس فورس نے یہاں پہنچ کر علاقے میں سخت کارروائی کرنا تھی مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ کئی ہفتوں کی کوشش کے باوجود یہ فورس اس وادی تک پہنچنے میں ناکام رہی۔ اسی دوران میں موسم بھی خراب ہو گیا اور مہم کا جوش و خروش کافی حد تک کم ہو گیا۔ زیادہ تر افراد کو گلگت واپس بھیج دیا گیا' صرف چند افراد "تلاش" کے کام میں لگے رہے۔ آخر میں' میں نے سردار سدرت کو بتایا کہ کس طرح یہ لوگ سوار رابل کے مسلح افراد کے ہتھے چڑھے اور کن حالات میں وزیر منصور خان کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں نے منصور خان کی اہلیہ نائیلہ اور اس کی پراسرار حالت کا ذکر بھی کیا اور سردار سدرت کو بتایا کہ ہم اس کا تعاقب کرتے ہوئے ہی اس علاقے میں پہنچے ہیں۔ سوار رابل کی بستی میں پیش آنے والے واقعات بھی میں نے اجمالاً سردار کے گوش گزار کیے۔

وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کوئی سوال بھی جڑ دیتا تھا اور اس کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ سوار رابل کے قبیلے کو رابلی قبیلہ کہا جاتا ہے۔ میں نے

سوار نے انکشاف کیا کہ کل رانلی قبیلے کی تربیت گاہ میں نوجوان لڑکوں کے قتل عام کے بعد ہی سوار رانل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس خون ریزی کا فوری جواب دیں گے اور وادی پر بھرپور حملہ کریں گے۔

میں نے کہا "سوار سدورت! مجھے حملے کی اس منصوبہ بندی کا آج صبح سویرے پتا چلا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے سوار رانل سے اور پھر تم سے ملوں اور تم دونوں کو اس خون ریزی سے باز رکھنے کی کوشش کروں لیکن سوار رانل کے قبیلے میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی اور نہ تمہارے قبیلے میں ہے۔ میں لڑائی سے کچھ دیر پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن پل پر موجود تمہارے محافظوں نے میری ایک نہ چلنے دی۔ وہ مجھے ٹرخاتے رہے' اتنی دیر میں سوار رانل اپنے لشکریوں کے ساتھ پہنچ گیا۔"

سوار سدورت کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہا۔ پھر کہنے لگا "تم یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ تم اور تمہارا ساتھی حملہ آوروں میں شامل نہیں تھے۔"

"یہ حقیقت ہے۔" میں نے زور دے کر کہا "حملہ آوروں سے ہمارا دور کا تعلق بھی نہیں۔ تم اپنے ان محافظوں سے پوچھ سکتے ہو جو پل پر موجود تھے۔ میں نے ان کے لیے ترنگے انچارج کو خبردار کیا تھا کہ حملے کا خطرہ ہے اور سوار رانل اپنے لشکریوں کے ساتھ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

سوار سدورت کی آنکھوں میں پریشانی اور سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنی دیر میں بیرونی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ سوار سدورت اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کہنے لگا "فی الوقت تم دونوں یہیں رہو۔ میں اکیلا اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں اور نہ اتنی جلدی ایسا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ ہو گا مشورے سے ہو گا۔ تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کمرے تک محدود رہو۔ میں رات کو کسی وقت پھر تم سے ملوں گا۔"

میں نے کہا "سفدور تو ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں' وہ ٹھیک ہے۔"

"اور جون چارٹل؟"

"وہ بھی۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے سوار سدورت کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

میں اور زریں گل اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے۔ آج پیش آنے والے واقعات ایک خوف ناک فلم کے مناظر کی طرح آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ بارش کی طرح برستی ہوئی گولیاں' چمکتے کلہاڑے' تڑپتے پھڑکتے جسم۔ کتنے ہی جیتے جاگتے انسان ہماری آنکھوں کے سامنے موت سے ہمکنار ہوئے تھے۔۔۔ اور ان میں زیادہ تعداد سوار رانل کے ساتھیوں کی تھی۔ وہ خود تو شاید بچ گیا

لیکن اس کے ان گنت ساتھی میدان میں کھیت رہے تھے' وہ لوگ تھے جو کل رات تک پرجوش نعرے لگا رہے تھے اور وادی کے باسیوں سے اپنے نوجوانوں کے قتل کا یادگار انتقام لینے کا عہد کر رہے تھے۔ وقت کی بساط پر ان کی ساری امیدیں خاک ہو گئی تھیں اور وہ خود بھی خاک و خون میں لوٹ گئے تھے۔ یہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ناقابلِ شکست رہی تھی۔

شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ سرنگ کا یہ حصہ بڑا گرم تھا۔ تماشا گاہیں یہاں سے قریب ہی تھیں۔ گانے کی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ آوازیں معمول سے کافی بلند تھیں اور ان میں جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ شاید "فتح" کی خوشی منائی جا رہی تھی جو آج اس وادی کے باسیوں کو نصیب ہوئی تھی۔ میدانِ جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کی لاشوں اور جاں بہ لب زخمیوں کی چیخ پکار کے درمیان جشن منانے کا دستور صدیوں سے جوں کا توں موجود ہے۔ گانے والے ایک کورس کی شکل میں گا رہے تھے۔ گاہے گاہے ان کی لے میں ڈھول کی تھاپ اور باجے کی گونج دار آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ بھنے ہوئے گوشت کی مہک اور شراب کی بو ہم تک پہنچ رہی تھی۔

رات نو بجے کے لگ بھگ ہمارے لیے بھی کھانا آیا۔ سوار سدورت کی صورت کہیں نظر نہیں آ رہی تھی' نہ ہی سفدور اور جون چارٹل میں سے کوئی ہم تک پہنچا تھا۔ ہم رات گئے تک سوار سدورت کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہیں آیا۔ اگلے دن بھی اس کا انتظار جاری رہا۔ زریں گل نے ملازموں سے استفسار کیا لیکن کسی نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔

دوپہر کے وقت ہمیں حیرت کا ایک شدید دھچکا لگا۔ مسلح افراد نے ہمیں سوار سدورت کی رہائش گاہ سے نکالا اور سرنگ سے لا کر اسی بندی خانے میں ڈال دیا جہاں میں اس سے پہلے بھی وقت گزار چکا تھا۔ یہ بندی خانہ وادی کے ایک بارونق حصے میں واقع تھا۔ یہاں باقاعدہ کسی جیل خانے کی طرح بیرکیں بنی ہوئی تھیں۔ ان بیرکوں میں کہیں آہنی جنگلے لگے تھے اور کہیں چوبی بانس کو سلاخوں کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اس بندی خانے میں باقاعدہ ٹارچر سیل بھی تھے' جہاں ملزموں کو اذیت دے کر ان سے اعترافِ جرم کرایا جاتا تھا۔ اس بندی خانے میں خاتون نامی کی ماں پر جو وحشیانہ تشدد ہوا تھا وہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔

پہلے کی نسبت اس مرتبہ بندی خانے میں کافی رش تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تین چار سو ملزموں (قیدیوں) کو بھی اسی بندی خانے میں رکھا گیا تھا جو کل لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ جس کوٹھری میں مجھے اور زریں کو پہنچایا گیا اس میں بھی دس بارہ افراد ٹھنسے ہوئے تھے۔ شام سے کچھ دیر پہلے ہمیں ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ ناشا تھی' وادی کے سب سے بڑے پجاری کی نافلف بیٹی۔ پجاری اولاد سرپ جو وادی کے پجاریوں (جاتریوں) کے

ہی میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور اس ہلاکت کے بعد آج پہلی دفعہ میرا اور ناشا کا آمنا سامنا ہو رہا تھا۔ ناشا ہمیشہ کی طرح ایک لمبے ڈھیلے لبادے میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں کسی "جنس" کے جوتے تھے۔ لبادے کے نیچے اس کا لباس بے حد مختصر تھا اور کمان کی طرح تنا ہوا جسم گاہے گاہے اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ کسی جنگلی گھوڑی ہی کی طرح وحشی پھرتیلی اور تیز و طرار تھی لیکن اس وقت اس کی تیز طراری قدرے ماند نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں بھی فکر کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ میرے اور زریں گل کے سامنے پہنچ کر بہت کھڑی ہو گئی۔ ہمارے درمیان کوٹھری کی آہنی سلاخیں حائل تھیں۔ میں اس کے باپ کا قاتل تھا اگر وہ اپنے لبادے کے اندر سے اچانک ریوالور نکال کر مجھ پر فائرنگ شروع کر دیتی' یا مجھے بڑا کوسنے لگتی تو میں کیا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک ٹک مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بے نام شکوے شکایت اور گئے دنوں کی تلخ و شیریں یادوں کا عکس تھا۔

وہ آہستگی سے بولی "تم نے دوبارہ یہاں آ کر اچھا نہیں کیا شاہ میں!"

میں نے کہا "میں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور نہ میری نیت میں کوئی فرق ہے۔ میں ساری بات سوار سدورت کو بتا چکا ہوں۔"

وہ افسردگی سے بولی "تم نے بتایا تو سب کچھ ہے لیکن ثابت نہیں کر سکے۔۔۔ اور جو بات "ثابت" ہو رہی ہے وہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں اچھی نہیں ہے۔"

"کیا ثابت ہو رہا ہے؟"

"یہی کہ تم اس کارروائی میں شامل رہے ہو جو سوار رانل اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے خلاف کی ہے۔ بلکہ تم اس حملے میں بھی شامل تھے جو کل سپہر وادی پر ہوا۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔"

"لیکن واقعات تمہارے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں کہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"

"کیا یہ غلط فہمی ہے کہ تم پچھلے کئی روز سے سوار رانل کے ساتھ رانلی قبیلے کی بستی میں موجود تھے۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم قبیلے کے نوجوانوں کو دست بدست لڑائی کی تربیت دے رہے تھے۔۔۔ اور پھر تم عین لڑائی کے موقع پر بھاگتے ہوئے پکڑے گئے ہو۔"

"ہم لڑائی میں شریک نہیں تھے اور نہ ہی بھاگ رہے تھے۔ لڑائی سے پہلے سوار سدورت سے ملنے یہاں پہنچا تھا۔ پل پر موجود تمہارے مسلح لوگوں نے مجھے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس بات کی گواہی پل کی چوکی کا انچارج دے سکتا ہے اور دوسرے افراد بھی دے سکتے ہیں۔"

"لیکن ان میں سے تو کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ جس انچارج کی بات کر رہے ہو اس کا سر دستی بم سے اڑا دیا گیا تھا۔ باقی افراد بھی حملے میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔"

"یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔۔۔ وہ دس پندرہ افراد تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی تو بچا ہو گا۔"

"میرے خیال میں تو کوئی نہیں بچا۔"

"تو پھر میری زبان پر اعتبار کرو۔ میں تم لوگوں کا دشمن نہیں دوست ہوں۔ میری دشمنی صرف جاتریوں سے تھی۔ تم سے میری کیا عداوت ہو سکتی ہے۔"

"یہ بات میں تو مان جاؤں گی۔ شاید سوار سدورت بھی مان جائے لیکن دوسرے نہیں مانیں گے۔"

"دوسروں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"بستی کے بڑے بوڑھے' معزز لوگ۔۔۔ جن کے مشورے سے سوار فیصلے کرتا ہے۔ درحقیقت تم نے خود کو ایک سنگین معاملے میں پھنسا لیا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "سفدور کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ وہ خیریت سے تو ہے۔"

"بالکل خیریت سے ہے۔" ناشا نے جواب دیا "بلکہ موج کر رہا ہے۔ دو نہایت خوب صورت لڑکیاں اس کی خدمت گار ہیں۔ اسے بہترین رہائش ملی ہوئی ہے۔ کھانے پینے کو بھی خوب ملتا ہے۔"

میں نے کہا "حیرت کی بات ہے ابھی تک اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"ابھی اور بھی بہت سی "حیرت کی باتیں" تمہارے سامنے آنے والی ہیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گی؟"

"میرے خیال میں یہ وقت ایسی وضاحتوں کے لیے مناسب نہیں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی "میں موقع دیکھ کر پھر آؤں گی۔"

"کیا سفدور تک میرا پیغام پہنچا سکتی ہو؟"

"کوشش کروں گی۔" وہ بولی اور چپ چاپ واپس چلی گئی۔

اس کا رویہ خاصا مبہم اور الجھاؤ والا تھا۔ میں کافی دیر اس رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ سفدور کی غیر حاضری بھی ناقابلِ فہم تھی۔ میری طرح زریں گل بھی اپنی سوچوں میں گرفتار تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک ان خونی مناظر کا عکس نظر آ رہا تھا جو ہم دونوں نے کل سہ پہر پل کے آس پاس دیکھے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑیں' تیز دھار ہتھیاروں کی چمک' مرنے والوں کے خون چکاں جسم اور زخمیوں کی چیخ و پکار۔ وہ سارے واقعات ایسے نہیں تھے کہ آسانی سے بھلائے جا سکتے۔ یوں لگتا تھا کہ جاگتی آنکھوں سے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا ہم نے۔

ہم ایک بار پھر اسی جنجال میں آ پھنسے تھے جس میں سے چند مہینے پہلے بہ مشکل نکل پائے تھے اور یہ سب کچھ۔۔۔ سب کچھ چند عاقبت نااندیش لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ کچھ ایسے حکمران بیوروکریٹ اور سیاسی حضرات جنہوں نے خواہ مخواہ کی محاذ آرائی کی اور اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی سخت مصیبت میں گرفتار کر دیا۔۔۔

پھر میرے خیالات کا دھارا اپنا رخ بدلتے بدلتے سردار رابل کے قبیلے پر جا پہنچا۔ وہ پراسرار بستی جو سنسان پہاڑوں کی بلندی پر واقع تھی' جہاں مقدس بیٹری روشنی کے حوالے سے ایسے شخص کی پرستش کی جا رہی تھی جو واقعی کچھ ناقابل فہم صلاحیتوں کا مالک تھا۔ میرے تصور میں وہ نہایت حسین اور پراسرار آنکھیں آئیں جو میں نے ایک ریشمی پردے کی اوٹ میں دیکھی تھیں۔ میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ کوئی ایسی کیفیت تھی کہ ان آنکھوں میں جسے لفظوں میں بیان کرنا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں۔ ایک بے نام سی ہیبت طاری ہوتی تھی اس ماحول اور ان آنکھوں کا تصور کر کے۔ پھر میں ان شب و روز کے بارے میں سوچنے لگا جو میں اس بستی میں گزار آیا تھا۔ میرے ذہن میں حسین و نوخیز "چشمہ" کی شبیہہ ابھری۔ وہ ہر رات میرے پہلو میں رہی تھی لیکن مجھ سے بہت دور رہی تھی۔ مترجم واحدی جو ہر گھڑی مجھ پر ایک نیا انکشاف کرتا رہا تھا اور کرخت چہرہ "جواناں" جو ایک رات نیزہ دھار برچھا لے کر میری خواب گاہ میں گھس آیا تھا۔

دیر تک اپنے خیالوں میں گم رہنے کے بعد میں کوٹھری کے سنگلاخ فرش پر لیٹ گیا۔ پوری کوٹھری میں ایک ہی بوسیدہ سا گدیلا بچھا ہوا تھا۔ اوپر لینے کے لیے بھی اون سے بھرے ہوئے گدیلے تھے۔ یہ گدیلے وزنی ضرور تھے لیکن نہایت بدبودار اور بوسیدہ تھے۔ اس کوٹھری میں پہنچ کر مجھے اٹک جیل میں گزرے ہوئے دن یاد آ گئے تھے۔

صبح سویرے میری نظر اپنے ساتھی قیدی پر پڑی اور میں دنگ رہ گیا۔ وہ میرا جانا پہچانا چہرہ تھا۔ یہ چہرہ کل تک کوٹھری میں موجود نہیں تھا۔ شاید رات کسی وقت اسے یہاں ٹھونسا گیا تھا۔ وہ نوشاب تھا۔ وہی نوجوان جو چشمہ کا محبوب تھا اور چشمہ کے میرے پاس آنے کے بعد اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر جہاں مجھے حیرت ہوئی وہاں بہت خوشی بھی ہوئی۔ لڑائی سے پہلے مترجم واحدی نے مجھے بتایا تھا کہ نوشاب تین دیگر نوجوانوں کے ساتھ ایک نہایت خطرناک مہم پر گیا ہے اور اس کے زندہ بچ جانے کا امکان بہت کم ہے۔ واحدی نے ان چاروں کی طرف سے مکمل مایوسی کا اظہار کیا تھا لیکن اب میں نوشاب کو بخیر و عافیت اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے مہم میں حصہ نہیں لیا تھا یا شاید وہ خوش قسمت تھا اور بچ نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔

نوشاب بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ نوشاب سے میری صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات اس تربیت گاہ میں ہوئی تھی جہاں مجھے نوجوان لڑکوں کو تربیت دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ نوشاب اس وقت بھی ایسا ہی گم صم اور پژمردہ نظر آیا تھا۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی' خاصا لمبا تڑنگا اور قبول صورت تھا لیکن اس کے چہرے پر چھائی ہوئی محرونی نے اس کی شخصیت کو گہنا رکھا تھا۔ اس "محرونی" کی وجہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ روتی سسکتی چشمہ نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ نوشاب اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا لیکن جب چشمہ قبیلے کے بے رحم رسم کا شکار ہو کر میرے حوالے ہو گئی تو نوشاب کا دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ وہ قبیلے کے دستور سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا لیکن محبت کی چوٹ بھی اتنی شدید تھی کہ ناقابل برداشت تھی۔ وہ زندگی سے ہی بیزار ہو گیا تھا۔ یقیناً یہی بیزاری تھی جس نے اسے ایک نہایت جان لیوا مہم میں حصہ لینے پر آمادہ کیا تھا۔

میں نے زریں گل کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ لڑکے سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ زریں نے کوشش کر کے مقامی زبان میں کسی حد تک اپنا مطلب بیان کر لیا۔ نوشاب کے بارے میں کافی باتیں اسے میری زبانی بھی معلوم تھیں لہٰذا نوشاب سے بات شروع کرنے میں اسے بہت دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کافی دیر الفاظ اور اشاروں کی زبان میں نوشاب سے سر کھپاتا رہا۔ پھر میرے پاس آ کر اس نے ناکامی کا اظہار کر دیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! وہ تو ایک دم چپ ہے۔ بولتا ہے' میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا' کسی سے بھی کوئی بات نہیں چاہتا۔ خو آپ کے بارے میں بھی اس کے دل میں بڑا [illegible] ہے۔ آپ کے بارے میں اس نے ایک دو الٹا سیدھا بات کیا ہے۔ ہم کو اس پر بہت غصہ آ رہا ہے۔"

"نہیں بھئی غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے سمجھایا "وہ بہت دکھی ہے۔ ہمیں اس کا دکھ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

O☆O

اگلے دو روز ہم نے اسی سرد کوٹھری میں گزار دیے۔ سردار سدورت نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ ناشا یا منو سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ اس وادی میں ڈاکٹر بھی ناراشتا سا تھا۔ وہ جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا اور وادی کے لوگ اسی کے علاج معالجے پر انحصار کرتے تھے۔ یقینی بات ہے اسے ہماری آمد کا پتا چل چکا ہوگا لیکن اس نے بھی ہماری خبر نہ لی تھی۔ لگتا تھا کہ صورت حال ہمارے حق میں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ہمیں وہی ناپسندیدہ کھانا زہر مار کرنا پڑ رہا تھا جس کا ذائقہ دل کو مالش پر آمادہ کرتا تھا۔ بچے کھچے میں گستن کی تیز بو سے بھوک ہوا ہو جاتی تھی۔

زریں گل نے مسلسل نوشاب سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ نوشاب اب زریں سے تھوڑا تھوڑا کھلنے لگا تھا۔ اس کی باتوں سے زریں کو معلوم ہوا کہ چار روز پہلے نوشاب کو رات کے وقت پل کے قریب سے گرفتار کیا گیا تھا۔ منصوبے کے مطابق نوشاب دیگر تین جانباز ساتھیوں کے ہمراہ نالے کے کنارے پہنچا تھا۔ کانٹا کنڈا اٹھائے ہوئے وہ چاروں نالے کی عمودی دیواروں سے اترے تھے۔ وہ رسے اور میخیں بھی استعمال نہیں کر سکتے

تھے کیونکہ ان سے آواز پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان کا ایک ساتھی ڈھلوان سے اترتے ہوئے گر کر جاں بحق ہو گیا' جب کہ ایک ساتھی دوبارہ نالا عبور کرتے ہوئے پانی میں بہہ گیا۔ باقی دو ساتھی پل کے نیچے واقع چرخیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان کے پاس لکڑی کی ایک وزنی لٹھ تھی۔ یہ لٹھ انہوں نے پل کی ایک چرخی میں پھنسا دی کہ چرخی حرکت کرنے کے قابل نہ رہی۔ رات کے وقت تند نالے کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن وہ زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے' صبح ہو جاتی تو پل کے نیچے انہیں لازماً دیکھ لیا جاتا۔ انہوں نے سرد پانی میں چھلانگیں لگائیں اور واپس کنارے تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ نالا پار کر چکے تھے لیکن کنارے پر چڑھنے سے پہلے انہیں دیکھ لیا گیا۔ پہریداروں نے انہیں للکارا۔ انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پہریداروں نے فائرنگ کر دی۔ اس فائرنگ میں نوشاب کا ساتھی ہلاک ہوا اور نوشاب کو زندہ پکڑ لیا گیا۔ فائرنگ کے دوران میں نوشاب بھاگتے بھاگتے گرا تھا۔ اس واقعے کی نشانی بازو پر چوٹ کی صورت میں اس کے جسم پر موجود تھی۔

نوشاب کی روداد متاثر کن تھی۔ وہ موت کے منہ سے بچ کر نکلا تھا۔ شاید قدرت کو اس کی زندگی منظور تھی۔ ممکن تھا کہ اس کی سلامتی میں معصوم چشمہ کی دعاؤں کو بھی دخل ہو۔ اس روز دوپہر کے وقت میں نوشاب کے پاس جا بیٹھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اشاروں کنایوں میں اسے بتایا کہ میرے بارے میں اسے غلط فہمی ہے۔ میں ویسا ہرگز نہیں ہوں جیسا وہ سمجھ رہا ہے۔ اس کی محبوبہ "چشمہ" میرے پاس موجود ضرور رہی ہے لیکن اس کے ساتھ میرا کوئی ذہنی یا جسمانی تعلق نہیں رہا۔

میری تمام باتوں کے جواب میں اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میری باتوں کو مطلق اہمیت نہیں دے رہا۔ کوٹھری کے باقی قیدی الجھن سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نوشاب سے کس بات پر تکرار کر رہا ہوں۔

میں نے اپنی مدد کے لیے زریں گل کو بھی بلا لیا۔ زریں گل کے تعاون سے نوشاب کے ساتھ میری جو ٹوٹی پھوٹی گفتگو ہوئی' اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

میں نے کہا "سردار رابل نے چشمہ کو میرے پاس زبردستی بھیجا تھا۔ نہ اس میں میری خواہش کا دخل تھا اور نہ پسند کو۔"

نوشاب نے کہا "تمہاری پسند یا خواہش کو دخل نہیں تھا لیکن وہ لڑکی تو ہے اور خوب صورت بھی ہے۔ میں یہ بات کس طرح مانوں کہ وہ کئی راتوں تک تمہاری خواب گاہ میں رہی' تمہارے بس میں رہی اور پھر بھی بچی رہی۔"

میں نے کہا "تم میری بات کا یقین نہ کرو لیکن اس کی بات پر تو کرو جس سے محبت کرتے ہو۔ محبت تو یقین کرنا سکھاتی ہے' تم کیسی محبت کر رہے ہو۔"

اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا "یہ پیار محبت سب ڈھونگ ہے۔ اگر وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی تو جان دے دیتی لیکن تمہارے بستر پر سونا قبول نہ کرتی۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے میرے بستر پر سونا قبول کیا ہے۔ ایسی نوبت ہی نہیں آئی ہے۔ اگر ایسی نوبت آتی تو ممکن ہے وہ وہی کچھ کر گزرتی جو تم کہہ رہے ہو۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اگر خدانخواستہ میں چاہتا بھی تو چشمہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ جس رات چشمہ کو میری خواب گاہ میں پہنچایا گیا' چشمہ کا ایک بڑا ہمدرد اور خیر خواہ خواب گاہ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ میرے ٹکڑے کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا تھا۔ شاید تمہیں معلوم ہو اس کا نام جواناں ہے۔ وہ چشمہ کے باپ کا دوست ہے۔"

"میں نے یہ ساری کہانی سن رکھی ہے۔" نوشاب نے بیزاری سے جواب دیا "مجھے یقین نہیں ہے ان باتوں پر۔"

"تو پھر کیسے یقین آئے گا تمہیں؟" میں نے قدرے غصے سے کہا۔

میرے غصے نے اسے چونکا دیا۔ وہ کچھ دیر یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "کیا تم کہہ سکتے ہو کہ چشمہ تمہاری ماں اور بہن کی طرح تھی۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے کہا "اگر اتنی ہی بات تھی تو تم نے اس قدر لٹکایا کیوں؟ چشمہ میرے لیے ماں اور بہن کی طرح ہے اور اگر اس سے بڑھ کر بھی کوئی مقدس رشتہ ہو سکتا ہے تو میں وہ بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس لیے کہ میرا دل اور میرا ذہن بالکل صاف ہے۔"

نوشاب جذباتی انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ پھر وہ ایک دم سسک پڑا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے کندھے سے لگا لیا۔ ہمدردی پا کر اس کا دل اور بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کوٹھری کے باقی قیدی تعجب سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

O☆O

بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہمارے ارد گرد کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ اس بندی خانے میں رہتے ہوئے باہر کے حالات کے متعلق اندازہ لگانا قطعی مشکل تھا۔ پہریداروں کا رویہ بھی قیدیوں سے اچھا نہیں تھا جو لڑائی میں گرفتار ہو کر یہاں آئے تھے۔ انہیں ڈانٹا ڈپٹا جاتا تھا اور کھانا بھی کم ملتا تھا۔ ہم بھی ان قیدیوں میں شامل تھے۔ میں نے انچارج پہریدار سے کئی بار کہا تھا کہ میں سردار سدورت سے ملنا چاہتا ہوں لیکن اس نے نہ صرف میری بات کو نظر انداز کیا تھا بلکہ بے طرح مجھے گھورا بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ لڑائی میں گرفتار ہونے والے ہر شخص کو یہاں کے پہریدار کچا کھا جانا چاہتے ہیں۔ شاید اس طیش کا سبب وہ

یقینی نقصان تھا جو الپ وادی کو سوار رفیل کے اچانک حملے کی وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔

زریں گل اکثر نوشاب کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ نوشاب کی آنکھوں میں ایک بار پھر زندگی کی مدھم چمک نظر آنے لگی تھی۔ اس کی خاموشی بھی کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ وہ زریں کے علاوہ دیگر قیدیوں سے بھی باتیں کرتا تھا۔ تمام قیدی نوشاب سے بے حد متاثر تھے۔ ظاہر ہے اس نے پورے قبیلے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی تھی اور اپنے لشکریوں کے لیے ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کارنامہ بھی اس کے قبیلے کو شکست سے ہمکنار نہیں کر سکا تھا۔ بہرحال ہار جیت تو لڑائی کا حصہ ہوتی ہے۔

زریں نے مجھے بتایا کہ نوشاب اپنے پچھلے رویے پر بہت پچھتا رہا ہے۔ اسے افسوس ہے کہ اس نے چشمہ کی گریہ زاری سے کیوں اثر نہ لیا اور اس کی بات پر کیوں یقین نہ کیا۔ اب ان کے درمیان اس بندی خانے کی دیواریں ہیں۔ وہ اس تک اپنے خیالات بھی نہیں پہنچا سکتا۔

میں نے کہا "زریں گل' مایوسی کی قید سے بڑھ کر کوئی قید نہیں ہوتی۔ اب اس میں امید جاگی ہے تو قسمت بھی جاگے گی۔ وہ ضرور آزاد ہو گا۔۔۔ مجھے توقع ہے کہ اسے چشمہ کے سامنے شرمندگی سے سر جھکانے کا پورا پورا موقع ملے گا۔"

زریں گل ایک دم اداس ہو گیا۔ بولا "پتا نہیں ام کو بھی ایسا موقع ملے گا یا نہیں۔"

"کیا مطلب۔ تم کس سے معافی مانگنا چاہتے ہو؟"

"کلثوم سے جناب۔۔۔۔ اور کس سے؟"

"بابیں! تم نے کیا گناہ کیا ہے کہ معافی مانگنا چاہتے ہو؟"

"عشق سے بڑا گناہ اور کیا ہو گا استاد صیب۔ ام نے اس سے عشق فرمایا اور پھر اس کا آرزو بھی پورا نہ کر سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ ام اس کے ساتھ وادی میں رہ جائے لیکن ام اس کو روتا چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلا گیا۔ اگر ام کو معلوم ہوتا کہ پھر یہیں آنا ہے اور آپ کو بھی آنا ہے تو شاید ام یہیں رہ جاتا۔"

زریں گل کا چہرا ایک دم لٹکا ہوا تھا۔ میں نے کہا "تمہارا چہرا دیکھ کر آج مجھے بھی ایک گانا یاد آ رہا ہے۔ قمر شہنائی کا گانا تھا' تجھے اپنے دل سے ہم نے۔۔۔۔ کچھ اس طرح کا تھا۔" میں نے جان بوجھ کر گانا ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ فوراً بولا "تجھے اپنے دل سے ام کیسے بھلا دے' تیرا یاد ہی تو امارا زندگی ہے۔"

"بالکل یہی۔" میں نے تائید کی۔

چند سیکنڈ کے لیے خوش رہنے کے بعد زریں گل کا چہرا ایک بار پھر لٹک گیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! ویسے ام کو آپ پر بھی افسوس ہے۔"

"کس بات پر؟"

"دیکھیں اس دن کلثوم کا بیا بس ناشا' ام سے ملنے اس بندی خانے میں آیا۔ آپ نے اس سے دنیا جہان کا باتیں کیا لیکن کلثوم کے بارے میں کوئی بات نہیں کیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ تم امارا بالکل بھی خیال نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم تو انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ تجھے کیا معلوم ہوا کہ ہم نے کلثوم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

"امارا خیال ہے کہ اب آپ بات کو مذاق میں ٹالنے والا ہے۔ یہ بات مذاق کا نہیں ہے استاد صیب! فکر کی وجہ سے کہیں امارا دل ٹھک ٹھک پھٹ جائے گا پھر آپ کو پتا چلے گا ام کلثوم کے کتنا سیریس تھا۔"

"سیریس نہیں سیریس۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں جی۔" زریں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "وہ سائیں عالی صیب بھی پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اگر وہ امارے ساتھ ہی پکڑا جاتا اور یہاں ہوتا تو شاید امارا کچھ مدد کر سکتا۔"

میں نے کہا "وہ بے گناہ تھا اگر وہ بچی ہوئی چیز ہے تو وہ پکڑا کیوں جاتا۔ تمہیں یوں کہنا چاہیے کہ اگر ہم اس کے ساتھ پکڑے جاتے تو شاید وہ ہماری کچھ مدد کر سکتا۔ بہرحال اب سانپ کی لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تم دیکھو اور تحمل کی دھار۔"

زریں نے کہا "آپ کا خیال ہے۔۔۔۔ کیا ناشا دوبارہ یہاں آئے گا؟"

"کیوں' کیا اب اس سے عشق لڑانا ہے؟"

"نہیں استاد صیب! کچھ باہر کے حالات بالات کا پتا تو چلے گا۔"

"باہر کے حالات کا پتا ایک اور طریقے سے بھی چل سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"کسی طرح ڈاکٹر جبری کو یہاں بلا لیا جائے۔"

"چھاؤنی سفید چٹری والا بابا لیکن وہ یہاں کیسے آئے گا؟"

"تمہارے بیمار ہونے سے۔"

"ام سمجھا نہیں۔"

"وہ یہاں کا اکلوتا سمجھدار ڈاکٹر ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی شدید بیمار ہو جائے تو شاید ڈاکٹر جبری اسے دیکھنے یہاں چلا آئے۔"

"ہاں یہ بات تو آپ کا ٹھیک ہے۔ اگر آپ کہیں تو ام بیمار ہو جائے۔ ام تو ویسے بھی خود کو بہت بیمار محسوس کر رہا ہے۔"

"یہاں بیمار عشق کی نہیں صرف بیمار کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "میرے خیال میں اس کام کے لیے نوشاب مناسب رہے گا۔"

"کیا مطلب؟"

سیما غزل کا

شاہکار ناول

دو حصّوں میں مکمل

اول ۱۲۰/۰۰ روپے — دوم ۱۲۰/۰۰ روپے

ایک دوشیزہ کی کہانی جو اپنی شناخت کی تلاش میں نکلی اور عذابوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

براہ راست منگوانے کا پتہ:

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون: ۷۲۴۷۳۱۴

"اس کا بازو زخمی ہے۔ وہ پرسوں کافی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ اپنی تکلیف کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کرے اور پہریداروں سے درخواست کرے تو ممکن ہے کہ وہ ڈاکٹر کو یہاں لے آئیں یا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔"

"وہ تو ہم سب کو بھوکا مارنے کے چکر میں ہے' وہ ڈاکٹر کہاں لائے گا۔"

"ابھی تجویز کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔"

زریں بولا "ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ بیماری کا ایکٹنگ کریں تو آپ کے لیے ڈاکٹر بلا لیا جائے۔ آپ بہرحال پہریداروں کے لیے زیادہ اہم قیدی ہے۔ آپ کو سوار سدرت کے دوست کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ ویسے بھی سب پہریدار آپ کو جانا پہچانا ہے۔"

"لیکن میں تو اسی صورت میں بیمار ہو سکتا ہوں اگر واقعی بیمار ہو جاؤں۔ مجھ سے ایکٹنگ ہی نہیں ہوگی۔"

"ہم نے آپ سے کہا تھا نا کہ خدا کے کارخانے میں کچھ بھی بیکار نہیں ہے۔ حتیٰ کہ فلمیں بھی بیکار نہیں ہیں۔ اگر آپ فلمیں دیکھتا تو آج آپ کے لیے ایکٹنگ کا مشکل نہ ہوتا۔"

"پاکستانی فلموں میں ایکٹنگ ہوتی۔ . ." میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہو اور بات کرو۔" زریں نے سر جھٹک کر کہا "ہمارے پاکستانی اداکاروں جیسا ایکٹنگ اور کون مائی کا لال کرے گا۔ ایک طرف ہمارے سلطان راہی اور یوسف خان کو کھڑا کرو' دوسری طرف ہالی ووڈ کے تمام فرنگی اداکاروں کو کھڑا کرو۔ ہمارا دونوں شیر جوان ان کو دو بڑکوں میں آگے نہ لگا لے تو ہمارا نام نہیں۔ اب آپ ہی ذرا سوچ کر بتائیں سلطان راہی کی ڈانگ کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے۔ گریگری پیک جیسا اداکار دس دفعہ بھی پیدا ہو جائے تو سلطان راہی کی دو ڈانگیں نہیں کھا سکتا اور وہ جو عمر شریف ہے سونے کی تلاش والا' لالے سدھیر کی ایک بڑک کی مار نہیں ہے۔ اعلانیہ (المیہ) اداکاری میں بھی ہمارے اداکاروں کا جواب نہیں ہے۔ اب آپ ہی ذرا انصاف سے بتائیں اگر اعلانیہ اداکاری میں شبنم اور الزبتھ ٹیلر کا مقابلہ کرایا جائے تو کون جیتے گا۔ شبنم ایسے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور ہونٹ ٹیڑھا کر کے کہتی ہے کہ "سرتاج ام ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جائے گا۔" تو عورتیں دھاڑیں مار مار کر روتا ہے۔ کیا الزبتھ ٹیلر ایسے دھاڑیں مروا سکتا ہے؟ اور مزاحیہ اداکاری میں جس طرح ہمارا رنگیلا صاحب ہونٹ ہلاتا ہے' چارلی چیپن ایک دفعہ چلائے تو اس کی ٹانگ میں گھل پڑ جائے۔"

"چارلی چیپن نہیں چارلی چیپلن۔" میں نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہے ہمارے رنگیلے کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا نا۔"

"یار بات کہاں کی تھی' تم کہاں لے گئے ہو۔ میرا مطلب تھا کہ . . . ."

میرا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا۔ ایک شخص ہماری کوٹھری کی طرف آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا منہ کھلا رہ گیا۔ یہ وہی تھا جس کے بارے میں ہم باتیں کر رہے تھے اور جسے یہاں بلانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ یعنی ڈاکٹر ہنری۔ گھنی سفید بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھوں نے حرکت کی اور میرے چہرے پر جم گئیں۔ اس کے جھریوں سے بھرے ہوئے سرخ و سپید چہرے پر شناسائی کا تاثر تھا مگر وہ اس شناسائی کا اظہار کھل کر نہیں کر رہا تھا۔ اس نے عام سے لہجے میں مجھے مخاطب کیا "ہیلو شاہ جہاں کیسے ہو؟"

"قسمت مزے میں ہوں۔" میں نے طنز سے کہا "اس بندی خانے سے بہتر رہنے کی جگہ یہاں اور کون سی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن اس جگہ کا انتخاب بھی تو تم نے خود ہی کیا ہے۔" وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولا۔

"کیا تم میری صفائی سنے بغیر ہی مجھ پر فرد جرم عائد کر دو گے؟"

"میں فرد جرم عائد کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ یہ کام سوار سدرت اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔" ڈاکٹر ہنری نے کہا اور قیدیوں اور مادا روں کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

وہ سلاخوں کے باہر سے مادا روں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک معاون بھی تھا۔ معاون کے ہاتھ میں ایک بکس تھا۔ جس میں دوائیں اور مرہم پٹی کا سامان تھا۔ دو مسلح محافظ بھی ہنری کے ساتھ تھے۔ ان محافظوں کے بال ان کے کندھوں تک پہنچ رہے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں۔

ڈاکٹر ہنری نے نوشاب کے بازو کا معائنہ بھی کیا۔ زخم کی مرہم پٹی کی اور کھانے کے لیے بھی دوا دی۔ پھر وہ میرے پاس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیتھو اسکوپ بھی تھا۔ وہ یونہی میرے سینے کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر دھیمی آواز میں بولا "میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا شاہ جہاں! لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم دونوں کے لیے بڑی مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ تم لڑائی میں پکڑے گئے ہو اور لڑائی میں پکڑے جانے والوں کے خلاف بستی میں بہت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں ایک سو ایک مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ ہم لڑائی کرنے والوں میں شامل نہیں تھے۔"

"تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا' اس کا ثبوت درکار ہے۔"

"ثبوت وہی پہریدار دے سکتے ہیں جن سے میں نے بات کی تھی اور انہیں بتایا تھا کہ سوار رائل کسی بھی وقت ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سوار سدرت سے ملنے کا موقع دیں۔"

"لیکن ان میں سے تو شاید ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ اگر وہ زندہ ہوتے بھی تو ان کے بیان سے تم صاف بری نہیں ہو سکتے تھے۔

تم پر الزام تو پھر بھی باقی رہتا تھا کہ تم رائل قبیلے کی بستی میں سوار کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر رہے ہو اور بستی کے نوجوان تم سے تربیت بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا! آپ کسی طرح سوار سدرت یا صلور سے میری ملاقات نہیں کرا سکتے؟"

وہ بولا "میں کوشش کروں گا لیکن یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیا صلور سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟"

"جس دن تم دونوں کو اس بندی خانے میں لایا گیا تھا اس دن وہ مجھے ملا تھا۔ سوار سدرت بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں لڑائی میں زخمی ہونے والے افراد کی تیمارداری کے لیے میرے شفا خانے میں آئے تھے۔ صلور کو تم دونوں کی گرفتاری کا علم تھا اور وہ اس وجہ سے پریشان اور گم صم نظر آتا تھا۔"

"اس نے گرفتاری کے سلسلے میں آپ سے کوئی بات نہیں کی؟"

"شاید وہ کرتا لیکن سوار سدرت کی موجودگی میں موقع نہیں ملا۔"

میں نے ڈاکٹر ہنری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ کا کیا خیال ہے۔ گرفتار شدگان کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟"

اس کی آنکھوں میں تشویش سی لہرا گئی۔ بولا "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ گرفتار ہونے والوں کی تعداد تین چار سو کے لگ بھگ ہے۔ ان سب کے بارے میں ایک جیسا فیصلہ تو نہیں ہوگا۔ کچھ کو کڑی سزا ملے گی اور کچھ کو نرم۔ ممکن ہے کہ کچھ زخمیوں کو رحم کھا کر چھوڑ دیا جائے۔ ویسے رحم کرنا اس وادی کی روایت تو نہیں ہے۔"

"سزا کے بارے میں فیصلہ کون کرتا ہے؟"

"یہ اکیلے سوار سدرت کا کام نہیں ہے۔ قبیلے کے دستور کے مطابق کچھ بزرگ حضرات سوار کے مشیر ہیں۔ تم انہیں مشاورتی کونسل بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ سب لوگ مل جل کر ہی کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق مشاورت والوں کا رویہ لڑائی میں پکڑے جانے والوں کے متعلق خاصا سخت ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رائل کے حملے میں قبیلے کا کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ مرنے والوں میں سات آٹھ اہم سوار بھی شامل ہیں۔"

ڈاکٹر ہنری یقیناً مجھ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن پہریدار سر پر کھڑے تھے اور اضطراب کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے کھڑا ہو گیا "بہرحال گھبرانے کی بات نہیں۔ خدا اچھا ہی کرے گا۔ میں اپنے طور پر کوشش کر رہا ہوں اور یقیناً صلور بھی کچھ نہ کچھ کر رہا ہوگا۔"

ڈاکٹر ہنری چلا گیا اور ہمارا رابطہ ایک بار پھر باہر کے حالات سے کٹ گیا۔

O☆O

یہ تیسرے روز سہ پہر کی بات ہے۔ چند پہریدار ہماری کوٹھری کے دروازے پر پہنچے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ ایک پہریدار نے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دوسرا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں تین ہتھکڑیاں تھیں۔ ایک ہتھکڑی مجھے اور دوسری زریں گل کو لگائی گئی۔ تیسری ہتھکڑی ہماری ہی کوٹھری کے ایک عمر رسیدہ دادار صاحب کے لیے تھی۔ ہتھکڑیاں لگا کر ہم تینوں کو کوٹھری سے نکالا گیا اور بندی خانے سے باہر لایا گیا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی پھر بھی ہوا تیز اور سرد تھی۔ چشمے کی گزرگاہ میں پانی کی فراوانی تھی۔ پگھلی ہوئی برف پانی کی سطح پر کپاس کی پھٹکیوں کے مانند تیر رہی تھی۔ گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بلندی کی طرف بڑھتے ہوئے ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ نیم گرم سرنگ میں داخل ہوتے ہی جیسے سکون سا آ گیا۔ یہ سرنگ اس وادی میں گوشۂ عافیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ جلد ہی ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں روشنی کرنے اور آگ وغیرہ جلانے کی اجازت تھی۔

سرنگ کی ذیلی شاخیں بھی تھیں اور ان شاخوں میں رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے حجرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ہر حجرے کو بند کرنے کے لیے لکڑی کا ایک دروازہ موجود تھا۔ یہ حجرے اندر سے بہت آرام دہ اور نفیس تھے۔ مجھے ایسے ہی ایک حجرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر بے اختیار اپنی چٹکی سے کاٹنے کو دل چاہا۔ حجرے نما کمرے میں دو سراپا قیامت حسینائیں میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ان میں ایک مقامی تھی اور دوسری چینی یا جاپانی نظر آتی تھی۔ کمرا نیم گرم تھا لہٰذا دونوں لڑکیاں مختصر بلکہ ہیجان خیز لباس میں تھیں۔ کمرے میں شراب اور خشک فروٹ کے علاوہ کھانے پینے کی دیگر اشیا بھی موجود تھیں۔ مجھے کمرے میں پہنچا کر پہریداروں نے میری الٹی ہتھکڑی کھول دی اور دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ پہریداروں کے رویے میں خاطر خواہ نرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ یخ بستہ بندی خانے سے یہاں پہنچ کر یوں لگتا تھا جیسے تانگا پربت کی چوٹی سے اتر کر ایک دم نرم گرم ریشمی لحاف میں گھس گیا ہوں۔ جاپانی لڑکی نے مسکرا کر میرا استقبال کیا پھر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی "تم بہت تھکے ہوئے ہو گے' اگر تم چاہو تو ہم تمہارے جسم کو مساج کر سکتی ہیں۔ تمہاری ساری تھکاوٹ منٹوں میں دور ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "لگتا ہے تم کو کسی مساج گھر سے سیدھی یہاں چلی آئی ہو۔"

اس کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا گیا۔ بولی "میں معافی چاہتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں معافی چاہتی ہیں۔ آپ جتنے دن یہاں رہیں گے ہمارے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم آپ کو اپنے اور اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گی۔ اس کے علاوہ جس قسم کی خدمت جس وقت بھی درکار ہو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔"

لڑکی نے بظاہر یہ بات مسکرا کر کہی تھی لیکن اس کے لہجے کے پیچھے اختار رہے کی تفکیت چھپی ہوئی تھی۔

میں نے لڑکی کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام چنگ اور اپنی ساتھی کا نام رالی بتایا۔ اس نے بتایا کہ رالی بہت اچھا گاتی بھی ہے۔

سرنگ کی فضا گرم تھی۔ مجھے اپنے گرم کپڑوں میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنا موٹا اونی لبادہ اتار دیا۔ جاپانی لڑکی چنگ کے ہاتھ میری قمیص کی طرف بڑھ گئے۔ اس نے بڑی نفاست سے میری قمیص میرے جسم سے علیحدہ کردی۔ مقامی لڑکی نے میرے جوتوں کے تسمے کھول دیے۔ میں قالیچے پر بیٹھا تو اس نے جوتے اتار کر ایک طرف ڈال دیے۔ دونوں لڑکیاں بڑے ساحرانہ انداز میں میرے قریب تر آ رہی تھیں۔ وہ میرا مساج کرنا چاہ رہی تھیں اور اگر وہ "صرف" مساج کرنا چاہ رہی تھیں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ جاپانی لڑکی اس فن میں خاص طور پر ماہر نظر آتی تھی۔ وہ میرے بازوؤں اور ٹانگوں کو مخصوص انداز میں حرکت دینے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی ہر حرکت میرے جسم سے تھکاوٹ کو علیحدہ کر رہی تھی۔ جیسے یہ تھکاوٹ کوئی غیر مرئی چیز نہ ہو بلکہ دکھائی دینے والی ہو اور چنگ اسے اپنے ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر علیحدہ رکھتی جا رہی ہو۔ اس نے مقامی لڑکی کی مدد سے میرے سینے، پیٹ، پشت اور ٹانگوں پر کسی خاص چکناہٹ سے مالش کی۔ اس دوران میں ایک ملازمہ گرما گرم کھانا بھی لے آئی۔ یہ کھانا گوشت، زردہ اور کئی کی چند خوشبودار لمبوتری روٹیوں پر مشتمل تھا۔ آج کئی روز بعد مجھے ڈھنگ کا کھانا نصیب ہوا تھا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کچھ تو مساج کی وجہ سے سکون کی سی کیفیت تھی، کچھ کھانے نے خمار طاری کر دیا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

میں نے جاپانی لڑکی چنگ سے پوچھا "وہ دو افراد جو میرے ساتھ آئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

وہ ذرا شوخی سے بولی "وہ دونوں بھی یہیں ہیں۔ تمہاری جیسی سہولتیں انہیں بھی حاصل ہیں۔"

"کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟"

"مل سکتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ یہ کام صبح پر اٹھا رکھیں۔"

میں بستر پر دراز ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے صنوبر یا نثار وغیرہ کی کوشش رنگ لے آئی ہے اور ہمارے سلسلے میں سردار صدرت نے نرمی اختیار کر لی ہے۔ اب یہ بھی ممکن تھا کہ صبح ہماری ملاقات صنوبر سے بھی ہو جائے۔ صنوبر پر مجھے پورا بھروسا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے طوفان میں چٹان کی طرح ڈٹ جانے والا دوست تھا۔ اس کی باخبری اور بلند ہمتی بھی ہر شے سے بالاتر تھی۔

میری پلکوں کو نیند سے بوجھل دیکھ کر مقامی لڑکی نے چراغ کو پھونک مار دی تھی۔ اب کمرے میں ایک ریشمی اندھیرا سرسرا رہا تھا۔ میرے بالکل قریب دو آفت زادیاں موجود تھیں۔ ان کے جسموں کی آنچ مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں اس آنچ کو محسوس کرتے کرتے گہری نیند سو گیا۔

اگلا دن اسی پُر آسائش انداز میں طلوع ہوا۔ جنگلی گلابوں کی طرح کھلی کھلی دونوں لڑکیوں نے گرما گرم ناشتے کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ ناشتے کے فوراً بعد میں زریں گل سے ملنے اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر مسلح پہریدار موجود تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اس سے پوچھا کہ میرا ساتھی کدھر ہے۔ اس نے ہاتھ سے ایک قریبی کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے دروازے پر دھیمی دستک دی۔ ایک مقامی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ زریں گل سامنے ہی قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے چت لیٹا تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے حواس میں آیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "کیسی گزر رہی ہے؟"

وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا "تو استاد صیب! ام کو لگ رہا ہے کہ کل سہ پہر فوت ہو گیا تھا۔ فرشتوں نے ام کو دولوی موت کے بندی خانے سے اٹھا کر سیدھا جنت میں لا اتارا ہے۔ بے شمار نعمتوں کے علاوہ دو دو حوریں بھی اماری خدمت پر لگا دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "کچھ ہوش کے ناخن لو۔ یہ جنت نہیں وادی کی سرنگ ہے اور ہم ابھی تک پورے کے پورے جنگیوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ لڑکیاں حوریں نہیں بلکہ ان سہولتوں کا حصہ ہیں جو ہمیں یہاں مہیا کی گئی ہیں۔ ایسی ہی دو عدد سہولتیں میرے کمرے میں بھی موجود ہیں اور ایک "سہولت" نے تو اتنا مختصر لباس پہن رکھا ہے کہ...... تیرے دادا حضور دیکھ لیتے تو پھر سے جوان ہو جاتے۔"

زریں گل نے کہا "استاد صیب! اماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کہاں اتنی سختی اور کہاں ایسی نرمی...... یہ لڑکیاں تو امارے اوپر ایسا گرا پڑ رہا ہے جیسے گڑ پر مکھیاں گرتا ہے۔ اگر ام کلثوم پر عاشق نہ ہو چکا ہوتا تو کل رات ان دونوں میں سے کسی ایک پر ضرور عاشق ہو جاتا اور کیا پتا کہ دونوں پر ہی عاشق ہو جاتا۔"

"ہاں اندھیرے میں تیرے جیسے عاشق ایسا بھی کر گزرتے ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ بولا "ام کو تو لگتا ہے استاد صیب! یہ سب صیدو صیب کا کیا دھرا ہے۔ ان کی وجہ سے ام پر یہ نرمی برتا گیا ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچ انداز میں بولا "ویسے ایک بات امارے دماغ میں بھی بار بار آرہا ہے کہ اگر یہ سب صیدو صاحب کی وجہ سے ہوا ہے تو پھر وہ تیسرا بندہ امارے ساتھ کیوں یہاں آیا ہے۔ صیدو صیب کو اس سے کیا ہمدردی ہو سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"وہ امارے اس ساتھ والے کمرے میں ہے۔ ویسے وہ جتنا بوڑھا نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ رات اس نے جی بھر کر شراب پی

پھر اٹھ کر ناچنے لگا۔ خو امارا خیال ہے کہ وہ اپنے حصے کی حوروں...... میرا مطلب ہے کہ لڑکیوں سے بھی جی بھر کر مستیاں کرتا رہا ہے۔ لڑکیوں کا دبا دبا ہنسی اور اس کے قہقہے ام کو صاف سنائی دے رہا تھا......"

"یعنی اس نے اپنی "سہولتوں" سے فائدہ اٹھایا ہے؟"

"جی ہاں۔"

اچانک ہمیں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ کئی افراد باتیں کرتے ہوئے سرنگ کے اس حصے میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازے میں سے باہر جھانکا۔ باہر کا منظر توجہ طلب تھا۔ پانچ چھ افراد محافظوں کے نرغے میں اندر آئے تھے۔ ان سب کو الٹی ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ لڑائی میں پکڑے جانے والے بلار تھے اور اسی بندی خانے سے لائے گئے تھے جہاں سے کل سہ پہر ہمیں لایا گیا تھا۔ ہماری ہی طرح ان بلاریوں کو بھی مختلف کمروں میں پہنچا دیا گیا۔ یقیناً ان کی ہتھکڑیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔

زریں گل نے پوچھا "کیا معاملہ ہے استاد صیب!"

"تمہاری ہی طرح پانچ چھ قیدیوں کی بھی عزت افزائی ہوئی ہے۔" میں نے کہا "جن میں ہمارا احترام احمدی بھی شامل ہے۔"

"یعنی اس جنت میں جنتیوں کا اور حوروں کا آبادی بڑھ رہا ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

کچھ دیر تک زریں گل کے پاس بیٹھ کر اور اسے ہدایات وغیرہ دے کر میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

کئی دنوں کی بے تحاشا سردی سے اکڑا ہوا جسم سرنگ کی خوشگوار حرارت پا کر بہت آرام محسوس کر رہا تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر سویا تو شام کے بعد تک سوتا رہا۔

اٹھا تو طبیعت کافی ہشاش بشاش تھی۔ اس برفانی وادی میں سرنگ واقعی جائے سکون و راحت تھی۔ خاص طور سے یہ کمرے تو نہایت پر آسائش تھے۔ دبیز قالین، گدے، غالیچے اور روشنی کا مناسب انتظام۔ یہ کمرے چاروں طرف سے بند تھے پھر بھی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میری "خدمت" پر مامور دونوں دوشیزائیں آج مختلف لباس میں نظر آ رہی تھیں۔ جاپانی دوشیزہ چنگ کا لباس تو کل ہی کی طرح مختصر تھا لیکن مقامی لڑکی کندھوں سے پنڈلیوں تک لباس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ پیراہن اتنا چست اور باریک تھا کہ "چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والا معاملہ تھا۔

ان دونوں نے بناؤ سنگھار کر رکھا تھا اور آج بھرپور طرح مائل بہ کرم نظر آتی تھیں۔ ان کی ہر ادا لبھانے والی اور ہر حرکت دعوت انگیز تھی۔ ایسی آفت زادیوں کے ساتھ بسر کرنا ایک آفت سے کم نہیں تھا...... اچانک میرے ذہن میں ایک خیال برق کی طرح کوندا اور میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔

میں جہاں بیٹھا تھا وہاں پتھر کی طرح ساکت بیٹھا لرز گیا تھا۔ میرے تصور میں بدنصیب صحافی شاہد خاں کا چہرہ تھا۔ وہی شاہد خاں جسے سزا کے طور پر تماشا گھر میں بدمست سانڈوں کے آگے پھینک دیا گیا تھا۔ سزا دینے سے پہلے اسے بھی تو ہماری ہی طرح آٹھ دس روز تک بہت عیش و عشرت میں رکھا گیا تھا...... بالکل...... ہاں بالکل ایسا ہی آرام دہ کمرا تھا جہاں میں نے شاہد خاں کو شراب کے نشے میں دھت، عورتوں سے لپٹتے چمٹتے دیکھا تھا۔ پورے ایک عشرے یعنی تقریباً دس روز تک اسے اس وادی میں ہر آرام و عیش حاصل رہا تھا اور پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بالکل جیسے قربانی کے کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے خوب عزت دی جاتی ہے، خوب کھلایا پلایا جاتا ہے "کہیں ہمارے ساتھ بھی تو کوئی ایسا ہی سانحہ رونما نہیں ہونے والا؟" یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح میرے پیکرِ خیال کو چھید گیا۔ میں غیر ارادی طور پر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ لڑکیوں سے اس بارے میں کچھ پوچھنا فضول تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی جواب نہیں دیں گی۔ اوپر سے جتنی سادہ نظر آتی تھیں اندر سے اتنی ہی گہری تھیں۔ پہریداروں سے بھی کسی قسم کی توقع رکھنا عبث تھا۔ میری بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میں کہاں تک آزادی سے جا سکتا ہوں۔ ایک پہریدار تو کمرے کے بالکل عین سامنے موجود تھا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی...... لیکن جب میں آٹھ دس قدم آگے ایک موڑ پر پہنچا تو دو عدد گن بردار پہریداروں نے میرا راستہ روک لیا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بتایا کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ نیچی چھت والی تنگ سرنگ میں مشعل جل رہی تھی اور اس مشعل کی روشنی میں پہریداروں کے چہرے کچھ زیادہ ہی سنگین نظر آ رہے تھے۔ سرنگ مجھے اپنے بالکل سامنے تقریباً نصف فرلانگ تک دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں اور بھی پہریدار موجود تھے...... اور یہ سرنگ کی ذیلی شاخیں تھیں۔ یقیناً بڑی سرنگ اور دہانے پر بھی پہریدار موجود تھے۔ اتنے لوگوں سے بچ کر باہر نکل جانا ناممکنات میں سے تھا...... مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوا...... تصور میں وہ تماشا گھر آ گیا جہاں میں نے شاہد خاں کی بے بسی اور اذیت ناک موت کا منظر دیکھا تھا۔ نوکیلے سینگوں والے سانڈ، خون اگلتا برہنہ جسم اور تماشائیوں کی چیخ پکار کیا وہ سب کچھ ہمارے ساتھ بھی ہونے والا تھا؟ یہ خیال ہی سوہانِ روح تھا۔

میں اپنے کمرے کی طرف پلٹا تو ایک جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ نوشاب تھا "تم یہاں؟" میں نے تشویش آمیز حیرت سے پوچھا۔

اس نے اشاروں سے بتایا کہ کل جو بلار بندی خانے سے یہاں آئے ہیں وہ ان کے ساتھ تھا۔

بندی خانے کے سو جہنم سے یہاں پہنچ کر وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھوک اور بے آرامی نے جو زردی کھنڈر رکھی تھی وہ بھی اب کم نظر آتی تھی۔۔۔ اس کے چہرے پر سب سے اہم آنکھیں تھیں۔ بولتی ہوئی ذہین آنکھیں۔ جب سے اسے اس بات کا یقین ہوا تھا کہ چنتر اس سے جھوٹ نہیں بول رہی (اور وہ آج بھی وہی پہلے والی چنتر ہے) اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک اُجاگر ہو گئی تھی۔ اب بندی خانے سے اس آرام دہ سرنگ میں آکر یہ چمک اور نمایاں ہوئی تھی۔ یقیناً اس کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی تھی۔ اسے توقع پیدا ہو گئی تھی کہ شاید وہ اس وادی موت سے بچ کر واپس اپنے قبیلے میں پہنچ جائے۔ پھر اس صورت کو دیکھ سکے جس کے لیے اس کی راتیں بے آرام اور دن بے سکون ہیں۔

انسان اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اکثر اوقات اس کے سارے تخمینے، اندازے اور منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھی والا یہ سرخ و سپید نوجوان بھی اپنے مستقبل سے قطعی بے خبر تھا۔ وہ بندی خانے سے اپنی رہائی کو نیک شگون سمجھ رہا تھا، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ "شگون" اس کے لیے موت کا پروانہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا سینہ دکھ کی شدت سے جل اٹھا۔ بہر حال میں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں تو شدید پریشانی کے عالم میں مبتلا تھا ہی، اپنے ساتھ دوسروں کو کیوں کرتا۔۔۔ اور پھر ابھی کچھ واضح بھی تو نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ میری بھیانک سوچ غلط ہی ثابت ہو۔

میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ رات آہستہ آہستہ اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ یہ حسین شبستان الف لیلوی منظر پیش کر رہا تھا۔ شراب کی صراحیاں، عورتیں، تماشا گاہوں کی طرف سے آنے والی موسیقی کی مدھم لہریں اور پکوانوں کی خوشبو لیکن میں اس ہوتی ہوا ماحول سے کوسوں دور تھا۔ میں گاؤ تکیے کے سہارے گم صم بیٹھ گیا۔ جاپانی لڑکی چنگ اور مقامی دوشیزہ رابی میرے قریب بیٹھ گئیں۔ وہ اپنی اداؤں سے میرا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں زیادہ بیزاری بھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یوں انہیں کسی طرح کا شک ہو جاتا۔

جاپانی چنگ بولی "گانا سنو گے؟"

"ہاں سناؤ۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔

وہ کھکھلا کر ہنسی "میں نہیں۔۔۔ یہ سنائے گی۔" اس کا اشارہ رابی کی طرف تھا۔

اس نے رابی کو اشارہ کیا۔ وہ ایک کونے سے ایک سارنگی جیسا ساز اٹھا لائی۔ بڑے انداز سے نشست جما کر اس نے ساز اپنی گود میں رکھا۔ پھر اس کی پتلی پتلی خوب صورت انگلیاں ساز پر حرکت کرنے لگیں۔۔۔ وہ گانے لگی۔ یہ مقامی زبان کا گانا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن آواز پُرسوز تھی اور رگ رگ میں اتر رہی تھی۔ اس گانے کا ساتھ دیتے ہوئے چنگ نے ہولے ہولے تھرکنا شروع کر دیا۔۔۔ پھر وہ باقاعدہ رقص کرنے لگی۔ گداز قالین پر اس کے دودھیائی پاؤں بڑی نزاکت سے حرکت کرنے لگے۔ وہ مختصر لباس میں تھی۔ لیمپ کی سفید روشنی میں اس کا جسم شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ رقص کرتے کرتے اس نے بلوری صراحی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔

مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں تھا اور ویسے بھی شدید پریشانی نے گھیر رکھا تھا لیکن رابی کی آواز پھر بھی اچھی لگی۔ ایک خاص قسم کا گداز اور سوز تھا اس آواز میں۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں فرزانہ کی شبیہ ابھرنے اور مٹنے لگی۔ میں فرزانہ کو اس کے شوہر نامدار کے ساتھ قلات میں چھوڑ آیا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ میں جانتا تھا، جیسے میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں وہ بھی میرے متعلق سوچتی ہو گی۔ خدا معلوم وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں کن مصیبتوں میں جکڑا ہوا ہوں۔۔۔ رابی کی آواز کی لہریں مجھے اپنے ساتھ بہاتی ہوئی بہت دور فرزانہ کے پاس لے گئیں۔ میں اس کے گلاب ہونٹوں کو دیکھنے لگا، اس کی ریشمی زلفوں میں الجھنے لگا۔ تصوری تصور میں، میں نے فرزانہ سے پوچھا "مجھے یاد کرتی ہو نا۔"

وہ خاموش رہی۔ بس پلکیں جھکا لیں۔

میں نے کہا "مجھے یاد رکھنا۔ مجھے بھول مت جانا۔ میری زندگی بس اسی احساس کے گرد گھومتی ہے کہ تم نے مجھے بھلایا نہیں۔"

رابی کا گانا ختم ہو گیا۔ چنگ کا تڑپتا پھڑکتا جسم بھی تھم گیا۔ وہ تیز سانس لے رہی تھی اور مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ان نظروں میں ہوشربا اشارے پوشیدہ تھے۔ یہ حسین و جمیل زندگی کے اشارے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ موت کے اشارے بھی ہو سکتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ہمیں اس شبستان میں گزاری ہوئی دس نشہ انگیز راتوں کی قیمت ایک دردناک موت کی صورت میں چکانی پڑے۔ ان لڑکیوں کے بوسے، موت کے بوسے بن سکتے تھے، ان لڑکیوں کا "وصل" اجل کا مصافحہ ثابت ہو سکتا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ رات کا اندھیرا دن کے اُجالے میں مدغم ہوتا رہا اور دن کے اُجالے کو رات کی ریشمی تاریکی آغوش میں لیتی رہی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ اس جنگلی قبیلے کا پراسرار ہماری نگاہ سے اوجھل تھا۔ زریں گل کئی بار پوچھ چکا تھا کہ میں کیوں گم صم رہتا ہوں۔ میں ہر بار صفائی سے اسے ٹال گیا تھا۔ زریں گل نے اپنے طور پر یہ قیاس لگایا تھا کہ میری پریشانی کی وجہ صنوبر ہے۔ ہمیں یہاں پہنچے ہوئے انیس بیس دن ہونے کو آئے تھے

اور ابھی تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ زریں گل خود بھی کچھ کم بے قرار نہیں تھا، وہ جلد از جلد صنوبر اور کلثوم وغیرہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس پریشانی سے کوسوں دور تھا جو مجھے لاحق تھی اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ شدید تر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی خدمت گار دونوں لڑکیوں کے رویے کا بغور جائزہ لیا تھا اور مجھے ان کے رویے میں کچھ خوفناک جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ وہ کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی تھیں جو کسی چند روزہ مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سلوک میں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ان کی آنکھوں کا تاثر ہوتا تھا۔ اس تاثر میں رحم اور ترس کی کیفیت ملتی تھی۔

بالکل ایسی ہی صورت کا ذکر مجھ سے مرحوم شاہد خان نے اپنی ہلاکت سے ایک دو روز قبل کیا تھا۔ مجھے وہ گفتگو اچھی طرح یاد تھی جب میں آخری بار شاہد خان سے ملنے اس سرنگ میں آیا تھا۔ ایک ایسے ہی عشرت کدے میں وہ نوخیز حسیناؤں کے درمیان موجود تھا لیکن اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اس نے کہا تھا "شاہ جہاں صاحب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ لوگ مجھ سے عجیب سا برتاؤ کر رہے ہیں، جیسے مجھے کہیں دور بھیجنے سے پہلے میری مہمانی کا حق ادا کیا جا رہا ہو۔" ایسی ہی کئی باتیں اس نے کی تھیں اور پھر۔۔۔ اگلے ہی روز اسے اذیت آمیز موت مار دیا گیا تھا۔

میں اپنے لیے بے بسی اور بے چارگی کی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی خطرناک صورت حال پیش آئی تو مجھے بھرپور مزاحمت کرنی ہے۔۔۔۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے اور کس وقت؟ میں نے اس بارے میں کافی سوچ بچار کی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابھی تک کوئی بات بھی حتمی نہیں تھی۔

یہ شاید آٹھویں روز کی بات ہے۔ میں بستر پر چت لیٹا تھا۔ مقامی لڑکی رابی میرا سر دبا رہی تھی۔ یہاں رہنے والے ہر شخص کے جسم سے ناگوار سی بو اٹھتی تھی۔ یقیناً یہ بو رابی میں بھی موجود تھی۔ شروع میں یہ بو خاصی واضح تھی لیکن اب ساتھ آٹھ دن کے بعد میری حس شامہ خاصی حد تک کند ہو چکی تھی۔ رابی میرے ساتھ گھل مل چکی تھی اس کے باوجود میں ناگواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اچانک چنگ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میرا دل صنوبر کے خیال سے یک بارگی دھڑک اٹھا لیکن پھر چنگ کی زبانی پتا چلا کہ آنے والی عورت ہے۔۔۔ وہ ناشا تھی۔ اس کا آنا بھی میرے لیے بے حد خوشی کا باعث تھا۔

ناشا حسب دستور ڈھیلے ڈھالے اونی لبادے میں تھی۔ پاؤں میں جوگر ٹائپ جوتے تھے۔ گریبان اتنا کشادہ تھا کہ جسمانی خطوط وضاحت سے نظر آتے تھے لیکن وہ ان کی طرف سے قطعی بے پروا رہتی تھی۔ عجیب سی سرکشی تھی اس کی چال ڈھال میں۔ وہ بے زبان خاموش ہر قاعدے ضابطے سے بغاوت کرتی محسوس ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ کچھ خاموش اور نڈھال سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی مسکراہٹ بھی پھیکی پھیکی محسوس ہوئی۔

وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور حال چال دریافت کرنے لگی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے ناشا۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے آٹھ روز ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے بندی خانے میں بھی ہم دس بارہ روز رہے ہیں لیکن تم صرف ایک بار ملنے آئی اور صنوبر تو ایک بار بھی نہیں آیا۔ کیا کوئی پابندی ہے تمہارے اوپر؟"

وہ بولی "ہاں پابندی تو ہے۔ ویسے بھی میں کچھ بیمار رہی ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ کچھ چھپا رہے ہو۔"

اس کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا لیکن سنبھل کر بولی "نہیں یہ تمہارا وہم ہے۔ مجھے بھلا چھپانے کی کیا ضرورت ہے اور ایسی بات ہو بھی کیا سکتی ہے۔"

میں نے کہا "ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔ مجھے اپنے ساتھی شاہد خان کا انجام یاد ہے۔ اسے بھی ایسی ہی "مہمان نوازی" کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔"

"نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" ناشا کی آواز کانپ رہی تھی۔

ایک احساس ندامت سا اس پر طاری تھا۔ نگاہ خود بخود جھک گئی تھی۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا سر اوپر اٹھایا "ناشا! میری طرف دیکھو۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ ایک دم جیسے اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور سسکیوں سے رونے لگی۔ میں اپنی جگہ مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میرے دل نے اسی لمحے گواہی دے دی کہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بدترین اندیشے سو فیصد حقیقت ہیں۔

یکایک ناشا چلّانے لگی "یہ تمہیں مار دیں گے۔۔۔۔ یہ تم سب کو مار دیں گے۔ یہ نہیں چھوڑیں گے تمہیں زندہ۔۔۔ ایسی موت سے بہتر ہے یہاں سے بھاگنے کی کوشش میں مر جاؤ۔۔۔۔ شاہ جہاں۔۔۔ اگر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ یہاں سے۔۔۔۔ بھاگ جاؤ۔"

ناشا کی بلند آواز سن کر چنگ اور رابی سہم گئی تھیں۔ دروازے پر مسلح پہرے دار بھی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ ناشا کو روتے دھوتے دیکھ کر اس کے کرخت چہرے کی سختی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے مقامی زبان میں ناشا سے کچھ کہا۔ الفاظ شاید سخت ہوں لیکن لہجہ احترام کا ہی تھا۔ جواب میں ناشا پھٹ پڑی۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا اور وہ پہرے دار کو بے نقط سنانے لگی۔ اس کا یہ روپ دیکھ کر مجھے منجمد جھیل میں ہونے والی طوفانی لڑائی یاد آگئی۔ ناشا کا چہرہ اس وقت بھی ایسا ہی پُرجلال نظر آیا تھا۔۔۔ اس لڑائی میں وہ دیوانہ وار پہرے داروں پر جھپٹی تھی اور ان

کے لیے موت بن گئی تھی۔

ناشا پہریدار پر جھکی تو چار پانچ مزید پہریدار دوڑتے ہوئے اندر آگئے۔ ایک دو کے سوا سب نہتے تھے۔ وہ سب بلند اور تیز آوازوں میں بولنے لگے۔ وہ ناشا کو میرے کمرے سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم و غصے کی چنگاریاں تھیں اور وہ پہریداروں کے انچارج سے باقاعدہ ہاتھاپائی کر رہی تھی۔۔۔۔ اچانک۔۔۔۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کیا اور قریب کھڑے ہوئے پہریدار کی زنگ آلود گن ایک جھٹکے سے چھین لی۔ اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا میں نے دروازے میں کھڑے ہوئے ایک چوڑے چکلے پہریدار کے تھوبڑے پر گن کے دستے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گرا، میں کھلے دروازے سے تیر کی طرح باہر نکل گیا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے گن کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا تھا۔ اب یہ ہتھیار میری انگلی کے اشارے پر آگ اگل سکتا تھا۔ میں سرنگ میں دس بارہ قدم ہی بھاگا تھا کہ ایک پہریدار بلائے ناگہانی کی طرح میرے سامنے آگیا۔ اس کے پاس رائفل سیدھی کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے پوری طاقت سے میرے چہرے پر مُکا رسید کرنا چاہا۔ میں نے جھک کر یہ وار بچایا۔ وہ لڑکھڑایا تو ایک جھپٹے میں اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آگئی۔ میں نے مخصوص جھٹکا دیا۔ وہ ایک دم میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ یہی وقت تھا جب ایک کلہاڑا بردار محافظ سرنگ کے موڑ سے نمودار ہوا اور دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اپنے بازو میں جھولتے ہوئے پہریدار کو زور سے اس پر دھکیل دیا۔ دونوں پہلے دیوار میں لگی ہوئی مشعل سے ٹکرائے اور پھر پُرشور آواز سے سرنگ کے فرش پر گر گئے۔ سرنگ کے اس حصے میں مشعل گر جانے سے ایک دم اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے اپنے عقب میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اندازے سے ایک ذیلی راستے میں داخل ہو گیا اور دوڑنے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں غلط راستے پر جا رہا ہوں۔ بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو تیز ہو رہی تھی اور موسیقی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ یعنی میں ان تین تماشا گاہوں کی طرف جا رہا تھا جہاں شب و روز راگ رنگ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ میں نے اپنا رخ پھیرا اور ایک بل کھاتی سرنگ میں دوڑنے لگا۔ میرے اردگرد پہرے داروں کا شور تھا اور گاہے گاہے کسی رائفل کا فائر بھی سنائی دے جاتا تھا۔ یکایک میں نے خود کو بڑی سرنگ میں پایا۔ سرنگ کا دہانہ مجھے صرف نصف فرلانگ کی دوری پر نظر آ رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی بڑی سرنگ میں پہنچ جاؤں گا۔ اگر میں دہانے تک سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ سلامتی سے طے کر لیتا تو میرے بچ نکلنے کے امکانات روشن ہو سکتے تھے۔ سرنگ سے باہر گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ اس تاریکی میں کوئی مارچ جلا سکتا تھا اور نہ کسی دوسرے طریقے سے روشنی کر سکتا تھا۔ میں اس صورتحال کا فائدہ اٹھا کر کسی گھر میں گھس سکتا تھا یا درختوں میں چھپ سکتا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ تیزی سے دہانے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ بیس تیس گز کا فاصلہ میں نے سلامتی سے طے کر لیا لیکن پھر یکایک خودکار رائفل کے ایک طویل برسٹ سے سرنگ گونج اٹھی۔ مجھے اپنے پاؤں میں چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے میں اوندھے منہ سنگلاخ فرش پر گرا۔ فائرنگ رکی تو میں پھر اٹھا لیکن اس سے پہلے کہ بھاگتا، تاریکی میں دو سائے لپکے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک لمبا تڑنگا تھا اور دوسرا درمیانے قد کا گٹھا ہوا۔ لمبے تڑنگے شخص نے میری گن پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے بڑی مہارت سے گن کی نال اوپر کی طرف اٹھا دی تھی۔ درمیانے قد والے نے میرے پیٹ میں رائفل کا دستہ رسید کرنا چاہا۔ میں نے تڑپ کر خود کو اس مہلک وار سے بچایا اور اس کی پیٹھ پر "تسلی بخش" ٹانگ جمائی۔ وہ بڑی قوت کے ساتھ پتھریلی دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ لمبا تڑنگا شخص بدستور رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ناف میں گھٹنا مارا۔ وہ تھوڑا سا جھکا لیکن اس نے رائفل نہیں چھوڑی۔ میں نے رائفل پر سے ایک ہاتھ ہٹایا اور اس کی گردن "قینچے" میں لینی چاہی لیکن عین آخری لمحے میں وہ بے حد پھرتی سے میرے ارادے کو ناکام بنا گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب میرے عقب میں آنے والی بلائیں موقع پر پہنچیں اور یکے بعد دیگرے مجھ سے لپٹ گئیں۔ یہ سب لمبے بالوں اور بدبودار جسموں والے جانور نما انسان تھے۔ انہوں نے ہر طرف سے مجھے جکڑ لیا اور گھونسوں اور ٹھوکروں سے مارنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی زبان میں چیخ و پکار بھی کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے زمین پر گرا دیا۔ رائفل میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر موڑے اور زنجیر کر دیے۔ پھر میرے پاؤں میں بھی بیڑی پہنا دی گئی۔

میرے اردگرد پہریداروں کا جمگھٹا تھا۔ وہ سب کے سب خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً انہیں اجازت نہیں تھی ورنہ وہ یہیں میری بوٹی بوٹی کر دیتے۔ وہ مجھ سے بے حد خائف بھی نظر آ رہے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی دو دفعہ دلیری میں زبردست تہلکہ مچا چکا تھا۔ وہ وحشی تھے لیکن میں نے انہیں وحشی ترین کے دکھا دیا تھا۔

اس دوران میں وہ پہریدار بھی موقع پر پہنچ گئے جن میں سے ایک کی گردن میرا تختۂ مشق بنی تھی۔ پہریداروں کی یہ ٹولی غصے میں بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی مجھے زدوکوب کرنا چاہا، اس موقع پر وہ لمبا تڑنگا پہریدار آڑے آگیا جس نے مجھے روکا تھا۔

"چھوڑ دو۔۔۔۔ پیچھے ہٹ۔۔۔۔ پیچھے ہٹو" وہ پہریداروں سے کہنے لگا۔

وہ اردو بول رہا تھا۔ میں اس کی آواز سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ صفدر تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی

کوشش کی۔۔۔۔ ہاں وہ صفدر ہی تھا۔ وہ مقامی لباس میں تھا۔ اس کے سر کے بال بھی مقامی لوگوں کے انداز میں لمبے ہو چکے تھے۔ چہرے پر داڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔

صفدر کی دید نے مجھے مبہوت کر دیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی چند لمحے پہلے میں نے اپنے جگری یار صفدر سے ہاتھاپائی کی ہے۔ اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا ہے اور اس کے سینے پر گن کی ضرب لگائی ہے۔۔۔۔ پھر مجھے یاد آیا کہ چند لمحے پہلے اسی نے کتنی پھرتی سے اپنی گردن میرے مخصوص دباؤ سے بچائی تھی۔۔۔۔ اوہ خدایا! تاریکی میں یہ کس پر ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا میں۔۔۔

میں ابھی صفدر کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ پہریدار مجھے گھسیٹتے ہوئے سرنگ کے اندرونی حصے میں لے گئے۔ مجھے کمرے میں لے جا کر بڑی بے دردی سے قالین پر پٹخ دیا گیا۔ میرے ناک منہ سے خون رس رہا تھا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میرا خیال تھا زریں گل میری خبرگیری کے لیے آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے آنے سے روک دیا گیا ہے۔ دونوں لڑکیاں بھی کمرے سے رخصت ہو گئی تھیں۔ میں قالین پر اوندھا پڑا اس کایا پلٹ پر غور کرتا رہا۔ حالات کے اشارے بے حد خوف ناک تھے۔ صفدر کی صورت دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی لیکن اس سے کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ ہمارے لیے کیا کر رہا ہے۔ یہ بات طے تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہو گا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ہماری مصیبت سے لاتعلق ہو۔ صفدر پر میرا یقین ایک لمحے کے لیے بھی ڈانواں ڈول نہیں ہوا تھا۔ یہ یقین ڈانواں ڈول ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

O☆O

اگلے ۳۶ گھنٹے تک میں بے یار و مددگار اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ ان ۳۶ گھنٹوں میں مجھے صرف ایک مرتبہ کھانا دیا گیا اور صرف کوہ پون گھنٹے کے لیے چہل قدمی کرائی گئی۔ یہ بڑی حیرت ناک چہل قدمی تھی۔ ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور پاؤں میں کئی کلو وزنی بیڑی تھی۔ میرے ہر قدم کے ساتھ یہ بیڑی پتھریلے فرش پر کھڑ کھڑ بجتی تھی۔

تیسرے روز علی الصبح آناً فاناً وہ گھڑی سر پر آن پہنچی جس نے کئی روز سے میرا جسمانی و ذہنی سکون تباہ کر رکھا تھا۔ دو مسلح پہریدار کمرے میں گھس آئے۔ میں اس سرنگ میں ان کی صورتیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں اور چہرے پر سفاکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مجھے لے کر کمرے سے باہر آ گئے۔ یہاں میں نے ان تمام قیدیوں کو دیکھا جنہیں چند روز پہلے بندی خانے سے اس آرام دہ شبستان میں پہنچایا گیا تھا۔ ان میں زریں گل کے علاوہ نوشاب اور حریم واحدی بھی شامل تھے۔ نوشاب جو کل تک خوش و خرم تھا ایک دم متوحش اور ہراساں نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر دو تین جگہ تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔ کچھ یہی حال زریں گل اور واحدی کا بھی تھا۔ ان سب کو الٹی ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان بیڑیوں کی موجودگی میں وہ چل تو سکتے تھے لیکن کسی قسم کی پھرتی دکھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ قریباً چند درجن مسلح پہریدار ان کے ساتھ موجود تھے۔ مجھے بھی ان پابہ زنجیر افراد میں شامل کر دیا گیا۔

زریں بہت برافروختہ نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "استاد! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کہاں اتنی عزت اور کہاں یہ مار پیٹ اور ہتھکڑیاں۔ قسم سے اپنا تو دماغ گھوم رہا ہے۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن ایک پہریدار نے رائفل کی نال اس کی کنپٹی پر لگائی اور گرج کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ زریں کا چہرہ لال اور گلابی ہو گیا لیکن میرے تاثرات دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پہریدار ہمیں دھکیلتے ہوئے سرنگ کے دہانے کی طرف لے چلے۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ ہم پر کوئی بہت بڑی۔۔۔ بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ رہ رہ کر ایک وسیع تماشا گھر کا تصور نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا اور بپھرے ہوئے سانڈوں کی خوف ناک پھنکاریں کانوں میں گونجنے لگتی تھیں۔

نوشاب میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی آمیز حیرت برس رہی تھی۔ وہ دو ہفتے پہلے تک زندگی سے بہت دور جا چکا تھا لیکن پھر مجھ سے ملنے کے بعد اور میری اور چشمہ کی لاتعلقی کے بارے میں جاننے کے بعد اس میں نئے سرے سے زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہوئی تھی۔ وہ چشمہ سے ملنا چاہتا تھا، اس سے اپنے سابقہ رویے کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ قید میں ہوتے ہوئے بھی اس نے آزاد فضاؤں کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے، اس کے کانوں میں پھر سے محبت کے نغمے گونجنے لگے تھے لیکن جب یہ سب کچھ ہو گیا تھا، وہ پھر سنگین ترین مصائب کا شکار ہو گیا تھا۔

یکایک میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے کہیں دور سے سانڈ کے ڈکرانے کی لرزہ خیز آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز صورِ اسرافیل کی طرح میری سماعت میں گونجی۔ بے شک یہ مست سانڈ کی آواز ہی تھی اور ہمیں اسی آواز کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ میری طرح زریں گل نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ میں نے پہلی بار زریں کو اتنا پریشان دیکھا تھا۔ اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں۔ ان میں بے شمار دہشت زدہ سوالات چیخ رہے تھے۔

ہم نے سرنگ کے اندر قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ہماری منزل تماشا گھر ہے۔ بہت بڑے مجمع کا ملا جلا شور سنائی دے رہا تھا۔ نعروں کی گونج تھی اور آوازوں میں کبھی کبھی کسی سانڈ کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ زریں گل کی طرح دیگر قیدی بھی دہشت ناک موت کی چاپ سن

بچکے تھے۔ ان کے رنگ برف کی طرح سفید ہو رہے تھے اور قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ [illegible] کے سائے میں "موت" کی طرف ہمارے مارچ کا وہ منظر ناقابل فراموش تھا۔ اب ہماری دونوں جانب لمبے چوغوں والے مقامی افراد چلنے لگے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آہنی کے بنے ہوئے چھوٹے کلہاڑے تھے۔ وہ ان کلہاڑوں کو اوپر نیچے ایک ساتھ حرکت دیتے تھے اور عجیب و غریب آواز میں کوئی مناجات پڑھتے تھے۔ جوں جوں ہم تماشا گاہ سے نزدیک پہنچ رہے تھے' مناجات کی آواز بلند اور تیز ہو رہی تھی۔ ایک انوکھا سا ہیجان تھا اس آواز میں۔ پھر تماشائیوں کا خوف ناک منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہاں سرنگ کو تراش خراش کر ایک وسیع و عریض "بون ذا وا اسٹیڈیم" کی شکل دے دی گئی تھی۔ اسٹیڈیم ہی کے انداز میں یہاں بیٹھنے کے لیے سیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی پتھروں سے تراشی گئی تھیں۔ وسط میں وہی تالاب تھا جسے یہ لوگ موت کے کنویں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس "خشک تالاب" کی دیواریں پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ان پتھروں کے درمیان باریک درزیں موجود تھیں۔ جس بدنصیب کو بدمست سانڈوں کے آگے ڈالا جاتا تھا وہ جان بچانے کے لیے انہی دیواروں پر چڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ درزوں میں ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں پھنسا پھنسا کر کنارے کی طرف آتا تھا لیکن پھسل کر گر جاتا تھا اور "تماشے" کا یہی حصہ سب سے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتا تھا۔

تماشا گاہ کی سیڑھیوں پر ہمیں لاتعداد افراد بیٹھے نظر آئے۔ ان میں مرد و زن' بچے' بوڑھے سبھی شامل تھے۔ خوش حال لوگوں کے لیے آگے کی نشستیں مخصوص تھیں۔ ان کے بالوں میں قیمتی پتھر گندھے ہوئے تھے اور ان کے لباس قیمتی اور صاف ستھرے تھے۔ عام افراد غلیظ اور بدبودار تھے اور دور ہی سے پہچانے جاتے تھے' ان میں سے بیشتر کے لباس اور جوتے وغیرہ لوٹ کا مال تھے...... نوعمر لڑکوں کو حسب معمول تماشا گاہ میں سب سے آگے جگہ دی گئی تھی۔ یہ لوگ "تالاب" کے بالکل کنارے پر بیٹھے تھے۔

تالاب کے اندر کچھ ہلچل موجود تھی لیکن دور سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید کوئی شوقیہ کھلاڑی "مل وانٹ" کر رہا تھا۔ پہرے داروں نے ہم میں سے چند ماداروں کو جدا کر لیا اور زیر زمین سیڑھیوں کی طرف لے چلے۔ ہمیں ہانک کر تماشا گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ تماشا گاہ میں ایک جانب لوہے کا ایک بڑا پنجرہ تھا۔ ہمیں اس پنجرے میں دھکیل دیا گیا اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ جن ماداروں (قیدیوں) کو زیر زمین سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا تھا' وہ اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ نوجوان نوشاب اور زریں بھی زیر زمین جانے والے ماداروں میں شامل تھے۔ مترجم واحدی ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے واحدی سے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہے واحدی؟"

وہ پژمردہ لہجے میں بولا "اپنے خدا کا شکر ادا کرو۔ تمہیں شاید ایک دن کی زندگی اور مل گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہاری سزا پر آج عمل درآمد نہیں ہو گا۔ ہم شاید کل تماشا بنیں گے۔ آج ہم تماشائی ہیں۔"

"اور آج کون تماشا بنے گا؟" میں نے پوچھا۔ میرے لہجے میں کوشش کے باوجود تھوڑی سی لرزش آ گئی تھی۔

واحدی نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا "آج وہ تماشا بنیں گے جو سیڑھیوں سے نیچے اتارے گئے ہیں۔ یہ تماشا دو تین دن جاری رہے گا' لہٰذا سزا پانے والے تمام بدنصیبوں کو ایک ہی روز زندگی سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔"

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ ارد گرد کے مناظر نگاہوں میں دھندلاتے جا رہے تھے۔ جو افراد سیڑھیوں سے نیچے اتارے گئے تھے' ان میں نوشاب کے علاوہ زریں گل بھی شامل تھا۔ تو کیا میں ابھی تھوڑی دیر میں نوجوان نوشاب اور اپنے جان سے عزیز ساتھی زریں گل کو موت کے منہ میں دیکھنے والا تھا۔ یہ بڑا لرزہ خیز خیال تھا۔ نوشاب اور زریں کی حسرت ناک موت کا تصور کر کے میرا کلیجا منہ کو آ گیا۔ جی چاہا' جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ ان آہنی سلاخوں سے ٹکراؤں اور انہیں توڑ کر نکل جاؤں۔

تالاب کے اندر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ ایک سانڈ بے قراری سے تالاب میں چکرا رہا تھا۔ اس کے نوکیلے سینگوں پر روئی سے بھرے ہوئے غلاف چڑھا دیے گئے تھے۔ تالاب میں وہی برہنہ جسم' جواں سال عورت تھی جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر دو دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی شادی شدہ عورت ہے۔ وہ سانڈ کے حملوں کے سامنے پھرتی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور مختلف کرتب دکھا رہی تھی۔ تماشائی داد کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ تماشا دیکھنے والوں میں سردار سدوت بھی شامل تھا۔ وہ کافی فاصلے پر تھا' تاہم اس کا چمکدار لباس اور اس کے بالوں میں جگمگاتے ہوئے قیمتی پتھر میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسی زرنگار کرسی پر بیٹھا تھا جس پر چند ماہ پہلے میں نے سردار پاناسو کو بیٹھے دیکھا تھا۔

پھر فن کار عورت کا مظاہرہ ختم ہو گیا۔ اس نے ہوا میں قلابازی کھائی اور سانڈ کے اوپر سے ہوتی ہوئی تالاب کے آہنی دروازے تک پہنچ گئی۔ سانڈ نے جھنجھلا کر اسے ٹکر مارنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل چکی تھی۔ سانڈ کے سر کی زوردار ضرب سے لوہے کا دروازہ جھنجھنا اٹھا___ تھوڑی دیر بعد ہی لمبے بانسوں کی مدد سے سانڈ کو بھی تالاب سے باہر نکال دیا گیا۔

تالاب میں نظر آنے والا اگلا منظر یقیناً بہت وحشت ناک تھا اور اس کا ثبوت موسیقی کا ہیجان انگیز "شور" تھا۔ موسیقی تو پہلے بھی سنائی دے رہی تھی لیکن اس کا آہنگ اب بالکل بدل گیا تھا۔

اس موسیقی میں ڈھول کی تھاپ نمایاں تر تھی اور اس تھاپ کے ساتھ دل شدت سے دھڑکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد تالاب کے اندر سے چیخ و پکار کی لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے لگیں تاہم چیخنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران میں تالاب کے دو دروازوں میں سے ایک کھلا اور تین عدد نہایت صحت مند بپھرے ہوئے سانڈ دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ ان کے نوکیلے سینگ بے نیام تلواروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ادھر ادھر چکرانے لگے پھر آپس میں سینگ لڑانے لگے۔ چیخ و پکار کی مدھم آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ اچانک تالاب کا دوسرا دروازہ کھلا اور وہ بدقسمت شخص اندر آ گیا جس کی موت پر مہر ثبت ہو چکی تھی۔ وہ سراپا برہنہ تھا۔ اسے عقب سے دھکا دے کر سانڈوں کے عین سامنے پھینکا گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک سانڈ سر جھکا کر اس کی طرف لپکا۔ وہ چیختا ہوا دیوار کی طرف بھاگا اور غیر ارادی طور پر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ کوشش آسان نہیں تھی۔ پچھلی دفعہ ایک قیدی بہول خان کے حوالے سے زریں نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلے تین چار برسوں میں سزا پانے والوں میں سے صرف دو عدد خوش قسمت افراد تالاب میں سے نکل کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بدقسمت شخص کی پشت پر لگنے والی زوردار ٹکر نے اس کی کئی پسلیاں توڑ دیں اور سانڈ کا ایک سینگ اس کے جسم میں گھس گیا۔ سانڈ نے اسے اچھال کر تالاب کے وسط میں لا پھینکا___ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے لہو سے تالاب کا فرش سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے سے بہت بہتر تھا کہ منہ پھیر لیا جائے۔ دو تین منٹ بعد جب میں نے دوبارہ تالاب میں جھانکا تو بدقسمت قیدی کی لاش کٹ پھٹ کر ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ وحشی قبیلے کے سفاک تماشائی جوش کے عالم میں گلے پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور اچھل کود کر رہے تھے۔

اسی دوران میں خشک تالاب کا دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور روتے بلکتے شخص کو بڑے زور سے اندر دھکیل دیا گیا۔ ایک بار پھر وہی خونی تماشا شروع ہو گیا جسے دیکھنے کے لیے لوہے کا دل اور پتھر کا حوصلہ درکار تھا۔ بدنصیب شخص کی بھاگ دوڑ' موت کے خلاف اس کی جدوجہد' اس کا خونچکاں جسم' اس کا چیخنا چلانا' یہ سب کچھ تماشائیوں کے لیے تفریح طبع کا باعث تھا۔ قریباً دس منٹ میں یہ شخص بھی لاش میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے لہو کے چھینٹے تالاب کی دیواروں پر نظر آ رہے تھے۔

منحوس موسیقی کچھ دیر کے لیے تھم گئی۔ جیسے کسی بڑی آفت سے پہلے سکون کا ایک مختصر وقفہ آتا ہے۔ میں بے قراری میں اپنی جگہ پر پہلو بدل رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت واحدی کی بھی تھی۔ میری ڈری ہوئی نگاہیں تالاب کے اس آہنی دروازے پر لگی ہوئی تھیں جس میں سے بدقسمت افراد اندر دھکیلے جاتے تھے۔ معلوم نہیں اب اس دروازے میں سے کس کو اندر داخل ہونا تھا۔ نوشاب کو' زریں گل کو' یا کسی اور کو۔ دل کی دھڑکن کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی وقت جی چاہتا کہ آنکھیں بند کر لوں اور اس وقت تک بند رکھوں جب تک یہ انسانیت سوز تماشا ختم نہ ہو جائے۔ میں زریں گل کو موت کا رقص کرتے میں کیسے دیکھ سکتا تھا لیکن آنکھیں بند کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ میں مرنے والے کی چیخیں تو سن سکتا تھا اور کانوں میں انگلیاں دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ میرے ہاتھ آہنی ہتھکڑی میں جکڑے تھے "کاش وقت کی گردش تھم جائے۔" میرے دل سے بار بار یہ دعا نکل رہی تھی۔

منحوس موسیقی پھر سنائی دینے لگی۔ تب تالاب کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک شخص لڑھکتا ہوا اندر آ گیا___ وہ نوشاب تھا۔ اس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں تھا۔ گرتے ساتھ ہی وہ غیر ارادی طور پر پھر دروازے کی طرف لپکا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی آہنی دروازہ پھر دھماکے سے بند ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا مضبوط جسم کا دراز قد نوشاب تالاب کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا لیکن وہ چیخ و پکار نہیں کر رہا تھا۔ ایک سانڈ اپنے پاؤں کو فرش پر رگڑ رگڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ بجلی کی تیزی سے نوشاب کی طرف آیا۔ نوشاب نے تڑپ کر خود کو بچایا اور ایک دم جست لگا کر سانڈ پر چڑھ گیا۔ شاید اس کا ارادہ تھا کہ وہ تالاب کی دیوار سے چمٹ جائے لیکن سانڈ نے پلک جھپکنے میں اسے زمین پر پٹخ دیا۔ ایک دوسرے سانڈ نے اسے سینگوں پر اٹھایا اور دیوار پر دے مارا۔ نوشاب نے اضطراری کیفیت میں دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ دیوار قریباً سولہ فٹ اونچی تھی۔ پتھر کے بلاکوں کے درمیان درزیں بھی موجود تھیں۔ عام حالات میں کوئی ان درزوں میں انگلیاں پھنسا کر اوپر چڑھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر موت کے شکنجے میں آیا ہوا قیدی یہ کوشش بھی کر گزرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کوشش ہمیشہ ناکام ہوتی تھی۔ نوشاب کی کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ بمشکل چار پانچ فٹ اوپر جانے کے بعد وہ پھر دیوار سے پھسلا اور نیچے آ گرا۔ فلک شگاف قہقہوں اور تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ تالاب کے عین کنارے پر بیٹھے نوعمر لڑکوں نے چیخ چیخ کر سانڈوں کو مشتعل کیا۔ ایک سانڈ نے نوشاب کو سینگوں پر اٹھایا اور اتنی زور سے اچھالا کہ وہ کئی فٹ ہوا میں بلند ہو گیا۔ نوشاب کے حلق سے اب گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ یہ وہ بہادر نوجوان تھا جس نے اپنے قبیلے کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھی تھی اور موت کے منہ میں چھلانگ لگائی تھی۔ چار جانبازوں میں سے صرف وہ زندہ بچا تھا۔ میں اس کی زندگی کو معجزہ قرار دے رہا تھا لیکن آج یہ "معجزہ" پھر موت کی زد میں تھا۔ چترہ اور نوشاب کی محبت موت کی زد میں تھی___ اور مستقبل کے بے شمار سہانے خواب موت کی زد میں تھے اور یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا___ میں جانی استاد تھا۔ میرے بارے میں زریں

گل جیسے لوگوں کا خیال تھا کہ میں ناممکن کو ممکن کر لیتا ہوں اور بڑے اطمینان کے ساتھ موت سے بھی لڑ جاتا ہوں..... اور واقعی کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہو گا لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔

نوشاب نے ایک سانڈ کی آنکھ زخمی کر دی تھی۔ اس کی آنکھ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ تالاب میں ہرنی کی طرح اچھل کود کر رہا تھا۔ دوسرے سانڈ نے نوشاب کو عقب سے ٹکر رسید کی۔ وہ لڑھکا اور خون آلود فرش پر دور تک پھسل گیا۔ اس کی ایک ران سے کھال ادھڑ کر گھٹنے پر لٹک رہی تھی اور کندھے پر سینگ کا بہت گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے تالاب کے وسط میں لیٹا تھا اور کراہ رہا تھا۔ وہ سر تا پا برہنہ تھا لیکن موت کے چنگل میں پھنس کر شاید شرم و حیا کا تصور بھی اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ چیختے چلاتے اور قہقہے لگاتے وحشیوں کے درمیان وہ اکیلا تھا۔ سیاہ پوش دیوتا کے سنگ دل پجاری ایک نہتے دشمن کو جان کنی کے عذاب میں مبتلا کر کے مسرور تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ہاتھ پاؤں زنجیر تھے اور سر پر رائفل بردار پہرے دار کھڑے تھے۔ میں نے اضطراب کے عالم میں زور زور سے چیخنا شروع کر دیا "چھوڑ دو اسے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے۔"

میری آواز تماشا گاہ میں دور تک گونجی۔ بہت سے لوگ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے چلا کر کہا "سردار سدرت! تم ظلم کر رہے ہو۔ تم درندگی پر اتر آئے ہو۔ چھوڑ دو اسے، مت مارو اسے۔"

معلوم نہیں میری آواز سردار سدرت تک پہنچی یا نہیں مگر لاتعداد لوگ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے تھے۔ پھر وہ چیخ پکار کو میرا جنون سمجھتے ہوئے جوابی چیخ پکار کرنے لگے۔ ان کے حلق سے عجیب و غریب مضحکہ خیز آوازیں نکل رہی تھیں۔ میری آواز ان آوازوں میں اور موسیقی کے بے ہنگم شور میں دب کر رہ گئی۔ بدبودار پہریداروں نے پنجرے کی سلاخوں کے باہر سے ہی مجھے دبوچ لیا۔ چمڑے کی ایک پٹی جو شاید کسی پتلون کی بیلٹ تھی، میری گردن میں ڈالی گئی اور عقب سے یوں کھینچا گیا کہ میری پشت پنجرے کی سلاخوں سے جا لگی۔ ہاتھ اور پاؤں تو پہلے ہی پابند تھے، اب میں گردن ہلانے سے بھی قاصر تھا۔ چمڑے کی پٹی نے بڑی مضبوطی کے ساتھ مجھے سلاخوں سے منسلک کر رکھا تھا۔

نوشاب تالاب کی دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ اس کے سینے میں ایک سانڈ کے دونوں سینگ "پیوست" ہو چکے تھے۔ اس نے دونوں سینگوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ اس کا جسم زندگی کی آخری حرکت کر رہا تھا، وہی جان کنی کی حرکت..... جو ٹمٹما کر بجھ جانے والی شمع کی یاد دلاتی ہے۔ اپنے پیاروں سے بہت دور اپنے دشمنوں کے نرغے میں وہ مر رہا تھا اور پھر وہ مر گیا۔ اس کی لاش بدمست جانوروں نے روند دی۔ اس کا سر ناریل کی طرح ٹوٹ گیا۔

اور اب..... اب شاید زویں گل کی باری تھی۔ میرے جسم میں آتش فشاں دہک رہا تھا۔ ایک لاوا تھا جو سنگلاخ چٹانوں میں سلگ رہا تھا لیکن باہر نکلنے کا راستہ نہیں پا رہا تھا۔ میری نگاہیں تالاب کے آہنی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ دروازہ اب ایک بار پھر کھلنے والا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ابھی چند لمحوں بعد زوردار دھکا کھا کر تالاب کے وسط میں گرنے والا شخص زویں گل ہی ہو۔ وہ شخص جو طویل عرصے سے میرا سایہ بنا ہوا تھا۔ میرے پسینے کی جگہ عقیدت مندی سے خون گرا رہا تھا۔ وفادار، زندہ دل، بہادر شخص کیا..... کیا اس کی قسمت میں بھی دردناک موت لکھی تھی۔ میرا دل جیسے سینے میں پھٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور اگر میری آنکھوں کی قسمت میں زویں کی دردناک موت کا نظارہ لکھا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہیں اور دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا ہے۔

اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ تماشا گاہ کے داخلی راستے پر نمودار ہوا تھا اور تیزی سے سردار سدرت کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ صندور تھا۔ میرا یار..... میرا غم خوار..... صندور کو دیکھ کر مجھے وہی سکون محسوس ہوا جو ایک ڈوبتے ہوئے شخص کو کسی کا ہاتھ تھام کر محسوس ہو سکتا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی "وہ ضرور کچھ کرے گا..... وہ ضرور کچھ کرنے والا ہے۔ مصیبت ٹلنے والی ہے" میرا یار یہ مصیبت ٹال کر لے گا۔"

میرا سینہ فخر سے لبریز ہو گیا۔ دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی گہری دھند ایک تابناک سورج کو دیکھ کر ناپید ہونے لگی۔ میں نے دیکھا "صندور" سردار سدرت کی نشست کے سامنے پہنچ کر رک گیا ہے۔ وہ سردار سدرت کے سامنے جھک گیا تھا اور دھیمے لہجے میں کوئی بات کر رہا تھا۔ سردار سدرت مسلسل اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر سدرت نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وحشت ناک موسیقی تھم گئی۔ سردار سدرت اپنے عمر رسیدہ مشیروں سے مشورہ کرنے لگا۔ صندور تیز قدموں سے واپس لوٹ گیا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد صندور دوبارہ نظر آیا۔ اب اس کے ساتھ ایک زخمی شخص بھی تھا۔ زخمی کو ایک طرف سے صندور نے اور دوسری طرف سے ایک مسلح محافظ نے سہارا دے رکھا تھا۔ اس زخمی شخص کو سردار سدرت کے عین سامنے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ سردار سدرت اس زخمی شخص سے باتیں کرنے لگا۔ صندور بھی قریب ہی موجود رہا۔ سردار نے اپنے دو محافظوں کو کوئی حکم دیا۔ وہ تیز قدموں سے "موت کے تالاب" کی طرف چلے گئے۔ صندور لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے اسے اپنے روبرو پایا۔ اس نے مقامی پہریداروں سے کڑک کر کچھ کہا۔ میری گردن سے فوراً

چمڑے کی پٹی نکال لی گئی۔ صندور نے انچارج پہریدار..... کے ہاتھ سے چابی لی اور آہنی پنجرے کا قفل کھول کر اندر آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ بے اختیار ہو کر اس نے مجھے گلے سے لگایا۔ ایک شبنم جیسی ٹھنڈک میرے دکھ سے دل میں اتر گئی۔ صندور نے اپنے ہاتھ سے میری ہتھکڑی کھولی اور ایک بار پھر بے پناہ جذبے کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہوا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا "اب سب ٹھیک ہو جائے گا شاہ جہاں صاحب۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

میں نے کہا "صندور! زویں گل آج سزا پانے والے قیدیوں میں شامل ہے۔"

"میں نے کہا ہے نا" آپ بے فکر رہیں۔ سردار سدرت کے آدمی زویں کو لینے گئے ہیں..... وہ دیکھیں۔ وہ زویں کو لا رہے ہیں۔" صندور نے نیچے تالاب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، زویں کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی، یہ شلوار بھی غالباً اسے از راہ ترس پہنائی گئی تھی۔ اس کے پاؤں میں بیڑیاں بدستور موجود تھیں۔ وہ دو مسلح محافظوں کے نرغے میں دھیمے قدموں سے سردار سدرت کی طرف جا رہا تھا۔ پھر وہ سردار سدرت کے سامنے پہنچ گیا۔ صندور بھی مجھ سے رخصت ہو کر سردار کی طرف چلا گیا۔ وہاں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

خونی تماشا اب تھم چکا تھا۔ تماشائیوں میں اضطراب نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان کی تفریح کا سلسلہ کیوں منقطع ہوا ہے۔ اس چند منٹ بعد صندور پھر میرے پاس آ گیا۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی کی وجہ سے روشن نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! سردار سدرت نے اس شخص کی گواہی تسلیم کر لی ہے۔"

"تم کس شخص کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جسے میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اس کا نام اردے ہے۔ یہ پل کے ان پہریداروں میں سے ہے جن سے آپ نے شروع میں ملاقات کی تھی۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہو، ان پہریداروں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ اردے بھی شدید زخمی ہوا تھا۔"

اب صندور کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے یقیناً اردے نامی اس شخص سے سردار کے سامنے میرے اور زویں کے حق میں گواہی دلائی تھی۔

میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے صندور بولا "اردے آپ دونوں کے متعلق جانتا ہے۔ اس نے تصدیق کی ہے کہ حملے سے پہلے ہی آپ اور زویں گل پل پر پہنچے تھے۔ آپ نے انچارج پہریدار کو خبردار کیا تھا کہ جلد ہی سردار دہانی اپنے لشکریوں سمیت پل پر زبردست حملہ کرنے والا ہے۔ آپ نے اصرار کیا تھا کہ آپ کو فوراً سردار سدرت سے ملایا جائے۔ اس بیان کے بعد سردار سدرت اور اس کے مشیروں کا رویہ آپ کے سلسلے میں خاصا نرم ہو گیا ہے۔"

اسی دوران میں ایک شخص صندور کے پاس پہنچا اور مقامی زبان میں اس سے کچھ بات کی۔ صندور نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "سردار سدرت مجھے بلا رہا ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ صندور مقامی زبان کسی نہ کسی حد تک سمجھنے لگا ہے۔ میں نے صندور سے پوچھا کہ جون جاوئل تو خیریت سے ہے۔ صندور نے میری بات کا جواب اثبات میں دیا۔

پانچ دس منٹ بعد صندور زویں گل کو لے کر پھر میرے پاس آ گیا۔ زویں گل کی بیڑیاں کھول دی گئی تھیں اور ہاتھ بھی آزاد ہو گئے تھے۔ اب اس کے بدن پر پورا لباس نظر آ رہا تھا۔ صندور نے میری بیڑی بھی کھلوائی۔

"تم بڑے موقع پر آئے ہو صندور۔" میں نے کہا "مجھے یقین تھا کہ تم نے ہمیں یاد رکھا ہو گا۔"

وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! یاد تو اسے کیا جاتا ہے جو بھولا ہوا ہو۔ آپ تو ہر گھڑی میرے دماغ میں رہتے تھے۔ جب سے آپ وادی میں پہنچے ہیں میں ایک پل بھی آپ کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔ تمام صورت حال پر میری نظر تھی، میں جانتا تھا کہ آپ کی جان اسی صورت میں بچائی جا سکتی ہے کہ پل کے پہریداروں میں سے کوئی آپ کے بیان کی تصدیق کرے..... مجھے ایک سردار کی زبانی معلوم ہوا کہ پل کی حفاظت پر مامور بارہ عدد پہریداروں میں سوائے ایک کے سب کی لاشیں مل گئی ہیں..... یہ سوچا جا سکتا تھا کہ شاید یہ پہریدار مرا نہ ہو بلکہ زخمی ہوا ہو لیکن اگر وہ زخمی ہوا تھا تو اسے وادی کے بڑے شفا خانے میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ کسی بھی شفا خانے میں نہیں تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ وہ ان ہلاک شدگان میں ہو جو لڑائی کے دوران میں تیز "کوہی نالے" میں گر گئے تھے۔ مگر یہ بات دل کو کچھ لگتی نہیں تھی۔ پل کے تمام پہریدار حفاظتی چوکی کے اندر لڑتے ہوئے مارے گئے تھے، انہیں اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ پل کی طرف پسپا ہو سکیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ اردے نامی پہریدار مرا نہیں۔ میں شب و روز اس کی تلاش میں لگا رہا اور آخر اسے پا لیا۔

در حقیقت یہ ایک وہمی شخص تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شفا خانے جانے میں اس کے لیے خطرات پوشیدہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زخمی ہونے کے بعد وہ گھر ہی میں چھپ گیا اور اس کے اہل خانہ مقامی طریقے کے مطابق اس کا علاج معالجہ کرنے لگے۔ اس شخص کا بڑا بھائی، باپ اور دادا شفا خانے میں ہی مرے تھے لہٰذا اس کا خیال تھا کہ سیاہ پوش دیوتا نے اس کے اہل خانہ کی روح نکالنے کے لیے شفا خانے کی چار دیواری مخصوص کر رکھی ہے۔ بہت جتن کر کے ہم اس تک پہنچے اور اسے بیان دینے پر آمادہ کیا....."

ابھی صفدر کی بات جاری تھی کہ چار مسلح محافظ ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ ان کے تیور دیکھ اچھے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک مترجم بھی تھا۔ محافظوں کے انچارج نے مترجم کے ذریعے مجھ سے کہا "تم کو نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ تم پر ایک اور الزام بھی ہے۔ تمہارے ہاتھوں ایک شخص شدید زخمی ہو چکا ہے اور اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔"

"میں نے کسی کو زخمی نہیں کیا۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

"کل تم نے' یہ جاننے کے بعد کہ تمہیں سزا دی جا رہی ہے' اپنی قیام گاہ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ جن پہریداروں نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تم نے انہیں زدوکوب کیا۔ ان میں سے ایک شخص کی گردن بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ وہ کل سے شفاخانے میں بے ہوش پڑا ہے۔"

صفدر کے چہرے پر اب گہری پریشانی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مقامی زبان میں انچارج سے کوئی سوال کیا۔ انچارج کا جواب خاصا طویل تھا اور اس میں تلخی سی بھی تھی۔ صفدر بے قراری سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ انچارج مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگانا چاہ رہا تھا لیکن صفدر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ تیز قدموں سے سرواد سرورت کی طرف چلا گیا۔ صفدر اور سرواد سرورت کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو طویل ہوتی چلی جا رہی تھی "انچارج" ہاتھ میں ہتھکڑی لیے کھڑا تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اسی دوران میں بڑی بڑی بالیوں والا ایک نہایت بدبودار جنگلی "انچارج" کے نام کوئی پیغام لے کر آ گیا۔ اس پیغام کے ملتے ہی انچارج نے مترجم کے ذریعے مجھ سے کہا "ہم سرواد کے حکم کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے ہیں' تمہیں ہتھکڑی لگوانی پڑے گی۔"

میں شدید تذبذب کا شکار تھا۔ کبھی جی میں آتا تھا کہ اپنی آزادی کا فائدہ اٹھاؤں اور "مزاحمت" کا حق ادا کروں' کبھی ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ میری مزاحمت میرے ساتھیوں کی سنگین مشکلات میں اضافہ نہ کر دے؟ اسی دوران میں مجھے صفدر کی صورت بھی نظر آ گئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فی الحال ہتھکڑی لگوا لوں۔

○☆○

میں ایک بار پھر اسی منحوس بندی خانے میں تھا' جہاں سرد ہوائیں جسم کو چیرتی ہوئی گزرتی تھیں اور رات ہوتے ہی در و دیوار برف ہو جاتے تھے۔ مجھے ایک بار پھر کچے چنے اور انڈوں وغیرہ پر مشتمل بدبودار کھانا نگلنا پڑا۔ اس مرتبہ زریں گل میرے ساتھ موجود نہیں تھا۔ الزام غلط ثابت ہونے کے بعد اسے رہائی مل گئی تھی اور وہ صفدر کے ساتھ چلا گیا تھا۔ نوشاب بھی اس دفعہ موجود نہیں تھا۔ وہ زندگی ہی سے رہائی پا چکا تھا۔ کوٹھری کے جس گوشے میں وہ سوتا تھا اور آنکھوں میں چشمہ کے خواب سجاتا تھا' وہ گوشہ اب کسی اور کے قبضے میں تھا۔ مجھے لگا جیسے نوشاب کی آنکھیں ابھی تک اس کوٹھری میں موجود ہیں اور آزادی کے سپنے دیکھ رہی ہیں۔

مترجم واحدی اور وہ دیگر افراد جنہیں موت کی سزا ہو چکی تھی اس کوٹھری میں نہیں تھے۔ خبر نہیں انہیں کہاں رکھا گیا تھا۔ میں صبح تک اس بارے میں سوچتا رہا۔ صبح پتا چلا کہ وہ اسی بندی خانے میں تھے۔ میں نے علی الصباح اپنی بیرک نما کوٹھری کے اندر سے واحدی اور ان دیگر افراد کو دیکھا جو کل میرے ساتھ تماشا گاہ کے پنجرے میں بند تھے۔ کل انہوں نے اپنے ساتھیوں کا تماشا دیکھا تھا آج وہ خود تماشا بننے والے تھے۔ انہیں اسی "خشک تالاب" کی طرف لے جایا جا رہا تھا جہاں بپھرے ہوئے جانوروں کے سامنے زندگی سسکتی تھی' تڑپتی تھی' مضحکہ خیز اچھل کود کرتی تھی اور پھر خون اگل اگل کر مر جاتی تھی۔ وہ سب پابہ زنجیر تھے۔ ان کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے جیسے موت سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ خون کا ایک قطرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا ان کے جسموں میں۔ مترجم واحدی کی ویران آنکھیں ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں سے چار ہوئیں..... وہ آخری جھلک تھی۔ اس کے بعد میں نے سہ پہر کو واحدی کی کٹی پھٹی مسخ لاش دیکھی۔

وہ رات ہمیشہ سے زیادہ تاریک اور سرد تھی۔ اس وادی سے بہت دور آباد دنیا کا تصور میرے ذہن میں آیا۔ بہ مشکل دس بجے کا وقت تھا۔ میں نے سوچا لاہور کے کئی بازار ابھی بارونق ہوں گے۔ ابھی باغوں میں چہل پہل ہو گی۔ سینماؤں کے آخری شو ابھی شروع ہوئے ہوں گے لیکن اس وادی میں یہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ یہاں دیوتا کے خونخوار پیروکار اپنی توقع سے زیادہ نیند پوری کر چکے تھے۔ پہاڑ اور ان کی بلندیاں خاموش تھیں۔ دیودار اور چیڑ کے جنگلوں میں سناٹا چکرا رہا تھا اور شاید ان بدنصیبوں کی روحیں بھی جو کل اور آج موت کے تالاب میں دردناک طریقے سے مارے گئے تھے۔ وہ اسی درندگی اور بے حسی کا شکار تھے جو انسانی فطرت میں کسی عفریت کی طرح پنہاں رہتی ہے۔

مجھے یخ بستہ فضاؤں میں ان کی آخری کراہیں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں یقیناً جواں سال نوشاب کی سسکیاں بھی تھیں۔ وہی نوشاب جس نے موت کو گلے لگانا چاہا تھا تو موت نہیں آئی تھی اور جب ایک نئے عزم کے ساتھ زندہ رہنا چاہا تو زندگی نہیں ملی تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کو چھونے کی حسرت لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں نوشاب کا تصور کیا تو کہیں پڑھا ہوا یہ شعر ذہن میں گونجنے لگا۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

میں دوہرے کمبل میں لپٹ کر سویا ہوا تھا' اس کے باوجود پاؤں اور ٹانگیں سن ہو رہی تھیں۔ جو قیدی میرے ساتھ لیٹا ہوا تھا وہ

پتا نہیں بیہودہ تھا' بار بار اپنی ایک ٹانگ سمیٹتا تھا اور اس کا گھٹنا میرے پہلو میں رسید کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اس کا گھٹنا پیچھے ہٹایا۔ آخر جھلاہٹ میں میرے منہ سے نکلا "کیا کرتے ہو؟"

وہ گہری تاریکی میں کھسیایا پھر اس کی آواز آئی "میں کچھ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہے' شمار جنات کرتا ہے۔"

مجھے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں جھپکیں اور غور سے اپنے پہلو میں دیکھا "کیا دیکھتے ہو' میرے سر پہ سینگ تو نہیں اگ آئے۔" آواز دوبارہ آئی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پہلو میں لیٹا ہوا سایہ بھی کمبل ہٹا کر بیٹھ گیا۔ میں نے بے اختیار اس کو ٹٹولا۔ اس کے گلے میں مالائیں اور گھنگھریاں نہیں تھیں لیکن وہ سائیں عالی ہی تھا۔ میں نے اس کے بوسیدہ چولے کو چھو کر ہی پہچان لیا "او سائیں! تم یہاں بھی پہنچ گئے۔" میرے منہ سے نکلا۔

"مجھے کہیں جانے کے لیے رکشے' ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس کسی بھی جن کی دُم پکڑ کر پہنچ جاتا ہوں۔ دُم سمجھتے ہو نا تم! یعنی ٹیل۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سائیں کی آمد ہر بار حیران کن ہوتی تھی۔ میری خاموشی کو محسوس کر کے سائیں بولا "کس سوچ میں پڑ گئے ہو..... تمہارا کیا خیال ہے' جن کی دم نہیں ہوتی..... بھئی ہوتی ہے بعض جنوں کی دُم لیکن دُم دار ستاروں کی طرح یہ جن بھی عام نہیں ہوتے۔ تم نے کبھی دیکھا ہے دم دار ستارہ؟" میں جواب میں خاموش رہا۔ وہ بولا "میں نے آج دوپہر ایک دُم دار ستارہ دیکھا تھا۔ میں اس کی دم کی لمبائی ناپتا ادھر نکل آیا۔ یہاں کے نامعقول کلہاڑا برداروں نے مجھے پکڑ لیا اور باندھ کر یہاں لے آئے۔ میرے جنات کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے اسلحہ نکال لیا لیکن میں نے انہیں سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دُم دار ستارہ؟"

"نہیں تمہاری چھیتی سوچ۔"

"اس کو چھوڑو' دُم دار ستارے کی بات کرو۔ میں نے دوپہر کو دیکھا تھا' کل وہ پھر نکلے گا لیکن تم دیکھ نہیں سکو گے۔ دوپہر کے وقت دم دار ستارہ دیکھنے کے لیے خاص آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔" بولتے بولتے وہ ایک دم سنجیدگی سے کہنے لگا "تمہیں معلوم ہے نا' دُم دار ستارہ نحوست کی علامت ہوتا ہے..... معلوم ہے نا تمہیں؟"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"میں نحوست کی بات کر رہا ہوں' تباہی کی بات کر رہا ہوں۔ جہاں درندگی حد سے زیادہ ہو جائے وہاں تباہی تو پھر آتی ہے نا۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے سائیں عالی سے پوچھا "تم کس تباہی کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جو دُم دار ستارہ لا رہا ہے۔" سائیں نے رسان سے جواب دیا پھر میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "جون چاؤل کا پتا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"کیسے بے پروا ہو تم..... اصل میں جس کام کے لیے یہاں پہنچے تھے وہی بھول گئے۔ ارے یہ جون چاؤل ہی تو تھا جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ یہ دور دراز کا سفر تم نے اسی کے لیے تو کیا تھا۔ جو دفینہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے' اس کا سراغ اسی جون چاؤل کے پاس تو ہے۔ اگر یہ سراغ بھی کھو گیا تو کیا کریں گے ہم؟"

میں نے کہا "ڈھونڈنے میں مجھ سے زیادہ دلچسپی تمہیں ہے۔ تمہیں ہی پتا ہونا چاہیے کہ جون چاؤل کدھر ہے؟"

"ہاں تو میں کب انکاری ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کہاں ہے..... لیکن مسئلہ دُم دار ستارے کا ہے جو کسی بھی وقت اپنی دم ہلا دے گا اور تباہی آ جائے گی۔ ہمیں اس تباہی سے بچ کر نکلنا ہے اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی نکالنا ہے۔"

"کون دوست؟"

"جون چاؤل' صفدر اور وہ پاگل جسے تم زریں گل کہتے ہو۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"کل دوپہر تک سب سمجھ میں آ جائے گا۔ بس خیال رکھنا کہ جب دُم دار ستارہ اپنی دم یعنی ٹیل ہلائے تو تم میرے ساتھ رہنا۔ کہیں ادھر ادھر نہ ہو جانا۔"

یہ بات اب میری سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ سائیں عالی اپنے رمزیہ انداز میں کسی ہلچل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ ہلچل جو کل کسی وقت اس وادی میں رونما ہو سکتی تھی۔

میں نے سائیں عالی سے پوچھا "تم جس تباہی کی بات کر رہے ہو وہ کس قسم کی ہے؟ اور کون لائے گا؟"

وہ بولا "قسم کا تو مجھے پتا نہیں لیکن لائیں گی وہ آنکھیں..... جو تم نے دیکھی ہیں اور میں نے بھی..... وہی خاص آنکھیں..... جو ایک بار دیکھ کر بھلائی نہیں جا سکتیں۔"

میں نے وضاحت چاہی لیکن سائیں عالی نے وضاحت نہیں کی۔ اس پر عجیب سی خود فراموشی طاری ہو گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ کہیں دور' بہت دور چلا گیا تھا۔ سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سائیں نے جن آنکھوں کی بات کی ہے یہ وہی آنکھیں ہیں جو میں نے سرواد رال کی بستی میں سنگی دیوار کے پار دیکھی تھیں۔ اس پراسرار و دلکش خیمے میں جہاں کسی نادیدہ ماخذ سے سنہری روشنی پھوٹتی تھی اور ایک انتہائی حسین و جمیل شخص کا ہیولا نظر آتا تھا۔ یہ اس شخص کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں صرف ایک ساعت کے لیے مجھ سے چار ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ان میں سے بے انتہا طاقتور مقناطیسی لہریں

پھوٹ کر اردگرد کی ہر چیز کو احاطے میں لے رہی ہیں۔

پھر میرے ذہن میں وزیر منصور خان کی خوبرو نائیلہ کا تصور آگیا۔ یقیناً یہ کی پراسرار آنکھیں تھیں جن کی بے پناہ کشش اس لڑکی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں نائیلہ کی غیر معمولی کیفیت کو ابھی تک فراموش نہیں کر سکا تھا۔ وہ گلگت میں عجیب ہیجان کا شکار نظر آئی تھی۔ پھر جب کیپال کے مقام پر ہم نے اسے آزاد چھوڑا تھا تو وہ برف پوش پہاڑوں اور وادیوں میں دیوانہ وار آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کی منزل صرف اور صرف داملی قبیلہ تھا' جہاں مقدس سنہری روشنی کی پرستش کی جاتی تھی۔ اب سائیں عالی ان آنکھوں کے حوالے سے کسی غیر معمولی واقعے کی پیش گوئی کر رہا تھا اور سائیں کی پیش گوئیاں غیر اہم نہیں ہوتی تھیں۔

میرا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سنہری عقاب اور مقدس روشنی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر کون تھا وہ خوبرو شخص جو سات پردوں میں چھپ کر رہتا تھا اور اپنی سحر انگیز شخصیت سے لوگوں کو دیوانہ کر دیتا تھا۔ بے شک وہ اس دور دراز علاقے میں سادہ لوح قبائلیوں کی سادگی کا فائدہ اٹھا رہا تھا لیکن اس کی غیر معمولی صلاحیتوں سے انکار بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی تھا' مجھے وہ شخص اور اس کے پیروکار اس وادی موت کے باسیوں سے بہتر نظر آئے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ ان میں ذات پات کی تقسیم موجود تھی۔ وہ بے حد محنتی اور امن پسند تھے جب کہ سرداد سدوت کے لوگوں یعنی "وادی داخان" والوں کا اصل پیشہ ہی لوٹ مار تھا۔ جارحیوں کا تسلط ختم ہونے کے بعد وہ کسی حد تک لوٹ مار سے باز تو آگئے تھے لیکن اتنی جلدی ان کی فطرت بدل نہیں سکتی تھی۔ ایک روز پہلے تماشاگاہ میں ان لوگوں کا رویہ دیکھ کر مجھے ان سے نفرت سی ہوگئی تھی۔ جان کنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے لوگوں کی بے بسی پر قہقہے لگانا اور تالیاں پیٹنا نہایت شقی القلب لوگوں کا ہی کام تھا۔ اتنے ہجوم میں مجھے کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آیا تھا جس کے چہرے پر اس تماشے سے نفرت یا بیزاری کا تاثر پایا جاتا ہو۔

وہ رات میں نے کروٹیں بدلتے ہی گزار دی۔ اگلا دن حسب معمول طلوع ہوا۔ سب کچھ روز مرہ کی طرح تھا۔ سائیں عالی اب یکسر خاموش ہوگیا تھا۔ میری ہر بات کے جواب میں بس "ہوں ہاں" کر کے رہ جاتا تھا۔ اپنی گفتگو میں سائیں نے بار بار "دوپہر" کا اشارہ دیا تھا مگر دوپہر آئی اور گزر گئی۔ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ پھر سہ پہر ہوئی اور شام ہوگئی۔ سائیں کسی گہری سوچ میں غرق نظر آتا تھا۔

یہ رات دوسرے پہر کا وقت تھا۔ میں دوہرے کمبل میں ٹانگیں سکیڑ کر سردی پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اگر کسی وقت اونگھ آ بھی جاتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ کسی یخ بستہ پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ ایسے میں بندے کو ایک گرم و آرام دہ بستر کی اصل اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچانک ایک نامانوس شور نے مجھے چونکا دیا۔ ایک گونج سی تھی جو وادی کے شمالی حصے سے بتدریج بلند ہو رہی تھی۔ یہ شور اور گونج میں چند دن پہلے بھی سن چکا تھا' جب سرداد داملی اپنے لشکریوں کے ساتھ وادی پر حملہ آور ہوا تھا۔ مکمل پل بہت قریب موجود تھا۔ اس دن پہلی بار میرے کان اس گونج سے آشنا ہوئے تھے۔ میرے دل سے آواز آئی۔ ہونہ ہو' آج پھر وہی صورت حال بن گئی ہے۔ شاید سوار داملی پھر وادی پر حملہ آور ہوگیا ہے۔ میں بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا' پھر میں نے جھنجوڑ کر سائیں عالی کو گہری نیند سے بیدار کیا۔ وہ پہلے تو اول فول بولتا رہا' پھر اس نے بھی نامانوس شور سن لیا اور ایک دم چوکنا ہوگیا۔ شور اب کافی قریب آگیا تھا۔ میں نے بیرک نما کوٹھری کے آہنی جنگلے میں سے باہر جھانکا اور مجھے محسوس ہوا کہ شمال کی طرف روشنی سی پھیلی ہوئی ہے۔ روشنی اور اس وادی میں؟ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ یہاں تو سورج غروب ہونے کے بعد دیا سلائی تک جلانے کی اجازت نہیں تھی' کہاں اتنی روشنی کہ آسمان سرخ ہو رہا تھا۔

سائیں عالی نے دیوانگی سے بھرپور قہقہہ لگایا "دم دار ستارہ ہاہا۔ ہاہا دم دار ستارہ۔ تمہیں کہا تھا نا یہ ستارہ منحوس ہوتا ہے۔"

شور و غل اب واضح ہوگیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ پل کی جانب کوئی خوف ناک ہلچل مچ چکی ہے۔ کوٹھری کے کئی نادار اب جاگ گئے تھے اور ہراساں لہجے میں ایک دوسرے سے سوال وجواب کر رہے تھے۔ میں نے بندی خانے کے دو محافظوں کو دیکھا۔ وہ رائفلیں ہاتھوں میں لیے ہمارے سامنے سے سرپٹ بھاگتے نکل گئے۔ یقیناً ان کا رخ پل ہی کی طرف تھا۔

ہم کوٹھری میں تھے مگر قرب و جوار میں اچانک ہی جو شدید ہلچل مچی تھی وہ ہم بڑی اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر شخص بھاگ رہا ہے اور بلند آواز سے بول رہا ہے۔ چند لمحے بعد گھوڑوں کی تیز ٹاپوں سے اندازہ ہوا کہ ایک دستہ بڑی تیز رفتار کے ساتھ بندی خانے سے نکلا ہے اور پل کی طرف گیا ہے۔ اگلا آدھا پون گھنٹا بے حد سنسنی خیز تھا۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ داملی قبیلے نے صرف چوبیس دن پہلے شکست کھانے کے بعد وادی پر دوسرا شدید حملہ کیا ہے اور اس کے بہادر سوار پل پار کر کے وادی میں گھس آئے ہیں۔ بندی خانے سے پل کا فاصلہ دو فرلانگ سے زائد تھا۔ اس کے باوجود ایک شدید ترین معرکے کے صوتی اثرات ہم تک پہنچ رہے تھے۔

سائیں عالی بظاہر ہر شے سے بے نیاز نظر آتا تھا اور کوٹھری کے وسط میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ گاہے گاہے اس کے ہونٹوں سے نعرہ بلند ہوتا تھا "ہا دل دھڑکا وحشی کا ...... ہا دل دھڑکا۔" اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

تھوڑی دیر بعد لڑائی کا ہولناک شور بندی خانے سے نزدیک تر ہوگیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ حملہ آوروں نے جان ہتھیلی پر رکھ لی ہے اور وادی کے کلہاڑا برداروں کو روندتے ہوئے آگے

بڑھ رہے ہیں۔ شمال کی جانب سے ابھرنے والی سنہری مائل روشنی بھی قریب تر آتی جا رہی تھی۔ بندی خانے کے در و دیوار سے چپکی ہلکی تاریکی پہلے جیسی گمبھیر نہیں رہی تھی۔ اچانک مجھے مشعل برداروں کی ایک گھڑ سوار ٹولی نظر آئی۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ بندی خانے کے سامنے سے گزر گئی تھی۔ چند لمحوں بعد ایک ایسی ہی ٹولی بندی خانے میں گھس آئی۔ اس کے برچھے روشنی سے چمک رہے تھے۔ یقیناً یہ سردار داملی کے لشکری تھے۔ کوٹھری میں بند قیدیوں نے مشعل برداروں کو دیکھتے ہی پرجوش نعرے لگائے اور اچھل کود کرنے لگے۔ چند لشکری گھوڑوں سے اتر کر ہماری بیرک نما کوٹھری کے سامنے پہنچے۔ ایک شخص نے سٹین ایم ایم کے پے در پے فائر کر کے دروازے کا آہنی قفل توڑ دیا۔

دروازہ کھلتے ہی قیدی بھرا مار کر باہر نکلے۔ یہ تمام تر قیدی داملی قبیلے کے تھے۔ مشعل بردار گھڑ سواروں نے ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں تو برچھے اور بھالے تھما دیے اور بعض کو اپنے ساتھ گھوڑوں پر سوار کر لیا۔ سائیں عالی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "شفیع محمد! میری بات یاد ہے نا؟"

"کون سی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "میرے ساتھ رہنا' ادھر ادھر نہ ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

ہم بندی خانے سے باہر نکلے تو ہر طرف افراتفری کا عالم نظر آیا۔ یہ بڑی تباہ کن قسم کی افراتفری تھی۔ گلیوں میں متحارب گروہوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ گولیوں کے دھماکے تھے اور تیز دھار آلوں کی چمک موت بن کر سروں پر تڑپ رہی تھی۔ میں نے کئی گھروں کو دھڑا دھڑ جلتے دیکھا۔ ان جلتے گھروں میں سے مرد زن اور بچے چیختے چلاتے بھاگ رہے تھے۔ ان میں کئی زخمی تھے اور کچھ کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ یہی لوگ تھے جو ایک روز پہلے تک تماشاگاہ میں درندگی اور سفاکی کا مظاہرہ زبردست تالیوں کے شور میں دیکھ رہے تھے' آج موت نے ایک بدمست سانڈ کا روپ دھار لیا تھا۔ یہ پوری بستی "موت کا تالاب" بن گئی تھی اور آسمان تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہماری آنکھوں کے عین سامنے ایک زبردست جھڑپ ہو رہی تھی۔ لمبے بالوں والے تین کلہاڑا بردار ایک گھوڑا گاڑی کے عقب میں چھپے ہوئے تھے اور ان حملہ آوروں پر فائر کر رہے تھے جنہوں نے ایک دیوار کی اوٹ میں پناہ لے رکھی تھی۔ دیواروں کے پیچھے سے بھی تابڑ توڑ فائر ہو رہا تھا۔ پھر اچانک بھک بھک کی آوازوں سے گھوڑا گاڑی میں شعلے بھڑک اٹھے۔ یقیناً اس پر "پیٹرول بم" قسم کی کوئی شے پھینکی گئی تھی۔ شیشے کی بڑی بوتل میں تیل وغیرہ ڈال کر اسے "پیٹرول بم" کی شکل دینا خاصا آسان ہوتا ہے۔ جونہی گھوڑا گاڑی سے شعلے بلند ہوئے' اس کی آڑ میں پناہ لینے والے مقامی لوگ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹے۔ اسی وقت وہ لوگ فائرنگ کی زد میں آگئے۔ حملہ آوروں نے پلک جھپکتے میں ان تینوں کو بھون ڈالا۔ یہ سارا واقعہ بے حد مختصر وقت میں رونما ہوا تھا۔ بہ مشکل پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔

سائیں عالی اور میں کالے دھوئیں کے اندر سے بھاگتے ہوئے سرنگ کے دہانے کی طرف جا رہے تھے۔ بندی خانے کا کمبل میرے کندھے پر تھا۔ سائیں میری رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا اور بالکل ایک بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ گلی کوچوں میں ہونے والی لڑائی کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا لیکن ہم نے جو کچھ بھی دو تین منٹ کے اندر دیکھا' اس سے یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ آوروں کا پلڑا بھاری ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک خاص بات محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وادی کا دفاع کرنے والے گھڑ سواروں کی تعداد کم ہے۔ پیدل دستے بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن گھڑ سواروں کے مقابلے میں انہیں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔

ہم دوڑتے ہوئے سرنگ کے دہانے پر پہنچے اور پھر اندر داخل ہوگئے۔ یہاں بتدریج دھواں بھرتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے دو نیم برہنہ مقامی لڑکیوں کو دیکھا' ان کی پیشانی پر ایک ایک دھاری تھی۔ وہ حملہ آور گھڑ سواروں کے آگے آگے جان بچانے کے لیے بھاگ رہی تھیں۔ لمبے بالوں والے ایک بہت موٹے کلہاڑا بردار کی لاش پھلانگ کر ہم سرنگ کی تنگ شاخ میں داخل ہوگئے۔ یہاں ابھی دھواں بھرنا شروع نہیں ہوا تھا' ہاں بارود کی بو یہاں تک بھی پہنچی ہوئی تھی۔ دیواروں پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں چھتوں پر نیم عریاں دیوی دیوتاؤں کی تصویریں کندہ نظر آتی تھیں۔ روایتی دیوتا "یمن سانڈ" کی تصویر اکثر جگہوں پر کندہ کی گئی تھی لیکن یہاں یہ سانڈ دیوتا' عورتوں کے ساتھ نظر آ رہا تھا اور کئی تصویریں بہت قابل اعتراض تھیں۔

ابھی ہم اس سرنگ میں چالیس پچاس قدم آگے گئے ہوں گے کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں پڑی "خوچہ ہمارا خیال ہے کہ یہ راستہ ٹھیک رہے گا۔" یہ زریں کی آواز تھی۔

میں نے پکار کر کہا "زریں! ہم اس طرف ہیں۔"

چند ہی لمحوں میں زریں ہمارے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ جون چاؤل تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی جانے پہچانے چہرے تھے۔ یہ فلمی یونٹ کے وہ لوگ تھے جو پچھلی دفعہ ہمارے ساتھ اس وادی میں سے نکل نہیں سکے تھے۔ ان میں ایک خوب صورت چہرہ سری لنکن اداکارہ لو-سانچی کا تھا۔

میں نے زریں گل سے پوچھا "صفدر کہاں ہے؟"

وہ بولا "وہ یہاں نہیں ہیں۔ انہیں ...... ڈھونڈنا پڑے گا۔"

"او گاڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

سائیں عالی بگڑ کر بولا "خدا کو یاد نہیں کرو گے تو انگریزی میں کرو گے ...... چلو آؤ میرے ساتھ' مجھے پتا ہے صفدر کہاں ہوگا۔"

ہم سائیں عالی کے پیچھے باہر کی طرف لپکے۔ سرنگ کے دہانے کے پاس ایک حملہ آور کی لاش تھی۔ خودکار رائفل دبی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل کھینچ لی۔ اس میں تیس گولیوں والا میگزین چڑھا ہوا تھا اور اس میں سے ابھی شاید چار پانچ گولیاں ہی استعمال ہوئی تھیں۔ زریں کی نگاہیں بھی تیزی سے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شاید وہ بھی کسی "مرنے والے" کا ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا۔ پُراسرار پو ٹلیوں والے درخت کے پاس ایک گڑھا تھا۔ سائیں عالی نے اپنے پیچھے آنے والوں کو چیخ کر ہدایت کی کہ وہ اس گڑھے میں اتر جائیں تاکہ اندھا دھند فائرنگ سے محفوظ رہیں۔ بیشتر افراد گڑھے میں اتر گئے۔ سائیں عالی مجھے' زریں گل اور جون چارلی کو لے کر داری کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا "میرے ساتھ رہنا' آگے پیچھے نہیں ہونا۔" سائیں کی ٹانگوں میں اتنی قوت نہ جانے کہاں سے آگئی تھی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ راستے میں ہی کہیں سے اس نے ایک مشعل بھی نکالی تھی۔ اس مشعل کی روشنی ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔

ہم سب دیواروں کے ساتھ ساتھ جھک کر چل رہے تھے۔ کہیں فائرنگ کی شدت ہوتی تھی تو اوندھے لیٹ جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ چند کلماڑا بردار برق رفتاری سے ہم پر حملہ آور ہوئے۔ شاید وہ ہمیں لداروں کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ ظاہر ہے سائیں عالی کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے بھلایا یا نظر انداز کیا جاسکتا۔ وہ لپکے بھی سائیں عالی کی طرف تھے۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ایک آدھ کلماڑے کا پھل ضرور سائیں کے سر کو دو نیم کر دیتا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ ایک برسٹ نکلا اور تین افراد اچھل اچھل کر تاریکی میں گرے۔ باقی پناہ لینے کے لیے مختلف اطراف میں بھاگے۔ ہم ایک بار پھر سائیں کے پیچھے چل دیے۔ فائرنگ کی آواز کے باوجود سائیں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔

اچانک کہیں پاس ہی دستی بموں کے دو زوردار دھماکے ہوئے اور فضا لرز گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' دو گھر شعلوں کی زد میں تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے دس بارہ سال کا ایک بچہ جلتے ہوئے گھر سے نکلا۔ اس کے کپڑوں نے آگ پکڑ رکھی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا اور بھاگ رہا تھا لیکن آگ سے بھاگ کر وہ کہاں جاسکتا تھا۔ آگ تو اس کے ساتھ تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے بڑی حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی یہ "بے بس نگاہ" میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی۔ یہ موت کے جبڑے میں پھنسے ہوئے بچے کی نگاہ تھی۔ وہ صرف ایک بچہ تھا۔ اس کا تعلق کسی قبیلے اور کسی دیوتا سے نہیں تھا۔ کوئی اس کی ماں تھی اور وہ اس کا لختِ جگر تھا۔ ان لمحوں میں مجھے صرف ماں اور بچے کا رشتہ یاد رہا۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے دوڑا۔ میرے کندھوں پر بندی خانے کا کمبل تھا۔ بچے کا اونی لباس کافی موٹا تھا۔ ابھی آگ شاید اس کے نازک جسم تک نہیں پہنچی تھی۔ اگر پہنچ گئی ہوتی تو وہ بھاگ نہ سکتا اگر تڑپنے لگتا۔ میں نے اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنا دہرا کیا کمبل اس پر پھینک دیا اور پوری طرح اپنی بانہوں میں لپیٹ لیا۔ شعلے بجھ گئے۔ سفید دھوئیں اور جلے ہوئے گوشت کی بو نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ ایک زخمی عورت چیختی ہوئی میری طرف بڑھی۔ جلتے ہوئے مکانوں کی روشنی میں اس کا چہرہ رنج و الم کی تصویر نظر آتا تھا۔ وہ بچے سے لپٹ گئی۔ اسے ٹٹولنے لگی اور اس کا منہ چومنے لگی۔ یقیناً یہ اسی کا بچہ تھا۔

گھڑسواروں کا ایک دستہ آیا اور ہمارے قریب سے دندناتا ہوا گزر گیا۔ دھوئیں کے مرغولے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ سائیں عالی اور زریں وغیرہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے بری طرح کھانستے ہوئے انہیں آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ کسی رائفل کی گولیاں سنسناتی ہوئی میرے قریب سے گزریں اور مجھے بھاگ کر ایک تنگ مجنبے کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔ داری نہایت خوف ناک تصادم کی زد میں تھی۔ وہ بستی جہاں ایک دیا تک جلانے کی اجازت نہیں تھی' پوری کی پوری بستی جل رہی تھی۔ ہر طرف زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخ و پکار تھی۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ سائیں عالی کی خواہش یہی تھی کہ ہم داری میں مچی ہوئی شدید افراتفری کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جائیں اور نکلنے کا راستہ پل کی جانب ہی تھا۔ میں نے سوچا' مجھے پل کی طرف بڑھنا چاہیے۔ عین ممکن تھا کہ وہاں سائیں عالی' منصور اور زریں وغیرہ سے ملاقات ہو جاتی۔ اس موہوم امید کے سہارے میں پل کی طرف بڑھا۔ خودکار رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی اور میں اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار بھی تھا۔

اب یہ امر واضح طور پر دکھائی دینے لگا تھا کہ وادی کے لوگوں کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں اور جس جارحانہ انداز کے لیے وہ مشہور تھے وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ یعنی "ناقابلِ شکست" کو شکست ہو چکی تھی' یا بس ہونے ہی والی تھی۔ ایسا کیونکر ہوا؟ یہ سوال بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ یقیناً اس صورتِ حال کے پیچھے کوئی غیر معمولی سبب تھا۔ کوئی انہونی ضرور ہوئی تھی۔ میں توہم پرست نہیں تھا' نہ ہی تصور اور خیال کی میرے نزدیک زیادہ اہمیت تھی لیکن کوئی بات ایسی ضرور تھی جو میری عقل کے دائرے سے باہر تھی اور تحریر وجود رکھتی تھی۔

دھوئیں کے مرغولوں اور گولیوں کی بوچھاڑوں سے بچتا میں پل کی طرف بڑھ رہا تھا جب اچانک منصور سے مڈبھیڑ ہو گئی "شاہ جہاں صاحب! باقی لوگ کہاں ہیں؟" منصور نے چیخ کر پوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ وہ تمہیں ہی ڈھونڈنے نکلے تھے۔"

ایک دم گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ قریب سے گزرتا ہوا ایک گھڑسوار گھوڑا تڑپ کر زمین پر گر گیا۔ ہم دونوں ایک جھونپڑے کی اوٹ میں ہو گئے۔

میں نے منصور سے پوچھا "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وادی کے جانباز پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔"

"ہاں' میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا۔ سردار سدرت کے ڈیڑھ سو سے زیادہ گھڑسوار لڑائی میں حصہ نہیں لے رہے۔ خبر نہیں وہ کہاں ہیں۔"

گولیاں ایک بار پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ حملہ آوروں کی برتری اب بالکل واضح ہو چکی تھی۔ وہ داری کے خونخوار جنگجوؤں کو بھگا بھگا کر مار رہے تھے۔ انہیں برچھوں سے کاٹ رہے تھے اور گولیوں سے اڑا رہے تھے۔ جہاں کوئی لمبے بالوں والا نظر آتا تھا اسے مار دیا جاتا تھا یا پکڑ لیا جاتا تھا۔ کندھوں پر پہنچے ہوئے بال اور کانوں کے بڑے بڑے بالے داری داخان کے لوگوں کی پہچان تھے اور اب یہی پہچان ان کے لیے موت کا پروانہ بنی ہوئی تھی۔ ہم سے صرف چند گز کی دوری پر ایک جھونپڑا بہت بڑے الاؤ کی شکل میں جل رہا تھا۔ اس الاؤ کی روشنی سے ارد گرد کی ہموار زمین سرخ ہو رہی تھی۔ ہم نے دیکھا تین چار جواں سال عورتیں اور بچے بھاگتے ہوئے آئے۔ ان کے پیچھے سردار راحل کے لشکری تھے۔ انہوں نے عورتوں کو پکڑنا چاہا۔ عورتوں نے مزاحمت کی' وہ مردوں کے سے انداز میں حملہ آوروں سے لپٹ گئیں اور مزاحمت کرنے لگیں لیکن حملہ آور زیادہ تھے۔ انہوں نے عورتوں کو زمین پر گرا لیا۔ ان کے کپڑے پھاڑ دیے اور نوچ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ ان کے بچے قریب کھڑے رو رہے تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اچانک ایک طرف سے کچھ گھڑسوار لپکتے ہوئے آئے۔ ان میں سب سے اگلا گھڑسوار ایک پچہ نظر آتا تھا۔ وہ سردار راحل تھا۔ مختصر جسم کا لیکن انتہائی بارعب اور سخت جان نظر آنے والا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور پستول تھا۔ عورتوں سے گتھم گتھا ہونے والے لشکریوں پر درندگی سوار تھی لیکن جب انہوں نے سردار راحل کو اپنے سر پر دیکھا تو ایک دم ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئے۔ سردار راحل نے دو ہوائی فائر کیے اور اپنے لشکریوں کو چلا کر سرزنش کی۔

ایک لشکری نے جواب میں کچھ کہا۔ سردار راحل نے غضب ناک ہو کر اس کی ٹانگ میں گولی ماری اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس پر چڑھا دیا۔ زخمی لشکری گھوڑے کے دھکے سے دور جا گرا۔ سردار راحل غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے ساتھی سہم کر رہ گئے۔

سردار سدرت اور اس کے ساتھیوں کی مزاحمت مکمل طور پر ختم ہونے والی تھی۔ سب سے شدید مزاحمت' بڑی سرنگ کے دہانے پر دیکھنے میں آئی تھی۔ وہاں کلماڑا بردار جنگجوؤں کی لاشیں کٹے ہوئے کھلونوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ تیل کے بم اور دستی بم جگہ جگہ آگ بھڑکا چکے تھے اور اس آگ کی روشنی میں سردار راحل کے ساتھی ایک تند ریلے کی طرح سرنگ میں گھسے چلے جا رہے تھے۔ سرنگ کے اندر سے گاہے گاہے فائرنگ کی زوردار آواز آتی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ اندرونی حصے میں کہیں کہیں معمولی مزاحمت ہو رہی ہے۔

○☆○

ناقابلِ تسخیر کو تسخیر کر لیا گیا تھا۔ ناقابلِ عبور..... عبور ہو چکا تھا۔ وادی داخان کو قدرتی کمینگاہیں ٹوٹ گئی تھیں اور اس کا "اسرار" پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ سردار راحل کے قبیلے کو واضح فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس فتح میں یقیناً اس غیر معمولی جوش و خروش کو بھی دخل تھا جو تربیت گاہ میں نوجوان لڑکوں کے قتلِ عام سے پیدا ہوا تھا۔ میں اس قتلِ عام کا چشم دید گواہ تھا اور وہ خوف ناک نظارہ میں ابھی تک بھولا نہیں تھا۔ اس خون ریز قبائلی لڑائی میں دونوں طرف سے سخت جانی نقصان ہوا تھا۔ کم و بیش چھ سو افراد لقمۂ اجل بنے تھے اور زخمی ہونے والوں کی تعداد بے شمار تھی۔ سردار سدرت خود بھی شدید زخمی ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دستی بم کے دھماکے میں صاف اڑ گیا تھا اور ایک ٹانگ پر بھی زخم آئے تھے۔ سردار سدرت کے کم و بیش دس بڑے بڑے سردار اور ملک اس لڑائی میں کام آئے تھے۔

پوری داری پر قبضہ ہو گیا تھا' تاہم یہ بات دیکھنے میں آئی تھی کہ قابضین نے مذہبی مقامات کو تاراج نہیں کیا تھا۔ نہ جاترو (عبادت گاہ) میں اکھاڑ پچھاڑ کی گئی تھی اور نہ رہائش دیوتا کے مجسموں کو چھیڑا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سردار راحل نے اعلان کیا تھا کہ لوٹ مار نہیں ہو گی اور عورتوں کی بے حرمتی کرنے والے کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے ایک دو لشکریوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا تھا۔ ناشا کے بارے میں ہمیں فکرمندی تھی۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ ہاں' ڈاکٹر ہنری کے متعلق پتا چلا تھا کہ وہ گرفتار ہے۔

ہم چونکہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے لہٰذا لڑائی کے ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر داری سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ شاید نہ بھی بچھڑتے تو داری سے فرار کا منصوبہ ناکام رہتا۔ زریں گل کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ لڑائی کے دوران میں ہی راحل کے لشکریوں نے چرخیوں کے ذریعے پل کو حرکت دی تھی اور اسے نیچے گرا دیا تھا۔ یعنی اپنی واپسی کا راستہ خود ہی بند کر دیا تھا (تاکہ آگے بڑھتے ہوئے قدم اب پیچھے نہ ہٹ سکیں۔) یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ حملے کے وقت سردار سدرت کے پہرے دار یہ پل کیوں نہ گرا سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو حملہ آور کبھی اتنی قوت سے داری میں داخل نہ ہو سکتے۔ وادی داخان کے خونخوار کلماڑا برداروں کی عبرت ناک شکست کے حوالے سے کئی باتیں وضاحت طلب تھیں۔

ایک چیز ہمارے حق میں گئی تھی اور اس وجہ سے تمام حالات ہمارے حق میں ہو گئے تھے۔ سردار راحل اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ چھبیس ستائیس روز پہلے ہم کیو کمر بستی سے نکلے تھے اور دو مری تک پہنچے تھے۔ وہ بے خبر تھے کہ میں اور زریں گل منصے سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئے تھے اور ہم نے

سردار سدورت سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے علم میں یہی تھا کہ ہم باقاعدہ حملے میں شریک تھے اور کلہاڑا برداروں سے لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ درحقیقت ایک ڈیڑھ پہلے جب سردار سدورت اور سردار رابیل کے قبیلوں میں لڑائی شروع ہوئی تھی تو سخت ہنگامی صورتِ حال تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ لہٰذا حملے کے وقت ہماری غیر موجودگی محسوس نہیں کی جا سکی تھی۔ صرف صندور کا مسئلہ تھا۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے اس وادی میں مقیم تھا۔ وہ یہاں لڑکوں کو تربیت بھی دیتا رہا تھا' اس کے علاوہ وہ رابیل قبیلے میں لڑکوں کے قتلِ عام میں بھی شریک ہوا تھا۔ بے شک وہ ایک عسکری نوعیت کی کارروائی تھی مگر اس میں صندور کی شرکت ثابت ہو جاتی تو صندور کے لیے ناقابلِ بیان مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

لیکن پھر یوں ہوا کہ یہ معاملہ بھی دوسرے معاملات کی طرح خود بخود ہی سدھر گیا۔ ہمارے ستارے بڑے اچھے جا رہے تھے۔ ہماری خوش بختی میں کچھ عمل یقیناً سائیں عالی کو بھی تھا۔ سردار رابیل' سائیں کی بات بڑے دھیان اور توجہ سے سنتا تھا۔ بالکل جیسے کوئی عقیدت مند اپنے بزرگ کی بات پر توجہ دیتا ہے۔ سائیں عالی نے اپنے خاص انداز میں سردار رابیل کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ صندور وادی داخان میں ایک رہنما کی حیثیت سے موجود تھا۔ وہ اپنے کسی قول و فعل میں بھی خود مختار نہیں تھا۔ وہ اگر یہاں لشکریوں کو تربیت دے رہا تھا تو اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔ وہ سزا کا نہیں دل جوئی کا حق دار ہے کیونکہ دشمنوں کا دشمن ہے۔

سائیں عالی کی باتیں سردار رابیل کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ سردار رابیل اور اس کے مشیر حضرات' صندور کے سلسلے میں زیادہ گہرائی میں نہیں گئے اور نہ ہی انہیں یہ شک گزرا کہ صندور تربیت گاہ پر ہونے والے حملے میں شریک تھا۔

وادی میں حالات آہستہ آہستہ معمول پر آ رہے تھے۔ دارِ فانی سے کوچ کرنے والوں کی لاشیں مقامی رسموں کے مطابق ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ قیدیوں کو محفوظ مقامات پر منتقل کیا جا چکا تھا۔ قریباً ایک سو نمائی قیدیوں کو وادی سے نکال کر سردار رابیل کی بستی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سردار سدورت شفا خانے میں زیرِ علاج تھا۔ سردار رابیل اور اس کے قریبی ساتھیوں نے "مستقل" وادی میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ وہ سرنگ کے اندر "تخت" نامی حصے میں رہائش پذیر تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اس سے پہلے سردار سدورت اور اس سے پہلے بادشاہ جلوہ افروز ہوتا تھا۔ ہمیں تخت کے قریب ہی آرام دہ رہائش گاہ ملی ہوئی تھی۔ صندور' زریں گل' جون چاولی' سائیں عالی سب یہیں موجود تھے۔ دو دن پہلے سروج بھی آ گئی تھی۔ وہ اب تک سردار رابیل کی بستی میں تھی۔

سائیں عالی مجھ سے خفا نظر آتا تھا۔ پتا نہیں کیوں' جب بھی مجھے دیکھتا تھا اس کا منہ بن جاتا تھا۔ وادی پر قبضہ ہوئے دس روز ہو چکے تھے۔ ان دنوں میں اس نے مجھے ایک بار بھی "شفیع محمد" کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایک رات جب کھانا وغیرہ کھا کر اونگھ رہے تھے' میں سائیں عالی کے پاس جا بیٹھا۔ حسبِ معمول کمرے کے ایک کونے میں اونی نمدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اور اشاروں کنایوں میں "جنات" سے باتیں کر رہا تھا۔ کبھی گم تھا' کبھی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتا تھا۔ کبھی نفی میں سر ہلا تا تھا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے سائیں عالی! مجھ سے ناراض ہو؟"

وہ بولا "تم نے کام ہی ناراض ہونے والا کیا ہے۔ سارا تمہاری وجہ سے بگڑا ہے۔ ورنہ ہم یہاں سے نکل گئے ہوتے۔ میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ میرے ساتھ رہنا مگر تم نے سن کر ان سنی۔"

میں نے کہا "سائیں! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے رکنے کی وجہ کیا تھی۔ روتے بلکتے بچے کو دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اگر میں اس کا بچاؤ نہ کرتا تو وہ معصوم جل کر راکھ ہو جاتا۔"

سائیں بولا "اسی لیے تو تم سے کچھ کہا نہیں ہے' ورنہ پتا کیا کر جاتا تمہارے ساتھ۔"

"کیا کر جاتے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی اور خلا میں گھور کر بولا "ہم پاس بہت سے ایسے جن ہیں جو مارشل آرٹس جانتے ہیں۔ ایسے جن سے کہہ کر تمہارے ہاتھ پاؤں تڑوا دیتا..... پھر تمہیں قاف میں کسی بزرگ جن کے مزار پر پھنکوا دیتا۔ تمہاری وجہ کسی مسکین جن کی روزی لگ جاتی۔ وہ تمہیں ریڑھی پر ڈال کر بازاروں میں پھراتا اور بھیک مانگتا۔"

میں نے کہا "تم ہر کام جنات سے کروا سکتے ہو تو پھر ہمیں یہاں سے بھی نکال لے جاؤ۔"

وہ بولا "یہاں جنات سے بھی بڑی شکتی موجود ہے۔ وہ ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دے گی۔"

"کون سی شکتی؟"

"ان آنکھوں کی شکتی جو تم نے دیکھی تھیں..... اور دیکھو گے بھی۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ سمجھنا چاہتے ہو تو میری طرح ننگے سر ننگے پاؤں ہو جاؤ۔ چوغہ پہنو اور گلے میں مالا ڈالو' متقل مندروں کے کھنڈروں ویرانوں میں ڈیرا ڈالو۔ یہ باتیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"لیکن بتانے میں کیا حرج ہے۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی۔"

"میں بتا نہیں سکتا' ہاں دکھا سکتا ہوں۔"

سائیں عالی اٹھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چالیس پچاس قدم دور ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ کمرا بھی ہمارے کمرے کی طرح آرام دہ اور صاف ستھرا تھا۔ فرش پر اونی دری بچھی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مسہری پر ایک نحیف و نزار شخص بندھا ہوا تھا۔ اس کے بازو' پاؤں' پیٹ' سینہ سب کچھ رسیوں میں جکڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ مچل مچل جاتا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے نائیلہ کی ہذیانی کیفیت یاد آ گئی۔ وہ بھی اسی طرح بستر پر آب کی طرح تڑپتی رہی تھی۔ یہی آثرات تھے جن کی بنا پر اس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ پاگل ہو گئی تھی۔ تو کیا یہ شخص بھی اسی اثر میں تھا جسے مقدس سنہری روشنی سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اس شخص کے بال لمبے تھے اور کانوں میں بالے تھے۔ یقیناً وہ اس وادی سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے سائیں عالی سے پوچھا "یہ کون ہے؟ اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔"

سائیں بولا "اس کا نام دارا شان ہے۔ دارا ایک جنگجو شخص ہے اور سردار سدورت کے لشکریوں میں اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہ وادی کے گھڑ سوار دستوں کا سالار تھا۔"

"لیکن اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟"

"یہ کسی کو معلوم نہیں۔ نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ اس شخص نے عین لڑائی کے موقع پر اپنے سردار اعلیٰ (سدورت) کا ساتھ کیوں چھوڑا۔ وادی پر ہونے والے دوسرے حملے سے کچھ ہی دیر پہلے یہ شخص اپنے قریباً چار سو گھڑ سواروں کے ساتھ وادی کے جنوبی حصے میں واقع جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے تک یہ لوگ وہیں رہے تھے۔ لڑائی میں ان لوگوں کے شریک نہ ہونے سے ہی سردار رابیل کو اتنی زبردست فتح نصیب ہوئی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ ذہن میں ہلچل مچ گئی تھی۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شخص بھی کسی نہ کسی طور پر مقدس سنہری روشنی کا دیدار کر چکا ہے جو سردار رابیل کی بستی میں پتھریلی دیوار کے پار جھلکتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وادی داخان کے باسیوں کو ہونے والی ذلت آمیز شکست میں اس "مقدس روشنی" کا بھی ہاتھ تھا جس کی رابیل قبیلے میں پوجا کی جاتی ہے۔ ایک بار پھر یہ سوال میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا کہ وہ خوبرو شخص کون تھا جس کی ہم نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی اور اس کے اطراف سے پھوٹتی ہوئی لالہ رونی کیا تھی۔

میں نے سائیں عالی سے پوچھا "یہ شخص کیا چاہتا ہے؟"

"وہی چاہتا ہے جو مسز منصور خان کی خوبرو بیوہ چاہتی تھی اور نائیلہ چاہتی تھی جسے تم نے رابیل کی بستی کے ایک گھر میں مچھلی کی طرح تڑپتے دیکھا تھا۔ یہ شخص وہیں جانا چاہتا ہے جہاں وہ دونوں گئی ہیں۔ کل صبح مقامی رواج کے مطابق اسے نارنجی رنگ کے صاف ستھرے کپڑے پہنائے جائیں گے' خوشبو لگائی جائے گی۔ اس کے گلے میں مقدس پھولوں کے ہار ڈالے جائیں گے اور گھوڑا گاڑی پر بٹھا کر سردار رابیل کی بستی کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ وہاں جا کر اعلیٰ نشکوں کی سنگت میں اس شخص کو پتھر کی بلند و بالا دیوار تک پہنچایا جائے گا۔ دیوار میں واقع دروازہ خود بخود کھل جائے گا یہ شخص اندر داخل ہو جائے گا..... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔" یہاں تک کہہ کر سائیں عالی نے بلند قہقہہ لگایا "دل دھڑکا سالے کا..... ہاں دل دھڑکا سالے کا" اس نے بلند آواز سے کہا اور روتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں بھی تیزی سے باہر آ گیا۔ سائیں عالی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اندر سے ایک دم چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے واپس جا کر دیکھا۔ مسہری سے بندھا ہوا نحیف و نزار شخص تڑپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں اور حلق سے نامانوس آوازیں نکل رہی تھیں۔ اسے شدید قسم کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر کئی افراد وہاں اکٹھے ہو گئے۔ ان میں زریں گل' جون چاولی' صندور اور سروج وغیرہ بھی تھے۔

سروج کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ یہ سرنگ کا ایک تنگ حصہ تھا۔ دیوار پر لیمپ روشن تھا۔ دیواروں پر رینگنے والے سائے بہت ناک نظر آ رہے تھے۔ سروج نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا "شاہ جہاں' سائیں جی کدھر ہیں؟"

میں نے کہا "مجھے تو پتا نہیں۔ ابھی بڑی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئے ہیں۔"

وہ میرے قریب سمٹ آئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "شاہ جہاں' آج تم میرے کمرے میں آ جاؤ' میں بالکل اکیلی ہوں۔"

میں نے چونک کر سروج کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں وہ "رنگین دعوت" نہیں تھی جو عموماً نظر آیا کرتی تھی۔ آج وہ بالکل مختلف موڈ میں تھی۔ اس موڈ میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے' تم کچھ پریشان ہو؟"

وہ بولی "پتا نہیں شاہ جہاں' کیا بات ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"یہ بھی پتا نہیں..... لل..... لیکن شاہ جہاں! کوئی نہ کوئی بات یہاں ہے ضرور..... میں کبھی نہیں ڈری تھی لیکن آج کل ڈر رہی ہوں۔ مجھے اندھیرے اور اکیلے پن سے خوف آتا ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولی "شاہ جہاں..... کسی وقت..... کسی وقت مجھے لگتا ہے جیسے کوئی میرے بالکل پاس موجود ہے۔ مجھے گھور رہا ہے۔ کوئی آواز مجھے پکارنے لگتی ہے۔"

ایک دم میرا جسم سنسنا اٹھا۔ میرے ذہن میں ایک نہایت خوفناک خیال آیا تھا۔ سروج بھی تو ہمارے ساتھ اس روشنی کا دیدار کر چکی تھی جسے مقامی لوگ مقدس سنہری روشنی کہتے تھے۔ سروج نے بھی اس پُراسرار خوبرو شخص کو دیکھا تھا جو ایک ریشمی خیمے میں مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا رہتا تھا..... کہیں..... سروج بھی تو کسی ہذیانی کیفیت کا شکار نہیں ہونے والی تھی۔ کہیں اس کے اعصاب بھی تو کسی پُراسرار شکنجے میں نہیں جکڑے جانے والے تھے؟

میں نے تسلی آمیز انداز میں سروج کے شانے پر ہاتھ رکھا "گھبرانے کی بات نہیں ہے سروج! تم اپنے ذہن میں خواہ مخواہ بے کار سوچوں کو جگہ دے رہی ہو۔ چلو تو میرے ساتھ میں تمہارے کمرے تک چلتا ہوں۔"

"دیکھو ۔۔۔ تمہیں رات بھر میرے ساتھ رہنا ہوگا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے بھئی چلو آؤ۔"

میں اسے ساتھ لے کر سرنگ کے اس حصے میں آگیا جہاں سروج اور سائیں عالی کی قیام گاہ تھی۔ ہمارے حجرہ نما کمروں کی طرح یہ بھی ایک مختصر لیکن پُرآسائش کمرا تھا۔ فرش پر گداز اونی نمدا تھا اور لیمپ کی روشنی بھی موجود تھی۔ سائیں عالی اور سروج دونوں نمدے پر ہی سوتے تھے۔ سروج کا بستر سائیں کے قدموں کی طرف ہوتا تھا۔

سروج ایک گہری سانس لے کر دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔ اس نے بوسیدہ سی جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ تنگ پتلون میں اس کا زریں جسم پھنسا پھنسا نظر آتا تھا۔ سرد موسم کے سبب اس کے چہرے پر خشکی تھی اور ہونٹ سرخ ہو کر پھٹ گئے تھے۔ بالوں کی خوب صورتی بھی ماند دکھائی دیتی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولی "شاہ جہاں! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ پتا نہیں کیوں میرا من ہول رہا ہے۔ بڑی منحوس جگہ ہے یہ ۔۔۔ لگتا ہے ہر طرف بربادی کی پرچھائیاں ہیں۔"

میں نے کہا "جو بربادی پھیلنی تھی پھیل چکی۔ اب تو حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ وادی پر سردار راتل کا مکمل کنٹرول ہے ۔۔۔ اور سردار راتل برا شخص نہیں ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، اس نے وادی کو زیر کرنے کے بعد کتنی امن پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کہیں لوٹ مار نہیں ہوئی۔ کسی مذہبی جگہ کی بے حرمتی نہیں کی گئی۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا گیا ہے حالانکہ وادی والوں نے جس طرح تربیت گاہ میں قتلِ عام کیا تھا یہ لوگ وہی کچھ یہاں بھی کر سکتے تھے۔"

"میں یہ بات نہیں کر رہی۔" سروج نے الجھن سے کہا "میں دوسری بات کر رہی ہوں۔ کوئی نہ کوئی ایسا چکر ہے یہاں ۔۔۔ جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اور یہ کوئی سنی سنائی بات تو نہیں ہے۔ ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور کانوں سے سن رہے ہیں۔ ابھی تم نے بھی اس بندے کو دیکھا جو مسہری سے بندھا پڑا تھا اور جھیل کی طرف تڑپ رہا تھا۔ اس سے پہلے ہم قبیلے کی ایک لڑکی کو اسی حالت میں دیکھ چکے ہیں ۔۔۔ اور نائیلہ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔"

"میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے سروج۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرا خیال ہے کہ یہ کوئی انہونی نہیں ہے۔ ہپناٹزم ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ ہاں البتہ اس کے اثرات کے بارے میں اختلافات موجود ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ۔۔۔"

میری بات ادھوری رہ گئی۔ ایک زوردار چیخ نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ یہ چیخ سرنگ کے اسی حصے کی طرف سے ابھری تھی جہاں گھڑسوار دستے کے سالار دارا خاں کو رسیوں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑ کر وہاں پہنچا۔ بہت زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع تھے۔ ان میں مجھے سردار راتل بھی نظر آیا۔ وہ اس ہجوم میں ایک بچے کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن حقیقت میں یہ بچہ ہی سب کا بزرگ تھا۔ ایک عجیب سا رعب داب تھا اس مختصر شخص میں۔ وہ سرہانے کی طرف کھڑا تھا اور دارا خاں پر جھکا ہوا تھا۔ دارا خاں کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور ہاتھ پاؤں جڑے تھے۔ اس کا سفید رنگ نیلا ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی دارا خاں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بالکل وہی کیفیت نظر آ رہی تھی جو اس سے پہلے ہم نائیلہ کی آنکھوں میں دکھائی دی تھی۔ یہ آنکھیں کسی کو دیکھ رہی تھیں۔ کوئی انجانی کشش تھی جو ان آنکھوں کو اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی لیکن جسے یہ آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔

سردار راتل نے اپنے قریب کھڑے ایک شخص کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ غالباً وہ مریض کی حالت دیکھ کر طیش میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے کارندوں کو کچھ ہدایات جاری کیں اور تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

میں نے زریں گل سے پوچھا "کچھ سمجھ میں آیا ہے؟"

زریں بولا "سردار راتل بہت خفا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دارا خاں کی حالت خراب ہے۔ وہ مقدس روشنی کے دیدار کے لیے تڑپ رہا ہے اور اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے کارندوں کو ہدایت فرمایا ہے کہ صبح کا انتظار نہ کیا جائے اور اسی وقت دارا خاں کو راتلی قبیلے کی بستی میں لے جانے کا انتظام کیا جائے۔"

میں نے یہ حیران کن چیز دیکھی کہ سردار راتل کے جانے کے فوراً بعد دارا خاں کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی۔

اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ تشنج کی کیفیت بھی ماند نظر آنے لگی۔ دارا خاں چھوٹی چھوٹی سانسوں کے بجائے گہری سانسیں لینے لگا اور اس کی پیشانی کی پھولی ہوئی رگیں بھی غائب ہو گئیں۔ ایک سردار کے کہنے پر دو افراد نے دارا خاں کی بندشیں کھول دیں اور اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

دارا خاں کی حالت میں یہ تبدیلی ناقابلِ فہم تھی۔ مقامی لوگوں کو تو زیادہ تعجب نہیں تھا لیکن وہ لوگ جو یہ منظر پہلی بار دیکھ رہے تھے، ششدر نظر آتے تھے۔ ان میں صفدر اور زریں گل کے علاوہ فلمی یونٹ کے ارکان بھی تھے۔ خوب صورت سری لنکن اداکارہ لوسانچی حیرت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ لوسانچی پُرکشش جسم کی مالک تھی لیکن مجھے کئی روز سے اس کا جسم کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا۔ آج مجھ پر انکشاف ہوا کہ جسم بے ڈھنگا کیوں لگ رہا ہے۔ لوسانچی کی ڈھلی ڈھلی کمر اب اپنی شکل و شباہت کھو چکی تھی۔ یقیناً وہ حاملہ تھی۔ وہ پچھلے قریباً سات ماہ سے اس وادی میں محصور تھی اور لٹیروں کے رحم و کرم پر تھی۔ خبر نہیں اس کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ بے چاری روزگار کے لیے وطن چھوڑ کر اور دور دراز کا سفر کر کے یہاں پہنچی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا ان پہاڑوں میں ہونے والی "شوٹنگ" کتنی طویل ثابت ہوگی اور اس "شوٹنگ" میں اسے اپنی منشا کے خلاف کیسے کیسے ناپسندیدہ مناظر فلم بند کرانے پڑیں گے۔ حالات کی "لوکیشن" پر "وقت" ایک ظالم فلم ساز بن گیا تھا۔ نہ اسے شوٹنگ شیڈول کی پروا رہی تھی، نہ بزنس کی، نہ اداکارہ کی ذہنی و جسمانی حالت کی۔ نصف برس گزر گیا تھا لیکن سرما کی ایک یخ بستہ صبح کو شروع ہونے والی یہ شوٹنگ ابھی "پیک اپ" نہیں ہوئی تھی۔

دارا خاں کو دو افراد نے کندھوں سے تھاما اور سہارا دے کر ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ یہاں بہت سی الم غلم اشیا رکھ دی گئی تھیں۔ تانبے کا ایک بہت بڑا ٹب نما برتن تھا۔ معلوم ہوا کہ اس ٹب میں کھڑا کر کے دارا خاں کو گرم پانی سے نہلایا جائے گا۔ دارا خاں کی خاص بسنتی پوشاک کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ حجامت کا سامان تھا، پھولوں کے ہار تھے، نرم چمڑے کے بنے ہوئے خاص جوتے تھے اور اسی نوع کی کئی اشیا تھیں۔ کمرا اسی پُراسرار خوشبو سے مہک رہا تھا جسے محسوس کر کے بارش میں بھیگے ہوئے صندلی جنگلوں کا تصور ذہن میں آ جاتا تھا۔

ایک سردار نے درخواست کی کہ ہم سب کمرے سے باہر چلے جائیں۔ ہمارے باہر آنے کے بعد صرف وہی تین چار افراد کمرے میں رہ گئے جنہوں نے دارا خاں کو تیار کرنا تھا۔ تیاری کا یہ عمل قریباً دو گھنٹے میں مکمل ہوا۔ دو گھنٹے بعد جب ہم نے دوبارہ دارا خاں کو دیکھا تو وہ عجیب و غریب نظر آ رہا تھا۔ ایک لمبے بسنتی چغے نے اسے گردن سے ٹخنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے کانوں سے بڑے بڑے بالے نکال دیے گئے تھے۔ لمبے بال تراش دیے گئے تھے اور نہلا دھلا کر اسے خوب صاف کر دیا گیا تھا۔ اس کی شیو بنی ہوئی تھی اور چہرے پر کسی محلول کی مدد سے خاص طرح کی چمک پیدا کر دی گئی تھی۔ لیمپ کی روشنی دارا خاں کے چہرے پر پڑتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ نورانی کرنیں اس کے نقوش سے پھوٹ رہی ہیں۔ دارا خاں کے بالوں میں بھی کوئی چمکیلے برادے جیسی شے چمک رہی تھی۔

دارا خاں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے اور اسے بڑے احترام کے ساتھ سرنگ سے باہر لایا گیا۔ سرنگ سے باہر سردی تھی اور مدھم چاندنی نشیب و فراز کو نمایاں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ رات قریباً نو دس بجے کا عمل تھا مگر پوری وادی کئی گھنٹوں سے محوِ خواب تھی۔ صرف سرنگ کے اندر بیداری کے آثار موجود تھے۔ دارا خاں کو ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کیا گیا۔ دو مسلح محافظوں کے علاوہ سردار راتل کا حکیم تیشم بھائی بھی گاڑی میں سوار ہوا۔ اس کے علاوہ ایک نہایت عمر رسیدہ شخص بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کے دانوں کی مالا تھی اور وہ منہ میں مسلسل کچھ بڑبڑا رہا تھا ۔۔۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو "الوداع" کہنے والے لوگ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور گاڑی کو دیکھتے رہے۔ مدھم چاندنی میں ان کے چہرے اور حلیے پُراسرار نظر آ رہے تھے جیسے وہ آسیبی سائے ہوں جو کسی پُراسرار قبائلی رسم کی تکمیل کے بعد اچانک ہی ہوا میں تحلیل ہونے والے ہوں۔ اتنے میں صفدر اندر سے دوڑا دوڑا آیا۔ میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں صاحب! سروج آپ کو بلا رہی ہے۔"

"کیا کہتی ہے؟"

"وہ بڑی ڈری ہوئی ہے۔ آپ کا نام لے کر چیخ رہی تھی۔"

میں صفدر اور زریں گل کے ساتھ واپس سرنگ میں

آ گیا۔ سرنگ کے گرم اور روشن حصے میں ابھی بیشتر افراد جاگ رہے تھے۔ تماشا گاہوں کی طرف شام جیسی رونق تو نہیں تھی تاہم موسیقی کی مدھم آواز اب تک سنائی دے رہی تھی۔ ہم تخت کے رہائشی حصے کی طرف مڑ گئے۔ یہ سرنگ کی تنگ بھول بھلیاں تھیں۔ کہیں کہیں چھت صرف انسانی قد کے برابر اونچی تھی۔ روغنی مشعلیں جل رہی تھیں اور کمروں کے اندر شمع دان اور لیمپ روشن تھے۔ بڑا خواب ناک سا ماحول تھا۔ میں سروج اور سائیں عالی کے کمرے میں پہنچا تو سروج مسہری پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ گھٹنوں پر سر دیے رو رہی تھی۔

"کیا ہوا سروج؟" میں نے اس کا شانہ جھنجوڑ کر پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسلسل روتی رہی۔ میں نے صفدر اور زریں گل کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو میں نے دروازہ بند کر لیا اور سروج کے قریب آ بیٹھا۔ میں نے اس کا شانہ سہلایا اور ایک بار پھر رونے کی وجہ پوچھی۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ سسکتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! مجھے لگتا ہے کہ میرے ساتھ بھی کچھ ہونے والا ہے۔"

"یہ کیا فضول بکواس ہے۔۔۔ کیا ہونے والا ہے؟" میں نے اسے ڈانٹا۔

وہ بولی "کچھ نہ کچھ ہو جائے گا تم دیکھ لینا۔"

"تم اپنے دماغ کو درست کرو اور خواہ مخواہ وہموں کی گٹھڑی نہ بنو۔"

"یہ وہم نہیں ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی "کیا ابھی تم جس شخص کو گھوڑا گاڑی پر سوار کرا کے آئے ہو وہ وہم تھا؟ اور وہ سارے لوگ جن کو تم نے اپنی آنکھوں سے دماغی مریض بنتے دیکھا ہے کیا وہ وہم تھے۔۔۔ کیا وہ سب وہم تھے؟"

میں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا "تمہارے ذہن پر ماحول کا اثر ہے۔ یہاں سے نکل جانے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یقین کرو' تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہے گا۔"

"لیکن کب نکلیں گے ہم؟" وہ جھنجلا کر بولی "اب یہاں سے کیا لینا ہے ہمیں۔ ہم صفدر اور جون چاؤل کے لیے آئے تھے' وہ ہمیں مل گئے ہیں۔ اب کیا رکاوٹ ہے یہاں سے جانے میں؟"

میں نے کہا "کل میں سردار راہل سے ملا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ وادی سے نکل بھاگنے والے کھانزا بیواروں کی کچھ ٹولیاں آس پاس کے پہاڑوں میں موجود ہیں۔ ان کی طرف سے ہمیں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جب تک ان لوگوں پر قابو نہیں پا لیا جاتا ہمارا یہاں سے نکلنا مناسب نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر ہمیں یہاں روک رہے ہیں۔ یہ ہمیں واپس نہیں جانے دیں گے۔"

"یہ بھی تمہارے واہموں میں سے ایک واہمہ ہے۔ سردار راہل کو جتنا میں جان گیا ہوں تم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ وہ عام قبائلی سرداروں سے بالکل مختلف شخص ہے۔"

سروج کچھ دیر ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتی رہی پھر کراہ کر بولی "سائیں جی اب تک واپس نہیں آئے۔"

میں نے کہا "اچھا ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر سائیں عالی نہ آیا تو میں یہیں تمہارے پاس رہوں گا۔"

میں قریباً ایک گھنٹا سروج کے پاس بیٹھا رہا اور تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ سروج نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ اس نے پچھلے دو تین ہفتوں میں اپنے ارد گرد اتنے ہولناک واقعات دیکھے تھے کہ وہ بنیادوں تک ہل گئی تھی اور یہ سب کچھ سروج کے ساتھ ہی نہیں تھا' ہم سب ذہنی طور پر انتشار کا شکار تھے۔ ہر صبح کوئی انہونی سامنے آ جاتی تھی اور ہر شام کوئی بھیانک واقعہ دل و دماغ میں تہلکہ مچا دیتا تھا۔

کافی انتظار کے باوجود سائیں عالی واپس نہیں آیا۔ میں وہیں سروج کے کمرے میں لیٹ گیا۔ وہ مسہری پر تھی۔ میں نے نیچے اونی نمدے پر بستر لگا لیا۔ تماشا گاہوں سے ابھرنے والی مدھم موسیقی بھی اب تھم چکی تھی۔ ہر طرف ایک پُرہول سناٹا طاری تھا۔ اس سناٹے میں ابھی تک وہ چیخیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں جو دارا خان کے سینے سے بلند ہوئی تھیں۔ کتنی اذیت تھی اس کی آواز میں جیسے وہ کسی چٹان کے نیچے دبا ہوا ہو اور مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ دارا خان کا خیال ذہن میں آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے نائلہ کی صورت بھی گھومنے لگی۔ نجانے اب وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔ اسے مقدس روشنی کی دلہن کہا گیا تھا اور چند روز پہلے کسی دلہن کی طرح بنا سنوار کر مقدس دیوار کے پار بھیجا گیا تھا۔

سوچتے سوچتے میں وادی موت سے وادی خواب میں چلا گیا۔ پتا نہیں میں کتنی دیر سویا رہا پھر مجھے اپنے بالکل قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نیم تاریکی میں غور کر دیکھا۔ کوئی میرے بستر میں میرے ساتھ موجود تھا۔ یہ

سروج تھی۔ سراپا قیامت عورت' ہوشربا حسن کی مالک۔ وہ کسی جونک کی طرح میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں بری طرح سٹپٹایا' جی چاہا کہ اسے دھکیل کر دور کر دوں پھر مجھے اندازہ ہوا کہ سروج کے لپٹنے میں کسی طرح کی خرابی نیت کو دخل نہیں ہے۔ اس کا لمس ایک ڈری ہوئی ننھی بچی کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر میرے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا اور چہرہ میری بغل میں گھسیڑ دیا تھا۔ اس کے نتھنوں سے خارج ہونے والی گرم سانس میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔

"سروج!" میں نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"جا کر سو جاؤ۔"

"اچھا سو جاتی ہوں۔" اس نے کہا مگر اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ کچھ دیر بعد وہ واقعی سو گئی مگر میں نے باقی رات جاگتے ہوئے گزاری۔

○☆○

صبح میں نے دیکھا تو سروج کو تیز بخار تھا۔ سائیں عالی کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ جب غائب ہوتا تو کئی کئی دن اس کا کھوج کھرا نہیں ملتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو صفدر اور زریں گل میرا انتظار کر رہے تھے۔ زریں گل کی نظروں میں میرے لیے شکوک نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے بزبانِ خاموشی پوچھ رہا ہو کہ میں نے رات کیسے گزاری ہے۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اس کی زبان قینچی کی طرح چلنی شروع ہو جاتی لیکن جب سے سروج گم صم ہوئی تھی' زریں گل کا رویہ بھی کچھ نرم پڑ گیا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اس کی آنکھوں میں سروج کے لیے ہمدردی کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔

صفدر نے کہا "سروج خیریت سے تو ہے؟"

"بخار ہے اسے۔ رات بھر جاگتی رہی ہے۔"

زریں گل نے کہا "بخار کا علاج تو یہاں ڈاکٹر ہنری ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی بندی خانے میں ہے۔"

زریں نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ واقعی ڈاکٹر ہنری کی صورت میں یہاں ایک مسیحا صفت موجود تھا۔

میں اسی وقت زریں گل کے ساتھ سردار راہل کی طرف چلا گیا۔ سردار راہل "تخت" کے ایک شاندار کمرے میں بڑے ٹھاٹ سے ٹانگیں پسارے لیٹا تھا۔ وہ اپنے لیے پہریدار ۔۔۔ محافظ وغیرہ رکھنے کا تکلف نہیں کرتا تھا بلکہ عام طور پر کوئی خادم بھی اس کے قریب نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی بیویاں ہی اس کی خدمت گار بھی تھیں۔ اس وقت بھی وہ تنہا تھا۔ زریں گل نے میرے ترجمان کے فرائض انجام دیے اور

سیما غزل
کا ایک خوفناک اور پُراسرار ناول
کال بیل
دو حصوں میں مکمل
قیمت: -/300 روپے
ایک بدروح کا انتقام • تباہی اور بربادی کی دیوی زیوسا • خوفناک آدم خور مکڑیاں • لمحہ لمحہ خوف اور موت کی طرف بڑھتی ہوئی دہشت ناک داستان
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

ٹوٹی پھوٹی زبان میں سردار رائل کو بتایا کہ ہماری ساتھی لڑکی بیمار ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر ہنری اسے دیکھ لے۔

"کون ڈاکٹر ہنری؟" سردار رائل نے پوچھا۔

زریں نے اسے ڈاکٹر ہنری کے بارے میں بتایا۔ سردار رائل نے کہا "اگر وہ واقعی قابل اور عمر رسیدہ شخص ہے تو پھر اس کا ٹھکانا بندی خانہ نہیں۔"

اس نے اپنے ایک مصاحب کو بلایا اور اپنی زبان میں اسے ہدایت دی کہ بندی خانے میں موجود عمر رسیدہ معالج کو یہاں "تخت" میں لایا جائے۔

مصاحب دو پہریداروں کے ساتھ بندی خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردار رائل ہم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ایک صاف دل شخص تھا اور سردار ہونے کے باوجود خاصی سادہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی واحد دلچسپی وہ تین عورتیں تھیں جو شریکِ حیات کے طور پر اس سے منسوب تھیں۔ یہ تینوں عورتیں خوبرو اور بلند قامت تھیں۔ سردار رائل ان کے درمیان یوں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا جیسے کوئی کوتاہ قد ساربان اپنی تین سڈول اونٹنیوں کو لے کر جا رہا ہو۔ سردار رائل کا جسم بہت مختصر تھا لیکن جتنا بھی تھا فولادی تھا۔ اس کے علاوہ وہ بے حد پھرتیلا بھی تھا۔ میں نے لڑائی کے میدان میں اسے بجلی کی طرح حرکت کرتے دیکھا تھا۔ سردار رائل کا پختہ عقیدہ تھا کہ مقدس روشنی بہترین پشت پناہ اور رہنما ہے۔ مقدس روشنی کے احکامات اس کے لیے پتھر پر کھنچی ہوئی لکیر تھے۔ وہ ان پر من و عن عمل کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

اس نے کہا "مقدس روشنی عام دیوی دیوتاؤں کی طرح ہمیں صرف پوجا پاٹ نہیں سکھاتی۔ یہ روشنی قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتی ہے اور ہمیں زندگی گزارنے کا انوکھا اور بہترین طریقہ بتاتی ہے۔ یہ طریقہ ہے محنت کا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کی خوشی کا راز ان تھک محنت و مشقت میں ہے۔ جس طرح گرمی کے بغیر سردی کا احساس نہیں ہو سکتا۔ کڑواہٹ کے بغیر مٹھاس بے معنی ہے۔ تھکاوٹ کے بغیر آرام کا تصور نہیں کیا جا سکتا' اسی طرح محنت کی اذیت کے بغیر راحت اور خوشی کا حصول ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص حسب نسب' حیثیت یا مال و دولت کے زور پر خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ قطعی ناکام ہے۔ خوشی کا راز صرف اور صرف جفاکشی اور سادہ رہن سہن میں ہے اور ہم یہ بات زبانی کلامی نہیں کہتے' اپنے عمل سے اسے ثابت کرتے ہیں۔ تم میرا لباس دیکھ رہے ہو۔ میری خوراک بھی تمہارے علم میں ہے۔ میں فرش پر سوتا ہوں اور یہی حال میرے مصاحبین کا ہے اور بستی کے عام لوگوں کا ہے۔ ہم صبح شام تک سخت محنت کرتے ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں' لکڑیاں کاٹتے ہیں' کپڑا بنتے ہیں' بھیڑ بکریاں چراتے ہیں اور شکار کی تلاش میں ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں ...... اور ہم خوش ہیں کیونکہ ہمارا ایمان اپنے ہاتھوں کمائے ہوئے رزق پر ہے۔ ہم وادی داخان کے لوگوں کی طرح لٹیرے نہیں۔ جس دھرتی کو یہ لوگ بنجر اور بے فیض کہتے ہیں اسی دھرتی سے ہم نے مقدس روشنی کی برکت اور اپنی محنت سے اپنا رزق حاصل کیا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ہم سے خار کھاتے تھے۔ انہوں نے ہماری خوشیوں کو گہنا رکھا تھا۔ ان کی بدخواہی ہمارے سکون کو غارت کر رہی تھی۔ ہم نے اس لڑائی سے بہت دامن بچانا چاہا۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ آفت ہمارے سروں سے ٹل جائے۔ مقدس روشنی کا بھی یہی حکم تھا کہ حتی الامکان ہم خون ریزی سے باز رہیں لیکن جب ہمارا ناطقہ بند کر دیا گیا' ہماری بستی میں ہونے والی لوٹ مار بڑھتی چلی گئی تو ہمیں حرکت میں آنا پڑا اور تم دیکھ رہے ہو' ہم کامیاب ہیں۔ یہ ہماری نہیں حق سچ کی فتح ہے اور مقدس روشنی کا کرم شامل رہا تو ہم آئندہ بھی کامران رہیں گے۔ تم دیکھو گے' بہت جلد ہمارے خیالات بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی اچھے لگیں گے۔ وہ بھی ہمارے عقیدے کی حقیقت کو مانیں گے۔"

میں نے زریں گل کے ذریعے سردار رائل سے کہا "سردار! تم نے ایک اثر انگیز تقریر کر ڈالی ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے' بہت اچھا کہا ہے۔ میں تمہارے عقیدے پر کوئی حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی محنت کی عظمت اور سادگی کے فوائد سے کسی کو تم سے اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن محنت اور سادگی کے علاوہ وہ جو کچھ رائلی قبیلے میں ہو رہا ہے اس کا دفاع تم کیسے کرو گے؟"

"میں سمجھا نہیں!"

"میں ان ناقابلِ فہم واقعات کی بات کر رہا ہوں جو رائلی قبیلے میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جسے تم لوگ مقدس روشنی کہتے ہو۔ وہ عام لوگوں اور خاص طور سے نوجوانوں کے دل و دماغ پر خاص انداز سے اثر کرتی ہے۔ میں نے پچھلے چند ہفتوں میں کم از کم تین افراد کو اس شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتے دیکھا جو مقدس روشنی کے دیدار کے بعد رونما ہوتا ہے۔ ان تین افراد میں دو خوبرو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ایسی لڑکیاں مقدس دیوار کے پار جانے کے لیے یوں بے قرار ہوتی ہیں کہ باقی رشتے ناتے کو بھول جاتی ہیں۔ انہیں تم لوگ سائی

یعنی سنہری عقاب (روشنی) کی دلہن کہتے ہو۔ ان دلہنوں کو بناسنوار کر دیوار کے پار لے جایا جاتا ہے اور میں نے سنا ہے کہ وہ پھر کبھی واپس نہیں آتیں۔ کچھ ایسا ہی سلوک مردوں سے بھی ہوتا ہے۔ وہ دیوار کے پار جا کر مقدس روشنی کے خادم بن جاتے ہیں اور وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں ...... میں کوئی غلط بات تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں ___ تم ٹھیک کہہ رہے ہو ...... کیا تمہاری بات مکمل ہو گئی ہے؟"

"نہیں ... میں مقدس روشنی کے متعلق بھی تجسس کا شکار ہوں۔ جسے تم لوگ مقدس روشنی کہتے ہو وہ ایک خوبرو شخص ہے۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ وہ شخص مجھے گوشت و پوست کا عام انسان نظر آیا ہے' جسے چھوا جا سکتا ہے' جس سے بات کی جا سکتی ہے۔ اگر اس شخص میں کوئی چیز مختلف یا غیر معمولی ہے تو وہ شاید ___ اس کی آنکھیں ہیں ... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا۔" سردار رائل نے کہا "وہ جسے تم عام انسان کہہ رہے ہو وہ مجسم روشنی ہے۔ اس کے جسم کو اور سنہری روشنی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر وہ شخص کیا ہے جو ریشمی غلاف کے اندر سے نظر آتا ہے؟"

"وہ ہماری نگاہ کا دھوکا ہے ___ سراب ہے ___ ہماری بصارت میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم مقدس روشنی کو مکمل شکل و صورت میں دیکھ سکیں۔ نہ ہمارے ذہن کو اتنی تاب ہے کہ وہ اس روشنی کی دید برداشت کر سکے۔ لہٰذا ہماری آسانی کے لیے وہ روشنی اپنی شباہت بدل لیتی ہے اور ہمیں ایک خوبرو انسان کی صورت دکھائی دیتی ہے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ریشمی غلاف کے اندر روشنی کے سوا کچھ نہیں ہوتا؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔"

سردار رائل کی بات پر یقین کرنا میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا یہ یقین کرنا کہ سورج رات کو نکلتا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے جیتے جاگتے شخص کو دیکھ چکا تھا' اس سے بات کر چکا تھا اور میرے ساتھی بھی اس مرحلے سے گزر چکے تھے۔ بے شک وہ ماحول پُراسرار تھا' وہاں گونجتی آوازیں' وہاں پھیلی ہوئی خوشبو اور وہ در و دیوار ذہن پر ایک خاص سا اثر کرتے تھے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہاں پہنچ کر انسان کے حواس کام کرنا چھوڑ جاتے تھے یا وہ ایسی چیزوں کو دیکھنے لگتا تھا جو اس کے سامنے نہیں ہوتی تھیں تو یہ سراسر غلط تھا۔ کم از کم میرے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سردار رائل کے کارندے ڈاکٹر ہنری کو لے کر تخت میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ہنری کی جھریوں بھری پیشانی پر چند روز پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ یہ چوٹ اسے گرفتاری کے وقت لگی تھی۔ مجھے دیکھ کر بوڑھے ہنری کا منہ کھل گیا۔ ہمارے درمیان رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ ڈاکٹر ہنری کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میری درخواست پر سردار رائل نے اس کے ہاتھ کھلوا دیے۔ میں نے سردار رائل کے سامنے ڈاکٹر ہنری کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا ذکر کیا اور رائل کو بتایا کہ ڈاکٹر ہنری لڑائی میں زخمی ہونے والے لشکریوں کے لیے بہترین معالج ثابت ہو سکتا ہے۔

رائل نے کہا "میں نے پہلے بھی ڈاکٹر ہنری کے بارے میں سن رکھا ہے۔ آج ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میری طرف سے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ وادی میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اور اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔"

میں ڈاکٹر ہنری کو لے کر اس کمرے میں آ گیا جہاں سروج بخار میں پھنک رہی تھی۔ ڈاکٹر ہنری نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں' نبض ٹٹولی اور کچھ دیر انگلش میں اس سے باتیں کرتا رہا پھر وہ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ کہنے لگا "مریضہ کیا لگتی ہے تمہاری؟"

میں نے کہا "یہ ہماری سیاحتی پارٹی کی ساتھی ہے۔"

ہنری بولا "مسٹر شاہ جہاں! میں سمجھتا ہوں کہ مریضہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ اس کی گردن کے پٹھے کھنچے ہوئے ہیں اور سر میں جو شدید درد ہو رہا ہے اس کی وجہ بھی کسی ذہنی پریشانی ہے۔ کیا کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟"

میں نے کہا "مسئلے تو بہت ہیں جناب! سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی ہے لیکن سردار رائل کا کہنا ہے کہ ابھی وادی سے نکلنا اور گلگت کی طرف سفر کرنا خطرناک ہے۔ وادی سے نکل بھاگنے والے بہت سے گروہ ابھی ان پہاڑیوں میں منڈلا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر ہنری بولا "لیکن وہ جلدی جانے پر کیوں اصرار کر رہی ہے۔ لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ اب اسے یہاں فوری نوعیت کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چند دن سردار رائل کی میزبانی کا مزید لطف اٹھا لے ___ حالات درست ہو جائیں تو پھر تم لوگوں کو سفر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

میں نے ڈاکٹر ہنری سے کہا "اس لڑکی کے مسئلے کی بابت میں آپ کو پھر بتاؤں گا۔ یہ کافی گمبھیر چکر ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر ہنری نے روانی سے کہا۔ "فی الحال میں اس کے بخار کے لیے دوا بھیج دیتا ہوں' نیند کی دوا بھی ہوگی۔ یہ جتنا زیادہ آرام کرے گی اتنا ہی اچھا ہے۔"

میں نے پوچھا "اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنے دواخانے۔" ہنری نے جواب دیا "کیا مجھے اس کی اجازت نہیں ہے؟"

"کیوں اجازت نہیں ہے۔ سردار رائل کہہ چکا ہے کہ آپ اپنے "پیشہ ورانہ فرائض" آزادی سے انجام دے سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ تم کل آ کر مجھے مریضہ کی حالت کے بارے میں بتا دینا۔"

"بہت بہتر' میں آؤں گا۔ میں آپ کو مریضہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

اگلے روز سہ پہر کے وقت میں ڈاکٹر ہنری کے دواخانے پہنچا۔ یہ دواخانہ میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ میں ایک سے زائد مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔ دو کشادہ کمرے تھے جن میں شیشے کے بے شمار مرتبان اور جار وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ ان میں خشک جڑی بوٹیاں تھیں۔ بیج تھے اور تیار شدہ دوائیں تھیں۔ یہ جگہ دواخانے سے زیادہ لیبارٹری نظر آتی تھی جہاں مختلف اقسام کی تیز بوئیں چکراتی رہتی تھیں۔ ان بوؤں کے درمیان ڈاکٹر ہنری کسی قدیم فلسفی کی طرح بیٹھا نظر آتا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی ایک خشک جڑی بوٹی ہے جو مرتبان سے نکل کر لکڑی کی کرسی پر پھیل گئی ہے۔

اس سہ پہر بادل گھر کر آئے ہوئے تھے اور گاہے گاہے مینہ برسنے لگتا تھا۔ میں اور ڈاکٹر ہنری اونی لبادوں میں لپٹے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر ہنری! آپ ایک دانشور ہیں اور اس وادی سے باخبر ترین افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کو رائلی قبیلے کے حالات کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوں گی۔ آپ نے مقدس روشنی کے بارے میں کیا سن رکھا ہے؟"

ڈاکٹر ہنری نے طویل سانس لے کر کہا "پہلے تم بتاؤ' تم نے کیا سن رکھا ہے؟"

میں نے کہا "سنی سنائی باتوں پر تو میں زیادہ یقین نہیں رکھتا ہوں۔ ہاں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔"

"کیا دیکھا تھا تم نے؟"

میں نے کہا "تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے جب ہم رائلی قبیلے میں تھے ایک روز ہمیں مقدس روشنی کا دیدار کرایا گیا تھا۔ [illegible] کے ایک کنارے پر بلند و بالا سنگی دیوار ہے جسے وہ مقدس دیوار قرار دیتے ہیں۔ ہمیں اس دیوار کے پار [illegible] گیا تھا۔ دیوار کے پار ہم نے کچھ عجیب و غریب مناظر [illegible] ہمیں کچھ ایسے سفید پوش مرد و زن نظر آئے جو بہت [illegible] صورت تھے۔ یہ لوگ ایک صاف شفاف کھوہ کے [illegible] پر تھے اور بے حد خاموشی اور آہستگی سے چلتے پھرتے [illegible] آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر کچھ عجیب سی کیفیت تھی [illegible] کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں [illegible] بہرحال وہ سب کے سب بہت خوش و مطمئن دکھائی دیتے [illegible] پھر ہمیں ایک ایسے خلا میں لایا گیا جہاں کھوہ کی چھت بہت اونچی تھی اور آوازیں دیر تک گونجتی رہتی تھیں۔ اس کے ایک اندرونی حصے میں وہ خاص الخاص مقام تھا [illegible] مقدس روشنی کا دیدار کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں ایک خوبرو شخص کو دیکھا جو ایک مسہری پر گاؤ تکیے سے ٹیک [لگائے] بیٹھا تھا۔ اس مسہری کو ایک ریشمی غلاف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ غلاف کے اندر سے سنہری روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اس روشنی کا منبع نہیں [دیکھ] سکا۔ خوبرو شخص نے مجھ سے چند باتیں کیں اور پھر واپس [بھیج] دیا۔۔۔۔ اس ملاقات میں" میں نے جو قابل ذکر چیز دیکھی [وہ] خوبرو شخص کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں مجھے بے [پناہ] کشش نظر آئی۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا جیسے میں لوہے [کا] ایک ذرہ ہوں اور کوئی بہت بڑا مقناطیس مجھے زبردست قوت سے کھینچ رہا ہے۔ ہم دو تین گھنٹے اس کھوہ میں رہے تھے۔ [illegible] پھر بستی میں واپس آ گئے تھے۔"

ڈاکٹر ہنری نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "[illegible] مقدس روشنی کے بارے میں اپنے تجسس کا اظہار [illegible] کر رہے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ تم مریضہ کے بارے میں [بات] کرتے آئے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ اسے کوئی تشویش [illegible] درپیش ہے جس کے بارے میں دواخانے آ کر مجھے بتاؤ گے۔"

میں نے کہا "مریضہ کے مسئلے کا تعلق بھی اسی بات [سے] ہے۔ شاید میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ جب ہمیں [مقدس] روشنی کا دیدار کرایا گیا تو یہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ تھی [illegible] کے علاوہ قبیلے کی تین عدد لڑکیاں بھی تھیں۔ اس واقعے [کے] تین چار روز بعد ایک قبائلی لڑکی اسی ہیجان کا شکار ہو گئی

جس کا ناتا مقدس روشنی کے دیدار سے جوڑا جاتا ہے۔ میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے تڑپتے پھڑکتے دیکھا ہے۔ بعد ازاں اسے پتھریلی دیوار کے پار پہنچا دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے سوچ پر اس واقعے کا گہرا اثر ہے۔ اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو اسے یہ وہم ہو چکا ہے کہ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی ہیجانی کیفیت کا شکار ہو جائے گی۔ وہ خوف زدہ رہتی ہے۔ دو تین روز سے میں اس کے ساتھ کمرے میں سو رہا ہوں۔ سوتے وقت وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ کل رات ایک دم چیخنے لگی وہ کہہ رہی تھی 'سانپ مجھے کھینچ رہا ہے۔ دو منہ والا سانپ مجھے کھینچ رہا ہے۔ وہ میز کے نیچے اور کونے کھدروں میں سانپ کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔"

ڈاکٹر ہنری کے جھریوں بھرے چہرے پر لاتعداد مزید لہریں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی دبلی پتلی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا دیں۔ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "جو کچھ تم نے دیوار کے پار دیکھا' اس کے بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا ہے؟"

میں نے کہا "میرا خیال یہی ہے کہ جس خوبرو شخص کو سامنے دیکھا تھا وہ میری اور آپ کی طرح ایک جیتا جاگتا شخص ہے' جس نے سادہ لوح قبائلیوں کو اپنی شعبدے بازی میں الجھا رکھا ہے۔"

"لیکن تم نے اس کی غیر معمولی آنکھوں کا ذکر بھی کیا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو میں اب بھی تسلیم کرتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی مخفی طاقت موجود ہے۔ غالباً اس طاقت کا تعلق مسمریزم یا ہپناٹزم وغیرہ سے ہے۔ ہپناٹزم اور خیال خوانی جیسے علوم کو اب سائنسی طور پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔"

"تم ہپناٹزم کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" ڈاکٹر ہنری نے پوچھا۔

"کچھ زیادہ نہیں۔" میں نے جواب دیا "صرف یہ معلوم ہے کہ ہپناٹسٹ برتر ذہنی قوت کا مالک ہوتا ہے اور وہ ایک خاص ماحول میں اپنے معمول کو "ترغیب" کے ذریعے غیر فطری نیند سلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ ترغیب یا "سجیشن" کے ذریعے ہی اپنے معمول کو مختلف احکامات وغیرہ بھی دے سکتا ہے۔"

ڈاکٹر ہنری نے کہا "کیا یہ سنی سنائی باتیں ہیں یا تم نے حقیقت میں بھی کسی کو ہپناٹائز کرتے یا ہوتے دیکھا ہے؟"

میں نے کہا "ایک مرتبہ ایک غیر ملکی ٹی وی چینل پر ایک اسٹیج شو دیکھا تھا۔ اس میں ایک ہپناٹسٹ نے تماشائیوں کے بیچ میں سے ایک معمول چنا تھا اور پھر اسٹیج پر اسے ہپناٹائز کرنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ نیند طاری ہونے کے بعد نوجوان معمول نے عامل کے بیشتر احکامات پر عمل کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو حرکت دی تھی' پاؤں ہلائے تھے' منہ سے سیٹی بجانے کی کوشش کی تھی۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کسی شعبدے بازی کو دخل تھا یا نہیں۔"

ڈاکٹر ہنری گھٹنوں پر زور دے کر اپنی جگہ سے اٹھا اور جڑی بوٹیوں سے بھری ہوئی ایک الماری کی زیریں دراز کھول لی۔ اس طویل دراز میں کتابیں ٹھسی ہوئی تھیں۔ لرزتے ہاتھوں سے ڈاکٹر ہنری نے ایک فائل تلاش کی۔ اس فائل میں انگلش کے بہت سے ٹائپ شدہ کاغذات تھے۔ یہ پرانے کاغذات غالباً کسی مسودے کا حصہ تھے۔ ہنری نے جھاڑن سے فائل کی گرد صاف کی اور میرے قریب آن بیٹھا۔ میں نے کاغذات کو ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ اس تحریر کا موضوع ہپناٹزم ہے۔

ہنری میری آنکھوں میں جھانک کر بولا "سچ بتاؤ' تم اس موضوع کو کتنی سنجیدگی سے لیتے ہو؟!"

میں نے کہا "بہت زیادہ سنجیدگی سے تو نہیں لیتا لیکن اسے مذاق بھی نہیں سمجھتا جیسے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس موضوع میں کوئی نہ کوئی بات تو ہے جو طویل عرصے سے دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے بہت سے ذہین لوگ اس کو اہمیت دے رہے ہیں اور ویسے بھی علم کسی جامد چیز کا نام نہیں۔ مابعد النفسیات میں جن مفروضوں کو بیس سال پہلے مذاق سمجھا جاتا تھا اب وہ ٹھوس حقیقت بن چکے ہیں۔ کیا معلوم کل ہپناٹزم' خیال خوانی اور اس جیسے دیگر علوم کے بارے میں کیا کیا انکشافات ہوں۔"

ڈاکٹر ہنری نے بڑی سنجیدگی سے ہونٹ سکوڑے پھر مسودے کا ایک ورق منتخب کرتے ہوئے بولا "مسمریزم کی ابتدا ڈاکٹر مسمر سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مسمر کا پورا نام فریڈرک انٹین مسمر تھا۔ وہ ۱۷۳۰ء کے لگ بھگ ویانا میں پیدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ حیوانی مقناطیسیت ایک حقیقت ہے اور یہ پوری کائنات میں موجود ہے۔ وہ اس حیوانی مقناطیسیت پر مختلف تجربات کرتا رہا یہاں تک کہ اسے مریضوں کے علاج معالجے میں استعمال کرنے لگا۔ ڈاکٹر مسمر کے بعد میرے ایک ہم وطن ڈاکٹر جیمس بریڈ نے تقریباً ایک سو تیس سال پہلے مسمریزم کے لیے پہلی بار ہپناٹزم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ شروع میں عام لوگوں

کی طرح مسمریزم کو ایک بے معنی لفظ سمجھتا تھا اور واہمہ خیال کرتا تھا لیکن غور و فکر کے بعد وہ اس بارے میں سنجیدہ ہوا اور پھر سنجیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ مقناطیسی قوت موجود ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی چمکیلی چیز کی طرف مسلسل دیکھنے سے اعصابی تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جو بعد ازاں مقناطیسی نیند کا سبب بن جاتی ہے۔ جیمس بریڈ کے بعد بھی بے شمار طبی ماہروں، دانشوروں اور سائنس دانوں نے مقناطیسی طاقت کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اسے استعمال بھی کیا ہے۔ یہ لوگ مانتے ہیں کہ برتر ذہن کا مالک ایک شخص جس میں مقناطیسی قوت موجود ہو، عام لوگوں کو معمول بنا سکتا ہے۔ کچھ عامل اس حوالے سے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے، کچھ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں، کچھ بہت زیادہ اور کچھ غیر معمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنے معمول پر مقناطیسی نیند طاری کر لیتے ہیں اور ایسی حالت میں جو احکامات دیتے ہیں وہ معمول کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مقدس دیوار کے پار جو شخص موجود ہے وہ بھی کوئی غیر معمولی صلاحیتوں والا ہپناٹسٹ ہے۔"

"جو کچھ اب تک سنتا رہا ہوں، اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر ہنری نے جواب دیا "بہرحال ایک بات ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی۔ وہ شخص اپنی زندگی زبردست نظم و ضبط کے ساتھ گزار رہا ہے اور اپنے پیروکاروں سے بھی نظم و ضبط پیدا کرنے کا خواہش مند ہے۔ یہ لوگ بے حد سادہ رہن سہن اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی بنیاد سخت محنت مشقت پر ہوتی ہے۔ مرد و زن، بچے، بوڑھے سب ہی ایک ہی رنگ میں رنگے دکھائی دیتے ہیں۔ تم نے قبیلے کی بستی میں دیکھا ہی ہوگا، یہ لوگ صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس محنت کا صلہ انہیں ضرور ملے گا۔ براہ راست نہیں ملے گا تو بالواسطہ مل جائے گا۔ یہ لوگ دل و جان سے اس "شخص" کی پرستش کرتے ہیں اور اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ شخص ایک غیر معمولی ہپناٹسٹ ہی نہیں بلکہ دیگر حوالوں سے بھی زبردست صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس کا ایک نظریۂ حیات ہے جس پر وہ غیر متزلزل یقین رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس نظریۂ حیات کو سمجھیں اور اپنائیں۔ بے شک اس کے نظریے میں کچھ سنگین نوعیت کی خامیاں بھی ہیں لیکن اس کی خوبیوں سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر ہنری! تم نے میرا خیال تو پوچھ لیا اب تمہارا کیا خیال ہے، کیا واقعی کوئی شخص اتنا زبردست ہپناٹسٹ ہو سکتا ہے کہ سیکڑوں میل دور سے بھی اپنے معمول کو کشش کرے اور اچھے بھلے لوگوں کو یوں جنون میں کر دے کہ انہیں ہپناٹسٹ کے سوا اور کچھ یاد ہی نہ رہے۔"

"میرے علم میں تو ابھی تک ایسی کوئی مثال نہیں ہے لیکن ممکن ہے، ایسا ہوتا ہو یا کہیں نہ کہیں ہوا ہو۔"

ایک عجیب سی سنسنی میرے دل و دماغ پر طاری ہو رہی تھی۔ جو کچھ میرے ارد گرد ہو رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا لیکن اس پر یقین کرنا پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہنری کی باتوں نے میری الجھنوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہی کیا تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر ہنری! کیا تمہیں معلوم ہے کہ سردار سدورت کو جو شکست فاش ہوئی ہے اس میں بھی ایک "پراسرار پہلو" موجود تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"کہا جا رہا ہے کہ سردار سدورت کے گھڑ سوار دستوں کا سالار دارا خاں لڑائی سے کچھ دیر پہلے اپنے چار سو ماہر ترین گھڑ سواروں کو لے کر جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ لوگ لڑائی کے بعد واپس آئے تھے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی حکمت عملی ہو۔"

"حکمت عملی نہیں تھی۔ یہ لوگ سرے سے لڑائی میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ ان کی کمی لڑائی کے دوران میں بہت بری طرح محسوس کی گئی۔ یہاں تک کہ میں نے بھی محسوس کی۔"

"کیا تم کہنا چاہتے ہو کہ وہ سب لوگ کسی خاص ذہنی کیفیت میں تھے؟"

"سب لوگ تو نہیں مگر ممکن ہے کہ ان کا سردار دارا خاں اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو، گھڑ سوار اس کا حکم ماننے کے پابند تھے۔"

"دارا خاں بہت مضبوط شخص ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قسم کے حالات کا شکار ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہپناٹزم یا مسمریزم کا تعلق ہے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اس کا شکار عام طور پر لڑکے، لڑکیاں اور بچے بنتے ہیں۔۔۔ پختہ عمر لوگوں پر ان ترغیبات کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔"

"لیکن میں نے دارا خاں کو اپنی آنکھوں سے مچھلی کی طرح تڑپتے دیکھا ہے۔ بالکل وہی کیفیت جو اس سے پہلے جوان لڑکیوں پر طاری ہوئی تھی۔"

"اب دارا خاں کہاں ہے؟" ہنری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہیں جہاں وہ دونوں جوان لڑکیاں ہیں۔ تین روز پہلے رات کو دارا خاں کا ہیجان دیوانگی کی حد کو پہنچ گیا تھا۔ سردار رابل کے حکم پر اسے فوراً رابلی قبیلے کی بستی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ مقدس دیوار کے پار پہنچ چکا ہے۔"

ڈاکٹر ہنری کے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے۔ بوڑھی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ واقعی یہ بات سوچنے کی تھی۔ وادی کا دفاع ناقابل تسخیر تھا۔ ایک طویل عرصے سے یہاں کے باسی ناقابل شکست تھے۔ انہیں جو شکست ہوئی تھی وہ باخبر لوگوں کو آسانی سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً اس شکست کا کوئی پراسرار پہلو بھی تھا۔ ہم ابھی تک اسی پراسرار پہلو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ہنری بولا "جو حالات تم بتا رہے ہو، ان میں تو واقعی اچھے بھلے بندے کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ تمہاری ساتھی تو پھر ایک لڑکی ہے۔ اس نے نہ صرف لڑائی میں بے شمار ہلاکتیں دیکھی ہیں بلکہ ان پراسرار واقعات کا مشاہدہ بھی کر رہی ہے۔ ایسے میں ذہن شدید دباؤ کا شکار ہو جائے تو بڑی بات نہیں۔ میرے خیال میں اسے مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ اسے اردگرد کے حالات سے بالکل لاتعلق رکھو اور اسے تسلی دو کہ ایک دو دن میں یہاں سے روانگی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر ہنری! مریضہ کے بارے میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہی مقناطیسی نیند وغیرہ جس کے بارے میں ہم نے ابھی گفتگو کی ہے؟"

ڈاکٹر ہنری نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد انکار میں سر ہلا دیا "بظاہر تو اس میں کوئی ایسی علامت نظر نہیں آتی۔" وہ بولا "تین چار برس پہلے میں نے رابلی قبیلے کی دو سحر زدہ عورتوں کو دیکھا تھا۔ قبائلیوں کے بقول انہوں نے بھی مقدس روشنی کو دیکھا تھا۔ وہ عورتیں جاگتے ہوئے بھی سوئی ہوئی لگتی تھیں۔ اس لڑکی میں تو ایسی کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ اسے جو غنودگی سی ہے وہ صرف بخار کے سبب ہے۔ خدا نے چاہا تو جلد ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں کچھ دیر تک مزید ڈاکٹر ہنری کے پاس بیٹھا رہا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے ڈاکٹر سے مقامی لڑکی بیلاس کے بارے میں پوچھا۔ بیلاس ہنوز ڈاکٹر ہنری کے پاس تھی اور صحت مند تھی۔ "ملوث" ہونے کے سبب وہ گرفتاری سے بھی بچ گئی تھی۔ یہ بیلاس وہی لڑکی تھی جس کی جان میں نے قابے نامی غنڈے سے بچائی تھی۔ ہنری کی بیوی آنٹی رابین بندی خانے میں تھی۔ ویسے وہ بھی ٹھیک تھی۔ میں نے ہنری سے وعدہ کیا کہ آنٹی رابین کی رہائی کے لیے اپنی سی کوشش کروں گا۔

اب ابر آلود شام گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وادی کی تاریک اور طویل رات شروع ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر ہنری سے اجازت لے کر میں اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا۔

سرنگ کے اندر تماشا گاہ کے عین سامنے زریں گل سے ملاقات ہوئی۔ اس کے چہرے پر رونق نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگا "استاد صیب! آج ام بہت خوش ہے۔ ام کو امارے من کا مراد مل گیا ہے۔"

"نسوار مل گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نسوار نہیں جناب! مراد مل گیا ہے۔ ام کو امارا معشوق مل گیا ہے۔ ابھی تماشا گاہ میں کلثوم سے امارا ملاقات ہوا ہے۔"

"واقعی۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ام آپ سے کیسے جھوٹ بول سکتا ہے جناب۔۔۔ اور کلثوم کے بارے میں تو ام کسی سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ امارا عشق ہے۔ امارا ایمان ہے، امارا سب کچھ ہے۔ امارا تو دل چاہتا ہے کہ ام اس کے قدموں میں قربان ہو جائے۔"

میں نے کہا "قربان ہونے والے بکرے کے لیے "دوندا" اور "خصی" ہونا ضروری ہے۔ تم کسی شرط پر بھی پورے نہیں اترتے لہٰذا تمہاری قربانی مناسب نہیں۔"

"آج ام کو آپ کا مذاق بھی برا نہیں لگ رہا جناب! آج ہم اتنا خوش ہے کہ فلم سٹار ندیم صیب بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ندیم صیب نے گانا گایا تھا۔ ام کیوں دامن کو پھیلائے، ام کیوں کوئی دعا مانگے، تجھے جب پا لیا ام نے خدا سے اور کیا مانگے۔۔۔ استاد صیب آج امارے دل کا آواز بھی یہی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ارے باندرا! صرف ملاقات ہی ہوئی ہے یا بات بھی ہوئی ہے؟"

وہ بولا "جناب! آپ نے وہ گانا نہیں سنا۔ کچھ بھی نہ کہا، کہہ بھی گئے۔ کچھ کہتے کہتے رہ بھی گئے۔۔۔ جو پیار کرنے والا لوگ ہوتا ہے انہیں زبان سے کچھ کہنے کا ضرورت ہی نہیں پڑتا۔ ان کا خاموشی ہزار باتوں پر بھاری ہوتا ہے۔"

زریں گل کی گول گول آنکھوں میں خوشی لہریں لے رہی تھی۔ اب میں نے غور سے دیکھا تو اس کے ہاتھوں میں پیلے

پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ بھی نظر آیا۔۔۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھے۔ یہاں سامنے سرنگ کی دیوار پر بوباش دیوتا کی ایک بہت بڑی تصویر بنی ہوئی تھی جس کے اردگرد نیم برہنہ مرد و زن سجدہ ریز تھے۔ اس کے بالکل سامنے ایک تازہ تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ مقدس سنہری عقاب کی تھی اور یہ وادی کے نئے تابعین کی طرف سے تھی۔ یعنی سنہری عقاب بمقابلہ سانپ۔۔۔

زریں گل چٹخارے لے لے کر بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا "ام ابھی تماشا گاہ میں گیا تو وہاں سب لوگ شراب پی رہا تھا اور ناچ رہا تھا۔ ام ایک طرف بیٹھ گیا اور برفانی بکرے کے بھنے ہوئے گردے کھانے لگا۔ اچانک امارا نظر ایک لڑکی پر پڑا۔ وہ ناچنے والوں کے درمیان کھڑا تھا لیکن ناچ نہیں رہا تھا۔ وہ امارا ای طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کلثوم تھا۔ ام نے اسے دیکھا اور امارا دل ٹھک سے بند ہو گیا۔ ام کو لگا "ام ابھی اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو جائے گا۔ کلثوم امارے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کا آنسو تھا۔ ام نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بالکل کسی فلم کا سین نظر آ رہا تھا استاد صیب۔ یہ ایسا سین تھا جس کو سنسری قینچی کا ڈر بھی نہیں تھا لیکن ام نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اشاروں کنایوں میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کلثوم کا حال احوال پوچھا۔ کلثوم پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ ایک دم مکھن ملائی کی طرح۔ امارا دل چاہ رہا تھا کہ اسے ابھی پیالے میں ڈالے اور غٹا غٹ پی جائے۔۔۔"

"چاہے بعد میں لوگ جوتے مار مار کر سر پولا کر دیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ایک تو استاد صیب! آپ بیچ میں بول کر سارا مزہ کرکرا کر جاتا ہے۔ ام نے کچھ کیا تھوڑا ہے، صرف اپنے دل کا بات بتا رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ تم کچھ کرنے جوگے ہوتے تو اب تک شادی نہ کر لیتے۔"

"تو کیا آپ کو اماری مردانگی پر شک ہے؟ خدا کا قسم استاد صیب، ام ایک چھوڑ تین شادیاں کر سکتا ہے اور تینوں شادیوں کو بھی خوشی چلا سکتا ہے۔ آپ کا دوست عالم قریشی دو شادیاں کر کے ڈینگیں مارتا ہے۔ اس کا مردانگی اماری مردانگی کے سامنے دو ٹکے کا نہیں ہے۔ آپ کو پتا نہیں امارے اندر کتنا جذبات ہے۔"

میں نے کہا "جذبات تو گدھے میں بھی بہت ہوتے ہیں۔ کوئی انسانیت بھی تمہارے اندر ہے یا نہیں۔"

"دیکھیں استاد صیب! آپ پھر ہیر پھیر والا بات کر رہا ہے۔ ام جذبات کا ذکر فرما رہا ہے۔ اس میں گدھے کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ شاید آپ اماری اس بات کو مذاق سمجھیں استاد صیب! لیکن یہ حقیقت ہے کہ پشاور میں ایک لڑکی نے ام کو شہنشاہِ جذبات کا خطاب دے دیا تھا۔"

"تو کیا شہنشائی دکھائی تھی تم نے اسے؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کوئی لمبی چوڑی ملاقات ہوئی تھی؟"

"بس ایک رکشے میں بیٹھے بیٹھے پانچ دس منٹ کا ملاقات ہوا تھا۔"

"اوئے تیرا دماغ تو ٹھیک ہے۔ رکشے میں بیٹھے بیٹھے تجھے شہنشاہ۔۔۔ جذبات کا خطاب کیسے مل سکتا ہے۔ میرے خیال میں تم گپ لگا رہے ہو۔۔۔ اور اگر سچ بھی کہہ رہے ہو تو اس لڑکی نے شہنشاہ۔۔۔ جذبات کا نہیں بلکہ ملکۂ جذبات کا خطاب دیا ہو گا۔"

زریں گل ایک دم بھڑک کر بولا "دیکھیں استاد صیب! آپ پھر طنز فرما رہا ہے۔ اماری مردانگی پر شک کر رہا ہے۔ اگر رکشے میں شہنشاہ۔۔۔ جذبات کا خطاب نہیں مل سکتا تو ملکۂ جذبات کا خطاب کیسے مل سکتا ہے؟"

"اچھا بھئی، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم آگے چلاؤ پھر کیا ہوا تماشا گاہ میں؟"

زریں گل نے چند لمحے توقف کر کے اپنا موڈ درست کیا اور بولا "کلثوم بڑا اچھا لڑکی ہے۔ ام اس کی آنکھوں میں اپنا نام لکھا ہوا صاف دیکھ سکتا ہے۔ کچھ دیر امارے پاس رکنے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔ چار پانچ منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پھولوں کا یہ چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ گلدستہ اس نے ام کو دیا پھر ٹھوڑی کے نیچے اماری گردن پر پیار بھرا "بھوسہ" دیا اور واپس چلا گیا۔"

"بھوسہ؟ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو ناولوں اور کہانیوں میں ہوتا ہے۔ جو ہیروئن اور ہیرو بار بار ایک دوسرے کو دیتا رہتا ہے۔۔۔ یعنی۔۔۔ چمّاں۔"

"اوئے باندر! اسے بھوسہ نہیں بوسہ کہتے ہیں۔ اپنی اردو درست کرو ورنہ کسی کراچی والے سے مار کھاؤ گے۔"

زریں گل میری بات نظر انداز کر کے بولا "استاد صیب! کاش ام اس دور دراز وادی میں ہونے کے بجائے آج لاہور میں ہوتا۔ اندرون شہر جا کر ابھی نرالے کی مٹھائی لاتا اور لکشمی چوک پر کھڑے ہو کر ہر آتے جاتے کے منہ میں

ٹھونسنے لگتا۔ آج ام بہت خوش ہے۔ امارا دل چاہتا ہے ام بہت خوشی کرے۔۔۔ لیکن۔۔۔ پتا نہیں کیا ہے۔۔۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے اداسی جھلکنے لگی "کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "سروج کی حالت نے امارا دل غمزدہ کر رکھا ہے۔ نہیں وہ کب ٹھیک ہو گی۔"

میں نے کہا "وہ تو تمہیں زہر لگتی ہے۔ اس کے لیے نالاں کیوں؟"

زریں گل نے آہ بھری "استاد صیب! وہ تو سب ٹھیک لیکن آخر کو وہ ہمارا ساتھ رہی ہے نا۔ ام نے اس کے ساتھ بہت سا اچھا بُرا وقت گزارا ہے۔۔۔ ام اوپر سے جیسا ہے اندر سے امارا دل بڑا ملائم ہے استاد صیب۔ بالکل اخروٹ کے ماتق اوپر سے سخت، اندر سے نرم۔ ام دل چاہتا ہے کہ سروج جلد اچھا ہو جائے۔"

اچانک میری نگاہ سروج پر پڑی۔ وہ سرنگ کی ایک ذیلی شاخ سے نکلی تھی اور اس کشادہ جگہ پر آ گئی تھی جہاں سرنگ ایک ہال کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ کیروسین لیمپ کی روشنی میں وہ ایک اجڑی اجڑی تصویر نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے، بال الجھے ہوئے اور بازو دو خشک شاخوں کے اطراف میں لٹکے ہوئے۔

میں اور زریں گل اس کے پاس چلے گئے "تمہیں تو ڈاکٹر صاحب نے آرام کے لیے کہا ہوا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

وہ بولی "آرام کر کر کے تھک گئی ہوں۔ من گھبرا رہا تھا اس لیے چلی آئی۔" چند لمحے توقف کر کے بولی "تم نے کہیں سائیں صیب کو تو نہیں دیکھا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔"

"آج پورے آٹھ روز ہو گئے ہیں۔" وہ بولی "پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ اگر میرے ساتھ کوئی دُرگھٹنا ہو گئی تو انہیں کیسے پتا چلے گا۔"

"کوئی دُرگھٹنا نہیں ہو گی تمہارے ساتھ۔" میں نے اسے جھڑکا "خواہ مخواہ اپنے دماغ کو خراب مت کرو۔ میں ابھی ڈاکٹر چتری سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے ذہنی پریشانی کے سوا کوئی بیماری نہیں ہے تمہیں۔ ایک دم صحت مند ہو تم۔"

وہ ہولے ہولے مسکرائی "کبھی کبھی تو من چاہتا ہے کہ تمہاری بات پر وشواس کروں۔"

"تو کیا رکاوٹ ہے۔ کہو تو زریں گل سے بھی سفارش کرا دیتا ہوں۔"

وہ میرے مزاح کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "شاہ جہاں، مجھے پورا وشواس ہے کہ یہاں سے نکلتے ہی میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ اب کتنے دن ہمیں رہنا ہے یہاں؟"

"زیادہ سے زیادہ تین چار دن۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اس کے چہرے پر رونق نمودار ہو گئی۔ بولی "تو بس مجھے نیند کی کوئی ایسی دوا دے دو کہ دو تین دن میں سوئی ہی رہوں۔"

"پھر وہی ڈر۔۔۔ بھئی تم اس ڈر کو ذہن سے جھٹک کیوں نہیں دیتیں۔"

"یہ لو جھٹک دیا" وہ بڑی ادا سے سر جھٹک کر بولی۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا "چلو آؤ، اسی خوشی میں کچھ گرم گرم پئیں۔"

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً مقامی قہوہ یا پھر برفانی بکرے SNOW IBEX کی یخنی۔"

زریں گل نے ناراضگی سے کہا "دیکھیں استاد صیب! آپ نے "برفانی بکرا" کہتے ہوئے پھر میری طرف دیکھا ہے۔ جب بھی آپ کسی بدشکل جانور کا نام لیتے ہیں، میری طرف دیکھتے ہیں۔"

"یہ تمہارے دماغ کا فتور ہے۔ ورنہ برفانی بکرا SNOW IBEX تو بڑا پیارا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ سروج زیرِ لب مسکرا دی۔

ہم تماشا گاہ کی طرف چلے گئے۔ یہاں خاصی رونق تھی پھر بھی وہ بدمستی نظر نہیں آ رہی تھی جو پہلے نظر آیا کرتی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ اب وادی پر کلہاڑا برداروں کے بجائے رائلی قبیلے کے لوگوں کو قبضہ تھا۔ بوباش دیوتا کے پجاری یہاں جو حیوانہ اچھل کود کیا کرتے تھے اس کی جگہ اب دھیمے دھیمے رقص و سرور نے لے لی تھی۔ کچھ مرد و زن لکڑی کے فرش پر ناچ رہے تھے، کچھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہم آہنگ ہو کر گیت گا رہے تھے۔ ان میں رائلی قبیلے کے لوگوں کے علاوہ وادی واخان کے مفتوح باشندے بھی شامل تھے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے سوار رائلی کو اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلا دیا تھا اور انہیں بندی خانے میں ڈالنے کے بجائے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک ایسی ہی مثال ڈاکٹر چتری کی صورت میں ہمارے سامنے آ چکی تھی۔ ہم تماشا گاہ کے اس حصے میں آ گئے جہاں کھانے پینے کا انتظام

موجود تھا۔ لکڑی کی لمبی لمبی میزیں تھیں جن کے گرد اسٹول نما نشستیں رکھی گئی تھیں۔ ان میزوں کے گرد خوش باش لوگ بیٹھے تھے۔ چند مقامی لڑکیاں کھانے پینے کی اشیا فراہم کررہی تھیں۔ ہم بھی ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ کھانا منگوایا گیا جس میں تلے ہوئے انڈے' کوئلوں پر سینکا ہوا گوشت' مکئی کی' گندم کی لیموتری روٹیاں' قہوہ اور میٹھا شامل تھا۔

اتنی ساری چیزیں دیکھ کر سوج کی مری ہوئی بھوک چمک اٹھی تھی اور وہ کھانے میں ہمارا ساتھ دینے لگی۔ بے شک۔ سوج سے مجھے کئی اختلافات تھے جن میں سب سے بڑا اختلاف یہ تھا کہ اس نے دولت کے حصول کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا اور اس کے لیے ہر وقت اپنا تن من قربان کرنے کو تیار رہتی تھی۔۔۔۔ مگر سوج میں کچھ خوبیاں بھی تھیں' اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ وہ سائیں عالی کی چیلی تھی' جب کہ سائیں عالی ہمارے مشکل ترین حالات میں گاہے گاہے نمودار ہو کر ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرتا تھا۔ فی الوقت سوج ہماری ہی طرح "پردیسی" تھی۔ اپنے وطن اور اپنے عزیز و اقارب سے سیکڑوں ہزاروں میل دور اس وادی میں ناساعد حالات کا شکار تھی۔ اب وہ بیمار بھی تھی۔ اس کی دلجوئی اور دیکھ بھال کرنا ہر طرح سے ہمارا فرض بنتا تھا۔

کھانے کے دوران میں ہی صفدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے صفدر کے ذمے یہ کام لگا رکھا تھا کہ وہ وادی میں گھوم پھر کر سائیں عالی کو تلاش کرے۔ جس رات مقامی سردار راراخان شدید ہیجانی کیفیت کا شکار ہوا تھا' اسی رات سائیں عالی اچانک سرنگ میں سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کی گمشدگی نے سوج کو مزید پریشان کر رکھا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ سائیں عالی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا۔ جون چاؤل بھی صفدر کے ساتھ ہی تھا۔ سوج کی طرح جون چاؤل بھی چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد اس وادی سے نکل جائیں۔ جون چاؤل کی بے تابی کی وجہ فینگ بن تھی۔ وہ اپنی اس کوہ پیما ساتھی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ جب وہ فلپائن میں تھے تو چند گھنٹے بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزارتے تھے لیکن نانگا پربت کی پراسرار بلندیوں نے ان سے قربتیں چھین کر انہیں فاصلے دے دیے تھے۔ یہ فاصلے پچھلے کئی ماہ سے ان دونوں کو دن رات تڑپا رہے تھے۔ جون چاؤل جلد از جلد گلگت پہنچنا چاہتا تھا اور وہاں سے لاہور۔۔۔۔ میں نے اسے بتا رکھا تھا کہ فینگ ابھی تک لاہور میں ہی ہے اور شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ میری ہدایت کے مطابق ... ہر گھڑی جون چاؤل کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم جون چاؤل ... لیے کسی بھی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ... حالات میں جون چاؤل ہمارے لیے ایک بے حد اہم ... بن گیا تھا۔۔۔۔ چڑیل والی حویلی والے دفینے کے حوالے سے اب "جون چاؤل" ہی ہمارے پاس واحد سراغ تھا۔ ... چاؤل ہمیں بتا سکتا تھا کہ وہ "دفینہ" اب کہاں ہے جس کے لیے ایک خلقت پریشان ہے اور انڈیا میں جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ باؤلے کتوں کی طرح جس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں ۔۔۔ وہ دفینہ اب ایک چیلنج بن چکا تھا۔ اس میں موجود نوادرات کی کشش اور شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ امریکن ارب پتی مسٹر جی کلارک جیسا شخص ... سارے دھندے چھوڑ کر اس دفینے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ وہ دفینہ ایک گریزپا محبوب کی مثال ہو گیا تھا۔ اپنے ... سے اپنا رُخِ روشن چھپا کر پھر رہا تھا لیکن ایک ایسے شخص پر آشکار ہو گیا تھا جس سے اس کاروبار کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ... شخص یہی فلپائنی کوہ پیما جون چاؤل تھا۔ چند ماہ پہلے جب وہ مدراس کے ائرپورٹ پر اُترا ہو گا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ ہندوستان میں ایک بہت بڑے راز کا امین بننے والا ہے۔

کچھ دیر تماشا گاہ میں بیٹھ کر اور موسیقی سے لطف اندوز ہو کر ہم اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف چلے گئے۔ جب سے سائیں عالی گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہوا تھا' مجھے سوج کے کمرے میں سونا پڑ رہا تھا۔ ہم دونوں کمرے میں آ گئے۔ آج کئی دن بعد سوج کمرے سے نکلی تھی اور گھومی پھری تھی۔ اس کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر نظر آنے لگی تھی۔ مرجھائے ہوئے رُخساروں پر تھوڑی سی تازگی آئی تھی۔ آج میرے کہنے کے بغیر ہی اس نے دوا بھی پی لی۔

میں نے اس سے کہا "کسی دانا کا قول ہے کہ انسان کی آدھی سے زیادہ مصیبتیں وہ ہوتی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ مصیبتیں درحقیقت وہ اندیشے ہوتے ہیں جنہیں ہم بلاوجہ خود پر طاری کر لیتے ہیں۔ مثلاً فلاں شخص کے ساتھ میرا جھگڑا ہو جائے گا۔ مجھے فلاں بیماری لگ جائے گی' فلاں کام میں مجھے ناکامی ہو گی' وغیرہ وغیرہ۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں شاہ جہاں۔" سوج نے کہا "لیکن کبھی کبھی مجھے اپنے خیالات پر ادھیکار (اختیار) نہیں رہتا۔"

"بہرحال اب تو تم کافی بہتر نظر آتی ہو۔"

وہ مسکرائی "اگر میں واقعی بہتر نظر آتی ہوں تو پھر اس کا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ تم جتنی توجہ مجھ پر دے رہے ہو شاید کوئی اور نہ دے سکتا۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں وہی معروف فقرہ ادا کروں کہ ۔۔۔ یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا"

وہ مسکرا دی پھر اپنے ہاتھوں سے گلے کو مسلتی ہوئی بولی "میں سچ کہتی ہوں شاہ جہاں۔ یہاں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میرے پنکھ لگ جائیں اور اڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔"

"اڑ کر تو جاتری نکلے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"دھماکے سے اڑ کر نکلے تھے وہ ۔۔۔ ہم اڑ کر نہیں' اللہ نے چاہا تو اپنے پاؤں پر چل کر جائیں گے اور بہت جلد جائیں گے۔"

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ حسبِ معمول وہ مسہری پر لیٹی' میں نے نیچے اپنا نمدے دار بستر لگا لیا۔ سوج کو دوا کی غنودگی تھی' وہ جلد ہی سو گئی۔ میں بھی کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ میری آنکھ ایک نامانوس آواز سننے کے بعد کھلی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے کسی کا گلا دبایا جا رہا ہو اور اس کے حلق سے "خرر خرر" کی صدا بلند ہو رہی ہو۔ یہ آواز سوج کی مسہری کی طرف سے آ رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی' میں نے سونے سے پہلے لیمپ کی لو اتنی نیچی کر دی تھی کہ بس روشنی کا نقطہ سا باقی رہ گیا تھا۔

"سوج ۔۔۔ سوج۔" میں نے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر لیمپ کی لو اونچی کی۔ کمرے میں زرد روشنی پھیل گئی۔ میں نے لیمپ سر سے اونچا کر کے سوج کو دیکھا اور دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سوج کی آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر ایک لرزہ سا طاری تھا ۔۔۔ میری نگاہوں کے سامنے کمرے کا ہر منظر چکرانے لگا۔ دل کی گہرائیوں سے یہ آواز چیخ کی طرح ابھری کہ ۔۔۔ سوج کے ساتھ وہی کچھ ہو گیا ہے جو اس سے پہلے نائیلہ کے ساتھ ہوا تھا' تاجکی لڑکی کے ساتھ ہوا تھا اور داراخان کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ احساس اتنا لرزہ خیز تھا کہ مجھے اپنے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"سوج ۔۔۔ سوج۔" میں نے اسے کندھوں سے تھام کر جھنجوڑا۔

اس کی اوپر چڑھی ہوئی آنکھیں چند لمحے کے لیے ٹھیک ہو گئیں۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ کتنی اجنبیت اور لاتعلقی تھی ان کی آنکھوں میں۔ وہ آنکھیں مجھے نہیں' مجھ سے آگے کہیں بہت دور خلا میں جھانک رہی تھیں۔ صرف ڈیڑھ دو گھنٹے میں کتنی بڑی تبدیلی رونما ہو گئی تھی ان آنکھوں میں۔

مجھے یقین نہیں آیا کہ واقعی سوج اس جنون کا شکار ہو گئی ہے جس کا خوف اسے دو ہفتوں سے لرزا رہا تھا۔ کیا واقعی اس کے بدترین اندیشے حقیقت میں ڈھل چکے تھے؟ کیا واقعی اب وہ جیتی جاگتی ہنستی کھیلتی لڑکی نہیں رہی تھی بلکہ ایک آسیب زدہ مخلوق بن چکی تھی؟

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا "صفدر ۔۔۔ زریں گل۔" میں نے زور زور سے انہیں پکارا۔

پہلے پہریدار بھاگتے ہوئے آئے پھر صفدر اور زریں گل وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے سوج کی حالت دیکھی اور ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی' خوش فہمی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سوج کی حالتِ زار چیخ چیخ کر اس کی اندرونی کیفیت کی گواہی دے رہی تھی' اور یہ کیفیت ہم میں سے کسی کے لیے بھی انوکھی نہیں تھی۔ ہم پہلے بھی اس کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ خواب ناک آنکھیں' دہکتا ہوا چہرہ' کسی نامعلوم بلا کی شدت اور ادھ کھلے ہونٹ' پارے کی طرح مچلتا ہوا جسم۔ یہ سب کچھ ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔

صفدر نے سوج کو میری ہی طرح شانوں سے جھنجوڑا اور پکارا۔ اس بار سوج نے بڑی بیزاری سے اپنا سر نفی میں دائیں بائیں ہلایا اور صفدر کے بازو جھٹک دیے۔۔۔ پھر وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے گلے اور پیشانی کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور جسم میں شدید اکڑاؤ تھا۔ وہ مسہری سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی۔

رالی قبیلے کا ایک پہریدار زور زور سے چلانے لگا "سانی ۔۔۔ سانی۔" یعنی مقدس سنہری روشنی کی دلہن۔

"سانی' سانی۔" کی آواز سنتے ہی اور بھی بہت سے پہریدار اور لشکری کمرے کے سامنے جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں دہشت کے ساتھ ساتھ احترام کی کیفیت بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ احترام یقیناً سوج کے لیے ہی تھا۔ وہ سوج کو باہر جانے سے روکنا چاہتے تھے لیکن ہاتھ بھی نہیں لگا رہے تھے۔ وہ لڑکی اب ان کے لیے کوئی بہت مقدس و بلند و بالا ہستی

بن گئی تھی۔ دو پہرے داروں نے دوڑ کر لکڑی کا وہ منقش دروازہ بند کر دیا جو اس ذیلی سرنگ کو مرکزی سرنگ سے ملاتا تھا۔ تیسرے پہرے دار نے اس دروازے کو مقفل کر دیا۔ جونہی سروج خوابیدہ انداز میں چلتی اس دروازے کے قریب پہنچی، پہرے دار جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ سروج دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ کبھی پٹ کو اندر کی طرف کھینچتی، کبھی باہر دھکیلتی۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے۔

"سروج ــــ میری بات سنو۔ میں شاہ جہاں ہوں ـــــ" میں نے ایک بار پھر اسے متوجہ کرنا چاہا۔

پہلی کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ سروج کو اپنے قرب وجوار کا ہوش ہی نہیں۔ وہ خود کو وہاں یکسر تنہا سمجھ رہی ہے ـــ دو تین منٹ تک دروازے سے الجھنے کے بعد وہ نڈھال سی ہو گئی اور اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں نکلنے لگیں۔

اسی دوران میں دروازے کے باہر سے کسی شخص کی بھاری آواز آئی۔ میں پہچان گیا کہ یہ بھاری آواز، ایک بہت ہلکے شخص کی ہے۔ یہ سردار راائل کی آواز تھی۔ ایک پہرے دار نے جلدی سے دروازے کا قفل کھول دیا۔ جونہی دروازے کے پٹ وا ہوئے، سروج نے کسی بے قرار پرندے کی طرح باہر نکلنا چاہا لیکن سردار راائل کے ساتھ تین چار عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے بڑی مہارت سے سروج کو سنبھال لیا اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر مسہری تک پہنچا دیا۔ ان عورتوں کے انداز میں احترام کا عنصر نمایاں تھا۔ بے شک انہیں سختی کرنا پڑ رہی تھی لیکن اس سختی میں بدرجہ اتم شائستگی بھی موجود تھی۔ سروج کو مسہری پر لٹانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن وہ عورتوں کے ہاتھ سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس کا پرکشش جسم کمان کی طرح تنا ہوا تھا اور سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ کوئی پاروا سا تھا اس کے پیکر میں جو اپنی حدیں توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا۔

عورتوں نے سروج کو مسہری پر لٹا دیا اور پھر ریشمی ڈوریوں سے اس کے ہاتھ پاؤں مسہری سے باندھ دیے۔ سروج بدستور مچل رہی تھی۔ جب عورتیں سروج کو باندھ کر مسہری سے پیچھے ہٹ گئیں تو وہاں موجود راائلی قبیلے کے تمام افراد مسہری کے سامنے دو زانو ہو گئے۔ ان میں کوتاہ قد سردار راائل بھی تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چمکیلا برچھا تھا۔ اس برچھے کو فرش پر ٹیک کر سردار راائل نے مقامی زبان میں کچھ الفاظ کہے۔ ان الفاظ میں "سانی" کا لفظ تین دفعہ آیا اور واضح طور پر سنا گیا۔

سردار راائل کے اشارے پر ہم سب کمرے سے باہر نکل گئے۔ سروج کے پاس صرف دو ادھیڑ عمر عورتیں رہ گئیں۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ بڑی سے بڑی مصیبت میں پھنس کر بھی میں نے ایسی بے دلی اور قنوطیت محسوس نہیں کی تھی جیسی اب کر رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ عقل حیران تھی اور سوچ کے پر قینچ ہو گئے تھے۔ سردار راائل بڑے سبک قدموں سے میرے پاس آیا۔ اس نے مقامی زبان میں مجھ سے کچھ کہا۔ قریب کھڑے ہوئے ہمارے نئے مترجم دانیال نے ترجمہ کیا "آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کے ساتھ یہاں آنے والی دوشیزہ کو مقدس سنہری روشنی نے عظیم رتبہ بخشا ہے۔ وہ سانی بن گئی ہے۔"

"وہ ـــ سانی ـــ بن گئی ـــ ہے۔" یہ الفاظ مجھے اپنی سماعت میں گونجتے اور پھیلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ہم سب اپنی جگہوں پر دم بخود کھڑے تھے۔

سردار راائل نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اب یہ محترم دوشیزہ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہے۔ ہمارے نجس اجسام کا سایہ بھی اس پر نہیں پڑنا چاہیے۔ مقدس روشنی ہمیں اپنے حفظ وامان میں رکھے اور ہمیں ہمیشہ صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے دوستو! یہ دوشیزہ اب ہمارے لیے تمہارے جیسی خاکی مخلوق نہیں ہے۔ اس کا "اصل" اب روشنی ہے۔ یہ روشنی "مقدس سنہری روشنی" کا جزو ہے اور اپنے کل کی طرف لوٹ کر جانے کی، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ ممکن ہے کہ اس کی جدائی آپ کو شاق گزرے لیکن یہ جدائی اب اٹل ہے اور اسی میں اب محترم دوشیزہ کا بھی بھلا ہے ـــ

مقدس سنہری روشنی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی۔ وہ تھوڑا لے کے بہت زیادہ دیتی ہے۔ اپنی عزیزہ سے جدائی کا آپ کو جو قلق ہوگا اس کے بدلے آپ کو دستِ غائب سے بے شمار خوشیاں ملیں گی ـــ خوشیاں جو پائیدار ہوں گی اور دائمی بھی۔"

میں، صفدر، زریں گل ـــ سب مبہوت کھڑے تھے اور سردار راائل کی تقریر سن رہے تھے۔ روغنی مشعل کی روشنی میں سردار راائل کا چہرہ تانبے کے مانند چمک رہا تھا اور آنکھوں میں خاص قسم کی خود فراموشی تھی۔

O☆O

اگلے دو روز ہمارے لیے بڑے پریشان کن تھے۔ سروج ہماری ساتھی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ یہ تصور بڑا تکلیف دہ تھا کہ وہ کبھی

واپس نہ لوٹنے کے لیے چلی جائے گی۔ اب تک میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق سانی یعنی مقدس سنہری روشنی (عقاب) کی دلہن کو شبِ عروسی منانے کے لیے دیوار کے پار بھیجا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ صرف ایک بار دوبارہ نظر آتی تھی۔ اگلے روز صبح کے وقت وہ نہانے کے لیے رادی کے گرم چشمے پر لے جائی جاتی تھی۔ چند ادھیڑ عمر عورتیں جو اسی کام کے لیے مخصوص تھیں سانی کو خاص طریقے سے غسل کا طریقہ بتاتی تھیں اور کچھ رسمیں وغیرہ بھی ادا کرتی تھیں۔ تاہم اس دوران میں سانی اپنے کسی عزیز و اقارب یا کسی جان پہچان والے سے مل نہیں سکتی تھی۔ گرم چشمے سے وہ سیدھی واپس مقدس دیوار تک لائی جاتی تھی اور اندر بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے بعد کبھی اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہاں سال میں ایک مرتبہ اندر سے تحریر شدہ پیغامات باہر بھیجے جاتے تھے۔ یہ پیغامات سردار راائل کے ذریعے باہر آتے تھے۔ یہ پیغامات ان لوگوں کی طرف سے اپنے عزیز و اقارب کے نام ہوتے تھے جو ہمیشہ کے لیے مقدس دیوار کی دوسری جانب جا چکے ہیں۔ ان پیغامات سے بے حد خوشی اور طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ پیغام بھیجنے والے اپنے لواحقین کو بتاتے تھے کہ بہت سکون اور اطمینان سے ہیں۔ انہیں ایک ایسی حسین و جمیل زندگی نصیب ہے جو ہر کسی کے لیے قابلِ رشک ہو سکتی ہے۔ وہ اب اس زندگی اور اس ماحول سے محروم ہونے کا تصور بھی دماغ میں نہیں لا سکتے۔ وہ اپنے پیغامات میں اپنے لواحقین کو بتاتے تھے کہ وہ مقدس روشنی کے احکامات پر دل وجان سے عمل کریں اور دعا کریں کہ انہیں بھی مقدس روشنی کا قرب نصیب ہو ـــ اور وہ روحانی خوشی ملے جس کا حصول کسی بھی مادی وسیلے سے ناممکن ہے۔

اب یہ سب کچھ سروج کے ساتھ بھی ہونے والا تھا لیکن ہم کچھ نہ کرنے سے معذور تھے۔ سردار راائل ایک کائیاں شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم کس قسم کی مزاحمت کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس کے پہرے دار ہماری طرف سے بالکل چوکس ہو گئے تھے اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ دوسری طرف سروج بھی سخت پہرے میں تھی۔ اس کے قریب چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

تیسرے روز سہ پہر کے وقت سروج کی بندشیں وغیرہ کھول دی گئیں اور اسے راائلی قبیلے کی بستی میں لے جانے کی تیاری ہونے لگی۔ ہم سب افسردہ تھے لیکن یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلح پہرے داروں سے اٹی ہوئی اس سرنگ میں ہماری مزاحمت لاحاصل رہے گی۔ پھر ایسے میں سروج کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

سروج کوئی ایسی عفت مآب دوشیزہ نہیں تھی کہ جس کی آبرو پر حرف آنے کا اندیشہ ہمیں لاحق ہو جاتا مگر پھر بھی جو کچھ اس کے ساتھ ہونے جا رہا تھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ نامعلوم لوگوں کی تحویل میں وہ نامعلوم انجام کا شکار ہونے والی تھی۔ مقدس دیوار کے پار جا کر باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹنے والا تھا۔

زریں گل نے آہ بھرتے ہوئے کہا "استاد صیب! ام سروج سے ہر وقت لڑتا جھگڑتا رہتا تھا مگر اب ایسا لگ رہا ہے کہ وہ لڑائی بچوں جیسا لڑائی تھا، جس میں کوئی عداوت اور دشمنی نہیں ہوتا۔ امارا دل سروج کے لیے ایک دم غمزدہ ہے۔ کیا ام اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتا ہے؟"

"فی الحال تو یہ مشکل نظر آتا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" زریں نے پوچھا۔

"پہرے دار ہماری طرف سے بے حد چوکس ہیں۔ میرے خیال میں انہیں سردار راائل کی طرف سے اجازت مل چکی ہے۔ وہ فائرنگ شروع کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔" صفدر نے کہا۔

"ان پہرے داروں کو دیکھ دیکھ کر امارا غیرت بری طرح جوش مار رہا ہے۔ امارا دماغ میں آگ سا لگ گیا ہے۔ صیدر صیب، کیا ام یونہی ان پہرے داروں کو دیکھتا رہے گا اور یہ لوگ اماری ساتھی کو اٹھا کر کسی عورت باز کے بستر پر پھینک دیں گے۔"

"تم اپنے پٹھانی جوش کو فی الحال قابو میں رکھو تو بہتر ہے۔ اس جوش کو ظاہر کرنے کے لیے تمہیں ابھی بہت سے مواقع ملیں گے۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد مترجم دانیال کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ سانی (سروج) کو تیار کر دیا گیا ہے اور اسے گھوڑا گاڑی پر سوار کرنے کے لیے سرنگ سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔ کچھ فاصلے پر ہمیں وہی منحوس موسیقی بھی سنائی دے رہی تھی جو اس سے پہلے نائیلہ کی رخصت کے موقع پر سنائی دی تھی۔ میں سروج کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس کا تصور میرے ذہن میں خوب اجاگر تھا ـــ وہ ایک بسنتی لباس میں تھی۔ اس کی پیشانی پر، گلے میں اور کانوں میں پھولوں کے زیور تھے۔ آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر سرخی تھی۔ وہ ایک جادوئی خوشبو میں مہکی ہوئی تھی اور قرب وجوار سے بالکل بے خبر خواب ناک انداز

میں قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ ایک ایسے راستے پر چل رہی تھی جو یک طرفہ تھا۔

○☆○

سروج کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے فراموش کیا جا سکتا۔ سات آٹھ روز گزرنے کے باوجود ہم پر ایک "شاک" کی سی کیفیت تھی۔ سردار رابل نے وادی راخان میں بھی وہی قاعدے ضابطے نافذ کر دیے تھے جو رابلی قبیلے میں لاگو تھے۔ وادی سے باہر نکل کر لوٹ مار کرنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی تھی۔ لوٹ مار کا وہ سامان جو مقامی لوگوں کے زیر استعمال تھا بتدریج ضائع کیا جا رہا تھا۔ بیشتر ہاری آزاد کر دیے گئے تھے۔ لوگوں کے پاؤں سے بیڑیاں اور آہنی گولے وغیرہ نکالے جا رہے تھے۔ وادی کے طول و عرض میں آگ جلانے کے سلسلے میں جو دیرینہ پابندیاں عائد تھیں وہ بھی خاصی حد تک نرم کر دی گئی تھیں۔ تاہم رات کے وقت آگ جلانے یا روشنی کرنے پر پابندی برقرار تھی۔ سردار رابل نے ایک حکم کے ذریعے اعلان کیا تھا کہ بستی کے لوگ سادگی کو شعار بنائیں اور ہر مرد و زن عہد کرے کہ وہ محنت و مشقت کی زندگی گزارے گا۔ وادی کی تمام قابلِ کاشت زمین کو استعمال کرنے کا پروگرام بھی بنایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہنرمند لوگوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا تاکہ ان سے اجتماعی فائدے کے کام لیے جا سکیں۔

سردار رابل نے ہمیں "خوش خبری" سنائی تھی کہ وادی کے اردگرد حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ ایک دو روز تک ہمیں وادی سے روانہ ہونے کی اجازت دے دی جائے گی۔ فلمی یونٹ کے لوگ اس پروانۂ آزادی کے ملنے سے بہت خوش تھے۔ ان میں ایکسٹرا اداکار بھی تھے، رقاصائیں بھی اور ٹیکنیشن وغیرہ بھی۔ اس کے علاوہ خوبرو سری لنکن ہیروئن لوسانچی بھی آزادی پانے والوں میں شامل تھی۔ یہ لوگ وہ ساری صعوبتیں اور اذیتیں بھول گئے تھے جو انہیں اس وادی میں آنے کے بعد اٹھانا پڑی تھیں۔ وہ سارے حادثے، ساری بلائیں اور سارے اندوہناک مناظر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے جن کے ساتھ ان کا واسطہ یہاں آ کر پڑا تھا۔ اب وہ صرف واپسی کے راستے کو دیکھ رہے تھے وہ راستہ جو انہیں واپس اپنے شہروں اور گلی کوچوں میں لے جا سکتا تھا۔ سری لنکن لوسانچی کا پاؤں بھاری تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ طویل اور کٹھن سفر کے قابل نہیں تھی لیکن اس وادیِ موت سے نکل جانے کے لیے وہ ہر رسک لینے کو تیار تھی۔

یقیناً آزادی کی خبر ہمارے لیے بھی خوش خبری ہوتی لیکن سروج پر گزرنے والی قیامت نے اس خبر کو ہمارے لیے خوش خبری نہیں رہنے دیا تھا۔ میرے، صفدر اور زریں گل کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ سروج کو نامعلوم حالات کے سپرد کر کے ہنسی خوشی یہاں سے واپس چلے جاتے اور زریں گل تو سب سے زیادہ پُرجوش تھا۔ وہ سروج سے اپنی مخاصمت یکسر بھول گیا تھا۔ وہ بار بار اپنے دادا مرحوم کا قول دہرا رہا تھا۔ اس قول میں اس کے دادا نے کہا تھا کہ اپنی عورت کو کسی غیر کے قبضے میں چھوڑ کر بھاگ آنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ بندہ اپنی مردانہ صفات سے محروم ہو جائے اور سرخی پاؤڈر لگا کر ناچ گانا شروع کر دے۔

ایک روز شام کو سردار رابل نے ہمیں اپنی قیام گاہ پر بلایا۔ میں، صفدر اور زریں گل قیام گاہ پر پہنچے تو سردار رابل ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا تھا اور اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ بے حد عام سا انداز تھا اس کا.... لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی قبیلے کا سردار اعلیٰ ہے۔ وہ ابھی ابھی کام سے لوٹا تھا اور سخت تھکا ہارا تھا۔ سردار کے حکم پر وادی کو باقی علاقے سے جدا کرنے والے تیز کوہی نالے پر ایک اور پل تعمیر کیا جا رہا تھا۔ رابل کے سیکڑوں لشکری اس کام میں دن رات ـــ تھے۔ وہ خود بھی ایک عام لشکری کی طرح اس پل کی تعمیر میں حصہ لے رہا تھا۔

سردار رابل نے آواز دی تو اس کی خوبرو بیویوں میں سے ایک صحت مند بیوی دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے سردار رابل کو کسی ننھے بچے کی طرح اٹھا کر ایک بلند چوکی پر بٹھا دیا۔ سردار کے پاؤں اب لٹکنے لگے تھے۔ بیوی نے اس کے جوتے اتارے، موزے جدا کیے پھر وہ چوکی پر بیٹھے بٹھائے گرم پانی سے اس کا منہ ہاتھ دھلانے لگی۔ یہ بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بچے کے ناز اٹھا رہی ہے۔ اسی دوران میں کوتاہ قد سردار کی دوسری بیوی دُھلے ہوئے کپڑے لے آئی۔ سردار نے میلے کپڑے اتار کر دُھلے ہوئے پہنے۔ جب وہ زیریں لباس تبدیل کر رہا تھا، دونوں اطاعت مند خواتین نے ایک چادر کو دونوں طرف سے اس طرح پکڑا کہ سردار کے لیے پردہ بن گیا۔ اسی دوران میں سردار نے دو تین دفعہ ان نیک بیبیوں کو ڈانٹا ڈپٹا بھی۔ تھوڑی دیر بعد عورتیں باہر چلی گئیں اور سردار ہمارے درمیان تنہا رہ گیا۔ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "تم لوگ خوش بخت ہو کہ مقدس سنہری روشنی تمہیں دوسری مرتبہ ملاقات کا اعزاز بخش رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" ہماری طرف سے زریں نے پوچھا۔

سردار بولا "مقدس سنہری روشنی کا دیدار عام طور سے ان لوگوں کو کرایا جاتا ہے جو اس علاقے میں پہنچتے ہیں۔ ان کی واپسی کے وقت اس قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی جاتی۔ آپ لوگوں پر مقدس روشنی کی خاص عنایت ہے کہ آپ کی واپسی کے وقت بھی آپ کو دیدار کرایا جا رہا ہے۔ پرسوں صباح آپ لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ کل سہ پہر آپ لوگوں کی مقدس روشنی سے الوداعی ملاقات ہے۔"

"الوداعی ملاقات؟"

"ہاں۔ اس ملاقات میں صرف آپ اور آپ جائیں گے۔" رابل نے میری اور زریں گل کی طرف اشارہ کیا۔

○☆○

میں اور زریں گل ایک بار پھر اسی بلند و بالا پتھریلی دیوار کے سامنے تھے جو دیکھنے میں کسی فصیل کی طرح نظر آتی تھی۔ ایک روشن دن کی روشن سہ پہر تھی۔ آسمان گہرا نیلا تھا اور معلوم فاصلے پر ناگا پربت کی "سمیلی چوٹیاں" دھوپ میں ـ رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ سردار رابل بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ بوڑھا کاہن نما شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہر وقت انسانی ران کی طویل ہڈی رہتی تھی اور ہونٹ بدبدانے کے انداز میں ہلتے رہتے تھے۔ ہم ان دونوں حضرات کے ساتھ آج صبح ہی وادی راخان سے رابلی قبیلے کی بستی میں پہنچے تھے اور سردار رابل کے مکان میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد "مقدس دیوار" کی طرف چلے آئے تھے۔ ہم نے حسب سابق بسنتی رنگ کے لمبے چغے پہن رکھے تھے۔ ہمارے پاس خاص چمڑے کے صاف ستھرے جوتے تھے، ہمارے لباس پر وہی صندلی خوشبو لگائی گئی تھی جو حواس پر حیران کن اثر کرتی تھی۔ چار پانچ افراد نفیریاں اور تاشے بجاتے ہوئے ہمارے ساتھ چل رہے تھے۔ ہم دیوار کے بالکل قریب پہنچے تو ایک بار پھر یہی احساس ہوا کہ کچھ نادیدہ آنکھیں ہمیں گھور رہی ہیں۔ کہاں سے دیکھ رہی ہیں؟ اس سوال کا کوئی جواب سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم دوسری بار اس دیوار کے پار جا رہے تھے اس کے باوجود تجسس اور سنسنی خیزی کا عالم تھا جو پہلی بار تھا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب متاثر ہو رہے تھے۔ جونہی ہم دیوار کے عین سامنے پہنچے حسب سابق گڑگڑاہٹ کی آواز سے پتھر کی ایک چوکور سل اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور اندر داخل ہونے کے لیے خلا پیدا ہو گیا۔ خلا کے پیدا ہوتے ہی ہمارے ساتھ آنے والا مختصر گروہ واپس روانہ ہو گیا اور ہم اندر چلے گئے۔ پچھلی مرتبہ ہم یہاں آئے تھے تو مطلع سخت ابر آلود تھا اور ہر طرف بادلوں کے مرغولے چکرا رہے تھے لیکن اس مرتبہ قرب و جوار کا منظر واضح تھا۔ واقعی یہ ایک جنت نظیر جگہ تھی۔ حدِ نگاہ تک سبزہ، پھول اور چشمے نظر آ رہے تھے۔ وہ خوب صورت آبشار ہمارے بالکل سامنے تھا..... جس کا سفید پانی چمکتے پتھروں میں اٹکھیلیاں کرتا نشیب میں کہیں اوجھل ہو جاتا تھا۔

کھوہ نما خلا کے قریب ہمیں منڈے ہوئے سر والا وہی سفید پوش دکھائی دیا جس نے پچھلی مرتبہ بھی ہماری رہنمائی کی تھی۔ میں اور زریں گل اس شخص کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کھوہ کے آسیبی ماحول میں داخل ہو گئے۔ ایک عجیب نشاط کی سی کیفیت حواس پر چھا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ ایسا اس مخصوص خوشبو کی وجہ سے ہو جو ہمارے لباسوں پر تھی اور ان در و دیوار سے بھی پھوٹ رہی تھی۔ اس دفعہ بھی ہم نے کھوہ میں سفید پوش مرد و زن اور بچوں کو دیکھا۔ وہ سب بہت خوش باش اور اپنے حال میں مگن دکھائی دیتے تھے۔ کچھ ٹہل رہے تھے، کچھ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، کچھ اپنے حسین و جمیل بچوں کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مصروف تھے۔ ایک جگہ ہم نے کچھ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو رنگوں سے تصویر کشی کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ کینوس کی جگہ وہ کھوہ کی دیواریں استعمال کر رہے تھے۔ وہیں پر ایک دو سنگ تراش بھی مصروفِ کار تھے اور پتھروں کے ٹکڑوں کو شکل و شباہت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر ہم اس کشادہ جگہ پہنچے جہاں آوازیں دیر تک گونجتی تھیں۔ پانچ دس منٹ ہمیں وہاں بیٹھنا پڑا۔ اس قیام کے دوران میں ہمیں خوشبودار مقوی مشروب پلایا گیا۔ تب ملکوتی حسن والی وہ سفید پوش دوشیزہ نمودار ہوئی جس کا جسم چلتے ہوئے جھیل کے کنول کی طرح ڈولتا تھا۔ اس نے مجھے اور زریں گل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں کسی معمول کی طرح اپنی جگہ سے اٹھے اور دوشیزہ کے عقب میں چلتے ایک بیضوی کمرے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک بہت بھاری اور وسیع و عریض پردہ نظر آ رہا تھا۔ لڑکی ہمیں اس مخملی پردے کے مقابل کھڑا کر کے واپس چلی گئی۔ وہاں بے پناہ خاموشی تھی۔ میں زریں گل کو ساتھ لے کر پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا.. جہاں بہت بڑا فانوس روشن تھا اور عین وسط میں ایک زرنگار مسند نظر آ رہی تھی۔ اس مسہری نما مسند کو باریک ریشمی کپڑے کے غلاف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ جھولتا ہوا غلاف کمرے کی چھت سے منسلک تھا۔ ایک ہیبت ناک سناٹے نے گرد و پیش کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شاید سوئی بھی گرتی تو آواز پیدا ہوتی۔ اب

ہم شانہ بشانہ کھڑے تھے اور اس پُراسرار ریشمی جھونپڑی کو دیکھ رہے تھے جس کے اندر کوئی ہیولا ساکت بیٹھا تھا۔ اس کی جگر پاش نگاہیں ہمیں اپنے وجود سے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ خبر نہیں کتنی دیر ایک شدید بے چینی کے عالم میں گزر گئی۔ یقیناً یہ عرصہ ایک دو منٹ پر محیط ہوگا لیکن ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ برس بیت گئے ہیں اور ہم اس مسند کے سامنے ساکت و جامد کھڑے ہیں پھر ریشمی جھونپڑی کے اندر سنہری روشنی نمودار ہوگئی اور ہم نے بے مثال وجاہت کے مالک اس پُراسرار شخص کو سورج کی طرح اپنے سامنے طلوع ہوتے دیکھا۔ وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا' میں اچھی طرح جانتا تھا پھر بھی ذہن آسیبی دھندلکوں میں بھٹک رہا تھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔

"خوش آمدید۔" خوبرو شخص کی آواز آئی۔ یہ آواز ہشت پہلو کمرے میں دیر تک گونجتی رہی۔

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "تم نے اپنا نام شاہ جہاں بتایا تھا نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت کم لوگوں کو دوبارہ بلایا جاتا ہے۔" خوبرو شخص نے کہا "تمہیں بلانے کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھے دوسرے مہمانوں سے مختلف محسوس ہوئے ہو۔ پھر تم نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا' وہ بھی ایسا نہیں کہ آسانی سے فراموش کر دیا جائے۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

"میں راوی راخان میں پیش آنے والے اس واقعے کا ذکر کر رہا ہوں جس میں تم نے خود پسند جاتریوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا' اس بارے میں ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ جناب۔۔۔ کہ وہ سب کچھ آپوں آپ ہی ہو گیا تھا۔ اس میں میری کسی دلیرانہ منصوبہ بندی کو ہرگز دخل نہیں تھا۔"

"بہرحال ان الگ تھلگ پہاڑوں کی بلندیوں پر وہ ایک یادگار واقعہ تھا۔" چند لمحے ہشت پہلو کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ تب خوبرو شخص نے کہا "تمہیں یاد ہے' پچھلی ملاقات میں تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ کیا تم مجھے براہِ راست دیکھ سکتے ہو؟ تمہارا یہ سوال مجھے اچھا لگا تھا۔ اس سوال سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تم ایسی بات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو جو عام لوگ بغیر سمجھے محض [illegible] لیے مان لیتے ہیں کہ وہ میری زبان سے نکلتی ہے۔"

"آپ نے میرے بارے میں جو گمان کیا ہے' [illegible] کے لیے شکرگزار ہوں۔"

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی میں [illegible] ہماری سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ خوبرو شخص [illegible] سوال کیا "تمہارے نزدیک زندگی کی حقیقت کیا ہے؟"

میں نے کہا "زندگی خدا کا عطیہ ہے اور ہمارا [illegible] ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اسے خلقِ خدا کی بھلائی میں [illegible] کریں۔"

"میں مختلف بات کر رہا ہوں۔ میں پوچھ رہا [illegible] تمہارے نزدیک زندگی کن کیفیات سے مل کر بنتی ہے؟"

میں نے کہا "محترم! میں کوئی فلسفی تو نہیں [illegible] بہرحال جتنا مجھے معلوم ہے اس کے مطابق زندگی کی [illegible] کیفیات ہیں۔ خوشی اور غم۔"

"بالکل درست کہا تم نے۔ زندگی کی بنیادی کیفیا[ت] ہی ہیں یعنی راحت اور تکلیف ہے۔ باقی جتنی بھی کیفیات ہیں وہ ان دو کیفیتوں سے جنمی ہیں یا ان کے قریب قریب ہیں۔ کسی تیسری کیفیت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ [مثلاً] کوئی شخص بہت سکون محسوس کر رہا ہے تو یہ راحت کی شکل ہے۔ کوئی شخص کسی مکروہ چیز کو دیکھ کر کراہت محسوس کرتا ہے تو اس کراہت میں تکلیف کا عنصر شامل ہے۔ [اسی] طرح اگر کوئی شخص کسی ہنر کو بڑے شوق سے سیکھ رہا [ہے تو] اس "شوق" میں راحت پوشیدہ ہے۔ حیرانی' تجسس' [غم] غصہ' محبت' نفرت' دلچسپی' بیزاری غرض ہر کیفیت میں [یا راحت] ہوتی ہے یا تکلیف ہوتی ہے یا دونوں کا امتزاج ہوتا [ہے]۔ تمہیں میری بات سے اختلاف تو نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"ہمارا عقیدہ ہے کہ قدرت نے پوری کائنات [میں] مکافاتِ عمل جاری و ساری کر رکھا ہے۔ تم یہ کہہ سکتے [ہو کہ] قدرت کے ہاتھ میں ایک انتہائی حساس ترازو ہے جس [میں ہر] جاندار کو زندگی میں ہر راحت کے بدلے ایک تکلیف [اور ہر] تکلیف کے بدلے ایک راحت تول کر دی جاتی ہے۔ یہ [ترازو] اتنا حساس ہے کہ ایک ذرے کے برابر بھی کمی بیشی [نہیں] کرتا۔ اگر آج سے چالیس پچاس سال بعد یا ہزاروں سال بعد بھی کوئی ایسا پیمانہ ایجاد ہو گیا جو جاندار کی راحت اور تکلیف کو ٹھیک ٹھیک ناپ سکا تو اس پیمانے کو ایجاد کرنے والے یہ دیکھ کر ششدر رہ جائیں گے کہ جاندار کی

زندگی میں راحتوں اور تکلیفوں کی مجموعی مقدار سو فیصد۔۔۔ ہاں سو فیصد برابر ہوتی ہے۔"

"مکافاتِ عمل کو تو میں بھی مانتا ہوں۔"

"کیا تم یہ بات مانتے ہو کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کی سزا و جزا اسے زندگی ختم ہونے سے پہلے پہلے مل جاتی ہے؟"

"میرے عقیدے کے مطابق انسان کو اس کے عمل کی سزا و جزا ضرور ملتی ہے۔ اس دنیا میں ملتی ہے اور اگر نہ مل سکے تو آخرت میں ملے گی۔"

"یہاں ہمارے اور تمہارے درمیان اختلافات ہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق جاندار مخلوق کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ جو راحتیں وہ حاصل کرتا ہے' ان کے بدلے تکالیف مل جاتی ہیں اور جو تکالیف اسے ملتی ہیں' ان کا مداوا راحتوں سے ہو جاتا ہے اور یہ حساب کتاب' تصور میں آنے والے چھوٹے سے چھوٹے پیمانے تک برابر چلتا ہے۔ نہ ایک ذرے کے برابر راحت زیادہ ملتی ہے نہ تکلیف۔۔۔ اب ذرا سوچو۔۔۔ سوچو کہ جو شخص اس پیمانے پر پختہ یقین رکھتا ہو' زندگی اس کے لیے کتنی آسان ہو سکتی ہے۔ وہ ہر غم اس یقین کے ساتھ جھیل سکتا ہے کہ اس کے بدلے اسے خوشی مل کر رہے گی۔ وہ انتہائی مایوس کن صورتِ حال میں بھی تکلیف کو ہنس کر گلے سے لگائے گا اور دل میں ذرہ بھر ملال نہیں لائے گا۔ اسے یقین ہوگا کہ فطرت اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے مجبور ہے۔۔۔ "تکلیف" کے جھکے ہوئے پلڑے کو متوازن کرنے کے لیے فطرت کو "راحت" کے پلڑے میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ رکھنا ہی پڑے گا۔۔۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

خوبرو پردہ نشین کی باتیں میرے ذہن پر عجیب سا اثر کر رہی تھیں۔ بے شک اس کی باتیں میرے عقیدے سے متصادم تھیں لیکن ان میں ایک پہلو سچائی کا بھی جھلک رہا تھا۔ منطق کی ایک توانا لہر تھی جو الفاظ میں کہیں ڈوب جاتی تھی کہیں ابھر آتی تھی۔ وہ بولا "راحت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان تکلیف جھیلے۔ تکلیف ذہنی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی۔ اگر ایک شخص دفتر میں فائل دیکھ رہا ہے تو وہ ذہنی تکلیف برداشت کر رہا ہے۔ اگر ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا ہے تو وہ جسمانی تکلیف جھیل رہا ہے۔ اپنے تجربے کے مطابق ہم ذہنی تکلیف کو برا نہیں [سمجھتے] لیکن جسمانی تکلیف کو ذہنی تکلیف پر ترجیح دیتے ہیں۔ بہرحال ذہنی اور جسمانی تکلیف کی بات تو یونہی درمیان میں آ گئی ہے۔ جو اصل بات میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ہم لوگ مکمل یقین کے ساتھ پیہم تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت [رکھتے ہیں] کیونکہ ہم اس تکلیف کو راحت کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہماری جنت ہماری محنت مشقت میں ہے اور ہم نے اس جنت کو ڈھونڈ نکالا ہے۔"

خوبرو پردہ نشین کی باتیں فلسفیانہ تھیں لیکن اتنی پیچیدہ بھی نہیں تھیں کہ میری سمجھ میں نہ آتیں۔ میں نے کہا "محترم! آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے' میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ چند باتوں سے قطع نظر یہ سب کچھ ہمارے عقیدے کے خلاف نہیں ہے لیکن گستاخی معاف' یہاں میں نے کچھ ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں جو مجھے کسی لحاظ سے مناسب محسوس نہیں ہوئے۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہہ سکتے ہو۔" پردہ نشین کی آواز ہشت پہلو کمرے میں گونجی۔

میں نے کہا "محترم سانوس! میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ آپ کا دیدار کرنے کے بعد غیر معمولی ذہنی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ جنون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں خوبرو لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ وہ نیم دیوانگی کی حالت میں یہاں پہنچتی ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں لوٹتیں۔ میں نے۔۔۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔" پردہ نشین نے میری بات کاٹی "میں خود چاہتا ہوں کہ تمہیں اس بات کا جواب تفصیل سے دوں۔"

چند لمحے کے لیے ہشت پہلو کمرے میں خاموشی کا وقفہ آیا جس میں سانسوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی اور دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوتا تھا۔ آخر پردہ نشین کی نکھری ہوئی آواز بلند چھت کے نیچے گونجی "ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ بیشتر سماجی معیار اور بندھن کھوکھلے ہیں جو آباد دنیا میں لوگوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ اصل چیز سچی خوشی اور روحانی سکون ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہر شخص کو روحانی و جنسی آزادی حاصل ہے۔ تمام مرد و زن ایک اکائی کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ایسی اکائی جس کے غم اور خوشیاں مشترک ہیں۔ یہ منفرد طرز کی آزادی ہے مگر اس آزادی کا استعمال بڑے سلیقے اور شائستگی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کسی پر کسی کا جبر نہیں۔ سب فیصلے باہمی رضامندی سے ہوتے ہیں اور اپنا ساتھی چننے کے سلسلے میں عورت کی رائے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ عورت جس کے ساتھ جب تک رہنا چاہے' رہتی ہے اور اگر ہمیشہ رہنا چاہے اور مرد بھی اسے ہمیشہ رکھنا چاہے تو کسی کو اعتراض نہیں

ہونا۔ بے شک مرد کو عورت پر ذہنی برتری حاصل ہے لیکن ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ مرد و زن کے باہمی معاملات میں عورت کے فیصلے ہمیشہ بہترین ہوتے ہیں۔"

وہ نشین کی باتیں میری حیرت میں اضافہ کرتی چلی جارہی تھیں۔ میں نے کہا "کیا آپ مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ یہاں مرد و زن بغیر کسی ازدواجی بندھن کے زندگی گزارتے ہیں؟"

"نہیں ۔۔۔ بہت سے ہیں جو ایسا نہیں کرتے بلکہ کچھ ایسے بھی ہیں جو سرے سے کسی کے ساتھ وابستہ ہی نہیں ہوتے۔ تم میرے ساتھ اختلاف کرسکتے ہو لیکن حقیقت یہی ہے دوست کہ باہر کی دنیا میں لوگوں نے اپنے اوپر جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں' ان میں سے بیشتر بے بنیاد اور غیر فطری ہیں۔ انسان کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ تبدیلی چاہتا ہے۔ جلد نہیں تو دیر سے لیکن چاہتا ضرور ہے۔ وہ نہ بھی چاہے تو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں تبدیلی کی یہ خواہش موجود ہوتی ہے۔ وہ مرد یا عورت کی حیثیت سے اپنے جذباتی تعلقات کو کسی نئی ذات سے منسوب کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بہت کم ۔۔۔ بہت کم لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔"

میں نے کہا "اور آپ تبدیلی کی خواہش کو ابھار کر اسے بے لگام کر دیتے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔ ایسی خواہشوں کو پابندیاں بے لگام کرتی ہیں۔ ہم تو ان خواہشات کو تکمیل کے مرحلے تک پہنچنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ خواہشات تکمیل تک نہ پہنچیں تو انسان کے ذہن میں گہری اتر جاتی ہیں اور ایسے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں کہ زندگیاں اجیرن کرکے دنیا کو بدصورت بنا دیتی ہیں۔"

میں نے کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ آپ انسان کو ایک عام جاندار کے درجے پر لے آئے ہیں۔"

"تمہارے نزدیک انسان کا درجہ کیا ہے؟"

"ہم سمجھتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور وہ اس لیے اشرف المخلوقات ہے کہ وہ اپنی جبلت کو دبا کر ایک مہذب معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔"

"مہذب معاشرہ فطرت کے بہاؤ میں پتھر رکھنے سے نہیں بنتا۔ مہذب معاشرے کے کچھ اور لوازمات ہیں لیکن یہ طویل بحث ہوگی اور میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "آپ ان بچوں کو کیا سمجھتے ہیں جو آپ کی COMMUNITY میں پیدا ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان بچوں کے ماں باپ کون ہوتے ہیں؟"

"یہ فطرت کے بچے ہیں۔" وہ بولا "اور فطرت کبھی ناجائز نہیں ہوتی۔ یہ بچے بھی ناجائز نہیں ہیں۔ یہ صرف بچے ہیں۔ جیسے پھول صرف پھول ہوتے ہیں۔ اس کے بیج کے بارے میں غور کرنا بے معنی ہے۔۔۔ یہاں پیدا ہونے والا بچہ پوری کمیونٹی کا بچہ ہوتا ہے۔ وہ کسی کا نہیں ہوتا لیکن سب کا ہوتا ہے۔"

"میں ۔۔۔ آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔"

وہ بولا "ہمارے ہاں بچے کی ملکیت کا تصور نہیں۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ کمیونٹی کے متعلقہ افراد کی تحویل میں ہوتا ہے۔ ماں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ اس نے کس بچے کو جنم دیا ہے۔ بچے کے ماں باپ اگر بچے کی خواہش رکھتے ہوں تو وہ کسی بھی ایسے بچے کو گود لے لیتے ہیں جو کمیونٹی کے متعلقہ افراد کے پاس موجود ہو۔"

میری الجھن کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "آپ اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن مجھے اس عقیدے سے اختلاف ہے۔"

"جزوی اختلاف یا مکمل اختلاف؟"

"فی الحال میں جزوی ہی کہوں گا۔"

"تم اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہو۔"

"اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اپنا طریقۂ حیات اس کمیونٹی تک ہی محدود کیوں رکھا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ داہلی قبیلہ آپ کی پرستش کرتا ہے لیکن وہاں یہ رسم و رواج موجود نہیں جو اس دیوار کے اندر اس کمیونٹی میں ہیں۔ گستاخی معاف' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہاں جنسی کج روی نظر نہیں آتی۔"

"کج روی!" وہ مسکرانے والے انداز میں بولا "میرا خیال ہے کہ تم نے نرم لفظ استعمال کیا ہے' ورنہ تم بے راہروی یا گمراہی کہنا چاہ رہے تھے۔ خیر مجھے خوشی ہے کہ تم اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر رہے ہو۔" ایک لمحہ توقف کرکے وہ بولا "جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے' میں کہنا چاہوں گا کہ کوئی بھی نظریہ یا عقیدہ کسی ذہن میں بزور نہیں ٹھونسا جاسکتا۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے۔ داہلی قبیلے کے لوگ بہت جلد اس عمل سے گزر جائیں گے پھر وہ بڑی خوش دلی اور خلوص کے ساتھ وہی خیالات اپنا لیں گے جو اس کمیونٹی کے لوگوں نے اپنا رکھے ہیں۔ جسمانی و ذہنی محنت تو لوگ اب بھی کر رہے ہیں پھر وہ ان تھک محنت کریں گے۔ وہ محنت جو دکھوں کو توڑتی ہے اور جسم سے راحتوں کا خراج وصول کرتی ہے کہ ہر عضو "الامان" پکار اٹھتا ہے۔ وہ حقیقی مسرتوں سے آشنا ہونے لگیں گے۔ ان کی ذات پر چڑھے ہوئے کہنہ رواجوں کے خول ٹوٹ جائیں گے اور یہ سب کچھ بہت جلد ہوگا۔"

میں نے کہا "میرا پہلا سوال ابھی تک اپنی جگہ موجود ہے محترم سانوس ۔۔۔ وہ دوشیزائیں جو سانی کہلاتی ہیں اور بنا سجا کر یہاں لائی جاتی ہیں' ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟"

"ان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے جو کسی کے لیے بھی قابل صد رشک ہے۔ انہیں ایک اہم اعزاز ملتا ہے اور اس اعزاز کے بعد وہ اس کمیونٹی کی ممبر بن جاتی ہیں۔"

"کیا آپ اس اعزاز کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟"

"وہ سچی محبت اور روحانی خوشی کا اعزاز ہے اور اس کا تعلق میری ذات سے ہے۔" پردہ نشین نے جواب دیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بات گول کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا "کیا ہماری جو ساتھی یہاں لائی گئی ہے وہ بھی اس کمیونٹی کی ممبر بن چکی ہے؟"

"ہاں۔" مختصر جواب ملا۔

"کیا ہم ایک بار اس سے ملاقات کرسکتے ہیں؟"

"اب یہ ممکن نہیں۔"

"وہ ٹھیک تو ہے؟"

"اتنی خوش ہے کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"یہ حقیقی خوشی ہے یا تصوراتی؟"

"کیا مطلب؟"

"ایک بار پھر جسارت کرنا چاہ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ ۔۔۔ اپنی برتر ذہنی طاقت کی مدد سے منتخب لوگوں کو خاص قسم کی ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کوئی ایسی کیفیت جو ہپناٹزم سے ملتی جلتی ہے۔"

جنوبی کمرے کی گونجتی ہوئی فضا میں کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ چند لمحے مکمل خاموشی طاری رہی پھر پردہ نشین کی ٹھہری ہوئی آواز آئی "میں تمہاری بات پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس معاملے میں اپنے ذہن کو زیادہ تکلیف مت دو۔۔۔۔ وہ لڑکی تمام دوسرے لوگوں کی طرح آسودہ اور خوش ہے۔ تم دنیا جہاں کی ترغیبات بھی اس کے سامنے لے آؤ تو وہ اس ماحول سے جدا ہونا پسند نہیں کرے گی۔ اگر تم اس کے خیالات جاننا چاہتے ہو تو تمہیں تین چار ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔ سال کے ایک خاص موقع پر یہاں موجود لوگ اپنے پیغامات اپنے عزیز و اقارب تک پہنچا سکتے ہیں۔"

جس دوران میں' میں پردہ نشین سانوس کے ساتھ یہ پیچیدہ گفتگو کر رہا تھا' میرا ذہن ایک اور ڈگر پر بھی سوچ رہا تھا۔ یہ وہی سوچ تھی جو کئی روز سے میرے اندر پنپ رہی تھی۔ میں نے سانوس سے کہا "آپ کی اجازت سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں اس درخواست کو آپ گستاخی قرار نہ دے دیں۔"

"نہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو' کہہ سکتے ہو۔"

"کیا ایسا ہوسکتا ہے محترم سانوس! کہ ہم ابھی کچھ دن مزید یہاں رہ لیں؟"

"کیوں؟"

"بس یونہی دل چاہ رہا ہے۔ آپ سے مل کر ذہن پر عجیب سا اثر ہوا تھا' اس دوسری ملاقات میں یہ اثر اور گہرا ہوا ہے۔ میں یہ بات سچے دل سے کہہ رہا ہوں۔ اس جگہ سے اس ماحول سے انس سا ہوگیا ہے۔ میں کچھ دن مزید سردار داہلی کے ساتھ داہلی قبیلے میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں اس طرزِ زندگی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو یہ لوگ آپ کی ہدایات پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں دوسرے لفظوں میں یہ کہوں گا کہ یہاں کے رہن سہن کا قریب سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

خوبرو سانوس خاموش رہا۔ اس کی نگاہ میری طرف اٹھی۔ اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں۔ وہ تہلکہ خیز آنکھیں جو دل و دماغ کو لیزر شعاعوں کی طرح چیر کر گزر جاتی تھیں۔ میرے جسم کو جیسے ہزاروں وولٹ کا جھٹکا برداشت کرنا پڑا تھا۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخنوں تک دوڑ گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا ذہن ایک چٹیل میدان ہے اور اس میدان میں جو کچھ بھی رکھا ہے وہ ان نگاہوں کی زد میں ہے۔ کچھ بھی نہاں نہیں رہا' کچھ بھی چھپایا نہیں جاسکا۔ اگلے ہی لمحے ان نگاہوں کا زاویہ بدل گیا۔ چند سیکنڈ بعد پردہ نشین کی طلسمی آواز گونجی "تمہیں اپنے ارادے کا علم تو ہوگا لیکن اپنے ساتھیوں کے ارادے کے متعلق تم کیسے جان سکتے ہو۔ کیا وہ بھی یہاں رہنے کے خواہش مند ہیں؟"

"میرے ساتھی صرف تین ہیں جناب! ایک کا نام صفدر' دوسرے کا نام جون جاول اور تیسرے کا نام زریں گل ہے۔ یہ زریں گل میرے ساتھ ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔"

"اور وہ باقی لوگ؟"

میں پردہ نشین کا اشارہ سمجھ گیا۔ یقیناً وہ ان سری لنکن

اور پاکستانیوں کی بات کر رہا تھا جن کا تعلق فلمی یونٹ سے تھا۔ اس کے علاوہ پردہ نشین کا اشارہ ان لوگوں کی طرف بھی تھا جو مرحوم وزیر منصور خان کے ساتھ اس علاقے میں پہنچے تھے اور گرفتار بلا ہوئے تھے۔ میں نے کہا "وہ میرے ساتھی نہیں ہیں جناب۔۔۔ اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو ان کی اپنی رائے ہے۔"

ایک بار پھر وہی خاموشی لہریں لینے لگی جو میرے اعصاب کو شل کر دیتی تھی' مجھے لگتا تھا کہ میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ پردہ نشین سانوس غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن میری آنکھوں کی سمت نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی مہیب آواز بیضوی کمرے میں گونجی "میرے فیصلے کے بارے میں تمہیں کل صبح سردار رابل آگاہ کر دے گا۔۔۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا "بہت معذرت چاہتا ہوں لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا جس کی آپ نے تعریف فرمائی ہے۔"

پردہ نشین کی آواز ذرا توقف سے آئی "تم نے کہا تھا کہ تم مجھے براہ راست دیکھنا چاہتے ہو لیکن ایسا ممکن نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے۔۔۔ اگر تم مجھے براہ راست دیکھو گے تو پھر تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے جو باہر کی دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔"

ریشمی غلاف کے اندر اچانک ہی سنہری روشنی مدھم ہونا شروع ہو گئی۔ بالکل جیسے چاند ہولے سے سرک کر گہرے بادلوں کے عقب میں اوجھل ہو جائے' خوبرو پردہ نشین دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ اب بیضوی کمرے میں صرف فانوس کی روشنی تھی۔

اس مدھم روشنی میں بس اتنا ہی نظر آ رہا تھا کہ ریشمی غلاف کے اندر ایک ہیولا ساکت بیٹھا ہے' کبھی وہ وہم دکھائی دیتا تھا اور کبھی حقیقت۔۔۔

میری سماعت میں ابھی تک پردہ نشین کی آواز کی بازگشت تھی "تو پھر تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے جو باہر کی دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔" اس کا مطلب تھا کہ جو لوگ مقناطیسی کیفیت کا شکار ہوتے ہیں وہ پردہ نشین کو براہ راست دیکھتے تھے۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو یوں لگا جیسے بے وزنی کی کیفیت طاری ہے اور میں خلا میں ہوں۔ بیضوی کمرے کے داخلی راستے پر خوبرو دوشیزہ میری رہنمائی کے لیے موجود تھی۔

O☆O

سردار رابل کے ساتھ ہم دوبارہ واری راخان میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے صفدر کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید صفدر کو میرا وہ فیصلہ پسند نہ آئے جو میں نے سانوس کے روبرو بالکل اچانک کر لیا ہے۔ میری مراد وادی سے واپس نہ جانے کے فیصلے سے ہے لیکن صفدر نے میری ساری بات بڑے تحمل سے سنی اور مجھے تہ دل سے یقین دلایا کہ وہ میرے فیصلے سے متفق ہے۔

صفدر کو اس وادی موت میں محصور ہوئے اب چھ مہینے سے زائد ہو چکے تھے۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ دن رات اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب وہ یہاں سے روانہ ہو اور گلگت کی طرف سفر شروع کرے لیکن یہ اس کا ظرف تھا کہ میری بات سن کر اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی اور اس نے پلک جھپکنے میں میرے ارادے کو اپنا ارادہ بنا لیا۔ ایک ہم مزاج و غمگسار دوست کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔ میں نے یہ کام بھی صفدر کے ذمے ہی لگایا کہ وہ جون چاؤل کو ہمارے نئے پروگرام سے آگاہ کرے۔ صفدر نے یہ کام بڑے احسن طریقے سے انجام دیا۔ اس نے جون چاؤل کو بتایا کہ سروج ہماری دیرینہ ساتھی ہے۔ اب وہ غیر معمولی حالات کا شکار ہے۔ ہمارے لیے یہ بات کسی طور بھی مناسب نہیں ہے کہ سروج کو اس مصیبت میں چھوڑ کر واپس چلے جائیں۔ ہمیں اس کی رہائی کی ایک بھرپور کوشش کرنا ہو گی۔

جون چاؤل ایک جفاکش کوہ پیما ہی نہیں ایک باہمت ساتھی بھی تھا۔ بے شک صفدر کی طرح وہ بھی طویل عرصے سے اس وادی میں صعوبتیں برداشت کر رہا تھا اور اب جلد از جلد اپنے لوگوں میں واپس پہنچنا چاہتا تھا لیکن جو بات صفدر نے کہی تھی اس کا وزن بھی وہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمارے چند دن مزید رک جانے سے مصیبت زدہ لڑکی کو رہائی مل سکتی ہے تو رکنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صفدر نے جون چاؤل سے چند دن کی بات کی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں خود بھی علم نہیں تھا کہ ہمیں یہاں کتنی دیر رکنا پڑے گا۔ ممکن تھا کہ آٹھ دس روز میں ہی بہتری کی کوئی صورت نکل آتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ زیادہ وقت لگ جاتا۔ ہم جون چاؤل کو اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اس دفینے کا واحد سراغ تھا جس کے لیے پورے انڈیا میں بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور جس کے لیے مہم جو افراد کے گروہ شہروں اور ویرانوں کی خاک چھان رہے تھے۔ پچھلے کئی

مہینوں میں یہ تلاش زور و شور سے جاری رہی تھی اور اب بھی جاری تھی۔ یہاں آنے سے پہلے جب میں لاہور میں تھا' تو ہر روز اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خبر سننے کو یا پڑھنے کو مل جاتی تھی۔ فرید کوٹ' حیدر آباد' بھوپال اور مدراس کے حوالے ان خبروں میں اکثر آتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی دو گروہ آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ کبھی کسی شخص کا اغوا ہو جاتا تھا۔ کبھی یہ افواہ اڑ جاتی تھی کہ فلاں جگہ سے دفینہ برآمد کر لیا گیا ہے اور انڈیا گورنمنٹ اسے تحویل میں لے چکی ہے۔ ایک مرتبہ تو انڈین گورنمنٹ کے ایک نہایت ذمے دار شخص کا بیان بھی شائع ہو گیا تھا کہ قیمتی نوادرات کا کھوج لگا لیا گیا ہے اور بہت جلد اس سلسلے میں مزید پیش رفت ہو گی لیکن یہ سب افواہیں تھیں۔ جس دن میں اور زریں گل شیخ عاصم کے ساتھ گلگت روانہ ہوئے تھے اسی دن اخبار میں ایک انڈین منسٹر کے حوالے سے یہ خبریں چھپی تھی کہ دفینے اور نوادرات کی باتیں زیب داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی دفینے کا وجود ہے اور نہ کوئی دفینہ پاکستان سے یہاں پہنچا ہے۔ یہ سب کچھ سینہ گزٹ اور افواہوں کے زمرے میں آتا ہے۔ حقیقت بس یہی ہے کہ پاکستان سے ایک ٹرک نے غلطی سے سرحد پار کی تھی اور انڈیا چلا آیا تھا۔ اس ٹرک میں کچھ اسلحہ وغیرہ تھا اور تخریب کار تھے جو تاحال مفرور ہیں۔

اگر باریک بینی سے دیکھا جاتا تو فی الحال اس گمشدہ دفینے کا کوئی ٹھوس اور اہم سراغ نظر نہیں آتا تھا۔ جون چاؤل ہی وہ واحد شخص تھا جو دفینے کی آخری "لوکیشن" کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتا تھا۔ ہم جون چاؤل تک پہنچ چکے تھے اور یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ اب ہم کسی قیمت پر بھی جون چاؤل کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اگلے روز علی الصباح سردار رابل ہماری قیام گاہ پر پہنچا۔ اس روز سردی معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ ہم سرنگ کے گرم ترین حصے میں تھے پھر بھی کمرے کا دروازہ کھلتا تھا تو خنکی کا احساس ہوتا تھا۔ میں اور صفدر اسی "پراسرار گفتگو" کے بارے میں بات کر رہے تھے جو کل آسیب زدہ بیضوی کمرے میں میرے اور سانوس کے درمیان ہوئی تھی۔ سردار رابل کی آمد پر ہم خاموش ہو گئے۔ سردار رابل نے مترجم دانیال کی وساطت سے ہمیں بتایا کہ ہم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مبارک باد اس بات کی کہ مقدس روشنی نے ہماری درخواست قبول کی ہے اور ہم ایک دو ماہ یا جتنی دیر چاہیں' یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقدس روشنی کی طرف سے اس امر پر خوشی کا اظہار بھی ہوا تھا کہ ہم رابلی قبیلے کے رہن سہن اور رسم و رواج میں دلچسپی لے رہے ہیں اور قریب سے ان لوگوں کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔

سردار رابل نے کہا "فلم کمپنی کے لوگوں کو کل صبح واپس روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ دیگر افراد بھی واپس جائیں گے جو منصور خاں نامی شخص کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ اگر آپ لوگوں نے اپنے عزیز و اقارب کو کوئی پیغام وغیرہ بھیجنا ہو تو جانے والوں کے ہاتھ بھیج سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "وہ لوگ کتنے دن میں گلگت پہنچ جائیں گے؟"

"اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" رابل نے جواب دیا "تم نے دیکھا ہی ہو گا' راستے بے حد دشوار ہیں۔ ویسے بھی آج کل گلیشئرز وغیرہ گرتے ہیں۔ جو راستہ ایک دن مناسب ہوتا ہے وہ دوسرے دن سخت نامناسب ہو جاتا ہے اور کئی بار تو مسدود ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بڑے بڑے شناور راستہ بھول جاتے ہیں۔ بہرحال امید ہے کہ چار پانچ روز تک ہم انہیں کسی ایسی جگہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں سے وہ کسی بستی یا قصبے میں اتر سکیں گے۔ بہرحال اس میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے۔ ایک تو گلیشئرز کی وجہ سے راستے مسدود ہیں' دوسرے وادی واخان کے بھگوڑے لشکری اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں اور کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے محتاط رہ کر سفر کرنا پڑے گا۔"

"سردار رابل! میں تم سے ایک غیر متعلق سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں کہو۔" سردار رابل نے اپنے مختصر کندھوں کو جنبش دی۔

"کیا اب آپ لوگ بیرونی دنیا سے رابطہ رکھیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ کسی بھی لحاظ سے جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ حق حلال کی روزی اپنی سخت محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ وادی واخان کے لوگوں کے برعکس آپ کو باہر سے آنے والے کسی بھی فرد سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سردار رابل مسکرایا "تمہارا یہ سوال قبل از وقت ہے۔ بہرحال اس معاملے میں جلد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔"

اس روز دوپہر تک میں اور صفدر وادی میں گھومتے رہے۔ صفدر اب یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے جاتزو (عبادت گاہ) کی عمارت دکھائی پھر اسی کوہی نالے کی طرف لے گیا جہاں چرنیوں والے پرانے پل

کے متوازی ایک اور پل تعمیر کیا جارہا تھا۔ سیکڑوں افراد مصروف کار تھے۔ پل دیکھنے کے بعد ہم اس اسٹیڈیم نما تماشا گاہ کی طرف نکل گئے جہاں بد نصیب قیدیوں کو سانڈوں کے حوالے کیا جاتا تھا۔ یہی خونی تماشا گاہ تھی جہاں میں نے شاہد خان اور نوشاب سمیت قریباً ایک درجن افراد کو اذیت ناک طریقے سے مرتے دیکھا تھا۔ سانڈوں کی پھنکاریں اور مرنے والوں کی چیخیں جیسے ابھی تک ان در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ سردار رابل کے حکم پر "موت کے تالاب" کو مسمار کیا جارہا تھا۔ پروگرام کے مطابق اب اس اذیت گاہ کو مقدس روشنی کے معبد میں تبدیل کیا جانا تھا۔

گھوم گھام کر کچھ تھکاوٹ سی ہوگئی تھی۔ ہم نے گھوڑے لے لیے اور انہیں دُلکی چال چلاتے درّے کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ابھی ہم درے سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور ہی تھے کہ آٹھ دس گھڑ سوار نظر آئے۔ وہ گھنے درختوں کی طرف جارہے تھے۔ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے وہ۔ ان میں مجھے مترجم دانیال بھی نظر آیا۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا۔ ہم نے ایڑ لگائی اور گھوڑے دوڑا کر گھڑ سواروں کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے مترجم دانیال سے پوچھا "کیا معاملہ ہے؟"

دانیال نے بتایا "بندی خانے سے ایک قیدی فرار ہوگیا ہے۔ اسی کی تلاش ہورہی ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ واقعہ تو آٹھ دس روز پہلے کا ہے لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے جنگل سے ایک لاش ملی ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ اس شخص کو قتل کیا گیا ہے اور قتل کرنے والی وہی مفرور قیدی ہے۔"

"کیا مطلب؟ وہ کوئی عورت ہے؟"

"ہاں' ایک لڑکی ہے۔ سردار سدرت کے قریبی ساتھیوں میں سے ہے۔ لڑائی کے دوران میں گرفتار ہوئی تھی۔ بڑے قید خانے میں رکھا گیا تھا۔ وہاں آٹھ دس روز پہلے اس نے رات کو اپنی کوٹھری کی چھت پھاڑی اور فرار ہوگئی۔ فرار ہونے والوں میں اسی کوٹھری کا ایک لڑکا بھی شامل تھا۔ وہ تو پہرے داروں سے مقابلے میں مارا گیا لیکن لڑکی بھاگ نکلی۔"

مترجم دانیال کی بات سن کر میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام آسکتا تھا اور وہ تھا ناشا کا۔ میری معلومات کے مطابق ناشا' ڈاکٹر جیری کے ساتھ ہی گرفتار ہوئی تھی۔

گھوڑا دوڑاتے ہوئے مترجم دانیال غور سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "کیا بات ہے' آپ سوچ میں ڈوب گئے ہیں؟"

میں نے کہا "میں حیران ہو رہا ہوں کہ آٹھ دس روز ہوگئے ہیں اور آپ ابھی تک ایک لڑکی کو نہیں پکڑ سکے۔"

وہ بولا "وہ بڑی آفت چیز ہے۔ میں نے بھی اسے قید خانے میں دیکھا تھا۔ پہرے داروں کو بلا جھجک گالیاں دیتی تھی اور گالیاں بھی ایسی کہ مقدس روشنی کی پناہ۔ مردوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتی ہے اور ایسا خطرناک لباس پہنتی ہے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ ایسے سرد موسم میں بھی بعض اوقات اس کے تن پر بہ مشکل ایک گز کپڑا ہوتا ہے۔"

صفدر نے کہا "ہاں' اس کا نام ناشا ہے۔ میں نے بھی اسے یہاں وادی میں کئی بار دیکھا ہے۔ وہ بہت تیز طرار ہے۔ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ جن دنوں میں یہاں لڑکوں کو لڑائی کی تربیت دے رہا تھا' وہ بھی میرے پاس آئی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ بھی تربیت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ بڑی مشکل سے اسے ٹالا گیا تھا۔"

دانیال نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ بھی جانتے ہیں اسے؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا "وہ ایسی آفت ہے جسے ایک بار دیکھ کر آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ میری معلومات کے مطابق وہ اس وادی کے سب سے بڑے جاتری خاران کی بیٹی ہے۔"

"وہی جاتری جو آپ کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا؟" دانیال نے تصدیق چاہی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

گفتگو کے دوران میں ہمارے گھوڑے درمیانی رفتار سے دوڑتے رہے تھے۔ ہم ڈھلوان میں واقع جنگل کے اندر قریباً دو میل تک گھس چکے تھے۔ ایک جگہ جھمگٹا نظر آیا۔ یہاں دس پندرہ گھوڑے بھی موجود تھے۔ چیڑ کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان ایک مسلح محافظ کی لاش پڑی تھی۔ مرنے والے کا تعلق رابلی قبیلے سے تھا۔ اس کی عمر تیس پینتیس کے درمیان تھی۔ اس کے پیٹ میں ساٹھ کی طرف تیز دھار آلے کے دو گہرے گھاؤ تھے۔ جسم کا سارا خون ان زخموں سے نچڑ کر پتھروں پر پھیل گیا تھا اور مضروب تڑپ تڑپ کر راہی عدم ہوگیا تھا۔ مقتول کے پیٹ میں لگنے والے گھاؤ بظاہر برچھے کے نظر آتے تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرنے سے قبل مقتول نے خاصی جدوجہد کی تھی۔ اس نے اپنا برچھا بھی نیام میں سے نکالا تھا لیکن ۔۔۔ غالباً وہ اسے استعمال نہیں کرسکا تھا۔ یہ برچھا قریب ہی گھاس میں پڑا ہوا مل گیا تھا۔ محافظ کی خود کار رائفل گولیوں سمیت غائب تھی اور یہی چیز زیادہ پریشان کن تھی۔

میں نے غور سے لاش کو دیکھا اور مجھے پتا چل گیا کہ اس قتل کے سلسلے میں ناشا ہی پر شک کیوں کیا جارہا ہے۔ مقتول کے چہرے پر ناخنوں سے آنے والی خراشوں کے واضح نشان موجود تھے۔ بالالفاظ دیگر اسے دیکھتے ہی کہا جاسکتا تھا کہ مرنے سے پہلے کسی عورت کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی ہوئی ہے۔

موقع پر موجود محافظ اور سردار باہم سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے پھر ایک بڑے سردار نے پانچ پانچ گھڑ سواروں پر مشتمل چار پارٹیاں بنائیں اور انہیں مختلف اطراف میں روانہ کردیا۔ ہر پارٹی میں دو دو رائفل بردار موجود تھے۔ میں اور صفدر رضا کارانہ طور پر مترجم دانیال والی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ویسے بھی اس قبیلے میں مجھے راہراج (چوتھائی سردار) کی حیثیت مل چکی تھی۔ اس حیثیت سے میں بلا روک ٹوک کہیں بھی آجاسکتا تھا اور کسی معاملے میں ضروری مداخلت بھی کرسکتا تھا۔۔۔ سورج چوٹیوں کے پیچھے اوجھل ہوچکا تھا۔ شام کے سائے بڑی تیزی سے گہرے ہورہے تھے۔ چیڑ' دیودار اور اخروٹ کے اس جنگل میں رات سے پہلے ہی رات کا سماں ہوگیا تھا۔ وادی میں اب روشنی کرنے پر پہلے جیسی پابندیاں برقرار نہیں رہی تھیں لہٰذا "رات" ابھی پہلے جیسی اندھی بہری نہیں تھی۔ سردار رابل کے لشکریوں نے مشعلیں جلالی تھیں۔ کچھ کے ہاتھ میں لالٹین تھیں۔ یہ لوگ تاریک جنگل میں چاروں طرف پھیل گئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ان درختوں میں بھوتوں کی آتشیں آنکھیں حرکت کررہی تھیں۔ یہ آنکھیں اس لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں جس کا نام ناشا تھا اور جو اپنی طرز کی انوکھی لڑکی تھی۔ جس کا خمیر بغاوت سے اٹھا تھا اور جو اپنے وجود میں ہر وقت مزاحمت کا طوفان چھپائے رہتی تھی۔ تین چار ماہ قبل اس وادی سے نکلنے میں ناشا نے ہماری بھرپور مدد کی تھی۔ اس کی عادتوں اور خصائل سے اختلاف کیا جاسکتا تھا لیکن میں اس کے احسانات کو ہرگز فراموش نہیں کرسکتا تھا۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار ہونے کی صورت میں ناشا کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ قاتل بن چکی تھی اور قتل کی سزا موت سے کم کیا ہوسکتی تھی۔ اس نے بہت جلد بازی سے کام لیا تھا' ورنہ میرا ارادہ تھا کہ سردار رابل وغیرہ سے اس کی سفارش کی جائے اور ڈاکٹر جیری کی طرح اس کے لیے بھی رعایتیں حاصل کی جائیں۔

رات دم بدم سرد ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے قدموں تلے خشک پتے چرمرا رہے تھے اور گاہے گاہے درختوں کی نوکیلی شاخیں جسم کے کھلے حصوں کا مزاج پوچھ لیتی تھیں۔ ان شاخوں کی زد سے بچنے کے لیے میں نے ایک محافظ سے لالٹین حاصل کرلی تھی۔ یہ روشنی کافی نہیں تھی پھر بھی نہ ہونے سے بہتر تھی۔ کچھ آگے جاکر جنگل بہت گھنا ہوگیا۔ ہمیں گھوڑوں سے اترنا پڑا۔ گھوڑے درختوں سے باندھ دیے گئے۔ لشکریوں کے ساتھ ساتھ ہم بھی پیدل گھومنے لگے۔ ایک دوسری پارٹی ہم سے قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تلاش کا کام کررہی تھی۔ یہ دونوں پارٹیاں گاہے گاہے ایک دوسرے کو آوازیں دیتی تھیں اور صورت حال سے آگاہ کرتی تھیں۔ تاریکی میں نا دیدہ دشمن کا خوف کسی درندے کے خوف سے کم نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ناشا کے پاس مقتول محافظ کی خود کار رائفل بھی ہے۔ خود کو خطرے میں دیکھ کر وہ کسی بھی وقت گولیوں کی بوچھار کرسکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اچانک کسی طرف سے اس کا ہیولا برآمد ہوتا اور کسی شخص کے پیٹ میں دو فٹ لمبا برچھا گھونپ دیتا۔ ہم آدھ پون گھنٹا درختوں میں چکراتے رہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آخر سردار کی بلند آواز جنگل میں گونجی۔ وہ ہماری پارٹی کو واپس چلنے کا حکم دے رہا تھا۔ اِدھر اُدھر بکھری روشنیاں ایک جگہ سمٹ آئیں اور واپس اس طرف روانہ ہوگئیں جہاں گھوڑے باندھے گئے تھے۔ جس وقت صفدر اپنا گھوڑا کھول رہا تھا' وہ بری طرح چونک گیا۔ میں نے دیکھا' وہ بڑی محویت سے گھوڑے کی لگام کو دیکھ رہا تھا۔ لگام ابھی تک ایک درخت کی موٹی شاخ سے بندھی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے بولا "شار جہاں صاحب! کیا یہاں گھوڑوں کے پاس کوئی موجود تھا؟"

"نہیں تو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "کوئی گڑبڑ ہوئی ہے یہاں۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے شک ہو رہا ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں کوئی یہاں آیا ہے۔ یہ دیکھیے' اس لگام کو میں نے دو مرتبہ گرہ دی تھی۔ یہ ایک گرہ کھلی ہوئی ہے۔"

میں نے دیکھا۔ صفدر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام شاخ سے باندھتے وقت صفدر نے دہری گرہ لگائی تھی۔ اب صرف ایک گرہ نظر آرہی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کسی نے گھوڑا کھولنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی وجہ سے یہ کام

ادھورا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ لگام کو خاص انداز میں گرہ لگائی گئی تھی۔ اس بات کا امکان بالکل نہیں تھا کہ جانور کی کھینچا تانی سے یہ گرہ از خود کھل گئی ہو۔ میں نے لالٹین کو ذرا بلند کیا اور ارد گرد کی زمین کو غور سے دیکھا۔ یہ زمین کچی نہیں پتھریلی تھی' گھاس پھونس بھی بہت تھا۔ ایسی جگہ پر نقشِ قدم یا کسی اور زمینی شہادت کا مل جانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کوئی یہاں موجود رہا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو ہم میں سے نہیں تھا۔

پارٹی کے باقی افراد گھوڑوں پر سوار ہو چکے تھے۔ ہم نے بھی اپنے گھوڑے سنبھالے اور ان کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے۔ بظاہر صفدر خاموش تھا لیکن یقینی بات تھی کہ میری طرح وہ بھی اسی معاملے کے بارے میں سوچ رہا ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہمیں پیش آیا تھا۔

جس وقت ہم تخت میں واپس پہنچے' رات کے تقریباً دس بج رہے تھے۔ وادی محوِ خواب تھی لیکن تخت میں زندگی کے آثار موجود تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے صفدر سے کہا "صفدر' میرا خیال ہے کہ ہمیں واپس وہاں جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ناشا وہاں کہیں آس پاس موجود ہو۔"

"میرا خیال بھی یہی ہے۔" صفدر نے کہا "لیکن کیا اس وقت پہریدار ہمیں واپس جانے دیں گے؟"

"ہماری حیثیت یہاں قیدی کی نہیں ہے۔ ہم جس وقت چاہیں جا سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ دونوں ایک ساتھ نکلیں گے تو انہیں شبہ ہو گا۔ پہلے تم جاؤ' بعد میں' میں آ جاتا ہوں۔"

"اور گھوڑے؟"

"ہم گھوڑوں کے بغیر ہی چلیں گے۔ شارٹ کٹ راستہ استعمال کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

گرم اور آرام دہ سرنگ میں آکر واپس یخ بستہ سردی میں جانا جان جوکھم کا کام تھا لیکن یہ کام ہمیں بہرصورت کرنا تھا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہم ایک بار پھر جنگل کی طرف روانہ ہو رہے تھے لیکن اس مرتبہ ہم پاپیادہ تھے۔

مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ بہرحال سردی سے بُرا حال ہو گیا۔ تیز ٹھنڈی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور درختوں کے ہیولے آسیبی انداز میں جھوم رہے تھے۔ سرنگ سے روانہ ہوتے وقت میں نے ایک ٹارچ حاصل کر لی تھی۔ ہتھیار کے طور پر ہمارے پاس ایک پسٹل موجود تھا۔ یہ پسٹل وادی میں ہونے والی آخری لڑائی کے دوران میں مجھے ایک رابلی محافظ کی لاش کے پاس سے ملا تھا اور ابھی تک میری تحویل میں تھا۔ اگر ہمارے قیاس کے مطابق ناشا واقعی کہیں آس پاس موجود تھی تو ہمیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ تاریکی میں وہ ہمیں پہچاننے سے قاصر تھی۔ ایسے میں ہو سکتا تھا کہ وہ ہم پر حملہ آور ہو جاتی۔

جب ہم ذرا گھنے جنگل میں داخل ہوئے تو "اچانک حملے" کا خطرہ شدید تر ہو گیا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ ہم گاہے گاہے ناشا کو پکارتے رہیں۔ اس طرح ہم اس کی اچانک یورش سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ بالفرض اگر یہاں ناشا کے علاوہ کوئی اور چھپا ہوا تھا تو بھی ہمارا "پکارنا" ہمارے لیے سودمند تھا۔ وہ شخص ہماری آواز سن کر ہم سے دور چلا جاتا اور یوں ہمارے ساتھ اس کی مڈھ بھیڑ ہونے کا امکان ختم ہو جاتا۔

ہم نے ناشا کو آوازیں دینا شروع کیں۔ جنگل میں ہماری آواز دور تک گونج رہی تھی۔ ہوا کی لہریں اس آواز کو شمال کی طرف فاصلے تک پھیلا رہی تھیں۔ "ناشا' کہاں ہو۔" میں نے پکار کر کہا۔ یہ میری پانچویں چھٹی آواز تھی۔

اچانک کچھ فاصلے پر درختوں میں تیز سرسراہٹ سنائی دی۔ جیسے کسی جنگلی جانور نے عجلت میں اپنی جگہ تبدیل کی ہو۔ پسٹل پہلے ہی میرے ہاتھ میں تھا۔ سو دستے پر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ ایک تناور درخت کی اوٹ لے کر ہم محتاط نظروں سے آواز کے رخ پر دیکھنے لگے۔ ٹارچ میں نے بجھا دی تھی۔

"ناشا۔" میں نے پکارا۔

"کون؟" اس دفعہ ایک نسوانی آواز ابھری اور میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ یہ ناشا کی آواز تھی۔ میں نے پکار کر کہا "ناشا! یہ میں ہوں' شار جہاں"

"تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" ناشا نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"صفدر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

صفدر نے از خود ناشا کو آواز دے کر میرے بیان کی تصدیق کر دی۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ناشا تذبذب میں ہے۔ سوچ رہی ہے کہ ہماری آمد کے پیچھے کوئی سازش نہ ہو۔ تاہم ناشا کی سوچ بچار کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ شاخوں کی سرسراہٹ سنائی دی پھر ایک ہیولا سا ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔

میں نے ٹارچ روشن کر دی۔ ٹارچ کی روشنی سیدھی ناشا پر پڑی۔ وہ کسی ویسٹرن اسٹائل انگلش فلم کا کردار نظر

آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر حسبِ معمول ایک اونی لبادہ تھا۔ یہ اونی لبادہ اوور کوٹ سے ملتا جلتا تھا۔ پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں خودکار رائفل تھی جس کی نال زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے قریب آتے ہوئے بولی "ٹارچ بجھا دو۔ ہو سکتا ہے ان کتے کے پلوں میں سے کوئی بھی ہمارے آس پاس موجود ہو۔"

میں نے ناشا کو ایک بار اچھی طرح دیکھ کر ٹارچ بجھا دی۔ وہ بولی "تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

میں نے کہا "ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔"

"چلو تو میرے پیچھے۔" اس نے حسبِ عادت اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی وہ رُخ پھیر کر روانہ ہو گئی۔ ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ تاریکی میں بھی یوں رواں دواں تھی جیسے دن کا وقت ہو۔ جنگلی بودوباش نے شاید اس میں بھی حیوانوں والی صفات پیدا کر دی تھیں۔ وہ اپنی جسمانی خوب صورتی سے اتنی بے پروا تھی جتنی کوئی "مادہ جانور" ہو سکتی ہے۔ جنگلی گھوڑی کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہ چیڑ اور اخروٹ کے گھنے درختوں کے اندر سے گزرتی چلی گئی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں اس مقام پر پہلے بھی آ چکا ہوں۔ یہ واقعہ ان دنوں کا تھا جب میں پہلی بار اس وادی موت میں وارد ہوا تھا اور یہاں قیام کیے مجھے چند دن ہی ہوئے تھے۔ وہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ...زاروں کی دسترس سے بچنے کے لیے ہم ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر سرپٹ بھاگ نکلے تھے۔ ناشا نے بڑی چابک دستی سے گھوڑا گاڑی کا رخ جنگل کی طرف موڑ دیا تھا۔ بعد ازاں گھوڑا گاڑی الٹ گئی تھی۔ میں اور وزیریں گل اسی جنگلی لڑکی ناشا کی رہنمائی میں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ٹھکانا ایک قدرتی پناہ گاہ کی شکل میں تھا۔ بلندی سے کوئی چٹان گری تھی اور اس کا ملبا بڑی بڑی سلوں کی صورت میں ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر میں ایک کشادہ غار سا بن گیا تھا۔ یہ محفوظ جگہ تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم اسی پناہ گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم منزلِ مقصود پر تھے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا آج سے کئی ماہ پہلے تھا۔ خاموشی' تاریکی اور گھنے جنگل کی ہیبت۔ ...ول کا ایک ناقابلِ شناخت حصہ بنی ہوئی تھی۔ ...راستہ گھاس پھونس سے ڈھکا ہوا تھا۔ ناشا نے جھک کر ایک پتھر کو سرکایا۔ فوراً روشنی کی شعاعیں نمودار ہو گئیں۔ اس پناہ گاہ کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ہم جھک کر چلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر ویسا ہی تھا جیسا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ جگہ مکمل طور پر بند تھی۔ بناوٹ کچھ اس طرح کی تھی کہ اندر کی جانے والی روشنی باہر سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس خلا کو گرم رکھنے کے لیے آگ دہکائی گئی تھی۔ آگ کی روشنی میں' میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک شخص جو مادر زاد برہنہ تھا' پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے پیٹ میں گھسیڑ رکھے تھے۔ اس شخص کے پاؤں اس طرح زنجیر سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ ایک فٹ سے بڑا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے سارے جسم پر وحشیانہ تشدد کے نشانات تھے۔ کہیں گرم لوہے سے داغا گیا تھا' کہیں چھڑی وغیرہ سے پیٹا گیا تھا' کہیں تیز دھار آلے سے چرکا لگایا گیا تھا۔

ہماری آہٹ سن کر بھی اس کے جسم میں حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ سو رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" صفدر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مرد۔" ناشا نے مختصر جواب دیا۔

"کون مرد؟" میں نے پوچھا۔

"وہی مرد جو دماغ کے بجائے اپنے پٹھوں سے سوچتا ہے۔ جس کے لیے عورت ایک بھیڑ بکری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جسے اپنی طاقت اور حیثیت پر بے جا گھمنڈ کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔" وہ زہر خند لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے کہا "مردوں کے بارے میں تو تمہارے منہ سے ہمیشہ ایسے ہی پھول جھڑا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس "مرد" پر خاص عنایت کی وجہ کیا ہے؟"

وہ بولی "کوئی مرد خاص یا عام نہیں ہوتا' یہ سب کے سب ایک ہی مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے اندر حیوان چھپا رہتا ہے' کسی کا حیوان جلدی نظر آ جاتا ہے کسی کا دیر سے۔"

"کیا تمہیں کبھی کوئی مرد ایسا نہیں ملا جس کے اندر حیوان کے بجائے انسان ہو؟"

"نہیں ملا۔۔۔ مجھے تو باپ بھی ایسا ہی ملا جو اندر سے حیوان تھا۔ کیا کچھ نہیں کیا اس نے وادی کی عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اپنے بدکار باپ کے قتل پر میں تمہیں مبارک باد

پیش کرتی ہوں۔"

"تمہیں ہر مرد برا لگتا ہے۔" میں نے کہا "یہاں تک کہ اپنا باپ بھی برا لگتا تھا۔ اگر کوئی بھائی ہوتا تو وہ بھی برا لگتا' اگر کوئی بیٹا ہوگا تو شاید وہ بھی برا لگے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اپنے اندر بھی کوئی برائی موجود ہو؟"

وہ بولی "ہاں۔۔۔ میں بری ہوں۔۔۔ میں بہت بری ہوں۔ اگر میں اچھی ہوتی تو چپ چاپ ان مردوں کے ظلم برداشت کرتی۔ میرا جابر باپ کسی بڑے نیک پارسا نوجوان جابر سے میرا بیاہ کردیتا پھر میں اس کی ٹھوکریں کھاتی اور اپنی سوتنوں کو دیکھ دیکھ کر اپنا کلیجا جلاتی رہتی۔۔۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی نیکی اور پارسائی۔ ہی مجھے ان لعنتی رسموں سے کچھ لینا دینا ہے۔ میں ہوا کی طرح آزاد ہوں اور جب تک زندہ ہوں' ہوا کی طرح آزاد رہوں گی۔"

میں نے پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کے کوٹ نما اونی لبادے پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ ایک آستین پر تو کافی بڑے بڑے دھبے تھے۔ میرا دھیان اس لاش کی طرف چلا گیا جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے اخروٹ کے جنگل میں دیکھی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ قتل ناشا نے ہی کیا ہے اور ناشا کی آستین پر نظر آنے والے دھبے اسی مقتول محافظ کے خون کے ہیں۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو ورب چھا بھی مجھے نظر آگیا جو واردات میں استعمال ہوا تھا۔ بہرحال میں نے فوری طور پر اس واقعے کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرا دھیان ایک بار پھر اسی شخص کی طرف چلا گیا جو لباس سے بے نیاز کیچوے کی طرح سکڑ کر آگ کے قریب پڑا تھا۔ وہ سانولے رنگ کا تھا۔ سر اور چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے۔

میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناشا سے پوچھا "کیا یہ بھی کوئی محافظ ہے؟"

ناشا نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں محافظ ہے۔ ایسا محافظ جس کی ٹانگیں چیر کر آگ میں پھینک دینا چاہیے۔"

"کوئی زیادتی کی ہے اس نے تم سے؟"

"میں نے کہا ہے ناکہ یہ ایک مرد ہے اور مرد کو جب بھی موقع ملے ڈنک مارنے سے نہیں چوکتا۔"

صفدر نے کہا "لیکن یہ مقامی تو نظر نہیں آرہا؟"

وہ بولی "مقامی ہے یا غیر مقامی' جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔"

اس نے کھڑے کھڑے ایک زوردار ٹھوکر سوئے ہوئے شخص کی پیٹھ پر رسید کی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایک دم چیخنے لگا "خدا کے لیے نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔ مجھے معاف کردو' مجھ پر رحم کرو۔"

وہ بغیر کسی کو دیکھے اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا اور دہائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں یوں حرکت کررہے تھے جیسے وہ چھڑی وغیرہ کی ضرب سے بچنے کی سعی کررہا ہو۔ اس کا چہرہ روشنی کی طرف آیا تو اندازہ ہوا کہ اس کی ایک آنکھ مار پیٹ کی وجہ سے ضائع ہوچکی ہے اور چہرے پر بے تحاشا چوٹوں کے نشان ہیں۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور چونک سا گیا۔ یہ شکل تو مجھے جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ ذرا سا آگے بڑھ کر میں مضروب کی طرف جھکا اور مدھم شعلوں کی روشنی میں غور سے اسے دیکھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ شخص بدری تھا۔ وہی بدری جس کا قلمی نام نایکا مہتاب بیگم سے بہن بھائی کا رشتہ تھا۔ مہتاب بیگم کو مرحوم مسٹر منصور نے پیسے کا لالچ دیا تھا اور اس لالچی عورت نے منصور سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ "وادیٔ موت" تک ٹاسک فورس کی رہنمائی کرے گی۔ عورت ذات ہونے کی وجہ سے وہ خود تو اس مہم میں شرکت نہیں کرپا سکی تھی' اس نے اپنے سگے بھائی بدری کو یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ یہ "نیک کام" انجام دے۔۔۔ یہ بدری ہی تھا جس کی رہنمائی میں منصور خان اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ گلگت سے روانہ ہوا تھا۔ میں نے آخری بار بدری کو گلگت کے اس ہوٹل میں دیکھا تھا جہاں منصور کے گارڈز سے میری مار ماری ہوئی تھی۔ اب قریباً دو تین ماہ بعد میں اسے ٹھٹھرتی ہوئی بیگار گاہ میں بدری کو دیکھ رہا تھا اور اس حالت میں دیکھ رہا تھا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ایک حقیر کیچوے کی طرح سنگلاخ زمین پر پڑا تھا اور کانپ رہا تھا۔

تیز و طرار ناشا نے میرے تاثرات بھانپ لیے۔ چونکنے والے لہجے میں بولی "تم اسے جانتے ہو؟"

"تھوڑا تھوڑا۔" میں نے جواب دیا "یہ شخص اسی پارٹی میں شامل تھا جو منصور نامی ایک مہم جو وزیر کی قیادت میں رابلی قبیلے کی بستی میں پہنچی تھی۔"

"وزیر۔۔۔ یہ وزیر کیا ہوتا ہے؟" ناشا نے پوچھا۔

"جیسے تمہارے قبیلوں میں راہراج' بڑا سردار یا سردار اعلیٰ ہوتا ہے' اسی طرح ہمارے ہاں وزیر اور حکمران وغیرہ ہوتے ہیں۔ منصور نامی وہ وزیر درحقیقت تمہاری وادی پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کافی بڑی فورس تھی۔ ہیلی کاپٹر تھے اور بہت سارا اسلحہ تھا۔ اگر یہ لوگ تمہاری وادی تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے تو بڑا خونریز معرکہ ہوتا لیکن وہ وادی کا کھوج نہ لگا سکے اور قراقرم رینج میں کئی روز بھٹکنے کے بعد واپس چلے گئے۔ وزیر منصور خان اور اس کی نوجوان بیوی نائیلہ کسی طرح رابلی قبیلے کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے چند ساتھی بھی پکڑے گئے۔ یقیناً بدری بھی ان میں شامل تھا۔ بعد ازاں وزیر منصور خان کی خوبرو بیوی نائیلہ کو مقامی رواج کے مطابق "سالی" بنا کر دیوار کے پار بھیج دیا گیا۔ جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں' ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی طرح وزیر منصور خان اپنی بیوی کو رابلی قبیلے کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ لوگ یہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ منصور خان زخمی تھا۔ پتا نہیں وہ اس حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ اس کے زخم بہت سنگین تھے۔ آخر وہ ایک ویرانے میں سخت سردی اور زخموں کے سبب دم توڑ گیا۔ اس کی بیوی ادھر اُدھر بھٹکتی رہی۔ اسے کچھ مقامی لوگوں نے دیکھا اور وہ بے وارلوگوں تک پہنچا دیا۔"

ناشا گہری سوچ میں تھی۔ اسے میری باتوں نے سخت حیران کیا تھا۔ وہ کچھ دیر لرزتے کانپتے بدری کو گھورتی رہی پھر بولی "لیکن یہ بدبخت اگر سردار رانئل کا قیدی تھا تو پھر یہ یہاں کیسے بن گیا؟"

"یہ بات واقعی سوچنے کی ہے۔" میں نے کہا۔

صفدر بولا "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی غداری کے صلے میں اسے یہ رتبہ ملا ہو۔"

میں نے ناشا سے پوچھا "تم نے اس سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی؟"

وہ بولی "یہ کتے کا پلا مقامی زبان سمجھتا ہے اور نہ اسے انگریزی آتی ہے۔"

میں ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بدری کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی ضائع ہونے والی آنکھ کا زخم اب مندمل ہورہا تھا۔ اپنی اکلوتی آنکھ سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس آنکھ میں شناسائی موجود تھی۔ وہ مجھے پہچان چکا تھا اور کیوں نہ پہچانتا' میرے ساتھ اس نے کئی ہفتے گزارے تھے۔ جن لوگوں کو میں نے اس وادی سے نکالا تھا ان میں یہ شخص بھی شامل تھا۔ وہ احسان فراموش تھا شاید اسی لیے اس حالت کو پہنچا تھا۔

میں نے کہا "مجھے پہچانا بدری؟"

"ہاں۔" اس کے ہونٹوں سے ایک ناقابل شناخت بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ اس نے چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور سسکیوں میں رونے لگا۔ اسے اپنی عریانی کی بالکل پروا نہیں تھی' نہ ہی وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی اس پر۔"

میں نے ناشا سے درخواست کی کہ وہ بدری کے پاؤں کی بندشیں کھول دے تاکہ اس سے مناسب ماحول میں بات چیت کی جاسکے۔

ناشا غرائی "نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ تم اس کے آنسوؤں پر مت جاؤ۔ یہ انسان کے روپ میں بھیڑیا ہے۔ ایسے بدفطرت مردوں سے نمٹنا میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے۔" میں نے کہا "لیکن اگر ہم اس سے اس کی سرگزشت سننا چاہتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ اس سے ذرا دوستانہ ماحول میں بات کی جائے۔"

اس نے انگلش کی ایک معروف گالی نکالی اور بولی "اس کی کیا مجال کہ تمہارے سوالوں کے جواب نہ دے۔ تمہارے ایک اشارے پر مشین کی طرح نہ بولنے لگے تو میرا نام نہیں۔"

پھر وہ بے حد طیش سے ایک کونے میں گئی۔ وہاں سے اس نے ایک زنجیر نکالی۔ جیسے بکرے کے گلے میں رسی ڈالی جاتی ہے اس طرح اس نے زنجیر کا ایک حلقہ بدری کے گلے میں ڈال دیا اور کھینچ کر اسے اوندھے منہ گرادیا پھر اس نے بدری کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا منہ اپنے پاؤں پر جھکا دیا۔ بدری سرتاپا کانپ رہا تھا۔ اس نے کتے کی طرح لمبی زبان باہر نکالی اور جلدی جلدی ناشا کے بوٹ چاٹنے لگا۔ ناشا نے اس کے بال بدستور مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ چند لمحوں بعد ناشا نے اس کے گلے کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور اسے سیدھا کھڑا کردیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال بدری کے ٹخنے پر رسید کی۔ اس نے جلدی سے ایک ٹانگ اوپر اٹھالی۔ اب وہ کسی بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ بالکل کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح وہ ناشا کی ہدایات پر عمل کررہا تھا۔

میں اور صفدر یہ منظر دیکھ کر دم بخود تھے۔ ناشا بولی "شاید تمہیں میرا یہ سلوک ظالمانہ لگے لیکن اس شخص کے کرتوتوں کے مقابلے میں یہ سلوک کچھ بھی نہیں۔ شاید میں کوئی عام لڑکی ہوتی تو جو کچھ اس کے ساتھ ہورہا ہے اس سے دس گنا سخت سلوک یہ میرے ساتھ کرتا۔"

میں نے پوچھا "آخر ہوا کیا تھا؟"

وہ بولی "کوئی ایسی نئی بات نہیں تھی۔ وہی حرام زدگی جو اس جیسے مردوں کی خصلت ہوتی ہے' اس میں بھی موجود ہے۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ لڑائی کے بعد میں بندی خانے میں تھی۔ وہاں یہ حرامی پہرے دار تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا

پہریدار لاماں بھی تھا۔ جس کوٹھری میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں چار پانچ عورتیں اور بھی تھیں لیکن میرے سوا وہ ساری ادھیڑ عمر اور بال بچے والی تھیں۔ اس حرامی نے مجھ پر بری نظر ڈالنا شروع کر دی۔ لاماں بھی اس کے ساتھ تھا۔ کوٹھری کی عورتوں اور بچوں کے سامنے یہ مجھ سے فحش مذاق کرتے تھے اور گالیاں دیتے تھے پھر یہ مجھے لالچ دینے لگے کہ اگر میں رات کے وقت ان کی خواہش پوری کر دوں تو میری رہائی کے لیے کوشش کریں گے۔ میں نے لاماں کے منہ پر تھپڑ مارا اور اس حرامی بدری کو بھی صلواتیں سنائیں۔ اس دن کے بعد سے یہ دونوں میرے پیچھے پڑ گئے۔ چوبیس گھنٹے میرا ناک میں دم کیے رہتے تھے، میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھی اور خوب گالیاں دیتی تھی۔ ایک رات ان دونوں بدبختوں نے کھانے میں کوئی نشہ آور دوا ملا دی۔ کوٹھری کی ساری عورتیں اور بچے بے ہوشی کی نیند سو گئے۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔ رات کسی وقت میں نے دیکھا کہ یہ دونوں بدبخت مجھ سے چمٹے ہوئے ہیں اور کتوں کی طرح جھنجھوڑ رہے ہیں۔ میں نے ان کی مزاحمت کرنا چاہی لیکن میرے دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں سکت تھی اور نہ کچھ بولا جا رہا تھا۔ درحقیقت میں گہری بے ہوشی میں تھی اور بیدار ہونے کی خواہش رکھنے کے باوجود بیدار نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن "جو کچھ" ہو رہا تھا اسے روکنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ یہ ایسی بے بسی تھی جسے میں بہت عرصے تک بھول نہیں سکوں گی۔ یہ دونوں کتے بار بار میرے بے سکت جسم سے کھینچا تانی کرتے رہے اور پھر میری عریانی کو ڈھانپ کر باہر چلے گئے۔

میں جانتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے' اپنے مجرموں کو بھی پہچانتی تھی لیکن ان کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ اپنے اندر کھولنے اور کڑھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی میں ۔۔۔ اب میرے ذہن میں یہ اندیشہ بھی سما گیا تھا کہ وہ اپنی شیطانیت پھر دہرائیں گے۔ میں رات کے کھانے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ بھوک کے سبب میری نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک رات میں نے ہمت کی اور لوہے کی ایک پتری کے ذریعے کوٹھری کی چھت ادھیڑنی شروع کر دی۔ مجھے اپنی توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ چھت کے تختے گل چکے تھے اور اوپر بھربھری مٹی تھی۔ دوسری رات پچھلے پہر میں چھت پھاڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ میں چاہتی تھی کہ کوٹھری میں موجود ساری عورتیں اور بچے یہاں سے میرے ساتھ نکل جائیں لیکن ان پر بزدلی غالب آ گئی۔ صرف پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے نے ہمت کی۔ میرے ساتھ کوٹھری سے باہر آیا۔ ہم دیواروں کے سائے میں چلتے آگے بڑھے۔ ہم اصطبل کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن ایک پہریدار کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ اس نے آواز دے کر ہمیں رکنے کے لیے کہا پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا برچھا خاص انداز میں ہم پر پھینکا۔ یہ برچھا لڑکے کی پشت میں لگا اور وہ تڑپ کر وہیں گر گیا۔ پہریدار بھاگتا ہوا لڑکے تک پہنچا۔ اس وقت تک میں جاں بہ لب لڑکے کی پشت سے برچھا کھینچ چکی تھی۔ جونہی پہریدار سامنے آیا' میں نے برچھا دستے تک اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس کے بعد میں اصطبل کی طرف بھاگی اور قریب کھڑی ہوئی ایک گھوڑا گاڑی میں چھپ گئی۔ اس حرامی بدری کو شک ہو گیا تھا۔ اس کے اعمال کی سزا اسے کھینچ کر گھوڑا گاڑی میں لے آئی۔ اس سے پہلے کہ یہ مجھ پر حملہ کرتا' میں نے حملہ کر دیا۔ اس کی آنکھ پر شدید چوٹ لگی اور یہ تڑپنے لگا۔ میں نے اس کے گلے پر گھٹنا رکھ کر اس کی سانسیں بند کر دیں' تھوڑی دیر بعد یہ بے ہوش ہو گیا۔ میں نے ایک بڑا کمبل اوڑھا اور گھوڑا گاڑی بھگا کر بندی خانے کی حدود سے باہر لے آئی۔ گھوڑا گاڑی کے اندر سے ہی مجھے دو زنجیریں بھی مل گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک تھیلا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس میں بھنی ہوئی مکئی اور گڑ وغیرہ تھا۔ شراب کی ایک لبالب بھری صراحی میرے قدموں میں پڑی تھی۔۔۔ دو گھنٹے بعد میں بندی خانے سے محفوظ فاصلے پر نکل گئی۔ بدری نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے گھوڑا گاڑی ایک جگہ روکی اور زنجیر سے بدری کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ دوسری زنجیر میں نے اپنی کمر سے لپیٹ لی۔ بدری کے منہ پر یخ بستہ شراب کے چھینٹے مار کر میں نے اس کے حواس بحال کیے اور پھر برچھے کے زور پر اسے گھوڑا گاڑی سے نیچے اتار لیا۔ خشک مکئی اور گڑ کا تھیلا میں نے بدری کے گلے میں لٹکا دیا تھا۔ اسی حالت میں میں نے اسے دوپہر تک چلایا اور اس جنگل میں لے آئی۔ اب یہ پچھلے دس دن سے یہاں ہے اور میری مہمان نوازی کا لطف اٹھا رہا ہے۔"

میں اور صفدر حیرت سے ناشا کی کتھا سن رہے تھے۔ بدری ابھی تک بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اپنا توازن درست رکھنے کے لیے اسے بار بار دیوار کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ ناشا کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ خوب صورت تو وہ پہلے بھی نہیں تھا' اب ایک آنکھ بیٹھ جانے کے بعد مکروہ چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور نقوش بے حد کرخت تھے۔

بہرحال اب ان کرخت نقوش کو ابتلا کے رنگوں نے قدرے ملائم کر رکھا تھا۔

پناہ گاہ میں ایک طرف تین چار پتھروں کی مدد سے ایک چھوٹا سا چولہا بنایا گیا تھا۔ اس چولھے پر ایک دیگچی نما برتن رکھا تھا اور نیچے آگ جل رہی تھی۔ دیگچی میں دھیمی آنچ پر کچھ پک رہا تھا اور ایک نامانوس سی بُو اٹھ رہی تھی۔ میں نے ناشا سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

وہ بولی "اس حرامی کے لیے دوا بنا رہی ہوں۔"

بدری بری طرح زخمی تھا۔ اس کے زخموں کو دوا کی ضرورت تھی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ناشا اس کی چوٹوں کے لیے کوئی مرہم وغیرہ تیار کر رہی ہے لیکن بعد ازاں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔

میں بدری کے قریب بیٹھ گیا۔ ناشا مجھ سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ میں کس طرح اس یخ بستہ جنگل تک اور پھر اس ناگلو تک کیسے پہنچا۔ میں نے اور صفدر نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ ہم نے اس پر انکشاف کیا کہ رات پہلے پہر ہی ہم متلاشی گھڑسواروں کے ساتھ یہاں پہنچے تھے اور جنگل میں اسے تلاش کرتے رہے ہیں۔ اس مرحلے میں' میں نے ناشا کو اس لاش کے متعلق بھی بتا دیا جو اخروٹ کی "دکھ" میں سہ پہر کے وقت ملی تھی۔

ناشا بولی "یہ میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے دیکھ رہے ہو نا یہ اسی بدبخت کے ہیں جو لاش کی شکل میں اخروٹ کے درختوں میں پڑا تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس حرامی بدری کا ساتھی لاماں۔ وہ کتے کی طرح میری بو لگاتا پھر رہا تھا۔ چار دن سے جنگل میں تھا۔ میں نے گھات لگا کر اس پر حملہ کیا اور پیٹ چیر کر رکھ دیا۔۔۔ یہ رائفل جو میرے ہاتھوں میں ہے اسی کی ہے۔"

"ہم جانتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "اسی لیے تو تمہیں آوازیں دیتے پھر رہے تھے کہ کہیں تم ہمیں بھی رائفل کا کرہ ہدف نہ کر دو۔"

وہ بولی "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم دوبارہ یہاں کیوں چلے آئے۔ میرا مطلب ہے کہ میری یہاں موجودگی کے بارے میں تمہیں شک کیوں ہوا؟"

میں نے کہا "اس کا سرا صفدر کے سر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"تم نے رابلی گھڑسواروں میں سے کسی کا گھوڑا کھولنے کی کوشش کی تھی؟"

ناشا کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ تاہم اس نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ میں نے کہا "حسنِ اتفاق سے وہ گھوڑا صفدر کا تھا۔ صفدر کو اندازہ ہوا کہ گھوڑے کو درخت سے کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ منطقی طور پر ہمارا دھیان تمہاری طرف گیا۔ ہمیں شک گزرا کہ تم کہیں آس پاس موجود ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ شک درست ثابت ہوا۔"

ناشا سے کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد میں بدری کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک ایسے بھیڑیے کی طرح میرے سامنے بیٹھا تھا جس کے سارے دانت نکال دیے گئے ہوں' پنجے کاٹ دیے گئے ہوں اور مار مار کر جس کی ہڈی پسلی نرم کر دی گئی ہو۔

میں نے کہا "بدری! تیری حالت اتنی قابلِ رحم ہے کہ مجھے تجھ پر غصہ بھی نہیں آ رہا۔ حالانکہ جو برے سے برا تم ہمارے ساتھ کر سکتے تھے' تم نے کیا ہے۔ تم یہ بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے ساتھی وادی میں یرغمال بنے ہوئے ہیں اور اگر وادی پر حملہ ہوا تو دیگر نقصان کے علاوہ ان کی جانیں بھی جائیں گی لیکن پیسے کے لالچ میں تم نے اور تمہاری بہن نے بدترین بے وفائی کی۔"

بدری کے منہ میں جیسے زبان ہی نہیں تھی۔ وہ بس سر جھکائے بیٹھا تھا اور پاؤں کے انگوٹھے سے پتھریلی زمین کو کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے گلے کی زنجیر کو جھٹکا دیا "میری طرف دیکھو بدری! کتنی رقم ملی تھی تمہیں مسٹر منصور خان سے؟ دو لاکھ۔۔۔ پانچ لاکھ۔۔۔ دس لاکھ ۔۔۔ اس کے علاوہ تمہیں یا تمہارے کسی ساتھی کو نوکری شوکری مل گئی ہو گی۔ کوئی لائسنس یا پلاٹ مل گیا ہو گا۔۔۔ کیا یہ چیزیں اس مالی اور جانی نقصان کو پورا کر سکتی ہیں جو صرف تمہاری وجہ سے یہاں ہوا ہے۔ منصور خان مرا ہے' اس کے دو جنوں ساتھی مرے ہیں۔ اس کی بیوی نیم پاگل ہوئی ہے اور ہم سب یہاں در بدر بھٹک رہے ہیں۔"

بدری کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور صرف اتنا بولا "خدا کے لیے مجھے اس عورت سے بچا لو۔ تم جو کہو گے میں کروں گا۔"

میں نے کہا "کیا تم ان لوگوں کو واپس لا سکتے ہو جو تمہاری وجہ سے زندگی ہار رہے ہیں؟"

وہ کراہا "میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ ایک بار تو خدا بھی بندے کو معاف کر دیتا ہے۔"

میں نے کہا "میں اس بارے میں تم سے کوئی وعدہ نہیں

کر سکتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ لڑکی مسلح ہے اور ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے لیکن اگر تم وہ سب کچھ تفصیل سے بتادو جو اب تک یہاں تمہارے ساتھ پیش آیا ہے تو میں تمہاری جان بچانے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔"

بدری نے اپنے سیاہی مائل خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں امید کی موہوم چمک نظر آنے لگی تھی۔

وہ ٹوٹے پھوٹے انداز میں اور رک رک کر بولنے لگا۔ بولتے ہوئے وہ گاہے گاہے سہم کر ناشا کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اس نے اگلے ڈیڑھ پون گھنٹے میں مجھے اور صندور کو جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے۔

"بدری بر حوم منصور خاں اور دیگر افراد کے ساتھ ہی رابلی قبیلے کے ہتھے چڑھا تھا۔ گرفتاری کے وقت ان افراد نے شدید مزاحمت کی تھی دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا اور اس فائرنگ میں رابلی قبیلے کے چار پانچ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ منصور خاں کے دو ساتھی بھی مارے گئے تھے۔ سردار رابل کے حکم پر گرفتار ہونے والوں کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا تھا۔ اسی دوران میں یہ واقعہ رونما ہوا کہ منصور خان کی بیوی نائیلہ کو مقدس دیوار کے پار پہنچا دیا گیا تھا۔ منصور خان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ منصور خان کے پاس ہیرے کی ایک نہایت بیش قیمت انگوٹھی موجود تھی۔ یہ انگوٹھی اس نے بندی خان کے ایک لالچی پہریدار کو رشوت میں دی تھی اور بندی خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اسی پہریدار نے منصور خان کو وہ خاص طریقہ بھی بتادیا تھا جس پر عمل کرکے منصور خان اپنی اہلیہ کو بچانے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا تھا۔ پہریدار نے منصور خان کو بتایا کہ جب مقدس روشنی کی دلہن دیوار کے پار اپنی سہاگ رات گزار لیتی ہے تو اسے پہلی اور آخری بار دیوار سے باہر لایا جاتا ہے تاکہ وہ گرم چشمے پر خاص طریقے سے روایتی غسل کر سکے۔ پہریدار نے یہ بھی بتایا کہ یہ غسل ایک چار دیواری میں کیا جاتا ہے اور وہاں دلہن کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے منصور خان کو بتایا کہ اگر وہ کسی طرح اس چار دیواری میں جا کر پتھروں میں چھپ جائے تو سائی کو وہاں سے نکالنے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتا ہے۔ قصہ مختصر منصور خان نے اس طریقہ کار پر عمل کیا۔ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہوا اور وہ حیرت ناک طور پر نائیلہ کو بستی سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔۔۔ لیکن یہاں وہ واقعہ ہوا جس نے ساری بازی پلٹ دی اور منصور خان کے ساتھ ساتھ نائیلہ کو بھی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس واقعے کا تعلق بدری سے تھا۔ (میرا اور صندور کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ سوادرا کے لشکریوں میں بدری کو "راکفل بردار" کا رتبہ کسی غدا کے صلے میں ملا ہے) بدری کو منصور خان کے سارے پروگرام کا علم تھا۔ اس نے فطری کمینگی کا ثبوت دیا اور سوادرا کو بتادیا کہ منصور خان بندی خانے سے فرار ہوچکا ہے اپنی اہلیہ کو بستی سے نکال لے جانے کے لیے گرم چشمے پر چکا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی سردار رابل کے گھڑ سوار گرم چشمے کی طرف لپک گئے۔ منصور خان اس وقت تک نائیلہ کو لے کر بستی کی حدود کراس کر چکا تھا۔ اور گرد کی پہاڑیوں میں ان کی تلاش شروع ہوئی۔ بستی سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک جھڑپ میں منصور خان زخمی بھی ہوا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح رابلی گھڑ سواروں کی زد سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔

بدری کو اپنی غداری کے صلے میں بندی خانے سے رہائی مل گئی تھی اور ایک خوبرو مقامی عورت کی رفاقت بھی مل گئی تھی۔ سیلانی مزاج کے رنگین طبع بدری نے سوادرا کے سامنے خواہش ظاہر کی کہ وہ اسی قبیلے کے فرد کی حیثیت سے یہاں رہنا چاہتا ہے اور واپس جانے کا خواہش مند ہے۔ اس کی درخواست ابھی زیرِ غور تھی کہ رابلی قبیلے اور اوی داخان کے لوگوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس کے بعد کے واقعات کا علم ہمیں ناشا کی زبانی ہو ہی چکا تھا۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ناشا خاموشی سے ایک طرف بیٹھی رہی تھی۔ وہ اردو، پشتو وغیرہ سے بالکل نابلد تھی۔ بے کار بیٹھی، گاہے گاہے اس ریچھی نما برتن کے نیچے آگ درست کر دیتی تھی جس میں تیز بو والی کوئی شے مسلسل پک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ "شے" تیار ہونے کے قریب ہے۔ کیونکہ ناشا اسے بار بار ایک لکڑی سے ہلا بھی رہی تھی۔

"یہ کوئی مرہم وغیرہ ہے؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں، مرہم ہی سمجھو۔" ناشا بولی "لیکن یہ جسم کے ظاہری زخموں کے لیے نہیں اندرونی بیماریوں کے لیے ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"یہ پلانے والی دوا ہے۔ ایک نہایت تیز اثر جڑی بوٹی سے تیار کی گئی ہے۔ یہ بندے کے سارے اندرونی فاسد مادے کاٹ دیتی ہے۔ جتنی بھی کدورتیں، خباثتیں اور غلاظتیں اور ٹیڑھا پن ہوتا ہے سب نکل جاتا ہے۔"

"یہ کس کے لیے ہے؟"

وہ زیرِ لب مسکرائی "تم دونوں بھی استعمال کر سکتے ہو اگر چاہو تو۔ ویسے یہ اسی یک چشم حرامی کے لیے ہے۔" اس نے بدری کی طرف اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ناشا نے ریچھی نما برتن چولھے سے اتارلیا جیسے دیہات میں عورتیں ڈوئی چلا کر ساگ کو ملائم کرتی ہیں، وہ بھی ریچھی میں لکڑی چلانے لگی۔ ریچھی میں ایک سیاہی مائل محلول تھا جس میں سے ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ ناشا نے یہ محلول لکڑی کے ایک پیالے میں ڈالا۔ جب وہ ذرا ٹھنڈا ہوگیا تو اشاروں سے بدری کو حکم دیا کہ وہ اسے پی لے۔

بدری کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آرہے تھے۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کا تذبذب دیکھ کر ناشا نے اس کے گلے کی زنجیر تھامی اور ایک جھٹکے سے اس کا سر پیالے پر جھکا دیا "پیو" وہ دہاڑی "ورنہ کتے کی طرح پینے پر مجبور کردوں گی۔"

بدری لرز کر رہ گیا۔ اس نے پیالہ اٹھایا۔ کچھ دیر ڈگمگاتا رہا پھر رک رک کر پی گیا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس نے ابھی جو چیز پی ہے وہ زہر ثابت ہوگی۔

ناشا ہمیں بتانے لگی کہ اس نے ڈاکٹر ہنری کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جڑی بوٹیوں کی شناخت اور استعمال کے ہنر میں شاید ہی کوئی شخص اس کا ثانی ہو۔ ناشا کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ جڑی بوٹیوں کے متعلق تھوڑا بہت جانتی ہے اور اس کا کریڈٹ ڈاکٹر ہنری کو جاتا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی بدری کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہونے شروع ہوگئے تھے۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا پھر یہ کیفیت اس کی برداشت سے باہر ہوگئی۔ کراہ کر بولا "م۔۔۔ میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔ م۔۔۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے بدری کا یہ پیغام ناشا تک پہنچانا چاہا لیکن وہ میرے بولنے سے پہلے ہی سمجھ گئی۔ اس نے بدری کے گلے کی زنجیر تھامی اور کسی پالتو جانور کی طرح اسے اپنے پیچھے چلاتی ہوئی باہر لے گئی۔ بدری کے پاؤں میں بیڑی تھی۔ وہ تیزی سے نہیں چل سکتا تھا۔ بے چینی کے عالم میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بڑا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

بدری اور ناشا کی واپسی قریباً نصف گھنٹے بعد ہوئی۔ بدری کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھیں سفید سفید تھیں اور چہرے کی کرختگی عجیب سی ملائمت میں ڈھلی ہوئی تھی۔۔۔ ناشا نے اس کا منہ پکڑا اور ہماری طرف گھماتے ہوئے بولی "دیکھو اس تھوبڑے کو۔ پہلے سے بہتر نظر آتا ہے یا نہیں۔"

واقعی بدری کے چہرے پر عجیب سی ملائمت اور منکینی نظر آرہی تھی۔ اس کے ہونٹ پہلے سے کم بھدے نظر آرہے تھے اور لگ رہا تھا کہ رنگت بھی پہلے سے کچھ صاف ہوگئی ہے۔ ناشا بولی "اگلے دو روز میں اسے ایسی دو خوراکیں مزید ملیں گی تو اس کا پیٹ بالکل شیشے کی طرح صاف ہوجائے گا۔ ساری جسمانی اور ذہنی بیماریاں اس کے اندر سے نکل بھاگیں گی۔"

صندور نے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خود بھی اپنے اندر سے نکل بھاگے۔ میرا مطلب ہے کہ اللہ کو پیارا ہو جائے۔"

"نہیں، میں اتنی آسانی سے اسے "پیارا" نہیں ہونے دوں گی۔ ابھی تو اپنے کیے کی کوئی سزا ہی نہیں ملی ہے اسے۔"

"کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا مطلب ہے۔ جو کچھ کر سکتے ہو تم مرد ہی کر سکتے ہو؟" وہ عجیب جنگلی پن سے بولی۔ اس کا پُرشباب جسم ہمیشہ کی طرح کسی کڑی کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔

بدری کے چہرے پر ایک بار پھر بے قراری نظر آنے لگی تھی۔ ناشا نے لکڑی کے پیالے میں اسے سادہ پانی پلایا پھر طاقتور رائفل کندھے سے لٹکائی اور بدری کے گلے کی زنجیر تھام کر اسے دوبارہ باہر لے گئی۔ سخت سردی میں برہنہ بدن چلتا ہوا وہ قابلِ رحم لگ رہا تھا۔

○☆○

رات کے آخری پہر آنکھ لگ گئی تھی۔ اگلے روز ہم دیر تک سوتے رہے۔ میری آنکھ کسی آہٹ سے کھلی تھی بلکہ شاید کھلی ہی نہیں تھی۔ میں نیم خوابی کی حالت میں تھا۔ پناہ گاہ میں جلتی ہوئی آگ بجھ چکی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے بالاؤں کے کھڑکھڑانے اور گھنٹیوں کے بجنے کی مدھم آواز سنی تھی۔ یہ آواز میں سیکڑوں بار سن چکا تھا۔ اس کا تعلق سائیں عالی سے تھا "تو کیا سائیں عالی یہاں کہیں آس پاس موجود ہے؟" یہ خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور میں یکدم بیدار ہوگیا۔ مجھے لگا جیسے پناہ گاہ کے داخلی راستے پر رکھا ہوا پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا ہے اور ایک ہیولا سا باہر نکل گیا ہے۔

"سائیں۔" میں نے پکار کر کہا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور رکوع

کے انداز میں جھک کر داخلی راستے کی طرف بڑھا۔ پناہ گاہ سے باہر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ درخت، گھاس، برف اور پتھر ہر شے دمک رہی تھی۔ وہ بے بس ہونے ہی والی تھی۔ پناہ گاہ سے نکل کر میں نے ایک بار پھر سائیں کو پکارا لیکن یہ پکار بھی بے سود رہی۔ مجھے لگا کہ گھنی جھاڑیوں میں کوئی چیز تیزی سے حرکت کر کے مجھ سے دور جا رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ چیز وہم تھی یا حقیقت۔

میں جھاڑیوں کی طرف لپکا۔ دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سائیں عالی کئی روز سے غائب تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح آناً فاناً اپنی جھلک دکھایا کرتا تھا۔ میں درختوں میں دور تک بھاگتا چلا گیا۔ جونہی میں ایک بلندی پر پہنچا، بری طرح ٹھٹک گیا۔ گھنے درختوں کے اندر ہلچل کے آثار نظر آ رہے تھے۔ رابلی قبیلے کے درجنوں مسلح لشکری تھے جو ایک دائرے کی شکل میں پھیل کر پناہ گاہ کی طرف سمٹ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برچھے اور آتشیں ہتھیار تھے، وہ خونخوار چیتوں کی طرح چوکس اور محتاط نظر آ رہے تھے۔ اس بات میں شک کی ذرہ بھر گنجائش بھی نہیں رہی تھی کہ وہ ناشا کی پناہ گاہ سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ میں بلندی سے اترا اور دوڑتا ہوا واپس پناہ گاہ میں پہنچا۔ میں نے ٹارچ جلا کر روشنی کی۔ ناشا سو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی برہنہ بدن بدری دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ اس کے گلے کی زنجیر کا ایک سرا ناشا نے اپنی کلائی سے منسلک کر رکھا تھا۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر صفدر بھی بے خبر سو رہا تھا۔

میں نے ناشا کو جھنجوڑ کر جگایا، وہ اٹھ بیٹھی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"وہ آ گئے ہیں۔" میں نے اسے اطلاع دی۔

"کون؟"

"سردار رابل کے لشکری۔ انہوں نے تمہارے اس ٹھکانے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔"

ناشا کے چہرے پر خوف و ہراس کے بجائے عجیب سی سختی عود کر آئی۔ اس نے تڑپ کر کلائی کی زنجیر علیحدہ کی اور اپنی براؤننگ کیس ایکشن رائفل تھام لی۔

"ایک ایک کو بھون ڈالوں گی۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"نہیں۔" میں نے اس کی رائفل تھام لی "خودکشی مت کرو۔ میں اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ بولی "میں قاتل ہوں۔ میری سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ میں ذلت کی موت مرنا نہیں چاہتی۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"دیکھو ناشا! تم نے پہلے بھی جلد بازی کی۔۔۔ اب کر رہی ہو۔ ایسا مت کرو۔ تم نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں احسان کا بوجھ اٹھا کر رکھنا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں مصیبت سے نکالنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور میں نکالوں گا۔ رائفل نیچے رکھ دو اور یہاں بیٹھو۔ میں خود رابل کے لشکریوں سے بات کرتا ہوں۔"

ہماری بلند آوازیں سن کر صفدر اور بدری بھی بیدار ہو چکے تھے۔ صفدر کے چہرے پر گہری پریشانی نظر آ رہی تھی۔ ناشا کے چہرے پر شدید تذبذب دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے ڈھیلا پڑتے دیکھا تو اس کے ہاتھوں سے رائفل لے کر صفدر کو تھما دی "صفدر! ناشا کا خیال رکھو۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے اردو میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں رابل کے لشکریوں کے روبرو تھا۔ مجھے یوں اچانک درختوں سے نمودار ہوتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ان میں مترجم دانیال نظر آ گیا۔ میں نے مترجم دانیال کو ساری بات کھول کر بتائی۔ میں نے اس سے کہا کہ کل رات تخت میں واپس جانے کے بعد میرے ساتھی (صفدر) نے مجھے بتایا کہ اسے ایک شک ہو رہا ہے۔۔۔ یوں لگتا ہے کہ جنگل میں کسی شخص نے گھوڑا کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بس اسی شک کی بنیاد پر علی الصباح دوبارہ یہاں آئے اور ہمیں مفرور لڑکی کا سراغ مل گیا۔۔۔ میں نے دانیال کو باور کرایا کہ ہم اسے مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اس جنگل میں خود کو زیادہ دیر چھپا نہیں سکتی۔ آج نہیں تو کل اسے پکڑا ہی جانا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ وہ خود کو سردار رابل کے حوالے کر دے۔

معلوم نہیں کہ دانیال کو میری باتوں پر کہاں تک یقین آیا۔ بہرطور وہ میری باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ میں "راہراج" تھا اور میری یہ حیثیت بھی دانیال کو مجبور کرتی تھی کہ وہ میری باتیں توجہ سے سنے۔ میں خاموش ہوا تو اس نے پوچھا "اب کیا پوزیشن ہے؟"

میں نے کہا "تم جانتے ہی ہو، وہ سر پھری لڑکی ہے۔ کار رائفل اس کے قبضے میں ہے اور ساتھ سترہ ہیں۔ وہ مورچا نما پناہ گاہ میں ہے۔ مزاحمت کر کے درجنوں جانیں لے سکتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ سمجھانے بجھانے سے وہ رائفل میرے حوالے کر دے گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ آپ اسے باہر لے آئیں۔"

"میرے خیال سے وہ چاہے گی کہ کسی ذمے دار شخص کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ اس وقت ان لشکریوں میں سب سے زیادہ ذمے دار شخص کون ہے؟"

مترجم دانیال نے درمیانی عمر کے ایک مضبوط شخص کی طرف اشارہ کیا "ان کا نام سارقا ہے۔ سردار رابل کے بعد ہمارے قبیلے میں یہی سب سے زیادہ ذمے دار شخص ہیں۔ سردار کی غیر موجودگی میں یہ قائم مقام سردار کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مقدس سنہری روشنی کی نگاہ میں سارقا کی اہمیت سردار رابل سے بھی زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "لیکن پھر بھی سردار تو سردار رابل ہی ہے نا۔"

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ خود یہاں آ جائیں تو معاملہ زیادہ اچھے طریقے سے حل ہو جائے گا۔"

دانیال نے کہا "میں آپ کی بات لشکریوں تک پہنچا رہا ہوں لیکن مجھے امید نہیں کہ ایسا ہو سکے گا۔"

مترجم دانیال لشکریوں کی طرف چلا گیا۔ ان سب کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے، ناشا نے ان کے دو ساتھیوں کی جان لی تھی اور جیرا اڑایا تھا۔ لشکریوں کے ساتھ کتے بھی تھے۔ ان پہاڑی کتوں کے جسم پر لمبے بال تھے اور ان کی سرخ زبانیں منہ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ شاید انہی بوگیر کتوں کی مدد سے یہ لشکری اس پناہ گاہ تک پہنچ پائے تھے۔

مترجم دانیال سارقا نامی رعب دار شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ گاہے گاہے دیگر لشکری بھی اس گفتگو میں حصہ لے رہے تھے۔ میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی تک کوئی خواب ہی دیکھ رہا ہوں اور سائیں عالی کی جھلک بھی خواب ہی کا حصہ تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ سائیں عالی پناہ گاہ میں آیا تھا یا نہیں۔ بہرحال میں نے گھنٹیوں اور مالاؤں کی آوازیں ضرور سنی تھیں۔ اگر اس آواز کی بازگشت مجھے اپنے پیچھے لگا کر درختوں میں نہ لے جاتی تو شاید ناشا کے ساتھ ہم بھی پناہ گاہ کے اندر گولیوں سے چھلنی ہو جاتے یا خونخوار کتے ہمیں بے خبری میں چیر پھاڑ ڈالتے۔ میرے دل میں بار بار یہ آس بھی پیدا ہو رہی تھی کہ شاید سائیں عالی پھر کہیں سے نمودار ہو جائے اور اس کا کوئی "چمتکار" ہمیں اس مصیبت سے نکال لے۔ اس آسیبی ماحول میں ایسے پراسرار خیالات ہی ذہن میں آ سکتے تھے۔

مترجم دانیال، سارقا نامی شخص سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد میرے پاس آیا۔ اس نے کہا "سردار رابل کا یہاں آنا تو ممکن نہیں۔۔۔ ہاں سردار سارقا نے یہ وعدہ کیا ہے کہ لڑکی کو ہلاک نہیں کیا جائے گا۔۔۔ (یعنی فوری طور پر ہلاک نہیں کیا جائے گا) اس کا مقدمہ سردار رابل سنیں گے اور اگر مقامی قانون کے مطابق اس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش ہوئی تو یہ گنجائش اسے ضرور دی جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر ملزمہ سردار رابل کے فیصلے پر نظرثانی کرانا چاہے تو اسے کیا کرنا ہو گا؟"

دانیال بولا "شاید آپ کے ذہن میں مقدس روشنی کا خیال آ رہا ہے لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مقدس روشنی قبیلے کے معاملات میں مطلق دخل اندازی نہیں کرتی۔ سردار رابل کے فیصلے کو ہی مقدس روشنی کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ معاملہ براہِ راست مقدس روشنی کے سامنے ہی پیش کیا جائے۔ یہ کوئی عام معاملہ نہیں ہے۔ اس میں ایک قیدی لڑکی کی آبروریزی کا ارتکاب کیا گیا ہے۔"

"ایسا ہونا ممکن نہیں۔" مترجم دانیال نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

کچھ دیر مترجم دانیال سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد میں پناہ گاہ میں واپس چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ سارقا اور دیگر لشکریوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے اور اگر زیادہ دیر ہوئی تو وہ پوری قوت سے پناہ گاہ پر دھاوا بول دیں گے۔

پناہ گاہ کے اندر صفدر، ناشا اور بدری موجود تھے۔ ناشا کو سمجھانا کافی دشوار ثابت ہوا۔ اس میں کافی وقت لگا بہرحال ناکامی نہیں ہوئی۔ میں ناشا کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہا کہ میں اس کے لیے سردار رابل سے رعایتیں حاصل کر لوں گا۔

○☆○

ناشا خود کو رابل کے لشکریوں کے حوالے کر چکی تھی۔ بدری کی بیڑی کھول دی گئی تھی اور گلے سے زنجیر بھی نکال دی گئی تھی۔ بدری نے ایک کمبل سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔ ہم سب اس پناہ گاہ کے سامنے کھڑے تھے جہاں پچھلے دس روز سے "ناشا" بدری کے ساتھ موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ بدری کے تاثرات بدلے ہوئے ہیں۔ وہ جو آج صبح تک کیچوے کی طرح معمولی اور بے ضرر نظر آ رہا تھا، ایک دم

شیطنی ناگ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے نفرت اور غصے کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ مترجم دانیال کی وساطت سے وہ سارقا کو اپنی "قید" کا احوال سنا رہا تھا۔ اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن ناشا کی طرف اس کی "باربار اٹھنے والی انگلی" میں ضرور دیکھ رہا تھا۔

سارقا کا چہرہ تن گیا تھا اور لشکریوں کی آنکھوں میں بھی ہیجان نظر آنے لگا تھا۔ سارقا نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا پھر دو تین لشکری آگے بڑھے' انہوں نے اچانک ناشا کو دھکا دے کر آگے گرایا۔ بے حد پھرتی سے ناشا کے دونوں ہاتھ زنجیر کی مدد سے پشت پر جکڑ دیے گئے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے چلا کر دانیال سے پوچھا۔

سارقا نے گرج دار آواز میں جواب دیا۔ یہ جواب دانیال نے مجھ تک پہنچاتے ہوئے کہا "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ یہاں ہونے لگا ہے' یہ مقامی رواج کے مطابق غیر معمولی نہیں۔"

"کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ناشا کو بدری کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ طرمہ کے ہاتھوں اس کی ایک آنکھ ضائع ہوئی ہے۔ اسے بے پناہ اذیت اور توہین کا سامنا کرنا پڑا ہے۔"

"لیکن ۔۔۔ لیکن یہ انصاف نہیں ۔۔۔ یہ تو شرم ناک زیادتی ہے۔ تمہارا سردار مجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ ناشا کو صرف گرفتار کیا جائے گا اور رابل کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

"وہ وعدہ اپنی جگہ قائم ہے۔" دانیال نے کہا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مکروہ چہرہ بدری نے سب کے سامنے بڑی بے حجابی سے وہ کمبل اتار پھینکا جو اسے جسم ڈھانپنے کے لیے دیا گیا تھا۔ ناشا اب زمین پر گری ہوئی تھی اور چلا رہی تھی۔ سارقا کے لشکری اسے بازوؤں اور بالوں سے گھسیٹتے ہوئے کھوہ کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس کھوہ میں اس کے ساتھ بدری کے ہاتھوں جو سلوک ہونے والا تھا وہ مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لشکریوں کے راستے میں کھڑا ہو گیا ۔۔۔ صفدر نے ایک چٹان کی طرح میرے کندھے سے کندھا لگا رکھا تھا۔

"یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ ہو کر رہے گا اور ابھی ہو کر رہے گا۔" سارقا کی طرف سے فیصلہ کن جواب ملا "اگر تم زیادہ شور شرابا کرو تو پھر یہ سب کے سامنے ہو گا۔"

کچھ دیر تک میرے اور سارقا کے درمیان زور دار تکرار ہوئی۔ مترجم دانیال میرے قریب آیا اور بڑے موٴدب لہجے میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا "شاہ جہا صاحب! آپ کو مقدس روشنی کی نظر میں بڑا مرتبہ اور مقام ملا ہے۔ آپ کو دوبارہ ملاقات کا شرف بخشا جا چکا ہے' ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں آپ پر مزید عنایات بھی ہوں۔ ان سب بڑی عنایات کے بدلے میں آپ اس آوارہ سنگی لڑکی کی حمایت کر کے بہت گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔ آپ کے اس رویے سے ہم سب کو ہی نہیں ۔۔۔ بلکہ عظیم سردار رابل اور ۔۔۔ مقدس روشنی کو بھی دکھ ہو ۔۔۔ ہم سب کی نظروں میں آپ کا بڑا مقام ہے اور ۔۔۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے مقام پر۔" میں نے دانیال کی بات کاٹی۔

ناشا کو پناہ گاہ کے اندر پہنچایا جا چکا تھا۔ برہنہ بدری وحشیانہ انداز میں کھوہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پلک جھپکنے میں اپنی جیکٹ کے اندر سے پسٹل نکالا "رک بدری!" میری آواز چٹانوں میں گونجی۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ سارقا اپنی رائفل کا رخ میرے چہرے کی طرف پھیر رہا ہے۔ میرے پسٹل نے ایک دھماکے سے شعلہ اگلا اور گولی سارقا کا حلق چیر کر نکل گئی۔

سارقا مردہ چھپکلی کی طرح چت سے پشت کے بل پتھروں پر گرا۔ اس کی شہ رگ سے خون فوارے کی طرح چھوٹ رہا تھا۔ اچانک میرے دائیں طرف برق سی کوند گئی۔ یہ صفدر تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے جھپٹ کر ایک لشکری کے ہاتھ سے سیون ایم ایم رائفل چھین لی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ چند لمحے کے لیے قبائلی سکتے میں رہ گئے تھے۔ جونہی وہ سنبھلے' صفدر نے رائفل کا برسٹ مارا۔ یہ فائرنگ ان قبائلیوں کے پاؤں میں کی گئی تھی جو سب سے آگے کھڑے تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ پتھروں سے ٹکرایا اور ہر طرف چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ قبائلی بڑبڑا کر پیچھے ہٹے۔ یہی لمحہ تھا جب میں نے قریب کھڑے دانیال پر ہاتھ ڈالا اور عقب سے اس کی گردن دبوچ لی۔ پلک جھپکنے میں دوسرا پسٹل میرے ہاتھ میں تھا' یہی جو دانیال کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ میں دانیال کو رائفل سمیت گھسیٹتا ہوا الٹے قدموں پناہ گاہ کی طرف بڑھا۔ میرے ایک ہاتھ میں رائفل اور دوسرے میں پسٹل کے علاوہ "دانیال کی گردن" تھی۔ ایک برسٹ آیا'

دانیال ڈھال کی صورت میرے سامنے تھا۔ چند گولیاں ہمارے سروں پر سے گزر گئیں۔ دو گولیاں دانیال کے کندھے میں لگیں۔ اس سے پہلے کہ مزید فائرنگ ہوتی' میں دانیال سمیت پناہ گاہ میں گھس چکا تھا۔ دانیال کی رائفل دانیال کے کندھے سے لٹک رہی تھی مگر رائفل کی لبلبی پر میری انگلی تھی۔ اس رائفل سے میں نے جو واحد گولی چلائی وہ منحوس صورت بدری کی پیشانی پر لگی تھی اور بھیجا پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ میں نے بدری کو لڑکھڑا کر ایک ڈھلوان پر پھسلتے دیکھا۔ اس کی لاش ایک جھاڑی میں اٹک گئی۔ بدری ننگا تھا اور اوندھا پڑا تھا۔ مرنے کا یہ انداز شرمناک تھا مگر اس شرمناکی کو بدری نے خود دعوت دی تھی۔ وہ کسی اور مقصد سے عریاں ہوا تھا۔ اب یہ عریانی موت کی عریانی بن گئی تھی۔ فلمی نائیکہ حساب بیگم کا چہیتا بھائی جھاڑیوں میں مردہ پڑا تھا۔ اس کی سانولی سلونی پشت ڈھلتے سورج کی دھوپ میں چمک رہی تھی۔

صفدر مجھ سے پہلے ہی پناہ گاہ میں پوزیشن لے چکا تھا۔ ہمارے اندر گھسنے کے بعد جونہی دہانہ خالی ہوا' صفدر نے سیون ایم ایم سے فائرنگ شروع کر دی۔ خوف ناک تڑتڑاہٹ پہاڑیاں ایک بار پھر گونجیں اور میں نے قبائلیوں کو الٹے پاؤں بھاگتے دیکھا۔ وہ کھلی جگہ پر تھے۔ انہیں کسی آڑ کی ضرورت تھی۔ آڑ کی تلاش میں بھاگتے ہوئے وہ چیخ و پکار بھی کر رہے تھے۔

دوسری طرف دانیال میری گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا۔ اس کے کندھے سے بہنے والا خون اس کے پاؤں پر گر رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور اسے نیم بے ہوش کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ دہانے پر یکدم ہی گولیوں کی بارش ہو گئی۔ رابلی لشکریوں نے پوزیشن لے لی تھی اور اب اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ یہ پناہ گاہ کسی محفوظ ترین فوجی "بنکر" سے کم نہیں تھی۔ دہانے کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ باہر سے ہونے والی فائرنگ بالکل بے اثر ہو جاتی تھی لیکن اندر سے فائرنگ کرنا بے حد سہل اور سود مند تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں باہر سے سیکڑوں گولیاں برسائی گئیں۔ جواب میں ہم نے بمشکل چند راؤنڈ استعمال کیے لیکن یہ راؤنڈ زیادہ موٴثر تھے۔ جلد ہی لشکریوں کو احساس ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ ایمونیشن ضائع کر رہے ہیں۔ فائرنگ پہلے کم ہوئی اور پھر ختم ہو گئی۔

ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ چیڑ کے بلند درختوں میں ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ ناشا پناہ گاہ کے وسط میں پڑی تھی۔ اس کا بالائی جسم لباس سے بے نیاز تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ کھولے اور اونی لبادہ پہننے کو دیا۔ وہ غصے سے تلملا رہی تھی اور رابلی لشکریوں کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ میرے ہاتھ سے رائفل چھین لے اور گرجتی ہوئی

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۲۷۲۱۴

ہوئی اور "دھماکیں دھماکیں" گولیاں چلاتی ہوئی باہر نکل جانے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا اشتعال کم کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے دانیال کا زخمی کندھا دیکھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک تو بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی، دوسری کندھے میں لگی تھی۔ ہم نے کوئلوں کی راکھ سے زخم کا خون بند کیا اور پٹی وغیرہ باندھ دی۔ اس دوران میں صفدر داخلی راستے پر چوکس بیٹھا رہا۔ قریب دیوار پر اس کی گہری نگاہ تھی اور انگلی لبلبی پر جمی ہوئی تھی۔

پانچ دس منٹ بعد دانیال کو ہوش آگیا۔ وہ کندھے کی تکلیف کے سبب کراہ رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ گردن کی تکلیف بھول گیا تھا۔ اس کی گردن کی رگ پر میرے بازو کا ٹھیک ٹھاک دباؤ پڑا تھا۔ رگ کا نیلگوں ابھار صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھا پھر کراہتے ہوئے بولا "شاہ جہاں صاحب! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ بہت برا ہوا۔ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔"

"تو کیا۔ جو ہونے جارہا تھا وہ برا نہیں تھا؟" میں نے پوچھا "وہ بدبخت سب کے سامنے ناشا کی عزت برباد کرنے کی بات کر رہا تھا۔"

"لیکن۔ لیکن آپ نے تو انہیں (سارقا) جان سے ہی مار دیا۔ آپ کو معلوم نہیں سردار سارقا قبیلے کے لیے کتنے اہم تھے۔ سردار رائیل کے بعد وہ ہمارے قبیلے کے سب سے معزز شخص تھے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مقدس روشنی کے مقرب تھے۔ مقدس روشنی کی نگاہ میں وہ شاید سردار رائیل سے بھی زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ مجھے ڈر ہے کہ ان کی موت مقدس روشنی کے شدید ترین غضب کو آواز دے گی۔"

میں نے کہا "اگر ایک خودسر شخص کو "درندگی کے مظاہرے" سے روکنے پر مقدس روشنی خفا ہوتی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" دانیال نے بے حد مایوسی سے پیشانی پر ہاتھ مارا "آپ کو احساس نہیں کہ آپ نے چند لمحوں میں اپنے لیے کتنی مشکلات پیدا کرلی ہیں۔ مقدس روشنی کی ساری مہربانیاں کھو کر آپ نے خود کو کڑی سزا کا مستحق ٹھہرالیا ہے۔"

ہمارے انجام کا تصور دانیال کا خون خشک کر رہا تھا۔ میں نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو۔ ہم نے جو کچھ کیا اس پر ہمیں ذرہ بھر بھی پچھتاوا نہیں۔ اپنے اقدام کے لیے ہم خمیازہ بھگتنے کو تیار ہیں۔"

دانیال نے بے بسی سے آنکھیں بند کرلیں اور دیوار سے ٹیک لگالی۔

میں نے صفدر سے پوچھا "باہر کیا پوزیشن ہے؟"

وہ بولا "سامنے تو کوئی نظر نہیں آرہا لیکن وہ آس پاس موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مزید کارروائی سے پہلے وہ قوم کے بڑے سردار یا سردار رائیل سے مشورہ کرنا چاہتے ہوں۔"

"تمہارے پاس ایمونیشن کتنا ہے؟"

"اس بیلٹ میں قریباً تیس گولیاں موجود ہیں۔"

میں نے کہا "میرے والی رائفل میں صرف آٹھ گولیاں رہ گئی ہیں۔ ہاں پسٹل کے چالیس پچاس راؤنڈز موجود ہیں۔"

"پھر فکر کی بات نہیں۔" صفدر نے جواب دیا "ہم ان لوگوں کو دیر تک روک سکتے ہیں۔ ابھی ناشا نے جو رائفل واپس کی ہے اس کے سادے راؤنڈز بھی یہیں پڑے ہیں۔ وہ آپ کی رائفل میں استعمال ہوسکتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔" صفدر نے زندہ دلی سے جواب دیا۔

"زریں گل اور جون چاؤل باہر ہیں۔ اگر لشکری انہیں ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کے لیے یہاں لے آئے یا ان کے سروں پر اسلحہ تان کر ہمیں حکم دیا کہ چلو جلدی باہر نکلو۔ تو پھر؟"

"یہ تو جب ہوگا تب دیکھ لیں گے۔" صفدر نے کہا۔

جب میں اور صفدر ساتھ ہوتے تھے، ہم دونوں میں ایسا ہی والہانہ جوش و خروش پیدا ہوجاتا تھا۔ صفدر ایک زبردست فائٹر تھا۔ اس کے علاوہ اس میں ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اس کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اس کے چہرے پر سکون و اطمینان کی کیفیت رہتی تھی۔

صورتِ حال ایک دم ہی دھماکا خیز ہوگئی تھی۔ دانیال اس صورتِ حال سے بے حد خوف زدہ تھا۔ وہ بار بار کفِ افسوس مل رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں نے سارقا کی جان لے کر خود کو اور اپنے ساتھیوں کو ایک جان لیوا عذاب میں گرفتار کرلیا ہے۔ بے شک دانیال بھی رائیلی تھا لیکن مترجم ہونے کی حیثیت سے وہ ہمارے قریب تھا۔ ہلاک ہوجانے والے مترجم راعدی کی طرح دانیال کو بھی ہماری سلامتی کا خیال رہتا تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ باہر موجود لشکریوں کی طرف سے گاہے گاہے ہلکی فائرنگ ہورہی تھی۔ اس فائرنگ کا مقصد ہمیں پناہ گاہ کے اندر محصور رکھنا تھا اور یہ بتانا تھا کہ ہم مہم جوئی کی کوشش نہ کریں۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ پناہ گاہ کے داخلی

دہانے کے بالکل قریب کچھ جلتی ہوئی اشیا گریں۔ یہ گھوڑا گاڑی کے پہیوں میں استعمال ہونے والے ربڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ اس کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے تھے جنہیں بڑے بڑے گولوں کی شکل میں سلگایا گیا تھا۔ گاڑھا سیاہ دھواں پناہ گاہ کے سامنے پھیلنے لگا۔ سلگتی ہوئی اشیا مسلسل دہانے کے آس پاس گر رہی تھیں۔ یہ دھواں تنگ پناہ گاہ میں داخل ہوجاتا تو ہمارا دم گھٹ کر رہ جاتا۔ اس صورت میں ہمارے پاس باہر نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں ناشا لپک کر ہمارے پاس آئی۔ اس کے انگ انگ میں جیسے بجلی بھری ہوئی تھی۔ اس نے دہانے کو ڈھانپنے والی پتھریلی سل سیدھی کی اور اسے دہانے میں بڑی مہارت سے پھنسا لیا۔ اطراف میں چھوٹی چھوٹی درزیں رہ گئی تھیں۔ ان درزوں کو بند کرنے کے لیے ناشا نے دانیال اور صفدر کے مفلر لے لیے۔ چند سیکنڈ کے اندر اس نے پناہ گاہ کو دھوئیں سے بالکل محفوظ کردیا۔ میں اور صفدر دہانے کی سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر چوکس بیٹھ گئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ پناہ گاہ کی گہری تاریکی دور کرنے کے لیے ہم نے ٹارچ روشن کرلی تھی۔ اپنا پسٹل میں نے ناشا کو دے دیا تھا۔ وہ اسلحہ شناس تھی اور اسلحہ چلانے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ اس نے پسٹل اپنی گود میں رکھ لیا اور پناہ گاہ میں موجود گولیوں سے خالی میگزین بھرنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ خاصی پُرامید نظر آرہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سردار رائیل کے لشکری ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ہمیں اس پناہ گاہ سے نہ نکال پائیں گے۔

اچانک ایک مدھم آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ آواز دہانے کے بالکل پاس سے ابھری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سردار رائیل کی آواز ہے۔ وہ دانیال کو پکار رہا تھا۔ شاید دانیال کے ذریعے ہم سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے دانیال کو اشارہ کیا کہ وہ دہانے کے پاس چلا جائے۔ دانیال اٹھا اور اس پتھر سے کان لگا کر کھڑا ہوگیا جس نے پناہ گاہ میں داخلے کا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ دانیال نے پکار کر سردار رائیل سے پوچھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جواب میں رائیل نے دانیال کو کچھ سمجھایا۔ دانیال کے دھواں دھواں چہرے پر اطمینان نمودار ہونے لگا تھا۔ سردار رائیل کی بات ختم ہوئی تو دانیال نے رائیل کی ترجمانی کرتے ہوئے مجھے بتایا "سردار رائیل کا کہنا ہے کہ انہوں نے مسلح لشکریوں کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ سے براہِ راست بات کریں۔"

میں نے کہا "اگر سردار رائیل بات کرنا چاہتا ہے تو وہ غیر مسلح ہو کر اندر آسکتا ہے۔"

دانیال نے میری پیش کش اپنی زبان میں سردار رائیل تک پہنچادی۔ معمولی توقف کے بعد سردار رائیل نے آمادگی ظاہر کردی۔ میرے اشارے پر دانیال پتھر کی سل کی طرف بڑھا۔ میں اور صفدر دیوار کے ساتھ پوزیشن لیے کھڑے تھے۔ دانیال نے سل ہٹائی۔ دہانے پر کوتاہ قد سردار رائیل نمودار ہوا۔ وہ اتنا مختصر تھا کہ بغیر جھکے کھوہ میں آگیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے۔ میں نے دانیال کو اشارے سے کہا کہ وہ سردار کی تلاشی لے۔ دانیال تذبذب میں تھا۔ اس کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اپنے سردار کے ساتھ یہ گستاخی کرے۔ اس کا تذبذب دیکھ کر ناشا خود آگے بڑھی۔ اس نے بڑی بے باکی سے سردار کے پورے جسم پر ہاتھ گھمایا اور اسے اندر لے آئی۔ سردار کے چہرے پر چٹان کی سی سختی نظر آرہی تھی۔ مختصر الوجود ہونے کے باوجود وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والا شدید تناؤ اس بات کا غماز تھا کہ سارقا کی اچانک موت پورے رائیلی قبیلے کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوئی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس دھماکا خیز واقعے کے باوجود رائیل اتنی جلدی بات چیت پر آمادہ ہوگیا ہے۔ کیا یہ کوئی حکمت عملی تھی یا پھر خود پر دہ نشین (مقدس روشنی) کی طرف سے کسی طرح کی مداخلت ہوئی تھی؟ بہت سے سوال ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

سردار رائیل نے سخت تنقیدی نظروں سے پہلے ناشا کو اور پھر مجھے گھورا۔ اس کے ہونٹوں سے ٹھہری ہوئی آواز نکلی "جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ کوئی عام شخص سارقا کا قاتل ہوتا تو اسے اسی جگہ تار تار کردیا جاتا، چاہے اس کے لیے کتنی جانوں کی قربانی بھی دینا پڑتی لیکن تمہیں داہراج کا منصب عطا ہوا ہے اور اس کے علاوہ تمہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ تم دو مرتبہ مقدس روشنی سے ملاقات کا شرف حاصل کرچکے ہو۔" ایک لمحہ توقف کرکے سردار رائیل نے کہا "مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے ہماری دل شکنی کی ہے۔ رائیلی قبیلے کے لوگ تمہیں ایک رازخ (ہیرو) کا درجہ دینے لگے تھے کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ تمہارے ہاتھوں جارتوں کا قصہ پاک ہوا ہے۔ وہ تمہارے قصیدے پڑھنا چاہتے تھے لیکن تم نے ایک معزز سردار کو قتل کرکے ان کی زبانوں کو تالے لگادیے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر تم لوگ کسی حوالے سے مجھے اہم سمجھتے ہو تو یہ تمہاری مہربانی ہے۔ بہرحال ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے وہی کچھ کیا تھا جو اپنے ذہن کے مطابق ٹھیک سمجھا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر تم لوگ ٹھنڈے دل سے سوچو تو ان حالات میں کسی معقول شخص کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تم ایک قبیلے کے سردار ہو۔ کیا تم گوارا کرو گے کہ کسی بے بس

عورت کو صفائی کا موقع دینے سے پہلے اسے سزا دے دی جائے اور سزا بھی ایسی جو ہر لحاظ سے غیر انسانی ہو؟"

سردار رابل نے ایک گہری سانس لی اور ناشا کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "اس لڑکی نے پہریدار بدری کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ سب کے سامنے ہے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے اس کی بے رحمی کا۔ اس کے علاوہ قید خانے سے بھاگنے کے بعد ہمارے دو وفادار لشکریوں کو قتل کر چکی ہے۔"

ناشا تڑپ کر آگے آئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ میں نے کہا "سردار رابل! اس لڑکی کے ساتھ جو کچھ قید خانے میں ہوا ہے وہ شاید تمہارے علم میں نہیں۔"

"کیا ہوا ہے؟" سردار نے پوچھا۔

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تمہارے پہریداروں نے کوٹھری میں گھس کر اس کی آبرو لوٹی تھی۔ رات بھر اسے وحشت کا نشانہ بنایا تھا اور ابھی وہ اسے مزید روندنا چاہتے تھے۔"

سردار رابل گڑبڑا کر رہ گیا پھر ذرا سنبھل کر بولا "ایسے موقع پر عورت کی طرف سے اس طرح کے الزامات لگائے جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے اور پھر جس طرح کی یہ عورت ہے وہ سب کو معلوم ہے۔"

میں نے کہا "عورت کیسی بھی ہو ایسے معاملوں میں بہت کم جھوٹ بولتی ہے اور پھر ذرا سوچو، اسے کیا ضرورت تھی بدری کو یہاں لانے کی اور اس پر تشدد کرنے کی۔ وہ اسے وہیں مار کر چھوڑ آتی۔ بدری پر ہونے والا تشدد اس حقیقت کا گواہ ہے کہ بدری کی طرف سے ناشا پر زیادتی ہوئی ہے۔ ناشا نے خود سے ہونے والے انسانیت سوز سلوک کا بدلہ بدری کو زخم لگا کر لیا ہے۔"

"تم برائی کو برائی کا جواز بنا رہے ہو۔" سردار رابل نے کہا "بہرحال مقدس روشنی کی طرف سے تمہیں اور خرمہ کو یہ موقع ملا ہے کہ تم اپنی صفائی پیش کر سکو۔ تم نے اپنی اور ناشا کی صفائی میں جو کچھ بھی کہنا ہے، تفصیل اور مناسب ترتیب سے مجھے بتا دو۔ میں یہ سب کچھ مقدس روشنی کے علم میں لے آؤں گا۔"

"کیا میں یہ سب کچھ ذاتی طور پر مقدس روشنی کے گوش گزار نہیں کر سکتا۔"

"ایسا ہونا ممکن ہوتا تو میں خود یہاں نہ آتا۔ کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ میں درست ترجمانی نہیں کروں گا؟"

"خدا گواہ ہے کہ ایسا نہیں۔ میں تو صرف سہولت کے نظریے سے کہہ رہا ہوں۔"

سردار رابل خاموش رہا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات سردار رابل کے گوش گزار کر دی۔ گاہے گاہے ناشا نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ ایک بے باک لڑکی تھی۔ اس نے وضاحت کے ساتھ سردار رابل کو بتایا کہ بندی خانے کی کوٹھری میں بدری اور ولاماں نامی پہریدار کے ہاتھوں اس پر کیا بیتی تھی۔

سردار رابل نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم فی الحال اسی پناہ گاہ میں رہیں اور یہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ کل صبح واپس آئے گا اور ہمیں تازہ صورت حال سے آگاہ کرے گا۔

صفدر نے پوچھا کہ اب وہ کہاں جا رہا ہے۔

وہ بولا "مقدس سنہری روشنی کی خدمت میں۔"

وہ رات ہم نے پناہ گاہ میں ہی کاٹی۔ پناہ گاہ کے وسط میں جلنے والی آگ نے ہمیں اتحاد تازگی اور بے پناہ سردی سے محفوظ رکھا۔ ہم نے پناہ گاہ کا دہانہ پتھریلی سل سے بند کر دیا تھا پھر بھی درزوں سے سرد ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی اندر گھس آتی تھی اور پناہ گاہ کے وسط میں جلنے والی آگ کے شعلے کانپنے لگتے تھے۔ سردار رابل کے لشکری بظاہر آس پاس موجود نہیں تھے لیکن یہ بات یقین کرنے والی نہیں تھی کہ وہ یہاں سے جا چکے ہیں۔ وہ پناہ گاہ سے دور ہٹ گئے تھے مگر پناہ گاہ کے گرد ان کا حصار یقیناً برقرار تھا۔

بھنی ہوئی مکئی اور گڑ والا تھیلا ابھی تک پناہ گاہ میں موجود تھا۔ ہم آگ کے گرد بیٹھ کر مکئی کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ راکھلیں ہماری گود میں دبکی تھیں۔ کل دوپہر کے وقت میرے ہاتھوں جو دو لاشیں پناہ گاہ کے سامنے گری تھیں ان کی یاد ابھی تک وحشت بن کر در و دیوار میں سمائی ہوئی تھی۔ بہرحال ہمارے ذہنوں میں اس ہنگامے کا پہلے جیسا اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ناشا سے وادی کے حالات کے بارے میں دیر تک باتیں ہوئیں۔ سردار رابل سے ملنے کے بعد ہم خود کو بہت مطمئن محسوس کر رہے تھے۔ لاشعوری طور پر ہمیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ ہم رابلی لشکریوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ناشا سے ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں ناشا کی چھوٹی بہن (یعنی زریں کی محبوبہ) کلثوم کا ذکر آ گیا۔ میں نے ناشا سے پوچھا "کلثوم اب کیسی ہے؟"

وہ رسان سے بولی "دو ماہ پہلے میں نے اس کی شادی کر دی تھی۔"

"شش شادی؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ وہ میری بہن ہے۔ مجھے ہی اس کے بارے میں سوچنا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری طرح در بدر بھٹکے اور لوگوں کے لیے تماشا بنے۔ بستی کا ہی ایک اچھا سا لڑکا دیکھ کر میں نے اس کا بندھن باندھ دیا۔"

میں سناٹا کر رہ گیا۔ فوراً ہی میری آنکھوں کے سامنے زریں گل کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ وہ بے خبر تو کچھ اور ہی منصوبے بنائے بیٹھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے کلثوم سے ہونے والی اپنی زریں ملاقات کا احوال کتنے جوش خروش سے بیان کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ناچ گھر میں کلثوم نے اسے پھولوں کا گلدستہ پیش کیا ہے اور اسے بوسہ بھی دیا ہے۔ وہ اس ملاقات کے نشے میں مدہوش تھا اور نت نئے فلمی گانے اس کی زبان پر جاری و ساری تھے۔ ناشا کی زبانی کلثوم کی شادی کا سن کر مجھے واقعی دھچکا لگا۔

میں نے کہا "ناشا! کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

وہ خفا ہو کر بولی "یہ کوئی مذاق والی بات ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولی "حالات ٹھیک رہے تو شاید اس مہینے اس کا رواھا بھی ہو جائے۔"

"رواھا؟ یہ کیا بلا ہے؟"

"تم اس کو رخصتی بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ اپنے گھر سے اپنے شوہر کے گھر چلی جائے گی۔"

مجھے قدرے اطمینان ہوا پھر بھی بات بے حد تشویشناک تھی اور زریں کے نقطۂ نظر سے تو یہ خودکشی کا مقام تھا۔ زریں کے بقول کلثوم اس کی آخری محبت تھی اور یہ "محبت" کسی اور سے منسوب ہو چکی تھی۔

میں نے زریں گل کی وکالت کرتے ہوئے ناشا سے کہا "تم نے بہن کی شادی کر دی ہے لیکن وہ میرا ساتھی زریں گل۔ اس بدنصیب کا کیا ہو گا؟"

"بھاڑ میں جائے وہ۔ اگر وہ واقعی کلثوم کے لیے سنجیدہ ہوتا تو وادی سے واپس کیوں جاتا۔ تم مرد ہوتے ہی مطلب پرست ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک چکنا گھڑا پایا جاتا ہے تمہارے اندر۔"

میری طرح صفدر بھی حیران تھا۔ وہ بولا "لیکن کلثوم تو دو دن پہلے زریں کو تماشا گاہ میں ملی ہے۔ وہاں اس نے زریں گل کو گلدستہ دیا تھا اور بڑی محبت جتاتی رہی تھی۔"

"کیا محبت جتاتی رہی تھی؟" ناشا نے تیکھے پن سے پوچھا۔

صفدر نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "زریں بتا رہا تھا کہ کلثوم نے اسے بوسہ دیا تھا اور محبت بھری نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔"

ایک دم جیسے کوئی بات ناشا کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کا تنا ہوا چہرہ نرم پڑ گیا۔ وہ بولی "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میری بہن کا نام کلثوم نہیں کلثوم ہے۔ تم نے اگر اس کا نام [illegible] لیا کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلثوم میری بہن ہے۔ میں جانتی ہوں وہ کیسی لڑکی ہے۔ اب وہ بھی تمہارے ساتھی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔"

"لیکن تماشا گاہ میں اس کا زریں گل سے ملنا کیا تھا؟"

"تم اسے ایک رسم سمجھ سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ کلثوم نے تمہارے ساتھی کو زرد پھولوں کا گلدستہ دیا ہو گا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"زرد پھولوں سے کیا ہوتا ہے؟"

"ہمارے ہاں یہ رواج نہیں کہ لڑکی شادی کے بعد بھی کسی غیر مرد سے ملتی رہے۔ جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے چاہنے والے کو بتا دیتی ہے کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے اس کے لیے اجنبی ہو گئی ہے۔ اس کا اظہار وہ زرد پھولوں کا گلدستہ دے کر کرتی ہے۔ بعض دفعہ گردن پر بوسہ بھی دیتی ہے۔ اس کے بعد سچے دل سے وہ دونوں اپنے راستے جدا کر لیتے ہیں۔"

"وصت تیرے کی۔" میرے منہ سے نکلا "زریں گل تیرا تو بیڑا غرق ہو گیا۔"

صفدر بھی گہری سوچ میں گم تھا۔ شاید تصور ہی تصور میں وہ بھی زریں گل کو آہوں کا دھواں چھوڑتے اور دردناک گانے گاتے دیکھ رہا تھا۔

○☆○

وہ رات بہت طویل تھی لیکن ہر رات کی طرح اس رات کی بھی صبح ہو گئی۔ سردار رابل ہمارے پاس پہنچا اور اس نے ہمیں یہ خوش کن اطلاع دی کہ "مقدس روشنی" کی طرف سے پناہ گاہ کا محاصرہ اٹھانے کا حکم ہوا ہے اور ہم لوگ آزاد ہیں۔

مجھے اس فیصلے کے بارے میں بتاتے ہوئے سردار رابل کی آنکھوں میں حیرت تھی اور سردار رابل ہی نہیں، دیگر تمام افراد بھی جو سردار رابل کے ساتھ تھے، ششدر نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے اور صفدر کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہم کسی دوسری دنیا کے آدمی ہوں یا پھر جنات وغیرہ ہوں جن کے سروں پر بڑے بڑے سینگ نظر آ رہے ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی حیران تھے۔ سارقا جیسے اہم سردار کو قتل کرنے کے باوجود اتنی آسانی سے ہماری جان چھوٹ جائے گی، ہمیں ہرگز امید نہیں تھی بلکہ مترجم دانیال کو تو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ہنوز پریشانی تھی۔ غالباً وہ خیال کر رہا تھا کہ ہمیں کسی حکمت عملی کے تحت پناہ گاہ سے باہر لایا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ باہر نکلتے ہی ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے۔ ہمارے اپنے ذہنوں میں بھی ایسے وسواس موجود تھے لیکن سردار رابل کی گفتگو سننے کے بعد کم از کم میرا نوّے فیصد شک تو دور ہو گیا تھا۔ میرا ا

گواہی دے رہا تھا کہ "خوبرو پردہ نشین" کی طرف سے کوئی ایسا فیصلہ آگیا ہے جو ہم سب کے لیے حیران کن ہے۔ کوتاہ قد سردار رابیل نے مجھ پر ایک اور انکشاف بھی کیا۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ مقدس سنہری روشنی عنقریب مجھے ایک بار پھر ملاقات کا شرف بخش سکتی ہے۔

یہ اطلاع چونکا دینے والی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ اطلاع سن کر میرے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔ آپوں آپ میرے تصور میں وہ دو چمک دار آنکھیں آگئی تھیں جنہیں پردے کی اوٹ سے دیکھنا بھی بے حد محال اور ناقابل فراموش تجربہ ثابت ہوتا تھا۔ ان آنکھوں کے تصور کے ساتھ ہی وہ سحر انگیز آواز بھی کانوں میں گونجنے لگی جس کا تعلق خوبرو پردہ نشین سے تھا۔ یہ آواز جیسے کسی کے ہونٹوں سے نہیں نکلتی تھی، در و دیوار سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ میں حقیقت کی دنیا کا آدمی تھا۔ خواب، خیال اور تصورات کی میری زندگی میں گنجائش تھی اور نہ میں نے کبھی اس سے ناتا جوڑا تھا۔ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں کے دوران میں کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے جو محیرالعقول تھے اور ان میں سے کچھ کو پراسرار بھی کہا جاسکتا تھا لیکن میں نے اس اسرار کو ہمیشہ عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا تھا اور اسرار کا پردہ چاک کرکے ٹھوس حقائق کا کھوج لگایا تھا لیکن ان بلند و بالا پہاڑوں میں پہنچنے کے بعد پے در پے ایسے واقعات پیش آئے تھے جنہوں نے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہمیشہ ٹھوس حقائق کی جستجو میں رہنے والا ذہن قدرے مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا اور یہ کیفیت میری ہی نہیں صفدر اور جون جاوئل کی بھی تھی۔ ہمیں وہ ساری باتیں یاد آرہی تھیں جو ہم نے وقتاً فوقتاً پیراسائیکالوجی، ہپناٹزم، خیال خوانی اور حاضرات وغیرہ کے بارے میں سنی تھیں۔ جب یہ باتیں سنی گئی تھیں، انہیں بہت سنجیدگی سے نہیں لیا گیا تھا لیکن اب حالات ہمیں مجبور کر رہے تھے کہ ہم انہیں بہت سنجیدگی سے لیں۔ ان کے بارے میں سوچیں اور غور کریں۔ اب یہ باتیں بہت قریب کی باتیں لگتی تھیں کیونکہ اب یہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی ہوگئی تھیں اور جب آنکھوں سے دیکھ لیا جائے اور کانوں سے سن لیا جائے تو پھر نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔

سردار رابیل ہمیں اپنے ساتھ لے کر واپس سرنگ میں آگیا۔ "سخت" میں پہنچ کر ہم اپنی اپنی رہائش گاہ میں منتقل ہوگئے۔ سردار رابیل کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ ہم آزاد ہیں تاہم ہماری رہائش گاہ سے باہر پہرے داروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ اضافہ ہماری حفاظت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ ہماری رہائش گاہ کے سامنے مکمل صفائی نظر آرہی تھی۔ درحقیقت یہاں بہت سے لوگوں نے پھول اور گلدستے وغیرہ کو چھوڑے تھے۔ یہ ایک طرح سے میرے لیے خراج تحسین تھا لیکن اب چونکہ میرے ہاتھوں سے سردار سارقا کا قتل ہوچکا تھا لہٰذا لوگوں کا رویہ بدل گیا تھا۔

زریں نے پورے چوبیس گھنٹے بعد ہمیں دیکھا۔ وہ سوال پر سوال کرتا جا رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ بستی سے دور جنگل میں کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ اسی سبب وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ناشا ہمارے ساتھ موجود تھی۔ صفدر نے اسے اختصار کے ساتھ تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ زریں اس اطلاع پر بہت خوش نظر آنے لگا تھا کہ میں نے رابیل قبیلے کے ایک بددماغ سردار کو گولی سے اڑا دیا ہے اور بدری قوم کے "بگنجر" کو بھی جہنم واصل کر دیا ہے۔ وہ چہک کر بولا "حبیب! ام کو آپ کی شاگردی پر ناز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو آپ جیسا نیک استاد عطا فرمائے۔ ام کو یقین تھا کہ آپ بہت جلد سارے کام ٹھیک ٹھاک کر لے گا۔"

"سارے کاموں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"امارا مطلب ہے کہ ام سورج کو یہاں سے چھڑانے میں کامیاب ہو جانے گا۔ اس کے بعد امارے یہاں سے واپس جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگا۔ سب کچھ اکھٹا خلاص ہو جائے گا۔"

صفدر نے کہا "سورج کو چھڑانا اتنا آسان نہیں۔"

"امارا ایمان ہے کہ استاد حبیب ہر ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے۔ بالکل لالہ سدھیر کی طرح۔"

"لالے سدھیر نے کس ناممکن کو ممکن کیا تھا؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہ ہیرو آرہا ہے۔" زریں کے بجائے میں نے جواب دیا۔

صفدر بے ساختہ مسکرانے لگا۔ زریں اپنی دھن میں بولتا رہا "آپ لالے سدھیر کی بات پر اس لیے ہنستا ہے کہ آپ نے ان کا فلمیں نہیں دیکھا۔ گستاخی معاف، آپ کا ٹموف ہی خراب ہے۔"

"ٹموف نہیں ذوق۔" میں نے تصحیح کی۔

"لیکن جو بھی ہے خراب تو ہے نا۔"

صفدر بولا "سدھیر صاحب بہت بڑے فن کار ہیں اور

ان کے قدر دان ہیں لیکن فلموں میں وہ جو کمالات دکھاتے ہیں وہ دراصل کہانی کار کے اور ہدایت کار کے کمالات ہوتے ہیں۔"

"آپ بات کو کسی اور طرف لے گیا ہے۔ ام یہ کہہ رہا ہے۔ ام کیا کہہ رہا تھا؟" زریں بات بھول گیا اور پیشانی مسلنے لگا۔

"شاید تم مسالے دار نسوار کی بات کر رہے تھے۔" صفدر نے لقمہ دیا۔

"خو چہ۔ مسالے دار نسوار کھانے والے کا دماغ اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوتا۔" زریں بولا "ام کو پتا ہے ام کوئی اور بات کر رہا تھا۔" وہ ماتھا ٹھونکنے لگا۔ کوشش کے باوجود جب یاد نہیں آیا تو ہنس کر بولا "فلم زرقا میں بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔"

صفدر نے کہا "بھئی وہ فلم تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ اس میں کوئی ایسا سین نہیں تھا۔ نہ ہی اس میں کوئی تمہارے جیسا غائب دماغ تھا۔"

زریں بولا "ام سین کی بات نہیں کر رہا۔ ام اور بات کر رہا ہے۔ ام سائیکل پر زرقا فلم دیکھنے گیا تھا۔ واپسی میں "یا زرقا" گاتے ہوئے تانگے پر گھر آگیا۔ دوسرے روز والد صاحب نے سائیکل کے بارے میں پوچھا تو اسی طرح امارے دماغ کا بلب چلا گیا۔ ام کو دو گھنٹے تک یاد ہی نہیں آیا کہ سائیکل کہاں ہے۔ کبھی کبھی ام ایک دم اسی طرح بھول جاتا ہے۔ شاید یہ بچپن کی چوٹ کا اثر ہے۔ ایک مرتبہ اندھیرے میں امارے دادا نے ام کو چور سمجھ کر امارے سر پر جستی کا لوٹا مارا تھا۔"

پھر زریں گل لہک لہک کر بتانے لگا کہ کس طرح ایک رات وہ سرکس دیکھ کر واپس آیا تھا اور رب نواز دارا کی چارپائی کے پاس سے گزرا تھا اور کس طرح انگریزوں کے زمانے کا بھاری بھرکم لوٹا اڑتا ہوا اس کے سر پر لگا تھا۔

زریں بہت خوش تھا۔ میں اور صفدر سوچ رہے تھے کہ کس منہ سے اسے کلثوم کے بارے میں بتائیں۔ یقیناً یہ خبر اس کے سر پر بجلی بن کر گرنے والی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ پہاڑی دوشیزہ کی جس ادا کو وہ محبت سمجھا تھا وہ جدائی تھی۔ میں نے رات کو بھی اس بارے میں کئی بار سوچا۔ قبائلی لوگوں میں رشتوں ناتوں کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ اب یہ بات بہت مشکل تھی کہ کلثوم کے سلسلے میں زریں گل کی دال گل جاتی۔ دوسری طرف زریں تھا کہ اپنے اس عشق کو مسلسل اپنا آخری عشق قرار دے رہا تھا۔

ہنسی ہنسی میں ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں سرنگ سے باہر جانے کے لیے حجرہ نما کمرے سے نکلا تو ایک پہرے دار نے میرا راستہ روک لیا۔ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولا "نہیں واہراج! سردار رابیل کا حکم ہے کہ آپ باہر نہ جائیں۔"

"کیا میں خود کو گرفتار سمجھوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں جناب۔" اس نے زور شور سے نفی میں سر ہلایا "دراصل آپ کی حفاظت کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے۔ سردار سارقا کی موت کا کچھ لوگوں کو بہت رنج ہے۔ سردار رابیل نہیں چاہتے کہ باہر جانے سے آپ کے لیے کسی طرح کا خطرہ پیدا ہو۔"

میں نے کہا "ہم اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ تم سردار رابیل تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔"

شاید میں کچھ اور بھی کہتا لیکن ایک منظر دیکھ کر چونک گیا۔ مجھے زریں گل نظر آیا۔ وہ ایک نوعمر لڑکی کے ساتھ تماشا گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اب شام ہونے والی تھی۔ تماشا گاہ کی طرف رونق میلہ دکھائی دینے لگا تھا۔ پہلے تو میں نے یہی خیال کیا کہ شاید زریں گل کے ساتھ کلثوم ہے لیکن غور کیا تو وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ وہ دونوں تماشا گاہ کے ہنگامہ خیز ماحول میں داخل ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ زریں گل اس خوبرو لڑکی کے ساتھ بڑی اکڑفوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ وہ لڑکی کی قربت سے مسرور نظر آتا تھا اور اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

زریں کی یہ رنگین مصروفیت دیکھ کر مجھے پریشانی تو ہوئی لیکن ایک طرح کا اطمینان بھی ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اپنی فطری عاشق مزاجی سے مجبور ہو کر زریں گل اس نئی لڑکی کے چکر میں گرفتار ہو گیا ہے۔ نسوانی خوب صورتی زریں کی کمزوری تھی۔ اگر واقعی زریں اس لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا تو یہ اس لحاظ سے خوش آئند بات تھی کہ اب کلثوم والا معاملہ ناکامی میں فٹ ہو چکا تھا پھر میرے ذہن میں یہ بات آئی شاید زریں کو وہ ناخوش گوار خبر مل چکی ہے اور یہ خبر ملنے کے بعد ہی اس نے نئی لڑکی میں دلچسپی لینا شروع کی ہے لیکن اگر اسے معلوم ہو گیا تھا تو مجھ سے ذکر کرتا۔

بہرحال میں وہاں سے واپس آگیا۔ مجھے امید تھی کہ زریں خود ہی مجھے اس بارے میں کچھ نہ کچھ بتائے گا۔ اگلے دو تین روز تذبذب کے عالم میں گزرے۔ سردار رابیل سے ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی کسی اہم سردار نے آکر ہمارا حال احوال پوچھا تھا۔ ان تین دنوں کے حوالے سے صرف دو

واقعات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو میں نے ان چار عدو رابلی افراد کو دیکھا جنہوں نے لڑائی کی ہنگامہ خیزی میں بوالہوسی دکھائی تھی اور مفتوح قبیلے کی عورتوں پر تشدد کیا تھا۔ ان چار افراد کو مجرمانہ حملے اور قتل کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ جب میں نے انہیں دیکھا تو انہیں سزائے موت کے لیے ہی لے جایا جا رہا تھا۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ایک پہریدار کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو رابلی قبیلے کی بستی میں لے جا کر مقدس دیوار کے سائے میں سزا دی جائے گی۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا جو رابلی قبیلے میں مقامی رواج کے مطابق مجھ سے منسوب کی گئی تھی۔ میری مراد چشمہ سے تھی۔ وہ نوخیز لڑکی جس کی آنکھوں سے کرنیں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں، اب بے روغن چراغ کی طرح بجھ چکی تھی اور وہ کیوں نہ بجھتی، وہ شخص جس کے دم سے اس کی زندگی میں روشنی تھی وہ موت کی تاریک وادیوں میں اتر چکا تھا۔ چشمہ کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے پھر وہ خونچکاں مناظر گھوم گئے جن کا تعلق بدمست سانڈوں سے تھا اور کٹے پھٹے نوشاب سے تھا۔ میں اجڑی بچھڑی بنجر چشمہ کو دیکھتا رہا اور اس کے لیے حرف تسلی سوچتا رہا لیکن اس کا غم مجھے اتنا مہیب دکھائی دیا کہ حرف تسلی سوجھا ہی نہیں اور اگر سوجھ بھی جاتا تو مترجم کے بغیر میری بات اس حرماں نصیب تک کون پہنچاتا۔ وہ اپنی عمر رسیدہ ماں کے ساتھ کسی کام سے "تخت" میں آئی تھی۔ ان کے ساتھ ایک نحیف و نزار شخص بھی تھا۔ وہ تینوں جلد ہی سرنگ سے واپس چلے گئے تھے۔ تو ــــ قدرت بھی کبھی کیسے مناظر دکھاتی ہے۔ جب زندگی کی امید تک نہیں ہوتی تو زندگی مل جاتی ہے اور جب انسان موت کے منہ سے نکل کر نئی زندگی کی خوشی منا رہا ہوتا ہے تو اسے پھر موت آ دبوچتی ہے۔ حالات کی کروٹ تقدیر کا راستہ روکنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

ان تین دنوں میں ناشا ہمارے ساتھ ہی مقیم رہی تھی۔ وہ بدری کے خلاف غم و غصے سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے اور صفدر کے سامنے کئی بار اس پختہ عزم کا اظہار کیا تھا کہ اگر موقع ملا تو وہ بدری کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے موقع نہیں ملے گا کیونکہ بدری میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا (یہ اور بات ہے کہ ناشا کو ابھی یہ حقیقت معلوم نہیں تھی۔ میں نے بھی اس خبر کو اس کے لیے "سرپرائز" ہی رہنے دیا تھا۔)

ناشا بے حد سخت موسم کی پالی ہوئی تھی۔ وہ کڑی سردی میں معمولی لباس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ اس نیم گرم سرنگ میں آ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ اس نے بڑی بے باکی سے اپنا اونی لبادہ اتار پھینکا اور نہایت مختصر لباس میں دندناتی پھرتی تھی۔ جونہی زریں کی نگاہ اس پر پڑتی تھی زریں کے منہ سے بے ساختہ لاحول ولا قوۃ نکل جاتا تھا۔ زریں بلاشبہ رنگین مزاج تھا لیکن رنگین مزاجی میں وہ رکھ رکھاؤ کا قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عام زندگی میں بھی بس اتنی ہی عریانی جائز ہے جتنی پاکستانی فلموں میں نظر آتی ہے۔ اگر اس سے زیادہ عریانی یا بے باکی نظر آتی تھی تو وہ فوراً گناہ و ثواب کے چکر میں پڑ جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر زریں کے نزدیک "پاکستانی فلمیں" بے حیائی یا شرافت ناپنے کا صحیح ترین پیمانہ تھیں۔ ناشا کی عریانی پر چونکہ پاکستانی سنسر بورڈ کی قینچی چل سکتی تھی لہٰذا زریں کے نزدیک یہ عریانی سخت گناہ تھی۔

مجھ سے کہنے لگا "استاد صیب! آپ نے اس عورت کا جان بچایا ہے۔ یہ بہت زیادہ احسان مند ہے آپ کا۔ کیا آپ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پردہ کیا کرے۔"

"بھئی ہر جگہ کے رسم و رواج ہوتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی بے پردگی کو اتنا برا نہیں سمجھا جاتا۔"

"نہیں استاد صیب! یہ بات نہیں ہے۔ ہم نے یہاں کی دوسری عورتوں کو بھی دیکھا ہے۔ چند ایک کے سوا وہ سب کے سب پورے لباس میں نظر آتے تھے۔ بالکل جیسے ہماری فلموں میں زیبا اور شمیم آرا نظر آتا ہے اور تو اور "آپ کلثوم کو ہی دیکھ لیں۔ کتنا باپردہ اور سیدھا سادہ ہے۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا نا۔۔۔ کہ اس کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔ ایک دن تو ہم حیران رہ گیا۔ مرغا اپنی مرغی صاحبہ سے محبت فرما رہا تھا۔ وہ سمجھا کہ وہ لڑ رہا ہے۔ وہ ان کو چھڑانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ اندازہ لگائیں اس کا ذہن کتنا معصوم اور صاف ستھرا ہے۔ آخر وہ بھی تو اسی وادی میں رہتا ہے نا۔۔۔"

زریں گل کلثوم کا ذکر کر رہا تھا اور بڑے تعریفی انداز میں کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں پھر یہ سوال کلبلانے لگا کہ زریں کو کلثوم کی شادی کی خبر ہو چکی ہے یا نہیں۔ اگر ہو چکی تھی تو اس نے مجھ سے تذکرہ کیوں نہیں کیا تھا۔ اور اب کلثوم کا ذکر تعریفی انداز میں کیوں کر رہا تھا اور اگر نہیں ہوئی تھی تو وہ ایک نئی لڑکی کے ساتھ کیوں گھوم پھر رہا تھا۔ عجیب گھن چکر تھا یہ شخص۔ میں نے کلثوم (یا گلثوم) کی بات کرنے کے لیے یہ موقع مناسب سمجھا۔ میں نے کہا "زریں! میں نے پرسوں تمہیں ناچ گھر میں دیکھا تھا۔ وہاں خیر سے تم نے ایک

چھنک چھلو کے گلے میں باہیں ڈالی ہوئی تھیں۔ اگر میری نظر کمزور نہیں ہوئی تو وہ۔۔۔ کلثوم ہرگز نہیں تھی۔"

زریں کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن وہ زیادہ دہشت زدہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اس کے چہرے پر فلمی لیلا غورث کی طرح تفکر کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔

"کیا بات ہے زریں گل! تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "استاد صیب! امارا قسمت بڑا خراب ہے۔ ایک دم بدنصیب ہیرو ٹائپ کمار کے مافق۔ ام جب کسی کے ساتھ ٹوٹ کر محبت فرماتا ہے تو امارے راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ آ جاتا ہے۔ اب دیکھیں ام دل و جان سے کلثوم پر نچھاور ہے لیکن وہ ام سے برابر بے رخی برت رہا ہے۔ شکل تک نہیں دکھا رہا ام کو۔ ام دو قدم اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ تین قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس کو حالانکہ چند روز پہلے جب وہ ام کو پہلی بار ناچ گھر میں ملا تھا تو اس نے ام سے بڑا محبت فرمایا تھا۔ ام کو پھول دیا تھا۔ ام کو چوما تھا۔۔۔"

میں سمجھ گیا کہ زریں گل ابھی تک چوتھویں عشق کی ناکامی سے آگاہ نہیں ہوا۔ وہ بے خبر تھا کہ کلثوم کی شادی ہو چکی ہے۔ میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا "لیکن تم اس چھنک چھلو کے ساتھ کیوں گھومتے پھرتے نظر آتے ہو؟"

وہ بولا "خو استاد صیب! یہ بھی ایک اسٹریجی ہوتا ہے۔"

"اسٹریجی نہیں اسٹرے ٹجی اور یہ ہوتا نہیں ہوتی ہے۔"

"خیر جو کچھ بھی ہے مگر ہے تو۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ذرا سا مسکرا کر بولا "اس سین پارٹ میں بڑا طاقت ہوتا ہے استاد صیب۔ روٹھا ہوا محبوب ایک دم سے تیر کی طرح سیدھا ہو جاتا ہے۔ دراصل محبوبہ کو سیدھا کرنے کا طریقہ سب سے پہلے سنتوش صاحب نے ایک اردو فلم میں بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ ایسا پاپولر ہوا کہ بہت سے ہیرو نے استعمال کیا۔ اپنے محبوب کو دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ کر محبوبہ اندر ہی اندر کڑھتا ہے، پیچ و تاب کھاتا ہے پھر ایک دم سے لڑکے کی جان ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو اتنا بے چین ہوتا ہے کہ تھاہ کر کے ہیرو سے چمٹ جاتا ہے۔"

زریں کی سیدھی سادی باتیں سن کر مجھے ہنسی آ رہی تھی اور قدرے افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک کلثوم کے چکر میں تھا اور نئی لڑکی والا چکر صرف کلثوم کو راہ راست پر لانے کے لیے چلا رہا تھا۔

○☆○

سردار رابل نے مجھے بتایا کہ مقدس روشنی (خوبرو پردہ نشین) مجھ سے پھر سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ پناہ گاہ سے بستی میں واپس آ کر میں قریباً ۴۸ گھنٹے تک بڑی شدت سے اس ملاقات کا انتظار کرتا رہا تھا لیکن "بلاوا" نہیں آیا تھا۔ چوتھے یا پانچویں روز یہ بلاوا بالکل اچانک آیا۔ میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ سردار رابل کمرے میں آ دھمکا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ مقدس سنہری روشنی نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سرنگ کے اس سارے حصے میں پھیل گئی جسے تخت کہا جاتا تھا۔ پچھلی دفعہ زریں گل میرے ساتھ گیا تھا لیکن اس مرتبہ صرف مجھے یاد کیا گیا تھا۔ صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس دفعہ کچھ ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات جو ہمارے لیے بالکل ناقابل قبول ہو گی۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

صفدر نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ آپ لڑکی کی رہائی کے لیے کوشش کریں اور اس کا نتیجہ توقع کے خلاف نکلے۔ میرا مطلب ہے، آپ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ ہم دونوں ساتھ ہوں گے تو ہر مسئلے سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے کہا "یار! تم بے فکر رہو۔ میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا جس کی وجہ سے مصیبت دُم ہلانے لگے۔ جہاں تک ساتھ لے جانے کی بات ہے۔ میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اگر سردار رابل۔۔۔"

"سردار رابل کی حیثیت صرف ہامبرکی ہے۔" میں نے صفدر کی بات کاٹی "جو حکم اسے دیوار کے پار سے ملتا ہے وہ ہم تک پہنچا دیتا ہے۔"

زریں گل بولا "لیکن استاد صیب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ام کو اندھیرے میں رکھا جا رہا ہو۔ امارا مطلب ہے کہ آپ کی گولی سے قبیلے کا ایک اہم ترین سردار ہلاک ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو۔۔۔ خدانخواستہ سزا دینے کے لیے لے

جایا جا رہا ہو۔"

میں نے کہا "جہاں تک میری معلومات ہیں' کسی کو سزا دینے کے لیے دیوار کے پار نہیں لے جایا جاتا۔ ایسے کاموں کے لیے سردار رائیل ہی مقرر ہے۔"

ناشا بھی اپنے حشر خیز لباس میں قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ کہنے لگی "تم اپنی زبان میں بولتے چلے جاتے ہو' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے اسے بتایا کہ ہم کس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ وہ بولی "تمہاری یہ بات درست ہے۔ رائلی قبیلے میں مجرموں کو سزا دینے کا کام صرف سردار رائیل ہی کرتا ہے اور اس کے لیے ایک جگہ مخصوص ہے۔ جس دیوار کو یہ لوگ مقدس دیوار کہتے ہیں اس کے قریب بستی کی طرف ایک گہری کھائی ہے۔ یہ کھائی درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ کھائی کی تہ میں ایک آبی گزرگاہ ہے اور نوکیلی چٹانیں ہیں۔ مجرموں کو بلندی سے اس کھائی میں دھکا دے دیا جاتا ہے۔ تین دن پہلے جو چار مجرم یہاں سے لے جائے گئے تھے انہیں بھی اس کھائی میں دھکا دیا گیا تھا۔"

مجھے یاد آیا کہ جن دنوں میں رائلی قبیلے کی بستی میں مقیم تھا میں نے یہ خوفناک کھائی دیکھی تھی۔ اس وقت سامیں جالی بھی میرے ساتھ تھا۔ اس نے کھائی کے کنارے کھڑے ہو کر زور سے نعرہ لگایا تھا "بادل دھڑکا قاتل کا بادل دھڑکا۔"

صفدر زادار زریں گل کو تسلی تشفی دے کر میں سردار رائیل کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں مجھے غسل دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میری بسنتی پوشاک اور تیاری کا دیگر سامان بھی اس حمام نما کمرے میں موجود تھا۔ جادوئی خوشبو کے مرغولے ابھی سے حواس پر اثر کرنے لگے تھے۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح میرے سر اور چہرے کے بال بھی کئی ہفتوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ ایک حجام نے ان بالوں کو خوب صورتی سے تراشا۔ میں نے ٹب نما برتن میں نیم گرم پانی میں غسل کیا۔ اس کے بعد وہ بسنتی پوشاک پہنی جس میں ہلکا سا نارنجی رنگ بھی شامل تھا۔ مجھے تیار کرنے کے لیے جو کارندے مخصوص کیے گئے تھے انہوں نے میرے جسم پر خوشبو کا چھڑکاؤ کیا۔ میرے گلے میں سفید اور گلابی پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ اس کے بعد میرے پاؤں میں چمڑے کے مخصوص جوتے پہنا دیے گئے۔ میری مکمل تیاری میں قریباً ایک گھنٹا لگا۔ اس عرصے میں میں خود کو ہوش محسوس کر رہا تھا لیکن ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا اس سے پہلے بھی دو دفعہ میں ان مراحل سے گزر چکا تھا۔ وہ یہ ہے ذرا پہلے مجھے سجائی

گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا اور رائلی قبیلے کی بستی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ وہ کاہن نما شخص میرے ساتھ تھا جس کے ہاتھ میں انسانی ران کی ہڈی رہتی تھی اور جو ہر وقت منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ سردار رائیل اور دو بھی گاڑی میں سوار تھے۔ وادی سے نکلنے کے لیے ہم نے رسیوں والا پل استعمال کیا۔ یہ پل اب شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ پل کی دونوں جانب رائلی قبیلے کے مسلح پہرے دار اور رائفل بردار جوان پہرا دے رہے تھے۔ یہی وہ جگہ تھا جہاں چند ہفتے پہلے رائلی قبیلے اور وادی والوں کے درمیان کشتیوں میں ایک خون ریز لڑائی ہوئی تھی۔ اس پل کے ساتھ اب جو نیا پل تعمیر کیا جا رہا تھا اس کا نصف کام ہو چکا تھا۔

پیالہ نما وادی سے نکل کر ہماری گھوڑا گاڑی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ بیشتر راستہ چڑھائی کا تھا۔ ہم ان بلندیوں کی طرف جا رہے تھے جہاں مقدس دیوار تھی اور پردہ نشین تھا جسے یہ لوگ سنہری روشنی قرار دیتے تھے اور کبھی سانوس یعنی سنہری عقاب کے نام سے بھی پکارتے تھے۔

میں اپنے رگ و پے میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیوں یہ بات میرے دماغ میں بھی آ رہی تھی کہ اس دفعہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس دفعہ بھی پردہ نشین سے ہونے والی ملاقات غیر معمولی ثابت ہو۔ میں نہیں جانتا ذہن سے یہ بات کیوں چپک گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے غیر متوقع طور پر بلایا گیا تھا۔ سردار رائیل سمیت رائلی قبیلے کا ہر فرد میرے بلاوے کو خصوصی اہمیت دے رہا تھا۔ میری طرف دیکھنے والی ہر آنکھ میں ایک انجانی کشش نظر آتی تھی۔ زریں کا یہ فقرہ گاہے گاہے میرے کانوں میں گونجنے لگتا تھا "استاد صیب! آپ کی گولی سے قبیلے کا ایک اہم سردار ہلاک ہوا ہے' کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو اسی جرم کی سزا کے لیے وہاں لے جایا جا رہا ہو۔"

زریں نے اپنے ایک خدشے کا اظہار کیا تھا۔ بے شک یہ موہوم خدشہ تھا لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ذہن میں عجیب عجیب خیال سر اٹھانے لگے۔ کہیں میں اس دیوار کے پار جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنوں سے دور تو نہیں ہو جاؤں گا۔ صفدر سے' زریں گل سے' شفقت سے' ساہی صاحب سے اور ۔۔۔ غزال سے۔ غزال کے تصور کے ساتھ ہی ذہن کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ غزال مجھ سے لامحدود فاصلوں پر تھی۔ درمیانی فاصلے کے لحاظ سے بھی اور حالات کے اعتبار سے بھی لیکن اس کا دل میرے دل

کے قریب دھڑکتا تھا۔ میں اس کی سانسوں کی آہٹ اپنے آس پاس محسوس کرتا تھا۔ وہ پل پل میرے ساتھ جیتی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے تصور میں لانے کی کوشش کی تو وہ ذرا میری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو گئی۔ وہی جسم' وہی ہونٹ' وہی آنکھیں جن میں ہمیشہ مجھے ایک پیاسا صحرا نظر آیا تھا۔

قریباً پینتیس میل کا فاصلہ پانچ چھ گھنٹے میں طے کر کے ہم رائلی قبیلے کی رہائش گاہ میں پہنچ گئے۔ بستی کے وسط سے گزر کر ہم سردار رائیل کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ وہاں ہم نے قریباً ایک گھنٹا آرام کیا اور قہوہ وغیرہ پیا۔ شام کے سائے اب تیزی سے پھیلنے لگے تھے۔ اب ہمارے سفر کا آخری مرحلہ رہ گیا تھا۔ ایک مختصر جلوس کے ساتھ مجھے اس پتھریلی فصیل کی طرف روانہ کیا گیا جسے یہ لوگ مقدس دیوار کہتے تھے۔ مختصر جلوس میں تاشے نفیریاں بجانے والے چند مقامی افراد تھے۔ راہب نما شخص تھا' سردار رائیل تھا اور چند مسلح محافظ تھے۔ تاشوں اور نفیریوں سے ابھرنے والی موسیقی اپنی طرز کی انوکھی موسیقی تھی۔ اس موسیقی میں بلند پہاڑوں کے درختوں سے گزرنے والی مخمور ہوا کی سیٹیاں تھیں اور ان ادنٹوں کی آہٹ بھی جو سنسان جھیلوں پر مسلسل کرتی ہیں۔ پتھریلی دیوار پر پھر مجھے اسی سنہری عقاب کی جھلک دکھائی دی جو میں نے اپنی آمد کے دوسرے روز اس دیوار پر دیکھا تھا۔ شام کے دھندلکے میں لپٹا ہوا وہ پرندہ کبھی وہم اور کبھی حقیقت نظر آتا تھا پھر اس کی طویل چیخ فضاؤں میں گونجی اور وہ اپنے غیر معمولی طویل پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہوا دیوار کے عقب میں اوجھل ہو گیا۔

مجھے پتھریلی دیوار تک پہنچا کر جلوس واپس لوٹ گیا۔ میں اندر کھلنے والے راستے سے اندر داخل ہوا اور اسی جنت نظیر گوشے میں پہنچ گیا جہاں ہر شے کسی حسین خواب میں بسا نظر آتی تھی۔ باقی کے تجربات حسب سابق تھے۔ منڈے ہوئے سر والا سفید پوش مجھے اس کھوہ میں لے گیا جو شیشے کی طرح چمکتی دمکتی تھی۔ یہاں آسودہ چہروں اور پرسکون آنکھوں والے سفید پوش مرد و زن پریوں کی زادوں کی طرح گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کہیں مصوری ہو رہی تھی' کہیں موسیقی' کہیں رنگوں کو لانے کے مناظر تھے۔ کہیں خوبرو لوگ ٹولیوں کی صورت بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ ایک جگہ درمیانی عمر کے کچھ لوگ بچوں کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ایک آٹھ سالہ بچی آنکھوں پر پٹی باندھے بلی کی طرح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چل رہی تھی اور منہ سے بلی کی

آواز نکال رہی تھی۔ کچھ بچے چوہوں کی طرح پھدک رہے تھے اور اس بلی لڑکی کی پکڑ سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی قلقاریوں سے کھوہ کا وہ حصہ گونج رہا تھا۔ دیکھنے والے تالیاں بجا رہے تھے۔ میں ان خوش باش لوگوں میں نائیلہ اور سوزن کے چہرے تلاش کرتا رہا لیکن ناکامی ہوئی۔ چمکتی دمکتی کھوہ میں بلوری شمع دان روشن ہونے شروع ہو گئے تھے اور ان کی کرنیں شفاف پتھروں پر منعکس ہو رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا "خوبرو پردہ نشین" جان توڑ محنت و مشقت کا پرچار کرتا ہے اور جسمانی تکالیف کو ہی خوشیوں کی بنیاد قرار دیتا ہے لیکن یہاں تو کہیں جان توڑ محنت مشقت نظر نہیں آتی تھی۔ ہر طرف آرام اور سکون کے ڈیرے تھے۔ فراغت ہی فراغت تھی۔ آخر کہاں تھے وہ جفاکش لوگ جو ہر روز پانی پینے کے لیے کنواں کھودتے تھے۔

حسب سابق مجھے اس کمرے میں پہنچایا گیا جہاں مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ خشک میوے کی رکابیاں میرے سامنے آئیں اور وہ گلابی محلول بھی جو تقویت میں اپنی مثال آپ تھا۔ دستور کے مطابق میں نے پھل چکھا اور تھوڑا سا مشروب پیا۔ میرا خیال تھا کہ مشروب کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں لہٰذا میں نے جان بوجھ کر صرف چند گھونٹ لیے تھے۔ اب وہ مرحلہ درپیش تھا جس کا تصور ہی سینے میں زلزلے جگا دیتا تھا۔ مجھے خوب صورت دوشیزہ کی معیت میں اس پراسرار ریشمی کمرے میں پہنچنا تھا جہاں پردہ نشین براجمان تھا۔ متبسم دوشیزہ اندر داخل ہوئی اور میں اس کے ہاتھ کا اشارہ سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ایک بلند و بالا محرابی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ میں بھاری بھرکم مخملی پردہ اٹھا کر ریشمی کمرے میں چلا گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ملاقاتی کے سوا اور کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوشیزہ واپس جا چکی تھی۔ میں نشست پر بیٹھ گیا اور اس چھوٹے سے ریشمی خیمے کی طرف دیکھنے لگا جس میں پراسرار ہیولا ساکت بیٹھا نظر آتا تھا۔ کمرے میں وہی خاموشی طاری تھی جس میں سانسوں کی سرسراہٹ اور دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی محسوس ہوتی تھی۔ دھیرے دھیرے ریشمی خیمے کے اندر سنہری روشنی نمودار ہونے لگی۔ جسمی' گاؤ تکیہ' ہیولا سب کچھ واضح ہونے لگا پھر پردہ نشین کی آواز کمرے کی بلند چھت کے نیچے گونجی "خوش آمدید۔"

"شکریہ محترم!" میں نے جواب دیا۔

بغیر کسی تمہید کے پوچھا گیا "کیا تمہیں معلوم تھا کہ تم

کس شخص کو قتل کر رہے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں محترم؟"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ سارقا ایک بڑا سردار ہی نہیں میرا مقرب بھی ہے؟"

(اس سوال کا جواب ہاں میں تھا کیونکہ جب میں نے سارقا پر گولی چلائی تھی اس وقت مجھے مترجم دانیال کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سردار سارقا "مقدس روشنی" کی پسندیدہ شخصیت ہے بلکہ "مقدس روشنی" کے نزدیک شاید وہ سردار رابل سے بھی اہم شخص ہے) میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا اور "پردہ نشین" کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "یہ درست ہے جناب۔ مجھے مترجم نے بتایا تھا کہ سارقا تمام سردار ہے اور مقدس روشنی اسے اہمیت دیتی ہے۔"

"اس کے باوجود تم نے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ تم نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ قبیلے کی بیشتر آبادی تمہاری پرستار ہے۔ لوگ اپنی گفتگو میں تمہاری تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ جب تم نے کے ایک سردار کو گولی سے اڑاؤ گے تو ان کے دوستانہ جذبات کا کیا ہوگا' وہ تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

میں نے کہا "محترم! میں اہل قبیلہ کے جذبات کی دل وجان سے قدر کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا..... لیکن محترم جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا وہ میرے لیے اس قدر ناقابل برداشت تھا کہ میں کسی دوسری سوچ کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دے سکا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب کچھ آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا جو اس روز وہاں جنگل میں ہونے والا تھا۔ سردار سارقا نے درجنوں افراد کے سامنے لڑکی کی "ذلت" کا تماشا لگانے کا اعلان کیا تھا۔"

بیضوی کمرے میں اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ ایک ناقابل بیان سنسنی میرے رگ وپے میں گردش کرنے لگی۔ جوں جوں یہ خاموشی طویل ہو رہی تھی' میری بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اس خاموشی کو توڑنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے معلوم تھا جناب' میں ایک ایسا کام کر رہا ہوں جو میرے لیے بھی ناپسندیدہ ہے لیکن میں صورت حال سے مجبور تھا۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو شاید اپنی ہی نظروں میں گر جاتا۔"

اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ پردہ نشین نے کہا "تمہارا یہ اقدام ہمارے لیے بھی ناپسندیدہ ہے لیکن..... جس طرح تم نے اسے ضروری قرار دیا' ہم بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اطمینان ہے کہ تم نے ایک موزوں وقت پر ایک درست فیصلہ کیا اور ہر مصلحت کو ایک طرف رکھ کر ایک ایسی لڑکی کو ذلت سے بچایا جس سے دارغان کے جاتریوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔"

"بہت شکریہ محترم سانوس! مجھے توی امید تھی کہ آپ کی نگاہوں میں ناقابل معافی مجرم نہیں ٹھہروں گا۔"

"میری نظر میں تم مجرم نہیں ہو۔ تمہیں وہی کچھ چاہیے تھا جو تم نے کیا۔"

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔ اس کے بعد جو "پردہ نشین" نے کہا وہ اتنا غیر متوقع اور دھماکا خیز تھا کہ اپنی جگہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا۔ مجھے لگا سینے میں دھڑکنے والے دل کے سوا میرے جسم کا ہر حصہ بے جان ہو چکا تھا۔ پردہ نشین نے اپنی مہیب آواز میں پوچھا "کیا تم یہاں..... ہمارے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے میری گویائی چھین لی میرے جسم کو پتھر کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا اس سوال کا کیا جواب دوں۔ اس دیوار کے اندر رہنے کا مطلب جزوی موت تھا۔ اپنے آپ سے' اپنے ارد گرد اپنی دنیا سے ہمیشہ کے لیے لاتعلقی۔ ایک ایسے انجانے میں زندہ رہنے کا فیصلہ جہاں سب کچھ سنہری دھند میں چھپا ہوا تھا' جہاں معاشرت کی بنیادی قدریں تبدیل تھیں۔ چند لمحوں میں میرا رخش خیال سیکڑوں ہزاروں میل کی خاک چھان آیا۔ کیا میں خوبرو پردہ نشین کے سوال کا جواب "ہاں" میں دے کر دوبارہ اپنی دنیا کو دیکھ سکوں گا؟ دوبارہ اپنے لوگوں سے مل سکوں گا؟ یہ سوال برچھی کی طرح میرے دماغ کو چھید رہا تھا۔ کہیں میں کسی ایسے طلسم میں گرفتار نہیں ہو جاؤں گا جسے توڑنا میرے بس میں نہ ہو۔ کوئی ایسا جال جو میری پوری زندگی کو جکڑ لے۔ میری سمجھ میں آئی کہ پردہ نشین کے سوال کا جواب نفی میں دے دوں۔ اس سے کہہ دوں کہ میں واپس جانا چاہتا ہوں لیکن نہ جانے معلوم کیا ہوا؟ یقین کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی پورے جسم میں توانائی بن کر دوڑ گئی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "ہاں محترم سانوس! میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔"

ریشمی خیمے کے اندر خوبرو پردہ نشین کے چہرے پر چمک نمودار ہو گئی۔ ایک ایسا تبسم جو میں اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ پردے کے اندر سے وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ "پردہ پوش" تھی پھر بھی میرے کانوں میں ایک رس گھولنے والی سرگوشی سی ابھر رہی تھی۔

سے آر پار ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "محترم سانوس! میں یہاں رہنا چاہتا ہوں لیکن یہاں ویسے نہیں پہنچنا چاہتا جیسے عام لوگ پہنچتے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"محترم سانوس! میں نے ان لوگوں کو تڑپتے مچلتے دیکھا ہے' آپ کی قربت حاصل کرنے کے لیے انہیں جنون میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو۔ میں آپ سے دور جانا نہیں چاہتا۔ آپ بس مجھے ابھی سے اپنے پاس رہنے کا اعزاز بخش دیں....."

"لیکن پاس آنے کے لیے دور جانا ضروری ہے۔"

"کیا آپ چاہیں بھی تو اس طریقہ کار کو بدل نہیں سکتے؟"

گفتگو میں چند لمحے کی خاموشی حائل ہوئی پھر آواز آئی "ہاں میں چاہوں تو یہ طریقہ کار بدل سکتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ مسہری کے گرد تنے ہوئے ریشمی خیمے میں روشنی کچھ تیز ہو گئی تھی یا شاید یہ صرف میرا خیال تھا۔

پھر کیا ہوا۔ مجھے کچھ بھی ٹھیک سے یاد نہیں۔ نہ ہی اس بارے میں اعتماد کے ساتھ کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یقیناً میں ایک دم ہی کسی اتھاہ تاریکی میں گھر گیا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک آرام دہ کمرے میں پایا۔ اس کمرے کی دیواریں صاف شفاف اور سبزی مائل پتھر کی تھیں۔ اس پتھر میں ہلکی سفید اور قرمزی دھاریاں تھیں۔ یہ بالکل ہموار پتھر تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ پہلے بڑی محنت سے پہاڑ کو تراش کر یہ کمرا بنایا گیا ہے پھر اس کی دیواروں' چھت اور فرش کو رگڑ رگڑ کر انڈے کی طرح ملائم اور چمکدار کیا گیا ہے۔ خاص طور سے دیواریں اتنی شفاف تھیں کہ ان میں کافوری شمعوں کی روشنی صاف منعکس ہو رہی تھی۔ میں ان دیواروں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ میں ابھی تک "خوبرو پردہ نشین" کی چھوٹی سی "جنت نظیر" دنیا میں ہوں۔ میں ایک صاف ستھرے بستر پر تھا۔ یہ سفید بستر زیادہ سخت تھا اور نہ زیادہ نرم۔ لکڑی کی ایک طویل نشست اور بستر کے سوا کمرے میں کوئی فرنیچر قسم کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے سرہانے کی طرف ایک الماری میں چند خوب صورت برتن رکھے تھے۔ میں نے محسوس کیا' فضا میں ایک خوش گوار حرارت رچی بسی ہے۔ سب سے پہلے میں نے اپنا کرنٹل کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سر پر کوئی وزنی چیز مار کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا لیکن سر یا گردن پر ایسے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ میں نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔ شاید میں اچانک کسی گہرائی میں گر گیا تھا لیکن اگر گرا ہوتا تو جسم پر چوٹیں آئی ہوتیں۔ جو گلابی دودھ جیسا مشروب میں نے پیا تھا' اس میں ایک خاص قسم کا سرور تھا لیکن یہ مشروب تو میں اس سے پہلے بھی دو دفعہ پی چکا تھا پھر کیا بات تھی کہ میں اچانک اپنے ہوش وحواس میں نہیں رہا تھا اور اب کافی دیر بعد میری آنکھ اس کمرے میں کھلی تھی۔ میں نے "کافی دیر" اس لیے کہا کہ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ جس وقت میں بیضوی کمرے میں پردہ نشین کے روبرو بیٹھا تھا تو میں شکم سیر تھا..... یہی وقت تھا جب میں نے پہلی بار اپنا لباس غور سے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میں بسنتی چغے کے بجائے سفید براق لباس میں تھا۔ وہی لباس جو اس "کیمونٹی" کے لوگ پہنتے تھے۔ میرے ذہن نے چیخ کر کہا "شاہ جہاں! تم ان منفرد لوگوں میں شامل ہو چکے ہو جو مقدس دیوار کے پیچھے "خوبرو پردہ نشین" کے زیر سایہ زندہ ہیں۔"

یہ انکشاف اتنا سنسنی خیز تھا کہ میں بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے خود کو ٹٹول کر جیسے یہ یقین کرنے کی کوشش کی کہ یہ میں "خود" ہی ہوں۔ خود کو ٹٹولنے کے بعد میرے ذہن نے جو دوسرا ردعمل ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ میرے قدم خود بخود دروازے کی طرف بڑھے۔ اخروٹ کی لکڑی کا نہایت خوب صورت دروازہ مقفل تھا۔ میں نے اپنی "پشتو دانی" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پکار کر کہا "کوئی ہے..... کوئی ہے؟"

چند لمحے بعد "کلک" کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور میں نے سترہ اٹھارہ سال کے ایک برخوردار لڑکے کو اپنے سامنے پایا۔ اس کے جسم پر سفید براق لباس تھا اور چہرے پر اجلی سی روشنی تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے بتایا کہ میں اس کے پیچھے آؤں۔ میں نے نرم چمڑے کے صاف ستھرے جوتے پہنے اور لڑکے کے پیچھے چل دیا۔ لباس کی طرح جوتے بھی بالکل میرے سائز کے تھے۔ جوتوں کا تلوا نرم تھا لہٰذا چکنے فرش پر کوئی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ راہداری میں فانوس اور شمع دان روشن تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت رات ہوگی۔ کھوہ میں ہر وقت رات کا سماں رہتا تھا۔ ہم گہرائی میں اتر رہے تھے۔ ایک جگہ پتھر سے تراشی ہوئی سیڑھیاں نظر آئیں۔ سیڑھیاں اتر کر ہم کھوہ کے ایک زیریں حصے میں پہنچ گئے۔ ایک درمیانے سائز کے نہایت نفیس کمرے میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص بیٹھا نظر آیا۔ وہ نمدے پر آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ اس کے سامنے سنگ

مرمری ایک چوکی تھی۔ اس چوکی پر کچھ کاغذات تھے اور وہ ان پر اندراج کر رہا تھا۔ یہ شخص سفید فام تھا۔ چھوٹی چھوٹی سنہری داڑھی اس کے خوبرو چہرے پر سج رہی تھی اور نیلی آنکھوں میں بڑی دلنشیں مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھے شستہ انگریزی میں مخاطب کیا "ہیلو شاہا! میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہماری اس کمیونٹی میں آپ کو اپنا پہلا دن مبارک ہو۔"

داڑھی والے شخص کی آواز کمرے میں گونجتی محسوس ہوئی۔ اس کا لہجہ اس کی صورت سے بھی زیادہ نرم تھا۔ وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا "میرا نام گرے ہے۔ شاید آپ حیران ہو رہے ہیں کہ یہ گرے کیا نام ہوا۔ دراصل میرا پورا نام گریگری فورڈ ہے لیکن ہماری اس کمیونٹی کی روایت کے مطابق ناموں کو مختصر اور آسان کر دیا جاتا ہے' بالکل جیسے اب آپ کا نام شاہ جہاں کے بجائے شاہا ہے۔ آج سے آپ کو اسی نام سے پکارا اور لکھا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے اس مختصر نام کو پسند کریں گے۔"

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ واقعی مجھے اپنے نام کا مخفف اچھا لگا تھا۔ گرے نے اپنا تعارف جاری رکھتے ہوئے کہا "یہاں میری حیثیت کو سمجھنے کے لیے آپ اپنے ذہن میں لیبر انچارج کا تصور لا سکتے ہیں۔ یہاں کے مکینوں کو ضرورت کے مطابق مختلف کاموں پر لگانا اور ان کی رہنمائی کرنا میری ذمے داری ہے۔ یہ کام بہت آسان ہے۔ اتنا آسان کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں لیبر کو کنٹرول کرنے کا تصور ہی موجود نہیں۔ جس شخص کے ذمے جو کام لگایا جاتا ہے وہ پوری تندہی اور جانفشانی سے انجام دیتا ہے۔ یہاں ورکنگ ٹائم دس گھنٹے ہیں۔ ان دس گھنٹوں کا ہر سیکنڈ صرف اور صرف کام کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقفہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں کھانا صرف صبح اور شام کے اوقات میں کھایا جاتا ہے۔ ورکنگ ٹائم کی اہمیت ہمارے ہاں بہت زیادہ ہے۔ اگر کسی شخص کے ورکنگ ٹائم میں سے کچھ وقت ضائع ہو جائے تو اسے اتنا ہی دکھ ہوتا ہے جتنا کسی نہایت قیمتی شے کے کھو جانے سے ہو سکتا ہے۔ یہاں مشقت کو عبادت کا سا تقدس دیا جاتا ہے۔"

"کیا یہاں ہر شخص کام کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں آٹھ سال کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے تک ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق کام کرتا ہے اور اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ یہاں بچے کو صرف اتنی ہی تعلیم دی جاتی ہے جتنی ایک سادہ زندگی گزارنے کے لیے اسے درکار ہوتی ہے۔ درحقیقت زندگی ہمارے ہاں سادہ ترین اور خالص ترین شکل میں موجود ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھ نہیں پا رہا۔ آٹھ سال کا بچہ یا سو سال کا بوڑھا کیا مشقت کر سکتا ہے۔"

گرے نامی دراز شخص ایک بار پھر دلنشین انداز میں مسکرایا "آپ کے ذہن میں ابھی بہت سے سوال اٹھیں گے دھیرے دھیرے ان سب سوالوں کا جواب آپ کو از خود مل جائے گا۔"

"کیا مجھے بھی کوئی کام سونپنے کے لیے بلایا گیا ہے؟"

"کیا آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ کوئی کام کریں؟"

میں نے کہا "جب یہاں سب لوگ کام کرتے ہیں تو میں کیوں نہیں کروں گا۔"

وہ محبت سے بولا "آپ کریں گے' ضرور کریں گے لیکن ابھی دو تین دن آپ فارغ ہیں۔ اس دوران آپ ہماری اس چھوٹی سی دنیا میں گھوم پھر کر دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی گرے نے سنگ مرمر کی چوکی کو دستک دینے والے انداز میں تھپتھپایا۔ یہ آواز سن کر ایک نہایت خوبرو لڑکی نمودار ہو گئی۔ [illegible] سفید لباس لڑکی میں اس کے جسم کے خدوخال میری نگاہ سے اوجھل تھے۔ اس کے چہرے کی رعنائی بتا رہی تھی کہ چہرے کی طرح اس کا جسم بھی بے مثال ہے۔ وہ سفید فام نہیں تھی' نہ ہی [illegible] لگتی تھی۔ شاید ملی جلی نسل ہو۔ میں اس کی قومیت کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکا۔ گرے نے کہا "یہ ہیں ہمارے نئے ساتھی شاہا۔ آپ ان کو اپنے ساتھ لے جائیں اور اچھی طرح گھمائیں پھرائیں۔"

"جو حکم محترم گرے۔" خوش قامت لڑکی نے مرحبا کہا پھر وہ مسکراتی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کی نگاہ کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔

ہم دونوں آگے پیچھے باہر نکل آئے۔ ہم دہانے کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے کھوہ گہرائی میں اتر رہی تھی۔ در و دیوار شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔ کہیں کہیں وہ بلوری قلمیں بھی نظر آ رہی تھیں جو گہرے غاروں کی چھتوں سے نکل آتی ہیں۔ دیکھنے میں یہ برف یا برف کی قلمیں لگتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ دراصل معدنیات ہوتی ہیں جو بے پناہ چٹانی دباؤ کے سبب قلموں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ کہیں کہیں ان رنگ دار قلموں کا نظارہ بے حد خوب صورت تھا۔ راستے میں سفید پوش مرد و زن بھی تھے

سب اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ لڑکی جو میری گائیڈ کے فرائض انجام دے رہی تھی' مترنم آواز میں بولی "اب ہم رہائشی حصے سے نکل آئے ہیں اور اس حصے میں داخل ہو رہے ہیں جہاں روزمرہ کے فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔"

میں نے نوٹ کیا کہ اب مجھے ایسے مرد و زن بھی دکھائی دے رہے تھے جنہوں نے سفید پوشاکوں کے بجائے خاکستری لباس پہن رکھے تھے۔ میں نے کہا "تو! یہ کیا لباس ہے؟"

وہ بولی "یہ کام کا لباس ہے جناب!"

"اور سفید لباس؟"

"وہ آرام کا لباس ہے۔" وہ مسکرائی۔

مجھے کھوہ کے اندر بھی ایک چشمہ نظر آیا۔ یہاں دھوبی گھاٹ کا سا ماحول تھا۔ تقریباً چالیس عدد مرد و زن یہاں موجود تھے اور کپڑے دھو رہے تھے۔ ان میں سفید و خاکستری پوشاکیں بھی شامل تھیں۔ میں نے یہاں دھلی ہوئی اور ان دھلی پوشاکوں کے بلند و بالا ڈھیر دیکھے۔ آگے گئے تو ایک وسیع و عریض مطبخ دکھائی دیا۔ یہاں کھانا پکانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ بے داغ کپڑوں میں ملبوس کچھ لوگ سبزیاں کاٹ رہے تھے اور گوشت وغیرہ صاف کر رہے تھے۔ ہر کام تندہی اور سلیقے سے انجام دیا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے کھٹا کھٹ کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ یہ آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہاں بہت سی دستی کھڈیاں تھیں جن پر اونی اور سوتی کپڑا بنا جاتا تھا۔ ہم کھوہ میں جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے گہرائی میں اتر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کھوہ تحت الثریٰ تک جا پہنچتی ہے۔ یہ شاخ در شاخ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ شاخیں تنگ تھیں اور کچھ کشادہ۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کسی جسم کی شریانیں ہیں۔ ان شریانوں میں ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی' انتہائی عجیب و غریب اور منظم۔ اگلے دو ڈھائی گھنٹے میں میں نے اس زیرِ زمین شہر کے بیشتر خدوخال دیکھ لیے۔ ہر لمحہ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ یہ ایک مکمل نظام معاشرت تھا۔ یہاں اناج ذخیرہ کرنے کے لیے گودام تھے۔ پانی صاف کرنے اور نتھارنے کے لیے تالاب تھے۔ دستکاری کے چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے۔ کپڑے سینے اور جوتے تیار کرنے کے مرکز تھے۔ اناج پیسنے کی چکیاں تھیں۔ ہر جگہ آلات کا ذریعہ انسان خود تھا یا بیل گھوڑے اور خچر وغیرہ تھے۔ آٹا پیسنے کی جو بہت بڑی چکی میں نے دیکھی اسے تین بیل گھما رہے تھے۔ ان بیلوں کو حرکت میں رکھنے کے لیے ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ وہ گاہے گاہے بیلوں کو چھڑی سے ٹھوکا دیتا تھا۔ اس کا منہ سر آٹے کی دھول میں اٹا تھا۔ دو نوعمر لڑکے اس کے معاون تھے۔ اس چکی سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر دو کولہو تھے۔ یہاں بیجوں سے روغن نکالنے کا کام ہو رہا تھا۔ پاس ہی کچھ چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے۔ یہاں لکڑی اور پتھر پر آرائش کا کام کیا جا رہا تھا۔ غرض سیکڑوں مرد و زن تھے جو اپنے اپنے کام بے پناہ ذمے داری اور تندہی سے انجام دے رہے تھے۔ لوہار' ترکھان' کمہار' موچی' معمار' سنگ تراش' یہ سب لوگ یہاں موجود تھے اور محنت کی عظمت پر یقین رکھنے کے عملی ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک سادہ لیکن آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے تمام لوازمات اس جگہ موجود تھے۔

پھر میرا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں کھوہ کے قابل استعمال حصے کو وسعت دینے کا کام جاری تھا۔ میں نے مرد و زن کو پتھر توڑتے' بوجھ کھینچتے اور تراش خراش کرتے دیکھا۔ کام سے ان کی لگن اور دلچسپی غیر معمولی تھی۔ ان میں کچھ ہانپ رہے تھے' کچھ بے حد تھکے ہوئے تھے لیکن بیزاری کسی کے چہرے پر نہیں تھی۔ کوئی نشہ سا تھا ان کی آنکھوں میں۔ شاید یہ محنت کا نشہ تھا۔

یہ شک گزرتا تھا کہ یہ کھوہ کبھی ختم نہیں ہوگی اور گہرائی میں اترتے اترتے زمین کے قلب میں جا گھسے گی۔ ہم کچھ آگے جا کر پلٹ آئے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم تقریباً دو تین سو فٹ اوپر آنے کے بعد کھوہ کے ایک بغلی راستے سے گزرے اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر باہر آ گئے۔ یہاں مجھے دور تک کھیت اور باغ نظر آئے۔ کہیں کہیں خوب صورت پہاڑی ڈھلوانوں پر بھیڑ بکریوں کے گلے بھی گھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ اپنے حال میں مگن تھے۔ ان میں جو چستی اور تیزی دکھائی دے رہی تھی وہ بناوٹی ہرگز نہیں تھی۔ یہ ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ میری گائیڈ لڑکی نے مجھے بتایا کہ یہاں کام کے اوقات عموماً صبح سورج نکلنے سے چار بجے تک ہوتے ہیں۔ وقفہ کوئی نہیں ہوتا۔ سورج چار بجے کے بعد چھٹی ہو جاتی ہے۔ لوگ آرام کرتے ہیں یا تفریحات میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر ماہ دو ناغے ہوتے ہیں۔ ایک مہینے کے شروع میں دوسرا وسط میں۔ اصل تفریحات چھٹی کے ان دونوں میں ہی ہوتی ہیں۔ واپسی پر ہم ایسے راستے سے گزرے جہاں تفریحات کا انتظام تھا۔ حمام تھے' نیم گرم پانی کے تالاب تھے' کھیل کے ان ڈور میدان تھے۔

میں خوبرو گائیڈ کے ساتھ سہ پہر تک گھومنے کے بعد اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔ میں قدرے تھک گیا تھا لیکن گائیڈ

اسی طرح ہشاش بشاش نظر آتی تھی۔ شام کو کھانا جلدی کھالیا جاتا تھا۔ ہم نے بھی کھایا۔ یہاں ملازم یا خادم کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔ ہر شخص کو چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنا کام خود ہی کرنا ہوتا تھا۔ کھوہ میں ایک مقام پر دو بڑے بڑے "ہال" تھے۔ یہ طعام گاہیں تھیں اور مطبخ سے منسلک تھیں۔ ہر شخص مطبخ سے اپنا کھانا خود لاتا تھا اور ہال میں لکڑی کی نشستوں پر بیٹھ کر کھاتا تھا۔ ماحول بے حد صاف ستھرا اور لوگوں کا رویہ شائستہ تھا۔ کہیں دھکم پیل یا ابتری کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کام کا وقت ختم ہوتے ہی سب لوگوں نے صاف ستھرے سفید لباس زیب تن کر لیے تھے۔ ان کے چہروں پر چمک اور آنکھوں میں نشہ سا تھا۔ شاید یہ اس راحت کا نشہ تھا جو جان جوکھم میں ڈالنے کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہے یا پھر ان کے مزاج ہی ایک خاص سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ایک بے خودی اور سرشاری کی سی کیفیت ہر وقت ان پر طاری رہتی تھی۔ میری گائیڈ لو میرے ساتھ تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانے لگی۔ اب وہ بھی سفید لباس میں دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً وہ اس گرم چشمے کے پانی میں نہائی بھی تھی جو ہم نے کھوہ کے اندرونی حصے میں دیکھا تھا۔ وہ بہت کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے لو سے اس کا حدود اربعہ دریافت کرنا چاہا لیکن وہ ماضی کے سلسلے میں کوئی بھی بات کرنے سے انکاری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مقدس روشنی کی پیروکار ہے اور بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بہت نازک اندام لڑکی تھی۔ اس کی جلد اتنی شفاف تھی کہ شیشے کا گمان ہوتا تھا۔ کھانے میں سبزی کے علاوہ روٹی تھی اور مختلف پھل تھے۔ تازہ بھی اور خشک بھی۔ ایک لذیذ کھانے کے بارے میں لو نے مجھے بتایا کہ یہ اخروٹ کا حلوا ہے۔ کھانا سادہ تھا لیکن یہ ایسی سادگی تھی جس میں ذائقہ بھی تھا۔ یہاں استعمال ہونے والے زیادہ تر برتن دھات یا لکڑی کے تھے۔ تاہم پتھر کے برتن بھی استعمال ہوتے تھے۔ جن پیالوں میں ہم نے قہوہ پیا وہ پتھر ہی سے تراشے گئے تھے۔ کھانے کے دونوں کمروں میں بیک وقت قریباً تین سو افراد نے کھانا کھایا۔ ایسی ہی تین شفٹیں ہوئیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کھوہ میں کم و بیش ایک ہزار افراد موجود ہیں۔ ان میں عورتیں، بچے، بوڑھے سب شامل تھے۔ یہیں پر مجھے ایک اہم کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ میں نے نائلہ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہی نائلہ جو منشر منصور کی منکوحہ تھی اور پھر بیوہ بن کر اس دور دراز قبیلے میں پہنچی تھی اور اس مقدس دیوار کے پار چلی آئی تھی۔ وہ طعام گاہ میں بیٹھی تھی۔

اس نے لانبے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ سفید لباس میں کوئی آسمانی مخلوق ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک [illegible] تھا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے غور [illegible] مجھے نائلہ کی گود میں تین چار سال کا پیارا سا بچہ بھی نظر [illegible] میں حیرت سے اس مختصر فیملی کو دیکھتا رہا پھر میں نے اپنی [illegible] سے حرکت کی اور ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لوگ کھانا کر چکے تھے اور اب خوشبودار قہوے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

"ہیلو نائلہ۔" میں نے کہا۔

وہ خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ حسب [illegible] وہ مجھے پہچان نہیں سکی تھی۔ لو بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس [illegible] میرا تعارف کراتے ہوئے نائلہ اور اس کے ساتھی کو بتایا "شاہ ہیں۔ یہ حال ہی میں ہمارے ساتھی بنے ہیں۔ آج [illegible] ان کا پہلا دن تھا۔"

ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے نائلہ سے [illegible]

"آپ کیسی ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بولی تو اس کے اندر سے [illegible] پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے [illegible] تھی "یہ میرے ساتھی ہیں۔ ان کا نام راج ہے۔"

"اور آپ کا اپنا نام؟" میں نے پوچھا۔

"نائے۔" اس نے روانی میں جواب دیا "یہ ہمارا [illegible] ہے۔ ہم نے اس کا نام ابھی تجویز نہیں کیا۔"

نائلہ کا ساتھی مرد راج پاکستانی یا ہندوستانی باشندہ [illegible] تھا۔ اس کا نام شاید راجندر یا معراج وغیرہ ہوگا۔ وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ میں نے نائلہ یعنی نائے سے پوچھا "یہ پاکستانی ہیں؟"

وہ بولا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں دوست۔ یہاں ہمارا تعلق صرف اور صرف اپنی کیمونٹی سے ہے۔ ہم دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں یہاں صرف مقدس روشنی کے پیروکار ہیں۔"

ایسی ہی بات اس سے پہلے لو نے بھی کہی تھی۔ میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ مجھے نائلہ کے چہرے پر عجیب سی بے خبری نظر آئی۔ جیسے وہ اپنے ماضی قریب اور بعید کو بالکل فراموش کر چکی ہو۔ اسے یاد ہی نہ ہو کہ چند ماہ پہلے تک وہ ایک شادی شدہ عورت تھی اور اپنے "وڈیو" شوہر کے ساتھ گلگت سے روانہ ہوئی تھی۔

میں نے کہا "محترم نائے! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟"

وہ بڑی روانی سے بولی "میں یہاں سلائی کڑھائی کا کام کر رہی ہوں۔ جو اونی نمدے آپ نے یہاں دیکھے ہیں ان پر پھول کاڑھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بستر کی چادروں اور پردوں وغیرہ پر بھی کشیدہ کاری ہوتی ہے۔"

"اور آپ راج؟ آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میرا کام علاج معالجے کے شعبے سے ہے۔ پہلے میں باغبانوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ان دنوں جو خاتون میرے ساتھ تھیں وہ جڑی بوٹیوں سے دوائیں تیار کرنے میں بہت مہارت رکھتی تھیں۔ ہم تین چار برس ساتھ رہے تھے لہٰذا یہ مہارت کسی حد تک مجھ میں بھی منتقل ہو گئی۔ بعد ازاں میں نے یہی کام اپنا لیا۔"

"وہ خاتون اب کہاں ہیں؟"

"مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اب باغبانی کر رہی ہیں۔ آج کل وہ کیمونٹی کے سب سے تجربہ کار باغباں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ یہ صاحب تھوڑے سے معمر ضرور ہیں لیکن بڑے پُرجوش توی ہیں اور خاتون کو بہت خوش رکھے ہوئے ہیں۔"

پھر وہ راج نامی شخص معمر باغباں اور خاتون کی باتیں دلچسپ پیرائے میں بیان کرنے لگا۔ خاتون کا نام اس نے ناشی بتایا۔

میں نے پوچھا "کیا اب آپ کی ناشی سے ملاقات ہوتی ہے؟"

"کبھی کبھی۔" وہ مسکرایا "کوئی دو ماہ پہلے ناشی نے ایک شب میرے ساتھ بسر کی تھی۔"

"ان کے "ساتھی" اس بات پر اعتراض نہیں کرتے۔"

"یہاں اس قسم کے خیالات کی گنجائش نہیں۔" راج نے کہا پھر نائلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "دیکھیں یہ خاتون آج کل میرے ساتھ ہیں لیکن یہ اپنی منشا سے کہیں بھی جا سکتی ہیں۔ کسی سے بھی مل سکتی ہیں۔ اگر یہ جانا چاہیں تو۔" وہ "تو" پر زور دے کر بولا۔

نائلہ یعنی نائے کے چہرے پر کسی طرح کا تاثر نہیں تھا۔ نجانے کیوں مجھے مسٹر راج کی باتیں زیادہ بری محسوس نہیں ہوئیں۔ شاید اس کی وجہ یہاں کا ماحول تھا۔ ہر شخص جب ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا نظر آئے تو دیکھنے والے کے اپنے دل و دماغ پر بھی بتدریج اثر ہونے لگتا ہے۔ اچھی یا بری قدریں آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھونے لگتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے راج کی باتیں ہی نہیں اس حسین غار کا ماحول بھی زیادہ برا نہیں لگا تھا یا یوں کہہ لیجئے کہ اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا لگنا چاہیے تھا۔ اس حسین و جمیل کھوہ نما غار کے اندر سب کچھ جیسے ایک سنہری خواب میں لپٹا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے مجھے اس ماحول سے انسیت سی ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے آج جی بھر کر سیر کی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور اب اپنے کمرے میں سفید براق بستر پر گر کر آرام کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

شاید میں طعام گاہ سے اٹھ کر کمرے میں چلا جاتا لیکن میری گائیڈ لو کی حنائی انگلیوں نے میرا بازو تھام لیا "آپ یہاں کی تفریحات نہیں دیکھیں گے؟" اس نے آہستگی سے کہا۔

میں انکار نہ کر سکا۔ ہم طعام گاہ سے اٹھے اور وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کھوہ فانوسوں اور شمعدانوں سے جگمگا رہی تھی۔ صندلی خوشبو در و دیوار سے پھوٹ رہی تھی اور حسین و جمیل جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے اتراتے پھرتے تھے۔ لو مجھے ایک کشادہ کمرے میں لے آئی۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا کہ اس کمرے کی دیواریں شفاف شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ صندلی قندیلیں روشنی میں جگمگاتی تھیں تو قوسِ قزح کے رنگ بکھر جاتے تھے۔ انتہائی شفاف فرش پر بہت سے جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے متحرک رہے تھے۔ جس موسیقی پر وہ متحرک رہے تھے وہ بے حد دھیمی اور سحر انگیز تھی۔ اس موسیقی میں وحشت یا ہیجان کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ایک ایسا ردھم تھا جو کسی نرم پھوار کی طرح روح میں جذب ہوتا چلا جاتا تھا۔ رقص گاہ کا تصور ذہن میں آتے ہی بھڑکیلے لباس، سجے سنورے چہرے اور بہکتے قدموں والے لوگ نگاہوں میں گھومنے لگتے ہیں لیکن یہ انوکھی رقص گاہ تھی۔ نہ کسی چہرے پر سنگھار نظر آتا تھا، نہ کہیں کوئی مخمور قہقہہ گونجتا تھا۔ سب مرد و زن ایک جیسے سفید لباس میں ملبوس تھے لیکن اس سادگی میں انتہا درجے کی تمکنت اور شان تھی۔ میں نے اس خوب صورتی اور شان کا منبع ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ خیال ہی خیال میں میں نے اس کھوہ کا موازنہ وادیٔ موت (جنی وادی دو اخان) کی کھوہ سے کیا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ وہاں وحشت، عریانی اور ہوس کے دیوتا تھے۔ یہاں سکوت، شائستگی اور محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ رقص گاہ کے ارد گرد سنگِ مرمر کی بہت سی نشستیں تھیں۔ ان نشستوں کے ساتھ میزیں تھیں۔ میزوں کے گرد مرد و زن بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک زردی مائل مشروب کے پیالے یہاں وہاں گردش کر رہے تھے۔ ملازم کوئی نہیں تھا۔ دیگر

مقامات کی طرح یہاں بھی "سیلف سروس" تھی۔ لڑکی اپنے اور میرے لیے ایک پیالہ لے آئی۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک گھونٹ لیا۔ یہ مشروب 'شراب' ہرگز نہیں تھا کیونکہ بہت خوش ذائقہ تھا۔ ہاں الکحل کی ہلکی سی بو اس میں محسوس ہوتی تھی۔ میں اور لڑکی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے اور رقص سے لطف اندوز ہونے لگے۔ رقص دیکھتے ہوئے ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ غیر محسوس طور پر میں اس ماحول کو اور یہاں کی مصروفیات کو پسند کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ تشویشناک سوچ بھی آئی کہ کہیں میرے ذہن پر کسی طرح کے اثرات تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ آخری ملاقات میں میرے ساتھ کچھ ہوگیا ہو۔ وہی ہپنا ٹیسیت جو سائنسی طور پر اپنا وجود رکھتی تھی اور جس کا ذکر داوی داخان میں ڈاکٹر ہنری نے تفصیل سے کیا تھا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس بے سروپا خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ ایک بے معنی سوچ تھی۔ میں جو کچھ کر رہا تھا، اپنی مرضی اور منشا سے کر رہا تھا۔ میں پوری طرح اپنے ہوش حواس میں تھا۔ ایک خوبرو دوشیزہ میرے قریب آئی اور اس نے مجھے رقص کی پیش کش کی۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رقص کرتے جوڑوں کے درمیان لے گئی۔ وہ ایک خوش شکل اور بھرپور عورت تھی۔ ایک ایسے پکے ہوئے پھل کی طرح جو بے حد رسیلا تھا اور کسی کے ہونٹوں تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کی بانہیں بڑی شائستگی سے میرے کندھوں پر رکھی تھیں تاہم اس کے لمس میں چھپی ہوئی گرم جوشی میں واضح طور سے محسوس کر سکتا تھا۔ رقص میں اس کے قدم بڑی مہارت سے اٹھ رہے تھے۔ رقص کے آخری مرحلے میں وہ دلنواز بے باکی سے میرے بالکل قریب آگئی۔ اس کا جسم کئی بار میرے جسم سے مس ہوا۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ پتا نہیں وہ زرد مشروب کا اثر تھا یا اس کی قربت کا جو ہم دونوں میں موجود تھی۔

"آپ میرے ساتھ کچھ وقت گزاریں گے؟" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔

"شاید میں ایسا نہ کر سکوں۔" میں نے کہا۔

"کیا میں وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" وہ مسکرائی۔

"مجھے وہ خاتون پسند آئی ہیں جن کے ساتھ میں نے آج وقت گزارا ہے۔"

"یعنی آپ کی گائیڈ؟"

"جی ہاں۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے بے ضرر جھوٹ بولا۔

"ویری نائس۔" وہ خوش دلی سے بولی "میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں حیران ہوا کہ وہ کتنی آسانی اور خندہ پیشانی سے دستبردار ہوگئی ہے۔ بدمزگی یا ملال کی جھلک بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آئی تھی۔

ہم نے اس خواب ناک ماحول میں پانچ دس منٹ بڑے دھیمے انداز میں رقص کیا پھر ایک دوسرے کا ہاتھ چوم کر اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔

لڑکی مجھے کچھ اور بھی دکھانا چاہتی تھی۔ رقص کا ایک اور راؤنڈ ختم ہوا تو وہ مجھے لے کر باہر نکل آئی۔ ہم کھوہ کے ایک ایسے کشادہ حصے سے گزرے جہاں نو عمر لڑکے اور لڑکیاں "رگبی" کی طرز کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اس جگہ چھت پر ایک بہت بڑا فانوس روشن تھا۔ میں ایک چیز دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ایک فانوس میں دودھیا برقی قمقمے جل رہے تھے۔ یہ بے حد حیران کن بات تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کھوہ میں برقی سہولت موجود تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ "برق" کہاں سے آرہی تھی۔ کیا کوئی جنریٹر سسٹم تھا یا یہ لوگ اپنے طور پر بجلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میں نے اس بارے میں لڑکی سے پوچھا۔ وہ بولی "میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری اس کمیونٹی میں کچھ ایسے لوگوں کا اضافہ ہوا ہے جو سائنسی ایجادات کے بارے میں بہت علم رکھتے ہیں اور وہ عنقریب یہاں ایسے انتظامات کر دیں گے کہ ہمیں اپنی رہائش گاہوں میں روشنی کے لیے موم اور روغن وغیرہ کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

میں نے کہا "ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں سادہ ترین انداز میں زندگی بسر کی جاتی ہے لیکن دوسری طرف آپ لوگ باہر کی دنیا میں استعمال ہونے والی ایجادات کو بھی یہاں متعارف کرا رہے ہیں۔"

وہ مسکرائی "پہلے آپ پوری بات تو سنیں۔ جو لوگ یہاں آئے تھے وہ اس قابل تھے کہ ہماری اس چھوٹی سی دنیا کو باہر کی دنیا کی طرح بہت سی آسائشوں سے بھر دیتے لیکن مقدس روشنی ایسا نہیں چاہتی اور نہ وہ کبھی چاہے گی۔ "مقدس روشنی" نے برقی رو کو بھی پسند نہیں کیا۔ برقی رو حاصل کرنے کے باوجود ہم نے اسے کہیں بھی استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی کریں گے۔ بس علامتی طور پر اس ہال میں یہ فانوس جلایا جاتا

ہے۔"

تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے کھوہ کی ایک ایسی شاخ نظر آئی جس کے راستے کو لکڑی کے ایک چھوٹے سے پھاٹک کے ساتھ بند کر دیا گیا تھا۔ یہ پھاٹک اخروٹ کی لکڑی کا تھا اور اس پر عقاب کی ایک نہایت خوب صورت شبیہ کندہ کی گئی تھی۔ عقاب کی آنکھوں کی جگہ دو قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔

لڑکی نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "آپ جانتے ہیں، یہ کون سی جگہ ہے۔ یہ مقدس روشنی یعنی سانوس کا مسکن ہے۔ یہ کوئی محل نہیں اور نہ ہی کوئی قلعہ ہے۔ بس ایک ویسی ہی رہائش گاہ ہے جیسی میں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ سانوس کی خدمت پر کوئی غلام یا نوکر مقرر نہیں۔ وہ اپنا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ جان کر حیرانی ہو کہ ہمارے دیوتا سانوس بھی یہاں کے عام لوگوں کی طرح طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک سخت محنت مشقت کرتے ہیں۔"

"کیا وہ آپ لوگوں کے سامنے آتے ہیں؟"

"بالکل آتے ہیں۔ ان کا پردہ باہر کی دنیا سے ہے۔ اندر کی دنیا سے نہیں۔"

"کیا کبھی آپ نے انہیں دیکھا ہے؟"

وہ مسکرائی "آپ کو یاد ہے آج صبح آپ نے آٹا پیسنے والی ایک چکی دیکھی تھی۔ اس چکی پر جو دراز قد شخص کام کر رہا تھا۔ وہ محترم سانوس ہی تھے۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

وہ بولی "میں درست کہہ رہی ہوں۔ قابلِ صد احترام سانوس یہاں ایک عام فرد کی طرح کام کرتے ہیں۔ ان کا اصل کام انتظامی امور کی نگرانی ہے لیکن بوقتِ ضرورت وہ سب کچھ کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ پتھر تک توڑ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر دو ہفتے بعد کھوہ کے ایک مخصوص حصے میں مذہبی اجتماع ہوتا ہے۔ یہاں محترم سانوس خطاب کرتے ہیں۔ ہماری کمیونٹی کی نصف آبادی باری باری یہ خطاب سنتی ہے۔"

لڑکی کی باتیں واقعی تعجب خیز تھیں اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ میں نے اناج پیسنے والی چکی پر جس شخص کو آٹے کی دھول میں لپٹا ہوا دیکھا تھا وہ سانوس تھا۔ سانوس دیوتا جو اس مختصر دنیا کا بلا شرکت غیرے فرمانروا تھا، جو سنہری عقاب اور مقدس روشنی جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا اور جس کی طلسماتی قوتوں کا چرچا پورے رابلی قبیلے اور داوی داخان میں تھا۔ مجھے پھر نائیلہ یاد آگئی جو اسی سانوس کی کشش سے کھنچتی ہوئی گلگت سے یہاں پہنچ گئی تھی۔ اور سوچ جس نے میری آنکھوں کے سامنے ہوش گنوائے تھے اور سانوس کے جنون میں مبتلا ہوئی تھی۔

میں نے اپنی حیرت کو ضبط کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا "محترم سانوس اپنی رہائش گاہ پر تنہا رہتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ اپنی دو ساتھیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ایک ساتھی مستقل ہے۔ ان کو ہمیشہ محترم سانوس کا قرب نصیب رہتا ہے۔ دوسری ساتھی بدلتی رہتی ہے۔ ہفتے بعد، دس ہفتے بعد، دس مہینے بعد، الغرض وہ کسی بھی وقت بدل سکتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ایک ساتھی کی جگہ دوسری ساتھی آجاتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پہلی ساتھی کہاں جاتی ہے؟"

"کہا جاتا ہے کہ گئے وقتوں میں تبدیل ہونے والی ساتھی کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ساتھی کمیونٹی کے عام لوگوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ آپ کو یقیناً معلوم ہوگا۔ آج آپ جس تائے نامی نوجوان خاتون سے ملے تھے وہ بھی ساتھی رہ چکی ہیں۔ انہیں قریباً دو ماہ تک ساتھی رہنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ اب وہ کمیونٹی کے بہترین معالج کی ساتھی ہیں۔ جو خواتین ساتھی رہ چکی ہیں، انہیں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "سانوس آپ لوگوں کے نزدیک دیوتا ہیں، ان کی اولاد کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟"

"سانوس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ وہ عام انسان نہیں ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ حیات رہیں گے۔"

اچانک کھوہ میں جلترنگ بج اٹھے۔ لڑکی چونک گئی۔ بولی "محترم شاہا! یہ سونے کا وقت ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہم قیام گاہ کی طرف چلیں؟"

سارے دن کی مصروفیت نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں نڈھال ہو کر بستر پر گر جانا چاہتا تھا۔ ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور آٹھ دس منٹ میں قیام گاہ میں پہنچ گئے۔ آئینہ دیواروں والے کمرے میں صاف شفاف بستر پر لیٹ کر عجیب سی راحت محسوس ہوئی۔ کھڑکیوں پر دودھیا پردے جھول رہے تھے۔ میرے سرہانے پتھر کی ایک رکابی میں تازہ پھل رکھے تھے اور پھول پڑے تھے۔ پُراسرار صندلی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔

لزا ابھی تک میرے ساتھ تھی۔ صبح اس نے مجھے اپنی مصروفیات بتادی تھیں۔ مسلسل تین یوم تک اسے روزانہ صبح سے شام تک میرے ساتھ رہنا تھا۔ اب اس کے جانے کا وقت تھا۔ اس نے شمع دان کی پانچ شمعوں میں سے چار بجھا دیں۔ اب کمرے میں ہلکی سی خواب ناک روشنی باقی رہ گئی تھی۔ لزا باہر جاچکی تھی۔ میں بستر پر چت لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ کھوہ میں اتنی حرارت موجود تھی کہ سخت سردی میں بھی مجھے کمبل وغیرہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔ چند لمحے بعد میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ لزا واپس آرہی ہے۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے گھنگریالے بال شانوں پر منتشر تھے۔ وہ آہستگی سے میرے قریب سرک آئی۔ بولی "آپ کا بہت بہت شکریہ شاہا!"

"کس بات پر؟"

"آپ نے مجھے اپنے لیے پسند کیا۔ میں فخر محسوس کررہی ہوں۔"

"آپ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

وہ ناز سے مسکرائی "آپ تردد نہ فرمائیں۔ مجھے "زارا" نے سب کچھ بتادیا ہے۔"

"زارا۔۔۔ یہ کون ہے؟"

"وہی خاتون' جنہوں نے رقص گاہ میں آپ کے ساتھ رقص کیا تھا۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ صورت حال یہ رخ اختیار کرلے گی۔ میں نے تو یونہی کنی کترانے کے لیے ایک بات کہہ دی تھی۔

میں یہاں پوری حقیقت پسندی سے سچائی کے ساتھ ایک بات تسلیم کرنا چاہ رہا ہوں اور وہ یہ کہ میں غیر محسوس طور پر اپنے خیالات میں تبدیلی محسوس کررہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اچھائی اور برائی کے سلسلے میں میرے معیار غیر محسوس طور پر تھوڑے سے تبدیل ہوئے ہیں۔ اب وہ واقعات گزر چکے ہیں لہٰذا میں زیادہ اچھے طریقے سے ان کا تجزیہ کرسکتا ہوں۔ مجھے ہپناٹزم اور سجیشن وغیرہ کے بارے میں بنیادی معلومات تو حاصل تھیں لیکن میں یہ بات ہرگز نہیں جانتا تھا کہ ہپناسٹ کی مقناطیسی قوت کیا ہوتی ہے۔ جس شخص پر یہ قوت اثر کرتی ہے وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ کیا وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلی سے آگاہ ہوتا ہے یا نہیں اور اگر ہوتا ہے تو آگاہی کتنی واضح یا غیر واضح ہوتی ہے۔ اب ان حالات کو ذہن میں لاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شاید میں واقعی کسی طرح کی مقناطیسیت کا شکار تھا یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بات اتنی پیچیدہ نہ ہو بلکہ جس طرح ہر شخص پر اردگرد کے ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ مجھ پر بھی ہورہا ہو۔۔۔ بہرحال یہ امر بالکل واضح تھا کہ میرے اندر تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

لزا جس طرح میری خواب گاہ میں آن وارد ہوئی تھی اور جس طرح تشکر کا اظہار کررہی تھی میرے لیے مشکل پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں اپنائیت کروٹیں لے رہی تھی۔ مجھ سے یہ نہ ہوسکا کہ اسے ٹکا سا جواب دے کر باہر نکال دوں۔ وہ میرے قریب ہی دوسرے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کا ہر انداز توبہ شکن تھا اور ہر ادا میں دعوت تھی۔ زمین کی گہرائی میں سیکڑوں فٹ تک اترے ہوئے اس حسین غار میں' اس طلسمی ماحول میں' اس ریشمی رات میں' یہ دعوت صبر آزما تھی لیکن میرا ذہن لزا نامی اس لڑکی سے لاانتہائی فاصلے پر تھا۔ جب بھی کوئی ایسا لمحہ آتا تھا' نجانے کیوں غزال خود بخود میرے خیالوں میں داخل ہوجاتی تھی حالانکہ اب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی وہ میرے ہر رویے کا رخ متعین کرتی تھی۔ وہ اپنی بانہیں پھیلا دیتی تھی اور میرے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوجاتی تھیں۔ کسی موہوم امید' کسی خیالی وعدے کا تعاقب کرتا میں ان آنکھوں کی گہرائی میں اتر جاتا تھا۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ میں لزا نامی اس لڑکی کے بہت قریب ہونے کے باوجود بہت دور رہا۔

اگلے دو دن بھی میں نے اسی طرح کھوہ کے مختلف حصوں میں گھومتے ہوئے گزار دیے۔ مجھ پر کئی انکشافات ہوئے۔ یہ کھوہ درحقیقت ایک شاندار غار تھا جو قدرت کی صناعی اور تخلیق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایسے غار ہزارہا سال تک پانی کے زیرزمین بہاؤ سے وجود میں آتے ہیں اور شاخ در شاخ دور تک چلے جاتے ہیں۔ یہ غار بھی زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی دیواروں میں رنگین پتھر جھلملاتے تھے اور انہیں تراش خراش کر اتنا خوب صورت بنادیا گیا تھا کہ کئی جگہ شیش محل سا منظر نظر آتا تھا۔ غار کے زیادہ گہرے حصے دیکھتے ہوئے سانی صاحب کی بات یاد آگئی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ فرانس میں ایک BERNARD RESEAU نامی غار ہے جو زمین کی گہرائیوں میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میٹر تک اترا ہوا ہے۔ یقیناً یہ بھی قدرت کی کوئی ایسی ہی تخلیق تھی۔ یہاں کے پُراسرار مکینوں نے اس غار کے مختلف حصوں کو مختلف کاموں کے لیے مخصوص کررکھا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی مکمل دنیا تھی۔ یہ دنیا یہاں کے باشندوں نے اپنی قوتِ بازو اور حوصلے سے تعمیر کی تھی۔ یہ لوگ زندگی کے ہر شعبے میں ان تھک محنت پر یقین رکھتے تھے

اور اپنے خون پسینے سے اس مختصر گوشۂ اراضی کو خوب تر بنارہے تھے۔ اس دنیا کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں "نصف سچ" دیکھ رہا ہوں۔ میں نے نصف سچ کیوں کہا ہے' اس کی وضاحت میں آگے چل کر کروں گا۔

اگلی صبح لزا نے مجھے خاکستری لباس پہنایا اور ساتھ لے کر دوبارہ اس نیلی آنکھوں والے شخص کے سامنے پیش ہوئی جس کا نام گرے تھا اور جو محنت کشوں کو ان کی قابلیت کے مطابق مختلف ذمے داریاں سونپتا تھا۔ حسب سابق یہ شخص اپنے کمرے میں سنگ مرمر کی چوکی کے سامنے موجود تھا۔ محنت کشوں کی مختلف ٹولیوں کے نمائندے وہاں موجود تھے۔ وہ ان نمائندوں کو قبائلی زبان میں مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ (اس خوب صورت غار کے طول و عرض میں رالی قبیلے کی زبان ہی بولی جاتی تھی۔) اس کام سے فارغ ہوکر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور انگلش میں بولا "آپ کیا کرنا پسند فرمائیں گے؟"

"جو آپ مناسب سمجھیں۔"

"لیکن آپ کی کوئی ترجیح تو ہوگی؟"

میں نے کہا "رالی قبیلے میں مجھے نوجوان لڑکوں کو ذاتی دفاع کی تربیت دینے کے لیے چنا گیا تھا۔"

وہ مسکرایا "یہاں کوئی ذاتی دفاع نہیں۔ اس لیے کہ یہاں جارحیت ہی نہیں۔ اس پوری کمیونٹی میں کبھی کوئی جرم نہیں ہوا اور نہ ہی کہیں کوئی ہتھیار پایا جاتا ہے۔"

غالباً وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے یہاں ہتھیار جیسی کوئی چیز دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ لوگوں کا رویہ اتنا شائستہ اور صبر و برداشت کا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ دو روز پیشتر لزا نے مجھے سانوس (مقدس روشنی) کی رہائش گاہ دکھائی تھی۔ رہائش گاہ سے باہر ایک جگہ کھوہ کی دیوار پر کام ہورہا تھا۔ شاید کسی سبب دیوار کی بالائی سطح خراب ہوگئی تھی۔ اب اسے دوبارہ رگڑ کر ملائم اور شفاف کیا جارہا تھا۔ آٹھ دس مزدور وہاں کام کررہے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر مجھے محترم سانوس کی رہائش کے پاس دیوار کی مرمت کے کام پر لگادیا جائے تو بہتر رہے گا۔ یہ کام میرے لیے آسان ثابت ہوگا اور ویسے بھی مجھے اپنی قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔"

میری بات فوراً مان لی گئی۔ گرے نے مقامی زبان میں لزا کو ہدایت کی کہ وہ مجھے ڈیوٹی پر لے جائے۔

میں نے سوچ سمجھ کر اس کام کا انتخاب کیا تھا۔ میں سانوس کی رہائش گاہ کے پاس رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سائیں عالی کی چوتھی مریدنی سروج سانی کی حیثیت سے سانوس کی قیام گاہ پر ہی موجود ہے۔ بے شک وہ یہاں کے رواج کے مطابق عارضی سانی تھی اور کسی بھی وقت اس کی جگہ نئی سانی نے لے لینا تھی مگر یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی تھی کہ یہ تبدیلی کب رونما ہوگی۔ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کئی ہفتے یا پھر مہینے لگ جاتے یعنی کچھ خبر نہیں تھی کہ سروج کب تک سانوس کی رہائش گاہ کی دیواروں میں محصور رہے گی۔ اگر میں سانوس (مقدس روشنی) کی رہائش گاہ کے قریب کام کرتا تو اس بات کا امکان موجود تھا کہ میں کسی وقت سروج کی جھلک دیکھ سکوں یا پھر اس سے بات کرسکوں۔

اس روز میں نے اپنے کام کا آغاز کردیا۔ نہایت سخت' نیلے پتھر کے ہموار ٹکڑے تھے جن کی مدد سے ہمیں کھردری دیوار کو رگڑنا تھا۔ اس کام میں پانی بھی استعمال ہوتا تھا۔ لکڑی کے بالٹی نما برتن چشمے کے پانی سے لبالب بھرے تھے اور کام کرنے والوں کے قریب رکھے تھے۔ مشاق افراد دیوار کے اس حصے پر کام کررہے تھے جو تیاری کے مرحلے میں تھا۔ مجھ جیسے نوآموز ابتدائی اسٹیج کا کام کررہے تھے۔ پورے دس گھنٹے میں نے تندہی سے کام کیا۔ میرے بازو شل ہوگئے اور انگلیاں چٹخنے لگیں۔ کسی وقت میں دم لینے کے لیے ٹھہر جاتا مگر جب اپنے ہم کاروں کو مسلسل کام کرتے دیکھتا تھا تو پھر شروع ہوجاتا تھا۔ اس زبردست جسمانی مشقت میں ہمیں شام تک وقفہ نہیں ملا۔ جب کھوہ میں کام ختم کرنے کا اعلان ہوا اور گھنٹیوں کے شور میں محنت کشوں نے اپنے اپنے ٹھکانوں کا رخ کیا تو میں بھی اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ لزا ابھی اپنے کام سے واپس نہیں آئی تھی۔ میں بستر میں گر گیا۔ ایک عجیب سے سکون اور آرام کا احساس ہوا۔ ایسا احساس پہلے شاذونادر ہی ہوا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا لگا۔ تھوڑی دیر بعد لزا بھی آگئی۔ وہ بھی خاکستری لباس (کام کے لباس) میں تھی۔ یہ لباس اُجلے اُجالے سفید لبادے کے برعکس ذرا چست ہوتا تھا۔ لزا کو اس لباس میں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ چہرے کی طرح اس کا سراپا بھی پُرکشش ہے۔

ہم نے چشمے کے نیم گرم پانی میں غسل کیا اور سفید اُجلے لباس پہنے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد ہم کھوہ کے اس علاقے کی طرف نکل گئے جو تفریحات کا مرکز تھا۔ یہ بڑی شائستہ اور دھیمی تفریحات تھیں۔ کہیں شوروغل اور ہیجان نہیں تھا۔ کہیں مصوری ہورہی تھی' کہیں رقص

جاری تھا کہیں ان اور کھیل کود کے مناظر تھے۔

میں نے لز سے پوچھا "یہاں لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ نزاع وغیرہ؟"

وہ بولی "محترم شاہا! لڑائی جھگڑا یا نزاع ایک فالتو چیز ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کے پاس فالتو توانائی ہو۔ یہاں کسی کے پاس فالتو توانائی ہے اور نہ وقت' لہٰذا نزاع بھی نہیں ہوتا۔ ہم نے مقدس روشنی کی تعلیمات کے مطابق اپنی توانائی کی ایک ایک رمق مثبت کاموں پر لگا رکھی ہے۔ جو تھوڑا بہت وقت ہمارے پاس ہوتا ہے ہم اسے اچھے طریقے سے گزارتے ہیں اور انجوائے کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "لیکن "اختلاف" تو انسانی فطرت میں شامل ہے۔"

"انسانی فطرت نے اس حسین غار میں پہنچ کر اپنے راستے بدل لیے ہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"مگر کسی نہ کسی حوالے سے تو تنازعات پیدا ہوتے ہوں گے۔"

"ایسے واقعات کی تعداد لونہ ہونے کے برابر ہے۔ فرض محال کبھی ایسا ہو تو ہم مقدس روشنی کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہیں۔"

میں نے ایک جگہ نیم گرم معدنی پانی کا تالاب دیکھا۔ یہاں بہت سے لڑکے تیراکی کر رہے تھے۔ یہ منظر میرے لیے بے حد حیرت کا باعث تھا۔ میں ابھی بھولا نہیں تھا کہ میں نانگا پربت کے نواح میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوں۔ اس کھوہ سے باہر درجۂ حرارت یقیناً نقطۂ انجماد سے آٹھ دس درجے نیچے تھا لیکن اس عجیب و غریب غار کے اندر تیراکی ہو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق رات کے نو ساڑھے نو کا عمل ہوگا جب ہم واپس اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اگلے روز پندرہ روزہ تعطیل تھی لہٰذا لوگ زیادہ دلچسپی سے تفریحات میں حصہ لے رہے تھے۔ ہر عمر کے مرد و زن بڑی بے تکلفی لیکن شائستگی سے بلا جھجک محبت کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں جھول رہے تھے' ہم آغوش ہو رہے تھے۔

رات اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر میں بستر میں لیٹ گیا۔ جسم میں کہیں کہیں چبھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے کل لز کو اس بارے میں بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو پانی غسل کے لیے استعمال ہوتا ہے اس میں دیگر معدنیات کے علاوہ گندھک کی ہلکی سی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ یہ چبھن اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر دو چار بجنے تک روغن سے ہلکی سی مالش کی جائے تو یہ شکایت نہیں ہوتی۔ یہ خاص قسم کا روغن گندم اور ایک مقامی پودے کے بیجوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔

حسب توقع تھوڑی دیر ہی بعد لز میرے جسم کی مالش کے لیے آن وارد ہوئی۔ فرش پر چٹائی بچھا کر میں لیٹ گیا۔ وہ حنائی انگلیوں سے بڑی نزاکت اور محبت کے ساتھ روغن لگی۔ اس کی ہتھیلیاں ایک ایسے "سیاہی چوس" کی طرح تھیں جو میرے جسم سے تھکاوٹ' کھچاؤ اور پژمردگی کی سیاہی کو چوستا چلا جا رہا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور رخسار دہکنے لگے تھے۔ اس کی جلد اتنی شفاف اور نازک تھی کہ کسی وقت گماں ہوتا تھا کہ شریانوں میں دوڑتا ہوا خون بھی نظر آ سکتا ہے۔۔۔ بڑے توبہ شکن انداز میں وہ میرے قریب تر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ بہکنے لگے تھے۔ پتا نہیں کب اس نے شمع دان بجھا دیا اور کمرے میں گہری تاریکی پھیل گئی۔ میں نے خود کو دو مرمریں بانہوں کے حصار میں پایا۔ ایک گداز تھا جس میں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ شیشے سی نازک تھی لیکن بلا تردد ہر پتھر سے ٹکرا جانا چاہتی تھی۔ اس کا چہرہ میرے بالکل قریب تھا۔ اس نے خود کو میری بانہوں میں محصور کر لیا تھا اور محصور رہنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے ایک ایسے مدہوش راستے کی طرف کھینچ رہی تھی جہاں ہوش و حواس ٹکڑے ہو کر بکھر جاتے ہیں اور ایک تیز "دھارا" مزاحمت کی چٹانوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ جیل سے میری رہائی کے بعد نواب زادی شاہیں پہلی عورت تھی جو میری زندگی میں آئی تھی اور اب یہ دوسری عورت "آنے" کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ جذبات کا دھارا بے حد شدید تھا لیکن اس میں مزاحمت کی چٹانیں بھی کچھ کم وزنی نہیں تھیں اور ان میں دو چٹانیں تو گراں تر تھیں۔ غزالہ کی "محبت" اور شفا سے کیا ہوا "وعدہ"۔ یکایک میں نے لز کو پیچھے دھکیل دیا۔ بڑی قطعیت لیکن شائستگی کے ساتھ میں نے اسے یہ باور کرایا کہ میں ایسی قربت کا خواہاں نہیں ہوں۔

O☆O

اس پُراسرار غار میں ان پُراسرار لوگوں کے درمیان زندگی ایک انوکھی اور دلچسپ ڈگر پر چل نکلی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں غیر محسوس طور پر ان لوگوں میں مدغم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے اس ماحول سے انسیت ہوتی جا رہی تھی۔ بے شک وہ بے حد کٹھن زندگی تھی لیکن اس میں آرام اور سکون بھی تھا۔ ایک راحت تھی جس کا تجربہ مجھے اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

ایک روز لز کی زبانی مجھے پتا چلا کہ آج شام کے بعد محترم بانوس اپنا پندرہ روزہ خطاب کریں گے اور مجھے بھی اس میں شرکت کرنا ہوگی۔ یہ تجربہ میرے لیے نیا اور سنسنی خیز تھا۔ دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد ہم نے کپڑے بدل کر کھانا کھایا اور پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد حسین و جمیل کھوہ کے اس حصے کی طرف روانہ ہوگئے جہاں خطاب کیا جاتا تھا۔ کھوہ کی بیشتر جگہوں کی طرح یہ جگہ بھی اپنی مثال آپ تھی۔ بیضوی شکل میں ایک بہت کشادہ جگہ تھی۔ یہاں اسٹیڈیم کی طرز پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کم و بیش پانچ سو افراد بیک وقت ان سیڑھیوں پر بیٹھ سکتے تھے۔ سامنے ایک چبوترہ سا تھا۔ ایک چبوترے پر پتھر سے ایک بڑے عقاب کا مجسمہ تراشا گیا تھا۔ بعد میں اس مجسمے پر سنہری رنگ کر دیا گیا تھا۔ چبوترے کی ایک دیوار میں محرابی دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دروازہ اور چبوترہ رغبہ سانوس کی رہائش گاہ کے بالکل قریب ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ سانوس یعنی خود پردہ نشین اپنی رہائش گاہ سے نکلتا ہو اور محرابی دروازے سے گزر کر اس چبوترے پر چلا جاتا ہو۔ اس وسیع نشست گاہ کی دیواروں پر شاندار پچی کاری کی گئی تھی۔ نقاشی کے ایسے ایسے شاندار نمونے تھے کہ میری نگاہ پتھرا کر رہ گئی۔ میں ایسے فنون کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ان دیواروں کو نقاشی سے سجانے میں درجنوں فن کاروں نے برسوں صرف کیے ہوں گے۔ در و دیوار پر نہایت خوب صورتی سے کندہ کی گئیں یہ تصویریں بے معنی نہیں تھیں۔ یہ وہ فلسفۂ حیات تھا جو "مقدس روشنی" نے یہاں لاگو کر رکھا تھا۔ اس فلسفے کے دو اہم ترین عنصر جفاکشی اور جنس تھے۔ دیواروں پر نظر آنے والی تصویریں بھی انہیں دو پہلوؤں کی عکاسی کر رہی تھیں۔ نشست گاہ کے ایک حصے میں جفاکشی کے مناظر تھے۔ ہل چلایا جا رہا تھا' بوجھ اٹھایا جا رہا تھا' پتھر توڑے جا رہے تھے' جنگل سے لکڑیاں کاٹی جا رہی تھیں اور اسی طرح کے تمام مشقت طلب کام کیے جا رہے تھے۔ دوسرے حصے میں مرد و زن کے باہمی تعلق کو نمایاں کرنے والی تصویریں تھیں۔ بڑی بے باکی اور آزاد خیالی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ کئی شبیہات سراسر "تلذذ" کے زمرے میں آتی تھیں۔ بہرحال ان سب فن پاروں میں تخلیقی جوہر نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ تصویریں لاہور یا کراچی کے کسی میوزیم میں ہوتیں تو ہزاروں شوقین انہیں دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے لیکن یہاں بیٹھے ہوئے لوگ ان تصویروں سے بالکل بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں اتنی مرتبہ ان تصویروں کو دیکھ چکی تھیں کہ شاید اب دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔

ایکا ایکی عجیب طرز کی موسیقی نشست گاہ میں گونجنے لگی۔ نشست گاہ میں موجود سب لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ چبوترہ جو پہلے تاریک تھا اب ایک خواب ناک سی سنہری روشنی میں جھلملانے لگا۔ سنہری عقاب میں ہیرے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ تب چبوترے پر موجود محرابی دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آگیا۔ وہ چبوترے پر اسی جگہ آکر رکا جہاں روشنی نہایت نمایاں تھی۔ وہ سرتاپا روشنی میں نہا گیا اور ایک زرنگار نشست پر بیٹھ گیا۔ یہ وہی پردہ نشین تھا جسے میں اس سے پہلے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ آج وہ پردے کے بغیر تھا۔ میری آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ وہ ناقابلِ بیان حد تک خوب صورت تھا۔ اس کی عمر کا ٹھیک سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ بس یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ جواں سال ہے۔ یہ محاورہ میں نے کئی بار سنا تھا کہ فلاں چیز پر نگاہ نہیں ٹکتی۔۔۔ آج میں اس محاورے کو حقیقت کے قالب میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسی وجاہت تھی جسے بیان کرتے ہوئے کسی بڑے سے بڑے ماہر زبان کو بھی دانتوں پسینے آجاتے۔ یہ وجاہت کہاں تھی؟ اس کی روشن پیشانی میں؟ سرخ و سپید رخساروں میں؟ حسین و جمیل ٹھوڑی میں؟ یا ان آنکھوں میں جہاں سمندروں کی گہرائی اور کہکشاؤں کی سی روشنی تھی۔ وہ ایک سفید براق لباس میں تھا اور اس کے سینے پر سنہری عقاب کی شبیہ تھی۔

وہ زرنگار نشست پر بیٹھ گیا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے دوسرے لوگوں کو بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کی مسحور کن آواز نشست گاہ میں گونجی اور پھر گونجتی چلی گئی۔ وہ مقامی زبان میں بول رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایک انوکھی ملائمت اور اثر انگیزی تھی۔ کسی جادو اثر مقرر کی طرح اس کی آواز کا زیر و بم ایک زور آور دھارے کی شکل اختیار کر رہا تھا اور سامعین کو اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن پھر بھی میرے دل کو تہ و بالا کر رہے تھے۔ میں اس کی پُرکشش شخصیت کے سحر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی ادائیں میرے دل میں گھر کر رہی تھیں۔ حسین و جمیل شخص نے اپنی تقریر کے آخر میں سامعین سے کوئی سوال کیا۔ اس سوال کا جواب سامعین نے ہم آہنگ ہو کر اثبات میں دیا۔۔۔ اور بار بار دیا۔

مقامی زبان میں کی جانے والی وہ تقریر کافی دیر بعد ختم ہوئی۔ آخر میں مختصر سا خطاب انگریزی میں بھی کیا گیا۔ شاید یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو ابھی مقامی زبان پوری طرح سیکھ

میں پائے تھے۔ اس خطاب کا خلاصہ یوں تھا "میرے جان سے عزیز دوستو! اس بات پر یقین رکھو کہ سورج روزانہ مشرق سے نکلتا ہے اور اس بات پر بھی یقین رکھو کہ ہم زندگی میں جو بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اس کا صلہ راحت کی شکل میں ہمیں مل کر رہتا ہے۔ جب ہمارے اندر یہ یقین پختہ ہو جائے گا تو ہم بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کا سامنا خندہ پیشانی سے کریں گے۔ ہم اپنی طرف بڑھنے والی ہر "تکلیف" کی پیشانی پر بوسہ دیں گے اور اسے آنے والی راحت کا پیامبر سمجھیں گے۔ یہی زندگی کا جوہر ہے' یہی ہماری تقدیروں کی حقیقت ہے۔ ہاں میرے دوستو! تقدیر ہمارے ظرف کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ ظرف جو ہمیں تکلیفیں سہنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ آؤ میرے ساتھیو' ہم آنکھیں بند کر کے خود کو زندگی کی تلخیوں اور سختیوں کے سامنے سینہ سپر کر دیں۔ آؤ ہم بھی خوشیوں کے حصول کے لیے کڑی مشقتوں اور جفاؤں کے سمندر میں کود پڑیں۔ آؤ ہم پختہ یقین کو پتوار بنا کر ان جنت نظیر ساحلوں پر اتریں جو صرف خوابوں خیالوں میں دیکھے جاتے ہیں۔۔۔ بتاؤ میرے دوستو! کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

ایک ساتھ بہت ساری آوازیں ابھریں اور انہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ مجھے لگا جیسے میرے منہ سے بھی بے اختیار "ہاں" کی آواز نکلتے نکلتے رہ گئی ہے۔ خوبرو شخص نے اپنا سوال پھر دہرایا "کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟"

"جی ہاں۔" بے شمار لوگوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"کیا تم میرے ساتھ چلتے رہو گے۔"

"جی ہاں۔" ایک بار پھر گونج کی شکل میں آواز ابھری۔

خوبرو شخص نے دلنشین لہجے میں کہا "ایک بات پر پختہ یقین رکھو دوستو! زندگی پر غم یا پر مسرت نہیں ہوتی۔ نہ ہی آباد یا برباد ہوتی ہے۔ زندگی صرف فعال یا غیر فعال ہوتی ہے۔ یعنی مصروف ہوتی ہے یا غیر مصروف۔ مصروف زندگی کا مطلب ہے زیادہ مشقت اور زیادہ راحت' غیر مصروف زندگی کا مطلب ہے کم مشقت اور کم راحت' کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری زندگیاں بے کار میں جائیں؟"

"جی نہیں۔" بے شمار آوازیں ابھریں۔

"تو پھر اپنی زندگیوں کو استعمال کرو۔ جان توڑ مشقتوں و تکلیفوں اور حیران کن مسرتوں کے لیے اپنے سینے کھول دو۔ اگر کسی کے دل میں کوئی وسوسہ ہے تو وہ نکال باہر کرے۔ وہ مجھ پر یقین رکھے۔ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو وہ نہیں دیکھ رہا۔ میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کے "ترشی زندگی" کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھما دوں گا۔"

خوبرو سانوس کا خطاب ختم ہو گیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لوگوں نے اٹھ کر تعظیم پیش کی اور بڑے نظم کے ساتھ قطار اندر قطار نشست گاہ سے باہر نکلنے لگے۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا "آپ نہیں جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"آپ نے آج پہلی بار معظم سانوس کا خطاب سنا ہے۔ یہاں کی روایت کے مطابق ابھی آپ یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال یا سوالات ابھرے ہیں تو آپ معظم سانوس سے براہِ راست ان کا جواب دریافت کر سکتے ہیں۔"

میں اپنی نشست پر بیٹھا رہ گیا۔ لز واپس چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں نشست گاہ خالی ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں اور خوبرو سانوس وہاں تنہا رہ گئے۔ وسیع نشست گاہ میں پر ہول سناٹا طاری تھا۔ بلند و بالا چھت کے نیچے میں خود کو ایک دم حقیر محسوس کرنے لگا تھا۔ چبوترے پر سنہری روشنی کے دھارے میں سانوس بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کم و بیش بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ جسم میں شاک سا محسوس ہوا۔ تاہم اس شاک کی شدت اس شاک کی نسبت کم تھی۔ جو خوبرو سانوس کو پردے کی اوٹ سے دیکھ کر مجھے لگا تھا اور یہ تعجب خیز بات تھی۔ اب میں اسے براہ راست دیکھ رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ اس سے آنکھیں چار کرنا میرے لیے ایک تکلیف دہ تجربہ ثابت ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

"کوئی سوال ابھرا ہے تمہارے ذہن میں؟" سانوس کی مرعوب کن آواز ابھری۔

"جی نہیں۔" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ سانوس کی شکل و صورت نے ہی نہیں اس کی باتوں نے بھی میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں ایک محبوب شخصیت بن کر میرے دل و دماغ میں سما گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے اور میں سنتا رہوں۔ میں نے سنا تھا کہ قادر الکلام مقرر اپنے توانا خیالات کے زور سے سامعین کو اپنے اثر میں لے لیتے ہیں۔ شاید مجھ پر بھی کوئی ایسی ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

سانوس دل پذیر انداز میں مسکرایا "اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہے تو بلا تکلف پوچھو۔ اور اگر نہیں

تو میرے ایک سوال کا جواب دو۔"

"پوچھیے۔"

"لیکن تمہیں یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ اس سوال کا جواب' چاہے وہ کیسا بھی ہو' پوری بے باکی اور سچائی سے دو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

وہ بولا "یہاں کا طرزِ زندگی تمہیں کیسا لگا؟"

میں نے احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہا "محترم۔ میں اسے نصف سچ کہوں گا۔"

"نصف سچ؟ کیا مطلب؟"

"محترم سانوس! میں نے یہاں کے طرزِ زندگی کو دل کی گہرائیوں سے پسند کیا ہے۔ آپ کا یہ فلسفہ کہ راحت کو بے عملی اور سکون میں نہیں مشقت اور تکلیف میں تلاش کرنا چاہیے۔ مجھے اپنے دل کی آواز محسوس ہوا لیکن اس فلسفے کا دوسرا پہلو میرے لیے الجھنوں کا باعث ہے۔ میری مراد اس طرزِ معاشرت سے ہے جس کو آپ فروغ دینا چاہتے ہیں۔ گستاخی کی دست بستہ معافی چاہتا ہوں' مجھے لگتا ہے کہ آپ زندگی کی بنیادی قدروں کو نظر انداز فرما رہے ہیں۔ اگر ماں کو بچے کے پیار سے محروم کر دیا جائے' شوہر کو بیوی کی وفا سے' بہن کو بھائی کی محبت سے اور اولاد کو والدین کی حقیقی شفقت سے تو کیا یہ ناانصافی نہیں ہو گی۔ آپ نے مرد و زن کو جو آزادی فراہم کر رکھی ہے ممکن ہے کچھ لوگوں کی نظروں میں وہ خوشنما ہو لیکن اس کی انتہا کیا ہو گی۔"

وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا خیال بلا جھجک بیان کیا ہے۔ تمہارے سوال کے جواب میں' میں صرف یہی کہوں گا کہ جو بات تمہیں عجیب لگ رہی ہے وہ اتنی عجیب نہیں ہے بلکہ یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ بہت جلد تم خود اس حقیقت کو تسلیم کر لو گے۔ اگر تم نہیں بھی کرو گے تو کوئی تمہیں مجبور نہیں کرے گا۔ تمہیں یہاں کسی بھی معاملے میں کسی بھی حوالے سے جبر نہیں ملے گا۔"

جس سنہری روشنی نے خوبرو سانوس کو منور کر رکھا تھا وہ دھیرے دھیرے ماند پڑنے لگی اور پھر بالکل بجھ گئی۔ چبوترے پر تاریکی کے سوا کچھ نہ رہا۔ اسی وقت نشست گاہ کا ایک دروازہ کھلا۔ لز اندر آئی اور مجھے نشست گاہ سے باہر لے گئی۔

***

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میرے سوچنے سمجھنے کا انداز تبدیل ہو رہا تھا۔ میں یہاں کے روز و شب میں بتدریج گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں اور لز صبح سویرے اٹھتے۔ طعام گاہوں میں صبح کا کھانا کھا کر ہم خاکستری لباس پہنتے اور اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ اب مجھے ان تھک جسمانی مشقت میں مزہ آنے لگا تھا۔ شام کو ہم نہا دھو کر لباس تبدیل کرتے۔ تھوڑی دیر آرام کرتے اور پھر تفریح گاہوں کی طرف نکل جاتے۔ وہ زرد مشروب جو یہاں کثرت سے پایا جاتا تھا' نشہ آور نہیں تھا لیکن اپنے اندر ایک تقویت بخش تاثیر رکھتا تھا۔ اسے گرم اور سرد دونوں حالتوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ان دنوں میں' میں نے یہاں کے مکینوں کے "غیر معمولی جذبۂ مشقت" کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور بے حد متاثر ہوا۔ ان دنوں میں' میں نے "نصف سچ" والی بات کئی مرتبہ سوچی۔ کئی بار میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر یہ لوگ اپنی صرف ایک خامی دور کر لیں تو وہ ہر طرح سے قابلِ تقلید ہیں اور وہ خامی تھی مادر پدر جنسی آزادی۔ مرد و زن کا بے روک ٹوک باہمی اختلاط اور پیدا ہونے والے بچوں کے سلسلے میں والدین کی لاتعلقی اور اس جیسے دیگر مسائل کسی طور پر بھی نظر انداز کرنے والی چیز نہیں تھے۔ اس خوب صورت معاشرت کا یہ ایک تاریک پہلو تھا اور اسی لیے میں اسے نصف سچ کہہ رہا تھا۔

وہ ہفت روزہ تعطیل کا دن تھا۔ میرے ساتھ والے بستر پر رات بھر لز میری قربت کی منتظر لیٹی رہی تھی لیکن میں پاس ہونے کے باوجود اس سے بہت دور تھا۔ صبح کے کھانے کے بعد میں اکیلا ہی چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔ یہ فراغت کا دن تھا۔ کمیونٹی کے لوگ روز مرہ کے معمولات سے آزاد ہو جاتے تھے۔ جی بھر کر آرام کرتے تھے' بے وقت کھاتے تھے' بے وقت جاگتے تھے۔ ایک پہر دن گزر چکا تھا لیکن غار کے پیچ و خم میں مکین گہرائیوں میں بیشتر لوگ ابھی تک آرام گاہوں میں تھے۔ میں بغلی راستہ استعمال کر کے باہر نکل آیا۔ وہ ایک بے حد چمکیلا دن تھا۔ مکئی اور چاول کے کھیتوں پر دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ سرسبز پہاڑی ڈھلوانوں پر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چر رہے تھے۔ ان ڈھلوانوں سے پار وہ بلند و بالا فصیل بھی نظر آ رہی تھی جسے پار کر کے میں یہاں پہنچا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس فصیل سے پار جو دنیا ہے وہ اجنبی اور غیر مانوس ہے۔ اپنے عزیز و اقارب کی صورتیں اور اپنے پیاروں کی شکلیں ذہن میں دھندلانے سی لگی تھیں۔ دل کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ آبشار کے پانی سے جو آبی راستہ بن گیا تھا میں اس کے کنارے بیٹھ گیا۔ میرے سامنے خوشگفتہ جنگلی پھولوں پر تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ چڑ' اور

اخروٹ کے دیوقامت درختوں پر پہاڑی پرندے چہلتے تھے اور تیز دھوپ کے سبب ہوا میں نباتات کی مہک رچ گئی تھی۔ میں سرسبز گھاس پر بیٹھا بیٹھا سوچنے لگا___ کیوں نہ میں سچ مچ ہمیشہ کے لیے اس غار کا مکین ہو جاؤں۔ کتنی سادہ حیات تھی یہاں کی اور کتنی بھرپور؟ بالکل جیسے صبح کی ہوا۔ ہر آلائش اور تصنع سے پاک___ ہزاروں لاکھوں سال پہلے کے زمانے کی یاد دلاتی ہوئی۔ جب انسان غاروں میں رہتا تھا۔ جب سب سے جدید اور پیچیدہ مشین پہیا تھا۔ میں بڑے ٹھنڈے دل دماغ سے سوچنے لگا۔ باہر کی ہنگامہ خیز دنیا میں کیا رکھا ہے میرے لیے؟ میں ایک مفرور قیدی تھا۔ قانون اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی لیے میری تاک میں تھا۔ بے شمار دشمنیاں مگرمچھ کی طرح منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ دفینے___ اور دفینے کے نوادرات سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ غزالہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ نواب زادی شاہین موت کی آغوش میں جا چکی تھی۔ بے شک صفدر اور وزیر بل میرے ہمدم تھے' میری جدائی ان کے لیے کٹھن تھی لیکن کوئی کسی کے لیے سدا غمزدہ نہیں رہتا۔ وقت بہت جلد ہر کسک کو مٹا دیتا ہے' ہر دکھ کو دھندلا دیتا ہے۔ آجا کے ایک ہستی شفقتا تھی جس کے لیے میں پریشان ہو سکتا تھا لیکن وہ بھی اب محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ بابا صاحب نے اسے باپ سے بڑھ کر شفقت دے رکھی تھی۔ وہ شفقتا کے لیے ایک بے حد مضبوط سہارا تھے۔

میں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا تو میرے لیے "غور" کی نئی نئی راہیں کھلتی چلی گئیں۔ میں نے بڑے معروضی انداز میں اپنے دل کی گہرائی میں جھانکا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے یہاں کی انوکھی زندگی کو پسند کیا ہے۔ بے شک مجھے کئی معاملوں میں اختلافات تھے لیکن یہ اختلافات ایسے نہیں تھے کہ ان کے ساتھ گزارا نہ کیا جا سکے اور سوچا جاتا تو یہاں کی معاشرتی آزادی کچھ ایسی انہونی بات بھی نہیں تھی۔ مغربی معاشروں میں بھی کچھ تو ہو رہا تھا۔ بچے والدین سے جدا تھے۔ خاندانی بندھن ٹوٹ رہے تھے۔ ازدواجی رشتے فرسودہ قرار دیے جا رہے تھے۔ پارسائی اور نیک چلنی کے تصورات یکسر تبدیل ہو رہے تھے۔

ایک دم میرا ذہن جیسے مختلف ڈگر پر سوچنے لگا۔ کوئی انجانی سی قوت میرے دل و دماغ پر اثر کر رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ آنکھیں بند کر کے یہاں کے ماحول میں مدغم ہو جاؤں۔ خود کو اس سماجی دھارے کے سپرد کر دوں جو بے پناہ قوت سے مجھے دھکیل رہا ہے۔ میں کیوں زندہ رہ کر بھی زندگی سے دور رہوں؟ میری نگاہوں میں ان نوخیز دوشیزاؤں کے جھلملانے لگے جو ہر وقت میرے ارد گرد منڈلاتی تھیں۔ آرام دہ خواب گاہیں' جہاں ریشمی راتیں سرسراتی تھیں' مچلتی ماربلیاں جن میں سرگوشیاں گونجتی تھیں___ اور تب تھکن انگڑائیاں لینے لگی تو جو میرے پاس رہ کر ہم سے بہت دور تھی۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر کا جہان ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ اس کے اندر سے ایک نیا شخص ہونا چاہ رہا ہے۔ میں نے خود کو پشت کے بل سبز گھاس پر گرا دیا۔ نیلے جاودانی آسمان پر چمکتا ہوا سورج میرے اوپر تھا۔ ایک سنسناہٹ سی رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ "کہیں ہپناٹزم تو نہیں؟" میرے ذہن سے یہ سوال خوف بن کر ابھرا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں۔" ذہن نے خود ہی جواب دیا۔ "میں کسی کے زیر اثر نہیں۔ میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور جو کچھ سوچ رہا ہوں' خود سوچ رہا ہوں۔"

اچانک مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ لز میرے سرہانے کھڑی تھی۔ تھکاوٹ کے سبب وہ آج دیر تک سوئی تھی۔ اس کا روپ بہت نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ سفید لبادے میں تھی۔ بالوں میں جنگلی پھول تھے' ہاتھوں میں سفید گجرے تھے۔ چہرے کی دمک میں کھڑی وہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ [illegible] گھنیری سی نیم باز آنکھیں۔ "آپ کو مبارک ہو۔" وہ بولی۔

"کس بات کی؟"

وہ میرے پاس بیٹھ گئی "میں آپ کے لیے معظم سانوس کا ایک پیغام لائی ہوں۔"

"کیسا پیغام؟"

"میرے خیال میں آپ کی زندگی کا سب سے خوشی کا پیغام۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری ہو سکتی ہے۔" لز نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی "آپ نے اپنی دنیا میں کسی لڑکی سے محبت کی تھی؟"

یکایک میرے تصور میں غزالہ کی صورت ابھر آئی۔ میں نے خالی خالی لہجے میں کہا "لز! آپ بات کو معمہ بنا رہی ہیں۔ بتائیں کیا معاملہ ہے؟"

وہ کہنے لگی "معظم سانوس آپ کی خوشی کے لیے ایک ایسی دوشیزہ کو یہاں بلانے والے ہیں جس کو آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں___ وہ آپ کی محبت ہے۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ فطری بات تھی کہ میرے ذہن میں صرف اور صرف غزالہ کا تصور آ رہا تھا۔ ساڑھے تین ماہ پہلے میں اپنے کٹھن سفر پر گلگت سے روانہ ہوا تھا تو غزالہ اپنے شوہر نامدار کے ساتھ گلگت میں ہی تھی۔

میں نے اپنے اندر کے زلزلے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا "کیا نام ہے اس لڑکی کا؟"

وہ بولی "مجھے نام معلوم نہیں۔ صرف اتنا پتا چلا ہے کہ وہ کچھ دیگر لوگوں کے ساتھ ان پہاڑوں میں موجود ہے۔ ان لوگوں میں لڑکی کا شوہر بھی شامل ہے جو کوئی عرب باشندہ ہے۔ یہ لوگ بے خبر ہیں کہ وہ اپنی حدود سے کتنی دور آ چکے ہیں۔ وہ سردار رابل کی دسترس میں ہیں اور معظم سانوس کے ایک اشارے پر سردار رابل انہیں یہاں پہنچا سکتا ہے۔"

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لڑکی کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ میں تو کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ یہ غزالہ درمیان میں اچانک کیسے آ پہنچی تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر میرے ذہن نے بے شمار امکانات پر غور کر لیا۔ یکایک ایک روح فرسا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ اس لڑکی کو بھی ہماری دنیا میں شامل کر لیا جائے گا؟"

"جی ہاں۔"

"اس کا کیا طریقہ ہو گا؟"

"وہی جو ہمیشہ سے رائج ہے۔ پہلے وہ لڑکی اپنے رازوں کے ساتھ مقدس روشنی کے دیدار کے لیے لائی جائے گی۔ معظم سانوس اس پر نظر فرمائیں گے اور وہ سالی بھی ایک مقررہ عرصہ تک وہ معظم سانوس کی خدمت میں رہے گی پھر وہ ایک عام فرد کی حیثیت سے ہم میں شامل ہو جائے گی۔ وہ اپنے "ساتھی" کے لیے کسی کو بھی منتخب کرنے کے لیے آزاد ہو گی۔ اگر آپ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ بھی آپ کو چاہتی ہے تو پھر یہاں آپ کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔"

میرے کانوں میں لڑکی کی آواز نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا تھا۔ ایک حسین غار کے حوالے سے کچھ دیر پہلے میرے ذہن میں جو بھٹکی ہوئی سوچیں آئی تھیں وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئیں۔ دوشیزاؤں کے بلوری جسم' ریشمی خواب گاہیں' دھوپ کی صراحیاں' سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا۔ میرا تصور پر صرف ایک ہی نقش ٹھہرا ہوا تھا۔

میں غزالہ کو سانوس کی خواب گاہ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک مجبور محض کی حیثیت سے اس کے سامنے تھی۔ اس کی مقناطیسیت میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ ہر رات اس سے کھیل رہا تھا۔ میرا تن بدن سلگ اٹھا۔ میں غزالہ کے لیے ایسی بے بسی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اپنے رشتے ناتوں سے ہمیشہ کے لیے جدا کرا دی جائے گی۔ ایک ایسی دنیا میں پہنچا دی جائے گی جہاں وہ تمام عمر نیم خوابیدہ حالت میں رہے گی اور اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھلا پائے گی۔

لز کی یہ اطلاع ایک ایسے برقی جھٹکے کی طرح تھی جس نے میرے سوئے ہوئے ذہن کو بیدار کر دیا تھا۔ ایک پردہ سا آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اور دھندلاتے ہوئے مناظر واضح تر ہو گئے تھے۔ مجھے لگا جیسے میں کئی دنوں سے ایک خوف ناک دھند میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا___ آج اچانک اس دھند کو چیر کر نکل آیا ہوں۔ لز تو اطلاع دے کر چلی گئی لیکن میں وہیں آب جو کے کنارے بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں تلاطم مچا ہوا تھا۔ مجھے اپنے خیالات پر ندامت ہونے لگی جو کچھ دیر پہلے میرے ذہن میں آئے تھے۔ میں نے کیوں سوچا تھا ان رنگینیوں میں گم ہو جانے کا؟ میں جس چیز کو برا سمجھ رہا تھا اسے ہی اپنانے کا کیوں سوچ رہا تھا؟ کیا میں قبول کر سکتا تھا کہ غزالہ ایسی زندگی گزارے! شفقتا ایسی زندگی گزارے؟ انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کے اصل بچے کون سے ہیں؟ ان کا کوئی شریک سفر ہو اور نہ غم خوار۔ وہ انسانیت سے دور اور حیوانیت سے قریب ہوتی چلی جائیں؟ جیسے کوئی شخص بے پناہ قوتِ ارادی کے ساتھ نیند سے بیدار ہو جاتا ہے' میں نے بھی اپنے ذہن کو اس ماحول کے سحر سے آزاد کر لیا۔ سر کو زور سے جھٹک کر میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس جنت نظیر غار میں آنے کے بعد پہلی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ اس کے ساتھ ہی سانوس کے بارے میں بھی مجھے اپنے خیالات یکسر بدلے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ خدا نہیں تھا انسان تھا اور انسان خطا کا پتلا ہے۔ سانوس بھی خطا کر رہا تھا۔ وہ محنت کی عظمت پر حیران کن حد تک یقین رکھتا تھا اور یہ بہت اچھی بات تھی لیکن وہ یہاں ایک ایسی معاشرت کو پروان چڑھا رہا تھا جو کسی طور پر قابلِ ستائش نہیں تھی۔ کم از کم میرے جیسے شخص کے لیے تو نہیں تھی۔ میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک اندیشہ دیو کی طرح میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اگر واقعی وہی ہو جاتا جس کی اطلاع لز نے دی تھی

تو کیا ہوتا؟ اگر غزال، شیخ عاصم اور ان کے مبینہ ساتھی "مقدس روشنی" کے دیدار کے لیے یہاں پہنچ جاتے تو پھر سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ اگر مجھے کچھ کرنا تھا تو ان کی آمد سے پہلے پہلے کرنا تھا۔ جب "کچھ کرنے" کا خیال میرے ذہن میں آیا تو میں اپنے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کرنے لگا کہ سانوس کوئی غیر مرئی مخلوق نہیں بلکہ میرے جیسا گوشت و پوست کا ایک انسان ہے۔ اسے چھوا جا سکتا ہے' دیکھا جا سکتا ہے MAN TO MAN اس سے بات کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے اس میں جناتائز کرنے کی صلاحیتیں ہوں لیکن یہ کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں۔

O☆O

وہ رات کا پہلا پہر تھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ میرے ساتھ والے دو دھیا بستر پر محو خواب تھی۔ شمع دان کی نہایت مدھم روشنی کمرے کے ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ میں نے اپنے تکیے کے نیچے سے گوشت کاٹنے والی وہ لمبی چھری نکالی جو میں نے آج دوپہر مطبخ سے اٹھائی تھی اور اپنے سفید لبادے میں چھپا کر یہاں لے آیا تھا۔ اب میں نے پھر یہ چھری لبادے میں چھپائی اور دبے قدموں خواب گاہ سے نکل آیا۔ میرے پاؤں میں نرم چمڑے کے وہی جوتے تھے جو فرش پر آواز پیدا نہیں کرتے تھے۔ میں محتاط قدموں سے کھوہ کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سانوس (مقدس روشنی) کی قیام گاہ تھی۔ حسین و جمیل غار میں معدنیات کی قلمیں فانوسوں کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ رنگ برنگے شفاف پتھر آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔ مکینوں کی طرح کھوہ بھی سوئی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں پر پہریدار یا محافظ وغیرہ کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سانوس کی رہائش گاہ پر بھی پہریدار قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ میں مختلف راستوں سے گزر کر اس چوبی پھاٹک تک پہنچ گیا جو سانوس کی رہائش گاہ کی حدود کو ظاہر کرتا تھا۔ پھاٹک پر سنہری عقاب کی شبیہ بھی کندہ تھی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد پھاٹک کو دھکیلا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں اسے پھلانگ کر دوسری جانب پہنچ گیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے اور تمام حسیات جاگ اٹھی تھیں۔ لبادے کے نیچے تیز دھار چھری پر میری گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ میرے دل میں بار بار یہ خدشہ پیدا ہوتا کہ کہیں میرا ارادہ متزلزل نہ ہو جائے۔ کہیں پھر وہی دھند میرے حواس پر نہ چھا جائے جس نے مجھے اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ کر رکھا تھا اور میں اس ماحول میں مدغم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں جلد از جلد عجیب الخلق سانوس کے سامنے پہنچ جانا چاہتا تھا اور وہ سب کچھ کر گزرنا چاہتا تھا جو کرنا ضروری تھا۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ "وہ سب نہیں ہونے دوں گا جس کا "اندیشہ" کسی اطلاع نے ذہن میں جگایا ہے۔ غزال یا اس کا شوہر کسی بھی یہاں نہیں پہنچیں گے۔ اگر ان کی مبینہ آمد ہوئی تو مجھے سانوس نامی اس شخص کو قتل بھی کرنا پڑا تو کر گزروں گا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ سروج سانوس کی رہائش گاہ پر ہے۔ میں سروج سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کیسا ہے؟ اگر سروج کی حالت اب تک غیر تھی تو بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا جا سکتا تھا۔ اس حالت کا ذمہ دار صرف سانوس تھا۔ وہ ایک ہپناٹسٹ تھا اور ہپناٹزم کے معمول کی حالت کی تمام ذمہ داری ہپناٹسٹ پر ہوتی ہے۔

میں کسی بھی رکاوٹ کا سامنا کیے بغیر ان کمروں میں داخل ہو گیا جو سانوس کی رہائش گاہ کہلاتے تھے۔ ویسے ہی کمرے تھے جن میں عام لوگ رہائش رکھتے تھے۔ کہیں کوئی آرائش نظر آتی تھی اور نہ غیر معمولی چمک۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے اس اہم ترین گوشے میں گھس آیا ہوں۔۔۔ میں نے ایک پردہ جھانکا اور دنگ رہ گیا۔ سانوس میرے سامنے تھا۔ ریشمی پردے تھے' نہ جھلملاتی روشنیاں' نہ کوئی طلسمی ماحول۔ مجھ سے صرف دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر خوبرو سانوس تھا۔ وہ مسہری پر بیٹھا تھا۔ لڑکیوں پر دبیز پردے تھے۔ اونی نمدے تھے۔ حسین و جمیل شخص نیم دراز تھا۔ شمع کی روشنی میں وہ کوئی ضخیم کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس کے خوب صورت سنہری بالوں کی ایک لٹ ڈھلک کر اس کی فراخ پیشانی پر آ گئی تھی۔ اس کی وجاہت نے چند لمحوں کے لیے مجھے مبہوت سا کر دیا۔

اچانک اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "آ گئے ہو شاہ؟"

میں سر تا پا لرز گیا۔ وہ مجھے دیکھے بغیر میری موجودگی محسوس کر چکا تھا یا پھر وہ میری بے خبری میں مجھے دیکھ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آئی کہ لبادے کے نیچے سے چھری نکال کر فرش پر پھینک دوں اور سر جھکا کر خوبرو سانوس کے روبرو کھڑا ہو جاؤں لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے قوتِ ارادی کی ایک لہر توانائی بن کر میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میری فطری خودسری نے بھی سر اٹھایا۔ میں نے بلند کیا اور میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ سانوس میری طرح گوشت و پوست کا ایک انسان ہے۔ میں اس کے ساتھ اسی انداز میں بات کر سکتا ہوں جس طرح ایک شخص دوسرے سے کرتا ہے۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوا' صندلی خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا' اس کے ساتھ ہی پہلو کی جانب سے ایک ہیولا سا میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں سانوس کے قریب پہنچتا۔ ہیولے نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑے زور سے چیخا "نہیں۔۔۔ شفیع محمد۔۔۔ نہیں۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ خدا کے لیے پیچھے ہٹ جاؤ۔"

اس آواز نے چند لمحے کے لیے مجھے مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ مجھے اپنی سماعت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ میری جانی پہچانی آواز تھی اور ہمیشہ کی طرح یہ آواز۔۔۔ ایک بار پھر مجھے بری طرح چونکانے کا باعث بنی تھی۔ یہ سائیں عالی کی آواز تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔۔۔ ہاں وہ سائیں عالی ہی تھا۔ وہی آفت کا پرکالا' وہی آسیب زادہ جو حالات کی تاریکی میں بھوت بن کر چھپا رہتا تھا اور پھر اچانک کسی موڑ پر اچانک سے نمودار ہو جاتا تھا۔ اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اور پورے زور سے دھکیل رہا تھا۔ وہ مجھے خوبرو سانوس سے دور لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سانوس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہ اب کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا جسم کسی مجسمے کی طرح بے حرکت تھا۔ میں نے اس کی نیلی آنکھیں دیکھیں۔ خدا کی پناہ۔ ان میں نیلگوں بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ایک خاموش غضب تھا جو برقی لہروں کی طرح تڑپ رہا تھا۔

سائیں عالی نے مجھے دھکیل کر دیوار سے لگا دیا پھر گھوم کر سانوس سے مخاطب ہوا "اسے معاف کر دو سانوس۔۔۔ یہ نادان ہے۔ یہ تمہاری طاقت سے بے خبر ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے' بے خبری میں کیا ہے۔ یہ تمہارے رحم کا حق دار ہے۔"

میں حیرت سے کبھی سائیں عالی کی طرف اور کبھی خوبرو سانوس کی طرف دیکھتا تھا۔ سائیں عالی کی یہاں موجودگی بے حد حیرت ناک تھی۔ وہ اپنے مخصوص لباس کے بجائے سفید لبادے میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں گھنٹیاں تھیں اور مالا کیں۔ اس غار میں رہنے والے دیگر افراد کی طرح سائیں عالی بھی بہت اجلا اور صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ خوفناک لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "بے وقوف' احمق! یہ تم نے کیا کیا ہے۔ کس نے کہا تھا تم سے ایسا کرنے کو۔ معافی مانگو۔ میں کہتا ہوں' معافی مانگو ان سے۔"

سائیں کا اشارہ سانوس کی طرف تھا۔ سانوس نے ہم دونوں کی طرف سے رخ پھیر لیا پھر اس کی بے حد گمبھیر آواز ابھری "اسے یہاں سے لے جاؤ عالی۔"

سائیں عالی دانت پیس رہا تھا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ ساتھ ساتھ وہ غرا رہا تھا "بہت برا کیا تم نے شفیع محمد! بہت برا کیا۔"

"میں نے ابھی کچھ نہیں کیا۔ ہاں کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

سائیں نے میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا "تجھے خدا کا واسطہ خاموش رہ۔ کچھ مت بول۔ تجھے کچھ خبر نہیں تو کیا کہہ رہا ہے۔"

سائیں عالی پر ہیجان کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا اور نشست پر دھکیل کر بولا "بیٹھ جاؤ یہاں۔۔۔ خبردار جو اٹھنے کی کوشش کی۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"سانوس کے پاس۔"

"دیکھو سائیں عالی!" میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "جو غلط ہے وہ غلط ہے۔ چاہے وہ سانوس نے کیا ہو یا اس سے بھی بڑے کسی شعبدے باز نے۔ میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے اب اس سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ سانوس سے کہہ دو وہ سروج کو آزاد کر دے اور ہمیں یہاں سے بحفاظت واپس نکالنے کی ذمہ داری قبول کرے۔"

"تم بکواس بند نہیں کر سکتے۔" سائیں عالی پھر غرایا "سروج کی تم سے زیادہ فکر مجھے ہونی چاہیے اور مجھے ہے بھی۔۔۔ لیکن تم نہیں جانتے۔۔۔ وہ اب ہمارے لیے بے کار ہے۔ کسی کام کی نہیں وہ۔۔۔ وہ اب ہمیشہ کے لیے یہاں کی ہو چکی ہے۔ اگر ہم اپنی خیریت چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا خیال ذہن سے نکالنا ہو گا۔"

"سائیں عالی! یہ بات تمہارے نزدیک درست ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک نہیں۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ میں حق بات ہر حال میں کہوں گا۔ سانوس جو کھیل اس عشرت کدے میں کھیل رہا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے۔"

سائیں عالی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر دھیمے لہجے میں غرایا "اچھا تو اب بک بک بند رکھ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا اور جاتے جاتے دروازہ

بند کر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کے بولنے کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ یقیناً وہ اسی کمرے میں تھا جہاں کچھ دیر پہلے سانتوس سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگائے اور سننے کی کوشش کرنے لگا۔ سائیں عالی ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتا تھا اور اسی زبان میں سانتوس سے بات کر رہا تھا۔ سائیں عالی کا لہجہ التجائیہ تھا۔ میں الفاظ سن نہیں پا رہا تھا لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ سانتوس کا غضب ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی ممکنہ سزا سے مجھے بچانے کے لیے وہ سانتوس کو مختلف یقین دہانیاں کرا رہا تھا۔

یکایک میں چونک گیا۔ میری نگاہ کھڑکی سے باہر ایک نسوانی ہیولے پر پڑی۔ یہ ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ بسنتی لباس میں تھی اور دھیمے قدموں سے کھڑکی کے سامنے سے گزری تھی۔ میں سیکنڈ کے دسویں حصے میں پہچان گیا۔ وہ سروج تھی۔ وہ اپنے اردگرد سے بالکل لاتعلق دکھائی دے رہی تھی۔ میرے اعصاب ایک دم تن گئے۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرا ذہن پوری طرح جاگ رہا تھا اور میرے خیال میں یہ بیداری اس وقت شروع ہوئی تھی جب آج صبح لڑکی زبانی مجھے سانتوس کے ارادوں کا علم ہوا تھا۔ غزالہ کا نام میرے لیے ایک ایسا الیکٹرک شاک ثابت ہوا تھا جس نے میری بے حسی اور غنودگی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ میں نے ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ میں تیزی سے سروج کی طرف بڑھا۔

"سروج!" میں نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ ہاں وہ سروج ہی تھی لیکن خدا کی پناہ۔۔۔ اس کی آنکھیں اپنے اندر ریگانگی کا سمندر لیے ہوئے تھیں۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی مگر لگتا تھا کہ خلا میں دیکھ رہی ہو۔ میں نے بلاجھجک اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ تھوڑا سا جھنجوڑ کر کہا "سروج! میں ہوں۔ شاہ جہاں" مجھے پہچانا نہیں تم نے؟"

"چھوڑ دو۔" وہ کسمسا کر آہستہ سے بولی۔

"سروج ہوش میں آؤ۔" میں نے اسے پھر ہلایا۔

وہ مچل گئی۔ بڑی لاتعلقی سے اس نے میرا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

"نہیں سروج! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ مجھے بتاؤ تم مجھے پہچان رہی ہو یا نہیں؟"

اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ان میں پہلے بیگانگی تو نہیں تھی لیکن شناسائی بھی نہیں تھی۔ "سروج! ساتھ آؤ۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سائیں بھی وہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے اسے کمرے کی طرف لے جانا چاہا۔ ایک دم اس کا جسم تختے کی طرح اکڑ گیا۔ اس نے خود کو مجھ سے جدا کرنا چاہا۔ جب ناکامی ہوئی تو ایک دم اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔ پلک جھپکنے میں میرے ذہن نے فیصلہ کیا۔ میرے ہاتھ سروج کی گردن سے قریب تر تھے۔ اس سے پہلے کہ اس کا منہ پوری طرح کھلتا اور وہ چیختی، میں نے اس کی گردن کے مخصوص حصے پر انگوٹھے سے دباؤ ڈالا۔ یہ بڑا جچا تلا دباؤ تھا۔ سروج کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ کھوہ کا وہ حصہ قریباً خالی تھا۔ ویسے بھی یہ نصف شب کا وقت تھا مگر یہ صورت حال تادیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی بھی وقت کوئی شخص موقع پر نظر آ سکتا تھا۔ میں بے ہوش سروج کو بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے میں لے آیا۔ سائیں اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے بے ہوش سروج کو کمرے میں موجود مسہری کے نیچے گھسیڑ دیا۔ شمع دان کا رخ ایسا تھا کہ مسہری کے نیچے بالکل تاریکی تھی اور جب تک کوئی خصوصی طور پر مسہری کے نیچے جھانکنے کی کوشش نہ کرتا، سروج دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔

چند ہی لمحے بعد سائیں عالی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور وہ اندر آ گیا۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی غیر حاضری میں یہاں کیا واقعہ رونما ہوا ہے۔ سائیں کے چہرے پر ہیجانی کیفیت برقرار تھی۔ وہ جلتی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے پہلی بار غور سے سائیں کو دیکھا۔ وہ پہلے سے کافی دبلا نظر آ رہا تھا۔ چہرہ زرد تھا اور خشک ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔

وہ ایک گہری سانس لے کر میرے سامنے نشست پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ یہ کمرا درحقیقت سانتوس کی رہائش گاہ کا ہی ایک حصہ تھا۔ میں اب تک بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ کمرا سائیں عالی کے لیے مخصوص ہے۔ سائیں عالی کے استعمال میں رہنے والی اکثر چیزیں مثلاً عصا، مالا، کھڑاویں وغیرہ یہاں نظر آ رہی تھیں۔ خبر نہیں کہ اس غار میں سائیں عالی یہ اشیا کیسے حاصل کر سکا تھا۔ میں نے سائیں عالی کو پہلی بار اس قدر سنجیدہ دیکھا تھا۔ وہ بولا "شفیع محمد! وہ بہت طاقتور ہے۔ اس کے ہاتھ میری اور تمہاری توقع سے زیادہ لمبے ہیں۔ وہ اپنے

علیم الحق حقی — کا قیامت خیز ناول
انسانی قیامت
قیمت: ۱۰۰/۰۰ روپے
ایک فانی انسان کی داستانِ عبرت جو لافانی بننا چاہتا تھا اُس نے قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دی تھی۔
براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

ابرو کے اشارے سے وہ کام لے لیتا ہے جو ہم دن رات سر پٹخ کر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ ہمیں اس کی بڑائی تسلیم کرنا پڑے گی۔"

"بڑائی تسلیم کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ سروج اب واپس آسکتی ہے۔ اگر تم ایسی کوئی کوشش کرو گے تو وہ صرف اور صرف حماقت کہلائے گی۔ باقی رہی ہمارے یہاں سے واپس جانے کی بات۔ تو اس کا دارومدار بھی صرف سانوس پر ہے۔ وہ چاہے تو ہم جا سکتے ہیں لیکن ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہمیں یہاں سے بھیجے گا کہ نہیں۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ تمہاری سزا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ عام طور پر غصے میں نہیں آتا لیکن تم نے دوسری مرتبہ اسے سخت مشتعل کیا ہے۔ اگر اس نے تمہیں سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تو یہ سزا موت سے کم نہیں ہوگی۔ میں جانتا ہوں وہ بہت سخت سزا ہوگی۔ اوپر والا تمہیں ایسی کسی بھی مصیبت سے محفوظ رکھے۔"

میں نے کہا "کیا مطلب ہے تمہارا؟ پہلی دفعہ میں نے سانوس کو کب خفا کیا تھا؟"

وہ بولا "تم نے اب تک خود کو یہاں کے ماحول سے مانوس نہیں کیا۔ ایک خوب صورت لڑکی دن رات تمہارے ساتھ رہتی ہے لیکن تم دونوں میں ابھی تک کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا۔ یہ یہاں کی روایت کے خلاف ہے۔ سانوس کا خیال ہے کہ تم زبردست قوت ارادی رکھتے ہو۔ ایسے لوگ اس مقدس دیوار کے اندر "مخصوص انداز" کی زندگی گزارنے کے لیے مناسب نہیں سمجھے جاتے۔ اب تم نے سانوس کی رہائش گاہ میں داخل ہو کر اور سانوس کے بارے میں برا ارادہ اپنا کر اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کر لی ہیں۔"

"برے ارادے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

سائیں عالی عجیب سے لہجے میں بولا "سانوس جانتا ہے کہ تمہارے لباس میں تیز دھار آلہ موجود ہے اور میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس کچھ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ ہتھیار میری حفاظت کے لیے ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔ اس کیونی میں کسی کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں دشمنی اور ایذا رسانی جیسے تصورات کا کوئی وجود نہیں۔ بہرحال تم خواہ مخواہ کوئی بحث مت کرو۔ یہاں تمہارے چھپانے سے کچھ بھی چھپنے والا نہیں۔ سانوس سب کچھ جانتا ہے۔ شاید وہ یہ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ حل اب ایک ہی ہے۔ غیر مشروط معافی۔ تمہاری طرف سے اس معافی کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سائیں! میرا خیال ہے کہ تم اس شخص سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو چکے ہو۔ وہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں، انسان ہے بلکہ میرے خیال میں کم تر درجے کا انسان ہے۔ تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ اپنی شعبدے بازی کو اپنی عیاشیوں کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ رابلی قبیلے کی خوبرو لڑکیاں اس کی دلہن بنا کر یہاں بھیجی جاتی ہیں۔ وہ اس کی ہوس کا ایندھن بنتی ہیں اور پھر اس کیونی کے عام لوگوں میں شامل ہو کر ایک غیر اخلاقی و غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ نائیلہ اور سروج کے اغوا کے بعد اب ہمیں کس ثبوت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر اب بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی اور تمہیں مزید ثبوت چاہیے تو تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔ میرے خیال میں چند روز تک فرزانہ بھی کسی جنون کا شکار ہو کر اس غار میں پہنچ جائے گی۔"

"شفیع محمد! تم بلا سوچے سمجھے بول رہے ہو۔" سائیں عالی کراہا "تمہیں سانوس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ شاید تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سانوس کی زندگی میں آج تک کوئی عورت نہیں آئی۔ وہ عورت سے اتنا ہی دور رہتا ہے جتنا مشرق سے مغرب۔ یہاں پہنچنے والی عورتیں سانوس کے ساتھ رہتی ضرور ہیں لیکن وہ اکثر ان کی شکل تک نہیں دیکھتا اور جس کو تم شعبدے بازی کہہ رہے ہو وہ بھی شعبدے بازی نہیں ہے۔ وہ ایک جیتی جاگتی توانائی ہے۔ ایک کشش ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے، محسوس کیا جا سکتا ہے۔"

میں سکتے کی حالت میں سائیں عالی کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے کہا "یہ تم کیا بات کر رہے ہو سائیں! میں یہ بات تو مان لوں کہ سانوس عورت سے دور ہے۔ وہ نوخیز دلہنیں، ناز سنگھار، وہ شب عروسی اور گرم چشمے کا روایتی غسل۔ یہ سب کیا ہے؟"

"وہ سب فریب نظر ہے۔ ایک روایت کے تانے بانے ہیں۔" سائیں نے پورے وثوق سے کہا۔

اچانک میرے ساتھ ساتھ سائیں بھی چونک گیا۔ کمرے کے دروازے پر تیز دستک ہوئی تھی۔ سائیں

نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک مقامی شخص نظر آیا۔ اس نے سائیں کے ساتھ کھسر پھسر کی پھر وہ دونوں باہر چلے گئے۔ چند لمحے بعد سائیں واپس آیا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر شدید ذہنی ہیجان کی زد میں تھا۔ وہ پھنکار کر بولا "شفیع محمد! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ کہہ رہے ہیں کہ تم سروج کو یہاں لائے ہو؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سائیں نے شمع دان اٹھایا اور اس کی لو میں مسہری کے نیچے جھانکا۔ وہاں سروج بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی۔

سائیں کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا "یہ کیا کر دیا تو نے احمق..... او میرے خدا! یہ کیا ہو رہا ہے۔"

مجھے لگا کہ سائیں "جلالی" حالت میں مجھ پر جھپٹ پڑے گا اور مجھے جھنجوڑنے بھنبھوڑنے کی کوشش کرے گا لیکن اسی وقت باہر سے کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں اور یوں محسوس ہوا کہ وہ لوگ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ سائیں عالی کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں۔ اس کی نگاہ تیزی سے کمرے میں چکرائی اور اپنے عصا نما ڈنڈے پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس نے عصا اٹھایا اور دروازے کی طرف آگیا۔ دروازہ اب زور زور سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ سائیں عالی نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ ناقابل فراموش تھا۔ سرسراتی آواز میں بولا "میں سب سنبھال لوں گا شفیع محمد، تو اس معاملے میں نہیں آئے گا۔ بالکل نہیں آئے گا۔"

پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی کنڈی گرا دی۔ باہر سے یک دم زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی نے سائیں کو دھکیلا بھی تھا۔ بولنے والے قبائلی زبان میں بول رہے تھے۔ وہ بھرا مار کر اندر گھس آنا چاہتے تھے لیکن سائیں عالی چٹان کی طرح ان کے راستے میں کھڑا تھا پھر ایک دم صورت حال بگڑ گئی۔ سائیں کو دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ سائیں کے حلق سے ایک نعرۂ مستانہ بلند ہوا۔ میں نے اس کے عصا کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ برق کی سی تیزی تھی، ایک دیوانہ سا انداز تھا۔ سائیں آنے والوں پر پل پڑا تھا۔ ان لوگوں کے ہاتھ خالی تھے۔ انہوں نے پھرتی کا مظاہرہ کر کے سائیں عالی پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن قطعی ناکام رہے۔ سائیں انہیں مارتا دھکیلتا ہوا دور لے گیا پھر یہ ہنگامہ ایک دم میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ سائیں کے عصا کی ایک ضرب فانوس کو لگی تھی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ بے ہوش سروج کو مسہری کے نیچے سے نکالوں اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے جھک کر مسہری کے نیچے دیکھا۔ سروج بے ہوش اور بے ترتیب پڑی تھی۔ میں نے شانے سے کھینچ کر اسے باہر نکال لیا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ ہوش میں آرہی ہے۔ وہ کسمسا رہی تھی پھر اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور بے چینی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کراہنے لگی اور مچلنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑا اور اپنے بارے میں بتانے کی کوشش کی۔ وہ کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ پھر چیخنے لگے گی۔ میں نے اس کی گردن کی رگ کو دوبارہ مسل دیا۔ وہ بے حرکت ہو گئی تو میں نے اسے کندھے پر لادا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ فانوس ٹوٹ جانے کی وجہ سے قرب و جوار میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پندرہ بیس گز فاصلہ طے کر کے جونہی میں روشنی میں آیا، مجھے تین افراد نظر آئے۔ وہ بالکل نہتے تھے۔ انہوں نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے دو کے پیٹ میں اپنی ٹانگوں سے زوردار ضربیں لگائیں اور تیسرے کو کندھے سے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد میں اندھا دھند بھاگتا چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں لیکن میں بھاگ رہا تھا۔ میں کسی ایسے محفوظ گوشے میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں میں کچھ دیر سانوس اور اس کے پیروکاروں کی نگاہ سے اوجھل رہ سکوں۔ میں سانوس اور اس کے پیروکاروں کا ردعمل دیکھنا چاہ رہا تھا..... مگر میں غار کی ایک ایسی شاخ میں داخل ہو گیا تھا جو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں چھپنے یا ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ موجود نہیں تھی۔ یہ راستہ بڑی تیزی سے گہرائی میں جا رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دو ڈھائی فرلانگ فاصلہ طے کرتے کرتے میں کئی سو فٹ گہرائی میں اتر گیا ہوں۔ یہ جگہ بالائی غار کی طرح بہت زیادہ صاف ستھری نہیں تھی۔ یہاں LIME STONE (چونے کا پتھر) بہت کثرت سے نظر آرہا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھ رہا تھا، روشنی کم اور تاریکی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ تاریکی بہت زیادہ ہو گئی۔ میرے قدموں کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ اس زمین دوز غار میں بھاگتے بھاگتے اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ "طویل طویل غار" اسی غار یا سرنگ کا حصہ ہے جو میں داوی داخان میں دیکھ چکا ہوں۔ وہی بناوٹ تھی۔ وہی ساخت تھی۔ وہی چونے کے پتھر اور جپسم کے آثار تھے۔ میں

نے کہیں سنا تھا کہ زیر زمین غاروں کے سلسلے بہت طویل ہوتے ہیں اور شاخ در شاخ میلوں تک پھیل جاتے ہیں۔ وادی واخان یہاں سے پینتیس چالیس میل کے فاصلے پر تھی اور یہ بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میری معلومات کے مطابق سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں میں پائے جانے والے HOLLOCH نامی غار کی شاخوں کی لمبائی قریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو یہ بات قرین قیاس تھی کہ مقدس دیوار کے اندر واقع یہ کھوہ اور واخان کی سرنگ در حقیقت ایک ہی "بڑے غار" کے دو حصے ہوں۔ ایک عظیم الشان غار جو ان پہاڑوں میں میلوں تک پھیلاؤ رکھتا ہو۔

اچانک نیم تاریکی میں میرا پاؤں پھسلا اور میں پانی میں گرا۔ سروج بدستور میرے کندھے پر تھی۔ میں اٹھا تو کمر تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ غار کے اس حصے میں خاصی سردی تھی لیکن جس پانی میں ہم گرے تھے وہ نیم گرم تھا۔ کم از کم سرد نہیں تھا۔ غالباً یہ اسی گرم چشمے کی کوئی رو تھی جو اس غار میں بہتا تھا یا پھر یہاں پانی ایک چھوٹی سی جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس رو کی دوسری جانب پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ سروج بھی مکمل طور پر بھیگ چکی تھی۔ گویا غار کے اس حصے میں سرد ہوا بھی موجود تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ تیز ہوا کسی بڑے روزن یا سوراخ سے زمین کی گہرائیوں میں داخل ہو رہی تھی اور کسی دوسرے روزن یا سوراخ سے باہر نکل رہی تھی۔ اس ہوا کی آمدورفت کے سبب ایک گونج دار سی آواز بھی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک جگہ مجھے تھوڑی سی روشنی دکھائی دی۔ آگے جا کر دیکھا تو یہ ایک بڑی چٹان تھی۔ اس چٹان کی آڑ میں ایک چھوٹی سی پناہ گاہ بن گئی تھی۔ یہاں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ ایک جگہ تھوڑے سے ادھ بجھے انگارے موجود تھے۔ جو روشنی مجھے دکھائی دے رہی تھی وہ ان انگاروں کی ہی تھی۔ انگاروں کے قریب ہی اخروٹ کے چھلکے اور کچھ تازہ پھلوں کی گٹھلیاں موجود تھیں۔ ایک ہموار جگہ پر خشک گھاس پھونس بچھا کر عارضی سا بستر بنایا گیا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اس الگ تھلگ مقام کو کسی رومانی جوڑے نے پکنک پوائنٹ کے طور پر استعمال کیا ہے اور یہ واقعہ غالباً رات کے پہلے پہر کا تھا۔ کچھ "محبت بھرے" لمحات یہاں گزارنے کے بعد اور گرم چشمے کے پانی سے غسل فرمانے کے بعد وہ لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔

میں نے سروج کو گھاس پھونس کے بستر پر لٹا دیا۔ خشک لکڑیاں قریب ہی موجود تھیں، میں نے ان کی مدد سے انگاروں کو آگ میں تبدیل کر دیا۔ یہ جگہ بالکل سنسان عام راستے سے ہٹ کر تھی۔ ہتھیار کے طور پر چھری تک میرے پاس موجود تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو آتشیں ہتھیاروں کا وجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میرے پاس موجود چھری کی اہمیت سیون ایم ایم رائفل سے کم نہیں تھی۔ قریباً آدھ گھنٹے تک میں اپنے اردگرد چوکنا رہا۔ میری سماعت کسی بھی آہٹ کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھی لیکن کوئی آہٹ میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ میں یہ جانتا تھا کہ سانوس کی رہائش گاہ پر کیا ہوا ہے۔ سائیں بڑی شدت سے سانوس کے پیروکاروں پر حملہ آور ہوا۔ اس کے بعد ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔

میں نے دیکھا، سروج سردی سے لرز رہی ہے۔ اس کے جسم پر بھیگا ہوا لباس تھا۔ وہ ابھی تک نیم بے ہوش تھی۔ میں نے لباس اس کے جسم سے علیحدہ کیا پھر اسے اچھی طرح نچوڑا اور آگ کے قریب پھیلا دیا۔ میرے جسم پر دوہرا لبادہ موجود تھا۔ بالائی لبادہ آگ کے قریب رہنے سے کافی حد تک سوکھ چکا تھا۔ میں نے سروج کا برہنہ جسم اس لبادے میں لپیٹ دیا اور خود بھی آگ کے پاس نیم دراز ہو گیا۔ شعلے غار کی پتھریلی دیوار پر عجیب و غریب ہیولے بنا رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے بالکل پاس کسی متحرک شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید کوئی رینگنے والا جاندار ہے یا پھر کسی تاریک گوشے سے پھڑک کر نکلنے والی کوئی چمگادڑ یہاں آ گری ہے۔ ایک جلتی ہوئی لکڑی کو میں نے مشعل کی طرح اٹھایا اور دھیان سے فرش پر دیکھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی مچھلی تھی جو بمشکل تین انچ لمبی۔ اس سیاہ مچھلی کا سر مینڈک نما تھا۔ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ اس ننھی مچھلی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ طویل غاروں کی گہرائیوں میں اکثر زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چمگادڑ، چوہے، حشرات الارض اور کہیں کہیں مچھلیاں بھی۔ ایسے بعض جانداروں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ پیدائشی طور پر ان کی آنکھیں نہیں ہوتیں (کیونکہ وہ ہزاروں لاکھوں سال سے نسل در نسل غار کی دائمی تاریکی میں پروان چڑھے ہوتے ہیں) آج میں اپنی آنکھوں سے ایک ایسے ہی "بے چشم" جاندار کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مچھلی شعلوں کی روشنی میں پتھریلے فرش پر مچل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کا نشان تک نہیں تھا۔ غالباً یہ مچھلی میرے یا سروج کے لباس میں کہیں اٹک کر پانی سے باہر آئی

تھی اور اب اپنی آبی دنیا میں لوٹنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ میں نے اس بیمار مچھلی کو اس کی تمام تر تاریکیوں سمیت واپس تاریک پانی میں پھینک دیا۔

سروج کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بے ہوشی اب نیند میں بدل چکی ہے۔ میں آگ کے قریب ہی نیم دراز ہو گیا۔ میرا ذہن اس قدیم غار کے بارے میں سوچنے لگا اور اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا جو "مقدس روشنی" (کلا) تھا اور یہاں ایک انوکھی تہذیب کو پروان چڑھا رہا تھا۔ یہ شخص میری توقعات سے بڑھ کر پُراسرار تھا۔ میرا ذہن اس شخص سے مکمل طور پر اتفاق کر رہا تھا اور نہ اختلاف۔ ان تھک محنت اور جفاکشی کے حوالے سے اس شخص کا فلسفہ قابل تعریف تھا اور اس نے میرے دل کی گہرائیوں کو چھوا تھا لیکن یہاں کا طرز معاشرت میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور شاید کسی بھی معقول شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ دن کے لیے اس ماحول نے مجھے مسحور ضرور کر دیا تھا لیکن ایک روز پہلے غزال کے نام سے جو برقی جھٹکا مجھے لگا اس نے ذہن کو ہر سحر سے آزاد کر دیا تھا۔ کم از کم وقتی طور پر تو مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی نامعلوم سحر سے آزاد ہو گیا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے سائیں مالی نے سانوس کی نجی زندگی کے بارے میں جو انکشاف کیا تھا وہ واقعی حیران کن تھا۔ اگر سائیں کے بقول سانوس واقعی عورتوں سے دور تھا تو پھر اس کا کردار اور بھی ناقابل فہم ہو جاتا تھا۔ ذہن میں بار بار ایک سوال اٹھ رہا تھا کہ اگر وہ خود ایک صاف ستھرے کردار اور اعلیٰ خیالات کا مالک ہے تو اپنے پیروکاروں کو ناروا آزادیاں کیوں دے رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اس کے کردار میں یہ سقم بھی موجود نہ ہوتا۔

شاید کچھ دیر کے لیے مجھے اونگھ آ گئی تھی۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو آگ بجھ چکی تھی اور اردگرد تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آگ دوبارہ روشن کی۔ میرے اندازے کے مطابق اس غار کی گہرائیوں سے باہر دن نکل آیا تھا۔ سروج ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے بدن پر سے میرا لبادہ کئی جگہ سے سرک گیا تھا۔ کندن بدن آگ کے شعلوں میں دمک رہا تھا۔ وہ ایک پری پیکر لڑکی تھی اور کسی بھی شخص کے ہوش و خرد پر بجلی بن کر گر سکتی تھی۔ میں نے لبادہ اس کے جسم پر درست کر دیا اور آگ میں مزید لکڑیاں جھونکنے کے لیے اٹھ بیٹھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ غار کے کسی قریبی حصے سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ یہ چاپ بہت مدھم تھی لیکن غار کی ساخت کی وجہ سے آواز گونج رہی تھی۔ میں نے آگ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے بجھایا اور دھیان سے آواز کا رخ جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی پھر وہ دائیں رخ پر چلی گئی اور بتدریج مدھم ہو گئی۔ لیکن جلد ہی وہ پھر سنائی دینے لگی اور آہستہ آہستہ واضح ہوتی چلی گئی۔ یہی وقت تھا جب سروج نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی برہنگی کی پروا کیے بغیر ایک دم بھاگ کھڑی ہو گی یا چیخنا چلانا شروع کر دے گی۔ اس موقع پر اس کی ہلکی سی آواز بھی میرے لیے مصیبت پیدا کر سکتی تھی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر دوبارہ لٹا دیا اور اس کے ہونٹ اپنے ہاتھ سے بند کر دیے۔ وہ بری طرح کسمسانے لگی اور میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی لیکن میں نے اسے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ آواز ہر پل قریب تر آ رہی تھی۔ قریباً بیس تیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر یہ آواز رک گئی۔ چار پانچ منٹ خاموشی سے گزرے۔ سروج مزاحمت کرنے کے بعد اب تھک گئی تھی اور میری بانہوں میں بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک چاپ پھر سنائی دینے لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا چکر کاٹ کر پچھلی طرف جا رہا تھا۔ شاید وہ میری موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا اور اب چکر کاٹ کر عقب سے نمودار ہونا چاہتا تھا۔ اس کی مدھم چاپ مجھے اس کی تازہ ترین پوزیشن سے آگاہ کر رہی تھی۔ جلد ہی میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ اب وہ پچھلی طرف سے میری جانب آ رہا تھا۔ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ سروج کو دوبارہ بے ہوشی کی تاریکی میں اتار دوں لیکن یہ کارروائی سروج کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میرا دل سروج کو اتنی تکلیف پہنچانے پر آمادہ نہیں ہو پا رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ میں نے اسے پھر کچھ دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

چھری ہاتھ میں لے کر میں آہستہ آہستہ آواز کی سمت بڑھا۔ میری چھٹی حس مجھے واضح طور پر کسی خطرے سے خبردار کر رہی تھی۔ پچاس ساٹھ گز آگے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہوا کی رفتار خاصی تیز ہو گئی ہے اور ہوا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آواز بھی بڑھ گئی ہے۔ یہ بڑی مہیب اور گونج دار آواز تھی۔ میرا لبادہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر آیا۔ میں نے غار کے اندر ایک وسیع و عریض ہموار جگہ دیکھی۔ یہاں غار کی چھت بہت اونچی تھی

اور دیوار یں بہت فاصلے پر تھیں۔ اگر یہ کہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بڑی چھت نہیں دیکھی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں پتھروں کی بے شمار چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ کہیں کہیں کتبے بھی لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ اس خوب صورت غار کا پُراسرار قبرستان ہے۔ یہ زمین کے اندر سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں رہنے والے سفید پوشوں کی آخری آرام گاہیں تھیں۔ یہ جگہ نیم روشن تھی۔ معلوم نہیں یہ قدرتی روشنی کہاں سے آرہی تھی۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی۔ ہوا کی رگڑ سے دیوار یں ملائم ہو چکی تھیں۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ہوا ان گنت زمانوں سے یونہی شب و روز چل رہی ہے۔ کیوں چل رہی ہے اس کا جواب ماہرارضیات ہی دے سکتے تھے اور وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ میں یہ دیکھ کر سکتے کی حالت میں رہ گیا کہ مجھ سے بیس تیس قدم کی دوری پر سفید ریشمی لباس والا وہ خوبرو سانوس موجود ہے۔ اس کا لباس اور اس کے سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے عین سامنے ایک شخص کھڑا تھا اور وہ سائیں عالی تھا۔ سائیں عالی کا سفید لبادہ بھی ہوا میں بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ سائیں عالی کے چہرے پر جو سنجیدگی تھی وہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سائیں کا چہرہ کسی بھورے پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔

سائیں کے ہونٹوں سے آواز نکلی اور تیز ہوا کے دوش پر سوار ہو کر میرے کانوں تک پہنچی۔ اس نے سانوس سے مخاطب ہو کر کہا "سانوس! یہ سب کچھ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ تم عالی ظرف ہو۔ ایک وسیع دل رکھتے ہو۔ تم اسے معاف کیوں نہیں کر دیتے؟"

سانوس نے مسحور کن آواز میں جواب دیا "معافی کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب جرم کا اقرار کیا جائے اور اقرار کے لیے گناہ گار کا سامنے آنا ضروری ہوتا ہے۔"

"لیکن ایسا تو عام لوگ کرتے ہیں۔ تم عام نہیں ہو سانوس۔ تمہیں قدرت نے توانائیاں بخشی ہیں۔ تم بغیر دیکھے بھی دیکھ لیتے ہو۔ بغیر سنے بھی سن لیتے ہو۔"

"لیکن میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔ مجرم کو قرار واقعی سزا نہ دلواؤں گا تو پھر یہ نظام بھی برقرار نہیں رہ سکے گا۔"

"اس نے کوئی جرم نہیں کیا سانوس۔ اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے کی طاقت سے عارضی طور پر اس ماحول کے سحر سے نکل آیا ہے۔ وہ تو ایک "حیران" شخص ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ اور کیوں ہے؟"

"میں اس کی معصومیت کی بات نہیں کر رہا۔ اصولوں کی بات کر رہا ہوں جن پر اس کی نیتی کا تقاضا ہے۔ اسے قرار واقعی سزا ملنا ضروری ہے۔"

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ یہ ایسی خاموشی تھی جو چٹانوں کو ریزہ ریزہ کردے اور حوصلے بھاپ بن کر ہوجائیں۔

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا محترم سانوس۔" عالی نے کہا۔

"تم کیا کرو گے؟"

"میں اس کی زندگی بچانے کے لیے ہر طرح سے تمہارا راستہ روکوں گا۔"

"اور اگر نہ روک سکے؟"

"تو پھر۔۔۔ تو پھر میں تمہیں بددعا دوں گا حالانکہ میں نے کبھی کسی کو بددعا نہیں دی۔"

سائیں کا لہجہ عجیب و غریب تھا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تم کسی کو بددعا دے سکتے ہو۔" سانوس نے کہا۔

"اگر میں ارادے سے نہیں دوں گا تو میرے ہونٹوں سے نکل جائے گی۔"

"کیوں نکل جائے گی؟"

"اس لیے کہ تم جس شخص کو مارنا چاہتے ہو وہ مجھے حد عزیز ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری بددعا کوئی بہت بڑا طوفان کھڑا کر دے گی؟"

"میں نے کہا نا سانوس کہ میں نے زندگی میں کسی کو بددعا نہیں دی۔ مجھے نہیں معلوم میری بددعا میں اثر ہے یا نہیں لیکن مجھے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ میں نے آج تک کچھ بھی مانگا ہے مجھے ملا ہے۔" سائیں کے لہجے میں عجیب سختی تھی۔

دو دونوں یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کے لبادے تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کے بال لہرا رہے تھے اور وہ دونوں دو چٹانوں کی طرح اپنی اپنی جگہ مستحکم کھڑے تھے۔ وہ بڑے ہی ڈرامائی لمحے تھے۔ زمین کے اندر سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں تیز ہوا فراٹے سے داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کی حرکت ایک مہیب گونج پیدا کر رہی تھی۔ وسیع و عریض قدرتی چھت کے نیچے قبرستان کے بیچوں بیچ سائیں عالی اور سانوس مدِمقابل تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے لیکن اس خاموشی میں بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ یہ بڑے فیصلہ کن لمحے تھے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہو جائے۔ ایک طرف منہ پھٹ

قوتوں کا مالک وہ پراسرار شخص تھا جو انسانی ذہن کو ایک نگاہ میں جکڑ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ دوسری طرف بستی کی گلیوں میں بھٹکنے والا وہ مخبوط الحواس ملنگ تھا جو تاریکی کے پردے میں آسیب کی طرح چھپا رہتا تھا۔ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی پایا جا سکتا تھا۔ اس کی پُراسراریت ایک معما تھی۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سائیں اور سانوس بھی ساکت ہو گئے تھے۔ یہ وقفہ پچیس تیس سیکنڈ کا رہا لیکن بے حد طویل محسوس ہو رہا تھا پھر سانوس کے ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کوئی بات کہی۔ ہوا کے شور کے سبب یہ آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔ سانوس نے رخ بدلا اور متوازی قدموں سے چلتا ہوا ایک چٹان کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ اس کے قدموں کی مدھم گونج کچھ دیر سنائی دیتی رہی پھر ہوا کے شور میں دب گئی۔

سائیں عالی ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ میں پتھریلی دیوار کی اوٹ سے نکل کر سائیں عالی کی طرف بڑھا۔ سائیں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے وہاں دیکھ کر سائیں عالی کو بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ یہ بات واضح تھی کہ سانوس کی طرح وہ بھی میری موجودگی سے آگاہ تھا۔

"وہ الو کی پٹھی کہاں ہے؟" سائیں نے تنک سے پوچھا۔ یقیناً اس کا اشارہ سروج کی طرف ہی تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔

میں سائیں کو لے کر آگ کے نزدیک پہنچ گیا۔ سروج گھاس پھونس کے بچھونے پر بے سدھ لیٹی تھی۔

"یہ بے ہوش ہے؟" سائیں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن گہری بے ہوشی نہیں۔"

ایک دم جیسے سائیں عالی کو چکر سا آگیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ اب واضح نظر آرہا تھا۔ سائیں کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹ بالکل خشک تھے۔ کل رات بھی جب میں نے سائیں کو سانوس کی رہائش گاہ پر دیکھا تھا تو وہ بے حد کمزور نظر آرہا تھا۔ اب یہ کمزوری نمایاں نظر آرہی تھی۔

"سائیں کیا بات ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اسے شانے سے جھنجوڑا "سائیں تم ٹھیک تو ہو۔"

اس نے آنکھیں کھولیں اور اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے کہیں قریب سے جلے ہوئے چمڑے کی بو آرہی ہے۔ کہاں سے آرہی تھی یہ بو۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ آگ کافی دور تھی۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔

"سائیں پانی پیو گے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ چند لمحے بعد اس کے چہرے کی زردی کم ہو گئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا تھا سائیں عالی؟" میں نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ بیزاری سے بولا پھر میری آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگا "شفیع محمد! تو نے بہت برا کیا ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تجھے منع کرتا رہا لیکن تو نے ایک نہ مانی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے سروج کو پاگل پن سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور بس۔"

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/روپے

علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

"اور یہ تمہارا پاگل پن ہے۔" سائیں نے کہا "سانوس تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ تمہیں بدترین عذاب سے دوچار کر سکتا ہے۔ تمہیں اس حالت کو پہنچا سکتا ہے کہ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ٹکڑے کر ڈالو۔ اس غار کے امن کو برباد کرنے کی کم از کم سزا یہ ہے کہ گناہ گار کو سوار رابل کے حوالے کر دیا جائے اور وہ اسے دیوار کے قریب واقع گہری کھائی میں دھکیل کر فنا کے گھاٹ اتار دے۔ شفیع محمد! سانوس کے ہاتھ تمہاری توقع سے زیادہ لمبے ہیں۔"

"تو پھر وہ واپس کیوں چلا گیا ہے؟"

"شاید کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے۔ یا شاید ہمیں یہ موقع دینے کے لیے کہ ہم کچھ سوچ سمجھ لیں۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ واپس آئے گا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" سائیں کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ میری نگاہ سائیں کے پاؤں پر پڑی اور میں چونک گیا۔ اس کے دونوں پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بہت دیر تک شاید کئی راتوں تک کھڑا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے کوئی چلہ وغیرہ کاٹا ہو۔ وہ فاقہ زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک مرتبہ سروج نے مجھے بتایا تھا کہ سائیں کبھی کبھی طویل چلے کاٹتا ہے۔ وہ بھوکا پیاسا کھلے آسمان تلے شب و روز کھڑا رہتا ہے اور دیکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ زندہ انسان نہ ہو، درخت ہو۔

میں نے پوچھا "سائیں! یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا ہے؟"

"بہرے کی ماں کا سر ہوا ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا "تو میری فکر چھوڑ شفیع محمد! یہ سوچ تجھے کیا کرنا ہے۔"

"یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو سائیں کہ اس غار میں ہوتے ہوئے ہم کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے سانوس نے ہی کرنا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' وہ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دے گا؟"

"ایسا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" سائیں نے بے حد بے قراری سے کہا "بہرحال' مجھے امید ہے وہ سوچے گا۔ وہ ضرور سوچے گا۔"

"اور اگر اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تو پھر؟"

"پھر ہم یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔"

"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے سائیں؟"

"میں اور تم۔"

"اور سروج؟"

"سروج کو یہاں سے لے جانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" سائیں افسردگی سے بولا "سروج اب ہمارے ختم ہو چکی ہے۔"

"مرنے سے پہلے کوئی بھی ختم نہیں ہوتا سائیں۔ دروازے بند ہو جائیں تو بھی امید کا ایک دروازہ ضرور کھلا رہتا ہے۔"

سائیں نے کراہتے ہوئے کہا "اچھا میرا دماغ مت چاٹ۔ جو کچھ بھی ہوگا سامنے آ جائے گا۔"

"میں تمہارا دماغ نہیں چاٹ رہا۔ میں تمہیں اپنا ارادہ بتا رہا ہوں سائیں۔ ہم سروج کو یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

اچانک قدموں کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ چاپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم و بیش آٹھ دس آدمی ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ سائیں بابا ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اپنے عصا پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ چہرے پر پھر وہی بھوری چٹان کی سی سختی عود کر آئی تھی۔ ایک بار پھر مجھے کہیں سے جلے ہوئے گوشت کی بو محسوس ہوئی۔ یہ بڑی پُراسرار بو تھی۔ سائیں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "دیکھو شفیع محمد! میں جانتا ہوں تو بڑا بہادر ہے لیکن یہاں تو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ یہاں جو کچھ کرنا ہوگا' میں خود کروں گا۔" پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر بولا "لا وہ چھری مجھے دے دے۔"

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے لباس کے نیچے ہاتھ ڈالا اور چھری سائیں کے حوالے کر دی۔ سائیں نے اسے اپنے چغے میں چھپا لیا۔ غار کے اس حصے میں پہنچنے والے اب نزدیک آ گئے تھے۔ وہ قبرستان کی وسیع و عریض چھت تلے پہنچے تو ان کی صورتیں صاف نظر آنے لگیں۔ تیز ہوا میں ان کے سفید لبادے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کے پاس ایک پالکی نما چیز بھی تھی۔ ایک شخص ہمارے قریب چلا آیا۔ یہ سنہری بالوں والا گرے تھا۔ وہ شائستہ انگریزی میں سائیں بابا سے مخاطب ہو کر بولا "آپ کو مقدس روشنی نے یاد فرمایا ہے۔"

"مجھے کہاں جانا ہوگا؟"

"مقدس روشنی کی قیام گاہ پر۔" گرے نے کہا "اس کے علاوہ سانی بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔"

یقیناً سانی سے گرے کی مراد سروج ہی تھی۔ سائیں بابا چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "ٹھیک ہے۔ تم سانی کو لے جا سکتے ہو۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن سائیں نے ہاتھ خفیف اشارے سے منع کر دیا۔ تین افراد آگے بڑھے۔ ...ں نے بے ہوش سروج کو بے حد احترام کے ساتھ اٹھایا ...لکی نما سواری میں لٹا دیا۔ سائیں نے ایک بار پھر مجھے ...سے تسلی کا اشارہ دیا اور پالکی کے ساتھ ہی روانہ ہو گیا۔ ...کے پیچھے چلتے وہ لوگ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں اپنی جگہ تنہا کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ یہ سارا معاملہ بے حد پُراسرار اور میری سمجھ سے ...تھا۔ پچھلے پانچ گھنٹے میں' میں نے سائیں کا ایک بالکل نیا ...دیکھا تھا۔ اس کی اوٹ پٹانگ شخصیت ایک بالکل ...سانچے میں ڈھلی دکھائی دیتی تھی۔ وہ جس طرح تم... کر سانوس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا' وہ منظر میرے لیے ...ل فراموش تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ...مجھے واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچنا چاہیے۔

میں قیام گاہ پر پہنچا تو لو شدت سے میری منتظر تھی۔ میں ...وقت اسے خواب گاہ میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔ صبح اسے ...م ہوا تھا کہ سانوس (مقدس روشنی) کی رہائش گاہ پر کسی ...کا ہنگامہ ہوا ہے۔ وہ بے حد متفکر ہو گئی تھی۔ یہ بات ...کے معاملہ فہم ذہن میں آ گئی تھی کہ اس ہنگامے سے میرا ...ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ...آواز میں بولی "آپ ٹھیک تو ہیں شاہ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں' آپ فکرمند نہ ہوں۔"

وہ مجھ سے رات والے واقعات کی تفصیل جاننا چاہ رہی ...یہ بات اس کے لیے سخت حیرت کا باعث تھی کہ میں بغیر ...ت سانوس کی رہائش گاہ میں گھس گیا تھا اور وہاں میری ...دنگا فساد کی نوبت آ گئی تھی۔ میں لو کو ٹالنا چاہ رہا تھا ...گھما پھرا کر بات وہیں لے آتی تھی۔ اس دوران میں ...عالی نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ...سے میری طرف آ رہا تھا۔ عصا بدستور اس کے ہاتھ میں ...شفاف فرش پر یہ عصا ٹھک ٹھک کی آواز پیدا کرتا تھا تو ...گونج محسوس ہوتی تھی۔ دو مقامی افراد بھی اس کے ...مجھے سائیں اندر آیا تو میں نے لو کو تھوڑی دیر کے لیے ...دیا۔ سائیں کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا اور آنکھوں ...نورانی مسرت کی چمک تھی۔ وہ میرے قریب سمٹ آیا ...ہوا زاری سے بولا "شفیع محمد! مبارک ہو۔"

"...کس بات کی؟"

"سانوس نے ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دے ...اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پچھلے سات آٹھ برس میں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ درحقیقت یہاں آنے کے بعد بہت کم لوگ واپس جا سکے ہیں۔ شاید صرف دو یا تین افراد۔" سائیں کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

"یہ کرشمہ کیوں کر ہوا؟"

"میں نہیں جانتا۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ میں نے سانوس سے دوٹوک بات کی تھی۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں تمہاری اور سروج کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ قبول نہیں کروں گا۔"

"سروج بھی ہمارے ساتھ جائے گی نا۔" میں نے پوچھا۔

سائیں کے چہرے پر ایک بار پھر شدید تذبذب نظر آنے لگا۔ وہ بولا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم اس کا کیا کریں گے۔ جس طرح مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی' مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اب اس غار سے باہر نہیں رہ سکے گی۔"

"سائیں! تم مایوسی کی بات مت کرو۔ تم نے ایک برسوں پرانی روایت کو ختم کر دیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ سانوس ہمیں آزاد کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سروج کو بھی سنبھالنے میں کامیاب رہو گے۔"

سائیں نے تڑپ کر کہا "شفیع محمد! میں تمہیں منع کر چکا ہوں۔ ایسی باتیں مت کرو۔ یہ سانوس کی مجبوری نہیں' اس کی کشادہ دلی ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دے رہا ہے۔ تم اس کی حیثیت اور طاقت کے بارے میں مسلسل غلط اندازے لگا رہے ہو۔ آئندہ ایسی بات زبان سے مت نکالنا۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی۔"

میں ایک گہری سانس لے کر سائیں کے قریب ہی اونی نمدے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "سائیں! اس شخص کی سوچیں واقعی قابلِ قدر ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی ذہنی طور پر اس سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ محنت کی عظمت کو سب مانتے ہیں لیکن سانوس کی طرح اس حقیقت پر والہانہ یقین شاید ہی کوئی رکھتا ہو۔ زمین کی گہرائی میں اترے ہوئے اس حسین غار کے اندر میں نے زندگی کی جو شکل دیکھی ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ اگر یہ شخص اپنے نظریات میں چند تبدیلیاں کر لے تو شاید میرے جیسے لوگ بھی آنکھیں بند کر کے اسے اپنا رہنما تسلیم کر لیں۔"

"چند تبدیلیوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں معاشرتی آزادی کی بات کر رہا ہوں۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا یہاں کس قسم کا مادر پدر آزاد نظام چل رہا ہے۔"

سائیں کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں "شفیع محمد! تو اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس بارے میں میں بھی تمہارا ہم خیال ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ ہماری سوچ ہی ناقص ہو۔"

"ہماری سوچ درست ہے۔" میں نے زور دے کر کہا "آج نہیں تو کل سانوس کو اس معاشرت کی خرابی کا احساس ہو کر رہے گا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ بھی یہی بات کہہ رہے..... کہ آج نہیں تو کل ہمیں اپنی معاشرت کی خرابی کا احساس ہو کر رہے گا۔"

میں نے کہا "سائیں! میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ میرے دل سے یہ آواز نکل رہی ہے کہ سانوس کو اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی ہونی چاہیے لیکن وہ کامیابی تب ہی حاصل کر سکتا ہے جب اپنی سوچ اور عمل کی خامیوں کو دور کرے گا۔ جب وہ اپنے فلسفے کے کمزور حصوں کو نکال باہر کرے گا تو اس کا فلسفہ ہر دل عزیز ہو گا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا سائیں عالی کہ تم سانوس کو اپنے انداز سے سمجھانے کی کوشش کرو۔"

سائیں نے طویل سانس لے کر کہا "ایسے لوگ اپنے خیالات پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں۔ درحقیقت یہی غیر معمولی یقین ہوتا ہے جو ان کی بات میں اثر پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو دیوانہ وار ان کی تقلید پر مجبور کرتا ہے۔ سانوس کی ساری اچھائیاں اور برائیاں ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا میرے خیال میں ممکن نہیں ہے۔ نہ ہی ہمارا یہ منصب ہے کہ انہیں جدا کرنے کی کوشش کریں۔ بہرحال اگر جانے سے پہلے سانوس سے ایک اور ملاقات ہوئی تو میں تمہارے خیالات اس تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

"ایسا ضرور کرو سائیں۔" میں نے زور دے کر کہا "یہ سانوس کے پرستاروں کے ساتھ ہی نہیں شاید خود سانوس کے ساتھ بھی بھلائی ہو گی۔"

سائیں وہیں اپنی تمدے پر دراز ہو گیا۔ اس کی نقاہت عروج پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "ایک بات اور بھی ہے سائیں!"

"ہاں کہو۔"

"نہیں، سانوس سے سردار سدورت کی سفارش کرنا ہو گی۔ ڈاکٹر ہنری اور ناشا کی طرح سردار سدورت بھی جاتریوں کے خلاف برسرپیکار رہا ہے۔ اگر ہنری اور ناشا کو معافی مل سکتی ہے تو سدورت کو بھی ملنی چاہیے۔ ویسے بھی وہ شدید زخمی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا۔" سائیں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اچانک میری نگاہ سائیں کے ایک پہلو پر پڑی۔ کروٹ لینے کے دوران میں سائیں کا چغہ پہلو سے کھسک گیا تھا۔ اس کی گندمی جلد نظر آنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ سائیں کے جسم پر جلنے کا نشان تھا۔ یہ نشان لمبائی کے رخ پر تھا۔ جیسے آہنی سلاخ سے جلد کو داغا گیا ہو۔ نشان زیادہ پرانا نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ دس بارہ گھنٹے ہوئے ہیں۔ کولہے کی ہڈی سے لے کر سینے کے درمیان تک آبلہ سا بن گیا تھا۔

"یہ کیا ہے سائیں؟" میں نے پوچھا۔

سائیں نے چونک کر چغہ پہلو پر برابر کر دیا "کچھ نہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "یونہی جل گیا تھا۔"

میں نے غور سے دیکھا تو سائیں کے گریبان میں سے بھی ایک ایسا ہی نشان جھانک رہا تھا۔ ایک آبلہ سا تھا جو سینے سے شروع ہو کر نیچے تک چلا گیا تھا۔ اچانک مجھے جلے ہوئے گوشت کی وہ بو یاد آ گئی جو کل رات محسوس ہوئی تھی۔ قبرستان کے وسیع و عریض چیمبر کے نزدیک جب سائیں عالی سانوس سے بات کر کے میرے پاس آیا تھا تو یہ بو مجھے دوری سے محسوس ہوئی تھی۔ "یہ کیا ماجرا ہے؟" یہ سوال بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھرا اور یہ صرف ایک سوال نہیں تھا، ایسے کئی سوال تھے۔ سائیں کا مدقوق چہرہ اور دھنسی آنکھیں، سوجے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ کیا واقعی یہ کسی پراسرار چلے یا روحانی عمل کی نشانیاں تھیں۔ سائیں میرے لیے ناقابل فہم رہا تھا اور آج ہمیشہ سے زیادہ ناقابل فہم نظر آ رہا تھا۔

میں نے سائیں عالی کو کریدنا چاہا کہ اس کے جسم پر نظر آنے والے آبلے کیسے ہیں لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا "دل رمز کا کھوجی کا..... ہاں دل رمز کا..... دل و رمز کا کھوجی کا..... دل رمز کا....." اور باہر نکل گیا۔

سائیں کے جاتے ہی لو اندر آ گئی۔ اس کی حسین آنکھوں سے اداسی جھانک رہی تھی۔ گرفتہ لہجے میں بولی "آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ کل واپس جا رہے ہیں۔"

"بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

"کیا سچ مچ آپ چلے جائیں گے؟"

"امید تو یہی ہے۔"

وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش پیاس تھی اور ادھوری خواہشوں کا عکس تھا۔ ہم ہر رات ایک دوسرے کے پاس رہے تھے۔ میں نے ہر رات لو کی ٹوٹی انگڑائیاں دیکھی تھیں اور اس کے جسم کی آنچ محسوس کی تھی..... اور اب میں یہاں سے واپس جا رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان بس ایک رات باقی رہ گئی تھی۔ اس آخری رات کی آخری ملاقات کا غم لو کے چہرے سے عیاں تھا۔

وہ بستر پر دراز ہو گئی اور خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی نیم دراز ہو کر خیالوں کے تانے بانے میں الجھ گیا۔ اس شیشے جیسے حسین غار میں شیشے جیسی نازک لڑکی میرے پہلو میں تھی اور بے حد..... بے حد اداس تھی۔ رات کا موم پگھل رہا تھا۔ وہ بولی "آپ بہت مختلف ہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ یہاں آ کر کوئی واپس نہیں جاتا۔"

"بس یہی "مختلف" ہے مجھ میں؟"

"نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔" وہ آہ بھر کر بولی۔

"مثلاً کیا؟"

"مثلاً یہ فاصلہ جو ہمارے درمیان موجود رہا ہے..... میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

میں نے کہا "چار دن کی جدائی کا یہ بہت بڑا انعام ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اگر میں یہاں کے عام لوگوں جیسا ہوتا تو شاید اب تک ہم ایک دوسرے سے جدا بھی ہو چکے ہوتے۔ ایک دوسرے کو بھول چکے ہوتے۔ آپ کسی اور مرد کی بانہوں میں ہوتیں۔ میرے پہلو میں آپ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔"

"لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی کچھ پایا بھی جاتا ہے اور کھویا بھی نہیں جاتا۔"

"آپ کبھی کبھی کی بات کر رہی ہیں۔ ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا اور میں آپ کے سلسلے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔ اپنے اور آپ کے فاصلے کے حوالے سے آپ کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ سسک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ بڑی محبت اور نرمی سے میں نے اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا لیکن اس عمل میں کسی طرح کے ہیجان کو دخل نہیں تھا۔ یہ بڑا سادہ سا لمس تھا۔ جیسے کسی پیارے دوست کا لمس یا پھر بچے کا لمس۔ اس کی دھڑکن میں اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا اور اس کی سانسیں میرے چہرے سے چھو رہی تھیں۔ اس

ہیبت کے شاہ تصنیف اور خوبصورت بیان سے پہچانے جانے والوں کے لئے

خاص کہانی

میر کارواں

قیمت: ۸۰/- روپے

ہینڈ بال کے ایک عظیم کھلاڑی کی کہانی۔ اس کا ناقابل تسخیر شاگرد غلط راہوں پر چل نکلا تھا۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

بے غرض لمس میں خالص محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹھنڈک بخش اور پُرسکون محبت۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے "جنس" سلگتا ہوا شعلہ ہے اور "محبت" برگِ گل میں سرایت کر جانے والی شبنم۔ وہ میری بانہوں میں سو گئی۔ میں نے شمع دان کی اکلوتی شمع میں اس کا چہرہ دیکھا اور بہ آہستگی اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکال لیا۔

علی الصباح سائیں عالی دوبارہ آدھمکا۔ وہ خاصا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا "چل شفیع محمد! جلدی کر۔ نکل چلیں یہاں سے۔"

"اور سورج؟"

"وہ بھی ہے۔ باہر لیٹی ہے پالکی میں۔"

"سانوس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟"

"ہاں ہوئی تھی لیکن ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ بس ہم نکل چلیں یہاں سے۔"

میں نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ چہرے پر ایک معصوم دلکشی لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی۔ کمرے میں میرا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ میں یہاں خالی ہاتھ آیا تھا اور مجھے خالی ہاتھ ہی جانا تھا۔ میں نے لڑکی کے چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور سائیں عالی کے ساتھ باہر آ گیا۔ کچھ فاصلے پر سات آٹھ سفید پوش موجود تھے۔ ان میں سے چار نے ایک پالکی اٹھا رکھی تھی۔ جونہی ہم باہر نکلے' یہ لوگ ہمارے ساتھ روانہ ہو گئے۔ کئی پُرپیچ راستوں سے گزر کر ہم غار کی عمیق ترین گہرائیوں سے نکل آئے۔ آخر میں خود کو اس بیضوی کمرے میں پایا جہاں مہمانوں کو پھل اور گلابی مشروب پیش کیا جاتا تھا۔ اس کمرے میں آواز دیر تک گونجتی تھی اور مخصوص صندلی خوشبو کے مرغولے نتھنوں سے ٹکراتے تھے لیکن اس مرتبہ یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ خوشبو تو موجود ہے لیکن میری حسِ شامہ اس خوشبو کی عادی ہو چکی ہے۔ خلافِ دستور اس کمرے میں ہمیں مشروب یا پھل وغیرہ پیش نہیں کیے گئے۔ سفید پوش مرد و زن بے آواز قدموں سے آ جا رہے تھے۔ خوبرو بچے اٹکھیلیاں کرتے پھرتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سانوس جن لوگوں کو اس غار میں آباد کرنے کے لیے لاتا ہے ان میں سے پچانوے فیصد خوبرو ہوتے ہیں۔ شاید وہ اس غار کی خوب صورتی کو انسانی خوب صورتی سے مزید اُجاگر کرنا چاہتا تھا۔ یہاں ہمیں لباس بدلنے کی ہدایت کی گئی۔ اپنے سفید لبادے اتار کر ہم نے وہی بسنتی چوغے پہن لیے جن کے ساتھ ہم یہاں آئے تھے۔ دو عورتوں نے سورج کا لباس پالکی کے اندر ہی تبدیل کر دیا تھا۔ بیضوی کمرے سے روانہ ہونے کے بعد چار پانچ منٹ کے اندر ہم غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ باہر چمکیلی دھوپ تھی۔ دور ایک برف پوش چوٹی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ شاید اس چوٹی کے پیچھے وہ پہاڑ تھے جن میں سے آباد دنیا کو جانے کا راستہ نکلتا تھا۔ میں نے دھوپ' پہاڑ' آسمان اور درخت پہلے بھی کئی بار دیکھے تھے لیکن آج ان کا نظارہ کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ ہم اس بلند و بالا پتھریلی دیوار کے سائے میں پہنچ گئے جس کی دوسری طرف راہلی قبیلے کی بستی تھی۔ ایک مانوس گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار کے ایک حصے میں خلا نمودار ہو گیا۔ میں اور سائیں عالی اس خلا سے باہر آ گئے۔ باہر کا منظر ہمارے لیے حیران کن تھا۔ لکڑی کے چھوٹے سے پل کے پار لوگوں کا ایک بڑا ہجوم نظر آ رہا تھا جو پُرتجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں کوتاہ قد سردار راہلی بھی شامل تھا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی خودکار رائفل اس کے قد سے تھوڑی ہی چھوٹی نظر آتی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو پالکی ہمارے عقب میں رکھی تھی۔ سفید پوش افراد میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور بلند و بالا فصیل کا خلا بند ہو گیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس دیوار میں ایک خلا ہے اور اس خلا سے گزرنے کے بعد ایک دہانہ نظر آتا ہے۔ وہ دہانہ ایک ایسے غار کا ہے جو زمین کی گہرائیوں میں ہزارہا گز تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک ایسی دلکش و حیرت انگیز دنیا جو خواب سے قریب اور حقیقت سے دور نظر آتی ہے۔

جونہی فصیل میں نظر آنے والا خلا بند ہوا' سردار راہلی گھوڑے سے اتر کر تیزی سے ہماری طرف آیا۔ اس کے پیچھے چند اور افراد تھے۔ ان میں وہ کاہن بھی شامل تھا جس کے ہاتھ میں انسانی ران کی ہڈی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے منہ میں بدبدا رہا تھا۔ سردار راہلی کے ساتھ آنے والے افراد نے ہمیں جھک کر تعظیم پیش کی۔ سردار راہلی نے باقاعدہ ہمارے ہاتھوں کو بوسہ دیا پھر اس نے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پالکی نما ڈولی اٹھائی اور ہمیں لے کر بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جونہی ہم ہجوم میں پہنچے' ہجوم نے کائی کی طرح پھٹ کر ہمیں راستہ دیا۔ لوگ بڑے تجسس سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ بالکل جیسے کسی عجوبے کو دیکھا جاتا ہے۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ ہمیں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ راہلی کی رہائش گاہ پر لایا گیا۔ میں نے پالکی میں جھانکا۔ سورج بے سُدھ پڑی

تھی۔ ہماری ہی طرح اس کے جسم پر بھی بسنتی رنگ کا لباس تھا۔ سردار راہلی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے لباس بدل سکتے ہیں۔

اس جوگیوں جیسے لباس میں رہنا مجھے پسند نہیں تھا۔ میں نے فوراً کپڑے بدل لیے۔ یہ وہی کپڑے تھے جو روانہ ہوتے وقت میں نے اتارے تھے۔ چند خواتین نے سورج کے کپڑے بھی بدل لیے۔ ہاں سائیں عالی نے یہ تکلف نہیں کیا۔ وہ بسنتی چوغے میں بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔

ہم نے ایک شب راہلی قبیلے کی بستی میں قیام کیا۔ اگلے روز ہمیں گھوڑا گاڑی پر بٹھایا گیا اور وادی واخان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ سردار راہلی رات کو ہی وادی واخان واپس پہنچ چکا تھا۔ چرخیوں والے طویل پل سے گزر کر جب ہم وادی واخان میں داخل ہوئے تو وہاں بھی ہمارا استقبال کرنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ ان میں بچے بوڑھے' مرد و زن سب شامل تھے۔ مجھے ان میں زریں گل' صفدر' ناشا اور ڈاکٹر ہنری بھی دکھائی دیے۔ جونہی میں گھوڑا گاڑی سے نکلا صفدر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کے بعد زریں نے مجھے "دبن جپھا" ڈال لیا۔ ناشا اور ڈاکٹر ہنری بھی استقبالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد واپس آئے ہیں یا پھر ہماری آمد اتنی انوکھی ہے کہ لوگ آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں کر پا رہے۔ شاید دوسری بات ہی زیادہ درست تھی۔ ہم ایک ایسے خواب ناک ماحول سے نکل کر واپس آئے تھے جو حقیقت سے دور اور افسانے سے قریب تر محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے لیے دیوار پار کی دنیا ایک دوسری دنیا کی طرح تھی۔ یہ دنیا اب بھی ہم سے زیادہ دور نہیں تھی لیکن محسوس ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر ہے۔ پتا نہیں جس جگہ سے ہم آئے تھے اسے غار کہنا بھی چاہیے یا نہیں' کیونکہ غار کا لفظ ہم عموماً چھوٹے سے کمرے وغیرہ کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن وہ تو ایک زیرِ زمین شہر تھا۔ لائم اسٹون' جپسم' سالٹ اور سنگِ سرخ کی دیواریں۔ بڑے بڑے قدرتی چیمبرز' قدیم دیواروں پر آرٹ کے نمونے اور راہداریاں جن کی دیواروں پر شیشے کا گمان ہوتا تھا۔ ہم نے اس غار کا صرف ایک مختصر حصہ دیکھا تھا۔

پھر میرے تصور میں سائیں عالی کا جلا ہوا جسم آیا اور بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سائیں کے جسم پر آبلے کیوں پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے اس کے جسم پر آتشیں کوڑے برسائے ہیں یا آسمانی برق نے لہرا کر اسے داغ ڈالا ہے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی کہ سائیں کے جسم پر ان نشانات کو نمودار ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کسی وقت یوں بھی محسوس ہوتا تھا کہ ان نشانات کا تعلق' اس گمبھیر ملاقات سے ہے جو قبرستان کے وسط میں سانوس اور سائیں کے درمیان ہوئی تھی۔ جب وہ دونوں خوفناک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ ان نشانوں کا اس ملاقات سے کیا تعلق؟ اس سوال کا واضح جواب ذہن میں نہیں ابھرتا تھا اور یہ کوئی ایک سوال نہیں تھا۔ ایسے بہت سے سوالات ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔

زریں گل میرے سامنے کھڑا تھا اور بدستور آبدیدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میری نگاہ زریں کے ہاتھ پر پڑی' میں ٹھٹک گیا۔ زریں کا ہاتھ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ چوٹ لگ گیا تھا۔"

"کیسے؟"

"بس لگ گیا۔" زریں منمنا کر رہ گیا۔

صفدر کی آنکھوں میں مسرت آنسو بن کر چمک رہی تھی۔ بولا "شاہ جہاں صاحب! یہ میری زندگی کا یادگار دن ہے۔ میں آپ کو ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ زریں گل کی بات صحیح نکلی۔ وہ کہتا تھا استاد حبیب بہت جلد واپس آئے گا اور واپس ہی نہیں آئے گا' سورج کو بھی واپس لائے گا۔ اس کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔"

وادی واخان کے لوگ ہمیں دیکھنے کے لیے جوق در جوق امڈ آئے تھے۔ ان میں وادی کے اصل مکین بھی تھے اور راہلی قبیلے کے افراد بھی۔ ہمیں سرنگ کے اندر سردار راہلی کی قیام گاہ "تخت" میں پہنچایا گیا۔ میں اس سرنگ کو پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن اب ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ سرنگ کی بناوٹ اور اس کے در و دیوار کی ساخت دیکھ کر میرا دل گواہی دینے لگا کہ ہو نہ ہو یہ سرنگ اسی عظیم الشان غار کا ایک حصہ ہے جو ہم نے دیوار کے پار دیکھی ہے۔ دیوار کے پار جو غار واقع تھا وہ بہت گہرائی میں تھا لہٰذا وہاں معدنیات زیادہ واضح شکل میں موجود تھیں۔ یہ سرنگ زمین کی بالائی سطح میں تھی لہٰذا یہاں بھربھرا پتھر زیادہ تھا اور وہ حیران کن خوب صورتی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جغرافیہ داں بتاتے ہیں کہ ایسے طویل و عریض غار' ہزاروں لاکھوں سال

کے دوران پانی کے میکانکی یا کیمیائی عمل سے وجود میں آتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات تھی کہ گئے زمانوں میں ان پہاڑوں میں یہ پانی کہاں سے آیا تھا اور کس شکل میں موجود رہا تھا۔

ہمارا سب سے پہلا مسئلہ سروج کی دیکھ بھال تھا۔ سائیں سروج کی طرف سے خاصا ناامید تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال تو وہ بے ہوشی کی حالت میں ہے جونہی اس کے حواس بحال ہوں گے وہ واپس جانے کے لیے بے چین نظر آنے لگے گی۔ سائیں عالی کی ہدایت پر سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ سروج کو مسہری پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں چمڑے کی پٹیوں سے جکڑ دیے گئے۔ میں نے ڈاکٹر ہنری کو ہدایت کی کہ وہ سروج کے لیے سکون بخش ادویات کا انتظام کرے۔ وادی داخان پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سروج کو بھی ہوش آ گیا۔ ہم سب اس وقت سروج کے قریب ہی موجود تھے۔ وہ پہلے خالی خالی نظروں سے ہم سب کے چہرے دیکھتی رہی پھر در و دیوار کو گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ بتدریج تناؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے پٹھے کھنچتے چلے جا رہے تھے۔ ایکا ایکی اس کے پورے جسم میں لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہی کیفیت جو اس سے پہلے بھی میں نے کئی افراد پر طاری دیکھی تھی۔ سروج کا چہرہ بے قراری و بے بسی کی تصویر تھا۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹر ہنری نے اس کے بازو میں انجکشن دے دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی ساری بے تابیوں سمیت بے ہوشی کی پناہ میں چلی گئی۔

سائیں عالی کے چہرے پر سخت مایوسی کے آثار تھے۔ وہ بولا "شفیع محمد! میں نے تجھ سے کہا بھی تھا' یہ لڑکی اب ہمارے بس کی نہیں ہے۔ اسے اب ہمارے درمیان نہیں رہنا ہے۔"

"سائیں' حوصلہ رکھو۔" میں نے کہا "تم کوشش سے پہلے ہی ہمت ہار رہے ہو۔"

سائیں عالی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے دو مقامی عورتوں کو سروج کی نگہداشت پر مامور کیا اور دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ زریں گل کے علاوہ صفدر اور جون چاؤل بھی میرے ساتھ تھے۔ ان تینوں کے چہرے پر تجسس تھا۔ وہ مجھ سے "دیوار پار" کے حالات جاننے کے لیے بے چین تھے۔ سب سے اہم سوال ان کے لیے یہ بھی تھا کہ ہم سروج کو واپس لانے میں کیونکر کامیاب ہوئے۔

میں نے اپنے اس حیرت ناک سفر کے بارے میں انھیں مختصر الفاظ میں بتایا۔ زیادہ تفصیل میں جانا بے مقصد تھا لہٰذا کئی باتیں میں حذف بھی کر گیا۔ بہرحال جو کچھ میں نے بتایا وہ ان پر حیرتوں کے پہاڑ توڑنے کے لیے کافی تھا۔ ان کے چہروں پر بار بار شدید استعجاب و ہیجان کے آثار نمودار ہوتے رہے۔ غار کے اندر بسنے والوں کا نظریہ حیات واقعی تعجب خیز تھا۔ تکالیف برداشت کرنے کے حوالے سے جو غیر متزلزل یقین وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے وہ سوچنے سمجھنے کی چیز تھا۔ جب میں نے صفدر وغیرہ کو بتایا کہ مقدس روشنی یعنی سانوس ایک تجرد کی زندگی گزارتا ہے تو وہ دم بخود رہ گئے۔ میری طرح یہ بات ان کے لیے بھی تعجب خیز تھی کہ سجی سجائی دلہنیں جو سانوس کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں صرف نام کی دلہنیں ہوتی ہیں۔ انہیں ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے' سانوس ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ کیونی کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کی تفریحات کے بارے میں بھی میں نے انھیں خاص خاص باتیں بتائیں۔

اس روداد کے آخر میں سائیں عالی کا کردار نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا تھا۔ بلاشبہ میرے لیے وہ منظر ناقابل فراموش تھا جب قبرستان کے نواح میں سائیں عالی مجھے بچانے کے لیے سانوس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔ سانوس کی طاقت اور غیر معمولی صلاحیتوں پر یقین رکھنے کے باوجود سائیں نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کی بھرپور مزاحمت کی تھی۔

میں نے اپنی روداد میں سانوس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر تفصیل سے کیا۔ یہ بات میں اب ذہنی طور پر تسلیم کرتا تھا کہ سانوس کی آنکھوں میں اور اس کے لب و لہجے میں ایک قسم کی مسحور کر دینے والی کیفیت موجود تھی۔ ڈاکٹر ہنری کے کاغذات میں' میں نے اس کیفیت کے بارے میں تفصیل سے پڑھا تھا۔ جیمس بریڈ نامی روحانی معالج نے اسے مقناطیسی قوت قرار دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ مقناطیسی قوت کا حامل شخص اپنے معمول پر اعصابی تھکاوٹ طاری کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر مسمر بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکا تھا۔ بعد ازاں ۱۸۳۱ء میں فرانس کی طبی اکیڈمی نے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی تھی اور اس کمیٹی نے طویل تحقیق کے بعد ایسی توانائی کی موجودگی کی تصدیق کی تھی۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں بار بار اس پندرہ روزہ خطاب کا خیال بھی آ رہا تھا جو سانوس اپنے پیروکاروں سے کرتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ خطاب

بھی دراصل ہپناٹزم اور سجیشن کی کوئی قسم ہی ہو۔ سانوس اپنے الفاظ کے ذریعے اپنی مقناطیسی قوت کو بروئے کار لاتا ہو اور سامعین اس قوت سے متاثر ہوتے ہوں۔

میری یہ روداد مختصر ہونے کے باوجود دو گھنٹے سے پیشتر ختم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری نگاہ بار بار زریں کے زخمی ہاتھ پر جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر زریں سے اس بارے میں پوچھا۔ زریں کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔

صفدر نے ایک لمبی آہ بھری اور دردناک لہجے میں بولا "آپ کے بعد زریں گل کے ساتھ بہت برا سلوک ہوا ہے جناب! یہ زریں کا ہی حوصلہ ہے کہ برداشت کر گیا ہے۔ کوئی دوسرا عاشق بھی ہوتا تو اس کے پاؤں اکھڑ جاتے۔"

"اچھا تو یہ زخم عاشقی کے سلسلے میں آیا ہے؟"

"زخم نہیں جی۔ بہت سے زخم ہیں۔" صفدر نے وضاحت کی "جسم کا زخم تو آپ کو دکھائی دے رہا ہے لیکن دل کے زخم زریں دکھا سکتا ہے اور نہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

زریں نے غم زدہ نظروں سے صفدر کو گھورا۔ صفدر جلدی سے بولا "میں بالکل سنجیدہ ہوں جناب۔"

میرا خیال تھا کہ زریں حسب عادت صفدر سے بحث کرنے لگے گا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

صفدر اور جون چاؤل زیر لب مسکرا رہے تھے۔ بہرحال ان کے چہروں پر خاطر خواہ ہمدردی بھی پائی جا رہی تھی۔ صفدر نے بتایا "پچھلے دنوں زریں عشق کے زبردست بخار میں مبتلا رہا ہے۔ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کلثوم نے پہلی ملاقات میں اسے "بوسہ" اور زرد پھول کیوں دیے تھے۔ کلثوم کی شادی کی خبر زریں پر برق بن کر گری تھی۔ ہنسی مذاق میں جو الٹے گانے وہ الاپا کرتا تھا' وہ سب اسے بھول گئے تھے اور رونے کی حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کلثوم سے ملنے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن وہ خبر نہیں کن سات پردوں میں جا چھپی تھی۔ بہت کوشش کے بعد آخر پچھلے ہفتے وہ اسے دیکھ سکا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں وادی کی سب سے بڑی جاترو (عبادت گاہ) میں ہر ہفتے مذہبی رسم ہوتی ہے۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیاں وہاں رقص کرتی ہیں اور گانے وغیرہ گاتی ہیں۔ وہاں کلثوم بھی اپنی اماں کے ساتھ آئی تھی۔ زریں پٹھانی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلثوم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی روادار نہیں رہی۔ بالآخر زریں مشتعل ہو گیا۔ اس نے بھرے مجمع میں کلثوم کو تھپڑ کھینچ مارا۔ لوگوں نے زریں کو پکڑ لیا۔ پہلے مارا پیٹا پھر عبادت گاہ سے باہر ایک ستون سے باندھ دیا۔ اسی دوران میں کلثوم کی بہن ناشا کو بھی پتا چل گیا۔ آپ جانتے ہیں وہ پہلے ہی زریں گل کے بہت خلاف ہے۔ وہ آگ بگولا ہو کر وہاں پہنچ گئی۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوتا تو وہ یقیناً مار مار کر زریں کا بھرکس نکال دیتی لیکن میں نے اور جون چاؤل نے بڑی مشکلوں سے زریں کو ناشا کے ہاتھوں تار تار ہونے سے بچا لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اتنی درگت بنوانے کے بعد وہ راہ راست پر آ گیا ہو گا لیکن اس پر تو بھوت سوار تھا۔ رہائی پانے کے فوراً بعد اس پر پھر جنون طاری ہو گیا۔ پھٹے کپڑوں اور نیل نیل چہرے کے ساتھ وہ پھر کلثوم کے گھر کے سامنے جا پہنچا۔ چیخ چیخ کر واویلا کرنے لگا۔ اطلاع ملنے پر ہم بھاگے ہوئے وہاں پہنچے تو زریں گل کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا ارادۂ مبارک یہ تھا کہ کلثوم کے گھر کے سامنے خود کو گولی مار کر شہید محبت ہو جائے گا۔ اگر آپ وہاں موجود ہوتے اور زریں کا دیوانہ پن دیکھتے تو دنگ رہ جاتے۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اس کے ہاتھ سے پستول چھینا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے اسے زمین پر گرا دیا۔ زمین پر گر کر وہ ایک دم نڈھال ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اس پر تشنج کا دورہ پڑ گیا ہے۔ رنگ زرد ہو گیا اور ہاتھ پاؤں مڑنے لگے۔ ڈاکٹر ہنری نے اسے فوراً شفا خانے پہنچانے کی ہدایت کی۔ وہاں ڈاکٹر نے رات بھر اس کی دیکھ بھال کی اور ہم بھی جاگتے رہے۔ طبیعت بحال ہونے کے بعد زریں گل ایک دم خاموش اور بیمار نظر آنے لگا تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے وہ گم صم رہا۔ اگلے روز شام کو میں اسے دیکھنے شفا خانے پہنچا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ ہاتھ بری طرح زخمی تھا۔ کھال چھل گئی تھی اور انگلیوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ زریں نے پتھر سے ہاتھ کچلا تھا۔ درحقیقت کلثوم کے رخسار پر طمانچہ مارنے کا دکھ زریں کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا تھا۔ اس نے فلمی انداز میں اپنے ہاتھ کا کباڑا کر لیا تھا۔ تین چار روز تک وہ مسلسل آنسو بہاتا رہا تھا۔ نہ کچھ کھاتا پیتا تھا نہ بات کرتا تھا پھر خود ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اب کہتا ہے کہ اس نے کلثوم والا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ یہ دروازہ اب کبھی نہیں کھلے گا۔"

میں نے کہا "لیکن یہ بھی تو بتاؤ کہ کلثوم دروازے کے اندر ہے یا باہر؟"

"وہ اندر ہی ہے جی۔ وہ کہتا ہے کہ باقی کی ساری زندگی

کلثوم کے نام پر گزار دے گا۔"

یہ واقعات میرے لیے حیران کن تھے۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ زریں گل اپنے اس معاشقے میں سنجیدہ ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنا زیادہ سنجیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ صفدر جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ زریں نے یقیناً خود کو گولی مارنے کا اعلان بھی کیا ہوگا۔ غصے میں اکثر اس کی عقل کا جلوس نکل جاتا تھا۔ بہرحال اس دھواں دھار المیہ اشوری میں خوش آئند بات یہ تھی کہ عاشق نامراد اب قدرے نارمل نظر آ رہا تھا۔۔۔

وہ ساری رات بے آرامی کی کیفیت میں گزری۔ سوج مسلسل گہری غنودگی میں تھی۔ تاہم اس حالت میں بھی اس کے چہرے پر گاہے گاہے وہی پُراسرار بے قراری نمودار ہو جاتی تھی جو ہم نے شروع میں دیکھی تھی۔ سائیں عالی رات دو تین دفعہ سوج کے پاس آیا تھا۔ سرہانے کی طرف کھڑے ہو کر وہ دیر تک منہ میں کچھ بدبداتا رہا تھا پھر سوج کے سر پر پھونک مار کر واپس چلا گیا تھا۔

اگلا دن اس وادی بے اماں سے ہماری روانگی کا دن تھا۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ مجھے کوتاہ قد سردار رابیل کی صورت نظر آئی۔ رابیل کے ساتھ مترجم دانیال بھی تھا۔ اس کے کندھے کے زخم اب درست تھے۔ دانیال کی وساطت سے رابیل نے کہا "شاباش! مقدس روشنی نے آپ کا مطالبہ منظور کر لیا ہے۔ سردار سدورت کے لیے معافی کا اعلان کیا گیا ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کی روانگی سے پہلے ایک بار سردار سدورت سے آپ کی ملاقات کرا دی جائے۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

رابیل بولا "آپ کی روانگی کے انتظامات مکمل ہیں۔ مقدس روشنی کی طرف سے آپ کے لیے کچھ تحائف بھی ہیں۔ یہ تحائف آپ کے ساتھ بھیجنے کے لیے ایک بکس میں بند کر دیے گئے ہیں۔"

کچھ دیر بعد سردار سدورت سے بھی ہماری ملاقات کرا دی گئی۔ گھمسان کی لڑائی میں اس کے دونوں جبڑے ٹوٹ گئے تھے اور سر پر بھی سخت چوٹیں آئی تھیں۔ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی پھر بھی وہ آسانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ ہم نے بھی وہاں زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے تسلی تشفی دے کر اور یہ خوش خبری سنا کر کہ وہ اب اپنی ہی وادی میں قیدی نہیں ہے ہم واپس لوٹ آئے۔

زریں کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ میں نے پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ دیکھا تھا۔ وہ جا بجا ڈھول ناچ گانے الاپتا رہتا تھا لیکن اب جب کہ اس پر بیچ بیچ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس کی زبان گنگ تھی۔ وہ زریں ہنسنے ہنسانے والا شخص تھا۔ ہم ہر بات کو مزاحیہ انداز میں لیتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے اندر ایک درد مند دل ہے۔ آج اس دل کا سارا درد زریں کی آنکھوں میں آ گیا تھا۔ وہ قابلِ رحم حد تک نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی سنجیدگی کم کرنے کے لیے کہا۔ "تمہاری شکل دیکھ کر نجانے کیوں مجھے میرا لاہوریا قریشی یاد آ رہا ہے۔ جب وہ زیادہ کھا لیتا ہے تو کہتا ہے پیٹ "اپھر" گیا ہے۔ جب اس کا پیٹ اپھرتا ہے تو اس کی صورت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں عشق کی خوراک کھانے کی وجہ سے تمہارا پیٹ بھی "اپھر" گیا۔ اب جدائی کا چورن کھاؤ گے تو طبیعت میں افاقہ ہو گا۔"

"افاقہ تو ہو گیا ہے استاد صیب۔" زریں بجھے بجھے میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"بس استاد صیب! ام نے پکا پکا فیصلہ کر لیا ہے۔ ام راستہ جدا کر لے گا۔"

"کس سے؟"

"سب سے۔ آپ سے بھی۔ ام کو معلوم ہے آپ اماری گستاخی پر رنج تو ہو گا لیکن یہ سچا بات ہے استاد صیب اب امارا دل بالکل اچاٹ ہو گیا ہے۔ ام کہیں سکون سے رہنا چاہتا ہے۔ بالکل تن تنہا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ام ایک نیا شخص بن کر رہے۔ کوئی ام کو جانتا ہو نہ ام کسی کو۔ پچھلے دنوں کا کوئی نشانی امارے ساتھ نہ ہو۔ بلکہ امارا نام بھی امارے ساتھ نہ ہو۔"

میرا جی چاہا کہ اس کی گردن پر جھانپڑ رسید کروں مگر اس کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی تھی کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

زریں بولا "استاد صیب! ام بہت غلط کار ہے۔ ام گناہ گار ہے۔ ام نت نئی لڑکیوں سے عشق لڑاتا رہا۔ ان کو دھوکا دیتا رہا اور خود بھی دھوکا کھاتا رہا۔ ام کو کیا معلوم تھا کہ جب ام سچے دل سے کسی کے ساتھ عشق فرمائے گا تو خدا تعالیٰ ام کو سزا دے گا۔ امارا محبوب ہمیشہ کے لیے ام سے چھین لیا جائے گا۔ بے شک ام اسی قابل ہے۔ امارے جیسے دل پھینک کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ام کو ان لڑکیوں کا آہ لگا ہے جن سے ام بغلگیر ہوا، جن کے ہم بوسے لیے، جن سے ام نے عشق معشوقی کا باتیں فرمایا۔" وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا اور منہ پھیر کر

لیا۔ ہر وقت ہنسانے والا آج خود اشک بار تھا۔

میرا دھیان فوراً ناشا کی طرف چلا گیا۔ ناشا کلثوم کی بہن تھی اور اس کے علاوہ میری سرپرست اعلیٰ بھی تھی۔ کلثوم کی شادی اسی نے طے کروائی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو کلثوم کی قسمت کا فیصلہ بدل بھی سکتا تھا۔ زریں گل کی دردناک حالت دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اسی سلسلے میں ناشا سے بات کروں۔ ناشا یوں تو خود دماغ لڑکی تھی لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ خاصا معقول رہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے پچھلے دنوں سار قانای سالار اور بدری نام کے شیطان سے اس کی جان بھی بچائی تھی۔ وہ ایک طرح سے میری احسان مند تھی۔ ممکن تھا کہ وہ زریں گل کے سلسلے میں میری بات تحمل سے سنتی اور اگر زریں کے لیے کوئی رعایت نکل سکتی تو نکال لیتی۔ میں جانتا تھا کہ قبائلی قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں لیکن سخت سے سخت قانون میں بھی کہیں نہ کہیں تو لچک موجود ہوتی ہے۔ ہو سکتا تھا یہاں بھی کوئی لچک موجود ہو۔

میں نے صفدر سے مشورہ کیا اور ناشا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ابھی تک اپنی دوست راخشی کے ساتھ ہی مقیم تھی۔ میں اس گھر میں پہلے بھی کئی دفعہ آ چکا تھا۔ راخشی بھی مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ میں نے اس سے ناشا کے متعلق پوچھا تو پتا چلا کہ وہ کل شام سے گھر نہیں آئی۔ میں دو گھنٹے تک وادی میں ناشا کو تلاش کرتا رہا لیکن اس کا کہیں کھوج نہ ملا۔ وہ گھر بھی واپس نہیں آئی یقیناً اسے معلوم تھا کہ ہم وادی سے واپس جا رہے ہیں۔ ہمیں الوداع کہنے کے لیے اسے آنا چاہیے تھا لیکن وہ غائب تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کر اوجھل ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں زریں کے سلسلے میں اس سے کوئی درخواست کروں۔ دوسری طرف سردار رابیل بہت بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ مقدس روشنی کی طرف سے دی جانے والی ہدایات کا پابند تھا۔ ان ہدایات کے مطابق ہمیں علی الصباح وادی سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ اب دوپہر ہونے کو آئی تھی۔ ناشا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ جب تک ہم وادی میں ہیں وہ نظر نہیں آئے گی۔

صفدر بھی اداس نظر آنے لگا تھا۔ اس نے مجھے علیحدگی میں لا کر ایک چھوٹی سی پوٹلی دکھائی "یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ کے شاگرد کا ترکہ۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

میں نے پوٹلی کھول کر دیکھی۔ اس میں زریں گل کے استعمال کی اشیا تھیں۔ نسوار کی ڈبیا، سگریٹ کا پیکٹ، کنگھی، عطر، انگوٹھی، مونچھیں تراشنے والی چھوٹی سی قینچی، بٹوا اور مفلر۔ میں سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھنے لگا۔

صفدر بولا "یہ چیزیں زریں نے دو دن پہلے بڑی رازداری سے مجھے دی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ آپ کو بھی پتا نہ چلے۔ کہتا تھا کہ میں ہر وہ چیز خود سے دور کر دینا چاہتا ہوں جسے دیکھ کر مجھے کلثوم کی یاد آ سکتی ہے۔ وہ ان چیزوں کو میرے لیے اپنی آخری نشانی قرار دے رہا تھا۔"

میں نے دل ہی دل میں زریں کو چند صلواتیں سنائیں۔ اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

بالآخر دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ ہم بوجھل دل کے ساتھ وادی سے روانہ ہو گئے۔ ہم یہاں صفدر اور جون جاڈل کو لینے پہنچے تھے۔ آج ایک طویل کوشش کے بعد ہم کامیاب رہے تھے لیکن اس کامیابی کی قیمت ہمیں "سوج" کی صورت میں چکانی پڑی تھی۔ سوج ہمارے ساتھ ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ بدستور بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ کسی وقت ہوش میں آتی تھی تو خون بار نظروں سے اردگرد دیکھتی تھی اور اس کا چہرہ اندرونی ہیجان سے تمتما اٹھتا تھا۔ سائیں عالی مسلسل خاموش تھا۔ اس کے دل و دماغ پر کوئی بہت گراں بوجھ تھا۔ اس کے جسم کے آبلے اب پھٹ گئے تھے۔ ڈاکٹر ہتری نے ان آبلوں پر کئی بار دوا لگانا چاہی تھی لیکن سائیں عالی نے اسے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ سائیں کا کہنا تھا کہ اس کے جنات روزانہ کوہ قاف سے مرہم لے کر آتے ہیں اور ایک پری جو ایم بی بی ایس ہے اپنے ہاتھ سے ان زخموں پر مرہم لگاتی ہے۔

سردار رابیل نے ہمیں بتایا کہ ہم گھوڑا گاڑیوں پر یہاں سے روانہ ہوں گے۔ وادی کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ یہ پٹی اس وقت کھولی جائے گی جب ہم ان ویران پہاڑوں سے باہر نکل کر کسی آبادی کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ ہمیں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ گھوڑا گاڑیوں پر سوار کرایا گیا۔ ایک گھوڑا گاڑی میں وہ تحائف لادے گئے جو ہمیں مقدس روشنی، سردار رابیل اور قبیلے کے عمائدین کی طرف سے دیے گئے تھے۔ سردار رابیل کی طرف سے اظہارِ خیرسگالی کے طور پر ہم سب کو ایک ایک برچھا بھی پیش کیا گیا۔ اس برچھے کے نقرئی دستے میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ جب ہماری گھوڑا گاڑیاں سرنگ کے دہانے سے چرخیوں والے پل کی طرف

روانہ ہوگئیں تو راستے کی دونوں جانب وادی کے لوگ کھڑے تھے اور حیرت آمیز دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں ابھی تک یقین نہیں ہوا تھا کہ ہم مقدس دیوار کے پار جانے کے باوجود اور خاص "کمیونٹی" کے لوگوں میں شامل ہونے کے باوجود واپس آگئے ہیں۔ زریں گل میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ ایک ایسے شخص کا چہرہ جسے ایک بڑا صدمہ سہنے کے بعد سکون آگیا ہو۔ سوج کو ایک دوسری گھوڑا گاڑی میں لٹایا گیا تھا۔ سائیں عالی اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ سوج کے حوالے سے سائیں کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں تھیں۔ میری نظریں ناشا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دل میں امید تھی کہ شاید آخری لمحوں میں ہی وہ کہیں نظر آجائے۔۔۔ اور میں اس سے کلثوم کے سلسلے میں کوئی گزارش کرسکوں۔ جب گھوڑا گاڑی اس مکان کے سامنے پہنچی جہاں ناشا اپنی سہیلی داخشی کے ساتھ رہتی تھی تو میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے ناشا نظر آئی تھی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ بہت سی عورتیں اور مرد تھے۔ ان میں ایک بہت موٹی عورت کو میں صاف پہچان گیا۔ یہ ناشا اور کلثوم کی ماں تھی۔ ایک کلہاڑا بردار شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری گھوڑا گاڑی روکی۔ سردار راتل ہم سے آگے جا رہا تھا۔ ہماری گھوڑا گاڑی کو رکتے دیکھ کر اس نے بھی اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ سردار راتل کا تو پورا قافلہ رک گیا۔ میں نے دیکھا کہ ناشا تیزی سے ہماری گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے لہٰذا جب اس نے اچانک زریں گل کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور گھوڑا گاڑی سے نیچے اتارا تو میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ ناشا کا ایک زناٹے دار تھپڑ زریں کے گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ ناشا بھوکی بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے زریں پر تھپڑوں کی بارش کردی۔ ساتھ ساتھ وہ ناقابل فہم زبان میں چیخ رہی تھی۔ وہ ایک لمبی تڑنگی لڑکی تھی۔ جسم میں کسی کمان کی سی سختی تھی۔ دو تین مردوں کے ساتھ وہ باآسانی نمٹ سکتی تھی۔ زریں گل ویسے بھی زخمی تھا۔ اس اچانک حملے نے اسے حواس باختہ کرڈالا تھا۔ میں لپک کر ان دونوں کے درمیان آیا۔ بڑی مشکل سے میں نے ناشا کو زریں گل سے جدا کیا۔ کھلے لبادے کے اندر سے ناشا کا عریاں جسم بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی اور آنسوؤں کے درمیان بولتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ زریں اس پر جوابی حملہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن حیرت ناک بات تھی کہ وہ خاموش کھڑا تھا۔ چند لمحے اسی طرح گزرے پھر ناشا ایک دم پرسکون نظر آنے لگی۔ اس نے گالوں پر لگاتار بہنے والے آنسو پونچھے اور میری گرفت سے اپنے کندھے چھڑا کر واپس گھر کی طرف لوٹ گئی۔

میں اور صفدر، زریں کو دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ زریں کے زخمی ہاتھ نے پھر خون اگلنا شروع کردیا تھا۔ ہاتھ کی سفید پٹی پر سرخ داغ نمودار ہوگئے تھے۔ کچھ دیر بعد ناشا دوبارہ نظر آئی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ کلثوم بھی تھی۔ وہ قبیلے کے روایتی لباس میں تھی۔ اس لباس پر بے تحاشا کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ناشا، کلثوم کو ہاتھ سے پکڑ کر ہمارے پاس لے آئی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی "میں اسے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ یہ جس کے ساتھ جانا چاہتی ہے، اسے بھیج دو۔۔۔ لیکن اس کا خیال رکھنا۔۔۔ یہ بہت بے وقوف ہے۔ بہت سیدھی سادی ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو ناشا؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

ناشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چھوٹی بہن کو گلے سے لپٹا کر اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا پھر اس کے ہونٹوں کو ہاتھ سے چھو کر واپس مڑ گئی۔ ہم سب ہکا بکا کھڑے تھے۔ ایکا ایکی کیا ہوگیا۔ اچانک ایک شور سا مچ گیا۔ وادی کے لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہوگئے۔ وہ اپنے ہاتھ ہوا میں لہرانے لگے اور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگے۔ اس رقص سے خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ رقص کرنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اپنے کلہاڑوں اور برچھوں کو آپس میں ٹکرا کر جلترنگ کی سی آواز بھی پیدا کر رہے تھے۔ کلثوم سب کے بیچ خاموش کھڑی تھی۔ چند فٹ کے فاصلے پر زریں گل بھی بت بنا ہوا تھا۔ زریں کے چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئی تھیں۔ قبیلے کی چند لڑکیاں آگے بڑھیں۔ انہوں نے کلثوم کو شانوں سے تھاما اور زریں گل کے سامنے کھڑا کردیا پھر وہ زریں سے کسی بات پر اصرار کرنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ وہ زریں گل کو مجبور کر رہی ہیں کہ وہ کلثوم کو گود میں اٹھائے اور گھوڑا گاڑی تک پہنچائے۔ یقیناً یہ یہاں کا کوئی رواج ہوگا۔ زریں گل کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کلثوم اس کے سامنے شرمائی لجائی کھڑی تھی۔ زریں گل نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس لمحے زریں کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے

زریں گل سے کہا کہ وہ لڑکیوں کی خواہش پوری کردے۔ زریں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذرا سا جھک کر کلثوم کو بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ گھبرا کر اپنی بھاری بھرکم اوڑھنی میں غروب ہوگئی۔ تماشائیوں نے زوردار نعرے لگائے اور اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ مسرت کا اظہار کرنے والوں میں سردار راتل بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے گلے میں جھولتی ہوئی ایک طلائی زنجیر اتاری اور زریں گل کے گلے میں پہنا دی۔ اس زنجیر میں اڑان بھرتے ہوئے ایک سنہری عقاب کی شبیہ تھی۔ گھوڑا گاڑی میں پہنچ کر زریں گل نے کلثوم کو گود سے اتارنا چاہا لیکن پرجوش قبائلی لڑکیوں نے اسے مجبور کردیا کہ وہ کلثوم سمیت گاڑی میں بیٹھے اور اسے اپنی آغوش میں لے رکھے۔ کلثوم کی بانہیں زریں کے گلے میں حمائل تھیں اور اس نے اپنا چہرہ زریں کی طرف سے پھیر رکھا تھا۔ یہ بڑی خوب صورت ادا تھی۔ یعنی وہ جس کی آغوش میں تھی اس کی طرف رخ نہیں کر رہی تھی۔ شوخ آنکھوں والی لڑکیاں اور شریر بچے زریں اور کلثوم کو دیکھنے کے لیے بار بار گھوڑا گاڑی کی طرف امڈ رہے تھے۔ سردار راتل نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹایا اور گھوڑا گاڑی کے سرخ پردے گرا دیے۔

یہ بڑی عجیب صورت حال تھی۔ آدھ پون گھنٹا پہلے ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک ناشا نمودار ہوگی اور لمحوں میں زریں گل کی تمام محرومیوں کا مداوا کردے گی۔ زریں پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی اور زریں کو خوش دیکھ کر ہمارے دلوں میں بھی مایوسی کی دھند چھٹ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس وادی میں آنے کے بعد ہم نے تکلیف کے جتنے بھی لمحات گزارے ہیں، ان سب پر خوشی کا ایک لمحہ غالب آگیا ہے۔ کلثوم کی ماں آگے بڑھی اس کے ہاتھ میں ایک تھال تھا اور اس میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں۔۔۔ کشمش کے دانوں جیسی۔۔۔ وہ پہلے صفدر کے پاس گئی اور تھال میں سے مٹھی بھر چاندی اس کے ہاتھ پر رکھ دی پھر ایک مٹھی چاندی اس نے جون جارل اور سائیں کو دی۔ آخر میں وہ میرے پاس آئی۔ میری طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سا غم ابھر آیا۔ میرے ہاتھ پر مٹھی بھر چاندی رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ لرز گیا تھا۔ میں جانتا تھا ایسا کیوں ہے۔ میں نے وادی کے مہان جاتری کو دوسرے جاتریوں سمیت موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مہان جاتری فاران اس عورت کا شوہر اور کلثوم و ناشا کا باپ تھا۔ میرے دل میں آئی کہ اس غم زدہ عورت کو شانوں سے تھام لوں اور اس سے معافی مانگوں لیکن سوال یہ تھا کہ وہ مجھے معاف کرے گی؟ ایک عورت اپنے شوہر کے قاتل کو کیسے معاف کرسکتی ہے۔ وہ جیسا بھی تھا بہرحال اس کا شوہر تھا اور پھر میں حرفِ معذرت زبان پر لاتا بھی کیسے؟ نہ وہ میری زبان سمجھ سکتی تھی نہ میں اس کی۔ میں خاموشی سے "چاندی" لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد باجے گاجے کے زبردست شور میں ہماری گھوڑا گاڑیاں پھر سے چرخیوں والے پل کی طرف روانہ ہوگئیں۔ کلثوم کے پیچھے مسکراتے چہرے تھے اور اشک بار آنکھیں تھیں۔ ایک لڑکی وداع ہو رہی تھی۔ کتنا انوکھا انداز تھا یہ۔۔۔ یہ لڑکی ایک گلی سے دوسری گلی یا ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جا رہی تھی بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا جا رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کب واپس لوٹنا تھا اور لوٹنا بھی تھا یا نہیں۔ خوشی اور غم یوں بغلگیر ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔

وادی سے نکلتے ہی ہم سب کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ سردار راتل ہمیں خدا حافظ کہہ کر واپس چلا گیا تھا۔ قریباً دو درجن محافظوں کے ساتھ ہم نے گھوڑا گاڑیوں پر اپنا سفر جاری رکھا۔ سردار راتل کا حقیقی بھائی محافظوں کا انچارج تھا۔ سردار راتل کے برعکس اس کا بھائی خاصا لمبا تڑنگا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ سردار راتل مختصر الوجود ہونے کے باوجود تین لمبی تڑنگی بیویوں کا مالک تھا، جب کہ اس کا بھائی عظیم الجثہ ہونے کے باوجود ایک دھان پان نازک اندام بیوی رکھتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے گرانڈیل شوہر سے چھو بھی گئی تو چکنا چور ہو جائے گی۔ شاید کسی ایسے ہی موقع کے لیے شاعر نے کہا ہے۔۔۔ یہاں کسی کو کچھ بھی حسبِ آرزو نہیں ملا۔

سردار راتل کے بھائی سمیت تمام محافظ آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ قریباً دو گھنٹے گھوڑا گاڑیوں پر سفر کرنے کے بعد ہمیں گھوڑوں پر سوار کردیا گیا۔ سوج چونکہ بے ہوشی کی حالت میں تھی لہٰذا اس کے لیے پالکی کا انتظام کیا گیا تھا۔ حیران کن طور پر یہ پالکی لبوتری ساخت کی تھی اور اسے صرف دو کہار (مزدور) اٹھاتے تھے۔ ایسی پالکی کو لے کر چلنا ایک مشقت طلب کام ہوتا ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہونے کے بعد ہم اپنے سفر کے دشوار مرحلے میں داخل ہوگئے۔ میں جانتا تھا، یہ مرحلہ بہت طویل ہے۔ شاید کئی دنوں تک ہمیں خطرناک راستوں پر گلیشیرز کی زد میں رہ کر چلنا پڑے گا۔ ایسے راستے جہاں قدم کی ایک لغزش کا مطلب "ہزاروں فٹ کا

قری فال" ہوتا ہے۔ ایک ایسا فری فال جس کے اختتام پر دردناک موت منتظر رہتی ہے۔

شام تک ہم تھک کر نڈھال ہو چکے تھے۔ ہمارے لیے خیمے لگا دیے گئے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد ہماری آنکھیں کھول دی گئیں۔ یہ ایک بڑا خیمہ تھا۔ اس کی دو تہیں تھیں۔ باہر کی تہ چمڑے کی تھی اور خیمے کے مکینوں کو یخ بستہ برفانی ہوا کی کاٹ سے محفوظ رکھتی تھی۔ خیمے کے اندر لیمپ روشن تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہم اس وقت ایک بہت بڑے اور بہت پرانے گلیشیر پر خیمہ زن ہیں۔

میں نے دیکھا کہ زریں گل چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت ہی مسرت تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوشی کے مارے اور بھی چھوٹی ہو گئی تھیں۔ وہ کلثوم کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا اور مسلسل انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

زریں گل بولا "استاد صیب' ایک تو یہ بڑا مصیبت ہے۔ ام کو اس کا زبان نہیں آتا۔ اب ام اس کو کیسے سمجھائے کہ اگر یہ کھائے گا نہیں تو اتنا لمبا سفر کیسے طے کرے گا۔"

میں نے کہا "وہ ساری زندگی تمہارے بغیر کھاتی رہی ہے۔ اب بھی کھا لے گی۔ تم زیادہ دلبر جانی بننے کی کوشش مت کرو۔ ویسے بھی ابھی یہ تمہارے لیے غیر محرم ہی ہے۔"

اصل محرم تو دل کا محرم ہوتا ہے جی۔ آپ کو کیا پتا کہ آج ام کتنا خوش ہے۔ امارا دل چاہتا ہے کہ امارے پاس ایک تلوار ہو۔"

"تلوار؟ کس کی گردن اڑاؤ گے۔"

"گردن نہیں اڑائے گا۔ ام خٹک ناچ کرے گا۔ ایسا ناچ کہ دیکھنے والا لوگ دنگ رہ جائے۔"

میں نے کہا "بھائی جی' اللہ نے چاہا تو اب ساری عمر ناچ ہی کرو گے۔ بیگمی کا ناچ۔"

خوشی کے مارے زریں گل کے آنسو نکلے پڑ رہے تھے۔ اپنے زخمی ہاتھ کے ساتھ ساتھ وہ ساری جسمانی چوٹیں بھول چکا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب! اگر اجازت ہو تو ام اپنی خوشی کا تھوڑا سا اظہار فرمائے؟"

"کیا مطلب؟ سب کے سامنے اظہار فرمائے گا۔"

"نہیں جناب! آپ غلط مطلب لے رہا ہے۔ ام اور بات کر رہا ہے۔ امارے دل کے اندر ایک گانا اچھل اچھل پڑ رہا ہے۔ امارا دل چاہتا ہے کہ ام آپ کو سنائے۔"

مجھ سے پہلے ہی صفدر بولا "ہاں ہاں' ضرور سناؤ۔ یہاں کون سا کوئی غلطی نکالنے والا بیٹھا ہے۔"

زریں نے کان پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں بند کیں۔ سانس اندر کی طرف کھینچی پھر اس کے حلق سے شہد میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی "ام کیوں دامن کو پھیلائے ــــ خدا م کیوں کوئی دعا مانگے۔ تجھے جب پالیا ام نے خدا سے اور کیا مانگے۔ خدا سے اور کیا مانگے۔"

جب زریں نے دو تین بار لہک لہک کر کہا کہ خدا سے اور کیا مانگے تو خیمے کے دروازے پر سائیں عالی کی شکل نظر آئی۔ اس نے ناراض لہجے میں کہا "اوئے تو خدا سے عقل مانگ۔ تجھے پتا نہیں کہ کوئی بیار ہے جو بندہ اپنی خوشی میں کسی کے غم کو بھولتا ہے' وہ اپنے لیے دوزخ کا سامان کرتا ہے۔"

زریں گل جھینپ کر چپ ہو گیا۔ صفدر ایک خالی برتن بجا کر زریں گل کو تال دینے کی کوشش کر رہا تھا' اس نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے۔ واقعی ہمیں خیال نہیں رہا تھا۔ سوہنی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ہم ہنسی مذاق میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں خیمے سے باہر نکلا۔ چاند تاروں کی مدھم روشنی میں گلیشیر کا نظارہ دل فریب تھا۔ حدِ نگاہ تک ایک سپاٹ میدان نظر آ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ کہیں کہیں روشنی کی بھی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے خیمے کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ اگر مجھے بتایا نہ گیا ہوتا کہ ہم گلیشیر پر ہیں تو میں ہرگز اندازہ نہ لگا سکتا۔ درجۂ حرارت منفی تھا۔ میں سوہنی والے خیمے میں پہنچا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں... رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ گاہے گاہے مزاحمت بھی کرتی رہی تھی۔ اس مزاحمت کے آثار خراشوں کی صورت اس کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر موجود تھے۔

کچھ دیر سوہنی کے پاس بیٹھ کر میں خیمے میں واپس لوٹا تو صفدر اور زریں گل دبی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ صفدر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا "دیکھیے جناب! آپ کے شاگرد صاحب نے کیا "ٹو زن" لیا ہے۔ وہ ساری چیزیں واپس لے لی ہیں جو برسوں مجھے سونپی تھیں اور کہا تھا کہ میں انہیں آخری نشانی سمجھ کر سنبھال لوں۔"

زریں گل چمک کر بولا "ساری چیزیں کہاں جناب۔ بہت تو ابھی صیدر صیب کے پاس ہی ہے۔"

وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ نسوار کی ڈبیا' سگریٹ کا پیکٹ' کنگھی' خنجر' انگوٹھی' ماچس سب کچھ نظر آ رہا تھا لیکن ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صفدر بولا "ہوا تو میں دے دیتا ہوں جناب! لیکن ہوا

خطرناک تصویر ہرگز نہیں دوں گا جو ہوتے ہیں گی ہے۔"

"اسی تصویر کے لیے تو ام بڑا مانگ رہا ہے۔" زریں گل بزاخ سے بولا۔

"کون سی تصویر؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جناب! بدو منیر ایک ہیروئن کے ساتھ چپت کر لیتا ہوا ہے۔"

میں نے زریں گل کو گھورا "اوئے باندر! تجھے اب کیا ضرورت ہے ایسی تصویر کی؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا "استاد جی! اب ہی تو ضرورت ہے ایسی تصویروں کی۔"

"کیا مطلب؟"

"ام نے آپ کو بتایا تھاں جناب کہ کلثوم بالکل معصوم ہے۔ اسے پتا ہی نہیں کہ مرد عورت کا کیا چکر ہوتا ہے۔ امارا مطلب ہے کہ شادی کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہے اسے۔ ایک دن مرغا صاحب اپنی مرغی ــــ"

"اچھا یار چھوڑو' سنا ہوا ہے یہ قصہ۔" میں نے اس کی بات کاٹی "مجھے یہ بتاؤ کہ اگر وہ واقعی معصوم ہے تو تم کیوں اس کی معصومیت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔"

"استاد صیب! ام دل و جان سے آپ کو استاد مانتا ہے لیکن عشق و محبت کے معاملے میں آپ امارا استاد نہیں ہے۔ آپ خود تو ساری زندگی کسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہیں پڑا۔ اب ام کو بھی منع فرما رہا ہے۔"

میں نے کہا "زریں گل مجھے لگتا ہے تم روز بہ روز عالم ترپٹی بنتے جا رہے ہو۔ وہ جیسے کشمیری پریسہ دیکھ کر صبر نہیں کر سکا تھا تم بھی کلثوم کو دیکھ کر صبر نہیں کر رہے۔ بھلے مانس آرام سے کھاؤ گے تو بدہضمی سے بچو گے۔"

اسی دوران میں باہر گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے خیمے سے سر نکال کر باہر کی یخ بستہ تاریکی میں جھانکا۔ یہ ہمارے پورٹرز تھے۔ یعنی وہ لوگ جو وادی سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ان میں ہمارے نیم عدد محافظ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایک چٹان کے عقب میں بہت بڑے ترپال کے نیچے پناہ لے رکھی تھی۔ وہاں آگ جل رہی تھی اور وہ محفل سجائے بیٹھے تھے۔ پتا نہیں وہ کون سا گیت گا رہے تھے۔ اس گیت میں برفانی ہواؤں کی روانی تھی اور اس پہاڑی لڑکی جیسی ترنگ تھی جو سرما کی طویل رات کو سینے پر اپنے محبوب کے بستر پر اپنی زلفیں کھولتی ہے اور رات بھر اس کے سنگ جاگنے کے لیے آمادہ نظر آتی ہے۔ دو تین شخص مل کر گا رہے تھے اور باقی چار افراد خالی کنستروں اور ڈبوں کی مدد سے تال دے رہے تھے۔ میں نے ذرا سا آگے جا کر' ایک پتھر کی اوٹ سے دیکھا۔ بڑا دلچسپ منظر تھا۔ ایک نوجوان رقص کر رہا تھا۔ اس نے ڈوری کی مدد سے گلے میں کوئی گول گول کدو جیسی سبزی لٹکا رکھی تھی۔ یہ دو گول کدو اس کے سینے کے مقام پر دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ تماشائی اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نانگا پربت کے دامن میں کسی نامعلوم گلیشیر پر الاؤ کی وہ روشنی اور رقص کرتا ہوا وہ نوجوان کسی خواب کا حصہ دکھائی دیتے تھے۔ اس گھڑی نہ کوئی رابطی تھا اور نہ رافانی۔ نہ کلاشنکوف بردار اور نہ برچھا بردار۔ وہ صرف انسان تھے۔ زندگی کی اصل سے قریب تر نظر آ رہے تھے اور زندگی کی اصل تو ایک شوخ بچہ ہوتا ہے جو سو سالہ بوڑھے کے اندر بھی موجود رہتا ہے۔

اگلے روز اجالا ہونے سے پہلے ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ دی گئیں۔ یقیناً جس گلیشیر پر ہم نے رات گزاری تھی اس کا کوئی نام ہوگا۔ حدود اربعہ ہوگا لیکن ہم یہ تفصیلات نہیں جان سکتے تھے۔ اگر جان سکتے تو پھر ہماری آنکھوں پر پٹیاں نہ ہوتیں۔ میں اس خوب صورت گلیشیر کو دن کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے بہت دور تھا۔

اس اجنبی گلیشیر کی ان دیکھی خوب صورتی کو الوداع کہہ کر ہم اگلی صبح پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے تنگ اور خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ کئی جگہ ہمیں گھوڑوں سے اترنا پڑا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ ایک درے کے قریب تھا۔ ایک بڑی چٹان کے قدرتی سائبان تلے ہم نے خیمے لگائے۔ یہاں ہوا کی رفتار خاصی تیز تھی تاہم خیموں کے اندر سکون محسوس ہوتا تھا۔ اندھیرا پھیلنے پر ہماری آنکھوں کی پٹیاں کھول گئیں۔ اس وقت کھانا تیار ہو چکا تھا۔ یہ مقامی کھانا چاول' انڈے اور سبزی پر مشتمل تھا۔ تاہم ہمارے لیے ڈبا بند چکن سوپ بھی مہیا کیا گیا۔ یہ سوپ پاؤڈر کی شکل میں ہوتا ہے اور گرم پانی ملانے سے فوراً تیار ہو جاتا ہے۔ زریں گل بڑے لاڈ سے سوپ کے چمچے بھر بھر کر کلثوم کے منہ میں ڈال رہا۔ ساتھ ساتھ وہ افسوس بھی کر رہا تھا کہ وہ کلثوم کی بات سمجھنے سے قاصر ہے۔

صفدر نے کہا "جس بات پر تم افسوس کر رہے ہو وہی تمہاری سب سے بڑی خوش قسمتی ہے۔ اگر تمہارے اندر تھوڑی بہت عقل بھی ہوئی تو لڑکی کو ہوں کا توں رہنے دو گے۔"

"کیا مطلب؟" زریں نے منہ پھاڑا "جوں کا توں کیوں؟"

صفدر نے قہقہہ لگایا "تم غلط مطلب لے رہے ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم لڑکی کو اپنی زبان مت سکھاؤ۔ ساری زندگی سکون سے کٹے گی۔"

اس رات خیموں کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی کہ جون چاؤل کو زریں اور کلثوم کے ساتھ دوسرے خیمے میں بھیج دیا گیا۔ میں اور صفدر' سائیں عالی اور سوج والے خیمے میں مقیم ہوگئے۔ یہ خاصا بڑا خیمہ تھا۔ سوج بدستور خواب آور دوا کے زیر اثر تھی۔ سائیں عالی گہرے مراقبے میں تھا اور کبھی کبھی ایک دم چونک کر اپنے نادیدہ جنات سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ ہمیں سونے کے لیے سلیپنگ بیگ دیے جاتے تھے۔ گو یہ بیگ بوسیدہ اور میلے کچیلے تھے لیکن ہمیں نانگا پربت کی ٹھنڈ سے بہرحال محفوظ رکھتے تھے۔ خیمے میں مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ تیل کی بو پنجاب کے کسی گاؤں کی یاد دلا رہی تھی جہاں لالٹینوں کے قریب بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا جاتا ہے اور بڑے پیالوں میں گرما گرم دودھ پی پی کر باتیں (کہانیاں) سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ پنجاب کے دیہات یاد آئے تو وہ سب کچھ یاد آگیا جو ان دیہاتوں سے متعلق تھا اور میرے ساتھ گزر چکا تھا۔ جاگیردار قادر زماں' نجو' خودسر بدمعاش کاریمن' چنے پل کی حویلی کا دفینہ' راہ گم کردہ ٹرک' مشرقی پنجاب' بوٹا سنگھ' سب کچھ یاد آیا اور پھر اپنا جل کوٹ بھی یاد آیا۔ بچپن کی محبت' باغ کھیت کھلیان اور غزالہ جس کے جسم سے کچے آموں کی خوشبو آتی تھی اور میں ساون کے دنوں میں جلترنگ کی طرح بج اٹھتا تھا۔ رات کے سمندر میں یادوں کی لہریں ایسے ہی انسان کو آدبوچتی ہیں۔ میں نانگا پربت کے نواح میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک یخ بستہ درے کے کنارے خیمہ زن تھا لیکن میرا تصور مجھے پنجاب کے دیہات اور وہاں کی بھینی خوشبوؤں کے درمیان لے آیا تھا۔

صفدر اور میں پاس پاس لیٹے سرگوشیاں کرتے رہے۔ میں نے صفدر کو بتایا کہ میری اطلاعات کے مطابق شیخ عاصم بھی ان پہاڑوں میں کہیں موجود ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دیگر افراد کے علاوہ غزالہ بھی ہے۔ صفدر اس اطلاع پر حیران ہوا۔ میں نے خیال ظاہر کیا کہ اگر یہ اطلاع واقعی درست ہے تو ان لوگوں سے مڈھ بھیڑ ہو سکتی ہے۔ کچھ دیر اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد صفدر نے جون چاؤل کی بات چھیڑ دی۔ صفدر نے وادی میں کافی وقت جون چاؤل کے ساتھ گزارا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس دفینے کے متعلق بات کر چکا ہوگا اور عین ممکن ہے کہ ضروری معلومات بھی حاصل کر چکا ہو۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ صفدر نے بتایا کہ جون چاؤل کے ساتھ اس حوالے سے اس کی بہت تفصیلی ملاقات ہو چکی ہے اور ایک دو موقع پر تو وہ ساری ساری رات جاگتے رہے ہیں اور اس موضوع پر بات کرتے رہے ہیں۔ صفدر نے گاہے گاہے جون چاؤل سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کا مختصر جائزہ کچھ اس طرح تھا۔

کئی ماہ پہلے جون چاؤل کوہ پیما ٹیم کے ساتھ فلپائن سے گلگت آتے ہوئے انڈیا کے شہر مدراس میں رکا تو وہاں اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ ساحل کی طرف سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچا جہاں امرا کی کوٹھیاں اور فارم وغیرہ تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اچانک مدراس کی دھواں دھار بارش نے اسے آلیا۔ وہ پناہ کے لیے ایک کوٹھی کے پورچ میں داخل ہو گیا۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں درمیانی عمر کی ایک خوب صورت خاتون مقیم تھی۔ خاتون کے بچے ہوسٹل میں مقیم تھے۔ شوہر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ جون چاؤل نے اس عورت کے ساتھ کچھ وقت گزارا۔ وہ عورت اس پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ بارش رک چکی تھی لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ جون چاؤل رات کے کھانے کے لیے رک گیا۔ رات کے کھانے کے دوران میں ان کی بے تکلفی میں اضافہ ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جون چاؤل نے رات اس کوٹھی میں گزاری۔ اس عورت پر جون چاؤل کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک ہی رات میں وہ جون چاؤل کو اس حد تک چاہنے لگی تھی کہ اس کے لیے سب کچھ تیاگ دینے پر آمادہ ہو رہی تھی۔ درحقیقت شکنتلا نامی اس ہندو عورت کو جون چاؤل میں اپنے بچھڑے محبوب کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہ آواگون کے نظریے پر بے تحاشا یقین رکھتی تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ جون چاؤل اس کے سورگ باشی محبوب کا دوسرا جنم ہے اور بھگوان نے ایک طوفانی بارش کے بہانے ان دونوں کو پھر ملا دیا ہے۔ یہی پختہ یقین تھا جس کے سبب اس نے آناً فاناً اپنا سب کچھ جون چاؤل پر وار دیا تھا اور اب اس سے بھی آگے جانا چاہ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ حقیقت حال وہ نہ ہوتی جو وہ بنا رہی تھی' بہرحال جو کچھ اس نے جون چاؤل کو باور کرایا وہ یہی تھا۔

جون چاؤل بڑی رازداری سے دو راتیں اس شکنتلا نامی عورت کے ساتھ رہا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے سمجھاتا بجھاتا بھی رہا۔ وہ بال بچے دار تھی۔ اس کا پتی تھا' گھربار تھا۔ وہ

ایک واہمے کو بنیاد بنا کر اچانک اپنی زندگی تہس نہس کیوں کر رہی تھی۔ جون کے مسلسل پند و نصائح کے سبب بالآخر وہ عورت کسی حد تک سنبھل گئی۔ تاہم اس نے جون چاؤل سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھار یہاں آکر اس سے ملتا رہے گا۔ تیسرے روز جون چاؤل نے اس عورت سے اجازت چاہی اور اسے بتایا کہ ہوٹل میں اس کی کوہ پیما ٹیم شدت سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔

رخصت کے وقت شکنتلا نامی اس عورت نے جون کو کچھ تحائف دیے۔ ان میں گندھارا آرٹ کے کچھ بے مثال نوادرات تھے۔ یوں لگتا تھا کہ عورت ان اشیا کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ نہیں۔ شاید یہ اشیا اس کے شوہر کی تحویل میں تھیں اور اس نے ابھی تک پتنی کو ان کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ جون چاؤل نے انکار کیا مگر بہرحال وہ عورت یہ تحائف جون کو دے کر رہی۔

جون ان تحائف کے ساتھ اپنے ہوٹل میں آگیا۔ اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ان قیمتی اشیا کا کیا کرے۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ نانگا پربت کی بلندیوں پر جا رہا تھا' وہ اس گراں قدر سامان کو کہاں سنبھالتا۔ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ اسے فارن کرنسی کی ضرورت بھی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ ان اشیا کو فروخت کر دیا جائے۔ اپنی گرل فرینڈ ٹنک بن کے لیے ایک دو زیورات رکھ کر جون باقی چیزیں ایک دکان دار کے پاس لے گیا۔ یہ دکان دار نوادرات کا ڈیلر سیٹھو رام داس تھا۔

اس سے آگے کے واقعات مجھے اور صفدر کو معلوم ہی تھے۔ ان واقعات کو ابھی ایک سال ہی گزرا تھا۔ وہ ساری کہانی میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔ مسٹر جی کلارک صاحب کو علم تھا کہ دفینہ مدراس لایا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مدراس کے تمام گفٹ اسٹورز اور نوادرات کے ڈیلروں کو خبردار کر رکھا تھا۔ جونہی جون چاؤل نوادرات فروخت کرنے کے لیے سیٹھ رام داس کے پاس پہنچا تھا' رام داس چوکنا ہو گیا تھا اور اس نے مسٹر جی کلارک کے کارندے کو اطلاع پہنچا دی تھی۔ بدقسمتی سے اس "اطلاع" پر جلد ہی کارروائی نہ ہو سکی اور جون چاؤل اپنی ٹیم کے ساتھ گلگت آپہنچا۔ بعد میں سیٹھ رام داس کو بھی قتل کر دیا گیا اور یوں تک جون چاؤل کی تلاش میں ہمیں قراقرم کی برف چھاننا پڑی۔

صفدر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بولا "جون چاؤل کا اندازہ ہے کہ شکنتلا نامی اس عورت کا شوہر کسی فرم میں ملازم ہے اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص ہے۔ ممکن ہے اس کے پاس دفینے کے نوادرات کسی نے امانتاً رکھوائے ہوں یا پھر ان نوادرات کا تعلق اس فرم سے ہو جہاں وہ کام کرتا ہے۔ جون چاؤل عورت کے پتے ٹھکانے سے آگاہ ہے اور ہمیں ناک کی سیدھ میں وہاں پہنچا سکتا ہے اور اگر ان لوگوں نے اپنی رہائش تبدیل کی ہے تو بھی فرم سے ان کے ٹھکانے کا علم ہو سکتا ہے۔ جون چاؤل اس سلسلے میں خاصا پُرجوش ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بے خبری میں اس کے ہاتھ ایسی اشیا آگئی ہیں جن کا تعلق میگاسی کے مشہور نوادرات سے ہے۔"

ہم باتیں کرتے کرتے اتنے محو ہو گئے تھے کہ گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ یوں ہی میں نے گھوم کر دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ سائیں عالی سوج پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے سوج کی جیکٹ کی زپ کھول دی تھی اور بالائی جسم بالکل عریاں کر دیا تھا۔

"سائیں یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے اضطراری کیفیت میں کہا اور اٹھ کر سائیں کے قریب چلا گیا۔

لیمپ کی روشنی میں سوج کا جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ایک بھرپور لڑکی تھی۔ بے شک وہ آزاد خیال تھی لیکن ہوش میں ہوتی تو خود کو اس حالت میں دیکھ کر ضرور اس کے رخسار شہابی ہو جاتے۔ میں نے سائیں کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ٹھٹک گیا۔ سوج کے سینے پر بھی وہی اٹھنی جیسا داغ نظر آرہا تھا جو اس سے پہلے ہم نے نائیلہ کے جسم پر دیکھا تھا۔ اس داغ میں کسی اڑتے ہوئے پرندے کی شبیہ تھی۔ یقیناً سنہری عقاب کی شبیہ۔۔۔ میں نے قریب جا کر دھیان سے دیکھا۔ ہاں وہ عقاب ہی تھا۔

"یہ کیا ہے سائیں عالی؟" میں نے پوچھا۔

"شاید تقدیر کی مُہر۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نہیں سمجھتا شفیع محمد۔۔۔ کہ سوج کبھی ٹھیک ہو سکے گی۔" سائیں نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر سوج کا لباس برابر کر دیا۔ ہم تینوں اپنی اپنی سوچ میں گم کھڑے تھے۔

○☆○

ان پُرپیچ راستوں پر ہمارا سفر مسلسل چار دن جاری رہا۔ چوتھے دن راستہ بے حد دشوار ہو گیا۔ ہمیں گھوڑے بھی چھوڑنا پڑے۔ ہمارے محافظوں نے ہماری آنکھوں پر سے پٹیاں اتار دیں۔ یہ ایک نہایت تنگ اور جان لیوا "ٹریک"

تھا۔ یہاں دو آدمی کندھے سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتے تھے۔ پاؤں پھسلنے کا مطلب یہ تھا کہ بندہ ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گرے اور لاپتا ہو جائے۔ بقول شاعر "نہ کہیں جنازہ اٹھے نہ مزار ہو۔" ہوا کی رفتار بھی قدموں کو بار بار غیر متوازن کر رہی تھی۔ ہم نے بہت سنبھل سنبھل کر اور سُست روی سے یہ راستہ طے کیا۔ زریں گل کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر کلثوم کی تھی۔ حالانکہ وہ زریں گل سے زیادہ اعتماد کے ساتھ وہاں سے گزر گئی۔ سوروج بدستور پالکی میں تھی۔ اب ہماری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ سوروج کے لیے یہ دو کہاروں والی پالکی استعمال کیوں کی گئی تھی۔ ان تنگ راستوں پر بڑی پالکی استعمال ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ گھوڑے اس پُل صراط نما راستے کے پار ہی رہ گئے تھے۔ پانچویں دن بھی ہم نے پاپیادہ سفر جاری رکھا۔ رات کو ایک ڈھلوان پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ ہمارا قافلہ اب مختصر ہو چکا تھا۔ پورٹر بھی نصف رہ گئے تھے۔ ہاں محافظوں میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وادی میں ہونے والی خون ریز لڑائی کے بعد بھگوڑے کھمارا بردار ان پہاڑوں میں تتر بتر ہو چکے ہیں اور ان کی وجہ سے ہمیں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

چھٹے روز ہم نے دوپہر تک سفر کیا۔ ایک مقام پر ہماری آنکھوں کی پتلیاں کھلی رہ گئیں۔ نانگا پربت کی چوٹی ہمارے دائیں جانب دکھائی دے رہی تھی۔ بائیں طرف گہرائی میں آبی نالا تھا۔ کئی سو فٹ کی پستی تھی پھر بھی ہمیں آبی نالے کی سطح پر تیرتی ہوئی برف نظر آ رہی تھی اور پانی کا شور ہم تک پہنچ رہا تھا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہمارے ہمراہی واپس جانے کے لیے تیار نظر آ رہے ہیں۔ وہ ہمارا سامان علیحدہ کر چکے تھے اور یہ سامان دو ڈھیروں کی صورت برف پر پڑا تھا۔ اس میں ہمارے لیے دو خیمے تھے۔ کھانے پینے کی اشیا تھیں، سوروج کی دوائیں تھیں، ہمارے تحائف تھے اور ایک عدد طاقتور رائفل تھی۔ سوار رابل کے بھائی نے مترجم کی وساطت سے ہمیں بتایا کہ ہم اب وادی سے محفوظ دوری پر پہنچ چکے ہیں۔ یہاں سے آگے اب ہمیں اکیلے جانا ہوگا۔ اس نے ہمیں ہاتھ سے تیار کیا ہوا بڑا سا نقشہ بھی تھما دیا۔ اس نقشے میں راستے کی مکمل تفصیل موجود تھی۔ ہم مزید تین روز سفر کر کے کیچال تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ ایک بہت "شارٹ کٹ" راستہ تھا۔

میں نے اخلاقی طور پر سوار رابل کے بھائی سے کہا کہ وہ ابھی کچھ اور آگے تک ہمارے ساتھ رہے لیکن اس نے معذرت کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کا مؤقف تھا کہ اسے سوار کی ہدایت پر عمل کرنا ہے اور ہدایت یہ ہے کہ وہ لوگ اس سے آگے نہیں جا سکتے۔

ہم سے رخصت ہو کر ہمارے محافظ اور پورٹر واپس چلے گئے۔ اب اس ویران برف زار میں ہم کل سات مسافر تھے۔ ان میں سے ایک مسافر نیم بے ہوش تھا۔ یعنی سوروج۔ سوروج کی پالکی اٹھانے کے لیے صنوبر اور جون چاؤل نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ باقی افراد نے رُک سیک (پشت کے تھیلے) کے علاوہ دیگر سامان بھی خود پر لاد لیا۔ ہر شخص کے حصے میں کم و بیش بیس کلو سامان آیا تھا۔ یہاں تک کہ کلثوم جو ہر کی حیثیت نئی نویلی دلہن کی سی تھی، اسے بھی سامان اٹھانا پڑا۔ شکر کا مقام تھا، راستہ اب زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ ہم نے درمیانی رفتار سے سفر جاری رکھا۔ آبی نالا گہرائی میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کبھی نزدیک آ جاتا، کبھی دور چلا جاتا۔ صنوبر اور جون چاؤل جب تھک جاتے تو پالکی نیچے رکھ کر کچھ دیر سانس لے لیتے۔ ہم بھی موقع غنیمت جان کر بیٹھ جاتے۔ کلثوم کے لیے زریں گل کی بے چینی دیدنی تھی۔ شاید اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کلثوم کے ساتھ اڑ کر پشاور پہنچ جائے اور سیدھا کسی نکاح خواں کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دے۔ وہ پروانے کی طرح کلثوم کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس کی بے تابیاں دیکھ کر کلثوم کے چہرے پر گاہے گاہے حیا کا رنگ لہرا جاتا تھا۔

میں نے کہا "اوئے مجنوں کی اولاد! ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔ بعد میں کیا حال ہوگا۔ تم تو کسی کو جینے دو گے نہیں۔"

"پہچاننے کے قابل ہی نہیں رہے گا جناب۔" صنوبر نے لقمہ دیا "پورے ایک مہینے بعد تو یہ گھر سے نکلے گا۔ اس وقت تک نظر کمزور ہو چکی ہوگی۔ سر کسی بابے کی طرح ہلتا ہوا ہوگا۔ لوگ عشق میں ناکام ہو کر جان گنوا دیتے ہیں، یہ عشق میں کامیاب ہو کر جان گنوا دے گا۔"

"سید و صیب! آپ بیچ میں مت بولیں۔ آپ ہمارا محبت کی گہرائی کو نہیں سمجھتا۔ اللہ کرے کبھی آپ پر ایسا وقت آئے پھر ام پوچھے گا کہ وقت کاٹنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

صنوبر نے کہا "کبھی تم نے روزہ رکھا ہے؟"

"الحمدللہ۔ بہت رکھا ہے۔"

"شام کے وقت کھانا جب سامنے ہو تو وقت گزارنا مشکل ہوتا ہے یا آسان؟"

"خو چے بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"ہمیں تو تم جان بوجھ کر وقت کو مشکل بنا رہے ہو۔ ہر وقت کلثوم کے ارد گرد گھومتے رہو گے تو یہی ہوگا۔"

"لیکن یہ بے چارہ کرے کیا۔ اسے اس کے سوا کچھ نظر ہی تو نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

زریں بولا "استاد صیب! یہ بات نہیں ہے۔ دراصل ام چاہتا ہے کہ کلثوم کو دنیا کا تھوڑا سا ہوا لگے۔ اس کا جھجک دور ہو۔ وہ بالکل معصوم ہے، بالکل سیدھا سادہ، جب ام وادی میں تھا تو ایک روز ایک مرغا صاحب..."

"یار! خدا کے لیے اس قصے کو چھوڑو۔ بہت دفعہ سنا ہے۔" میں نے کہا۔

صنوبر بولا "اچھا اب کیا پوزیشن ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی جھجک دور ہوئی یا نہیں؟"

"جھجک کیا خاک دور ہوگا؟ تنہائی تو ملتا نہیں۔ خو کل رات ام ذرا سا اس کے پاس کھسکا تو سائیں صیب نے ہمارے سر پر ڈنڈا رسید فرمایا اور بولا "خبردار! ہاتھ لگایا تو ان چھوڑوں گا تمہارے اوپر۔ وہ تم کو اتنا تاڑے گا کہ تم ساری عمر کسی عورت کا نام نہیں لے گا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا تھا جی ہمارا سارا جذبات ایک دم ٹھنڈا ہو رہی قلفے کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ ام سمجھ گیا کہ کلثوم کے معاملے میں ہمارا دال نہیں گلے گا۔"

"ہاں پہاڑوں پر ویسے بھی دال مشکل سے گلتی ہے۔" میں نے کہا۔

زریں گل نے آہ بھری "سید و صیب! آپ بھی تم ام سے دشمنی نبھا رہا ہے۔ کم از کم وہ تصویر ہی دے دیتا یا سائیں عالی کا نظر بچا کر ام وہ تصویر کلثوم کو دکھاتا۔ شاید اس کا دماغ کچھ روشن ہوتا۔"

صنوبر بولا "چلو یہ ایک بہانہ تو اپنے لیے رہنے دو۔ اگر تصویر دیکھ کر بھی اس نے تمہیں گھاس نہ ڈالی تو ہم سب کے سامنے تمہیں بڑی پشیمانی ہوگی۔"

زریں بولا "ہمارا دادا کہا کرتا تھا، انسان اپنی پوری کوشش کرے۔ اگر پھر بھی ناکام ہو تو اسے اللہ کا مرضی سمجھے اور پھر سے کوشش میں لگ جائے۔"

ہم شام تک نالے کی سیدھ میں چلتے رہے۔ شام کے وقت جب ہم پڑاؤ ڈالنے کے لیے کوئی مناسب جگہ دیکھ رہے تھے تو اچانک ہمیں چونکنا پڑا۔ کچھ فاصلے پر نشیب میں ایک ہموار سطح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کے درمیان ایسے چھوٹے چھوٹے برفیلے میدان اکثر نظر آ جاتے ہیں جیسے کوئی سفید چادر بچھی ہوئی ہو۔ جو سفید چادر ہمیں دکھائی دے رہی تھی اس پر تین رنگ برنگے دھبّے تھے۔ یہ دھبّے خیموں کے تھے۔ تین خیمے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے تھے۔ ان جدید خیموں کے رنگ زرد اور سرخ تھے۔ خیموں سے دس بیس گز آگے جا کر ڈھلوان ایک دم ختم ہو جاتی تھی اور وہاں سے آبی نالے تک پہنچنے والی خوفناک کھائی کا آغاز ہو جاتا تھا۔

ایک دم میرے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ شیخ عاصم اور غزالہ وغیرہ کا پڑاؤ ہو۔ ان انتہائی سنسان پہاڑوں میں کوئی ٹرائیکر یا ہائیکر تو آ نہیں سکتا تھا۔ یہ جگہ متوجہ رستوں سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ یہ مقامی لوگ بھی نہیں تھے۔ ہمارے ذہن میں یہ شک پیدا ہونا فطری بات تھی کہ ان خیموں کی خاص اہمیت ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر اس معاملے میں صلاح مشورہ کیا پھر محتاط قدموں سے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم بلندی پر تھے لہٰذا یہ اندیشہ کم ہی تھا کہ پڑاؤ والوں کو نظر آ جائیں گے۔ طاقتور رائفل ہمارے پاس موجود تھی۔ میرے پاس پسٹل کے علاوہ میرا خنجر بھی تھا۔ اس کے علاوہ اپنے پاس موجود آرائشی برچھوں سے بھی ہم ہتھیار کا کام لے سکتے تھے۔ سائیں عالی بالکل گم صم تھا۔ اس کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور وہ ہواؤں میں جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد ہی ہم پڑاؤ کے سامنے پہنچ گئے۔ اس وقت مجھے ایک ایسے شخص کی شکل نظر آئی جسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ پڑاؤ شیخ عاصم کا ہی ہے۔ درحقیقت میں نے شیخ عاصم کے خاص کارندے باقر خان کو پہچان لیا تھا۔ باقر خان سے میری آخری ملاقات ڈیفنس کی کوٹھی میں ہوئی تھی جہاں میں شیخ عاصم پر حملہ کرنے کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ باقر خان کو پہچانتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ احساس بجلی کی طرح دل و دماغ میں تڑپا کہ میں ایک بار پھر غزالہ کے قریب تر ہوں۔ آج سے تین چار ماہ پہلے میں جب گلگت سے روانہ ہوا تھا تو غزالہ اور عاصم میری روانگی سے بالکل بے خبر تھے۔ میں بڑی رازداری سے گھر چھوڑ کر آیا تھا۔ اس دن کے بعد ہماری ملاقات آج ہو رہی تھی۔

باقر خان نے بھی شاید ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ خیموں کی طرف گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد دو تین ہیولے خیموں سے باہر نظر آنے لگے۔ ان میں سے ایک یقیناً شیخ عاصم تھا۔ میں نے شیخ عاصم کو اس کے چوڑے چکلے جسم اور گھونگریالے بالوں سے پہچانا۔ میری کلائی میں وہ رسٹ واچ آج موجود نہیں تھی جو مجھے شیخ عاصم کی قربت یا دوری سے آگاہ کرتی تھی۔ تاہم

اس طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب سے شیخ عاصم کے رویے میں تبدیلی واقع ہوئی تھی' اس نے رسٹ واچ کا سسٹم آف کر دیا تھا۔

وہ لوگ ساکت کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے چہروں پر اونی ٹوپیاں تھیں۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور لباس عجیب و غریب تھے۔ ایک دو منٹ میں ہم آمنے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے شیخ عاصم اور غزالہ کو شناخت کر لیا۔ عاصم کی طرح غزالہ بھی کوہ پیمائی کے لباس میں تھی۔ جیکٹ' ٹراؤزر' مفلر' ہاتھوں پر دستانے نظر آ رہے تھے۔ ایک اجنبی شخص بھی غزالہ اور شیخ عاصم کے ساتھ موجود تھا۔ میں گرم جوشی سے شیخ عاصم کی طرف بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن اچانک ٹھٹک گیا۔ میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو جیسے ایک دم بریک لگ گئے تھے۔ مجھے شیخ عاصم اور غزالہ کے چہروں پر وہ شناسائی نظر نہیں آ رہی تھی جو آنی چاہیے تھی۔ ہم بالکل آمنے سامنے پہنچ چکے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ شیخ عاصم اور غزالہ نے ہمیں پہچانا نہ ہو پھر ان کے چہروں پر وہ جوش و خروش کیوں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں مجھے یہ بات سوجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

شیخ عاصم کی آواز ابھری "السلام علیکم! آپ لوگ پاکستانی معلوم ہوتے ہیں۔"

شیخ عاصم کے اس فقرے نے میرے تمام اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ کوئی وجہ تھی کہ شیخ عاصم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہیں پہچان رہا تھا۔ کہیں یہ لوگ کسی مصیبت میں تو نہیں تھے۔ میرا دھیان خود بخود شیخ کے پہلو میں کھڑے شخص کی طرف چلا گیا۔ وہ کوئی مقامی شخص تھا۔ شلوار قمیص کے اوپر اس نے بہت بھاری بھرکم جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے۔

میں نے کہا "ہاں جناب! ہم پاکستانی ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی کا تعلق فلپائن سے ہے۔"

"یہ ڈولی کیسی ہے؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔

"اس میں ایک بیمار خاتون ہیں۔"

"کہاں سے آ رہے ہیں آپ لوگ؟" شیخ عاصم انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

"موزچو پاس کی طرف ٹریکنگ کے لیے نکلے تھے' راستہ بھٹک کر دور نکل گئے۔ کئی دن پریشانی میں کاٹے۔ اسی دوران میں ہماری اس ساتھی پر اعصابی دورہ پڑ گیا۔"

"ہاں زیادہ بلندی کی وجہ سے اس قسم کی تکالیف بھی ہو جاتی ہیں۔" شیخ عاصم نے تبصرہ کیا۔

غزالہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ خاموش تھے لیکن نگاہ بات کرنا چاہ رہی تھی۔ صفدر نے شیخ عاصم سے پوچھا "آپ لوگ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

شیخ عاصم نے بھی ہم سے ملتا جلتا جواب دیا۔ بولا "ہائی کنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ ہماری خواہش تھی' ایوالانچس (برفانی تودوں) کی تصویر کشی کریں۔ سنا تھا کہ اس علاقے میں کافی ایوالانچس گرتے ہیں۔"

شیخ عاصم کے لہجے میں تناؤ صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ میرے ساتھ ساتھ صفدر اور زریں گل بھی معاملے کی سنگینی پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اس بات میں اب شبے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ مصیبت کیا ہو سکتی تھی' نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ شخص ان کے ساتھ کھڑا ہے وہ مسلح ہے۔ ممکن تھا کہ اس کی جیب میں ریوالور وغیرہ ہو اور اگر ایسا نہیں تھا تو خیمے میں اس شخص کے ساتھی موجود ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں نے شیخ عاصم اور غزالہ کو نشانے پر لے رکھا ہو پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ شیخ کا کوئی ساتھی بطور یرغمال ان لوگوں کے قبضے میں ہو۔ میں نے خیموں کی طرف دیکھا اور نجانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ نادیدہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔

"کیا آپ یہاں پڑاؤ کرنا چاہ رہے ہیں؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"حق ہو۔" سائیں نے زوردار نعرہ لگایا۔

عاصم بولا "آپ جہاں چاہے ڈیرا لگا لیں لیکن اگر ہمارا مشورہ مانیں تو اس سامنے والے ٹیلے کے پاس چلے جائیں۔ شمال کی طرف سے جو ہوا چل رہی ہے اس سے آپ کا بچاؤ ہو جائے گا۔"

عاصم کی بات یوں تو درست تھی مگر میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اس مشورے کے پیچھے بھی کوئی دباؤ ہے۔ شاید شیخ عاصم کسی مجبوری کے تحت یہ مشورہ دے رہا تھا۔

تھوڑی سی تفصیل پوچھنے کے بعد میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی کہ ہم ٹیلے کے پار خیمے لگائیں گے۔

اس دوران میں ہمیں یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ شیخ اور غزالہ کے علاوہ یہاں کم و بیش آٹھ اور افراد موجود ہیں۔ ان میں چار قلی تھے' دو شیخ عاصم کے ساتھی تھے اور دو کے بارے میں' میں کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔ پورشنوں کے لیے جو خیمہ لگایا گیا تھا وہ کافی بڑا تھا۔ شیخ عاصم کا کارندہ واقر قافلہ

خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ سب لوگوں کے چہروں پر تناؤ اور کی بے کیفیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ خاص طور سے پورٹرز (قلیوں) کے چہرے تو پریشانی کی منہ بولتی تصویر تھے۔ زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا ہمیں مشکوک بنا سکتا تھا۔ ہم چند ہی باتیں کرنے کے بعد اس ٹیلے کی طرف بڑھ گئے جس کے عقب میں ہمیں خیمہ زن ہونا تھا۔

درحقیقت شیخ عاصم کی زبان سے پہلا جملہ سننے کے بعد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ صفدر کے ساتھ میں عالی اور زریں گل نے بھی عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ صورت حال کو جلدی سے جانچ لیا تھا اور شیخ عاصم غزالہ وغیرہ سے بالکل اجنبیوں کی طرح ملے تھے۔ ٹیلے کی دوسری جانب بھی ہموار جگہ موجود تھی۔ یہاں ہوا کی کاٹ بھی کم تھی۔ تاہم وہ وسیع وادی دکھائی نہیں دیتی تھی جو ٹالے کے کنارے سے نظر آ رہی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی خیمے استادہ کیے۔ لیمپ روشن کیے' آگ جلائی اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹا پہلے ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ یوں اپنی راہ پر چلتے چلتے اچانک شیخ اور غزالہ سے ہماری ملاقات ہو جائے گی اور ملاقات بھی اس انداز کی ہوگی کہ دل و دماغ میں سینکڑوں سوال جاگ اٹھیں گے۔ میری طرح صفدر کو بھی پختہ یقین ہو گیا تھا کہ شیخ عاصم اپنی اہلیہ اور ساتھیوں سمیت کڑی مشکل میں ہے۔ یہ مشکل کیا تھی؟ فوری طور پر ذہن میں یہی بات آتی تھی کہ کچھ لوگوں نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ یقیناً ہماری آمد سے پہلے انہیں بری طرح ڈرایا دھمکایا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہمارے سامنے بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کریں۔ اگر ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اتنی آسانی سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہ لگا سکتا لیکن ہمارا معاملہ مختلف تھا۔ ہمیں آگاہ کرنے کے لیے شیخ عاصم اور غزالہ کو کسی قسم کا تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ ان کا رویہ ہی سب کچھ بیان کر گیا تھا۔

راستے میں سردار رابل کا بھائی بار بار کہتا رہا تھا کہ ان پہاڑوں میں شکست خوردہ کلاشا بردار گھوم رہے ہیں اور وہ اجنبی لوگوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں لیکن یہاں ایک اور ہی معاملے سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ جن لوگوں نے شیخ عاصم کے پڑاؤ پر قبضہ جما رکھا تھا ان میں سے کوئی بھی کلاشا بردار نظر نہیں آتا تھا۔ کلاشا برداروں کی سب سے بڑی نشانی ان کے لمبے بدبودار بال تھے اور کانوں کے بڑے بڑے بالے تھے پھر یہ کون لوگ تھے؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی تھی کہ ان کی تعداد کیا ہے اور ان کے پاس کیا اسلحہ ہے؟

اس نئے واقعے کے بعد ہماری بھوک اڑ گئی تھی۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور اس تشویشناک چویشن پر غور کرنے لگے۔ غزالہ کی موجودگی ہم سب کے لیے خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ ایک جوان خوب صورت لڑکی کا گن پوائنٹ پر بے بس ہو جانا ہولناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ کب سے اس بے بسی کا شکار تھی اور اس کے شوہر نامدار نے اس بے بسی کے خاتمے کے لیے کیا کیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے مجھے ایک خاص راستے پر چلا کر ایک خاص وقت میں خاص مقصد کے لیے یہاں بھیجا ہے اور یہ مقصد تھا غزالہ و شیخ عاصم کی بے بسی کا خاتمہ۔ جونہی پہاڑوں پر اندھیرا گہرا ہوا اور برف کی سفید چادر رات کی سیاہی میں سیاہ رنگ ہوئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر میرے اٹھنے کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ بولا "احتیاط سے شاہ جہاں صاحب۔"

زریں بولا "ہم آپ کے ساتھ چلے؟"

"نہیں ابھی ضرورت نہیں۔ ابھی میں صرف جائزہ لینے جا رہا ہوں۔"

"آپ ہمیشہ ایسا ہی کہتا ہے پچھلی دفعہ..."

میں نے آنکھیں نکال کر دیکھا تو زریں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

میں نے ملیشیا کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میری جیکٹ کی جیب میں پسٹل موجود تھا۔ حسب دستور پنڈلی سے ایک خنجر بھی لگا ہوا تھا۔ میں خیمے سے نکلا اور بے حد احتیاط سے اس ڈھلوان کی طرف چل پڑا جس کے آخر میں سینکڑوں فٹ گہری کھائی تھی اور کھائی کی تہہ میں آبی نالے کا برفیلا پانی شور مچا رہا تھا۔ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کے خیمے اسی کھائی کے کنارے پر تھے۔

ان خیموں تک میرا سفر بہت طویل اور صبر آزما ہوا۔ آخری سو گز کا فاصلہ میں نے برف پر اوندھے منہ رینگ کر طے کیا۔ رات بے حد تاریک تھی۔ اس تاریکی میں پانی اور ہوا کے مدھم شور کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی لیکن جب میں ایک خیمے کے بالکل نزدیک پہنچا تو بہت مدھم انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ خیمے کوہ پیمائی کے عام خیموں سے بڑے تھے۔ ایک خیمہ تو خیر کافی بڑا تھا' چھوٹے خیموں میں بھی تین چار افراد فراوانی سے سما سکتے تھے۔ دو خیموں کے اندر لیمپس کی ہلکی روشنی تھی' تیسرا تاریک نظر آ رہا تھا۔ میں

جس خیمے کے قریب پہنچا تھا وہ روشن تھا۔ میں بے آواز سرکتا ہوا خیمے کے ساتھ جا لگا۔ یہ بڑی پُرخطر حرکت تھی۔ چھینک، کھانسی یا کوئی بھی ہلکی سی آہٹ خیمے کے مکینوں کو میری موجودگی سے آگاہ کر سکتی تھی۔ خیمے کے اندر سے ابھرنے والی آوازیں اب میں سن سکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خیمے میں شیخ عاصم اور غزالہ کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی موجود ہے۔ وہ کوئی مقامی تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بات کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ جارحانہ تھا۔ وہ غزالہ سے مخاطب تھا "دیکھو لڑکی! اس میں میری کوئی غرض نہیں ہے۔ میں تو تمہارے اور مالک کے درمیان راضی نامہ کرانا چاہتا ہوں اور بس۔"

"تم اپنی یہ گندی بکواس بند نہیں کر سکتے۔" شیخ عاصم کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

جواب میں اجنبی شخص نے جو کچھ کہا' اس کا مفہوم کچھ یوں تھا "ابھی تو تم صرف گندی بکواس ہی سن رہے ہو۔ اگر تمہاری ہٹ دھرمی دور نہ ہوئی اور سردار واپس آگیا تو پھر تم کو بہت سا گند دیکھنا بھی پڑے گا اور یہ بھی بڑی بات نہیں کہ جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو۔"

"وہ جب واپس آئے گا تو دیکھ لیں گے اس کو بھی۔" غزالہ نے پھنکار کر کہا۔

مقامی شخص نے قہقہہ لگایا "پھر تو تمہارے پاس کوئی مہلت ہی نہیں ہوگی۔ وہ غصے میں بھرا ہوگا۔ تمہیں اٹھا کر برف پر پٹخے گا اور ادھیڑ کر رکھ دے گا ___ جو کام آسانی سے اور پیار محبت سے ہو سکتا ہے' اسے تم مشکل بنا رہی ہو۔"

شیخ عاصم غرایا "تمہارے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ تمہارے گلے کا پھندا بن جائے گا۔ میری بات یاد رکھنا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔"

اجنبی بولا "میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا۔ یہ تو بڑی امن پسندی کی بات ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی "دیکھو لڑکی! تم ایک ڈاکٹر ہو اور ڈاکٹر کا کام کیا ہوتا ہے؟ اس کا کام علاج کرنا ہوتا ہے۔ تم ڈاکٹر ہو اور ہمارا سردار مریض ہے۔ تمہاری خوب صورتی نے اسے بیمار کر دیا ہے۔ وہ تمہاری خواہش کے بخار میں تپ رہا ہے۔ اب اگر تم اس کا بخار دور کر دوگی تو یہ گناہ نہیں "علاج" ہوگا ___ یہ خدمت ہوگی ___ وہ کیا کہتے ہیں ___ دکھی انسانیت کی خدمت اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں دوا دارو بھی خرچ نہیں ہوگا۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نے مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ادھر مریض بھلا چنگا ہوگیا۔"

ایک دم تھوکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سے ایک تھپڑ کسی کے گال پر پڑا۔ میں نے اندازہ لگایا غزالہ یا شیخ عاصم نے مقامی شخص کے منہ پر تھوکا ہے۔ جواب میں اس نے تھپڑ جڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چوکڑی کی آوازیں آنے لگیں کوئی غزالہ کو مار رہا تھا۔ وہ رہی تھی' سسکاریاں بھر رہی تھی پھر اس کے حلق سے سی چیخ نکل گئی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ غزالہ کو سوئی چبھنے کی تکلیف بھی میرے لیے ناقابل برداشت تھی' کہاں یہ کہ اسے مارا جا رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے اور ہاتھ خود بخود پنڈلی کے خنجر تک پہنچ گیا۔ پلک جھپکتے میں نے ایک طرف سے خیمہ پھاڑ دیا۔ جو منظر دکھائی دیا مجھے آگ بگولا کرنے کے لیے کافی تھا۔ غزالہ زمین پر تھی۔ ایک شخص نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے۔ اس شخص کا دوسرا ہاتھ غزالہ کا گلا دبا رہا تھا۔ غزالہ کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ آہٹ سن کر حملہ آور نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' میرا خنجر دستے تک اس کے بازو میں گھس گیا۔ وہ کربناک انداز میں چیخا پھر اس کا ہاتھ قریب پڑی رائفل کی طرف بڑھا۔ میری ٹھوکر نے رائفل کو دور اچھال دیا۔ اس شخص نے لیٹے لیٹے میرے منہ پر گھونسا مارا لیکن میں نے یہ وار با آسانی بچایا اور گھٹنے کی ایک شدید ضرب اس کی پسلیوں پر رسید کی۔ پسلی ٹوٹنے کی اطمینان بخش آواز سنائی دی۔ یہی وقت تھا جب غزالہ کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ کسی نے عقب سے میرے سر پر رائفل کے دستے سے کاری ضرب لگائی تھی۔ میں اوندھے منہ غزالہ کے قریب گرا اور جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا جو بے بسی اور موت کا منظر تھا۔ میں نے اپنے کانوں میں فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنی۔ خودکار رائفل کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رائفل بردار کا شعلہ نشاں چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ لبلبی دبانے کا عزم رکھتا ہے۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر درجنوں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو سکتی تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر خود کو گولیوں کی بوچھاڑ کے لیے تیار کر لیا۔ عین اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک پرچھائیں سی لہرائی۔ یقیناً یہ شیخ عاصم تھا۔ وہ لپک کر رائفل بردار پر جا پڑا تھا۔ یہی وقت تھا جب خودکار رائفل کی ہولناک تڑتڑاہٹ گونجی۔ یقیناً شیخ عاصم کو جانی نقصان پہنچا تھا۔ اس کے منہ سے کی چیخ نکل گئی تھی۔ میرے لیے یہ چند ساعتیں کافی تھیں۔

تیزی سے اٹھا۔ خنجر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے جست لگائی اور ہوا میں اڑتے ہوئے خنجر رائفل بردار کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ اتنے تیز رفتار حملے کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ میرے جسم سے ٹکرانے کے بعد اسے شدید جھٹکا لگا اور وہ پشت کے بل میرے نیچے گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے رائفل اٹھا کر دوسرے شخص کی طرف سیدھی کرلی۔ خوف سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس نے چلا کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ خیمے سے باہر بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ چند ہی لمحے میں پڑاؤ کے تمام افراد ہمارے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ میں نے رائفل کا رخ ان لوگوں کی طرف کر دیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان میں سے کون دشمن ہے اور کون دوست۔

"پیچھے ہٹ جاؤ ___ سب پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ گھبرائے اور الٹے قدموں دور ہٹ گئے۔ میں نے شیخ کے کارندے کو آواز دی۔ وہ بھاگ کر قریب آیا۔ میں نے کہا "اپنے صاحب کو دیکھو۔"

شیخ عاصم اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کے جسم سے خون نکل رہا تھا۔ غزالہ اس پر جھکی ہوئی تھی لیکن اسے ہاتھ نہیں لگا رہی تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ غزالہ کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ یہی حالت شیخ عاصم کی بھی تھی۔

باقر خان نے جلدی سے شیخ عاصم کو سیدھا کیا۔ اس کا پہلو خون سے تربتر تھا۔ کم روشنی میں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ گولی یا گولیاں کہاں لگی ہیں۔ جس شخص کے سینے میں میرا خنجر ترازو ہوا تھا' وہ ساکت پڑا تھا۔ دو تین جھٹکے کھا کر اس کا جسم زندگی کی رمق سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے مقامی لباس کی صدری پہن رکھی تھی لیکن خم دار خنجر صدری چیر کر اس کے قلب تک پہنچا تھا۔ مرنے والے کا چہرہ لیمپ کی طرف تھا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہوا کہ اس کے کانوں میں دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ یقیناً ان سوراخوں میں بالے پہنے جاتے تھے۔ مرنے والے کے بال بھی بے ڈھنگے طریقے سے کٹے ہوئے تھے۔ میں ایک لمحے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ وادی راخان کا کلہاڑا بردار ہی ہے۔ صرف اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے روپ بدل رکھا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھی کا تعلق بھی وادی راخان سے ہی تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ پڑاؤ کے باقی افراد میں کوئی بھی شیخ عاصم اور غزالہ کا دشمن نہیں ہے۔ میں نے رائفل باقر خان کو تھمائی' ہلاک ہونے والے قبائلی کے سینے سے خنجر کھینچا اور شیخ عاصم و غزالہ کی بندشیں کاٹ دیں۔ پڑاؤ میں دو مزید افراد کے ہاتھ بھی باندھے گئے تھے۔ ان کی بندشیں باقر خان نے کاٹ دیں۔ میں نے شیخ عاصم کو لیمپ کے قریب سیدھا لٹایا۔ وہ خون سے تربتر تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ گولی کہاں لگی ہے۔ میں نے اس کی جیکٹ اتاری۔ قمیص اور بنیان پھاڑ دی۔ جلد ہی غزالہ نے عاصم کا زخم ڈھونڈ نکالا۔ یہ ایک تشویشناک زخم تھا۔ گولی پسلیوں سے نیچے پہلو میں لگی تھی۔ اگر وہ گہرائی میں گئی تھی تو انتڑیاں وغیرہ کٹ گئی ہوں گی لیکن اگر گوشت میں رہی تھی تو شدید خطرہ نہیں تھا۔ ایک دوسری گولی شیخ عاصم کے ہاتھ کا انگوٹھا کاٹ کر گزر گئی تھی۔ غزالہ نے پیٹ کے زخم کے ارد گرد سے خون صاف کیا پھر باقر کو ہدایت کی کہ وہ جلدی سے میڈیکل باکس لائے۔ باقر خان دوڑ کر باکس لے آیا۔ غزالہ نے اپنے آنسو پونچھے اور ایک ڈاکٹر کے پیشہ ورانہ تحمل کے ساتھ شوہر پر جھک گئی۔ شیخ عاصم ہوش میں تھا لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ غزالہ نے پہلے شیخ عاصم کو چند انجکشن لگائے۔ یہ دراصل ایک ہی انجکشن تھا جسے تقسیم کر کے مختلف جگہ لگایا گیا تھا۔ اس انجکشن سے زخم کے ارد گرد گوشت سن ہوگیا۔ غزالہ نے سرجری کا بلیڈ نکالا اور عاصم کے جسم میں پیوست ہونے والی گولی تلاش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے لیکن ایک ڈاکٹر کا مضبوط ارادہ اس لرزش کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ غزالہ نے بڑی مہارت سے پیٹ چاک کر دیا تھا۔ وہ گہرائی میں جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے انتڑیوں کی جھلک نظر آنے لگی۔ غزالہ نے میرے ہاتھ میں کاٹن تھما دی تھی۔ میں مسلسل خون صاف کر رہا تھا اور روئی کے بھیگے ہوئے "پھیے" ایک طرف پھینکتا جا رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود ہماری پیشانیاں پسینے سے تر ہو چکی تھیں۔ تقریباً دس منٹ کی کوشش کے بعد غزالہ ہانپ گئی۔ خون اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ خوف آ رہا تھا۔ "انتقالِ خون" کے انتظام کے بغیر خون کے مسلسل اخراج کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ گولی غالباً گہرائی میں اتری ہوئی تھی۔ "ماثنر آپریشن" کے ذریعے اس کا نکلنا ممکن نہیں تھا۔ غزالہ نے ٹانکے لگا کر زخم بند کیے اور بینڈیج کر دی۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال ہر ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

شیخ عاصم کا جلد از جلد اسپتال پہنچنا ضروری تھا اور

اچتال یہاں سے نامعلوم فاصلوں پر تھا۔ ہمارے اردگرد ویرانی تھی اور برف پوش پہاڑ تھے۔ سردار دانیل کے بھائی نے بتایا تھا کہ ہم اسی "ایک شارٹ کٹ" راستے پر مسلسل تین دن سفر کریں تو کیچال پہنچ سکتے ہیں۔ غزالہ کی پریشانی ہم سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ خاص طور سے میرے لیے تو یہ نظارہ بالکل ناقابل برداشت تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل کٹ رہا تھا۔ وہ بازیابی ہو رہی تھی۔ بے بسی سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہی تھی۔ بے شک اس نے زخم سی دیا تھا مگر خون کا اخراج مکمل طور پر بند نہیں ہوا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ خون پیٹ میں ہی جمع ہو رہا ہو اور زہر بن کر جسم میں پھیل جائے۔

خیمے سے باہر آ کر میں نے باقر خان سے بات چیت کی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ شیخ عاصم تقریباً ایک ماہ پہلے گلگت سے ٹریکنگ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ شیخ عاصم کے ساتھ ان کی اہلیہ کے علاوہ ایک قریبی دوست مسٹر باسط اور لاہور کے ایک صنعت کار اشفاق صاحب ہیں۔ مسٹر باسط فوٹو گرافی کا بہت تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ جدید قسم کے اسٹل اور موؤی کیمرے بھی ہیں۔ دس پندرہ روز یہ لوگ کیچال کے قرب و جوار میں گھومتے رہے پھر ایوالا بچس اور گلیشیر کی تلاش میں اس جانب آ گئے۔ علاقے میں پیش آنے والے حادثات کی وجہ سے یہاں ٹریکنگ کی پابندی ہے مگر شیخ صاحب نے اپنے تعلقات استعمال کر کے خصوصی اجازت لے رکھی تھی۔

اپنے ساتھ پیش آنے والے سنگین واقعے کے متعلق بتاتے ہوئے باقر خان نے کہا "ہم پندرہ بیس روز سے اس علاقے میں ہیں۔ یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ رات کو دو افراد جناب شیخ صاحب والے خیمے میں گھس گئے۔ انہوں نے شیخ صاحب' ان کی اہلیہ اور دوست مسٹر باسط کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کا تیسرا ساتھی ہمارے خیمے کے قریب چھپا ہوا تھا۔ جونہی ہم چیخ کی آواز سن کر باہر نکلے' ہمارے پاؤں میں تابڑ توڑ گولیاں برسائی گئیں اور ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا گیا۔ رائفل بردار بڑی اچھی پوزیشن میں تھا اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجبوراً ہمیں غیر مسلح ہونا پڑا۔ ان لوگوں نے ہمیں باندھ کر ایک خیمے میں ڈال دیا۔ بعد میں وہ وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ یوں لگتا تھا کہ کئی دنوں سے بھوکے ہیں۔ دو رائفلوں کے علاوہ ان لوگوں کے پاس کلہاڑے بھی تھے۔ وہ تین چار روز سے ہمیں مسلسل خوف زدہ کر رہے ہیں۔ خاص طور پر ان کا سردار جو بدفطرت شخص ہے۔ اس کے جسم سے ناگوار بو اٹھتی ہے اور جسم پر ریچھ کی طرح بال ہیں۔ ایک روز تو میں نے اسے کچا گوشت بھی کھاتے دیکھا تھا۔"

میں نے پوچھا "اب وہ شخص کہاں ہے؟"

باقر خان نے کہا "ان میں سے ایک شخص انگریزی میں بات کر لیتا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اس پاس میں ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہیں۔ سردار ان کی طرف گیا ہے۔ امید ہے آج رات یا کل صبح تک واپس آ جائے گا۔"

"اس کے پاس کیا اسلحہ ہے؟"

"ایک رائفل ہے جی مگر گولیاں زیادہ نہیں۔ آٹھ دس راؤنڈ ہوں گے۔ اس میں سے بھی دو تین اس نے بیگم صاحب کو ڈرانے کے لیے چلا دیے تھے۔"

"بیگم صاحب کو ڈرانے کے لیے؟"

"جی ہاں۔ وہ بہت تنگ کرتا رہا ہے انہیں۔ شیخ صاحب کو باہر برف پر لے گیا۔ ایک سفری تھیلا خیمہ ان کی کمر سے باندھ دیا۔ مترجم کے ذریعے ان کو کہا گیا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائیں۔ اگر دس منٹ تک کسی کی گولی کی زد سے نکل گئے تو وہ انہیں کچھ نہیں کہے گا۔ شیخ صاحب نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے مشتعل ہو کر شیخ صاحب پر فائرنگ کر دی۔ وہ نشانہ لے کر گولیاں چلا رہا تھا۔ غالباً اس نے تین گولیاں چلائیں۔ گولیاں شیخ صاحب کے سر کے بالوں کو چھو کر گزر گئیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہو' سر پر ایک جگہ سے ان کے بال غائب ہوئے ہیں۔"

باقر خان جو کچھ بتا رہا تھا وہ خاصا تشویش ناک تھا۔ اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ وہی کلہاڑا بردار ہی تھے جنہوں نے اپنی شباہت بدل رکھی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے اور صفدر' زریں وغیرہ کو بھی پہچان لیں۔ بہتر تو یہی تھا کہ فوری طور پر یہاں سے چلا جائے اور اس سے پہلے کہ کلہاڑا برداروں کا تیسرا ساتھی واپس پہنچے' ہم یہاں سے محفوظ فاصلے پر پہنچ جائیں۔ محفوظ فاصلہ پیدا کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہم یہیں موجود رہیں اور جونہی وہ شخص اکیلا یا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس پہنچے' اسے آڑے ہاتھوں لیا جائے۔ میں نے صفدر اور جون چارلس سے مشورہ کیا۔ دوسرا طریقہ زیادہ مناسب تھا کیونکہ رات کی تاریکی میں پرخطر برفانی دراڑوں کے اوپر سفر کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔

جناب ایم اے راحت کے پُراسرار قلم سے ایک پُراسرار داستان

نایاب

❋ برف کی وادیوں سے اترنے والے برف زادوں کی داستانِ حیرت۔
❋ دو دوستوں کی داستان' ایک شیر کی طرح بہادر اور دوسرا لومڑی کی طرح ذہین اور عیار۔
❋ شیر کی طاقت اور لومڑی کی مکاری رکھنے والے مل کر کالی طاقتوں سے ٹکرائے تو موت کو بھی پسینہ آ گیا۔

اپنے قریبی بک سٹال یا ہاکر سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ : قیمت۔ 100 ڈاک خرچ۔ 20

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار ، لاہور۔ فون :۔ ۷۲۳۰۴۱۴

اسٹاکسٹ : علی بک سٹال
نسبت روڈ ، چوک میو ہسپتال ، لاہور۔ فون :۔ ۷۲۳۹۵۰۳

تھا۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ وہ مریض بھی ہمارے ساتھ تھے۔

ہم نے مرنے والے کلہاڑا بردار کی لاش گھسیٹ کر آبی نالے کی گہرائی میں پھینک دی۔ دوسرا شخص خون کے اخراج اور پسلیوں کی چوٹ کے سبب بے ہوش ہو چکا تھا (بازو کے زخم سے بری طرح خون رستا رہا اور اب خود ہی بند ہو گیا تھا) میں نے اس کی صدری کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کا جسم ٹٹولا۔ ایک پسلی کا فریکچر صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ قبائلی کی نزبل نو رائفل سمیت پڑاؤ میں چار رائفلیں تھیں۔ ایک رائفل ہمارے پاس بھی موجود تھی۔ یعنی اسلحے کے لحاظ سے ہم خاصی مضبوط پوزیشن میں تھے۔ اگر چار پانچ قبائلی آ بھی جاتے تو ہم ان سے بخوبی نمٹ سکتے تھے۔

اس ٹھٹھرے ہوئے برف زار میں ہم نے ساری رات جاگتے ہوئے گزار دی۔ شیخ عاصم کو غزالہ نے درد کش اور خواب آور دوا کی بھاری ڈوز دے دی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا پھر بھی اس کے ہونٹوں سے گاہے گاہے کراہ نکل جاتی تھی۔ غزالہ اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور پریشانی کی تصویر دکھائی دیتی تھی۔

میں نے اس سے کہا "غزالہ! کیوں کیا تم لوگوں نے ایسا؟ کیوں اتنی دور چلے آئے؟"

وہ بولی "آپ جانتے ہیں کہ عاصم کے ذہن میں جو بات سما جائے وہ نکلتی نہیں۔ میں بہت منع کرتی رہی لیکن وہ نہیں مانے۔"

میں نے کہا "باقر خان بتاتا ہے کہ مسٹر باسط فوٹوگرافی کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ لوگ اتنی دور چلے آئے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ بات بھی ہو لیکن اصل بات آپ بھی جانتے ہیں۔"

"کیا اصل بات؟"

غزالہ نے نمناک نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غم واندوہ نے اس کی موہنی صورت کو عجیب سی ملاحت دے رکھی تھی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "آپ گلگت سے بن بتائے روانہ ہو گئے تھے پھر انکل ساہی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ آپ مسٹر منصور کی نیم پاگل بیوی کو لے کر کسی نامعلوم سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔ پورے ایک ماہ تک ہم نے گلگت میں ہی قیام کیا اور بہت بے چینی سے آپ کا انتظار کرتے رہے۔ پریشانی روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر عاصم سے رہا نہ گیا۔ عاصم نے فیصلہ کیا کہ وہ نیپال کی طرف جائیں گے۔ ان کے دوست مسٹر باسط کو ٹریکنگ کا شوق بھی ہے۔ عاصم نے انہیں بھی وہیں سے بلا لیا۔ پوری تیاری کے ساتھ لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ شروع میں اس قدر آگے آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر جوں جوں آگے بڑھتے گئے "ارادہ بدلتا گیا" یہاں تک کہ ہم اس دور دراز علاقے میں آ پہنچے۔"

میں نے کہا "جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ اب یہاں سے جانے کا کیا ہوگا۔ عاصم کی حالت تم دیکھ ہی رہی ہو۔"

غزالہ اٹھ کر خیمے کے ایک گوشے میں گئی اور دہاں سے ایک بڑا سفری تھیلا اٹھا لائی۔ اس تھیلے میں سے اس نے بڑے سائز کا ایک ٹرانس میٹر نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور بولی "یہ لانگ رینج ٹرانس میٹر ہے۔ چند روز پہلے عاصم کیمپ کے بیس کیمپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو ایک فوجی پوسٹ سے رابطہ ہو گیا۔ وہاں سے کسی میجر شوکت صاحب نے بات کی تھی۔ اس پوسٹ کا کوڈ نیم شاہ زوری ہے۔ عاصم نے فریکوئنسی وغیرہ اس کاغذ پر نوٹ کر رکھی ہے۔ آپ کوشش کر کے دیکھیں شاید رابطہ ہو جائے۔"

میں نے ٹرانس میٹر کا معائنہ کیا۔ بیٹری بڑی اچھی حالت میں تھی۔ غزالہ کی بتائی ہوئی فریکوئنسی پر میں نے بار بار رابطے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ بیٹری کمزور ہونے کے ڈر سے ہم نے کوشش صبح تک کے لیے ترک کر دی۔

رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صفدر ساری رات رائفل گود میں رکھے چوکس بیٹھا رہا۔ زریں گل، کلثوم، سورج اور سائیں عالی دوسرے پڑاؤ میں تھے۔ ایک رائفل زریں گل کے پاس بھی تھی۔ اگلی صبح میں نے پھر ٹرانس میٹر کو آزمایا۔ میری دوسری یا تیسری کوشش ہی کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ دوسری طرف سے خاصی صاف اور واضح آواز آئی تھی۔ کوئی شخص پوٹھوہاری لہجے میں بول رہا تھا "ہیلو! شہ زوری پوسٹ۔۔۔ ہیلو شہ زوری" جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ پوسٹ کا آپریٹر تھا۔ ایک مختصر مکالمے کے بعد اس نے میری بات میجر صاحب سے کرا دی۔۔۔ میجر صاحب کا لہجہ سخت تھا مگر وہ کوآپریٹو شخص تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں مصیبت سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ ایک غیر ملکی مہمان کا معاملہ ہے اور اگر مدد پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو اس کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ غیر ملکی مہمان کی جان اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے ریسکیو کر لیا جائے۔

میجر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے ہمارے کیمپ کا حدود اربعہ پوچھا۔ میں نے نقشے کی مدد سے انہیں

لوکیشن سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا یہ کافی دشوار راستہ ہے۔ ویسے بھی "ہیلی" کا حصول خاصا مشکل ہے۔ بہرحال وہ کوشش کرتے ہیں۔

میجر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم نے ایک گھنٹے بعد پھر رابطہ کیا۔ انہوں نے ہمیں خوش خبری سنائی کہ ایک "للا" ہیلی کاپٹر خوراک لے کر "کے ٹو بیس کیمپ" کی طرف جا رہا ہے۔ اگر موسم صحیح رہا تو واپسی میں ہمارے مریض کو "پک" کرنے کی کوشش کرے گا۔ میجر صاحب نے ہمیں کچھ ضروری ہدایات دیں اور متوقع ٹائم دوپہر ساڑھے گیارہ بجے کا بتایا۔

جو ہیلی کاپٹر آ رہا تھا اس کا نام لاما بتایا گیا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ ہیلی کاپٹر چھوٹا ہے یا بڑا اور اس میں کتنے آدمیوں کی گنجائش ہوگی۔ بہرحال میرا ارادہ تھا کہ اگر تھوڑی بہت گنجائش نکل آئی تو سورج کو ضرور سوار کرانے کی کوشش کروں گا۔ ہم نے تیاری مکمل کر کے گیارہ بجے ہی ہیلی کاپٹر کا انتظار شروع کر دیا۔ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے برف زار میں بیٹھ کر نیلے آسمان پر کسی متحرک نقطے کی تلاش کرنا بڑا جان جوکھم کا کام تھا۔ خاص طور سے اس حالت میں کہ کلہاڑا بردار قبائلیوں کا خطرہ بھی تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا تھا۔ گاہے گاہے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ اگر وہ زیادہ تعداد میں یہاں پہنچ گئے اور مسلح بھی ہوئے تو کیا ہوگا۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکل رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر جلد یہاں پہنچ جائے۔

شیخ عاصم کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے تیز بخار ہو چکا تھا۔ زخم سے بھی مسلسل خون رس رہا تھا۔ شیخ عاصم کیسا بھی تھا بہرحال کل رات اس نے بے حد جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے نزبل نو رائفل کی زد میں دیکھ کر اس نے بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور رائفل بردار پر جا پڑا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ اس نے میرے حصے کی گولی اپنے جسم پر لی تھی۔ شیخ عاصم کے دل میں کیا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا ویسے بھی یہ ایک علیحدہ موضوع تھا۔ بہرحال فی الوقت میں خود کو عاصم کا احسان مند محسوس کر رہا تھا۔ وہ کہنہ دشمنی دھندلا سی گئی تھی جو میرے اور اس کے درمیان برسوں سے پائی جاتی تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے بارہ بجے اور پھر دو بج گئے۔ ہیلی کاپٹر کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ہم پر مایوسی غالب آنے لگی تھی۔ میں پھر ٹرانس میٹر پر رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کھٹ کھٹ کی مدھم آواز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یقیناً یہ ہیلی کاپٹر کے پروں کی آواز تھی۔ ہم نے اس آواز کا ماخذ تلاش کیا تو ہماری آنکھیں چمک اٹھیں۔ دور نیلگوں افق پر نانگا پربت کی بائیں جانب سے ایک سیاہی مائل نقطہ نمودار ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ نقطہ بڑا ہوتا گیا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ ساعت شکن ہوتی گئی۔ "لاما" ہیلی کاپٹر توقع کے برعکس یہ کافی بڑا ہیلی کاپٹر تھا۔ پائلٹ نے لینڈ کرنے کے لیے ایک ہموار جگہ تلاش کی اور بے حد مہارت سے ٹھوس برف پر اتر گیا۔ تیز ہوا سے ہمارے خیمے اور لباس بری طرح پھڑپھڑانے لگے۔ یوں لگا جیسے سردی کی شدت دس گنا بڑھ گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہیلی کاپٹر کے انجن بند کر دیے جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ مکمل وردی اور ہیلمٹ وغیرہ میں جکڑا ہوا پائلٹ ہیلی کاپٹر سے اترا اور پنکھے کے نیچے جھک کر چلتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا۔

"السلام علیکم۔" وہ چیخ کر بولا۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے بھی چلا کر جواب دیا۔

"مریض کہاں ہے؟"

میں نے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے آپ اسے لے آئیں۔ ہیلی میں تین مسافروں کی مزید گنجائش موجود ہے۔ آپ میں سے جو جانا چاہتے ہیں وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ آ جائیں۔"

میں نے فوری طور پر صفدر اور جون چاول کے ساتھ مشورہ کیا۔ فیصلہ ہوا کہ سورج کے علاوہ غزالہ اور کلثوم کو بھی بھیج دیا جائے۔۔۔ کلثوم ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر سخت خوف زدہ تھی اور اسے کوئی جناتی مخلوق سمجھ رہی تھی۔ میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ کلثوم کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ وہ کیا سمجھاتا' وہ تو خود ڈرا ہوا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ کلثوم ہیلی کاپٹر سمیت قراقرم کے برف زاروں میں گم ہو جائے گی اور وہ باقی ساری عمر" ابھی جاول دارا" دل بے پارہ پارہ گاتا رہے گا۔ ویسے بھی اسے اتنی فرصت نہیں تھی کہ کلثوم کو سمجھا پاتا۔ اس کی ٹوپی پنکھے کی طوفانی ہوا سے بار بار اڑ جاتی تھی۔ وہ بھاگ کر جاتا تھا' ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھتا تھا' کلثوم سے بات کرنے کے لیے جھکتا تھا' ٹوپی پھر اڑ جاتی تھی۔ بصد مشکل ہم نے غزالہ کے علاوہ سورج اور کلثوم کو بھی ہیلی کاپٹر میں سوار کرا دیا۔ سورج کو آرام دہ طریقے سے لٹانا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال جیسے تیسے اسے سوار کر دیا گیا۔ ہیلی کاپٹر کو سیدھا گلگت پہنچنا تھا۔ پاپیادہ ایک طویل سفر تھا لیکن ہیلی کاپٹر نے دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے دروازے بند ہوئے تو عملے کے دونوں افراد نے اپنے سفید دستانے ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔ میں نے

دیکھا کہ نرناک کی آنکھیں کھڑکی کے شیشے سے لگی ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کے گہرے سائے تھے۔

ہیلی کاپٹر کے رخصت ہوتے ہی ہم نے بھی پڑاؤ اٹھایا اور اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ ایک بڑا مسئلہ زخمی کلاماڑا بردار کا تھا۔ جون چاڈل کی تجویز تھی کہ ایک چھوٹے خیمے اور کچھ خوراک کے ساتھ کلاماڑا بردار کو یہیں چھوڑ دیا جائے لیکن مجھے اور صفدر کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ کچھ بھی تھا' بہرحال وہ انسان تھا۔ ہم اسے ان ویران برف زاروں میں چھوڑ جاتے تو وہ ٹھٹھر کر مر جاتا۔ بے شک اس بات کی امید تھی کہ اس کا سردار دوبارہ یہاں آئے گا لیکن یہ بات یقینی نہیں تھی۔ ویسے بھی کلاماڑا بردار کو اپنے ساتھ لے جانا سود مند تھا۔ وادی داخان تک کا راستہ ابھی تک ایک راز تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس شخص کی وجہ سے یہ راز کھل جاتا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ پالکی جو اب تک سروج کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے' زخمی شخص کے لیے استعمال کی جائے گی۔ بڑی عجلت کے ساتھ ہم نے سامان اپنی کمروں پر لادا اور نقشے کے مطابق جنوب مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیخ عاصم کا عربی دوست باسط اور پاکستانی صنعت کار اشفاق احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ پورٹرز سمیت ہمارا قافلہ کل بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ گیجال تک کا سفر نہایت طویل اور کٹھن تھا۔ ہمیں پورے چار روز لگے۔ راستے میں کئی دشوار ناکوں کو پار کرنا پڑا۔ برف پگھلنے کا موسم تھا لہٰذا کئی جگہ طغیانی کی سی کیفیت تھی۔ پل صراط جیسے راستے' گہری کھائیاں' برفانی ہوا اور جان لیوا دراڑیں۔ وہی گوناگوں مشکلات تھیں جن سے میں پہلے بھی گزر چکا تھا۔ اس چار روزہ سفر میں صرف ایک خاص واقعہ ہوا اور وہ یہ کہ ایک روز صبح سویرے جب ہم نے دیکھا تو زخمی کلاماڑا بردار مردہ پڑا تھا۔ اس کا جسم گردن تک سلیپنگ بیگ کے اندر تھا۔ منہ کھلا تھا اور آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ دو امکانات تھے۔ ایک تو یہ کہ ٹوٹی ہوئی پسلی نے اس کے پھیپھڑے میں زخم پیدا کر دیے تھے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ اس کے پاس کوئی زہریلی شے موجود تھی جو اس نے طویل اذیت سے نجات پانے کے لیے کھا لی تھی۔ اس امکان کو قوی کرنے کے لیے یہ شہادت موجود تھی کہ متوفی کا جسم نیلا ہو رہا تھا اور چہرے پر بھی نیلاہٹ موجود تھی لیکن لاش پر اس قسم کے آثار سخت سردی کی وجہ سے بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ کچھ بھی تھا' وادی داخان کا وہ بدبودار وحشی نما انسان اب ہم میں موجود نہیں تھا۔ وہ بلند ترین پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں رہنے والے اسی روپاش دیوتا کے پاس پہنچ چکا تھا جس کی وہ آج تک پوجا کرتا رہا تھا۔ میری سماعت میں وہ گیت گونجنے لگا جو کبھی میں نے وادی داخان کی سرنگ میں سنا تھا۔ کورس کی شکل میں گایا ہوا وہ گیت کچھ اس طرح سے تھا۔

ہم روپاش کے بیٹے۔ ہم روپاش کی بیٹیاں۔
ہم مقدس پہاڑوں کی آغوش میں پلتے ہیں۔ وہیں طلوع ہوتے ہیں اور وہیں ڈھلتے ہیں۔

کلاماڑا بردار کی لاش ہم نے ایک نامعلوم ڈھلوان پر برف کی قبر میں دفن کی اور اپنا سفر جاری رکھا۔

○☆○

مجھے اچھی طرح یاد ہے' وہ جمعہ کا دن تھا۔ ہم گلگت کے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس کے وسیع ہال میں موجود تھے۔ ایک طویل سفر کی تکان ہمارے چہروں پر تھی اور اعضا مضمحل تھے۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ گلگت میں ہمارا استقبال کرنے کے لیے اتنے لوگ جمع ہوں گے۔ کئی اعلیٰ سرکاری افسران' پولیس' فوج اور FNCA کے حکام یہاں موجود تھے پھر بہت سے شناسا چہرے بھی تھے۔ ایسے چہرے جو کئی ماہ میری نگاہوں سے اوجھل رہے تھے۔ ساہی صاحب' ایس پی برکت' مجتبیٰ کنور' قادر زماں اور امریکی ادیب پی مسٹر جی کلارک صاحب۔

یہ لوگ ہمارے سفر کے حالات جاننا چاہتے تھے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ ہم حیران کن خبریں سنائیں گے۔ حیران کن خبریں تو ہمارے پاس موجود تھیں لیکن وہ ساری کی ساری سب کے سامنے نہیں سنائی جا سکتی تھیں۔ ہم نے صرف وہی کچھ بتایا جو اس ہجوم کے سامنے ہم بتا سکتے تھے۔ یہ بہت تھوڑا تھا' پھر بھی سننے والوں کے منہ کھلے رہ گئے اور آنکھوں میں حیرت منجمد ہو گئی۔ مقدس دیوار کا اسرار' سنہری عقاب (سانوس) کی پوجا۔ دو قبیلوں کا خوفناک تصادم اور زمین کی گہرائی میں میلوں تک پھیلا ہوا قدیم غار۔ یہ ساری باتیں حیرت گم کرنے والی تھیں۔ ہم نے تھوڑا بتا کر زیادہ چھپا لیا۔ نائیلہ کے حوالے سے ہم پر سوالات کی بوچھار کر دی گئی۔ اس موقع پر مجتبیٰ کنور نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور ہمیں حاضرین کے پُرتجسس سوالات سے بچا کر ہال سے نکال لے گیا۔

اس رات مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کے ساتھ میری طویل میٹنگ ہوئی۔ صفدر بھی اس موقع پر موجود تھا۔ ہم نے تمام امور پر کھل کر بات کی۔ وہ اسرار جو ہم نے مقدس دیوار

کے پار دیکھا تھا' مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کے لیے بھی تعجب خیز تھا۔ اگر یہ باتیں میری زبان سے ادا نہ ہوتیں تو شاید وہ اسے مذاق میں ٹال دیتے لیکن وہ جانتے تھے کہ میں توہم پرست نہیں ہوں اور نہ ہی ٹھوس شہادت کے بغیر کسی بات پر یقین کرنے والا ہوں۔ انہیں بھروسا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' پوری طرح پرکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ "مقدس دیوار" کی اسراریت کا ایک ٹھوس ثبوت بھی ہمارے پاس موجود تھا اور وہ تھی سروج۔ اس کی حالت مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک دونوں نے دیکھی تھی۔ وہ حالت ایسی تھی کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کوئی ذہنی دورہ نہیں تھا' نہ وہ پاگل پن تھا' نہ کوئی نشہ تھا۔ وہ کوئی اور ہی کیفیت تھی۔ ایک ایسی خود سپردگی' ایک ایسی وارفتگی تھی جو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا اور سروج پہلی عورت نہیں تھی۔ اس سے پہلے ساہی صاحب اور دیگر بہت سے لوگ نائیلہ کو بھی اسی کیفیت کا شکار دیکھ چکے تھے۔ ایک مقناطیسی کشش تھی جو اپنی ہزار ہا نادیدہ ڈوریوں سے نائیلہ کو اپنی طرف کھینچتی رہی تھی۔ تقریباً چار ماہ پہلے ہم یہاں سے نائیلہ کو لے کر روانہ ہوئے تھے۔ جس حالت میں نائیلہ گئی تھی تقریباً اسی حالت میں سروج واپس آئی تھی۔

کافی دیر تک اس معاملے پر بات کرنے کے بعد ہماری گفتگو کا رخ جون چاڈل کی طرف مڑ گیا۔ یقیناً جون چاڈل ہی تھا جس کے حصول کے لیے ہم پہلی بار گلگت پہنچے تھے اور دشوار گزار برف زاروں میں بھٹکے تھے۔ آج کئی حیران کن و خوں ریز واقعات کے بعد ہم اپنا یہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پچھلے برس نانگا پربت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والا خلاباز کوہ پیما جون چاڈل آج ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ اس دفینے کا ایک نہایت اہم سراغ تھا جس کے پیچھے بڑے بڑے مہم جو دربدر کی خاک چھان رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسٹر جی کلارک صاحب جیسے لوگوں نے بھی اس تلاش کو "فل ٹائم" جاب بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جون چاڈل کو بھی اس گفتگو میں شریک کر لیا گیا۔ جون چاڈل نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک کے ساتھ مدراس واپس جائے گا اور انہیں شکنتلا نامی اس عورت تک پہنچائے گا جس سے اسے نوادرات تحفے میں ملے تھے۔ اس نے صرف ایک معمولی سی شرط یہ رکھی کہ شکنتلا کے ساتھ اس کے دو روزہ تعلق کا راز کھولا نہیں جائے گا اور شکنتلا کے ساتھ کسی قسم کی سختی نہیں کی جائے گی۔ مسٹر جی کلارک نے یہ شرائط بلا تردد قبول کر لیں۔ جون چاڈل نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں مسز شکنتلا اور اس کا خاندان اپنی رہائش گاہ تبدیل کرنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اگر انہوں نے رہائش گاہ تبدیل کر لی ہے تو پھر اس سلسلے میں تھوڑی سی مشکل پیش آ سکتی ہے۔

مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک اس کامیابی پر بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ شاید جون چاڈل کی صورت میں انہیں اس دفینے کی جھلک نظر آ رہی تھی جو بے شمار آنکھوں میں سنہری خواب بن کر اترا ہوا تھا۔ مسٹر جی کلارک کی تحسین آمیز نظر بار بار میری طرف اٹھ رہی تھی۔ شاید وہ میری کوشش کا اعتراف کرنے کے لیے ایسے الفاظ تلاش کر رہے تھے جن سے ان کی بڑائی بھی متاثر نہ ہو اور مافی الضمیر بھی بیان ہو جائے۔

مجتبیٰ کنور بولا "شاہ جہاں! تم اور صفدر تیاری کر لو' ہم کل ہی یہاں سے اسلام آباد اور وہاں سے انڈیا روانہ ہو رہے ہیں۔ مسٹر جون چاڈل بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اب ہم اس سلسلے میں بالکل تاخیر نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "مجتبیٰ صاحب! مجھے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ شیخ عاصم شدید زخمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مسٹر اور مسز عاصم کو اس حالت میں چھوڑ کر نوادرات کے لیے انڈیا روانہ ہو جاؤں۔"

"ان کی طرف سے تم بالکل فکر مت کرو۔" مجتبیٰ نے مخصوص لہجے میں کہا "شیخ عاصم کو لاہور کے بہترین اسپتال میں ایڈمٹ کیا جا چکا ہے۔ اس کی وائف کے علاوہ دیگر احباب بھی اس کے پاس موجود ہیں۔ اب یہ ڈاکٹروں کا کام ہے۔ تمہارے وہاں جانے سے کوئی فرق پڑ سکتا تو میں فوراً تمہیں روانہ کر دیتا۔"

ایک بار پھر مجتبیٰ کنور کے لہجے میں اسی تحکم کی ہلکی سی جھلک نظر آئی جو مجھے ناگوار محسوس ہوتا تھا۔ میں نے کہا "میں بے حد معذرت چاہتا ہوں۔ اگر میرے لاہور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تو مدراس جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اور محترم کلارک صاحب ہر قسم کی صورت حال کو بہ آسانی کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اگر آپ میری نمائندگی ضروری سمجھتے ہیں تو صفدر کو ساتھ لے جائیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

مجتبیٰ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے پی جی کلارک صاحب بول پڑے "ٹھیک ہے شاہ جہاں! اگر تم پہلے لاہور جانا ضروری سمجھتے ہو تو چلے جاؤ۔ ہم مدراس میں تمہارا انتظار کریں گے۔ جونہی تم فرصت پاؤ وہاں آ جانا۔"

میں نے کلارک صاحب کی بات کا جواب اثبات میں دیا۔

اگر میں دل کی بات کہتا تو مجھے اس سارے معاملے سے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ ذاتی طور پر مجھے نوادرات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی بے تحاشہ مال و دولت کی خواہش رہی تھی۔ اس دھندے والے چکر میں تو مجھے حالات نے ملوث کیا تھا اور دھیرے دھیرے یوں جکڑا تھا جیسے کوئی اژدہا اپنے شکار کو جکڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی گھمن گھیری تھی جس نے میرے شب و روز کا سکون برباد کیا تھا اور بلاوجہ کیا تھا۔ بے شک موجودہ "حالات" میں دھندے کے حوالے سے امید کی روشن کرن نظر آرہی تھی لیکن میرے دل کا پنچھی پھڑپھڑا رہا تھا اور ایک ہی اڑان میں لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ غزالہ کا غم زدہ ملول چہرہ بار بار میری نگاہوں میں گھومتا تھا۔ شیخ عاصم کی تشویش ناک حالت بھی میرے تصور کو کچوکے لگانے لگی تھی۔

تین دن پہلے شیخ عاصم اور سروج کو "گلگت پہنچتے ہی" بذریعۂ ہوائی جہاز اسلام آباد روانہ کردیا گیا تھا۔ کلثوم ابھی تک گلگت میں ہی تھی۔ میں نے جب زریں گل کو یہ اطلاع دی کہ ہم ساہی صاحب کے ساتھ کل لاہور روانہ ہو رہے ہیں تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ صفدر کو میں نے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ نجیبی کنور اور جی کلارک صاحب کے ساتھ براہ راست انڈیا چلا جائے۔ میں سائیں عالی کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی خاص ترنگ میں تھا۔ ہوا میں ہاتھ نچا نچا کر اپنے جنات سے باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگا "تمہاری پی آئی اے سے میری پی آئی اے (پرستان انٹرنیشنل ائرلائنز) بہت بہتر ہے۔ وہاں پریاں انگور کی شراب پیش کرتی ہیں اور ویڈیو پر "خواتین جنوں" کے ریسلنگ مقابلے بھی دکھائے جاتے ہیں۔"

میرے بے حد اصرار کے باوجود سائیں عالی ہمارے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوا۔ اس کے جسم کے آبلے ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ اسے سوج کی بیماری کا حوالہ بھی دیا گیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہنے لگا "شفیع محمد! اگر مجھے زیادہ تنگ کرو گے تو میں تم سب پر ہیضے کے جراثیم چھوڑ دوں گا۔ میرے علاوہ کوئی دوسرا بھی لاہور نہیں جاسکے گا۔ ایک دفعہ یہی جراثیم میں نے پرستان کے ایک اپوزیشن رہنما اور اس کے چند ساتھیوں پر چھوڑے تھے۔ بہت برا حال ہوا تھا ان کا..... رفع حاجت کے لیے لوٹے بھر بھر کر انہوں نے بحرالکاہل کا آدھا پانی ختم کردیا تھا۔ وہ تو شکر جنات کو ان پر ترس آگیا اور اس نے انہیں مجھ سے معافی دلائی۔"

سائیں عالی جب ایسے واہی تباہی بولنے لگتا تھا تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ کسی صورت بات نہیں مانے گا۔

وہ رات ہم نے جیسے تیسے کاٹی۔ اگلے روز صبح سویرے بذریعۂ فوکر گلگت سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ زریں گل اور کلثوم ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ جہاز کی کھڑکیوں سے نیچے نظارے بے حد خوب صورت تھے۔ قراقرم کے برف پوش پہاڑ کے نوکی چوٹی تک دکھائی دے رہے تھے۔ زریں گل کی انگلی مسلسل حرکت کر رہی تھی اور کلثوم کو یہ نظارے دکھا رہی تھی۔ کلثوم کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی اور زریں گل کھڑکی کی طرف جھکا ہوا تھا۔ نظارے دکھانے کی کوشش میں وہ کلثوم پر لدسا گیا تھا۔ کلثوم شرما رہی تھی اور ساتھ ساتھ زریں کو کہنی سے پیچھے دھکیلنے کی غیر محسوس کوشش بھی کر رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا "ارے زریں گل! تو نظارے اسے دکھا رہا ہے یا خود نظارے لے رہا ہے؟"

"ک ک..... کیا مطلب ہے جناب۔"

میں نے کہا "سائیں عالی یہاں نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تو اس نامحرم کے ساتھ اتنا زیادہ فری ہوجائے۔ ذرا پیچھے ہٹ کے بیٹھ۔"

زریں پہلے تو کھسیانا ہوا پھر بتیسی نکال دی۔

ساہی صاحب بولے "زریں گل، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، تم کلثوم کے ساتھ ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے تنہا نہیں چھوڑ رہے۔"

وہ بولا "یہ بالکل دیہاتن ہے جی۔ ام کو ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں منہ اٹھا کر ادھر ادھر نہ نکل جائے۔"

ساہی صاحب بولے "لیکن یہ تو جہاز ہے، یہاں منہ اٹھا کر کدھر جائے گی۔"

"اس کا کیا پتا جی۔" زریں بولا "کیا معلوم غسل خانے کی طرف جائے اور جہاز سے باہر نکلنے والا دروازہ کھول کر اللہ کو پیاری ہوجائے۔"

"دروازہ کھولنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"خو جی جب قسمت خراب ہو تو اللہ تبارک تعالیٰ آسانیاں بھی پیدا کردیتا ہے۔ ایک مرتبہ ام لاہور میں تھا۔ ایک روز صبح سویرے امارا آنکھ پھڑکنے لگا۔ امارے دل میں یہ وہم پکا پکا بیٹھ گیا کہ آج ام کو امارے پیارے دادا کے بارے میں کوئی برا خبر خط کے ذریعے ملے گا اور ضرور ملے

گا..... اور پھر یہی ہوا۔ دوپہر کو ہمیں پشاور سے ایک خط ملا۔ خو جی اس میں لکھا تھا کہ امارا دادا حضور ایک سیاسی پارٹی کے جلسے میں گیا، وہاں اس نے اسٹیج پر جاکر چھوٹا سا تقریر فرمایا اور پھر اسٹیج سے نیچے آگیا..... یہ خط پڑھ کر ام بڑا حیران ہوا کہ اس میں تو پریشانی اور نقصان والا کوئی بات نہیں پھر امارے دل میں نقصان والا بات کیوں آرہا تھا۔ اگلے روز امارا سارا اطمینان ایک دم دور ہوگیا۔ امارا بھائی پشاور سے آیا اور اس نے بتایا کہ امارا دادا حضور شدید زخمی ہے..... دراصل لکھنے والے نے خط میں ٹھیک سے لکھا نہیں تھا۔ امارا دادا "اسٹیج" سے "نیچے نہیں آیا تھا" اسٹیج "کے" نیچے آیا تھا۔ وہ تقریر فرما کر اتر ہی رہا تھا کہ سارا اسٹیج دھڑام سے نیچے گر گیا تھا اور کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ امارا دادا بھی اسٹیج کے نیچے آگیا تھا۔ اس کی کنپٹی پر شدید چوٹ لگا تھا۔ آدھا کان کٹ کر نیچے لٹک گیا تھا۔ وہ بیچارہ تو وہ اخبار تک نہیں پڑھ سکا تھا۔"

"کان کی چوٹ سے اخبار کا کیا تعلق؟" ساہی صاحب نے پوچھا۔

"وہ عینک لگاتا تھا ناں۔ کان زخمی تھا تو عینک کہاں لگاتا..... بہرحال کہنے سے امارا مطلب یہ ہے جناب کہ جب مصیبت آنا ہوتا ہے تو آسانی بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اتنا پکا اسٹیج گر سکتا ہے تو اس جہاز کا دروازہ کیوں نہیں کھل سکتا۔ آپ برا نہ مانیں۔ یہ جہاز تو ام کو ویسے بھی پہلی جنگ عظیم سے پہلے کا لگتا ہے۔"

ساہی صاحب بے اختیار زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہو رہے تھے۔ کہنے لگے "اگر یہ اتنی معصوم لڑکی ہے تو تمہیں چاہیے تھا کہ اسے کسی اچھے جہاز میں لے کر آتے۔"

زریں گل کچھ سمجھے بغیر بولا "معصوم سی معصوم ہے جی۔ ادھر پہاڑوں میں بڑے مزے کا واقعہ ہوا۔ ایک دن ام صحن میں بیٹھے تھے۔ ایک مرنا صاحب اپنی مرغی....."

"خدا کے لیے زریں گل اب چھوڑ دے اس واقعے کی جان۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔

زریں گل کھسیا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

○☆○

منظر لاہور کے ایک پرائیویٹ کلینک کا تھا۔ یورپی معیار کا یہ کلینک گلبرگ کے علاقے میں واقع تھا۔ شیخ عاصم اسی کلینک میں زیرِ علاج تھے۔ میں تنہا یہاں پہنچا تھا۔ شیخ عاصم کے وی آئی پی روم کا نمبر مجھے معلوم تھا۔ ایسے صرف دو کمرے اس وسیع علاج گاہ میں موجود تھے۔ میں کمرے میں پہنچا تو ایک باوردی روم اٹینڈنٹ کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ شیخ عاصم ایک صاف ستھرے بیڈ پر سیدھا لیٹا تھا۔ اسے گلوکوز لگا ہوا تھا۔ غالباً کچھ دیر پہلے تک خون بھی ٹرانسفر ہو رہا تھا مگر اب "بلڈ بیگ" خالی تھا۔ شیخ عاصم گہری غنودگی میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسپتال کے ملازم سے پوچھا کہ انہیں کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا۔

وہ شائستہ لہجے میں بولا "ان کی مسز موجود ہیں۔ ابھی باہر نکلی ہیں۔ شاید فون کرنے گئی ہیں۔"

ذرا دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی اور خوشبو کے ایک خوش گوار جھونکے کے ساتھ غزالہ اندر آگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "آپ یہاں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"میں تو..... آپ کے بارے میں پوچھنے گئی تھی۔"

"کس سے؟"

"ابو سے۔ میں نے انہیں آج صبح سے کہہ رکھا ہے کہ وہ گلگت فون کریں اور پتا کریں کہ آپ لوگ گلگت پہنچے ہیں یا نہیں..... میں ابھی فون پر ابو سے یہی بات کرنے گئی تھی۔ میں..... میں بہت فکر مند تھی آپ کے لیے..... آپ سب کے لیے۔" آخری الفاظ اس نے عجلت میں ادا کیے تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ واقعی ان میں خوشی کی چمک تھی۔ یقیناً یہ خوشی اس فکر مندی کا ردِعمل تھی جو اب تک غزالہ کو لاحق رہی تھی۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "میں آپ کو اس دور دراز برف زار میں چھوڑ آئی تھی۔ وہاں بے شمار خطرات تھے پھر میں بے فکر کیسے رہ سکتی تھی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں آپ کے بارے میں نہ سوچتی۔"

مجھے لگا جیسے غزالہ کا ذہن دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ اپنے زخمی شوہر کے لیے پریشان ہے اور دوسرا میری مشکلات کے بارے میں سوچتا رہا ہے۔ کیا ایک ذہن دو حصوں میں تقسیم ہوسکتا ہے؟ یہ سوال بے اختیار میرے ذہن میں ابھرا۔

"اب عاصم کیسا ہے؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

وہ بولی "کل شام دو گھنٹے کا آپریشن ہوا تھا۔ گولی نکال دی گئی ہے لیکن شدید انفیکشن کے آثار موجود ہیں۔ ڈاکٹروں کے خیال میں ابھی دو تین روز انہیں سخت نگہداشت میں رکھنا ہوگا۔"

"دبئی میں اطلاع دے دی گئی ہے؟"

"نہیں۔ عاصم نے سختی سے منع کیا ہے۔ کہتے تھے کہ معمولی بات ہے' وہاں لوگ پریشان ہوں گے۔"

میں نے کہا "تم علاج سے مطمئن ہو؟"

غزالہ نے اثبات میں جواب دیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ غزالہ کی آنکھیں سرخ ہیں اور چہرے پر تکان کے آثار ہیں۔ کسی کے بتائے بغیر ہی میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ پچھلے چار پانچ روز سے مسلسل شوہر کے ساتھ رہی ہے اور رات دن اس کی تیمارداری کرتی رہی ہے۔ میں نے کہا "غزالہ تم خود ڈاکٹر ہو۔ تمہیں سمجھانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی طرف سے بے حد بے پروائی برت رہی ہو۔ تیمارداری میں اس حد سے نہیں گزرنا چاہیے کہ بندہ خود بیمار ہو جائے اور اسے تیمارداروں کی ضرورت پڑ جائے۔"

وہ بولی "میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ جہاں۔"

اس کی ڈبڈبائی ہوئی نگاہیں شوہر کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "تم ایک دن کے لیے گھر چلی جاؤ۔ تمہاری جگہ یہاں میں موجود رہوں گا۔"

"نہیں شاہ جہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کل ابو کو یہاں چھوڑ کر میں کچھ دیر کے لیے گھر چلی گئی تھی۔ ویسے بھی یہاں کوئی بے آرامی نہیں ہے۔"

"دیکھو غزالہ' ضد نہ کرو۔" میں نے تحکم سے کہا "تمہاری حالت میں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ مہینوں کی بیمار لگ رہی ہو۔ چلو گھر جاؤ اور کل تک آرام کرو۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں تم سے فون پر ڈسکس کر لوں گا۔"

میرے بے حد اصرار کے باوجود غزالہ شام تک شیخ عاصم کے پاس رہی۔ شام کو چچا جلیس آئے تو ہم دونوں نے کہہ سن کر اسے گھر بھیج دیا۔ میں نے چچا جلیس سے کہہ دیا کہ رات کو میں ہی عاصم کے پاس رہوں گا۔

رات کو دس بجے کے قریب ایک نوجوان ڈاکٹر آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مسز غزالہ کہاں ہیں۔ میں نے بتایا کہ وہ آج گھر چلی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بولے "ان تک ایک پیغام پہنچا دیجیے۔ انہوں نے میرے ذمے کام لگایا تھا کہ میں اسلام آباد فون کروں اور پتا چلاؤں کہ ایس ایس پی ساہی صاحب گلگت پہنچے ہیں یا نہیں۔ انہیں بتا دیجیے کہ ساہی صاحب کل دوپہر ہی گلگت پہنچ گئے تھے۔ وہ آج سہ پہر لاہور پہنچ چکے ہیں۔ جن شاہ جہاں صاحب کے بارے میں مسز غزالہ نے پوچھا تھا وہ بھی ساہی صاحب کے ساتھ ہی ہیں۔"

میں نے نوجوان ڈاکٹر کو نہیں بتایا کہ میں ہی شاہ جہاں ہوں۔ بس یہ یقین دہانی کرائی کہ میں اس کا پیغام غزالہ تک پہنچا دوں گا۔

اس واقعے کے قریباً ایک گھنٹے بعد ہی فون آ گیا۔ یہ غزالہ کی سہیلی ڈاکٹر کشور کا فون تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی لیکن وہ نہیں پہچان سکی۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟" ڈاکٹر کشور نے پوچھا۔

"میں جلیس صاحب کا دوست ہوں۔"

"اچھا انکل' آپ کو کچھ پتا ہے کہ ساہی صاحب واپس پہنچے ہیں یا نہیں؟"

"ہاں' وہ آج سہ پہر پہنچ گئے ہیں۔"

"ان کے ساتھ ایک شاہ جہاں صاحب بھی تھے۔"

"جی ہاں' وہ بھی پہنچ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اوہ' تھینکس گاڈ۔" ڈاکٹر کشور کی آواز آئی "غزالہ بڑی پریشان تھی اس بارے میں۔"

ان ہی کلمات کے بعد ڈاکٹر کشور نے فون بند کر دیا (یہ وہی ڈاکٹر تھی جو عالم قریشی کی کوٹھی میں میری دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔)

صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ غزالہ میری واپسی کے بارے میں واقعی بہت پریشان رہی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میری واپسی کے بارے میں اسے جلد از جلد کوئی اطلاع ملے۔ میرے دل میں عجیب سا درد جاگ گیا۔ وہی درد جو مجھے اکثر بے چین رکھتا تھا۔ غزالہ کو کھو کر بھی میں اس کی خواہش رکھتا تھا۔ میں شکست فاش کھا چکا تھا لیکن میرا دل ہار نہیں مانتا تھا۔ مجھے چند ماہ پہلے کی ایک رقت انگیز صورت حال یاد آ گئی۔ اس صورت حال کا تعلق عالم قریشی کے گھر سے تھا۔ میں جیل کوٹ سے واپس آیا تھا' جیل کوٹ میں یادوں کے سائے میں گزری ہوئی ایک رات نے میری کایا پلٹی تھی۔ مجھے وہ رات بڑی اچھی طرح یاد تھی۔ میں نے اس رات کی صبح فیصلہ کر لیا تھا کہ میں غزالہ کے سامنے اقرار محبت کر لوں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ میں اسے جذبے کی انتہائی شدت کے ساتھ چاہتا ہوں۔ بے شک وہ شادی شدہ ہے لیکن میری محبوب ہے۔ اس روز غزالہ عالم قریشی کے گھر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے تازہ گلابوں کا گلدستہ تیار کروایا تھا۔ اس گلدستے سے کہیں زیادہ حسین خوشبو میرے سینے میں مہک رہی تھی۔ وہ بات میری نوک زبان پر آنے والی تھی جیسے بے شمار موسموں اور رتوں کی تائید حاصل تھی لیکن عین موقع پر پتا چلا کہ غزالہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ شیخ عاصم بھی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کی رفاقت میں مسرور نظر

آ رہے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اب غزالہ کو ماضی کا قصہ سمجھوں گا۔ لیکن ایسی باتیں سوچنے سے کب ہوتی ہیں۔ اگر سوچنے سے ہوتیں تو لوگ جنگلوں کی خاک نہ چھانتے' دیوانے نہ کہلاتے' محبت کے نام پر موت کو گلے نہ لگاتے۔ بے شک اب میں کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا لیکن سینے میں دل تو وہی بدبخت تھا جو برسوں پہلے نگاہ کے تیر میں پرویا گیا تھا۔

اس رات پچھلے پہر شیخ عاصم نے آنکھ کھولی۔ وہ ڈاکٹر ابھی ابھی اسے دیکھ کر گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب مریض جاگے تو اسے دو کیپسول پلا دیے جائیں۔ میں نے شیخ عاصم کو دوا پلائی۔ وہ گہری سرخ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ وہ یک ٹک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا "تم یہاں شاہ جہاں؟" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہاں' میں تمہیں دیکھنے آیا تھا۔"

"غزالہ کہاں ہے؟"

"اسے میں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے گھر بھیج دیا ہے۔"

"وہ بہت پریشان تھی۔ میرے لیے بھی۔۔۔ اور تمہارے لیے بھی۔"

"میرے لیے تو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔"

"تھی شاہ جہاں۔۔۔۔ تھی۔۔۔۔" شیخ عاصم نے کراہتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا پھر بولا "شاہ جہاں! تم ایک خوش قسمت شخص ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر گہری غنودگی میں چلا گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ صبح قریباً چار بجے کھلی۔ میں جاگ رہا تھا اور اس کے بالکل قریب موجود تھا۔ ابھی ابھی ایک نرس اسے انجکشن دے کر گئی تھی۔ اس انجکشن کے بعد شیخ عاصم کی حالت قدرے بہتر نظر آنے لگی تھی۔ اس کی خوابیدہ آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ کھوئے کھوئے مدھم لہجے میں بولا "شاہ جہاں! میں غزالہ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہر قیمت پر۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی اور تمہاری دشمنی ختم کرنے پر بھی تیار ہوں۔۔۔ یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے شاہ جہاں۔۔۔ بہت بڑا فیصلہ۔۔۔ لیکن اس سلسلے میں تمہیں بھی کچھ تعاون کرنا ہو گا۔۔۔"

"کیسا تعاون؟" میں نے پوچھا۔

گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹ حرکت میں آئے "شاید۔۔۔ تم بھول گئے ہو۔ میں نے گلگت جانے سے پہلے تم سے ایک بات کہی تھی۔۔۔ اس بات پر غور کرنا۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس پر پھر غنودگی کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ اس کی بھاری پلکیں مزید بھاری ہوئیں اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

میرے سینے میں کوئی شے سلگنے لگی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شیخ عاصم مجھے کون سی بات یاد دلا رہا ہے۔ ایک ناگوار احساس رگ و پے میں پھیل گیا اور طبیعت سخت مکدر ہو گئی۔ شیخ عاصم شگفتہ کی بات کر رہا تھا۔ یہ بات اس نے گلگت جانے سے پہلے بھی کی تھی۔ مجھ سے کہا تھا کہ شیخ راشد بن راشد کے قتل سے شروع ہونے والی دشمنی ختم کرنے کے لیے ہم رشتے داری کے بندھن میں بندھ جائیں۔ میں اپنی بہن شگفتہ کا رشتہ عاصم کی فیملی میں ایک ایسے نوجوان سے کر دوں جو رشتے میں عاصم کا "بھتیجا" ہے۔

یہ تجویز میں نے فیصلہ کن انداز میں فوراً رد کر دی تھی۔ آج بھی یہ تجویز مجھے اتنی ہی بری لگی تھی جتنی گلگت جانے سے پہلے لگی تھی۔ شیخ عاصم ایک مریض کی حیثیت سے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میں ایک تیماردار کی حیثیت سے اس کے پاس موجود تھا۔۔۔ ورنہ شیخ کی بات کے جواب میں میرا ردعمل کافی سخت ہوتا۔

شیخ ایک بار پھر گہری نیند سو چکا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے آخر شب کی خاموشی میں گونج رہے تھے۔ میں نے اس کے چربی دار چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ گھنی کانٹے دار مونچھیں' چوڑے جبڑے' پھولے ہوئے گلے۔۔۔ اور ایک ایسی ٹھوڑی جسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ شیخ عاصم ارادے کا مضبوط اور سخت گیر شخص ہے۔ شیخ کی جلد شفاف تھی تاہم آنکھوں کے نیچے ہلکے سیاہ دائرے موجود تھے۔ یقیناً یہ کثرت شراب نوشی اور عیاشی کی نشانیاں تھیں۔ میں جانتا تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ عاصم ایک عیاش شخص ہے اور بے شمار عورتوں کے ساتھ اس کے تعلقات رہے ہیں۔ کئی ماڈل گرلز اور اداکارائیں ڈیکوریشن پیس کی طرح اس کی خواب گاہ میں سجی تھیں اور کئی دوشیزائیں اس کے حرم کی زینت بن کر اس کی راتیں مہکاتی رہی تھیں اور یہ مصروفیات ایسی نہیں تھیں کہ یکلخت ختم ہو جاتیں۔ کسی نہ کسی طور یہ عشرتیں اب بھی جاری تھیں۔ عاصم میرے سامنے بستر پر لیٹا تھا اور وہ تمام کالی راتیں جو وہ گزار چکا تھا اور گزار رہا تھا ان کا سایہ اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔

ناپسندیدگی کی ایک لہر میرے سینے سے اٹھی اور میں نے عاصم کے چہرے سے نگاہ ہٹا لی۔ کمرے کھڑے ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی

دیر کے لیے آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ میری نگاہ غزالہ پر پڑی' وہ عاصم پر جھکی ہوئی تھی اور بڑی محبت سے اسے سُوپ پلا رہی تھی۔ میں اپنی جگہ بے حرکت لیٹا رہا اور نیم وا آنکھوں سے غزالہ کی مصروفیات دیکھتا رہا۔ شیخ عاصم کو سُوپ پلا کر اس نے نیپکن سے اس کی گھنی مونچھیں صاف کیں پھر اسے کلی کرانے لگی۔ شیخ عاصم کلی کر چکا تو غزالہ نے گیلے تولیے سے اس کا منہ صاف کیا' ہاتھ صاف کیے پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد اس کی پائینتی بیٹھ گئی اور اس کے پاؤں دبانے لگی۔ شیخ عاصم کی حالت اب بہتر تھی۔ اس نے ایک کروٹ دراز کار لی۔۔ اور بڑی طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ اس گھڑی وہ ایک ایسے موٹے تازے جنگلی بلے کے مانند نظر آ رہا تھا جو سڑک پار کرتے ہوئے تیز رفتار گاڑی کی زد سے بال بال بچ نکلا ہو اور اب ٹانگیں پسار کر دھوپ سینک رہا ہو۔

میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے دیکھ کر غزالہ چونک گئی "صبح بخیر" اس نے کہا۔

"صبح بخیر۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر مزید آرام کر لیتے۔"

"آرام کی ضرورت تو تمھیں تھی لیکن تم صبح سویرے آ گئیں۔"

"میں ناشتا لائی تھی۔ آپ کا ناشتا میں تیار کر کے گھر چھوڑ آئی ہوں۔ خانساماں سے کہیے گا' وہ گرم کر دے گا۔"

"گھر؟ کون سے گھر؟"

"اپنے گھر۔۔۔ ڈیفنس میں۔ دوپہر کو آپ کا دوست عالم قریشی بھی یہیں آ جائے گا پھر آپ پروگرام بنا لیجیے گا کہ آپ نے کہاں رہنا ہے۔ میرے خیال میں انکل ساہی کے ساتھ تو آپ رہ نہیں سکتے۔ عالم قریشی کے گھر میں بھی خطرات موجود رہیں گے۔ نوادرات کا کھوج لگانے والے بڑی شدت سے آپ کو اور صفدر کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں زریں گل کو بھی سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ویسے زریں گل ہے کہاں؟"

"میں نے اسے اسٹیشن کے قریب ایک غیر معروف ہوٹل میں ٹھہرا رکھا ہے۔"

"سنا ہے اس کی بیوی بھی ساتھ ہے؟"

"بیوی تو نہیں ہے' ہاں مستقبل کی بیوی کہہ سکتے ہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں شیخ عاصم کے گھر جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ غزالہ نے عالم قریشی کو ریں کا نام دے رکھا تھا۔ میں نے عالم قریشی سے فون پر رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ غزالہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ عالم قریشی فی الحال شہر سے باہر ہے۔

غزالہ ایک 'تاریک شیشوں والی کار' پر اسپتال آئی تھی۔ اسی کار پر میں ڈیفنس میں واقع شیخ عاصم کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ یہ وہی کوٹھی تھی جس پر عبدالجبار کے نام کی پلیٹ لگی رہتی تھی۔ کوٹھی تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا۔۔۔ میں شیخ عاصم پر قابو پانا چاہتا تھا اور ایک رات رازداری سے کوٹھی میں داخل ہو گیا تھا لیکن عین موقع پر شیخ عاصم کے گارڈز خبردار ہو گئے تھے اور مجھے افراتفری میں کوٹھی سے نکلنا پڑا تھا۔ بہرحال آج صورت حال مختلف تھی۔ میں مین گیٹ کے راستے کوٹھی میں داخل ہوا۔ عاصم کے پرائیویٹ سیکریٹری نے مجھے خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ غزالہ کے ہاتھ کا بنا ہوا پرتکلف ناشتا میرے سامنے آیا لیکن نجانے کیوں میری بھوک مری گئی تھی۔ یہ غزالہ کے ہاتھ کا نہیں مسز عاصم کے ہاتھ کا ناشتا تھا اور یہ ناشتا میرے چھوٹے سے آشیانے میں نہیں شیخ عاصم کے وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں رکھا تھا۔ میں نے بے دلی سے چند لقمے لیے۔ یہاں کی ہر شے میں مجھے شیخ عاصم اور غزالہ کا پرتو نظر آتا تھا۔ ان در و دیوار میں ان دونوں کی سرگوشیاں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان کی ہنسی میری سماعت سے ٹکراتی تھی۔

میں عقبی باغ میں چلا آیا اور چہل قدمی کرنے لگا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے میں سورج اور سائیں عالی کے بارے میں سوچنے لگا۔ سائیں عالی کا تو کوئی پتا نہیں تھا' سورج کو ساہی صاحب نے لاہور پہنچتے ہی ایک جدید نفسیاتی اسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔ وہاں شب و روز اس کی نگہداشت کی جا رہی تھی۔ سورج کا خیال آیا تو خیالات کا ایک لشکر ذہن پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ ناقابل یقین واقعات یاد آ گئے جو قراقرم کے گمنام پہاڑوں میں ہم پر گزرے تھے اور جن کے اثرات ہمارے لہو میں رچے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ مجھے لگا' قراقرم کے ویرانوں کا وہ سنہری عقاب سیکڑوں میل کا فاصلہ لمحوں میں طے کر کے یہاں ڈیفنس کالونی پہنچ گیا ہے اور کسی درخت کی شاخ پر بیٹھا اپنی جگر پاش نگاہوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ سانوس کی جادوئی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی "تمہاری تہذیب کی جڑیں کھوکھلی ہیں شاہا۔ تمہارے معیار جھوٹے ہیں۔"

میرا ذہن ایک بار پھر شیخ عاصم اور غزالہ کی طرف منعطف ہونے لگا۔ کیا ہمارے معیار جھوٹے تھے؟ شاید

ہمارے معیار جھوٹے نہیں تھے لیکن کچھ جھوٹے لوگوں کی وجہ سے یہ معیار "بے وقار" ہو جاتے تھے۔ جیسے۔۔۔ جیسے یہ عاصم تھا۔ عاصم ایک سچا اور کھرا شوہر ہوتا تو شاید میرے دل میں اس کے خلاف اتنی شدید رقابت پیدا نہ ہوتی۔۔۔ میرا دل بار بار گواہی دیتا تھا کہ شیخ عاصم وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا تھا کہ غزالہ آنکھیں بند کر کے اس پر اپنی محبت نچھاور کر رہی ہے اور شوہر پرستی میں ہر حد سے گزری ہوئی نظر آتی ہے تو میرے سینے میں کچھ سلگنے لگتا تھا۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔

میں عالم قریشی کا انتظار کر رہا تھا اور وقت گزارے نہیں گزر رہا تھا۔ میں کمروں میں ٹہلنے لگا۔ اسٹڈی روم میں بہت سا میڈیکل بکس ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ غالباً غزالہ ہی انہیں دیکھتی رہی تھی۔ یہیں ایک شیلف میں مجھے ایک البم پڑا دکھائی دیا۔ شاید غزالہ بے خیالی میں ادھر چھوڑ گئی تھی۔ میں البم دیکھنے لگا۔ اس میں صرف غزالہ اور عاصم کی تصویریں تھیں۔ سب سے پہلی تصویر ہی میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ عاصم صوفے پر بیٹھا تھا۔ غزالہ بے تکلفی سے قالین پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنی ٹھوڑی عاصم کے گھٹنے پر ٹکا رکھی تھی۔ میں نے دل میں سوچا' نجانے ایسی کتنی زرخرید کنیزیں عاصم کے قدموں میں بیٹھ چکی ہیں۔ اندر کی تصویریں بھی میرے لیے آنکھوں کا عذاب ثابت ہوئیں۔ ان میں سے کچھ تصویریں ان کے ہنی مون کی بھی تھیں اور ان میں سری لنکا اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ کچھ تصویریں انڈیا اور کچھ کراچی کی تھیں۔ ہر تصویر میں عاصم چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ غزالہ اس کے لیے ایک معمول کی طرح تھی جسے وہ اپنی مرضی سے اٹھاتا بٹھاتا اور چلاتا تھا۔ غزالہ کا کیسی سی طاوتری کا سا انداز تھا جو مجھے "ہانٹ" کرتا تھا۔ میں نے البم ایک طرف پھینک دیا اور اسٹڈی روم میں ٹہلنے لگا۔ عاصم کی صورت بار بار میرے تصور میں آتی تھی اور دماغ میں چنگاریاں سی بھر جاتی تھیں۔ وہ دوستی کی بات کر رہا تھا لیکن یہ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی (دل میں اترنا تو دور کی بات ہے۔) کبھی کبھی اس کے چہرے میں مجھے ایک بے رحم ایسے درندے کا چہرہ نظر آتا تھا جس نے شکار پر جھپٹنے کے لیے گھات لگا رکھی ہو اور شکار کون تھا؟ شاید۔۔۔ میری بہن شفقت تھی۔ وہ معصوم کلی جو ہوا کے لمس سے لرز جاتی تھی اور ناقابل جس کے چہرے کو میلا کرتی تھی۔ میں نے ماں بن کر اس کی سرگوشیاں سنی تھیں' بھائی بن کر اس کے ساتھ کھیلا تھا اور باپ بن کر اس کی پرورش کی تھی۔ وہ میری زندگی کا محور تھی اور اس کی زندگی مجھ سے شروع ہو کر مجھ پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ وہ ایک معصوم روح تھی۔ آسمان پر خدا کو جانتی تھی اور روئے زمین پر اپنے بھائی جان کو۔ اگر بھائی جان کے ہوتے ہوئے کوئی درندہ اس پر شب خون مارتا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو روئے زمین پر اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ آج رات اسپتال جاؤں اور شیخ عاصم کو شوٹ کر دوں۔ رسٹ واچ والی پابندی بھی موجود نہیں ہے' اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور وہ خطرہ ہمیشہ کے لیے مٹا دوں جو تلوار کی طرح میری شفقت کے سر پر لٹک رہا ہے۔۔۔ پھر فوراً ایک سوال میرے ذہن میں ابھرا۔ کیا غزالہ مجھے اپنے شوہر کے قتل پر معاف کر دے گی۔ وہ شوہر جسے وہ دل و جان سے اپنی زندگی مانتی ہے۔ نہیں وہ ایسا ہرگز نہ کر سکے گی۔ وہ زندگی بھر اپنی نگاہوں سے میرے منہ پر تھوکتی رہے گی۔ میں غزالہ کی محبت ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا اور اس کی بدترین نفرت کا مستحق ٹھہر جاؤں گا۔۔۔ کیا یہ عظیم نقصان میں برداشت کر سکوں گا؟ اس سوال کا جواب بھی نفی میں تھا۔ اس گھڑی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غزالہ ایک نادان بچی ہے۔ وہ ایک بے رحم بردہ فروش کی انگلی پکڑے بازار جا رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ اسے بردہ فروش سے جدا کروں اور کہیں دور لے جاؤں۔ دور کسی دوسرے شہر' کسی دوسرے ملک جہاں شیخ عاصم کی ہوا بھی اسے نہ چھو سکے۔ کوئی ایسی بلند چار دیواری ہو جہاں غزالہ صرف میری ہو اور میں صرف اس کا' جہاں غزالہ کے ہاتھ سے بنا ہوا ناشتا صرف میرے لیے ہو۔ جہاں اسٹڈی کے شیلف میں رکھے البم پر صرف میری اور اس کی تصویریں ہوں۔ شیخ عاصم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ برسوں ہمارے تعاقب میں بھٹکتا رہے لیکن ہم تک نہ پہنچ سکے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا میں ایسا کر کے غزالہ کے ساتھ ساتھ شفقت کو بھی عاصم کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہوں؟ یہ سوال بڑی تیزی سے میرے ذہن میں ابھرے۔ ان کا جواب میرے سینے میں پھٹتے ہوئے رعزکن کے گولے تھے۔ میری سوچوں میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری پیشانی پر پسینہ حرکت کر رہا ہے۔ ان لمحوں میں میرے تصور میں اپنے اور غزالہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ذہن میں ہل چل مچی ہوئی تھی۔ یہ سوچ ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بار بار ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھی کہ میں غزالہ کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤں۔ بہت دور جہاں میرے اور اس کے سوا کوئی نہ ہو۔ اس سنسنی خیز سوچ کے دباؤ سے میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شدید ذہنی دباؤ کے لمحات میں کسی پیارے سے ملاقات ہو جاتی ہے اور انسان کو ایک تکلیف دہ صورت حال سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز ڈرائنگ روم کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ بھاری بھرکم آواز میرے پنجابی دوست عالم قریشی کی تھی۔ وہ عاصم کے سیکرٹری سے باتیں کرتا ہوا ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو عالم قریشی دونوں بازو پھیلا کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی گرفت بڑی سخت تھی۔ خاص طور سے پیٹ تو لوہے کی طرح سخت تھا۔

"شاہ جہاں یار! تم نے تو میری تو می جان نکال لی تھی۔ تمہیں پتا نہیں یہ دن میں نے کیسے گزارے ہیں۔ ہر صبح امید بندھتی تھی' ہر شام ٹوٹ جاتی تھی۔ ایسے ایسے برے خیال دل میں آتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ کبھی تو دل چاہتا تھا کہ میں خود بھی گلگت پہنچ جاؤں اور لنگوٹا کس کے پہاڑوں میں گھومنا شروع کر دوں۔"

میں نے اس کا لال لال چہرہ دیکھتے ہوئے کہا "واقعی فکر مند تو تم کافی رہے ہو' رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے۔ ویسے بھی دبلے ہو گئے ہو۔"

وہ میرا طنز سمجھ کر بولا "یار! تم میرے موٹاپے پر نہ جاؤ۔ اندر کچھ بھی نہیں۔ بس پھوک ہی پھوک ہے۔ طاقت چربی میں نہیں ہوتی گوشت میں ہوتی ہے اور گوشت کہاں ہے میرے اوپر۔۔۔ اور آئے بھی کہاں سے گوشت؟ معدہ تو کام نہیں کرتا۔ گئے دنوں میں پورا پورا بکرا کھا جایا کرتا تھا' ذرا گرانی نہیں ہوتی تھی' اب ڈھائی تین کلو گوشت کھا لو تو لگتا ہے کہ ایک من کا وٹا رکھ لیا ہے معدے میں۔ پچھلے ہفتے تمہاری چھوٹی بھابی نے رات کو تھوڑی سی ربڑی کھلا دی' مشکل سے ڈھائی تین پاؤ ہو گی۔ ساری رات یہ ربڑی گلے میں اٹکی رہی۔ صبح تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔۔۔ کبھی تمہارے بارے میں' کبھی تمہاری واپسی کے بارے میں۔ سچ کہتا ہوں' ایک پل چین نہ آیا۔"

"اب کہاں گئے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"سب بتاتا ہوں۔ پہلے تم بتاؤ کہ خیریت سے ہو؟ کہاں رہے؟ کیسے واپس آئے؟ خدا کی قسم ایک سو ایک سوال رہے ہیں میرے دماغ میں۔"

میں نے کہا "تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں بالکل خیریت سے ہوں' باقی ایک سو سوالوں کے جواب کافی لمبے ہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔ فی الحال میرے سوال کا جواب دو۔"

عالم قریشی میرے قریب ہی صوفے پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ بولا "ہم کہو گے' پھر کھانے کی باتیں شروع کر دی۔ دراصل گوجرانوالہ گیا تھا میں۔"

"گوجرانوالہ گئے ہو گے تو پھر چڑے کھانے ہو گے۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تم نے۔ وہاں راجا پہلوان کے چڑے بڑے مشہور ہیں۔ میں پچھلے اتوار پنڈی سے ہوتے ہوئے کچھ چڑے لے آیا تھا۔ سوچا تھا تمہاری چھوٹی بھابی سے کہوں گا کہ پکا دے۔ لاہور آیا تو پتا چلا کہ وہ اپنے کوٹ لکھپت گئی ہوئی ہے۔ بیبڑی قسمت! میں نے ... سے کہہ دیا۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلنے والی عورت ہے۔ میں نے سوچا نرا چڑے کا سالن ہوا تو شاید پورا نہ آئے گا۔ بندی نے ایک سیر چڑوں میں تین سیر گونگلو ڈال دیے۔ سمجھتے ہو نا تم؟ شلجم۔۔۔ اب یار! ذرا بتاؤ تم۔۔۔ چڑوں اور گونگلوؤں کا کوئی میل ہے۔ گونگلو تو ایسی شے ہے کہ جس میں بھی ڈالو اسے بھی گونگلو بنا دیتی ہے۔ اب چڑے کی تو ایک شخصیت ہوتی ہے' اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ چڑے بٹیرے کا تو ذائقہ ہی تب آتا ہے' جب اسے کالی مرچ مسالے کے ساتھ روسٹ کیا جائے۔ پلیٹ میں آئے تو ایسے لگے جیسے انگ انگ لشکارے مار رہا ہے۔ ساتھ ہی کوئی گورے گورے ہاتھوں سے ٹماٹو کیچپ ڈال دے اور روغنی نان رکھ دے تو سونے پر سہاگا۔۔۔ چڑے گونگلو کا سالن دیکھ کر میرا جو حال ہوا' تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ چھڈو اتنی سخت بے حرمتی پر "بڑی" کو میں نے گھر سے نہیں نکال دیا۔ کل میں اسپیشل طور پر صرف چڑے کھانے گوجرانوالہ گیا تھا۔ رات کو دیر ہو گئی' سوچا صبح تک پنڈی رہ دی اور چڑے کھا کے جاؤں گا۔ صبح سیدھا شو روم پر آیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ تم میرا انتظار کر رہے ہو۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر یہاں بھاگ آیا۔"

عالم قریشی نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

عالم قریشی کے آنے سے پہلے میں شدید ذہنی انتشار کا شکار تھا مگر اس کی طوفانی باتوں میں بہت سی پریشانیاں دب گئیں۔ میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگا۔ عالم قریشی

تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا "چل بھئی شاہ جہاں! اب ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر کھڑا ہو جا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کے گھوڑے' تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔ میرے گھر۔ یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تو ہوٹل میں ٹھہرے یا کسی اور کے گھر میں رہے۔ یا تو شرافت سے سیدھا جیل چلا جا جو تیرا اصل ٹھکانا ہے یا پھر میرے گھر چل۔"

میں نے کہا "یار! لیکن تجھے پتا ہے کہ حالات میرے لیے زیادہ ٹھیک نہیں ہیں۔ عیسیٰ جان کے قتل کے بعد بہت سے لوگ مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں پھر خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پاگل کتے ہیں جو ہر جگہ دفینے کی بو سونگھ رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کو پتا ہے کہ تو میرا ایک معقول یار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تیرے گھر کی نگرانی ہو رہی ہو گی اور کوئی پتا نہیں کہ تیری بھی نگرانی ہو رہی ہو۔"

عالم قریشی بولا "مجھے لگتا ہے کہ میرے معدے کی طرح تیرا دماغ بھی کام نہیں کر رہا۔ میں بچہ تھوڑا نہیں ہوں کہ اپنی نگرانی یا تعاقب شعاقب سے خبردار نہ ہو سکوں۔ تیرے جانے کے بعد مہینہ ڈیڑھ مہینہ تک یہ کام ہوا تھا' اس کے بعد کسی نے ایسی حرکت نہیں کی۔"

"پھر بھی قریشی! میں تیرے گھر جا کر اپنے ساتھ ساتھ تجھے بھی مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔" میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

عالم قریشی کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر بولا "اگر میرے گھر میں تم محفوظ نہیں ہو تو کیا یہاں محفوظ ہو؟"

"تمہارے گھر سے زیادہ محفوظ ہوں۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے کہ یہ شیخ عاصم کی کوٹھی ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر غزالہ یہاں آتی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا بھی پیچھا کیا جاتا ہو۔"

"تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں یہیں رہوں گا۔ میں تو صرف تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اگر تم کوئی انتظام کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں خود کچھ سوچ لیتا ہوں۔"

"جی چاہتا ہے چپیڑ ماروں تیرے منہ پر۔" عالم قریشی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا "اوئے میرے ہوتے ہوئے تو خود انتظام کرے گا۔ اللہ کی قسم پورا انٹرکانٹی نینٹل بک کرا سکتا ہوں تیرے لیے۔۔۔ لیکن نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ دندناتا ہوا ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

کچھ دیر فون پر باتیں کرتا رہا پھر پھنکار کر بولا "چلو اٹھاؤ اپنا بھگ بھوسڑا اور آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"جہاں بھی میں لے چلوں۔"

"میرا بھگ بھوسڑا (سامان) کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہا اور عالم قریشی کے ساتھ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

عالم قریشی مجھے لے کر باہر نکلا۔ یہاں اس کی نہایت شان دار مرسیڈیز گاڑی کے بجائے رنگین شیشوں والی ایک سوزوکی کار موجود تھی۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے اور لاہور کی بھری پری سڑکوں سے گزرنے لگے۔ سہ پہر ہونے والی تھی۔ اسکولوں اور دفاتر کے دروازے کھل چکے تھے۔ جو لوگ علی الصباح ان دروازوں کے پیچھے بند ہوئے تھے وہ اب آزاد تھے اور واپس گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر تھکن تھی لیکن گھر واپس پہنچنے کی امید نے اس تھکن کو ڈھانپ لیا تھا۔ میرے چہرے پر یقیناً طویل مسافتوں کی تھکن تھی لیکن اس تھکن کو ڈھانپنے کے لیے کوئی امید موجود نہیں تھی اور نہ میرا گھر تھا۔ میں عالم قریشی کے پہلو میں خاموشی سے بیٹھا رہا اور لاہور کی رونقیں دیکھتا رہا۔ یہ رونقیں شروع سے مجھے پسند تھیں۔ میں ان میں کھو سا جاتا تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ عالم قریشی گلبرگ کی طرف جا رہا ہے بلکہ مین مارکیٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اسی مین مارکیٹ جس سے کچھ فاصلے پر اس کی عالیشان کوٹھی موجود تھی۔

"اوئے یہ کیا کر رہے ہو۔" میں نے ہینڈ بریک کی طرف ہاتھ بڑھایا "کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"خاموش رہ' تو اغوا ہو چکا ہے اور اغوا شدہ بولتے نہیں۔" اس نے ڈانٹا پھر ذرا توقف سے بولا "میرے جگر کے ٹکڑے! ذرا تسلی سے سانس لے۔ تجھے کہا ہے نا کہ میری وجہ سے تو مصیبت میں نہیں پڑے گا۔"

"میں نہیں پڑوں گا لیکن تو پڑے گا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تیرے گھر نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں لے کے جاؤں گا تجھے اپنے گھر۔"

"پکّا۔"

"یار تو تو ایسے ڈر رہا ہے جیسے کوئی کنواری لڑکی ہو۔ حالانکہ نہ تو لڑکی ہے اور نہ ہی کنواری۔"

عالم قریشی نے گاڑی اپنی کوٹھی کی عقبی سڑک پر ڈال دی۔ عالم قریشی کی کوٹھی ٹو سائیڈ اوپن تھی یعنی دونوں طرف سڑک لگتی تھی۔ عالم قریشی نے مجھے عقبی طرف اپنے پڑوسیوں کے مکان کے سامنے اتار دیا پھر ایک چابی میری

طرف بڑھاتے ہوئے بولا "یار دروازہ کھول کر اندر چلا جا۔ آج کل یہ خالی پڑی ہے۔ اس کے والی وارث ایک شادی کے چاول کھانے امریکا گئے ہوئے ہیں۔ یہ دوسری چابی بڑے والے بیڈ روم کی ہے۔ دروازہ کھول کر آرام کر۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تجھے ٹیلی فون کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اگر ہو سکے تو کہیں سے ریڈی میڈ میک اپ کا سامان بھی لے آؤ۔" اس سلسلے میں میں نے عالم قریشی کو ضروری ہدایات بھی دیں۔

یہ کوٹھی بھی عالم قریشی کی کوٹھی کی طرح وسیع و عریض اور رچی سجائی تھی۔ تمام کمرے مقفل تھے۔ میں نے ایک بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ دو تین ہفتوں سے کوٹھی کی صفائی نہیں ہوئی تھی لیکن کمرے چونکہ "ہوا" بند تھے لہٰذا اندر گرد و غبار جمع نہیں ہوا تھا۔ میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ قریب ہی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسپتال کا نمبر ملایا۔ حسب توقع میری کال کا جواب غزالہ نے ہی دیا۔

"ہیلو، میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔ عاصم کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"کافی بہتر ہے۔ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

"میرے خیال میں فون پر بتانا مناسب نہیں۔ بہرحال جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔"

غزالہ بولی "عاصم آپ کا پوچھ رہے تھے۔ رات کو ایک چکر یہاں کا لگا جائیں۔"

میں نے کہا "کافی مشکل ہے۔ میں نے عالم قریشی سے کہا ہے کہ وہ کہیں سے ریڈی میڈ میک اپ کا سامان لائے۔ اصل حلئے میں میرا باہر گھومنا پھرنا خطرناک ثابت ہوگا۔"

"آپ کے دوست کے پاس رنگین شیشوں والی گاڑی بھی ہے۔ اس میں سفر کر سکتے ہیں آپ یا پھر میں اسٹیشن ویگن بھجوا دوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ کل صبح تمہاری طرف آؤں۔"

وہ بولی "اگر آپ اپنا ٹھکانا نہیں بتا سکتے تو کم از کم فون نمبر تو دے دیں۔"

میں نے فون نمبر دے دیا۔

چند رسمی باتوں کے بعد گفتگو ختم ہو گئی۔ ریڈی میڈ میک اپ کی بات تو میں نے یونہی کہہ دی تھی در حقیقت میں بار بار شیخ عاصم کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بے شک اس نے میری جان بچائی تھی اور میری طرف آنے والی گولی اپنے جسم پر لی تھی مگر پتا نہیں کیوں، شیخ عاصم کی طرف دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک لاوا سا کھولنے لگتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اندر سے ایک آواز ابھرتی تھی جو مجھے بے حد محتاط رہنے کی تلقین کرتی تھی۔

شام ہوتے ہی عالم قریشی بڑی رازداری سے میرے پاس آ گیا۔ نہ اطلاعی گھنٹی بجی نہ کوئی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عالم قریشی بیڈ روم کے دروازے پر کھڑا تھا "اوئے قریشی! تو کہاں سے گھس آیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "جس طرح دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اسی طرح اچھے پڑوسی کو بھی اچھے پڑوسی کی طرف راہ ہوتی ہے۔ دونوں گھروں کے درمیان جو دیوار ہے وہ سمنٹ کوارٹر کے پیچھے صرف چار فٹ اونچی ہے۔ میرے جیسا کوئی ہٹا کٹا بندہ بھی با آسانی سے پھلانگ سکتا ہے۔"

عالم قریشی کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے شاپنگ بیگ تھے۔ ایک میں روسٹ چرغے اور نان تھے، دوسرے میں گوال منڈی کی مچھلی اور رس ملائی وغیرہ تھی۔ پورے پانچ روپے کی وہ آئس کریم ہی لے آیا تھا۔ اس کے کام ایسے ہی شاہانہ ہوتے تھے۔ پیسہ اتنا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں خرچ کرے۔ اس نے بڑے اہتمام سے مجھے ڈنر کرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دنیا جہان کی باتیں بھی کرتا رہا۔ وہ گفتگو کا رخ میرے سفر کی طرف لے آیا۔ وہ میرے سفر کو سندباد کا پانچواں سفر قرار دے رہا تھا اور اس سفر کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اسے وہ تمام اہم باتیں بتا دیں جن کے بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ہماری گفتگو رات بارہ بجے تک جاری رہی۔ وادی میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات نے عالم قریشی کو تحیر کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا۔ خاص طور پر سوراج کی آسیب زدہ حالت کے بارے میں سن کر وہ دنگ رہ گیا۔

اگلے روز صبح سویرے غزالہ کا فون آ گیا۔ وہ چھوٹتے ہی بولی "عاصم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کل دوپہر سے کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔ پلیز آپ ایک بار آ کر مل لیں۔"

میں نے کہا "لیکن میں کیا کروں گا آ کر۔ اللہ کا شکر ہے اب اس کی طبیعت بہتر ہے۔ اگر میرے آنے سے۔۔۔"

"پلیز شاہ جہاں۔" غزالہ نے میری بات کاٹی "آپ نہ آنے پر اصرار کیوں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اتنی چاہت سے آپ کو بلا رہے ہیں تو کیا حرج ہے آنے میں؟"

غزالہ کے لہجے میں ہلکی سی ناراضگی بھی تھی۔ شاید یہ ناراضگی درست ہی تھی۔ شیخ عاصم میری وجہ سے زخمی ہوا تھا۔ زبانی کلامی ہی سہی لیکن مجھے اس کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے تھا۔

میں نے غزالہ سے کہا "ٹھیک ہے، میں آج کسی وقت ...نے کی کوشش کروں گا۔"

عالم قریشی بڑا چٹا پٹا نکلا۔ پیسے کے زور پر وہ ہر کام ...نوں میں کر گزرتا تھا۔ اس نے میرے لیے ریڈی میڈ میک ...ب کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ بڑی نفیس قسم کی مونچھیں تھیں۔ ...تھوں کی بناوٹ تبدیل کرنے والا جیلی نما لوشن، بالوں کی ...نگت تبدیل کرنے والا محلول اور اسی قسم کی کئی اشیا۔ ...رحال ابھی ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ میں عالم قریشی ...ی تاریک شیشوں والی سوزوکی کار اسپتال جانے کے لیے ...تعمال کر سکتا تھا۔

شام کے وقت غزالہ کا ایک فون اور آ گیا۔ یہ فون سننے ...ے تھوڑی ہی دیر بعد میں اسپتال پہنچا۔ شیخ عاصم تکیے کے ...ہارے بیٹھا تھا۔ بڑی خوش اخلاقی سے ملا۔ وہ بہت بدلا ہوا ...ر آتا تھا۔ غزالہ اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ ...الہ التجائیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ ...ریا بہ زبانِ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں رسم دنیا ...اتے ہوئے شیخ عاصم کا شکریہ ضرور ادا کروں۔ میں ان ...ہوں کی درخواست کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ میں نے شیخ عاصم ...ے کہا "مجھے افسوس ہے شیخ عاصم! کہ میری وجہ سے تمہیں ...زخم لگا۔ میں تمہارے لیے دل میں احسان مندی کے ...ات محسوس کرتا ہوں۔"

شیخ عاصم کے چہرے پر چمک آ گئی "شاہ جہاں! تمہارے ...جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔ میری وجہ سے تمہیں ...ند کو پہنچے ہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ زخم تو بہت معمولی ...ے۔"

...ولنے کی وجہ سے شاید اسے تکلیف ہو رہی تھی، اس ...چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔

غزالہ بولی "آپ زیادہ بات مت کریں۔ ڈاکٹر صاحب ...منع کر رکھا ہے۔"

وہ مسکرایا "تمہارے بس میں ہو غزالو تو تم مجھے سانس ...سے بھی روک دو۔ بہت زیادہ احتیاط بھی مریض کے لیے ...ب ہوتی ہے اور پھر ہم کوئی نئے نئے مریض تھوڑے ہی ...ایک سال سے مسلسل مرضِ عشق میں مبتلا ہیں۔" اس ...ن انکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ غزالہ کے چہرے ...م کا رنگ لہرا گیا۔

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ شیخ عاصم نے غزالہ کو غزالو ...ر کا طب کیا تھا۔ یہی وہ خطاب تھا جو میں نے بڑے پیار ...زالہ کو دیا تھا۔ آج حالات نے یہ لفظ مجھ سے چھین کر

شیخ عاصم کے ہونٹوں پر سجا دیا تھا۔

شیخ عاصم میرے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ میں رات کا کھانا اس کے ساتھ کھا کر جاؤں لیکن میں کل آنے کا وعدہ کرکے واپس آگیا۔

اگلا دن بہت چمکیلا اور خوش گوار تھا۔ لان میں پھول مہک رہے تھے۔ میرے دل میں اپنی بہن شفقتا کی یاد کا پھول کھلا ہوا تھا۔ اسے دیکھے ایک مدت ہوگئی تھی۔ اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ اسے بانہوں میں بھر کر دیر تک بیٹھا رہوں۔ وہ مجھ سے کچھ کہے نہ میں اس سے کچھ کہوں۔ ساہی صاحب کے سوا شفقتا کا پتا اور کسی کو نہیں تھا اور ساہی صاحب کا اصرار تھا کہ میں شفقتا سے دور رہوں۔ میرے ارد گرد جو حادثے منڈلا رہے تھے وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے شفقتا تک بھی پہنچ سکتے تھے لیکن ان حادثوں کے خوف سے میں کب تک اپنی بہن سے دور رہ سکتا تھا۔ وہ میرے جسم کا حصہ تھی۔ میری اور اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون ایک تھا اور یہ خون کسی نامعلوم مقام سے ہر روز مجھے پکارتا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ غزالہ کا فون پھر آگیا۔ وہ بولی "عاصم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کتنی دیر میں آ رہے ہیں آپ؟"

جی چاہا انکار کردوں لیکن غزالہ کے لہجے میں چھپی ہوئی درخواست کو رد کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے کہا "عالم قریشی گاڑی لے کر گیا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

عالم قریشی دیسی گھی کی نہاری کھانے کے لیے ہفتے میں دو بار خصوصی طور پر لاہور کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں جاتا تھا۔ اکثر اس کی "پھوپی" بھی ساتھ ہوتی تھی۔ وہ نہاری کھا کر دس بجے کے قریب واپس آیا تو میں گاڑی لے کر اسپتال روانہ ہوا۔

اسپتال میں شیخ عاصم آج وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر سفید براق چادر تھی۔ کمرے کی دیوار گیر کھڑکی سے پردے ہٹا دیے گئے تھے۔ شیشے سے باہر خوب صورت گراسی لان میں رنگ برنگے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ ایسے ہی خوب صورت پھولوں والا لباس غزالہ نے بھی پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دل گداز مسکراہٹ اور تازگی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ شوہرِ نامدار صحت مند ہو رہا تھا۔ وہ بڑی مستعدی اور محبت سے عاصم کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ درحقیقت یہی منافرتے جن سے نگاہ بچانے کے لیے میں یہاں آنے سے کتراتا تھا۔ غزالہ ایک مشرقی عورت کی حیثیت سے جو کچھ کر رہی تھی ٹھیک کر رہی تھی۔ مشرقی بیویوں کی محبت ایسی ہی حتمی اور غیر مشروط ہوتی ہے لیکن یہاں مسئلہ کچھ اور تھا۔ میری نگاہ میں شیخ عاصم وہ نہیں تھا جو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے برعکس غزالہ کی نگاہ میں شیخ عاصم وہی تھا جو دکھائی دیتا تھا۔

شیخ عاصم کی طبیعت بہتر تھی اور وہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ میں دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں اور شام تک یہیں رہوں۔ تھوڑی دیر گپ شپ ہوتی رہی پھر کمرے کے اندر ہی پکنک کا سا ماحول بن گیا۔ شیخ عاصم نے تکیے کے نیچے سے کارڈز نکالے اور مجھے کھیلنے کی دعوت دی۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر انسان چاہے وہ کتنا بھی بارعب اور عمر رسیدہ ہو مگر کبھی کبھی اپنے لڑکپن یا بچپن کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ خاص طور پر مکمل فراغت کے زمانے میں یہ کیفیت نمودار ہوتی ہے۔

شیخ عاصم جیسے شخص سے یہ توقع کرنا محال تھا کہ وہ کسی قسم کے کھیل میں دلچسپی لے گا یا کھل کر قہقہہ بھی لگائے گا لیکن اس وقت وہ گاہے گاہے قہقہہ لگا رہا تھا اور کارڈز کھیلنے پر بھی آمادہ نظر آتا تھا۔ بمبئی میں اور ناسک جیل میں میں نے اکثر کارڈز کھیلے تھے (بمبئی کے ایک مشہور قمار خانے میں یار لوگوں نے ایک بڑے جگادری پتے باز سے میرا مقابلہ کرلیا تھا۔ وہ ٹھیک ٹھیک کھیلتا رہتا تو شاید میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا لیکن اس نے میری مسلسل مزاحمت سے گھبرا کر چالبازی دکھانے کی کوشش کی تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو میز الٹنے اور جگادری پتے باز۔۔۔ کے گروہ کی ٹھکائی کرنے کا موقع مل گیا۔)

میں نے شیخ عاصم سے کھیلنا شروع کیا تو انکشاف ہوا کہ وہ ایک تجربہ کار کھلاڑی ہے۔ خاص طور سے "فلش" میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ وہ اپنے آخری پتے بے حد مہارت سے استعمال کرتا تھا اور مقابل کو حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ تاش کے کھیل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وقت کا پتا نہیں چلتا۔ غزالہ گاہے گاہے کولڈ ڈرنک اور چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کرتی رہی۔ ہم کھیلتے رہے۔ کبھی کبھی وہ عاصم کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ کھیل کی اونچ نیچ کو سمجھتی تھی۔ میرا پلہ بھاری ہو جاتا تو غزالہ کی ساری ہمدردیاں شیخ کے ساتھ ہو جاتیں۔ کسی وقت وہ مجھے رگیدنے لگتا تو وہ غیر محسوس طور پر میری خیر خواہ بن جاتی۔ ایک موقع پر تو وہ باقاعدہ مجھے مشورے دینے لگی۔ شیخ نے کہا "بھئی اب تو اپنے گھر سے بھی مخالفت

شروع ہوگئی ہے۔"

"یہ مخالفت نہیں۔ میرے خیال میں مہمان نوازی ہے" میں نے کہا۔

"مہمان نوازی تو گھر میں ہوتی ہے۔ کیا تم اسپتال کو میرا گھر بنانا چاہ رہے ہو؟" عاصم نے پوچھا۔

میں نے کہا "تمہارا تو پتا نہیں لیکن اگر میرے ارد گرد ایسی خوب صورتی اور اتنا آرام ہو تو میں ضرور گھر پر ایسے اسپتال کو ترجیح دوں۔"

"خوب صورتی۔۔۔ کیسی خوب صورتی؟" عاصم نے پوچھا۔

غزالہ نے کہا "عاصم! آپ نے باتوں باتوں میں غلط چال چل دیا ہے۔"

عاصم مسکرایا "ہاں بھئی! جب گھر سے مخالفت ہونے لگے تو ایسی بدحواسیاں تو ہوتی ہی ہیں۔"

کچھ دیر بعد گفتگو کا رخ موجودہ حالات کی طرف مڑ گیا۔ عاصم نے مجھ سے کہا "شاہ جہاں! تم نے اپنے گرد بڑے دشمن اکٹھے کر لیے ہیں۔ اتنے دشمنوں کے درمیان وقتی طور پر تو رہا جا سکتا ہے لیکن طویل عرصے تک نہیں۔ تمہارے حق میں یہ بہت بہتر ہے کہ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ میں ایک بار پھر اپنی پیش کش کو دہراتا ہوں۔ تم جاپان چلے جاؤ۔ میں سارے کاغذات تیار کرا دیتا ہوں۔ رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ کسی پرسکون گوشے میں اطمینان سے سال دو سال گزار دو۔ اگر مناسب ہو تو اپنی بہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ تمہاری طرح اس کے لیے بھی یہاں بے شمار خطرات ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا۔ تم سے بڑا خطرہ اس کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ بات میں زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ میں نے کہا "میں یہ فیصلہ اتنی جلدی نہیں کر سکتا۔ ہاں وعدہ کرتا ہوں کہ اس بارے میں سوچوں گا۔"

شیخ عاصم نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "شاہ جہاں! یقین کرو میں تمہاری اور شفقتا کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم دونوں کے بارے میں میرے خیالات کچھ عرصہ پہلے بہت مختلف تھے لیکن اب میں سچے دل سے اس دشمنی کا خاتمہ چاہتا ہوں جس نے میری اور تمہاری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ میں اس دشمنی کو ہمیشہ کی دوستی میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ صرف میرا اور تمہارا معاملہ ہوتا تو خدا گواہ ہے میں کبھی ایسی بات نہ کرتا لیکن تم جانتے ہو کہ اس معاملے میں میرا قبیلہ فریق ہے اور قبائلی نظام فریق ہے۔ تم میری مجبوری سمجھ رہے ہو نا۔"

میں جانتا تھا کہ شیخ عاصم اب کیا بات کہنے والا ہے۔ اس کی زبان پر ایک بار پھر میری بہن شفقتا کا نام آنے والا تھا اور میرے لیے یہ بات سخت ناپسندیدہ تھی۔ غصے اور جھنجلاہٹ کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی لیکن اس سے پہلے کہ میں عاصم کو کوئی سخت جواب دیتا میری نگاہ عاصم کے عقب میں غزالہ پر پڑ گئی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک واضح التجا تھی۔ وہ خاموشی کی زبان میں مجھ سے درخواست کر رہی تھی کہ میں تحمل سے کام لوں۔ کوئی ایسی بات نہ کہوں جس سے عاصم کے دل میں ملال آجائے اور اس کی "دل شکنی" ہو۔

میں نے اپنا غصہ بہ مشکل ضبط کیا اور عاصم سے کہا کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن فی الوقت میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔

عاصم نے میرے لہجے میں چھپی ہوئی قطعیت محسوس کرلی۔ اپنی جھینپ چھپانے کے لیے وہ سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔ غزالہ نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی ایک کامیاب کوشش کی اور اندر آکر دھم سے صوفے پر آ بیٹھی "آپ دونوں صبح سے اکیلے ہی کھیل رہے ہیں، چلیے مجھے بھی شامل کیجیے۔" اس نے کہا۔

وہ بھی کھیلنے لگی۔ اس کے آنے سے ہمارا موضوع مکمل طور پر بدل گیا۔ غزالہ اچھا کھیلتی تھی لیکن لگتا تھا کہ کافی عرصے سے کھیلی نہیں۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہی تھی ان میں ایسی تفریحات کا گزر کہاں ہوتا ہے۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی لیکن ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی۔ ایسے فاصلوں کو پاٹنے کے لیے ایک عمر بھی تھوڑی ہوتی ہے۔

کارڈز بانٹتے ہوئے، کارڈز اٹھاتے ہوئے، کارڈز لیتے ہوئے میری انگلیاں بار بار غزالہ کی انگلیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کتنا معمولی سا لمس تھا یہ لیکن میرے جسم پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ کبھی یہی غزالہ تھی جو سراپا میرے سپرد تھی۔ میرے ایک اشارے پر ریشمی تھان کی طرح میری بانہوں میں کھلتی اور پھسلتی چلی جاتی تھی۔ وہ اپنی والہانہ قربت سے میرا دل جیتنے کی سیکڑوں کوششیں کر چکی تھی لیکن ناکام رہی تھی۔ آج اس کی انگلیوں کا معمولی لمس میرے دل میں زلزلے جگا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ لمس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اصل حقیقت وہ احساس ہوتا ہے جو ذہن میں پایا جاتا ہے۔ وہ نارسائی، وہ لاچاری اور دوری ہوتی ہے جو فرق کی روح ہے۔ کتنی بڑی بدقسمتی تھی۔ میرے دل میں غزالہ کی خوابیدہ محبت

اس وقت بیدار ہوئی تھی جب غزالہ میری نہیں رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا پھر چائے پی۔ غزالہ بہت خوش تھی کیونکہ موسم بہت خوش گوار تھا۔ لان میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا میں تازگی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عاصم خوش تھا۔

اچانک سب کچھ غارت ہو گیا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور چچی فاخرہ دندناتی ہوئی اندر آ گئی۔ داماد کو دیکھ کر اس کے چہرے پر جو ملاحت ابھری تھی وہ مجھے دیکھ کر یک دم کرختگی میں بدل گئی "تم کب آئے شاہ جہاں؟" اس نے اندرونی ناگواری کو چھپا کر پوچھا۔

"آج صبح آیا تھا۔"

"تب سے یہیں ہو؟"

"ہاں امی۔" غزالہ نے جلدی سے کہا "عاصم نے خود بلایا تھا انہیں۔"

گفتگو اردو میں ہوئی تھی لہٰذا شیخ عاصم کی سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر چچی فاخرہ اپنے داماد کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اب یہاں سے چلوں۔ میں نے شیخ عاصم اور غزالہ سے اجازت لی۔ شیخ عاصم نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت لے لی۔ ابھی میں دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ عقب سے چچی فاخرہ کی آواز آئی "ٹھہرو شاہ جہاں! ایک بات کہنی ہے تم سے۔"

میں رک گیا۔ چچی کے پیچھے ہی غزالہ بھی نمودار ہو گئی تھی "کیا بات ہے امی؟ کیا کہنا ہے آپ نے؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"کچھ نہیں' تم اندر جاؤ عاصم کے پاس۔" چچی فاخرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"لیکن امی آپ۔۔۔"

غزالہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی کیونکہ چچی فاخرہ تیز قدموں سے چلتی میرے قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ روش پر چلنے لگی۔ دونوں طرف گراسی لان تھا اور پھول مہک رہے تھے۔ یہ ایک دلفریب منظر تھا لیکن اب کچھ بھی دلفریب نہیں رہا تھا۔ ہر خوب صورتی پر چچی فاخرہ کا سایہ پڑ گیا تھا۔ وہ بولی "شاہ جہاں! میں تم سے پہلے بھی دو تین بار کہہ چکی ہوں۔ اب تمہارا غزالہ سے ملنا جلنا کسی طور بھی مناسب نہیں۔ تمہاری وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی میں پہلے ہی بہت پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اب حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں تو اس کے حال پر رحم کرو۔"

"یہی بات میں کہہ رہا ہوں کہ یہ لوگ میرے [illegible] کریں۔ میں نے آپ کے داماد اور بیٹی سے نہیں کہا تھا کہ میرے پیچھے گلگت پہنچ جائیں اور میرا کھوج لگاتے پھریں۔ اب بھی میں ان سے دور رہنا چاہتا ہوں لیکن وہ ایسا [illegible] چاہتے۔ میں نہیں جانتا' ان کے دل میں کیا ہے۔"

"لیکن تم یہ تو جانتے ہو کہ تمہارے دل میں کیا ہے یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارے میل جول کا کیا نتیجہ نکل [illegible] ہے۔ تم کوئی چھوٹے بچے نہیں کہ کوئی تمہیں انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ تم یہاں سے کہیں چلے کیوں نہیں جاتے؟"

"میں جہاں بھی جاؤں گا' تمہارا داماد مجھے ڈھونڈ لے گا۔ بڑی محبت ہے اسے مجھ سے۔ شاید تمہاری بیٹی سے بھی محبت' وہ مجھ سے کرتا ہے۔ رات دن تڑپتا ہے میرے لیے" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں کیا الٹی سیدھی ہانکتے ہو تم۔" چچی [illegible] جھنجلاہٹ سے بولی "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹی اور داماد کے ساتھ نظر نہ آؤ' ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔؟"

"ورنہ۔۔۔ میں۔۔۔ مجھ سے جو ہو سکے گا کروں گی۔"

مجھے غصہ آنے کے بجائے اس عورت پر ترس آیا۔ ساری زندگی اردگرد کے لوگوں پر حکم چلاتی رہی تھی۔ اب بوڑھی ہو چکی تھی اور بیمار بھی تھی لیکن اندر کی تن فن نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے دھمکا رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا مظلوم بھتیجا اب سولہ سال کا سہما ہوا لڑکا نہیں ہے۔ وہ پلک جھپکتے میں چچی سے اور چچی کے خاندان سے اپنے [illegible] ہونے والے ہر ستم کا بدلہ چکا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ [illegible] کے چہیتے خان داماد کو بھی ناکوں چنے چبوا سکتا ہے۔

چچی مسلسل تحکمانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "چچی! مجھے مت سمجھاؤ۔ جو کچھ کہنا اپنے داماد اور بیٹی سے کہو۔"

لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں اسپتال کی پارکنگ کی طرف آ گیا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ لاہور کی سڑکیں روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔ [illegible] معمول سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔ بازاروں میں [illegible] کا ہجوم تھا۔ پارکوں میں معمول سے زیادہ رونق دکھائی دے رہی تھی۔ ہوٹل' اسنیک شاپس' فاسٹ فوڈ کارنر خاص طور سے سجے سنورے نظر آتے تھے۔ ویک اینڈ کی

خصوصی حسن اور رنگ ہر جگہ نمایاں تھا۔ ویک اینڈ کی مخصوصیت' وہ اطمینان ہوتا ہے جو ہفتے بھری مشقت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ بے فکری کی شام اور فرصت کی ایک طویل رات' جس کی صبح کو جب تک چاہے سویا جا سکتا ہے لیکن یہ سکون و اطمینان ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جن کے گھر ہوتے ہیں۔ میرے جیسے بے گھر' بے ٹھکانا لوگوں کا کوئی ویک اینڈ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں گم اپنے ہی عذابوں کا شکار رہتے ہیں۔ استاد دامن کا ایک مصرع خود بہ خود میری حالت میں گونجنے لگا۔۔۔۔ عیداں تے شبراتاں آون سانوں کب۔

پندرہ منٹ میں' میں گلبرگ پہنچ گیا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے پانچ منٹ مزید لگ گئے۔ عالم قریشی نے خالی کوٹھی کی ایک چابی مجھے دے دی تھی۔ میں آمد و رفت کے لیے عقبی دروازہ استعمال کر رہا تھا۔ طعام کا بندوبست عالم قریشی کے گھر میں ہوتا تھا۔ بھورا نامی ایک ملازم بڑے اہتمام سے کھانا لے کر آتا تھا۔

دروازہ کھول کر میں نے گاڑی عقبی گیراج میں کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف غزالہ تھی۔ اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ہیلو شاہ جہاں! آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟۔۔۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

وہ کانپتی آواز میں بولی "شاہ جہاں! یہاں آپ کے جاتے ہی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔ پانچ دس منٹ پہلے کچھ لوگ کمرے میں گھس آئے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے زبردست ہوائی فائرنگ کی ہے۔"

گھبراہٹ کے سبب غزالہ کا گلا رندھ گیا اور وہ مزید نہ بول سکی۔

چند لمحے کے توقف کے بعد ریسیور سے عاصم کی آواز ابھری۔ وہ خاصے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! کچھ لوگ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے یہاں گھس آئے تھے۔ انہوں نے ایک ڈاکٹر اور ایک "روم اٹینڈنٹ" کو بری طرح لہولہان کیا ہے۔ ایک نرس کی ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں۔ ہم نے کوشش کر کے دو بندوں کو تو پکڑ لیا ہے لیکن ایک بھاگ گیا ہے۔"

یہ اطلاع دھماکا خیز تھی۔ میں نے پوچھا "کچھ پتا چلا' کون لوگ ہیں؟"

"ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔" شیخ عاصم بولا "ویسے حلیے سے تو قاتل لگتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی میلسی والا معاملہ ہو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے شیخ عاصم نے کہا "تمہارے ٹھکانے کا ہی پتا نہیں' ورنہ میں چاہ رہا تھا کہ ایک دو گارڈز تمہاری طرف بھیج دوں۔ ہو سکتا ہے کہ حملہ آوروں کو تمہاری رہائش گاہ کا پتا ہو اور وہ وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"خیر' ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"بہت احتیاط کی ضرورت ہے تمہیں۔ بلکہ بہتر ہے کہ ایک دو گھنٹے کے لیے تم اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔"

عاصم کی آواز کے پس منظر میں بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ پولیس موبائل کا سائرن بھی سنائی دے رہا تھا۔ اچانک لائن میں خرابی کی وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے ریسیور رکھ کر اپنا پہلو ٹٹولا۔ قمیص کے نیچے لگے ہوئے ہولسٹر میں ریوالور موجود تھا۔ میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور اس نئی صورتِ حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ یہ کوئی غیر متوقع صورتِ حال نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ لاہور میں میرے بے شمار "مہربان" ہیں اور میری خاطر تواضع کے لیے سخت بے چین بھی ہیں۔

اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک پرچھائیں مجھ پر جھپٹی۔ میں اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اضطراری طور پر میں نے اپنا سر پیچھے ہٹایا اور ایک برق سی میری نگاہوں کے سامنے کوند گئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ ایک لمبا چھرا تھا جو حملہ آور قاتل نے بے دریغ میری گردن پر آزمایا تھا۔ حملہ آور کی کمر از خود میرے بازو میں آ گئی۔ میں نے پوری قوت سے اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ وہ دیوار گیر لیمپ سے ٹکراتا ہوا صوفے پر گرا۔ وہ خاصا پھرتیلا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دوسرا وار میں نے بڑے اطمینان سے پیچھے ہٹ کر بچایا۔ میرے اطمینان نے اس کے ہیجان میں اضافہ کر دیا تھا۔ چیختے ہوئے اس نے دو وار مزید کیے۔ میں نے جھکائی دے کر اس کے پیچھے پر ٹانگ جمائی اور وہ دور جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا میں نے جست لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں سوئی گیس کی تیز بو پھیلی ہوئی ہے۔ دم سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ درحقیقت جس لیمپ سے حملہ آور ٹکرایا تھا' وہ سوئی گیس لیمپ تھا۔ لیمپ کا پائپ اکھڑ گیا تھا اور تیز بو پورے کمرے میں بھرتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ یہ ایئر ٹائٹ کمرے تھے۔ جس دروازے سے حملہ آور داخل ہوا تھا' وہ آٹومیٹک طور پر بند ہو چکا تھا۔ اب

سرعت سے نکلتی ہوئی گیس مختصر کمرے میں بھرتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر گیس کا اخراج مزید جاری رہتا تو کمرا گیس چیمبر بن جاتا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے حملہ آور کا تھیرے والا ہاتھ دبوچ رکھا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ خالی تھا۔ وہ پہلے اس ہاتھ سے میرے بال کھینچنے کی کوشش کرتا رہا پھر اس کا ہاتھ اپنے پہلو میں رینگ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے پہلو میں ریوالور موجود ہے۔ یہ بڑی خطرناک کوشش تھی۔ اس کمرے میں فائر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ آگ لگ جاتی۔ ہماری لاشیں تک شناخت نہ ہو سکتیں۔ میں نے "ایمرجنسی" میں سر کی دو بھرپور ضربیں مدمقابل کے چہرے پر لگائیں اور اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ نہ صرف چہرے پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی بلکہ حواس پر بھی پہلے سی گرفت نہ رہی۔ میں نے اس کی گردن بازو میں لے کر دبائی اور اسے مکمل طور پر بے ہوش کر دیا۔ تیز بو کے سبب دماغ چکرا رہا تھا۔ جلدی سے آگے بڑھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ حملہ آور کے ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔ بڑی تیزی سے میں نے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کوٹھی کے بیرونی فرش گرد آلود تھے۔ اگر کوئی شخص یہاں گھومتا پھرتا تو قدموں کے نشانات فوراً پکڑے جاتے۔ کوٹھی کے عقبی گیٹ سے نکل کر میں نے باہر جھانکا۔ باؤنڈری وال کے بالکل قریب ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا موٹر سائیکل کی نشست پر جوتے کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ بھاری بھرکم موٹر سائیکل حملہ آور کی تھی اور وہ اس کی نشست پر پاؤں رکھ کر باؤنڈری وال پر چڑھا تھا۔

اندرونی کمرے سے فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ میں گیٹ بند کر کے واپس آیا۔ حملہ آور بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے رستا ہوا خون اس کے حلق میں گر رہا تھا اور سانس کے ساتھ خرخر کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ میں نے ریسیور اٹھایا، دوسری طرف حسب توقع غزالہ تھی۔ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی "آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"در۔۔۔ دراصل عاصم کو اندیشہ ہے کہ حملہ آور آپ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"میں پوری طرح خبردار ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن اگر وہ زیادہ ہوئے تو؟ میرا۔۔۔ مطلب ہے آپ اپنے ٹھکانے کے بارے میں بتا کیوں نہیں دیتے۔ عاصم چاہتے ہیں کہ ایک دو گارڈز آپ کی طرف بھیج دیں۔"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی عالم قریشی اور ایک دو دوست میرے ساتھ ہیں۔"

ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر غزالہ نے کسی سے بات کی، پھر بولی "عاصم کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ اپنا ایڈریس نہیں دے سکتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ ہماری طرف آ جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے بے زاری سے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

فون پر بات ختم کر کے میں بے ہوش قبائلی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ شلوار قمیص پر جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں بھاری تلے کی پشاوری چپل تھی۔ میں نے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کی مشکیں کسیں، منہ میں اچھی طرح کپڑا ٹھونسا اور ایک اندرونی کمرے میں بند کر دیا۔ بعد ازاں اس کی موٹر سائیکل بھی اندر لا کر کھڑی کر دی۔ حملہ آور کی جیب سے برآمد ہونے والا ریوالور اعشاریہ دو پانچ کا تھا۔ چیمبر میں پانچ گولیاں موجود تھیں۔ میں نے ان گولیوں کو غور سے دیکھا اور چونک سا گیا۔ یہ اصل گولیاں نہیں تھیں۔ ایسی گولیاں عام طور پر فلموں کی شوٹنگ وغیرہ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ بات بڑی توجہ طلب تھی۔ اس شخص کے ریوالور میں نقلی گولیاں کیوں تھیں۔ اس نے خود دھمکی آمیز یا کسی ... دکھ دی تھیں۔ میں دیر تک اس معمے کو حل کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ یقیناً یہ شخص اکیلا ہی یہاں پہنچا تھا۔ اگر اس کا کوئی ساتھی ہوتا تو اسے مار کھاتے دیکھ کر ضرور سامنے آتا۔ میرے خیال میں اس شخص نے بے وقوفی کی تھی جو اکیلا ہی اندر گھس آیا تھا۔ اصولی طور پر اسے چاہیے تھا کہ میرے ٹھکانے کا علم ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرتا اور منظم طریقے سے مجھ پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی۔ شاید اس نے تنہا کارروائی کر کے "نمبر" بنانے کی کوشش کی تھی یا پھر وہ انتقام کے حوالے سے قدرے جذباتی تھا کہ صبر نہیں کر سکا تھا۔

کچھ بھی تھا اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ باہر نکلنے سے پہلے میں اپنا حلیہ تھوڑا بہت تبدیل کر لوں۔ ریڈی میڈ میک اپ سامان عالم قریشی میرے لیے مہیا کر چکا تھا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تقریباً پون گھنٹا صرف کیا اور خود کو خاصی حد تک تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔ اب میرے بالوں کی ... مختلف تھی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا۔ پتلون اور جیکٹ کے بجائے میں نے تھری پیس سوٹ پہن لیا تھا۔

گاڑی کے بجائے میں نے ٹیکسی میں سفر کیا اور ...

...ب سمجھا اور اسپتال پہنچ گیا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ساہی صاحب کی جیپ مجھے پارکنگ میں ہی نظر آ گئی۔ وہ چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ جس نرس کو گولیاں لگی تھیں اس کی حالت نازک تھی اور وہ آپریشن تھیٹر میں موت اور حیات کی کشاکش کا شکار تھی۔ محلے کے دو افراد کو چوٹیں آئی تھیں اور خود شیخ عاصم کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ اس کے بازو کا زخم ایک بار پھر خون اگلنے لگا تھا اور ماتھے پر بھی گہری چوٹ کا نشان تھا۔ یہ بات مجھے اسپتال پہنچ کر معلوم ہوئی کہ میرے اسپتال سے نکلنے کے چند سیکنڈ بعد ہی حملہ آور عاصم کے کمرے میں گھس آئے تھے۔ وہ تین افراد تھے۔ تینوں بری طرح بپھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرا نام لے کر گالیاں دی تھیں اور چیخ چنگھاڑ رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آیا تھا اس پر انہوں نے بے دریغ حملہ کیا۔ انہیں روکنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

میری تلاش میں ناکام ہو کر وہ باہر کی طرف لپکے۔ انہیں یقین تھا کہ میں ابھی اسپتال کے آس پاس ہی ہوں۔ اس موقع پر شیخ عاصم نے زخمی ہونے کے باوجود ہمت سے کام لیا اور حملہ آوروں کو میرے تعاقب سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر ایک شخص کو عقب سے دبوچ لیا۔ عاصم کو دیکھ کر وہ چوکیدار بھی ایک حملہ آور پر پل پڑا۔ تیسرے شخص نے فائرنگ کر دی۔ چوکیدار تو بچ گیا لیکن ایک نرس کی ٹانگ اور پہلو میں گولیاں لگیں۔ فائرنگ کرنے والا شخص افراتفری کا فائدہ اٹھا کر بھاگ گیا۔

پولیس اہلکار موقع پر موجود لوگوں کے بیان لے رہے تھے۔ ساہی صاحب تفتیشی کارروائی کی نگرانی خود کر رہے تھے۔ میں شیخ عاصم کے قریب جا بیٹھا۔ اس کے ماتھے پر تازہ ... نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار تھے لیکن مجھے دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ غزالہ اس کے قریب کھڑی تھی۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "ابھی یہ عورت تو مجھے بچے ... سوئے، چھوٹی موٹی لڑکی میں تبدیل کر دے گی۔ اتنی احتیاط کراتی ہے جیسے کہ لگتا ہے میں شیشے کا مرتبان ہوں۔ ادھر ٹھیس لگے گی اور ٹوٹ جاؤں گا۔ اب تم ہی بتاؤ، زخم میرے بازو میں ہیں، ٹانگیں تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ دو قدم چل کر دروازے تک گیا ہوں اور یہ ڈانٹ لے کر میرے سر سوار ہو گئی ہے۔"

غزالہ ناراضی سے بولی "دو قدم چل کر دروازے تک نہیں گئے آپ۔ ایک ہٹے کٹے بندے سے ہاتھا کشتی بھی کی ہے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اور لوگ بھی آ گئے ورنہ پتا نہیں وہ آپ کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا کہاں لے جاتا۔"

میں نے کہا "غزالہ بات تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے تمہیں بیڈ ریسٹ کے لیے کہا ہوا ہے۔"

"ڈاکٹروں کی بات چھوڑو یار۔" عاصم نے بے تکلفی سے کہا "ڈاکٹرز تو کہیں گے دو مہینے تک بستر پر تختہ بن کر پڑے رہو۔ تم ہی بتاؤ، ایسی۔۔۔ خوب صورت بیوی کی موجودگی میں یہ ممکن ہے؟"

آخری الفاظ عاصم نے بہت آہستگی سے کہے تھے لیکن غزالہ کے کانوں تک پہنچ گئے، اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولی "مائنڈ یور لینگویج عاصم" پھر کسی کام کے بہانے باہر نکل گئی۔

عاصم نے دھیرے سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! ایک کہاوت ہے کہ انتہا کی دشمنی اور انتہا کی دوستی کے درمیان ایک مدھم لکیر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ شاید۔۔۔ ہمارے درمیان بھی ایک ایسی ہی مدھم لکیر موجود تھی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تمہارے ساتھ میری انتہا کی دشمنی انتہا کی دوستی میں بدل چکی ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں تمہیں دوست سمجھتا ہوں اور جسے میں دوست سمجھتا ہوں، اس کے لیے میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ مجھے جب بھی ملے، سلامتی سے ملے اور خوش ہو۔ یقین جانو میں تمہیں بھی خوش اور سلامت دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ یہاں تمہارے اردگرد ہو رہا ہے شاہ جہاں، وہ کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ میرے خیال میں ان معاملوں سے نمٹنے کا تجربہ تم مجھ سے زیادہ رکھتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں سنجیدگی سے سوچو اور اس مسئلے کا کوئی حل نکالو۔"

میں نے اطمینان سے کہا "جسے تم مسئلہ کہہ رہے ہو، یہ میرے لیے مسئلہ نہیں ہے۔ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اس میں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ انہی حالات میں گزرا ہے۔ بہرحال۔۔۔ تمہارا شکریہ کہ تم مجھے دوست سمجھ رہے ہو اور میرے لیے خود کو مصیبت میں ڈال رہے ہو۔"

ساہی صاحب بھی وہیں آ گئے۔ وہ میرا تبدیل شدہ حلیہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ وہ گرفتار شدہ پٹھان سے ابتدائی پوچھ گچھ کر چکے تھے۔ اس پوچھ گچھ سے ابھی تک کوئی خاص بات ثابت نہیں ہو سکی تھی۔ دونوں پٹھان ٹھیٹ پشتو بولتے تھے اور ان کا تعلق آزاد قبائلی علاقے سے تھا۔

یہ لوگ پچھلے بارہ گھنٹوں سے اسپتال کی نگرانی کر رہے

تھے۔ میں نے ساہی صاحب کو بتایا کہ ایک ملزم میرے پاس بھی موجود ہے۔ وہ میری رہائش گاہ پر بندھا ہوا ہے۔ تاہم میں نے ساہی صاحب سے تتلی کولیوں کا ذکر نہیں کیا۔

○☆○

اگلے چار پانچ روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ شیخ عاصم بدستور اسپتال میں تھا اور اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ غزالہ دن رات اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ ساہی صاحب ان حملہ آوروں کے پیچھے لگے ہوئے تھے جن کا تعلق عینی جان والے واقعے سے تھا اور جو پورے لاہور میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

زریں گل اور کلثوم اسی ہوٹل میں مقیم تھے جہاں میں نے انہیں ٹھہرایا تھا۔ ایک بار رازداری سے ہوٹل جاکر میں نے ان کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ وہ مزے میں تھے لیکن اتنا مزہ بھی نہیں تھا جتنی زریں گل کی خواہش تھی۔ میری ہدایت پر ساہی صاحب نے ایک لیڈی پولیس کانسٹیبل کو سادہ لباس میں کلثوم کے ساتھ ٹھہرایا تھا۔ کلثوم اور کانسٹیبل ایک کمرے میں تھیں جب کہ زریں دوسرے کمرے میں۔ کلثوم کے دہکتے شباب اور زریں کے بے تاب عشق کے درمیان پولیس آگئی تھی۔ ظاہر ہے "پولیس" کی موجودگی میں زریں کے ہاتھ پاؤں بندھ گئے تھے۔ خاص طور سے ہاتھ بندھ گئے تھے ورنہ وہ بہت کچھ کر گزرتا۔ میں جب اس سے ملنے گیا تو وہ باقاعدہ "ترلے" لینے لگا کہ میں جلد از جلد اس کے دو بول پڑھوا دوں ورنہ وہ گولے کی طرح پھٹ جائے گا یا پھر کسی رات لیڈی کانسٹیبل کی جان لے لے گا اور سرپٹ گھوڑے کی طرح بھاگتا ہوا اپنی "منزل" تک پہنچ جائے گا۔ ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر اس نے پورے ہوٹل کی فضا [illegible] کر رکھی تھی۔

جون چاؤل اور منور اطلا میں تھے۔ سٹرجی کلارک اور تیجنی کنور بھی ان کے ساتھ تھے۔ ساہی صاحب کے ذریعے مجھ تک جو اطلاعات پہنچی تھیں ان سے پتا چلا تھا کہ مدراس میں وہ لوگ شکنتلا نامی عورت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اس کے بچے کا فی الحال پتا نہیں چل رہا۔ بہرحال وہ لوگ اپنی پیش رفت سے مطمئن تھے۔ دفینے کے کچھ اور نوادر بھی ان کے ہاتھ لگے تھے۔

سائیں حالی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر پراسرار طور پر لاپتا تھا۔ مجھے اس کے جسم کے آبلوں کی فکر تھی۔ وہ معمولی آبلے نہیں تھے۔ خبر نہیں اس نے کہیں سے علاج کرایا بھی تھا یا نہیں۔۔۔ سوہو بدستور نفسیاتی اسپتال میں تھی۔ اس کی بے ہوشی میں وقفے تو آتے تھے لیکن یہ زیادہ طویل نہیں ہوتے تھے۔ اس کی بیماری کی تازہ ترین پوزیشن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا۔

شیخ عاصم کا رویہ میرے ساتھ مسلسل دوستانہ تھا۔ دن میں کم از کم ایک بار مجھے فون کرتا تھا۔ ایک دو بار غزالہ بھی اس گفتگو میں شریک ہوئی تھی۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ شیخ عاصم مجھے کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ بے شک وہ فی الوقت میری حفاظت اور سلامتی کی باتیں کر رہا تھا لیکن اس گفتگو کا حرفِ اور آخری نتیجہ وہی "منگنی" والی بات تھی۔ شیخ عاصم اور کسی حد تک غزالہ کی بھی یہ خواہش تھی کہ میں شکنتا کے لیے امریکہ پلٹ خوبرو نوجوان ایاز کا رشتہ قبول کرلوں۔

رشتے ناتے کرنا عورتوں کا کام ہوتا ہے، بہرحال کچھ مرد حضرات بھی اس سلسلے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتے تھے لیکن مجھے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ شکنتا اس دنیا میں میرا واحد خونی رشتہ ہے اور میرے جینے کا سہارا ہے۔ اگر کبھی مجھ سے اس کے بارے میں کوئی غلط فیصلہ ہو گیا اور اس فیصلے کے نتیجے میں شکنتا کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔ شیخ عاصم جو بات کر رہا تھا وہ میرے لیے بالکل پسندیدہ نہیں تھی اور پسندیدہ ہو بھی کیسے سکتی تھی۔ میں تو ابھی تک یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ شیخ عاصم کے بدلے ہوئے رویے میں حقیقت کتنی ہے اور افسانہ کتنا ہے۔ وہ بہت گہرا شخص تھا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے سینے کی گہرائی میں کوئی موتی ہے یا مگرمچھ۔

ایک روز دوپہر دو بجے اسپتال سے غزالہ کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ ساڑھے بارہ بجے ملازم کو کھانا لے کر پہنچنا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا۔ بہت سے فون بھی غزالہ نے کیے تھے لیکن گھر سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ دونوں فون لائنیں ایک ساتھ خراب کیوں ہو گئی ہیں۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے میں ابھی خود جاکر پتا کرتا ہوں۔"

غزالہ کو اب معلوم ہو چکا تھا کہ میری رہائش گاہ گلبرگ میں ہے اور میں عالم قریشی کا "پڑوسی" ہوں۔ میری رہائش سے شیخ عاصم کی ڈیفنس والی کوٹھی بمشکل چند منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔

میں عاصم کی کوٹھی پر پہنچا۔ خانساماں سے معلوم ہوا کہ سب خیریت ہے۔ کھانا تھوڑا سا لیٹ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوا کہ عین موقع پر گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہوگئی لہٰذا کھانا بروقت اسپتال نہ پہنچایا جا سکا۔ ابھی چند منٹ پہلے

ملازم کھانا لے کر اسپتال روانہ ہوا تھا۔ کوٹھی کا ایک ٹیلی فون تو واقعی خراب تھا، دوسرے کا ریسیور کریڈل پر ٹھیک سے رکھا نہیں گیا تھا۔

صورت حال واضح ہونے کے بعد میں واپس روانہ ہوا۔ شیخ عاصم کی کوٹھی سے نکل کر ابھی میں سوا ڈیڑھ سو گز ہی دور گیا تھا کہ ایک گاڑی کو دیکھ کر چونک گیا۔ گاڑی کی کھڑکی میں ایک لڑکی ہاتھ لہرا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی اس کے پہلو میں روکی۔ لڑکی کافی خوب صورت تھی۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال رہی ہوگی۔ وہ بولی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق یونان یا ترکی وغیرہ سے ہے۔ رنگ سفید، آنکھیں نیلی اور بال سنہری مائل تھے مگر وہ کافی خستہ حال دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات بھی تھی جو شریف گھریلو لڑکیوں میں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ پہلی نظر میں مجھے غریب الوطن اور مصیبت زدہ نظر آئی۔ رسمی کلمات کے بعد وہ بولی "آپ میری مدد کریں گے؟"

"جی فرمائیے۔"

"میں شیخ عاصم صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کون شیخ عاصم؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں جانتی ہوں، یہ شیخ عاصم کی رہائش گاہ ہے۔ حالانکہ نیم پلیٹ کسی اور کے نام کی لگی ہے۔"

میں نے کہا "محترمہ! میں تو اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔"

"حالانکہ ابھی آپ اسی کوٹھی میں سے نکلے ہیں؟"

"کوٹھی سے نکلنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوٹھی کے مالک کا شجرۂ نسب جانتا ہوں اور اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ کسی شیخ عاصم کی کوٹھی ہے تو آپ خود جاکر معلوم کرلیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" وہ منمنائی۔ اس کے چہرے پر بے رنگی تھی۔

میں نے پوچھا "آپ مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟"

وہ بولی "میں چاہتی ہوں کہ آپ کسی طرح شیخ عاصم کو رازداری سے یہ اطلاع پہنچا دیں کہ میں یہاں ان کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"مگر مسئلہ کیا ہے؟"

"یہ خالص دفتری نوعیت کا مسئلہ ہے مگر اس میں پیچیدگی ہے کہ میں اس کے بارے میں ڈسکس کرنے کے لیے شیخ صاحب کے گھر نہیں جا سکتی۔"

لڑکی ہوشیار بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا، وال میں کالا ہے۔ وہ یہاں شیخ عاصم کے راستے میں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ شاید اسے توقع تھی کہ شیخ گاڑی میں یہاں سے گزرے گا اور وہ اسے روک لے گی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ شیخ تو اسپتال میں پڑا ہے۔ ایک اور بات بھی عجیب تھی۔ لڑکی کو شیخ عاصم کے گھر کا فون نمبر معلوم نہیں تھا، نہ ہی وہ شیخ کے کسی دوسرے ٹھکانے سے آگاہ تھی۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ جس گاڑی پر وہ یہاں پہنچی ہے وہ اس نے ائیرپورٹ سے کرائے پر حاصل کی ہے۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر میں نے ایک چھوٹا سا سفری بیگ دیکھ لیا تھا۔ اس بیگ پر "پی آئی اے" کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ مجھے یہ معاملہ خاصا پراسرار نظر آیا۔ غالباً لڑکی عاصم کی کوئی سابق گرل فرینڈ تھی اور اسے یہ معلوم تھا کہ عاصم اس کوٹھی میں اپنی "وائف" کے ساتھ رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ براہِ راست کوٹھی میں جانا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے لڑکی سے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟"

وہ بولی "میں شیخ صاحب کی تعمیراتی فرم کی دبئی برانچ میں کام کرتی ہوں۔ شیخ صاحب نے میرے ذمے ایک اہم کام لگا رکھا تھا۔ اسی سلسلے میں مجھے سخت ہنگامی طور پر ان کے مشورے کی ضرورت پڑی ہے۔ میں آج صبح کی فلائٹ کے ذریعے دبئی سے لاہور پہنچی ہوں۔"

"یہاں کا پتا تمہیں کس نے بتایا تھا؟"

"ایک مرتبہ شیخ صاحب نے ہی بتایا تھا۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ شیخ صاحب یہاں نہیں ہیں۔"

"لیکن یہ شیخ صاحب کی رہائش گاہ ہی ہے نا؟" اس نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ تم کہہ سکتی ہو لیکن یہاں شیخ صاحب سے تمہاری ملاقات نہیں ہوگی۔ بے شک وہ دن بھی کھڑی رہو۔"

"پھر کہاں ہو سکتی ہے ملاقات؟"

"یہ ایک لمبا چکر ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتا۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ میں تمہیں ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔۔۔ اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو کہیں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

لڑکی نے چند سیکنڈ کے لیے میری آنکھوں میں دیکھا پھر تیار ہو گئی۔ اس میں قوتِ فیصلہ کی کمی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ لڑکی نے میری اس

بات پر یقین کر لیا تھا کہ شیخ عاصم اس کوٹھی میں موجود نہیں۔ غالباً اب تک کے انتظار کے بعد اس نے اپنے طور پر بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ڈیفنس سے روانہ ہوئیں اور گلبرگ کے ایک شاندار ہوٹل کے سامنے جا رکیں۔ میں اس نامعلوم غیر ملکی کو لے کر ایک پُرسکون و نیم تاریک گوشے میں جا بیٹھا۔ لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ ڈائننگ ہال میں اکا دکا افراد موجود تھے۔ میں لڑکی سے گفتگو کرنے لگا۔ وہ ایک پڑھی لکھی ذہین لڑکی تھی۔ میں اسے کھوجنا چاہ رہا تھا لیکن وہ اتنا ہی بتا رہی تھی جتنا بتانا ضروری سمجھتی تھی۔ اس کا نام یوسا اور مذہب عیسائیت تھا۔ وہ یونانی نژاد ترک تھی۔ اس کی خوب صورتی ہر شک و شبے سے بالاتر تھی۔ سب سے نمایاں صفت اس کی نیلی آنکھیں اور بے انتہا صحت مند اور شفاف جلد تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ شیخ عاصم کے ساتھ اس لڑکی کا تعلق صرف دفتری نوعیت کا ہے۔ وہ اتنی جاذبِ نظر تھی کہ شیخ عاصم جیسے شخص کے ساتھ اس کا تعلق "دفتری نوعیت" کا رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے لڑکی کو بتایا کہ میری حیثیت شیخ عاصم کے راز دار دوست کی ہے۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جو یہاں پاکستان میں عاصم کے کاروباری مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے یوسا نامی اس لڑکی کو بتایا کہ شیخ عاصم اور مسز عاصم فی الوقت ڈیفنس سوسائٹی والی رہائش گاہ پر نہیں ہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ شہر میں ہی موجود نہ ہوں۔

"یعنی آپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ جونہی عاصم سے رابطہ ہوا میں اسے تمہارے بارے میں اطلاع کر دوں گا۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ جانتے نہیں کہ میں کتنا ضروری مسئلہ لے کر یہاں پہنچی ہوں۔ اگر آپ نے مجھے شیخ عاصم تک پہنچانے میں تاخیر کی تو یقین جانیے کہ آپ کو شیخ صاحب کی شدید ناراضی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

میں جانتا تھا کہ یہ فتنہ ساماں لڑکی کس قسم کا مسئلہ لے کر یہاں پہنچی ہوگی۔ بہرحال میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اسی ہوٹل میں ایک دو روز قیام کر لے۔ امید ہے کہ اس دوران میں شیخ عاصم سے اس کا رابطہ ہو جائے گا۔

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد وہ مان گئی۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ اس نے کار ائرپورٹ سے کرائے پر لی تھی۔ ہوٹل انتظامیہ کے ذریعے یہ کار واپس کر دی گئی۔ یوسا فرسٹ فلور پر ایک اٹیچ باتھ روم میں شفٹ ہو گئی۔

اگلے دو روز میں، میں دو تین بار ہوٹل جا کر یوسا سے ملا۔ وہ ایک ماڈرن اور بے تکلف لڑکی تھی۔ اس نے ہر موضوع پر کھل کر بات کی۔ یہاں تک کہ ڈھکے چھپے لفظوں میں شیخ عاصم سے اپنے رومانی تعلق کا بھی اعتراف کر لیا۔ وہ ایتھنز کی رہنے والی تھی۔ ایک ڈانس اسکول میں زیرِ تعلیم رہی تھی، ماڈلنگ کر چکی تھی، ایک مقابلۂ حسن میں بھی شرکت کر چکی تھی اور ایسے ہی بہت سے کام کر چکی تھی۔ اس کی ماں خود بھی ایک مشہور و معروف بیلے ڈانسر تھی۔ ایک چھوٹا بھائی باپ سنگر تھا۔ ایک بیلے ڈانس میں ہی شیخ عاصم کی "جوہر شناس" نگاہ یوسا پر پڑی تھی اور... اس نے منہ مانگی تنخواہ پر یوسا کو اپنی ایک فرم میں ملازم رکھ لیا تھا۔ فرم کو تو دراصل یوسا نے برائے نام ہی "جوائن" کیا تھا۔ حقیقت میں اس نے شیخ عاصم کو "جوائن" کیا تھا اور خوبرو عورتوں کے اس گروپ کو "جوائن" کیا تھا جو شیخ عاصم کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا تھا۔

یوسا سے یہ میری تیسری ملاقات کا واقعہ ہے۔ میں اور یوسا ہوٹل کے خوب صورت کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں ہوٹل کے سبزہ زار اور سوئمنگ پول کو روشن کر رہی تھیں۔ یوسا خاصی مایوس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس موجود زرِ مبادلہ ختم ہونے والا تھا اور شیخ عاصم کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ میں تو "مخصوص کوشش" کر ہی رہا تھا، وہ اپنے طور پر بھی کوشش کر رہی تھی لیکن لاہور میں وہ بالکل اجنبی تھی اور شیخ عاصم کے [illegible] والے ایڈریس کے سوا یوسا کے پاس کوئی "کلیو" بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے طور پر شیخ عاصم کے ایک منیجر سے رابطہ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن یہ شخص بھی یوسا کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا... اور وہ کرتا بھی کیسے، کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ شیخ عاصم کہاں ہے۔ اس شام یوسا کے سامنے [illegible] کے علاوہ شراب بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے پیگ لیتی رہی اور میرے سامنے اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کا نشہ تیز اور لہجہ غیر [illegible] گیا۔ اس روز بہکے بہکے انداز میں اس نے مجھے کئی راز کی باتیں بتائیں۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ دبئی میں شیخ عاصم نے اپنی محل نما رہائش گاہ میں کئی خوب صورت لڑکیوں کو

کر رکھا ہے۔ شیخ عاصم کے بھائی اور قریبی دوست اکثر ان لڑکیوں کو عیاشی کے لیے استعمال کرتے تھے اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر اُمرا کے ہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ تاہم کچھ عرصے پہلے شیخ عاصم میں ایک نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اس نے اپنا "حرم" ختم کر دیا۔ دو تین مرحلوں میں سب عورتوں کو چھٹی دے دی گئی۔ جن عورتوں کی جوانی ڈھل رہی تھی، انھیں گزر بسر کے لیے معقول رقم دی گئی، دوسری لڑکیوں کو بھی انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا گیا۔ تاہم یوسا سمیت تین چار لڑکیاں ایسی تھیں جنھیں مستقل چھٹی نہیں دی گئی۔ انھیں رازداری سے بتایا گیا کہ ایک سال کے اندر اندر ان کی بحالی کے امکانات موجود ہیں۔ ان لڑکیوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ "سیف لائف" گزاریں گی۔ "سیف لائف" سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ صنفِ مخالف سے میل جول نہ رکھا جائے۔ یوسا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ شیخ عاصم کا تعلق سوسائٹی کے جس طبقے سے ہے، وہاں "سیف لائف" کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُمرا جن ملکی اور غیر ملکی خواتین کو اپنا قرب بخشتے ہیں، ان کی عمومی صحت کے بارے میں خاصی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کا حسب نسب دیکھا جاتا ہے، خاندانی ہسٹری دیکھی جاتی ہے، میڈیکل چیک اپ ہوتا ہے۔ کئی مراحل سے گزرنے کے بعد انھیں منتخب کیا جاتا ہے۔ یوسا بھی ان مراحل سے گزری تھی۔ اب شیخ عاصم کی طرف سے اسے کہا گیا تھا کہ وہ "سیف لائف" گزارے گی۔ تاکہ اسے دوبارہ "خدمت گزاری" کا اعزاز بخشا جا سکے۔ یعنی وہ کسی بھی مرد سے جسمانی تعلقات نہیں رکھے گی۔ شیخ عاصم کی قربت دوبارہ حاصل ہونے کی امید میں یوسا پچھلے چھ ماہ سے پابند زندگی گزار رہی تھی۔ جب کہ اس کی ساتھی لڑکیاں اپنی ضروریات کے مطابق اپنے اپنے "کام" سے لگ گئی تھیں۔ کوئی ڈانس کرنے لگی تھی، کوئی ماڈلنگ میں مصروف ہو گئی تھی، کوئی کسی فرم میں ملازم ہو گئی تھی اور کوئی ملازمت کی "آڑ" کے بغیر ہی کسی شوقین مزاج کی خواب گاہ میں سج گئی تھی۔ کام مختلف تھے لیکن "خدمت" ایک ہی تھی اور مخدوم بھی ایک ہی۔ وہی ہوس کار مرد جو مختلف بھیس بدل کر مختلف جگہوں پر شکار کی تاڑ میں بیٹھا تھا۔

اب یوسا ایک مشکل کا شکار تھی۔ دو چار ماہ پہلے اس کا باپ سنگر بھائی ایتھنز سے استنبول میں ایک کنسرٹ کرنے گیا تھا اور وہاں ایک کیس میں پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ بھائی کو چھڑانے کے لیے یوسا نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ اس سلسلے میں یوسا کے ایک "مطلوق" نامی عزیز نے اس کی بہت مدد کی تھی اور دوڑ دھوپ کے علاوہ رقم بھی پانی کی طرح بہائی تھی۔ یوسا کا بھائی تو چھوٹ گیا لیکن اب یوسا پھنس گئی تھی۔ اسے پکڑنے والا "رسی" اس کا مال دار عزیز "مطلوق" تھا۔ وہی صدیوں پرانا دستور، عورت کا استحصال، جسمانی طاقت کے بل پر، دولت کی طاقت کے بل پر اور معاشرے کی طاقت کے بل پر۔ اب یوسا کے پاس دو ہی راستے تھے۔ وہ "مطلوق" کی بات مان لے اور اس پچاس سالہ خرانٹ کی بیوی بن جائے یا پھر وہ بھی وہی کرے جو اس جیسی دوسری لڑکیاں کر رہی تھیں۔ یعنی اپنی خوب صورتی کے جال سے دولت کی مچھلیاں پکڑے اور ان مچھلیوں کی گٹھڑی باندھ کر مطلوق کے سر پر دے مارے۔ لیکن یہ دونوں راستے ایسے تھے جن پر قدم رکھنے کے بعد یوسا دوبارہ شیخ عاصم کی "بے انتہا منافع بخش قربت" حاصل نہیں کر سکتی تھی لہٰذا وہ چپکے چپکے پاکستان پہنچی تھی اور شیخ عاصم سے مل کر اپنا مسئلہ بیان کرنا چاہ رہی تھی۔ ریشمی تاریکی میں گزارے ہوئے کسی کمزور لمحے میں شیخ عاصم نے یوسا کو بتایا تھا کہ لاہور میں بھی اس کی ایک خفیہ رہائش گاہ موجود ہے۔ اسی رہائش گاہ کا کھوج لگاتی ہوئی یوسا تین دن پہلے ڈیفنس پہنچی تھی۔

وہ بول رہی تھی اور ساتھ ساتھ ڈرنک بھی کر رہی تھی۔ جوں جوں اس کی آنکھوں میں نشہ بڑھ رہا تھا اس کی زبان کی روانی ملتی جا رہی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ نشے میں ڈوبے ہوئے شخص میں لاکھ خرابیاں سہی لیکن اس میں یہ صفت ضرور ہوتی ہے کہ وہ سچ بولتا ہے، درحقیقت وہ سچ کے سوا کچھ بول ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے، نشے کی لہروں میں بہہ کر باہر آ جاتا ہے۔ یوسا بھی جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ سچ تھا۔ اس کے ذہن میں اتنی استطاعت ہی نہیں تھی کہ وہ سچ پر پردہ ڈال سکتا یا اسے توڑ موڑ کر پیش کر سکتا۔

میں نے تیزی سے سوچا۔ یہ لڑکی عاصم اور غزالہ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے، اس لڑکی کی آمد عاصم کا چین حرام کر دیتی۔ عاصم کا چین حرام ہوتا تو غزالہ بھی بالواسطہ متاثر ہوتی۔ وہ عاصم کو تندرست دیکھنے کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھی۔ عاصم کے چہرے پر مسرت دیکھ کر اس کا چہرہ بھی کھل اٹھتا تھا۔ عاصم کے لیے اس کے دل میں وہ تمام تر خیر خواہی موجود تھی جو ایک مشرقی بیوی کے دل میں اپنے شوہر کے لیے موجود ہوتی ہے۔ ان حالات میں یہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا کہ یوسا کی آمد کا علم ان دونوں کو ہوتا یا اس حوالے سے کوئی افسانہ بنتا۔

میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔ بہتر تھا کہ لڑکی کو شیخ عاصم تک پہنچنے سے پہلے ہی "روحی" واپس بھیج دیا جاسکے۔ لڑکی کو رقم کی ضرورت تھی۔ اس کا تقاضا تقریباً پانچ ہزار ڈالر کا تھا۔ پاکستانی کرنسی میں یہ اس وقت تقریباً ایک لاکھ روپے بنتے تھے' میرے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ میں یوسا کو یہ رقم فراہم کردیتا۔ عالم قریشی کے پاس بے تحاشا پیسہ تھا۔ جس کمرے میں' میں رہتا تھا وہاں کی الماریوں میں اکثر نوٹوں کی گڈیاں پڑی رہتی تھیں۔ یہ گڈیاں شاہ خرچ عالم قریشی نے میرے استعمال کے لیے رکھ چھوڑی تھیں۔ جیسے وہ کرنسی نہ ہوا اسٹیشنری وغیرہ ہو۔

میں نے اسی روز عالم قریشی سے ایک لاکھ روپے حاصل کیے۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ رقم میں کیوں حاصل کررہا ہوں لیکن وہ حاتم طائی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ کہنے لگا "بس یار' جب تمہیں معلوم ہے کہ تم یہ رقم کیوں حاصل کررہے ہو تو پھر مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم نے کبھی اپنے آپ سے اپنے خرچ کی وضاحت کی ہے۔"

اگلے روز میں نے پاکستانی کرنسی ڈالروں میں تبدیل کرائی اور ہوٹل جاکر یوسا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اسے تو رقم کے سوا کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بس اس نے اتنا پوچھا کہ شیخ عاصم صاحب سے میری ملاقات کہاں ہوگی۔ میں نے کہا "تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ شیخ صاحب نے رقم دے دی ہے۔ اب تم جاؤ' شیخ صاحب کا حکم ہے کہ اب جب تک وہ خود تم سے رابطہ نہ کریں' تم ان سے نہیں ملوگی۔"

اس روز شام کو وہ آفت کی پرکالا واپس چلی گئی تھی۔ وہ بڑی فتنہ ساماں لڑکی تھی۔ اس پر جوبن ٹوٹ کر برسا تھا اور انگ انگ سے مستی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی کہ چھو دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا' یہ لڑکی "MAN KILLER" ہے۔ وہ شیخ عاصم تک جا پہنچتی تو اسے دن میں تارے نظر آجاتے۔ ممکن تھا کہ شیخ کے اردگرد موجود اخبار والے کسی کہانی کی بو سونگھ لیتے اور ایک نیا اسکینڈل کھڑا ہوجاتا۔ اس لحاظ سے یوسا کی روانگی ایک نیک شگون تھا۔

دوسرے روز میں اسپتال پہنچا تو شیخ عاصم گہری نیند سو رہا تھا۔ غزالہ سائیڈ روم میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ رات شیخ عاصم کو ہلکا بخار ہوگیا تھا اور نیند نہیں آئی تھی۔ وہ ابھی ابھی سویا تھا۔ اسے جگانا مناسب نہیں تھا۔ ہم سائیڈ روم میں ہی بیٹھے رہے اور دھیمی آواز میں گفتگو کرتے رہے۔ غزالہ بولی "میں زریں گل کو مس کررہی ہوں۔ وہ لاہور رہیں مگر اس کے باوجود اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔"

میں نے کہا "اب اس کی شادی پر ہی ملاقات کریں گے۔ اللہ کرے عاصم جلد اچھا ہوجائے پھر سب پشاور چلیں گے' اس کے میٹھے چاول کھانے کے لیے۔"

غزالہ بولی "ہاں' عاصم بھی بہت انجوائے کریں گے۔ اب ان کی دلچسپیاں بہت بدل گئی ہیں۔ کئی پرانے معمولات بالکل ختم کردیے ہیں۔"

"واقعی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' شاہ جہاں!" غزالہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولی "میں بھی غیر محسوس طور پر انہیں بدلنے کی کوشش کررہی ہوں اور میں اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ ــــ"

غزالہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ یقیناً جھجک گئی تھی۔ میں نے کہا "تم نے بات مکمل نہیں کی؟"

وہ سر جھکا کر بولی "شاہ جہاں! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ یہ حقیقت ہے کہ عاصم کچھ عرصہ پہلے تک بہت آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ وہ نائٹ لائف کے عادی تھے۔ ان کے محل میں عورتیں بھی موجود تھیں لیکن عاصم نے بتدریج سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے دوست احباب اس تبدیلی پر حیران ہیں۔ شاید آپ بھی یہ سن کر حیران ہوں کہ عاصم نے اپنی رہائش گاہ میں موجود بار روم ختم کردیے ہیں اور آہستہ آہستہ تمام عورتوں کو بھی نکال دیا ہے۔ ان کا اپنے آپ سے اب یہ عہد ہے کہ محل میں کوئی اجنبی عورت داخل نہیں ہوگی۔"

میں غزالہ کی باتیں سن رہا تھا اور میری نگاہوں میں یونانی حسینہ یوسا کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کے بیانات غزالہ کی توقعات کی نفی کررہے تھے۔ یوسا نے میرے سامنے بڑی رازداری سے یہ انکشاف کیا تھا کہ شیخ عاصم نے تین چار لڑکیوں کے ساتھ خاص قسم کا برتاؤ کیا ہے اور انہیں باور کرایا گیا ہے کہ عشق کے دفتر میں حسن کی یہ "چھانٹی" عارضی ہے اور بہت جلد انہیں بحال کردیا جائے گا اور میں یہ جانتا تھا کہ یوسا نے جھوٹ نہیں بولا۔

اگر یوسا کی بات سچ تھی تو اس کا مطلب تھا کہ شیخ کے قول و فعل میں تضاد موجود ہے۔ معلوم نہیں وہ یہ دوغلا پن کیوں اور کس کے لیے اختیار کررہا تھا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ غزالہ کو یوسا کی آمد کے بارے میں سب کچھ بتادوں۔۔۔ لیکن پھر نجانے کیوں میں خاموش رہ گیا۔ مجھے

علیم الحق حقی انڈیا کے فلمی ستاروں کی داستان درونِ پردہ سناتے ہیں۔

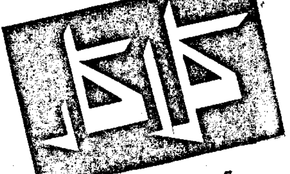

قیمت: -/۱۰۰ روپے

ایک کلاکار کی شیطانی ذہانت کی عبرت انگیز کہانی۔

وہ اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز ۲۰ عزیز مارکیٹ۔ اُردو بازار لاہور فون: ۷۲۴۷۴۱۴۰

سٹاکسٹ: علی بک سٹال نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون ۷۲۲۳۸۵۳

ہمت نہیں ہوئی کہ غزالہ کو یہ بات بتا کر اس کا ذہنی سکون برباد کروں۔ ویسے بھی یہ بڑا مناسب نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ غزالہ میری بات کا کیا مطلب لیتی۔ وہ یہ بھی سوچ سکتی تھی کہ میں اسے عاصم سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہاں یہ بات ہے کہ اسی روز جب غزالہ مجھے کچھ دیر کے لیے شیخ عاصم کے پاس چھوڑ گئی تو میں نے شیخ عاصم کو لڑکی کی آمد کے بارے میں بتا دیا۔ میری توقع کے عین مطابق شیخ نے لڑکی کو غائبانہ صلواتیں سنائیں اور کہا کہ وہ ان حرافہ لڑکیوں میں سے ہے جو اپنے تعلقات کو بلیک میلنگ کے لیے استعمال کرتی ہیں اور رقم بٹورنے کے چکر میں رہتی ہیں۔ شیخ عاصم نے تسلیم کیا کہ وہ لڑکی چند ماہ اس کے محل میں رہی تھی لیکن اب اس سے اس کا کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں۔

میں نے کہا "لیکن وہ تو کہتی ہے کہ شیخ صاحب نے مجھے پابند کر رکھا ہے اور عنقریب میں دوبارہ ان کی ملازمت میں آنے والی ہوں۔"

"ظاہر ہے کہ پیسے بٹورنے کے لیے اس نے ایسا ہی کچھ کہنا تھا۔ اب کہاں ہے وہ حرام زادی؟"

"میں نے اسے واپس بھیج دیا ہے۔"

شیخ نے میری آنکھوں میں دیکھا "کوئی پیسہ تو نہیں دیا تم نے اسے؟"

"وہ بہت پکا ارادہ لے کر آئی ہوئی تھی۔ کہتی تھی کہ شیخ صاحب سے ملے بغیر کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔ وہ ایک لاکھ میں جان چھوڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا، یہ مہنگا سودا نہیں ہے۔"

شیخ کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی لیکن بظاہر اس کے چہرے پر ناگواری طاری ہو گئی۔ وہ بولا "ایسی دو ٹکے کی لڑکیوں سے بلیک میل ہونا میں نے نہیں سیکھا۔ تم نے خواہ مخواہ پیسے ضائع کیے ہیں۔ بہرحال یہ تمہارا نہیں میرا نقصان ہے۔ تم نے تو اپنی طرف سے بھلائی کی ہے۔ میرا منیجر صبح تمہیں چیک دے دے گا۔"

میں نے کہا "یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو روپے دیے وہ دے دیے۔"

اس دوران میں غزالہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ہم خاموش ہو گئے۔

○☆○

دوسرے روز میں سورج کو دیکھنے اسپتال پہنچا۔ وہ اب "آئی سی یو" سے عام کمرے میں منتقل ہو چکی تھی۔ اس کی زبردست دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ اس کی دماغی حالت کے معائنے کے لیے لاہور کے دو معروف سرجنوں کے علاوہ کراچی سے ایک نیورو فزیشن اور ایک نیورو سرجن بھی یہاں پہنچ چکے تھے۔ ایک تو تجبیں کور کے آرڈرز تھے جس نے اسپتال کے عملے کو چوکس کر رکھا تھا، دوسری طرف ڈاکٹر حضرات ذاتی طور پر بھی مریضہ میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ بالکل مختلف نوعیت کا کیس تھا۔ تمام ٹیسٹ اور تجزیے بتا رہے تھے کہ مریضہ کی ذہنی حالت میں کوئی نمایاں نقص نہیں۔ اس کے باوجود وہ نارمل لوگوں کی طرح ایکٹ نہیں کر رہی تھی۔ کوئی انجانی کشش تھی جس نے اسے دائرۂ اثر میں لیا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والا "پردے" کا گہرا نشان بھی ایک معما تھا۔ وہ خواب آور دواؤں کے زیر اثر بھی رہتی تھی۔ جونہی دواؤں کا اثر کم ہوتا تھا وہ بیدار ہو جاتی تھی اور اپنے آپ کو جیسے انجانی چیزوں کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کرنے لگتی تھی۔ بہرحال پچھلے چند روز سے اس کی طبیعت میں کچھ افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سائیں ملنگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اسپتال کے اسٹاف سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک روز صبح سویرے ایک مفلوک الحال ملنگ نما شخص مریضہ کے سرہانے کھڑا پایا گیا تھا۔ وہ نرس کی غیر موجودگی میں پتا نہیں کس طرح کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ جب نرس نے اسے دیکھا تو وہ مریضہ کے قریب کھڑا تیزی سے کچھ پڑھ رہا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نرس چیختی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اسٹاف کے دو افراد کو لے کر واپس آئی تو ملنگ نما شخص موقع سے غائب ہو چکا تھا۔

یہ سو فیصد یقینی بات تھی کہ اسپتال کا عملہ جس ملنگ کا ذکر کر رہا تھا، وہ سائیں حالی ہی تھا۔ سائیں کی "آمد" اور "رفت" ایسی ہی بے سروپا ہوتی تھی۔

سورج کی تیمارداری کے دوران میں زریں گل سے بھی میری ملاقات ہو گئی۔ وہ سورج کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔ میرے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود اس نے مجھے فوراً پہچان لیا تھا اور اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ میں نے کہا "زریں کے بچے، میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ زیادہ ادھر ادھر مت گھومو۔"

وہ بولا "ام ادھر ادھر تو نہیں گھوم رہا استاد صیب، ام سورج کا خبر گیری کرنے آیا ہے۔ ام سچ کہتا ہے استاد صیب ام سورج کی طرف سے بڑا فکر مند ہے۔"

"اتنا درد تمہارے دل میں کب سے پیدا ہو گیا؟ تم تو اس کی ہوا پر تلواریں چلاتے تھے۔"

"وہ تو پہلے جیسا والا تھا استاد صیب۔ وہ کوئی عداوت والا نہیں تھا۔"

"اب پکا بھول جاؤ۔ اب تو تم بال بچے دار بننے والے ہو۔"

"آپ کے منہ میں گھی اور شکر استاد صیب" زریں جوش سے بولا "لیکن ام کچھ کرے گا تو بال بچے والا بنے گا نا۔ آپ نے امارا ہاتھ پاؤں باندھ دیا ہے۔ امارے اور کلثوم کے درمیان پولیس کھڑا کر دیا ہے۔ وہ تھانے دارنی دن رات پہرا دیتا ہے کلثوم کا۔ اس طرح تو قیامت تک بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ام بہت تنگ آ گیا ہے استاد صیب۔ یا تو کلثوم سے امارا شادی کرا دیں، یا پھر ام کو ایک خون معاف کر دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ام اس تھانے دارنی کو فائر مارے گا۔ ام کو نفرت ہو گیا ہے اس سے۔ وہ ہر وقت ام پر نظر رکھتا ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ وہ قسائی ہے اور ام اس کی دکان کے سامنے بیٹھا ہوا بلی ہے۔ ذرا موقع ملے گا تو ام اس کا بوٹی اٹھا کر بھاگ جائے گا۔ کلثوم کوئی بوٹی تو نہیں ہے۔ وہ جیتا جاگتا لڑکی ہے۔ وہ ام سے پیار کرتا ہے، ام پر بھروسا کرتا ہے۔"

"بے وقوف ہے نا۔" میں نے کہا۔

"کون؟"

"وہی تھانے دارنی۔" میں نے بات بدلی۔

زریں بولا "استاد صیب! اگر کلثوم وادی میں رہ جاتا تو اور بات تھا لیکن وہ امارے قریب رہ کر بھی ام سے اتنا دور ہے، یہ ام سے برداشت نہیں ہو گا۔"

"ہاں۔ میرے خیال میں اتنا بڑا ظلم تو قیس عرف مجنوں پر بھی نہیں ہوا تھا۔" میں نے زریں کے انداز میں تبصرہ کیا۔

"آپ بات کو مذاق میں مت ٹالیں۔ آپ ام کو اجازت دیں۔ ام سیدھا پشاور جائے گا۔ امارا چاچا ام سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ فوراً سے پہلے امارا شادی کا انتظام کرے گا۔"

"تم کیا ہم تم سے پیار نہیں کرتے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہاری شادی کا انتظام ہم کریں گے اور دھوم دھام سے کریں گے۔"

"کب؟" زریں کے منہ سے رال ٹپکتے ٹپکتے رہ گئی۔

"بس دو ہفتے کے اندر۔"

زریں کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

○☆○

پشاور کے ایک نواحی گاؤں ناکوٹ میں زریں گل کا چاچا رہتا تھا۔ ڈاکٹری ہدایات کی روشنی میں طے پایا تھا کہ زریں کی شادی ناکوٹ میں ہی ہو گی۔ ایک ہفتے کے اندر شیخ عاصم بھی صحت یاب ہو کر اسپتال سے فارغ ہو گیا۔ دو چار روز گھر میں آرام کرنے کے بعد وہ خود کو بالکل فٹ محسوس کرنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کچھ دن کھلی ہوا میں گھومے پھرے اور پاکستان کی کنٹری سائیڈ دیکھے۔ اس حوالے سے زریں گل کی شادی ایک سنہری موقع تھی۔

دوسری طرف عالم قریشی بھی زریں کی شادی کے حوالے سے بڑا پرجوش تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ لڑکی کے سرپرست کی حیثیت سے برات کی خاطر تواضع کے تمام اخراجات خود برداشت کرے گا۔ ایسے معاملوں میں وہ بڑی فیاضی کا رویہ اختیار کرتا تھا۔ اس نے اپنے ایک کارندے کو ہدایت دی تھی اور اس نے ایک دن کے اندر اندر دلہن کا مکمل جہیز تیار کرا لیا تھا۔ اس میں کپڑے گہنے اور گھریلو سامان شامل تھا۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں، سب سے بڑا روپیہ۔ جن انتظامات کے لیے بعض اوقات ایک زندگی بھی ناکافی ہوتی ہے وہ روپے کی موجودگی میں ایک دن کے اندر با سہولت انجام دیے جا سکتے ہیں۔ اچھا کھانے کی طرح عالم قریشی کو اچھا کھلانے کا بھی جنون تھا۔ برات کے کھانے کی ذمے داری عالم قریشی نے لاہور کے دو بہترین "باورچی بھائیوں" کے سپرد کر دی تھی۔ ان حضرات کو شادی سے تین دن پہلے پشاور پہنچ جانا تھا۔

شادی جمعے کے روز تھی۔ شیخ عاصم کی خواہش کے مطابق ہم لوگ سوموار کو ہی پشاور پہنچ گئے۔ ہم بذریعہ جہاز گئے تھے۔ شیخ عاصم اور غزالہ کے علاوہ زریں اور کلثوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ زریں گل کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کی شادی اتنی "بڑی" ہو جائے گی اور اس میں غیر ارادی طور پر زبردست دھوم دھام کا عنصر شامل ہو جائے گا۔ درحقیقت یہ سب کیا دھرا عالم قریشی ہی کا تھا۔ اب رہی سہی کسر شیخ عاصم کی آمد نے پوری کر دی تھی۔ ظاہر ہے، عاصم ایک وی آئی پی شخص تھا۔ وہ پانچ چھ روز ناکوٹ جیسے دور افتادہ گاؤں میں قیام کا ارادہ رکھتا تھا۔ اب ضروری تھا کہ گاؤں میں ہر قسم کی سہولیات میسر ہوں۔ شیخ عاصم کا ایک منیجر ہماری آمد سے بھی دو روز پہلے ناکوٹ پہنچ گیا تھا۔ وہ دو لگژری جیپ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ناکوٹ میں اس نے رہائشی سہولتوں کا جائزہ لیا تھا۔ راشن پہنچایا تھا اور شیخ عاصم کے خانساماں کے لیے

کچن وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔

ناکوٹ سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سو ڈیڑھ سو گھر ہوں گے۔ چھوٹا سا بازار بھی تھا۔ زریں کا بھائی بازگل خان زریں کی کاربن کاپی نظر آتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ تھی اور چہرے پر جھریوں کا نکھار تھا۔ اس کی دس بارہ کینال زرعی زمین تھی۔ وہ ہمارے قدموں تلے بچھا جا رہا تھا۔ زریں کے والد سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ خاموش طبع شخص تھا اور ویسے بھی کچھ ناراض ناراض لگتا تھا۔ بہرحال پٹھانوں کی روایتی مہمان نوازی اس میں بھی موجود تھی۔ ناکوٹ میں پہلی بار میں نے زریں کی والدہ اور دادی وغیرہ کو دیکھا۔

ہماری رہائش کا انتظام گاؤں کے ملک (سردار) کی حویلی میں کیا گیا تھا۔ ملک کا نام افسر خاں تھا۔ وہ شکار کا بے حد شوقین تھا۔ لہٰذا جب اسے معلوم ہوا کہ ہم یہاں مچھلی کے شکار کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ مسکراتا نہیں تھا۔ بس جب اس کی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں اور کنپٹیوں کے قریب جھریاں سی پڑ جاتی تھیں تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

اگلے دو روز خوب گزرے۔ صبح سویرے ہم جھیلوں پر گھومنے پھرنے نکل جاتے۔ ملک افسر خاں ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ ہم تیتر بٹیر وغیرہ شکار کرتے۔ کبھی کوئی پرندہ شکار ہو کر پانی میں گر جاتا تو زریں گل بے دریغ پانی میں چھلانگ لگاتا اور شکار نکال کر لے آتا۔ حالانکہ اس کام کے لیے افسر خاں کے کارندے بھی موجود ہوتے تھے۔ دراصل زریں آج کل بڑی "ہوائی شتنی" کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے تیرنے کا انداز بھی خوب تھا۔ وہ گیلی شلوار کے پائنچے باندھ کر رکھتا تھا۔ تیرنے سے پہلے پھونکیں مار مار کر تیزی سے شلوار میں ہوا بھرتا تھا اور پانی میں کود پڑتا تھا۔ غبارے کے مانند پھولی ہوئی شلوار اسے تیرنے میں مدد دیتی تھی۔ غالباً ان دنوں زریں بھی شلوار کی طرح پھول کر کپا ہو رہا تھا۔

ایک دن سہ پہر کو ہم واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ زریں نے شادی کی خوشی میں میوزک کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ یہ انتظام بالکل روایتی انداز کا تھا۔ گراموفون کے ذریعے ریکارڈ بجائے جا رہے تھے اور لاؤڈ اسپیکر سے گزر کر ان کی آواز پورے گاؤں میں گونج رہی تھی۔ زریں نے فخر سے سینہ تان کر کہا "استاد صیب! امارے بچپن کا خواہش تھا کہ جب امارا شادی ہو تو ہم پورے تین روز تک "ریکارڈنگ" بجائے۔ آج امارا خواہش پورا ہو رہا ہے۔ اب انشاء اللہ تین روز تک دن رات ریکارڈنگ بجے گا۔"

"بہت نیک خیال ہے لیکن گاؤں کے لوگ کہاں جائیں گے؟"

"کیا مطلب؟"

"اتنا شور۔ وہ تو پاگل ہو جائیں گے۔"

زریں ہنسا "وہ پاگل نہیں ہو گا جی۔ وہ تو بہت چوائے کرے گا۔"

"چوائے نہیں انجوائے۔"

"ہاں جی۔ یہی امارا مطلب ہے۔ یہ بڑا موسیقی پسند لوگ ہے اور پھر امارا انتخاب بھی تو دیکھو۔ یہ سارا گانا ام خود چنا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا "شادی کے موقع پر اس سے اچھے گانے بھلا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ابھی کون سا گانا لگا ہوا تھا؟"

"ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو یاد آئیں کبھی تو مت رونا۔ لیکن ابھی یہ گانا ختم نہیں ہوا۔ وہ بول ابھی باقی ہے۔"

"یار میں اس کی نہیں پچھلے گانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں وہ تھا۔ یہ دنیا یہ محفل امارے کام کا نہیں..... اور اس سے پہلے پاکستانی گانا تھا۔ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔ محبت کا جنازہ جا رہا ہے۔"

"ماشاء اللہ بہت خوب۔" میں نے کہا۔

زریں گل خوشی سے پھولا تا اندر چلا گیا۔

شادی سے اڑتالیس گھنٹے پہلے عالم قریشی بھی اپنے باورچیوں کے ساتھ ناکوٹ پہنچ گیا۔ اس کے آنے سے شادی کے ہنگاموں میں کام و دہن کی لذت بھی شامل ہو گئی۔ عالم قریشی نے اپنے باورچیوں کے کمالات پر ایسے ایسے چٹ پٹے اور لذیذ تبصرے کیے کہ سب معترف ہو گئے بلکہ ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ صرف باورچیوں کو دیکھ کر ہی ہمارے منہ میں پانی آنے لگا۔ زریں گل کی مہندی کی رات عالم قریشی نے ایک نئی روایت قائم کی۔ اس نے کہا "گوشت ووشت تو بہت کھا لیا ہے۔ آج ایک نئی چیز پکواتا ہوں۔" یہ نئی چیز مسور کی دال تھی۔ مغلیہ طرز سے بنائی گئی یہ مسور کی دال واقعی کھانے کی چیز تھی۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اور تو اور ملک افسر خاں بھی گلاس بھر بھر کر دال پیتا رہا۔ یہاں تک کہ نڈھال ہو گیا۔

ملک افسر خاں نے ہمارے منع کرنے کے باوجود

ناچ کا انتظام بھی کیا تھا۔ راگ رنگ کے لیے دو خوب صورت رقاصائیں منگوائی گئی تھیں۔ یہ کوئی پڑھی لکھی قسم کی فن کار لڑکیاں تھیں۔ غزلیں گا رہی تھیں اور بڑی سنجیدگی و متانت سے "باوقار" قسم کا رقص کر رہی تھیں۔ بہرحال ان کی خوب صورتی میں کلام نہیں تھا۔

عالم قریشی میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس پر ابھی تک اس مسالے والی مغلیہ دال کا نشہ طاری تھا۔ کہنے لگا "سچ بتانا یار! ایک طرف یہ مسور کی دال ہو، دوسری طرف بہترین قسم کا بھنا ہوا گوشت ہو۔ تم کس طرف جاؤ گے؟"

میں نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں دال کی طرف ہی جاؤں گا۔ تمہاری اس دال کے مقابلے میں گوشت کچھ بھی نہیں۔"

عالم قریشی نے زندگی سے بھرپور اپنا مخصوص قہقہہ لگایا پھر مزید لطف لیتے ہوئے بولا "اب بتاؤ، ایک طرف یہ ہرے کپڑے والی ناچتی کڑی (لڑکی) ہو اور دوسری طرف دال کی پلیٹ ہو تو پھر کس طرف جاؤ گے۔ ذرا تصور کرو۔ ذرا سوچو۔"

میں نے کہا "میں اس قسم کا بے ہودہ تصور کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"اچھا چلو اپنا تصور نہ کرو۔ کسی اور کے بارے میں سوچو۔ کسی اور کے سامنے یہ دونوں چیزیں ہوں تو وہ کس طرف جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بھوک پر منحصر ہے۔ کہ کس طرح کی بھوک ہے۔"

عالم قریشی نے قہقہہ لگایا "اچھا دونوں طرح کی بھوک ہو پھر؟"

میں نے کہا "میرا جواب اب بھی وہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہاری دال کے مقابلے میں "گوشت" کچھ بھی نہیں۔" میں نے گوشت پر زور دے کر کہا۔

وہ ایک بار پھر منہ کھول کر ہنسنے لگے "گوشت کا لفظ تم نے خوب استعمال کیا ہے۔" اس نے داد دی۔

مہندی کی رات زریں گل بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا اس کے دل کی مراد پوری ہونے والی تھی۔ قریباً ایک سال تک دن رات جس لڑکی کے خواب زریں نے دیکھے تھے وہ اس کی دلہن بننے والی تھی۔ اس عاشق مزاج نے یوں تو درجنوں عشق کیے تھے لیکن اس آخری عشق میں اس نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اس نے اتنی شدت سے کلثوم کو چاہا تھا کہ وہ اس کے لیے جان تک دینے کو تیار ہو گئی تھی۔ مثالی میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے محبوبہ کو [illegible] لے لیا تھا اور خود اس کے ساتھ بھی تو کچھ کم نہیں ہوئی تھی۔ وادی کی عبادت گاہ میں اسے اپنی سالی (ناشا) کے ہاتھوں سرعام پھینٹی لگی تھی اور ایک موقع پر تو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یعنی کلثوم نے بھی اسے گنیوں (نخرے سے) لیا تھا۔

راگ رنگ کی محفل میں اچانک میری نظر زریں گل پر پڑی۔ وہ بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ خوش تھا لیکن اب ایک دم افسردہ نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی "کیا بات ہے۔ تھوتھا کیوں لٹکا رکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "استاد صیب! کبھی کبھی امارا دل چاہتا ہے کہ امارا شادی میں کوئی بالکل فلمی قسم کا واقعہ ہو جائے۔"

"کیا مطلب۔ فلم میں تو ایسے موقع پر دلہن کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔"

"نہیں استاد صیب! ام چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی واقعہ ہو جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کوئی مجھے اغوا کر لے۔"

"اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ ام چاہتا ہے استاد صیب بلکہ ام سوچتا ہے کہ کتنا اچھا ہو اگر فلموں کا ایک مشہور سین آپ کے ساتھ بھی ہو جائے۔ فلموں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہیرو کے کسی دوست یا ساتھی وغیرہ کا شادی ہوتا ہے۔ ہیرو شادی میں آتا ہے۔ وہاں خوب صورت لباسوں والی لڑکیاں ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے۔ ان میں سے ہی کسی ایک لڑکی کی صورت میں ہیرو کو اپنا ماڈل مل جاتا ہے۔"

"ماڈل نہیں آئیڈیل۔"

"ہاں جی وہی۔ پھر وہ لڑکی ہیرو کا جند جان بن جاتا ہے اور کچھ ہی عرصے بعد ان کا شادی ہو جاتا ہے۔"

"کیا تم نے یہاں کوئی ایسی لڑکی دیکھی ہے جو میرا آئیڈیل بن سکے؟"

وہ بولا "آپ کے آئیڈیل کا بھلا ام کو کیسے پتا چل سکتا ہے۔ ویسے ادھر بڑے کمرے میں بہت سا لڑکی لوگ بیٹھا ڈھولک وغیرہ بجا رہا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی نظر آ جائے۔"

پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی کہ میں اٹھ کر زریں گل کے ساتھ چل دیا۔ لڑکی دیکھنے کی بات میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہیں تھی۔ ہاں بس شادی بیاہ کی مقامی

رسمیں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی پٹھان فیملی کی شادی میں میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

زریں گل میری آمادگی پر بہت خوش ہوا۔ وہ مجھے لے کر کشاں کشاں گھر کے اندر پہنچ گیا۔ یہ اس کے چچا کے محلے میں ہی ایک گھر تھا۔ یہ گھر عارضی طور پر دلہن کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا تاکہ برات آنے کی رسم ادا ہو سکے' ورنہ تو دلہن بھی اسی گھر میں مقیم تھی جہاں سے دلہا کی برات جانی تھی۔

نیم پختہ گھر کو خوب سجایا گیا تھا۔ باقاعدہ لائٹنگ بھی کی گئی تھی۔ گراسی لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ سارے انتظامات عالم قریشی نے کیے تھے۔ گھر کے اندر اور باہر عورتوں اور بچوں کی گہما گہمی تھی۔ اندر سے ڈھولک بجنے اور قہقہے گونجنے کی آواز آ رہی تھی۔ زریں گل ایک راہداری سے گزار کر مجھے ایک نیم تاریک کمرے میں لے آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ایک کھڑکی کھولی تو ڈھولک والے کمرے کا منظر میری نگاہوں کے سامنے کھل گیا۔ درجنوں خواتین اور لڑکیاں شادی کے گیت گانے میں مصروف تھیں۔ ان میں نوعمر بچیاں اور بچے بھی تھے۔ کلثوم کے سر زرد اوڑھنی تھی۔ نانگا پربت کی پُراسرار وادی کا خوب صورت ہیرا ناگوٹ کے اس مکان میں جگمگا رہا تھا۔ یہ محبت کی طاقت تھی۔ لڑکیاں پشتو اور اردو میں گیت گا رہی تھیں۔ ان میں غزالہ بھی شامل تھی۔ وہ ڈھولک کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اس نے گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ کلائیوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ ہاتھوں پر مہندی تھی۔ وہ تالی بجاتی تھی تو چوڑیاں دودھیا بلب کی روشنی میں جگمگا جاتی تھیں۔ میں سب کچھ بھول کر اسے دیکھتا چلا گیا۔ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی وہ۔ میں سوچنے لگا۔ وہ پہلے ہی ایسی تھی یا مجھ سے دور رہ کر ایسی لگنے لگی تھی۔ ایسے لمحوں میں غزالہ سے محرومی کا احساس بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔

زریں گل مسکراتے ہوئے بولا "استاد صیب' کوئی خاتون پسند آیا آپ کو؟"

میں اسے کیسے بتاتا کہ پسند تو آیا ہے لیکن وہ مجھ سے بہت دور ہے۔ کچھ دیر اس کمرے میں ٹھہر کر ہم واپس آ گئے۔

اگلے روز زریں گل کی شادی بخیر وخوبی انجام پا گئی۔ زریں گل کی برات پر اس کے یاروں دوستوں نے زبردست ہوائی فائرنگ کی۔ پٹاخے چھوڑے گئے اور آتش بازی ہوئی۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ عالم قریشی نے شادی کے کھانے میں گاؤں والوں کو بھی شریک کیا۔ گاؤں کے ہر گھر سے دو

افراد کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ ساہی صاحب بھی خصوصی طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے۔ اقبال (ساہی صاحب کی چھوٹی بہن) کسی کورس میں شرکت کے لیے انگلینڈ گئی ہوئی تھی ورنہ وہ بھی اس شادی میں ضرور شریک ہوتی اور سب سے زیادہ انجوائے کرتی۔

اگلے روز ولیمہ تھا۔ ولیمے کے کھانے کے بعد میں اور عالم قریشی حویلی کے ایک آراستہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ شیخ عاصم اور غزالہ بھی وہیں موجود تھے۔ لاہور روانگی کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ عالم قریشی کل واپس جانا چاہتا تھا لیکن غزالہ کا خیال تھا کہ ایک دن اور یہاں رہا جائے اور پھر زریں گل اور کلثوم کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے جایا جائے۔ اسی دوران میں ملک افسر خاں کا ایک کارندہ اندر آیا۔ اس نے سر جھکا کر اطلاع دی کہ کوئی شخص محترم شیخ عاصم سے ملنے آیا ہے۔ شیخ عاصم کو حیرانی ہوئی کہ یہاں اس سے ملنے کون آسکتا ہے۔

غزالہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ افسر خاں کا کارندہ ایک لمبے تڑنگے شخص کو لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں سونے کی چین تھی۔ عمر ستائیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ میں اس جواں سال شخص کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس کا نام شاہد ملتانی تھا۔ شاہد ملتانی چند سال پہلے تک اسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ اسی لیڈری کے دوران میں اس سے دو تین قتل ہو گئے تھے۔ ان جرائم نے اسے اسٹوڈنٹ لیڈر سے زبردست گینگسٹر بنا دیا تھا۔ اس نے باقاعدہ ایک گروہ رکھا تھا۔ اونچے لوگوں تک اس کی پہنچ تھی۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں شاہد نے اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ میں چونکہ تبدیل شدہ حلیے میں تھا لہٰذا شاہد ملتانی مجھے نہیں پہچان سکا۔ وہ بڑی بھلی انگلش بول لیتا تھا۔ اس نے شیخ عاصم سے کہا "عاصم صاحب۔ وطن سے ایک صاحب' آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کا ان سے فوری طور پر ملنا ضروری ہے۔"

"تم کون ہو؟" عاصم نے پوچھا۔

"میرا نام شاہد ملتانی ہے۔ جو صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں وہ چونکہ پاکستان میں بالکل اجنبی ہیں لہٰذا میں انہیں ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

"کیا نام ہے تمہارے صاحب کا؟"

"یہ سب کچھ آپ ان سے مل کر معلوم کر سکتے ہیں۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"وہ گاؤں سے باہر جیپ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان

[ان] کا خیال ہے کہ گاؤں سے باہر جا کر ان سے ملاقات کرنا [آپ] کے مفاد میں ہے۔"

مجھے اس معاملے میں کسی ہنگامے کی بو محسوس ہو رہی [تھی۔] غالباً یہ بو شیخ عاصم نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ شاہد [ملتان]ی سے بولا "میں تمہارے صاحب کا نام جاننا چاہتا ہوں۔ [نام] جانے بغیر میں کسی سے نہیں ملوں گا چاہے وہ امریکا کا صدر [ہی] کیوں نہ ہو۔"

شاہد ملتانی کے چہرے پر وہی سرخی نمودار ہوئی جو میں [نے] تہذیب یافتہ بدمعاشوں کے چہروں پر اکثر دیکھی تھی۔ وہ [ن]رم لہجے میں بولا "محترم عاصم صاحب' یہ ملاقات جتنی [آپ] کے مہمان کے لیے ضروری ہے اتنی ہی آپ کے لیے [بھ]ی ضروری ہے اور یہ بات بھی آپ کے ہی مفاد میں ہے کہ [مل]اقات یہاں نہ ہو۔"

شیخ عاصم بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا جو شاہد ملتانی کے [ب]ھاری لہجے کے اثر میں آ جاتا۔ وہ گرج کر بولا "تم مجھے میرا [بھ]لا سمجھانے والے کون ہوتے ہو؟"

شاہد ملتانی کی بھوری آنکھوں میں طیش بھری تند چمک [نمو]دار ہوئی۔ وہ ایک ہنگامہ پسند قاتل تھا۔ اس سے یہ توقع کی [جا] سکتی تھی کہ وہ ایک لمحے میں بڑے سے بڑا پھڈا کھڑا کر لے [گ]ا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا' میں نے ہاتھ کے اشارے [س]ے اسے روک دیا۔

"کہاں ہے تمہارا صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لوگ برساتی نالے کے پل پر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ [ی]ہ سامنے والی کھڑکی کھول کر آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ واقعی نشیب میں قریباً دو [ف]رلانگ کے فاصلے پر پہاڑی نالے کا پل نظر آ رہا تھا اور پل پر [ک]ھڑی دو دیو ہیکل جیپیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے شاہد ملتانی سے اردو میں کہا "دیکھو اس طرح سر [را]ہ کھڑے ہو کر بات کرنا کچھ مناسب نہیں ہے۔ تم ان لوگوں کو یہاں لے آؤ۔ ہم بند کمرے میں تسلی سے گفتگو کر لیتے ہیں۔"

"گفتگو یہاں نہیں ہو سکتی۔ گفتگو گاؤں سے باہر [ہو گی]۔" شاہد ملتانی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔ ایک بار اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لو۔"

شاہد ملتانی چند لمحے مخالف نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر [اس] نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک واکی ٹاکی نکالا اور باہر نکل [گی]ا۔ صحن کے ایک گوشے میں جا کر وہ واکی ٹاکی پر بات کرنے

لگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا رابطہ نیچے پل پر کھڑے افراد سے تھا۔ تین چار منٹ تک بات کر کے وہ ہمارے پاس واپس آ گیا۔

"نہیں جی۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا "اگر آپ کو بات کرنی ہے تو نیچے پل پر آنا ہوگا۔"

اب یہ معاملہ شیخ عاصم کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا "چلو آؤ۔" وہ غرا کر بولا۔

شیخ عاصم کے اٹھتے ہی اس کے مسلح گارڈز بھی اٹین شین ہو گئے۔ میں نے بھی قمیص کے نیچے ریوالور ٹٹولا اور سب کے ساتھ باہر آ گیا۔ شیخ عاصم کا چہرہ طیش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ دندناتا ہوا اپنی جیپ میں جا بیٹھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ شیخ عاصم کے مسلح گارڈز پہلے ہی اپنی نشست سنبھال چکے تھے۔ دو دوسری گاڑیاں بھی ساتھ چل پڑیں۔ ان میں ایک گاڑی کے اندر ہمارا میزبان ملک افسر خاں اور اس کے کارندے تھے۔

ہم پل پر پہنچے تو جیپوں میں موجود افراد باہر نکل آئے۔ ان میں تھری پیس سوٹ والا ایک شخص نمایاں تھا۔ اس کی شہد رنگ مونچھیں کسی سانڈ کے سینگوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ رنگ سرخ سپید اور آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس شخص کا تعلق شمال مغربی ترکی یا یونان وغیرہ سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال بھی بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ یہ خوبصورت سا خیال تھا۔ قریباً دو ہفتے قبل وہ مجھ سے ملی تھی اور پانچ ہزار ڈالر کی رقم لے کر گئی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے آگاہ کیا کہ نیلی آنکھوں والے اس شخص کا تعلق چینا یوسا والے رافعے سے ہے۔

اگلے تین چار منٹ میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ نیلی آنکھوں والا شستہ انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ اس نے شیخ عاصم کو اپنا نام طلوق بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ وطن سے صرف اس سے ملنے کے لیے پاکستان آیا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ وہ پچھلے چار روز سے لاہور میں تھا اور شیخ عاصم کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شیخ عاصم نے کہا "تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں کیا چاہ سکتا ہوں؟"

"جب تک تم بولو گے نہیں' مجھے کیا معلوم ہوگا۔" شیخ عاصم نے کہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں پہنچنے سے پہلے شیخ عاصم کے چہرے پر جو غضب ناکی نظر آ رہی تھی' وہ اب قدرے ماند پڑ

گئی تھی۔ شاید وہ طلوق نام کے اس شخص کو پہلے سے جانتا تھا۔ طلوق کے ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ اور چہرے پر کسی پرانے زخم کا نمایاں نشان تھا۔ طلوق کو دیکھ کر ایک نہایت طرار اور بھتہ باز قسم کے شخص کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا (یہی وہ شخص تھا جس نے یوسا کے بھائی کو پولیس سے چھڑانے میں مدد کی تھی)

طلوق نے کہا "جو میں جانتا ہوں' وہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ یوسا کو میرے حوالے کر دو۔"

"میں کسی یوسا کو نہیں جانتا۔" شیخ نے خشک لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں تم جاننا کسے کہتے ہو۔ جس کے ساتھ بستر میں سویا جائے اس سے بڑھ کر شناسا اور کون ہو سکتا ہے!"

"تم زبان سنبھال کر بات کرو۔ وہ ایک ڈانسر تھی۔ لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ چند دن میری رہائش گاہ میں رہی تھی اور بس۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا' دوسری لڑکیوں کے ساتھ ہی اسے بھی فارغ کر دیا گیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ اور تم مجھ سے یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔" شیخ کا پارا ایک بار پھر چڑھنے لگا "میں تم جیسے اٹھائی گیروں کے ساتھ بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔"

"ریلیکس مین ریلیکس۔" طلوق کے لہجے میں خوفناک دھیما پن تھا "تم مسلسل غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ یوسا صرف چند دن کے لیے تمہاری رہائش گاہ میں نہیں ٹھہری تھی' تم نے اسے اپنی فرم میں باقاعدہ ملازمت دلا دی تھی۔ مقامی نمائشی فرم کی بہت سی دوسری کاغذی ملازماؤں کی طرح وہ بھی تمہاری رکھیل بن گئی تھی اور یہ بھی غلط ہے کہ تم نے اپنی تمام رکھیلوں کو ہمیشہ کے لیے فارغ کر دیا ہے اور اب اللہ لوک بن گئے ہو۔۔۔ یہ صرف عارضی وقفہ ہے۔ تم نے کئی منظورِ نظر لڑکیوں سے وعدے کر رکھے ہیں کہ انہیں ملازمتوں پر بحال کیا جائے گا۔ یوسا بھی ان میں سے ایک ہے۔"

"بکواس بند کر بدبخت۔۔۔ تو مجھے جانتا نہیں ہے۔"

"میں تجھے بہت دور تک جانتا ہوں۔"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کر۔ ایتھنز کی گلیوں میں چھری لگانے والے لوہار کی یہ ہمت کہ میرے منہ لگے۔"

"اور کھجوروں کے پتوں سے ٹوکریاں بنانے والے خانہ بدوش کے بیٹے کی یہ جرأت کہ میرا حق چھینے۔"

دونوں طرف کے گارڈز نے رائفلیں سونت لیں۔ شیخ عاصم کے ساتھ ساتھ طلوق نامی شخص کا چہرہ بھی انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ شاہد ملتانی جینز نے طلوق کے بازو کو پکڑا تھا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ٹمپریچر نیچے لانے کے لیے شیخ عاصم اور طلوق کے درمیان آگیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ شاہد ملتانی اب میری طرف خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ طلوق نے غیض سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "شیخ! پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یوسا تیرے قبضے میں ہے۔ تیرے سوا وہ اور کہیں جا ہی نہیں سکتی۔"

"ہاں ابھی تو کہے گا کہ تیری ماں بھی میرے قبضے میں ہے۔" شیخ عاصم غرایا۔

یہی وقت تھا جب میں نے شاہد ملتانی کا ہاتھ ہولسٹر کی طرف بڑھتے دیکھا۔ معاملہ قابو سے باہر ہونے والا تھا۔ میں نے حتی الامکان پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور طلوق کی پیشانی پر رکھ دیا۔ یہ عمل پلک جھپکنے میں مکمل ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ کسی شخص کے جسم میں خفیف سی جنبش بھی ہوتی' ۳۸ بور کا سیاہ ریوالور زہریلے بچھو کی طرح طلوق کی پیشانی سے چپک چکا تھا "خبردار۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

شاہد ملتانی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ بہرحال دونوں طرف کے گارڈز حرکت کرنے سے باز نہیں رہے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کر لی تھیں۔ دونوں طرف کے گارڈز ایک دوسرے کی گولیوں کی زد میں آ گئے تھے اور سب سے زیادہ طلوق زد میں تھا لیکن ابھی گولی کسی نے نہیں چلائی تھی۔ ٹریگر پر میری انگلی کا ہلکا سا دباؤ دہکتے ہوئے سیسے کو ریوالور کے چیمبر سے طلوق کے کھوپڑے میں منتقل کر سکتا تھا۔

"رائفلیں پھینک دو۔" میں نے طلوق کے گارڈز سے گرج کر کہا۔

طلوق کے گارڈز دراصل شاہد ملتانی کے ساتھی ہی تھے۔ شاید ایک یا دو افراد طلوق کے ساتھ وہیں سے آئے ہوں گے۔

شاہد ملتانی کا رنگ متغیر تھا۔ یقیناً اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی تیزی سے تبدیلی آئے گی۔ وہ بولا "تمہاری طرف کے گارڈز رائفلیں پھینک دیں تو یہ بھی پھینک دیں گے۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد دونوں طرف کے

گارڈز نے رائفلیں گرا دیں۔ آخری موقع پر ایک ہوشیار گارڈ نے پھرتی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مجھ سے قریباً دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اندھے جوش میں وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن میری ٹانگ بروقت اس کے سینے پر پڑی۔ اس کا وہی حال ہوا تھا جو اس گیند کا ہوتا جو تیزی سے بیٹسمین کی طرف بڑھتی ہے لیکن پھر چھکے کی صورت میں باؤنڈری سے باہر جا گرتی ہے۔ بولر اور بیٹسمین دونوں کی قوت گیند کے خلاف استعمال ہو جاتی ہے۔ شرط صرف بروقت ضرب کی ہوتی ہے۔ گارڈ کی گردن پیچھے کی طرف اچھلا اور وہ ڈھلوان پر لڑھک کر نیچے کھائی میں جا گرا۔ اس عمل کے دوران میں میری توجہ ایک لمحے کے لیے بھی طلوق کی طرف سے نہیں ہٹی تھی۔

شاہد ملتانی بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا "تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

میں نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا "استاد جمالی کا نام سنا ہے؟"

شاہد ملتانی کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نمودار ہوئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بتدریج ماند پڑ گئی "اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ آپ ہیں تو کبھی یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو مزید پیچھے ہٹنے کی ہدایت کی۔ وہ سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ درحقیقت طلوق سمیت سب افراد کا دم خم شاہد ملتانی کی وجہ سے تھا' اب وہ ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا تو وہ کیا کھڑے رہتے۔ طلوق اگر کچھ کرنے کی سوچتا بھی تو کر نہیں سکتا تھا۔ ریوالور جان لیوا بچھو کے مانند اس کی پیشانی پر تھا۔

ماحول کا درجہ حرارت کم ہو گیا تو میں نے ریوالور طلوق کی پیشانی سے ہٹا لیا۔۔۔ میں' شیخ عاصم' طلوق اور شاہد ملتانی ایک جیپ میں آ بیٹھے۔ اس جیپ کی نشستیں اس طرح گھوم سکتی تھیں کہ "ڈرائنگ روم" کے سے انداز میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کی جا سکتی تھی۔ شیخ عاصم اور طلوق کے درمیان دس پندرہ منٹ تک نہایت تلخ گفتگو ہوئی۔ یہی غنیمت ہے کہ دوبارہ اسلحہ وغیرہ نہیں نکلا۔ دونوں اپنے اپنے موقف پر اڑے ہوئے تھے۔ طلوق کو یقین تھا کہ اس کی منگیتر (وہ یوسا کو منگیتر ہی بتا رہا تھا) شیخ عاصم کی تحویل میں ہے جب کہ شیخ عاصم اس دعوے کو بے بنیاد اور طیش انگیز قرار دے رہا تھا۔

ایک لاحاصل تکرار کے بعد نہایت تناؤ کے ماحول میں طلوق نامی وہ شخص شاہد ملتانی اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس چلا گیا۔

○☆○

اگلے روز رات کو ہم بھی لاہور واپس پہنچ گئے۔ زریں گل اور کلثوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ لاہور میں زریں گل اور کلثوم میرے ساتھ عالم قریشی کے پڑوس والی کوٹھی میں ٹھہرے۔ عالم قریشی نے ایک بیڈ روم اور ایک سٹنگ روم ان دونوں کے لیے کھلوا دیا تھا۔ اب ایک ملازم بھی ہمارے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ الٰہ دین کے جن کی طرح ہر حکم سیکنڈوں میں بجا لاتا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے زریں گل میرے پاس آیا تو کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی اس طرح خاموش نظر آتا تھا۔ وہ شخص جو ہر وقت مسکراتا رہتا ہو' اپنی دانستہ و نادانستہ حماقتوں سے دوسروں کو خوش رکھتا ہو' وہ خاموش دکھائی دے تو یہ خاموشی بہت نمایاں نظر آتی ہے اور زریں گل تو ایسا شخص تھا جس کی میں رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے لکڑی کے باندر' تھوبڑا کیوں لٹکا ہوا ہے؟"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "استاد صیب! کلثوم کا معصومیت ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ وہ ہمارے پاس رہ کر بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو' اس نے سہاگ رات کو ہمارے ساتھ بڑا ناانصافی فرمایا۔ ام کمرے میں پہنچا تو وہ ہمارے آٹھ سالہ بھتیجے کو ساتھ لے کر بیٹھا ہوا تھا بلکہ گود میں لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ ام نے بہت کوشش کیا کہ بھتیجا صیب جا کر اپنا کام کرے اور ام کو اپنا کام کرنے دے لیکن کلثوم اس کو ایسا جکڑ کر بیٹھا کہ اٹھنے ہی نہیں دیا۔ رات کو وہ اسے ساتھ لے کر سویا رہا۔ اگلے روز ام نے بھتیجا صیب کو واپس بھیج دیا اور سوچا کہ آج میدان صاف ہے لیکن اس رات دیکھا تو کلثوم اپنے کمرے میں ہی نہیں تھا۔ دوسرے کمرے میں دیکھا تو وہ ہماری اماں جان کے ساتھ لپٹ کر سویا ہوا تھا۔۔۔ یہ بات نہیں ہے استاد صیب کہ وہ ام سے پیار نہیں کرتا' وہ ام پر جان چھڑکتا ہے لیکن ساتھ ساتھ ام سے ڈرتا بھی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں' ام میں کوئی ڈرنے والا بات ہے۔ کسی قسم کا شک نظر آتا ہے ہماری شرافت میں۔ ام تو اتنا مہان آدمی ہے۔ ایک مرتبہ ہمارا دادا۔۔۔"

"یار' دادا کی بات چھوڑو۔۔۔ اب بتاؤ۔۔۔ اب تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ اب تو تم اسے یہاں لے آئے ہو۔ یہاں

تمہاری محبت کا راستہ روکنے والا کون ہے؟"

"وہ بہت احتیاط کرتا ہے جی۔ رات اس نے عشا کے فوراً بعد اندر سے کنڈی لگالیا تھا۔ ام نے بہت درخواستیں کیا لیکن اس نے نہیں کھولا پھر ام کو ڈر پیدا ہوگیا کہ کہیں وہ رونے ہی نہ لگ پڑے۔ لہٰذا ام تین گلاس ٹھنڈا پانی پی کر برآمدے میں سوگیا۔"

زریں گل کی رونی صورت دیکھ دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ ہم تھوڑی دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ میں نے زریں گل کو تسلی دی کہ میں عالم قریشی سے کہوں گا۔ اس کی "پھپھولی" بڑی تیز طرار عورت ہے۔ وہ کلثوم سے مل کر اسے سمجھاوے گی کہ وہ تمہاری درخواستیں رد نہ کرے۔ زریں خوش نظر آنے لگا..... پھر گفتگو کا رخ شیخ عاصم کی طرف مڑ گیا۔ زریں گل سنجیدگی سے بولا "استاد صیب! ام کو تو غزالہ بی بی کا بہت خیال آرہا ہے۔ ان کو کتنا شرمندگی ہوگا یہ باتیں سن کر۔"

"کون سی باتیں؟"

"وہی جو پشاور میں ہوئی۔ اس شخص (طلوق) نے شیخ عاصم پر الزام لگایا ہے کہ وہ دس دس عورتیں اپنے پاس رکھتا تھا اور اب بھی وہ پوری طرح ایسی خرمستیوں سے پیچھے نہیں ہٹا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ یہ جھگڑا سب کے سامنے نہ ہوتا اور شیخ صیب کی عزت میں فرق نہ پڑتا۔"

"اس کی عزت میں اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔" میں نے کہا "یہ لوگ وی آئی پی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس قسم کے واقعات کی حیثیت معمولی ہوتی ہے۔"

"مگر پھر بھی استاد صیب! غزالہ بی بی کا ذہن تو وہی ہے جو امارا اور آپ کا ہے۔ وہ اپنے شریکِ زندگی کو نیک نام اور شرافت کا پتلا دیکھنا چاہتا ہوگا۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے۔"

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف غزالہ تھی۔ وہ بولی "آج رات کا کھانا آپ ہماری طرف کھائیں گے۔ یہ ایک طرح سے زریں گل اور کلثوم کی شادی کی دعوت بھی ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ عاصم سے پوچھیے گا۔" وہ بولی "آٹھ بجے تک آپ ضرور آجائیں اور اپنے دوست عالم قریشی کو بھی لایئے گا۔"

شام کو ہم عالم قریشی کی گاڑی میں ڈیفنس کے لیے روانہ ہوئے۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن شام سے پہلے خود عاصم نے بھی فون کردیا تھا اور آنے کی تاکید کی تھی۔

اس قسم کی گھریلو مصروفیات اور سماجی میل جول کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں تو جرم و سزا کی دلدل میں گردن تک دھنسا ہوا شخص تھا۔ میں اٹک جیل سے فرار ہوا تھا اور اب پیرول پر رہا تھا۔ قانونی پھندے کے علاوہ دشمنوں کے بے شمار پھندے بھی میری گردن کے اردگرد جھول رہے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ موت ایک بہت بڑا پرندہ ہے جو ہر وقت مجھ پر سایہ فگن رہتا ہے۔ میں جس شخص سے ملتا ہوں وہ بھی اس پرندے کے سائے میں آجاتا ہے۔

میں عالم قریشی کے ساتھ ایک شیورلیٹ کار کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ زریں گل اور کلثوم پیچھے تھے' کبھی کبھی دونوں کھسر پھسر بھی کرنے لگتے تھے۔ زریں گل کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ چپ چاپ فلمی اشتہاروں والا صفحہ کلثوم کو دکھا رہا تھا۔ جیسے وہ اشتہاروں کا صفحہ نہ ہو "توجہ دلاؤ نوٹس" ہو۔ اچانک وہ چونک کر بولا "یہ دیکھئے استاد صیب! شیخ صیب کے بارے میں خبر بھی آیا ہے۔"

میں نے اخبار دیکھا۔ اندرونی صفحے پر واقعی شیخ عاصم کے حوالے سے ایک دو کالمی خبر موجود تھی۔ لکھا تھا "پشاور کے نواحی گاؤں میں امارات کے رئیس زادے کا نامعلوم افراد سے جھگڑا۔"

سرخی کے نیچے بڑھا چڑھا کر تفصیل لکھی گئی تھی کہ "راشد بن ارشد قتل کیس" کے حوالے سے مشہور ہونے والے شیخ عاصم کا جھگڑا کچھ نامعلوم افراد سے ہوا ہے۔ ان افراد کا تعلق دبئی سے تھا۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ شیخ عاصم بن ارشد نے یوسا نامی ایک یونانی لڑکی اپنی ناجائز تحویل میں رکھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کے تنازع پر دونوں گروپ میں شدید ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

شیخ عاصم کی نجی زندگی اور اس کی رنگین مصروفیات کی ایک جھلک بھی اس خبر میں موجود تھی۔ پریس کو تو خبر بنانے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔ پتا نہیں یہ خبر پریس تک کیسے پہنچی تھی۔ شیخ سے اختلافات ہونے کے باوجود مجھے یہ خبر دیکھ کر افسوس ہوا۔ اس خبر میں پگڑی اچھالی گئی تھی اور پگڑی کسی کی بھی ہو' قابلِ عزت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی پگڑی تھی جو غزالہ کا شوہر تھا۔ جسے وہ اپنی عزت سمجھتی تھی۔ میں نے اخبار پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

کوٹھی کے کیاؤنڈ میں شیخ عاصم نے خود ہمارا استقبال کیا۔ غزالہ بھی قیمتی ساڑی میں وہاں موجود تھی۔ ہم نشست گاہ میں آبیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ کلثوم توجہ کا مرکز تھی۔ وہ اردو کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کرنے کے قابل ہوگئی تھی اور اپنی ہر بات انہی الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ کوشش دلچسپ صورتِ حال پیدا کردیتی تھی۔ سب بے ساختہ مسکرانے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ ہماری مسکراہٹیں دیکھ دیکھ کر کلثوم جھینپ سی گئی تو غزالہ اسے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد عالم قریشی خوراک اور اس کے اثرات کے بارے میں طویل لیکچر دینے میں مصروف ہوگیا۔ شیخ عاصم بھی خوش دلی سے گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ دو تین روز پہلے جو ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا اس کے اثرات شیخ کی گفتگو یا تاثرات میں بالکل نظر نہیں آتے تھے۔ دو ہی دن میں وہ جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔

کھانا بہت شاندار تھا۔ شیخ عاصم نے بے حد تکلف کیا تھا۔ پاکستانی ڈشوں کے علاوہ چند عربی ڈشیں بھی تھیں۔ شیخ عاصم بہت کھل مل کر باتیں کررہا تھا۔ خاص طور پر میرے ساتھ اس کا رویہ بہت انسیت کا تھا۔ وہ اپنے خاندانی پس منظر اور نجی زندگی کے حوالے سے بے تکلف باتیں کررہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے قریب آنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش کررہا ہے۔

ہم کھانا کھا کر جانے کی تیاری کررہے تھے جب اتفاقاً شیخ عاصم کا ایک مہمان بھی آگیا۔ یہ ایک دراز قامت خوبرو عربی نوجوان تھا۔ یہی عاصم کا وہ ایاز نامی بھتیجا تھا جس کے رشتے کی بات اس نے میرے ساتھ کی تھی۔ یہ نوجوان خندہ پیشانی کے ساتھ سب سے ملا۔ عاصم نے مجھ سے خصوصی طور پر اس کا تعارف کرایا۔ نوجوان کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ اس چمک کو ذہانت کے ساتھ منسوب کیا جاسکتا تھا اور حد سے بڑھی ہوئی تیزی طراری کے ساتھ بھی..... بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ یہ نوجوان اتفاقاً آگیا ہے' ویسے یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ کوئی پلاننگ ہو۔

بہرحال نوجوان کے ساتھ مل کر میری طبیعت مکدر ہوگئی اور شیخ عاصم کے گھر باقی کے پانچ دس منٹ میں نے بیزاری کے عالم میں گزارے۔

O☆O

اگلے روز سہ پہر کے وقت غزالہ کا فون آگیا۔ زریں گل اور کلثوم کا حال احوال پوچھ کر بولی "شاہ جہاں! ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟"

"ہاں..... کہو۔"

"ایاز آپ سے ملنا چاہتا ہے..... وہ آپ سے بڑا متاثر ہوا ہے۔ خاص طور سے گلگت کے سفر میں آپ سب کے ساتھ جو حالات پیش آئے ہیں وہ اس کے لیے حیرت انگیز ہیں۔ وہ آپ کی زبان سے کچھ واقعات سننا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ....."

"ہاں ہاں کہو۔"

"وہ سروج کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ بڑا تجسس ہے اسے اس بارے میں۔ دراصل یونیورسٹی میں سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی اس کے پسندیدہ مضمون رہے ہیں۔ داوی کے بارے میں حیران کن باتیں سن کر وہ بڑا "سول ویٹ" ہوا ہے۔"

"ہاں..... ایسا تو ہوتا ہے۔"

"وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"بھئی' آج تو مجھے دو کام کرنے ہیں۔ اگر کل وقت مل گیا تو میں فون کروں گا۔"

"کہیں آپ ٹالنے کی کوشش تو نہیں کررہے.....؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے....." چند لمحے لائن پر خاموشی رہی پھر میں نے کہا "عاصم اب کیسا ہے؟"

"دو تین روز کچھ بجھے بجھے سے رہے ہیں۔ اب ٹھیک ہیں۔"

"بجھے بجھے سے کیوں؟"

"وہی جو بات ہوگئی تھی گاؤں میں۔"

"جھگڑے والی بات؟"

"ہاں..... کتنے افسوس کی بات ہے کہ لوگ "کاروباری مقابلے" کو ذاتی دشمنی بنالیتے ہیں اور پھر اپنے مخالف پر بے دریغ کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں۔"

"کاروباری مقابلہ؟"

"ہاں..... یہ طلوق نام کا شخص دبئی میں عاصم کا کاروباری حریف بھی رہا ہے۔ کسی وقت یہ ذاتی فائدے کے لیے عاصم کے آگے پیچھے گھومتا تھا' اب کیسے کیسے بے ہودہ الزام لگا رہا ہے۔ یہ ذاتی عناد کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے شاہ جہاں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یوسا نامی اس لڑکی کا کوئی وجود نہیں ہے؟"

"میرے خیال میں تو یہ بے بنیاد بات ہے..... اگر اس کی کوئی بنیاد ہے بھی تو عاصم اب اس زندگی سے بہت دور آچکے ہیں۔ وہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔"

میرے ہونٹوں پر بے ساختہ افسردہ سی مسکراہٹ آگئی۔ غزالہ کو کیا معلوم تھا کہ میں یوسا نامی لڑکی سے خود مل چکا

ہوں۔ نشے کی حالت میں وہ لڑکی مجھ پر اپنا راز روزِ روشن کی طرح کھول چکی ہے۔ میں نے غزالہ کو یہ سب کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ شیخ عاصم پر اندھا اعتماد کر رہی تھی۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی تو اسے بے حد تکلیف ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ شاید مجھے بھی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

اس رات میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی مجھے لگتا کہ شیخ عاصم کے بارے میں میرے سارے اندیشے غلط ہیں۔ وہ واقعی بہت تبدیل ہو چکا ہے اور زندگی کو نئے ڈھنگ سے گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ شیخ عاصم کا بہروپ ہے اور غزالہ ایک بہروپ سے محبت کر رہی ہے۔ وہ تباہی کے ایک عمیق گڑھے کی طرف بڑھ رہی ہے اور میں بے بسی سے اسے دیکھ رہا ہوں پھر میرا ذہن مختلف زاویے سے سوچنے لگا۔ اگر غزالہ ایک عمیق گڑھے کی طرف بڑھ رہی ہے تو اس میں کس کا قصور تھا۔ یقیناً اس میں میرا قصور بھی تھا۔ میں نے ایک عرصے تک ہٹ دھرمی کا دامن بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔ اس ہٹ دھرمی نے غزالہ کے لیے میری طرف آنے والے تمام راستے بند کر دیے تھے پھر اسے کسی طرف تو جانا ہی تھا کیونکہ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔ حالات اسے شیخ عاصم کی طرف لے گئے تھے۔ اب وہ اس کی بیوی تھی اور مشرقی بیوی کئی قسم کے جبر کا شکار ہوتی ہے۔ کچھ اندرونی جبر ہوتے ہیں اور کچھ بیرونی۔۔۔ غزالہ کھلی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ سری لنکا میں اس کی بیماری کے دوران شیخ عاصم نے اس سے کیا سلوک کیا تھا۔۔۔ وہ اسے جاں بہ لب چھوڑ کر سیر و سیاحت کے لیے چلا گیا تھا۔ شیخ عاصم کی اس سے بڑی پرکھ اور کیا ہو سکتی تھی مگر غزالہ نے ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے خود کو ایک بار پھر شیخ عاصم کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک بیوی کی حیثیت سے یہ اندھا اعتماد اس کی مجبوری تھا۔ اس اندھے اعتماد میں اچھنوں کی "آس" ایک کرن کی طرح چھپی ہوئی تھی۔

دو روز بعد غزالہ کے پیہم اصرار پر ایاز سے ملاقات کرنا پڑی۔ وہ بڑی اچھی انگریزی بولتا تھا۔ تاہم اس انگریزی میں عربی پن صاف جھلکتا تھا۔ وہ (ذ) اور (ث) کو بالترتیب (د) اور (ت) سے بدل دیتا تھا۔ یہ بالکل درست ہے کہ وہ مجھے عام عربی نوجوانوں سے قدرے مختلف نظر آیا۔ اس میں خوش اخلاقی موجود تھی اور گفتگو سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ "وادیِ موت" میں پیش آنے والے واقعات میں بے حد دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ ایک ایک بات کرید کر پوچھنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ اس نے ماہر النفسیات اور اس طرح کے دیگر علوم کے بارے میں بھی بات کی، تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ اس حوالے سے اس کی معلومات زیادہ گہری نہیں ہیں۔ دفینے اور نوادرات کے حوالے سے بھی ایاز کے ساتھ سرسری سی گفتگو ہوئی۔

اگلے روز وہ پھر مجھ سے ملنے میری قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نہایت قیمتی تحفہ بھی لایا تھا۔ یہ شیشے کے خوب صورت کیس میں بند دو ننھے منے کچھوے تھے۔ بہ مشکل پانچ پانچ گرام وزن رہا ہوگا ان کا لیکن خوب صورتی بے مثال تھی۔ ایاز نے بتایا کہ اس طرح کے چند نایاب کچھوے اس نے سنگاپور کے آکشن میں خریدے تھے۔۔۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایسی چیزوں کا شوق نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو ایسی چیزوں کے لیے گھر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال اس کے مسلسل اصرار پر میں نے یہ تحفہ رکھ لیا اور زریں گل کے حوالے کر دیا۔ اس روز ایاز تین چار گھنٹے میرے پاس بیٹھا رہا۔ وہ گیا تو زریں گل میرے پاس کھسک آیا "استاد صیب! یہ لڑکا کون ہے؟"

"شیخ عاصم کا بھتیجا ہے۔"

"کہیں یہ وہی تو نہیں جس کے بارے میں ایک مرتبہ شیخ عاصم نے بات کیا تھا؟"

"ہاں۔ وہی ہے۔"

زریں سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

زریں گل بولا "امارا دادا فرماتا تھا' اچھوں سے برے اور بروں سے اچھے پیدا ہوتے ہیں۔ اب اس لڑکے کو ہی دیکھیں۔ یہ شیخ عاصم جیسے آدمی کا بھتیجا ہے لیکن شیخ سے بڑا مختلف ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے دادا نے یہ نہیں کہا تھا کہ اتنی جلدی کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے؟"

اتنے میں کلثوم بھی وہاں آ گئی۔ وہ زرق برق گلابی لباس میں تھی۔ عالم قریشی نے اسے بیٹی کی طرح رخصت کیا تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ گہنوں سے لاد دیا تھا۔ وہ ہم دونوں کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ انداز میں ایک شرم آمیز سادگی تھی۔ میں نے زریں گل سے پوچھا "کیسی جا رہی ہے تمہاری ازدواجی زندگی؟"

وہ بولا "استاد صیب! تھوڑا سا فرق پڑا تو ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"پہلے تو یہ ام سے جنگلی ہرنی کی طرح بدکتا تھا' اب پاس

بیٹھنے لگا ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ اپنے حسن کے باغ میں سے تھوڑا تھوڑا پھل توڑنے کا اجازت ام کو دے رہا ہے۔"

"اوئے باندر! تو تو شاعر ہو گیا ہے۔"

"ہاں جی۔ ایک پٹھان اوپر سے شاعر۔۔۔ اب امارا دیوانگی کا اندازہ آپ خود فرمالیں۔ امارا تو دل چاہتا ہے کہ ام ایک ہی رات میں پورا "دیوان" لکھ دے کلثوم کے اوپر لیکن یہ تو ایک غزل لکھنے کی اجازت بھی نہیں دے رہا۔ بس ایک دو شعروں پر ٹرخا رہا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

کلثوم کو ہماری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ بڑی معصوم لاتعلقی سے کھڑی تھی اور شیشے کے کیس میں خوب صورت کچھوے دیکھ رہی تھی۔

زریں بولا "آپ کی طرف سے یہ کچھوے پا کر ام بہت خوش ہوا ہے۔ پتا ہے کیوں؟"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ام ان کو اپنے کمرے میں رکھے گا۔ وہاں پر یہ دونوں آپس میں پیار محبت فرمائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو دیکھ کر کلثوم کو بھی عقل آ جائے۔ یہ بالکل نکما ہے۔ آپ کو پتا ہے نا کہ ایک دفعہ اُدھر "وادی" میں ایک مرتبہ صاحب۔۔۔"

"ہاں ہاں' بہت اچھی طرح پتا ہے۔" میں نے بیزاری سے زریں کی بات کاٹی "اب تو جا اور ان کچھوؤں کو بھی لے جا۔"

○☆○

اگلے چار پانچ روز میں ایاز سے مزید ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ خود عاصم اور غزالہ بھی آئے پھر ایک روز فون پر غزالہ سے طویل بات چیت ہوئی۔ غزالہ خلوصِ دل سے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ عاصم کی سوچ اور مزاج میں زمین آسمان کا فرق آ چکا ہے۔ وہ اب ایک نئے ڈھنگ سے جینا چاہ رہا ہے۔ وہ ایاز کے اخلاق کی بھی تعریف کرتی رہی۔

غزالہ جو کچھ کہہ رہی تھی' خلوصِ نیت سے کہہ رہی تھی لیکن جتنا میں دنیا کے بارے میں جانتا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے چہروں کے ایسے روپ دیکھے تھے کہ اب کسی چہرے پر اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک روز اچانک مجھے یاد آیا کہ عاصم کے ایک بہت پرانے کاروباری حریف عشارب اینڈ کمپنی کا منیجر الطاف ایک "کوآپریٹو" شخص ہے اور اس سے عاصم کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ الطاف "عشارب کمپنی" کی ایک پاکستانی برانچ کا منیجر تھا۔ یہ برانچ لاہور ہی میں تھی۔ معمولی کوشش سے مجھے اس کا فون نمبر مل گیا۔ میں نے فون کیا اور الطاف سے رابطہ قائم ہو گیا۔ پانچ دس منٹ رسمی گفتگو ہوئی پھر میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے الطاف سے عاصم کے بھتیجے ایاز کا ذکر کیا۔ وہ حیرت انگیز طور پر ایاز کے بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ امارات میں ایاز واقعی ایک نیک نام نوجوان ہے۔ اپنے مرحوم باپ کی طرح اسے "وائٹ مین" کہا جاتا ہے اور اس کا کبھی کوئی اسکینڈل بھی نہیں بنا لیکن یہ سب کچھ ویسا ہی نہیں جیسا نظر آتا ہے۔ ایاز نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ یورپی ممالک اور امریکا میں گزارا ہے۔ وہ جب باہر جاتا ہے تو ایک رنگین مزاج شہزادہ بن جاتا ہے۔ امارات میں اس کا کردار یورپ والے کردار سے بالکل مختلف ہے۔

جو کچھ ایاز کے بارے میں معلوم ہوا وہ میری توقعات کے خلاف نہیں تھا۔ جب بندے کے پاس دولت ہو' جوانی ہو اور ماحول ہو تو قدموں کا سنبھلے رہنا مشکل ہو جاتا ہے پھر ایاز کا تعلق جس خانوادے سے تھا وہاں تو ایک ہی بہن شرافت ہوتا ہے۔

ایاز کے بارے میں جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں وہ کسی انکشاف کے زمرے میں نہیں آتی تھیں' بس میرے خیالات کی تصدیق ہوئی تھی۔ شیخ عاصم میرے لیے قابلِ اعتبار پہلے تھا نہ اب تھا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ غزالہ کا مستقبل مجھے گہری تاریکیوں میں غرق ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کوئی نادان لڑکی نہیں تھی۔ ایک ذہین ڈاکٹر تھی۔ زندگی کے نشیب و فراز سمجھتی تھی لیکن شیخ عاصم نے اسے یوں اپنے جال میں جکڑا تھا کہ وہ مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔ کبھی کبھی دل میں آتا کہ اطمینان سے بیٹھ کر غزالہ کو سمجھاؤں۔ شیخ عاصم کے بارے میں جو کچھ میرے دل میں ہے سب کچھ اس کے گوش گزار دوں لیکن پھر خیال آتا کہ پتا نہیں غزالہ میری اس کوشش کو کیا معنی پہنائے گی۔ اس بات کا بہت ہی کم امکان تھا۔ وہ میرے سمجھانے پر کچھ سمجھ جائے اور یہ مجھے سمجھانے والی بات ہی نہیں تھی۔ یہ تو اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ وہ سراپا مشرقی عورت تھی۔

پھر بھی کبھی ایسا ہوتا کہ میں اپنے ہی اوپر شک کرنے لگتا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا۔ یعنی میں شیخ عاصم کا رقیب تھا۔ اسی رقابت کے سبب شیخ عاصم کی ذات کی ہر برائی مری نگاہوں میں کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

ایک روز میں اسپتال میں سروج کو دیکھ کر واپس آرہا تھا۔ نسر کے ساتھ ساتھ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میرا ذہن خیالوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک چونکا دینے والا خیال آیا۔ کچھ روز پہلے نامعلوم افراد کی طرف سے مجھ پر حملہ ہوا تھا۔ اس حملے میں ایک نرس بھی شدید زخمی ہوگئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس حملے کے پیچھے بھی شیخ عاصم ہی کی کوئی گہری سازش ہو۔ میں نے اس بارے میں سوچا تو میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اس حملے کے جو ملزم پکڑے گئے تھے ان میں سے کسی کا بھی عیسیٰ جان یا اس کے رشتے داروں سے تعلق ثابت نہیں ہوسکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ "کرائے" کے حملہ آور ہیں اور کسی نامعلوم شخص نے انہیں اس کارروائی پر آمادہ کیا تھا..... پھر میرے ذہن میں وہ واقعہ آگیا جو ابھی تک میری سوچ سے چپکا ہوا تھا۔ جس حملہ آور نے میری قیام گاہ پر پہنچ کر مجھ پر حملہ کیا تھا اس کے پاس سے میں نے ایک ریوالور برآمد کیا تھا۔ اس ریوالور سے نقلی گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔ ان نقلی گولیوں کے حوالے سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا تھا کہ شاید حملہ آور مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ صرف ڈرانا چاہتے تھے۔

اب اگر شیخ عاصم کا مفاد دیکھا جاتا تو اس کا مفاد بھی مجھے قتل کرنے میں نہیں تھا۔ میں قتل ہوجاتا تو اسے شفقا تک کون پہنچاتا۔ ہاں مجھے پریشان اور خوف زدہ کرنے میں اس کا مفاد ضرور پوشیدہ ہوسکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی اور شفقا کی سلامتی کی طرف سے فکر مند رہوں اور پاکستان چھوڑ کر جاپان چلا جاؤں۔ جہاں شیخ عاصم کہیں محفوظ اور الگ تھلگ جگہ پر میری رہائش کا بندوبست کردے۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا گیا' اتنا ہی میرے دماغ میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ اس حملے کا تعلق عیسیٰ جان کے قتل سے نہیں تھا۔

بعض اوقات انسان کے ذہن میں کوئی خیال آتا ہے اور پھر خیال کو اتنی جلدی تقویت پہنچتی ہے کہ وہ خود بھی حیران ہوجاتا ہے۔ میرے خیال کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچا تو زریں گل نے بتایا کہ ساہی صاحب آئے بیٹھے ہیں۔

ساہی صاحب ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کررہے تھے۔ ان کے چہرے پر تشویش واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر انہوں نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ دراصل ایک خط تھا جو ساہی صاحب کے پٹھان چوکیدار عبدالرحمٰن کو کچھ نامعلوم افراد نے لکھا تھا۔ خط میں عبدالرحمٰن سے کہا گیا تھا کہ اس کا تعلق زوئے مشت سے ہے۔ اس لیے عبدالرحمٰن کا فرض بنتا ہے کہ وہ زوئے مشت کے ایک باسی کے قتل کا بدلہ چکانے کے لیے ان کی مدد کرے۔ زوئے مشت کے قتل ہونے والے باسی کا نام عیسیٰ جان لکھا گیا تھا اور عبدالرحمٰن کو واشگاف الفاظ میں لالچ دیا گیا تھا کہ اگر وہ "قاتل شاہ جہاں" کے گھرانے کے کسی بھی فرد کو پکڑوا دے تو اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ آخر میں لکھا تھا "ہمیں شبہ ہے کہ شاہ جہاں کی اکلوتی بہن لاہور ہی میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ ایس ایس پی ساہی کی بیٹی فریال کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ایس ایس پی ساہی کی بیٹی یا خود ایس ایس پی اس کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اگر تم اس سلسلے میں کوئی مفید اطلاع فراہم کرسکو تو ہم تمہیں خوش کردیں گے۔" خط میں بہت سی نازیبا باتیں بھی لکھی تھیں جن سے قبائلیوں کے غم وغصے کا اظہار ہوتا تھا۔

ساہی صاحب نے بتایا کہ عبدالرحمٰن نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے یہ خط فوراً ان کے حوالے کردیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر خط غور سے پڑھا۔ تحریر میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ خط کسی قبائلی نے لکھا ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ کسی پٹھان یا قبائلی کا کام نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور ہاتھ ہے اور یہ وہی ہاتھ ہے جو مجھے اپنے اور شفقا کے بارے میں فکر مند کرنا چاہ رہا ہے۔

شفقا جس جگہ پناہ گزیں تھی وہ جگہ ایک سربستہ راز تھی۔ ساہی صاحب کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ بالفرض اگر کوئی مجھے پکڑ لیتا اور میرے جسم کی ایک ایک پور کو بدترین اذیت سے دوچار کردیتا تو میں پھر بھی شفقا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ یہی پوزیشن زریں گل، اصغر یا غزالہ کی تھی..... جو لوگ شفقا کو تلاش کرنا چاہ رہے تھے ان کے پاس یہ ایک مناسب راستہ تھا کہ وہ شفقا کے حوالے سے مجھے اس قدر تشویش میں مبتلا کردیں کہ میں بدحواس ہوکر شفقا کا ٹھکانا تبدیل کرنے کی کوشش کروں اور وہ لوگ مجھے "ٹریپ" کرلیں۔

میں جب ان واقعات کی کڑیاں شیخ عاصم کی اس "خواہش" سے ملاتا تھا کہ میں جلد از جلد جاپان چلا جاؤں تو مجھے شیخ عاصم اور ان واقعات میں ربط محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہ بات ذہن میں آتی تھی کہ شیخ عاصم مجھ پر دو طرف دباؤ ڈال رہا ہے۔ ایک طرف وہ دن رات میرے قریب آنے کی کوشش کررہا ہے اور مجھ سے رشتے داری کی باتیں کررہا

ہے۔ دوسری طرف قبائلیوں کی آڑ لے کر مجھے خوف زدہ کررہا ہے۔

میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "جو دو بندے پکڑے گئے تھے وہ کہاں ہیں؟"

"جوڈیشل ریمانڈ پر کوٹ لکھپت جیل میں۔" ساہی صاحب نے جواب دیا۔

"کچھ معلوم ہوا ان سے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ وہ آزاد قبائلی علاقے کے کسی زمرد خان کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی کے کہنے پر انہوں نے ہمارا کھوج لگایا تھا اور حملہ کیا تھا۔"

"زمرد خان کا کھوج نہیں لگایا گیا؟"

"اس کا کچھ پتا نہیں۔ وہ ایک مفرور شخص ہے۔ اس تک پہنچنا بہت دشوار کام ہے۔"

جو شک میرے ذہن میں پنپ رہا تھا' اس کا اظہار میں نے ساہی صاحب سے نہیں کیا۔ ہاں یہ رائے ضرور دی کہ ممکن ہے یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہ ہو جتنا نظر آتا ہے۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟"

"ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ جان والے واقعے کا فائدہ اٹھا کر کوئی اور شخص میرے ساتھ دشمنی کررہا ہو۔" ساہی صاحب اسی سے سوچنے لگے۔ میں نے پوچھا "اس کیس کی تفتیش کون کررہا ہے؟"

وہ بولے "پہلے تو انسپکٹر ریاض تھا' اب ایس پی برکت خود اس معاملے کو ڈیل کررہا ہے۔"

اس جواب نے مجھے مایوس کیا۔ ایس پی برکت تو مکھی پر مکھی مارنے والا شخص تھا۔ وہ سرتاپا ایک روایتی پولیس والا تھا۔ تفتیش کے دوران میں وہ ذہن استعمال کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ اس کی تفتیش ڈنڈے سے شروع ہوکر ڈنڈے پر ختم ہوجاتی تھی۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا "جناب! اس سے تو بہتر تھا کہ انسپکٹر ریاض ہی اس کیس کو ہینڈل کرتا۔ آپ نے تفتیش تبدیل ہی کرانی تھی تو پھر انسپکٹر ریاض سے بہتر بندہ ہونا چاہیے تھا۔"

میں نے ساہی صاحب سے مزید کہا کہ وہ تفتیش انسپکٹر ریاض ہی کے پاس رہنے دیں۔ وہ جو کچھ کرے گا ایس پی برکت سے تو اچھا ہی کرے گا۔ ساہی صاحب نے میری بات مان لی۔

جونہی ساہی صاحب گئے' میں نے انسپکٹر ریاض سے رابطہ کیا۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال کے واقعات نے اس شخص کو میرا معترف کررکھا تھا۔ میں نے ریاض سے تفتیش کے متعلق بات کی۔ اس نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ آخر میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ سے باتیں کرتے ہوئے ایک اور بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ کیوں نہ دونوں ملزموں میں سے ایک ملزم کو رہا کردیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس کا تعاقب کرنے سے کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

میں نے کہا "طریقہ تو خیر کافی پرانا ہے' اگر احتیاط سے آزما سکتے ہو تو آزمالو۔" ریاض کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں ریاض کی تفتیش کے سلسلے میں اتنا پر امید نہیں تھا لیکن صرف اڑتالیس گھنٹے کے اندر ریاض نے ایک سنسنی خیز رپورٹ دی۔ وہ لاہور کے بازارِ حسن کے ایک ہوٹل سے بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ حملے کے ایک ملزم زمانی کا تعاقب کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ ملزم زمانی ایک کوٹھے پر موجود ہے..... اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ زمرد خان جس کے بارے میں قیاس کیا جارہا تھا کہ وہ دور دراز قبائلی علاقے میں روپوش ہے۔ وہ اس کوٹھے پر مزے میں بیٹھا ہے اور روسٹ چانپیں کھانے کے ساتھ ساتھ ایک رقاصہ سے اٹکھیلیاں کررہا ہے۔

میں نے انسپکٹر ریاض کو شاباش دینے کے بعد ضروری ہدایات دیں اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بازارِ حسن کی جانب روانہ ہوگیا۔ بازارِ حسن میں معمولی جدوجہد کے بعد زمرد خان نامی شخص کو گرفتار کرلیا گیا۔ وہ ایک خطرناک شخص تھا مگر بے خبری میں پکڑا گیا تھا۔ اس لیے شدید مزاحمت نہیں کرسکا۔ اسے کڑے پہرے میں پولیس اسٹیشن لایا گیا۔ یہاں دو تین گھنٹے کی "محنت" کے بعد زمرد خان نے بہت کچھ قبول کرلیا۔ زمرد خان سے مسلم ٹاؤن کے ایک رہائشی حاجی برکات صاحب کا پتا معلوم ہوا۔ حاجی برکات علاقے کی معروف سیاسی شخصیت تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس کا نام سونے کی اسمگلنگ کے سلسلے میں بھی لیا جاتا تھا۔ زمرد خان کا کہنا تھا کہ اس نے اپنے کارندوں سے جو کچھ کروایا وہ حاجی برکات کے کہنے پر کرایا۔ اس کارروائی کے اصل مقاصد اس کی نظر سے بھی اوجھل ہیں..... زمرد خان کے بیانات سے کم از کم یہ بات تو صاف ہوگئی کہ مجھ پر ہونے والے حملے کا عیسیٰ جان کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی اس خط کا کوئی تعلق ہے جو شفقا کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور چوکیدار عبدالرحمٰن کو ملا تھا۔ حاجی برکات ملک سے باہر تھا۔ مسلم ٹاؤن میں اس کی وسیع وعریض کوٹھی خالی پڑی تھی۔ وہاں دو چوکیداروں اور دو گارڈز کے سوا اور کوئی نہیں

تھا۔ یہ صورتِ حال پچھلے کوئی ڈیڑھ ماہ سے جوں کی توں تھی۔ بیرونِ ملک حاجی برکات سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ اپنے کسی فون پر موجود نہیں تھا۔ اتنے مال دار واثر ورسوخ والے شخص کی کوٹھی میں بلاوارنٹ داخل ہونا ممکن نہیں تھا وارنٹ جاری کرانا بھی خاصا مشکل کام تھا۔ بہرحال ساہی صاحب کسی نہ کسی طور یہ کام کرگزرے۔ حاجی برکات کی رہائش گاہ کی تلاشی کے لیے پولیس کوٹھی میں داخل ہوگئی۔

رات کو جس وقت کوٹھی کی تلاشی شروع ہوئی قریباً اسی وقت میں، شیخ عاصم اور غزالہ کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل میں ایک ڈنر میں شریک تھا۔ یہ غزالہ اور شیخ عاصم کی شادی کی سالگرہ تھی۔ ہاں دو برس پہلے آج ہی کے روز غزالہ مسز شیخ عاصم بنی تھی اور میرا اور غزالہ کا دم توڑتا ہوا تعلق ایک آخری ہچکی لے کر خاموش ہوگیا تھا۔ آج ہی کے روز وہ سب کچھ مجھ سے چھن گیا تھا جو میرے بچپن اور جوانی کا اثاثہ تھا۔ میں خوش وخرم غزالہ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ سوچیں موجود ہیں لیکن غزالہ کا چہرہ ایک عورت کا چہرہ تھا۔ اسے پڑھنا آسان نہیں تھا۔

شیخ عاصم بڑے خوش گوار موڈ میں تھا۔ سگار سلگاتے ہوئے بولا "بھئی آج تمہارے سامنے میں غزالہ کے ذمے ایک کام لگانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے ایک خوب صورت دلہن ڈھونڈے۔"

غزالہ مسکرائی "لیکن میں ہی کیوں ڈھونڈوں؟"

"اس لیے کہ تمہارے لیے یہ کام بے حد آسان ہوگا۔ تم شاہ جہاں کی پسند وناپسند بہت اچھی طرح سمجھتی ہو۔ جو خوبیاں تمہارے اندر ہیں وہی اس کی دلہن کے اندر ڈھونڈ لینا۔ یہ ایک منٹ میں ہاں نہ کہے تو میرا نام بدل دینا؟"

"مجھے تو اپنے اندر خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔" غزالہ نے کہا۔

"بھئی یہ بھی تو ایک خوبی ہے۔ یہ خوبی بھی دلہن میں ضرور ہونی چاہیے۔ قد کاٹھ، رنگ، عمر سب کچھ ملنا چاہیے بلکہ اگر نام بھی ملتا جلتا ہو تو کیا کہنے مثلاً شائلہ، نائلہ وغیرہ۔"

غزالہ نے دلنواز ناراضگی سے عاصم کو گھورا۔ وہ بولا "بھئی اس میں گھورنے والی کیا بات ہے۔ ماضی ایک حقیقت تھا اور حال بھی ایک حقیقت ہے۔ اگر ان دونوں حقیقتوں کے درمیان مشابہت کا تھوڑا سا تعلق باقی رہ جائے گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

وہ سر تھام کر بولی "عاصم! آپ موضوع نہیں بدل سکتے۔"

عاصم نے کہا "کس قدر افسوس کی بات ہے! شخص کو یہ بات کہنی چاہیے وہ خاموش بیٹھا ہے اور موضوع بدلنے کا کہہ رہی ہو۔"

"میں انہی کی ترجمانی کررہی ہوں۔"

"وہاٹ این انڈراسٹینڈنگ!" شیخ عاصم نے آنکھ گھما کر کہا۔

غزالہ ایک بار پھر شاکی نظروں سے عاصم کو دیکھنے لگی۔ میں ان دونوں کی ہلکی پھلکی گفتگو سن رہا تھا لیکن ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ میں تصور کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ حاجی برکات نامی شخص کی کوٹھی میں تلاشی ہورہی ہے۔ ساہی صاحب کی زیرِ نگرانی پولیس کے سپاہی پوری کوٹھی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس تلاشی کا فائدہ اسی صورت میں تھا اگر شیخ عاصم اور حاجی برکات کے درمیان کسی طرح کا کا(روباری) تعلق ثابت ہوجاتا۔ اگر ایسا ہوجاتا تو میرے اس خیال کی بہت حد تک تصدیق ہوجاتی کہ چند روز پہلے مجھ پر جو حملہ ہوا ہے اس میں شیخ عاصم ملوث تھا۔ یہ کتنا تہلکہ خیز انکشاف ہوتا۔ میرے سامنے مسکراتے چہرے والی غزالہ بیٹھی تھی۔ وہ پچھلے چند مہینوں سے شیخ عاصم کو ایک بالکل بدلا ہوا تصور کررہی تھی اور اپنی کامیابی پر بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ میں اس کی طمانیت دیکھتا تو دل میں بے ساختہ خواہش جاگتی تھی کہ غزالہ کی تمام خوش فہمیاں درست ثابت ہوجائیں۔ میں شیخ عاصم کے خلاف کوئی بھی واضح ثبوت ڈھونڈ سکوں اور شیخ کی نسبت میرے دل میں پائے جانے والے تمام اندیشے اپنی موت آپ مرجائیں پھر غزالہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔ کسی ایسی جگہ جہاں شیخ عاصم میرا پیچھا نہ کرسکے۔ نہ اس کی وہ "شرط" میرا سکون برباد کرسکے جس میں میری بہن کا نام آتا تھا۔ شیخ عاصم بہت بڑی غلط فہمی میں تھا۔ وہ میرے لیے مٹی تھا لیکن اگر سونا بھی ثابت ہوجاتا تو میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنی بہن کی شادی اس کے خاندان میں کرتا۔ میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میری بہن اپنے سسرال میں قاتل کی بہن سمجھی جائے اور اسے دیکھ کر کسی کے ذہن میں یہ خیال تک بھی آئے کہ وہ ایک دشمنی کے خاتمے کے لیے دلہن بنی ہے۔ اگر میں شیخ عاصم کی اصلیت جاننے کی کوشش کررہا تھا تو اس کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں تھی کہ میں شیخ عاصم کی شرط یا مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں تو صرف غزالہ کے

(بارے میں) سوچ رہا تھا۔ اگر شیخ کی اصلیت وہ نہیں تھی جو شیخ ظاہر کررہا تھا تو پھر عنقریب غزالہ پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ سکتے تھے۔ شیخ عاصم جانتا تھا کہ میں آج بھی غزالہ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے راہِ راست پر لانے کے لیے وہ وفا پیشہ بیوی پر عرصۂ حیات تنگ کرسکتا تھا۔ اسے قتل تک کرسکتا تھا۔

پارٹی سے فارغ ہوکر میں رات ایک بجے گھر پہنچا۔ زریں گل کے کمرے کے پاس سے گزرا تو کلثوم کی دبی دبی ہنسی سنائی دی پھر زریں کے گنگنانے کی آواز آئی۔ ام خوشی سے کیوں نہ گائے۔ ہمارا دل بھی گا رہا ہے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ساہی صاحب تھے۔ بولے "شاہ جہاں! تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے۔ میں ابھی دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

میرا دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ ساہی صاحب معلوم نہیں کون سی خبر لارہے تھے۔ بہرحال اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ یہ خبر کوٹھی کی تلاشی کے حوالے سے ہوگی۔ پندرہ منٹ میں نے سخت بے چینی میں گزارے۔ حسبِ معمول ساہی صاحب عقبی گیٹ سے اندر آئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچے تو میں نے ان کے ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ دیکھا۔ پتا نہیں اس لفافے میں کیا تھا۔

ساہی صاحب بولے "یہ لو۔ یہ تمہارے شیخ عاصم کے بارے میں ہے۔"

میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں کئی کاغذات تھے۔ چند خطوط تھے، کچھ رجسٹریاں تھیں۔ ایک فون انڈکس بھی تھا۔ میں یہ کاغذات دیکھتا رہا اور میرے خون کا دباؤ بڑھتا رہا۔ شک کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ یہ کاغذات ثابت کررہے تھے کہ شیخ عاصم اور حاجی برکات نہ صرف ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ ماضی میں ان کا کاروباری واسطہ بھی رہا ہے۔ حاجی برکات امارات سے سونا خریدتا رہا تھا اور وہاں شیخ عاصم کی ایک فرم یہی کام کرتی تھی۔

زمرو خان اور حاجی برکات کا تعلق ثابت ہوچکا تھا اور اب حاجی برکات اور شیخ عاصم کے درمیان بھی "لنک" نکل آیا تھا۔ میرا دماغ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

○☆○

وہ سارا دن میں نے سخت بے قراری کے عالم میں گزارا۔ اگلی رات بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ میری توقع کے عین مطابق شیخ عاصم دو چہروں والا آدمی ثابت ہورہا تھا۔ غزالہ کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ اس دو چہروں والے شخص کی بیوی تھی اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ تھا کہ میں غزالہ کو شیخ عاصم کے دوہرے چہرے کے بارے میں قائل نہیں کرسکتا تھا۔ بے شک شیخ عاصم کے دوہرے چہرے کے بارے میں ثبوت موجود تھے لیکن یہ ثبوت اتنے نمایاں نہیں تھے کہ غزالہ کو متاثر کرسکتے۔ اگر میں غزالہ کو جاکر بتاتا کہ اسپتال میں مجھ پر ہونے والا حملہ عیسیٰ جان کے ساتھیوں نے نہیں خود شیخ عاصم نے کروایا تھا تو غزالہ کا ذہن کبھی یہ بات تسلیم نہ کرتا۔ میں اسے قائل کرنے کے لیے ساری تفصیل بتاتا تو بھی وہ قائل نہ ہوتی۔ میرے پاس سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ حاجی برکات سے شیخ عاصم کا کاروباری تعلق رہا ہے۔ وہ اس کا جواب یہ دیتی کہ عاصم کا کاروباری تعلق تو بے شمار لوگوں سے رہا ہے۔ اگر وہ لوگ کوئی غیر قانونی کام کرتے ہیں تو اس کا الزام عاصم کے سر تو نہیں تھوپا جاسکتا۔ بالکل ایسے ہی غزالہ نے یوسا کے بارے میں بروسیل کو رد کردیا تھا۔

رات کسی پہر نیم غنودگی کی حالت میں مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ اسے جاگتی آنکھوں سے سپنا بھی کہا جاسکتا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے دیوار پر ایک فلم چل رہی ہے۔ اس فلم میں مجھے غزالہ نظر آرہی ہے اور شیخ عاصم نظر آرہا ہے لیکن ان دونوں کے چہروں پر وہ مسکراہٹ نہیں ہے جو برسوں شادی کی سالگرہ پر نظر آئی تھی۔ عاصم کا چہرہ غضب سے بگڑا ہوا تھا اور غزالہ کا چہرہ وحشت سے کھنڈر ہورہا ہے۔ عاصم چیخ رہا ہے "میں خون پی جاؤں گا تیرا اور تیرے اس یار کا—" وہ غزالہ کے گریبان میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس کی قمیص پھٹتی چلی جاتی ہے۔ وہ روتی سسکتی غزالہ کو بے لباس کردیتا ہے۔ اس کا جسم وحشت سے سکڑا سمٹا ہے اور کانپ رہا ہے۔ عاصم ایک چرمی کوڑا ہوا میں لہراتا ہے اور شڑاپ کی آواز سے غزالہ کے ننگے جسم پر رسید کرتا ہے۔ ایک خون جیسی "سرخ" لکیر غزالہ کی سپید پشت پر نمودار ہوتی ہے پھر دوسری لکیر نمودار ہوتی ہے پھر تیسری— پھر لکیروں کا جال سا بچھ جاتا ہے۔ وہ عاصم کے قدموں کے قریب فرش پر لوٹ رہی ہے۔ چیخ رہی ہے۔ اپنی عریانی کا خیال اس کے ذہن سے محو ہوچکا ہے۔ اس کے ہاتھ ظالم کوڑے کی زد سے بچنے کے لیے ہوا میں اٹھے ہوئے ہیں۔

"خدا کے لیے عاصم— میرا قصور بتاؤ؟"

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم میرے دشمن سے محبت کرتی ہو۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے اس شخص سے انتقام لینے میں میری مدد نہیں کی۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ شاہ جہاں کی بہن ابھی تک میری پہنچ سے دور ہے۔ تم اگر دل سے چاہتیں تو یہ سب کچھ ہوسکتا تھا— ہوسکتا ہے یہ سب کچھ۔"

وہ پھر اسے بے دریغ پیٹنے لگتا ہے۔

میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا' آنکھوں کے سامنے متحرک مناظر دھندلائے اور پھر اوجھل ہو گئے۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ہتھیلیوں پر پسینہ تھا۔ میرے دل سے یہ آواز ایک "معتبر گواہی" کی طرح بلند ہو رہی تھی کہ جو منظر میں نے ابھی خیال کی آنکھ سے دیکھا ہے وہ بہت جلد حقیقت کا روپ دھارنے والا ہے..... پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ وقت کا انتظار کرنا چاہیے..... یا اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے' کچھ کر گزرنا چاہیے؟ ایک بار پھر وہی خیال میرے ذہن میں پوری شدت سے ابھرا۔ میرا دل چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر ساری مصلحتوں کو ٹھوکر مار کر غزالہ کو شیخ عاصم کی چار دیواری سے نکالوں اور کہیں دور لے جاؤں۔ بہت دور جہاں وہ ہر مصلحت سے' ہر مجبوری سے آزاد ہو جائے۔

"کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ کیا مجھے ایسا کر گزرنا چاہیے؟" میں نے بے پناہ کرب کے عالم میں سوچا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ انگلیوں کی پوروں میں ایک عجیب سی سنسناہٹ جاگ اٹھی تھی۔ دل کی دھڑکن سینے میں بارودی دھماکوں کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ میرے اندر سے آواز آئی "شاہ جہاں! ایک بار پھر سوچ لو۔ کہیں تم ایک برباد لڑکی کو مزید برباد کرنے تو نہیں جا رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے اقدام کو تمہاری خود غرضی سمجھے اور تم اس کی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے مجرم بن جاؤ....." میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ فوراً ہی ایک جوابی آواز ابھری "وہ مزید برباد کیا ہو گی۔ عاصم سے بڑا دشمن اس کے لیے اور کوئی نہیں ہے۔ تم یہ پروا نہ کرو کہ وہ کیا سمجھے گی۔ تم یہ دیکھو کہ اس کی بھلائی کس میں ہے۔ وہ عنقریب ایک خوفناک عفریت کی لپیٹ میں آنے والی ہے۔"

پھر چچی فاخرہ اور چچا جلیس کا خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہیں یہ تو نہیں ہو گا کہ غزالہ کے بعد چچا اور چچی شیخ کے زیر عتاب آجائیں گے۔ چچی دل کی مریضہ تھی' اس کے لیے کوئی بڑا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ چچی کیسی بھی تھی بہرحال غزالہ کی ماں تو تھی۔ میں غیر ارادی طور پر ان دونوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس مسئلے کا ایک حل میرے ذہن میں آ رہا تھا لیکن ابھی واضح نہیں تھا۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے شیخ عاصم کا فون آگیا۔ وہ آج کل فٹ بال میں بہت دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ امارات کی ٹیم سے ایک یورپی ٹیم کا اہم میچ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا۔ شیخ عاصم نے کہا' میں اس کی کوٹھی پر آجاؤں۔ وہاں ہم اکٹھے میچ دیکھیں گے اور لنچ بھی کریں گے۔ میں نے کنی کترانی چاہی

لیکن وہ بولا "تمہارے لیے دو اہم خوشخبریاں بھی ہیں اور یہ ایسی خوشخبریاں نہیں کہ فون پر سنائی جا سکیں۔"

میرا دماغ چوالا مکھی بنا ہوا تھا۔ شیخ عاصم اور حاجی برکات کے باہمی تعلق کا علم ہونے کے بعد میرے لیے خوش فہمیوں کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ شیخ عاصم نے ہمیشہ کی طرح خوب خاطر تواضع کی۔ اس نے بیئر کا ایک گلاس میرے سامنے رکھا اور بولا "اس بیئر کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایاز انگلینڈ سے مہنگے داموں خرید کر لایا ہے۔ یہ بیئر ایک ایسے بحری جہاز میں سے نکالی گئی ہے جو قریباً سو سال پہلے پلے ماؤتھ کے قریب سمندر میں ڈوب گیا تھا۔"

"اچھی ہے۔" میں نے ایک چسکی لے کر کہا۔

وہ بولا "تمہیں پتا ہے' ایاز تو پیتا نہیں ہے۔ میں کبھی کبھار شغل کرتا ہوں۔ اس لیے وہ لے آیا۔"

"ہاں جی' بہت نیک لڑکا ہے۔" میں نے لفظ نیک پر زور دے کر کہا۔ عاصم نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں..... تم کسی خوش خبری کی بات کر رہے تھے؟"

عاصم نے قہقہہ لگایا "ہو اتنی اہم بات بھول کر ہم دوسری باتوں میں لگ گئے۔" سگار کا ایک طویل کش لے کر اس نے دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا "کل رات جاپانی ماہر سے میری بات ہو گئی ہے۔ سرجن صاحب بھی ایک دو ہفتے تک وہاں پہنچ رہے ہیں۔ تمہارے جسم سے الیکٹرونک ڈوائس نکالنے کا مکمل انتظام ہو گیا ہے۔ ایک آپریٹنگ مشین کا مسئلہ رہ گیا ہے' امید ہے کہ وہ بھی دو چار ہفتے تک حل ہو جائے گا۔ اب تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو کہ یہ آپریشن تم نے کہاں کروانا ہے۔ ہونے کو تو یہ سب کچھ پاکستان میں بھی ہو جائے گا لیکن جو سہولت اور حفاظت وہاں میسر آئے گی وہ یہاں نہیں ہو گی۔ بہرحال میری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے میں اس بارے میں سوچ سمجھ لیتا ہوں۔"

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں جانتا تھا عاصم مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ مجھے ہر طرف سے گھیر گھار کر جاپان کی طرف ہی لے جاتا تھا۔ پتا نہیں وہاں اس نے میرے لیے کون سی جنت تعمیر کر رکھی تھی۔ مجھے اب سو فیصد یقین ہو چلا تھا کہ عاصم کی نیت صاف نہیں ہے۔ اس کی باتیں بے شک بڑی میٹھی تھیں اور اخلاص سے لبالب بھری نظر آتی تھیں لیکن یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ مجھے الیکٹرانک ڈوائس کی زنجیر سے آزاد کر دیتا۔ کم از کم شنا کے حصول تک تو اس نے ایسا

نہیں کرنا تھا۔

اتنے میں کھانا آگیا اور ہم کھانے میں مصروف ہو گئے۔ نے کے دوران میں بھی گفتگو جاری رہی۔ غزالہ خوش ا رہی تھی۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس نے بھی یہ خواہش کی کہ میں ان دونوں کے ساتھ جاپان جاؤں۔ اس کی ے انداز ہوتا تھا کہ وہ میرے بارے میں اور میری ے کے بارے میں بہت سوچتی ہے۔ کھانے کے دوران ی شیخ عاصم کا ایک ضروری فون آگیا۔ وہ جلدی جلدی نمٹاتے ہوئے بولا "مجھے ہیڈ آفس جانا ہے' شام تک گا۔"

غزالہ بولی "لیکن..... مجھے امی کے گھر بھی تو جانا تھا۔"

وہ بولا "ہاں یہ تو یاد ہی نہیں رہا۔" پھر وہ میری طرف کہنے لگا "یہ تمہارے پرانے پرستار جیسے ہیں' ان کے چلی جانا۔ جاتے جاتے تمہیں ڈراپ کر جائیں گے۔"

غزالہ ایک بار پھر ناراضگی سے عاصم کو گھورنے لگی۔ نے کہا "ٹھیک ہے' میں ڈراپ کر جاؤں گا۔"

کھانا کھانے کے فوراً بعد عاصم نکل گیا۔ میں نے غزالہ کہا "وہ دوسری خوش خبری تو درمیان میں ہی رہ گئی۔"

غزالہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ کہنے لگی "وہ خوش آپ کو عاصم ہی سنائیں گے۔"

پانچ دس منٹ بعد میں غزالہ کو لے کر گھر سے نکل گیا۔ بےباس عالم قریشی کی وہی تاریک شیشوں والی بڑی سوزوکی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا غزالہ میرے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے گی یا پچھلی نشست پر۔ میں نے دونوں دروازوں کے لاک کھول دیے۔ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے وہ چند لمحے تذبذب کا شکار رہی پھر دروازہ کھول کر میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سراپا چادر میں چھپا رکھا تھا' نصف چہرہ بھی چادر کے پلو میں چھپا تھا۔ آنکھوں پر بڑے خوب صورت سے "سن گلاسز" تھے۔

ہم چچا جلیس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ غزالہ شیخ کی باتیں کرنے لگی۔ اس کے معمولات' اس کی عادات اور اس کی بدلی ہوئی عادات کے بارے میں بتانے لگی اور وہ مستقبل قریب کے پروگراموں کا ذکر کرنے لگی۔ کہنے لگی کہ جاپان میں شیخ عاصم نے سیر و تفریح کا کتنا لمبا چوڑا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اس نے کہا کہ جاپان' عاصم کا پسندیدہ ملک ہے اور ٹوکیو کے مضافات میں ایک خوب صورت

رہائشی عمارت عاصم کی ملکیت ہے..... میں غزالہ کی باتیں سن رہا تھا لیکن یہ باتیں کسی دور افتادہ صدا کی طرح میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ ذہن میں تو کسی اور ہی طرح کی جنگ جاری تھی۔ غزالہ شیخ عاصم کا خوب صورت چہرہ دیکھ رہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے شیخ عاصم کا گھناؤنا چہرہ تھا۔ وہ چہرہ جو کسی درندے کے چہرے کی طرح جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا اور گھات لگا کر کسی اچھے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں نے یہ وقت ہاتھ سے کھو دیا تو غزالہ کو بہت پچھتانا پڑے گا اور غزالہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی۔ مجھے اپنی بے بسی کے وہ سارے لرزہ خیز واقعات یاد آگئے جو سری لنکا میں میرے ساتھ ہوئے تھے۔ وہ الیکٹرانک ڈوائس' وہ درد کی لہریں' وہ ہاتھوں کو مفلوج کرنے والے وظائف' سب کچھ مجھے یاد آیا۔ جنگ میں ساری اہمیت وقت کی ہوتی ہے۔ جو کام کسی وقت بہت آسان ہوتا ہے' وقت گزر جانے پر انتہائی دشوار ہو جاتا ہے اور سیکڑوں جانیں دے کر بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ ابھی وقت گزرا نہیں تھا۔ ابھی شیخ عاصم کو اپنے منصوبے کی ناکامی کا شبہ تک نہیں تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر زندگی کی چمک تھی اور وہ ہلکے پھلکے انداز میں شیخ عاصم کی باتیں کر رہی تھی۔ وہی انداز جس میں "مشرق" اپنی تمام تر حیا اور وفاداری کے ساتھ موجود تھا۔ وہ میرے اندر لڑی جانے والی جنگ سے قطعی بے خبر تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی' میں کتنے بڑے فیصلے کی سولی پر لٹک رہا ہوں۔

میں نے سامنے دیکھا' ہم فیروز پور روڈ سے گزر رہے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ ہمارے بائیں جانب تھا۔ سامنے ایک دوراہا تھا۔ ایک سڑک گلبرگ کی طرف چلی جاتی تھی جہاں چچا جلیس کی کوٹھی تھی' دوسرا راستہ سیدھا جیل روڈ اور ائرپورٹ کی طرف جاتا تھا۔ گاڑی تیزی سے اس دوراہے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ مجھے دائیں طرف مڑنا تھا یا سیدھا نکل جانا تھا۔ بظاہر میرے سامنے دو سڑکیں تھیں لیکن حقیقت میں یہ زندگی کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ غزالہ کو چچا جلیس کے گھر تک پہنچاتا تھا اور اس دلدل تک پہنچاتا تھا جس میں وہ غیر محسوس طور پر دھنسی ہوئی تھی' دوسرا راستہ غزالہ کو شیخ عاصم اور حالات کی دلدل سے دور لے جاتا تھا۔ بہت دور' کسی نامعلوم مقام پر..... یہ فیصلے کی گھڑی تھی..... اور گاڑی تیزی سے ہموار سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی.....

میں نے کن انکھیوں سے غزالہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ میرے سینے میں اٹھنے والے طوفان سے قطعی بے خبر تھی۔ کار کی ادھ کھلی کھڑکی میں سے اندر داخل ہونے والے ہوا کے شریر جھونکے اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ وہ بار بار انہیں سنبھالتی تھی اور آوارہ لٹوں کو کانوں کے پیچھے سے گزار رہی تھی۔ وہ دلکش تھی۔ ماہ و سال جیسے اس کی خوب صورتی کو چھوئے بغیر گزر گئے تھے۔ گاڑی بھاگ رہی تھی اور دوراہا قریب آ رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا دوراہا بھی تھا۔ اور پھر میں نے ایک گہری سانس لے کر گاڑی بائیں طرف والی سڑک پر موڑ دی۔ اس سڑک پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں نے غزالہ کو ایک بھیانک مستقبل سے بچا لیا ہے۔ وہ مستقبل جو ایک تاریک جنگل جیسا تھا اور جس میں شیخ عاصم منافقت کی آڑ میں ایک درندے کی طرح چھپا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت اس کے چہرے سے مسکراہٹ کا نقاب اتر سکتا تھا اور وہ غزالہ کو اپنی آتشیں آنکھوں کے شعلوں سے بھسم کر سکتا تھا۔

غزالہ نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر عام سے لہجے میں بولی "ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

"مجھے ایک ضروری فون یاد آ گیا تھا۔" میں نے کہا "یہاں قریب ہی پی سی او ہے' وہاں سے کال کر لیتا ہوں۔"

کچھ آگے جا کر میں نے پی سی او کے سامنے گاڑی روک دی۔ غزالہ اندر ہی بیٹھی رہی۔ میں اٹھ کر فون بوتھ میں گھس گیا۔ سب سے پہلے میں نے چچا جلیس کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف چچی فاخرہ تھی۔ میری آواز پہچان کر اس کے لہجے میں حسب معمول تلخی عود کر آئی۔

"خیریت ہے شاہ جہاں' کیسے فون کیا؟" اس نے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ تڑخ کر بولی۔

"تم اپنا ٹھکانا کر لو۔ تمہارا چہیتا داماد شیخ عاصم' آج کسی بھی وقت تمہارے گھر آ سکتا ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور شیخ کے آنے سے پہلے یہاں سے رفو چکر نہ ہوئیں تو آج شیخ تمہیں اپنا اصل روپ دکھا دے گا اور مجھے خدشہ ہے کہ یہ روپ دیکھ کر تمہاری حرکت قلب بند نہ ہوئی تو کم از کم تمہیں ٹھیک ٹھاک دورہ ضرور پڑ جائے گا۔"

"کیا مطلب؟ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟"

"حقیقت کہہ رہا ہوں میری پیاری چچی' میری دلی خواہش ہے کہ تم اپنے داماد کا اصل روپ نہ دیکھ پاؤ۔ وہ بڑا خوار کرے گا تمہیں۔ بہتر یہی ہے کہ چچا کے ساتھ فوراً کہیں چلی جاؤ۔ کسی ایسی جگہ جہاں شیخ تمہیں ڈھونڈ نہ سکے۔"

"تم زبان سنبھال کر بات کرتے ہو یا میں فون بند کر دوں۔"

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ غزالہ میرے ساتھ جا رہی ہے۔ لاہور سے باہر' شاید پاکستان سے باہر۔ غزالہ شیخ کی بیوی نہیں' زر خرید کنیز ہے اور کنیز بھاگ جائے تو مالک اسے ڈھونڈنے کی کوشش میں بڑے ظالم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات کنیز کے خونی رشتے داروں کی بھی کھال ادھیڑ دیتے ہیں۔۔۔ خدا حافظ!"

سلسلہ منقطع کر کے میں نے ساہی صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ ساہی صاحب گھر ہی میں مل گئے "ہیلو شاہ جہاں! کہاں ہو تم؟"

"بڑے نازک مقام پر ہوں جناب۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"تم تو کبھی محفوظ مقام پر نہیں ہوتے۔" ساہی صاحب نے کہا پھر ذرا توقف سے بولے "حاجی برکت اور شیخ عاصم کے کچھ مزید تعلقات کا بھی پتا چلا ہے۔ امارات میں ہوٹل کے کاروبار میں ان دونوں نے مشترکہ شیئرز بھی خرید رکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے شبہات کافی حد تک درست ہیں۔"

میں نے کہا "اب تو شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی جناب! شیخ عاصم میرے خلاف گہری چال چل رہا ہے۔"

ساہی صاحب بولے "شاید وہ چاہتا ہے کہ تم خوف زدہ ہو کر شفقتا سمیت کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی کوشش کرو اور وہ تمہیں چھاپ لے۔۔۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ۔۔۔"

"ساہی صاحب! گستاخی معاف! میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ دراصل میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں غزالہ کو شیخ کے چنگل سے بچا کر دور لے جا رہا ہوں۔ کہاں لے جا رہا ہوں خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ میری یہ کارروائی شیخ کو پاگل کر دے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے لیے مشکل پیدا کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی طرف سے چوکس رہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو شاہ جہاں!" ساہی صاحب کی آواز میں بے حد حیرت تھی۔

"میں اس وقت آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا جناب! آپ بس یہی سمجھیں کہ جیسے ہی موقع ملا' میں آپ سے رابطہ کروں گا۔ آپ پلیز۔۔۔

...ل کو فون کر دیں کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ادھر ادھر ... شیخ عاصم سے کچھ بھی بعید نہیں۔" زرین گل اپنی دلہن کلثوم کے ساتھ اپنی موون منانے پشاور چلا گیا ...

ساہی صاحب سناٹے میں تھے۔ چند لمحے کے لیے کچھ ... سکے۔ میں نے اس خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی سے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔۔۔ چند لمحے فون بوتھ کے اندر ہی کھڑا سوچتا رہا۔ میرے جسم میں ... ک ذرائع موجود تھا۔ یہ ذرائع دس کلو میٹر کے ... میں کام کرتا تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں شیخ کے چوکس ہونے سے پہلے پہلے دس کلو میٹر کے دائرے سے نکل جاؤں۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ راولپنڈی پہنچنے سے ... ری نہیں روکوں گا۔

میں فون بوتھ سے باہر نکلا تو غزالہ اسی طرح گاڑی میں ... تھی۔ وہ کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ حالات کی طوفانی ... ن کا اسے احساس تک نہیں تھا۔ میں نے بڑو کا فرکی پے ... ل اور دھیمے قدموں سے چلتا واپس گاڑی میں آ بیٹھا۔

"بڑی دیر لگا دی آپ نے۔" غزالہ نے کہا۔

"ہاں' کچھ ایسی ہی بات تھی۔"

گاڑی ایک بار پھر روانہ ہو گئی۔ رخ وہی تھا جو فون ... نے سے پہلے تھا۔ غزالہ نے تعجب سے کہا "آپ واپس ... نہیں؟"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "غزالہ! مجھ پر بھروسا ... ہو؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے مگر۔۔۔"

"غزالہ! میں ابھی تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتا ... بس مجھے تھوڑا سا وقت دو۔"

"لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟" غزالہ اب واضح طور پر ... تھی۔

"بس تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کوٹھی ہے' وہاں۔"

اچانک میری نگاہ عقبی آئینے پر گئی۔ میری چھٹی حس ... احساس دلایا کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں نے جلدی ... چند سڑکیں تبدیل کیں اور یہ ثابت ہو گیا کہ ایک ... جیپ ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ فاصلہ زیادہ تھا پھر ... اندازہ ہو رہا تھا کہ جیپ میں دو سے زیادہ افراد موجود ...

"کیا کوئی پیچھا کر رہا ہے؟" غزالہ نے پریشانی سے پوچھا۔ "مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔"

تحیر، تجسس، رومان اور ایڈونچر سے بھرپور ناول
ایک نئی سدا بہار تخلیق
کھلاڑی
ایم۔ اے۔ راحت
ایک بلند حوصلہ نوجوان کی داستان جو چٹانوں میں رکتا تھا
ایک ایسا نوجوان جو چیلاوے سے زیادہ پھرتیلا تھا
جو موجوں کو مسخر کر چکا تھا۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا جانتا تھا۔ قدرت جس کے لیے ترک ہو جاتا تھا۔ ہوائیں اپنا رخ موڑ دیتی تھیں۔

"کون لوگ ہیں؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

یہ بات صحیح تھی کہ ابھی مجھے تعاقب کرنے والوں کے بارے میں ٹھیک سے خبر نہیں تھی۔ بہرحال میرا قیاس کہہ رہا تھا کہ یہ شیخ عاصم کے کارندے ہوں گے۔ شیخ عاصم آسانی سے بھروسا کرنے والا شخص نہیں تھا۔ بھروسا تو وہ تب کرتا جب اس کی نیت صحیح ہوتی۔۔۔ اس کے دو چہرے نہ ہوتے۔ اس کے چہرے پر روشنی اور سینے میں سیاہی تھی۔ وہ گیم کھیل رہا تھا اور گیم کھیلنے والا شخص کبھی غافل نہیں ہوتا۔ غزالہ خود کو آزاد سمجھتی تھی لیکن وہ آزاد نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ شیخ عاصم کی نگراں نگاہیں ہر جگہ اس کا تعاقب کیا کرتی ہیں۔ آج میرا یہ یقین درست ثابت ہو رہا تھا۔ سرخ جیپ گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ ہم مختلف سڑکوں پر سفر کرتے گلشن راوی کی طرف نکل آئے تھے۔ کہیں کہیں زیر تعمیر کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اکثر سڑکوں پر ویرانی تھی۔ اب سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ سورج مغربی افق پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں غزالہ کا چہرہ زرد نظر آتا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی سانس میں خفیف سی تیزی آ گئی ہے۔ سرخ جیپ ہمارے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اچانک جیپ نے ہمیں اوور ٹیک کیا۔ ایک شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اس اشارے میں درخواست کے بجائے حکم تھا۔ جیپ کا زاویہ بھی ایسا تھا کہ ہم چاہنے کے باوجود آگے نہیں نکل سکتے تھے۔ دونوں اطراف گہرے خالی پلاٹ تھے۔ ہم کار کو سڑک سے اتار بھی نہیں سکتے تھے۔ جیپ کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔ مجبوراً ہمیں کار روکنا پڑی۔ کار میں سے دو

اترلو نکل کر تیزی سے ہماری طرف آئے۔ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے غزالہ کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی انہیں نہیں جانتی۔ بظاہر وہ دونوں غیر مسلح تھے مگر ان میں سے ایک کا ہاتھ اپنے کوٹ کی بھاری بھرکم جیب میں تھا۔ یقیناً جیب میں ریوالور قسم کی کوئی شے تھی۔ بھاری جیب والا کار کی کھڑکی کے سامنے رکا اور بولا "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"تم یہ پوچھنے والے کون ہو؟"

"میرا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔"

"تمہارا شناختی کارڈ؟"

"ابھی آپ کو تسلی کرا دی جاتی ہے۔ آپ گاڑی ایک طرف لگائیں۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا مخاطب بکواس کر رہا ہے۔ اگر اس کا تعلق پولیس سے ہوتا تو وہ میرے مطالبے پر سب سے پہلے اپنی شناخت ہی کراتا پھر اس کا لہجہ اور حلیہ بھی ہرگز پولیس اہلکاروں جیسا نہیں تھا۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ سرخ جیپ سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک سنہری موقع ہے۔ جیپ ہمارے سامنے کھڑی تھی اور تھوڑی سی ترچھی تھی۔ اس زیرِ تعمیر کالونی کی سڑکیں خاصی بلندی پر تھیں۔ دونوں طرف گہرائی میں خالی پلاٹ تھے۔ اگر میں تیزی سے کار آگے بڑھاتا تو جیپ کار سے ٹکرا کر خالی پلاٹ میں لڑھک سکتی تھی۔ بھربھری مٹی کی ڈھلوان طے کر کے دوبارہ سڑک پر آنا شاید جیپ کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

کار اسٹارٹ تھی۔ میں نے اچانک ایکسلی ریٹر پر دباؤ ڈالا۔ پہیوں نے خوفناک احتجاجی چیخ ماری۔ کمان سے نکلے تیر کی طرح گاڑی آگے بڑھی تو بھاری بھرکم جیب والا لڑھک کر دور جا گرا۔ اگلا نشانہ سرخ جیپ تھی۔ کار کے بمپر نے اس کی سائیڈ پر ضرب لگائی۔ جیپ کی ہینڈ بریک نہیں کھینچی گئی تھی اور نہ وہ گیئر میں تھی۔ وہ ناک کے بل ستر کا زاویہ بناتی ہوئی خالی پلاٹ میں لڑھک گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے غزالہ کی گردن نیچے جھکا دی اور خود بھی حتی الامکان جھک گیا۔ ہمارے عقب میں تڑتڑ کی آواز آئی۔ یہ ری پیٹر کے فائر تھے اور یقیناً ٹائر برسٹ کرنے کے لیے کیے گئے تھے مگر ہماری گاڑی کی ہموار روانی بتا رہی تھی کہ یہ کوشش ناکام رہی ہے۔

چاروں طرف سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے چند سڑکیں تبدیل کیں اور اس جال سے باہر نکل کر مین ملتان روڈ پر پہنچ گیا۔ اچانک غزالہ کی ہلکی سی چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایک بڑی اسٹیشن ویگن دھند تیزی سے ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ ویگن کی کھڑکی میں سے رائفل کا بیرل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ لگتا تھا کہ ویگن سوار ہمیں کچلنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں (یقیناً ایسا نہیں تھا مگر بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا)

"کون لوگ ہیں یہ؟" غزالہ نے کراہتے ہوئے پوچھا

"ٹھیک سے پتا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ کار میں ارتعاش نمودار ہو گیا ہے اور وہ غیر محسوس طور پر ایک طرف جھکی ہوئی ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ انکشاف تھا۔ ایک ٹائر پنکچر ہو گیا تھا اور ہوا بہت کم رہ گئی تھی۔ پہلے جو فائرنگ ہوئی تھی یہ اسی کا نتیجہ تھا۔ ری پیٹر والے کارتوس کا کوئی باریک چھرا ٹائر میں گھس چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی بری طرح لڑکھڑانے لگی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم رک جاتے۔ میں نے جین مندر چوک سے ٹرن لیا اور اسٹیٹ لائف کے دفتر کے سامنے گاڑی روک دی۔ گاڑی سے نکلتے ہی میں غزالہ کو لے کر عمارت کے احاطے میں گھس گیا۔ یہ چھٹی کا وقت تھا۔ ملازمین گروہ در گروہ باہر نکل رہے تھے۔ میں غزالہ کا ہاتھ تھامے ایک اندرونی راہداری میں چلا گیا۔ یہ جگہ بہ نسبت سنسان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ سامنے ایک افسر کے کمرے کا ادھ کھلا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ لمبی چوڑی میز پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ غزالہ بولی "شاہ جہاں! عاصم کو فون کریں۔ ان کے گارڈز دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

میں اسے اپنے دل کی بات کیسے بتاتا۔ مجھے تو یقین تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والے لوگ شیخ عاصم کے ہی ہیں۔ ایک کھڑکی سے میری نگاہ پارکنگ لاٹ کی طرف گئی۔ یہاں بہت سی گاڑیاں موجود تھیں۔ کچھ گاڑیوں کے ڈرائیور انہیں چمکانے دمکانے میں مصروف تھے۔ کچھ ڈرائیور گاڑیوں میں بیٹھے اپنے صاحبان کا انتظار کر رہے تھے۔ تاریک شیشوں والی ایک ایسی ہی گاڑی مجھے استعمال کے لیے موزوں نظر آئی۔ ڈرائیور سفید یونیفارم میں ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ یہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس پر قابو پانا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ میں غزالہ کو لے کر ایک عقبی دروازے سے باہر نکلا اور پارکنگ لاٹ میں پہنچ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ ادھ کھلا رکھا تھا۔ وہ مجھے اور غزالہ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، میں پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔

"جی صاحب!" وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "نیچے دیکھو۔"

اس نے گردن موڑی اور میری گود میں دیکھا۔ ۳۲ بور کے ریوالور کی خوفناک نال اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے میں ڈرائیور کا رنگ اپنی وردی کی طرح سفید ہو گیا "خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کر دو۔" میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا "کوئی چالاکی دکھائی تو ابھی مارے جاؤ گے۔"

غزالہ تیزی سے دوسری طرف والا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ ڈرائیور تذبذب میں تھا۔ میں نے غزالہ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے ایک دھانسو قسم کی گالی دی اور ریوالور کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ میرے خیال میں ریوالور سے بھی زیادہ اثر ڈرائیور پر گالی کا ہوا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہمیں مین روڈ پر لے آیا۔ ایک ویران سڑک پر پہنچ کر میں نے نوجوان ڈرائیور کو گاڑی سے اترنے کا حکم دیا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا اور منت سماجت کرنے لگا "صاحب! میں غریب آدمی ہوں۔ گاڑی چلی گئی تو میری نوکری بھی چلی جائے گی اور مجھے پولیس بھی پکڑے گی۔"

میں نے کہا "واویلا مت کرو۔ ایک گھنٹے کے اندر گاڑی تمہیں شہر کی کسی سڑک پر کھڑی مل جائے گی لیکن اگر شور کیا یا پولیس کے پاس گئے تو پچھتانا پڑے گا۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

○☆○

شاہدرہ سے کچھ آگے یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی درحقیقت عالم قریشی ہی کی تھی۔ عالم قریشی اپنی دوسری بیوی کو علیحدہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے یہ کوٹھی تعمیر کرائی گئی تھی۔ یہ کوٹھی مکمل آراستہ تھی۔ تاہم نامعلوم وجوہات کی بنا پر عالم قریشی ابھی یہاں منتقل نہیں ہوا تھا۔ میں اس کوٹھی کی چابی چپکے سے عالم قریشی کی دراز میں سے نکال لایا تھا (ایسا میں نے احتیاطاً کیا تھا ورنہ میرا ارادہ تو سیدھا راولپنڈی ہی جانے کا تھا) اس آراستہ کوٹھی میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ میں غزالہ کو لے کر یہاں آ گیا۔

"یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"میرے خیال میں اس وقت ہمارا واپس جانا ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے تمہارے گھر کی نگرانی بھی کر رہے ہوں۔ اس کے علاوہ چچا کے گھر پر بھی یہ لوگ موجود ہو سکتے ہیں۔"

غزالہ کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں "پلیز شاہ جہاں! آپ عاصم سے رابطہ کریں۔ کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

"یہاں کا فون ٹھیک نہیں ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں باہر سے فون کرتا ہوں۔"

وہ بولی "ابھی جائیں بلکہ ان سے کہیں کہ وہ کچھ گارڈز یہاں بھیج دیں۔ گارڈز کے ساتھ ہم ابھی ڈیفنس واپس جا سکتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور غزالہ کو کمرے میں بند رہنے کی ہدایت کر کے باہر آ گیا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر میں نے شیخوپورہ روڈ پر آٹھ دس کلو میٹر سفر کیا اور پھر گاڑی ایک قصبے کی گلی میں چھوڑ دی۔ یہیں سے ایک ٹیلی فون پر میں نے عالم قریشی سے رابطہ کیا اور اسے مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا (لیکن یہ نہیں بتایا کہ میں اس کی کوٹھی میں قیام پذیر ہوں) میں نے عالم قریشی کو سمجھایا کہ غزالہ کی گمشدگی کے بعد شیخ عاصم کے ہرکارے اس کی طرف بھی آ سکتے ہیں لہٰذا وہ ہوشیار رہے۔

گاڑی کے اندر سے ایک ٹیلی فون انڈکس ملا تھا۔ اس میں گاڑی کے مالک کا فون نمبر بھی تھا۔ میں نے اس نمبر پر رنگ کیا اور مالک کو اطلاع دے دی کہ اس کی گاڑی شیخوپورہ روڈ پر فلاں ذیلی سڑک پر موجود ہے۔

میں بس کے ذریعے واپس کوٹھی پہنچ گیا۔ غزالہ بے چین سی ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ شیخ عاصم سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ ابھی گھر واپس نہیں آیا ہے۔

غزالہ کو ابھی شک نہیں گزرا تھا کہ میں اسے شیخ عاصم سے چھین کر یہاں لے آیا ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے مجھے اور اسے یہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ غزالہ کا خیال تھا کہ ان لوگوں کا تعلق قبائلی بھینی جان کے ساتھیوں سے ہے۔

ایک قریبی ہوٹل سے میں پکا پکایا کھانا لے آیا۔ غزالہ نے ایک دو لقمے لیے۔ اس کی پریشانی ہر لحظہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ مجھے مجبور کرنے لگی کہ میں پھر جاؤں اور عاصم سے رابطہ کروں۔ میں اس کی تسلی کے لیے چلا گیا۔ واپس آ کر میں نے بتایا کہ عاصم بالکل خیریت سے ہے۔ بہرحال اسے بھی خطرے کا احساس ہے اور اس نے مشورہ دیا ہے کہ ہم دونوں ابھی واپس آنے کی کوشش نہ کریں۔

"عاصم نے ایسا کیوں کہا ہے؟" غزالہ الجھن سے بولی "کیا وہاں بھی کوئی بات ہوئی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا "کچھ لوگوں نے گھر کے سامنے ہوائی فائرنگ کی ہے۔"

غزالہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی "لیکن ___ مم ___ میرا مطلب ہے ہم دونوں کہاں رہیں گے؟"

"میں نیچے رہوں گا۔ تم اوپر والی منزل پر جا کر سو جاؤ۔"

"مم ___ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں کہنا چاہ رہی ہوں کہ آپ اکیلے ہیں۔ اگر وہ لوگ کھوج لگا کر یہاں تک پہنچ گئے تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا "جاؤ اور جا کر لیٹ جاؤ۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "میں یہیں رہوں گی۔ اسی کمرے میں۔"

میں قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ غزالہ قالین پر بیٹھی تھی اور سوچ میں گم تھی۔ میرا دھیان بار بار اس الیکٹرانک ڈوائس کی طرف جا رہا تھا جو میرے جسم میں موجود تھا۔ میرے ذہن میں بے شمار مرتبہ یہ شک گزر چکا تھا کہ اس ڈوائس کی وجہ سے شیخ عاصم میری "لوکیشن" سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ دس کلو میٹر کے دائرے میں، میں کہیں بھی ہوتا شیخ عاصم مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھی بہت جلد میرا کھوج لگا لے گا لیکن ایک امید بھی تھی کہ شاید ___ ایسا نہ ہو۔

غزالہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے والدین کے گھر جاتے جاتے یہاں کیوں پہنچی ہے۔ میں غزالہ کو سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا لیکن اس موضوع پر بات کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ غزالہ شیخ عاصم کے بارے میں کچھ بھی سننا پسند نہیں کرے گی اور یہ بات اس کے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہو گی کہ میں اسے شیخ عاصم کی دسترس سے نکال کر یہاں لے آیا ہوں۔ عین ممکن تھا کہ میری بات سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتی اور زبردستی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔ وہ ایک بیوی تھی لیکن میں یہ جانتا تھا کہ وہ بیوی نہیں ہے، وہ ایک شکار ہے۔ وہ شکاری کے کانٹے پر لگا ہوا گوشت کا وہ ٹکڑا ہے جس سے مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ غزالہ کو جو کچھ بھی بتانا ہے، بتدریج بتاؤں۔ آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ تاکہ بات اس کے دل میں اترتی چلی جائے۔

میں سوچنے لگا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ بات کہیں سے بھی شروع کی جا سکتی تھی۔ میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ پچھلے دس بارہ برس کی باتیں ایک جگہ جمع ہو چکی تھیں۔ آج دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ کہہ ڈالوں۔ اپنی پریشانیاں، ذہنی الجھنیں، محرومیاں، اپنے اندر کی جنگ، سب کچھ غزالہ کے سامنے بیان کر دوں لیکن میں اسے الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بات جل کوٹ سے شروع کی۔ میں نے کہا "غزالہ! شاید تمہیں پتا چل چکا ہو۔ میں گلگت جانے سے پہلے ایک دفعہ جل کوٹ گیا تھا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہوا تھا۔" غزالہ سر جھکا کر بولی "میں کبھی کبھی وہاں جاتی ہوں۔ میرے کلینک کے چوکیدار نے بتایا تھا۔"

"وہی کلینک جو تم نے ہمارے آبائی مکان میں کھول رکھا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے وہ مکان خرید لیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس میرا دل چاہا تھا۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔ جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

میں نے کہا "غزالہ میں والدہ اور والد کی قبر پر بھی گیا تھا۔ قبریں بہت صاف ستھری ہیں اور ان کی دیکھ بھال بھی کی جاتی ہے۔ گورکن نے بتایا تھا کہ تم اکثر وہاں جاتی ہو۔"

"جی ہاں۔"

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی حسین پیشانی پر ماضی کی پرچھائیاں لہراتی محسوس ہوئیں۔ وہ کھوئی گئی تھی، بہت دور چلی گئی تھی مجھ سے۔ یقیناً انہی کھیتوں کھلیانوں میں جہاں ہم دونوں کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔

میں نے کہا "غزالہ! میں نے جل کوٹ میں صرف ایک رات گزاری تھی۔ ساری رات میں اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھا رہا تھا جہاں سے تمہارے گھر کا منظر نظر آتا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا وہ بالکونی؟"

"جی ہاں۔"

"اور وہ محرابی کھڑکیاں بھی جن میں کھڑی ہو کر تم اپنے بال سنوارا کرتی تھیں۔"

"جی ہاں۔"

"اور وہ دالان بھی جہاں ایک تخت پر گدیلا پڑا رہتا تھا اس گدیلے پر تم اور تنھا میں کشتی کیا کرتے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"پھر تو غزالہ! تمہیں وہ باغ بھی یاد ہو گا جہاں آم کے پیڑ تھے اور ایک پیڑ کے دو شاخے پر ہم گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔"

"مجھے تو سب یاد ہے۔ آپ ہی بھولے ہوئے تھے۔" غزالہ نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"غزالہ، شاید تمہیں معلوم نہیں۔ جس روز میں جل کوٹ سے واپس عالم قریشی کے گھر آیا تھا۔ میں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا تھا۔ تم اس فیصلے کو میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کہہ سکتی ہو۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"ایک ایسا فیصلہ جو عمل در آمد سے محروم ہو چکا ہے اور شاید محروم ہی رہے۔"

"آپ الجھی ہوئی بات کر رہے ہیں۔"

"خود بھی تو الجھا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

غزالہ نے سر اٹھا کر تنقیدی نظروں سے مجھے دیکھا "ہاں الجھے ہوئے تو آپ ہیں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"غزالہ! آج میں تمہارے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے بہت غلطیاں کی ہیں۔ تمہیں بڑے دکھ اور پچھتاوے دیے ہیں اور دیتا چلا جا رہا ہوں۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں غزالہ ___ تمہارے بے شمار آنسو میرے سینے کا بوجھ ہیں۔"

غزالہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی حسین آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ خاموش تھی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "اتنی دیر شاہ جہاں ___ اتنی دیر ___ یہ بات کہنے میں آپ نے اتنے برس لگا دیے۔ اتنے موسم، اتنی صدیاں، اتنے زمانے گزار دیے۔ یہ چند الفاظ آپ کے دل سے آپ کی زبان پر آتے آتے کتنے عذاب گزر گئے مجھ پر، کتنے گھاؤ لگ گئے میری روح پر کچھ خبر ہے آپ کو؟ میں نے آپ کی محبت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ روتی بلکتی رہی، آپ کے سامنے سر جھکاتی رہی، اپنی نسوانیت، اپنی انا، اپنا پندار سب کچھ بیچ دیا میں نے۔ لیکن آپ پتھر بنے رہے اور اب جب کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، آپ اپنی زیادتیوں کا اعتراف کر رہے ہیں۔"

میں ان خاموش نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے میں نے کہا "گیارہ بجنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔ تم دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا لو۔ میں باہر والی لاؤنج میں بیٹھوں گا ___ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے جگا لینا۔ ویسے کچن میں سب کچھ موجود ہے۔"

رات کا باقی حصہ میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزارا۔ غزالہ کو شیخ عاصم سے جدا کر کے ایک بہت بڑا قدم اٹھایا تھا میں نے۔ غزالہ اس قدم سے بے خبر تھی۔ اسے باخبر کرنا ضروری تھا لیکن یہ اطلاع اس تک پہنچانے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ میں خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا اور توڑتا رہا۔ ایک بار پھر میرا دھیان الیکٹرانک ڈوائس کی طرف چلا گیا۔ ابھی تک اس ڈوائس کی وجہ سے میرے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ میں شیخ عاصم سے زیادہ سے زیادہ دس کلو میٹر کے فاصلے پر نہیں تھا۔ یعنی میرا فاصلہ دس کلو میٹر سے زیادہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ میری قسمت ساتھ دے رہی تھی اور ڈوائس کا سسٹم کام نہیں کر رہا تھا۔

صبح سویرے میں ناشتے کے لیے بازار جانا چاہتا تھا کہ غزالہ کی آواز نے مجھے روک لیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ ناشتا تیار تھا۔ غزالہ مجھ سے پہلے اٹھ کر کچن میں مصروف ہو گئی تھی اور اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک مدت سے اس گھر میں رہ رہی ہے اور کچن میں کام کر رہی ہے۔ میں کچن میں پہنچا تو ٹیبل پر تازہ اورنج جوس کے دو گلاس رکھے تھے۔ انڈے کا آملیٹ تھا، ڈبل روٹی تھی اور گرما گرم حلوا تھا جو غزالہ نے بنایا تھا۔ حلوے کی خوشبو سے پورا کچن مہک رہا تھا۔

"بھئی! یہ تکلف کیوں کیا تم نے۔ میں بازار سے لے آتا۔"

"جب سب کچھ گھر میں موجود ہے تو بازار جانے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ کسی گھر گرہستن کی طرح بولی۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ناشتے کی طرف بڑھا تو وہ بے ساختہ بولی "ٹھہریے! میرا خیال ہے آپ کو کچھ زیادہ ہی بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"منہ ہاتھ تو دھو لیجیے۔"

"اوہ سوری! مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔"

میں نے کچن میں لگے ہوئے بیسن پر منہ دھویا۔ وہ تولیا لیے میرے قریب کھڑی تھی۔ ہم دونوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ غزالہ بار بار اپنی رسٹ واچ دیکھ رہی تھی۔ ناشتا ختم کرتے ہی بولی "شاہ جہاں! آپ عاصم سے بات کریں۔ میں ان کی طرف سے بڑی فکر مند ہوں۔"

میں نے کہا "فکر مند تو میں بھی ہوں۔"

"تو پھر جائیے نا۔ فون پر بات کیجیے۔"

"غزالہ! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل خیریت ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

ہم دونوں ڈرائنگ میں آ بیٹھے۔ میں نے کہا "غزالہ! تمہیں یاد ہے، پشاور میں ڈوبیں گل کی شادی پر ہنگامہ ہوا تھا۔ وہیں سے آنے والے ایک شخص نے شیخ عاصم پر یوسا نامی لڑکی کے بارے میں الزام لگایا تھا۔"

"ہاں لیکن آپ یہ بات کیوں چھیڑ رہے ہیں؟"
"اس لیے غزالہ کہ وہ بات درست تھی۔"

غزالہ کے چہرے پر کئی رنگ گزر گئے۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں غزالہ! میں جانتا ہوں' تمہیں بہت دکھ پہنچے گا لیکن میں وہی بیان کر رہا ہوں جو حقیقت ہے۔ عاصم کا یوسا نامی اس لڑکی سے تعلق تھا اور اب بھی ہے اور بات صرف یوسا ہی کی نہیں' عاصم نے اپنی کسی بھی منظور نظر لڑکی کو مستقل طور پر فارغ نہیں کیا۔ وہ سب پھر اس کے حرم کو آباد کرنے والی ہیں۔ ان سب کو یقین دہانی کرائی گئی ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"یہی کہ شیخ عاصم کے بارے میں تمہاری توقعات بہت جلد غلط ثابت ہونے والی ہیں۔ مجھے بڑے افسوس اور رنج کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے غزالہ کہ عاصم صرف اوپر سے بدلا ہے۔ اندر سے وہ اب بھی پرانا شیخ عاصم ہے۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے اس نے اپنا عشرت کدہ ختم کر دیا تھا' ساری داشتاؤں کو چھٹی دے دی تھی مگر یہ دھوکا ہے۔"

"آپ۔ یہ سب کیسے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کیا جانتے ہیں یوسا کے بارے میں اور دوسری لڑکیوں کے بارے میں؟"

"یوسا خود مجھ سے ملی تھی۔" میں نے کہا "وہ دبئی سے آئی تھی اور شیخ عاصم سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اسی نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی تھیں۔ ان لڑکیوں کے نام بھی بتائے تھے جو در پردہ ابھی تک شیخ عاصم سے وابستہ ہیں۔"

"میں تو پچھلے دو ماہ سے چوبیس گھنٹے عاصم کے ساتھ رہی ہوں۔ میں نے کسی یوسا کو نہیں دیکھا۔"

"میں نے اسے تم تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں اور عاصم کو کسی طرح کی پریشانی ہو۔ میں نے رقم دے کر اسے واپس بھیج دیا تھا۔"

غزالہ کے چہرے پر شدید الجھن تھی۔ اس نے بے چینی سے اپنی انگلیاں موڑیں "شاہ جہاں! آپ کھل کر بتائیں کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

"میں کچھ کہنا نہیں چاہ رہا۔ میں بس تمہیں FACTS بتا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ان پر غور کرو۔ عاصم تمہارا شوہر ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ میاں بیوی سے قریبی رشتہ اور کون سا ہوتا ہے۔ یہ رشتہ اگر تاریکی میں ڈوب جائے تو دھاگے سے بھی کمزور ہو جاتا ہے۔"

"شاہ جہاں! میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ بدل رہے ہیں۔ وہ پہلے سے بہت بدل چکے ہیں۔"

"بس تم یہی ایک بات دہراتی رہنا۔ تم حقیقت سے آنکھیں چرا رہی ہو غزالہ۔ تم خود کو فریب دے رہی ہو۔ عاصم ضرور بدلا ہو گا لیکن یہ تبدیلی مثبت نہیں منفی ہے۔ اگر میں تمہیں FACTS بتا رہا ہوں تو خدانخواستہ اس میں میرا کوئی مفاد نہیں۔ میں صرف اور صرف تمہاری بہتری کا سوچ رہا ہوں۔ میں بڑے دکھ کے ساتھ تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں لاہور میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے لوگ میری جان کے ساتھی نہیں تھے۔ وہ عاصم کے ساتھی تھے۔"

"یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" غزالہ کے چہرے پر بے انتہا حیرت امڈ آئی۔

"ہاں غزالہ! میں یہ بات ثبوت کے بغیر نہیں کہہ رہا۔ تمہارے انکل ساہی صاحب اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ان کی تفتیش کے مطابق حملے میں حاجی برکات نامی ایک شخص ملوث تھا۔ حاجی برکات کی کوٹھی پر چھاپا مارا گیا۔ وہاں سے ملنے والے کاغذات نے ثابت کیا کہ حاجی برکات اور شیخ عاصم میں کاروباری مراسم ہیں۔ دبئی میں سونے کے کاروبار میں حاجی برکات اور شیخ عاصم کے درمیان تعلقات ہیں۔"

میں نے جیب سے کچھ کاغذات نکال کر غزالہ کو دکھائے۔ وہ پریشان نظروں سے ان کاغذات کو دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ زبان بار بار خشک لبوں پر حرکت کرتی تھی۔ کاغذ مجھے واپس تھماتے ہوئے بولی "خدا کے لیے شاہ جہاں۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ مجھے ان معاملوں سے دور رکھو۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ آپ دونوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے۔ میں بس یہ جانتی ہوں کہ وہ میرے شوہر ہیں۔ جیسے بھی ہیں' مجھے ان کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں سمیت وہ میرے شریک حیات ہیں۔"

"غزالہ! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ شیخ عاصم نے تمہارے ساتھ شادی نہیں کی' ایک کھیل کھیلا ہے۔ تمہارے ساتھ ایک سانحہ ہوا ہے غزالہ۔ اب یہ سانحہ بدترین شکل اختیار کر سکتا ہے۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی جان دے کر بھی تمہاری ازدواجی زندگی بچانے کی کوشش کرتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس ازدواجی زندگی کا وجود ہی نہیں ہے۔"

"پلیز شاہ جہاں۔۔۔ پلیز خاموش ہو جائیں۔" غزالہ قریباً چیختے ہوئے بولی۔

"اب بات شروع ہوئی ہے تو مجھے کہہ لینے دو غزالہ۔ مجھے مت ٹوکو۔ میں تمہارے جذبات سمجھ رہا ہوں لیکن میں

دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہی ہو۔ تم شیخ عاصم کا ایک چہرہ دیکھ رہی ہو' میں دوسرا دیکھ رہا ہوں اور یہ دوسرا چہرہ اتنا بھیانک ہے کہ تم تصور نہیں کر سکتی ہو۔ کیا تم پسند کرو گی کہ کل کلاں شیخ تمہیں اذیت کی سولی پر لٹکا دے۔ تم زندگی اور موت کے لیے ترس کر رہ جاؤ اور میں تمہاری حالت دیکھ کر مجبوری کی انتہا پر پہنچ جاؤں' یہاں تک کہ عاصم کو شمشانا کا پاک بنانے پر مجبور ہو جاؤں۔ کیا تم یہ چاہو گی کہ تمہاری وجہ سے شیخ عاصم اپنے مذموم ترین مقصد میں کامیاب ہو جائے۔"

"خدا کے لیے شاہ جہاں! مجھے باتوں میں مت الجھائیں۔ میری خاطر آپ کوئی مجبوری مول نہ لیں۔ آپ کے سامنے میرے جسم کا تار تار بھی علیحدہ ہو جائے تو آپ پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہو گی۔ میں آپ کو اپنی ہر ذمے داری سے حلفاً آزاد کرتی ہوں۔ بس مجھ پر اتنا کرم کریں کہ مجھے میرے شوہر کے پاس چھوڑ آئیں۔ اب وہ جیسے بھی ہیں جو بھی ہیں' میرا نصیب ہیں۔ مجھے ان کا دیا ہوا بڑے سے بڑا غم دل و جان سے قبول ہے۔"

میں حیرت کے عالم میں غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج وہ ہمیشہ سے مختلف نظر آئی تھی۔ وہ نازک اندام لڑکی ایک پہاڑ کی طرح میرے سامنے کھڑی تھی اور میری ہر دلیل اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایک مشرقی عورت کی حیثیت سے وہ شیخ عاصم کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرے گی لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کا ردعمل اتنا شدید اور اٹل ہو گا۔

ایک عجیب سی تلخی میرے رگ و پے میں پھیل گئی۔ میں نے اندرونی ہیجان کو کم کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ غزالہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ میں نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ غزالہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے اس کی سسکی کمرے میں گونج جاتی تھی۔ یہ سسکی مجھ سے درخواست کر رہی تھی کہ میں جلد سے جلد اسے اس کے گھر واپس چھوڑ آؤں۔

اچانک "اوغ" کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا' غزالہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ابکائی لے رہی ہے۔ دوسری ابکائی کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں حیرت سے بُت بنا دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ دو منٹ بعد وہ باہر نکلی۔ اس کا منہ دھلا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی جھکی تھیں۔ یہ جھکی جھکی آنکھوں والا خاص انداز مجھے ایک بات سمجھا رہا تھا۔ میں سنانے میں رہ گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ غزالہ عاصم کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ ٹیلی فون کال میرے کانوں میں گونجنے لگی جو کل شیخ عاصم نے مجھے کی تھی۔ اس نے کہا تھا "شاہ جہاں! ہمارے پاس تمہارے لیے دو خوش خبریاں ہیں پھر ایک خوش خبری اس نے مجھے سنا دی تھی۔ یعنی اس نے مجھے بتایا تھا کہ میرا الیکٹرانک ڈوائس نکالنے کے لیے انتظام کر لیا گیا ہے۔ دوسری خوش خبری سنانے سے پہلے وہ کسی ضروری کام سے روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے غزالہ سے پوچھا تھا تو وہ بولی تھی کہ یہ "خوش خبری" عاصم ہی سنائیں گے۔ اب وہ "خوش خبری" میں بغیر کسی کے سنائے سن رہا تھا۔

"اوہ میرے خدا!" میرے دل سے بے اختیار آہ نکلی اور میں نڈھال سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ غزالہ دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ وقت کتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا تھا۔ پہلے غزالہ میری بچھڑی ہوئی محبوبہ تھی پھر وہ عاصم کی بیوی بنی تھی۔ اب وہ عاصم کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ درد کی ایک ٹیس میرے سینے میں پھیل گئی۔ غم گہرا اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ نہ جانے کیوں ان غمناک گھڑیوں میں وادی موت کی سرنگ کا منظر میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ پُراسرار پردہ نشین سانسوں کی مہیب آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی "غم' خوشی کا سایہ ہے' غم یعنی تکلیف کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ غم سے گھبرانا نادانی ہے۔ غم نہ ہو گا تو خوشی کا وجود نہ ہو گا۔ میرے دوستو! شدید ترین اذیتوں اور جان توڑ غموں کے لیے اپنے سینے کو کھول دو' اپنی بانہیں پھیلا دو۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ یہی مسرتوں کی کلید ہے۔ قدرت پر بھروسا رکھو۔ قدرت کے ہاتھ میں بڑا حساس ترازو ہے۔ وہاں ہر تکلیف کے بدلے ایک راحت اور ہر راحت کے بدلے ایک تکلیف تول کر دی جاتی ہے اور یہ ترازو تصور میں آنے والے' چھوٹے سے چھوٹے پیمانے کو درست تولتا ہے۔"

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ سانسوں کی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی' اکثر اس کے خیالات میرے ذہن پر دستک دیتے رہتے تھے۔ درحقیقت یہ خیالات میرے اپنے عقیدے سے کسی طرح بھی متصادم نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے شدت سے متاثر کیا تھا۔ ان خیالات کی وجہ سے میرے اندر وہ مخصوص توانائی بڑھی تھی جو مجھے حادثات اور مشکلات سے ٹکرانے کا حوصلہ دیتی تھی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور اس بے پناہ غم کو اپنے اندر

جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا جو غزالہ کے رویے اور اس کی تازہ ترین حالت کی وجہ سے میرے اندر منہ زور چشمے کی طرح پھوٹا تھا۔

غزالہ واپس جانا چاہ رہی تھی۔ وہ عاقل اور بالغ تھی۔ اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا حق رکھتی تھی۔ میرا کام صرف اسے سمجھانا تھا' وہ میں نے سمجھا دیا تھا۔ اب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ اس سے آگے زبردستی کی حد شروع ہو جاتی تھی اور میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ غزالہ کو زبردستی یہاں روکوں گا۔ تو کیا میں اسے واپس شیخ عاصم کے پاس چھوڑ آؤں۔ اس بھیڑیے کے پاس جس نے خود کو بھیڑ کی کھال میں چھپا رکھا ہے اور جس کے خونخوار دانت کسی بھی وقت غزالہ کو بھنبھوڑ سکتے ہیں۔

میں سوچتا رہا اور میرے دل ودماغ میں جنگ جاری رہی۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ غزالہ شیخ عاصم کے بارے میں میری ہر دلیل کو سنے بغیر رد کیوں کرتی رہی ہے۔ آج شیخ سے اس کا بندھن مجھے ہمیشہ سے زیادہ مضبوط نظر آیا تھا۔ اس مضبوطی کی وجہ یقیناً وہ ننھی زندگی تھی جس نے غزالہ کے وجود میں جنم لیا تھا۔

سوچوں کے دھارے مجھے اپنے ساتھ بہاتے رہے اور غم ساون بھادوں کی بارش کی طرح میرے دل پر گرتا رہا اور جذب ہوتا رہا۔۔۔۔ غم' جو ساتوں کے الفاظ میں زندگی کا اٹوٹ حصہ تھا۔۔۔ میں نے گھڑی دیکھی' ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اگر دیکھا جاتا تو ابھی کچھ زیادہ بگڑا نہیں تھا۔ واپسی کے لیے کوئی بھی بہانہ بنایا جا سکتا تھا۔ میرا اور غزالہ کا تعاقب کرنے والوں نے کسی مرحلے پر بھی اعتراف نہیں کیا تھا کہ وہ شیخ عاصم کے کارندے ہیں۔ میں شیخ عاصم سے کہہ سکتا تھا کہ ہمیں گلبرگ جاتے ہوئے اپنے تعاقب کا شبہ ہوا تھا۔ بعد ازاں نامعلوم افراد نے ہم پر گولی چلائی۔ ہم خود کو بچانے کے لیے اس کوٹھی میں آ گئے۔ ذاتی سواری دستیاب نہیں تھی اور کوٹھی کا فون بھی خراب تھا۔ کوٹھی سے باہر حملہ آوروں کا خطرہ تھا لہٰذا واپسی کے لیے ہمیں صبح تک انتظار کرنا پڑا۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھا' غزالہ دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ غالباً رو رہی تھی۔ ایک رات پہلے جو سفر میں نے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ آغاز کیا تھا' وہ چند قدم چلنے کے بعد ہی اختتام پذیر ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میری ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی ہے۔ حالات کے ایک ہی جھکڑ نے ہر منصوبے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک سگریٹ ختم کیا۔ رگ رگ میں نقاہت سی اتر رہی تھی۔ سست قدموں سے میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں غزالہ موجود تھی۔

اچانک مجھے صحن کی طرف سے مدھم آہٹ سنائی دی۔ اس کوٹھی میں میرے اور غزالہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ آہٹ کا سنائی دینا خطرے کی نشانی تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر میں نے باہر جھانکا اور سناٹے میں رہ گیا۔ ایک شخص دائیں جانب کی بیرونی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو چکا تھا اور اب مین گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی کارروائی کا پیشگی اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یقیناً اس کے ساتھی باہر موجود تھے اور اب وہ مین گیٹ کھول کر انہیں بھی اندر لانا چاہ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ پہلے سے کھلا تھا' میں تیزی سے باہر نکلا۔ میرے پاؤں میں "ربر سوز" تھے لہٰذا قدموں کی معمولی سی آواز بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ نو وارد کے ہاتھ مین گیٹ تک پہنچتے میں نے اسے عقب سے جا لیا۔ میرا بازو اس کی گردن سے لپٹا اور اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا واپس برآمدے میں لے آیا۔ گردن پر پڑنے والے بے پناہ دباؤ کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی پتلون کی بیلٹ میں اعشاریہ دو پانچ کا پستول اڑسا ہوا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے پستول نکال کر جیب میں ڈال لیا۔

غزالہ اس ہلچل سے آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے باہر آئی۔ برآمدے میں بے ہوش شخص کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"یہ کیا ہوا شاہ جہاں؟"

"تم اندر جاؤ۔ یہاں خطرہ ہے۔" میں نے اسے کمرے کی طرف دھکیلا۔

اسی دوران میں بیرونی دیوار کی منڈیر پر ایک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ آگے کو جھک کر صحن میں جھانک رہا تھا۔ یقیناً یہ بے ہوش ہونے والے شخص کا ساتھی تھا اور اس بات پر حیران تھا کہ ابھی تک اس نے گیٹ کیوں نہیں کھولا۔ اپنے ساتھی کو غائب پا کر اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی اور وہ دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اتنے میں غزالہ ہانپتی ہوئی واپس آئی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا "شاہ جہاں! میں نے ادھر سے دیکھا ہے۔ اف خدایا۔۔۔ وہ بہت سے ہیں۔ ان کے پاس رائفلیں ہیں۔"

میں نے غزالہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا کوٹھی کے عقبی حصے میں لے آیا۔ کوٹھی کا عقبی دروازہ مقفل تھا' میں نے حتی الامکان تیزی سے یہ دروازہ کھولا اور غزالہ کے

ساتھ باہر آ گیا۔ حملہ آور اس وقت تک کوٹھی میں داخل ہو چکے تھے۔ میں سامنے والے حصے سے ان کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ کوٹھی میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ پیدل فرار ہونے کی کوشش میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ قریب ہی ایک ہائی روف کیری ڈبا کھڑا تھا۔ میں نے پستول کا آہنی دستہ رسید کر کے ڈبے کا ایک شیشہ توڑ دیا اور دروازہ کھول کر غزالہ کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اب مسئلہ ڈبے کو اسٹارٹ کرنے کا تھا۔ میرے پاس کوٹھی کی چابیوں والا گچھا موجود تھا۔ میں نے پھرتی سے مختلف چابیاں اگنیشن میں آزمائی شروع کیں۔ ایک دو چابیاں لگیں بھی لیکن ڈبا اسٹارٹ ہونے میں نہیں آیا۔

حملہ آور کوٹھی کو خالی پا کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بالائی منزل سے کسی حملہ آور کی نظر ہم پر پڑ جاتی۔ یکایک میری نگاہ کچھ دور کھڑی ایک 175 موٹر سائیکل پر پڑی۔ موٹر سائیکل سوار ابھی ابھی اتر کر ایک کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اگنیشن میں لگی ہوئی چابی دور سے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں کیری ڈبے سے اترا اور غزالہ کو لے کر موٹر سائیکل کی طرف دوڑا۔ یہی وقت تھا جب ایک حملہ آور نے زوردار آواز سے عقبی دروازہ کھولا اور اس کی نگاہ ہم پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

"رک جاؤ۔" وہ چیخا۔

پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے ماؤزر ہماری ٹانگوں کی طرف سیدھا کیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے پستول نے دھماکے سے گولی اگلی اور حملہ آور سینے پر موت کا سرخ داغ لے کر پشت کے بل گیٹ کے درمیان گرا "بھاگو غزالہ" میں نے غزالہ کو تیزی سے کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ اونچی ہیل پہنے ہوئے تھی۔ اس کا پاؤں لڑکھڑایا اور وہ کنکریٹ کے فرش پر گر گئی۔ میں نے اس کی چوڑیوں کو ٹوٹتے اور دور تک بکھرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اسے سنبھالا۔ یہی وقت تھا' جب مزید دو افراد گیٹ پر نظر آئے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پستول ان کی طرف سیدھا کیا اور میگزین خالی کر دیا۔ وہ دونوں زخمی ہوئے اور خود کو بچانے کے لیے دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ جونہی غزالہ کے ہاتھ کی گرفت میری کمر پر مضبوط ہوئی' میں نے جھٹکے سے کلچ چھوڑ دیا۔ ڈبل سائلنسر موٹر سائیکل کمان سے نکلے تیر کی طرح بغلی گلی میں گھستی چلی گئی۔ مجھے اپنے عقب میں فائرنگ کی تڑتڑ سنائی دی لیکن میں جانتا تھا کہ فی الوقت ہم اس فائرنگ سے محفوظ ہیں۔ لوگوں کے چہروں پر ہراس نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس ہراس کا سبب فائرنگ کی آواز تھی جو کچھ لوگوں نے مجھے اور غزالہ کو دوڑ کر موٹر سائیکل پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ ہماری "افراتفری" کے منظر نے انہیں حیران کیا تھا۔

قریباً دو فرلانگ آگے آ کر ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں نئی آبادی کی حدیں پرانی آبادی سے ملتی تھیں۔ میں نے موٹر سائیکل پرانی آبادی کی طرف موڑ دی "غزالہ! مضبوطی سے تھام لو۔" میں نے کہا اور موٹر سائیکل ایک کچی گلی میں گھسا دی۔

موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ہمیں یہ "سہولت" حاصل ہو گئی تھی کہ ہم کار سواروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے تنگ گلیوں میں گھس سکتے تھے۔ موٹر سائیکل بری طرح اچھل رہی تھی لیکن غزالہ نے مجھے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ جیسے میرے جسم ہی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ ہمارے عقب میں آنے والے شاید غم وغصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے چلے آ رہے تھے۔ اپنے عقب میں' میں نے ایک سفید گاڑی کی جھلک دیکھی لیکن وہ کافی فاصلے پر تھی۔ ہم ایک مزید تنگ گلی میں گھسے تو یہ کار بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ گندے پانی کی نالیوں والی غلیظ گلی تھی۔ ٹاٹ لگے دروازوں کے سامنے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ کہیں عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں' کہیں خوانچے والے نے راستہ روک رکھا تھا۔ موٹر سائیکل ان رکاوٹوں کے درمیان سے گزرتی' اچھلتی کودتی پھلانگتی چلی جا رہی تھی۔ اس دو تین فرلانگ لمبی گلی سے گزر کر ہم جیا موسیٰ کی آبادی کی طرف آئے اور پھر بڑی سڑک پر پہنچ گئے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ غزالہ کا سر میری پشت سے ٹکا ہوا ہے اور وہ ہولے ہولے کراہ رہی ہے۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید اسے گولی لگ گئی ہے۔ یہ خیال اتنا روح فرسا تھا کہ مجھے اپنی ٹانگیں بے جان محسوس ہونے لگیں۔

میں نے موٹر سائیکل روکے بغیر پیچھے مڑ کر دیکھا "غزالہ کیا ہوا؟"

وہ خاموش رہی' اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے اور رنگ زرد ہو رہا تھا "گولی تو نہیں لگی؟" میں نے پوچھا' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "پھر کیا ہوا ہے؟"

غزالہ کو خاموش پا کر میں نے موٹر سائیکل ایک طرف روک لی۔ غزالہ شدید تکلیف میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ناف پر دھرا تھا۔۔۔ یہ ہاتھ مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ شدت غم سے مجھے اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہوئے۔ میرے

دل نے گواہی دی کہ غزالہ کو جسمانی طور پر نقصان پہنچا ہے۔ وہ امید سے تھی۔ ایسی حالت میں اسے نہ صرف بھاگنا پڑا تھا بلکہ وہ گری بھی تھی۔

"غزالہ' تم ٹھیک تو ہو؟"

"اف میرے خدا!" کرب میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہوتی جارہی تھی۔

"غزالہ مضبوطی سے بیٹھو۔" میں نے کہا اور موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ میرا رخ راوی کے پل کی طرف تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد موٹر سائیکل لیڈی ولنگڈن اسپتال کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔

O☆O

یہ گائنی کا کیس تھا۔ غزالہ کو فوراً آپریشن تھیٹر پہنچایا گیا۔ سوس پندرہ منٹ میں ابارشن کی تصدیق ہوگئی۔ دو ڈھائی مہینے کا حمل ضائع ہوچکا تھا۔ غزالہ کو خون کی ضرورت تھی۔ میرا خون ملتا تھا۔ میں نے دو بوتل خون دیا۔ ایک بوتل باہر سے حاصل کیا گیا۔ اس کی حالت سنبھلی لیکن۔۔۔ اسے "سی یو" میں ہی رکھا گیا۔ اسپتال کی پرچی میں میں نے غزالہ کا نام ارم لکھوایا تھا۔

سہ پہر تین بجے کے قریب جب غزالہ کی حالت بہتر ہوگئی تو میں نے پبلک بوتھ سے عالم قریشی کو ٹیلی فون کیا۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی بولا "یار کہاں ہو تم؟ کیا مصیبت ڈال دی ہے تم نے ہمیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"بڑے کی ماں کا سر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بندے زبردستی کوٹھی میں گھس آئے تھے۔ میرے چوکیدار کو جوتے شوربے (گھونسے) بھی لگائے ہیں انہوں نے۔۔۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ گارڈ موجود تھے۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کرلیں اور ان دونوں کو باہر نکلنا پڑا۔"

"کچھ پتا چلا کون لوگ تھے؟"

"وہی تیرے رقیب شیخ عاصم کے بندے ہوں گے اور کون ہوں گے۔ ابھی تمہارے فون سے پہلے ایک فون آیا ہے۔ کوئی کتے کا بچہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ اگر مجھے شاہ جہاں کا پتا ہے تو بتادوں ورنہ میرا حشر شاہ ایران سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ اسے وہم تھا کہ شاید میں نے تمہیں کوٹھی کے اندر ہی کہیں پناہ دے رکھی ہے۔"

میں نے کہا "میں تو اس سے بھی زیادہ کی توقع کر رہا تھا' بہرحال تم اپنے گارڈز کو چوکس رکھو اور اگر ہوسکے تو اپنے تعلقات کو استعمال کرکے پولیس گارڈز بھی لگوالو۔"

"او نہیں یار! اتنا بکری بھی نہ بناؤ تم مجھے۔۔۔ جو ہو دیکھا جائے گا اور تم بتاؤ' کیسے فون کیا ہے اور وہ۔۔۔ تمہاری ڈاکٹر غزالہ کہاں ہے؟"

"یار' اسی کے لیے تو فون کیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے کوئی گائنی کا مسئلہ تھا اس کا۔"

"او ہو! وہ اب ٹھیک تو ہے؟" عالم قریشی کی پرتشویش آواز ابھری۔

"ہاں کچھ بہتر ہے۔"

"لیکن یار! وہ تو خود بڑی لائق فائق گائنی اسپیشلسٹ ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے' وہ اپنا علاج خود کرتے چلی جاتی۔"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" قریشی اپنے سوال پر خود ہی شرمندہ ہوگیا "مگر وہ ہے کہاں؟"

"لیڈی ولنگڈن اسپتال میں۔"

"اوہ۔۔۔ وہاں تو اتنی زیادہ "کیئر" نہیں ہوسکے گی۔"

"اسی لیے تو فون کیا ہے تمہیں۔ تمہارے یار را مرچنٹ کا پرائیویٹ اسپتال بھی تو ہے جیل روڈ پر۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں وہاں تمہارے پاس آجاؤں؟"

"آجاؤ تو بہتر ہے لیکن یہ نہ ہو کہ تمہارا پیچھا کیا جائے۔"

"یار! آج الو کا پٹھا نہ سمجھو مجھے۔۔۔ میں دیکھ بھال کر آؤں گا۔۔۔ اور ہاں ایک بندر بھی ملنے آیا ہوا ہے تم سے لمبے بال' گلے میں مالائیں اور گھنگھیاں' پہنا ہوا چوغہ۔ ہاو ہا نعرہ لگاتا ہے 'دل دھڑکا عاشق کا' ہا دل دھڑکا۔"

"سائیں عالی؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے یہ وہی حضرت ہوسکتے ہیں۔ کہتا ہے مجھے فوراً شفیع محمد سے ملاؤ ورنہ اس کا بڑا نقصان ہوجائے گا۔ پکائی ہانڈی جل جائے گی اس کی۔"

سائیں عالی کئی ہفتوں سے روپوش تھا۔ اب وہ عالم قریشی کے پاس پایا جا رہا تھا۔ میں نے عالم قریشی سے کہا "ٹھیک ہے' اسے بھی ساتھ لے آؤ لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ احتیاط سے۔ اگر تعاقب ہو رہا ہو تو واپس چلے جانا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"تم زیادہ ہدایت کار نہ بنو۔ تمہاری بات میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

فون پر مجھ سے بات کرنے کے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد عالم قریشی اسپتال پہنچ گیا۔ سائیں عالی اس کے ساتھ تھا اور وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ یہ وہی تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن تھی جو میں اکثر استعمال کرتا رہا تھا۔ وین پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ عالم قریشی نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے گھر کے آس پاس پھر کچھ مشکوک افراد گھوم رہے تھے۔ گارڈز نے ان کو مار بھگایا ہے۔ عالم قریشی نے یہ بھی بتایا کہ وہ احتیاطاً اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے آیا تھا اور راستے میں انہیں ایک عزیز کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ وہ وہاں بالکل محفوظ ہوگئے تھے۔ عالم قریشی نے مجھ سے غزالہ کا حال احوال دریافت کیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں تمام صورت حال بتائی پھر ہم سائیں عالی کے پاس وین میں چلے آئے۔ وہ حسب عادت نشست پر بیٹھنے کے بجائے گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا' اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ میرا دھیان سب سے پہلے اس کے جسم کے پراسرار آبلوں کی طرف گیا۔ آبلے بالکل ٹھیک تھے۔ وین کی اندرونی روشنی میں سائیں کے چہرے اور ہاتھوں وغیرہ کی جلد بالکل صاف نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا یہاں کبھی کوئی آبلہ تھا ہی نہیں۔

سائیں عالی نے پلکیں اٹھائیں اور سرخ انگارا آنکھوں سے مجھے گھورا "دل دھڑکا عاشق کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔" اس نے نعرہ لگایا۔

قریب سے گزرتے ہوئے دو افراد ٹھٹک کر وین کی طرف دیکھنے لگے۔ سائیں عالی مجھ سے مخاطب ہوکر مجذوبانہ لہجے میں بولا "شفیع محمد! جنات میں بھی علم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ تمہاری طرح جنات میں بھی ڈاکٹرز ہوتے ہیں۔ ایک اسپیشلسٹ مادہ جن کو میں نے ابھی تیری مریضہ کی طرف بھیجا تھا' اس نے بتایا ہے کہ حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں۔ مریضہ کو علاج کی ضرورت ہے۔ اب وہ مادہ جن خود مریضہ کا علاج کرے گی لیکن یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ تمہیں پتا ہی ہے "جن" ڈاکٹروں کے سارے آلات اور اوزار بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ انجکشن کی سرنج ہی کو لے لو۔ جنوں کی سرنج سائیکل میں ہوا بھرنے والے پمپ سے تین گنا بڑی ہوتی ہے۔ اب اتنا بڑا ٹیکا لگ جائے کسی کی ناز (نس) میں تو وہ پار ہوجائے گا یا نہیں۔ لہٰذا غزالہ کا علاج کرنے کے لیے ذہب النساء بی بی اس "جن" ڈاکٹر کو کسی انسان میں گھسنا پڑے گا۔ میرے کہنے پر وہ لیڈی ڈاکٹر عارفہ عباسی میں گھس گئی ہے۔ عارفہ عباسی کو جانتے ہو نا تم؟ شہر کی سب سے بڑی لیڈی ڈاکٹر ہے۔"

سائیں عالی حسب عادت اوٹ پٹانگ بولتا چلا جارہا تھا۔ عالم قریشی اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "سائیں عالی! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو سیدھے لفظوں میں کہہ دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

وہ بولا "سیدھے لفظ یہی ہیں کہ تم غزالہ کو چھٹی دلواؤ یہاں سے۔ ہم اسے لیڈی ڈاکٹر عارفہ عباسی کے پاس لے کر چلتے ہیں۔"

میں عارفہ عباسی نام کی اس ڈاکٹر کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے کہا "لیکن وہ تو نہیں دیکھے گی۔ دو دو مہینے پہلے وقت لینا پڑتا ہے اس سے۔"

سائیں عالی نے بڑی روانی سے ڈاکٹر عباسی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور بولا "دیکھے گی کیوں نہیں۔ اس کا باپ بھی دیکھے گا۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے عالم قریشی کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھ سے مجھے ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ سرگوشی میں بولا "گھر میں یہ ملنگ صاحب فون پر کسی سے گفتگو بھی فرما رہے تھے۔ ایک دو بار کسی ڈاکٹر کا نام بھی لیا تھا انہوں نے۔۔۔ کیا پتا یہ وہی ڈاکٹر عارفہ عباسی ہو۔"

سائیں عالی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ عارفہ عباسی سائیں کی کوئی مریدنی ہی نکل آئے۔ وہ اس سے پہلے بھی اس طرح ہم کو حیران کرچکا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ ہمیں سائیں عالی کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اگر وہ ڈاکٹر عباسی سے وقت لینے میں کامیاب نہ ہوپاتا تو ہم کسی اور کلینک کی طرف رجوع کرسکتے تھے۔ قریشی کے دوست کا اسپتال بھی تو تھا۔

ہم نے غزالہ کو لیڈی ولنگڈن اسپتال سے چھٹی کرائی اور بذریعہ اسٹریچر اسے اسٹیشن ویگن میں لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نقیر مست حال عزت مآب سائیں عالی کی رہنمائی میں روانہ ہو رہے تھے۔ سائیں عالی اب ڈرائیور کے قریب فرش پر بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہمیں سمن آباد کے قریب ایک متوسط آبادی کی طرف لے آیا ہے۔ میں نے کہا "یہ کدھر جا رہے ہو؟"

سائیں نے ڈلنا "بچہ کا بیٹھا رہ۔ تجھے اس سے کیا مطلب کہ کہاں لے جا رہا ہوں۔۔۔ تجھے تو لڑکی کی صحت چاہیے نا۔"

پانچ منٹ بعد ہم ایک مفلوک حال "گلی نما سڑک" پر آگئے۔ یہ گنجان علاقہ تھا۔ لوگ اچک اچک کر اسٹیشن ویگن

میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیں عالی کیا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے پوچھا "تم تو ڈاکٹر عارفہ عباسی کے پاس لے جا رہے تھے؟"

وہ بولا "اس کے کلینک جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہیں پر دیکھ لے گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ ان کچی گلیوں میں چل کر آئے گی ہماری مریضہ کو دیکھنے؟"

"کیوں نہیں آئے گی۔ اس کو تو وہ جن چمٹی ہوئی ہے۔ وہ جن اسے یہاں لے کر آئے گی اور عارفہ عباسی کا تو بس نام ہی ہے۔ درحقیقت کوہ قاف کی "جن ڈاکٹر" زیب النساء اسے دیکھنے آ رہی ہے عارفہ عباسی کے روپ میں۔۔۔ ہاہاہا۔"

اسٹیشن ویگن ایک دو منزلہ مکان کے صحن میں داخل ہو گئی۔ یہاں سے غزالہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ چلا کر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں پرانی طرز کے پلنگ بچھے تھے اور فرش پر بیل بوٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ غزالہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا اور چہرے پر گہرے دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ملک کی مشہور و معروف لیڈی ڈاکٹر عارفہ عباسی خراماں خراماں چلی آ رہی ہے۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر تھی۔ جسم فربہ تھا' مجموعی طور پر وہ ایک رعب دار شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی سائیں عالی کو جھک کر سلام کیا اور اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ سائیں عالی نے بازو کھینچ کر ڈاکٹر عباسی کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ گئی۔ سائیں نے اپنا غلیظ منہ ڈاکٹر عباسی کے کان سے لگایا اور کچھ سمجھانے لگا۔ ڈاکٹر سعادت مندی سے سہلا رہی تھی پھر وہ بولی "آپ بے فکر رہیں سائیں! آپ کے کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

ڈاکٹر عارفہ عباسی کے ساتھ ایک نرس بھی آئی تھی۔ اس کے علاوہ کافی بڑا میڈیکل باکس تھا۔

عالم قریشی' سائیں عالی کی آن بان دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عارفہ عباسی غزالہ کی دیکھ بھال میں لگ گئی تو ہم دوسرے کمرے میں آ بیٹھے۔ عالم قریشی بولا "یار! مجھے تو بڑا غم کھائے جا رہا ہے۔ اگر تیرے جسم میں لگے ہوئے آلے سے تیری پوزیشن کا پتا چل سکتا ہے تو پھر تو کوئی جگہ بھی تیرے لیے محفوظ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے شیخ عاصم کے کارندے کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

"ابھی تک یہ صرف ایک اندیشہ ہے' بہرحال اس اندیشے کی تصدیق یا تردید آج ہو جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا اگر شیخ کے کارندے پھر مجھ تک پہنچ گئے تو اندیشہ ٹھیک ثابت ہو جائے گا۔"

"تو یہاں ڈاکٹر غزالہ کے پاس کون رہے گا؟"

"تم اور سائیں عالی۔ اسی لیے تو تم دونوں کو اپنے پاس بلایا ہے۔"

"یار' مجھے تو اس سائیں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کہیں سچ مچ ہی یہاں جنات کی آمد و رفت نہ ہو جائے۔ صبح تم واپس آؤ تو مجھے ان لوگوں نے مکھی بنا کر دیوار سے چپکا رکھا ہو۔ نہ بابا نہ۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ دو جوان جہان بیویوں کا اکلوتا خاوند ہوں میں۔"

میں جانتا تھا کہ عالم قریشی مذاق کر رہا تھا۔ ورنہ میری خاطر وہ ساری رات ایک ٹانگ پر یہاں کھڑا رہ سکتا تھا۔۔۔ عالم قریشی نے مجھے ایک خط بھی تھمایا۔ یہ زریں کا خط تھا جو اس نے پشاور سے عالم قریشی کے پتے پر بھیجا تھا۔ اس خط میں زریں گل نے بتایا تھا کہ اس کا نیا ممون بہت اچھا جا رہا ہے اور روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا "کلثوم نے تھوڑا تھوڑا اردو بولنا شروع کر دیا ہے۔ بستی کا لوگ اس کا اردو سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے۔"

کچھ دیر بعد جب تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر عباسی نے بتایا کہ مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہے تو میں نے سائیں عالی اور عالم قریشی کو خدا حافظ کہا اور اس دو منزلہ مکان سے نکل آیا۔ موٹر سائیکل میں اسپتال ہی چھوڑ آیا تھا۔ اب کوئی سواری نہیں تھی میرے پاس۔ میں نے ایک ٹیکسی رکوائی اور سوار ہو گیا۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے خود سے پوچھا "کہاں جانا چاہتا ہوں میں؟"

جواب یہ تھا "دور۔۔۔ بہت دور۔ شیخ عاصم کی دسترس سے باہر۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے جسم میں موجود الیکٹرانک ڈیوائس دس کلو میٹر کی رینج سے باہر کام نہیں کرے گی۔ اگر میں ڈیوائس کا سسٹم آن ہونے سے پہلے اس رینج سے باہر نکل جاتا تو شیخ عاصم کے ہاتھ آنے سے بچ سکتا تھا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا "لاہور سے باہر چلو۔"

"لاہور سے باہر؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں شاہدرہ کی طرف چلو۔" میں نے کہا۔

ٹیکسی کا رخ شاہدرہ کی طرف ہو گیا۔ لاہور سے بیس تیس میل آگے جا کر میں کسی مسافر بس پر سوار ہو سکتا تھا اور وہاں سے راولپنڈی یا پشاور کا رخ اختیار کر سکتا تھا۔ شیخ عاصم کی زد سے بچنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا کہ میں اس سے بہت دور رہوں۔ رہا غزالہ کا مسئلہ تو عالم قریشی اس کے پاس موجود تھا۔ میں بذریعہ ٹیلی فون عالم قریشی سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ عالم قریشی اور سائیں عالی وغیرہ کی موجودگی میں مجھے غزالہ کی طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

ٹیکسی نے دریائے راوی کا پل پار کیا اور جی ٹی روڈ پر آگے بڑھنے لگی۔ میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے ایک پٹرول پمپ سے ٹینکی فل کروائی۔ میں نے اسے آگے جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میری کلائی پر رسٹ واچ موجود تھی جس کا رابطہ شیخ عاصم کی رسٹ واچ سے رہتا تھا۔ گلگت روانگی سے پہلے میں اپنی رسٹ واچ عالم قریشی کے حوالے کر گیا تھا۔۔۔ تین چار دن پہلے جب میں نے حتمی فیصلہ کیا تھا کہ غزالہ کو شیخ عاصم کے چنگل سے نکالوں گا تو میں نے یہ رسٹ واچ پھر اپنی کلائی پر باندھ لی تھی۔ اب ٹیکسی میں لاہور سے باہر جاتے ہوئے میری نگاہ بار بار اس رسٹ واچ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ جوں جوں لاہور سے میرا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا میری بے چینی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اگر ڈیوائس کا سسٹم آن ہونا تو میں لاہور سے زیادہ سے زیادہ دس کلو میٹر دور جا سکتا تھا۔ اس کے بعد میری کلائی پر برقی جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے اور ایک کلو میٹر تک مسلسل لگتے رہتے' اس کے بعد ڈیوائس میرے سینے میں پھٹ کر مجھے ہلاکت سے دو چار کر دیتا۔۔۔ اب میں لاہور سے قریباً اٹھارہ کلو میٹر دور آ چکا تھا۔ میری رسٹ واچ نے مجھے کوئی "شاک" نہیں دیا تھا۔

یہ کیا معاملہ تھا۔ ممکن تھا کہ ڈیوائس کا سسٹم خراب ہو گیا ہو۔۔۔ یا پھر وہ مختصر بیٹری جو ڈیوائس کے ساتھ میرے جسم میں موجود تھی اور مکمل ختم کرتی تھی' کمزور پڑ گئی ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شیخ عاصم ابھی تک میری "کارروائی" سے آگاہ ہی نہ ہوا ہو اور وہ لوگ جنہوں نے کل شام اور آج صبح ہمارا پیچھا کیا تھا' شیخ عاصم کے کارندے نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بھی ایک سو ایک وجوہات ہو سکتی تھیں۔ کیا پتا تھا کہ میری "سوچ" ہی غلط ثابت ہو جائے۔ یعنی جو کچھ غزالہ کہتی تھی' وہ درست ہو۔ شیخ عاصم سچ مچ بدل چکا ہو۔ وہ دل و جان سے میری اور اپنی دشمنی ختم کرنا چاہ رہا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ میں غزالہ کو اس سے ہمیشہ کے لیے چھڑا کر لے جانا چاہتا ہوں۔

پھر میرا دھیان اس المیے کی طرف چلا گیا جو آج غزالہ کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا واقعہ نہیں تھا۔ غزالہ کے وجود میں جنم لینے والی ایک زندگی آنکھ کھلنے سے بہت پہلے موت کے اندھیرے میں اتر گئی تھی۔ ایک بچہ۔۔۔ ماں کی صورت دیکھنے سے پہلے اور اسے اپنی صورت دکھانے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ ایک عورت کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔

اچانک یوں لگا جیسے کسی زہریلے ناگ نے میرے جسم میں ڈنک رسید کر دیا ہو۔ میرا پورا جسم جھنجھنا اٹھا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے اپنی کلائی کو دیکھ رہا تھا۔ میری کلائی پر برقی جھٹکا لگا تھا۔ ڈیوائس کا سویا ہوا سسٹم بیدار ہو چکا تھا۔ بالکل جیسے کوئی کینہ ور دشمن انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔ میرے سارے اندازے اور قیافے ایک لمحے میں تتر بتر ہو گئے تھے' حقیقت اپنی منحوس شکل میں سامنے آ گئی تھی۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ کلائی پر لگنے والے جھٹکے شدت اختیار کر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں شیخ عاصم سے کم از کم نو کلو میٹر کی دوری پر ہوں اور اب ہر لحظہ یہ فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ لاہور سے بیس پچیس کلو میٹر دور آ کر برقی ارتعاش کیوں شروع ہوا۔ اس کا یقینی جواب بھی فوراً ہی میرے ذہن میں آ گیا۔ شیخ عاصم کسی گاڑی پر سوار تھا اور میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اب کسی وجہ سے میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا تھا اور مجھے موت کی رارنگ دینے والے سگنل شروع ہو گئے تھے۔

یکایک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے پر کاٹ ڈالے ہیں اور میں جو بلند پرواز کا سوچ رہا تھا' خاک میں گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا ہوں۔ عالم قریشی یہاں ہوتا تو ضرور مجھے برا بھلا کہتا۔ عین ممکن تھا کہ "جلد باز" اور "بے وقوف" جیسے القابات سے نوازتا۔ وہ کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا کہ جب تک الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم سے نکل نہیں جاتا' میں شیخ عاصم سے کسی طرح کا نیا جھگڑا مول نہ لوں۔ وہ اکثر اکے دیتا تھا کہ میں "میٹھا" بن کر پہلے اس ڈیوائس سے چھٹکارا حاصل کر لوں پھر غزالہ کے بارے میں سوچوں۔۔۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ڈیوائس سے چھٹکارے کا انتظار کرتا رہا تو قیامت تک انتظار ہی کرتا رہوں گا۔ شیخ عاصم مجھ سے وعدے بھی کرے گا' تسلیاں بھی دے گا لیکن عمل کبھی

نہیں کرے گا اور مجھے یہ ہرگز پسند نہیں تھا کہ میں ایک موہوم امید کے سہارے اپنے سارے آپشن گنوا کر بے دست و پا ہو جاؤں۔

میں ایک نئی نکور ٹیکسی پر سوار تھا۔ شیخ عاصم اور اس کے ہرکارے مجھ سے نو ساڑھے نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ اگر عام حالات ہوتے تو میں شیخ عاصم سے باآسانی پیچھا چھڑا سکتا تھا لیکن ڈیوائس کی موجودگی میں میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں بھاگ سکتا تھا نہ کہیں چھپ سکتا تھا۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ میں کہیں رک جاؤں اور شیخ عاصم کا انتظار کروں۔

پانچ دس منٹ بعد ٹیکسی گوجرانوالہ کی حدود میں داخل ہو گئی۔ شہر کے بارونق علاقے میں پہنچ کر میں نے ایک ریستوران کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ ڈرائیور کو آنے جانے کا کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور خود ریستوران میں جا بیٹھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اتنی لمبی سواری اٹھانے پر گھاٹے میں نہیں رہا تھا۔

اب شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ ریستوران میں کڑاہی گوشت اور تکے وغیرہ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کسی ایسے ہی ریستوران میں بیٹھ کر چند دن پہلے عالم قریشی نے روسٹ چرغے کھائے تھے۔ چرغے یہاں بھی موجود تھے لیکن میرا ذہن "کھانے پینے" سے کوسوں دور تھا۔ دل و دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میری جیب میں بھرا ہوا پسٹل موجود تھا۔ ایسی چیزیں حاصل کرنے میں مجھے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں گھات لگا کر بیٹھ جاؤں۔ جونہی شیخ عاصم یہاں پہنچے، اسے شوٹ کر دوں لیکن میں جانتا تھا کہ شیخ عاصم اتنا انجان نہیں ہے۔ وہ کبھی کھلے بندوں میرے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ میری اور اپنی دشمنی کی گہرائی کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جب تک یہ دشمنی سوئی ہوئی تھی، فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ اب یہ جاگ اٹھی تھی۔ اب ایک لمحے کی غفلت کی سزا موت تھی۔

میں بیٹھا رہا اور شیخ عاصم کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ سگنل کی مدد سے وہ بہت جلد اس گمنام ریستوران تک آ پہنچے گا۔ میرا قیافہ تھا کہ وہ خود اپنی بلٹ پروف مرسیڈیز میں بیٹھا رہے گا۔ اس کے مسلح گارڈز ریستوران میں داخل ہوں گے اور مجھے گھیرے میں لے لیں گے، باقی گارڈز باہر موجود رہیں گے تاکہ اگر میں فرار ہونے کی کوشش کروں تو مجھے گرفت میں لیا جا سکے۔ لیکن میرے یہ اندازے اس وقت بالکل غلط ثابت ہو گئے جب میں نے شیخ عاصم کو تنہا

ریستوران میں داخل ہوتے دیکھا۔ ہاں وہ شیخ عاصم ہی تھا۔ سرخ و سپید، لمبا چوڑا، ڈیشنگ شخصیت کا مالک۔ اوسط درجے کے اس ریستوران میں موجود لوگوں نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ہال میں پہنچ کر اس نے اردگرد دیکھا اور سیدھا میری میز کی طرف آیا۔ اس کے انداز میں خوف کا عنصر نہیں تھا۔ کم از کم تین میٹر کے فاصلے سے میری کلائی پر بجلی کے جھٹکے شروع ہو جاتے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، یہاں تک کہ عاصم میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔ اس کا مطلب تھا اس ڈیوائس کا سسٹم آف کر رکھا ہے۔

"یہ سب۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے تعجب ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"اور میں نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے ہمارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ بھئی یہ کیا کر رہے ہو تم۔ کل تم غزالہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ غزالہ گلبرگ نہیں پہنچی ہے، نہ وہ تمہارے ساتھ ہے۔ کوئی اطلاع بھی نہیں تم دونوں کے بارے میں۔ یہ کیا ہو رہا ہے سب؟"

"مجھے خود پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"یار! ٹھیک سے بات کرو، میرا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے۔ غزالہ کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

شیخ عاصم نے چہرے پر بے پناہ حیرت سجا رکھی تھی۔ چند لمحے کے لیے تو مجھے بھی شک گزرا کہ شاید وہ کچھ نہیں جانتا۔ میں نے کہا "غزالہ! بالکل ٹھیک ہے، اس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"شکر ہے خدایا۔" شیخ نے کہا "میرے دل میں تو عجیب وسوسے آ رہے تھے۔ جس گاڑی پر کل تم گئے تھے وہ آج صبح "جین مندر" کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کارتوس کے چھرے لگے تھے اور ان چھروں کی وجہ سے ٹائر بھی پنکچر تھا۔ گاڑی دیکھ کر میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ ایک دو گھنٹے تک ہم نے تمہاری تلاش میں بھاگ دوڑ کی پھر مجبوراً مجھے الیکٹرانک ڈیوائس کا سسٹم آن کرنا پڑا۔ ڈیوائس کا سسٹم آن کرنے میں ایک چھوٹا سا رسک بھی تھا، بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔"

عاصم کی باتیں الجھن میں ڈالنے والی تھیں۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ہماری گمشدگی کے بارے میں کچھ خبر نہیں

میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ عاصم کی رہائش گاہ سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا تعاقب شروع ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تعاقب کرنے والے شیخ کے کارندے تھے۔

میری توقع کے عین مطابق شیخ کا اگلا سوال حملہ آوروں کے متعلق تھا "کچھ پتا چلا کہ پیچھا کرنے والے کون لوگ تھے؟" شیخ نے دریافت کیا۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کسی کی صورت نہیں دیکھی؟"

"نہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ عیسیٰ بان کے ساتھی ہوں؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کون کس کا ساتھی ہے؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"رات کہاں گزاری؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گا۔"

"غزالہ اب کہاں ہے؟"

"یہ بھی بعد میں بتاؤں گا۔"

"بادشاہ جہاں! تم کیسی الجھی الجھی باتیں کر رہے ہو۔ مجھے تو تمہاری ذہنی صحت پر شک ہو رہا ہے۔"

شیخ عاصم بالکل معصوم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ معصوم نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے ظاہر اور باطن کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ وہ دو چہروں والا شخص تھا۔ میں نے فیصلہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور پسٹل نکال کر شیخ عاصم کی پسلیوں سے لگا دیا "خبردار! حرکت نہ کرنا شیخ۔" میں نے زہریلی سرگوشی کی۔

عاصم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا "یہ کیا۔۔۔ پاگل پن ہے شاہ جہاں۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو؟"

"سو فیصد ہوش میں ہوں۔" یکایک مجھے محسوس ہوا کہ عاصم کے ہاتھوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے "خبردار" میں نے پسٹل کی نال اس کی پسلیوں میں بے دردی سے گھسیڑ دی "اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے دور رکھو۔"

عاصم ٹھٹک کر رہ گیا۔ عاصم کے ہاتھ میں وہ رسٹ واچ تھی جو میری موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ اگر عاصم کے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں واچ تک پہنچ جاتیں اور وہ ڈیوائس کا سسٹم آن کر دیتا تو درمیانی فاصلہ کم ہونے کے سبب ڈیوائس میرے سینے میں پھٹ جاتا۔

"کوئی چالاکی نہیں چلے گی، محترم عاصم صاحب۔ اس پسٹل میں ۳۸ بور کی گولی ہے اور تم جانتے ہی ہو یہ گولی کتنی ظالم ہوتی ہے اور جس پسٹل میں یہ گولی ہے وہ کتنا ظالم ہوتا ہے۔ تمہارے جسم سے پار ہو کر بھی یہ گولی رکے گی نہیں۔ کرسی کی پشت کو توڑ کر نکلے گی۔ کھڑکی کے شیشے کو توڑے گی اور آخر میں رکھی ہوئی آٹے کی بوریوں میں جا گھسے گی۔"

میری سرگوشی نے عاصم کو رم بخود کر دیا تھا۔ میں نے کہا "اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھاؤ۔"

میرے لہجے میں موجود سفاکی نے شیخ عاصم کو ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک ہاتھ کی مدد سے "رسٹ واچ" شیخ کی کلائی سے اتار کر جیب میں ڈال لی۔

شیخ نے کہا "میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آ رہی شاہ جہاں۔ یہ ایکا ایکی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ تم پر میں نے حملہ کروایا ہے۔"

"حملہ تو معمولی بات ہے شیخ عاصم۔ تمہاری دشمنی تو کہیں زیادہ سنگین ہے۔" ہم عام سے لہجے میں بات کر رہے تھے اور آواز بھی دھیمی تھی پھر بھی ریستوران میں موجود لوگ ٹٹولنے والی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک دو نے میرے ہاتھ میں پسٹل کی جھلک بھی دیکھ لی ہو۔

شیخ عاصم گہری سانس لے کر بولا "میرا خیال ہے کہ ہماری گفتگو کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں۔"

"چلو پھر اٹھو یار لیکن بڑی احتیاط سے۔ تمہاری کوئی غلط حرکت میری انگلی کو بھی حرکت میں لے آئے گی۔ اگر تم مر گئے تو یہ سراسر خودکشی ہوگی۔"

شیخ عاصم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اردگرد موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر پسٹل شیخ عاصم پر تان لیا۔ شیخ کی کھوپڑی اور ۳۸ بور پسٹل کے درمیان بمشکل ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر اردگرد موجود لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ان میں سے کچھ جلدی سے باہر کھسک گئے۔ یقیناً اکثر لوگوں کے ذہن میں یہی بات آئی ہوگی کہ میں سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہوں جس نے کسی مجرم کو چالبازی سے پکڑا ہے۔

کسی نے کوئی سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کی۔ میں عاصم کو اسی حالت میں اس ریستوران سے باہر لے کر آیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر عاصم کی شاندار مرسیڈیز موجود تھی۔ اس کے عقب میں ایک لینڈ کروزر بھی نظر آ رہی تھی۔ سادہ کپڑوں میں تین گارڈز آس پاس موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ گارڈز کی اصل تعداد تین چار گنا ہوگی اور وہ یہیں کہیں

موجود ہوں گے۔ پسٹل کی نال عاصم کے سر سے چھو رہی تھی۔ گارڈز جانتے تھے کہ اگر انہوں نے فائر کیا تو عاصم بچ نہیں سکے گا۔

مرسیڈیز خالی تھی "چابی کہاں ہے؟" میں نے عاصم سے پوچھا۔

"ڈرائیور کے پاس۔"

"ڈرائیور سے کہو کہ وہ دروازہ کھولے۔"

عاصم نے اشارہ کیا۔ سفید وردی والے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

میں نے عاصم سے کہا "ڈرائیور سے چابی لو اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو۔"

عاصم نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ فی الحال میری مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔۔۔ عاصم نے اسٹیئرنگ سنبھالا۔ میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا اور گاڑی موقع سے روانہ ہو گئی۔ "موقع واردات" پر موجود لوگ ہکا بکا کھڑے تھے۔ میں نے گارڈز کو تیزی سے لینڈ کروزر کی طرف لپکتے دیکھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ عاصم فی الحال مزاحمت نہیں کرے گا۔ لہٰذا جب اچانک اس نے حرکت کی تو میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ عاصم نے ایک دم پوری طاقت سے بریک پیڈل دبا دیا تھا۔ میرا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ شیخ عاصم نے قابل ذکر پھرتی دکھائی اور مجھ پر جھپٹا۔ میری پسٹل والی کلائی اس کے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن اگر اس کا خیال تھا کہ وہ پسٹل مجھ سے چھین لے گا تو یہ "خام خیال" تھا۔ یہ اس کے کسی زر خرید غلام یا کنیز کی کلائی نہیں تھی جسے وہ آسانی سے مروڑ لیتا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پورا زور لگایا لیکن پسٹل میرے ہاتھوں سے نہ چھڑا سکا۔ مرسیڈیز رینگتی ہوئی ایک پھل فروش کی ریڑھی سے ٹکرائی تھی اور رک گئی تھی۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ شیخ کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے سے نکالا اور کہنی کی جچی تلی ضرب اس کی گردن پر رسید کی۔ تکلیف کی شدت سے میرے بازو پر شیخ کے ہاتھوں کی وحشیانہ گرفت ذرا نرم پڑی تو میں نے پسٹل کا رخ اس کی چھاتی کی طرف موڑ دیا۔ موت و حیات کی کشمکش میں یہ ایک گراں قدر کامیابی تھی۔ میری انگلی کی ایک جنبش شیخ عاصم کا سینہ پھاڑ کر اسے لاش میں تبدیل کر سکتی تھی۔ اس لاش کو گاڑی سے باہر دھکیل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنا اور یہاں سے فرار ہونا میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ یہ بلٹ پروف گاڑی تھی۔ شیخ کے محافظ آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔۔۔ لیکن شیخ عاصم کو مارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا' اس لیے کہ میرے اور شیخ کے درمیان غزالہ کھڑی تھی' وہ موجود نہیں تھی پھر بھی موجود تھی۔ فیصلے کے اس لمحے میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ٹریگر دبایا تو گولی غزالہ کے جسم کو چیر کر عاصم تک پہنچے گی۔ میں ٹریگر نہ دبا سکا۔ میں نے کہنی کی پے در پے ضربیں عاصم کی گردن پر رسید کیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ان مخصوص ضربوں سے نڈھال ہو جائے تو میں اسے ٹانگوں سے دھکیل کر باہر پھینک دوں اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لوں۔۔۔ لیکن عاصم کے نڈھال ہونے میں جو دس پندرہ سیکنڈ صرف ہوئے انہوں نے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ گارڈز بھاگتے ہوئے مرسیڈیز تک پہنچ گئے تھے۔ مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ خود کار رائفلوں کے بیرل میرے سر سے لگے ہوئے تھے اور کئی خونی نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میرا پسٹل والا ہاتھ بدستور شیخ عاصم کی آہنی گرفت میں تھا لیکن اب اگر میں چاہتا بھی تو اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ شدید رسہ کشی کے دوران میں اس کا میگزین علیحدہ ہو کر گر گیا تھا۔

شیخ عاصم کے گارڈز رائفلوں سمیت گاڑی میں گھس آئے۔ شیخ کی پیشانی پھٹ گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ ایک گارڈ نے رائفل کا وزنی کندہ پورے زور سے میرے جبڑے پر رسید کیا۔ غالباً شیخ عاصم کی چوٹوں کا بدلہ چکانا چاہ رہا تھا۔ شیخ عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

○☆○

شیخ عاصم کے تربیت یافتہ گارڈز جدید رائفلوں کے زور پر مجھے ڈیفنس والی کوٹھی میں لے آئے۔ شیخ عاصم لینڈ کروزر پر کوٹھی پہنچا۔ گارڈز نے مجھے بڑے "فنکارانہ" طریقے سے نشانے پر لے رکھا تھا۔ میری مکمل تلاشی لی گئی اور کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک بیڈ ایک بیڈ صوفے اور ایک خالی الماری کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ لکڑی کے مضبوط دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ کمرے میں ایک لمبی چوڑی کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی میں اندر کی طرف جالی اور باہر لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ میں اس کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ اسٹڈی روم اور ٹی وی لاؤنج کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی اور شیخ عاصم میرے سامنے آ گیا۔ اس کی پیشانی پر پٹی چپکی ہوئی تھی۔ منحوس رسٹ واچ پھر اس کی کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔ یہ رسٹ واچ مرسیڈیز میں شیخ نے میری جیب سے نکال لی تھی۔ وہ بڑے غور سے میری

طرف دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں میں طیش کی بجلیاں بھی تھیں' سوچ کی پرچھائیاں بھی تھیں اور ضبط و تحمل کے آثار بھی تھے۔ وہ بہت گمبھیر آواز میں بولا "یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"میں نے یہ سب اس لیے کیا ہے کہ میں تمہاری اصلیت جانتا ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں میں۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ دوستی اور رشتے داری کی جو بات کرتا رہا ہوں وہ سب فریب ہے؟"

"میں اسے بدترین مکاری کہوں گا۔ تم اب بھی مکاری کر رہے ہو۔ تمہاری دلی خواہش ہے کہ میرے جسم کے چیتھڑے اڑا دو لیکن تم خود پر بے پناہ ضبط کر رہے ہو۔"

"یہ سب تمہارا دماغی فتور ہے۔ جو کچھ تم سوچ رہے ہو کیا اس کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ تمہارا ماضی تمہارا حال سب کچھ میرے سامنے ہے۔ تمہارا مقصد بالکل واضح ہے اور اس مقصد کی بنیاد وہی ضد ہے جو کئی برس پہلے تمہارے بھائی نے اختیار کی تھی۔۔۔ تمہارے ناپاک ذہن میں میری بہن کے خلاف انتقام پل رہا ہے۔ انتقام کی اس "منزل" تک پہنچنے کے لیے تم نے کئی برس صرف کیے ہیں۔ لاکھوں ڈالر خرچ کیے ہیں۔ اپنا ملک چھوڑا ہے' غزالہ سے شادی کی ہے اور اب میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو۔ ان تمام کوششوں کے دوران میں تمہاری نگاہ ایک پل کے لیے بھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹی۔ تم اونٹ کا کینہ رکھنے والے شخص ہو شیخ عاصم' تمہاری رگ رگ میں ضد رچی بسی ہے۔"

شیخ عاصم نے ایک بہت گہری سانس لی۔ اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بولا "شاہ جہاں' عقل مند سے عقل مند آدمی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔ ذہین سے ذہین شخص بھی کسی مرحلے پر فریب میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہیں بھی دھوکا ہو رہا ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے شاہ جہاں کہ تم نے آج تک میرے اور غزالہ کے رشتے کو تسلیم نہیں کیا۔ تمہارا خیال ہے کہ میں نے اس سے شادی نہیں کی صرف اپنے انتقام تک پہنچنے کے لیے اسے ذریعہ بنایا ہے اور وہ اب بھی میرے لیے ایک مہرہ ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا ہے کہ میں واقعی اس سے محبت کر سکتا ہوں۔"

"یہ انہونا خیال میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔"

"یہ انہونا خیال نہیں ہے شاہ جہاں' یہ ہونی ہے اور ہو چکی ہے۔ غزالہ پہلے جو کچھ بھی تھی لیکن اب وہ میری بیوی ہے' میری محبت ہے۔"

"تمہارے کہنے سے کوا سفید نہیں ہو جائے گا عاصم۔"

"شاہ جہاں! تم فی الوقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔ ابھی مجھے صرف اتنا بتا دو کہ غزالہ کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے محفوظ ہے کیونکہ تم اس تک پہنچ نہیں سکتے ہو۔"

عاصم کے چہرے پر سرخی لہرا گئی "تو تم مجھے اس کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟"

"بالکل نہیں بتاؤں گا۔ تم اس کے لیے دردناک موت کا سایہ ہو عاصم۔۔۔ میں یہ سایہ اس پر نہیں پڑنے دوں گا۔"

"وہ میری بیوی ہے۔ تم میری بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف یہاں سے لے کر گئے ہو۔ وہ تمہاری حبس بے جا میں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ کتنا سنگین معاملہ ہے۔"

"وہ تمہاری بیوی تھی یا ایک کنیز تھی جسے ایک خاص مقصد کے تحت خریدا گیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ایک لمبی بحث چھیڑ سکتا ہے۔ تم اس بحث میں مت پڑو شیخ عاصم۔ میرا ہمدردانہ مشورہ یہی ہے کہ تم اب اپنا یہ بہروپ ختم کر کے واپس دبئی سدھار جاؤ اور اس دشمنی کو فل اسٹاپ لگا دو جس نے تمہاری اور میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ میں پھر وہی بات دہراتا ہوں۔ تمہارے بھائی نے میری معصوم بہن کی طرف اپنا ناپاک ہاتھ بڑھایا تھا' میں نے اپنی بہن کو بچانا چاہا لیکن اس نے طاقت کے غرور میں ہر جگہ میرا تعاقب کیا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں اسے ختم کر ڈالوں۔ اس کی موت کے ساتھ ہی یہ باب ختم ہو گیا۔ تم اس باب کو پھر کھولو گے تو ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

شیخ غرایا "میں اپنی بیوی کی بات کر رہا ہوں۔ تم گڑے مردے اکھاڑنے کیوں بیٹھ گئے ہو؟"

"گڑے مردے میں نہیں' تم اکھاڑ رہے ہو عاصم۔"

عاصم نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اپنے غضب پر قابو پاتے ہوئے بولا "تمہارے حواس ٹھیک نہیں ہیں۔ خود کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں پھر تم سے بات کروں گا۔"

غصے میں بھرا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

میں بیڈ روم میں نیم دراز ہو گیا۔ مجھے اطمینان تھا کہ غزالہ محفوظ مقام پر ہے۔ بے شک عالم قریشی مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اس کی معاملہ فہمی اور دانائی ہر شک سے بالا تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ معاملے کی سنگینی کو سمجھ چکا ہے اور ہر صورت غزالہ کی حفاظت کرے گا۔ اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کہ اپنے اہلِ خانہ کو بھی محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا۔

حالات بالکل غیر متوقع رخ اختیار کر گئے تھے۔ جس وقت میں غزالہ کے ساتھ روانہ ہوا تھا' مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ اوائکس کا سسٹم آن ہونے سے پہلے میں عاصم سے اتنی دور پہنچ جاؤں گا کہ اس تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں رہے گا مگر فوراً ہی ہمارا تعاقب شروع ہو گیا تھا اور سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ حالات اب نہایت حوصلہ شکن تھے۔ عاصم ہر طرح مجھ پر حاوی تھا۔ "اوائکس سسٹم کی زنجیر" اپنی تمام تر نامہربانی کے ساتھ ایک بار پھر مجھے جکڑ چکی تھی۔ میں اس کمرے میں مقید تھا اور خونخوار صورتوں والے انتہائی تربیت یافتہ گارڈز میرے ارد گرد موجود تھے۔ خوش آئند بات صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ میں غزالہ کو شیخ عاصم کی تحویل سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

آدھی رات کے بعد میں سو گیا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ کل کے واقعات ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ غزالہ کا لیموں جیسا زرد چہرہ میری نگاہ میں گھوم گیا۔ معلوم نہیں اب وہ کس حال میں تھی۔ یقیناً اس پر بہت بڑا صدمہ گزرا تھا۔

میں نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ واپس آیا تو مسلح گارڈز میز پر ناشتا رکھ کر جا چکے تھے۔ بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی پھر بھی میں نے چند لقمے لیے۔ اسی دوران میں شیخ عاصم نمودار ہو گیا۔

اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ لگتا تھا رات بھر جاگتا رہا ہے۔ سگار کے چند گہرے کش لینے کے بعد وہ بولا "تمہارے دماغ کو جو چڑھی ہوئی گرمی کچھ اتری ہے یا نہیں۔"

"بہت بہتر ہوتا' اگر تم اپنے دماغ کے بارے میں سوچتے۔" میں نے کہا۔

وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ بے حد نرم لہجے میں بولا "شاہ جہاں! یقین کرو مجھے اس انداز میں تم سے بات کرتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے تم کوئی حوالاتی ہو اور میں تھانے دار ہوں۔ ہم تو فاصلے کم کرنا چاہ رہے تھے' یہ فاصلے بڑھ کیوں گئے ہیں؟"

"فاصلے باتوں سے نہیں' عمل سے گھٹتے یا بڑھتے ہیں شیخ عاصم۔"

"میرے عمل میں کون سی کمی رہی ہے۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی اور تمہاری دشمنی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم جب گلگت میں لاپتا ہوئے تو میں شب و روز ویرانوں میں بھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ تمہاری طرف آنے والی گولی اپنے جسم پر کھائی اور کئی دن اسپتال میں تڑپتا رہا۔ کیا یہ بھی کسی سازش کا حصہ تھا؟"

"ہاں۔۔۔ یہ واقعات بھی تمہاری عداوت سے جدا نہیں تھے۔ تم نے قراقرم میں میری خاطر مجھے نہیں ڈھونڈا تھا' اپنی عداوت کی خاطر ڈھونڈا تھا۔ میری جان بچانے کی اضطراری کوشش بھی اسی وجہ سے تھی۔ میری جان چلی جاتی تو تمہیں تمہارے "انتقام" تک کون پہنچاتا۔ میری بے گناہ بہن کا پتا چلانے کے لیے تم نے مجھے بچایا۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے میری آواز غصے میں تھرا گئی۔

عاصم نے بہت مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ یکایک قدموں کی آواز سن کر عاصم چونک گیا۔ میں بھی آواز کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ کسی عورت کے قدموں کی چاپ تھی۔ چند لمحے بعد جو منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا' اس نے میرے ہوش گم کر دیے۔ میں نے اپنے سامنے غزالہ کو دیکھا۔ وہ سرتاپا چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہلکے حلقے تھے۔ چہرے کی زردی کچھ کم تھی لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"عاصم۔" اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔ وہ تیزی سے عاصم کی طرف آئی۔ عاصم نے اسے گلے لگا لیا۔

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ میں ایک قیدی کی طرح مقفل کمرے کے اندر کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ غزالہ رو رہی تھی اور روئی چلی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا' یہ اس زندگی کا نوحہ ہے جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ماں کی کوکھ میں ختم ہو گئی تھی۔ ان لمحات میں عاصم اور غزالہ دونوں مجھے بالکل نظر انداز کر چکے تھے۔

"غزالہ! تم کیسے آ گئیں یہاں؟" میں نے کمرے کے اندر سے پوچھا۔

غزالہ نے روتے روتے بے پناہ تحیر سے میری طرف دیکھا۔ وہ شاید اب میری موجودگی سے آگاہ ہو رہی تھی۔

شیخ عاصم نے دلاسا دینے والے انداز میں اس کی پیٹھ تھپکی اور اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے باہر چلا گیا۔

میں سناٹے کے عالم میں کھڑا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا' بالکل غیر متوقع تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں کلبلانے لگے' غزالہ یہاں کیسے پہنچی؟ عالم قریشی اور سائیں عالی نے اسے روکنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ کیا اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ "ابارشن" کے صرف ایک دن بعد بستر سے اٹھ کر اتنی دور چلی آتی۔

اس گھر میں غزالہ کی واپسی مجھے ایسی ہی لگی جیسے کوئی نادان پرندہ آزادی پانے کے بعد اپنے پنجرے میں واپس آ جائے۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ میرا دل غم اور دکھ سے بھر گیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد شیخ عاصم کے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ وہ دندناتا ہوا کھڑکی کے سامنے آیا۔ اس کا چہرہ طیش سے انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' غزالہ لپک کر آئی اور عاصم کا کندھا تھام لیا۔ وہ رو رہی تھی "نہیں عاصم! انہیں کچھ مت کہیں۔ جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔ بس ختم کریں یہ بات۔۔۔ پلیز ختم کر دیں۔"

عاصم اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا' اس کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ اچانک غزالہ کو نہ جانے کیا ہوا' وہ عاصم کے پاؤں پر گر پڑی۔ گڑگڑاتے ہوئے بولی "پلیز عاصم! آپ دونوں کی یہ دشمنی میری جان لے لے گی۔ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا' آج آپ سے مانگ رہی ہوں۔ خدا کے لیے بھول جائیں ساری نئی پرانی باتیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کو دفن کر دیں۔ خدا کے لیے آج ختم کر دیں سب کچھ۔"

شیخ عاصم نے غزالہ کو اپنے قدموں سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی ٹانگوں سے چمٹی رہی۔ روتے ہوئے بولی "نہیں عاصم! میں نہیں اٹھوں گی۔ مجھ کو یقین دلائیں آپ۔۔۔ جو کچھ ہوا اسے آپ بھول جائیں گے۔۔۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔۔۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ سب رشتے ناتے توڑ لوں گی میں یہاں سے۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں آپ سے۔۔۔ کبھی آپ سے نہیں کہوں گی مجھے یہاں لائیں۔ پلیز عاصم' آپ بھی وعدہ کریں۔۔۔ ہمیں کچھ لینا دینا نہیں ہے اب یہاں سے۔"

غزالہ کا سارا وجود ایک مہیب زلزلے کی زد میں تھا۔ وہ کسی بچے کی طرح بلک رہی تھی۔ اس کا یہ روپ میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ میرا دل سینے میں خون ہونے لگا۔ میں نے اسے دکھ پہنچایا تھا اور یہ دکھ اتنا شدید تھا کہ وہ اپنا سارا دکھ بھلا کر' اپنا سارا وقار بھول کر بچے کی طرح بلکنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

شیخ عاصم نے اسے کندھوں سے تھاما اور ایک بار پھر اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اس کی ٹانگوں سے پیوست ہو چکی تھی۔ اس نے شدت کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں عاصم! میں نہیں اٹھوں گی۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں۔"

شیخ عاصم کے چہرے پر شدید پریشانی نظر آ رہی تھی۔ اس نے غزالہ کے کندھوں کو مضبوطی سے تھاما "پلیز غزالہ! اٹھو تو سہی۔۔۔ پلیز اٹھو۔"

کسی نہ کسی طرح وہ غزالہ کو اٹھانے میں کامیاب رہا۔ غزالہ کی ہچکیوں نے اس کے نازک جسم میں تلاطم برپا کر رکھا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ شیخ اسے بانہوں کے حلقے میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

○☆○

یہ اگلے روز دوپہر کا واقعہ ہے۔ میں اپنے بیڈ پر لیٹا تھا اور پریشان سوچوں کے نرغے میں تھا۔ بے شک شفا ایک محفوظ پناہ گاہ میں تھی لیکن حالات کی کروٹ کا پیشگی اندازہ لگانا ممکن نہیں ہوتا۔ شفا کو تلاش کرنے والے برسوں سے مصروف کار تھے۔ پانی کا قطرہ بھی مسلسل پتھر پر گرتا رہے تو سوراخ کر ڈالتا ہے۔ یہ تلاش بھی مسلسل ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں کسی بھی وقت کوئی حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔ شیخ عاصم کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن ایک بات میرے نزدیک ہمیشہ سے طے تھی کہ شیخ عاصم کا اندر صاف نہیں تھا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ غزالہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی کھڑکی میں آ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر کھڑکی سے میرا جائزہ لیتی رہی پھر آگے آئی اور دروازے کے قفل میں چابی گھما کر دروازہ کھول دیا۔ میں بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا' وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نگاہیں جھکائے جھکائے بولی "شاہ جہاں! آپ آزاد ہیں۔ میں نے عاصم سے بات کر لی ہے۔"

غزالہ کی آواز میں ایسی غیریت اور سرد مہری میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً اس سرد مہری کی وجہ وہ حادثہ تھا جو چار روز پہلے شاہدرہ میں پیش آیا تھا۔ اس حادثے کے نتیجے میں غزالہ کو اسپتال جانا پڑا تھا اور "ابارشن" کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

میں نے کہا "غزالہ تمہارے لہجے میں ایسی رکھائی تو کبھی نہ تھی۔"

وہ بولی "مجھے آپ پر کوئی افسوس نہیں۔ یہ میری تقدیر میں لکھا تھا۔"

"لیکن تم یہ تو سوچ سکتی ہو کہ یہ میری وجہ سے ہوا۔ میں ہی تمہیں وہاں لے کر گیا تھا۔ نہ میں یہ قدم اٹھاتا نہ وہ لوگ ہمارے پیچھے لگتے۔ نہ تمہیں ایسی نازک حالت میں بھاگ دوڑ کرنی پڑتی۔"

"پلیز! اب یہ ذکر نہ کریں۔" وہ سسک کر بولی "مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

اس کا رنگ ایک بار پھر ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ وہ چار روز میں ہی برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے فرزانہ۔"

"آپ کا افسوس گزرے ہوئے وقت کو واپس نہیں لا سکتا۔" فرزانہ کے لہجے کی بے رخی برقرار تھی۔

کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر وہ بولی "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ... میرے ہی گھر میں "بند دروازے" کی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔"

"گویا اب یہ اذیت ختم ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا ہے نا کہ اب آپ آزاد ہیں۔"

"اس آزادی کی کوئی حقیقت نہیں فرزانہ۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا "اگر تمہارے کہنے پر شیخ عاصم مجھے چھوڑ بھی دے تو یہ کارروائی محض ایک فریب ہو گی۔ ایسے فریب وہ پہلے بھی مجھے دے چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب تک الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم میں ہے، میں شیخ عاصم کا قیدی ہوں۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ اب آپ قیدی نہیں ہیں۔" وہ ذرا تیزی سے بولی "یہ دیکھیں، یہ رہے آپ کے کاغذات۔ یہ ہے آپ کا پاسپورٹ۔ یہ دیکھیں... اس پر جاپان کا ویزا بھی لگا ہوا ہے۔ یہ آپ کے لیے ہوٹل کی ایڈوانس بکنگ ہے۔ یہ آپ کے ٹریولرز چیک ہیں۔ یہ ان سرجن صاحب کی اپائنٹ منٹ ہے جنہوں نے آپ کو آپریٹ کرنا ہے۔ دونوں جاپانی انجینئرز کے ایڈریس اور رابطہ نمبر وغیرہ بھی ان کاغذات میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی تھوڑی دیر پہلے عاصم نے خود بھی دونوں جاپانی ماہرین سے بات کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں آپ کو کسی طرح کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا۔" پھر ذرا توقف سے بولی "یہ آپ کا ریٹرن ٹکٹ ہے۔ لاہور ـــ کوالالمپور ـــ ٹوکیو ـــ وہاں سے ٹوکیو ـــ کوالالمپور ـــ لاہور۔"

میں حیرت سے فرزانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے تمام کاغذات میرے سامنے میز پر رکھ دیے تھے اور اپنے دونوں خالی ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے تھے۔ جیسے اس نے اپنے ہاتھوں کو کسی بہت بڑے بوجھ سے آزاد کر لیا ہو۔

میں نے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک لگتا تھا۔ پاسپورٹ پر میری تصویر پتا نہیں کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ غالباً یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب ہم سری لنکا میں تھے۔ یقیناً شیخ عاصم نے یہ سارے انتظامات ایک ڈیڑھ دن کے اندر کیے تھے۔ اس جیسے بااثر شخص کے لیے یہ کام ناممکن بھی نہیں تھا۔ کاغذات دیکھ کر میں نے واپس میز پر رکھ دیے۔

فرزانہ خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو "اب تو آپ کو اپنی آزادی پر شبہ نہیں رہے گا نا؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "فرزانہ، تم اسے میری قنوطیت کہہ سکتی ہو، میرا تعصب کہہ سکتی ہو اور میری جاہلیت بھی قرار دے سکتی ہو لیکن میں عاصم کے بارے میں اپنے خیالات پر نظرثانی نہیں کر سکتا۔ آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں وہ اپنا اصل چہرہ دکھائے گا ضرور... اور مجھے یقین ہے کہ یہ چہرہ تمہاری توقعات سے بہت مختلف ہو گا۔"

فرزانہ نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم ایک غیر متعلق موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ ویسے بھی مفروضے تو مفروضے ہی ہوتے ہیں... اگر آپ ان کاغذات کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تو یہ کاغذات بھی مفروضہ ہی لگ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم لوگ میرے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟"

وہ آہ سی بھر کر کہنے لگی "ہم شاید کچھ دن بعد جائیں گے... لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات ہے کہ آپ کو ٹوکیو میں کوئی مشکل پیش آ جائے گی تو یہ اندیشہ دل سے نکال دیں۔ عاصم نے وہاں سب کچھ او کے کرا لیا ہے۔ آپ کو یہی محسوس ہو گا جیسے آپ لاہور ہی میں ہیں۔"

میں گہری نظروں سے فرزانہ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے انداز نے اسے گڑبڑا دیا۔ میں نے کہا "میری دعا ہے کہ تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے... لیکن مجھے ایسا لگتا نہیں ہے۔"

وہ ایک خفیف جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں خاموش ناراضگی تھی "اچھا میں چلتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ کمرے کا دروازہ تالا لگائے بغیر چھوڑ گئی تھی۔ میں اپنے سامنے میز پر پڑے کاغذات کو گھور رہا تھا۔ ذہن گھڑ دوڑ

میدان بنا ہوا تھا۔

وہ سارا دن میں نے اسی کمرے میں کاٹا۔ دوپہر کا کھانا اور پھر شام کا کھانا مجھے کمرے میں ہی پہنچا دیا گیا۔ اس دوران شیخ عاصم کی جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ میں عالم قریشی سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر وہاں فون کی سہولت موجود نہیں تھی۔ رات نو بجے کے قریب مجھے دوبارہ فرزانہ کی جھلک نظر آئی۔ اس کا چہرہ کملایا ہوا پھول نظر آتا تھا۔ زرد رنگت اس کے چہرے کے علاوہ اس کے لباس پر بھی حاوی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر واپس چلی گئی۔ میں اس کی نگاہوں کو کوئی معنی نہ پہنا سکا۔

رات دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ صبح سویرے تین بجے شیخ عاصم کے ملازمین نے مجھے جگا دیا۔ ان میں شیخ کا ملازم خاص باقر خاں بھی شامل تھا۔ باقر نے مجھے بتایا کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر مجھے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔ ساڑھے پانچ بجے ٹوکیو کے لیے میری فلائٹ ہے۔

میں اس نادر شاہی حکم پر بھونچکا رہ گیا۔ کم از کم ایک دن پہلے مجھے اطلاع تو ہونی چاہیے تھی۔ ٹکٹ اوپن تھا۔ اس پر تاریخ کا اندراج نہیں تھا پھر باقر خاں کیسے اتنے یقین سے کہہ رہا تھا کہ ڈھائی تین گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے... اس کے ساتھ ہی مجھے فرزانہ کی وہ جھلک یاد آ گئی جو رات پہلے پہر میں نے دیکھی تھی۔ میں نے اس جھلک کا تصور ذہن میں اجاگر کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ فرزانہ کی نظروں میں الوداعی تاثر تھا۔ شاید وہ نگاہوں نگاہوں میں مجھے خدا حافظ کہہ گئی تھی۔

میں نے باقر خاں سے کہا کہ ٹکٹ پر تو سیٹ کنفرم نہیں ہے۔

وہ بولا "مجھے اس بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے جی۔ بہرحال یہ بات پکی ہے کہ ساڑھے پانچ بجے آپ کی فلائٹ ہے۔"

میں نے کہا "یہ جھٹ پٹ روانگی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کیا میں تمہارے صاحب یا بیگم صاحبہ سے بات کر سکتا ہوں؟"

"آپ نے کیا کہنا ہے ان سے؟"

"یہ تو میں ان سے ہی کہوں گا۔"

وہ بولا "دیکھیں آپ کسی طرح پریشان نہ ہوں۔ ٹوکیو میں بھی آپ کو رابطے کی پوری سہولتیں حاصل ہوں گی۔ آپ کسی خرچے کے بغیر صاحب سے بات کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ بھی جس سے آپ نے بات کرنی ہو گی وہاں پہنچ کر کر لیجیے گا۔ میرا مطلب ہے آپ کے دوست احباب وغیرہ آپ کو فری ٹیلیفون سروس مہیا کی جائے گی۔"

باقر خاں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے ٹھوکے دے رہی تھی۔ کچھ ہونے والا تھا یا ہو چکا تھا۔ باقر خاں کے بارے میں تھوڑا بہت میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یہ شخص عاصم کے خاص الخاص کارندوں میں سے تھا۔ شکل و صورت سے یہ کسی امیر گھرانے کا بگڑا نوجوان نظر آتا تھا۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو جرم کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں بلکہ تفریح کی غرض سے کرتے ہیں۔ باقر خاں اور اس کے ساتھی مجھے کمرے سے باہر لائے۔ ٹی وی لاؤنج سے گزر کر ہم ایک طویل راہداری میں پہنچے تو اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور میرے تمام اندیشے حقیقت میں بدل گئے۔ باقر خاں کے ہاتھ میں جدید ماؤزر نظر آ رہا تھا۔ باقر خاں کے تینوں ساتھی بھی انتہائی تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان میں سے دو کے پاس سیون ایم ایم رائفلیں تھیں۔ انہوں نے بڑی پریکٹیکل فارمیشن کے ساتھ مجھے نشانے پر لے رکھا تھا۔ ان کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ انہیں صرف رائفل تاننے کا آرڈر ہی نہیں ملا، بوقتِ ضرورت گولی چلا دینے کی اجازت بھی ملی ہے۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے کہا۔

"مذاق نہیں، تمہاری ٹوکیو روانگی ہے۔" باقر خاں نے خباثت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر ایک ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہاں حبس اور سیلن کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید یہ کمرا اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ گارڈز میرے ساتھ ہی اندر گھسے تھے۔ اسٹور نما کمرے میں پہنچتے ہی انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں مزاحمت کا خیال آیا لیکن گارڈز اپنے کام میں بے حد ماہر تھے۔ فوجی کمانڈوز کی طرح وہ بہترین پوزیشن میں کھڑے تھے اور میری معمولی جنبش بھی نوٹ کر رہے تھے۔ ایک گارڈ نے رائفل کی نال میرے سر کے پچھلے حصے سے لگا دی۔ باقر خاں فیصلہ کن لہجے میں بولا "اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔"

مزاحمت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ گارڈز... بہت مستعد تھے۔ میری ذرا سی بے احتیاطی کا نتیجہ فائرنگ کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ پیچھے موڑے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک لرزہ خیز خیال آیا۔ کہیں میرے ہاتھوں پر وہی منحوس دستانے تو نہیں چڑھائے جا رہے تھے

جنھوں نے سری لنکا میں میری جان عذاب میں مبتلا کیے رکھی تھی۔ بہرحال خیریت گزری۔۔۔ بس اتنا ہوا کہ میری کلائیوں کو پشت کی طرف موڑ کر باندھ دیا گیا۔ جب یہ کام ہو چکا تو باقر خاں اور دیگر گارڈز کے چہرے پر بشاشت نظر آنے لگی۔ ان کے چہرے کھلے کھلے دکھائی دیتے تھے۔ اسٹور کے ایک حصے میں چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس مقفّل دروازے کو کھولا گیا تو سامنے کسی "بیس منٹ" (تہ خانہ) کی سیڑھیاں نظر آئیں۔ باقر خاں نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا "چلو جناب 'ائرپورٹ' کے مین دروازے سے اندر داخل ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے عقب سے دھکیل دیا گیا۔ میں سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا فرش پر آیا۔ یہاں کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہ خاصا وسیع و عریض ہال تھا۔ بہت سی نگاہیں مجھے گھور رہی تھیں۔ خوش قسمتی کی بات تھی کہ سیڑھیوں پر لڑھکنے کے باوجود مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں فوراً ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ مسلح گارڈز موت کے فرشتوں کی طرح میرے سر پر مسلط تھے۔ باقر خاں مزاحیہ انداز میں بولا "جناب عالی! یہ ہے آپ کا انٹرنیشنل ٹرمینل۔ یہاں سے آپ پرواز فرمائیں گے ٹوکیو کے لیے۔"

اس نے ایک بار پھر مجھے عقب سے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا ایک کرسی کے قریب پہنچ گیا "نشست پر تشریف رکھیے۔" باقر خاں نے مزاحیہ انداز میں کہا اور ساتھ ہی بازو سے ٹھوکا دیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ باقر خاں نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا "لگتا ہے آپ کبھی جہاز پر بیٹھے نہیں ہیں۔ حضور والا آپ کا جہاز ٹیک آف کرنے والا ہے۔ ایسے میں بیلٹ باندھنا ضروری ہوتا ہے۔"

اس نے آگے جھک کر ایک چرمی بیلٹ نشست کی سائیڈ سے نکال لی۔ چند لمحوں کے لیے وہ میرے اور گارڈز کے درمیان آگیا۔ ایسے مواقع مزاحمت کے لیے سنہری تصور کیے جاتے ہیں مگر میں جانتا تھا کہ میں مزاحمت کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ باقر خاں نے چرمی بیلٹ ایک بکل کے ذریعے میری کمر کے گرد اس طرح کس دی کہ میں اس آہنی کرسی سے پیوست ہو کر رہ گیا۔

"تو جی اب آپ کا جہاز کر رہا ہے ٹیک آف۔" باقر نے اپنے ہاتھ کو جہاز کی طرح فضا میں بلند کیا اور منہ سے شوں کی طویل آواز نکالی۔ گارڈز بے ساختہ مسکرانے لگے۔

میں نے کہا "باقر خاں! میں تیرے جیسے خارش زدہ کتوں کے منہ ہی نہیں لگتا۔ مجھے اپنے آقا ولی نعمت سے ملاؤ' میں اس سے بات کروں گا۔"

باقر خاں نے منہ سے چیں چیں کی آواز نکالی "دیکھیں جناب! میں آپ کے جہاز کا کیپٹن ہوں اور آپ مجھے کتا کہہ رہے ہیں۔۔۔ اور وہ بھی خارش زدہ۔ یہ تو بہت ناانصافی ہے جی۔"

میں نے کہا "جب میں تیری مسخری نکالوں گا تو تُو خارش زدہ کتے سے بھی حقیر نظر آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

باقر خاں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ یہ کال بیل قسم کی چیز تھی۔ باقر خاں جلدی سے "بیس منٹ" کے عقبی حصے میں چلا گیا۔

میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سا اطمینان میرے دل ودماغ کو تھپکیاں دینے لگا تھا۔ شاید اس اطمینان کی وجہ وہ پردہ تھا جو میرے اور حالات کے درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ جس اندرونی کشمکش نے مجھے گھیر رکھا تھا وہ یکسر ختم ہو گئی تھی۔ شیخ عاصم کی اصلیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ شیخ وہی نکلا تھا جو میں نے سوچا تھا' خوش فہم غزالہ کے اندازے ایک بار پھر غلط ثابت ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد باقر خاں واپس آگیا۔ اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ برقرار تھی۔ شوخ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سفر کافی لمبا ہے۔ اکتا جائیں گے جناب! میرا خیال ہے آپ کو کوئی مووی وغیرہ دکھائی جائے۔ کون سی پسند کریں گے۔ ایکشن' رومانٹک یا بیڈ روم والی۔۔۔۔"

میں خاموشی سے اس کا سرخ و سپید چہرہ تکتا رہا۔ وہ بولا "چلو۔۔۔ ملا جلا پروگرام دکھا دیتے ہیں آپ کو۔"

اس نے ایک کارندے کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور چند سیکنڈ بعد ایک مصیبت زدہ شخص کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عالم قریشی کا سب سے پرانا اور چہیتا ملازم نوازش تھا۔ جن دنوں میں شیخ عاصم کے پڑوس میں پناہ گزیں رہا تھا یہ نوازش ہی میری خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ وہ بے حد خوش اخلاق اور سلیقہ پسند ملازم تھا۔ میرے ساتھ اس کی اچھی جان پہچان ہو چکی تھی۔ نوازش کی صورت دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پچھلے تین چار گھنٹوں میں اسے سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کا لباس پھٹ چکا تھا اور چہرے پر کئی جگہ ضربوں کے نشانات تھے۔ نوازش فریادی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے تھرائی ہوئی آواز نکلی "خدا کے لیے صاحب جی! مجھے اور میری گھروالی کو ان ظالموں سے بچالیں۔" اس نے میرے

سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔"

یہ جان کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا کہ نوازش کی بیوی بھی ان لوگوں کے شکنجے میں ہے۔ صورت حال کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شیخ عاصم کے کارندوں نے عالم قریشی کے گھر دھاوا بولا تھا۔ عالم قریشی تو میری ہدایت کے مطابق اپنے اہل خانہ سمیت گھر میں موجود نہیں تھا۔ شیخ کے کارندوں کا بس ملازمین پر چلا تھا اور وہ انہیں اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔

اتنے میں بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور نوازش کی بیوی بھی ایک زوردار دھکا کھا کر اندر آگئی۔ اس کی قمیص تار تار تھی اور وہ سکڑ سمٹ کر اپنی عریانی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

نوازش میرے سامنے باقر خاں کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا اور گھگیانے لگا "خدا کے واسطے! ہم پر رحم کرو۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔"

باقر گرجا "حرام کے تخم! ویسے ہی بکواس کر جیسے پہلے کر رہا تھا۔ تیرا مالک بہت بڑا پھنے خاں ہے' بڑے بڑے مجرم اس کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ وہ ہماری چٹنی بنائے گا اور مرتبان میں بند کر دے گا۔"

نوازش بلکنے لگا "ہمارا کوئی قصور نہیں صاحب! ہم سے غلطی ہوئی' ہم کو معافی دے دیں۔"

باقر نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ اوندھے منہ میرے قدموں کے پاس گرا۔ گارڈز اس پر پل پڑے۔ پلک جھپکتے میں انہوں نے نوازش کے کپڑے تار تار کر دیے۔ وہ اسی حالت میں آگیا جیسا ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ اپنے سرتاج کا یہ حشر دیکھ کر بد قسمت بیوی نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسکیوں سے رونے لگی۔۔۔ شیخ کے کارندوں نے نوازش کو میرے ہی جیسی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے جسم کو چرمی پٹی سے کس دیا۔ اس کے بعد بدمست کارندے نوازش کی بیوی پر جھپٹے۔ پلک جھپکتے میں اس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہ رہا۔

میں نے باقر خاں سے پوچھا "یہ سب کچھ تُو کس کے حکم پر کر رہا ہے؟"

باقر خاں نے قہقہہ لگایا "اس میں حکم کی کون سی بات ہے جناب۔ جہاز پر اپنے پسنجرز کو تفریح فراہم کرنا ہر ائرلائن کا فرض ہوتا ہے۔ اگر آپ تفریح کرنا نہیں چاہتے تو اپنی آنکھیں بند فرما سکتے ہیں۔"

واقعی میرا دل چاہ رہا تھا کہ آنکھیں بند کرلوں۔ باقر خاں کے اشارے پر شیخ کے دو ہٹے کٹے کارندے جانوروں کی طرح نوازش کی بیوی پر جھپٹ پڑے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی لیکن وہاں اس کی سننے والا کون تھا۔ بپھرے ہوئے دونوں افراد نے جواں سال عورت کو فرش پر گرا دیا اور اذیت دینے والے انداز میں اسے نوچنے کھسوٹنے لگے۔ مجھے لگا جیسے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ ایک انتہائی اندوہناک منظر میرے سامنے تھا اور میں کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

شیخ عاصم کا وہ بدترین روپ میرے سامنے آچکا تھا جس کے بارے میں میرا ذہن مجھے خبردار کرتا رہا تھا۔۔۔ اور میں غزالہ کو خبردار کرتا رہا تھا۔ یہ وہی سفاک روپ تھا جس کا مشاہدہ میں انڈیا میں اور پھر سری لنکا میں کر چکا تھا۔ یہ ننگا ہو کر ناچنے والے اس شیطان کا روپ تھا جس کے سینے میں غضب اور نفرت کا لاوا بھرا ہوا تھا۔۔۔ آج وہ سب کچھ۔۔۔ درست ثابت ہو گیا تھا جس کا اندیشہ مجھے پل پل بے چین رکھتا تھا۔

دونوں مسٹنڈے کالی بھڑوں کی طرح جواں سال عورت سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کے زہریلے ڈنک عورت کو اذیت کی انتہا سے گزار رہے تھے۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر زمین کو شق ہو جانا چاہیے تھا یا آسمان کو ٹوٹ کر ہمارے سروں پر آگرنا چاہیے تھا لیکن کبھی کبھی قدرت بھی سب کچھ "مکافاتِ عمل" کو سونپ کر لاتعلق ہو جاتی ہے۔ نہ زمین پھٹتی ہے نہ آسمان ٹوٹتا ہے۔۔۔ اور وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جسے دیکھنے کی انسانی نگاہ تاب نہیں رکھتی۔ میں نے کن انکھیوں سے نوازش کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور آنسو منہ زور دھاروں کی طرح اس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔

اس بد قسمت کا آنکھیں بند کرنا بھی غور طلب تھا۔ آنکھیں بند کر کے وہ اپنی جواں سال بیوی پر گزرنے والی قیامت سے لاعلم رہنا چاہتا تھا۔۔۔ لیکن یہ لاعلمی اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے کان کھلے تھے اور کانوں میں وہ انگلیاں نہیں ٹھونس سکتا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ چرمی پٹی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اپنی شریکِ حیات کی آہ و بکا اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور آنکھ اوجھل ہونے کے باوجود پہاڑ اوجھل نہیں ہوا تھا۔

"سب۔۔۔ کیسی ہے فلم؟" باقر خاں نے میرے کانوں کے قریب سرگوشی کی۔

میں نے بڑے اطمینان سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

اس کا چہرہ ایک دم لال بھبھوکا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ طیش سے بے قابو ہو کر مجھ پر ٹوٹ پڑے گا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے غضب پر قابو پا کر اپنا سکون برقرار رکھا۔ مسکرا کر بولا "لگتا ہے جناب کو فلم کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلی فلم آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ پتا ہے اس کے مرکزی کردار کون ہیں؟ اس کے مرکزی کردار عالم قریشی اور اس کی دوسری بیوی ہوں گے۔"

میرے جسم کا سارا خون میرے سر کو چڑھ گیا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں۔ باقر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر جناب کو وہ فلم بھی پسند نہ آئی تو ہم آپ کو ایک اور فلم دکھائیں گے۔ اس کے مرکزی کردار زریں گل اور اس کی نو بیاہتا بیوی ہوں گے۔۔۔ غالباً کلثوم نام ہے نا اس کی بیوی کا۔ مجھے یقین ہے کہ بڑی اچھی پرفارمنس دے گی وہ۔ نئی نویلی ہے نا۔"

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

وہ بولا "تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"تم جانتے ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ اپنی آنکھ سے میرا تھوک صاف کر کے بولا "ایک مشورہ ہے تمہارے لیے اگر تم مانو تو۔۔۔ جو تم سے چاہا جا رہا ہے وہ کر گزرو کیونکہ ہر صورت میں وہ تمہیں کرنا ہی ہے۔ ہزاروں ذلتیں برداشت کر کے بھی' ہزاروں تکلیفیں جھیل کر بھی اور فرضِ محال تم مر بھی گئے تو بھی وہ سب کچھ ہونا ہے۔ تم اپنے ہاتھ سے نہ کرو گے تو کوئی اور کر گزرے گا یا پھر ہم خود ہی کر گزریں گے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ منحوس باقر خاں اپنی ناپاک زبان سے کیا بات کہہ رہا ہے۔ یہ وہی بات تھی جو پچھلے کئی برس سے شیخ عاصم کہہ رہا تھا۔ وہی کینۂ انتقام جو شیخ عاصم کے سینے میں مدت سے الاؤ کے مانند بھڑک رہا تھا اور جس کے شعلے میری معصوم بہن شفتا تک پہنچنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر باقر خاں کے منہ پر تھوک دیا۔ اس خبیث نے اب کی بار بھی یہ ذلت بڑی خندہ پیشانی سے جھیلی۔ جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور مسکراتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ اگلی فلم میں ایک کردار مجھے بھی ادا کرنا پڑے گا۔"

مسلح کارندوں نے ابھی تک نوازش کی بیوی کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ باقر خاں چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ سجا کر بولا "معزز مہمان تو میرے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ فلم کے کئی دلچسپ حصے وہ دیکھ ہی نہیں سکے ہوں گے۔ فلم ری وائنڈ کر لی جائے تو بہتر ہو گا۔ کیا خیال ہے معزز مہمان؟" اس نے آخری الفاظ مجھ سے مخاطب ہو کر کہے۔

میرے منہ سے باقر خاں کے لیے بے ساختہ ایک غلیظ گالی نکل گئی۔۔۔ وہ بد مزہ ہوئے بغیر بولا "میرا خیال ہے کہ معزز مہمان اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے شیطانی کھیل ختم کر دیا۔ دو گارڈز اجڑی بکھری عورت کو مردہ جانور کی طرح گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ وہ مکمل سکتے کی سی حالت میں تھی۔۔۔ "بیس منٹ" کے اس حصے میں خاموشی چھا گئی۔ نوازش صدمے سے نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ شیخ کے ایک کارندے نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو اس کی چرمی پٹی کھولی گئی۔ ایک کارندے نے اسے شلوار پہنائی۔ دوسرے نے کندھے پر لادا اور "بیس منٹ" کے کسی دوسرے حصے میں لے گیا۔

چند لمحے بعد سیڑھیوں کی طرف آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ شیخ عاصم زینے اتر کر میری طرف آ رہا تھا۔ وہ بڑی اطمینان سے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ کوئی شرم کوئی جھجک نہیں تھی اس کی آنکھوں میں۔ وہ اپنے چہرے سے محبت' خلوص اور دوستی کا نقاب اتار کر ذرا بھی شرمندہ نہیں تھا۔ وہ مستحکم قدموں سے چلتا ہوا میرے سامنے آیا۔ باقر خاں نے جلدی سے ایک کرسی پکڑی اور میرے سامنے رکھ دی۔ شیخ عاصم اس آرام دہ کرسی پر براجمان ہو گیا۔ عاصم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باقر خاں کو کوئی اشارہ کیا۔ باقر خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ "بیس منٹ" کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ اب میں اور شیخ عاصم تنہا تھے۔ مجھ سے صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر وہ بڑے طمطراق سے بیٹھا تھا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہارے چہرے سے نقاب اتر گیا شیخ عاصم۔"

"میرے چہرے پر کوئی نقاب تھا اور نہ اب ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرا موقف تو تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ موقف جیسا بھی ہے' میں نے اسے چھپا کر نہیں رکھا ہوا۔"

"تمہارا موقف یہ ہے کہ تم اپنے بدکار بھائی کی موت کا

بدلہ لینے کے لیے میری بہن کو نشانہ بنانا چاہتے ہو۔"

"نہیں۔" عاصم نے فوراً کہا "میں تمہاری اور اپنی دشمنی ختم کرنے کے لیے ایک درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری بہن کا رشتہ اپنے خاندان میں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری بہن کو اپنے خوبرو' تعلیم یافتہ اور مہذب بھتیجے کی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ وہ ایسا لڑکا ہے جو کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔"

"تم صرف اپنے انتقام کو رشتے داری کا نام دے رہے ہو عاصم۔۔۔ تمہارے اندر کا کینہ پرور قبائلی' دنیا کو دھوکا دینے کے لیے اپنے چہرے پر مصنوعی چہرہ چڑھا رہا ہے۔"

"یہی وہ نکتہ ہے جہاں میرا اور تمہارا اختلاف ہے۔ تم اس نکتے کو جتنی جلدی سمجھ جاؤ گے اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔" عاصم نے کہا۔

"اگر میں یہ نکتہ نہ سمجھوں تو؟"

"کیا مطلب؟"

"اگر میں تمہاری رشتے داری کی تجویز ماننے سے انکار کر دوں تو؟"

"پھر تمہیں اپنی عقل پر خود ہی ماتم کرنا پڑے گا۔" شیخ نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا "جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہنا ہے شاہ جہان۔"

"کیا کرو گے؟"

"جو کچھ تم نے ابھی یہاں دیکھا ہے۔۔۔ یہ صرف ایک جھلک ہے۔ ہم اس سے سو گنا آگے جا سکتے ہیں لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بارانی کی اس حد تک نہیں جاؤ گے۔ بہت جلد تمہارا دماغ مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

"اگر تمہاری یہ توقع پوری نہ ہوئی تو۔۔۔ اور سو گنا آگے جانے کے باوجود تم ناکام رہے تو؟"

وہ مسکرایا "پھر ہمارے پاس اور بھی راستے ہیں۔ اب یہ بات کھل ہی گئی ہے تو ہم ہر راستہ اپنائیں گے۔"

"اچھا۔۔۔ فرضِ محال تم شفتا تک پہنچ بھی جاؤ۔ وہ ایک عاقل بالغ لڑکی ہونے کی حیثیت سے تمہاری بات ماننے سے انکار کر دے تو۔۔۔؟"

"اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہو گی۔ تمہارے "جرمِ قتل" نے تمہاری بہن سے انکار کی گنجائش چھین لی ہے۔"

"یعنی تم بزورِ بازو اسے اپنے بھتیجے سے منسوب کرو گے؟"

"بے شک ایسا ہی ہو گا۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے چہرے پر کوئی نقاب نہیں ہے۔ یہ باتیں جو تم اب کہہ رہے ہو کیا غزالہ کے سامنے بھی کہہ سکتے ہو؟"

"وہ عورت ہے' ناقص العقل ہے۔ میرے لیے ضروری نہیں کہ اسے ہر بات بتاؤں۔۔۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو بتاؤں گا بھی۔"

"تم ایک عظیم دھوکے باز ہو عاصم۔۔۔ شاید تمہارا خمیر ہی فریب سے اٹھا ہے۔" میں نے اپنی دلی جذبات کا اظہار کیا۔

شیخ عاصم نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ خود کو پرسکون رکھتے ہوئے بولا "تم اپنی حالت پر ٹھنڈے دل سے غور کرو شاہ جہان اور اس یقین کے ساتھ غور کرو کہ تم نے جو کچھ بھی سوچنا ہے اسی چھت کے نیچے سوچنا ہے۔ یہاں سے نکل بھاگنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہاں سے نکلنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ تم اپنی بہن کے لیے ایاز کا رشتہ قبول کر لو۔۔۔ یا کسی وجہ سے تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔"

بیس منٹ میں بہت سی تلخی اور سگار کا دھواں چھوڑ کر شیخ عاصم واپس چلا گیا۔ میں جس آہنی کرسی پر بیٹھا تھا وہ بیس منٹ کے فرش پر گڑی ہوئی تھی۔ چرمی پٹی کی وجہ سے میں کرسی کے ساتھ پیوست تھا۔ ایک ایسی ہی اور کرسی بھی یہاں موجود تھی۔ اس پر تھوڑی دیر پہلے نوازش کو بٹھایا گیا تھا۔

شیخ عاصم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی شیطانی مسکراہٹ والا باقر خاں اور اس کے ماتحت گارڈز واپس آ گئے۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کرسی سے کھولنے کے بعد بیس منٹ کے کسی اور حصے میں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہاں چھوٹے چھوٹے لاک اپ سے بنے ہوئے تھے۔ باقر خاں نے اپنے ایک ماتحت سے کہا کہ وہ کرسی کی بیلٹ کھول دے۔

ماتحت' بیلٹ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے میں' میں خاصا مصروف رہا ہوں۔ درحقیقت' جس آہنی کرسی پر مجھے بٹھایا گیا تھا اس کے ایک پہلو کی طرف لوہے کا ایک تیز کنارہ سا موجود تھا۔ میں اپنی کلائی سے بندھی ہوئی رسی کو مسلسل اس تیز دھار کنارے سے رگڑتا رہا تھا۔ نتیجے میں کم از کم چار جگہ سے رسی کٹ چکی تھی۔ اب مجھے یقین تھا کہ تھوڑا سا زور لگاؤں گا تو رسی ٹوٹ جائے گی۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس "بیس منٹ" میں باقر خاں کو

خاص اہمیت حاصل تھی۔ ماتحت گارڈز اس کی ہر ہدایت پر بلا چوں و چرا عمل کرتے تھے۔ وہ ان کے لیے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اگر میں کسی طرح اس پر قابو پالیتا تو باقی گارڈز کو بے بس کیا جاسکتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ مخصوص انداز سے تین مرتبہ کال بیل بجانے پر "ہیں منٹ" کے باہر موجود ایک "بیل بوائے" اندر آجاتا تھا۔ اگر میں مخصوص انداز میں بیل دیتا اور دروازہ کھلنے سے پہلے دروازے کے قریب چھپ جاتا تو "ہیں منٹ" سے نکلنے کا امکان پیدا ہوسکتا تھا۔ جو وحشت ناک مناظر کچھ دیر پہلے میں نے یہاں دیکھے تھے انہوں نے دل و دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھی۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مستقبل قریب میں عالم قریشی یا زریں گل کو اس حالت میں دیکھوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے "فوری ایکشن" کا ارادہ کیا تھا۔

جونہی مسلح گارڈز نے میری کمر سے بیلٹ ہٹائی' میں نے دونوں ہتھیلیوں پر زور دیا اور کلائی کی رسّی جو زیادہ مضبوط نہیں تھی' تڑاخ کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ اسی دوران میں میری زوردار ٹانگ گارڈ کے سینے پر پڑی تھی اور وہ اچھل کر کمرے کے وسط میں جاگرا تھا۔ یہاں اس لباس کی دھجیاں پڑی تھیں جو ایک گھنٹا پہلے نوازش کی بیوی کے جسم پر تھا۔ جونہی میرے ہاتھ آزاد ہوئے' میں نے جست کی اور باقر خاں پر جاپڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکل کر میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر میں نے پیچھے کی طرف کھینچا اور ریوالور اس کی کنپٹی سے لگادیا۔

"خبردار' گولی ماردوں گا۔" میں نے کہا۔

میری دھمکی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ایک گارڈ نے گولی چلادی۔ میرے اور خودکار والے کے درمیان باقر خاں تھا۔ کم از کم تین گولیاں اس کے جسم میں لگیں۔ وہ تکلیف سے چیخ اٹھا۔ اسی اثنا میں ایک پٹھان گارڈ پہلو سے مجھ پر جھپٹا۔ میں نے ٹانگ کی ضرب سے اسے پیچھے دھکیلا اور زخمی باقر خاں کو کھینچتا ہوا الٹے قدموں زینوں کی طرف بڑھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوند گئی۔ یہ حملہ اتنا شدید اور تیز رفتار تھا کہ مجھے حرکت کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ سیڑھیوں کے قریب سے ایک شخص نے مجھ پر جست کی تھی اور مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے فرش پر گرا تھا۔ زخمی باقر خاں بھی میرے ساتھ ہی گرا تھا۔ میں نے گرتے گرتے بھی ٹریگر دبادیا تھا لیکن باقر ریوالور کی زد سے نکل چکا تھا۔

جست کرکے اپنے اوپر گرنے والے شخص کو میں نے ٹانگوں کے زور سے اچھالنا چاہا لیکن وہ میری توقع سے بہت زیادہ پھرتیلا اور سخت جان تھا۔ اس نے تڑپ کر خود کو میری ٹانگوں کی زد سے بچایا اور ایک طوفانی مکا میرے جبڑے پر رسید کیا۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ مکا کسی معمولی مدمقابل کا نہیں ہے۔ ایک دم ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے آنکھیں کھول کر مدمقابل کا چہرہ دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آج کافی عرصے بعد وہ شخص میری آنکھوں کے سامنے تھا جس سے برسرِپیکار ہونا میرے لیے ہمیشہ ایک "کڑی آزمائش" رہا تھا۔ شیطانوں کا ابن شیطان شنکر شکرا... ہاں وہ خوف ناک دست شنکر شکرا کا ہی ہوسکتی تھی جس نے لمحوں میں مجھے نہتا کردیا تھا۔

میرے پاس یہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی کہ شنکر یہاں کیوں اور کیسے موجود ہے۔ یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا کہ اگر وہ اب تک اسی "ہیں منٹ" میں تھا تو سامنے کیوں نہیں آیا تھا۔ میرے سامنے سب سے اہم مسئلہ شنکر کے طوفانی حملے سے بچنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا بھی کمزوری دکھائی تو وہ میری ہڈی پسلی ایک کرکے رکھ دے گا۔ وہ میرے ہر داؤ کا توڑ جانتا تھا' میرے لڑنے کا انداز اسے ازبر تھا۔

شنکر کا دوسرا مکا میں نے اپنے بازو پر روکا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ میرے سر کی زوردار ٹکر نے اسے چکرایا تو میں تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔

لیکن یہاں مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوئی جو ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ کم از کم ایک ایسے شخص سے نہیں ہونی چاہیے تھی جو "اسٹریٹ فائٹر" تھا اور جمانی استاد کہلاتا تھا... میں شنکر شکرا سے لپٹا رہتا تو مسلح گارڈز مجھے اپنی رائفلوں کی زد میں نہیں لے سکتے تھے' جونہی میں شنکر سے علیحدہ ہوا' دو خودکار رائفلوں کی نالیاں میرے سر سے آلگیں۔ میں ذرا سا ٹھٹکا تو شنکر نے گرانے کے انداز میں مجھے سویپ کیا۔ اس سویپ میں اتنی پرفیکشن اور تیزی تھی کہ چاروں شانے چت گرنے تک مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔

شنکر کے ہاتھ میں کولٹ پسٹل چمک رہا تھا۔ اس کی سانپ جیسی تیز نگاہوں نے میرے ہاتھوں کی کٹی ہوئی رسّی کا جائزہ لیا پھر آہنی کرسی کو دیکھا۔ دو تین سیکنڈ کے اندر اسے معلوم ہوگیا کہ میں نے اپنے ہاتھ کیونکر آزاد کروائے تھے۔ جس شخص نے مجھے کرسی سے باندھا تھا اس کے منہ پر شنکر نے کولٹ پسٹل کا دستہ مارا اور وہ لڑکھڑا کر دور جاگرا۔ یقیناً

اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ٹوٹی ہوئی ناک میں سے خون فوارے کی طرح ابل رہا تھا۔

"ہیں منٹ" میں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ شنکر سے بے حد مرعوب بلکہ دہشت زدہ نظر آرہے تھے۔ باقر خاں پشت کے بل فرش پر پڑا تھا۔ گولیاں اس کی ٹانگوں میں لگی تھیں۔ وہ درد کی شدت سے رسّی کی طرح بل کھا رہا تھا لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اسے تھامتا۔

شنکر کی جگر پاش نظریں میری نظروں سے ملیں پھر اس کے ہونٹوں سے بے انتہا زہریلی سرگوشی نکلی "چلو شاہ جہاں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل کو حرکت دی۔

میں شنکر کے آگے آگے چلتا سیڑھیوں پر آیا۔ یہ وہ سیڑھیاں نہیں تھیں جن سے اتر کر میں "ہیں منٹ" میں پہنچا تھا۔ یہ سیڑھیاں ایک گیلری نما مقام کی طرف جاتی تھیں۔ یہ گیلری ہیں منٹ کا ہی ایک حصہ تھی۔ گیلری میں سامنے کی طرف اسٹیل کے خوب صورت پائپ کا جنگلا سا لگا ہوا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا جیسے گیلری کی آرائش کی گئی ہے لیکن قریب سے دیکھ کر پتا چلا کہ اسٹیل کے پائپوں سے آہنی سلاخوں کا کام لیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت چھوٹے چھوٹے لاک اپ تھے۔ ان کی کل تعداد چھ تھی۔ ہر لاک اپ میں لوہے کے اسپرنگوں والا چھوٹا سا بیڈ اور ایک کرسی تھی۔ عقبی دیوار کے ساتھ ایک مختصر دروازہ بھی نظر آرہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ باتھ روم تھے۔ ایک لاک اپ کے سوا باقی سب خالی تھے۔ اس لاک اپ میں ایک خوبرو لیکن مفلوک الحال دوشیزہ بند تھی۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ یوسا تھی... رہی یونانی لڑکی جو خود کو شیخ عاصم کی KERP یعنی راشتہ بتاتی تھی۔ چند ہفتے پہلے وہ رقم کا ایک تقاضا لے کر دبئی سے شیخ کے پاس آئی تھی۔ میں نے اس خیال سے اس کی ضرورت پوری کردی تھی کہ وہ شیخ اور غزالہ کو ڈسٹرب نہ کرے۔ میرے خیال میں وہ واپس امارات جاچکی تھی لیکن لیکن اب میں اسے یہاں لاک اپ میں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے امارات سے بھی ایک شخص طارق' یوسا کو ڈھونڈتا ہوا یہاں آچکا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ یوسا امارات نہیں پہنچی اور یہیں شیخ عاصم کی تحویل میں ہے۔

یوسا کے چہرے پر کئی جگہ نیلگوں نشان تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر اس "ہیں منٹ" میں بہیمانہ تشدد ہوتا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ بھی اسی قسم کے حالات سے گزری ہو جن سے تھوڑی دیر پہلے نوازش کی بدقسمت بیوی گزری تھی۔

مجھے دیکھ کر یوسا کی نیلی آنکھوں میں شناخت کی چمک نظر آئی۔ اس نے آگے آکر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

مسلح پہرے داروں نے مجھے لاک اپ میں دھکیل کر دروازہ بند کردیا۔

○☆○

پورے چوبیس گھنٹے میں بھوکا پیاسا وہاں بند رہا۔ شنکر شکرا کی منحوس صورت دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ وہ اسی ہیں منٹ کے کسی حصے میں موجود ہے۔ درحقیقت یہ ایک وسیع "ہیں منٹ" تھا۔ شاید جتنا رقبہ کوٹھی کا تھا' اتنا ہی اس "ہیں منٹ" کا بھی تھا۔ یہاں مختلف کمرے اور راہداریاں وغیرہ تھیں۔ جس لاک اپ میں' میں بند تھا وہ بلندی پر واقع تھا۔ وہاں سے نیچے اس ہال میں جھانکا جاسکتا تھا جہاں مجھے اور نوازش کو کرسیوں پر جکڑا گیا تھا اور انسانیت سوز تماشا دکھایا گیا تھا۔

اس "ہیں منٹ" میں قریباً ایک درجن نہایت تربیت یافتہ کمانڈو ٹائپ گارڈز موجود تھے۔ ان گارڈز کا براہ راست تعلق شنکر شکرا سے تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' ان گارڈز کا ٹرینر (استاد) بھی شنکر شکرا تھا اور یہ سب انڈین تھے۔ شیخ اور شنکر شکرا کے درمیان لنک ایک طویل عرصے سے موجود تھا۔ سری لنکا میں غزالہ کے مسلسل اصرار پر شیخ عاصم نے غزالہ کو باور کرایا تھا کہ اس نے شنکر کو فارغ کردیا ہے مگر حقیقت میں صرف اتنا ہوا تھا کہ شنکر انڈر گراؤنڈ ہوگیا تھا۔ شیخ سے اس کا رابطہ کبھی بھی ٹوٹا نہیں تھا۔ یہ قریباً ویسی ہی فریب کاری تھی جیسی شیخ نے اپنے "عشرت کدے" کے حوالے سے غزالہ کے ساتھ روا رکھی تھی۔ اس نے غزالہ کو باور کرایا تھا کہ اس نے اپنی "نائٹ لائف" موقوف کردی ہے اور عشرت کدے کی تمام لڑکیوں کو چھٹی دے دی گئی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔

اگلے روز صبح کے وقت میرے لاک اپ میں کھانا پہنچایا گیا۔ پریشان کن حالات کے باوجود بھوک بھی موجود تھی۔ کھانا پہنچانے کے لیے لاک اپ کا دروازہ نہیں کھولا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پر چھوٹی سی ایک کھڑکی موجود تھی۔ اسی میں سے ٹرے اندر پہنچادی گئی تھی۔ اس کھڑکی کی چوڑائی روف اور اونچائی بہ مشکل پانچ انچ تھی بلکہ اسے کھڑکی کے بجائے رخنہ ہی کہنا چاہیے۔ ایسے رخنے تمام لاک اپس میں موجود تھے۔

ساری رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ میں بیڈ پر نیم

دراز ہو گیا۔ کھانے کی حرارت کی وجہ سے غنودگی طاری ہوئی اور آنکھ لگ گئی۔ دوپہر کے وقت بیدار ہوا تو ایک اور لاک اپ آباد نظر آ رہا تھا۔ اس لاک اپ میں نوازش اور اس کی بیوی کو بند کیا گیا تھا۔ پرسوں جب میں نے آخری بار نوازش کو دیکھا تھا تو اس پر غشی طاری تھی۔ اب وہ بہتر نظر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی کے جسم پر نیا لباس تھا۔ وہ سر جھکائے ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ بالکل گم صم اور اُجڑی بکھری۔ میں نے غور سے نوازش کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت کر جیسے اسے اب سکون سا آ گیا تھا۔ صدمہ کتنا بھی بڑا ہو، وقت اس پر اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ گزرنے والے چوبیس گھنٹے کوئی طویل مدت نہیں تھی لیکن انہوں نے نوازش کے غم کی شدت کم کر دی تھی۔ یہی دستورِ قدرت ہے۔ ہر لاک اپ کی درمیانی دیوار کنکریٹ کی تھی، ہاں اسٹیل کے پائپوں والے جنگلے میں سے قریبی لاک اپس کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں یونانی لڑکی یوسا سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن میرے اور اس کے لاک اپ کے درمیان ایک لاک اپ خالی تھا لہٰذا رسائی کی صورت نہیں تھی۔ اب یہ خالی لاک اپ آباد ہو گیا تھا یعنی اس میں نوازش اور اس کی بیوی آ گئے تھے۔ نوازش کے ذریعے میں یوسا تک اپنی بات پہنچا سکتا تھا۔ بیڈ کے نیچے سے مجھے ایک ٹوٹا پھوٹا بال پوائنٹ مل گیا تھا۔ معمولی سی کوشش سے میں نے اسے لکھنے کے قابل بنا لیا تھا۔ ایک پرانے اخبار کے خالی حاشیے پر لکھنے کے لیے جگہ بھی موجود تھی۔ میں نے انگلش میں یوسا کے لیے چند الفاظ لکھے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ تو "رقم" لے کر واپس دبئی چلی گئی تھی اپنا قرضہ اتارنے کے لیے۔۔۔ وہ واپس کیوں آئی اور اس لاک اپ تک کیسے پہنچی؟

اخبار کا کاغذ تہ کر کے میں نے نوازش کو تھمایا اور سرگوشی کے انداز میں کہا کہ وہ یہ کاغذ اور بال پوائنٹ میم صاحب تک پہنچا دے۔

نوازش پہلے تو جھجکا پھر اس نے گارڈ کی نظر بچا کر یہ دونوں چیزیں یوسا کو دے دیں۔

قریباً ایک گھنٹے بعد یوسا کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس نے جواب دینے کے لیے کسی میڈیسن کی پیکنگ کا گتا استعمال کیا تھا۔ اس کی تحریر سے جو کچھ معلوم ہوا وہ کچھ یوں تھا۔

یوسا کے ساتھ افسوس ناک المیہ ہوا تھا۔ وہ یونانی نژاد شخص کا قرض چکانے کے لیے جو رقم مجھ سے لے کر گئی تھی وہ لاہور ایئرپورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ کسی راہزن نے پستول دکھا کر اس سے اور ٹیکسی ڈرائیور سے ساری نقدی چھین لی تھی۔ یہاں تک کہ یوسا کے پاس واپس ہوٹل آنے کا کرایہ تک نہیں رہا تھا۔ یہ سوچ کر اس کی روح فنا ہو گئی تھی کہ دبئی جا کر وہ کیا کرے گی۔ اس کا قرض خواہ اب اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی ہوسناک نگاہیں یوسا کے جسم سے لپٹنے کے لیے تیار تھیں۔ ان نگاہوں کے خوف سے یوسا نے واپس دبئی جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس ہوٹل آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر شیخ عاصم کی کوٹھی کا رخ کیا۔ اس مرتبہ وہ سیدھی کوٹھی کے دروازے پر چلی آئی۔ شومیٔ قسمت یوسا کی ملاقات شیخ کے ملازم خاص باقر خاں سے ہوئی۔ باقر خاں جانتا تھا کہ یوسا شیخ عاصم کی داشتاؤں میں سے ایک ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس لڑکی کو شیخ عاصم کی وائف مسز غزالہ کی نظر سے بچانا ہے۔ وہ کوٹھی کے بائیں باغ میں واقع خفیہ راستے کے ذریعے یوسا کو کوٹھی کے وسیع و عریض بیس منٹ میں لے آیا۔

دو دن بیس منٹ میں رکھنے کے باوجود جب باقر خاں نے یوسا کو شیخ عاصم سے نہیں ملایا تو اس کا پارا چڑھ گیا۔ پے در پے مسائل نے پہلے ہی اسے دل شکستہ کر رکھا تھا۔ وہ باقی چیخنے چلانے لگی۔ باقر نے اسے تھپڑ مارا تو اس نے بھی باقر کا منہ نوچ لیا۔ اس مار کٹائی کے بعد باقر خاں نے یوسا کو لاک اپ میں بند کر دیا۔ اب یوسا کے لیے ایک دردناک صورت حال سامنے آ گئی تھی۔ شیخ عاصم نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی چہیتی KEEP لاک اپ میں بند ہے اسے رہائی نہیں دلائی تھی اور نہ ملاقات کی تھی۔

یوسا کی روداد پڑھ کر مجھے کچھ حیرت نہیں ہوئی۔ یہ سب کچھ شیخ عاصم کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ وہ دو چہروں والا شخص تھا اور دونوں چہرے ایک دوسرے سے بے انتہا مختلف تھے۔ رات کی تنہائی میں وہ جس لڑکی کے حسن سے اپنی خوشیاں کشید کرتا رہا تھا وہ اب ایک پھٹے پرانے کپڑے کی طرح لاک اپ کے ایک کونے میں پڑی تھی۔ اس نے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس کے پاس اتنی دور سے چل کر کیوں آئی ہے۔

اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ چند ہفتے پہلے زریں گل کی شادی کے موقع پر امارات سے آنے والے شخص نے ہنگامہ کیوں مچایا تھا اور یہ الزام کیوں لگایا تھا کہ یوسا پاکستان میں ہے اور شیخ عاصم کے پاس ہے۔ اسے یقین تھا کہ یوسا قرض کی ادائیگی کے لیے رقم لینے عاصم کے پاس آئی ہوگی اور عاصم نے دادِ عیش دینے کے لیے یا کسی اور

صدمے سے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہوگا۔

میں لاک اپ کے بیڈ پر لیٹا رہا اور اپنے خیالات سے لڑتا رہا۔ نیلی آنکھوں والی یوسا کی بے بسی دل پر کچوکے لگا رہی تھی۔ گاہے گاہے میرا دھیان اپنے پڑوسی قیدی نوازش کی طرف بھی چلا جاتا تھا، وہ غم کی تصویر تھا۔ کوشش کے باوجود وہ مجھ سے نگاہیں چار نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ نیچے ہال میں پرسوں جو کچھ ہم نے دیکھا تھا اس کے بعد واقعی آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

لاک اپ میں کروٹ کے بل لیٹے لیٹے اچانک میں چونک گیا۔ نیچے ہال میں اچانک کچھ آوازیں سنائی دی تھیں۔ میں نے اسٹیل کے پائپوں میں موجود درزوں سے نیچے جھانکا۔ فرش میں گڑی ہوئی آہنی کرسیوں کے قریب دو افراد کھڑے تھے۔ ایک عورت، ایک مرد۔ عورت نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ مرد شلوار قمیص میں تھا۔ مرد کو میں نے غور سے دیکھا اور میری رگوں میں خون جم گیا۔ وہ زریں گل تھا۔ اس نے شلوار قمیص پر چھوٹے چھوٹے آئینوں والا ٹلوکا بھی پہن رکھا تھا اور بے حد چکا چکا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ نوبیاہتا کلثوم تھی۔ کلثوم کے ہاتھ میں ایک پوٹلی بھی تھی۔ وہ دونوں خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ کلثوم گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک مسلح گارڈ ان دونوں کے عقب میں کھڑا تھا۔ یقیناً یہی ان دونوں کو یہاں لایا تھا۔ وہ انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا تو وہ کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں کچھ دیر اردگرد کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کے خیال میں بالکل نہیں تھا کہ اس ہال کے اوپر جو نیم تاریک گیلری ہے وہاں کوئی موجود ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔

کلثوم معصومانہ انداز میں مختلف اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ زریں گل اسے منع کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔ زریں گل اور کلثوم کا یہاں ہونا میرے ذہن میں بدترین اندیشے جگا رہا تھا۔ وہ دھمکی میرے کانوں میں گونجنے لگی تھی جو پرسوں باقر خاں نے مجھے دی تھی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، جیل روڈ کے ایک پبلک فون بوتھ سے میں نے ساجی صاحب سے رابطہ کیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پشاور میں زریں سے فون پر بات کریں اور اسے بدلے ہوئے حالات سے آگاہ کر دیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ کسی حوالے سے شیخ عاصم کے غضب کا نشانہ بن جائے۔ پتا نہیں کہ میری یہ وارننگ زریں تک پہنچی تھی یا نہیں۔ بہرحال نتیجہ میرے سامنے تھا۔ زریں اور کلثوم اس خطرناک "دام" میں موجود تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ انہیں چالبازی کے ساتھ یہاں لایا گیا ہے۔

ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر میرا کلیجا دہل رہا تھا۔ کلثوم اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ایک ٹیپ ریکارڈر کے پاس پہنچ گئی "یہ ۔۔۔ کیا ۔۔۔ ہوتا؟" وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"یہ بڑے مزے کا چیز ہوتا ہے۔" زریں نے جواب دیا "اس میں آواز بھرا جاتا۔ جو ام بولتا ۔۔۔ وہ اس میں بھرا جاتا ۔۔۔ جیسے گھڑے میں پانی بھرا جاتا۔ جیسے گھڑا الٹانے سے گھڑے میں سے پانی نکلتا ایسے ہی اس میں سے آواز نکلتا۔"

"آواز کیا ہوتا؟" کلثوم نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"تمہاری زبان میں غرش بولتا ۔۔۔ اس میں غرش بھرا جاتا ہے۔ غرش یعنی آواز کچھ سمجھ میں آیا ۔۔۔ کھو، ام تم کو کر کے بتاتا ہے۔"

زریں گل نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک شیلف میں اسے کیسٹیں پڑی نظر آئیں۔ اس نے ایک کیسٹ نکال کر ٹیپ ریکارڈر میں لگائی۔ اسے پلے کر کے دیکھا "ہاں یہ خالی ہے۔" اس نے اپنا بڑا سا سر ہلایا "اب ام تم کو اس میں آواز بھر کر بتاتا۔ ابھی جب استاد حبیب آئے گا، ام اس کا آواز بھی بھرے گا۔"

اس کے بعد زریں گل نے بدر منیر کے چند مکالمے ایکشن کے ساتھ بولے پھر پنجابی ہیرو کے انداز میں دو تین بڑکیں لگائیں پھر دھیمے سُروں میں کوئی گانا گانے لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو زریں گل کی حرکات دلچسپ محسوس ہوتیں۔ لیکن میرا دل خون ہو رہا تھا۔ زریں اور کلثوم کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ شعلوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔

گانے کے چند بول بولنے کے بعد زریں نے ٹیپ کو ری وائنڈ کیا۔ اس کے مکالمے کمرے میں گونجنے لگے۔ کلثوم آوازیں سن سن کر حیران ہو رہی تھی۔ بڑے معصو[م انداز] میں اس کا منہ کھل گیا تھا۔ وہ کبھی زریں کی طرف دیکھتی اور کبھی ٹیپ ریکارڈر کی طرف۔ مکالمے ختم ہوئے تو زریں گل کا گانا سنائی دینے لگا۔ کلثوم نے منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگی۔ وہ رنگ برنگے لباس میں تھی۔ ہاتھوں پر مہندی لگی ہوئی تھی۔ کلائیوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ وہ قلات کی دور دراز وادی میں کھلنے والا خوش رنگ پھول تھی جو زریں گل کے ہاتھوں میں مسکتا ہوا یہاں چلا آیا تھا۔

اچانک زریں گل کی آواز ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی لرزہ خیز نسوانی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں ٹیپ ریکارڈر سے بلند ہو رہی تھیں۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو۔ خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔" یہ ایسی چیخیں تھیں کہ سننے والے کا کلیجا ہل سکتا تھا۔ لیکن جن سے رحم کی التجا کی جا رہی تھی وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں یہ آواز پہچان گیا۔ میں یہ آواز کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ نوازش کی بیوی کی آواز تھی۔

کلثوم کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں زریں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟

زریں الجھتے ہوئے لہجے میں منمنایا "شاید کوئی ڈراما وغیرہ ہے۔"

"تو اب ملے گا... ہوتا؟" کلثوم نے پوچھا۔

اسی دوران میں میری آواز ٹیپ ریکارڈر سے ابھری "یہ سب کچھ تو کس کے حکم پر کر رہا ہے؟"

باقر کی آواز آئی "اس میں حکم کی کون سی بات ہے جناب' جہاز پر اپنے پسنجرز کو تفریح فراہم کرنا ہر ائرلائن کا فرض ہوتا ہے۔ اگر آپ تفریح کرنا نہیں چاہتے تو اپنی آنکھیں بند فرما سکتے ہیں۔"

زریں گل بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔ یقیناً میری آواز اس نے پہچان لی تھی۔ اس نے ٹیپ ری وائنڈ کر کے پھر آوازیں سنیں پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ پتا نہیں کیا ہو رہا تھا۔ کلثوم بھی گم صم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جھولتی ہوئی پوٹلی نیچے رکھ دی تھی۔

زریں گل نے دائیں بائیں دیکھا پھر مجھے آواز دی "استاد صیب... استاد صیب! کہاں ہیں آپ؟"

اس آواز کے جواب میں تین چار گارڈز نمودار ہوگئے۔ ایک گارڈ نے اچانک زریں کے سر کے پچھلے حصے میں رائفل کا کندہ رسید کیا۔ وار اتنا اچانک اور شدید تھا کہ زریں گل بالکل مزاحمت نہ کرسکا۔ وہ جھکا تو اس کے پیٹ پر بہت زور سے ٹھوکر ماری گئی۔ زریں چاروں شانے چت گر گیا۔ کلثوم کی چیخوں سے کمرا گونج اٹھا۔

زریں کو اتنی پھرتی اور مہارت سے چت کیا گیا تھا کہ میں ششدر رہ گیا لیکن جب حملہ کرنے والے شخص کی صورت دیکھی تو حیرت خاصی حد تک کم ہوگئی۔ یہ شنکر شنکرا تھا۔ بے شک زریں گل لڑائی بھڑائی میں ماہر تھا لیکن اس جیسے دو تین لڑاکا بھی بیک وقت شنکر سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ شنکر نے اشارہ کیا۔ دو تین گارڈز نے زریں کو دبوچ کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ دیگر دو گارڈز نے کلثوم کو یوں دبوچا جیسے عقاب چڑیا کو دبوچتے ہیں۔ وہ چیخ رہی تھی اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نیم بے ہوش زریں گل کو اٹھایا گیا۔ گارڈز نے پلک جھپکنے میں اس کے کپڑے تار تار کر دیے۔ کچھ بھی اس کے جسم پر باقی نہ رہا۔ یہ مجھ لیے بڑا تکلیف دہ نظارہ تھا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ زریں گل کو ایسی حالت میں دیکھوں گا۔ کلثوم... زریں کی حالت دیکھ کر ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہ قریباً وہی صورت حال تھی جو اس سے پہلے نوازش کے ساتھ پیش آئی تھی۔

نیم بے ہوش زریں گل کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا بالوں بھرا سینہ اس خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔ وحشی گارڈز نے اسے گھسیٹ کر کرسی پر بٹھایا اور چمڑے کی بیلٹ سے باندھ دیا۔ اس کے بعد شنکر شنکرا سیڑھیاں طے کر کے میرے لاک اپ کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ حسب معمول پُرسکون تھا لیکن اس سکون کے پیچھے درندگی اور شیطانیت کی بجلیاں چمک رہی تھیں۔ اس نے قریب کے دونوں لاک اپس کے سارے پردے کھینچ دیے۔ اب لاک اپس میں سے نیچے کے ہال کا منظر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ چند لمحے جگر پاش نظروں سے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا "کیا خیال ہے۔ کھیل شروع کیا جائے... یا تمہارے ارادے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے؟"

"کیسا ارادہ؟"

"اپنی بہن کا پتا بتاؤ گے یا اپنے دوست کی بیوی کو گارڈز کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھو گے؟"

میں نے کہا "شنکر! تُو تو خود کو میرا بہادر دشمن کہتا تھا۔ آج تیری بہادری ہیجڑے پن میں کیوں بدل گئی ہے۔ اس لاک اپ میں بند کر کے مجھے دھمکا رہا ہے۔"

شنکر سپاٹ لہجے میں بولا "تو اچھی طرح جانتا ہے شاہ جہاں! غصہ دلانے کا یہ حربہ بہت پرانا ہے۔ باقی رہی بہادری والی بات تو وہ بھی تُو اچھی طرح جانتا ہے۔ تیرا اس لاک اپ میں بند ہونا ہی تیرے سوال کا جواب ہے۔ میں نے اپنے بازو کے زور سے اس لاک اپ میں بند کیا ہے تجھے... کیا ہے یا نہیں؟"

"یہ کیوں بھول رہا ہے کہ تیرے ساتھ ایک درجن گارڈز بھی تھے۔"

"میں تیرے ساتھ بحث کرنا نہیں چاہتا اور بحث چھیڑنے سے تجھے کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوگا کیونکہ تُو جانتا ہے غصے میں آنے والا نہیں ہے۔ میں صرف اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے تیرے پاس آیا ہوں۔ ہم اپنا کام شروع کریں یا تُو نے اپنے ارادے پر نظرثانی کی ہے؟"

یہ بڑا ہولناک سوال تھا۔ مجھے لگا جیسے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا ہے۔ تو خیز کلثوم گارڈز کے شکنجے میں تھی۔ اپنے شوہر کی عریانی سے نگاہ بچانے کے لیے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر اس کا منہ کھلا تھا اور وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ جو پوٹلی وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی وہ دھینگا مشتی میں کھل گئی تھی اور کمرے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ اس میں سے نکل کر کئی اشیا بکھر گئی تھیں۔ ان اشیا کو دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ وہ سوغاتیں تھیں جو زریں اور کلثوم میرے لیے پشاور سے لائے تھے۔ وہ کاغذی بادام' اخروٹ' چلغوزے وغیرہ تھے۔ ایک لفافے میں گرم شال تھی۔ بلوری قہوے کا ایک ڈبا تھا۔ اب یہ سب چیزیں فرش پر سوہانِ حسرت بنی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شنکرا! تم عاصم کو بلاؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا "باتیں تو بہت ہو چکیں۔ اب شیخ صاحب مزید وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اب تو دو ٹوک بات کرو۔ تمہاری بہن کہاں ہے۔ اور تمہیں شیخ صاحب کے بھتیجے کا رشتہ اس کے لیے قبول ہے یا نہیں؟"

"میں دو ٹوک بات ہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کہاں ہے تمہاری بہن؟"

"میں شیخ عاصم..."

"بکواس نہیں چاہیے۔" شنکر نے نہایت سرد سرگوشی کی "تمہاری بہن کہاں ہے' اس کا ایڈریس دو۔"

"میں شیخ عاصم سے ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے یہ ڈیل پسند آئے گی۔"

"ڈیل یہی ہے جو میں نے تجھے بتا دی ہے۔ تم اپنی بہن کا پتا بتاؤ گے اور شیخ ایاز کے ساتھ اس کے نکاح کے فارم پر دستخط کرو گے۔ دوسری صورت میں تیرا دوست اور اس کی دلہن ذلیل ہو کر تیری آنکھوں کے سامنے دم توڑیں گے۔ اور یہ اینڈ نہیں ہوگا' یہ سلسلہ دور تک چلے گا۔ تیرے اور دوست سے یاروں کو بھی اس "ہیں منت" کی میزبانی سے لطف اٹھانے کا موقع ملے گا۔"

میں نے تحمل سے کہا "دیکھو شنکرا! میں "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔ تم شیخ عاصم کو بلاؤ۔"

"تم نے جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو... اور کہنا بھی کیا ہے۔ مجھے اپنی بہن کا ایڈریس لکھوا دو تاکہ اسے پورے عزت و احترام کے ساتھ یہاں لایا جائے اور تمہارے مذہب کے عین مطابق اسے شیخ ایاز کی زوجیت میں دیا جائے۔"

"لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ..."

"سوہن داس۔" شنکر نے میری بات کاٹ کر اپنے کارندے کو پکارا۔

سوہن داس گندمی رنگت اور کبوتر جیسی سرخ آنکھوں والے ایک ڈشکرے کا نام تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کلثوم کی طرف جھپٹا۔ کلثوم اس کی گرفت میں آئی تو مچھلی کی طرح تڑپی۔ زریں گل کی کربناک دہاڑ نے "ہیں منت" کو دہلا دیا۔ وہ خود کو چمڑے کی بیلٹ کی بندش سے نکالنے کے لیے اندھا دھند زور لگانے لگا۔

"ٹھہر جاؤ شنکر... میں تمہیں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

شنکر نے ایک بار پھر سوہن داس کو آواز دی۔ وہ جرمن شیفرڈ جیسا خونخوار شخص' کلثوم سے پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا "شنکرا! شیخ عاصم کے ساتھ میری دشمنی کیا ہے؟ کیا یہی ناکہ میں نے آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے اس کے بھائی کو قتل کیا تھا۔ وہ اس قتل کا خوں بہا چاہتا ہے؟"

"ہاں... اگر چاہتا ہے تو پھر؟"

"اگر اسے قتل کا بدلہ قتل مل جائے تو کیا پھر بھی خون بہا کی ضرورت باقی رہے گی؟"

"تم جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو اور مختصر کہو۔"

"میں نے شیخ عاصم کے بھائی شیخ راشد کو قتل کیا' وہ اس کے بدلے میری جان لے لے۔"

اس سے پہلے کہ شنکر کوئی جواب دیتا' ہیں منت کا بیرونی دروازہ کھلا اور شیخ عاصم زینے اتر کر اندر آ گیا۔ اس کے آتے ہی تمام محافظ اٹینشن ہوگئے۔ شنکر شنکرا بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ زریں گل کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا' اس کے باوجود اس کے منہ سے غوں غاں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ شیخ عاصم نے ایک تنقیدی نظر زریں گل پر ڈالی پھر سرسری نگاہ سے کلثوم کا جائزہ لیا۔ قمیص اس کے کندھے سے ادھڑ گئی تھی۔ وہ گارڈز کی گرفت میں تھی اور اس کا پورا جسم ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔

شیخ عاصم گیلری کے زینے چڑھ کر میرے پاس آ گیا۔ شنکر نے لاک اپ کے جنگلے کے پاس ایک کرسی رکھ دی پھر شاید

عاصم نے شنکر کو آنکھ سے اشارہ کیا تھا' وہ گیلری سے نیچے چلا گیا "کیا بات کر رہے تھے تم؟" شیخ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ اس گیلری میں کہیں مائیک وغیرہ نصب ہے اور یہاں ہونے والی ساری گفتگو شیخ عاصم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مائیک کے بجائے کوئی ٹی وی کیمرا وغیرہ نصب ہو۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تمہارے بھائی شیخ راشد کو قتل کیا۔ تم اس کے بدلے مجھے قتل کر دو۔ یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔ شاہ جہاں۔" وہ بے حد نرمی سے بولا "میں تمہاری جان لینا نہیں چاہتا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں صرف یہ دشمنی ختم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا اور یہ بڑا معقول اور قابل قبول بہانہ ہے۔ تم اپنی بہن کے لیے میرے بھتیجے کا رشتہ قبول کر لو۔ آج بلکہ ابھی یہاں ان دونوں کا نکاح ہو جائے گا۔ یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

"لیکن اس مسئلے کا یہ حل مجھے قبول نہیں ہے عاصم۔"

ایک دم عاصم کے چہرے پر درشتی نمودار ہوئی لیکن اس کے لہجے کا دھیما پن برقرار رہا۔ وہ پُرسکون انداز میں بولا "یہ سب کچھ تو ہونا ہی ہے شاہ جہاں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ خوشی سے کرو یا سو طرح کے عذاب جھیل کر۔"

شیخ عاصم ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بات سنو شیخ عاصم۔" میں کوشش کے باوجود اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا۔

شیخ عاصم نے سپاٹ لہجے میں کہا "اگر تم ایڈریس لکھوانا چاہتے ہو تو شنکر کو لکھوا سکتے ہو۔"

اس کے بعد وہ تیز قدموں سے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دو تین بار آواز دی لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ مجھے وہ لمحہ یاد آیا جب شیخ عاصم اپنی مرسیڈیز کار کے اندر میری گولی کی زد میں تھا۔ میں نہ صرف شیخ کو جہنم واصل کر سکتا تھا بلکہ خود کو بھی اس منحوس تہ خانے میں پہنچنے سے بچا سکتا تھا۔ اس وقت صرف غزالہ کے خیال نے مجھے گولی چلانے سے باز رکھا تھا۔ اب وہ غزالہ نہ جانے کہاں تھی۔ میری مصیبتوں سے بے خبر نہیں کتنی دور اور کتنی بے خبر تھی؟

جونہی شیخ عاصم "میس منٹ" سے باہر نکلا۔ شنکر شکرا اٹل تقدیر کی طرح ایک بار پھر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی نوٹ بک تھی اور بال پوائنٹ "تم کوئی ایڈریس لکھوانا ہے تمہیں؟" اس نے سفاک لہجے میں پوچھا۔

میں کبھی نوٹ بک کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی پیچھے کھڑی کلثوم کی طرف۔ وہ اس معصوم کبوتر کی طرح نظر آ رہی تھی جس نے خونخوار بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لی ہوں پھر میری نگاہ زریں گل کی نگاہوں سے ٹکرائی۔ وہاں دل خون کر دینے والی بے بسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ نگاہیں خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ تو جانی استاد ہے۔ آپ نے تو ہارنا نہیں سیکھا پھر آج آپ چپ کیوں ہے؟"

زریں سراپا ایک سوال تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ چند فٹ کے فاصلے پر اس کی نویلی بیوی کلثوم درندوں کے چنگل میں تھی۔ شنکر شکرا کے ایک اشارے پر اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ زریں کی خاموش نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں "استاد صیب! آپ جانتا ہے کلثوم ہمارا محبت ہے۔ وہ پہلا لڑکی ہے جس کے ساتھ ہم نے اس قدر ٹوٹ کر محبت کیا ہے۔ اب وہ ہمارا بیوی ہے۔ اگر ہمارا معصوم بیوی کے ساتھ ہمارے سامنے کچھ ہو گیا تو ہم زندہ کہاں رہے گا۔ ہم تو اس کے ساتھ ہی مر جائے گا۔ آپ سب کچھ جانتا ہے پھر آپ کیوں خاموش ہے استاد صیب۔ آپ تو کبھی ایسے خاموش نہیں ہوا تھا۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں ایک ناقابل شکست "لاک اپ" میں تھا۔ میرے سامنے شنکر شکرا ہاتھ میں نوٹ بک لیے کھڑا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں قلم تھا اور نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی بے رحم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں شاہ جہاں! تم کوئی ایڈریس لکھوا رہے ہو یا نہیں؟"

میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ شنکر شکرا نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ اپنے کارندوں کے لیے وہ اس کا ایک مخصوص اشارہ تھا۔ یہ اشارہ پاتے ہی دو افراد حرکت میں آئے۔ ان میں سے ایک کبوتر جیسی سرخ آنکھوں والا موٹا سا تھا۔ میں نے اس کے ناپاک ہاتھوں کو کلثوم کی طرف بڑھتے دیکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔

"رک جاؤ۔" میں حلق کی پوری قوت سے چیخا۔ میری آواز پورے "میس منٹ" میں گونجی۔ سب افراد میری طرف دیکھنے لگے۔ ان میں کلثوم اور زریں

بھی شامل تھے۔ میں ایک ایسے دوراہے پر تھا جو میرے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا تھا۔ کسی شخص کو درمیان سے چیر دیا جائے تو وہ جتنی اذیت محسوس کر سکتا ہے شاید اتنی ہی میں بھی محسوس کر رہا تھا۔ شیخ عاصم میرے جسم سے بوٹیاں نوچ کر مجھے دہکتے انگاروں پر لٹا دیتا' برقی جھٹکوں سے مجھے توڑ پھوڑ دیتا تو بھی مجھے اتنی اذیت محسوس نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو میں برداشت کر جاتا مگر یہ سب کچھ دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اور دوسری طرف یہ بھی میرے بس میں نہیں تھا کہ میں شیخ عاصم کو اپنی بہن کا پتا بتا دوں۔ یہ ایسے ہی لمحے ہوتے ہیں جب انسان دعا کرتا ہے کہ زمین پھٹ جائے یا آسمان ٹوٹ کر اس پر آ گرے اور اسے ملیا میٹ کر دے۔ مجھے لگا جیسے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ شنکر شکرا کی منحوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تم ایڈریس لکھوا رہے ہو یا نہیں؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بڑے فیصلہ کن لہجے میں بولا تھا۔

میں نے بہ مشکل تھوک نگل کر کہا "ہاں۔۔۔ میں لکھوانا چاہتا ہوں۔"

"دھوکے بازی نہیں چلے گی شاہ جہاں۔" شنکر نے وارننگ دی "اگر کچھ وقت حاصل کرنے کے لیے غلط ایڈریس بتاؤ گے تو اس کے لیے علیحدہ سے سزا مقرر ہے۔"

شنکر نے میرے دل کی چوری پکڑ لی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بمشکل چھپائے۔

شنکر مجھے بتا رہا تھا کہ میں جھوٹ نہ بولوں لیکن میرے پاس جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں وقت حاصل کرنے کی کوشش نہ کروں لیکن میں وقت حاصل نہ کرتا تو کیا کرتا؟ کبھی کبھی انسان پر ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب بدترین انجام سے بچنے کے لیے چند منٹ کی "بیکار مہلت" مہلت پر حاصل کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میں بھی ہر قیمت پر یہ مہلت چاہتا تھا۔

"نہیں۔ میں غلط نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تو لکھواؤ۔" شنکر نے قلم کی نوک کاغذ پر رکھ دی۔

میں نے کہا "شاداب سوسائٹی" لین نو۔ ایچ ۹۸۔ کرنل افتخار کے نام کی نیم پلیٹ ہے۔"

یہ سراسر ایک خیالی ایڈریس تھا۔ شنکر شکرا مسلسل میری طرف دیکھ رہا تھا "فون نمبر کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"فون نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

شنکر نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی۔ اس کا پاؤں سلاخوں کے درمیان سے گزر کر میرے سینے کے نچلے حصے سے ٹکرایا۔ جوتے کی نوک عین اس مقام پر لگی جسے "سولر" کہا جاتا ہے۔ یہاں لگنے والی ضرب بندے کو مچھلی کی طرح تڑپا دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ کتنی ہی دیر مجھے سانس نہیں آ سکی۔ در و دیوار نگاہوں کے سامنے چکرانے لگے۔ سانس بحال ہوئی تو شنکر کی سانپ جیسی پھنکار میرے کانوں میں پڑی "میں نے تمہیں کہہ دیا ہے' دھوکا دینے کی کوشش کرو گے تو بری طرح پچھتاؤ گے۔"

"میں دھوکا۔۔۔ نہیں کر رہا۔"

"تم دھوکا کر رہے ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "تم کر رہے ہو دھوکا۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف

مشہور ٹی وی سیریل
منزلیں کی مصنفہ
سیما غزل کا ایک
ناقابلِ فراموش ناول

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰
جلد دوم: ۱۵۰

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ہوں۔" شنکر کی آواز خوفناک ہوتی چلی جارہی تھی۔

اس نے اپنے کارندوں کو ہاتھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید کلثوم پر پھر کوئی عذاب ٹوٹنے والا ہے لیکن یہ اندیشہ غلط تھا۔ کلثوم کے ساتھ کچھ نہیں کیا گیا۔ بس یہ ہوا کہ ایک کارندہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو آواز میرے کانوں میں پڑی اس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ یہ آواز عالم قریشی کی تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا "تم مجھے جانتے نہیں ہو میں کون ہوں۔ میں تمہارا حشر کردوں گا۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو..."

اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی زوردار آواز ابھری۔ معلوم ہوا کہ کسی نے عالم قریشی کو تھپڑ مارا ہے پھر کوئی گرج کر بولا "حرام زادے! زیادہ بڑ بڑ کی تو ابھی کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔ پیچھے ہٹ جاؤ... اور پیچھے ہٹ جاؤ۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔"

بولنے والے کا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اسلحہ ہے اور وہ اسلحے کے زور پر عالم قریشی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ چند لمحے بعد دھینگا مشتی کی آوازیں آئیں۔ ان میں عالم قریشی کی دبی دبی کراہیں بھی شامل تھیں۔ ان آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ عالم قریشی کو زدوکوب کیا جارہا ہے یا اسے فرش پر گرا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے جارہے ہیں۔ ان آوازوں کے دوران میں مجھے ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ میں نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ یہ عالم قریشی کی دوسری بیوی کی آواز تھی۔ وہ کسی مصیبت میں تھی۔ یقیناً شیخ عاصم کے کارندوں نے اسے دبوچ رکھا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں اپنے شوہر کو گرفتار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ یہ آوازیں ان خفیہ مائیکس کے ذریعے آرہی تھیں جو اس "ہیپی منٹ" کی دیواروں میں خفیہ طور پر نصب کیے گئے تھے۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل چکا تھا کہ یہاں دیواروں میں خفیہ مائیکس اور اسپیکر وغیرہ موجود ہیں۔

شنکر نے کہا "شاہ جہاں! ان آوازوں کو کہیں ریکارڈنگ نہ سمجھنا۔ یہ براہ راست آوازیں ہیں۔ تیرا دوست قریشی اور اس کی بیوی اس وقت یہاں موجود ہیں اور ہماری "میزبانی" سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو یہیں بیٹھے بیٹھے ان سے بات کرسکتے ہو۔"

شنکر نے قریبی دیوار پر لگا ہوا ایک بٹن آن کیا اور زور سے بولا "قریشی! تمہارا دوست... لنگوٹیا دوست شاہ جہاں تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "بولو شاہ جہاں! اور کچھ نہیں تو تسلی کا بول ہی کہہ دو۔"

"تم میری آواز سن رہے ہو قریشی؟" میں نے کہا۔

"ہاں شاہ جہاں! تم کہاں ہو؟"

"یہیں اسی "ہیپی منٹ" میں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ لوگ مجھے اور پروین کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ مجھے... مجھے باندھ رکھا ہے انہوں نے۔"

"تم فکر مت کرو قریشی۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی بڑی شدت سے محسوس ہورہا تھا۔

"یہ سب کیا ہورہا ہے شاہ جہاں... یہ مسٹنڈے ہیں کون؟ یہ مجھے جانتے نہیں، میں ان کی... دے دوں گا۔" عالم قریشی نے ٹھیٹ گالی دی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا شنکر نے دیوار پر لگا ہوا بٹن آف کردیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب میری آواز قریشی تک پہنچ نہیں سکے گی... ہاں قریشی اور اس کی بیوی پروین کی آوازیں اس ہال تک پہنچ رہی تھیں۔ گالی دینے کی پاداش میں شیخ کے کارندے عالم قریشی کو بری طرح پیٹنے لگے تھے۔ قریشی پٹ رہا تھا اور گالیاں دیے رہا تھا۔ قریشی کی بیوی رو رہی تھی اور اپنا آپ کارندوں کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کررہی تھی "دور ہٹاؤ اپنے گندے ہاتھ مجھ سے... خبیث! مجھے چھوا تو..."

اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تو ابتدا ہے جن گندے ہاتھوں کو وہ خود سے دور ہٹانا چاہ رہی ہے وہ نہ صرف اسے چھو سکتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔

شنکر زہرناک لہجے میں بولا "شاہ جہاں! ابھی تھوڑی دیر میں ہم تمہیں ایک اور آواز بھی سنائیں گے۔ پتا ہے کس کی آواز؟"

ایک دم میرے ذہن میں سیکڑوں اندیشے سانپوں کی طرح کلبلانے لگے۔ شنکر کے باریک ہونٹوں پر قاتل حد نفرت مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ بولا "اندازہ لگاؤ... کس کی ہوسکتی ہے یہ آواز۔ اتنا اشارہ دے رہا ہوں کہ وہ ایک ناری ہے۔ سندر اور جوان ناری۔ موہن داس جیسے لوگ ایسی لڑکیوں پر جھپٹ کر خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

میرا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ پائپ نما سلاخیں درمیان سے ہٹ جائیں۔ میں ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر شنکر پر پل پڑوں۔ میں اسے فنا کردوں یا وہ مجھے فنا کردے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شنکر نے اپنے پاؤں سے میرے پنجرے کو ٹھوکر لگائی۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا تعلق تمہارے تیرے دوست سے ہے۔" شنکر نے کہا۔

میرے ذہن میں صفدر کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی کسی کا نام میرے ذہن میں ایک چیخ کی طرح گونج گیا پھر کسی کا نام بے ساختہ میرے ہونٹوں پر بھی نکل گیا "نجم" میرے ہونٹوں سے سرگوشی برآمد ہوئی۔

"شاید تم اپنے دوست صفدر کی منگیتر کی بات کررہے ہو... لیکن نہیں۔ یہ وہ نہیں ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور ہے۔ نادیہ یا فریال... کچھ اسی قسم کا۔ تمہارے ایس ایس پی صاحب کی پتری ہے۔ دو روز پہلے ہی انگلینڈ سے آئی ہے۔ شاید کوئی کورس وغیرہ کرنے گئی ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فیروز پور روڈ پر ہمارے بندوں کی اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ وہ اس کی میزبانی کے لیے اسے کار سمیت یہاں لا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے بس پہنچنے ہی والی ہوگی۔" شنکر نے رسٹ واچ دیکھی "میرے اندازے کے مطابق وہ بیس منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی اور تم اس سے بالمشافہ گفتگو کرسکو گے۔"

یکے بعد دیگرے ایسی خبریں مل رہی تھیں کہ میں بادوں تک ہل گیا تھا۔ زریں اور عالم قریشی کی یہاں موجودگی تو ہر شک سے بالاتر تھی۔ یقیناً فریال کے بارے میں بھی شنکر جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ جو شخص زریں اور عالم قریشی کو یہاں لا سکتا تھا اس کے لیے فریال کو لانا بھی مشکل نہیں تھا۔ اگر مشکل تھا بھی تو وہ اسے مشکل نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا نام شنکر شکرا تھا۔ ناممکن کو ممکن کردینے کی اس میں فطری صلاحیت تھی۔ یہ شخص بڑی سرعت کے ساتھ بدترین قسم کی اذیتیں میرے لیے جمع کرچکا تھا۔ یک دم میں نے خود کو بے حد ناتواں اور پژمردہ محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ساری دلیری، ہمت اور استقامت ایک تند و تیز ریلے میں بہتی چلی جارہی ہے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میرا مقابل جرائم کی دنیا کا وہ عیار ترین شخص تھا جس کا ثانی نہیں ملتا تھا۔ اس بدبخت کا دماغ کسی برق رفتار کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا اور اس کی عقابی نگاہ کو کسی بھی حوالے سے دھوکا دینا ممکن نہیں تھا۔

"بتاؤ اب کیا وچار (خیال) ہے؟" شنکر نے کہا۔

اس کا انداز اس جیتے ہوئے کھلاڑی جیسا تھا جس نے اپنے تمام پتے میرے سامنے رکھ دیے تھے اور اب پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ تمہاری شکست میں کون سی کسر باقی رہ گئی ہے۔

میری زبان گنگ ہورہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں اپنے حصے کے تمام الفاظ بول چکا ہوں اور اب موت تک میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں ہے... یہ تذبذب کی انتہا تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر شنکر نے ایک بار پھر مخصوص اشارہ کیا۔ شیخ کے دو ہٹے کٹے کارندے وحشی جانوروں کی طرح کلثوم پر جھپٹے۔ یہ منظر اندوہناک تھا۔ کارندوں کے ناپاک ہاتھ کلثوم کو نوچ رہے تھے۔ ان کے منحوس چہرے کلثوم کے چہرے پر جھکتے چلے جارہے تھے۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ دوسری طرف زریں گل ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا "پیچھے ہٹ جاؤ... پیچھے ہٹ جاؤ... ام کہتا ہے پیچھے ہٹ جاؤ۔" وہ مسلسل چنگھاڑتا چلا جارہا تھا۔

وہ لمحہ قریب تھا کہ کلثوم کے کپڑے تار تار ہو جاتے اور وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ذلت کی تصویر بن جاتی۔ یہ میری برداشت کا نقطۂ عروج تھا۔ اس سے آگے کچھ دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اپنی بہن کو مصیبت سے بچانے کے لیے میں زریں گل کی عزت کا جنازہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا دیتا اور بات صرف زریں گل ہی کی نہیں تھی۔ عالم قریشی اور اس کے بعد ساہی صاحب بھی اس "طوفانِ بے پناہ" کی زد میں آنے والے تھے۔

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "رک جاؤ شنکر! مجھے تمہارا مطالبہ منظور ہے۔"

شنکر نے بے حد تیز نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے دل میں جھانکا۔ میرے لہجے میں چھپی ہوئی سچائی اس شکرا چشم سے اوجھل نہیں رہ سکی۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ کارندے جو کالی بھڑوں کی طرح کلثوم سے چمٹ گئے تھے، پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بالکل جانور نظر آرہے تھے بلکہ کتے نظر آرہے تھے۔ ایسے کتے جو گوشت کے ٹکڑے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ انہیں زنجیروں سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا گیا تھا۔

"ہاں کہاں ہے تمہاری بہن؟" شنکر نے کہا۔

"مجھے خدشہ ہے شنکر! کہ تم میری بات جھٹلاؤ گے لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا وہ سچ ہوگا۔"

"ہاں بکو... کیا کہتے ہو؟" شنکر کا لہجہ زہریلا تھا۔

"مجھے شفقتا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" میں نے

کہا "میں — میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی وقت شیخ عاصم مجھ پر قابو پالے اور میں تشدد سے مجبور ہو کر اسے شگفتہ کے بارے میں کچھ بتادوں۔ میں نے شگفتہ کو اپنے ایک بااعتماد ساتھی کے حوالے کیا تھا۔ اب اسی کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"بہت خوب — یہ تو کسی جاسوسی فلم کی سچویشن لگتی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے لیکن سچ یہی ہے۔"

شنکر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا "چلو ٹھیک ہے۔ ہم اس لڑکی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ہمیں کون پہنچاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم شیخ عاصم کو بلالو۔ وہ میری بات زیادہ اچھی طرح سمجھ سکے گا۔"

"تم کھل کر بات بتاؤ۔ سمجھنا یا نہ سمجھنا ہمارا کام ہے۔"

شنکر کا لہجہ ایک بار پھر سخت ہو گیا۔

"لیکن میں شیخ سے کچھ یقین دہانیاں چاہتا ہوں۔"

"میں نے کہا ہے نا — تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے غیر مشروط طور پر کہنا ہے۔ بالکل غیر مشروط طور پر — چلو شاباش کہو جو کہنا ہے۔"

"تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں بات سمجھ رہا ہوں بلکہ بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم اس لڑکی کو شدید اذیت میں دیکھنا چاہتے ہو۔" شنکر نے نیچے کھڑی کلثوم کی طرف اشارہ کیا۔

اتنا ایکی مائیک پر شیخ عاصم کی آواز ابھری۔ اس نے انگلش میں کہا "ٹھہرو شنکر! میں آتا ہوں۔"

شنکر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

نیچے ہال میں سپاہی مائل موہن داس اور دیگر دو غنڈوں کے چہروں کی چمک بھی ماند پڑ گئی اور کیوں نہ ماند پڑتی۔ وہ ایک "دلچسپ کھیل" کے ایک "دلچسپ دور" سے محروم کر دیے گئے تھے۔

چار پانچ منٹ بعد شیخ عاصم پھر ہال میں نظر آیا۔ اس کے اندر آتے ہی تمام افراد انتہائی مئودب نظر آنے لگے۔ شنکر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ زریں گل شیخ عاصم کو دیکھ کر واویلا کرنے لگا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شیخ اردو نہیں سمجھتا' زریں چیخ رہا تھا "شیخ! ام تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ام تیری پوری نسل کو برباد کردے گا۔ تو قبائلی ہے تو ام تجھ سے بڑا قبائلی ہے۔ امارا قبیلہ اتنا بڑا ہے کہ وہ پیشاب کردے گا تو تم سب اس میں بہہ جائے گا۔ ام تجھے معاف نہیں کرے گا۔ شیخ صاحب' قبر کی دیواروں تک تمہارا پیچھا کرے گا۔"

پھر وہ شیخ عاصم کو اور اس کے لواحقین کو نہایت غلیظ قسم کی گالیوں سے نوازنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور چہرہ ترلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کسی طرح اس کے جسم کے گرد کسی ہوئی چرمی بیلٹ ٹوٹ جائے اور اس کے ہاتھ آزاد ہو جائیں تو وہ اس ایک منٹ میں موجود کئی افراد کو مارنے کے بعد خود کو اور کلثوم کو بھی مار ڈالے گا۔ اس کی پٹھانی غیرت اپنے عروج پر نظر آرہی تھی۔ شیخ عاصم نے موہن داس کو اشارہ کیا۔ اس نے دو دوسرے افراد کے ساتھ مل کر زبردستی زریں گل کا منہ کھولا اور اچھی طرح کپڑا ٹھونس کر ہونٹوں پر چوڑی ٹیپ چپکا دی۔ زریں کی آنکھیں غصے سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ چند روز پہلے اپنی شادی پر وہ کتنا خوش تھا۔ وہ آنکھیں جو آج غصے اور اذیت سے پھٹ رہی تھیں' ان میں امنگوں کی بہار تھی اور خوشیوں کے ستارے چمک رہے تھے۔ کتنا کم فاصلہ ہوتا ہے انسان کے دکھ اور سکھ کے درمیان۔ چند روز پہلے اپنی شادی پر رقص کرنے والے اور شادیانے بجانے والے زریں گل کو کیا معلوم تھا کہ وہ اپنی دلہن سمیت اذیت کے ایک بھیانک شکنجے میں جکڑا جانے والا ہے۔

سلاخوں نما پایوں کے سامنے پہنچ کر شیخ عاصم کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے تخلیے کا حکم دیا۔ نیچے ہال میں موجود دو تین افراد کے سوا سب لوگ باہر چلے گئے یہاں تک کہ شنکر بھی (یہ وہ تین افراد وہی تھے جنہوں نے کلثوم کو دبوچ رکھا تھا) شیخ عاصم نے ایک ساتھ دو سگار نکال کر ان کے کونے توڑے۔ نہایت قیمتی لائٹر نکال کر اس نے دونوں سگار سلگائے اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔

"نہیں شیخ عاصم۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پلیز۔" اس نے اصرار کیا۔

میں نے سگار تھام لیا۔ دو تین گہرے کش لینے کے بعد اعصاب قدرے پرسکون ہو گئے۔ عاصم شستہ انگریزی میں بولا "جو کچھ یہاں ہو رہا ہے شاہ جہاں! مجھے اس پر بے حد افسوس ہے لیکن اس کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تم نے میرے لیے کوئی اور راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ بہرحال اب مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے رویے پر نظرثانی کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تم اس معاملے کو مزید طویل نہیں کرو گے۔ میرا مطلب ہے کہ جو کچھ تم بتاؤ گے اس کے مطابق ہم شگفتہ تک پہنچ جائیں گے۔"

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اور فی الوقت کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ شیخ عاصم نے میری بے

بسی محسوس کرتے ہوئے اپنا لہجہ کچھ مزید نرم کر لیا۔ بولا "شاہ جہاں! دیکھو' تم پوری طرح میرے بس میں ہو۔ مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری بہن کی عزت و آبرو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ جو کچھ ہو گا دستور کے مطابق ہو گا اور اگر تم سمجھو تو اس میں تمہاری عزت افزائی ہے۔ تمہاری بہن شگفتہ ایک عالی نسب خاندان کی بہو بنے گی۔ اس کا ہونے والا خاوند ایک دمکتا خوبرو جوان ہے۔ بے شمار جائیداد کا مالک ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں اس کا کاروبار ہے۔ ایک لڑکی کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں شاہ جہاں! جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تمہاری اور تمہاری بہن کی بہتری پوشیدہ ہے اور یہی مناسب ترین راستہ ہے میری اور تمہاری دشمنی کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا۔"

میں نے کہا "یہ سب باتیں تم پہلے بھی کہہ چکے ہو عاصم! ان کو دہرانے سے ان کے اثر میں اضافہ نہیں ہو جائے گا۔"

"اتنا اثر باتوں میں نہیں ہوتا جتنا اس سچویشن میں ہوتا ہے جس میں بات کہی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ سچویشن ایسی ہے جس میں' تم سے میں کچھ بھی منوا سکتا ہوں اور بغیر کسی دلیل اور وضاحت کے۔ پھر بھی اگر میں وضاحت کر رہا ہوں تو کیوں؟ آخر اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔"

"تمہاری ہر وجہ کے پیچھے ایک وجہ ہوتی ہے عاصم۔ میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے۔"

"شکوے گلے کرنا چاہتے ہو تو کرلو۔ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ پھر شاید تمہیں میری باتیں اتنی تلخ نہ لگیں۔"

"جو تلخ ہے وہ تو تلخ ہے اور رہے گی۔"

"وقت کی مجبوری ہے کہ یہ تلخی تمہیں برداشت کرنی ہے۔ تمہیں اس شخص کا نام بتانا ہو گا جسے شگفتہ کے ٹھکانے کے متعلق علم ہے۔"

میں نے کہا "میں تمہیں اس شخص کا نام بتا دیتا ہوں مگر اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ نہ تم اس کے پاس جاؤ گے نہ اس سے پوچھ گچھ کرو گے۔ نہ ہی اس پر ظاہر کیا جائے گا کہ میں پچھلے تین چار دن میں کن حالات سے گزرا ہوں۔"

شیخ عاصم نے سگار کا گہرا کش لے کر کہا "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ شگفتہ کس کے پاس ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ شگفتہ جہاں بھی ہے ہمارے پاس پہنچ جائے اور یہ کام جلد از جلد ہو جائے۔ اگر وہ لاہور میں ہے تو اس کام کے لیے تین

ابنِ آدم کے نشترِ قلم سے ایک بھرپور معاشرتی ناول

سیاہ عقاب

قیمت -/۱۰۰ روپے

ایک گدھ کی بلند پروازی کی داستان۔

وہ اپنے آپ کو عقاب سمجھ بیٹھا۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۲۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

فون: ۷۲۴۷۴۱۴

چار گھنٹے کا وقت بہت ہوگا۔ اگر پاکستان میں کسی جگہ ہے تو میں زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "فی الوقت میں خود بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ پاکستان میں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹے میں حل ہو سکتا ہے۔" عاصم نے کہا پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر پھیلتے ہوئے بولا "اب اگر تم پسند کرو تو اس شخص کا نام بھی بتا دو جس نے شفتا کو اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔"

عاصم کے منہ سے بار بار شفتا کا نام سن کر میرے سینے میں ٹیس سی اٹھ رہی تھی لیکن یہ اٹل مجبوری کا تقاضا تھا کہ میں یہ ٹیس برداشت کروں۔ میں نے کہا "شیخ عاصم! میں تمہیں اس شخص کا نام بتا دیتا ہوں لیکن اس سلسلے میں' میں نے جو شرائط بیان کی ہیں' ان کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا۔"

اپنے الفاظ کے ہلکے پن کو میں بھی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ میری بے بسی کا نشہ شیخ کی آنکھوں میں زہریلی مسکراہٹ بن کر تیر گیا۔ وہ فراخ دلی سے بولا "ٹھیک ہے' شاہ جہاں! مجھے اس معاملے میں تمہاری شرطیں منظور ہیں۔"

میں نے کہا "اس شخص کا نام دجال ساہی ہے۔ ایس ایس پی دجال ساہی۔ جنہیں تمہاری بیوی انکل ساہی کہتی ہے۔"

شیخ عاصم کے ہونٹ دائرے کے انداز میں سکڑ گئے۔ ان سکڑے ہوئے ہونٹوں میں سے دھوئیں کی ایک طویل لکیر خارج ہو کر میرے اردگرد پھیل گئی۔

"سو دِس اِز دا مین۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ چہل قدمی کرتا رہا پھر دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر بولا "او کے' شاہ جہاں! اب تم کیا چاہتے ہو۔ کیا تم خود مسٹر ساہی سے بات کرو گے؟"

"ظاہر ہے میں خود ہی بات کروں گا۔"

"کیا تمہیں سیل فون مہیا کر دیا جائے؟"

"ایسی باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں۔ نہ ہی میں یہ چاہوں گا کہ ساہی صاحب کو یہاں لایا جائے۔"

"انہیں یہاں لانے میں کیا قباحت ہے؟"

"بہت بڑی قباحت ہے۔ وہ جان جائیں گے کہ میں مجبوری کی حالت میں ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔ اگر تم خود پوچھنا چاہو گے تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ہو سکتا ہے تمہارے لیے ان کی زبان کھلوانا میری زبان کھلوانے سے مشکل ثابت ہو۔"

"ہماری مشکلات کی فکر مت کرو شاہ جہاں! صرف بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہاں سے جانے دو اور موقع دو کہ میں بالکل نارمل حالت میں خود ساہی صاحب سے ملوں۔"

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب شیخ عاصم نے بڑی آسانی سے میری یہ بات مان لی۔ وہ بڑے اعتماد سے بولا "ٹھیک ہے شاہ جہاں! تم اس معاملے کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ ویسے مجھے تمہارے لہجے سے سچائی کی بو آ رہی ہے۔ تم اپنی منشا کے مطابق ساہی صاحب سے مل سکتے ہو۔"

"میں کب جا سکتا ہوں؟"

"چاہو تو ابھی۔"

میرے ذہن میں ایک بار پھر فریال کا خیال آ گیا۔ شیخ نے بتایا تھا کہ وہ ان کے قبضے میں آ چکی ہے اور کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والی ہے۔ یہ خیال میرے لیے روح فرسا تھا کہ نوجوان فریال کو اغوا کر کے اس عقوبت خانے میں پہنچا دیا جائے۔

میں نے شیخ عاصم سے پوچھا "ساہی صاحب کی بیٹی فریال کہاں ہے؟"

"کیوں۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اب جب کہ ہمارے درمیان "ڈیل" ہو چکی ہے' تم لوگ فریال کو اس معاملے سے الگ رکھو۔"

"لیکن وہ تو یہاں پہنچ چکی ہے' یا پہنچنے والی ہے۔"

پھر اس نے واکی ٹاکی پر کسی سے رابطہ کیا اور فریال کے بارے میں پوچھا۔ دوسری طرف سے ملنے والا جواب سن کر اس نے واکی ٹاکی بند کر دیا "وہ لڑکی یہاں پہنچ چکی ہے۔" اس نے کہا "اب اسے فوری طور پر چھوڑنا ہمارے لیے مناسب نہیں ہو گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اپنی بات پر اصرار نہیں کرو گے۔ بہرحال اس بات کی میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں' لڑکی یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔۔۔ بالکل جیسے تمہارے دونوں دوست اور ان کی بیویاں محفوظ رہیں گی۔" شیخ کا اشارہ زریں اور عالم قریشی کی طرف تھا۔

شیخ کے لہجے میں فیصلہ کن کیفیت تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ فریال کے سلسلے میں اس سے ٹکراؤ لا حاصل ہے۔

کی نگاہ میری کلائی کی گھڑی پر تھی۔ وہ اٹھ کر مجھ سے چھ سات قدم کے فاصلے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی کلائی کی گھڑی سے چھیڑ چھاڑ کی۔ چند سیکنڈ بعد میری رسٹ واچ کے ڈائل پر سرخ اسپارکنگ نمودار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی کلائی پر برقی جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ایک بار پھر موت کے اس جال میں تھا جس نے سری لنکا میں کئی ماہ تک مجھے جکڑے رکھا تھا۔ منحوس برقی جھٹکے میری کلائی کو جھنجوڑ رہے تھے اور میرے ذہن میں ان اذیتوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی جو چند ماہ پہلے میں نے جھیلی تھیں۔ سسٹم کو چیک کرنے کے لیے شیخ عاصم دو تین قدم میری طرف بڑھا۔ جھٹکے شدید تر ہو گئے۔ میرا پورا بازو جیسے نادیدہ ضربوں سے جھنجنا رہا تھا۔ آخری حد نو فٹ (تین میٹر) کی تھی۔ اس کے بعد میرے سینے میں موت کا دھماکا ہو سکتا تھا۔ قریباً دس بارہ فٹ کی دوری پر پہنچ کر عاصم رک گیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو "کیوں شاہ جہاں! اپنی بے بسی اور میرے اختیار کا کچھ اندازہ ہوا تمہیں؟ میں کسی ہتھیار کے بغیر' کسی کوشش کے بغیر صرف دو قدم مزید اٹھا کر تمہیں موت سے دوچار کر سکتا ہوں۔"

چند لمحے بعد شیخ عاصم پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ ہٹتا گیا' یہاں تک کہ گیلری کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ جھٹکے کمزور پڑتے گئے اور آخر معدوم ہو گئے۔ سسٹم بالکل صحیح کام کر رہا تھا۔

شیخ عاصم نے کہا "تمہیں اپنی آزادی کی حدود یاد ہیں نا۔ الیکٹرانک واکس کے ذریعے تم میرے ساتھ مسلسل منسلک ہو۔ تمہارا اور میرا درمیانی فاصلہ کم از کم تین میٹر اور زیادہ سے زیادہ دس کلو میٹر ہونا چاہیے۔"

"مجھے سب یاد ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "یہ بات بھی اب تمہیں بخوبی معلوم ہو چکی ہو گی کہ دس کلو میٹر کے دائرے میں تم جہاں کہیں بھی ہو گے' تمہاری ٹھیک ٹھیک پوزیشن میرے علم میں رہے گی۔"

"تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں ڈاج دینے کی کوشش کروں گا؟"

"نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گے لیکن پھر بھی یاد دہانی ضروری ہے اور آخری یاد دہانی یہ ہے کہ شنکر تمہارے ساتھ جائے گا۔ تمہارے واپس آنے تک وہ مسلسل تمہارے ساتھ رہے گا۔"

اس آخری شرط نے مجھے بری طرح گڑبڑا دیا۔ میں نے کہا "میرے ساتھ شنکر کی موجودگی تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ساہی صاحب' شنکر کو پہچان لیں اور نہ بھی پہچانیں تو میرے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ چونک جائیں گے اور یہ بات میں تمہیں بتا دوں' وہ ایک بار شک میں پڑ گئے تو پھر میری ہزار خواہش اور درخواست کے باوجود مجھے شفتا تک نہیں پہنچائیں گے۔"

"شفتا تک پہنچنا اور اسے یہاں لانا تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔"

"لیکن تم رسک لے رہے ہو۔ شنکر یا تمہارا کوئی اور کارندہ میرے ساتھ ہو گا تو ساہی صاحب شک میں پڑیں گے۔ وہ ایک جہاندیدہ پولیس آفیسر ہیں۔ وہ خطرے کی بو بڑی آسانی سے سونگھ لیتے ہیں اور پھر میں اس بات پر حیران ہوں کہ تم زریں' عالم قریشی اور فریال کو یہاں جمع کرنے کے باوجود میری طرف سے فکر مندی کیوں محسوس کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ان لوگوں کو بدترین اذیت میں چھوڑ کر شفتا کے ساتھ رفو چکر ہو جاؤں گا؟"

"میرا نہیں خیال کہ تم ایسا کر پاؤ گے۔"

"پھر تمہارا یہ الیکٹرانک واکس بھی تو موجود ہے۔ اس کے ہوتے تمہیں کس بات کی فکر ہے؟"

"میں سب جانتا ہوں شاہ جہاں! لیکن شنکر کا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے۔ اگر اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہے تو وہ تم خود حل کر لینا۔" شیخ کا لہجہ حتمی تھا۔

مجھے مزید کچھ ہدایات دینے کے بعد شیخ عاصم باہر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شنکر شنکرا آ دھمکا۔ وہ ایک بالکل نئے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سکھ کے روپ میں تھا۔ سرخ پگڑی' داڑھی اور مونچھیں جن میں ہلکی سی سفیدی تھی۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سونے کا ایک موٹا تعویذ اس کی بالوں بھری چھاتی پر چمک رہا تھا۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا "میرا نام شوبھا سنگھ ہے اور ہم دونوں بمبئی میں گہرے دوستوں کی طرح رہے ہیں۔ میں خاص طور پر تم سے ملنے یہاں پاکستان آیا ہوا ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نیچے ہال میں زریں بدستور کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ کلثوم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے فرش پر گرا دیا گیا تھا۔ وہ وہیں پڑی کبھی دھیمی اور کبھی بلند آواز سے رو رہی تھی۔ شنکر نے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ کلثوم اور زریں کو کمرے میں لے جائیں اور انہیں آرام کے ساتھ رکھیں۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شاہ جہاں! آرام سے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم شیخ عاصم کی ہدایات کے

مطابق چلو گے۔ یہ آرام سے رہیں گے۔ جہاں کہیں تم بھٹکے، ان پر مصیبت نازل ہونا شروع ہو جائے گی اور تم جانتے ہی ہو یہ مصیبت کتنی بڑی مصیبت ہے اور اس کا اختتام کیا ہے؟"

O☆O

میں ایک ڈاٹسن کار میں بیٹھا تھا اور شنکر کے ساتھ ہی ساہی صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے "بیس منٹ" کے اندر ہی ایک باتھ روم میں، میں نے شیو کی تھی، نہایا تھا اور کپڑے بدلے تھے۔ میرے کہنے پر شنکر نے میرے لیے ریڈی میڈ میک اپ کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ اس سامان کے ذریعے میں نے اپنے چہرے پر معمولی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ اب بظاہر میں بالکل تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ تاہم دل کے اندر جو صف ماتم بچھی ہوئی تھی اس کے متعلق صرف میں جانتا تھا۔ شنکر میرے انڈین دوست شوبھا سنگھ کے بھیس میں میرے ساتھ تھا۔ حلیے کے ساتھ ساتھ اس نے آواز بھی بدل لی تھی۔ اسے دیکھ کر اور سن کر خود مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شنکر شنکرا ہے۔ اس کے لباس میں ایک "رشین میڈ" نہایت طاقتور واکی ٹاکی موجود تھا اور اس کے علاوہ بھرا ہوا پسٹل بھی تھا۔

سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ ساہی صاحب کو اس وقت دفتر میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ گاڑی میں خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک جگہ گاڑی روک کر میں نے ساہی صاحب کو فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر ششدر رہ گئے "شاہ جہاں! تم کہاں ہو۔ کیا کرتے پھر رہے ہو؟" ان کی آواز میں حد درجہ لرزش تھی۔

میں نے کہا "جناب! میں خود آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں پھر سب کچھ بتاتا ہوں۔"

"او کے بھئی جلدی آؤ۔ میرا تو دماغ پھٹا جا رہا ہے تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر۔"

"بس جناب! میں پہنچ رہا ہوں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد میں شنکر شنکرا سمیت ساہی صاحب کے دفتر کی عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ساہی صاحب کس مزاج کے آدمی ہیں۔ وہ شفتا اور انجم کی حفاظت کا تہیہ کر چکے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا کہ انہیں ان دونوں کی حفاظت کی فکر مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ پچھلی مرتبہ جب وہ میرے لیے شفتا کے ہاتھ کا بنا ہوا سویٹر لے کر آئے تھے تو میرے دل کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ میں صحیح معنوں میں شفتا سے ملنے کے لیے تڑپ گیا تھا لیکن میرے اصرار کے باوجود ساہی صاحب نے مجھے یہ رسک نہیں لینے دیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اب بھی ساہی صاحب سے شفتا کا پتہ معلوم کرنا آسان نہیں ہوگا۔ انہیں شبہ ہوا تو بے انتہا محتاط ہو جائیں گے۔ اپنی جگہ وہ درست تھے اور میں بھی درست تھا۔ میں تارا عاصم کے بچھائے ہوئے ایک ایسے جال میں پھنس گیا تھا جس میں سے نکلنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ نجانے کیوں اس موقع پر مجھے بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی یاد آ گئی تھی۔ مرزا صاحباں کی کہانی۔۔۔ صاحباں نے مرزا کے سارے تیر توڑ کر اسے دشمنوں کے سامنے نہتا کر دیا تھا۔ شاید اس کہانی کا ایک باب تھوڑی شدت کے ساتھ یہاں بھی دہرایا گیا تھا۔۔۔ میں شاہ جہاں ولد وقار احمد اپنی محبوب ہستی غزالہ ولد جلیس احمد کے ہاتھوں اپنے دشمنوں کے سامنے نہتا ہو گیا تھا۔

جونہی ہم ساہی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ میری شکل دیکھ کر وہ ذرا سا چونکے ضرور مگر مجھے پہچاننے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ انہوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میں نے شنکر کا تعارف کراتے ہوئے کہا "ساہی صاحب! یہ میرا بمبئی کا دوست شوبھا سنگھ ہے۔ بہت ہی پیارا دوست اور بڑا جاں نثار ساتھی ہے۔ صرف مجھ سے ملنے یہاں آیا ہوا ہے۔۔۔ اور شوبھا سنگھ! یہ ایس ایس پی ساہی صاحب ہیں۔ میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ یہ میرے بزرگ اور سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں۔" ساہی صاحب اور شنکر شنکرا نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ساہی صاحب کو شنکر پر کسی طرح کا شبہ نہیں گزرا تھا۔

ساہی صاحب نے مجھ سے کہا "تم نے پہلے تو کبھی شوبھا سنگھ کا ذکر نہیں کیا؟"

"بس ایک اتفاق ہی ہے۔" میں نے کہا "ورنہ میں جب بھی انڈیا گیا ہوں تو زیادہ وقت شوبھا سنگھ کے ساتھ ہی رہا ہوں۔"

ساہی صاحب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ شنکر ان نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا "اگر آپ کو ذاتی گفتگو کرنی ہے تو میں کچھ دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں شوبھا سنگھ! تم سے بھلا کیا پردہ ہے۔"

ساہی صاحب گہری سانس لیتے ہوئے بولے "تمہارا آخری فون شاید جمعرات کو آیا تھا۔ تم نے بتایا تھا کہ غزالہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس کے بعد کوئی خبر نہیں آئی۔"

میں نے کہا "کوئی خاص خبر تھی ہی نہیں جناب، جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ سب غلط ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں غزالہ کو شیخ کے چنگل سے نکال لوں گا لیکن جو شخص خود ہی اپنی مشکل سے چھٹکارا پانا نہ چاہے اس کی مدد کون کر سکتا ہے۔ غزالہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی شیخ عاصم سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ وہ کہتی ہے کہ عاصم جیسا بھی ہے اس کا شوہر ہے اور وہ آخری دم تک اس کا ساتھ نبھائے گی۔ میرا کام اسے سمجھانا تھا ساہی صاحب۔۔۔ وہ میں نے سمجھا دیا ہے۔ شیخ عاصم کے کردار کے بارے میں جو وہ "اونچ نیچ" بتا دی ہے جو میرے علم میں ہے۔ وہ کوئی نادان لڑکی نہیں۔ ایک تعلیم یافتہ ڈاکٹر ہے اور شاید کئی معاملوں میں ہم سے بھی زیادہ سوجھ بوجھ رکھتی ہے۔ اسے اپنے فیصلے کرنے کا حق حاصل ہے اور اس کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عاصم کے پاس واپس جائے گی۔ جس وقت غزالہ نے یہ بات کہی تھی، اسے میرے ساتھ روانہ ہوئے صرف آٹھ دس گھنٹے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ غزالہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس جا سکتی تھی۔ آٹھ دس گھنٹے کی غیر حاضری کے لیے کوئی بھی معقول بہانہ بنایا جا سکتا تھا۔۔۔ میں غزالہ کو واپس اس کے گھر لے آیا۔"

ساہی صاحب میری روداد توجہ سے سن رہے تھے۔ انہیں سنانے کے لیے میں نے مکمل کہانی تیار کی تھی۔ یہ کہانی تربیاچی تھی لیکن اس کہانی میں اصل کہانی کا دو تہائی حصہ شامل نہیں تھا۔

ساہی صاحب نے مجھ سے کئی ایک سوالات کیے۔ میں ان سوالات کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا لہٰذا ساہی صاحب کو تسلی بخش جوابات دیے۔ میں پوری تیاری کے ساتھ نہ آیا ہوتا تو ساہی صاحب کو قائل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

سہ پہر کی چائے ہم نے اکٹھے ہی پی۔ اس دوران میں بھی مختلف موضوعات پر ہماری گفتگو جاری رہی۔ ساہی صاحب کا خیال تھا کہ میں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اکا ایکی غزالہ کو لے کر چلے جانے کی اور اگر میں نے یہ قدم اٹھا ہی لیا تھا۔۔۔ تو پھر اس پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے تھا۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میں پچھلے چند دنوں میں کن جاں توڑ مصائب سے گزرا ہوں اور کن حالات میں مجھے یہ قدم واپس اٹھانا پڑا ہے۔ ساہی صاحب کا خیال تھا کہ جو ہو چکا۔ وہ ہو چکا اب میں غزالہ کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ ہاں یہ ضرور کروں کہ شیخ عاصم پر نگاہ رکھوں اور اس کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔

میں نے ساہی صاحب سے فریال کے بارے میں پوچھا۔ وہ پرجوش لہجے میں بولے "وہ پرسوں ہی انگلینڈ سے واپس آئی ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کے لیے ڈھیر سارے تحفے لائی ہے۔ اب گھر گھر جا کر بانٹتی پھر رہی ہے۔ بڑی رونق پسند طبیعت ہے اس کی۔۔۔ تمہارا ذکر بھی کر رہی تھی۔ کہتی تھی تمہیں دیکھے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔ تمہارا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹالا۔"

میں نے پوچھا "اب وہ کہاں ہے؟"

بولے "آج صبح سے نکلی ہوئی ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں اس کی ایک دو کلاس فیلوز رہتی ہیں۔ ان کی طرف گئی ہے۔ کہتی تھی شام تک واپس آؤں گی۔"

میرا سینہ سلگ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فریال ماڈل ٹاؤن میں نہیں ہے۔ وہ ڈیفنس میں ہے۔ اس منحوس کوٹھی میں جس کے تہ خانے میں ایک عقوبت خانہ تھا اور جہاں کچھ لوگ درندگی اور سفاکی کے ریکارڈ قائم کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔

"تم کچھ کھوئے کھوئے سے ہو؟" ساہی صاحب نے کہا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔" ساہی صاحب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

میں نے کہا "اگر اجازت ہو تو سگریٹ سلگا لوں؟"

"کیوں نہیں؟" ساہی صاحب خوش دلی سے بولے۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ ساہی صاحب بغور میری طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا "جناب! شوبھا سنگھ سے مل کر مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی ہے لیکن اس پریشانی میں اطمینان کا پہلو بھی ہے کیونکہ شوبھا سنگھ مجھے نہ ملتا تو شاید بہت زیادہ نقصان ہو جاتا۔"

"مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ کیا تم کھل کر بات کرنا پسند کرو گے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے جناب کہ شوبھا سنگھ کا ایک سگا بھتیجا شیخ عاصم کے خاص کارندوں میں شامل ہے۔ شیخ عاصم جب بھی پاکستان یا ہندوستان میں ہوتا ہے 'جانی' نام کا یہ نوجوان اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے کہ جانی کی ملاقات شوبھا سنگھ سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں شیخ کا تذکرہ بھی آیا۔ جانی کی زبانی شوبھا سنگھ پر سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ شیخ عاصم لاہور میں جس لڑکی کو تلاش کر رہا ہے اس کا نام شگفتہ وقار (شفتا) ہے اور وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ شوبھا کو یہ بھی پتا چلا ہے کہ شیخ عاصم اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے قریب ہے اور اسے معلوم ہوا ہے کہ لڑکی (شفتا) کو کسی پولیس آفیسر نے اپنی تحویل میں لے رکھا ہے۔"

ساہی صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ آنکھوں سے گہری

تشویش جھانکنے لگی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن شوبھا (یعنی شنکر) کی موجودگی میں جھجک رہے تھے۔ شنکر خود ہی اٹھتے ہوئے بولا "شاہ جہاں! یار! مجھے پتا کرنا۔ میں تھوڑی دیر باہر بیٹھتا ہوں۔ آپ دونوں آرام سے گل (بات) کر لیں۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باہر چلا گیا۔

ساہی صاحب بولے "یہ شوبھا سنگھ قابلِ اعتماد بندہ ہے نا؟"

میں نے کہا "ساہی صاحب! جس طرح میں آپ پر غیر مشروط اعتماد کرتا ہوں اسی طرح شوبھا سنگھ پر بھی کر سکتا ہوں۔"

ساہی صاحب نے ایک طویل سانس لی "تمہاری اطلاع واقعی پریشان کن ہے لیکن میرے سلسلے میں شیخ عاصم کو شک کیسے پڑا۔ میں نے تو اپنی طرف سے پوری احتیاط کی ہے۔"

"شیخ کے ذرائع بہت پھیلے ہوئے ہیں ساہی صاحب۔ کیا معلوم کہاں کہاں اس کے نمک خوار موجود ہیں۔"

کچھ دیر وہ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ آخر ساہی صاحب بولے "اگر اس اطلاع میں دس فیصد بھی سچائی ہے تو ہمیں غفلت نہیں کرنی چاہیے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" میں نے تائید کی۔ وہ بولے "پھر کیا سوچا ہے تم نے اس بارے میں؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو آپ کو اپنی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنا پڑے گا۔ دوسرے شفتا کا ٹھکانا اب تبدیل کرنا پڑے گا۔"

ساہی صاحب گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ بہت دیر بعد انہوں نے کہا "لیکن اگر تم اسے میرے پاس سے لے جاؤ گے تو کہاں رکھو گے؟"

"یہ میں نے سوچ لیا ہے ساہی صاحب۔" میں نے کہا "لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"لیکن اس بارے میں آپ کو بتاؤں گا نہیں۔ بالکل جیسے آج تک آپ نے مجھے نہیں بتایا۔ آپ نے ہی تو کہا تھا کہ شفتا کے ٹھکانے کا علم اگر صرف ایک فرد کو ہو گا تو یہ بہ نسبت کم دسک ہو گا۔"

ساہی صاحب گم صم تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کا ذہن کن اندیشوں میں گھر گیا ہے۔ میرے بقول اگر وہ شیخ عاصم کی نگاہوں میں آ چکے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ ہر وقت ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے دفتر سے باہر اس وقت بھی شیخ کے کارندے موجود ہوں۔

ساہی صاحب بولے "کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ تم ان حالات میں میرے پاس نہ آتے۔ میرا مطلب ہے فون پر بات ہو سکتی تھی؟"

"میں نے اس بارے میں سوچا تھا لیکن ممکن ہے کہ آپ کا فون بھی ٹیپ ہو رہا ہو۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" انہوں نے تشویشناک نظروں سے فون سیٹ کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنے دفتر میں ہی موجود رہیں۔ مجھے شفتا کا مکمل ایڈریس سمجھا دیں۔ میں شوبھا سنگھ کے ساتھ یہاں سے نکل جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ اس میک اپ میں مجھے آپ کا کوئی ملاقاتی سمجھا گیا ہو گا۔ میں یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے تعاقب کی اچھی طرح تسلی کر لوں گا۔ اس کے بعد شفتا تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ میرا پیچھا ہو رہا ہے تو میں شوبھا سنگھ کے ساتھ ہوٹل واپس چلا جاؤں گا۔"

"لیکن تمہارا وہ الیکٹرانک ڈیوائس تو کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گا؟"

"جی نہیں۔" میں نے ایک اور سفید جھوٹ بولا "ڈیوائس سسٹم آج کل کام نہیں کر رہا۔ میں اچھی طرح چیک کر چکا ہوں۔"

ایک طویل گفتگو کے بعد تمام امور طے پا گئے۔ ساہی صاحب نے مجھے شفتا کا پتا بتا دیا۔ وہ الفاظ ان کے ہونٹوں سے ادا ہو گئے جنہیں سننے کے لیے میں ایک عرصے سے بے قرار تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ شفتا لاہور میں کس علاقے، کس گلی اور کس مکان میں ہے۔ یہ مکمل ایڈریس تھا لیکن یہ مکمل ایڈریس مجھے شفتا کے پاس لے جانے کے بجائے اس سے دور لے جانے والا تھا۔ میرے دل سے ایک آہ نکلی اور محسوس ہوا کہ میرا سارا جسم غم کی حدت سے بخارات بن کر اڑ رہا ہے۔ شفتا سے یہ کیسا ملاپ تھا۔ میری وہ معصوم بہن ایک مدت سے دن رات میری راہ تک رہی تھی۔ آج میں اس سے ملنے جا رہا تھا لیکن میرے پاس اس کے لیے دل شق کر دینے والے دکھوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آہ اپنی بہن کے لیے یہ کیسی سوغات میں نے اپنی جیب میں بھر رکھی تھی۔ کیا یہی صلہ تھا شفتا کے انتظار کا؟ یہی انعام تھا اس جدائی کا جو اس نے ایک سنگین سزا کی طرح بڑے صبر سے کاٹی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خود کو شوٹ کر لوں۔ میں کیا منہ لے کر جا رہا تھا شفتا کے پاس۔۔۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا اس کے پاس

اس طرح جانے کا لیکن مجھے جانا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سہ پہر کے ساڑھے چار ہو چکے تھے۔ لاہور کی سڑکوں پر شام کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ خوش نما لوگ جیتے مسکراتے چہرے 'تفریح گاہوں کی رونق بڑھ رہی تھی لیکن میرے اندر دل کا موسم کچھ اور تھا۔ خاموشی سی خاموشی تھی! کرب سا کرب تھا! سینے میں غم کا گاڑھا سیاہ دھواں بھرتا چلا جا رہا تھا۔ میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ کتنے خوش قسمت ہیں۔ کسی کا "زریں گل" موت کے شکنجے میں نہیں، کسی کا "عالم قریشی" عزت و آبرو کے خطرے سے دوچار نہیں اور کسی کی معصوم بہن خدانخواستہ جاں لیوا عداوت کے نشانے پر نہیں۔ وہ غموں اور فکروں سے آزاد ہیں۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کہیں بہت دور بسنے والے لوگ ہیں۔

ہماری ڈاٹسن کاروان "دور افتادہ" بسنے والے لوگوں کے درمیان سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ اس گاڑی کی منزل "لاہور کینٹ" کا وہ مکان تھا جہاں شفتا رہائش پذیر تھی۔ ساہی صاحب نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق شفتا کے ساتھ صفدر کی منگیتر انجم بھی اسی مکان میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک عمر رسیدہ خانساماں سجاول خان بھی اسی مکان میں رہتا تھا۔ سجاول خان' ساہی صاحب کا بے حد قابلِ اعتماد ملازم تھا۔ وہ آج کل خانساماں کے علاوہ محافظ اور ڈرائیور وغیرہ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھے سجاول خان کے نام ایک رقعہ بھی لکھ دیا تھا۔

ہم شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) پر پہنچے اور وہاں سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف آ گئے۔ لاہور کینٹ کی آبادی اسٹیڈیم کے قریب ہی واقع ہے۔ یہ پوش علاقہ ہے۔ صاف ستھری سڑکیں اور خوب صورت کوٹھیاں۔۔۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ آج طویل عرصے کے بعد میں شفتا کی شکل دیکھنے والا تھا۔ سوچ رہا تھا۔۔۔ پتا نہیں وہ کیسی نظر آئے گی' دبلی ہو گی یا پہلے سے صحت مند ہو گئی ہو گی۔ اس نے کیسا لباس پہن رکھا ہو گا۔ اس کے چہرے پر وہ چمک موجود ہو گی یا نہیں جو اس کے چہرے پر صرف مجھے دیکھ کر نمودار ہوتی تھی۔

کار میں خود ڈرائیو کر رہا تھا' میرے پہلو میں انڈیا کا خطرناک ترین غنڈا شنکر شکرا۔۔۔ شوبھا سنگھ کے روپ میں بیٹھا تھا۔ اس کے لباس میں بھرا ہوا پستل تھا اور وہ وائرلیس ٹاکی تھا جس پر وہ صرف ایک بٹن دبا کر شیخ عاصم سے رابطہ کر سکتا تھا۔

جوں جوں ہم منزل کے قریب پہنچ رہے تھے میرے دل و دماغ میں جاری کشمکش سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ دل کی گہرائیوں سے آواز آئی "شاہ جہاں! ایک بار پھر سوچ لو۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں کہ تم خود کو حالات کے اس شکنجے سے آزاد کرا لو۔"

میں سوچنے لگا۔ اگر میں اچانک شنکر شکرا پر جھپٹ پڑتا تو اس بات کا امکان تیس چالیس فیصد کے قریب تھا کہ میں اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یعنی ساٹھ فیصد امکان اس بات کا تھا کہ یہ کوشش ناکام ہو گی۔ بالفرض اگر میں کامیاب ہو بھی جاتا ہوں تو وقتی طور پر میں آزادانہ نقل و حرکت کے قابل ہو سکتا تھا مگر یہ نقل و حرکت مجھے اس لیے فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی کہ الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم میں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شنکر وائرلیس ٹاکی پر شیخ عاصم کو آگاہ کر چکا تھا کہ لڑکی لاہور کینٹ کے ایک مکان میں ہے اور ہم وہاں جا رہے ہیں۔۔۔ اب اگر میں شنکر کو کسی طرح زیر کر کے واپس ساہی صاحب کے پاس یا کسی پولیس آفیسر کی طرف جانے کی کوشش کرتا تو شیخ کو فوراً علم ہو جاتا کہ میں شفتا کی طرف جانے کے بجائے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔ وہ فوراً حرکت میں آ جاتا اور بڑی سرعت کے ساتھ مجھ تک پہنچ جاتا۔ یہ الیکٹرانک ڈیوائس درحقیقت ایک نظر نہ آنے والی زنجیر تھا جس نے مجھے بے بس کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ اس زنجیر کی موجودگی میں' میں شفتا کو لے کر بھاگ بھی جاتا تو کتنی دور بھاگ سکتا تھا۔ میری آزادی کا دائرہ محدود فاصلے کا تھا اور پھر سب سے بڑی بات وہ یرغمالی تھے جو شیخ عاصم کی دسترس میں تھے اور جن کے ساتھ وہ پوری آزادی سے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں ان بے گناہوں کو چھوڑ کر کہاں جاتا جو صرف میری وجہ سے ذلت آمیز موت کے چنگل میں تھے۔ میں بس ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری گاڑی دس پندرہ مرلے کی ایک صاف ستھری کوٹھی کے سامنے رکی۔ گاڑی سے اتر کر میں نے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے بعد ایک سرخ و سپید تنومند بزرگ کی صورت نظر آئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہی سجاول خان تھا۔ میں نے سجاول خان کو ساہی صاحب کا رقعہ دکھایا۔

رقعہ پڑھنے کے بعد سجاول خان نے بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بے پناہ حیرت کے ساتھ خوشی کی جھلک بھی تھی۔ اس نے اپنی انگلی میری طرف اٹھائی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا "آ۔۔۔ آپ شاہ جہاں صاحب ہے۔۔۔ امارا مطلب ہے کہ۔۔۔ چھوٹی بی بی کا بھائی

صاحب۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن آپ۔۔۔ ہمارا مطلب ہے کہ آپ تو۔۔۔"

"میں نے اپنی شکل میں تھوڑی سی تبدیلی کر رکھی ہے۔ اس لیے بوڑھا دکھائی دے رہا ہوں۔ میک اپ سمجھتے ہو تم؟"

"میک اپ؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"بدخواہوں کی نظر سے بچنے کے لیے چہرے میں جو تھوڑی بہت تبدیلی کی جاتی ہے اُسے میک اپ کہتے ہیں۔ شاید تم نے رقعہ غور سے نہیں پڑھا۔ آخر میں تمہارے صاحب نے اس بارے میں بھی لکھا ہوا ہے۔"

سجاول خان نے ایک بار پھر رقعہ دیکھا۔ ساہی صاحب کے دستخط تھے، مہر بھی تھی لیکن سجاول خان پوری طرح مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا "جناب! آپ ادھر ہی ٹھہریں۔ ام ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ فون وغیرہ کے ذریعے ساہی صاحب سے تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے کہا "خان صاحب! اگر آپ ساہی صاحب کو فون کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ ٹھیک نہیں۔ ہمیں خطرہ ہے کہ ساہی صاحب کا فون ٹیپ ہو رہا ہوگا۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا کوئی بات نہیں۔ ام فون کرنا نہیں چاہتا۔ ام کو آپ پر بھروسا ہے۔ ام تو۔۔۔ ام تو بس ذرا بی بی جی سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

ہمیں وہیں دروازے پر چھوڑ کر سجاول خان اندر چلا گیا۔ میری اور شنکر شکرا کی نظریں عمارت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی کے پردوں میں ہلچل ہوئی ہے۔ یقیناً ہمیں وہاں سے کوئی دیکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد زینوں پر کسی کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ میرا دل جیسے کن پٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ شفتا کے بھاگتے قدموں کی آواز ہے اور میں کیوں نہ پہچانتا اس آواز کو؟ یہ میری بہن کے قدموں کی آواز تھی۔ ان پاؤں کی آواز تھی جنہیں میں نے بچپن سے جوانی تک پروان چڑھتے دیکھا تھا۔

میں سراپا آنکھ بن گیا اور ان زینوں کی طرف دیکھنے لگا جن کا آغاز گیراج کے اندر سے ہوتا تھا۔ پھر مجھے شفتا نظر آئی۔ دھنک سے زیادہ خوش رنگ، ہوا سے ہلکی اور شبنم سے زیادہ معصوم صورت۔۔۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کی بانہیں کھلی تھیں۔ اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں اور میری آنکھیں اسے۔ اپنے گرد و پیش سے ہم یکسر بے خبر ہو چکے تھے۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ وہ "بھیا" کہہ کر میری بانہوں میں سما گئی۔

وہ رو رہی تھی اور اپنا چہرہ میرے سینے سے رگڑ رہی تھی "آپ کہاں چلے گئے تھے بھیا۔۔۔ کیوں مجھے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ آپ بہت برے ہیں بھیا۔ آپ بڑے سخت دل ہیں۔"

شفتا کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ میری بانہوں میں سمائی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر بار بار پیار دیا۔ اس کی پشت تھپکی۔ اس کی پیشانی چومی۔ شفتا کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبریز تھے۔ اس نے ایک بار پھر بڑے دھیان سے میری صورت دیکھی، جیسے آنکھوں کے راستے میری شبیہہ دل میں اتار لینا چاہتی ہو، تب وہ دوبارہ مجھ سے چمٹ گئی۔ اسی دوران میں انجم بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی بے اختیار میرے گلے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔۔۔ خوشی۔۔۔ جو ہم سے کوسوں دور تھی۔

ہم اندر کمرے میں آ بیٹھے۔ شوبھا سنگھ (شنکر شکرا) کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ شفتا روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور سمجھاتے ہوئے کہا "شفتا! تمہاری جدائی مجھ پر بھی تو قیامت کی طرح گزری ہے پھر تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ میں جان بوجھ کر تم سے دور رہا ہوں۔"

"مگر آپ فون تو کر سکتے تھے، کبھی کبھار آپ صورت تو دکھا سکتے تھے؟"

"یہ سب کچھ ممکن ہوتا تو میں کیوں نہ کرتا میری بہن۔۔۔ تم مجھ سے مت پوچھو، اپنے دل سے پوچھو۔ کیا کسی بہت بڑی مجبوری کے بغیر میں تم سے دور رہ سکتا ہوں۔"

شفتا کے آنسو ٹپ ٹپ میرے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ وہ بے دریغ رو رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ان آنسوؤں کی ابھی اسے بہت ضرورت ہے۔ وہ حالات کی اس کروٹ سے بے خبر تھی جو میری اور اس کی زندگی کو ایک مہیب طوفان کی زد میں لے آئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا خاموش طبع شخص میرا دوست نہیں ایک ایسا درندہ صفت شخص ہے جس کا سایہ بھی انسان کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

سجاول خان ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنکس لے آیا۔ میری اور شفتا کی "ملاقات" دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ انجم کچھ مضمحل نظر آ رہی تھی۔ میں نے ذرا غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بیمار رہی ہے۔ اس کی

آنکھیں پیلی تھیں۔ یہ یرقان کی علامت تھی، چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔

میں نے انجم سے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا تو میرا یہ اندازہ درست رہا کہ پچھلے دنوں وہ شدید بیمار رہی ہے اور اب بھی پوری طرح صحت مند نہیں۔ میں جانتا تھا کہ انجم ایک بہت حساس لڑکی ہے۔ صفدر اس کا منگیتر تھا اور وہ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ صفدر اور انجم کے ساتھ یہ المیہ ہوا تھا کہ ان کی شادی بالکل آخری لمحوں میں ملتوی ہوئی تھی اور اب تک ملتوی ہوتی چلی آ رہی تھی۔ ساہی صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ انجم صفدر کی دوری بہت بری طرح محسوس کر رہی ہے اور اکثر خاموش رہتی ہے۔ بہرحال، انہوں نے مجھے انجم کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ آج مجھے شفتا اور خود انجم کی زبانی معلوم ہو رہا تھا کہ پچھلے ڈھائی تین ماہ اس نے یرقان جیسے موذی مرض سے لڑتے ہوئے گزارے ہیں۔

"ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ یہ شفتا کی بچی یونہی بات بڑھا رہی ہے۔" انجم نے کہا۔

"جی نہیں بھیا! خدا کی قسم یہ مرتے مرتے بچی ہیں۔" شفتا نے آنسو پونچھ کر کہا "اور اگر مجھ پر یقین نہیں تو بابا خان سے پوچھ لیں۔"

سجاول خان بولا "ہاں جی، اس کی گواہی تو ام بھی دیتا ہے کہ بڑا بی بی سخت بیمار رہا ہے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ صاحب جی اس کا علاج گھر میں کرانا چاہتا تھا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ ادھر پاس سے ہی ایک ڈاکٹر صاحب مل گیا، جنہوں نے صاحب (ساہی صاحب) کے کہنے پر گھر ہی میں بی بی کا علاج کیا۔ نہ صرف علاج کیا بلکہ خدا تعالیٰ کی مدد سے ان کو بہت حد تک ٹھیک بھی کر دیا۔"

میری آمد نے شفتا کو نہال کر دیا تھا۔ شفتا کو اس سے غرض نہیں تھی کہ میں اتنا عرصہ کہاں رہا ہوں، بس اسے یہ شکوہ تھا کہ کیوں رہا ہوں۔ اب یہ شکوہ بھی اس کے معصوم ذہن سے صاف ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میری آمد کی خوشی میں وہ سب کچھ بھولتی جا رہی تھی۔ اس سادہ دل نے تو یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں لی تھی کہ میں اتنے عرصے بعد آج اچانک کیوں وارد ہو گیا ہوں اور میری یہ آمد مستقل ہے یا عارضی۔ وہ سارے گھر میں جیسے اڑتی پھر رہی تھی۔ خانساماں کو ایک طرف ہٹا کر اس نے کچن خود سنبھال لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے کچن سے شملے کی مرچ اور بھنتے ہوئے قیمے کی خوشبو آنے لگی۔ یہ ہم دونوں کی پسندیدہ ڈش تھی۔ ایک دوسری پسندیدہ ڈش ماش کی دال اور اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ جب کبھی ہم دونوں بہن بھائی بہت خوش ہوتے تھے اور جیب میں پیسے بھی ہوتے تھے تو انہی دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز پکایا کرتے تھے۔

شملے کی مرچ اور قیمے کی خوشبو ایک زہریلے دھوئیں کی طرح میرے دماغ میں بھرنے لگی پھر اس دھوئیں کے ساتھ یادوں کا دھواں شامل ہونے لگا۔ بچپن کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں، ننھی منی آرزوئیں، میں نے سیکڑوں بار یا شاید ہزاروں بار شفتا کو دلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔ ایک خوب صورت گڑیا جو عروسی جوڑے میں دھنک کی طرح خوش رنگ نظر آتی تھی۔ میں نے تصور ہی تصور میں بے شمار مرتبہ اس گڑیا جیسی دلہن کا ماتھا چوما تھا، اسے کسی پھول کی طرح اپنے توانا بازوؤں میں اٹھایا تھا اور ڈولی میں بٹھایا تھا۔ آج شاید وہ وقت آن پہنچا تھا لیکن یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ مجھ سے اس دھنک رنگ گڑیا کو مانگا نہیں جا رہا تھا، چھینا جا رہا تھا۔ میری شہ رگ پر حالات کا خنجر تھا اور مجھے صرف اقرار میں سر ہلانے کی اجازت تھی۔ میں جانتا تھا کہ شیخ عاصم میرا دشمن ہے اور خطرناک دشمن ہے لیکن یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اس حد تک لاچار کر سکتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر وہی ناقابلِ فراموش منظر گھوم گیا جب مرسیڈیز میں شیخ عاصم کے ساتھ میری ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ وہ بدبختی کا نمونہ بن کر میرے "پسٹل" کے نشانے پر آ گیا تھا۔ میری انگلی کی ایک جنبش اس کا قصہ پاک کر سکتی تھی لیکن غزالہ کے تصور نے مجھے شیخ کے قتل سے باز رکھا تھا۔ ہاں۔۔۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اسی وجہ سے تو ہو رہا تھا کہ شیخ عاصم میرے ہاتھوں جہنم واصل نہیں ہوا تھا۔۔۔ بلاشبہ میری اس اندوہناک لاچاری کے ڈانڈے بالآخر غزالہ سے جا ملتے تھے۔ غزالہ۔۔۔ جو بیوی تھی۔۔۔ صرف ایک بیوی۔۔۔ جس کی وفا شعار نگاہ اپنے شوہر سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

سجاول خان نے مجھے میرے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بولا "چھوٹے صاحب جی، ام نے آپ کے لیے اوپر والا کمرا صاف کر دیا ہے۔ اگر آپ کے دوست بھی یہیں رہیں گے تو ان کے لیے علیحدہ کمرا کھول دیتا ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا تھا کمرا صاف کرنے کو؟"

"چھوٹی بی بی نے صاحب۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ چلا گیا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ شفتا کے وہم

وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ اس کی یہ ملاقات کتنی مختصر اور کتنی سنگین ہے۔ وہ میرے لیے کمرے صاف کروا رہی تھی لیکن اسے خود بھی اپنا کمرا بلکہ یہ گھر چھوڑنا تھا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا "ہیلو انجم آپی! کہاں ہیں آپ۔۔۔ ہائی گاڈ۔ آج تو بڑی مزیدار خوشبو آرہی ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ بھنا ہوا قیمہ اور شملے کی مرچ ہے لیکن آپ کو نہیں کھانے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔۔۔"

ایک نوجوان تیز لہجے میں بولتا ہوا اندر آگیا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی لیکن صورت سے کم عمر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں شوخی اور امنگ ترنگ کا عکس تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا۔ میں برآمدے کے قریب کھڑا تھا۔

وہ بولا "جی فرمایئے۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

میں نے کہا "آپ فرمایئے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

وہ بولا "میرا نام حمزہ ہے جی۔۔۔ ڈاکٹر حمزہ۔ میں بابا خان کا پڑوسی ہوں۔ یہاں اپنی مریضہ کو دیکھنے آیا ہوں۔۔۔"

"آپی انجم کو؟"

"جی ہاں۔۔۔ اور آپ؟"

اتنے میں بابا خان یعنی سجاول خان بھی اندر آگیا۔ وہ بولا "آؤ بیٹا حمزہ! ام تمہاری ہی طرف جارہا تھا۔ بڑی بی بی کچھ گھبراہٹ محسوس کررہا ہے۔ ذرا دیکھ لو ان کو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "صاحب جی! یہ ڈاکٹر حمزہ ہے بہت اچھا بیٹا ہے۔ اس نے بی بی انجم کا علاج معالجہ کیا ہے۔"

"ایکسکیوزمی سر۔" نوجوان نے کہا اور تیزی کے ساتھ اندر چلا گیا۔

میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بیڈ روم میں انجم بستر پر کروٹ لیے پڑی تھی۔ کھانسی کی شدت سے بار بار اس کا جسم دہل جاتا تھا۔

نوجوان ڈاکٹر نے بڑی اپنائیت سے انجم کا معائنہ کیا۔ اسے پینے کی دوا دی۔ ٹمپریچر لیا اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا۔ ساتھ ساتھ وہ انجم سے تسلی آمیز باتیں بھی کرتا جارہا تھا۔ وہ انگلش کے الفاظ کثرت سے استعمال کررہا تھا' تاہم اس کے انداز میں عجیب سی بے ساختگی اور بے تکلفی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے بڑے عام سے لہجے میں شفتا کو آوازیں دینا شروع کردیں "شفتا۔۔۔ او شفتا۔ بھئی ذرا جلدی سے ادھر آنا۔۔۔"

اس نے دو تین بار پکارا تو شفتا آگئی۔ وہ بولا "ادھر آؤ۔۔۔ یہاں سے آپی کا بازو زور سے پکڑو۔ خون لینا ہے تھوڑا سا۔"

شفتا نے بازو دبایا۔ وہ نس ڈھونڈنے لگا۔ نس مل نہیں پارہی تھی۔

وہ بولا "بھئی ذرا زور سے دباؤ۔ جیسے چھوٹی عید پر آپی انجم کے دو ہزار روپے دبائے تھے۔"

ڈاکٹر حمزہ کے مذاق پر شفتا کا چہرہ گلابی ہوگیا۔ یقیناً میری موجودگی کی وجہ سے وہ چپ رہی تھی۔ میں نے غور سے شفتا کا چہرہ دیکھا اور اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس احساس کو میں فوری طور پر کوئی واضح معنی تو نہیں پہنا سکا لیکن دل میں ہلچل سی ضرور ہوئی۔

شفتا اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی "بھیا' پلیز ذرا آپ دبا دیں بازو۔"

میں آگے بڑھا۔ نوجوان ڈاکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس کی سوالیہ نظریں شفتا کی طرف اٹھ گئیں "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ تم نے انہیں بھیا کہا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ یہ میرے بھیا ہیں۔" شفتا نے کہا۔

ڈاکٹر حمزہ کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بڑی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ؟" وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

میرے چہرے پر میک اپ کی وجہ سے جو بزرگی نظر آرہی تھی اس نے ڈاکٹر حمزہ کو الجھن میں مبتلا کردیا تھا۔

میں نے کہا "آپ مجھے دیکھ کر اتنے حیران کیوں ہیں؟"

وہ بولا "آپ شفتا کے بھیا ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کہنے لگا "لیکن۔۔۔ یہ عینک۔۔۔ یہ سفید بال۔ میں تو سمجھا تھا۔۔۔ آپ جوان آدمی ہیں۔"

"ابھی میں جوان آدمی ہی ہوں۔ یہ تو ایک بہروپ ہے۔ سمجھو میں ایک ڈرامے میں کام کررہا ہوں۔ اس ڈرامے کے لیے میں نے گیٹ اپ اور میک اپ کررکھا ہے۔"

اس نے غور سے میرے بالوں کی سفیدی اور چہرے کی جھریاں دیکھیں اور تاڑ گیا۔ آخر ڈاکٹر تھا۔۔۔ وہ سمجھ گیا کہ میرے چہرے پر نظر آنے والی بزرگی کے آثار حقیقی نہیں مصنوعی ہیں۔

وہ بولا "جناب! میں نے شفتا اور آپی انجم سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ بڑا اشتیاق تھا آپ کو دیکھنے کا۔ یقین کریں۔۔۔ بہت بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

میں نے کہا "اس خوشی میں تم اپنی مریضہ کے منہ سے تھرمامیٹر نکالنا بھول گئے ہو۔"

"او سوری۔۔۔ ویری سوری۔" ڈاکٹر حمزہ نے بوکھلا کر کہا اور انجم کا ٹمپریچر دیکھا۔ کہنے لگا "ٹمپریچر تو نارمل ہے لیکن بلڈ پریشر کچھ لو ہوگیا ہے۔ انیمیا کی سی کیفیت ہے۔ انجکشن وغیرہ دینے پڑیں گے۔ دراصل یہ کھاتی بھی تو کچھ نہیں ہیں۔۔۔ اور جو یہ کھانا چاہتی ہیں وہ ہم کھلا نہیں سکتے۔ یہ روٹی کھانا چاہتی ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ تائی فائیڈ اور یرقان وغیرہ میں مریض کے نظام ہضم میں کس قسم کی تبدیلیاں واقع ہوجاتی ہیں۔۔۔"

اس کے بعد ایک ہی سانس میں ڈاکٹر حمزہ نے یرقان اور اس کے اثرات کے حوالے سے ایک طویل لیکچر دے دیا۔ اپنی گفتگو سے وہ ایک ابھرتا ہوا پُرجوش اور نہایت ذہین ڈاکٹر نظر آیا۔ چند منٹ کی گفتگو کے دوران میں ہی وہ مجھے بڑی بے تکلفی سے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ وہ انجم کو آپی کہہ رہا تھا۔ شفتا کو اس کے نام سے پکار رہا تھا اور سجاول خان کو صرف "بابا" کہہ کر مخاطب کررہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے بول رہا تھا اور ہر موضوع پر بول رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد جب میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ ڈاکٹر حمزہ کے والد بھی ایک بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ ہارٹ اسپیشلسٹ کو ہارٹ کی تکلیف نہیں ہوسکتی۔ کوئی تین برس پہلے وہ دورۂ قلب کی وجہ سے انتقال کرگئے تھے۔ اب ایک والدہ کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ پراپرٹی کافی تھی لیکن حمزہ کی والدہ نے ایک اسپتال کے لیے دو تہائی حصہ وقف کردیا تھا۔

شفتا اور انجم کے علاوہ سجاول خان بھی ڈاکٹر حمزہ کی دلچسپ اور شوخ و شنگ طبیعت سے متاثر نظر آتا تھا۔ انجم اب کچھ سنبھل گئی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ شفتا چائے بنا لائی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ شوبھا سنگھ (شنکر) کی چائے ڈرائنگ روم میں ہی بھیج دی گئی۔ چائے پیتے ہوئے حمزہ کو تین چار زوردار چھینکیں آئیں اور وہ جیب سے رومال نکال کر ٹھوں ٹھوں کرنے لگا "پتا نہیں کس نے یاد کیا ہے!" وہ بڑبڑایا۔

انجم بولی "مجھے تو لگتا ہے زکام نے یاد کیا ہے۔"

"شاید یہی بات ہے۔" حمزہ بولا "کل پورا ایک پاؤنڈ فریش کیک کھانا پڑا مجھے اکیلے کو۔"

"ایک پاؤنڈ؟ وہ کیوں بھئی؟" انجم نے پوچھا۔ شفتا کی سوالیہ نظر بھی حمزہ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں آپی۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گا' ورنہ آپ دو توں ماریں گی مجھے۔" حمزہ کا اشارہ انجم اور شفتا کی طرف تھا۔

"نہیں ماریں گے' کچھ نہیں کہیں گے۔"

"وعدہ؟"

"ہاں وعدہ۔"

"دراصل کل میں نے اپنی سالگرہ منائی اور منائی بالکل اکیلے میں۔۔۔ کمرے میں بند ہو کر۔ خود ہی کیک کاٹا۔ خود ہی تالی بجائی۔ خود ہی اپنی بلائیں لیں اور پھر کیک بھی سارا کھالیا۔"

"ارے وہ کیوں؟" انجم نے پوچھا۔

حمزہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اس کی شفاف آنکھوں کی مسکراہٹ غم کی ہلکی سی دھند میں چھپ گئی۔ وہ بولا "آپی! تم تو جانتی ہو' امی خوشی کے موقع پر کتنا غم زدہ ہوجاتی ہیں۔ سب بھولی بسری باتیں انہیں یاد آتی ہیں اور ابو تو اتنی شدت سے یاد آتے ہیں کہ نڈھال ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ابھی کچھ وقت لگے گا انہیں اس صدمے سے سنبھلنے میں۔۔۔ کل اتفاقاً وہ میری سالگرہ بھولی ہوئی تھیں۔ میں نے بھی انہیں یاد دلانا ضروری نہیں سمجھا۔ بس اکیلے ہی دل خوش کرلیا مگر جو کیک کھایا تو اس کی قیمت اب ادا کرنی پڑ رہی ہے۔" اس نے پھر ایک چھینک ماری اور "سوری" کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اتنے میں گھر کے ملازم نے آکر بتایا کہ ڈرائنگ روم میں جو "صاحب" بیٹھے ہیں' وہ مجھے یاد فرمارہے ہیں۔

وہ ہولناک تشویش جو تھوڑی دیر کے لیے پس منظر میں چلی گئی تھی۔ ایک بار پھر پوری شدت سے نمودار ہوئی اور دل و دماغ پر مسلط ہوگئی۔

میں شنکر کے پاس پہنچا۔ وہ بڑے اطمینان سے شیشے کی نازک تپائی پر پاؤں رکھے صوفے پر نیم دراز تھا۔ باریک ہونٹوں پر ایک ایسی خباثت بھری مسکراہٹ تھی جو شہر فتح کرنے والے کسی سپہ سالار کے ہونٹوں پر نظر آسکتی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ٹانگیں سمیٹیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی شاہ جہاں! کتنی دیر ہے؟" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ابھی کچھ ٹائم لگے گا۔"

"کتنا ٹائم؟"

"میں کہہ نہیں سکتا۔ اگر میں شفتا کو اچانک یہاں سے لے جاؤں گا تو باقی لوگ شک میں پڑیں گے۔ اس کے علاوہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود شفتا کو بھی ذہنی طور پر تیار کرنے

کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے تو زیادہ وقت چاہیے۔"

"لیکن پتا تو چلے کتنا وقت؟"

"تم اتنی جلد بازی کیوں کر رہے ہو۔ تمہارے سامنے شیخ عاصم سے بات ہوئی تھی۔ وہ ۲۴ گھنٹے کی بات کر رہا تھا۔ ابھی تو ڈیڑھ دو گھنٹے ہی ہوئے ہیں۔"

شنکر کے چہرے پر سختی کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ بڑے تحکم سے بولا "تم باہر جاؤ۔ میں اس بارے میں شیخ صاحب سے واکی ٹاکی پر بات کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے سینے میں کھولتے ہوئے لاوے پر بمشکل قابو پایا' تم میری طرف سے شیخ سے کہو کہ ہم کل دس گیارہ بجے تک پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن کل کیوں۔ آج کیوں نہیں؟" شنکر کا لہجہ زہرناک تھا۔

میں نے کہا "میں ایک اتفاق سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہوں۔ کل ۲۸ تاریخ ہے' یہ تاریخ میری والدہ کی برسی کی ہے۔ شفتا بھی اس بارے میں اچھی طرح جانتی ہے۔ کل میں اسے اسی برسی کے بہانے یہاں سے لے جاؤں گا۔"

شنکر بولا "میری اطلاع کے مطابق تمہاری ماتا صاحبہ کی قبر سانیوال کے قریب جل کوٹ نامی گاؤں میں ہے؟"

"ہاں یہ درست ہے۔"

"تو پھر تم اس قبر پر حاضری دینے کے لیے ابھی روانہ ہو سکتے ہو۔ صبح تک تم گاؤں پہنچ جاؤ گے۔"

"لیکن تم ابھی جانے پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو؟"

"تمہیں سوال کرنے کا ادھیکار نہیں ہے۔" شنکر غرا کر بولا "ہم کس بات پر اصرار کریں گے اور کس پر نہیں اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔"

غم و غصے کی شدت سے میرا دماغ چکرانے لگا۔ شنکر کا توہین آمیز بلکہ ذلت آمیز رویہ میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ سینے میں کھولتا ہوا لاوا ہر طلوث کو توڑ کر بہہ نکلنا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آئی کہ جو ہوتا ہے ہو جائے۔ جو قیامت ٹوٹنی ہو ابھی ٹوٹ پڑے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا کہ زریں گل اور عالم قریشی اپنی بیویوں سمیت جان گنوا دیں گے۔ فریال اذیت ناک موت مر جائے گی۔ شفتا کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ٹھیک ہے ہو جائے یہ سب کچھ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے وہ میں شیخ عاصم اور اس کے حواریوں کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ میں اس کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔ ایسی ذلت ناک موت ماروں شیخ عاصم اور اس کے حواریوں کو کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت کی مثال بن جائیں۔

مجھے لگا جیسے میرے بدن کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا ہے۔ میں اپنے ہی عرق میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ عقابی نگاہوں والے شنکر شکرا کو میرے چہرے پر پتا نہیں کیا نظر آیا تھا کہ وہ یک دم چوکس ہو گیا اور غیر ارادی طور پر تھوڑا سا پیچھے کھسک گیا۔

اس دوران میں واکی ٹاکی کی مخصوص "بیپ بیپ۔ بیپ" سنائی دینے لگی۔ یہ بہت مدھم آواز تھی لیکن واکی ٹاکی چونکہ شنکر کے ہاتھ میں تھا لہٰذا آواز واضح سنائی دی۔ دوسری طرف شیخ عاصم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ شنکر نے انگلی کے اشارے سے مجھے باہر جانے کی ہدایت کی۔ میں باہر آ گیا۔ برآمدے کے قریب مجھے ایک خوب صورت سی باوقار عورت نظر آئی۔ پتا چلا کہ یہ حمزہ کی والدہ ہیں۔ اسی دوران میں شفتا بھی اندر داخل ہوئی "سلام خالہ جان۔" اس نے کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔" عورت نے بڑی محبت سے شفتا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا انداز نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔

شفتا بولی "خالہ جان! انہیں دیکھیے اور بتائیے کون ہیں یہ؟"

خاتون بغور میری طرف دیکھنے لگیں۔ کہنے لگیں "بیٹا شکل تو تم سے ملتی جلتی ہے لیکن ان کی عمر ہے؟ اگر عمر کم ہوتی تو میں سمجھتی تمہارے بھائی جان ہیں۔"

"یہ میرے بھائی جان ہیں۔ بھیا شاہ جہاں' ان کی عمر کے متعلق آپ کو پھر بتاؤں گی۔"

خاتون کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے میرے سر پر پیار دیا۔ بولیں "تمہارے بارے میں بہت سن رکھا تھا بیٹا۔ آج دیکھا تو ایسا ہی پایا جیسا سنا تھا۔ ماشاء اللہ جیتے رہو۔ لمبی عمر پاؤ اور خوشیاں دیکھو۔"

خاتون یعنی حمزہ کی والدہ ہمارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ وہ ایک گداز دل والی مہربان عورت تھیں۔ ان کے قریب بیٹھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک غیر مرئی پیار کی پھوار سی ان پر برس رہی ہے۔ نجانے کیوں انہیں دیکھ کر مجھے اپنی والدہ یاد آنے لگیں۔ وہی لب و لہجہ۔ وہی رکھ رکھاؤ۔ چہرے کی وہی مقدس روشنی۔ حمزہ بھی وہیں موجود تھا۔ وہ مسلسل بول رہا تھا اور گاہے گاہے باتوں کی

پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ ان لوگوں میں بیٹھ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ پڑوسی نہیں بلکہ ایک ہی گھر کے افراد بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ خوبرو خاتون شفتا کو "شفتا بیٹا" کہہ کر بلا رہی تھی اور شفتا کا نام پکارتے ہوئے ان کا لہجہ واقعی ایک "ماں" کا لہجہ محسوس ہونے لگتا تھا۔

ڈاکٹر حمزہ کو دیکھنے کے بعد میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا' وہ اب زیادہ شدت سے محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ٹھوس حقیقت کی طرح۔ ایک ایسی کونپل کی طرح جو پتھر کا سینہ توڑ کر نکلی تھی اور اب اپنے تمام رنگوں اور خوشبوؤں کے ساتھ روز روشن میں.... لہلہا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد گھریلو ملازم نے مجھے آ کر بتایا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے سردار صاحب مجھے یاد فرما رہے ہیں۔

رنگوں اور خوشبوؤں کے پہلو سے ایک بار پھر کسی نے مجھے بیگاروں بھلوں کی طرف کھینچ لیا۔ میں کمرے میں موجود مسکراتے چہروں سے اجازت لے کر اس چہرے کے سامنے آ گیا جو پتھر کی طرح سپاٹ تھا اور جس کی سطح کے نیچے درندگی اور سفاکی کسی آسیب کی طرح پوشیدہ تھی۔

"ہاں کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "شیخ صاحب سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ تمہیں صبح تک کا سمے (وقت) دینے کے لیے تیار ہیں لیکن اس کے بعد اور رعایت نہیں ہو گی۔ گیارہ بجے تک تمہیں ہر صورت شیخ صاحب کے پاس پہنچنا ہے۔"

"اور کچھ کہنا ہے؟"

"بس یہی کہ کوئی ہوشیاری دکھانے کی گنجائش تمہارے پاس نہیں ہے' لہٰذا یہ کوشش مت کرنا۔"

میں ڈرائنگ روم سے واپس آ گیا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ اور اس کی والدہ واپس گھر جانا چاہ رہے تھے لیکن سجاول خان اور انجم نے اصرار کر کے انہیں روک لیا۔

شفتا نے کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا تھا۔ وہ پکانے میں بے مثال تھی۔ اس نے کسی سے سیکھا نہیں تھا۔ نہ ہی ماں یا کوئی بڑی بوڑھی سر پر تھی جو اسے کھانے پکانے کے اسرار و رموز سکھاتی۔ اس نے جو سیکھا تھا خود سیکھا تھا۔ جو ایک بار اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاتا معترف ہو جاتا تھا۔ میں اکثر اسے چھیڑا کرتا تھا کہ تمہارا دولہا تو بہت دبلا پتلا اور مریل سا ہونا چاہیے۔ اگر وہ پہلے ہی کچھ صحت مند ہوا تو تم اسے کھلا کھلا کر بارہ من کا دھوبی بنا دو گی۔

شفتا کے ہاتھ کا پکا ہوا یہ کھانا مجھے کسی اور وقت نصیب ہوتا تو شاید میری زندگی کے بہترین "کھانوں" میں سے ایک ہوتا لیکن اس وقت تو ہر لقمہ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح حلق میں لگتا تھا۔ شفتا گاہے گاہے کن انکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر بمشکل قابو پا رکھا تھا۔

ڈاکٹر حمزہ بھی بہت مزے سے کھا رہا تھا۔ اس کی والدہ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا "حمزی تجھے زکام ہو رہا ہے۔ یہ اچار گوشت زیادہ مت کھاؤ۔"

وہ بولا "ایسا اچار گوشت کھا کر تو مجھے جہنم میں بھی جانا پڑے تو تیار ہوں..... ویسے بھی ممی جان! ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟"

انجم بولی "ڈاکٹر تو تم ہی ہو لیکن چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہوتا ہے۔"

وہ بولا "یہ پرانے زمانے میں ہوتا ہو گا۔ یعنی آپ کے دور میں۔ آج کل تو چراغ تلے یعنی بلب تلے روشنی ہی روشنی ہوتی ہے۔"

انجم بولی "اچھا تو میں کس دور کی ہوں؟"

وہ بولا "نہیں نہیں۔ اتنی پرانی بھی نہیں ہیں آپ۔ اور اگر ہیں بھی تو کیا ہوا۔ آپ کوئی روئے زمین کی پہلی عورت تو نہیں تھیں۔ اس سے پہلے مائی حوا اور دیگر کئی عورتیں تشریف لا چکی تھیں۔"

شفتا چہرہ جھکا کر مسکراہٹ روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر حمزہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "بھائی جان! مائی حوا اور بابا آدم کے ذکر پر بات یاد آ گئی۔ اب دیکھیں نا آپ۔ امی جان مجھے اچار گوشت سے منع فرما رہی تھیں۔ میں منع نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم سب حضرت آدم کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ نہ ماننے کی سرشت خدا نے ہم میں رکھی ہوئی ہے۔ جو چیز ہم سے جتنی دور ہوتی ہے' ہم اس سے اتنا ہی قریب ہونا چاہتے ہیں۔ آپ دیکھیں پیراسائیکالوجی کیا کہتی ہے۔ فرائڈ کا نظریہ یہ ہے کہ....."

انجم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "خدا کے لیے' اچار گوشت کھا لو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

اس بات پر زور کا قہقہہ پڑا..... قہقہہ جو مجھ سے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا پھر ڈاکٹر حمزہ اور اس کی والدہ اپنے گھر چلے گئے۔ دونوں گھروں کے ٹیلیفون "ہاٹ لائن" سے منسلک تھے۔ ڈائل پر صرف ایک نمبر گھمانے سے رابطہ ہو سکتا تھا۔ انجم کو رات کی دوا کھلانے کے لیے شبنم

میرے پاس آبیٹھی۔ اس کی ہر ادا سے اس کے اندر چھپی ہوئی بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے سوا اپنے ارد گرد کی ہر چیز کو بھولی ہوئی ہے۔ ایک مقناطیس کی طرح وہ میری سمت کھنچی چلی آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہی ہلکی پھلکی معصوم باتیں جو وہ ہمیشہ سے کرتی آئی تھی۔ وہ بڑی سادہ دل تھی اور میرے پاس پہنچ کر کچھ اور بھی معصوم نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اپنا ہر فیصلہ، ہر مسئلہ اور ہر الجھن مجھ پر چھوڑ دیتی تھی اور میری موجودگی میں یوں بے فکر ہو جاتی تھی جیسے مجھ سے الگ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بھائی ایک ایسی بلند و بالا دیوار ہے جو اسے دنیا کی ہر مصیبت، ہر آفت اور بلا سے دور رکھ سکتا ہے۔ وہ اس دیوار کے سائے میں بیٹھ کر ہر غم سے آزاد ہو جاتی تھی اور جب کوئی ہر غم سے آزاد ہو جائے تو پھر وہ ہلکی پھلکی باتیں ہی کرتا ہے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ پچھلے دنوں وہ کیا کیا کرتی رہی ہے۔ پچھلے تہواروں میں اس نے کیا کیا کھایا۔۔۔ کیا کیا پہنا، کیسے میری کمی محسوس کی پھر وہ مجھے بتانے لگی کہ آج کل وہ پرائیویٹ ایم اے کی تیاری کر رہی ہے۔

اس کی باتوں میں مستقبل کے خوابوں کی جھلک تھی اور ان خوب صورت دنوں کی آس تھی جو سنہری پنکھ ہلاتے کہیں دور سے پرواز کرتے اس کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بے خبر تھی کہ ان سنہری پنکھوں والے دنوں کو ایک خونخوار شکرا ہوا میں ہی دبوچ چکا ہے اور اس کی آنکھوں کے سارے خواب کینہ پرور لوگوں کی سنگ باری سے چکنا چور ہونے والے ہیں۔

وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ میرا بازو اس کے کندھوں پر تھا۔ میرے اندر درد کی لہری اٹھی۔ اس لہر میں باپ کی شفقت، ماں کا لاڈ اور بھائی کی محبت سب کچھ شامل تھا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور ہونٹ اس کے نرم و ملائم بالوں پر رکھ دیے۔ میرا دل چاہا وہ ایک ننھی سی گڑیا بن کر میرے سینے میں سما جائے اور میں اسے ہر آفت سے بچا کر کہیں بہت دور لے جاؤں۔

اچانک شفتا نے اپنا سر اٹھایا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میری آنکھوں میں نمی تھی "آپ۔۔۔ بھیا آپ رو تو نہیں رہے؟"

"نہیں بھئی۔"

"صحیح بتائیں نا۔"

"میرے خیال میں یہاں مجھے وہی مشہور فلمی مکالمہ کہنا پڑے گا۔۔۔ نہیں پگلی، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔"

اس نے سر پھر میرے سینے سے لگا دیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں دو حصوں میں بٹ گیا ہوں۔ ایک طرف زریں، عالم فہمی اور فریال تھے۔۔۔ دوسری طرف میری بہن تھی۔ میں زریں، فہمی اور فریال کو بچا سکتا تھا لیکن میری بہن کی زندگی تباہ و برباد ہوتی تھی۔ اگر میں شفتا کو بچاتا تو وہ تینوں بلکہ پانچوں افراد حسرتناک انجام سے دوچار ہوتے تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی اپنے دوستوں کی سلامتی کا خیال میرے ذہن پر حاوی ہو جاتا تھا اور کبھی شفتا کی سلامتی کا خیال۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ان لمحات میں مجھے اپنی جان کی ذرہ بھر پروا بھی نہیں تھی۔ موت کو گلے لگانا شاید میرے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھیں کھول کر بند کر لینا۔

میں نے شفتا کے سر پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے کہا "شفتا! مجھے بتاؤ۔۔۔ اگر کسی وقت میں تم سے کہوں کہ تم مجھے چھوڑ کر ایک دم کہیں دور چلی جاؤ۔ برقع پہنو، بس میں بیٹھو اور کہیں دور نکل جاؤ۔ کسی دوسرے شہر، کسی دور دراز علاقے میں اور کئی برسوں تک مجھ سے کوئی رشتہ ناتا نہ رکھو تو؟" وہ ایک بار پھر چونک کر کڑی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "میں صرف فرض کر رہا ہوں۔۔۔ اور ابھی کی بات نہیں کر رہا ہوں، زندگی کے کسی حصے میں۔۔۔ کسی دور میں۔"

وہ بولی "میں ضرور چلی جاؤں لیکن آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"فرض کرو۔ میں نہ جا سکوں تو۔ کوئی مجبوری ہو مجھے؟"

"کیوں مجبوری ہو۔۔۔ کیسی مجبوری ہو؟"

"مثلاً۔۔۔ مثلاً یہ الیکٹرانک ڈوائس والا معاملہ ہی ہو۔ تم جانتی ہو اس ڈوائس کی وجہ سے میں ایک خاص علاقے میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔"

"تو اگر ایسا ہوا تو پھر میں نہیں جاؤں گی۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ آپ سے دور رہ کر بہت دیکھ لیا ہے۔ اب اور نہیں رہا جائے گا۔۔۔ اور۔۔۔ اور آپ ایسی باتیں کر ہی کیوں رہے ہیں۔ دیکھیں بھیا اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھا ہے اور اب آپ ایسی باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔"

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ہماری نئی مطبوعات ☆

ایم اے راحت

- ناگ دیوتا ۱۰۰/=
- مقدس خنجر ۱۲۵/=
- مہم جو ۱۲۵/=
- محافظ ۱۲۵/=
- جن زادی ۲۰۰/=
- دھند (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- نایاب ۱۰۰/=
- احساس ۱۰۰/=
- وحشت کدہ ۱۲۰/=
- آسیب ۱۷۵/=
- سوکھے گلاب ۱۸۰/=
- کھلاڑی ۲۲۵/=
- سرفروش (دو جلدیں) ۳۲۰/=
- رازداں (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- ساسون (تین حصے) ۱۵۰/=
- سمندر کا بیٹا (تین حصے) ۱۵۰/=
- بھرنے (تین حصے) ۱۵۰/=
- باغی (دو حصے) ۸۰/=
- شہ زور (دو حصے) ۱۰۰/=
- الیہ (چار حصے) ۲۰۰/=
- بساط (چار حصے) ۲۰۰/=
- پارس ۵۰/=
- پرواز ۵۰/=
- خون آشام ۵۰/=

علیم الحق حقی

- عشق کا عین ۳۲۵/=
- شناخت ۲۰۰/=
- ماوس کاویا ۱۵۰/=
- ببول ۱۵۰/=
- پرماتما ۱۶۰/=
- تاش کے پتے ۱۵۰/=
- ہٹلر کی واپسی ۱۲۰/=
- آنکھوں میں دھنک ۸۰/=
- میر کارواں ۸۰/=
- کلاکار ۱۰۰/=
- برف کے ہاتھ ۱۰۰/=
- انسانی قیامت ۱۰۰/=
- زندان نامہ ۱۰۰/=
- طوفان کے بعد ۱۵۰/=
- اچھوت ۸۰/=
- ہزاروں خواہشیں ۱۰۰/=
- لہو کے تاجر ۱۲۰/=
- نسلوں کا قرض ۸۰/=
- شب احتساب ۸۰/=
- چوتھی سمت ۱۰۰/=
- چہار درویش ۱۰۰/=
- کار مسلسل ۱۰۰/=
- تحریک مزاحمت ۸۰/=
- پس نقاب ۱۰۰/=
- شفتالو کا بیج ۱۰۰/=
- لساوقاسم ۱۰۰/=
- حساب دشمناں ۸۰/=
- شاہ چور ۱۰۰/=

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون : ۷۲۴۳۷۳۱۴

تاوان

[illegible]

بار اول ـــــ ۱۹۹۹ء

مطبع ـــــ یونائیٹڈ پرنٹرز لاہور

کمپوزنگ ـــــ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر لاہور

قیمت ـــــ -/۶۰ روپے

ISBN 969-8429-36-0

اشاعت

علی بک سٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال

لاہور فون، ۷۲۲۳۸۵۲

[illegible]

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک سچی سرگزشت

میرے ذہن میں خوفناک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ تصور میں جب کلثوم کی لرزہ خیز چیخیں گونجیں اور زریں کی بے بسی کا تصور نگاہوں میں آیا تو جسم میں انگارے بھر گئے۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ میں نے کیوں ایسی محبتیں پالیں جو آج میرے پاؤں کی زنجیریں بنی ہوئی ہیں۔ چاروں طرف سے گھرے ہوئے شخص کو کیا حق پہنچتا تھا' انہیں پالنے کا اور رشتے جوڑنے کا۔ ایسے شخص کو تو شنکر شکرا کی طرح ہونا چاہیے اور شیخ عاصم کی طرح ہونا چاہیے۔ تن تنہا ـــ اپنی ذات میں مگن۔ اپنی غرض تک محدود۔ نہ کسی سے کوئی تعلق واسطہ ہو نہ کسی کی بے بسی پاؤں سے زنجیر بن کر لپٹے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ایسے ہی حالات میں شیخ عاصم یا شنکر شکرا کے خلاف میں کوئی کارروائی کرنا چاہتا تو کیا کرتا۔ شنکر کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا' نہ اس کا کوئی ایسا دوست یا ساتھی تھا جس سے اس کا جذباتی تعلق ہوتا۔ اس کی ساری وابستگیاں اپنی ذات کے ساتھ تھیں۔ ہواؤں میں اڑنے والے کسی شکاری پرندے کی طرح وہ آزاد اور بے خوف تھا۔ کچھ یہی حال شیخ عاصم کا بھی تھا۔ اپنی ذات کے سوا کسی کے ساتھ اس کی رشتے داری یا وابستگی نہیں تھی۔۔۔ پھر مجھے اس "لمحے" کا خیال آیا جو میرا تھا لیکن مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکا تھا۔ گرینڈیز کے اندر میری انگلی کی جنبش شیخ عاصم کو زندگی سے موت کی طرف دھکیل سکتی تھی لیکن میں نے اپنی جیت کا وہ قیمتی لمحہ غزالہ کے نام پر قربان کر دیا تھا۔ کیوں کیا تھا میں نے

ایسا؟ کیوں دماغ کے بجائے دل سے سوچا تھا۔ اب کہاں تھی وہ غزالہ جس کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا تھا؟ یقیناً وہ اسی چار دیواری میں تھی جس کے نیچے ایک تہ خانے میں زریں گل' عالم قریشی' ان کی بیویاں اور فریال ایک کلیجا شق کرنے والی اذیت کا شکار تھے۔ اسی تہ خانے کے اوپر وہ کسی کمرے میں بیٹھی اپنے "فیصلوں" پر نازاں ہو رہی ہوگی۔ اپنے شوہر پرستی کے سرور میں ڈوب کر شیخ عاصم کے صدقے واری جا رہی ہوگی "آپ میرے مجازی خدا ہیں عاصم۔ آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے ہر طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ میرے اردگرد کچھ بھی ہوتا رہے' اب مجھے پروا نہیں۔ میں ایک مشرقی عورت ہوں۔ میری تعلیم' میری سمجھ بوجھ' میرا شعور سب کچھ وہاں ختم ہو جاتا ہے جہاں آپ سے میرے رشتے کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ میں ہر دور میں غیر مشروط طور پر آپ

سے منسلک رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دیا ہے اور آنکھیں بند کر کے کہا ہے' اے میرے شریک سفر! اب میرا اپنا کوئی ارادہ ہے اور نہ منزل۔"

زندگی میں پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غزالہ کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل و دماغ میں تلخی سی سرایت کر گئی ہے۔

شفقا اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ میرے لیے دودھ لینے گئی تھی۔ میں صوفے پر دراز ہو گیا۔ سوچیں کسی جری لشکر

کے برق رفتار دستوں کی طرح پلٹ پلٹ کر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ میرا وصیان زریں قریشی اور فریال کی طرف گیا تو پھر خود بخود شیخ عاصم کی طرف آگیا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک سوال ابھرا "کیا میں ۔ کیا میں شیخ عاصم کی بات مان لوں؟"

وہ تسلسل کے ساتھ یہ بات کہہ رہا تھا کہ اس کا طریقہ کار کتنا بھی برا صحیح لیکن اس کی نیت غلط نہیں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے صرف اس لیے کر رہا ہے کہ ایک طرف تو وہ غزالہ سے اپنا تعلق قائم و دائم رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے قبائلی توانین کے تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا ہے اور اس کا حل یہی ہے کہ میری اور اس کی دشمنی کو رشتے داری میں بدل کر ہمیشہ کے لیے نابود کر دیا جائے۔ وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ شفقا اس کے گھرانے کی عزت دار بہو بنے گی۔ اسے اس کے حصے کا پورا پیار اور احترام ملے گا پھر وہ بڑے اصرار کے ساتھ اپنے بھتیجے کی تعریفیں بھی کر رہا تھا۔ وہ ایاز کو ایک باشعور، شریف النفس اور خوبرو نوجوان قرار دیتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈوں تو شفقا کے لیے اس جیسا رشتہ مجھے نہیں ملے گا۔

میری سوچوں کا تانا بانا شفقا کی آمد سے ٹوٹا۔ وہ میرے لیے دودھ لے آئی تھی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی وہ۔ سب وہ موسم کے لحاظ سے لون کے ہلکے پھلکے شلوار کرتے میں تھی۔ نصف آستین کا کرتہ اس پر بڑا پیارا لگتا تھا۔ اس نے اپنے بال ایک پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ وہ دھریک کے درخت کی طرح اونچی لمبی اور دلکش تھی۔ کتنی مسرور نظر آ رہی تھی وہ مجھے دیکھ کر۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ شاید اس کے بس میں ہوتا تو وہ ساری رات میرے سرہانے سے لگی بیٹھی رہتی اور باتیں کرتی رہتی لیکن اسے میرے آرام کا بھی خیال تھا۔

وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ میں بستر میں لیٹ گیا تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی "بھیا کتنی خشکی ہو گئی ہے آپ کے سر میں۔ لگتا ہے مہینوں سے تیل نہیں لگایا۔"

وہ ہمیشہ سے اسی طرح میرے بالوں کے پیچھے پڑی رہا کرتی تھی۔ "اچھا میں تیل لے کر آتی ہوں۔" اس نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیل کی شیشی لیے واپس آ گئی۔ کہنے لگی "بھیا! یہ آپ کا دوست کچھ عجیب آدمی نہیں ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وہیں ڈرائنگ روم میں صوفے پر پھیل کر لیٹا ہوا ہے حالانکہ ساتھ والے کمرے میں "بابا خان" نے اس کا بستر بھی بچھا دیا ہے۔"

"بس یہ سردار لوگ اسی طرح کے اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ ویسے دل کا برا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "اگر آپ کا دوست ہے تو پھر برا کیسے ہو سکتا ہے۔"

اس کی انگلیاں بڑی محبت سے میرے بالوں میں چل رہی تھیں "توبہ اللہ کتنی خشکی ہے۔ لگتا ہے سر نہیں ریگستان ہے۔ اب دیکھئے چار پانچ روز میں، میں کس طرح ٹھیک کرتی ہوں آپ کے بال۔"

میں نے کہا "اگر میں نے چار پانچ روز تمہارے پاس رہنا ہی نہ ہوا تو پھر؟"

"دیکھیں بھیا! ستانے والی باتیں نہ کریں۔" وہ ٹھٹکی "اب آپ نے کہیں جانے کی بات نہیں کرنی۔ بالکل نہیں کرنی۔"

"تو کب تک رکھو گی مجھے اپنے آپ۔ اگر میں نہ جاؤں گا تو تم کہیں چلی جاؤ گی۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی! میں نہ جاؤں گا تو تم کہیں چلی جاؤ گی۔ اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ سمجھا کرو نا بات۔"

اس نے میرے بال مٹھیوں میں بھینچے "بھیا! ایسی باتیں نہ کیا کریں، مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"مگر یہ تو دنیا کا دستور ہے بے وقوف۔۔۔ ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور اگر ہونے والا کام جاری ہو جائے تو کیا یہ اچھا نہیں ہوتا؟"

"دیکھیں بھیا! میں سچ مچ میں رو دوں گی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

وہ واقعی رونے کے قریب تھی۔ میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ میں نے کہا "شفقا تمہیں معلوم ہے کل امی کی برسی ہے؟"

"ہاں بھیا۔" وہ چونک کر بولی "مجھے یاد ہے لیکن میں چاہتی تھی کہ آپ کو صبح سویرے بتاؤں۔"

"اس مرتبہ امی کی برسی پر جل کوٹ نہ چلیں؟" میں نے تجویز پیش کی۔

وہ سر تا پا لرز گئی۔ جل کوٹ کا نام ہم دونوں کے لیے ایسا ہی روح فرسا تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح بولی "بھیا! جو آپ کا فیصلہ ہوگا، وہی میرا فیصلہ ہوگا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔ تم اب جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں جانتا تھا۔۔۔۔ کمرے میں جا کر وہ اب دیر تک آنسو بہائے گی۔ والد اور والدہ کا تذکرہ اسے ہمیشہ اشکبار کر دیا کرتا تھا۔

شفقا کے جانے کے بعد میں دبے پاؤں باہر آیا۔ برآمدے میں آکر ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ شنگر شکرا پھیل کر صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس کی سانپ جیسی متحرک نگاہیں بڑی تیزی سے ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ایک سیکنڈ میں جان گیا کہ کھڑکی میں سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے لیکن بظاہر وہ انجان بنا رہا۔ میں واپس کمرے میں آگیا۔ لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف انجم تھی "ہاں بھئی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔ دراصل، آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"بات کرنا تھی تو ادھر آجاتی۔ انٹرکام کا سہارا لینے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے کہا۔

انجم کا کمرا پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس کی کال پر حیرت ہوئی۔

وہ بولی "دراصل بات ایسی تھی کہ انٹرکام پر ہی اچھی طرح ہو سکتی تھی۔"

"ہاں ہاں کہو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ بولی "بھائی جان! چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن امید کرتی ہوں کہ آپ اس گستاخی کو درگزر کریں گے۔"

"بھئی اتنی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں۔ تم جو چاہو بے دھڑک کہہ سکتی ہو۔ کیا شفقا کے بارے میں کوئی بات ہے؟"

"جی ہاں۔" انجم نے جواب دیا "آپ سوچیں گے کہ آج ہی تو میں آیا ہوں۔ اسے اتنی جلدی کیا پڑی تھی بات کرنے کی۔ دراصل۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"بھئی پہیلیاں مت بجھواؤ۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

وہ بولی "دراصل مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ اچانک بتائے بغیر کہیں چل دیں گے اور میری بات دل میں ہی رہ جائے گی۔"

"تمہیں یہ شک کیوں پڑا کہ میں اچانک ہی کہیں چل دوں گا؟"

وہ بولی "آپ آئے بھی تو اچانک ہی ہیں۔"

جواب واقعی برمحل تھا۔ میں نے موضوع بدل کر کہا "ہاں کہو بات کیا ہے؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر انجم کی آواز آئی "بھائی جان! پچھلے چند مہینوں میں، میں نے حمزہ اور اس کی والدہ کو بہت اچھی طرح دیکھا اور پرکھا ہے۔ یہ بڑے اچھے لوگ ہیں بھائی جان۔۔۔ اور حمزہ تو ایسا لڑکا ہے کہ چراغ لے کے ڈھونڈیں تو نہ ملے۔ وہ شفقا کو پسند بھی کرتا ہے۔ میرے ساتھ ہر وقت اس کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں اگر رشتے کی بات کی جائے تو شفقا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آخر ہم نے اس کی شادی تو کرنی ہی ہے۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ تو کیوں نہ اس بارے میں سوچ لیا جائے۔"

میرے وہ اندازے درست ثابت ہوئے تھے جو پچھلے آٹھ دس گھنٹوں میں، میں نے لگائے تھے۔ یہاں ایک تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور اس تبدیلی کا تعلق شفقا سے تھا۔ میری خاموشی کو محسوس کر کے انجم نے کہا "بھائی جان! وہ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شفقا میری سگی بہن نہیں ہے لیکن یقین کریں میں اس کے لیے سگی بہنوں کی طرح سوچتی ہوں۔ اگر مجھے اس معاملے میں کوئی معمولی سی بھی خامی یا خرابی نظر آتی تو میں آپ کو ضرور بتاتی۔۔۔ یہ لوگ ہر طرح آپ کے اور شفقا کے قابل ہیں۔ چند دن آپ کو حمزہ کی والدہ کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع ملے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی بااخلاق عورت ہیں۔ شفقا کا ان کے ساتھ بہت دل لگا ہوا ہے، اکثر ان کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ سچ پوچھیں تو ایک طویل عرصے تک شفقا نے یہاں جو قید تنہائی کاٹی ہے اس میں حمزہ کی والدہ نے اسے بہت بہت سہارا دیا ہے۔"

میں بھلا کیا جواب دیتا۔ میرا دل تو سینے میں کٹ کر سو ٹکڑے ہو رہا تھا۔ انجم بڑے خلوص اور بڑے چاؤ سے شفقا کے مستقبل کی بات کر رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شفقا کا مستقبل تو تاریکیوں کے ہاتھ رہن ہو چکا ہے۔ ایسی تاریکیاں جن کے اندر "امید کی کرن" کے بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

میری خاموشی پھر طویل ہو گئی تھی "آ۔۔۔ آپ کو لڑکا کیسا لگا ہے؟" انجم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"جب تم کہہ رہی ہو انجم کہ وہ اچھا ہے تو اچھا ہی ہے

لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ابھی ایسی بات کے لیے یہ مناسب موقع ہے۔"

وہ جلدی سے بولی "بھائی جان! میں آپ سے کوئی فیصلہ تو نہیں مانگ رہی' میں نے تو صرف ایک بات کی ہے۔ آپ اس بارے میں اچھی طرح سوچیں۔ ان لوگوں کو کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں جلدی ہے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا "اوکے انجم! تھینک یو فار کالنگ۔" میں نے کہا اور انٹرکام بند کردیا۔

سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے۔ میں جو بات شفقا سے کرنے آیا تھا وہ آگ اور پانی کے سات سمندر پار کرنے سے زیادہ مشکل تھی' یہاں پہنچ کر یہ بات اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ یہاں آکر میں نے دیکھا کہ پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی گزر چکا ہے۔ شفقا کے ذہن کے کورے کاغذ پر سنہری روشنائی سے ایک نام لکھا ہوا تھا۔ یہ روشنائی زیادہ واضح نہیں تھی لیکن اتنی مدھم بھی نہیں تھی کہ بالکل پڑھی نہ جا سکتی۔ شفقا کی آنکھوں نے وہ خواب دیکھے تھے جو اس عمر میں ہر دوشیزہ دیکھتی ہے۔ اس کے تصور میں کچھ سہانے سپنے سجے تھے' اس کی سوچوں میں کچھ گلاب کھلے تھے لیکن اس سے پہلے کہ یہ گلاب پوری طرح کھلتے اور یہ سپنے پوری طرح چمکتے' وقت کا بے رحم ہاتھ انہیں نوچنے کے لیے حرکت میں آگیا تھا۔

میری زندگی میں کلیجا پھاڑ دینے والے غم کے بہت سے مواقع آئے تھے لیکن آج مجھے سچ مچ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا کلیجا پھٹ رہا ہے۔ کوئی تیز دھار چیز سینے کو ادھیڑتی اور چیرتی چلی جا رہی تھی۔ شاید ایسے ہی مواقع پر لوگوں کی ہمت جواب دے دیتی ہے اور وہ خودکشی کرلیا کرتے ہیں۔ آج کی شب میرے بستر پر انگارے بچھے ہوئے تھے' میں اٹھ کر آمدے میں ٹہلنے لگا۔ لان سے اوپر بہت اوپر سیاہ آسمان تھا۔ چاند کے گرد ستاروں کا ہجوم تھا۔ جیسے سب تارے چاند کے گرد بیٹھے کوئی دلچسپ کہانی سن رہے ہوں۔ ان چاند ستاروں سے کہیں بہت اوپر قدرت اپنے تمام تر اسرار و رموز کے ساتھ موجود تھی۔ وہ خدا جو بزرگ و برتر دکھ دیتا ہے اور دکھ سہنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ آج میں بے اختیار اس سے اپنے حصے کا حوصلہ مانگ رہا تھا۔ وہ برداشت اور وہ صبر مانگ رہا تھا جس کا تقاضا مجھ سے حالات کر رہے تھے۔ میرا ایمان تھا' وہ قدرت موجود ہے۔ یہ بات میں نے کسی مولوی' مفتی یا دانشور سے نہیں سنی تھی' یہ میرے اندر کی آواز تھی۔ میرے اندر کا فتویٰ تھا اور میرے خیال میں ہر شخص کے اندر یہ آواز موجود ہوتی ہے۔ ہر شخص کا دل ایک بزرگ و برتر ہستی کی موجودگی کی گواہی دیتا ہے۔ کچھ لوگ اس آواز پر کان دھرتے ہیں اور کچھ نہیں دھرتے پھر میرا دھیان سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرکے وادیٔ موت میں چلا گیا۔ وہ پُراسرار پردہ نشین ۔۔۔ وہ سانوں ۔۔۔ اپنی تمام تر اسراریت کے ساتھ میرے تصور میں جلوہ گر ہوا۔ وہ بھی تو اپنے انداز میں اس قدرت پر یقین رکھتا تھا جس کے ہاتھ میں ایک نہایت حساس ترازو تھا۔ ایک ایسا ترازو جس میں رائی کے دانے کے ہزارویں حصے کے برابر بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی تھی۔ سانوں کہتا تھا کہ اس ترازو میں انسان کو ہر راحت کے بدلے ایک تکلیف اور ہر تکلیف کے بدلے ایک راحت تول کر دی جاتی ہے۔ وہ بڑے جوش سے اعلان کرتا تھا کہ ہمیں اپنے سینے اور اپنے بازو سخت ترین مصائب کے لیے کھول دینے چاہئیں اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم برداشت کریں گے اس کا صلہ ہمیں مل کر رہے گا۔ وہ مشکلوں سے بچنے کی نہیں' ان سے ٹکرانے کی ترغیب دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مشکلوں کے بغیر زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خوشیوں کے بغیر زندگی گزار دیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہم بے جان اور غیر دلچسپ ماہ و سال گزار کر زندگی کو ضائع کردیں۔

سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرکے سانوں کی جادوئی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میرے خیالات کو درہم برہم کرتی رہی۔ میری شکستہ روح اس آواز کو سنتی رہی اور اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ ان لمحوں میں یہ آواز مجھے توانائی کی لہر جیسی محسوس ہوئی۔ اس آواز نے میرے کان میں کہا "شاہ جہاں! جسمانی اذیت کی طرح روحانی اذیت بھی بڑی قابل قدر چیز ہے۔ شفقا کے بارے میں اپنی منشا کے خلاف کوئی فیصلہ کرنا تمہارے لیے بے حد اذیت ناک ہے ۔۔۔۔ ہے نا ۔۔۔۔؟ مگر تم اذیتوں سے ڈرتے کیوں ہو۔ کیا تمہیں قدرت کے ترازو پر بھروسا نہیں؟"

"ہے بھروسا لیکن میں کیا کروں؟" میرے اندر سے آواز آئی۔

"میں تمہیں اس اذیت سے نکلنے کا راستہ نہیں بتا سکتا۔ یہ راستہ تو تم نے خود سوچنا ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس اذیت کو "مصیبت" مت جانو۔ اس کو زندگی کا ایک حصہ سمجھو۔ بے شمار لوگوں کو ایسی اذیتیں سہنا پڑتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی اذیتیں سہنا پڑتی ہیں۔"

وہ رات شاید میری زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

صبح فجر کی اذان کے تھوڑی ہی دیر بعد شفقا بھی بیدار ہو گئی تھی یا شاید وہ سوئی ہی نہیں تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ہم دونوں کمرے میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کبھی کوئی خوش گوار یاد شفقا کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتی' کبھی کسی واقعے کا تذکرہ اسے غمگین کر دیتا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کی چھوٹی انگلی کا خوب صورت RING ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ اس کی ناک کا دلکش تل ہمیشہ سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "شفقا! ہم دونوں نے ہمیشہ بے تکلفی سے بات کی ہے۔ ہم نے وہ باتیں بھی کی ہیں جو بہن بھائی آپس میں کرتے ہیں اور وہ باتیں بھی جو باپ بیٹی یا ماں بیٹی آپس میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم آپس میں اچھے دوست بھی ہیں ۔۔۔ ہیں یا نہیں؟"

اس نے بڑی معصومیت سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "شفقا' انسان کی زندگی میں کئی مرحلے آتے ہیں۔ پہلے وہ بچہ ہوتا ہے پھر وہ جوان ہوتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں سے انکار کرنا میرے نزدیک دانش مندی نہیں۔ تم ماشاءاللہ اب جوان ہو۔ اس عمر میں لڑکی ایک نئے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی نظر میں کوئی جیون ساتھی بھی ہوتا ہے یا پھر کوئی آئیڈیل ہوتا ہے جس کے بارے میں وہ سوچتی ہے ۔۔۔۔ کیا تمہارے ذہن میں اس قسم کی کوئی بات ہے؟"

شفقا چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔ بے شک وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھی لیکن ہمارا رشتہ تو بہن بھائی کا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے شفقا؟" میں نے کہا۔

اس کا سر جھکتا چلا جا رہا تھا "نہیں بھیا! ایسی تو ۔۔۔۔ کوئی ۔۔۔ بات نہیں ہے۔" وہ بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"میری طرف دیکھ کر بات کرو شفقا۔" میں نے اس کی ٹھوڑی انگلی سے اٹھائی۔

اس نے بڑی مشکل سے میری طرف دیکھا ۔۔۔ اور ایک بار پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔

"اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو شفقا؟"

"نہیں بھیا ۔۔۔ میں نے کہا ہے نا۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"سوچ لو ۔۔۔ تم نے اپنے بھیا سے کبھی جھوٹ نہیں بولا؟!"

"نہیں بول رہی۔ جو بات آپ پوچھ رہے ہیں وہ نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

وہ خاموش رہی۔ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

میں نے کہا "مجھے انجم نے بتایا تھا کہ حمزہ تمہیں پسند کرتا ہے؟"

شفقا کا چہرہ قوسِ قزح کا نمونہ پیش کرنے لگا۔

میں نے دو تین بار پوچھا لیکن شفقا اس بارے میں خاموش رہی۔ میں نے کہا "شفقا! تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔"

غالباً شفقا کو یہ توقع نہیں تھی کہ میں یوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔ وہ بے حد پریشان نظر آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا اقرار بھی تھا کہ میں نے جو موضوع چھیڑا ہے اس میں حقیقت کا عنصر شامل ہے۔

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہری سانس لے کر کہا "شفقا! تم میری بہن ہو۔ میں تمہاری بات نہ سمجھوں گا تو اور کون سمجھے گا۔ جس طرح میں اپنے دل میں جھانک لیتا ہوں' اسی طرح تمہارے دل میں بھی جھانک سکتا ہوں۔ تمہارے بتائے بغیر ہی میں سمجھ رہا ہوں کہ تم بھی ڈاکٹر حمزہ کو پسند کرتی ہو۔"

خاموشی کا ایک اور وقفہ ہمارے درمیان آیا۔ یہ وقفہ اس امر کا ٹھوس ثبوت تھا کہ شفقا کے ذہن میں بھی کسی نہ کسی حد تک حمزہ کی پسندیدگی موجود ہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ پسندیدگی ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے۔ کم از کم شفقا کی طرف سے یہ ابتدائی مرحلے میں ہی تھی۔

میں نے کہا "شفقا! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ رتبے کے لحاظ سے میں تمہیں مشورہ بھی دے سکتا ہوں اور حکم بھی دے سکتا ہوں لیکن میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں' اور وہ یہ کہ اگر تمہارے دل میں ڈاکٹر حمزہ کا کوئی خیال ہے تو اسے نکال دو۔"

شفقا کا سارا جسم کسی غیر مرئی جھٹکے سے لرز گیا مگر وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس سے ایسی باتیں کروں گا اور اتنے کھردرے پن سے کروں گا۔ اس نے بڑی ہمت کرکے اپنی اشک بار نگاہیں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "بھیا! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ مجھ سے درخواست کر رہے ہیں تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی چھری سے ذبح کر رہا ہے۔ خدا کے لیے ایسی باتیں مت کریں۔ میں تو آپ کے اشارے پر ۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ اس سے آگے وہ ایک لفظ

بھی نہ کہہ سکی۔ ہچکیوں سے رونے لگی اور پھر تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا۔ خود ہی لڑتا رہا اور خود ہی زخموں سے چُور ہوتا رہا۔ میں نے ایسے بہت سے واقعات پڑھے تھے کہ کسی شخص نے جنونی انداز میں فائرنگ کی اور درجنوں افراد کو قتل کر کے خود کو بھی گولی مار لی۔ میں سوچتا تھا' لوگوں سے ایسا پاگل پن کیوں ہوتا ہے۔ آج اسی سوال کا جواب میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ حالات کسی وقت انسان کو ایسے موڑ پر لے آتے ہیں کہ اسے اپنے ساتھ ساتھ پوری دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یقیناً میں بھی ایسے ہی موڑ پر کھڑا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان لوگوں کو شوٹ کر دوں جو شفتا کو مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جنہیں یرغمال بنایا گیا ہے اور پھر شفتا کو بھی اور خود کو بھی گولی مار لوں۔

اچانک دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا' سامنے شنکر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ اسے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا لیکن وہ بڑی بے تکلفی سے رہائشی حصے کی طرف آ گیا تھا اور یقیناً ایسا کرتے ہوئے اس نے کسی سے اجازت بھی نہیں لی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' اس نے اپنا واکی ٹاکی میری طرف بڑھا دیا "تمہارے لیے کال ہے۔"

"کس کی کال؟"

"شیخ عاصم صاحب کی۔" شنکر نے جواب دیا۔

میں نے واکی ٹاکی تھام لیا۔ شنکر واپس چلا گیا۔

"ہیلو' شاہ جہاں اسپیکنگ۔" میں نے کہا۔

شیخ عاصم بولا "شاہ جہاں! میں ساری رات تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ یقین کرو۔ ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا خیال دل سے نہیں نکلا۔"

"کیا ضرورت ہے اس قدر پریشان ہونے کی؟ صورتِ حال پوری طرح تمہارے قابو میں ہے۔"

"میں صورتِ حال کے بارے میں نہیں' تمہارے بارے میں پریشان ہوں۔ میں جانتا ہوں شاہ جہاں! میں نے تمہیں ایک نہایت سخت آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ ایک طرف تمہارے تین بہترین دوست ہیں اور ایک طرف وہ بہن جو تمہیں جان سے زیادہ عزیز ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ صورتِ حال صرف اور صرف اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ تم مجھے ٹھیک سے سمجھ نہیں پائے ہو۔ تم نے کبھی میری بات پر اعتبار نہیں کیا اور نہ تمہارے ذہن میں کبھی یہ بات آئی ہے کہ میں تمہارے ساتھ مخلص ہو سکتا ہوں۔ میں نے تمہیں ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی' تمہیں سوچنے سمجھنے کے لیے پورا پورا وقت دیا۔ تمہارے ذہن کو صاف کرنے کے لیے ہر وہ طریقہ استعمال کیا جو میرے بس میں تھا لیکن تمہارا ذہن صاف نہ ہو سکا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے مجبوراً کرنا پڑا ہے اور شاید ان حالات کی جتنی تکلیف تمہیں پہنچی ہے اس کے لگ بھگ مجھے بھی پہنچی ہے لیکن شاہ جہاں! یقین کرو۔ اگر تم میرے دل کی گہرائی میں جھانکنے کے قابل ہو سکو تو وہاں تمہیں اب بھی اپنے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات ہی ملیں گے۔ تم میری بات سن رہے ہو نا؟"

"ہاں سن رہا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ بولا "شاہ جہاں! میں تمہیں اب بھی یقین دلاتا ہوں کہ شفتا ایک باعزت و نیک نام گھرانے کی بہو بن رہی ہے اور مستقبل میں اسے بے شمار اور دیرپا خوشیاں حاصل ہوں گی۔ یہ شادی جہاں شفتا کی زندگی سنوارے گی' وہاں ہم دونوں کی زندگیوں کو بھی عداوت کے بے رحم شکنجے سے آزاد کرے گی۔ تمہارے ساتھ رشتے داری کے بندھن میں بندھتے ہی وہ قبائلی قانون بے اثر ہو جائے گا جس نے مجھے ہر طرف سے جکڑ رکھا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو..... یہ ساری باتیں تم پہلے بھی کہہ چکے ہو اور میں پہلے بھی سن چکا ہوں..... اگر کوئی نئی بات ہے تو کہو۔"

وہ بولا "شاہ جہاں! میں سمجھتا ہوں کہ شفتا اب ہمارے خاندان کی ہونے والی بہو ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آنی چاہیے جو کل کلاں اس کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ کوئی ایسی الجھن پیدا ہو جائے اس کے ذہن میں کہ اسے نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنا مشکل ہو جائے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ میں چاہتا ہوں کہ شفتا کو یہاں "ہیں منٹ" میں پیش آنے والے حالات کا علم نہ ہو۔"

"کچھ اور کہنا چاہتے ہو یا بس؟"

"تمہارے لہجے کی یہ بھی گواہ ہے کہ تم بہت طیش میں ہو..... اور جتنا طیش ہے اتنا ہی غم بھی تمہارے دل میں موجود ہے۔ میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شاہ جہاں مگر کیا ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی مجبوریوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس چڑھتے ہوئے طوفان کو ذرا اُتر لینے دو۔ مطلع صاف ہو جائے گا تو تمہیں بہت کچھ بدلا ہوا نظر آئے گا۔ شاید تم چیزوں کو ایک نئے اور خوش گوار روپ میں دیکھ سکو؟"

"میں چیزوں کو جس رنگ روپ میں دیکھ چکا ہوں' شیخ عاصم! وہ رنگ روپ آسانی سے اترنے والا نہیں۔ تم جتنی نرمی اور محبت کا مظاہرہ کر رہے ہو اس سے سو گنا زیادہ "نرم" اور "ہمدرد" بھی ہو جاؤ تو میری رائے تمہارے بارے میں نہیں بدل سکتی۔ میں خود کو فریب نہیں دے سکتا۔ تم وہی ہو جس کا مظاہرہ تم "ہیں منٹ" میں کر چکے ہو اور وہی تمہارا اصلی روپ ہے۔ میں حقیقت پسند ہوں شیخ عاصم..... اور حقیقت یہ ہے کہ تم سو فیصد غلط ہونے کے باوجود غالب ہو اور میں سو فیصد صحیح ہونے کے باوجود مغلوب ہوں۔"

"چلو ایسا ہی سہی لیکن یہ تو تم مانو گے کہ تم پر سو فیصد غالب ہونے کے باوجود میں مستقبل کے بارے میں تم سے اچھے وعدے کر رہا ہوں۔ تمہیں اور شفتا کو عزت دمان دینے کی بات کر رہا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "شفتا میرے لیے بھی بہو کی طرح ہو گی۔ تم اسے پورے اعتماد کے ساتھ یہاں لے کر آؤ پھر ہم آئندہ کے لیے مل بیٹھ کر متفقہ طور پر فیصلہ کریں گے۔ آئی ایم ویٹنگ فار یو..... کتنے بجے تک تم پہنچ جاؤ گے یہاں؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"بہرحال جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرے کانوں میں شیخ عاصم کا فقرہ گونج رہا تھا "شفتا میرے لیے بہو کی طرح ہو گی۔" شیخ عاصم جیسے شخص کی زبان پر آ کر یہ فقرہ کتنا بے معنی اور غیر معتبر ہو گیا تھا۔ اس فقرے میں مجھے صرف الفاظ نظر آ رہے تھے' روح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے واکی ٹاکی واپس شنکر کو دے دیا۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا پھر ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر میں نے شفتا کو کمرے میں بلایا۔

اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ یقیناً میرے پاس سے جانے کے بعد بھی وہ روتی رہی تھی۔ میرے پاس آنے سے پہلے اس نے اپنی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ اس پانی کے قطرے ابھی تک اس کے رخساروں پر موجود تھے۔ وہ شبنم سے دُھلے ہوئے پھول کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں بات کروں گا تو وہ بات جون جولائی کی گرم ہوا جیسی ہو گی جو اس پھول کو کملا کر رکھ دے گی لیکن مجھے یہ بات کرنی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے کہا "شفتا! تم نے ابھی کہا تھا کہ تم میرے ایک اشارے پر جان تک لٹا سکتی ہو۔ شاید یہ بات کہتے ہوئے تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں اتنی جلدی تمہیں آزمائش میں ڈالوں گا اور تم کو "جان لٹانے" سے بھی زیادہ سخت امتحان میں ڈال دوں گا۔"

شفتا نے بڑے اطمینان سے میری بات سنی۔ اس کے چہرے پر ایک دائمی سکون تھا۔

میں نے کہا "شفتا! تمہیں یاد ہے' ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے اتنی محبت نہ کیا کرو اور نہ اس گھر سے جس میں تم میرے ساتھ رہتی ہو..... میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایک دن جب تم بڑے اطمینان سے بیٹھی ہو گی' میں دروازہ کھول کر گھر میں آؤں گا اور کہوں گا کہ میں نے تیرا بر ڈھونڈ لیا ہے' اب چل اٹھ اور تیاری کر۔ دو تین ہفتے کے اندر چھٹ جا میرے گھر سے..... اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میری اس اطلاع کے بعد تو دو تین ہفتے ایک مہمان کی طرح میرے اپنے گھر میں رہے گی اور پھر چلی جائے گی۔ تجھے یاد ہیں نا یہ باتیں؟"

وہ معصومیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے دوبارہ کہا "تجھے یاد ہیں نا وہ باتیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دو آنسو "حیرت" بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔

میں نے کہا "شفتا! آج میں تیرا بر ڈھونڈ لایا ہوں۔ ویسا ہی جیسا میں نے تجھ سے کہا تھا۔ خوب صورت' اونچا لمبا' پڑھا لکھا۔"

میری آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لرز گئی۔ شفتا نے میری طرف دیکھا۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس کی آنکھوں میں درد کی ایسی لہر تڑپی جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں نے خود کو سنبھالا اور بے رحمی سے کہا "شفتا! تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

جیسے لوہے کا ذرہ مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے' وہ میری طرف کھنچی اور میرے سینے سے چمٹ گئی "نہیں بھیا! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے ہیجانی انداز میں کہا۔

میں اسے پیچھے ہٹا کر اس کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو میرے ساتھ پیوست کر لیا تھا۔ وہ جیسے میرے ہی جسم کا حصہ بن گئی تھی۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "پوچھو گی نہیں شفتا' میں نے تمہارے لیے کیا چُنا ہے؟"

"نہیں بھیا۔" اس نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "میرے لیے وہی کافی ہے جو آپ نے کہہ دیا۔ مجھے اب اور کچھ نہیں سننا۔"

"لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں بتانا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو اپنی شفتا پر اعتماد نہیں؟"

"اعتماد ہے اور اسی اعتماد کی وجہ سے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

"ایسی کون سی بات ہے بھیا! جسے کہنے کے لیے آپ کو اتنا سوچنا پڑ رہا ہے۔ آپ مت سوچیں بھیا۔ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ بڑی سے بڑی بات بلا جھجک مجھ سے کہہ دیں۔ اگر وہ بات آپ کے لیے اچھی ہے تو میرے لیے بھی اچھی ہوگی۔"

"یہی تو مسئلہ ہے شفتا! وہ بات میرے نزدیک اچھی نہیں ہے۔"

"کوئی مجبوری ہے آپ کی؟"

"ہاں۔۔۔ مجبوری ہے۔"

"آپ کی ہر مجبوری میرے سر آنکھوں پر بھیا۔ آپ کے لیے۔۔۔ ایک لمحے کے سکون کے لیے میں ہنس کر اپنی جان دے سکتی ہوں۔"

میں نے بے اختیار اس کا سر چوم لیا۔ وہ بدستور میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے کہنا شروع کیا "شفتا! تم جانتی ہو نا کہ شیخ عاصم سے ہماری دشمنی کتنی پرانی ہے اور یہ دراصل شیخ عاصم ہی تھا جس کی وجہ سے تمہیں ایک عرصے تک یہاں روپوش رہنا پڑا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے بھیا۔"

"یہ دشمنی اب ایک عجیب موڑ پر آگئی ہے شفتا۔ اب یہ دشمنی ختم بھی ہو سکتی ہے' برقرار بھی رہ سکتی ہے اور بہت زیادہ بڑھ بھی سکتی ہے۔"

پھر میں نے مختصر الفاظ میں وہ تمام حالات شفتا کے گوش گزار کر دیے جو گلگت سے واپس آنے کے بعد اب تک پیش آئے تھے۔ "بیس منٹ" میں پیش آنے والے روح فرسا واقعات کا میں نے ذکر نہیں کیا تاہم شفتا کو یہ بتا دیا کہ شیخ عاصم نے میرے گرد جال سا پھیلا دیا ہے۔ وہ ہمارے خلاف دباؤ اور محبت دونوں حربے استعمال کر رہا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ اس کی "محبت" بھی دباؤ ہے' کبھی لگتا ہے کہ دباؤ بھی محبت ہے۔ وہ ایک بہت گہرا شخص ہے۔ میں اس کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا۔ میں نے اپنا ہر دکھ' اندیشہ کھول کر شفتا کے سامنے بیان کر دیا۔ وہ بڑی خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ میرا کہا ہوا ہر لفظ جیسے اپنے سینے میں جذب کر رہی تھی۔

میری روداد ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک آواز نے ہمیں چوکنا کر دیا۔ گھر کا نگہبان بابا خان شفتا کو اطلاع دے رہا تھا کہ دو عورتیں اس سے ملنے آئی ہیں۔ شفتا آنسو پونچھتی ہوئی میرے پاس سے اٹھی اور باہر چلی گئی۔ شاید وہ اس بات پر حیران تھی کہ صبح سویرے کون عورتیں ملنے آگئی ہیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا' ان میں ایک تراشیدہ بالوں والی درمیانی عمر کی ماڈرن عورت تھی۔ شاید کسی دفتر میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔ دوسری عمر رسیدہ تھی۔ اس کے لباس اور شکل سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ شاید کسی عرب ملک سے تعلق رکھتی تھی۔ پھر میرا دھیان فوراً شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ فوراً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں یہ عورتیں عاصم نے تو نہیں بھجوائیں۔ اگلے چار پانچ منٹ میں میرے اس خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ وہ عورتیں شیخ عاصم نے بھجوائی تھیں۔ انہیں یہاں کا پتا یقیناً شکر شکرا نے ہی بتایا تھا۔ ان میں سے ایک عورت شیخ کے لاہور آفس میں ملازم تھی۔ دوسری کا تعلق شیخ کی فیملی سے تھا۔ وہ شیخ عاصم کی کوئی پھوپی یا خالہ وغیرہ تھی۔ وہ انگلش نہیں جانتی تھی صرف عربی میں بات کرتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتی تھی' ساتھی عورت (جس کا نام ریحانہ تھا) اس کا ترجمہ کرتی جاتی تھی۔ عربی عورت شفتا کو بار بار بنت یعنی "بیٹی" کہہ کر پکار رہی تھی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر وہ نرمی اور اپنائیت نہیں تھی جو بیٹی کہنے والے کے چہرے پر ہونی چاہیے۔ وہ اپنے خدوخال کے اعتبار سے کوئی روایتی قسم کی قبائلی عورت نظر آتی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔

ریحانہ نامی اس عورت نے مجھے مخاطب کر کے کہا "جناب! میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اس خوشی کے موقع پر میں آپ کو اور دلہن صاحبہ کو لینے کے لیے آئی ہوں۔"

"دلہن صاحبہ" کے الفاظ میرے سینے پر کسی زہریلے تیر کی طرح لگے۔ جی چاہا اس عورت کی زبان کھینچ لوں لیکن یہ صرف وقتی اشتعال تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ اس عورت کا کیا قصور ہے۔ وہ یقیناً اصل صورت حال سے بے خبر تھی' اس کے لیے یہ بس ایک خوشی کا موقع تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس خوشی کے پس منظر میں کیا ہے؟ اس خوشی کے پس منظر میں ایک عقوبت خانہ تھا' جہاں کچھ بے بس افراد تھے' درندگی تھی اور دہشت تھی۔۔۔

دونوں عورتیں کچھ دیر شفتا سے باتیں کرتی رہیں پھر اس کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ انجم خواب آور دوا کے زیرِ اثر تھی اور اب تک گہری نیند سو رہی تھی۔ شکر شکرا بدستور ڈرائنگ روم میں براجمان تھا۔ اس نے پتا نہیں کہاں سے وہسکی کا انتظام بھی کر لیا تھا اور شراب نوشی کے ساتھ ساتھ سگریٹ نوشی میں بھی مصروف تھا۔ اس کی عقابی نظریں ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں اور وہ گھر میں موجود ہر شخص کی نقل و حرکت پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد دونوں عورتیں شفتا کے ساتھ پھر نمودار ہوئیں۔ وہ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ گئیں۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اس کمرے کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ دونوں عورتیں شفتا کے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تراشیدہ بالوں والی بڑے میٹھے لہجے میں شفتا سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شفتا بالکل نارمل نظر آ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ کبھی کبھی مسکرانے والے انداز میں کھنچ جاتے تھے۔ وہ غم واندوہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا جو کچھ دیر پہلے موسلادھار بارش کی طرح شفتا کے چہرے پر برسا تھا۔ شاید وہ غم واندوہ شفتا نے ایک دبیز پردے کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ وہ اثر پذیری' وہ لچک اور مطابقت شفتا کے کام آ رہی تھی جو قدرت نے ازل سے عورت کی فطرت میں رکھی ہوئی ہے۔ وہ یوں گھل مل کر دونوں خواتین سے باتیں کر رہی تھی جیسے مدت سے انہیں جانتی ہو۔

پھر میں نے دیکھا کہ عمر رسیدہ عورت نے ایک چھوٹا سا ہار نکالا اور شفتا کے گلے میں پہنا دیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چھوٹی سیپیوں کا ہار تھا۔ ان سیپیوں کو مختلف رنگ دیے گئے تھے۔ سیپیوں کی ایسی ہی ایک لڑی شفتا کی کلائی میں بھی پہنائی گئی۔ یہ کوئی قبائلی رسم تھی جو اس عمر رسیدہ عورت نے ادا کی تھی۔

میں نے شفتا کا چہرہ دیکھا۔ وہاں دکھ' حیرت یا پریشانی' کسی طرح کے آثار نہیں تھے۔ وہ بالکل سپاٹ چہرہ تھا۔ اس دوران میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ڈاکٹر حمزہ لمبے ڈگ بھرتا اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں شفتا دونوں خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ دونوں خواتین کو دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا "السلام علیکم جی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

تراشیدہ بالوں والی مسز ریحانہ نے جواب دیا۔ عمر رسیدہ عورت خالی خالی نظروں سے حمزہ کو دیکھتی رہی۔ حمزہ سوالیہ نظروں سے شفتا کو دیکھ رہا تھا "یہ بھیا کے مہمان ہیں۔" شفتا نے مختصر جواب دیا۔

"بھیا کے مہمان ہیں تو پھر ہمارے بھی مہمان ہیں۔" حمزہ نے بے تکلفی سے کہا پھر خود ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا "مجھے ڈاکٹر حمزہ کہتے ہیں جی۔ ہم بابا خان کے پڑوسی ہیں۔"

شفتا اور خواتین کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں ملا۔ تینوں خاموش رہیں۔ حمزہ کھسیانے انداز میں ہنسا "میرا خیال ہے' آپ بہت ضروری بات کر رہی ہیں' میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔"

وہ جانے کے لیے مڑا پھر رک گیا۔ شفتا سے مخاطب ہو کر بولا "امی جان آپ کو بلا رہی تھیں لیکن اگر وہ سو رہی ہیں تو انہیں جگائیں نہ۔۔۔ جب جاگیں تو بتا دیں۔"

شفتا نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ اس کے انداز میں عجیب سی بیگانگی پائی جاتی تھی۔ جیسے حمزہ جو کل رات اس کے لیے ایک جانا پہچانا شخص تھا آج بالکل اجنبی بن گیا تھا۔

حمزہ نے بھی اس انداز کو محسوس کیا۔ شفتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تم ٹھیک تو ہو شفتا؟"

"ہاں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

تب حمزہ کی نگاہ ان سیپیوں پر پڑی جو شفتا کے گلے اور کلائی میں نظر آ رہی تھیں۔

"ارے بھئی! یہ کیا پہن لیا تم نے۔" اس نے پوچھا۔

شفتا کا چہرہ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دم رو پڑے گی لیکن پھر وہ اپنے تاثرات پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ بے رخی سے بولی "حمزہ! آپ پلیز ذرا باہر چلے جائیں۔ ہم پرسنل بات کر رہے ہیں۔"

"او آئی ایم ویری سوری۔" حمزہ نے کہا اور جلدی سے باہر چلا گیا۔

دونوں خواتین پھر شفتا سے گفتگو کرنے لگیں۔

شفتا کو ان خواتین سے باتیں کرتے دیکھ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دو عورتیں نہیں' دو آسیبی سائے ہیں جو شفتا کو مجھ سے چھیننے کے لیے اس چار دیواری میں رینگ آئے ہیں۔ میں نے آواز دے کر شفتا کو اپنے پاس بلایا۔

وہ عورتوں سے معذرت کر کے چلی آئی۔

"کیا بات ہے بھیا؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"شفتا! کیا کہہ رہی ہیں یہ عورتیں؟"

"کچھ بھی نہیں بھیا۔ بس باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے تو بھلی عورتیں لگتی ہیں۔ بڑی محبت سے پیش آ رہی ہیں۔"

میں نے لرزیدہ آواز میں کہا "شفتا میں تمہیں اپنے دوستوں پر قربان نہیں کر سکتا اور نہ اپنے بے گناہ دوستوں کو

اذیت ناک موت مرنے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟"

شفتا نے جو جواب دیا وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ بامعنی اور اثر انگیز تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شفتا ایک ننھی سی گڑیا نہیں' ایک عاقل و بالغ لڑکی ہے' اس کی بات میں ایک ایسی پختگی ہے جو دل و دماغ کو آناً فاناً متاثر کر سکتی ہے۔ وہ بولی "بھیا! جب میں پریشان نہیں ہوں تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ خدا نے جو کچھ میرے لیے لکھا ہے وہ مجھے مل کر رہے گا۔ وہ اچھا ہوگا یا برا' مجھے اسے قبول کرنا ہوگا اور پھر آپ ابا جان کی وہ بات کیوں بھول رہے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے اچھا برا تو انسان خود ہوتا ہے۔ ایک اچھا انسان اپنے اردگرد کی ہر برائی کو اچھائی میں بدل دیتا ہے۔"

میں نے کہا "شفتا! تم کچھ بھی کہو لیکن میں حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتا اور حقیقت یہی ہے کہ میں بے بس ہوں۔۔۔ میں مجبور ہوں کہ شیخ عاصم کی بات مانتے ہوئے تمہیں ان کے گھرانے کی بہو بنا دوں۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جسے میں ہزاروں کوششوں کے باوجود گلے سے نیچے نہیں اتار سکتا اور نہ شاید کبھی اتار سکوں گا۔"

وہ تڑپ کر میرے سینے سے آلگی "بھیا! آپ مجھے بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ لڑنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ مل کر لڑوں گی۔ آپ کے لیے جان دینا میرے لیے اتنا ہی آسان ہوگا جتنا ایک کانٹے کی تکلیف سہنا۔ اگر آپ مجھ سے صبر اور برداشت چاہتے ہیں تو مشکل سے مشکل گھڑی میں آپ مجھے صابر و شاکر پائیں گے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ مجھے جہاں چاہے اور جس کے ساتھ چاہے بھیج دیجیے۔ میں کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی۔"

میں نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں شیخ کے پیدا کردہ حالات کے ہاتھوں اور اپنے جسم میں چھپے ہوئے منحوس آلے کے ہاتھوں اتنا بے بس ہو جاؤں گا۔ مجھے فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سب کچھ شیخ عاصم کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ میں نے غزالہ کو چاہا تھا اور اتنا چاہا تھا کہ خود کو برباد کر لیا تھا۔ ایک فیصلہ کن لمحے میں غزالہ کی چاہ میں گم ہو کر میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔

میں نے کہا "شفتا' خدا کی رضا کے سامنے میرا بس نہیں۔ ہمیں حالات کے ریلے میں بہنا ہوگا۔ ہم شیخ عاصم کی طرف جا رہے ہیں لیکن میرا تم سے وعدہ ہے' میں آخر تک حق مزاحمت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ مجھے موقع کی تلاش رہے گی۔ اگر مجھے یہ موقع ملا تو میں یہ حق ضرور استعمال کروں گا۔۔۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ سوچ کر مجھے معاف کر دینا کہ میں نے خدانخواستہ اپنی جان بچانے کے لیے یہ مجبوری قبول نہیں کی ہے۔ کچھ ایسے لوگوں کی جان بچانے کے لیے قبول کی ہے جو ہم سے بہت محبت کرتے ہیں۔۔۔ ہم پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں اور ان میں ہمارے سب سے بڑے محسن ساہی صاحب کی بیٹی فریال بھی ہے۔"

"فف۔۔۔ فریال؟" شفتا کے چہرے پر تاریک سائے لہرا گئے۔

"وہ شیخ عاصم کی تحویل میں ہے۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں پاس رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شفتا نے فون اٹھایا۔ آنسو پونچھے اور آواز کو نارمل رکھتے ہوئے بولی "ہیلو۔۔۔ کون۔۔۔ انکل ساہی آپ۔۔۔ خیریت تو ہے؟"

کچھ دیر وہ ساہی صاحب کی بات سنتی رہی پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا "انکل ساہی بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا "میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

"شاہ جہاں' ایک پریشان کن خبر ہے۔" ساہی صاحب کی نڈھال سی آواز سنائی دی۔

میں خبر سننے سے پہلے ہی اس کی ساری تفصیل جانتا تھا بلکہ وہ بھی جانتا تھا جو ساہی صاحب نہیں جانتے تھے۔ وہ بولے "شاہ جہاں! فریال کا پتا نہیں چل رہا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کچھ گفٹ وغیرہ لے کر کل اپنی فرینڈز کی طرف گئی تھی۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی ہے۔"

ساہی صاحب بڑے تحمل سے بول رہے تھے لیکن ان کے لہجے کے پیچھے غم و اندوہ کا وہی سمندر ہلکورے لے رہا تھا جو ایک گمشدہ بیٹی کے باپ کا نصیب ہوتا ہے۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "رپورٹ وغیرہ ہو چکی ہے؟"

"ہاں۔ وہ تو رات بارہ بجے ہی ہو گئی تھی۔ پولیس بھاگ دوڑ کر رہی ہے لیکن ابھی تک فریال کا کھوج ملا ہے اور نہ گاڑی کا۔"

میں نے ساہی صاحب کو تسلی تشفی دی اور کہا کہ وہ بے فکر رہیں۔ فریال ان شاء اللہ بہت جلدی گھر آ جائے گی۔

میرے لہجے نے انہیں چونکایا' بولے "شاہ جہاں! تمہاری زبان مبارک ہو' تم بڑے یقین سے بات کر رہے ہو۔ کیا کوئی کچھ پتا تمہارے پاس؟"

"کچھ تو نہیں جناب' ایک آئیڈیا ہے۔ میں کچھ دیر بعد آپ سے پھر رابطہ کروں گا۔" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

ساہی صاحب نے پوچھا کہ میں شفتا کے ساتھ یہاں سے کب روانہ ہو رہا ہوں۔

میں نے کہا "بس ہم روانہ ہونے ہی والے تھے کہ آپ کا فون آ گیا۔"

ساہی صاحب کو ایک بار پھر تسلی دینے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ ساہی صاحب بہت معاملہ فہم تھے۔ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ میرے پاس کوئی اہم کلیو ہے لیکن بوجوہ میں بتا نہیں رہا۔ بہرحال میرے رویے سے ان کی بہت امید بندھ گئی تھی۔

اس دوران میں مجھے پھر شنکر شکرا کی نحس صورت دکھائی دی۔ وہ واکی ٹاکی تھامے میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے شفتا کو اشارہ کیا' وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ شنکر نے واکی ٹاکی مجھے تھماتے ہوئے کہا "شیخ صاحب بات کریں گے۔"

دوسری طرف شیخ ہی تھا۔ وہ بولا "شاہ جہاں! کیا بات ہے۔ تم روانہ نہیں ہو رہے۔ میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ دبئی سے یہاں پہنچے ہیں' وہ بھی تمہارے انتظار میں ہیں۔۔۔ ہاں ایک بات میں تم سے اور کہنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ "ہیں منٹ" میں ہوا وہ "ہیں منٹ" تک ہی محدود ہے۔ شنکر اور اس کے گارڈز کے سوا اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں اور نہ کبھی آئندہ ہوگا۔۔۔ وہ ایک اٹل مجبوری ہے جس کا میں اور تم شکار ہوئے ہیں۔ اس مجبوری کی ناخوشگوار روداد ہم لوگوں تک ہرگز نہیں پہنچے گی۔ شاید تمہیں میری اس بات پر یقین نہ آئے لیکن اگر تم یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر سوچو کہ شفتا اب ہمارے خاندان کی بہو ہے اور اس کی عزت و ناموس ہمیں عزیز ہیں تو شاید تمہیں یقین آ بھی جائے۔"

"اور کچھ کہنا ہے؟"

"بس یہی کہ ذرا جلد پہنچ جاؤ۔"

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج شفتا کو جی بھر کر دیکھوں لیکن وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میں بھی جذباتی ہو جاتا تو اس کے لیے خود پر قابو پانا ممکن نہ رہتا۔ آنسوؤں کے دھارے پلکوں کے بند توڑ کر بہہ نکلتے اور مجھ میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ اسے روتے دیکھ سکوں۔ میں نے اسے اپنے پاس بلانے کے بجائے بابا خان کو اس کے پاس بھیجا اور اسے ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہم کوٹھی سے روانہ ہو رہے تھے۔ شنکر شکرا اور میں اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ شفتا پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ دو خواتین تھیں۔ گاڑی پورچ سے روانہ ہوئی تو میری نگاہ عقب نما آئینے پر پڑی۔ شفتا مڑ کر کسی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے شفتا کی نگاہ کا تعاقب کیا اور کسی نے میرا دل جیسے مٹھی میں مسل دیا۔ اپنے گھر کی بالکونی میں نوجوان ڈاکٹر حمزہ حیرت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ شفتا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شفتا جانتی تھی کہ وہ بہت دور جا رہی ہے۔ ڈاکٹر حمزہ نہیں جانتا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے کسی طوفان سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی ڈرائیو وے کو طے کر کے سڑک پر آ گئی۔ ڈاکٹر حمزہ کا گھر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر حمزہ بھی' اس کی خوب صورت والدہ بھی اور وہ حسین یادیں بھی جن کا تعلق شفتا سے اور ان در و دیوار سے تھا۔

O☆O

جب ہم ڈیفنس میں شیخ عاصم کی کوٹھی پر پہنچے تو مجھے حیرت اور اذیت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ کوٹھی پر لائٹنگ کی گئی تھی اور پورچ میں کئی گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً ان گاڑیوں کا تعلق شیخ عاصم کے مہمانوں سے تھا۔ ابھی دن کا وقت تھا لیکن سجاوٹ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رات ہوتے ہی کوٹھی بقعۂ نور بن جائے گی۔ کتنا تضاد تھا اس جگمگاتی کوٹھی میں اور آج کے دن میں۔۔۔ آج میری والدہ کی برسی تھی۔ یہ برسی مجھے ہمیشہ سے بڑھ کر الم انگیز محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اپنی پنڈلی میں جراب کے اندر گھسا ہوا وہ ننھا سا لیڈیز پسٹل ہاتھ سے چھوا جو چھوٹا ہونے کے باوجود بے حد طاقتور تھا۔ یہ پسٹل مجھے انجم کی الماری کی ایک دراز سے ملا تھا۔ یقیناً حفاظت خود اختیاری کے لیے یہ پسٹل ساہی صاحب نے انجم کو یا پھر شفتا کو دے رکھا تھا۔ یہ پسٹل اب میرے پاس تھا لیکن مجھے دس فیصد امید بھی نہیں تھی کہ میں اسے استعمال کر سکوں گا۔

گاڑی کوٹھی کے خوب صورت پورچ میں مڑ گئی۔ یہاں

شیخ کا بھتیجا ایاز اور کچھ دیگر افراد ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان سب کا تعلق شیخ عاصم کی فیملی سے تھا۔ تنومند گردنیں تانبے سی رنگت والے چہرے گھونگریالے بال ——— وہ بظاہر خوش اخلاقی سے ملے۔ ایاز نے فوراً فوراً ان کا تعارف کرایا۔ میں نے ایک بات واضح طور پر محسوس کی۔ شیخ عاصم کی یہ بات درست تھی کہ ان لوگوں کو اس شرمناک صورتِ حال سے بے خبر رکھا گیا تھا جس کا سامنا میں پچھلے تین چار روز سے کر رہا تھا بلکہ شاید ایاز بھی اس صورتِ حال سے آگاہ نہیں تھا۔ (بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

ایاز کے لہجے میں میرے لیے شناسائی کی جھلک تھی۔ وہ بھی ظاہری رکھ رکھاؤ اور خوش اخلاقی کے ساتھ ملا۔ تاہم دیگر افراد کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی وہ فاتحانہ چمک موجود تھی جس کا تعلق موجودہ صورتِ حال سے تھا۔ چہرے کے تاثرات پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن آنکھیں تاثرات کے معاملے میں خود مختار ہوتی ہیں۔ وہ اکثر دل کا راز کھول دیتی ہیں۔ میں اپنے اردگرد موجود تمام آنکھوں میں ایک طرح کا احساسِ برتری دیکھ رہا تھا اور یہ میرا وہم نہیں تھا۔ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ جسے کوئی بھی غور کرنے والا شخص محسوس کر سکتا تھا۔

شفتا خواتین کے ساتھ کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں مہمان خانے میں آ بیٹھا۔ شیخ عاصم یہاں بھی نظر نہیں آیا۔ وسیع و عریض نشست گاہ میں کئی اجنبی چہرے موجود تھے۔ تمباکو کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ کسی کسی میز پر کولڈ ڈرنکس اور بیئر وغیرہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ کھڑکی اس ائرکنڈیشنڈ فضا میں باہر کی گرمی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

میں ایک نشست پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا ——— یہاں موجود افراد ہنس رہے تھے' گپیں لگا رہے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ان قدموں کے نیچے ایک منحوس "ایکس منٹ" ہے جہاں آہوں اور سسکیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے ——— پھر میرا دھیان غزالہ کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی تو اسی چار دیواری میں موجود تھی۔ کیا اسے خبر نہیں تھی کہ شفتا کو یہاں لایا گیا ہے۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غزالہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری آمد کے موقع پر وہ موجود نہیں تھی۔ حالانکہ کئی دوسرے افراد اپنی بیگمات کے ساتھ موجود تھے۔ تو کیا شیخ نے اسے حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے کہیں اور بھیج دیا تھا؟

یقیناً ایسا ہی تھا ——— غزالہ کو تو شیخ عاصم نے یہ بتا رکھا تھا کہ میں ٹوکیو پرواز کر چکا ہوں اور وہاں اپنا "الیکٹرانک ڈرائیکس" نکلوا رہا ہوں۔ شنکر کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ میرے چہرے کے قریب جھکا ہوا تھا۔ بڑے شائستہ لہجے میں بولا "آپ کو شیخ صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

میں شنکر کے پیچھے پیچھے چلتا ایک اندرونی کمرے میں پہنچا۔ یہاں شیخ عاصم کہیں دکھائی نہیں دیا "کہاں ہے شیخ؟" میں نے پوچھا۔

وہ سرد لہجے میں بولا "کہیں بھی نہیں۔ میں نے تمہیں بلایا تھا۔"

"کیوں؟"

اس کی خون بار نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ ابھی تک شوبھا سنگھ والے گیٹ اپ میں تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا نیچے جھکا اور میری پنڈلی پر ہاتھ گھما کر پسٹل نکال لیا۔

"تمہاری بدھی (عقل) پر ماتم کرنے کو من چاہتا ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا "جانتے بھی ہو کہ تم اس وقت چنگل میں پھنسے ہوئے مچھر سے زیادہ حقیر ہو پھر بھی شرافت ہو کر نہیں بیٹھ رہے۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کسی سانپ کی طرح پھنکارا "شیخ صاحب کے نرم رویے کے کارن کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔ وہ تینوں چھوکریاں پوری طرح ہمارے بس میں ہیں۔ وہ لال آنکھوں والا موہن داس ان پر جھپٹنے کے لیے میرے بس ایک اشارے کا منتظر ہے۔ وہ آفت مچا دے گا "ایکس منٹ" میں"

میرے ہاتھ بے اختیار شنکر کے گریبان تک پہنچ گئے۔ بے پناہ قوت کے ساتھ میں نے اسے جھٹکا دیا اور دھکیلا ہوا دیوار تک لے گیا۔ شنکر نے پھرتی سے طاقتور پسٹل کی نال میری پیشانی پر رکھ دی "خبردار" وہ غرایا "جان سے مار ڈالوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں پاگل پن ناچ رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اگر اب تک شیخ عاصم نے اور شنکر نے مجھے زندہ رکھا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہیں شفتا کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اب شفتا ان کے پاس تھی۔ میری زندگی یا موت کا فیصلہ کرنا اب ان کے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں اس طرح بے کار میں موت کے گھاٹ اتر کر شفتا کا یا دوسروں کا کیا بھلا کر سکتا تھا۔ میری مثال وہی ہوتی جو ہاری ہوئی بم کے پٹیسمین کی ہوتی ہے جو بوکھلا کر مفت میں

اپنی وکٹ گنوا دیتا ہے۔

میں نے شنکر کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر خود سے دور ہٹا دیا "چلو واپس جاؤ ——— اپنی جگہ بیٹھو۔" اس نے تحکم سے کہا۔

میں باہر چلا گیا۔

دل و دماغ میں مایوسی کی آندھی چل رہی تھی اور غم کی دھول اڑ رہی تھی۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ نشست گاہ کی کھڑکی میں سے میں نے پائیں باغ کا ایک حصہ دیکھا تھا۔ وہاں غزالہ کھڑی تھی اور بلوچی مالی کو باغیچے کے بارے میں ہدایات دے رہی تھی۔ گلابی ساڑی اور کھلے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ خوب صورت رنگوں سے بنی ہوئی ایک تصویر جو زندہ تھی اور حرکت کر رہی تھی۔ وہ ابھی تک کچھ کمزور تھی لیکن اس کمزوری نے اس کی جاذبیت میں کمی واقع نہیں کی تھی۔

میری آنکھوں میں اس خوب صورت تصویر کی دید نے انگارے بھر دیے۔ وہ شیخ عاصم کے گھر میں سجی ہوئی تصویر تھی جس نے مجھے شیخ عاصم کے سامنے بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے شیخ کی بدنیتی اور شیطانیت کے کیسے کیسے ثبوت فراہم کیے تھے لیکن میری ہر دلیل اور منطق غزالہ پر رائیگاں گئی تھی۔ نجانے کیوں سب کچھ دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شیخ عاصم کی بے وفائیاں' دھوکے بازیاں' فریب کاریاں' سب کچھ غزالہ کے لیے لازوال محبت کی پرچھائیاں بن گئی تھیں اور وہ اپنا آپ ان پرچھائیوں میں گم کرتی چلی گئی تھی۔ اب تو یوں لگ رہا تھا کہ شیخ عاصم کل سورج کو مغرب سے نکالنے کا دعویٰ کرے تو غزالہ وہ بھی چپ چاپ مان جائے گی۔

غزالہ کے نزدیک میں ٹوکیو روانہ ہو چکا تھا اور یہ واقعہ تین روز پہلے کا تھا۔ اب معلوم نہیں شیخ عاصم نے میری یہاں موجودگی کے حوالے سے غزالہ کے سامنے کیا وضاحت کی تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے کہا ہو' میں ٹوکیو کا چکر لگا کر واپس آ گیا ہوں اور اب شفتا کی شادی کرنے کے بعد آپریشن کے مرحلے سے گزروں گا۔ اس طرح کے ایک سو ایک بہانے شیخ گھڑ سکتا تھا اور غزالہ کو باور کرا سکتا تھا کہ یہی حقیقت ہے۔

پھر میں یہ سوچنے لگا کہ غزالہ نے ابھی تک مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ شاید وہ میک اپ کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں سکی تھی یا پھر اب میرے اور اس کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ اس نے فوری طور پر مجھ سے ملنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ سوچا ہو گا کہ جب وقت ملے گا تو مل لے گی اور ایسا فاصلہ پیدا کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ غزالہ سے میری آخری ملاقات کا خاتمہ بڑے تلخ حالات میں ہوا تھا۔ میں اسے شیخ عاصم سے دور لے گیا تھا ——— اور اسی بھاگ دوڑ میں غزالہ کے ساتھ "ابارشن" والا واقعہ پیش آ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ غزالہ کے لیے وہ ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوا تھا۔ بے شک اس نے منہ سے نہیں کہا لیکن وہ اس المیے کا ذمے دار مجھے ہی سمجھتی تھی۔ آخری ملاقات میں اپنے لیے جو بے رخی اور بیگانگی میں نے غزالہ کے رویے میں دیکھی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی اور واقعی وہ کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ اس میں غزالہ کی جان بھی جا سکتی تھی۔ وہ تو سائیں بابا بروقت معروف گائناکالوجسٹ ڈاکٹر عارفہ عباسی کو لے آیا اور وہ ڈاکٹر غزالہ کے لیے زندگی کا وسیلہ بن گئی۔

بے حد شائستگی کے ساتھ کسی "باڈی گارڈ" کے انداز میں شنکر شکرا میرے پہلو میں آ بیٹھا۔ وہ ہر جگہ سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ بے انتہا چوکس تھا ——— خاص طور پر پسٹل برآمد ہونے کے بعد وہ اور چوکس ہو گیا تھا۔ وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

جب تک پسٹل میرے پاس تھا' امید کی ایک مدھم سی کرن میرے دل میں موجود تھی۔ اگر میں پھرتی کا مظاہرہ کر کے کسی ایسے شخص کو یرغمال بنا لیتا جو شیخ عاصم کے لیے بے انتہا اہمیت کا حامل ہوتا اور شیخ کو باور کرا دیتا کہ اگر میری بات نہ مانی گئی تو میں اس فرد کو قتل کر دوں گا تو شیخ سے رعایتیں حاصل کی جا سکتی تھیں مگر یہاں پہنچ کر مجھے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آیا تھا جسے شیخ کا قریبی شمار کیا جا سکے۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ ایک بھائی بھی تھا لیکن ان میں سے کوئی یہاں نہیں تھا اور اگر وہ ہوتے بھی تو معلوم نہیں ان کے ذریعے شیخ پر دباؤ ڈالا جا سکتا تھا یا نہیں۔ شیخ ایک خود پرست شخص تھا۔ اپنے مفاد کے سوا شاید ہی اسے دنیا کی کوئی چیز عزیز ہو۔ میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اگر میں شنکر' ایاز یا غزالہ کے سر پر پسٹل رکھ دیتا تو شیخ کو ان کی زندگی یا موت کی ذرہ بھر پروا نہ ہوتی۔ اب باقی رہ جاتا تھا خود شیخ عاصم ——— تو میں اس کی طرف بڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ الیکٹرانک ریز الارم کا سسٹم آن تھا۔ میرے اور شیخ کے درمیان کم از کم نو فٹ کا فاصلہ ہونا ضروری تھا۔

پھر بھی اگر پسٹل میرے پاس رہتا تو میں شیخ عاصم کو نو دس فٹ کی دوری سے نشانے پر لے سکتا تھا اور کوشش کر سکتا تھا کہ شیخ عاصم کو نفسیاتی دباؤ میں لے آؤں لیکن اب

تو یہ گنجائش بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ شنکر سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ شنکر میرے پہلو میں تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے پہلو میں انگارا دھرا ہے۔ پھر میری نگاہ شیخ عاصم پر پڑی۔ وہ وسیع ڈرائنگ روم کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میری کلائی پر بجلی جھٹکے لگنے لگے۔ تاہم یہ مدھم جھٹکے تھے۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ بارہ چودہ فٹ رہا ہوگا۔ شیخ عاصم نے مجھے خوش آمدید کہا اور وہی کلمات ادا کیے۔ اس وقت ہم تینوں کے سوا ڈرائنگ روم میں کوئی اور موجود نہیں تھا پھر شنکر بھی باہر چلا گیا۔ شیخ نے ملائمت سے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے استقبال کے لیے نہ آ سکا۔ تم جانتے ہی ہو سیکیورٹی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ بہرحال میں تہ دل سے تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر توقف کرنے کے بعد وہ بولا "میں چاہتا ہوں شاہ جہاں کہ ہم پروگرام طے کرلیں۔ کل جمعے کا مبارک دن ہے۔ اگر نکاح کی رسم ہو جائے تو بہت بہتر ہو۔ بہرطور آخری فیصلہ تمہارا ہی ہوگا۔"

میں نے کہا "میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب تم ان بے گناہوں کو رہا کردو۔"

"ان کی طرف سے کیوں فکر مند ہوتے ہو شاہ جہاں! ان کی حیثیت اب یہاں معزز مہمانوں کی سی ہے۔ ڈونٹ وری اباؤٹ دیم۔ وہ تھوڑی دیر اور یہاں رہ لیں گے تو ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ ان کے دل و دماغ پر جو ناخوشگوار اثرات پڑے ہیں وہ کسی حد تک زائل ہو جائیں گے۔"

"اپنے ارادوں کو خوب صورت الفاظ کے لبادے پہنا کر تم حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے اور حقیقت یہی ہے کہ تم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ٹھیک ہے تم انہیں اپنے پاس رکھو۔۔۔ لیکن ساہی صاحب کی بیٹی کو تو جانے دو۔ وہ تنہا گھر سے نکلی ہوئی ہے اور تم جانتے نہیں ہو کہ اس کے والدین کتنے پریشان ہیں۔"

شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا "پولیس والوں کو بھی تو احساس ہونا چاہیے کہ جب کسی کا بچہ بچی اغوا ہو جاتے ہیں تو والدین پر کیا بیتتی ہے۔" پھر ذرا توقف کرکے سنجیدہ لہجے میں بولا "ٹھیک ہے شاہ جہاں! اس لڑکی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں شنکر سے کہتا ہوں۔ وہ جیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے لایا تھا ویسے ہی واپس بھجوا دے گا۔ اوکے؟"

اس نے ایک نیا سگار سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا "میں نے تم سے پروگرام کے بارے میں پوچھا تھا اور میں یہ کوئی رسمی بات نہیں کر رہا۔ جو کچھ ہوگا تمہارے کہنے کے مطابق ہوگا۔ ہاں میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ تین چار روز کے اندر اندر ہم اس فرض کی ادائیگی سے فارغ ہو جائیں اور اگر کل کا دن ہو تو یہ بہت مبارک بات ہے۔"

شیخ عاصم مجھے اختیار دے رہا تھا لیکن یہ مشروط اختیار تھا۔ اس نے زبان سے نہیں کہا تھا لیکن وہ مجھے یہ بات سمجھانے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کے بعد "ٹیس منٹ" میں پھنسے ہوئے بے کس افراد کی جان چھوٹ جائے گی۔

میں نے کہا "شیخ عاصم! میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس بارے میں مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ شاید تم اپنی دانست میں مجھ سے رائے لے رہے ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"اوکے۔ اوکے۔ ایز یو لائیک۔" اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

O☆O

وہ میری زندگی کی تلخ ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ شیخ کی کوٹھی جگمگا رہی تھی لیکن میرے دل کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ ایک آواز بار بار میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی تھی اور مجھ سے پوچھتی تھی "شاہ جہاں! شفقتا کے سوا دنیا میں تیرا اور کوئی نہیں۔ وہ تیری سب سے عزیز ہستی ہے۔ کیا تو اپنی عزیز ترین ہستی کے لیے کچھ نہ کرسکے گا؟ کیا تو اسی طرح دیکھتا رہے گا اور دشمنی کا عفریت تیری بہن کو نگل جائے گا۔ تو تو بڑا انصاف پسند تھا۔ خدائی فوجدار بن کر دوسروں کو انصاف فراہم کرتا تھا۔۔۔ مظلوموں کی داد رسی کرتا تھا۔ کیا آج اپنی پیاری بہن کی داد رسی نہیں کرے گا۔۔۔ یا پھر تجھے کسی اور کا انتظار ہے۔ کسی اور راستہ و جہاں کا۔۔۔ جو آج تیری مدد کو آئے گا۔"

ہاں وہ رات بہت بھاری تھی مجھ پر اور اس رات سے بھی بھاری وہ لمحے تھے جب مجھے شیخ عاصم یا شنکر اکا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رات کے کھانے سے پہلے ہی میں اپنے کمرے میں بند ہو گیا۔ بچپن سے لے کر اب تک کی وہ تمام گھڑیاں میری نگاہ کے سامنے سے گزرنے لگیں جو میں نے شفقتا کے ساتھ گزاری تھیں۔ ہم نو عمری میں ہی ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ لاڈ کیسے دکھائے جاتے ہیں' ضدیں کیسے کی جاتی ہیں اور کیسے منوائی

جاتی ہیں۔ ہم نے لڑکپن سے ہی حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا خاندان تھے۔ ایک خاندان میں پائے جانے والے تمام رشتے ہم دونوں کی ذات میں سما گئے تھے۔ کبھی میں شفقتا کے لیے باپ بن جاتا تھا' کبھی بھائی اور کبھی ماں۔ وہ بھی کبھی میرے لیے بہن ہوتی تھی' کبھی بیٹی اور کبھی ہمجولی۔ ہماری محبت مثالی تھی اور گزرنے والے ماہ و سال نے اس محبت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ ہم قریب ہو کر تو ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہی تھے' دور رہ کر بھی ہمیشہ ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے۔ شفقتا کو اپنے بھائی پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ اپنے بھائی کے بازوؤں کو دنیا کے مضبوط ترین بازو سمجھتی تھی اور اس کے سینے سے لگ کر وہ "دیوارِ چین" کی پناہ میں آ جاتی تھی۔

لیکن آج سب تصورات چکنا چور ہونے کا دن تھا۔ دیوارِ چین مسمار ہو رہی تھی اور مضبوط بازو بے جان ہوتے جا رہے تھے۔۔۔ شفقتا کا ناقابلِ تسخیر بھائی آج قابلِ تسخیر تھا۔۔۔ وہ کسی "میدان" میں نہیں ہارا تھا' نہ ہی کسی جنگجو نے اسے پچھاڑا تھا' وہ اپنوں کی محبت کی دلدل میں ہی پھنس گیا تھا اور اپنی پالی ہوئی چاہتوں نے ہی اس کا گھیراؤ کرلیا تھا۔

میں لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ میری آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔ یہ جلن بھی مجھے لڑکپن کی یاد دلا رہی تھی۔ جب کبھی بھی حالات کے تھپیڑے کھا کر میرا دل بھر آتا تھا۔ یہ جلن میری آنکھوں میں اتر آتی تھی۔ شاید غم کی پرورش سے میری آنکھیں تر ہونے کے بجائے اور خشک ہو جاتی تھیں۔ آج بھی یہ جلن پورے عروج پر تھی۔ یہ جلن مجھے احساس دلا رہی تھی کہ میرے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے ابھی ناامیدی کی ہوا سے مکمل طور پر بجھے نہیں ہیں۔ ابھی تاریک سمندر کی تہہ میں روشنی اور توانائی کا آتش فشاں زندہ ہے۔

میرے کمرے سے باہر شنکر اکے مسلح گارڈ تھے۔ میں لیٹا رہا۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ میرے دونوں پہلو جل رہے تھے یا شاید پورا جسم ہی جل رہا تھا۔ گھر میں چہل پہل کی آوازیں تھیں۔ کبھی عورتوں کے کورس میں ہنسنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ یقیناً ان میں غزالہ کی آواز بھی شامل ہوگی۔ میں سوچتا اور میرا دل خون ہونے لگتا۔ ان آوازوں میں ڈوبتے ابھرتے نجانے کس وقت مجھے اونگھ سی آ گئی۔

وہ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت تھی۔ نہ میں سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے غزالہ میرے پاس آئی ہے۔ میرے بالکل قریب کھڑی ہے۔ میرا حال احوال پوچھ رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا "غزالہ! سب کچھ تیرے سامنے ہے' تیرا شوہر جیت گیا ہے' میں ہار گیا ہوں۔ اس نے مجھے بے دست و پا کرکے رکھ دیا ہے۔ زوبیں' گل' عالم قریشی' ان دونوں کی بیویاں اور تیری پیاری دوست فریال تیرے شوہر نامدار کے قبضے میں ہیں۔ وہ بڑی محبت سے ان کی "میزبانی" کا حق ادا کر رہا ہے۔ اگر اس "میزبانی" کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی ہے تو جا کر اپنے گھر کے تہ خانے میں دیکھ لے۔"

غزالہ بولی "شاہ جہاں! آپ کا دل عاصم کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہوگا۔ عاصم کا طریقۂ کار نامناسب ضرور ہو سکتا ہے لیکن وہ جو کچھ کر رہے ہیں' آپ کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ اس دشمنی کے خاتمے کے لیے کر رہے ہیں جو نہ جانے کتنی زندگیوں کو موت کے اندھیرے میں اتار سکتی ہے۔"

میں نے بے پناہ حیرت سے غزالہ کی طرف دیکھا "غزالہ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ الفاظ تمہاری زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ یہ علم ہونے کے بعد بھی کہ تمہارے گھر کے تہ خانے میں کن لوگوں کو اور کیوں بند کیا گیا ہے' تم اپنے شوہر کی وکالت جاری رکھے ہوئے ہو۔"

غزالہ نے نفی میں سر ہلایا "نہیں شاہ جہاں! بات ویسے نہیں ہے جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔ زوبیں' فریال اور عالم قریشی کو تہ خانے میں عاصم لے کر نہیں آئے ہیں' یہ سب تو شنکر کی منصوبہ بندی ہے۔ اس نے عاصم کی بے خبری میں ایسا کیا ہے۔ عاصم نے اسے سختی سے ہدایت کی ہے کہ "ٹیس منٹ" میں کسی سے کسی طرح کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ عاصم دل کے برے نہیں ہیں شاہ جہاں۔۔۔ مجھ سے زیادہ انہیں بھلا اور کون جانے گا۔ ہاں حالات کے تحت انہیں ایک دو سخت فیصلے ضرور کرنے پڑے ہیں۔"

"چلی جاؤ غزالہ' چلی جاؤ۔ اپنی شوہر پرستی کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔" میں نے دھاڑ کر کہا۔

ایک دم نیم غنودگی کی وہ حالت ختم ہو گئی۔ میں صوفے پر لیٹا لیٹا تصورات کی دنیا میں کھو گیا تھا۔ کمرے میں غزالہ تھی اور نہ اس کی آواز۔ میں اس ویران تاریکی میں تنہا تھا۔

گھر کے طول و عرض میں اب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس کسی کسی وقت کوئی قہقہہ یا آواز ہوا کے دوش پر تیر جاتی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مین گیٹ پر رنگین قمقموں کی لڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اس طویل پہاڑ جیسی رات کو کاٹنے کی کوشش کرنے لگا نجانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا ہاتھ صوفے سے نیچے لٹک رہا ہے اور کسی نے یہ ہاتھ تھام رکھا ہے۔ پھر مجھے دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی نسوانی جسم میرے بالکل قریب موجود تھا۔

"کون؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ ٹیبل لیمپ کی طرف بڑھا۔ میں نے لیمپ روشن کردیا۔ میں غزالہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ قالین پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی پیشانی صوفے کے ہتھے سے ٹیک رکھی تھی اور زاروقطار رو رہی تھی۔۔۔ ہاں اس مرتبہ یہ تصوراتی غزالہ نہیں تھی۔ وہ سچ مچ میرے سامنے موجود تھی۔ میں کتنی دیر تک حیرانی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا پھر میں نے تلخ لہجے میں کہا "مسز عاصم! تم؟"

اس نے میرا ہاتھ بھینچ لیا۔ اس کے رونے میں تیزی آچکی تھی۔

"تم کیوں آئی ہو یہاں؟" میں نے زہر خند لہجے میں پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ سسکیاں بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔

میں نے کہا "تم ایک وفا شعار شوہر پرست بیوی ہو اور میرا نہیں خیال کہ تمہارے شوہر نامدار نے تمہیں خود یہ اجازت دی ہوگی کہ تم رات کے اندھیرے میں ایک غیر مرد کے کمرے میں جاؤ اور یوں اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھو۔ تم بہت بڑا گناہ کررہی ہو۔ تمہاری دنیا اور آخرت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔"

"پلیز! شاہ جہاں!" وہ سسکی "مجھ پر یوں طنز کے تیر مت چلائیں۔ میرا کلیجا پہلے ہی چھلنی ہو رہا ہے۔"

"کیوں' ایسی کیا چیز دیکھ لی تم نے کہ تمہارا "پتھر کلیجا" بھی چھلنی ہو گیا؟"

"میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے شاہ جہاں۔۔۔ سب کچھ دیکھ لیا ہے۔"

"کیا تم تہ خانے کی بات کررہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ میں نے محبوب' عالم قریشی' زریں گل' سب کو دیکھ لیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ اللہ کرے مجھے موت آجائے۔ میں کیوں زندہ رہی' یہ سب کچھ دیکھنے کو؟" وہ ہچکیوں سے رونے لگی "مجھے نہیں معلوم تھا عاصم اس حد تک جاسکتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھے اتنا بڑا دھوکا دیں گے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ کو جاپان بھجوا دیا گیا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ کے ساتھ اور آپ کے دوستوں کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہوگا۔۔۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔ شاہ جہاں۔ آپ کے ساتھ اور آپ کے دوستوں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی ذمے دار صرف اور صرف میں ہوں۔"

میرے سینے سے آہ نکل گئی۔ میں نے کہا "غزالہ! تمہارے ذمے داری قبول کرلینے سے میرے دکھ کم کیسے ہوجائیں گے۔ کیا تمہارے آنسو بہانے سے شفتا مجھے واپس مل سکتی ہے۔ فریال کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے۔ زریں گل کلثوم اور عالم قریشی پر ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے ہیں' ان کا مداوا ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر بند کرو یہ رونا دھونا۔ اپنے شوہر کے پاس واپس جاؤ اور اس کے بیڈ روم میں جاکر سو رہو۔"

اس نے میرا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں شفتا کو اس چنگل سے نکالوں گی اور شفتا کے ساتھ ساتھ ان سب کو بھی جو نیچے "بیس منٹ" میں بند ہیں۔"

"کیا کرو گی؟ شیخ کی منت سماجت کرو گی۔ اس کے پاؤں پڑو گی لیکن میں دعوے سے یہ کہتا ہوں' وہ تمہاری ہر درخواست رد کردے گا۔"

"نہیں۔۔۔ میں ان سے درخواست نہیں کروں گی۔"

"تو پھر رائفل پکڑو گی۔ گولیاں چلاؤ گی۔۔۔؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہوگا' لیکن میں آپ سب کو یہاں سے نکال کر رہوں گی۔" اس کے لہجے میں عجیب سی سختی تھی۔ غزالہ کا ایسا لہجہ میں پہلی بار سن رہا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ کھڑکی کے پاس جاکر اس نے پردہ تھوڑا سا سرکایا اور باہر دیکھنے لگی۔ وہ بڑے دھیان سے باہر کا جائزہ لے رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ میری طرف مڑی اور آنسو پونچھ کر بولی "آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا' میں ابھی آتی ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا رہا پھر اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ پردہ ابھی تک سرکا ہوا تھا۔ میں نے باہر جھانکا۔ برآمدے کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔ یہاں ایک چوکیدار موجود تھا۔ گن اس کی گود میں تھی اور وہ ایک تخت پر عجیب بے ڈھنگے سے انداز میں بیٹھا تھا۔ پشت دیوار سے ٹیک رکھی تھی اور ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ واضح طور سے ایک طرف جھکا ہوا بھی تھا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ اونگھ رہا ہے۔ یہ رات کا درمیانی حصہ تھا۔ چوکیدار اور گارڈز وغیرہ رات کے درمیانی حصے میں عموماً بڑے ہوشیار باش اور چوکس دکھائی دیتے ہیں۔ اسے نہ جانے کیا ہو رہا تھا کہ ابھی سے گردن ڈال رکھی تھی۔ یکایک میں چونک گیا۔ چوکیدار دیوار کے ساتھ پھسلتے پھسلتے پہلو کے بل لکڑی کے تخت پر دراز ہوگیا تھا۔ صاف طور پر یوں محسوس ہوا تھا کہ غنودگی کا حملہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا ہے پھر میری نگاہ ایک اور منظر پر پڑی اور پورے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ برآمدے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ کوئی عورت "برہنہ فرش" پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور "اوغ اوغ" کی آواز سے قے کی۔ قے کرنے کے بعد اس نے دوبارہ زور سے "ہائے ہائے" کیا اور دوبارہ سر فرش پر ڈال کر سو گئی یا نیم بے ہوش ہوگئی۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ کوٹھی کے اندر کوئی زبردست قسم کی گڑبڑ موجود ہے۔ مجھے کہیں سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی قریبی کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ ٹرانسمشن ختم ہوچکی تھی اور شاں شاں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوٹھی میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں جو ٹی وی آف کرسکے۔ ہر طرف موت کا سا سناٹا تھا' بس کبھی کبھی کسی کے کھانسنے کی آواز آتی تھی یا یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی خوابیدہ شخص واویلا کررہا ہے۔

میرے عقب میں آہٹ ہوئی تو میں اچھل کر رہ گیا۔ گھوم کر دیکھا تو سامنے غزالہ کھڑی تھی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں وہ خاصی پریشان دکھائی دیتی تھی۔ رنگت اڑی اڑی تھی اور لمبے ریشمی بال شانوں پر منتشر تھے۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس مہین لباس میں اس کے جسمانی خدوخال نمایاں تھے لیکن وہ اتنی محو تھی کہ اپنی ذات کی طرف سے بالکل بے خبر ہو رہی تھی۔

وہ میرے قریب آئی اور ہیجانی انداز میں بولی "شاہ جہاں! کوٹھی میں موجود سب افراد بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں۔ میں چوکیداروں کو بھی دیکھ آئی ہوں' ان میں کوئی بھی اپنے حواس میں نہیں۔ یہ لیجیے۔۔۔ یہ ہے بیس منٹ کی چابی۔ آپ بیس منٹ میں چلے جائیے۔ میری اطلاع کے مطابق وہاں کل چھ افراد موجود ہیں۔ ان میں سے ایک شنکر شکرا ہے۔ یقیناً وہ لوگ بھی سو رہے ہوں گے لیکن میں آپ کو یہ گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہ بے ہوشی کی نیند سو رہے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی جاگ بھی رہا ہو۔ دراصل تہ خانے کا انتظام اس کوٹھی سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ وہاں موجود لوگوں کا کھانا بھی نیچے ہی پکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے آپ کو اندیشہ ہو سکتا ہے۔" اپنی بات ختم کرکے وہ خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی' جیسے پوچھ رہی ہو "آپ کو میری بات سمجھ میں آگئی ہے نا۔"

میں واقعی بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا پھر بھی میں نے تصدیق کے لیے پوچھا "غزالہ! یہ سارے لوگ بے ہوش کیسے ہوئے؟"

وہ بولی "بے ہوش نہیں ہیں' بس گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں نے انہیں کھانے میں "ا یلافک 22" کی اوور ڈوز دی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی خواب آور دوا ہے۔ اس کا اثر کھانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد شروع ہوتا ہے۔ اثر میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے اور بندہ غیر محسوس طور پر بہت گہری نیند میں چلا جاتا ہے۔ اس گہری نیند کا دورانیہ ڈھائی سے تین گھنٹے ہوتا ہے۔"

میرے سینے میں طوفان برپا تھا۔ غزالہ جو کچھ کہہ رہی تھی' اگر درست تھا تو پھر اسے ادا ہی کہا جاسکتا تھا۔ مجھے ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے شفتا جو مجھ سے بتدریج دور ہوتی جارہی تھی' ایک دم قریب آگئی ہے پھر میری نگاہ کھڑکی سے باہر تخت پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی طرف گئی۔ وہ ایک طرف بالکل لڑھک چکا تھا۔ رائفل اس کی گود سے کھسک کر فرش پر پڑی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے "خواب خرگوش" کا منظر پیش کررہا تھا۔ میرے ذہن میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ غزالہ کی دی ہوئی "نیند" ان لوگوں کے لیے موت کا سندیسہ بھی لاسکتی تھی۔

میں نے کہا "جن لوگوں کو تم نے خواب آور دوا دی ہے' ان میں بچے بھی ہوں گے۔ کہیں کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے؟"

وہ تیزی سے بولی "آپ بھول رہے ہیں کہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ اس بارے میں آپ بے فکر رہیں۔"

اس نے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز میری طرف بڑھائی۔ میں نے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ ایک ماؤزر تھا۔ ہتھیار کا لمس اور وزن محسوس کرکے میرے رگ وپے میں نئی جان دوڑ گئی۔ ماؤزر فلی لوڈڈ تھا۔ میں نے روشنی کی طرف کرکے اسے چیک کیا۔ میں شاید لفظوں میں اس احساس کو بیان نہ کرسکوں جو غزالہ کے ہاتھ سے ماؤزر لے کر مجھ پر طاری ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک دم زمین و آسمان نے اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جو فاتح تھا مفتوح ہوگیا ہے' جو برتر تھا کمتر ہوگیا ہے۔ یہ عمارت اور اس میں موجود سب ذی نفس ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند ہو کر میری جیب میں آگئے تھے اور ان میں۔۔۔ شنکر شکرا بھی شامل تھا۔ عورت ہمیشہ مرد سے ہتھیار چھپاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے جنگ و جدل سے روکتی ہے۔ وہ مرد کو ہتھیار دیتی اس وقت ہے' جب اسے معلوم

ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ وہ ہتھیار دے کر ایک طرح سے مونو کی دلیری اور اس کی فہم و فراست پر بھروسے کا اعلان بھی کر لی ہے۔

ماؤزر لینے کے بعد میں نے غزالہ سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا کہ شفتا کہاں ہے؟

وہ بولی "شفتا میرے کمرے میں ہے۔ اس نے رات کے کھانے میں بس ایک دو لقمے لیے تھے۔ ہلکی سی غنودگی کے سوا وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور شیخ عاصم؟"

"وہ مردانے میں ہیں۔" غزالہ سر جھکا کر بولی۔

"کیا وہ بھی دوا کے اثر میں ہے؟"

"ہاں۔" غزالہ نے جواب دیا "مردانے میں آٹھ دس افراد ہیں۔ ڈھائی تین گھنٹے تک ان میں سے کوئی بھی گہری نیند سے بیدار نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "کیا تم مجھے تہ خانے کا راستہ دکھاؤ گی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم کوریڈور میں پہنچے۔ یہاں نیلگوں بلب روشن تھا۔ دبیز قالین پر دبے پاؤں چلتے ہم کوٹھی کے شمالی حصے میں آ گئے۔ میری معلومات کے مطابق تہ خانہ دوسری سمت تھا۔

"یہ کہاں لے جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

غزالہ نے میرا سوال نظر انداز کر دیا اور ایک دیوار گیر کھڑکی میں سے مجھے پورچ کا منظر دکھاتے ہوئے بولی "وہ دیکھیں، سبز نمبر پلیٹ والی سیاہ اسٹیشن ویگن کھڑی ہے۔ یہ قونصلیٹ صاحب کے بھائی کی ہے۔ آپ اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ یہ ہے اس کی چابی۔"

غزالہ نے ایک اور چابی میری طرف بڑھا دی۔

پھر وہ مجھے لے کر تہ خانے کی طرف چلی آئی۔ راستے میں میری نگاہ ایک ایسے کمرے میں پڑی جہاں نائٹ بلب روشن تھا اور دو بیڈز پر دو عورتیں بے سُدھ پڑی تھیں۔ یقیناً ان عورتوں کا تعلق مہمانوں سے تھا۔ ہم کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچے تو قمقموں کی وہ لڑیاں نظر آئیں جو کوٹھی کی آرائش کے لیے آویزاں کی گئی تھیں۔ ان آرائشی قمقموں کو دیکھ کر سینے میں عجیب سی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ قمقمے شاید بجلی سے نہیں اس عداوت کے زہر سے روشن تھے جو برسوں سے میرے اور شیخ عاصم کے درمیان پائی جاتی تھی۔ یہ قمقمے ایک ایسی تقریب کی شان بڑھانے کے لیے لگائے گئے تھے جس کی بنیاد جبر پر تھی اور جبر کی "اصلیت" کلیجا پھاڑ دینے والا غم تھا۔ ان قمقموں کو دیکھ کر میرے سینے میں مچلتی ہوئی غیظ و غضب کی لہریں کچھ اور بلند ہو گئیں۔

مجھے تہ خانے کے دروازے پر پہنچا کر غزالہ خاموش کھڑی ہو گئی۔ میں نے غزالہ کو اسٹیشن ویگن کی چابی دی اور اسے کہا کہ وہ ویگن اسٹارٹ کر کے کوٹھی کی عقبی سمت میں لے آئے۔

ویگن پورچ میں بھی کھڑی رہتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن میں غزالہ کو موقع سے ہٹانا چاہتا تھا۔ وہ پورچ کی طرف چلی گئی تو میں نے دروازے کے ہینڈل قفل میں چابی ڈالی اور بہ آہستگی دروازہ کھول دیا۔ تہ خانے کی سیڑھیاں اور ہال کا منحوس منظر میرے سامنے تھا۔ یہی ہال تھا جہاں میں نے نوازش کی بیوی کی عزت تار تار ہوتے دیکھی تھی اور بعد ازاں زریں اور کلثوم کو بھی بدترین خطرات سے دوچار دیکھا تھا۔ بہرحال اب یہ ہال بالکل خالی نظر آ رہا تھا۔ میں سیڑھیوں پر بہ آہستگی پاؤں رکھتا ہال میں پہنچ گیا۔ اوپر گیلری میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کے سوا باقی سب لاک اپس تاریک تھے۔ روشنی والا لاک اپ وہی تھا جہاں میں نے چند روز پیشتر شیخ کی محبوبہ دلنواز یوسا کو پابند سلاسل دیکھا تھا۔ وہ اب بھی لاک اپ میں ہی تھی۔ میں ہال میں سے بھی اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بستر پر محوِ خواب تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں تہ خانے کے اندرونی حصوں کی طرف بڑھا۔ یہ ایک بل کھاتا ہوا کوریڈور تھا جس کی دونوں جانب کمرے تھے۔ ان در و دیوار میں نہ جانے کتنے لوگ اذیت اور ذلت سے دوچار ہو چکے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ انہی کمروں میں کہیں زریں، کلثوم اور قریشی وغیرہ موجود ہیں (شاید میں بتانا بھول گیا کہ فریال کو اس تہ خانے کے چنگل سے آزاد کیا جا چکا تھا اور یہ بات مجھے غزالہ نے تہ خانے کے دروازے پر پہنچ کر بتائی تھی۔) میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بالکل اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے عقب میں موجود ہے۔ میں پھرتی سے پلٹا، ایک سایہ مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے کہ میں کامیاب ہوتا، میری ایڑی کسی چیز سے ٹکرائی اور میں پشت کے بل گرا۔ گرتے گرتے میرا دایاں ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک ہاکی اسٹک تھی۔ معلوم نہیں کہ یہ اسٹک یہاں کیوں کر اور کیسے پہنچی، بہرحال میرے لیے یہ اسٹک بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ میں ماؤزر کا فائر کر کے پورے "ہنی منٹ" کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کسی ایسی شے کی ضرورت تھی جس سے میں مدِمقابل کے سر پر بھرپور ضرب لگا سکوں۔ اس مقصد کے لیے ہاکی سے بہتر چیز بھلا کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے تاک کر بھرپور ضرب لگائی۔ وار مدمقابل کی کنپٹی پر لگا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے سُدھ ہو گیا۔ میں اپنی جگہ پر رُکا رہا اور ردِعمل کا انتظار کرتا رہا مگر اردگرد

سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی۔ اس کا مطلب تھا کہ دھینگا مشتی کی مدھم آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔ مدمقابل اوندھا پڑا تھا۔ کوریڈور سے آنے والی ہلکی روشنی میں وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح حقیر دکھائی دیتا تھا۔ میں اسے پھلانگ کر آگے بڑھا۔ ماؤزر میرے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹریگر پر رکھی تھی۔ ایک قریبی کمرے سے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ شنکر شکرا کے کارندے تھے۔ اس تہ خانے کے تبدی ایسی بے فکری کی نیند کہاں سو سکتے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ شنکر شکرا کی طرف سے تھا۔ وہ آفت زادہ شیطان سے بڑھ کر عیار اور خونی درندے سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو میرے راستے میں تنہا کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت رکاوٹ بن سکتا تھا۔ جب میں اس کے مقابل ہوتا تھا، میری ہر حس پوری طرح بیدار ہو جاتی تھی اور یہ "بیداری" ضروری تھی کیونکہ شنکر کے مقابلے میں ایک لمحے کی غفلت کا مطلب موت تھا۔ جس کمرے سے خراٹے بلند ہو رہے تھے، وہاں ہلکی سی روشنی تھی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، کمرے میں قالین پر شنکر کے تین کارندے سو رہے تھے۔ ان میں جنگلی کبوتر جیسی سرخ آنکھوں والا موہن داس بھی تھا۔ وہی خبیث بلا جس نے میری آنکھوں کے سامنے روتی بلکتی نوازش کی بیوی پر ستم ڈھایا تھا اور اس سے بے بسی کا خراج وصول کیا تھا۔ عزت لٹا کر سسکتی ہوئی عورت کی آواز جیسے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ ماؤزر کی کم از کم تین چار گولیاں اس بدبخت کی کھوپڑی میں اتار دوں لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ ماؤزر کی آواز تہ خانے میں موجود ہر فرد کو بیدار کر سکتی تھی۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نگاہ ایک اندرونی دروازے پر پڑی۔ یہ ایک اور کمرا تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی لیکن دروازے کو باہر سے چائنا کا تالا لگا ہوا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ زریں اور عالم قریشی وغیرہ اسی کمرے میں موجود ہوں گے پھر ایک اور اچھا اتفاق ہوا، میری نگاہ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی چابی پر چلی گئی۔ یہ چابی یقیناً دروازے میں جھولتے ہوئے قفل کی تھی لیکن اس چابی اور قفل تک پہنچنے کے لیے مجھے ان افراد کے درمیان سے گزرنا تھا جو قالین پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ ذرا سی آہٹ انہیں جگا سکتی تھی اور مرنے مارنے پر آمادہ کر سکتی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے ان کے درمیان سے گزرا۔ چابی کے پاس ہی دیوار پر دو ہولسٹر بھی موجود تھے۔ میں نے یہ ہولسٹر ریوالوروں سمیت ایک الماری کے پیچھے چھپا دیے پھر بغیر آواز پیدا کیے قفل کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی

میری نگاہ سب سے پہلے زریں گل پر پڑی۔ وہ پہلو کے بل قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کلثوم دراز تھی۔ نیند کی حالت میں بھی زریں کا ایک ہاتھ کلثوم کے بازو پر تھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ حالت نیند میں کوئی کلثوم کو اس سے چرا کر لے جائے گا۔ زریں گل کا یہ پوز جیسے میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔

عالم قریشی اور اس کی بیوی بھی اسی کمرے میں موجود تھے۔ بیوی سو رہی تھی لیکن عالم قریشی کروٹیں بدل رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی معمولی سی آہٹ اس کی سماعت تک پہنچ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میرے چہرے پر نگاہ پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد میں نے زریں کے ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر اسے جگایا۔ وہ پہلے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اور عالم قریشی نے ایک ساتھ ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد دونوں خواتین کو جگایا گیا۔ نوبیاہتا کلثوم برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ وہی ہنستی مسکراتی کلثوم تھی اور یہ وہی ہنستا مسکراتا زریں گل تھا جو پشاور سے میرے لیے سوغاتوں کی گٹھری لے کر آئے تھے۔ اب تو وہ خود اجڑی بکھری گٹھریوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میں نے ان چاروں کو ایک ساتھ لیا اور بے حد احتیاط کے ساتھ واپس پلٹا۔ ہم دوبارہ اسی کمرے سے گزرنے پر مجبور تھے جس میں شنکر کے کارندے سو رہے تھے۔ شنکر ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہیں موجود ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس سے میرا سامنا نہ ہو۔ اگر میرے ذہن میں شنکر والا اندیشہ نہ ہوتا تو شاید میں موہن داس سمیت کمرے میں سوئے ہوئے تینوں افراد کو بھون کر رکھ دیتا۔

ہم دبے پاؤں ہال میں پہنچے اور پھر تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ میں نے تہ خانے کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم شنکر شکرا جیسے عیار کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ غزالہ عقبی دروازے میں کھڑی تھی۔ میری ہدایت کے مطابق وہ اسٹیشن ویگن عقبی دروازے کے عین سامنے لا کر آئی تھی یعنی ویگن کوٹھی کے پچھلے احاطے میں کھڑی تھی۔

"سب ٹھیک ہے نا؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا "غزالہ! میں ابھی آ رہا ہوں، تم ان لوگوں کو

ویگن میں سوار کرو۔"

وہ چونک کر بولی "کہاں جا رہے ہیں؟"

"یہیں ہوں بس ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

میں نے عالم قریشی کو اپنے ساتھ لیا اور کوٹھی کے مردانے حصے کی طرف بڑھا۔ ماؤزر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ مردانے میں پہنچ کر مجھے وہی مناظر نظر آئے جن کی توقع تھی۔ شیخ عاصم کے پانچ چھ مہمان صوفوں پر لڑھکے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ باتیں کرتے کرتے بتدریج نیند کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ شیشے کی تپائی پر دو کپ دھرے تھے اور ان میں ٹھنڈی تھار چائے بھی نظر آ رہی تھی۔ شیخ عاصم بے تکلف دوستوں کی محفل میں بڑے آرام سے ایک "صوفہ کم بیڈ" پر نیم دراز تھا۔ اس کے سر کے نیچے گاؤ تکیہ تھا اور چہرے کا رخ ٹی وی کی طرف تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے اور وہسکی کی چسکیاں لیتے لیتے سو گیا ہے۔

جونہی میں شیخ عاصم کے نزدیک پہنچا' میری کلائی پر برقی جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ مجھے شیخ کی کلائی پر وہ منحوس گھڑی بھی نظر آ گئی جو میری بہت سی مصیبتوں کی بنیاد تھی۔ یہ گھڑی اتارنے کے لیے میں شیخ کے نزدیک نہیں جا سکتا تھا' اس لیے عالم قریشی کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ میں نے عالم قریشی سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر شیخ کی کلائی سے گھڑی اتارے اور میری طرف آنے کے بجائے گھڑی کے ساتھ دوسرے دروازے سے باہر چلا جائے۔

عالم قریشی اس خطرناک گھڑی کے "فنکشن" اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر شیخ کی کلائی سے گھڑی جدا کی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میری کلائی پر برقی جھٹکے لگنے بند ہو گئے۔ میں آگے بڑھا اور شیخ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میرا بدترین دشمن میرے سامنے تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھا اور میرے ہاتھ میں پکڑے ماؤزر سے بھی۔ میری انگلی کی ایک جنبش اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی لیکن میں اسے مار نہیں سکتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں' جن میں سے ایک یہ تھی کہ شیخ عاصم ہی وہ شخص تھا جو میرے جسم میں چھپے ہوئے الیکٹرانک ڈوائس سے مجھے نجات دلا سکتا تھا اور ایک وجہ یہ تھی کہ شیخ عاصم اب بھی غزالہ کا شوہر نامدار تھا اور شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ایک سوئے ہوئے دشمن کو موت کے گھاٹ اتارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں شیخ کا چہرہ دیکھتا رہا اور اپنے آپ میں کھولتا رہا۔ غیظ و غضب کی شدت سے میری ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ یہی وقت تھا جب میں نے غزالہ کو دیکھا۔ وہ تیزی سے نشست گاہ میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا تفکر تھا' جیسے اسے ڈر ہو کہ میں شیخ عاصم کو نقصان پہنچا جاؤں گا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ماؤزر کو غزالہ نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا پھر اس کی آنکھوں سے ایک خاموش التجا پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں شیخ عاصم سے دور رہوں۔ میرے ہاتھوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ یوں تیزی سے میرے پیچھے چلی آئے گی۔ اس کا آنا اس امر کی گواہی دے رہا تھا کہ شیخ عاصم کے بارے میں اس کے جذبات اب بھی فکرمندی کے ہیں۔

میرے دل سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد' اتنا کچھ دیکھ لینے کے بعد' وہ اب بھی شیخ کے لیے خیر خواہی کے جذبات رکھتی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ میں ماؤزر تو تھما دیا تھا لیکن یہ اجازت نہیں دی تھی کہ میں ماؤزر کا رخ شیخ کی طرف کر دوں۔ وہ کیوں کر رہی تھی ایسا؟ یا وہ اچھائی برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت یکسر کھو چکی تھی۔

شیخ عاصم کی گھڑی اب اتر چکی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں اس کے بالکل پاس چلا گیا۔ غزالہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی اور میری ہر ہر حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

میں نے کہا "غزالہ! شفا کو گاڑی میں بٹھا دیا ہے؟"

"ہاں بٹھا دیا ہے۔" غزالہ نے کہا۔

"تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"میں بیٹھ جاؤں؟" اس نے بے حد حیرت سے کہا۔

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟"

"ہمارے ساتھ۔" میں نے بے حد مستحکم لہجے میں کہا۔

غزالہ بے ساختہ تھوڑا سا پیچھے کھسک گئی۔ اس کی آنکھوں میں انکار ہی انکار تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں میں یہیں رہوں گی۔۔۔ عاصم کے پاس۔"

"لیکن عاصم تو ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔" میرا لہجہ پتھر کی طرح سپاٹ اور سخت تھا۔

"شاہ جہاں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" غزالہ رو دینے کے قریب تھی۔

"یہ میری مجبوری ہے غزالہ!" میری اور شیخ کی دشمنی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ سب کچھ کھل کر سامنے آ چکا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہاں سے آزاد ہو کر بھی شیخ کی گرفت ہی میں رہوں گا۔ جب تک الیکٹرانک ڈوائس کی زنجیر میرے پاؤں سے نہیں نکلتی میرے لیے کہیں بھی پناہ نہیں ہے اور یہ الیکٹرانک ڈوائس صرف اور صرف شیخ کے کہنے پر میرے جسم سے نکل سکتا ہے۔"

"شاہ جہاں! پلیز آپ ایسی باتیں مت کریں۔ میں آپ

کو یقین دلاتی ہوں۔"

"یقین دلانے سے کچھ نہیں ہو گا غزالہ! اس سے پہلے بھی تم لاتعداد مرتبہ شیخ پر یقین کر کے دیکھ چکی ہو۔ نتیجے میں شرمندگی اور مایوسی کے سوا کچھ بھی تمہارے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہارا دل جتنی بار چاہے اس سے دھوکا کھاؤ لیکن میں مزید دھوکا نہیں کھا سکتا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ میری زندگی کی آخری سانس تک شیخ الیکٹرانک ڈوائس میرے جسم سے نہیں نکالے گا۔ یہ کام جب بھی ہو گا' شیخ کو مجبور کرنے سے ہو گا۔"

غزالہ کا جسم سر تاپا لرزنے لگا تھا "یہ ٹھیک نہیں شاہ جہاں! جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں' یہ بالکل غلط ہے۔ یہ دشمنی اور بڑھے گی اور خون خرابا ہو گا۔"

"جو کچھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ کچھ بھی برا نہیں ہو گا غزالہ۔ میں شیخ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ ہاں میں یہ وعدہ کرتا ہوں تم سے کہ اس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ جیسے جا رہا ہے' ویسے ہی صحیح سلامت یہاں واپس پہنچے گا اور یہ وعدہ شیخ کے وعدوں جیسا نہیں ہے۔"

ہم نشست گاہ کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ ہمارے ارد گرد نیم بے ہوش افراد مردہ چھپکلیوں کی طرح بے سُدھ پڑے تھے اور ان میں شیخ عاصم بھی شامل تھا۔ ہم شیخ عاصم کے سر پر کھڑے اس کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے اور ... مجبور محض تھا۔

اس سے پہلے کہ غزالہ کوئی جواب دیتی' میں نے جھک کر شیخ عاصم کو کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ ایک وزنی شخص تھا' بے ہوشی کے سبب کچھ اور بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ غزالہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں میری خیر خواہ بھی ہے اور شیخ عاصم کی ہمدرد بھی۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "پلیز شاہ جہاں! اتنا خطرناک کام مت کریں۔ آپ عاصم کو اور عاصم کے خاندان کے اثر و رسوخ کو نہیں جانتے۔ یہ قبائلی لوگ ہیں۔ ان کے پیچھے پورے قبیلے کی طاقت ہے۔ یہ آپ کا جینا حرام کر دیں گے۔"

میں نے زہر خند لہجے میں کہا "یہ تمہاری سادگی ہے کہ میرے لیے جینے کو اب بھی اہم سمجھتی ہو۔"

کچھ کہنے کے لیے غزالہ کا منہ کھلا لیکن میں قدم آگے بڑھا چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ تن کر میرے راستے میں کھڑی ہو جائے گی یا میرے ہاتھ سے ماؤزر لینے کی کوشش کرے گی لیکن پھر سنگین ترین لمحہ گزر گیا۔ میں غزالہ کے پاس سے ہو کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

چند ہی لمحے بعد میں شیخ عاصم کا نیم بے ہوش جسم اسٹیشن ویگن میں لاد رہا تھا۔ اسٹیشن ویگن میں زریں گل' کلثوم' عالم قریشی اور اس کی بیوی موجود تھے۔ اس کے علاوہ وہ جو بھی تھا جو میرے دل کی سیپی میں کسی موتی کی طرح جگمگا رہا تھا۔ یہ میری "ماں جائی" کا چہرہ تھا' میری شفتا کا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ سسکنے لگی۔ میں نے ماؤزر عالم قریشی کو تھمایا اور خود آگے جا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

غزالہ اسٹیشن ویگن سے آٹھ دس قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ وہ جیسے تذبذب کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ میں نے اسٹیشن ویگن اسٹارٹ کرنے کے بعد منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم جھٹکے سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر گاڑی میں آ بیٹھی۔ میں نے گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھائی۔ جب ہم عقبی دروازے کے پاس سے گزرے تو مجھے کہیں اندر سے دروازہ پیٹے جانے کی زور دار آوازیں آئیں۔ یقیناً "بیس منٹ" کا دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ "بیس منٹ" میں موجود لوگ خواب آور دوا کے اثر میں نہیں تھے لہٰذا ان میں سے کوئی بیدار ہو گیا تھا اور اب وہ سب باہر نکلنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ میں دروازے کو مقفل کرنے کے علاوہ باہر سے بولٹ بھی کر آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دروازہ پیٹا جا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز پوری کوٹھی میں گونج رہی تھی لیکن جن کو یہ آواز سنائی جا رہی تھی وہ لمبی تان کر سو رہے تھے۔ ہم کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکلے۔ چوکیدار اپنے کیبن کے قریب بچھی ہوئی ایک چٹائی پر بے سُدھ پڑا تھا۔ اسٹیشن ویگن فراٹے بھرتی ہوئی باہر نکلی اور ڈیفنس کی سنسان کشادہ سڑک پر پھسلنے لگی۔

عالم قریشی میرے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رسٹ واچ اس کے پاس نہیں ہے یا وہ اس کا سسٹم آف کر چکا ہے۔ میرا دوسرا قیاس درست تھا۔ میرے استفسار پر عالم قریشی نے مجھے گھڑی دکھائی اور بتایا کہ یہ بٹن دبانے سے دست واچ پر سگنل کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔

میں نے عالم قریشی سے گھڑی لے کر احتیاط سے ڈیش بورڈ میں مقفل کر دی۔ یہ گھڑی میرے لیے دستی بم یا ٹائم بم سے زیادہ خطرناک تھی۔ کسی غلطی کے سبب گھڑی کا بٹن دب جاتا تو مجھے ناقابلِ تلافی جانی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میری نگاہ بار بار عقب نما آئینے کی سمت اٹھ رہی تھی۔ ہمارا عقب خالی تھا۔ میرا دھیان گھوم پھر کر شنکر ٹھکرا کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ

ایسا شخص نہیں تھا کہ اسے اتنی آسانی سے مات دی جا سکتی۔ معلوم نہیں کہ وہ کوٹھی میں تھا بھی یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم "بیس منٹ" میں تو نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو شدید مزاحمت کے بغیر ہمیں نکلنے نہ دیتا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی اور میں بری طرح چونک گیا۔

میں نے عالم قریشی سے پوچھا "قریشی! شنکر تہ خانے ہی میں تھا؟"

"اور کہاں ہوتا تھا' اس کُتیا کے بچے نے۔"

"لیکن وہ نظر نہیں آیا؟"

"پتا نہیں کیوں نظر نہیں آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ جاگ رہا تھا۔"

میں نے کہا "قریشی! کچھ یاد ہے تمہیں کہ شنکر نے کیا پہن رکھا تھا؟"

وہ ذرا ذہن پر زور دے کر بولا "آدھی آستین کی نیلی قمیص تھی اور میرا خیال ہے خاکی پتلون تھی۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جو شخص تہ خانے میں ہاکی اسٹک کی چوٹ کھا کر اتنا شتنیل ہوا تھا' اس نے یہی لباس پہن رکھا تھا۔۔۔ تو کیا میں نے بے خبری میں شنکر کو مار گرایا تھا۔ یہ خیال بے حد سنسنی خیز تھا اور جتنا سنسنی خیز تھا' اتنا ہی دکھ دینے والا بھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بے ہوش ہو کر گرنے والا شخص شنکر ہی ہے تو میں کبھی اسے زندہ نہ چھوڑتا۔ اسی جگہ جان سے مار دیتا لیکن مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ جگہ خاصی تاریک تھی پھر چوٹ کھا کر شنکر گرا بھی اوندھے منہ تھا۔ ہال سے اندر آنے والی روشنی میں مجھے صرف اس کا پہلو نظر آیا تھا۔ نیلی قمیص اور خاکی پتلون ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ میں سوچنے لگا' بے خبری میں انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے۔ کرکٹ' فٹ بال اور دیگر کھلاڑی بے خبری میں بڑے بڑے ریکارڈ بنا گزرتے ہیں بغیر کسی ہچکچاہٹ اور اعصابی دباؤ کے وہ اہم سنگِ میل عبور کر لیتے ہیں۔ اسی طرح دیگر شعبوں میں بھی بے خبری اور لاعلمی کبھی کبھی انسان کے لیے گراں قدر کامیابیوں کا سبب بنتی ہے۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ میرا مدِمقابل شیطان ابن شیطان شنکر ٹھکرا ہے ورنہ ممکن تھا کہ میں اعصابی کشیدگی کا شکار ہوتا اور اتنی آسانی سے اسے زیر نہ کر سکتا۔ ہاکی اسٹک کی چوٹ عین اس کی کنپٹی پر لگی تھی اور اس کے پاس بے ہوش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

اسٹیشن ویگن برق رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ زریں گل نے پوچھا "استاد صیب! ام کہاں جا رہا ہے؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو ہمیں شہر سے نکلنا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کہاں جانا ہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! کیا ام تھوڑی دیر کے لیے اسپتال نہیں جا سکتا؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کلثوم کا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے چکر آ رہا ہے۔"

میں نے غزالہ سے کہا کہ وہ کلثوم کو چیک کرے۔

غزالہ کے پاس معائنے کا سامان تو نہیں تھا۔ بہرحال اس نے کلثوم کو نشست پر لٹا کر اسے اچھی طرح دیکھا۔ چند منٹ بعد بولی "پریشانی کی بات نہیں' معمولی سی کمزوری ہے۔ جس کی وجہ سے بلڈ پریشر تھوڑا سا کم محسوس ہوتا ہے۔"

اسی دوران میں ایک پولیس ناکے پر ہمیں روک لیا گیا۔ یہ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ ہم فیروز پور روڈ سے گزر رہے تھے۔ یہ غالباً کوئی خصوصی ناکا تھا ورنہ سبز نمبر پلیٹ کے ہوتے ہوئے ہمیں روکا نہ جاتا۔ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ ایک سب انسپکٹر نے مجھ سے کاغذات طلب کیے۔ میں نے ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈالا اور رجسٹریشن نکال لی۔ رجسٹریشن بک سب انسپکٹر کو دینے سے پہلے میں نے گاڑی کے مالک کا نام پڑھ لیا تھا۔ رجسٹریشن بک کے بعد سب انسپکٹر نے لائسنس دیکھا۔ اتفاقاً لائسنس پر لگی ہوئی تصویر کسی ایسے شخص کی تھی جو میری ہی عمر اور میرے ہی ڈیل ڈول کا تھا۔

میں نے شفتا اور غزالہ کو آنکھ سے اشارہ کر دیا تھا۔ وہ شیخ عاصم کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی تھیں اور انہوں نے چہروں پر پریشانی سجا لی تھی۔ (ویسے حقیقی طور پر بھی وہ پریشان ہی تھیں) جونہی پولیس والوں کی نگاہ شیخ عاصم پر پڑی وہ چونک گئے۔ شیخ عاصم نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اور نشست پر دراز تھا۔

"یہ صاحب کون ہیں؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ امرجنسی اسپتال لے جا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے جائیں۔" سب انسپکٹر نے کاغذات کے تفصیلی معائنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور ہمیں جانے دیا۔

راوی کا پل کراس کر کے ہم نے گاڑی شیخوپورہ روڈ پر ڈال دی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم اس گاڑی سے نجات حاصل کر لیں۔ تہ خانے میں جو لوگ دروازہ پیٹ رہے تھے وہ زیادہ دیر تہ خانے میں نہیں رہ سکتے

تھے۔ ان کے باہر نکلتے ہی یہ راز طشت ازبام ہوجاتا تھا کہ قونصلیٹ کی گاڑی پورچ سے غائب ہے۔ اس کے علاوہ تہ خانے کے قیدیوں اور شیخ عاصم کی گمشدگی کو بھی واز نہیں رہنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ بے حد برق رفتاری سے سیاہ اسٹیشن ویگن کی تلاش شروع ہوجائے گی۔ قدرت کی طرف سے اسٹیشن ویگن سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ہمیں اچھا موقع مل گیا۔ شاہدرہ سے چار پانچ میل آگے ہمیں سڑک کے کنارے ایک اور ویگن کھڑی نظر آئی۔ ویگن کے ونڈ اسکرین پر گلاب اور موتیے کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ یقیناً یہ ویگن کسی شادی یا مہندی وغیرہ کی رسم میں شرکت کرکے واپس آئی تھی۔ ڈرائیور کنارے کی جھاڑیوں میں بیٹھا پیشاب کررہا تھا۔

ہم نے اسٹیشن ویگن روکی اور سب سے پہلے نیم بے ہوش شیخ عاصم کو اٹھا کر دوسری ویگن میں لٹایا۔ اسی دوران میں ویگن کا ڈرائیور بھی فارغ ہوکر واپس آگیا تھا۔ وہ حیرت سے ہماری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا مسخری ہورہی ہے بھئی؟" اس نے کہا۔

میں نے اس سوال کا بڑا مختصر جواب دیا۔ یہ جواب ماؤزر کی ایک طوفانی ضرب کی صورت میں تھا۔ یہ ضرب ڈرائیور کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح عالم قریشی کی بانہوں میں جھول گیا۔ ہم نے اسے اٹھا کر ویگن میں ڈالا اور پھر خود بھی ویگن میں منتقل ہوگئے۔ ویگن میں زرق برق لباس پہن کر بیٹھنے والی خواتین نہ جانے کہاں تھیں لیکن ان کی خوشبو ابھی تک ویگن میں چکرا رہی تھی۔

شیخوپورہ روڈ کی حالت قدرے بہتر تھی، ویگن تیزی سے اپنا سفر طے کرنے لگی۔ زریں گل نے پھر پوچھا "استاد صیب! ام کہاں جائے گا۔"

میں نے کہا "بے فکر رہو۔ جہاں بھی لے جاؤں گا وہ محفوظ جگہ ہوگی۔"

وہ لرزاں آواز میں بولا "استاد صیب! یہ اماوے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ام نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ ام اپنی بیوی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ اماوے سامنے کتنا برا سلوک ہوا اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "زریں گل! بزرگ کہتے ہیں کہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ بے شک جو ہوا وہ برا تھا لیکن کیا تمہارے لیے یہ شکر کا مقام نہیں کہ کلثوم کی آبرو بچ گئی ہے۔ اس کے ساتھ کھینچا تانی ہوئی ہے، اس کے کپڑے پھٹے ہیں لیکن ناپاک ہاتھ اس سے دور رہے ہیں۔"

زریں گل خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی یورش سے سرخ تھیں۔ وہ گاہے گاہے جلتی نظروں سے شیخ عاصم کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

میں نے زریں سے پوچھا کہ وہ ناگوٹ (پشاور) سے لاہور کیونکر پہنچا۔ زریں نے بتایا "امارے پاس اُدھر ناگوٹ میں شیخ عاصم کا نوکر جانوں آیا تھا۔ جانوں کو آپ اچھی طرح جانتا ہے۔ جانوں نے ام کو بتایا کہ اُدھر لاہور میں تانگے پر جاتے ہوئے آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ آپ اپنے کسی انگریز دوست کو تانگے کی سیر کرا رہا تھا۔ اس حادثے میں آپ کے دونوں پاؤں پر چوٹیں آیا تھا لیکن اب آپ تندرست ہے اور ام کو یاد فرما رہا ہے۔ ام میاں بیوی یہ اطلاع سن کر فوراً لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ ام کو کیا معلوم تھا یہاں اماوے لیے کیا جال بچھا ہوا ہے۔ ام شیخ عاصم کے بارے میں اب اچھے خیالات رکھنے لگا تھا۔ امارا خیال تھا کہ وہ بہت بدل گیا ہے۔ ام کو کیا پتا تھا کہ اندر سے وہ خنزیر اب بھی اماری جان اور آبرو کا دشمن ہے۔"

غزالہ ویگن کے پچھلے حصے میں تھی۔ ویسے بھی انجن کا شور تھا لہٰذا زریں کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچی ورنہ اپنے شوہر کے بارے میں زریں کے القابات سن کر وہ ضرور متاثر ہوتی۔

میں نے عالم قریشی سے پوچھا "قریشی! تم کیسے پھنسے اس شکنجے میں؟"

وہ بولا "مجھے تو باقاعدہ اغوا کیا گیا ہے یار! میں 'چھوٹی' کے ساتھ کھانا کھانے مزنگ چونگی جارہا تھا۔ غلطی شاید میری ہی تھی کہ گاڑی کے دروازے لاک نہیں کیے تھے۔ جیسے ہی سینما والے اشارے پر گاڑی رکی تو دو بندے تیزی سے اندر گھس آئے۔ انہوں نے میری گردن سے پستول لگا دیا اور دھمکی دی کہ میں گاڑی ڈیفنس کی طرف موڑ دوں۔ وہ نشے میں ٹن ہورہے تھے۔ مجھے لگا کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ بغیر سوچے سمجھے گولی چلا دیں گے۔ مجبوری کی حالت میں، میں گاڑی چلاتا رہا اور آخر شیخ کی منحوس کوٹھی میں پہنچ گیا۔"

عالم قریشی کے رخسار پر گہری چوٹ تھی اور ایک ہاتھ کی انگلی بھی موچ کر گیا ہورہی تھی۔ یہ چوٹیں اسے شیخ عاصم کے عقوبت خانے میں ہی پہنچی تھیں۔ زریں کی طرح وہ بھی گاہے گاہے خشمگیں نظروں سے شیخ عاصم کو دیکھ لیتا تھا۔

صبح ساڑھے پانچ کے قریب ہم جھنگ پہنچے اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر جھوک ضامن پہنچ گئے۔ وہی جھوک

ضامن جہاں میں اٹک جیل سے اغوا ہونے کے بعد پہنچا تھا۔ یہ سارا علاقہ قادر زماں کی جاگیر تھا اور اسی جاگیر سے میری کہانی کا دوسرا دور شروع ہوا تھا۔ جاگیردار کی حویلی کے بلند و بالا برج، غلام گردشیں، بونے ملازم، اصطبل سب کچھ مجھے یاد تھا اور وہ لڑکی نجو بھی جو کالی بھجنگ تھی لیکن شکل و صورت اور جسمانی کشش کے اعتبار سے نہایت حسین تھی۔

قادر زماں کے ساتھ میرے تعلقات میں اب مثبت تبدیلی واقع ہوچکی تھی۔ قادر زماں پنجاب کے طاقتور ترین سیاست داں مجتبیٰ کنور کے حواریوں میں شامل تھا اور مجتبیٰ کنور دفینے کے سلسلے میں میری خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ مجتبیٰ کنور کو امریکی ادب جی مسٹر جی کلارک اسپانسر کررہے تھے۔ اس اسپانسر شپ کا مطلب تھا بے شمار ڈالر اور ڈالر کس کو عزیز نہیں ہوتے! مجتبیٰ کنور اور قادر زماں کو بھی عزیز تھے۔ دفینہ ملتا یا نہ ملتا لیکن ان دونوں کو ڈالر تو اندھا دھند مل رہے تھے۔

میں ویگن سیدھا جاگیردار قادر زماں کی حویلی کے مین گیٹ پر لے گیا۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہوگیا تھا۔ خوش گوار ہوا چل رہی تھی اور حویلی کے اردگرد موجود درختوں پر اوس کی چمک تھی۔ اس حویلی اور اس قصبے کا تقریباً ہر فرد مجھے پہچانتا تھا۔ گیٹ پر موجود مسلح کارندوں نے فوراً قادر زماں کو میری آمد کی اطلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قادر زماں میرے سامنے تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ حسب معمول دو بلوری بونے باڈی گارڈز اس کے ساتھ تھے۔

قادر زماں نے بڑے جوشیلے انداز میں آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگایا پھر زریں گل اور عالم قریشی سے مصافحہ کیا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ ویگن کے اندر دونوں بے ہوش افراد پر پڑ گئی۔ ان میں سے ایک تو ویگن کا ڈرائیور تھا اور دوسرا امارات کا وہ امیر کبیر شخص جو اپنی ذات میں فرعون تھا اور جس کے ایک اشارے پر قسمتوں کے دروازے کھلنے اور بند ہوتے تھے۔ وہ ویگن کی پچھلی پرانی نشست پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی بے ہوشی اب نیند میں بدل چکی تھی اور یہ نیند اب کسی بھی وقت بیداری میں ڈھل سکتی تھی۔ غزالہ شیخ عاصم کے قریب سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر غم و اندوہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

قادر زماں نے حیرت ناک نظروں سے شیخ عاصم کو دیکھا پھر اس کی سوالیہ نظریں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے کہا "ہاں۔ یہ شیخ عاصم ہی ہے۔"

قادر زماں بولا "جان جی! یہ تو بہت بڑا آدمی ہے۔ تم نے اسے کیسے پھینکا ہوا ہے اس کھٹارا گاڑی میں۔۔۔ اور یہ تمہارے ہاتھ لگا کیسے ہے؟"

میں نے کہا "یہ لمبی کہانی ہے۔ آرام سے سناؤں گا۔" درحقیقت میں غزالہ کے سامنے شیخ کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔

قادر زماں کے اشارے پر اس کے کارندے آگے بڑھے اور انہوں نے ویگن کو اپنے حصار میں لے لیا۔ غزالہ متفکر نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا "غزالہ! جو وعدہ میں نے تم سے کیا ہے، اس پر قائم رہوں گا۔ تمہیں لاعلم رکھ کر شیخ کے ساتھ کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔"

میں نے غزالہ اور شفقا کو حویلی میں بھیج دیا۔ زریں، کلثوم، عالم قریشی اور اس کی بیوی بھی ساتھ ہی گئے۔ ویگن کے بے ہوش ڈرائیور کو ویگن ہی میں رہنے دیا گیا جب کہ شیخ عاصم کو قادر کے کارندے اٹھا کر باہر لے آئے اور ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ اسے چارپائی پر ڈال کر اندر لے جانا چاہتے تھے لیکن چارپائی کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی شیخ عاصم ہوش میں آگیا۔ "بلفک 22" نامی دوا کا اثر بالآخر ختم ہوگیا تھا۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے چندھیائی نظروں سے اردگرد دیکھتا رہا پھر اچانک اسے ماحول کی تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ اپنی ڈیفنس والی کوٹھی میں بے تکلف دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگا رہا تھا جب اس پر بتدریج شدید غنودگی کا حملہ ہوا تھا۔ اب وہ ڈیفنس کی کوٹھی سے کوسوں دور قادر زماں کی حویلی کے سامنے چارپائی پر پڑا تھا اور اس کے اردگرد جاگیردار کے مسلح کارندے تھے۔

شیخ کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ چیخ کر بولا "شاہ جہاں! یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ میں کہاں دیکھ رہا ہوں خود کو؟"

"تم خود کو بڑی مناسب جگہ پر دیکھ رہے ہو۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب تمہارے اندر بہت سی انقلابی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔"

شیخ عاصم اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بہت کڑی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جیسے ایک ہی کوشش میں بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کے ہونٹوں سے سانپ جیسی پھنکار نکلی "شاہ جہاں! لگتا ہے کہ تجھ کو عزت راس ہی نہیں ہے۔ میں تجھے مان اور مرتبہ دینے کی کوشش کررہا ہوں لیکن تو ذلت کے گڑھے میں گرنے کے لیے ہاتھ چھڑا چھڑا کر بھاگ رہا ہے۔۔۔ جانتا ہے تیری اس حرکت کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "نتیجہ سوچ کر ہی حرکت کی ہے۔"

میرے اطمینان نے شیخ عاصم کی پریشانی میں اضافہ کردیا۔ یقیناً اس کا دھیان فوری طور پر شفقنا کی طرف گیا تھا اور میرے ان ساتھیوں کی طرف گیا تھا جنہیں اس نے تہ خانے میں یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا "شفقنا کہاں ہے؟"

"شفقنا اب محفوظ ہاتھوں میں ہے اور وہ بے گناہ بھی جنہیں تم تہ خانے میں اذیتیں پہنچا رہے تھے۔"

شیخ عاصم کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ میں اس کے بالکل قریب موجود ہوں۔ تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر۔ اس کی نظر بے اختیار اپنی کلائی پر گئی۔ وہاں گھڑی موجود نہیں تھی وہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"شاہ جہاں! تم نے بڑے اچھے وقت پر ایک بہت برا قدم اٹھالیا ہے۔ مجھے تمہاری اور تمہاری بہن کی بدبختی پر رونا آرہا ہے۔"

میں نے قادر زماں کے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے شیخ عاصم کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ دو مسلح اہلکار اس کے پیچھے ہوگئے۔ یوں ایک قیدی کی حیثیت سے شیخ عاصم جھوک خناسن کی بلند و بالا حویلی میں داخل ہوا۔

میں نے قادر زماں سے کہہ دیا کہ شیخ کی حیثیت یہاں ایک اہم قیدی کی سی ہے اور اسے کڑی نگرانی میں رکھنا ہوگا۔

شیخ عاصم کو حویلی کے اندرونی حصے میں بھیج دیا گیا۔ میں اور قادر زماں حویلی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ زریں گل اور عالم قریشی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ خواتین کو زنان خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ قادر زماں میرے سامنے بچھا جارہا تھا۔ یہ وہی قادر زماں تھا جس نے اس حویلی میں مجھ پر عرصہ حیات تنگ کردیا تھا۔ آج وہ اپنے مفاد کے لیے میزبانی کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ فی الحال وہ میرے بارے میں کسی کو اطلاع نہ پہنچائے۔ ویسے بھی تھیچی کنور اور مسٹر جی کلارک وغیرہ دفینے کے سلسلے میں اٹلی یاترا کررہے تھے اور وہی دونوں افراد تھے جنہیں اطلاع پہنچانے کے لیے قادر زماں بے تاب ہوسکتا تھا۔

ہم سب کے حلیے ابتر تھے۔ قادر زماں نے فوری طور پر غسل اور لباس کا انتظام کیا۔ میں نہانے کے لیے غسل خانے کی طرف جارہا تھا جب اچانک چیخ و پکار کی آوازوں نے مجھے متوجہ کرلیا۔ جس آواز نے مجھے خاص طور سے چونکایا وہ زریں گل کی دہاڑ تھی۔ میں اپنا راستہ بدل کر آوازوں کی طرف لپکا۔ ایک قالین پوش راہداری سے گزر کر میں مہمان خانے کی طرف آیا۔ مہمان خانے کے کوریڈور میں دو افراد گتھم گتھا تھے۔ ان میں سے ایک یقیناً زریں گل تھا۔ میں اس کی سرخ قمیص دور ہی سے پہچان سکتا تھا پھر مجھے دوسرے شخص کی صورت نظر آئی اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ شیخ عاصم تھا۔ وہی شیخ عاصم جس کے نوکروں کے نوکر بھی زریں گل سے زیادہ باحیثیت تھے۔ وہی شیخ عاصم، زریں کے نیچے تھا اور زریں اس پر تابڑ توڑ گھونسے برسا رہا تھا۔ یوں نظر آرہا تھا جیسے زریں اپنے ہوش کھوچکا ہے۔ قادر زماں کے دو تین کارندے زریں کو شیخ کے اوپر سے کھینچنے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ جونک کی طرح شیخ سے چمٹ گیا تھا۔

"زریں۔" میں نے چیخ کر کہا اور ان دونوں کی طرف دوڑا۔

میرے پہنچتے پہنچتے شیخ کی قمیص پھٹ گئی اور اس کا بالائی جسم نیم عریاں ہوگیا۔ زریں گل کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ نتیجے کی پروا کیے بغیر شیخ کو جان سے مار ڈالتا۔ اس کی دہاڑیں بلند و بالا دیواروں کے اندر گونج رہی تھیں "حرام زادے! تُو نے ایک پٹھان کی آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ام تیرا جان لے لے گا۔ خود مرجائے گا یا تجھے مار دے گا۔ اوئے بدبخت ام تیرا ٹانگیں نہ چیر ڈالے تو اپنے باپ کا نہیں ہے۔"

میں نے لپک کر زریں گل کو شیخ عاصم کے اوپر سے ہٹانا چاہا مگر اس نے مجھے دیکھے بغیر پورے زور سے ٹانگ چلائی۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ عین اسی وقت غزالہ بھی ایک جانب سے نمودار ہوگئی۔ اس نے زریں گل کو شیخ عاصم کے اوپر دیکھا تو اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ زریں گل اب پوری قوت سے شیخ کا گلا دبا رہا تھا۔ قادر زماں کے کارندے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پارہے تھے کہ زریں گل کو کیسے اور کتنی شدت سے روکیں۔ غزالہ کی ترس ناک صورت دیکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر زریں گل پر جھپٹ کر اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔

"چھوڑ دو زریں گل! پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے تحکم سے کہا۔

زریں گل زار و قطار رو رہا تھا "نہیں استاد صیب! ام آج آپ کی بات بھی نہیں مانے گا۔ ام کسی کی نہیں مانے گا۔ مارے گا یا مر جائے گا۔"

یوں لگ رہا تھا کہ اسے کوئی دماغی دورہ پڑ گیا ہے۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچا اور اپنے ساتھ لیتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

○☆○

منظر قادر زماں کی حویلی کے ایک شاندار کمرے کا تھا۔ بھاری بھرکم پردے، دبیز قالین، جہازی سائز کی تصویریں، خالص جاگیردارانہ ماحول تھا۔ غزالہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی "شاہ جہاں! آپ اور عاصم چکی کے دو پاٹوں کی طرح ہوگئے ہیں۔ میں ان کے درمیان پس کر رہ گئی ہوں۔ آپ دونوں کیوں کررہے ہیں اس طرح میرے ساتھ ــــ؟"

میں نے کہا "غزالہ! تم نے مجھے اور عاصم کو ایک ساتھ کھڑا کردیا ہے۔ کیا یہ تمہاری زیادتی نہیں ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولی "مجھے کچھ پتا نہیں کہ کس کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے اور کون کررہا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ آپ نے کیا رسپانس دیا ہے میری کوشش کا۔ میں نے شفقنا کی خاطر اور آپ کے دوستوں کی خاطر کتنا بڑا قدم اٹھایا۔ میں جانتی تھی کہ عاصم مجھ پر بے انتہا خفا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ میری ازدواجی زندگی ہی خطرے میں پڑ جائے لیکن میں نے آپ کے لیے یہ رسک لیا لیکن آپ میری مرضی کے خلاف عاصم کو زبردستی یہاں اٹھوا لائے پھر آپ نے وعدہ کیا کہ عاصم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی لیکن یہاں آنے کے ایک گھنٹے بعد ہی اس وعدے کی دھجیاں بکھر گئیں۔ آپ کے دوست نے جانوروں کی طرح عاصم کو مارا۔ ان کے ہونٹ پھٹ گئے اور کپڑے تار تار ہوگئے۔ یہ تو ابتدا ہے، آئندہ نہ جانے کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "غزالہ! تمہاری اور میری سوچ میں بہت فرق آچکا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ میں نے عاصم کو یہاں لاکر تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میرا خیال برعکس ہے۔ جو کچھ تم نے کردیا تھا اس کے بعد عاصم تمہیں کبھی معاف نہیں کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا ٹھکانا بھی "بیس منٹ" قرار دیا جاتا جہاں مجھے اور میرے ساتھیوں کو رکھا گیا تھا ــــ میں ایک بار پھر اپنی بات دہراؤں گا غزالہ ــــ شیخ عاصم تمہارا شوہر نہیں۔ وہ ایک خطرناک بہروپیا ہے۔ اپنے مطلب کی خاطر وہ تمہیں بڑی سفاکی سے ایک مہرے کی طرح استعمال کررہا ہے اور تم بڑے پاگل پن سے استعمال ہورہی ہو۔ میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ تم اب اس میں اور کیا دیکھنا چاہتی ہو۔ اب اور کیا دلیل رہ گئی ہے اس بدبخت کے حق میں ــــ مجھے کہنے دو غزالہ کہ وہ ایک بدترین شخص ہے۔"

غزالہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ سسکیاں خود بخود اس کے ہونٹوں سے نکلتی جارہی تھیں۔ شاید وہ خود بھی حیران تھی کہ اپنے شوہر کی صفائی میں کیا کہے اور کیونکر کہے۔

میں نے کہا "غزالہ! اگر تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود ہے کہ تم شیخ کی اصلاح کرسکتی ہو تو اس سے بڑی غلط فہمی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہ آج بھی مکمل طور پر ناقابل اصلاح ہے اور کل بھی رہے گا۔ ٹھیک ہے کہ اس سے شادی کرکے ایک غلطی تم سے ہوچکی، اب اس بدبخت کی غیر مشروط طرف داری کرکے دوسری سنگین غلطی مت کرو۔"

وہ کراہی "شاہ جہاں! میں عاصم کے ساتھ اپنی وابستگی سے منحرف نہیں ہوسکتی۔ آپ میرے سامنے عاصم کو گالی دے کر میری ذہنی اذیت میں اضافہ کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "غزالہ! تمہاری ذہنی اذیت تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ جہاں تک عاصم کا تعلق ہے وہ بدترین سلوک کا مستحق ٹھہر چکا ہے۔ تم ذرا خود کو اپنی شوہر پرستی سے الگ کرکے سوچو۔ جو شخص مجبور عورتوں کو ان کے لواحقین کے سامنے درندگی کا نشانہ بناتا ہے، قتل کرتا ہے، اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر انتہا سے گزر جاتا ہے، اسے گالی دینا جرم ہے۔ میرے خیال میں تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بھوکے کتوں کے آگے پھینک دیا جائے تو بھی یہ سزا بہت معمولی ہے۔"

غزالہ نے بے ساختہ میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا کلیجا تھام رکھا تھا۔ وہ کراہ کر بولی "شاہ جہاں! مجھے خود پر اختیار نہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا دل دو ٹکڑے ہوگیا ہے۔ ایک ٹکڑا آپ کے لیے دھڑک رہا ہے اور دوسرا عاصم کے لیے۔"

"میں نے کہا ہے نا غزالہ کہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔ شیخ عاصم نے میرے لیے دشمنی کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ تم نے اپنے گھر میں میری مدد کی، میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس شکر گزاری کی خاطر میں خود کو شیخ کا ہاتھ بندھا غلام نہیں بنا سکتا۔ مجھے ہر صورت وہ زنجیر توڑنی ہے جو شیخ نے مجھے پہنا رکھی ہے۔ اگر شیخ سیدھی طرح مان جائے گا تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا، دوسری صورت میں میں اپنے وعدے کا پابند نہیں رہوں گا۔ مجھے شیخ کو مجبور کرنا پڑے گا کہ وہ

الیکٹرانک ڈوائس میرے جسم سے نکلوائے۔"

میرے دو ٹوک لہجے نے غزالہ کو چونکا دیا "تو آپ ان پہ۔۔۔۔ سختی کریں گے؟"

"کرنی پڑی تو ضرور کروں گا لیکن پھر بھی یہ سختی اس سختی کا عشر عشیر بھی نہیں ہوگی جو شیخ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر کرتا رہا ہے۔ غزالہ وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ میں کہنا نہیں چاہتا لیکن مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ درندگی کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ تمہیں اس بات پر افسوس ہے کہ زریں گل نے اس کا گریبان پکڑا ہے اور اسے مارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو معمولی بات ہے غزالہ۔ ایسے ظالموں کو تو لوگ گھسیٹتے ہوئے گلیوں میں لے آتے ہیں۔ ان کے گلے میں رسی ڈالتے ہیں اور انہیں بازاروں میں کھینچتے ہیں۔"

غزالہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ ریشمی لٹوں نے پھسل کر اس کا چہرہ مجھ سے چھپا لیا۔ پتا نہیں اس کے تاثرات کیا تھے۔ اس کی نحیف آواز میرے کانوں تک پہنچی "شار جہاں! آپ نے جو بات کہی ہے' میں اسے دل سے تسلیم کرتی ہوں۔ الیکٹرانک ڈوائس آپ کے جسم سے نکلنا چاہیے۔ آپ کو آزادی سے رہنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک موقع اور دیں۔ میں اس سلسلے میں عاصم سے خود بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب رہوں گی۔ اگر وہ اب بھی نہ مانے تو پھر آپ کو اپنی مرضی کرنے کا اختیار ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے غزالہ! میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں لیکن اس کام کے لیے میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تمہیں کل صبح تک مجھے حتمی نتیجے سے آگاہ کرنا ہوگا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا "لیکن میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں غزالہ۔۔۔۔ میں شیخ عاصم کے حوالے سے بدترین خدشات دل میں رکھتا ہوں۔ مجھے یہ خدشہ بھی لاحق ہے کہ کہیں عاصم تمہیں میرے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال نہ کرے۔ وہ پوری طرح کھل کر سامنے آچکا ہے۔ یہ بعید نہیں کہ وہ تمہیں یرغمال بنا لے اور۔۔۔۔"

"پلیز شاہ جہاں!" غزالہ نے میری بات قطع کی "آپ کسی مفروضے کی بنا پر مجھے عاصم کے پاس جانے سے مت روکیں۔ پلیز۔"

میں نے غزالہ کو عاصم کے پاس بھیج دیا۔ عاصم کو حویلی کے مہمان خانے میں رکھا گیا تھا اور آغا قادر زماں کے نمک خوار ملازم اس کا کڑا پہرا دے رہے تھے۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ شیخ عاصم سے غزالہ کی ملاقات اتنی مختصر ثابت ہوگی اور اس ملاقات کا نتیجہ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائے گا۔ مہمان خانے میں جانے کے صرف ایک گھنٹے بعد مجھے غزالہ کی صورت دوبارہ نظر آئی۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی کہ شیخ عاصم میرا مطالبہ ماننے کو تیار ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس سے بالمشافہ بات کروں۔

میں شیخ عاصم کے پاس کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے سوجے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کی قمیص پر ابھی تک خون کے دھبے تھے اور گریبان تار تار تھا۔ زریں گل نے واقعی اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کی تھی۔ اس کے طوفانی گھونسوں نے کئی جگہ سے شیخ کے چہرے کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ ایک آنکھ سوج کر کپا ہو چکی تھی۔ دل ہی دل میں' میں زریں گل کی کارروائی پر خوش ہوا۔

شیخ عاصم نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شار جہاں! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے تمام مسائل کا حل الیکٹرانک ڈوائس ہی ہے تو تم یہ ڈوائس نکلوا لو۔ میں اس کے لیے فوری انتظام کر دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "شیخ تیرے لہجے میں اب بھی دھمکی پوشیدہ ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔ تو کیا مسائل پیدا کرے گا میرے لیے؟"

"بہت مسائل پیدا ہوں گے شار جہاں۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ زندگی تمہارے لیے کتنی دشوار ہو سکتی ہے' تم شیخ عاصم سے نہیں ٹکرا رہے' تم ایک مکمل قبائلی نظام سے ٹکرا رہے ہو۔ تم ایک ایسی دشمنی کو بڑھاوا دے رہے ہو جو نسل در نسل آدم خوری کر سکتی ہے۔"

"میں دیکھ لوں گا تمہارے قبائلی نظام کو اور تمہاری آدم خوری کو بھی۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی نظام کتنا بھی طاقت ور ہو اگر اس کی بنیاد انسانیت پر نہیں تو وہ حقیر اور بے وقعت چیز ہے۔ اسے ایک جھٹکے سے پرانے کپڑے کی طرح پھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔۔۔۔ تم مجھے لیکچر دینے کی کوشش مت کرو' صرف یہ بتاؤ کہ الیکٹرانک ڈوائس نکالنے کے لیے تم کیا انتظام کر رہے ہو؟"

وہ بولا "انتظام کے بارے میں' میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ تم جاپان جاؤ گے۔ ٹوکیو کے اسپتال میں ہڈیوں کے سرجن تمہارا آپریشن کریں گے اور جاپانی انجینئر ڈوائس تمہارے سینے سے نکال لے گا۔"

"میں یہ بکواس پہلے بھی تمہاری لعنتی زبان سے سن چکا ہوں۔ مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔"

وہ بولا "ہماری ٹائمنگ میں فرق ضرور تھا لیکن جھوٹ میں نے پہلے بھی تم سے نہیں بولا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے وہ کام ہو جائے جس کے لیے وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ شاید تم میری بات پر یقین نہ کرو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ایاز کی شادی ہو جاتی تو دو تین روز بعد میں خود تمہیں جاپان کے لیے روانہ کرتا۔ میں نے جب تم سے کہا تھا کہ جاپان کے لیے تمہارا ویزا اور ریٹرن ٹکٹ حاصل کیا جا چکا ہے تو اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں تھا۔ تم ان کاغذات کی خود تصدیق کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "عاصم! اب ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ اور میں ایک بات تمہیں اور بتا دوں۔ اب اگر شادی کا ذکر یا میری بہن کا نام بھی تمہاری زبان پر آیا تو میں بہت برا سلوک کروں گا تم سے۔۔۔۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میں جاپان جاؤں گا اور نہ کہیں اور۔۔۔۔ الیکٹرانک ڈوائس پاکستان میں ہی نکلے گا۔ تمہیں اپنے جاپانی انجینئر اور سرجن وغیرہ کو بھی یہیں بلوانا پڑے گا۔ لاہور میں اور کراچی میں ایک سے بڑھ کر ایک جدید اسپتال موجود ہے۔ ہم اس آپریشن کے لیے وہاں ارینج کر سکتے ہیں۔"

شیخ نے نفی میں سر ہلایا "میرے خیال میں یہ بہت مشکل ثابت ہوگا۔ جاپانی انجینئر تو شاید پاکستان آجائے لیکن سرجن اس بات کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ پاکستانی اسپتال میں آپریشن کرنا شاید ان کے لیے ممکن نہ ہو۔"

میں نے کہا "وہ پاکستان میں بنے ہوئے جراحی کے آلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کرسکتے ہیں تو پاکستانی اسپتال میں آپریشن بھی کرسکتے ہیں بلکہ اس سے پہلے تم خود بھی کہہ چکے ہو کہ وہ اس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔"

"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں اس کے لیے کوشش کروں گا۔"

"تمہاری کوشش اب پہلے سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگی۔ اب تم دل کی گہرائیوں سے کوشش کرو گے کیونکہ اس کے سوا اب تمہارے پاس چارہ نہیں ہے۔"

"تم مجھے دھمکا رہے ہو؟"

"بالکل دھمکا رہا ہوں لیکن یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے۔ میں اس پر عمل کرنے کے لیے دل و جان سے تیار ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں عاصم۔۔۔۔ جو کچھ میں تمہاری کوٹھی کے تہ خانے میں دیکھ چکا ہوں اس کے بعد میرے دل میں تمہارے لیے رحم کی رمق بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ برے سے برا سلوک کرکے بھی شرمندہ نہیں ہوں گا۔"

میرے لہجے میں موجود تپش نے عاصم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک دم میرے اندر غضب کی لہر اٹھی۔ میں نے غرا کر کہا "آنکھیں نیچی کر عاصم۔ میں کہتا ہوں آنکھیں نیچی کر۔"

جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اس کے گھونگریالے بال پکڑے اور سر کھینچ کر نیچے کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں حواس کھو کر اس پر پل پڑوں گا اور اس کو تہس نہس کر ڈالوں گا۔"

میرے لب و لہجے نے عاصم کا پتا پانی کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ میں برداشت کی انتہا کو چھو رہا ہوں اور اگر اس نے اس موقع پر چوں چراں کی تو میں پھٹ پڑوں گا۔

میں نے باہر نکلنے سے پہلے کہا "دیکھو شیخ عاصم! میں تمہیں ایک گھنٹا دے رہا ہوں۔ اس دوران میں تم سوچ سمجھ لو۔ تمہارے پاس صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے۔ تمہیں میرا الیکٹرانک ڈوائس نکلوانا ہے اور یہ کام پاکستان میں ہوگا۔ یہ میری نہیں' تمہاری دردسری ہے کہ ڈوائس نکالنے والے لوگ یہاں کیسے آئیں گے۔ اگر تم نے اب ٹال مٹول کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں ایک مختلف شخص بن جاؤں گا۔ تمہاری اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا لیکن یہ ضرور بتا دوں گا کہ جان کیسے نکالی جاتی ہے۔"

شیخ عاصم نے میری بات خاموشی سے سنی۔ میں باہر نکل گیا۔ درحقیقت شیخ عاصم کے لیے میرے دل میں شدید نفرت نے جگہ بنا لی تھی۔ پتا نہیں کیوں رہ رہ کر وہ منظر میری نگاہوں میں گھوم جاتا تھا' جب عالم ترنگی کے ملازم نوازش کی بیوی ننگے فرش پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس کا ایک تار نہیں تھا۔ دو بدبودار جانور اس سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے ربڑ کی طرح توڑ موڑ رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد ہی قادر زماں کے ایک کارندے نے آکر مجھے بتایا کہ مہمان یعنی شیخ عاصم مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

میں شیخ عاصم کے پاس پہنچا تو وہ سب کچھ پہلے سے سوچے بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "شار جہاں! مجھے تمہارا مطالبہ غیر مشروط طور پر منظور ہے۔ میں اپنی سرتوڑ کوشش کروں گا کہ دونوں معالج یہاں پاکستان آکر تمہارا آپریشن کریں۔ بالفرض یہ نہ ہو سکا تو کسی اور معالج کو تیار کیا جائے گا۔"

شیخ کے اور میرے درمیان چند منٹ گفتگو ہوئی اس کے بعد میں اسے بونے بازی گارڈز کی تحویل میں چھوڑ کر واپس

آگیا۔

زنان خانے میں پہنچا تو شفتا سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے اسے بانہوں میں لے کر تسلی دی اور کہا کہ اب اس کے لیے مصیبت کا وقت گزر گیا ہے۔ وہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے جس نے مجھے سراپا جکڑ رکھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ شفتا کے کانوں میں اور گلے میں ابھی تک وہی زیور تھا جو ایک روز پہلے شیخ عاصم کی رشتے دار خواتین نے اسے پہنایا تھا۔ ننھی ننھی رنگین سیپیوں والا یہ زیور آنکھوں کے راستے خنجر کی طرح میرے دل میں اتر گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ زیور شفتا کے جسم سے اتارا اور کوڑے دان میں پھینکا۔ شفتا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور ایسی ہی چمک یقیناً میری آنکھوں میں بھی تھی۔ میری بہن نے میرے مانگے بغیر کتنی بڑی قربانی دی تھی میرے لیے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اس کا ہاتھ جس کے ہاتھ میں چاہوں' تھما دوں۔ یہ پوری زندگی کا ایثار تھا جو اس نے پلک جھپکنے میں کیا تھا۔

نہ جانے ان لمحات میں کیوں نوجوان ڈاکٹر حمزہ کا چہرہ میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب کل دوپہر میں شفتا کو لاہور کینٹ والی کوٹھی سے لایا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ اپنے گھر کی بالکونی میں غم کی تصویر بنا کھڑا نظر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والے دکھ نے میرے دل کی گہرائیوں کو چھوا تھا۔ میں اتنا انجان نہیں تھا کہ شفتا اور حمزہ کے درمیان پائے جانے والے پسندیدگی کے تعلق کو نہ جان سکتا پھر انجم نے بھی مجھے اس حوالے سے کافی کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی انجم سے ایک اور ملاقات کروں گا اور اس سلسلے میں اس سے مزید معلومات حاصل کروں گا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ شفتا کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ اگر ڈاکٹر حمزہ اسے پسند کرتا تھا اور بقول انجم' شفتا کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا تو پھر یہ شادی فوری طور پر بھی ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر حمزہ برسرروزگار تھا۔ بہت اچھا فیملی بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ شفتا بھی پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار تھی۔ گھر گرہستی کی ذمے داریاں بخوبی اٹھا سکتی تھی۔

اسی روز رات نو بجے کے لگ بھگ میں نے انجم کو لاہور سے بھکر قادر زماں کی حویلی میں بلا لیا۔ میں نے اس سے شفتا کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی۔ انجم نے جو کچھ پہلے بتایا تھا وہی دہرا دیا۔ اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ شفتا کو ڈاکٹر حمزہ پسند کرتا ہے اور شفتا بھی اسے ناپسند نہیں کرتی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر حمزہ کی والدہ شفتا سے بے حد پیار کرتی ہیں اور اسے بیٹی کی طرح سمجھتی ہیں۔ اگر انہیں اشارہ مل جائے کہ ہم لوگ شفتا کی شادی کا سوچ رہے ہیں تو وہ فوراً شفتا کے لیے اپنی جھولی پھیلا دیں گے۔ میں نے انجم سے کہا کہ وہ لاہور واپس جائے اور ڈاکٹر حمزہ کی والدہ کو اس سلسلے میں ٹٹولے۔ اگر ان کی طرف سے مثبت جواب ملے تو مجھے اس سلسلے میں فوری طور پر مطلع کرے۔ اگلے روز دس بجے قادر زماں کی حویلی میں انجم کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اشاروں کنایوں میں ڈاکٹر حمزہ کی والدہ سے بات کی ہے۔ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ وہ شفتا کو بہو بنانے کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔ انجم نے بتایا کہ ڈاکٹر حمزہ کے چچا سلطان صدیقی ادویات کا کام کرتے ہیں۔ وہ ایک طرح سے ڈاکٹر حمزہ کے سرپرست بھی ہیں۔ وہ ایک دو روز میں اپنے کام کے سلسلے میں جھنگ آ رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ مجھ سے ملنے جھوک ضامن بھی آئیں گے۔

میں نے انجم سے کہا کہ وہ مجھے مسٹر سلطان کے آنے کا صحیح ٹائم کنفرم کر کے بتائے تاکہ میں انہیں مناسب طریقے سے خوش آمدید کہہ سکوں۔

اسی روز شام کو انجم نے فون پر سلطان صدیقی سے بھی میری بات کرا دی۔ سلطان صدیقی کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک بارعب کاروباری اور جہاندیدہ شخص ہے۔ رسمی گفتگو کے بعد صدیقی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کل جھنگ پہنچ رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ کل شام کو ہی مجھ سے ملنے جھوک ضامن آئیں۔

اگلے روز شام کو میں نے قادر زماں کی حویلی میں ہی مسٹر سلطان صدیقی کے لیے ڈنر کا انتظام کرایا۔ توقع تھی کہ وہ آٹھ بجے تک پہنچ جائیں گے لیکن وہ نہیں آئے۔ ساڑھے نو بجے انہیں فون کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک ضروری میٹنگ میں شرکت کے لیے مقامی تھری اسٹار ہوٹل میں گئے ہوئے ہیں۔ فون پر بات کرنے والے نے توقع ظاہر کی کہ صدیقی صاحب کل ضرور میری طرف آئیں گے۔

میرا خیال تھا کہ میٹنگ سے واپسی پر صدیقی صاحب مجھے فون کریں گے اور پروگرام کے مطابق جھوک ضامن نہ پہنچنے پر معذرت کا اظہار کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ اس سے پہلے جب انجم نے فون پر صدیقی صاحب سے بات کرائی تھی تو وہ بڑی خوش دلی سے ملے تھے

اور ملاقات کے سلسلے میں بڑے اشتیاق کا اظہار کر رہے تھے لیکن اب ان کے رویے میں سرد مہری محسوس ہو رہی تھی۔

اگلے روز شام کو بھی صدیقی صاحب نہیں آئے۔ میں نے بھی فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرے روز نو دس بجے میں نے قادر زماں سے ایک ٹویوٹا جیپ لی۔ میں ایک پرانے ساتھی سے ملنے جھنگ جانا چاہتا تھا۔ یہ "ساتھی" وہی سیاہ رنگت والی نجو تھی جو میرے قیاس کے مطابق دنیا کے پرکشش ترین جسم کی مالک تھی لیکن رنگ گورا نہ ہونے کی وجہ سے کسی گنتی میں نہیں آتی تھی۔ وہ کم ظرف لوگوں کی دسترس میں تھی اور دربدر بھٹک رہی تھی۔ مجھے قادر زماں کے ایک کارندے سے معلوم ہوا کہ نجو آج کل جھنگ میں ہے اور کسی ادھیڑ عمر پٹواری نے اس سے نکاح کر رکھا ہے۔ میں نجو کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب سی انسیت تھی' مجھے اس لڑکی کے ساتھ۔ میں جھنگ جانے کے لیے نکلا تو شفتا بھی تیار ہو گئی۔ دراصل وہ انجم کی صحت یابی پر اس کا جشن صحت منانا چاہتی تھی اور اسے کوئی اچھا سا تحفہ بھی دینا چاہتی تھی پھر ایک عرصے سے اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھے اور لمبی ڈرائیو پر نکلے۔ چھوٹی چھوٹی معصوم آرزوئیں' خوش رنگ خواہشیں' یہی سب کچھ تو اس لڑکی کا اثاثہ تھا۔

ہم دونوں دس بجے جھوک ضامن سے نکلے اور جھنگ شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس وقت ہم جھنگ شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھے۔ اچانک میری نگاہ ایک سفید کار پر پڑی' وہ درمیانی رفتار سے بھکر کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اس کار کو پہچان لیا۔ میں نے اسے ڈاکٹر حمزہ کے گھر میں کھڑے دیکھا تھا۔ شفتا نے بھی کار پہچان لی اور مڑ کر دیکھنے لگی۔ کار میں ڈرائیور کے ساتھ دو افراد موجود تھے' ان میں سے ایک یقیناً سلطان صدیقی صاحب تھے' ان کا گنجا سر میں نے گاڑی میں سے صاف دیکھ لیا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ صدیقی صاحب مجھ سے ملنے جھوک ضامن جا رہے ہیں۔ میں نے فوراً گاڑی کو یوٹرن دیا اور صدیقی صاحب کے پیچھے گیا۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے صدیقی صاحب کی گاڑی رکوا دی۔

میرے ساتھ ساتھ صدیقی صاحب بھی گاڑی سے باہر نکل آئے۔ میرے علاوہ انہوں نے شفتا کی خیر خیریت بھی دریافت کی۔ اس کے بعد رسمی انداز میں معذرت کی کہ وہ شدید مصروفیت کے سبب پروگرام کے مطابق مجھ سے ملنے نہ آ سکے اور فون پر بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ میں نے کہا "کوئی بات نہیں۔ یہ بھی بہت اہم ہے کہ آپ نے اب وقت نکال لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا "آپ اب ہماری طرف ہی جا رہے ہیں نا؟"

"میری خواہش تھی کہ ایسا ہو نا۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا "مجھے ایک ضروری کام سے بھکر جانا ہے۔ وہاں سے پانچ چھ بجے سے پہلے فارغ نہیں ہو پاؤں گا اور آج شام ہی لاہور روانگی ہے۔"

شفتا بولی "انکل ایسا بھی کیا ضروری کام ہے کہ آپ یہاں آ کر بھی ہم سے نہیں مل سکتے۔"

وہ بولے "میرے ایک دوست سپرنٹنڈنٹ افتخار صاحب ہیں' ان کے بیٹے کی شادی ہے۔ شرکت بہت ضروری ہے۔ اچھا۔ پھر ملیں گے' خدا حافظ۔" انہوں نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ان کے انداز میں نمایاں سرد مہری بلکہ لاتعلقی تھی۔

باول ناخواستہ میں نے مصافحہ کیا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے لیکن چند قدم چل کر رک گئے' دوبارہ میری طرف آتے ہوئے بولے "ہاں مجھے یاد آیا۔ افتخار صاحب جیل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کافی عرصہ لاہور جیل میں بھی رہے ہیں۔ آپ نے بھی تو لاہور میں جیل کاٹی ہے۔ آپ نہیں جانتے انہیں۔۔۔؟"

مسٹر صدیقی نے یہ بات عام سے انداز میں کہی تھی لیکن اس بات کی گہرائی میں سمجھتا تھا یا شفتا سمجھتی تھی۔ ایک لمحے میں میرے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اگل دیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے بیچ چوراہے میں میرے سر پر گھڑوں پانی انڈیل دیا ہو۔ میرا دل چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر ایک زناٹے کا تھپڑ مسٹر صدیقی کے رخسار پر جڑ دوں لیکن پھر شفتا کی موجودگی نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "عزت افزائی کا شکریہ صدیقی صاحب۔" اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

شفتا کا رنگ بھی غم و غصے سے پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کے پنکھڑیوں جیسے نازک لب مسلسل تھراتے چلے جا رہے تھے۔ موڈ اتنا اپ سیٹ ہو گیا تھا کہ جھنگ جانے کے بجائے ہم نے واپس جھوک ضامن جانا مناسب سمجھا۔ راستے بھر شفتا بالکل خاموش رہی۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ہے۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے بات کی تو وہ چھلک پڑی۔ روتے ہوئے بولی "مجھے بڑا افسوس ہے بھیا کہ میری وجہ سے آپ کو شرمندگی ہوئی۔ شاید

میں ہوں ہی بد قسمت۔"

میں نے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے کندھے سے لگالیا "نہیں میری بہن' تیری خوش قسمتی میں کوئی شبہ نہیں۔ ایسی معمولی باتیں دل سے نہیں لگایا کرتے۔"

میں شفتا کو تسلی دے رہا تھا لیکن حقیقتاً مجھے بھی بہت شاک لگا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کے چچا نے بڑا توہین آمیز انداز اختیار کیا تھا اور یہی وہ چچا تھا جس پر حمزہ اندھا دھند اعتماد رکھتا تھا۔ انجم نے مجھے بتایا تھا کہ سلطان صدیقی' ڈاکٹر حمزہ کے سرپرست ہی نہیں دوست بھی ہیں۔ ڈاکٹر حمزہ اپنے چچا کے فیصلوں پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرتا ہے۔ آج اسی چچا نے مجھے اور شفتا کو بے رخی سے جھٹک دیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ کیا سلطان صدیقی کو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ میں جیل کاٹ چکا ہوں۔ کیا وہ میرے ماضی سے لاعلم تھے؟

شفتا کی حالت اس کلی کی سی تھی جو بہار کے پہلے جھونکے سے کھلی ہو لیکن پھر ایک طوفانی ژالہ باری نے اسے پامال کرکے رکھ دیا ہو۔ وہ نیم جان ہو رہی تھی۔ حویلی واپس آکر بھی وہ بالکل گم صم رہی۔ دوپہر کا کھانا اس نے نہیں کھایا تھا' رات کو بھی ایک لقمہ نہیں لیا۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے جب بھی شفتا کو آزردہ دیکھا تھا میرے دل میں تیر سا لگا تھا۔ پتا نہیں' یہ کیسا ناتا تھا ہم دونوں کے درمیان۔

رات کو میں نے اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے کی کوشش کی۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے ایک دو لقمے لیے۔ میں نے کہا "شفتا! محبت اس کائنات کا اعلیٰ ترین جذبہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا محبت کرنے والے کو کسی بھی طور پر شرمندہ ہونے کی ضرورت ہے۔ انسانی خیالات سچے ہوں تو ان میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت دوسرے لوگوں پر اثرانداز بھی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح ڈاکٹر حمزہ تمہیں پسند کرتا ہے' تم بھی اسے پسند کرتی ہو اور میرے نزدیک یہ صورت حال کسی طور پر قابلِ انگشت نمائی نہیں ہے۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ آج جو کچھ ہوا یہ بھی کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فون پر ڈاکٹر حمزہ یا اس کی والدہ سے بات کرو۔"

وہ اپنی سرخ آنکھیں ہٹ پٹا کر میری طرف دیکھنے لگی' جیسے میری سوچ پر اسے حیرانی ہو رہی ہو۔ میں نے کہا "شفتا! اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ بے جا شرم اور جھجک بے وقوفی کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ ایک صاف سیدھی بات ہے کہ ڈاکٹر حمزہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس موقع پر کیا سوچ رہا ہے اور کیا چل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی بنا پر وہ خود تم سے رابطہ قائم نہ کر سکتا ہو۔"

"نہیں بھیا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی "جن لوگوں نے آپ کی توہین کی' میں ان پر تھوکوں گی بھی نہیں۔ انہیں کیا معلوم آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں مر سکتی ہوں لیکن آپ کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "شفتا جذباتی باتیں مت کرو۔ یہ ایک نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی بھیا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔"

وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

انجم نے مجھے ڈاکٹر حمزہ کے گھر کا فون نمبر لکھوایا تھا۔ حویلی کے فون سے لاہور میں ڈاکٹر حمزہ کے گھر بات ہو سکتی تھی۔ میں فون نمبر والا کاغذ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ کافی دیر تک میں الماریوں اور درازوں کو کھنگالتا رہا۔ آخر فون نمبر مل گیا۔ میں نے اسٹڈی میں جاکر فون کیا۔ میری خواہش کے عین مطابق فون ڈاکٹر حمزہ نے ہی ریسیو کیا۔

"السلام علیکم' میں ڈاکٹر حمزہ بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے شائستہ آواز سنائی دی۔

"میں شاہ جہاں بات کر رہا ہوں۔۔۔ جھوک ضامن میں قادر زماں صاحب کی حویلی سے۔"

"شاہ جہاں۔۔۔ میں سمجھا نہیں؟"

"ڈاکٹر صاحبان تو حافظے کے بڑے تیز ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ مایوسی کی ایک بلند لہر نے مجھے ڈھانپ لیا۔ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو شفتا دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے فون کرتے سن لیا تھا۔ وہ شکوہ کناں انداز میں بولی "میں نے آپ سے کہا تھا نا بھیا!"

"کیا ہوا؟" میں نے بھولے پن سے کہا۔

وہ بولی "مجھے پتا ہے کہ آپ نے کس کو فون کیا تھا اور اس نے کیا جواب دیا ہے۔"

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔ شفتا مزید کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی۔

ایک آگ سی میرے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ ڈاکٹر حمزہ اور اس کے اہلِ خانہ کے رویوں میں یہ تبدیلی کیونکر آئی

تھی؟ یقیناً اس کا سبب صرف اور صرف میں تھا۔ یہ میرے ماضی کی دھول تھی جس نے شفتا کے مستقبل کو دھندلا دیا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے بالکل بھول گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ میری حقیقت جو کچھ بھی تھی لیکن دنیا کی نظر میں' میں جہانی استاد تھا۔ جرائم کی دنیا میں میرا نام ان مٹ روشنائی سے لکھا جا چکا تھا۔ لاہور اور بمبئی میں ہونے والی ہنگامہ خیزیوں میں درجنوں افراد میرے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور اب میں ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔ ان حالات میں اگر ڈاکٹر حمزہ اور اس کے لواحقین نے میری طرف سے بے رخی اختیار کی تھی تو یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

پشیمانی کے بوجھ سے میرے کندھے ٹوٹنے لگے۔ کتنا اچھا ہوتا' میرا منحوس سایہ شفتا پر نہ پڑتا۔ وہ ساہی صاحب کی تحویل میں ہی رہتی۔ میں کبھی اس کی صورت دیکھتا' نہ وہ میری صورت دیکھتی لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ شیخ عاصم کسی بدروح کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا اور اس کے مطالبے پر مجھے ساہی صاحب کو مجبور کرنا پڑا تھا کہ وہ مجھے شفتا تک پہنچائیں۔۔۔ شیخ عاصم کا خیال آیا تو میری رگ رگ میں آگ بھر گئی۔ یہی خاندان میری بیشتر مصیبتوں کا ذمے دار تھا۔ اگر برسوں پہلے عاصم کے بھائی راشد بن ارشد نے نوعمر شفتا پر میلی نگاہ نہ ڈالی ہوتی اور اسے ہوس کی سولی پر چڑھانے کا عزم نہ کیا ہوتا تو میرے ہاتھوں قتل نہ ہوتے اور میں جو قانون کا طالب علم تھا' قانون کا مجرم قرار نہ پاتا۔ شاہ جہاں ایل ایل بی سے جہانی استاد تک میں نے جو سفر طے کیا تھا' اس کی شروعات عاصم کے بھائی سے ہی ہوئی تھی پھر راشد میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا اور میں جیل چلا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ کہانی ختم ہو گئی تھی لیکن امارات کے چند کینہ پرور قبائلیوں کے نزدیک یہ کہانی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان میں شیخ عاصم پیش پیش تھا۔ وہ پچھلے قریباً آٹھ سال سے میری زندگی کو جہنم بنانے کی مسلسل کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اٹک جیل میں قتل کرانے کی کوشش کی تھی پھر اس کے انتقام کا رخ شفتا کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر شفتا تک پہنچنا چاہتا تھا' اسی مقصد کے حصول کے لیے اس نے غزالہ سے شادی کی تھی اور مجھے میری محبت سے دور کرکے دہرے عذاب سے دوچار کر دیا تھا۔ میرا ماضی اور حال' شیخ عاصم کے دیئے ہوئے زخموں سے داغ داغ تھا۔۔۔ آج یہ شخص میری تحویل میں تھا اور میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جی چاہا ابھی مہمان خانے میں جاؤں اور مار مار کر شیخ عاصم کو جان سے مار ڈالوں۔ میں بہت دیر تک اپنی ہی آگ میں سلگتا رہا۔ پھر ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

نہ جانے کیا ہوا' میرے قدم خود بہ خود مہمان خانے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مہمان خانے کے دروازے پر قادر زماں کا خونخوار بونا باڈی گارڈ پہرا دے رہا تھا۔ یہ بونے کینیا کے تھے اور مقامی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ باوردی رہتے تھے اور ان کی کمر سے آویزاں چھوٹے چھوٹے ہولسٹرز میں نقرئی اور طلائی دستوں والے پسٹل پائے جاتے تھے۔ قادر زماں کے ایک اشارے پر یہ بونے اتنی برق رفتاری سے حرکت کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ بونے کو قادر زماں کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ میں جب چاہے مہمان خانے میں جا سکتا ہوں اور "مہمان" سے مل سکتا ہوں۔ میں اندر چلا گیا۔ یہاں حویلی کا پرانا ملازم منصب علی موجود تھا۔ میں نے اس سے شیخ عاصم کے بارے میں پوچھا۔

وہ بولا "اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے رات کا کھانا کھایا ہے۔ اب کمرے کے اندر ٹہل رہا ہے۔"

"اس کی بیوی آئی تھی؟"

"جی ہاں' دونوں نے اکٹھے ہی کھانا کھایا تھا پھر وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بی بی صاحبہ واپس گئی ہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم دروازے پر جاؤ۔ کسی کو اندر مت آنے دینا۔"

منصب علی نے اطاعت مندی سے سر جھکا لیا اور باہر چلا گیا۔ میں شیخ عاصم کے کمرے میں پہنچا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ چابی قریب ہی میز پر موجود تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شیخ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پسٹل تھا اور نگاہیں شیخ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ جہاندیدہ شخص تھا۔ سمجھ گیا' میں غصے میں بھرا ہوا ہوں اور اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ وہ کھڑا ہو گیا اور مضطرب نظروں سے پسٹل کی طرف دیکھنے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے' شیخ عاصم گٹھے ہوئے جسم کا ایک زور آور شخص تھا۔ اسے دیکھ کر بالوں سے بھرے ہوئے جسم والے کسی بھینسے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ وہ ذرا غصے میں آتا تھا تو اس کا رنگ آگ کی طرح سرخ ہو جاتا تھا اور دیکھنے والے کو مرعوب کر دیتا تھا۔ شیخ کا قد چھ فٹ سے کچھ اوپر ہی تھا۔ شانے چوڑے اور مضبوط تھے۔ جبڑے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ اس شخص کے خلاف میرے دل میں آج طیش ہی طیش بھرا ہوا تھا۔ وہ میرے بس میں تھا۔ میں اس کے

ساتھ وہی بدترین سلوک کر سکتا تھا جو وہ آج تک مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے کرتا آیا تھا۔ میں کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔ مجھے اپنے دستانوں میں جکڑے ہوئے ہاتھ یاد تھے اور یہ بھی یاد تھا کہ اپنے ہنی مون کے موقع پر شیخ نے کس طرح مجھے ادنیٰ ترین گھریلو ملازم کا درجہ دیا تھا۔ وہ منظر بھی میرے ذہن پر نقش تھا جب شیخ عاصم نے مجھے درخت سے الٹا لٹکوا دیا تھا اور اس کے کارندوں نے چرمی بیلٹس کے ساتھ میری کھال ادھیڑ دی تھی اور یہ تو فقط ایک دو مثالیں ہیں۔ ایسے لاتعداد انسانیت سوز اور ناقابلِ برداشت واقعات مجھے یاد تھے۔ ان میں سے ہر واقعہ اتنا گھناؤنا تھا کہ اس کی پاداش میں، میں شیخ عاصم کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال سکتا تھا لیکن میں ایک غالب شخص کی حیثیت سے اس پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ بے شک میں اسے جی بھر کر مارنا چاہتا تھا لیکن باندھ کر نہیں۔ آزادی کے ساتھ... اسے اپنے دفاع کا بلکہ جارحیت کا بھی پورا موقع دے کر۔ میں نے بھرے ہوئے پسٹل میں سے میگزین نکالا اور پسٹل ایک طرف پھینک دیا پھر میں نے جھک کر پنڈلی سے خنجر بھی علیحدہ کر دیا اور کھڑکی سے باہر پھینک کر کھڑکی بند کر دی۔ اب میں اور شیخ عاصم قطعی غیر مسلح تھے۔ ہم دونوں بند کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ ایک MAN TO MAN صورتِ حال تھی۔ شیخ عاصم سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا تھا۔

میں نے کہا "شیخ! اس کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر مجھے نیچا دکھا کے یہاں سے نکل سکتا ہے تو نکل جا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرے سوا اس حویلی میں کوئی تجھے روکے گا نہیں۔"

شیخ کی آواز کانپ گئی "یہ... کیسی باتیں کر رہے ہو شاہ جہاں! میں... تم سے لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور لڑنا کوئی عقل مندی کا کام بھی نہیں ہے۔"

"لڑائی اور مارپیٹ بے شک بے وقوفی کا کام ہے مگر آج تک تم نے یہ بے وقوفی بڑھ چڑھ کر کی ہے۔ اب اتنا احتراز کیوں کر رہے ہو۔ یاد ہے ایک مرتبہ تم نے کہا تھا کہ میں ہیجڑا نہیں ہوں۔ اب اپنی مردانگی کا ثبوت دو۔ تم ہٹے کٹے ہو، صحت مند ہو۔ میں خالی ہاتھ تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ آؤ... اور جھپٹو مجھ پر، جس طرح میرے ہاتھ باندھ کر مجھ پر جھپٹا کرتے تھے۔"

شیخ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "شاہ جہاں! تم ذرا تحمل سے کام لو۔ اب ہمارے درمیان تنازع کی کون سی بات ہے۔ تم نے کہا تھا کہ سرجن لودھی اور الیکٹریکل انجینئر کو یہیں پاکستان میں بلایا جائے۔ میں اس پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ کل تمہارے سامنے فون پر ٹوکیو میں بات ہوئی ہے۔ اللہ نے چاہا تو دو چار روز میں سب انتظام ہو جائے گا۔"

"وہ انتظام تو تم کرو گے کیونکہ اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں لیکن جو ستم تم نے ڈھائے ہیں وہ اتنے زیادہ ہیں کہ میرا دل غم و غصے سے پھٹ رہا ہے۔ میں تمہارے ساتھ وہی سب کچھ کر سکتا تھا جو تم میرے ساتھ کرتے رہے ہو لیکن میں تمہیں کھلے مقابلے کی دعوت دے رہا ہوں۔ آؤ، میں خالی ہاتھ تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ حملہ کرو مجھ پر۔"

شیخ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ مسلسل اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس کی ساری اکڑ فوں ناک کے راستے بہہ گئی تھی اور اب وہ فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا "شاہ جہاں! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم اپنے دشمنوں کو برہنہ کر کے ہنٹر لگوانے کا سوچ سکتے ہو، نوجوان لڑکیوں کو اپنے کارندوں کے سامنے برباد کروا سکتے ہو۔ تو مجھ پر ہاتھ اٹھانے کا کیوں نہیں سوچ سکتے۔ اٹھاؤ ہاتھ، میں کہتا ہوں اٹھاؤ ہاتھ۔"

میں نے کھڑے کھڑے زوردار لات شیخ کے سینے پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا تھا "دیکھو شاہ جہاں! یہ ٹھیک نہیں۔"

میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور اڑنگا لگا کر دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ اس چوٹ نے شیخ کو تلملا کر رکھ دیا۔

وہ غرایا "تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو شاہ جہاں۔ میں تمہیں..."

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ میرا گھٹنا اس کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ اس کے ہونٹ جو پہلے ہی زخمی تھے ایک دم خون اگلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے شیخ کے لیے ایک شایانِ شان گالی نکلی۔ اب یہ معاملہ شیخ کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا اور ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ بے شک اس کے بدن میں کسی وحشی سانڈ کی سی طاقت اور سختی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میں نے مچل کر خود کو چھڑانا چاہا۔ شیخ کی گرفت بڑی سخت تھی۔ درحقیقت اس نے ایک

دم اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ میں نے اس کے گھونگریالے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور چہرہ اوپر اٹھا کر ناک پر ٹکّے کی ضرب لگائی۔ شدید ضرب کے باوجود عاصم کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ اس پر وحشی پن طاری ہو چکا تھا۔ دو قدم دوڑ کر اس نے مجھے دیوار سے ٹکرا دیا۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں چوٹ لگی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ شیخ عاصم نے گھٹنے کی ایک وحشیانہ ضرب پیٹ کے نچلے حصے میں لگائی اور زور لگا کر مجھے پشت کے بل گرا دیا۔ وہ یقیناً ایک گرانڈیل اور مجسم غیظ و غضب شخص تھا۔ اس کا چٹانی جسم اپنی پوری توانائی کے ساتھ مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔ میرے ذہن میں آیا یہی وہ شخص ہے جس نے غزالہ کا قرب حاصل کیا ہے۔ یہی وہ منحوس جسم ہے جس نے غزالہ کے جسم کو تسخیر کر رکھا ہے۔ اسے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس جسم کے لیے میرے ذہن میں بے پناہ نفرت ابل پڑی۔ چنگاریاں سی چھوٹ گئیں آنکھوں کے سامنے۔ میں نے ایک ٹرکش داؤ استعمال کرتے ہوئے عاصم کو اپنے اوپر سے دور پھینک دیا۔ میں اور عاصم ایک ساتھ فرش سے اٹھے تھے۔ اس کا چہرہ انگارا ہو رہا تھا۔ ہونٹوں سے ناقابلِ فہم گالیاں نکل رہی تھیں۔ اس نے مجھ پر جھپٹا مارا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا۔ ایسے موقعوں پر مدِمقابل ان بیلنس ہو جاتا ہے مگر یہ عاصم کی طاقت کا کرشمہ تھا یا اس کے غیظ و غضب کا کہ وہ بلا تامل پھر مجھ پر آیا۔ اس کا گھونسا میرے پیٹ میں لگا۔ یہ بڑی سوچی سمجھی ضرب تھی۔ سینے کی پسلیوں سے نیچے یہی وہ مقام تھا جہاں مجھے اکثر درد اٹھتا تھا۔ شیخ عاصم سے زیادہ اس مقام کے بارے میں بھلا اور کون جان سکتا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ایک اور ضرب اسی مقام پر لگائی۔ درد کی لہریں پورے جسم میں پھیل گئیں۔ اس موقع پر میں ذرا سستی دکھاتا تو شاید شیخ مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا جاتا۔ میں نے گھوم کر شیخ کے چہرے پر مکا رسید کیا اور اسے دور پھینک دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ میں دیوانہ وار شیخ پر پل پڑا۔ میرے مکوں اور ٹھوکروں نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اور کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔

ایکا ایکی مجھے غزالہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی پر چیخ رہی تھی۔ یقیناً یہ خادم منصب علی تھا۔ منصب علی اس کا راستہ روکے کھڑا تھا اور وہ اسے پیچھے ہٹا کر اندر آنا چاہتی تھی پھر وہ اسے ہٹا کر اندر آ گئی۔ عاصم اس وقت میرے نیچے تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا اور بال میری مٹھی میں تھے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" غزالہ چیخی "چھوڑیں انہیں... پلیز چھوڑیں۔"

میں شیخ عاصم کے اوپر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

غزالہ نے آگے بڑھ کر شیخ عاصم کو سہارا دیا۔ اسے بٹھایا اور اپنے پلو سے اس کا خون آلود چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ کر شدید احتجاجی لہجے میں بولی "آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا؟ آخر کیا چاہتے ہیں آپ۔"

"میں اسے جان سے مار دینا چاہتا ہوں غزالہ... لیکن یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ تم میرے راستے کی دیوار بن گئی ہو۔ کاش یہ تمہارا شوہر نہ ہوتا۔ کاش..."

"مگر اب... نئی بات کیا ہوئی ہے؟"

"باتیں تو سب پرانی ہیں لیکن وہ ہر بار نئی ہو کر سامنے آتی ہیں۔ بار بار تازہ زخم لگتے ہیں مجھے۔ اس خانوادے کی وجہ سے میری پوری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔"

"پلیز شاہ جہاں... پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے... دیکھیں آپ نے کیا حال کر دیا ہے ان کا۔" وہ اپنے پلو سے شیخ کا خون آلود چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنے ہونٹوں سے خون پونچھ کر کہا "زخم تو میرے چہرے پر بھی آئے ہیں لیکن تمہیں صرف اپنے شوہر کے زخم دکھائی دے رہے ہیں۔ شاید تمہیں اس شخص کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ہے۔"

میں غم و غصے میں کھولتا ہوا باہر آ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں کچھ دیر مزید وہاں رکا تو میرے ہاتھوں شیخ کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔

اپنے کمرے میں جا کر میں دیر تک ٹہلتا رہا اور اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ ان لمحات میں شیخ عاصم کا چہرہ میرے لیے دنیا کا مکروہ ترین چہرہ تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو غزالہ کھڑی تھی۔ وہ غم کی تصویر نظر آتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں میرے لیے طیش یا نفرت کے بجائے ہمدردی تھی۔ عجیب لڑکی تھی وہ... پل میں کچھ نظر آتی تھی، پل میں کچھ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیخ عاصم کو لہولہان دیکھ کر وہ اس کے لیے تڑپ گئی تھی۔ اب مجھے آزردہ دیکھ کر اس کی آنکھوں سے ہمدردی کی پھوار برسنے لگی تھی۔

مدھم لہجے میں بولی "شاہ جہاں! زرین گل تو ایک سیدھا سادہ قبائلی ہے لیکن آپ تو پڑھے لکھے سمجھدار ہیں۔ آپ کو عاصم کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں اس کی صورت دیکھتا ہوں تو مجھے خود پر قابو نہیں رہتا۔" میں نے کہا "تم جانتی نہیں ہو غزالہ! اس شخص نے

کس کس طرح میری زندگی برباد کی ہے۔ اب اس کی وجہ سے شفتا کی زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ آج دوپہر میں نے اپنی زندگی کا ایک بدترین صدمہ برداشت کیا ہے۔"

غزالہ میرے قریب آ بیٹھی۔ بہت قریب۔ ہمارے درمیان فاصلہ موجود تھا لیکن اس کے جسم کی نرمی' ملائمت اور حدت یہ فاصلہ عبور کر کے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے سانسوں کی مہک میرے غضب کے شعلوں کو پھوار بن کر ڈھانپ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے بولی "کیا ہوا شاہ جہاں؟"

میں نے کہا "غزالہ! تمہارے شوہر کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور اس کی نیت میں اتنی برائی ہے کہ شاید میں اور تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اپنی معصوم بہن کو اس کی دسترس سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کی شادی کر دوں۔ ایک اچھا رشتہ ہماری نظر میں تھا۔ بات قریباً طے ہونے والی تھی لیکن میں یہ بھولا ہوا تھا کہ میں کون ہوں اور میرے ساتھ کیسی کیسی بدنامیاں وابستہ ہیں۔ آج دوپہر وہ سب کچھ ختم ہو گیا اور ایسے برے طریقے سے ختم ہوا کہ دل خون ہو گیا۔ شاید تم شفتا سے ملی نہیں ہو۔ ذرا جا کر اس کی صورت دیکھو۔ روز زندوں سے دور اور مُردوں سے قریب لگ رہی ہے۔"

غزالہ کے چہرے پر تاسف کے تاثرات پھیل گئے۔ یقیناً وہ دل کی گہرائیوں سے دکھ محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کہا "غزالہ! تم جانتی ہو میں ایسا نہیں تھا۔ میں قانون کا طالب علم تھا' قانون شکن نہیں تھا۔ مجھے قانون شکن کس نے بنایا؟ تیرے جیٹھ نے اور تیرے شوہر نے۔ انہوں نے مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکیل دھکیل کر جرم کی دلدل میں پہنچایا۔ میں نے بار بار پاؤں جمانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری ایک نہ چلنے دی۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اب تک شیخ اور اس کے حواریوں کے چیتھڑے اڑ چکے ہوتے۔ میں خود پر بہت ضبط کرتا رہا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں لیکن کبھی کبھی سب کچھ میرے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔"

غزالہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ میری طرف جھک آئی۔ اپنی اوڑھنی کے پلو سے وہ میری ٹھوڑی اور میرا خون آلود ہونٹ صاف کرنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے منہ میں خون کا ذائقہ گھلا ہوا ہے اور میرے ہونٹ زخمی ہیں۔ بڑی نرمی اور ملائمت سے اس نے میرے ہونٹ صاف کیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے جسم کی خوشبو وحدت مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہو رہی تھی پھر وہ میرے بائیں ہاتھ کی انگلی کو دیکھنے لگی۔ یہ انگشت شہادت عاصم سے لڑائی کے دوران زخمی ہوئی تھی۔ درمیانی جوڑ اکھڑ گیا تھا۔ انگلی درمیان میں سے سوج گئی تھی اور ہولے ہولے لرز رہی تھی لیکن مجھے اب تک احساس نہیں ہوا تھا۔ غزالہ نے بڑی ملائمت سے انگلی کو مٹھی میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی کی نرمی اور نزاکت مرہم بن کر زخمی انگلی میں سرایت کر گئی۔ تب جیسے ایک لہر سی سمندر سے اٹھتی ہے اور ساحل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ غزالہ نے اپنے بازو میری طرف بڑھائے۔ وہ ذرا بلندی پر بیٹھی تھی' میں پستی میں تھا۔ اس نے میرا سر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور سینے سے لگا لیا۔ یہ ایک ایسی اچانک حرکت تھی کہ چند لمحے کے لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا۔ میرا چہرہ اس کی بانہوں کے احاطے میں تھا اور ایک مہربان گداز میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اس گداز میں تلاطم تھا۔ یہ تلاطم ان خاموش ہچکیوں کی وجہ سے تھا جو غزالہ کے سینے سے بلند ہو رہی تھیں۔ پھر ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ایکا ایکی غزالہ کو کیا ہوا ہے۔ عاصم سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے وارفتگی کا مظاہرہ کیا تھا اور یوں میرے قریب آئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک میکانکی حرکت کے تحت ہوا تھا۔ شاید خود غزالہ کو بھی پتا نہ چلا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا' کسی بھی وقت کوئی بھی اندر آسکتا تھا لیکن شاید اسے پروا ہی نہیں تھی یا پھر وہ جذبے کی رو میں اتنی دور تک بہہ گئی تھی کہ اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے میرا چہرہ اپنے بازوؤں سے آزاد کیا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ جھیل جیسی آنکھوں پر نمناک پلکیں لرزتی چلی جا رہی تھیں۔ ان گنت بھید چھپے تھے اس کی آنکھوں میں۔ وہی بھید جو زمانوں سے عورت کی ذات کا حصہ رہے ہیں۔ وہ گہرائی جہاں سمندر سما جائیں اور قطرہ محسوس ہوں۔

وہ عجیب سی کھوئی ہوئی آواز میں بولی "اس روز آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"کس روز؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"جب آپ جل کوٹ سے آئے تھے۔ عالم قریشی کے گھر سے آپ نے مجھے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ جلدی آؤ۔"

میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ غزالہ انہی نازک ترین لمحوں کا ذکر کر رہی تھی' جب میرے اندر ایک

انقلابی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آبائی قصبے جل کوٹ میں غزالہ کا کلینک دیکھا تھا۔ وہاں کے تنگ کمروں میں غزالہ کی خوشبو محسوس کی تھی اور انا کے اس بت کو پاش پاش کر دیا تھا جس نے برسوں سے میرا راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے غزالہ کی طرف لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب میں نے غزالہ کو سب کچھ بتانے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا تو وہ شیخ عاصم کے ہمراہ چلی آئی تھی اور ان دونوں کو ایک دوسرے میں مگن پا کر میرے دل میں اٹھنے والی بلند لہر ایک دم کہیں گم ہو گئی تھی۔ آج کئی ماہ بعد غزالہ نے وہ سب کچھ مجھے یاد دلا دیا تھا لیکن سوچنے کی بات تھی کہ غزالہ کو ان نازک ترین لمحات کا علم کیسے ہوا۔ میں نے تو اس سلسلے میں کوئی اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

غزالہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "اتنی پرانی بات تم آج کیوں دہرا رہی ہو؟"

"یونہی ذہن میں الجھن سی تھی۔"

"کیسی الجھن؟"

اس کی پلکیں لرز کر جھک گئیں لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

"کیسی الجھن... بتاؤ نا؟" میں نے اصرار کیا۔

"مجھے لگا تھا جیسے آپ کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہیں لیکن ایک دم ارادہ بدل دیا ہے۔"

عورت کی تیز حسیات کے بارے میں بہت کچھ کہا اور سنا جاتا ہے... آج ایک بار پھر مجھے یہ ثبوت مل رہا تھا کہ یہ باتیں کچھ ایسی غلط نہیں ہیں۔ عورت کبھی کبھی وہ کچھ محسوس کر لیتی ہے جو نہ صرف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے بلکہ بہت دور بھی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "غزالہ! پرانی باتیں چھیڑنے سے فائدہ نہیں۔ ویسے بھی کچھ باتیں ان کہی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"میں نے آپ کو دکھ دیا ہے نا؟" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے پوچھا۔

"میں نے بھی تو تمہارے ساتھ کچھ کم نہیں کیا۔"

"آپ کا معاملہ' آپ کے ساتھ ہے لیکن میرے لیے یہ بوجھ ناقابل برداشت ہو گا کہ میری وجہ سے آپ کو صدمہ پہنچا۔ میرے قول و فعل سے آپ کو کسی بھی طرح کی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دیں۔"

"اور تم معاف نہیں کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"معافی کیسی؟" وہ سسک کر بولی "میں نے تو آپ کو سزا دی ہے۔ آپ سے بہت دور چلی گئی ہوں۔ شاید اب میں چاہوں بھی تو یہ فاصلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ ایسی کڑی سزا کے بعد تو معافی کا لفظ بھی بے معنی ہو جاتا ہے۔"

"ہاں سزا تو واقعی بہت کڑی ہے لیکن یہ بات غلط ہے کہ اس سزا میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔"

"میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں شاہ جہاں... میرا دل دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک حصہ مجھے آپ کی طرف کھینچتا ہے' دوسرا آپ کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ عاصم میں بے شمار برائیاں ہیں اور ناقابل معافی برائیاں ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے انہیں شوہر تسلیم کیا ہے۔ میں امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میری خواہش ہے کہ بدترین حالات میں بھی یہ دامن میرے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں یہ حالات بدترین نہیں ہیں؟"

وہ لاجواب ہو کر رہ گئی۔ میں نے کہا "غزالہ! مجھے لگتا ہے تم پر کوئی ظلم نہیں ڈھا رہا۔ تم خود اپنے آپ پر ظلم ڈھا رہی ہو۔ اپنی ہی فرسودہ سوچوں کی قیدی ہوئی ہو تم۔ جس شخص نے اپنے آپ کو خود گرفتار کر رکھا ہو' اسے رہائی کون دلا سکتا ہے؟"

"پلیز شاہ جہاں! ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ وقت ہم سے آگے نکل چکا ہے۔ ہمیں وہ سب کچھ بھول جانا چاہیے۔"

"تم تو شاید بھول جاؤ گی لیکن میں نہیں بھول سکتا اور اگر بھول بھی جاؤں تو کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہرگز نہیں بھولیں گی۔ جو پرانی ہونے کے باوجود پرانی نہیں ہوں گی اور زندگی میں بار بار مجھے تازہ زخم لگائیں گی۔ اب تم بتاؤ جو کچھ آج میرے ساتھ ہوا ہے' وہ میں کیسے بھولوں گا۔ جو لوگ بڑی چاہت سے شفتا کا ہاتھ مانگ رہے تھے' انہوں نے مجھے اور شفتا کو پاپا! حقارت سے ٹھکرایا ہے۔ کاش تم نے اس وقت شفتا کی صورت دیکھی ہوتی جب وہ آنسو بہاتی ہوئی حویلی میں واپس آئی تھی... کیا کسی طور اس کے آنسوؤں کا مداوا ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے شاہ جہاں!... بلکہ ضرور ہو گا۔" غزالہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں چونک کر غزالہ کی طرف دیکھنے لگا "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ بولی "شاہ جہاں! شاید آپ کو معلوم نہیں' ابھی کچھ دیر پہلے وہ لڑکا یہاں آیا ہے جس سے شفتا کے رشتے کی بات ہو رہی ہے۔"

"کون؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ڈاکٹر حمزہ۔" غزالہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" میرے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر حمزہ حویلی پہنچا ہے۔ آپ شاید اس وقت عاصم سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ قادر زماں کے کارندوں نے اسے حویلی کے مین گیٹ پر روک رکھا تھا۔ اسے شاید آپ کا نام ٹھیک سے معلوم نہیں' وہ آپ کو شاہ زماں کہہ رہا تھا پھر جب اس نے شفقنا کا نام لیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں اسے اندر لے آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ فوری طور پر آپ سے یا شفقنا سے ملنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لیے مہمان خانے کی طرف آئی تھی' جب اندر سے مجھے لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ کی آوازیں سنائی دیں۔"

غزالہ کی اطلاع سنسنی خیز تھی۔ میں غزالہ کو ساتھ لے کر فوراً اس کمرے میں پہنچا جہاں ڈاکٹر حمزہ بیٹھا' زریں گل سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد وہ متذبذب نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ تنہائی چاہتا تھا۔ میں نے غزالہ اور زریں گل کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر چلے گئے۔

ڈاکٹر حمزہ نے کہا "بھائی جان! سب سے پہلے تو مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کا نام بھول گیا۔ دراصل ایک ہی بار تو ملاقات ہوئی ہے ہماری اور وہ بھی بے حد مختصر۔"

"نو مینشن۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "بھائی جان! میں اس موقع پر ایک اہم بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ اسے چھوٹا منہ اور بڑی بات بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہے۔"

"تم جو کہنا چاہتے ہو بے تکلفی سے کہہ سکتے ہو۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "بھائی جان! میں اپنی شرمندگی کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا ہے مگر یہ سب کچھ ویسا نہیں ہے' جیسا آپ کو محسوس ہوا ہے۔ اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔"

"کیسی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"انکل اور ممی کو بری طرح دھمکایا گیا ہے' خوف زدہ کیا گیا ہے۔ انہیں سمجھایا گیا ہے کہ اگر ہم نے رشتہ قبول کیا تو ہمارا انجام حسرت ناک ہو گا۔"

میرے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ میرا ذہن ایک لمحے میں شیخ عاصم اور اس کے حواریوں کی طرف چلا گیا۔

"کس نے دھمکایا ہے تمہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

حمزہ بولا "پہلے گھر میں دو مرتبہ دھمکی آمیز فون آیا' پھر ایک شخص نے انکل سے آفس میں ملاقات کی اور صاف سیدھے لفظوں میں انہیں بتایا کہ وہ اس رشتے کا خیال دل سے نکال دیں۔ انکل نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امارات کا کوئی بہت بااثر شیخ ہے۔ پاکستان کے علاوہ اس کا کاروبار دنیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ شفقنا کا رشتہ اپنے بھتیجے سے کرنا چاہ رہا ہے۔ انکل کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں' کم از کم ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "پھر اب تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

وہ بولا "پلیز بھائی جان! مجھے غلط مت سمجھیں' میں آپ کو بڑا سمجھ کر آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں آپ کے حکم پر بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن تمہارے بزرگ تو کسی ایسی صورت حال کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔"

"ممی نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے بھائی جان... یقین کریں وہ شفقنا کو بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں۔ یہ صدمہ جھیلنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔ دوسری طرف انکل بھی غم سے چور ہیں۔ آپ کے ساتھ انہوں نے جو لب و لہجہ اختیار کیا' وہ ان کی مجبوری تھی۔ یہ کچھ وہی جانتے ہیں کہ وہ اس مرحلے سے کیسے گزرے۔"

"تمہارے بڑوں کے دلی جذبات کیا ہیں' مجھے اس سے غرض نہیں لیکن ان کا رویہ بے حد توہین آمیز تھا۔ کم از کم انہیں ایک بار مجھ سے ملنا تو چاہیے تھا۔ یہ تو جاننا چاہیے تھا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ انہوں نے جس طرح خوف زدہ ہو کر آناً فاناً رویہ بدلا ہے' وہ بہت تکلیف دہ ہے۔"

"میں آپ سے دست بستہ معافی چاہتا ہوں بھیا۔" اس نے ایسے انداز سے کہا کہ میرے دل کی تلخی ایک دم نصف رہ گئی۔ "حالات ایک دم ایسے ہو گئے تھے کہ ہم چکرا کر رہ گئے تھے۔ میں آپ کو بتانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن بتانا پڑ رہا ہے کہ ان لوگوں نے چچا کو باقاعدہ گریبان سے پکڑا تھا اور دفتر میں گھسیٹا تھا۔ لاہور کا ایک خطرناک اجرتی قاتل بھی ان کے ساتھ تھا۔ چچا کو انجائنا کی تکلیف ہو گئی اور ان کے لیے دو بار ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا۔ جس وقت آپ نے گھر کے فون نمبر پر مجھے کال

کی' اس وقت بھی چچا کو تکلیف ہو رہی تھی اور ڈاکٹر ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے بے حد افسوس ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا کہ میں نے آپ کی کال پر فون بند کر دیا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "حمزہ! تمہاری یہ بات درست ہے کہ امارات کا ایک شیخ اس معاملے میں ٹانگ اڑا رہا تھا لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔ وہ عنقریب قانون کے شکنجے میں جکڑا جانے والا ہے اور امید ہے کہ دس پندرہ برس سے پہلے وہ باہر نہیں آ سکے گا۔"

"لیکن سنا ہے وہ تو——"

"تم اس کے اثر و رسوخ کی بات کر رہے ہو نا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں اس کا اثر و رسوخ۔"

میرے اشارے پر ڈاکٹر حمزہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے لے کر مہمان خانے میں آیا۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہر سو خاموشی تھی۔ مہمان خانے کے بونے پہریدار بھی اونگھ رہے تھے۔ ہم شیخ عاصم کے مقفل کمرے کے سامنے پہنچے۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ اندر زیرو کا بلب روشن تھا۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا پھر ڈاکٹر حمزہ کو اندر جھانکنے کی ہدایت کی۔ شیخ عاصم کے چہرے پر جگہ جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پٹی کے ذریعے گردن میں جھول رہا تھا۔ غالباً کلائی وغیرہ مڑ گئی تھی۔ اس کا یہ علاج معالجہ غزالہ نے خود ہی کیا تھا۔ شیخ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر سو رہا تھا۔

میں نے حمزہ سے کہا "یہ ہے امارات کا وہ پھنے خان شیخ۔ یہ ساری رات بھی کمرے کا دروازہ پیٹتا رہے گا تو کوئی اس کے لیے دروازہ نہیں کھولے گا۔"

حمزہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا "شیخ کئی مقدمات میں انٹرپول کو درکار ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں بھی اس پر قتل' دھوکا بازی اور عصمت دری کے درجنوں کیس بنیں گے۔ تھوڑا سا وقت ضرور لگے گا لیکن پھر یہ شخص اس طرح قانون کے شکنجے میں جکڑا جائے گا کہ ہل تک نہیں سکے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شخص اپنے حصے کی دھمکیاں دے چکا ہے اور اپنے حصے کی فرعونیت بھی دکھا چکا ہے۔ اب اس کا حساب شروع ہونے والا ہے اور یہ حساب یقیناً بہت کڑا ہو گا۔"

"لیکن اس کو مارا کس نے ہے؟"

"سمجھو کہ اس کے مقدر نے مارا ہے اور یہ مقدر اب اسے اور اس کے خیر خواہوں کو اور بھی بہت کچھ دکھانے والا ہے۔"

میری گفتگو کا ڈاکٹر حمزہ پر مثبت اثر ہو رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے سے اعتماد جھلکنے لگا تھا۔ میں نے حمزہ کو بتایا کہ اس حویلی میں شیخ عاصم کی موجودگی کے بارے میں چار پانچ افراد کے سوا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ لاہور میں وسیع پیمانے پر شیخ کی تلاش ہو رہی ہے لیکن کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ شیخ یہاں جھنگ میں ہے۔

ہم دونوں واپس کمرے میں آ گئے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر حمزہ! تمہارے تاثرات کیا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے بارے میں تم لوگوں نے جو رائے قائم کی ہے وہ اور پختہ ہو گئی ہو؟"

"میں سمجھا نہیں۔ کون سی رائے؟"

"یہی کہ میں ایک جانا پہچانا مجرم ہوں۔ جہانی اُستاد کے نام سے مشہور ہوں۔ ہر کام دھونس اور دبدبے سے کرتا ہوں۔ جیلیں کاٹ چکا ہوں۔ قانون کو کھلونا بنائے رکھتا ہوں۔ وغیرہ—— وغیرہ۔"

ڈاکٹر حمزہ بولا "یہ خیال آپ کے ذہن میں کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ میں نے اپنی سینہ زوری کا ایک ثبوت فراہم کیا ہے۔ ایک بہت دبنگ شخص کو بے دست و پا پنجرے میں بند دکھا دیا ہے۔"

حمزہ نے اپنائیت سے کہا "آپ اس بارے میں بات نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ برا نہ منائیں تو کہوں کہ شفقنا نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے' سب کچھ۔ شروع سے آخر تک۔ یقین کریں بھائی جان' میں نے آپ کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ آپ کے کئی تصوراتی ہیولے بنائے ہیں۔ آپ سے ملا ہوں تو آپ کو ان تصوراتی ہیولوں سے بڑھ کر پایا ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے اندر آپ کے لیے ایک خلا موجود تھا۔ بالکل آپ جیسا ہی ایک شخص مجھے درکار تھا جو مجھ سے بہت "بزرگ" نہ ہو' جس کے ساتھ میں بہت بے تکلفی سے بات کر سکوں۔ جو مجھے قیمتی مشورے دے سکے' جسے دیکھ کر میرے اندر حوصلہ مندی پیدا ہو۔ آپ میری خواہش کے عین مطابق ہیں شاہ زماں بھائی۔"

"شاہ زماں بھائی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"او آئی ایم ویری سوری۔" وہ چونک کر بولا "آپ کے لیے میرے منہ سے ہمیشہ شاہ جہاں کے بجائے شاہ زماں ہی نکلتا ہے۔ شفقنا بھی مجھے بار بار ٹوکا کرتی تھی۔ شاید کوئی ٹیکنیکل وجہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں حویلی آیا تو تب بھی

چوکیدار کو آپ کا نام شاہ جہاں کے بجائے شاہ زماں ہی بتا رہا تھا۔"

میں اور ڈاکٹر حمزہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوجوان ڈاکٹر حمزہ کی باتوں سے اخلاق جھلکتا تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ شفتا کو دل کی گہرائیوں سے پسند کرتا ہے اور اسے اپنانے کے لیے ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہے۔ درحقیقت وہ یہاں آیا ہی اسی لیے تھا۔ وہ گرین کارڈ ہولڈر تھا اور دو مرتبہ امریکا جا چکا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ اگر شفتا کے ساتھ شادی کے لیے پاکستان میں حالات سازگار نہیں تو وہ اور شفتا شادی کے فوراً بعد امریکا منتقل ہو جائیں۔ میں نے کئی موضوعات پر کھل کر بات کی۔ ڈاکٹر حمزہ مجھے بہت اپنا اپنا لگا۔ اس کی گفتگو میں تصنع نام کو نہیں تھا، جو کچھ اس کے دل میں ہوتا تھا براہِ راست زبان پر آجاتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شفتا کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ میں شفتا کو یہاں بلا سکتا تھا لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ اس وقت حمزہ اور اس کی فیملی کے خلاف غم و غصے سے بھری ہوئی تھی۔ جب تک اسے اصل صورتِ حال کا علم نہ ہوتا، اسے یہاں لانا ٹھیک نہیں تھا۔

وہ رات ڈاکٹر حمزہ نے حویلی میں گزاری۔ میں نے اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں اس کا بستر لگوا دیا۔ سونے سے پہلے وہ کافی مطمئن بلکہ خوش نظر آ رہا تھا۔ میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ صبح شفتا سے بات کروں گا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کروں گا لیکن صبر بھی نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ شفتا یہ رات کتنی اذیت میں کاٹے گی۔ تھوڑی دیر بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد میں شفتا کی طرف چلا گیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے زیرو کے بلب کی دودھیا روشنی میں دیکھا، اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ مسلسل روتی رہی ہے۔

میں نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ کچھ دیر ہم یونہی ساکت کھڑے رہے پھر میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی "وہ آیا ہے۔"

"کون؟" وہ فاختہ کی طرح چونک کر بولی۔

"ڈاکٹر حمزہ!"

اس کا جسم تن گیا۔ وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر مجھے گھورنے لگی۔

میں نے کہا "اتنے غصے سے مت دیکھو جھانسی کی رانی۔۔۔ وہ بے چارہ پہلے ہی بہت سہما ہوا ہے۔"

وہ لاڈ سے بولی "بھیا! کیوں مذاق کرتے ہیں آپ۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

"مذاق نہیں کر رہا ہوں پاگلے۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ تو دو ڈھائی گھنٹے سے آیا بیٹھا ہے۔ بالکل اُداس کبوتر نظر آ رہا ہے۔"

شفتا "ناقابلِ یقین" نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے پاس بٹھا لیا۔ اس کے گلے میں بازو ڈالا اور شروع سے لے کر آخر تک ساری بات اسے بتا دی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب میں اس کے پاس سے اٹھا تو صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ یعنی جب میں آیا تھا تب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اب جا رہا تھا تب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب نظر آنے والے آنسو خوشی کے تھے۔

رات کو میں گہری نیند سویا۔ زخمی انگلی گاہے گاہے درد کرتی رہی۔ تاہم اس انگلی کو غزالہ نے اپنی نرم و گداز مٹھی میں لے کر اس پر ایک ایسا مرہم رکھا تھا جو شدید سے شدید درد پر حاوی تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج میرا سارا جسم اس انگلی کے مانند مضروب ہو جاتا اور غزالہ اپنے نرم و گداز جسم سے مجھے ڈھانپ لیتی۔ غزالہ میری نہیں تھی۔ میرے اور اس کے درمیان عاصم حائل تھا لیکن میری سوچیں اور میری آرزوؤں کے درمیان تو کوئی حائل نہیں تھا۔ میری سوچیں چاروں طرف بے لگام گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑ رہی تھیں۔ تصور کے پردے پر غزالہ میری بانہوں میں تھی۔ میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اسے چوم رہا تھا، بھینچ رہا تھا۔ میرا چہرہ اس کے جسم کے گرم گداز میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سرگوشیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں جنہیں سننے کے بعد موت بھی آسان محسوس ہوتی ہے۔ ذہنی رو بھٹکی ہوئی تھی۔ بے شک یہ ذہنی عیاشی تھی۔ میں اس قسم کی سرگرمی کو پسند نہیں کرتا تھا مگر کبھی کبھی سوچیں واقعی بے لگام گھوڑوں کے مانند ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود اختیار کرتی ہیں۔ انہیں بار بار روکا جاتا ہے لیکن وہ چکمہ دے کر نکل جاتی ہیں۔

صبح میری آنکھ ایک نامانوس شور سے کھلی۔ حویلی کا ایک بوڑھا ملازم زور زور سے چیخ رہا تھا۔ غالباً اپنی زبان میں اپنے کسی ساتھی کو کچھ سمجھا رہا تھا پھر مجھے حویلی کے ملازم خاص منصب علی کی چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ کسی کمدار سے مخاطب تھا "اوئے رمضانی' جلدی کرو۔۔۔ اٹھاؤ اسے۔۔۔ اسپتال چلتے

ہیں۔ شاید ابھی سانس ہو۔"

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ یقیناً کوئی شدید زخمی حالت میں پایا گیا تھا۔ ایک دوسری آواز آئی "نہیں بھائی۔۔۔ بے کار ہے۔ یہ تو مر چکا ہے۔"

ایکا ایکی میرے ذہن میں ایک اور خوف ناک اندیشہ جاگا۔ ڈاکٹر حمزہ ساتھ والے کمرے میں سویا تھا۔ خدانخواستہ کہیں اس کے ساتھ تو کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ میں لپکتا ہوا باہر آیا۔ میرے بدترین اندیشے غلط ثابت ہو گئے اور دل جو دھڑکنا بھول گیا تھا پھر سے دھڑکنے لگا۔ میں نے دیکھا، برآمدے کے ٹائیلوں والے فرش پر ایک لاش پڑی ہے۔ یہ کسی نوجوان گھریلو ملازم کی لاش تھی۔ وہ شکل و صورت سے پشاوری نظر آتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پٹھانی چپل تھی۔ اس کے سینے میں دل کے مقام پر خنجر یا چاقو سے وار کیا گیا تھا۔ خون کے لوتھڑے فرش پر جمے ہوئے تھے۔ زخم کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وار کرنے والا کوئی ماہر قاتل ہے۔ زخم کا رخ اور مقام قاتل کے نقطہ نظر سے سو فیصد درست تھا۔ یقیناً چند سیکنڈ کے اندر اندر مضروب کی موت واقع ہو گئی تھی۔

میری نگاہ ذرا آگے گئی اور ایک بار پھر مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔ باورچی خانے کی دہلیز پر ایک اور لاش نظر آ رہی تھی۔ باورچی خانے کے فرش پر بہت سا دودھ بکھرا ہوا تھا اور انڈے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اسی دودھ اور انڈوں میں ایک مقتولہ لت پت پڑی تھی۔ یہ ایک نوجوان قبول صورت خادمہ تھی۔ ناک میں کوکی چمک رہی تھی۔ کلائیوں میں کسی میلے ٹھیلے سے خریدی ہوئی چوڑیاں تھیں۔ وہ سراپا دیہاتن نظر آ رہی تھی، اس کے گلے میں دوپٹے کا پھندا ڈال کر بھینچا گیا تھا یہاں تک کہ وہ جاں بحق ہو گئی تھی۔ دم گھٹ کر ہلاک ہونے والوں کی طرح مقتولہ کی آنکھیں باہر ابلی ہوئی تھیں اور زبان بھی باہر نکلی ہوئی تھی۔ مقتولہ نے بٹنوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور ایک خاص چیز نوٹ کرنے والی یہ تھی کہ قمیص کے گریبان کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے اور "زیریں لباس" بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ مقتولہ کے کانوں میں رات کی رانی کے پھول تھے اور ہونٹوں پر سستی سی لالی بھی لگی ہوئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں لاشوں کے گرد جمگھٹا ہو گیا۔ پوری حویلی میں کہرام مچ گیا تھا۔ رونے پیٹنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یقیناً مقتولین کے یا کسی ایک مقتول کے والی وارث بھی یہاں موجود تھے۔ چار پانچ منٹ کے اندر اندر آغا قادر زماں بھی موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے بونے محافظوں نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ حویلی میں موجود ہر چہرہ خوف و ہراس کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پہلا خیال تو ذہن میں یہی آ رہا تھا کہ شاید حویلی میں باہر سے مسلح افراد گھسے ہیں اور انہوں نے پکڑے جانے کے خوف سے دونوں ملازمین کو ہلاک کر دیا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کئی امکانات ہو سکتے تھے۔ ایک بات میں صاف دیکھ رہا تھا کہ دونوں مقتولین کو بے حد مہارت سے قتل کیا گیا تھا۔ شاید انہیں مزاحمت کا معمولی سا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

میں نے دیکھا جب آغا قادر زماں لاشوں کے معائنے کے لیے موقع پر پہنچا تو ملازم خاص منصب علی نے کوئی چیز قادر زماں کے حوالے کی اور ساتھ ہی لاشوں کی طرف اشارہ بھی کیا، جیسے وہ اسے بتا رہا ہو کہ یہ چیز لاشوں کے پاس سے ملی ہے۔ قادر زماں نے ایک بار دیکھ کر وہ چیز جیب میں رکھ لی۔

قادر زماں نے اپنے محافظوں اور کارندوں سے پوچھ گچھ کی پھر پولیس کو فون کیا گیا۔ پولیس کے انتظار میں لاشوں کو موقع پر ہی چادروں سے ڈھانپ دیا گیا اور حویلی میں موجود لوگوں کو لاشوں کے قریب جانے سے منع کر دیا گیا۔

قادر زماں ہمارے ساتھ اپنے وسیع ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ اس کا چہرہ بے حد متفکر نظر آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں میرے علاوہ عالم قریشی، ڈاکٹر حمزہ، ملازم خاص منصب علی اور چند دیگر افراد تھے۔

قادر زماں گمبھیر لہجے میں بولا "پچھلے دس برسوں میں اس قسم کا یہ پہلا واقعہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوا۔ یہ بات تو کسی طرح دماغ میں نہیں آتی کہ کوئی باہر سے حویلی میں گھسا ہے۔ حویلی رات بھر کڑے پہرے میں رہتی ہے۔ دروازوں کے علاوہ احاطے میں بھی پہرے دار موجود رہتے ہیں۔ دقوعہ تک آنے والے کو کم از کم تین جگہ پہرے داروں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ حویلی کے اندر سے ہی کسی نے کارروائی کی ہے؟"

"بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے لیکن ملازموں سے کسی کی کیا عداوت ہو سکتی ہے۔" قادر زماں پرسوچ لہجے میں بولا "اس کے علاوہ ایک اور بات بھی آپ سب کو نظر آ رہی ہوگی۔ ایسا لگتا ہے کہ نوکرانی کے ساتھ ایسی ویسی بات بھی ہوئی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو محسوس ہو رہی ہے" قادر زماں کے ایک ساتھی نے تائید کی۔

میں نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی تیسرا شخص مقتولہ

کے ساتھ "مصروف" ہو۔ اسی دوران میں مقتول لڑکا بھی آگیا ہو۔ راز کھلنے کے خوف سے قاتل نے اسے جان سے مار ڈالا ہو۔ بعد میں شہادت ختم کرنے کے لیے لڑکی کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہو۔"

"یہ بات میرے بھی دل کو لگ رہی ہے جان جی۔" قادر زماں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

کچھ دیر اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ ایک کارندے کی زبانی پتا چلا کہ مقتول صابر خاں اور مقتولہ نسرین آپس میں بھی بہت چہتے بولتے تھے' ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی ناتا ہو۔ یہ صورتِ حال ایک اور امکان کو وجود دے رہی تھی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اور لڑکی کو رات کی تنہائی میں مصروف دیکھ کر لڑکی کا کوئی دائی وارث اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا ہو اور اس نے دونوں کو ختم کر ڈالا ہو۔

گفتگو کے دوران میں ہی قادر زماں مجھے اٹھا کر باہر لے آیا۔ کہنے لگا "شاد جہاں! ہمارے درمیان دشمنی کا دور ختم ہو چکا ہے' اب ہم دوستی کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور اللہ نے چاہا تو یہ دوستی قائم رہے گی لیکن اونچ نیچ تو آتی ہی رہتی ہے' جیسے اب آئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

قادر زماں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بٹوا نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "یہ چھوٹا سا بٹوا موقع سے ملا ہے۔ میرے کارندے منصب علی کو یقین ہے کہ یہ حویلی کے کسی بندے کا بٹوا نہیں۔ یہ بات بھی تقریباً طے ہے کہ رات کو باہر سے کوئی بندہ حویلی میں نہیں آیا۔ اب یہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ حویلی میں آئے ہوئے مہمانوں میں سے کسی کا بٹوا ہے۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے شاد جہاں! میں تم پر اتنا اعتماد کر سکتا ہوں' جتنا خود پر کرتا ہوں لیکن اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کے بارے میں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔"

میں نے بٹوے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ عالم قریشی یا زریں گل میں سے کسی کا نہیں تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ سے میری جان پہچان زیادہ طویل نہیں تھی لیکن اس مختصر وقت میں ہی میں اس کی "نیچر" بہت اچھی طرح جان گیا تھا۔ یہ دو قتل تو ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ حمزہ کے بارے میں تو یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ اس نے غصے میں کسی کا گریبان تک پکڑا ہو گا۔ جہاں تک عالم قریشی اور زریں گل کا تعلق تھا' میں ان کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر کے گارنٹی دے سکتا تھا کہ وہ کسی ایسی خوف ناک حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

میں نے بٹوے کو کھول کر دیکھا۔ اس میں نقدی' دو گاری ایک دو رسیدوں اور فلائنگ کوچ کے ایک پرانے ٹکٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ چمڑے کا قیمتی بٹوا تھا۔ خاصا پرانا تھا' اس میں پسینے کی بو اور پرفیوم کی باس رچ بس چکی تھی۔ پرانا ہونے کے باوجود وہ نیا ہی نظر آتا تھا۔ بٹوے میں سے اٹھتی ہوئی باس کو محسوس کر کے مجھے یوں لگا جیسے یہ باس میری جانی پہچانی ہے۔ کہیں بہت قریب سے یہ باس میرے نتھنوں سے ٹکرا چکی ہے' میں نے بٹوا قادر زماں کو واپس کرتے ہوئے کہا "نہیں چوہدری! یہ بٹوا میرے ساتھیوں میں سے کسی کا نہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنی طرف سے ان کی سو فیصد ضمانت دیتا ہوں۔ ایسی کسی واردات سے ان کا تعلق ہونا ناممکنات میں سے ہے۔"

چوہدری قادر زماں نے بٹوا مجھ سے واپس لے لیا اور بولا "جان جی! میں نے تم سے ضمانت نہیں مانگی تھی۔ تمہارا بس یہ کہنا ہی بہت ہے کہ اس بٹوے سے تمہارے ساتھیوں کا تعلق نہیں۔"

تھوڑی ہی دیر میں پولیس بھی حویلی میں پہنچ گئی۔ تفتیش شروع ہو گئی۔ قریباً دو درجن افراد کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ فوٹو گرافرز نے لاشوں کی تصویریں اتاریں' پولیس نے موقع پر کارروائی مکمل کی اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا۔ یہ قادر زماں کا اثر و رسوخ تھا کہ پولیس صرف ایک گھنٹے میں فارغ ہو کر واپس چلی گئی۔ کسی شخص کو حراست میں نہیں لیا گیا۔ حتیٰ کہ ہم سے بھی پوچھ گچھ نہیں ہوئی حالانکہ آؤٹ سائیڈرز کی حیثیت سے ہم سے پوچھ گچھ ہونی چاہیے تھی۔

پولیس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد حویلی میں پھر ہلچل پیدا ہو گئی۔ میں نے پریشان چہروں کو ادھر ادھر لپکتے دیکھا پھر مجھے زریں گل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مہمان خانے کی طرف سے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا زریں گل؟"

وہ بولا "استاد صیب! اپنا نہیں یہاں کیا گڑبڑ گھوٹالا ہو رہا ہے۔ ادھر مہمان خانے کی طرف سے کوٹھری میں ایک بوڑھا گارڈ بے ہوش ملا ہے۔ اس کے سر پر کسی وزنی شے سے چوٹ لگائی گیا ہے۔ بہت سا خون بھی بہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک ملازمہ عورت کوٹھری سے ایندھن نکالنے گیا تو وہاں سے خرخر کی آواز آیا۔ دیکھا تو بوڑھا غشی کی حالت میں پڑا تھا۔ اب اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے وغیرہ مارا گیا ہے اور وہ ہوش میں آیا ہے۔"

صورتِ حال واقعی غور طلب تھی۔ یوں لگتا تھا کہ رات کو حویلی میں کوئی زبردست قسم کی گڑبڑ ہوئی تھی۔ دو افراد کا بہیمانہ قتل اور ایک محافظ کا بے ہوش پایا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میں مہمان خانے کے اس کمرے میں پہنچا جہاں بوڑھے محافظ کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔ اس کے سر پر پٹی باندھی گئی تھی اور چہرے سے خون صاف کر دیا گیا تھا۔ بوڑھے محافظوں میں سے ایک ہیڈ گارڈ بھی تھا۔ صرف وہی انگلش زبان سمجھتا تھا۔ وہ ایک طرح سے بوڑھوں کے مترجم کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بے ہوش ہو جانے والے کوتاہ قد گارڈ کا مافی الضمیر بیان کرنے لگا۔ گارڈ نے بتایا کہ رات وہ مہمان خانے کے سامنے پہرے پر تھا۔ رات ڈھائی تین بجے کا عمل تھا جب اس نے ایک سایہ سا دیوار پر ادھر ادھر رینگتا دیکھا۔ پہلے تو اس نے اسے وہم خیال کیا مگر پھر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی شخص بڑی پھرتی اور چابک دستی سے حویلی کے ماحول کا جائزہ لے رہا ہے۔ بوڑھے گارڈ نے اپنی ٹریننگ کے مطابق طاقت ور پستول نکال لیا اور سائے کی طرف بڑھا۔ دفعتاً یک سایہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا' بالکل جیسے اسے زمین نگل گئی ہو۔ وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جب کوئی بلا کی طرح اس سے چمٹ گیا۔ سر پر کسی وزنی چیز کی ضرب لگی اور گارڈ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

بوڑھے گارڈ کی باتوں سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ رات حویلی میں پُراسرار قسم کی نقل و حرکت رہی ہے۔ ممکن تھا کہ بوڑھے گارڈ نے جس پرچھائیں کا ذکر کیا ہے' وہی پرچھائیں دو افراد کے بہیمانہ قتل کی ذمے دار ہو۔ قادر زماں کو یقین تھا کہ حویلی میں کوئی باہر سے نہیں آیا اور نہ ہی واردات کے بعد باہر گیا ہے' اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی تھا' حویلی میں موجود تھا اور اب بھی ہے۔ اچانک میں نے ایک منظر دیکھا اور چونک گیا۔ زریں گل ہمارے پاس ہی کھڑا تھا' ایک دم وہ برآمدے کی طرف اوجھل ہو گیا۔ میں نے برآمدے میں جا کر دیکھا' وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے زریں گل نے کسی مشکوک شخص کو دیکھا ہے اور اس کے پیچھے گیا ہے۔ میں کچھ دیر زریں گل کو یہاں وہاں دیکھتا رہا مگر وہ نظر نہیں آیا' جب میں مایوس ہو رہا تھا تو وہ اچانک ایک طرف سے واپس آ رہا تھا۔ وہ حویلی کے اندر ہی واقع پرائیویٹ اسپتال کی طرف سے واپس آ رہا تھا۔

وہ بولا "استاد صیب! ابھی ام نے حویلی میں کام کرنے والے ایک بندے کو ادھر سے گزرتے دیکھا تھا۔ اس نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ام کو اس کا آنکھیں ایک دم جانا پہچانا لگا تھا۔ ام اس کے پیچھے گیا تھا۔ وہ حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں چلا گیا۔ وہاں درختوں پر اسپرے کا کام ہو رہا ہے۔ وہ بندہ بھی اسپرے کرنے والے مزدوروں میں شامل ہے' اسی لیے اس نے منہ پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔"

میں نے غور کیا۔ حویلی کے پچھواڑے سے واقعی اسپرے کی بو آ رہی تھی۔ حویلی کے پچھواڑے اور دونوں پہلوؤں میں لمبے چوڑے باغ موجود تھے۔ غالباً وہاں دستی پمپوں کے ذریعے اسپرے کیا جا رہا تھا۔ میں نے زریں سے پوچھا "کچھ پتا چلا کہ وہ کون تھا؟"

"ٹھیک سے پتا نہیں چلا لیکن امارے دماغ میں آ رہا ہے کہ ام نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اگر وہ منہ سے کپڑا اتار دے گا تو ام ایک دم اسے پہچان لے گا۔"

میں زریں کے ساتھ فوراً پچھواڑے کے باغ میں پہنچا۔ امرود' جامن' آم اور لیچی کے بہت سے درخت یہاں موجود تھے۔ ان درختوں کے درمیان پختہ روشیں بنی ہوئی تھیں اور گھاس کے قطعات تھے۔ یہی درخت تھے جن کے درمیان ایک مرتبہ رات کی تاریکی میں میرے اور خونخوار بوڑھے باڈی گارڈز کے درمیان سنسنی خیز معرکہ ہوا تھا۔ مجھے یہ تمام گرد و پیش بہت اچھی طرح یاد تھا۔

اس وقت تین چار افراد منہ پر ڈھاٹے باندھے درختوں پر اسپرے کر رہے تھے۔ کچھ افراد دستی مشینوں کے ذریعے گھاس کاٹنے میں مصروف تھے۔

میں نے زریں گل سے پوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے؟

زریں کے چہرے پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ اس نے اسپرے کرنے والوں کو غور سے دیکھا اور بولا "وہ اب ان لوگوں میں موجود نہیں ہے۔ خو چہ ام کو لگتا ہے کہ وہ نازگیا ہے اور غائب ہو گیا ہے۔"

یہ کافی سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ ایک دم میرا ذہن شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ محاذ جس کو ہم خاموش سمجھ رہے تھے' خاموش نہ ہو' شیخ عاصم کو آزاد کرانے کے لیے اس کے حواری حرکت میں آ چکے ہوں۔ بے شک ان حواریوں میں وہ شخص بھی شامل تھا' شیطان جس سے پناہ مانگتا تھا اور درندگی و سفاکی جس کی فطرت تک پہنچ کر انتہا کو چھو جاتی تھی۔ مجسم حیوان منگر منگرا' میں اسے شیخ کی ڈیفنس والی کوٹھی میں بے ہوش چھوڑ آیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ

خطرناک شخص کسی طور اس حویلی میں داخل ہو چکا ہو اور کسی سنگین ہنگامے کا سبب بننے والا ہو۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میرا دھیان خود بہ خود اس چرمی بٹوے کی طرف چلا گیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے قاور زماں نے مجھے دکھایا تھا اور جس میں سے مجھے ایک مانوس بُو آئی تھی۔ میں نے زریں گل سے کہا "زریں کہیں ایسا تو نہیں کہ شنکر شکرا یا اس کے ساتھی یہاں موجود ہوں؟"

زریں کے چہرے پر زلزلہ نمودار ہوا۔ "او میرے خدایا! امارا خیال ہے کہ یہ وہی شنکر ہی تھا۔"

میں واپس قاور زماں کے پاس آیا۔ بٹوے سے آنے والی مخصوص بو میرے ذہن میں تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ اس بُو کا تعلق شنکر شکرا سے ہے۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں شنکرا اور میں کئی مرتبہ دست و گریباں ہوئے تھے۔ میں جب بھی اس کے نزدیک آیا تھا یہ نامانوس حیوانی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ پرفیوم اور پسینے کی ملی جلی اس بو کو میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا مگر اس کا وجود حقیقت تھا۔ قاور زماں سے چرمی بٹوا لے کر میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا ایک بار پھر اس کی بُو سونگھی۔ ذہن میں جیسے سیکڑوں قمقمے روشن ہو گئے۔ چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ شنکر شکرا اپنی تمام تر سفاکی اور درندگی کے ساتھ اس حویلی میں موجود ہے۔

یہ خیال آتے ہی میرے اعصاب پوری طرح تن گئے۔ تمام حسیات ہر طرح بیدار ہو گئیں۔ میں نے قاور زماں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں ایک علیحدہ کمرے میں پہنچے۔ قاور زماں کے دونوں بوڑھے باڈی گارڈ اس کے ساتھ تھے۔ میں نے قاور زماں کو اشارہ کیا اور اس نے گارڈز کو بھی باہر بھیج دیا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! شنکر شکرا کا نام سنا ہے آپ نے؟"

"بالکل سنا ہے لیکن اس کا ذکر یہاں کیسے آگیا؟"

چوہدری کے چہرے پر ہراس نمودار ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "مجھے ڈر ہے چوہدری کہ شنکر شکرا اس حویلی میں موجود ہے۔"

قاور زماں کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولا "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ حرامی یہاں موجود ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے زریں گل نے اسے ان مزدوروں میں دیکھا ہے جو حویلی کے پچھواڑے باغ میں اسپرے کر رہے ہیں۔ اب وہ فرار ہو گیا ہے۔ اس کی اسپرے مشین وہیں درختوں میں پڑی ہے۔"

قاور زماں نے چلا کر بوڑھے باڈی گارڈز کو بلایا۔ انچارج گارڈ بھی ان کے ساتھ ہی آیا۔ قاور زماں نے گارڈز کو حکم دیا کہ وہ پوری حویلی میں پھیل جائیں اور پوری طرح چوکس ہو جائیں۔ اس نے گارڈز کو بتایا کہ ایک اجنبی شخص حویلی میں موجود ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ خطرناک شخص وہی ہو جس نے رات دو افراد کو جان سے مارا ہے۔

بوڑھے گارڈز حکم کی تعمیل میں چاروں طرف پھیل گئے۔ ان کی زرد آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہو گئی تھی۔ قاور زماں نے اپنے ملازم خاص منصب علی کو بلایا اور پوچھا کہ حویلی میں کام کرنے والے بندوں کو کون لایا تھا۔

"کون سے بندے جاگیر دار جی؟" منصب علی نے پوچھا۔

"وہی جو درختوں پر اسپرے کر رہے ہیں۔"

"میں ہی لے کر آیا تھا جی۔"

"کہاں سے لائے تھے؟"

"وہ خود آئے تھے جی سائیکلوں پر۔ راج پورہ کے چوہدری خان محمد کے باغوں میں بھی انہوں نے ہی اسپرے کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ اگر اسپرے کرانا ہے تو وہ مناسب قیمت پر کر دیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہے اسپرے کا موسم ہے۔ آپ نے خود بھی دو تین دفعہ کہا تھا کہ اسپرے کروا لو۔ لیکن کیا۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"لگ تو یہی رہا ہے کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔" قاور زماں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ منصب علی سہم کر رہ گیا۔ قاور زماں نے منصب کو حکم دیتے ہوئے کہا "باغ کو فوراً گھیر لو لیکن میں بے وقوفی برداشت نہیں کروں گا۔ اسپرے کرنے والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ انہیں گھیرا گیا ہے۔"

میں نے کہا "اور ان کے قریب جانے کی کوشش نہ کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس خطرناک ہتھیار ہوں۔"

منصب علی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ وہ سخت پریشان نظر آتا تھا۔ ابھی دو مقتولوں کی لاشیں ہی اٹھائی گئی تھیں کہ یہ نیا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ قاور زماں کے گرد موجود دونوں باڈی گارڈز آج ہمیشہ سے زیادہ محتاط اور چوکس نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ ہر صورت ہولسٹروں پر تھے اور پلک جھپکنے میں ان کے دستوں والے پسٹل ان کے ہاتھ میں آ سکتے تھے۔ میں

اپنا پسٹل چیک کرلیا تھا اور اس کے بروقت استعمال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

قادر زماں مجھے ساتھ لے کر حویلی کے بلند و بالا مین گیٹ تک پہنچا۔ یہاں باقاعدہ لکڑی کا کیبن بنا ہوا تھا اور گھنی مونچھوں والا مسلح چوکیدار موجود تھا۔ قادر زماں نے چوکیدار سے پوچھا "بخشے! کل صبح اسپرے کرنے والے کتنے بندے حویلی میں آئے تھے؟"

"پپ۔۔۔ پانچ جاگیردار جی۔" چوکیدار ہکلا کر بولا۔

"شام کو واپس کتنے گئے تھے؟"

"میرے سامنے تو چار گئے تھے جناب' ایک دوپہر کو ہی چلا گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"ان میں سے ایک بندہ دوپہر کو چھٹی کر گیا تھا جی۔ اس وقت گیٹ پر سلامت علی کی ڈیوٹی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ایک بندہ دوپہر کو ہی چلا گیا تھا؟ کیا سلامت علی نے خود بتایا تھا؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔ اسپرے کرنے والوں نے بتایا تھا۔"

"سلامت علی کہاں ہے؟" جاگیردار نے گرج کر پوچھا۔

"وہ آج چھٹی پر ہے جی۔ شام کو آپ ہی سے پوچھ کر گیا تھا۔"

جاگیردار ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس کا طوفانی تھپڑ چوکیدار کے گال پر پڑا اور چٹاخ کی آواز جیسے پوری حویلی میں گونج گئی۔ جاگیردار گرجا "حرام زادے! وہ پانچواں بندہ واپس نہیں گیا تھا' وہ رات اسی حویلی میں تھا۔ تیری اس ماں کو اور تیرے باپ کو اسی نے قتل کیا ہے۔ حرام خورو! تم سے تو کتے ہی اچھے ہیں جو آنکھیں کھول کر پہرا دیتے ہیں۔"

ایک اور تھپڑ چوکیدار کے گال پر پڑا اور اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ قادر زماں نے حویلی کے گیٹ پر تین مزید مسلح افراد متعین کیے اور میرے ساتھ حویلی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ حویلی کے دیگر مکینوں کی طرح عالم قریشی اور زریں گل بھی صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کر چکے تھے۔ وہ کسی بھی طرح کے ہنگامے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہاں ڈاکٹر حمزہ کے لیے یہ سچویشن اجنبی تھی' وہ کچھ تردد سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سامنے جس انداز میں شنکر شکرا کا نام لیا جا رہا تھا' یقیناً وہ بھی اس کے لیے تعجب کا باعث تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم شنکر شکرا کا نہیں کسی خون آشام درندے کا ذکر کر رہے ہیں جو پہریداروں کی نظر بچا کر اس حویلی میں گھس آیا تھا اور اب کسی تاریک کونے کھدرے میں گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔

قادر زماں کی ہدایت کے مطابق اس کے مسلح کارندے عقبی باغ میں پہنچ گئے تھے۔ وہ سب دیہاتی لباس میں تھے۔ ان کے کھلے کرتوں اور تہبند وغیرہ کے اندر یقیناً آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ ایک دو افراد کے کندھے سے آٹومیٹک رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ باغ کے باہر سے گزرنے والے خم دار راستے کے ساتھ ساتھ موجود تھے اور درختوں پر اسپرے کرنے والے چاروں افراد پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ یہاں مجھے قادر زماں کے خوفناک سینٹ برنارڈ کتے بھی نظر آئے۔ ان کتوں کی زنجیریں جاگیردار کے تومند کمداروں نے سنبھال رکھی تھیں۔ اسپرے کرنے والے پانچ افراد میں سے چار نظر آ رہے تھے۔ وہ شلواریں قمیصیں پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے منہ پر صافے وغیرہ لپیٹ رکھے تھے۔ ان کے پاس ہینڈ پمپ سے چلنے والی مشینیں تھیں۔ ان مشینوں کے اندر ایک بڑے سائز کی رائفل آسانی سے چھپائی جا سکتی تھی۔ اگر قادر زماں کے کارندے فوری طور پر ان افراد کو گھیر کر ہینڈز اپ کرا دیتے تو ان پر قابو پایا جا سکتا تھا لیکن اس صورت میں وہ پانچواں شخص ہوشیار ہو جاتا جو اس حویلی میں کہیں گم ہو گیا تھا اور جو درحقیقت اس گروہ کا خطرناک ترین شخص تھا۔ میری مراد شنکر شکرا سے ہے۔ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ اس کا سراغ لگا لیا جائے۔

میں نے قادر زماں سے کہا "چوہدری صاحب! ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے ہمیں شنکر پر قابو پانا ہے۔ جب تک وہ ہماری گرفت میں نہیں آتا' اس حویلی میں موجود کسی شخص کی زندگی بھی محفوظ نہیں ہے۔ آپ نے شنکر کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہوگا لیکن جو کچھ بھی سنا ہے' کم ہے۔ وہ ایک بدترین شخص ہے اور اس کا حویلی میں داخل ہو جانا کسی المیے سے کم نہیں۔"

قادر زماں اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بولا "جان جی! ہم تو تمہارے پیچھے ہیں۔ جو تم کہو گے' وہی کریں گے جس طرح پہلے کرتے رہے ہیں۔"

جاگیردار کا لہجہ پہلو دار تھا۔ میں نے کہا "چوہدری صاحب! مجھے اعتراف ہے کہ جو کچھ ہوا ہے' میری وجہ سے ہوا ہے اور اس وجہ سے ہوا ہے کہ میں شیخ عاصم کو یہاں لے کر آیا ہوں۔ یہ سو فیصد میری مصیبت ہے جو آپ کو بھی بھگتنا پڑ رہی ہے لیکن آپ بے فکر رہیں' میں شنکر کا سامنا خود کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آج کا دن شنکر کی ذلت کا دن ثابت ہوگا۔"

میں نے قادر زماں سے کہا کہ وہ اپنے کارندوں کو حویلی کے چاروں طرف پھیلائے رکھے تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اس کے علاوہ اسپرے کرنے والے افراد پر گہری نگاہ رکھی جائے۔ اگر ان میں کوئی آتشیں ہتھیار نکالنے یا مزاحمت پر آمادہ نظر آئے تو فوراً گولی چلا دی جائے۔ اس کے بعد میں نے زریں گل کو ساتھ لیا' قادر زماں کے دو چاق چوبند مسلح گارڈز بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ میں سب سے پہلے مہمان خانے میں پہنچا۔ شیخ عاصم مہمان خانے میں بند تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ شنکر یہاں شیخ عاصم کی رہائی کے لیے پہنچا ہے' اسے ماضی میں اپنی "کمانڈو" کارروائیوں پر بڑا فخر رہا تھا۔ آج پھر وہ کمانڈو کارروائی کے لیے کمربستہ نظر آتا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں مہمان خانے کے اردگرد موجود ہو۔

میں نے سب سے پہلے شیخ عاصم کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس کا منہ سرپٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور وہ آرام دہ بستر پر نیم دراز تھا۔ غالباً وہ اس ہلچل سے بے خبر تھا جو حویلی کے طول و عرض میں مچی ہوئی تھی۔ میں نے قادر زماں کے تین ہونہار باڈی گارڈز کو ہدایت کی کہ وہ شیخ عاصم کے "لاک اپ" کے سامنے موجود رہیں اور کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں بلادریغ گولی چلا دیں۔ اس کے بعد میں نے زریں گل کے ساتھ مل کر مہمان خانے کے اندرونی اور بیرونی حصے کا بھرپور جائزہ لیا۔ یہاں کسی کی موجودگی کا سراغ نہیں ملا۔

مہمان خانے کی تلاشی کے بعد ہم زنان خانے کی طرف چلے گئے۔ اس بات کا شدید ترین خدشہ موجود تھا کہ شنکر کسی کو یرغمال بنالے اور ہمیں دھمکا کر عاصم کو رہا کرانے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں غزالہ' شفقا' عالم قریشی' اس کی بیوی یا زریں کی بیوی بہترین یرغمالی ثابت ہو سکتے تھے۔ میں نے ان تمام افراد کو حویلی کے ایک اندرونی کمرے میں جمع کر دیا اور چار بہترین مسلح گارڈز اس کمرے کی نگرانی پر مامور کر کے زریں گل کو بھی وہاں چھوڑ دیا۔ زریں گل کے پاس ۳۸ بور کا طاقتور جرمن پسٹل موجود تھا اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

قادر زماں کے مسلح گارڈز کے ساتھ میں حویلی کے مردانے میں پہنچا تو اچانک ایک رائفل کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آواز پچھواڑے کے باغ سے آئی تھی۔ میں نے پسٹل ہاتھ میں لیا اور دوڑتا ہوا عقبی حصے کی طرف لپکا۔ رائفل کے پہلے برسٹ کے بعد ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ رائفل کے علاوہ ماؤزر اور پسٹل کا فائر بھی ہو رہا تھا۔

اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ باغ میں اسپرے کرنے والوں پر گولی چلائی گئی ہے یا اسپرے کرنے والوں نے گارڈز پر گولی چلائی ہے۔

میں جونہی ایک تنگ راہداری سے نکل کر عقبی حصے میں پہنچا۔ ایک شخص توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔ ہم دونوں اوپر نیچے گرے' وہ اٹھ کر بھاگا۔ میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ اسپرے کرنے والے افراد میں سے ایک تھا۔ میں نے زمین پر گرتے گرتے اپنا رخ تبدیل کیا "رک جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ شخص نہیں رکا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر پسٹل کا فائر کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ میرے ساتھی گارڈز بھاگ کر اسے دبوچنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ زخمی ہونے والے کے ہاتھ میں ریوالور ابھی تک موجود تھا' وہ اپنے قریب آنے والے کسی شخص کو بھی شوٹ کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرا فائر تاک کر اس شخص کے بازو پر کیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ میں نے کہا "اگلی گولی تیرے سر میں ماروں گا۔"

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹا رہ گیا۔ میں نے اسے اٹھنے اور ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دیا۔ تعمیل کے سوا اس کے پاس چارہ نہیں تھا۔

اسی دوران میں باغ سے بھی مسلح گارڈز دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اس شخص پر قابو پا لیا گیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہ وہی منحوس موہن داس تھا۔ سیاہ رنگت والا شیطان' جس نے میری آنکھوں کے عین سامنے مجھ سے صرف دس فٹ کی دوری پر ملازم نوازش کی جواں سال بیوی کی عزت برباد کی تھی اور بعد ازاں کلثوم کے ساتھ بھی دست درازی کی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو جذبات پر قابو نہیں رہا۔ میرا ہاتھ گھوما اور چٹاخ سے ایک زوردار طمانچہ موہن داس کے چہرے پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے قادر زماں سے کہا کہ اس شخص کو میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹا لو۔

قادر زماں نے موہن داس کو اپنے مسلح گارڈز کے حوالے کر دیا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اسپرے کرنے والے باقی تین افراد میں سے دو گرفتار ہو گئے تھے۔ تیسرے کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ قادر زماں کے کارندے باغ میں چاروں طرف اسے تلاش کر رہے تھے۔ جلد ہی اس کا سراغ بھی لگ گیا۔ وہ جھاڑ جھنکاڑ کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ سیون ایم ایم کی دو گولیوں نے اس کا بھیجا اڑا

کر رکھ دیا تھا۔

قادر زماں کی زبانی معلوم ہوا کہ شنکر کے ساتھیوں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ اسپرے کرتے کرتے حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف نکل گئے تھے پھر ایک دم انہوں نے آتشیں ہتھیار نکالے اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ گارڈز ریڈ الرٹ تھے۔ اس سے پہلے کہ شنکر کے ساتھی گیٹ پر موجود چوکیداروں کو ٹارگٹ بناتے' انہوں نے فائر کھول دیا۔ شنکر کے ساتھی دفاع پر مجبور ہو گئے اور درختوں کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ اس موقع پر قادر کے بونے باڈی گارڈز نے زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بندروں کی طرح درختوں پر چڑھ گئے اور شنکر کے ساتھیوں کو بے بس کر دیا۔ ایک شخص چکما دے کر بھاگا لیکن وہ میرے ہاتھوں زخمی ہو گیا۔

آٹھ دس گھنٹے کے اندر یہ حویلی میں ہونے والا دوسرا اہم ترین واقعہ تھا۔ پوری حویلی میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس کی آمد سے پہلے شنکر شکرا کا کھوج لگانے کی ایک اور بھرپور کوشش کر لی جائے۔ اب اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ شنکر شکرا حویلی میں موجود ہے۔ اس کے ساتھی گرفتار ہو چکے تھے اور ان میں سے ایک نے زریں گل سے اپنی جان بچانے کے لیے اعتراف بھی کر لیا تھا کہ شنکر ان کے ساتھ حویلی میں داخل ہوا ہے۔ اس شخص نے جو دوسرا اہم اعتراف کیا وہ یہ تھا کہ کل شام شنکرا اپنے باقی چار ساتھیوں کے ساتھ واپس نہیں گیا تھا بلکہ حویلی میں ہی روپوش ہو گیا تھا۔ اس "اعتراف" کے بعد یہ بات اور یقینی ہو گئی تھی کہ رات کو جو دو قتل ہوئے ہیں ان کا تعلق صرف اور صرف شنکر شکرا سے ہے۔ زریں گل اس شخص سے مزید پوچھ گچھ جاری رکھے ہوئے تھا اور امید تھی کہ مزید انکشافات ہوں گے۔

اگلے ایک گھنٹے میں' میں نے قادر زماں کے مسلح گارڈز کے ساتھ مل کر حویلی کا کونا کونا چھان مارا لیکن شنکر کا کہیں کھوج نہیں لگا۔ اب تو یہی بات ذہن میں آ رہی تھی کہ وہ کسی طور حویلی سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر پولیس پھر موقع پر پہنچ گئی۔ شنکر کے مرنے والے ساتھی کی لاش تحویل میں لے لی گئی۔ مرنے والے کا نام کرن کمار تھا اور یہ بات اس کے گرفتار شدہ ساتھیوں سے معلوم ہوئی۔

شام تک پولیس اپنی کارروائی میں مصروف رہی پھر یہ لوگ لاش سمیت واپس چلے گئے۔ حویلی کے اندر قادر زماں کے چاق و چوبند بونے باڈی گارڈز اور عام محافظ پہرا دے رہے تھے۔ خصوصاً شیخ عاصم کی مکمل حفاظت کی جا رہی تھی۔ میں اس شخص کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک مدت بعد مجھے شیخ کے اثر و رسوخ اور اس کی عیاری پر فوقیت حاصل ہوئی تھی' میں نہیں چاہتا تھا کہ پانسا دوبارہ پلٹ جائے۔ میں عاصم کے سلسلے میں انتہائی محتاط تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ میں کسی حد تک عدم تحفظ کا شکار بھی تھا۔ یعنی میں اپنے اندر وہ خود اعتمادی محسوس نہیں کر رہا تھا جو کٹھن حالات میں خود بہ خود میرے مزاج کا حصہ بن جاتی تھی۔ ایسا صرف اور صرف اس وجہ سے تھا کہ میرا مدمقابل شنکر تھا۔ جب کبھی بھی شنکر سے میرا سامنا ہوتا تھا یہ میرے لیے کڑی آزمائش کا وقت ہوتا تھا۔ یہ شخص میرا سخت ترین حریف تھا۔ شنکر جب میرے ارد گرد موجود ہوتا تھا' مجھے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک چال چل جائے گا۔ کسی نہ کسی طور' کوئی ایسا کام کر جائے گا جو مجھے سخت ترین مشکل میں ڈال دے گا۔ اس وقت بھی میری کچھ یہی کیفیت تھی۔ اگر بدقسمتی سے شنکر اس حویلی میں موجود تھا تو وقت کا تقاضا تھا کہ میں آنکھ بھی نہ جھپکوں۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ دروازہ کھلا اور غزالہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ حویلی میں پائے جانے والے سنگین حالات کی وجہ سے وہ بھی آزردہ نظر آتی تھی۔ مجھ سے کچھ کہے سنے بغیر اس نے میڈیکل باکس کھولا اور میرے چہرے کی چوٹوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ وہ میرے بہت قریب تھی لیکن جب وہ قریب ہوتی تھی' میں خود سے بہت دور چلا جاتا تھا۔ اس کی قربت میں جو جادو تھا وہ بیس برس گزرنے کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

میری مرہم پٹی کرنے کے بعد اس نے فریج سے پانی نکالا اور دو گولیاں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میری طرف بڑھا دیں۔ وہ ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ اپنی ہر ادا سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے دوا کھالی۔ وہ جیسے آئی تھی' ویسے ہی واپس چلی گئی۔ وہ خاموش رہی تھی لیکن اس کی خاموشی نے بھی مجھ سے سیکڑوں باتیں کی تھیں۔ شکوے شکایتیں' درخواستیں اور یہ اعتراف بھی کہ وہ شیخ عاصم کے لیے جتنی فکرمند ہے اتنی ہی میرے لیے بھی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری مرہم پٹی کے بعد اب وہ عاصم کی طرف گئی ہے۔

غزالہ کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر حمزہ آ گیا۔ وہ ایک امن پسند نوجوان تھا' حویلی میں پے در پے ہونے والے ہنگاموں نے اس کی طبیعت مکدر کر رکھی تھی۔ وہ بولا "بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہاں تو باقاعدہ میدان جنگ کا سا منظر ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

وہ بولا "کیا میرا یہ اندازہ درست ہے کہ یہ ہنگامہ شیخ عاصم کی وجہ سے ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا پھر دھیمے لہجے میں اسے سمجھانے لگا۔ میری باتوں سے اس کا اضطراب اور خوف تیزی سے کم ہوا۔ ایک خود اعتمادی سی اس کے اندر اجاگر ہونے لگی۔ وہ میری باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ گاہے گاہے سوالات بھی کر رہا تھا۔ ہماری گفتگو بتدریج بے تکلفی کا رنگ اختیار کر رہی تھی۔۔۔ رات بھیگتی چلی جا رہی تھی۔ حویلی کے احاطے میں رکھوالی کے کتے بھونک رہے تھے اور گاہے گاہے پہرے داروں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ یہ ایک روایتی قسم کی "دیہاتی رات" تھی۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر حمزہ بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اس کے اونگھنے کے انداز میں نمایاں قسم کی شدت تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر نے دو تین بار زور سے جھٹکا کھایا۔ مجھے خود اپنا سر بھی منوں وزنی محسوس ہو رہا تھا۔

"حمزہ!" میں نے بلند آواز میں کہا۔

حمزہ نے اپنی گہری سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا "سر چکرا رہا ہے۔" اس کی دور افتادہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میں نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی کوشش میں وہ ایک طرف کو جھکتا چلا گیا۔ میرے ذہن میں جیسے درجنوں ایٹم بم پھٹ گئے۔ ہمیں کوئی تیز خواب آور چیز کھلا دی گئی تھی۔۔۔ میں جب تک اپنی جگہ سے اٹھا' ڈاکٹر حمزہ بستر پر لڑھک چکا تھا' اس کی آنکھیں بالکل بند تھیں۔ میں اٹھا تو مجھے زور سے چکر آیا۔ میری ٹھوڑی نہ جانے کس چیز سے ٹکرائی۔ چند لمحوں کے لیے ذہن پر چھائی ہوئی دھند صاف ہوئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میری نگاہ برآمدے میں پڑی۔۔۔ اور جسم سنسنا اٹھا۔

دو بونے پہریدار برآمدے میں اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ یقیناً وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھے۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔ یہ تو وہی منظر تھا جو میں نے اس سے پہلے شیخ عاصم کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔۔۔ کیا وہی واقعہ' اسی انداز میں یہاں بھی دہرایا گیا ہے؟ یہ سوال جتنا بے ساختہ تھا اتنا ہی خوف ناک بھی تھا۔۔۔ میں سر پکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ اگر ڈیفنس والا واقعہ یہاں دہرایا گیا تھا تو یہ کس نے دہرایا تھا؟ کیا غزالہ نے ایسا کیا تھا؟ نہیں غزالہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی چھچھوری نہیں ہو سکتی تھی کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اسی جہنم زار میں دھکیلنے کی کوشش کرے جہاں سے نکال کر لائی تھی۔ اس کی ناراضگی بجا لیکن اس ناراضگی میں وہ اس انتہا تک نہیں جا سکتی تھی تو پھر؟۔۔۔ تو کیا پھر شنکر شکرا ہی چال چل گیا تھا۔ وہی ابلیس ابن ابلیس جس کی عیاری سے شیطانیت بھی پناہ مانگتی تھی۔ میرے دل نے پکار کر غزالہ کے حق میں اور شنکر کے خلاف آواز بلند کی۔۔۔

میرا ذہن گہری تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے سے باہر کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے اپنے آپ کو ایک جان لیوا نیند سے بچانا ہے۔ میں نے اندھوں کی طرح ٹٹول کر اپنی پنڈلی سے خنجر کھینچا اور خود کو زخمی کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

خنجر کا پھل ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمکا۔ یہ خنجر آج تک میرے دشمنوں کو گھائل کرتا رہا تھا' آج اس خنجر کی دھار میرے جسم پر چلنے والی تھی۔ میں نے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور خنجر کی نوک اپنے بائیں بازو پر کلائی سے ذرا اوپر رکھ دی۔ نیند ایک ایسے پہاڑی دریا کی طرح تھی جس میں شدید طغیانی آئی ہوئی تھی اور یہ دریا ہر لمحے چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پلکوں پر کسی نے منوں بوجھ رکھ دیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے میں نے ایک لمحے کی تاخیر کی تو غنودگی کا دریا مجھے بہا کر لے جائے گا۔ میں نے دل کڑا کیا اور خنجر کی نوک بازو کے گوشت میں دھنسا دی پھر اسی عالم میں خنجر کو کہنی کی طرف کھینچا۔ میرے بازو پر تقریباً چار انچ لمبا گہرا کٹ آیا اور خون تیزی سے فرش پر گرنے لگا۔ بازو میں انگارے سے بھر گئے تھے۔ ذہن پر چھائی ہوئی گہری غنودگی کی دھند ذرا چھٹ گئی۔

میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور اسے اندر سے بولٹ کر دیا۔ پسٹل کو ڈھونڈنے میں بھی مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پسٹل میں آٹھ گولیوں والا میگزین لگا ہوا تھا۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور کھڑکی کے قریب تن کر کھڑا ہوا۔ میرا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ دھمک کانوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ میں بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ

میرے خلاف کتنی خوفناک چال چلی گئی ہے اور اس چال کا نتیجہ کتنا المناک نکل سکتا تھا۔ جو اندیشے میرے ذہن میں تھے اگر وہ درست تھے تو پھر حویلی میں موجود بیشتر گارڈز اور مسلح کارندے بے ہوش ہو چکے تھے اور شیخ عاصم کو رہائی دلانے کے لیے ایک برق رفتار کارروائی کی جانے والی تھی۔ یہ کارروائی یقیناً شنکر شکرا ہی کر رہا تھا۔ اس کے سوا اور کس میں اتنی جرأت تھی کہ یوں خم ٹھونک کر میرے مقابل آسکتا اور بلند و بالا دیواروں والی اس محفوظ ترین حویلی میں گھسنے کا خطرہ مول لے سکتا۔

اگر شنکر حق نمک ادا کرتے ہوئے شیخ عاصم کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر میرے ہاتھ میں کیا رہ جاتا تھا اور اگر وہ شیخ عاصم کے ساتھ ساتھ شفا کو بھی دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیتا تو پھر میرے پاس زندہ رہنے کا کیا جواز رہ جاتا تھا۔ لہٰذا بے موت مرنے سے بہتر تھا کہ میں مزاحمت کا حق ادا کروں۔ ادھ کھلی کھڑکی سے میں نے باہر جھانکا۔ بونے باڈی گارڈ بے حس و حرکت پڑے تھے۔ برآمدے میں بھی ایک شخص موڑھے پر بیٹھا بیٹھا ایک طرف لڑھکا ہوا تھا۔

اچانک میرے جسم میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی۔ مجھے صرف دس پندرہ گز کے فاصلے پر شنکر شکرا نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی خودکار رائفل تھی اور چہرے کے تاثرات خوفناک تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور مسلح شخص بھی تھا۔ شنکر کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں گھنے جنگل میں کسی درندے کو ڈھونڈ رہا تھا اور وہ درندہ غیر متوقع طور پر اچانک میرے عین سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ شنکر کو دیکھتے ہی مجھے سو فیصد یقین ہو گیا کہ وہ مہمان خانے کی طرف جا رہا ہے۔ شیخ عاصم مہمان خانے میں مقید تھا اور یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ شنکر سب سے پہلے شیخ عاصم تک پہنچنے کی کوشش کرے گا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کمرے میں میری موجودگی سے آگاہ ہو اور مہمان خانے میں جانے سے پہلے وہ مجھے گرفتار یا شوٹ کرنے کی کوشش کرے۔ میں پوری طرح چوکس ہو گیا۔ چار پانچ قدم کے اندر فیصلہ ہو جاتا تھا۔ اگر وہ سیدھا نکل جاتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ مہمان خانے کی طرف جا رہا ہے۔ اگر کمرے کی طرف رخ کرتا تو پھر یقیناً وہ یہاں میری موجودگی سے آگاہ تھا۔

میرا دوسرا خیال درست نکلا۔ شنکر اور اس کا ساتھی کمرے کی طرف آئے۔ یہی وقت تھا جب شنکر کی عقابی آنکھوں نے کھڑکی کے پیچھے میری موجودگی نوٹ کرلی۔ اس سے پہلے کہ میں پسٹل کا رخ اس کی جانب کرتا یا ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھاتا، وہ پارا صفت، بجلی کی طرح تڑپا اور ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کی پھرتی متاثر کن تھی۔ میں نے گولی چلائی لیکن وہ ستون کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک لمحے کے اندر جوابی فائر ہوا۔ میں نے خود کو بڑی سرعت سے نیچے جھکایا تھا ورنہ کھڑکی کی جالی کی طرح ایک سوراخ میرے جسم میں بھی ہو جاتا۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ پوزیشن لے لی۔ ستون کے پیچھے سے یکے بعد دیگرے دو شعلے اور چمکے۔ گولیاں جالی توڑتی ہوئی کمرے کی دیواروں میں لگیں۔ میں نے بھی جواباً دو فائر کیے۔ دھماکوں سے پوری حویلی گونج اٹھی تھی۔ رکھوالی کے کتے زور شور سے بھونکنے لگے تھے لیکن "انسانی شور" سنائی نہیں دیا تھا اور دیتا بھی کیسے؟ پوری حویلی قبرستان کا نمونہ پیش کر رہی تھی، صرف شمالی جانب سے ایک دو بلند آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں۔

پے در پے ہونے والے دھماکوں نے میری نیند کو کافی حد تک پسپا کیا تھا۔ بازو سے اٹھنے والی درد کی ٹیسیں بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ شنکر کے ساتھ آنے والے مسلح شخص نے بھی دیوار کی اوٹ میں پوزیشن لے لی تھی۔ اب وہ بھی شنکر کے ساتھ مل کر فائر کرنے لگا۔ کھڑکی پر مسلسل گولیاں برس رہی تھیں۔ میں بھی گاہے گاہے جوابی فائر کر رہا تھا۔

پھر ایک دم فائرنگ کا رخ تبدیل ہو گیا۔ گولیاں اب بلندی سے آنے لگیں۔ یقیناً شنکر زینوں کی طرف چلا گیا تھا اور اب دس بارہ فٹ کی بلندی سے فائر کر رہا تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ کمرے کا فرش اب محفوظ نہیں تھا اور حمزہ بستر پر تھا۔ کوئی بھٹکی ہوئی گولی کسی بھی وقت اسے نشانہ بنا سکتی تھی۔ ابھی میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے بستر کا تکیہ بری طرح اچھلتے دیکھا۔ اس میں دو سیاہ سوراخ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ خیال برق کی طرح میرے ذہن میں آیا کہ فائر کرنے والے نے حمزہ کو بستر پر دیکھ لیا ہے اور اب اگلا فائر حمزہ کے جسم پر ہوگا۔ کھڑکی کو بند کرنا بے کار تھا کیونکہ اس میں اوپر سے نیچے تک شیشے ہی شیشے لگے ہوئے تھے۔ بہتر تھا کہ میں حمزہ کو نشانے سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ میں نے کھڑکی کے سامنے آکر تابڑ توڑ فائر کیے یہاں تک کہ میگزین خالی ہو گیا پھر میں نے سنگل بیڈ گھسیٹ کر دیوار کی اوٹ میں کر دیا۔ یہ وہی بیڈ تھا جس پر حمزہ بے ہوش پڑا تھا لیکن وہ یہاں بھی محفوظ نہیں تھا۔ کمرے کے اندر شعلے سے لپک رہے تھے۔ یہ پگھلے

ہوئے سیسے کے شعلے تھے۔ سیسا جو موت کی علامت تھا۔ اس دوران میں برآمدے کے شمالی حصے کی طرف سے بھی فائرنگ سنائی دینے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ فائرنگ جاگیردار قادر زماں کے ان کارندوں کی طرف سے ہے جو بے ہوش ہونے سے محفوظ رہے ہیں۔ مسلسل فائرنگ نے ان لوگوں کو حویلی کے اس کونے میں کھینچ لیا تھا۔ برآمدے کی طرف سے شروع ہونے والی فائرنگ کے بعد کمرے کی کھڑکی پر فائرنگ کا دباؤ کم ہو گیا۔ مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں حمزہ کو مزید محفوظ پوزیشن میں لے جاؤں۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بغلی دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ ایک اٹیچ اسٹور کا دروازہ تھا۔ میں حمزہ کے ساتھ اسٹور میں داخل ہو گیا۔ حمزہ یوں تو قد آور تھا لیکن جسم چھریرا تھا۔ میں نے اسے بڑی آسانی سے اٹھا رکھا تھا۔ اسے اسٹور کے فرش پر لٹا کر میں نے اسٹور کا دروازہ اس طرح بند کر دیا کہ اس میں بس تھوڑی سی درز باقی رہ گئی۔ اگر شنکر یا اس کے ساتھی کمرے میں گھسنے کی کوشش کرتے تو میں انہیں باآسانی نشانہ بنا سکتا تھا لیکن ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور کیوں کی جاتی؟ شنکر جیسے عیار ترین مقابل سے یہ توقع فضول تھی۔

حمزہ کو اسٹور میں مقفل کرنے کے بعد میں دوبارہ کھڑکی کی طرف آیا۔ میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ میں سر کو بار بار جھٹک کر اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھڑکی پر پہنچ کر میں نے باہر کا جائزہ لیا۔ برآمدے کے ستونوں کے بالکل قریب دو خون چکاں جسم پڑے تھے اور یہ جسم شنکر یا اس کے ساتھی کے ہرگز نہیں تھے۔ یہ جاگیردار کے محافظ تھے۔ ان دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں گولیوں سے چھلنی ہیں۔

میں نے دو فائر کیے۔ جواب میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ شنکر مہمان خانے کی طرف جا چکا تھا۔ وہ اپنی پہلی فرصت میں شیخ عاصم کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ شدید غنودگی کے سبب مجھے زور سے چکر آیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچ گئے۔ میں نے باتھ روم میں گھس کر سر پر نلکے کا ٹھنڈا پانی چھوڑا پھر سارا جسم بھگو لیا لیکن کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ قدم بدستور لڑکھڑا رہے تھے اور دماغ میں دھند سی بھر رہی تھی۔ میں نیند کے ساتھ دیوانہ وار لڑتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا میں مہمان خانے کی طرف بڑھنے لگا۔ حویلی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی
دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/- روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے ہاکر یا قریبی
بکسٹال سے طلب فرمائیں

جیسے کوئی بھوت پریت یہاں سے گزر گیا ہے اور ہر طرف اپنے آسیبی سائے چھوڑ گیا ہے۔ میں نے ایک کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ یہ دراصل مہمان خانے کا کچن تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں مجھے ایک ادھیڑ عمر شخص نظر آیا۔ وہ ایک چٹائی پر بے سدھ ہو پڑا تھا۔ کچن میں چولہا جل رہا تھا اور پتیلی میں رکھی ہوئی چیز جل کر کوئلہ ہو رہی تھی۔ یقیناً حویلی کے اندرونی کمروں میں بھی اسی قسم کی صورت حال موجود تھی۔ جو جہاں تھا وہیں تنا فانا نیند کے طوفانی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ڈیفنس کی طرح یہاں بھی اسی تیز خواب آور دوا نے کام دکھایا ہے جس کا نام غزالہ نے "ہیلفک 22" بتایا تھا۔ اس دوا کی خاصیت یہ تھی کہ یہ معدے میں پہنچنے کے دو ڈھائی گھنٹے بعد اثر کرتی تھی اور جب اس کا اثر شروع ہوتا تھا تو تنا فانا نیند کا عفریت اپنے شکار کو دبوچ لیتا تھا۔ خود میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے رات کا کھانا کھائے دو ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے۔ پندرہ بیس منٹ پہلے تک میرے ذہن پر غنودگی کا معمولی سا اثر بھی نہیں تھا پھر جب غنودگی نے حملہ کیا تو پلک جھپکنے میں میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اگر میں اپنے بازو کا گوشت ہڈی تک چیر نہ ڈالتا تو شاید اس وقت میں بھی ادھیڑ عمر خانساماں کی طرح فرش پر بے سدھ پڑا ہوتا اور کلی طور پر حالات کے رحم و کرم پر ہوتا۔

مہمان خانے میں داخل ہونے کے بعد میں مزید محتاط ہو گیا۔ پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹریگر پر بالکل تیار تھی۔ موقع ملتے ہی میں نے پسٹل دوبارہ لوڈ کرا لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مقابلہ کس "آفت" سے ہے۔ یہاں معمولی سی غلطی یا غفلت کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اگر شنکر مہمان خانے میں موجود تھا تو اب کسی بھی لمحے اس سے میرا آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ میرا ہر قدم پل صراط پر تھا۔ حویلی میں گہرا سکوت تھا لیکن اسے مکمل سکوت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مختلف حصوں سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یقیناً یہ حویلی کے وہ چند ایک مکین تھے جو کسی نہ کسی طور پر "ہیلفک 22" کے طوفانی اثر سے محفوظ رہے تھے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے رات کا کھانا نہ کھایا ہو۔ یا کھانے میں کوئی ایسی چیز کھائی ہو جس میں خواب آور دوا موجود نہیں تھی۔ کئی ایک امکانات ہو سکتے تھے۔

اسی دوران میں مجھے مہمان خانے کے اندرونی حصے سے یکے بعد دیگرے دو فائر سنائی دیے۔ فوری طور پر تو میں کیا سمجھا کہ شیخ کی حفاظت پر مامور پہریداروں کو نشانہ بنایا گیا ہے لیکن بعد ازاں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ پہریدار بھی حویلی کے دوسرے مکینوں کی طرح خواب آور دوا کے اثر میں تھے (اور یہ ایک لحاظ سے ان کے حق میں اچھا ہی ہوا ورنہ شنکر انہیں زندہ نہیں چھوڑتا) جو دو فائر مجھے سنائی دیے تھے وہ اس دروازے کے قفل پر کیے گئے تھے جہاں شیخ عاصم مقید تھا۔ تالا ٹوٹ گیا تھا اور شنکر شیخ عاصم کو باہر لے آیا تھا۔

جب مجھے شنکر اور شیخ عاصم کے قدموں کی چاپ سنائی دی میں مہمان خانے کے پورچ میں تھا۔ درحقیقت یہ عاصم ہی کے قدموں کی آواز تھی (شنکر ہمیشہ ربر سول جوتے پہنتا تھا' یہی وجہ تھی کہ اس کی چال میں بلی جیسی خاموشی پائی جاتی تھی۔ میں نے جب بھی اسے حرکت کرتے دیکھا وہ کسی درندے کے مانند نظر آیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں خاموشی اور پھرتی کا عنصر اتنا نمایاں ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ ذہن میں کسی سریع الحرکت جانور کا تصور آتا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ پسٹل میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ میرے کان اس چاپ پر لگے تھے جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ان لمحوں میں غراتی اور دہاڑتی ہوئی نیند بھی ایک دم پسپا ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ میری پھرتی اور مہارت کا کڑا ترین امتحان ہے۔ یہاں ایک لمحے کی سستی کا نتیجہ فوری موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

سب سے پہلے مجھے شیخ عاصم دکھائی دیا۔ اس کے پہلو میں ایک قدم پیچھے شنکر تھا۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ نال کا رخ زمین کی طرف تھا۔ رائفل کے ساتھ منسلک چمڑے کی پٹی شنکر کے شانے پر تھی۔ شنکر کے پیچھے اس کا نومند ساتھی تھا۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں فیصلہ کیا' اپنا اور شیخ عاصم کا درمیانی فاصلہ بھانپا اور تڑپ کر اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لایا تھا۔ اس سے پہلے کہ شنکر اور اس کے ساتھی کو پوری طرح خطرے کا احساس ہوتا میرا پسٹل شیخ عاصم کے سر کو بوسہ دے رہا تھا "خبردار شنکر!" میں نے سرد ترین لہجے میں کہا "میں گولی چلا دوں گا۔"

شنکر اپنی جگہ منجمد ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھی نے احمقانہ دلیری کا مظاہرہ کیا اور پچھتانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔ ۳۸ بور پسٹل کی گولی نے اس کی بائیں آنکھ کو نشانہ بنایا تھا اور کھوپڑی توڑ کر نکل گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شنکر کی رائفل میری طرف سیدھی ہوتی یا شیخ عاصم اپنی جان بچانے کے لیے حرکت کرتا' میرا پسٹل پھر اس کے سر کو چھونے لگا تھا۔ شنکر کا جسم ایک جھٹکا کھا کر رہ گیا۔ یقیناً میرے

ایکشن کی "ایکوریسی" اور ٹائمنگ اس کے لیے خلاف توقع تھی۔ مجھے اپنے جسم میں شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ یہ امر واقعہ تھا کہ اگر اس موقع پر شنکر یا شیخ عاصم مجھے ڈاج دینے کی ہلکی سی کوشش بھی کرتے تو میں ان کے بھیجے اڑا کر رکھ دیتا۔ "نیس منت" "میں" میں نے درندگی اور شیطانیت کا جو مظاہرہ دیکھا تھا وہ نفرت کا لاوا بن گیا تھا اور یہ لاوا برق کی رفتار سے میرے جسم میں دوڑ رہا تھا۔ نوازش کی بیوی کی دلدوز چیخیں' کلثوم کی منت سماجت' زریں گل کی بے بسی' عالم قریشی کے زخم۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا اور میرے اندر بے رحمی کو پروان چڑھا رہا تھا۔ وہی بے رحمی جو جرائم کی دنیا میں میری پہچان بنی تھی اور جس نے لاہور اور بمبئی کے بڑے بڑے غنڈوں کا پتا پانی کیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر شنکر کو وارننگ دی "شنکر رائفل نیچے پھینک دے ورنہ تیرا یہ شیخ آج زندہ نہیں بچے گا۔"

شنکر پتھر کی طرح ساکت نظر آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں اندیشہ جاگا کہ کہیں یہ پتھر ایک جان لیوا دھماکے سے پھٹ نہ جائے۔ اس چالباز ترین شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ دوسری طرف میں بھی آج اس شیطان لعین کو معمولی سا موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے شیخ کی توانا گردن اپنے بازو کی مخصوص گرفت میں لی اور پسٹل کی نال عین اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ گردن پر مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا تو شیخ کے گلے سے ترس ناک خرخراہٹ بلند ہوئی۔ بازو کے جھٹکے نے اس خرخراہٹ کو چیخ میں تبدیل کر دیا۔ شیخ عاصم بن ارشد جیسا دبنگ شخص اپنی شان و شوکت بھول کر ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخا تھا۔

میں نے سفاک لہجے میں کہا "شنکر مجھے گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔"

شنکر کی شکرا صفت نگاہوں نے صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ اس نے خودکار رائفل نیچے گرا دی۔ یہی وقت تھا جب مجھے ایک سایہ سا اپنی طرف لپکتا نظر آیا۔ میں نے اس کے دوڑنے کے انداز سے پہچان لیا۔ وہ یقینی طور پر میرا دستِ راست اور جاں نثار ساتھی زریں گل تھا۔ میں نے دور ہی سے اس کے ہاتھ میں لہراتی ہوئی رائفل بھی دیکھ لی۔ مہمان خانے کے قریب پہنچ کر وہ ایک دم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ درحقیقت وہ ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا تاکہ صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔ یقیناً یہ ایک دانش مندانہ اقدام تھا۔ میں نے پکار کر کہا "زریں' آگے آ جاؤ۔"

چند لمحے بعد زریں نظر آیا۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اسے قریب بلا لیا۔ وہ بالکل چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ خواب آور دوا کے اثر میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس نے زمین پر گرے ہوئے شنکر کے ساتھی کو دیکھا پھر حیرت ناک نظروں سے شنکر اور شیخ عاصم کو تکنے لگا۔ میرا بازو ابھی تک شیخ کی منحوس گردن میں تھا اور پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر تھی۔

زریں گل شنکر کی طرف بڑھا۔ میں نے چیخ کر کہا "دور رہو اس سے۔ بس اسے نشانے پر رکھو۔"

زریں نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ میں نے دل کی گہرائی سے کہا "شنکر! تیری چالاکی کا ایک ہی مطلب ہو گا۔ شیخ کی جان جائے گی۔"

وہ اپنے باریک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ زریں گل نے اپنی رائفل سیدھی کی اور بے دریغ شنکر کے پاؤں میں فائر کیے۔ دھماکوں سے شنکر کے اردگرد چنگاریاں پھوٹ گئیں۔ بہرحال وہ زخمی نہیں ہوا۔ میں نے کہا "شنکر! اس کے بعد جو فائرنگ ہوگی' وہ تیرے پاؤں بے کار کر ڈالے گی۔"

میرے لہجے میں ...قطعیت کو محسوس کر کے شنکر کے

● جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی معاشرتی اور رومانی داستان۔
● محبت کیا ہے؛ اس ناول میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا۔

دلِ پارہ پارہ

قیمت ۱۲۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ۔ چوک میو ہسپتال۔ لاہور۔ فون: ۷۲۳۳۹۵۳

چہرے پر بے بسی لہرائی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ زریں گل زبردست فارم میں نظر آ رہا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بلائے ناگہانی کی طرح شنکر کی طرف بڑھا۔ اس نے وزنی رائفل نال کی طرف سے پکڑ رکھی تھی۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں بلند کی اور دستہ پورے زور سے شنکر کے سر پر رسید کیا۔ ضرب کی آواز بڑی بھیانک تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اس ضرب نے شنکر کا منحوس کھوپڑا توڑ دیا ہوگا اور وہ جانبر نہیں ہو سکے گا مگر پھر یہ دیکھ کر تھوڑا سا تعجب ہوا کہ شنکر بے جان ہو کر نیچے نہیں گرا بلکہ ذرا سا لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بڑی تیزی کے ساتھ زریں نے اس کے سر پر دوسری ضرب لگائی۔ یہ پہلی سے بھی شدید تھی۔ کھٹاک کی آواز دور تک گئی۔ ضرب لگانے کے ساتھ زریں گل نے شنکر کو پشتو میں غالباً کوئی وحشیانہ قسم کی گالی بھی دی تھی۔ یہ دوسری ضرب شنکر کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔ کچھ بھی تھا، وہ گوشت و پوست کا انسان تھا۔ اوندھے منہ ذرا نیورے پر گرا اور بے سُدھ ہو گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون کی ایک چوڑی لکیر اس کے ایک رخسار کو بھگوتی چلی جا رہی تھی۔ زریں گل پر وحشت سوار تھی۔ اس نے تیسری ضرب لگانے کے لیے رائفل اوپر اٹھائی لیکن میں نے چیخ کر اسے منع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ زریں کی دو طوفانی ضربوں نے شنکر کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا ہے۔

اس دوران میں حویلی کے شمالی حصے سے قادر زماں کے کچھ مسلح کارندے پہنچ گئے، ان میں سے تین چار کے ہاتھوں میں جدید رائفلیں تھیں۔ کچھ نے رکھوالی کے کتوں کی زنجیریں تھام رکھی تھیں۔ میں نے زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ فوراً سے پیشتر شنکر شکرا کی مشکیں کس دے۔ زریں نے قادر زماں کے ایک کارندے کو رسی لانے کا کہا۔

شیخ عاصم بدستور میری گرفت میں تھا۔ شیخ کی گردن اس بری طرح جکڑی ہوئی تھی کہ وہ جسم کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ دوسروں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والے پر آج خود عرصۂ حیات تنگ تھا۔ میں ذرا سا دباؤ اور بڑھاتا تو وہ اپنا قتیل ہو جاتا۔ میں شیخ عاصم کا بہت لحاظ کر چکا تھا، اب اس شخص کے لیے میرے دل میں رحم کی رمق تک باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے کھڑے کھڑے شیخ عاصم کو اڑنگا لگایا، وہ اوندھے منہ پختہ فرش پر گرا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ گردن آزاد ہونے کے بعد اس پر کھانسی کا شدید ترین دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے دونوں بازو پشت کی طرف موڑے اور قادر زماں کے ایک کارندے سے پگڑی لے کر کلائیوں کو جکڑ دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں شیخ عاصم اور شنکر شکرا مہمان خانے میں منتقل ہو چکے تھے۔ شیخ کو اسی کمرے میں پہنچایا گیا تھا جہاں وہ اس سے پہلے تھا۔ اس کمرے کے دروازے کا تالا شنکر کی فائرنگ سے ٹوٹ چکا تھا لہٰذا یہاں ٹوٹے قفل کی جگہ دوسرا قفل لگایا گیا۔ شنکر کے لیے ایک دوسرا کمرا منتخب کیا گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ بند کرنے سے پہلے شنکر کی اچھی طرح تلاشی لے لی گئی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی ایسی چیز بھی نہیں چھوڑی گئی جو کسی بھی حوالے سے شنکر کے کسی کام آ سکتی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون بہہ بہہ کر خود ہی بند ہو چکا تھا۔

ایک مسلح شخص کو شیخ عاصم اور دو کو شنکر شکرا کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ قادر زماں کے جو افراد میرے ارد گرد موجود تھے، ان میں قادر زماں کا کارندۂ خاص منصب بھی تھا۔ منصب علی نے خوف زدہ لہجے میں مجھے بتایا کہ حویلی میں اکثر افراد بے ہوش ہیں۔ ان میں جاگیردار صاحب اور ان کے اہلِ خانہ بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، حویلی کے اندر ہی ایک چھوٹا سا جدید اسپتال بھی موجود تھا۔ یہاں دو ڈاکٹرز ہر وقت موجود رہتے تھے ان میں سے ایک ڈاکٹر خواب آور دوا کا شکار ہو کر لمبا لیٹ چکا تھا تاہم دوسرا ہوش میں تھا اور پوری حویلی میں بوکھلایا بوکھلایا پھر رہا تھا۔

میں اور زریں گل منصب کے ساتھ حویلی کے زنان خانے میں پہنچے۔ میں شفقا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی باہر کے شخص کے لیے زنان خانے کے اندر جانا ممکن نہیں تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہاں سے گزرنا بھی ممکن نہیں تھا مگر یہ ہنگامی صورتِ حال تھی۔ حویلی کے سارے قاعدے ضابطے دھرے رہ گئے تھے۔ ہم منصب کی رہنمائی میں ایک کمرے کے اندر پہنچے۔ شفقا ایک بیڈ پر بے سُدھ پڑی نظر آئی۔ میں نے اس کی نبض وغیرہ دیکھی۔ اس کے سانسوں کی روانی محسوس کی۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، وہ بس گہری نیند میں تھی۔ اس کمرے میں مجھے ایک چہرہ اور بھی نظر آیا۔ اس چہرے کو دیکھ کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ حویلی میں جو کچھ ہوا ہے اس میں غزالہ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ نیند کے جس طوفانی ریلے نے اس حویلی کے مکینوں کو اپنے ساتھ بہایا تھا وہ کسی اور کی کوشش کا مرہونِ منت تھا۔ میں نے جس چہرے کو دیکھا وہ غزالہ کا چہرہ تھا۔ وہ شفقا کے ساتھ والے بیڈ پر بے سُدھ پڑی تھی۔ اس کی حالت قریباً قریباً شفقا جیسی ہی تھی۔ اب یہ

سوچنا بے معنی تھا کہ غزالہ نے خود ہی کھانے میں خواب آور دوا ملائی ہوگی اور بھول کر خود ہی کھانا کھا لیا ہوگا۔ یہ امر یقینی تھا کہ یہ سب کچھ شنکر شکرا کا ہی کیا دھرا ہے۔

غزالہ اور شفقا کو دیکھنے کے بعد ہم نے عالم قریشی کی بیوی پروین کی خبر لی۔ اس کی نیند بے ہوشی کی نیند تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عالم قریشی کی طرح پروین بھی بسیار خور تھی۔ بہرحال پروین کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ اسے خطرناک کہا جا سکتا۔ غیر متوقع طور پر زریں کی بیوی کلثوم بھی زریں گل ہی کی طرح بیدار تھی اور پورے ہوش میں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میاں بیوی نے پروگرام بنا کر کھانا نہیں کھایا۔ قادر زماں بھی زنان خانے میں ہی تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں پایا گیا۔ اس کی خوبرو بیوی اس کے پہلو میں تھی اور دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ قادر زماں کی صرف ایک جھلک دیکھ کر ہم اس کے بیڈ روم سے باہر آ گئے۔ میرا سر ایک بار پھر بری طرح چکرانے لگا تھا۔

حویلی کے مردانے میں بھی وہی منظر تھا جو زنان خانے میں نظر آیا تھا۔ پہریدار اور کمدار یہاں وہاں مدہوش پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر فوراً احساس ہو جاتا تھا کہ وہ آناً فاناً گہری نیند کی زد میں آئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کمروں میں سے نکل کر تازہ ہوا میں آنے کی کوشش کی تھی مگر پھر اتنی تیزی کے ساتھ "مغلوب" ہوئے تھے کہ مردانے کے برآمدے میں ہی گر کر بالبٹ کر بے سدھ ہو گئے تھے۔ عجیب شے تھی یہ "پلنگ 22"

عالم قریشی بھی ہمیں مردانے میں ہی ملا۔ وہ گہری نیند میں تھا بلکہ اسے بے ہوشی ہی کہنا چاہیے۔ میں نے حویلی کے ڈاکٹر کو ہدایت کی کہ عالم قریشی کو "ٹریٹ منٹ" دی جائے۔ عالم قریشی نے یقیناً پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور "پیٹ بھر" کر بے ہوش ہوا تھا۔

حویلی کے دو کچن تھے۔ ایک مہمان خانے میں تھا، دوسرا زنانے اور مردانے حصے کے درمیان میں تھا۔ مردانے حصے میں دو قسم کا کھانا پکا تھا۔ ایک اہلِ خانہ کے لیے، دوسرا ملازموں اور کمداروں کے لیے۔ ان دونوں کھانوں میں خواب آور دوا موجود تھی۔ مہمان خانے میں پکنے والا کھانا دوا سے محفوظ تھا۔ حویلی میں موجود صرف وہی لوگ گہری نیند سے محفوظ رہے تھے، جنہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا یا بہت کم کھایا تھا۔

ڈاکٹر نے کئی افراد کے معائنے کے بعد یہ تسلی بخش اعلان کیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تین چار افراد کے سوا سب لوگ نارمل ہیں۔

زریں گل میرے خون آلود بازو کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے اسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ یہ کسی اور کا نہیں میرا اپنا دیا ہوا زخم ہے۔

"استاد صیب! امارا مغز بالکل گھوم گیا ہے۔ آپ یہ کیا فرما رہا ہے؟"

میں نے زریں کو تفصیل بتائی کہ کس طرح خود کو نیند سے بچانے کے لیے میں نے خود کو زخمی کیا۔ جس وقت میں زریں گل سے باتیں کر رہا تھا، میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ نیند ایک تیز آندھی کی طرح تھی جو ہوش و حواس کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتی تھی۔ اب تک تو حالات کی شدید ترین سنگینی نے مجھے ہوش میں رکھا تھا، اب چونکہ خطرہ ٹل گیا تھا لہٰذا میری قوتِ مزاحمت بھی دم توڑنے لگی تھی۔ زریں گل جب خون روکنے کے لیے میرے بازو پر پٹی باندھ رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری گردن کے بجائے کوئی بہت وزنی گٹھڑی رکھی ہے۔

زریں گل کی دور افتادہ آواز میرے کانوں میں پڑی "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے استاد صیب"

"میں ذرا سونا چاہتا ہوں۔" میرے ہونٹوں سے الفاظ خود بخود پھسل گئے۔

مجھے صرف اتنا یاد رہا کہ میں نے خود کو صوفے پر نیم دراز کیا تھا پھر نیند کے ایک منہ زور جھونکے نے مجھے دبوچ لیا۔

○☆○

حواس دوبارہ بحال ہوئے تو میں اپنے بیڈ روم میں تھا۔ یہ حویلی ہی کا ایک کمرا تھا۔ میں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا، ایک تاریک رات کی صبح ہونے والی تھی۔ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ طبیعت میں تھوڑی سی کسلمندی بھی تھی۔ میں نے باتھ روم میں جا کر سر پر نلکے کا ٹھنڈا پانی ڈالا۔ میرے بازو پر بینڈیج ہو چکی تھی۔ یہ بینڈیج زریں نے میری بے ہوشی (یا گہری نیند) کے دوران میں کرائی تھی۔

میں واپس کمرے میں آیا تو زریں موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹرز کی کوششوں سے قادر زماں رات تین بجے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے حویلی کے تمام معاملات کو اچھی طرح سنبھال لیا ہے۔ زریں گل نے کہا "رات کی مارا ماری میں چار آدمی مارا گیا ہے۔ ان میں تین جاگیردار قادر زماں کا کارندہ ہے اور ایک اس حرامی شنکر شکرا کا ساتھی جسے آپ نے گولی مارا تھا۔"

میں نے پوچھا "قادر زماں نے پولیس کو بلایا ہے؟"

"نہیں اس مرتبہ پولیس نہیں آیا ہے جناب۔ حویلی کا بات حویلی کے اندر ہی ہے۔"

میں نے شفقتا' ڈاکٹر حمزہ اور عالم قریشی وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ زریں نے بتایا کہ عالم قریشی کے سوا سب بیدار ہو چکے ہیں۔ عالم قریشی کو ایک دو بار قے ہوئی تھی۔ اس نے انٹی گریالی وغیرہ بھی پیا تھا "اب وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں زریں گل نے بتایا "شفقتا بی بی نے بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلے آپ کے متعلق اور پھر ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ ام نے بی بی لوگ کو بتایا کہ آپ تو اپنے بیڈ روم میں ہے لیکن ڈاکٹر حمزہ کا پتا نہیں۔ بی بی لوگ پریشان ہو گیا اور اس کے ساتھ ام بھی پریشان ہو گیا۔ ام دونوں اس کو ڈھونڈنے لگا۔ بی بی لوگ بار بار آنسو پونچھ رہا تھا اور ام سے پوچھ رہا تھا کہ حویلی میں کتنے لوگ مارا گیا ہے اور کتنے زخمی ہوا ہے' اس کو وہم تھا کہ کہیں حمزہ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ جب ام دونوں اس کمرے میں گیا جہاں آپ پر فائرنگ ہوا تھا تو وہاں شیشے کی بہت سی کرچیاں اور گولیوں کے خول پڑا ہوا ملا۔ یہیں پر اسٹور کے دروازے کے پاس ڈاکٹر صیب کا ایک جوتا بھی پڑا ہوا تھا' جوتے کے قریب خون کا بہت سا قطرہ تھا۔ خو چہ شفقتا بی بی کے ساتھ ساتھ ام بھی بہت زیادہ ڈر گیا۔ ام نے ڈرتے ڈرتے اسٹور کا دروازہ کھولا تو اندر ڈاکٹر حمزہ بے سدھ پڑا تھا۔"

میں نے زریں گل سے پوچھا کہ جاگیردار قادر زماں اب کہاں ہے؟

وہ بولا "ابھی جاگیردار صیب ام کو مہمان خانے میں ملا تھا۔ حویلی کا اور بھی بہت سا ملازم وہاں جمع تھا۔ امارا خیال ہے کہ حویلی کا جو ملازم لوگ مرا ہے ان کے نہلانے دھلانے اور کفن دفن کا انتظام ہو رہا تھا۔ جاگیردار صیب نے ام سے فرمایا کہ پریشانی کا کوئی بات نہیں۔ ام نے سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ تم اپنے استاد صیب کے پاس جاؤ اور ان کا دیکھ بھال فرماؤ۔ ام آپ کے پاس آگیا۔"

میں نے شنکر اور شیخ عاصم کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولا "وہ دونوں چوہے دان میں چوہے کے ماتق پھنسا ہوا ہے۔ جاگیردار صیب نے ان دونوں کی نگرانی کا کڑا انتظام کیا ہے۔"

زریں گل میرے ساتھ باتیں تو کر رہا تھا مگر اس میں پہلے والی ترنگ اور شوخی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ کچھ بجھ سا گیا تھا اس کے اندر۔

میں نے زریں سے کہا "اوئے افلاطون! ساری حویلی بے ہوش ہو گئی' تیرے دیدوں میں نیند کیوں نہیں آئی۔ تو نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا؟"

"نہیں استاد صیب؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن کیوں؟ ایسا معجزہ پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔"

"بس وہ کلثوم نے نہیں کھایا تھا نا۔ اس لیے ام نے بھی نہیں کھایا۔ اللہ نے امارے حق میں بہتر کر دیا ورنہ ام بھی دوسروں کے ساتھ ہی لم لیٹ جاتا۔ آپ کو پتا ہے ام کھانا بھی زیادہ ہے۔ امارا حال بھی عالم قریشی صیب جیسا ہوتا۔ ام کو بہت خوشی ہے کہ ام جاگتا رہا اور جب آپ کو اماری مدد کا ضرورت پڑا تو ام آپ کے قریب تھا۔"

میں نے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن تو مجنوں کب سے ہو گیا؟ یعنی کلثوم نے نہیں کھایا تو تم نے بھی نہیں کھایا... اور پوچھنے کی بات یہ ہے کہ کلثوم نے کیوں نہیں کھایا؟"

زریں کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی "وہ نہیں کھا سکی نا۔ اس کو کبھی کبھی متلی ہوتا ہے۔"

"او تیرا ستیاناس زریں گل۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا کہا آپ نے؟" وہ میری طرف جھکتا ہوا بولا۔

"برے کی ماں کا سر کہا ہے... تجھے ہر کام میں اتنی جلدی کیوں پڑی رہتی ہے۔ لگتا ہے کوئی لٹھ لے کر تیرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

زریں گل کھسیا کر رہ گیا۔ اسی دوران میں جاگیردار قادر زماں بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کمرے میں آ دھمکا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا "کیسی طبیعت ہے جان جی؟" جاگیردار نے پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن مجھے بہت زیادہ افسوس ہے۔ رات کو آپ کے تین ملازم جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"بھئی! یہ سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے اور پھر یہ تمہاری لڑائی ہی نہیں رہی' ہم سب کی لڑائی بن گئی ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں خاص طور پر فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

جاگیردار قادر زماں میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ آج صبح سویرے شنکر شکرا کے گرفتار شدہ تینوں ساتھیوں کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ انہیں حویلی کے ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا ہے اور قادر زماں بذات خود ان سے پوچھ گچھ کر رہا ہے (حویلی کے اس انوکھے ٹارچر سیل کے بارے میں' میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یہاں قادر زماں کے خونخوار پونے قادر زماں کے قیدیوں کو خوفناک اذیت سے دوچار کرتے تھے اور ایسا خوفناک ماحول پیدا کر دیتے تھے کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے تھے) قادر زماں کے مطابق

کہ ان ساتھیوں کو زبردست چھترول کرائی گئی تھی۔ وہ تینوں دو دو بار بے ہوش ہوئے تھے' آخر انہوں نے سب کچھ اگل دیا تھا۔

انہوں نے بتایا تھا کہ وہ شنکر شکرا کے ساتھ جنے کی صبح اسپرے کرنے والوں کے بھیس میں حویلی پہنچے تھے۔ شام کو باقی افراد تو واپس چلے گئے تھے مگر شنکر شکرا حویلی کے اندر چھپنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شنکر شکرا یہاں شیخ عاصم کو رہائی دلانے کی مہم پر پہنچا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شیخ کو حویلی میں کس مقام پر رکھا گیا ہے۔ وہ شیخ کا سراغ لگا رہا تھا جب اس کی مڈھ بھیڑ کچن کے قریب ان دو بدقسمت ملازمین سے ہوئی جن کی لاشیں کل صبح دریافت ہوئی تھیں۔ ان میں ایک نوجوان صابر خان تھا اور دوسری لڑکی نسرین۔ درحقیقت ان دونوں کا آپس میں میل جول تھا۔ وہ رات کی تاریکی اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر کچن میں ملتے تھے۔ وہاں کھاتے پیتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی محبت کا عملی یقین بھی دلاتے تھے۔ اس "عملی یقین" کا ثبوت وہ قمیص تھی جو مقتولہ نسرین کے جسم سے جزوی طور پر جدا پائی گئی تھی۔ ان لوگوں نے شنکر کو دیکھ لیا۔ شنکر کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر نوجوان صابر خان نے جرات دکھائی اور شنکر سے لپٹ گیا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ قیامت کو گلے لگا رہا ہے۔ شنکر نے بڑی بے دردی سے صابر خان کے دل میں خنجر گھونپ دیا پھر نسرین کا گلا گھونٹ کر اسے بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

میرے اور قادر زماں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران میں بھی زریں گل بالکل گم صم بیٹھا رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار اس کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ لاہور (ڈیفنس والی کوٹھی) کے تہ خانے میں کلثوم کے ساتھ جو دست درازی کی گئی تھی اس نے زریں کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ وہ ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار کل رات کا منظر گھوم رہا تھا۔ زریں نے شنکر شکرا کے دیوار کی طرف گھومتے ہی اس پر اتنی تیزی سے اور شدت سے حملہ کیا تھا کہ شنکر تو کجا میں خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ اس نے جو ضربات شنکر کے سر پر لگائی تھیں ان میں بلا کی نفرت پوشیدہ تھی۔

قادر زماں نے مجھے ہر طرح سے تسلی تشفی دی۔ وہ بولا "جان جی! اپنے دماغ پر کسی طرح کا بوجھ نہ رکھنا۔ حویلی میں جو ہنگامے ہوئے ہیں اس سے دس گنا زیادہ ہنگامے بھی ہو جائیں تو بھی میری مہمان نوازی میں ایک ذرہ بھر فرق نہیں آئے گا۔ اب ہم اور تم کوئی دو نہیں ہیں' ہمارے دوست اور دشمن سانجھے ہیں۔ تم بالکل بے فکر ہو کر آرام کرو۔ یہاں جو کچھ ہوا میں اس کو بڑی اچھی طرح کنٹرول کر لوں گا۔ علاقہ انچارج سے لے کر ڈی آئی جی تک سارے اپنے جگر ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ حویلی میں بغیر اجازت کے گھسے اور تفتیش کرے۔ یہ قادر زماں کی جاگیر ہے' کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب مگر جن بندوں کو ہم نے پکڑا ہے وہ کوئی ایویں شیویں چیز تو نہیں ہیں۔ ان کے ساتھی اور بھی ہیں۔ وہ اب حویلی پر چڑھائی کریں گے اور آپ کو سخت مصیبت میں ڈال دیں گے۔"

"جان جی! یہی تو مزے داری کی بات ہوئی ہے۔ کسی کنجر کے تخم کو پتا ہی نہیں ہے کہ شیخ عاصم کو پکڑ کر اس حویلی میں پہنچایا گیا ہے۔"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"میں نے ایک بات کہلوائی ہے ان حرام زادوں سے۔"

"شاید آپ شنکر کے ساتھیوں کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں انہی ناپاک چمچوں کڑچھوں کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے سامنے بڑی دھواں دھار قسم کی چھترول کروائی ہے میں نے ان کی۔ ایک کے کا تو پیشاب ہی نکل گیا تھا کپڑوں میں۔ پورا کچا چٹھا کھول کر بتا دیا ہے انہوں نے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وہ کسی لمبے چوڑے پروگرام کے تحت یہاں جھوک ضامن میں نہیں پہنچے تھے۔ جو کچھ ہوا بالکل اتفاقاً ہوا اور آناً فاناً ہوا۔ دراصل شنکر شکرا اور اس کا ساتھی موہن داس شیخ عاصم کی تلاش میں تھے۔ دو اور افراد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کے پاس ایک لینڈ کروزر جیپ تھی اور وہ سرگودھا میں پھر رہے تھے۔ درحقیقت ان کو کچھ ایسے ثبوت ملے تھے جس سے انہیں شک ہوا تھا کہ تم لوگ لاہور سے نکل کر سرگودھا اور فیصل آباد سائیڈ کی طرف گئے ہو۔ ان ثبوتوں میں سب سے بڑا ثبوت قونصلیٹ کی وہ سیاہ اسٹیشن ویگن تھی جو تم لوگوں نے شاہدرہ کے قریب چھوڑی تھی۔ جس وقت شنکر شکرا اور موہن داس سرگودھا میں گھوم رہے تھے' انہیں اپنے ایک مخبر کے ذریعے بڑی اہم اطلاع ملی۔ انہیں پتا چلا کہ تم اپنی ہمشیرہ کے ساتھ جھوک ضامن میں دیکھے گئے ہو۔ دراصل جب تم اپنی ہمشیرہ کے ساتھ جھنگ گئے تھے اسی وقت تمہیں ٹریس کر لیا گیا تھا۔ شنکر اس اطلاع پر فوراً سرگودھا سے جھنگ پہنچ گیا۔ یہاں اس کے مخبر نے اسے سو فیصد یقین دلا دیا کہ تم میری حویلی میں ہو اور تمہارے علاوہ تمہاری ہمشیرہ' شیخ عاصم' اور شیخ عاصم کی بیوی غزالہ بھی حویلی میں

ہیں۔ شنکر فوراً حویلی میں گھسنے کو تیار ہو گیا۔ مقامی مخبر کی مدد سے انہوں نے اسپرے کرنے والوں کا روپ دھارا اور حویلی میں گھس گئے۔ یہ کل پانچ افراد تھے۔ مخبر صفیر احمد بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے ان لوگوں سے لمبے چوڑے سوال جواب کیے ہیں۔ یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ان پانچوں کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس مشن پر ہیں۔"

جاگیردار قادر زماں کی اطلاع واقعی اہم تھی۔ اگر شنکر کی یہاں موجودگی کا علم باہر کسی کو نہیں تھا تو یہ صورتِ حال ہمارے لیے بے حد مفید تھی لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہے۔ شنکر ایک بے حد خبردار شخص کا نام تھا۔ یہ کیونکر ہوا تھا کہ ایک خطرناک کام پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے کسی ساتھی کو آگاہ نہ کیا ہو۔ بہرحال یہ کوئی ایسی ناممکن بات بھی نہیں تھی۔ شنکر کا اعتماد حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اس کی اکثر کارروائیاں "ون مین شو" کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ اکثر اس بات کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا تھا کہ کسی کو اپنے پروگرام کے متعلق بتائے۔

اگر صورتِ حال وہی تھی جو جاگیردار بتا رہا تھا تو پھر یہ حویلی اب بھی ہمارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ بہرحال ابھی میں اس سلسلے میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ شنکر کے ساتھیوں سے خود بات کروں۔

قادر زماں مجھے آرام کا مشورہ دے کر واپس چلا گیا۔

چار پانچ گھنٹے سونے کے باوجود میری آنکھیں پھر نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ بازو میں بھی درد کی مسلسل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پین کلر دوا کھائی تو تھوڑی دیر کے لیے پھر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو ہلکا ہلکا شور کانوں میں گونج رہا تھا۔ جیسے بہت سے افراد مل کر چلا رہے ہوں۔ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے ہوں۔ شاید پھر کوئی ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ حویلی پچھلے دو تین روز سے مسلسل ہنگاموں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ پہلے ملازم صابر خان اور ملازمہ نسرین قتل ہوئے پھر ایک کوٹھری میں بوناباڑی گارڈ ملا جو شدید زخمی تھا۔ اس کے بعد باغ میں شنکر کے ساتھیوں کا کھوج لگا جو اسپرے کرنے والوں کے بھیس میں تھے۔ محافظوں اور اسپرے کرنے والوں کے درمیان زبردست فائرنگ ہوئی' جس میں ایک شخص ہلاک ہوا۔ بعد ازاں رات کو شنکر میدان میں کود پڑا' میرے اور اس کے درمیان شدید لڑائی ہوئی جس میں چار افراد موقع پر ہلاک ہو گئے۔ اب آٹھ دس گھنٹے بعد میں ایک نئے ہنگامے کی بو سونگھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ احاطے میں بہت سے افراد جمع تھے اور ہراساں نظروں سے بلندی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی نظروں کا تعاقب کیا اور دم بخود رہ گیا۔ دو منزلہ حویلی کے مرکز میں ایک اونچی برجی سی بنی تھی۔ اس برجی پر پندرہ بیس فٹ کا ایک کھمبا تھا۔ کھمبے پر ٹیلی وژن کے تین چار اینٹینا لگے ہوئے تھے اور ایک سیاسی پارٹی کا خستہ حال جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ اس کھمبے کا بالائی سرا حویلی کی چھت سے تقریباً چالیس فٹ اونچا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کھمبے پر دو افراد چڑھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ایک زریں گل ہے۔ میں نے زریں گل کو اس کی نسواری ٹوپی اور بادامی قمیص سے پہچانا۔ سورج اب کافی اوپر آ چکا تھا۔ اس کی روشنی میں زریں کی کلادار ٹوپی کے شیشے دمک رہے تھے۔ زریں گل کھمبے کے درمیانی حصے پر تھا۔ اس سے دو تین فٹ اوپر ایک شخص کھمبے سے چمٹا ہوا اور مزید اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے زریں گل نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور نیچے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے ایک اور چیز نوٹ کی اور میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اوپر والا شخص موہن داس تھا وہی موہن داس جس نے ونیض کے تہ خانے میں شنکر کے ساتھ مل کر درندگی اور بربریت کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ وہ شیطانی کھیل میری آنکھوں کے سامنے آ گیا جو تہ خانے کے ہال میں کھیلا گیا تھا۔ ایک لاچار عورت سے چمٹی ہوئی وہ سیاہ بھڑیں جو اس کے بے بس جسم کے لیے بدترین اذیت کا سبب بن رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بھڑ یہ موہن داس تھا۔ دراصل اس شیطانی کھیل کا مرکزی کردار یہی موہن داس تھا۔ ایک لمحے کے اندر پچویشن میری سمجھ میں آ گئی۔ وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ میرے دل میں موجود تھا۔ زریں گل نے گرفتار شدہ موہن داس کو کہیں دیکھ لیا تھا اور اب ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر اس پر حملہ آور ہو گیا تھا۔

نیچے احاطے میں کھڑے لوگ چیخ رہے تھے اور واویلا کر رہے تھے۔ کچھ افراد بھاگتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی تیزی سے احاطے میں پہنچا۔ احاطے میں پہنچ کر میں نے غور سے دیکھا تو مجھے زریں گل کے ہاتھ میں کوئی چمکیلی سی چیز نظر آئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ سبزی کاٹنے والی تیز دھار چھری تھی۔ میں نے چیخ کر کہا "زریں گل۔۔۔ زریں گل۔" لیکن میری آواز شور میں دب کر رہ گئی۔ شاید زریں تک چیخ پہنچ بھی جاتی تو وہ سنی ان سنی کر دیتا۔ وہ اردگرد سے بالکل بے خبر نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ زریں گل نے موہن داس کی ٹانگ کو دو تین شدید جھٹکے دیے۔

موہن داس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ یقیناً وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح کھمبے سے چمٹ گیا تھا اور جان بچانے کے لیے بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ زریں گل نے موہن داس کی پتلون کی بیلٹ میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور زور لگا کر موہن کے برابر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جاؤں لیکن پھر نجانے دل میں کیا آئی کہ زریں گل کو روکنے کا خیال دل سے نکال کر میں اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا' بالکل ایک خاموش تماشائی کی طرح۔ قادر زماں کے کارندے چھت پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا۔ اسی دوران میں جاگیردار قادر زماں بھی دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ چھت پر کھڑے مسلح کارندے سوالیہ نظروں سے قادر زماں کو دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ قیدی کی جان بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ یقیناً قادر زماں نے بھی محسوس کر لیا کہ اگر چند لمحوں کی تاخیر بھی ہوئی تو قیدی زریں گل کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے گا۔

پھر شاید جاگیردار نے اپنے کارندوں کو سخت کارروائی کا حکم دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جونہی وہ حکم دینے کے لیے آگے بڑھا' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "نہیں چوہدری صاحب! جو کچھ ہو رہا ہے' ہو جانے دیں۔" میرے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔

جاگیردار چونک کر میری طرف دیکھنے لگا "لیکن یہ ہے کون؟" اس نے ہیجانی انداز میں پوچھا۔ اس کا اشارہ موہن داس کی طرف تھا۔

میں نے کہا "انڈین غنڈا ہے۔ پتا نہیں کتنے جرم کر چکا ہے یہاں۔ پولیس نے یقیناً اس کے سر پر انعام رکھا ہوا ہوگا۔"

زریں گل اب موہن داس کے روبرو پہنچ چکا تھا۔ موہن داس نے رخ ذرا سا پھیرا تو مجھے اس کی قمیص پر خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آئے۔ وہ پہلے سے شدید زخمی تھا۔ زریں نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس پر چھری کے دو وار مزید کیے۔ موہن داس دردناک انداز میں چیخا۔ اس کی گرفت کھمبے کے اینگل آئرن پر سے ختم ہو گئی۔ وہ پہلے برجی کی ڈھلوان پر گرا پھر وہاں سے پھسل کر چھت پر آ پڑا۔ یہ بڑا سنسنی خیز منظر تھا بالکل کسی ہنگامہ خیز فلم جیسا۔ احاطے میں موجود لوگ جو اب تک دم بخود کھڑے تھے' مقتول کو دیکھنے کے لیے بھاگتے چھت کی طرف دوڑے۔ زریں گل ابھی تک کھمبے پر تھا۔ دو مسلح پہرے داروں نے رائفلیں زریں کی طرف سیدھی کر لی تھیں اور تحکم آمیز انداز میں اسے نیچے اترنے کا کہہ رہے تھے۔ زریں آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ میں بھی دوڑ کر چھت پر پہنچ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ زریں گل شدید اشتعال میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کر کے اپنے لیے خطرہ پیدا نہ کر لے۔ پہرے داروں کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں اور وہ کسی حد تک زریں سے خوف زدہ بھی تھے۔ ایسی حالت میں ذرا سی غلط فہمی خوف ناک نتیجہ نکال سکتی تھی۔

موہن داس چھت پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کے قریب خون کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اس کے جسم میں جنبش موجود تھی لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساکت ہو گیا۔ ہاں زریں گل نے موہن داس کو قتل کر دیا تھا۔ اس موہن داس کو جس نے نوازش کی بیوی کو بے آبرو کیا تھا اور کلثوم سے دست درازی کی تھی۔ وہی موہن داس اپنے ہی خون میں لت پت ساکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت جنگلی کبوتر کی آنکھوں کی طرح سرخ رہتی تھیں لیکن آج یہ آنکھیں خوف اور وحشت سے سفید نظر آ رہی تھیں۔

قادر زماں کے مسلح محافظوں نے زریں کو گھیرے میں لے لیا۔ زریں نے چھری بے پروائی سے ایک طرف پھینک دی تھی اور اب خالی ہاتھ کھڑا تھا۔ اس دوران میں قادر زماں بھی چھت پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ زریں کو ہماری طرف آنے دیں۔ کارندوں نے رائفلیں جھکا لیں اور زریں ہمارے پاس آ گیا۔ اس کا سارا بدن غیظ و غضب کی زیادتی سے لرز رہا تھا مگر آنکھوں میں ایک گہرا اطمینان کروٹیں لے رہا تھا۔ فضا میں ایک عجیب سی سنسنی خیزی لہریں لے رہی تھی۔ جس وقت زریں نے موہن داس پر آخری دو وار کیے تھے' اس کی کلادار ٹوپی سر سے پھسل کر گر گئی تھی۔ ایک بوڑھے محافظ نے یہ ٹوپی اٹھا کر زریں گل کو دے دی۔

میں نے ایک لفظ کہے بغیر زریں گل کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر زینے اترنے لگا۔ میں زریں کو سیدھا اپنے کمرے میں لایا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ زریں پر ابھی تک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس کے لباس پر موہن داس کے ناپاک خون کے چھینٹے موجود تھے اور وجود لرز رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا پانی پینے کے لیے دیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور اس سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے لیٹ جائے۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا اور وہیں بیٹھا رہا۔

میں نے کمرے کو باہر سے لاک کیا اور احاطے میں آگیا۔ ہر چہرے پر ہیجانی کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔ حویلی کے ملازمین ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ مقتول موہن داس کو جس کمرے میں بند کیا گیا تھا وہاں باتھ روم نہیں تھا۔ اسے پیشاب وغیرہ کے لیے مہمان خانے کی عقبی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر زنجیر سے باندھے گئے تھے۔ باتھ روم کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ دو رائفل بردار موہن داس کے سر پر کھڑے تھے۔ عین اسی وقت جب موہن داس ٹوائلٹ میں قدم رکھ رہا تھا' ایک جانب سے زریں گل تند بگولے کی طرح برآمد ہوا اور اس نے وحشیانہ انداز میں موہن پر چھری کا وار کیا۔ یہ وار موہن کے پیٹ کے بجائے اس کی ران پر لگا۔ وہ جان بچانے کے لیے چیختا ہوا بھاگا۔ زریں نے اس کا پیچھا کیا۔ دا رائفل بردار ہکا بکا کھڑے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ ان کی قوتِ فیصلہ سلب ہو گئی تھی۔ موہن داس مہمان خانے کے پچھواڑے واقع گھنے درختوں میں گھس گیا۔ زریں اس کے پیچھے تھا۔ رائفل بردار محافظ کچھ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کریں۔ موہن داس اور زریں دونوں گھنے درختوں میں روپوش ہو گئے تھے۔ تقریباً ایک منٹ بعد وہ دونوں حویلی کی چھت پر دکھائی دیے۔ موہن داس چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا۔ زریں اس کا پیچھا کر رہا تھا پھر جان بچانے کی اضطراری حرکت کے تحت موہن داس اس بلند چھجے پر چڑھ گیا جہاں اسے آخری دو کاری زخم لگے۔ اس گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ زریں نے موہن کو مہمان خانے سے ٹوائلٹس کی طرف جاتے دیکھا تھا' پہچانا تھا اور آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

جب میں احاطے میں موجود لوگوں سے باتیں کر رہا تھا تو جاگیردار کا ملازم منصب علی میرے پاس آیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا "جناب! وہ شنکر نام کا قیدی بہت شور کر رہا ہے۔ گالیاں بک رہا ہے اور دھمکیاں دے رہا ہے۔"

شنکر کا نام سن کر میں چونکا اور منصب کے ساتھ تیزی سے مہمان خانے کی طرف چل دیا۔ میں نے منصب سے پوچھا "کیا کسی نے اس سے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں جی.... کہا تو کسی نے کچھ نہیں۔"

"پھر کیا ہوا ہے؟"

"وہ جو بندہ ابھی مرا ہے نا' اس کی لاش چھت سے اتار کر مہمان خانے کے اندر سے باہر لائی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ساتھی کی لاش دیکھنے کے بعد شنکر نے واویلا شروع کیا ہے۔"

"یہ بڑی بے وقوفی کی ہے تم نے۔ لاش کو مہمان خانے کے اندر سے لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس جی غلطی ہو گئی۔ میں تو موقع پر موجود نہیں تھا۔"

مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے میری رفتار کچھ تیز ہو گئی۔ مجھے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں شنکر پہریداروں کو مشتعل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ قادر زماں کے پہریداروں میں بڑے بڑے پھنّے خان لوگ شامل تھے اور انہیں غلیظ گالیوں سے نواز رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ شنکر چاہ رہا تھا کہ پہریدار اسے مارنے پیٹنے کے کمرے میں داخل ہوں اور وہ انہیں آڑے ہاتھوں لے۔ میں اس شخص کی فطرت اب بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

جونہی ہم مہمان خانے کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے' مجھے شنکر کی گھن گرج سنائی دی۔ وہ پہریداروں کے لیے بڑی گندی زبان استعمال کر رہا تھا اور واقعی بے حد مشتعل نظر آتا تھا۔ شنکر کے کمرے کے سامنے آٹھ دس پہریدار نظر آئے۔ وہ بھی شنکر ہی کی طرح مشتعل نظر آ رہے تھے۔ بہرحال خیریت گزری تھی کہ کسی نے شنکر کے کمرے میں گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے دیکھ کر شنکر اور بھڑک گیا۔ اس نے غلیظ زبان استعمال کی اور مجھے دھمکی دی کہ موہن کے قتل کا مجھے بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور زبان بھی شعلہ فشاں تھی۔

میں نے تمام پہریداروں کو باہر بھیج دیا۔ کھڑکی کے قریب آکر میں نے شنکر سے کہا "تم اپنی اداکاری سے کسی کو دھوکا دے سکتے ہو لیکن مجھے نہیں۔ میں شاید تم کو اتنا جاننے لگا ہوں جتنا تم اپنے آپ کو جانتے ہو۔ اس کمینے داس کی لاش دیکھ کر تمہارے اندر غصے کے بگولے تو چلے ہوں گے لیکن اتنے نہیں جتنے تم ظاہر کر رہے ہو۔ غصہ جو تم دکھا رہے تھے' صرف اس لیے تھا کہ پہریدار تمہارے جھانسے میں آکر دروازہ کھول دیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے جواب میں مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میرا دایاں ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس سے پہلے کہ شنکر کچھ سمجھ سکتا' میں نے اس کا گریبان تھام لیا اور ایک انتہائی وحشیانہ جھٹکے سے میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی آہنی سلاخوں سے ٹکرایا۔ تصادم اتنا زوردار تھا کہ پوری کھڑکی جھنجھنا اٹھی۔ شنکر کا اگلا ایک دانت ٹوٹ گیا اور

ہونٹ پھٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس ضرب کی شدت سے سنبھلتا' میں نے اسے دوبارہ جھٹکا دیا۔ چہرہ پھر سلاخوں سے ٹکرایا۔ چند ساعتوں کے اندر وہ تین چار شدید جھٹکے تھے جنہوں نے شنکر کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑا تو وہ مجھے قاتلانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا خون تھوکنے لگا۔

میں نے کہا "تمہاری بدزبانی کی سزا دینے کے لیے تمہارا اس کمرے سے نکالا جانا ضروری نہیں۔ یہ بات آئندہ بھی اپنے ذہن میں رکھنا۔"

وہ اپنے مخصوص سرد لہجے میں غرایا "مجھے اس کمرے میں بند کر کے اپنی دلیری اور شکتی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ اگر ہمت ہے تو نکالو مجھے یہاں سے اور دو دو ہاتھ کر کے دیکھو۔ بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ مجھے نیچا دکھا لو گے تو اپنے ہاتھ سے خود کو گولی مار لوں گا اور یہ لکھ کر دے جاؤں گا کہ میں اپنی موت کا ذمے دار صرف اور صرف میں ہوں۔"

میں نے کہا "دو دو ہاتھ کرنے کا شوق تو مجھے بھی بہت تھا لیکن کیا تم نے ڈیفنس کے "بیس منٹ" میں مجھے یہ موقع فراہم کیا تھا؟ اگر نہیں کیا تھا تو پھر مجھ سے بھی یہ توقع مت رکھنا۔ بے وقوفی اور دلیری میں جو فرق ہوتا ہے وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم پہریداروں کے ساتھ بدزبانی بند کرو ورنہ چار پانچ روز کے اندر بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر زمین چاٹنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

شنکر شکرا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں باہر نکل گیا۔ میری ہدایت کے مطابق پہریدار مہمان خانے کے برآمدے میں موجود تھے۔ میں نے انچارج پہریدار کو ایک طرف بلایا۔ اس کا نام سجاد تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ شنکر نام کا شخص بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ پرلے درجے کا چالباز ہے اس لیے اس کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ بدزبانی صرف اس لیے کر رہا ہے کہ اسے سزا دینے کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا جائے۔

پہریدار سجاد نے مجھے بتایا کہ بونے بازی گار روز اس (شنکر) کے خلاف غصے سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں موقع دیا جائے' وہ ایک منٹ میں اس کا دماغ درست کر دیں گے۔

میں نے کہا "یہی تو سب سے بڑی غلطی ہے۔ میں ایک بار پھر وارننگ دے رہا ہوں۔ کوئی شخص کسی بھی صورت میں قیدی کے قریب نہیں جائے گا۔ اگر کوئی جائے گا تو نتیجے کی ساری ذمے داری اس پر ہو گی۔"

○☆○

اگلے چند روز خاصے غیر یقینی تھے۔ حویلی میں جو ہنگامے ہوئے تھے انہیں سمیٹنا کافی مشکل نظر آ رہا تھا۔ خصوصاً اس پس منظر میں کہ ان ہنگاموں کے دوران میں کئی افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ تاہم اس موقع پر مجھے جاگیردار قادر زماں کے اثر و رسوخ کا معترف ہونا پڑا۔ اس نے یہ سارے معاملات اتنی خوبی سے سنبھالے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ پولیس کی جیپ صرف ایک مرتبہ حویلی کے مین گیٹ پر نظر آئی۔ اس کے بعد پولیس آئی ہی نہیں اور اگر آئی بھی تو ایک دو بڑے افسر آئے اور وہ بھی سادہ لباس میں۔

شنکر اور شیخ عاصم بدستور حویلی میں مقید تھے۔ شنکر کی طرف سے مجھے زیادہ خطرہ تھا۔ میرے مشورے پر قادر زماں نے اسے حویلی کے تہ خانے میں واقع ایک محفوظ کوٹھری میں پہنچا دیا تھا۔ جاگیردار قادر زماں کی یہ اطلاع بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ شیخ اور شنکر کی اس حویلی میں "آمد" ایک سربستہ راز کی طرح ہے اور اس کے ساتھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے خود بھی شنکر کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ کی تھی اور اس اطلاع کی تصدیق ہوئی تھی۔ دیکھا جاتا تو میری اور شیخ کی برسوں پرانی جنگ کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے شیخ پر غلبہ حاصل ہوا تھا۔ شیخ اور اس کا دستِ راست شنکر شکرا میرے قبضے میں تھے اور میں ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں نے غزالہ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ شیخ سے پرانے بدلے چکانے کی کوشش نہیں کروں گا اور نہ ہی اسے بے جا تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا (شیخ کے کمرے میں جا کر میں نے اس سے جو مار پیٹ کی تھی وہ سراسر ایک وقتی ابال تھا اور یہ تشدد کے زمرے میں بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے شیخ کو مردانہ وار لڑنے کا موقع دیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے آس پاس اور کوئی موجود نہیں تھا) غزالہ سے کیے ہوئے وعدے کا میں نے پورا پاس کیا تھا۔ شیخ عاصم کو انگلی تک نہیں لگائی تھی۔ بہرحال اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے الیکٹرانک اداکیں نکلوانے کے سلسلے میں حیل و حجت کی تو پھر اسے بدترین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

شیخ عاصم نے میری ہدایات کے مطابق عمل کرنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے منیجر الطاف کو پوری رازداری کے ساتھ لاہور سے جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں بلایا تھا پھر اسے ضروری احکامات دے کر فوری

طور پر ٹوکیو روانہ کردیا تھا۔ منیجر الطاف کی واپسی کل ہی ہوئی تھی۔ وہ جاپانی الیکٹرانک انجینئر مسٹر گاشی اور آسٹریا کے سرجن مسٹر کلاکٹ کو ساتھ لے آیا تھا۔ دوسرے سرجن مسٹر ہیرولڈ کو آج پاکستان پہنچنا تھا۔ یہ ساری کارروائی بڑی رازداری سے ہو رہی تھی۔ منیجر الطاف اور شیخ عاصم کے دو بہت قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو اس معاملے کی بھنک تک نہیں تھی۔

اسی روز دوپہر کو دوسرے سرجن مسٹر ہیرولڈ بھی پاکستان پہنچ گئے۔ سرجن ہیرولڈ کا تعلق امریکا سے تھا۔ وہ سرجن کلاکٹ سے سینئر تھے۔ سرجن ہیرولڈ کے آنے سے پہلے ہی سرجن کلاکٹ وہ چھوٹا سا اسپتال دیکھ چکے تھے جو جاگیردار قادر زماں نے اپنی حویلی میں تعمیر کر رکھا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، یہ اسپتال چھوٹا ہونے کے باوجود مکمل ترین تھا۔ اس میں ٹریٹمنٹ کی جدید ترین سہولتیں موجود تھیں بلکہ ایک دو ایسی مشینیں بھی میں نے یہاں دیکھی تھیں جو مجھے کہیں اور نظر نہیں آئی تھی۔ سرجن کلاکٹ کا خیال تھا کہ اس اسپتال میں مجھے آپریشن کی کافی سہولتیں میسر آسکتی ہیں جن کی پاکستان کے کسی دوسرے اسپتال میں توقع کی جاسکتی ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں حتمی فیصلہ سرجن ہیرولڈ ہی کرسکتے تھے۔ سرجن ہیرولڈ نے آتے ساتھ ہی اسپتال کے آپریشن تھیٹر کا معائنہ کیا اور سرجن کلاکٹ کے خیال کی تصدیق کردی۔ انہوں نے صرف گیسٹروسکوپی کے لیے ایک جدید مشین کا تقاضا کیا۔ قادر زماں نے ذمے داری قبول کی کہ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مشین مہیا کردے گا۔

صورت حال میرے لیے بے حد تسلی بخش تھی۔ سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔ غزالہ بھی کافی مطمئن نظر آرہی تھی۔ بے شک اپنے شوہر شیخ عاصم سے اس کی وابستگی قائم تھی لیکن وہ دل سے یہ چاہتی تھی کہ میں اس زنجیر سے آزاد ہو جاؤں جو شیخ عاصم نے الیکٹرانک ڈوائس کی صورت میں میرے پاؤں میں پہنا رکھی ہے۔ وہ ایک طرف تو شیخ عاصم کی طرف سے رات دن پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ اسے جلد از جلد آزادی نصیب ہو، دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ شیخ عاصم کم از کم اس وقت تک میری گرفت میں رہے جب تک ڈوائس میرے جسم سے نکل نہیں جاتا۔ وہ جتنی فکرمندی سے شیخ عاصم کی مرہم پٹی کرتی تھی، اتنی ہی فکرمندی سے میرے بازو کا زخم بھی دیکھتی تھی۔

عالم قریشی اب بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ دو روز علیل رہا تھا۔ ان دو روز میں وہ جم کر کھا پی نہیں سکا تھا۔ اب وہ اس کی کسر نکال رہا تھا لیکن یہ کسر کسی طور نکلنے میں نہیں آرہی تھی۔ اس کی بیوی کو یقین تھا کہ وہ دو روز کی کسر نکالنے کے لئے ایک ہفتے میں ایک مہینے کا فالتو کھانا کھا جائے گا۔ میں نے خود بھی اسے کھاتے دیکھا تھا۔ وہ کھانے کے آخر میں میٹھی چیز کھاتا تھا اور پھر منہ کرارا کرنے کے بہانے ایک بندے کا کھانا مزید کھا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر منہ میٹھا کرنے لگتا تھا۔ ویسے وہ آج کل مطمئن نظر آتا تھا۔

میری بہن شفقا بھی اس خیال سے بہت خوش نظر آرہی تھی کہ میرے جسم سے وہ منحوس آلہ نکلنے والا تھا جس نے قدم قدم پر میرے ہاتھ پاؤں جکڑے تھے اور مجھے شدید ترین اذیتوں سے دوچار کیا تھا۔ جس رات ڈاکٹر ہیرولڈ حویلی میں پہنچا، اسی روز شام کو مجھے انجم کی زبانی معلوم ہوا کہ شفقا نے آج حویلی کے غریب ملازمین میں خیرات تقسیم کی ہے۔ دس پندرہ روز بعد عید کی آمد تھی لہٰذا اس نے بچوں کو کپڑے سلوانے کے لیے سو روپے فی کس کے حساب سے دیے تھے۔ اس کے علاوہ تین چار غریب خاندانوں کو بھی عید گزارنے کے لیے پیسے دیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب کچھ میری صحت و سلامتی کے لیے کررہی ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس کے پاس یہ پیسے آئے کہاں سے۔

میں نے شام کو اس سے پوچھا، وہ مجھے ٹالنے کی کوشش کرنے لگی۔ بولی "میرے پاس پیسے تھے۔ انکل ساحی جو خرچ دیتے تھے، میں نے اس میں سے تھوڑے تھوڑے جمع کیے تھے۔" اچانک میری نگاہ اس کے گلے کی طرف اٹھ گئی۔ سونے کی وہ خوب صورت چین نظر نہیں آرہی تھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے نگینے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ چین شفقا کو اپنی برتھ ڈے پر ساحی صاحب سے تحفے میں ملی تھی۔

میں نے کہا "شفقا! چین کہاں ہے؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ شفقا کی خاموشی مجھے ایک ہی لمحے میں سب کچھ سمجھا گئی۔ اس نے خیرات نکالنے کے لیے چین فروخت کی تھی۔ وہ پگلی اپنی محبت کے اظہار کے لیے ہمیشہ ہی ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتی تھی اور بعض اوقات مجھ سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی لیکن اس وقت میں کوشش کے باوجود اسے ڈانٹ نہیں سکا۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا "شفقا! ایسا کیوں کیا تم نے؟"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر مسکرائی "بس بھیا! میرا دل چاہتا تھا ایسا کرنے کو۔"

کتنا سادہ اور بے ساختہ جواب تھا۔ میں نے اس کے سر پر پیار دیا۔

وہ بولی "بھیا! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"آپ کے آپریشن سے۔"

"بھئی آپریشن میرا ہو رہا ہے اور میں نہیں ڈر رہا پھر تم کیوں ڈر رہی ہو؟"

"بھیا! آپ بہادر ہیں لیکن میں بہادر نہیں ہوں' بالکل بھی بہادر نہیں ہوں اور جب بات آپ کی ہو تو میری بزدلی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کر تیرے ساتھ رہ رہ کر میں بھی ڈرپوک ہو جاؤں لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" وہ معصومیت سے بولی۔

"میں تجھے زیادہ دیر اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔"

"کیا مطلب بھیا؟"

"پاگل خانی! تو تجھے جتنی ہو گئی ہے اور بات تیری سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس کے چہرے پر دھنک کے رنگ لہرا گئے۔ وہ ٹھٹک کر بولی "دیکھیں بھیا! ایسی باتیں مت کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"واقعی اچھا نہیں لگتا؟"

اس نے گردن جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"بھئی! اگر ایسی بات تھی تو پہلے بتانا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔ انجم بھی یہی کہتی تھی' ویسے دیکھنے میں بھی اچھا نظر آتا ہے۔ زیادہ خوب صورت تو نہیں مگر ٹھیک ٹھاک ہے۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی "کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"ڈاکٹر حمزہ کی اور کس کی؟"

وہ لال گلابی ہو گئی "دیکھیں بھیا! آپ ایسی باتیں نہ کریں' ورنہ میں رو دوں گی۔"

اتنے میں انجم بھی وہاں آ گئی "کیا باتیں ہو رہی ہیں بہن بھائی میں؟"

میں نے کہا "بھئی! یہاں تو سارا معاملہ ہی الٹ ہو گیا ہے۔ ہم کچھ اور سوچ رہے ہیں اور یہ کہہ رہی ہے کہ۔۔۔"

"پلیز بھیا!" شفتا نے اپنے ہاتھ سے باقاعدہ میرے ہونٹ بند کر دیے۔

میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے میرے ہونٹ ڈھانپ رکھے تھے۔ کبھی کبھی ہم بالکل اسی طرح دوستوں کے انداز میں زور آزمائی کرنے لگتے تھے۔

"بھئی! مجھے بات تو کرنے دو۔" میں نے بہ مشکل کہا۔

وہ دوبارہ میرے ہونٹ ڈھانپ کر بولی "نہیں آپ باجی کو غلط سلط بتائیں گے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹایا "میں وعدہ کرتا ہوں بھئی۔۔۔ کچھ بھی غلط سلط نہیں بولوں گا۔"

"وعدہ؟"

"ہاں وعدہ۔"

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ذرا سی زور آزمائی نے اس کے رخساروں کو شہابی کر دیا تھا۔ میں شفتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انجم سے مخاطب ہوا "بھئی! شفتا نے یہ بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر حمزہ اسے اچھا نہیں لگتا' بلکہ یہ تو کہہ رہی ہے کہ۔۔۔"

شفتا ایک بار پھر تڑپ کر میری طرف آئی۔ وہ میرے ہونٹ بند کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "اب تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اب تو میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہا۔"

وہ شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے ہونٹ کھولے لیکن بات نہیں کر سکی اور سٹپٹا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

انجم بولی "ابھی لاہور سے حمزہ کا فون آیا تھا۔ وہ آپ کی خیر خیریت پوچھ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ شاید وہ کل یا پرسوں اپنی والدہ کے ساتھ حویلی آئے۔" نارمل ہونے کے بعد ڈاکٹر حمزہ واپس لاہور چلا گیا تھا۔

میں نے کہا "یہ کام خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

انجم بولی "میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جا سکتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ وہ فی الحال حویلی نہ آئے۔"

ابھی میں اور انجم باتیں ہی کر رہے تھے کہ جاگیردار کا سیکریٹری بہار آ گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ جاگیردار صاحب اسپتال والے بلاک میں ہیں اور مجھے یاد فرما رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دونوں غیر ملکی ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ ہیں۔

میں انجم سے رخصت ہو کر اسپتال پہنچا۔ آپریشن تھیٹر کے قریب ہی ایک شاندار کمرے میں جاگیردار قادر زماں موجود تھا۔ دونوں سرجن اور جاپانی سائنس داں مسٹر کاشی بھی وہیں تھے۔ ان کے سامنے بہت سے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ ایکسرے فلمیں تھیں' کچھ ٹیسٹ رپورٹیں تھیں۔ یہ سارا مواد میرے ہی مرض کی تشخیص سے تعلق رکھتا تھا۔

میرے یہ ٹیسٹ ڈاکٹر کلاکٹ نے ایک روز پیشتر کیے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کلاکٹ اور ڈاکٹر ہیرولڈ کے چہروں پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

سلام دعا اور رسمی گفتگو کے بعد ڈاکٹر ہیرولڈ نے شستہ انگریزی میں کہا "مسٹر شاہ جہاں! سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ الیکٹرانک ڈوائس آپ کے جسم میں رکھنے سے ہم دونوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم مسٹر شیخ عاصم کی درخواست پر یہ آپریشن کرنے کے لیے یہاں پہنچے ہیں اور اس سلسلے میں جو بھی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے' اس کے بارے میں ہم نے شیخ صاحب کو بتا دیا ہے۔"

"پیچیدگی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسی طرف آ رہا ہوں۔" ڈاکٹر ہیرولڈ بولے۔ انہوں نے مسٹر کاشی کو اشارہ کیا۔ کاشی ایک تصویر میرے سامنے لے آیا۔ یہ کلر تصویر تھی اور گیسٹرو اسکوپی کرنے والی مشین کے ذریعے خاص طریقے سے اتاری گئی تھی۔ یہ میرے معدے کے اندرونی حصے کی تصویر تھی۔ جو منظر مجھے اس تصویر میں نظر آ رہا تھا وہ میں گیسٹرو اسکوپی کی چھوٹی سی ٹی وی اسکرین پر کچھ عرصے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس تصویر میں میرے معدے کے اندر چھوٹا سا ڈبیا نما آلہ نظر آ رہا تھا۔ تصویر میں منظر کو چونکہ انلارج کیا گیا تھا لہٰذا ڈبیا کے دونوں طرف وہ چھوٹی چھوٹی PINS بھی نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر ہیرولڈ نے کہا "یہ آلہ ایک خاص قسم کے لوشن کے ذریعے آپ کے معدے کی اندرونی جھلی سے چپکا دیا گیا تھا۔ اب اس آلے کو آپ کے جسم سے جدا کرنے کے لیے ہمیں جھلی کا وہ حصہ کاٹنا ہو گا جہاں آلہ پیوست ہے لیکن جراحی کا یہ عمل کرنے سے پیشتر اس آلے کو "فیڈ" کیا جانا ہے۔ یہ کام مسٹر کاشی کو کرنا ہے۔ آلے کے دونوں طرف آپ کو دو PINS نظر آ رہی ہیں۔ ان PINS کے سروں پر دو باریک TIPS ہیں۔ یہ TIPS ڈوائس کے نظام کو متحرک کرتی ہیں۔ مسٹر کاشی ان کو پُش کر کے اندر دبا دیں گے تو یہ ڈوائس تقریباً ڈیڈ ہو جائے گا لیکن یہاں مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کچھ عرصے پہلے اس ڈوائس کی وجہ سے آپ کے معدے میں زبردست انفیکشن رہا ہے۔ اب یہ انفیکشن ٹھیک ہے لیکن سوجن کی وجہ سے آلے کی وہ PINS جن کے سرے جھلی کے اوپر رہنے چاہیں تھے' جھلی کے اندر جا چکے ہیں۔ اب ایک "مائنر" سے آپریشن کے ذریعے ان سروں کو معدے کی اندرونی سطح سے باہر نکالا جائے گا۔ اس کے بعد مسٹر کاشی اپنا کام کر سکیں گے۔ درحقیقت یہی مائنر آپریشن ہمارے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔"

"یعنی آپ اس میں خطرہ محسوس کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہیرولڈ نے ایک نظر ڈاکٹر کلاکٹ پر ڈالی پھر گھنی بھوؤں کے نیچے سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ذرا سا توقف کر کے اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "ہاں مسٹر شاہ جہاں! اس میں آپ کی زندگی کے لیے خطرہ ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ PINS کو آپ کے معدے کی اندرونی سطح سے علیحدہ کرنے کے دوران میں ڈوائس آپ کے جسم میں پھٹ جائے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم کسی تنگ سوراخ میں پھنس گیا ہے اور میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر ہیرولڈ! آپ کے خیال میں آپریشن کے دوران ڈوائس کے پھٹنے کا کتنے فیصد امکان ہے؟"

میرے سوال کا جواب ڈاکٹر ہیرولڈ کے بجائے جاپانی ماہر مسٹر کاشی نے دیا۔ وہ بولا "تقریباً 75 فیصد مسٹر شاہ جہاں!"

کاشی کے لہجے میں یقین اور افسردگی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ قادر زماں بھی چپ چپ نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ لوگ اس معاملے میں کافی ڈسکس کر چکے تھے۔

ڈاکٹر ہیرولڈ بولے "اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں مسٹر شاہ جہاں!۔۔۔ ہم ڈوائس نکالیں۔ یا اس کو جہاں کا تہاں رہنے دیں۔ ڈوائس نکالنے میں جو خطرہ پوشیدہ ہے وہ آپ کو مسٹر کاشی نے بتا ہی دیا ہے۔ قریباً ستر پچھتر فیصد خدشہ اس بات کا موجود ہے کہ دوران آپریشن ڈوائس آپ کو نقصان پہنچا جائے۔ دوسری طرف اگر ہم ڈوائس نہیں نکالتے تو فوری طور پر تو آپ آپریشن کے خطرے سے بچ جائیں گے لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکے گی۔ عین ممکن ہے کہ آپ کو معدے کی وہ شدید تکلیف پھر شروع ہو جائے جس کا تجربہ آپ اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اس مرتبہ یہ درد زیادہ شدید ثابت ہو گا۔ آپ کب تک "پین کلر" سے کام چلائیں گے پھر آپ کو آپریشن کی طرف آنا ہی پڑے گا۔ یقینی بات ہے کہ تب تک آپریشن میں موجود خطرات مزید بڑھ جائیں گے جو رسک اس وقت ستر فیصد کے قریب ہے ممکن ہے کہ بڑھ کر نوّے فیصد یا اس سے بھی زیادہ ہو جائے۔"

ڈاکٹر ہیرولڈ کے لب و لہجے میں پیشہ ورانہ قطعیت شامل تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے قادر زماں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سراسر میرا معاملہ تھا اور اس کے بارے میں جو بھی حتمی جواب دینا تھا' مجھے ہی دینا تھا۔ میں ایک دم ایک سنگین دوراہے پر آ گیا تھا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر ہیرولڈ! میں اس وقت ایک مریض کی حیثیت سے آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔ آپ حضرات اپنی اپنی فیلڈ میں ماہر ترین تصور کیے جا سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو اس سلسلے میں کسی سے مشورے کی ضرورت ہے۔ آپ جو بھی مناسب سمجھتے ہیں' کریں۔ میں خود کو کلی طور پر آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر ہمارے پاس آپ کی آمادگی کا کوئی قانونی ثبوت تو ہونا چاہیے۔" ڈاکٹر کلائنٹ نے کہا۔

"آپ اس حوالے سے جس قسم کے پیپر پر چاہیں' مجھ سے دستخط کروا لیں۔"

"آپ کے وارث یہاں ہیں؟"

"ایک چھوٹی بہن کے سوا میرا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس سے دستخط لینا چاہتے ہیں تو وہ بھی کر دے گی۔"

ڈاکٹر ہیرولڈ اور ڈاکٹر کلائنٹ کچھ دیر سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے پھر مسٹر گاشی نے بھی ایک دو سرگوشیاں کیں۔ سامنے میز پر پھیلی ہوئی رپورٹوں وغیرہ پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ آخر ڈاکٹر ہیرولڈ نے عینک اتار کر میز پر رکھی اور اپنی گھنی بھنوؤں کے نیچے سے مجھے دیکھ کر بولے "مسٹر شاہ جہاں' ہماری متفقہ رائے تو یہ ہے کہ آپریشن میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ بہرحال اس سلسلے میں حتمی فیصلہ میں آج رات تک کروں گا۔ میں آسٹریا میں اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر سے فون پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ فون پر رابطہ ہونے کے فوراً بعد میں آپ کو بتا دوں گا کہ آپ کا آپریشن کب ہوتا ہے اور آپریشن کے لیے آپ کو کیا تیاری کرنا ہے۔"

اسپتال سے میں دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر واپس آیا۔ دونوں ماہر ترین سرجنوں نے جو کچھ بتایا تھا وہ ہر زاویے سے پریشان کن تھا۔ جاگیردار قادر زماں بھی میرے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! مجھے تو یہ معاملہ بڑا سیریس لگتا ہے ورنہ اتنے بڑے اور قابل ڈاکٹروں کے ماتھے پر پسینہ نہ آتا۔"

"لیکن آپریشن کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں۔" میں نے کہا۔

"جان جی! گزارہ تو ہو ہی رہا ہے نا۔ ڈاکٹروں کا کیا ہے' وہ تو کہہ ہی دیتے ہیں کہ بس جی بیماری سیریس ہو گئی ہے۔ اگر آپریشن نہ ہوا تو مریض ہفتہ بھی مشکل سے نکالے گا۔ مریض نہ صرف ہفتے نکالتا ہے بلکہ اگلے پندرہ بیس برسوں تک بھی زندہ سلامت رہتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری جی' ایک طرف تو آپ ڈاکٹروں کو قابل ترین کہہ رہے ہیں' دوسری طرف ان کے مشورے پر یقین بھی نہیں کر رہے۔ ویسے بھی جاگیردار صاحب میں اس تکلیف کو بڑھانا نہیں چاہتا ہوں اور بات صرف تکلیف کی ہی نہیں ان پابندیوں کی بھی ہے جو مجھے اس آلے کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ایک بدترین قسم کی غلامی ہے اور "آقا" وہ بے رحم شخص ہے جسے آپ شیخ عاصم کے نام سے جانتے ہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے' اب ہو جائے' میں اس معاملے کو اب اور نہیں لٹکاؤں گا۔"

قادر زماں بولا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمہارا یہ آپریشن شہر میں ہو۔ میرا مطلب ہے کہ یہ آپریشن تھیٹر بہت بڑا نہیں ہے۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی تو کیا ساری سہولتیں یہاں مل سکیں گی؟"

"بالکل مل سکیں گی۔ آپ گھبرائیں مت۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے بھی یہ دنیا کے بہترین سرجن ہیں۔ آپریشن تھیٹر کے بارے میں کم از کم ہم سے تو بہتر جانتے ہیں۔"

دل پر بوجھ ہو تو مسکرانا کسی مہم جوئی سے کم نہیں ہوتا۔ میں بھی خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مہم سر کر رہا ہوں۔ خاص طور پر شفتا کے سامنے پہنچ کر مجھے اپنے تاثرات کا بہت خیال رکھنا پڑا۔ وہ ان دنوں میری طرف سے خاصی فکرمند تھی۔ اب بھی وہ قریباً ایک گھنٹے سے لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی "کیا کہا ہے ڈاکٹر صاحب نے؟"

"بھئی یہی کہا ہے کہ معمولی سا آپریشن ہے۔ چار پانچ روز میں' میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔"

"سچ بھیا؟ آپ میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے؟"

"اگر مجھ پر یقین نہیں تو خود پوچھ آؤ جا کر۔"

وہ چہرے پر خوشی سجا کر بولی "مجھے یقین تھا بھیا! آپ کوئی اچھی خبر لے کر آئیں گے۔ مائی ارشاد کو جانتے ہیں نا آپ؟"

"کون مائی ارشاد؟"

"وہی جس کی ایک سائیڈ پر فالج ہے۔ جاگیردارنی صاحبہ کی منہ چڑھی کراتی رہتی ہے۔ حویلی کے لوگ اسے بڑا مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مائی ارشاد کی دعاؤں میں بڑا اثر ہے اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات اکثر پوری ہو جاتی ہے۔ آج مائی ارشاد خود آپ میرے پاس آ بیٹھی۔ کہنے لگی "تمہارے بھائی کو کچھ نہیں ہو گا۔ اس کی تکلیف معمولی ہے۔ وہ بالکل بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

"تمہاری مائی ارشاد تو کوئی پہنچی ہوئی چیز لگتی ہے۔ کیوں نہ اس سے تمہارے مستقبل کے بارے میں کچھ پوچھا جائے۔"

اس کے چہرے پر پھر رنگ لہرا گیا "دیکھیں بھیا! آپ پھر مجھے ستانے کی طرف آ رہے ہیں۔ پلیز آپ میرے مستقبل کی فکر چھوڑ دیں۔ اگر فکر کرنی ہے تو اپنی کریں۔ پتا ہے کتنی عمر ہو گئی ہے آپ کی؟"

"مردوں کی عمریں نہیں' حیثیت دیکھی جاتی ہے۔"

"دیکھیں بھیا! آپ مجھے باتوں میں نہ ٹالیں۔ غزالہ باجی کی تو شادی ہو چکی۔ اب آپ کے پاس کوئی بہانہ نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو میں مانوں گی نہیں۔ اب تو مجھے ہر صورت آپ کا کچھ کرنا ہی کرنا ہے۔"

"یہ تو "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والا معاملہ ہے یا پھر تم اس مقولے پر عمل کر رہی ہو کہ جارحیت ہی بہترین دفاع ہے۔ یعنی تم نے سوچا کہ اگر تم میری شادی کی بات شروع کرو گی تو میں تمہاری شادی کی بات بھول جاؤں گا۔ نہیں میری ننھی سی بہن' میں اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

کچھ دیر ہم اسی طرح ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے پھر میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک عجیب سی ویرانی دل میں بھر گئی تھی۔ دوران آپریشن میری موت کا ۷۵ فیصد امکان تھا اور یہ وہ امکان تھا جو دو ماہر ترین ڈاکٹر بتا رہے تھے اور ایک ماہر ترین انجینئر بتا رہا تھا "آپریشن نہ کرانے کی صورت میں یہ خطرہ مزید بڑھ سکتا تھا اور پچانوے فیصد یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتا تھا۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ بے خبری انسان کے لیے کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ جو حالات میرے سامنے آئے تھے' وہ ایک عرصے سے مجھے درپیش تھے لیکن میں بالکل مطمئن تھا۔ آج "باخبر" ہونے کے بعد جو بے قراری دل و دماغ پر غالب آئی تھی اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ مجھے ہر شے بدلی بدلی نظر آ رہی تھی جیسے میں کسی طویل سفر پر روانہ ہونے والا ہوں اور ہر منظر کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ہر سو خاموشی تھی۔ کھڑکی سے باہر حویلی کا محرابی دروازوں والا ایک طویل برآمدہ اور احاطے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ احاطہ جہاں چوکس پہریدار اور خونخوار کتے صبح تک پہرا دیتے تھے۔ یہ میرے لیے اور ہم سب کے لیے ایک محفوظ ترین پناہ گاہ تھی لیکن جب انسان کو اپنے جسم کے اندر سے ہی خدشات لاحق ہو جائیں تو پھر پناہ گاہیں اور حفاظتی انتظامات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ میں باہر سے حملہ آور ہونے والے ہر خطرے کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکتا تھا لیکن اندر سے جو خطرہ حملہ آور ہوا تھا اس کے سامنے میں بے بس تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ خود کو آپریشن ٹیبل پر لٹا کر ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں۔ جہاں تک ڈاکٹروں کا تعلق ہے' میں ان کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھا۔ بے شک ان ڈاکٹروں کو شیخ عاصم نے ہی ارینج کیا تھا مگر وہ اپنے پیشے کے تقدس کو سمجھنے والے ڈاکٹر تھے۔ اصل مسئلہ جاپانی ماہر مسٹر گاشی کا تھا' یہی وہ شخص تھا جس نے شیخ عاصم کے کہنے پر یہ آلہ میرے جسم میں رکھا تھا بلکہ ایک لحاظ سے اس ہلاکت خیز آلے کا موجد بھی یہی شخص تھا۔ آپریشن کے دوران میں یہ شخص اپنے ہاتھ کی معمولی سی دانستہ لرزش کے ذریعے مجھے موت کی وادی میں دھکیل سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک بے ضمیر شخص تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مالی فائدے کی خاطر ایسا ہلاکت خیز آلہ کیوں بناتا۔ کہنے کو تو شیخ عاصم گارنٹی دے رہا تھا کہ مسٹر گاشی پوری دیانت داری کے ساتھ سرجن صاحبان کا ساتھ دے گا اور آپریشن کامیاب کرانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گا لیکن اس کے دل کی گہرائی میں کیا ہے' یہ اسی کو پتا تھا۔

نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ ایک مرتبہ جی بھر کر شفتا کی صورت دیکھوں۔ کیا معلوم تھا کہ کل کیا ہو جائے۔ میں خاموشی سے حویلی کے زنان خانے میں پہنچا۔ ایک نگران عورت نے میرا راستہ روکا۔ میں نے اسے بتایا کہ اپنی بہن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے اندر جانے دیا۔ میں صرف شفتا کو دیکھنے آیا تھا لیکن یہاں غزالہ بھی موجود تھی۔ دونوں گہری نیند سو رہی تھیں۔ دو چہرے جو میری نگاہوں کے لیے عزیز ترین تھے۔ میری زندگی میں کتنی اہمیت تھی' ان دونوں کی لیکن ایک چہرہ میرے لیے اب پرایا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹائی اور اس چہرے کو دیکھنے لگا جو پرایا نہیں تھا۔ وہ میری بہن شفتا کا چہرہ تھا۔ مدھم لائٹ میں اس کی خوب صورتی و معصومیت کچھ اور اجاگر ہو گئی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ خم کھا کر اس کی ٹھوڑی سے چھو رہی تھی۔ میں محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا کہ اگر

واقعی مجھے کچھ ہو گیا تو میری یہ معصوم بہن کس کے سہارے پر ہو گی۔ میرے دل میں یکبارگی یہ بات آئی کہ شفتا کا کوئی مضبوط اور مستقل سہارا ہونا چاہیے۔ جب میں نے مضبوط اور مستقل سہارے کا سوچا تو میرے دماغ میں خود بخود ڈاکٹر حمزہ کی شبیہ ابھر آئی۔ میں نے اسی وقت وہاں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ شفتا کو اب بے سہارا نہیں رہنے دوں گا۔ میری زندگی مسلسل خطرات کی زد میں تھی۔ آپریشن کا خطرہ بہت بڑا خطرہ تھا لیکن یہ ٹل بھی جاتا تو ایسے سیکڑوں خطرات منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں شیخ عاصم اور شنکر شکرا جیسے خطرناک ترین لوگوں سے ٹکر لے چکا تھا اور یہ دشمنی کسی بھی وقت مجھ سے اپنا خراج وصول کر سکتی تھی۔

شفتا کو دیکھ کر میں واپس لوٹا۔ زنان خانے کی ڈیوڑھی سے گزر کر میں مردانے حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک راہ داری سے گزر رہا تھا جب مجھے اپنے عقب میں قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ دیکھا تو وہ غزالہ تھی۔ اس نے اوڑھنی اچھی طرح سر کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے مجھے اپنے کمرے میں شفتا کے سرہانے کھڑے دیکھ لیا تھا اور اب مجھ سے کوئی بات کرنے کے لیے یہاں آگئی ہے۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"جیسا بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔"

"عاصم بتا رہے تھے کہ آپ کا آپریشن کچھ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپریشن میں رسک کچھ بڑھ گیا ہے۔"

"میری زندگی میں رسک کے علاوہ اور ہے بھی کیا؟"

وہ بولی "شاہ جہاں! میں اس بارے میں بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ رسک اس سے بھی زیادہ ہے جتنا ڈاکٹر بتا رہے ہیں؟" میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ غزالہ نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "شاید میں آپریشن میں وہ رسک بھی شامل کر رہی ہوں جو جاپانی ماہر مسٹر گانی کی وجہ سے ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "شاہ جہاں' میں اس شخص کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ پتا نہیں کیوں اس کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے دل میں نفرت پیدا ہونے لگتی ہے۔ مجھے وہ شخص اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے کہا "جو چیز تمہارے شوہر کو اچھی لگتی ہے' اصولی طور پر وہ تمہیں بھی اچھی لگنی چاہیے۔ کامیاب ازدواجی زندگی کی بنیادی شرط یہی ہے کہ میاں بیوی کی رائے میں ہم آہنگی ہو۔"

"پلیز شاہ جہاں! طرمت کریں۔۔۔ میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا کہ آپ کے جسم سے ڈوائس نکالنے کی کارروائی میں جاپانی ماہر حصہ لے۔"

"تو پھر یہ کارروائی کیسے ہو گی؟"

"آپ اس شخص کا کوئی متبادل ڈھونڈیں۔"

"یہ کام میں نے نہیں' شیخ عاصم نے کرنا ہے۔"

"مگر وہ نہیں مانتے' انہیں مسٹر گانی پر پورا اعتماد ہے۔"

"یعنی تم شیخ عاصم پر عدم اعتماد کر رہی ہو؟"

"یہ عدم اعتماد نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ میں۔۔۔ اپنی بات عاصم کو سمجھا نہیں پا رہی ہوں۔"

"ہم تو مجھے بھی کوئی بات سمجھا نہیں پا رہی ہو۔ شیخ عاصم میرا دشمن نمبر ایک ہے۔ تم اس کی رفادار شریک حیات ہو پھر تم میری خاطر پریشانیاں کیوں پال رہی ہو؟"

"کیا میں عاصم کی شریک حیات ہو کر آپ کے لیے نہیں سوچ سکتی۔ کیا میں بیک وقت آپ کی اور عاصم کی بھلائی کی خواہش مند نہیں ہو سکتی۔ کیا ایسا کر کے میں کوئی جرم کر رہی ہوں؟"

"ہاں تم جرم کر رہی ہو۔ اب تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے کا اور ہمارے غم میں دبلا ہونے کا۔"

وہ دل گیر لہجے میں بولی "میں نے یہ حق کب کھویا ہے؟"

"اس وقت جب تم نے "بیس منٹ" میں وہ قیامت دیکھی جو تمہارے شوہر کے ہاتھوں میرے ساتھیوں پر ٹوٹی تھی' اس کے باوجود تم نے اپنے شوہر کی طرف داری جاری رکھی۔ عاصم کی سخت ترین مذمت کرنے کے بجائے تم نے اس کی وکالت کرنے کی کوشش کی۔"

"میں آپ کے سوال کا جواب دے سکتی ہوں شاہ جہاں! لیکن شاید وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ آپ ایک مرد ہیں۔ آپ کو یہ پتا نہیں کہ عورت جب بیوی بنتی ہے تو کیا کیا مجبوریاں اس کی ذات کا حصہ ٹھہرتی ہیں۔"

"تو تمہیں کون کہتا ہے میری خاطر مجبور ہونے کو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنے بارے میں خود سوچ سکتا ہوں۔"

"بہت ناراض ہیں مجھ سے؟"

"مجھے یہ حق ہرگز نہیں ہے۔"

"آپ اپنے حقوق اور فرائض کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" پھر ذرا توقف سے بولی "میں اس جاپانی کو آپ کے آپریشن میں ہرگز شریک نہیں ہونے دوں گی۔"

"مگر کیوں۔۔۔ کیوں کرو گی تم ایسا۔ کیا تم یہ سارا معاملہ کھٹائی میں ڈال دینا چاہتی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان سب لوگوں کو کس مشکل سے یہاں اکٹھا کیا گیا ہے۔"

"اگر وہ یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی سے کھیل جائیں۔" وہ بے حد تلخ لہجے میں بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی "اگر اس جاپانی سے مدد لیے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تو پھر آپ کو اس سے دیانت داری کی ضمانت حاصل کرنا ہو گی۔"

"شاید تمہارا مطلب جذبہ ورانہ دیانت داری سے ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میں آپریشن کے دوران میں پستول لے کر اس کے سر پر کھڑا رہوں گا۔ یا کوئی اور طریقۂ کار ہے تمہارے ذہن میں۔"

"مجھے جاپانی ماہر کے بارے میں ایک خاص بات معلوم ہوئی ہے۔ یہ بات حیران کن ہے لیکن اگر یہ واقعی درست ہے تو آپ اس شخص کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتے ہیں۔"

غزالہ کا انداز تجسس انگیز تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی "جاپانی فلموں کے ایک مشہور کریکٹر ایکٹرس کی بچی کے ساتھ مسٹر گانی کا زبردست معاشقہ چل رہا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک فلم میگزین میں بھی اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ لڑکی مسٹر گانی کے ساتھ پاکستان آئی ہوئی ہے۔"

"لیکن گانی کے ساتھ تو صرف ایک اسسٹنٹ اور دو ملازم ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔" غزالہ رازداری سے بولی پھر وہ مجھے اس بارے میں تفصیل بتانے لگی۔

○※○

رات کے دس بجے تھے۔ میں بڑی رازداری کے ساتھ مہمان خانے کے اس حصے میں داخل ہوا جہاں گانی قیام پذیر تھا۔ یہ تین کمروں پر مشتمل ایک آرام دہ سوئٹ تھا۔ ایک وسیع بیڈ روم گانی کے لیے تھا جب کہ ایک دوسرے بیڈروم میں گانی کے دونوں ذاتی ملازم سوتے تھے۔ گانی کا اسسٹنٹ مہمان خانے کے ایک دوسرے پورشن میں سوتا تھا۔ میں ایک اسٹور نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرا ارادہ ملازمین والے کمرے میں گھسنے کا تھا۔ مجھے امید تھی کہ گانی کے دونوں ملازمین میں سے کوئی باہر نکلے گا اور اس وقت مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ کمرے کے اندر کیا پوزیشن ہے۔ میرا انتظار تھوڑا سا طویل ضرور تھا لیکن بے کار ثابت نہیں ہوا۔ تقریباً دس منٹ بعد ملازمین والے کمرے میں کسی نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ ارد گرد کا جائزہ لیا اور کھڑکی دوبارہ بند کر دی۔ میں نے اپنی پناہ گاہ میں سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ کھڑکی کھلنے اور بند ہونے سے ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا کھسک گیا تھا۔ کمرے کے اندر سے ٹیوب لائٹ کی روشنی باہر راہداری میں پہنچ رہی تھی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا پھر دبے پاؤں چل کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے اندر جھانکا۔ پورے کمرے کا منظر میرے سامنے تھا۔ گانی کا ایک ملازم باتھ روم میں سے نکل رہا تھا۔ ملازم کی عمر تو بیس پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ لمبے بالوں والا ایک کلین شیو جاپانی تھا۔ خاصا اسمارٹ نظر آتا تھا۔ دوسرا ملازم میرے اندازے کے مطابق بیس بائیس سال کا ہو گا۔ وہ بھی چھوٹی آنکھوں اور شفاف جلد والا ایک اسمارٹ جاپانی تھا۔ شاید وہ دونوں سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بڑی عمر والا نوجوان لوتھ پیسٹ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے ساتھی سے گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسی دوران میں مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں جلدی سے اپنی پناہ گاہ یعنی اسٹور میں پسپا ہو گیا۔

جس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی وہ مسٹر گانی خود تھا۔ گانی کی عمر چالیس سال کے قریب تھی تاہم اچھی صحت اور سڈول جسم کے سبب پینتیس چھتیس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ واش بیسن پر ایک نگاہ ڈال کر وہ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں دس پندرہ منٹ مزید اپنی پناہ گاہ میں موجود رہا پھر میں نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ ملازمین کے کمرے میں سے ایک خوبرو لڑکی برآمد ہو رہی تھی۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے مگر اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے سے میک اپ میں وہ خوب سج رہی تھی۔ اس کے گلے میں نہایت قیمتی پتھروں کا ہار تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں نے کمرے میں صرف دو نوجوانوں کو دیکھا تھا۔ پورے کمرے بلکہ باتھ روم کا منظر بھی میری نگاہوں کے سامنے آیا تھا۔ تیسرا کوئی فرد کمرے میں موجود نہیں تھا پھر یہ لڑکی کہاں سے آگئی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً چکرا کر رہ جاتا لیکن مجھے زیادہ شدید دھچکا نہیں لگا۔ غزالہ نے مجھے اس بارے میں پہلے ہی کچھ اشارے دے دیے تھے۔ اس نے مجھے ایک

حیران کن اطلاع دی تھی اور وہ اطلاع یہ تھی کہ مسٹر گاشی کے ساتھ جاپان سے آنے والے دو خوبرو ملازموں میں سے ایک ملازم لڑکا نہیں بلکہ لڑکی ہے اور یہ لڑکی مسٹر گاشی کی وہی چنچل محبوبہ ہے جس کا باپ جاپانی فلموں کا ایک مشہور اسٹار ہے۔ اب میں نے ایک خوبرو لڑکی کو ملازمین کے کمرے سے نکل کر مسٹر گاشی کے کمرے میں جاتے دیکھا تو غزالہ کی اطلاع کی سوفیصد تصدیق ہوگئی۔

لڑکی کم عمر تھی جب کہ گاشی چالیس کے لگ بھگ تھا۔ وہ اپنی چال ڈھال سے بڑی شوخ اور اوٹ پٹانگ نظر آتی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاشی کے کمرے کے سامنے پہنچی' ایک لمحے کے لیے اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر کمرے میں گھس گئی۔ میرا ذہن سوچ کے گھوڑے دوڑانے میں مصروف ہوگیا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ تھا کہ غزالہ کو یہ بھید کیسے معلوم ہوا پھر سوچنے کی بات یہ تھی کہ گاشی کی محبوبہ یوں بھیس بدل کر اس کے ساتھ کیوں آئی۔ غزالہ نے بتایا تھا کہ جاپان میں گاشی کا یہ اسکینڈل کافی مشہور ہے اور اخبارات میں اکثر اس کے بارے میں نیوز لگتی رہتی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ شوبز سے تعلق رکھنے والی اس چنچل کم عمر لڑکی کے ساتھ درمیانی عمر کے سائنس داں کا رومانس اخباری رپورٹروں کے لیے کشش رکھتا ہو اور اخبار والوں سے بچنے کے لیے گاشی کی محبوبہ بھیس بدل کر اس کے ساتھ آئی ہو۔ (بعد ازاں میرا یہ قیافہ نوے فیصد درست ثابت ہوا) ایک سوال یہ بھی تھا کہ گاشی کی محبوبہ اپنی اصلیت کیونکر چھپا سکی۔ فلموں اور ڈراموں میں تو اکثر ایسا ہوجاتا ہے کہ لڑکی روپ بدل کر لڑکا بن جاتی لیکن حقیقی زندگی میں ایسے روپ کا بھرم رکھنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے غور کیا تو یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ لڑکی کے خدوخال میں خوبرو لڑکوں کی جھلک پائی جاتی تھی۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ جاپانی نسل کی تھی۔ اس خطے کے لوگوں کے نقوش ایسے ہوتے ہیں کہ مردانگی اور نسوانیت آپس میں گھل مل جاتی ہے۔ لڑکی نے فیشن کے مطابق جینز کی بنت کھلی سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ یوں اس کے جسمانی خدوخال چھپ کر رہ گئے تھے۔

لڑکی بن ٹھن کر اپنے محبوب کے بیڈ روم میں گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ تھوڑا وقت وہاں گزارے گی۔ مجھے اس اسٹور روم میں اکڑوں بیٹھ کر تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ یہ ایک کٹھن انتظار تھا۔ تاہم اس انتظار کا صلہ مجھے توقع کے مطابق ملا۔ گاشی کے بیڈ روم کا دروازہ مدھم آواز سے کھلا اور لڑکی مسکراتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس کے اسکرٹ کے بالائی بٹن کھلے تھے اور آنکھوں میں نشہ سا تیر رہا تھا۔ "بائے" اس نے کمرے میں دیکھ کر ہاتھ ہلایا پھر دروازہ بند کرکے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ میں سب کچھ پہلے سے طے کرچکا تھا' یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔

اس سے پہلے کہ لڑکی اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچتی' میں اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور عقب سے لڑکی کو یوں دبوچ لیا کہ اس کے ہونٹوں سے آہ تک نہیں نکل سکی۔ وہ اسمارٹ لیکن نہایت صحت مند لڑکی تھی۔ عام جاپانیوں کی طرح جسم سڈول تھا۔ اس نے بے طرح مچل کر خود کو چھڑانا چاہا۔ میں نے اس کے پاؤں زمین سے اوپر اٹھا دیے اور دیوار سے دور ہٹ گیا۔ یوں وہ اپنے دفاع کے ضمن میں کوئی آہٹ یا آواز پیدا نہیں کرسکی۔ میں اسے اٹھا کر سوئٹ کے بیرونی دروازے تک لایا۔ آہستگی سے کنڈی گرائی اور باہر آگیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے لڑکی کی گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور اسے بے ہوش کردیا۔

○☆○

منظر میرے بیڈ روم کا تھا۔ گاشی کی محبوبہ جس کا نام غزالہ سے نن تارا معلوم ہوا تھا' ڈبل بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی لپ اسٹک بکھری بکھری تھی۔ یہ پھیلی ہوئی لالی اس ملاقات کی طرف اشارہ کررہی تھی جو بند کمرے میں گاشی اور نن تارا کے درمیان ہوئی تھی۔ پانچ دس منٹ بعد نن تارا کو ہوش آگیا۔ کچھ دیر کسمسانے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے نقوش کو انفرادی طور پر دیکھا جاتا تو وہ زیادہ خوب صورت نہیں تھے اور ان میں لڑکپن پایا جاتا تھا لیکن مجموعی طور پر وہ خوب صورت تھی اور اس کے سراپا میں ایک خاص قسم کی کشش موجود تھی۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی' اپنی گردن مسلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہلے اس نے جاپانی میں چوں چاں کی۔ پھر انگلش میں بولی "میں کہاں ہوں۔ گاشی کہاں ہیں؟"

میں نے انگریزی میں جواب دیا "تم بڑے محفوظ ٹھکانے پر ہو' یہاں میری مرضی کے خلاف کوئی آسکتا ہے اور نہ جاسکتا ہے۔"

"ہوں۔ لیکن تم کون ہو؟"

"میں ہی تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔ تم مسٹر گاشی کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں جارہی تھیں' میں نے تمہیں اٹھایا اور یہاں لے آیا۔"

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس

کے چہرے پر شدید الجھن نظر آرہی تھی۔ تب اس کا ہاتھ ایک بار پھر اپنی گردن پر پہنچ گیا' وہ گردن مسلنے لگی "تم نے کیا کیا تھا میرے ساتھ۔ مجھے لگتا ہے میں کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہوگئی تھی۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے اس کی گردن پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا "یہاں کان کے نیچے ایک خاص رگ ہوتی ہے' اس کو مسل دیا جائے تو کچھ دیر کے لیے جسم اور دماغ کا رابطہ ختم ہوجاتا ہے۔"

وہ یک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی "تو کیا تم نے مجھے اغوا کیا ہے؟"

"میرے خیال میں اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ تم یہاں ہو۔ لیکن شور مچانے کی کوشش نہ کرنا۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کمرے سے آواز باہر نہیں جاتی۔"

میرا ہاتھ اپنے پسٹل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکی نے چیخنے کی کوشش کی تو پسٹل اس کے سر سے لگا دوں گا لیکن جو کچھ ہوا' قطعی غیر متوقع تھا۔ لڑکی مطمئن بیٹھی رہی بلکہ میں نے محسوس کیا کہ اپنے اغوا کا سن کر اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ بستر پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور بولی "کیا تم نے واقعی مجھے اغوا کرلیا ہے؟"

"تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں شاپنگ کرانے کے لیے یہاں لایا ہوں۔"

وہ بولی "یہ دلچسپ ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر میرے قریب چلی آئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا واقعی میں اغوا ہوچکی ہوں۔ میرا مطلب ہے تم مجھے زبردستی اٹھا کر یہاں لے آئے ہو؟"

"بے شک ایسا ہی ہوا ہے۔"

وہ پرجوش لہجے میں بولی "سچ پوچھو تو میری بڑی خواہش تھی اغوا ہونے کی۔ میں نے فلموں میں اکثر لڑکیوں کو اغوا ہوتے دیکھا ہے۔ کچھ تو بہت شور مچاتی ہیں۔ کچھ بڑے "سوبر" طریقے سے اغوا ہوجاتی ہیں۔ ویسے میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' میں صحیح اغوا ہوئی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میرے ریکشن ٹھیک ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس موقع پر مجھے چیخنا چلانا ہو۔ اور میں تم سے باتوں میں مصروف ہوگئی ہوں۔"

"نہیں' تم بالکل صحیح جارہی ہو۔" میں نے کہا۔

میں اس لڑکی کی باتیں سن کر حیران ہورہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس کینڈے کی تھی۔ اپنے اغوا کی بات وہ یوں کررہی تھی جیسے پکنک کی بات کررہی ہو۔ اس کے چہرے پر ایک کھلنڈری سی سادگی تھی۔ اس کے علاوہ ایک تجسس تھا جس کی بنیاد ان سنسنی خیز معلومات پر تھی جو نئی نسل کو کچی عمر میں ہی حاصل ہوجاتی ہیں۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "اب تم کیا کرو گے میرے ساتھ؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ ٹھنک کر بولی "ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ کیا تم نے پہلے کبھی کوئی لڑکی اغوا نہیں کی؟"

"ہمت کی ہیں لیکن وہ اس طرح چٹاخ پٹاخ نہیں بولتیں۔"

"میں پہلی مرتبہ اغوا ہوئی ہوں نا۔ اب تم بتاؤ گے تو مجھے پتا چلے گا کہ کیا کرنا ہے۔"

"نہیں بالکل خاموش رہنا ہے اور تسلی سے یہاں بیٹھنا ہے ورنہ میں تمہارا سر توڑنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" میں نے قمیص کے اندر سے پسٹل نکال کر اسے دکھایا۔

سیاہ رنگ کا خوف ناک پسٹل دیکھ کر وہ ذرا سی سنجیدہ ہوئی لیکن پھر فوراً ہی اس کا فطری انداز واپس آگیا۔ وہ بولی "ایک فلم میں' میں نے دیکھا تھا' ایک لڑکی نے اغوا کرنے والے سے کہا تھا' مجھے مرنا پسند نہیں اور نہ ہی یہ پسند ہے کہ تم مار پیٹ کر مجھے زخمی کردو۔ اس کے سوا میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گی۔ میں بھی تم سے کم و بیش یہی کہنا چاہتی ہوں۔ براہ مہربانی تم اپنا یہ پسٹل میرے سامنے سے ہٹالو۔"

لڑکی کی باتیں عجیب و غریب تھیں۔ غزالہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لاابالی سی لڑکی ہے۔ بہت ماڈرن ماحول میں پروان چڑھی ہے اور کچھ اوٹ پٹانگ بھی ہے۔ گاشی اس سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے اور اس کی خاطر اپنی تمام شہرت اور نیک نامی داؤ پر لگائے بیٹھا ہے۔

یکے بعد دیگرے غزالہ کی تمام باتوں کی تصدیق ہورہی تھی۔ لڑکی واقعی اوٹ پٹانگ تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی صورت اور سراپا میں ایسا سحر بھی تھا کہ صنف مخالف کو گرویدہ کرسکتا تھا۔

میں نے دس پندرہ منٹ تک نن تارا نامی اس لڑکی سے ہلکی پھلکی گفتگو کی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شوخی اور غیر سنجیدگی اس لڑکی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مسٹر گاشی اس کے لیے ایک دل پسند شخص تھا' لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت میں غرق ہورہی ہو۔ دوسری طرف گاشی واقعی اس کی محبت میں غرق ہورہا تھا۔ وہ ایک نامور سائنس داں تھا اور

سوسائٹی کے اعلیٰ حلقوں میں اس کی نیک نامی تھی۔ اب شوبز سے تعلق رکھنے والی ایک عام سی لڑکی کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا تھا' یہ بات شادی شدہ کاشی کے لیے باعث شرمندگی بھی تھی مگر وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ذرائع ابلاغ کے نمائندے اکثر مسٹر کاشی کے پیچھے پڑے رہتے تھے' اسی خطرے کے پیش نظر وہ چنچل محبوبہ کو ملازم کے روپ میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

نن تارا سے گفتگو کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ غزالہ نے مجھے کاشی پر قابو پانے کا جو طریقہ بتایا ہے' وہ کارگر ثابت ہوگا۔

میں نے نن تارا کے منہ پر ٹیپ چپکائی اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے کمرے میں بند کردیا۔ صبح چار بجے کے لگ بھگ میں نے مسٹر کاشی کو فون کیا۔ کافی دیر گھنٹی بجتی رہی۔ غالباً نوعمر محبوبہ سے "ملاقات" کے بعد وہ مدہوش ہوکر سو رہا تھا۔ دس پندرہ گھنٹیوں کے بعد اس نے ریسیور اٹھایا اور اس کی خواب آلود آواز میرے کانوں میں پڑی۔ حسب توقع اس نے پہلے جاپانی میں چوں چاں کی' جب میں نے انگلش میں صبح بخیر کہا تو وہ بھی انگریزی پر آگیا۔ میں نے کہا "مسٹر کاشی! میرا خیال ہے تم نے آواز سے پہچان لیا ہوگا اور اگر نہیں پہچانا تو اب پہچان لو۔ میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔ وہ بدقسمت شخص جو تمہاری مسلک ایجاد کا شکار ہوا اور اپنے جسم وجاں پر ہزارہا سختیاں جھیلتا رہا۔"

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے مسٹر شاہ جہاں! لیکن تم کس لہجے میں بات کررہے ہو؟"

"وہی لہجہ جو تم جیسے لوگوں کو راس آتا ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پارہا۔"

"تمہارے ملازموں میں سے ایک اغوا ہوچکا ہے اور اس وقت میرے قبضے میں ہے۔"

"کون سا ملازم؟"

"وہی جس کے اندر تمہاری محبوبہ نن تارا چھپی ہوئی ہے۔"

دوسری طرف سناٹا چھاگیا۔ یقیناً میرا جواب کاشی کے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوا تھا۔ چند لمحے کے لیے فون پر خاموشی چھائی رہی پھر فون پر دروازہ زور زور سے بجنے کی آواز سنائی دی۔ یعنی بات بھی کہ کاشی ملازمین کے کمرے کی طرف گیا ہے تاکہ میری اطلاع کی تصدیق کرسکے۔ تقریباً ایک منٹ اسی طرح گزر گیا۔ کہیں قریب باتوں کی مدھم آواز آتی رہی پھر کاشی آندھی اور طوفان کی طرح ٹیلی فون کی طرف واپس لوٹا۔

وہ مارتھ چیں میں دہاڑا "تم جانتے کیا ہو۔۔۔ کیوں ہے تم نے ایسا؟"

میں نے کہا "میں تمہیں کامیاب و کامران دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے آپریشن کے دوران تم اپنی ذمے داری بڑے اچھے طریقے سے نبھاؤ۔ بہت بچار کے بعد ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آیا۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے میں تمہاری محبوبہ دلنواز کو خوش کرتا ہوں۔ میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا ہوں۔ اس کی خاطر مدارات کی جائے گی۔ اس کا دل بہلایا جائے گا۔ تم آپریشن سے فارغ ہوجاؤ گے تو تمہاری نن تارا تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ بالکل حفاظت کے ساتھ اور خوش و خرم۔"

"تم مجھے یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ نن تارا کو اغوا کرایا ہے۔ اس لیے کہ تمہارے آپریشن کے دوران میں کسی طرح تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کروں۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو لیکن اب یہ مت کہنا کہ مجھے مہم جوئی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس مہم جوئی کی ضرورت تھی۔ تم ایک ناقابل اعتبار شخص ہو مسٹر کاشی تم نے رقم کی خاطر ایک غیر قانونی اور انسانیت سوز کام کیا۔ اب بھی سب کچھ کرسکتے ہو۔ تمہارے ہاتھ کی ایک ذرا جنبش مجھے موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہے۔ بولو میں غلط تو نہیں کہہ رہا اور اگر میں سچ کہہ رہا ہوں تو کیا مجھے دفاع کا حق حاصل نہیں۔" ایک لمحے توقف کے بعد میں نے کہا "سنو کاشی! میں نن تارا کو اپنے ایک ساتھی کے حوالے کررہا ہوں۔ تم جتنی محبت نن تارا سے کرتے ہو اس سے کہیں زیادہ وہ مجھ سے کرتا ہے۔ اس کا نام زریں گل ہے۔ ایک نہایت جذباتی بلکہ سرپھرا شخص ہے۔ اگر آپریشن کے دوران میں ڈوانس پھنسنے سے مجھے کچھ ہوا تو وہ شخص ایک لمحہ سوچے بغیر تمہاری نن تارا کو قتل کرڈالے گا۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے۔" کاشی کی کانپتی ہوئی آواز ریسیور پر سنائی دی "میں۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کام پوری دیانت داری سے انجام دوں گا۔ اپنی حتی الامکان کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔"

"تمہیں ایسا کرنا پڑے گا کاشی ورنہ لڑکی میرے ساتھی کے ہاتھوں بے موت مرے گی۔"

"لیکن اگر میری تمام تر کوشش کے باوجود کوئی ویسی بات ہوگئی تو؟"

"پھر بھی لڑکی کی جان جائے گی ہی۔ بے شک اس میں ذرا سی زیادتی نظر آتی ہے لیکن تمہاری وجہ سے جو زیادتیاں میرے ساتھ ہوئی ہیں' ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہاں ایک بات اور۔۔۔ اس واقعے کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"دیکھو مسٹر شاہ جہاں! اگر تم رویہ نہیں بدلو گے تو میں آپریشن میں شامل ہونے سے انکار کردوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس آپریشن میں 50 فیصد کے قریب رسک ہے۔ ایسے رسکی کام میں تم مجھ سے سو فیصد گارنٹی مانگ رہے ہو۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟ اگر تم مجھ پر بھروسا نہیں کرسکتے تو اس کام کے لیے کسی اور کو چن لو۔ جس قسم کا تعاون تم لوگ چاہو میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"یہی تو بات ہے مسٹر کاشی! یہ کام کرنا بھی تم ہی کو ہے اور اپنے ہاتھ سے کرنا ہے۔ تمہاری محبوبہ نن تارا کی زندگی اب آپریشن کی کامیابی سے مشروط ہوچکی ہے۔ اگر تمہارے خیال میں یہ زیادتی ہے تو زیادتی ہی سہی مگر یہ اپنی جگہ ٹھوس حقیقت ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ نن تارا کہاں ہے؟" کاشی کی ٹوٹتی آواز ابھری۔

"اچھا! تم اس کی آواز سننا چاہتے ہو۔۔۔ چلو میں سنا دیتا ہوں۔"

میں نے نن تارا کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی ٹیپ اتاری۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ جونہی میں نے ریسیور اس کے کان سے لگایا' وہ ملائم تھر تھراتی ہوئی بولی "یہ ٹھیک ہے ڈارلنگ کہ مجھے اغوا کرلیا گیا ہے۔ لیکن یہ بہت مہذب شخص ہے۔ مجھے الگ ہی نہیں لگ رہا کہ میں اغوا ہوچکی ہوں۔ کسی طرح کی سنسنی خیزی میں محسوس نہیں کررہی ہوں۔"

میں نے ریسیور نن تارا کے سامنے سے ہٹا کر کہا "اس لڑکی کی باتوں پر مت جاؤ۔ جب یہ ہمارا اصل روپ دیکھے گی تو سنسنی خیزی سے بلبلا اٹھے گی۔ میں اسے زریں گل کے حوالے کررہا ہوں۔ بس سمجھو کہ موت کے فرشتے کے حوالے کررہا ہوں۔ وہ اس کانچ سی لڑکی کو پہلے توڑے پھوڑے گا پھر جان سے مار ڈالے گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

نن تارا کے اغوا کے بارے میں جان کر کاشی جس خوف و تشویش کا شکار ہوا تھا اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ نن تارا کی زندگی اس کے لیے بے حد اہم ہے۔ یہ بات میرے لیے بہت طمانیت کا باعث تھا۔

○☆○

میرے آپریشن کے لیے ڈاکٹر ہیرولڈ اور ڈاکٹر کلائنٹ نے اگلے روز سہ پہر کا وقت مقرر کیا۔ آپریشن کے تمام انتظامات ہوچکے تھے۔ گیسٹرواسکوپی کے لیے اسپیشل مشین بھی حاصل کی جاچکی تھی۔ ڈاکٹر ہیرولڈ نے مجھے ہدایت کردی تھی کہ آپریشن سے دس گھنٹے پہلے میں کچھ کھاؤں پیوں نہیں۔ مجھے دوا انجکشن لگائے گئے تھے اور کھانے کے لیے بھی دوا دی گئی تھی۔ میں نے شفتا اور انجم کو اس خطرے سے بالکل بے خبر رکھا تھا جو آپریشن کے حوالے سے مجھے لاحق تھا۔ وہ دونوں اسے ایک معمولی آپریشن سمجھ رہی تھیں۔ زریں گل اور عالم قریشی بھی اپنی بیویوں سمیت ابھی تک حویلی میں تھے۔ انہیں اتنا پتا تو چل گیا تھا کہ آپریشن سنگین ہے مگر اصل سنگینی سے وہ بھی لاعلم تھے۔

آپریشن سے آٹھ دس گھنٹے پہلے زریں گل میرے پاس آیا۔ نوبیاہتا کلثوم بھی اس کے ساتھ تھی۔ کلثوم ابھی تک بجھی بجھی تھی' پھر بھی وہ پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ جیس منڈ میں اس کے ساتھ جو دست درازی ہوئی تھی وہ یقیناً ایک ناقابل فراموش واقعہ تھی مگر اس واقعے کی بار میں اب روز اول جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی۔ زریں گل بے حد گم صم تھا۔ ورنہ صفت موہن داس زریں کے ہاتھوں قتل ہوچکا تھا' اس خوانی واقعے کے اثرات ابھی تک زریں پر موجود تھے۔ زریں گل کی پیہم خاموشی کی دوسری وجہ میرا آپریشن تھی۔ وہ اس سلسلے میں حد سے زیادہ پریشان تھا۔ ایک روز پہلے وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا تھا اور بولا تھا "استاد صیب! امارے منہ میں خاک اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو ام بھی اپنی جان دے دے گا۔ بے شک یہ حرام موت ہے مگر ام یہ گناہ بھی اپنے سر لے لے گا۔"

میں نے اسے سمجھایا بجھایا تھا اور وہ کسی حد تک سمجھ گیا تھا مگر آج پھر وہ حد سے زیادہ فکر مند نظر آرہا تھا اور اس کی آنکھوں میں گاہے گاہے نمی تیر جاتی تھی۔ اس نے اشارے سے کلثوم کو باہر بھیج دیا اور گمبھیر آواز میں بولا "استاد صیب! اس جاپانی لڑکی کا کیا کرنا ہے جو آپ نے امارے قبضے میں دیا ہے؟"

میں نے کہا "کرنا کیا ہے' اسے فی الحال اپنی تحویل میں رکھو۔"

وہ جذباتی لہجے میں بولا "استاد صیب! ام قسم کھاتا ہے اگر آپ کو آپریشن کے دوران میں کچھ ہوگیا تو ام اس چھوکری کو قتل کردے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"یہ آپ کا حکم ہے اور امارے دل کا آواز بھی ہے۔ جس شخص نے آپ کے جسم میں وہ منحوس آلہ رکھا ہے اس کو اس کے کیے کا سزا تو ملنا چاہیے۔"

"مگر یہ ضروری تو نہیں کہ کاشی کی بدنیتی کی وجہ سے ہی وہ ڈوائس پھٹے۔ دونوں سرجن بھی بتا چکے ہیں کہ اس آپریشن میں میرے لیے بہت خطرہ ہے۔"

"لیکن آپ نے خود ہی تو ام سے کہا تھا کہ اگر آپریشن میں کوئی گڑبڑ ہوا تو اس چھوکری کو قتل کرنا ہے۔"

"وہ صرف کاشی کو راہِ راست پر لانے کے لیے تھا' وہ راہِ راست پر آچکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ آپریشن کے دوران میں اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کرے گا۔ اس کے باوجود اگر میرے ساتھ کچھ ہوا تو اس کا ذمے دار کاشی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہر دو صورتوں میں تن تارا نامی اس لڑکی کو کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے۔ تم اسے بحفاظت کاشی کے سپرد کرنے کے پابند ہو۔"

زریں گل دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کا خراب موڈ پہلے سے بھی ابتر نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس سے اقرار لیا کہ اگر واقعی میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا تو وہ وہی کچھ کرے گا جو میں نے کہا ہے۔ زریں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں پھر اس کے موڈ کو ذرا خوش گوار کرنے کے لیے کلثوم کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اب اردو کے چند ایک الفاظ سمجھنے لگی تھی اور کسی حد تک اپنی بات سمجھانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ناخنے کیوں کاٹ رہی ہے' کھانا کیوں نہیں کھاتی؟

اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور اشاروں کنایوں میں جو کچھ بتایا' اس کا مطلب یہ تھا کہ کھانا کھانے کو اس کا دل نہیں چاہتا۔ ویسے وہ کچھ شرما بھی رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اصل معاملے کی اسے بھی بھنک ہے۔

میں نے کلثوم سے کہا "مجھے تو لگتا ہے زریں گل نے تم پر کوئی تعویذ دھاگا کروا دیا ہے۔ یہ بہت چیز شخص ہے' تمہارے حصے کا بھی کھانا چاہتا ہے ورنہ تمہیں بھوک نہ لگنے کی اور دل خراب ہونے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

زریں گل میرا بازو دبا کر آہستگی سے بولا "استاد صیب! آپ سمجھنے کا کوشش فرمائیں نا۔ یہ اس لیے زیادہ نہیں کھاتا کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔ یعنی ام نے اس کا پاؤں بھاری کر دیا ہے۔"

"تم نے کیا پاؤں کے ساتھ بھی کلو کا وٹا باندھ دیا ہے؟"

"بس وٹا ہی سمجھیں جی۔۔۔ زریں گل کا بیٹا ہو گا' لوہے کے ماتق سخت اور بھاری ہو گا۔"

"اور بے وقوف بھی۔" میں نے کہا "اوئے چغد اتنی جلدی کیا تھی ایسے کام کی۔ ابھی تو وہ خود بچی ہے' اس کی گود میں بچہ دے رہا ہے۔"

زریں گل ایک دم سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے کے بعد بولا "بات تو آپ ٹھیک کہہ رہا ہے استاد صیب!! اس کو ٹھیک سے یہ بھی نہیں پتا کہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

"کیا نہیں پتا؟" میں نے پوچھا۔

وہ سرخ ہوتے ہوئے بولا "بس سمجھیں جی کہ کچھ نہیں پتا۔ ام تو اس کو انگلی پکڑ پکڑ کر چلاتا ہے۔"

"پھر تو یہ سارا قصور ہی تیرا ہے زریں۔ تجھ پر تو بڑا کیس بننا چاہیے۔"

زریں گل سر کھجانے لگا۔ کلثوم مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے زریں سے پوچھا "یہ واپس جانے کا کہتی ہے؟"

زریں بولا "توبہ کریں جی' یہ تو دن رات ام کو یقین دلاتی ہے کہ امارے ساتھ ہی جیئے اور مرے گا۔ کیا بتاؤں استاد صیب! یہ اتنا خدمت کرتا ہے امارا کہ ام تو بالکل چوزا بن گیا ہے۔ یہ اسی طرح اماری خدمت کرتا رہا تو ام تو خود سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پیئے گا۔"

"یہ تو اور بھی غلط بات ہے۔ بے وقوف' تجھے چاہیے کہ اس حالت میں اسے زیادہ سے زیادہ آرام کراؤ۔"

"آرام کی طرف تو یہ آتا ہی نہیں جی۔ دن بھر بیل کی طرح کام کرتا ہے اور رات کو۔۔۔"

"رات کو کیا؟"

زریں پھر سرخ ہو گیا "رات کو بھی آرام نہیں کرتا۔ پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد زریں بولا "دیکھیں استاد صیب! آپ ادھر ادھر کا بات کر کے امارا دھیان اصل بات سے ہٹا رہا ہے۔ ام آج اتنا دکھی ہے کہ ساری زندگی میں اتنا دکھی نہیں ہوا۔ آپ کے آپریشن کا سوچ کر امارا دل ایک دم پھوڑا بن جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اس موقع پر تمہیں دوگانا گانا چاہیے تو ام بہت پریشان ہے' خوچے ام کو اور پریشان نہ کرو۔ ا۔۔۔"

"امارا دل تو جینے کو بھی نہیں چاہ رہا استاد صیب! نہیں' ام کو کیا ہو گیا ہے۔"

کچھ ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے زریں گل کو ۔۔ایا کہ جاگیردار قادر زماں نے موہن داس کے قتل کو بڑے ۔۔چھے طریقے سے ہینڈل کیا ہے۔ اس بات کا امکان نہ ہونے ۔۔ے برابر ہے کہ پولیس پوچھ گچھ کے لیے حویلی میں آئے گی ۔۔ین اگر ایسا ہوا بھی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں نے ۔۔ریں کو بتایا کہ اسے پولیس کے سامنے کیا موقف اختیار کرنا ۔۔ہے۔ موہن داس ایک انڈین ایجنٹ تھا اور غیر قانونی طور پر ۔۔ں حویلی میں داخل ہوا تھا۔ ظاہر ہے' اس کے ارادے ۔۔ے نہیں تھے۔ ایسے میں اگر کوئی حفاظت خود اختیاری کے ۔۔ت اسے مار دیتا تو یہ عین ضرورت کے مطابق تھا۔ مجھ سے ۔۔ہ دیگر ہدایات لینے کے بعد زریں اور کلثوم غم زدہ سے ۔۔پس چلے گئے۔

غزالہ شاید باہر کھڑی ان دونوں کے جانے کا ہی انتظار ۔۔رہی تھی۔ وہ اندر آتے ہوئے بولی "کیسے ہو شاہ جہاں؟"

"وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ غزالہ نے ۔۔پنے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلدان میز پر رکھ دیا۔

"شاہ جہاں! اب میں بڑی حد تک مطمئن ہوں۔" ۔۔الہ نے کہا "یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تن تارا میں کاشی کی ۔۔ن ہے۔ اب وہ اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرے گا کہ ۔۔یشن کامیاب ہو۔"

"لیکن تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ نوجوان ملازم کے بھیس ۔۔ں کاشی کی محبوبہ تن تارا ہے؟"

چند لمحے متذبذب رہنے کے بعد غزالہ بولی "میری ۔۔وجودگی میں کاشی کے دونوں "ملازم" باغ میں ٹہل رہے ۔۔ہے۔ میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کی ۔۔باتیں بھی سنیں۔ مجھے نوجوان ملازم میں نسوانی پن نظر آیا۔ ۔۔س کی حرکات و سکنات بھی کچھ مشکوک سی تھیں۔ میں نے ۔۔س بارے میں عاصم سے پوچھا۔ وہ پہلے تو سوچ میں پڑ گئے پھر ۔۔نہوں نے مجھ پر انکشاف کیا کہ کاشی کے ساتھ آنے والے ۔۔ان ملازموں میں سے ایک دراصل اس کی مشہورِ ۔۔زمانہ محبوبہ تن تارا ہے۔ عاصم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ ۔۔اس بارے میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی مگر جب میں ۔۔نے آپ کے آپریشن کے بارے میں اور کاشی کے کردار کے ۔۔بارے میں سوچا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے آپ کو تن تارا ۔۔کے بارے میں بتا دینا چاہیے۔"

"یعنی تم نے عاصم سے وعدہ خلافی کی!"

"ہاں وعدہ خلافی کی' لیکن آپ کی بہتری کے لیے کی لہٰذا ۔۔اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میں نے۔۔۔ میں نے عاصم کو بھی بتا دیا ہے کہ مجھے کاشی پر بھروسا نہیں تھا لہٰذا کاشی پر قابو پانے کے لیے میں نے شاہ جہاں کو تن تارا کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

میرا دل سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ یہ لڑکی پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی تھی۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولی "ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے کہا "تم کوئی نادان کالج گرل نہیں ہو' ایک پڑھی لکھی باشعور ڈاکٹر ہو لیکن تمہارا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ پتا نہیں تمہارا ذہن ساتھ نہیں دے رہا یا تم جان بوجھ کر ایسے کام کر رہی ہو۔ تم قدم قدم تباہی کی طرف بڑھ رہی ہو۔ تم نے مسلسل ایسے کام کیے ہیں کہ عاصم کے دل میں تمہاری دشمنی پھلتی پھولتی چلی گئی ہو گی۔ ابھی یہ دشمنی پوشیدہ ہے لیکن جب سامنے آئے گی تو تم اپنے لیے رو رو کر موت کی دعا مانگو گی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنے لیے نہایت زہریلے کانٹے بو رہی ہو۔"

"جن تکلیفوں سے آپ مجھے ڈرا رہے ہیں' اگر یہ آپ کی خاطر آئیں گی تو میں انہیں ہنسی خوشی برداشت کر لوں گی۔"

"لیکن کیوں؟"

اس نے سر جھکایا "مجھے خود پتا نہیں ہے۔"

"اب کیا رہ گیا ہے' میرے اور تمہارے درمیان؟"

"کچھ بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ سب کچھ باقی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ پہلے میں تمہیں چھو سکتا تھا' تمہارے قریب آسکتا تھا' قریب تر آسکتا تھا۔ کیا اب ایسا ہو سکتا ہے؟"

اس کے ہونٹ لرزے "آپ مرد ہیں نا' اس لیے جسم کی بات کر رہے ہیں۔ میں عورت ہوں' اس لیے احساس کی بات کر رہی ہوں۔"

"یہ سب رومانی ناولوں اور کہانیوں کی باتیں ہیں۔" میں نے تلخی سے کہا "محبت ایک اکائی کی طرح ہوتی ہے جس میں محبت کرنے والے روح اور جسم سمیت پورے کے پورے شامل ہوتے ہیں۔ میں حقیقت پسند ہوں اور ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ تم شیخ عاصم کی بیوی ہو۔ وہ تم پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ اگر تمہارے اندر حالات سے ٹکرانے کا حوصلہ نہیں' اگر تم شیخ عاصم سے اپنا راستہ جدا نہیں کر سکتی ہو تو پھر مجھے تمہارے اس افسانوی احساس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نامور شاعروں میں اپنا نام لکھوانا نہیں چاہتا ہوں اور نہ مشہورِ زمانہ عاشقوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن میں آپ سے کچھ مانگ تو نہیں رہی شاہ جہاں! بکھر رہی ہی رہی ہوں۔"

"مجھے اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"اور شیخ عاصم؟"

"میں انہیں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔" میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بولی "کیا ایک دل میں دو محبتیں نہیں رہ سکتیں شاہ جہاں؟"

"رہ سکتی ہیں لیکن مجھے یہ کسی طور قبول نہیں ہے کہ شیخ عاصم جیسے درندہ صفت شخص کی محبت کے ساتھ میری محبت ایک ہی دل میں رہے۔"

"شاہ جہاں! میں عاصم کو سنبھالنے اور سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اگر میں اس کوشش میں ناکام ہوگئی تو میں۔۔۔ آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک آخری فیصلہ کرلوں گی۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"میں نے سوچ لیا ہے کہ۔۔۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"شاہ جہاں! میں ہمیشہ کے لیے آپ سے دور چلی جاؤں گی۔"

کوئی چیز میرے اندر چھناکے سے ٹوٹی اور بکھر گئی۔ نجانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے غزالہ کو دونوں شانوں سے پکڑا اور اس کا رخ اپنی طرف پھیرلیا۔ میرے اندر غیظ و غضب کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں بولا تو میری آواز ہیجانی انداز میں لرز رہی تھی۔ میں نے کہا "غزالہ! میں جانتا ہوں' عاصم کے سلسلے میں تمہاری ہر کوشش ناکام ہوگی۔ تم نے اگر کوئی فیصلہ کرنا ہی ہے تو پھر آج کرو۔ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور چلی جاؤ یا ہمیشہ کے لیے عاصم کو چھوڑ دو۔ آج اور ابھی فیصلہ کرو۔"

غزالہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی "آپ کیسی باتیں کررہے ہیں شاہ جہاں!"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آج تم مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دو گی غزالہ۔۔۔ یا پھر پالو گی۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ سوچنا ہے ابھی اچھی طرح سوچ سمجھ لو اور پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

غزالہ کا رنگ زرد ہوگیا تھا' وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی پھر وہ خود کو سمیٹتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! آپ غصے میں ہیں۔ مجھ سے ایک ایسا مطالبہ کررہے ہیں جسے پورا کرنا میرے بس میں نہیں۔"

"تو پھر کیا ہے تمہارے بس میں۔۔۔ ایک طرف دلیر ہو کہ شیخ عاصم کا گھناؤنا ترین روپ دیکھ کر بھی شانے سے شانہ ملائے کھڑی ہو' دوسری طرف اتنی کہ اپنی ہی زندگی کے بارے میں ایک آسان فیصلہ ہوئے تمہارا پتا پانی ہو رہا ہے۔ تم منافقت ہو غزالہ۔"

غزالہ کی پیشانی پر ہلکا سا بل آگیا "میں کبھی منافق نہیں تھی شاہ جہاں! میری زبان پر ہمیشہ وہی بات رہی جو دل میں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میری آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی پھر سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب وہ میرے شوہر ہیں۔ میں مذہب اور معاشرے کی رو سے ان کی منکوحہ ہوں' وہ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہیں۔ دن پہلے تک میں ان کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ زندگی اب ان کی زندگی سے جدا کیسے کرسکتی ہوں اپنے اور میرے خاندان کے بارے میں شاید کچھ جانتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے خاندان کی پشتوں سے ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ ہمارے خاندان کی جس گھر میں ڈولی سے اترتی ہیں' اسی گھر سے ان کے اٹھتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں نا یہ سب باتیں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں' لیکن یہ ایک پرانی روایت کیا نئے زمانے کی ایک پڑھی لکھی باشعور روشن خیال سینے سے لگا کر رکھے گی اور اپنی زندگی ایک ایسے زوجیت کی بھینٹ چڑھا دے گی جو شوہر تو کیا انسان کہلانے کا حقدار بھی نہیں ہے۔"

غزالہ نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا "سب کچھ میرے بس میں نہیں ہے شاہ جہاں! آپ جس "لفظ" کے بارے میں سوچ رہے ہیں وہ میں زبان پر نہیں لا سکتی۔ جو عقیدے اور روایات نسل در نسل پروان چڑھتی ہیں' وہ اتنی آسانی سے انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

میرے سینے سے غم و غصے کی ایک دیوانہ کردینے والی لہر اٹھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور غزالہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تو تمہارا جواب نہ میں ہے؟"

"شاہ جہاں! میں نے۔۔۔"

"میں صرف ایک بات پوچھتا ہوں۔ تمہارا جواب نہ میں ہے؟"

"لیکن میں۔۔۔"

"غزالہ! میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دے دو۔"

وہ روہانسی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا جیسے وہ خاموشی کی زبان میں مجھ سے رحم کی درخواست کررہی ہے۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے ضبط کے بندھ ٹوٹ رہے ہیں۔ وہ خود ساختہ دیواریں ڈھے رہی ہیں جو اس نے اپنے اردگرد اٹھا رکھی ہیں۔ وہ ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے میری بانہوں کی طرف بڑھنے والی ہے۔ یہ شاید غزالہ کی زندگی کا کٹھن ترین لمحہ تھا۔ وہ ایک ہی لمحے میں تذبذب کی انتہا کو چھوگئی تھی مگر پھر یہ طوفانی لمحہ غزالہ کے ارادے کو مسمار کیے بغیر گزر گیا۔ اس نے اپنا سر جھکالیا۔ دو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر زمین میں جذب ہوگئے۔ یہ اقرار کا نہیں انکار کا اشارہ تھا۔ اس اشارے نے میرے دل کو دو نیم کردیا۔ پہلا احساس تو شدید ترین مایوسی کا تھا پھر اس مایوسی کو طیش کی ایک بلند لہر نے ڈھانپ لیا۔ مجھے لگا جیسے میرا ہاتھ غزالہ پر اٹھ جائے گا مگر ہاتھ تو نہیں اٹھا' تاہم میرے ہونٹوں سے ایک آواز پھنکار کی طرح نکلی "دفع ہوجاؤ یہاں سے۔۔۔ چلی جاؤ غزالہ۔ میری نگاہوں سے دور ہوجاؤ۔ آئندہ کبھی مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ میں۔۔۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہارے شوہر پر۔ میری طرف سے جہنم میں جاؤ تم دونوں۔۔۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ اگر شیطان ہے تو تم اپنی شوہر پرستی کے ذریعے اس کی مددگار بنی ہوئی ہو۔ تم نے اپنی آنکھوں سے اس بدبخت کا کردار دیکھا ہے' سب کچھ تمہارے گھر میں تمہارے سامنے ہوا ہے۔ میرا خیال تھا کہ تم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس حرام زادے کے منہ پر تھوک دو گی لیکن تم اب بھی بڑی ڈھٹائی سے اسے سمجھانے اور سنبھالنے کی باتیں کررہی ہو۔ ٹھیک ہے جاؤ' اسے سمجھاؤ اور سنبھالو۔ اس کے اندر سے کوئی اوتار' کوئی "ریفارمر" نکال سکتی ہو تو نکال لو۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔"

میں نے اسے باقاعدہ دروازے کی طرف دھکیل دیا پھر اس کا لایا ہوا گلدان اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ میرا سارا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ زندگی میں شاید ہی کبھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوئی ہو۔ میں خالی خالی نظروں سے اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں غزالہ اب موجود نہیں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا' غم سے میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔ کتنا قریب آتے آتے کس قدر دور ہوگئے تھے ہم۔

○☆○

آپریشن تھیٹر کی طرف جاتے ہوئے میرے احساسات عجیب سے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرا سفر کال کوٹھری سے پھانسی گھاٹ تک کا سفر ہے۔ میں ایک ایسے آپریشن کا سامنا کرنے جا رہا تھا جس میں زندگی کی امید ۲۵ فیصد اور موت کا رسک ۷۵ فیصد تھا۔ میں نے آخری بار شفقنا کو جی بھر کر دیکھا تھا اور وہ تمام آنسو اپنے حلق میں گرا لیے تھے جو میری آنکھوں سے چشموں کی طرف ابلنا چاہتے تھے۔ آپریشن سے کچھ دیر پہلے میں نے ڈاکٹر حمزہ کے نام ایک طویل خط بھی لکھا تھا اور یہ خط انجم کے حوالے کیا تھا تاکہ وہ ڈاکٹر حمزہ تک پہنچا دے۔

انجم کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ وہ بولی تھی "بھائی جان! آپ اتنے لمبے چوڑے خط کیوں لکھ رہے ہیں۔ کل ڈاکٹر حمزہ نے آنا ہے۔ اس وقت تک آپ ٹھیک ٹھاک ہوچکے ہوں گے۔ خود بات کرلیجیے گا۔"

"کل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے کہا تھا۔

وہ بولی "بھائی جان! آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں' میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ کہیں آپ۔۔۔ آپریشن کے بارے میں کچھ چھپا تو نہیں رہے۔"

میں نے فوراً تسلی تشفی کی باتیں کرکے اسے مطمئن کردیا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کے نام جو خط میں نے انجم کو دیا تھا اس میں' میں نے اپنے اور شفقنا کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ میں نے ڈاکٹر حمزہ کو بتایا تھا کہ شفقنا میری زندگی کا محور ہے' اس کی "پُرمسرت زندگی" میری آنکھوں کا سہانا خواب ہے۔ میں نے اس جذباتی تعلق کی بات کی تھی جو حمزہ اور شفقنا کے درمیان پایا جاتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر حمزہ کو اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ دونوں زندگی کے سفر میں شریک ہوجائیں تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوگی۔

آپریشن تھیٹر تک کا سفر ختم ہوا' میری منزل آگئی تھی۔ مجھے اسٹرلائز لباس پہنایا گیا اور آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا گیا۔ سبز کپڑوں میں ملبوس عملے نے مجھے گھیرلیا۔ اس دوران میں مجھے ایک دو مرتبہ ڈاکٹر کلاکنٹ اور ڈاکٹر ہیرولڈ کی صورتیں بھی نظر آئیں۔ وہ آپریشن کے مخصوص لباس میں تھے۔ ان کے چہرے ٹینس نظر آرہے تھے اور اس سنگینی کی گواہی دے رہے تھے جو میرے آپریشن سے متعلق تھی۔ بے ہوش ہونے سے چند لمحے پہلے مجھے کاشی کی صورت بھی دکھائی دی۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ بارہ گھنٹوں میں ہی کاشی بارہ ہفتوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ صاف

محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ویسے ابھی تک اس نے میری ہدایات پر سختی سے عمل کیا تھا۔ نن تارا کے اغوا کے متعلق کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ غالباً یہ خبر کاشی اور اس کے دو تین ساتھیوں تک محدود تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔ جواب میں شاید اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آنہیں سکی۔

میری نس میں انجکشن لگایا گیا اور سوئی چبھتے چبھتے میں گہری سرخی مائل تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں پھر سے ایک بچہ بن گیا ہوں، سنہری اور سیاہ پروں والے ایک مرغ کا تعاقب کرتا ہوا میں ایک کنویں جیسی گہرائی میں اترتا چلا جارہا ہوں۔ ایک عجیب سی ویرانی اور اداسی میرے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ یہی ویرانی جو گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں میرے آبائی قصبے جل کوٹ کی گرد آلود گلیوں میں رینگا کرتی تھی۔ میں مرغ کی آواز کا تعاقب کرتا ان گلیوں میں بھاگتا چلا جارہا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے ہم ار رجامن کے اسی باغ میں پہنچ جاتا ہوں جہاں میں اور غزالہ کھیلا کرتے تھے۔ وہی لڑکپن ہے، وہی اداسیاں ہیں اور غزالہ کے جسم سے اٹھتی ہوئی وہی پکے پکے آموں کی مدہوش کر دینے والی خوشبو ہے۔ میں بے اختیار غزالہ کو بانہوں میں لے لیتا ہوں، اسے بھینچتا ہوں، پیار کرتا ہوں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر جامن کے ایک بہت گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔ میں غزالہ سے کہتا ہوں "دیکھو غزالو! ہم کتنے خوش بخت ہیں۔ قدرت نے ہمیں اپنی کہانی شروع سے شروع کرنے کا ایک اور موقع دے دیا ہے۔"

وہ میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتی ہے اور اس کے رخسار شہابی ہوجاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں "آؤ غزالو! ہم وعدہ کریں کہ پہلے والی غلطیاں اب نہیں دہرائیں گے۔"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں شاہ جہاں۔" وہ آہستہ سے کہتی ہے اور اپنے ہاتھ کی انگلیاں میرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا دیتی ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں، ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک ہے۔ میں کہتا ہوں "غزالہ! اب جب کسی خنک سہ پہر کو میں جیٹھے چاول لے کر تمہارے گھر آؤں گا تو کبھی وہ غلطی نہیں کروں گا جس کے نتیجے میں تمہیں گھر میں میری شکایت کرنا پڑی اور بڑے میاں کے کارندوں کو موقع ملا کہ مجھے بے دردی سے مار پیٹ کر پھینک دیں۔"

"وہ تمہاری نہیں، میری غلطی تھی شاہ جہاں! اگر تمہارے ہاتھوں میری قمیص ذرا سی پھٹ گئی تھی تو کیا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے، مجھے تمہاری شکایت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ میں ہی تھی شاہ جہاں! جس کی وجہ سے ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہوئے اور ہم جدا ہوگئے۔ اب ہم اس جدائی کو کبھی اپنے قریب نہیں آنے دیں گے۔"

"ہاں اب ہم اس جدائی کو کبھی قریب نہیں آنے دیں گے۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "اور اگر کسی وجہ سے ایسا ہو بھی گیا تو ہم اس کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ ایک دوسرے کو منالیں گے۔ جب ایک روز مجھے ڈھونڈتی ہوئی تاج محل ہوٹل کے اس کمرے میں پہنچو گی اور مجھے بتاؤ گی کہ تم ہی غزالہ ہو اور میری تلاش میں در در بھٹکتی رہی ہو۔ تو میں آگے بڑھ کر تمہارے ہاتھ کو تھام لوں گا اور تمہیں اپنے قریب کرکے بانہوں میں لے لوں گا۔ وہ سارے لفظ جو میں نے اپنی زبان کی فصیل کے پیچھے روکے تھے آزاد کردوں گا۔ وہ سارے آنسو جو میں نے پلکوں تک نہیں آنے دیے تھے، ایک مرتبہ تمہارے قدموں میں گرادوں گا۔"

"ہاں شاہ جہاں! اس مرتبہ ہم وہ نہیں ہونے دیں گے جو ہوا تھا۔ ہماری جدائی اگر طویل بھی ہوئی تو ہم اسے صبر سے جھیلیں گے۔ میں اس جدائی کو وہ فیصلہ کن موڑ نہیں مڑنے دوں گی جس کے بعد وہ دائمی جدائی بن گئی۔ اگر موسم سرما کی وہ زرد شام دوبارہ سے آئی جب گھر کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے جان نے مجھ سے میری شادی کی بات کی تھی۔ تو مجھے تمہاری قسم شاہ جہاں! میں صاف انکار کردوں گی۔ ہاں کہہ دوں گی شاہ جہاں کہ مجھے ساری عمر تمہارا انتظار ہے۔"

میں نے غزالہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ غزالہ کے وجود میں لہریں لینے والا یقین اس کے ہاتھ کے راستے میرے وجود میں منتقل ہونے لگا۔ میں نے کہا "غزالو! ہم یقیناً ایسا کریں گے۔ اور میرے منہ میں خاک۔ اگر کسی انہونی سبب۔ کسی المیے کے نتیجے میں تم کسی اور کی ہو بھی گئیں تو ہم اپنی محبت کی طاقت سے تقدیر کو بدل دیں گے۔ ہم جدائی کی چٹان کے پرخچے اڑا دیں گے اور وہاں وہ راستہ کریں گے جو ہمیں دائمی ملاپ کی منزل تک پہنچا دے۔ جب جھوک ضامن کی اس بلند و بالا حویلی کے ایک بند کمرے میں۔ ایسے ہی موسم میں۔ ایسے ہی حالات میں تمہاری ملاقات ہوگی۔ اور ہماری گفتگو تکرار کے موڑ پر

گی۔ تو میں تم سے تمہارا آخری فیصلہ طلب نہیں کروں گا۔ تمہیں ہاں یا نہ کی سولی پر چڑھا کر تم پر اپنی طرف آنے کے تمام راستے بند نہیں کروں گا۔"

"اور میں بھی شاہ جہاں! میں بھی گفتگو کو اس نہج پر نہیں آنے دوں گی۔ میں ساری دنیا سے منہ موڑ لوں گی لیکن تمہاری طرف سے نہیں موڑوں گی۔ میں ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے خود کو تمہاری بانہوں میں گرا دوں گی۔ تمہارے سپرد کردوں گی۔"

"وعدہ کرتی ہو نا غزالو!"

"ہاں، وعدہ کرتی ہوں۔"

"اور میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

ہمارے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست ہوچکے تھے۔ ایک ہی جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ جل کوٹ کی سنسان زرد دوپہر بے حد گرم ہونے کے باوجود حسین لگنے لگی تھی۔ خوش گوار ترین موسم اور دلفریب ترین مناظر اس گرم دوپہر کے سامنے ہیچ تھے لیکن پھر اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔ درختوں سے پنچھی اڑ گئے اور شاخوں سے جھولتے ہوئے پھل سیاہ ہوگئے۔ ہر طرف ایک تاریک اداسی پھیل گئی۔ شیخ عاصم نظر آیا۔ وہ اپنی جسامت سے دوگنا نظر آرہا تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور بولا۔

"ہوش کرو شاہ جہاں! وقت گزر چکا ہے اور وقت کسی کے لیے پلٹ کر نہیں آتا۔ تم اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر نکلو اور حقیقت کو دیکھو۔ یہ میری بیوی ہے اور وفا شعار بیوی ہے۔ تم مر تو سکتے ہو لیکن اب اسے حاصل نہیں کرسکتے ہو۔ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی ایسی طاقت نہیں جو اب تم کو غزالہ سے ملا سکے۔"

شیخ غزالہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے مجھ سے دور لے جاتا ہے۔ وہ بغیر کسی مزاحمت کے بلکہ آمادگی کے ساتھ اس کے قدم سے قدم ملاتی چلی جاتی ہے۔ میں خود کو پیاس کے ایک لامتناہی صحرا میں پاتا ہوں۔ میرا جسم کباب ہورہا تھا اور حلق میں کانٹے پیوست ہیں۔ میرا دم آنکھوں میں ہے۔ میں سوچتا ہوں، غزالہ تو کتنی ظالم ہوگئی ہے۔ کیا کوئی گوشت پوست کا انسان اتنا بے حس ہوسکتا ہے۔ کرب انتہا پر ہے۔ اچانک مجھے سائیں عالی کا مہربان چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھتا ہے۔ اس کے ہونٹ تسلی بخش انداز میں ہل رہے ہیں۔

میں نحیف آواز میں پوچھتا ہوں "سائیں! تم اتنی دیر کہاں رہے۔ نہ کسی کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ نہ اپنا اتا پتا بتایا۔"

وہ کہتا ہے "میں بہت دور چلا گیا تھا شفیع محمد! لیکن میرا دل یہیں تیرے آس پاس تھا۔ وہ ہر وقت تیرے آس پاس رہتا ہے۔"

پھر سائیں ایک طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک خوبرو لڑکی ہاتھ میں ٹھنڈے شربت کا لبالب بھرا ہوا جام لے کر نمودار ہوتی ہے اور یہ پیالہ نما جام میرے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے۔ یہ لڑکی سوہج ہے۔ سائیں کہتا ہے "یہ لڑکی تیری بہت سی مشکلوں کا حل ہے شفیع محمد۔ اسے اپنا لے۔ مستقل طور پر نہ سہی، عارضی طور پر ہی سہی لیکن اسے اپنا کرلے۔ یہ تیرے زخمی دل پر مرہم رکھے گی۔ تیرا ہر درد اپنے ہونٹوں سے چوس لے گی۔"

پھر ایک دم سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ کوئی میرا شانہ ہلا کر مجھے جگا رہا تھا، میرے کان میں سرگوشیاں کررہا تھا۔ میں گہرے تاریک کنویں میں سے باہر نکل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میرے حواس بحال ہورہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ اردگرد کے مناظر دھندلائے دھندلائے نظر آرہے تھے پھر وہ بتدریج واضح ہونے لگے۔ سب سے پہلے مجھے شفتا کا چہرہ نظر آیا، وہ میرے اوپر جھکی ہوئی تھی "بھیا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ میں ایک بار پھر "زاویہ موت" سے لوٹ آیا ہوں۔ میرا آپریشن مکمل ہوچکا تھا اور اب میرے حواس مجھے واپس مل رہے تھے۔ غالباً ۲۵ فیصد امکان نے ۷۵ فیصد بھیانک اندیشوں کو شکست دے دی تھی۔ پتا نہیں میں کہاں تھا لیکن جہاں بھی تھا آرام سے تھا۔ شفتا کی محبت بھری آواز ایک بار پھر کانوں میں گونجی "بھیا آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر میری نگاہ زریں گل کے چہرے پر پڑی۔ خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ایک ایک کرکے عالم قریشی، پروین، ڈاکٹر حمزہ سب کے چہرے میری نگاہوں میں آگئے۔ اور ایک ایسا چہرہ بھی آیا جسے دیکھنے کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ یہ سائیں عالی کا چہرہ تھا۔ اس کا جسم کمزور تھا اور لمبے بال جٹاؤں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے شفتا کو پیار کیا پھر سائیں عالی کو دیکھنے لگا۔ شفتا نے مجھے بتایا کہ سائیں صاحب بہت دیر سے میرے ہوش میں

آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک میرا آپریشن ہوتا رہا ہے' سائیں صاحب وظیفے میں مصروف رہے ہیں۔ میں نے سائیں کو اپنے پاس بلایا۔ وہ میرے قریب آگیا۔ بدبو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ سائیں کا میلا کچیلا ہاتھ میرے سر کے بالوں میں رینگنے لگا۔ میں نے دیکھا' سائیں کی گردن اور رخساروں پر ان آبلوں کے نشان ابھی تک موجود تھے جو وادیِ موت کی سرنگ میں سائیں کے جسم پر نمودار ہوئے تھے۔ زمین کی گہرائیوں میں واقع وہ قبرستان مجھے یاد تھا جہاں سے ہوا فراٹے بھرتی ہوئی گزرتی تھی۔ نامعلوم مقام کی طرف سے آنے والی وہ ہوا' نامعلوم مقام کی طرف چلی جاتی تھی۔ اسی پراسرار مقام پر سائیں عالی اور سانوں کا آمنا سامنا ہوا تھا اور یقیناً یہی وہ لمحات تھے جب سائیں کے جسم پر یہ آبلے نمودار ہوئے تھے۔ سائیں نے میرے چہرے پر ایک دو پھونکیں ماریں اور پیچھے ہٹ گیا۔ تب مجھے سروج کا چہرہ نظر آیا اور میری آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ مجھے یاد آیا کہ آپریشن کی طویل بے ہوشی کے دوران میں جو مناظر میری آنکھوں کے سامنے آتے رہے ہیں' ان میں سروج کا چہرہ بھی تھا۔

کتنی عجیب بات تھی۔ میں نے بے ہوشی کے عالم میں سائیں عالی اور سروج کو دیکھا تھا اور وہ دونوں اس وقت میرے سامنے موجود تھے۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا یا انہی پُراسرار واقعات کی کڑی تھی جو اس سے پہلے سائیں کی نسبت سے رونما ہوتے رہے تھے۔

عجیب سی نقاہت میرے رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو مہربان چہرے والا ڈاکٹر ہیرولڈ سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر کلائنٹ بھی تھا۔ دونوں کے چہروں پر نظر آنے والی چمک اور طمانیت اس بات کی گواہ تھی کہ میرا آپریشن ناکام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ہیرولڈ نے میرے وائیٹل سائنز چیک کیے اور میرا شانہ تھپکنے کے بعد باہر چلا گیا۔

نگہداشت پر موجود ایک اسسٹنٹ ڈاکٹر کی زبانی پتا چلا کہ میرے معدے میں موجود الیکٹرانک ڈوائس کامیابی سے "ری موو" کردیا گیا ہے۔ مجھے قریباً پانچ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ میں اسپتال کے اندر ہی ایک کمرے میں موجود تھا۔ دیوار کا کلاک شام ساڑھے سات کا وقت بتا رہا تھا۔ کئی چہرے مجھے اپنے اردگرد نظر آئے تھے لیکن ان میں غزالہ کا چہرہ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی۔ اس کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں وہ غمناک ترین واقعہ بھی آگیا جو آپریشن سے پہلے رونما ہوا تھا۔ ایک ٹیس سی میرے دل میں اٹھی اور میرے دل نے گواہی دی کہ میرے اور غزالہ کے درمیان موجود فاصلوں میں سیکڑوں گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ جسم سے الیکٹرانک ڈوائس نکل جانے کی خوشی میرے لیے بہت بڑی خوشی تھی گو یہ خوشی اس مہیب غم میں بالکل دب کر رہ گئی تھی جو آج غزالہ کی طرف سے مجھے ملا تھا۔ میری خوشی شہنائی کی گونج جیسی تھی اور غزالہ کا غم بہت بڑے بارودی دھماکوں جیسا۔ مسلسل دھماکوں کی آواز میں شہنائی کی گونج کہاں سنی جاسکتی ہے۔

میں خاموشی سے لیٹا رہا اور اپنے غم و اپنی خوشی کا وزن تولنے کی کوشش کرتا رہا۔

اگلے تین چار روز بستر پر ہی گزرے۔ میں تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ آپریشن کے اثرات معدوم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک نرس کے علاوہ شفقتا اور انجم بھی ہمہ وقت میری تیمارداری میں مصروف رہتی تھیں۔ ڈاکٹر حمزہ بھی دو تین بار آکر مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ بہت اپنا سا لگنے لگا تھا۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت جلد دوسروں کے دل میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے ہیں۔ وہ مجھے بڑی اپنائیت سے بھائی جان کہتا تھا۔ انجم کے لیے وہ آپی کا لقب استعمال کرتا تھا۔ عالم قریشی کو انکل اور زریں کو دولھا بھائی کہتا تھا۔ زریں دولھا بھائی کے لقب پر پھولا نہیں سماتا تھا۔ حویلی میں ہونے والے خون ریز ہنگاموں کے بعد حالات بڑی تیزی سے معمول پر آرہے تھے' تاہم ذہنوں کے اندر ابھی تک خوف و ہراس کی کیفیت موجود تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حویلی میں ابھی تک اجنبی افراد موجود تھے۔ جن میں میرے اور میرے ساتھیوں کے علاوہ شنکر شکرا' شیخ عاصم' ڈاکٹر ہیرولڈ اور ڈاکٹر کلائنٹ بھی تھے۔

آپریشن کے دوسرے روز ہی میری ہدایت پر زریں گل نے کاشی کی گرل فرینڈ کاشی کے حوالے کردی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ زریں نے اس کے بارے میں حیران کن باتیں بتائی تھیں۔ "مغویہ" ہونے کے باوجود وہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتی تھی۔ جی بھر کر سوتی تھی اور انگلش میگزین میں لطیفے پڑھ پڑھ کر لوٹ پوٹ ہوتی تھی۔ جب زریں گل نے اسے بتایا کہ وہ اسے آزاد کرکے کاشی کے پاس واپس بھیج رہا ہے تو وہ سخت مایوس نظر آنے لگی۔ اس نے بے تحاشا انگلش بولی۔ یقیناً اس نے یہی کہا ہوگا کہ یہ اچھا اغوا ہے' نہ مجھے نوچا کھسوٹا گیا' نہ کپڑے پھاڑے گئے' نہ کوئی کھیل نہ ڈراما۔ شرافت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسے اغوا ہونے سے تو

بہتر ہے کہ بندہ اغوا ہی نہ ہو۔

اپنی گرل فرینڈ کو حاصل کرنے کے فوراً بعد کاشی وطن واپس جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کاشی کے حویلی سے جانے کے بعد حویلی میں شنکر اور شیخ عاصم کی موجودگی راز رہ سکے گی۔

یہ آپریشن سے چوتھے یا پانچویں روز کا واقعہ ہے۔ میں کمرے کے اندر ہی ٹہل رہا تھا۔ جاگیردار کا ایک ملازم لیاقت میرے پاس آیا۔ اس نے میری خاصی دیکھ بھال کی تھی اور مجھ سے کافی بے تکلف ہوچکا تھا۔ کہنے لگا "صاحب جی! وہ بندہ بڑا بگھڑا ہوا ہے جی۔ اس نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے سب کا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جی۔۔۔ جو انڈیا کا رہنے والا ہے۔ شکل سے تو بڑا گرا بندہ لگتا ہے جی۔"

"تم شنکر کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"وہی جناب! اس نے تو سب کی ماں بہن ایک کر رکھی ہے۔ آج تو اس نے حد ہی کردی جناب۔ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جاگیردار صاحب کا نام لے لے کر ان کو گالیاں دے رہا تھا۔ میں بڑا کمزور سا بندہ ہوں جی لیکن مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کمرے میں گھس کر حرام زادے کا گلا دبا دوں۔ مجھے لگتا ہے کہ جاگیردار جی کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ ضرور اس کی ہڈی پسلی تڑوا دیں گے۔"

اس وقت میری نظر جاگیردار کے ملازم خاص منصب علی پر پڑگئی۔ وہ اسپتال سے کچھ دوائیاں لے کر جا رہا تھا۔ غالباً جاگیردار کے دو لاڈلے کتوں کو کوئی تکلیف لاحق تھی۔ میں نے منصب علی کو بلایا۔ میں نے کہا "منصب علی! مجھے لیاقت کی زبانی پتا چلا ہے کہ شنکر اپنی کوٹھری میں بہت بدتمیزی کر رہا ہے اور ہر ایک کو گالی گلوچ کا نشانہ بنا رہا ہے۔"

منصب علی بولا "میں اس طرف گیا نہیں جناب مگر جس قسم کا وہ بندہ ہے' یہ بات سچی ہی لگتی ہے۔"

میں نے کہا "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس کی طرف سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ مار دھاڑ پر آگیا تو تم سب لوگ مل کر بھی اسے قابو نہیں کرسکو گے۔ اتنا خون خرابا ہوگا یہاں کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔ جاگیردار صاحب نے سب کو سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ اس شخص کی کوٹھری میں کوئی داخل نہ ہو۔"

"بہرحال' تم ایک بار پھر جاکر اپنے ساتھیوں سے کہہ دو۔ اس کی طرف سے اپنے کان بند کرلیں۔ جو بکواس وہ کر رہا ہے اسے کرنے دیں۔ اس کو بدکلامی کی سزا ضرور ملے گی لیکن طریقے سے۔"

میرے کہنے پر منصب علی نے جونیئر ڈاکٹر سے لی ہوئی دوائیں وہیں رکھیں اور مہمان خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ شنکر کو وہیں ایک تہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ اسی دوران میں عالم قریشی بھی آگیا۔ وہ آج کل میری صحت کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ آتے جاتے میرے زرد چہرے کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے میرے لیے بہت ہلکی غذا تجویز کر رکھی تھی۔ عالم قریشی کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے خیال میں "غذا" کا مطلب ہی یہی تھا کہ وہ بہت مرغن چٹ پٹی ہو اور بہت زیادہ ہو۔ کہنے لگا "یار شاہ جہاں! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ڈاکٹر تجھ سے کوئی پرانا بدلہ چکا رہے ہیں۔ بھلا اچھی خوراک کے بغیر بھی بندے کی کمزوری دور ہوسکتی ہے۔ پچھلے سال میں بیمار ہوگیا تھا۔ اپنڈکس کی تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا "پرہیز کرو۔ گرم چیز نہیں کھانی اور بادی بھی نہیں کھانی۔" اب بندہ پوچھے کہ پھر کھانا کیا ہے۔ ہر شے یا گرم ہوتی ہے یا بادی ہوتی ہے۔ میں نے پانچ چھ دن تو روکھے سوکھے ہوکے پرہیز کیا پھر ایک دن مجھے غصہ چڑھ گیا۔ میں نے کہا "دیکھی جائے گی جو ہوگی۔" میں نے لکشمی چوک سے چار پانچ چرغے منگوائے۔ مزنگ چونگی کی ڈھائی تین کلو مچھلی' دو کلو دہی' چار روغنی نان اور نالے کی رس ملائی۔ سب کچھ چڑھا گیا میں۔ آخر یار! یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں' بندہ تکلیف سے ڈر کر کیوں ناشکری کرتا رہے۔"

"پھر ہوا کیا؟ تکلیف تو نہیں بڑھی؟"

"وہ تو بڑھی۔۔۔ اور ایسی بڑھی کہ بس کچھ نہ پوچھو مگر ایک دفعہ مزہ تو آگیا نا۔ ویسے بھی ہر کام میں اللہ کی طرف سے بہتری ہی ہوتی ہے۔ بدپرہیزی کرنے سے تکلیف تو میری بڑھ گئی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے پھوڑی پڑگئی اور ساتھ ساتھ ڈاکٹروں کو بھی پھوڑی پڑگئی۔ اتنا سخت درد ہوا مجھے کہ میری چیخیں نکلنے لگیں۔ جو کام ہفتوں میں ہونا تھا وہ گھنٹوں میں ہوگیا۔ فٹافٹ میرے ایکسرے ہوئے۔ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اپنڈکس تک پھول کر کپا ہو رہا ہے لہٰذا فوری آپریشن کرنا پڑے گا۔ اگر نہ کیا گیا تو پھٹنے کا خطرہ ہے۔ لو جی' ایک گھنٹے کے اندر اندر آپریشن ہوا' ڈاکٹروں نے اپنڈکس نکال کر دور پھینکا۔ میں دو دن کے اندر بھلا چنگا ہوگیا۔ یار شاہ جہاں! ذرا سوچو کتنا فائدہ ہوا مجھے بدپرہیزی کرنے کا۔ قصہ ہی ختم ہوگیا ورنہ پتا نہیں کتنی دیر اس تکلیف کی وجہ سے پریشانی رہتی۔ میں تو تم سے بھی یہی کہتا

ہوں۔ مت زور کھانے پینے سے۔ کھانے پینے کا آخری نتیجہ فائدے کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔"

"تو تمہارے خیال میں کیا کھانا چاہیے مجھے؟"

وہ بولا "دوائیوں کی وجہ سے بندے کے اندر گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا سب سے اچھا حل دودھ سوڈا ہے۔ ڈیڑھ کلو دودھ میں دو بوتلیں سیون اَپ کی ڈال کر غٹاغٹ چڑھا جاؤ۔ اس سے بھوک کھل جائے گی۔ میں تمہارے لیے بھاٹی گیٹ سے اسپیشل سری پائے لے کر آتا ہوں بلکہ پکوا کر لاؤں گا۔ مرچ مسالا کم ہوگا اور گوشت بھی نرم ہوگا۔ بس سمجھو حلوا ہوگا۔ کھاتے جاؤ گے اور طاقت آتی جائے گی۔ شام تک اتنی طاقت آجائے گی کہ سنبھالی نہیں جائے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ہیرولڈ تمہاری باتیں سن لے تو ابھی تمہیں اقدامِ قتل کے کیس میں گرفتار کروا دے۔"

"کس کا قتل؟"

"میرا اور کس کا۔ بھائی میرے معدے کا آپریشن ہوا ہے۔ اتنی اذیت ناک موت مت مارو مجھے۔ اگر کوئی پرانی عداوت ہے تو کسی اور طریقے سے نکال لینا۔"

عالم قریشی بولا "یار! تو دنیا میں آیا کیا لینے تھا۔ بھلا موج میلے کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ تجھے دیکھ کر مجھے ایک مشہور لطیفہ یاد آجاتا ہے۔ ایک تمہارے جیسا بندہ ایک بہت قابل ڈاکٹر کے پاس گیا۔ کہنے لگا 'مجھے کوئی ایسا علاج بتائیں کہ میری عمر لمبی ہو جائے۔' ڈاکٹر نے پوچھا کہ تم شراب پیتے ہو؟ اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے پوچھا 'عورتوں میں دلچسپی ہے؟' اس نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے پوچھا 'دنیا میں گھومنے پھرنے کا شوق ہے؟' وہ پھر زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگا۔ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر بولا 'تم صرف میرا اور اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہو۔ جب تمہیں کسی چیز کا شوق ہی نہیں تو لمبی عمر لے کر کیا کرو گے تم۔'"

میں نے ہنسنے کی کوشش کی تو معدے میں ٹیس سی اٹھی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ قریشی بولا "دیکھا نا' پیٹ خالی ہے ایسے میں بندہ ہنس بھی نہیں سکتا۔"

اسی دوران میں جاگیردار کا ملازم منصب علی واپس آگیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر میں چونکا۔ وہ کچھ بتانے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا "آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے تھے جی۔ وہ بندہ تو کوئی ایسی اہم چیز نہیں ہے جس سے اتنا ڈرا جائے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اسی شنکر کی جناب! اسے تو بڑی زبردست پھینٹی لگوائی ہے جی جاگیردار صاحب نے۔ مار مار کر حلیہ خراب ہے۔ اب اسے باہر احاطے میں لا رہے ہیں۔ اسے ننگا ادھر درختوں میں الٹا لٹکائیں گے اور سب کے سامنے ادھیڑیں گے۔"

مجھے زبردست شاک لگا۔ میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا "اسے کوٹھری سے نکال لیا ہے چوہدری نے؟" میں نے پو

"ہاں جی' میرے جانے سے پہلے ہی نکال لیا تھا۔" دفاع کرتے ہوئے بولا۔

میں نے سر پکڑ لیا۔ یہ شدید بے وقوفی کی تھی ان لو نے۔ عالم قریشی اور نرس کے منع کرنے کے باوجود میں سے اتر آیا "قریشی ریوالور ہے تمہارے پاس؟" میں پوچھا۔

"ہاں ریوالور تو ہے لیکن جا کہاں رہے ہو۔۔۔ تمہ طبیعت۔۔۔"

"کچھ نہیں ہے میری طبیعت کو۔" میں نے بات کاٹ "میرا راستہ چھوڑو۔"

میں تیزی سے باہر نکلا۔ اسپتال سے مہمان خا فاصلہ ایک سو میٹر تھا۔ حویلی کا وسیع احاطہ اور باغ کا کچھ اس راستے میں آتا تھا۔ شام کے سات ساڑھے سات بجے تھے۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے مہمان خانے کی جا کسی طرح کی نقل و حرکت نظر نہیں آئی لیکن میرا دل گوا دے رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ اور حویلی' جس ستارے بری طرح گردش میں ہیں' ایک اور ہنگامے کی زد ہے۔ میں تیزی سے مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ میرے میں درد ہو رہا تھا لیکن یہ قابلِ برداشت تھا۔ عالم قریشی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جاگیردار قادر زماں کا ملا خاص منصب علی تھا۔

جونہی ہم مہمان خانے کے دروازے پر پہنچے' میرا اچھل کر حلق میں آگیا' اندر سے فائرنگ کی آواز سنائی تھی۔ عالم قریشی نے اپنا ریوالور نکال کر میرے حوالے کر منصب علی نے بھی اپنی لمبی قمیص کے نیچے سے ماؤزر نکال تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں ایک دم ہوشیار ہو کر پھڑکنے لگی تھیں۔ یکایک ایک گولی منصب علی کے عین ماتھے پر لگی۔ وہ اوندھے منہ قریشی کے قدموں میں گرا اور تڑپنے لگا۔

میں نے قریشی کا بازو کھینچا اور ہم دونوں ایک صو کے عقب میں قالین پر گرے۔ قریشی دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ یوں تو دلیر اور جہاندیدہ شخص تھا لیکن لڑائی بھڑائی اور دنگا فسا سے ہمیشہ کنی کتراتا تھا۔ چند سیکنڈ تک ہم صوفے کے عقب میں رہے۔ میں نے ریوالور کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ میرے بدترین اندیشے حقیقت بن کر سامنے آ رہے تھے۔ میرے اندر

کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ شنکر اس حویلی میں ایک طوفان کھڑا کرنے والا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جہاں میں لیٹا ہوا ہوں' وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ صوفے کے عقب میں نیم تاریکی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے وہاں ایک ایسا چہرہ دکھائی دیا کہ میری روح فنا ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن حقیقت سامنے تھی اور اسے جھٹلانا ناممکن تھا۔ یہ "حقیقت" خون میں لت پت تھی اور ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھی۔۔۔ جاگیردار قادر زماں کی لاش میں۔۔۔ ہاں' یہ جاگیردار قادر زماں کی لاش تھی۔ اس کی تنومند گردن پر نہایت چابک دستی سے کسی تیز دھار آلے کا وار کیا گیا تھا۔ گردن بہت دور تک کٹ چکی تھی اور ایک طرف ڈھلک چکی تھی۔ کندھوں کی طرف قالین پر خون ہی خون تھا۔ میں نے بے اختیار جاگیردار کے جسم کو چھو کر دیکھا۔ اس کی نبض دیکھتے ہوئے مشکل چند سیکنڈ ہوئے ہوں گے۔ میں نے سوچا' شاید ابھی وہ زندہ ہو۔ ہم سوئچ بورڈ کے پاس ہی تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بلند کر کے سوئچ آن کیا۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیل گئی۔ میں جاگیردار پر جھک گیا۔ اس کی گردن سے خون کے آخری قطرے گر رہے تھے لیکن وہ مر چکا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد مجھے پتا چلا کہ گردن کے علاوہ جاگیردار کے پیٹ میں بھی ایک گہرا گھاؤ موجود ہے۔

عالم قریشی پتھر ہو رہا تھا۔ عالم قریشی کے ساتھ ساتھ میرے جوتے بھی خون سے آلودہ نظر آ رہے تھے۔ یہ جاگیردار قادر زماں کا خون تھا۔ وہ قادر زماں جو اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ جس کے کارندے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کٹھ پتلیوں کی طرح ساکت کھڑے رہتے تھے۔ جس کے اثر و رسوخ اور طاقت کی لہریں لاہور اور وفاقی دارالحکومت تک محسوس کی جاتی تھیں۔ آج اس شخص کا خون بڑی خاموشی سے قالین پر بہہ رہا تھا اور ہمارے جوتوں کو رنگین کر رہا تھا۔۔۔ یہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اس میں کوئی ڈراما نہیں تھا' کوئی سنسنی خیزی نہیں تھی۔ نہ ہی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی نہ بموں کے دھماکوں نے زمین کو لرزایا تھا نہ کسی بہت بڑے معرکے کے آثار نظر آتے تھے۔ ایک بہت بڑا رنگ چوہدری "دبے پاؤں آنے والی" موت کا شکار ہوا تھا اور اس صوفے کے پیچھے بے سدھ پڑا تھا۔

قادر زماں کی موت کا دھچکا اتنا شدید تھا کہ ہم نے اپنے قریب تڑپتے ہوئے منصب علی کو بھی یکسر فراموش کر دیا۔

پیشانی پر گولی لگنے کے باوجود وہ ابھی تک زندہ تھا' تاہم یہ زندگی بڑی مختصر نظر آ رہی تھی۔ ٹیوب لائٹ روشن ہونے کے بعد پورے کمرے کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا اور یہ منظر ذہن کو ماؤف کرنے والا تھا۔ کمرے کے مختلف حصوں میں تین بونے باڈی گارڈز کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ اسی فائرنگ کی آواز تھی جو ہم نے مہمان خانے کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے سنی تھی۔ میں نے ایک باڈی گارڈ کے ہاتھ سے گرا ہوا ننھا سا پسٹل اٹھایا اور قریشی کا ریوالور اسے واپس کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ طلائی دستے والا یہ چھوٹا پستول کتنا طاقتور ہے۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھر سیون ایم ایم رائفل کی خوفناک تڑتڑاہٹ گونجی اور کسی نے دو وقفوں سے پورا میگزین خالی کر دیا۔ میں آواز کی طرف دوڑا۔ ان لمحات میں اپنے آپریشن اور زخم کی طرف سے میرا دھیان یکسر ہٹ گیا تھا۔ ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی' شنکر آزاد ہو گیا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے اس حویلی میں تہلکہ مچا دے گا۔ درندگی اور سفاکی میں اس شخص کا نام تھا' وہ جب بھڑکتا تھا تو آتش فشاں بن جاتا تھا' مجھ سے زیادہ اس ابلیس کے شر سے اور کون آگاہ ہو سکتا تھا۔ میرے دل سے ایک ہی آواز ابھر رہی تھی "کاش' قادر زماں اور اس کے ساتھی شنکر کو نکالنے کی حماقت نہ کرتے۔"

میں اور عالم قریشی دوڑتے ہوئے مہمان خانے کی نشست گاہ میں پہنچے۔ یہی وقت تھا جب زریں گل بھی ریوالور بدست ہم سے آن ملا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا "زریں! تم زنان خانے کی طرف جاؤ۔ اگر شنکر اس طرف جائے تو بلا دریغ گولی مار دو۔"

زریں میری بات سمجھ کر زنان خانے کی جانب دوڑا۔ میں نشست گاہ میں داخل ہوا اور ایک مزید ذہنی دھچکا مجھے سر تا پا دہلا گیا۔ نشست گاہ میں جاگیردار کے چار کمداروں کی لاشیں پڑی تھیں اور تین چار افراد خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ نشست گاہ میں ہر طرف گولیوں کے خول تھے اور بارود کی بو تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے لہو کی چادر سی تن گئی۔ یہ انتہا تھی۔۔۔ لیکن شاید یہ انتہا نہیں تھی۔

اچانک ایک جگر پاش بارودی دھماکا ہوا۔ مجھے لگا جیسے پوری حویلی ہوا کے دوش پر پرواز کر گئی ہے۔ ایک بونے باڈی گارڈ کا کٹا ہوا بازو اڑتا ہوا آیا اور عالم قریشی کے قدموں میں گرا۔

دھماکا اتنا شدید تھا کہ ہمارے دماغ سن ہو کر رہ گئے۔ کانوں میں سنسناہٹ سی بج رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے دھوئیں کی دبیز چادر تن گئی تھی۔ بارودی دھماکا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہوا کا شدید دباؤ بھی محسوس ہوتا ہے۔ مہمان خانے میں ہونے والا یہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عالم قریشی پہلو کے بل ایک ٹوٹی ہوئی میز پر گرا تھا۔ میں نے کمرے کی ایک دیوار کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔

فضا میں ہر طرف بارود کی بو تھی اور چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں جو سب سے پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ ایک بہت بڑا بارودی دھماکا ہوا ہے اور حویلی کا مہمان خانہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرا سوال ذہن میں یہ ابھرا کہ اس دھماکے سے مجھے اور عالم قریشی کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے یا ہم کس حد تک محفوظ رہے ہیں؟ دھماکے میں اور خاص طور پر شدید دھماکے میں زخمی ہونے والے کو فوری طور پر درد کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کو حیرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ وہ یہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اضطرار کی کیفیت میں اپنے جسم کو ٹٹولا پھر عالم قریشی کی طرف بڑھا۔

"قریشی! تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے پکار کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ہم دونوں بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ راہداری کا ایک حصہ گر چکا تھا اور اندھیرے میں راستہ بالکل مسدود نظر آ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے مزید دو دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے شدت میں پہلے دھماکے جیسے نہیں تھے پھر بھی خاصی طاقت تھی ان کی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دو دھماکوں کی آواز بھی پانچ کلومیٹر دور "چراغ" نامی بستی میں صاف سنی گئی تھی۔ ان دھماکوں کے ساتھ ہی مہمان خانے کے عقبی حصے میں زبردست آگ بھڑک اٹھی اور ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ میں اور عالم قریشی جیسے تیسے مہمان خانے کے بیرونی دروازے سے نکلے۔ حویلی کے دوسرے حصے میں بجلی بحال تھی۔ ہر طرف بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ میں نے تین محافظوں کو دیکھا۔ وہ ایک شدید زخمی شخص کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے حویلی کے اسپتال کی طرف بھاگ رہے تھے پھر مجھے ایک لہولہان ہوتا باڈی گارڈ نظر آیا۔ اسے ایک گرانڈیل دیہاتی نے کسی بچے کی طرح بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا اور طبی امداد کے لیے لے جا رہا تھا۔ میں اور عالم قریشی دوڑتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں آگ لگی ہوئی تھی۔ عالم قریشی کے سے ریوالور گر چکا تھا تاہم میرے ہاتھ میں طلائی دستے والا ننھا سا پستول موجود تھا جو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بونے باڈی گارڈ کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔

آگ بے حد خوفناک تھی۔ شعلے آسمان کو چھو رہے اور گاڑھا سیاہ دھواں پوری حویلی میں پھیلتا جا رہا تھا۔ خوش قسمتی کی بات تھی کہ حویلی کا مہمان خانہ اصل عمارت سے ہٹ کر تھا۔ مہمان خانے کی آگ کتنی بھی پھیل جاتی، حویلی کا زنانہ اور مردانہ حصہ اس سے محفوظ رہتا۔ حویلی کے ملازم اور دیگر لوگ آگ بجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ کوشش ایسے ہی تھی جیسے دریا کے پانی کا رخ پھیرنے کے لیے اس میں مٹھیاں بھر بھر کر ریت پھینکی جائے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب مہمان خانے کی آگ عمارت کو خاکستر کر کے ہی بجھے گی۔ حویلی کے ملازمین نے جن دو تین زخمیوں کو شروع میں نکال لیا تھا، وہ یقیناً خوش قسمت تھے۔ اب آگ میں گھرے ہوئے کسی شخص کی مدد کو پہنچنا ناممکن تھا۔ چند لمحے تک آگ کو گونجتے دہاڑتے اور غراتے ہوئے شعلوں کو دیکھتے رہے پھر زنان خانے کی طرف دوڑے۔ یوں تو نے فائرنگ شروع ہونے کے فوراً بعد زریں گل کو زنان خانے کی طرف دوڑا دیا تھا لیکن جو خطرات ہمیں درپیش ان کے مقابلے کے لیے زریں گل بالکل ناکافی تھا۔ شنکر آزاد تھا اور اس حویلی کے اندر موجود تھا اور وہ ایسا شخص جس سے شیطان بھی دل میں ہزار بار پناہ مانگتا ہوگا۔ اگر وہ زنان خانے کی طرف نکل جاتا تو وہاں کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ ثروت، ماہ جبیں، کلثوم، فرزانہ سب وہیں موجود تھیں۔

مہمان خانے سے زنان خانے کی عمارت تک کا درمیانی فاصلہ میں نے اندھا دھند بھاگتے ہوئے طے کیا۔ ان لمحات میں اپنے معدے کے درد اور آپریشن کے معاملات کو میں بھولا ہوا تھا۔ جونہی ہم زنان خانے میں داخل ہوئے، مجھے زریں گل نظر آیا۔ اس نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام خواتین کو ایک کمرے میں جمع کر لیا تھا۔ کمرے کے باہر سے تالا لگایا تھا اور خود رائفل تان کر دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح تمتما رہا تھا اور آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ مرنے مارنے کے لیے پارے کی طرح آمادہ ہے۔

"استاد صیب! یہ کیا ہوا۔ اتنا بڑا دھماکا۔ ام کو لگتا ہے کہ امارا کان پھٹ گیا ہے۔" وہ لرزتی آواز میں بولا۔

عورتیں کمرے میں بند تھیں اور اندر ہی چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ کمرے کی کھڑکیوں یا روزن وغیرہ سے انہوں نے آگ دیکھ لی تھی جس کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے اور جلتے ہوئے گوشت و بارود کی بو بھی ان کی حس شامہ تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے حویلی کے چار پانچ مسلح پہرے داروں کو بلایا اور انہیں خواتین کے کمرے کے سامنے زریں گل کے ساتھ متعین کر دیا۔ پہرے داروں کو اس کام کے لیے قائل کرنا ذرا مشکل ثابت ہوا۔ درحقیقت وہ ملازم خاص منصب علی کے زیر کمان تھے اور موجودہ ہنگامی صورت حال میں منصب علی کی ہدایات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ منصب علی انہیں ہدایات دینے کے لیے زندہ نہیں ہے تو وہ بھونچکا رہ گئے۔ بہرحال اس "حیرت" کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ انہوں نے میری بات بلا چون و چرا مان لی اور خواتین کی حفاظت پر کھڑے ہو گئے۔

میں نے عالم قریشی کے علاوہ تین چار ہوشیار گارڈز کو ساتھ لیا اور شنکر کی تلاش میں نکلا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر وہ زنان خانے کی طرف نہیں آیا تو اپنے دوسرے ٹارگٹ کے آس پاس ہوگا۔ اس کا دوسرا ٹارگٹ ظاہر ہے شیخ عاصم تھا۔ وہ اپنے اس آقا ولی نعمت کو بہر صورت یہاں سے نکالنا چاہتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ "ولی نعمت" مہمان خانے کے اندر یا کہیں آس پاس موجود ہے۔

آگ اب مہمان خانے کی تین چوتھائی عمارت کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ حصہ مکمل طور پر آگ کی زد میں تھا جہاں شیخ عاصم اور شنکر کے ساتھیوں کو بند کیا گیا تھا۔ اچانک مجھے شعلوں کی سرخ روشنی میں شیخ عاصم دکھائی دیا۔ وہ تین مسلح محافظوں کے نرغے میں تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ شاید آگ کی سرخ زبانوں نے اس کے بدن کے کسی حصے کو چاٹنے کی کوشش کی تھی۔

محافظوں نے مجھے بتایا کہ وہ شیخ کو مہمان خانے کے عقبی دروازے سے نکال کر لائے ہیں۔ میرا یہ اندازہ بھی غلط تھا کہ وہ آگ کی زد میں آیا ہے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے جو آثار تھے، وہ ان زخموں کی وجہ سے تھے جو چند روز پہلے مجھ سے مار دھاڑ میں اس کے جسم پر آئے تھے۔ ان میں سے ریڑھ کی ہڈی کی ایک چوٹ اسے کافی تکلیف دے رہی تھی۔ میں نے شیخ عاصم کو فوراً اپنی تحویل میں لے لیا اور اسے پوری حفاظت کے ساتھ "مردانے" کے ایک محفوظ کمرے میں پہنچا دیا۔ شنکر کے سلسلے میں میری پریشانی مسلسل بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ ابھی تک دکھائی دیا تھا اور نہ اس کی موجودگی کے کہیں آثار نظر آئے تھے۔ میں نے مردانے کی بیٹھک میں فوری طور پر پہرے داروں اور گارڈز کی "ہنگامی میٹنگ" بلائی اور انہیں حکم دیا کہ وہ آگ بجھانے کا خیال دل سے نکال کر حویلی میں پھیل جائیں اور شنکر کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ میں نے پہرے داروں کو سمجھایا کہ جب تک شنکر اس چار دیواری میں ہے، یہاں بڑے سے بڑا حادثہ رونما ہو سکتا ہے۔

پہرے دار اور گارڈز بے حد پریشان تھے۔ وہ عظیم الشان حویلی کے ایک حصے کو آگ کے شعلوں میں دیکھ رہے تھے اور چاروں طرف ان کے ساتھیوں اور عزیز و اقارب کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایسے میں انہیں گائیڈ لائن کی ضرورت تھی۔ گائیڈ لائن انہیں منصب علی کی طرف سے ملا کرتی تھی یا پھر جاگیردار قادر زماں کی طرف سے لیکن وہ دونوں اس موقع پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ منصب علی کے بارے میں تو وہ میری زبان سے سن چکے تھے کہ وہ زندہ نہیں ہے، جاگیردار قادر زماں کے بارے میں، میں نے ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ جاگیردار کی ناگہانی موت کی خبر پہرے داروں کے حوصلے پست کر دے گی اور وہ افراتفری کا شکار ہو جائیں گے۔

اچانک میں چونک گیا۔ میں نے سائیں مالی نور بلخ۔ وہ اپنے درویشانہ انداز میں جھومتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ حویلی میں جو کہرام مچا ہوا تھا اور جو قیامت برپا تھی، اس کا شائبہ تک سائیں کے چہرے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "تجھے کسی بھی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب اچھا ہو گیا ہے۔ وہ لومڑی کا ناجائز بچہ بھاگ گیا ہے حویلی سے۔ ہاں بھاگ گیا ہے۔ بارود نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ اب تم خود سوچو جسے دکھائی نہ دے رہا ہو وہ لڑائی مار کٹائی کیا کرے گا۔"

میں نے حیرانی سے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا "سائیں! تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ کیا تو نے دیکھا ہے اسے؟"

"میں نے نہیں دیکھا لیکن میرے جنات نے دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں دیکھوں یا میرے جنات دیکھیں، بات ایک ہی ہوتی ہے۔" پھر وہ ذرا سا مسکرایا اور اس کے زرد دانت نمایاں نظر آنے لگے۔ رازداری کے لہجے میں بولا "ویسے شفیع محمد! آپس کی بات ہے۔ میرا یہ جن ہے بڑے کمال کی چیز۔ ذرا جوش میں آئے تو تہلکہ مچا دیتا ہے۔"

"کون سا جن؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"وہی جس نے شنکر کو اندھا کیا ہے۔"
"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ شنکر کو بارود نے اندھا کیا ہے۔"

"ارے پاگل! بارود دراصل میرے جن ہی کا نام ہے۔ اس کا پورا نام بارود خان ہے۔ تم حیران کیوں ہو رہے ہو۔ جنات میں بھی پٹھان ہوتے ہیں اور ان کے نام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تلوار خان' بغاوت گل اور تباہی جان وغیرہ۔ اب تم خود سوچو ایک تو جوشیلا پٹھان ہو اوپر سے جن ہو' وہ کیا کیا کارنامے انجام نہیں دے گا۔ اب اس بارود خان کو ہی دیکھو۔ میری آنکھ کے اشارے کو ایسے سمجھتا ہے جیسے "بارود" جلتی ہوئی تیلی کے اشارے کو سمجھتی ہے۔"

سائیں عالی کی باتیں' ہمیشہ کی طرح میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بس اتنی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ مجھے شنکر کے حوالے سے تسلی دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ شنکر اب اس حویلی میں موجود نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں' اب بھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ سائیں عالی کی بات پر یقین کروں یا کم از کم یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

بہرحال ابھی سائیں پر میرا اعتبار اس قدر بھی نہیں جیسا تھا کہ میں سائیں کی اطلاع پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا اور اس نتیجے سے غافل ہو جاتا جو سائیں کی اطلاع غلط ہونے کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ مجھے اس حویلی میں شنکر کو ہر صورت تلاش کرنا تھا یا اس بات کا مکمل اطمینان کرنا تھا کہ وہ حویلی میں موجود نہیں۔ میری ہدایات کے مطابق محافظ اور بونے گارڈز پوری حویلی میں پھیل گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ شنکر کی صورت دیکھتے ہی اس پر فوراً گولی چلائیں۔ مہمان خانے کی آگ عروج پر پہنچ کر اب مدھم ہونا شروع ہو گئی تھی۔ آگ کے گرد بہت سے لوگ نیم دائرے کی شکل میں کھڑے تھے اور حسرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو کچھ لوگوں کو روتے ہوئے پایا۔ ان میں سے ایک جاگیردار قاور زماں کا تایا زاد بھائی حاکم علی اور دو جاگیردار کے بھتیجے تھے۔ وہ بار بار اس خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ جاگیردار صاحب مہمان خانے کی طرف آئے تھے اور وہ یہاں سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ جاگیردار آگ میں گھر گیا ہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ آگ سے پہلے ہی جاگیردار موت کے نرغے میں آ گیا تھا اور آگ نے اگر جلایا ہے تو اس کی لاش کو جلایا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بھیانک شعلے مدھم پڑنے شروع ہو گئے جو کسی کو مہمان خانے کے قریب پھٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ شعلوں کے اندر سے جلی ہوئی عمارت کے خدوخال واضح ہو کر سامنے آنے لگے۔ سب کچھ انگارا ہو رہا تھا۔ راہداری میں لاشیں نظر آئیں۔ سرتاپا برہنہ اور بالکل سفید۔ زیادہ تباہی مہمان خانے کے شمالی حصے میں ہوئی تھی۔ کئی کمروں کی چھتیں اڑ گئی تھیں اور وہ حصہ ملبے کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس حصے میں بارود ہی دھماکے ہوئے تھے اور ہم نے جیتے جاگتے انسانوں کے چیتھڑے ہوا میں اڑتے دیکھے تھے۔ میں نے جاگیردار قاور زماں کے تایا زاد بھائی حاکم علی کا ہاتھ پکڑا اور اسے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے تھوڑی دور باغیچے کے درختوں میں لے گیا۔ میں نے حاکم علی سے پوچھا "یہ سب کیا ہوا ہے۔ کیا لوگوں نے یہاں ایمونیشن جمع کر رکھا تھا؟"

حاکم علی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک بات ہم سے چھپاتے ہوئے بولا "تمہارا اندازہ درست ہے۔ مہمان خانے کے پچھواڑے جو گول کمرا ہے اس کے نیچے تہ خانے میں کافی اسلحہ پڑا ہوا تھا۔ ہتھیار تھے' ڈائنامائٹ تھے' دستی بموں کی کچھ پیٹیاں بھی تھیں مگر یہ سارا سامان بڑے محفوظ طریقے سے رکھا گیا تھا۔ میرا تو دماغ چکرا رہا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ یہ سب کیسے ہو گیا ہے۔" چند لمحے توقف کرکے اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور خوف زدہ لہجے میں بولا "شاہ جناں! میرا تو کلیجا پھٹ رہا ہے۔ مجھے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ بھائی قاور زماں بھی ہے۔" یہاں تک کہہ کر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

میں نے حاکم علی کا شانہ تھپکا اور اسے لے کر اس جلتے ہوئے کھنڈر کی طرف آ گیا جو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک حویلی کا مہمان خانہ کہلاتا تھا۔ بڑے بڑے شہتیر اور لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے ابھی تک سلگ رہے تھے۔ لوگ آگ کے قریب سمٹے آ رہے تھے اور ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ دھماکوں والی جگہ پر تو کوئی شے سلامت نظر نہیں آ رہی تھی۔ انسانی جسموں سمیت ہر چیز کی دھجیاں بکھری تھیں۔ لوہے کی بھاری بھرکم اشیا بھی دھماکے کی شدت سے تڑ مڑ کر ناقابل شناخت ہو گئی تھیں۔ میں نے دو چٹخی ہوئی کھوپڑیاں دیکھیں۔ ایک جلتا ہوا بازو دیکھا اور ایسے ہی بہت سے ناقابل شناخت حصے دیکھے۔ اس دوران میں دو محافظ بھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ حویلی کا چپا چپا چھان مارا گیا ہے لیکن شنکر کا کہیں کھوج نہیں ملا۔ ان دونوں محافظوں میں سے ایک بڑی عمر کا تھا اور خاصا تجربہ کار نظر آتا تھا۔ اس نے غم زدہ لہجے میں بتایا کہ حویلی کے پچھلے گیٹ پر دو محافظ مردہ

پائے گئے ہیں اور ایک تازی گھوڑا بھی غائب ہے۔ خیال ہے کہ دھوئیں کی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر کوئی شخص وہاں سے بھاگ نکلا ہے۔ میں نے محافظوں کو تلاش جاری رکھنے کا حکم دیا۔ بڑی عمر کے تجربہ کار کارندے کا نام عبدالغنی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ حویلی سے باہر نکلے اور حویلی کے گردونواح میں مطلوبہ شخص کو تلاش کرے۔ عبدالغنی کچھ متذبذب نظر آ رہا تھا لیکن جب جاگیردار کے تایا زاد حاکم علی نے بھی میرے حکم کی تائید کی تو وہ مسلح کارندوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر حمزہ ابھی تک دکھائی نہیں دیا۔ دھماکے سے تھوڑی دیر پہلے وہ بھی مہمان خانے میں چلا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے میں کشت و خون کے آثار دیکھ کر بہت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر حمزہ کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں پھر میں زنان خانے کی طرف چلا گیا۔ میں نے زریں سے پوچھا کہ ڈاکٹر حمزہ تو دکھائی نہیں دیا۔ زریں بولا "خوام بھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میرے جسم کے ہر مسام نے پسینہ اگل دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہے۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے عالم قریشی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی اچانک خدشات کے مہیب سائے نظر آنے لگے تھے۔ ڈاکٹر حمزہ کہاں تھا؟ دھماکے سے تھوڑی دیر پہلے وہ مہمان خانے میں تھا۔ نہیں اس کے ساتھ۔۔۔ کچھ ہو تو نہیں گیا تھا۔ میں اندھا دھند مہمان خانے کے سلگتے ہوئے کھنڈر کی طرف دوڑا۔ دھماکوں والے مقام پر اب آگ قریباً بجھ چکی تھی۔ حویلی کے ملازمین نے پانی کی بالٹیاں انڈیل انڈیل کر یہاں کیچڑ سی کر دی تھی۔ انسانی جسم کے جلے ہوئے ناقابل شناخت ٹکڑے اکٹھے کیے جا رہے تھے۔ میں اور عالم قریشی بھی اس کھنڈر میں داخل ہو گئے اور سخت خوف و ہراس کے عالم میں ان ٹکڑوں کو اور ان ناقابل شناخت لاشوں کو دیکھنے لگے۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا اور آنکھیں کسی اندوہناک منظر کے اندیشے سے پتھرائی ہوئی تھیں۔ دھماکوں والا مقام دیکھنے کے بعد ہم مہمان خانے کے دیگر حصوں میں گھومنے لگے۔ نشست گاہ بھی جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔ یہاں پوری سات لاشیں موجود تھیں۔ سات عدد انسانی ڈھانچے جن کی ہڈیاں ابھی سلگ رہی تھیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک یہ جیتے جاگتے انسان تھے۔ یہاں ابھی تک گولیوں کے بے شمار خول نظر

خون آشام

مُصنّف: ایم اے راحت

قیمت -/۵۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲۰ روپے

ایک ایسے بڈھے سادھو کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔
وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔

★

اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی

پبلشرز
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

آ رہے تھے۔ میں ایک ایک لاش کو غور سے دیکھنے لگا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ڈھانچے کو غور سے دیکھنے لگا لیکن ڈھانچا تو پھر ڈھانچا ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر یہ پتا نہیں چل سکتا کہ مرنے والا کون ہے۔ بس یہ پتا چل سکتا ہے کہ انسان تھا اور بچہ تھا یا بڑا تھا۔ یا شاید یہ بھی پتا نہیں چل سکتا کہ بچہ تھا یا بڑا تھا کیونکہ نشست گاہ میں مجھے ایک بچے کا ڈھانچا بھی نظر آیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بچے کا ڈھانچا نہیں ہے' یہ تدور زماں کا ایک بونا باڈی گارڈ تھا جو فائرنگ سے ہلاک ہو کر دروازے کی دہلیز پر اوندھا گرا تھا۔ نشست گاہ کا دلدوز منظر دیکھنے کے بعد ہم مہمان خانے کے بیرونی کمرے میں پہنچے۔ یہاں بھی پانی پھینک پھینک کر آگ کو سرد کیا جا چکا تھا۔ حویلی کے محافظ اور ملازمین لاشیں اٹھانے میں مصروف تھے۔ یہاں ایک دو لاشیں قابل شناخت حالت میں تھیں۔ تاہم حویلی کے مالک یعنی جاگیردار تدور زماں کی لاش قطعی ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ اس کا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ یہاں تک کہ پاؤں کی جوتی بھی خاکستر ہو چکی تھی۔ مجھے صرف دو اشیا ایسی دکھائی دیں جو کسی طور جاگیردار تدور کی شناخت میں مدد دے سکتی تھیں۔ ایک اس کے گلے میں پڑا ہوا طلائی تعویذ' دوسری بائیں ہاتھ کی دو انگوٹھیاں لیکن یہ چیزیں بھی بے پناہ حدت کے سبب تڑمڑ چکی تھیں اور انہیں آسانی سے پہچان لینا ممکن نہیں تھا۔ جاگیردار کے تایا زاد بھائی اور دیگر کارندوں نے بھی اس لاش کو دیکھ لیا تھا لیکن ان میں سے کسی کو فی الحال یہ کہنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ یہ جاگیردار ہی کی لاش ہے۔ فضا میں زبردست سوگواری پائی جا رہی تھی۔ گاہے گاہے کسی بین کی آواز ابھرتی تھی اور سوگواری کی فضا کچھ اور گمبھیر ہو جاتی تھی۔ میری روح یہ سوچ سوچ کر فنا ہو رہی تھی کہ اگر ڈاکٹر حمزہ کا سراغ نہ ملا تو کیا ہوگا؟ دل و دماغ میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ اس سے آگے کی بات سوچ سکتا۔ عالم قریشی نے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو یار' کچھ نہیں ہوا ہے حمزہ کو۔"

"تو پھر کہاں ہے وہ؟"

"کہیں بھی ہے لیکن یہاں نہیں ہے۔" قریشی نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

بھیانک اندیشوں کی شدت میرے دل و دماغ میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ میں ایک بار پھر دل کڑا کر کے ان لاشوں کو دیکھنے لگا جو مہمان خانے میں جا بجا نظر آ رہی تھیں۔ مہمان خانے سے نکل کر میں اور عالم قریشی بے قراری سے حویلی کے طول و عرض میں چکرانے لگے۔ زنان خانے میں اب زریں گل نے خواتین کو کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ڈری سہمی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو شفق لپک کر میرے پاس آ گئی "بھیا' یہ سب کیا ہوا ہے۔ آپ سب خیریت سے تو ہیں نا؟"

"ہاں ہاں سب خیریت سے ہیں۔" میں نے کہا' میں نے محسوس کیا کہ میں نادانستہ طور پر شفق سے نگاہیں چرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید میں ڈر رہا تھا کہ وہ مجھ سے کہیں ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں نہ پوچھ لے لیکن اس بے چاری میں اتنی جرات کہاں تھی کہ وہ اس قسم کا کوئی سوال کر سکتی۔ اس کی یہ معصوم مشرقیت ان لمحات میں مجھے ایک کڑی آزمائش سے بچا گئی۔ شفق کو تسلی تشفی دینے کے بعد میں کلثوم اور انجم کی طرف متوجہ ہوا۔ ان دونوں کے رنگ بھی ہلدی ہو رہے تھے۔ یہیں پر مجھے غزالہ بھی دکھائی دی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شیخ عاصم کی خیریت کے بارے میں بے حد فکرمند ہوگی اور یہ توقع رکھ رہی ہوگی کہ میں اسے شیخ عاصم کے متعلق کچھ بتاؤں گا لیکن میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ خود سے نہیں پوچھے گی تو میں بھی اسے مخاطب نہیں کروں گا۔ غزالہ نے خود سے نہیں پوچھا' میں بھی اس کے بارے میں خاموش رہا۔ ہاں جاتے جاتے میں نے زریں گل کو بتا دیا کہ شیخ عاصم خیریت سے ہے اور مردانے کے ایک کمرے میں آرام کر رہا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے جاتے ہی زریں گل یہ بات غزالہ کے گوش گزار کر دے گی۔

میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ حمزہ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ دوسری پریشانی کا تعلق حویلی کے حالات سے تھا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا' یہ قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ تین زبردست دھماکے ہوئے تھے جن میں کم و بیش چودہ افراد کی جانیں چلی گئی تھیں اور تقریباً ایک درجن افراد زخمی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پورے کا پورا مہمان خانہ جل کر راکھ ہو گیا تھا اور یقیناً یہ مالی نقصان ایک کروڑ کے ہندسے تک پہنچا ہوگا۔ مہمان خانے کی عمارت تقریباً نصف ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور یہاں جدید ترین رہائشی سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ بیش قیمت فرنیچر' قالین اور الیکٹرونک آلات کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس کی بھاری جمعیت یہاں قدم رنجہ فرمانے والی ہے۔ اس سے پیشتر تو جاگیردار تدور زماں یہاں موجود تھا اور سب کچھ سنبھال لیتا تھا مگر اب معاملات قابو سے باہر ہونے والے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ پولیس کے بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے میں اور میرے ساتھی یہاں

سے نکل جائیں۔ اس وقت حویلی میں نفسا نفسی کا عالم تھا' یہاں سے کوچ کرنے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔

چند منٹ سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے عالم قریشی اور زریں گل کو بلایا اور ان سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ شیخ عاصم سمیت فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ حویلی کے گیراج میں چھ سات گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک وہ ٹویوٹا گاڑی بھی تھی جس پر میں اور شفق چند روز پہلے جھنگ گئے تھے۔ اس گاڑی کی ایک چابی ابھی تک میرے پاس تھی۔ اس گیراج میں ایک چھوٹی سوزوکی کار ایسی بھی تھی جو کسی بھی چابی سے بآسانی کھولی اور چلائی جا سکتی تھی۔ ہم کل نو افراد تھے۔ ان دو گاڑیوں میں ہم بآسانی یہاں سے نکل سکتے تھے۔

میں نے زریں گل کو ہدایت کی کہ وہ خواتین کو لے کر فوراً گیراج کی طرف آ جائے۔ عالم قریشی کے ذمے میں نے یہ کام لگایا کہ وہ دونوں مطلوبہ گاڑیاں چیک کرے اور ان کے دروازے وغیرہ کھول کر رکھے پھر ان گاڑیوں کو گیراج کے اندر ہی صحیح پوزیشن میں کھڑا کرے۔ جب زریں اور عالم قریشی اپنے اپنے کام سے روانہ ہو گئے تو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بڑی تیزی سے حویلی کا ایک اور چکر لگایا۔ میں حمزہ کو تلاش کرنے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ افسوس کہ یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ میرا دل انتہا مایوسی اور غم سے بھر گیا۔ میرے بس میں ہوتا تو ساری رات حویلی میں گھومتا رہتا اور حمزہ کو تلاش کرتا رہتا لیکن وقت اور حالات کے تقاضے کچھ اور تھے۔ ہمیں جلد از جلد حویلی سے نکلنا تھا۔ حویلی کا ایک مایوس کن راؤنڈ لگانے کے بعد میں "مردانے" حصے میں آیا۔ یہاں سے میں نے شیخ عاصم کو ساتھ لیا اور باہر نکل آیا۔ "مردانے" کے بیرونی دروازے پر ایک مسلح پہریدار نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ حویلی میں مزید دھماکوں کا خطرہ ہے۔ خاص طور پر "مردانے" کی عمارت میں دھماکے کا امکان ہے۔

پہریدار جو پہلے ہی ہراساں تھا مزید ہراساں نظر آنے لگا۔ درحقیقت اس وقت حویلی میں ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ سارا حفاظتی انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ پہریدار مجھ سے سوال جواب کرتا' اسے اپنی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ میں "مردانے" حصے میں بم دھماکے کا خطرہ ظاہر کر رہا تھا اور پہریدار "مردانے" کے عین سامنے کھڑا تھا۔ وہ واضح طور پر بے قرار نظر آنے لگا۔ شیخ عاصم کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ کسی طرح کی مزاحمت پیش کر سکتا پھر بھی میں نے طلائی دستے والا پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"کہاں لے جا رہے ہو مجھے تم؟" عاصم خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"فی الحال خاموشی سے چلتے رہو۔" میں نے بے رخی سے کہا۔

"غزالہ کہاں ہے؟"

"گھبراؤ مت۔ وہ تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

دھوئیں کے مرغولے پوری حویلی میں چکرا رہے تھے۔ یہ دھواں ہمارے لیے مفید تھا۔ ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر گیراج تک پہنچ گئے۔ میری توقع کے عین مطابق باقی لوگ بھی گیراج میں پہنچ چکے تھے۔ میری نگاہوں نے غزالہ کو تلاش کیا۔ وہ بھی وہیں موجود تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ شیخ عاصم یہاں سے جا رہا تھا تو وہ یہاں کیسے رہ سکتی تھی۔ عالم قریشی نے اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دیا تھا۔ اس نے دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی کر رکھی تھیں اور ان کا رخ گیراج کے بلند و بالا گیٹ کی طرف تھا۔ ہم کل نو افراد تھے۔ میں نے عالم قریشی سے کہا کہ وہ چھوٹی گاڑی کی ڈرائیونگ کرے۔ اس کے ساتھ پروین' انجم اور کلثوم کو بٹھا دیا گیا۔ بڑی گاڑی کی ڈرائیونگ میں نے زریں کے سپرد کر دی۔ زریں کے ساتھ اگلی نشست پر شفق بیٹھ گئی۔ پچھلی سیٹ پر درمیان میں شیخ عاصم کو بٹھایا گیا۔ ایک طرف میں اور دوسری طرف غزالہ بیٹھ گئی۔ اصولی طور پر ہم دس افراد تھے لیکن اس وقت ایک فرد ہم میں نہیں تھا۔ یعنی حمزہ۔ اس کا سوچ سوچ کر میرا دل خون ہو رہا تھا۔ جب گاڑیاں روانہ ہوئیں تو انجم نے چونک کر پوچھا "حمزہ کہاں ہے؟"

اس سوال کا جواب فی الحال میرے پاس نہیں تھا اور نہ ہی عالم قریشی یا زریں کے پاس تھا۔ بہرحال فوری طور پر جواب دینا بھی ضروری نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ کسی کی پیشانی پر سوالیہ شکن ابھرتی' میں نے کہا "وہ چلا گیا ہے۔ فائرنگ سے تھوڑی دیر پہلے وہ نکل گیا تھا۔"

"کہاں؟" انجم نے پوچھا۔

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

انجم ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ گاڑیاں گیراج سے نکلیں اور دھوئیں کے مرغولوں سے گزرتی ہوئیں بغیر کسی خاص رکاوٹ کے حویلی سے باہر آ گئیں۔ ہم نے تیزی سے جھنگ کی طرف سفر شروع کیا۔ سوزوکی گاڑی جسے عالم قریشی چلا رہا

تھا' آگے تھی۔ ہم ٹویوٹا پر عقب میں آ رہے تھے۔ ابھی ہم حویلی سے دو تین میل دور ہی آئے تھے کہ ہمیں فائر بریگیڈ کی دو خستہ حال گاڑیاں دکھائی دیں۔ یہ حویلی کی طرف جا رہی تھیں۔ یقیناً اب وہاں ان گاڑیوں کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک تاریک تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ میرا رویہ دیکھنے کے بعد عاصم نے بھی بہتر سمجھا تھا کہ خاموشی سے سفر کرتا رہے۔ یقیناً اسے بھی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ حویلی میں جو بھی تباہی آئی تھی وہ شنکر کی وجہ سے آئی تھی۔ عاصم کے لیے افسوس کا مقام یہ تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود شنکر اسے آزاد کرانے میں ناکام رہا تھا۔ اس زاویے سے دیکھا جاتا تو اس ساری تباہی و بربادی کا ذمے دار صرف اور صرف شیخ عاصم تھا پھر میرا دھیان دوبارہ ڈاکٹر حمزہ کی طرف چلا گیا۔ دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی کہ وہ سلامتی سے ہو۔ سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ حویلی میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ایک بڑے حصے میں گھپ اندھیرا تھا اور دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے میں پوری تسلی کے ساتھ کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ جیسے سائیں عالی اور سروج بھی یقیناً حویلی ہی میں موجود تھے لیکن مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اسی طرح ڈاکٹر حمزہ بھی حویلی میں ہی کہیں پایا جاتا ہو۔ ایک دوسرا امکان یہ بھی ذہن میں آتا تھا کہ پے در پے ہونے والے خوفناک دھماکوں کے بعد جس طرح بہت سے لوگ حویلی سے نکل گئے تھے' حمزہ بھی نکل گیا ہو اور اب کسی محفوظ مقام پر رک کر صورتِ حال درست ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔

حویلی سے قریباً آٹھ کلو میٹر آگے آنے کے بعد جب ہماری گاڑی نہر کے پل سے گزر رہی تھی' میں نے ایک پولیس جیپ دیکھی۔ وہ آندھی کی رفتار سے حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ میں پہچان گیا' یہ جھنگ کے ڈی ایس پی خورشید کمبوہ کی جیپ تھی۔ یقیناً حویلی کی طرف دوڑ لگانے والا یہ اکیلا آفیسر نہیں تھا۔ ابھی بہت سے سرکاری و غیر سرکاری لوگوں کو اس سڑک پر سرپٹ بھاگنا تھا۔ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ جاگیردار قادر زماں مرحوم و مغفور ہو چکا تھا۔ یہ سنسنی خیز خبر تھوڑی ہی دیر میں جنگل کی آگ کے مانند پھیلنے والی تھی۔ پولیس جیپ کو دیکھنے کے بعد میں تھوڑا سا محتاط ہو گیا۔ یقینی بات تھی کہ ابھی بہت سی پولیس گاڑیاں ہمیں کراس کرنے والی تھیں۔ ایسے میں ہم پر شک کیا جا سکتا تھا کیونکہ ہمارے پاس حویلی کی گاڑیاں تھیں۔ ان مشکوک گاڑیوں کو دیکھ کر پولیس والوں کے ماتھے ٹھنک سکتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم سڑک سے ہٹ کر چلیں یا پھر پولیس کا ریلا گزرنے تک کسی جگہ رک جائیں۔

ایک جگہ سڑک سے کچھ ہٹ کر روشنیاں نظر آئیں۔ یہ ایک "ٹرک ڈرائیور ریسٹورنٹ" تھا۔ ایسے ریسٹورنٹ ہائی ویز پر اکثر نظر آتے ہیں۔ یہاں چارپائیاں وغیرہ بچھی ہوئی تھیں اور لکڑی کی میزوں پر پانی کے جگ وغیرہ رکھے تھے۔ میں نے عالم قریشی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گیا تو میں نے اسے بتایا کہ ہمیں کچھ دیر کے لیے کہیں رک جانا چاہیے۔ وہ بھی پولیس جیپ دیکھ چکا تھا اور اس کے لیے میری بات سمجھنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ ہم نے گاڑیاں ڈرائیور ہوٹل کی طرف موڑ دیں۔ گاڑیوں کو ہوٹل کے پچھواڑے گھنے درختوں میں کھڑا کر دیا۔ ہوٹل کا نوجوان ملازم بھاگا ہوا آیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ وہ دو چارپائیاں اور دو میزیں پچھواڑے کے کھلے احاطے میں لے آئے۔ ملازم نے فوری طور پر عمل کیا۔ شیخ عاصم کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ لہٰذا میں نے اسے ایک مریض کی "حیثیت" سے گاڑی میں ہی رہنے دیا۔ غزالہ بھی شیخ عاصم کے پاس گاڑی میں ہی رہی۔ ہم نے اس ڈرائیور ہوٹل میں کڑک چائے پی۔

شفقتا بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔ میری اس وضاحت کے بعد کہ میں نے حمزہ کو خود کہیں بھیجا ہے' وہ بالکل مطمئن ہو گئی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ یہ بات اس کے بھائی جان نے کہی تھی۔ وہی بھائی جان جس کے کہے پر وہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی تھی اور جسے وہ شاید اس دنیا کا سب سے قابلِ اعتبار شخص سمجھتی تھی۔ جتنی بار شفقتا کے چہرے پر میری نگاہ پڑی' میرے دل میں ایک گھونسا سا لگا۔ یہ سوچ ہی میرے لیے سوہانِ روح تھی کہ حمزہ کو کچھ ہو گیا ہو گا۔ میں اس بارے میں سوچتا تھا تو دماغ سن ہو کر رہ جاتا تھا۔

ہماری توقع کے عین مطابق آٹھ دس منٹ بعد پولیس کی کچھ مزید گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی سڑک پر سے گزریں۔ اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان گاڑیوں کی منزل جاگیردار قادر زماں کی حویلی ہے۔ اس کے بعد بھی وقفہ وقفہ سے چار چار منٹ کے وقفے سے پولیس کی گاڑیاں وہاں سے گزرتی رہیں۔ گاہے گاہے اس سنسان علاقے کا سناٹا سائرنوں کی آوازوں سے گونج اٹھتا تھا۔ یہ سلسلہ رکا تو ہم دوبارہ کاروں پر سوار ہوئے اور بھکر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بھکر تاریکی اور خاموشی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ہماری کاریں فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی سڑکوں سے گزریں اور

شیخوپورہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں اپنی منزل کا تعین کر چکا تھا اور عالم قریشی کو بھی اس بارے میں بتا چکا تھا۔ ہم شیخوپورہ سے سات آٹھ میل دور ایک جانے پہچانے قصبے کی طرف جا رہے تھے۔ اس قصبے کو عرفِ عام میں منڈیالی کہا جاتا تھا۔ یہ وہی قصبہ تھا جہاں میں ایک مرتبہ ایس پی برکت کے ساتھ پولیس والے کے روپ میں گیا تھا۔ ہمیں "مانک" نامی ایک شخص سے تفتیش کرنا تھی۔ نبیلہ' مانک' یوسف۔۔۔ مجھے وہ سارے بھولے بسرے کردار یاد آئے اور بدبخت عیسیٰ جان بھی یاد آیا جو نبیلہ کو اغوا کر کے علاقہ غیر میں لے گیا تھا اور اسے درندگی کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ نبیلہ سے ملنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ عیسیٰ جان کس قماش کا شخص ہے اور عورت کے سلسلے میں اس کی بھوک کس انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ بہرحال یہ سب باتیں ماضی کا حصہ تھیں اور موجودہ حالات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ قصبے میں' میں مانک اور نبیلہ وغیرہ سے نہیں مل سکوں گا۔ اب یہ قصبہ ان دونوں کے وجود سے خالی تھا۔ میری منزل اس قصبے میں ایک شناسا کی حویلی تھی۔ اس کا نام شیر محمد تھا۔ شیر محمد سے میری جان پہچان انہی دنوں میں ہوئی تھی' جب میں مانک اور نبیلہ کے سلسلے میں یہاں آتا جاتا تھا۔ شیر محمد اونچا لمبا گبرو تھا۔ وہ زمینداری کرتا تھا اور خاصا خوش حال تھا۔ گلابی اردو بولنے میں شیر محمد کا جواب نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ عادت اسے کہاں سے پڑی تھی۔ یوں تو وہ خالص پنجابی تھا لیکن جہاں کہیں کسی شہری کو دیکھتا تھا' فوراً پنجابی میں اردو کا تڑکا لگانا شروع کر دیتا تھا۔ شیر محمد کی بیوی بڑی خوب صورت تھی۔ بالکل گوری چٹی' ذرا ذرا نیلی آنکھیں' پتلے ہونٹ۔ سو فیصد انگریز لگتی تھی۔ اس کا نام ناہید تھا۔ شیر محمد کی طرح وہ بھی زبردست قسم کی مہمان نواز تھی لیکن بولتی بہت کم تھی بلکہ ایک دو ملنے میں تو یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس میں بولنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ شیر محمد کی حویلی کافی وسیع تھی بلکہ بڑے چوہدری کی حویلی سے بھی بڑی تھی۔

ہم حویلی کے بڑے گیٹ پر پہنچے تو جس شخص پر سب سے پہلے میری نگاہ پڑی وہ شیر محمد ہی تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے جسم سے خالص دیہاتی بو اٹھ رہی تھی اور اس کے بازوؤں میں خالص دیہاتی زور تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور مہمان جتنے زیادہ ہوتے ہیں ان کی خوشی بھی اتنی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے گاڑیاں حویلی کے وسیع احاطے میں کھڑی کر دیں اور حویلی کا گیٹ بند ہو گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم ایک میدانِ جنگ میں ہوتے ہوئے ایک محفوظ مورچے میں داخل ہو گئے ہیں۔

شیر محمد میری آمد کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار تھا لیکن اس بے قراری میں کسی طرح کے منفی خیالات شامل نہیں تھے۔ شیر محمد ایسا شخص تھا کہ اسے میں کچھ نہ بتاتا اور مہینوں اس حویلی میں رہتا تو بھی وہ مجھ سے اصرار کر کے کچھ نہ پوچھتا۔ بہرطور میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتا دیا کہ میں کیسے اور کن حالات میں یہاں پہنچا ہوں۔ جاگیردار قادر زماں کو شیر محمد بھی اچھی طرح جانتا تھا' اس کی موت کی خبر شیر محمد کے لیے بھی حیرت ناک تھی۔ شیر محمد یہ جان کر بھی ازحد حیران ہوا کہ ہمارے ساتھ "رسی سے بندھے ہوئے ہاتھوں والا" جو شخص ہے وہ امارات کا ایک امیر کبیر شخص ہے۔

شیر محمد کی حویلی میں ہمیں قیام و طعام کی بہترین سہولتیں میسر آئیں۔ شیر محمد مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا "بادشاہو! یہ تمہاڈی اپنی ہی حویلی ہے۔ جتھے جی چاہے اٹھو بیٹھو۔ کسے طراں بھی پریشان ہونے کی لوڑ نہیں ہے۔" اس نے اپنے قول و فعل سے ثابت کر کے دکھا دیا۔ اگلے روز شام تک ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم اپنے ہی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اگلے روز جو سب سے اہم چیز ہمیں نظر آئی وہ اخبار تھا۔ جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں برپا ہونے والی قیامت کی خبر نے پہلے صفحے پر جگہ پائی تھی۔ قادر زماں کی ہلاکت کی تصدیق ہو چکی تھی اور قادر زماں کی تصویر بھی چھپی تھی۔ خبر میں شنکر بھارتی کا ذکر بھی نمایاں الفاظ میں کیا گیا تھا (تمام اخباروں میں شنکر شکرا کو شنکر بھارتی کے نام سے لکھا گیا تھا) اخباری اطلاعات کے مطابق شنکر نے جاگیردار قادر زماں سے پرانی عداوت کا بدلہ لیا تھا۔ چند روز پہلے وہ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ "اسپرے کرنے والوں" کے روپ میں حویلی کے اندر گھسا تھا۔ اس کے پاس بڑی تعداد میں ڈائنامائٹ وغیرہ تھے۔ ان لوگوں نے موقع تاک کر حویلی کے مہمان خانے تک رسائی حاصل کی تھی اور مہمان خانے کی عمارت کو ڈائنامائٹ سے اڑا دیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق تین بڑے دھماکے ہوئے تھے اور عمارت میں آگ لگ گئی تھی۔ پوری عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔ اس واقعے میں کم از کم بائیس افراد ہلاک اور تین درجن کے لگ بھگ زخمی ہو گئے تھے۔ مرنے والوں میں جاگیردار قادر زماں' اس کا ایک چچا اور ملازمِ خاص منصب علی بھی شامل تھے۔ بتایا گیا تھا کہ دھماکوں سے قبل شنکر بھارتی اور اس کے ساتھیوں نے حویلی میں اندھا دھند فائرنگ بھی کی اور زیادہ جانی نقصان اسی

فائرنگ سے ہوا۔ جاگیردار قادر زماں پر شنکر نے اس وقت تیز دھار خنجر سے حملہ کیا جب وہ شنکر کے ہاتھ سے خود کار رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جاگیردار نے شدید زخمی ہونے کے بعد بھی رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ نتیجے میں شنکر نے آخری اور فیصلہ کن وار اس کی گردن پر کیا اور اسے نیچے گرا دیا۔ اس سے پہلے جاگیردار کے چار ہونے والے باڈی گارڈ شنکر کی رائفل سے نکلنے والے برسٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ ان واقعات کا چشم دید گواہ قادر زماں کا ایک گارڈ تھا۔ وہ خوش قسمتی کے طفیل شنکر کی وحشیانہ فائرنگ سے بچ نکلا تھا۔ اس کی چھاتی میں گولی لگی تھی اور وہ ایک صوفے کے پیچھے گر گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شنکر پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر فرد کو بلا امتیاز ہلاک کر رہا تھا۔ اس نے کسی کو سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ فائرنگ کے فوراً بعد وہ زخمیوں کو پھلانگتا ہوا تہ خانے کی طرف چلا گیا۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اس نے دھماکا کہاں اور کیسے کرنا ہے۔

ان خبروں میں شیخ عاصم کا ذکر بھی تھا۔ اس کے علاوہ میرے متعلق بھی چند سطور لکھی گئی تھیں۔ اخبار نے مختلف ذرائع کے حوالے سے اطلاع دی تھی کہ اس بات کے واضح ثبوت ملے ہیں کہ شیخ عاصم اور استاد جہانی بھی دھماکوں کے وقت حویلی میں موجود تھے۔ اخبار نے لکھا تھا "یہ عین ممکن ہے کہ استاد جہانی۔۔۔ شیخ عاصم کو اغوا کر کے قادر زماں کی حویلی میں لے گیا ہو اور قادر زماں کی حویلی میں ہونے والے خون خرابے کی بنیاد یہی اغوا ہو۔ شنکر نے اپنے "باس" کو چھڑانے کے لیے جاگیردار کی حویلی پر چڑھائی کر دی ہو۔" آخر میں اخبار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ شنکر بھارتی اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے اور شیخ عاصم کو حویلی سے نکال لے گیا ہے۔

ایک دوسری خبر میں بالکل مختلف بات کی گئی تھی (اور یہی بات حقیقت کے قریب تھی) اخبار نے لکھا تھا "کچھ لوگوں کی طرف سے خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ حویلی میں جو خوفناک دھماکے ہوئے ہیں وہ اس ناجائز ایمونیشن کی وجہ سے ہوئے ہیں جو قادر زماں نے حویلی کے تہ خانے میں اسٹور کر رکھا تھا۔ شنکر کو اس ایمونیشن کا سراغ مل گیا تھا اور اس نے کسی طریقے سے اس ایمونیشن کو آگ دکھا دی تھی۔" اس خبر میں پولیس کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ اکثر لاشوں کی شناخت قطعی ناممکن ہے لہٰذا یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مرنے والوں میں کون کون شامل ہے۔ بہت سے افراد ابھی تک لاپتا ہیں اور ان میں شیخ عاصم کے علاوہ مسز شیخ عاصم بھی

شامل ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق شاہ جہاں اپنے ساتھیوں سمیت دھماکے کے فوراً بعد کسی نامعلوم مقام پر چلا گیا ہے۔

تمام اخباروں میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ اس طرح کی خبریں موجود تھیں۔ میرے ذہن پر ایک زبردست بوجھ تھا اور گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بوجھ کا تعلق ڈاکٹر حمزہ سے تھا۔ میں جلد از جلد ڈاکٹر حمزہ کی خیریت سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ میں لاہور میں ڈاکٹر حمزہ کے گھر فون کر لوں۔ شیر محمد کے گھر فون موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ فون کرنے کے لیے مجھے نہر کے پل پر جانا پڑے گا۔ وہاں ایک چھوٹا سا بازار موجود تھا۔ شیر محمد کے پاس سواری کے لیے ایک سجا سجایا تانگا موجود تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں فون کرنے کے لیے پل پر جانا چاہتا ہوں تو اس نے فوراً تانگے بان کو حکم دیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے نکلا تو زریں گل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ قصبے کے کسی حجام سے شیو بنوا کر واپس آ رہا تھا۔ خوب صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ حالات کیسے بھی تھے، بہرحال وہ نیا نیا شادی شدہ ہوا تھا۔ صاف ستھرا رہنا تو ضروری تھا۔ منہ میں نسوار کا چٹکارا رکھنے کے لیے اس نے ڈبیا نکالی تھی لیکن مجھے دیکھ کر دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ زریں گل میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ حالات کا زیادہ اثر قبول نہیں کرتا تھا اور بہت جلد نارمل نظر آنے لگتا تھا۔ حویلی پر حالانکہ ہر روز نت نئے ہنگاموں نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ زریں گل سے ایک شخص قتل ہوا تھا اور آخری رات تو ہی ہو گئی تھی۔ بارودی دھماکوں نے حویلی کے ایک بڑے حصے کو تباہ کر دیا تھا اور قادر زماں کی زندگی کا باب ختم ہو گیا تھا۔ ان غیر معمولی واقعات کا سامنا کرنے کے صرف ایک روز بعد زریں گل پھر سے نارمل نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا "استاد صیب یہ آپ کا دوست شیر محمد تو بڑے کمال کا بندہ ہے۔ ام تو ایک دم انٹریسٹ ہو گیا ہے اس سے۔"

"انٹرسٹ نہیں امپریس۔" میں نے تصحیح کی۔

زریں نے اثبات میں سر ہلایا "بالکل! امارا یہی مطلب ہے۔ امارے ملک کو ایسے ہی دلیر لوگوں کی ضرورت ہے جو دشمن کے چھکے چھڑا سکیں اور کافروں پر اپنا دھاک بٹھا سکیں۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن شیر محمد نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟"

وہ بولا "خو استاد صیب! یہ کیا کم کام ہے کہ اس نے

ایک دشمن قوم کا عورت کو بیوی بنا کر اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔"

"پتا نہیں کیا بک بک کر رہا ہے۔" میں نے کہا "کون سی دشمن قوم کی عورت؟"

"استاد صیب! فرنگی عورت اور کون سا عورت۔ آپ نے شیر محمد کا بیوی نہیں دیکھا۔ وہ انگریز ہے لیکن اپنے شیر محمد صیب نے اس کو بالکل قابو میں رکھا ہوا ہے۔ بالکل تیر کے ماتق سیدھا کیا ہوا ہے۔ خو ام نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ امارا پاکستانی لباس پہنتا ہے۔ سر پر دوپٹا لیتا ہے۔ اس کا ہر ادا سولہ صد پاکستانی ہے۔"

اب میری سمجھ میں زریں گل کی بات آئی۔ وہ شیر محمد کی سرخ سپید خوبرو بیوی کو انگریز سمجھ رہا تھا۔ وہ لگتی بھی ایسی ہی تھی۔ زریں گل اپنی روانی میں بولتا چلا جا رہا تھا "خو استاد صیب! ہو تو ایسا۔ دشمن قوم کا عورت بھی دل و جان سے اس کا مطیع و فرماں بردار ہو جائے۔ ام نے اس فرنگی خاتون کو اپنے ہاتھوں سے روٹیاں پکاتے اور جھاڑو دیتے دیکھا ہے بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ام حیران ہو گیا، وہ اپنے ہاتھ سے بھینس کا دودھ دھو رہا تھا۔ سولہ صد پاکستانی لگ رہا تھا۔"

"وہ سولہ صد پاکستانی ہی ہے۔" میں نے زریں کی نقل اتارتے ہوئے کہا "کھامڑ! تجھے پاکستانی اور انگریز کی بھی پہچان نہیں ہے۔"

"آپ ام سے مذاق فرما رہا ہے استاد صیب! ام اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ انگریز ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ انگریز اتنی اچھی پنجابی بول سکتا ہے۔"

"یہی تو خوبی کا بات ہے استاد صیب! وہ پنجابی انداز میں روٹیاں ہی نہیں پکاتا، پنجابی انداز میں بولتا بھی ہے۔ امارے خیال میں آپ کو بھی پتا ہے کہ وہ انگریز ہے لیکن آپ ام سے دل لگی فرما رہا ہے۔ آخر ام نے بھی دنیا دیکھا ہے۔ کیا ام انگریز اور پاکستانی میں فرق بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ام تو انگریز عورت کو دو میل سے دیکھ لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی امارا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"بے شک تمہارا خون کھولنے لگتا ہے اور تم عورت کو دو میل دور سے دیکھ بھی لیتے ہو لیکن اس کے لیے عورت کا انگریز ہونا ضروری نہیں۔ ہر عورت کو دیکھ کر تم یہی کرتے ہو۔"

زریں نے کہا "استاد صیب! آپ تھوڑا سا زیادتی فرما رہا ہے۔ اب تو ام شادی شدہ ہے۔ اب ام ایسا کیوں کرے گا۔ ام سچ کہتا ہے۔ ام کو کلثوم سے بڑا محبت ہے۔ امارا دل ہر وقت گنگناتا رہتا ہے۔ آپ نے وہ مشہور گانا تو سنا ہی ہو گا۔ امارے دل پر چھایا ہے ایک صورت متوالا سا، نازک سا شرمیلا سا معصوم سا بھولا بھالا سا۔۔۔ اور وہ گانا بھی سنا ہو گا۔ بھول گیا سب کچھ، یاد نہیں اب کچھ۔ اک یہی بات نہ بھولا۔۔۔ اور ایک وہ گانا بھی۔ مل گیا مل گیا ام کو پیار کا یہ منزل۔ ام آپ کو کیا بتائے استاد صیب! دنیا میں آپ کے بعد ام سب سے زیادہ کلثوم سے محبت کرنے لگا ہے۔ یہ گانے جو ام نے آپ کو بتایا ہے یہ تو مذاق میں ہے ورنہ ان گانوں میں اتنا طاقت کہاں کہ یہ اس محبت کو بیان کر سکیں جو کلثوم کے لیے ہمارے دل میں ہے۔"

"بالکل غلط کہہ رہے ہو تم۔ اگر تمہیں اس سے محبت ہوتی تو اتنی سی چھوٹی عمر میں اسے بال بچے کی مصیبتیں نہ ڈالتے۔"

"اس بات پر تو ام اتنا پچھتایا ہے استاد صیب کہ بیان نہیں کر سکتا لیکن جو تیر کمان سے نکل گیا وہ واپس کیسے آ سکتا ہے۔ ویسے ابھی امارے دل میں تھوڑا بہت امید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کلثوم کا جو دل وغیرہ خراب ہو رہا ہے اس کا تعلق بچے وچے سے نہ ہو۔ اس کا آب و ہوا تبدیل ہوا ہے۔ اس وجہ سے بھی تو طبیعت خراب ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اب کبوتر کی طرح آنکھیں بند مت کرو۔ تم بھی تو آب و ہوا تبدیل کر کے گھنٹہ گھر گئے تھے۔ کیا تمہارا دل خراب ہوا تھا؟ ویسے بھی عورتوں کو ہم سے بہت زیادہ پتا ہوتا ہے۔"

زریں گل چپ ہو گیا پھر رونی صورت بنا کر بولا "ویسے استاد صیب! سب ٹھیک ہو جائے گا نا!"

"میں خود کیا کہہ سکتا ہوں۔ فال والے طوطے سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

"استاد صیب! آپ مذاق مت فرمائیں۔ امارے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ واقعی اتنی چھوٹی عمر میں شادی نہیں ہونی چاہیے۔"

"وے خدا کا خوف کر زریں! تیری عمر چھوٹی ہے؟ تیری عمر کے تو جن بھی اب عینکیں لگاتے ہیں۔"

"ام اپنا نہیں کلثوم کی بات کر رہا ہے استاد صیب! ام نے بہت برا کیا۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھا۔ ام نے فٹافٹ اس سے شادی بنایا اور فٹ فٹ گھر گرہستی میں بھی ڈال دیا۔ اب پتا نہیں کیا ہو گا۔ ام نے حویلی میں سائیں عالی صاحب سے بھی بات کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ام کو

کوئی تعویذ دے گا لیکن تعویذ ملنے سے پہلے ہی حویلی میں ہنگامہ ہو گیا اور اب پتا نہیں سائیں صیب کہاں ہے۔"

"تم نے آخری بار سائیں کو کہاں دیکھا تھا؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں زریں سے پوچھا۔

"حویلی میں ہی دیکھا تھا جی۔ دھماکا تو آٹھ بجے کے قریب ہوا تھا' ام نے سائیں کو شام سات بجے کے لگ بھگ دیکھا تھا۔ وہ کھانے والے کمرے میں بیٹھا تھا اور میٹھی سویوں کے اوپر ساگ کا سالن ڈال کر روٹی سے کھا رہا تھا۔ سروج بھی پاس ہی بیٹھی تھی اور اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے سائیں کے بارے میں بھی فکر ہے۔"

"اس کا فکر چھوڑیں جی۔ خواس کا تو کام ہی نظر آنا اور غائب ہونا ہے۔ آپ ڈاکٹر حمزہ صیب کا کوئی فکر کریں جی۔ ام اس کے بارے میں سخت پریشان ہے۔"

"میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی اچھی خبر ملے گی۔"

کوچوان مئودب انداز میں میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

محلے کے بازار سے لاہور فون کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ حمزہ کے گھر میں اس کی والدہ موجود نہیں تھیں۔ ایک نوکر نے فون ریسیور کیا۔ میری آواز پہچان کر بولا "آپ شاہ جہاں صاحب ہی ہیں نا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور پوچھا کہ ڈاکٹر حمزہ کہاں ہیں۔ وہ بولا "ڈاکٹر صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔"

میں نے پوچھا "اور ان کی والدہ؟"

وہ بولا "وہ تو آپ ہی کی طرف گئی ہے۔ میں خود انہیں بھکر جانے والی ویگن میں سوار کرا کے آیا ہوں۔ آج دوپہر انہوں نے اخبار میں دھماکوں والی خبر پڑھی تھی۔ اسی وقت سے سخت پریشان تھیں۔ بار بار آپ کو حویلی کے نمبر پر فون کر رہی تھیں پھر ان سے برداشت نہیں ہوا۔ بھکر جانے کے لیے نکل کھڑی ہوئیں۔" پھر وہ ذرا توقف سے کہنے لگا "صاحب جی۔۔۔ ڈاکٹر حمزہ تو خیریت سے ہیں نا؟"

"ہاں خیریت سے تو ہے لیکن پتا نہیں بتائے بغیر کہاں چلا گیا ہے۔" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں کہا۔

ملازم بولا "بیگم صاحبہ اسی لیے پریشان تھیں۔ کہتی تھیں کہ چھوٹے صاحب بے پروا ہیں۔ پتا نہیں کدھر چلے گئے ہیں، جو واپس نہیں آئے۔"

نوکر کا نام تاجی تھا۔ میں نے کہا "تاجی' یہ چھوٹے صاحب کہاں کہاں جاتے ہیں۔ کچھ پتا ہے تمہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بھکر سے بتائے بغیر کہاں چلے گئے ہیں' اب کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے انہیں؟"

وہ بولا "صاحب جی! ان کے کچھ ٹھکانے تو ہیں جی۔ لمبی چوڑی یاری دوستی بھی نہیں۔ اسپتال جاتے ہیں اور وہاں سے گھر آ جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر حمزہ کے ساتھ شفقا کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ شاید اس لیے ملازم محتاط لہجے میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے ذرا کریدا تو اس نے بتایا کہ حمزہ نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ہیلتھ کلب بنا رکھا ہے۔ وہ ہفتے میں دو تین بار شام کو وہاں بھی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ارسلان احمد نامی ایک ایڈووکیٹ بھی اس کا گہرا دوست تھا۔ ملازم نے مجھے تین چار ٹھکانے ایسے بتائے جہاں ڈاکٹر حمزہ کا پتا کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہیلتھ کلب اور ایڈووکیٹ ارسلان احمد کا فون نمبر بھی مجھے دیا۔ ہیلتھ کلب شہر کے فیشن ایبل علاقے شادمان میں تھا۔ میں نے فوری طور پر وہاں رنگ کیا۔ اس فون کال کا نتیجہ مایوسی کی صورت میں نکلا۔ حمزہ پچھلے چھ سات روز سے ہیلتھ کلب میں نہیں آیا تھا۔ وہاں سے میں نے ایڈووکیٹ کے آفس میں فون کیا۔ شام کا وقت تھا۔ یہ نوجوان ایڈووکیٹ بھی دفتر میں ہی تھا۔ اس نے حمزہ کے بارے میں نہ صرف لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ فکرمندی بھی ظاہر کی۔ وہ جانتا تھا کہ حمزہ بھکر گیا ہوا ہے اور جاگیردار کی رہائش میں ہونے والی وحشیانہ فائرنگ اور بم دھماکوں کے بارے میں بھی اسے معلوم تھا۔ اس نے مجھ سے کرید کرید کر پوچھنا چاہا کہ میں کون بول رہا ہوں اور حمزہ کہاں جا سکتا ہے۔

میں نے ایڈووکیٹ ارسلان احمد کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ حمزہ ویسے تو بالکل خیریت سے ہے لیکن آج صبح سے اس کا پتا نہیں چل رہا۔ میں نے ارسلان احمد سے درخواست کی کہ وہ لاہور میں حمزہ کے ممکنہ ٹھکانوں پر اس کا پتا کرائے۔ میری باتوں نے ارسلان احمد کو مزید پریشان کر دیا اور اس کی باتوں سے گہری بے قراری جھلکنے لگی۔ میں نے ارسلان احمد سے درخواست کی کہ وہ حمزہ کی گمشدگی کی خبر فی الحال اپنے تک ہی رکھے۔

دل پر جیسے کوئی آرا سا چلا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سرگودھا کے سول اسپتال میں پہنچوں۔ دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کی نعشیں آخری خبریں آنے تک سول اسپتال میں ہی تھیں۔ اب رات ہو چکی تھی۔ اگر میں حویلی میں کسی کو بتائے بغیر سیدھا سرگودھا چلا جاتا تو سب کو پریشانی ہوتی

تھی' لہٰذا شہزاد کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں سرگودھا جا رہا ہوں۔

○☆○

سرگودھا کے اسپتال میں بہت ہجوم تھا۔ لاشیں ابھی لواحقین کے حوالے نہیں کی گئی تھیں۔ درحقیقت بہت سی لاشیں تو جلی ہوئی ناقابل شناخت ہڈیوں کی شکل میں تھیں۔ ان ہڈیوں کو الگ الگ شناخت کر کے میتوں کی صورت دینا اور پھر طبی معائنہ وغیرہ کرنا ایک دشوار کام تھا۔ مرنے والے کل افراد کی تعداد اب اٹھائیس ہو گئی تھی۔ ان میں چودہ پندرہ قطعی ناقابل پہچان تھے۔ اسپتال کے احاطے میں لواحقین کی آہ و بکا جاری تھی۔ قابل شناخت لاشوں کو کپڑوں سے ڈھانپ کر اسپتال کے برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ مرنے والوں کے لواحقین انہیں پہچان سکیں۔ پولیس کی بھاری نفری بھی ان لاشوں کے ارد گرد موجود تھی۔ اتفاقاً میری نظر ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑ گئی۔ یہ ایس پی برکت تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں مونچھوں کو تاؤ دے رکھا تھا اور بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ میں ہجوم سے کنی کتراتا ہوا اسپتال کے برآمدے کی طرف آ گیا۔ میں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ حویلی میں قیام کے دوران میں میری داڑھی کچھ بڑھ گئی تھی اور مونچھیں بھی خاصی گھنی ہو گئی تھیں۔ اب میں نے شیو کرائی تھی اور مونچھیں بھی کافی ہلکی کر دی تھیں۔ "نظری عینک" لگا کر میرا حلیہ کافی بدلا بدلا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ آسانی سے مجھے پہچانا نہیں جا سکے گا۔

میں نے ستون کے پاس کھڑے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ایس پی برکت کو بلا کر لائے۔

کانسٹیبل نے جا کر میرا پیغام دہرا دیا اور ایس پی برکت کو بتایا کہ استاد جہانی آپ کو بلا رہا ہے۔ میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ کانسٹیبل کی بات سن کر ایس پی برکت کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے پھر وہ کانسٹیبل کے ہمراہ تیر کی طرح اس گوشے کی طرف بڑھا جہاں میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایس پی برکت نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔ اس کی مونچھیں فرطِ جذبات سے پھڑک رہی تھیں۔ کہنے لگا "مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آج کل میں تمہاری شکل ضرور دیکھنی پڑے گی۔"

"میری شکل سے اتنا ڈرتے کیوں ہو برکت صاحب؟"

"تمہاری شکل سے نہیں ڈرتا' ان مصیبتوں سے ڈرتا ہوں جو تم اپنے پیچھے لگائے پھرتے ہو۔ جو کچھ قاور زماں کی حویلی میں ہوا ہے وہ کوئی چھوٹی مصیبت تھی کہ اب تم پھر نظر آ گئے ہو۔"

"بہت افسوس کی بات ہے برکت صاحب! اتنے دن بعد ملاقات ہوئی ہے پھر بھی جلی کٹی سنا رہے ہو۔ میں تو آپ سب لوگوں کی بہتری کا ہی سوچتا ہوں۔ بندہ فارغ رہے تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ آپ لوگ بھاگ دوڑ کریں گے تو آپ کی مشینیں چالو ہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ترقی شرقی کا چانس بھی بن جائے۔"

"نہیں چاہیے مجھے ترقی بھوتی دی۔ جب بندہ بھوتی دا پریشانیوں میں پڑ کر رولے ہی کسی کام کا نہ رہے تو ترقی کیا کرنی ہے۔"

میں نے کہا "چلو ترقی نہیں کرنی لیکن پولیس میں تو رہنا ہے نا اور پولیس میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ زندہ ہو۔"

"زندہ ہو' کیا مطلب؟"

"یہ جینا بھی کیا جینا ہے برکت صاحب۔ بہرحال کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی بری بھلی زندگی بھی چھن گئی تو کیا کرو گے۔ وہ تمہارا اور ہمارا ازلی دشمن شنکر شکرا زنجیر تڑا کر نکلا ہوا ہے۔ بالکل پاگل کتے کی طرح ہو رہا ہے۔ اگر تمہیں کاٹ کھائے گا تو پیٹ میں چودہ ٹیکے لگوا کر بھی جان نہیں بچے گی۔ زندگی موت ظاہر ہے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تمہاری زندگی کم ہے تو میری کیا مجال ہے کہ اس میں اضافہ کر سکوں لیکن اگر میں تمہارے آس پاس ہوں گا تو شنکر کی ڈرم میں نمدہ فٹ کر کے رکھوں گا ورنہ وہ آپ پولیس والوں کی ڈرم میں نمدہ فٹ کروے گا۔"

شنکر کے ذکر پر ایس پی برکت چونک گیا۔ بے شک ایس پی برکت ایک نڈر پولیس والا تھا مگر شنکر کا نام ہی ایسا تھا کہ کوئی شخص بھی جو اسے جانتا تھا' فکرمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ایس پی برکت نے مونچھیں مروڑیں اور بولا "ہم ساہی صاحب کے بندے ہو ایسی بات کر سکتے ہو ورنہ تمہیں پتا ہی ہے کوئی بھوتنی دا میرے سامنے منہ نہیں کھول سکتا۔ باقی اس وقت میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم جس کام کے لیے آئے ہو وہ بتاؤ۔"

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "کوئی خاص کام تو نہیں ہے' بس میں وہ اشیا دیکھنا چاہتا ہوں جو مرنے والوں کے جسم سے علیحدہ کی گئی ہیں۔"

"وہ سب کچھ تو سرگودھا کے ہیڈکوارٹر میں ہے!" ایس پی برکت نے کہا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نکلنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ میں ایک ایسی فکرمندی لے کر یہاں پہنچا تھا جو گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے "جاچا: کٹ" کہہ کر تھوڑا سا کھٹن لگایا تو وہ مان گیا کہ مرنے والوں کی ذاتی اشیا اسی کی تحویل میں ہیں اور یہیں اسپتال میں ہیں۔ وہ مجھے اسپتال کے ایک پرائیویٹ روم میں لے آیا۔ دروازے پر دو پولیس مین پہرا دے رہے تھے۔ پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بہت سی اشیا علیحدہ علیحدہ رکھی گئی تھیں۔ انگوٹھیاں، دھات کے تعویذ، کلائی کی گھڑیاں، کانوں میں ڈالنے والی طلائی مرکیوں کا ایک جوڑا بھی ان اشیا میں نظر آ رہا تھا۔ ان طلائی مرکیوں کو دیکھ کر میری نگاہ میں قادر زماں کے خاص ملازم منصب علی کا چہرہ گھوم گیا۔ یہ مرکیاں یعنی بالیاں اسی کی "باقیات" تھیں۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈاکٹر حمزہ کی رسٹ واچ کا ڈائل کسی حد تک پہچان سکتا ہوں۔ مرنے والوں کی اشیا میں قریباً پندرہ گھڑیاں شامل تھیں۔ ان میں جاگیردار قادر زماں کی شاندار رادو واچ بھی تھی۔ ہزاروں روپے مالیت کی وہ گھڑی جس پر دیکھ! جانے والا وقت لوگوں کی قسمیں بناتا اور بگاڑتا تھا۔ آج یہ گھڑی پیچھے رہ گئی تھی اور وقت بہت آگے نکل گیا تھا۔ دیگر تمام اشیا کی طرح یہ گھڑی بھی گرمی کی شدت سے بدشکل ہو چکی تھی۔ اسٹریپ جل کر خاک ہو چکا تھا اور ڈائل سیاہ ہو گیا تھا۔ میں ڈری ڈری نظروں سے ان گھڑیوں کو دیکھتا رہا۔ دل کو ہر لحظہ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ان گھڑیوں میں مجھے حمزہ کی گھڑی دکھائی نہ دے جائے۔ یہ کیسی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ آنکھیں کسی چیز کو تلاش بھی کرتی ہیں اور اس کی دید سے بچنا بھی چاہتی ہیں۔

ان گھڑیوں میں مجھے حمزہ کی چوکور ڈائل والی گھڑی نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی اور ایسی شے نظر آئی جس پر حمزہ کی ملکیت کا شبہ کیا جا سکتا پھر بھی دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لاشوں کی حالت اتنی بری ہو چکی تھی کہ انہیں کسی طور پہچاننا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہی حالت راکھ اور کوئلوں سے ملنے والی اشیا کی تھی۔ ممکن تھا کہ ابھی کئی چھوٹی موٹی چیزیں ملبے میں ہی دفن ہوں پھر یہ امکان بھی تھا کہ حسب عادت اور حسب توفیق پولیس والوں نے کچھ اشیا خورد برد بھی کی ہوں گی۔

میں نے مردہ خانے میں جا کر ناقابل شناخت لاشوں کا معائنہ بھی کیا۔ یہ ایک بڑا ناخوش گوار کام تھا مگر مجھے کرنا پڑا۔ ایس پی ..کٹ بدستور میرے ساتھ تھا۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ میں کس کی تلاش میں ہوں لیکن میں یہ جواب ہوبار ..

کر گیا۔

رات ساڑھے دس بجے کے قریب میں شیر محمد کی حویلی میں واپس پہنچا۔ شفقا بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات تھی۔ میں برسوں شفقا سے دور رہا تھا۔ دنیا کے خطرناک ترین دنوں میں گھرا رہا تھا۔ شب و روز سنگین ترین حالات مجھے درپیش رہے تھے۔ اگر پاگل سی لڑکی میرے ساتھ ہوتی تو سہم سہم کر دم توڑ دیتی۔ میری ذرا سی غیر حاضری جس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ مجھے بار بار موت کے منہ میں دیکھ کر کیونکر زندہ رہ سکتی۔

"اتنی دیر لگا دی بھیا! کہاں چلے گئے تھے؟" وہ ناراضی سے بولی۔

"بس ذرا سرگودھا تک چلا گیا تھا۔ پولیس کے ساتھ بیان وغیرہ درج کرانے تھے۔" میں نے جھوٹ گھڑا۔

میں نے محسوس کیا کہ شفقا کی نگاہیں میرے علاوہ میرے عقب میں بھی دیکھ رہی ہیں۔ شاید وہ توقع کر رہی تھی میرے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔ اس کی توقع اس کی زبان پر نہیں آسکتی تھی لیکن میں اس کے دل کی بات اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا کرتا تھا۔ میں نے غور کیا تھا اسے 'ایک' گھڑی بھی اس کے ساتھ۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑی خبر سینے میں چھپائے پھر رہا ہوں۔ شفقا کے معصوم چہرے پر سجی ہوئی سیاہ آنکھیں جس کی منتظر تھیں وہ لاپتا تھا، وہ کہیں نہیں تھا۔

اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے نام کی بھوک نہیں تھی مگر اس نے مجھے زبردستی بٹھا کر کھانا کھلایا۔ بولی "بھیا، آپ کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

یہ مزاج شناسی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ میرے سر میں واقعی درد ہو رہا تھا۔ وہ سر دبانے لگی۔ اس کی انگلیوں کا لمس میری روح میں اترنے لگا۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں میرے کانوں میں رس گھولنے لگیں۔ بے شک حویلی کے واقعات اندوہناک تھے لیکن شفقا پر ان واقعات کا کوئی بہت زیادہ اثر نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے مہمان خانے کی تباہی و بربادی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی۔ صرف چند روز پہلے حویلی کے واقعات سے بھی بڑھ کر ایک خوف ناک واقعہ شفقا پر گزر چکا تھا۔ وہ ناقابل فراموش لمحات جب میں زریں گل، عالم قریشی اور ... کی بیویوں کی وجہ سے اس قدر مجبور و لاچار ہو گیا تھا کہ شیخ کے بھتیجے کے لیے شفقا کے رشتے پر آمادگی ظاہر کرنا

تھی۔ میں اپنی جان سے پیاری بہن کو لے کر خود شیخ کے گھر پہنچا تھا اور اسے تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔ شفقا نے ایثار کی عمدہ مثال قائم کی تھی اور اس امتحان میں سرخرو ہوئی تھی۔ خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے وہ وقت ہم پر سے ٹال دیا تھا۔ شفقا کی زندگی کا مرجھایا ہوا پھول جان لیوا خزاں کی زد سے نکل آیا تھا۔ اب پھر اس کی مردہ پتیوں میں جان پڑ رہی تھی۔ اس کی باتوں میں شگفتگی آگئی تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس تازہ بہار کے پیچھے پھر زہریلی ہوا کا طوفان نمودار ہو رہا ہے۔ یہ سوچ میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتی تھی کہ اگر واقعی حمزہ کے ساتھ کچھ ہو چکا ہے تو یہ صدمہ شفقا کے لیے کتنا ہولناک ثابت ہوگا۔ طویل غم کے بعد خوشی ملے اور یہ خوشی لمحاتی ثابت ہو کر پھر غم میں بدل جائے تو انسان ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔ کیا شفقا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا تھا؟ میں جانتا تھا کہ چند روز پہلے تک شفقا، ڈاکٹر حمزہ کو صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور یہ پسندیدگی محبت کے رشتے میں نہیں بدلی تھی لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ میں نے اور انجم نے واشگاف الفاظ میں شفقا اور حمزہ کے رشتے کی باتیں کی تھیں بلکہ پانچ چھ روز پہلے جب میرے آپریشن کی تیاری ہو رہی تھی تو میں نے شفقا کو واضح طور پر بتا بھی دیا تھا کہ حمزہ سے اس کے رشتے کی بات ہو رہی ہے اور ہم بہت جلد اس کے ہاتھوں پر مہندی لگانے والے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پیاری باتیں شفقا نے سنی تھیں اور اپنے اندر جذب کی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے سپنے بنے تھے اور اس کے دل میں ارمانوں نے جگہ بنائی تھی اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تھا تو ایک بار پھر ایک مہیب غم کے سائے میری اور شفقا کی زندگی پر پھیلنے لگے تھے۔ وہ مجھے اپنے نرم ہاتھوں سے دباتی رہی، میں سوچتا رہا اور نجانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے روز کے اخبارات میں پھر جھوک ضامن کی حویلی کے بارے میں خبریں موجود تھیں۔ جاگیردار آغا قادر زماں کے جنازے کی تصویر تھی جس میں دو تین وزیروں کے علاوہ پنجاب کے طاقت ور ترین سیاست دان مجتبیٰ کھوکر نے بھی شرکت کی تھی۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق مجتبیٰ کھوکر مسٹری کلارک کے ساتھ دفینے کے چکر میں تھا اور یہ لوگ انڈیا میں تھے۔ اس خبر کے ذریعے مجھے پتا چلا کہ مجتبیٰ پاکستان آگیا ہے۔ جھوک ضامن کے سانحے کے حوالے سے شنکر کا تفصیلی ذکر بھی آیا تھا۔ اخبار نے اس کی ایک پرانی تصویر بھی شائع کی تھی۔ اس قتل عام کا ذمے دار شنکر کو ٹھہرایا جا رہا تھا اور ایک رپورٹر نے بڑی پُرمغز رپورٹنگ کرتے ہوئے لکھا تھا

کہ اگر شیخ عاصم کو رہائی دلانے میں شنکر کو کامیابی نہیں ہوئی اور وہ ابھی تک استاد جمالی کے پاس ہے تو پھر شنکر پاکستان میں ہی رہے گا اور شیخ عاصم کو بازیاب کرانے کی مزید کوشش کرے گا۔ ضلع سرگودھا اور لاہور کے علاوہ پنجاب کے دیگر اہم اضلاع میں بھی پولیس کو شنکر کی طرف سے چوکس کر دیا گیا تھا۔ اسی دوران میں عالم قریشی بھی وہاں آگیا۔ وہ خاصا حیران دکھائی دے رہا تھا۔ کہنے لگا "یار، میں نے ابھی کھیتوں میں اس ملنگ کو دیکھا ہے جسے تم سائیں عالی کہتے ہو۔ اس کے ساتھ وہی خوب صورت ہندو لڑکی بھی تھی۔ سائیں کی طرح وہ بھی بھنگ ملنگوں کے لباس میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا اور ایسی جگہوں سے پھٹا ہوا تھا جہاں سے ہرگز نہیں پھٹنا چاہیے تھا۔ ہر آتا جاتا چور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے کسی کو کبھی کھوٹا سکہ بھی نہیں دیا ہوگا، وہ بھی کھلے دل سے بال بچوں کی خیرات نکال رہے تھے۔ اس ہندو لڑکی نے میرے سامنے بھی ہاتھ پھیلا دیا۔ سائیں بولا "اللہ کے نام پر دے جا سخیا۔ شاہ جنات تیرا بیڑا پار کرے گا۔ تجھے اور تیرے یار کو ساری مشکلوں سے نکالے گا۔" میں نے دس کا نوٹ نکال کر دیا۔ لڑکی بولی "ہم مانگت نہیں ہیں بابو جی۔ صرف ایک وقت کی روکھی سوکھی روٹی کھانی ہے ہیلٹن ہوٹل میں۔ بس پندرہ سو روپے کا سوال ہے۔ اگر یقین نہیں ہے تو خود اپنے ساتھ لے جاؤ ہمیں ہیلٹن ہوٹل میں۔"

میں نے کہا "چلو ہیلٹن بھی لے چلتے ہیں مگر پہلے شاہ جہاں سے تو مل لو۔"

سائیں کہنے لگا "میں اس سے کیوں ملوں۔ وہ خود مجھ سے ملنے آئے گا۔ اسے آنا ہی پڑے گا۔ اسے دفینے کی تلاش ہے اور دفینے کی چابی میرے پاس ہے۔ یہ دیکھو، یہ ہے چابی۔" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا پھر مجھ سے پوچھنے لگا "اچھی چابی ہے نا۔ بالکل ولایتی تالے کی لگتی ہے۔ کس کا دل نہیں چاہے گا کہ اسے جیب میں رکھ لے۔ ایک وہ تمہارا پاگل یار ہے کہ اس کی طرف ہاتھ ہی نہیں بڑھاتا مگر ایک بات وہ بھی اچھی طرح جان لے، جب تک وہ اس چابی کو ہاتھ نہیں لگائے گا اور "اچھی طرح" ہاتھ نہیں لگائے گا، دفینے والا تالا کھلے گا نہیں۔"

میں نے پوچھا "اس میں کیا راز ہے؟"

وہ بولا "کچھ باتیں راز ہی اچھی لگتی ہیں۔ جیسے یہ تمہارا پھولا ہوا پیٹ۔" ہندو لڑکی مسکرانے لگی۔ سائیں نے بڑی سنجیدگی سے میرے پیٹ سے کان لگا دیا پھر مجھ سے پوچھنے لگا

"خوش خبری کب سنا رہے ہو۔" اب بتاؤ بھلا میں اس بات کا کیا جواب دیتا۔

عالم قریشی کی بات مکمل ہوئی تو میں بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا "اب سائیں کہاں ہے؟"

قریشی نے جواب دیا "آرام سے بیٹھ جاؤ اب وہ یہاں نہیں ہے۔ میرے روکنے کے باوجود وہ اپنی چیلی کے ساتھ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر چڑھ گیا تھا اور شیخوپورہ کی طرف نکل گیا تھا۔

وہ سارا دن بھی پریشانی اور کشمکش میں گزر گیا۔ شیر محمد ہماری خوب خاطر تواضع کر رہا تھا لیکن سب کے دل پریشان تھے لہٰذا شیر محمد کی مہمان نوازی بے اثر جا رہی تھی۔ حویلی کی آرائش اور یہاں کے رہن سہن سے شیر محمد کی خوش حالی کی جھلک ملتی تھی۔ حویلی کی اندرونی سجاوٹ مکمل طور پر دیہاتی انداز کی تھی۔ بجلی یہاں موجود تھی مگر شہری محبوب کی طرح اکثر آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھی۔ اس آنکھ مچولی سے نمٹنے کے لیے ہر کمرے میں لالٹین اور گیس لیمپ کا انتظام کیا گیا تھا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ میرا دل سگریٹ کو چاہ رہا تھا لیکن سگریٹ نادارد تھے۔ طلب جب شدید ہوئی تو میں کسی بھی برانڈ کے سگریٹ پینے کو تیار ہو گیا۔ ان دنوں روٹھائن کے سگریٹ عام تھے۔ ان کا ذائقہ قدرے بہتر تھا۔ مجھے یہ سگریٹ شیر محمد کے ایک کارندے چراغ دین کے پاس نظر آئے تھے۔ چراغ دین کی ڈیوٹی گیٹ پر تھی۔ حویلی کا کوئی مستقل چوکیدار نہیں تھا۔ شیر محمد کے کارندوں میں سے ہی کوئی اپنی باری کے مطابق ڈیوٹی سنبھالتا تھا۔ میں گیٹ پر پہنچا۔ وہ گیٹ کے چھوٹے دروازے کے پاس لوہے کی کرسی رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "چراغ دین" وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ دو تین آوازیں دیں لیکن وہ بڑے مزے کی نیند سو رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ کرسی پر بڑے چوکس انداز میں بیٹھا تھا اور ہاتھ ٹریل ٹو رائفل پر تھے۔ اس کی "چوکیداری" پر قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ نکال لیے۔ بعد ازاں بغلی جیب ٹٹول کر ماچس بھی نکال لی۔ وہ بدستور خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے اس کا مزید امتحان لینے کے لیے رائفل پر ہاتھ ڈالا اور بڑی آہستگی کے ساتھ رائفل اس کے ہاتھوں میں سے نکال لی۔ اس کے ہاتھ بدستور اسی پوزیشن میں رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی خیالی رائفل کو پکڑ رکھا ہے۔ مسلح محافظ کا یہ شاندار "احساسِ ذمے داری" میرے لیے یادگار تھا۔ وہ کرسی پر بالکل اٹین شن حالت میں بیٹھا تھا اور سو رہا تھا۔ میں نے ثبوت کے طور پر رائفل اپنے پاس رکھ لی اور سگریٹ کا کش لگاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ مویشیوں والے احاطے کے پاس مجھے دو سائے نظر آئے۔ وہ مجھے دیکھ کر بالکل چوروں کے انداز میں سمٹ کر دیوار سے لگ گئے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں انہیں دیکھے بغیر گزر جاؤں گا لیکن میں انہیں دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے بھی یہ بات نوٹ کر لی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر ان کی طرف قدم بڑھایا تو وہ ایک دم حرکت میں آئے اور بھاگ نکلے۔ میرے پاس بھری ہوئی رائفل تھی' میں نے بیک وقت ان دونوں کا پیچھا کیا۔ ایک سایہ تو بیرونی دیوار پھاند کر بھاگ گیا لیکن دوسرا میری گرفت میں آ گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگایا لیکن میں نے وار لگا کر اسے گرا دیا۔ اب وہ میرے نیچے پوری طرح دبا ہوا تھا اور مچل رہا تھا۔ اس کے جسم میں بجلی سی بھری ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نرمی اور لچک بھی تھی۔ اچانک مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے کسی گداز کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے نیچے دبا ہوا جسم کسی مرد کا نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس شک کی واضح تصدیق ہو گئی۔ میرا مدمقابل بلکی آواز میں کراہا تھا۔ یہ سو فیصد نسوانی آواز تھی۔

میں نے رائفل کی نال اس کی گردن پر رکھ دی "خبردار' جان سے مار ڈالوں گا۔" میں نے اسے دھمکایا۔

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ میں اسے لے کر برآمدے کی طرف آیا۔ یہاں ایک لالٹین کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بیس بائیس سال کی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ اس نے معمولی لباس پہن رکھا تھا اور انداز دیہاتی تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات اور میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔" میرے لہجے میں سختی تھی۔

"میں یہاں ملازم ہوں۔ صفیہ نام ہے میرا۔"

"اور وہ تمہارے ساتھ کون تھا جو بھاگ گیا ہے؟"

"تم کس کی بات کر رہے ہو۔ مم۔ میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔"

میں اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گیا۔ وہ سخت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی "واردات" میں ملوث ہے۔ میں نے دروازہ بند کرنے کے بعد رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔ وہ

بولی "خبردار! اگر مجھے کچھ کہا تو میں شور مچا کر سب کو اکٹھا کرلوں گی۔"

میں نے کہا "تمہارے شور مچانے سے پہلے میں گولی تمہاری گردن سے پار کردوں گا۔ چھ میں قتل کرچکا ہوں' ایک اور ہو جائے گا تو چھتیس پورے ہو جائیں گے۔ یعنی راؤنڈ فگر ۔۔۔ پنجابی میں کہتے ہیں نہ لینڈا بجھلے نہ دینڈا بجھلے۔"

میرے تاثرات نے لڑکی کو مزید خوف زدہ کردیا۔ میرا خیال تھا کہ بھاگنے والا اس کا کوئی آشنا وغیرہ ہوگا مگر تھوڑی ہی دیر بعد یہ خیال غلط ثابت ہوگیا۔

بھاگنے والے کے لیے لڑکی کے منہ سے واحد کے بجائے جمع کا صیغہ نکل گیا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ بولی "مجھے کچھ پتا نہیں وہ کون تھے۔"

میں نے کہا "چلو یہ تو ثابت ہوا کہ وہ ایک سے زیادہ تھے۔ اب لگے ہاتھ یہ بھی بتادو کہ وہ رات کے اس پہر یہاں کون سی بے بے کی فاتحہ پڑھنے آئے تھے؟"

وہ ہکلائی "تمہیں اللہ کا واسطہ ہے مجھے جانے دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی۔"

میں نے کہا "میں یہی تو پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیا نہیں کرو گی۔"

وہ منتیں سماجتیں کرنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ اگر مجھے سچ سچ بتادے گی تو میں یہ بات صرف اپنے تک رکھوں گا۔ وہ خاصی چالاک تھی' اسے میرے وعدے پر بالکل یقین نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر وہ مجھے سچ بتادے گی تو پھر میں اس کے لیے کوئی گنجائش نکال لوں گا۔ کافی دیر تذبذب میں رہنے کے بعد آخر کار اس نے زبان کھول دی۔ کہنے لگی۔

"چوہدری صاحب! ادھر اڈے میں کئی مہینوں سے ٹریکٹر کا ایک بے کار انجن پڑا ہوا ہے۔ کسی کام کا نہیں ہے جی۔ میرا دیور تنویر موٹر مکینک کا کام کرتا ہے۔ اس پر بڑی تنگی کا وقت آیا ہوا ہے جی۔ بیوی بیمار ہے۔ مکان سیلاب میں گر گیا تھا۔ بے چارے کو روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے کہیں یہ انجن دیکھا تھا۔ مجھ سے ہر وقت کہتا رہتا تھا کہ میں چوہدری صاحب سے کہہ کر اسے یہ انجن لے دوں۔ مجھے چوہدری صاحب سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ بس جی۔۔۔ میری مت ماری گئی۔ میں نے سوچا کہ انجن بے کار ہی تو پڑا ہوا ہے۔ کسی دن کوئی اٹھا کر لے جائے گا تو کیوں نہ ہمارے کام آجائے۔ میں نے تنویر سے کہا کہ وہ رات کو ریڑھا لے کر آئے اور انجن رکھ کر لے جائے۔ وہ میرے کہنے پر ہی آیا تھا جی ورنہ اس کی اتنی ہمت کہاں کہ یوں حویلی میں آجاتا۔"

میں نے پوچھا "اس کے ساتھ کون تھا؟"

"دو دوست تھے جی اس کے۔ کوئی غیر بندہ نہیں تھا' ہمارے ہی محلے کے لڑکے تھے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے لڑکی کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سچ نہیں بول رہی یا پھر آدھا سچ بول رہی ہے۔ اس کی ساری قمیص گوبر میں لتھڑی ہوئی تھی۔ جب میں نے مویشیوں کے احاطے کے پاس اسے دبوچا تھا تو وہ پہلو کے بل گر گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پہلے قمیص صاف کرے' میں پھر اس سے بات کرتا ہوں۔

وہ بولی "اور بات کیا کرنی ہے چوہدری صاحب۔ جو بات تھی وہ میں نے آپ کو بتادی ہے۔"

میں نے کہا "میری ناک سڑی جارہی ہے' تم پہلے اپنی قمیص تو صاف کرو۔"

کمرے کے اندر ہی ایک چھوٹا سا گھڑا بنا ہوا تھا۔ یہاں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور ڈونگا وغیرہ پڑا رہتا تھا۔ اس نے پانی ڈال کر قمیص اور سر دھولیا۔

میں نے ایک بار پھر اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ جو کچھ بتا چکی تھی اس کے سوا کچھ نہیں بتایا۔ ساتھ ساتھ وہ میری ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ وہ کافی تیز طرار لڑکی تھی۔ چوہدریوں اور بڑے زمینداروں کی حویلیوں میں کام کرنے والی ایسی لڑکیاں ایک "خاص حد" تک جانے کے لیے تیار رہتی ہیں اور اگر ضرورت پڑے اور انہیں اس میں فائدہ نظر آئے تو وہ ہر حد پار کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں۔ یہ صفیہ نامی لڑکی بھی کچھ اسی رنگ ڈھنگ کی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی باتوں سے لگاوٹ کا اظہار کرنے لگی۔ بزبانِ خاموشی وہ مجھے یہ سمجھا رہی تھی کہ اگر میں اس کی کارستانی کے بارے میں چوہدری شیر محمد کو نہ بتاؤں تو وہ میری چرپات بننے کو تیار ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا لباس نہایت غریبانہ تھا۔ پیلی سی سوتی قمیص تھی جس پر ایک آدھ پیوند بھی لگا ہوا تھا۔ پاؤں میں پلاسٹک کی چپل تھی۔ اوڑھنی نہایت خستہ حال تھی۔ اس کا لباس بھیگنے کے بعد اس کے جسم کو نمایاں کرنے لگا تھا بلکہ شاید وہ جان بوجھ کر اسے نمایاں کررہی تھی۔ یکبارگی مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ غربت یا حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے کتنا ارزاں کرلیا تھا خود کو۔ اپنے بقول وہ ایک معمولی سی چوری کرنے

جارہی تھی۔ اب اس چوری کو چھپانے کے لیے وہ اپنا آپ میرے سپرد کرنے کو تیار تھی۔ یہ کچے مکانوں کی مجبوری تھی اور عالیشان حویلیوں کا جبر تھا۔ یہ بھوک کی لاچاری تھی اور اناج سے بھرے ہوئے گوداموں کا اختیار تھا۔ بے شک وہ چالاک تھی مگر اس چالاکی سے اس نے کیا حاصل کیا تھا اور مستقبل میں کیا حاصل کرسکتی تھی۔ اس نے اپنی معمولی شکل اور معمولی عقل کے ساتھ غالباً ساری زندگی اسی خستہ حال قصبے میں رہنا تھا۔ بھینسوں کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اُپلے تھاپنے تھے اور چوہدریوں کے میلے کپڑے دھونے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ آدھا سچ بول رہی تھی' اس کے باوجود میں نے اسے جانے دیا۔ درحقیقت میں نے اس معاملے میں دلچسپی صرف اس لیے لی تھی کہ میں اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے بے حد محتاط تھا۔ اس حویلی میں ہونے والی کوئی بھی پُراسرار سرگرمی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے صفیہ نامی اس لڑکی کو جس مقام سے پکڑا تھا' وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر شیخ عاصم اور غزالہ کا کمرا تھا۔ سایوں کی نقل و حرکت دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک دم اندیشے پیدا ہوگئے تھے اور میں شیخ اور غزالہ کی طرف سے فکرمند ہوگیا تھا۔ بہرحال لڑکی سے ملنے اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ کوئی ایسا "سیریس" معاملہ نہیں ہے۔

اس رات بھی میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ جو تھوڑی بہت نیند آئی بھی' وہ اندیشوں اور تفکرات سے بھرپور تھی۔ چوکیدار چراغ دین کی جیب سے نکالے ہوئے تمام سگریٹ میں نے پھونک دیے۔ صبح میں نے ماچس اور رائفل چراغ دین کو واپس کردی۔ پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ شیر محمد سے چراغ دین کی شکایت کروں گا مگر رات ملازمہ صفیہ کے رویے سے مجھے اندازہ ہوا کہ شیر محمد ملازموں کے حوالے سے بڑا سخت ہے لہٰذا میں نے خود ہی چراغ کو سرزنش کرکے بات ختم کردی تھی۔ صبح کے وقت میں اخبار دیکھ رہا تھا جب شفقا بھاگی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس نے بتایا کہ انجم کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ میں نے جا کر دیکھا' انجم تکلیف سے بے حال ہورہی تھی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر پسینہ تھا اور ضبط کی شدت نے اس کا رنگ ہلدی کر رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور کراہتے ہوئے بولی "حمزہ کو بلادیں۔۔۔ پلیز! اسے بلادیں۔"

مجھے یاد آیا کہ لاہور والے مکان میں ڈاکٹر حمزہ ہی انجم کا علاج کرتا رہا تھا اور وہ اس پر بے پناہ اعتماد کرتی ہے۔ اب تکلیف کی شدت میں اسے ڈاکٹر حمزہ کی کمی پہلے سے زیادہ محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کہا "اچھا انجم! میں ابھی حمزہ کا پتا کراتا ہوں۔" اسے تسلی تشفی دے کر میں کمرے سے باہر آگیا۔

شفقا میرے پیچھے ہی پیچھے آئی تھی۔ کہنے لگی "بھیا! اُدھر لاہور میں بھی ایک روز انجم باجی کی حالت بالکل ایسی ہی ہوگئی تھی۔ بار بار حمزہ کا نام لے رہی تھی لیکن وہ لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انکل ساہی نے دو تین ڈاکٹر بلوائے تھے لیکن انجم باجی کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہوتی تھی۔ حمزہ آئے تھے تو ان کی طبیعت سنبھلی تھی۔"

میں نے کہا "لیکن اس وقت میں حمزہ کا انتظام کہاں سے کروں۔"

شفقا کی پلکیں لرزیں اور پھر جھک گئیں "کیا کہیں دور گئے ہوئے ہیں وہ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! ذرا دور ہی گیا ہوا ہے۔"

"فون وغیرہ نہیں ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔"

"اب کیا ہوگا بھیا!" انجم کے لیے شفقا کی آنکھوں میں گہری پریشانی تھی۔

"اچھا میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی اچھا ڈاکٹر مل جائے۔" میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ غزالہ بھی تو ڈاکٹر ہے۔ ایسے دور دراز قصبے میں عام ڈاکٹر کا ملنا بھی دشوار ہوتا ہے اور غزالہ تو پھر ہائلی کوالیفائڈ تھی۔ یہ چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی' ڈاکٹر گھر میں تھا اور میں سوچ کے گھوڑے دور دور تک دوڑا رہا تھا۔ میں نے زریں گل کو بھیجا کہ وہ ڈاکٹر غزالہ کو بلا لائے۔ زریں گل گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ غزالہ مصروف ہے۔ شیخ عاصم کے کندھے کے اندر فریکچر ہوچکا ہے اور وہ کندھے میں تکلیف محسوس کررہا ہے۔ غزالہ اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد زریں گل کو پھر بھیجا اور زریں گل کی زبانی غزالہ سے کہلوایا کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے آکر انجم کو دیکھ جائے۔ زریں گل نے واپس آکر بتایا کہ وہ بس آرہی ہیں۔

قریباً دس منٹ مزید گزر گئے۔ غزالہ نہیں آئی۔ میرا انتظار غصے میں بدلنے لگا۔ انجم تکلیف میں تھی اور ایک ایک پل گن کر گزار رہی تھی۔ انتظار نے طول کھینچا تو میں خود اس کمرے میں گیا جہاں غزالہ اور شیخ عاصم کو ٹھہرایا گیا تھا۔

میری ہدایت پر زریں گل یہاں مسلسل پہرا دے رہا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ شیخ عاصم کی کسی بھی ہوشیاری یا چالبازی کا منہ توڑ جواب دیا جائے اور فوری کارروائی کی جائے۔ زریں اب بھی دروازے کے قریب چوکس کھڑا تھا۔ میں نے کمرے میں جھانکا تو شیخ عاصم ایک طویل نشست والی کرسی پر نیم دراز نظر آیا۔ اس نے قمیص اتار رکھی تھی۔ اس کا جسم کسی جنگلی جانور کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ غزالہ نے اس کے کندھے پر سفید پٹی سے بینڈیج کر رکھی تھی۔ اس کی ناک اور پیشانی پر بھی دوا لگی ہوئی تھی۔ غزالہ نے شیخ کے پاؤں ایک پرات نما برتن میں رکھے ہوئے تھے اس برتن میں گرم پانی کے علاوہ روئی کے ٹکڑے بھی تیر رہے تھے۔ وہ بڑی محبت سے شیخ عاصم کے ورم زدہ پاؤں پر ٹکور کر رہی تھی۔ شیخ نے بڑے سکون کے عالم میں آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

یہ منظر میری آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گیا۔ ادھر انجم درد سے تڑپ رہی تھی اور یہاں غزالہ شوہر کے پاؤں کو ٹکور کرنے میں مصروف تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس گھڑی مجھے شیخ عاصم کے ساتھ ساتھ غزالہ پر بھی طیش آیا۔ میں نے کہا "بہت افسوس کی بات ہے غزالہ۔ تمہیں اپنا صرف "بیوی ہونا" یاد ہے' باقی سب کچھ بھول چکی ہو۔ شاید تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔"

غزالہ نے بجھی بجھی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لفظ کہے بغیر وہ کمرے سے نکلی اور انجم کی طرف چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے آیا۔ وہ بڑے دھیان سے انجم کا معائنہ کرنے میں مصروف ہوئی "ہلکا سا بخار بھی ہے۔" اس نے پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ میں اس نے معائنہ مکمل کر لیا پھر خاموشی سے نسخہ لکھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور شاید سوجی ہوئی بھی ہیں۔ غالباً روتی رہی تھی وہ۔ اس نے نسخہ شفتا کو تھمایا اور دواؤں کے بارے میں ضروری ہدایات دینے لگی "یہ اوپر والا انجکشن سب سے ضروری ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے منگوالیں۔ انجکشن آئے تو مجھے فوراً بتا دیں۔ میں آ کر لگا دوں گی۔"

وہ جتنی خاموشی سے آئی تھی' اتنی ہی خاموشی سے واپس بھی چلی گئی۔ واپس جاتے ہوئے وہ میرے قریب سے گزری' میں نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی نہ ہی اس نے نگاہ اٹھانے کی ضرورت سمجھی۔ بالکل قریب ہونے کے باوجود ہم ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر تھے۔

غزالہ کی لکھی ہوئی دوائیاں شیخوپورہ سے ملیں۔ بہرحال ان کے استعمال سے انجم کی تکلیف جو برداشت سے باہر ہو رہی تھی' برداشت کی حد میں آ گئی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں گاہے گاہے ڈاکٹر حمزہ کو یاد کر رہی تھی۔ جتنی بار وہ ڈاکٹر حمزہ کو پکارتی تھی' شفتا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے شفتا اور انجم کو خود بتایا تھا کہ حمزہ کو میں نے ہی کسی کام سے بھیج رکھا ہے اور وہ جلد ہی یہاں پہنچ جائے گا۔ اب اس راتے کو خاصی دیر گزر چکی تھی لیکن حمزہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔

وہ ساری رات میں نے سوتے جاگتے گزاری۔ ایک تو ذہن حمزہ کی طرف سے پریشان تھا' دوسرے رہ رہ کر نگاہوں میں شیخ عاصم کا منحوس چہرہ آ رہا تھا۔ وہ بدبخت کتنی تسلی سے آرام کرسی پر نیم دراز تھا اور غزالہ اسے گرم پانی کی ٹکور کر رہی تھی۔ ایک بار پھر میرے سینے میں وہی اتھل پتھل مچ رہی تھی جو چند روز پہلے جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں مچی تھی۔ اس اتھل پتھل کے نتیجے میں' میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں شیخ عاصم کو بند کیا گیا تھا۔ میں نے شیخ عاصم کو "دست کشائی" کی دعوت دی تھی اور پھر اسے مار مار کر لہو لہو کر دیا تھا۔ اسی دوبدو لڑائی کے زخم تھے جو شیخ ابھی تک چاٹ رہا تھا۔ اب ایک بار پھر میرے دل میں شیخ عاصم کے خلاف غم و غصہ تیز ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر شیخ پر پل پڑوں اور اس کے بدکار جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تیر محمد کے کتوں کو کھلا دوں۔ میں غصیلا یا شعلہ مزاج شخص نہیں تھا۔ مجھے اس بات پر فخر تھا کہ میرے اندر برداشت کا مادہ موجود ہے۔ اس برداشت اور تحمل کی بدولت میں بڑے بڑے مراحل سے سرخرو ہو کر گزرا تھا اور اب بھی گزر رہا تھا لیکن شیخ عاصم ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی شیطانیت' سفاکی اور عداوت کے زور سے میری برداشت میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اس نے میری تحمل مزاجی اور اعتدال پسندی کو قدم قدم پر روندا تھا اور مجھے ایسے سانحوں سے گزارا تھا جو پتھر کے انسان کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں۔ کون سی ایسی قیامت تھی جو اس نے مجھ پر نہیں توڑی تھی اور توڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے میری عداوت میں درندگی کی انتہا کو چھوا تھا اور یقیناً آئندہ بھی چھونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایسے شخص کے لیے میں رحم'

اعتدال پسندی اور برداشت کے جذبات لاتا تو کہاں سے لاتا۔ جب میں اس کی قید میں تھا تو اس نے مجھ پر ہر ستم روا رکھا تھا' آج وہ میری دسترس میں تھا اور چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑوں گا اور میرے سینے سے ابلنے والا لاوا شیخ کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا غزالہ میرے ہاتھوں سے اپنے شوہر نامدار کا قتل برداشت کر لیتی۔ میرے دماغ کی نسیں جیسے پھٹنے لگیں۔

انتقامی جذبے کی شدت انتہا کو پہنچی تو میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ میں کیوں اس انداز میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ عاصم میری قید میں تھا' میرے رحم و کرم پر تھا۔ اگر میں بھی اس کی بے بسی و لاچاری سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیتا تو کیا فرق رہ جاتا' میرے اور اس کے درمیان۔ میرا دل چاہا کہ شیخ عاصم کو اپنی نگاہوں سے دور کر دوں۔ اتنی دور کہ نہ اس کی صورت مجھے نظر آئے نہ آواز کانوں میں پڑے اور نہ مجھے اس کے اور غزالہ کے حالات کی کچھ خبر ہو سکے۔ یہ شیخ عاصم اور غزالہ کے "حالات" ہی تو تھے جو بار بار میری آنکھوں کا عذاب بنتے تھے اور میرے دل پر ستم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال وہ منظر تھا جو آج میں نے دیکھا تھا۔ غزالہ اپنے شوہر نامدار کی خدمت گزاری میں مصروف تھی۔ وہ شوہر جو ایک بھوسے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک ایسا نقاب تھا اس شوہر کے چہرے پر جس کے پیچھے ایک خونخوار درندے کے نقوش پوشیدہ تھے۔ میں ان نقوش کو اچھی طرح پہچانتا تھا لیکن غزالہ نہیں پہچانتی تھی اور یہی ہم دونوں کی زندگیوں کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

ایک دم میں چونک گیا۔ عالم قریشی نے عقب سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا "کیا سوچ رہے ہو تجن پیارے۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"کچھ نہیں۔ ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"ہاں۔ یہ سوچ تو میرے دماغ میں بھی دن رات گھسی ہوئی ہے لیکن اب اس کے ساتھ ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی ہے' اسی بارے میں بات کرنے کے لیے آیا تھا۔"

"کیسی پریشانی؟"

"یار! یہ زریں گل اندر سے بالکل آگ کی طرح گرم ہے۔ مجھے اس کی طرف سے ڈر لگا رہتا ہے۔ کہیں یہ کوئی کام نہ دکھا جائے۔"

"میں سمجھا نہیں!؟"

"موہن داس کے قتل کے بعد بھی تم کچھ نہیں سمجھے ہو۔ جس طرح اور جس انداز میں اس نے موہن داس کا "بولو رام" کیا ہے' اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ شنکر اور شیخ عاصم کے خلاف بھی غم و غصے سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر پٹھانی خون ہے اور تمہیں پتا ہی ہے کہ پٹھانی خون غیرت کی آگ پر جوش کھا جائے تو اتنی آسانی سے ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ زریں کے خون نے بھی غیرت کی آگ پر جوش کھا رکھا ہے۔ مجھے کئی بار یہ شبہ ہوا ہے کہ زریں شیخ عاصم کو نقصان پہنچانے کے چکر میں ہے۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ تم نے اسے ہی شیخ کی پہرے داری پر بھی لگا رکھا ہے۔"

میں نے کہا "یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے دل میں کتنا بھی غم و غصہ ہو' وہ میری مرضی کے بغیر نہیں چلے گا۔"

"جب اس نے موہن داس کو قتل کیا تو کیا اس میں تمہاری مرضی شامل تھی؟"

"موہن داس کی بات اور تھی۔ شیخ' غزالہ کا شوہر ہے اور زریں گل غزالہ پر جان چھڑکتا ہے۔"

"جان تو تم بھی غزالہ پر چھڑکتے ہو۔ کیا تمہارا دل چاہتا ہے کہ شیخ عاصم زمین پر دندناتے اور ظلم ڈھانے کے لیے زندہ رہے؟"

عالم قریشی کی بات میں وزن تھا۔ میں نے خود بھی ایک دو بار محسوس کیا تھا کہ شیخ عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے زریں کی نگاہیں شعلہ بار ہو جاتی ہیں۔ ڈیفنس کے تہ خانے میں زریں اور اس کی محبوب بیوی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' وہ زریں کے دماغ میں کسی میخ کی طرح گڑا ہوا تھا۔ اس دلدوز واقعے کے تین اہم کردار تھے۔ ایک شیخ عاصم' دوسرا شنکر اور تیسرا موہن داس۔ موہن داس کو تو زریں جان سے مار چکا تھا مگر شیخ زندہ تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ کسی وقت بھی زریں کا دماغ الٹ سکتا تھا اور وہ شیخ کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر میرا دھیان اپنی طرف چلا گیا۔ میں اس حوالے سے کون سا نیک تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں خود بھی شیخ عاصم کے بارے میں نہایت سنگین انداز میں سوچ رہا تھا۔

میں نے کافی دیر اس معاملے پر غور و خوض کیا۔ دیکھا جاتا تو اب شیخ عاصم کو اپنی تحویل میں رکھنے سے مجھے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ الیکٹرانک ڈیوائس کو REMOVE کرانا تھا اور یہ کام بخوبی ہو چکا تھا۔ میرے آپریشن میں حصہ لینے والے دونوں سرجن صاحبان وطن واپس جا چکے تھے۔ مسز کاشی اپنی نوجوان محبوب کے ساتھ

ملازم کو کیو ہو چکا تھا۔ ان تینوں ماہرین نے آپریشن کے لیے خطیر معاوضہ لیا تھا۔ صرف مسٹر "ہیرولڈ" کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالر سے زائد تھا۔ یہ سارے اخراجات شیخ عاصم کی زیر نگرانی چلنے والی ایک برطانوی فرم نے برداشت کیے تھے۔ میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ کیوں نہ غزالہ سے کہوں کہ وہ شیخ عاصم کو لے کر چلی جائے۔ میری نظر سے بہت دور اور میرے ذہن سے بھی بہت دور اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غیظ و غضب سے بھی بہت فاصلے پر۔ اگر میرے ہاتھوں یا زریں گل کے ہاتھوں شیخ عاصم کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔ وہ ہزار بار پھانسی دیے جانے کے لائق تھا لیکن غزالہ کا شوہر تھا لہٰذا میں اس کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا تھا۔

میں نے فوری فیصلہ کیا اور شیخ عاصم کے پاس جا پہنچا۔ یہ اس دیہاتی طرز کی حویلی کا ایک نیم پختہ کمرا تھا۔ بہرحال اندر سے اسے آرام دہ بنایا گیا تھا۔ اسپرنگ دار ڈبل بیڈ 'الماری' ٹیلی وژن 'صوفہ سب کچھ یہاں موجود تھا۔ شیخ عاصم سو رہا تھا۔ غزالہ صوفے پر نیم دراز تھی اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پرانا اخبار دیکھ رہی تھی۔

میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا "غزالہ! شیخ عاصم کو جگاؤ۔"

"وہ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ اگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" میں نے بے رخی سے بات کاٹی "یہ اتنا بیمار نہیں 'جتنا تم پریشان ہو رہی ہو۔ اٹھاؤ اسے۔"

میری بلند آواز سن کر شیخ خود ہی جاگ گیا۔ وہ پہلے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ آن کر دیا "کیا بات ہے؟" اس نے حسب عادت رعب دار آواز میں پوچھا۔

میں نے کہا "تم دونوں جانے کی تیاری کرو۔ صبح تم یہاں سے روانہ ہو رہے ہو۔"

"کہاں؟" وہ منہ پھاڑ کر بولا۔

"جہاں تمہارا دل چاہے۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔"

وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "یقیناً یہ تمہاری کوئی چال ہے۔ کہیں پولیس والوں کی طرح ہمیں چھوڑ کر مقابلے میں مار کرنا تو نہیں چاہتے ہو۔ تمہارے ملک میں یہ رواج کافی دیکھا ہے میں نے۔"

میں نے کہا "مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں مار کر گاڑ دوں تمہیں تو کوئی قیامت تک ڈھونڈ نہیں سکتا اور اگر انتقام لینا چاہوں تو بھی وہ برے سے برا سلوک تم سے کر سکتا ہوں جو تمہارے تصور میں آسکتا ہے لیکن یہ میرا منشا نہیں ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔"

عاصم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا "صبح تیار ہو جانا۔ تمہیں گاڑی مہیا کر دی جائے گی۔ شیر محمد کا ڈرائیور تمہیں لاہور چھوڑ دے گا یا لاہور سے پہلے جہاں بھی تم اترنا چاہو۔" عاصم خاموش رہا۔ میں نے ذرا توقف کر کے کہا "لیکن ایک بات یاد رکھنا عاصم! اگر تم پھر میری طرف چلو گے تو میں تمہیں صرف استاد جہانی کی حیثیت سے ملوں گا اور جو لوگ استاد جہانی کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ میرے اس فقرے کا مطلب کیا ہے۔ تمہیں باعزت طریقے سے پیچھے ہٹنے کا موقع دے رہا ہوں حالانکہ تم ہرگز اس قابل نہیں ہو۔ میرے خیال میں میں اپنی بات کہہ چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کل میں پھر تمہاری صورت یہاں دیکھوں۔"

میری نگاہ غزالہ پر پڑی۔ وہ پتھر کے بت کے مانند ساکت کھڑی تھی۔ میرے لہجے کی اجنبیت اس پر بے طرح اثر انداز ہوئی تھی۔

O☆O

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ جب شیر محمد کا ملازم عاصم اور غزالہ کے لیے کھانا لے کر گیا تو واپسی پر اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب مجھے بلا رہی ہیں۔ میں اس وقت حمزہ کی تلاش کے بارے میں عالم قریشی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے ملازم کے ہاتھ کہلوا بھیجا کہ میں فارغ نہیں ہوں۔ اگر انہوں نے کوئی پیغام دینا ہے تو ملازم کے ہاتھ دے دیں۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے مجھے آ کر بتایا کہ کل صبح ڈاکٹر صاحب اور ان کے شوہر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ گاڑی کا انتظام کروا دیا جائے' اس کے علاوہ انہوں نے درد روکنے کے چند انجکشن بھی منگوائے ہیں۔

میں نے نسخے پر انجکشن دیکھے۔ یہ درد روکنے والے انجکشن تھے اور ان میں ایک انجکشن نیند کا بھی تھا۔ کندھے کے درد کی وجہ سے شیخ عاصم ساری ساری رات جاگتا رہتا تھا۔

اور وہ جدائی کی رات تھی۔ علی الصباح غزالہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔ یقیناً پہلے وہ لاہور جا رہی تھی پھر ممکن تھا کہ وہ سری لنکا چلی جاتی یا پھر امارات۔۔۔ یا کسی اور دور دراز ملک میں۔ یوں

لگتا تھا کہ اب میرے اور اس کے درمیان کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ میرے اور غزالہ کے درمیان محبت کا رشتہ تھا جو اب ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح میرے اور شیخ کے درمیان دشمنی کا رشتہ تھا اور وہ بھی اب کمزور پڑ گیا تھا۔ کم از کم میری طرف سے تو دشمنی ضرور کمزور پڑ گئی تھی۔ میرے جسم سے زہر ایک ڈوا کس نکل چکا تھا اور اب مجھے شیخ عاصم سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہاں شیخ کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کے جذبۂ عداوت پر بہار ہے یا خزاں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے چہرے سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میری طرف سے تو شیخ عاصم ہمیشہ کے لیے الوداع تھا' ہاں اگر اس کی دشمنی پھر میرے سامنے لے آتی تو یہ اور بات تھی۔

میں کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ یہ ایک خاموش دیہاتی رات تھی۔ ستمبر اکتوبر کا موسم تھا' شہروں میں تو یہ مہینے خنک نہیں ہوتے لیکن دیہات کی کھلی فضا میں اکتوبر کے دنوں میں ٹھنڈک محسوس کی جاتی ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت' زخم کی طبیعت اب کچھ بہتر تھی لیکن وہ ڈاکٹر حمزہ پر اس قدر نثار رہتی تھی کہ مسلسل اسے یاد کیے جا رہی تھی۔ میں مسلسل اسے ٹال رہا تھا اور جتنی مرتبہ ٹالتا تھا' اتنی مرتبہ ذہن پر بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ حمزہ کے بارے میں سوچتا تھا تو ذہن عجیب ہی دائرے میں گھومنے لگتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس ایسے کو اب تین چار دن گزر چکے تھے۔ کم از کم دس لاشیں ناقابل شناخت رہی تھیں اور انہیں ایسے ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ کیا پتا تھا کہ ان میں سے ایک لاش اس خوش خلق نوجوان کی ہو جس کے نام کا عکس میں نے شنا کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور جسے مسیحا کی حیثیت سے انجم پکار رہی تھی۔

مجھے کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ حویلی کے صحن میں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایک بڑے چھپر تلے چند بھینسیں خاموشی سے کھڑی تھیں۔ ان کے منہ چل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی پریشان کن سوچ کی جگالی کر رہی ہیں۔ میں نیم پختہ سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کی چھت پر آ گیا۔ یہ حویلی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن صحن کافی وسیع تھا۔ چاند کی روشنی کچے پکے مکانوں کو مختلف زاویوں سے روشن کر رہی تھی اور قصبہ دور دور تک لوٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پشت پر باندھے اور چھت پر ٹہلنے لگا۔ کافی دیر ہوا خوری کرنے کے بعد میں جیسے واپس آیا تو ایک سائے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ ایک نسوانی سایہ تھا اور بڑی آہستگی سے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا میرے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ میں سیڑھیوں میں اس طرح بیٹھ گیا کہ صرف میرا سر سیڑھیوں کے پردے سے اوپر رہا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا' سایہ کمرے کے دروازے کے عین سامنے پہنچ کر رک گیا۔ بے شک وہ غزالہ تھی۔ اس کی قمیص کے سفید پھول مدھم روشنی میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درحقیقت میں نے اسے لباس سے ہی پہچانا تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے پاس رکی رہی پھر یوں لگا کہ دستک دینے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہے لیکن دستک کی آواز نہیں آئی۔ غالباً اس نے ہاتھ دروازے تک پہنچانے کے بعد روک لیا تھا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ غزالہ میرے کمرے کے سامنے کھڑی تھی اور اس خاموش رات کی تنہائی میں مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ شاید جانے سے پہلے آخری بار مجھ سے ملنا چاہتی تھی یا اپنے اور شیخ عاصم کے حوالے سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی تھی۔ کچھ بھی تھا بہرحال یہ سب کچھ بالکل غیر متوقع تھا۔ میں اپنے ذہن میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ غزالہ اور شیخ عاصم کو ان کے حال پر چھوڑ دوں گا۔ میرا کام غزالہ کو صورت حال سے آگاہ کرنا تھا۔ اب وہ اپنے اچھے برے کی خود ذمے دار تھی۔

چند لمحے دروازے کے قریب کھڑے رہنے کے بعد غزالہ واپس مڑ گئی۔ میں نے اس کی سیاہ اوڑھنی کا چمکیلا کنارہ چاندنی کی کرن میں دمکتے دیکھا۔ اس نے چار پانچ قدم بے دلی سے اٹھائے اور پھر رک گئی۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آ رہی تھی۔ حرکات و سکنات سے نہایت نمایاں کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ پھر دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ دستک کے لیے اٹھتے دیکھا لیکن دستک پھر ندارد تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کم و بیش چار مرتبہ اپنا ہاتھ دستک کے لیے اٹھایا اور گرا دیا۔ آخر ایک نہایت مدھم دستک کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت کو دروازے سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ یہ بڑی عجیب سچویشن تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اور میں پہلے ہی کمرے سے باہر تھا۔ نہ صرف باہر تھا بلکہ اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ پہلی دستک کے بعد وہ قریباً ایک منٹ تک ساکت کھڑی رہی پھر اس نے دوسری دستک دی۔ یہ پہلی سے قدرے بلند تھی لیکن اس مرتبہ بھی ظاہر ہے کوئی جواب نہیں ملا۔ وقفے وقفے سے اس نے تین چار بار "ناک" کیا۔ آخر مایوس ہوئی

اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا صرف پھنسا ہوا تھا۔ اگر وہ ذرا سا زور لگا کر دھکیلتی تو وہ کھل جاتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ برآمدے کی مدھم روشنی میں پتھر کی مورتی کی طرح ساکت کھڑی رہی۔ وہ جیسے کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ تو رو رہی ہے۔ میں نے اس کی مدھم سسکیوں کی آواز سنی۔ یہ آواز دھیرے دھیرے بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ان سسکیوں میں ایک منہ زور درد لہریں لیتا محسوس ہوتا تھا۔

میں جھنجلا کر رہ گیا۔ وہ کیوں کر رہی تھی ایسا۔ اگر وہ مجھ سے ملنا ہی چاہتی تھی تو پھر ذرا زور سے دروازے پر دستک دے سکتی تھی یا مجھے آواز دے کر ہی بلا سکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود بھی آدھے دل سے کوشش کر رہی تھی۔ مجھ سے ملنا چاہتی بھی تھی اور نہیں بھی۔ اب اس نے دستک دینے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا تھا اور روتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سسکیاں بتدریج ہچکیوں میں بدل گئیں اور ہچکیاں اتنی بلند ہو گئیں کہ کافی فاصلے تک صاف سنی جانے لگیں۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ حویلی کے گیٹ سے باہر موجود چوکیدار یہ رونا دھونا سن کر اندر نہ آ جائے یا حویلی کا کوئی مکین کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نہ جھانکنے لگے۔ وہ میرے کمرے کے دروازے سے لگ کر رو رہی تھی۔ یہ آواز خاصی بلند تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں کمرے میں موجود ہوتا اور بہت گہری نیند نہ سویا ہوتا تو یہ آواز مجھے جگا سکتی تھی۔

کہتے ہیں کہ عورت کے آنسو مرد کے دل پر براہ راست اثر کرتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں آج غزالہ کے آنسو میرے دل پر اثر نہیں کر رہے تھے۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ روتے روتے غزالہ کی آواز ایک دو بار خاصی بلند ہو گئی۔ شاید وہ اپنی زبان سے میرا نام پکارے بغیر مجھے بلانا چاہ رہی تھی۔ بالفاظ دیگر آنسوؤں کی زبان میں مجھے پکار رہی تھی۔ وہ ایک نہایت باوقار، ڈاکٹر اور خوش اطوار عورت تھی۔ وہ جس جذباتی رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ یہ ہیجان کا کوئی اندرونی دھارا تھا جو اسے بہا کر لے گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلی گئی۔ کمرے کے سامنے برآمدے میں اور صحن میں دور تک خاموشی چھا گئی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ چند منٹ بعد میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ غزالہ واپس آ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ میں ٹھیک سے دیکھ نہ سکا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ بمشکل چند سیکنڈ رکنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میں سہتے ہوئے قدموں سے نیچے اترا۔ دروازے کے سامنے جیسے ابھی تک غزالہ کے جسم کی خوشبو بسی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ بلب روشن کیا تو فرش پر کوئی چیز دیکھ کر چونک گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا لفافہ تھا۔ لفافے میں کوئی ڈائری نما چیز تھی۔ میں نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یہ ایک البم تھا۔ اس کارڈ سائز البم میں بہت سی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میں بری طرح چونک گیا۔ اس البم میں سب کی سب تصویریں میری تھیں۔ شروع سے آخر تک میں ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی نادر تصویریں اس میں موجود تھیں۔ سب سے پہلی تصویر شاید اس وقت کی تھی جب میری عمر صرف دو تین ہفتے تھی۔ اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر میں میں اپنی والدہ کی گود میں نظر آ رہا تھا۔ ایک اور تصویر چند ماہ بعد کی تھی اس میں میرے دادا نے مجھے اپنے سینے پر لٹا رکھا تھا اور قریب ہی صاحب بیٹھے کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ قریباً ایک درجن نایاب تصویریں تھیں۔ غزالہ نے یہ کہاں کہاں سے اور کیسے جمع کی تھیں۔ یہ جیسے کونوں کھدروں میں بکھری ہوئی میری وہ زندگی تھی جو آج تک نظروں سے اوجھل تھی۔ اس کے بعد میرے لڑکپن کی تصویریں تھیں۔ ان بلیک اینڈ وائٹ تصویروں نے میرے سامنے میرے لڑکپن کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ کئی بھولے بسرے چہرے یاد آئے اور کئی دھندلائی ہوئی یادوں پر وقت کی گرد صاف ہوئی۔ یقیناً یہ میرے لیے ایک گراں قدر البم تھا۔ اس البم میں میری آخری تصویر صرف دو ماہ پہلے کی تھی۔ یہ زریں گل کے ولیمے کی تصویر تھی۔ اس میں شیخ عاصم اور عالم قریشی کے ہمراہ پنڈال میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں ان تصویروں کی بھول بھلیوں میں ایسا کھویا کہ کچھ ہوش نہ رہا۔ البم کے اندر سے ایک چھوٹی سی پرچی پھسل کر گر گئی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا۔ یہ غزالہ کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ اس نے صرف دو تین سطور لکھی تھیں۔ یہ انگ تھیں۔ اس نے لکھا تھا "شاہ جہاں! بہت عرصے تک اس البم کو سنبھال کر رکھا ہے۔ میری خواہش تھی اگلے ماہ آپ کی برتھ ڈے پر یہ تحفہ آپ کو پیش کروں۔ چونکہ میں جا رہی ہوں پھر خبر نہیں کب ملنا ہو لہٰذا میں یہ البم آپ کے کمرے میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ خدا حافظ۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ غزالہ

ملنے جانے کے بعد پھر میرے کمرے کی طرف کیوں آئی تھی۔ یہ اس کا ارادہ ہوگا کہ وہ یہ البم خود مجھے دے گی مگر چونکہ مجھ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی لہٰذا وہ البم کے ساتھ یہ مختصر تحریر میرے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔ اس نے یہ لفافہ دروازے کی نچلی درز سے کمرے میں پہنچایا تھا۔ میں دیر تک تصویریں دیکھتا رہا اور اس بھاگ دوڑ کے بارے میں سوچتا رہا جو غزالہ نے ان تصویروں کو اکٹھا کرنے کے حوالے سے کی ہوگی۔ یہ تصویریں مجھے ماضی میں بہت دور تک لے گئیں۔ شاید میں کچھ اور بھی دور جاتا لیکن جو پریشانیاں مجھے لاحق تھیں وہ مجھے ماضی کے بارے میں زیادہ سوچنے نہیں دے رہی تھیں اور تو اور غزالہ سے جدائی سے پہلے کی یہ آخری ملاقات بھی مجھے زیادہ متاثر نہیں کر رہی تھی۔

میں کچھ دیر بعد پھر چھت پر چلا گیا اور شبنم آلود کھیتوں سے چھو کر آنے والی خنک ہوا میں ٹہلنے لگا۔ شیر محمد حمزہ کی تلاش میں بڑا مخلص کردار ادا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دو خاص آدمیوں کو لاہور بھیج رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر حمزہ کے ممکنہ ٹھکانوں پر چھان بین کر رہے تھے۔ شیر محمد کے ذریعے جھوک ضامن کے آس پاس دیہات میں بھی ڈاکٹر حمزہ کی تلاش کا کام رازداری سے ہو رہا تھا۔ چھت پر ٹہلتے ٹہلتے اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا اور میں بری طرح چونک گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حویلی میں ہنگامے کی رات ڈاکٹر حمزہ شنکر کے ہتھے ہی چڑھ گیا ہو۔ یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ یہ بات ناممکنات میں سے نہیں تھی۔ شنکر ایک ایسا خطرناک ترین شخص تھا جو انتہائی نامساعد صورت حال میں بھی مخالف پر وار کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر حمزہ بالکل اور طرز کا لڑکا تھا۔ مار دھاڑ سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ دھماکوں کے بعد حویلی سے فرار ہوتے وقت شنکر کی نگاہ اگر حمزہ پر پڑ گئی تھی تو اس کے لیے بالکل مشکل نہیں تھا کہ اسلحے کے زور پر یا بے ہوش کر کے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔ شنکر بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ حمزہ چند ہی دنوں میں میرے بہت قریب آ گیا ہے اور میں شدت سے اس کے تحفظ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ شیخ عاصم کی ضد بن ساتھی اور اس حوالے سے وہ شنکر کے لیے بھی بے حد اہم تھا۔ حمزہ کو اپنے قبضے میں کرنا شنکر کے لیے ہر لحاظ سے سود مند تھا۔

مگر یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ سائیں عالی کی اطلاعات کے مطابق تو شنکر بھی دھماکوں میں زخمی ہوا تھا اور اس کی بینائی متاثر ہوئی تھی جس کے سبب اسے موقع سے فرار ہونا پڑا تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر وہ حمزہ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کیسے کامیاب ہو سکتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا اس امکان کو یکسر رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس بارے میں کئی پہلوؤں سے سوچا اور میرا یہ خیال تقویت پکڑتا گیا کہ حمزہ کی گمشدگی کا تعلق شنکر سے ہو سکتا ہے۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور بات آنے لگی۔ اگر میں یہ فرض کر لیتا کہ حمزہ شنکر کے پاس ہے تو پھر شیخ عاصم کے سلسلے میں درگزر کا مظاہرہ کر کے اسے رہا کر دینا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔

میں نے اس سلسلے میں عالم قریشی سے بھی مشورہ کیا۔ عالم قریشی نے بھی یہی رائے دی کہ جب تک حمزہ کے بارے میں کوئی ٹھوس اطلاع نہیں ملتی، شیخ عاصم کو رہا کرنا ٹھیک نہیں۔ صبح چھ بجے کے لگ بھگ میں شیخ عاصم اور غزالہ کے پاس پہنچا۔ غزالہ نے کھوجتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ غالباً وہ اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ مجھے اس کا رکھا ہوا لفافہ ملا ہے یا نہیں۔ اگر ملا ہے تو میرا ردعمل کیا ہے۔ وہ اور شیخ عاصم بالکل الوداعی موڈ میں نظر آتے تھے۔ وہ علی الصباح اٹھ گئے تھے اور اپنا مختصر سامان سنبھال رہے تھے۔

میں نے شیخ سے مخاطب ہو کر دو ٹوک لہجے میں کہا "پروگرام بدل گیا ہے شیخ عاصم! تم فی الحال نہیں جا رہے ہو۔"

شیخ کا منہ کھلا رہ گیا۔ غزالہ بھی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جس ہینڈ بیگ میں وہ شیخ کی دوائیاں وغیرہ رکھ رہی تھی وہ اس نے میز پر رکھ دیا "کیا بات ہوئی ہے شاہ جہاں؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں نے کہا ہے ناکہ پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔"

"ملتوی کر دیا ہے یا ختم کر دیا ہے؟" شیخ عاصم نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ختم کر دیا ہے یا بنا ہی نہیں تھا۔ تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سب کچھ تو تمہیں بونس میں مل رہا ہے ورنہ تم جس سلوک کے مستحق ہو وہ تمہارے تصور سے بھی آگے کی چیز ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میری ابھی غزالہ کے ساتھ اسی سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔ میں غزالہ کو بتا رہا تھا کہ مجھے اب بھی دس فیصد سے زائد امید نہیں کہ تم ہمیں رہا کر دو گے۔ یہ میرے شک کو میرا وہم قرار دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی

کہ ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی اور ایک گھنٹے تک ہم اس قصبے کی حدود سے باہر ہوں گے۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ انگریزی مقولے کے مطابق ابھی چائے کی پیالی اور ہونٹوں کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔ شاہ جہاں اتنی آسانی کے ساتھ ہماری میزبانی سے دستبردار نہیں ہوگا۔"

عاصم کے لہجے میں بڑا زہریلا پن تھا مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ غزالہ کی نگاہوں میں شک کی دھندلاہٹ تھی۔ یوں تو اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میرا یہ فیصلہ اسے ہرگز پسند نہیں آیا۔ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھے بغیر کہا "تمہاری روانگی کے آئندہ پروگرام سے میں تمہیں بعد میں آگاہ کروں گا۔ بہرحال میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ جب تک تم یہاں ہو، تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی بشرطیکہ تم بھی قسمت آزمائی یا مہم جوئی کی کوشش نہ کرو۔"

ان دونوں کے تاثرات دیکھے بغیر میں کمرے سے باہر آ گیا۔

شیر محمد کو چونکہ بدلے ہوئے پروگرام کا پتا نہیں تھا لہٰذا اس کی ہدایت کے مطابق اس کا ڈرائیور ٹھیک سات بجے گاڑی لے کر حویلی پہنچ گیا۔ وہ غزالہ اور شیخ عاصم کو لاہور لے جانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے ڈرائیور خان محمد کو بتایا کہ مہمان واپس نہیں جا رہے ہیں۔ اتنی دیر میں شیر محمد بھی منہ میں مسواک ڈالے وہاں پہنچ گیا "کیا بات ہے جگن پیارے۔ آپ کے مہمان نظر نہیں آ رہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ مہمان فی الحال یہیں رہیں گے۔

شیر محمد نے ڈرائیور سے کہا "ٹھیک ہے خانوں! تم واپس جاؤ ڈیرے پر بلکہ ایسا کرو یہاں سے ایک بوری چاول کی بھی لے جاؤ گاڑی میں رکھ کے۔ ادھر ڈیرے پر پانچ چھ دیگیں پکوا کر غریب غربا میں بانٹ دو۔ ہمارا یار شاہ جہاں ایک وڈی مصیبت سے بچ بچا کر صحیح سلامت ہمارے کول آیا ہے۔ اس کی خیر خیرات تو کرنی چاہیے۔ کیوں باؤ شاہ جہاں۔ میں ٹھیک کہندا ہوں نا۔"

"جیسے تمہاری مرضی بھئی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

شیر محمد نے ڈرائیور سے کہا "اپنی گھر والی اور سالے کو بھی ساتھ لے جاؤ ڈیرے پہ۔ چاول شاول پکنے میں ہاتھ ونڈائیں گے۔"

ڈرائیور نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شیر محمد مجھ سے مخاطب ہوا "فکر شکر کرنے کی کوئی لوڑ نہیں شاہ جہاں۔ جتنے دن دل کرے اچھے رہو اور موج میلہ کرو۔ اگر دارو شارو پینا ہو تو وہ بھی بتاؤ۔ ولایتی کا ایک کریٹ منگوایا ہے۔ اس کے علاوہ پکی دیسی بھی رکھی ہوئی ہے۔ دیسی کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ کڑوی ہوا شراب۔"

میں نے کہا "دیسی کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے تو پھر انگریزی میم سے شادی کیوں کر رکھی ہے؟"

"کون سی انگریزی میم؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میرا ساتھی زریں گل کہتا ہے کہ تو نے میم سے کر رکھی ہے۔"

شیر محمد نے قہقہہ لگایا "ہاں یار! وہ تیرا پٹھان یار واقعی کچھ سر پھرا ہے۔ کل مجھ سے بھی ایسی گل کر رہا تھا 'شاباش چوہدری شاباش۔ تم نے ایک فرنگن کو بنا کر امارا دل خوش کر دیا ہے۔ جب ام کسی فرنگن کو بھائی کا بچہ کھلاتے ہوئے دیکھتا ہے تو امارا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔'"

میں نے کہا "وہ تمہاری بیوی کو فرنگن سمجھتا ہے۔ اس کی یہ خوش فہمی قائم ہی رہنے دو۔ اگر بغیر کچھ خرچ کیے مسلمان بھائی کا دل خوش ہوتا ہے تو ہونے دینا چاہیے۔"

"بڑی عجیب شے ہے۔ پرسوں مجھ سے کہندا آپ کا بیوی کو دیکھ کر اور اس کا فرمانبرداری دیکھ کر ایمان تازہ ہو گیا ہے۔"

ہم زریں گل کی باتیں کرتے ہوئے حویلی سے با گئے۔ بڑا خوش گوار موسم تھا۔ خالص دیہی علاقے صاف ستھری اوس میں بھیگی بھیگی صبح تھی۔ سرسبز کھیتو درمیان پگڈنڈی پر چلتے ہم دور نکل گئے۔ کسان روزم کاموں میں مصروف تھے۔ کنویں اور ٹیوب ویل چل تھے۔ چارے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں اونچے نیچے را پر ہچکولے کھا رہی تھیں۔ مویشیوں کے ریوڑ اپنی اپنی طرف گامزن تھے اور ان کے گلے سے جھولتی ہوئی فضا میں موسیقی بکھیر رہی تھیں۔ کہیں کہیں دیہاتی خوا جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ یہ سارے خوب مناظر تھے لیکن میرا ذہن ان مناظر کی خوب صورتی دور تھا۔ میرے ارد گرد بکھرے ہوئے پریشان کن اپنے سیاہ پروں سے ان سارے مناظر کو ڈھانپ ر اور ان میں اہم ترین مسئلہ حمزہ کی گمشدگی کا تھا۔ مجھے تھا کہ حمزہ کے لواحقین بھی بے حد فکر مند ہوں گے ا والدہ کا تو تصور کر کے ہی کلیجا منہ کو آتا

تھا۔ پتا نہیں کہ وہ اس کی تلاش میں کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی تھیں۔ انہیں میرا موجودہ ٹھکانا معلوم نہیں تھا ورنہ جیسے بھی ہوتا وہ یہاں پہنچ جاتیں۔ حمزہ کی گمشدگی ایک المناک خبر تھی۔ خاص طور پر حمزہ کی والدہ اور شگفتہ پر اس کا بہت اثر ہوا تھا لیکن اس خبر کو زیادہ دیر چھپایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایک پرانی طرز کے کنویں کو دیکھنے کے لیے میں رک گیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ دو افراد گھوڑیاں بھگاتے ہماری طرف آ رہے ہیں۔ وہ شیر محمد کے کارندے تھے۔ انہوں نے قریب آ کر اطلاع دی کہ خان محمد پر حملہ ہوا ہے۔ خان محمد عرف خانوں وہی ڈرائیور تھا جو تھوڑی دیر پہلے عاصم اور غزالہ کو لینے کے لیے حویلی میں آیا تھا۔ چونکہ عاصم اور غزالہ کو میں نے روک لیا تھا لہٰذا شیر محمد نے اسے واپس ڈیرے پر بھیج دیا تھا۔ ڈیرا قصبے سے باہر شیخوپورہ جانے والی نیم پختہ سڑک پر واقع تھا۔ شیر محمد کی ہدایت کے مطابق خانوں اپنی بیوی اور سالے کو بھی گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ اب صرف آدھے گھنٹے بعد یہ اطلاع آ رہی تھی کہ اس پر حملہ ہوا ہے۔

شیر محمد کے کارندے گھوڑیوں پر آئے تھے۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں بتایا کہ قصبے سے کوئی دو میل آگے چھوٹی پہی والے موڑ پر ایک جیپ نے گاڑی کا راستہ روکا۔ رائفلوں سے مسلح تینوں افراد نیچے اترے جبکہ چوتھا اندر ہی بیٹھا رہا۔ ان چاروں افراد نے منہ سر ڈھاٹوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور خانوں کو گالیاں دیں اور زدوکوب کیا۔ وہ خانوں کی بیوی ثریا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ وہ اسے لیڈی ڈاکٹر سمجھ رہے تھے (خانوں کی بیوی ذرا فیشن ایبل تھی) لیکن جب ثریا نے پنجابی بولی اور ٹھیٹ دیہاتی لہجے میں بات کی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ عورت ڈاکٹر وغیرہ نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ثریا کو تھپڑ مارے، اس کے کانوں سے بالیاں نوچیں اور گالیاں بکتے ہوئے واپس چلے گئے۔

شیر محمد کے پوچھنے پر اس کے کارندے نے بتایا "خانوں زخمی ہے۔ اس کے سر پر چوٹ آئی ہے۔ پہلے اسے ڈاکٹر طفیل کے پاس لے کر گئے تھے، اب تحصیل اسپتال لے گئے ہیں۔"

یہ خبر سنسنی خیز تھی۔ شیر محمد تو ایک گھوڑی پر سوار ہو کر موقع کی طرف چلا گیا، میں حویلی واپس آ گیا۔ میرے ذہن میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ حملہ خانوں اور اس کی فیشن ایبل بیوی پر نہیں بلکہ شیخ عاصم اور غزالہ پر ہوا تھا۔ عین وقت پر چونکہ شیخ اور غزالہ کی روانگی کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لہٰذا ان کی گھات میں بیٹھے ہوئے افراد نے غلطی سے خانوں اور اس کی بیوی پر حملہ کر دیا۔ چند روز پہلے کا واقعہ نجانے کیوں میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ رات کے وقت شیخ عاصم اور غزالہ والے کمرے کے پاس نامعلوم سائے نظر آئے تھے اور میں نے ان میں سے صفیہ نامی لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ لڑکی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ ٹریکٹر کے کسی ناکارہ انجن کا معاملہ ہے لیکن اس وقت بھی مجھے لڑکی کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ آج پیش آنے والے واقعے نے مجھے ایک بار پھر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گاڑی پر حملہ کرنے والوں نے لیڈی ڈاکٹر کا ذکر کیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر تو غزالہ ہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی پر حملہ غزالہ اور شیخ عاصم کے لیے کیا گیا تھا۔ حملہ کرنے والے یا تو شیر محمد کے ہی آدمی تھے یا انہیں کسی نے آگاہ کیا تھا کہ فلاں گاڑی میں فلاں وقت پر شیخ عاصم اور غزالہ فلاں راستے سے گزریں گے۔ شیخ اور غزالہ کی روانگی صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی اور اس کا علم حویلی کے معدودے چند افراد کو تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان چند افراد میں صفیہ نامی وہ لڑکی بھی شامل ہو اور اس نے حملہ آوروں کو اطلاع پہنچائی ہو کہ کل صبح سویرے شیخ عاصم اور غزالہ لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔ میں نے غور کیا تو واقعات کی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس سارے معاملے کا تعلق غزالہ اور شیخ سے ہے اور صفیہ نامی وہ لڑکی بھی اس معاملے میں ملوث ہے۔ اس رات شیخ کے کمرے کے بالکل پاس پراسرار سایوں کا پایا جانا اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا۔

غزالہ کو خطرے میں محسوس کرنے کے بعد میری حسیات پوری طرح بیدار ہو گئیں اور فکرمندی انتہا کو پہنچ گئی۔ بے شک میں غزالہ سے مکمل طور پر لاتعلق ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی سلامتی مجھے اب بھی دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ میں آگ بگولا ہو گیا۔ میں نے پوری حویلی میں صفیہ کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ اسی دوران شیر محمد بھی آ گیا۔ گاڑی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ خانوں کی بیوی کے زخمی کانوں سے خون رس رہا تھا۔ خود خانوں کا سالا بھی بہت ہراساں نظر آ رہا تھا۔

میں شیر محمد کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ملازمہ صفیہ کا پتا کرائے۔ شیر محمد حیران نظر آنے لگا۔ بولا "جگن جی! اوس کڑی کا اس معاملے سے کیا تعلق واسطہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ بھی بتادوں گا' پہلے لڑکی کا پتا کرواؤ۔"

شیر محمد نے پہلے حویلی میں پتا کرایا پھر اپنے کارندوں کو دوڑایا۔ آدھے پونے گھنٹے کے اندر صورتِ حال واضح ہوگئی۔ وہ لڑکی کہیں بھی نہیں تھی۔ اپنے اپاہج خاوند اور موٹر مکینک دیور سمیت وہ کہیں غائب ہو چکی تھی۔ شیر محمد نے بتایا کہ اس کی بیوی نے رسوئی میں ۲۰۰ روپے پیالیوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے' وہ بھی نہیں مل رہے۔ خیال ہے کہ یہ پیسے بھی وہی لے گئی ہے۔ شیر محمد نے بتایا "اس کے علاوہ بھی لڑکی اور اس کا خاوند میرے آٹھ سو روپے کے مقروض ہیں۔"

شیر محمد سخت حیران نظر آرہا تھا کہ کار پر ہونے والے حملے میں صفیہ کیسے ملوث ہوسکتی ہے اور اگر ایسا ہے تو مجھے اس کے بارے میں کیسے علم ہوا ہے۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری روداد شیر محمد کے گوش گزار کردی۔ وہ ہکا بکا نظر آنے لگا۔ اس نے مجھے برآمدے میں کاٹھ کباڑ کے نیچے پڑا ہوا ٹریکٹر کا انجن دکھایا۔ وہ کسی کام کا نہیں تھا اور پڑا پڑا زنگ آلود ہو رہا تھا۔ شیر محمد نے کہا "اس کتے کی بچی نے بالکل جھوٹ بکا ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں یہ انجن لے جاؤں۔ میں نے کہا لے جاؤ۔ میں نے اس کا اچار ڈالنا ہے؟ پھر وہ خود ہی لے کر نہیں گئی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ لوہے کے بھاؤ ہی بکنا ہے اور اتنا ہی کرایہ بھی پڑ جائے گا۔ وہ بالکل بکواس بک رہی تھی کہ اس کا دیور انجن اٹھانے کے لیے آیا ہے۔ پکی کی گل ہے کہ وہ کوئی اور چکر ہی تھا۔"

"چکر تو اب بالکل سامنے آگیا ہے شیر محمد۔" میں نے کہا "کچھ لوگ لیڈی ڈاکٹر غزالہ تک پہنچنا چاہ رہے ہیں۔"

شیر محمد گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا "اک گل میری سمجھ میں آندی ہے۔ اس علاقے میں دور دور تک کوئی چنگا ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی گڑبڑ والا معاملہ ہوجاتا ہے تو لوگوں کو بڑا وخت پڑ جاتا ہے۔"

"گڑبڑ والا معاملہ؟ میں سمجھا نہیں۔"

"یار! کسی کھاتے پیتے زمیندار کی لڑکی خسرکی "خراب" ہوجاتی ہے تو اس کو "ٹھیک" بھی تو کرانا پیندا ہے۔ کوئی سیانا ڈاکٹر ہو تو لوگ دے دلا کر کام کرا لیتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر تو یہاں دور دور نہیں ملتی اور اگر مل جائے تو منہ مانگے پیسے لیتی ہے۔ آج کل اس علاقے میں گند بھی تو بڑا مچا ہوا ہے۔ آئے دن کوڑے کی ڈھیریوں پر سے کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے۔"

شیر محمد کی بات میں وزن تو تھا لیکن اس بات پر فوراً یقین کر لینا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ میں بڑی دیر تک سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ میں دل ہی دل میں شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ میں نے عین وقت پر شیخ اور غزالہ کو لاہور بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ اس وقت وہ دونوں مسلح افراد کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے اور مجھ پر حمزہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں کو ڈھونڈنے کی ذمے داری بھی عائد ہوجاتی۔

میں نے زریں گل کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ شیخ اور غزالہ کی حفاظت کے سلسلے میں پوری طرح چوکس رہے اور ہر وقت دو تین گھنٹے بعد مجھے رپورٹ دیتا رہے۔ زریں گل کی معاونت کے لیے میں نے شیر محمد کے ایک کارندے کو بھی مقرر کر دیا۔ اس کارندے کی تمام خدمات شیر محمد نے میرے سپرد کر رکھی تھیں۔ احتیاطاً میں نے زریں گل کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے دماغ کے کیڑے کو قابو میں رکھے۔ اس کے غصے کی وجہ سے شیخ عاصم کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ زریں گل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے پٹھانی غم و غصے کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ساتھ وعدہ بھی کیا کہ شیخ عاصم کو اس کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

حمزہ کی پریشانی ہی کم نہیں تھی' اب یہ سوالیہ نشان بھی دماغ میں پیوست ہوگیا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو غزالہ کے چکر میں ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لیڈی ڈاکٹر غزالہ کے چکر میں ہیں۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ شیر محمد کی بات ہی درست ہے۔ یعنی یہ کوئی میڈیکو لیگل کیس ہے جس میں کسی متاثرہ شخص کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی کلینک یا اسپتال میں جائے بغیر اس کا کام ہوجائے۔ غزالہ گائناکالوجسٹ تھی' اس لحاظ سے یہ بھی امکان قوی ہوجاتا تھا کہ جس مریض یا مریضہ کے لیے غزالہ کی ضرورت ہے وہ "غلط قسم" کی تکلیف میں مبتلا ہے مگر یہ صرف ایک امکان تھا۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں امکانات ہوسکتے تھے۔ میرے ان گنت بدخواہ تھے' ان میں سے کوئی غزالہ کے درپے ہوسکتا تھا یا ممکن تھا کہ اس معاملے کا تعلق شیخ عاصم سے ہو۔ عاصم نے غزالہ کو اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے ذہنی طور پر بہت سی رکھیلوں کو فارغ کر دیا تھا۔ ان میں ایک سے بڑھ کر ایک ہوشیار چالاک لڑکی تھی۔ ایسی ہی یوسانا نامی ایک لڑکی کا تعاقب کرتی ہوئی پاکستان آئی تھی اور اپنی مالی مجبوری کی وجہ سے عاصم کے گھر کے چکر لگاتی رہی تھی۔ میں نے بعد میں اس کی مالی معاونت بھی کردی تھی مگر وہ پھر کسی چکر میں پھنس گئی تھی اور اب شیخ عاصم کے کارندوں کی تحویل میں تھی۔ پھر رفنے والا چکر بھی جوں کا توں موجود تھا۔ بہت سے لوگ تھے جو انڈیا میں اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں خصوصاً

جنوب میں اس چکر کے حوالے سے سرگرداں تھے۔

صفیہ نامی وہ لڑکی اپنے شوہر اور دیور کے ساتھ یوں غائب ہوئی کہ بس ناپید ہی ہوگئی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں شیر محمد نے اس کی تلاش میں اپنے کارندوں کو بہت بھگایا لیکن لڑکی کا کوئی سراغ نہیں ملا اور یقیناً یہ لڑکی کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ شیر محمد کی گرفت میں آنے سے بچی رہی ورنہ شیر محمد کے ارادے اس کے بارے میں اور اس کے خاوند و دیور کے بارے میں بڑے خطرناک تھے۔ وہ انہیں درختوں سے الٹا لٹکوانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صفیہ کو وہ نہایت فحش قسم کی گالیاں بڑے تواتر سے دے رہا تھا۔ اس کے خیال میں وہ پکی چور اور دھوکے باز تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک چالو لڑکی بھی تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی برے سے برا سلوک کیا جاتا وہ کم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر صفیہ' شیر محمد کے ہاتھ آجاتی تو بہت پچھتاتی۔

دو روز کے اندر یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس گتھی کا سرا وہ صفیہ نامی لڑکی تھی اور وہ مل کر نہیں دے رہی تھی۔ صفیہ کے ساتھ ساتھ حمزہ کی تلاش بھی جاری تھی۔ انجم اب بہتر تھی اور وہ کئی بار مجھ سے حمزہ کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔ دوسری طرف میں شفتا کی آنکھوں میں بھی بے چینی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ حویلی میں ہونے والے دھماکا خیز ہنگامے کے پانچ چھ روز بعد بھی اخبار میں اس ہنگامے کی چھوٹی موٹی خبریں موجود تھیں۔ اس سے واقعے کی اہمیت اور شدت کا احساس ہوتا تھا۔ ہنگامے کے حوالے سے تجلی کنور کا ایک بیان بھی شائع ہوا تھا۔ تجلی کنور نے کہا تھا کہ بدنام زمانہ بھارتی دہشت گرد شنکر شکرا ایک عرصے سے پاکستان میں کارروائیاں کر رہا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس شخص کا راستہ روکا جائے اور اسے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ تجلی کنور نے اپنے بیان میں اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ شیخ عاصم اور شنکر کے درمیان گہرے روابط ہیں اور جھوک ضامن کی حویلی میں ہونے والی تباہی کا ذمے دار صرف اور صرف شنکر شکرا ہے۔

اسی اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک خبر ایسی تھی جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اس خبر کی بنیاد ڈاکٹر حمزہ کی والدہ کا بیان تھا۔ وہ دن رات اپنے بیٹے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کا بیٹا شاہ جہاں اور امارات کے شیخ عاصم کی باہمی رقابت کا شکار ہوا ہے۔ بیٹے کے غم میں انہیں انجائنا کی تکلیف ہوگئی تھی اور وہ اسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ اس بیان کے نیچے رپورٹر نے اپنا نقطۂ نظر بھی بیان کیا تھا اور لکھا تھا کہ حویلی کے سانحے میں کم و بیش دس لاشیں قطعی طور پر ناقابلِ شناخت رہی تھیں۔ ڈاکٹر حمزہ کے لواحقین پر اب مایوسی طاری ہو رہی ہے اور وہ دبی زبان میں یہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ شاید وہ اب ڈاکٹر حمزہ کی صورت نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ اندوہناک خبر تھی اور میں کسی ایسی ہی خبر کی توقع کر رہا تھا۔ میں نے وہ اخبار فوراً چھپا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شفتا یا انجم کی نگاہ اس خبر پر پڑے اور ان کے اندیشے بھیانک ترین روپ اختیار کر جائیں۔

اسی روز شام کو میں نے ایک بار پھر بذریعہ ٹیلیفون لاہور میں حمزہ کے قریبی دوست ایڈووکیٹ ارسلان احمد سے رابطہ کیا۔ ارسلان احمد کے لب و لہجے میں سخت مایوسی پائی جاتی تھی۔ وہ بولا "ہمیں نے حمزہ کے ہر ممکنہ ٹھکانے پر بار بار چکر لگایا ہے بلکہ پورا لاہور ہی چھان مارا ہے' وہ کم از کم لاہور میں تو نہیں ہے۔"

پھر اس نے حمزہ کی والدہ کی حالتِ زار بیان کرنا شروع کردی۔ کہنے لگا "وہ پاگلوں کی طرح باتیں کرنے لگتی ہیں۔ آج صبح کہہ رہی تھیں۔ میرے حمزہ کی شادی ہے۔ وہ منگنی کی انگوٹھی بنوانے چلا گیا ہوگا۔ دوپہر کو نیم بے ہوشی کی حالت میں حمزہ کا نام پکار رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ انہیں حمزہ کی ہر بات منظور ہے' وہ جیسا کہے گا' ویسا ہی کریں گی۔ جہاں اس کا دل چاہے گا' وہاں اس کی شادی کریں گی۔"

ارسلان کی باتوں نے مجھے مزید غمزدہ کر دیا۔ ارسلان سے میں نے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ وہ غائبانہ طور پر مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے لیے یہ بات بڑی سنسنی خیز تھی کہ شاہ جہاں (اور ماضی کا استاد جہانی) براہِ راست اس سے مخاطب ہے اور اس سے بھی زیادہ تحیر خیز بات اس کے لیے یہ تھی کہ شاہ جہاں' اس کے دوست (یعنی ڈاکٹر حمزہ) کے لیے اس قدر فکرمند ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا "شاہ جہاں صاحب! خالہ جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ذہنی طور پر بے حد پریشان ہیں۔ اگر حمزہ کے لیے کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں اور اگر خدانخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ اس کے ساتھ کچھ ہو چکا ہے تو پھر بھی یہ بات کنفرم ہوجانی چاہیے تاکہ خالہ جان کو ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار کیا جاسکے۔"

اس فون کے بعد میری طبیعت مزید مکدر ہوگئی۔ عالم قریشی بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم فون کرنے کے لیے قصبے سے تانگے پر "نیلی بازار" تک آئے تھے۔ ہمیں تانگے پر ہی واپس جانا تھا۔ ہم دیہاتیوں والے لباس میں تھے۔ موسم خنک ہوچکا

تھا لہٰذا ہم نے کھیس کی بکلیں مار رکھی تھیں۔ بُکل بڑی زبردست چیز ہے' اس کے اندر بندے کی شخصیت چھپ کر رہ جاتی ہے اور شخصیت کے علاوہ بھی بکل کے اندر بہت کچھ چھپایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسلحہ وغیرہ۔ ہم نے بھی اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ میرے پاس طلائی دستے والا ننھا سا طاقتور پسٹل تھا۔ عالم قریشی کے پاس ریوالور تھا۔ یہ ایک بہت سجا سجایا تانگا تھا۔ کوچوان چوبیس پچیس سال کا گھونگھریالے بالوں والا خالص دیہاتی جوان تھا۔ وہ گونگا بہرا تھا۔ ہم اس کی موجودگی میں آزادی سے گفتگو کر لیتے تھے۔ عالم قریشی نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ حمزہ کی گمشدگی میں شنکر کا ہاتھ ہے۔"

"پھر تو میرا یہ فیصلہ ٹھیک ہی ہے کہ میں نے شیخ اور غزالہ کو روک لیا ہے۔ اگر تمہارا اندازہ درست ہے تو پھر ہم حمزہ کو شنکر سے حاصل کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"شکریار! تمہارے سوالی بات بھی بڑی وزن دار ہے۔ اگر حویلی سے فرار ہوتے وقت شنکر خود زخمی تھا تو پھر اسے اتنا ہوش کہاں سے ہو گیا کہ وہ حمزہ کو بھی زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔"

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا "جو شواہد اب تک سامنے آئے ہیں ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حویلی سے فرار ہوتے وقت شنکر کا چہرہ زخمی تھا اور وہ اکیلا تھا۔ اب آگے کی اللہ ہی جانتا ہے۔"

بس یہی سوچ ہے' جس سے آگے سوچنے کی ہمت نہیں ہوتی اور دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ اگر حمزہ کو حویلی سے زبردستی نہیں لے جایا گیا تو پھر وہ کہاں غائب ہوا۔ اسے کیا ضرورت تھی غائب ہونے کی۔ اگر وہ وقتی طور پر خوف کے سبب غائب ہوا بھی تھا تو اسے لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر اسے عینی شاہد کی حیثیت سے کسی قانونی پیچیدگی میں ملوث ہونے کا اندیشہ تھا تو بھی وہ کم از کم اپنے دوست ایڈووکیٹ ارسلان سے تو رابطہ کرتا۔ اس کے غائب ہونے کی اس کے سوا کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یا تو اسے زبردستی کہیں لے جایا گیا ہے یا پھر وہ بھیانک اندیشہ ہی حقیقت ہے جس کے بارے میں سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔

شیر محمد کے کارندوں کے ساتھ مل کر عالم قریشی نے جھنگ کے نواحی دیہات میں کافی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اب وہ تھک سا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حمزہ اگر مل سکتا ہے تو لاہور سے مل سکتا ہے۔ دوسری طرف ایڈووکیٹ ارسلان کہہ رہا تھا کہ وہ اور کہیں سے بھی مل سکتا ہے لیکن لاہور سے نہیں مل سکتا۔

ہمارا تانگا کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سہ پہر ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ سنہری دھوپ میں کھیت کھلیان' رہٹ اور کسان ہر شے خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ ایک جگہ اچانک تانگے کو زوردار جھٹکا لگا۔ اس کا ایک پہیا گڑھے میں پڑنے کے بعد پُرشور آواز سے ایک پختہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور تانگا ایک طرف الٹتے الٹتے بچا۔ کوچوان کے ساتھ ساتھ میں اور عالم قریشی بھی نیچے اتر آئے۔ تانگے کا پہیا تقریباً علیحدہ ہونے کے قریب تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ ہم تیز رفتاری سے سفر نہیں کر رہے تھے ورنہ نقصان ہو سکتا تھا۔ یہ سراسر اتفاقیہ حادثہ تھا لیکن اس حادثے میں ایک چیز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ اس چیز کا تعلق حادثے سے نہیں تھا بلکہ اردگرد کے ماحول سے تھا۔ راستے کے کنارے ایک چادر پوش عورت بیٹھی تھی۔ دیہاتی انداز میں آنکھوں کے سوا اس کا پورا چہرہ اور جسم چادر میں چھپا ہوا تھا۔ دیہاتی عورتیں جب راستے کے کنارے بیٹھتی ہیں تو عموماً اپنا رخ سڑک کی مخالف سمت میں رکھتی ہیں تاکہ راہ گیروں سے پردہ رہے۔ یہ عورت بھی اسی انداز میں بیٹھی تھی مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ اپنے قریب ہی اتنا زبردست شور پیدا ہونے کے باوجود اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ جس جگہ تانگے کا پہیا باغ کی پختہ دیوار سے ٹکرایا وہاں سے عورت کا فاصلہ بمشکل دس گز تھا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جب کسی شخص کے عقب میں اچانک شور بلند ہو تو وہ مڑ کر دیکھتا ہے مگر یہ عورت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اتفاقیہ بات تھی کہ جس لمحے پختہ دیوار سے تانگے کا تصادم ہوا اس وقت بھی میری نگاہ اس چادر پوش عورت پر ہی تھی۔ یا تو وہ ہمارے کوچوان کی طرح گونگی بہری تھی یا پھر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ میں نے عالم قریشی کی توجہ کنارے پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دلائی۔ وہ بھی عورت کے انداز پر مسکرانے لگا۔

تانگے کا کوچوان ہوشیار شخص تھا۔ اس نے تانگے کے اندر سے ہی ایک دو اوزار نکالے' لکڑی کی ایک موٹی لٹھ کو کار کے جیک کی طرح استعمال کیا اور پہیے کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں ہمیں بتایا کہ پانچ دس منٹ میں تانگا پھر سفر کے لیے تیار ہو جائے گا۔ میں اور عالم قریشی ایک پگڈنڈی پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ عورت بدستور اپنی جگہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں حیران ہوا کہ اگر وہ کسی تانگے یا ویگن کا انتظار کر رہی ہے تو پھر یوں منہ پھیر کے

کیوں بیٹھی ہے۔ شاید وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی یا اسے توقع تھی کہ جو بھی سواری گزرے گی' وہ خود اسے متوجہ کر لے گی۔

چار پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے پھر مجھے محسوس ہوا کہ سڑک کے کنارے بیٹھی عورت بے چینی محسوس کر رہی ہے۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور ہمارے پاس سے گزرتی ہوئی قریبی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سیاہ جرابیں تھیں۔ اس کی چال ڈھال دیکھ کر میں شک میں پڑ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے چادر میں کوئی بہروپیا چھپا ہوا ہے "بات سنو۔" میں نے پکار کر کہا۔

چادر پوش نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے چند قدم تیزی سے اٹھا کر چادر پوش کو جا لیا۔ اور اس کی کلائی پکڑ لی۔ کلائی ہاتھ میں آتے ہی میرے شک کی تصدیق ہو گئی۔ یہ کسی عورت کی کلائی نہیں تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے چادر ہٹائی۔ میرے سامنے ایک جواں سال مرد کا چہرہ تھا۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال کے قریب ہو گی' وہ دیکھنے میں ہی غریب صورت اور مفلوک الحال نظر آتا تھا۔ اس کی رنگت سیاہی مائل تھی اور اس میں خالص قسم کا چکناپن تھا۔ اس قسم کی رنگت عام طور پر موٹر مکینک حضرات کی ہوتی ہے یا ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا تعلق مشینری کی مرمت یا دیکھ بھال وغیرہ سے ہوتا ہے۔ نوجوان تھر تھر کانپ رہا تھا اور اضطراری طور پر اپنا آپ مجھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا "کون ہو تم؟" میں نے اسے زنانے دار تھپڑ رسید کیا۔ وہ باقاعدہ رونے لگا۔ اس دوران میں ہمارا کوچوان بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے حلق سے غوں غوں کی آواز نکال کر واویلا شروع کر دیا اور ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ شخص اسی قصبے کا رہنے والا تھا جہاں سے ہم آئے تھے "کون ہو تم؟" میں نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔

گونگے کوچوان نے اشاروں کنایوں میں ہمیں سمجھایا کہ یہ شخص موٹر مکینک ہے اور یہی دو تین دن پہلے دیوار پھاند کر چوہدری شیر محمد کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ ان لوگوں کی تلاش میں چوہدری شیر محمد اور اس کے کارندوں نے رات دن ایک کیا تھا۔ آج بغیر کسی خاص کوشش کے ان بھگوڑوں میں سے ایک ہاتھ آ گیا تھا۔ میں نے چادر پوش کی چادر اس کے گلے میں ڈال دی اور اسے بل دے کر رسی بنالی۔ اب وہ اس قابل نہیں تھا کہ اچانک اپنا آپ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر سکتا۔

میں نے قمیص کے نیچے سے پسٹل نکال لیا۔ پسٹل کی نال نوجوان کے سینے سے لگاتے ہوئے میں نے کہا "زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔"

میں واقعی غصے میں تھا' میرے تاثرات نے اس کے خوف میں نمایاں اضافہ کیا۔ چند دن پہلے جس انداز میں صفیہ نامی لڑکی نے پکڑے جانے پر منت سماجت کی تھی' وہ بھی منت سماجت کرنے لگا۔ ویسی ہی مسکینی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی مگر ساتھ ساتھ آنکھوں میں خباثت بھی تھی۔ میں نے اسے کچھ مزید ڈرایا دھمکایا تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھ بھی جوڑ رہا تھا کہ میں اس کی بے گناہی پر یقین کر لوں۔ یعنی طرفہ تماشا تھا۔ جب مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا ہے تو میں اس کو بے گناہ کیسے قرار دے دیتا۔

پانچ دس منٹ میں تانگا بالکل فٹ ہو گیا۔ ہم نے بہروپیے نوجوان کو تانگے پر سوار کیا اور اس کی نشاندہی پر تانگا ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ راستے میں نوجوان نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ صفیہ نامی گھریلو ملازمہ کا دیور تنویر احمد ہے۔ صفیہ کا خاوند اشفاق احمد اس کا بڑا بھائی تھا اور فالج کے سبب ایک ٹانگ اور بازو سے معذور تھا۔ یہ لوگ آج کل شیر محمد کے خوف سے ایک مقامی زمیندار رانا سلطان کے پاس پناہ لیے ہوئے تھے اور اس کے دیئے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے۔

میں نے تنویر احمد سے پوچھا کہ ان لوگوں کو شیر محمد کے ڈر سے بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ بولا "بس جی ہمیں اس دن والی بات کا ڈر تھا۔"

"کس دن والی بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جب ہم ٹریکٹر کا انجن لینے کے لیے چوری چھپے حویلی میں آئے تھے۔ آپ نے میری بھاوج کو موقع پر پکڑ لیا تھا۔ بعد میں آپ نے اسے تسلی تو دی تھی کہ آپ اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے پر ہمیں ڈر تھا کہ آپ بتا دیں گے اور چوہدری صاحب ہم تینوں کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

میں نے اسے تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "تم بکواس کر رہے ہو۔ انجن وغیرہ کا کوئی چکر ہی نہیں ہے۔ وہ انجن تو چوہدری شیر محمد نے خود تمہاری بھاوج کو دے رکھا تھا اور کہا تھا کہ اسے اغوا کر لے جاؤ۔ اس رات تم لوگ کسی اور چکر میں حویلی کے اندر گھسے تھے۔ اگر تم خود اس چکر کے بارے

میں بتادو گے تو یہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا ورنہ بہت ذلیل ہونا پڑے گا تمہیں اپنی بھاوج سمیت۔"

وہ پھر آنکھوں میں آنسو بھرلایا 'قسمیں کھانے لگا کہ اس کے علاوہ کوئی چکر نہیں ہے۔ میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ کہ تم یہ عورتوں والا بھیس بدل کر کہاں جارہے تھے؟"

وہ کانپتے ہوئے بولا "میں راج گیری کا کام بھی جانتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہوتے' لاہور جاکر کچھ دہاڑی لگالوں مگر پکڑے جانے سے بھی بڑا ڈر آتا تھا۔ بھاوج نے مشورہ دیا کہ میرے کپڑے پہن لو اور چوری سے نکل جاؤ۔"

عالم قریشی نے پوچھا "مگر یہ کیا چکر ہے؟ تمہارے بالکل پیچھے تانگے کا پہیا نکلا۔ اچھا بھلا شور ہوا۔ تم نے پھر بھی مڑکر نہ دیکھا۔"

وہ بولا "دراصل۔۔۔ دراصل۔۔۔ جی میں نے دیکھ لیا تھا آپ کو۔ میں نے حویلی کا تانگا پہچان کرمنہ دوسری طرف کرلیا تھا پھر جب تانگے کا پہیا نکل گیا اور آپ وہیں پر کھڑے ہوگئے تو میں نے سوچا کہ کہیں آپ کوئی گل بات کرنے کے لیے میرے پاس نہ آجائیں۔ میں نے وہاں سے نکل جانا چاہا اور پکڑا گیا۔"

اس دوران میں ہم کپاس کے کھیتوں کے درمیان بنے ہوئے ایک ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ نیچی چھت والے پانچ چھ کمرے تھے۔ ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ بھینسوں کے لیے چھپر وغیرہ ڈالے گئے تھے۔ اس ڈیرے کے پچھواڑے ایک چھوٹے سے کچے گھر میں ہماری ملاقات تنویر کی بھاوج صفیہ اور اس کے معذور خاوند اشفاق سے ہوگئی۔ مجھے دیکھ کر صفیہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنے دیور کی طرف اور کبھی ہم دونوں کی طرف دیکھتی تھی۔ میں نے گھر کے چھوٹے سے صحن میں گھس کر دروازہ بند کردیا۔ کوچوان کو تانگے سمیت ہم نے ڈیرے سے کافی فاصلے پر درختوں کے درمیان کھڑا کیا تھا۔

عالم قریشی بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ دیکھنے میں بھی رعب دار لگتا تھا۔ میں نے صفیہ سے مخاطب ہوکر عالم قریشی کی طرف اشارہ کیا "جانتی ہو یہ کون ہیں؟" اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے کہا "یہ لاہور کے ایک بڑے تھانے کے ایس ایچ او ہیں۔ جب یہ سختی کرنے پر آتے ہیں تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ تم تو ایک لڑکی ہو اور نازک بدن بھی ہو۔ کیوں خواہ مخواہ خود کو عذاب میں ڈالتی ہو۔ جو کچھ تم نے اور تمہارے دیور صاحب نے اپنی مٹی پلید کرانے کے بعد بتانا ہے' وہ پہلے ہی بتادو۔"

پولیس کے ذکر نے صفیہ کو مزید خوف زدہ کردیا۔ وہ ڈری ڈری نظروں سے اونچے لمبے عالم قریشی کو دیکھ رہی تھی۔ عالم قریشی نے ڈرانے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے صفیہ کو دو تین جھانپڑ لگادیے اور فحش گالیاں دیں۔ یقیناً ان گالیوں کو سن کر صفیہ کے دل میں قریشی کے تھانے دار ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا ہوگا۔ جب عالم قریشی نے خاص تھانیداری انداز میں دھمکی دی اور صفیہ کے سامنے ہی اس کے چالباز دیور کے زنانہ کپڑے اتارنے کی بات کی تو وہ ایک دم پسیج گئی اور زبان کھولنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔

درحقیقت یہ لوگ بڑے چھوٹے پیمانے کے وارداتیے تھے۔ اٹھائی گیری' چوری چکاری' نوسربازی' بس اسی قسم کے مشاغل تھے ان کے۔ اپنے "کیریئر" میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالا تھا' نہ صرف ہاتھ ڈالا تھا بلکہ ناکام بھی ہوئے تھے۔

غزالہ کے حوالے سے پیش آنے والے اس واقعے کی تفصیل کچھ یوں تھی۔ میرے دوست شیر محمد کی طرح رانا سلطان بھی علاقے کا ایک کھاتا پیتا زمیندار تھا بلکہ زمین کے اعتبار سے وہ شیر محمد سے بڑا زمیندار تھا۔ اس کا ایک کارندہ غیاث عرف غیاثا چند روز پہلے رات کے وقت صندلی نامی قصبے میں آیا۔ وہ صفیہ کے دیور تنویر کو موٹر مکینک کی حیثیت سے بہت دیر سے جانتا تھا بلکہ یہ جان پہچان دوستی کی حدوں کو چھوتی تھی۔ غیاثے نے تنویر سے کہا کہ تمہارے قصبے میں آج کل ایک ڈاکٹر آئی ہوئی ہے۔ ایک مریض کو دکھانا بہت ضروری ہے' تم کسی طرح اس ڈاکٹر سے کہو کہ وہ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا نکال کر ہمارے ساتھ چلی جائے اور مریض کو دیکھ لے۔

تنویر نے کہا "یار وہ لوگ چوہدری شیر محمد صاحب کے مہمان ہیں اور بڑے اونچے لوگ ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کہیں جاکر دیکھنے پر راضی نہیں ہوگی۔ بہرحال اگر تم پوچھنا چاہتے ہو تو خود شیر محمد صاحب سے پوچھ لو۔"

غیاثا اور تنویر احمد' شیر محمد سے پوچھنے کے لیے حویلی کی طرف آئے۔ اتفاقاً اس وقت غزالہ شیخ عاصم کے ساتھ حویلی سے باہر ہی موجود تھی۔ وہ شیخ عاصم کو چہل قدمی کرانے کے لیے باہر لائی تھی اور دونوں برسات کی تاروں بھری رات کو دیکھ دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔ غیاثے نے براہ راست ڈاکٹر غزالہ سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ ایک اُجڈ دیہاتی تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز مؤثر نہیں تھا۔ جب غزالہ نے کہیں جانے سے معذوری ظاہر کی تو وہ اسے رشوت کی جھلک

دکھانے لگا۔ غزالہ بھڑک اٹھی اور اس نے غیاثا کو برا بھلا کہا۔ شیخ صاحب نے بھی انگلش میں تھوڑی بہت گھن گرج کا مظاہرہ کیا۔ غیاثا واپس چلا گیا۔ اگلے روز رات کو وہ پھر تنویر کے پاس آدھمکا۔ اس نے بتایا کہ مریض کی حالت خراب ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ اسے اسپتال بھی نہیں لے جایا جاسکتا۔ چوہدری رانا سلطان صاحب نے کہا ہے کہ کسی بھی طرح لیڈی ڈاکٹر کو لایا جائے۔ تنویر نے کہا' سب کچھ تمہارے سامنے ہے' وہ صاف انکار کرچکی ہے۔ غیاثا بولا ٹھیک ہے اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تو ہم ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بندے کی جان بچانا ڈاکٹر کی ضد سے زیادہ اہم بات ہے۔" غیاثے نے تنویر سے کہا کہ ہم صفیہ سے ملنے کے بہانے حویلی میں جاتے ہیں۔ ڈاکٹرنی سے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ جانے کو تیار ہوگئی تو ٹھیک ہے ورنہ اسے زبردستی لے جائیں گے۔ تنویر جانتا تھا کہ یہ خطرناک کام ہے۔ وہ کسی طور آمادہ نہیں تھا لیکن غیاثے نے ذرا دھمکا کر اور لالچ دے کر اسے اس کام کے لیے آمادہ کرلیا۔

تنویر کی بھاوج صفیہ ملازمہ کی حیثیت سے رات کو حویلی میں ہی رہتی تھی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے حویلی میں گئے۔ اسے ساری بات بتائی پھر صفیہ غیاثے کو لے کر ڈاکٹر غزالہ کے پاس پہنچی۔ غیاثے نے اپنے پچھلے رویے کی معافی مانگی اور نرم لہجے میں غزالہ سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ جاکر مریض کو دیکھ لے۔ غزالہ نے ایک بار پھر معذرت کی اور بتایا کہ اس کے شوہر بیمار ہیں اور وہ ان کی دیکھ بھال کررہی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ مریض کو گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آئیں' اس سے جو کچھ ہوسکا' وہ کرے گی۔

غیاثا دل ہی دل میں کھولتا ہوا غزالہ کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ تنویر اور صفیہ کے ساتھ مل کر غزالہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام بنارہا تھا۔ جب اتفاقاً میرا ادھر سے گزر ہوا اور میں نے صفیہ اور تنویر کو چوروں کی طرح دیوار کے سائے میں کھڑے دیکھ لیا۔ میرے ہاتھ میں خوبیدا چوکیدار کی رائفل تھی۔ وہ دونوں میرے انداز سے نہ جانے کیا سمجھے کہ انہوں نے خود کو چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے دوڑ کر صفیہ کو پکڑلیا جب کہ تنویر اور غیاثا بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ حاضر دماغ صفیہ نے اصل بات چھپانے کے لیے فوراً ٹریکٹر کے ناکارہ انجن والا بہانہ گھڑلیا۔ دوسری طرف غیاثا جس مریض کے لیے غزالہ کو لے جانا چاہتا تھا' اس کی حالت بدستور خراب تھی۔ صرف ایک روز بعد میں نے غزالہ اور شیخ عاصم کو آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چوہدری شیر محمد نے اپنے ذاتی ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ اگلے روز صبح سویرے آکر دونوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لاہور لے جائے۔ صفیہ چونکہ حویلی میں ہی رہتی تھی لہٰذا اسے اس پروگرام کا علم ہوگیا۔ اس نے لالچ کا دامن پکڑا اور اپنے دیور تنویر کے ذریعے یہ اطلاع غیاثے تک پہنچادی۔

غیاثے کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ ویران راستے پر جاتی ہوئی گاڑی روک کر غزالہ کو بزور بازو اپنے ساتھ لے جاتا۔ وہ رانا سلطان کا کارندہ خاص تھا اور اس میں اُجڈ لوگوں جیسی ہٹ دھرمی تھی۔ وہ غزالہ کو بہرصورت اپنے مریض کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ پروگرام کے مطابق غیاثے کے ڈھاٹا پوش ساتھیوں نے "پیپی والے موڑ" پر شیر محمد کی گاڑی پر حملہ کیا اور ڈرائیور خانوں کو شدید زخمی کردیا۔ خانوں کی بیوی کے بارے میں انہیں شبہ گزرا کہ شاید وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ جب اصلیت کا پتا چلا تو وہ بھاگ گئے اور جاتے جاتے خوف زدہ عورت کے کانوں سے سونے کی بالیاں نوچ کر لے گئے (یاد رہے کہ اس حملے میں غیاثا خود شریک نہیں تھا)

یہ وہ مکمل روداد تھی جو صفیہ نامی ملازمہ کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ صفیہ نے بتایا کہ جب چوہدری صاحب کا ڈرائیور خانوں شدید زخمی ہوگیا تو وہ سخت خوف زدہ ہوگئی۔ وہ شیر محمد کی سخت طبیعت سے واقف تھی۔ اسے اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر شیر محمد کو پتا چل گیا کہ اس واردات میں وہ بھی ملوث ہے تو وہ الٹا لٹکا کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے اور اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ وہ اپنے شوہر اور دیور کے ساتھ قصبے سے غائب ہوگئی اور یہاں چوہدری رانا سلطان کی بجوہ میں آگئی۔

یہ مسئلہ اتنا سنگین تو نہیں نکلا تھا جتنا میں نے تصور کیا تھا پھر بھی اپنی جگہ اس کی اہمیت تھی۔ یہ گتھی سلجھ گئی تھی کہ غزالہ کے درپے کون لوگ تھے۔ میں غیاثے نام کے اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس مریض کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کررہا ہے۔ اس سارے واقعے میں غیاثے کی ہٹ دھرمی نمایاں نظر آتی تھی۔ جتنی کوشش اس نے غزالہ کو لے جانے کے لیے کی تھی' اتنی کوشش وہ کہیں اور کرتا تو شاید کوئی دوسرا ڈاکٹر اس کے مریض کو دیکھنے پر آمادہ ہوجاتا مگر وہ تو جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا کہ غزالہ کو ہی لے کر جائے گا۔ اگر یہ شخص واقعی ضد پر اترا ہوا تھا تو پھر اب بھی غزالہ کے لیے مشکل کا باعث بن سکتا تھا۔

میں نے کہا "کیا خیال ہے عالم قریشی! اس پھنے خان غیاثے کو دیکھ لیا جائے؟"

عالم قریشی نے آہستگی سے کہا "چھوڑو یار! ہمیں اس نئے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے چکر پہلے ہی کم نہیں ہیں۔ میرے خیال میں ہمارا سب سے بڑا اور خاص الخاص مسئلہ ڈاکٹر حمزہ ہے۔ ہمارا سارا زور ڈاکٹر کی تلاش میں لگنا چاہیے۔"

"لیکن یار! غزالہ بھی تو اہم ہے۔ اگر ان لوگوں نے ضد میں آکر پھر اسے تنگ کرنے کی کوشش کی تو؟"

"میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوگا۔" عالم قریشی نے پُرسوچ لہجے میں کہا "اور اگر ہوا بھی تو غزالہ اور شیخ نے کون سا ہفتوں تک یہاں رہنا ہے۔ تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ چند روز تک انہیں چھوڑ دو گے۔"

"بات چند روز کی نہیں ہے۔" میں نے کہا "بات یہ ہے کہ ڈاکٹر حمزہ کو ملنا چاہیے۔ میرے خیال میں جب تک ڈاکٹر حمزہ دستیاب نہ ہو جائے انہیں شیخ کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔"

"شاید تم ابھی تک اسی سوچ میں ہو کہ حمزہ کے غائب ہو جانے میں شنکر کا ہاتھ ہے۔ یار! یہ بات میرے دل کو تو کچھ لگتی نہیں ہے۔ آگے کی اللہ جانے۔" عالم قریشی کی بات سن کر میرا دل ایک بار پھر غم کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔ حقیقت بے حد تلخ تھی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حمزہ کی زندگی کے امکانات مسلسل معدوم ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک ہم دونوں چونک گئے۔ گھر سے باہر ایک کھٹارا جیپ رکنے کی آواز آئی۔ جیپ کی آواز سن کر صفیہ اور اس کے دیور کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی "کون آیا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں صفیہ سے پوچھا۔

"مم... میرا خیال ہے غیاثا ہوگا۔" وہ ہکلائی۔

چند ہی لمحے بعد جیپ کا انجن بند ہو گیا۔ میں نے ننھے منے طاقت ور پسٹل کی نال صفیہ کے دیور تنویر کی گردن پر لگا دی اور اس سے کہا کہ اگر اس نے آواز نکالی تو جان سے جائے گا پھر میں اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چھپ گیا۔ قریشی بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے صفیہ سے کہا کہ وہ غیاثے کے ساتھ نارمل انداز میں بات کرے۔ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تنویر کی جان کی خیر نہیں۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد غیاثا لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آگیا۔ وہ لمبا تڑنگا تھا۔ اس نے سفید تہبند پر فیروزی رنگ کا چمکدار کرتہ پہن رکھا تھا۔ گھنی مونچھیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ شکل و صورت سے واقعی پھڈے باز لگتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے صفیہ سے پوچھا "تنویر اکرم کدھر ہے؟"

وہ بولی "شش... شہر چلا گیا ہے۔"

"زنانے کپڑے پہنا دیے تھے اسے؟"

"ہاں۔"

"چلو اچھا ہی ہوا۔ تین چار دہاڑیاں ہی لگا آئے گا۔" پھر ذرا توقف سے بولا "اور وہ تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"وہ افیم کی ڈلی کھا کر سویا پڑا ہے صبح سے۔"

واقعی جب سے ہم یہاں آئے تھے، صفیہ کا شوہر مسلسل سو رہا تھا۔ غیاث کے چہرے پر چمک نظر آئی اور اس نے بڑی بے باکی سے ہاتھ آگے بڑھا کر لڑکی کی کمر پر چٹکی کاٹی۔ وہ سسک کر رہ گئی۔ وہ واضح طور پر حواس باختہ نظر آ رہی تھی مگر غیاث نے اس کی کیفیت پر غور نہیں کیا اور چارپائی پر بیٹھ کر اسے آغوش میں لے لیا۔ خوب ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لڑکی بہت ارزاں بھی نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس سے ملنے والا ہر شخص اس کے درپے ہو جاتا ہے۔

میں اور عالم قریشی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو غیاثے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے تیزی سے سنبھالا لیا اور کڑک کر بولا "کون ہو اوئے تم؟"

"میرا تیرا باپ ہوں اور یہ تیرا تایا ہے۔" میں نے کہا اور ایک زوردار ٹانگ غیاثے کے چہرے پر رسید کی۔ وہ ڈکرا کر رہ گیا۔

لڑکی چیخ مار کر اس کی گود سے نکلی اور ایک کونے میں سمٹ گئی۔ منہ پر ٹانگ کھانے کے بعد غیاثے کو بڑی "مسرت" ہوئی تھی۔ اس مسرت کے عملی اظہار کے لیے اس نے گالی دی اور تیزی سے میری طرف آیا۔ جیسے برسوں بعد مجھ سے ملا ہو اور بغلگیر ہونا چاہتا ہو۔ میں نے خود کو اس کی زد سے بچایا اور دائیں ہاتھ کا بھرپور مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ وہ ناک آؤٹ ہونے والے باکسر کی طرح چکرا کر کمرے کے وسط میں گرا اور پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً وہ خود کو بہت توپ قسم کی چیز سمجھتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اسے زمین چاٹنی پڑے گی اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے سامنے جس پر وہ اپنا رعب گانٹھنے اور دبدبہ جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میرے مکے نے اس کے کم از کم دو دانت جڑوں سے ہلا دیے تھے۔ میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا اور اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا۔ غیاثا اب

مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے یا یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس نے مجھے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

عالم قریشی نے کہا "شاہ جہاں! اس کے چہرے پر سب سے بری چیز اس کی مونچھیں ہیں۔ وہ سامنے سیفٹی ریزر پڑا ہے میرا خیال ہے اس کی مونچھیں صاف کرا دیں۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔"

"یعنی نہ رہیں مونچھیں نہ کرے بدمعاشی۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایک دم غیاثے کی آنکھوں میں شدید حیرت ابھری تھی۔ اس کے لب تھرائے۔ وہ میری طرف انگلی اٹھا کر بولا "آ... آپ کا نام شاہ جہاں ہے؟"

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"آپ... استاد جہانی... ہیں نا۔ میں نے... میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور پہچانتا بھی ہوں۔ آپ کو جھوک ضامن کا غنڈا کارچین یاد ہوگا، اس کے ساتھ آپ کی لڑائی ہوئی تھی۔ میں بھی ان دنوں اس کے گینگ میں شامل تھا۔"

میں نے غیاثے کی گردن پر سے پاؤں اٹھا لیا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے فیروزی کرتے کے پلو سے اپنے خون آلود ہونٹ پونچھنے لگا۔ اس نے اپنی آستین اوپر اٹھائی۔ کہنی سے ذرا اوپر اس کے بازو پر ایک پرانے زخم کا بڑا سا نشان تھا۔ یہ تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ غیاثا بولا "یہ زخم آپ ہی کے چاقو سے آیا تھا۔"

عالم قریشی مسکرا دیا "لیکن اس زخم پر شاہ جہاں کے سائن نہیں ہیں۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ زخم اسی نے لگایا تھا۔"

غیاثا کھسیانے انداز میں ہنسا "میں کوئی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ لڑائی اور محبت میں تو سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ..."

"شاہ جہاں سے تمہارا کتنا قریبی تعلق ہے۔" عالم قریشی نے پھر اس کی بات اچک لی۔

وہ گڑبڑا کر رہ گیا "میں تو... میں تو صرف آپ سے معافی مانگنا چاہ رہا ہوں جی۔ میری اتنی جرأت کہاں کہ آپ پر ہاتھ اٹھاؤں۔ جو کچھ ہوا ہے، بے خبری میں ہوا ہے۔" وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑنے لگا۔

صفیہ اور اس کے دیور تنویر کے چہرے پر موسلا دھار حیرت برس رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص ان کے لیے بگا ڈاکو تھا، وہ اب جیرا مسکین نظر آ رہا تھا۔ اس کی غراہٹ گھگھیاہٹ میں بدل چکی تھی اور اس کے چٹکیاں کاٹنے والے بے لگام ہاتھ اب ہمارے سامنے بندھے ہوئے تھے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ کمزوری درجہ بدرجہ طاقت کے سامنے جھکتی رہتی ہے۔ بہرحال احتیاط پھر بھی ضروری تھی۔ بے شک غیاثا میرے صدقے واری جا رہا تھا اور میری دید کو اپنی خوش بختی قرار دے رہا تھا لیکن دلوں کے حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ موقع دیکھ کر اپنے لباس کے نیچے سے آتشیں ہتھیار نکال لیتا اور ایک سیکنڈ میں ہمیں بھون کر رکھ دیتا۔ آدمی کو بھونے جانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ استاد جہانی ہو، عالم قریشی ہو یا پھر کوئی بہت بڑا سپرمین ہو، گولی سب سے یکساں سلوک کرتی ہے۔ میں نے غیاثا نام کے اس شخص کی مکمل تلاشی لی اور اسے کمرے کے ایک گوشے میں فرش پر بٹھا دیا۔

میں نے اس سے پوچھا "رانا سلطان کون ہے؟"

وہ بولا "وہ چوہدری صاحب ہیں جی گاؤں کے۔ بڑے اچھے شخص ہیں۔"

میں نے کہا "ظاہر ہے جس شخص نے تم جیسا کارندہ پال رکھا ہو، وہ اچھا شخص ہی ہوگا۔"

غیاثا بولا "میں پھر معافی چاہتا ہوں جی آپ سے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ دیہات میں عام لوگوں میں رعب وغیرہ رکھنے کے لیے ایسے چھوٹے موٹے کام کرنے ہی پڑتے ہیں۔ ورنہ میں دل کا برا نہیں ہوں جی اور چوہدری سلطان صاحب تو ویسے ہی بالکل اور ٹائپ کے بندے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اس طرح کا چوہدری پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، بالکل اور طرح کے بندے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو دیکھ لیتے ہیں اس اور طرح کے بندے کو بھی لیکن ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ اگر تم نے یا رانا سلطان کے کسی بندے نے دوبارہ صندلی قصبے کا رخ کیا اور ڈاکٹر غزالہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تو میں اس کا حشر خراب کر دوں گا۔"

غیاثا پھر گڑگڑانے لگا "بس جی، بے خبری میں غلطی ہو گئی۔ آئندہ ہرگز نہیں ہوگی۔ آپ کہتے ہیں تو میں ان ڈاکٹر صاحبہ سے بھی معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"تمہاری معافی سے کیا ہوتا ہے۔ معافی تو اس شخص کو مانگنی چاہیے جس کے تم کارندے ہو۔"

"نہیں جناب۔" غیاثا زور دے کر بولا "میں آپ کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔ چوہدری سلطان

صاحب کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کو یہاں لانے کے لیے میں نے جو کچھ بھی کیا' وہ اپنی طرف سے کیا۔ چوہدری سلطان صاحب کو تو ان باتوں کی خبر تک نہیں ہے۔"

عالم قریشی نے پوچھا "وہ مریضہ کون ہے جس کے لیے تم ڈاکٹر غزالہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے؟"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں جی۔ وہ مریضہ نہیں مریض ہے۔"

"تو پھر اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال میں نہیں جا سکتا۔" عالم قریشی نے پوچھا۔

"بس جی کوئی مسئلہ ہے مگر مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔"

"معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں جمالی صاحب۔ بس مجھے اتنا ہی پتا ہے کہ کوئی شخص زخمی ہے اور وہ کسی اسپتال یا کلینک وغیرہ میں جانا نہیں چاہتا۔"

میں نے پستول سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو اٹھو' میں تمہارے چوہدری رانا سلطان سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا "آپ یہ پستول بے شک اپنی جیب میں رکھ لیں جناب! مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ آپ کے حکم سے سرتابی کروں۔"

میں نے کہا "یہ پستول تمہارے حق میں بہتر ہی ہے۔ تم اپنے چوہدری سے کہہ سکو گے کہ ہمیں مجبوری کی حالت میں حویلی تک لائے ہو۔"

بات غیاث کی سمجھ میں آگئی تھی لہٰذا اس نے پستول ہٹانے کے سلسلے میں مجھ پر زیادہ زور نہیں دیا۔ میں نے پستول اپنی بغل کے اندر کرلیا اور غیاث کو ڈیرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ رانا سلطان کی دو منزلہ حویلی اس ڈیرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ عالم قریشی کو میں نے ڈیرے میں ہی رہنے دیا تاکہ وہ صفیہ اور اس کے دیور پر نظر رکھ سکے۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہم ایک خوب صورت حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ دیہاتی علاقہ تھا۔ اس کے باوجود حویلی کی بناوٹ اور سجاوٹ میں شہری جھلک پائی جاتی تھی۔ حویلی کے مین دروازے سے باہر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس پر "لنگر خانہ" کے الفاظ لکھے تھے۔ پتا نہیں یہ واقعی حویلی والوں کی خدا ترسی تھی یا بس یونہی رسمی کارروائی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو حویلی کے دو مسلح کارندوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔

"کہاں جا رہے ہو جوانو؟"

"یہ چوہدری صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔" میری بجائے غیاث نے جواب دیا۔

"لیکن چوہدری صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کرلیتے ہیں۔ بیٹھکیں اسی لیے ہوتی ہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ دراصل غیاث نے مجھے اشارے سے سمجھا دیا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ چوہدری صاحب اندر ہی ہیں۔

"یہ کیا طریقہ ہے بھئی۔ تم بغیر پوچھے اندر گھستے جا رہے ہو۔" کارندے نے مجھے روکنے کے لیے میرے بازو پر ہاتھ ڈال دیا۔

میرا موڈ بڑا تلخ ہو رہا تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ میں اسے دھکیلا۔ وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ ایک دوسرا شخص آگے آیا۔ میں نے اسے بھی دھکا دیا اور اندر چلا گیا۔ میں جانتا تھا۔ ایک چھوٹے چوہدری کے چھوٹے چھوٹے بے حوصلہ نوکر ہیں۔ بندوقوں کے باوجود ان میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرسکتے۔ وہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ اسی دوران میں' میں اندرونی احاطے میں داخل ہوگیا۔ عام حویلیوں کے برعکس یہاں کا احاطہ گراسی لان کی شکل میں تھا۔ چاروں طرف پھولوں کی طویل کیاریاں تھیں۔ اچانک میری نگاہ ایک منظر پر پڑی اور میں اپنی جگہ پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔ آنکھوں کے سوا جیسے میرا پورا جسم بے جان ہوگیا تھا۔ میں نے ایک وہیل چیئر دیکھی تھی اور اس پر نوجوان ڈاکٹر حمزہ کو دیکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حمزہ نے منہ پھیر لیا تھا اور تیزی سے چیئر کے پہیے کو گھماتا ہوا مولسری کے ایک پودے کے پیچھے اوجھل ہوگیا تھا۔

چند لمحے بعد میں اپنے حواس میں آیا اور تیزی سے ڈاکٹر حمزہ کے پیچھے بھاگا۔ میں پودوں کے عقب میں پہنچا تو حمزہ وہیل چیئر سمیت برآمدے تک پہنچ چکا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی چیئر کا ایک پہیا کھڈ میں گیا اور وہ ایک طرف الٹ گئی۔ میں نے دوڑ کر حمزہ کو سنبھالا۔ وہ کرسی کے ساتھ ہی الٹ پڑا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے بازو کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا اور اس کا پورا جسم کانپتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رو رہا ہے پھر میری نگاہ اس کے بائیں بازو پر پڑی اور دل پر گھونسا سا لگا۔ اس کا ہاتھ کلائی پر سے غائب تھا۔ کٹے ہوئے بازو پر سفید بینڈیج کی گئی تھی۔ کرسی کے الٹنے سے زخمی بازو پر ضرب لگی تھی اور بینڈیج پر خون کے تازہ داغ

نظر آنے لگے تھے۔

میں نے بڑی کوشش کرکے حمزہ کا بازو اس کے چہرے پر سے ہٹایا۔ اس کا ایک رخسار مٹی سے لتھڑا ہوا تھا اور آنکھ سے بہنے والا آنسو اس مٹی پر لکیر سی بنا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حسرت برس رہی تھی۔

"حمزہ یہ کیا ہوا؟" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور میں نے اسے گلے سے لگالیا۔ غم اور خوشی اس طرح آپس میں مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

سیل غم پر بند باندھنے والا کوئی عظیم الشان بند ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا اور حمزہ کے آنسوؤں کے منہ زور دھارے بہہ نکلے۔ حمزہ میری بانہوں میں چھپ چھپا کر زار و زار رونے لگا۔ ہمارے ارد گرد رانا سلطان کے مسلح محافظ تھے اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حمزہ کی ایک ٹانگ پر بھی گھٹنے تک پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور خون کے تازہ دھبے نظر آرہے تھے۔

یہ ایک بڑا ڈرامائی سا منظر تھا اور اس کی تلخی میرے رگ و پے میں گھل رہی تھی۔ حمزہ نے کراہتے ہوئے کہا "آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔ پلیز آپ چلے جائیں۔ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ پلیز چلے جائیں آپ۔"

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا "حوصلہ کرو حمزہ! تم تو بہت بہادر نوجوان ہو۔"

"میں بہادر نہیں ہوں۔ میں بڑا بزدل ہوں۔ آپ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرنا بھائی جان۔۔۔ اور نہ کسی اور کو میرے بارے میں بتانا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

اس نے باقاعدہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ جوڑنے کے لیے دو ہاتھ ہونا ضروری ہوتے ہیں۔ وہ حسرت کی تصویر بن کر رہ گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بے اختیار اس کا رخسار چوم لیا۔ نجانے کیوں انہی لمحوں میں شفا کی معصوم صورت میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی تھی۔ ایک ہی لمحے میں میرے ذہن نے واقعات کی کئی کڑیاں آپس میں جوڑ لیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ سا کھنچ گیا اور میں جان گیا کہ حویلی میں ہونے والے دھماکوں کے بعد حمزہ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یقیناً اس کے جسم پر جو سنگین زخم دکھائی دے رہے تھے وہ انہی بارودی دھماکوں کی نشانی تھی' جنہوں نے چند روز پہلے جاگیردار قادر زماں کی حویلی کو تہ و بالا کیا تھا۔ ان دھماکوں میں حمزہ کا ہاتھ اڑ گیا تھا اور ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔ چونکہ اس وقت زخم تازہ تھے اور قوت برداشت بھی تھی لہٰذا حمزہ کسی طرح حویلی سے نکل گیا تھا پھر نامعلوم طریقے سے وہ یہاں زمیندار رانا سلطان کی حویلی تک پہنچا تھا۔ میں ابھی رانا سلطان سے ملا نہیں تھا لیکن آثار سے نظر آرہا تھا کہ وہ ایک بھلا مانس شخص ہے۔ غالباً اس نے حمزہ کو پناہ دی تھی۔ معذور ہونے کے بعد حمزہ کو حوصلہ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی کے سامنے اور خاص طور پر شفا کے روبرو جائے۔ اس نے رانا سلطان سے درخواست کی ہوگی کہ وہ اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زہر آلود زخم لے کر کسی اسپتال بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اسی رویے کے سبب رانا سلطان اس کے لیے کسی ڈاکٹر کا انتظام کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ ایک دور دراز گاؤں تھا' یہاں کسی ڈاکٹر کا انتظام کرنا آسان نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رانا سلطان کا کارندہ غزالہ کے پیچھے پڑا رہا تھا۔

میں نے حمزہ کا پٹیوں میں جکڑا ہوا پاؤں دیکھا۔ ٹانگ نیلی ہو رہی تھی۔ یہ زہر پیدا ہونے کی علامتیں تھیں۔ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ ایسے کیسز میں مریض کی جان بچانے کے لیے عموماً جسم کا متاثرہ حصہ الگ کرنا پڑ جاتا ہے۔ حمزہ کی جان بھی خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اس وقت کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ بے وقوف اپنے آپ کو یہاں چھپائے بیٹھا تھا۔ خود ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی حالت کے بارے میں خود کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر وہ اتنا بزدل ہو چکا تھا کہ جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔

اسی دوران میں ایک لمبا تڑنگا بارعب شخص مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہی رانا سلطان ہے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں اس کا سرخ و سپید چہرہ خوب سج رہا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "کون ہیں آپ؟"

"میں۔۔۔ انہیں لینے آیا ہوں۔" میں نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔

حمزہ چیخ کر بولا "مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں کہہ چکا ہوں' مجھے کہیں نہیں جانا۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

اس کی آواز حویلی کی بلند چھتوں کے نیچے دور تک گونج گئی۔

میں نے ایک بار پھر حمزہ کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ میری گرفت سے نکل نکل جا رہا تھا۔

"چھوڑ دیں مجھے۔ مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔"

رانا سلطان تیزی سے آگے آیا اور اس نے مجھے پیچھے ہٹا کر حمزہ کا سر تھپتھپایا اور اسے دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ حمزہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا وہ بے حد قابلِ رحم نظر آ رہا تھا۔ رانا سلطان نے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ میں موقع سے ہٹ جاؤں۔ میں غیاث کے ساتھ حویلی نما کوٹھی کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ ہم سب بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ میں حالات کی نیرنگی پر حیران ہو رہا تھا۔ ہم نکلے تھے غزالہ کے بدخواہ کو ڈھونڈنے اور نتیجے میں پہنچ گئے تھے گمشدہ حمزہ تک۔ تھوڑی دیر بعد زمیندار رانا سلطان وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور حمزہ سے میرا کیا تعلق ہے؟

میں نے اسے اپنے اور حمزہ کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ میں نے کہا کہ وہ میری چھوٹی بہن کا منگیتر ہے اور عنقریب اس کی شادی ہونے والی ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ لاہور میں حمزہ کی والدہ اس کی گمشدگی کے سبب سخت پریشان ہیں اور ان کو خرابیِ صحت کی وجہ سے اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔

رانا سلطان دھیمے لہجے میں بات کرنے والا ایک پڑھا لکھا زمیندار نظر آتا تھا بلکہ وہ زمیندار نظر ہی نہیں آتا تھا۔ لباس سے لے کر شکل و صورت تک اس کا کچھ بھی زمیندار یا چوہدریوں جیسا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ آج سے چھ روز پہلے رات کے وقت وہ ایک شادی میں شریک ہو کر قصبے سے واپس آ رہا تھا اس کے پانچ چھ ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ وہ گاڑیوں پر سوار وہ لوگ شیخوپورہ جانے والی سڑک پر آئے تو نشیب کی گھنی جھاڑیوں میں ان کی نگاہ ایک کھنڈرا جیپ پر پڑی۔ اس کا ہارن مسلسل بجتا چلا جا رہا تھا اور لائٹیں بھی روشن تھیں۔ درحقیقت ہارن کی آواز نے ہی ان کی توجہ جیپ کی طرف مبذول کرائی تھی۔ جیپ کے ارد گرد کوئی بندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے گاڑیاں روکیں اور قریب جا کر دیکھا تو حمزہ ڈرائیونگ سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے بازو اور ٹانگ سے نکلنے والا خون گاڑی کی نشست کو رنگین کر چکا تھا۔ رانا سلطان اور اس کے ساتھیوں نے زخمی حمزہ کو اٹھایا اور اپنے گھر لے آئے پھر اس کے بازو اور ٹانگ کی مرہم پٹی کی گئی۔ صبح تک وہ ہوش میں آ گیا۔ رانا سلطان نے حمزہ کا نام پتا پوچھا اور یہ جاننا چاہا کہ اس پر کیا بیتی ہے لیکن وہ کچھ بھی بتانے سے انکاری تھا۔ بس یہی تکرار کر رہا تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم جب اگلے روز دوپہر کے وقت ایک اخبار گاؤں میں آیا اور اس میں جھوک ضامن کی حویلی میں ہونے والے شدید دھماکوں کی خبر پڑھی گئی تو رانا سلطان اور اس کے ساتھیوں کو شک گزرا کہ ہو نہ ہو یہ نوجوان بھی انہی دھماکوں میں زخمی ہوا ہے۔ رانا سلطان کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس بارے میں ایف آئی آر درج کرائے مگر جب وہ حمزہ کی خوف زدہ صورت دیکھتا تو اسے اپنا ارادہ ڈانواں ڈول محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ نوجوان خود کو ہر صورت میں پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ اپنے دشمنوں سے خوف زدہ تھا۔ بالآخر سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لڑکے کے کہنے کے مطابق عمل کرے گا۔ یعنی اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے گا اور نہ کسی اور کو لیکن اس کا علاج معالجہ بھی ضروری تھا۔ کٹے ہوئے بازو سے رسنے والا خون تو اگلے روز بند ہو گیا مگر ٹانگ کو علاج معالجے کی شدید ضرورت تھی۔ پہلے رانا سلطان نے اپنے طور پر ایک کمپاؤنڈر سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں ہے بہتر ہے کہ مریض کو بڑے اسپتال لے جایا جائے یا پھر کسی اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کیا جائے۔ علاقے میں اچھا ڈاکٹر ملنا ناممکن تھا۔ جو ایک ڈاکٹر موجود تھا اس پر رانا سلطان بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس دوران میں اسے اپنے خاص کارندے غیاث کی زبانی اطلاع ملی کہ قصبے میں ہی ایک لیڈی ڈاکٹر موجود ہے۔ وہ بڑے اسپتال کی سرجن ہے اور نوجوان مریض کے لیے اچھا مشورہ دے سکتی ہے۔ رانا سلطان نے غیاث سے کہا کہ وہ کسی طرح ڈاکٹر کو حویلی میں لے آئے۔ غیاث نے اپنے طور پر غزالہ کو حویلی لانے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد زبردستی پر اتر آیا۔ رانا سلطان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک امن پسند اور صلح جو شخص ہے۔ اس میں محبت اور ہمدردی کے جذبات بھی تھے۔ یہ محبت اور ہمدردی ہی تو تھی کہ وہ خطرہ مول لے کر ایک اجنبی نوجوان کو پناہ دیے ہوئے تھا اور رات دن اس کے لیے پریشان تھا۔ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ حمزہ کو اسپتال سے دور رکھنا اس کے لیے بہت نقصان دہ ہے لیکن وہ اس کی ضد کی وجہ سے مجبور بھی تھا اور توقع کر رہا تھا کہ شاید غیب سے کوئی معجزہ ظہور میں آ جائے اور حمزہ کی حالت سنبھل جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ نوجوان کے لیے رانا سلطان کی ہمدردی اور خیرخواہی محسوس

کر کے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ رانا سلطان کا ملازم غیاث میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ وہ رانا سلطان کے سامنے میرے تعریفوں کے پل باندھنا شروع ہو گیا۔ اس نے رانا سلطان سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ مجھے حمزہ کا محسن تصور کرنے لگا۔ رانا سلطان اور اس کے ساتھی میرے متعلق اخبارات میں بھی پڑھ چکے تھے۔ وہ مجھے ایسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے کسی عجوبے کو دیکھا جاتا ہے۔ میں نے رانا سلطان سے کہا کہ حمزہ کو فوراً اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت ہے۔

رانا سلطان بولا "آپ کا حمزہ سے "زیادہ قریبی" تعلق ہے۔ آپ اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اس کی ذہنی حالت اس طرح کی ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے نہیں جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اس کو آمادہ کر لوں گا۔ اگر نہ بھی ہو سکا تو ہم اسے خواب آور انجکشن لگا دیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ اسپتال جانے سے انکار کیوں کر رہا ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خطرے کا احساس ہو رہا ہو۔"

میں نے رانا سلطان کو گول مول جواب دیا تھا ورنہ یہ حقیقت تھی کہ میں اس رویے کی وجہ اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ حمزہ حادثے کے بعد چھپتا کیوں پھر رہا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے معذور ہو چکا تھا اور ایک ٹانگ بھی شدید خطرے میں تھی۔ وہ شدید ترین ڈپریشن کا شکار ہو چکا تھا اور اپنی معذوریوں کے ساتھ کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ (اور) خاص طور پر شفقت کے سامنے۔۔۔ اس کے لیے یہ سوچ سوہانِ روح تھی کہ وہ اپنے کٹے پھٹے جسم کے ساتھ شفقت کا سامنا کرے۔

رانا سلطان سے ملنے کے بعد میں نے حمزہ سے ملاقات کی۔ وہ کمرے میں بستر پر نیم دراز تھا۔ ایک خادم خدمت گزاری کے لیے دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ حمزہ کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بہرحال اب اس کی ہیجانی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور دھیمے لہجے میں بات کرنے لگا۔ میں نے اسے اس کی والدہ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ ہم سب اس کے لیے اور اس کی سلامتی کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ میں نے کہا "حمزہ! مجھے تمہارے رویے پر افسوس ہے۔ شاید اس لیے کہ تم ایک ڈاکو ہونے کے باوجود اپنے آپ سے سنگین غفلت برت رہے ہو۔ کوئی بھی انجان شخص تمہاری ٹانگ دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ تمہیں فوری علاج کی ضرورت ہے۔"

حمزہ خاموش رہا۔ اس کی نظریں زمین میں گڑی تھیں۔ میں نے کہا "میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔ کیا ہوا اگر حادثے میں تمہارا ہاتھ جاتا رہا ہے۔ ایسا کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ، عالم قریشی کے ساتھ یا خود شفقت کے ساتھ۔ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں پھر تم کیوں پشیمان ہو رہے ہو؟"

میں کافی دیر اسی کوشش میں لگا رہا۔ اسی دوران میں رانا سلطان بھی آ گیا۔ ہم نے مل جل کر اسے سمجھایا اور شہر جانے پر نیم رضامند کر لیا۔ میں نے حمزہ سے حادثے میں زخمی ہونے کے بارے میں تفصیلات پوچھیں۔ اس نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ حادثے کے وقت وہ دھماکے کی جگہ سے بہت قریب تھا۔ دھماکے کی شدت سے وہ لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی پھر اچانک اسے لگا کہ اس کے پاؤں پر جیسے نیم گرم سیال گر رہا ہے۔ یہ اس کا اپنا خون تھا جو اس کے کٹے ہوئے بازو سے فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹانگ بہت بھاری محسوس ہوئی۔ ٹانگ پر بھی تین گہرے زخم تھے۔ ایک جگہ سے پتلون میں سیاہی مائل سوراخ ہو چکا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا گزری ہے۔ اس نے اپنے حواس بحال کیے اور اٹھ کر باہر کی طرف لپکا۔ اس وقت حویلی کے مہمان خانے والے حصے میں گھپ اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ گرتا پڑتا حویلی سے باہر آ گیا۔ یہاں مین گیٹ کے پاس ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا اور ڈرائیور گاڑی کے قریب کھڑا وحشت زدہ نظروں سے حویلی سے اٹھتے دھوئیں کے بادل کو دیکھ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب دو زبردست دھماکے مزید ہوئے۔ تین چار افراد گیٹ کے قریب سے بھاگ کر درختوں کی طرف چلے گئے۔ ان میں جیپ کا ڈرائیور بھی شامل تھا۔ جیپ کا ہارن ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے مسلسل بج رہا تھا۔ زخمی حمزہ نے جیپ خالی دیکھی تو اس میں بیٹھ کر وہاں سے نکل آیا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اپنا تیزی سے بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کی اور کٹی ہوئی کلائی پر مضبوطی سے کپڑا لپیٹ لیا۔ خون کے اخراج اور صدمے کی شدت سے حمزہ کی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں لیکن وہ جیپ کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ پختہ سڑک پر پہنچ کر اس نے تیز رفتاری سے سفر کیا۔ وہ لاہور میں اپنے دوست ایڈووکیٹ ارسلان کے پاس پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن لاہور پہنچنے سے پہلے اس

کی ہمت جواب دے گئی۔ سست رفتاری سے رینگتی ہوئی جیپ اس کے قابو سے باہر ہو کر جھاڑیوں میں گھس گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

حمزہ روداد سنا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے سر سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

○☆○

میں حمزہ کو بذریعہ کار فوراً لاہور لے آیا۔ یہ نویوٹا کار رانا سلطان ہی کی تھی۔ عالم قریشی اور زریں سمیت باقی سب لوگ صندلی کے قصبے میں ہی رہے تھے۔ میں نے زریں اور عالم قریشی سے کہا کہ وہ شیخ عاصم اور غزالہ کی حفاظت پوری ذمے داری سے کریں۔ میں حمزہ کو لاہور کے ایک جدید پرائیویٹ اسپتال میں لے آیا۔ یہ وہی "ڈاکٹر مسز رقیہ والا" اسپتال تھا۔ پہلو کے وہ میں جلا ہونے کے بعد میں کافی عرصے یہاں رہ چکا تھا۔ کہنے کو تو یہ اسپتال تھا لیکن اس کے در و دیوار سے میری بہت سی خوشگوار یادیں بھی وابستہ تھیں۔ اسی اسپتال میں علاج کے دوران میں غزالہ شب و روز میرے ساتھ رہی تھی۔ اس کی مہربان سرگوشیاں جیسے ابھی تک ان برآمدوں میں گونج رہی تھیں اور اس کی خوب صورت ہنسی اسپتال کے سبزہ زاروں میں چکرا رہی تھی۔ اسی اسپتال کے کمرا نمبر دس میں وہ یادگار رات آئی تھی جب غزالہ کے لانبے بال میرے بستر پر منتشر ہو گئے تھے اور میں بے خبری میں کروٹ بدل کر ان بالوں پر سو رہا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ حمزہ کے حصے میں وہی کمرا آیا جس میں میں ٹھہر چکا تھا۔ یعنی کمرا نمبر دس۔ حمزہ کا فوراً مکمل طبی معائنہ ہوا۔ شہر کے معروف آرتھوپیڈک سرجن نے معائنے کے بعد بتایا کہ ٹانگ کے زخم کے سبب اس بات کا شدید خطرہ موجود ہے کہ زہر جسم میں سرایت کر جائے اور مریض کی جان مزید خطرے میں پڑ جائے۔ سرجن نے کہا "آئی ایم ویری سوری۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ٹانگ کاٹنا پڑے گی۔"

یہ ایک اندوہناک خبر تھی لیکن جب اس سے زیادہ سنگین خبروں کا تصور ذہن میں آتا تھا تو یہ خبر اپنی شدت کھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے عالم قریشی اور زریں گل کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ شفتا کو یا انجم کو حمزہ کی سنگین حالت کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ صرف یہ بتا دیں کہ اس کا سراغ مل گیا ہے اور وہ لاہور میں ہے۔ بہرحال حمزہ کی والدہ کو حمزہ سے ملانا ضروری تھا۔ وہ ایک قریبی اسپتال میں زیرِ علاج تھیں۔ میں نے جا کر انہیں خوش خبری کے انداز میں بتایا کہ حمزہ مل گیا ہے۔ بے چین ہو کر ماتا بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی "میرا ابا؟ کہاں چھوڑ آئے ہو اسے؟"

میں نے کہا "وہ تھوڑا سا زخمی ہے اور ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔"

"کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔ میری تسلی کے لیے غلط بات تو نہیں بتا رہے ہو؟"

میں نے کہا "وہ "رقیہ اسپتال" میں ہے۔ آپ اس سے بات کر سکتی ہیں۔"

"تو پلیز کراؤ میری بات ... میں ترس گئی ہوں۔"

میں نے فون پر حمزہ کی والدہ کی بات حمزہ سے کرا دی۔ کسی حد تک مطمئن ہو گئیں لیکن وہ ہر صورت بیٹے سے ملنا چاہتی تھیں۔ میں نے ان کے ڈاکٹر کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ ڈاکٹر نے خاتون کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ کہیں نہیں جائیں گی۔ میں حمزہ کے پاس واپس پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ابا ارسلان بھی پہنچ گیا۔ اسے میں نے ہی بلایا تھا اور اس پر پابندی عائد کی تھی کہ وہ اسپتال میں ڈاکٹر حمزہ کی موجودگی کے بارے میں کسی کو نہیں بتائے گا۔ اسپتال سے ہی فون کال کر کے میں نے ساہی صاحب کو بھی رازداری سے اسپتال بلا لیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ اسپتال ڈاکٹر مسز رقیہ کی ملکیت تھا۔ ڈاکٹر رقیہ میڈیکل کالج میں غزالہ کی استاد تھیں اور غزالہ کے حوالے سے مجھے بھی بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ اس کیس کو بڑی اہمیت دے رہی تھیں۔ آرتھوپیڈک سرجن کی موجودگی میں ہم نے طویل صلاح مشورہ کیا۔ تمام رپورٹیں ہمارے سامنے تھیں۔ سرجن کا اصرار تھا کہ جلد ہی ہو سکے مریض کی ٹانگ کاٹ کر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کی جائے۔ ساہی صاحب نے تجویز پیش کی کہ حمزہ کو بیرون ملک بھیجنے کی کوشش کی جائے۔

آرتھوپیڈک سرجن نے کہا "بے شک اس بات میں وزن ہے لیکن یہ تجویز قابلِ عمل نہیں۔ مریض کو امریکا وغیرہ بھیجنے کی کوشش میں جو وقت ضائع ہو گا اس کا ازالہ نہیں ہو سکے گا اور عین ممکن ہے کہ پھر ٹانگ کاٹنے کے باوجود مریض کی زندگی نہ بچائی جا سکے۔ یہ ایک بڑا سنگین دور تھا۔ ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہو گئی تھی یا شاید میں نے یہ ذمے داری اٹھائی تھی۔ میں نے سوچا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ حمزہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے اس فیصلے میں حمزہ کی والدہ کو شریک ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ خاندان میں اور بھی جو ذمے دار حضرات ہیں ان کی رائے بھی اس میں شامل ہونی چاہیے۔

ارسلان نے مشورہ دیا کہ حمزہ کی والدہ کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ انہیں اس قسم کا شدید صدمہ پہنچایا جائے۔ بہتر ہے کہ حمزہ کے چچا میاں انور یا بڑے ماموں سے رابطہ کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اندر حمزہ کے چچا اور ماموں کو اس حادثے کی اطلاع ہو گئی۔ انہیں بھی سمجھایا گیا کہ حمزہ کی والدہ کو ابھی اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ جب بات ایسے نکلتی ہے تو پھر نکلتی چلی جاتی ہے۔ ہمارا ارادہ صرف حمزہ کے ماموں اور چچا کو آگاہ کرنے کا تھا لیکن صبح تک یہ خبر حمزہ کے کئی رشتے داروں تک پہنچ گئی اور وہ اسپتال کے برآمدے میں نظر آنے لگے۔ ان میں سے چند افراد ہماری طرف خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے جیسے ہم ہی اس سارے المیے کے ذمے دار ہوں۔ تاہم حمزہ کے چچا میاں انور کا رویہ مناسب ہی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ حمزہ از خود جھوک ضامن گیا تھا اور وہاں پر جو کچھ بھی ہوا وہ صرف ایک المیہ تھا اور اس میں ہمارا کسی سازش کا دخل نہیں۔ ہاں وہ اس بات پر حیران ضرور تھے کہ زخمی ہونے کے بعد حمزہ اتنے دن کہاں رہا۔ میں نے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ میں نے کہا کہ حمزہ شدید ذہنی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ اپنا کٹا ہوا بازو اور شدید زخمی ٹانگ لے کر کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک مقامی چودھری کی حویلی میں مقیم تھا اور دل میں یہ آس لگائے ہوئے تھا کہ شاید اسے اسپتال نہ جانا پڑے اور اس کی حالت بہتر ہو جائے۔

حمزہ کے چچا اور ماموں کسی طور پر حمزہ کی ٹانگ کٹوانے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ اپنے طور پر میو اسپتال کے ایک سرجن کو لے آئے۔ سرجن نثار احمد نے اپنے طور پر حمزہ کا معائنہ کیا۔ اس کی رپورٹیں وغیرہ دیکھیں۔ اس نے عندیہ ظاہر کیا کہ حمزہ کو اس کے ذاتی کلینک میں منتقل کر دیا جائے۔ وہ اس کی ٹانگ کا ایک آپریشن کرے گا۔ ممکن ہے کہ ٹانگ بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

ڈاکٹر رقیہ اور ان کے اسپتال کا سرجن مختلف رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ٹانگ کا کاٹنا بہت ضروری ہے۔ مسز رقیہ نے دبے لفظوں میں مجھ سے یہ بھی کہا کہ سرجن نثار احمد کی شہرت زیادہ اچھی نہیں۔ وہ صرف مال بنانے کے چکر میں ہے۔ اپنے پرائیویٹ اسپتال میں آپریشن کر کے وہ ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ چارج کرے گا اور آخری نتیجہ ٹانگ کاٹنے کی صورت میں نکلے گا۔ میں نے ساہی

علیم الحق حقی کے نشترِ قلم سے معاشرے کا پوسٹ مارٹم کرتی

تحریریں

شناخت

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور ــــ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

ملنے کا پتہ: علی بک سٹال، نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

فون: ۷۲۲۳۸۵۳

صاحب سے مشورہ کیا اور کہا کہ کیوں نہ اس صورتِ حال میں کسی زیادہ سینئر سرجن سے رائے لی جائے۔ یہ تجویز ساہی صاحب کو بھی پسند آئی۔ انہوں نے فون پر تین چار جگہ رابطہ کیا اور مجھے بتایا کہ بات بن رہی ہے۔ ملٹری کے ایک نہایت تجربہ کار اور مانے ہوئے آرتھوپیڈک سرجن سے ساہی صاحب کا رابطہ ہو گیا۔ ان کا نام تو کچھ اور ہوگا لیکن ساہی صاحب انہیں کرنل جان صاحب کہہ کر پکار رہے تھے۔ کرنل جان صاحب کی رہائش تو لاہور میں تھی لیکن وہ کام کے سلسلے میں مری میں مقیم تھے۔ ویک اینڈ پر وہ لاہور آ رہے تھے۔ ساہی صاحب کی درخواست پر انہوں نے ائیرپورٹ سے براہ راست اسپتال آنے کی ہامی بھر لی۔

کرنل جان شام سات بجے کے لگ بھگ "رقیہ اسپتال" پہنچے۔ وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ تجربہ چہرے سے ٹپکا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے حمزہ کا معائنہ بڑی تفصیل اور گہرائی سے کیا۔ ہنگامی طور پر ایک دو ٹیسٹ بھی نکلوائے گئے۔ ڈاکٹر مسز رقیہ اور دیگر سرجن بھی کرنل جان کے ہمراہ تھے۔ جب بند کمرے میں ڈاکٹرز کی میٹنگ ہو رہی تھی تو ہم بے چینی سے باہر انتظار کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈاکٹرز کمرے سے باہر آئے۔ ڈاکٹر مسز رقیہ راہداری میں ایک بار پھر کرنل جان صاحب سے گفتگو میں مصروف ہو گئیں۔ کرنل جان بار بار نفی میں سر ہلا رہے تھے۔ جب دراز قد کرنل جان اپنا بریف کیس سنبھالے باہر نکل گئے تو میں مسز رقیہ کے پاس پہنچا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! کیا کہا کرنل صاحب نے؟"

"شاید اس کی ٹانگ کاٹنے کی ضرورت نہیں۔" مسز رقیہ نے جواب دیا۔ مسز رقیہ کے لہجے نے مجھے چونکا سا دیا۔

"کیا مطلب؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"بہت دیر ہو چکی ہے۔" مسز رقیہ نے روکھے لہجے میں جواب دیا "زہر بہت پھیل چکا ہے۔ اب شاید ٹانگ کاٹ کر بھی اسے بچایا نہ جا سکے۔"

میرے پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

ڈاکٹر رقیہ بولیں "مسٹر شاہ جہاں! آپ سمجھدار آدمی نظر آتے ہیں لیکن ٹانگ کے آپریشن میں تاخیر کرکے آپ نے بہت غلطی کی ہے۔ آپ ایک ایسے بوگس شخص کی باتوں میں آ گئے جسے ڈاکٹر کہنا بھی اس پیشے کی توہین ہے۔ وہ صرف مال بنانے والا شخص ہے۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا "لیکن مسز رقیہ میں اس ڈاکٹر نہیں لایا تھا۔ حمزہ کے لواحقین ہی لائے تھے۔ مریض حق مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ ٹانگ کٹوانے جیسا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"جب معاملہ زندگی اور موت کا ہو مسٹر شاہ جہاں کچھ کام قاعدے ضابطے سے ہٹ کر بھی کرنے پڑتے میں آپ کو قصوروار نہیں ٹھہرا رہی لیکن اس آپریشن تاخیر ہوئی ہے اس کا کوئی تو ذمے دار ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں ارسلان بھی میرے آن کھڑا ہوا تھا۔۔ وہ عاجزی سے بولا "ڈاکٹر صاحبہ! کچھ جیسے بھی ہو اسے بچائیں۔"

"جو کچھ کر سکتے ہیں وہ تو کر ہی رہے ہیں" ڈاکٹر لہجے میں انتہا درجے کی مایوسی تھی۔

ہم اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے اور ڈاکٹر لمبے ڈگ بھرتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ارسلا حد پریشان لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ کے زیادہ تعلقات ہیں، پلیز آپ ہی کچھ کریں۔ حمزہ کی وا ایک ایک پائی بیٹے پر لگا سکتی ہیں۔ اگر پاکستان سے با کوئی امید پیدا ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ بھی کر گزرنا چاہیے"

میں نے کہا "میں اس بارے میں ڈاکٹر رقیہ سے بات کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو کچھ یہاں ہو وہی باہر ہوگا۔ صرف وقت اور پیسے کا زیاں ہوگا۔"

"مگر اس وقت تو حالت بہتر تھی اور ڈاکٹر امید رہے تھے۔ اب صورتِ حال مختلف ہے۔"

اس دوران میں حمزہ کے چچا اور ماموں وغیرہ پر پہنچ گئے۔ ارسلان نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انہیں حال سے آگاہ کیا۔ حمزہ کے چچا نے رونا شروع کر دیا دوسرے عزیزوں کے پاس جا کر کھسر پھسر کرنے لگا۔

میں کمرے میں حمزہ کے پاس پہنچا۔ وہ نوجوان موت کے سائے میں تھا۔ اس کا گورا رنگ سانولا سانولا نظر آنے لگا تھا۔ ہونٹ اور پپوٹے سوجے اسے گلوکوز کی نالی لگی ہوئی تھی۔ خواب آور دوا وہ گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے پیشانی پر ہاتھ آگ کی طرح جل رہی تھی۔ اسی دوران میں انجکشن وغیرہ دینے کے لیے آ گئیں۔ میں باہر صاحب پریشان نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے

میں نے چند روز پہلے انہیں بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر والدہ حمزہ کے لیے شفتا کا رشتہ مانگ رہی ہے۔ ساہی

نے فوراً اس رشتے کے حق میں رائے دی تھی۔ وہ اس لحاظ سے بھی خوش ہوئے تھے کہ شفتا کی زندگی کو شیخ عاصم اور اس کے قبیلے کی طرف سے جو خطرے لاحق ہیں وہ اس شادی کے بعد بہت حد تک کم ہو جائیں گے۔ اب اگر ڈاکٹر حمزہ کی تشویشناک حالت دیکھ کر وہ غمزدہ ہو رہے تھے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ یقیناً ان جیسے جہاندیدہ شخص کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ شفتا اور حمزہ ایک دوسرے کو بھی پسند کرتے ہیں۔ اچانک ہی ساہی صاحب باتیں کرتے کرتے ٹھٹک گئے۔ ہم نے حمزہ کی والدہ کو دیکھا تھا۔ وہ دو افراد کا سہارا لیے ہوئے ہماری ہی طرف آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے بستر سے نیچے نہیں اتریں کیونکہ ان کی حالت بھی ایسی ہی تھی مگر وہ حمزہ کو دیکھنے یہاں پہنچ گئی تھیں۔ یقیناً ان کے قریبی عزیزوں میں سے ہی کسی نے یہ نیکی کمائی تھی۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے حمزہ کے چچا انور صاحب اور ماموں کو سمجھا دیا کہ حمزہ کی والدہ کے سامنے حمزہ کی تشویشناک حالت کا تذکرہ نہیں ہونا چاہیے۔۔ نہ زبانی اور نہ تاثرات سے۔

حمزہ کی والدہ کمرے میں بیٹے کے پاس چلی گئیں۔ انہیں یہی بتایا گیا کہ حمزہ کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ حمزہ کے ماموں نے خاتون کو بتا دیا کہ ڈاکٹر حمزہ کی ٹانگ کاٹنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ رونے دھونے لگیں۔ دہائی دینے لگیں کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔ بازو اور ٹانگ کے بغیر ان کا بیٹا اپاہج ہو کر رہ جائے گا۔ حالات کی سختی کتنی جلدی انسان کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ تین چار گھنٹے پہلے تک ہم سب بھی اسی طرح سوچ رہے تھے جیسے اب حمزہ کی والدہ سوچ رہی تھیں۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ حمزہ کی ٹانگ کاٹی جائے مگر یہ جاننے کے بعد کہ حمزہ کی زندگی کا چراغ ہی ٹمٹما رہا ہے، اس کی ٹانگ کاٹے جانے کا صدمہ زیادہ بڑا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حمزہ کی والدہ ابھی نہیں جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا بسترِ مرگ پر ہے لہٰذا وہ اس کی ٹانگ جانے کے خوف سے نڈھال نظر آنے لگی تھیں۔

حمزہ کے چچا انور صاحب نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور حمزہ کی والدہ کو جلدی وہاں سے ہٹا لے گئے۔

O☆O

رات کے دس بج چکے تھے۔ ڈاکٹر حمزہ پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اسپتال والوں سے جو کچھ ہو رہا تھا وہ کر رہے تھے مگر مریض کی حالت جوں کی توں تھی۔ میرے کہنے پر ساہی صاحب نے سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس گارڈ بھی موقع پر لگوا دیے تھے۔ درحقیقت مجھے شنکر کی طرف سے بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آزاد تھا اور یقیناً ہمارے ارد گرد ہی کہیں موجود تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی حالت ایسے خونی درندے کی سی ہو رہی ہے جو پنجرہ توڑ کر بھاگا ہوا ہے اور زخمی بھی ہے۔ وہ کوئی بھی خطرناک ترین کام کر سکتا ہے۔ شنکر کے حوالے سے میرا دھیان بار بار "صندلی قصبے" کی طرف جا رہا تھا۔ جس شخص کی شنکر کو تلاش تھی وہ صندلی قصبے میں موجود تھا یعنی شیخ عاصم۔ شنکر اسے حاصل کرنے کے لیے پورے قصبے کو تہ و بالا کر سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی کو بھنک تک نہ پڑے کہ میں حویلی میں ہونے والے دھماکوں کے بعد صندلی قصبے میں مقیم رہا ہوں اور میرے باقی ساتھی بھی وہاں ہیں۔

حمزہ بدستور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا اور اسی طرح تین دن گزر گئے۔ اس کی متاثرہ ٹانگ پر آبلے نمودار ہو گئے تھے۔ یہ لاہور کا بہترین اسپتال تھا اور یہاں حمزہ کو بہترین علاج میسر تھا۔ ڈاکٹروں سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ کر رہے تھے۔ چوتھے روز دوپہر کے وقت میرا دل چاہا کہ ایک چکر صندلی قصبے کا لگا آؤں اور وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لے آؤں۔ مجھے یقین تھا کہ عالم قریشی اور زریں گل نے سب کچھ سنبھال رکھا ہوگا مگر پھر بھی ان کی خیر خیریت دریافت کرنا ضروری تھا۔ خاص طور پر مجھے شفتا کی پریشانی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں وہ بہت گھبرائی ہوئی ہوگی۔ عالم قریشی کو میں نے شفتا کے بارے میں خصوصی ہدایت کی تھی مگر میری کمی تو اسے ہر صورت میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ شیخ عاصم اور غزالہ کی خیر خبر لینا بھی ضروری تھا۔

میں نے صرف ساہی صاحب کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں۔ بڑی خاموشی کے ساتھ میں اسپتال سے نکلا۔ ایک رکشا پکڑ کر میں نے یونہی دو تین سڑکوں کا چکر لگایا۔ اپنے تعاقب کے اندیشے کو پوری طرح رفع کرنے کے بعد میں بادامی باغ اڈے پر پہنچا اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر شیخوپورہ پہنچ گیا۔ راستے میں، میں مسلسل اپنے طوفانی حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنے پہلو کا انتہائی خطرناک آپریشن مجھے ابھی تک ایک خواب لگتا تھا۔ میں اس جان لیوا آپریشن سے نہ صرف بچ گیا تھا بلکہ چند ہی دنوں میں خود کو سو فیصد فٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ جھوک ضامن کی حویلی میں پیش آنے والے دیگر واقعات بھی ذہن میں چکراتے رہے۔ قادر زماں کی ناگہانی موت، شنکر کا زخمی ہو کر موقع سے بھاگنا، لاشوں کا انبار۔ سب نہ بھولنے والے مناظر تھے۔ موسم اب کافی خنک ہو چکا

تھا۔ میں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ تھا۔ شیخوپورہ شہر سے میں نے ایک پرائیویٹ کار کرائے پر لی اور صندلی قصبے روانہ ہو گیا۔ راستے میں میں اپنے تعاقب کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہا تھا۔ میرے تعاقب کے کوئی آثار نہیں تھے۔ قصبے میں پہنچتے ہی میں نے شیر محمد کی حویلی کا رخ کیا۔ حویلی کے دروازے پر ہی زریں گل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایک جہازی ساز چارپائی پر شیر محمد کے کارندوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور بڑی خوش دلی سے گپیں ہانک رہا تھا۔ شیر محمد کے کارندے بھی اس گفتگو میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ میں یہ سوچ کر حیران ہوا کہ قصبے کے ٹھیٹ پنجابیوں اور پشاور کے ٹھیٹ پٹھان میں کیا دلچسپی مشترک ہو سکتی ہے۔

مجھے دیکھ کر سب لوگ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ زریں گل تیزی سے چل کر میرے پاس آ گیا "ہاں بھئی زریں! سب خیریت ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک دم خیریت استاد صیب! آپ جیسا چھوڑ کر گئے تھے سب ویسا ہی ہے۔ آپ بتائیں چھوٹے صاحب کا کیا حال ہے؟" زریں نے آخری الفاظ بڑی پست آواز میں کہے تھے۔ چھوٹے صاحب سے اس کی مراد حمزہ ہی تھی۔

میں نے حمزہ کے بارے میں گول مول جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا۔ وہ مزید تفصیل پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "یہ ٹھیٹ پنجابی اور دیہاتی لوگ ہیں۔ تم ان کے ساتھ کیسے گھل مل گئے؟ ابھی میں دیکھ رہا تھا کہ یہاں خوش گپیوں کا دریا بہہ رہا تھا۔"

وہ بولا "استاد صیب! آپ کا یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ام اور یہ لوگ بالکل اجنبی ہے لیکن ایک دلچسپی ایسا ہے جس نے ان لوگوں کو امارے بالکل قریب کر دیا ہے اور وہ دلچسپی ہے سدھیر صیب۔ یہ لوگ بھی اس کو ہیرو مانتا ہے اور ام بھی دل و جان سے اس کا پرستار ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔ ام کو سدھیر صیب کا ایک ایک سین اور ایک ایک مکالمہ یاد ہے۔ خاص طور سے جن فلموں میں اس نے فرنگیوں کا خانہ خراب فرمایا ہے۔ وہ فلمیں تو امارے دل کا دھڑکن ہے۔ امارا تو ایمان ہے استاد صیب! اگر امارے ملک میں چار پانچ سو لوگ بھی سدھیر صیب جیسا دلیر اور بہادر بن جائے تو پوری دنیا میں فرنگیوں کو کہیں سر چھپانے کا جگہ نہ ملے۔"

میں نے کہا "شیخ عاصم اور غزالہ کیسے ہیں؟"

"شیخ کندھے کی چوٹ کی وجہ سے سارا دن لیٹا رہتا ہے۔ غزالہ بی بی خادمہ کی طرح اس کی خدمت گزاری میں مصروف رہتا ہے۔ ویسے وہ دونوں خیریت سے ہیں۔"

"ویسے خیریت سے ہیں؟ کیا مطلب؟"

"امارا مطلب ہے کہ جب نیا نویلا میاں بیوی کو ہوا رات دن اکٹھا رہنا ہو تو پھر عام طور پر بیوی کا خیریت ذرا مشکوک ہو جاتا ہے نا۔ جیسے کلثوم کا ہوا ہے لیکن یہ لوگ کافی دیر سے اکٹھا ہے پھر بھی ان کا خیریت مشکوک نہیں ہوا ہے۔"

غالباً زریں کو معلوم نہیں تھا کہ چند ہفتے پہلے غزالہ اسپتال میں داخل ہوئی تھی اور اگر معلوم تھا تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کیوں ہوئی تھی۔ غزالہ کی اباریشن کی اندوہناک صورت حال شروع سے آخر تک میری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئی۔ کتنا ناخوش گوار تصور تھا یہ۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس تصور سے وابستہ اذیت اور پشیمانی برقرار تھی۔

زریں گل کی آواز نے مجھے پھر خیال سے چونکا دیا "استاد صیب! ام بتانا بھول گیا۔ ایک مہمان بھی آیا ہوا ہے ادھر۔"

"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ڈاکٹر حمزہ کا والدہ صاحب۔ پتا نہیں وہ کیسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ادھر پہنچ گیا ہے۔"

میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میں تو چاہتا تھا کہ صندلی قصبے کے بارے میں کسی کو بھنک بھی نہ پڑے اور زریں کہہ رہا تھا کہ حمزہ کی والدہ یہاں آئی بیٹھی ہیں۔ یہ کیسے ہو گیا تھا۔ میں ذہنی طور پر چکرا کر رہ گیا۔

میں نے زریں گل سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ حمزہ کی والدہ آج صبح رانا سلطان نام کے ایک شخص کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ رانا سلطان کے بارے میں زریں کو عالم قریشی نے بتایا تھا کہ وہ ایک قریبی گاؤں کا زمیندار ہے۔

اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ غلطی یقیناً مجھ سے ہوئی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ رانا سلطان اور خیال وغیرہ کو اس بارے میں سختی سے ہدایت کر دیتا۔ رانا سلطان ایک ہمدرد شخص تھا۔ یقیناً وہ حمزہ کی مزاج پرسی کے لیے لاہور پہنچا تھا۔ وہیں اسپتال میں ہی اس کی ملاقات کہیں حمزہ کی والدہ سے ہو گئی تھی۔ رانا سلطان نے صندلی قصبے، لیڈی ڈاکٹر (غزالہ)۔ اور میرا ذکر کیا ہو گا۔ ان باتوں سے حمزہ کی والدہ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شفقنا کہاں ہے اور میرے باقی ساتھی کہاں ہیں۔ حمزہ کی والدہ شفقنا کو بے حد چاہتی تھیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ وہ رشتہ ہونے سے پہلے ہی اس کو وہ درجہ دینے لگی تھیں جو رشتہ ہونے کے بعد ابتیں۔

بیٹے ان کی زبان پر شفقنا کا نام رہتا تھا۔ یقیناً محبت کا یہی جذبہ انہیں اب یہاں کھینچ لایا تھا۔ حمزہ کی شدید بیماری نے انہیں ذہنی طور پر شدید متاثر کیا تھا۔ کبھی تو وہ بالکل بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی تھیں۔ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹرز حمزہ کی طرف سے ناامیدی ظاہر کر چکے ہیں پھر بھی ان کا دل ایک ماں کا دل تھا اور ماں کا دل اولاد کے دکھ تکلیف کو بغیر کسی واسطے کے بھی محسوس کر سکتا ہے۔

میں زریں سے مل کر حویلی میں داخل ہوا۔ شیر محمد کوئی کام نمٹانے لاہور گیا ہوا تھا۔ میری نگاہیں شفقنا کو تلاش کر رہی تھیں لیکن شفقنا سے پہلے ہی میری ملاقات انجم سے ہو گئی۔ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے اشارے سے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئی "بھائی جان! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے ہم سے حمزہ کی حالت چھپائے رکھی۔"

"اگر بتا بھی دیتا تو کیا فائدہ ہوتا۔ تم لوگ اسے دیکھنے لاہور تو جا نہیں سکتے تھے۔" میں نے قدرے جھنجلاہٹ سے کہا۔

انجم بولی "حمزہ کی امی کہہ رہی ہیں کہ اس کا ہاتھ کلائی کے پاس سے بالکل کٹ گیا ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "وہ رو رو کر کہہ رہی تھیں کہ ایک ٹانگ کاٹے جانے کا بھی خطرہ ہے؟"

"ہاں ٹھیک کہہ رہی تھیں۔"

انجم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ رو رہی تھی حالانکہ اصل دکھ سے شاید ابھی وہ بے خبر تھی۔ یہ حمزہ کی ٹمٹماتی ہوئی زندگی کا دکھ تھا۔ انجم کو معلوم نہیں تھا کہ حمزہ کے جسم کے کسی ایک حصے کو خطرہ لاحق نہیں بلکہ اس کی پوری زندگی بدترین خطرے کی زد میں ہے۔

دوپٹے سے آنسو پونچھ کر وہ بولی "حمزہ کی امی صبح سے آئی ہوئی ہیں۔ خود بھی رو رہی ہیں، ہمیں بھی رلا رہی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ حمزہ معذور ہو گیا ہے۔ رات دن آنسو بہاتا رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اب کسی کے قابل نہیں رہا۔ اب کسی کو میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں تو حمزہ نے ایسی بات نہیں کی ہو گی۔ وہ تو خواب آور دواؤں کے زیر اثر نیم بے ہوش پڑا رہتا ہے۔"

انجم بولی "وہ بہت دکھی نظر آ رہی ہیں۔ صبح سے بس ایک ہی بات پوچھے جا رہی ہیں۔ کیا تم لوگ میرے بیمار اور معذور بیٹے کو قبول کر لو گے۔ اس کے لیے شفقنا کا رشتہ دو گے۔ ہم انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تو شفقنا بھی رونا شروع ہو گئی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی 'انجم باجی میں کیا کروں۔ خالہ کو کس طرح دلاسا دوں۔'"

میں نے پوچھا "اب شفقنا کہاں ہے؟"

"وہیں حمزہ کی امی کے پاس بیٹھی ہے۔ انہیں زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

انجم کو وہیں چھوڑ کر میں بہ آہستگی اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں حمزہ کی والدہ شفقنا کے ساتھ موجود تھیں۔ برآمدے سے دبے پاؤں گزر کر میں کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ حمزہ کی والدہ بستر پر تھیں اور تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ تپائی پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی۔ غالباً جو دو تین لقمے انہوں نے لینے تھے وہ لے لیے تھے۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھیں۔ شفقنا ان کے پاس بیٹھی ان کا بایاں بازو دبا رہی تھی۔

وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولیں "میں تم سب کے آگے جھولی پھیلاتی ہوں بیٹی۔ میرے حمزہ کا ساتھ مت چھوڑنا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ مر جائے گا۔"

"نہ خالہ! ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔" شفقنا نے مدھم آواز میں کہا۔

"اگر میں تمہارے بھیا کے آگے تمہارے لیے جھولی پھیلاؤں اور وہ تم سے پوچھیں تو تم انکار تو نہیں کرو گی نا؟"

شفقنا نے گلوگیر آواز میں کہا "آپ حوصلہ رکھیں خالہ! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم میری بات کا جواب دو نا۔ تم انکار تو نہیں کرو گی؟" حمزہ کی والدہ ہیجانی انداز میں بول رہی تھیں۔

شفقنا کا سر جھکتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بولی "جو میرے بھیا کی سوچ ہو گی، وہی میری سوچ ہو گی۔"

"اور تمہارے بھیا کی سوچ کیا ہو گی؟"

شفقنا کی سسکی سنائی دی "وہ بڑے اچھے انسان ہیں خالہ۔ جتنا آپ سوچ سکتی ہیں اس سے زیادہ اچھے ہیں۔" شفقنا باقاعدہ رونے لگی تھی۔

حمزہ کی والدہ نے ہاتھ آگے بڑھایا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ شفقنا بڑی محبت کے ساتھ ان کے سینے سے لگ گئی۔

میں خاموشی سے واپس لوٹ آیا۔ انجم ابھی تک کمرے میں موجود تھی۔ کہنے لگی "آپ نے نوٹ کیا ہو گا کہ خالہ کچھ بہکی بہکی سی باتیں کر رہی ہیں۔"

"میں نے بات تو نہیں کی لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ ایسا کر رہی ہیں۔ اکلوتا جوان بیٹا اس حالت کو پہنچ جائے تو ماں پر جو کچھ بیتے کم ہے۔"

اسی دوران میں عالم قریشی بھی وہاں پہنچ گیا۔ ملک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد وہ کہنے لگا "یار شاہ جہاں! یہ کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ایک طرف تم کہہ رہے تھے کہ یہاں قصبے میں ہماری موجودگی کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے' دوسری طرف تم نے رانا سلطان کے ساتھ ڈاکٹر کی والدہ کو یہاں بھیج دیا ہے۔"

میں نے وضاحت کی کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ڈاکٹر حمزہ کی والدہ ازخود رانا سلطان کے ساتھ یہاں پہنچی ہیں۔ میں نے کہا "اب ضروری ہو گیا ہے کہ حمزہ کی والدہ کو یہیں روک لیا جائے۔ دوسری طرف میں لاہور جانے سے پہلے رانا سلطان اور غیاث وغیرہ کو بھی اچھی طرح سمجھاتا ہوں کہ وہ ہماری یہاں موجودگی کی خبر کو اپنے تک ہی رکھیں۔"

عالم قریشی نے پوچھا "ششکر کا کچھ پتا چلا؟"

"ابھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "اسی لیے ضروری ہے کہ ہم پوری طرح چوکس رہیں۔ خاص طور سے شیخ عاصم اور غزالہ کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ شیر محمد آئے تو اس سے کہو کہ تین چار ہوشیار بندے اس کام کے لیے وقف رکھے۔"

عالم قریشی اور زریں گل کو ضروری ہدایات دے کر میں رانا سلطان کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اسے بتا سکوں کہ صندلی میں ہماری موجودگی کی خبر عام ہونے سے کتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔

O☆O

میں واپس لاہور پہنچا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ حمزہ کے کمرے کے قریب پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ہر چہرہ سوگوار نظر آتا تھا۔ کچھ آنکھیں بھیگی بھیگی دکھائی دے رہی تھیں۔ حمزہ کا چچا انور احمد آگے آیا اور میرے ہاتھ تھام کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ حمزہ کو سانس کی شکایت ہو گئی ہے اور اسے آکسیجن لگائی گئی ہے۔ میں نے اندر جا کر دیکھا' حمزہ کی سانس واقعی رک رک کر آ رہی تھی۔ میڈیکل فائل ٹیبل پر موجود تھی۔ دو گھنٹے پہلے آخری ڈاکٹری معائنہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے شدید نمونیا کی رپورٹ لکھی تھی۔

رپورٹ دیکھنے کے بعد میں ڈاکٹر سبز رقیہ کے پاس پہنچا۔ ان کے چہرے پر پیشہ ورانہ سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے کہا "آپ کے مریض کی حالت ٹھیک نہیں۔ پورا سسٹم خراب ہو رہا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہمارے بس میں ہے وہ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ! بظاہر تو ٹانگ اب بہتر نظر آ رہی ہے۔ آبلے وغیرہ بھی نہیں ہیں۔"

انہوں نے بال پوائنٹ کو ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا "کل شام تک ہمیں بھی کچھ بہتری کے آثار نظر آئے تھے لیکن یہ بھی خدشہ تھا کہ یہ بہتری عارضی ثابت ہو گی۔ آج وہی ہوا ہے۔ سینے میں شدید انفیکشن ہو گئی ہے۔ اس انفیکشن کو کنٹرول کرنے کے لیے تیز اینٹی بایوٹک دی جائیں گی تو گردوں پر اثر پڑے گا اور وہ پہلے ہی متاثر ہیں۔"

میں نے آزردہ لہجے میں کہا "ڈاکٹر صاحب! کوئی امید ہے بھی یا نہیں؟"

وہ بولیں "امید کا دامن تو آخری سانس تک نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بہرحال آپ کے مریض کی جو حالت ہے وہ میں نے آپ کو چار پانچ روز پہلے ہی بتا دی تھی۔ ٹانگ کا زہر پورے جسم میں پھیل رہا ہے۔"

وہ مایوسی اور ناامیدی سے بھری ہوئی رات تھی۔ حمزہ کی حالت بتدریج بگڑ رہی تھی۔ روشن آنکھیں اور چمکدار پیشانی والا نوجوان مسیحا زندگی کی صرف چوبیس بہاریں دیکھنے کے بعد خزاں کا رزق بن رہا تھا۔ اندیشوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کوئی کرن نہیں تھی۔ اب تو کوئی حرفِ تسلی بھی نہیں سوجھتا تھا۔ اچانک میری نظر سائیں عالی پر پڑی۔ وہ جھومتا جھومتا برآمدے کی طرف آ رہا تھا۔ اسپتال کے چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ اسے جھاڑ پلاتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھا۔ پاؤں ننگے تھے' بال جٹاؤں کی صورت' مالائیں کھڑکھڑ بج رہی تھیں اور گھنٹیاں شور مچا رہی تھیں۔ خلافِ معمول آج سروج سائیں کے ساتھ نظر نہیں آ رہی تھی۔ سروج اور سائیں کو میں نے آخری مرتبہ قادر زماں مرحوم کی حویلی میں دھماکوں سے چند گھنٹے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔

سائیں میرے پاس پہنچا اور بغیر کسی تمہید کے بولا "تم بڑے مطلبی ہو شفیع محمد! سروج اتنے دن اسپتال میں بے ہوش پڑی رہی' تم نے ایک مرتبہ منہ دکھایا اور پھر اس کی خبر نہ لی۔ اب یہ تمہارا چہیتا بیمار ہوا ہے تو ایک ہفتے سے یہاں چھاؤنی ڈالے بیٹھے ہو۔"

سائیں عالی کا شکوہ کسی حد تک درست تھا۔ "وادی داغان" سے واپسی کے بعد سروج کی بری حالت ہو گئی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑاتی رہتی تھی اور پھر اٹھ اٹھ

کر کسی نامعلوم مقام کی طرف بھاگتی تھی۔ وہی مقناطیسی کشش جو کسی آسیب کی طرح اپنے شکار کو دبوچتی تھی اور جس کا مرکز سیکڑوں میل دور گلگت کا ایک پراسرار علاقہ تھا۔

میں نے کہا "سائیں! یہ شکوے شکایت کا وقت نہیں ہے۔ ہم بے حد پریشان ہیں۔ حمزہ کی حالت بڑی نازک ہے۔ اب تو ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا ہے۔"

سائیں نے بلند قہقہہ لگایا اور اسپتال کے در و دیوار گونج اٹھے۔ آس پاس موجود لوگ مڑ مڑ کر سائیں کو دیکھنے لگے۔ وہ بولا "دل دھڑکا پاگل کا ۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔" اس کے بعد سائیں نے "حق ہو" کا ایک زوردار نعرہ بلند کیا اور آگے پیچھے جھولنے لگا پھر طنزیہ انداز میں بولا "کتنے یقین سے کہتے ہو کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ ڈاکٹر صرف انسانوں میں ہی تو نہیں ہوتے۔ جنات میں بھی ہوتے ہیں۔ جنوں کی ایم بی بی ایس یہاں کی ایم ڈی اور ڈی ایچ اے سے بھی بڑی ڈگری ہوتی ہے۔ کیا تم نے اپنا مریض کسی جن ڈاکٹر کو دکھایا' اگر نہیں دکھایا تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "سائیں' تم کہاں تھے اور سروج کہاں ہے؟"

وہ بولا "میرا خیال ہے' تم مجھے الو کا پٹھا سمجھ رہے ہو اور میری بکواس کو ۔۔۔ میرا مطلب ہے میری باتوں کو بکواس قرار دے رہے ہو۔"

"نہیں سائیں' ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تم بات کا رخ کیوں بدل رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تمہارے مریض کی حالت کیوں خراب ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کب سے خراب ہے اور کتنی خراب ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس میں تمہارا بھی قصور ہے۔ تم نے فیصلہ کرنے میں دیر کی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں خاموش رہا۔ سائیں اپنی باتوں سے اکثر حیران کر دیتا تھا۔ اب بھی اس نے مجھے حیران کیا تھا۔ ایک دم سائیں میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس قدر قریب کہ اس کی خودرو داڑھی میرے رخسار سے چھونے لگی اور اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو براہ راست میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ عجیب سے لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "شفیع محمد! ڈاکٹر حمزہ کے مقدر میں موت ہے۔ وہ بچ نہیں سکتا ۔۔۔ لیکن مقدر کیا ہے۔ مقدر پتھر کی لکیر نہیں ہے۔ مقدر کو بدلا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مقدر کو بدل دیا کرتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

سائیں کے ہونٹ میرے کانوں سے چھونے لگے۔ وہ سرگوشی میں بولا "تمہارا مریض بچ سکتا ہے ۔۔۔ ہاں اگر تم چاہو تو تمہارا مریض بچ سکتا ہے۔"

سائیں کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے سراپا جھنجوڑ دیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر سائیں کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بڑے اعتماد سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ۔۔۔ میں چاہوں تو مریض بچ سکتا ہے؟"

"ہاں تم چاہو تو بچ سکتا ہے بلکہ دو مریض بچ سکتے ہیں۔ ایک وہ مریض جو تمہیں پیارا ہے۔ ایک وہ مریض جو مجھے عزیز ہے۔"

میں نے کہا "سائیں! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

وہ بولا "سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمہارے مریض کی حالت ہر پل بگڑتی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہی رہا تو ۔۔۔" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "سائیں! تم کچھ سمجھاؤ گے تو سمجھوں گا نا۔"

سائیں نے میرا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا مجھے باہر باغیچے میں لے آیا۔ ایک پتھریلی بنچ پر مجھے بٹھا کر وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ بولا "شفیع محمد! آج کی رات سودے کی رات ہے۔ آج تمہیں کچھ حاصل کرنا ہو گا اور کچھ کھونا ہو گا۔ میں بڑی دیر سے کسی ایسی ہی رات کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تم کیا سودا کرنا چاہتے ہو سائیں!"

"زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے شفیع محمد ۔۔۔ لیکن اسی اوپر والے نے انسان کو علم اور وجدان بھی دیا ہے ۔۔۔ اور میرا وجدان کہتا ہے کہ جو نوجوان مریض اس اسپتال کے کمرا نمبروس میں نیم جان لیٹا ہے اس کی جان بچ سکتی ہے۔ میں اس کی جان بچا سکتا ہوں ۔۔۔ دوسری طرف ایک اور مریض ہے بلکہ مریضہ ہے۔ سمجھو وہ بھی شدید بیمار ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس کی جان تم بچا سکتے ہو۔"

"کون مریضہ!" میں نے پوچھا۔

"سروج!" سائیں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا "اس کی حالت ابھی تک خراب ہے۔ اس پر دیوانگی کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ وہ راتوں میں اٹھ جاتی ہے اور خود کو چھڑا کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہونا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم اس کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے

ہو۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن جب تم اس کے ساتھ جاگیردار کی حویلی میں نظر آئے تھے اس وقت تو وہ ٹھیک نظر آتی تھی۔"

"وہ عارضی افاقہ تھا۔ اس قسم کے وقفے اکثر آتے ہیں۔ کبھی چند گھنٹے' کبھی ایک دن' کبھی دو دن۔ افاقہ جتنا طویل ہوتا ہے' اس کے بعد پڑنے والا دورہ بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔"

"مگر تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ تم سوجی کو زندگی کی طرف واپس لا سکتے ہو۔ صرف تم ہی اسے واپس لا سکتے ہو۔ تمہاری محبت' تمہاری قربت اسے ان بھول بھلیوں سے نکال سکتی ہے جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔"

"سائیں! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔"

"ہاں۔۔۔ آج کھل کر کہنے ہی کی رات ہے۔ میں دو ٹوک بات کروں گا اور تم بھی دو ٹوک جواب دو گے۔" سائیں نے ذرا توقف کرنے کے بعد کہا "میں پہلے بھی کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں' تمہارے اور سوجی کے ستارے حیران کن طور پر ملتے ہیں۔ تم دونوں ایک ہو جاؤ تو تمہارے لیے کامیابی اور خوشی کے دروازے کھل جائیں گے اور ان میں سب سے بڑی کامیابی اس دفینے کا حصول ہو گا جس کے لیے بے شمار لوگ ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ اس دفینے میں موجود نایاب نوادرات انمول ہیں۔ یہ نوادرات "ذوق رکھنے والے" لوگوں میں تہلکہ مچا دیں گے۔ اگر تم اور سوجی ایک ہو جاؤ تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تمہارے لیے اس دفینے تک پہنچنا مشکل نہیں رہے گا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ ایسا کیوں ہو گا؟ بہت سے "کیوں" ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔"

سائیں نے ذرا توقف کر کے بڑی توجہ سے ناک میں انگلی گھمائی اور اپنی گدڑی سے صاف کرنے کے بعد بولا "میں تم پہ کوئی پابندی لگانا نہیں چاہتا۔ نہ ہی میری یہ خواہش ہے کہ تم ضرور سوجی سے شادی ہی کرو۔ بس میری یہ تمنا ہے کہ تم سوجی کے ساتھ رہو اور جسمانی طور پر تمہارے درمیان کوئی دوری نہ ہو۔ تمہیں اگر میری یہ شرط منظور ہے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ حمزہ کی جان بچانے کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا' اور تم دیکھو گے کہ انسان اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے کیسے بناتا ہے۔ زندگی کو موت میں بدلتے تو تم نے اکثر دیکھا ہو گا' اب یہ بھی دیکھنا کہ موت زندگی میں کیسے بدلتی ہے۔"

میں سکتے کی سی حالت میں سائیں عالی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سائیں کی آنکھوں میں ایک آگ فروزاں تھی۔ ایسی ہی آگ میں نے اس وقت دیکھی تھی جب وادی موت کی ایک عمیق سرنگ میں پُراسرار پردہ نشین سانوس اور سائیں عالی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

سائیں نے کہا "شفیع محمد! سوچ بچار میں وقت ضائع نہ کرو۔ جتنی دیر کرو گے کام اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ یہ سچا سودا ہے۔ اس میں تمہارے ساتھ کوئی فریب نہیں ہو رہا ہے۔ تمہیں میری شرط ماننے کے لیے صرف زبانی اقرار کرنا ہے۔"

سائیں عالی میرے اعصاب پر سوار ہو رہا تھا۔ ڈیڑھ دو برس پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے اول جلول شخص کے پاس بیٹھوں گا یا اس کی باتیں توجہ سے سنوں گا لیکن سائیں نے بتدریج اپنے آپ کو منوایا تھا اور آج صورت حال یہ تھی کہ میں سائیں کی ایک ایسی بات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور تھا جو کوئی فاترالعقل شخص ہی کہہ سکتا تھا اور کوئی مخبوط الحواس ہی سن سکتا تھا۔ سائیں اپنے مخصوص پُراسرار انداز میں مجھے حمزہ کی زندگی کی نوید سنا رہا تھا۔ وہی حمزہ جو بستر مرگ پر تھا اور ڈاکٹر جس کے لیے جواب دے چکے تھے۔

سائیں فیصلہ طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ واقعی فیصلے کی گھڑی ہے۔ میرے اندر سے آواز آئی "شاہ جہاں! اگر ڈوبتے ہوئے حمزہ کو تمہیں تنکے کا سہارا بھی مل رہا ہے تو یہ سہارا لے لو۔ اسے ضائع نہ کرو۔ کیا پتا سائیں کی کرشماتی شخصیت کوئی کرشمہ دکھا ہی دے۔ تمہیں صرف اقرار ہی تو کرنا ہے کہ تم سوجی کے سلسلے میں سائیں کی خواہش کو ٹھکراؤ گے نہیں۔"

میں چند لمحے سائیں کی روشن آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر میرے اندر سے جذبے کی ایک لہر سی اٹھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "سائیں! تمہیں ایسے موقع پر کوئی شرط رکھنی تو نہیں چاہیے تھی' بہرحال اب تم نے شرط رکھی ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔۔۔ اب تم بتاؤ' تم ڈاکٹر حمزہ کے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

میری بات کا جواب دینے کے بجائے سائیں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا "بادل دھڑکا بھیا کا۔۔۔ بادل دھڑکا۔" پھر

اس نے آگے بڑھ کر مجھے بانہوں میں لے لیا بلکہ یوں لگا جیسے وہ جن کی طرح مجھ سے چمٹ گیا ہو۔ اس کی کہنیاں اور بالائیں میرے سینے میں چبھ رہی تھیں۔ بدبو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ سائیں نے فرط جوش میں میرا گال چوما ہے۔ اس کی ایک دیرینہ تمنا پوری ہونے کا امکان پیدا ہوا تھا اور یہ اسی کا رد عمل تھا۔

چند لمحے بعد سائیں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے طوطے کی طرح گردن اٹھا کر آسمان کو گھورا۔ دنیا کے ہنگاموں' بکھیڑوں اور مصیبتوں سے بہت اوپر کھلی فضا میں تارے چمک رہے تھے اور شاید سائیں عالی کے وہ خیالی جنات بھی منڈلا رہے تھے جن کے قصیدے وہ اٹھتے بیٹھتے پڑھتا تھا۔ سائیں عالی نے خلا میں دیکھتے ہوئے کچھ ناقابل فہم اشارے کیے پھر اپنے خاص انداز میں بڑبڑانے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا "چلو آؤ میرے ساتھ۔"

میں سائیں کے ساتھ واپس اس کمرے کے سامنے پہنچا جہاں حمزہ موت و حیات کی فیصلہ کن کشمکش کا شکار تھا۔ سائیں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "چلو اٹھاؤ اسے اور لادو گاڑی میں۔"

میرے ساتھ ساتھ دیگر افراد بھی حیرانی سے سائیں کی صورت تکنے لگے۔ سائیں گرجا "غیراشہ کیا دیکھتے ہو۔ اسے نکالو یہاں سے اور گاڑی میں سوار کرو۔ میں اسے کہیں لے جانا چاہتا ہوں۔"

سائیں کا مطالبہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے مانا جا سکتا۔ حمزہ انتہائی نگہداشت وارڈ میں تھا۔ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور جان بچانے میں مدد دینے والی مختلف مشینیں اس کے اردگرد بکھری تھیں۔ اسے یہاں سے لے جانا تو در کنار' ہلانا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر ایک بات غور کرنے کی تھی۔ مرتو وہ یہاں بھی رہا تھا اور مرنے سے بڑھ کر اس کا نقصان مزید کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے حمزہ کے لواحقین سے اس پہلو پر بات کی تو وہ متفکر نظر آنے لگے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ایسا کرنا بے وقوفی ہے مگر کچھ سائیں کی پُراسرار شخصیت اور اس کی باتوں سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ سائیں جس اعتماد سے اپنی رائے دے رہا تھا' وہ اعتماد توجہ کے قابل تھا۔

حمزہ کا چچا انور احمد پہلے ہی اس رائے کا اظہار کر چکا تھا کہ جب یہاں کے ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں تو حمزہ کو یہاں سے لے جانا چاہیے لیکن کہاں؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ اب سائیں کی باتیں سن کر انور احمد ایک بار پھر زور و شور سے یہ کہنے لگا کہ حمزہ کو شیشے کی اس قبر سے نکال لیا جائے جس میں وہ پچھلے چار روز سے قید ہے اور سسک رہا ہے۔

انور احمد کے ساتھ جا کر میں نے ڈاکٹر مسز رقیہ سے بات کرنا چاہی مگر وہ ایک ہنگامی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے جا چکی تھیں۔ میں نے انچارج ڈاکٹر سے بات کی۔ ڈاکٹر برہم نظر آنے لگا۔ کہنے لگا "آپ مریض کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ اس کو کہاں لے کر جائیں گے؟"

اگر میں بتا دیتا کہ کہاں لے جانا چاہتے ہیں اور کس کے کہنے پر لے جانا چاہتے ہیں تو یقیناً ڈاکٹر کی برہمی میں اضافہ ہوتا لہٰذا میں نے صرف اتنا کہا کہ ہم مریض کو کہیں اور شفٹ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر جز بز تو بہت ہوا۔ بہرحال' حمزہ کو ڈسچارج کرنے کے سوا ان کے پاس چارہ نہیں تھا۔

ضروری کارروائی کے بعد ہم ڈاکٹر حمزہ کو ایمبولینس میں لے آئے۔ ایمبولینس والے نے ساہی صاحب سے پوچھا "سر! کہاں جانا ہے؟"

ساہی صاحب سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں سوالیہ نظروں سے سائیں کی طرف دیکھنے لگا۔ سائیں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ کچھ دیر سائیں خلا میں گھورتا رہا پھر ایک دم چھلانگ لگا کر ایمبولینس میں گھس گیا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کے اشارے پر میں بھی ایمبولینس میں چلا آیا۔ انور احمد اور ماموں صاحب بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہو گئے لیکن جب حمزہ کے دو تین اور معزز قسم کے رشتے داروں نے ایمبولینس میں بیٹھنے کا ارادہ کیا تو سائیں عالی نے بری طرح جھڑک دیا۔ سائیں کے اشارے پر ڈرائیور نے ایمبولینس اسٹارٹ کی اور پھر سائیں کی ہدایات کے مطابق ہی آگے بڑھنے لگا۔

قریباً ایک گھنٹے تک لاہور کی مختلف سڑکوں پر چلنے کے بعد ایمبولینس میانی صاحب کے قبرستان میں پہنچ گئی۔ یہ رات کے گیارہ کا عمل تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ شہر خموشاں رات کے اس پہر کچھ اور بھی خاموش و پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ میں حیران ہوا۔ ہم حمزہ کو زندگی کی طرف لانا چاہتے تھے لیکن سائیں عالی ایک ایسے مقام پر لے آیا تھا جس کے ساتھ صرف موت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ جن لوگوں نے میانی صاحب کا قبرستان دیکھا ہے' وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنا وسیع و عریض ہے۔ شہر لاہور کے بیچوں بیچ یہ کسی تاریک جنگل کی

طرح پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کے درمیان سے تنگ سڑکیں گزرتی ہیں۔ دن کے وقت بھی ان سڑکوں پر سے گزرتے خوف آتا ہے۔ ہماری ایمبولینس ان پیچ در پیچ سڑکوں سے گزر کر میانی صاحب قبرستان کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جگہ سائیں عالی نے رکنے کا اشارہ کیا۔ سائیں سمیت ہم سب اتر آئے۔ یہاں جنتر کی جھاڑیاں کثرت سے تھیں۔ کیڑے مکوڑوں کی آوازیں سرسراہٹ کی طرح فضا میں گونج رہی تھیں۔ سائیں عالی مجھے لے کر جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ ہم قبروں سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے ایک سائبان کے پاس پہنچے۔ یہاں میلا سا بلب روشن تھا۔ غالباً عارضی طور پر روشن کیا گیا تھا۔ ایک تازہ قبر کھدی ہوئی تھی۔ قبر کے اندر سے جو نرم بھربھری مٹی نکلی تھی اس پر ایک گورکن مزے کی نیند سو رہا تھا۔ یہ مٹی میں لتھڑا ہوا ایک نوجوان تھا۔ ایک اور شخص بھی پاس ہی لیٹا ہوا تھا مگر اس نے اپنے اوپر چادر تان رکھی تھی۔ سائیں عالی نے اپنے عصا سے نوجوان کے پیٹ پر ٹھوکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سائیں کو دیکھتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے جلدی سے سائیں کے پاؤں چھوئے اور سراپا عجز و انکسار نظر آنے لگا۔

"بابا کہاں ہے؟" سائیں نے تحکم سے پوچھا۔

نوجوان نے جلدی سے کہا "آیئے میرے ساتھ۔"

اس نے لالٹین پکڑی اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ جنتروں اور قبروں سے بچتے بچاتے ہم قبرستان کے اندر گھستے چلے جا رہے تھے۔ کچھ غراہٹیں سنائی دیں۔ یہ آوارہ کتے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں دو تین کتے نظر آئے اور میں حیران رہ گیا۔ یہ خاصے موٹے تازے اور دیدہ دلیر قسم کے کتے تھے۔ ایک کتا زیادہ پاس آیا تو نوجوان نے اسے مٹی کے ڈھیلے مارے۔ ہم مٹی کے بنے ہوئے ایک کوٹھا نما کمرے میں پہنچے۔ ابھی ہم باہر ہی تھے کہ اندر سے کسی کے کراہنے کی مسلسل آواز آنے لگی۔ "ہوں ہوں" کرتی ہوئی اس آواز میں عجیب دردناک سی کیفیت تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ مٹی کے طاق میں مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ اس کچے کمرے کا فرش بھی کچا تھا۔ ایک گولا سا ہڈیوں کا ڈھانچا زمین پر دراز تھا۔ اس کا جسم مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مٹی کے اس کمرے میں ہر شے مٹی کی ہے۔ مٹی کی ہانڈی، مٹی کے پیالے، مٹی کا چولھا، گھڑا، کیناٹی چوکی، غرض ہر شے مٹی کی تھی۔ سادھو نما شخص نے سائیں عالی کو دیکھا تو ایک دم ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سائیں عالی کے پاؤں چھونے چاہے لیکن سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سادھو نما شخص کے دونوں گھٹنوں پر بڑے بڑے سیاہ نشان تھے۔ ایسے ہی نشان اس کی ہتھیلیوں پر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس شخص کی سفید داڑھی خاصی لمبی تھی۔ رخساروں کے پاس سے وہ بھاری تھی لیکن نیچے آ کر پتلی ہو گئی تھی اور نیزے کی انی کی طرح بن گئی تھی۔ سادھو کا چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بخار میں تپ رہا ہے اور کسی طویل بیماری کے پنجوں میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس شخص کو ہماری آمد کا پہلے سے علم تھا اور وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بڑے کمزور لہجے میں سائیں سے ایک دو باتیں کیں، ان باتوں کے دوران میں بھی وہ مسلسل کراہتا رہا۔

سائیں نے مجھ سے کہا "جاؤ شفیع محمد! مریض کو لے آؤ۔"

سادھو نما شخص نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا "صادقے! چارپائی لے کر ان کے ساتھ چلا جا۔"

صادقا باہر گیا اور چند لمحے بعد ایک بوسیدہ چارپائی کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اس کی بغل میں ایک تہ شدہ دری تھی۔ ہم نے قبروں کے درمیان قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا اور واپس ایمبولینس کے پاس پہنچ گئے۔ انور احمد نے روہانسی آواز میں مجھ سے کہا "بیٹا جی! کچھ کرنا ہے تو جلدی کرو، حمزہ کی سانس اکھڑ رہی ہے۔"

ہم نے نیم جان حمزہ کو اسٹریچر سمیت ایمبولینس سے باہر نکالا۔ صادقے نے سفید دری چارپائی پر بچھا دی تھی۔ حمزہ کو چارپائی پر منتقل کیا گیا۔ چارپائی اٹھا کر ہم سادھو کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ سائیں عالی کے اشارے پر چارپائی کمرے کے ایک کونے میں طاق کے پاس رکھ دی گئی۔ چراغ کی زرد روشنی حمزہ کے چہرے پر لرز رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ "کوما" میں جا چکا ہے۔ سادھو نے بغور حمزہ کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری تشویش بلکہ کسی حد تک ناامیدی نظر آنے لگی تھی پھر وہ کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف بڑھا۔ اس کے چلنے کا انداز دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اور اسی وقت یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی کہ سادھو نما شخص کے گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر سیاہ نشان کیسے تھے۔ یہ شخص سیدھا چلنے کے بجائے چھوٹے بچوں کی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چل رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی کمر میں شدید تکلیف ہے جس کے سبب وہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس انداز میں چلتے ہوئے اس کی داڑھی زمین سے بس چند انچ ہی اوپر تھی۔

وہ بڑا عجیب بلکہ کسی حد تک خوفناک لگ رہا تھا۔

اس نے لکڑی کی ایک الماری کھولی۔ الماری میں شیشے کی بہت سی بوتلیں تھیں۔ یہ کھلے منہ والی جام کی بوتلوں جیسی تھیں۔ بوڑھے کا نوجوان ساتھی ایک دیا لے کر بوڑھے کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ الماری میں رکھی ہوئی شیشے کی بوتلوں میں مٹی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ مختلف رنگوں اور نسلوں کی مٹی تھی۔ سیاہی مائل، سرخی مائل، پیلی، چکنی، بھربھری، ریتلی، باریک۔ سادھو نما بوڑھے نے ان بوتلوں میں سے تین بوتلیں منتخب کیں اور کسی بچے کی طرح گھٹنوں کے بل چلتا ہوا حمزہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں وہ مسلسل کراہتا رہا تھا۔ سائیں ہمیں ایک ایسے مسیحا کے پاس لایا تھا جو خود بھی بیمار تھا۔ اس مسیحا کے پاس دوا کے نام پر مٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

حمزہ کے قریب پہنچ کر سادھو نما شخص آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ نوجوان نے تینوں منتخب کردہ بوتلیں چارپائی کے قریب رکھ دیں۔ وہ کچھ متذبذب نظر آ رہا تھا۔ سائیں عالی نے اس کا تذبذب بھانپ لیا۔ اس نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم سب نیچی چھت والے اس کمرے سے باہر نکل آئے۔

سائیں نے کہا "گاڑی کی طرف چلو، ہم واپس جائیں گے۔"

"اور حمزہ؟"

"اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا، ہمارے سامنے آ جائے گا اور مجھے اسی فیصد امید ہے کہ اچھا ہی ہو گا۔"

"لیکن ..."

"لیکن کچھ نہیں؟" سائیں نے میری بات کاٹی "بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا جواب ہمیں نہیں مل سکتا اور نہ کبھی آئندہ مل سکے گا۔ ہماری عقل محدود اور قدرت لامحدود ہے۔ کیا جو کچھ تم نے گلگت کی وادی میں دیکھا تھا، اسے تمہاری عقل مانتی ہے؟ لیکن وہ سب کچھ تھا اور تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔ ان ناقابلِ فہم واقعات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کیا تم جھٹلا سکتے ہو؟"

"لیکن یہ شخص کون ہے؟"

"یہ ایک ... جن ہے۔" سائیں عالی نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ایک لمحے کے لیے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خبر نہیں یہ قبرستان کے تاریک ماحول کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی۔ مجھے حقیقی معنوں میں خوف محسوس ہوا۔

"ہاہا ڈر گئے۔" سائیں نے قہقہہ لگایا "نہیں یار ... یہ جن نہیں ہے۔ میرے تیرے جیسا عام انسان ہے اور اگر بہ فرضِ محال جن ہے بھی تو تیری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہمارا مریض اچھا ہو جائے۔"

"لیکن مٹی سے کیا ہو گا؟"

"خبردار ایسی بات نہ کہنا۔" سائیں عالی نے مجھ پر آنکھیں نکالیں "مٹی ہی سب کچھ ہے۔ اپنے اردگرد دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ کون سی ایسی چیز ہے جو مٹی میں سے نہیں نکلی۔ سب کچھ بالواسطہ یا بلاواسطہ مٹی میں سے ہی نکلا ہے اور پھر یہ جو مٹی ہے، یہ وہ کوئی تھوڑی ہے۔ یہ تو کوہ قاف کی مٹی ہے۔ پتا نہیں کوہ قاف کے کس کس کونے سے اکٹھی کی گئی ہے۔ یہاں اندھیرا ہے ورنہ میں تمہیں اپنا بدن دکھاتا۔ تمہیں معلوم ہے گلگت سے واپسی پر یہ بدن آبلوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ کوئی معمولی آبلے نہیں تھے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس ان کا علاج نہیں تھا۔ اب میرا بدن بالکل صاف ہے اور یہ اسی مٹی کی شفا ہے۔ جس شخص کو تم نے ابھی دیکھا ہے اس نے پورے ایک ہزار سال تک جنگل جنگل، صحرا صحرا گھوم کر یہ مٹی اکٹھی کی ہے۔"

سائیں کے لہجے میں ایک بار پھر بے پناہ سنجیدگی عود کر آئی تھی۔ اس سنجیدگی کو محسوس کر کے حمزہ کے چچا انور احمد اور ماموں حاجی صاحب کے چہروں پر پھر خوف اور بے یقینی کے سائے منڈلا گئے۔ یقیناً پُراسرار، تاریک ماحول ہر ذہن پر اثر کر رہا تھا۔

سائیں نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور حمزہ کے ماموں حاجی صاحب سے مخاطب ہو کر بولا "کیوں، پھر ڈر گئے۔ اوئے پاگلو! میں مذاق کر رہا ہوں اور اگر ... فرض کیا، مذاق نہ بھی ہو تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ جنات ہر وقت ہمارے آس پاس رہتے ہیں بلکہ ان میں بڑے بڑے شریف جن بھی ہوتے ہیں بلکہ ایسے جن بھی ہوتے ہیں جو خوشبو لگا کر شہروں کے اندر سے نہیں گزرتے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی انسان انہیں چمٹ نہ جائے۔ ابھی پچھلی جمعرات کو میں نے کوہ قاف میں ایک ایسا جن دیکھا تھا جسے انسان چمٹا ہوا تھا۔ یقیناً وہ کوئی ہندو تھا کیونکہ مریض جن اٹھتے بیٹھتے ہرے رام ہرے کرشنا کا ورد کرتا تھا اور ایک دو مرتبہ جوش میں آ کر اس نے گائے کا پیشاب پینے کی کوشش بھی کی تھی۔"

انور احمد نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "شاد جہاں! میرا خیال ہے چلیں یہاں سے۔" انور احمد کی آواز میں واضح طور پر خوف جھلک رہا تھا۔

حاجی صاحب نے کہا "لیکن حمزہ؟ میرا مطلب ہے ہم اسے یوں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔"

"خاموش۔" سائیں گرجا "میری بات پر یقین نہیں آرہا تمہیں۔ اگر نہیں آرہا تو آؤ میرے ساتھ۔ اٹھاؤ اس موے کو اور لے جاؤ یہاں سے۔ جا کر پھر جمع کراؤ اسپتال میں۔"

میں نے انور احمد کا بازو دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں ایک بار پھر کتوں کے زور و شور سے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں لگتا تھا کہ رات کے اس پہر قبرستان کی وسعتوں میں کتوں کے گروہ دندناتے پھر رہے ہیں۔ چند لمحے بعد کچھ کتے دوڑتے اور غراتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ میرا ہاتھ خود بخود اپنے طلائی دستے والے پاسٹل تک پہنچ گیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ سب کے سب بڑے پلے ہوئے کتے تھے اور کسی ایسے اکیلے شخص کے لیے جس کے پاس ہتھیار وغیرہ نہ ہو' خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ کتے ہماری طرف آرہے تھے لیکن پھر ایک دم ان کا رخ بدل گیا۔ وہ اس پختہ سائبان کی طرف چلے گئے جہاں میلا کچیلا بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں ہم نے دیکھا کہ دو تین کتے کسی شے کے لیے چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ غور کیا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ ایک انسانی بازو تھا۔ وہ سیاہی مائل تھا اور یقیناً اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کتوں نے کسی قبر میں نقب لگائی تھی اور وہاں سے یہ انسانی عضو کھینچ لائے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد یہ کتے اس لوتھڑے سمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی کریہہ آوازیں مدہم اور دور ہوتی چلی گئیں اور پھر معدوم ہو گئیں۔ سائیں نے "حق ہو" کا فلک شگاف نعرہ لگایا تو کسی قریبی شاخ پر بیٹھا ہوا ایک الو پھڑپھڑا کر تاریکی میں گم ہو گیا۔

قبرستان کا ماحول ہم سب پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ انور احمد اور حاجی صاحب بھی جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ جاں بہ لب حمزہ کو یہاں چھوڑ جائیں۔ وہ سخت تذبذب میں نظر آرہے تھے۔ سائیں عالی نے ان کی کیفیت تاڑ لی۔ بولا "کیا بات ہے۔ تمہارے بوتھوں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ اگر یہاں رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اگر کوئی جن شن یا بری شری چمٹ گئی تو مجھے نہ کہنا۔"

انور احمد اور حاجی صاحب نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ انور احمد نے کہا "کیا خیال ہے شار جہاں! اگر ہم یہیں ایمبولینس میں بیٹھ جائیں تو؟"

"جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

انور احمد نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! پتا نہیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ حمزہ کی حالت دیکھ دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم یہیں ایمبولینس میں رات گزار لیتے ہیں۔"

سائیں نے ہمارا ارادہ دیکھا تو آگے بڑھ کر اس شخص کو جگا دیا جو سائبان کے نیچے گھاس پر گرم چادر تانے لیٹا تھا۔ سائیں نے اس کے پہلو میں پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھی تو اس کے لمبے بال ریشمی تھان کی طرح اس کی کمر پر کھلتے چلے گئے۔ وہ سروج تھی۔ ایک سو دس فیصد سروج تھی۔ اس نے ہلکے سرخ رنگ کی شلوار اور سرخ پھولوں والی سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ قبرستان کی اس پُراسرار فضا میں شعلہ بدن سروج کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی آوارہ روح اپنی قبر پھاڑ کر حسینہ کے روپ میں نمودار ہو گئی ہے۔ سروج کو دیکھ کر انور احمد اور حاجی صاحب کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے تھے۔

سائیں نے سروج کو مخاطب کر کے دور ہی سے ہانک لگائی "یہ دیکھ مہمان آئے ہیں۔ رات یہیں رہیں گے ہمارے پاس۔ ان کے لیے چائے بنالا ذرا کڑک سی۔"

سروج آنکھیں مل رہی تھی اور بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لباس اور بالوں پر مٹی نظر آرہی تھی پھر بھی وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بڑی ادا سے بال جھٹکے اور ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں عجیب الخلقت بوڑھا حمزہ کا علاج کر رہا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ سائیں عالی سروج کے ساتھ اسی قبرستان میں رہائش پذیر ہے۔ ہم سائیں کے ساتھ ایمبولینس میں آبیٹھے۔ سائیں حسب معمول کوہ قاف اور جنات کے بارے میں الٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ سروج آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کی بوسیدہ کٹرے تھی۔ ٹرے میں چائے کی پیالیاں رکھی تھیں۔ ایمبولینس میں آکر اس نے بڑے اہتمام سے چائے ہمیں سرو کردی۔ چائے ایک پتیلی میں لائی گئی تھی۔ المونیم کی یہ مڑی تڑی پتیلی نیچے سے سیاہ ہو رہی تھی۔ سروج نے چائے کی پیالی مجھے تھمائی تو اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے ٹکرائیں۔ وہ

خاص انداز سے چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سائیں عالی کہتا تھا کہ وہ بیمار ہے "اسے دورے پڑتے ہیں۔ اگر وہ واقعی بیمار تھی تو پھر اس بیماری نے اس پر بڑے اچھے اثرات چھوڑے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ پُرکشش نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نشیلی اور ہونٹ پہلے سے بڑھ کر دعوت انگیز تھے۔

چائے دے کر وہ جیسے آئی تھی' ویسے ہی مٹکتی اور لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اچانک حمزہ کے ماموں حاجی صاحب نے ایک لرزہ خیز چیخ ماری اور اچھل کر سائیں عالی کے اوپر آگرے۔ ان کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے کوئی شے اپنے پاؤں پر رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے پاؤں جھٹکا' کوئی جانور اچھل کر نشست کے نیچے گھس گیا اور پھر وہاں سے تڑپ کر باہر نکل گیا۔ ایمبولینس کی اندرونی روشنی میں' میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ وہ ایک موٹے سائز کا بجو تھا۔ وہی مردار خور جانور جس کا ذکر شہر خموشاں کے حوالے سے اور خرابا جات کے حوالے سے اکثر آتا ہے۔ ہاں! جس وقت ایمبولینس خالی تھی بجو چہل قدمی کرتا اندر گھس آیا تھا۔ اب میری لات کھا کر وہ یقیناً پھر کسی کھلی قبر میں جا گھسا ہو گا۔ ایمبولینس کی اندرونی روشنی میں حاجی صاحب کا رنگ زرد نظر آرہا تھا۔ ہم نے ایمبولینس کے دونوں دروازے بند کر لیے۔ دور سے ایک بار پھر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کتوں کے غولوں کے غول یہاں پھر رہے ہیں۔ میانی صاحب کے قبرستان کی وہ رات اپنے انداز کی انوکھی رات تھی۔ اس رات نے ایک بہت بڑے سیاہ چگادڑ کی طرح ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سائیں عالی ہمارے درمیان بیٹھے بیٹھے مراقبے میں گم ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ سر کے ہلنے سے اس کے گلے میں آویزاں گھنٹیاں مدھم آواز پیدا کر رہی تھیں۔ سائیں کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان گاڑی کی اندرونی روشنی میں چمک رہا تھا۔ یہ نشان' سوالیہ نشان سے ملتا جلتا تھا۔ شاید یہ واقعی ایک سوالیہ نشان تھا جو سائیں کی پیشانی سے شروع ہو کر رخسار سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ سائیں نے ایک مرتبہ خود بتایا تھا کہ زخم کے اس نشان کا وظیفے سے گہرا تعلق ہے مگر اس تعلق کی وضاحت اس نے نہیں کی تھی۔

ایمبولینس میں بیٹھے بیٹھے میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا دل باہر نکلنے کو چاہ رہا تھا۔ سگریٹ کی طلب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی مردہ خانے سے باہر نکلا ہوں۔ ایمبولینس کے اندر مجھے ہر طرف جان کنی کا منظر نظر آرہا تھا۔ آہیں' سسکیاں' نوحے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے ایمبولینس کے اس مختصر کیبن میں آخری ہچکیاں لی تھیں' اکڑتے جسم آخری بار پھڑپھڑائے تھے اور کتنی آنکھوں نے ایمبولینس کی نیلی چھت کو آخری بار دیکھنے کے بعد ہمیشہ کے لیے تاریکی اوڑھ لی تھی۔ میں ایمبولینس سے نکل آیا تھا۔ اب بھی "قبروں" کی صورت میں میرے اردگرد موت تھی لیکن یہ موت اور طرح کی تھی۔ اس موت میں مرنے کا عمل مکمل ہو چکا تھا اور ہر طرف سکون تھا۔ ایمبولینس کے اندر جان کنی کے لمحات تھے اور بلا کی بے قراری تھی۔

میں جنتر کی جھاڑیوں کے درمیان ٹہلنے لگا۔ مٹی سے بنی ہوئی وہ چھوٹی سی چار دیواری مجھ سے قریباً سو گز کی دوری پر تھی جس کے اندر ایک کمرا تھا اور اس کمرے کے اندر ایک عجیب الخلقت بوڑھا اپنے عجیب و غریب انداز میں حمزہ کا علاج کر رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اندر جا کر یہ کارروائی دیکھوں لیکن پھر سائیں عالی کا خیال آگیا۔ اس نے کہا تھا کہ اب ہم میں سے کوئی کمرے میں نہیں جائے گا۔ اس وقت تک جب تک حمزہ کی حالت سنبھل نہیں جاتی یا پھر کوئی بری خبر نہیں آجاتی۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور اس سائبان کی طرف چلا گیا جہاں زرد بلب روشن تھا۔ اس سائبان کے نیچے پختہ قبر تھی۔ قبر کے اردگرد کافی جگہ کھلی چھوڑی گئی تھی۔ یہاں گھاس لگی ہوئی تھی اور لوہے کا قریباً دو فٹ اونچا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ہماری آمد کے وقت سروج گھاس کے اسی قطعے پر لمبی تان کر سو رہی تھی۔ میں بھی جنگلا پھلانگ کر گھاس پر جا بیٹھا اور سگریٹ پینے لگا۔ پختہ قبر پر ریشمی چادر چڑھی تھی اور مٹی کے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ کتبے پر لکھا تھا۔ "پروفیسر افتخار باجوہ۔ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ۔" نیچے تاریخ ولادت اور وفات درج تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر کتبے پر کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ نہ بھی لکھا جاتا تو پروفیسر صاحب مرحوم کا کیا نقصان ہو جاتا۔ ایسے ہی بہت سے کتبے قبرستانوں میں نظر آیا کرتے ہیں۔ کچھ ان میں سے دلچسپ ہوتے ہیں' کچھ سبق آموز اور کچھ مضحکہ خیز۔ اگر بندے کے پاس کسی وقت فرصت ہو تو وہ میانی صاحب جیسے قبرستان میں گھوم پھر کر دیکھے اور کتبوں کا مطالعہ کرے۔ دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد میں نے ایک بازو سر کے نیچے رکھا اور لیٹ گیا۔ رات بھیگ گئی تھی۔ جنتر' بیری

اور نیم کے پتے شبنم آلود ہو رہے تھے۔ مٹی کے "کچی چھت والے کمرے" کے اندر مکمل سکوت تھا۔ بس کبھی کبھار دروازہ کھلتا تھا اور فوراً بند ہو جاتا تھا۔ مجھے ایک دو بار سوج کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ ایک بار چنگیر میں کوئی گرم چیز اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ دوسری بار اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی میلا کپڑا باہر پھینکا تھا۔

کہیں دور سے پولیس کا سائرن سنائی دیا۔ یقیناً یہ کار قبرستان کی کسی اندرونی سڑک پر کھڑی تھی پھر سیٹیاں گونجنے لگیں۔ شاید کوئی "ریڈ-RAID" وغیرہ ہوئی تھی۔ کوئی چور اچکا اٹھائی گیرا یا جوئے باز قانون کے نرغے میں تھا۔ کچھ دیر بعد یہ شور ختم ہو گیا اور ایک بار پھر قرب و جوار میں خاموشی چھا گئی۔ لیٹے لیٹے مجھے اونگھ آنے لگی تھی۔ سچ ہے نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اچانک مجھے سوج کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ میرے بالکل قریب آن کھڑی ہوئی۔

"شاہ جہاں! وہ لڑکا جو اندر ہے، تمہارا کیا لگتا ہے؟"
اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میرا قریبی عزیز ہے۔" میں نے کہا "کیسا ہے وہ؟"

"اس کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن اب تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوج زیر لب مسکرائی "اس کی حالت اب بہتر ہے مگر۔"

"مگر کیا؟"

"وہ خطرے سے اب بھی باہر نہیں ہے۔ تم اس کے جیون کے لیے پرارتھنا کرو۔" وہ واپس پلٹی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اندر بہت کام ہے۔" اس نے کہا اور لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

اس کا لب و لہجہ اب بالکل نارمل نظر آتا تھا لیکن سائیں عالی کہتا تھا کہ وہ اب بھی بیمار ہے۔ پتا نہیں یہ کیسی بیماری تھی جس نے اس کے شباب کو دو آتشہ کر رکھا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور بے قراری سے سائبان کے نیچے ٹہلنے لگا۔ جی چاہا کہ سائیں عالی کی نگاہ بچا کر کمرے میں جھانکوں۔ سائیں عالی ایمبولینس میں بیٹھا تھا اور وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا چار دیواری کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں دو قطاروں میں بہت سے مٹکے رکھے تھے۔ میں ان مٹکوں کے درمیان سے گزر کر کمرے تک پہنچا۔ اندر مٹی کے چراغوں کی مدھم روشنی تھی۔ حالانکہ یہاں بجلی موجود تھی لیکن عجیب الخلقت بوڑھے نے دیے جلا رکھے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی رخنے یا جھری سے اندر کا منظر نظر آسکے مگر مکمل ناکامی ہوئی۔ ہاں یہ ہوا کہ بوڑھے کے کراہنے کی آواز میں نے سن لی۔ اس آواز میں کبھی سوج یا نوجوان گورکن کی صدا بھی شامل ہو جاتی تھی۔

چند لمحے ٹھہر کر میں واپس لوٹ آیا۔ میرے پیچھے ہی سوج بھی چلی آئی۔ اس نے تسلی بخش لہجے میں "تمہارے مریض کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ یوں سمجھو صاحب کی کرامت سے مردے میں جان پڑ رہی ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ بادا صاحب عام لوگوں کا نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے ہاتھ میں جو شفا ہے کیول (صرف) خاص لوگوں کے لیے ہے۔ اگر یہ عام لوگ علاج کریں تو میرا وشواس ہے کہ ان کے ڈیرے کے سامنے لوگوں کی قطاریں لگی رہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا حمزہ کو ہوش آگیا ہے؟"

"مکمل ہوش تو نہیں آیا۔ ہاں وہ کئی بار بڑبڑایا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اس کے شریر میں جیون جھلک نظر آئی ہے۔ سچ شاہ جہاں! مجھے بڑی خوشی ہوئی اس بہتری دیکھ کر۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے شریر میں میرے شریر میں زندگی دوڑ گئی ہے۔"

"تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ تمہارا مریض اچھا ہو گا تو تمہارے قریب آنے کا موقع ملے گا۔ ارے تم مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ سائیں صاحب نے مجھے تمہاری شرط کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" بات کرتے سوج کے چہرے پر شفق کا رنگ پھیل گیا۔ "سائیں صاحب نے مجھے بتا دیا ہے کہ اگر مریض اچھا ہو گیا تو تم مجھے اپنانے کے پابند ہو جاؤ گے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا کمرے کے سے سوج کو آواز پڑ گئی۔ بلانے والا نوجوان گورکن تھا۔ اس کی آواز میں عجلت تھی۔ سوج دوڑتی ہوئی اندر گئی۔ کسی جلدی کے کام سے دوڑ کر جانا اس کا خاص انداز تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کچھ اور بھی نوجوان اور پرکشش نظر آتی تھی۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ اچھی لگتی ہے۔ میں متفکر ہو گیا۔ کہیں حمزہ کی طبیعت نہیں بگڑ گئی تھی۔

سوج کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ایک بار گہری خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو بس کبھی کبھار کتوں کی آوازیں درہم برہم کرتی تھیں۔ ہاں ایک اور بھی تھی۔ مسلسل چیختے ہوئے جھینگروں کی آواز۔

آواز خاموشی کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ میں دوبارہ گھاس کے قطعے پر لیٹ گیا۔ چونکہ یہاں روشنی تھی لہٰذا کیڑے مکوڑوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ میری دائیں جانب ساتھ ساتھ کئی قبریں تھیں۔ ان پر خشک پھول پڑے تھے اور چاول اور باجرہ وغیرہ بکھرا ہوا تھا۔ ایک ایسی ہی قبر پر لوہے کا چھوٹا سا سائبان تھا اور اس پر بوسیدہ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ابھی مجھے لیٹے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سوج دوبارہ آگئی۔ اس نے سفید و سیاہ دھاریوں والا نیا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بڑی بے تکلف ادا سے میرے قریب بیٹھ گئی۔ میرے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ نکالا، ایک لمبا سا کش لیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی انداز میں کھانسنے لگی "بڑا کڑوا اور تیز ہے، بالکل تمہاری طرح۔"

"تو کیوں پی رہی ہو؟"

"مجھے کڑوی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ خاص طور پر تمہارا کڑوا پن تو میرے من کا روگ ہے۔"

"تمہارے دماغ کی مینوفیکچرنگ میں کہیں کوئی فرق رہ گیا ہے ورنہ میں جتنی دفعہ تمہیں نظر انداز کر چکا ہوں، تمہارے اندر تھوڑی سی بھی انا ہوتی تو تم پلٹ کر نہ دیکھتیں۔"

"یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔ اپنے پسندیدہ مرد کی طرف سے نظر انداز کیے جانے کے بعد عورت کے اندر کی آگ بھڑکتی ہے، کم نہیں ہوتی۔"

اس نے سگریٹ دوبارہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور میرا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اپنا ہاتھ چھڑا لیتا مگر یہ نازک صورت حال تھی۔ حمزہ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور مجھے سائیں عالی کی خوشنودی کی ضرورت تھی۔ میری خاموشی نے سوج کا حوصلہ بڑھا دیا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور اپنا سر میرے چہرے پر جھکا دیا۔ وہ ایک ایسا آتش پارہ تھی جو گیلی لکڑی کو بھی لمحوں میں سلگا کر شعلہ بنا سکتا تھا۔ اس کے جلتے ہوئے ہونٹ میرے چہرے سے ہم کلام ہو گئے۔ میں لیٹا ہوا تھا اور وہ بیٹھی ہوئی تھی، اس کے بالوں نے میرے چہرے کو ڈھانپ لیا۔

میں نے اسے پیچھے ہٹایا "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ ہم کسی باغیچے میں نہیں، قبرستان میں بیٹھے ہیں۔ ایسی جگہوں پر رنگینیوں کے بجائے موت کو یاد کرنا چاہیے۔"

"آج پھر جینے کی تمنا ہے، آج پھر مرنے کا ارادہ ہے۔" اس نے شوخی سے کہا "تمہارا مریض اچھا ہو رہا ہے شاہ جہاں۔ اب تم مجھے اپنے پیار سے محروم نہیں رکھ سکتے۔ یہ تو ایک ہاتھ لو، ایک ہاتھ دو والی بات ہے۔ ویسے شاہ جہاں، بائی دی وے، یہ تو چلو قبرستان ہے۔ اور کون سی ایسی جگہ ہے جہاں تمہیں میری گرمجوشی اچھی لگ سکتی ہے؟"

"میرا خیال ہے تم اپنی چونچ بند رکھو تو بہتر ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"تمہاری پریشانی دور کرنے کے لیے ہی تو میں تمہارے پاس آئی ہوں۔ ذرا ان زلفوں میں سر چھپا کر دیکھو۔ بڑی سے بڑی پریشانی تم سے دور ہو جائے گی۔"

وہ میرے اوپر ڑھے سی گئی۔ اس کا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی قریب آتی تھی، مجھے اس کے انداز میں ایک ایسی شدت محسوس ہوتی تھی جو پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جلتے سانسوں کی پھنکاریں میرے چہرے اور گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے میری قمیص کے بٹن کھول دیے اور اپنا چہرہ میرے سینے سے رگڑنے لگی۔ وہ دیدہ دلیر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ ناراض نظروں سے مجھے دیکھنے لگی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"سائیں صاحب کے پاس۔"

"کیا تکلیف ہے؟"

"تم۔۔۔ تم شرط کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔" وہ بہکے بہکے سے انداز میں بولی۔

اسی دوران میں سائیں عالی خود ہی وہاں آگیا "کیا بات ہے۔ کیا تکرار ہو رہی ہے تم دونوں میں؟"

سوج نے شکوہ کناں نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "کچھ نہیں۔ شاہ جہاں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں کمرے میں جا کر بیٹھوں۔"

میں نے کہا "سائیں! تم اس کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ یہاں میرے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ حد سے بڑھ رہی تھی اس لیے میں نے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" سائیں ناصحانہ انداز میں بولا "جہاں اتنی نزدیکی ہو، وہاں ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔" پھر اس نے سوج کو مخاطب کیا "ذرا دھیرج سے کام لو باکی۔ اب جو کچھ تو چاہتی ہے وہ تیرا ہے۔ سمجھ لے اب یہ شخص تیرے جی سمان ہے۔ تو ایسا سمجھ رہی ہے نا؟" سوج نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ سائیں بولا "اور جو جی سمان ہوتا ہے اس کی خوشی کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ اسے ناراض نہیں کیا جاتا۔ اس کی مرضی دیکھی جاتی ہے، اپنی مرضی اس پر مسلط نہیں کی جاتی۔ چل معافی مانگ اس سے۔"

سوج نے ذرا تذبذب دکھایا تو سائیں نے آنکھیں نکال لیں۔ وہ جلدی سے بولی "میں سمجھا چاہتی ہوں تم سے۔" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ سائیں نے آگے بڑھ کر اپنے عصا کی چوٹ سوج کی پشت پر لگائی۔ وہ تلملا کر رہ گئی۔

سائیں نے کہا "یہ بھی کہو کہ تمہاری منشا کے مطابق چلوں گی۔ تم سے پیار مانگوں گی ضرور لیکن چھینوں گی نہیں۔"

سوج نے بے بسی سے ہونٹ سکوڑے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر لڑکھڑاتی آواز میں بولی "تمہاری منشا کے مطابق چلوں گی۔ تم سے پریم مانگوں گی لیکن چھینوں گی نہیں۔"

"شاباش۔" سائیں نے اپنی لاٹھی سے ہی سوج کو شاباش دی پھر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز میں خاص قسم کی تیزی پائی جا رہی تھی۔ سوج سائیں کے پیچھے ہی پیچھے اندر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ بار بار بند ہو رہا تھا اور کھل رہا تھا۔ نوجوان گورکن کافی مصروف دکھائی دیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کوئی پرات نما برتن اٹھائے ہوئے باہر نکلا۔ اس برتن میں یقیناً کوئی محلول تھا پھر ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ وہ چولہے کی ایک جلتی ہوئی لکڑی لے کر اندر داخل ہوا ہے۔ دس پندرہ منٹ تک یہ سرگرمی جاری رہی۔ اسی دوران میں حمزہ کا چچا انور احمد، ماموں حاجی صاحب اور ایمبولینس کا ڈرائیور بھی ایمبولینس سے نکل کر میرے پاس آن بیٹھے۔ چچا انور احمد کے مایوس چہرے پر اب امید کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ پہلے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "کیا واقعی حمزہ کی حالت اب بہتر ہے؟"

میں نے کہا "دیکھا تو میں نے ابھی کچھ نہیں۔ سائیں عالی کی چیلی بتا رہی تھی اور سائیں بھی یہی کہہ رہا ہے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ سائیں عالی اور نوجوان گورکن صادق باہر آتے دکھائی دیے۔ وہ تازہ تازہ کھدی ہوئی قبر کے پاس چلے گئے۔ کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر صلاح مشورے کرتے رہے پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نوجوان گورکن نے قبر کو پاٹنا شروع کر دیا۔ بیلچے کی مدد سے اس نے دس منٹ کے اندر قبر کا گڑھا بھر دیا اور جو تھوڑی بہت مٹی بچ گئی وہ ادھر ادھر بکھیر دی۔ سائیں عالی پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے جا کر سائیں عالی سے پوچھا "یہ قبر کیوں بھر دی، کیا جنازہ نہیں آ رہا؟"

"نہیں آ رہا۔" سائیں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"وہ لوگ دوسری جگہ قبر کھدوا رہے ہیں جی۔" نوجوان گورکن نے جواب دیا۔

اس کا جواب گول مول تھا اور مجھے بالکل مطمئن نہ کر سکا۔ بہرحال میں نے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ناقابل فہم صورت حال تھی یہاں کی۔ جب ہم یہاں پہنچے تو اکیلا گورکن قبر تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اور یہاں موجودگی میں کوئی شخص اسے یہ کہنے نہیں آیا تو بند کر دی جائے لیکن وہ قبر بند کر رہا تھا۔ میرے کانوں میں سائیں عالی کا فقرہ گونجنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ "مردہ زندہ ہو رہا ہے۔"

کہیں اس فقرے کا تعلق اس قبر سے تو نہیں؟ میں نے کالج کے زمانے میں "روحانی علاج" سے متعلق ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ کچھ خاص قسم کے روحانی معالج شگون کے طور پر علاج سے پہلے مریض کا کفن تیار کرواتے اور اسے مریض کی چارپائی کے نیچے یا بستر کے نیچے رکھتے۔ کہیں یہ بھی تو کوئی اسی طرح کا شگون نہیں تھا۔

قبر بند کرنے کے بعد سائیں عالی اور نوجوان دوبارہ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے سائیں عالی سے کہا "حمزہ کے چچا اور ماموں بڑے پریشان ہیں۔ وہ ایک بار دیکھنا چاہتے ہیں۔"

سائیں نے پہلے تو مجھے گھور کر دیکھا پھر بولا "ٹھیک ہے لیکن تم کمرے میں نہیں جا سکتے۔ میں کھڑکی کھول دیتا ہوں تم وہاں سے دیکھ لینا۔"

سائیں عالی اندر چلا گیا۔ اس نے کھڑکی کھول دی اور پھر اس نے ہمیں آواز دی۔ ہم نے باری باری کھڑکی سے اندر جھانکا۔ منظر چونکا دینے والا تھا۔ حمزہ چارپائی پر لیٹا تھا۔ ستر پوشی کے لیے اس کی ٹانگوں کے درمیان ایک کپڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے پورے جسم پر مٹی تھی۔ متاثرہ ٹانگ پر یہ لیپ گہرے خاکستری رنگ کا تھا۔ چارپائی کی دونوں جانب مٹی کے دیے روشن تھے۔ چارپائی کے نیچے مٹی کا پرات نما برتن رکھا تھا۔ اسے پنجابی میں کنالی کہا جاتا تھا۔ حمزہ کی ٹانگ سے نکلنے والا خون قطرہ قطرہ کنالی میں گر رہا تھا۔ میں نے صاف دیکھا کہ حمزہ کے ہونٹوں میں جنبش ہے اور وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ یعنی وہ ہوش میں تھا۔ کمرے میں ایک آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ یہ معالج بوڑھے کے کراہنے کی آواز تھی۔ وہ درد میں ڈوبی اور ایک راگنی بخار میں تپی ہوئی آواز تھی۔ یہ آواز سننے والے کے دماغ پر عجیب پژمردگی طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے دیکھا بوڑھا ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ایک کونے میں گیا۔ اس کی داڑھی فرش سے بس چند انچ ہی اوپر تھی۔ کو

اس گوشے میں چھوٹا سا گھڑا تھا اور لوٹا رکھا تھا۔ نوجوان گورکن بوڑھے کے ہاتھ دھلانے لگا۔

حمزہ کو دیکھنے کے بعد ہم تینوں کھڑکی سے ہٹ آئے۔ کچھ دیر بعد سائیں عالی ہمارے پاس پہنچا۔ اس نے پہلے "حق ہو" کا ایک تنگ شگاف نعرہ لگایا پھر بولا "اب تم یہاں سے چلے جاؤ تو زیادہ مناسب ہے۔"

"اور حمزہ؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی چار پانچ روز یہیں رہے گا۔ اس کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے کپڑوں کے دو جوڑے کل تک بھجوا دو اور خبردار، تیمارداری کے بہانے یہاں رش لگانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

ماموں حاجی صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا "لیکن سائیں صاحب! اس کی ماں تو رو رو کر مر جائے گی۔ بس اسے ایک بار شکل دکھا دیں۔"

"ٹھیک ہے اسے لڑکے کے کپڑے دے کر بھیج دینا۔"

ہم واپس روانہ ہونے تو سائیں نے آواز دے کر مجھے روک لیا "شفیع محمد۔ اس کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" پھر اس نے کمرے کی طرف رخ کر کے سوج کو آواز دی۔ وہ پہلے سے تیار بیٹھی تھی، لپکتی ہوئی باہر آئی۔ اس کا مختصر سامان اس کے پاس شولڈر بیگ کی صورت میں تھا۔ سائیں نے کہا "جاؤ شفیع محمد کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہاں اکیلی بیٹھی بیمار ہوتی رہتی ہو۔"

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سوج میرے ساتھ بھیجے جانے کا کیا مطلب ہے۔ میں اسے اپنے گھر لے جانے کا اور اپنے ساتھ رکھنے کا پابند تھا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر سائیں عالی میرے قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ اس کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں میرے سینے میں چبھنے لگیں اور بدبو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ رازداری سے بولا "شفیع محمد! سوچ میں مت پڑ۔ سمجھو تمہارے لیے کامیابی کے دروازے کھل رہے ہیں۔ قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ کس بات سے کیا نکل آئے اور کون سا واقعہ کس واقعے کی بنیاد بن جائے ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ تم سوچو جب حمزہ نام کا یہ لڑکا جھوک ضامن کے بم دھماکوں میں زخمی ہوا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ اس "زخمی" کی وجہ سے آج تمہارے قریب آ جائے گی۔ اب سوج تمہارے بچے کی ماں ہے۔ بظاہر تم دونوں کے اس ناتے کا رشتے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تعلق ہے۔ گہرا تعلق ہے۔ تم بہت جلد میری اس بات کی سچائی کو آنکھوں سے دیکھو گے۔" سائیں عالی نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا "جاؤ۔ سوج کو ساتھ لے جاؤ۔ اس کے قریب ہو جاؤ اور پھر انتظار کرو کہ یہ قربت کیا رنگ لاتی ہے۔"

سائیں کی باتیں میرے لیے ہمیشہ کی طرح ناقابل فہم تھیں لیکن اس سے بحث کرنا فضول تھا۔ سوج میرے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایمبولینس میں بیٹھے میانی صاحب کے قبرستان سے باہر نکل رہے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ میانی صاحب قبرستان کی ایک رات اپنے تمام تر اسرار و رموز کے ساتھ پیچھے رہ گئی تھی۔

○☆○

میں منڈی کے قصبے میں جانے سے پہلے ایک بار ساہی صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔ میں سوج کے ساتھ پرانی انارکلی کے قریب ایمبولینس سے اتر گیا۔ اب اجالا ہو چکا تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے والے لوگ، دودھ فروش، اخبار فروش وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ میں پرانی انارکلی سے گزر کر مال روڈ پر آیا پھر ٹولنٹن مارکیٹ کا چکر کاٹ کر اور پنجاب لائبریری کے سامنے سے گزر کر دوبارہ پرانی انارکلی کے چھلے چوک میں آ گیا۔ یہ سارا میرا دیکھا بھالا علاقہ تھا۔ ہر ہر گلی کا ہر ہر نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ سری پائے کی دکانوں سے تھوڑا آگے چناخ چناخ کی آواز سے پوریاں بنائی جا رہی تھیں۔ میں نے یہیں ایک اسٹول پر بیٹھ کر حلوا پوری کا ناشتا کیا۔ ساتھ میں گرم گرم چنے اور گاجر آم لیموں کا اچار تھا۔ بس وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ اس ناشتے نے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کیے ہوئے ناشتے سے زیادہ مزہ دیا۔ سوج میرے ساتھ تھی۔ وہ بھی چٹخارے لے لے کر کھاتی رہی۔ اس کی چمک دمک دیکھ کر بہت سے لوگ ناشتا چھوڑ کر اسے تاڑنے لگے تھے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ ستر سے اسی سال کا بوڑھا بھی اسے دیکھتا تو ہونٹوں پر زبان پھیرے بغیر نہیں رہتا تھا۔ بقول کسی شاعر کے، اس کے حسن میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ ایک طرف صد سالہ بوڑھے کو پرشباب ماضی کی طرف کھینچ سکتی تھی تو دوسری طرف بارہ سالہ لڑکے کو پرشباب مستقبل کی طرف کھینچ سکتی تھی۔ کئی "دل جلوں" کا ناشتا خراب کرنے کے بعد ہم اٹھے تو رک گئی کہ وہ سری پائے بھی کھائے گی۔ میں نے سری پائے کے نقصانات اور مضمرات گنوا کر اسے بہ مشکل باز کیا تو وہ لسی کی طرف راغب ہو گئی۔ میں اس کی ناز برداری پر مجبور تھا۔ جب بھی اسے سختی سے روکنے کا ارادہ کرتا تھا تو سائیں

عالی کا چھوٹا ہوں میں گھوم جاتا تھا۔ مجبوراً دو گلاس میٹھی لسی بنوائی۔ سوج کی فرمائش پر اس میں باقاعدہ پیڑے بھی ڈالے گئے۔

لسی پی کر ہم پیدل ہی مال روڈ کی طرف چل دیے۔ میری خواہش تھی کہ جلد ہی رکشا وغیرہ مل جائے لیکن وہ آفت زادی میرے ساتھ پیدل چلنا چاہ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دیکھنے والے اسے کتنے غور سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے پاؤں دھڑکتے سینوں کو کس طرح کچل کچل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ وہ ان لمحوں سے بھرپور لطف اٹھانا چاہتی تھی اور ساتھ ساتھ مجھے بھی یہ بتانا چاہتی تھی کہ دیکھو "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔" لسی پی کر بدبخت کی چال کچھ اور بھی مستانی ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ناچ رہی ہے۔ ایک ٹیکسی ملی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب نو بجنے والے تھے۔ ہم نے سیدھا ساہی صاحب کے آفس کا رخ کیا۔ ساہی صاحب ابھی آفس میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ میں جا دھمکا۔ سوج کو میں نے باہر ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہنے دیا تھا۔ ساہی صاحب حمزہ کے بارے میں بڑے پریشان تھے۔ میں نے انہیں تازہ ترین صورت حال سے باخبر کیا۔ میانی صاحب کے قبرستان میں جو رات ہم نے گزاری تھی، وہ ہر لحاظ سے حیرت انگیز تھی۔ ساہی صاحب بھی سنتے رہے اور حیران ہوتے رہے۔ ان کے پاس اس سلسلے میں کئی سوالات تھے لیکن میرے پاس جوابات کا وقت نہیں تھا۔ میں اب جلد از جلد "صندلی" پہنچنا چاہتا تھا۔

ساہی صاحب نے مجھ سے پوچھا "شفتا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ بھی صندلی میں ہی ہے۔"

"تم غلطی کر رہے ہو شاہ جہاں!" وہ پریشان لہجے میں بولے "تم جانتے ہو شنکر آزاد ہے اور بے حد طیش میں بھی ہے۔ لاہور میں اس کی موجودگی کے ثبوت مسلسل مل رہے ہیں۔ آج رات بیڈن روڈ پر ایک تباہ شدہ کار میں دو تاجر گولیوں سے چھلنی پائے گئے ہیں۔ برکت نے جو رپورٹ دی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارروائی شنکر کی ہے یا اس کے ساتھی ایرانی دہشت گردوں کی۔ پرسوں بھی ایک لیڈی ڈاکٹر میو اسپتال کے عین سامنے قتل ہوئی ہے اور وہاں شنکر کو باقاعدہ دیکھا گیا ہے۔ قصہ کوتاہ، میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے ساتھ ساتھ شفتا کی زندگی کو بھی شدید خطرے میں ڈالو بلکہ میری رائے میں تو تم نے شفتا کو منظر عام پر لا کر ہی غلطی کی ہے۔ تمہارے دوستوں کا اور ان کی بیویوں کا جو بھی معاملہ تھا، وہ تمہیں کسی اور طریقے سے حل کر لینا چاہیے تھا مگر تم نے بالکل برعکس کام کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے اندھیرے میں رکھا اور شفتا سے ملنے کا بہانہ کرکے اسے ساتھ شیخ عاصم کے پاس لے گئے۔ میں سچ کہتا ہوں تم مجبوریاں اپنی جگہ لیکن مجھے اس واقعے سے سخت صدمہ ہے۔" ایک لمحہ توقف کرکے وہ بولے "بہرحال میں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اگر تم میری رائے کو کچھ اہمیت دو تو میں یہ کہوں گا کہ وقت ضائع کیے بغیر فوراً شفتا کو منظر سے ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی بہت پچھتانا گا۔"

"منظر سے ہٹانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"تم اسے اپنے ساتھ نہ رکھو۔ جس طرح وہ پہلے تھی، اسی طرح اسے کہیں گم کر دو یا اسے مجھ تک پہنچاؤ، اس کا کچھ کر لوں گا۔"

"لیکن آپ تو شنکر اور شیخ کی نظروں میں آچکے ہیں، جانتے ہیں کہ شفتا اس سے پہلے آپ کی تحویل میں تھی۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے پاس رہے۔ میرے پاس نہیں ہوگی اور نہ ہی مجھے اس بات کا علم ہوگا کہ وہ کہاں ہے لیکن وہ نہایت محفوظ اور قابل بھروسا ہاتھوں میں ہوگی۔ سابق آئی جی ابدال شاہ صاحب کو جانتے ہو تم؟"

میں نے کہا "جب آپ جانتے ہیں تو پھر مجھے جاننے کی ضرورت ہے۔ آپ صرف دو بھروسے والے آدمی ساتھ کر دیجیے۔ میں شفتا کو ان کے ساتھ آپ کی طرف روانہ کر دوں گا۔"

"نہیں، اس کام کے لیے سادہ کپڑوں میں پہنچوں گا۔ تم مجھے اپنا مکمل پتا لکھواؤ۔"

میں نے ساہی صاحب کو صندلی قصبے کا لکھوا دیا۔

O☆O

جس وقت میں اور سوج "صندلی" پہنچے، رات نو بج رہے تھے۔ شفتا اور انجم نے اس سے پہلے سوج کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں تعجب نظر آنے لگا۔ شفتا کی نظریں بھی حیرت آمیز دلچسپی سے سوج کے سراپا کا کر رہی تھیں۔ وہ میرے کان میں کہنے لگا "تجن یار، یہ پھلجھڑی کہاں سے لیا دی ہے۔ مجھے تو بالکل کسی ہندی فلم کی ایکٹریس لگ رہی ہے۔"

میں نے کہا "خبیرے! تیری نظر کسی شکاری کتے سے تیز ہے۔ یہ واقعی ہندوستانی فلموں کی ایکٹریس ہے۔"

شفتا اور انجم حمزہ کے حوالے سے بے حد پریشان نظر آتی تھیں۔ میں انہیں ایک طرف لے گیا اور حمزہ کی خیریت سے آگاہ کیا۔ میانی صاحب کے قبرستان میں گزری ہوئی بھیانک رات کا ذکر کیے بغیر میں نے انہیں بتایا کہ حمزہ کی طبیعت اب سنبھل گئی ہے اور وہ ہوش میں ہے۔"

انجم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "حمزہ کی امی تو نیم پاگل ہو رہی ہیں۔ مسلسل بہکی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے نیند کی گولی دے کر سلایا ہے انہیں۔"

میں نے غزالہ اور شیخ عاصم کے بارے میں پوچھا۔ انجم نے بتایا کہ شیخ عاصم کی حالت جوں کی توں ہے۔ وہ اٹھنے بیٹھنے میں سخت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ قمیص اتار کر سارا دن پیٹ کے بل چارپائی پر لیٹا رہتا ہے اور دھوپ سینکتا ہے۔ غزالہ گاہے گاہے اس کی پشت اور کندھے پر "وکس" کی مالش کرتی رہتی ہے۔ انجم نے بتایا کہ کل رات نو دس بجے شیخ عاصم زریں گل کی کسی بات پر بھڑک اٹھا اور بلند آواز میں گالی گلوچ کرنے لگا۔ خیریت گزری کہ اس کی انگریزی گالیاں اور قصیدے زریں کی سمجھ میں نہیں آئے ورنہ پتا نہیں کیا طوفان کھڑا ہو جاتا۔

اسی رات دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ ساہی صاحب بھی شفتا کو لینے صندلی قصبے پہنچ گئے۔ وہ سادہ لباس میں تھے۔ ظاہری حلیہ کافی بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر عینک کا اضافہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی اور کسی مقامی زمیندار کی طرح نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کے دو مزید سادہ پوش افراد تھے۔ یہ لوگ ایک پرائیویٹ کار پر بڑی رازداری سے یہاں پہنچے تھے۔ ساہی صاحب شفتا کے علاوہ انجم کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ڈیڑھ دو گھنٹے شیر محمد کی حویلی میں قیام کیا۔ اس دوران میں شفتا اور انجم تیار ہو گئیں۔ شفتا کے لیے میرا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس نے بالکل چون چرا نہیں کی لیکن بے حد اداس تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے گوشے بار بار نم ہو جاتے تھے اور وہ انہیں بہانے بہانے سے پونچھ لیتی تھی۔

میں نے اسے گلے سے لگا کر کہا "اداس ہو؟"

وہ ایک دم رو پڑی "بھیا! اس مرتبہ کتنا انتظار کروائیں گے؟"

"اس مرتبہ بالکل انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے تسلی دی "اپنے بھیا کے وعدے پر اعتبار کرتی ہو نا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ناک سے "سوں سوں" کرتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔ "تو بس یقین رکھو، جلد ہی میں تمہارے پاس لوٹ آؤں گا۔"

ساہی صاحب نے ازخود جا کر غزالہ اور شیخ سے بھی ملاقات کی۔ وہ کافی دیر باتیں کرنے کے بعد میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "شاہ جہاں! شیخ عاصم اور غزالہ کے بارے میں اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا "اگر میں اس بارے میں آپ سے مشورہ طلب کروں تو؟"

وہ بولے "یہ بات طے ہے کہ شیخ کسی بھی صورت غزالہ سے مخلص نہیں ہے۔ وہ اسے استعمال کر رہا ہے اور جب تک موقع ملے گا، کرتا رہے گا لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ غزالہ ازخود اس دلدل سے نکلنا نہیں چاہتی اور اگر وہ نہیں چاہتی تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"اس نے آپ سے کیا کہا ہے؟"

"وہ کہتی ہے کہ وہ عاصم کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہے اور امید ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ عاصم کی بدلی ہوئی عادات کا حوالہ بھی دے رہی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس نے ذہنی میں ان تمام عورتوں سے کنارہ کر لیا ہے جن سے کسی نہ کسی طور اس کا تعلق رہا تھا۔ اب وہ اپنے دیگر معاملات پر بھی کنٹرول کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ غزالہ کا یہ بھی خیال ہے کہ اپنی تمام تر کمزوریوں اور قباحتوں کے باوجود عاصم کے دل میں اس کی محبت موجود ہے۔"

"یہ باتیں سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔" میں نے بے حد بیزاری سے کہا "میں نے تو اب لعنت بھیج دی ہے ان دونوں کے معاملات پر۔ ہٹ دھرمی اور حماقت کی ایک حد ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ غزالہ یہ حد پار کر چکی ہے۔"

ساہی صاحب نے پرسوچ لہجے میں کہا "عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے شاہ جہاں! معلوم نہیں غزالہ شیخ عاصم کے سلسلے میں اتنی استقامت کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے شیخ کی ذات میں واقعی امید کی کوئی کرن نظر آ رہی ہو۔"

"ساہی صاحب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ شیخ جو کچھ کر چکا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا کرے گا۔ ہم آخری حد تک اسے دیکھ چکے ہیں۔"

"بہرحال، کچھ بھی ہے۔ غزالہ عاقل بالغ اور بہت حد تک خودمختار ہے۔ اسے اپنے فیصلے کرنے کی آزادی ہے۔"

"میں اس کی آزادی میں بالکل روڑے نہیں اٹکا رہا جناب۔ میں نے ان دونوں کو صرف اس لیے روکا ہوا تھا کہ حمزہ کا سراغ نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ہو سکتا ہے حمزہ

شنکر شکرا کی تحویل میں ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حمزہ کے بازیاب کرانے کے لیے شیخ عاصم کا ہمارے پاس ہونا ضروری تھا۔ اب چونکہ یہ شبہ غلط ہو چکا ہے لہٰذا میں ابھی اور اسی وقت ان دونوں کو یہاں سے روانہ کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا تاکہ اب مجھے خود اس معاملے سے شدید الجھن ہونے لگی ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو مجھے کوفت ہو رہی ہے ان دونوں کو یہاں دیکھ کر؟"

ساہی صاحب نے کہا "ٹھیک ہے' تم ان دونوں کی رائے پوچھ لو اور ایک آدھ دن میں ان کے یہاں سے جانے کا انتظام کر دو۔ میرے خیال میں غزالہ وہیں جانا چاہے گی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اب تمہارے اور شیخ عاصم کے درمیان بہت فاصلہ رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا' تمہاری دشمنی اتنی ہی کمزور و ناتواں رہے گی۔"

میں نے کہا "شنکر یہاں ہے تو شیخ کے دور جانے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"میں نے اس بارے میں بھی بات کی تھی۔" ساہی صاحب نے کہا "میرے اندازے کے مطابق غزالہ خود بھی شنکر سے بے حد الرجک ہے۔ شاید اس نفرت کی جڑیں اس واقعے میں ہے جب شنکر نے غزالہ کو اغوا کر لیا تھا اور اس کو شرمناک دھمکیاں دی تھیں۔ بہرحال غزالہ کا کہنا ہے کہ وہاں پہنچتے ہی وہ شیخ عاصم سے جو پہلا کام کروائے گی وہ یہ ہوگا کہ شیخ شنکر سے ناتا توڑ لے گا۔"

اس حوالے سے میرے اور ساہی صاحب کے درمیان کچھ دیر گفتگو ہوئی پھر ساہی صاحب شفقا اور انجم کو لے کر "حسن دلی" سے لاہور روانہ ہو گئے۔ میں نے حمزہ کی والدہ کو بھی ان کے ساتھ ہی لاہور بھیج دیا تھا۔ میں ساہی صاحب کو بتا چکا تھا کہ حمزہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ ساہی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کل کسی وقت حمزہ کی والدہ کو حمزہ سے ملا دیں گے۔

وہ سارا دن میں نے آرام کرتے ہوئے گزارا۔ صرف دوپہر کو عالم قریشی نے تھوڑی دیر کے لیے مجھے جگایا اور ہم نے کھانا کھایا۔ عالم قریشی کے نزدیک "کھانے" میں دو خصوصیات کا ہونا لازمی تھا۔ کھانا اچھا ہو اور بہت زیادہ ہو۔ یہ دونوں خصوصیات اسے شیر محمد کے کھانے میں مل رہی تھیں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں شیر محمد زبردست قسم کا مہمان نواز شخص تھا اور یہی خوبی اس کی انگریز نما بیوی میں بھی تھی۔ دوپہر کے کھانے میں مچھلی' کوفتے' بھنا ہوا مرغ' تنوری روٹی' رائتا' ترکے والے چاول' فرنی' دہی کی میٹھی لسی اور اس قسم کی کئی چیزیں شامل تھیں۔ عالم قریشی خشوع و خضوع کے ساتھ کھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ تعریفیں بھی کرتا جا رہا تھا مگر ایسا نہیں تھا کہ تعریف کرنے کے لیے وہ رکتا ہو' کھانے کے دوران میں تو وہ سانس لینے کے لیے بھی نہیں رکتا تھا۔ میں اکثر اسے کہا کرتا تھا کہ یوں تو تم عالم قریشی ہو لیکن کھانے کے سلسلے میں ظالم قریشی ہو۔ کھانے کے دوران میں کوفتے کی صورت' سیرت اور "شخصیت" کے حوالے سے اس نے ایک زبردست لیکچر دیا کہ جی چاہا کوفتے پر کوئی ضخیم کتاب چھپنی چاہیے یا کوئی ڈاکومنٹری فلم بنی چاہیے جس میں کوفتے کے پس منظر' تاریخ اور خصوصیات پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی جائے۔ اپنے لیکچر کا اختتام عالم قریشی نے ان الفاظ پر کیا "میں نے یہاں تک سنا ہے کہ یو ایس اے میں کوکنگ کی طرح کو کنگ بھی ایک مضمون ہے اور یار لوگ کوفتے پر مضمون لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "کھانے کے بارے میں تمہاری معلومات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا حالانکہ اس بار تم نے کافی لمبی گپ چھوڑی ہے۔"

نجانے شیر محمد کے دل میں کیا بات آئی تھی کہ اس نے رات کو ہمارے اعزاز میں جشن کا اہتمام کر لیا۔ اس نے چپکے لاہور سے دو طوائفیں بلائی تھیں۔ ہمیں عین وقت پتا چلا۔ وہ میزبان کی حیثیت سے مجھے اور عالم قریشی کو اپنی حویلی کی وسیع و عریض بیٹھک میں لے گیا۔ وہاں محفل تیار تھی۔ فرش پر قالین اور اس پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیے لگے تھے۔ حقے پانی کا انتظام بھی تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لائن میں کرسیاں رکھی تھیں۔ میں اور عالم قریشی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ ہمارے پہلو میں سازندے جا بیٹھے۔ ایک دم نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ ایک تیکھی تلوار جیسی لڑکی چھنا کے سے ہمارے سامنے آئی۔ اسے دیکھ کر ساز جاگے اور وہ محو رقص ہو گئی۔ اس نے پنجابی فلمی گانا سنایا اور زبردست رار سمیٹی۔ گانے بجانے کی آواز سن کر سروج بھی تماشا دیکھنے پہنچ گئی۔ وہ خوب صورت سبز ساری میں ملبوس تھی۔ حسب معمول پیٹ عریاں تھا۔ گریبان کسی بیابان کی طرح وسیع و عریض تھا۔ وہ چپکے سے میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ زریں نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی۔ ان کے درمیان میرے حوالے سے پرانی چپقلش تھی۔

سازوں نے آہنگ بدلا اور اس مرتبہ دوسری رقاصہ

جلوہ گر ہو گئی۔ یہ ذرا کم عمر اور زیادہ تیز طرار تھی۔ اس نے ایک انڈین گانے پر دھواں دھار رقص کیا۔ رقص خوب صورت تھا۔ سروج کے پاؤں بھی تھرکنے لگے۔ وہ جیسے مست ہو رہی تھی۔ تیسرا گانا شروع ہوا تو دونوں لڑکیاں بیک وقت اٹھیں۔ یہ بھی ایک بھڑکتا ہوا پنجابی گانا تھا۔ دونوں لڑکیاں رقص کے ساتھ ساتھ "اشتعال انگیز" انداز میں ایک دوسرے سے لپٹ چپک بھی رہی تھیں۔ تماشائی نگاہوں کو خوش کرنے کا یہ انداز انوکھا تھا اور میری نظر سے پہلی بار گزرا تھا۔ اگربتیوں کی مہک' حقے کا دھواں' تالیاں' نقدی' واہ واہ کا شور' رقص و سرود کی یہ ساتی محفل پورے جوبن پر تھی جب اچانک میں چونک گیا۔ میرے پہلو میں بیٹھی سروج میں بھی اچانک ترنگ جاگی تھی۔ وہ پُرشوق انداز میں اٹھی۔ اس نے ساڑی کا پلو خاص انداز میں کمرے کے گرد لپیٹا اور اٹھ کر محو رقص ہو گئی۔ دونوں لڑکیوں نے اس "شمولیت" پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کے رقص میں تیزی آ گئی اور سازندوں کے ہاتھ بھی زیادہ جوش و خروش سے چلنے لگے۔ سروج کا رقص دیکھ کر ہر طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہونے لگا۔ ظاہر ہے' بازارِ حسن کی عام طوائفیں اس کے رقص کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ "لولی کی پنچھی" انڈین فلم انڈسٹری سے وابستہ تھی اور کئی فلموں میں رقص کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ وہ بڑی بے حجابی اور چابک دستی سے اپنے جسم کو مختلف انداز دے رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ میرے ارد گرد ہی گھوم رہی تھی۔ کبھی گلے میں بانہیں ڈال دیتی تھی' کبھی ہاتھ تھام لیتی تھی' کبھی آغوش میں لینے کی کوشش کرتی تھی۔ شیر محمد اس کی اداؤں پر خوش تھا اور مجھے بڑی داد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہا ہو "بڑے چھپے رستم ہو یار! شہر سے کیا بڑھیا چیز ڈھونڈ کر لائے ہو۔"

میرے ساتھ سروج کی چہلیں دیکھ دیکھ کر عالم قریشی کا چہرہ بھی تمتمانے لگا تھا۔ اگر اس محفل میں کوئی شخص بدمزہ ہو رہا تھا تو وہ زریں گل تھا۔ سروج کے ساتھ اس کی پرانی دشمنی پوری شدت کے ساتھ عود کر آئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ گانا ختم ہونے تک زریں اپنا ڈھائی من پاؤ خون ضرور جلا بیٹھے گا۔ مجھے خود بھی شدید الجھن ہو رہی تھی۔ میں سروج کو اس خرمستی سے روک دینا چاہتا تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔ بیٹھک کے باہر سے کسی کے بلند آواز میں بولنے کی آواز آئی پھر ایک دروازہ کھلا اور غزالہ کی صورت دکھائی دی۔ وہ سخت برہم نظر آ رہی تھی۔ اندر آ کر وہ ذرا سا ٹھٹکی بھی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اندر اتنے زیادہ افراد موجود ہوں گے۔ بہرحال اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور غصے سے بولی "آپ لوگوں کو خیال ہونا چاہیے۔ اتنا شور ہے کہ آس پاس کے لوگ بھی جاگ گئے ہوں گے۔ اور کچھ نہیں تو ایک مریض کا ہی خیال کریں۔"

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ غزالہ اور عاصم کا کمرا اس بیٹھک کے عین عقب میں واقع ہے۔ یقیناً گانے بجانے کا شور وہاں تک پہنچا تھا اور شیخ عاصم کی نیند خراب ہوئی تھی۔

اصولی طور پر غزالہ نے ٹھیک بات ہی کی تھی لیکن نجانے میرے دل کی کیا کیفیت ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ میں نے شیر محمد سے صرف اتنا کہا کہ وہ بیٹھک کے وہ تین روشندان بند کروا دے جو عقبی دیوار میں کھلتے ہیں۔ شیر محمد نے حکم دیا اور ملازم فوراً حکم کی تعمیل کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ غزالہ بدستور دروازے میں کھڑی تھی اور سلگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ سروج کو رقص کرتے اور میرے ارد گرد پروانہ وار گھومتے دیکھ چکی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی' مجھے اس صورت حال نے سکون بخشا تھا۔ دو تین سیکنڈ دروازے میں رکنے کے بعد غزالہ واپس چلی گئی۔ رقص و سرود کی محفل ایک بار پھر جاری و ساری ہو گئی۔

وہ بڑی توبہ شکن رات تھی۔ سروج رات پچھلے پہر بڑی خاموشی سے میرے کمرے میں کھسک آئی تھی۔ وہ کسی بلی کی طرح بڑی آہستگی اور ملائمت سے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کا جسم جیسے ابھی تک ناچ رہا تھا اور سانسوں میں گھنگروؤں کی کھنک تھی۔ اس کی ریشمی ساری کا پلو میرے چہرے پر سرسرانے لگا۔ وہ سراپا ایک دعوت تھی۔

میں نے کہا "تمہیں سائیں عالی کی بات یاد نہیں؟"

"کیسی بات؟" اس نے سرگوشی کی۔

"سائیں نے کہا تھا تم اپنے آپ میں رہو گی۔ میرے کہنے کے مطابق چلو گی۔"

"ہائے رام۔ تمہارے کہنے کے مطابق ہی تو چل رہی ہوں۔"

"میں نے کیا کہا ہے؟"

"تم نے نہیں کہا لیکن تمہاری آنکھوں نے تو کہا ہے۔ جب میں ناچ رہی تھی' تمہاری آنکھیں سب کچھ کہہ رہی تھیں اور کیول آنکھوں ہی کی بات نہیں' تم بھی تو تھوڑا بہت کہہ رہے تھے۔ تم مجھے اپنے قریب آنے کا موقع دے رہے تھے۔ میرے شریر کو چھو رہے تھے۔ کھاؤ میری سوگند' کیا تم

ایسا نہیں کر رہے تھے؟"

"غلط فہمیاں ہیں تمہاری۔" میں نے خشک لہجے میں تیز سرگوشی کی اور اسے اپنے ہاتھوں سے پیچھے دھکیل دیا۔

وہ ٹلنے والی یا بدمزہ ہونے والی کہاں تھی۔ اپنے موقف پر اور اپنی "جگہ" پر اڑی رہی۔ اس کی قربت ایک کڑی آزمائش کی طرح تھی۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر عالم تریشی سو رہا تھا۔ برآمدے میں شیر محمد کی چارپائی تھی۔ اگر شور ہوتا تو وہ دونوں جاگ جاتے۔ اس "صورت حال" کا خاص طور پر شیر محمد پر بہت برا اثر پڑتا۔ چپکی رکی ہوئی سروج کو میرے پہلو میں دیکھ کر یقیناً میرے بارے میں اس کی رائے مثبت نہ رہتی۔ سروج میری اس مجبوری کو نیم رضامندی سمجھنے لگی تو مجھے مجبوراً سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔

اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس میرے چہرے پر پھینکی اور بولی "اب ہم دونوں برابر ہیں شاہ جہاں۔ اگر میں ہاری ہوئی ہوں تو تم بھی ہارے ہوئے ہو۔ میں اپنا دل ہار چکی ہوں تو تم اپنی شرط ہار چکے ہو۔ آج نہیں تو کل پاس آنا ہی پڑے گا تمہیں۔"

وہ ایک ادا سے اٹھی۔ اپنی ساڑی درست کی اور مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر ٹھمکتی مٹکتی ہوئی باہر چلی گئی۔

اگلے روز کئی دنوں کے بعد خوشگوار دھوپ نکلی۔ شیر محمد کی حویلی کی چھت پر دھوپ میں بیٹھنے کا جو مزہ آیا وہ کہیں نہیں آیا۔ اس چھت سے حد نگاہ تک سرسبز کھیت، کھلیان اور کنوئیں نظر آتے تھے پھر ایک کچا پکا راستہ تھا جہاں پر بیل گاڑیوں، ٹریکٹروں اور تانگوں کی آمد و رفت کا منظر دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ میں اسی منظر میں گم تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس طرح حمزہ کی بیماری کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا ناک میں گھس گیا۔ مڑ کر دیکھا تو حسب توقع سروج ہی تھی۔ اس نے ایسا ہیجان خیز لباس پہن رکھا تھا جس کے سامنے کل کی قابل اعتراض ساڑی بھی نوابوں والا برقع نظر آتی تھی۔

میں نے کہا "یہ شہر نہیں گاؤں ہے اور ہم مہمان ہیں اس گھر میں۔ تمہاری عزت تو شاید انڈیا میں ہی رہ گئی ہے، ہماری عزت کا ہی خیال کرو۔"

وہ بولی "رات عزت ہی کا خیال تو کیا ہے۔ چپ چاپ چلی گئی تھی۔"

"تو تم مجھے دھمکا رہی ہو؟"

"میری یہ مجال مہاراج۔۔۔ میں تو آپ کی باندی، آپ کے چرنوں کی دھول ہوں۔" اس نے بڑی ادا سے کہا۔

"یہ فلمی مکالمے اپنے پاس ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

اسی دوران میں غزالہ صحن میں نظر آنے لگی۔ اس نے سر دھویا تھا اور صحن کے ایک کونے میں واقع تھوڑی سی دھوپ میں کھڑی تولیے سے بال سکھا رہی تھی۔ میں شاید نیچے اپنے کمرے میں چلا جاتا لیکن غزالہ کو دیکھ کر سروج کے ساتھ چھت پر ہی ٹک گیا۔ ہم دونوں وہاں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ غزالہ نے ایک دوبار اچٹتی سی نگاہ ہم پر ڈالی پھر بالوں پر تولیا لپیٹ کر اندر چلی گئی۔ اس چار دیواری میں غزالہ کی موجودگی سروج کے لیے بڑی "بھاگوان" ثابت ہو رہی تھی۔ میرے دل کا موسم عجیب سا ہو گیا تھا۔ میں سروج کی حوصلہ شکنی نہیں کر رہا تھا بلکہ کسی وقت تو محسوس ہوتا تھا کہ میں غیر ارادی طور پر اس کی حوصلہ افزائی کر رہا ہوں۔ کل رات بارہ بجے تک میں نے ذوق و شوق سے اس کا رقص دیکھا تھا۔ صبح سویرے چھت پر اس سے باتیں کی تھیں پھر دوپہر کے وقت میں شیر محمد کی جیپ پر اسے قصبہ دکھانے لے گیا۔ وہ بڑی خوش تھی۔ انگ انگ سے مستی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اصل بات وہ بھی جانتی تھی۔ اتنی بھولی نہیں تھی وہ۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اپنی گم گشتہ محبت کے دکھوں کا مارا ہوا ہوں۔ میں غزالہ کی موجودگی میں اگر اس کی "پیش رفت" سے صرف نظر کر رہا ہوں تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ میں غزالہ کو دکھی کرنا چاہتا ہوں۔ سروج کو اس سے غرض نہیں تھی کہ کون دکھی ہوتا ہے اور کون خوش؟ وہ تو صرف اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی تھی۔ سہ پہر کو جب ہم قصبے کی سیر سے واپس آئے تو سروج نے میرے ہاتھ میں ایک ڈبا تھما دیا۔ اس ڈبے میں سرخ اور سفید دھاریوں والی ایک خوب صورت قمیص موجود تھی۔ یہ ڈبا اس مختصر سامان میں موجود تھا جو سروج لاہور سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ میں پہلے بھی اس ڈبے کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا۔ تاہم مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس میں میرے ہی لیے قمیص کا تحفہ ہو گا "یہ تمہارے لیے ہے۔" وہ بڑی ادا سے بولی پھر خود ہی پوچھنے لگی "پتا ہے میں نے تمہارے لیے کب سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"

"شاید تم کہو گی پچھلے جنم سے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تم دو روز سے مسلسل پچھلے اور اگلے جنم کی باتیں کر رہی ہو۔"

"پتا نہیں، مجھے تمہاری کوئی بات بری کیوں نہیں لگتی۔ بہرحال تم وشواس کرو کہ یہ تمہاری قمیص میں پچھلے دو ماہ سے

سنبھالے سنبھالے پھر رہی ہوں۔ لاہور کی سب سے بڑی مارکیٹ سے لی تھی۔ پتا نہیں کیا نام ہے اس کا۔ شاید لبرٹی۔ اچھی ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"بہت سندر لگو گے تم پہن کر مگر پتا نہیں کہ تم پہنو گے بھی یا نہیں۔"

"تم کچھ زیادہ ہی مدھوبالا بننے کی کوشش نہیں کر رہی ہو؟"

"میرے مدھوبالا بننے سے کیا ہو گا، کوئی دلیپ کمار بنے تو بات بھی ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔

اسی دوران میں زریں گل دروازے کے عین سامنے سے گزرا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا ہر ہر انداز بتا رہا تھا کہ وہ غصے سے کھول رہا ہے۔ نتھنے پھولے ہوئے تھے اور گردن اصیل مرغ کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ اگر اسے میرا ڈر نہ ہوتا تو شاید ابھی سروج کو بالوں سے پکڑ لیتا اور کھینچتا ہوا پیدل ہی لاہور چھوڑ آتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا اور یونہی چیزیں اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پٹخنے لگا پھر جھگڑے کی آواز آئی۔ وہ کلثوم سے لڑ رہا تھا "یہ تم نے ہمارے جوتے کا کیا حال کیا ہے۔ ایک پر کالا پالش مار دیا ہے، ایک پر براؤن مار دیا ہے۔"

نوکرانی کی آواز آئی۔ وہ کلثوم کی طرف داری کرتے ہوئے بولی "خان جی! آپ کی بی بی نے پالش غلط نہیں مارا۔ آپ نے جوتا غلط پکڑا ہوا ہے۔ یہ ایک جوتا چوہدری صاحب کا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ لیکن یہ بھی تو ٹھیک بات نہیں ہے کہ ہمارا جوتا ایک ساتھ نہیں ملتا ہے۔ کوئی کہیں پڑا ہوتا ہے کوئی کہیں۔۔۔" وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔

نوکرانی نے کہا "خان صاحب! شاید آپ کے دماغ کو زیادہ نسوار چڑھ گیا ہے۔ ایک جوتا تو آپ نے پہنا ہوا ہے، دوسرا ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ ویسے بھی آپ کو چاہیے کہ ذرا اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھیں۔ جب عورت کی حالت آپ کی بی بی جیسا ہو تو اس پر زیادہ غصہ نہیں کرنا چاہیے۔"

میں جانتا تھا کہ زریں کو غصہ کس بات پر ہے۔ یہ پنجابی کی اسی مثال تھی کہ ڈگا کھوتی توں تے غصہ کمہار تے۔ اسے طیش سروج پر آ رہا تھا۔ اس پر بس نہیں چل رہا تھا اور وہ کلثوم پر چڑھ دوڑا تھا۔

اسی دوران میں شیر محمد کا خاص ملازم رفیق بھی لاہور سے واپس آ گیا۔ یہ شخص اس دور دراز قصبے کا رہائشی ہونے کے باوجود تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا اور جہاندیدہ بھی تھا۔ میں نے اسے سائیں عالی کے نام ایک چٹھی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ حمزہ کی خیر خیریت دریافت کر کے آئے۔ رفیق نے آ کر بتایا کہ حمزہ صاحب ابھی تک قبرستان کے اندر واقع ڈیرے پر ہیں۔ کل رات ان پر کچھ دیر کے لیے پھر بے ہوشی طاری ہوئی تھی لیکن اب وہ بہتر ہیں۔ سائیں عالی نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رفیق کو اجازت دی تھی کہ وہ خود اندر جا کر حمزہ کو دیکھ لے۔

حمزہ کی حالت معلوم ہو جانے سے مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

اب میں چاہ رہا تھا کہ شیخ عاصم اور غزالہ سے بات کروں اور ان سے پوچھوں کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں اور ان کی روانگی کا کیا انتظام کیا جائے۔ غزالہ کو خود سے جدا کرنا ایسے ہی تھا جیسے اپنے جسم کا ایک حصہ خود سے جدا کر دیا جاتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب یہ سب کچھ مجھے کرنا ہی ہے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ میں اس بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ غزالہ کی شادی ہو جانے کے بعد بھی میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں آس اور امید کی کرنیں موجود تھیں لیکن اب یوں لگتا تھا کہ سب کچھ بجھ گیا ہے۔ تڑپ تڑپ کر شاید بتدریج دل کو قرار آ گیا تھا۔ جیسے کوئی بیمار "شب بھر" ناقابل برداشت تکلیف جھیلنے کے بعد صبح دم نیند کی آغوش میں چلا جائے۔ غزالہ کی جدائی قریب تھی لیکن میرے دل پر غم کا وہ اثر نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا یا شاید یہ اثر بعد میں ہونا تھا۔ ساون کی رتوں میں، سرما کی لمبی طویل راتوں میں اور بہار کی شفق رنگ شاموں میں۔ کتنا بے رحم لمحہ تھا وہ۔ جب میں نے غزالہ سے اس کا حتمی جواب ہاں یا نہ میں پوچھا۔ وہ زندگی کی بازی تھی، دائمی جدائی یا دائمی ملاپ کا داؤ تھا اور وہ داؤ میں ہار گیا تھا۔ شاید جیتے جیتے ہار گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے غزالہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے میری طرف قدم بڑھانے والی ہے۔ میری بانہوں میں سنسناہٹ جاگ گئی تھی۔ جیسے یہ بانہیں اسے خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہو گئی تھیں لیکن پھر وارفتگی اور بے خودی کی وہ لہر گزر گئی تھی۔ غزالہ واپس اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔

کبھی کبھار میں سوچتا تھا کہ کہیں غزالہ غیر ارادی طور پر مجھ سے میری گزشتہ نامہربانیوں کا بدلہ تو نہیں لے رہی۔ میں نے بھی تو چودہ پندرہ برس تک کتنی سنگین بے رخی اختیار کیے رکھی تھی اس سے۔۔۔ میرا دل ایک چٹان بن گیا تھا اور وہ

اس سے سر پھوڑ پھوڑ کر ہار گئی تھی۔ شاید اس نے اپنی نارسائیوں کے ردِ عمل میں اب اپنی "شوہر پرستی" کو ایک چٹان بنا لیا تھا اور میرے سر ٹکرانے کا نظارہ دیکھتی رہی تھی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ وہ اتنی استقامت کے ساتھ اپنے ارادوں پر ڈٹ گئی تھی؟ یہ سوال ساہی صاحب کے ذہن میں ابھرا تھا اور میرے ذہن میں بھی بار بار ابھر چکا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم تھا جب ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ شیر محمد کی کوئی نوکرانی دہشت ناک انداز میں چیخی تھی پھر ایک ساتھ بہت سی آوازیں ابھریں۔ اہلِ خانہ بلند آواز میں بول رہے تھے۔ شیر محمد کی بیوی نے چیخ کر کہا "پانی لاؤ۔"

ایک نوکر دوڑتا ہوا دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ میں لپک کر باہر آیا۔ ہلچل کے آثار شیر محمد کے کمرے کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ شیر محمد برسوں سے دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس کمرے میں کلثوم اور سروج شیر محمد کی بیوی کے ساتھ سوتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر شیر محمد کی بیوی نے ہاتھ کے اشارے سے اندر بلایا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ دیگر عورتوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ میں اندر پہنچا تو ایک لرزہ خیز منظر نظر آیا۔ سروج کو دورہ پڑ چکا تھا۔ وہی خوفناک کیفیت تھی جو اس پر پہلے بھی طاری ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ رخسار دمک اٹھے تھے اور لب پیاسے انداز میں ادھ کھلے تھے۔ تین چار صحت مند عورتوں نے سروج کو دبوچ رکھا تھا اور چارپائی پر لٹائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ اپنے جسم کو بل دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک جوار بھاٹا اس کے رگ و پے میں ہلچل مچا رہا ہے۔ یہ جوار بھاٹا اسے دور کہیں بہت دور لے جانا چاہتا تھا اور وہ جانے پر مجبور ہو رہی تھی۔

مجھے وہ سارے مناظر یاد آ گئے جو میں اس سے پہلے دیکھ چکا تھا۔ سروج کی یہ کیفیت سب سے پہلے میں نے وادیِ موت میں دیکھی تھی۔ داخان کی بڑی سرنگ کے اندر چند روز تک وہ کچھ بیمار بیمار سی رہی تھی پھر ایک روز اس کی "بیماری اور خاموشی" طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ خوفناک تن کی اسی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی جو اس سے پہلے کئی خوبرو عورتوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ وہ انجانی کشش اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مجھے یاد آ گئی جو ان خوبرو عورتوں کو سنہری روشنی کی طرف کھینچتی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک نقطے کی طرف کھنچی چلی جاتی تھیں۔ ہاں یہ وہی کیفیت تھی جو آج پھر سروج پر طاری ہو گئی تھی۔ شیر محمد بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ رسی کا انتظام کرے۔ وہ لپک کر گیا اور ایک چارپائی کی طویل ادوائن لے آیا۔ میں نے عورتوں کی مدد سے سروج کو یوں باندھا کہ وہ چارپائی سے اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے تڑپتے مچلتے جسم پر کمبل ڈال دیا گیا۔ دیہاتی عورتیں خوف زدہ ہو کر واویلا کر رہی تھیں۔ کچھ نے بلند آواز میں قرآنی آیات پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ لڑکی پر سایہ ہو گیا ہے۔

شیر محمد کی والدہ بولی "بس یہ شہری لڑکیاں کسی کی سنتی ہی کب ہیں۔ ہر وقت بن ٹھن کر اور خوشبو لگا کر پھرتی ہیں۔ کل میں نے اسے خود قبرستان کے پاس سے گزرتے دیکھا ہے، اثر ہو گیا ہوگا۔"

شیر محمد نے میرے کان میں سرگوشی کی "کہیں پہلے بھی تو اس پر سایہ وغیرہ نہیں تھا؟"

"کیوں؟ کیا تمہیں کچھ نظر آیا تھا؟"

"نظر تو نہیں آیا تھا یار... لیکن لڑکی کچھ بکھری ہوئی لگتی تھی۔ جیسے کوئی فرق ہو اس کے دماغ میں۔ کل رات دیکھا تھا کس طرح ڈانس کر رہی تھی۔"

زریں گل اور عالم قریشی بھی کمرے میں پہنچ گئے تھے اور پریشان نظروں سے سروج کی حالت دیکھ رہے تھے۔ شیر محمد کی والدہ بولی "ادھر کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو تم سب... لڑکی کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے۔ جاؤ کوئی جا کر بابا ہری شاہ کو بلا لاؤ۔ وہی کچھ کر سکتا ہے اب تو۔"

میں نے شیر محمد سے کہا "تمہاری بات صحیح ہے۔ لڑکی کی بیماری نئی نہیں ہے۔ پہلے بھی دورے پڑتے رہے ہیں۔ یہاں کوئی بابا شابا کام نہیں کرے گا۔ اس کا علاج فی الحال یہی ہے کہ اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ تم ان ساری عورتوں کو باہر نکال دو اور ان سے کہو کہ شور بالکل نہ کریں۔"

شیر محمد نے میری ہدایت پر عمل کیا اور چند ہی لمحے بعد کمرا عورتوں سے خالی ہو گیا۔ شاید شیر محمد نہ بھی کہتا تو کمرا خالی ہو جاتا کیونکہ سروج کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور اردگرد موجود عورتیں سخت خوف زدہ ہو رہی تھیں۔ میرا دل تو غزالہ کو بلانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر عالم قریشی نے اسے بلا لیا۔ عالم قریشی کا کہنا تھا کہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اسے بلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ غزالہ نے سروج کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی۔ وہ اس حالت سے اچھی طرح آشنا تھی اور جانتی تھی کہ صورتِ حال مزید بگڑے گی۔ اس کے پاس ایک ٹرنکولائزر انجکشن تھا۔ وہ فوراً اس نے سروج کو لگا دیا۔ وہ

ایم اے راحت کا ناول

دہشت کدہ

- کالی طاقتوں اور روحانی طاقتوں کا خوفناک ٹکراؤ۔
- پراسرار مورتی کے حصول کے لئے رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان۔
- حسرت اور استعجاب میں لپٹی ہوئی دہشتناک کہانی۔

قیمت: 120/- روپے ڈاک خرچ: 20/-

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر	علی میاں پبلی کیشنز 20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور — فون: 7247414
اسٹاکسٹ	علی بک سٹال چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ لاہور — فون: 7223853

تین دوائیں اس نے لکھ دیں اور کہا کہ فوری طور پر ان کا انتظام کیا جائے۔

شیر محمد نے کار پر دو آدمی دوڑائے۔ وہ شیخوپورہ سے دوائیں لے کر صرف ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آگئے۔ غزالہ نے سروج کو ایک اور انجکشن لگایا مگر اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ بڑے تیز قسم کے خواب آور انجکشن تھے مگر یوں لگتا تھا کہ سروج پر ان کا مطلق اثر نہیں ہو رہا۔ میں حیران تھا اور مجھ سے زیادہ غزالہ حیران تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں عالم قریشی سے کہا کہ یہ حیران کن کیس ہے۔ ڈبل سے زیادہ اوورڈوز جا چکی تھی مگر سروج ہوش سے بیگانہ نہیں ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ ڈوز دینے کی غزالہ میں ہمت نہیں تھی۔

سروج کی یہ حالت تھی کہ اس کا جسم مکمل طور پر اکڑ گیا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی کی رگیں یوں ابھر آئی تھیں جیسے پھٹ پڑیں گی۔ اس کے چہرے کی کیفیت بیماروں جیسی نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ "شباب" کا ایک سمندر اس کے اندر موجزن ہو گیا ہے اور اس کی لہریں اس کے تنے ہوئے جسم میں ہلچل مچا رہی ہیں۔ وہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ ان وحشیانہ جھٹکوں کے سبب اس کی کلائیوں اور ٹخنوں پر سے خوب صورت نازک جلد چھلنا شروع ہو گئی تھی اور ایک کلائی میں سے تو باقاعدہ خون رسنے لگا تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر وہ یونہی جدوجہد کرتی رہی تو اس کی کلائیاں اور ٹخنے بری طرح زخمی ہو جائیں گے پھر ایک اور شدید خطرہ بھی تھا۔ غزالہ نے دیکھا کہ سروج کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ یہ بلڈ پریشر اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میری نگاہ رہ رہ کر اس کی پیشانی پر جم جاتی تھی۔ اس کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کوئی رگ پھٹ جائے گی اور سروج کی زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگے گا۔

میں نے عالم قریشی اور زرین سمیت سب کو باہر نکالا۔ میں سروج کے جسم پر وہ مخصوص نشان دیکھنا چاہتا تھا جو اس سارے فساد کی بنیاد تھا۔ یہ وہی گول مہر جیسا پُراسرار نشان تھا جس کے بیچوں بیچ ایک اڑتے ہوئے عقاب کی شبیہ تھی۔ "وادی موت" میں مجھے اس نشان کے بارے میں سردار راحل نے ایک خاص بات بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہر وہ عورت جو سانوس یعنی سنہری عقاب کی سائی (ڈلس) بنتی ہے اس کے جسم پر یہ نشان نمودار ہو جاتا ہے پھر جب خاص اوقات میں سائی پر وجد اور بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو یہ نشان سرخی مائل ہو جاتا ہے۔ بے خودی کی کیفیت جب اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو نشان بہت سرخ ہو کر سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس نشان کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دورے کی کیفیت میں ابھی شدت آئے گی یا کمی واقع ہونی شروع ہو جائے گی۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ سروج نے نصف بازوؤں والی چیک دار قمیص اور کاٹن کی پتلون پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کی قمیص کے بٹن کھولے۔ جسم سامنے سے عریاں ہو گیا۔ اس کے شفاف دودھیا سینے کے عین بیچ ڈبی اٹھنی نما نشان موجود تھا۔ اس نشان کے اندر عقاب کی شبیہ تھی۔ نشان کا رنگ ابھی ہلکا سرخ تھا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی سروج میں دورے کی کیفیت بہت شدت پکڑے گی۔ میرے پاؤں میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ اگر اس تاریک رات میں اس دیہاتی مکان کے نیم روشن کمرے میں سروج کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ کیا سائیں عالی یہ سب کچھ برداشت کر لیتا۔ اس نے سروج کو میرے سپرد کیا تھا اور اس امید کا اظہار بھی کیا تھا کہ سروج کی اس پُراسرار بیماری میں میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میری محبت اور قربت سروج کو اس کشش سے آزاد کر سکتی ہے جس کا تعلق مقدس سنہری روشنی اور وادی موت سے ہے۔ جب ہم وادی موت سے لوٹے تھے تو سائیں عالی نے بڑی مایوسی سے کہا تھا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب ہم سروج کو یہاں سے لے جا کر کیا کریں گے۔ جس طرح مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی مجھے یقین ہے کہ یہ بھی اب اس غار سے باہر نہیں رہ سکے گی۔ یہ ہمارے لیے تقریباً ختم ہو چکی ہے۔"

آج پھر وہی الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے تھے۔ کیا ہم واقعی سروج کو بے کار میں وہاں سے لے کر آئے تھے۔ کیا واقعی اسے واپس "وادی موت" میں جانا تھا یا یوں ہی تڑپ تڑپ کر اور پھڑک پھڑک کر مر جانا تھا۔ ایک لاچار، بے بس سی معمول کی حیثیت سے۔

میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا میری قربت واقعی سروج کے کسی کام آ سکتی ہے؟ اگر ایسا تھا تو مجھے سب کچھ کر گزرنا چاہیے تھا۔ یہ بڑی نازک پوزیشن تھی۔ میں حمزہ کی موت کے خلاف ایک خطرناک جنگ لڑ رہا تھا۔ اس جنگ کی کمان سائیں عالی کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اس جنگ میں حمزہ کا پلہ بھاری رکھنے کے لیے جان توڑ کوشش

کر رہا تھا۔ اگر ادھر میری کسی غلطی کی وجہ سے سروج کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا تو سائیں عالی کا ردِعمل بہت شدید ہوتا تھا۔ میں سوچتا رہا اور فیصلے کی سولی پر لٹکتا رہا۔ میں ایک دوراہے پر تھا اور میرا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا پھر میں آگے بڑھا۔ میں نے قمیص برابر کر کے سروج کا سینہ ڈھانپ دیا۔ اس کا کِھلا ہوا چہرہ کسی ایسے کِھلے ہوئے گلاب جیسا تھا جو اپنے ہی شباب کے زور سے پتی پتی ہونے والا تھا۔ اس کے انگارا ہونٹ ادھ کھلے تھے اور درزوں میں سے دانتوں کی سفیدی چمک رہی تھی۔ میں بہ آہستگی جھکا اور سائیں عالی کی "ہدایات" پر عمل کرنے کے بعد دھیرے دھیرے آوازیں دینے لگا "سروج۔۔۔ آنکھیں کھولو۔ سروج یہ میں ہوں میری طرف دیکھو۔"

اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ نہ ہی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ تاہم میں نے ایک حیرت انگیز بات محسوس کی۔ سروج کا اینٹھتا ہوا جسم قدرے نرم پڑ گیا۔ وہ جو اپنی کلائیوں کو مسلسل جھٹکے دے رہی تھی ذرا پُرسکون ہو گئی۔ یہ تبدیلی حوصلہ افزا تھی۔ میں ایک بار پھر اس پر جھک گیا۔ میں ساتھ ساتھ اسے پکار رہا تھا۔ کبھی سرگوشیوں میں کبھی بلند آواز میں۔ وہ عجیب سا منظر تھا۔ اس کمرے میں دو جہازی سائز پلنگ تھے۔ دونوں پلنگوں کے اوپر ایک ایک طاق تھا۔ ہر طاق میں ایک لیمپ روشن تھا۔ کمرے کی آرائش دیہاتی انداز میں کی گئی تھی۔ اس آرائش میں سب سے نمایاں ایک خوب صورت پڑچھتی تھی جس پر منقش برتن سجے ہوئے تھے اور وہ جھالروں والے پردے تھے جن پر کروشیا کا خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں روشنی اور سائے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے محسوس ہوتے تھے "سروج۔" میں نے اسے شانوں سے جھنجوڑتے ہوئے پکارا۔

اس کی پلکوں میں جنبش نمودار ہوئی۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی آنکھوں کو سہلانے لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ جمنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ اس کی جدوجہد کمزور ہو رہی ہے بلکہ کمزور ہو چکی ہے۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر اس کی بندش کھول دی۔ پہلے ہاتھوں کی پھر پاؤں کی پھر وہ رسی بھی ہٹا دی جس نے اس کی کمر کو جکڑ رکھا تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ دورے کی حالت میں سروج کی زبان سے کبھی ایک لفظ نہیں نکلا تھا لیکن آج وہ ہلی تھی۔ اس نے بہت مدھم آواز میں کچھ کہا تھا۔ میں سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف محسوس ہو رہا تھا۔ سروج کا سراپا اپنی تمام تر تمازت اور وحشت کے ساتھ۔

اس نے سرسراتی آواز میں پھر کچھ کہا۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیے۔ کئی اتھاہ گہرائیوں میں سے ایک آواز میرے کان میں پڑی "تم۔۔۔ کون۔۔۔ ہو۔۔۔؟"

"میں شاہ جہاں ہوں۔"

"تم۔۔۔ وہی شاہ جہاں ہو۔۔۔ نا۔" میں خاموش رہا

"تم۔۔۔ میرے شاہ جہاں ہو نا؟"

"ہاں۔۔۔ تمہارا شاہ جہاں ہوں۔"

"تم نے وہی قمیص پہنی ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔"

مجھے لگا وہ اپنی ہزاروں من وزنی پلکوں کو اٹھا کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ آگے بڑھایا اور طاق میں رکھا ہوا لیمپ بجھا دیا۔ دوسرا لیمپ روشندان سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے خود ہی بجھ گیا تھا۔ کمرے میں تیرگی چھا گئی۔ اور تیرگی آسیب ہے 'تیرگی بے خودی ہے۔ یہ ایک شوریدہ سرلہر کی طرح انسان کو بہا کر لے جاتی ہے۔ میں بار بار سروج کو پکار رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ سو جائے گی یا کھو جائے گی۔ دوبارہ اسی پُراسرار کشش کی دسترس میں چلی جائے گی۔ جسے سردار راحل نے ناقابلِ تسخیر کہا تھا۔ یہ ایک جدوجہد تھی 'ناقابلِ تسخیر' کو تسخیر کرنے کی۔ میں سروج کو "ناقابلِ تسخیر" کے پنجوں سے چھڑا کر اپنے قریب تر کرتا چلا جا رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں ہماری بوجھل سانسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

○☆○

وہ صبح بہت نکھری نکھری تھی۔ میں جاگا تو سروج میرے پہلو میں موجود نہیں تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رات کسی پہر میں نے اس کی بندش کھول دی تھی۔ میں اس کے قریب تر آگیا تھا۔ ایک منہ زور ریلا ہمیں اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا تھا اور اب میرا پہلو خالی نظر آ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ سب سے پہلے میری نظر شیر محمد پر پڑی۔ وہ مویشیوں والے شیڈ کے پاس کھڑا اپنی گھوڑی پر کاٹھی ڈال رہا تھا۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" میں نے شیر محمد سے پوچھا۔ میرے لہجے میں اندیشے تھے۔

شیر محمد کی آنکھوں میں شوخ مسکراہٹ لہرائی۔ اس نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا۔ سروج وہاں موجود تھی۔ اس اُجلی اُجلی صبح کی طرح وہ بھی بہت نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ شیر محمد کی بیوی کے کپڑے تھے۔ وہ لمبی تڑنگی تھی لہٰذا یہ کپڑے سروج کو بہت بڑے تھے مگر وہ اس حلیے میں بھی پرکشش نظر آرہی تھی۔ اس کے ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

شیر محمد نے مونچھوں کو تاؤ دیا اور معنی خیز لہجے میں بولا "شکل سے تو بکے ٹرینا رار لگتے ہو مگر لگتا ہے کہ جھاڑ پھونک بھی کرلیتے ہو!"

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ جن شن اتار لیتے ہو۔" اس نے ترچھی نظر سے سروج کو دیکھا۔

شیر محمد کا انداز مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ بہرحال وہ ایک مخلص میزبان تھا۔ میں سروج کے ساتھ اندر آگیا۔ وہ بغور میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جیسے رات کے تمام واقعات یاد کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ کبھی اس کے چہرے پر الجھن نظر آتی تھی اور کبھی شرم کی ہلکی سی سرخی پھیل جاتی تھی۔ میں نے اس کی کلائیاں دیکھیں' وہاں سے جلد چھل گئی تھی اور اس نے کوئی مرہم وغیرہ لگا رکھا تھا۔ ایسے ہی کچھ اور پرانے نشان بھی اس کی کلائیوں پر دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ دورے کے اثر سے نکل چکی تھی لیکن مکمل طور پر نہیں نکلی تھی۔ کسی وقت اس کی آنکھوں میں شناسائی کے ساتھ ساتھ ایک اجنبیت بھی نظر آنے لگتی تھی۔ ان لمحوں میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ سروج نہیں کوئی نامعلوم آسیب زدہ مخلوق ہے۔ وہ جہاں دیکھتی تھی وہاں نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی مقناطیسی قوت اپنے بے پناہ اثر و رسوخ کے ساتھ اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔

میں نے اسے شانوں سے جھنجوڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ایک دم غمزدہ نظر آنے لگی۔ اداس اور زرد رو۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو پھسل کر رخساروں پر آگئے۔ اس نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا اور اپنا بازو میری کمر کے گرد حمائل کردیا۔ دل گرفتہ آواز میں بولی "شاہ جہاں۔۔۔ مجھ سے دور مت جانا ورنہ وہ مجھے لے جائے گا۔۔۔ وہ ضرور مجھے لے جائے گا پھر میں کبھی واپس نہ آسکوں گی۔"

"کون لے جائے گا؟"

"وہی۔"

"کون وہی؟"

"جو مجھے لینے آتا ہے' جس کے ساتھ سنہری روشنی ہوتی ہے۔" وہ لرز کر بولی۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے سائے تھے۔ میں نے اسے بانہوں میں لے لیا۔

وہ میرے سینے سے پیوست ہوگئی اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے پھر سے وادی واخان کے وہ مناظر یاد آئے جب سروج پر پہلی دفعہ یہ دورہ پڑا تھا۔ اس دورے سے وہ کئی روز سخت مضطرب رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت ایک خوف کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ اسے کچھ ہوجائے گا۔ وہ جلد از جلد اس وادی سے نکل جانے کی خواہش کا اظہار کرتی رہی تھی مگر ہماری مجبوریاں آڑے آتی تھیں اور ہم وادی واخان کو چھوڑ نہیں سکے تھے پھر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ سروج "سائی (عقاب دلہن)" بن گئی تھی۔

ہمارے درمیان سروج کا "امیج" کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن جب سے وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی' ہمارے دلوں میں اس کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی نے جگہ لے لی تھی۔ اور تو اور سروج کا کٹر مخالف زریں گل بھی اب خاصی حد تک نرم پڑ چکا تھا۔ میں کبھی کبھی خود بھی محسوس کرتا تھا کہ سروج کی موجودہ حالت کی ذمے داری کسی حد تک ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔ گلگت میں ہم سب ایک ٹیم کی طرح تھے۔ ہم نے اکٹھے مصیبتیں جھیلی تھیں اور مشکل اوقات کاٹے تھے۔ اگر اس وقت کسی آفت کے اثرات کسی ساتھی میں ابھی تک موجود تھے تو اس کی فکر کسی ایک کو نہیں ہم سب کو ہونی چاہیے تھی۔

میں نے سروج کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو سروج۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب تک کہو گی تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

"اگر میں کہوں جیون بھر تو؟"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

"جواب دو نا۔ اگر میں کہوں جیون بھر تو؟"

"تم بہت جلد اچھی ہوجاؤ گی پھر تمہیں کسی ایسے ویسے سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"پھر تو میں چاہوں گی کہ میں کبھی اچھی نہ ہوں اور ایسا ویسا سہارا تم نے کس کو کہا ہے؟ تم جانتے نہیں ہو شاہ جہاں! میرے نزدیک تمہاری کتنی اہمیت ہے۔ کاش میرے الفاظ میں اتنی شکتی ہو کہ وہ تم پر میرے من کا حال کھول سکیں۔ جو رات میں نے کل گزاری ہے وہ میرے لیے اور میری آتما کے لیے بے حد تکلیف دہ تھی لیکن پھر بھی وہ میرے جیون کی سب سے قیمتی رات ہے۔ اس لیے کہ تم میرے ساتھ تھے۔"

ہم نے کمرے میں اکٹھے ہی ناشتا کیا۔ ناشتے میں دیسی

والے پراٹھے' دہی کا رائتا اور گرما گرم حلوا تھا۔ ساتھ میں ایسی تھی جیسے تلے ہوئے سادہ پراٹھے بھی تھے۔ بڑی اشتہا انگیز خوشبو تھی۔ میں نے دیکھا کہ سروج قیمے والا پراٹھا کھا رہی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کہا "یہ کیا دیکھ رہا ہوں میں۔۔۔ تم ماس (گوشت) کھا رہی ہو۔"

وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی "ماس کھانا تو معمولی بات ہے۔ میں تو تمہاری خاطر اپنا آپ بدل سکتی ہوں۔"

"مگر تمہاری اصل منزل تو وفینہ تھا؟"

"ہاں۔۔۔ ایک وقت ایسا تھا جب میرا مقصد صرف اور صرف دفینہ تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب کچھ اور شدید خواہش بھی اس خواہش میں شامل ہوچکی ہیں۔" سروج کا انداز رمزیہ تھا۔

ناشتے کے بعد ہم اکٹھے ہی کمرے میں بیٹھے رہے۔ مجھے سروج کے ساتھ اپنا تعلق بالکل نیا محسوس ہورہا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد یہ دوسری عورت تھی جو میری زندگی میں آئی تھی اور تنہائی کی ساتھی بنی تھی۔ پہلی عورت نواب زادی شاہین تھی۔ وہ خوبرو حسینہ بھی آندھی طوفان کی طرح میری زندگی پر چھاگئی تھی اور پھر آندھی طوفان کی طرح گزر بھی گئی تھی۔ بیماری کی طرف سے سروج کا دھیان ہٹانے کے لیے میں اس سے مسلسل باتیں کررہا تھا۔ وہ اندر سے خوف زدہ تھی۔ ایک بے نام خوف ہر پل اس کی جان کو چمٹا ہوا تھا۔ وہ اس ڈر کو دور بھگانے کے لیے میرے قریب رہنا چاہ رہی تھی۔

میں اسے لے کر باہر آگیا۔ ہم حویلی کی شاندار چھت پر ٹہلنے لگے۔ پتا نہیں کیا بات تھی اس چھت پر۔ یہاں پہنچ کر طبع میں بشاشت اور آنکھوں میں تراوٹ سی آجاتی تھی۔ ایک دم میں چونک گیا۔ چھت پر پہلے سے کوئی موجود تھا۔ وہ غزالہ تھی۔ چھت کے ایک گوشے میں ایک قدیم "آرام کرسی" پڑی تھی۔ وہ اس پر نیم دراز تھی اور سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں گم تھی۔ ہمیں پہلو بہ پہلو دیکھ کر وہ بری طرح چونکی۔ میرے ساتھ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ سچ کہتے ہیں۔ نگاہیں بولتی ہیں۔ یہ نگاہیں ایک لمحے میں نہ جانے مجھ سے کیا کچھ کہہ گئیں اور ایک شکوہ بھی کر گئیں۔ اس رات کا شکوہ جو میں نے کل سروج کے ساتھ گزاری تھی۔ میں نے اور غزالہ نے برسوں ایک ایسی ہی رات کے سپنے دیکھے تھے۔ رات دن' صبح و شام' ہر ہر پل ان سپنوں کی پرستش کی تھی۔ انہیں پالا پوسا تھا مگر وہ رات ہماری قسمت میں نہیں تھی۔ ایسی رات غزالہ پر بھی آئی تھی لیکن

اس کے ساتھ کوئی اور تھا۔ ایسی رات مجھ پر بھی آئی تھی لیکن میرے ساتھ کوئی اور تھا اور میرے لیے کتنے دکھ کی بات تھی کہ کل رات غزالہ بھی اسی چار دیواری میں تھی' اسی چھت کے نیچے تھی۔ دوسروں کی طرح یقیناً اس نے بھی سب کچھ محسوس کیا تھا۔

غزالہ آرام کرسی سے اٹھی تو بڑی خاموشی کے ساتھ ہمارے قریب سے گزر کر نیچے چلی گئی۔ میں کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد سروج کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کی باتیں سننے لگا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ یہ کیسی بے حسی تھی۔ شاید اتنے ستم اٹھانے کے بعد اب احساس زیاں بھی نہیں رہا تھا۔

ہم چھت پر ٹہلتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ شیر محمد کے ملازم چور نظروں سے نئی پیکر سروج کو تکتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے تھے لیکن آج وہ اسے ڈرے ڈرے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ یقیناً کل شام انہوں نے جو ہولناک تماشا دیکھا تھا اس کے بعد وہ سروج کو کوئی آسیب زدہ مخلوق سمجھنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ بے شک وہ آج بھی کل ہی کی طرح حسین تھی بلکہ کل سے زیادہ حسین نظر آرہی تھی لیکن آج ملازمین کے دلوں میں حسن پرستی کی جگہ "خدا خوفی" نے لے لی تھی۔ وہ چپکے چپکے رال پٹاوری کرنے کے بجائے چپکے چپکے جل تو جلال تو پکار رہے تھے۔

چھت کی بلندی سے یکایک میری نگاہ ایک ریوڑ پر پڑی اور میں "الرٹ" ہوگیا۔ اس دیہاتی ریوڑ کے چرواہے کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہمقدم تھا۔ اس نے کندھے پر ایک میں سر کھنبو رکھا تھا اور گٹھری سا بنا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بال لہرا رہے تھے اور سیاہ لبادہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں فاصلے سے ہی پہچان گیا۔ وہ سائیں عالی تھا۔ سروج نے بھی سائیں کو دیکھ لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سائیں عالی کو لانے والا ریوڑ شیر محمد کے گھر کے سامنے رکا۔ کچھ بچے سائیں کے پیچھے لگ گئے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ قصبے کے آوارہ کتے بھی ریوڑ کے ساتھ ساتھ بھونکتے ہوئے آرہے تھے۔ سائیں نے ریوڑ سے اتر کر بچوں اور کتوں پر ایک ساتھ اپنی لاٹھی گھمائی۔ سب پیچھے ہٹ گئے۔ سروج نے آگے بڑھ کر حسب معمول سائیں کے گرد بندھے پاؤں چھوئے اور مؤدب کھڑی ہوگئی۔

سائیں سیدھا میری طرف آیا۔ چند لمحے غور سے میرا چہرہ تکتا رہا پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ آگے بڑھ کر میرا رخسار چوم لیا۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو اور اس کے نیس دار تھوک نے میرے اندر کراہت کا احساس جگایا۔

لیکن یہ امر مجبوری میں نے اس کراہت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سائیں نے فرطِ مسرت میں میرے شانے پر دھپ لگاتے ہوئے کہا "اوئے شفیع محمد! تو نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ تجھے پتا نہیں' تو نے میری بات مان کر کتنا بڑا کام کیا ہے۔ نہ ہی تجھے یہ خبر ہے کہ میری بات ماننے کا تجھے کتنا بڑا صلہ ملنے والا ہے۔"

اس نے جوش میں آ کر میرے شانے پر پھر ایک دھپ جمائی۔ اس کے بعد میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور والہانہ انداز میں ناچنے لگا۔ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ نچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ میری طرف سے مایوس ہو کر اس نے سروج کے ہاتھ پکڑ لیے اور اسے ہم رقص بنا لیا۔ وہ پہلے تو جھجکی پھر ہولے ہولے سائیں کا ساتھ دینے لگی۔ کتنی بھی آزاد خیال سہی لیکن لڑکی تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ سائیں اردگرد موجود لوگوں سے بھی کہہ رہا تھا کہ وہ رقص میں اس کا ساتھ دیں۔ گلی میں جمع ہونے والے بہت سے ننگ دھڑنگ بچے اور کچھ بڑے بھی سائیں عالی کی بات ماننے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ سب مختلف انداز میں ناچنے لگے۔ ایک من چلے نے جو شاید بھینس کا دودھ دوہنے جا رہا تھا خالی بالٹی کو طبلے کے انداز میں بجانا شروع کر دیا۔ چند نوجوان تالیاں بجانے لگے۔ سائیں کے گلے میں آویزاں بے شمار گھنٹیاں بھی اس ساز و آواز کا حصہ بن گئیں۔ کچھ دیر محوِ رقص رہنے کے بعد سائیں نے "حق ہو" کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کر دیا پھر اس نے دور نیم اور کیکر کے کچھ بلند درختوں کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "وہ دیکھو! ان درختوں کے پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ جیسے ہم یہاں ناچ رہے ہیں' میرے ایک درجن جن ان درختوں کے پیچھے ناچ رہے ہیں۔ ایک جن تو اتنا خوش ہے کہ اس نے کپڑے تک اتار پھینکے ہیں۔ صرف چڈی پہن کر ناچ رہا ہے۔ ان جنات کے ساتھ تین چار پریاں بھی ناچ رہی تھیں لیکن اب وہ دائیں بائیں ہو گئی ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ چڈی والا جن کچھ زیادہ ہی خوش ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ہا ہا ہا۔۔۔"

سائیں عالی تھوڑی دیر ادھر ادھر کی ہانکتا رہا پھر اس نے مجھے اور سروج کو لیا اور گھر کے اندر آ گیا۔ شیر محمد نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سائیں کو دیکھنے والا مجمع باہر رہ گیا۔ سائیں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر زوردار دھپ رسید کی اور بولا "میں نے کہا تھا نا کہ راستوں سے راستے نکلتے ہیں اور ایسے راستوں سے ایسے راستے نکلتے ہیں جن کا ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ سروج کو پا کر تم نے بہت کچھ پایا ہے شفیع محمد۔ اب میں دیکھتا ہوں تمہیں دفینے تک پہنچنے سے کون روکتا ہے۔ تم دفینے تک پہنچو گے۔ تم پہنچ کر رہو گے۔ صرف تم ہی ہو۔ صرف تم ہی ہو جو ایسا کر سکتے ہو۔"

سائیں عالی کا جی ایک بار پھر ناچنے کو چاہ رہا تھا لیکن عین اس وقت اس کی نظر غزالہ پر پڑ گئی اور وہ رک گیا۔ غزالہ' شیخ عاصم کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے سائیں پر اور مجھ پر بس ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔

"یہ یہاں کیوں پھر رہی ہے؟" سائیں عالی نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"اس کا شوہر بیمار ہے اس لیے یہاں رکی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"شوہر بیمار ہے تو شہر جائے اور علاج کرائے۔ یہاں اس کا کیا کام ہے۔ اس کو یہاں سے چلتا کرو شفیع محمد۔ اس کے اور تمہارے ستارے نہیں مل رہے۔ یہ یہاں سے جتنی جلدی چلی جائے اتنا ہی تمہارے لیے اچھا ہے۔"

میں نے کہا "بس آج ہی کسی وقت یہ چلی جائے گی۔"

"آج ہی نہیں۔۔۔ ابھی۔۔۔ اسی وقت روانہ کرو اسے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں' وہ تم نہیں دیکھ رہے۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ حالانکہ میں خود چاہ رہا تھا کہ غزالہ یہاں سے چلی جائے لیکن سائیں عالی کا نادر شاہی حکم دل و دماغ پر گراں گزرا۔ سائیں عالی نے میری کیفیت بھانپ لی۔ وہ میرے قریب آیا۔ یہاں تک کہ میں اس کی "بدبو اور شفقت" کو بہت نزدیک سے محسوس کرنے لگا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا پھر بے حد حلیم اور مہربان لہجے میں بولا "شفیع محمد! میں جانتا ہوں تو اندر سے زخمی ہو رہا ہے مگر جو بات بری نظر آتی ہے' وہ ہمیشہ بری نہیں ہوتی۔ کس کے حق میں کیا بہتر ہے یہ صرف اوپر والا ہی جانتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل میں' میں نے کہا "سائیں عالی! میں اپنے اندر کا کیا کروں۔ تو مجھے سروج کی طرف دھکیل رہا ہے اور تو جانتا نہیں کہ میرا دل اس سے کتنی دوری پر ہے۔ تو کہتا ہے کہ سروج میرے لیے ایک تحفہ ہے لیکن یہ تحفہ اس کمبل جیسا ہے جو مجھے جلتے ہوئے صحرا میں ملا ہے یا اس شمع جیسا ہے جو ایک چمکتی دوپہر کو کسی نے میرے ہاتھ میں تھما دی ہے یا یخ شربت کے اس گلاس جیسا ہے جو ٹھٹھرے ہوئے برف زار میں کسی نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا ہے۔ یہ تحفہ بہت خوب صورت ہو گا

سائیں لیکن یہ میرے کسی کام کا نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان خواہش کا رشتہ ہی نہیں ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ اپنے ذہن میں سوچا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر سائیں نے مجھے اس کا جواب دیا۔ شیر محمد کے کارندے نے میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے دودھ کا ایک گلاس سائیں کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ سائیں نے قریب سے ریت کی ایک مٹھی اٹھائی اور دودھ میں ڈال کر پورا گلاس غٹ غٹ چڑھا گیا پھر ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا "نفس کو مار کر چلنا ہی حقیقی مسرت کے حصول کا راستہ ہے۔ جو تمہیں ناپسند ہو اسے پسند کرنا سیکھو شفیع محمد۔ پھر سب کچھ تمہارے تابع ہو جائے گا۔"

پتا نہیں یہ واقعی میرے سوال کا جواب تھا یا صرف ایک اتفاق تھا' ایک واہمہ تھا' بہرحال جو کچھ بھی تھا' سائیں کی بات دل و دماغ کو متاثر کرنے والی تھی۔

سائیں نے ایک بار پھر مجھے غزالہ کے کمرے کی طرف دھکیلا۔ "میں کہتا ہوں جاؤ۔ ابھی انہیں یہاں سے روانہ کرنے کا انتظام کرو۔ اگر تم میں ہمت نہیں تو مجھے بتاؤ۔ میں کر دیتا ہوں انہیں۔"

"ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

درحقیقت میں سائیں کے آنے سے پہلے ہی غزالہ سے اس بارے میں بات کرنے والا تھا۔ سائیں کو شیر محمد کے پاس بیٹھک میں بٹھا کر میں عالم قریشی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا کہ وہ میری طرف سے شیخ اور غزالہ سے بات کرے اور ان سے پوچھے کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں اور ان کے بھجوانے کے لیے کیا انتظام کیا جائے۔

عالم قریشی نے پانچ دس منٹ بعد آ کر مجھے بتایا کہ وہ لاہور جانا چاہتے ہیں مگر غزالہ فکرمند ہے کہ اس مرتبہ بھی پہلے کی طرح کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے۔

غزالہ کا اشارہ یقیناً اسی واقعے کی طرف تھا جس میں نمبردار کی کار پر یہ سمجھ کر حملہ کیا گیا تھا کہ اس میں شیخ عاصم اور غزالہ جا رہے ہیں۔

میں نے عالم قریشی سے کہا کہ وہ اس حوالے سے غزالہ اور شیخ کی پوری تسلی کرا دے۔ اس قسم کا واقعہ اب نہیں ہو گا۔ اگر وہ مزید تسلی چاہتے ہیں تو شیر محمد کے مسلح کارندے جیپ پر ان کی گاڑی کے ساتھ جائیں گے اور انہیں لاہور کے نواح میں پہنچا کر آئیں گے۔ میں نے عالم قریشی سے یہ بھی کہا کہ وہ شیخ کے سامنے اپنی وارننگ دہرا دے۔ اسے اچھی طرح سمجھا دے کہ اگر اس نے عداوت اور خوں ریزی کا یہ سلسلہ ختم نہیں کیا تو پھر یہ لڑائی محدود نہیں رہے گی۔ اس کی جاں لیوا تپش امارات میں اس کے بیوی بچے اور عزیز و اقارب تک محسوس کریں گے۔

وہ ایک عجیب دوپہر تھی۔ یوں تو وہ بڑی خوب صورت تھی' چمکیلی' خوش گوار حرارت والی اور گہرے نیلے آسمان والی اور تھم تھم کر چلتی ہوا والی لیکن اس دوپہر کی تاثیر بڑی تلخ تھی۔ سائیں عالی بہت خوش تھا۔ وہ گاہے بگاہے پُرجوش انداز میں اٹھتا اور ناچنے لگتا تھا۔ اس کا تماشا دیکھنے کے لیے حویلی کے تمام مرد و زن جمع ہو چکے تھے۔ خاص طور سے بچوں کے ہاتھ تو ایک مشغلہ آ گیا تھا۔ وہ سائیں کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بے ڈھنگے پن سے ناچنے لگتے تھے۔ سائیں نے اپنی "میزبانی" خود کرتے ہوئے شیر محمد کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے لیے بہت سے میٹھے چاول اور حلوا وغیرہ پکوائے۔ سائیں کے حکم پر باورچی خانے سے پکوانوں کی خوشبو اڑنے لگی تھی۔ ایک طرف مسرت کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف غزالہ اور شیخ کا مختصر سامان شیر محمد کی گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ وہ دونوں یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے انہیں گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ غزالہ نے تاسے کی ایک لمبی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ اس میں یقیناً شیخ عاصم کی دوائیں وغیرہ تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے صرف ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ایک الوداعی نظر' ایک خاموش بات۔۔۔ یہ جدائی کا موڑ تھا لیکن میری آنکھ سے کوئی آنسو نہیں ٹپکا' نہ ہی وہ پلٹ پلٹ کر میری طرف آئی۔ بڑی خاموشی سے سب کچھ ہو گیا۔

وہ چلی گئی۔ میں خالی خالی سا' ناچتے گاتے ہجوم میں بیٹھا رہ گیا۔ میرے پہلو میں چمکتی دمکتی ہوئی سروج تھی۔ وہ بار بار نوکیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی تھی اور اس کے انگ انگ سے مستی پھوٹنے لگتی تھی۔

اسی دوران میں' میں نے زریں گل کو دیکھا۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت سے نیچے اترا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجمع کو چیر کر وہ میرے پاس پہنچا۔ اتفاقاً سروج اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے سروج کو نفرت سے دھکیل کر ایک طرف کیا پھر میرے اوپر جھک کر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "استاد صیب! لشکر آ گیا۔۔!!"

"اُستاد صیب' شنکر آ گیا ہے۔" یہ آواز میرے کانوں میں گونجی پھر پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ ہڈیوں کے گودے تک میں اتر گئی۔

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل قریب آ گیا ہے۔ اس کی کار ام صاف پہچان گیا ہے۔ ساتھ میں ایک بڑا جیپ بھی ہے۔"

میں نے غور سے سنا۔ گاڑیوں کے انجنوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنی قمیص کے نیچے سے چمکتے ہوئے دستے والا وہی چھوٹا سا پسٹل نکال لیا جو میرے پاس ایک نامعلوم بونے کی نشانی تھا۔ بونے کی طرح یہ پسٹل بھی مختصر ہونے کے باوجود نہایت خطرناک اور طاقت ور تھا۔ میرا انداز دیکھ کر عالم قریشی اور شیر محمد کے ماتھے بھی ٹھنک گئے تھے۔

شیر محمد نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا "تجن جی! کیا گل ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "ایک پرانا دشمن آ گیا ہے شیر محمد۔ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔"

شیر محمد کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا "کوئی گل بات ہی نہیں ہے تجن پیارے۔ ایک دشمن کیا' سو بھی آ جائیں تو پروا نہیں ہیگی۔" پھر اس نے اپنے کارندے کو آواز دی "او طفیلے! رائفلیں نکال لو اوئے۔ باہر کا دروازہ بند کر دو۔ تین چار بندے چھت پر چلے جاؤ۔"

شیر محمد کی ہدایات پر یوں عمل ہوا جیسے وہ کوئی کمانڈر ہو اور اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا ہو۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر کئی رائفلیں اپنی جھلک دکھانے لگیں۔ دھوتی قمیص والے تین چار بندے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چھت پر چلے گئے۔ ایک آدمی بیرونی دروازہ بند کرنے کے لیے لپکا۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ "نہیں۔۔۔ یہ کھلا رہنے دو۔"

چند سیکنڈ بعد شنکر کی کار دروازے کے عین سامنے نظر آئی۔ اس کے پیچھے ایک لینڈ کروزر جیپ تھی۔ کار کے دروازے کھلے اور شنکر اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ باہر نکلا۔ لینڈ کروزر میں سے بھی پانچ چھ افراد باہر نکل آئے۔ یہ سب لوگ شکل و صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ان میں سے دو چار کو میں پہچانتا بھی تھا۔ ان لوگوں کے تیور سخت خطرناک تھے۔ شنکر لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے آیا۔ وہ پتلون قمیص اور کوٹ میں تھا۔ اس کا ہاتھ۔۔۔ کوٹ کی جیب میں تھا اور مجھے سو فی صد یقین تھا کہ اس جیب میں کولٹ پسٹل موجود ہے۔ (حالانکہ بعد میں یہ اندازہ غلط ثابت ہوا)

ڈھلتے سورج کی روشنی میں' میں نے غور سے دیکھا۔ شنکر کی تاریک شیشوں والی عینک کے نیچے رخساروں پر چھوٹے چھوٹے سیاہ نشان نظر آ رہے تھے۔ بالکل جیسے کسی [illegible] سیال کے چھینٹوں نے کھال جلا دی ہو۔ میرے عین سامنے پہنچ کر شنکر نے تاریک شیشوں والی عینک اتار دی۔ سیاہ نشان اس کی دونوں آنکھوں کے آس پاس موجود تھے۔ ایک کی ابرو نصف جلی ہوئی تھی اور آنکھ کے پپوٹے پر بھی [illegible] دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں بچ گئی تھیں لیکن اس بارودی دھماکے نے شدید اثرات چھوڑے تھے۔ اب یہ ثابت ہو گئی تھی کہ حویلی میں ہونے والے بارودی دھماکے میں شنکر زخمی ہوا تھا اور اسے آناً فاناً وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔

شنکر یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا "کیا لینے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا لینے آیا ہوں؟" وہ حسب عادت بالکل سپاٹ لہجے میں بولا۔

"اگر شیخ عاصم اور اس کی بیوی کے لیے آئے ہو تو دونوں یہاں سے جا چکے ہیں۔"

"مجھے کیا معلوم کہ وہ جا چکے ہیں یا نہیں!"

"تمہیں یقین کرنا پڑے گا کیونکہ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

شنکر نے جگر پاش نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی یہ تیز نظر برمے کی طرح دماغ میں گھستی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کئی بار مجھے یوں لگا تھا کہ یہ نظر نہیں "ایکسرے" اور ٹھوس چیزوں کے اندر سے گزر جاتی ہے۔ چند لمحے مجھے گھورتے رہنے کے بعد شنکر بولا "اگر وہ یہاں نہیں تو کہاں ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ اور معلوم بھی ہوتا تو ضروری تھا کہ میں تمہیں بتا دیتا۔"

"کتنی دیر ہو گئی ہے انہیں گئے ہوئے؟"

"بیس پچیس منٹ ہوئے ہوں گے۔"

کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ شنکر جیسے اپنے خیال میں کھو گیا تھا۔ میں نے کہا "تم اب جا سکتے ہو شنکر۔"

"اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ میرا دل تمہیں ملنے کو چاہ رہا ہے۔" عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں اس لہجے کی خطرناکی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ شنکر کا بے حد پُرسکون اور دھیما لہجہ اکثر کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔

جیب کے اندر پسٹل کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میری دائیں طرف کھڑا زریں گل بھی شدید مضطرب نظر آنے لگا تھا۔

شنکر کے ساتھی اس کے دائیں بائیں چوکس کھڑے تھے۔ ان میں سے تین چار کے ہاتھ میں جدید ساخت کی روسی رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔

بالکل اچانک شنکر نے زریں کی طرف جست لگائی۔ یہ جست اتنی اچانک تھی کہ میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی لپک گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شنکر کے بائیں ہاتھ میں تیز دھار خنجر ہے۔ زریں لڑائی بھڑائی میں ماہر تھا اور بے حد پھرتیلا بھی تھا لیکن اس کا سامنا شنکر سے تھا۔ وہ شنکر جو اپنے دشمن کو ایک ساعت کی مہلت بھی نہیں دیتا تھا۔ میں نے زریں گل کو شنکر کے حملے سے بچنے کی کوشش میں لڑکھڑاتے اور پھر زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ شنکر اس کے اوپر تھا۔ بس اب سیکنڈ کے سوویں حصے کی بات تھی۔ شنکر کا خنجر زریں گل کے جسم میں داخل ہونے والا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ شنکر کتنا مہلک زخم لگاتا ہے۔ جھوک ضامن کی حویلی میں قادر زماں کی کٹی پھٹی لاش میرے تصور میں کوند گئی۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی۔ میرے دونوں ہاتھ شنکر کی کمر پر پڑے۔ شنکر سے لپٹ کر میں نے پلٹنی کھائی اور اسے زریں گل سے جدا کر دیا۔ ہم دونوں جدل کرتے ہوئے آٹھ دس فٹ دور چلے گئے۔ میں نے سب سے پہلے شنکر کے خنجر والے ہاتھ پر توجہ دی۔ جونہی شنکر کی کلائی میرے ہاتھ میں آئی' میں نے اسے پوری قوت سے مروڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں خنجر چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ میرے خطرناک حریف نے کیا داؤ لگایا ہے' میں اڑتا ہوا سائیں عالی کے قدموں میں گرا۔ پھر میں نے شنکر کو کسی خوں خوار چمگادڑ کی طرح خود پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے سینے پر رسید کیں۔ بڑی بھرپور قوت کی ضرب تھی۔ شنکر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو لوٹ پوٹ ہو کر رہ جاتا مگر وہ بدبخت لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ اب میں بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اس چمکتی دھوپ میں' ان حیران حیران نگاہوں کے درمیان دو دیرینہ حریف آمنے سامنے تھے۔ ارد گرد کا منظر یہ تھا کہ شنکر کے ساتھیوں اور شیر محمد کے کارندوں نے ایک دوسرے پر اسلحہ تان لیا تھا۔ دونوں فریق سخت مشتعل نظر آتے تھے لیکن دونوں فریق یہ بھی جانتے تھے کہ فائرنگ کا نتیجہ آٹھ دس افراد کی ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا آمنے سامنے ہونے کے باوجود کسی شخص نے ابھی فائر نہیں کیا تھا۔

شنکر کے خنجر کے جواب میں' میں نے بھی اپنی پنڈلی سے رامپوری خنجر کھینچ لیا۔ شنکر کو روبرو دیکھ کر خون میں جوش پیدا ہو گیا تھا۔ شنکر نے کسی ماہر چاقو زن کی طرح خنجر کو حرکت دی اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر پشت دیوار کی طرف کر لی۔ اس کی عقابی نگاہیں میرے ہاتھ پر جمی تھیں۔ وہ دانت پیس کر بولا "میرے راستے سے ہٹ جا جانی۔۔۔ میں آج تیرے اس بچے کی جان لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

میں جانتا تھا کہ شنکر کا اشارہ زریں کی طرف ہے۔ میں شنکر کے اس خوفناک ارادے کی وجہ بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ زریں نے کچھ روز پہلے شنکر کے قریبی ساتھی موہن داس کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ زریں نے یہ قتل تیز دھار آلے سے کیا تھا' شاید اسی لیے شنکر کے ہاتھ میں بھی تیز دھار آلہ نظر آ رہا تھا۔

شنکر کی نگاہ ایک لمحے کے لیے زریں کی طرف اٹھی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میرے "وفادار" خنجر کا پھل شنکر کے بائیں کندھے کو ادھیڑتے ہوئے گزر گیا۔ زخمی سانپ کی طرح پلٹ کر اس نے وار کیا' یہ وار اتنا اچھا نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے پیچھے شنکر کی بے پناہ پھرتی کارفرما تھی۔ میں اپنا چہرہ بچاتے بچاتے لڑکھڑا گیا۔ شنکر اس لڑکھڑاہٹ کو کہاں معاف کرنے والا تھا۔ اس نے ٹانگ کی ضرب میرے سینے پر لگائی' میں بہت دور تک لڑھک گیا۔ گرتے ہوئے میرا ایک ہاتھ اس بہت بڑے دیگچے سے ٹکرایا تھا جس میں سائیں عالی کے لیے حلوا پک رہا تھا۔ دیگچہ الٹ گیا اور حلوا بہہ نکلا۔ مجھے احساس ہوا کہ خنجر میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ میں خنجر کی طرف لپکا مگر اس سے پہلے ہی شنکر کی ٹھوکر میرے سر پر لگی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہ نازک ترین لمحے تھے۔ شنکر حاوی ہو چکا تھا۔ میں ان لمحات میں شنکر کے خنجر کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے زریں کو دیکھا' اس نے ایک لاٹھی پورے زور سے شنکر کے خنجر والے ہاتھ پر ماری اور خنجر شنکر کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔ ضرب کی شدت نے ایک لمحے کے لیے شنکر کو میری طرف سے غافل کیا۔ یہ مختصر مہلت میرے سنبھلنے کے لیے کافی تھی۔ میں تڑپ کر پھر شنکر سے لپٹ گیا اور اسے زریں کی طرف جانے سے روک لیا۔ زریں کی حرکت کا جواب دینے کے لیے شنکر کا ایک غنڈا زریں پر پل پڑا تھا۔ یعنی اب دو طرفہ لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک طرف میں شنکر سے برسرپیکار تھا اور دوسری طرف زریں گل شنکر کے کارندے سے گتھم گتھا ہو گیا تھا۔

شنکر کی عیاری ہر شک سے بالاتر تھی۔ وہ میرے خطرناک ترین حربے کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنی گردن کے سلسلے میں پوری احتیاط برت رہا تھا۔ اسے بخوبی معلوم تھا کہ یہ گردن میرے شکنجے میں آگئی تو پھر ٹوٹ کر ہی نکلے گی۔ پچھلے چند برسوں میں چار پانچ مرتبہ میرا اور شنکر کا آمنا سامنا ہو چکا تھا لیکن اس نے ہر بار اپنی گردن بڑی مہارت سے بچائے رکھی تھی۔

قریباً دو منٹ تک ہمارے درمیان شدید زور آزمائی ہوئی۔ اس زور آزمائی کے دوران میں مجھے پتا چل گیا کہ شنکر کی جیب میں ریوالور یا پسٹل وغیرہ نہیں۔ پھولی ہوئی جس جیب کے بارے میں مجھے شک تھا وہاں کوئی دوا کی تالی قسم کی شے تھی۔ زبردست زور آزمائی کے دوران میں میرے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور بالوں کے اندر سے بہنے والا خون بار بار میری آنکھوں کے سامنے سرخ پردہ کھینچ رہا تھا۔ میری جیب میں پسٹل موجود تھا لیکن یہ پسٹل چونکہ بہت مختصر تھا لہٰذا شنکر اس کی موجودگی سے باخبر نہیں تھا۔ شنکر سے خطرناک زور آزمائی کرتے ہوئے میں اس موقع کی تلاش میں تھا کہ پسٹل نکال سکوں۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ شیخ عاصم کی آواز تھی۔ وہ چیخ کر شنکر سے مخاطب ہوا تھا "چھوڑ دو شنکر۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔" اس نے انگلش میں کہا۔

شیخ کی باٹ دار آواز سن کر شنکر کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے سر کی زوردار ضرب میرے سینے پر رسید کی اور مجھے خود سے دور ہٹا دیا۔ میں نے دیکھا شیخ عاصم ہم سے قریباً دس قدم کی دوری پر موجود تھا۔ وہ چند سیکنڈ پہلے ہی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ وہ جیپ پر آیا تھا۔ جیپ حویلی کے ادھ کھلے پھاٹک میں نظر آرہی تھی اور ابھی اسٹارٹ تھی۔ شیخ نے تیز لہجے میں شنکر سے کہا "شنکر! میں اس موقع پر لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتا' تم اپنے کارندوں کو یہاں سے واپس جانے کی ہدایت کرو۔"

شنکر چند لمحے خاموشی سے شیخ عاصم کی طرف دیکھتا رہا' یقیناً اسے یہ نادر شاہی حکم پسند نہیں آیا تھا لیکن اپنے بگ باس کی بات رد کرنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بہت گہری سانس اس نے لی اور اپنے کارندوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے ہتھیار جھکا لیے اور پھر الٹے قدموں آہستہ آہستہ باہر نکل گئے۔

"تم بھی آجاؤ شنکر۔" شیخ نے دوسرا حکم صادر کیا۔

شنکر چند سیکنڈ تک مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ میری پیشانی کی طرح اس کے ایک کندھے سے بھی خون رس رہا ہے۔ اس کندھے پر لڑائی کے شروع میں میرے خنجر نے بوسہ دیا تھا۔

زریں گل کے ساتھ گتھم گتھا ہونے والا شخص بھی زریں سے جدا ہو گیا تھا اور اپنے ہونٹوں سے خون پونچھنے میں مصروف تھا۔ زریں گل اور اس کے مدمقابل کے کپڑے بری طرح پھٹ گئے تھے۔ شنکر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پھنکارا "میں تیرے اس بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس بات پر وشواس رکھنا اور میری اس بات کو یاد رکھنا۔"

ظاہر ہے شنکر کا اشارہ زریں گل کی طرف ہی تھا۔ میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں کسی بھی شخص کی دھمکی نظر انداز کر سکتا تھا لیکن شنکر کی دھمکی نظر انداز کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شنکر اور اس کے کارندے شیخ عاصم کے ساتھ واپس چلے گئے۔ جیسا کہ بعد میں شیر محمد کے کارندوں سے معلوم ہوا' شنکر کو واقعی خبر نہیں تھی کہ شیخ عاصم اور غزالہ حویلی سے واپس جا چکے ہیں۔ شیخ اور غزالہ شیر محمد کے کارندوں کے ہمراہ دو گاڑیوں پر قصبے سے روانہ ہوئے تھے۔ قصبے سے باہر ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ جب گاڑیاں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں تو شیخ عاصم کو نشیب میں نہر کے پاس شنکر کی گاڑی دکھائی دی تھی۔ اس کی ہدایت پر شیر محمد کے کارندوں نے شنکر کو آوازیں دی تھیں لیکن یہ آوازیں اس تک نہیں پہنچ سکی تھیں اور وہ اپنے ساتھیوں سمیت حویلی میں آگیا تھا۔ شیخ عاصم نے غزالہ کو تو وہیں کار میں چھوڑا تھا اور خود جیپ پر بیٹھ کر شنکر کے پیچھے حویلی پہنچا تھا۔

شیر محمد اور اس کے کارندے حیرت سے بُت بنے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ سارا گورکھ دھندا ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ زریں گل نے جیب سے رومال نکالا اور پیشانی کا خون صاف کرنے لگا۔ ایک ملازم نے بھیگا ہوا کپڑا میرے سر کے زخم پر رکھ کر خون روکنے کی کامیاب کوشش کی۔

حلوے والا دیگچہ الٹ گیا تھا اور سائیں عالی اس کے پاس یوں خاموش کھڑا تھا جیسے اخبار کے لیے تصویر اتروانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس کے پہلو میں سورج تھی۔ وہ بھی گم صم تھی۔ وہ آج تک مجھے صرف اور صرف

روپ میں دیکھتی رہی تھی۔ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ کوئی شخص مار دھاڑ میں مجھ سے آگے نکل گیا ہو یا میرا ہم پلہ ہی ثابت ہوا ہو لیکن آج اس نے دیکھا تھا کہ شنکر میرا ہم پلہ ثابت ہوا تھا بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پوری لڑائی میں اس کا پلڑا کچھ بھاری ہی رہا تھا۔

سائیں عالی نے میرے شانے پر زور سے تھپکی دی پھر بلند آواز میں بولا "دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے خوب مقابلہ کیا ہے۔"

چند لمحے حویلی کے احاطے میں سناٹا رہا۔ پھر اس سناٹے کو سائیں کے ایک زوردار نعرے نے توڑا "دل دھڑکا دیگچے کا۔ بابل دھڑکا۔ بابل دھڑکا۔"

وہ ناچنے لگا' حلوے کا خالی دیگچہ اس نے ہیلمٹ کی طرح اپنے سر پر الٹ لیا اور ہاتھوں سے اسے طبلے کی طرح بجانے لگا۔ اس کی مستی دیکھ کر حاضرین کے چہروں پر چھائی ہوئی تشویش ماند پڑ گئی۔ کچھ نوجوان مسکرانے لگے جو کونے کھدروں میں چھپے ہوئے بچے باہر نکل آئے اور دلچسپی سے سائیں عالی کی حرکات دیکھنے لگے۔ سائیں عالی نے سورج کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اسے اپنے ساتھ ناچنے پر مجبور کرنے لگا۔ یہ نظارہ دلچسپ تھا۔ خاص طور سے مرد اس نظارے کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں سورج پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ شاید زریں نے ایک دفعہ ٹھیک ہی کہا تھا کہ سورج ایک چلتا پھرتا فتنہ ہے۔ جس نے اپنی دنیا و آخرت خراب کرنی ہو' اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لے۔ میں سورج کے پارے کی طرح مچلتے اور ڈولتے جسم کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا' یہ جسم کل شب واقعی میرے پاس تھا یا وہ ایک خواب تھا۔ ایک عجیب سا بانکپن' ایک عجیب سی ترغیب تھی اس جسم میں۔ یہ جسم خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہتا تھا۔ مجھے دیکھو۔ میری طلب کرو۔ میرے لیے ٹھنڈی آہیں بھرو۔ میں نے کئی بار سورج کے اس شعلہ فشاں بدن کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ کوئی کنواری دوشیزہ نہیں تھی نہ کوئی نوخیز حسینہ تھی' پھر بھی اس میں دوشیزگی اور نوخیزی کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ اگر حقیقت پسندی سے سوچا جاتا تو وہ ایک پختہ کار لڑکی تھی۔ نجانے اب تک کتنے مردوں کی آغوش گرم کر چکی تھی۔ کتنے ہوس پرستوں کی راتیں اس کے وجود سے مہکی اور چہکی تھیں مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ ساز کے اس تار کی طرح جو رات بھر بجنے کے باوجود ڈھیلا نہ پڑے اور تنا رہے' وہ بھی تنی ہوئی تھی۔

وہ سائیں عالی کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی تھی اور انگ انگ ڈول رہا تھا۔ پختہ عمر کے لوگ' نوجوان لڑکے بالے تک اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان لمحات میں وہ شاید یہ بات بھی فراموش کر چکے تھے کہ ایک دن پہلے اس لڑکی پر شدید دماغی دورہ پڑ چکا ہے اور حویلی کی خواتین کے بقول اسے جنات چمٹے رہے ہیں۔

○☆○

اگلی رات بھی بے حد رنگین و سنگین تھی۔ رنگین اس لیے کہ شعلہ بدن سورج میرے ساتھ تھی اور سنگین اس لیے کہ شنکر کا خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ وہ شیخ عاصم کے لیے کام ضرور کر رہا تھا مگر اس کا زر خرید غلام نہیں تھا۔ وہ شیخ عاصم کے کہنے پر واپس چلا گیا تھا مگر اپنے سینے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے واپس یہاں آسکتا تھا۔ اس نے زریں گل کو قتل کرنے کا عہد کیا تھا اور میں نے جب سے اس "عہد" کے منحوس الفاظ سنے تھے' ایک لمحے کے لیے بھی انہیں فراموش نہیں کر سکا تھا۔ میری ہدایت پر شیر محمد کے کارندے حویلی کی حفاظت کے سلسلے میں بڑے چوکس ہو گئے تھے۔ دو ٹولیاں حویلی کی چھت پر پہرا دے رہی تھیں جبکہ آٹھ دس افراد باہر بھی موجود تھے۔

حویلی کے ایک نیم گرم کمرے میں سورج میرے سامنے ریشم کے ایک تھان کی طرح کھلتی چلی جا رہی تھی۔ میرا ذہن پریشانی میں گھرا ہوا تھا اور میں اس سے پہلو بچانا چاہتا تھا لیکن کل رات کے واقعات نے سورج کا حوصلہ پہاڑ کر دیا تھا۔ جھجک تو اس میں پہلے بھی نہیں تھی' اب وہ مادر پدر آزاد ہو گئی تھی۔ ایک ایسے چڑھے ہوئے دریا کے مانند جس کے سامنے کوئی بھی بند باندھنا ناممکن ہو وہ پھیلتی اور بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس دریا کا شور میری سماعت میں بھرتا جا رہا تھا۔ اس ان چاہے شور میں غزالہ کی آواز مجھے کہیں دور سے' بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی "خدا حافظ شاہ جہاں۔ میں اس گھر میں جا رہی ہوں جہاں شادی کے بعد ہر عورت کو جانا ہوتا ہے۔ آپ کو اپنا یہ دیس اور اپنے لوگ مبارک ہوں۔"

اگلے دو تین روز بڑی کشمکش میں گزرے۔ میں لاہور واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا دھیان ہر وقت ڈاکٹر حمزہ میں اٹکا ہوا تھا۔ میں اسے میانی صاحب قبرستان کے ایک تاریک مکان میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اس تاریک مکان میں ایک عجیب الخلقت بوڑھا اپنے عجیب انداز میں اس کا علاج معالجہ کر رہا

تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ حمزہ کی حالت اب کیسی ہے۔ میں نے سائیں سے کئی بار کہا تھا کہ میں حمزہ کو دیکھنا چاہتا ہوں مگر اس نے ہر بار سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی حمزہ کو دیکھنے کا وقت نہیں آیا۔ شاید وہ اپنی چیلی کو میری زیادہ سے زیادہ "قربت" فراہم کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اگر میں حمزہ کو دیکھنے لاہور چلا جاتا تو وہ "ماحول" خراب ہو جاتا جس کے سبب سورج کے ارمان پورے ہو رہے تھے۔ وہ ہر رات میرے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کی "قربت" میں ایک عجیب قسم کی شدت اور وارفتگی تھی۔ وہ سُدھ بُدھ بھلا دینے والا رویہ اختیار کرتی تھی۔ محبت کے لمحات میں اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا "دیکھنا شاہ جہاں! میں تمہارے دل و دماغ سے غزالہ کا نام کھرچ کر نکال دوں گی۔"

مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ یہ کام کر سکے گی۔ یہ کام تو شاید میری موت سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سورج کچھ دیر کے لیے مجھے اپنے حُسن و شباب کے ریلے میں بہا کر ضرور لے جاتی تھی لیکن جب میں واپس لوٹتا تھا تو میرے اندر کا صحرا کچھ اور پھیل جاتا تھا۔ ایک ایسا کرب میرے رگ و پے میں پھیلتا تھا کہ جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ سورج کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے زہریلے ناگ بن کر میرے احساس سے لپٹ جاتے تھے اور میرا سانس لینا دوبھر کر دیتے تھے۔

صبح دم جب میں اٹھتا تھا تو مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے ایک حسین عورت کے پہلو میں محبت بھری رات گزاری ہے۔ میں خود کو اجڑا اجڑا اور خستہ حال محسوس کرتا تھا اور یقیناً مجھے دیکھنے والے بھی مجھے دیکھ کر یہی تاثر لیتے تھے۔ خاص طور سے زریں گل کی آنکھوں میں تو ناپسندیدگی کی تحریر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ سورج کے ساتھ اس کی کبھی بنی نہیں تھی۔ وہ اسے بلا جھجک فاحشہ قرار دیتا تھا اور مجھے اس کے سائے سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اب اس کی ساری کوششیں ناکام ہوئی تھیں' وہ خود کو مفتوح اور سورج کو فاتح محسوس کر رہا تھا۔ بے شک زریں گل جانتا تھا کہ اس میں میری مجبوری کا عمل دخل بہت زیادہ ہے' پھر بھی وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے کہ سائیں عالی نے میرا بے طرح بگڑا ہوا موڈ محسوس کر لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہم لاہور واپس جائیں گے۔ اس نے مجھے امید دلائی کہ میں آج شام سے پہلے پہلے حمزہ کو دیکھ سکوں گا۔ ہم دوپہر کے وقت سندلی قصبے سے روانہ ہوئے۔ ہمارے مختصر سے قافلے میں زریں گل' کلثوم اور عالم قریشی مع اہلیہ کے علاوہ سائیں عالی اور سورن بھی شامل تھے۔ ہم نے لاہور پہنچ کر عالم قریشی کے گھر کا رخ کیا۔ عالم قریشی کا گھر مجھے بہترین جائے پناہ محسوس ہو رہا تھا۔ شام کے فوراً بعد ہم سائیں عالی کی معیت میں قبرستان پہنچے۔ وہ جمعرات کی شام تھی۔ پورا قبرستان اگربتیوں اور پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں قبروں کے درمیان سوگوار چہروں والے خواتین و حضرات گھوم رہے تھے۔ کہیں آنسو بہہ رہے تھے' کہیں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ کہیں صرف رسم پوری ہو رہی تھی۔ قبرستان میں آنے اور دعا مانگ کر شتابی شتابی واپس لوٹ جانے کی رسم۔

ہم نے گاڑی ایک اندرونی سڑک پر کھڑی کی اور قبروں کے درمیان سے گزر کر اس چھوٹی سی چار دیواری کے پاس پہنچ گئے جہاں قریباً دس روز پہلے ہم حمزہ کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا چھوڑ گئے تھے۔ اس رات کے سارے مناظر میری نگاہوں میں تازہ ہو گئے تھے۔ تاروں کی روشنی' کنوئیں کے گرد' پھڑپھڑاتا ہوا سبز جھنڈا۔ مشک و کافور کی خوشبو۔

جونہی ہم نیچی چھت والے کمرے کے پاس پہنچے' مجھے اندر سے کراہنے کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہی "ہائے ہائے" جو اس رات میں نے دیر تک سنی تھی۔ یہ اسی بوڑھے معالج کی "ہائے ہائے" تھی جس کی کمر میں کوئی پرانی تکلیف تھی اور جو چوپایوں کے انداز میں چلتا تھا۔ ایک عجیب سی یاسیت نے مجھے گھیر لیا۔ پتا نہیں یہ شخص کب سے اس تکلیف میں مبتلا تھا اور شب و روز اسی طرح کراہتا رہتا تھا۔ میں' زریں گل' عالم قریشی اور سائیں چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر سائیں نے اپنی لاٹھی سے دروازے پر دستک دی۔ بوڑھے معالج کے نوجوان ساتھی گورکن صلواتے نے دروازہ کھولا۔ سائیں عالی کو دیکھ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ سب سے پہلے میری نگاہ حمزہ اور اس کی والدہ پر پڑی۔ حمزہ بستر پر نیم دراز تھا۔ وہ بے حد کمزور نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار بھی تھے۔ حمزہ کی والدہ کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا اور وہ مٹی کے ہی چمچ سے حمزہ کو کچھ کھلانے میں مصروف تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اس کمرے میں کھانے پینے کی چیزوں کے سوا ہر شے مٹی کی ہے۔

ہمیں دیکھ کر حمزہ کی والدہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ پھر میں نے یہ حیرت ناک منظر دیکھا کہ اعلیٰ سوسائٹی کی یہ تعلیم یافتہ اور خوش پوش خاتون

دوڑ کر سائیں عالی کے غلیظ قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس نے وارفتگی کے عالم میں سائیں کے پاؤں چھو لیے اور سائیں کے حق میں دعائیں کرنے لگی۔

سائیں نے خاتون کو جھڑکا اور پیچھے ہٹ گیا۔ بوڑھا معالج ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا آیا اور اس نے باقاعدہ سائیں کے پاؤں کو بوسہ دینے کی کوشش کی۔ سائیں ایک مرتبہ پھر پیچھے ہٹ گیا لیکن اس مرتبہ اس نے جھڑکی وغیرہ نہیں دی۔ بس خاموش کھڑا رہا اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ بوڑھا معالج ایک کرشمہ ساز شخص تھا۔ نجانے کتنے لوگ اس کی قدم بوسی کے لیے تڑپتے تھے لیکن وہ خود سائیں عالی کے قدم چھو رہا تھا۔ سائیں کی شخصیت ہماری نظر میں کچھ اور بھی بھاری بھرکم ہو گئی تھی۔

میں نے حمزہ کی پیشانی چھوئی۔ اسے ہلکا سا بخار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ میرا ہاتھ اس کی پیشانی پر تھا' اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا "بھائی جان۔۔۔ مجھے۔۔۔ یقین نہیں آ رہا۔"

"کس بات کا؟"

"کہ میں۔۔۔ بچ گیا ہوں۔۔۔ کیا میں واقعی بچ گیا ہوں؟"

"نہ صرف بچ گئے ہو بلکہ تندرست بھی ہو رہے ہو۔"

"لیکن۔۔۔ میری ٹانگ۔۔۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ٹانگ پر سے چادر ہٹائی۔ ٹانگ کی حالت بظاہر بہت بری نظر آ رہی تھی۔ اوپر کی ساری کھال اتر چکی تھی یا چیتھڑوں کی صورت میں لٹک رہی تھی۔ نیچے سے سرخ سرخ گوشت نظر آ رہا تھا۔ یہ بڑا کراہت آمیز منظر تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ٹانگ کے علاوہ حمزہ کا سارا جسم برہنہ ہے اور اس کے اوپر ستر پوشی کے لیے صرف ایک چادر ڈال دی گئی ہے۔

بوڑھے معالج نے اطمینان سے کہا "گھبرانے کی بات نہیں۔ ٹانگ جتنی خراب نظر آ رہی ہے' اتنی خراب ہے نہیں۔ یہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں ایک جیتا جاگتا معجزہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ قبرستان موت کا گڑھ تھا۔ موت کے اس گڑھ سے حمزہ کو زندگی مل گئی تھی اور ایسے وقت مل گئی تھی جب ڈاکٹر اور ان کا جدید علم اس سلسلے میں بے بس نظر آ رہا تھا۔ بے شک ابھی حمزہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں تھا لیکن اس کی حالت دیکھ کر امید کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک روز اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔

حمزہ کی والدہ نے بوڑھے معالج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ملنگ جی نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں حمزہ کے پاس رہنے کی اجازت دے دی ہے اور وہ پچھلے چار روز سے مسلسل حمزہ کے پاس ہیں۔۔۔ ہم ڈیڑھ پون گھنٹا حمزہ کے پاس بیٹھے رہے اور اس سے دل جوئی کی باتیں کرتے رہے۔ حمزہ کی والدہ نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا اور میرے ساتھ باہر آ گئیں۔ اب قبرستان میں اندھیرا ہو چکا تھا مگر قبروں پر جلتے ہوئے دیے اور ٹمٹماتی ہوئی موم بتیوں نے گھٹا ٹوپ اندھیرے کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ ایک ایسی ہی روشن قبر کے پاس پہنچ کر حمزہ کی والدہ رک گئیں۔ ان کے چہرے پر ایک بار پھر ہیجانی کیفیت نظر آنے لگی تھی۔۔۔ گلوگیر آواز میں بولیں "شاہ جہاں! اگر میرے بچے کی زندگی بچائی ہے تو اسے سہارا بھی دو۔ وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ مجھے تو۔۔۔ ڈر ہے کہ وہ مایوسی میں کچھ کر نہ بیٹھے۔"

"آپ حوصلہ رکھیں آنٹی! تھوڑا سا وقت لگے گا لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بیٹا! وہ تمہیں اور شفتا کو بہت چاہتا ہے۔ اس کی زبان پر ہر وقت تم دونوں کا نام ہی رہتا ہے۔ کل رات نیند میں بھی تمہارا نام لے رہا تھا۔ تم اس سے دور مت جانا ورنہ وہ بالکل ٹوٹ جائے گا۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ ایک "غمزدہ ماں" مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ روہانسی آواز میں بولیں "بیٹا! اب تو ہم ایسے خریدار ہیں جن کے پاس کھوٹے سکوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اب تو سب کچھ تمہارے رحم و کرم پر ہے' جو سلوک تم کرو گے وہ سہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

انہوں نے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "شفتا اب کہاں ہے؟"

"وہ لاہور سے باہر ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میں شفتا اور انجم کو ساہی صاحب کی تحویل میں دے چکا تھا۔ انہوں نے دونوں کو سابق آئی جی ابدال شاہ کے سپرد کرنا تھا۔

"مجھے یاد آتی ہے وہ۔" انہوں نے سسک کر کہا۔

اسی دوران میں سائیں عالی نے مجھے چار دیواری کے اندر سے پکارا۔ میں اور حمزہ کی والدہ کمرے میں واپس آ گئے۔ حمزہ کو پیشاب کی حاجت ہو رہی تھی۔ دو چارپائیاں کھڑی کر کے اس کے لیے پردہ کیا گیا۔ حمزہ کی والدہ اسے پیشاب کرانے میں مصروف ہو گئیں اور ہم سب باہر آ گئے۔

○☆○

عالم قریشی کے گھر میں چار پانچ روز ہم نے سکون سے گزارے۔ آپریشن کے بعد میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ پہلو کا درد بالکل ٹھیک تھا اور عمومی صحت میں بھی بہتری آئی تھی۔ عالم قریشی کا پرانا رنگ ڈھنگ دھیرے دھیرے بحال ہو رہا تھا۔ دو تین ہفتے پہلے کے سنگین واقعات بتدریج اس کے ذہن سے محو ہو رہے تھے۔ "صندلی قصبے" کے شیر محمد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اس نے شیر محمد کے اعزاز میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ عالم قریشی کھانے کھلانے کا دلدادہ تھا۔ وہ ہر "صورت حال" میں سے ضیافت اور دعوت کی "صورتِ حال" نکال لیتا تھا۔ کوئی پرانا دوست ملے تو ضیافت' پرانا دوست بچھڑے تو ضیافت' نیا دوست بنے تو ضیافت' پاکستان کرکٹ میچ جیتے تو ضیافت' کوئی تہوار آئے تو ضیافت' کوئی پیدا ہو تو ضیافت اور کوئی مرے بھی تو ضیافت۔ شیر محمد نے کئی روز ہماری میزبانی کی تھی' عالم قریشی نے کوشش کی کہ ایک ہی روز میں کئی روز کی کسر نکل جائے۔ بڑا وسیع و عریض دستر خوان تھا۔

میں ایک دن چھوڑ کر ایک دن حمزہ کی خیریت دریافت کرنے جا رہا تھا۔ اس کی حالت اگر بہتر نہیں ہو رہی تھی تو خراب بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بوڑھا معالج مٹی کی مختلف اقسام سے اس کا علاج جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایک روز پہلے ساہی صاحب سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے غیر متوقع طور پر بتایا تھا کہ شفقتا اور انجم ابھی تک ان کے پاس ہی ہیں۔ دراصل ساہی صاحب نے ان دونوں کو جن سابق آئی جی صاحب کی تحویل میں دینا تھا وہ کسی فوری کام کے سلسلے میں اسلام آباد چلے گئے تھے اور ان کی واپسی تین چار روز تک متوقع تھی۔ ساہی صاحب نے مجھے بتایا کہ شفقتا اور انجم کی حفاظت کا تسلی بخش انتظام کیا گیا ہے اور انہیں آئی جی ابدال شاہ صاحب کی تحویل میں دیتے ہوئے بھی پوری احتیاط اور رازداری سے کام لیا جائے گا۔

ساہی صاحب نے مجھ سے سروج اور سائیں عالی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی مقیم ہیں۔ عالم قریشی نے انہیں بالائی منزل کا ایک کمرا دے رکھا ہے۔ ساہی صاحب کو زریں گل کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ سروج روز بہ روز میرے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس سلسلے میں سائیں عالی بھی اس سے بھرپور تعاون کر رہا ہے۔ ساہی صاحب چاہتے تھے کہ میں اس سلسلے میں احتیاط سے کام لوں' انہوں نے کہا "شاد جہاں! یہ کبھی مت بھولنا کہ سروج انڈین ہے' اور ہندو ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص مشن کے تحت تمہارے قریب آ رہی ہو۔"

میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں جناب۔ میں اس حوالے سے پوری طرح چوکس ہوں۔ باقی نوّے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ سروج کے رویے میں کسی سازش کو دخل نہیں۔ میں خدانخواستہ آپ کی بات کو جھٹلانا نہیں چاہتا صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سروج کی حالت آج کل ذہنی مریضہ کی سی ہے۔ کسی وقت اسے دورہ پڑتا ہے اور وہ بالکل بکھری جاتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو کمپوز نہ رکھ سکتا ہو وہ کسی سازش کو کمپوز کیا کرے گا۔"

جس وقت میں ساہی صاحب سے گفتگو کر رہا تھا' میرا ایک ٹیلی فون آ گیا۔ ٹیلی فون کی اطلاع دینے والی زریں کی بیوی گلثوم تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے حمزہ کی والدہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید کسی پی سی او سے بول رہی تھیں۔ کہنے لگیں "شاد جہاں بیٹا! تم جلدی آ جاؤ۔ حمزہ نے۔ حمزہ نے۔" ان کی آواز رندھ گئی اور وہ کچھ بھی بول نہ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے عالم قریشی اور ساہی صاحب کو بتایا۔ ساہی صاحب نے مشورہ دیا کہ ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔ عالم قریشی نے گاڑی نکالی۔ میں اور عالم قریشی قریباً نصف گھنٹے میں میانی صاحب قبرستان پہنچ گئے۔ یہ دوپہر تھی لیکن قبرستان کے کئی گوشے اب بھی نیم تاریک تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم افریقہ کے کسی پُراسرار جنگل میں گھس آئے ہیں۔ حیرت کی بات تھی کہ یہ پُراسرار جنگل زندہ دلان کے شہر لاہور کے قلب میں واقع تھا۔ زندگی کی گہما گہمی کے بیچوں بیچ موت ایسے ہی خاموشی سے چھپی رہتی ہے۔

ہم بھاگم بھاگ سادھو کے ڈیرے پر پہنچے۔ حمزہ اپنے بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی والدہ نے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حمزہ کے بستر کی چادر بدلی گئی ہے۔ پرانی چادر لہو سے تربتر تھی "یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

نوجوان گورکن صادقے نے حمزہ کی اس کلائی کی طرف اشارہ کیا جس پر ہاتھ موجود نہیں تھا۔ کلائی پر تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر خون کے دھبے تھے۔ صادقا بولا "صاحب نے شیو کرنے والے بلیڈ سے اپنی کلائی کی نس کاٹ لی تھی۔ ہمیں اس وقت پتا چلا جب خون چارپائی سے نیچے ٹپکنے لگا۔ اگر تھوڑی دیر اور گزر جاتی تو ان کا بچنا محال تھا۔"

حمزہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ غالباً کمزوری کی وجہ سے اس پر گہری

غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

حمزہ کی والدہ نے کہا "شاد جہاں! میرا بیٹا اس کمرے میں گھٹ کر مر جائے گا' خدا کے لیے اسے یہاں سے لے جانے کی اجازت دلوا دو۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے سادھو جی کی طرف دیکھا۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔ بولا "ابھی ایک ہفتہ مزید اس کو یہاں رہنا ہو گا۔ ورنہ میری کوئی ذمے داری نہیں ہو گی۔"

"لیکن وہ یہاں گم صم پڑا رہتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ذہنی مریض نہ بن جائے۔" حمزہ کی والدہ نے کہا۔

سادھو بولا "بی بی! اگر یہ گم صم رہتا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم اسے گم صم نہ رہنے دو۔ باتیں کرو اس سے۔"

"کب تک باتیں کروں اور کب تک وہ میری باتیں سنے۔ کوئی آتا جاتا نہیں ہے یہاں۔ سب ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ گئے ہیں۔ پہلے اس کا ماموں اور چچا آتے تھے' اب وہ بھی شکل نہیں دکھاتے۔ سچ کہتے ہیں' مصیبت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔" حمزہ کی والدہ سخت مایوس نظر آ رہی تھیں۔

میں نے کہا "آپ گھبرائیں مت آنٹی۔ اب میں روزانہ آیا کروں گا۔ بلکہ صبح و شام آیا کروں گا۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی حمزہ نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ وہ یرقان کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور ترس بھی۔ ترس اس بات کا تھا کہ وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا اور غصہ اس بات کا کہ پڑھا لکھا اور باشعور ہونے کے باوجود اس نے کم ہمتی کا ثبوت دیا تھا اور موت کو گلے لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی حالت اچھی نہیں تھی ورنہ میرے منہ سے ضرور اس کے لیے تلخ و ترش باتیں نکل جاتیں۔

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا اور مسلسل تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور نتھنے بار بار پھڑک جاتے تھے۔ وہ بڑی نحیف آواز میں بولا "بھائی جان! آپ مجھ سے جتنی محبت کرتے ہیں مجھے اتنا ہی آپ سے خوف آنے لگتا ہے' میرا دل چاہتا ہے کہ آپ سے دور' بہت دور چلا جاؤں۔ میری منحوس زندگی کا سایہ بھی آپ لوگوں پر نہ پڑے۔"

میں نے کہا "اگر تم صحت مند ہوتے تو میں اس بات کا ایسا سخت جواب تمہیں دیتا کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔ آئندہ ایسی بات منہ سے مت نکالنا۔"

اس روز رات گئے تک میں اور عالم قریشی ڈاکٹر حمزہ کے پاس رہے۔ میرے یہ نو دس گھنٹے ضائع نہیں گئے۔ جب ہم حمزہ کے پاس سے واپس آئے تو وہ اپنی خطرناک یاسیت کی دلدل سے قریباً قریباً نکل چکا تھا۔

اگلے روز بھی میں نے کافی وقت حمزہ اور اس کی والدہ کے ساتھ گزارا۔ ایک روز پہلے مجھے حمزہ پر جو غصہ آیا تھا وہ بتدریج ہمدردی میں ڈھل گیا تھا۔ حمزہ کئی روز سے اس کمرے میں قید تنہائی کاٹ رہا تھا۔ ایک والدہ کے سوا اس کا کوئی غمگسار نہیں تھا۔ عزیز و اقارب انہیں مصیبت میں دیکھ کر ایک دم کنارہ کش ہو گئے تھے۔ چچا انور احمد تھے لیکن انہیں بھی ایک نہایت ضروری کام سے ایتھنز جانا پڑ گیا تھا۔ دوسرے چچا وہی سلطان احمد صدیقی تھے۔ حمزہ اور شفقتا کے رشتے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے تھنگر نے انہیں اس بری طرح ڈرایا دھمکایا تھا کہ انہیں دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔ مکمل طبی معائنے کے بعد ڈاکٹروں نے ان کا آپریشن تجویز کر دیا تھا۔ انور احمد دراصل اسی آپریشن کے سلسلے میں ایتھنز گئے تھے۔ یہ دونوں بھائی میڈیسن کا کام کرتے تھے اور حمزہ کی والدہ کا بھی اس کام میں شیئر تھا۔ کاروبار کی حالت پہلے بھی کچھ اچھی نہیں تھی' پے در پے صدمات اور دونوں بھائیوں کی غیر حاضری کی وجہ سے کاروبار کا شدید نقصان ہوا تھا۔ کاروبار کے لیے ایک بینک سے قرضہ لیا گیا تھا اور وہ بینک نوٹس پر نوٹس بھیج رہا تھا۔ خطرہ تھا کہ "ڈگری" وغیرہ کا چکر پڑ جائے گا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں ڈاکٹر حمزہ کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ خود کو اپنے اوپر بوجھ سمجھ رہا تھا۔ میں پورے دل سے محسوس کر رہا تھا کہ اسے سہارے کی شدید ضرورت ہے۔ میں کئی گھنٹے حمزہ کے پاس بیٹھا رہا۔ دل جوئی کی باتیں کیں۔ اس کو زندگی سے پیار کی تلقین کی۔ اسے سمجھایا کہ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ تیسرے روز میں حمزہ کی تیمارداری کے لیے گیا تو میرے ساتھ عالم قریشی کے بجائے شفقتا تھی۔ میں اسے بڑی رازداری کے ساتھ ساہی صاحب کے گھر سے یہاں لے آیا تھا۔ شفقتا سے مل کر حمزہ کی والدہ جیسے پھر سے جی اٹھیں۔ حمزہ کی کیفیت برعکس تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اس حالت میں شفقتا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شفقتا تو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ

گئی۔ پتا نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے' خجالت کے تھے یا دکھ کے۔ اس روز سائیں عالی بھی ہمارے ساتھ آیا تھا۔ میری درخواست پر سائیں عالی نے حمزہ کے بوڑھے معالج سے سفارش کی کہ "مریض" ایک ہی چھت تلے پڑے پڑے اکتا گیا ہے' لہٰذا اگر مناسب ہو تو اسے چھٹی دے دی جائے۔

ساد ھو نے حسب معمول کراہتے ہوئے کہا "سائیں صاحب! میرے حساب کے مطابق تو ابھی اسے کم از کم ایک ہفتہ مزید یہاں رہنا چاہیے تھا' بہرحال اگر گھر میں طریقے کے مطابق اس کا علاج جاری رکھا جا سکتا ہے تو دو روز بعد میں اسے یہاں سے فارغ کر سکتا ہوں۔"

سائیں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' ہم سادھو جی کی ہدایت کے مطابق گھر میں علاج کر لیں گے۔"

دو روز بعد ڈاکٹر حمزہ کو شہر خموشاں کے اس انوکھے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ اس کی حالت کافی پتلی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا اور رنگ یرقان کے مریض کی طرح زرد تھا۔ اس کی ٹانگ کا بالائی گوشت پچکا ہر گل گیا تھا لیکن نیچے سے جو گوشت نمودار ہو رہا تھا وہ سرخ تھا۔ کبھی کبھی ٹانگ کے نچلے حصے سے خون بھی رسنے لگتا تھا۔ ہماری سمجھ بوجھ کے مطابق ٹانگ کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن سادھو اس بات پر مصر تھا کہ جس طرح مریض کی زندگی بچی ہے' ٹانگ بھی بچے گی۔ حمزہ فی الوقت چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی زندگی چارپائی تک محدود تھی۔ اس نے قبرستان کے اس تنگ و تاریک کمرے میں شدید اذیت اور تنہائی کے شب و روز گزارے تھے' میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے گھر لے جانے کے بجائے کسی تفریحی مقام پر لے جاؤں۔ کسی ایسی صحت افزا جگہ پر جہاں اس کے دل و دماغ کا موسم بدل سکے۔

میں نے عالم قریشی سے بات کی۔ اس نے چند گھنٹے کے اندر اندر ہمارے لیے ایبٹ آباد میں قیام و طعام کا بندوبست کر دیا۔ ہم ایک شاندار و آرام دہ منی کوچ میں پہلے پنڈی پہنچے اور وہاں سے ایبٹ آباد آگئے۔ میرے اور شفقت کے علاوہ حمزہ کی والدہ بھی حمزہ کے ساتھ تھیں۔ ایبٹ آباد کے ایک پوش علاقے میں عالم قریشی کے دوست کا ذاتی بنگلا موجود تھا۔ بڑی خوب صورت لوکیشن تھی۔ ایک طرف مری اور نتھیا گلی کے بلند و بالا پہاڑ نظر آتے تھے' دوسری طرف نشیب میں حویلیاں اور ہری پور تک ایک وسیع و عریض منظر کھلا ہوا تھا۔ بائیں رخ پر ایبٹ آباد کا شہر تھا اور یہ بھی قدرے نشیب میں نظر آتا تھا۔ موسم خنک تھا' بہرحال مری اور نتھیا گلی جیسی

سردی تو یہاں نہیں تھی۔ حمزہ کا بستر ایک صاف ستھرے روشن کمرے میں تھا۔ کھڑکی میں سے دور تک دلکش مناظر دکھائی دیتے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کا رنگ ہلکا نیلا تھا اور آنکھوں کو عجیب سی ٹھنڈک بخشتا تھا۔ عالم قریشی نے دبے لفظوں میں کہا "یار! اتنا شاندار کمرا دیکھ کر تو میرا دل بھی بیمار ہونے کو چاہنے لگا ہے۔"

میں نے کہا "اپنی طرف سے تو تم پوری کوشش کرتے رہتے ہو بیمار ہونے کی۔ میرا خیال ہے کہ جلد یا بدیر تمہاری یہ خواہش بڑے اچھے طریقے سے پوری ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" عالم قریشی نے کہا۔

"مطلب تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ دوپہر کو تم کہہ رہے تھے کہ سفر میں تمہیں بھوک نہیں لگتی پھر بھی گوجر خان کے ہوٹل میں تم نے پورے دو چرغے کھائے اور گوبھی گوشت کی ڈھائی تین پلیٹیں بھی صاف کیں۔ اس کے بعد تم سویٹ ڈش بھی مانگ رہے تھے۔"

وہ بولا "یار' گوبھی گوشت تو میں نے مجبوراً کھایا تھا۔ دراصل چکن گرم ہوتا ہے' اس کی گرمی کاٹنے کے لیے گوبھی یا شلجم جیسی چیز کھائی جائے تو طبیعت سیٹ رہتی ہے۔ باقی رہی سویٹ ڈش تو وہ گوبھی کو ہضم کرنے کے لیے ضروری ہوتی تھی۔"

"یار! تم صفائیاں پیش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتا ہوں تمہارے کھانے پینے کے یہ سلسلے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ مجھے یاد ہے پچھلے ہفتے شیر محمد کی حویلی میں تم نے سویٹ ڈش ہضم کرنے کے لیے سوڈا واٹر پیا تھا اور پھر سوڈا واٹر کو ہضم کرنے کے لیے کسی اور چیز کا نام بتا رہے تھے۔"

عالم قریشی ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور آنکھیں عمودی رخ پر چھوٹی ہو جاتی تھیں جبکہ افقی رخ پر پھیل جاتی تھیں۔ عالم قریشی صرف ہمیں چھوڑنے کے لیے ایبٹ آباد آیا تھا لیکن ایک رات رہنے کے بعد اس کا دل ایسا لگا کہ اس نے چند دن ہمارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس نے رہنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر یہ بات بھی یقینی تھی کہ عالم قریشی کی "چھوٹی" بھی وہاں آئے گی۔ اپنی چھوٹی کے بغیر وہ کہیں بھی زیادہ دیر نکتا نہیں تھا۔ چھوٹی بڑی ہوشیار تھی' اس نے عالم قریشی کی دکھتی رگ پکڑ رکھی تھی۔ ایسے ایسے چٹخارے کھانے پکاتی تھی کہ قریشی پھڑک کر رہ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے قریشی کو اس وہم میں بھی مبتلا کر رکھا تھا کہ وہ بہت رنگیلا اور بارعب مرد ہے' اور اس کی جھڑکی

سن کر وہ بھیگی بلی بن جاتی ہے۔ قریشی کے نزدیک عورت میں دو خوبیاں ہونا بہت ضروری تھیں۔ وہ کھانا اچھا پکاتی ہو اور مرد سے رب کر رہتی ہو۔ چھوٹی نے پہلی خوبی تو کوشش کر کے پیدا کر لی تھی' دوسری خوبی کے لیے وہ ایکٹنگ کرتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ قریشی سے زیادہ ڈرتی نہیں۔ بس اس کی خوشی کی خاطر وہ ڈرنے سہمنے کی ایکٹنگ کرتی ہے۔ اب یہ ایکٹنگ اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جتنا دب کر رہے گی' عالم قریشی خود کو اتنا ہی مرد محسوس کرے گا اور وہ خود کو جتنا مرد محسوس کرے گا' ان کی زندگی اتنی ہی خوش گوار اور رنگ دار ہوگی۔ پھر اس سے "چھوٹی" کو ایک اور فائدہ بھی تھا۔ بارعب اور رنگیلے قسم کا عالم قریشی "بڑی" کے لیے اور بھی ناقابل اصلاح ثابت ہو سکتا تھا۔ "بڑی" سیدھی سادی عورت تھی۔ دل کی بات فوراً زبان پر لے آتی تھی۔ نتیجے میں عالم قریشی کی "مردانگی" کو ٹھیس پہنچتی تھی اور وہ مار کٹائی پر اتر آتا تھا۔

دو روز بعد عالم قریشی کی چھوٹی بھی بن ٹھن کر اور چوڑی چھنکا کر ایبٹ آباد پہنچ گئی۔ اس نے آتے ساتھ ہی کچن سنبھال لیا اور دیسی گھی کے جہازی سائز ڈبے کا منہ کھول دیا۔ وہ خالص پنجابی کھانے پکاتی تھی اور تقریباً ہر کھانے میں دیسی گھی لازمی جزو کی حیثیت رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد گفتگو کی محفل جمتی یا ہم حمزہ والے کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی وغیرہ دیکھتے۔ اس خوش گوار ماحول میں حمزہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ خاص طور سے عالم قریشی کے چٹکلے اسے اکثر مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ بہرحال وہ ابھی تک بستر سے ملنے جلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی والدہ شب و روز اس کی تیمارداری کر رہی تھیں' حسب ضرورت شفقت بھی ان کی مدد کرتی تھی۔ حمزہ کی ٹانگ پر روزانہ صبح کے وقت ایک خاص قسم کی مٹی کا لیپ کیا جاتا تھا۔ شام سے پہلے ٹانگ نیم گرم پانی سے دھو دی جاتی تھی اور اچھی طرح صاف کرنے کے بعد اسے کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک محلول بھی صبح و شام اسے پینے کے لیے دیا جاتا تھا۔ حمزہ کی والدہ کا کہنا تھا کہ اس میں کوئی دوائی ہے لیکن مجھے تو وہ بھی سرخی مائل مٹی کا محلول لگتا تھا۔ بہر طور حمزہ کی ٹانگ اب کم خوف ناک نظر آنے لگی تھی۔ ٹانگ کے گرد چیتھڑوں کی طرح لٹکتی ہوئی کھال اب سیاہی مائل ہو کر جھڑنا شروع ہو گئی تھی۔ نیچے سے نظر آنے والا سرخ گوشت اب گندمی رنگ اختیار کر گیا تھا۔ ٹانگ کے نچلے حصے سے خون کا رساؤ بھی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔

زریں گل اور کلثوم لاہور ہی میں تھے۔ سائیں عالی اور سراج بھی وہیں رہ گئے تھے۔ تین چار روز میں سراج کے آٹھ دس فون آچکے تھے۔ اکثر اس کا فون رات کو آیا تھا' یہ بڑا ترغیب آمیز فون ہوتا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی تھی اور مجھے بتاتی تھی کہ میرے بغیر یہ رات کتنی سونی اور اداس ہے۔ وہ میری بانہوں کو یاد کرتی تھی اور بڑی بے باکی سے اس بستر کا ذکر کرتی تھی جو سراج کے ساتھ ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔ ایک ایسے ہی فون کے دوران میں وہ بڑبڑانے لگی اور زریں گل کی شان میں غائبانہ قصیدے پڑھنے لگی "کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "مجھے تو لگتا ہے پچھلے جنم میں یہ شخص تمہاری چٹنی تھا' ہر وقت بھوت کی طرح سوار رہتا ہے میرے سر پر۔ ایسی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے کہ بڑی سے بڑی سوتن بھی کیا دیکھتی ہوگی۔ میں ٹیلی فون کرتی ہوں تو آس پاس گھومتا رہتا ہے۔ دروازوں سے کان لگاتا ہے اور کھڑکیوں سے جھانکتا ہے۔ پتا نہیں کیا بگاڑا ہے میں نے اس کا۔ میں سچ کہتی ہوں شاہ جہاں! اسے اپنے پاس بلا لو یا پھر مجھے بلا لو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے اس خونی سے۔"

میں نے کہا "فی الحال میں تم دونوں میں سے کسی کو نہیں بلا سکتا اور نہ خود آسکتا ہوں۔"

شفقت پہلے ایک دو روز بہت چپ چپ رہی تھی۔ پھر میں نے بٹھا کر اسے سمجھایا تھا۔ میں نے کہا تھا "شفقت! ہمارے درمیان کبھی کوئی پردہ نہیں رہا۔ میں تمہارے دل میں اتنی ہی آسانی سے جھانک سکتا ہوں جتنی آسانی سے اپنے دل میں جھانک لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دل میں حمزہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی تھیں۔ اس بات کا یقین ہونے کے بعد ہی میں نے تمہاری منگنی کی بات کی تھی لیکن اب حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں کہ میں جو ہمیشہ تمہارے دل میں جھانک لیا کرتا تھا اب اپنی کوشش میں ناکام ہو رہا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو گی۔ مجھے بتاؤ گی کہ موجودہ حالات میں تم اپنے اور حمزہ کے بارے میں کیا سوچ رہی ہو؟"

شفقت کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ اس نے کہا "بھیا! حالات کی تبدیلی میرے لیے اہم نہیں ہے۔ باقی میری سوچ کا آپ مجھ سے مت پوچھیں۔ آپ سے جدا میری اپنی کوئی سوچ ہے ہی نہیں۔ جو آپ سوچیں گے وہی میری سوچ ہوگی۔"

میں نے کہا "شفقت' حالات نے ہم بہن بھائی کو ایک اہم

موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ حمزہ اب وہ نہیں جو چند ہفتے پہلے تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے معذور ہو چکا ہے۔ اس کی ٹانگ کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اس کے مالی حالات اتنی تیزی سے دگرگوں ہوئے ہیں کہ فی الوقت وہ قریباً مفلس ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ساری حقیقتیں ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ حمزہ اس حادثے کا شکار ہونے سے پہلے بھی تمہیں دل و جان سے چاہتا تھا۔ تمہیں اپنانے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔"

شفقا کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے کچھ نہیں بول رہی تھی لیکن اس کی خاموشی ہمیشہ کی طرح مجھ سے بول رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "بھیا! آپ نے جس آخری حقیقت کا ذکر کیا ہے' وہی سب سے بڑی اور سب سے قیمتی حقیقت ہے۔ باقی سب کچھ بے معنی ہے' بے وقعت ہے۔"

کمرے کی بولتی ہوئی خاموشی کو توڑنے کی ضرورت تو نہیں تھی' پھر بھی میں نے خاموش رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے کہا "شفقا! مستقبل کے بارے میں تو فی الحال خیال آرائی کی جا سکتی ہے لیکن جو چیز ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے وہ حمزہ کی لاچاری اور کس مپرسی ہے۔ اسے ہماری توجہ اور سہارے کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں ہمیں اپنا یہ ذمے داری پوری کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔"

اس گفتگو کے بعد شفقا کا رویہ تبدیل ہوا تھا۔ ایک معصوم پیاری سی جھجک جو اسے ہر وقت گھیرے رکھتی تھی' دور ہو گئی تھی۔ اب وہ حمزہ کی والدہ کے ساتھ مل کر اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ اس سے باتیں کر لیتی تھی' کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اسے کوئی ڈائجسٹ یا کتاب وغیرہ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ حمزہ ابھی اتنا کمزور تھا کہ بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں اور شفقا اسے بمشکل اٹھا کر گاؤ تکیے کے سہارے بٹھاتے تھے۔ ایسے میں اس کی ٹانگ سے ٹیسیں اٹھتی تھیں اور آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا۔ اذیت اور ذہنی کرب کے سات سمندروں میں سے گزر کر اس کا دل بہت نرم ہو گیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا لیٹا اشارے سے نماز پڑھتا تھا اور والدہ کا بتایا ہوا ورد بھی کرتا رہتا تھا۔

ایک دن بارش ہوئی۔ ہم نے اسے وہیل چیئر پر بٹھایا' گھٹنوں پر کمبل ڈالا اور باہر برآمدے میں لے آئے۔ وہ بڑی سہانی صبح تھی۔ بادلوں کے پرے مری و نتھیا گلی کی چوٹیوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ جیسے کوئی پیراک پانی کی لہروں میں ڈوبتا ہے' پھر ابھرتا ہے اور طویل سانس لے کر پھر غوطہ زن

ہو جاتا ہے' یہ چوٹیاں بھی ڈوب اور ابھر رہی تھیں۔ حدِ نگاہ تک درخت' ان درختوں پر بارش کی پھوار' بھیگی بھیگی وادیاں اور ان وادیوں میں بادلوں کی اٹکھیلیاں۔ ایسا طلسماتی منظر تھا کہ نگاہیں جامد ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں نے کن انکھیوں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔ یہ منظر اسے بھی کشش کر رہا تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے سے دکھ اور اذیت کے سائے مکمل طور پر اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسے بچے کے مانند نظر آ رہا تھا جو مسلسل روتے روتے کسی خوب صورت یا مزے دار چیز کو دیکھ کر بہل جائے لیکن اس کے سینے سے ایک دکھ بھری ہچکی بدستور بلند ہوتی رہے اور اس کی آنکھوں میں بدستور آنسو تیرتے رہیں۔ اس نے اپنا معذور بازو غیر ارادی طور پر کمبل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ کوٹ کا بٹن بند کرنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ اکلوتے ہاتھ سے کوشش کرنے کے باوجود بٹن بند نہیں کر سکا۔ شفقا کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ بٹن بند کر دے۔ اس نے آگے بڑھ کر بٹن بند کرنے میں حمزہ کی مدد کی۔ اپنی لاچاری کو محسوس کر کے حمزہ کچھ اور بھی گم صم نظر آنے لگا۔ سچ کہتے ہیں کہ اصل موسم دل کا موسم ہوتا ہے۔ ہم ایک نہایت جاذب نظر منظر کے روبرو کھڑے تھے لیکن بالکونی میں وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے حمزہ کے دل میں ویرانی تھی لہٰذا قرب و جوار کی ہر دلکشی اس کے لیے بے معنی ہو گئی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ صرف ہماری خوشی کی خاطر خود پر جبر کر کے وہاں بیٹھا ہوا ہے' ورنہ اپنے کمرے میں جانا اور کمبل اوڑھ کر چپ چاپ لیٹ جانا اس کے لیے زیادہ راحت کا باعث ہے۔

میں حمزہ کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ بادل ایک بار پھر جھوم کر آئے تھے اور دن ہی میں شام کا منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ کہیں دور چوٹیوں پر بجلی تڑپی پھر گھن گرج سنائی دی اور درختوں کے پتوں پر گرنے والی بارش کی آواز تیز ہو گئی۔ ہلکی پھوار بالکونی کے اندر تک پہنچ رہی تھی' ہمارے پاؤں نم آلود ہو رہے تھے۔ میں نے کہا "حمزہ کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ بولا "کوئی ایک سوچ ہو تو بتاؤں بھائی جان۔"

"اچھا کوئی ایک ہی بتا دو۔"

"چچا سلطان بہت یاد آ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ مجھے کتنے عزیز ہیں۔ باپ کے بعد انہوں نے مجھے باپ کا سایہ دیا ہے۔ وہ میرے سرپرست ہی نہیں میرے ہم خیال دوست بھی ہیں۔ انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ہے۔ آج وہ ہزاروں میل دور اٹلانٹک کے کسی اسپتال میں

بیماری کاٹ رہے ہیں' مالی مشکلوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے' میں کتنا بدنصیب ہوں کہ انہیں دیکھ نہیں سکتا' ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ الٹا ان پر بوجھ بن گیا ہوں۔"

میں نے کہا "تم انہیں دیکھ تو بے شک نہیں سکتے لیکن ان کی مدد ضرور کر سکتے ہو۔ اور وہ مدد یہ ہے کہ تم جلد از جلد تندرست ہو جاؤ۔ یقین کرو تمہارے چچا کو تمہاری طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جائے گا تو وہ بھی اپنی بیماری سے اور اپنے حالات سے لڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تمہارے تندرست ہونے کی لازمی شرط یہ ہے کہ تم اپنے ذہن کو ہر قسم کے بوجھ سے آزاد رکھنے کی کوشش کرو اور خوش رہو۔"

ہم کافی دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ عالم قریشی بھی ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اسے بے شمار لطیفے یاد تھے جو وہ موقع محل کے لحاظ سے سناتا رہتا تھا۔ اس کے ہر لطیفے میں ایک چیز بڑی مزے دار ہوتی تھی۔ جب وہ لطیفہ سنا کر ہنستا تھا تو اس کی چربی دار توند بڑے دلچسپ انداز میں تھرکتی تھی۔ توند کا یہ "تواتر" لطیفے کا لطف دوبالا کر دیتا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ وہ مختلف کھانوں اور ان کی خصوصیات پر چھوٹے چھوٹے لیکچر بھی دیتا جاتا تھا اور یہ لیکچر واقعی سننے کی چیز ہوتے تھے۔ مثلاً وہ مٹن قورمے کی بات شروع کرتا تھا تو اس کی پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔ وہ آپ کو بتا سکتا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں مٹن قورمہ ایجاد ہوا تھا یا نہیں۔ اور کون سا فرعون مٹن قورمے کی خاطر اپنی آدھی سلطنت سے محروم ہو گیا تھا اور غلجی خاندان کے کس بادشاہ نے شاندار مٹن قورمہ بنانے والی کنیز کو ملکہ کا درجہ دے دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مٹن قورمے کی تاریخ بتانے کے بعد وہ اس کی خصوصیات پر اتنا پر اثر لیکچر دیتا تھا کہ انسان کا دل' اپنا سر پیٹنے کو چاہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس نے اپنی اتنی عمر رائگاں کر دی۔ اب تک کی عمر میں اگر دو چار سو مرتبہ مٹن قورمہ کھایا بھی تو کیا کیا۔ یہ تو وہ چیز تھی کہ اسے دن رات کھایا جاتا اور اتنا کھایا جاتا کہ کھانے کا حق ادا ہو جاتا۔

مجھے یاد آیا کہ عالم قریشی کی زبان سے مٹن قورمے کے بارے میں ایک ایسا ہی لیکچر سننے کے بعد زریں گل نے کہا تھا "زندگی میں تو سبھی قورمہ کھایا کرتے ہیں۔ ہم تو مر کر بھی میری جان قورمہ کھائے گا۔"

رم جھم برستی بارش کے سامنے' بالکونی میں بیٹھ کر ہم دیر تک عالم قریشی کی دلچسپ باتیں سنتے رہے اور اس مچھلی کی خوشبو سونگھتے رہے' جو عالم قریشی کی "چھوٹی" کچن میں بھون

رہی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ شفقا اٹھی اور لپک کر فون اٹھایا "ہیلو کون۔ اچھا میں بلاتی ہوں۔ ذرا ہولڈ کریں۔" اس نے کہا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ حمزہ کی والدہ کی طرف دیکھ رہی تھی جو ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد بس سلام پھیرنے ہی والی تھیں۔

"کون ہے بیٹی؟" حمزہ کی والدہ نے سلام پھیر کر پوچھا۔

"امریکا سے کال ہے خالہ۔"

حمزہ کی والدہ "یا اللہ خیر" کہتی ہوئی اٹھیں۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگایا' چند لمحے بعد وہ چیخ اٹھیں "کیا کہا؟"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک اور چیخ ماری اور ریسیور پھینک کر ماتم کناں ہو گئیں۔ حمزہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ باقی سب بھی ششدر تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف حمزہ کے چھوٹے چچا انور احمد تھے۔ یہ وہی صاحب تھے جو ہمارے ساتھ میانی صاحب قبرستان میں بھٹکتے رہے تھے۔ وہ میری آواز پہچان کر بولے "تم شاہ جہاں ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا "بھائی سلطان آج صبح دل کے دورے سے فوت ہو گئے ہیں۔ ہم ان کی میت پاکستان لانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ تمہاری بہت مہربانی ہو گی' تم بھابی کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اگر حمزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو اس تک یہ اطلاع نہیں پہنچنی چاہیے۔ اسے بڑا پیار تھا بھائی سلطان سے۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے ان کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ سسکیاں لینے لگے۔

میں نے انہیں بتایا کہ حمزہ میرے قریب ہی موجود ہے اور وہ اس خبر سے آگاہ ہو چکا ہے۔ انور احمد نے دو تین فقروں میں حمزہ کا حال احوال دریافت کر کے فون بند کر دیا۔

حمزہ نے اپنا چہرہ اکلوتے ہاتھ میں چھپا رکھا تھا اور ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔ حمزہ کی والدہ پر نیم غشی کی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کا خوشگوار ماحول اچانک ہی ماتمی فضا میں ڈھل گیا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ گھرانا ہر طرف سے دکھوں کے نرغے میں تھا۔

وہ ساری رات حمزہ اور حمزہ کی والدہ نے روتے ہوئے گزاری۔ ان کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی سوگوار تھے۔ رات کے پچھلے پہر امریکا سے دوبارہ فون آیا۔ معلوم ہوا کہ میت واپس پاکستان لانے میں کچھ مسائل درپیش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کام میں تین چار روز لگ جائیں۔ اس روز صبح کے وقت جب حمزہ بڑے غمگین موڈ میں بستر پر نیم دراز تھا

تو میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہی ہے کچھ عرصہ پہلے میں اور زریں گل ایک چکر میں پھنس گئے تھے اور ہمیں گلگت جانا پڑا تھا۔ گلگت سے آگے کی ایک الگ تھلگ وادی "واخان" کے بارے میں بھی تم نے سن رکھا ہے۔ اسی وادی واخان میں ہماری ملاقات ایک عجیب و غریب شخص سے ہوئی تھی۔ وہ ہپناٹزم اور اس قسم کے دیگر علوم میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ اس شخص کے حوالے سے جو کچھ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' کانوں سے سنتے تو کبھی یقین نہ کرتے۔ وہ ایک جیتا جاگتا کرشمہ ہے حمزہ۔ اس کی کچھ باتوں سے ہمیں اختلاف تھا لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہمارے دل و دماغ میں گھر کر چکی ہیں اور شاید کبھی نکلیں گی نہیں۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ زندگی نام ہی اذیت اور راحت کا ہے۔ ہمیں بڑی سے بڑی اذیت (دکھ) سے گھبرانا نہیں چاہیے کیونکہ اذیت کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ اس کے بدلے انسان کو راحت یعنی خوشی مل کر رہتی ہے۔ ہم کو کاتب تقدیر سے گلے شکوے کرنے کے بجائے اپنے سینے اذیت کے لیے کھول دینے چاہئیں۔ ہمیں چاہیے کہ پردۂ غیب سے اپنی طرف آنے والے ہر دکھ کو خندہ پیشانی سے قبول کریں اور کسی بھی حالت میں مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیں۔ یہاں اذیت یا دکھ سے مراد "غم" نہیں ہے بلکہ ہر وہ عمل یا کیفیت ہے جو ہمارے نفس کے لیے ناپسندیدہ ہو۔ اس میں مشقت بھی شامل ہے' بھوک بھی شامل ہے' موسموں کی سختی بھی شامل ہے۔ محرومی' صبر' ندامت' الجھن' خوف' نارسائی' بیماری غرض ہر وہ کیفیت جس سے ہمارے نفس کو ٹھیس پہنچے۔ ہمیں ان ساری کیفیات کو دل سے خوش آمدید کہنا چاہیے اور اس بات پر پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ ساری کیفیات ایک نہایت حساس ترازو میں تولی جا رہی ہیں اور ان کے بدلے' ان کے وزن کے عین برابر ہمیں راحت مل کر رہے گی۔ اور یہاں راحت سے مراد صرف خوشی نہیں بلکہ وہ ساری حالتیں اور کیفیات ہیں جو ہمارے نفس کے لیے پسندیدہ ہیں۔ مثلاً کامیابی' محبت' آرام' فخر' خوب صورتی' صحت وغیرہ وغیرہ۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے حمزہ' تو قدرت دراصل غم دے کر ہمیں خوشی کی نوید سناتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ہمارا امتحان بھی ہوتا ہے' قدرت ہم پر اپنے انعامات کی بارش کرنے کے لیے ہماری برداشت کو آزماتی ہے اور ہمارے ظرف کو پرکھتی ہے۔"

میں دیر تک حمزہ سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندر سے پوری طرح مسمار ہو چکا ہے۔ میں ایک ایک اینٹ رکھ کر اسے جوڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ کبھی روتا' کبھی لمبی لمبی آہیں بھرنے لگتا۔

اگلے تین چار روز ایک ناخوشگوار بلکہ دکھ بھری مصروفیت کی نذر رہے۔ ہم اپنا "تفریحی قیام" ادھورا چھوڑ کر ایبٹ آباد سے واپس لاہور آ گئے۔ یہاں دو روز بعد حمزہ کے چچا کی میت بھی پہنچ گئی۔ تجہیز و تکفین کے بعد بھی دو چار روز افسوس کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ان معمولات کی وجہ سے حمزہ کی سنبھلی ہوئی طبیعت پھر بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ کے زخموں سے خون رسنے لگا تھا اور بخار بھی آنے لگا تھا۔ ایک روز حمزہ کی والدہ نے غم زدہ لہجے میں مجھ سے کہا "بیٹا! میری بات مانو تو حمزہ کو وہیں ایبٹ آباد لے چلو۔ وہاں آب و ہوا تبدیل ہو گی اور اسے آرام بھی ملے گا۔"

میرا اپنا خیال بھی مختلف نہیں تھا۔ ایبٹ آباد واپس جانے کے لیے کسی لمبے چوڑے انتظام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہاں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ عالم قریشی اپنی "چھوٹی" کے ساتھ وہاں مقیم تھا۔ وہ صرف ایک دن کے لیے لاہور آیا تھا اور حمزہ کے چچا کی آخری رسومات میں شریک ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ سلطان صدیقی کی رسم دسواں کے بعد ہم نے ایک مرتبہ پھر سامان پیک کیا اور لاہور سے ایبٹ آباد جا پہنچے۔ تاہم روانہ ہونے سے پہلے ہم ایک بار پھر میانی صاحب قبرستان پہنچے تھے اور حمزہ کے عجیب وضع معالج نے حمزہ کا تفصیلی معائنہ کیا تھا۔ ایبٹ آباد کے سفر میں اس مرتبہ زریں گل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ عالم قریشی کے گھر میں سخت بوریت محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہاں ایک اور مصیبت بھی تھی' یعنی سوہج۔ وہ سج دھج کر پورے گھر میں گھومتی تھی اور زریں کی چھاتی پر مونگ دلتی تھی۔ ان کے درمیان ایک دو چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں۔ بہرحال وہ ساری باتیں زیادہ اہم نہیں تھیں۔ جو بات میرے لیے اہم تھی' وہ یہ تھی کہ زریں گل کو جان کی دھمکی دی جا چکی تھی اور یہ دھمکی کسی ایرے غیرے شخص نے نہیں' ننکر شنکرا نے دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ زریں گل میری نگاہوں سے اوجھل رہے اور میری غیر موجودگی میں اسے شیطان ابن شیطان کی کسی کارروائی کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ میں نے زریں گل کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ایبٹ آباد جانے کی اجازت دے دی۔ میرا خیال تھا کہ اب سوہج بھی ایبٹ آباد جانے کے لیے اصرار کرے گی لیکن غیر متوقع طور پر ایسا

نہیں ہوا۔ دراصل سائیں عالی مہینے کی آخری راتوں میں کوئی چلہ کاٹنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس چلے کے دوران میں بے اناج قسم کی کوئی چیز نہیں کھاتی تھی' اس کے علاوہ کچھ دیگر پابندیاں بھی عائد تھیں۔ سوہج کے لیے لازم تھا کہ وہ سائیں کی دیکھ بھال کے لیے لاہور ہی میں رہے۔

ہم لوگ ایک اسٹیشن ویگن میں اکٹھے ہی ایبٹ آباد پہنچے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ عالم قریشی نے ہمارے لیے ہر شے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ گھر سے اٹھ کر گھر ہی میں آ گئے ہیں۔ ایبٹ آباد پہنچنے کے دو روز بعد ہی حالات تبدیل ہونے شروع ہو گئے۔ حمزہ کی زندگی کو ڈھانپ لینے والے مایوسی کے گہرے بادل غیر محسوس طور پر چھٹنے لگے۔ سب سے پہلے تو یہ اطلاع ملی کہ حمزہ کے چچا مرحوم سلطان صدیقی نے ایک گراں قدر بیمہ پالیسی خرید رکھی تھی۔ اس کا کلیم تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے تھا۔ سلطان صدیقی کی وفات کے بعد وصیت نامے کی رو سے یہ رقم اب حمزہ کو ملنے والی تھی۔ ڈوبتے ہوئے کاروبار اور دگرگوں حالات کو سنبھالا دینے کے لیے یہ رقم بہت کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔

اگلے روز شام کے وقت سلطان صدیقی مرحوم کے وکیل کے ذریعے حمزہ کو ایک اور اچھی خبر ملی۔ بینک نے فرم کے اچھے ریکارڈ کی بنا پر ان کے قرضے کو ری شیڈول کر دیا تھا اور یوں قرقی و ضبطی کے خطرات ٹل گئے تھے۔ حمزہ کو کاروبار کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی پھر بھی ان اطلاعات کے مثبت پہلو روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ اسی روز شام کو حمزہ کا قریبی دوست ایڈووکیٹ ارسلان بھی ایبٹ آباد پہنچا۔ اس نے بینک کے معاملات درست ہونے پر حمزہ کو مبارک باد دی اور دیر تک بیٹھا دل جوئی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ایبٹ آباد آتے ہوئے حمزہ کے معالج سے مل کر آیا تھا اور اس کے لیے کھانے کی ایک دوا لے کر آیا تھا۔ حسب توقع یہ دوا ابھی مٹی ہی کی شکل میں تھی۔ چکنی سی مٹی تھی جسے باریک پیسا گیا تھا۔ ایڈووکیٹ ارسلان اور میں دیر تک اس مٹی کا تجزیہ کرتے رہے۔ معلوم نہیں کہ یہ صرف مٹی تھی یا اس میں کوئی دوا وغیرہ بھی ملائی گئی تھی۔ ہومیوپیتھی میں اکثر دوا میں اسی طرح گلوکوز وغیرہ میں ملا کر دی جاتی ہیں۔

کھانے کی یہ دوا حمزہ کے لیے بہت مفید اور زود اثر ثابت ہوئی۔ دو تین روز میں ہی اس کے چہرے پر رونق نظر آنے لگی۔ ٹانگ بھی اب بہتر دکھائی دیتی تھی۔ اوپری کھال مکمل طور پر اتر گئی تھی اور ٹانگ کے خدوخال واضح ہو گئے تھے۔ ایک روز میں نے اور شفتا نے حمزہ کو دونوں طرف سے سہارا دیا اور چند قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل گئیں اور رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا' بہرحال یہی بڑی بات تھی کہ وہ ٹانگ پر وزن ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

حمزہ کو دوبارہ اس کے بستر پر لٹا کر اور دوا وغیرہ کھلا کر میں باہر نکلا تو زریں گل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ گراسی لان میں بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا اور گہری سوچ میں گم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اور عالم قریشی جو سموسے کھاتے رہے تھے ان کی باقیات تین چار پلیٹوں میں پڑی تھیں۔ عالم قریشی اب وہاں نہیں تھا۔ اس کی کرسی خالی پڑی تھی۔ میں وہاں جا بیٹھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے' کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کہیں نسوار تو شارٹ نہیں ہو گئی؟!"

"نہیں جی۔۔۔ وہ تو یہاں بہت ملتا ہے۔ ام ایک اور چکر میں پڑا ہوا ہے۔ دراصل کلثوم نے ام کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

"کیوں۔۔۔ وہ روٹی نہیں دیتی ہے تمہیں؟"

"روٹی شوٹی تو سب ملتا ہے جی۔"

"جب روٹی بھی ملتا ہے اور شوٹی بھی ملتا ہے تو پھر تمہیں کس بات کی تکلیف ہے؟"

وہ زیر لب مسکرایا "ایسا پریشان کن تکلیف نہیں ہے جی۔۔۔ مگر ہے بھی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ کھل کر بات کرو۔"

وہ گہری سانس لے کر رازدارانہ لہجے میں بولا "کلثوم بڑا اچھا رقص کرتا ہے جی۔ ایسا رقص کہ آدمی دیکھے اور بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ یہ کوئی قبائلی رقص ہے جی۔ اتنا پیارا کہ مسرت شاہین دس بار بھی پیدا ہو جائے تو نہیں کر سکتا اور پھر اس رقص میں ایسا پاکیزگی' ایسا خوب صورتی ہے کہ بندہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے' یوں لگتا ہے کہ کسی ہنڈولے میں سوار ہو گیا ہے اور اڑتا چلا جا رہا ہے۔ کلثوم کبھی کبھی ام کو اکیلے میں یہ رقص دکھاتا ہے۔ اب کچھ دنوں سے اس نے نہیں دکھایا' ام پریشان ہے۔"

"دکھایا کیوں نہیں۔۔۔ تم کہہ دو کہ وہ دکھائے۔"

"یہی تو مصیبت ہے جی۔ وادی واخان کی لڑکیاں وہ رقص ہر موقع پر نہیں کرتیں۔ وہاں ہر رقص کا اپنا ایک موقع ہوتا ہے۔ جو رقص ام نے آپ کو بتایا ہے یہ بھی لڑکیاں اس وقت کرتی ہیں جب ان کا شوہر کسی بات پر ان سے خفا ہوتا ہے۔ اس رقص کا نام "ہابے" ہے۔ "ہابے" کا مطلب

ہوتا ہے لڑائی کے بعد ملاپ۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم نے رقص دیکھنا ہے تو کسی بات پر ناراض ہو جاؤ اس سے۔"

"خو آب تک ام یہی تو کرتا رہا ہے۔" زریں زیرِ لب مسکرایا "کسی نہ کسی بات پر ناراض ہو جاتا تھا۔ دو تین روز بعد وہ رقص دیکھنے کو مل جاتا تھا۔ اب ایک ایک کر کے اس نے امارا سارا بہانہ ختم کر ڈالا ہے۔ کوئی موقع ہی نہیں دیتا ہے ام کو ناراض ہونے کا۔ یہ عورت تو اماری سمجھ سے بالکل باہر ہے استاد صیب۔ چٹا ان پڑھ ہے لیکن اس کا دماغ کمپیوٹر کے مافق ہے۔ جو بات ام ایک بار بتاتا ہے یہ اسے پلے سے باندھ لیتا ہے۔ مجال ہے کہ پھر بھول جائے۔ اب ایسی عورت کا بندہ کیا کرے۔ کھانا وقت پر' کپڑے وقت پر' ضرورت کا ہر چیز موجود' جو بات ام کہتا ہے اس پر فرماں برداری سے سر ہلاتا ہے۔ جب ام سلائے سو جاتا ہے' جب جگائے جاگ اٹھتا ہے۔ اماری تو ساری مردانگی کا ستیاناس کر دیا ہے اس نے۔ آپ خود بتائیں' جس مرد کو غصہ نہ آئے وہ مرد تھوڑا ہوتا ہے' اب دیکھیں' ام یہاں ایک کھمبے کے الو کے مافق بیٹھا' ناراض ہونے کا بہانہ سوچ رہا ہے لیکن بہانہ نہیں مل رہا۔"

"میں تمہارے دکھ کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا "لیکن پھر بھی تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مرد ہو۔ اور مرد کتنا بھی گیا گزرا ہو' اتنا لاچار نہیں ہو سکتا کہ عورت پر رعب گانٹھنے کا کوئی بہانہ نہ ڈھونڈ سکے۔ بلکہ اگر وہ تمہیں ناراض ہونے کا کوئی بہانہ نہیں دے رہی تو یہ بھی ناراض ہونے کا ایک بہانہ ہے۔ بھئی تم اس کے شوہر ہو۔ تمہیں قانونی' مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے یہ حق حاصل ہے کہ جو توقع تم اپنی بیوی سے رکھتے ہو وہ پوری ہو۔"

زریں بولا "آپ تو مذاق کی بات فرماتا ہے استاد صیب۔ ام سنجیدہ ہے۔ وہ قبائلی رقص واقعی دیکھنے کا چیز ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی نوخیز جنگلی مورنی اپنے سارے رنگ بکھیر کر ناچنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ ام کو یہ ناچ دیکھ کر وہ مشہور گانا یاد آ جاتا ہے۔ جھوم جھوم کے ناچو آج' گاؤ آج۔ گاؤ خوشی کے گیت۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا "اس گمبھیر مسئلے کا حل یہ ہے بھئی کہ زوجہ صاحبہ کو سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ اسے کہہ دو کہ تمہیں اس کا فلاں رقص اچھا لگتا ہے اور برائے مہربانی وہ کسی معقول یا نامعقول وجہ کے بغیر بھی تمہیں یہ رقص دکھا دیا کرے۔ اگر وہ واقعی اتنی فرماں بردار جتنی تم بتا رہے ہو تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ اور اگر انکار کرے گی تو پھر بھی تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ تم فوراً اس سے ناراض ہو جانا۔ جب تمہارا منہ سور کی طرح بن جائے گا تو یقیناً وہ رقص پر مجبور ہو جائے گی۔"

"بات تو آپ نے بڑی ٹھیک کی ہے۔ پتا نہیں یہ پہلے اماری سمجھ میں کیوں نہیں آیا۔ بہرحال یہ مسئلہ تو حل ہوا۔"

"اب کیا مسئلہ ہے؟"

وہ نسوار کا چٹکا منہ میں رکھ کر بولا "استاد صیب! ام چاہتا ہے کہ ام آپ کو بھی وہ شاندار رقص دکھائے' یہاں موجود سب لوگ وہ رقص دیکھے۔ ام سچ کہتا ہے' آپ خٹک' جھومر' لڈی۔ سب ناچ بھول جائے گا۔ امارا خیال ہے استاد صیب ایسا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر حمزہ اب تیزی سے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ ام ان کا جشنن صحت مناتے ہیں۔"

"جشنن نہیں جشن۔" میں نے تصحیح کی۔

"جی بالکل ٹی۔ ذرا رونق بھی لگ جائے گا' اچھا کام ہو جائے گا۔ حمزہ صیب کا دل لگ جائے گا۔ جشنن امارا مطلب ہے جشن کے آخر میں کلثوم اپنا قبائلی رقص دکھائے گا۔ یہاں سب اپنے ہیں' کوئی غیر تو ہے نہیں۔ عالم زیب صیب ویسے بھی کل ایک دن کے لیے لاہور جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی تم ہمیں وہی رقص دکھاؤ گے جس کا نام "ہابے" ہے اور جو کلثوم تمہیں منانے کے لیے کرتی ہے؟"

زریں گل نے پہلے تو اثبات میں سر ہلایا پھر اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ وضاحت کرتے ہوئے بولا "یہ ہو بہو وہی رقص تو نہیں ہو گا نا جی۔ تھوڑا بہت تبدیلی تو آئے گا۔ تنہائی میں اس رقص کا انداز تھوڑا سا اور ہوتا ہے۔ وہ امارے قریب آتا ہے' ام سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔"

میں نے زریں گل کو گردن سے پکڑ لیا "اوئے لکڑی کے باندر! چھیڑ چھاڑ کی بات نہیں کر رہا میں۔ مجھے یہ بتا کہ تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے یا گوبر پر منہ مارنے گئی ہے۔ صرف دو ہفتے پہلے حمزہ کے چچا فوت ہوئے ہیں۔ اب تو جشن منائے گا اور ناچ گانا ہو گا تو تجھے جوتے نہیں ماریں گی حمزہ کی والدہ؟"

زریں کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور آنکھیں گول گھوم گئیں "باپ رے! امارے تو دماغ میں سے ہی نکل گیا تھا۔ واقعی یہ جشنن وغیرہ کا موقع تو ہے نا

نہیں۔"

میں نے کہا "دماغ کو تو تم خواہ مخواہ بیچ میں لے آتے ہو۔ اس نام کی شے سے تمہارا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔"

وہ سر کھجا کر بولا "خو استاد صیب! شاید کسی ایسے ہی موقع کے لیے وہ گانا بنا تھا "سوچا تھا کیا۔ کیا ہو گیا۔""

اس دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں فون کی طرف بڑھا۔ فون برآمدے میں رکھا تھا۔ ابھی میں فون سے دور ہی تھا کہ زریں گل آڑے آ گیا "نہیں استاد صیب! آپ مت اٹھائیں فون۔ یہ وہی بے غیرت کا بچہ سروج ہو گا۔ آپ پر ڈورے ڈالے گا۔ آپ سے واہیاتی کی باتیں کرے گا۔ آپ اس کو منہ مت لگائیں استاد صیب۔ وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔ ایسی چالو عورت کا تو سایہ بھی آپ پر نہیں پڑنا چاہیے۔"

میں نے کہا "اچھا تایا جان! آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن مجھے فون تو سننے دو۔"

اس نے بمشکل راستہ چھوڑا۔ دوسری طرف واقعی سروج تھی۔ اس نے ہیلو تو ایک بہت لمبی آہ بھری' پھر رجزیہ گفتگو کرنے لگی۔ اس کی گفتگو کا ہر لفظ اپنے اندر کی کہانی سنا رہا تھا۔ کوئی لفظ بخار میں تپ رہا تھا' کوئی انگڑائیاں لے رہا تھا' کوئی طوفانی انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ہر فقرہ ریشم کی طرح اس کے ہونٹوں سے پھسلتا تھا اور نسوانی لباس کی طرح سرسرانے لگتا تھا۔ میں یہ ساری باتیں سننے پر مجبور تھا بلکہ گاہے گاہے مجھے حسبِ حال جواب بھی دینا پڑتا تھا۔ یہ سب کچھ سائیں عالی کی ہدایت کے مطابق تھا۔ سائیں عالی کی ہدایت نہ بھی ہوتی تو مجھے معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری بے رخی یا سرد مہری سروج کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہی اعصابی دورے اسے پھر اپنی گرفت میں لے سکتے تھے جو کچھ عرصہ پہلے اسے ہلکان کر رہے تھے۔ اس کی حالت بہتر ضرور ہوئی تھی لیکن یہ کہنا بے حد مشکل تھا کہ وہ اس بیماری کے اثر سے نکل آئی ہے۔ وہ مقناطیسی کشش جو اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی اب بھی اس کے اردگرد موجود تھی۔

وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور زریں گل دیر تک جلتا اور کڑھتا رہا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ میرے ہاتھ سے ریسیور لے کر سروج کو بے نقط سنا دیتا۔ گفتگو کے آخر میں سروج نے مجھے ایک الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس نے بتایا کہ کل رات گیارہ بجے کے قریب ابوظبی سے ایک فون آیا تھا۔ کوئی عورت بول رہی تھی مگر رہی تھی کہ وہ شاہ جہاں سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔ آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔ تاہم سروج کو شک تھا کہ وہ شیخ عاصم کا نام بھی لے رہی تھی۔ پھر اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

سروج سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میں اس "انٹرنیشنل کال" کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کال کس کی ہو سکتی تھی اور اس میں شیخ عاصم کا ذکر کیوں آیا تھا۔ ممکن تھا کہ کال دوبارہ آتی۔ میں نے سروج سے کہہ دیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ کال کرنے والے کا پیغام نوٹ کر لے اور اگر وہ مزید بات کرنا چاہے تو اسے میرا ایبٹ آباد والا نمبر دے دے۔

ہر گزرنے والا دن حمزہ کے لیے پہلے سے بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی ناتوانی کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ٹانگیں خود سے بستر سے نیچے اتار لیتا تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا شفتا اسے سہارا دے کر چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حمزہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ پھر وہ بے دم سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ شفتا گلاس میں پانی لے کر اسے پلانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ حمزہ کا بے حد خیال رکھ رہی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد خوب محفل جمتی تھی۔ عالم تریش کے مرغن لطیفے' زریں گل کی مسالے دار باتیں۔ کلثوم کی معصوم شوخیاں "چھوٹی" کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ سب کچھ مل کر سماں سا بندھ جاتا تھا۔ ایسے میں میرا غم ہلکا ہو جاتا اور سینے میں سلگتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑنے لگتی۔ غزالہ کے سوا بھی دنیا میں بہت کچھ تھا' وقت کا مرہم زخموں کو مندمل کر سکتا تھا۔ زندگی بدل سکتی تھی' ممکن تھا کہ اس میں عرصہ لگتا مگر امید بہرحال موجود تھی۔ کسی وقت میں محفلِ طرب میں بیٹھا بیٹھا کھو سا جاتا۔ میں سوچتا غزالہ کہاں ہو گی' کس حال میں ہو گی۔ ایک روز میں یہی سوچ رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ شفتا تیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی "بھیا! کیا سوچ رہے تھے؟"

میں نے سنبھل کر کہا "تیرے بارے میں سوچ رہا تھا اور حمزہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

وہ شرما سی گئی' حالانکہ وہ جانتی تھی' میں غلط کہہ رہا ہوں۔

میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ میں بھی کتنا خود غرض تھا کہ ان حالات میں بھی اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ مجھے شفتا کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ اس کی زندگی ایک نہایت اہم موڑ پر تھی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔ شفتا کے لیے اب حمزہ سے منہ موڑنا ناممکن تھا۔ اس کی جسمانی معذوری شفتا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی

تھی۔ حمزہ کی ٹانگ ٹھیک ہوگئی تھی' نہ بھی ہوتی تو شاید شفا کے رویے میں سرمو فرق نہ آتا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ حمزہ اور شفا ایک دوسرے کو خوش رکھ سکیں گے۔ شفا کو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا' حمزہ کو بھی میں نے بہت اچھی طرح دیکھ پرکھ لیا تھا۔ حمزہ کے ہاتھ کی معذوری کی وجہ سے دل میں ایک کانٹا سا ضرور چبھ گیا تھا لیکن بقول کسے۔ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ انسان کی خواہشات کا بدرجہ اتم پورا ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں کوئی کمی تو ضرور ہوتی ہے اور یہ کمی ہمیں قبول کرنی ہوتی ہے۔ جس طرح شدید ترین خوشی میں غم اور شدید ترین غم میں سکون کا پہلو پوشیدہ رہتا ہے شاید اسی طرح مکمل "حصول" بھی ممکن نہیں ہوتا۔ حمزہ میں بے شمار خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ شفا اس کے ساتھ خوش رہ سکتی تھی اور وہ اسے خوش رکھ سکتا تھا۔ باقی سب باتیں بے معنی تھیں۔

جھوک شامن کی حویلی میں ہونے والے خوف ناک دھماکوں سے پہلے حمزہ اور شفا کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور دونوں طرف سے رضامندی ظاہر ہوگئی تھی۔ شیخ عاصم کی طرف سے حمزہ کے اہل خانہ پر جو دباؤ پڑا تھا وہ انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ خاص طور سے حمزہ کی والدہ نے برملا کہا تھا کہ وہ شفا کو بہو بنا کر رہیں گی۔ یقیناً اب بھی ان کے خیالات مختلف نہیں تھے۔ حمزہ پر ایک طرح کی قنوطیت ضرور طاری تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کیفیت پر بتدریج قابو پا رہا تھا۔

ایک رم جھم برستی خنک دوپہر میں دیر تک میں حمزہ کے پاس بیٹھا رہا۔ حمزہ بستر پر نیم دراز تھا' میں کرسی پر تھا۔ ہمارے درمیان اپنائیت مہک رہی تھی۔ میں غیر محسوس طور پر حمزہ کے احساس کمتری اور اس کے اندر چھپی ہوئی خود ترسی کی کیفیت کو دور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ حمزہ میری باتوں سے کافی اثر لے رہا تھا۔ وہ مجھے بے حد اپنائیت سے بھائی جان کہہ کر بلاتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں محبت کا ایک نہایت مضبوط رشتہ ہم دونوں میں استوار ہوچکا تھا۔ حویلی میں ہونے والے ہنگامے میں "میں" نے بے ہوش حمزہ کو برستی گولیوں میں سے نکالا تھا اور گود میں اٹھا کر محفوظ مقام تک پہنچایا تھا' وہ واقعہ روز اوّل کی طرح اس کے ذہن میں تازہ تھا اور وہ بار بار اس کا ذکر کرتا رہتا تھا۔

میں حمزہ کو اپنے بچپن کی روداد سنانے لگا۔ یہ روداد سناتے ہوئے ماضی پوری جزئیات کے ساتھ میرے پردۂ تصور پر نمودار ہوگیا۔ میں نے وہ منظر دیکھا جب میں پانچ سال کی گڑیا سی شفا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا اور چچی ثنا کے ظلم و ستم سے دور بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر میری نگاہوں کے سامنے وہ آنگن آیا جہاں میں نے اور شفا نے اپنی نئی زندگی شروع کی تھی۔ ایک ایک اینٹ رکھ کر ہم نے اپنے آپ کو تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ہماری یادوں کا آنگن تھا' یہاں ہر گوشے میں لازوال مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میں اپنی ننھی بہن کو نہلا رہا تھا۔ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر کہانیاں سنا رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ سے لقمے کھاتی تھی' میرے سینے پر سر رکھ کر سوتی تھی۔ اس کی دنیا مجھ سے شروع ہوکر مجھ ہی پر ختم ہوجاتی تھی۔ جتنا میں شفا کو سمجھتا تھا شاید وہ بھی خود کو نہیں سمجھتی تھی اور نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ جتنا میں شفا کو سمجھتا ہوں اتنا ہی حمزہ کو سمجھ جائے' تاکہ وہ قدرت کی اس خوب صورت تخلیق کی حفاظت کرسکے جس کا نام شفا تھا۔ ہاں وہ ایک خوب صورت تخلیق تھی۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری بہن تھی۔ اس میں وہ صفات موجود تھیں جن کے لیے اسے یہ نام دیا جاسکتا تھا۔ اور ان صفات میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اپنی صفات سے بے خبر تھی۔ ایک ایسی بے ساختگی اور بے تکلفی تھی اس کے مزاج میں جو براہ راست دل پر اثر کرتی تھی اور اپنا آپ منواتی تھی۔ بے شک اس کے مزاج کے کچھ رنگ تیز تھے اور کچھ مدھم تھے لیکن ایک گلدستے کے رنگوں کی طرح یہ رنگ برے نہیں لگتے تھے کیونکہ یہ سب پھولوں کے رنگ تھے۔ ان رنگوں کی اصل وہ "فطری اچھائی" تھی جو شفا کی ذات کا ایک لازمی جزو تھی۔ میں شفا کے لیے بہت پریشان رہا کرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک مختلف لڑکی تھی۔ اس کے شریک حیات کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس کی انفرادیت کو محسوس کرے۔ حمزہ سے مل کر میرے دل نے گواہی دی تھی کہ وہ اس خاص نظر کا مالک ہے جو شفا کی انتہائی خوب صورت انفرادیت کو محسوس کرسکتی ہے۔

شاید قدرت نے مجھے جو محرومیاں بخشی تھیں ان کا مداوا اس طرح کررہی تھی کہ میں شفا کی زندگی کو ایک دلکش سانچے میں ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

عالم قریشی ایک دو روز کے لیے لاہور گیا ہوا تھا۔ واپس ایبٹ آباد آکر اس نے بتایا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "میرے ملازم اختر نے بتایا ہے کہ ابوظہبی سے چار پانچ مرتبہ فون آچکا ہے۔ یہ فون سروج ہی سنتی رہی ہے۔

لیکن اس نے صرف ایک بار ہی ہمیں بتایا ہے۔"

واقعی یہ توجہ طلب بات تھی۔ میں نے عالم قریشی سے پوچھا "تم نے سروج سے اس بارے میں دریافت نہیں کیا؟"

"نہیں۔۔۔ میں نے سوچا پہلے تم سے بات کرلوں۔"

"ملازم نے اور کیا بتایا ہے؟"

"بس یہی کہہ رہا تھا کہ کوئی عورت بولتی تھی' کہتی تھی شاہ جہاں صاحب یا قریشی صاحب سے بات کرائیں۔ ملازم کہتا تھا کہ وہ دونوں یہاں نہیں ہیں' سروج صاحبہ ہیں۔۔۔ پھر سروج بات کرتی تھی اور بس۔"

جو اندیشہ میرے ذہن میں آیا یقیناً وہی عالم قریشی کے ذہن میں بھی تھا۔ غزالہ اپنے شوہر شیخ عاصم کے ساتھ امارات گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ کالیں اسی کی طرف سے ہوں۔ مجھے سروج پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ آئندہ کال آئے تو وہ مجھے اطلاع دے بلکہ کال کرنے والے سے کہے کہ وہ ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ کرے لیکن اس نے ڈائریکٹ رابطہ تو کیا کروانا تھا مجھے خبر تک نہیں دی تھی۔

میں نے فوراً سروج کو لاہور میں فون کیا۔ میرا سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ ابوظہبی سے کسی کی کالیں آرہی ہیں۔ وہ صاف مکر گئی۔ کہنے لگی "بس ایک کال آئی تھی ڈارلنگ۔ اس کے بارے میں' میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔ پھر ایک دن آدھی رات کو گھنٹی ہوئی تھی۔ ملازم اختر نے کال سنی تھی۔ میرے جاتے جاتے فون بند ہوگیا تھا۔ اختر نے بتایا تھا کہ کوئی شاہ جہاں کو پوچھ رہا تھا۔"

میں صاف محسوس کررہا تھا کہ سروج غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔ بہرحال فون پر الجھنا مناسب نہیں تھا۔

میں اس رات دیر تک جاگتا رہا۔ رہ رہ کر یہ خیال ذہن میں آرہا تھا کہ کہیں غزالہ کسی مصیبت میں نہ ہو۔ جب غزالہ مندرا قصبے میں شیر محمد کے گھر سے گئی تھی تو میرا خیال تھا کہ یہ جدائی طویل ثابت ہوگی اور بہت دیر تک ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہیں جائے گی لیکن صورت حال برعکس نظر آرہی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ پھر کچھ ہونے والا ہے اور وہ جو ایک اندیشہ سا ذہن میں تھا کہ شیخ عاصم اپنی فطرت پر قابو نہیں رکھ سکے گا اور اس کی شیطانیت ہمیں پھر ایک دوسرے کے سامنے لے آئے گی' درست ثابت ہوتا نظر آرہا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید یہ فون کال اس لڑکی یوسا کی طرف سے ہو جو بہت سی دوسری خوب رو لڑکیوں کے ساتھ شیخ عاصم کے حرم کو آباد کیے ہوئے تھی اور اب شیخ کے ساتھ اس کا تنازع چل رہا تھا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو رد کردیا۔ یوسا صرف انگلش بول سکتی تھی اور عالم قریشی کے ان پڑھ ملازم نے فون کرنے والی کا پیغام سنا اور سمجھا تھا۔ ویسے بھی میری آخری اطلاعات کے مطابق یوسا' شیخ عاصم کی گرفت میں تھی۔

اگلے روز صبح سویرے میں ایبٹ آباد سے لاہور روانہ ہوگیا۔ بذریعہ 'فلائنگ کوچ' میں جس وقت لاہور پہنچا شام ہونے والی تھی۔ میں سیدھا گلبرگ میں عالم قریشی کے گھر گیا۔ یہ گھر گلبرگ مین مارکیٹ کے قریب ہی واقع تھا اور اس کا حدود اربعہ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہوچکا تھا۔ سائیں عالی اور سروج اسی گھر میں بطور مہمان مقیم تھے۔ چوکیدار نے مجھے پہچان کر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔ میں اندر چلا گیا۔ دبے پاؤں میں سائیں عالی کے کمرے تک جا پہنچا۔ اندر سے چیخم دھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ سائیں عالی کی آوازیں تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ حسب عادت سروج پر برس رہا ہوگا۔ وہ غرا کر بولا "دونوں ہاتھ کانوں کو لگاؤ۔ اب بیٹھ جاؤ۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔۔۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ مسلسل یہ الفاظ دہراتا چلا جارہا تھا۔ شاید وہ سروج کو کسی بات پر سزا دے رہا تھا۔ اس قسم کا رویہ وہ اکثر اپناتا رہتا تھا۔ اٹھک بیٹھک کروانے کے ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جارہا تھا "آئندہ۔۔۔ ایسا کام ہوگا؟ بولو آئندہ یہ حرکت ہوگی؟"

جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید سروج کی بولتی بند تھی۔ کافی دیر جب یہ سلسلہ جاری رہا تو میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ حیرت کا مقام تھا کہ کمرے میں سائیں عالی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے سامنے خلا میں دیکھ رہا تھا اور انگلی کی حرکت سے کسی نادیدہ وجود کو اٹھک بیٹھک کا حکم صادر کررہا تھا۔

میں اندر چلا گیا۔ سائیں عالی نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خلا میں اشارہ کیا اور کرخت آواز میں بولا "بس اس بار اتنا ہی کافی ہے تمہارے لیے' آئندہ ایسی غلطی کی تو کھال کھینچ کر بھس بھروں گا۔"

چند لمحے بعد مجھ سے مخاطب ہوکر بولا "حرام زادہ! پریوں کو چھیڑتا تھا۔ پرستان میں پریوں کا گورنمنٹ کالج ہے۔ اس کے سامنے کوہ قاف کے کچھ آوارہ جن منڈلاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ دو دفعہ اس کی ٹھکائی ہوئی ہے' دو دفعہ حوالات گیا ہے مگر باز نہیں آتا تھا۔ اب اللہ نے چاہا تو تیر کی طرح سیدھا ہوجائے گا۔" پھر اس نے ایک گہری سانس

لی "خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ تم اچانک کیسے ٹپک پڑے ہو؟"

میں نے کہا "بس یونہی' ایک دو کام تھے یہاں۔ سوچا سروج سے بھی ملتا جاؤں۔"

"ہاں ہاں ملو۔ ضرور ملو۔ تم دونوں ملو گے تو ستاروں کی گردش مکمل ہوگی۔۔۔ اور دفینہ تب ہی ملتا ہے جب ستاروں کی گردش نے مکمل ہونا ہے۔"

اس دوران میں سروج بھی اندر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی' پھر اس کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ سائیں عالی کی موجودگی میں وہ مجبور تھی ورنہ ضرور بھاگ کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ مجھے نمسکار کر کے وہ باہر چلی گئی۔ سائیں ایک بار پھر الٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ کہنے لگا "میں جتنا آج کل خوش ہوں' پوری زندگی میں نہیں ہوا۔ اس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب میں نے فتح پور سیکری میں تین مہینے کا چلہ کامیابی سے کاٹا تھا اور ۱۸ بچے گنتی جن میرے قبضے میں آئے تھے۔ میری خوشی کا مرکز تم اور سروج ہو۔ تمہارے ملاپ سے ستاروں میں ایسی تبدیلی آ رہی ہے جو تمہارے لیے ایک بہت بڑی کامیابی کا سندیسا لانے والی ہے۔"

رات کا کھانا میں نے سروج کے ساتھ اکیلے کھایا۔ وہ بڑی چنچل رنگی نظر آ رہی تھی۔ سولہ سنگار والا محاورہ اس پر صادق آ رہا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے' کلائیوں میں تازہ پھولوں کے گجرے تھے اور جامنی رنگ کی بنارسی ساڑی میں اس کا شباب پھڑپھڑاتا محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں اور پیشانی پر وہی چمک دمک تھی جس میں سے ایک خاص قسم کی اسراریت جھلکتی تھی۔ جب سروج پر دورہ پڑتا تھا اس وقت یہ چمک دمک اس کے پورے چہرے کو چھپا لیتی تھی بلکہ پورے جسم پر حاوی ہو جاتی تھی۔

میں کھانا کھا کر سگریٹ سلگا رہا تھا جب اس نے عقب سے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے نرم و گداز جسم کا نصف بوجھ میرے شانوں پر آ گیا۔ وہ میرے کانوں میں چوڑیاں کھنکھناتی ہوئی بولی "آج کی رات کتنی سندر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہو اور میں تمہاری بانہوں میں مر جاؤں۔"

"ایک تو تم عورتوں کو مرنے کا بڑا چاؤ ہوتا ہے' حالانکہ مرنا اتنا آسان نہیں۔ خاص طور پر تم جیسی خوبصورت کے لیے تو بہت مشکل ہے۔ دولت کی خواہش تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دفینہ تمہاری زندگی کا مقصد نہ ہوتا۔"

اس نے شوخ انداز میں چٹ سے ایک بوسہ میرے رخسار پر ثبت کیا اور بولی "تم بھی تو کسی دفینے سے کم نہیں ہو۔ پتا نہیں اپنی خاموشی کی گہرائی میں کب سے دفن پڑے ہو۔ میں تمہیں کھود رہی ہوں' کھوج رہی ہوں' تمہارے نایاب نوادرات دیکھ رہی ہوں' اور جتنا دیکھ رہی ہوں اتنا ہی دیکھنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے۔ بھگوان جانتا ہے' نے مجھے کچھ کر دیا ہے شاہ جہاں۔۔۔ تمہیں پتا نہیں میں نے یہ (وقت) تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے۔"

اس نے بالوں سے کلپ کھینچ کر اپنے بال بالکل کھلے چھوڑ دیے اور سراپا دعوت نظر آنے لگی۔ میں نے کہا "اگر تم دوری کو اتنا ہی محسوس کر رہی تھی تو وہاں چلی آتی۔"

"میں کیا کرتی۔ میری جان وہاں تمہارے پاس پہنچی ہوئی تھی اور جسم یہاں سائیں جی کی سیوا کر رہا تھا۔ وہ چلہ کاٹ رہے تھے۔ بڑا دشوار چلہ تھا مگر اس سے بھی دشوار چلہ میں نے کاٹا ہے' تمہاری جدائی کا چلہ۔"

وہ ہیجانی انداز میں میرے قریب تر آتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے شباب کی سرکشی جیسے بے باکی سے مجھے للکار رہی تھی۔ میں اس سے باتیں کر رہا تھا مگر فون وغیرہ کے سلسلے میں میں نے کوئی بات نہیں کی۔ رات کے ساڑھے گیارہ کا عمل تھا جب ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ سروج کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ ساڑی کو سنبھالتے ہوئے وہ بستر سے اتری۔ میں نے بازو تھام کر اسے روک لیا "ٹھہرو۔ میں سنتا ہوں۔ شاید میری کال ہے۔" میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ میں نے بغلی کمرے میں جا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو' کون بول رہا ہے؟"

"شاہ جہاں اسپیکنگ۔"

"ہیلو شاہ جہاں صاحب' آپ کہاں تھے۔ اتنی زیادہ کوشش کی آپ سے رابطہ کرنے کی۔۔۔ کم از کم چھ سات میسج دے چکی ہوں میں مس سروج کو۔ میں نے ان سے گزارش کی تھی کہ اگر آپ لاہور میں نہیں ہیں تو آپ کا رابطہ نمبر ہی دے دیں۔"

"کچھ مصروفیت تھی مجھے۔۔۔ اور رابطہ نمبر بھی نہیں تھا۔ آپ کا اسم شریف؟"

"جی۔ میرا نام سلطانہ ہے۔ آپ مجھے مسز غزالہ کی دوست کہہ سکتے ہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ میں مسز غزالہ کے کہنے پر ہی آپ سے رابطہ کر رہی ہوں۔" وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔

"غزالہ خیریت سے تو ہے نا؟"

"وہ خیریت سے ہے بھی اور نہیں بھی۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ پھر چند لمحے کے توقف سے نسوانی آواز نے کہا "بہتر ہوگا اگر آپ کسی طرح ابوظہبی آ جائیں۔"

سلطانہ نامی لڑکی کا لہجہ چونکا دینے والا تھا (وہ لب و لہجے سے لڑکی ہی محسوس ہوتی تھی) میرے ذہن میں ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔ غزالہ مصیبت میں تھی اور مصیبت بھی ایسی تھی کہ وہ ایک سخت قسم کی "قطع تعلقی" کے باوجود مجھے بلانے پر مجبور ہوتی تھی۔ سلطانہ نامی لڑکی کی باتوں سے پتا چل رہا تھا۔ مجھے کال کرنے میں غزالہ کی رضامندی یا نیم رضامندی شامل ہے۔

میں نے کہا "سلطانہ صاحبہ! آپ صاف سیدھی بات بتائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیا یہ فون کال آپ نے مسز غزالہ کے کہنے پر کی ہے؟"

"میں کہہ رہی ہوں نا کہ ان کی رضامندی سے کی ہے۔ ہاں میری ایک درخواست ہے' آپ فون پر زیادہ تفصیل پوچھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ غزالہ کے لیے دل میں تھوڑی بہت بھی ہمدردی رکھتے ہیں تو جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھیں بی بی! میں اس طرح ایک فون کال پر بھاگا ہوا ابوظہبی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ غزالہ سے یا پھر شیخ عاصم سے میری بات کرائیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر آپ کو تفصیل بتانا ہوگی کہ کیا واقعہ ہے اور میرا ابوظہبی آنا کیوں اتنا ضروری ہو گیا ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر سلطانہ کی آواز آئی "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتی۔ آپ کو میری بات پر اعتبار کرنا ہوگا۔ میں جو کچھ آپ سے چاہ رہی ہوں' اس میں میرا کوئی مفاد ہے اور نہ لالچ۔ غزالہ سے پرخلوص دوستی کا رشتہ ہے جو مجھے یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہاں میں آپ کو یہ ثبوت ضرور دے سکتی ہوں کہ میں غزالہ کی دوست ہوں' اور وہ مجھ پر اتنا اعتماد کرتی ہے کہ مجھے اپنے رازوں میں شریک کر لیا ہے۔"

اس کے بعد سلطانہ نے چند ایسی باتیں بتائیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غزالہ کے بہت قریب ہے یا کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اسے غزالہ کے حالات کا علم ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ گلگت سے ہماری واپسی پر کیا حالات پیش آئے تھے' میں کتنا عرصہ بیمار رہا تھا' غزالہ نے کیسے میری تیمارداری کی تھی' پھر مجھے دوبارہ کیوں گلگت کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔۔۔ غزالہ کا ابارشن کب اور کیسے ہوا تھا' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "جب آپ اتنا کچھ بتا سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں بتا سکتیں کہ اب کیا مسئلہ درپیش ہے۔ اور نہیں تو کم از کم یہی بتا دیں کہ غزالہ کے اس مسئلے کا تعلق شیخ عاصم سے تو نہیں؟"

"ہاں۔" مختصر جواب ملا۔

"یعنی یہ مسئلہ شیخ عاصم کا پیدا کردہ ہے؟"

وہ ایک دم تلخ ہو گئی "آپ بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ غزالہ کی پریشانی کا سنیں گے تو فوراً۔۔۔" اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔۔۔ فون بالکل ڈیڈ ہو چکا تھا' لہٰذا اس بات کا امکان نہیں تھا کہ سلطانہ نے فون بند کیا ہے۔ شاید لائن میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ میں کچھ دیر فون سیٹ سے الجھتا رہا' پھر میری نگاہ سروج پر پڑی۔ اس کی ساڑی بے ترتیب تھی اور جسم جگہ جگہ سے جھلک دکھا رہا تھا۔ "کون تھا؟" وہ بالوں کی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے اندر آ گئی۔

سروج کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جانتے بوجھتے انجان بنی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "وہی تھی جو پچھلے چار پانچ دن سے مسلسل فون کر رہی ہے اور تم سے درخواستیں کر رہی ہے کہ تم مجھ سے اس کا رابطہ کرا دو۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"تم سب سمجھتی ہو۔" میں نے سخت لہجے سے کہا "بس مکر کر رہی ہو' تم ان عورتوں میں سے ہو جنہیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میں نرم سے نرم الفاظ میں تمہیں خود غرض کہہ سکتا ہوں۔"

اس کا سر خود بخود جھک گیا۔ ہونٹ شرمندگی آمیز غصے سے پھڑک رہے تھے۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور اپنے منتشر بال سمیٹتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کی نشاط انگیز چمک بجھ گئی تھی اور بدن میں لہریں لیتی ہوئی انگڑائیاں بھی معدوم ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر کروٹ بدل کر لیٹی ہوئی ہے۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کیوں تم نے مجھے ان فون کالز سے بے خبر رکھا؟"

وہ جھلا کر بولی "وہ کیوں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ شادی شدہ ہے' اس کا پتی ہے پھر کیوں بہانے بہانے سے

تمہارے قریب رہنا چاہتی ہے۔"

"تم کس کی بات کررہی ہو؟"

"غزالہ کی بات کررہی ہوں اور کس کی کررہی ہوں۔ میں اس کے سارے چلتر سمجھتی ہوں۔ ایک طرف وہ دھن دولت کے لیے شیخ عاصم سے ڈبی ہوئی ہے' دوسری طرف تمہارے پریم کی مالا جپتی ہے۔ پھر کہتی ہے' میں شریف زادی ہوں' مجھ سے بڑی "نیک پروین" ابھی پاکستان میں پیدا ہی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "سوہج! تم اس کے سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میرے خیال میں تم اس قابل نہیں ہو کہ غزالہ جیسی لڑکی کا نام بھی تمہاری زبان پر آئے' کجا کہ تم اس کے کردار پر تبصرے کرو۔ وہ جو کچھ ہے میں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ہو وہ بھی میں جانتا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم نہایت ضروری فون کالز کو مجھ تک پہنچنے سے روکو؟"

"حق اور ادھیکار کی بات کرتے ہو تو پھر یہ بڑی لمبی ہو جائے گی۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"کیا لمبی ہو جائے گی' کیا کرلو گی تم؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

سائیں عالی کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور وہ جھومتا جھامتا اندر آگیا "کیا ہوا بالکو۔ کیوں شور مچا رہے ہو؟" وہ ہم دونوں سے ایک ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

سوہج ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی پھر شب خوابی کا لباس درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی "اچھا لڑائی ہوئی ہے۔" سائیں عالی بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر بچوں کے انداز میں پکار پکار کر کہنے لگا "لڑائی لڑائی معاف کرو۔ بکری کی مینگنی صاف کرو۔ لڑائی لڑائی معاف کرو۔ بکری کی مینگنی صاف کرو۔" پھر اس نے سوہج کو لاٹھی سے ٹھوکا دے کر میری طرف بڑھایا "چلو گلے ملو دونوں۔"

سوہج بادل ناخواستہ میرے گلے لگ گئی۔ سائیں اسے ڈانٹتے ہوئے بولا "خبردار' جھگڑا نہیں کرنا۔ جو بات شیخ محمد کہے وہ مانو۔ ورنہ اسی کمرے کے پنکھے سے الٹا لٹکا دوں گا تمہیں۔"

سوہج نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ سائیں عالی واپس چلا گیا۔ اس کی مدھم آواز دور تک آتی رہی "لڑائی لڑائی معاف کرو۔ بکری کی مینگنی صاف کرو۔"

میں بیڈ روم میں صوفے پر لیٹ گیا۔ ذہن پر بے شمار خیالات کی یورش تھی۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ غزالہ امارات پہنچتے ہی کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو گئی تھی اور یہ مصیبت کا تعلق شیخ عاصم سے تھا۔ اس بات کا تو مجھے اور ساہی صاحب کو یقین تھا کہ شیخ عاصم غزالہ کے سلسلے میں مخلص نہیں ہے۔ اس نے بہروپ بھر رکھا ہے اور اس کا اصل روپ جلد یا بدیر غزالہ کے سامنے آجائے گا۔ لیکن اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی کہ یہ سب کچھ اتنی جلد ہوگا۔ ایبٹ آباد میں مجھے شک گزرا تھا لیکن اب سلطانہ نامی لڑکی سے بات کرکے یقین ہو گیا تھا کہ امارات پہنچتے ہی شیخ عاصم اپنی اصلیت پر آگیا ہے۔ میں سر تا پا تڑپ گیا۔ میں ایسی آفت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا' کم از کم اتنی جلدی تیار نہیں تھا۔

مجھے شدت سے افسوس ہو رہا تھا کہ رابطہ منقطع کیوں ہو گیا۔ ممکن تھا کہ میں سلطانہ نامی اس لڑکی سے مزید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اب مجھے اس کی اگلی کال کا انتظار کرنا تھا۔ خبر نہیں تھی کہ یہ کال کب آتی ہے' آتی بھی یا نہیں۔ گفتگو کے آخر میں وہ خاصی تلخ ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی بات پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرلوں۔

سوہج شاید سو چکی تھی۔ بیڈ روم میں اکمل کی بتی کی پھیکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سوہج نے غالباً "ریڈ وائن" کے ایک دو پیگ لیے تھے۔ میں اٹھ کر کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ نگاہ بار بار فون کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ ریسیور اٹھا کر دیکھا' فون ابھی تک "ڈیڈ" تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک شک ابھرا۔ میں نے فون کے تار کا تعاقب کیا۔ تار کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ کوریڈور میں آگیا تھا اور قالین کے نیچے سفر کرتا ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو میرا شک درست ثابت ہو گیا۔ فون کا تار کٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ سوہج ہی کی کارروائی تھی۔ جس وقت میں ابوظہبی کی کال سن رہا تھا' سوہج نے پلاس سے تار کاٹ ڈالا تھا۔ سوہج کے لیے غصے کی ایک بلند لہر میرے سینے سے اٹھی۔ جی چاہا سائیں عالی والا عصا میرے ہاتھ میں ہو اور اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں لیکن اس سوہج کو عملی جامہ پہنانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ سائیں عالی کی چہیتی چیلی تھی اور سائیں عالی حمزہ کے حوالے سے مجھ پر ایک بہت بڑا احسان کرچکا تھا۔ زندگی دینے والی خدا کی ذات ہے مگر سائیں عالی کی سفارش پر اس رات میانی صاحب کے قبرستان میں جو کچھ حمزہ کے ساتھ ہوا تھا وہ میرے لیے ناقابل فراموش تھا۔ اور میں ہی کیا'

لوگ بھی اس کرشمے سے باخبر تھے وہ اسے بھول نہیں سکتے تھے۔ جب بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اپنی مسیحائی ایک طرف رکھ دی تھی' ایک ایسے فقیر منش معالج نے حمزہ کی بیماری سے جنگ کی تھی جو خود بھی شدید علیل تھا۔ اور جس کے ہونٹوں سے ہر پل "ہائے ہائے" کی صدا نکلتی تھی۔

میں اپنے آپ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ فون کے کٹے ہوئے تار میں نے پھر سے جوڑے اور موہوم امید کے سہارے ابوظہبی کی کال کا انتظار کرنے لگا۔ کال نے نہیں آنا تھا نہ آئی۔ میں قریباً ساری رات جاگتا رہا۔ اگلے روز بھر کال کا انتظار رہا۔ شام سے رات تک اور رات سے صبح تک میرے کان مسلسل گھنٹی کی آواز پر لگے رہے۔

دو روز کے مسلسل انتظار کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ کال اب نہیں آئے گی۔ میرے اور سلطانہ نامی لڑکی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کا اختتام خاصی بدمزگی میں ہوا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ سوہج سے کچھ معلوم کرسکوں۔ عین ممکن تھا کہ سلطانہ نے اسے ابوظہبی میں اپنا کوئی پتا ٹھکانا بتایا ہوا فون نمبر دیا ہو۔

میرے استفسارات کا جواب سوہج نے نفی میں دیا۔ وہ مجھ سے اکھڑی ہوئی تھی اور بہت غم زدہ نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے منانے کی کوشش کروں گا لیکن جب میری طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تو اس کا پھولا ہوا منہ خود ہی ٹھیک ہونا شروع ہو گیا۔ یہ لاہور آنے کے بعد تیسرے روز کی بات ہے' میں شام کو کامن روم میں بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ یونہی میز پر رکھے فون انڈیکس کی ورق گردانی کررہے تھے' اچانک میں ایک ایڈریس دیکھ کر چونک گیا۔ یہ ابوظہبی کا ایڈریس تھا۔ مسٹر عبدالباسط' ملحقہ جنرل پوسٹ آفس۔ سوق عثمانیہ' ابوظہبی' نیچے مکان کا نمبر بھی درج تھا اور سلطانہ عزیز کے الفاظ بھی لکھے تھے۔

میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ سوہج کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ غالباً اس نے سلطانہ کا فون سنتے ہوئے بے پروائی سے یہ ایڈریس کاغذ پر گھسیٹ دیا تھا اور پھر بھول گئی تھی۔ یہ ایڈریس میرے لیے بے حد اہم تھا۔ مجھے اس ایڈریس کی ضرورت تھی۔

○☆○

قریباً چوبیس گھنٹے بعد میں لاہور سے امارات کے لیے پرواز کررہا تھا۔ میری منزل امارات کا دارالخلافہ ابوظہبی تھا۔ ابوظہبی کو ابوذبی بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء تک یہ دوسری عرب ریاستوں کی طرح ایک بنجر علاقہ تھا لیکن پھر انگریزوں نے یہاں سے تیل نکالا اور یہ مالا مال ہو گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ابوظہبی چھ دوسری ریاستوں یعنی شارجہ' عجمان' فجیرہ' دبئی وغیرہ کے ساتھ ایک وفاق میں شامل ہو گیا تھا اور رحم دل ہر دل عزیز سلطان شیخ زید اس وفاق کے سربراہ مقرر ہوئے تھے۔ ابوظہبی روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک ضروری کام بھی کیا تھا۔ میں نے لاہور سے ایبٹ آباد میں فون پر زریں سے رابطہ کیا تھا اور اسے سمجھایا تھا کہ وہ کلثوم کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے کہیں روپوش ہو جائے۔ میں نے اسے صاف لفظوں میں بتایا تھا کہ مجھے شکر کی طرف سے سخت خطرہ ہے۔ کچھ پس و پیش کے بعد زریں نے میری بات مان لی تھی۔

میں نے اس فرضی پاسپورٹ پر سفر کیا تھا جو ساہی صاحب نے مجھے بنوا کر دیا ہوا تھا۔ اس پاسپورٹ پر میرا نام اعجاز احمد ڈیال تھا۔ دیگر کاغذات بھی اسی نام سے تیار کیے گئے تھے۔ ائرپورٹ پر مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ میں اپنے اٹیچی کیس کے ساتھ ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلا تو دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ ابوظہبی کی فضا میں پہنچتے ہی شدید تپش کا احساس ہوا۔ حالانکہ یہ نومبر کے آخری ایام تھے پھر بھی دوپہر خاصی گرم تھی۔ وہی چمکتا دمکتا سورج جو مڈل ایسٹ کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں اس شہر کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور اچھا خاصا متاثر ہو رہا تھا۔ ایک لمبی چوڑی ٹیکسی کار میرے پاس آکر رکی۔ ڈرائیور لمبی ناک اور گھونگریالے بالوں والا کوئی مصری باشندہ تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں پوچھا "کہاں جائیں گے؟"

میں نے سوہج کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا ہوا وہی ایڈریس بتا دیا جو مجھے فون انڈیکس میں سے ملا تھا۔ ٹیکسی روانہ ہوئی اور ابوظہبی کی صاف ستھری کشادہ سڑکوں پر پھسلنے لگی۔ ہر طرف بلند عمارتیں بن رہی تھیں اور ترقیاتی کام ہو رہے تھے۔ مجموعی طور پر شہر خوب صورت اور پرسکون تھا۔ گرین بیلٹس اور باغیچے وغیرہ دیکھ کر گمان ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم ایک صحرائی شہر سے گزر رہے ہیں۔ یہ سب تیل کی دولت کے کرشمے تھے۔ اگر وسائل موجود ہوں تو صحرا کو نخلستان بنایا جاسکتا ہے اور خیموں کو بلند و بالا عمارتوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے گزر کر ہم قریباً بیس منٹ بعد ایک رہائشی علاقے میں پہنچے۔ یقیناً یہ طبقۂ امرا کا علاقہ تھا۔ چند ہی لمحے بعد میں ایک خوب صورت کوٹھی کے مین گیٹ پر

کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔ ایک کالے بھجنگ حبشی ملازم نے دروازہ کھولا۔ میں نے چٹ پر اپنا نام اور مختصر تعارف لکھ کر اندر بھیجا۔ چار پانچ منٹ بعد ایک شاندار عورت دروازے پر نظر آئی' ٹیکسی ڈرائیور کی طرح اس عورت کو دیکھ کر بھی میں نے فوراً اس کی قومیت کا اندازہ لگالیا۔ یقیناً وہ مصری یا لبنانی تھی۔ جب وہ بولی تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ مصری ہے۔ عرب ممالک میں مصر کے لوگ اپنی اونچی لمبی ناک' گھونگریالے بالوں اور کھلے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے فوراً پہچانے جاتے ہیں۔ عورتوں کا حسن دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ سرخ و سفید رنگ جس میں گندمی رنگ کی آمیزش ہوتی ہے' بھرے بھرے جسم اور خوب صورت سیاہ آنکھیں۔ میرے سامنے کھڑی عورت میں بھی یہ تمام صفات موجود تھیں۔ میں اسے عورت کہہ رہا ہوں' اس کی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ وہ مصری خواتین کی طرح لمبی تڑنگی تھی۔ ورنہ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ اس کی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ مجھے اندر لے گئی۔ یہ خوب صورت رہائشی مکان عربی طرز سے سجایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم بہت آرام دہ تھا اور ائرکنڈیشنر کی وجہ سے یہاں سکون بخش خنکی تھی۔ اس عورت کا نام سلطانہ تھا اور فون پر میری بات اسی سے ہوئی تھی۔ فون پر جو تھوڑی سی تلخی ہوئی تھی اس کی جھلک اب سلطانہ کے چہرے پر نظر نہیں آئی تھی' اس تلخی کے بجائے ایک حیرت سی اس کے چہرے پر تھی۔ اس حیرت کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ میں غیر متوقع طور پر یہاں ابو ظہبی پہنچ گیا تھا۔

وہ بولی "آپ نے مجھے حیران کردیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ نہیں آئیں گے۔"

"اسی لیے آپ نے دوبارہ فون نہیں کیا۔"

"میرا دل بجھ سا گیا تھا۔ پھر جس طرح آپ نے اچانک فون بند کردیا تھا اس سے میں اور مایوس ہوگئی تھی۔"

"میں نے فون بند نہیں کیا تھا۔ لائن کٹ گئی تھی۔ بہرحال خوش آئند بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔"

گھریلو ملازم بہت صاف ستھرے کپڑوں والا ایک خوب رو لڑکا تھا۔ وہ طشتری میں اورنج جوس اور آئس کریم رکھ کر لے آیا۔ سلطانہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور گفتگو میں مصروف ہوگئی۔ اس گھر میں سلطانہ کی تین چار سالہ ثریا سی بچی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ سلطانہ' غزالہ کی دوست تھی۔ یہ دوستی غزالہ کی شادی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ دراصل سلطانہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ اسے انگلش کے علاوہ اردو اور فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ غزالہ سے شادی کے بعد جب شیخ عاصم کو اردو سیکھنے کا شوق چرایا تو اس نے سلطانہ کو اسکول کی ملازمت سے چھ ماہ کی چھٹی دلائی اور اپنے ساتھ لاہور لے گیا۔ لاہور کی ریئس والی کوٹھی میں قیام کے دوران میں سلطانہ' شیخ عاصم اور غزالہ کے ساتھ ہی مقیم رہی تھی۔ وہ ایک طرف غزالہ کو عربی سکھانے کی کوشش کررہی تھی اور دوسری طرف شیخ کو اردو سے واقف کررہی تھی۔ لاہور میں قیام کے دنوں میں غزالہ اور سلطانہ میں خاصی انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگئی تھی۔ سلطانہ کی زندگی کی مختصر روداد یہ تھی کہ سات آٹھ سال پہلے وہ ایک ٹیچر کی حیثیت سے بیروت میں مقیم تھی۔ ایک ارب پتی لبنانی تاجر کا نوعمر بیٹا جو فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا' اس پر بری طرح فریفتہ ہوگیا تھا۔ نوعمر عاشق نے اعلان کیا کہ اگر سلطانہ اس کی نہ ہوسکی تو وہ خودکشی کرلے گا۔ دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ ایک نوعمر لڑکے کی تفریح طبع کے لیے سلطانہ کو خرید لیا گیا۔ بہرحال بہت جلد سلطانہ کے نوعمر شوہر کا دل اس سے بھر گیا اور وہ چند ماہ کی بچی اور کچھ جائداد لے کر کنارہ کش ہوگئی۔ اب وہ تنہا تھی۔

میں نے سلطانہ کی طویل باتوں سے گھبرا کر کہا "پلیز سلطانہ صاحبہ! مجھے صرف اتنا بتادیں' غزالہ ٹھیک تو ہے نا۔"

سلطانہ کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے۔ بولی "شلو جہاں صاحب! سچ بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو اپنے طور پر یہاں بلوایا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ ناراض ہوں گے لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر میں غزالہ سے کہتی تو شاید وہ میری اس تجویز کو رد کردیتی اور مجھے سختی سے منع بھی کردیتی۔" ایک لمحہ توقف کرکے اس نے کہا "جہاں تک غزالہ کی خیریت کا تعلق ہے' وہ ابھی تک تو خیریت سے ہے لیکن اس خیریت پر مسلسل خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرا دھیان بار بار آپ کی طرف جا رہا تھا۔ غزالہ کی زبانی وقتاً فوقتاً جو کچھ مجھے آپ کے متعلق معلوم ہوتا رہا ہے اس نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ موجودہ حالات میں آپ ہی غزالہ کے لیے کچھ کرسکتے ہیں۔"

"کیا شیخ عاصم اس پر سختی کررہا ہے؟"

"پتا نہیں آپ سختی کو کن معنوں میں لیتے ہیں۔ ہمارے مشرقی ماحول میں تو عورت پیدا ہی سختی سہنے کے لیے ہوتی ہے۔

غزالہ پر بھی کئی معنوں میں سختی ہوتی رہی ہے اور ہورہی ہے لیکن اب اس کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے وہ اس کی حساس طبع کے لیے بے حد ناقابل برداشت ہوگا۔ میں تو سوچتی ہوں کہ کاش وہ شیخ صاحب کے ساتھ یہاں آئی ہی نہ ہوتی' وہ بہت بری طرح جکڑی گئی ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی اور سلطانہ اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ میں صوفے پر بیٹھا اپنے خیالوں میں الجھتا رہا۔ شیخ عاصم کی فطرت مجھ پر بہت اچھی طرح آشکار ہوچکی تھی۔ وہ ایک کینہ پرور اور بے رحم شخص تھا۔ اسے عہد قدیم کے کسی روایتی عیاش آقا سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔ وہی الف لیلوی آقا جو راہ چلتی خوب رو لڑکیوں کو اٹھاتے تھے یا نیلامیوں سے خریدتے تھے پھر انہیں اپنے عشرت کدوں میں بند کرتے تھے اور کوڑے مار مار کر آداب غلامی سکھاتے تھے۔ یہ زر خرید لونڈیاں اپنے حسن و شباب کو ہتھیلی پر سجا کر قطار در قطار اپنے آقاؤں کی خواب گاہوں کے سامنے کھڑی رہتی تھیں اور آقا کی ابرو کے ایک اشارے پر اپنا آپ "ہوس" کے سپرد کردیتی تھیں۔ ان کی دوشیزگی پامال کرنے کے بعد انہیں حرم کا حصہ بنادیا جاتا تھا' چند روز یا چند ہفتے آقا انہیں یاد رکھتا تھا پھر وہ اس کے حرم کے کسی گوشے میں سمٹ کر اس کی "قربت یا محبت" کی بھیک کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ نجانے کیوں میرے دل میں بھی ہر وقت یہ اندیشہ کسی انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا کہ کہیں غزالہ کے ساتھ بھی ایسا کچھ نہ ہوجائے۔

غزالہ شیخ عاصم کو اپنا شوہر گردانتی تھی لیکن میرے تجزیے کے مطابق شیخ کی نظر میں اس کی حیثیت ایک خوب صورت' زر خرید باندی سے زیادہ نہیں تھی۔ اگر وہ صرف باندی ہی ہوتی تو شاید یہ زیادہ خطرناک بات نہ ہوتی مگر غزالہ نے خود کو بیوی سمجھنے کا جرم کیا تھا اور بیوی ہونے کے زعم میں اس نے کچھ ایسے کام بھی کیے تھے جو شیخ عاصم کے نزدیک ہرگز قابل معافی نہیں ہوسکتے تھے۔ سری لنکا میں جب شیخ عاصم بیمار غزالہ کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا تھا تو غزالہ نے میرا تعاون قبول کرنے کی جسارت کی تھی۔ اس نے شیخ عاصم پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ میرے جسم سے الیکٹرانک ڈوائس نکلوا کر مجھے آزاد کردے۔ اس کی ایک اور بڑی جسارت یہ تھی کہ ایئنس والی کوٹھی میں اس نے شیخ کے مہمانوں سمیت درجنوں افراد کو "ملنگ ۲۲" نامی دوا کھلا کر بے ہوش کردیا تھا اور میرے قریبی ساتھیوں کو شمسہ سمیت شیخ کے چنگل سے رہائی دلوا دی تھی۔ یوں بازی پلٹ گئی تھی اور شمسہ کی زندگی

تباہی کے عین کنارے پر پہنچ کر لوٹ آئی تھی۔ یہ تو چند ایک مثالیں تھیں' ایسے کئی واقعات تھے جو شیخ کو غزالہ پر غضب ناک کرسکتے تھے اور غزالہ کے لیے کڑی سزا کا موجب بن سکتے تھے۔ یہاں اپنے لوگوں میں پہنچ کر غزالہ کو اذیت دینا یا اس کی جان لے لینا شیخ عاصم کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا دریا میں مچھلی کے لیے پانی پینا آسان ہوتا ہے۔ وہ اس قتل کا نام و نشان یوں مٹا سکتا تھا کہ قیامت تک سراغ نہ ملتا۔

خوبرو سلطانہ نے رات کو میرے لیے پُر تکلف عشائیے کا انتظام کیا تھا۔ نہایت خوبصورت پردوں والے ڈائننگ روم میں سجی ہوئی کھانے کی میز زبردست نظر آتی تھی اور عربوں کی مہمان نوازی کی جھلک دکھاتی تھی لیکن میں اس کھانے سے اتنا ہی دور تھا جتنا مشرق سے مغرب۔ میرے حواس پر تو صرف غزالہ اور اس کی مصیبت کا تصور براجمان تھا۔ میری خواہش تھی کہ سلطانہ کی مصروفیات جلد ختم ہوں' وہ کہیں ٹک کر بیٹھے اور مجھے غزالہ کے حالات کے متعلق تفصیل سے بتائے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کررہی ہے۔

کھانے کے بعد مزے دار کوفی چائے پیتے ہوئے سلطانہ نے اچانک کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ غزالہ اسی گھر میں ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں ششدر رہ گیا۔

"غزالہ یہاں میرے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔ آیئے میں آپ کو اس سے ملواؤں۔"

میرے لیے یہ حقیقت بے حد تعجب خیز تھی کیونکہ پچھلے نو دس گھنٹے سے جس چہار دیواری میں موجود ہوں' غزالہ بھی اسی چہار دیواری میں ہے۔

میں کسی معمول کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور سلطانہ کے ساتھ چل دیا۔ ہم قالین پوش زینے طے کرکے مکان کی بالائی منزل پر آگئے۔ پورا مکان شاہانہ انداز میں سجا ہوا تھا۔ دبیز پردے' بڑے بڑے فانوس' منقش دروازے۔ راہداری میں مجھے دو باوردی گارڈز نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ ہم ان کے قریب سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچے۔ سلطانہ دبے پاؤں چل رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک ادھ کھلی کھڑکی کے سامنے پہنچے۔ ریشمی پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا اور اندر کا منظر نظر آرہا تھا۔ میں نے غزالہ کو دیکھا۔ وہ ایک شاندار مسہری پر لیٹی تھی۔ ٹیلی وژن پر ایک عربی فلم چل رہی تھی۔ غزالہ کی نگاہیں اسکرین پر تھیں لیکن اس کا ذہن کہیں دور

بہت دور رہتا تھا۔ وہ ایک ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ بال بھی شانوں پر بکھرے تھے۔ غزالہ کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ ایک نظر دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔

ہم جس طرح خاموشی سے بالائی منزل پر پہنچے تھے، اسی طرح خاموشی سے واپس آگئے۔ "یہ سب کیا ہے سلطانہ' غزالہ یہاں کیسے اور شیخ عاصم کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "ابھی آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔ غزالہ ابھی تک اس بات سے بے خبر ہے کہ آپ یہاں ہیں۔ وہ حیران ہو رہی ہوگی کہ میں نیچے جاتی ہوں تو واپس آنے کا نام کیوں نہیں لیتی۔ آپ بیٹھیں' میں ابھی پندرہ بیس منٹ میں آتی ہوں۔"

سلطانہ اوپر چلی گئی۔ میں نے قریباً پون گھنٹے تک سخت بے قراری سے سلطانہ کا انتظار کیا۔ غزالہ کی حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھا تھا۔ چند ہی ہفتے میں وہ پندرہ بیس پاؤنڈ وزن کم کر چکی تھی اور رنگ سرسوں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں یہاں کیا سلوک ہوا تھا اس کے ساتھ اور شیخ عاصم کا برتاؤ اس کے ساتھ کیا رہا تھا۔

سلطانہ جس وقت واپس آئی گھڑی کی سوئیاں شب گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ وہ بولی۔ "شاہ جہاں صاحب! غزالہ' شیخ عاصم صاحب کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ پریشانی اس نے خود مول لی ہے۔ مجھے ایک مدت سے اندیشہ تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا۔ غزالہ کے تقریباً ہر خیر خواہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ امارات پہنچ کر شیخ کا رویہ وہ نہیں رہے گا جو پاکستان میں ہے۔"

سلطانہ نے کہا۔ "میں آپ کے اندیشے کی نفی نہیں کر رہی لیکن فی الحال بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ غزالہ شیخ عاصم صاحب کی وجہ سے پریشان نہیں۔ شیخ عاصم صاحب کے لئے پریشان ہے۔ یہاں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ شیخ عاصم اس وقت اسپتال میں ہیں۔ پاکستان میں ان کی کمر پر جو چوٹ آئی تھی وہ یہاں ایک واقعے کی وجہ سے پھر تازہ ہو گئی ہے اور انہیں بے حد تکلیف دے رہی ہے۔ دوسری طرف خاندان میں بھی کچھ لوگ شیخ عاصم کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ غزالہ کے ساتھ شیخ عاصم کی شادی سے ناخوش ہیں۔"

"کیوں؟ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"لیکن اب ایسا ہے۔ قبیلے والوں کا خیال ہے کہ شیخ عاصم اپنے بھائی شیخ راشد بن ارشد کا قتل معاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس ارادے کی وجہ غزالہ ہے۔"

میں نے سلطانہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہارے خیال میں واقعی ایسا ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے شیخ عاصم ماڈرن ہونے کے باوجود سرتاپا قبائلی ہیں۔ اور قبائلی اتنی آسانی سے دشمنی فراموش نہیں کرتے۔ میرے خیال میں تو شیخ عاصم کے خیالات بھی وہی ہیں جو باقی قبیلے کے ہیں لیکن شیخ عاصم ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لے رہے ہیں۔ دوسری طرف قبیلے کے کچھ معزز افراد جن میں شیخ عاصم کی پرانی حریف عشارب فیملی بھی شامل ہے' شیخ کو فوری انتقام کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی ماہ پہلے ایک قبائلی میٹنگ (جرگے) میں فیصلہ ہوا تھا کہ اگر آپ اپنی ہمشیرہ (غزالہ) کی شادی شیخ صاحب کے بھتیجے شیخ ایاز کے ساتھ کر دیں تو اس دشمنی کو راضی نامے میں بدلنے کی صورت نکل سکتی ہے لیکن چونکہ یہ شادی نہیں ہو سکی اور جو لوگ یہاں سے برات کی صورت میں پاکستان گئے تھے وہ خالی ہاتھ واپس آئے ہیں لہٰذا قبیلے کے سرکردہ افراد کا انتقام نئے سرے سے جوش مارنے لگا ہے اور وہ لوگ جلد از جلد کوئی فیصلہ چاہ رہے ہیں۔"

"مگر شیخ عاصم تو قبیلے کا سرخیل ہے اور وہ سب اس پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔"

"آپ کی بات درست ہے مگر پچھلے چند ہفتے میں حالات نے کئی کروٹیں لی ہیں اور اس میں ایک اہم کردار شنکر شکرا نامی شخص کا بھی ہے۔"

"شنکر شکرا؟ اس نے کیا کیا ہے؟"

"شاید یہ بات آپ کے لئے باعثِ حیرت ہو کہ شنکر شکرا شیخ عاصم کی شدید مخالفت کر رہا ہے اور میرے اندازے کے مطابق قبیلے میں پھوٹ ڈلوانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ شنکر تو شیخ کا چہیتا اور قابلِ اعتماد کارندہ ہے۔"

"اب ایسا نہیں ہے۔" سلطانہ نے حیرت انگیز انکشاف کیا۔ "شنکر کے ساتھ شیخ صاحب کی مخالفت پیدا ہو چکی ہے۔"

"وجہ؟"

"شیخ صاحب نے شنکر کو فارغ کرنا چاہا تھا۔ شنکر نے اسے اپنی ہتک جانا اور بھڑک اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیخ صاحب کے اس فیصلے کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے۔ وہ اپنی سبکدوشی کے ڈانڈے غزالہ سے ملا رہا تھا۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ مجھے غزالہ کی وہ بات یاد آ گئی جو اس نے امارات آنے سے قبل کہی تھی۔ اس نے میری یہ بات تسلیم کی تھی کہ جب تک شنکرا اور شیخ عاصم کا ساتھ ہے' شیخ عاصم چاہے بھی تو مجھ سے محاذ آرائی ترک نہیں کر سکتا۔ یہ بات تسلیم کرنے کے بعد غزالہ نے پختہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ شیخ عاصم پر زور دے گی کہ وہ شنکر سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"شنکر کو ملازمت سے الگ کرنے والا واقعہ کب پیش آیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی دو ہفتے پہلے۔ سنا ہے کہ شنکرا اور شیخ عاصم کے درمیان سخت کلامی بھی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے وہ شیخ عاصم کو دھمکا کر گیا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ کوئی بہت عیار شخص ہے۔ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اسے معلوم تھا کہ قبیلے میں سے کون سے لوگ شیخ عاصم صاحب کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ ان میں شیخ عاصم کا چچا زاد بھائی شیخ عشارب سب سے نمایاں تھا۔ شنکر سب سے پہلے شیخ عشارب سے ملا اور شیخ عاصم کے خلاف اس کے کان بھرے۔ شنکر نے شیخ عشارب اور دوسرے شیوخ کو باور کرایا کہ جس شادی کے لئے قبیلے کے معزز افراد پاکستان گئے تھے وہ شادی صرف اور صرف مسز شیخ عاصم (غزالہ) کی وجہ سے انجام نہیں پا سکی تھی۔ شنکر نے شیخ عاصم کے مخالفین کے ذہنوں میں یہ بات بھی ڈالی ہے کہ شیخ عاصم اپنی بیوی کے کہنے پر شاہ جہاں سے قتل کا بدلہ چکانے کا ارادہ ترک کر چکے ہیں۔ شنکر کی یہ بات بھس میں چنگاری ثابت ہوئی۔ قبیلے میں جو لوگ پہلے دبی زبان میں شیخ صاحب کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ وہ کھلے عام کرنے لگے۔ مجھے اندر کے حالات کا کچھ زیادہ علم تو نہیں مگر اتنا پتا ضرور چلا ہے کہ پچھلے اتوار شیخ عاصم اور عشارب فیملی کے سربراہ مسٹر عشارب کا آپس میں جھگڑا ہوا اور نوبت تلخ کلامی سے آگے بڑھ کر گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ شیخ عاصم نے شیخ عشارب کو اپنے گھر سے نکلنے کے لئے دھکا دیا۔ جواب میں مسٹر عشارب نے شیخ صاحب کو دھکا دیا۔ شیخ عاصم صاحب کا پاؤں رپٹا اور وہ برآمدے کی تین سیڑھیوں سے نیچے گر گئے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں پھر سے شدید درد ہو گیا۔ اب شیخ عاصم اسپتال میں ہیں اور سخت پریشان ہیں۔"

شیخ عشارب کا ذکر سن کر مجھے وہ سارے واقعات یاد آ گئے تھے جو سری لنکا میں پیش آئے تھے۔ شیخ عشارب شیخ عاصم کا وہی چچا زاد بھائی تھا جو "اے کو" کے نام سے سری لنکا میں قیمتی کھالوں اور آئیوری کا کالا دھندا کرتا تھا۔ شیخ عاصم کے ساتھ اس کا کاروباری ٹکراؤ بھی تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے سلطانہ سے پوچھا۔ "شیخ عاصم اسپتال میں ہے تو غزالہ کو بھی وہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ یہاں آپ کے پاس کیا کر رہی ہے؟"

"غزالہ بڑی مشکل میں ہے شاہ جہاں صاحب! اگر میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے تو بلاوجہ نہیں بلایا۔ شیخ عاصم کی تمام پریشانیوں کا نزلہ غزالہ پر گر رہا ہے اور یہ نزلہ گرانے والے شیخ عاصم کے اہلِ خانہ ہیں۔ وہ ان تمام معاملات کی اصل ذمے داری غزالہ پر ہی ڈال رہے ہیں۔ شیخ عاصم کے گھر میں دو عورتیں ایسی ہیں جو بے حد بااثر اور طاقتور ہیں اور وہ دونوں غزالہ کے خلاف ہیں۔ ان میں سے ایک شیخ صاحب کی والدہ ماجدہ ہیں' دوسری شیخ صاحب کی پہلی بیوی جمیلہ نور ہیں۔ درحقیقت شیخ صاحب کے حرم میں جمیلہ نور سیاہ و سفید کی مالک ہے۔ وہ چونتیس پینتیس برس کی ایک بہت خرانٹ و کرخت عورت ہے۔ وہ تمام عورتیں جو شیخ عاصم کے حرم کی زینت بنتی ہیں ان پر جمیلہ کڑی نگرانی رکھتی ہے اور ان سب کو جمیلہ کے حکم کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ جمیلہ جس لڑکی سے ناراض ہو جائے وہ چاہے شیخ عاصم کو کتنی ہی پسند ہو' زیادہ دیر حرم میں نہیں ٹھہر سکتی۔ اب اسے غزالہ کی خوش قسمتی کہا جائے یا بدقسمتی کہ جمیلہ نور نے پہلے دن ہی غزالہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ شاید' اس کا خیال ہے کہ غزالہ مستقبل میں اس کے "اقتدار" کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ بیوی کی حیثیت سے اب تک تین عورتیں عاصم صاحب کی زندگی میں آ چکی ہیں۔ ان میں سے ایک تو بہت ہی بھلی مانس اور کسی حد تک گوشہ نشین ہے۔ باقی دو سے جمیلہ کی بنی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں ماتھے پر طلاق کا داغ سجانا پڑا۔ ابھی غزالہ کو یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے' جمیلہ کا رویہ کسی حد تک مبہم ہے لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ رویہ زیادہ دیر مبہم نہیں رہے گا۔ عنقریب جمیلہ کھل کر غزالہ کی مخالف ہو جائے گی اور غزالہ کو بڑی سختی برداشت کرنی پڑے گی۔ اب بھی غزالہ کے لئے اس گھر میں صورتِ حال کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بہت بری ہے۔ وہ لوگ غزالہ کی آمد کو شیخ فیملی کے لئے برا شگون قرار دے رہے ہیں۔ شیخ کی بیماری اور قبیلے میں اس کی مخالفت کا ذمے دار غزالہ کو قرار دیا جا رہا ہے۔ چند ہفتوں کے اندر ہی اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جانے لگا ہے اور یہ

رویہ صرف جمیلہ تک ہی محدود نہیں' پورا گھر غزالہ سے یہی برتاؤ کر رہا ہے۔ خاص طور پر عاصم کے اسپتال شفٹ ہونے کے بعد وہ اور زیادہ گھٹن کا شکار ہوگئی ہے۔ ایک ہفتے سے وہ بہت ڈپریس تھی۔ جمیلہ نے اس سے سخت کلامی کی تھی۔ غزالہ شیخ عاصم کی مزاج پرسی کے لئے اسپتال جانا چاہتی تھی۔ جمیلہ نے اسے روکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسپتال کی انتظامیہ بار بار مزاج پرسی کی اجازت نہیں دے گی۔ معمولی سی بات تھی لیکن اس پر جمیلہ بگڑ گئی اور غزالہ کو سارے اہل خانہ کی تلخ و ترش باتیں سننا پڑیں۔ اتفاقاً میں بھی وہاں چلی گئی۔ میں نے جمیلہ سے درخواست کی کہ وہ غزالہ کو چند روز کے لئے میرے ساتھ بھیج دے۔ ماحول بدلنے سے اس کا موڈ بہتر ہوجائے گا اور میں اسے سمجھا بجھا بھی دوں گی۔ جمیلہ نے اجازت دے دی۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "جو حالات تم نے بتائے ہیں وہ تکلیف دہ ہیں لیکن ان حالات کو غزالہ نے خود دعوت دی ہے۔ اب یہ سب کچھ تو اسے جھیلنا ہی ہے اور بہتر ہے کہ وہ خود ہی ان حالات کا سامنا کرے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہاں آنا غزالہ کے لئے کسی طور فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔"

سلطانہ نے گلاس میں مجھے قہوہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو ایک زیادہ گمبھیر مسئلے کے لئے یہاں بلایا ہے۔ مجھے خدشہ ہے شاہ جہاں صاحب کہ شنکر شکرا نامی وہ بدمعاش غزالہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ سلطانہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "غزالہ نے مجھے بتایا ہے کہ وہ خبیث ایک مرتبہ پہلے بھی اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے چکا ہے اور اس کی جان کے درپے ہے۔ موجودہ حالات میں وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس نے غزالہ کو بالکل تنہا کردیا ہے۔ وہ اس اجنبی ملک میں اجنبی لوگوں کے درمیان ہے اور یہ اجنبی لوگ اس کی مخالفت بھی کررہے ہیں۔ وہ شکستہ دل ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔ اسے ایک شیخ عاصم کا آسرا تھا اور وہ بھی اسپتال میں ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے شک گزرا کہ شنکر غزالہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا؟"

وہ بولی۔ "شک کی کوئی بات ہی نہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے شنکر کو غزالہ کا پیچھا کرتے دیکھ چکی ہوں۔ اس کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے گاڑی ایک پولیس اسٹیشن میں گھسا دی اور یوں اس موذی سے غزالہ کی جان بچ گئی۔ یہ اسی دن کا واقعہ ہے جب میں غزالہ کو اپنے ساتھ یہاں لارہی تھی۔ ایک گاڑی نے مسلسل ہمارا تعاقب کیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص کی شکل دیکھ کر غزالہ کی چیخ نکل گئی۔ اسی نے مجھے بتایا کہ یہ بدنام زمانہ مجرم شنکر شکرا ہے اور اس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ ہمارے راستے میں تین چار کلو میٹر تک سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ غزالہ کے مشورے پر میں نے گاڑی نزدیکی پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دی۔ ہم نے پولیس والوں کو بتایا کہ ایک خطرناک شخص بری نیت سے ہمارا پیچھا کررہا ہے۔ غزالہ نے عقلمندی کا ثبوت دیا کہ شنکر شکرا کا نام نہیں بتایا' ورنہ ہم یقیناً مصیبت میں پڑجاتیں۔ اگلے روز کے اخبار سے بلکہ شاید اسی روز شام کے اخبار سے ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ ابو ظہبی کی پولیس شنکر بھارتی عرف شنکر شکرا کی موجودگی سے آگاہ ہوچکی ہے اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر میری یا غزالہ کی زبان سے شنکر کا نام نکل جاتا تو لازماً ہمیں لمبی چوڑی تفتیش کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہرحال تھانے میں آدھا پون گھنٹہ رکنے کا ہمیں بہت فائدہ ہوا' نہ صرف شنکر سے ہمارا پیچھا چھوٹ گیا بلکہ اسٹیشن انچارج کی طرف سے ہمیں حفاظت کے لئے مسلح گارڈز بھی مہیا کئے گئے۔ ابھی آپ نے بالائی منزل پر جو دو گارڈز دیکھے ہیں ان کا تعلق پولیس سے ہے۔ یہاں ابو ظہبی کی پولیس ایسے معاملات میں سستی کا مظاہرہ ہرگز نہیں کرتی۔"

سلطانہ جو کچھ بتا رہی تھی وہ خاصا تشویش ناک تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ غزالہ کو اس کے ساتھ یہاں رہتے ہوئے کتنے روز ہوئے ہیں۔

وہ بولی۔ "آج آٹھواں روز ہے۔ اس دوران میں سب خیریت رہی ہے۔"

"شنکر کی صورت تو پھر نظر نہیں آئی؟"

"نہیں ابھی تک تو نہیں۔ دراصل غزالہ کی پریشانی دیکھتے ہوئے میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا۔ پہلے تین چار روز میں اور وہ ایک دوسرے مکان میں رہی ہیں۔ وہ مکان شہر کے شمالی علاقے میں ہے اور میری ایک لبنانی دوست کا ہے۔ جب مجھے پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ میری رہائش گاہ محفوظ ہے تو پھر ہم یہاں شفٹ ہوئیں۔" ایک لمحہ توقف کرکے سلطانہ نے کہا۔ "میں نے غزالہ سے شنکر کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے لیکن اطمینان کی بات میرے لئے یہ تھی کہ میں نے غزالہ سے آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں' میں اس نتیجے پر

پہنچی تھی کہ ان حالات میں غزالہ کو آپ کی شدید ضرورت ہے۔ پولیس گارڈز یا شیخ صاحب کے دو چار کارندوں کے بس کی یہ بات نہیں کہ شنکر جیسے موذی سے غزالہ کو محفوظ رکھ سکیں لیکن میں یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ غزالہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی کہ میں آپ کو اس سلسلے میں زحمت دوں اور یہاں بلواؤں' لہٰذا میں نے اس کے علم میں رکھے بغیر یہ قدم اٹھایا۔"

میں اور سلطانہ اس موضوع پر قریباً ایک گھنٹا گفتگو کرتے رہے۔ سلطانہ سخت پریشان تھی۔ وہ شنکر کے بارے میں بہت تھوڑا جانتی تھی لیکن جتنا بھی جانتی تھی اس سے سلطانہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ شنکر بہت خوفناک شخص کا نام ہے۔

میں نے کہا۔ "سلطانہ صاحبہ' آپ نے مجھے یہاں بلا تو لیا ہے لیکن غزالہ کو ابھی تک بے خبر رکھا ہوا ہے۔ اسے کون بتائے گا کہ میں یہاں ہوں اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟"

"نتیجہ کچھ بھی نکلے' میں اس کی حماقتوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ آپ کو یہاں بلانے والی میں ہوں۔ اب اسے آپ کی آمد سے باخبر بھی میں ہی کروں گی۔ آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔"

سلطانہ بالائی منزل پر چلی گئی۔ میں کمرے میں بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ سلطانہ واپس آئی اور نہ غزالہ کی جھلک دکھائی دی۔ میں زینے طے کرکے اوپر پہنچا۔ ابھی راہداری میں ہی تھا کہ غزالہ اور سلطانہ کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے غزالہ کو مسہری پر نیم دراز دیکھا تھا۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ غزالہ اور سلطانہ میں گرماگرم بحث ہورہی ہے بلکہ اسے تلخ کلامی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ گفتگو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس گفتگو کا بنیادی موضوع یہاں میری آمد ہی ہے۔ گارڈز موجود نہیں ہوتے تو شاید میں مزید آگے جاتا اور یہ گفتگو سننے کی کوشش کرتا مگر گارڈز کی موجودگی میں' میں نے واپس آنا ہی مناسب سمجھا۔ سلطانہ کی واپسی کے لئے مجھے قریباً نصف گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ غزالہ بھی اس کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔ میری اور غزالہ کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ لمحہ مختصر ہونے کے باوجود بہت طویل تھا۔ میں اس ایک لمحے میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔ اپنی مجبوریاں' غزالہ کی رسوائیاں' گزر جانے والے وقت کا احساس ۔۔۔ کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

"السلام علیکم" غزالہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے جواب دیا اور رسمی انداز میں حال پوچھا۔ غزالہ نے مختصر جواب دیئے۔

اس کے تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سلطانہ کے ساتھ اس کی کافی بحث ہوئی ہے۔ یقیناً اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ سلطانہ نے مجھے یہاں بلا لیا تھا' بہرحال سلطانہ اسے کسی نہ کسی طرح قائل کرنے میں کامیاب رہی تھی (ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ میرے سامنے ہی نہ آتی) وہ بمشکل پانچ منٹ ہمارے ساتھ بیٹھی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے مجھے یہاں دیکھ کر اس کی پریشانیوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا ہے۔ مجھے خود بھی یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں غزالہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہوں۔ اگر یہ بات کسی طرح غزالہ کے شوہر یا اس کے سسرالی رشتے داروں کو معلوم ہوجاتی تو بات کا بتنگڑ بن سکتا تھا۔

میں نے جیسے تیسے رات کاٹی اور صبح سلطانہ سے کہا کہ میں اپنے رہنے کا انتظام کسی ہوٹل میں کرلیتا ہوں۔ اس نے میری اس رائے کو سختی سے مسترد کردیا۔ بولی۔ "میں خطرے کی بو سونگھ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو یہاں صرف اس لئے بلایا ہے کہ آپ غزالہ کی حفاظت کرسکیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ غزالہ کے آس پاس رہیں۔"

میں نے ایک دو دلائل دیئے لیکن سلطانہ نے کہا۔ "میں یہاں کے حالات کو آپ سے بہتر سمجھتی ہوں۔"

سہ پہر کے وقت میں شہر میں گھومنے کے لئے نکل گیا۔ ایک تپتی ہوئی دوپہر کے بعد لمحہ بہ لمحہ اپنے پر پھیلاتی شام بڑی خوشگوار تھی۔ صاف ستھری کشادہ سڑکیں' دورویہ سایہ دار درخت' چمکتی دمکتی لمبی کاروں کی [illegible] اور ان سب سے بڑھ کر کھجور کے تناور درخت گویا نیلے آسمان کو چھوتے ہوئے' میں اس ماحول سے لطف اندوز ہوتا شہر کے ایک بارونق علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں شاپنگ سینٹر تھے' ریستوران تھے' اکا دکا نائٹ کلب بھی نظر آرہے تھے۔ اس زاویے سے شہر خاصا ماڈرن نظر آتا تھا۔ راستے میں مجھے ایک شیخ صاحب نظر آئے۔ انہوں نے ہاتھ پر خوبصورت سنہری عقاب بٹھا رکھا تھا۔ سنہری عقاب کو دیکھ کر میرا ذہن پلک جھپکتے میں وادی داخان کی بھول بھلیوں میں پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سنہری عقاب کی آنکھوں میں

جھانکا' مجھے لگا جیسے یہ پردہ نشین سانوس کی آنکھیں ہیں۔ سانوس کی غیر مرئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ "تکلیفوں اور مشقتوں سے محبت کرنا سیکھ لو۔ یہی تمہارے لئے راحتوں کا پیغام لاتی ہیں۔" میں صاف ستھرے فٹ پاتھ پر دھیمے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی شام نے رات کا لباس اوڑھنا شروع کر دیا۔ فضا میں موجود ہلکی سی تپش بھی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔ میں ایک مصری ریسٹوران میں داخل ہو گیا۔ بڑا خوبصورت ماحول تھا۔ ہلکی موسیقی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی' در و دیوار سے روشنیاں سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ لگتا تھا' میں کسی مغربی ملک کے ریسٹوران میں ہوں۔

میں ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گیا۔ ایک مصری رقاصہ گانے کی دُھن پر تھرکتی پھر رہی تھی۔ اس کا پیٹ بہت اوپر سے نیچے تک عریاں تھا۔ ناف میں کوئی قیمتی پتھر جگمگا رہا تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں بے خبری میں ایک رنگین ماحول والے ریسٹوران نما کلب میں آ گیا ہوں۔ میری قریبی میز پر چند امیر زادے بیٹھے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گلاسوں میں چائے پی رہے تھے اور قیمتی سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے۔ جب بھی رقاصہ ان کے قریب سے گزرتی' وہ کوئی نہ کوئی دست درازی کر گزرتے۔ رقاصہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی کیونکہ یہ اس کی ڈیوٹی تھی۔ نہ صرف یہ اس کی ڈیوٹی تھی کہ برداشت کرے بلکہ یہ بھی ڈیوٹی تھی کہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھے۔ میں جلتا بھنتا لاتعلق بیٹھا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ پھر ایک موقع ایسا آیا کہ ایک امیر زادے نے سرِعام' رقاصہ سے فحش حرکت کی۔ ضبط کے باوجود رقاصہ کے چہرے پر برہمی کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے احتجاجی نظر کاؤنٹر پر موجود منیجر نما دیوہیکل شخص پر ڈالی۔ دیوہیکل شخص کا ردعمل یقیناً رقاصہ کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے خاص انداز میں رقاصہ کو گھورا۔ وہ پھر سے مسکرانے لگی اور محو رقص ہو گئی۔ رقاصہ اور منیجر کی نگاہوں کے انتہائی مختصر تبادلے کو شاید میرے سوا کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ نجانے ایسے کتنے واقعات روزانہ ایسے کلبوں میں ہوتے تھے۔ رقاصہ پیٹ کی خاطر پیٹ کی نمائش کر رہی تھی اور اس ننگے پیٹ کی پاداش میں چٹکیوں اور چٹکلوں سے زیادہ اذیت ناک فقروں کی سزا جھیل رہی تھی۔ سزا تو سزا ہوتی ہی ہے لیکن سزا جھیل کر مسکرانا بھی ایک سزا ہوتی ہے اور میں اس دہری سزا کا منظر دیکھ رہا تھا۔

میں جہاں بیٹھا تھا وہاں دائیں طرف ایک دیوار گیر شیشہ تھا۔ اس کے ہلکے براؤن شیشے میں سے باہر صاف ستھرے پارکنگ لاٹ اور سڑک کا منظر نظر آ رہا تھا۔ یہ جمعرات کی شب تھی یعنی ویک اینڈ کا ماحول تھا۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ لمبی لمبی کاروں میں سے دلکش چہرے جھانک رہے تھے۔ ابوظہبی میں مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رات کے وقت سڑکوں پر لائٹنگ کا انتظام تھا۔ زردی مائل بڑی شاندار روشنیاں تھیں جو ہر چیز کو جگمگا دیتی تھیں۔ اچانک میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ میری نظر شنکر شنکرا پر پڑی تھی۔ یقیناً وہ شنکر شنکرا ہی تھا۔ یہ سب کچھ ایک اتفاق کے تحت ہوا تھا۔ پارکنگ لاٹ کے ایک تاریک گوشے میں وہ کھڑا تھا۔ ایک شیورلیٹ کار تیزی سے ریورس ہوئی تو اس کی طاقتور روشنیوں نے ایک سیکنڈ کے لئے پارکنگ کے اس تاریک گوشے کو منور کر دیا۔ یہی لمحہ تھا جب میری نگاہ بھی اس طرف اٹھی۔ جیسے سرچ لائٹ کا روشن دائرہ جنگل میں چھپے ہوئے کسی درندے کی جھلک دکھا کر آگے نکل جائے' پارکنگ لاٹ کے اس گوشے میں بھی پھر تاریکی چھا گئی تھی۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔

یہ شنکر یہاں کیسے پہنچا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ سلطانہ کی رہائش گاہ کے آس پاس موجود ہو اور وہاں سے میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آ گیا ہو۔ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ سلطانہ کے اندیشے درست ہیں۔ شنکر غزالہ کے آس پاس موجود ہے۔ وہ اس چار دیواری تک پہنچ چکا ہے جس نے اس دیارِ غیر میں غزالہ کو پناہ دے رکھی ہے۔ اور اگر وہ اس چار دیواری تک نہیں بھی پہنچا تو اس کے قرب و جوار میں ضرور موجود ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف وہی خنجر تھا جو ایک خاص تکنیک سے میری پنڈلی سے چپکا رہتا تھا۔ میز پر چائے کا بل اور ٹپ وغیرہ رکھ کر میں باہر نکل آیا۔ ریسٹوران کے ایک بغلی دروازے سے گزر کر میں ریسٹوران کے پارکنگ لاٹ میں پہنچا۔ وہ تاریک گوشہ جہاں میں نے شنکر کی جھلک دیکھی تھی' بالکل خالی نظر آ رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پارکنگ لاٹ میں چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے کے لئے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے وہم ہوا تھا۔ شنکر یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ بندہ جس چیز کے بارے میں بہت سوچتا ہے وہ اعصاب پر اور حواس پر سوار ہو جاتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ چیز نہ موجود ہونے کے باوجود "موجود" محسوس ہوتی ہے مگر پھر فوراً ہی میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔

بےشک شنکر کی جھلک مجھے بہت تھوڑے وقت کے لئے نظر آئی تھی۔ شاید ایک سیکنڈ یا نصف سیکنڈ کے لئے مگر میری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔

میری واپسی بذریعہ ٹیکسی کار ہوئی۔ میں گھر پہنچا تو سلطانہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا تیار تھا اور کھانے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ یہ خالص عربی طرز کا کھانا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی تھی جسے مقامی طور پر دجاج کہا جاتا ہے۔ چاول تھے جنہیں زیتون کے تیل میں پکایا گیا تھا اور اس میں کئی طرح کا گوشت ڈالا گیا تھا۔ ایرانی طرز کی لمبوتری روٹیاں تھیں۔ کھجور' کریم اور پنیر کو مکس کر کے ایک شاندار سویٹ ڈش تیار کی گئی تھی۔ شنکر کو دیکھنے کے بعد میری بھوک اڑ چکی تھی لیکن سلطانہ نے اتنی محبت سے اہتمام کیا تھا کہ مجھے چار و ناچار کھانے کی میز پر بیٹھنا ہی پڑا۔ غزالہ بھی میز کے دوسرے سرے پر موجود تھی' کھانے کے دوران میں اس نے بس رسماً ایک آدھ فقرہ بولا تھا۔

ابھی ہم ڈائننگ ٹیبل پر ہی تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد ملازمہ اندر داخل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک جسیم جثیم عورت کی جھلک نظر آئی۔ اس کا قد کم و بیش سوا چھ فٹ تھا۔ شانے چوڑے' گردن مضبوط اور رنگ گندمی تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی ایک بارعب اور دبنگ عورت نظر آئی۔ میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ یہ شیخ عاصم کی پہلی بیوی جمیلہ نور ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ جمیلہ نور نے زرق برق اور نہایت قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ زیورات بھی بہت قیمتی تھے اور ان میں جواہرات کی چمک دمک دکھائی دے رہی تھی۔

اسے دیکھ کر سلطانہ اور غزالہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ مجبوراً مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ جمیلہ نور براہِ راست غزالہ سے مخاطب ہوئی۔ "میں کافی دیر سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن شاید دونوں لائنیں خراب ہیں۔"

غزالہ کے بجائے سلطانہ نے جواب دیا اور تصدیق کی کہ لائنیں خراب ہیں۔ جمیلہ نور غزالہ سے بولی۔ "تم ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پرنس اشباح کی چھوٹی بیٹی کی منگنی کی تقریب ہے۔ تمہارا جانا بھی بہت ضروری ہے۔"

پھر غزالہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے اپنے ساتھ آئی ہوئی ایک سیاہ فام خادمہ کو اشارہ کیا۔ خادمہ کے ہاتھ میں ایک نفیس اٹیچی کیس تھا۔ جمیلہ نور شکستہ انگریزی میں بولی۔ "وقت کم تھا' میں تمہارا لباس وغیرہ ساتھ ہی لے آئی ہوں۔ میک اپ کٹ بھی اندر رہی ہے۔ چلو جلدی سے کپڑے بدل لو۔"

"لیکن ــــ میری طبیعت کچھ ــــ ٹھیک نہیں ہے۔" غزالہ نے دبے لہجے میں کہا۔

"نہیں چاند! جانا ضروری ہے۔ ورنہ شیخ صاحب بھی ناراض ہوں گے۔ پرنس کے گھر والوں نے خاص طور سے کہا تھا کہ نئی دلہن کو بھی ساتھ لے کر آئیں۔"

"ان سے کہہ دیں کہ شیخ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں لہٰذا ــــ"

"تم مجھے رسم و رواج سکھانے کی بات مت کرو۔" وہ عجیب دندناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خود پر بہت ضبط کیا ہے۔ اس کا وسیع و عریض چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔

میں نے نوٹ کیا کہ سلطانہ نے خاموشی سے غزالہ کو کوئی اشارہ کیا ہے۔ غالباً اس نے غزالہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جمیلہ نور کے جواب میں خاموش رہے۔

جمیلہ نور لہجے میں ملائمت پیدا کرتے ہوئے بولی۔ "ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کے رسم و رواج کو اپنانا پڑتا ہے۔ اور یہ ہماری رسم ہے کہ جب کسی حرم میں سے ایک بیوی کسی تقریب میں جاتی ہے تو دوسریوں کو بھی جانا پڑتا ہے۔"

غزالہ بڑی لاچار نظر آ رہی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ تقریب میں جانا نہیں چاہتی لیکن جمیلہ نور کے سامنے مرعوبیت کا شکار ہے۔ شاید اسے خوف تھا کہ اس نے پھر اعتراض کیا تو جمیلہ نور بھڑک اٹھے گی۔ وہ چند سیکنڈ سوچتی رہی پھر ملازمہ کے ہاتھ سے اٹیچی لیا اور خاموشی سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

جسیم جثیم عورت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ چہرے پر عجیب سی سختی نمودار ہو گئی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سلطانہ سے عربی میں کوئی سوال کیا۔ یقیناً یہی پوچھا ہو گا کہ یہ ذات شریف کون ہیں۔ جواب میں سلطانہ نے تسلی بخش جواب دیا۔ جمیلہ نور پھیل کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھاری بھرکم اور مضبوط تھے۔ سینے کا پھیلاؤ اور حجم بہت زیادہ تھا۔ وہ اسے اوڑھنی وغیرہ سے ڈھانپنے کا تکلف نہیں کرتی تھی بلکہ بڑی شان سے اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی۔ وہ سلطانہ سے عربی میں باتیں کرتی رہی۔ جو دو کنیزیں اس کے ہمراہ آئی تھیں وہ ہاتھ باندھے مؤدب کھڑی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ باہر گاڑی میں شیخ عاصم کی دوسری بیگم بھی موجود ہے۔

غزالہ پندرہ بیس منٹ میں تیار ہو کر باہر آ گئی۔ میں اپنے

دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک ایسی نو بیاہتا لڑکی نظر آ رہی تھی جو سسرال میں اپنے اولین دن گزار رہی ہو۔ اس کا لباس شوخ رنگوں والا تھا۔ کانوں میں جھمکے، گلے میں ہار، کلائیوں میں رنگ برنگے نگینوں والی طلائی چوڑیاں، اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ یہ میک اپ لباس سے میل کھاتا تھا اور خوب لگ رہا تھا۔ اس نے فقط ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور جمیلہ نور کے ساتھ باہر نکل گئی۔ سلطانہ ان دونوں کو بیرونی دروازے تک چھوڑنے گئی۔ دونوں یمنی کنیزیں ہاتھ باندھے عقب میں چل رہی تھیں۔

میں تہیہ کر چکا تھا کہ غزالہ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ بعد از شام میں نے مصری ریستوران کے پارکنگ لاٹ میں جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ میں غزالہ کی طرف سے غفلت برتوں۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور سلطانہ کے پیچھے ہی پیچھے گھر کے گیراج میں پہنچ گیا۔ یہاں سلطانہ کی شاندار لنکن گاڑی موجود تھی۔ گاڑی کی چابی مجھے تپائی پر پڑی مل گئی تھی۔ جس وقت سلطانہ، جمیلہ نور اور غزالہ کو سی آف کر کے باہر سے اندر آئی، میں سفید لنکن پر اندر سے باہر نکل گیا۔ جلد ہی طویل شفاف سڑک پر مجھے جمیلہ نور کی کار کی عقبی سرخ روشنیاں دکھائی دے گئیں۔ میں نے محفوظ فاصلہ رکھ کر گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ شنکر شکرا کہیں آس پاس موجود ہے اور وہ کسی بھی وقت غزالہ کے لئے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور گاڑی بھی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔ میرے اعصاب تن گئے۔ کہیں یہ شنکر شکرا ہی تو نہیں تھا۔ ہیڈ لائٹس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی جیپ نما گاڑی ہے۔ ہم کئی سڑکوں پر گھومے تھے لیکن یہ روشنیاں مسلسل دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اس گاڑی کا معائنہ کرنے کے لئے لنکن کار کی رفتار قدرے کم کر دی۔ جلد ہی عقب میں آنے والی ٹویوٹا جیپ میرے نزدیک پہنچ گئی۔ نہ صرف نزدیک پہنچی بلکہ مجھے اوور ٹیک بھی کر گئی۔ اس جیپ میں چار مسلح گارڈز موجود تھے۔ وہ خاکی وردی میں تھے اور سیاہ بھجنگ چہروں پر سرخ ٹوپیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایسے ہی گارڈز میں نے لاہور میں بھی شیخ عاصم کے ساتھ دیکھے تھے۔ یقیناً یہ گارڈز بھی شیخ عاصم کے تھے۔ اب اصل صورتِ حال میرے سامنے آئی۔ یہ گارڈز اس کار کی حفاظت پر مامور تھے جس میں جمیلہ نور اور غزالہ وغیرہ جا رہی تھیں۔ یہ بہتری ہوا کہ میں نے ان گارڈز کو آگے نکل جانے دیا ورنہ وہ اس بات سے آگاہ ہو سکتے تھے

کہ میں کار کا تعاقب کر رہا ہوں۔ گارڈز کی موجودگی کے بعد میں تعاقب کے سلسلے میں مزید محتاط ہو گیا۔ اب میں جمیلہ نور کی کار کے بجائے گارڈز کی جیپ کا تعاقب کر رہا تھا اور اس تعاقب میں بھی میں نے دونوں گاڑیوں کے درمیان کافی فاصلہ رکھا ہوا تھا۔

جلد ہی تعاقب کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد حیرت ہوئی کہ گاڑیاں کسی ہوٹل یا میرج ہال وغیرہ میں رکنے کے بجائے ایک چٹیل میدان میں رکی تھیں بلکہ اسے ریگستان کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ چاروں طرف گھپ تاریکی تھی۔ درمیان قریباً دو ایکڑ کا رقبہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں عارضی انتظام کے تحت دودھیا روشنیاں نصب کی گئی تھیں۔ ان روشنیوں کے ساتھ ساتھ بہت سے رنگ برنگے خیمے لگے تھے۔ یہ جدید طرز کے بہت مہنگے خیمے تھے اور ان میں سے کچھ خیموں میں ائرکنڈیشنرز بھی لگے نظر آ رہے تھے۔ خیموں کے ارد گرد قطار در قطار لمبی لمبی کاریں اور جیپیں وغیرہ کھڑی تھیں۔ میرے آگے جانے والی دونوں گاڑیاں بھی ایک مناسب جگہ پر پارک کر دی گئیں۔ میں نے خیموں کے ارد گرد ایک چکر کاٹا اور پھر کھجور کے ایک جھنڈ کے عقب میں کھڑی دو کاروں کے ساتھ اپنی کار کھڑی کر دی۔

خیموں کے درمیان خوش لباس خواتین و حضرات گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ کسی وقت بچوں کی چکاریں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ میوزک بج رہا تھا اور کہیں کہیں نوجوان لڑکوں لڑکیوں نے رقص کا انداز بھی اختیار کر رکھا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ کئی عرب ریاستوں میں شادی بیاہ کی رسوم چار دیواری کے بجائے کھلی جگہوں پر خیمے لگا کر منعقد کی جاتی ہیں۔ ان خیموں میں ہی خوشی کے مختلف انداز اختیار کئے جاتے ہیں اور کھانا پکانا بھی وہیں ہوتا ہے۔ آج میں وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

پارکنگ کے ارد گرد کہیں کہیں مسلح گارڈز نظر آ رہے تھے۔ گاڑیوں کے باوردی ڈرائیور صاحبان بھی یہاں وہاں موجود تھے۔ اگر سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو خوشی منانے کا یہ انداز خاصا غیر محفوظ تھا۔ اچھے لباس اور رکھ رکھاؤ والا کوئی شخص بھی بلا روک ٹوک اس تقریب میں شمولیت اختیار کر سکتا تھا۔

میں نے محتاط نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہاں کم و بیش پانچ سو مہمان موجود تھے۔ خیموں کے عین درمیان ایک پنڈال سا تھا۔ یہاں سرخ قالین بچھے تھے اور نہایت شاندار صوفہ سیٹ رکھے تھے۔ ایک زرنگار اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اس

پر ایک زرنگار شامیانہ تنا ہوا تھا۔ دن بھر کی تپش کے بعد رات میں چلنے والی ہلکی ہلکی ہوا اس شامیانے کو جھولے مدھم اور بجنے بلا رہی تھی۔ پنڈال میں اکا دکا نشستوں کے سوا سب خالی تھیں۔ اسٹیج کے عین عقب میں شاہی بینڈ باجے بجانے میں مصروف تھا۔ یہ اتنے خوبصورت مناظر تھے شاید انہیں لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔ ماحول دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگر میں اندر داخل ہو جاؤں اور مہمانوں میں گھل مل جاؤں تو مجھے کوئی "سپاٹ آؤٹ" نہیں کر سکے گا۔

میرے پینٹ کوٹ میں تھا۔ سفید قمیص پر میں نے سرخ ٹائی بھی لگائی تھی۔ اس لباس میں اور بھی درجنوں حضرات یہاں پھر رہے تھے۔ ان میں اکثریت اماراتیوں کی تھی مگر انڈین اور پاکستانی بھی تھے۔ اس کے علاوہ مجھے چند یورپین جوڑے بھی نظر آئے۔ میں بڑے نارمل انداز میں پنڈال کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک جگہ کوئی ڈرامائی شو قسم کی چیز پیش کی جا رہی تھی۔ دو مرد ایک نوجوان خاتون کے ساتھ پُر مزاح مکالمے کر رہے تھے اور تماشائی دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ یہ گفتگو عربی میں ہو رہی تھی لہٰذا میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں پنڈال میں بھی ایک تماشائی کی حیثیت سے ایک شاندار صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریب بیٹھے ایک یورپین نوجوان نے مجھے بتایا کہ یہ تینوں اداکار ٹی وی اسٹار ہیں۔ ایکدم پنڈال قہقہوں اور رنگوں سے بھر گیا۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ والا معاملہ تھا۔ چالیس پچاس خوش جمال و خوش لباس خواتین کا ایک جھرمٹ آیا تھا اور عین سامنے کے صوفوں پر براجمان ہو گیا تھا۔ یہ قریباً سب کی سب مقامی خواتین تھیں، سوائے ایک کے۔ اس ایک کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مقامی نہیں ہے، وہ غزالہ تھی۔ زرق برق پوشاکوں میں ملبوس اور زیورات سے لدی ہوئی۔ جمیلہ نور اس کے ساتھ تھی۔ وہ سب کی سب خواتین خوبصورت و نوجوان تھیں، اس کے باوجود غزالہ کی انفرادیت برقرار تھی۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ وہ میری تھی، میں نے اسے چاہا تھا اور زندگی سے بڑھ کر چاہا تھا، بلکہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس کی خوبصورتی واقعی منفرد تھی۔ ایک بلند چوٹی کی طرح جو تنہا اور اداس ہوتی ہے لیکن باوقار ہوتی ہے۔ غزالہ ایک ایسی لڑکی تھی جو ہمیشہ باوقار نظر آئی۔ حتیٰ کہ پریشانی، خوف، افراتفری اور پشیمانی جیسی کیفیت میں بھی غزالہ کا وقار اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب غزالہ نے میری محبت

جیتنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی، یہاں تک کہ اس نے اپنی نسوانیت سے بھی تجاوز کیا تھا اور وہ باتیں اپنی زبان سے کہی تھیں جو عام طور سے مشرقی لڑکی نہیں کہتی مگر نجانے کیا بات تھی، ان عاجزانہ لمحات میں بھی مجھے اس کے اندرونی وقار میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

جمیلہ نور بڑے طمطراق سے غزالہ کا تعارف مہمان خواتین سے کرا رہی تھی۔ خواتین بھی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا کیونکہ اصل تقریب شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ گفتگو کبھی عربی میں ہونے لگتی تھی، کبھی انگلش میں۔ بہرحال یہ گفتگو میری سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا۔ اچانک غزالہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سن ہو کر رہ گئی۔ یقیناً اسے زبردست شاک لگا تھا، بہرحال وہ فوراً ہی خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے ارد گرد بیٹھی کسی عورت کو پتا نہیں چلا کہ وہ ایک دو لمحوں کے لئے کتنی شدید حیرت سے دوچار ہوئی ہے۔ اس ہجوم میں مجھے شیخ عاصم کے دو تین قریبی عزیزوں اور اس کی پہلی زوجہ جمیلہ نور کے علاوہ اور کسی سے خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ سب میرے لئے اجنبی تھے اور میں ان کے لئے غیر تھا۔ میں شام کا اخبار اپنے سامنے کھول کر بیٹھا رہا۔ اخبار کے اوپر سے کبھی اسٹیج کی طرف اور کبھی غزالہ کی طرف دیکھتا رہا۔ مہمان خواتین بے شک غزالہ کو اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے چہروں پر مسکراہٹیں بھی سجا رکھی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں حقیقی پسندیدگی کے تاثرات نہیں تھے۔ اس کے بجائے ان آنکھوں میں ایک چھپا چھپا طنز اور تضحیک تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھیں۔۔۔ اچھا تو یہ وہ نئی نویلی دلہن ہے جس کے آتے ہی قبیلے میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور دولہا اسپتال میں جا لیٹا ہے۔ آنکھوں سے نکلنے والے طنز کے تیر میں تو محسوس کر رہا تھا یقیناً غزالہ بھی کر رہی ہو گی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔

اس دوران میں دو پاکستانی حضرات میرے پیچھے آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے شاندار تھری پیس سوٹ زیب تن کر رکھے تھے۔ گلے میں سونے کی زنجیریں اور انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں دیکھ کر شک گزرتا تھا کہ یہ خوش حال قسم کے تاجر حضرات ہیں۔ وہ دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ وہ پٹھان تھے اور بے فکری سے پشتو میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں یہ جان کر چونک گیا کہ ان کی گفتگو کا موضوع شیخ عاصم کی نئی شادی اور نئی دلہن ہے۔ ایک نے کہا۔ "مسز عاصم زینت خاتون

ہیں۔"

دوسرا بولا "ڈیئنٹ نہ ہوتیں تو یہاں تک کیسے پہنچتیں۔ ویسے میں نے ان کی ایک اور خوبی بھی سنی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جب خوبصورت اور ذہین بیوی مالدار شوہر پر قابو حاصل کر لیتی ہے تو پھر اس چکر میں پڑ جاتی ہے کہ شوہر کی دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھایا جائے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ مسز عاصم شوہر کو بدلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ یہ تو شاید آپ کو بھی معلوم ہو کہ شیخ عاصم صاحب نے "سوقِ جبل" والا عشرت کدہ قریباً قریباً ختم کر دیا ہے۔ وہ لڑکیاں جو وہاں کی رونق تھیں سب ادھر اُدھر بکھر گئی ہیں۔ شیخ صاحب نے انہیں چھ مہینے کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی ہے۔ اونٹوں کی ریس میں شیخ صاحب بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔ اس سال وہ وہاں بھی نہیں گئے۔ کافی عادتیں بدلی ہیں ان کی اور پھر ایک اور اہم خبر ہے۔ سنا ہے پاکستان میں کسی گینگسٹر سے جو پرانی دشمنی چل رہی تھی شیخ صاحب کی، وہ بھی مسز غزالہ کی کوششوں سے ختم ہو گئی ہے۔"

پہلا شخص ہنس کر بولا۔ "تمہاری باقی باتوں پر تو میں جیسے تیسے یقین کر لوں گا لیکن آخری بات پر نہیں۔۔۔ اس لئے کہ مجھے اس معاملے کی تفصیل معلوم ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ مسز عاصم کو شیخ عاصم صاحب پر کتنا بھی اختیار حاصل ہو لیکن وہ دشمنیاں اور تنازعے ختم کرانے جیسے معاملات پر ہاتھ نہیں ڈال سکتیں۔ یہ مردوں کے کام ہوتے ہیں اور مرد ہی کر سکتے ہیں۔ مسز عاصم نے صرف اتنا کیا تھا کہ اپنی ایک عزیزہ کو بچانے کی کوشش کی تھی۔"

"کون عزیزہ؟"

"یہ وہی لڑکی تھی جس سے عاصم صاحب کے بھتیجے ایاز کی شادی کی جا رہی تھی۔ شادی کا مقصد یہی تھا کہ دونوں خاندان رشتے داری میں بندھ جائیں اور دیرینہ عداوت ختم ہو لیکن مسز عاصم نے اس شادی میں رکاوٹ ڈال دی۔ میرے خیال میں تو انہوں نے دشمنی ختم کرانے کے بجائے اسے بڑھاوا دیا ہے۔ شیخ عاصم صاحب کے خاندان اور قبیلے میں سخت اشتعال پایا جاتا ہے۔ قبیلے والوں کا کہنا ہے کہ ان کی شدید بے عزتی ہوئی ہے کیونکہ برات خالی ہاتھ واپس آئی ہے۔ اس معاملے میں کچھ اور کہانیاں بھی سننے کو مل رہی ہیں۔ اگر وہ سب سچی ہیں تو معاملہ اور بھی بگڑ جائے گا۔"

"کیسی کہانیاں؟"

"اڑتی اڑتی سی بات ہے کہ لاہور میں ہونے والی [illegible] سے ایک رات پہلے امارات سے جانے والے [illegible] تقریب کے دیگر شرکا کو کوئی نشہ آور چیز کھلا دی گئی تھی۔ [illegible] دوران میں دلہن غائب ہو گئی اور اس کے ساتھ ساتھ عاصم اور ان کی یہ نئی اہلیہ بھی روپوش ہو گئی۔ سو وہاں کوئی بڑا گمبھیر چکر چلا ہے جسے یہ لوگ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہرحال ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہتیں۔ جلد یا بدیر سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

دوسرے ساتھی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یار! یقین نہیں آرہا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو شیخ عاصم اور مسز [illegible] کے تعلقات کیسے ٹھیک رہتے۔ تمہیں معلوم ہی ہے شیخ صاحب عورتوں کی نافرمانی کو کتنا ناپسند کرتے ہیں۔"

پہلا ہنسا۔ "بھائی میرے۔۔۔ بات وہی ہے جو تھوڑی دیر پہلے تم نے کہی ہے۔ فی الحال دلہن صاحبہ کو شیخ صاحب پر کنٹرول حاصل ہے مگر یہ صورت حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ ابھی تو قبیلے والے خلاف ہوئے ہیں، بہت جلد شیخ صاحب کے اہل خانہ بھی باتیں بنانے لگیں گے اور میرے خیال میں [illegible] عاصم سے اچھا سلوک اب بھی نہیں ہو رہا۔ تم ان کو دیکھو۔ کس طرح دبی دبی اور سہمی سہمی نظر آتی ہیں۔ روایتوں کو دیکھا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں کہ مسز عاصم پر نحوست وغیرہ کا لیبل لگانے کی کوشش بھی کی جائے۔ ان کے آتے ہی شیخ صاحب نکیل ہو گئے ہیں اور قبیلے کی شدید مخالفت شروع ہو گئی ہے۔"

دونوں حضرات چونکہ پشتو میں گفتگو کر رہے تھے انہیں اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کوئی تیسرا ان کے [illegible] سے "مستفیض" ہو سکتا ہے۔ اس دوران میں ہلچل کے آثار نمودار ہوئے۔ جس لڑکی کی منگنی ہو رہی تھی وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں شرماتی لجاتی اسٹیج پر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے لوگ بھی پنڈال میں داخل ہو گئے۔ سب طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شان و شوکت دیدنی تھی۔

مختلف رسوم شروع ہو گئیں۔ غزالہ اس ہجوم میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اٹھا اور چہل قدمی کے انداز میں پنڈال سے باہر آگیا۔ سکون و قرار میرے دل سے رخصت ہو چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا، میں شنکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ اسی شہر میں موجود تھا، انہی فضاؤں میں سانس لیتا

تھا۔ وہ کسی درندے کی طرح ہمیشہ گھات میں رہتا تھا اور اس مرتبہ اس کا ہدف غزالہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ موذی اب اس محفل میں کہیں رینگ رہا ہو۔ میری ذہنی کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ مجھے ہر شخص پر اس کا شبہ ہو رہا تھا۔

میں خیموں کی حدود سے باہر نکلا اور پارکنگ کی طرف [illegible]۔ صحرا کی طرف سے خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں نے [illegible] لگایا اور کھجوروں کے جھنڈ کی طرف آگیا۔ یہاں وہ [illegible] موجود تھی جس پر میں یہاں پہنچا تھا یعنی سلطانہ کی [illegible]۔ میں گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میری داہنی [illegible] ایک لمبی قطار میں بڑے بڑے دیگچے رکھے تھے اور ان کے نیچے عارضی چولہوں میں آگ جل رہی تھی۔ لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ نہایت مشاق قسم کے درجنوں کھلے آسمان تلے لذتِ کام و دہن کا انتظام کرنے میں مصروف تھے۔

اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ ایک شخص بڑے آرام سے میرے قریب پہنچا تھا اور میری ہی طرح کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ شنکر تھا۔ کریم کلر سوٹ میں ملبوس۔۔۔ چہرہ برف کی طرح سخت اور سرد۔ وہ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔ "ابو ظہبی میں [illegible] کیا امید شاہ جہاں۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ [illegible] سے انداز میں خاموش کھڑا تھا۔

پھر اس نے کہا۔ "کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

میں بولا۔ "اس لڑکی کو چھوڑنا نہیں ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اس لڑکی کی جو اندر محفل میں شریک ہے۔ گلابی رنگ کا لباس پہن رکھا ہے جس نے گلے میں زمرد کا جڑاؤ ہار [illegible]"

شنکر کا اشارہ واضح طور پر غزالہ کی طرف تھا۔ میں [illegible] ہو کر رہ گیا۔ شنکر پھر گویا ہوا۔ "جانتے ہو کیوں نہیں چھوڑنا اسے۔۔۔ اس لئے کہ وہ چھوڑے جانے کے قابل نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو کڑی سے کڑی سزا کا حقدار بنا لیا ہے۔"

"اگر تم اس سلسلے میں اپنی لعنتی زبان بند رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہو گا۔"

[illegible] آنکھوں کے اردگرد کے داغ نمودار نظر آرہے [illegible] مجھ سے آج تک کسی نے اس لہجے میں بات [illegible] کی ہے تو پھر زندہ نہیں بچا۔"

"[illegible] زندہ ہوں۔"

"یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ہے شاہ جہاں۔۔۔ بھگوان کی سوگند تمہارا جیون ایک چیونگ گم کی طرح میری جیب میں ہے، جب چاہوں گا نکال کر منہ میں رکھ لوں گا۔۔۔ بہرحال اس وقت تو میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں، جس کا شبھ نام غزالہ ہے اور جسے تم پیار سے غزالو بھی کہتے ہو۔۔۔ اتنا عرصہ تمہاری صحبت میں رہنے کے باوجود وہ بڑی بے وقوف نکلی ہے۔ ایک نادان دوست کی طرح اس نے نہ صرف اپنے جیون پر بربادی کی مہر لگائی ہے بلکہ اپنے پتی کے راستے میں بھی زہریلے کانٹے بوئے ہیں۔ اس نے اپنے پتی کے کان بھرے کہ وہ میرے ساتھ ایگری منٹ ختم کر کے مجھے انڈیا واپس بھیج دے۔ وہ بڑا سیانا ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہے سندر ناری بڑوں بڑوں کی مت مار دیتی ہے۔ شیخ عاصم کی بھی ماری گئی۔"

میں نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے بڑے کم ظرف لگتے ہو تم۔ غزالہ نے شیخ عاصم سے کہہ کر تمہیں ملازمت سے نکلوا دیا۔ اب تم ایک تھرڈ کلاس غنڈے کی طرح اس سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔"

"بات ملازمت سے نکالنے کی نہیں ہے۔ یہ تو بڑا پرانا پھڈا ہے پیارے۔ اس عورت کا کوئی ایک روش ہو تو میں تمہیں بتاؤں بھی۔ یہ قدم قدم پر مجھے نیچا دکھانے کے چکر میں رہی ہے۔ اس نے ہمیشہ میرے اور شیخ عاصم کے درمیان دیوار بننے کی کوشش کی ہے۔ آخر اپنے چلتروں سے اسے بہکانے میں کامیاب ہو گئی۔ تم جانتے ہو، میں شکست قبول کرنے کا عادی نہیں ہوں اور ایسی شکست قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ شکست ہے تو پھر اس شکست کا بدلہ غزالہ کی لجا اور آبرو کی شکست ہو گا۔ میں اسے اپنے بستر کی زینت بناؤں گا۔۔۔ اس کے ساتھ وہ برتاؤ کروں گا جس کی وہ حقدار ہے۔۔۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ میں بڑی سے بڑی سوگند کھا کر تمہیں وشواس دلا سکتا ہوں کہ میں اسے بے آبرو کرنے کے بعد اس کی ہتیا بھی کروں گا۔۔۔ آئی ریئلی مین اِٹ۔"

میرے جسم میں جیسے لاوا بھر گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر شنکر سے لپٹ جاؤں لیکن اس سے پہلے کہ میں حرکت کرتا، شنکر نے اپنی مخصوص برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک کولٹ پسٹل کی نال میری کنپٹی سے لگا دی۔ یہ پسٹل غالباً پہلے ہی شنکر کے ہاتھ میں تھا اور تاریکی کے باعث مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

"دھیرج مہاراج۔" وہ پھنکارا۔

میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ اس کی سانپ سی پھنکار

میرے کانوں میں پڑی۔ "بسنز کی زینت بنانے کی بات کی ہے تو اتنا تڑپ کیوں ہو۔ یہ کوئی انوکھی تو نہیں۔ تم نے بھی ایک ہندو ناری (سروج) سے سمبندھ جوڑ رکھا ہے۔ میں جوڑ لوں گا تو کیا برا کروں گا' بولو کیا برا کروں گا۔ میں اسے تمہاری طرح مہینوں نہیں رکھوں گا۔ بس دس پندرہ روز کافی ہوں گے۔ اگر یہ بھی زیادہ لگ رہے ہیں تو اور کم کر دیتا ہوں۔ ایک ہفتہ ٹھیک رہے گا! بولو۔ ایک ہفتہ ٹھیک رہے گا؟"

میں چپ رہا۔ یوں لگ رہا تھا کہ قوت گویائی سلب ہو گئی ہے۔ میں سخت سے سخت الفاظ بھی بولتا تو وہ اس غم و غصے کے سامنے ہیچ تھے جو میرے سینے میں طوفان برپا کر رہا تھا۔ وہ شیطان زادہ میرے سامنے غزالہ کو ننگی گالیاں دے رہا تھا۔ میری کنپٹی پر پسٹل تھا۔ حرکت کرنے کا مطلب خودکشی تھا۔

وہ بڑی ملائمت سے نیزے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "تمہاری خاموشی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمہیں غزالہ کے ساتھ "بلاد کار" ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اس بات پر ہے کہ میں ہفتہ بھر اسے پاس رکھنے کے بعد اس کی جان لینا چاہتا ہوں۔ شاید تمہارا خیال ہے کہ اس کے دوش کے مقابلے میں موت کی سزا زیادہ ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے ڈیئر۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بعض اوقات دو ہم خیال لوگوں میں سے ایک کے کیے کی سزا دوسرے کو بھگتنا پڑ جاتی ہے۔ غزالہ کی ہتیا والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ تمہارے ساتھی زریں نے میرے قریبی ساتھی موہن داس کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اس قتل کا بدلہ بھی تو ضروری ہے۔ یعنی اگر زریں نہیں تو تمہاری غزالو ہی سہی۔ اگر ایک پنتھ میں دو کاج ہو رہے ہیں تو برا کیا ہے؟ میری دردِ سری بھی کم ہو جائے گی۔ مجھے تمہارے اس پٹھان چمچے کو تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف یہ تمہاری غزالو بھی ایک ہفتہ میرے پاس رہنے کے بعد آتما ہتیا کا سوچ رہی ہو گی۔ اس کی مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔ تمہیں اس کارروائی میں یہ فائدہ ہو گا کہ تمہارے اس چمچے زریں گل کی جان بچ جائے گی۔ یعنی اگر میں تم سے کچھ لے رہا ہوں تو دے بھی رہا ہوں۔ لہٰذا زیادہ نراش ہونے کی ضرورت نہیں۔ اٹ از ویری سمپل اینڈ فیئر۔"

میں نے بہت کوشش کر کے اپنی سلب شدہ گویائی کو بحال کیا اور کہا۔ "شنکر' تمہاری اس ساری گفتگو کے نتیجے میں میری سمجھ میں بس ایک ہی بات آئی ہے۔ ہماری یہ دیرینہ دشمنی ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم میں سے ایک مارا جائے گا۔ یا ممکن ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مارے جائیں۔"

میرا لہجہ اتنا اجنبی تھا کہ میں خود بھی پہچان نہ پایا۔ میں جذبے کی بے پناہ شدت نے شنکر کو بھی چونکا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرے پورے جسم میں دھیمی سی لرزش نمودار ہو گئی ہے۔ اس لرزش کا تعلق میرے اندر کے استادوں سے تھا اور اس کی دہشت سے تھا۔

شنکر شنکرا نے میرے خوفناک انداز کو نظرانداز کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس نے اطمینان سے اپنا پسٹل جیب میں ڈالا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور چیلنج کرنے والی نظروں سے دیکھ کر کھجوروں کے جھنڈ میں او جھل ہو گیا۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری کنپٹی پر ابھی تک شنکر کے کولٹ پسٹل کا دباؤ ہے۔ ایک عجیب دھیمی سی آگ سلگ رہی تھی میرے تن بدن میں۔ میں درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دیکھتا رہا جس کے پیچھے شنکر شنکرا او جھل ہوا تھا پھر دھیرے دھیرے چلتا میں واپس پنڈال میں آ گیا۔ یہاں اب پہلے جیسی رونق تھی۔ منگنی کی مختلف رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ ایک طرف زرق برق لباس میں ملبوس چند نوعمر بچیاں ہاتھوں میں دف بجا رہی تھیں' دوسری طرف شاہی خاندان کی خواتین ایک بہت بڑی ریشمی چادر تانے کھڑی تھیں۔ چادر کے نیچے لڑکی اور لڑکا موجود تھے۔ وہ ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنا رہے تھے۔ گاہے گاہے فضا کھنکتے قہقہوں سے گونج اٹھتی تھی۔ ہر طرف رنگین آنچلوں اور خوبصورت چہروں کی بہار تھی۔ دنیا کی بہترین خوشبوئیں خیموں کے درمیان چکرا رہی تھیں اور موسیقی کی لے کو گرما رہی تھیں۔ ان بے شمار خوبرو چہروں میں میری نگاہ ایک روشن چاند پر پڑی۔ یہ غزالہ کا چہرہ تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ بھی خوشی کے اس رنگ میں رنگی تھی۔ اس کے چہرے کی مستقل اداسی ایک مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی۔ وہ محویت سے دیکھ رہی تھی۔ غزالہ کا چہرہ دیکھا تو شنکر کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ یہ بازگشت کسی انتہائی زہریلی پھنکار سے مشابہ تھی۔ وہ جو کچھ غزالہ کے بارے میں کہہ گیا تھا اس قدر سنگین تھا کہ اس کے بارے میں سوچ کر دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی تھیں۔ "میں غزالہ کو اپنے بستر کی زینت بناؤں گا۔ میں اس کی ہتیا کروں گا۔ میں اس کا نام و نشان مٹا دوں گا۔"

شنکر کے جملے تھے جو لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخوں کی طرح میرے کانوں میں اتر رہے تھے اور دماغ کو چھید رہے تھے۔ غزالہ ان فقروں سے اور فقروں کے ان اثرات سے جو مجھ پر مرتب ہو رہے تھے' قطعی بے خبر تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا' ابھی تھوڑی دیر پہلے اس پنڈال سے باہر کھجوروں کے جھنڈ کے پاس اس کے متعلق کیا کہا اور سنا گیا ہے۔

میرے دل نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! غزالہ اپنی زندگی کے شدید ترین خطرے سے دوچار ہے۔ اس کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت کرو گے تو وہ تم سے لامتناہی فاصلوں پر چلی جائے گی پھر نہ اس کی شکل دیکھ پاؤ گے نہ اس کی فریاد کناں آواز تم تک پہنچ سکے گی۔"

یہی وقت تھا جب غزالہ کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹک گئی۔ یہ وہی لمحہ تھا جب ہم سب کچھ بھول جاتے تھے۔ اپنے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا ہمیں۔ لیکن یہ صرف ایک لمحہ ہوتا تھا' جو پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں گزر جاتا تھا۔ ہم ایک بار پھر اپنے قرب و جوار میں واپس آ جاتے تھے۔

تقریب رات قریباً ایک بجے ختم ہوئی۔ اس دوران میں میں نے ہر لحظہ غزالہ کو اپنی نگاہ میں رکھا۔ واپسی کے سفر میں بھی میں غزالہ کے تعاقب میں تھا۔ سب سے آگے شیخ عاصم کی شاندار کار تھی۔ اس کار میں غزالہ۔ شیخ عاصم کی دونوں بیویوں کے ساتھ موجود تھی۔ کار کے پیچھے مسلح گارڈز کی جیپ تھی۔ میں جیپ سے کافی فاصلے پر رہ کر تعاقب کر رہا تھا۔ کھلی جیپ کے اوپر ایک نیلی روشنی نصب تھی۔ یہ روشنی تعاقب کرنے میں بڑی مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ تقریب گاہ سے شیخ عاصم کی رہائش گاہ تک قریباً دس میل کا فاصلہ تھا۔ سارے راستے میرے دل کو دھڑکا لگا رہا۔ ہر لحظہ یوں لگا کہ ابھی کسی طرف سے شنکر کسی شکاری عقاب کی طرح جھپٹ پڑے گا اور غزالہ کو اڑا لے جائے گا۔ شنکر کی موجودگی میرے اعصاب میں عجیب سی کشیدگی پیدا کر دیتی تھی۔ یہ کشیدگی مجھے بے حد ناپسند تھی' اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے سبب مجھے اپنی خود اعتمادی میں کمی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ بے شک وہ نہایت عیار شخص تھا اور اپنے مقابل کو حیران کرنا جانتا تھا لیکن وہ کوئی آسیبی چھلاوا بھی نہیں تھا۔ جیتا جاگتا انسان تھا۔ میں نے خود کو بارہا یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اب

ماہر جادو و عمل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے اکرا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار' لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۳۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۳۲

بھی سمجھا رہا تھا۔

شیخ عاصم کی رہائش گاہ تک کا راستہ خیریت سے گزر گیا۔ جب کار اور جیپ آہنی گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں تو میں سیدھا نکلتا چلا گیا۔ شیخ کی رہائش گاہ خاصی محفوظ تصور کی جاسکتی تھی۔

سلطانہ کے گھر واپس پہنچتے ہی میں سلطانہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ اداس سی بیٹھی تھی۔ شاید سہیلی کے یوں آناً فاناً چلے جانے سے افسردہ تھی۔ جب بم تخیم جمیلہ نور' غزالہ کو لینے آئی تھی تو غزالہ ذہنی طور پر یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی۔ سلطانہ کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ ابھی دو چار روز مزید یہاں رکے گی۔ سلطانہ نے غزالہ کا دل بہلانے کے لیے کئی پروگرام بنا رکھے تھے مگر جمیلہ نور کے نادر شاہی حکم کے سامنے ان دونوں کا بس نہیں چلا تھا اور غزالہ کو آناً فاناً یہ گھر چھوڑ کر تقریب اٹینڈ کرنا پڑی تھی۔ تقریب سے جمیلہ نور اسے سیدھا گھر لے گئی تھی۔

بغیر کوئی تمہید باندھے میں نے سلطانہ سے کہا "سلطانہ! آپ کے خدشات سو فیصد درست ہیں۔ شنکر غزالہ کے تعاقب میں ہے اور اس کے ارادے نہایت سنگین ہیں۔"

"کیا آپ نے شنکر کو دیکھا ہے؟"

"میری اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے خطرناک دھمکیاں دی ہیں اور شنکر ایسا شخص نہیں جس کی دھمکی کو کسی بھی صورت نظر انداز کیا جاسکے۔ میں غزالہ کی طرف سے بے حد فکر مند ہوں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"بہتر ہے کہ آپ اپنے طور پر شیخ عاصم سے رابطہ کریں۔ اسے شنکر کے بارے میں بتائیں اور اس سے کہیں کہ وہ غزالہ کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ میرے اندازے کے مطابق کوٹھی پر پانچ چھ گارڈز سے زیادہ نہیں ہیں اور اتنے بندوں کو شنکر چیونٹیوں کی طرح مسل سکتا ہے۔"

میری فکر مندی نے سلطانہ کو بھی فکر مند کر دیا تھا۔ وہ بولی "کیا بیماری کی حالت میں شیخ عاصم کو یہ سب کچھ بتانا مناسب رہے گا؟"

میں نے کہا "مجھے اس کی بیماری کی نوعیت کا علم نہیں' آپ زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ بہرحال اگر یہ مناسب نہیں تو اس کا کوئی اور طریقہ سوچیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں جمیلہ نور سے بات کرتی ہوں۔ جمیلہ نور کے ذاتی خیالات چاہے کچھ بھی ہوں لیکن وہ شیخ صاحب کے مفاد کا پورا تحفظ کرتی ہیں۔"

میں نے کہا "اس بارے میں آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ بہرحال جو بھی کرنا ہے' جلدی کریں اور دوسرے یہ کہ اب میرا یہاں آپ کے پاس رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ شنکر مجھے دیکھ چکا ہے۔ اب میری یہاں موجودگی باز نہیں رہے گی۔"

"تو کہاں جائیں گے آپ؟"

"کسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ بذریعہ فون میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں آپ کو پرائیویٹ نمبر دیتی ہوں۔"

اس نے ایک دراز میں سے چٹ نکالی اور اپنا خاص نمبر اس پر لکھ دیا۔

میں نے کہا "شنکر بہت اشتعال میں ہے۔ آپ کو اپنی طرف سے بھی بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس شخص پر وحشت سوار ہو جائے تو اسے کچھ دکھائی سنائی نہیں دیتا۔"

سلطانہ نے خشک لبوں پر زبان پھیری پھر پُر سوچ لہجے میں بولی "میں جمیلہ نور سے کیا کہوں۔ میرا مطلب ہے کہ انہیں خطرے سے آگاہ کرنا ہے اور آپ کا ذکر بھی نہیں کرنا۔"

"اس سے کہہ دیں کہ بازار میں شنکر سے براہ راست آپ کی ملاقات ہوئی ہے۔ اس نے غزالہ کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔" اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں میں نے سلطانہ کو سمجھائیں۔

سلطانہ نے میرے سامنے ہی فون پر جمیلہ نور سے رابطہ کیا۔ دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ سلطانہ کا انداز ملتجیانہ تھا اور لہجے سے تشویش ظاہر ہوتی تھی۔ قریباً دس منٹ بعد اس نے فون بند کیا اور مجھے بتایا کہ اس نے جمیلہ نور کو سب کچھ سمجھا دیا ہے' جمیلہ نور نے شیخ عاصم کے ذاتی حفاظتی دستے کو طلب کر لیا ہے اور یہ لوگ دس پندرہ منٹ میں رہائش گاہ پر پہنچ جائیں گے۔ سلطانہ نے یہ بھی بتایا کہ جمیلہ نور نے اس کے فیصلے کی تائید کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شیخ صاحب کو اطلاع نہ دے کر اس نے اچھا کام کیا ہے۔

"جمیلہ نور کیسی عورت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ڈکٹیٹر ٹائپ خاتون ہیں۔ اپنی مرضی چلانا چاہتی ہیں اور شیخ صاحب نے ابھی انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ بہرحال ابھی تک تو انہوں نے شیخ صاحب سے وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ شیخ صاحب کی غیر موجودگی میں اکثر معاملات کو وہ ہینڈل کرتی ہیں۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اور خاص ذہن کی مالک ہیں مگر خاندان کے پیچیدہ مسائل کو چٹکیوں

سلجھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کاروباری معاملات کی بھی انہیں سوجھ بوجھ ہے۔"

صبح کا انتظار کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسی وقت اپنا مختصر سامان لیا اور سلطانہ کی رہائش گاہ سے "محل ہوٹل" منتقل ہو گیا۔ یہاں میری شناخت اعجاز نیپالی ہی تھی۔ صبح دس گیارہ بجے تک میں نے آرام کیا۔ اس کے بعد نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور ناشتے کے لیے نیچے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ ہوٹل ایک بڑی شاہراہ کے کنارے واقع تھا۔ بے حد ستھرا ماحول تھا۔ ڈائننگ ہال میں چاروں طرف رنگ دار گلاس لگا تھا اور باہر کے خوب صورت مناظر نظر آتے تھے۔ ناشتے کے دوران میں میرا ذہن صرف ایک ہی نکتے پر سوچ رہا تھا۔ میں شنکر شکرا کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ زمین کو اس کے نجس وجود سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ کبھی کسی کو قتل کرنے کی خواہش میرے دل میں اتنی شدت سے پیدا نہیں ہوئی تھی جتنی شنکر کے حوالے سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک عجیب سی پیاس جاگ اٹھی تھی میرے اندر۔ شنکر کو جہنم واصل کرنے کا خیال تو اکثر دل میں آتا تھا مگر اس بار اس خیال کا رنگ ڈھنگ انوکھا تھا۔

میں دیر تک اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ شنکر سے ملاقات کی دو ہی صورتیں تھیں۔ وہ مجھ تک پہنچتا یا میں اس تک پہنچ جاتا۔ اگر میں اس انتظار میں رہتا کہ وہ مجھ تک پہنچے تو اس میں کئی اندیشے تھے۔ سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ وہ موقع تاک کر غزالہ پر وار کر جاتا اور غزالہ اپنی زندگی کے بدترین عذاب سے دوچار ہو جاتی۔ بہتر یہی تھا کہ کسی الیمے کا انتظار کرنے کے بجائے میں خود شنکر تک پہنچ جاؤں۔

اچانک میں چونک گیا۔ کوئی میرے سامنے آکر بیٹھ گیا تھا۔ یہ سلطانہ تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ دیا اور میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ یہاں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں' یہ ساتھ ہی میرا آفس ہے۔"

"لیکن آپ تو اسکول میں۔۔۔"

"اسکول کا ٹائم گیارہ بجے تک ہے۔ پارٹ ٹائم کے طور پر میں ایک انگریزی روزنامے میں کام کرتی ہوں۔ یہ ہے میرا کارڈ۔"

اس نے شولڈر بیگ میں سے پریس کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کی جاب چیف رپورٹر کی تھی۔ روزنامے کا نام "بلیک اینڈ وائٹ" تھا پھر اس نے "بلیک اینڈ وائٹ" کا تازہ پرچہ بھی بیگ میں سے نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اچھا اخبار تھا۔ کاغذ اور پرنٹنگ وغیرہ جدید تقاضوں کے مطابق تھی۔ ایک خبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ غربی شہر میں سوق جابر کے قریب دو سرکاری اہلکار قتل ہوئے تھے۔ ان کا تعلق انٹرپول سے تھا۔ اس خبر میں' مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے والا لفظ "انٹرپول" تھا۔ انٹرپول اور شنکر کا بڑا پرانا بیر تھا۔ انٹرپول شنکر سے اور شنکر انٹرپول سے انتہا درجے کی خار رکھتا تھا۔ وہ انہیں بڑی حقارت سے "انٹرپولیے" کہا کرتا تھا۔ ایک موقع پر بمبئی میں انٹرپول کے درجنوں اہلکار شنکر کے ہاتھوں ہلاک اور ہاتھ پاؤں سے معذور ہوئے تھے۔ انٹرپول کے ایک اہلکار کو قتل کرنے کے بعد شنکر اور اس کے ساتھیوں نے مقتول کی نوعمر جرمن ساتھی کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا اور یہ واقعہ کافی مشہور ہوا تھا۔

خبر دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں اس واقعے کا تعلق شنکر شکرا سے نہ ہو۔ میں نے تفصیل پڑھی اور میرا دل گواہی دینے لگا کہ غربی شہر میں ہونے والا یہ واقعہ شنکر سے متعلق ہے۔ قتل کے اس سفاکانہ واقعے میں جرمن ساختہ کولٹ پسٹل استعمال ہوا تھا اور دونوں اہلکاروں کو ٹھوڑی کے نیچے اس طرح گولیاں ماری گئی تھیں کہ گولیاں اوپر کی طرف سے سر پھاڑ کر نکل گئی تھیں۔ یہ بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندی' ہو نہ ہو یہ وہی کولٹ پسٹل ہے جو ایک روز پہلے شنکر نے میری کنپٹی سے لگایا تھا۔ لاشیں ایک رہائشی بلاک کے عقب میں واقع کھجور اور زیتون کے درختوں میں پائی گئی تھیں۔ انہیں دو بڑے پلاسٹک بیگوں میں بند کیا گیا تھا۔

سلطانہ نے کہا "آپ کچھ سوچ رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص خبر ہے؟"

"ہاں بہت خاص خبر ہے۔ یہ علاقہ کس جگہ ہے؟" میں نے اخبار پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"زیادہ دور نہیں مگر آپ وہاں کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "سلطانہ! مجھے شنکر کی تلاش ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ قتل شنکر نے کیے ہیں۔"

وہ پہلے چونکی پھر پُر سوچ لہجے میں بولی "گویا آپ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن میری رائے ہے کہ آپ خود وہاں نہ جائیں۔ انٹرپول کے اہلکار قتل ہوں تو غیر ملکیوں پر خواہ مخواہ شبہ کیا جاتا ہے۔ آپ کی جگہ میں اخباری رپورٹر کی حیثیت سے وہاں چلی جاتی ہوں۔ جو معلومات آپ کو درکار ہیں' مجھے بتا دیں۔"

سلطانہ ایک ذہین اور چوکس عورت نظر آتی تھی۔ اس پر اعتبار کرنے کو بھی دل چاہتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات میں وزن ہے۔ جو کام میں کرنا چاہتا تھا وہ سلطانہ زیادہ

اچھے طریقے سے کرسکتی تھی۔

میں ہوٹل میں رہا' سلطانہ جائے واردات پر چلی گئی۔ شام چار بجے کے لگ بھگ ہوٹل کے کمرے میں اس کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک پبلک بوتھ سے بول رہی ہے۔ اس نے کہا "شاہ جہاں صاحب! اہلکاروں کے قتل کا شبہ دو کورین لڑکوں پر کیا جارہا ہے اور پولیس نے ان میں سے ایک کو گرفتار کرلیا ہے۔ تاہم اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ واردات کورین لڑکوں کی نہیں ہے۔ جہاں لاشیں ملی ہیں وہ رہائشی علاقہ ہے اور مقامی لوگ......" ایک دم وہ خاموش ہوگئی۔

"ہیلو۔ ہیلو سلطانہ!" میں نے دو تین بار کہا۔

سلطانہ کی لرزتی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں صاحب! میں آپ کو دوبارہ رنگ کرتی ہوں۔ مم۔ میرا خیال ہے کہ۔ میں نے شنکر کی گاڑی دیکھی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میں ششدر بیٹھا رہ گیا۔

پندرہ بیس منٹ میں نے بڑے اضطراب میں گزارے۔ آخر فون کی گھنٹی بجی اور سلطانہ نے ہانپتے ہوئے لہجے میں خوش خبری سنائی کہ اس نے شنکر کو "ٹریس" کرلیا ہے۔ وہ سوتی جابہ کی پانچویں لین کی کوٹھی نمبر سات میں داخل ہوا تھا۔

میں نے پوچھا "تم نے اچھی طرح پہچان لیا ہے؟"

"وہ ایک سو ایک فیصد شنکر ہے۔" سلطانہ نے لرزاں لہجے میں کہا۔

میں نے کوٹھی کا حدود اربعہ پوچھا۔

وہ بولی "دیواریں بہت اونچی ہیں۔ گیٹ پر مسلح محافظ موجود ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ کسی اہم شخص کی رہائش گاہ ہے۔"

میں نے کہا "میں خود وہاں آنا چاہتا ہوں۔"

سلطانہ نے مجھے مکمل ایڈریس سمجھا دیا۔ یہ خاصا آسان ایڈریس تھا۔ سلطانہ نے بتایا کہ مین سڑک پر ایک لبنانی اسنیک بار ہے' وہ وہاں بیٹھی میرا انتظار کررہی ہے۔

میں بذریعہ ٹیکسی کار قریباً پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ گرمی خاصی شدید تھی۔ سورج سوا نیزے پر آیا ہوا تھا۔ پارکنگ میں مجھے سلطانہ کی گاڑی اور اس کا ڈرائیور فوراً نظر آگئے۔ میں اسنیک بار میں پہنچا۔ سلطانہ ایک پرسکون گوشے میں اکیلی بیٹھی میرا انتظار کررہی تھی۔ اس نے میرے لیے بھی اورنج جوس منگوایا' ہم باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا "سلطانہ! میں وہ کوٹھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی "تو دیکھ لیں۔"

"کہاں؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

اس نے سڑک کی طرف کھلنے والی دیوار گیر کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ کھڑکی میں فرش سے چھت تک رنگ دار گلاس لگا ہوا تھا۔ اس گلاس میں سے خوب صورت گرین بیلٹ نظر آرہی تھی اور گرین بیلٹ کی دوسری جانب رہائشی عمارتیں دکھائی دیتی تھیں۔ سلطانہ بولی "دائیں طرف کی لین میں براؤن رنگ کی چوتھی کوٹھی میں شنکر داخل ہوا ہے۔ وہ بلیو بیکوار.... کار میں تھا۔ ابھی تک وہ اندر ہی ہے۔"

میں نے آنکھیں سکوڑ کر براؤن کوٹھی کا جائزہ لیا۔

سلطانہ کی بات درست معلوم ہوئی۔ کوٹھی کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ ان پر خاردار باڑھ بھی لگی ہوئی تھی۔ گیٹ پر دونوں طرف "گارڈز پوسٹ" بنی ہوئی تھیں اور وہاں باوردی گارڈز چوکس دکھائی دیتے تھے۔ سلطانہ نے بتایا کہ یہ جواہرات کے ایک بڑے تاجر نوشیر رضا کی رہائش گاہ ہے۔ سلطانہ کی معلومات کے مطابق نوشیر رضا کا تعلق ایران سے تھا اور وہ ایک نہایت دبنگ شخص کے طور پر مشہور تھا۔

میں نے سگریٹ سلگا کر تین چار گہرے کش لیے۔ "اب کیا کیا جائے سلطانہ!"

وہ بولی "مقامی پولیس کو اطلاع دے دی جائے کہ شنکر فلاں کوٹھی میں اپنے مسلح ساتھیوں سمیت موجود ہے۔ میرے خیال میں آپ کا یہ قیافہ سو فیصد درست ثابت ہوچکا ہے کہ انٹرپول کے دونوں ایجنٹس کو شنکر شکرا نے ٹھکانے لگایا ہے۔ یہاں کی پولیس بہت سخت ہے۔ وہ شنکر کو آسانی سے جانے نہیں دے گی۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں شنکر کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ وہ ہر روز ایسے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ عام پولیس کو چکما دینا اس کے لیے اتنا ہی آسان ہے جتنا آپ کے لیے کلاس روم میں نرسری کے بچوں کو بہلانا۔ اس خاص شخص کے لیے کوئی خاص الخاص انتظام کرنا پڑے گا۔"

میں سوچ میں گم ہوگیا۔ سلطانہ کو یت سے میرا چہرہ تک رہی تھی۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں نے کہا "ٹھیک ہے سلطانہ! میں ہوٹل چلتا ہوں۔ آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔"

اس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر مزید میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ بہرحال اب میں جانے کی بات کررہا تھا تو اسے بھی جانا ہی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جب بھی اسے فون کروں' پرائیویٹ نمبر پر کروں۔ وہ نمبر ہر طرح سے محفوظ ہے اور ٹیپ بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

اس خاص نمبر کے بارے میں سلطانہ مجھے پہلے بھی بتا چکی تھی۔ ایک دم میرا ذہن دوسرے رخ پر چلا گیا۔ میں

نے سلطانہ سے پوچھا کہ یہ اسپیشل فون نمبر اس نے کیسے حاصل کیا۔

وہ بولی "ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ میں میری ایک دوست ڈویژنل آفیسر ہے۔"

میں نے کہا "کیا آپ کی یہ دوست شنکر کے سلسلے میں ہماری کچھ مدد کرسکتی ہے؟"

"میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "کیا کسی طرح شنکر کی قیام گاہ کے فون ٹیپ کیے جاسکتے ہیں یا کوئی اور طریقہ جو ہمیں شنکر کی منصوبہ بندی سے آگاہ کرسکے۔"

وہ دبے دبے سے جوش سے بولی "میرے خیال میں فون ٹیپ کرنا الماس کے لیے زیادہ مشکل کام نہیں ہوگا۔"

"گڈ۔ یہ ایک اچھی نیوز ہے۔ آپ کسی طرح یہ کام کرادیں۔"

سلطانہ نے ہامی بھری۔ اسے کچھ مزید ہدایات دے کر میں ہوٹل واپس آگیا۔

شام سے تھوڑی دیر بعد سلطانہ کا فون آیا۔ اس نے خوش خبری سنائی کہ کام ہوگیا ہے۔ سلطانہ کی دوست الماس نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے مسٹر نوشیر رضا کی رہائش گاہ پر موجود دو فون لائنز پر "آبزرویشن مشین" لگوادی تھی اور اب ان لائنز پر ہونے والی گفتگو ٹیپ ہورہی تھی۔

سلطانہ اس کامیابی پر بہت خوشی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کہا "آپ کو بہت زحمت دے رہا ہوں میں۔"

"زحمت کیسی۔" اس نے فوراً میری بات کاٹی "غزالہ آپ کی عزیز ہے تو میری دوست ہے۔ اور پھر ویسے بھی مجھے آپ کا ہاتھ بٹانا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے غزالہ سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا' یعنی یوں سمجھئے کہ غائبانہ آپ سے مکمل طور پر متعارف تھی میں۔ اب آپ کو دیکھا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بہت عرصے سے جانتی ہوں۔"

اگلے روز رات کو سلطانہ دو آڈیو ٹیپس لے کر میرے پاس پہنچی۔ ان ٹیپس پر وہ مکمل گفتگو موجود تھی جو پچھلے قریباً تیس گھنٹوں میں نوشیر رضا کی دو فون لائنز پر کی گئی تھی۔

میں سلطانہ کی "ایفی شینسی" کا قائل ہوگیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا کیسٹ پلیئر بھی لائی تھی۔ ہم نے بند کمرے میں ٹیپس کو سننا شروع کیا۔ بہت سی کالز تھیں' ان میں کچھ کاروباری تھیں' کچھ نجی نوعیت کی تھیں۔ زیادہ تر کالز نوشیر رضا کی انگریز پرسنل سیکرٹری نے کی تھیں۔ آخر ایک کال میرے مطلب کی نکل ہی آئی۔ یہ کال رات قریباً ایک بجے شنکر شکرا نے پاکستان میں کی تھی۔ جس شخص کو کال کی

گئی تھی اسے رضوان علی کے نام سے پکارا گیا تھا اور وہ لاہور کے ایک مہنگے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بہرحال اس شخص کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی انڈین بدمعاش ہے اور شنکر کے قریبی ساتھیوں میں سے ہے۔ شنکر اور اس شخص کے درمیان جو مختصر گفتگو ہوئی وہ چشم کشا تھی۔ اس گفتگو کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں زریں گل' شفتا اور ساہی صاحب وغیرہ کے نام بار بار آرہے تھے اور موضوع اتنا سنگین تھا کہ میری ہتھیلیوں پر پسینہ آنے لگا۔ رضوان علی نامی شخص شنکر کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دے رہا تھا۔ وہ شنکر کو بتا رہا تھا کہ وہ اپنی طرف سے مطلوبہ افراد کو تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہا۔ مطلوبہ افراد سے اس کی مراد زریں گل اور شفتا تھے۔ کرائے کے ایک درجن خطرناک قاتل رضوان علی کی زیر ہدایت کام کررہے تھے اور شب و روز ان دونوں کو تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ خاص طور سے زریں گل کو ٹریس کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کام کے لیے تین افراد پہلے سے پشاور میں موجود تھے' اب رضوان علی دو مزید افراد کو بذریعہ فلائنگ کوچ وہاں روانہ کررہا تھا۔

یہ بڑے سنگین انکشافات تھے' تاہم ان میں ایک پہلو اطمینان کا بھی تھا۔ اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ رضوان علی کی آواز میں مایوسی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ ابھی تک زریں یا شفتا تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ساہی صاحب کے بارے میں تو اس نے شنکر کو حتمی رپورٹ دے دی تھی کہ شفتا شاید اس مرتبہ ساہی صاحب کی تحویل میں نہیں ہے۔ زریں گل کے متعلق وہ قدرے پرامید محسوس ہوتا تھا اور اسے توقع تھی کہ شاید ایک آدھ دن میں کوئی "کلیو" مل جائے۔ رضوان نامی شخص

کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ساہی صاحب اپنی حفاظت کے سلسلے میں بڑی احتیاط برت رہے ہیں اور مسلح گارڈ ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس گفتگو کے آخر میں شنکر نے غصیلے لہجے میں رضوان نامی شخص کو کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔

سلطانہ نے میرے لیے جو جاگ وڈ کی تھی وہ اس "ٹیپ شدہ گفتگو" کی شکل میں کارآمد ہو گئی تھی اور صرف اس گفتگو تک ہی محدود نہیں تھا۔ ان آڈیو ٹیپس میں میرے مطلب کا ایک اور مکالمہ بھی موجود تھا۔ یہ مکالمہ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ شنکر اور شیخ عشارب کے درمیان ہوا تھا۔ یہ بھی بڑی اہم قسم کی گفتگو تھی۔ یہ گفتگو ڈھکے چھپے انداز میں کی گئی تھی تاہم تھوڑے سے غوروخوض کے بعد مفہوم واضح ہو جاتا تھا۔ اس گفتگو میں غزالہ کا ذکر آیا تھا اور اسے "وہ لڑکی" کہہ کر یاد کیا گیا تھا۔ اسی طرح شیخ عاصم کو "بڑے صاحب" کہا گیا تھا۔ اس مکالمے میں شیطان ابن شیطان شنکر نے شیخ عشارب سے کہا تھا کہ پاکستان میں شفتا کو ڈھونڈنے میں سخت دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ کسی خفیہ ٹھکانے پر ہے۔ اس کے بعد شنکر نے شیخ عشارب کے سامنے ایک نہایت تشویش ناک تجویز پیش کی تھی۔ اس نے شیخ عشارب سے کہا تھا "میرا خیال ہے جناب کہ وہ لڑکی (غزالہ) اس سارے معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ پاکستان میں اس ٹھکانے سے واقف ہو جہاں شفتا کو رکھا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ لوگ اپنے اندیشے ایک طرف رکھ کر اس لڑکی (غزالہ) پر ہاتھ ڈال لیں تو بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

شیخ عشارب نے کہا تھا "تم جانتے ہو یہ کتنا نازک مسئلہ ہے۔ ہم اس میں براہ راست ملوث نہیں ہو سکتے اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔"

شنکر بولا تھا "آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے طور پر اس لڑکی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتا ہوں؟"

شیخ عشارب نے جواب میں چند لمحے خاموشی اختیار کی تھی پھر بولا تھا "یہ تمہارے سوچنے کا مسئلہ ہے شنکر۔ میں اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

شیخ عشارب کے جواب میں "نیم رضامندی" کا انداز تھا۔

ٹیپس پر سنائی دینے والی گفتگو نے سلطانہ پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی' شنکر کا شمار دنیا کے چند خطرناک ترین قاتلوں میں ہوتا ہے۔ اور یہ قاتل غزالہ کے بارے میں نہایت خطرناک ارادے ظاہر کر رہا تھا۔

کیسٹ ختم ہوئی تو سلطانہ نے میرے دونوں ہاتھ بے اختیار ہو کر تھام لیے "پلیز شاہ جہاں صاحب' آپ کچھ کریں۔ غزالہ کو یہاں سے نکال کر کہیں دور لے جائیں۔"

"لیکن کیسے؟" میں نے پوچھا "آپ دیکھ رہی ہیں حالات کیا ہیں۔ ہم نے خود جمیلہ نور صاحب سے کہہ کر غزالہ کے حفاظتی انتظامات سخت کروائے ہیں۔ اب اسے ان حفاظتی انتظامات سے نکالنا کیونکر ممکن ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ حفاظتی انتظامات نہ بھی ہوں تو غزالہ میرے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس مسئلے کا حل غزالہ کو یہاں سے نکالنا نہیں ہے۔"

"پھر کیا حل ہے؟"

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔"

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی "شفتا آپ کی بہن ہے نا؟" اس نے پوچھا۔ میرا جواب اثبات میں تھا۔ وہ بولی "کیا غزالہ کو واقعی شفتا کے ٹھکانے کا علم ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شنکر کو غلط فہمی ہے اور یہی غلط فہمی غزالہ کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے سلطانہ۔ میرے اندازے کے مطابق شنکر کی یہ غلط فہمی خود ساختہ ہے۔ وہ شفتا کا نام صرف اس لیے لے رہا ہے کہ شیخ عشارب اور اس کے ہم نواؤں کو غزالہ کے خلاف زیادہ سے زیادہ بھڑکا سکے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ شفتا اس قبیلے کی ضد ہے۔ یہ لوگ ہر صورت اسے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں مجھے ایک خوفناک مجبوری کے شکنجے میں جکڑ لیا گیا تھا۔ جو لوگ یہاں سے برات کی صورت میں لاہور گئے تھے' وہ کسی بھی طرح ڈاکوؤں سے کم نہیں تھے۔ اور یہ ڈاکو میری معصوم بہن کو شادی کے نام پر اغوا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی اس مذموم کوشش میں ناکام رہے۔ اپنی یہ ناکامی انہیں کسی طور پر ہضم نہیں ہو رہی۔ میں نہیں سمجھتا کہ شیخ عاصم ان سے جدا ہے۔ اس کے خیالات بھی اتنے ہی زہریلے ہیں جتنے قبیلے کے باقی لوگوں کے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ بسترِ علالت پر ہے۔ جب وہ ٹھیک ہوگا' وہ بھی وہی کچھ کرے گا جو باقی اہلِ قبیلہ کر رہے ہیں۔"

"لیکن غزالہ کا خیال تو کچھ اور ہے۔ وہ کہتی ہے۔۔۔؟"

"وہ جو کچھ کہتی ہے میں ایک ہزار دفعہ سن چکا ہوں لیکن وہ سب کچھ غلط ہے۔ شیخ عاصم بالآخر اسے دھوکا دے گا اور یہ بڑا خوف ناک دھوکا ہوگا۔"

کچھ دیر بعد میں نے سلطانہ کو واپس بھیج دیا۔ اس نے

وعدہ کیا کہ وہ کل یا پرسوں مزید ٹیپس کے ساتھ آئے گی۔

بستر پر نیم دراز ہو کر میں سوچ بچار میں مصروف ہو گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ شیطان ابن شیطان شنکر سے میرا خوف ناک تصادم ہونے والا ہے۔ وہ اپنی یادداشت کھو کر سراپا شعلہ بن گیا تھا اور شعلے کا مقابلہ پھونکوں سے نہیں کیا جا سکتا' اسے بجھانے کے لیے آندھی درکار ہوتی ہے۔

سب سے پہلے میں نے لاہور میں ساہی صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ تھوڑی سی دشواری سے گھر کے نمبر پر ان سے رابطہ ہو گیا۔ میری آواز پہچانتے ہی وہ پھٹ پڑے "شاہ جہاں! تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ ایک دم غائب ہو جاتے ہو اور ہم تمہاری خیریت کا سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔"

"جناب! میں عالم قریشی کو سب کچھ بتا کر گیا تھا اور اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ وہ آپ کو انفارم کر دے۔"

"انفارم تو اس نے کیا تھا لیکن کوئی رابطہ تو ہونا چاہیے تھا جس پر تازہ صورت حال معلوم ہو سکتی۔ یہاں عالم قریشی بال بال بچا ہے۔ شنکر کے کچھ خطرناک غنڈوں نے عالم قریشی کو اس کے بیوی بچوں سمیت گھر میں ہی یرغمال بنانے اور بعد ازاں قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ بس قسمت اچھی تھی کہ رات کے وقت مجرموں کے درمیان وائرلیس پر ہونے والی گفتگو پیٹرولنگ پولیس نے اپنی وائرلیس پر سن لی اور فوری طور پر مجھے اطلاع کر دی۔ عین واردات کے وقت گھیرا ڈال کر مجرموں پر دھاوا بول دیا گیا۔ عالم قریشی کی کوٹھی کے عین سامنے آدھی رات کے وقت زبردست پولیس مقابلہ ہوا۔ مجرم ایک ساتھ والی کوٹھی میں گھس کر مورچہ زن ہو گئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل جاں بحق اور چھ دیگر اہلکار زخمی ہوئے۔ تین حملہ آور موقع پر مارے گئے۔ دو کو گرفتار کر لیا گیا اور دو تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گئے۔ گرفتار شدہ مجرمان کی شناخت ہو گئی ہے۔ وہ دونوں انڈین ہیں اور شنکر کے قریبی ساتھی ہیں۔ وہ عالم قریشی کو اذیت دے کر اس سے زریں گل اور شفتا کا پتا ٹھکانا پوچھنا چاہتے تھے۔"

میں نے پوچھا "عالم قریشی خیریت سے تو ہے نا؟"

"بالکل خیریت سے ہے۔ اس کی کوٹھی پر مسلح گارڈ لگا دی گئی ہے۔ اس گارڈ کا انچارج ایس پی برکت خود ہے۔"

میں نے کہا "جناب! عالم قریشی سے بھی زیادہ آپ کو اپنی طرف سے محتاط رہنا چاہیے۔ وہ لوگ آپ کو ٹارگٹ کی حیثیت دے رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شفتا پہلے بھی آپ کے پاس تھی۔ انہیں یقین ہے کہ شفتا آپ کے پاس ہوگی اور اگر نہیں ہے تو آپ اس کے بارے میں جانتے ضرور ہوں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ عالم قریشی جیسے حالات آپ کو بھی پیش آ سکتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔ بہرحال تمہیں میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ساہی صاحب کے لب و لہجے پر مجھے شک سا گزرا۔ میں نے کہا "کہیں کوئی واقعہ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہیں آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

وہ بولے "ایک معمولی سا واقعہ ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے وحدت روڈ پر میری گاڑی روکنے کی کوشش کی تھی مگر میرے پیچھے آتی ہوئی پولیس کی ایک اور گاڑی کو دیکھ کر فرار ہو گئے تھے۔ ہم ان افراد کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"آپ اسے معمولی واقعہ کہہ رہے ہیں۔" میں نے احتجاج کیا "جناب! آپ بالکل غفلت نہ کریں۔ آپ جانتے نہیں کہ یہاں ابوظہبی میں کیا کھچڑی پک رہی ہے اور کیسے خطرناک ارادے ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ شنکر زخمی سانپ کی طرح لوٹ رہا ہے اور آپ کو معلوم ہی ہے کہ ایسی کیفیت میں وہ کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ ان سب لوگوں کو بے حد محتاط کر دیں جن کا کسی طور میرے ساتھ تعلق ہے یا رہا ہے۔ شنکر کے بھیجے ہوئے قاتل ایسے لوگوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ آپ فریال کے سلسلے میں بہت زیادہ احتیاط کریں۔ آپ جانتے ہیں اس سے پہلے وہ دو مرتبہ ان ظالموں کے جان لیوا چنگل سے بال بال بچی ہے۔ اس کے علاوہ چچا جلیس' چچی فاخرہ اور غزالہ کے دیگر اہل خانہ کو بھی سخت حفاظت کی ضرورت ہے۔ جہاں تک زریں کی بات ہے' میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ شنکر کے دستِ راست موہن داس کو قتل کرنے کے بعد وہ شنکر کی ہٹ لسٹ پر سب سے اوپر آ گیا ہے۔ میں اس کی طرف سے بے حد فکرمند ہوں۔ جناب' اگر آپ کسی طرح اس سے رابطہ قائم کر سکیں تو اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیں۔ یہ اس کے لیے اور اس کی بیاہتا بیوی کے لیے بہت اچھا ہوگا۔"

"زریں کا کوئی پتا نہیں ہے شاہ جہاں! میرا خیال ہے اس نے خطرے کی بو سونگھ لی ہے اور عارضی طور پر روپوش ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا کئی جگہ پتا کروایا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔ زریں کو کلثوم سمیت روپوش ہونے کے لیے میں نے ہی کہا تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کس حد تک محفوظ ہے۔"

ساہی صاحب نے مجھ سے غزالہ کی خیریت دریافت کی اور دیگر حالات پوچھے' میں نے مختصراً انہیں بتایا اور یہ بھی

بتایا کہ شیخ عاصم کا قبیلہ شیخ ایاز کی برات واپس جانے والے واقعے کو کتنی اہمیت دے رہا ہے اور اس حوالے سے ان کے ارادے کتنے سنگین ہیں۔

ساہی صاحب نے کہا "شاہ جہاں! تم شفقا کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ وہ اور انجم بے حد محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان کا بال بیکا نہیں ہوگا۔"

ساہی صاحب کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ میرے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

اگلے روز کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں سارا دن ہوٹل میں رہا لیکن شام کو باہر نکل گیا اور یونہی ابوظہبی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایسے ہی سڑکوں پر گھومتے گھومتے کسی موڑ پر شنکر ٹکرا سے میری مڈھ بھیڑ ہو جائے میں اپنی قمیص کے نیچے سے ۳۸ بور کا لوڈڈ ریوالور نکالوں اور اس کی تمام گولیاں شنکر کے منحوس سینے میں اتار دوں۔۔۔ آج بڑی مدت بعد مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یہ شنکر کے خون کی پیاس تھی۔ میری ایک ایک رگ' ایک ایک نس میں یہ پیاس لق و دق صحرا کی طرح اتری ہوئی تھی۔ اس کیفیت سے مجھے وہ برسوں پرانا زمانہ یاد آ گیا تھا جب میں شیخ راشد بن ارشد کے خون کا پیاسا تھا اور اسے قتل کرنے کے لیے جنوبی پنجاب اور سندھ میں کسی آبلہ پا کی طرح چکراتا پھرتا تھا۔ اس وقت بھی میرے لباس میں اسی طرح بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا اور سانس سینے میں آری کی طرح چلا کرتی تھی۔

میں دل میں قاتل اندھیرا لیے یونہی بے مقصد ابوظہبی کی روشن روشن سڑکوں پر چکراتا رہا۔ کبھی کسی ریسٹوران میں بیٹھ گیا۔ کبھی کسی شاپنگ سینٹر میں گھومنے لگا۔ شام بڑی خوش گوار تھی' صاف ستھری روشن سڑکیں' چمکتی دمکتی لمبی گاڑیاں پس منظر میں بلند عمارتیں اور افق پر شفق رنگ آسمان۔

اگلے روز بعد از دوپہر سلطانہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ پھر ٹیپ شدہ گفتگو اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ بڑی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی شنکر کس بلا کا نام ہے پھر بھی وہ اس کے خلاف میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس ہونے لگا تھا کہ میں ایک غم زدہ عورت اور اس کی معصوم بچی کو اپنے مطلب کی خاطر خطرات میں جھونک رہا ہوں۔ اگر وہ اس معاملے میں ایکسپوز ہو جائے تو خبر نہیں کیا حشر ہوتا اُن کا۔

سلطانہ اپنے ساتھ ...دو کیسٹس لائی تھی۔ حسب سابق ان میں بھی ٹیلیفون کی دونوں لائنز پر ہونے والی گفتگو تھی۔ بیشتر گفتگو عربی میں تھی اور اسے صرف سلطانہ ہی سمجھ سکتی تھی۔ بہرحال کہیں کہیں انگلش بھی سنائی دیتی تھی۔ اس نایاب ریکارڈنگ میں ایک جگہ شیخ عشارب اور اس کے ایک انگریز دوست کے درمیان بڑی رنگین قسم کی گفتگو بھی ریکارڈ ہوئی تھی۔ عشارب کا انگریز دوست عشارب کو اپنی گزشتہ رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ رات اس نے شراب کی ایک سربمہر بوتل پی۔ یہ واقعی سربمہر شراب تھی اور نشے میں بے مثال تھی۔ گفتگو سے عیاں تھا کہ وہ شراب اور بوتل کے الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے' درحقیقت وہ کسی بنت حوا کا ذکر کر رہا ہے۔

جلد ہی ان ٹیپ شدہ آوازوں میں سے مجھے اپنے مطلب کی گفتگو مل گئی۔ یہ گفتگو حسب سابق شنکر اور شیخ عشارب کے درمیان ہوئی تھی۔ کال شنکر نے خود کی تھی اور کال کا ٹائم شب بارہ بجے تھا۔ شنکر نے شیخ عشارب کو آگاہ کیا تھا کہ وہ اس لڑکی (غزالہ) تک پہنچنے کا پختہ ارادہ کیے ہوئے ہے۔ اس نے عشارب کو بتایا تھا کہ اس کے کارندے بڑے صاحب (شیخ عاصم) کی رہائش گاہ کا بغور جائزہ لیتے رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی حوصلہ افزا صورت حال سامنے نہیں آئی۔ رہائش گاہ کے حفاظتی انتظامات بے حد سخت ہیں۔ خون خرابے کے بغیر اندر داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف وہ لڑکی (غزالہ) بھی چار دیواری سے باہر نہیں نکل رہی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ خطرے سے پوری طرح آگاہ ہو گئے ہیں۔

شنکر شکرا کے لہجے سے صاف طور پر مایوسی اور جھنجلاہٹ جھلکتی تھی۔ وہ اب واضح الفاظ میں غزالہ کے اغوا کی بات کر رہا تھا اور شیخ عشارب خاموشی سے سن رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی نیم رضامندی بتدریج رضامندی میں بدل رہی ہے۔۔۔ گفتگو کے آخر میں شنکر شکرا نے ڈرامائی لہجے میں کہا "جناب! میرے ذہن میں ایک اور بات آ رہی ہے۔۔۔ جو قلعے باہر سے فتح نہیں کیے جا سکتے' ان کو اندر سے فتح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیوں نہ ہم بھی کسی اندر کے آدمی سے کام لیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" عشارب کی آواز سنائی دی۔

شنکر بولا "بڑے صاحب (شیخ عاصم) کا ایک با اعتبار کارندہ میرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات مانے گا۔ میں اس لڑکی (غزالہ) تک پہنچنے کے لیے اس کارندے کو استعمال کر سکتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟"

"آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کا نام ابھی صیغہ راز میں رکھوں۔۔۔ بہرحال وہ بہت اچھی جگہ پر ہے اور ہمارا کام باآسانی کر سکتا ہے۔"

کچھ دیر شنکر اور شیخ عشارب کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی پھر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

کیسٹ ختم ہوئی تو سلطانہ اور میں بغور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سلطانہ کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہ اسی گھر کے بھیدی کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کا ذکر شنکر اور عشارب کی گفتگو میں آیا تھا۔ سلطانہ کی خاموشی طویل ہوئی تو میں نے پوچھا "کچھ سمجھ میں آیا کہ وہ بندہ کون ہو سکتا ہے؟"

وہ بولی "شیخ عاصم صاحب گھریلو ملازمین اور گارڈز وغیرہ کے سلسلے میں بڑی چھان پھٹک سے کام لیتے ہیں۔ انہیں بھرتی کرتے وقت ان کے پورے شجرۂ نسب کو کھنگالا جاتا ہے۔ بہرحال کیا کہا جا سکتا ہے کہ کس وقت کس کے دل میں کیا سما جائے۔۔۔ میرے خیال میں جمیلہ نور صاحب ہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتی ہیں۔ وہ بڑی باخبر عورت ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ملازمین اور گارڈز وغیرہ میں اپنے ایک دو جاسوس بھی چھوڑ رکھے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس ذریعے سے وہ کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"تو پھر یہ کام فوراً کریں۔ شنکر کی باتوں سے ظاہر ہے کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔"

"میں ابھی نور صاحب سے ملتی ہوں۔" سلطانہ نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

○☆○

اگلے روز سلطانہ ہوٹل نہیں آئی۔ میں نے دیر تک انتظار کرنے کے بعد اسے فون کیا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی "میں سہ پہر چار بجے آپ کی طرف آنے کے لیے نکلی تھی مگر مجھے شک گزرا کہ کوئی پیچھا کر رہا ہے۔ جلد ہی اس شک کی تصدیق بھی ہو گئی۔ یہ ایک سرخ ڈاٹسن تھی جو مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھی۔ میں واپس گھر آ گئی۔ وہ سرخ ڈاٹسن اب بھی گھر کے آس پاس موجود ہے۔ میں نے پولیس گارڈز کو پوری طرح چوکس کر دیا ہے۔"

"یقینی بات ہے کہ وہ شنکر شکرا کے لوگ ہی ہوں گے۔" سلطانہ نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر تک خود آپ کی طرف آ رہا ہوں۔"

"لیکن کیوں۔" وہ چونکی "یہ تو خطرناک ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ شنکر کی نگاہ میں آ جائیں گے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس کی نگاہ میں آ ؤں۔ میرے اور اس کے درمیان ہونے والی آنکھ مچولی اب خاصی طویل ہو گئی ہے۔"

ظاہر تھا کہ اب سلطانہ میری سلامتی اور خیریت کی طرف سے تشویش کا اظہار کرے گی لہٰذا میں نے فوراً الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں بذریعہ ٹیکسی کار سلطانہ کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ سرخ گاڑی مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے کال بیل بجائی' جلد ہی سمی سلطانہ باہر آئی اور مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھے بتایا کہ سرخ کار والے مستقل یہاں نہیں رہتے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔

سلطانہ نے بتایا کہ وہ کل جمیلہ نور کی طرف گئی تھی اور اسے ساری بات بتا کر آئی تھی۔ جمیلہ نور نے نوٹس لیا ہے اور خاصی محتاط ہو گئی ہے۔

میں نے کہا "اس کے جاسوس کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہ تو ابھی خاموش ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب جمیلہ نور کی ہدایت پر وہ اپنی صفوں میں کالی بھیڑ ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔"

سلطانہ کی بچی بیمار تھی۔ وہ بڑی خوب صورت تھی اور شستہ انگریزی میں بات کرتی تھی لیکن افسوس کا مقام تھا کہ یہ بچی نارمل نہیں تھی۔ اس کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ میں اس کے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ اس ننھی بچی نے مجھے زرغونہ کی یاد دلا دی۔ وہی فرشتہ صفت قبائلی بچی جسے راوی داخان میں ایک بھیانک رسم کی بھینٹ چڑھایا جانے والا تھا۔ میں نے اسے بچایا تھا اور وہ پھر ہمارے ساتھ ہی گلگت سے لاہور پہنچی تھی۔ اب وہ فینگ کے ساتھ ہی فلپائن جا چکی تھی۔ ماں باپ کی موت کے بعد فینگ سے اس کی بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک پل اس کے بغیر نہیں گزارتی تھی۔ گلگت سے واپسی پر فینگ اور زرغونہ کچھ دن لاہور ہی میں رہے تھے پھر جب فینگ کے کزن والد مسٹر راموس لاہور آئے تھے تو انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سلطانہ کی بچی لالہ سے باتیں کرتے کرتے خیالوں کا دھارا کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ اچانک کال بیل کی آواز نے مجھے چونکایا۔ سلطانہ کچن میں تھی۔ وہاں سے دروازے پر پہنچی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دروازے کی جھری سے دیکھا کہ بھیم تحیم جمیلہ نور اندر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا اور ایک جواں سال لڑکی تھی۔ لڑکی کچھ ڈری ہوئی تھی۔ بظاہر وہ انڈین یا سری لنکن نظر آتی تھی۔ جمیلہ نور کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تمتمایا ہوا تھا اور وہ طیش میں دکھائی دیتی تھی۔ گارڈ واپس چلا گیا جب کہ جمیلہ نور' سلطانہ اور گندمی رنگت والی خوف زدہ لڑکی کے ساتھ کسی اندرونی کمرے میں اوجھل ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ میرے پاس آئی۔ وہ بولی "اس

لڑکی کی خیر نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"جمیلہ نور کو اس پر شک ہے۔ نور صاحب کا خیال ہے کہ اگر گھر کے ملازمین میں کسی کی وفاداری مشکوک ہو سکتی ہے تو پھر وہ یہ لڑکی ہے۔"

"اس شک کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"خاص ہے یا نہیں اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن وجہ ضرور ہے۔ بقول جمیلہ نور صاحب عزی اپنی تنخواہ سے زیادہ خرچ کر رہی تھی' اس کے پاس سے چند قیمتی زیور بھی برآمد ہوئے ہیں۔ وہ یہ نہیں بتا سکی کہ زیور اس نے کہاں سے حاصل کیے ہیں۔ وہ کافی چالاک نظر آتی ہے۔"

"لیکن لڑکی کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ سلطانہ جواب میں کچھ کہتی' کسی اندرونی کمرے سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ سلطانہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ بولی "جمیلہ نور صاحب اس سے اقبالِ جرم کروانا چاہتی ہیں۔ ان کے خیال میں لڑکی کافی ڈھیٹ ہے۔ مار پیٹ کے بغیر کچھ اگلے گی نہیں۔ وہ اپنی قیام گاہ پر لڑکی سے تفتیش کرنا نہیں چاہتی تھیں لہٰذا یہاں لے آئی ہیں۔"

"گارڈ کہاں ہے؟"

"وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔"

کسی اندرونی کمرے سے آنے والی چیخ پکار بلند ہو رہی تھی۔ روتی بلکتی لڑکی کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔ سلطانہ کی بچی لالہ یہ آوازیں سن کر خوف زدہ ہونے لگی۔ سلطانہ اسے چھاتی سے لگا کر کسی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

میں اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں سے آہ و بکا کی صدائیں آ رہی تھیں۔ یہ زیریں منزل کا ایک کمرا تھا اور جہازی سائز کے زینوں کے نیچے واقع تھا۔ دروازے کھڑکیاں بند تھیں۔ لڑکی کی آواز ہی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے الٹا لٹکایا گیا ہے اور کسی چھڑی وغیرہ سے پیٹا جا رہا ہے۔ وہ چیخ رہی تھی اور جاں بخشی کی التجائیں کر رہی تھی۔ ان التجاؤں کے جواب میں گاہے گاہے جمیلہ نور کی دہاڑتی ہوئی پاٹ دار آواز سنائی دیتی تھی۔

یکلخت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور جمیلہ نور کا شعلہ فشاں چہرہ نظر آیا۔ میں تیزی سے ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ تاہم ایک سیکنڈ کے لیے مجھے کمرے کے اندر کا منظر نظر آ گیا تھا اور وہ سنسنی خیز تھا۔ گندمی رنگت والی جواں سال ملازمہ چھت سے الٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں تھا۔ اس کے بال جھول رہے تھے اور فرش سے چھو رہے تھے۔ اس کے برہنہ جسم پر جگہ جگہ چھڑیوں کے سرخ نشان دکھائی دے رہے تھے۔

جمیلہ نور نے چیخ کر سلطانہ کو پکارا اور اسے کوئی ہدایت جاری کی۔ دو تین فقرے بولنے کے بعد اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔

میں ستون کی اوٹ سے نکل کر واپس سلطانہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچن میں تھی اور خواہ مخواہ چیزیں اِدھر سے اُدھر کر رہی تھی۔ بالکل گم صم دکھائی دیتی تھی۔ دفعتاً میں نے کہا "حضور صاحب کیا کہہ رہی تھیں آپ سے؟"

وہ بولی "کچھ نہیں۔ یونہی لڑکی کو دھمکا رہی تھیں۔"

"کیا مطلب۔ شاید وہ گارڈ کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں۔ ن۔ نہیں۔" سلطانہ گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر بولی "بس وہ دھمکا رہی تھیں یونہی۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ جمیلہ نور نے گارڈ کو بلانے کا ارادہ ظاہر کر کے زیر تفتیش لڑکی کو ایک خطرناک دھمکی دی تھی۔ لمبے تڑنگے حبشی گارڈ کو برہنہ لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا جاتا تو یقیناً لڑکی بدترین عذاب سے دوچار ہو جاتی۔

بند کمرے سے بلند ہونے والی چیخیں اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی سے مار پیٹ نہیں کی جا رہی۔ شاید جمیلہ نور کی دھمکی کارگر رہی تھی۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ بس کبھی کبھی کمرے کے اندر سے جمیلہ نور کی مردانہ دہاڑ سنائی دیتی تھی۔ یکایک میں چونک گیا۔ سلطانہ کا ماتھا بھی ٹھنکا تھا۔ بند کمرے کے اندر گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ میں اور سلطانہ دوڑ کر آواز کی سمت گئے۔ یہی وقت تھا جب دروازہ دھماکے سے کھلا اور کیم شحیم جمیلہ نور کی پریشان صورت دکھائی دی۔ میں نے کمرے میں جھانکا۔ فرش پر خون میں لت پت لڑکی پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال رنگین ہو چکے تھے۔ عریاں جسم بے ترتیب تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک چادر اس پر پھیلا دی۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس لے چکی تھی۔ اس کے قریب ہی چھوٹے سائز کا طاقتور لیڈیز پستول پڑا تھا۔

جمیلہ نور اب سلطانہ سے بات کر رہی تھی۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور لہجے میں بے تحاشا نفرت تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ بار بار لڑکی کی خونچکاں لاش کی

طرف بھی اشارہ کرتی تھی۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی پر خودکشی کا الزام لگا رہی ہے۔ ویسے موقع محل اور لاش کی پوزیشن دیکھی جاتی تو یہ الزام درست نظر آتا تھا۔

ان کی گفتگو میں ذرا وقفہ آیا تو میری سوالیہ نگاہ سلطانہ پر جم گئی۔ وہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی "لڑکی نے خود کو گولی مار لی ہے۔ وہاں میری میز کی دراز میں پستول پڑا تھا۔ لڑکی نے پھرتی سے نکالا اور اپنی کنپٹی پر رکھ کر چلا لیا۔"

سلطانہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔

جمیلہ نور کی تفصیلی نگاہیں اب مجھ پر جم گئی تھیں۔ اپنے بھڑکیلے لباس اور بھاری بھرکم زیورات کے ساتھ وہ کوئی بارعب ملکہ ہی نظر آ رہی تھی۔ جمیلہ نور نے مجھے ایک مرتبہ پہلے بھی یہیں دیکھا تھا۔ تب سلطانہ نے اسے بتایا کہ میں ایک پاکستانی تاجر ہوں اور سلطانہ نے مجھے "بھائی" بنا رکھا ہے۔ اس وقت تو جمیلہ نور نے مجھ پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا لیکن آج وہ کر رہی تھی اور کرنے کی وجہ بھی تھی۔ میں ایک خودکشی یا قتل کا چشم دید گواہ بن چکا تھا۔

جمیلہ نور نے مجھ سے انگلش میں مخاطب ہو کر کہا "تم سلطانہ کے منہ بولے بھائی ہو نا؟"

میں نے فوراً اثبات میں جواب دیا' سلطانہ نے بھی اقرار میں سر ہلایا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "یہ لڑکی غداری کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے ملی ہوئی تھی جو عاصم اور اس کی نئی بیوی کو نقصان پہنچانا چاہ رہے ہیں۔ میں اسے پوچھ گچھ کے لیے یہاں لائی تھی۔ اس نے اچانک پستول نکال کر خود کو گولی مار لی۔"

"یہ تو کافی سنگین معاملہ ہو گیا ہے۔ بہتر تھا کہ آپ اسے پولیس کے حوالے کر دیتے۔" میں نے کہا۔

"بہرحال کچھ بھی ہے۔ ہم نمٹ لیں گے... اس کی خودکشی سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ مجرم تھی۔"

"آپ کو اس پر شک کیسے گزرا؟"

"یہ پہلے سے مشکوک تھی۔ جب ہمیں اطلاع ملی کہ ملازمین میں سے کوئی فرد مخالفین کے ساتھ ملا ہوا ہے تو ہم نے اس لڑکی پر خصوصی توجہ دی۔ معلوم ہوا کہ یہ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کر رہی ہے پھر اس کے پاس سے کچھ قیمتی زیورات بھی برآمد ہوئے۔"

جمیلہ نور مجھے اس سلسلے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ اس کی خواہش تھی کہ اگر گواہی وغیرہ کا موقع آئے تو میں خودکشی کی تائید میں بیان دوں... سلطانہ کی بھی یہی خواہش تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مقامی قانون میں گواہی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

بند کمرے میں فائر کی آواز زیادہ نہیں پھیلی تھی پھر بھی گیراج میں موجود حبشی گارڈ تک پہنچ ہی گئی تھی۔ وہ بھی اب اندر آ گیا تھا اور پریشان سا ایک گوشے میں کھڑا تھا۔

میں سلطانہ کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ضروری ہے۔ میرے تمام کاغذات جعلی تھے اور تھانے کچہری کے چکر میں پڑنا میرے لیے کسی طور مناسب نہیں تھا۔ پولیس کے آنے سے پہلے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ سلطانہ نے میرے خیال کی تائید کی لہٰذا مجھے ہوٹل واپس آنے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔

اگلے روز کے اخبارات میں یہ خبر موجود تھی کہ ایک انڈین ملازمہ نے اپنی مالکہ کی ڈانٹ ڈپٹ سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی... تفصیل میں سب باتیں درج تھیں لیکن یہ درج نہیں تھا کہ ملازمہ کے جسم پر تشدد کے نشانات موجود تھے۔ غالباً اثر و رسوخ کے ذریعے یہ بات دبا دی گئی تھی۔ انڈین ملازمہ کی موت سے یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے بلکہ بہت سی دال ہی کالی ہے۔ سلطانہ نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ مرنے والی ملازمہ بے حد چالاک تھی اور اسے کسی حد تک پراسرار بھی کہا جا سکتا تھا۔ جب سلطانہ غزالہ سے ملنے شیخ عاصم کی رہائش گاہ پر جاتی تھی تو یہ ملازمہ اکثر ان کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔

اس دن میں رات گئے تک جاگتا رہا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔ میرے ذہن میں شنکر شکرا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ شخص اب تقاضا کر رہا تھا کہ اس سے فیصلہ کن ملاقات کر لی جائے۔ زندگی یا موت کی یہ ملاقات اب جلد از جلد ہونا ضروری تھی... میرے دل و دماغ کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ بے شک شنکر سے نفرت و دشمنی تو پہلے بھی موجود تھی لیکن اس میں ایسی خوفناک شدت نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ خوفناک شدت کیوں پیدا ہوئی ہے؟ شاید اس لیے کہ شنکر کے دل میں بھی نفرت و دشمنی خوفناک شدت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ دانا کہتے ہیں کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ پیار سے پیار پیدا ہوتا ہے۔ غصے سے غصہ اور شدید غصے سے شدید غصہ پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً شنکر کے غیظ و غضب نے میرے اندر کے پرانے اور تازہ زخم بھی ہرے کر دیے تھے۔ اب میرے اندر بار بار ایک ہی خواہش لہر کے مانند اٹھ رہی تھی۔ میں شنکر کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ میرے دل کی گہرائی سے آواز آ رہی تھی

"شاہ جہاں! اس سے پہلے کہ زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا یہ شخص غزالہ یا شفنا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا جائے اس کا سر کچل ڈالو۔"

لیکن کیسے؟ کہاں تھا وہ شخص۔ ابو ظہبی کی بھول بھلیوں میں وہ کسی سانپ ہی کی طرح روپوش تھا۔

دوپہر کو سلطانہ اسکول کے کام سے فارغ ہوتے ہی میرے پاس ہوٹل پہنچ گئی۔ اس نے بتایا کہ جمیلہ نور صاحب نے بڑے مدبرانہ انداز میں حالات پر قابو پالیا ہے۔ پولیس نے ابتدائی تفتیش مکمل کرلی ہے۔ تفتیشی ٹیم کے انچارج نے بیان دیا ہے کہ اس واردات میں شواہد خودکشی کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

سلطانہ نے بتایا کہ جمیلہ نور صاحب پامردی سے حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہیں۔ اب بھی وہ تن تنہا سارے مسائل سے نمٹ رہی ہیں۔ بہرحال غزالہ کے حوالے سے ان کی تشویش ہر لحظہ بڑھتی جارہی ہے۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ لڑکی ختم ہوگئی ہے۔" سلطانہ نے جواب دیا "اگر وہ زندہ رہتی تو اس سے بہت کچھ پوچھا جاسکتا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ اکیلی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی سازش میں شریک تھا۔"

میں نے پوچھا "شنکر کی طرف کیا صورت حال ہے؟"

سلطانہ بولی "ابھی تک تو خاموشی ہے۔ وہ گہری چال چلنے والا ہے۔ سرخ کار کل رات سے نظر نہیں آرہی۔ اب بھی میں پوری طرح اطمینان کرکے یہاں پہنچی ہوں۔ کسی نے تعاقب نہیں کیا ہے۔"

"مزید کالیں ٹیپ ہوئی ہیں؟"

"ہاں ہوئی ہیں اور میں نے سنی بھی ہیں لیکن ان میں کوئی کام کی بات نہیں۔"

"شیخ عاصم کی حالت اب کیسی ہے؟"

"میں کل اس کی مزاج پرسی کے لیے جانا چاہتی تھی، میں نے سوچا کہ غزالہ کو بھی ساتھ لے جاؤں لیکن جمیلہ نور صاحب نے اجازت نہیں دی۔ ایک طرح سے انہوں نے ٹھیک ہی کیا۔ موجودہ حالات میں گارڈز وغیرہ کے ساتھ بھی غزالہ کا گھر سے نکلنا ٹھیک نہیں بلکہ ملازمہ کی خودکشی کے بعد تو جمیلہ نور صاحب سوچ رہی ہیں کہ غزالہ کو حفاظت کی غرض سے کہیں اور منتقل کردیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی مکان بھی دیکھا ہے۔ وہ یہ سارا کام اپنی صوابدید کے مطابق اور پوری ذمے داری سے کررہی ہیں۔ وہ سخت گیر ضرور ہیں لیکن ان کی ذمے داری اور دانائی کے خود شیخ عاصم صاحب بھی معترف ہیں۔ اب دیکھیں ملازمہ کی خودکشی والا واقعہ کتنا سنگین ہے اور اس سے بھی سنگین شنکر کی سازش ہے مگر جمیلہ نور صاحب نے بیمار شوہر کو ان تکلیف دہ حالات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے۔" پھر وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی "ہاں۔۔۔ نور صاحب شنکر کی پلاننگ کو بڑی اہمیت دے رہی ہیں۔ وہ خود ٹیپ شدہ گفتگو سننا چاہ رہی ہیں۔ کیا خیال ہے، ٹیپ ان کو سنا دی جائے۔ اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟"

"نہیں حرج کی کیا بات ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ٹیپ سننے کے بعد وہ اور زیادہ احتیاط برتیں۔"

یہ اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ میں ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہا کر باہر نکلا ہی تھا کہ سلطانہ پر نظر پڑی۔ وہ تیزی سے میری طرف آرہی تھی۔ چھوٹتے ہی بولی "میں آپ کو پورے ہوٹل میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

"کیوں خیریت؟"

"جلدی آیئے۔۔۔ بہت ضروری کام ہے۔"

"کہیں جانا ہے؟" میں نے تولیے سے جسم پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں 'میلوڈی مارکیٹ'۔۔۔ جمیلہ نور صاحب وہاں موجود ہیں۔ غزالہ بھی ہے۔ نور صاحب غزالہ کو بڑی خاموشی کے ساتھ غربی شہر پہنچانا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ کسی کو اس معاملے کا پتا نہ چلے۔ حتیٰ کہ ڈرائیور کو بھی نہیں۔ ہم یہاں میلوڈی مارکیٹ میں شاپنگ کے بہانے آئے تھے۔ نور صاحب نے ڈرائیور کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا ہے کہ ہم خود آجائیں گے۔"

میں نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا "لیکن اب میری ضرورت کیوں پیش آگئی ہے؟"

وہ بولی "آپ کو معلوم ہے، میں ڈرائیونگ نہیں کرسکتی۔ نور صاحب بھی نہیں کرتیں۔ گاڑی کون چلائے گا۔"

"تو یہ سوال ڈرائیور نے نہیں پوچھا تھا؟"

"اس کو تو یہ بتایا تھا کہ چھوٹی مالکن (غزالہ) ڈرائیو کرلیں گی لیکن غزالہ کو تو واپس آنا نہیں۔ اسے غربی شہر کے ایک مکان میں رہنا ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک شیخ عاصم صاحب واپس نہیں آجاتے۔"

"مگر یہ بات آپ نے پہلے نہیں سوچی تھی کہ واپسی پر گاڑی ڈرائیو کون کرے گا؟"

"جی! آپ تو بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ ڈرائیور کو واپس بھیجنے والا پروگرام راستے میں بنا تھا بلکہ یہ میری ہی تجویز تھی جسے نور صاحب نے قبول کیا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بس ابھی کمرے سے ہوکر واپس آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا ننھا منا پسٹل دراز سے نکالنا چاہا لیکن دراز لاک تھی اور چابی مل نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنا رام پوری خنجر پنڈلی سے لگایا اور دروازہ لاک کرکے واپس سلطانہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سوئمنگ پول کے قریب ایک سائبان تلے کھڑی میرا انتظار کررہی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر ہم پاپیادہ ہی روانہ ہوگئے۔ آسمان صاف اور دھوپ بے حد چمکیلی تھی۔ میلوڈی مارکیٹ زیادہ دور نہیں تھی۔ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ چل کر ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ جمیلہ نور اور غزالہ ائرکنڈیشنر لگائے بیٹھی تھیں۔ یہ شاندار لنکن کار شیخ عاصم کی نصف درجن گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ سلطانہ نے مجھے لنکن کی چابی دی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ خوش گوار ٹھنڈک اور خوشبو نے استقبال کیا۔ وہی جانی پہچانی خوشبو جو میری زندگی کا سرمایہ تھی اور میرے دل کا داغ۔ بھی۔ جمیلہ نور نے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے بھی رسمی کلمات ادا کیے۔ غزالہ سے بھی عام انداز میں علیک سلیک ہوئی۔ سلطانہ کی ہدایات کے مطابق میں کار ڈرائیو کرنے لگا۔ ایک شاندار کار تھی اور شاندار سڑک پر جیسے تیرتی چلی جارہی تھی۔ سلطانہ اور جمیلہ نور عربی میں گفتگو جاری رکھے ہوئے تھیں۔ سلطانہ نے ہدایت کی کہ میں گاہے گاہے عقب نما آئینے پر بھی نظر ڈالتا رہوں۔ میں اس کے کہنے سے پہلے ہی یہ کام کررہا تھا۔ ابھی تک مجھے عقب میں کوئی مشکوک گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ ہم تقریباً پانچ کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے غربی شہر میں پہنچ گئے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ہم رک جائیں گے مگر ہمارا سفر جاری رہا اور ہم مضافات میں پہنچ گئے۔ اب سڑک کی دونوں اطراف کھجور اور زیتون کے درخت نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں خانہ بدوشوں کی بستیاں تھیں اور ان کے گرد اونٹ حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اور خاص چیز جو نظر آئی، وہ دور فاصلے پر آگ کے شعلے تھے۔ لق و دق صحرا میں یہ شعلے انوکھا منظر پیش کرتے تھے۔ سلطانہ کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ تیل کے کنوئیں ہیں۔ وہی تیل جس نے اس خطہ ویراں کو دنیا کے بارونق ترین شہروں سے زیادہ باسہولت اور آرام دہ بنا رکھا تھا۔

ہماری گاڑی شہر کی کثافت اور آوکی ریفائنریوں کے علاقے سے بہت آگے ایک سرسبز باغ میں جاکر رکی۔ اس باغ کے بیچوں بیچ ایک شاندار بنگلا واقع تھا۔ پورچ میں گاڑی روک کر ہم بنگلے میں پہنچے۔ بنگلا خوب صورت ہونے کے باوجود ویرانی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بنگلے کے گرد بہت بڑا باغ تھا اور بنگلے کے اندر بھی مکینوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ محدودے تین چار ملازم تھے۔ جن میں دو گارڈز اور ایک خانساماں تھا۔ بنگلے کے اردگرد گراسی لانوں کی تراش خراش عمدہ نہیں تھی۔ رنگ و روغن بھی کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا تھا۔ یہ آثار بتاتے تھے کہ یہ عمارت عام طور پر مکینوں سے خالی رہتی ہے۔ صرف ملازم پیشہ لوگ ہوتے ہیں جو صفائی اور آرائش کا زیادہ دھیان نہیں رکھتے۔

میں غزالہ کے تاثرات سے اس کے دلی جذبات جاننے کی کوشش کررہا تھا۔ غزالہ کو یقیناً یہ بات بتادی گئی تھی کہ شہر میں اس کے لیے خطرات موجود ہیں جس کے سبب اسے یہاں مضافات میں شفٹ کیا جارہا ہے۔ وہ بہت گم صم نظر آتی تھی۔ شاید جمیلہ نور کا ناصحانہ و حاکمانہ انداز اُسے پسند نہیں تھا۔

ہم نے بنگلے کے ٹیرس پر بیٹھ کر تربوز کھایا اور چائے پی۔ تربوز اور چائے کا ملاپ انوکھا لیکن مزے دار تھا۔ ٹیرس پر سے اردگرد کے باغات اور نخلستانی علاقہ نظر آتا تھا۔ ہم گفتگو بھی کرتے رہے تاہم غزالہ اس عرصے میں گم صم ہی رہی۔ مقامی رواج کے مطابق اس نے نہایت قیمتی زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے علاوہ جڑاؤ زیور تھا۔ غزالہ کے تاثرات دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ ان بھاری بھرکم کپڑوں اور گہنوں کا بوجھ وہ اپنے جسم پر ہی نہیں مزاج پر بھی محسوس کررہی ہے۔

جب جمیلہ نور اور غزالہ کسی معاملے پر سرگوشی میں بات کررہی تھیں تو سلطانہ نے مجھے اشارہ کیا اور دوسری طرف لے گئی۔ کہنے لگی "ہمارا خیال تھا کہ غزالہ کو یہاں چھوڑ دیں گے۔ ایک باورچن اور ایک خادمہ بھی یہاں موجود ہے، وہ ان کے ساتھ "ایزی" محسوس کرے گی لیکن اس جگہ کی تنہائی اور دوری نے غزالہ پر اثر ڈالا ہے۔ وہ یہاں اکیلی رہنے سے خوف زدہ ہے۔ نور صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ یہاں رہوں۔۔۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہتی ہیں کہ میں آپ کو بھی یہاں رکھ لوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے پیش نظر جو سب سے اہم چیز ہے، وہ غزالہ کی سلامتی ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم غزالہ سے نزدیک ہوں گے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ اگر جمیلہ نور صاحب خود

اس طرح کی آفر کررہی ہیں تو ہمیں قبول کرلینی چاہیے۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"آپ کی بچی تو ابھی شہر میں ہے اور پھر وہی گاڑی کا مسئلہ۔ گاڑی کو اور جیلہ نور صاحبہ کو شہر کون پہنچائے گا۔"

"آپ نور صاحبہ کے ساتھ جائیں گے۔ نور صاحبہ کو گھر پہنچا کر وہاں سے آپ ٹیکسی کار لیں گے اور میرے گھر پہنچیں گے۔ میں فون پر "آپا" کو آپ کے بارے میں بتادوں گی۔ وہ بچی آپ کے حوالے کردے گی۔ آپ اسے لے کر ٹیکسی کار کے ذریعے یہاں آجائیں۔ آتے ہوئے ہوٹل سے اپنا سامان بھی لے آئیں۔ میرے خیال میں ہمیں ایک دو ہفتے یہاں رہنا پڑے گا۔" میں خاموش ہوگیا۔ وہ ایک دم چونک سی گئی "اتنی آپ کو میرا تحکمیہ لہجہ ناگوار تو نہیں گزرا؟"

میں نے مسکرا کر انکار میں سر ہلایا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ غزالہ کو میرا یہاں رہنا شاید اجنبی لگے۔"

وہ بولی "بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں۔ اس کی حفاظت کی ہے۔ شنکر کی جو گفتگو میں نے اور آپ نے سنی ہے اس سے یہ بات ثبوت کو پہنچی ہے کہ وہ غزالہ تک پہنچنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا۔ شیخ صاحب اسپتال میں پڑے ہیں۔ قبیلے والے اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔ ایسے میں شنکر جیسے موذی سے غزالہ کو کون بچائے گا۔ یقین کریں مجھے اپنے اس فیصلے پر خوشی ہورہی ہے کہ میں نے آپ کو بروقت پاکستان سے یہاں بلالیا۔"

سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا۔ میں مسز جیلہ نور کو لے کر شہر آگیا۔ راستے میں میرے اور جیلہ نور کے درمیان رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ جیلہ نور میرے کاروبار اور دیگر کوائف کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ اس بات پر کلی یقین کررہی تھی کہ میں گولڈ مرچنٹ ہوں اور سلطانہ کے سوا میری یہاں کسی سے جان پہچان نہیں ہے۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھی کہ ہمارے درمیان بہن بھائی کا رشتہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ آج کے دور میں بے لوث رشتے ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ وہ سلطانہ کی نجی زندگی کی بے سکونی پر بھی دکھ محسوس کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سلطانہ جیسی خوش اطوار اور خوب سیرت لڑکی کو ایک نو عمر امیر زادے کی ہوس پر قربان کردیا گیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سلطانہ کی زندگی کو مشکلات اور اکیلے پن سے نکالنے کی کوشش کروں۔ سلطانہ کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی ہے' اگر کوئی اچھا رشتہ مل جائے اور وہ شادی کرلے تو اس کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

جیلہ نور کو میں نے کار سمیت اس کی رہائش گاہ پر چھوڑا اور خود سلطانہ کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں سلطانہ کا فون موصول ہوچکا تھا۔ "آپا" بچی کو میرے ساتھ بھیجنے کے لیے تیار کرچکی تھی۔ میں نے بچی کو لیا اور بذریعہ ٹیکسی کار ہوٹل پہنچ گیا۔ راستے پر میں اپنے تعاقب کے سلسلے میں قطعی محتاط رہا تھا اور ابوظہبی کی کئی سڑکوں پر چکرانے کے بعد ہوٹل پہنچا تھا۔ ہوٹل سے "چیک آؤٹ" کرکے میں شہر کے مضافات کی طرف روانہ ہوگیا۔ غربی شہر سے گزرتے ہوئے مجھے پہلی بار اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ غالباً شنکر کے کارندے میرے ہوٹل کو "ٹریس" کرچکے تھے اور وہیں سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹ جاگ اٹھی۔ میں خون خرابا نہیں چاہتا تھا مگر لگ رہا تھا کہ خون خرابا ہوکر رہے گا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے موٹی ٹپ کا وعدہ کررکھا تھا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے میرے اشاروں پر چل رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ اوباش لوگ میرا تعاقب کررہے ہیں۔ میں ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔ میری ہدایت پر اگردنی ڈرائیور نے بڑی تیزی سے گاڑی کو کئی سڑکوں پر موڑا۔ بہرحال تعاقب کرنے والی سرخ کار بدستور ہمارے ساتھ چپکی رہی۔ وہ لوگ اب کھل کر سامنے آگئے تھے اور ہم سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ معاملہ جتنا سنگین نظر آرہا تھا' اتنی ہی آسانی سے ٹل بھی گیا اور میرے خیال میں ایسا صرف اس لیے ہوا کہ جن سڑکوں پر ہم یہ "بھاگ دوڑ" کررہے تھے' وہ ابوظہبی کی سڑکیں تھیں اور ابوظہبی میں دیگر قوانین کی طرح ٹریفک قانون کی پاسداری بھی بڑی سختی سے کی جاتی ہے۔ جہاں وجہ بند ٹریفک پولیس ہمہ وقت تیار رہتی ہے اور قانون توڑنے والے کا فوری اور سخت محاسبہ کیا جاتا ہے۔ ایک عرب جی شیخ جو کروڑوں کی کار میں بیٹھا ہے' سڑک پر ٹریفک قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ایک معمولی کانسٹیبل اسے روکتا ہے اور لرزہ بر اندام کرکے رکھ دیتا ہے۔ ہماری ٹیکسی کار ایک ٹریفک سگنل پر سے گزر گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ سرخ کار بھی گزرتی' اشارہ بند ہوگیا۔ سرخ کار سرخ سگنل کی دوسری طرف رہ گئی۔ ہم نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اگردنی ڈرائیور نے چابک دستی سے ٹیکسی کار کو تین چار مختلف سڑکوں پر موڑا اور تعاقب کرنے والوں کو مکمل جل دینے میں کامیاب ہوگیا۔

قسمت نے بہت ساتھ دیا تھا۔ ابوظہبی کی سڑکوں پر؟

ایک سنگین کشمکش میں الجھنے سے بچ گئے تھے۔ قریباً آدھ گھنٹے میں ہم واپس اسی بنگلے میں پہنچ گئے جہاں غزالہ اور سلطانہ ہمارا انتظار کررہی تھیں۔ میں نے ٹیکسی کار کو بنگلے سے دو تین فرلانگ دور ہی فارغ کردیا تھا اور خود کھجور درختوں کے گھنے درختوں کے پاپیادہ سفر کرکے بنگلے تک پہنچا تھا۔ سلطانہ کی معصوم بچی لالہ بھی میرے ساتھ تھی۔

سلطانہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے ساتھ بنگلے کی نچلی منزل میں ہی مقیم رہوں۔ اس نے بنگلے کے اندر ہی سے میرے لیے ایک جدید آٹومیٹک رائفل بھی فراہم کردی تھی۔ ساتھ میں کافی ایمونیشن بھی موجود تھا۔ یہ رائفل گھر ہی کے ایک لاکر میں بند تھی۔ لاکر کی چابی جیلہ نور نے سلطانہ کو دی تھی۔ جیلہ نور تو اب یہاں نہیں تھی مگر بنگلے کے ملازم تو موجود تھے۔ بہتر تھا کہ میں ان کے سامنے اپنی وہی حیثیت برقرار رکھوں جو جیلہ نور کی نظر میں تھی۔ یعنی ایک گولڈ مرچنٹ جو سونے کی تجارت کے سلسلے میں ابوظہبی آیا ہوا ہے اور جسے سلطانہ نے منہ بولا بھائی بنا رکھا ہے۔ اس حیثیت میں ضروری تھا کہ میں غزالہ سے بھی ایک خاص فاصلہ رکھ کر بات کروں۔ یوں تو غزالہ سے بہت کم بات ہوتی تھی' تاہم ایک دو بار میں نے اسے مخاطب بھی کیا تھا تو مسز غزالہ کہہ کر کیا تھا۔

اس بنگلے کا ماحول بے حد عجیب تھا۔ اُجڑا اُجڑا سا لیکن پھر بھی خوب صورت اور پُرسکون۔ جو رائفل سلطانہ نے مجھے دی تھی وہ گرد آلود اور جامد تھی۔ لگتا تھا کہ ایک عرصے سے اسے استعمال نہیں کیا گیا۔ میں نے اگلے روز بنگلے کی چھت پر بیٹھ کر رائفل کو کھولا۔ صاف کیا اور آزمائش کے طور پر چند ہوائی فائر بھی کیے۔ یہ ایک طاقتور رائفل تھی۔ اس میں ۲۵ گولی والا میگزین چلتا تھا۔ جس کے علاوہ بیلٹ اسٹریپ کے ساتھ بھی اس سے فائر کیا جاسکتا تھا۔ اس کی ساخت اور کارکردگی "جی تھری" کے قریب قریب تھی۔ یقیناً آڈیو ٹیپ سننے کے بعد جیلہ نور' غزالہ کی سلامتی کے لیے بہت فکرمند ہوگئی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ بدنام زمانہ شنکر شکرا نے قبیلے کے سرکردہ افراد کو اپنا ہم نوا بنالیا ہے اور خاص طور سے غزالہ کے سلسلے میں ان کی خاموش حمایت حاصل کرلی ہے۔ تمام قبیلہ کی ضد بن گئی تھی۔ شنکر نے اہل قبیلہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا اور انہیں باور کرایا تھا کہ اگر شمتا کو برآمد کرنا ہے تو غزالہ کو تشدد کے شکنجے میں جکڑنا ہوگا حالانکہ خود شنکر کو بھی کوئی اسی فیصد سے زیادہ امید نہیں تھی کہ غزالہ۔ شمتا کے بارے میں کچھ جانتی ہوگی۔

اس رہائش گاہ پر ہر قسم کی سہولت اور آرام حاصل تھا۔ میرا قیام ایک نہایت کشادہ اور آرام دہ کمرے میں تھا۔ یہاں دیواروں پر سرخ اونٹ کی کھال پر بنی ہوئی نادر پینٹنگ تھیں۔ جانوروں کی بیش قیمت نرافیاں تھیں۔ دبیز قالین' پردے اور غالیچے۔ سلطانہ نے مجھے بتایا تھا کہ دو تین برس پہلے شیخ عاصم صاحب یہاں کثرت سے آیا کرتے تھے۔ وہ جب یہاں آتے تھے تو یہی کمرا ان کا بیڈ روم ہوتا تھا۔ میں رات کو کمرے کے جہازی سائز بیڈ پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا۔ یہ بیڈ جو میری معلومات کے مطابق آسٹریلیا سے پانچ لاکھ امریکن ڈالر میں خریدا گیا تھا نجانے کیسی کیسی رنگین داستانوں کا گواہ تھا۔ اس کمرے کی دیواروں نے عیاش شیخ عاصم کی کیا کیا خرمستیاں دیکھی تھیں اور سنی تھیں۔ آج وہ شیخ عاصم اپنی کمر کی چوٹ سے عاجز ہوکر اسپتال کے ایک کمرے میں پڑا تھا اور یہ بیڈ روم میرے تصرف میں تھا۔ اس روز ملازمہ لڑکی راجن بھی رات کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں آئی تھی۔ وہ خوب صورت تھی اور خاصی "رواں دواں" بھی نظر آتی تھی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ وہ ہر طرح کی "مہمان نوازی" کے لیے تیار ہے صرف میرے اشارے کی ضرورت ہے۔ غالباً یہاں آنے والوں نے کم عمری میں ہی اسے خاصا تجربہ کار بنا رکھا تھا۔ میں نے جب اس کی طرف توجہ نہیں دی تو وہ کچھ حیران حیران سی واپس چلی گئی۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ جیلہ نور صاحبہ نے بنگلے پر وزٹ کیا۔ وہ ٹیکسی کار کے ذریعے بالکل اکیلی آئی تھیں۔ وہ غزالہ سے دیر تک تسلی تشفی کی باتیں کرتی رہیں۔ ان کی باتیں بے شک نرم ہوں لیکن لہجے میں تحکم کا عنصر موجود رہتا تھا۔ انہوں نے گھوم پھر کر بنگلے کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ گارڈز سے بھی گفتگو کی۔۔۔۔ شیخ عاصم کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اس کا ایک چھوٹا سا آپریشن ہوا ہے۔ اب وہ قدرے بہتر محسوس کررہا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جو کچھ بھی ہے جیلہ نور کے دل میں شوہر کی ہمدردی و خیر خواہی کسی نہ کسی درجے میں موجود ہے۔

جیلہ نور نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا۔ شام سے پہلے انہیں واپس چلے جانا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ آرام کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کی موجودگی میں خادمائیں اور خادم بے حد سہمے ہوئے رہتے تھے۔ ایک ہی آواز پر "لبیک" کہتے ہوئے لپک پڑتے تھے۔ نور صاحبہ آرام کرنے چلی گئیں تو میں بھی چھت پر چلا گیا۔ یہاں سائبان تلے بیٹھ کر

قرب وجوار کا نظارہ کرنا دلکش محسوس ہوتا تھا۔ چھت پر بیٹھے بیٹھے یک دم میں چونک گیا۔ میری نگاہ نیچے برآمدے میں گئی تھی۔ میں نے ایک سایہ سا لپک کر اندرونی حصے کی طرف جاتے دیکھا۔ نیلی قمیص کی بس ایک جھلک مجھے نظر آئی تھی۔ نیلی مردانہ قمیص کس نے پہن رکھی ہے؟ میں نے تیزی سے سوچا۔ گارڈز سمیت کسی نے نہیں پہن رکھی تھی پھر یہ کون تھا جو مشکوک انداز میں اندر گھسا تھا۔ سنسان دوپہر میں بنگلے کے در و دیوار کچھ اور بھی سنسان دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ایک طویل اور گرم بھائیں بھائیں کرتی دوپہر تھی۔ ایسی دوپہروں میں رات کا سناٹا اور خاموشی ہوتی ہے۔ گارڈز کے علاوہ قریباً سب مکین آرام کر رہے تھے۔ وہ کون تھا جو نیلی قمیص کی جھلک دکھا کر بنگلے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں چاروں طرف چکراتا رہا' کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دیا۔ اچانک میں ٹھٹک گیا۔ کہیں پاس سے باتوں کی مدھم آواز آئی تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں جمیلہ نور آرام کر رہی تھیں۔ میں نے لکڑی کے بھاری بھرکم دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں وہ نیلی قمیص والا نور صاحب کے کمرے میں ہی تو داخل نہیں ہوا۔ میں نے کمرے کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ لو اور گرمی سے بچاؤ کے لیے برآمدے اور کھڑکیوں پر چقیں لٹکائی گئی تھیں۔ ان کے سبب راہداری میں خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے ایک ایئرکنڈیشنر پر پاؤں رکھا اور روشن دان تک پہنچ گیا۔ روشن دان کافی وسیع تھا۔ میں روشن دان کے خلا میں نیم دراز ہو سکتا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی یہاں سے گزرتا بھی تو مجھے باآسانی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

روشن دان میں پہنچتے ہی مجھے اندر کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ اس کے علاوہ کمرے کے تین چوتھائی حصے کا منظر بھی واضح ہو گیا۔ جو کچھ میں نے کمرے میں دیکھا وہ میری بنیادیں ہلانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے بدنام زمانہ شنکر شکرا کو دیکھا۔ وہ نیلی قمیص اور سفید پتلون میں تھا اور کرسی پر بیٹھا تھا۔ جمیلہ نور بیڈ پر نیم دراز تھی اور بڑی محویت سے باتیں کر رہی تھی۔ دونوں کا ذریعۂ اظہار انگلش ہی تھا۔ جمیلہ نور کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور وہ ہمیشہ سے زیادہ بارعب نظر آ رہی تھی۔ زمانۂ قدیم کی کسی ملکہ کی طرح' زندگی اور موت کے فیصلے جاری کرنے والی اور اپنی انا کی خاطر خون کی ندیاں بہا دینے والی۔ وہ شنکر سے کہہ رہی تھی مطلب اس کو جلدی سے نمٹ کرو۔ آج ہی رات ختم کر دو۔"

شنکر بولا "نور صاحب! یہاں مجھے آپ سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ غزالہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ وہ بڑی ڈھیٹ قسم کی لڑکی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ آج ہی رات سب کچھ اگل دے۔ عین ممکن ہے کہ دو تین دن وقفے دے کر اس سے پوچھ گچھ کرنی پڑے۔ میرے خیال میں سختی بھی دوا کی طرح ہوتی ہے۔ روز مسلسل دی جائے تو اثر کم ہو جاتا ہے۔ اگر وقفے وقفے سے خوراک دی جائے تو وہ زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔"

جمیلہ بولی "مسٹر شنکر! مجھے لگتا ہے' تم لڑکی کو اوور اسٹیمیٹ کر رہے ہو۔ گرو دمین بنا رہے ہو اسے۔ مجھے نہیں لگتا وہ زیادہ سختی برداشت کر سکے گی۔"

"نور صاحب! آپ اس کے نرم نازک جسم اور ملائم چمڑی پر نہ جائیں۔ وہ اندر سے بالکل مختلف ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی میں اس کے تجربے سے گزر چکا ہوں' وہ آسانی سے ہتھیار پھینکنے والی نہیں۔"

"تمہارے خیال میں کتنا وقت درکار ہو گا تمہیں؟"

"میں تعین نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آج رات ہی کام ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چار پانچ روز لگ جائیں۔"

"دیکھو شیخ صاحب اب چار پانچ روز سے زیادہ اسپتال میں نہیں رہیں گے۔ دوسری طرف تم اس بدبخت شہزاد جہاں کا نام بھی بار بار لے رہے ہو۔ اگر وہ واقعی ابوظہبی پہنچ چکا ہے تو کسی بھی وقت تمہارے لیے شدید مشکل پیدا کر سکتا ہے۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ وہ بڑی عیاری اور تیز رفتاری سے کام کرتا ہے۔"

"لیکن اب مجھے اس کی طرف سے زیادہ فکر نہیں ہے۔ آپ اس لڑکی کو ایسی جگہ لے آئی ہیں جہاں سے بس اس کی آتما ہی پرواز کر سکے گی۔ اس سلسلے میں اب آپ بے فکر رہیں۔"

"مسٹر شنکر! دشمن کو کبھی بھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ تو ایک ایسا دشمن ہے جس کی صلاحیت کا تم خود بھی اعتراف کرتے ہو۔ میں نے بھی کئی لوگوں سے اس کے بارے میں سن رکھا ہے اور یہ اطلاعات کچھ ایسی اچھی نہیں ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ شخص غزالہ سے محبت کرتا رہا ہے۔ عشق کا بھوت اتنی جلدی تو سر سے نہیں اترا کرتا۔ اگر وہ اس بدبخت کے پیچھے یہاں پہنچا ہے تو پھر مزید آگے بھی آئے گا۔ بہتر ہے کہ تم بہت زیادہ وقت نہ لو اور جلدی قصہ تمام کرو۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا نور صاحب۔" شنکر کے

چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا کہ جمیلہ نور شنکر سے ملی ہوئی ہے۔ آڈیو ٹیپ میں شنکر نے جس گھر کے بھیدی کا ذکر کیا تھا وہ کوئی اور نہیں خود جمیلہ نور ہی تھی۔ وہ حفاظت کے بہانے غزالہ کو اس دور دراز مقام پر لے آئی تھی اور اب اسے شنکر کے رحم و کرم پر چھوڑ رہی تھی۔ اس مرحلے پر مجھے شک ہونے لگا کہ کہیں سلطانہ بھی تو جمیلہ نور سے ملی ہوئی نہیں لیکن سابق حالات و واقعات پر غور کیا تو مجھے یہ شک غلط محسوس ہونے لگا۔

شنکر کی آواز آئی "نور صاحب! گارڈز کا کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ان کو سنبھالنے میں تمہیں زیادہ وقت پیش نہیں آئے گی۔ ان کو رائفلوں میں استعمال کرنے کے لیے جو گولیاں دی گئی ہیں وہ نقلی ہیں۔ باقی رہی سلطانہ اور اس کا ساتھی اعجاز تو ان کے سلسلے میں بھی تمہیں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ ان دونوں کو کچن کے ساتھ والے کمرے میں بند کر دینا۔ وہیں پر پکاتے کھاتے رہیں گے اور تمہارے کھانے کا بندوبست بھی ہوتا رہے گا۔ سلطانہ کے ساتھی اعجاز کے پاس رائفل ہے اور اس میں گولیاں بھی اصل ہیں لیکن میں جاتے جاتے یہ رائفل اس سے لے جاؤں گی۔ وہ ایک تاجر پیشہ آدمی ہے' مار دھاڑ کرنے والا نہیں لگتا۔ اس پر بھی تم آسانی سے قابو پا لو گے' بلکہ سمجھو کر وہ اور سلطانہ تو قابو ہی قابو ہیں۔"

یہ میرا ذکر خیر ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی بے خبری بھی اسے کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔ جمیلہ نور ابھی دو منٹ پہلے "میرا" ذکر کر رہی تھی اور مجھے خطرناک ترین قرار دے کر شنکر کو مجھ سے ہوشیار رہنے کے مشورے دے رہی تھی۔ میں اعجاز ذبال کے روپ میں یہاں موجود تھا بلکہ جمیلہ نور خود اصرار کر کے مجھے یہاں لائی تھی اور مسلح بھی کیا تھا۔

کمرے میں ہونے والی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ جمیلہ نور ابھی تھوڑی دیر بعد بذریعہ ٹیکسی کار یہاں سے واپس جا رہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد شنکر اپنی کارروائی کا آغاز کرے گا۔ مکینوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دو مختلف کمروں میں بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد غزالہ' شنکر کے رحم و کرم پر ہو گی۔ جمیلہ نور' شنکر کے ہاتھوں غزالہ کو قتل کروا دینا چاہتی تھی۔ یقیناً اس دور اندیش عورت نے یہ بھانپ لیا تھا کہ غزالہ مستقبل قریب میں اس کے اقتدار و اختیار کے لیے خطرہ ثابت ہو گی لہٰذا وہ اس خطرے کو ابتدا میں ہی ختم کرنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف شنکر خود بھی مجھ سے عہد کر چکا تھا کہ وہ غزالہ کو اب جیتا نہیں چھوڑے گا۔ شنکر اب اس قتل کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ کمرے میں ہونے والی بات چیت سے مجھے معلوم ہوا کہ شنکر کے دو ساتھی بھی یہاں آئے ہیں۔ وہ قریبی درختوں میں موجود تھے۔

کمرے میں ہونے والی گفتگو اختتام کے قریب پہنچی تو میں نیچے چلا آیا۔ تاریک راہداری میں سکوت تھا۔ صرف ایئرکنڈیشنر کی مخصوص آواز سنائی دیتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ اپنا بریف کیس کھولا۔ بریف کیس میں اس رائفل کے قریباً ڈیڑھ سو راؤنڈ موجود تھے جو چار روز پہلے سلطانہ نے مجھے دی تھی۔ قریباً ۲۵ راؤنڈ رائفل کے میگزین میں بھی لگے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے ۵۰ کے قریب راؤنڈ نکال لیے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ گارڈز کے پاس جو دو رائفلیں ہیں ان میں یہ راؤنڈ استعمال ہو سکتے ہیں۔

میری توقع کے عین مطابق تھوڑی دیر بعد سلطانہ نے آ کر مجھے بتایا کہ جمیلہ نور صاحب مجھے یاد فرما رہی ہیں۔ میں جمیلہ نور کے پاس پہنچا۔ وہ حسب معمول شکستہ انگلش میں بولی "میں جا رہی ہوں۔ انشاء اللہ جمعرات کو پھر آؤں گی۔ آپ دونوں مجھ سے بڑا تعاون کر رہے ہیں اس کے لیے شکریہ۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ؟"

"نہیں۔ بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "آپ دونوں غزالہ کا دل لگائے رکھیں۔ کسی وقت اسے لے کر اِدھر اُدھر گھوم بھی لیا کریں۔ بہرحال ایسا کرتے ہوئے گارڈز کو ضرور ساتھ رکھیں۔ میں کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتی ہوں۔ شیخ صاحب بھی انشاء اللہ چار پانچ روز تک اسپتال سے آ جائیں گے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے چونکنے کی ایکٹنگ کی اور بولی "ہاں یاد آیا مسٹر اعجاز! وہ رائفل جو آپ کے پاس ہے مجھے دے دیں۔ اس کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو دوسری رائفل بھجوا دوں گی۔"

میں نے ایک بار پھر سعادت مندی سے سر ہلایا اور دل ہی دل میں اسے گالی دے کر رائفل لینے چلا گیا۔ میں نے رائفل مع ایمونیشن اسے واپس کر دی۔ مجھے امید تھی کہ راؤنڈز میں واقع ہونے والی کمی کا جمیلہ کو پتا نہیں چلے گا اگر پتا چل بھی جاتا تو میں لاعلمی کا اظہار کر سکتا تھا۔ ویسے بھی بنگلے

میں اور بنگلے سے باہر درختوں میں، میں نے دو تین بار ہوائی فائرنگ کی تھی۔ بہرحال خیریت گزری۔ جمیلہ نور نے ایمونیشن کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اشارے پر ملازم نے رائفل اور ایمونیشن بیگ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سلطانہ مجھے اطلاع دے رہی تھی کہ جمیلہ نور صاحبہ واپس شہر چلی گئی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب بہت جلد شنکر کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ گفتگو میں جمیلہ نے شنکر سے کہا تھا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر انتظار کرے۔ کم از کم اس وقت تک یہاں بنگلے میں کوئی کارروائی نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ (جمیلہ نور) اپنی رہائش گاہ پر پہنچ نہ جائے۔ یعنی وہ موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی کے بارے میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ جمیلہ نور کے جانے کے بعد شنکر زیادہ دیر انتظار کرے گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک بنگلے کے اندر ہی کہیں موجود تھا۔

میں چند منٹ تک بے قراری سے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ میں فوری طور پر خود کو مسلح کرلوں۔ مسلح ہونے کے لیے ضروری تھا کہ دونوں گارڈز میں سے کسی ایک کی رائفل میرے پاس آجاتی۔ سہ پہر کے پانچ بج چکے تھے۔ یہ دونوں گارڈز کے چائے پینے کا ٹائم تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ دونوں سرونٹ کوارٹر میں ہوں گے۔ میں کمرے سے نکلا اور کوارٹرز کی طرف بڑھا۔ راستے میں خوبرو ملازمہ راہین سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ وہ سلطانہ کی بچی کو اٹھائے لے جارہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بچی کو خاص انداز میں سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کے رخساروں کے بوسے لیے۔ راہین کی آنکھوں میں جیسے ہر وقت ایک مخملی بستر بچھا رہتا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا کوارٹرز کی طرف مڑ گیا۔ یہی وقت تھا جب اچانک خود کار رائفل کی تڑتڑ سے عمارت گونج اٹھی۔ بڑی تابڑ توڑ فائرنگ ہوئی تھی۔ دو برسٹ چلے۔ اس کے فوراً بعد ریوالور کے دو فائر سنائی دیے۔ کوئی چیخ کر بولا۔ میں دوڑتا ہوا کوارٹرز کی طرف گیا۔ فائرنگ اسی جانب سے ہوئی تھی۔ آتشیں ہتھیار تو میرے پاس کوئی تھا نہیں۔ میں نے پنڈلی سے اپنا خنجر کھینچ لیا تھا۔

کوارٹرز کے قریب ایک سیکنڈ کے لیے رک کر میں نے سن گن لی پھر دیوار کے ساتھ چپک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر اب خاموشی تھی۔ "شرافت!" میں نے سینئر گارڈ کو آواز دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ میرے عین سامنے شرافت کی لاش پڑی تھی۔ دو گولیاں اس کی پیشانی میں لگی تھیں۔ خون ابھی تک ٹپک رہا تھا، اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ میں نے شرافت کی طرف بڑھنا چاہا لیکن پھر مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ کوئی آس پاس موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر دیوار کی اوٹ سے کوارٹر کے صحن میں جھانکا۔ شرافت کی رائفل اس کے قریب پڑی تھی۔ یقیناً جو دو برسٹ مارے گئے تھے وہ اسی رائفل سے مارے گئے تھے۔ شواہد بتا رہے تھے کہ جمیلہ نور نے درست ہی کہا تھا۔ ان رائفلوں کا ایمونیشن اصلی نہیں تھا۔ اگر اصلی ہوتا تو شاید شرافت کی پیشانی پر دو سوراخ نظر نہ آتے اور اس کے قریب قہوے کی دو پیالیاں الٹی نہ پڑی ہوتیں۔ پیالیاں دو تھیں۔ دوسرا گارڈ کہاں تھا۔ یکایک میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کوارٹر کے چکنے فرش پر خون کی ایک لکیر دیکھی۔ یہ لکیر پھسلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی پھر فوراً دو تین پتلی لکیریں بھی اس چوڑی لکیر میں شامل ہو گئیں۔ یقیناً یہ خون کسی کے زخمی جسم سے بہہ رہا تھا۔ میں بے اختیار دروازے کی طرف بڑھا اور یہیں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میرا دشمن صحن میں اندر کی طرف دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خطرناک نزیل نور رائفل تھی۔ وہ شنکر تھا۔ وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا "خبردار شاہ جہاں! میں ٹریگر دبا دوں گا۔ آئی رئیلی مین اٹ۔"

اور میں جانتا تھا، وہ درست کہہ رہا ہے۔ میری زندگی اور موت کے درمیان شنکر کی انگلی کی ایک جنبش کا فاصلہ تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "اپنے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ لو۔" شنکر نے دوسرا حکم دیا۔

خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے خنجر نیچے فرش پر پھینکا اور ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لیے "اب دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔" شنکر کی زہری پھنکار ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے رخ دیوار کی طرف کیا اور اس وقت میری نگاہ دوسرے گارڈ پر پڑی۔ یہ ایک سوڈانی باشندہ تھا لیکن اب اس کا تعلق سوڈان سے تھا اور نہ کسی دوسرے ملک سے۔ وہ "عدم آباد" کا مکین ہو چکا تھا۔ جو خون میں نے ابھی چند لمحے پہلے دیکھا تھا وہ اسی بدنصیب گارڈ کے جسم سے خارج ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ پر تیز دھار آلے سے ایک گہرا زخم لگا تھا۔ یہ زخم اس کی ناف سے شروع ہو کر سینے تک چلا گیا تھا۔ انتڑیاں اس زخم میں سے جھانکنے لگی تھیں اور خون نے آس پاس کا فرش سرخ کر رکھا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے شنکر کے دونوں ساتھی بھی نمودار ہو گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ان منحوس صورتوں سے میں اچھی طرح آشنا تھا۔ یہ دونوں شنکر کے مستقل ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک فوراً کوارٹر کی چھت پر چڑھ گیا اور دوسرے نے بیرونی دروازے کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔ یقیناً انہیں خدشہ تھا کہ فائرنگ کی آواز کے بعد بنگلے کے مکین سرونٹ کوارٹرز کی طرف دوڑے آئیں گے لیکن یہ خدشہ باطل ثابت ہوا۔ کسی نے کوارٹرز کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی اور آتا بھی کون؟ بنگلے میں ایک ادھیڑ عمر ملازم کے سوا عورتیں ہی تھیں۔ یہ چار عورتیں تھیں۔ غزالہ، سلطانہ، خوبرو ملازمہ راہین اور ادھیڑ عمر بار رجن۔

رد عمل کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شنکر نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ ریوالور بدست باہر نکل گئے۔ ذرا دیر بعد مجھے بنگلے کے رہائشی حصے کی طرف سے چیخوں کی آواز آنے لگی۔ یقیناً خواتین ریوالور برداروں کو اپنے سر پر مسلط دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ سب سے بلند چیخیں ادھیڑ عمر بار رجن کی تھیں۔ وہ مقامی زبان میں نہ جانے کیا واویلا کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد یہ چیخیں دم توڑ گئیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، شنکر کے ساتھیوں نے عورتوں کو ڈرا دھمکا کر کامن روم میں بند کر دیا تھا اور ادھیڑ عمر ملازم کے سر پر ریوالور کے دستے رسید کیے تھے اور اسے نیم جاں کر کے پھینک دیا تھا۔ بنگلے کے مکینوں کو قابو کرنے کے بعد شنکر کے دونوں ساتھی واپس آگئے اور اس دوران میں شنکر نے مجھے قہرناک نظروں سے گھورنے اور بار بار فرش پر تھوکنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں اپنے خون کی "پیاس" میں جلی حروف میں پڑھ سکتا تھا۔ شنکر نے مجھے کوارٹر سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ گردن سے ہٹانے چاہے تو وہ چلا کر بولا "خبردار! جانی۔ میں اڑا ڈالوں گا تجھے۔ میں سوگند کھاتا ہوں۔"

میں نے ہاتھ دوبارہ گردن پر رکھ لیے۔ شنکر نے مجھے میرے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ جہاں کھڑکیوں میں آہنی گرلیں لگی تھیں اور جالیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف بھی تھا۔ مجھے بند رکھنے کے لیے بڑی محفوظ جگہ تھی۔ شنکر نے مجھے دیوار کی طرف رخ پھیر کر کھڑا ہونے کا حکم دیا پھر اپنے کارندے داسو سنگھ سے کہا کہ وہ میرے ہاتھ پشت پر اچھی طرح باندھ دے۔ داسو سنگھ موناسکھ تھا۔ یعنی وہ کلین شیو تھا اور پگڑی وغیرہ بھی نہیں باندھتا تھا۔ داسو سنگھ نے الماری سے ایک ٹائی نکالی اور میرے ہاتھ باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ مزاحمت کا خیال میرے ذہن میں آیا لیکن پھر فوراً ہی میں نے اسے رد کر دیا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ داسو کو ڈھال بنا کر شنکر کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا، یا داسو کو ویسے ہی شنکر کی طرف دھکیل دیتا لیکن میں جانتا تھا کہ شنکر میرے ساتھ ساتھ داسو کو بھی چھلنی کر دے گا۔ داسو کی اہمیت اس کے نزدیک چیونٹی سے زیادہ نہیں تھی اور بات صرف داسو ہی کی نہیں تھی، اپنے اکثر کارندوں کے بارے میں شنکر کے خیالات کچھ ایسے ہی ہوتے تھے۔ میرے علم کے مطابق صرف اور صرف ایک موہن داس تھا جس کی زندگی شنکر کے نزدیک اہم تھی اور شاید جسے وہ انسان سمجھتا تھا لیکن یہ موہن داس 'زریں گل' کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔

جب داسو سنگھ میرے ہاتھ باندھنے کے لیے قریب آیا، میرے ذہن میں کئی برس پرانا ایک منظر گھوم گیا۔ قریباً ایسی ہی چویشن تھی۔ بمبئی کے ایک قمار خانے میں ایک مشہور فلمی ولن کے بھائی کے ساتھ شنکر کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس کا نام اجے کمار تھا۔ شنکر نے اجے کمار کو ہینڈز اپ کرا دیا تھا پھر اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا کہ اجے کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔ اجے بے حد پھرتیلا جوان لڑکا تھا۔ جب شنکر کا ساتھی اس کے ہاتھ باندھنے کے لیے اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے اسے کندھے کی ٹکر سے شنکر پر جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ شنکر اپنے قریبی ساتھی پر گولی نہیں چلا سکے گا لیکن شنکر نے بڑے اطمینان سے دونوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ بعد میں درجنوں لوگوں اور چند پولیس والوں کی موجودگی میں اجے کی لاش پر اسپرٹ چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔

داسو سنگھ نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تو شنکر کہیں سے ایک ہتھکڑی "کف لاک" لے آیا۔ اس نے داسو سے کہہ کر میرے ہاتھ کھلوائے اور ٹائی کی جگہ میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے گئے۔ جب ہتھکڑی لگ گئی تو شنکر نے بنفس نفیس میری تلاشی لی۔ میری پتلون کی جیبوں میں رائفل کے قریباً نمیں راؤنڈ موجود تھے۔ وہ نکال لیے گئے۔ اس کے علاوہ بھی جیبیں بالکل خالی کر دی گئیں۔ اس کے بعد کمرے کی تلاشی شروع ہوئی۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی گئی جسے کسی بھی طرح ہتھیار یا آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ حتیٰ کہ سنگار میز کا بیضوی آئینہ بھی اتار لیا گیا۔

پوری طرح مطمئن ہوتے کے بعد شنکر اور اس کے

ساتھی دروازہ لاک کر کے باہر نکل گئے۔ اس دوران میں شنکر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا' یوں لگتا تھا کہ اشارہ بھی ہوا تو دھماکے سے پھٹ پڑے گا۔ اس شیطان ابن شیطان کو میں نے اکثر و بیشتر "سرد مزاج" ہی دیکھا تھا۔ اس کی وحشت اور درندگی ہمیشہ دھیمے پن اور ٹھہراؤ کی تہوں میں چھپی رہتی تھی۔ نہایت اشتعال انگیز موقعوں پر بھی اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں بے رنگ نظر آتی تھیں لیکن ان دنوں شنکر سے اپنے اندر کی آگ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ وہ سراپا آتش فشاں نظر آرہا تھا۔ برہمی اور جھنجلاہٹ کے مہیب طوفان اس کی آنکھوں میں صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ غالباً یہ تبدیلی جھوک ضامن میں موہن داس کی موت کے بعد واقع ہوئی تھی۔

شنکر کی وحشت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو ملیا میٹ کر رہا تھا۔ بند کمرے میں جمیلہ نور اور شنکر کے درمیان جس منصوبے پر بات ہوئی تھی اس کے مطابق دونوں گارڈز پر صرف قابو پایا جانا تھا لیکن شنکر نے ان دونوں کا قصہ ہی پاک کر ڈالا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میرے اور شنکر کے درمیان فیصلہ کن ٹکر ہونے والی ہے۔ برسوں سے جو "ڈیول" جاری تھا وہ شاید اختتام کو پہنچنے والا تھا یا کوئی ایسا رخ اختیار کرنے والا تھا جو اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔

رات دس بجے کے قریب شنکر کمرے میں وارد ہوا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں شراب کی سرخی تھی۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی ایک آنکھ کی بینائی میں قدرے فرق آچکا ہے یا شاید یہ نشے کی وجہ سے تھا۔ شراب کا گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ میں وہی کولٹ پستول تھا جو اس سے پہلے منگنی کی تقریب میں میری کنپٹی کو بوسہ دے چکا تھا۔ شنکر نے شراب کا گلاس تپائی پر رکھا اور بھرپور طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ اس کی یہ حرکت بالکل اچانک تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے اور نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔

وہ غرا کر بولا "آنکھیں نیچی رکھو جمالی! تم میری طرف اسی طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے رہو گے تو میں تمہیں وقت سے پہلے قتل کر بیٹھوں گا۔"

میں نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "تم مجھے دیکھنے سے منع نہیں کر سکتے۔ ہاں آنکھیں پھاڑنے والی بات پر میں غور کر سکتا ہوں۔"

اس نے بڑے وحشیانہ انداز میں اپنا سگریٹ میرے ہاتھ کی کلائی پر بجھا دیا۔ تکلیف کی شدت نے میری رگوں میں آگ بھر دی مگر میں نے "آہ" کو لبوں تک نہیں آنے دیا۔

شنکر مخمور آواز میں بولا "لوگ کہتے ہیں جمالی تکلیف کو آسانی سے جھیل لیتا ہے۔ میں لوگوں کی بات پر وشواس کرتے ہوئے تمہیں کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تمہیں ذہنی تکلیف پہنچاؤں گا اور مجھے وشواس ہے کہ تم میری کوشش کی داد دو گے۔"

میں نے کہا "شنکر! میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ ہماری دشمنی ختم ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ ہم دونوں کو یا ہم دونوں میں سے ایک کو اب مرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" اس نے زہرناک نظروں سے مجھے گھورا "میں نے جب سے تمہیں کھویا ہے' انگاروں پر لوٹتا رہا ہوں۔"

"کیا مطلب۔ میں سمجھا نہیں؟"

"میں لاطینی نہیں بول رہا۔ میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب تم اپنے دونوں دوستوں کی سندر پتنیوں سمیت میرے شکنجے میں تھے۔ تم نے اپنی بہن پیش کر کے اپنی جان بچالی تھی۔ افسوس اب ایسا کوئی آپشن نہیں ہے تمہارے پاس۔ مجھے تمہاری بہن سے کوئی دلچسپی نہیں جس سے دلچسپی ہے' وہ یہاں موجود ہے اور میرے بستر سے اتنی ہی دور ہے جتنا تمہارے نچلے ہونٹ سے اوپر والا ہونٹ لہٰذا مجھے دینے کے لیے تمہارے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ تم یہاں صرف اذیت برداشت کر سکتے ہو یا مر سکتے ہو۔"

اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور دھواں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولا "کتنی شبھ رات ہے یہ۔ میں نے جو چاہا تھا مجھے مل گیا۔ میرا بدترین دشمن ایک مکھی کی طرح میری مٹھی میں بھنبھنا رہا ہے اور اس کی محبوبہ کلی طور پر میرے رحم و کرم پر ہے۔ تم نے مجھے ایک عرصے سے شیطان کا لقب دے رکھا ہے۔ میرے خیال میں اب میری بڑی سے بڑی شیطانی پر بھی تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے۔"

یکلخت میرے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ شنکر نے اچانک جلتا ہوا سگریٹ پھر میری کلائی پر لگا دیا تھا اور یہ وہی جگہ تھی جہاں پہلے زخم آیا تھا۔ شنکر کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے مگر وہ لہجے میں بولا "مجھے لگتا ہے کہ میری باتیں سن کر تم خاصے راش ہوئے ہو۔ اذیت کے جس شکنجے میں تم کسے جانے والے ہو اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا تمہارے پاس۔ تمہاری بہن۔۔۔ جھجک تو تمہاری دور ہو ہی چکی تھی۔ پہلے کی طرح تم پھر اسے کہیں سے ڈھونڈ کر لے آتے اور اپنی جان بچا لیتے۔"

میں نے کہا "شنکر! یہ بات اپنے ذہن میں رکھ کہ تجھے ہر گالی کا حساب دینا پڑے گا اور میرے خیال میں یہ بات تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے تیری اور رنجیت عاصم کی شرط مانی تھی تو اپنی جان بچانے کے لیے نہیں مانی تھی' وہ اپنے جاں نثار دوستوں کے لیے ایک ایسا ایثار تھا جس کا مفہوم تیرے جیسے بدتخم کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا۔"

وہ نشے میں ڈوبی ہوئی دیوانی آواز میں بولا "میں جانتا ہوں۔ تو بہت بڑا ایثار پیشہ ہے۔ اب ایک ایثار اور کر۔ اپنے جیون کا آخری ایثار۔ میرے ہاتھوں سے مر جا۔ اور ایسے مر کہ میری تسلی ہو جائے۔ میرا من خوش ہو جائے۔"

"کیسے خوش ہوگا تیرا من؟"

"میں تجھے چیختے دیکھنا چاہتا ہوں جمالی! تڑپتے اور پھڑکتے ہوئے۔ دکھ اور درد کی انتہا سے گزرتے ہوئے۔ میں تجھے بہت۔۔۔ بہت ذلیل کر کے مارنا چاہتا ہوں جمالی۔ تجھ پر درندگی کی انتہا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں جانتا ہوں جمالی! یہ درست نہیں۔ یہ ایک بہادر دشمن کا کرتو یہ نہیں کہ اپنے ویرودھی (دشمن) کو باندھ کر اس طرح مارے۔۔۔ لیکن پیارے جمالی میں اپنے پاگل من کا کیا کروں۔ یہ کسی طور مانتا ہی نہیں۔ تو نے اپنے جیون میں جہاں اتنے ایثار کیے ہیں' ایک ایثار اور کر دے۔ میرے ہاتھوں میری مرضی کے مطابق میرے طریقے سے مر جا۔" شنکر کی آنکھوں میں جنون نظر آرہا تھا۔

اس نے تپائی پر رکھا ہوا وہسکی کا گلاس غٹاغٹ چڑھا لیا۔ کولٹ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے غافل نہیں ہوا تھا (حالانکہ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے)

گلاس خالی کر کے وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور کسی فلمی کردار کی طرح ٹانگیں پھیلا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا "میں جانتا ہوں جمالی! میں تمہارے ساتھ بہت برا کرنے جا رہا ہوں لیکن مجھے چھما کرنا یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں ہے۔ میرے ارادے کے ہاتھ بہت لمبے ہو چکے ہیں جمالی۔۔۔ اب حالات کی باگ ڈور انہوں نے خود تھام لی ہے۔" وہ کچھ دیر ساکت کھڑا رہا۔ جیسے اپنے بھیانک ارادوں پر خود ہی افسوس کر رہا ہو۔ تب وہ ٹیلی وژن کی طرف بڑھا اور اسے آن کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کوئی عربی "ٹاک شو" چل رہا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ہاں باہر جاتے ہوئے وہ دروازہ لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بیٹا میکس کی "ویڈیو فلم" تھی۔ یہ فلم موجودہ فلم سے قدرے چھوٹی اور مختصر دورانیے کی ہوتی ہے۔ اس نے وی سی پی میں ویڈیو فلم لگائی اور میرے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کولٹ پستول اور دوسرے میں ریموٹ کنٹرول تھا۔ فلم ری وائنڈ ہو کر چلنے لگی۔ جو منظر میری نگاہوں کے سامنے اسکرین پر ابھرا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ منظر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہی انسانیت سوز عریانی' وہی چیخ و پکار' وہی فریادیں اور وہی گھن گرج۔۔۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے رونما ہوا تھا۔ اب یہ منظر ٹی وی کی اسکرین پر تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ لاہور میں ڈیفنس کالونی کا وہی منحوس تہ خانہ تھا جہاں مجھے میرے دوستوں اور ان کی بیویوں سمیت پابہ زنجیر کیا گیا تھا اور ایک ناقابل قبول شرط کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ میں وہ سب کچھ کیسے بھول سکتا تھا اور جو منظر اس وقت ٹی وی اسکرین پر نظر آرہا تھا وہ تو تھا ہی ناقابل فراموش۔۔۔ یہ عالم قریشی کے ملازم نوازش کی بیوی کی آبروریزی کا منظر تھا۔ شنکر کے دو ساتھی کالی بھڑوں کی طرح اس عورت سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کی زہرناکی عورت کو پوری قوت سے چیخنے چلانے پر مجبور کر رہی تھی لیکن وہاں اس کی فریاد سننے والا کون تھا؟ اور جو سن رہے تھے وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس منظر میں شنکر کا "سیاہ چہرہ" مقتول ساتھی موہن داس بھی نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنگلی کبوتر کا خون اترا ہوا تھا اور چہرہ درندگی کی یورش سے مسخ تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ صرف چند روز بعد وہ دردناک طریقے سے قتل ہونے والا ہے' وہ ایک پاک دامن عورت کی عزت کو کھلونا بنائے ہوئے تھا۔ ایک منظر میں زرین گل اور میں بھی کرسیوں سے بندھے ہوئے نظر آئے۔ ان لمحوں کا تمام تر جان لیوا کرب پوری شدت سے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

شنکر بڑے پرسکون لہجے میں بولا "ہم وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ ایسا ہی منظر یہاں پھر دہرایا جانے والا ہے مگر اس مرتبہ اس منظر میں نوکرانی کے بجائے مالکن ہوگی۔ تمہارے دل کی مالکن۔۔۔ جسے تم بڑے پیار سے غزالو کہا کرتے ہو۔ میرے خیال میں اب تک تمہیں اندازہ ہو چکا ہوگا کہ اس منظر میں موہن داس کی جگہ کون لے گا۔ ہاں۔۔۔ تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ اس کی جگہ میں لوں گا۔۔۔ اور اس کے بعد۔" وہ مسکرایا "اس کے بعد تمہیں آگیا (اجازت) ہوگی کہ تم مجھے شیطان ابن شیطان یا جو بھی

چاہو کہہ سکو۔"

شنکر میرے کافی قریب موجود تھا۔ میں ٹانگ چلا کر اس کے ہاتھ پر ضرب لگا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ میں اس کے ہاتھ سے کولٹ پستول چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا۔ میرے ہاتھ بندھے تھے اور شنکر جیسے شخص کے ساتھ بندھے ہاتھوں سے مقابلہ کرنا ایسے ہی تھا' جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں ایک غیر مسلح شخص شارک سے مقابلہ کرے۔

میں اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ٹی وی پر نظر آنے والے مناظر ہولناک اور ابھرنے والی آوازیں لرزہ خیز تھیں۔ جس زنانے میں یہ شیطانی کھیل کھیلا گیا تھا وہاں وڈیو کیمرے نصب تھے اور شیخ عاصم دور بیٹھ کر بھی ہماری ہر ہر حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے وہم و گمان میں نہیں آئی تھی کہ ان شیطانی مناظر کو باقاعدہ ریکارڈ بھی کیا گیا ہو گا۔

فلم جیسے اچانک شروع ہوئی تھی' ایسے ہی ایک دم ختم ہو گئی۔ شنکر نے ریموٹ ایک طرف پھینکا۔ پستول کو بڑے انداز سے انگلی کے گرد گھمایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ نفرت اور اندرونی غیظ و غضب کی زیادتی سے بگڑا ہوا تھا۔ چند لمحے مجھے گھورنے کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ میں نے بے حد کرب کے عالم میں گزارے۔ مجھے خود پر بھی طیش آ رہا تھا۔ شاید اپنے بارے میں میرا یہ تجربہ درست تھا کہ شنکر کے مقابل میں غیر محسوس طور پر اعصاب زدگی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ دیکھا جاتا تو سرونٹ کوارٹر کے صحن میں داخل ہو کر میں نے فاش غلطی کی تھی اور غلطی کے نتیجے میں شنکر مجھے گن پوائنٹ پر رکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اچانک لرزہ خیز نسوانی چیخوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ ایک سے زیادہ عورتیں تھیں جو ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں پھر ان چیخوں کے ساتھ ساتھ مردانہ گھن گرج بھی سنائی دینے لگی۔ کہرام سا مچا ہوا تھا مگر یہ کہرام اس جگہ کے اندر ہی گونج کر ختم ہو رہا تھا اور بفرض محال یہ آوازیں باہر جاتیں بھی تو اس ویرانے میں انہیں سننے والا کون تھا۔ عمارت کے ارد گرد درجنوں ایکڑ اراضی پر صرف باغات اور جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ ابوظہبی کی سخت گیر پولیس اور امارات کا بے لچک قانون اس چار دیواری سے بہت دور تھا۔ یوں لگتا تھا کہ شنکر کے کارندے خواتین والے کمرے میں گھسے ہوئے ہیں اور کسی بات پر تکرار کر رہے ہیں۔

آوازیں دائیں جانب سے آ رہی تھیں۔ اس طرف ایک کشادہ کھڑکی تھی' تاہم کھڑکی کے پٹ بند تھے اور چٹخنیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹانگوں سے ایک میز دھکیل کر کھڑکی کے پاس کی پھر اس پر چڑھ کر دانتوں کی مدد سے ایک کھڑکی کی چٹخنی گرائی۔ باہر کی طرف آہنی جالی اور گرل تھی۔ یہ رکاوٹیں ایسی نہیں تھیں کہ میری نظر آر پار نہ جا سکتی۔ میری نظر آر پار گئی اور میں نے جو کچھ دیکھا وہ بے حد تشویش ناک تھا۔ کامن روم کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ یہی کمرا تھا جہاں خواتین کو بند کیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا شنکر اپنے مسلح کارندے کے ساتھ کامن روم میں موجود تھا اور خواتین سے گالم گلوچ کر رہا تھا۔ ادھیڑ عمر باورچن اور سلطانہ تیز آواز میں بول رہی تھیں۔ سلطانہ زیادہ بھری ہوئی تھی اور اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ شنکر مسلسل نفی میں سر ہلاتا چلا جا رہا تھا پھر اس نے سلطانہ کو ہاتھ سے دھکیل کر پیچھے کیا اور باہر نکل کر دروازے کو باہر سے لاک کر دیا۔ سلطانہ اور ادھیڑ عمر باورچن دروازہ پیٹتی رہ گئیں۔ غزالہ اور ملازمہ راحین بھی سراپا احتجاج نظر آ رہی تھیں۔ سلطانہ کی بچی گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔

شنکر کو کامن روم سے باہر نکلتے دیکھ کر میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور میز سے نیچے اتر آیا۔ شنکر کے جانے کے بعد خواتین کی احتجاجی آوازیں بھی دم توڑ گئیں۔

میں قریباً چوبیس گھنٹے بھوکا پیاسا اس کمرے میں بند رہا۔ کف لاک ناقابل شکست تھا اور کافی تنگ بھی تھا۔ میری ایک کلائی مسلسل رگڑ سے چھل گئی تھی۔ اس لاک سے الجھنا یا الجھنے کے بارے میں سوچنا لاحاصل تھا۔ شام آٹھ بجے کے لگ بھگ کمرے کا دروازہ کھلا اور شنکر کے سیاہ فام مسلح کارندے نے سلطانہ کو ایک ٹرے کے ساتھ اندر دھکیل دیا۔ سلطانہ اندر آ گئی تو دروازہ پھر لاک کر دیا گیا۔

ٹرے میں ابلے ہوئے چاول' گوشت کا سالن اور کوئی نامعلوم ترکاری تھی۔ سلطانہ میرے قریب بیٹھ گئی اور لقمے بنا بنا کر کھلانے لگی۔ وہ بے حد غمزدہ تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ کہنے لگی "شاہ جہاں صاحب! آخر وہی ہوا نا جس کا خطرہ تھا۔ آپ کا دشمن چال چل گیا۔"

"گھبراؤ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر مجھے کل والا واقعہ یاد آیا۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا "کل کیا بات ہوئی تھی؟"

وہ بولی "شنکر نے اپنے ساتھی کو کمرے کی اور ہماری تلاشی لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ہم نے کہا کہ تم کمرے کی تلاشی لے سکتے ہو لیکن ہماری تلاشی تم کیسے لے سکتے ہو۔ باورچن

انیسہ نے اس شخص کو دھکیل کر باہر نکالنا چاہا تو وہ بھڑک اٹھا اور شنکر کو بلا لایا۔ شنکر بھی بہت بدتمیزی سے بولا۔ تاہم اس نے تلاشی پر اصرار نہیں کیا۔"

میں نے کل دوپہر سے کھانا نہیں کھایا تھا اس کے باوجود بھوک نام کو نہیں تھی۔ سلطانہ کے اصرار پر میں نے چند لقمے لیے۔ سلطانہ بولی "سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ بدبخت شنکر یہاں پہنچا کیسے۔ جمیلہ نور صاحب کے اس ٹھکانے کا علم شاید ہی کسی کو ہو۔"

میں نے کہا "جمیلہ نور کو تو تھا نا؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ شنکر کو یہاں بلانے والی اور ہمیں اس کے جال میں پھنسانے والی جمیلہ نور ہی ہے۔ اس نے بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔"

سلطانہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ اسے میری بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے اور مختصر الفاظ میں سب کچھ اس کے گوش گزار کیا۔ وہ حیرت میں ڈوب ڈوب گئی۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ کل روانگی سے قبل جمیلہ نور نے مجھ سے رائفل کیوں واپس لے لی تھی؟

"اب کیا ہو گا؟" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"گھبرائیں مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"بہت ظالم ہیں یہ لوگ۔ شاید آپ کو پتا چل ہی گیا ہو۔ انہوں نے دونوں گارڈز کو جان سے مار ڈالا ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

وہ آبدیدہ ہو گئی "مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں شاہ جہاں صاحب۔ اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے جس کی فکر کرتی پھروں لیکن اپنی بچی کے لیے بہت پریشان ہوں۔ پتا نہیں یہ اولاد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ سوچتی ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا کیا ہو گا' یہ تو خود سے پانی بھی نہیں پی سکتی۔"

میں سلطانہ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا "آپ ان سب میں سے حوصلے والی ہیں۔ اگر آپ ہمت ہار جائیں گی تو ان کی ڈھارس بندھانے والا کون ہو گا۔"

سلطانہ نے کہا "مجھے تو اب ایک اور شک پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے گھر میں ملازمہ لڑکی زبیدہ نے خودکشی نہ کی ہو بلکہ جمیلہ نور نے اسے مارا ہو۔"

"مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ ایسا ہوا ہے۔" میں نے کہا "وہ لڑکی کسی طرح جمیلہ نور کی سازش سے آگاہ ہو گئی تھی۔"

اسی دوران میں دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ شنکر کا غلیظ صورت کارندہ اقتدار مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اندر آ گیا "بس۔ بھوجن کرا دیا ہے تو اب اٹھ جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر بالا سہتا کی طرح آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کرخت لہجے میں بولا۔

میرے اشارے پر سلطانہ نے برتن سمیٹے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

قریباً ایک گھنٹا خیریت سے گزرا پھر ایک دم چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں کل رات والی آوازوں سے مشابہ تھیں بلکہ ان میں کل سے بھی زیادہ شدت تھی۔ یکایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ کامن روم میں عورتیں حلق کی پوری قوت سے چیخ رہی تھیں اور مدد کے لیے پکار رہی تھیں۔ ان میں باورچن انیسہ کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے کل کی طرح میز کھسکا کر کھڑکی کے قریب کی اور دانتوں کی مدد سے ایک پٹ کھول دیا۔ کامن روم میں بھی میرے کمرے کی طرح ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ آج جو منظر میں نے دیکھا وہ بہت ہولناک تھا۔ شنکر کا کارندہ کامن روم میں موجود تھا۔ اس نے غزالہ کا بازو تھام رکھا تھا اور اسے دروازے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ غزالہ شدید مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی قمیص بازو سے پھٹ گئی تھی۔ دوپٹا گر گیا تھا اور بال بکھر گئے تھے۔ شنکر بھی کمرے میں موجود تھا اس کے ہاتھ میں کولٹ پستول نظر آ رہا تھا اور انگلی لبلبی پر تھی۔

سلطانہ اور ادھیڑ عمر باورچن غزالہ کو کارندے کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ملازمہ راحین بھی ان کوششوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ سلطانہ کی مزاحمت سب سے شدید تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے غزالہ کو تھام رکھا تھا اور کسی صورت اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ کبھی وہ التجائیہ لہجہ اختیار کر لیتی تھی' کبھی جارحانہ لہجہ اپناتی تھی۔ یہ قیامت خیز منظر کسی کے دل و دماغ کو بھی جھنجوڑ سکتا تھا' میں تو پھر وہ شخص تھا جس نے غزالہ کے سوا زندگی میں کچھ چاہا ہی نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے روبرو لہو کا پردہ سا تن گیا۔ مجھے لگا جیسے فیصلہ کن لمحہ آ گیا ہے۔ غزالہ کو بچانے کے لیے میں اپنی جان دے دوں گا یا شنکر کی جان لے لوں گا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ میں اس زنداں کے اندر سے شنکر کو کیا گزند پہنچا سکتا تھا۔ میں صرف گرج برس سکتا تھا اور غصے سے بے قابو ہو کر شنکر کو سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دے سکتا تھا اور میں نے یہ سب کچھ کیا۔ میرا خیال تھا کہ

شاید وہ غیرت کھائے گا اور جس طرح ایک مرتبہ پہلے وہ مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا' آج بھی ہو جائے گا لیکن لگتا تھا کہ وہ ماضی سے کافی سبق حاصل کر چکا ہے اور "غیرت مندی" کے نام پر کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ میری بلند بانگ اشتعال انگیزی پر اس نے کان نہیں دھرا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

سلطانہ اور غزالہ کی مزاحمت جب شدید ہوئی تو شنکر بھی اپنے کارندے کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے غزالہ کا بازو سلطانہ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ سلطانہ نے نہیں چھوڑا تو شنکر اس سے زور آزمائی کرنے لگا۔ سلطانہ کے معصوم خون نے جوش مارا۔ اس نے بھنا کر ایک طمانچہ شنکر کے رخسار پر جڑ دیا۔ بھرپور طمانچہ تھا' آواز دور تک گئی۔ شنکر ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس کی قہر ناک نظریں سلطانہ پر جم گئی تھیں پھر ایک بھونچال اس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ اس نے غزالہ کو تو دھکا دے کر دور پھینکا اور سلطانہ کو اندھا دھند کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ باورچن انیسہ اور غزالہ نے سلطانہ کو بچانے کی کوشش کی تو شنکر نے ان کے پاؤں میں فرش پر فائر کر دیا۔ دھماکے سے در و دیوار گونج اٹھے۔ تینوں عورتیں چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ شنکر سلطانہ کو کھینچ کر باہر لے گیا۔ اس کی بچی روتی بلکتی رہ گئی۔ میں نے شنکر کو کئی بار للکارا مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

وہ میری زندگی کی چند غمناک ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میرا جسم ٹکڑے ہو کر ہوا میں بکھر جائے۔ نہ میرا احساس باقی رہے اور نہ میں یہ سوچ سکوں کہ میں آج کی رات بے بسی کی انتہا کو چھو رہا ہوں۔ میرے لیے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ شنکر جس انداز میں سلطانہ کو کامن روم میں سے کھینچ کر لے گیا تھا' وہ انداز بہت بھیانک اور بہت واضح تھا۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے دڑبے میں ایک بے رحم ہاتھ داخل ہوا اور ایک مرغی کو کھینچ لے جائے۔ ہاں وہ رات میرے لیے بڑی اذیت ناک تھی' رہ رہ کر کامن روم کی طرف سے سلطانہ کی بچی کے رونے کی آواز آ جاتی تھی اور پھر ایک سسکی کے ساتھ رات کی تاریکی میں مدغم ہو جاتی تھی۔ رات کتنی بھی طویل ہو آخر اس کو کٹنا ہی ہوتا ہے۔ وہ رات بھی کٹ گئی۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ یوں لگا جیسے برآمدے میں پنکھے کے ساتھ کوئی کپڑا سا جھول رہا ہے۔ غور سے دیکھا تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ سلطانہ کی لاش تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے ادھڑ چکا تھا۔ چہرے پر تشدد کے نشانات تھے۔ دونوں بازو حسرت ناک انداز میں فرش کی طرف لٹک رہے تھے۔ (لاش کو الٹا لٹکایا گیا تھا)

یہ دلنشین مسکراہٹ والی وہی عورت تھی جس نے صرف آٹھ دس گھنٹے پہلے مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا تھا۔ جس کے ساتھ میں نے تسلی تشفی کی باتیں کی تھیں اور جس نے مجھے اپنی گفتگو سے حوصلہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ اذیت کا شکار ہو کر مر چکی تھی اور اس موت کو مرنے والی نے آگے بڑھ کر گلے لگایا تھا۔ اپنی عزیز دوست غزالہ کو بچانے کے لیے وہ شنکر اور غزالہ کے درمیان دیوار بن گئی تھی اور ایثار کی یادگار مثال قائم کی تھی۔ میں وہ منظر کیسے بھول سکتا تھا جب وہ جسم و جاں کی پوری قوت سے غزالہ کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی اور اس پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کر رہی تھی۔

میری آنکھیں خشک تھیں لیکن دل رو رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک بہت بڑا آبشار میرے اندر ہی اندر گر رہا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ آخر کمزور و بے بس عورت کے ساتھ کیوں تشدد کیا جاتا ہے۔ "تشدد کرنے والے" کی تمام اخلاقیات کہاں چلی جاتی ہیں۔ رحم' ترس' ہمدردی جیسے جذبات کہاں کھو جاتے ہیں اور پھر اپنے اندر کی تمام تر اچھائیوں کو قتل کرنے کے بعد وہ شخص حاصل کیا کرتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ایک روتی چیختی مزاحمت' خوف سے بگڑے ہوئے نقوش' سرد جسم اور عمر بھر کا پچھتاوا۔ یہ قبیح فعل جسے آبروریزی' عصمت دری اور "ریپ" جیسے گھناؤنے ناموں سے پکارا جاتا ہے' اکثر ایک گناہ بے لذت ہی ثابت ہوتا ہے اور اپنے فاعل کے چہرے پر ذلت اور نحوست کی کالک مل دیتا ہے۔

میں سوچتا رہا اور میرے ذہن میں غم و غصے کے آتش فشاں پھٹتے رہے۔ یہ کمرا میرے لیے آہنی پنجرے سے بڑھ کر مضبوط ثابت ہوا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں میں نے کمرے کا چپا چپا دیکھ لیا تھا۔ کمرے میں موجود ہر چیز کا بیسیوں مرتبہ معائنہ کیا تھا' کھڑکیوں اور دروازے پر زور آزمائی کی تھی مگر سب بے سود رہا تھا۔ ایک بار پھر اس سے ملتی جلتی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جو زینس کے تہ خانے میں پیش آئی تھی۔ ویسی ہی بے بسی و لاچاری' ویسی ہی سینہ شق کرنے والی اذیت۔

سلطانہ کی موت کا غم ایک قیامت کی طرح میرے سر پر ٹوٹا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ایک اس سے بھی بڑی قیامت

بہت جلد برپا ہونے والی ہے۔ اب یقیناً غزالہ کی باری تھی۔ آج دن میں یا رات کے آغاز میں کسی بھی وقت غزالہ' شنکر کے پنجۂ ہوس میں جکڑی جا سکتی تھی۔ آج تو سلطانہ بھی اسے بچانے کے لیے موجود نہیں تھی۔ یقینی طور پر غزالہ نے بھی اب تک چھت کے پنکھے سے لٹکی ہوئی سلطانہ کی لاش دیکھ لی تھی۔ پتا نہیں اس پر اور باقی دونوں عورتوں پر یہ منظر دیکھ کر کیا گزری تھی۔ مجھے یہ خدشہ بھی لاحق ہونے لگا کہ کہیں غزالہ اپنی جان لینے کی کوشش نہ کرے۔ موجودہ حالات میں مضبوط سے مضبوط اعصاب کی لڑکی بھی اس انداز میں سوچ سکتی تھی۔ بے چین ہو کر میں نے کھڑکی پوری کھولی اور غزالہ کو آوازیں دینے لگا "غزالہ! میری بات سنو۔ غزالہ کہاں ہو تم؟"

کامن روم کے اندر روشنی تھی لیکن چونکہ دن کا وقت تھا لہٰذا کامن روم کی جالی دار کھڑکیوں سے اندر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری دوسری تیسری آواز پر جالی دار کھڑکی کے سامنے ہیولا سا لہرایا اور پھر غزالہ کی صورت دکھائی دینے لگی۔ وہ جالی کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد تھا اور آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں غزالہ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں تیز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یہ سلطانہ کی چار سالہ بچی للی تھی۔ وہ جالی سے منہ لگا کر کھڑی ہو گئی اور ماں کی جھولتی ہوئی لاش دیکھ کر دہائی دینے لگی۔ غزالہ نے جلدی سے اس کا رخ پھیرا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ شنکر کے مسلح ساتھی نے کھڑکی کے پٹ مضبوطی سے بند کر دیے۔ کامن روم سے میرا رابطہ مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

آج مجھے ناشتا نہیں پہنچایا گیا۔ ناشتے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر سلطانہ کی لاش لٹک رہی تھی۔ ناشتا کرنا تو دور کی بات ہے مجھے تو سانس لینا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

دوپہر کے وقت سلطانہ کی لاش برآمدے میں سے ہٹا لی گئی تھی۔ سہ پہر ڈھائی تین بجے مجھے کھانا پہنچایا گیا۔ کھانا کھلانے کے لیے اس مرتبہ بنگلے کی ملازمہ راہین آئی تھی۔ وہ بڑی بھلی انگلش بول لیتی تھی۔ شاید شیخ عاصم کے مہمانوں کی "میزبانی" کر کر کے اسے یہ صلاحیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھ دی اور لرزتی کانپتی بیٹھ گئی۔ شنکر کا غنڈا صورت ساتھی اقتدار عرف قدری رائفل بدست دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے بھوک تو نام کو نہیں تھی۔ تاہم راہین سے باتیں کرنے کی غرض سے میں نے کھانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں دھیمے لہجے میں اس سے مختلف سوال پوچھتا رہا۔ وہ مختصر جواب دیتی رہی۔ اس نے بتایا کہ رات بھر ان میں سے کوئی نہیں سویا۔ للی' کو رات بھر تیز بخار رہا تھا اور وہ ماں کو پکارتی رہی تھی۔ شنکر کے دونوں غنڈے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ بار بار کے اصرار کے باوجود انہوں نے بچی کو پانی تک نہیں پلایا۔

شنکر کے ساتھی اقتدار نے راہین کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھا تو کڑک کر بولا "اے چھوکری! زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔ بس جلدی سے یار کو کھانا کھلا اور پھوٹ یہاں سے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے راہین کو ایک غلیظ گالی بھی دے ڈالی۔

یہ سب کچھ اردو میں کہا گیا تھا لہٰذا راہین کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ بہرحال وہ سمجھ گئی کہ اسے چپ رہنے کو کہا گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلی گئی۔ اقتدار اسے متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ راہین کے جانے کے بعد اقتدار نے ادھر ادھر دیکھا پھر دروازہ بند کر کے میرے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے درمیان تھی۔ سر نیم گنجا' آنکھوں اور پیشانی کی سلوٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک جہاندیدہ شخص ہے۔ اس نے جیب سے نہایت قیمتی برانڈ کا سگریٹ نکالا اور سلگا کر کش لینے لگا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہ رہا ہے۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک طویل کش کا دھواں فضا میں چھوڑ کر بولا "شاہ جہاں! تو ایک بدقسمت شخص ہے۔ تیری وجہ سے تیرے پورے خاندان پر مصیبتیں آئی ہیں۔ یہاں تک کہ اب تیری محبوبہ اور تیری اکلوتی بہن بھی بدترین حالات کا شکار ہیں۔ مجھے ایک فیصد امید بھی نہیں ہے کہ تیری محبوبہ کل کا سورج دیکھ سکے گی۔"

میں نے کہا' "تو شنکر کا پالتو ہے۔ امید تو نہیں کہ درست جواب دے گا پھر بھی میں تجھ سے اس ہمدردی کی وجہ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"سچ پوچھتا ہے تو مجھے تم دونوں پر ترس آ رہا ہے۔ تجھ پر بھی اور شیخ صاحب کی بیوی پر بھی۔"

"اب تو کہے گا کہ چونکہ تو مسلمان ہے اس لیے تیرے دل میں اپنے ہم مذہب کے لیے ہمدردی پیدا ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ؟"

"نہیں! میرے لیے یہ مذہب شذہب کوئی چیز نہیں۔ میں صرف ہندوستانی ہوں اور سیکولر ہوں۔ میں اگر تم پر رحم کھا رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ تم رحم کے قابل نظر آتے ہو۔ کسی وقت جب تم بمبئی میں مار دھاڑ کیا کرتے تھے' ہم تمہارے قصے سنتے تھے۔ اس وقت ہم تمہیں اپنا ہیرو سمجھتے تھے اور بہت سے ایسے ہیں جو اب بھی سمجھتے ہیں لیکن انہیں کیا معلوم کہ بمبئی کا وہ سرپھرا ہیرو آج ابوظہبی کے ایک باغ میں قید ہے۔ اس کی حیثیت اس چوہے کی سی ہے جس کی گردن کڑکی میں پھنسی ہوئی ہے اور دُم بے بسی سے ہل رہی ہے۔ وہ کسی بھی لمحے ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔"

"ترس کھانے کا بہت شکریہ۔"

اس نے دوسرا سگریٹ سلگا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور بولا "دل ایک بار جس کو ہیرو مان لیتا ہے وہ ہیرو ہی رہتا ہے' چاہے اس کا کتنا برا حال ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں جب میں سوچتا ہوں کہ تجھے شنکر صاحب کے ہاتھوں بری طرح ذلیل و خوار ہو کر مرنا پڑے گا تو دل میں چٹکی سی بھر جاتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کسی طرح تیری بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔" وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔

میں نے کہا "پھر کیا نتیجہ نکلا تمہاری سوچ کا؟"

وہ بولا "دیکھو شاہ جہاں! میں سمجھتا ہوں کہ تو اپنی زندگی کی آخری اور بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔ تیرے پاس ایک سنہری موقع ہے خود کو اور غزالہ کو بچانے کا۔ اگر تو اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائے گا تو بے وقوف کہلائے گا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"شنکر صاحب کو تجھ پر بہت غصہ ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ اگر تو ان سے تعاون کرے تو ان کا دل پسیج جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تجھے چھوڑ ہی دیں۔"

"کس تعاون کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی تعاون جو اس سے پہلے تم نے لاہور میں کیا تھا۔ تم نے شیخ عاصم صاحب کی شرط مان لی تھی اور شیخ صاحب کے بھتیجے سے اپنی بہن کے رشتے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس وقت صرف اور صرف غزالہ کی وجہ سے سارا کام بگڑ گیا تھا۔ میری معلومات غلط تو نہیں ہیں۔"

شنکر کے "پالتو" کے منہ سے شفتا اور شیخ کے بھتیجے کا ذکر سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اقتدار کو کڑی نظروں سے دیکھا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو شاہ جہاں! میں تیری برائی میں نہیں ہوں۔ دشمنیاں دو ہی طریقے سے ختم ہوا کرتی ہیں۔ یا تو ایک ایک کر کے سارے دشمن مر جاتے ہیں یا پھر مل بیٹھ کر دشمنی ختم کرنے کا کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس پر چل کر تو اپنی اور اپنے عزیزوں رشتے داروں کی زندگی محفوظ کر سکتا ہے اور اگر تو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچے تو یہ باعزت طریقہ ہے۔ خدانخواستہ تیری عزت پر تو ہاتھ نہیں ڈالا جا رہا۔ تیری بہن کو ایک اونچے گھرانے کی بہو بنایا جا رہا ہے۔ اس کا جیون ساتھی ایک پڑھا لکھا نوجوان شریف لڑکا ہے۔ تیری بہن کو وہ سب کچھ مل رہا ہے جس کی کوئی لڑکی تمنا کر سکتی ہے۔ یہ تیری بڑی بدقسمتی ہوگی اگر تو اس پیش کش سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔ ذرا سوچ' کچھ لینے کے لیے کچھ دینا تو پڑتا ہے۔ اپنے دل پر تھوڑا بہت جبر تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

میرے ہاتھ کھلے ہوتے یا اقتدار کے ہاتھ میں اسلحہ نہ ہوتا تو وہ زندہ بچ کر اس کمرے سے نہ نکلتا۔ مجھے بے تحاشا طیش آ رہا تھا اس شخص پر۔ وہ بظاہر میرا ہمدرد نظر آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ہمدرد نہیں ہے۔ وہ میری پرستاری کا دعویٰ کر رہا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اگر ابھی شنکر مجھے الٹا لٹکا دے اور میرے اس "پرستار" کے ہاتھ میں ہنٹر پکڑا دے تو وہ مار مار کر میری چمڑی ادھیڑ دے گا اور میرے ساتھ ہر وہ ظلم کر گزرے گا جو شنکر کرنے کے لیے کہے گا۔۔۔ در حقیقت یہ محض اس تھانے دار کے ماتحت کا کردار ادا کر رہا تھا جس نے کوئی شکار پھانس رکھا ہو اور خود اس سے سودا طے کرنا نہ چاہتا ہو۔ ایسے موقعوں پر اکثر کسی حوالدار یا اے ایس آئی کو آگے بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ "شکار" کو بڑے تھانے دار کے غیظ و غضب سے ڈرائے اور کسی مفاہمت تک لانے کی کوشش کرے۔

شنکر نے تین چار روز پہلے جب مجھے پکڑا تھا تو زور دے کر کہا تھا کہ اسے شفتا کی برآمدگی سے کوئی دلچسپی نہیں' وہ بہرصورت مجھے اور غزالہ کو "تسلی بخش" طریقے سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے خوف زدہ کرنے اور دھمکانے کا ایک انداز تھا۔ شنکر نے اپنے اس اعلان کے ذریعے مجھے باور کرایا تھا کہ میرے چاروں طرف موت کا گہرا اندھیرا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اب وہ اپنے ماتحت اقتدار احمد کے ذریعے مجھے اس اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھا رہا تھا۔ وہ مجھے اشارہ دے رہا تھا کہ اگر میں اپنی معصوم بہن کو قبیلے کی شرط کے مطابق شیخ ایاز سے بیاہ دوں تو میری جان بخشی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ اس بدبخت کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی ہزاروں جانیں شفتا کی ایک مسکراہٹ پر قربان کر سکتا ہوں۔۔۔ جہاں تک غزالہ کی بات

تھی' وہ بھی مجھے اسی طرح عزیز تھی۔۔۔ اس کی یہاں موجودگی میں میری کسی غلطی کو عمل دخل نہیں تھا پھر بھی میں اسے اپنی ذمے داری سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ تصور کرنا بھی سوہانِ روح تھا کہ میں اس بیڈ روم میں زندہ سلامت موجود ہوں اور کسی قریبی کمرے میں شنکر غزالہ کو تاراج کر دے یا اس کی جان لے لے۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ یہ نہیں ہونے دوں گا اور ایسا ہونا ہی ہے تو پھر یہ میری زندگی میں نہیں ہوگا۔

اقتدار کی باتیں سننے کے بعد میں نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا۔ میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ وہ فی الحال چلا جائے۔ میں اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔

وہ مجھے گھورتا رہا اور مایوسی میں سر ہلاتا رہا پھر ایک گہری سانس بھر کر وہ باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کامن روم کی طرف سے گھٹی گھٹی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں لپک کر کھڑکی تک پہنچا۔ کھڑکی میں سے اب کامن روم کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ کامن روم کی کھڑکیاں شنکر کے ساتھی نے بند کر دی تھیں۔ تاہم گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز صاف سنی جا سکتی تھیں۔ یقیناً یہ انہی خواتین کی آوازیں تھیں جو اس سے پہلے بھی دو مرتبہ پکار چکی تھیں۔ ان میں غزالہ بھی شامل تھی۔

مجھے یوں لگا کہ اب مارنے یا مر جانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ تخت یا تختہ والی بات تھی۔ کمرے کی تلاشی کے دوران میں شنکر کے کارندوں نے ہر وہ چیز ہٹا لی تھی جو کسی بھی طور ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتی تھی لیکن وہ ایک شے بھول گئے تھے۔ یہ شراب کی بڑے سائز کی ایک پرانی بوتل تھی۔ بوتل کا سائز چھوٹی صراحی سے تھوڑا ہی کم ہوگا۔ اس خالی بوتل میں مصنوعی پھول اور پتے خوب صورتی سے سجائے گئے تھے۔ میں اس بوتل کو توڑ کر "شیشے" کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔۔۔ گھٹی گھٹی چیخوں نے میرے دل و دماغ میں طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ میں نے بوتل میں سے پھول پتے نکالے اور اسے توڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر اس سے پہلے کہ میں بوتل کے ساتھ کچھ کرتا' ایک آواز نے میرے کان کھڑے کر دیے۔ یہ کسی جیپ کے انجن کی آواز تھی۔ یہ آواز بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ پچھلے چھ سات دنوں میں پہلی بار میں نے گاڑی کی آواز سنی تھی۔ گاڑی بنگلے کے عین سامنے بن کر رک گئی پھر بھاری بھرکم دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ دو تین منٹ بعد برآمدے کی جانب کسی کے بھاری قدموں کی صدا گونجی پھر ایک آواز نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ یہ شیخ عاصم کی آواز تھی۔ اس نے تھکی تھکی لیکن بات دار آواز میں بنگلے کے سیکورٹی گارڈ شرفت کو پکارا تھا لیکن شرفت یہاں نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ تو تین روز پہلے اپنے ساتھی سمیت راہی عدم ہو چکا تھا۔

عاصم شرفت کو پکارتا ہوا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا لیکن وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ پہلے سے کچھ دبلا ہو چکا تھا۔ وہ قدرے جھک کر چل رہا تھا اور ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھی۔ اس کے ساتھ جمیلہ نور کو دیکھ کر میری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

"کہاں مر گئے یہ سب۔" شیخ عاصم نے انگلش میں کہا۔

"پتا نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔" جمیلہ نور انجان بن کر بولی۔ اچانک کامن روم کی طرف سے اقتدار عرف قدری برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ شیخ عاصم کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکا۔ شیخ عاصم بھی چونک گیا۔ اقتدار جلدی سے دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

"یہ یہاں کیسے؟" شیخ عاصم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اچانک کامن روم کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور شنکر نمودار ہوا۔ رائفل بدست اقتدار احمد اس کے پیچھے تھا۔ شنکر کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ عاصم کا وجود غصے اور حیرت سے لرزنے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" جمیلہ نور نے کڑک کر پوچھا۔

"میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔" شنکر نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک ٹانگ پر وزن ڈالے کھڑا تھا۔

"غزالہ کہاں ہے؟" شیخ عاصم نے گرج کر پوچھا۔

"اندر کامن روم میں۔" شنکر نے جواب دیا۔

شیخ عاصم اسٹک کے سہارے چلتا کامن روم کی طرف بڑھا۔ شنکر نے اپنا بازو سیدھا کر کے شیخ کا راستہ روک لیا "کہاں چلے بڑے میاں! یہ شارع عام نہیں ہے۔"

شیخ عاصم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن شنکر نے دھکیل کر اسے دور ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اقتدار نے بھی اپنی رائفل شیخ عاصم کی طرف سیدھی کر لی۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے۔ کیا کر رہے ہو تم؟" جمیلہ نور نے بلند آواز میں کہا۔

وہ بھرپور اداکاری کر رہی تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ فساد کی اصل جڑ یہی ہے۔ یہی ہے جو غزالہ کو سازش کے تحت یہاں لائی ہے اور اسے ورنہ

صفت شنکر کے حوالے کیا ہے۔

شنکر نے جمیلہ نور کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم چپ رہو میڈم۔ یہ مردوں کی باتیں ہیں۔"

شیخ عاصم کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ یقیناً اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ غزالہ مصیبت میں ہے۔ وہ شنکر کی طرف انگلی اٹھا کر لرزاں آواز میں بولا "دیکھو شنکر! اگر میری بیوی کو کچھ ہوا تو میں تمہارا حشر کر ڈالوں گا۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے؟"

"مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانے گا شیخ عاصم۔ تم اس صدی کے سب سے بڑے زن مُرید ہو۔ اپنی چہیتی کے اشارے پر تم نے اپنے اس ساتھی کو دھتکار کر الگ کر دیا جس نے قدم قدم پر تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی اور بدترین دشمنیاں مول لیں۔"

شیخ چنگھاڑا "کون کہتا ہے کہ تم میرے ساتھی تھے۔ تم ملازم تھے میرے۔ میں تم سے کام لیتا تھا تو منہ مانگا معاوضہ دیتا تھا تمہیں۔۔۔ اس سے دس گنا کم معاوضے پر میں کسی بھی بڑے سے بڑے طرم خان کو ملازم رکھ سکتا تھا۔۔۔ اور یاد رکھو' ملازم ساری زندگی کے لیے نہیں ہوتا' اس کی ملازمت کام سے منسوب ہوتی ہے' جب کام نہیں ہوتا' اسے فارغ کر دیا جاتا ہے۔"

شنکر نے ایک بہت گہری سانس لی۔ اس کے باریک ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ غروب ہوتے سورج کی روشنی برآمدے میں پہنچ رہی تھی۔ اس روشنی میں شنکر کی آنکھوں کے اردگرد موجود زخم گھناؤنے نظر آ رہے تھے۔ وہ اطمینان سے بولا "ٹھیک ہے میں فارغ شدہ ملازم ہی سہی۔ اب یہ فارغ شدہ ملازم تمہاری چہیتی بیوی کو عزت اور زندگی سے فارغ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تم سے جو ہو سکتا ہے وہ کر لو۔"

شیخ عاصم غصے سے دیوانہ ہو کر شنکر کی طرف بڑھا۔ اقتدار نے آگے بڑھ کر رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی اور دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جمیلہ نور چھاچھا کُٹنی کا کردار ادا کرنے لگی۔ اقتدار کو کوسنے لگی اور واویلا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں شنکر کا دوسرا ساتھی راسو بھی رائفل ہاتھ میں لیے پہنچ گیا۔ اس کے تیور اقتدار سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

میں خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جمیلہ نور شنکر کو نہایت سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ شیخ عاصم پر رائفل اٹھا کر اس نے اپنے لیے امارات کی زمین تنگ کر لی ہے۔ مجھے معلوم تھا یہ ساری "مصنوعی" دھمکیاں ہیں۔ اسی دوران میں اچانک کامن روم کی برآمدے کے رخ والی کھڑکی کھلی۔ میں نے غزالہ کو دیکھا۔ اس کی قمیص کندھے سے ادھڑی ہوئی تھی اور بال منتشر تھے۔ وہ بڑے ضبط والی تھی لیکن اس وقت رو رہی تھی اور بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اس کی آواز میں فریاد تھی اور مدد کی درخواست تھی۔ اس آواز نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ شیخ عاصم نے غزالہ کو اس حال میں دیکھا تو بے اختیار آگے بڑھا۔ اقتدار نے ایک بار پھر رائفل اس کے سینے سے لگا دی لیکن اس مرتبہ شیخ عاصم بہت بپھرا ہوا تھا۔ وہ اقتدار کو دھکیلتا ہوا برآمدے کے اندرونی دروازے پر لے گیا۔ اقتدار اردو میں سنگین دھمکیاں دے رہا تھا "میں نرگیر و با دوں گا رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

یقیناً یہ الفاظ شیخ کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن اگر آتے بھی تو شاید وہ رکتا نہیں۔ دونوں الجھتے ہوئے برآمدے میں پہنچے پھر ایک دم شیخ اقتدار کو دھکیل کر کامن روم کی طرف بڑھا۔ ان لمحوں میں وہ یقیناً اپنی کمر کا درد بھی بھول چکا تھا۔ اس کے انداز میں صحت مندوں کی سی پھرتی تھی۔ اقتدار نے بھنا کر رائفل شیخ کی طرف سیدھی کر لی۔ شیخ عاصم کی پشت گولیوں کی زد میں تھی۔

"مار دو سالے کو۔" شنکر کی نہایت زہریلی پھنکار سنائی دی۔

کوئی لمحہ جاتا کہ درجنوں گولیاں شیخ کی پشت میں پیوست ہونے والی تھیں۔ جمیلہ نور دوڑ کر اقتدار سے لپٹ گئی۔ اس نے رائفل کی نال اوپر اٹھا دی تھی۔ وہ ایک لمبی تڑنگی عورت تھی اور خاصی زور آور بھی۔ وہ اقتدار سے الجھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ چیخ رہی تھی "شنکر! اسے روکو۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اسے روکو۔"

اس مرتبہ جمیلہ نور کا لہجہ مصنوعی نہیں تھا۔ شوہر کی جان خطرے میں دیکھ کر اس کی سازش کا تانا بانا ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنے پالتو کتے کو پٹا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کتا اب بپھر چکا تھا۔ وہ مالکن کے قابو میں بھی نہیں رہا تھا "شنکر اسے روکو۔ شیخ صاحب کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" جمیلہ نور پھر چیخی۔ شنکر کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اقتدار وحشت کے عالم میں جمیلہ نور کو گھسیٹتا ہوا کامن روم کے دروازے تک لے گیا۔ اقتدار کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ کامن روم میں پہنچ کر ایک ساعت کی دیر نہیں کرے گا اور شیخ کو چھلنی کر ڈالے گا۔

جمیلہ نور اور اقتدار کی زبردست کشمکش میں اچانک رائفل چل گئی۔ برسٹ کی صورت میں پانچ چھ فائر ہوئے۔ گولیاں اقتدار کی ٹھوڑی سے نیچے داخل ہوئی تھیں اور پچھلے حصے کو پھاڑ کر نکل گئی تھیں۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح فرش پر گرا۔ رائفل جمیلہ نور کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔ یہی وقت تھا جب کولٹ پستول کے تین فائر ہوئے۔ یہ فائر شنکر نے کیے تھے۔ ان کے خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک گولی جمیلہ نور کے چہرے پر لگی' دوسری گردن چیر گئی' وہ کراہ کر پہلو کے بل برآمدے کے فرش پر گری۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور پھسل گئی۔ یہ تمام واقعہ آٹھ دس سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا تھا۔

رائفل جمیلہ نور کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد کامن روم کے دروازے سے ٹکرائی تھی۔ یہی وقت تھا جب شیخ عاصم فائرنگ کی لرزہ خیز آواز سن کر واپس پلٹا تھا۔ اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور فوراً رائفل اٹھا لی۔ شنکر نے بلادریغ اس پر بھی گولی چلائی مگر اس مرتبہ کولٹ پستول سے صرف "ٹھک ٹھک" کی آواز برآمد ہو کر رہ گئی۔ شنکر کے پستول میں گولی نہیں تھی۔ یہ اتفاق شیخ کی اور شاید ہم سب کی زندگی کا ضامن بن گیا۔ شیخ کو جو دو تین سیکنڈ کی مہلت ملی اس میں شیخ نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس کا رخ شنکر کے سینے کی طرف کر دیا۔ شنکر بے بسی سے جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

برآمدے کے فرش پر دو خونچکاں لاشیں پڑی تھیں۔ یہ اقتدار اور جمیلہ نور کی لاشیں تھیں۔ پچھلے دو تین منٹ میں جمیلہ نور نے ایک یکسر مختلف کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب اس نے دیکھا تھا کہ "نئی سوتن" کے ساتھ ساتھ اس کے شوہر کی زندگی بھی شدید خطرے میں ہے تو اس نے شوہر کو بچانے کی اندھا دھند کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اپنی جان ہار گئی تھی۔ یقیناً وہ مختلف عورت تھی۔

جمیلہ نور کی لاش دیکھنے کے بعد عاصم کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ گھنی مونچھوں تلے اس کے ہونٹ نیلے نظر آنے لگے تھے اور جسم کانپتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شنکر کو AT THE SPOT گولی سے اڑا دے گا یا پھر خود اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ کامن روم میں موجود عورتیں اب چیختی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ ان میں سب سے آگے باورچن انیسہ تھی۔ اچانک میرا دھیان شنکر کے دوسرے ساتھی واسو سنگھ کی طرف گیا۔ وہ کہاں تھا؟

میں نے اس کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا اور میری نگاہ برآمدے کی پتھریلی سیڑھیوں پر جم کر رہ گئی۔ واسو سنگھ وہاں اوندھا پڑا تھا۔ رائفل اس کے جسم تلے دبی ہوئی تھی۔ صرف رائفل کی سیاہ نال ہی نظر آ رہی تھی۔۔۔ جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا جمیلہ نور اور اقتدار کی زور آزمائی کے دوران میں چلنے والی گولیاں ہی واسو سنگھ کے شدید زخمی ہونے کا سبب بنی تھیں۔ یہ تجربے کی بات ہے کہ بند جگہ پر اندھا دھند چلنے والی گولیاں اکثر کونوں و چکنی سطحوں پر ٹکرا کر "سلپ" ہوتی ہیں اور غیر متعلقہ لوگوں کے لیے خطرے کا باعث بنتی ہیں۔ اس واقعے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ برسٹ کی ایک گولی گول پتھریلے ستون سے "منعکس" ہوئی تھی اور واسو کی گردن میں پیوست ہو گئی تھی۔

اس واقعے کا پتا تب چلا جب ہنگامہ اختتام کو پہنچ گیا۔

"شنکر! اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" شیخ نے غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

شنکر نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ کے قدموں میں اس کی بیوی کی لاش پڑی ہے اور اس کا دماغ آتش فشاں بنا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور رائفل تھی اور اس کی انگلی کی ایک جنبش شنکر کی تمام ذہانت' عیاری اور پھرتی کی ارتھی نکال سکتی تھی۔

غزالہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "شاہ جہاں بھی یہاں ہیں۔"

"کہاں ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔" میں نے کھڑکی کی جالی سے لگتے ہوئے کہا "کمرے کا دروازہ لاک ہے۔"

"چابی کہاں ہے؟" شیخ نے غزالہ سے پوچھا۔

باورچن انیسہ نے عربی میں کچھ کہا اور اقتدار کی خونچکاں لاش کی طرف بڑھی۔ اس کی پتلون کی جیب ٹٹول کر اس نے چابیوں کا گچھا نکال لیا پھر وہ بڑی پھرتی سے میرے کمرے کی طرف آئی اور دروازہ کھول دیا۔ قریباً ۱۰ سیکنڈ بعد میں اس منحوس کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں پہنچا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے "کی رنگ" میں ایک چابی ہتھکڑی کی بھی تھی۔ غزالہ اور انیسہ نے مل کر میری ہتھکڑی کھولی۔ انیسہ' غزالہ' ملازمہ راہین اور بچی "گلال" سب رو رہی تھیں اور فرش پر پڑی ہوئی جمیلہ نور کی لاش سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف گیا۔ یہاں راسو شدید زخمی حالت میں اوندھا پڑا تھا۔ رائفل اس کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے جونہی اس کے نیچے سے رائفل کھینچنا چاہی' اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زور

سے کرایا۔ سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شنکر جیسے شاطر کے لیے یہ ایک لمحے کی مہلت کافی تھی۔ وہ زیتون کے پودوں کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جست لگائی اور چھلاوے کی طرح اوجھل ہو گیا۔ شیخ عاصم کی انگلی بے اختیار لبلبی پر دب گئی۔ تڑتڑ کی آواز سے درودیوار گونج۔ راحین کی خوف زدہ چیخ ابھری لیکن یہ سب بے سود تھا۔ شنکر صاف بچ گیا تھا۔ میں نے نیم مردہ واسو کے نیچے سے رائفل کھینچی اور اسے کاک کرتے ہوئے شنکر کے پیچھے بھاگا۔ بنگلے کے چاروں طرف باغ تھے اور جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور روشنی کی جگہ نیم تاریکی لے رہی تھی۔ یہ صورتِ حال شنکر کے لیے بڑی سازگار تھی۔ وہ "پارا صفت" بڑی آسانی سے روپوش ہو سکتا تھا۔ میں نے درختوں اور جھاڑیوں میں تھوڑی دیر شنکر کو ڈھونڈا پھر واپس آ گیا۔ میں کسی اندھے وار کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ شنکر جیسے شخص کے لیے گھات لگا کر حملہ کرنا بہت آسان تھا بلکہ اس حوالے سے وہ ماہر تصور کیا جا سکتا تھا۔

میں واپس آیا تو جمیلہ نور کی خونچکاں لاش کو اٹھا کر ایک بیڈ پر رکھا جا چکا تھا۔ شیخ عاصم، غزالہ اور انیسہ کے کپڑے خون میں تربتر نظر آ رہے تھے۔ یہ جمیلہ نور کا خون تھا۔ افتخار کی لاش اسی طرح برآمدے کے فرش پر پڑی تھی۔ اس پر بستر کی چادر ڈال دی گئی تھی۔ زخمی واسو سنگھ اب مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کی گردن سے خون رستا جا رہا تھا۔ میں نے اس کا خون بند کرنے کے لیے راحین کے سوتی حجاب سے پٹی پھاڑ کر گلے پر باندھ دی۔

میں نے کہا "شیخ عاصم! تمہاری ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھا کر شنکر نکل بھاگا ہے اور تم جانتے ہی ہو وہ کتنا خطرناک ہے۔ میرے خیال میں اب ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہیے۔"

شیخ عاصم کا قبائلی خون اب جوش مارنے لگا تھا۔ وہ بولا "یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم کسی کے ڈر سے اپنا گھر چھوڑ کر کیوں بھاگیں۔ ہم یہیں رہیں گے۔ میں ابھی فون کر کے پولیس کو طلب کر لیتا ہوں۔"

وہ کامن روم کی طرف بڑھا۔

"لیکن فون تو خراب ہے۔" غزالہ نے کہا "شنکر کے غنڈوں نے تار کاٹ ڈالے ہیں اور فون سیٹ توڑ دیا ہے۔"

شیخ عاصم نے باورچن انیسہ سے پوچھا کہ دونوں کار ڈرائیور کدھر ہیں۔ انیسہ کے رونے میں تیزی آ گئی۔ اس کی جگہ غزالہ نے جواب دیتے ہوئے کہا "عاصم! ان دونوں کو شنکر نے قتل کر ڈالا۔"

عاصم کے ہونٹ تشویش ناک انداز میں سکڑ گئے

"خانساماں کدھر ہے؟" شیخ عاصم نے پوچھا۔

"اس کا کچھ پتا نہیں۔" غزالہ نے جواب دیا۔

شیخ عاصم کے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں تھیں۔ وہ بیماری کے سبب کمزور ہو گیا تھا لیکن یہاں تھوڑی دیر پہلے جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے سبب عاصم کے جسم میں شاید اضافی توانائی عود کر آئی تھی۔ رائفل بدستور عاصم کے ہاتھ میں تھی اور چہرہ اندرونی غیظ و غضب سے تمتما رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی لاش دیکھ چکا تھا اور یہ نظارہ اس کے لیے یقیناً عذاب ناک ثابت ہوا تھا۔

اس نے قمیص کی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا "یہاں سے تین چار کلو میٹر شہر کی طرف ہائی وے پر فلنگ پمپ ہے۔ وہاں سے پولیس کو فون کرو۔ فون نمبر اس کارڈ پر موجود ہے 'میرا حوالہ بھی دے دینا۔ بتانا کہ واردات میرے روباط والے بنگلے میں ہوئی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی عاصم نے اپنی "ہیڈ نورڈ" جیپ کی چابی میری طرف اچھال دی۔

میرا خیال تھا کہ اگر پولیس کو فون ہی کرنا ہے تو پھر میرے بجائے عاصم خود جائے لیکن وہ اٹل لہجے میں مجھے جانے کا کہہ رہا تھا۔ رات کی تاریکی گہری ہو رہی تھی اور مجھے شنکر کی طرف سے اندیشہ تھا۔ اس کے دو ساتھی اس جھڑپ میں شدید نقصان اٹھا چکے تھے۔ ایک جہنم واصل ہو چکا تھا اور دوسرا شدید زخمی تھا۔ یقیناً شنکر کی حالت زخمی درندے کی سی تھی۔ وہ غضب ناک ہو کر کچھ بھی کر سکتا تھا مگر عاصم کے منہ سے نکلی ہوئی بات پتھر پر لکیر تھی۔ میں چابی لے کر "جیپ" کی طرف بڑھا۔ رائفل ابھی تک میرے پاس تھی۔ وہ میں نے جیپ میں رکھ لی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیپ فراٹے بھرتی ہوئی فلنگ اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے اور ذہن خیالوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ پچھلا ایک گھنٹا کس قدر سنگین واقعات کی نذر ہوا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق (جو بعد ازاں درست ثابت ہوا) شیخ عاصم تک روز بروز بگڑتے ہوئے حالات کی خبر پہنچ رہی تھی اور وہ چھٹی سے پہلے ہی اسپتال چھوڑ کر گھر آ گیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ شنکر اور اس کے عزیز و اقارب غزالہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے گھر میں ہی غزالہ کا جانی دشمن پیدا ہو جائے گا۔ اس کی بڑی اور سب سے قابلِ اعتماد بیوی جمیلہ نور تھی۔ اسپتال سے گھر آ کر شیخ نے جمیلہ سے غزالہ کے بارے میں

پوچھا ہو گا۔ جمیلہ نور دل میں تو سخت پریشان ہوئی ہو گی کیونکہ وہ غزالہ کو ایک جان لیوا سازش کے پنجوں میں چھوڑ آئی تھی۔ بظاہر اس نے پُرسکون رہنے کی کوشش کی ہو گی اور شیخ کو بتایا ہو گا کہ غزالہ حفاظت کی غرض سے روباط نامی مضافاتی بنگلے میں ٹھہرا دی گئی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے سامنے تھا۔ شیخ اور جمیلہ نور بنگلے میں پہنچے۔ وہاں شیخ عاصم کا استقبال اس کے پرانے گارڈز اور ملازموں کے بجائے شنکر کے شکروں نے کیا تھا۔

فلنگ اسٹیشن پہنچنے اور پولیس کو فون کرنے میں مجھے تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔ رات ہو چکی تھی لیکن گرمی کی شدت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جس پولیس آفیسر سے بات ہوئی وہ شیخ عاصم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ خبر سن کر کہ شیخ کی بیوی کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔

فون سے فارغ ہو کر میں فوراً بذریعہ جیپ واپس بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلطانہ کی موت کا دکھ ابھی تک کسی پہاڑ کی طرح میرے سینے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شیطان ابنِ شیطان شنکر نے اسے بے آبرو کر کے موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا اور یہ وہی سلطانہ تھی جس نے غزالہ کی دوست ہونے کے ناتے یہاں ابوظہبی میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ میں اس کے بے لوث تعاون کو کیسے بھول سکتا تھا۔ ان آڈیو ٹیپس کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو سلطانہ نے زندگی خطرے میں ڈال کر حاصل کی تھیں اور جن کی مدد سے مجھے شنکر کے ارادوں کا علم ہوا تھا پھر جس طرح کل رات اس نے غزالہ کو بچانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا وہ ایک یادگار واقعہ تھا۔ مجھے لگا جیسے ساحل کے ساتھ ساتھ جانے والی اس خاموش سڑک پر سلطانہ کی روح بھٹک رہی ہے اور اپنے لہو کا حساب مانگ رہی ہے۔ گھٹی گھٹی چیخیں، سسکیاں اور زندگی کی آخری ہچکیاں آہ۔ کبھی کبھی کتنا بے بس ہو جاتا ہے انسان۔ میرے دماغ میں انگارے سے بھرنے لگے۔

میں تیزی سے بنگلے کی طرف محوِ سفر تھا۔ پانچ دس منٹ میں جیپ باغ میں داخل ہوئی اور وسیع احاطے کو پار کر کے بنگلے میں پہنچ گئی۔ رات ہوتے ہی چاند نمودار ہو گیا تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی ماحول کی تیرگی سے نبرد آزما تھی۔ بنگلے میں اکثر بتیاں روشن تھیں۔ فلنگ اسٹیشن سے مجھے فرسٹ ایڈ کا سامان مل گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ شنکر کے جاں بہ لب ساتھی واسو سنگھ کا خون روکنے کی کوشش کی جائے۔ خون کے اخراج کے سبب کسی بھی وقت اس کی جان جا سکتی تھی۔ میں جیپ سے اترا تو دور ہی سے مجھے واسو کا نیم جاں لاشہ نظر آ گیا۔ پہلے وہ سیڑھیوں پر پڑا تھا۔ اب برآمدے میں تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ شاید شیخ عاصم وغیرہ نے اسے گھسیٹ کر برآمدے میں پہنچایا تھا۔ میں دوڑتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ برآمدے میں اوندھا پڑا جسم واسو کا نہیں بلکہ باورچن انیسہ کا تھا۔ سیون ایم ایم رائفل کی کم از کم چھ گولیاں اس کے جسم میں پیوست تھیں اور خون بہہ کر برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔

اچانک مجھے شدید ترین خطرے کا احساس ہوا

"غزالہ... غزالہ... عاصم! کہاں ہو تم؟" میں چلایا۔

جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ خاموشی سی خاموشی تھی۔ میں دوڑتا ہوا کامن روم میں پہنچا۔ کامن روم کے دروازے پر مجھے سیون ایم ایم کی گولیوں کے کئی خول نظر آئے۔ کامن روم میں ٹیلی وژن ابھی تک چل رہا تھا۔ ٹیلی وژن کے عین سامنے ملازمہ راحین کی لاش پڑی تھی۔ رائفل کے ایک مہلک برسٹ نے اس کی کھوپڑی اڑا کر رکھ دی تھی۔ حسین چہرہ کریہہ المنظر ہو گیا تھا۔ اس چہرے سے صرف ایک فٹ دور ٹی وی اسکرین پر کسی انگلش فلم کا کردار فلک شگاف قہقہے لگاتا نظر آ رہا تھا۔

"غزالہ... غزالہ..." ایک بار پھر میرے حلق سے بلند آواز نکلی۔

میں دیوانہ وار بنگلے کے مختلف کمروں میں چکرانے لگا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور انگلی لبلبی پر۔ آنکھوں کے سامنے لہو کی چادر سی تن گئی تھی۔ بنگلا خالی تھا۔ مجھے کہیں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ سوائے ایک پالتو بلی کے۔ وہ بنگلے کے عقبی دروازے پر مردہ پڑی تھی۔ اسے بھی گولی لگی تھی۔ یہاں دیواروں اور دروازوں پر بھی گولیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ شیشے کی بے شمار کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ عقبی لان میں ٹیوب لائٹس کی روشنی تھی۔ یہاں مجھے کچی زمین پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشان بھی دکھائی دیے۔

میرے دل نے چیخ کر گواہی دی کہ کچھ دیر پہلے شنکر شکرا فرشتۂ اجل کے روپ میں یہاں موجود رہا ہے۔ فرش پر گولیوں کے جو خول بکھرے ہوئے تھے وہ دو تین اقسام کے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شنکر یہاں اکیلا وارد نہیں ہوا۔

رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ مجھے اپنی انگلیاں چٹختی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں غزالہ کو آواز دیتا ہوا ایک بار پھر بنگلے میں اور بنگلے کے ارد گرد

چکرانے لگا۔ غزالہ، شیخ عاصم اور بچی لالہ میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں پریشان تو تھا لیکن دل ہی دل میں خدا کا شکر گزار بھی تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کیا پتا تھا کہ ان میں سے کوئی دکھائی دیتا تو وہ بھی انیسہ اور راحین کی طرح مردہ حالت میں ہوتا۔ بنگلے کے اردگرد گھومتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں آنے والے افراد دو گاڑیوں پر سوار تھے، ان کی تعداد سات آٹھ سے کم ہرگز نہیں تھی۔ عقبی لان کی کچی زمین پر ٹائروں اور پیروں کے نشانات ساری کہانی سنا رہے تھے۔ واسو کا نیم جاں جسم کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کا مطلب تھا کہ بنگلے کے مکینوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد شنکر اپنے زخمی ساتھی کو ساتھ لے گیا ہے۔ ان کے پاس دو گاڑیاں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ایک گاڑی میں زخمی کو اسپتال کی طرف روانہ کیا گیا ہو، دوسری میں شیخ عاصم اور غزالہ کو زبردستی بٹھالیا گیا ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا پچھلے بیس تیس منٹ کے اندر اندر ہوا تھا۔ میرا یہ بدترین اندیشہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ میری غیر موجودگی میں شنکر کچھ کر گزرے گا۔ غزالہ اب کہاں ہوگی۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟ یہ سوال آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑ گیا۔

اچانک ایک مدھم آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آہٹ ڈرائنگ روم کی ایک بڑی الماری کے پیچھے سے ابھری تھی۔ میں نے رائفل الماری کی طرف سیدھی کرلی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے جہازی سائز کی الماری کسی ہلکے پھلکے دروازے کی طرح سرک گئی اور عقب سے شیخ عاصم اور غزالہ برآمد ہوئے۔ بچی لالہ غزالہ کی گود میں تھی۔ شیخ عاصم کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا اور جو رائفل میں اس کے ہاتھوں میں چھوڑ گیا تھا وہ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

شیخ عاصم نے کہا "شاہ جہاں! پولیس کب پہنچ رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا "پولیس اسٹیشن کی گاڑی کہیں گئی ہوئی ہے۔ اسٹیشن انچارج نے وائرلیس پر دوسری گاڑی منگوائی ہے۔ آدھ پون گھنٹے تک وہ لوگ پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہاں کیا ہوا۔ انیسہ اور راحین دونوں ختم ہوچکی ہیں۔"

شیخ نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "آدھ پون گھنٹے میں تو بہت دیر ہوجائے گی۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔ شنکر اور اس کے ساتھی آس پاس ہی موجود ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ کسی بھی وقت واپس یہاں آسکتے ہیں۔"

میں پہلی بار شیخ عاصم کے چہرے پر خوف و ہراس کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ غزالہ کا رنگ بھی بالکل مٹی ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ مسلسل لرزتے چلے جارہے تھے۔

بات کی تہ تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میرے جانے کے کچھ ہی دیر بعد شنکر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بنگلے پر حملہ آور ہوا تھا (عاصم کی اطلاع کے مطابق یہ لوگ تین گاڑیوں میں یہاں پہنچے تھے) شنکر نے اندھا دھند فائرنگ کرکے باورچن انیسہ اور ملازمہ راحین کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے عاصم اور غزالہ کو چھپنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس دیوار گیر الماری کے پیچھے ایک خلا موجود تھا۔ خلا کے سامنے بھاری بھرکم الماری کو اتنی خوبی سے فٹ کیا گیا تھا کہ پوری الماری کو ایک انگلی کی مدد سے دروازے کی طرح حرکت دی جاسکتی تھی۔ الماری میں رنگ دار شیشے لگے تھے۔ شیشوں کے عقب سے غزالہ اور عاصم سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی دیکھا تھا اور دیکھنے کے بعد الماری کے پیچھے سے نکلے تھے۔ شیخ عاصم، غزالہ کو کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ بچی غزالہ کے کندھے سے لگی تھی۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ غالباً یہ غنودگی ان تینوں کے لیے بہتر ہی ثابت ہوئی تھی۔ بچی ہوش میں ہوتی تو خوف زدہ ہوکر یقیناً رونا دھونا شروع کردیتی اور الماری کے پیچھے ان تینوں کی موجودگی کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

میں غزالہ اور شیخ کے ساتھ چل رہا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ میری نظریں چاروں طرف گردش کررہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا دشمن کس قدر عیار ہے۔ اس کے سامنے ایک ساعت کی غفلت کا مطلب موت ہے۔ کامن روم کے ساتھ والے کمرے میں جمیلہ نور کی لاش پڑی تھی۔ اس کا چہرہ حجاب کے کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ لاش کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم باہر احاطے میں آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ شیخ عاصم چاہتا تھا کہ میں ڈرائیونگ کروں اور وہ رائفل اپنے ہاتھ میں رکھے۔ میں نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ میں نے کہا "عاصم! تم نے پہلے بھی میری بات نہیں مانی اور نتیجہ دیکھ لیا۔ اگر میری جگہ تم خود فون کرنے چلے جاتے تو شاید انیسہ اور راحین کو جان سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے۔"

میرے لہجے کی تپش محسوس کرتے ہوئے شیخ عاصم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے کافی تکلیف محسوس کرتا تھا اور کرب کی شدت سے اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا تھا (جیسا کہ بعد میں پتا چلا جب شنکر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بنگلے پر حملہ آور ہوا تھا تو شیخ اور غزالہ چھت پر تھے۔ گاڑیوں کو دیکھ کر انہوں نے تیزی سے نیچے اترنے کی کوشش کی تو شیخ ناہموار گرگیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر عقبی صحن میں گر گئی۔ شیخ کے ہونٹوں سے جو خون رس رہا تھا، وہ گرنے کی وجہ سے تھا)

جیپ فراٹے بھرتی ہوئی بنگلے سے نکلی اور باغ کے درمیان سے گزرتی ہوئی کشادہ سڑک پر آگئی۔ چاند کافی اوپر آگیا تھا، اس کی روشنی میں ریتلی زمین چمک رہی تھی اور ستارے بلند و بالا کھجوروں میں اٹکے نظر آتے تھے، جیپ کی حرکت سے ہوا چلنے لگی اور دھاروں کی صورت بہتا پسینہ خشک ہونے لگا۔ غزالہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ لالہ کو اس نے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ بنگلے سے چار پانچ کلومیٹر دور آنے کے بعد مجھے امید پیدا ہونے لگی کہ ہم بخیریت شنکر اور اس کے مسلح کارندوں کی زد سے بچ نکلیں گے۔

عین جس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آرہا تھا، میں نے دائیں جانب ایک جیپ کی اچھلتی کودتی روشنیاں دیکھیں۔ یہ جیپ تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ شیخ عاصم نے بھی کچے راستے پر دوڑتی ہوئی اس جیپ کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر گہری تشویش دکھائی دینے لگی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیپ ہمارے قریب پہنچ گئی۔ ایک کھڑکی میں سے نکلی ہوئی رائفل کی نال میں صاف دیکھ سکتا تھا پھر مجھے شنکر کے ایک سکھ کارندے کی سرخ پگڑی بھی دکھائی دے گئی۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی، یہ وہی لوگ تھے جو غزالہ اور شیخ عاصم کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ انہیں شک تھا کہ غزالہ اور عاصم بنگلے سے بھاگ نکلے ہیں۔

سڑک پر پہنچتے ہی جیپ ہمارے پیچھے لگ گئی۔ جیپ کو قریب آتے دیکھ کر عاصم نے رفتار بڑھا دی۔ وہ بڑی مشکل سے ڈرائیونگ کررہا تھا، ہر لحظہ یوں لگتا تھا کہ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوجائے گی۔ شنکر کے ساتھیوں والی جیپ برق رفتاری سے ہمارے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور کسی بھی کارروائی کے لیے تیار ہوگیا۔ دونوں گاڑیاں اب کم و بیش ۱۰۰ کلومیٹر کی رفتار سے بھاگ رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ شنکر کے ساتھیوں کی دوسری گاڑی بھی ہمارے پیچھے لگ گئی ہے کیونکہ پیچھے آنے والی جیپ کے عقب میں بھی تیز رفتار ہیڈلائٹس دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک تڑتڑ کی مخصوص آواز سے ویرانہ گونج اٹھا۔ سرخ جیپ میں سے ہماری گاڑی پر خودکار رائفل کا برسٹ مارا گیا تھا۔ غزالہ نے سہم کر میرا بازو تھام لیا۔ یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ سرخ جیپ بلا کی رفتار سے ہمارے قریب آرہی تھی پھر وہ اوورٹیک کرنے والی پوزیشن پر پہنچ گئی۔ شیخ عاصم نے کوشش کی کہ وہ اوورٹیک نہ کرسکے۔ قریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگتی ہوئی دونوں گاڑیوں میں تھوڑی سی کشمکش ہوئی پھر ایک اور برسٹ مارا گیا۔ میری دائیں جانب والی کھڑکی چکناچور ہوگئی۔ غزالہ کی گود میں دبکی ہوئی پھول سی بچی کے سر اور "چہرے" کا ایک حصہ صاف اڑ گیا۔ غزالہ نے چیخ ماری اور بچی کے اوپر اوندھی گر گئی۔

شاید وہ اس طرح بچی کو گولیوں کی زد سے بچانا چاہتی تھی لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ بچی تو مر چکی تھی، اب غزالہ بھی براہِ راست فائر کی زد میں تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاس رائفل سیدھی کرنے کی مہلت بھی نہیں تھی۔

مگر مسئلہ غزالہ کا تھا۔ یہ غزالہ کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اور غزالہ کے لیے تو میں ایک لمحے میں سے صدیاں چرا سکتا تھا۔ میں جس قدر برق رفتاری کا مظاہرہ کرسکتا تھا، میں نے کیا۔ میری رائفل کی نال ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے باہر نکلی۔ عین اسی لمحے مجھے سرخ جیپ کے اندر شنکر کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ میری نگاہ میں برق کوند گئی۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے سرخ جیپ کی دونوں کھڑکیاں چکناچور کردیں۔ اس کے ساتھ ہی میں غزالہ کو کور دینے کے لیے اس کے اوپر گر گیا۔ یعنی بچی کے اوپر غزالہ اور غزالہ کے اوپر میں تھا۔ جوابی برسٹ چلا لیکن یہ نشانے پر نہیں لگا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا برسٹ مارا۔ میں یہ برسٹ سرخ جیپ کی کھڑکیوں پر مارنا چاہتا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ جیپ کے تمام سوار نیچے جھک گئے ہیں اور وہ گولیوں کی زد میں نہیں ہیں تو میں نے جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنایا۔ کم از کم دس گولیاں فائر ہوئی تھیں۔ ان میں سے کئی جیپ کے بائیں ٹائروں میں لگیں۔ جیپ کی رفتار کسی طرح بھی ڈیڑھ سو کلومیٹر فی گھنٹا سے کم نہیں تھی۔ وہ بری طرح لہرائی اور سڑک سے اتر کر ریت میں چلی گئی۔ ڈرائیور مشاقی کا مظاہرہ کرکے جیپ پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا لیکن کئی مَن وزنی جیپ اپنے "مومینٹم" کے سبب ناقابلِ مزاحمت ہوچکی تھی۔ بہرحال وہ اس کی رفتار کم کرنے میں کامیاب رہا۔ پھر رفتار ریت کی وجہ سے بھی کم ہوتی ہوگی۔ بہرحال جیپ مسلسل ڈگمگا رہی تھی۔ کبھی اس کے ایک جانب کے پہیے ہوا میں بلند ہوجاتے کبھی دوسری جانب کے، پھر وہ الٹ گئی۔

جیپ کا رکنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ جیپ کے

سواروں کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ سارے کے سارے ہلاک یا زخمی ہو گئے ہوں۔ وہ اب بھی جوابی کارروائی کرنے کے قابل تھے۔ غزالہ کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ یقیناً وہ معصوم "لالہ" کا چہرہ بغور دیکھ چکی تھی۔ گولیوں نے اس کا ایک تہائی چہرہ اور سر اڑا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے چلا کر شیخ عاصم سے پوچھا کہ وہ ٹھیک ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔ وہ بھی بچی کا مسخ چہرہ دیکھ چکا تھا اور یہ جان چکا تھا کہ غزالہ کیوں چیخ رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "عاصم رکنا نہیں۔ ان کی دوسری گاڑی بھی قریب ہی ہے وہ ہمارے پیچھے آسکتی ہے۔"

عاصم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے سر پر اور کندھوں پر شیشے کی کرچیاں چمک رہی تھیں۔ ایسی کرچیاں پوری جیپ میں بکھری ہوئی تھیں۔ بچی ابھی تک غزالہ کی بانہوں میں تھی اور غزالہ نے اسے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ غزالہ کا کندھا بچی کے خون سے رنگین نظر آرہا تھا۔ میں نے کہا۔ "غزالہ اسے چھوڑ دو۔ یہ مر چکی ہے۔"

میں نے بچی کو کھینچ کر غزالہ سے جدا کیا اور اس کی لاش پچھلی نشست پر ڈال کر چہرہ ڈھک دیا۔ غزالہ کی ہچکیاں رکنے میں نہیں آرہی تھیں۔ شیخ عاصم اسے ڈانٹنے لگا۔ "چپ کر جاؤ۔ میں کہتا ہوں چپ کر جاؤ۔"

جیپ برق رفتاری سے اڑی جارہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہم ساحل کی طرف جارہے ہیں۔ سڑک تاریک اور سنسان تھی۔ اچانک انجن میں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور جیپ کو جھٹکے لگنے لگے۔ تب اچانک انجن بند ہو گیا۔ فیول کی سوئی صفر پر تھی۔ عاصم کے ساتھ مجھے بھی حیرانی ہوئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں عاصم کے کہنے پر پولیس کو فون کرنے گیا تھا تو گاڑی میں کافی پیٹرول موجود تھا۔ یقینی طور پر اندھا دھند فائرنگ کے دوران میں کوئی گولی گاڑی کی فیول لائن میں لگی تھی جس کی وجہ سے فیول ضائع ہو گیا تھا۔ عاصم نے چلتی گاڑی کو ایک دو بار سلف مار کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ مجبوراً اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر روک دی۔

چاروں طرف لق و دق ویرانہ تھا۔ کہیں کوئی ایسی آڑ نہیں تھی جو ہمیں چھپنے میں مدد دے سکتی۔ ہم کچھ دیر گاڑی سے الجھتے رہے، پھر گاڑی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ بچی کی خونچکاں لاش وہیں گاڑی میں پڑی رہنے دی گئی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم تیزی کے ساتھ گاڑی سے دور ہو جاتے لیکن گاڑی سے اترتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شیخ عاصم کے لئے تیزی سے دوڑنا تو درکنار تیزی سے چلنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے بنگلے میں اسے "واکنگ اسٹک" کے سہارے چلتے دیکھا تھا، اب وہ اسٹک بھی اس کے پاس نہیں تھی۔

عاصم کو ایک طرف سے غزالہ نے سہارا دیا اور دوسری طرف سے میں نے۔ ہم سڑک سے دور ہٹنے لگے۔ عاصم کی جیب میں پسٹل تھا اور میرے پاس رائفل۔ رائفل جدید اور طاقتور تھی لیکن اس کے زیادہ راؤنڈ میرے پاس نہیں تھے۔ اگر شنکر اور اس کے ساتھی ہمارے پیچھے آتے تو ہم زیادہ دیر مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر شنکر جیپ اڑنے والے واقعے میں محفوظ رہا ہے اور وہ ہمارے پیچھے آیا تو ایک خونی تصادم ہوگا۔ شنکر کے ہاتھ سے صبر اور برداشت کا دامن چھوٹ چکا تھا۔ وہ نیم پاگل ہو رہا تھا اور اپنے راستے میں آنے والے ہر ذی نفس کو قتل کر رہا تھا۔ یہ لرزہ خیز حقیقت تھی کہ روبلہ نامی بنگلے میں اس نے دونوں گارڈز سمیت چھ افراد کو قتل کیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے معصوم لالہ بھی شنکر یا اس کے کسی ساتھی کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔

بہرحال اس صورت حال میں امید کی ایک کرن بھی موجود تھی۔ بنگلا چھوڑنے سے پہلے میں فلنگ اسٹیشن سے پولیس کو فون کر چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ہماری سڑک کے کنارے کھڑی گاڑی "شنکر اور اس کے ساتھیوں کے بجائے پولیس کی نظر میں آجاتی اور مقامی پولیس جو اپنی مستعدی کے لئے مشہور تھی، ہمارے تحفظ کے لئے پہنچ جاتی۔ عاصم کو سہارا دیتے ہوئے ہم ہائی وے سے قریباً دو فرلانگ دور پہنچ گئے۔ عاصم کے منہ سے مسلسل کراہیں نکل رہی تھیں اور ریت میں اس کے پاؤں دھنس دھنس جارہے تھے۔ وہ ہمارا سہارا لینا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے لئے مجبور تھا۔ آخر کچھ دیر بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے دم ہو کر ریت پر بیٹھ گیا۔ غزالہ نے جلدی سے اس کا سر اپنے زانو پر رکھنے کی کوشش کی لیکن شیخ عاصم نے نیم دراز ہونے سے انکار کر دیا۔ غزالہ اس کے کندھے دبانے لگی اور آہستہ آہستہ اس کی گردن کے پٹھوں کا مساج کرنے لگی۔ عاصم کی یہ وہی تنومند گردن تھی جس میں ہر وقت سریا فٹ رہتا تھا۔ اب وہ گردن کمزور نظر آرہی تھی۔ اور اس پر سلوٹیں دکھائی

رہی تھیں۔ غزالہ نے سرگوشی میں عاصم سے ایک دو سوال پوچھے، پھر اس کی نبض دیکھی۔ شولڈر بیگ غزالہ کے پاس موجود تھا۔ اس نے ستاروں کی مدھم روشنی میں ٹٹول ٹٹول کر بیگ کے اندر سے ایک سرنج برآمد کی اس میں ایک انجکشن بھرا اور عاصم کے بازو میں لگا دیا۔ یہ توانائی بحال کرنے والا کوئی زود اثر انجکشن تھا۔ پانچ دس منٹ میں شیخ عاصم خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ ہم پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور سڑک کی مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ عاصم کا ایک بازو میرے کندھے پر اور دوسرا غزالہ کے کندھے پر تھا۔ چند قدم اٹھانے کے بعد وہ ایک آدھ بار ضرور کراہتا تھا مگر اس حالت میں بھی اس کے اندر کی اکڑ اور نخوت برقرار تھی۔ میں نے اسے کندھے پر اٹھانے کی پیشکش کی تو وہ کرخت لہجے میں بولا۔ "نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی اتنا لاچار نہیں ہوا میں۔"

اس نے میرے کندھے پر سے بھی بازو ہٹا لیا لیکن چلنے میں سخت دشواری پیش آئی اور وہ لڑکھڑانے لگا۔ میں نے از خود ہی اس کا بازو دوبارہ اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس موقع پر مجھے غزالہ کی آنکھوں میں اپنے لئے ممنونیت کے آثار نظر آئے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے رہے، آسمان اب صاف تھا اور صحرا پر بکھری ہوئی چاند تاروں کی روشنی طلسماتی منظر پیش کر رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر راستہ ڈھلوان ہو گیا۔ شیخ عاصم کو چلنے میں جو دشواری پیش آرہی تھی وہ خاصی کم ہو گئی۔ ہمارے چاروں جانب ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے تھے۔ جب ہم ایک ایسے ٹیلے کے اوپر سے گزر رہے تھے تو میری نگاہ عقب میں گئی اور دور کہیں نشیب میں دو روشنیاں جگنو کی طرح چمک کر اوجھل ہو گئیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ ہمارے تعاقب میں آنے والوں کے آثار ہوں۔ یہ روشنیاں ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچیں بھی ہو سکتی تھیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس ہوں۔

میں نے غزالہ یا عاصم کو ان روشنیوں کے بارے میں بتا کر ان کی پریشانی میں اضافہ نہیں کیا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ رفتار پہلے سے تیز کر دی۔ عاصم ایک بار پھر تھک چکا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہیں کہیں ریت پر ڈھیر ہو جائے اور بیل کی طرح ہانپنے لگے۔ لیکن اس کی انا اور خودداری آڑے آرہی تھی۔ چلتے ہوئے میں بار بار اپنی رائفل کو ٹٹول لیتا تھا۔ اس نیم تاریک بیاباں میں اگر شنکر جیسا موذی ہمارے تعاقب میں تھا تو پھر اس رائفل کی ضرورت کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ شنکر کے سر پر خون سوار تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ نیم پاگل ہو رہا تھا تو بے جا نہ ہوگا، اس تاریک بیاباں میں شنکر سے آمنا سامنا ہو جاتا تو اس سے بری سے بری توقع رکھی جاسکتی تھی۔

جوں جوں رات بھیگ رہی تھی، خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم سردی سے کانپنے لگے۔ صحرائی علاقوں میں دن اور رات کے ٹمپریچر میں اکثر نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ سردی کے سبب شیخ عاصم کی کراہٹ بڑھنے لگی اور وہ بار بار بے دم ہو کر بیٹھنے لگا۔ ہم پیچیدہ ڈھلوانی ٹیلوں میں کئی چکردار راستوں سے گزرے تھے۔ مجھے سمتوں کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ تاہم شیخ عاصم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی Where abouts سے آگاہ ہے۔ میں نے چپکے چپکے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا لیکن دوبارہ وہ منحوس روشنیاں نظر نہیں آئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ شیخ کچھ الجھا الجھا ہے۔ وہ بار بار اطراف میں نگاہ دوڑاتا تھا اور کسی وقت آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ سفر کے اس مرحلے پر پہنچ کر وہ جیسے راستہ بھول رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "کیا بات ہے عاصم! تم کچھ چکرائے ہوئے لگتے ہو؟"

وہ ہانپ کر سرد ریت پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سانسیں درست کرتا رہا پھر بولا۔ "یہیں کہیں ایک کیمپ ہے۔"

"کیسا کیمپ؟"

"تیل کے چند کنوئیں ہیں اس علاقے میں۔ انگلینڈ کی ایک فرم ٹھیکے پر تیل نکالتی ہے۔ ان لوگوں نے یہاں مستقل رہنا ہوتا ہے لہٰذا ایک چھوٹی سی کالونی بنا رکھی ہے، سمجھو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کے پاس اپنے سکیورٹی گارڈز وغیرہ بھی ہیں۔ اس کالونی میں پہنچ کر ہم خود کو بالکل محفوظ تصور کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہاں تو کسی کالونی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔" غزالہ نے کہا۔

"مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

میں نے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر جنوب کی طرف مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ "کہیں یہ تو نہیں وہ کالونی؟"

شیخ عاصم غزالہ کا سہارا لے کر بمشکل اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ٹیلے پر آگیا۔ میں نے انگلی سے دور ٹمٹماتی

روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔ عاصم نے غور سے دیکھنے کے بعد مایوسی میں سرہلا دیا۔ "نہیں' یہ تو پانچ چھ لالٹینیں ہیں۔ شاید بدوؤں کے کسی قافلے نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔"

واقعی یہ کوئی چھوٹا سا پڑاؤ ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ "چلو' جو بھی ہے۔ اس ویرانے میں ہمیں پناہ تو فراہم ہو سکتی ہے۔"

میری بات میں وزن تھا۔ غزالہ کے ساتھ ساتھ عاصم بھی تائیدی انداز میں سرہلانے لگا۔ غزالہ خود بھی تھکی ہوئی تھی لیکن اپنی تھکن کا اسے غالباً احساس تک نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے شوہر کی وجہ سے پریشان تھی۔ شوہر جسے بیماری' تھکن اور مجروحی لمحہ لمحہ نڈھال کیے جا رہی تھی۔

ہم نے دونوں طرف سے عاصم کو سہارا دیا اور درمیانی رفتار سے روشنیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ان پانچ چھ خیموں کے سامنے کھڑے تھے جو دو ریتلے ٹیلوں کے درمیان استادہ کیے گئے تھے۔ خیموں کے پاس ہی آٹھ دس اونٹ بھی موجود تھے۔ اونٹوں کی رسیاں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی تھیں اور ان کے گلے میں ٹنک دار گھنٹیاں تھیں۔ اسی پڑاؤ میں گھوڑے اور تازی کتے بھی دکھائی دیئے۔ جدید ابوظہبی سے ہٹ کر خانہ بدوشوں کے ایسے قافلے اکثر دکھائی دے جاتے تھے۔ میں دوران سفر میں کئی بار ایسے قافلوں کا مشاہدہ کر چکا تھا۔

ہماری آمد کا اندازہ ہوتے ہی دو جسیم افراد خیموں سے باہر نکل آئے۔ وہ مخصوص مقامی لباس میں تھے۔ لمبی سفید قبائیں اور روئی دار عمامہ۔ ان میں سے ایک کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ یہ پرانی طرز کی خستہ حال رائفل تھی۔ رائفل بردار نے ٹارچ کی روشنی ہمارے چہروں پر ڈالی۔ رائفل بردار اور شیخ عاصم کے درمیان عربی میں تین چار منٹ تک مکالمہ ہوا۔ رائفل بردار کے لہجے میں احترام نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی اب درشت نہیں رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہمیں پناہ مل گئی ہے۔

دونوں افراد ہمیں خیمے کے اندر لے گئے۔ بالکل یوں لگا جیسے ہم "لارنس آف عریبیا" کے دور کے کسی پڑاؤ میں آ گئے ہیں۔ خیمہ اونٹ کے بالوں اور چمڑے کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ فرش پر بھیڑ کی کھال کے نمدے بچھے ہوئے تھے۔ ایک بانس کے ساتھ لالٹین نما لیمپ روشن تھا۔ خیمے میں بھینی بھینی خوشبو موجود تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری آمد سے پہلے یہاں کوئی عورت موجود تھی جسے دوسرے خیمے میں بھیج دیا گیا ہے۔ خیمے کی حرارت اور روشنی میں پہنچ کر ہمیں سکون محسوس ہوا۔ عرب کی مشہور و معروف مہمان نوازی جلد ہی عملی صورت میں ہمارے سامنے آ گئی۔ تین بلوری پیالوں میں شہد ملا نیم گرم دودھ ہمیں پیش کیا گیا۔ یہ اونٹنیوں کا دودھ تھا اور اس کا ذائقہ بہتر کرنے کے لئے اس میں سونف وغیرہ ڈالی گئی تھی۔ میں نے اور عاصم نے تھوڑا تھوڑا دودھ پیا۔ غزالہ نے منہ تک نہیں لگایا۔ وہ سخت سوگوار نظر آ رہی تھی۔ رہ رہ کر ایک دلدوز ہچکی اس کے سینے سے بلند ہوتی تھی اور پورے جسم کو لرزا جاتی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں جیسے ابھی تک بیٹے نور' راحین اور انیسہ کی خونچکاں لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ اور معصوم نائلہ کے خون کے دھبے تو ابھی تک غزالہ کے لباس پر بھی موجود تھے۔ وہ اپنی اوڑھنی سے بار بار ان دھبوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عاصم نے انگلش میں مجھے بتایا کہ یہ خانہ بدوشوں کی فیملی ہے۔ کل نو دس افراد ہیں۔ یہ لوگ راس الخیمہ کی طرف جا رہے ہیں۔ رائفل بردار خاندان کا سربراہ ہے۔ وہ اپنی بیوی اور ایک بچے کے ساتھ محو سفر ہے۔ عاصم نے اس کا نام اقتاب بتایا۔ عاصم نے اقتاب کو بتایا تھا کہ ہم تینوں شکار پر نکلے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہماری جیپ خراب ہو گئی اور ہم راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلے۔

ایک بڑی رکابی میں ہمارے لئے کھانا لایا گیا۔ اقتاب ہمارے پاس بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے کھانے پر اصرار کرنے لگا۔ رکابی میں سالن تھا' تین پلیٹوں میں چاول تھے۔ ہمیں بھوک تو لگی ہوئی تھی لیکن کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی اپنے میزبان کا دل رکھنے کے لئے ہم نے یعنی میں نے اور شیخ عاصم نے دو چار لقمے لئے۔ سالن مزے دار تھا شاید میں چند لقمے اور لیتا لیکن جب عاصم نے مجھے بتایا کہ یہ ٹڈی کا گوشت ہے جسے اونٹ کی چربی میں بھونا گیا ہے تو میرا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ ٹڈی کا خیال آتے ہی ٹڈی دل نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا اور جی مالش کرنے لگا تھا۔ قہوے کے چند گھونٹ پی کر میں نے بمشکل طبیعت کو سنبھالا۔

شیخ عاصم نے اقتاب سے انگریزوں کی کالونی کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ بعد میں عاصم نے اقتاب کے بھائی اور بہنوئی سے بھی مکالمہ کیا لیکن نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ عاصم کی حالت کے پیش نظر ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ رات یہیں گزار لی جائے۔ اقتاب مہمان نوازی کے حوالے سے پورا پورا عرب بنا ہوا تھا۔ اس نے فوراً اپنا خیمہ ہمارے لئے خالی کر دیا۔ ہمارے

لئے تین گدیلے بچھا دیئے گئے اور کمبلوں کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ اسی دوران میں اقتاب کے بھائی کی نظر غزالہ کے خون آلود شانے پر پڑ گئی۔ وہ ذرا سا چونک گیا۔ اس نے عاصم سے پوچھا کہ بہن کے شانے پر یہ خون کیسا نظر آ رہا ہے؟

عاصم نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ ان پرندوں کا لہو ہے جو ہم نے شکار کئے تھے اور جو گاڑی کے اندر ہی رہ گئے ہیں۔

اقتاب کافی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ اس نے شیخ عاصم کو اس کی بیماری کے حوالے سے کئی مجرب نسخے بھی بتائے۔ اقتاب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں جیسے وہ ہماری میزبانی کرکے بہت لطف اٹھا رہا ہو۔ لیکن پتا نہیں کیوں اپنے خدوخال سے وہ مجھے ایک چالاک شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں کوئی ایسی بات تھی جو اس کے لب و لہجے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ شاید یہ وہ سادگی بھی نہیں تھا جس کا مشاہدہ میں نے ابوظہبی میں آ کر پہلی بار کیا تھا۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ اقتاب اور اس کا بھائی سونے کے لئے دوسرے خیمے میں چلے گئے۔ ہم نے لیمپ کی لو نیچی کی اور لیٹ گئے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جن خونی واقعات کا ہم نے چند گھنٹے پہلے مشاہدہ کیا تھا اور جو خطرات ہمیں درپیش تھے ان کی موجودگی میں نیند کیسے آ سکتی تھی۔ شنکر کی آمد کا اندیشہ ایک پل کے لئے بھی میرے ذہن سے جدا نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عاصم کو پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی اور وہ ڈگمگاتا ہوا خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ غزالہ نے اسے سہارا دینا چاہا لیکن اس نے اکیلے جانے پر اصرار کیا۔ ایک صحرا کے بیچوں بیچ ایک خیمے کی خوابناک روشنی میں' میں اور غزالہ اکیلے تھے۔ خیمے سے باہر رہ رہ کر تازی کتے کی آواز ابھرتی تھی اور پھر ہر سو خاموشی چھا جاتی تھی۔

"مجھے سلطانہ کی موت کا بہت افسوس ہے غزالہ۔"

"ہم کس کس کا افسوس کریں۔ کس کس کو روئیں۔" غزالہ کی غمناک آواز ابھری۔ "ان سب مصیبتوں کی جڑ میں ہوں۔ کاش مجھے ہی موت آ جائے۔"

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ اچانک ہمیں چپ ہونا پڑا۔ شیخ عاصم واپس آ رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے واپس آیا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں! ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ یہ اقتاب ٹھیک آدمی نہیں ہے۔ ابھی میں نے ساتھ والے خیمے میں اقتاب اور اس کے بہنوئی کی باتیں سنی ہیں۔ وہ لوگ ہماری اصلیت سے آگاہ ہیں اور ہمیں پکڑوانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔"

"پکڑوانے کا؟ لیکن کس کے ہاتھوں؟"

"اسی شنکر کے ہاتھوں اور عشارب کے کتوں کے ہاتھوں۔ شنکر سے ان کی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"کب؟"

"ابھی کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے۔ ہمارے یہاں آنے سے پہلے شنکر اور اس کے ساتھی یہاں پہنچے تھے۔ وہ لوگ اقتاب وغیرہ سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کر گئے ہیں۔ انہوں نے اقتاب کو بتایا ہے کہ وہ کالونی میں ہیں۔ اگر تمہارے بارے میں کوئی اتا پتا چلے تو کالونی میں اطلاع دی جائے۔"

"کون سی کالونی؟"

"انگلش کالونی جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔ میرے خیال

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں
اچھوت
قیمت: ۸۰ روپے
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۳۰۳۱۳
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۳۳۹۵۳

میں وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اقطاب نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کالونی کے بارے میں نہیں جانتا۔ اب وہ اپنے بہنوئی کو کالونی بھیج رہا ہے تاکہ شنکر وغیرہ آکر ہم پر قابو پالیں۔"

یہی وقت تھا جب مجھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ یہ گھوڑا پڑاؤ کے قریب سے روانہ ہوا تھا اور بڑی تیز رفتاری سے بہت دور چلا گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اقطاب کا بہنوئی کالونی کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔" شیخ عاصم کی پر تشویش آواز ابھری۔

"اب کیا کیا جائے؟" غزالہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا" عاصم نے کہا۔

"لیکن یہ لوگ ہمیں نکلنے دیں گے؟" میں نے استفسار کیا۔

"یہ سوچنے کی بات ہے" عاصم نے کہا۔

"بے شک یہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں لیکن ان کے پاس زیادہ ہتھیار نہیں۔ شاید ایک یا دو رائفلیں ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ گھرانے کے سربراہ اقطاب پر قابو پالیا جائے۔ اس کے بعد باقی کا کام زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لئے سواری بھی مل جائے گی اور cover کے لئے کوئی یرغمالی بھی ساتھ رکھ لیں گے۔"

ہم نے تیزی سے اس معاملے میں سوچ بچار کی۔ اس کے بعد میں نے اپنی جدید رائفل سنبھالی اور بڑی خاموشی کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔ اقطاب ساتھ والے خیمے میں موجود تھا۔ میں نے خیمے کے قریب پہنچ کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ اندر خاموشی تھی۔ اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ اندر اکیلا ہی ہے۔ تازی کتے رہ رہ کر بھونک رہے تھے۔ میرے باہر نکلنے کے بعد ان کے بھونکنے کے انداز میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی تھی۔ غالباً یہ تبدیلی ہی تھی جس نے اقطاب کو خیمے سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ میں نے خود کو جلدی سے خیمے کی اوٹ میں چھپایا۔ رائفل اقطاب کے ہاتھ میں تھی۔ وہ چوڑی اور مضبوط کاٹھی کا کوتاہ قد شخص تھا۔ عمر چالیس پینتالیس کے قریب تھی۔ کسی قدیم عرب کی طرح جو ہوا میں اپنے دشمن کی بو سونگھ لیتا تھا اقطاب بھی بالکل چوکس نظر آتا تھا۔ اچانک اپنے بالکل پاس اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے میری طرف گھوما۔ میں نے اس کی رائفل کی نال پر اپنی رائفل ماری اور پھر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ اقطاب کے ہونٹوں سے آہ تک نہیں نکل سکی۔ گردن پر پڑنے والے مخصوص دباؤ نے اسے میرے ہاتھوں میں بالکل موم کردیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح گر گئی تھی۔ میں نے ٹھوکر مار کر اقطاب کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ تاہم آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کی رائفل اٹھانی نہیں بھولا تھا۔

اقطاب خیمے میں میرے ساتھ یوں داخل ہوا جیسے توری کی بیل کے ساتھ مردہ توری لٹک رہی ہو۔ تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا اور حلق سے "خرر خرر" کی بڑی دھیمی آواز نکل رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ بے پناہ خوف کا شکار ہے۔ میں نے اس کی رائفل غزالہ کی طرف بڑھا دی، جو غزالہ نے ذرا سا جھجکنے کے بعد تھام لی۔ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دو تین منٹ تک گردن پر ناقابل برداشت عذاب جھیلنے کے بعد اقطاب کا سارا دم خم نکل چکا ہے اور اگر میں اس کی گردن چھوڑ بھی دوں تو وہ مطیع و فرماں بردار رہے گا۔ میں نے رائفل کی نال اس کے سر سے لگائی اور گردن آزاد کردی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا اور کراہنے لگا۔ شیخ عاصم نے عربی میں اس سے چند سوال پوچھے۔ اس گفتگو سے پتا چلا کہ شنکر اور اس کے ساتھی دو جیپوں پر سوار یہاں پہنچے تھے۔ ان کی تعداد بارہ کے قریب تھی۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور ان میں سے ایک دو زخمی بھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے اقطاب اور اس کے بہنوئی سے لمبے چوڑے انعام کا وعدہ کیا تھا۔

میں نے عاصم سے کہا "اس سے پوچھو کہ یہاں کے قبائلیوں کی مہمان نوازی تو مشہور ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ یہ کیسی مہمان نوازی کی ہے۔"

عاصم بولا "یہ کہتا ہے کہ وہ بھی تو مہمان ہی تھے جو پہلے اس پڑاؤ میں آئے تھے اور ہم سے مدد مانگی تھی۔"

مجھے اس بدو کی ڈھٹائی پر حیرت ہوئی۔ اس نے خوش اخلاقی کی آڑ لے کر ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی تھی اور اب اس عمل کو خوبصورتی سے "مہمان نوازی" کے ساتھ نتھی کر رہا تھا۔ سچ کہا گیا ہے کہ عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے۔

اچانک کوئی آندھی وطوفان کی طرح خیمے میں داخل ہوا۔ مجھے صرف ایک جھلک نظر آئی۔ یہ تازی کتا تھا۔ اس کے حملے میں چیتے کی سی پھرتی تھی۔ اس کے عقب میں کوئی شخص لپکا چلا آرہا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ غیرارادی طور پر میری انگلی نے ٹریگر دبا دیا۔ خطرناک کتے نے مجھ پر آخری جست لگانے کے لئے ابھی زمین چھوڑی نہیں تھی کہ رائفل نے اسے نشانہ بنالیا۔ چار گولیاں اسے لگیں۔ دو گولیاں اس کے جسم میں سے گزر کر پیچھے آنے والے شخص

کو بھی جہنم واصل کر گئیں۔ جب وہ کتے سمیت میرے قدموں میں گرا تو مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی عورت ہے۔

اسی دوران میں قوی ہیکل اقطاب کو موقع مل گیا۔ اس بدو نے کسی درندے کی طرح چھلانگ لگا کر مجھے عقب سے دبوچ لیا۔ میرے دونوں بازو رائفل سمیت اس کی گرفت کے آہنی شکنجے میں جکڑے گئے تھے۔ یہ "بے پناہ" گرفت تھی۔ مجھے بدو کی وحشیانہ طاقت کا اندازہ ہوا۔ میرا جسم شل ہو کر رہ گیا۔ وہ کوتاہ قد تھا لہٰذا میں عقب میں اسے سر کی ضرب بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ شیخ عاصم چلایا "غزالہ میرا پسٹل"

عاصم کا پسٹل تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ غزالہ نے لپک کر پسٹل نکالا اور عاصم کو تھما دیا۔ عاصم نے پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا لیکن اقطاب میرے ساتھ یوں گتھم گتھا تھا کہ عاصم فائر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بڑی وحشیانہ جدوجہد تھی جو میرے اور اقطاب کے درمیان ہو رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، میری گولیوں کا نشانہ بننے والی اقطاب کی بیوی تھی اور اس واقعے نے اقطاب کو غم و غصے سے پاگل کردیا تھا۔ اچانک خیمے کا پردہ ہلا اور ایک شخص خنجر بدست خیمے میں داخل ہوا۔ شیخ عاصم نے بے دریغ دو فائر کئے اور اسے لمبا لٹا دیا۔

دوسری طرف میں نے خود کو اقطاب کی گرفت سے نکالنے کے لئے اندھا دھند زور لگایا تو ہم دونوں اوندھے منہ گرے۔ اقطاب بدستور آسیب کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے غضبناک گالیاں فواروں کی طرح ابل رہی تھیں۔ دشنام طرازی کے ساتھ ساتھ وہ کسی کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ جدوجہد کے دوران میں اچانک مجھ پر ایک خوش آئند انکشاف ہوا۔ میری رائفل کی نال جو اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھی کھسک کر اقطاب کی ٹھوڑی کے عین نیچے آگئی تھی۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اٹھایا۔ میری انگلی لبلبی کے آس پاس تھی۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ رائفل سے سنگل شاٹ نکلا اور اقطاب کی گردن میں گھس گیا۔ فولادی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑگئی۔ اقطاب پشت کے بل تازی کتے کی لاش پر گرا اور دو بار اینٹھ کر ساکت ہوگیا۔ وہ مر چکا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر شیخ عاصم نے اس پر پسٹل کے دو فائر مزید کردیے تھے۔

میں رائفل لے کر چوکس کھڑا ہوگیا۔ میری نگاہ خیمے کے دروازے پر تھی۔ حملے کی نیت سے اندر گھسنے والا کوئی بھی شخص ایک ساعت میں گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ دو تین منٹ ہم "ریڈ الرٹ" پوزیشن میں رہے۔ پھر میں احتیاط کے ساتھ باہر نکلا۔ کچھ آوارہ بدلیوں نے چاند تاروں کے رخ پر نقاب ڈال دی تھی اور ریگزار میں ہر طرف تاریکی نظر آتی تھی۔ میں محتاط قدموں سے خیموں کی طرف بڑھا، عاصم میرے پیچھے تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ خیموں میں کوئی نہیں۔ پڑاؤ خالی پڑا تھا۔

"میرا اندازہ درست ثابت ہوا" شیخ عاصم نے کہا

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"جو چند افراد بھاگ گئے ہیں وہ اقطاب کے ساتھی نہیں تھے۔ اقطاب نے ابھی خود بتایا تھا کہ وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔ یہ لوگ اس کے مقروض تھے اور وہ قرض کے بدلے ان سے اپنے علاقے میں مزدوری لینا چاہ رہا تھا۔"

ہم نے گھوم پھر کر دیکھا، سب خیمے خالی تھے۔ بس ایک خیمے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ہم نے دیکھا، یہ قریباً ایک سال کا بچہ تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اقطاب کا بچہ ہے۔ اقطاب کے ساتھ گولی کا نشانہ بننے والی اس کی بیوی تھی یہ ایک غمزدہ کرنے والی صورت حال تھی۔ پلک جھپکنے میں ماں باپ دونوں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے تھے اور بچہ اپنی یتیمی کا اعلان کرنے لگا تھا۔ ماں باپ کے اعمال کی سزا عمر بھر کی محرومی کی صورت میں بچے کے سامنے آگئی تھی۔ فضا میں ابھی تک بارود کی بو تھی اور مرنے والوں کی آخری ہچکیوں کی گونج تھی۔ شاید یہ رات ہی ایسی تھی۔ یہ اپنے سیاہ لبادے میں موت کی سوغات لئے پھر رہی تھی اور یہاں وہاں فراخدلی سے بانٹ رہی تھی۔ پہلے روباط کے بنگلے میں جمیلہ نور کی موت۔ پھر اندھیرا گہرا ہوتے ہی راہین اور انیسہ کی لاشیں۔ ان لاشوں کے پہلو میں اقتدار کا خونچکاں جسم، بعد ازاں راستے میں پھول سی بچی کا قتل اور سرخ جیپ کو پیش آنے والا خونی حادثہ اور لق و دق ویرانے میں ایک ساتھ تین لاشیں۔

ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جاتے ہمارے لئے بہتر تھا۔ اقطاب کا بہنوئی تیز رفتار گھوڑے پر سوار یہاں سے کالونی کی طرف گیا تھا۔ قیاس کہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں واپس آجائے گا۔ اور اسے اکیلے نہیں آنا تھا، اس کے ساتھ خونخوار شنکر اور اس کے مسلح ساتھیوں کی آمد متوقع تھی۔ شیخ عاصم پڑاؤ میں موجود اونٹوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اونٹوں کی ریس کا شوقین تھا اور یقینی بات تھی کہ اس حوالے سے اسے اونٹوں کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوں گی۔ ویسے بھی وہ عرب قبائلی تھا اور یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اسے اونٹوں کے متعلق علم نہ ہو۔ ایک

لنڑی اونٹنی کو اس نے نکیل سے پکڑ کر بڑی مہارت سے بٹھایا پھر غزالہ کو اس پر سوار ہونے کی ہدایت کی۔ معمولی تذبذب کے بعد غزالہ سوار ہوگئی۔ قریب ہی ایک دوسری اونٹنی بیٹھی تھی۔ اس پر میں سوار ہوگیا۔ اس اونٹنی پر بھی سامان لدا ہوا تھا۔ عاصم غزالہ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اسے سوار ہونے میں سخت دقت پیش آئی تھی۔ ابھی اونٹنیاں اٹھی نہیں تھیں کہ خاموش فضا میں ایک بار پھر معصوم بچے کی فریاد چیخوں کی صورت میں ابھری۔ وہ رو رہا تھا۔ شاید اپنی تنہائی پر احتجاج کر رہا تھا۔ اس لق و دق ویرانے میں تین لاشوں کے ساتھ وہ اکیلا تھا۔ اگر ہم اس ویرانے میں اسے تنہا چھوڑ جاتے تو پتہ نہیں وہ کب تک اکیلا رہتا۔ اس ننھے سے بچے پر اس پر کیا گزرتی۔ غزالہ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بچے کو اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن شیخ عاصم کی وجہ سے تذبذب میں تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی اس کے لئے شیخ کی رضامندی ضروری تھی لیکن میرے لئے ضروری نہیں تھی۔ میں اونٹنی سے اترا اور خیمے میں گھس کر روتے بلکتے بچے کو اٹھالیا۔ وہ حیران حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک دلدوز ہچکی اور رونا اس کے ننھے سینے سے بلند ہو رہی تھی۔ خیمے میں مجھے پانی سے بھرے ہوئے دو کین اور راشن کا ایک تھیلا بھی دکھائی دیا۔ میں نے یہ دونوں چیزیں بھی اٹھالیں۔ بچہ میں نے غزالہ کو تھمادیا اور راشن اپنے والی اونٹنی پر دیگر سامان کے ساتھ رکھ لیا۔

شیخ عاصم کی ہدایات کے مطابق میں نے نکیل کو حرکت دی تو اونٹنی ایک زبردست ہچکولے کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ایک تازی کتا تو مر چکا تھا' دوسرا ایک بار پھر زور و شور سے بھونکنے لگا۔ شیخ عاصم والی اونٹنی بھی اٹھ گئی تو ہم تیزی سے شمال کی طرف روانہ ہوگئے۔ عاصم آگے اور میں پیچھے تھا۔ چاند ایک بار پھر نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں صحرا دمکنے لگا تھا۔ اونٹنیاں میری توقع سے زیادہ تیز رفتار تھیں۔ وہ اپنی طویل ٹانگوں کے ساتھ ہمیں ریت پر اڑائے چلی جارہی تھیں۔ بچہ غزالہ کے سینے سے لگ کر بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ عاصم نے غزالہ کو عقب سے تھام رکھا تھا ورنہ شاید اس کے لئے تیز رفتار اونٹنی پر اپنا توازن برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ وہ تو پھر عورت تھی خود میرے لئے یہ سواری ازحد مشکل ثابت ہو رہی تھی۔ جسم کا ہر جوڑ چٹختا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی ہم پڑاؤ سے بمشکل تین چار میل دور آئے تھے کہ ایک روح فرسا منظر کی وجہ سے اضطراب کے پنجے میں جکڑے گئے۔ ایک بار پھر اپنے عقب میں نامعلوم فاصلے پر مجھے چمکتی ہوئی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ روشنیوں کی حرکت سے میں نے قیافہ لگایا کہ یہ گاڑیوں کی ہی روشنیاں ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ عاصم نے بھی ان روشنیوں کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا کہ میں اونٹنی کی رفتار تیز کردوں۔ اپنی اونٹنی کی رفتار وہ پہلے ہی تیز کر چکا تھا۔ یہ بڑی تشویشناک صورت حال تھی۔ بے شک اونٹنیاں میری توقع سے کہیں زیادہ تیز تھیں لیکن جیپوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ان جیپوں میں مخصوص ٹائر لگے تھے اور وہ خاص طور پر ریتلے علاقوں میں سفر کے لئے بنائی گئی تھیں۔

خونخوار شنکر ہمارے تعاقب میں تھا۔ مجھے اپنی جان کی زیادہ پروا نہیں تھی لیکن میرے ساتھ غزالہ بھی تھی' اور غزالہ کے حوالے سے شنکر کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ اس کے وہ شرمناک الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے ایک مقامی تقریب کے موقع پر کہے تھے۔ میرا تن بدن سلگ اٹھا اور شنکر کے خون کی پیاس ناقابل برداشت ہوگئی۔ میرے اندازے کے مطابق جیپوں سے ہمارا فاصلہ چار پانچ میل سے کم نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں فوری خطرہ لاحق نہیں مگر اطمینان کی بات پھر بھی نہیں تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہائی وے یہاں سے کتنی دور ہے اور آیا ہم ہائی وے کی طرف جا بھی رہے ہیں یا نہیں۔ پھر ہائی وے پر پہنچ کر بھی ہمیں تحفظ اسی صورت میں مل سکتا تھا جب ہم کسی بھری پری بستی میں پہنچتے یا پٹرولنگ پولیس سے ہماری ملاقات ہو جاتی۔ فی الوقت ہمارے پاس واحد راستہ یہی تھا ہم بغیر رکے اور بغیر رفتار کم کئے چلتے رہیں۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اب کسی بھی وقت سپیدہ سحر نمودار ہو سکتا تھا۔ صحرا میں سپیدۂ سحر کا نمودار ہونا ایک انوکھا منظر ہوتا تھا۔ یہ منظر دیکھنے کی تمنا میرے دل میں عرصے سے تھی۔ آج یہ منظر مجھے نظر آنے والا تھا لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ "موت کا منظر" ہر منظر کو پس منظر میں دھکیل چکا تھا۔ ہم ان دیکھے انجام کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہمارے چاروں طرف ریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ شیخ عاصم کا کہنا تھا کہ ہم شمال کی طرف سفر کر رہے ہیں' بظاہر یہ راستہ ہائی وے کی طرف نہیں جاتا تھا لیکن ہائی وے چونکہ قوس کی شکل میں خم کھاتی ہوئی گزرتی ہے لہٰذا جلد یا بدیر ہم اسے "ٹچ" کریں گے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں صبح صادق کی جھلک نظر آگئی۔ تاریکی کے بطن سے آناً فاناً پھوٹنے والی یہ روشنی بڑی عجیب اور قاتل تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس روشنی نے مشرقی افق کا احاطہ کرلیا۔ خورشید تابناک کی آمد آمد تھی۔ صحرا کے سینے پر ایک حشر خیز دن طلوع ہونے والا تھا۔ بتدریج اندھیرے کو اجالے نے پسپا کردیا۔ قرب و جوار ہماری نگاہوں کے سامنے اجاگر ہوگئے۔ اس نظر نواز منظر کو کوئی قادر الکلام شاعر ہی اپنے لفظوں میں بیان کرسکتا ہے۔

اپنے عقب میں ڈگمگانے والی منحوس روشنیاں اب مجھے دور سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ شاید وہ نشیب میں اوجھل تھیں' یا پھر ریتلے ٹیلے ہمارے درمیان حائل ہوگئے تھے۔ اونٹنیوں کی سخت جانی کی داد دینا پڑتی تھی۔ وہ تین گھنٹے سے مسلسل سفر کر رہی تھیں لیکن ان کی حرکات و سکنات میں تکان کا شائبہ نہیں تھا۔ دونوں اونٹنیوں کی دو دو [illegible] تھیں اس کے باوجود ہچکولوں نے برا حال کیا ہوا تھا۔ خاص طور سے غزالہ کے چہرے پر تو شدید تھکن کے آثار صاف پڑھے جاسکتے تھے۔ یقیناً وہ زبردست قوت برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی اور اونٹنی کی حتیٰ الامکان کوشش کر کے اپنے ساتھ ساتھ بچے کو بھی سنبھال رکھا تھا۔ اس کا ایک بازو بچے کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ہودے کے کنارے کو تھام رکھا تھا۔ اسی ہاتھ سے وہ اپنے چہرے پر آجانے والے بالوں کو گاہے بگاہے پیچھے ہٹاتی تھی' اپنی اوڑھنی درست کرتی تھی اور کسی وقت بچے کو تھپتھپاتی بھی تھی۔

جوں جوں سورج اوپر آتا گیا' خنکی غائب اور گرمی حاضر ہوتی گئی پھر دھیرے دھیرے یہ گرمی تپش میں بدل گئی۔ صحرا غضب ناک ہو کر دہکنے لگا تو بدن سے پسینہ دھاروں کی صورت پھوٹنے لگا۔ رات کو جس تیزی سے خنکی غالب آئی تھی اب اسی رفتار سے تپش بڑھتی جارہی تھی۔ عاصم جس ہائی وے کا ذکر کر رہا تھا اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ سڑک تو دور کی بات ہے اب قرب و جوار میں کہیں کوئی خشک جھاڑی یا ہموار زمین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی ریتلے ٹیلے تھے اور ان کے اوپر آگ برساتا آسمان تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہم راستہ بھٹک چکے ہیں اور ہائی وے کی طرف جانے کے بجائے صحرا میں آگے گھس آئے ہیں۔ یقیناً عاصم بھی یہ سب کچھ محسوس کر چکا تھا' اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں اندیشوں کی پرچھائیاں تھیں۔ اگر بات صرف راستہ بھولنے کی ہوتی تو زیادہ تشویشناک بات نہیں تھی۔ سنگین ترین مسئلہ یہ تھا کہ بے رحم قاتل ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں تو ہمیں نظر نہیں آیا تھا لیکن دن کی روشنی میں ہموار ریت پر ہم اپنے نقش پا صاف دیکھ سکتے تھے۔ یہ نقش پا اتنے واضح تھے کہ ہمارا تعاقب کرنے والوں کو کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی۔ تعاقب کے سلسلے میں اگر مجھے کوئی خوش فہمی تھی بھی تو وہ اب مکمل طور پر دور ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ایک ٹیلے پر سے میں نے اپنے عقب کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ مجھے جنوبی افق پر دو سیاہ دھبے صاف دکھائی دیئے تھے۔ یہ دھبے متحرک تھے اور ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی دو جیپیں تھیں جن کا ذکر انتخاب نے کیا تھا۔ ان جیپوں میں شنکر اور اس کے خونی لشکرے موجود تھے۔ اور ان کے ساتھ شیخ مشارب کے کارندے تھے۔

عین دوپہر کے وقت ہمیں چند صحرائی جھاڑیاں نظر آئیں۔ ہم ان جھاڑیوں کے برائے نام سائے میں ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ اونٹنی پر لدے ہوئے سامان میں بڑے سائز کی ایک چادر موجود تھی۔ میں نے یہ چادر سائبان کی صورت شاخوں سے باندھ دی۔ غزالہ نے بھی اپنی اوڑھنی سے سائبان کا کام لیا۔ اس کے رخسار تمازت سے سرخ ہو رہے تھے اور بال پسینے سے بھیگ کر گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ بچہ بھوک سے نڈھال تھا۔ زور زور رو کر غزالہ کی گود میں ہی سو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کسمسایا اور حالت نیند میں اس کے ننھے ہاتھ غزالہ کے سینے پر رینگنے لگے۔ شاید وہ دودھ پیتا یتیم ابھی تک خود کو ماں کی گود میں سمجھ رہا تھا اور شیر خوار کی حیثیت سے اپنی خوراک تلاش کر رہا تھا۔ لیکن یہ خوراک یہاں نہیں تھی اور نہ یہ اس کی ماں کا جسم تھا۔ غزالہ نے اپنی قمیص کا دامن پانی میں بھگو کر بچے کے چہرے پر پھیرا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بچے کو دودھ کی ضرورت تھی۔

میں نے اونٹنی پر بندھا ہوا سارا سامان کھول لیا۔ اس میں روز مرہ ضروریات کی کئی اشیا موجود تھیں۔ کھانے پینے کی اشیا میں پانی کا ایک کین تھا' کھجور اور مکئی کا ملیدہ تھا' بکری کا خشک گوشت تھا اور گھر میں بنے ہوئے بسکٹ تھے۔ غزالہ نے تین چار بسکٹ پانی میں بھگوئے انہیں چمچ سے ہلایا اور پتلا دلیا سا تیار کرلیا۔ اس کے بعد بچے کو جگا کر وہ چمچ کی مدد سے تھوڑا تھوڑا کرکے اسے کھلانے لگی۔ یہ ایک مشکل کام تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طور کر گزری۔ اس دوران میں ہم نے بھی تھوڑی بہت پیٹ پوجا کرلی۔ غزالہ نے شیخ عاصم کے اصرار کے باوجود کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے صرف

چند گھونٹ پانی کے لئے۔ حبس بہت زیادہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہوا میں سے آکسیجن ختم ہو گئی ہے اور ہم فقط کاربن ڈائی آکسائڈ میں لاحاصل سانس لے رہے ہیں۔ ہم کسی دور دراز صحرائی علاقے میں نہیں تھے۔ میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ اگر یہاں گرمی اور حبس کا یہ عالم ہے تو مشہور زمانہ ربع الخالی یا صحرائے سینا جیسے ریگزاروں میں انسان کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔

ہم یہاں زیادہ دیر بیٹھنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے لیکن شیخ عاصم سے اٹھنا محال ہو رہا تھا۔ کمر کے درد نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ گرم ریت پر چادر بچھا کر اوندھا لیٹ گیا تھا۔ [illegible] آرام پہنچانے کی کمزور سی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد دونوں اونٹنیوں کو بٹھا دیا۔ "میرا خیال ہے عاصم ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے عاصم سے کہا۔

وہ کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ اور چہرہ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ غزالہ نے اٹھ کر اسے پانی دیا اور بھیگے ہوئے کپڑے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اچانک میں نے شیخ عاصم کو چونکتے دیکھا۔ اگر اس کا رخ جنوب کی طرف ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ اسے تعاقب کرنے والوں کی جھلک نظر آئی ہے لیکن اس کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا۔ میں نے شیخ عاصم کی نظروں کا تعاقب کیا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ افق پر گہری سرخی نظر آ رہی تھی اور دھوپ کی آب و تاب اچانک ہی کم ہونے لگ تھی۔ غزالہ نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا اور حیران ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے عاصم سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔

شیخ عاصم کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ آندھی ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ غائب ہو گئی اور یوں محسوس ہوا جیسے ابر چھا گیا ہے۔ سائبان کے طور پر جو چادر شاخوں سے باندھی گئی تھی وہ ہوا کے زور سے اونچے نیچے ہلنے لگ تھی۔ شیخ عاصم کے چہرے پر نظر آنے والے خوف نے ہمیں بھی سراسیمہ کر دیا تھا۔ شیخ عاصم بولا "ان علاقوں میں ایسے جھکڑ چلتے رہتے ہیں کبھی یہ ہلکے اور کبھی بہت تیز ہوتے ہیں۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔"

شیخ کی ہدایت پر دونوں اونٹنیوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا اور پھر ایک اونٹنی کی نکیل کو جھاڑی کے گرد لپیٹ کر گرہ دے دی۔ شیخ عاصم نے اپنے ڈبی دار سرخ عمامے کو بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس کی تقلید میں غزالہ نے اپنی اوڑھنی چہرے کے گرد لپیٹ لی اور میں نے بھی [illegible] میں منہ سر چھپا لیا۔ صرف ہماری آنکھیں [illegible] دم بدم تاریک ہوتے افق کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ [illegible] نہیں آ رہا تھا کہ پانچ دس منٹ پہلے جن ریتیلے ٹیلوں پر دھوپ چمک رہی تھی وہاں اب تاریکی پھیل رہی ہے۔ سرخی مائل سیاہ جھکڑ بڑی تیزی سے ہمارے قریب پہنچ رہا تھا۔ فضا میں سنسنی سی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اونٹنیوں کی آڑ میں لیٹ جانا ہمارے لئے زیادہ مناسب رہے گا۔ شیخ عاصم نے میرے اس خیال کی تائید کی۔ ہم اونٹنیوں کے قریب آ بیٹھے۔ غزالہ نے بچے کو سائبان کی چادر میں اس طرح لپیٹ لیا کہ اس کا پورا جسم چھپ گیا۔ اونٹنیاں بھی جیسے صورت حال کی سنگینی سے آگاہ ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور کانوں کی حرکت میں اضطراب پایا جاتا تھا۔

شیخ عاصم نے سرسراتی آواز میں کہا "لگ رہا ہے کہ یہ بہت تیز قسم کا جھکڑ ہے۔"

بہت جلد تند و تیز ہوا نے ہمیں آ لیا۔ ہم تینوں نے خود کو اونٹنیوں کی آڑ میں اوندھے منہ گرا لیا اور اپنے چہرے گرم ریت میں گھسیڑ دیئے۔ آندھی کی رفتار میری توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ منہ زور جھکڑ ہمیں زمین سے اٹھائیں گے اور اڑا کر نامعلوم دوری پر پھینک دیں گے۔ جسم کے جو حصے کھلے تھے وہاں ریت کے ذرات سوئیوں کی طرح چبھ رہے تھے اور اس چبھن کی اذیت ناقابل برداشت تھی۔ میں نے اونٹنیوں کے بلبلانے کی آواز سنی۔ وہ سخت بے قرار تھیں۔ پھر اچانک مجھے شدید جھٹکا محسوس ہوا۔ میں جس اونٹنی کی آڑ میں لیٹا تھا وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری اونٹنی بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی۔ غزالہ اس اونٹنی کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ اونٹنی کے اٹھنے سے وہ مزید خوفزدہ ہو گئی۔ اس ڈر سے کہ اونٹنی اسے کچل نہ ڈالے وہ بچے سمیت اٹھ کر بھاگی۔ طوفانی ہوا کے تھپیڑوں نے اسے الٹا دیا اور وہ لڑھکتی ہوئی میرے قریب آن گری۔ اس کی ہمت تھی کہ لڑھکنے کے باوجود اس نے بچے کو اپنی بانہوں سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا اور چہرہ ننگا ہو گیا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ کسی جان لیوا اذیت سے

گزر رہی ہے۔ میں تین چار قدم دوڑ کر اس کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اسے اپنے جسم سے ڈھانپ لیا۔ وہ مکمل طور پر میرے بازوؤں میں تھی۔ میری پشت ہوا کے رخ پر تھی اور غزالہ کو تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بھینچ لی تھیں اور ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے تھے۔ خبر نہیں کہ ہوا کی اس بے رحم یورش میں ہمارے سانسوں کی آمد و رفت کیسے بحال تھی۔ کچھ دکھائی یا سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے خطرناک صحراؤں میں چلنے والی باد سموم کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا۔ یہ نہایت گرم اور زہریلی ہوا ہوتی ہے جو بلا کی رفتار سے چلتی ہے اور اپنی زد میں آنے والے ہر جاندار کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ ایسی ہوا عموماً چند منٹ کے لئے چلتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کا دورانیہ بیس منٹ تک بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس قاتل ہوا سے بچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہم جس طوفانی جھکڑ کی زد میں تھے وہ "باد سموم" تو نہیں تھا پھر بھی وہ ہمیں اذیت کی انتہا تک لے آیا تھا۔ اونٹنیاں بلبلا رہی تھیں اور رسا تڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم ان کی زد سے باہر تھے ورنہ وہ کبھی کا ہمیں روند چکی ہوتیں۔

آخر دس منٹ کی خوفناک یورش کے بعد ہوا کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی۔ ہمارے جسموں پر ریت چڑھ گئی تھی۔ میں ایک ہاتھ سے مسلسل یہ ریت ہٹاتا جا رہا تھا ورنہ ہم دفن ہو کر رہ جاتے۔ شیخ عاصم کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر اوندھا پڑا تھا اور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ غزالہ بدستور میری بانہوں کے حلقے میں تھی۔ جیسے میں نے غزالہ کو بانہوں میں لے رکھا تھا اس طرح غزالہ نے بچے کو بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

آخر یہ طوفانی جھکڑ گزر گیا۔ فضا ریت اور گرد سے صاف ہوئی تو ہم ارد گرد دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ یہ منظر حیران کن تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہوا ہمیں اڑا کر کسی اور جگہ لے آئی ہے۔ یہ وہ مقام ہی نہیں لگتا تھا جہاں ہم نے اونٹنیاں باندھی تھیں۔ ریت کے پورے پورے ٹیلے ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو چکے تھے۔ ہماری اونٹنیوں کے نقوش پا جو ایک طویل راہ گزر کی طرح ہموار ریت پر دکھائی دیتے تھے سرے سے غائب ہو چکے تھے۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔ اب تک یہ نقوش پا ہی ہمارے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ہم نے چہروں سے کپڑے ہٹائے۔ دونوں اونٹنیوں کی نکیلوں سے خون رسنے لگا تھا۔ اضطراب کے عالم میں انہوں نے رسا تڑانے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی تھیں۔

مطلع ذرا صاف ہوا تو ہم اونٹنیوں پر سوار ہو گئے۔ میں نے شیخ عاصم سے کہا۔

"ہمارے قدموں کے نشان تو ختم ہو گئے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم اپنی سمت تبدیل کر لیں۔"

عاصم نے میرے خیال کی تائید کی۔ راستہ تو ہم بھول ہی چکے تھے۔ اب ہماری اولین ترجیح یہی تھی کہ ہم کسی طرح اپنے متعاقب افراد سے پیچھا چھڑا لیں۔ لہٰذا انہیں چکمہ دینے کے لئے ہم نے اپنے سفر کی سمت میں تھوڑی سی تبدیلی کی۔ اب ہم شمال کے بجائے شمال مغرب کی طرف بڑھنے لگے۔

رات گئے تک ہم نے بغیر رکے سفر جاری رکھا۔ تیز جھکڑ کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر رات کو بھی زیادہ سردی محسوس نہیں ہوئی۔ "بائی وے" اب بھی ہماری نظروں سے اوجھل تھی تاہم آج سفر میں ہمیں ایک کامیابی حاصل ہوئی تھی ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اندھیرا گہرا ہونے کے باوجود ہمیں دور و نزدیک کہیں بھی تعاقب کرنے والی روشنیاں نظر نہیں آئیں۔ ہمارا عقب بالکل تاریک اور غیر مشکوک نظر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ دوپہر کے وقت زبردست طوفان باد کی وجہ سے ہمارے قدموں کے نشان مٹ گئے تھے۔ اونٹنی پر لدے ہوئے سامان میں پیراشوٹ کا ایک مختصر خیمہ بھی موجود تھا۔ خیمے کی اونچائی زیادہ نہیں تھی لیکن لمبائی چوڑائی اتنی ضرور تھی کہ تین چار افراد پاس پاس لیٹ سکتے تھے۔ میں نے خیمہ نکال کر ہموار جگہ پر گاڑا۔ آگ جلانے کا سامان موجود تھا لیکن آگ جلانا ہمارے لئے مناسب نہیں تھا۔ بچے کو دوپہر کی طرح غزالہ نے پانی میں بسکٹ گھول کر پلائے اور تھوڑا سا شہد چٹایا۔ بچہ ماں کی جدائی میں نڈھال تھا۔ وہ مقامی لب و لہجے میں کسی وقت ماں کو پکارتا تو ہمارے دل ہل جاتے۔ غزالہ اسے بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھی۔

غزالہ نے رات کے وقت بھی ایک دو لقمے ہی لئے اور پانی پی کر لیٹ گئی۔ عاصم درد محسوس کر رہا تھا اور بے حد تھکا ہوا بھی تھا۔ غزالہ نے اسے درد کش اور خواب آور دوا کھلا دی تھی۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ خیمہ اتنا مختصر تھا کہ میں اور شیخ عاصم پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ شیخ عاصم کی دوسری جانب غزالہ بچے کے ساتھ موجود تھی۔ بچہ مسلسل "ریں ریں" کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ اسے پچکارنے بھی لگتی تھی۔ میں سوچنے

بچے کے ساتھ عورت کتنی مکمل نظر آتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "گود بھرنے" کی خواہش کو عورت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چند ماہ پہلے غزالہ کی گود بھی تو بھرنے والی تھی مگر پھر اس کے ساتھ ایک سانحہ پیش آ گیا تھا۔ اس واقعے کی تلخ یادیں ابھی تک میرے سینے میں دھوئیں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد بچہ سو گیا۔ بس غزالہ اور میں خیمے میں جاگتے رہ گئے۔ ہم بہت قریب تھے لیکن ہمارے درمیان شیخ عاصم حائل تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو ہماری قربت میں بے اندازہ دوری چھپی ہوئی تھی۔ خیمے سے باہر بیکراں صحرا تھا اور تاروں سے بھرا ہوا سیاہ آسمان۔ کچھ ہی دیر بعد چاند طلوع ہوا اور اس کی روشنی خیمے میں سے چھن چھن کر آتی محسوس ہوئی۔ یہ بڑا خواب ناک سا منظر تھا۔ کچھ دیر بعد غزالہ سو گئی۔ میں اٹھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ تھکا ہوا تو میں بھی بہت تھا لیکن سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

میں ریتیلے ٹیلے پر بیٹھ گیا اور دور دور تک چھٹکی ہوئی چاندنی دیکھنے لگا۔ اونٹنیاں خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کی لمبی گردنیں ایک سمت میں تھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دن بھر کے سفر کے بعد ہم شنکر اور اس کے ساتھیوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ مگر احتیاط پھر بھی لازم تھی۔ دوسرا سوال جو بار بار ذہن میں اٹھ رہا تھا یہ تھا کہ کیا ہم کل بھی اس ریگزار سے نکلنے میں کامیاب ہو سکیں گے یا نہیں؟ ہم آج دن بھر پانی بچاتے رہے تھے۔ اگر کل بھی اسی رفتار سے پانی کم ہوتا تو پھر پرسوں کے لئے ہمارے پاس بالکل نہیں بچتا۔ پانی کے بغیر اس لق و دق ویرانے میں زندگی کا تصور بھی محال تھا۔ یہ بڑا دردناک قسم کا تصور تھا۔ میں رات تیسرے پہر تک جاگتا رہا۔ پھر اٹھ کر خیمے میں چلا گیا اور سو گیا۔

اگلی صبح بڑی شفاف اور چمکدار تھی۔ سرخ انگارے جیسا افق دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ آج سورج قیامت ڈھائے گا۔ میں کافی دیر تک سوتا رہا تھا۔ اٹھا تو غزالہ خیمے سے باہر مصروف کار نظر آئی۔ اس نے تھوڑی سی آگ جلائی تھی اور ایک پتیلی میں دلیا ابال رہی تھی۔ کھجور اور تکی کے ملیدے کو بھی اس نے گرم کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے سامنے قابل قبول ناشتا موجود تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ شیخ عاصم کچھ گم صم سا ہے۔ شاید وہ غزالہ سے کچھ خفا تھا۔ غزالہ کی دس باتوں کا جواب وہ بس ایک آدھ لفظ میں دے رہا تھا اور "غزالہ" بھی بہت پھنس کر اس کے حلق سے نکلتا تھا۔ اسی طرح وہ میرے ساتھ بھی فاصلے سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عاصم نے کل والے واقعے سے اثر لیا ہے۔ طوفانی جھکڑ میں غزالہ کو میری بانہوں میں دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ لگی تھی اور وہ "جلاپا" محسوس کر رہا تھا۔ غزالہ کا مجھ سے بے تکلفی کے ساتھ بات کرنا بھی اسے زیادہ پسند نہیں تھا۔

اگر شیخ عاصم کے رویے کا سبب "غزالہ کی محبت" ہوتا تو یقیناً مجھے افسوس نہ ہوتا لیکن میں جانتا تھا یہ محبت نہیں ہے۔ یہ ملکیت کا احساس تھا۔ شیخ پتلون قمیص میں ملبوس ہونے کے باوجود ایک قدیم قبائلی کی طرح سوچ رہا تھا۔ غزالہ اس کے حرم کا حصہ تھی۔ اس کی منکوحہ اور اس کی ملکیت تھی۔ شیخ عاصم میرے لئے ذرا سی گنجائش بھی پیدا نہیں کر پا رہا تھا۔ چہ جائیکہ میں غزالہ کو بانہوں میں لوں اور بے تکلفی کے ساتھ اس سے بات کروں۔ غالباً غزالہ بھی شیخ عاصم کے رویے کو محسوس کر چکی تھی۔ وہ اس کے آگے بچھے بچھی جا رہی تھی اور اس کی دلجوئی کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر شیخ کا چہرہ بدستور جذبات سے عاری نظر آ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شیخ عاصم کو غزالہ کا بچے میں دلچسپی لینا بھی زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ یہ بات میرے نزدیک طے تھی کہ شیخ ایک خود پسند شخص ہے۔ وہ یہ بات کیسے قبول کر سکتا تھا کہ اسے کسی بھی حوالے سے نظر انداز کیا جائے۔ غزالہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز و محور شیخ کو ہونا چاہیے تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ بچے کو دیکھ کر شیخ عاصم کی نگاہ میں ایک بار بھی ہمدردی یا ترس کے جذبات نہیں ابھرے۔

کھانا وغیرہ کھا کر ہم نے خیمہ اکھاڑا۔ سامان سمیٹا اور سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد شیخ عاصم نے مغرب کی طرف سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہائی وے تک پہنچنے کی امید تو اب ختم ہو چکی تھی۔ شیخ کا خیال تھا کہ ہم مغرب کی سمت میں سفر کر کے شاید کسی آبادی یا نخلستان تک پہنچ جائیں۔ سامان والی اونٹنی اس مرتبہ بھی میرے نیچے تھی۔ عاصم اور غزالہ دوسری اونٹنی پر سوار تھے۔ بچہ غزالہ کے پاس تھا۔ اس کی مسلسل "ریں ریں" اب بند ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ غزالہ سے مانوس ہو گیا تھا۔ دوران سفر میں بھی شیخ جھنجلایا ہوا سا رہا۔ میں نے ایک دو بار اس سے بات کی تو اس نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ایک موقع پر جب گرمی کی شدت سے بچے نے کسمسانا اور رونا شروع کیا تو شیخ نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ غزالہ نے کوئی بات کہی تو اسے بھی شیخ کی ڈانٹ سننا پڑی۔

دوپہر کو گرمی پھر اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ریت کا ذرہ ذرہ انگارا بن گیا۔ شیخ کے مقابلے میں غزالہ اور میں گرمی کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ خاص طور سے غزالہ کی نرم و نازک جلد تو جھلس کر رہ گئی تھی۔ اس کے ہونٹ بالکل سفید ہو رہے تھے۔ ہم پانی بڑی کفایت شعاری سے استعمال کر رہے تھے مگر سورج ہمارا پسینہ بہانے میں بالکل کفایت شعاری نہیں برت رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت ہمیں پڑاؤ کے لئے بڑی مناسب جگہ دکھائی دی۔ ریگستان کے بیچوں بیچ ایسی جگہ کا ملنا دیران کن تھا۔ یہاں چند صحرائی درخت موجود تھے۔ ایک ریتلے ٹیلے نے آڑ سی بنا دی تھی۔ یہ ٹیلا ہمیں نہ صرف شدید لو سے بچا سکتا تھا بلکہ یہاں درختوں میں پانی کی موجودگی کا پتا بھی لگایا جا سکتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اردگرد درخت موجود ہیں تو تھوڑی بہت مقدار میں کہیں پانی بھی ہوگا۔

میں نے کہا "عاصم، دو تین گھنٹے میں شام ہو جائے گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم یہیں پڑاؤ ڈال لیں۔"

عاصم نے فوراً ناک بھوں چڑھائی "میری رائے مختلف ہے۔ ہم دو تین گھنٹے میں کافی فاصلہ طے کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آبادی تک پہنچ جائیں۔"

"اور آگے پھر ریت کے سوا کچھ نہ ملا تو؟"

"یہ رسک تو ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ابھی تھک ہار کر بیٹھ جائیں۔"

شیخ عاصم کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس جان لیوا ویرانے سے بھی بڑھ کر جو چیز اسے تنگ کر رہی ہے وہ میری موجودگی ہے۔ اسے یہ ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا کہ میں غزالہ کے شانہ بشانہ سفر کروں، ان دونوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھاؤں اور ایک مختصر خیمے میں ان کے ساتھ رات گزاروں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اب تک شیخ عاصم مجھے غزالہ کے حوالے سے رقابت کی آگ میں جلانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اب اس نے خود جلنا شروع کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ تندرست نہیں رہا تھا۔ حالات پر اس کی گرفت روز بہ روز کمزور پڑ رہی تھی اور اس حوالے سے اس میں احساس محرومی پیدا ہو رہا تھا۔

غزالہ نے دبے لفظوں میں کہا "بچہ نڈھال ہو رہا ہے۔"

شیخ یکدم بھڑک اٹھا "تم کمل کرواتے کیوں نہیں دیتی ہو۔ اگر شاہ جہاں کی طرح تمہارا بھی یہ خیال ہے کہ پڑاؤ یہاں ہونا چاہیے تو پھر ٹھیک ہے۔"

غزالہ نے گھبرا کر کہا "نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو چاہتی تھی کہ پانچ دس منٹ یہاں رک جائیں۔"

شیخ عاصم نے اونٹنی کو بٹھانے کے لئے نکیل کو مخصوص انداز میں جھٹکے دیئے اور بولا "جب رکنا ہے تو پھر رک جاتے ہیں۔ پانچ دس منٹ کیا اور ساری رات کیا۔"

اس نے اونٹنی بٹھا دی اور نیچے اتر آیا۔ اس کا انداز ناراضگی کا تھا۔ غزالہ کچھ دیر متذبذب بیٹھی رہی پھر وہ بھی بچے سمیت اتر آئی۔ بچہ واقعی سخت گرمی سے نیم جان تھا۔ تو نے اس کی پیشانی پر آنچلے سے ڈال دیئے تھے۔ غزالہ اور عاصم دونوں اتر آئے تو مجھے بھی اپنی اونٹنی کو بٹھانا پڑا۔ پچھلے دو دن کے تجربے سے میں اونٹنی کو اٹھانے بٹھانے میں چابک دست ہو گیا تھا۔

اس رات ہم نے اسی ٹیلے کے دامن میں پڑاؤ ڈالا۔ میں اور عاصم درختوں میں کافی دیر پانی کو کھوجتے رہے تاہم ناکامی ہوئی۔ ہاں کئی جگہوں پر زمین کی رنگت وغیرہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں زیر زمین پانی کی سطح کافی بلند ہے۔ یعنی اگر ہمارے پاس بیلچے وغیرہ ہوتے اور ہم "دل جمعی" سے کھدائی کرتے تو ممکن تھا کہ پانی تک پہنچ جاتے۔ شام کے بعد جب ہر طرف تیرگی چھا گئی تو غزالہ نے آگ روشن کی اور ہمارے کھانے کا انتظام کیا۔ خیمے کے اندر بچہ "ریں ریں" کر رہا تھا اور باہر وہ عارضی چولہے کے پاس آگ اور دھوئیں سے دست و گریباں تھی۔ پاس ہی دونوں اونٹنیاں جنبی ان نیم خشک شاخوں پر منہ مار رہی تھیں جو ہم نے قریبی درختوں سے توڑی تھیں۔ غزالہ کو اس حالت میں دیکھ کر یہ یقین کرنا بے حد مشکل تھا کہ وہ ایک گائناکالوجسٹ ہے اور اسے جواں سالی میں ہی ایک کامیاب معالج تصور کیا جانے لگا ہے۔ شاید اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین کرنا بھی مشکل تھا کہ غزالہ کے پاس ہی جو خستہ حال لاغر شخص پسینے میں شرابور بیٹھا ہے وہ امارات کا ایک دولت مند رئیس ہے اور اس کا کاروبار کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے ساتھ یہ یقین کرنا بھی مشکل تھا کہ بڑھی ہوئی شیو اور الجھے ہوئے بالوں والے جس شخص نے کھجور کے تنے سے ٹیک لگا رکھی ہے اور گرد آلود رائفل کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ شاہ جہاں عرف جہانی استاد ہے۔

رات کا کھانا کھاتے ہوئے غزالہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ "کیا ہوا اب؟" عاصم نے پوچھا

"کچھ نہیں" وہ منمنائی۔

عاصم کے اصرار پر اس نے بتایا کہ اسے اپنی فرینڈ سلطانہ یاد آ رہی ہے۔

معلوم نہیں اسے واقعی سلطانہ یاد آ رہی تھی یا پھر شیخ عاصم کے روکھے پھیکے رویے نے اسے آزردہ کر رکھا تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں باتیں ہوں۔ کھانا کھاتے کھاتے میں یکدم ٹھٹک گیا۔ ہوا کے دوش پر مجھے ایک آواز سنائی دی تھی۔ بہت مدھم سی آواز تھی اور مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ انسانی آواز ہے۔ پہلی بار تو میں نے اسے اپنا وہم جانا لیکن جب آواز دوسری بار آئی تو میرے کان کھڑے ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ رائفل تک پہنچ گئے۔ میں نے شیخ عاصم کے تاثرات دیکھے۔ یقیناً اس نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔

میں بھاگ کر ٹیلے کی بلندی پر پہنچا۔ رات کی تاریکی ابھی پوری طرح پھیلی نہیں تھی' مغربی افق خاصا روشن نظر آ رہا تھا۔ مجھے کافی فاصلے پر کچھ متحرک ہیولے دکھائی دیئے۔ پھر روشنیاں چمکیں۔ میں نے عاصم کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ چولہے میں سلگتی آگ بجھا دے۔

"کیا ہے؟" عاصم نے چلا کر پوچھا

"کچھ لوگ ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں" میں نے جواب دیا

"کس پر ہیں؟"

"لگتا ہے گھوڑوں پر ہیں"

"شفقر اور اس کے ساتھی ہوں گے" شیخ کی لرزاں آواز ابھری۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا" میں نے کہا اور رائفل سیدھی کر کے پوزیشن سنبھال لی

بلندی پر ہونے کے سبب میں بڑی اچھی پوزیشن میں تھا۔ عاصم نے بھی اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ اس نے غزالہ کو خیمے میں گھسنے کی ہدایت کی اور خود ایک کھجور کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ نو وارد قریب تر پہنچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں یقیناً مشعلیں تھیں اور وہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی تعداد دس کے قریب تھی' وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی ان کی آوازیں بھی ہمیں صاف سنائی دینے لگیں۔ وہ مقامی زبان بول رہے تھے۔

ہمارے قریب پہنچ کر ان کی رفتار کم ہوئی اور وہ خیمے سے بیس تیس قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ اپنے حلیے اور لب و لہجے سے وہ بدو دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے چار پانچ کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں کوئی نیزہ نما چیز تھی' باقی بھی یقیناً کسی نہ کسی طور مسلح تھے۔ ان میں سے ایک شخص جو کافی تنومند تھا اور جس کا تازی گھوڑا مچل مچل جا رہا تھا' بلند آواز میں بولا' زبان مقامی تھی۔

جواب میں شیخ عاصم نے کچھ کہا۔ تنومند شخص نے پھر کوئی سوال کیا۔ عاصم نے اس کا جواب دیا اور پسٹل سمیت درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ شیخ عاصم اور تنومند شخص کے درمیان عربی میں مکالمہ ہوا پھر شیخ عاصم نے بلندی کی طرف منہ کر کے مجھے پکارا اور کہا کہ میں نیچے آ جاؤں۔

میں نیچے چلا آیا۔ شیخ عاصم نے کہا "شاید ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایک آبادی کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک نخلستان ہے۔ وہاں دو ڈھائی سو نفوس پر مشتمل آبادی ہے۔ یہ لوگ وہیں سے آئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی پالتو بندر گم ہو گیا ہے۔ اسے ڈھونڈ رہے ہیں"

"پالتو بندر؟"

"ہاں۔ ان کے قبیلے کی "سردار" کا بندر ہے۔ پنجرے سے نکل بھاگا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسی طرف آیا ہے"

کچھ دیر شیخ عاصم گھڑ سوار افراد سے گفتگو کرتا رہا۔ گھڑ سواروں کا لب و لہجہ دیہاتیوں جیسا تھا۔ وہ بہت جلدی میں دکھائی دیتے تھے۔ پھر وہ چاروں طرف پھیل کر گمشدہ بندر کو تلاش کرنے لگے۔ ان میں سے چار افراد درختوں میں گھس گئے' باقی ادھر ادھر پھیل گئے۔ بندر کو پکڑنے کے لئے ان کے پاس ایک بڑا جال بھی تھا۔ تلاش کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو بلند آواز میں مخاطب بھی کر رہے تھے۔ خاموش صحرا ان کی آوازوں سے گونجنے لگا تھا۔

اب غزالہ بھی بچے سمیت خیمے سے باہر نکل آئی تھی اور درختوں میں چکراتی ہوئی مشعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ شیخ عاصم اب تک وہیں کھڑا تھا جہاں کھڑے ہو کر اس نے گھڑ سواروں کے سرغنہ سے بات کی تھی۔ اچانک غزالہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ٹیلے کے عقب سے ایک سایہ سا اچھل کر شیخ عاصم پر آن پڑا تھا' یہ بڑے سائز کا ایک سیاہ بندر تھا۔ بندر کا دھکا لگنے سے شیخ عاصم پشت کے بل گرا تھا اور اس کا پسٹل دور لڑھک گیا تھا۔

غزالہ کی چیخ نے کئی گھڑ سواروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان میں سے کئی ایک نے بندر کو شیخ عاصم سے گتھا دیکھ لیا۔ وہ موقع کی طرف لپکے۔ گھڑ سواروں کا سرغنہ سب سے آگے تھا۔ وہ ناقابل فہم زبان میں چلا رہا تھا۔ عاصم پر حملہ آور ہونے والا بندر نہایت خطرناک تھا۔ اس کے

سے "خوخو" کی لرزہ خیز آواز نکل رہی تھی اور وہ کسی درندے کی طرح عاصم کے سینے پر سوار ہو کر اس کی گردن میں پنجے گاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے تاخیر کی تو وہ عاصم کی گردن ادھیڑ دے گا۔

میں نے بلا تامل رائفل سیدھی کی اور بندر کا نشانہ لے لیا۔ میرا انداز دیکھا تو گھڑ سواروں کا حبشی سرغنہ تڑپ کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے رائفل کی نال اوپر اٹھا دی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ ناقابل فہم زبان میں چیخ رہا تھا۔ وہ مجھے فائر سے روکنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اگر تاخیر ہوئی تو عاصم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ خون خوار جانور اس پر پوری طرح حاوی ہو گیا تھا۔ میں نے جب پانی سر سے گزرتے دیکھا تو ٹانگ چلا کر حبشی کو دور پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری رائفل نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے اور بدمست بندر اچھل کر دور جا گرا۔ سارے کے سارے گھڑ سوار جیسے سکتے کی حالت میں رہ گئے تھے' شاید انہیں ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ میں نے بندر کے بدن میں دو سوراخ کر ڈالے ہیں۔

یکایک کسی نے عقب سے میرے سر پر بہت زور دار ضرب لگائی۔ میں چکرا کر اوندھے منہ ریت پر گرا۔ دو مضبوط ہاتھ میری رائفل پر آئے اور ایک "طوفانی جھٹکے" نے رائفل میرے ہاتھوں سے نکال دی۔ میں نے دیکھا' کئی رائفلوں کی نالیاں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں اور قہر ناک نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں۔ غزالہ بچے کو سینے سے چمٹائے خوف زدہ کھڑی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر بندر کا جسم آخری بار پھڑک کر ساکت ہو چکا تھا۔

حبشی سرغنہ نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ پھر مجھے کھینچ کر سیدھا کھڑا کر دیا گیا۔ بندر کی ہلاکت کا شدید رد عمل ہوا تھا۔ بہرحال مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ میرا یہ اطمینان اس وقت مزید گہرا ہو گیا جب میں نے ایک مشعل کی روشنی میں شیخ عاصم کو دیکھا۔ اس کی قمیص کی دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ سامنے سے اس کی گردن پر گہری خراشیں آئی تھیں اور ان زخم نما خراشوں سے خون کی دھاریاں بہہ کر اس کے سینے تک چلی گئی تھیں۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

گھڑ سواروں کا سرغنہ لپک کر بندر کے سرہانے پہنچا۔ مشعلوں کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا گیا۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور دوسری دل کے مقام پر پیوست ہو گئی تھی۔ اس کے جسم سے بہنے والے خون نے ارد گرد کی ریت کو سیاہ کر رکھا تھا۔ اگر گھڑ سواروں کا خیال تھا کہ جانور کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوگی تو انہیں مایوسی ہوئی۔ گھڑ سواروں کا سرغنہ بے حد مشتعل نظر آ رہا تھا۔ اس نے شیخ عاصم سے تند و تیز لہجے میں بات کی۔ اسی دوران میں چار پانچ مزید گھڑ سوار بھی موقع پر پہنچ گئے۔ یہ بھی بدو ہی تھے' ان کے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ بندر کی لاش دیکھ کر اور سرغنہ کی باتیں سن کر وہ بھی مشتعل نظر آنے لگے۔ وہ بلند آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں دو افراد نے خیمے کو اکھاڑ پھینکا اور ہمارا سارا سامان قبضے میں لے لیا۔ غزالہ بھی بچے سمیت خود کار رائفل کی زد پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہراس سمٹ آیا تھا۔

اچانک... بالکل اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ عاصم موقع پر موجود نہیں۔ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ٹیلے کے عقب میں اوجھل ہو گیا تھا۔ دراصل گھڑ سواروں کی ساری توجہ مجھ پر تھی کیونکہ میں نے فائرنگ کی تھی۔ نئے آنے والے گھڑ سوار اور سرغنہ بندر کی لاش کی طرف متوجہ تھے۔ شیخ عاصم درختوں کے قریب کھڑا تھا اور وہاں مشعلوں کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ اس نے صورت حال کا فائدہ اٹھایا تھا اور گہری تاریکی میں روپوش ہو گیا تھا۔

گھڑ سواروں کو عاصم کی غیر موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب بندر کی خونچکاں لاش کو بڑے احترام سے ایک گھوڑے پر بار کیا جا چکا تھا۔ سب سے پہلے حبشی نے ہی ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تھی۔ پھر سب گردنیں گھما گھما کر دیکھنے لگے۔ سرغنہ زور سے چیخا اور اس نے انگلی سے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ کئی گھڑ سوار ایڑ لگا کر درختوں کی طرف لپکے۔

سرغنہ نے غزالہ کو اڑنگا لگا کر پشت کے بل گرا دیا اور اس پر رائفل تان لی۔ اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' ایک جال عقب سے اچھلا اور مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بدوؤں نے بڑی چابک دستی سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دیا گیا اور جال کی گرفت مضبوط کر دی گئی۔ غزالہ کے گرنے کے بعد بچہ بھی ریت پر لڑھک گیا تھا اور حلق پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ گھڑ سوار پہلے غزالہ کے ہاتھ باندھنا چاہتے تھے مگر پھر اس خیال سے کہ بچے کو کون چپ کرائے گا' انہوں نے صرف غزالہ کی تلاشی لینے پر اکتفا کیا۔

مجھے جال میں اچھی طرح لپیٹ کر کسی "بستر بند" کی طرح گھوڑے کی پشت پر لاد دیا گیا۔ غزالہ اور بچے کو اونٹنی پر سوار کرا دیا گیا۔ گھڑ سوار چاروں طرف چکرا رہے تھے۔ ان

کے ہاتھوں میں روغنی مشعلیں تھیں۔ وہ عاصم کی تلاش میں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ عاصم ان کی گرفت سے بچ نہیں سکے گا۔ اونچے نیچے ریتیلے ٹیلوں کے سوا یہاں چھپنے کو کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ درختوں میں بھی وہ زیادہ دیر خود کو روپوش نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھر ریت پر اس کے قدموں کے نشانات تھے جن سے وہ کسی صورت پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹا ہم وہیں کھڑے رہے۔ پھر گھڑ سوار دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک ٹولی عاصم کی تلاش میں وہیں رہ گئی۔ دوسری ہمیں لے کر مغرب کی سمت روانہ ہوئی۔ عاصم کا نہ پکڑے جانا میرے لیے خوش آئند تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حیرانی کا باعث بھی تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود کو چھپانے میں کیسے کامیاب رہا ہے۔ گھوڑے چلنے کی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ گھڑ سواروں نے میری تلاشی لینے کے بعد مجھے گھوڑے پر لادا تھا لیکن پنڈلی والا خنجر ابھی تک میرے پاس تھا۔ گھوڑے پر لادے جانے سے پہلے ہی میں نے خنجر کو پنڈلی سے نکال کر بڑی صفائی سے اپنی آستین میں چھپا لیا تھا۔ اب میں گھوڑے پر اوندھے پڑے پڑے بھی آسانی سے جال کاٹ سکتا تھا۔ جال کاٹنے کے بعد کسی بدو سے رائفل چھیننا اور مار دھاڑ شروع کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر میں ایسی "مہم جوئی" میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور ہمیں کہاں لے جاتے ہیں۔

صرف پانچ دس منٹ کے سفر کے بعد ہمیں ایک نخلستان کے آثار نظر آنے لگے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں کھجور کے بلند و بالا درخت ہوا کے زور سے ہل رہے تھے۔ کہیں کہیں ناگ پھنی اور تاڑ کے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر شیخ عاصم کسی طور یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو پھر اس بات کے "چانسز" تھے کہ اس نے خود کو بدو گھڑ سواروں سے بچا لیا ہو۔ کم از کم وقتی طور پر تو وہ محفوظ ہو سکتا تھا۔

ہم تھوڑا اور آگے گئے تو ایک بستی کے آثار نمودار ہو گئے۔ درختوں تلے بہت سے۔ پختہ جھونپڑے اور مٹی کے گھروندے نظر آ رہے تھے۔ یہاں مشعلوں اور چراغوں وغیرہ کی روشنی تھی۔ جونہی ہم بستی میں پہنچے بہت سے لوگ گھروں سے نکل آئے۔ ان میں بچے بوڑھے جوان سب ہی شامل تھے۔ شیخ عاصم نے بتایا تھا کہ بستی دو ڈھائی سو نفوس پر مشتمل ہے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ بستی کے مکینوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

بندر کا مردہ جسم دیکھ کر وہ سب حیران نظر آ رہے تھے' اس کے علاوہ وہ اس بات پر بھی حیران تھے کہ گھڑ سوار اپنے ساتھ دو قیدی اور دو اونٹنیاں لے کر واپس آئے تھے۔ چند گلیوں میں سے گزار کر ہمیں ایک پختہ عمارت کے وسیع احاطے میں پہنچایا گیا۔ یہ عمارت اپنی بناوٹ اور وسعت کے لحاظ سے انوکھی تھی۔ دیواریں بہت موٹی اور نیم پختہ تھیں۔ دروازے محرابی تھے۔ میں نے ایک خوب رو لڑکی کو دیکھا۔ وہ قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا تھی۔ عربی طرز کی شلوار اور قمیص پر بہت سے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اس کے سانولے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں فراخ دلی سے کاجل لگایا گیا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا اس لڑکی کا باپ قبیلے کا سردار تھا لیکن وہ تین چار سال سے فالج کا شکار ہو کر بستر پر پڑا تھا۔ یہ لڑکی جس کا نام شاری تھا' اس کی واحد اولاد تھی۔ قبیلے کے دستور کے مطابق آئندہ قبیلے کی سرداری شاری کو ہی سنبھالنا تھی۔ باپ کی بیماری کی نوعیت ایسی تھی کہ شاری کو باپ کی زندگی میں ہی سرداری کے سارے اختیارات مل گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ بندر کا مردہ جسم دیکھ کر اور سرغنہ کی باتیں سن کر لڑکی کا چہرہ غضب ناک ہو گیا اور اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ وہ فرطِ جذبات سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پھر وہ دندناتی ہوئی اندر گھسی' باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں قریباً دس فٹ لمبا چرمی کوڑا تھا۔ وہ بے دریغ مجھ پر کوڑا برسانے لگی۔ میری پشت اور ٹانگوں میں جیسے کسی نے دہکی ہوئی سلاخیں اتار دی تھیں۔ بہرحال میں ضبط کیے پڑا رہا۔ غزالہ اس سفاکی پر بے چین ہو کر چیخی تو لڑکی غضب ناک ہو کر اس پر پل پڑی۔ غزالہ کو بھی چار پانچ شدید ضربیں سہنی پڑیں۔ پھر ایک عمر رسیدہ شخص نے آگے بڑھ کر شاری نامی اس لڑکی کا ہاتھ روکا اور اسے سمجھاتا بجھاتا ہوا اندر لے گیا۔

چند منٹ بعد یہی شخص باہر نکلا۔ اس نے میرے قریب آکر ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا "کیا تم انگریزی سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "کہاں سے آئے ہو تم؟"

میں نے کہا "میں پاکستانی ہوں۔ ابو ظہبی میں اپنے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہم شکار کے لیے نکلے تھے ہماری گاڑی صحرائی علاقے میں خراب ہو گئی۔ ہم راستہ بھٹک کر دور نکل آئے۔"

عمر رسیدہ شخص نے مشکوک لہجے میں پوچھا "تمہارے ساتھ یہ بچہ کس کا ہے؟"

میں نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے کہا "راستے میں دوران پہلے یہ بچہ ہمیں ایک اجڑے ہوئے پڑاؤ میں ملا تھا۔ اس کے ماں باپ کو غالباً صحرائی لٹیروں نے ہلاک کردیا تھا۔ بچہ بھوک پیاس سے جاں بہ لب تھا' ہم اٹھا کر ساتھ لے آئے۔"

عمر رسیدہ شخص نے بچہ فوراً غزالہ سے لے لیا "یہ بچہ مقامی باشندہ ہے۔ یہ ہمارے پاس رہے گا۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ غزالہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ وہ کچھ بھی کہہ نہ سکی تھی۔

ہمیں چاروں طرف سے رائفل بردار افراد نے گھیرا ہوا تھا۔ میں ایسی مچھلی کی طرح زمین پر پڑا تھا جسے ابھی ابھی دریا سے پکڑ کر لایا گیا ہو اور اب اس کا جائزہ لیا جا رہا ہو۔ جال نے پوری طرح مجھے لپیٹ رکھا تھا۔ عمر رسیدہ شخص کے اشارے پر دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے جال کی چند رسیاں کاٹیں اور پھر جال کھول کر مجھے باہر نکال لیا۔ رائفل بردار بڑی ہوشیاری سے مجھے کور کیے ہوئے تھے۔ ان کے تیور سے عیاں تھا کہ وہ اسلحے کے استعمال میں ماہر ہیں اور پلک جھپکنے میں مجھ پر بے دریغ فائر کھول دیں گے۔ اس کے علاوہ غزالہ بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کی موجودگی میں میں کسی طرح کا رسک لے ہی نہیں سکتا تھا۔

ہمیں گن پوائنٹ پر بستی کے شمالی حصے میں لایا گیا اور ایک مکان میں بند کردیا گیا۔ یہ پانچ چھ کمرے کا مکان تھا۔ احاطے میں تین بڑی بڑی کھجوریں سر جوڑے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان سے چاند اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ ہمیں جس کمرے میں بند کیا گیا اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور ان میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ مکان کی ساخت اور حدود اربعہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بندی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کمرے میں طاق دان کے اندر مٹی کے دو چراغ تھے جو اونٹ کی چربی سے جل رہے تھے۔ کچی زمین پر ایک بڑا نمدہ بچھا تھا اور خالی صراحی رکھی تھی۔ ہمیں کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کردیا گیا۔ درشت خدوخال والا ایک شخص کھڑکی سے باہر پہرا دینے والے انداز میں ٹہلنے لگا۔ اس نے رائفل بڑے اسٹائل سے اپنے کندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ حبشی تھا لیکن رنگت بہت زیادہ سیاہ نہیں تھی۔ بال گھونگھریالے اور آنکھیں روشن تھیں۔ اس کا بالائی لباس فقط ایک بنیان پر مشتمل تھا۔ اس بنیان میں سے اس کے ورزشی جسم کے رگ پٹھے نمایاں نظر آرہے تھے۔ میں اور غزالہ اونی نمدے پر خاموش بیٹھ گئے۔ میری پوری کمر پر شدید جلن ہورہی تھی' یہ جلن کوڑوں کی مرہونِ منت تھی۔ غزالہ بھی اپنے دائیں بازو کو بار بار سہلا رہی تھی۔ اس کے دودھیا بازو پر کوڑے کا سرخ نشان بہت نمایاں نظر آرہا تھا۔ ہمارے ذہنوں میں کئی سوالات تھے لیکن جو سوال زیادہ شدت سے ابھر رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ شیخ عاصم کہاں گیا؟ ہم دونوں کی خواہش یہی تھی کہ وہ بدوؤں کے ہتھے چڑھنے سے بچ جائے۔ اس کے پاس پانی سے لبالب بھری ہوئی ایک بوتل موجود تھی۔ اگر وہ کسی طرح یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوتا اور کسی آبادی تک پہنچ جاتا تو ہماری رہائی کے لیے کچھ نہ کچھ کرسکتا تھا' دوسری صورت میں ان کرخت چہرہ لوگوں کے درمیان ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اب تک صرف ایک شخص ایسا ملا تھا جو کسی حد تک ہماری زبان جانتا تھا' باقی تک ہم اپنا مافی الضمیر کسی طور نہیں پہنچا سکتے تھے۔

غزالہ منمنائی "ان لوگوں کا کیا بگاڑا ہے ہم نے۔"

"ہم نے سردار کے پالتو بندر کا خاتمہ بالخیر کردیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ــــ وہ عاصم کی جان لے رہا تھا۔ تب گولی چلاتے تو ــــ پتا نہیں کیا ہوجاتا۔"

میں نے کہا "یہ بات مجھے سمجھانے کی نہیں ان لوگوں کو سمجھانے کی ہے۔"

"وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ہم پردیسی ہیں۔ ہم پر مصیبت آئی تو ہم نے جان بچانے کے لیے اپنا دفاع کیا۔"

میں نے کہا "قانون کی کتابوں میں لکھا ہے کہ روم میں وہی کچھ کرو جو رومن کرتے ہیں۔ ہمیں اس صحرا میں گم ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ ہمیں یہاں کیا کچھ پیش آسکتا ہے۔ اور اگر اچانک کوئی خوں خوار بندر ہماری جان لینے کی کوشش کرے تو ہمیں اس سے کس لب و لہجے میں بات کرنی چاہیے۔"

غزالہ بولی "میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں خود اس سفید بالوں والے سے بات کروں۔ ان لوگوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ہم نے صرف جان بچانے کے لیے گولی چلائی تھی۔ ہمیں کوئی دشمنی نہیں تھی ان لوگوں سے اور نہ ان کے بندر سے۔"

میں نے کہا "خیال تو تمہارا ٹھیک ہے لیکن اس سفید بالوں والے کو بلاؤ گی کیسے؟ یہ جو کھڑکی میں کالا ریچھ کھڑا ہے یہ تو تمہاری بات سمجھنے سے رہا۔"

حبشی نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں پھیر کر میری طرف دیکھا اور بولا "یو شٹ اپ اینڈ مائنڈ یور لینگویج۔"

اس کا تلفظ درست نہیں تھا لیکن وہ انگلش جانتا تھا۔ یہ ہمارے لیے حیرت کی بات تھی۔ حبشی بھاری قدموں سے چلتا کھڑکی کے بالکل قریب چلا آیا۔ اس کے خدوخال سخت تھے لیکن ان میں ایک خاص طرح کی دلکشی' دبدبہ تھی۔ اس کی عمر بتیس انتالیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ ایک قوی ہیکل شخص تھا۔

میں نے کہا "حیرت کی بات ہے کہ تم اس دور دراز صحرائی بستی میں رہنے کے باوجود انگلش جانتے ہو۔"

وہ بولا "صحرا میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندہ ان پڑھ رہے۔ ہمارے محترم سردار صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ ان سے یہ شوق تھوڑا تھوڑا پورے قبیلے کو منتقل ہوا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی جو باتیں ہم نے کی ہیں' تم نے سنی ہیں؟"

"سو فیصد سنی ہیں۔" حبشی بولا "یہ باتیں سن کر مجھے افسوس ہوا ہے۔ تم جو خود کو شہری و مہذب کہتے ہو ایسی گھٹیا زبان استعمال کرتے ہو۔"

"میں دل سے معذرت چاہتا ہوں' مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے۔"

"بہت خوب" وہ مسکرایا تو اس کے کلیوں سے دانت چمک اٹھے "ہمارے سردار کا کہنا ہے کہ اپنی غلطی کھلے دل سے تسلیم کرلینا بڑے پن کی نشانی ہے۔" ایک لمبی توقف کرکے اس نے کہا "میں اسے تمہاری بدقسمتی سمجھوں گا کہ یہاں پہنچتے ہی تمہارے ہاتھوں ایک سنگین جرم سرزد ہوگیا ہے۔ تم نے "سوبالو" کو قتل کردیا ہے۔ سوبالو ہماری سردار کے لاڈلے بندر کا نام ہے۔ وہ بہت مشتعل ہے' کچھ بھی کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "اگر وہ پلا ہوا اور لاڈلا بندر تھا تو پھر خود سر کیوں ہورہا تھا' اس کی خوں خواری ہی اس کی موت کا سبب بنی ہے۔"

حبشی بولا "وہ شراب کا رسیا تھا۔ آج شام اس نے چوری چھپے گودام میں داخل ہوکر شراب پی لی تھی۔ نشے میں وحشت ہوکر اس نے ایک سفید بندریا کو زخمی کیا اور فرار ہوگیا۔ شاری اس کی گمشدگی سے سخت پریشان تھی اور ہر ایک پر برہم ہورہی تھی۔"

"یہ شاری کون ہے؟"

"ہماری سردار ـ سردار شماس کی طویل بیماری کے بعد وہی "سرداری" کے سارے فرائض انجام دے رہی ہے۔"

حبشی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ شاری خود سرادر کافی حد تک سخت گیر ہے۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ اس کو قبیلے کے چند معزز افراد مشورہ تو دے سکتے ہیں لیکن اس کے حکم کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ مشورہ دینے والوں میں سب سے اہم شخص وہی سفید بالوں والا تھا جس نے شاری کا بندر والا ہاتھ روکا تھا اور اسے سمجھا بجھا کر اندر لے گیا تھا۔ وہ رشتے میں بیمار سردار کا بھائی اور شاری کا چچا تھا۔ حبشی نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے مفرور ساتھی کی تلاش ہورہی ہے۔ ابھی تک وہ ہاتھ نہیں آسکا۔ حبشی سے کئی اور اہم باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ شاری خالص عربی نسل کی نہیں تھی۔ اس کی ماں ایک بلغارین خاتون تھی' اس کا نام سارہ تھا۔ سارہ سردار شماس کی چہیتی بیوی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی حسین خاتون تھی اور ایک اتفاق کے تحت سردار شماس کی بیوی بنی تھی۔ ازدواجی زندگی کے چار سال گزارنے کے بعد وہ مرگئی تھی اور سردار شماس کو دائمی جدائی دے گئی تھی۔ اس کے صرف دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا تھا' جو ماں کی موت کے دو سال بعد ہی زرد بخار کا شکار ہوکر مرگیا تھا۔ دوسری یہ لڑکی شاری تھی۔ چونکہ یہ سردار شماس کے پاس محبوب بیوی کی آخری نشانی کی حیثیت رکھتی تھی لہٰذا بہت لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلی تھی۔ باپ کی طرف سے اس میں جفاکشی اور سخت جانی جیسی صفات پیدا ہوئی تھیں جب کہ ماں کی طرف سے حسن اور پڑھنے لکھنے کا شوق ملا تھا۔ حیرت ناک بات تھی کہ ایک دور دراز صحرائی بستی کی مقیم ہونے کے باوجود وہ چند سال تک راس الخیمہ کے ایک تعلیمی ادارے میں پڑھتی رہی تھی۔ شاید وہ مزید پڑھتی لیکن اسی دوران میں سردار شماس زیادہ بیمار ہوگیا تھا اور شاری کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر سرداری کے فرائض سنبھالنے پڑے تھے۔

حبشی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ قبیلے کے لوگ شاری کی سرداری سے زیادہ خوش نہیں ہیں لیکن چونکہ وہ ان کے محبوب سردار شماس کی بیٹی ہے اس لیے "خوش دلی" سے برداشت کررہے ہیں۔ انہیں توقع ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی شعلہ مزاجی میں فرق آئے گا اور اس کے فیصلوں میں دانائی آجائے گی۔

میں نے حبشی سے پوچھا "یہاں کے لوگوں کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟"

وہ بولا "تمہارے خیال میں کیا ذریعۂ معاش ہوسکتا ہے؟"

"اونٹ بکریاں وغیرہ پالتے ہوگے تم لوگ' یا کھیتی باڑی۔"

وہ مزاحیہ انداز میں ہنسا۔ ہنسنے سے اس کے چہرے کی سختی کچھ اور بڑھ گئی۔ اپنی بھاری آواز میں کہنے لگا "یہاں مشکل سے اتنا پانی ملتا ہے کہ لوگ پیاسے مرنے سے بچ سکیں۔ چند ایک کھیتیاں ہیں جو زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو افراد کو ایک وقت کی روٹی دے سکتی ہیں۔ درخت سوکھے سڑے ہیں اور نہ ہونے کے برابر پھل دیتے ہیں۔"

"پھر کیا کرتے ہو تم لوگ؟"

"پیٹ بھرنے کے لیے جو کچھ کرنا پڑے' کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی بات چھپی ہوئی تھی۔

"تمہارے حالات اتنے برے نظر تو نہیں آتے۔" میں نے کہا "لوگ صحت مند ہیں۔ لباس بھی اچھا ہے۔ تمہاری سردار شاری اور اس کے چچا کے گلے میں موتیوں کے ہار بھی دیکھے ہیں میں نے۔ اور پھر یہ اسلحہ۔ اچھا جدید رائفل ہی دیکھ لو۔ اگر درہم میں حساب لگایا جائے تو بھی ایک ہزار درہم سے کم قیمت کی کیا ہوگی یہ۔"

وہ پھر مسکرایا اور اس کے سفید دانت چمک گئے "یہ ضروری نہیں کہ ساری باتوں کا پتا تمہیں ابھی اور اسی وقت چل جائے۔ اگر تم زندہ بچ گئے تو یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس کے لہجے سے سنگین خطرات کی نشان دہی ہونے لگی تھی۔

ایک دم حبشی خاموش ہوگیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی بھاری قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی' چند لمحوں میں سفید بالوں والا تنومند شخص ہمارے سامنے تھا۔ یہی شاری کا چچا تھا۔ حبشی نے اس کا نام ابو آبان بتایا تھا۔ ابو آبان کے بازوؤں میں وہی بچہ تھا جسے غزالہ سے چھینا گیا تھا۔ بچے کے رخساروں پر طمانچوں کے نشان تھے اور وہ مسلسل رو رہا تھا۔ ابو آبان کے حکم پر حبشی نے چوکس ہو کر رائفل اپنے ہاتھوں میں لے لی پھر آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سفید بالوں والے ابو آبان نے بچے کو غزالہ کے بازوؤں میں تقریباً پھینکتے ہوئے کہا "اس کتے کے بچے کو رکھو اپنے پاس۔"

غزالہ بچے کو پچکارنے لگی۔ اس نے بازو غزالہ کے گلے میں ڈال دیے اور فوراً چپ ہوگیا۔ ابو آبان نے ہم دونوں کو خشمگیں نظروں سے گھورا اور بولا "اگر تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے تو ابھی بتا دو۔ اگر کچھ چھپانے کی کوشش کرو گے تو چھپ نہیں سکے گا اور سزا بڑی بھیانک ہوگی۔"

"ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

ابو آبان بولا "تم مسلسل جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارے پاس جو اونٹ ہیں وہ تمہارے نہیں ہیں۔ اونٹوں کے ساتھ جو سامان ہے وہ بھی کسی اور کا ہے۔"

"ہم نے کب کہا ہے کہ وہ اونٹ ہمارے ہیں' نہ ہی ہم نے سامان کے بارے میں کوئی دعویٰ کیا ہے۔ یہ دونوں اونٹنیاں ہمیں اسی پڑاؤ کے قریب آوارہ گھومتی ملی تھیں جہاں سے یہ بچہ ملا تھا۔ ہمیں سواری اور سامان کی ضرورت تھی' بلکہ شدید ضرورت تھی۔ ہم نے یہ اونٹنیاں سواری کے لیے پکڑ لیں۔"

"خیر جھوٹ سچ کا پتا تو چل ہی جائے گا۔ اگر تم سچے بھی ہوئے تو بھی تمہاری بدقسمتی تو ثابت ہو ہی چکی ہے۔ تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تمہارے ہاتھوں ایک نہایت قیمتی جانور ہلاک ہوا ہے۔ وہ بندر جو مرا ہے' ہماری سردار شاری کا لاڈلا اور چہیتا تھا۔ کل اس کی آخری رسوم ادا ہوں گی۔ اس کے بعد ہی تم دونوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔"

ابو آبان واپس چلا گیا۔ حبشی چوکس ہو کر پہرا دینے لگا۔ اب رات بھیگتی چلی جا رہی تھی۔ کھجوروں کے جھنڈ میں اٹکا ہوا چاند اب آزاد ہو کر کچھ اوپر چلا گیا تھا۔ مدھم ہوا چلنے لگی تھی۔ اس ہوا کے دوش پر کبھی کبھی ایک شور سا تیر کر ہم تک پہنچتا۔ یہ ملی جلی آوازیں تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات گئے بھی بستی کے بہت سے مکین جاگ رہے ہیں۔ جو شور ہم تک پہنچ رہا تھا وہ نوحہ گری کا شور تھا۔ جیسے بہت سے افراد مل کر رو رہے ہوں۔ میرا دھیان بار بار سیاہ بندر کی خونچکاں لاش کی طرف جا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ نوحہ خوانی اسی مردہ جانور کے لیے ہو رہی ہو۔

وہ بڑی عجیب و غریب رات تھی۔ صحرائی بستی کا فسوں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں اور غزالہ میلے کچیلے نمدے پر بیٹھے تھے اور شیخ عاصم کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ہمیں کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا' شاید ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی لیکن بچہ تو بھوکا تھا۔ وہ کافی دیر بھوک سے روتا رہا پھر غزالہ کی گود میں پڑ کر سو گیا۔ غزالہ کے چہرے پر غم کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

رات کسی پہر مجھے نیند آ گئی۔ صبح کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ دیکھا تو وہ غزالہ تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ تیز چمکیلی دھوپ کمرے کے نصف حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ غزالہ نے عقبی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ادھر دیکھیں۔"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایک نامانوس شور کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ جیسے کہیں قریب سے کوئی جلوس گزر رہا ہو۔ کھڑکی سے جھانکا تو واقعی ایک جلوس نظر آیا۔ یہ صحرائی بستی کے مکینوں کا جلوس تھا۔ لگتا تھا کہ بستی کے سارے ہی مکین گھروں سے نکل کر اس جلوس میں شامل ہو گئے ہیں۔ سیاہ لباس پہنے ہوئے تقریباً دو درجن عورتیں اس ہجوم میں سب سے آگے تھیں۔ انہوں نے اپنے گرد آلود بال کھول رکھے تھے اور بلند آواز میں ماتم کر رہی تھیں۔ ان عورتوں کے عقب میں لکڑی کا ایک لمبوترا تابوت سا تھا۔ اس تابوت کو کئی افراد نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ تابوت کے پیچھے بھی ماتم کناں لوگوں کا اژدحام تھا۔ یہ سب مقامی لوگ تھے۔ وہ ننگے سر ننگے پاؤں تھے۔ بہت سوں نے سر میں گرد وغیرہ ڈال رکھی تھی۔ بہت سے مردوں کی پگڑیاں سوگوار انداز میں ان کی گردنوں میں جھول رہی تھیں۔ اس جلوس میں کچھ سازندے بھی شامل تھے۔ وہ عربی سازوں پر کوئی ماتمی دھن بجا رہے تھے۔ یہ سازندے جلوس میں سب سے پیچھے چل رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے شاہ جہاں۔" غزالہ حیرانی سے بولی۔

میں نے کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ اسی لعنتی بندر کا سفرِ آخرت ہے جو کل میرے ہاتھوں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا ہے۔"

غزالہ کی حیرانی بڑھ گئی "ایک پالتو بندر کے لیے اتنا واویلا اور ایسی ہنگامہ آرائی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر لوگ مجبوراً سوگوار نظر آرہے ہیں۔ جو کچھ ہمیں اب تک شاری کے بارے میں معلوم ہوا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ لوگ اس نابکار لڑکی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر لڑکی کو پسند نہیں کیا جاتا تو پھر اس کے شرابی بندر کو کیسے پسند کیا جاتا ہوگا۔ یقیناً یہ سب کچھ رسمی طور پر ہو رہا ہے۔"

کچھ دیر بعد یہ طویل جلوس کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ آنجہانی بندر کو صحرا میں "مدفون" کرنے کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔

رات والے حبشی کی جگہ ایک اور شخص ہمارا پہرا دے رہا تھا۔ میں نے اس سے شیخ عاصم کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اندازہ ہوا کہ وہ انگلش سے نابلد ہے۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اسے بتایا کہ بچہ کل سے بھوکا ہے اور رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔ وہ اس کے لیے کھانے کو کچھ لا رہا ہے۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں کچھ صبر کرنے کو کہا۔ وہ تانبے کی رنگت والا ایک اجڈ بدو نظر آتا تھا۔

دوپہر تک صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بچے کا بھوک سے برا حال تھا۔ وہ بے قرار ہو کر غزالہ کے سینے سے چمٹنے لگتا تھا۔ ایسے میں غزالہ کا چہرہ حیا سے سرخ نظر آنے لگتا تھا۔ گرمی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک شور نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ شور اس "بندی خانے" کے صدر دروازے کی طرف سے بلند ہوا تھا۔ شور میں ایک نسوانی آواز سب سے بلند تھی۔ یہ نسوانی آواز دلکش ہونے کے باوجود بجلی کی سی کڑک اور تپش رکھتی تھی۔ مجھے پہچاننے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگی۔ یہ اس قبیلے کی سرغنہ شاری کی آواز تھی۔ وہ غیظ و غضب سے پھٹی پڑ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کوٹھڑی کی طرف بڑھنا چاہ رہی ہے جہاں ہم بند ہیں۔ کوئی شخص اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روکنے والے کی آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ وہی سفید بالوں والا ابو آبان تھا جس کا رشتہ شاری کے ساتھ چچا بھتیجی کا تھا۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے اور شاری کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ دونوں مقامی زبان بول رہے تھے لہٰذا ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ پھر ایک دم شور و غل کی آوازیں ہمارے نزدیک آگئیں۔ غزالہ سہم کر میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ بچہ اس کی بانہوں میں تھا۔ مشرقی دیوار والی کھڑکی کے سامنے ایک بھونچال سا آگیا۔ میں نے شاری کو دیکھا۔ وہ سیاہ لباس میں تھی۔ لمبے ریشمی بال کھلے تھے' اس کا گندمی چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا' آنکھیں یاقوت کے ان سرخ پتھروں کی طرح چمک رہی تھیں جو ایک ہار کی صورت اس کے گلے میں آویزاں تھے۔

اس نے بھوکی شیرنی کی طرح میری آنکھوں میں جھانکا اور چلائی "میں تم سب کو ذلت کی موت ماروں گی۔"

اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں جدید پسٹل ہے۔ یہ لیڈیز پسٹل تھا اور شاری نے اسے بڑے ماہرانہ انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ اچانک ابو آبان نمودار ہوا۔ اس نے شاری کا پسٹل والا ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھا دیا' پھر اسے دھکیل کر واپس لے گیا۔ چچا اور بھتیجی کی بحث و تکرار مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں پسٹل کا ایک فائر بھی ہوا۔ غالباً یہ گولی ہوا میں چلی تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ "شور و غل" ہم سے فاصلے پر چلا گیا۔ ابو آبان اپنی شعلہ مزاج بھتیجی کو ایک بار پھر قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اسے ہم سے دور لے گیا تھا۔

گیا تھا۔

چند منٹ بعد ہمیں حبشی پہرے دار کی صورت نظر آئی۔ اس نے ہمیں اپنا نام الماجد بتایا تھا اور اس کا شمار سردار شارص کے خاص غلاموں میں ہوتا تھا۔ وہ سردار شارص کا ذاتی محافظ بھی تھا۔ اس نے کہا "تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم دونوں اس وقت زندہ سلامت اس کوٹھڑی میں موجود ہو ورنہ سردار شاری کا ارادہ تو یہی تھا کہ سوبالو (بندر) کی لاش کے ساتھ آج تم دونوں کی لاشیں بھی صحرا کی ریت میں دفن ہو جاتیں۔ تمہاری جان بچانے میں ابو آبان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ صرف وہی ہے جو غضب ناک شاری کے سامنے ٹھہرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ بہرحال تم اس خوش فہمی کا شکار نہ ہونا کہ تمہاری خطائیں معاف ہو گئی ہیں۔ تم بدستور مجرم ہو اور تمہیں ہلکی یا سخت سزا بھی ضرور ملے گی۔ فی الوقت صرف اتنا ہوا ہے کہ تم ایک اچانک موت سے بچ گئے ہو۔"

"کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ یہ سزا کس قسم کی ہوگی؟"

میں نے پوچھا۔

"سزاؤں کی بہت سی اقسام ہیں۔ شاری نت نئی سزائیں تجویز کرنے میں ماہر ہے۔ اس بارے میں تم بالکل بے فکر رہو۔"

"کیا یہاں جرگہ یا عدالت قسم کی کوئی چیز نہیں؟"

"عدالت' جرگہ' قاضی سب کچھ شاری ہے۔ وہ جتنی حسین ہے اس سے بڑھ کر سنگ دل ہے اور جتنی سنگ دل ہے اس سے بڑھ کر حسین ہے۔"

شاری کا ذکر کرتے ہوئے پہرے دار کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی تھی جیسے وہ خود بھی شاری کے حسن کا پرستار ہو۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں کھانا فراہم کر دیا گیا۔ بچے کے لیے بکری کا دودھ بھی تھا۔ کھانے میں گندم کی روٹی' زیتون کا تیل اور کوئی مقامی سبزی تھی جس میں تلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے ڈالے گئے تھے۔

ہم شام تک حبشی پہرے دار الماجد سے بار بار شیخ عاصم کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتا رہا کہ مفرور کا کچھ پتا نہیں۔ یہ الجھن آمیز صورت حال تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ شیخ عاصم اس لق و دق ویرانے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کا پستول اسی وقت گر گیا تھا جب شرابی بندر اس سے گتھم گتھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے میں قبیلے کے گھڑ سواروں سے کہاں تک محفوظ رہ سکتا تھا۔ ایک اندیشہ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کہیں غضب ناک بدر کا نے اسے قتل ہی نہ کروا ڈالا ہو۔

اندھیرا پھیلتے ہی بستی میں چراغ جل اٹھے۔ ان چراغوں اور مشعلوں میں زیادہ تر چربی کا تیل استعمال کیا جاتا تھا لہٰذا ہلکی ہلکی بو پھیل جاتی تھی۔ کل ہمیں یہ بو زیادہ محسوس ہوئی تھی لیکن آج ایسا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ہمیں چند روز یہاں رہنا پڑا تو یہ بو بالکل محسوس نہیں ہوگی۔ انسان عجیب ہے عجیب ماحول کو کتنی جلدی اپنا لیتا ہے' اس کا تجربہ میں بارہا کر چکا ہوں۔

O☆O

اگلے تین روز تک صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ہم اسی کوٹھڑی میں بند رہے۔ کوٹھڑی کا ایک چھوٹا دروازہ سرنگ نما راستے میں کھلتا تھا۔ اس دس بارہ گز لمبی سرنگ سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو جاتے تھے۔ اسے اس بندی خانے کا غسل خانہ کہا جا سکتا تھا۔ یہاں مٹی کا لوٹا اور لکڑی کا ایک ٹب نما برتن بھی رکھا رہتا تھا۔ ٹب کے پیندے میں اکثر تھوڑا بہت پانی بھی نظر آجاتا تھا۔

بچہ غزالہ سے مانوس ہو چکا تھا اور ہر وقت اس سے چمٹا رہتا تھا۔ میں اور غزالہ آپس میں بہت کم بات کرتے تھے۔ اگر بات ہوتی بھی تھی تو وہ عاصم کے بارے میں ہوتی تھی۔ غزالہ کے چہرے پر غم و الم کی مستقل پرچھائیاں چھائی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ سلطانہ اور بجی لالہ کی موت کے مناظر اسے "ہانٹ" کرتے ہیں۔ رات کو نیم تاریک کوٹھڑی میں جب ہم نمدے پر لیٹتے تو پاس پاس ہونے کے باوجود بہت دور ہوتے۔ جیسے دو مختلف دنیاؤں کے باسی ہوں۔ ایسے میں جل کوٹ کی حسین یادیں میرے ذہن پر یورش کرتیں اور دل غم کی دھند سے بھر جاتا۔

یہ چوتھی رات کا واقعہ ہے' حبشی پہرے دار الماجد رائفل بدست کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو اور مسلح محافظ تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک نیزہ نما ہتھیار تھا۔ وہ میری طرف سے بالکل چوکس نظر آتے تھے۔ الماجد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تمہارے ہاتھ باندھ کر تمہیں سردار شاری کے حضور پیش کرنے کا حکم ہے۔"

میں نے دیکھا' نیزہ بردار پہرے دار کے ہاتھ میں اونٹ کے بالوں سے بٹی ہوئی رسی نظر آرہی تھی۔ الماجد کے

اشارے پر وہ شخص میرے ہاتھ باندھنے کے لیے آگے بڑھا۔ موقع مزاحمت کے لیے بہترین تھا لیکن میرے ساتھ غزالہ تھی۔ میں اس کی اور بچے کی زندگی کے لیے معمولی سا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ دو رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور سیکنڈ کے دسویں حصے میں ہم پر گولیوں کی بوچھار ہو سکتی تھی۔

الماجد کے کہنے پر میں نے خاموشی سے اپنے ہاتھ بندھوا لیے۔ ہاتھ پشت پر بڑی مضبوطی و مہارت سے باندھے گئے تھے۔ مجھے گن پوائنٹ پر کوٹھڑی سے باہر نکالا گیا "خدا تم پر رحم کرے۔" الماجد زیر لب بڑبڑایا۔

غزالہ بھی جان چکی تھی کہ میرے لیے آزمائش کی گھڑی آنی ہے۔ ظاہر ہے' شاری نے مجھے طلب کیا تھا تو گپ شپ کے لیے نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے آڑے ہاتھوں لینے والی تھی۔ اور یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھے واپس آنا نصیب ہی نہ ہوتا۔ غزالہ کی حسین آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ مجھے یہ آنسو اچھے لگے' شاید اس لیے کہ یہ صرف اور صرف میرے واسطے تھے۔ ان میں عاصم کا عمل دخل نہیں تھا۔ میں باہر نکلنے لگا تو غزالہ نے بے اختیار میرا بازو تھام لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ پھر وہ الماجد سے مخاطب ہوئی "میں یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی' میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

الماجد نے سرد لہجے میں کہا "ہمیں وہی کچھ کرنا ہے جس کا ہمیں حکم ملا ہے۔"

"میں تمہاری سردار کے سامنے وضاحت پیش کرنا چاہتی ہوں۔ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ یہ بے قصور ہیں۔ انہوں نے صرف میرے کہنے پر میرے شوہر کی جان بچانے کے لیے گولی چلائی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک جانور کو زخمی یا ہلاک کرنے کی کوشش کا ایسا نتیجہ نکل آئے گا۔"

میں نے اردو میں غزالہ کو سمجھایا کہ وہ جذباتی پن کا مظاہرہ نہ کرے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے وہ میں خود بھی کہہ سکتا ہوں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کے غم و غصے کا بڑا ریلا گزر چکا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ مار پیٹ ہی کریں گے۔

وہ سسک پڑی۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔۔۔ ہاں یہ وہی لمحہ تھا جب وہ غزالہ شیخ نہیں صرف غزالہ ہوتی تھی اور میں جہانی استاد نہیں صرف شہ جہاں ہوتا تھا اور ہمارے قدم جل کوٹ کی زمین پر ہوتے تھے۔ ہمارے ارد گرد باغ لہلہاتے تھے اور ہمارے سروں پر ایک نیلا مہرباں آسماں ہوتا تھا۔ مگر لمحہ تو لمحہ ہی ہوتا ہے' گزر جاتا ہے۔ اس بار بھی یہ لمحہ گزر گیا۔ غزالہ نے کہا "شاہ جہاں' اپنا خیال رکھیے گا۔"

"کوشش کروں گا' حالانکہ میری اکثر کوششیں کامیاب نہیں ہوتیں۔" میں نے کہا۔

الماجد اور اس کا ساتھی پہرے دار مجھے گن پوائنٹ پر باہر لے گئے۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اس کے باوجود آج فضا میں دھوپ کی سی حرارت تھی۔ ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی پتا بھی جنبش کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم ایک خم دار گلی سے گزرے۔ دونوں طرف سفید سفید دیواروں والے کچے مکان تھے۔ کھجور اور تاڑ کے لمبے درختوں کے نیچے اونٹ بندھے ہوئے تھے' کہیں کہیں بکریاں بھی نظر آرہی تھیں۔ طاق دانوں میں چراغ روشن تھے اور گھروں کے بیرونی دروازوں پر مشعلیں بھی نظر آتی تھیں۔ یہ چراغ اور مشعلیں روشنی کے "ذریعے" تھے تاہم یہ گرمی میں بھی اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔

ہم اسی مکان میں پہنچے جہاں غضب ناک شاری سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ آج مکان کا وسیع احاطہ خالی تھا۔ ہم اندرونی حصے میں پہنچے۔ یہ بظاہر کچا پکا مکان اندر سے کسی محل کی طرح آراستہ تھا۔ کئی کمروں میں قالین بچھے تھے۔ دیواروں پر غالیچے نظر آرہے تھے جن پر باغات اور چشموں کی تصویریں تھیں۔ ایک بڑے کمرے کا فرش شفاف پتھروں سے پختہ کیا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ کمرا کسی جدید کوٹھی کے ڈرائنگ روم کے مانند سجا ہوا ہے۔ یہاں بید کی خوب صورت نشستیں موجود تھیں۔ ایک الماری میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ یہ انگلش عربی اور فارسی کی کتابیں تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سجاوٹ میں "قبائلی رنگ" بھی موجود تھا۔ جانوروں کے سروں کی ٹرافیاں' رائفلیں' کلہاڑیاں اور تلواریں وغیرہ بھی دیواروں پر آویزاں تھیں۔

اندرونی کمروں میں آکر دوسرا پہرے دار علیحدہ ہو گیا تھا۔ اب صرف تنومند حبشی الماجد میرے ساتھ تھا۔ ایک ساگوانی دروازے سے گزر کر اور ایک مخملی پردہ ہٹا کر ہم ایک کشادہ کمرے میں پہنچے' اس کمرے کی چھت خیمے کی طرح مخروطی تھی۔ حقیقت میں یہ کمرا ہی تھا لیکن دیکھنے میں خیمہ نظر آتا تھا۔ ویسے ہی روشن دان' ویسا ہی دروازہ۔ درمیان میں دو بانس نما خوب صورت ستون بھی گڑے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین بچھا تھا اور گاؤ تکیے لگے تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی دو چیزوں نے مجھے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک تو زعفران و عنبر کی مدھر خوشبو تھی۔ دوسری وہ پری جمال "آہو چشم حسینہ تھی جسے شاری کہا جاتا تھا اور جو اپنے باپ کی بیماری کے بعد سرداری کے سارے فرائض سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ ایک تین فٹ بلند چوکی پر بڑی تمکنت سے بیٹھی تھی اور جام پر جام چڑھا رہی تھی۔ دو کنیزیں اس کے عقب میں دست بستہ کھڑی تھیں۔ ایک خوب رو لڑکا جس کی عمر بمشکل دس سال تھی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر شاری کی سرخ آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے شاہانہ انداز میں تالی بجائی۔ یقیناً یہ "برخاست" کا اشارہ تھا۔ دونوں کنیزیں اور خوب رو لڑکا خیمہ نما کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے فوراً بعد ایک جوان نما تنومند حبشی اندر داخل ہوا۔ جونہی وہ اندر آیا، مجھے اپنے قدموں سے کوئی چیز لپٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا یہ ایک مضبوط رسی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، مجھے شدید جھٹکا لگا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ چند لمحے بعد حواس بحال ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کمرے کی مخروطی چھت سے الٹا لٹک رہا ہوں۔ فربہ اندام حبشی کی چابک دستی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ شاید وہ کوئی پیشہ ور جلاد تھا۔ اس نے چھت کے آہنی کنڈے میں جھولتی ہوئی رسی کو بڑی پھرتی سے پھندے کی صورت میرے پاؤں میں ڈالا تھا اور پھر دوسرا سرا کھینچ کر مجھے ہوا میں معلق کر دیا تھا۔

شاری کے اشارے پر فربہ اندام حبشی نے رسی کے دوسرے سرے کو دیوار میں گڑی ہوئی ایک آہنی کھونٹی کے ساتھ گرہ دے دی اور کورنش بجا کر باہر چلا گیا۔ اب خیمہ نما کمرے میں شاری، الماجد اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میرا سارا خون سر میں جمع ہو گیا تھا اور ٹخنے رسی کی گرفت میں شدید کھچاؤ کا شکار تھے۔

شاری نے مقامی زبان میں الماجد سے کچھ کہا اور اس نے اپنی پیٹی سے خنجر نکال کر میری قمیص چاک کی اور میرے بدن سے علیحدہ کر دی۔ اس کے بعد میرے ہاتھوں کی رسی بھی کاٹ دی گئی۔ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ میرا سر زمین سے قریباً چار فٹ بلند تھا۔ کمر اور ٹانگوں میں شدید کھچاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ میری اذیت کو دو آتشہ کرنے کے لیے شاری نے الماجد کو ایک نیا حکم جاری کیا۔ الماجد نے اس حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے ایک گوشے سے موٹی کڑیوں والی ایک آہنی زنجیر اٹھائی اور اسے میری گردن کے گرد دو بل دے کر باندھ دیا۔ زنجیر کی لمبائی بمشکل چار فٹ ہو گی لیکن اس کا وزن کسی طرح بھی پندرہ بیس سیر سے کم نہیں تھا۔ جسم جو پہلے ہی شدید کھچاؤ کا شکار تھا، کمان کے چلّے کی طرح تن گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ٹانگیں بالائی دھڑ سے علیحدہ ہو جائیں گی یا کمر درمیان سے ٹوٹ جائے گی۔ یہ اذیت میرے لیے انوکھی اور ناقابل بیان تھی۔ مجھے اذیت کے اس شکنجے میں کس کر شاری بالکل غافل نظر آنے لگی جیسے اسے مجھ سے اور میری حالت سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ اس کے بال منتشر تھے اور چہرہ کثرت شراب نوشی سے تمتما رہا تھا۔

الماجد اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے شاری کے قریب پڑے ساغر و مینا دور ہٹانے کی کوشش کی لیکن شاری نے اسے جھڑک دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاری کو کثرت شراب نوشی سے منع کر رہا ہے جبکہ وہ اسے بتا رہی ہے کہ اس کا سینہ غم کی شدت سے پھٹ رہا ہے، وہ شراب نوشی نہ کرے تو اور کیا کرے۔

میں نے ایک اور خاص بات بھی نوٹ کی۔ ملازمین کے سامنے شاری کے ساتھ الماجد کا رویہ بہت مؤدب اور محتاط تھا لیکن اب تنہائی میں وہ اس کے ساتھ بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ یہ بے تکلفی زیادہ نمایاں تو نہیں تھی لیکن اپنی غلام الماجد کی حیثیت سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ شاری منقش چوکی پر بیٹھی تھی الماجد قالین پر بیٹھا تھا۔ شاری کی نگاہوں میں الماجد کے لیے بے زاری اور غصہ تھا جبکہ الماجد کی نگاہوں میں شاری کے لیے عقیدت اور محبت تھی۔ شاری کو دیکھ کر الماجد کی نگاہوں میں جو والہانہ پن پیدا ہوتا تھا وہ بڑا واضح تھا۔

چوکی سے اترنے کے لیے شاری حرکت میں آئی تو حبشی الماجد نے جلدی سے اس کے سنہری جوتوں کو بوسہ دیا اور انہیں شاری کے پاؤں کے قریب رکھ دیا۔ شاری نے چہرے پر ناگواری کی شکن لیے ہوئے جوتے پہنے اور میرے قریب چلی آئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ شاری کے ہاتھ میں وہی کوڑا تھا جو بستی میں داخل ہونے کے فوراً بعد میرے جسم پر برسا تھا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

شاری نے سنہری جوتی کی ٹھوکر میرے سر پر رسید کی اور بولی "بدبخت! تو نے میرا دل ویران کیا ہے۔ میرے بس میں ہو تو تجھے کئی بار موت کی سزا دوں۔" وہ انگلش میں گویا ہوئی تھی۔ اس کا تلفظ درست اور لہجہ تعلیم یافتہ لوگوں جیسا تھا۔

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ ایک صحرائی لڑکی پڑھ لکھ کر بھی بدو کی بدو ہی رہی ہے۔"

اس نے تڑاخ سے ایک کوڑا میری کمر پر رسید کیا اور بولی "ہاں میں بدو ہوں لیکن تم نے ابھی میرے بدو پن کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا۔ میں تمہیں زندہ درگور نہ کروں تو میرا نام شاری نہیں اور میں سردار شماس کی بیٹی نہیں۔" اس کی آواز بہک رہی تھی۔ اس نے شراب سرخ کا ایک اور جام چڑھایا اور غرائی "تم۔ دنیا کے بدقسمت ترین انسان ہو۔ تمہارے ہاتھوں۔ تمہارے ہاتھوں سوبالو کی جان گئی ہے۔ اب تمہیں میرے ہاتھوں مرنا پڑے گا اور بڑی بری موت مرنا پڑے گا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟ کیا تمہارا سوبالو واپس آ جائے گا؟"

"نہیں، میرے دل کو سکون مل جائے گا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے سوبالو کی روح بے چین ہو جائے۔ تم جانتی ہو کہ تم میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ اگر تم قدرت پر یقین رکھتی ہو تو پھر تمہیں اس بات پر بھی یقین رکھنا چاہیے کہ ناانصافی کا بوجھ کسی نہ کسی پر تو پڑنا ہی ہے۔"

"مجھے لیکچر دینے کی کوشش نہ کرو۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ تمہارے ہاتھوں خون ہوا ہے اور مجھے تم سے اس خون کا حساب لینا ہے۔ میں روحوں پر یقین نہیں رکھتی اور اگر رکھتی بھی ہوتی تو پھر سوبالو کی روح کو سکون دینے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ تمہیں کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔"

اس نے تابڑ توڑ کئی کوڑے میرے عریاں جسم پر برسائے۔ مجھے اپنے سینے اور پیٹ پر خون کی سرخ دھاریاں سی نظر آنے لگیں۔ کھچاؤ کے ساتھ ساتھ جلن کی اذیت بھی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ شاری نے کوڑا ایک طرف پھینکا اور دوبارہ منقش چوکی پر جا بیٹھی۔ اس کا شباب غصے کے ملاپ سے دو آتشہ ہو گیا تھا۔ گال انگاروں کے مانند دہک رہے تھے اور سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ وہ واقعی حسین تھی۔ اس کی گردن پر زخم کا ایک پرانا نشان چاند کے دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

جونہی وہ چوکی پر بیٹھی، الماجد نے گھٹنوں کے بل جھک کر بڑی محبت اور ملائمت سے اس کی سنہری جوتی اتاری، اس کے تلوؤں کو بوسہ دیا اور بڑے احترام سے ایک طرف رکھ دیا۔ الماجد کے اس اظہار عقیدت پر خوش ہونے کے بجائے شاری کی تیوریاں کچھ اور چڑھ گئیں۔

اس نے چڑچڑے انداز میں الماجد سے کچھ کہا اور انگلی سے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ یقیناً وہ اسے باہر جانے کا کہہ رہی تھی۔ الماجد نے آرزوؤں اور حسرتوں سے بھرپور ایک والہانہ نگاہ شاری کے سراپا پر ڈالی پھر رکوع کے بل جھک کر اسے تعظیم پیش کی اور الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔ اب میں اور شاری اس خیمہ نما کمرے میں تنہا تھے۔ شمع دان میں موٹی شمعیں بڑی خاموشی سے جل رہی تھیں اور اسی خاموشی سے میری قوت برداشت بھی جلتی جا رہی تھی۔ بدن کا جوڑ جوڑ الگ ہو رہا تھا اور کمر تو جیسے دو لخت ہونے کو تھی۔

شاری بڑے اطمینان سے شغل مے نوشی میں مصروف ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف سے بالکل غافل نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اسے یقین تھا کہ بہت جلد میری قوت برداشت جواب دے جائے گی اور میں جان بخشی کے لیے اس کی منت سماجت کرنے لگوں گا۔ وہ استاد جانی کی برداشت کا امتحان لے رہی تھی اور استاد جانی یہ امتحان دینے کو پوری طرح تیار تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہنے لگا ہے۔ کھچاؤ کی اذیت سے رگ رگ ٹوٹ رہی تھی۔ جس جگہ میں الٹا لٹکا تھا وہاں قالین پر میرا پسینہ مسلسل گر رہا تھا۔ صورت حال تکلیف دہ تھی لیکن آہ بھرنا یا شاری سے رحم مانگنا مجھے کسی طور قبول نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ تکلیف انتہا سے گزرتی اور میں بے ہوش ہو جاتا۔ ایسے مرحلوں سے میں اس سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔

کمرے کے اندر ہی ایک طرف چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ اس حوض کی گہرائی تین فٹ کے قریب تھی۔ اس ٹب نما حوض میں ایک شخص باآسانی لیٹ سکتا تھا۔ ایک ایسی صحرائی بستی میں جہاں پینے کو دو گھونٹ پانی بھی بڑی مشکل سے ملتا تھا، حوض کی موجودگی بہت بڑی عیاشی ہی کہلا سکتی تھی۔

نشہ جب تیز ہوا تو شاری جھومتی ہوئی اٹھی اور کمرے کے ایک کونے سے چاندی کی ایک خوب صورت زنجیر اٹھا لائی۔ اس زنجیر کے ایک سرے پر چرمی پٹا بھی تھا۔ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شاری کے پالتو بندر کا پٹا رہا ہو گا۔ وہ زنجیر ہاتھ میں پکڑ کر اس انداز سے چلنے لگی جیسے دوسرے سرے پر اس کا پالتو بندر موجود ہو۔ کبھی وہ نقرئی زنجیر کو اس انداز سے جھٹکتی تھی جیسے بندر کو چھلانگ لگانے یا قلابازی کھانے پر اکسا رہی ہو۔ کبھی منہ سے "چخ چخ" کی آواز نکالتی تھی، کبھی مقامی زبان میں بڑبڑانے لگتی تھی۔ وہ بالکل وحشت ہو رہی تھی۔

پھر اچانک اس نے جھلا کر زنجیر دور پھینک دی۔ اس کی مست نگاہ کوڑا تلاش نہیں کر سکی۔ وہ خالی ہاتھ ہی مجھ پر پل پڑی۔ اس کے گھونسے میرے پیٹ اور سینے کو ہزار ہزار کونچے

لگے۔ اس کی ٹھوکر بار بار میرے سر کا مزاج پوچھنے لگی۔ اپنے چہرے کو اس کی ٹھوکروں سے بچانے کے لیے میں نے رسیوں بندھے بازوؤں میں چھپا لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ہانپ گئی۔ اس کا سینہ مدوجزر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پسینے کی دھاریں خوب صورت چہرے سے پھسل کر گردن پر رواں دواں تھیں۔ وہ چند لمحے مجھے خونی نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر اس نے ربن کھول کر اپنے لمبے سیاہ بال آزاد کر دیے۔ اپنا کُرتہ اتار دیا۔ اب اس کے بالائی جسم پر ایک مختصر زنانہ لباس کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جھومتی ہوئی اٹھی اور شفاف پانی کے حوض میں جا گری۔ گردن تک خود کو پانی میں ڈبو کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس خوشبو دار کمرے کی طرح یقیناً یہ پانی بھی معطر تھا۔ شاری کا جسم پانی میں ڈوب کر ہلکورے لینے لگا تھا۔ وہ ساکت تھی مگر گمان ہوتا تھا جیسے وہ رقص کر رہی ہے۔ وہ گرمی کی شدت کم کرنے کے لیے کافی دیر حوض میں لیٹی رہی پھر شاید اسے نشے میں کمی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے حوض کے اندر ہی سے ہاتھ آگے بڑھا کر شراب کی بلوری صراحی اپنی طرف کھسکائی' ایک جام بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔ چار پانچ منٹ بعد نشہ تیز ہوا تو اس نے ایک اور بڑا جام خالی کرلیا۔ اب ایک بار پھر وہ پوری ترنگ میں تھی۔

وہ مجھے مخاطب کرکے بہکی ہوئی آواز میں بولی "تم چیخو گے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ تم چیخو گے' اگر نہیں چیخو گے۔ تو۔ میں تمہیں۔ حشر تک یہاں لٹکائے رکھوں گی۔ تمہاری مردانگی کی ایسی کی تیسی۔ تم بھی ایک گھنٹے میں میرے تلوے نہ چاٹنے لگو تو میرا نام شاری نہیں۔"

میں نے اپنی بے پناہ اذیت پر قابو پاتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہے تو پھر تم ابھی سے اپنے لیے کوئی اچھا سا نام سوچ لو۔"

"واہو! مسٹر ہیرو... تف ہیو مرد کمانے کی کوشش کررہے ہو' تمہارے جیسے کئی بڑے ہیروز کا "ہیروپن" میں نے ناک کے راستے نکالا ہے۔ اگر یقین نہیں تو ابوظہبی کے سینٹرل کالج سے جا کر پوچھو۔ وہاں تمہیں ایسی کئی کہانیاں سننے کو مل جائیں گی۔ ویسے بائی دا وے... تم رہنے والے کس ملک کے ہو؟"

میں نے کہا "میں اس حالت میں تمہارے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔"

"میرا خیال ہے کہ تم انڈین ہو۔ اگر انڈین ہو تو پھر مجھے "دوسرے" انڈین کی ناک کی ہڈی توڑ کر اور آنکھیں پھوڑ کر بڑی خوشی ہوگی۔"

"پہلا انڈین کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بہکی ہوئی آواز میں بولی "تھا ایک حرامی! میرے ساتھ سینٹرل کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے مجھے گھورا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے بدو ہونے کا طعنہ بھی دیا تھا۔ میں نے اسے بدو بن کر دکھا دیا تھا۔ چند روز بعد کچھ "نامعلوم" لوگ اسے ہاسٹل سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اگلی صبح وہ ایک چوک میں بے ہوش پڑا تھا۔ وہ نابینا ہو چکا تھا۔ اور تمہیں پتا ہی ہوگا' نابینا کسی کو گھور نہیں سکتا۔"

وہ مسلسل بہکی ہوئی باتیں کررہی تھی۔ اس کا نشہ تیز تر ہو رہا تھا۔ کمرے سے باہر خاموشی تھی۔ بس کبھی کبھار کسی اونٹ کے بلبلانے یا بکری کے ممیانے کی دور افتادہ صدا سنائی دے جاتی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ سر کی طرف خون کا دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ لگتا تھا' ابھی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ شاری کی بھرائی ہوئی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بالکل مخمور ہو رہی تھی۔ شاید اسے اب خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ نشہ اس کے حواس کو مختل کر رہا ہے۔ اس نے مناسب سمجھا کہ حوض سے باہر آ جائے۔ اس نے اندھوں کی طرح ٹٹول کر حوض کا کنارہ پکڑا اور باہر آنے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں اس کا پاؤں بری طرح پھسلا اور وہ چھپاک سے پھر حوض میں جا گری۔ گرتے ہوئے اس کا سر پرشور آواز سے حوض کے کنارے سے ٹکرایا تھا۔ وہ منہ کے بل حوض میں گری۔ میں نے بمشکل گردن موڑ کر حوض کے اندر دیکھا اور مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ لڑکی کی ٹانگیں اور بازو بے حرکت نظر آرہے تھے۔ اس کا منہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا' نچلا دھڑ بھی پانی میں تھا' صرف پشت کا تھوڑا سا حصہ پانی سے باہر دکھائی دے رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ اگر وہ واقعی بے ہوش ہو چکی تھی تو پھر یہ تین فٹ گہرا' مختصر سا حوض اس کے لیے بحر اکاہل سے بڑھ کر عمیق اور جان لیوا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرسکتی تھی۔

میں نے تیزی سے سوچا' مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے تھا۔ میں چھت سے الٹا لٹکا تھا اور قریباً بے بس تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ شاری کی کنیزوں اور اس کے پہرے داروں کو آوازیں دوں۔ میں نے انہیں پکارنا شروع کردیا "کوئی ہے۔ کوئی ہے۔ بچاؤ۔ لڑکی ڈوب رہی ہے۔"

میں حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ میری چیخ پکار کا کوئی اثر

نہیں ہوا۔ شاید میری آواز باہر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آواز باہر تک پہنچ رہی ہو لیکن اس پر کان نہ دھرے جا رہے ہوں۔ میں چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور ایک بٹر بردار آفت زادی کے قبضے میں تھا' پہرے دار میری چیخ و پکار کو "معمول کی کارروائی" سمجھ سکتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ چھری اور بکرے کا تصادم تھا' ظاہر ہے اس میں بکرے ہی کو چیخنا تھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں حوض کے پانی میں اٹھتے ہوئے بلبلے صاف دیکھ رہا تھا' یہ بلبلے اس بات کی علامت تھے کہ پانی بے ہوش شاری کے پھیپھڑوں میں داخل ہو رہا تھا۔

میں نے بے بسی سے اردگرد دیکھا۔ میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی۔ مجھ سے آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر دو فٹ اونچا شمع دان موجود تھا۔ میرے ہاتھ اس شمع دان تک پہنچ جاتے تو بہتری کی صورت نکل سکتی تھی۔ میں نے الٹے لٹکے اپنے جسم کو جھلانا شروع کردیا۔ انداز وہی تھا جو بچے جھولا لیتے ہوئے اپنی رفتار بڑھانے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں خود کو جھلانے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے میرے جسم نے چار پانچ فٹ تک حرکت کی پھر یہ حرکت بڑھ کر آٹھ دس فٹ تک ہو گئی۔ ان سنگین لمحوں میں' میں نے خود کو سرکس کا بازی گر محسوس کیا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ میرے ہاتھ کارنس پر رکھے شمع دان تک پہنچ جائیں۔ اپنی چوتھی پانچویں کوشش میں' میں کامیاب ہو گیا۔ اب شمع دان میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے کوشش کرکے اپنا بالائی دھڑ اوپر اٹھایا۔ دو فٹ اونچے شمع دان کی شمعیں اس رسی سے چھونے لگیں جس کے سہارے میں الٹا لٹک رہا تھا۔ رسی جلنے لگی۔ میری نگاہ ٹب نما حوض میں تھی۔ میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ اس صحرائی قبیلے کی شعلہ صفت سردار بے بسی کی موت مر رہی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر پہرے داروں کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ادھر رسی تیزی سے جل رہی تھی' میں کسی بھی وقت کندھوں اور پشت کے بل قالین پر گر سکتا تھا۔ میں خود کو اس دھچکے کے لیے تیار کرنے لگا جو ناگزیر ہونے سے مجھے لگتا تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ میں چار فٹ کی بلندی سے پشت کے بل گرا تھا۔ شمع دان کی دو شمعیں اچھل کر دور جا گریں۔ میں نے انہیں پاؤں کی مدد سے بجھایا اور حوض کی طرف لپکا۔ شاری حوض کی تہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور قالین پر اوندھا لٹا دیا۔

ڈوبنے والے کے لیے فرسٹ ایڈ کے جتنے بھی طریقے رائج ہیں وہ اگلے دو تین منٹ میں' میں نے آزما لیے۔ شاری کے پیٹ میں داخل ہونے والا پانی نکل گیا۔ رکی ہوئی سانس بھی بحال ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھی۔ اس کا باریک مہین لباس بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا تھا۔ بالائی جسم پر ویسے ہی برائے نام لباس تھا۔ وہ ابھی ابھی ایک خوفناک عذاب سے گزری تھی مگر اس کی خوب صورتی پر اس "عذاب" نے کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ موم شمعوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اب بھی دل آویز نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کے سر کی چوٹ دیکھی۔ وہاں سے خون رسنے کے آثار نظر آتے تھے تاہم چوٹ زیادہ شدید نہیں تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کافی دیر اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرتا رہا پھر میں نے اسے گود میں اٹھا کر شاندار مسہری پر لٹا دیا۔ رات اب کافی بھیگ چکی تھی' ہوا میں خنکی سی بس گئی تھی۔ شاری کے کپڑے گیلے تھے' وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑا رہی تھی اور بے چینی کا اظہار کر رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی "صاعقہ... صاعقہ۔" مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی کسی کنیز کو بلا رہی ہے تاکہ وہ اس کا لباس بدل سکے۔ تین چار بار صاعقہ کا نام لے کر وہ پھر بہت گہرے سانس لینے لگی اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے ایک ریشمی چادر اس کے جسم پر ڈالی اور اس کا گیلا لباس اتار دیا۔ ایک قریبی الماری میں خشک لباس موجود تھا لیکن یہ لباس اسے پہنانا خاصا دشوار عمل تھا' لہٰذا میں نے اس کے جسم کو گرم رکھنے کے لیے ریشمی چادر کے اوپر ایک اونی شال ڈال دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد شاری کے حواس بحال ہونے لگے۔ اس کی ناک سرخ ہو گئی اور ہونٹوں کا گلابی پن لوٹ آیا پھر اس کی پلکوں میں جنبش ہونے لگی۔ وہ جاگ گئی۔ اس نے اپنی گہری سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ اس نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ ہوش میں آنے کے باوجود وہ ہوش میں نہیں تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا سر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ جیسے وہ اپنا توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن ناکام ہو رہی ہو۔ اٹھ کر بیٹھنے سے گرم شال اس کے بالائی جسم سے سرک گئی۔ گندمی جلد موم شمعوں کی روشنی میں کندن کی طرح دمک اٹھی۔ اس نے قدرے حیرت سے اپنے آپ کو دیکھا پھر مجھے گھورنے لگی۔

اس کے ہونٹوں سے بہکی بہکی سی بھرائی ہوئی آواز نکلی "تم... بڑے خراب ہو۔ تم نے میرا لباس اتار دیا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم گرگری پیک ہو۔ میں نے تمہاری ہر

قلم دیکھی ہوئی ہے۔ وہ ٹیلی وژن فلم بھی دیکھی ہوئی ہے جس میں تم نے کاؤبوائے کا کریکٹر کیا تھا۔ تم نے گھوڑوں کے ایک تاجر کی خوب صورت بیٹی کو ٹھنڈے جوہڑ میں ڈوبنے سے بچایا تھا اور پھر آتش دان کے پاس لٹا کر اس کے سارے کپڑے اتار دیے تھے۔ کیا زبردست منظر تھا۔ وہ اٹھ کر بالکل ہکا بکا رہ گئی تھی۔۔۔ ہاہا ہو ہو۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر.. لڑکھڑا کر بستر پر ہی گر گئی۔ اس کا سراپا کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھا۔ وہ بہت کم حجاب محسوس کر رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح انگلی نچا کر بولی "تم نے میرے بندر کو قتل کیا' کسی اور نے کیا ہوتا تو قسم خدا کی' آج ہی رات اس کا مقبرہ تعمیر کرا دیتی لیکن تم تو۔۔۔ تم تو گریگری پیک ہو۔ اب تمہارا کیا کروں؟ لیکن۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں سزا نہیں دوں گی۔۔۔ سزا ضرور ملے گی۔۔۔ ہاں یہ ہوگا' یہ کم سے کم سزا ہوگی۔۔۔ اور کم سے کم سزا پتا ہے کیا ہوگی۔۔۔ تمہیں۔۔۔ میں تمہیں بندر بنا کر اپنے پاس رکھ لوں گی۔۔۔ ہا ہا۔ عالمی شہرت کا مالک گریگری پیک بندر بن کر میرے پاس رہے گا۔۔۔ کہاں ہے۔۔۔ کہاں ہے وہ سوبالو والی زنجیر۔۔۔ وہ زنجیر میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے گلے میں پہنا دوں۔"

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ وہ بے حجاب پڑی مجھے گھورتی رہی۔ اس طلسماتی ماحول میں اس کے سراپا سے نگاہیں چرانا ایک مشکل کام تھا اور میں یہ کام کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ بولی "ویسے تم انگریزوں میں اکڑ بہت ہوتی ہے' چلو بندر نہ ہو' لیکن میرے پاس تو رہو۔۔۔ میرے سفید بندر۔۔۔"

اس نے باقاعدہ ہاتھ بڑھا کر میری ٹھوڑی چھونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس "ناکام کوشش" کی وجہ سے اس کا توازن بگڑا اور وہ بستر سے الٹ کر قالین پر جاگری۔ سر کے پچھلے حصے سے ٹکیں اچھی تھیں لہٰذا اس کے خوب رو چہرے پر چند ساعتوں کے لیے کرب کے آثار نظر آئے مگر اس نے قالین سے اٹھنے کی کوشش نہیں کی' وہیں چت پڑی رہی۔ نشے کی زیادتی کے سبب اسے رہ رہ کر ہچکی سی آ رہی تھی۔

میں اسے قالین سے اٹھانے کے لیے اس پر جھکا۔ اس نے امربیل کی طرح اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں۔ الکحل کے بھبکے میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگے۔ وہ کرخت آواز میں بولی "اے گریگری پیک! تمہارے بالوں کو کیا ہوا۔ وہ تو اور طرح کے تھے اور۔۔۔ اور تمہارا رنگ بھی ذرا سنولایا ہوا ہے۔ کیا بہت دیر پھرتے ہو دھوپ میں؟"

میں نے کہا "خدا کی بندی! میں گریگری پیک نہیں ہوں۔ تمہارے دماغ کو نشہ چڑھا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم مجھے الٹا لٹکا کر ڈنڈوں سے پیٹ رہی تھیں۔ یہ دیکھو' میرے پنڈے پر تمہارے ڈنڈوں کے نشان۔"

اس نے بہکا ہوا قہقہہ لگایا "مجھے الّو بنا رہے ہو۔ یہ نشان۔۔۔ یہ نشان تو عمر شریف کی کلہاڑی کے ہیں۔ فلم میکناز گولڈ میں تمہاری لڑائی ہوئی تھی نا... عمر شریف سے۔ اس نے دھڑا دھڑ کلہاڑی چلائی تھی تمہارے اوپر۔۔۔ میں سب جانتی ہوں' مجھ سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔"

وہ مسلسل بولتی جارہی تھی۔ اس کے گلے میں نہایت قیمتی موتیوں کا ہار تھا۔۔۔ سیاہ آنکھوں کا کاجل پانی میں غوطے کھانے سے بہہ گیا تھا اور رخساروں پر پھیل گیا تھا لیکن یہ سیاہی اس کے حسن کو زیادہ متاثر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے اس سے گردن چھڑانا چاہی تو اس نے مجھے اور زور سے بھینچ لیا۔

"نہیں' میں تم کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ مصمم ارادے سے بولی۔

میں نے ذرا زور لگا کر گردن کو اس کے پنجۂ ستم سے آزاد کرایا اور اسے اٹھا کر بستر پر ڈال دیا۔ اس نے ایک بار پھر میرے بازو میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گاڑ دیں "دیکھو گریگری! میں تم کو نہیں جانے دوں گی۔ اگر تم جاؤ گے تو میں شور مچاؤں گی۔۔۔ میں رونا شروع کر دوں گی اور تمہیں پتا ہے' میں کتنی بری آواز میں روتی ہوں اور کتنی زور سے بھی۔"

اس آفت زادی نے "سیمپل" کے طور پر مجھے رو کر دکھایا۔ وہ اپنے دعوے میں سچی تھی۔ اس کا رونا کسی طور پر قابلِ سماعت نہیں تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

میری چیخ و پکار پر تو کوئی کمرے میں نہیں آیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس بدبخت کی چیخیں سن کر کئی "اطاعت گزار" دوڑے آئیں گے۔ میں اس حالت میں اور اس موقع پر کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بدمست بلا جو اتفاق سے حسین بھی تھی' مجھ پر کسی طرح کا "چارج" لگا کر مجھے بدترین سزا کا حق دار ٹھہرا سکتی تھی۔

میں اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اس بدبخت کے دماغ میں نجانے کیا سمایا تھا' وہ مجھے مسلسل گریگری پیک کا خطاب دے رہی تھی۔ اس کی انگلیاں میرے بالوں میں تھیں اور حرکت کر رہی تھیں پھر اچانک ہی اسے نیند نے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی بہت مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ وہ سراپا قیامت میرے پہلو میں لیٹی تھی۔ اس کے بادلوں جیسے بالوں نے پورے تکیے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کے

خدوخال میں عرب اور یورپ کا حسین امتزاج تھا۔

میں آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اونی شال سے اسے ڈھانپ دیا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی۔ میں نے گھوم پھر کر اچھی طرح اس کمرے کا جائزہ لیا۔ اس خیمہ نما کمرے میں ساگوان کی دو بڑی بڑی الماریاں بھی تھیں۔ ان الماریوں میں سے ایک کے اندر تو شاری کے زرق برق کپڑے تھے' دوسری میں کتابیں اور کچھ ڈیکوریشن پیس وغیرہ تھے۔ اس الماری کے دو خانے مقفل تھے۔ میں نے ان مقفل خانوں کی چابیاں تلاش کیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد یہ چابیاں مجھے ایک تکیے کے غلاف میں سے مل گئیں۔ میں نے ایک مقفل خانہ کھولا۔ اس میں جیولری تھی اور قیمتی پتھر تھے' جن میں یاقوت' نیلم' زمرد ہر طرح کے جواہرات شامل تھے۔ یہ ساری جیولری یقیناً شاری ہی کی ملکیت تھی۔ دوسرے مقفل خانے میں بریٹا پسٹل کا ایک شان دار جوڑا اور ایک آٹھ ایم ایم رائفل کے علاوہ منقش دستوں والے خنجر موجود تھے۔ یہاں دو تین کتابوں کے علاوہ مجھے ایک ڈائری بھی نظر آئی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ شاری کی ذاتی ڈائری تھی۔ اس ڈائری میں شاری نے وقتاً فوقتاً اپنی یادداشتیں لکھی تھیں۔ کہیں کہیں تاریخ بھی درج تھی۔ کسی جگہ حساب کتاب جوڑا گیا تھا کہیں یونہی آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر نقشہ سا بنایا گیا تھا۔ تحریر انگلش میں تھی۔ لکھائی اچھی نہیں تھی مگر پڑھی جاسکتی تھی۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈائری کے صفحات الٹنے شروع کیے اور مجھ پر کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ سب سے پہلا انکشاف تو ان لوگوں کے پیشے کے بارے میں ہوا۔ چار روز پہلے جب میں نے حبشی الماجد سے اس قبیلے کے ذریعۂ معاش کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ پراسرار انداز میں مسکرا کر چپ ہوگیا تھا۔ آج اس مسکراہٹ کی وجہ میری سمجھ میں آئی۔ ان لوگوں کا پیشہ لوٹ مار تھا۔ بالفاظ دیگر ہم خطرناک صحرائی راہزنوں کے نرغے میں تھے اور شاری ان راہزنوں کی سردار تھی۔ یہ لوگ نہ صرف صحرا سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹتے تھے بلکہ کبھی کبھی صحرا سے دور "ہائی وے" تک بھی مار کرتے تھے۔۔۔ تاہم ایک بات تھی' یہ لوگ ابوظہبی کے باشندوں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ قبیلے کے اصل سردار شاص نے اہل قبیلہ کو ایسا کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اس نے ایسا حکم کیوں دے رکھا تھا' اس کی وجہ ڈائری میں تحریر نہیں تھی۔

ڈائری میں ایک جگہ شاری کی بلغارین والدہ سارہ کے بارے میں بھی معلومات موجود تھیں۔ بے شک یہ معلومات ادھوری تھیں لیکن ان سے سارہ شاص کے کردار پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی تھی۔ وہ پرکشش اور شان دار شخصیت کی مالک تھی۔ اس کا گھرانا بلغاریہ کے خوش حال گھرانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ شوقیہ فوٹوگرافر تھی۔ سن ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی اور بھائی کے دوست کے ساتھ عرب کے صحرائے ربع یا ربع الخالی کی سیاحت کو نکلی تھی۔ اس علاقے سے گزرتے ہوئے ان پر صحرائی قزاقوں نے حملہ کیا۔ چند دیگر افراد کے علاوہ سارہ کا بھائی اور بھائی کا دوست بھی مارا گیا۔ حسین و دلکش سارہ زندہ گرفتار ہوئی۔ سردار شاص نے اس سے شادی کرلی۔ سردار شاص کی بیوی بننے کے بعد سارہ نے حالات سے سمجھوتا کرلیا اور اپنے دل کو سمجھا لیا کہ اب اسے باقی کی زندگی اس صحرا میں انہی لوگوں کے درمیان گزارنی ہے۔ سردار شاص سارہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اپنا "پیشہ" ترک کرنے کے سوا اس نے اپنی محبوب بیوی کی قریباً ہر بات مانی۔ سارہ کو پڑھائی لکھائی سے محبت تھی' سردار شاص بھی پڑھائی لکھائی میں دلچسپی لینے لگا۔ سارہ نہ صرف اپنے گنوار خاوند کو پڑھاتی تھی بلکہ قبیلے کے دوسرے لوگوں میں بھی یہ شوق اُجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ دو خوب صورت بچوں کی ماں بن گئی تو سردار شاص کی نظروں میں اس کی قدروقیمت اور بڑھ گئی۔ شاید اگر سارہ کو کچھ اور زندگی ملتی تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ قبیلے کے مزاج میں بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دیتی لیکن وہ شادی کے تین چار سال بعد ہی راہیِ عدم ہوگئی۔ بہرحال اس کی کوششوں کے آثار کسی نہ کسی صورت ابھی تک قبیلے میں دیکھے جاسکتے تھے۔

میں دیر تک ڈائری کی ورق گردانی کرتا رہا اور مجھے خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ سارہ کی بیٹی شاری حسین و جمیل ہونے کے باوجود اپنے "پیشے" کے لیے ضروری اوصاف پر پوری اترتی تھی۔ وہ زبردست گھڑسوار اور نشانے باز تھی۔ جنگ و جدل اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ لوٹ مار کی اکثر مہمات میں خود شریک ہوتی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک دولت مند لڑکی تھی۔ وراثت میں بھی اسے بہت کچھ ملنے والا تھا۔ ڈائری میں ایک دو جگہوں پر شاری کے پالتو بندر سوبالو کا تذکرہ بھی موجود تھا۔

میں ابھی مزید ڈائری کا مطالعہ کرنا چاہ رہا تھا مگر پھر مجھے

دروازے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے روشن دان سے باہر جھانکا' مجھے اندازہ ہوا کہ صبح کا اجالا رات کی تیرگی میں شامل ہونے لگا ہے۔ شاری گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ میں نے ڈائری واپس الماری میں رکھی۔ بریٹا پسٹل دیکھ کر میری نیت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی مگر پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ میرے جسم پر صرف ایک پتلون تھی۔ اس لباس میں پسٹل کہاں چھپاتا۔ ویسے بھی غزالہ کی موجودگی میں' میں کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے الماری کے دونوں خانے دوبارہ مقفل کیے اور چابیاں تکیے کے غلاف میں رکھ دیں۔ دروازے سے کان لگا کر میں نے باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ میری سماعت سے ابو آبان کی جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔ ابو آبان ان لٹیروں میں کسی حد تک تحمل مزاج اور دانا نظر آتا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی موجودگی میں دروازہ کھول دوں اور ان لوگوں کو اندر کی صورت حال سے آگاہ کروں۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور باہر نکل آیا۔ ابو آبان سمیت باہر موجود دیگر افراد کے چہروں پر حیرت نظر آنے لگی۔

○✿○

میں ایک بار پھر غزالہ سمیت زنداں میں تھا۔ غزالہ ترس ناک نظروں سے میرے جسم پر کوڑوں کے نشانات دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں تقریباً ساری داستان سنا دی تھی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گئی تھی کہ مجھے سزا دیتے دیتے شاری خود ہی اتنا مضمحل ہو گئی تھی بلکہ جان سے جاتے جاتے بچی تھی۔ حبشی الماجد بدستور پہرے پر موجود تھا۔ اس کا کسرتی جسم طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں فولاد کی طرح دمک رہا تھا۔ میرے دریافت کرنے پر الماجد نے بتایا کہ ابھی تک ہمارے تیسرے ساتھی (شیخ عاصم) کا کچھ پتا نہیں چلا۔

الماجد اب میرے ساتھ کافی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا تھا۔ چند دیگر افراد کی طرح الماجد کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ شاری رات کو نشے میں وحشت ہو کر پانی میں گر گئی تھی اور دیر تک بے ہوش رہی تھی۔ وہ مجھ سے اس سلسلے میں کرید کرید کر سوال پوچھنے لگا۔ پتا نہیں شاری کے سلسلے میں اسے اتنی کرید کیوں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اور شاری کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ تعلق یک طرفہ بھی ہو سکتا تھا اور دو طرفہ بھی۔ وہ مسلسل مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور صرف الماجد ہی نہیں فی الحال باقی لوگ بھی مجھے ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاری ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ بیدار ہونے کے بعد ہی بتا سکتی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ ظاہر ہے میں ساری رات اس کے ساتھ کمرے میں بند رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور بے لباس بھی تھی۔ ذہن میں ان گنت اندیشے جاگ سکتے تھے' اور جاگ رہے تھے۔

حالانکہ میں نے اس خوب صورت فتنے کو غلط نظر سے دیکھا تک نہیں تھا پھر بھی میں انجام سے مطمئن نہیں تھا۔ کیا پتا تھا وہ بددماغ اٹھ کر کیا کہہ دے۔ رات بھر وہ بالکل ٹن رہی تھی اور مجھے گریگری پیک کے نام سے پکارتی رہی تھی۔ خبر نہیں تھی کہ اسے رات کی باتیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ کیا پتا وہ اپنے سر کی چوٹ اور اپنی بے ہوشی کا الزام بھی مجھ ہی پر دھر دیتی۔ اس طرح کے کئی وسوسے تھے۔

دوپہر کو ہمیں کھانا دیا گیا۔ اس میں دودھ روٹی اور بھیڑ کا گوشت شامل تھا۔ آج مجھے خوب کھل کر بھوک لگی تھی۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ غزالہ نے بھی چند لقمے لیے' اس کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا وہ مسلسل شیخ عاصم کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ بہرحال اس کی پریشانی پہلے کی نسبت کچھ کم تھی اور یہی حال میرا بھی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید عاصم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

شاری کے سلسلے میں میری پریشانی بدستور قائم تھی۔ اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ پتا نہیں وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے زنداں کے دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی سے جھانکا اور حیران رہ گیا۔ سردار شاری بنفس نفیس ہماری کوٹھڑی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت ڈھیلے لبادے میں تھی۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں ایک حبشی کنیز بڑے احترام سے چلی آ رہی تھی۔ رات والے سنگین واقعات کا شائبہ تک شاری کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔

شاری کو دیکھ کر الماجد نے جلدی سے چابیوں کا گچھا نکالا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رائفل میری طرف سونت کر انگلی لبلبی پر رکھ لی تھی۔

کنیز باہر کھڑی رہ گئی۔ شاری نپے تلے قدموں سے اندر آ گئی۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ غضب ناک ہے یا پُرسکون ہے۔ وہ چند لمحے تک غزالہ کو گھورتی رہی' پھر میرے قریب چلی آئی "کیسے ہو تم؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ لہجہ کل کی نسبت بہت نرم تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ یک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ معنی خیز نگاہیں تھیں' ان میں کل گزر جانے والی رات کی ساری تفصیل موجود تھی۔ وہ سارے رنگین و سنگین واقعات جو کل رات پیش آئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاری کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ اس کے گندمی رنگ میں ہلکی سی سرخی بھی شامل ہو گئی تھی "تم نے میرے کپڑے اتارے تھے؟" اس نے آہستگی سے کہا۔

میں نے کہا "اگر تمہیں یہ معلوم ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ کیوں اتارے تھے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر بدستور دھیمے لہجے میں بولی "تمہارے پاس گھڑی ہے؟"

میں نے کہا "تھی۔۔۔ مگر تلاشی کے دوران میں تمہارے آدمیوں نے اتار لی۔"

اس نے گھڑی مجھے واپس کرتے ہوئے کہا "یہ رکھ لو۔ رات دس بجے میں تمہارا انتظار کروں گی۔۔۔ وہیں کمرے میں۔"

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے الماجد کی طرف گھوم کر کہا "الماجد! اب انہیں بند رکھنے کی ضرورت نہیں۔ دروازہ کھلا چھوڑ دو۔ کل صبح انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کر دینا۔"

وہ الماجد سے مقامی زبان میں بات کرتی تھی لیکن یہ فقرہ اس نے انگلش میں کہا تھا' شاید اس لیے کہ ہم بھی سن لیں۔

الماجد نے اطاعت مندی سے سر جھکایا۔ شاری مجھے گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

بچہ سو رہا تھا۔ میں اور غزالہ کوٹھڑی میں آمنے سامنے بیٹھے رہ گئے۔ طاق دان میں دیے کی روشنی سے کوٹھڑی کی دیواروں پر ہماری پرچھائیاں بن رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ غزالہ مجھ سے نگاہیں چرا رہی ہے۔ غزالہ کی یہ کیفیت یقیناً اس فقرے کے سبب تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے شاری نے کہا تھا۔ میں نے غزالہ کو رات کے واقعات بتائے تو تھے لیکن زیادہ تفصیل سے نہیں بتائے تھے۔ میں نے چاہا کہ غزالہ کے سامنے وضاحت کروں اور اسے بتاؤں کہ میں نے شاری کا لباس (برائے نام لباس) کیوں اتارا تھا لیکن اسی دوران میں بچہ جاگ گیا اور غزالہ اٹھ کر اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔

دن بھر کی گرمی جس نے ہمیں جھلسا کر رکھ دیا تھا اب آہستہ آہستہ خوش گوار ٹھنڈک میں بدل رہی تھی۔ میں لیٹ گیا اور حالات پر غور کرنے لگا۔ الماجد شاری کے ساتھ ہی واپس جا چکا تھا۔ ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی بند نہیں کیا گیا تھا۔ بظاہر ہماری حیثیت اب قیدیوں کی سی نہیں رہی تھی' لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس زنداں سے باہر ابھی بھی پہرا موجود ہو اور اگر نہ بھی ہوتا تو یہ صحرا ایک زنداں ہی تو تھا۔ پانی خوراک اور سواری کے بغیر یہاں سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میرا دھیان ایک بار پھر شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ بے شک وہ میرا دشمن اور بدترین رقیب تھا لیکن اس سفر میں اس کی حیثیت میرے ساتھی کی تھی' میں اس کے بارے میں فکر مند تھا اور یہ فکر مندی بڑھتی جا رہی تھی پھر میرا خیال شاری کی طرف چلا گیا۔ رات والے واقعات کے بعد اس کے رویے میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ اب اس نے مجھے اپنے خلوت کدے میں بلایا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس انداز میں سوچ رہی ہے اور مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہی ہے۔

سوچتے سوچتے نجانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ دن بھر کی تپش کے بعد چلنے والی ٹھنڈی ہوا نے مجھے تھپک تھپک کر وادیٔ خواب میں پہنچا دیا تھا۔ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو رسٹ واچ رات کے بارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ دیے کی روشنی بہت کم ہو چکی تھی۔ تاہم چاند کافی اوپر آ گیا تھا اور اس کی کرنیں کھجور اور تاڑ کے بلند درختوں میں سے چھن چھن کر کھڑکی تک پہنچ رہی تھیں۔ غزالہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بچے کو بانہوں میں لیے لیٹی ہوئی تھی۔ غالباً جاگتے جاگتے تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے میرے اوپر چادر دے دی تھی اور سر کے نیچے تکیہ بھی رکھ دیا تھا۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھ کسی آہٹ کی وجہ سے کھلی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میری نگاہ زنداں کے صدر دروازے پر پڑی۔ وہاں الماجد دو رائفل بردار بدوؤں کے ساتھ موجود تھا۔ الماجد ہماری کوٹھڑی کے اندر آیا۔ اس نے مجھے اٹھنے کو کہا اور بولا "سردار شاری نے تمہیں بلایا ہے۔"

یکایک میری نگاہ پھر رسٹ واچ کی طرف اٹھ گئی۔ بارہ بج چکے تھے۔ شاری نے مجھ سے کہا تھا کہ میں دس بجے اس سے ملاقات کے لیے آؤں۔ شاید وہ ناراض ہو گئی تھی اور اس نے مسلح افراد کے ذریعے مجھے طلب کیا تھا۔

غزالہ بھی جاگ گئی تھی اور اپنے سرہانے مسلح افراد کو دیکھ کر پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور الماجد کے ساتھ شاری کی آرام گاہ کی طرف چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں شاری کے سامنے تھا۔ الماجد مجھے کمرے میں پہنچا کر اور دروازہ بند کر کے واپس چلا گیا تھا۔ کمرے کا ریشمی خواب ناک ماحول دیکھ کر مجھے کل شب کے سارے مناظر یاد آ گئے

اور جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ شاری کا چہرہ شام کی طرح بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا۔ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے تپائی پر خوب صورت پیالوں میں شربت قسم کی کوئی چیز رکھی تھی۔ ہم دونوں نے شربت پیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ان رسمی باتوں کے دوران میں ہی شاری کا رویہ بتدریج بدلنے لگا۔ وہ برہم نظر آنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر غرائی "میں نے دس بجے کا کہا تھا۔ تم آئے کیوں نہیں؟"

"دراصل۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ مجھے نیند آگئی۔"

اس کا سرخ چہرہ مزید سرخ ہوگیا "کیوں نیند آگئی؟" وہ چلائی "کیا میرے کہنے کی اتنی سی اہمیت بھی نہیں تھی تمہارے نزدیک؟"

"یہ اہمیت کی بات نہیں ہے۔ میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا اور سو گیا۔"

"نائی نت!" وہ چلائی اور اس نے ٹھوکر مار کر شیشے کا ایک پیالہ چکنا چور کردیا۔ وہ بالکل بپھری ہوئی تھی۔ اس نے میرے نہ آنے کو اپنی توہین جانا تھا اور یہ توہین اس کے لیے ناقابل برداشت ہورہی تھی پھر ایک اور بات بھی میں نے نوٹ کی تھی۔ الماجد سمیت شاری کے سامنے حاضر ہونے والا ہر شخص جھک کر تعظیم پیش کرتا تھا۔ حتیٰ کہ میں نے ابو تابان کو بھی رکوع کے بل جھکتے دیکھا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاری کو میری یہ حرکت بھی شاق گزری تھی۔

وہ چند لمحے تک مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی "ادھر سامنے بیٹھ جاؤ دیوار کے ساتھ۔ اب میں دیکھتی ہوں تم کیسے آنکھ جھپکتے ہو۔"

اس کے دماغ کا میٹر گھوم رہا تھا۔ میں نے خواہ مخواہ الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور دیوار کے ساتھ ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ آبلہ پا ادھر ادھر گھومتی رہی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجھ پر نیند کا غلبہ ہورہا ہے۔ فوراً میرا دھیان اس خوش ذائقہ مشروب کی طرف چلا گیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے نوش جاں کیا تھا۔ دو تین منٹ کے اندر مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس مشروب میں خواب آور دوا موجود تھی۔ میرا سر بھاری ہورہا تھا اور پلکیں بند ہوتی جارہی تھیں۔

"یہ تم نے کیا کیا ہے؟" میں نے شاری سے پوچھا۔

"تمہیں سونے کا شوق ہے ناں۔ اب ذرا سو کر دکھاؤ۔" وہ غرائی۔

میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔ نیند منہ زور ریلے کی طرح مجھے

غضب میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لایا اور خود کو سنبھالے رکھا۔ واقعی نیند کے غلبے میں نیند سے لڑنا ایک کڑی سزا ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے ڈھائی تین گھنٹے تک پامردی سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ نیند کا زور کم ہونے لگا۔ اس تمام عرصے میں وہ بڑے اطمینان سے مسہری پر نیم دراز ایک انگلش کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ غصیلی نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا کہ جس طرح دھیرے دھیرے اسے غصہ چڑھا تھا اسی طرح بتدریج ختم بھی ہوگیا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ میری قمیص کل الماجد نے پھاڑ کر علیحدہ کردی تھی۔ میرا بالائی جسم ابھی تک عریاں تھا۔ جلد پر وہ سرخ دھاریاں بھی موجود تھیں جو شاری کے دست ستم نے بنائی تھیں۔ وہ ان سرخ دھاریوں پر ہاتھ پھیرنے لگی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اچانک بولی "کیا مجھ سے پیار کرو گے؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ مجھے خاموش پاکر اس نے اپنا سوال دہرایا اور جواب طلب نظروں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔

میں نے کہا "تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے "کھانے" کا پوچھا جاتا ہے۔ پیار کوئی نوالہ تو نہیں کہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ پیار کیا نہیں جاتا' ہوجاتا ہے؟"

"ہاں میں اس کلیے کو ٹھیک سمجھتا ہوں۔"

"لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ پیار ہوجاتا ہے اور کیا بھی جاسکتا ہے۔"

ان لمحوں میں وہ صحرائی قزاقوں کی سردار نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک پڑھی لکھی شہری لڑکی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے کہا "تم نے شاید کسی کتاب میں یہ فقرہ پڑھا ہے اور رٹ لیا ہے۔"

"اور تم نے شاید عملی تجربات کیے ہیں!"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے کہیں تمہاری محبوبہ تو نہیں؟"

"میرے ذہن میں محبوبہ کا تصور کچھ اور ہے۔ ویسے بھی وہ شادی شدہ لڑکی ہے۔ ہمارے جس ساتھی کے بارے میں تم کہہ رہے ہو کہ اس کا کچھ پتا نہیں چلا وہ اس لڑکی کا خاوند ہے۔"

"بہرحال میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ پیار از خود ہی نہیں ہوتا' پیار کیا بھی جاسکتا ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ایسا پیار زیادہ پائیدار اور گہرا ہوتا ہے۔ اس کی مثال شادی ہے۔ جب مرد اور

عورت شادی کے بعد ایک دوسرے کی خوبیاں اور خامیاں سمجھ کر ایک دوسرے سے پیار کرنا شروع کرتے ہیں تو ان کے پیار میں افلاطونی پن نہیں ہوتا' پختگی اور گہرائی ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح دلیل کے ساتھ گفتگو کرسکتی ہے۔ شاید اس کے اندر اس کی تعلیم یافتہ ماں بول رہی تھی۔

میں نے کہا "پیار کے بارے میں تمہارا فلسفہ تمہاری ہی طرح عجیب ہے۔"

"اس میں کوئی بات عجیب نہیں۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی "میں سمجھتی ہوں کہ انسان پیار کرنا سیکھ سکتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسرے جان داروں کی طرح ایک جاندار ہے۔"

اس کا شانہ میرے شانے سے چھو رہا تھا۔ میں نے کہا "کیا تم ابھی اسی وقت اپنی تھیوری کو آزمانا چاہ رہی ہو؟"

میرے لہجے میں چھپے طنز کو محسوس کرکے وہ مسکرائی اور ذرا پیچھے ہٹ کر بولی "نہیں' اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ بہرحال آنے والے دنوں میں ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں یہ تھیوری ثابت کرسکتی ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم ہمیں یہاں روک کر رکھو گی؟"

"ہاں ایسا بہت ضروری ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک تمہارا گمشدہ ساتھی نہیں مل جاتا۔ اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ تمہارے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"جرم کی بات مت کرو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی' وہ ایک دم پھر برہم ہوگئی تھی۔ شاید اس کے دماغ میں پالتو بندر کا خیال آگیا تھا۔ تاہم فوراً ہی اس نے اپنی برہمی پر قابو پایا اور قدرے ملائمت سے بولی "جن معاملات کے متعلق پورا علم نہ ہو ان کے بارے میں زبان بند رکھنا بہتر ہوتا ہے۔"

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی پشت پر تھا۔ گندمی عارض حدت سے سرخ ہورہے تھے اور سیاہ آنکھوں میں نشہ سا تیر رہا تھا۔ کرختگی اور نزاکت کا عجیب امتزاج تھی یہ لڑکی۔ اس نے میرے ہاتھ کو معنی خیز انداز میں سہلایا اور بولی "اب تم جاسکتے ہو۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ جونہی میں دروازے سے نکلا' ایک سایہ سا لپک کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی دروازے سے چپکا ہماری باتیں سننے کی کوشش کررہا تھا۔ کہیں وہ الماجد تو نہیں تھا؟ میرے ذہن سے خیال گزرا۔

جس وقت میں زنداں کی کوٹھڑی میں واپس آیا' سپیدۂ سحر نمودار ہوچکا تھا' اندھیرے میں ڈوبا ہوا اور اوس میں بھیگا ہوا صحرا دھیرے دھیرے تیرگی کے پردے کو چاک کررہا تھا۔ یہ بڑا ہی سہانا منظر تھا۔ دور تک ریت کے ٹیلے اور چاروں طرف شفاف افق۔ اونٹوں کی بلبلاہٹ' بھیڑ بکریوں کی صدائیں' مرغان صبح گاہی کے آوازے اور اوپر گہرا نیلا آسمان جس پر صبح کا شاید ایک ہی تارا چمکتا رہ گیا تھا۔

میں کوٹھڑی میں پہنچا تو غزالہ جاگ رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے کی طرح اس کے گیسو بھی پریشان تھے۔ اس نے صرف ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور بچے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ غزالہ کی اس "نگاہ غلط انداز" میں کئی اندیشے اور شکوے سمائے ہوئے تھے اور شاید ایک طرح کی بیگانگی بھی تھی۔ نجانے وہ اپنے طور پر کیا سوچ رہی تھی کہ میں کس طرح کی شب گزار کر آیا ہوں۔ یقیناً وہ میری طرف سے بدگماں تھی اور اس کی بدگمانی بہت حد تک درست بھی تھی۔ اب یہ بات غزالہ کے لیے راز نہیں رہی تھی کہ سائیں عالی کی ہدایت پر سروج میرے بہت قریب آچکی ہے۔ جو راتیں شیر محمد کی حویلی میں سروج نے میرے ساتھ گزاری تھیں۔ وہ غزالہ کے علم میں تھیں۔ وہ انہیں کیسے بھول سکتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دو کنیزیں ہمارا ناشتا لے کر پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ الماجد بھی تھا۔ رائفل بدستور اس کے مضبوط کندھے سے جھول رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں اور مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ دیر پہلے تک روتا رہا ہے۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ نجانے کیوں ایک دم میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو سایہ سا لپک کر دیوار کے پیچھے اوجھل ہوگیا تھا وہ الماجد ہی تھا۔ مجھے اب صاف محسوس ہورہا تھا کہ الماجد اور شاری کے درمیان کوئی رشتہ موجود ہے۔ غالباً الماجد شاری پر بری طرح فریفتہ تھا اور پروانے کی طرح اس شمع حسن کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کی نگاہ جب بھی شاری پر پڑتی تھی' اس میں ایک ناقابل بیان چمک آجاتی تھی۔ جیسے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں شاری کے حسن کو سجدے کررہا ہو۔ مجھے وہ منظر یاد تھا جب اس نے بے پناہ محبت اور عقیدت سے شاری کے جوتوں پر بوسے دیے تھے اور اس سے بھی حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس نے جوتوں کے تلووں کو چوما تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے الماجد آج کچھ غمگین دکھائی دیتے ہو؟"

"کیوں۔ کیا تم پر الہام ہوتا ہے؟" وہ غرایا۔

اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت چمک رہی تھی۔

میں خاموش ہوگیا۔ میں واضح طور پر محسوس کررہا تھا کہ

میرا رات بھر شاری کی آرام گاہ میں رہنا الماجد کے لیے غم و غصے کا باعث ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے دروازے سے کان لگا کر شاری کی رومان بھری باتیں بھی سنی ہوں۔

جب تک ہم ناشتا کرتے رہے' دونوں کنیزیں ہمارے قریب ہی موجود رہیں پھر الماجد نے خشک لہجے میں مجھے اطلاع دی کہ ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں "زنداں" سے نکال کر مہمان خانے کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا جائے گا۔ الماجد نے غزالہ سے مخاطب ہو کر کہا "خاتون! تم اپنے ساتھی کے ساتھ رہنا پسند کرو گی یا تمہارے لیے دوسرے کمرے کا انتظام کیا جائے؟"

غزالہ ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آئی' پھر اس نے کہا "میں ان کے ساتھ ہی رہنا چاہوں گی۔"

الماجد مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں کوٹھڑی سے نکال لیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انتظار کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ ہماری کوٹھڑی سے باہر ایک مسلح شخص بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ بھی دیگر بدوؤں کی طرح روایتی لباس میں تھا۔ لمبی سفید قبا ٹخنوں تک پہنچتی ہوئی' پگڑی جس کے پلو سے بوقت ضرورت چہرہ بھی ڈھانپ لیا جاتا تھا' کھجور کی چھال سے بنی ہوئی جوتی جو تپتی ریت پر باآسانی چلنے میں مدد دیتی تھی۔ پہرے دار کو دیکھ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

دوپہر کے وقت مجھے الماجد کی صورت نظر آئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح مسلح اور چوکس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے شاری یاد کر رہی ہیں۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ شاری اتنی جلدی مجھے شرف ملاقات بخشے گی۔ میں الماجد کے ساتھ چل دیا۔ اس مرتبہ ہماری منزل شاری کی آرام گاہ نہیں تھی۔ الماجد مجھے ایک کھلے احاطے میں لے آیا' یہاں نخلستان کا سا منظر تھا۔ کھجور اور تاڑ کے درختوں کی چھاؤں اچھی لگتی تھی۔ یہاں اس قبیلے کو پانی فراہم کرنے والا واحد کنواں بھی تھا۔ یہ کنواں بہت کم مقدار میں پانی دیتا تھا۔ کنوئیں کے پاس ہی دو تخت بچھے تھے۔ یہ تخت مخملی کپڑے سے ڈھانپے گئے تھے اور ان پر گاؤ تکیے بھی لگے تھے۔ ایک تخت پر مجھے شاری بیٹھی نظر آئی۔ اس کے عقب میں دو کنیزیں موجود تھیں اور اسے پنکھا جھل رہی تھیں۔ یہاں ابو آبان سمیت تین چار دیگر بزرگ بھی موجود تھے۔

میں شاری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ بڑی تمکنت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ رات والی بے تکلفی اور شناسائی کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نہیں تھا۔

"تم کون ہو؟" شاری نے اچانک پوچھا۔

"ہم آپ کو بتا چکے ہیں کہ کون ہیں۔"

"تم اب تک جھوٹ بولتے رہے ہو۔" شاری نے کہا۔

"آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں کہ ہم جھوٹ بولتے رہے ہیں؟"

ابو آبان نے اپنی پاٹ دار آواز میں انکشاف کیا "کچھ لوگ یہاں آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ تم شکاری نہیں ہو۔ تم نے تین افراد کو جان سے مارا ہے اور اب سزا کے خوف سے بھاگے پھر رہے ہو۔" میں چونک گیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بے سروپا الزام لگانے والے لوگ کون ہیں؟"

"وہ ابوظہبی کے نہایت معزز شیوخ ہیں اور ان کے بارے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کسی پر الزام تراشی کر سکتے ہیں۔"

میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ اس بات میں شک کی بہت کم گنجائش رہ گئی تھی کہ ابو آبان جن لوگوں کا ذکر کر رہا ہے یہ وہی ہیں جو ابوظہبی کے مضافات سے ہمارے پیچھے چلے تھے یعنی شنکر اور شیخ عشارب کے کارندے۔

مجھے خاموش دیکھ کر ابو آبان بولا "ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اعجاز تمہارا فرضی نام ہے' تمہارا اصل نام شاہ جہاں ہے اور تم ان لوگوں کے ساتھ بہت بڑا دھوکا کر کے بھاگے ہوئے ہو۔"

"کیسا دھوکا؟"

"وہ کوئی رشتے وغیرہ کی بات بتا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم کسی رشتے کے معاملے میں اپنے قول سے پھرے ہوئے ہو۔ یہ بات اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ تم نے تین افراد کو جان سے مار ڈالا ہے اور بھاگ کر یہاں آ گئے ہو۔"

میں نے کہا "مسٹر ابو آبان' یہ سراسر بہتان تراشی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم شکاری نہیں ہیں اور ان لوگوں سے جان بچا کر بھاگ رہے ہیں لیکن اس کے علاوہ ان لوگوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ صرف جھوٹ ہے۔"

"تو پھر سچ کیا ہے؟"

"کیا آپ لوگ میرے سچ پر یقین کریں گے؟"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"میں نے اندازہ لگایا ہے محترم سردار کہ آپ ابوظہبی کے شیوخ کی بہت عزت و تکریم کرتے ہیں۔ ممکن ہے' آپ میں یہ رواج ہو کہ شیخ حضرات جو بات بھی کہیں اسے من و عن تسلیم کر لیا جائے۔ ایسے میں میرے بیان کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔"

"تمہیں خواہ مخواہ بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

شاری نے کہا "ہم بات کا وزن پورے انصاف سے تولیں گے۔ تم کو جو کہنا ہے' اطمینان سے کہو۔"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو میں اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ وہ لوگ ہم پر سنہرے قتل کا الزام کیوں لگا رہے ہیں۔ ہم تو خود اپنی جانیں بچانے کے لیے ان کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔"

ابو آبان بولا "ان کا کہنا ہے کہ جب وہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے' تم نے ان کی گاڑی پر فائرنگ کی۔ پانی دے پر رفتار سے چلتی ہوئی گاڑی الٹ گئی۔ اس سے دو شخص موقع پر ہلاک ہو گئے۔ ایک تمہاری فائرنگ سے قتل ہوا۔"

میں نے کہا "میں اس واقعے سے انکار نہیں کروں گا لیکن مجھے نہیں معلوم وہ لوگ ہلاکتوں کے بارے میں سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ۔ ویسے بھی وہ فائرنگ ہم نے اپنے دفاع میں کی تھی۔ اس کا ثبوت اس بچی کی لاش ہے جو ہمارے بازوؤں میں ان لوگوں کی گولیوں کا نشانہ بنی۔"

ابو آبان بولا "بہرحال چھوڑو اس بات کو' تم ہمیں اس واقعے کے بارے میں شروع سے بتانے جا رہے تھے۔"

میں نے کہا "جس لڑکی کے رشتے کی یہ لوگ بات کر رہے ہیں وہ میری سگی بہن ہے۔ یہ ایک زبردستی کا رشتہ تھا جسے یہ لوگ مجھ پر ٹھونسنا چاہ رہے تھے۔ ان لوگوں نے میرے کچھ عزیزوں کو یرغمال بنایا تھا اور تلوار کی نوک پر مجھ سے اپنی شرائط منوانا چاہ رہے تھے۔ قدرت نے میری مدد کی اور انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ یہ لوگ پاکستان سے نامراد واپس آ گئے۔ بس یہی میری اور ان کی دشمنی کی وجہ ہے۔"

"لیکن تم یہاں کیوں پائے جا رہے ہو۔ تمہیں تو پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "وہ لڑکی جو یہاں میرے ساتھ ہے' میری قریبی عزیزہ ہے۔ وہ بیاہ کر یہاں آئی ہے۔ اب یہ لوگ اپنی ناکامی کا انتقام اس سے لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے دعوے سے کہا تھا کہ وہ برات واپس جانے کی پاداش میں اس لڑکی کو زندہ درگور کر دیں گے۔ مجھے اس لڑکی کی ایک ہمدرد دوست نے پیغام دے کر پاکستان سے یہاں بلایا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس لڑکی کی مدد کروں اور میرے خیال میں اس کا فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔"

"وہ ہمدرد لڑکی اب کہاں ہے؟"

"وہ ان درندوں کی درندگی کا شکار ہو کر مر چکی ہے اور وہی نہیں مری' ان لوگوں نے مجھے اور غزالہ کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کی کوشش میں سات افراد کو قتل کیا ہے' اور یہ سارے قتل صرف سات آٹھ روز پہلے ہوئے ہیں۔"

ابو آبان کڑی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ بولا "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ہمارے معزز شیوخ کا ذکر احترام سے کرو۔ دوسری بات یہ کہ ہماری قبائلی روایات کے مطابق کسی برات کا خالی ہاتھ واپس لوٹنا ایک بہت بڑی توہین سمجھا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اکثر طویل خون ریزی شروع ہو جاتی ہے۔ اب تم خود اس بات کا اعتراف کر رہے ہو کہ "برات واپس لوٹنے" کی طرز کا کوئی واقعہ ہوا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ برات نہیں تھی۔ آپ یوں سمجھیں کہ یہ لٹیروں کا ایک گروہ تھا جو میری جان سے عزیز بہن کو اغوا کرنے کی نیت سے لاہور میں فروکش ہوا تھا۔ ان لٹیروں نے میرے قریبی دوستوں کو ان کی بیویوں سمیت یرغمال بنا رکھا تھا اور ان پر انسانیت سوز تشدد کر رہے تھے۔"

ایک بدو چلا کر بولا "ہم معزز مہمانوں کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات نہیں سنیں گے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارے مہمان معزز ہیں؟" میں نے زور دے کر کہا "یہ شیوخ ہی نہیں ہیں۔ ان میں ایک بدنام زمانہ انڈین بدمعاش ہے اور اس کے خون خوار ساتھی بھی ہیں۔"

شاری نے کہا "وہ انڈین ان شیوخ کے ساتھ کیوں ہیں؟"

"یہ آپ ان سے پوچھئے اور یہ بھی پوچھئے کہ یہ لوگ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار کیوں بن رہے ہیں۔ اس نام نہاد رشتے کے حوالے سے میرا اگر کوئی تنازع تھا تو وہ شیخ عاصم کے ساتھ تھا' اور شیخ عاصم وہی ہے جو میرے ساتھ ان لوگوں سے جان بچاتا پھر رہا تھا۔ اب وہ لاپتا ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو آپ کو بتاتا کہ یہ لوگ اس کی پہلی بیوی جمیلہ نور کو کتنی بے دردی سے قتل کر چکے ہیں اور اس کی دوسری بیوی غزالہ کے متعلق کتنے خطرناک ارادے رکھتے ہیں۔"

شاری نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ شیوخ کا آپس کا تنازع بھی ہے؟"

شاری نے میرے منہ میں ایک اچھی بات ڈالی تھی۔ میں نے کہا "بالکل ایسا ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شیخ عاصم اور اس کی اہلیہ میرے ساتھ یہاں پہنچے ہیں۔"

شاری اور ابو آبان سر جوڑ کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ شاری کا رویہ میرے حوالے سے نرم ہے اور وہ کوشش کر رہی ہے کہ ابو آبان اور دیگر معززین کو بھی کسی حد تک نرم کرے۔

یہ جاننے کے بعد کہ شیطان ابن شیطان شنکر ہمارے پیچھے اس صحرائی بستی میں پہنچ چکا ہے میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ وہ کسی وقت کسی جگہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ جرم کی دنیا کا جادوگر تھا۔ اس کی شیطانی ذہانت ایک طلسم تھی جو حالات کو اپنے تابع کرلیتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے خطرناک تھا مگر اب مشتعل ہو کر اس کی خطرناکی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ نیم پاگل ہوچکا تھا۔ میں غزالہ کو کوٹھڑی میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کئی اندیشے لاحق ہو رہے تھے۔

اچانک ایک حبشی کارندہ تیزی سے اندر آیا اور اس نے شاری کے قریب جھک کر عربی زبان میں کچھ کہا۔ چند الفاظ میری سمجھ میں آئے جس سے اندازہ ہوا کہ شیخ صاحب نیند سے بیدار ہوگئے ہیں اور اس طرف آرہے ہیں۔

شاری اور ابو آبان کے چہروں پر الجھن نظر آنے لگی۔ غالباً انہیں توقع نہیں تھی کہ مذکورہ شیخ صاحب یہاں آئیں گے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا پھر حبشی سے کچھ کہا۔ وہ جلدی سے واپس لوٹ گیا۔ شاری سمیت سب افراد تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ چند لمحے بعد میں نے شیخ عشارب کے بہنوئی شیخ سالم کو احاطے میں داخل ہوتے دیکھا۔ سرخ انگارا چہرے اور چوڑی ناک والا یہ شخص ان لوگوں میں شامل تھا جو ہمارا تعاقب کررہے تھے۔ شیخ سالم کے پیچھے چار پانچ افراد اور تھے۔ ان میں سے ایک کے سوا سب مقامی تھے۔ انہوں نے "مشرقی مجنوں" والا لباس پہن رکھا تھا یعنی پتلون قمیص اور سر پر ڈبی دار عمامہ۔ ان میں سے جو مقامی نہیں تھا وہ شیطان ابن شیطان تھا۔ اس کی داغ دار آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ سب سے پیچھے آرہا تھا لیکن حقیقت میں وہی سب سے آگے تھا۔ موقع محل کے لحاظ سے اس نے خود کو "پیچھے" کرلیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں اور ایک بجلی سی کوند گئی۔ ایک ہی لمحے میں اس نے مجھ سے خاموش وعدہ کرلیا کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا' مارے گا یا مرجائے گا۔ ایک ہی لمحے میں' میں نے اسے بتادیا کہ میں بھی ایسا ہی کروں گا۔

شیخ عشارب کا بہنوئی شیخ سالم مجھے دیکھتے ہی گرجا "ہاں یہی ہے وہ بدبخت۔ یہ قاتل ہے۔ خونی ہے۔"

وہ بے تکان اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ کسی کو خاطر میں لائے بغیر مجھ پر پل پڑتا۔ بدو محافظ اور معززین خاموش و مرعوب کھڑے تھے۔

شاری نے شیخ سالم سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی ایسی بات کہہ رہی ہے جس میں میری بہتری کا پہلو نکلتا ہے۔ شیخ سالم نے شاری کی بات کا طویل جواب دیا۔ شیخ کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

پھر شاری اور ابو آبان آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ آخر ابو آبان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "معزز شیخ کا کہنا ہے کہ تم اور شیخ عاصم کی بیوی آپس میں ملے ہوئے ہو۔ جو بھی خون خرابا ہوا ہے وہ تم دونوں کی وجہ سے ہی ہوا ہے اور وہ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ شیخ عاصم تمہارے ساتھ اپنی مرضی سے سفر نہیں کررہا تھا بلکہ تم دونوں نے اسے یرغمال بنا رکھا تھا' اور اب بھی وہ تمہارے خوف سے ہی روپوش ہوا ہے۔"

میں نے کہا "ابو آبان! پہلے جھوٹوں کی طرح یہ بھی ایک سفید جھوٹ ہے۔ شیخ عاصم خود یہاں نہیں ہے لہٰذا ان لوگوں کو من مانی کہانی گھڑنے کا موقع مل رہا ہے۔ کیا یہ لوگ مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا سکتے ہیں کہ انہوں نے شیخ عاصم کی بیوی جمیلہ نور اور دیگر ملازمین کو قتل نہیں کیا اور وضاحت کرسکتے ہیں کہ انڈین ایجنٹ شنکر جسے شیخ عاصم نے لات مار کر نوکری سے نکال دیا تھا' ان کے ساتھ کیوں کھڑا ہے۔"

سالم دہاڑا "تم اپنی چرب زبانی سے جھوٹ کو سچ ثابت نہیں کرسکتے۔ تمہاری ننگی پیٹھ پر دس کوڑے پڑیں گے تو ساری بدمعاشی پیشاب کے راستے نکل جائے گی۔"

میں نے کہا "مس شاری! شیخ عاصم کی منکوحہ مسز غزالہ شیخ یہاں موجود ہے۔ آپ اسے یہاں بلائیں۔"

شیخ سالم چیخا "خبردار۔ اس بدذات عورت کا نام مت لو۔ وہ معشوقہ ہے تمہاری۔ تمہارے ناجائز تعلقات ہیں اس کے ساتھ۔ وہ وہی بکے گی جو تم بکتے ہو۔"

ایک دم میرا میٹر گھوم گیا۔ میں دو قدم آگے بڑھا۔ میرے ہاتھ شیخ سالم کے گریبان پر آئے۔ میں نے اسے جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سا ابو آبان کے قدموں میں جا گرا۔

شنکر شکرا بھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے جھک کر پنڈلی سے خنجر کھینچ لیا۔ شاری زور سے چلائی۔ گن بردار حبشی محافظ پھرتی سے میرے اور شنکر کے درمیان آگئے۔ ان کی تعداد نصف درجن سے کم نہیں تھی۔ شنکر منہ زور طوفانی ریلے کی طرح محافظوں میں سے راستہ بنا کر میری طرف آنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"چھوڑ دو اس ماں کے ...... کو۔ آج اسے اپنی توپ چلا لینے دو۔"

میرے ہاتھ میں چمکتا خنجر دیکھ کر بدو پہرے داروں کے چہروں پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ شاری نے چیخ کر پہرے داروں سے کچھ کہا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ حرکت کرکے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔ ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوگئے تھے۔ اب ایک طرف شنکر پہرے داروں میں گھرا ہوا تھا' دوسری طرف میں ان کے حصار میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر پوری نفرت کے ساتھ شنکر کو للکارا۔

جواب میں شنکر نے گالیوں کی بوچھار کردی۔ پہرے داروں نے اسے رائفلوں سے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ ماحول میں زبردست قسم کا تناؤ موجود تھا۔ عشارب کے ساتھی [illegible] انڈین خنجر خوں خوار نظروں سے مجھے گھور رہے تھے لیکن [illegible] بدوؤں کی موجودگی میں وہ [illegible] مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

ابو آبان نے عربی میں اپنے پہرے داروں سے کچھ کہا۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے احاطے سے باہر لے گئے۔ پھر مجھے اسی زنداں میں پہنچا دیا گیا جہاں سے ایک گھنٹا پہلے نکالا گیا تھا۔ غزالہ بے چینی سے میرا انتظار کررہی تھی۔ اسے کسی طرح یہ بات معلوم ہوچکی تھی کہ بستی میں پہنچنے والے لوگ شنکر [illegible] اس کے ساتھی ہیں۔ اور یہ ایک اپنی خبر تھی [illegible] جتنی بھی تشویش ہوتی کم تھی۔ یہ لوگ ہمارے خون کے پیاسے تھے اور مسلسل پانچ روز سے موت کے فرشتوں کی طرح ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا اور تعداد کے لحاظ سے بھی وہ ہم پر کہیں بھاری تھے۔ اگر یہ بدو ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرتے تو ہمارا بچنا محال تھا۔

علی الصباح حبشی الماجد نے عندیہ ظاہر کیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں اس زنداں سے کسی اچھی جگہ منتقل کردیا جائے گا لیکن سہ پہر تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ اب ہمیں زنداں سے نکالنے کا ارادہ ملتوی کردیا گیا ہے۔ زنداں کے دروازے پر ایک پہرے دار مسلسل موجود تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے آنے کے بعد احاطے میں کیا بات چیت ہوئی ہے اور کیا فیصلے ہوئے ہیں۔ میں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ یہ بدو لوگ ابوظبی سے نازل ہونے والے امیرزادوں سے خاصے مرعوب ہیں اور وہ کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ان کی خوشنودی کو مدِنظر رکھیں گے۔ صرف شاری سے میں کچھ امید کرسکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ رکھتی ہے۔ اس نرم گوشے کی وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ میں نے شاری کو پانی کے لب لبا حوض میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔

اسی رات دوسرے پہر شاری نے مجھے ایک بار پھر خلوت کدے میں طلب کیا۔ اس مرتبہ بھی الماجد ہی مجھے لینے کے لیے آیا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ مجھے شاری کے خلوت کدے میں پہنچانا اس کے لیے ایک نہایت کٹھن کام ہے اور یہ کام کرتے ہوئے وہ کرب کے دریا میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ شاری کی طرف جاتے ہوئے راستے میں' میں نے الماجد سے شیخ عاصم کے بارے میں پوچھا۔ الماجد نے بتایا کہ قرب و جوار میں ایک دو چھوٹی چھوٹی بستیاں موجود ہیں' ہوسکتا ہے کہ وہاں کسی نے اس شخص کو پناہ دے رکھی ہو' بہرحال شاری کے حکم پر اس کی تلاش مسلسل جاری ہے۔

میں شاری کے پاس پہنچا تو وہ بھی گم صم نظر آئی۔ میں اس کے خوب صورت چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بولی "آج شیخ حضرات سے بڑی لمبی چوڑی بحث ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آج سارا دن اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔"

"پھر کیا نتیجہ نکلا؟" میں نے پوچھا۔

ایک گہری سانس بھر کر اس نے جو کی شراب کا گھونٹ حلق سے اتارا اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ واقعی تھکی تھکی نظر آتی تھی۔ اس کی یہ بات درست معلوم ہوئی کہ وہ سارا دن کسی مسئلے میں الجھی رہی ہے۔

"کیا بات ہے تم بہت خاموش ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ میں دراصل تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تمہارے ساتھ یہاں بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم یہاں رہو گے تو اس زیادتی کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گی مگر شاید اب تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"درحقیقت میں نے بڑی کوشش کے ساتھ تمہارے لیے یہاں سے جانے کا حق حاصل کیا ہے۔ وہ لوگ جو تمہارے پیچھے آئے ہیں بضد تھے کہ تمہیں ہر حالت میں ان کے حوالے کیا جائے۔ بستی کے معززین کی اکثریت بھی اسی حق میں تھی مگر میں تہِ دل سے محسوس کررہی تھی کہ ایسا کرنا تمہارے ساتھ بڑی زیادتی میں شمار ہوگا۔ میں نے اس رائے کی پُرزور مخالفت کی۔ میں نے شیوخ سے صاف کہہ دیا کہ اس وقت تم اور تمہارے ساتھی ہماری تحویل میں ہیں۔ ایک طرح سے تم نے ہماری پناہ لے رکھی ہے۔ ہم مجبور ہیں

کہ ایک طاقتور قبائل کے خلاف تمہارا تحفظ کریں۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد یہ طے پایا ہے کہ ہماری بستی میں بارگرود نواں میں تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جب تم یہاں سے دور کسی صحرا میں چلے جاؤ گے تو پھر تمہاری زندگی کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ تم ان لوگوں کی زد سے نکل پاتے ہو یا نہیں۔"

"جب تم لوگ ہمیں یہاں سے روانہ کرو گے؟"

"ہاں یہ مجبوری ہے۔" وہ آزردگی سے بولی "لیکن تمہیں بچ نکلنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ طے شدہ شرائط کے مطابق تم کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ ابوطبی سے آنے والے شیخ اور ان کے ساتھی آٹھ پہر تک ہمارے مہمان رہیں گے۔ اس دوران میں تم جتنی دور نکل سکتے ہو نکل جانا۔ آگے کیا ہوگا یہ اوپر والا جانتا ہے۔"

"تو کیا تم نے ہمیں اس بے رحم صحرا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"تمہیں سواری دی جائے گی۔ وافر پانی اور دیگر سامان فراہم کیا جائے گا۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم یہاں اجنبی ہیں۔ ہمیں ایسے علاقے میں سفر کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پہلے ہمارے ساتھ غزالہ کا شوہر شیخ عاصم تھا' اب وہ بھی نہیں۔ ایک کمزور عورت اور معصوم بچے کے ساتھ مجھے جان لیوا ویرانے میں دھکیلنا کیا تمہیں مناسب لگ رہا ہے؟"

"بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں' مجبوری کی ہے۔ ان لوگوں کی باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کے رشتے کا سنگین تنازع موجود ہے۔ اس تنازع کے سبب خون خرابا بھی ہوا ہے۔ وہ لوگ تمہیں مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ ہماری رائے تمہارے بارے میں کچھ بھی ہو لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہیں پناہ دے کر اپنے لیے خطرات مول لیں۔ میری اکیلی ذات ہوتی تو اور بات تھی مگر یہ تو پوری بستی کا معاملہ ہے۔"

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم انسان نہیں' ہرن' نیل گائے وغیرہ ہیں۔ ہمیں ویرانے میں چھوڑ کر ہمارے پیچھے شکاری لگائے جا رہے ہیں تاکہ وہ ہمیں شکار کریں۔ شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان غنڈوں کا سرغنہ کیسی شیطانی ذہنیت کا مالک ہے اور وہ شیخ عاصم کی بیوی کے بارے میں کیسے شرمناک خیالات رکھتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے تاراج کرنے کی قسم کھائے ہوئے ہے۔"

شاری بولی "مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے خطرات ہیں' اسی لیے تو تمہیں اس بستی سے دور جانے کے لیے پورے آٹھ پہر کی مہلت دی جا رہی ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اگر تم دونوں ہمت سے سفر کرو تو تمہارے لیے محفوظ فاصلے پر پہنچنا مشکل ہو۔"

میں نے کہا "تم نے سواری' سامان اور پانی وغیرہ کا ذکر تو کیا ہے لیکن ہتھیار کا ذکر نہیں کیا۔ اگر تعاقب کرنے والوں سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی تو ہم اپنا دفاع کیسے کریں گے؟"

"خدا کرے ایسی نوبت نہ آئے کیونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ تمہارے پاس ہتھیار ہوا بھی تو بیکار ہی ہوگا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں کوئی ہتھیار نہیں دو گے؟"

وہ ذرا توقف کر کے بولی "مجھے افسوس ہے کہ جو شرائط طے ہوئی ہیں ان کے مطابق ہم تمہیں تمہارے ہتھیار نہیں لوٹا سکتے۔"

"پھر اس سے تو بہتر ہے کہ ہمیں یہیں ان درندوں کے حوالے کر دو۔ کم از کم ہمارے کٹے پھٹے جسموں کو قبریں تو نصیب ہو جائیں گی۔"

"پلیز ایسا مت کہو۔" وہ بے زاری سے بولی "تم میرے اس یقین کو ڈانواں ڈول کر رہے ہو کہ تم آخری دم تک زندگی کے لیے لڑنے والے شخص ہو۔"

اس موضوع پر میرے اور شاری کے درمیان کافی دیر تک بات ہوئی۔ شاری نے مجھے سمجھایا کہ بستی سے نکلنے کے بعد مجھے کس سمت میں سفر کرنا ہے' کب قیام کرنا ہے اور کب اور کہاں اپنا رخ تبدیل کرنا ہے۔ اس نے ایک کاغذ پر مجھے مبہم سا نقشہ بھی بنا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم جنوب مشرق کی طرف دو دن تک سفر جاری رکھیں تو ہمارے بچ نکلنے کے امکان روشن ہو سکتے ہیں۔ اس نے صحرائی سفر کے بارے میں کئی مفید TIPS بھی مجھے دیں۔ آخر میں وہ غم زدہ لہجے میں بولی "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ تم مجھے ڈوبنے سے نہ بچاتے تو شاید اس وقت میرا یہ جسم قبر کی تاریکی میں گل سڑ رہا ہوتا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شاید تم واقعی مجھے یاد رکھو گی۔ میں نے تمہیں ایک محبوب چیز سے محروم کر دیا۔ تمہارا پیارا پالتو بندر ۔۔۔ سوبالو۔"

سوبالو کے ذکر پر شاری کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس کی آنکھوں سے نرمی و ملائمت غائب ہو گئی۔ روکھے پھیکے لہجے میں بولی "وہ ذکر اب مت کرو۔ ایسا کر کے تم مجھے تکلیف پہنچاؤ گے۔"

"میں معذرت چاہتا ہوں' بہرحال مجھے اس واقعے کا

افسوس بہت عرصے تک رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک سوالات میرے ذہن میں ابھرتے رہیں گے لیکن ان کے جواب پانے کے لیے میں دوبارہ یہاں تک نہ آ سکوں گا۔"

"کیسے سوال؟"

"تمہارے اور اس بستی کے بارے میں عام سوالات ہیں۔ جیسے ایک سوال اس حبشی الماجد کے بارے ہے۔"

میں نے دیکھا کہ الماجد کے ذکر پر شاری کے چہرے پر پرچھائیں سی لہرائی "کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ بدستور رکھائی سے بولی۔

"الماجد کا کردار مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔" میں نے کہا "تمہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک بے نام چمک ابھر آتی ہے۔ تمہارے لیے اس کی عقیدت بھی غیر معمولی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس جگہ کو بھی نگاہوں سے چومتا ہے جہاں تمہارا پاؤں پڑتا ہے۔ یہ کیسا تعلق ہے' میں نے اس بارے میں کئی بار سوچا ہے۔"

شاری چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "کوئی خاص تعلق نہیں ہے یہ۔۔۔ بس اتنا ہی ہے جتنا ایک آقا اور غلام کے درمیان ہوتا ہے۔ الماجد کے علاوہ باقی لوگ بھی اسی طرح میرا احترام کرتے ہیں۔"

"میں یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ بلکہ میں یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ تم الماجد کے احساسات سے بے خبر ہو۔ اس کی موجودگی میں' میں نے اکثر تمہیں بے چین پایا ہے۔"

وہ بولی "یہ تمہاری نگاہ کا فتور ہوگا۔ ہاں اتنی بات میں ضرور تسلیم کرتی ہوں کہ یہ حبشی لڑکپن سے ہی کچھ سرپھرا ہے۔ ضرورت سے زیادہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے' کئی بار میرے ہاتھوں ذلت بھی اٹھا چکا ہے مگر اپنی روش ترک نہیں کرتا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ دل ہی دل میں تمہیں بھی اس کی یہ غیر معمولی عقیدت مندی پسند ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اس سے بے زار ہونے کے باوجود تم نے اسے اپنے قریب رکھا ہوا ہے' اگر تم چاہو تو اس کی خدمات اپنے کسی مصاحب کے سپرد کر سکتی ہو۔"

وہ بھڑک گئی "کیا تم مجھ سے بحث کرنا چاہتے ہو۔ شاید تمہیں احساس نہیں کہ اپنی بات دہرا کر تم میری توہین کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک رذیل غلام کے لیے میرے ذہن میں کوئی فتور پیدا ہو سکتا ہے۔ اس جیسے غلام زادوں کا سایہ بھی مجھے اپنے جسم پر پسند نہیں ہے۔"

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میوہسپتال' لاہور۔
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ الماجد کا ذکر شاری کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتا ہے۔

(ن ہئن)

اگلی صبح ہم یہ صحرائی بستی چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ ہمیں ہماری دونوں اونٹنیاں واپس کردی گئی تھیں۔ ان پر رخت سفر بھی موجود تھا۔ پانی کے پانچ کین تھے۔ ہم احتیاط سے استعمال کرتے تو یہ پانی ہمارے لیے پانچ روز تک کافی تھا۔ ایک ہلکے پھلکے خیمے کے علاوہ راشن بھی سامان میں موجود تھا۔ جب میں اور غزالہ اونٹنیوں پر سوار ہونے کی تیاری کررہے تھے تو زنداں کے دروازے پر ابو آبان اور شاری کی جھلک نظر آئی۔ سفید ریش ابو آبان کے ہاتھ میں چھوٹا سا حقہ تھا جسے وہ مسلسل گڑگڑا رہا تھا۔ حسب معمول غلام الماجد شاری کے عقب میں تھا۔ شاری نے الوداعی نظروں سے مجھے دیکھا۔

ابو آبان بارعب آواز میں بولا "جو کچھ طے ہوا ہے اس کے مطابق تم اگلے آٹھ پہر تک آزادانہ سفر کرسکتے ہو۔ اس وقت تک ابو ظبی کے مہمان ہماری بستی میں قیام کریں گے۔ کل اسی وقت وہ یہاں سے روانہ ہونے کے لیے آزاد ہوں گے۔ تمہارے سفر کی سمت کے بارے میں انہیں کچھ نہیں بتایا جائے گا' نہ ہی کوئی اور کھوج فراہم کیا جائے گا۔"

ابو آبان نے ہماری اونٹنیوں کا جائزہ لیا۔ تسلی تشفی کے چند رسمی بول بولے اور ہمیں روانہ ہونے کی اجازت دے دی۔ میں نے پہلے غزالہ اور بچے کو اونٹنی پر سوار کرایا۔ غزالہ شدید الجھن میں تھی۔ اس کی نظریں رہ رہ کر اطراف میں چکرانے لگتی تھیں۔ میں جانتا تھا' یہ نظریں شیخ عاصم کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھی کہ عاصم کے بغیر اس بستی سے چلی جائے' میں نے بمشکل اسے رضامند کیا تھا۔ میں نے اسے باور کرایا تھا کہ عاصم اس بستی میں موجود نہیں' اگر ہوتا تو شاری مجھے ضرور آگاہ کرتی۔

میں اونٹنی پر سوار ہونے لگا تو شاری میرے قریب کھڑی تھی۔ ابو آبان کا دھیان اس وقت زنداں کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ شاری نے آہستگی سے کہا "تمہاری اونٹنی کے سامان میں دائیں طرف تمہارے لیے ایک چیز موجود ہے۔ امید ہے وہ تمہارے کام آئے گی۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم بستی سے روانہ ہورہے تھے۔ مشرق سے طلوع ہونے والا سورج دھیرے دھیرے بلندی پر آرہا تھا۔ اس کے تیور خطرناک ہوتے جارہے تھے۔ چلچلاتی دھوپ کے نیچے لق و دق صحرا حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ تپش کا سمندر تھا اور اس میں دور دور تک ٹھنڈک کا کوئی جزیرہ نظر نہیں آتا تھا۔ جوں جوں بستی ہم سے دور ہورہی تھی' ہم صحرا کے حوالے ہوتے چلے جارہے تھے۔

ہم نے مقررہ سمت میں بغیر رکے سہ پہر تک سفر کیا۔ سعودی عرب کا مشہور اور دنیا کا دشوار ترین صحرا الخالی ہمارے جنوب مغرب میں تھا' وہ سیکڑوں میل دور تھا لیکن اس کی جان لیوا تپش ہوا کے دوش پر سوار محسوس ہوتی تھی۔ ہماری اونٹنیاں تازہ دم تھیں لہٰذا ان کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ غزالہ نے بچے کو اپنی اوڑھنی کے پلو میں چھپا رکھا تھا۔ اس بے چارے کا گرمی سے برا حال تھا۔ سہ پہر تک وہ بے دم ہوگیا۔ ہمیں ایک جگہ ایک خشک کنواں دکھائی دیا۔ قریب ہی کھجور کا ایک سڑا ہوا جھنڈ بھی تھا۔ نیچے سرخ ریت میں چند نامعلوم جانوروں کے ڈھانچے دبے ہوئے تھے۔ یہ کچھ پیاسے جاندار ہوں گے جو اپنے حلقوم میں جان لیوا پیاس کے کانٹے لیے اس کنوئیں تک پہنچے ہوں گے اور کنوئیں کو اپنی ہی طرح پیاسا پاکر ہمت ہار بیٹھے ہوں گے۔ کسی معجزے کے انتظار میں وہیں جلتی ریت پر ٹھنڈے میٹھے پانی کے خواب دیکھتے راہی عدم ہوگئے ہوں گے۔ اس صحرا میں جان لیوا پیاس کی نجانے کتنی کہانیاں اسی طرح ریت کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔

ہم اس "خشک نخلستان" میں قریباً پون گھنٹا ستانے کے لیے رکے پھر آگے روانہ ہوگئے۔ میری کوشش تھی کہ ہم رات بھر سفر میں رہیں اور کل تک زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرلیں مگر رات کے دوسرے پہر تک غزالہ اور بچہ تھک کر چور ہوگئے۔ اونٹنیوں میں بھی صبح کی سی تیز رفتاری نہیں رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دو تین گھنٹے کے لیے قیام کرنا ہی پڑے گا۔ یہ جگہ ریتلے ٹیلوں سے اٹی ہوئی تھی۔ دو ٹیلوں کے درمیان ایک نشیبی مقام پر میں نے خیمہ گاڑ دیا۔ اونٹنیوں کو باندھ کر ہم خیمے میں آگئے۔ ہمارا قیام چونکہ مختصر تھا لہٰذا سامان اونٹنیوں پر ہی بندھا رہنے دیا گیا تھا۔ غزالہ نے خیمے کے اندر ہی ایک کونے میں چھوٹا سا گڑھا کھود کر آگ جلائی اور کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ ساتھ ساتھ وہ بچے کو بھی بہلا رہی تھی۔ اچانک مجھے شاری کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ سامان میں میرے لیے کوئی چیز موجود ہے۔ میں نے اٹھ کر اپنی اونٹنی کے سامان کا جائزہ لیا۔ داہنی طرف کے ایک تھیلے میں کسی سخت سی وزنی چیز کا احساس ہوا۔ میں نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ تھیلے کے نچلے حصے میں کپڑے کے اندر لپٹا ہوا ایک پسٹل موجود تھا' ساتھ میں تیس چھتیس راؤنڈ بھی تھے۔ یہ وہی پسٹل تھا جو بندر کے حملے کے وقت شیخ عاصم

کے ہاتھ سے گرا تھا۔ پسٹل کی موجودگی بڑی حوصلہ افزا تھی۔ ایک دم مجھے تحفظ کا احساس ہوا۔ اس لق و دق ویرانے میں خون کے پیاسے دشمنوں کے درمیان شاری کا یہ تحفہ واقعی بیش بہا تھا۔

خنکی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے چادر کی بکل ماری اور کھانا کھا کر خیمے کے ایک گوشے میں لیٹ گیا۔ غزالہ دوسرے گوشے میں بچے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہورہی تھی۔ سفر کی زبردست تکان کے ساتھ ساتھ بچے کو سنبھالنا اور پھر کھانا پکانے کی ذمے داری نبھانا۔ اور اب کمر سیدھی کرنے کے لیے وہ لیٹ تک نہیں رہی تھی۔ میں کن انکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ تھکاوٹ اس کی آنکھوں میں رچی بسی تھی لیکن حرکات و سکنات میں کاہلی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ گاہے گاہے بچے کو پچکارنے لگتی تھی' کبھی جھک کر اس کے سر پر بوسہ دیتی تھی۔ ایسے میں اس کی زلفیں چہرے پر ڈھلک آتی تھیں' وہ انہیں ہاتھوں سے سنبھال کر کانوں کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ تبھی مکمل نظر آرہی تھی وہ ایک بچے کو آغوش میں لے کر۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ہمیشہ سے زیادہ حسین لگی۔ چند لمحوں کے لیے میں کہیں بہت دور چلا گیا۔ میرا دل چاہا' وقت یہیں پر ٹھہر جائے۔ یہ رات' یہ خیمہ' یہ صحرا' سب کچھ یہیں پر منجمد ہوجائے۔ بس میں اور غزالہ ہوں اور ہمارے درمیان ایک ابدی قربت ہو۔ ہم ایک دوسرے میں سما کر ایک قالب بن جائیں۔ کوئی چاہے بھی تو ہمیں جدا نہ کرسکے۔ ہم باآواز بلند دنیا سے کہہ دیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم نے تم سے کچھ نہیں لینا۔ تم بھی ہم سے کوئی غرض نہ رکھو۔ میں نے حسرت ناک نظروں سے اپنے اور غزالہ کے درمیانی فاصلے کو دیکھا۔ ان لمحوں میں یہ فاصلہ کتنا کم تھا۔ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا لیکن ہمارے درمیان انا کی دیوار کھڑی تھی اور اس سے بھی بڑا ستم یہ تھا کہ شیخ عاصم کھڑا تھا۔

اچانک مدھم آوازوں نے مجھے چونکایا۔ یہ آوازیں بالکل قریب سے آئی تھیں۔ میں نے اٹھ کر جلدی سے چولہے کی آگ بجھا دی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں خیمے سے باہر نکلا۔ سامنے ٹیلے کی بلندی پر مجھے دو انسانی سائے نظر آئے۔ ان کا فاصلہ مجھ سے بمشکل دس گز تھا۔

"خبردار!" ایک کڑک دار آواز ابھری اور میں بھونچکا رہ گیا۔

یہ شیطان ابن شیطان شنکر کی آواز تھی۔ اس کے کندھے سے جھولتی ہوئی رائفل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ چادر کی بکل کے نیچے میرا ہاتھ اپنی بیلٹ کی طرف رینگ گیا اور میں نے پسٹل اپنی گرفت میں لے لیا۔ شنکر اور اس کا ساتھی ٹیلے سے اتر کر میرے عین سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کے پاس جدید رائفلیں تھیں۔ شنکر کی رائفل ابھی تک کندھے سے لٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھی نے اپنی رائفل ہاتھ میں کرلی تھی اور پوری طرح چوکس نظر آتا تھا۔ شنکر کی موجودگی نے میرے سینے میں بھونچال پیدا کردیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیوں کر ہوا ہے۔ شاری نے آج صبح بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ہم آٹھ پہر تک آزادانہ سفر کریں گے۔ اس دوران میں ہمارا تعاقب کرنے والے لوگ بستی میں مہمان کی حیثیت سے قیام کریں گے مگر نتیجہ اس دعوے کے بالکل برعکس برآمد ہوا تھا۔ ابھی ہمیں بستی سے روانہ ہوئے دس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ شنکر اپنے ساتھیوں سمیت ہمارے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر تو یوں لگتا تھا کہ شاید بستی سے ہمارے روانہ ہونے کے فوراً بعد شنکر بھی روانہ ہوگیا تھا۔ شاری نے ایسا کیوں ہونے دیا تھا؟ یہ سوال بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھرا' اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی ابھرا! "نہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ لوگ بستی والوں کو بے خبر رکھ کر یہاں پہنچ گئے ہوں۔"

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں میرا یہ شک یقین میں بدلنے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شنکر کے ساتھ بس ایک شخص ہے۔ یوں محسوس ہورہا تھا کہ شنکر نے اپنی روایتی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اہل بستی کو جل دیا ہے اور آج صبح چپکے سے میرے پیچھے چلا آیا ہے۔ شنکر کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی تھیں' یہ ایک بے رحم قاتل کی آنکھیں تھیں۔ اس قاتل کے ہاتھوں میں مہلک رائفل تھی اور وہ خود کو ہر طرح مجھ پر حاوی سمجھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بڑے اطمینان سے میرے قریب چلا آیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے پھنکارتی آواز نکلی "جمالی' مجھے پورا وشواس تھا کہ تو میرے ہاتھوں اپنے جیون کے بدترین عذاب سے دوچار ہونے والا ہے۔ آج یہ وشواس پورا ہوگیا ہے۔"

"جب تک کوئی واقعہ رونما نہ ہوجائے اس کے بارے میں پورے وشواس سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" میں نے بھی اطمینان سے جواب دیا۔ میری رگوں میں لاوا کھولنے لگا تھا۔

شنکر نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔ زہریلا قہقہہ لگا کر بولا "شاید تو ابھی مزید بھاگنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن میں تمہیں وشواس دلاتا ہوں کہ اب تجھے اور

بھاگنے نہیں دوں گا۔ تجھے انہی ٹیلوں کی ریت میں گاڑ دوں گا اور تیری پریم کہانی کا شبھ انجام بھی انہی ٹیلوں میں کروں گا۔ بھگوان کی کرپا سے وہ تیری غزالہ میرے ہاتھوں اسی خیمے میں رسوا ہوگی اور تیرے سامنے ہوگی۔"

شنکر کی آواز خوف ناک تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ رائفل شنکر کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ فائر وغیرہ مار کر مجھے زخمی کر دے گا۔ وہ بے انتہا شاطر دشمن تھا۔ اسے لمحوں کی مہلت دے کر میں بہت بھاری قیمت چکانے کا تجربہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ اب ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چادر کی بکل کے اندر میں پسٹل اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور شنکر اس سنگین حقیقت سے بے خبر تھا۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ میرے غیر مسلح ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ بس یہی توقع ہو سکتی تھی کہ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر موجود ہوگا۔

اچانک شنکر کے ہاتھ میں چمکنے والی رائفل کی نال نے حرکت کی۔ نال کا رخ میرے پاؤں کی طرف ہو گیا تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرا یہ شک پختہ تر ہو گیا کہ شنکر مجھے زخمی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے چادر کے نیچے پسٹل کو حرکت دی اور شنکر کی پیشانی کو نشانہ بنایا۔ وہ عقاب سے تیز تر نگاہ کا مالک تھا۔ میری چادر کے نیچے ہونے والی ہلکی سی جنبش کو اس نے مختصر ترین وقت میں نوٹ کیا۔ میرے پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ شنکر اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا۔ گولی شاید اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس گولی پر شنکر کے بجائے اس کے ساتھی کا نام لکھا تھا۔ وہ شنکر کے عقب میں ذرا بلندی پر کھڑا تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ تڑپ کر ریت پر جا گرا۔ اس سے پیشتر کہ میں دوسرا فائر کرتا، شنکر نے کھڑے کھڑے ایک طویل جست لگائی اور پسٹل کی زد سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ریت پر رول کیا اور ایک ٹیلے کے عقب میں روپوش ہو گیا۔

غزالہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا تھا اور خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا بازو تھاما اور جھٹکے سے بچے سمیت نیچے گرا دیا۔ ہمارا گرنا ہمارے حق میں بہت بہتر ثابت ہوا۔ رائفل کا ایک برسٹ خیمے کو چھلنی کر کے گزر گیا۔ میں نے چیخ کر کہا "غزالہ بھاگو۔"

میں اور غزالہ جھک کر بھاگے۔ میرا ایک بازو غزالہ کی گردن میں تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ گھبراہٹ میں سیدھی کھڑی نہ ہو جائے۔ میری یہ احتیاط کارگر رہی۔ ایک اور برسٹ ہمارے سروں کے اوپر سے گزرا اور ہم جان بچا کر ایک ٹیلے کی آڑ لینے میں کامیاب ہو گئے۔

میں اور غزالہ اوندھے منہ نیم گرم ریت پر لیٹے تھے، پسٹل میرے ہاتھ میں تھا۔ میں شنکر کی سمت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ ہمارے عین سامنے تاریکی میں موجود تھا۔ میں نے اندازے سے دو فائر اس پر کیے۔ جواب میں رائفل کا شعلہ کئی بار چمکا۔ گولیاں دھماکوں سے ہمارے ارد گرد کی ریت میں لگیں۔ رائفل کے شعلے سے مجھے شنکر کی پوزیشن کا بالکل درست اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے پھر دو فائر کیے۔ میگزین خالی ہو گیا تھا۔ فالتو میگزین نہیں تھا۔ مجھے پھر اسی میں گولیاں بھرنی تھیں۔ تاریکی میں یہ ایک مشکل کام تھا۔ جس وقت میں گولیاں بھر رہا تھا شنکر نے تیزی سے اپنی پوزیشن تبدیل کی اور قدرے بلندی پر آ گیا۔ اونٹنیوں کے قریب میں نے اس کا متحرک سایہ صاف دیکھا۔ یہ صورت حال نہایت ہی خطرناک تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شنکر اندھیرے میں بلی کی طرح دیکھ لیتا ہے۔ اس کا نشانہ بھی ہمیشہ سے بے داغ تھا۔ وہ ایک لمحے میں ہم تینوں کو بھون کر رکھ دیتا۔ میں نے میگزین ابھی پسٹل سے منسلک کیا ہی تھا کہ شنکر کی پاٹ دار آواز ویرانے میں گونجی "جمالی! بے موت مرو گے۔ پسٹل پھینک دو اور سامنے آ جاؤ۔"

اپنے فقرے میں شنکر ایک غلطی کر گیا تھا۔ اس نے مجھے "سامنے" آنے کا کہا تھا۔ بالفاظ دیگر اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں اسے نظر نہیں آ رہا۔ یعنی میرا یہ اندازہ غلط تھا کہ شنکر اب ہمیں براہ راست رائفل کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ میں غزالہ سمیت ریت کے ساتھ کچھ اور چپک گیا۔ میرا پسٹل اب لوڈ تھا لیکن گولیاں زیادہ نہیں تھیں۔ میں شنکر کی طرح بے دریغ فائرنگ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے بڑا معقول اور نتیجہ خیز جواب دینا چاہتا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنی رائفل استعمال کرے۔ اچانک کچھ آوازوں نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ آوازیں ہوا کے کسی آوارہ جھونکے پر تیر کر میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔ یہ بہت سی آوازیں تھیں۔ ان میں اونٹوں کے بلبلانے کی صدا تھی، گھنٹیوں کی کھنکھناہٹ تھی اور انسانی آوازیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ہجوم سا چلا آ رہا ہے۔ پھر میری نگاہ نے ایک روشن منظر دیکھا۔ درحقیقت غزالہ نے ہی میرا بازو دبا کر مجھے اس منظر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ میں نے صحرا کے تاریک افق پر روشنیوں کی ایک قطار دیکھی۔ یہ قطار اچانک ہی کسی نشیب سے بلند ہو کر ہمارے سامنے آئی تھی۔ اب یہ روشنیاں

تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ جوں جوں روشنیاں قریب آ رہی تھیں، مختلف آوازیں بھی واضح تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

پھر ایسی ہی چند روشنیاں مجھے اپنے بائیں پہلو پر بھی دکھائی دینے لگیں۔ میں حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ یہ شنکر کے ساتھی ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ لوگ ایسے موقع پر یہاں پہنچے تھے جب میں اور شنکر ایک دوسرے کے خلاف مورچا زن تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ایک خونی لڑائی لڑ رہے تھے۔ میں نے اپنے سامنے تاریکی میں گھورا۔ شنکر کی طرف سے کوئی ردعمل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ غالباً وہ بھی صورت حال میں رونما ہونے والی تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

تین چار منٹ میں روشنیاں ہمارے سامنے پہنچ گئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اور شنکر کے درمیان ہونے والی فائرنگ کی آواز نے ہی ان مشعل برداروں کو ہماری طرف کھینچا ہے یا پھر ممکن ہے کہ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے خیمے میں جلنے کی روشنی یا شنکر کی ٹارچ کی روشنی دیکھی ہو۔ جب وہ لوگ قریب پہنچے تو میں نے دو ہوائی فائر کیے۔ میرا مقصد یہ تھا کہ آنے والوں پر ہماری موجودگی ثابت ہو جائے اور وہ بھٹک کر کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔ میری یہ تدبیر کارگر رہی۔ مشعل بردار جلد ہی ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ وہ اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی مجموعی تعداد پچاس ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ وہ کلہاڑیوں اور رائفلوں وغیرہ سے مسلح نظر آ رہے تھے۔ ایک آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ حبشی الماجد کی آواز تھی۔ وہ انگلش میں چلا کر بولا تھا "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ ہم گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد میں اور شنکر مسلح بدوؤں کے درمیان کھڑے تھے۔ کم از کم ایک درجن رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں مجھے کئی جانے پہچانے چہرے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنہیں میں نے صحرائی بستی میں دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک ابو آبان کا بیٹا بھی تھا۔ اس کا نام حاتم تھا۔ وہ مضبوط جسم اور نہایت بارعب آواز کا مالک تھا۔ الماجد کی طرح وہ بھی بڑی بھلی انگلش بول سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے پسٹل لے لیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ شنکر کی طرف بڑھایا۔ وہ اس سے رائفل مانگ رہا تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں میں نے شنکر کا چہرہ دیکھا۔ چند لمحے کے لیے وہ متذبذب نظر آیا۔ یقیناً وہ رائفل سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا تھا مگر اس ہجوم کے سامنے وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے رائفل حاتم کے سپرد کر دی۔ حاتم کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں، وہ بہت غصے میں نظر آتا تھا۔ اب معلوم نہیں تھا کہ یہ غصہ اسے کس پر ہے۔ اصولی طور پر اس کے غضب کی وجہ شنکر ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ شنکر ہی تھا جس نے مبینہ معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی اور مقررہ وقت سے کہیں پہلے ہمارے تعاقب میں دوڑ آیا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ حاتم کے حکم پر اس کے مسلح ساتھیوں نے شنکر کو باقاعدہ گھیرے میں لے لیا تھا۔ پھر یکایک ایک جال سا اچھل کر شنکر پر آن گرا۔ شنکر اس جال میں شارک مچھلی کی طرح جکڑ کر رہ گیا۔ میں بھی اس تجربے سے گزر چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کتنا مضبوط جال ہے اور اس میں پھنس کر بندہ خود کو کتنا لاچار محسوس کرتا ہے۔ جال پھینکنے والے حبشی نے جال کی ڈوریوں کو بڑی پھرتی سے حرکت دی تھی۔ اس سے پہلے کہ شنکر کو ٹھیک سے پتا چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، وہ جال میں بری طرح لپٹ چکا تھا۔ حاتم نے آگے بڑھ کر شنکر کی پسلیوں میں کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ جواب میں شنکر نے اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

شنکر کا زخمی ساتھی ابھی تک ریت پر اوندھا پڑا تھا۔ الماجد نے مشعل کی روشنی میں اس کا معائنہ کیا۔ ریت اس کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اسے ہلا جلا کر دیکھا گیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ گولی اس کے سینے میں زیادہ گہرائی تک نہیں گئی تھی تاہم خون کافی بہہ گیا تھا۔ شنکر اور اس کا ساتھی اونٹوں پر سواری کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ ان کے اونٹ قریبی ٹیلوں میں موجود تھے۔ حاتم کے ساتھی ان اونٹوں کو گھیر کر موقع پر لے آئے۔ شنکر کے زخمی ساتھی کو ابتدائی مرہم پٹی کے بعد خاص طریقے سے ایک سرخ اونٹنی پر سوار کروا دیا گیا۔ جال میں لپٹے لپٹائے شنکر کے گرد کئی رسیاں مزید لپیٹی گئیں اور اسے اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا گیا۔

الماجد نے میری اور غزالہ کی خیریت دریافت کی۔ اس دوران میں حاتم کے ساتھی ہمارا مختصر خیمہ اکھاڑ چکے تھے اور ہمارا سامان اونٹنیوں پر لاد چکے تھے۔ میں نے الماجد سے کہا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"واپس بستی میں۔" الماجد نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن؟"

"لیکن کچھ نہیں۔" الماجد کا لہجہ سپاٹ تھا "ہمیں وہی

کرنا ہے جو حکم ملا ہے۔"

"اور حکم کیا ہے؟"

"حکم یہی تھا کہ تمہیں ڈھونڈا جائے اور جلد سے جلد ڈھونڈا جائے۔"

"جلد سے جلد۔ کیا مطلب؟"

"آج صبح بستی سے تمہاری روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ ابوظبی کے مہمانوں میں سے دو افراد خاموشی کے ساتھ تمہارے پیچھے روانہ ہو گئے ہیں۔ دراصل اصطبل خانے سے دو اونٹ غائب پائے گئے تھے۔ اس بات کی تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ کیا معاملہ ہے۔ شاری اور ابو آبان کو اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے تمہاری مدد کے لیے فوراً ہمیں روانہ کر دیا۔ ہم بڑی خاموشی اور رازداری سے روانہ ہوئے تھے۔ میرے خیال میں شاری اور ابو آبان کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔"

"کیا تم شنکر کو نگاہ میں رکھ کر اس کا تعاقب کر رہے تھے؟"

"نہیں، ہم ان کے قدموں کے نشانوں پر چل رہے تھے۔ صحرا میں "نقوشِ پا" کے ذریعے تعاقب کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں مدھم روشنی دکھائی دی۔ اس کے فوراً بعد فائرنگ کی آواز آئی۔ ان دو اشاروں کے ذریعے ہمارے لیے تم تک پہنچنا بہت آسان ہو گیا۔"

حاتم کی ہدایت پر ہم اونٹوں پر سوار ہو گئے اور یہ قافلہ واپس بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے اور غزالہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سفر کی نوعیت یوں تبدیل ہو جائے گی۔ شام سے پہلے ہم جن مقامات سے گزرے تھے اب وہ پھر ہماری نگاہوں کے روبرو تھے۔ حاتم اور اس کے ساتھی اپنی کامیاب مہم پر خوش نظر آتے تھے۔ وہ نہ صرف کامیاب ہوئے تھے بلکہ بڑے نازک وقت میں کامیاب ہوئے تھے۔ تین افراد کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے کچھ گا رہی تھی، گانا جب ایک خاص مقام پر پہنچتا تھا تو قافلے میں شامل بہت سے افراد کورس کی شکل میں ایک آواز بلند کرتے تھے۔ پھر وہ سب قہقہے لگانے لگتے تھے۔ اگر اہلِ قافلہ میں سے کوئی شخص خاموش تھا تو وہ الماجد تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ اپنے اونٹ پر ہچکولے کھاتے کھاتے ایک دم کہیں کھو سا جاتا تھا۔ میں بے اختیار اس کے پاؤں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے پاؤں کی کھال جھلسی ہوئی سی تھی۔ الماجد نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ گرم ریگستان میں طویل سفر کے دوران میں اس کے پاؤں کا یہ حال ہوا تھا۔

○☆○

صبح سویرے ہم بستی میں واپس پہنچ گئے۔ ابھی اندھیرا تھا۔ بستی کے اکثر مکین سو رہے تھے۔ تاڑ اور کھجور کے خوابیدہ درختوں کے نیچے سے گزر کر ہم بستی کے وسط میں پہنچے۔ مجھے اور غزالہ کو باقی قافلے سے علیحدہ کر کے ایک ہوادار مکان میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دو کشادہ کمرے تھے، چارپائیاں تھیں، پانی کے مٹکے تھے اور کھجور کا درخت تھا جس میں کھجوروں کے سرخ سرخ خوشے لٹک رہے تھے۔

ہم بے تحاشا تھکے ہوئے تھے، گھر میں پہنچتے ہی فوراً سو گئے۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو جسم پسینے میں شرابور تھا، صحرا کا سورج سوا نیزے پر آیا ہوا تھا۔ غزالہ میرے قریب بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ میں پنکھا تھا، کبھی مجھے اور کبھی بچے کو جھل رہی تھی۔ قریب ہی ایک تختے پر شربت کا بڑا گلاس رکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر غزالہ نے بتایا کہ یہ شربت ابھی ابھی ایک خادم دے کر گیا ہے۔ غزالہ نے شربت میری طرف بڑھا دیا۔ گلاس ٹھنڈا تھا۔ یہ لوگ مشروبات کو مٹی کی صراحیوں میں بھر کر خاص طریقے سے ٹھنڈا کرتے تھے۔ مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "تم نے پیا؟"

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غلط کہہ رہی ہے۔ میں نے گلاس اس کے سامنے رکھ دیا "نہیں تم نے نہیں پیا۔ پہلے تم پیو۔ میں بعد میں پی لوں گا۔"

"نہیں آپ پی لیں، مجھے پیاس نہیں ہے، میں نے ابھی پانی پیا ہے۔"

میں نے مٹکے دیکھے، دونوں بالکل خشک پڑے تھے۔ میں نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ غزالہ کا پُرتکلف اور اجنبی رویہ کبھی کبھی مجھے سخت دکھ پہنچاتا تھا، اندر سے گھائل ہو جاتا تھا میں۔ کسی اندرونی تپش سے آنکھیں جلنے لگتی تھیں۔ کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ پھر مجھے غزالہ کی مدھم آواز سنائی دی "پلیز شاہ جہاں! پی لیجیے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے آدھا شربت ایک آبخورے میں ڈال لیا تھا اور باقی میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں نے گلاس تھام لیا۔

اس دوران میں الماجد کی شکل نظر آئی۔ وہ یونہی جائزہ لینے کے لیے اندر آیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہمارے ستارے بڑے اچھے جا رہے ہیں۔ بستی کے معززین ہمارے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ ہماری بہتری کی

کوئی صورت نکل آئے گی۔

بعد از دوپہر ہمیں پُرتکلف کھانا دیا گیا۔ اس میں بھُنا ہوا گوشت، سوندھی سوندھی خوشبو والی گرم روٹی، کھیر اور چاول شامل تھے۔ شام تک تو حالات ٹھیک رہے لیکن پھر اچانک تبدیلی واقع ہوئی۔ ہمیں مسلح محافظوں کی صورت نظر آئی، انہوں نے ہمیں اس ہوادار مکان سے نکالا اور لے جا کر دوبارہ زنداں میں بند کر دیا۔ اور اسی پر بس نہیں کیا، ایک مسلح شخص ہمارے پہرے پر بھی کھڑا کر دیا گیا۔

رات گئے تک کھانے کا انتظار رہا لیکن بچے کے دودھ کے سوا ہمیں کوئی چیز نہیں دی گئی۔ ہاں صبح کے وقت ناشتا زنداں میں پہنچایا گیا۔ یہ ناشتا بھی بس واجبی سا تھا۔ جو خادمہ ناشتا لے کر آئی تھی، اس کے ساتھ الماجد بھی تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح سپاٹ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہمیں دوبارہ زنداں میں کیوں پہنچا دیا گیا ہے۔

وہ بولا "کل رات جو بندہ تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا تھا وہ مر گیا ہے۔ اس کے مرنے سے معاملہ اور رخ اختیار کر گیا ہے۔ ابوظبی سے آنے والے مہمان بہت برہم ہیں۔ پہلے بستی کے معززین کی طرف سے مہمانوں کو کہا جا رہا تھا کہ وہ تمہیں اپنی تحویل میں لینے کا ارادہ ترک کر دیں اور واپس چلے جائیں لیکن اب ایسا ممکن نہیں۔ ابو آبان اور شاری کوئی ایسا حل سوچ رہے ہیں جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔"

میں نے کہا "اگر وہ بندہ مرا ہے تو اس میں بھی شنکر اور اس کے ساتھیوں کا ہی قصور ہے۔ انہوں نے اپنے ہی کیے ہوئے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور ہمارے تعاقب میں چلے آئے۔ ہم نے صرف اپنا دفاع کیا ہے۔"

"دفاع کے لیے تم نے ریوالور چلایا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ ریوالور کہاں سے آیا۔ معاہدے کے مطابق تو تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ابوظبی کے مہمانوں کا کہنا ہے کہ اگر ان کے دو ساتھیوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے تو تم نے بھی کی ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ وہ پستول ہمیں راستے میں ایک قافلے سے ملا تھا تو پھر؟"

"تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ ریوالور پہچان لیا گیا ہے بلکہ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ ریوالور نہیں پستول تھا۔ وہ اسی اسلحے میں شامل تھا جو مالِ غنیمت میں حاصل ہوا تھا اور بستی کے گودام میں پڑا تھا۔"

میں نے الماجد سے پوچھا "تم بتا رہے ہو کہ شاری اور ابو آبان اس مسئلے کا کوئی درمیانی حل سوچ رہے ہیں، تمہارے خیال میں یہ حل کیا ہو سکتا ہے؟"

الماجد بولا "میرا اندازہ ہے کہ ابوظبی کے مہمانوں نے تم سے مبارزت طلب کی ہے، اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ان میں سے ایک شخص کے ساتھ لڑنا ہو گا۔ اگر تم نے اپنے مدِمقابل کو شکست دے دی تو تمہیں حق پر تسلیم کیا جائے گا۔"

"حق ثابت کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

"یہ مقامی طریقہ ہے اور برسوں سے رائج ہے۔ کوئی ایسا مسئلہ جو کسی طور حل نہ ہو رہا ہو، دو افراد کے درمیان مبارزت کے ذریعے حل کیا جاتا ہے۔ اکثر یہ مبارزت سنگین ثابت ہوتی ہے، اس میں ایک فریق کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، اگر وہ جان سے بچ بھی جائے تو عمر بھر کے لیے ناکارہ ضرور ہو جاتا ہے۔"

مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال کر الماجد واپس چلا گیا۔ اس زنداں سے باہر کیا کھچڑی پک رہی تھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس یہی اندازہ تھا کہ شیخ عشارب کے ساتھی اور شنکر بہر صورت مجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف شاری میری بہتری کے لیے کوششیں کر رہی ہے۔ رات گئے جب دن بھر کی گرمی کا زور توڑنے والی مدھم ہوا چلنا شروع ہوئی تھی، الماجد کی شکل دوبارہ دکھائی دی۔ اس کے ساتھ موٹی حبشی خادمہ بھی تھی۔ حبشن ہمارے لیے دودھ لے کر آئی تھی۔ ٹھنڈا دودھ اس نے آبخوروں میں ڈال کر ہمارے سامنے رکھ دیا، پھر اس نے شیشے کی ایک بوتل نکالی اور زنداں کے چراغوں میں تیل ڈالنے لگی۔ الماجد حسبِ معمول گم صم کھڑا تھا۔ برآمدے میں جلنے والی مشعل کی روشنی میں اس کا کسرتی جسم سیاہ فولاد کے مانند دمک رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا فیصلہ ہوا الماجد؟"

وہ بولا "مجھے شک پڑ رہا ہے کہ تمہاری موت کا فیصلہ ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔ غزالہ کا چہرہ بھی فق ہو گیا تھا۔

الماجد نے اپنے گھونگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "معززین نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری "مبارزت" ہو گی۔ یہ مبارزت اس شخص سے ہو گی جسے ہم کل رات تمہارے ساتھ ہی بستی میں واپس لائے ہیں۔"

"تم شنکر کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔"

میں نے پوچھا "تم نے یہ کیوں کہا کہ میری موت کا فیصلہ ہوا ہے؟"

الماجد چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بولا "تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

"کچھ کچھ۔" میں نے جواب دیا۔

"ابھی ابھی میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ تم اس شخص کو ٹھیک سے نہیں جانتے۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ یہ شخص ایک نہایت بے رحم قاتل ہے اور اس کی خطرناکی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔"

"کیا تم نے صرف سنا ہے یا اس سلسلے میں تمہارا ذاتی تجربہ بھی ہے۔"

"کل ذاتی تجربہ بھی ہوا ہے۔" الماجد نے جواب دیا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ کل صبح جب ہم بستی میں واپس آئے تو کافی ہنگامہ ہو گیا تھا۔ جس وقت شنکر نامی اس بندے کو جال میں سے نکالا جا رہا تھا' اس نے اچانک ایک محافظ کی رائفل چھین لی اور دوسرے کی ٹانگ میں گولی مار کر بھاگ نکلا۔ بستی کے بڑے چوراہے میں ہمارے سات آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ اسے زندہ پکڑنا چاہ رہے تھے مگر اس خواہش کے نتیجے میں انہیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ ان پانچ افراد کو اس بندے نے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے خود وہ منظر نہیں دیکھا لیکن دیکھنے والے بہت حیران ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بندے میں جناتی طاقت اور پھرتی ہے۔ اس نے بستی کے بہترین لشکریوں میں سے دو کی ہڈیاں توڑ ڈالیں اور ایک کو مار مار کر بے ہوش کر ڈالا' پھر اس نے قریب ہی موجود ابو آبان کے بیٹے حاتم پر جھپٹا مارا اور رائفل کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ حاتم کو اس کے شکنجے میں دیکھ کر ہمارے آدمی پیچھے ہٹ گئے۔ پوری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ اسی دوران میں ابو آبان اور ابو ظبی سے آنے والے معزز مہمان موقع پر پہنچ گئے۔ معزز مہمانوں نے حاتم کی جان شنکر سے چھڑائی اور رائفل اس سے واپس لی گئی۔ اس واقعے کے بعد سے بستی کے لوگوں میں اس شخص کے بارے میں بہت تجسس پایا جاتا ہے۔"

الماجد اس موضوع پر شاید کچھ دیر مزید بات کرتا مگر رات دوسرے پہر کا نقارہ بجنے کی آواز سن کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیاہ فام خادمہ کے ہمراہ باہر نکل گیا۔

اگلے روز شام سے ذرا پہلے شاری نے مجھے اپنی رہائش گاہ پر طلب کیا۔ میں الماجد کے ساتھ وہاں پہنچا۔ شاری مکان کے احاطے میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بندر کی زنجیر تھی اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے بھنے ہوئے چنے کھلا رہی تھی۔ بندر کے ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ تھا جس سے وہ ادھر ادھر لشکارے مار رہا تھا۔

مجھے بندر کی طرف گھورتے پا کر وہ بولی "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہ بالکل اسی بندر جیسا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن وہ نہیں ہے۔" اس کی کڑک دار آواز میں افسردگی جھلک آئی۔

"مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا شاری۔ مجھے کیا پتا تو میرے ہاتھوں۔۔۔"

"خدا کے لیے یہ ذکر مت چھیڑو۔" اس نے میری بات کاٹی "وہ واقعہ اب ماضی بن چکا ہے۔"

اس نے بندر کی زنجیر چھوڑ دی' وہ "خوخو" کی آواز نکالتا ہوا ایک دروازے کے اندر چلا گیا۔ شاری بولی "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اٹھ کر اپنی خلوت گاہ کی طرف بڑھی۔ حبشی کنیزوں نے بڑی تعظیم سے جھک کر اسے راستہ دیا۔ الماجد وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی' وہاں حزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں۔ میں خلوت گاہ کے آرام دہ ماحول میں داخل ہو گیا۔ شاری نے اپنی شال اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ نیچے اس نے باریک مہین لباس پہن رکھا تھا۔ یہ "بے چارہ" لباس شاری کے پرشباب جسم کو چھپانے اور سنبھالنے سے قطعی قاصر تھا۔ وہ ذرا حرکت کرتی تھی تو لباس کی "بے چارگی" اور بھی عیاں ہو جاتی تھی۔

شاری بڑی تمکنت سے اپنی نشست پر براجمان ہوئی اور بولی "خدا کا شکر ہے کہ تم ایک خطرناک چال سے محفوظ رہے ہو۔"

میں نے کہا "خدا کے بعد مجھے تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔ روانگی کے وقت تم نے نہ صرف مجھے ہتھیار فراہم کیا بلکہ میری مدد کو فوری طور پر کمک بھی روانہ کی۔"

"خیر یہ تو ہر لحاظ سے ہم سب کا فرض تھا' بہرحال اب معاملہ یہ ہے کہ وہ بندہ مر گیا ہے جو تمہارے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد تنازع کھڑا ہو گیا تھا' مجھے اندازہ ہے کہ الماجد نے تمہیں اس بارے میں تھوڑا بہت بتایا ہو گا۔"

میں نے کہا "کافی کچھ بتایا ہے۔"

مجھے جو کچھ الماجد سے معلوم ہوا تھا وہ میں نے شاری کے گوش گزار کر دیا۔

ہم کافی دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ آخر شاری بولی "مبارزت کے فیصلے پر میں نے ہی زور دیا تھا۔ مجھے اس مسئلے کا کوئی اور حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب پتا نہیں میرا یہ فیصلہ درست ہے یا غلط۔"

"اس شک کی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"ابو آبان اور کچھ دیگر افراد کا کہنا ہے کہ جس شخص سے تمہاری مبارزت ہونا قرار پائی ہے وہ لڑائی بھڑائی میں غیر معمولی تجربے کا مالک ہے۔ اس کے بارے میں کئی انوکھی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ پھر یہاں کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھا ہے۔ اس شخص نے پرسوں تن تنہا تین چار افراد کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے ہیں۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے اس شخص کے مقابلے میں حقیر سمجھتی ہو۔"

"ایسا ہوتا تو میں مبارزت کا فیصلہ کبھی نہ کرتی۔ یہ فیصلہ ہی اس بات کا گواہ ہے کہ مجھے تمہاری دلیری اور ہمت پر بھروسا ہے۔ تم نے بہت مشکل لمحات میں میری جان بچائی تھی اور جو لوگ مشکلوں سے لڑنا جانتے ہیں وہ بے ہمت نہیں ہوتے۔ ہاں میں ایک بات ضرور کہوں گی۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ لڑائی جو تمہارے اور شنکر نامی اس شخص کے درمیان ہونا قرار پائی ہے 'خاص نوعیت کی ہے۔ اسے عرف عام میں "مبارزت" کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے' اسے تم قبائلی رسم و رواج کا حصہ قرار دے سکتے ہو اور اس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ یہ لڑائی ایک اکھاڑا نما جگہ پر لڑی جاتی ہے۔ یہ اکھاڑا چاروں طرف سے بند ہوتا ہے۔ لڑائی کی شروعات خالی ہاتھوں سے ہوتی ہے مگر اکھاڑے کی ریت میں کچھ ہتھیار بھی چھپائے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ ساری تفصیلات تمہیں الماجد سے معلوم ہو جائیں گی۔ اگر تم چاہو تو اصل اکھاڑے کی طرز کا ایک عارضی اکھاڑا بنا کر الماجد تمہیں اس لڑائی کے گُر بھی سکھا سکتا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں ایسا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا مدمقابل بھی اس قسم کا اکھاڑا بنوا کر تربیت حاصل کرے۔ فیصلے کے مطابق یہ لڑائی ایک عشرے (دس روز) بعد ہونا قرار پائی ہے۔ اس دوران میں تمہیں بھرپور تیاری کرنا چاہیے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور گمبھیر لہجے میں بولی "یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں ہے اس کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔"

"کیا یہ سب ضروری ہے۔" میں نے پوچھا "میرا مطلب ہے کہ اگر اس مسئلے کا حل لڑائی ہی ہے تو پھر یہ لڑائی سیدھے سادے انداز میں کرا لیں۔ بلکہ ابھی کرا لیں۔ بستی کے بڑے چوراہے میں چلے جاتے ہیں' وہیں فیصلہ ہو جاتا ہے۔"

شاری نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا "تم نے میرا دل خوش کر دیا' مجھے تم سے یہی امید تھی۔" میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چٹاخ سے میرے رُخسار کا بوسہ لے لیا اور شوخ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحے توقف کرکے بولی "دلیر شخص کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ فیصلے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور یہی اس کی کامرانی کی دلیل ہوتی ہے۔ بہرحال جس مبارزت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ لڑائی نہیں ہو سکتی۔ یہ بہت پرانا دستور ہے۔ میں توقع کرتی ہوں کہ تم اپنی بات پر زور نہیں دو گے۔"

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات دسویں حصے (آخری) میں ملاحظہ فرمائیں!

شاہجہان عرف بھائی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل
1

اُس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا۔ وہ پیدا ہوا تو
اُس کا نام شاہ جہان رکھا گیا مگر دُنیا نے اُسے جہانی اُستاد کے نام سے پہچانا۔
اکڑی ہوئی گردنیں اُس کے رُوبرو خم ہوتی رہیں۔ جرائم کی دُنیا کے بے تاج
دُشمن شمع اُس کے سامنے بجھ گئے۔ قانون کے محافظوں کے سامنے وہ معمہ ایک
مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کے لیے اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔
لاہور جیل اور پھر اٹک جیل کی مصیبتیں اُس کا مقدر بنیں لیکن گردشِ حالات کو
ابھی کچھ اور ہی منظور تھے۔ زندگی جہانی اُستاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی
حالات کی ایک نئی کروٹ اُسے کچھ ناہموار راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ
بادلِ ناخواستہ اُسی سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت

اپنی دلیری کا سرٹیفکیٹ مجھے اپنے رخسار پر چسپاں محسوس ہو رہا تھا۔ میں ذرا تعجب سے اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ذات میں ایک معما محسوس ہوتی تھی' کبھی شعلہ مزاج' کبھی کوڑا بدست' کبھی محبت میں ڈوبی ہوئی اور کبھی صرف اور صرف سردار...... اس کے بدن میں عورتوں کی سی نزاکت موجود تھی لیکن اس نزاکت کے پیچھے ایک فولادی قوت بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

"شربت پیو گے؟" شماری نے پوچھا۔

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے تالی بجائی۔ حبشی الماجد اندر داخل ہوا اور جھک کر کھڑا ہو گیا "شربت لاؤ۔" شماری نے حکم دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد الماجد ہمیں منقش بلوری پیالوں میں شربت پیش کر رہا تھا۔ اتفاقاً میری نگاہ اس کی آنکھوں پر پڑی۔ وہ سرخ ہو رہی تھیں اور متورم بھی تھیں۔ یہ آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رو تا رہا ہے۔ الماجد شربت پیش کر کے باہر چلا گیا مگر میرے ذہن کو اپنے خیالوں میں جکڑ گیا۔ میں نے شماری سے کہا "ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں تم سے۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"الماجد سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"وہی جو ایک آقا اور غلام میں ہوتا ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"یہ جواب تو میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ میں اصل بات جاننا چاہتا ہوں۔"

"اصل بات یہی ہے۔"

میں اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ میرے مسلسل اصرار کو دیکھ کر شماری نے ایک گہری سانس لی۔ شربت کے پیالے سے آخری گھونٹ بھر کر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اگلے چند لمحوں میں یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ وہ بولی "تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہمارا روزگار کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ پیشہ اچھا ہے یا برا لیکن صدیوں سے ہم یہی پیشہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ میرے والد اس وقت صحت مند تھے اور مہمات پر جایا کرتے تھے۔ ایک رات وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ لاپتا ہو گئے۔ دو تین روز تک ان کا انتظار کیا گیا' پھر بستی میں بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ ہم سب ان کی تلاش میں نکل گئے۔ دور دور تک صحرا چھان مارا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص سردار

کو ڈھونڈ کر لائے گا اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان سے پانچ چھ روز بعد کی بات ہے' جب ہم سردار کی زندگی سے قریباً مایوس ہو چکے تھے' الماجد انہیں واپس لے آیا۔ الماجد کا گھوڑا راستے میں مرچکا تھا۔ اس نے سردار کو کندھے پر لاد رکھا تھا اور تین روز پیادہ سفر کرکے بستی میں پہنچا تھا۔ سردار نیم بے ہوش تھے' دوسری طرف الماجد کے پاؤں بھی مسلسل چلنے سے جھلس چکے تھے۔

ہوش میں آنے کے بعد سردار نے بتایا کہ ایک مہم میں ان کے دونوں ساتھی ہلاک ہو گئے تھے' وہ خود زخمی ہوئے تھے اور جان بچا کر ایک کھوہ میں گھس گئے تھے۔ وہاں انہیں شدید بخار نے آلیا تھا۔ وہ بھوک پیاس اور شدید تکلیف کے ہاتھوں رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہے تھے جب الماجد نے ان تک رسائی حاصل کی تھی اور انہیں بچا لیا تھا۔ بے شک یہ الماجد کا کارنامہ تھا مگر اس کارنامے کے صلے میں اس نے جو کچھ مانگا وہ اس کی کم ظرفی اور احسان فراموشی کا ثبوت تھا۔ اس نے نہایت کم عقلی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی جو اس کے ذہن میں بھی نہیں آنی چاہیے تھی۔ میرا خیال ہے تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ اس نے کیا مانگا ہوگا۔ غلام ابن غلام ہونے کے باوجود اس نے اپنے آقا کی عزت کی طرف میلی نگاہ سے دیکھا۔ اس نے مجھے حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اگر میں یہ بات اپنے والد کو بتا دیتی تو ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے اس بدبخت کی گردن اڑا دیتے یا اس کا قیمہ کرکے چیلوں گدھوں کی خوراک بننے کے لیے صحرا میں پھنکوا دیتے۔ اور تو اور بستی کے لوگوں کو ہی اس کی جسارت کا پتہ چل جاتا تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ میں نے اس بدبخت کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اماراتی درہم سے بھری ہوئی ایک تھیلی اسے دی اور حکم دیا کہ وہ یہ بستی ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے۔ یہ رونے بلکنے لگا۔ منت سماجت کرنے لگا کہ اتنی بڑی سزا اسے نہ دی جائے۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے اور ساری زندگی اس قسم کا نجس خیال بھی ذہن میں نہیں لائے گا۔ میں کسی صورت اس کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے حرام موت مرنے کی کوشش کی اور بہت سی افیم نگل لی۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی گئی۔ مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنی پڑی۔ میں نے اس شرط کے ساتھ اسے بستی میں رہنے کی اجازت دے دی کہ یہ آئندہ بے حد محتاط رہے گا اور کبھی کوئی ایسا لفظ اس کے منہ سے نہیں نکلے گا جس کی وجہ سے اسے بستی بدر ہونا پڑے۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم نے اسے اپنے قریب کیوں رکھا ہوا ہے۔ اگر واقعی تمہیں اس کے والہانہ جذبات پسند نہیں تو تم اسے غلام کے طور پر کسی اور کے سپرد بھی کر سکتی ہو۔"

"اس میں بھی ایک مسئلہ ہے۔" شاری نے کہا "میرے والد اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بستی کا سب سے بہادر اور وفادار غلام ہے۔ ان کی یہ پرزور خواہش رہی ہے کہ الماجد میرے ذاتی غلاموں میں شامل ہو اور میرے محافظ کا کردار بھی ادا کرے۔ انہیں آج تک یہ معلوم نہیں کہ پانچ برس پہلے اس "وفادار غلام" کے منہ سے کتنی نازیبا بات نکلی تھی بلکہ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہے سوائے میرے۔ پتا نہیں کیا بات ہے' آج اتنے عرصے بعد میں نے یہ بات تمہیں کیوں بتا دی ہے۔" چند لمحے تک وہ غور سے مجھے دیکھنے کے بعد بولی "میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی بات ہے تم میں جو مجھے تمہاری طرف کھینچتی ہے۔ تم مجھے اپنے اپنے سے لگنے لگے ہو۔"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے' الماجد وہ بات بھول چکا ہے جو اس نے پانچ برس پہلے کہی تھی؟"

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے اس کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی نظر آتی ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب وہ تمہاری طرف دیکھتا ہے اور یہ بہت نمایاں روشنی ہے۔ اگر میں نے اسے محسوس کیا ہے تو بستی کے اور بھی بہت سے لوگوں نے محسوس کیا ہوگا۔ کیا تم نے وہ مقولہ نہیں سن رکھا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" وہ بال جھٹک کر بولی "اور نہ ہی میں مقولوں پر اعتبار رکھتی ہوں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تم مقولوں پر اعتبار رکھتی ہو اور تمہیں عشق و مشک والی بات پر بھی اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ ایسی تمام باتیں تمہارے علم میں ہیں۔ بس جان بوجھ کر انجان بنی ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ الماجد کا اپنے اردگرد رہنا اور آہیں بھرنا لاشعوری طور پر تمہیں اچھا لگتا ہو۔"

وہ بے زار لہجے میں بولی "تم بے پر کی اڑا رہے ہو۔ بات کچھ اور ہو رہی تھی' تم کسی اور طرف نکل گئے ہو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ تمہیں اگلے دس روز میں خود کو مبارزت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ یہ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری بھی

عزت و آبرو کا سوال ہے۔ جو اعتبار میں نے تم پر کیا ہے' تمہیں اس پر پورا اتر کر دکھانا ہے۔ مقابلے کی تیاری کے لیے میں تمہیں ہر قسم کی سہولت دینے کا انتظام کر رہی ہوں۔ خواہ تربیت' معلومات' مشاورت غرض جو تم چاہو۔"

شاری بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور اس کی سنجیدگی دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں کوئی نامی گرامی پہلوان ہوں اور مجھے کسی دوسرے نامی گرامی پہلوان کے ساتھ لڑانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے بالکل نئی اور اجنبی تھی۔

میں شاری سے مل کر اس کے خلوت کدے سے باہر نکلا تو سب سے پہلے الماجد پر ہی نگاہ پڑی۔ وہ دروازے سے باہر گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر جلی حروف میں درج تھا کہ وہ ایک عاشق نامراد ہے۔

اگلے روز صبح سویرے الماجد نے مجھے زنداں سے نکالا اور بستی سے باہر کھلی جگہ پر لے گیا۔ یہاں چاروں طرف سرخی مائل ریت تھی اور کھجور کے اکا دکا درخت تھے۔ الماجد نے صرف ایک نیکر نما چیز پہن رکھی تھی۔ باقی جسم ننگا تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس نے واکنگ ایک طرف رکھی۔ نیکر کے اندر سے ایک خنجر نکالا اور ریت پر طویل لکیریں کھینچ کر مربع شکل بنا دی۔ یہ قریباً سو مربع گز جگہ تھی۔

الماجد نے کہا "سمجھو یہ وہ اکھاڑا ہے جہاں تم نے لڑائی لڑنی ہے۔ اس اکھاڑے میں دو تیز دھار آلات چھپائے جاتے ہیں' تیسرا آلہ ہوا میں معلق ہوتا ہے۔ اسے درخت کی کسی شاخ وغیرہ سے لٹکایا جاتا ہے۔ جو آلات اکھاڑے میں چھپائے جاتے ہیں' وہ ان دو مخالف کونوں میں ہوتے ہیں۔ انہیں ریت کے نیچے یوں چھپایا جاتا ہے کہ وہ آسانی سے نظر نہیں آ سکتے۔ لڑائی کی شروعات خالی ہاتھ ہوتی ہے۔ لڑنے کے ساتھ ساتھ دونوں فریق تیز دھار آلے کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ جس فریق کو آلہ پہلے مل جاتا ہے اس کا پلہ یقیناً بھاری ہو جاتا ہے۔ تیسرا آلہ بہ نسبت چھوٹا ہوتا ہے اور یہ زمین سے قریباً دس فٹ کی بلندی پر معلق کیا جاتا ہے۔ لڑائی کے دوران میں دونوں فریق اس آلے کے لیے بھی جدوجہد کرتے ہیں۔ عموماً یہ آلہ ایک تیز دھار خنجر ہوتا ہے۔ جو دو آلات ریت میں چھپائے جاتے ہیں' وہ زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ عام طور پر پیش قبض چھپائی جاتی ہے اور کبھی کبھی اس کی دھار زہر میں بھی بجھائی جاتی ہے۔"

الماجد نے کھجور پر چڑھ کر ایک شاخ توڑی پھر اس کے تین ٹکڑے کیے۔ ایک چھوٹا ٹکڑا ڈوری کی مدد سے ایک شاخ کے ساتھ لٹکا دیا۔ باقی دو ٹکڑے اس نے اکھاڑے کے دو کونوں میں دبا دیے۔ جو ٹکڑا ہوا میں معلق تھا اس کی بلندی دس گیارہ فٹ کے قریب تھی اور یہ تقریباً اکھاڑے کے وسط میں لٹک رہا تھا۔

وہ بولا "بس یوں سمجھ لو کہ مبارزت کے لیے میدان تیار ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لیے مجھے شنکر تصور کر لو اور سمجھو کہ سیکڑوں تماشائیوں کے درمیان ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے۔"

"تو تم مجھ سے لڑو گے؟"

"اس غلام زادے میں اتنی جرأت کہاں کہ وہ تم سے لڑے۔ یہ تو صرف ایک مشق ہے۔ شاری اور ابو آبان کا حکم ہے کہ میں تمہیں مشق کراؤں۔"

ہم دونوں اکھاڑے کے وسط میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ الماجد کا عریاں جسم دمک رہا تھا اور اس کے رگ پٹھے کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ بولا "دیکھو میں اب ہتھیار تک پہنچنے کے لیے دائیں کونے کی طرف جاتا ہوں تم مجھے روکنے کی کوشش کرنا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دوڑ لگائی۔ میں نے جھپٹ کر اسے دھکا دیا' وہ دور لڑھک گیا مگر لڑھکتے ہوئے بھی اس نے اپنا دماغ حاضر رکھا اور کونے کی طرف ہی گیا۔ میں نے جست لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے میرے سینے میں سر کی زوردار ٹکر رسید کی۔ یہ ٹکر میری توقع سے زیادہ سخت تھی' آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ میں ایک طرف الٹ گیا۔ الماجد نے پھرتی سے اٹھ کر ٹانگ چلائی۔ نشانہ یقیناً میری پسلیاں ہی تھیں مگر میں وار بچا گیا اور الماجد ہی کی طرح تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک [illegible]

نسلوں کا قرض

+ ایک حوصلہ مند شخص کی کہانی جس نے نسلوں کا قرض چکانے کا عہد کیا تھا۔
+ ایک پاکستانی ڈاکٹر اور بوسنیا کی دوشیزہ کی محبت کی جذبات میں الجھی ہوئی داستان۔
+ لمحہ بہ لمحہ کروٹ بدلتی سسپنس سے بھرپور کہانی۔

[illegible]

سینے پر لگنے والی ضرب سے مجھے کھانسی شروع ہو گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے شکایتی نظروں سے الماجد کو دیکھا۔ وہ بھولپن سے بولا "زور سے لگ گئی ہے کیا؟؟"

"بس کچھ لگ ہی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے بات ٹال دی تھی ورنہ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ الماجد نے جان بوجھ کر شدید چوٹ لگائی تھی، غالباً اس طرح اس نے اپنا اندرونی غصہ نکالا تھا۔ شاری اس کی محبوبہ تھی اور میں اس کی خلوت گاہ میں پہروں بیٹھا رہتا تھا۔ الماجد کے دل میں رقیبانہ جذبات کا جاگنا فطری بات تھی۔ وہ بے چارہ غلام زادہ تھا، کچھ کر تو نہیں سکتا تھا۔ جہاں اس کا بس چلا تھا وہاں اس نے تھوڑا بہت غصہ نکالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بے خبر کھڑا تھا، اچانک میں نے اسے جھکائی دی۔ وہ ٹانگیں بچانے کے لیے جھکا تو میں نے اس کی گردن جکڑی اور اڑنگا لگا کر اوندھے منہ پھینک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، میں اس کے سر پر تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر لگائی۔ یہ بڑی شدید ضرب ثابت ہوتی لیکن آخری موقع پر میں نے ارادہ بدل دیا اور زیادہ چوٹ نہیں لگائی۔

میں اور الماجد قریباً پندرہ منٹ ہلکی پھلکی زور آزمائی کرتے رہے۔ الماجد نے مجھے اس مخصوص لڑائی کے مختلف اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔ کبھی وہ میرے ساتھ داؤ پیچ کا عملی مظاہرہ بھی کرنے لگتا تھا۔ الماجد خاصا طاقت ور شخص تھا۔ اگر وہ واقعی میرا مدِمقابل ہوتا تو مجھے اسے ہرانے میں خاصی دشواری پیش آتی۔ ہاں اس میں ایک کمزوری تھی، وہ اپنے بازو کا استعمال بہت کم کرتا تھا۔ اس کے بازو ایک عرصہ زخمی رہے تھے، شاید اس تکلیف کا اس پر کوئی نفسیاتی اثر تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم دونوں ہانپ گئے تو وہیں ریت پر کھجور کی مختصر چھاؤں تلے بیٹھ گئے۔ الماجد کی سیاہ پیشانی پر پسینہ موتیوں کی طرح دمک رہا تھا۔ میں نے اس کی روشن آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اچانک کہا "تم شاری سے پیار کرتے ہو؟؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا "کیسی بات کر رہے ہو تم۔" وہ سخت سراسیمہ انداز میں بولا۔

"وہی بات کر رہا ہوں جو میں ہر روز تمہارے چہرے پر لکھی دیکھتا ہوں اور بہت سے دوسرے لوگ بھی دیکھتے ہوں گے۔ تم شاری سے محبت کرتے ہو۔"

الماجد اس تذکرے سے بہت ہراساں نظر آ رہا تھا۔

میں اسے منوا رہا تھا، وہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔ آخر میرا اصرار جب حد سے بڑھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "محبت تو میرے نزدیک ایک بہت چھوٹا لفظ ہے۔ عشق۔۔۔ جنون شاید یہ لفظ بھی اس جذبے کے سامنے حقیر ہیں جو میں شاری کے لیے رکھتا ہوں۔ بس میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ میں اپنے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر وہ اپنے ایک بوسے کے عوض میری جان لینا چاہے تو میں ابھی اپنا گلا خنجر سے کاٹ لوں گا۔ کوئی سوال نہیں پوچھوں گا، کوئی وضاحت نہیں مانگوں گا۔"

"مجھے یقین تھا کہ تمہارا جذبہ ایسا ہی شدید ہو گا۔"

"خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ کوئی فائدہ نہیں۔"

"فائدہ کیوں نہیں۔۔۔ کم از کم مجھے تو بہت فائدہ ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں بے موت مرنے سے بچ جاؤں گا۔"

"مرنے والی اس میں کیا بات ہے؟"

"بھائی ہے۔۔۔ ذرا دماغ پر زور دو۔ تم شاری کو پاگل پن کی حد تک چاہتے ہو۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تم شاری کو مجھ سے ہنستے مسکراتے دیکھتے ہو۔ یقینی بات ہے کہ تمہارے دل میں رقابت کے جذبات جاگ چکے ہوں گے۔ اب تم مجھے "مبارزت" کے داؤ پیچ سکھا رہے ہو۔ تم ضرور میری تربیت میں ڈھیلا کرو گے۔ تمہاری کوشش ہو گی کہ میں مبارزت کے روز اکھاڑے سے زندہ واپس نہ آ سکوں۔"

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کہی تھی، میرا خیال تھا کہ شاید الماجد مسکرائے گا لیکن مسکرانا تو شاید اسے آتا ہی نہیں تھا۔ کہنے لگا "رقابت تو وہاں ہوتی ہے جہاں کچھ کھونے کا ڈر ہو۔ میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو کھوؤں گا کیا۔"

"تم بڑی شاعرانہ بات کرتے ہو۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ صحرائی بستی میں رہنے والا تم جیسا پہلوان نما شخص ایسے الفاظ گھڑ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عشق کی گرمی نے تمہارے لب و لہجے کو سرخاب کے پر لگا دیے ہیں۔"

وہ بولا "تمہارے لہجے میں کون سے پر لگے ہوئے ہیں؟!"

"کیا مطلب؟"

وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ ابوظہبی کے مہمان تمہارے بارے میں کچھ باتیں درست بھی کہہ رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس خوب صورت لڑکی سے تمہارا واقعی کوئی تعلق ہو جو تمہارے ساتھ زنداں میں ہے۔"

"یہ بے معنی بات تمہارے ذہن میں کیوں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بے معنی بات نہیں ہے۔ میں نے کچھ محسوس کیا ہے، بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یاد ہے پرسوں دوپہر جب تم سوئے پڑے تھے اور وہ لڑکی شربت لیے تمہارے سرہانے بیٹھی تھی، میں نے کھڑکی میں سے اسے دیکھا تھا۔ تمہارے خوابیدہ چہرے کی طرف اس کا دیکھنا میرے ذہن میں ابھی تک نقش ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا۔ کوئی ایسی بات تھی اس کی حسرت ناک نگاہوں میں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی اور نہ سنی ہے پھر اس نے بڑی ہی ملائمت سے تمہارے بالوں کو بھی چھوا تھا۔ میں نہیں جانتا وہ کون ہے، تم کون ہو اور تمہارے درمیان کیا ہے لیکن میں ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی تم پر دل و جان سے فدا ہے۔"

اس رات جب ہم زنداں میں سونے کے لیے لیٹے تو میں چور نظروں سے دیر تک غزالہ کو دیکھتا رہا۔ وہ ایک معما تھی، شاید ہر عورت ایک خاص تناظر میں معما ہی ہوتی ہے۔ غزالہ ہر رات میرے قریب ہوتی تھی۔ ہمارے درمیان بس چند فٹ کا فاصلہ ہوتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنی کسی حرکت یا بات سے ظاہر نہیں کیا تھا کہ اسے مجھ سے کسی طرح کی لگاوٹ ہے یا میں اس کے لیے پرانے تعلق کے حوالے سے کوئی اہمیت رکھتا ہوں مگر الماجد نے بتایا تھا کہ جب میں نیند کی حالت میں تھا، وہ والہانہ انداز میں مجھے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے میرے بالوں کو چھوا تھا اور شاید آنکھوں سے اشک بھی گرائے تھے۔ یہ سب کچھ اس نے میری بے خبری میں کیا تھا۔ عام حالت میں تو وہ مجھ سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت غم کی پرچھائیاں لہراتی رہتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس غم کا تعلق شیخ عاصم کی گمشدگی سے ہے۔ وہ بھی حیران کن طور پر گم ہوا تھا۔ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ غزالہ بچے کو سینے سے لگائے لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لگتا تھا کہ سو رہی ہے لیکن ممکن تھا کہ میری بند آنکھوں کی طرح اس کی بند آنکھوں میں بھی ایک رمز موجود ہو۔

اگلی صبح ایک بھاری بھرکم ناشتے کے بعد الماجد پھر مجھے بستی سے باہر لے گیا۔ آج اس کا ایک بدو ساتھی بھی ہمراہ تھا۔ یہ شخص بستی میں ماہر ترین خنجر زن سمجھا جاتا تھا۔ ہم ایک بار پھر اس اکھاڑے میں پہنچے جہاں کل میرے اور الماجد کے درمیان زور آزمائی ہوتی رہی تھی۔ اس اکھاڑا نما مقام کی دو اطراف میں پہلے سے دیوار موجود تھی، مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ باقی دو اطراف میں بھی ایک کچی سی دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔ یہ دیوار زمین سے قریباً پانچ فٹ بلند تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اس دیوار کے گرد بستی کے کئی افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ ان میں نوجوان اور بچے بھی تھے۔ الماجد نے بتایا کہ پوری بستی میں مبارزت کا چرچا ہو چکا ہے اور یہ لوگ میری مشق وغیرہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

الماجد ٹھیک کہہ رہا تھا، لوگوں کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ وہ دیوار کے باہر سے اُچک اُچک کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ چند بچے بڑوں کے کندھوں پر سوار ہو گئے تھے۔ الماجد کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر تو برداشت کیا پھر ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو وہاں سے بھگا دیا۔ ہم کل کی طرح پھر زور آزمائی میں مصروف ہو گئے۔ الماجد کا ساتھی عبال مجھے خنجر زنی کے اسرار و رموز سمجھانے لگا (حالانکہ میرے خیال میں اسے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت تھی) میں اس کا دل رکھنے کے لیے اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ رہ رہ کے وہ مجھے اپنے فن کا مظاہرہ بھی دکھاتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ تین مرتبہ مبارزت میں حصہ لے چکا ہے اور تینوں مرتبہ اس نے اپنے مدِمقابل کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ بستی میں "یہ کارکردگی" ریکارڈ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس وقت عبال مجھے خنجر زنی کی "مشق" کرا رہا تھا، الماجد بڑی گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ کہنے لگا "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم اپنی طاقت اور مہارت کا بہت تھوڑا حصہ استعمال کر رہے ہو۔ اگر تو یہ تمہاری عادت ہے تو بہت غلط ہے، اگر جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہو تو پھر ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہاری پہلی بات ہی صحیح ہو گی، بلکہ مجھے تو پہلی بھی صحیح نہیں لگتی۔ پتا نہیں تمہیں مجھ میں کون سی طاقت اور مہارت نظر آئی ہے۔"

اسی دوران میں چار دیواری سے باہر شور شرابا سنائی دیا، دو افراد لکڑی کے مختصر دروازے سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں ایک مسلح بدو موجود تھا۔ وہ انہیں روک رہا تھا۔ الماجد نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جو افراد اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے وہ شیخ عشارب کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ایک عشارب کا بہنوئی شیخ سالم تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر آگ بگولا ہو رہا تھا۔ اندر گھسنے میں ناکامی ہوئی تو اس کا پارا مزید چڑھ گیا۔ غرا کر بولا "تیری لاش نہ بچھاری تو ہمارا نام نہیں۔ تو ایک مکار دھوکے باز شخص ہے۔ تو اپنی بہن کے بارے میں قول دے کر

اس سے بچھڑا ہے۔ ہمیں اپنے گھر بلا کر رسوا کیا ہے تو نے۔ اب ہمارے ہاتھوں تیری رسوائی کا تماشا دنیا دیکھے گی۔ تو وہ سب کچھ کرے گا جو ہم چاہتے ہیں اور ہمارے پاؤں چاٹ کر کرے گا۔"

میں نے کہا "تم نے بھی ابھی میرا کچھ نہیں دیکھا۔ اب دیکھنے پر تل گئے ہو تو پھر دیکھتے جاؤ۔ تمہاری غلاظت اور دولت کا گھمنڈ پیشاب کے راستے نہ نکال دوں تو میرا نام نہیں۔"

غصے کے مارے سالم کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس کا رنگ تانبے کی طرح ہو گیا تھا۔ کچھ دیر میرے اور سالم کے درمیان تلخ کلامی ہوئی پھر وہ بک بک کرتا واپس چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا "اپنے باپ شنکر سے کہہ دینا کہ اپنے ماتا پتا کو اپنا آخری پرنام بھیج دے' ہفتے کے دن میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پتا نہیں' سالم نے میری بات سنی نہیں تھی' یہ سنی ان سنی کر ڈالی تھی۔

میری اور سالم کی تلخ کلامی سن کر لوگ ایک بار پھر اکھاڑے کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ہر عمر کے افراد شامل تھے۔ چند ایک عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ عورتوں نے اپنے چہرے حجاب میں چھپا رکھے تھے۔ وہ سب بڑی متجسس نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے الماجد سے پوچھا "یہ لوگ مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟ لگتا ہے جیسے نظروں نظروں میں مجھے تول رہے ہوں؟"

وہ بولا "شاید تول ہی رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"پتا نہیں' تمہیں اچھا لگتا ہے یا برا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مبارزت کے موقع پر بستی کے لوگ شرطیں بھی لگاتے ہیں۔ شرطیں لگانے والوں میں زیادہ تعداد کھاتے پیتے لوگوں کی ہوتی ہے تاہم غریب غربا بھی چھوٹی موٹی شرطوں سے باز نہیں آتے۔ اب یہ لوگ تمہیں آنکھوں آنکھوں میں پرکھ رہے ہیں کہ تم پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔"

یہ میرے لیے بالکل انوکھی بات تھی۔ کچھ توہین کا احساس بھی ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ ہر جگہ کے مقامی رسم و رواج ہوتے ہیں' میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں الماجد سے پوچھا "تم بھی کسی پر شرط لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آیا "میں غلام زادہ ہوں' میرے پاس ہے ہی کیا' شرط لگانے کو۔۔۔ ہاں اگر کچھ ہوتا تو پھر تمہارے حق میں شرط لگاتا۔ تم میں جیتنے اور فتح حاصل کرنے کی قوت موجود ہے۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے اس کا لہجہ کچھ معنی خیز ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس کا اشارہ شاری والے واقعے کی طرف ہے۔ اس نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میں تنہائی میں شاری سے باتیں کرتا ہوں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اچھا تم اپنی بات چھوڑو' عام لوگوں کی کیا رائے ہے؟"

وہ بولا "بس ملی جلی رائے ہے۔ شاید شنکر کا پلڑا کچھ بھاری ہی ہو۔ دراصل تین دن پہلے جو واقعہ ہوا ہے اس نے شنکر کی کافی دھاک بٹھائی ہے۔ لوگ اسے جناتی قوت کا مالک کہہ رہے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کو تمہاری خوش بختی پر بھی یقین ہے۔"

"میری خوش بختی؟ کیا مطلب؟"

"یہ خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم نے آتے ساتھ ہی شاری کا انتہائی پیارا پالتو بھیڑیا ہلاک کر دیا' اس کے باوجود نہ صرف تمہاری جان بخشی ہوئی بلکہ تمہیں شاری کا قرب اور خوشنودی بھی حاصل ہوئی۔" ایک بار پھر الماجد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں غم کی بدلیاں تیرتی دیکھیں۔

اچانک شور سا بلند ہوا۔ میں نے چار دیواری کے اوپر سے دیکھا۔ بستی کی طرف ہلچل نظر آ رہی تھی۔ دو افراد بھاگتے ہوئے اکھاڑے کی جانب آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ کوئی خاص خبر لا رہے ہیں۔ ہمارے قریب پہنچ کر ایک شخص مقامی زبان میں چلانے لگا۔ اس کی بات سن کر الماجد اور عبال کے چہروں پر بھی زلزلے کے آثار نمودار ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں جوش اور سنسنی خیزی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

الماجد نے مجھے بتایا "ایک بہت اچھا شکار نظر آیا ہے۔ ہم اپنی مقامی بولی میں اسے "ہدف" کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ہدف ہے۔ تیس چالیس اونٹ ہیں۔ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ خاصا سامان ہاتھ آنے کی توقع ہے۔"

"سامان ہاتھ آنے کی توقع ہے؟ میں سمجھا نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں یہ بات عجیب لگتی ہو لیکن آبا و اجداد کے زمانے سے لوٹ مار ہمارا پیشہ ہے۔ اس ویرانے میں اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہی جنگل کا قانون کہ لقمہ بن جاؤ یا لقمہ بنا لو۔" بات کرتے کرتے ہم چار دیواری

سے باہر آ گئے تھے۔ الماجد بولا "چلو میں تمہیں زنداں پہنچا دوں۔ ہمیں اب جانا ہو گا۔ دعا کرنا ہم کامیاب واپس لوٹیں۔"

میں نے کہا "میں تو یہ دعا کروں گا کہ جو بدقسمت مسافر تمہارے ظلم کا شکار ہونے والے ہیں وہ اپنی جانیں اور اپنا مال بچانے میں کامیاب رہیں۔"

حبشی الماجد عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں درندگی کی جھلک تھی۔ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کوئی خوں خوار جانور دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر رہا ہو اور یہ کیفیت صرف الماجد تک ہی محدود نہیں تھی' میں نے بستی میں موجود ہر مرد و زن کے چہرے پر ایسی ہی وحشت دیکھی۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور رنگ تمتما رہے تھے۔ اپنی رائفلیں' کلہاڑیاں اور برچھیاں تھامے وہ ہنگامہ آرائی کے لیے تیار نظر آ رہے تھے۔ ان کی ٹولیاں مختلف جگہوں پر کھڑی ہوئی تھیں اور وہ سب کے سب تند و تیز لہجوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں' نوجوان لڑکے بھی تھے اور عمر رسیدہ بزرگ بھی نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی پگڑیاں ڈھاٹوں کی طرح چہروں پر لپیٹ لی تھیں' اپنی سواریاں تیار کر لی تھیں اور ہتھیار سونت لیے تھے۔ یکایک میری نگاہ دو گھڑ سواروں پر پڑی۔ وہ ایک گلی کے موڑ سے نمودار ہوئے تھے اور تیزی سے ہمارے زنداں کی طرف آ رہے تھے۔ وہ قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شاری ہے۔ وہ گھڑ سواری کے شاندار لباس میں تھی۔ دیگر افراد کی طرح اس نے بھی ایک بڑی پگڑی ڈھاٹے کی طرح چہرے اور سر پر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کی پیٹی کے دونوں جانب ہولسٹر بندھے تھے اور پیش قبض بھی نظر آ رہی تھی۔

شاری کو دیکھ کر ایک دم ہجوم سا اس کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ شاری نے بڑی تمکنت سے اپنا سیاہ پسٹل نکالا اور اسے ہوا میں لہرا کر مقامی زبان میں چند پرجوش فقرے ادا کیے۔ حاضرین کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ انہوں نے چند نعرے لگائے اور گھوڑوں و اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ شاری نے تقریر کرنے والے انداز میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیں پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آندھی و طوفان کی طرح بستی سے روانہ ہو گئی۔ اس کے قریباً ایک سو جنگجو ساتھی اس کے ہم رکاب تھے۔

یہ لوگ بستی سے نکلے تو ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ بستی کے باقی رہ جانے والے مکین گلیوں میں کھڑے تھے اور جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا ساتھ آوارہ کتے دے رہے تھے۔ وہ جیسے بھونک بھونک کر جانے والوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔

اکا دکا مسلح پہرے دار زنداں کے گرد اب بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں زنداں میں چلا جاؤں۔ زنداں کی کوٹھڑی میں غزالہ حیران و پریشان بیٹھی تھی۔ یہ ہلچل اس کے لیے ناقابل فہم تھی۔ میں نے غزالہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ جو پہرے دار ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتا تھا وہ کوٹھڑی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کان کھانے شروع کر دیے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کتنی دور گئے ہیں اور کس ارادے سے گئے ہیں؟

اس پہرے دار کے ساتھ آدھ گھنٹے کی مغز ماری میں جو دو تین باتیں میرے پلے پڑیں وہ یہ تھیں کہ شاری اور اس کے ساتھیوں کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کیونکہ جس قافلے پر حملہ کیا جانے والا ہے وہ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس قافلے کے متعلق پہرے دار کا خیال تھا کہ یہ کچھ صحرائی لوگ ہیں جو اپنے بال بچے اور مال مویشی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ ان کی تعداد ستر اسی کے لگ بھگ ہے۔

دس پندرہ منٹ بعد میں نے دیکھا کہ زنداں کے پہرے دار بڑے غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے بھی احتیاطاً کان دھرے اور چونک گیا۔ کہیں دور سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چھوٹے بڑے کئی طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے تھے' گاہے گاہے برسٹ بھی چل رہے تھے۔ ان آوازوں کو سن کر پہرے داروں کے چہرے جوش سے تمتما اٹھے۔ کچھ دیر بعد یہ آوازیں واضح ہونے لگیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ متحارب فریقوں میں سے ایک فریق بستی کے رخ پر دوڑ رہا ہے اور دوسرا فریق پیچھا کر رہا ہے۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ فائرنگ کی آوازیں قریب آتی چلی جا رہی تھیں۔

یہ سوچنا بڑا سنسنی خیز تھا کہ فائرنگ کی ان آوازوں کے ساتھ ساتھ کئی زندگیاں بھی ہوا میں تحلیل ہو رہی ہیں۔ اس جلتے سورج کے نیچے جھلسی ہوئی ریت پر موت و زیست کا کھیل کھیلا جا رہا تھا پھر اچانک ہی فائرنگ کی شدت کم ہو گئی۔ اندازہ ہوا کہ بدقسمت قافلے کی تقدیر کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد مجھے ایک گھڑ سوار دکھائی دیا۔ اس کی سفید قبا پر خون کے چھینٹے تھے۔ وہ الماجد تھا۔ اس نے اپنی رائفل ہوا

میں لہرائی اور پرجوش انداز میں کچھ الفاظ ادا کیے۔ بستی کے لوگوں نے جوابی نعرے بلند کیے اور کچھ مرد و زن ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے لگے۔ یقیناً حملہ کامیاب رہا تھا۔ الماجد گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

عین دوپہر کے وقت شاری اپنے ساتھیوں اور "ہدف" کے ساتھ بستی میں واپس پہنچ گئی۔ زنداں کی کھڑکیوں سے میں نے اس "واپسی" کا منظر دیکھا۔ غزالہ بھی میرے ساتھ تھی۔ ہمیں بالکل یوں لگا جیسے کسی قدیم زمانے کی فلم کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ بہت سے مرد و زن اور بچے قید کر کے لائے گئے تھے۔ یہ سب کے سب صحرائی باشندے تھے۔ سفید و رنگ دار قبائیں تھیں۔ سروں پر پگڑیاں یا عمامے تھے۔ ان میں سے کچھ افراد کا لباس قیمتی تھا اور ان کے گلے میں مالائیں وغیرہ بھی نظر آتی تھیں۔ ان کو زنگ آلود زنجیروں کی مدد سے ایک دوجے سے باندھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کے ہاتھوں میں بھی زنجیریں نظر آ رہی تھیں۔ ان سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کچھ عورتیں تو باقاعدہ بین کرنے کے انداز میں رو رہی تھیں۔ یقیناً کچھ لوگ اس لڑائی میں کام بھی آئے تھے۔ میں نے کئی سرخ اونٹ دیکھے جن پر مال و اسباب لدا ہوا تھا۔ ایک اونٹ کھڑکی کے بالکل پاس سے گزرا۔ اس کے کجاوے میں بہت سی رائفلیں اور برچھیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ یقیناً یہ اسلحہ مالِ غنیمت کا حصہ تھا۔ اسی اونٹ پر ایک زخمی بدو بھی اوندھا پڑا تھا۔ اس کا لہو قطرہ قطرہ اونٹ کی پشت پر بہہ رہا تھا۔ مالِ غنیمت میں اونٹوں کے علاوہ دو تین گھوڑے اور خچر بھی شامل تھے پھر ہمیں ایک چھکڑا نظر آیا۔ اس چھکڑے کو دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ چھکڑے میں کم و بیش آٹھ افراد کی خونچکاں لاشیں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ یہ ایک اندوہناک منظر تھا۔

سارا دن بستی میں ہلچل رہی۔ اہلِ بستی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ شام کو مجھے الماجد کی زبانی پتا چلا کہ "ہدف" پر مارا... جانے والا چھاپا بہت کامیاب رہا ہے۔ کافی مال اسباب ہاتھ آیا ہے۔ الماجد زندہ انسانوں کو بھی مال اسباب میں شمار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پکڑے جانے والوں میں سے دس پندرہ مرد ایسے ہیں جو تنومند غلاموں کی حیثیت سے اہلِ بستی کے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان میں ایک اندھا شخص بھی شامل تھا جو زیرِ زمین پانی کی موجودگی کا اندازہ لگانے میں خاص مہارت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ آٹھ کے قریب جوان خوب صورت عورتیں بھی تھیں۔

ایک درجن رائفلیں اور ان کا ایمونیشن بھی اہلِ بستی کے ہاتھ لگا تھا۔ الماجد کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان دور دراز صحرائی علاقوں میں اس قسم کی لوٹ مار اکثر جاری رہتی ہے۔ ایسی لوٹ مار میں پکڑے جانے والے قیدیوں سے بیگار لی جاتی ہے اور عورتوں کو گھر میں ڈال لیا جاتا ہے۔ ممکن تھا کہ جو لوگ پکڑے گئے ہیں وہ سارے کے سارے آزاد نہ ہوں بلکہ کچھ پہلے سے ہی قیدی ہوں۔

الماجد نجانے کن مصروفیات میں کھو گیا تھا۔ دو دن تک مجھے اس کی صورت نظر نہیں آئی۔ اکھاڑے میں جانے کا سلسلہ بھی موقوف رہا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ شنکر اور شیخ سالم وغیرہ کس حال میں ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کے غیظ و غضب کا اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا۔ شیخ سالم اور اس کے ساتھی نے جس طرح اکھاڑے میں گھسنے کی کوشش کی تھی اور ناکام ہو کر ادھم مچایا تھا وہ مجھے یاد تھا۔

تیسرے دن سہ پہر کے بعد جب صحرا کی جان لیوا گرمی ایک مسحور کن ٹھنڈک میں ڈھل چکی تھی، ابو آبان الماجد کے ساتھ زنداں میں آیا۔ ابو آبان نے مجھ سے دریافت کیا کہ مبارزت کے لیے میری تیاری کیسی جا رہی ہے؟ پھر اس نے میری خوراک کے سلسلے میں الماجد کو خصوصی ہدایات دیں۔ ابو آبان خاصے خوشگوار موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج رات جشن منایا جا رہا ہے، میں بھی اس میں شرکت کروں۔ ابو آبان اور شاری وغیرہ اب مجھے شاہ جہاں کے نام سے پکارتے تھے۔ ابو آبان نے میرے سامنے ہی الماجد کو ہدایات دیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں بھی جشن میں شرکت کرے گا۔ چراغ جلنے کے بعد تم اسے میرے مکان پر لے آنا۔" (یہ جشن ہدف پر کامیاب چھاپے کی خوشی میں منایا جا رہا تھا)

جشن واقعی بڑا زوردار تھا۔ اس جشن کی صرف ایک جھلک دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا جشن ہے۔ اہلِ بستی کے بارے میں اگر میں تھوڑی بہت نیک توقعات رکھتا بھی تھا تو وہ اس جشن خرافات کو دیکھنے کے بعد ختم ہو گئیں۔ یہ لوگ لٹیرے تھے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں تھے، شاری سب سے بڑی لٹیری تھی اور وحشت و سفاکی میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ یوں تو پوری بستی میں ہی جشن کا سماں تھا اور لوگ کھانے پینے کے علاوہ رقص و سرود میں بھی مصروف تھے لیکن ابو آبان کے وسیع و عریض مکان میں خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ یہاں بستی کے معزز مرد و زن جمع تھے۔ اس کے علاوہ ابو ظبی کے مہمانوں میں سے بھی چند

یہاں موجود تھے۔ ان میں سے کئی لوگ چھوٹے چھوٹے ...ٹو گنگنا رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح پی جا رہی تھی اور ...ہوئے گوشت کے بڑے بڑے پارچے چنگیں اور تانبے ...تھالوں میں رکھے تھے۔ اس بستی میں میں پہلی مرتبہ پھل ...دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہاں تربوز نظر آیا، خشک انگور نظر آیا ...شریفے کی قسم کا ایک پھل نظر آیا۔ شاری بھی اس جشن ...موجود تھی اور نشے میں دھت ہو رہی تھی۔ ابو آبان اس ...لگا چکا تھا لیکن وہ اس کے ساتھ ایک صراحی میں سے پی ...تھی۔ اس وقت میری حیرت اور بڑھ گئی جب ابو آبان ...لوٹ مار میں پکڑی گئی ایک خوش شکل لڑکی کو بازو سے تھاما ...بڑے اطمینان سے اپنے ایک مصاحب کے حوالے ...دیا۔ بالکل جیسے کوئی قیمتی چیز، کوئی گہنا وغیرہ خوش ہو کر کسی ...حوالے کیا جائے۔ جس تنومند مصاحب کو لڑکی سونپی گئی ...اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے فرطِ مسرت میں اپنے ...ے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور لڑکی کو پُرشوق نگاہوں سے ...نے لگا۔ وہ چاول سے کشید کی ہوئی شراب پی رہا تھا۔ اس ...ایک ہاتھ میں بلوری جام تھا۔ ترنگ میں اس نے لڑکی کو ...ب پلانے کی کوشش کی، لڑکی نے انکار کیا تو اس نے بھرا بلوری جام اس کے سر پر الٹ دیا۔ قہقہوں سے فضا گونج ...۔ اسی گونج میں منڈے ہوئے سر والے نے لڑکی کو ...ے پر اٹھایا اور جھومتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

...جنے میں گرفتار ہونے والی کچھ اور عورتیں بھی موقع پر ...ود تھیں۔ وہ گم صم نظر آ رہی تھیں لیکن اتنی خوف زدہ ...تھیں جتنا انہیں صورتِ حال کے مطابق ہونا چاہیے ...۔ شاید وہ اس قسم کے حالات کے لیے پہلے سے تیار تھیں ...پچھلے دو تین روز میں تیار ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ایک ...کے خوب صورت بال قینچی سے بڑی بری طرح کاٹ ...لے گئے تھے۔ اس کے رخساروں پر طمانچوں کے گہرے ...نا بھی تھے۔ معلوم ہوا کہ اس لڑکی نے شاری کے ساتھ ...بزی سے بات کی تھی۔

اس محفلِ نشاط و طرب میں میں نے ایک بات واضح ...محسوس کی۔ میری اور شنکر کی مبارزت کے سلسلے میں ...کے معززین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ میری ...ت کر رہے تھے اور کچھ شنکر کی۔ شنکر کی حمایت قدرے ...تھی کیونکہ شنکر کے ساتھی ابوظبی کے شیخ حضرات تھے ...ان حضرات کے لیے بستی والوں کے دل میں خصوصی نرم ...شہ موجود تھا پھر بہت سے لوگوں نے شنکر کو بستی کے ...ا ہے میں ایک زبردست فائٹر کی حیثیت سے دیکھا بھی

تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی میں اس کی مہارت کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔ بستی کے معززین میں ادھیڑ عمر کا ایک شخص صورت سے ہی عیار اور مطلب پرست نظر آتا تھا۔ اس کا نام حرسانی تھا اور وہ ابو آبان کا سسرالی رشتے دار تھا۔ چھوٹی چھوٹی لمبوتری ڈاڑھی، باریک آنکھیں اور منحنی جسم۔ وہ کسی مزاحیہ فلم کا کردار لگتا تھا لیکن مزاحیہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر خطرناک قسم کی کمینگی پائی جاتی تھی۔ وہ بہت کھل کر شنکر کی حمایت کر رہا تھا۔ شراب نوشی کے دوران میں وہ مسلسل شاری سے بحث جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ مقامی زبان میں بات کر رہے تھے، تاہم ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی وقت ان کی بحث... تلخی کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ میں ہونقوں کی طرح ان کی باتیں سننے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ الماجد قریب ہی کھڑا تھا اور والہانہ نظروں سے شاری کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ شاری کو دیکھتے ہوئے جیسے اسے اپنے اردگرد کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں سمیت اس کے اندر جذب ہو جاتا تھا۔

میں نے الماجد کا کندھا ہلا کر پوچھا "یہ کیا تکرار ہو رہی ہے؟"

الماجد نے پہلے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولا "حرسانی کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ آ گیا ہے اس لیے سنبھالا نہیں جا رہا، بدہضمی ہو گئی ہے اسے۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتا ہے اور اپنی دانائی ثابت کرنا چاہتا ہے۔"

"مثلاً اب کیا کہہ رہا ہے؟"

"ابوظبی کے مہمانوں کی حمایت اور تمہاری مخالفت میں بول رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ابوظبی کے شیخ حق پر ہیں۔ ان کی توہین ہوئی ہے اور زبردست توہین ہوئی ہے۔ ان کی برات واپس کی گئی ہے اور جو بندہ اس واقعے کا ذمے دار ہے وہ شرمسار ہونے کے بجائے اب امارات آن پہنچا ہے اور اپنی سابق محبوبہ کے ساتھ مل کر نئے گل کھلا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری طرف شاری تمہاری حمایت میں بول رہی ہے۔ شاری کو تمہاری اس بات پر مکمل یقین ہے کہ تم نے وہ رشتہ اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ تمہارے قریبی ساتھیوں کو یرغمال بنا کر تمہیں ایک ناپسندیدہ کام کے لیے انتہائی حد تک مجبور کر دیا گیا تھا۔"

یہ بحث تادیر جاری رہی۔ شاری بڑے جوش میں تھی اور ہاتھ نچا نچا کر بات کر رہی تھی حالانکہ وہ سوار تھی پھر بھی حرسانی اسے برابر جواب دے رہا تھا۔ وہ خاصے قیمتی لباس میں تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا

شار بستی کے امیر افراد میں ہوتا ہے۔

شاید حرسانی اور شاری کے درمیان ہونے والی بحث کچھ اور طویل ہوتی مگر کچھ دوسرے افراد درمیان آ گئے اور انہوں نے وقتی طور پر دونوں کو خاموش کرا دیا۔ اس خاموشی کو مستحکم کرنے کے لیے ابو آبان نے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔ ایک جھنکار سی بلند ہوئی اور دو رقاصائیں محو رقص ہو گئیں۔ ان کے نصف چہرے ریشمی نقاب میں چھپے ہوئے تھے اور وہ عربی انداز کا خوب صورت رقص پیش کر رہی تھیں۔ شمعوں اور فانوسوں کی روشنی میں ان کے چمکیلے لباس ہیجان خیز انداز میں دمک رہے تھے۔ رقص کی گرمی نے مے نوشوں کو بھی گرما دیا' وہ بڑھ چڑھ کر جام لنڈھانے لگے۔ ہر فرد کی امنگ ترنگ عروج پر پہنچ گئی۔ نشے میں دھت مرد محفل میں موجود عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جنہیں پرسوں "راہزنی کی مہم" میں پکڑا گیا تھا۔ میرے لیے یہ مناظر بڑے تکلیف دہ تھے خاص طور سے مجھے شاری کی بے حسی پر تعجب ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی عورت تھی مگر بڑے اطمینان سے اپنے سامنے قید کی عورتوں کی تذلیل دیکھ رہی تھی۔ میں اس رنگین و سنگین محفل کو چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ صحرا کے آسمان پر چاند تارے روشن تھے' بستی کی گلیوں میں بھی مشعلیں روشن تھیں اور جشن کا سا سماں تھا۔ اس جشن میں ان لوگوں کو بالکل فراموش کر دیا گیا تھا جو پرسوں کے ہنگامے میں ہلاک ہوئے تھے اور جن کی لاشیں صحرا کی ریت اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئی تھیں۔ مرنے والوں میں سے چھ افراد کا تعلق قافلے سے جبکہ دو کا بستی سے تھا۔ میں تھکے ہوئے قدموں سے چلتا اپنی کوٹھڑی میں واپس پہنچ گیا۔ ابھی میں دروازے سے کچھ دور ہی تھا کہ ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز آئی۔ یہ غزالہ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ نیم تاریکی میں وہ گدیلے پر لیٹی ہوئی تھی' کوئی اس سے کھیل رہا تھا۔ یہ وہی بچہ تھا جس کا نام بھی ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ غزالہ سے کافی مانوس ہو گیا تھا' ہر وقت اس کی گود میں گھسا رہتا تھا۔ بچے کا رنگ پختہ تھا' نقش و نگار بھی زیادہ تیکھے نہیں تھے لیکن بچہ کیسا بھی ہو' بچہ ہی ہوتا ہے۔ کائنات کی حسین ترین تخلیق جسے دیکھ کر خدا کی قدرت کاملہ پر مکمل یقین آ جاتا ہے۔ وہ بچہ غزالہ سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ اس کی بغل میں گھس رہا تھا' اپنے ننھے منے دانتوں سے اسے کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی قلقاریاں بھی گونج رہی تھیں۔ غزالہ بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ یہ منظر اتنا اثر انگیز تھا کہ میں سب کچھ بھول کر دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں تمام پریشانیوں اور کلفتوں سے سیکڑوں ہزاروں میل کی دوری پر چلا گیا۔

ایک دم غزالہ کو کھڑکی میں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چونکی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنی اوڑھنی اس نے سینے پر پھیلائی اور اپنے منتشر بال سمیٹ لیے۔ میں داخل ہوا تو وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ جب بھی باہر سے واپس آتا تھا وہ ایسی ہی نظروں سے دیکھتی تھی۔ میں ان نظروں کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے امید ہوتی تھی کہ شاید میں شیخ عاصم کے حوالے سے کوئی اچھی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ پھر میرا سپاٹ چہرہ اس کی شفاف آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں لہرا دیتا تھا۔

میں اس کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "یہ لوگ آپ کو ششکر سے کیوں لڑانا چاہ رہے ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔

"بس ان کے ہاں فیصلہ کرنے کا ایک انداز ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس سے حق اور باطل کی پہچان ہو جاتی ہے۔ سچا کامیاب ہوتا ہے' جھوٹا ناکام ہوتا ہے اور اپنی زندگی سے جاتا ہے۔"

غزالہ کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرا آئے۔ "آپ ... یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ لڑنے والوں میں سے کسی کو ... زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں؟"

"ہاں الماجد کا کہنا ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ ہار جانے والے کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے جاتے ہیں اور اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج بنا دیا جاتا ہے۔"

غزالہ نے کہا "نجانے کیوں مجھے اندیشہ ہے کہ یہ لڑائی صاف نہیں ہو گی۔ اس میں ششکر اور اس کے ساتھی کوئی چال چلیں گے۔"

ایک دم مجھے اور غزالہ کو خاموش ہونا پڑا۔ الماجد کے بھاری بھرکم قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ وہ کھڑکی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے فولادی جسم پر پسینہ چمک رہا تھا اور آنکھوں میں شراب کی ہلکی سی سرخی تھی۔ وہ کھوئے لہجے میں بولا "میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تم میں کچھ کی قوت ہے' تم لوگوں کے دل و دماغ پر اثر ڈال سکتے ہو۔"

"کیا اثر ڈالا ہے میں نے ... اور کس پر ڈالا ہے؟"

"شاری پر ڈالا ہے اور یہ ڈالا ہے کہ وہ تم پر ایک بھرکم شرط لگانے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی شرط

پورے علاقے میں آج تک کسی نے نہیں لگائی۔ میرے اندازے کے مطابق تقریباً چالیس ہزار درہم کی شرط ہے۔ یہ شرط شاری نے حرسانی سے اس بات پر لگائی ہے کہ تم ہفتے روز ہونے والی لڑائی میں کامیاب رہو گے۔"

"کب لگی ہے شرط؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے آنے کے بعد ... تم نے دیکھا ہی تھا کہ حرسانی اور شاری میں کتنی بحث ہو رہی تھی۔ رقص کے بعد بحث پھر شروع ہو گئی۔ حرسانی نے شاری سے کہا' اگر اس شاہ جہاں کی سچائی پر اتنا ہی یقین ہے تو پھر کوئی بڑی سی شرط لگاؤ اس پر تاکہ بیٹھے بٹھائے تمہارا فائدہ ہو جائے۔ شاری نے کہا' تو لگا لو شرط۔ حرسانی کو پرسوں مال غنیمت میں کافی حصہ ملا ہے۔ ویسے بھی اس کے پاس خاصی دولت ہے۔ اس نے پہلے دس ہزار درہم کی شرط لگائی پھر ساتھیوں کے اکسانے پر بیس ہزار کر دی اور بالآخر چالیس ہزار تک پہنچ گیا۔ اب یہ چالیس ہزار نقد یا اتنی مالیت کے سامان کی شرط ہے۔ لوگوں کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ بہت بڑی شرط ہے' ہارنے پر شاری کو شدید نقصان ہو گا' حرسانی کی تو شاید کمر ہی ٹوٹ جائے گی۔"

میں ابو آبان کے گھر سجی ہوئی محفل نشاط میں کھانا کھائے بغیر واپس آ گیا تھا لہٰذا میرا کھانا میرے پیچھے ہی پیچھے زندان میں پہنچ گیا۔ یہ کھانا دو بڑی طشتریوں میں تھا اور دو ہولی تازی خادمائیں لے کر آئی تھیں۔ یہ کھانا کم از کم تین افراد کا تھا۔ شاید یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ "خوراک" کھانے کے زور پر جیتی جاتی ہے۔ میں نے برا سا منہ بنا کر کھانا ایک طرف رکھ دیا۔

الماجد اور خادمائیں واپس چلی گئیں۔ کھانا اسی طرح پڑا رہا۔ جشن کا کھانا تھا لہٰذا انواع و اقسام کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے غزالہ سے کہا کہ وہ کھانا کھا لے۔

"لیکن آپ نے کیوں نہیں کھایا؟"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"میں بھی نہیں کھاؤں گی۔" اس کے ہونٹوں سے جیسے بے ساختہ نکل گیا۔

"میرے نہ کھانے سے تمہارا کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں "بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"تمہارا دل تو اور بھی بہت کچھ نہیں چاہ رہا ہو گا لیکن تم سب کچھ کر رہی ہو۔ میرے ساتھ اس کمرے میں رہ رہی ہو۔ میرے قریب سو رہی ہو' روزانہ میری آواز سنتی ہو' میری ناپسندیدہ شکل دیکھتی ہو۔"

"تو آپ یہ چاہتے ہیں نا کہ میں اس کوٹھڑی میں نہ رہوں۔ ٹھیک ہے صبح میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔ ان لوگوں سے کہوں گی مجھے کہیں اور بند کر دیں۔"

"تم کیوں جاتی ہو' اگر ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔"

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں "مجھے پتا تھا' آپ میں اتنا حوصلہ ہے کہ مجھے کسی بھی جگہ اکیلا چھوڑ سکتے ہیں۔" اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

میں نے کہا "اکیلا نہیں چھوڑوں گا' بس خود چلا جاؤں گا یہاں سے۔ میں شاری سے کہہ دیتا ہوں' وہ ایک دو خادماؤں کو تمہارے ساتھ یہاں سُلا دیا کرے گی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا مختصر سامان پاس ہی پڑا تھا۔ میں نے وہ سمیٹنا شروع کر دیا۔ غزالہ کے چہرے پر تشویش گہری ہو گئی۔ میں واقعی ذہنی طور پر کسی دوسری کوٹھڑی میں منتقل ہونے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر لحظہ ایک عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا تھا مجھے یہاں۔ جیسے اس زنداں کے اندر ایک اور زنداں میں رہ رہا ہوں میں۔ غزالہ کی بیگانگی میرے دل و دماغ پر ہر لحظہ چرکے لگاتی رہتی تھی۔

غزالہ نے میرا مستحکم ارادہ دیکھا تو شدید الجھن کا شکار ہو گئی' کچھ دیر تذبذب میں کھڑی رہی پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازے کا اندرونی قفل لگا دیا اور چابی اپنے پاس رکھ لی۔ میں حقیقتاً غصے میں تھا لیکن غزالہ کا انداز دیکھ کر معلوم نہیں کیا ہوا کہ چند ہی لمحوں میں میرا غصہ نصف رہ گیا۔

غزالہ نے ایک طشتری پر سے خوان پوش ہٹایا۔ دو پلیٹوں میں تھوڑا تھوڑا کھانا نکالا اور ایک پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ وہ احتجاجی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو' کھائیں ورنہ میں بھی نہیں کھاؤں گی۔

میں نے ایک لقمہ اٹھایا تو اس نے بھی اٹھا لیا "تالا کیوں لگا دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرے سوال کو جانتے بوجھتے نظرانداز کر دیا اور خواہ مخواہ بچے کو پچکارنے میں مصروف ہو گئی۔

صبح سویرے غزالہ نے مجھے شانے سے ہلا کر جگایا "وہ آئی ہے۔" غزالہ نے کہا۔

میں نے زنداں کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ شاری گھڑ سواری کے لباس میں تھی۔ اس کی تازی گھوڑی ہانپ رہی تھی اور خود اسے بھی سانس چڑھا ہوا تھا۔ پسینہ دھاروں کی

صورت اس کی شفاف گردن پر بہہ رہا تھا۔ یقیناً وہ کافی دور تک گھڑ سواری کر کے آئی تھی۔ جونہی وہ زنداں کے دروازے پر پہنچی، کہیں پاس سے الماجد بھاگ کر آیا اور گھوڑے کی رکاب کے پاس ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چوپائے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ شاری نے بڑے اطمینان سے اس کی عریاں پشت پر پاؤں رکھا اور گھوڑے سے اتر آئی۔ یہ جیسے اس کے لیے روزانہ کا معمول تھا۔ اس کے چہرے پر خجالت نظر آئی اور نہ ہی الماجد نے کسی طرح کی تنگی محسوس کی۔ شاری تیز قدموں سے اندر آئی۔ اس وقت تک غزالہ دروازے کا قفل ہٹا چکی تھی۔

شاری نے ہمیشہ مشترکہ "گڈ مارننگ" کہا اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بڑی پُرجوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے رات والی شرط کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا۔ وہ بولی "دولت کے گھمنڈ نے حرسانی کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ اس نے شراب کے نشے میں میری توہین کی۔ مجھے طعنہ دیا کہ میں صرف الفاظ کی حد تک تمہاری حمایت کر رہی ہوں ورنہ دل سے میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ ابو ظبیبی کے مہمان حق پر ہیں۔ میری یہ شرط حرسانی کے اسی طعنے کا جواب ہے۔ مقابلے میں جیت ہار تو ہوتی ہی ہے لیکن میں نے حرسانی پر کم از کم یہ تو ثابت کر دیا ہے کہ میری "حمایت" صرف لفظوں تک محدود نہیں ہے۔"

میں خاموش رہا۔ شاری کچھ دیر تک میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "شاید تم مجھ سے اتفاق نہیں کر رہے ہو یا پھر تمہیں یہ سارا سلسلہ ہی پسند نہیں ہے۔"

"تمہاری دوسری بات کسی حد تک درست ہے۔" میں نے کہا "بہرحال۔ اب جبکہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا ہوں، میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنے خیر خواہوں کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔"

"بہت خوب۔" شاری کے منہ سے بے ساختہ نکلا "مجھے تم سے یہی امید تھی، میں نے تمہیں بہت پہلے پرکھ لیا تھا۔ پتا ہے کس وقت؟"

"کس وقت؟" میں نے پوچھا۔

"اس دن جب میں نے تم سے مقابلے کی بات کی تھی۔ تم نے کہا تھا 'تیاری کی کیا ضرورت ہے' ابھی دو دو ہاتھ کرا لیں۔ بالکل یہی انداز ہوتا تھا میرے بابا کا۔ جو لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ اسی انداز میں بات کیا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اپنے دشمن کا مقابلہ پامردی سے کرو گے اور سیکڑوں لوگوں کے سامنے اسے نیچا دکھاؤ گے۔ وہ تمہارے ہاتھوں اپنی جان ہارے گا اور میرے کارندے اس کی لاش گھسیٹ کر میدان سے باہر نکالیں گے۔"

"تو کیا یہ لڑائی کسی ایک کی موت تک جاری رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

"الماجد نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں، مجھے تو نہیں بتایا گیا۔"

الماجد باہر کھڑا تھا۔ شاری نے آواز دی، وہ لپک کر آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شاری نے اس سے "تم نے شاہ جہاں کو لڑائی کی شرائط اور تفصیلات بتائیں؟"

"بہت کچھ بتا دیا ہے مالکن! تھوڑا رہ گیا ہے۔" [...] نے کہا۔

"تھوڑا کیا رہ گیا ہے؟ کیا تم نے شاہ جہاں کو یہ بتایا کہ یہ لڑائی دشمن کی موت تک جاری رہتی ہے؟"

"نہیں ابھی تو نہیں بتایا۔" الماجد دبے لہجے [...] "میں چاہتا تھا کہ بتدریج بتاؤں گا تاکہ ان کا ذہن اس کو قبول کر لے۔"

"تم ان پڑھ ہونے کے باوجود عالم فاضل بننے کی [...] کر رہے ہو۔" شاری کا لہجہ بے حد خشک تھا "مجھے یقین [...] کہ اس شخص کا دل اتنا کمزور نہیں کہ اسے "موت" قسطوں میں بتائی جائے" شاری کا اشارہ میری طرف تھا۔

وہ میرے منہ پر میری تعریف تو کر رہی تھی لیکن تعریف میں بناوٹ ہرگز نہیں تھی۔ جو کچھ اس کے [...] تھا، وہی زبان پر آ رہا تھا۔

الماجد نے کہا "میں شرمندہ ہوں مالکن۔"

شاری مجھ سے مخاطب ہو کر متکلم لہجے میں بو[...] "جہاں! الماجد نے تم سے کیا کہا تھا مبارزت کے بار[...]"

"اس نے بتایا تھا کہ یہ ایک شدید قسم کی لڑ[ائی] ہے۔ اس میں تین عدد تیز دھار ہتھیار استعمال [ہوتے] ہیں۔ وہ ہتھیار اکھاڑے کی ریت میں چھپے ہوتے ہیں [...] ہو انہیں معلق ہوتا ہے۔ لڑائی میں مدِ مقابل کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے یا اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے جاتے [ہیں]۔"

شاری نے کہا "اس میں بس آخری بات [...] مبارزت میں زخمی کر کے چھوڑ دینے کا تصور نہیں [...] مات کھاتا ہے وہ زندگی بھی ہار جاتا ہے۔ الماجد نے [...] سے کہ تمہیں ذہنی دھچکا لگے گا، فوری طور پر یہ [نہیں] بتائی۔"

میں نے دیکھا غزالہ کا زرد چہرہ کچھ اور زرد [...]

تھا۔ وقتی طور پر مجھے بھی دھچکا محسوس ہوا لیکن میں نے بہت جلد اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ ویسے بھی تو شنکر کے ساتھ میری دشمنی "زندگی یا موت" کے مرحلے میں پہنچ گئی تھی۔ شنکر صبر و تحمل کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا اور میری جان لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف میں نے بھی شنکر کے خون کی پیاس شدت سے محسوس کی تھی۔ اس "پیاس" سے مجھے وہی برسوں پرانا وقت یاد آگیا تھا جب میں ریوالور جیب میں لیے پاکستان کے طول و عرض میں شیخ راشد بن ارشد کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اب اگر شنکر کی خون آشامی اور میری پیاس کا معاملہ کسی دوبدو مقابلے میں طے ہو رہا تھا تو اس میں کیا مضائقہ تھا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے شاہ جہاں؟" شاری نے پوچھا۔

"سوچ تو کوئی نہیں' بس الجھن ہو رہی تھی۔ اگر تم لوگوں نے مقابلہ کرانا ہی تھا تو پھر ایک دو روز میں کرا دیا ہوتا' یہ تیاریاں' یہ مشقیں' یہ شرطیں' یہ سب تماشے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس یہ برسوں پرانا دستور ہے۔ ویسے بھی تم لوگ پہلی مرتبہ اس خاص قسم کی لڑائی میں حصہ لے رہے ہو۔ تمہیں اس کے قواعد و ضوابط سے آگاہی ہونی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس مہلت سے تمہیں کوئی نقصان ہوگا۔ ہاں اس کے برعکس فائدہ ضرور ہو سکتا ہے بلکہ یقیناً ہوگا۔"

اس نے الماجد سے کہا "الماجد! میں ابھی ناشتا کرنے جا رہی ہوں' تم ایک گھنٹے تک شاہ جہاں کو لے کر میرے پاس پہنچ جاؤ۔ میں اس سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہ رہی ہوں۔"

الماجد نے تعظیم سے سر جھکایا۔ شاری نے غزالہ سے ایک دو رسمی باتیں کیں' اسے یقین دلایا کہ اس کے شوہر کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے پھر مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ الماجد حسب سابق چوپائے کی طرح جھک گیا۔ شاری اس کی کمر پر پاؤں دھرتے ہوئے گھوڑی پر سوار ہو گئی۔ شاری جس ننھے بندر کو سدھا رہی تھی وہ بھی گھوڑی کے پاس ہی موجود تھا' جب شاری ماہرانہ انداز میں گھوڑی دوڑاتی اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھی تو بندر چھلانگیں لگاتا اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ ہاتھ میں ہر وقت ایک چھوٹا سا آئینہ رکھتا تھا اور شرارتی انداز میں سورج کا عکس ادھر ادھر پھینکتا رہتا تھا۔

ایک گھنٹے بعد الماجد مجھے شاری کے پاس لے گیا۔ میں اسی کمرے میں پہنچا جو اندر سے بالکل "خیمے" کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ شاری ابھی تک گھڑسواری والے لباس میں تھی۔ وہ ٹہل رہی تھی' جب وہ چلتی تھی تو اس کا سینہ بالکل تنا ہوا ہوتا تھا۔ بڑے شاہانہ انداز سے قدم اٹھاتی تھی۔ آج تو اس کی چال ڈھال کا انداز خصوصی طور پر خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بڑے جوش میں تھی۔ وہ میرے سراپا کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے غیر ارادی طور پر جائزہ لے رہی ہو کہ میرے ہاتھ پاؤں کتنے مضبوط ہیں اور لڑائی میں میرے جیتنے کا امکان کتنے فیصد ہے۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور مجھے "مبارزت" کے مختلف قواعد و ضوابط سے آگاہ کرنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ "مبارزت" کے سلسلے میں ہونے والے کم و بیش پچاس مقابلے دیکھ چکی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ لڑائی میں کیا کیا گر استعمال کیے جاتے ہیں اور کون کون سی چالیں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ وہ مجھے بتانے لگی کہ اکھاڑے کے کس حصے میں کس طرح کی لڑائی لڑنی چاہیے۔ مدِمقابل کو حربے (ہتھیار) سے دور رکھنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر مدِمقابل حربے تک پہنچ جائے تو دفاع کس طرح کرنا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ خود بھی لڑائی بھڑائی کے فن سے بخوبی آگاہ تھی۔ اس نے عملی طور پر بھی مجھے کئی داؤ پیچ بتائے۔ اس موقع پر وہ بڑی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ داؤ پیچ کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ میرے بالکل قریب آئی۔ ایک دو بار تو اس کا خوب صورت جسم میرے جسم سے بالکل پیوست ہو گیا لیکن میں نے غیر جانب داری سے اندازہ لگایا کہ اس کی ان حرکات میں بے ساختہ پن تھا۔

اس کے بتائے ہوئے داؤ پیچ غیر معمولی نہیں تھے اور نہ ہی نئے تھے لیکن میں اس کا دل رکھنے کے لیے گہری دلچسپی کا اظہار کرتا رہا پھر ہم قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ وہ لمبی سانسیں لے رہی تھی' اس کے عارض مشقت سے گلابی ہو رہے تھے۔ وہ گندمی رنگت کی تھی لیکن کسی کسی وقت رنگ کافی صاف نظر آتا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے اچانک ایک ایسی بات کہی جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے بالکل یوں لگا جیسے راہ چلتے چلتے میں ایک دم کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ وہ بولی "اگر میں تم سے کہوں کہ مجھ سے شادی کرلو تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا "میرا نہیں خیال کہ تم ایک اجنبی سے ایسا سوال کر سکتی ہو۔"

"تم اب اجنبی نہیں ہو۔" وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ

بولی "میں تمہیں اپنے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ میں تمہارا ایک احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔"

"لیکن میں نے تمہارے انتہائی پیارے پالتو بندر کی جان لی بھی تو ہے' چلو حساب برابر ہو گیا۔"

وہ بے زاری سے بولی "تم بار بار یہ ذکر کیوں لے بیٹھتے ہو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ خاموشی ذرا طویل ہوئی تو شاری نے کہا "تم پڑھے لکھے آدمی ہو' پیار و محبت کے معاملات سے بھی آگاہ لگتے ہو۔ تمہیں یہ بات معلوم ہوگی کہ لوگ برسوں قریب رہ کر بھی دور رہتے ہیں اور بعض لوگ لمحوں کے لیے ملتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ میں بہت صاف گو لڑکی ہوں بلکہ کچھ لوگ مجھے منہ پھٹ بھی کہتے ہیں۔ میں تم سے یہ تو نہیں کہوں گی کہ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے یا تم نہ ملے تو میں مر جاؤں گی لیکن ایک بات میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔ تم مجھے جیون ساتھی کے طور پر اچھے لگے ہو۔ شریکِ حیات کے لیے شاید مجھے کسی ایسے ہی مرد کی تلاش تھی۔"

"ایسے فیصلے کرنے کے لیے دس بیس روز کا ساتھ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"لیکن میں اکثر فیصلے ایسی ہی تیز رفتاری سے کرتی ہوں اور عموماً مجھے اپنے فیصلوں پر فخر ہوتا ہے۔"

"ہر فیصلے کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔" میں نے کہا "اور مجھے یقین ہے جو نوعیت ساتھی منتخب کرنے کا فیصلہ تم نے اکثر نہیں کیا ہوگا۔"

وہ میرے طنز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی' کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "میرے پاس اوپر والے کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ زیورات' ہیرے جواہرات' دیناروں اور درہموں سے بھری ہوئی تھیلیاں' اس ساتھ والے کمرے میں کئی صندوق ان اشیا سے بھرے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ درجنوں تازی گھوڑے' ایک سو سرخ اونٹ اور بستی کے اردگرد کی تین چوتھائی قابل کاشت زمین میری ملکیت ہے۔ میں اپنے جیون ساتھی کو خوش رکھنے کے لیے ہر سہولت اس ویرانے میں مہیا کر سکتی ہوں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ یہ ویرانہ شہر سے زیادہ بارونق اور آرام دہ ہو سکتا ہے۔ بس مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش ہے جو مجھے سچی خوشی اور محبت دے سکے۔"

میں نے کہا "اور تم یہ بات بھی جانتی ہو گی کہ سچی خوشی مال و دولت سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ سچی خوشی کوئی باغیچہ نہیں ہوتا جسے بہترین باغبانوں کی مدد سے کثیر رقم خرچ کرکے تیار کیا جا سکے' یہ تو ایک خود رو پودا ہوتا ہے۔ اپنی مرضی سے از خود نمو پاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ ممکن ہے کہ تمہارے اردگرد بھی کہیں یہ پودا موجود ہو لیکن تمہیں اس کا علم نہ ہو۔ بعض چیزیں بہت قریب ہونے کے باعث بھی تو نظر نہیں آتیں۔"

"تم ان استادوں جیسی باتیں کر رہے ہو جو راس الخیمہ کے اسکول میں مجھے پڑھایا کرتے تھے' بھاری بھاری لفظ' مشکل مشکل مثالیں' میرے خیال میں مجھ سے بات کرتے ہوئے تمہیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ایک صحرائی بستی میں رہنے والی بدو لڑکی سے مخاطب ہو۔"

"لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ بدو لڑکی ایک تعلیم یافتہ بلغارین ماں کی بیٹی ہے اور خود بھی حتی المقدور تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ خانہ بدوش لٹیروں کی سردار ہونے کے باوجود وہ فرفر انگلش بولتی ہے اور اس کی الماری میں بہت سی کتابیں موجود ہیں جن میں "لنڈا جوائے" کے خوب صورت رومانی ناول بھی ہیں۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے خوب صورت ہاتھوں میں پکڑا اور بولی "میری زندگی ایک مسلسل ایڈونچر ہے۔ میں اکثر اس صحرا کی خاک چھانتی رہتی ہوں' قافلوں پر شب خون مارتی ہوں' گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتی ہوں' زندگی و موت کے منظر اکثر میری آنکھوں کے سامنے آتے رہتے ہیں لیکن میرا دل ہمیشہ پُرسکون رہتا ہے اور اصیل گھوڑے کے مانند اپنی رفتار میں تبدیلی نہیں کرتا لیکن اب دیکھو۔" اس نے آخری الفاظ کہتے کہتے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کا دل واقعی جنگلی گھوڑے کے مانند بھاگ رہا تھا۔ کہنے لگی "میں نے یہ بھی لنڈا جوائے کے ناول میں ہی کہیں پڑھا تھا کہ اپنے پسندیدہ مرد کی قربت میں عورت کے دل کی رفتار بدل جاتی ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری لنڈا جوائے صاحبہ نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ سچی خوشی کی دولت سچی خوشی دے کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے جسم سے ہٹا لیا۔ جس طرح شاری نے اچانک میرے سر پر اپنے سوال کی "لٹھ" ماری تھی' میں نے بھی اس کے سر پر "لٹھ" ماری "الماجد کے بارے میں تمہارے خیالات کیا ہیں؟"

ہمیشہ کی طرح اس کے خوب صورت چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا' تاہم بہت جلد اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور بے زار لہجے میں بولی "میرے مرد، بندر اور الماجد کے سوا تمہیں کوئی اور بات بھی سوجھتی ہے یا نہیں؟"

"بندر اور الماجد کو ایک ہی سانس میں پکار کر کے تم کچھ زیادتی نہیں کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"مگر تم اس غلام زادے کا ذکر بار بار کیوں لے بیٹھتے ہو۔ میرا اس کا کیا تعلق؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے یہ لگتا ہے شاری کہ اس غلام زادے کی شکل میں تمہارے اردگرد ایک ایسی سچی خوشی موجود ہے جو تم پوری دنیا کی دولت اکٹھی کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتی ہو۔ ایک ایسا انعام جس کی قدر و قیمت کا اندازہ شاید انسانی ذہن کر ہی نہیں سکتا۔"

پہلے شاری کا رنگ جذبات سے سرخ تھا' اب غصے سے سرخ ہو گیا "جو کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "کھل کر کہوں گا تو تم غالباً میرا سر توڑ دو گی اور مجھے اپنے سر کی اشد ضرورت ہے۔ کم از کم بچنے تک تو میرا سر سلامت رہنا چاہیے۔ اپنا نقصان تو میں برداشت کر سکتا ہوں لیکن تمہارا نہیں کر سکتا۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"بھئی سیدھی سی بات ہے' تم نے میرے جیتنے پر بہت موٹی رقم کی شرط لگا رکھی ہے' اگر میں لڑائی سے پہلے ہی تمہارے ہاتھوں اُدھڑ گیا تو اس رقم کا کیا ہو گا۔"

"تم مسخرہ پن چھوڑ کر صاف سیدھی بات کیوں نہیں کہتے۔ میرا خیال ہے' تم مجھے یہ سنہری مشورہ دینے کی کوشش کر رہے ہو کہ میں الماجد سے شادی کر لوں۔ بولو۔ کیا یہی بات ہے نا؟"

میں نے شاری کے تاثرات دیکھے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی' مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کے سوال کا جواب "ہاں" میں دیا تو وہ شاید غصے سے پھٹ پڑے گی۔ میں نے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا "میں نے ایسی کوئی بات کی ہے؟ میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ الماجد تمہارے لیے بالکل خاص قسم کے جذبات رکھتا ہے' ان جذبات کی تعریف کرنے کے لیے شاید "عشق" اور "محبت" جیسے الفاظ بالکل نامناسب اور ناکافی ہیں۔"

"تم مجھے لفظوں میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں تمہیں۔۔۔" ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی نگاہ اندرونی دروازے کے پردے پر تھی۔

وہ اٹھ کر تیزی سے پردے کی طرف گئی۔ عین اسی وقت پردہ تیزی سے ہلا اور کسی کے بھاگتے قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ شاری پردہ ہٹا کر تیزی سے اس آواز کے پیچھے لپکی۔ میں کمرے کے وسط میں آن کھڑا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد شاری واپس آ گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بولی "تمہارے لیے یہاں پہلے ہی کم پریشانیاں نہیں تھیں' اب تم نے ایک اور مصیبت مول لے لی ہے۔ تمہاری باتیں اسوہ نے سن لی ہیں۔"

"یہ اسوہ کون ہے؟"

"یہ ایک کوتاہ قد حبشن ہے۔ سائے کی طرح یہاں وہاں چکراتی رہتی ہے۔ بابا کو اس پر بے پناہ اعتماد ہے۔ وہ بستی کی ہر خبر بابا تک پہنچاتی ہے۔ کہنے کو تو وہ خادمہ ہے لیکن حقیقت میں اس کی حیثیت بابا کے مشیر کی سی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے جو کچھ سنا ہے چند منٹ کے اندر اندر بابا تک پہنچ جائے گا۔"

"اگر ایسا ہو بھی جائے تو گھبرانے کی کون سی بات ہے۔ کون سی غلط بات ہوئی ہے یہاں؟"

"یہی تو تمہیں معلوم نہیں کہ کتنی خطرناک بات کہی ہے تم نے۔ تم نے ایک غلام زادے سے میرا ناتا جوڑنے کی بات کی ہے۔ بلکہ مجھے ایسا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ میں نے تو تمہارے یہ الفاظ برداشت کر لیے تھے لیکن بابا کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہو گا۔ تمہارے الفاظ ان تک پہنچ گئے تو وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"مگر تم تو کہتی ہو کہ الماجد کو وہ بہت پسند کرتے ہیں' اکثر اس کی تعریف ان کی زبان پر رہتی ہے؟"

"پسند کرنا اور تعریف کرنا دوسری بات ہے۔ تم نے تو ایک رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے' ایسی غلطیوں کے لیے تو ہمارے ہاں اکثر زبان کاٹ لی جاتی ہے۔"

شاری کو میں نے ہر لحاظ سے ایک دلیر لڑکی پایا تھا مگر اسوہ نامی عورت کو دیکھنے کے بعد وہ ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اپنے پالتو بندر کو گود میں اٹھا لیا اور مجھے الماجد کے ساتھ زنداں میں واپس بھیج دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ شاری کے اندیشے درست تھے۔ دو مسلح بدو اندر آئے اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ الماجد بھی زنداں کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ دونوں افراد سردار شاص کے ذاتی خدمت گاروں میں شامل ہیں اور یہ مجھے سردار کے پاس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔

میری چھٹی حس پکارنے لگی کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ غزالہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ وہ پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں تھی' جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ شنکر کے ساتھ ہونے والی میری لڑائی زندگی اور موت کی لڑائی ہو گی' اس کی آنکھوں میں ویرانوں نے ڈیرے جما لیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر یقین نہیں کر پا رہی اور کسی وقت اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگی ہے۔

"اب کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جہاں قسمت لے جائے۔" میں نے کہا "شاید بستی کے سردار شاص نے اپنی مزاج پرسی کے لیے بلایا ہے۔"

"کک۔۔۔ کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں فی الحال تو کوئی بات نہیں' کم از کم مجھے تو معلوم نہیں۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی "اپنا خیال رکھیے گا۔"

میں دونوں مسلح بدوؤں کے ساتھ سردار شاص کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سہ پہر ہو چکی تھی۔ چلچلاتی دھوپ بدن جھلسا رہی تھی۔ راستے میں لوگ مجھے ذوق و شوق سے دیکھتے رہے اور چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ یقیناً کچھ چہ میگوئیاں میری حمایت میں رہی ہوں گی اور کچھ مخالفت میں۔ سردار کی رہائش گاہ وہی تھی جہاں میں کئی مرتبہ شاری سے مل چکا تھا۔ یہ مکان کا دوسرا حصہ تھا۔ ذرا الگ تھلگ اور خاموش۔ یہاں چند ایک صحرائی پودے موجود تھے' لو کی آمد و رفت سے بچنے کے لیے کھجور کے خشک تنوں سے بڑی بڑی چقیں بنائی گئی تھیں اور انہیں پانی سے تر کیا گیا تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بستر پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچا نظر آیا۔ عمر ساٹھ سال کے قریب تھی' بال کھچڑی اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں' بہرحال کھنڈر بتا رہا تھا کہ عمارت عظیم اور مضبوط تھی۔ کمرے میں دو خدمت گار کنیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک وہی کوتاہ قد حبشن تھی جس کا ذکر شاری نے کیا تھا۔ وہ بہت چالاک و چست عورت نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی جاہلہ پہاڑی بکری کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ زریں گل یہاں موجود ہوتا تو اس عورت کو دیکھ کر اس کی رگ ظرافت ضرور پھڑکتی۔ ممکن تھا کہ وہ اسے کوئی خوب صورت سا خطاب دیتا یا کوئی پھڑکتا ہوا فلمی گانا اس کے اعزاز میں سنا دیتا۔ لاہور میں انارکلی سے گزرتے ہوئے ایک مرتبہ ایسے ہی زریں گل کی رگ ظرافت پھڑکی تھی' اس نے ایک بہت موٹی عورت کے قریب سے گزرتے ہوئے کہہ دیا تھا "تو بہ یہ متوالی چال۔۔۔ کہیں جھک جائے پھول کی ڈال۔۔۔" زریں بائیسکل پر تھا' اس کا خیال تھا کہ وہ تیزی سے نکل جائے گا لیکن عورت اس سے زیادہ پھرتیلی نکلی تھی' اس نے پاؤں سے جوتی اتار کر زریں کو کھینچ ماری تھی۔ شاید یہ واقعہ ہمیں معلوم نہ ہوتا لیکن جب زریں گھر لوٹا تھا تو اس کے کوٹ کی پشت پر زنانہ جوتی کا واضح نشان موجود تھا۔ مجبوراً زریں کو ساری کہانی سنانا پڑی تھی۔

خیالات کی رو بھٹک کر زریں گل کی طرف چلی گئی تھی حالانکہ یہ ایک سنگین موقع تھا۔ میں ایک جنگجو خانہ بدوش سردار کے روبرو پیش ہو رہا تھا۔ اشتعال کی حالت میں وہ میرے لیے کوئی بھی حکم جاری کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر میرا جسم گولیوں سے چھلنی کیا جا سکتا تھا۔ یہاں کون پوچھنے والا تھا۔ سردار ہی قانون اور سردار ہی عدالت تھا۔ میں نے سردار کو غور سے دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کس موڈ میں ہے۔ مجھے اس کا ہڈیوں بھرا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آیا۔ آنکھیں بالکل سفید تھیں اور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ سراپا موت کے چنگل میں پھنسا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ میری آمد پر اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ کنیزوں نے اسے سہارا دیا اور گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا۔ سردار نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کنیزیں مسلح شخص سمیت کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں اور سردار کمرے میں تنہا رہ گئے۔ "بیٹھ جاؤ" سردار نے نہایت بارعب مگر نحیف آواز میں کہا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ مجھے بیٹھنے کو کہے گا۔ مجھے حیرت ہوئی۔۔۔ مگر اس حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جب سردار نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ وہ بولا "نوجوان! اسوہ نے مجھے تمہارے متعلق کافی کچھ بتایا ہے۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ تم۔۔۔ میری مدد کر سکتے ہو۔"

"میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" میرے لہجے میں حقیقی حیرت تھی۔

"ہاں! تم مدد کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ وہ صاف لہجے میں انگلش بول سکتا تھا۔ اس کا تلفظ حیرت انگیز طور پر درست تھا۔ یقیناً اس تلفظ کے پیچھے وہ حسین بلغارین خاتون تھی جو کبھی سردار شاص کی بیوی بنی تھی۔

میں سوالیہ نظروں سے سردار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا "سب سے پہلے تو میں اس بات پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے شاری کو پانی

کے لب میں ڈوبنے سے بچایا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو شاید میری سانسیں اور مختصر ہو جاتیں۔"

میں نے کہا "اگر یہ احسان ہے تو آپ کی صاحب زادی نے ہمیں ہمارے جانی دشمنوں سے تحفظ دے کر یہ احسان بڑی اچھی طرح چکا دیا ہے۔"

سردار نے نحیف آواز میں کہا "شاری کسی کی بات سنتی نہیں تھی لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہاری بات نہ صرف سنتی ہے بلکہ سمجھتی بھی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ اب میں زیادہ دن جی سکوں گا۔ میں تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہ رہا ہوں جو میں نے اب تک کسی سے نہیں کہی۔ پتا نہیں یہ بات تم سے کہنے کا حوصلہ مجھے کیسے ہو گیا ہے۔ خدا کرے جو اعتماد میں تم پر کر رہا ہوں تم اس پر پورے اترو۔"

میں نے کہا "آپ کی صاحب زادی نے جس طرح ہماری میزبانی کی ہے وہ ہمارے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

سردار نے ایک طویل آہ بھری۔ اس کی سفید آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا "شاید تمہیں معلوم ہوا ہی ہو کہ شاری کی ماں ایک پڑھی لکھی روشن خیال خاتون تھی۔ اس کا اور ہمارا ساتھ بہت تھوڑا تھا لیکن جتنا بھی تھا ہمارے دل و دماغ پر نقش ہے اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اس کے اثرات کو محسوس کریں گی۔ وہ حسین و جمیل جسم کے ساتھ ساتھ حسین و جمیل روح کی مالک بھی تھی۔ اس کی ذات میں سے محبت اور نیکی کی ایک ایسی پھوار پھوٹتی تھی جس سے اردگرد کی ہر شے بھیگ جاتی تھی۔ ہم جیسوں کے سخت دل بھی اسی پھوار میں بھیگے اور ان میں نرمی جاگ اٹھی۔ اس کی زندگی نے بہت کم مہلت دی ورنہ وہ ہمارے بہت سے عقیدوں کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتی۔ تم جانتے ہو عام لوگوں پر اس کا یہ اثر تھا تو مجھ پر کیا ہوا ہو گا۔ میں تو اس کے قریب تھا۔ اس کا شوہر تھا۔"

چند لمحے توقف کر کے سردار شماص نے اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور اٹک اٹک کر بولا "سارہ انسانوں کی خرید و فروخت کی زبردست مخالف تھی۔ اس کے نزدیک ہر انسان آزاد تھا اور رنگ و نسل سے قطعِ نظر اسے آزاد ہی رہنا چاہیے تھا۔ وہ مجھے اس بات پر مسلسل آمادہ کرتی رہتی تھی کہ میں اپنا پیشہ تبدیل کر دوں۔ وہ اس بات کی بھی شدید خواہش رکھتی تھی کہ بستی میں موجود تمام غلاموں کو آزاد کر دیا جائے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سب کچھ راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کئی برس درکار ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دھیرے دھیرے لیکن مسلسل یہ بات میرے ذہن میں ڈالتی رہتی تھی۔ اس کی باتیں مجھ پر اثر تو کرتی تھیں لیکن میں اپنے قبیلے کی روایتوں اور لوگوں کی سوچوں سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ میری زبان قبیلے والوں کے ساتھ ہوتی تھی لیکن میرا دل اکثر سارہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا "تم غلام زادوں اور غلام زادیوں کی اتنی حمایت کیوں کرتی ہو؟ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کل کلاں جب ہماری بچی جوان ہو گی، تم اس کا ہاتھ کسی غلام زادے کے ہاتھ میں پکڑا سکو گی؟" وہ جواب میں بولی تھی "اگر وہ غلام زادہ ایک اچھا انسان اور میری بچی کے قابل ہوا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں اسے آزاد کراؤں گی اور اپنی بچی کا جیون ساتھی بناؤں گی بلکہ میری تو دعا ہے کہ میں کوئی ایسی اعلیٰ مثال قائم کر سکوں۔"

سردار کی سانس ایک بار پھر پھول گئی۔ میں نے قریب رکھے پیالے میں سے اسے دو گھونٹ پانی پلایا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں موند کر خاموش بیٹھا رہا پھر بولا "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ سارہ کی روح میرے آس پاس موجود ہے۔ اس نے بیس برس پہلے جو بات کہی تھی وہ اسے نبھانا چاہتی ہے یا پھر دعا اس نے مانگی تھی وہ اتنے صدقِ دل سے مانگی تھی کہ قبول ہو گئی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ سارہ اب خود اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کی دعا کی "قبولیت" نے مجھے ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ایک غلام زادہ اس بستی میں ایسا ہے جسے میں اس بستی کا بہترین نوجوان کہہ سکتا ہوں۔ وہ شریف النفس ہے، بہادر ہے، ذہین ہے۔ وہ بستی کا واحد غلام زادہ ہے جس نے تعلیم حاصل کی ہے، وہ شاری ہی کی طرح کتابیں پڑھ سکتا ہے اور دانائی کی باتیں کر سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم اس سے مل چکے ہو، وہ الماجد ہے۔ یہ بات جو میں آج تمہیں بتا رہا ہوں ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ الماجد مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ سے بہت اپنا لگا ہے پھر جب چند برس پہلے اس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر میری جان بچائی اور مجھے کندھے پر اٹھا کر بیسیوں میل دور سے بستی میں لایا تو مجھے یوں لگا جیسے اس کی محبت میرے خون میں شامل ہو گئی ہے۔ وہ سچ مچ محبت کیے جانے کے قابل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بستی کا ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے، اگر کوئی نہیں کرتا تو وہ نہیں کرتا جس سے الماجد محبت کرتا ہے۔ میرا اشارہ اپنی بیٹی شاری کی طرف ہے۔ ہاں نوجوان۔۔۔ میں برملا یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ الماجد دل و جان

سے شاری کو چاہتا ہے، وہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کر سکتا ہے مگر شاری کا الماجد کے ساتھ سلوک وہی ہے جو ایک سنگ دل آقا کا غلام کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ خلوت اور جلوت میں ہر جگہ اس کی توہین کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ شاید تم نے دیکھا ہو جب وہ گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہوتی ہے تو الماجد کی کمر پر پاؤں رکھتی ہے۔ اس کی جوتیاں سیدھی کرنا، اس کے لیے دروازہ کھولنا، اس کی خدمت میں پہروں دست بستہ کھڑے رہنا یہ سب اس کے فرائض میں شامل ہے اور یہ تو چند مثالیں ہیں، ایسے نجانے کتنے کام ہیں جو وہ الماجد سے لیا کرتی ہے۔ معلوم نہیں۔۔۔ معلوم نہیں وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ حالانکہ میں جانتا ہوں، وہ دل سے ایسا کرنا نہیں چاہتی۔ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں الماجد کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت ہمدردی کسی نہ کسی کونے کھدرے میں پائی جاتی ہے۔"

میں نے کہا "سردار شماص! میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن میں ابھی تک یہ جان نہیں پایا کہ میں آپ کی خدمت کس طرح کر سکتا ہوں۔"

سردار شماص بولا "حقیقت یہ ہے کہ میری خدمت گار ملازمہ اسوہ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری اور شاری کی باتیں سنی ہیں۔ ان باتوں سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے شاری کو الماجد کی محبت کا جواب محبت سے دینے کا مشورہ دیا ہے۔ ہمارے لیے حیرت ناک بات ہے کہ شاری نے تمہارا مشورہ صبر و تحمل سے سنا ہے اور کوئی طوفان کھڑا نہیں کیا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی ہے کہ وہ تمہارا مشورہ سن کر برداشت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم موقع دیکھ کر اس سے اس بارے میں بات کرو۔ اسے قائل کرنے کی کوشش کرو کہ الماجد اس بستی کا بہترین نوجوان ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے پُرخلوص اور شدید ترین محبت کرتا ہے۔ نجانے کیوں۔۔۔ نجانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ میری سارہ کی روح یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس نے جو یادگار مثال قائم کرنے کا عہد برسوں پہلے کیا تھا وہ میں پورا کروں۔ میں ایک غلام زادے کو آزاد کر کے اس سے اپنی بیٹی کا بیاہ کروں۔"

میں سردار کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ باپ اور بیٹی کے درمیان کتنی بڑی غلط فہمی موجود تھی۔ شاری کا خیال تھا کہ اس کی طرح اس کا باپ بھی آقا اور غلام کی تقسیم کا شدت سے قائل ہے اور وہ غلام زادے الماجد کا نام سننا بھی پسند نہیں کرے گا لیکن یہاں صورتِ حال بالکل مختلف تھی، باپ اس بات کا شدید خواہش مند تھا کہ شاری الماجد کے حوالے سے اپنا رویہ تبدیل کرے اور اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ میں سردار شماص کے کمرے میں اس اندیشے کے ساتھ آیا تھا کہ الماجد کا نام زبان پر لانے کی پاداش میں مجھے سردار کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن جب میں سردار کے کمرے سے واپس لوٹا تو میرے یہ تمام اندیشے باطل ثابت ہو چکے تھے۔ میں نے سردار کی ساری بات تحمل توجہ سے سنی تھی اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سلسلے میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔ یعنی میں شاری کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ الماجد کے حوالے سے اپنا موجودہ رویہ ترک کر دے۔

میں دونوں مسلح پہرے داروں کے ساتھ زنداں کی طرف واپس روانہ ہوا۔ ابھی ہم زنداں سے تھوڑی دور ہی تھے کہ ہمیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ زنداں کے بیرونی دروازے پر جمِ غفیر نظر آ رہا تھا۔ یہ بستی کے پُرجوش مرد و زن تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زنداں کے احاطے میں جانا چاہ رہے ہیں۔ الماجد ان سب میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہجوم کا راستہ روک رکھا تھا۔ اس نے دائفل کو لاٹھی کی طرح پکڑ رکھا تھا اور اس سے دھکیل کر لوگوں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔ میں ایک لمحے میں جان گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ یقیناً یہ سب میرے حمایتی تھے اور مجھ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ میں زنداں میں موجود نہیں ہوں۔ میرے ساتھ آنے والے دونوں پہرے دار بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا چکے تھے۔ انہوں نے وہیں سے واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مجھے لے کر اس چار دیواری میں پہنچ گئے جسے عارضی طور پر اکھاڑے کی شکل دی گئی تھی اور جہاں میں الماجد کے ساتھ تین چار مرتبہ مبارزت کی مشق کر چکا تھا۔ پہرے داروں نے مجھے اشارے کنایے میں سمجھایا کہ میں یہیں رکوں، الماجد بھی تھوڑی دیر میں یہیں پہنچ جائے گا پھر ایک پہرے دار تو میرے پاس رکا، دوسرا غالباً الماجد کو لینے چلا گیا۔

دوپہر کا ڈیڑھ بجنے والا تھا، دھوپ میں اتنی شدت نہیں تھی کیونکہ آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ کھجوروں کے سائے بھی گرمی کی شدت کو کسی حد تک کم کر رہے تھے۔ میں ستانے کے لیے وہیں ریت پر نیم دراز ہو گیا۔ میری پشت نیم پختہ دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار پر کوئلے سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ عربی کے چند الفاظ تھے، مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ الماجد نے لکھے ہیں۔ شاید یہاں فارغ بیٹھے بیٹھے

اس نے بے دھیانی میں یہ چند فقرے گھسیٹ دیے تھے۔ یہ کسی نظم کا ٹکڑا تھا۔ میں نے دو تین بار غور سے پڑھا تو اس کا مطلب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ مفہوم اس سے ملتا جلتا تھا۔

"میں اس ہوا کو چومتا ہوں جو اس کے مہکتے بدن سے چھو کر آتی ہے‘ میں اس کرن کو سجدہ کرتا ہوں جو اس کے گلابی رخسار پر چمکتی ہے۔ صحرا میں ریت کے جتنے ذرّے ہیں میرے دل میں اس کے لیے اتنے ہی ارمان ہیں۔ میں اس کی ایک مسکراہٹ کے عوض اپنی زندگی دے سکتا ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ الماجد نے یہ الفاظ کس کے لیے لکھے ہوں گے۔ میری اور اس کی ملاقات کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر میں اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنے آپ کو محبوب کی ذات میں گم کر چکا تھا۔ اسی دوران میں الماجد مجھے دور سے آتا دکھائی دیا۔ حسب معمول اس کے جسم پر صرف سوتی سی ایک پتلون تھی۔ اس کا لمبا چوڑا کسرتی جسم چلچلاتی دھوپ میں دمک رہا تھا۔ آج وہ اپنے ساتھ مشق کے لیے اصلی حربے (ہتھیار) لے کر آیا تھا۔

○☆○

جوں جوں مبارزت کا دن قریب آرہا تھا‘ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا جارہا تھا۔ بستی کا تقریباً ہر شخص حسب استطاعت اس لڑائی پر شرطیں لگا چکا تھا۔ الماجد کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ مبارزت کے اصل اکھاڑے کو اچھی طرح بنا سنوار دیا گیا ہے۔ یہ اکھاڑا ابو آبان کے مکان کے عین سامنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں واقع تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ شنگر کی تیاریاں بھی زور و شور سے جاری ہیں۔ پہلے چند روز اس نے اصل اکھاڑے میں ہی مشق کی تھی پھر میرے حمایتیوں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا اور شاری نے فوراً فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ مقابلے کے دونوں فریق اصل اکھاڑا‘ مشق کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ اب شنگر کو بھی ایک آزمائشی اکھاڑے میں داؤ پیچ بتائے جارہے تھے۔ جوں جوں مقابلے کا دن قریب آرہا تھا‘ غزالہ کی اُداسی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں مجھے ہر وقت تشویش کے گہرے سائے نظر آتے تھے۔ وہ اپنے کھانے پینے اور آرام کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہی تھی اور تو اور‘ بچے کی طرف اس کی توجہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ کسی وقت اس کی ضد پر وہ اسے بری طرح جھڑک دیتی تھی‘ وہ اونچی آواز میں رونے لگتا تھا۔ کبھی تو خود ہی رو کر چپ ہو جاتا تھا لیکن جب اس کا رونا دھونا طویل ہو جاتا تھا تو میں اسے اٹھا لیتا تھا یا پھر غزالہ ہی اپنے رویے پر نظرِثانی کر لیتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ رات کو بھی سوتی نہیں ہے۔ شاید آخری پہر جب خوشگوار ہوا چلنا شروع ہوتی تھی‘ اسے تھوڑی دیر کے لیے نیند آجاتی ہوگی۔

مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ میں نے بھی دل کو تھوڑا سا سخت کر رکھا تھا۔ بس نارمل انداز میں ضروری بات کر لیتا تھا۔

دل و دماغ کی کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ یوں تو دس بارہ سال سے میں مسلسل خطرات میں کھیل رہا تھا۔ ہر گھڑی موت و حیات کی کشمکش جاری رہتی تھی مگر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا کہ پلاننگ کے ساتھ کسی ایسی لڑائی میں حصہ لیا جائے جس میں صرف دو افراد کو مقابلہ کرنا ہو اور ان میں سے ایک کو بہرصورت زندگی سے ہاتھ دھونے ہوں۔ مجھے اپنے مضبوط اعصاب کا دعویٰ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے جیسے ہفتے کا دن قریب آرہا تھا‘ میرے رگ و پے میں ایک بے چینی سی پھیلتی جارہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جو بھی ہونا ہے‘ جلد سے جلد ہو جائے۔ میرا حریف وہی شخص تھا جو عام زندگی میں بھی میرا خطرناک ترین مدمقابل تھا۔ مجھے اس کی شیطانی صلاحیتوں کا پورا پورا اعتراف تھا اور میں جانتا تھا کہ اسے ہرانا میری زندگی کی ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

تین چار روز پہلے میں نے شاری کے سلسلے میں سردار شامس سے جو وعدہ کیا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس "مقابلے" سے پہلے کم از کم ایک ملاقات تو شاری سے ضرور کروں۔ میں شاری کو بتانا چاہتا تھا کہ الماجد کے بارے میں اس کے والد کے دلی جذبات کیا ہیں۔ میں شاری کو الماجد کی بیکراں والہانہ محبت کے بارے میں بتانے کی بھی خواہش رکھتا تھا مگر شاری سے ملاقات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے الماجد سے بھی کہا تھا کہ میں شاری سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں‘ پتا نہیں الماجد نے میرا پیغام شاری تک پہنچایا بھی تھا یا نہیں۔ شاری کی طرف سے مجھے ملاقات کا شرف نہیں بخشا گیا تھا۔ میں نے مقابلے سے ایک روز پہلے تک شاری سے ملنے کی کوشش جاری رکھی لیکن ناکامی ہوئی۔ ابو آبان کی زبانی مجھے پتا چلا کہ مبارزت سے پہلے اب شاری مجھ سے نہیں ملے گی‘ نہ ہی وہ شنگر سے ملاقات کرے گی۔ اس قسم کی ملاقاتوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ دونوں حریفوں میں سے کسی کی حمایت کر رہی ہے۔

تاہم مقابلے سے صرف ایک روز پہلے ایک حبشی کنیز کے ہاتھ مجھے شاری کا ایک تحریر شدہ پیغام ملا۔ شاری نے پیغام انگلش میں تحریر کیا تھا۔ اس میں میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا تھا اور شاری نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ جب ہفتے کا سورج غروب ہو رہا ہوگا تو ہم پھر ملیں گے۔ بالفاظ دیگر اس نے مجھے زندگی اور فتح کی دعا دی تھی۔

آخری روز الماجد اور اس کے ساتھی تیغ زن عیال نے مجھے بھرپور مشق کرائی۔ عارضی اکھاڑے سے باہر ایک جم غفیر موجود تھا‘ وہ ڈھول تاشے پیٹ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ اکھاڑے میں ہونے والی مشقوں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن چونکہ یہ یہاں کا رواج تھا لہٰذا مجھے پورا کرنا پڑ رہا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے یہ سارا سلسلہ ہی پسند نہیں آیا تھا‘ سچ اور جھوٹ کی پہچان کے لیے دو افراد کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا کر اکھاڑے میں چھوڑ دینا کسی طور مستحسن اقدام نہیں تھا۔ یقیناً یہ ایک وحشیانہ طریقۂ کار تھا۔ میں حق پر تھا لیکن میرا جیتنا اور شنگر کا ہارنا ضروری نہیں تھا۔ اسی طرح نجانے کتنے بے گناہ لوگ اس "مبارزت" نامی رسم کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ نہ صرف انہوں نے جان سے ہاتھ دھوئے تھے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے گناہ گار بھی مان لیا گیا تھا پھر اس موقع پر جس طرح شرطیں لگائی جارہی تھیں اور اودھم مچایا جارہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سچ جھوٹ کی پہچان تو ایک ضمنی بات ہے‘ اصل میں ایسے مواقع کو تفریح اور جوئے بازی کے لیے اہمیت دی جاتی ہے۔ تہذیب یافتہ لوگوں میں جانوروں کو لڑا کر ان کا تماشا دیکھنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے‘ یہاں تو انسانوں کو لڑایا جارہا تھا۔

رات کے کھانے میں ابو آبان کے علاوہ چند دیگر معززین نے بھی مجھ سے ملاقات کی اور میرے لیے اچھی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ مجھے ان لوگوں کا کوئی انداز بھی بھا نہیں رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے بارے میں فکرمند نہیں بلکہ اپنی ان رقموں کے بارے میں فکرمند ہیں جو انہوں نے مجھ پر لگا رکھی ہیں۔ جب وہ لوگ ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے تو میں اور غزالہ زنداں کی کوٹھڑی میں تنہا رہ گئے۔ بچہ غزالہ کے پہلو میں لیٹا تھا۔ مٹی کے دیے کی مدھم روشنی غزالہ کے زردی مائل رخساروں پر منعکس ہو رہی تھی۔ کوٹھڑی سے باہر زنداں کے احاطے میں حسب معمول ایک پہرے دار موجود تھا۔ احاطے کی کھجوروں میں آج پھر چاند اٹکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس اداس موقع پر نجانے کیوں مجھے پھر زریں گل یاد آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہاں موجود ہوتا تو کھجوروں اور چاند کا منظر دیکھ کر وہ گانا ضرور اس کے لبوں پر مچل جاتا جو وہ اکثر گنگنایا کرتا تھا۔ "چاند تکے چھپ چھپ کے اونچی کھجور سے۔۔۔ ام تو ملنے آیا تھا چُھپ کے حضور سے" میرا اور زریں گل کا ساتھ اتنا پرانا تھا کہ اس کم بخت کا خیال ہر جگہ آسیب کی طرح مجھ سے چمٹا رہتا تھا۔

کچھ دیر کوٹھڑی میں ٹہلنے کے بعد میں بھی لیٹ گیا۔ لیٹنے سے پہلے میں نے دیے کی لو نیچی کر دی تھی۔ گہرے سناٹے میں تاریکی سانس لے رہی تھی۔ شاید میں اور غزالہ دونوں ہی ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن جو کہنا چاہتے تھے وہ نوک زبان پر آکر رک جاتا تھا۔ غزالہ کی لمبی سانسیں اور کروٹیں گواہ تھیں کہ وہ بے چین ہے‘ میری اندرونی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی لیکن ظاہری طور پر میں سکون سے لیٹا تھا۔ یہ اعصاب شکن خاموشی ہمارے درمیان قریباً دو گھنٹے مسلط رہی۔ شاید ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ انا کا شکار رہتے اور بات نہ کرتے مگر بچے نے یہ مشکل آسان کر دی۔ وہ ایک دم رونے لگا تھا۔ غزالہ جلدی سے اٹھی اور دیے کی لو اونچی کی۔ کمرے میں ہلکی روشنی ہوئی‘ ایک دم غزالہ کی چیخ نکل گئی۔ ایک منحوس شکل کی مکڑی بچے کی ٹانگ پر بیٹھی تھی۔ مکڑی کا سائز درمیانے سائز کے مینڈک سے کم نہیں تھا۔ غزالہ نے سخت خوف کے عالم میں اوڑھنی کا پلو مار کر مکڑی کو بچے کی عریاں ٹانگ سے ہٹایا۔ وہ "بھن بھن" کی خوفناک آواز سے کوٹھڑی میں چکرانے لگی‘ کبھی ایک دیوار کے ساتھ ٹکرائی‘ کبھی دوسری سے پھر اچانک وہ غزالہ کی گردن کے پچھلے حصے سے چمٹ گئی۔ غزالہ کم ہمت نہیں تھی پھر بھی اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے لپک کر مکڑی پر ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر غزالہ کی گردن سے علیحدہ کیا۔ مکڑی کو فرش پر پٹخ کر میں نے پاؤں سے کچل دیا۔ خون کے ساتھ ایک زرد مادہ سا اس کے اندر سے بہہ نکلا۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا۔ اس قسم کا اڑنے والا کیڑا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تک غزالہ کے اوسان بحال نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اچانک ایک بار پھر اس کی چیخ نکل گئی۔ اس مرتبہ وہ خوف زدہ ہو کر مجھ سے ٹکرائی اور لپٹ گئی۔ میں نے دیکھا‘ صرف دو تین فٹ کے فاصلے پر دو اور ایسی ہی مکڑیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔

اسی دوران میں پہرے دار کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ جوتا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے ایک مکڑی کو نشانہ بنایا‘ دوسری پھر بھنبھناتی

ہوئی کوٹھڑی میں اڑنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ اڑنے والے مکڑی نما کیڑے بے ضرر نہیں ہیں ورنہ پہرے دار اتنا ہراساں نظر نہیں آتا۔ میں نے پاؤں کی حرکت سے گدیلے کو اس طرح دہرا کیا تھا کہ بچہ اس میں چھپ کر محفوظ ہو گیا تھا۔ غزالہ میری بانہوں میں تھی۔ چند سیکنڈ کی کوشش سے پہرے دار دوسری مکڑی کو بھی نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے تینوں مردہ مکڑیوں کو کھجور کے ایک چوڑے پتے پر رکھا اور زنداں کی کھڑکی کو اچھی طرح بند کر کے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ در و دیوار کو دیکھتا جا رہا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اور مکڑی بھی نظر آ سکتی ہے۔

غزالہ بدستور میری بانہوں میں تھی اور روتی چلی جا رہی تھی۔ شدید خوف کے بعد جب اطمینان کا احساس ہو تو اس طرح آنسو جاری ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ بھی ایسے ہی آنسو تھے، مگر پھر چند لمحوں بعد میں نے محسوس کیا کہ ان آنسوؤں میں کچھ اور بھی پوشیدہ ہے جو آنسو عارضی خوف و ہراس کے سبب بہے تھے، اب وہ اپنے اندر ایک گہرے دکھ کو سمیٹنے لگے تھے۔ اس دکھ نے ان آنسوؤں کے مزاج کو یکسر بدل دیا تھا۔ یہ دکھ اس "دوری" کا تھا جو میرے اور غزالہ کے درمیان ایک ہی چھت کے نیچے حائل تھی۔ یہ دکھ اس خاموشی کا تھا جو ہمارے ہونٹوں کو آنکڑیوں کی طرح جکڑے ہوئے تھی۔۔۔ اور یہ دکھ اسی رات کا تھا جو میری آخری رات بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ کل اس وقت مجھے کہاں ہونا تھا، کسی کو علم نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ میں ایک لاش کی صورت لوگوں کے کندھوں پر سوار ہوتا، ممکن تھا کہ تیرگی گھٹاٹوپ تاریکی میرا مسکن ہوتی۔ آج میں زندہ تھا، غزالہ کے قریب تھا، وہ میری سانسوں کی آمدورفت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس چار دیواری میں ہم تنہا تھے۔ کتنا فرق تھا آج اور کل میں! شاید۔۔۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بے حرکت کھڑی رو رہی تھی۔ خوف کے سبب مجھ سے لپٹنے والی اب دکھ کے سبب مجھ سے علیحدہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دکھ بے پناہ تھا اور میرا دکھ بھی بے پناہ تھا۔ کوٹھڑی کی نیم تاریکی میں مکڑیوں کی آمد تو ایک بہانہ بن گئی تھی، یہ بہانہ نہیں ہوتا تو شاید کوئی اور بہانہ بن جاتا۔ دکھ کا جو طوفانی ریلا ہمارے سینوں میں موجزن تھا اسے کسی نہ کسی صورت تو کناروں کو توڑنا ہی تھا۔

وہ نڈھال اور بے جان سی میرے بازوؤں میں رہی۔ میرے ہاتھ اس کی پشت پر رہے۔ وہ روتی رہی، میری آنکھوں میں بھی اشکوں کی نمی تیرتی رہی۔ مجھے یوں کھڑے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ شاید کوئی مجھ سے میری مرضی پوچھتا تو میں صدیوں تک یونہی کھڑے رہنے کو ترجیح دیتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ غزالہ کے گرم آنسو میری قمیص کے گریبان کو بھگو رہے ہیں۔ اس کے سینے سے اٹھنے والی ہر ہچکی کی جنبش میں محسوس کر رہا تھا۔ بہت دیر بعد، شاید کئی برسوں بعد مجھے بھی اپنے رخساروں پر آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

بچہ ذرا سا کسمسا کر گدیلے کے نیچے ہی سو چکا تھا۔ زنداں کی کھڑکی اور دروازہ دونوں بند تھے، اپنے ہی سایوں کے سوا کوئی بھی ہمیں دیکھنے والا نہیں تھا۔ میں نے غزالہ کے بالوں کو سہلایا، اسے خود سے جدا کرنے کی بڑی کمزور سی کوشش کی لیکن وہ جدا نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے بازو پھر اس کے گرد لپیٹ دیے۔ ہم اسی طرح کھڑے رہے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جو میرے دل میں ہے شاید وہی اس کے دل میں ہے۔ وہ بھی لامحدود وقت تک اسی طرح میرے ساتھ یہاں کھڑی رہ سکتی ہے۔ وہ ایک خواب کی سی کیفیت تھی۔ کسی طلسم نے اندیشے اور مصلحت کے ہر عفریت کو جکڑ کر ناچیز کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ماضی یا مستقبل کچھ بھی نہیں۔ زندگی بس اور بس اسی ایک پل کا نام ہے۔ ہم نجانے کتنی دیر اسی طرح وہاں کھڑے رہے۔ غزالہ نے جیسے قسم کھائی تھی کہ وہ پیچھے ہٹے گی اور نہ آگے بڑھے گی۔ شاید وہ تا ابد اس کیفیت کو جوں کا توں رکھنا چاہتی تھی۔ بہت دیر بعد اس کی سسکیوں کے درمیان مجھے اس کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز غزالہ کی تھی مگر بہت اجنبی لگ رہی تھی "شاہ جہاں! میں دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہوں۔ کیا کوئی عورت مجھ جیسی بھی ہوتی ہے۔ بتائیں! کیا کوئی عورت ہوتی ہے ایسی؟ میں عاصم کے ساتھ اپنا تعلق ختم کرنا نہیں چاہتی، نہ آپ کی۔۔۔ محبت دل سے نکال سکتی ہوں۔ ہاں میں نہیں نکال سکتی آپ کی محبت۔۔۔ کتنی بری عورت ہوں میں۔۔۔ کتنی قابل نفرت ہوں، مجھے مر جانا چاہیے شاہ جہاں! خودکشی حرام ہوگی لیکن مجھ جیسی کے لیے تو حرام نہیں ہے؟"

میں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس تھا ہی نہیں، ہاں میں نے ایک بات ضرور محسوس کی۔ شیخ عاصم سے مبینہ شادی کے بعد پہلی بار غزالہ نے برملا یہ اظہار کیا تھا کہ وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہے۔ دوسری طرف اس نے شیخ عاصم کے لیے محبت کے بجائے "تعلق" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے غزالہ کا ذہن بتدریج ایک سفر کر رہا ہے۔ میرے ذہن میں احساس جاگا کہ مستقبل کی تاریکی میں کہیں دور امید کی ایک کرن روشن ہو گئی ہے۔

میں نے غزالہ کے ہاتھ تھام لیے۔ ہم دونوں گدیلے پر آ بیٹھے۔ غزالہ کے نازک ہاتھوں کا لمس مجھے دنیا کی خوب صورت ترین چیز محسوس ہو رہا تھا اور صرف میں نے ہی غزالہ کے ہاتھ نہیں تھام رکھے تھے، اس نے بھی میرے ہاتھوں کو تھام رکھا تھا پھر بے اختیار ہو کر اس نے اپنی پیشانی میرے ہاتھوں پر رکھ دی۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے گرم پانی کے چشمے بہنے لگے اور میرے ہاتھوں کو بھگونے لگے۔ "شاہ جہاں! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بولی "آپ اس لڑائی سے پیچھے کیوں نہیں ہٹ جاتے؟"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا "پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان تمام الزامات کو درست ثابت کر دیا ہے جو شیخ عشاوب کے ساتھیوں نے اور شنکر شکرا نے ہم پر عائد کیے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہے، اس مرحلے سے مجھے گزرنا ہی پڑے گا۔ ویسے بھی شنکر سے ایک آخری فیصلہ تو ہونا ہی ہے، مبارزت کے میدان میں ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

"اگر۔۔۔ اگر۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں اٹک گئی۔

میں نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ دبائے اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پیوست کر دیں۔ ایک ہیجان سا میرے سینے میں پیدا ہو گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ہر مصلحت کو ذہن سے جھٹک دوں، اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لوں۔ اس پر پیار کی بارش کر دوں۔ اپنے ہونٹ اس کی آنکھوں پر رکھوں اور زندگی بھر کے لیے اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے خالی کروا لوں اور بہت کچھ ایسے ہی جذبہ انگیز تھے۔ اگر میں یہ جسارت کر گزرتا تو شاید یہ سب کچھ ہو جاتا لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ بس بڑے یقین کے ساتھ اس کے خوب صورت ہاتھوں کو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کیا۔ یقین اور ولولے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی اور پورے جسم میں امنگ و ترنگ کے دریا بہہ نکلے۔ یہ ایک ایسی خوشی تھی جو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ مستقبل کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں پھوٹنے والی امید کی ننھی سی کرن نے مجھے نہال کر دیا۔ میں نے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پورے یقین سے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوگا غزالہ۔ اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں یہ لڑائی جیتوں گا اور۔۔۔"

"اور کیا؟"

"اور ہر لڑائی جیتوں گا۔"

اپنے جذباتی لہجے کی بے پناہ شدت اور گرمی خود میں نے بھی محسوس کی۔ غزالہ اس لہجے میں چند لمحوں کے لیے کھو سی گئی تھی۔

○☆○

وہ دن طلوع ہو چکا تھا جب مجھے اور شنکر کو زندگی و موت کی لڑائی لڑنی تھی۔ صبح سویرے سے ہی بستی میں ہلچل اور تلاطم کے آثار نظر آتے تھے۔ رات والے واقعے کے بعد میری دلی کیفیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی و بے یقینی ہوا بن کر اڑ گئی تھی جس نے پچھلے کئی دن سے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں نے غزالہ کی آنکھوں میں اپنے لیے امید کی جو کرن دیکھی تھی اس نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر ڈالا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں نے اور غزالہ نے اکٹھے کھایا۔ برسوں بعد یہ موقع آیا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ کھا رہے تھے۔ غزالہ میرے سامنے مسکرا رہی تھی اور میرا حوصلہ بڑھانے کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میری جیت و کامرانی کی طرف سے بالکل مطمئن ہے لیکن میں جانتا تھا کہ اندر سے اس کی حالت کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ جونہی میں زنداں سے اکھاڑے کے لیے روانہ ہوں گا، وہ دروازہ بند کرے گی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔ اس نے مجھے فیصلہ کن لہجے میں بتایا تھا کہ وہ لڑائی دیکھنے کے لیے نہیں جائے گی۔

عصر سے تھوڑی دیر پہلے الماجد زنداں میں آیا۔ اس نے مجھے احاطے میں بلایا اور پوچھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ جلد ہی اصل بات بھی اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ کہنے لگا "میری دعا ہے کہ خدا آپ کو بہت طویل زندگی دے۔ آپ نہ صرف آج کی لڑائی میں سرخرو ہوں بلکہ زندگی میں پیش آنے والے ہر خطرے کا کامیابی سے مقابلہ کریں۔ بہرحال آج کی لڑائی سے پیش تر اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ دیں یا لکھ دیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ مبارزت میں ایک شخص کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کا دستور ہے کہ مقابلے میں حصہ لینے والے دونوں افراد سے وصیت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "بھئی! میں ایک بے مایہ شخص ہوں، نہ جائیداد ہے نہ بینک بیلنس، میں وصیت کیا کروں گا۔ بس ایک بہن ہے، اس کے لیے دعا کر سکتا ہوں۔ خدا اسے ان آفات سے بچائے جو ہر جگہ اس کا پیچھا کر رہی ہیں۔"

"پھر بھی کچھ نہ کچھ تو آدمی سوچتا ہی ہے۔"

میں نے صبح سویرے جب غزالہ نوافل ادا کر رہی تھی، احاطے میں بیٹھ کر شفقتا اور ساری صاحب کے نام دو خطوط لکھے

تھے۔ یہ وصیت نامہ تو نہیں تھا لیکن جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا، میں نے ان خطوں میں کہہ ڈالا تھا۔ ان خطوط میں، میں نے شفا کے منگیتر ڈاکٹر حمزہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ ایک خط میں نے شاری کے لیے لکھا تھا۔ یہ زیادہ طویل خط نہیں تھا تاہم میں نے اس میں وہ تمام باتیں سمو دی تھیں جو میں سردار شماس سے ملنے کے بعد شاری سے کہنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ تینوں خط الماجد کو دے دیے اور اسے تاکید کی کہ وہ فی الحال ان خطوط کے بارے میں کسی کو نہیں بتائے۔

عصر کے وقت بہت سے افراد مجھے لینے کے لیے زنداں میں پہنچ گئے۔ ان میں مسلح پہرے داروں کے علاوہ میرے بہت سے حمایتی بھی شامل تھے، وہ سب بہت پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ غزالہ مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے موجود نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی سے ہی نہیں نکلی تھی۔ شاید وہ اپنے اندر یہ منظر دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں کر پائی تھی۔ ایک چھوٹے سے جلوس کی شکل میں مجھے ایک قبر پر پہنچایا گیا۔ یہ قبر ایک چھوٹے سے خوب صورت گنبد کے اندر تھی۔ یہاں مشک و عنبر اور زعفران کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اردگرد قالین بچھے تھے اور لوگ خوب صورت قندیلوں کے نیچے بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔ جلوس کے تمام شرکا نے یہاں پہنچ کر ہاتھ چھت کی طرف اٹھائے اور دعائیہ انداز اختیار کیا۔ میں نے بھی تقلید کی۔ معلوم ہوا کہ یہ سردار شماس کی محبوب ترین بیوی سارہ کا مرقد ہے اور بستی کے لوگ اس مقام سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں۔ مرقد پر حاضری دینے کے بعد ہم ''اکھاڑے'' کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب جلوس کے ساتھ ڈھول تاشے بجنے شروع ہو گئے تھے اور کچھ مقامی عورتیں رجز کے انداز میں ہم آواز ہو کر گانے لگی تھیں۔ جلوس کے راستے میں بہت سی مسلی ہوئی پنکھڑیاں بکھری تھیں۔ الماجد نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے شنکر اور اس کے ہم نوا بھی ایک جلوس کی شکل میں مرقد پر حاضری دینے کے لیے آئے تھے اور پھولوں کی یہ پتیاں ان پر ہی نچھاور کی گئی تھیں۔

ہم پر بھی ایک دو جگہ ایسے ہی گل پاشی کی گئی لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ بستی میں شنکر کے خیر خواہوں اور پرستاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اکھاڑے پر پہنچ گئے۔ یہاں ازدحام تھا۔ غالباً پوری بستی کے لوگ اکھاڑے کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ عام طور پر باکسنگ یا کشتی وغیرہ کے رنگ بلندی پر ہوتے ہیں لیکن یہ اکھاڑا نشیب میں تھا۔ اکھاڑے کے اندر ریت تھی۔ اردگرد ساڑھے چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ ایک خم دار کھجور کی شاخیں اکھاڑے کے عین اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک شاخ سے ایک فٹ لمبا خطرناک دھار والا حربہ لٹک رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہی دو حربے اکھاڑے کی ریت میں دو کونوں پر چھپا دیے گئے ہیں۔ اکھاڑے کے قریب لوگ نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے، جو ذرا دور تھے وہ ڈھلوان پر کھڑے تھے۔ ہر شخص بآسانی اکھاڑے کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ بستی کے معززین اگلی صف میں موجود تھے، یہاں مجھے شاری ایک زرنگار کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔ اس کی ایک جانب ابو آبان اور دوسری طرف شیخ سالم کی نشست تھی۔ شاری کا نیا پالتو بندر بڑی فرماں برداری سے اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ تماشائیوں میں شنکر کے صرف ایک دو ساتھی نظر آ رہے تھے، ہاں شیخ سالم کے قریباً سارے ساتھی موجود تھے۔ وہ اپنے شہری لباس اور چیک دار عماموں کی وجہ سے علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان لوگوں کے چہرے تمتمائے اور آنکھوں سے نفرت اظہار ہونے لگا۔ شاری کے قریب سے گزرتے ہوئے میری نظریں اس سے چار ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نیک تمنائیں تھیں۔ تماشائیوں کے درمیان سے گزر کر میں جونہی اکھاڑے میں پہنچا، ایک ملا جلا شور بلند ہوا۔ یہ شور میری حمایت اور مخالفت میں تھا۔ مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے میں ٹیلی وژن پر فری اسٹائل ریسلنگ (نورا کشتی) کے مناظر دیکھ رہا ہوں لیکن اس لڑائی اور ٹیلی وژن پر دکھائی جانے والی ریسلنگ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ سراسر ڈراما اور یہ سراسر حقیقت تھی۔ ایک ایسی حقیقت جس کا اختتام خونچکاں موت تھی۔ اکھاڑے کے اندر قدم رکھتے ہوئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں سے میں زندہ واپس نکلوں گا یا لاش کی صورت میں۔

تھوڑی دیر بعد شنکر بھی اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ہلکا نشہ تیر رہا تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ میری طرح وہ بھی پتلون قمیص میں ملبوس تھا۔ سورج ڈھلنے کے بعد گرمی کی شدت بہت حد تک کم ہو گئی تھی پھر بھی شنکر کی قمیص پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ اپنے ازلی دشمن کو روبرو دیکھ کر میری رگوں میں خون اچھلا اور سر سے پاؤں تک ایک آگ سے بھر گئی۔ دوسری طرف شنکر کی آنکھوں سے بھی غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے شنکر کی غضب ناکی سے اتنی وحشت نہیں ہوتی تھی جتنی اس کی سرد مزاجی سے ہوتی تھی۔ اور شنکر کا مقام تھا کہ برسوں بعد شنکر کی سرد مزاجی اور برداشت غضب ناکی میں ڈھل

تھی۔

اس خونی کھیل میں ادھیڑ عمر کے ایک قوی ہیکل شخص کو منصف کے فرائض انجام دینے تھے۔ جونہی ہم اکھاڑے میں زینے سامنے کھڑے ہوئے، وہ قوی ہیکل شخص ہمارے بیچ میں آ گیا۔ یہ شخص ایک آنکھ سے محروم تھا تاہم اس کی اکلوتی آنکھ میں کئی آنکھوں کی چمک موجود تھی۔ اتنی روشن اور تیز آنکھ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس یک چشم منصف نے ہم دونوں کو اشارے سے بتایا کہ ہم اپنی قمیص اتار دیں۔ پہلے میں نے اور پھر شنکر نے اپنی قمیص جسم سے علیحدہ کر دی۔ منصف نے ہماری پتلونوں کی تلاشی لی اور جیبوں کے اندر ہاتھ گھما کر دیکھا، اس کے بعد شنکر کو جوتے اتارنے کی ہدایت کی گئی، میں پہلے ہی ننگے پاؤں تھا۔

اکھاڑے میں اور اردگرد بالکل سناٹا چھا گیا تھا، شور و غل کے ساتھ ساتھ ڈھول تاشوں اور نفیریوں کی تمام آوازیں بھی دم توڑ گئی تھیں۔ صرف اکھاڑے کے بالکل قریب رکھا ہوا ایک بڑا نقارہ دھیرے دھیرے بج رہا تھا۔ نٹ کی کھال سے بنایا گیا یہ نقارہ کافی بڑا تھا، ہر بار جب اس پر چوٹ پڑتی تھی تو آواز دل میں سرایت کرتی محسوس ہوتی تھی۔ لڑائی قریباً دس دس منٹ کے دو وقفوں میں ہونی تھی، اس کے بعد تیسرا وقفہ شروع ہونا تھا جو نتیجے تک جاری رہنا تھا۔ مجھے اور شنکر کو تمام ضروری ہدایات دینے کے بعد منصف درمیان سے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑائی شروع کرنے کے لیے شاری نے اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے گھڑیال پر چوٹ لگائی۔ میرے اور شنکر کے درمیان لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

نیم گرم ریت پر درختوں کی چھاؤں تلے میں اور شنکر بازو پھیلائے ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ایک دوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہے تھے۔ وہ جرم کی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ اسے بمبئی کا راجا بھی کہا جاتا تھا۔ آج اس کا مقابلہ لاہور کے ناؤ جمالی سے تھا۔ شنکر سیکڑوں افراد کا قاتل تھا۔ آج اس کے مقتولوں میں ایک کا اضافہ ہو جانا تھا یا پھر اسے خود مقتول بننا تھا۔ شنکر کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ سانپ کی آنکھیں یاد آتی تھیں۔ اس کی پھنکار بھی سانپ کی سی تھی۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

''جمالی! مار تو میں تمہیں دوں گا لیکن یہ حسرت رہے گی کہ تڑپا کر نہیں مار سکا۔'' اس کی آنکھوں کے اردگرد کے حلقے اور بھی منحوس نظر آنے لگے تھے۔

اس کے لہجے میں بے پناہ یقین تھا۔ میری نگاہیں اس کی ہر حرکت نوٹ کر رہی تھیں۔ اس کے قدموں کی ہر جنبش میرے علم میں تھی۔ ہم ایک دوسرے کی لڑائی کا انداز بہت اچھی طرح جان چکے تھے۔ اسے میرے خطرناک ترین داؤ کا علم تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی گردن میرے دائیں بازو کے شکنجے سے بچا کر رکھتا تھا۔ دوسری طرف اسے میرے سر کی خوف ناک ضرب سے بھی خطرہ لاحق رہتا تھا۔ شنکر اپنی کہنی اور گھٹنے کا استعمال بڑے خطرناک طریقے سے کرتا تھا۔ خاص طور سے جب وہ اپنے مدمقابل سے گتھم گتھا ہو جاتا تھا تو پھر اس کا گھٹنا ایک ایٹم بم کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ میں نے کئی جگاوری اسٹریٹ فائٹر کو شنکر کا مہلک گھٹنا رانوں کے درمیان کھا کر مچھلی کی طرح تڑپتے اور بعض اوقات جان سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ ایسے ہی ایک انگریز غنڈے کے بارے میں، میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ

تاش کے پتے

علیم الحق حقی کا شاہکار ناول

لومڑی کی طرح مکار اور بھیڑیے کی طرح خونخوار قاتل کی کہانی، وہ سب سے عظیم قاتل بننا چاہتا تھا۔

قیمت -/160 روپے
ڈاک خرچ -/20 روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر۔ علی میاں پبلی کیشنز۔ 20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414

سٹاکسٹ۔ علی بک سٹال۔ نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور 7223853

ایک مشہور انڈین فلمی ولن کا چھوٹا بھائی جو ایک نامور بدمعاش تھا' ایسے ہی انداز میں شنکر کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

ایک دوسرے کی کمزوریاں اور خوبیاں ذہن میں رکھے ہم موت کے اکھاڑے میں ایک دوجے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہل شنکر شکرا نے ہی کی۔ اس نے ایک دم ایسا تاثر دیا جیسے وہ ایک قدم آگے بڑھ کر میرے سینے پر ٹانگ رسید کرنا چاہ رہا ہے۔ میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹا۔ شنکر نے ایک دم پینترا بدلا اور اکھاڑے کے دائیں کونے کی طرف لپکا۔ میرے اندازے کے مطابق یہی وہ کونا تھا جہاں ریت میں سے ایک حربہ چھپایا گیا تھا۔ شنکر ابھی نصف راستے میں تھا کہ میں نے ہوا میں ڈائیو کیا اور شنکر کا پاؤں پکڑ لیا۔ وہ اوندھے منہ ریت پر گرا۔ اس کی پھرتی ہر شک سے بالاتر تھی۔ سانپ ہی کی طرح پلٹ کر اس نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رسید کیا۔ آنکھوں کے سامنے چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ اردگرد کی بلند کھجوریں اور ان پر چڑھے ہوئے تماشائی میری نگاہوں میں گڈمڈ ہو گئے۔ میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹک کر اپنا VIEW صاف کیا۔ شنکر کی ٹانگ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ اپنے چہرے پر اس کے پاؤں کا دوسرا وار میں نے جھک کر بچایا' شنکر پلٹ کر میرے اوپر آ گیا۔ اس کے گھٹنے سے بچنے کے لیے میں نے اس کی ایک ٹانگ اپنی رانوں کی گرفت میں جکڑ لی۔ اس نے میری دونوں کلائیاں پکڑیں اور اپنی حیوانی طاقت استعمال کرکے دونوں بازو ریت سے لگا دیے۔ تاہم اپنی اس کوشش میں اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل نزدیک آ گیا۔ مجھے اپنا سر استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔

"دھائیں" کی آواز سے ایک ٹکر شنکر کی ناک پر پڑی۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں نے اپنا گھٹنا اس کی پسلیوں میں رسید کیا اور خود سے دور پھینک دیا۔

میرے حمایتیوں نے مجھ پر تعریف کے ڈونگرے برسائے اور زبردست حوصلہ افزائی کی۔ وہ ساتھ ساتھ مجھے مشورے بھی دے رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے مجھے بتا رہے تھے کہ حربہ کس کونے میں ہے۔ میں لپک کر اکھاڑے کے کونے میں پہنچا۔ ریت میں اندھا دھند ہاتھ چلا کر میں نے حربہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ میرا دھیان حربہ ڈھونڈنے کی طرف ہی نہیں تھا' میں اپنے عیار ترین دشمن کی نقل و حرکت سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ جیسے ہی وہ مجھ پر جھپٹا' میں نے اپنی جگہ چھوڑی۔ وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی اکھاڑے کی چوبی دیوار سے ٹکرایا۔

یہی وقت تھا جب الماجد کی پکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں! حربہ نظر آ رہا ہے' وہ دیکھ حربہ۔"

الماجد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے جس کونے میں ریت الٹ پلٹ کیا تھا۔ وہاں کوئی شے چمک رہی تھی۔ یقیناً حربے کا دستہ تھا۔ یہ دستہ نہیں تھا' یہ وہ زندگی تھی جو میں اپنے لیے حاصل کر سکتا تھا اور یہ وہ موت تھی جو میں شنکر ابن شیطان کے سینے میں اتار سکتا تھا۔ حربے کی اس ایک جھلک میں بہت سی جھلکیاں سمٹ آئی تھیں۔ شفا کی مسکراہٹ' حمزہ کا پیار' زریں گل کی منتظر نگاہیں' سا صاحب کی بے قراریاں۔ میں نے اپنی تمام قوت جمع کی اور حتی الامکان رفتار سے حربے کی طرف جھپٹا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک بہت بڑی ناکامی میری منتظر ہے۔ شنکر نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور حربے تک پہنچ گیا۔ قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا' زہریلا۔ جونہی حربہ شنکر کے ہاتھ میں آیا تو ہر طرف چیخیں گونج گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں مسرت کی چیخیں ہوں لیکن زیادہ تر چیخیں دہشت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

نفسیات داں کہتے ہیں کہ پُرخوف چیخ درحقیقت ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے بلند کی جاتی ہے۔ شاید ان لوگوں نے بھی آنے والے لمحوں سے مطابقت پیدا کی۔ ذہنی طور پر خود کو تیار کیا تھا کہ ابھی وہ اپنے سامنے ایک جاگتے آدمی کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھیں گے۔ اس کا اچھلتا خون اور اس کے پیٹ کے اندرونی اعضا ان کی آنکھوں کے سامنے بکھریں گے۔

حربہ ہاتھ میں لے کر شنکر میری طرف پلٹا۔ اکھاڑے سے باہر یہاں وہاں تک سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بہت سے لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ نقارے کی دھمک بھی ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ الماجد کے جس خنجر زن ساتھی نے سات روز تک مجھے خنجر چلانے کی "مشق" کرائی تھی' چیخ چیخ کر مجھے ہدایات دے رہا تھا لیکن میرے کان جیسے بند ہو چکے تھے' ویسے بھی شنکر جیسے استاد فائٹر کے سامنے وہ بیچارہ مجھے کیا ہدایات دے سکتا تھا۔ میں الٹے قدموں اکھاڑے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ شنکر میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں جانتا تھا' وہ بہت مہلک وار کرے گا۔

اچانک شنکر گڑبڑا گیا' اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ میں نے دیکھا' اس کے چہرے پر کسی نے آئینے سے سورج کا عکس ڈالا تھا۔ شنکر جیسے بے رحم فائٹر کے روبرو مہلت سے فائدہ نہ اٹھانا خودکشی کرنے کے برابر تھا۔

میں نے اچھل کر اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی۔ یہ بڑی بھرپور ضرب تھی۔ شنکر ڈکراتا ہوا اکھاڑے کے دوسرے کونے میں جا گرا۔ میں اس کونے کے بالکل قریب ہو تھا جہاں دوسرا حربہ موجود ہونے کی امید ہو سکتی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ تیزی سے ریت میں چلائے۔ ہاتھوں کی انگلیاں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرانے کے لیے بے قرار تھیں مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ شنکر گرنے کے بعد اٹھ گیا ہے' حربہ اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ بلائے ناگہانی کی طرح میری طرف بڑھ رہا ہے۔

شنکر کا انتہائی مہلک وار میں نے جھک کر بچایا' پھر تڑپ کر دور ہٹ گیا۔ یہ میرے لیے بڑے کٹھن لمحے تھے' شنکر کے دو حملے خالی دے چکا تھا' اب وہ تیسرا حملہ کرنے والا تھا۔ یقیناً پہلی دو ناکامیوں کا غضب بھی اس کے تیسرے وار میں شامل ہونا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈیڑھ فٹ لمبا حربہ تھا۔ حربے کی دھار پر سریع الاثر زہر تھا۔ جسم پر لگنے والے چھوٹے سے زخم کا مطلب بھی "موت" ہو سکتا تھا۔

تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں اور وہ شنکر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے حربے (خنجر) پر مرکوز تھیں۔ ان لمحوں میں شاید مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں "...زت" کے اکھاڑے میں ہوں' میرے اردگرد سیکڑوں لوگ ہیں اور اردگرد کے درختوں پر بھی تماشائیوں کے جھنڈ ہیں۔ شنکر نے بجلی کی سی سرعت سے دو وار کیے۔ دونوں مرتبہ اس نے میرے عریاں پیٹ کو ہدف بنایا۔

مجھے معلوم تھا' اب وہ تیسرا وار کرے گا اور یہ بھی معلوم تھا کہ تیسرا وار کرتے ہوئے وہ خنجر کے دستے پر اپنی گرفت تبدیل کر لے گا' یعنی اب شہادت کی انگلی کے بجائے اس کی سب سے چھوٹی انگلی "پھل" کی طرف ہو گی اور انگوٹھا دستے کے سرے کو سہارا دے گا۔ بالکل جیسے برف توڑنے کے لیے سوئے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خنجر پر اپنی گرفت تبدیل کرنے کے لیے شنکر اسے ایک لمحے کے لیے ہوا میں اچھالے گا۔ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا اور اس وقت کیونکر میرے ذہن میں آیا' اس کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات انسان کے حافظے میں کہیں نہ کہیں نقش رہتی ہے اور خاص قسم کی صورت حال میں وہ بات ایک میکانکی عمل کے تحت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین سال یا سات آٹھ سال پہلے میں نے شنکر کو لڑائی کے وقت اس مہارت کے ساتھ یہ عمل کرتے دیکھا ہو۔ اب سنگین صورت حال کے اس ماحول میں یہ بات میرے ذہن میں آ گئی تھی کہ شنکر خنجر پر اپنی گرفت بدلے گا۔ جتنی دیر میں پلک جھپکی جاتی ہے شاید اتنی ہی دیر کے لیے شنکر نے خنجر کو ہوا میں معلق کرکے اپنی گرفت بدلنی چاہی۔ میری ٹانگ حرکت میں آ چکی تھی۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر نے خنجر کو ہوا میں اچھال دیا۔ جیسے اندھیرے میں ہوائی چھوٹتی ہے ایسے ہی خنجر (حربہ) شنکر کے ہاتھ سے نکلا اور ہوا میں بلند ہو کر ہجوم میں جا گرا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر سر کی ٹکر شنکر کے سینے میں رسید کی' اس نے خم کھایا تو میں نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں لینا چاہی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا' ہم لڑتے ہوئے کھجور کی اس شاخ کے عین نیچے پہنچ چکے تھے جہاں تیسرا خنجر جھول رہا تھا۔ شنکر نے جست لگا کر خنجر تک پہنچنا چاہا۔ اسی دوران میں میں نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ شنکر کا ہاتھ خنجر کو لگا' خنجر لہرایا اور بل کھا کر ایک بہ نسبت بلند شاخ پر جا اٹکا۔ اب بادی النظر میں یہی دکھائی دے رہا تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس خنجر تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔

اگلے تین چار منٹ تک میرے اور شنکر کے درمیان خوف ناک لڑائی ہوئی' میری طرح شنکر بھی خالی ہاتھ تھا۔ اس کی ناک اور پیشانی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ دوسری طرف میرا نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ "ایک چشم" منصف بگولے کی طرح ہم دونوں کے گرد چکرا رہا تھا۔ جونہی گھڑیال پر چوٹ پڑی' اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر مجھے شنکر سے علیحدہ کر دیا۔ گھڑیال پر شادی نے جو چوٹ لگائی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ مبارزت کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور ہم چند منٹ آرام کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ الماجد نے بتایا تھا' دس دس منٹ کے ایسے دو دور ہونے تھے' اس کے بعد جو دور شروع ہونا تھا وہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت تک جاری رہنا تھا۔ موت ۔۔۔ جو اس اکھاڑے میں ایک کمپلسری مضمون جیسی تھی۔

پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو میں اکھاڑے کے دروازے سے باہر آیا اور ایک چٹائی پر بیٹھ گیا' شنکر بھی باہر آ گیا تھا۔ اس کی ناک پر گہری چوٹ آئی تھی اور خون مسلسل رس رہا تھا۔ الماجد اور عباس دو تین افراد سمیت میرے قریب آ پہنچے۔ مجھے پیالے میں ٹھنڈا پانی پیش کیا گیا۔ میں نے پہلے کلیاں کیں (جو اس صحرا میں یقیناً ایک بڑی عیاشی تھی) کلیوں سے منہ میں بھرا ہوا خون صاف ہو گیا تو میں نے چند گھونٹ پانی پیا۔ آخری گھونٹ لیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ زندگی کا آخری گھونٹ ہے۔

الماجد ایک سفوف کے ذریعے میرے ہونٹ کا خون

روکنے کی کوشش کررہا تھا' وہ سرگوشی میں بولا "میرا خیال ہے کہ حربہ دائیں جانب والے شمالی کونے میں ہے۔ اب اسی ایک حربے کے ذریعے فیصلہ ہونا ہے۔ ایک حربہ باہر گر چکا ہے اور دوسرا اونچی شاخ پر اٹک گیا ہے۔"

"کیا اسے دوبارہ نہیں لٹکایا جائے گا؟"

"نہیں۔ مبارزت کے اصول کے مطابق' مبارزت کے دوران میں کسی حربے کا مقام تبدیل نہیں کیا جاتا۔ اب جو حربہ آپ کی ٹھوکر سے باہر گر گیا ہے وہ باہر ہی رہے گا اور جو شاخ پر اٹکا ہے وہ وہیں اٹکا رہے گا۔"

عبال نے پُرجوش لہجے میں الماجد سے کچھ کہا۔ الماجد نے ترجمانی کرتے ہوئے بتایا "عبال کہہ رہا ہے کہ آپ بہت اچھا لڑ رہے ہیں۔ آپ کی ضرب میں بہت طاقت ہے' خاص طور سے آپ نے جس طرح شنکر کے ہاتھ سے حربہ چھڑایا ہے' وہ منظر سب کو اش اش کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ فتح و شکست اور زندگی و موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن آپ بہت اچھا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

میں نے ایک نظر شاری کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی لمحے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ بظاہر اس کی نگاہوں میں لاتعلقی تھی لیکن اس لاتعلقی میں بھی ایک تعلق تھا۔ اس کی آنکھوں میں میری کامیابی کی امید تھی۔ شاری کا پالتو بندر اس کے پاؤں میں بیٹھا تھا۔ گول آئینہ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ حسب عادت اس کا عکس ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔ یہی عکس چند منٹ پہلے شنکر کی آنکھوں میں بھی پڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ صرف ایک اتفاق تھا یا پھر اس کے پیچھے شاری کی کوئی کرم فرمائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شریر بندر اپنا ہاتھ بار بار اپنی پیٹھ تک لے جانے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کوشش میں لٹو کی طرح گھومتا جا رہا ہے' اس کی پیٹھ پر ویسی ہی عجیب الخلقت مکڑی بیٹھی تھی جیسی کل رات میں نے اپنی کوٹھڑی میں دیکھی تھی۔ کل سے مجھے ایسی مکڑیاں دو تین جگہ نظر آئی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ مکڑیاں مقامی نہیں ہیں اور لوگ انہیں خاصی پریشانی کے عالم میں دیکھتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد شاری نے اپنے سامنے رکھے نقرئی گھڑیال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گھڑیال پر چوٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی شنکر کے ساتھ میری خونی لڑائی کے دوسرے دور کا آغاز ہو گیا۔ اکھاڑے میں ہم ایک دوسرے کے سامنے بازو پھیلائے کھڑے تھے' میری دلی خواہش تھی کہ کسی طرح شنکر کی منحوس گردن میرے قابو میں آجائے' دوسری طرف شنکر اس ارادے پر تھا کہ وہ میری ٹانگوں کے درمیان اپنے گھٹنے کی تباہ کن ضرب لگا سکے یا پھر میرے سینے کے نچلے حصے پر کہنی کا مہلک وار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

ہم ایک بار پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ طاقت ور تو تھا ہی مجھے ہر لحظہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ بدبخت کوئی عیاری کر جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ماضی میں کسی حد تک شنکر نے مجھ پر نفسیاتی برتری حاصل کر لی تھی اور اس برتری کا اثر اب تک میرے ذہن پر موجود تھا۔

انتہائی شدید اور زوردار لڑائی کے دوران میں ہی اندازہ ہوا کہ شنکر مجھے سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنے کی کوشش میں ہے۔ میں اب تک غیر ارادی طور پر شنکر کی کوشش کو ناکام بنا رہا تھا مگر اب اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ شنکر کتنی بڑی غلطی کر رہا ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار شخص بھی کسی موقع پر "نائب ودانی" کا مظاہرہ کر جاتا ہے۔ شنکر جو کر رہا تھا وہ "نائب ودانی" تو شاید نہیں تھی لیکن ایک بڑا "ٹیکنیکل فالٹ" تھا۔ غیظ و غضب کی انتہا میں وہ مجھے کریوں پٹخنا چاہ رہا تھا کہ مجھے شدید جسمانی نقصان پہنچے۔ اس جنون میں وہ ایک بات بالکل فراموش کر گیا تھا۔ ہمارے سروں کے عین اوپر وہ تیسرا حربہ موجود تھا جو شنکر کا ہاتھ لگنے سے شاخ میں الجھ گیا تھا۔ میں نے ذرا کمزوری دکھائی تو شنکر نے بجلی کی سرعت کے ساتھ مجھے اوپر اٹھا لیا۔ اکھاڑا اس کے ہم نواؤں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ جب شنکر نے سر سے بلند کیا' میرا اٹھا ہوا ہاتھ حربے سے ایک دو بالشت دوری پر تھا' میں نے معمولی کوشش سے حربہ حاصل کیا۔ اکھاڑے میں ایک دم موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ شنکر مجھے گردن کے بل زمین پر پٹختا میں نے اندھا دھند حربے یعنی خنجر کا وار کیا۔ خنجر کی نوک شنکر کے کان کے قریب کہیں لگی' تکلیف کی شدت سے وہ ڈگمگا گیا۔ میں نے مچل کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ نوک نے شنکر کی کنپٹی پھاڑ کر رکھ دی تھی۔ دوسرا وار شنکر کے سینے پر کیا۔ خنجر کا پھل پسلیاں چیر کر پھیپھڑوں میں اتر جاتا لیکن شنکر نے یہ وار ہاتھوں پر روکا' اس کی ہتھیلی زخمی ہوئی اور ایک انگلی کٹ کر لٹکنے لگی۔

شنکر کی بھوری آنکھوں میں حیرت تھی' شاید وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ خنجر میرے ہاتھ میں کہاں سے آیا' یا شاید وہ میری چال سے باخبر ہونے کے بعد حیرت زدہ تھا۔ اس عیار کی حیرانی نے مجھے جو سکون بخشا وہ بیان سے باہر ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی تھی' میری ایک ہی خواہش تھی' شنکر کے منحوس جسم کو زندگی سے محروم کر دوں۔ اس خنجر کو یوں بے دریغ استعمال کروں کہ ابن شیطان کے ٹکڑے اکھاڑے کی نیم گرم ریت پر بکھر

جائیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے بدترین حریف کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ وہ ڈول رہا تھا' کنپٹی کا زخم میری توقع سے زیادہ سنگین تھا۔ میرا خنجر والا ہاتھ شنکر کے پیٹ کو نشانہ بنانے کے لیے تیار ہوا تھا' عین اسی وقت رائفل کا دھماکا ہوا اور ایک گولی میرے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں' میں نے خنجر تھام رکھا تھا۔ دوسرا دھماکا ہونے سے پہلے میں نے خود کو ریت پر گرا لیا۔ دونوں فائر مکان کی چھت پر سے ہوئے تھے۔ میں نے رائفل کی نال کو حرکت کرتے صاف دیکھا۔ میرا ریت پر گرنا میرے لیے یقیناً بہت سود مند ثابت ہوا۔ دوسری گولی میرے بہت قریب سے گزری۔ میرے کندھے سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر اکھاڑے کی ریت ہوا میں اچھلی اور مجھے یوں لگا جیسے موت مجھے چھو کر گزر رہی ہے۔ فائرنگ سے ایک دم ہنگامہ مچ گئی' جس کا جدھر منہ تھا اُدھر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں دو فائر مزید ہوئے' پھر میں نے ابو آبان کے محافظوں کو رائفلیں سونتے دیکھا' وہ اسی چھت کی طرف متوجہ تھے جہاں سے مجھ پر گولی چلائی گئی تھی۔ محافظوں نے چھت کی طرف کئی فائر کیے' میں نے سفاری سوٹ والے ایک رائفل بردار کو قلابازی کھا کر چھت سے گرتے دیکھا' تب یکبارگی تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ آناً فاناً ہی اکھاڑے اور اردگرد کا علاقہ میدانِ کارزار کا نمونہ پیش کرنے لگا تھا۔

شنکر کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے' ایک چشم منصف بھی نظر نہیں آ رہا تھا' اکھاڑے کے قریب اونٹ کی کھال کا بہت بڑا نقارہ اوندھا پڑا تھا۔ نقارہ پیٹنے والا شخص گرم ریت پر اوندھا پڑا تھا' اس کا اپنا نقارہ بج چکا تھا۔ مجھے اس کے عین دل کے مقام پر گولی کا زخم نظر آیا۔ گولی قمیص پھاڑ کر پشت سے نکل گئی تھی۔ جونہی میں اکھاڑے سے باہر نکلا' ایک سنسنی خیز منظر دکھائی دیا۔ پتلون قمیص والے دو افراد نے شاری کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ایک نے اپنی رائفل شاری کی کنپٹی پر رکھی ہوئی تھی' دوسرے کی رائفل کا رخ شاری کے ذاتی محافظوں کی طرف تھا۔ یہ دونوں انڈین تھے پھر ان کے ساتھ ایک تیسرا فرد بھی شامل ہو گیا' یہ عشارب کا بہنوئی شیخ سالم تھا۔ اس کا سرخ چہرہ غیظ و غضب سے کچھ اور بھی سرخ نظر آنے لگا تھا۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں چلایا۔ یقیناً اس نے مقامی زبان میں شاری کے محافظوں کو دور رہنے کی ہدایت کی تھی اور انہیں وارننگ دی تھی کہ اگر حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو شاری کا خاتمہ بالخیر کر دیا جائے گا۔

محافظوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ ایک تو وہ ویسے بھی ابو ظہبی کے شیوخ سے مرعوب تھے' دوسرے ان کے ہاتھوں میں جدید ترین رائفلیں تھیں۔ ان کی اوسط اور گھٹیا درجے کی رائفلیں ان رائفلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں' اگر ایک بار پھر کھلم کھلا فائرنگ ہو جاتی تو پلک جھپکتے میں درجنوں مزید لاشیں گر جاتیں اور سو فیصد یقینی بات تھی کہ ان میں ایک لاش شاری کی بھی ہوتی۔ شاری جو قبیلے کی محبوب ہستی سارہ کی بیٹی تھی' جس کی رگوں میں ہر دل عزیز سردار شماس کا خون تھا اور جو قبیلے کی آئندہ سردار تھی۔ محافظ مجبور ہو گئے کہ وہ اپنی رائفلیں نیچے جھکا لیں۔ شیخ سالم اور اس کے دونوں انڈین ساتھی شاری کو کھینچتے ہوئے احاطے کے دروازے کی طرف بڑھے' شاری کے ننھے پالتو بندر نے "خوخو" کی آواز نکال کر سالم پر حملہ کرنا چاہا لیکن سالم نے اس کے منہ پر اس زور سے رائفل کا بٹ رسید کیا کہ وہ بلبلاتا ہوا دور جا گرا اور پھر بالکل سہم کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔

شاری مزاحمت کر رہی تھی' ساتھ وہ چلا بھی رہی تھی۔ اس کی آواز میں تحکم اور شدید برہمی تھی۔ وہ واقعی ایک جنگ جو لڑکی تھی۔ اس کی شدید مزاحمت دیکھ کر مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اسے یرغمال بنانے والے گھبراہٹ میں اسے شوٹ ہی نہ کر دیں۔ سالم اور اس کے ساتھی شاری

محمود احمد مودی کے جادوئی قلم سے ایک خوبصورت ناول

کنارہ

- ایک ایسے آدم زاد کی عبرتناک داستان جسے اولاد آدم نے ڈس لیا تھا
- سچی محبت کے متلاشی کو دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہ ملا

قیمت 20/

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز — 20-عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور — فون: 7247414

اسٹاکسٹ: بک سٹال — چوک میو ہسپتال' نسبت روڈ' لاہور — فون: 7223853

کو کھینچتے ہوئے احاطے سے باہر لے گئے۔ ان کے باقی ساتھی بھی اب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے ان میں انڈین اور سالم کے ساتھی سب شامل تھے' میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد کسی طرح بھی بیس سے کم نہیں تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں سے بیشتر کے ہاتھوں میں رائفلیں نظر آرہی تھیں۔ حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اکھاڑے میں شنکر سے میری لڑائی ہو رہی تھی تو یہ لوگ خالی ہاتھ نظر آرہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ سب کچھ منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا تھا۔ اسلحہ اکھاڑے کے آس پاس ہی کہیں چھپایا گیا تھا۔ سالم اور اس کے ساتھیوں کا ارادہ تھا کہ اگر شنکر کی شکست کی صورت نظر آئی تو وہ بازی الٹ دیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ہم جتنی دس لاشیں تو میں احاطے میں ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کی سب لاشیں مقامی لوگوں کی تھیں۔ جدید اسلحے نے پلک جھپکنے میں ان لوگوں کو چھلنی کروالا تھا۔ گلی میں پہنچ کر سالم اور اس کے ساتھیوں کا رخ اپنی قیام گاہ کی طرف ہو گیا۔ وہ شاری کو بڑے توہین آمیز انداز میں اپنے ساتھ کھینچ رہے تھے۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں وہاں کھڑے تھے لیکن کوئی بھی کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ وہ سب خوف و ہراس کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں اپنی ٹھوڑی اور ہونٹ سے خون پونچھتا ہوا باہر گلی میں آگیا۔ یہاں عورتوں کی ایک ٹولی بلند آواز میں دوہائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ عورتیں اپنے مردوں کو اکسا رہی تھیں کہ وہ شاری کو مسلح افراد سے چھڑانے کے لیے کچھ کریں۔

اچانک شاری نے جنگلی گھوڑی کی طرح زور مارا اور ایک انڈین غنڈے کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے دوسرے غنڈے کی ناف میں ٹانگ رسید کر کے خود کو اس سے چھڑانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ شیخ سالم نے اس کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ مارا' ایک دوسرے امیرزادے نے اسے دھکا دیا اور وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری۔ شیخ سالم نے اس کی طرف اپنی رائفل سیدھی کرلی۔ انداز خوفناک تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ شاری کو دہشت زدہ کرنا چاہ رہا ہے۔ ماحول میں زبردست تناؤ تھا۔

ایک دم میں نے بلندی سے ایک پرچھائیں گرتے دیکھی۔ یہ ایک شخص تھا جو قریبی چھت سے کودا تھا اور سیدھا شاری پر گرا تھا۔ اس نے شاری کو اپنے جسم سے ڈھانپ سا لیا تھا۔ عجیب والہانہ انداز تھا اس کا۔ سالم اور اس کے ساتھی چند لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آئے' شاید وہ فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ اپنی رائفلیں استعمال کریں یا نہیں۔ یہ تاخیر ان کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔

اچانک قریبی چھتوں سے ان پر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتے' کم از کم آٹھ افراد خاک و خون میں لوٹ گئے۔ میں نے شیخ سالم کو بھی ٹانگ پر گولی کھا کر گرتے دیکھا۔

میں زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دیوار کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے شیخ سالم کے چہرے پر طیش کے علاوہ حیرت کے آثار بھی نظر آئے۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اہل بستی یوں ان کے "مقام و مرتبے" کو پس پشت ڈال کر گولیوں سے بھوننا شروع کردیں گے۔ یہ شدید ترین اور جان لیوا فائرنگ بمشکل آدھ منٹ جاری رہی تاہم اس کا نتیجہ مختصر دورانیے کے باوجود لرزہ خیز تھا۔ شیخ سالم اور شنکر کے قریب آٹھ نو ساتھی خاک و خون میں لوٹ گئے تھے۔ باقیوں نے دہشت کے عالم میں رائفلیں پھینک دی تھیں اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مشتعل بدوؤں نے انہیں دبوچ لیا اور مار پیٹ کر ان کی مشکیں کس دیں۔ یہ سارا واقعہ بمشکل تین چار منٹ کے اندر رونما ہوا تھا۔

چھت سے کود کر شاری کو اپنے جسم کی آڑ میں لینے والا اور پھر اسے فائرنگ کی زد سے نکال کر لے جانے والا الماجد تھا۔ وہ شاری کے ذاتی محافظوں میں سے تھا اور اس نے محافظت کا حق ادا کردیا تھا۔ اس کا دلیرانہ انداز ایسا نہیں تھا کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھے دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ دو افراد نے اس کا زخمی بازو تھام رکھا تھا۔ خون کے قطرے ٹپ ٹپ ریت پر گر رہے تھے۔ یقیناً اسے گولی لگی تھی۔ الماجد کے بازو کا زخم دیکھ کر اپنے بازو کا زخم مجھے یاد آگیا۔ گولی کہنی سے اوپر بازو کے پچھلے حصے میں لگی تھی اور گوشت چیرتے نکل گئی تھی۔ یہ معمولی نوعیت کا زخم تھا۔ اس کے برعکس الماجد کا زخم سنگین نظر آرہا تھا۔

میں نے الماجد کے پاس جاکر پوچھا "شاری کہاں ہے؟"

"اندر کمرے میں ہے۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

"زخمی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ معمولی چوٹیں آئی ہیں۔"

"اور شنکر؟"

"وہ کہاں جائے گا۔ بستی میں ہی کہیں ہوگا' ابھی پکڑا جائے گا۔"

فائرنگ کا سنگین ہنگامہ ختم ہوا تو آس پاس کے لوگوں کو میری موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ میرے گرد اکٹھے ہو گئے ان میں زیادہ تر میرے خیر خواہ تھے' ان کے چہرے گواہی دے رہے تھے کہ وہ میری کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہیں او

مجھے فاتح قرار دے رہے ہیں۔ شاید صورت حال بہتر ہوتی تو وہ مجھے کندھوں پر اٹھا لیتے اور فلک شگاف نعرے بلند کرتے مگر اس وقت ماحول بے حد گمبھیر ہو رہا تھا۔ فضا میں ابھی تک بارود کی بو تھی اور یہاں وہاں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کو دیکھ کر ہر آنکھ میں ہراس اترا ہوا تھا۔ بہت سے مرد و زن تو ایسے تھے جو پہلی گولی چلتے ہی بھاگ گئے تھے اور اب گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

چند لمحے بعد مجھے شاری نظر آئی۔ اس کا حوصلہ بلند تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ پہلے تک شدید خطرے کی زد میں رہی ہے۔ شاری کی ہدایت پر [illegible] نے والے افراد کو اٹھا اٹھا کر شفا خانے کی طرف لے جایا جانے لگا۔ ان زخمیوں میں مجھے شیخ سالم بھی نظر آیا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر شنکر کی تھی' وہ آزاد تھا اور اس کی آزادی میرے ذہن میں اندیشوں کا طومار باندھ رہی تھی۔ یقیناً شاری کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سیدھی میری طرف چلی آئی۔ اس کا بندر چھلانگیں لگاتا اس کے عقب میں آرہا تھا۔ اس کا منہ بھی خون آلود تھا۔

"تم ٹھیک تو ہونا؟" شاری نے مجھ سے پوچھا اور میرا بازو دیکھنے لگی۔

"معمولی زخم ہے۔" میں نے کہا "گولی ہڈی میں نہیں لگی۔"

وہ بولی "اس حرام زادے (شنکر) کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا۔ زنداں میں تمہاری ساتھی اکیلی ہوگی۔ تم فوراً اس کے پاس پہنچو۔ میں تمہارے پیچھے گارڈز بھی بھیجتی ہوں۔"

میں سیدھا زنداں میں پہنچا۔ غزالہ کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ بے حد سہمی ہوئی تھی۔ مجھے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی جو کیفیت نمودار ہوئی شاید اسے میں لفظوں میں بیان نہ کرسکوں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

"شنکر سے آپ کا مقابلہ نہیں کرایا گیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"کرایا گیا ہے۔ تمہارا خیال درست تھا۔ شنکر اور اس کے ساتھی داؤ پر تھے۔ شنکر ہارنے لگا تو انہوں نے دھاوا بول دیا۔ ابھی جو اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی وہ اسی سلسلے میں تھی۔"

"شنکر کا کیا بنا؟" غزالہ نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"وہ شدید زخمی ہوا ہے لیکن بچ گیا ہے۔ اکھاڑے سے بھاگ کر بستی ہی میں کہیں چھپ گیا ہے۔"

"کہیں وہ اسی طرف نہ آگیا ہو؟"

"اسی لیے تو آیا ہوں' ہمیں اس کی طرف سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ بدبخت نیم پاگل ہو چکا ہے۔"

اسی وقت غزالہ کا دھیان میرے زخمی بازو کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھ سے اس زخم کے بارے میں پوچھنے لگی پھر وہ اندر سے کپڑے کی پٹی لے کر آئی اور میری مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ ساتھ ساتھ وہ اس ہنگامے کے متعلق سوالات بھی کرتی جارہی تھی جو زنداں سے باہر ہوا تھا اور جس کی گونج ابھی تک بستی میں موجود تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خوف و ہراس میں اضافہ ہو' لہٰذا میں نے اس ہنگامے کی اصل شدت اور خون ریزی سے اسے آگاہ نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد الماجد بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے بازو پر ایک بڑی پٹی بندھی تھی' چہرے پر تکلیف کے آثار اب بھی پائے جاتے تھے۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے گلے سے لگا لیا اور جذبات سے لرزاں آواز میں بولا "لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوسکا یہ علیحدہ بات ہے لیکن آپ نے سو فی صد میدان مار لیا ہے۔ قیمتی جانیں ضائع ہونے پر تو سب کو افسوس ہے لیکن میں آپ کو دل کی گہرائی سے مبارک باد دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "تم بھی مبارک باد کے مستحق ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس کامیابی میں تمہاری اور عبال کی تربیت کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ اور ہاں ایک مبارک باد اور بھی ہے۔ تم نے شاری کی حفاظت کے سلسلے میں جس دلیری کا مظاہرہ کیا ہے' اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ میں نے وہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں اداسی تیر گئی "وہ تو ایک غلام کا فرض تھا۔ اگر یہ فرض ادا نہ ہو سکتا تو ڈوب مرنے کا مقام تھا۔"

"خیر چھوڑو یہ باتیں۔ شنکر کا کچھ پتا چلا؟"

"اس کی تلاش ہو رہی ہے' مجھے یقین ہے کہ وہ بدکار ابھی تھوڑی دیر میں پکڑا جائے گا۔ وہ اچھا خاصا زخمی ہے' مجھے نہیں یقین کہ زیادہ مزاحمت کرپائے گا۔"

"اور سالم وغیرہ کہاں ہیں؟"

"انہیں زنداں میں لایا جارہا ہے۔ شاری ان پر سخت غضب ناک ہے' بلکہ اب تو پوری بستی ان کے خلاف ہے۔ سارا ادب احترام خاک میں مل گیا ہے ان کا۔ یہ دوسری مرتبہ ہے کہ انہوں نے ہم سب کو بدترین دھوکا دیا ہے۔ پہلی بار انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور ریگستان میں چوری چھپے آپ کا پیچھا کیا اور اس مرتبہ تو ہر حد پار کی ہے انہوں نے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ خدا کرے میرا

اندیشہ غلط ثابت ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ ابھی جو فائرنگ ہوئی ہے اس میں کم و بیش بیس افراد کی جانیں گئی ہیں۔ بہت سے زخمی ہیں اور ان میں سے بھی کئی صبح تک چل بسیں گے۔"

الماجد کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں میں ابو تبان کا بیٹا حاتم بھی شامل ہے۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اسے نشانہ باندھ کر گولی ماری گئی ہے اور گولی مارنے والا شنکر کا ایک انڈین ساتھی ہے۔

حاتم وہی شخص تھا جو صحرا میں ہماری مدد کو پہنچا تھا۔ جب شنکر نے چوری چھپے صحرا میں میرا اور غزالہ کا تعاقب کیا تھا تو حاتم ہی ہمیں مشکل سے نکالنے کے لیے کمک لے کر پہنچا تھا۔ بعد ازاں حاتم نے شنکر پر جال پھنکوایا تھا اور حاتم کے ساتھیوں نے شنکر کو زدوکوب بھی کیا تھا' غالباً اسی واقعے کا بدلہ لینے کے لیے ہنگامے کے دوران میں حاتم کو گولی ماری گئی تھی۔ اہلِ بستی پر اس واقعے نے بھی گہرا اثر چھوڑا تھا اور وہ ابو ظبی کے شیوخ کا سارا ادب و احترام بھول گئے تھے۔

الماجد کی اطلاع کے عین مطابق کچھ ہی دیر بعد شیخ سالم سمیت تمام قیدیوں کو زنداں میں پہنچا دیا گیا۔ انہیں باقاعدہ زنجیریں پہنائی گئی تھیں۔ ان کے لیے زنداں کی دو عقبی کوٹھڑیاں منتخب کی گئی تھیں۔ یہ کوٹھڑیاں کافی فاصلے پر تھیں پھر بھی شیوخ کی غضب ناک آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ یقیناً وہ بدوؤں کو خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے اور اپنے تئیں کوشش کر رہے تھے کہ شاید انہیں گرفتار کرنے والے ان کے رعب میں آ جائیں لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔

رات گئے تک الماجد کی زبانی مجھے باہر کی خبریں ملتی رہیں۔ پوری بستی پر سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ فائرنگ میں ہلاک ہونے والوں کے لواحقین ماتم کناں تھے اور ان کے نوحے بار بار رات کا سینہ چیر رہے تھے۔ الماجد کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گرفتار شدگان کے خلاف کوئی سخت فیصلہ ہونے والا ہے۔ پوری بستی میں غم و غصے کی لہر دوڑی ہوئی تھی' اس معاملے میں سب کی رائے ایک ہو گئی تھی۔ لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ابو ظبی سے نازل ہونے والے مہمانوں کی نیت شروع دن سے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ہر مسئلے میں اپنی مرضی کا حل چاہتے تھے۔ وہ تعداد میں بے شک تھوڑے تھے لیکن انہیں اپنے جدید ترین اسلحے اور اپنی عیاری پر گھمنڈ تھا۔ اسی گھمنڈ میں انہوں نے کئی افراد کا خون اپنی گردن پر لے لیا تھا۔

رات دس بجے کے قریب ایک اور خوش کن خبر ملی۔ الماجد بھاگا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ شنکر شکرا پکڑا گیا ہے۔ اس کی گرفتاری زنداں کے قریب سے ہی ہوئی تھی۔

الماجد نے بتایا "اس بدبخت نے یہاں پاس ہی ایک گھر میں گھس کر ایک عورت اور اس کے بچے کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ شام کے بعد عورت کا شوہر آیا تو اسے بھی گھر میں پابند کر دیا۔ اس نے گھر کے اندر سے ہی گوشت کاٹنے والی چھری حاصل کی تھی اور یہ چھری مسلسل بچے کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔ لڑائی میں اس کی کنپٹی پر جو زخم آیا تھا وہ کافی سنگین ہے اس میں سے مسلسل خون رس رہا تھا' ابھی تھوڑی دیر پہلے شنکر پر غشی طاری ہونے لگی تھی۔ عورت نے اس کے سر پر ایک لٹھ سے وار کیا اور بے ہوش کر کے گرا دیا۔ اس کے فوراً بعد ان لوگوں نے ہمیں اطلاع دی' ہم نے جا کر اس کی مشکیں کس لیں۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"اسے شفا خانے لے جایا گیا ہے اور ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ویسے یہ بہت اچھا ہوا ہے کہ وہ پکڑا گیا ہے' اس کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ ہنگامے کے وقت اکھاڑے سے فرار ہو کر وہ سیدھا زنداں کی طرف آیا تھا۔ اس کا ارادہ شاید....." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا اور غزالہ کی طرف دیکھنے لگا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ شنکر کے حوالے سے غزالہ کا ذکر کرنا چاہ رہا تھا۔ میں خود بھی اسی اندیشے کا شکار تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ شنکر غیظ و غضب کی حالت میں غزالہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ ہنگامے کے بعد وہ جتنی دیر آزاد رہا تھا' میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجتی رہی تھی۔ غزالہ کے حوالے سے شنکر نے مجھے جو دھمکی دے رکھی تھی وہ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ اس نے غزالہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی شرم ناک سوگند کھائی تھی اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شنکر کی دھمکی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

الماجد نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ہنگامے کے بعد شنکر زنداں میں آنا چاہ رہا تھا' ہو سکتا ہے کہ محافظوں کی نگاہ سے بچنے کے لیے وہ قریبی مکان میں گھس گیا ہو اور پھر وہاں سے باہر نہ نکل سکا ہو۔"

میرے ذہن میں بھی اسی قسم کی بات آ رہی تھی۔ زنداں کے قریبی مکان سے شنکر کا پکڑا جانا بے معنی نہیں تھا۔ رات کا باقی حصہ میں نے اور غزالہ نے سوتے جاگتے گزار دیا۔ بستی کا ماحول اتنا سوگوار تھا کہ سکون کی نیند آ ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے بازو سے ٹیسیں بھی رہ رہ کر اٹھتی تھیں اور پورے جسم کو جھنجھوڑ دیتی تھیں۔ آخری پہر جب

خوش گوار ہوا چلی تو میں کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ میری آنکھ فائرنگ کی مسلسل آواز سے کھلی تھی۔ زبردست "تڑ تڑ" تھی جو ہمیں بالکل پاس سے سنائی دے رہی تھی' غزالہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ قریباً ایک منٹ بعد فائرنگ ختم ہو گئی۔ اس فائرنگ میں سیون ایم ایم اور زیل ٹو قسم کی رائفلیں استعمال کی گئی تھیں۔

میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید کسی قیدی یا قیدیوں نے زنداں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ شاید ابھی تک بستی میں کوئی ایسا گروپ موجود ہو جس کی ہمدردیاں ابو ظبی کے امیرزادوں کے ساتھ ہوں اور ان کے ساتھ محافظوں کی جھڑپ ہوئی ہو۔ ایک بار آنکھ کھلی تو دوبارہ نیند نہیں آئی۔ میں بے تابی سے الماجد کا انتظار کرنے لگا۔ وہی بتا سکتا تھا کہ علی الصباح کیا واقعہ ہوا ہے۔ مجھے امید تھی کہ زیادہ سے زیادہ ناشتے کے وقت تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ناشتے پر الماجد کی صورت نظر آ جائے گی لیکن یہ امید بھی بر نہیں آئی۔ ناشتا لانے والی حبشی کنیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ عبال تھا۔ (عبال نے ہی مجھے مبارزت کے حوالے سے خنجر زنی کے کچھ داؤ پیچ بتائے تھے) عبال انگریزی نہیں جانتا تھا۔

میں نے اشاروں کنایوں میں عبال سے پوچھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے فائرنگ کیسی ہوئی ہے۔

عبال کے چہرے پر سنسنی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے اشاروں کی زبان میں مجھے جو کچھ بتایا اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ عبال نے بتایا کہ کل پکڑے جانے والے سارے قیدیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا ہے۔

پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر جنوبی کھڑکی کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھے کھڑکی سے باہر کا منظر دکھایا۔ یہ منظر عبال کی اطلاع ہی کی طرح سنسنی خیز تھا۔ میں سکتے کے عالم میں دیکھتا رہ گیا۔ ایک چھکڑا نما گاڑی میں قریباً ایک درجن لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کے صرف پاؤں نظر آ رہے تھے۔ جوتے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ابو ظبی کے امیرزادوں اور ان کے گماشتوں کی لاشیں ہیں۔ چھکڑے کے نیچے سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ جیسا کہ مجھے کئی روز پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ابو ظبی کے یہ امیرزادے اپنے ساتھ ایک جیپ بھی لے کر آئے ہیں۔ اس جیپ کے ٹائر خاص قسم کے تھے اور یہ خصوصی طور پر ریتیلے علاقے میں سفر کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ مجھے خون آلود چھکڑے کے پاس وہ گرد آلود جیپ بھی نظر آ گئی۔

میں نے غزالہ کو صورتِ حال بتائی۔ وہ بھی ششدر رہ گئی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بدوؤں کی گولیوں کا شکار ہونے والے ابو ظبی کے گنے چنے امیرزادے تھے اور ان میں شیخ عشارب کا بہنوئی شیخ سالم بھی شامل تھا۔ مجھے اس فیصلے سے بحث نہیں تھی کہ یہ اچھا ہے یا برا لیکن بے شک یہ ایک دلیرانہ فیصلہ تھا۔ میں نے عبال سے شنکر شکرا کے بارے میں پوچھا۔ کوشش کے باوجود میں اسے اپنی بات سمجھا نہیں پایا۔

اسی رات شاری نے مجھے اپنی خلوت گاہ میں طلب کیا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور غم کے آثار تھے' آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔ وہ ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ پالتو بندر جس کا نام بالی تھا' اس کے پاؤں میں لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ جو بندر میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا اس کا نام "سوبالو" تھا۔ شاری نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولی "تم مبارک باد کے مستحق ہو۔ تم نے "مبارزت" جیت لی ہے۔ اب صرف رسمی کارروائی باقی ہے۔"

"رسمی کارروائی؟ میں سمجھا نہیں؟"

"مبارزت کے اصول کے مطابق شنکر کو تمہارے ہاتھوں سے ہلاک ہونا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو آج علی الصباح اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہی گولی سے اڑا دیا جاتا۔"

"شنکر اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شفا خانے میں ہے اور مسلسل بے ہوش ہے۔ اسے قتل کرنے سے پہلے ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"کیا یہ بھی مبارزت کا کوئی اصول ہے؟"

"نہیں' مبارزت کا اصول تو نہیں لیکن اس بدبخت شخص کو مرنے سے پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس کے ہاتھوں مر رہا ہے اور اسے وہ تمام اذیت سہنی چاہیے جو مرنے والا سہتا ہے' جو چچا ابو آبان کے بیٹے نے سہی ہے اور بستی کے درجنوں لوگوں نے سہی ہے۔" شاری کے لہجے میں درندگی تھی اور اس گھڑی وہ اپنی تعلیم یافتہ ماں سے زیادہ اپنے جنگجو باپ کی بیٹی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زخمی اور بیمار دشمن پر وار کرنا مردانگی نہیں۔"

وہ ایک دم بھڑک گئی "اور ان لوگوں نے جو کچھ دو مرتبہ تمہارے ساتھ کیا ہے کیا وہ مردانگی تھی؟ پہلی مرتبہ تمہیں حاتم نے بچایا۔ دوسری مرتبہ اکھاڑے میں میرے محافظوں نے جانیں دیں' اس سارے کشت و خون کا ذمے دار کون ہے؟ شنکر ہے.... اور اگر شنکر نہیں ہے تو پھر تم ہو۔"

وہ خاصی برہم تھی۔ میں نے اس موقع پر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اپنے کھلے بالوں کو وہ بار بار جھٹک کر چہرے سے ہٹا رہی تھی' بلوری صراحی میں سے ایک جام پینے کے بعد وہ قدرے پرسکون ہوئی اور بولی "کچھ لوگ رحم کے قابل نہیں ہوتے' میں سمجھتی ہوں کہ یہ شخص جو شفا خانے میں پڑا ہے انہی لوگوں میں سے ہے۔ اگر اسے اذیتیں دے کر مارا جائے تو بھی انصاف کے خلاف نہیں ہوگا۔ ہم تو صرف جان لے رہے ہیں۔"

' میں نے پوچھا "کیا باقی سب قیدیوں کو مار دیا گیا ہے؟"

"ہاں۔ اس مسئلے کا بہترین حل یہی تھا۔ اب نہ کوئی اس صحرا سے نکل کر واپس کسی آبادی تک پہنچے گا اور نہ کسی کو ان امیر زادوں کی ہلاکت کا علم ہو سکے گا۔ ان لوگوں کا کھوج کھرا مٹانے کے لیے ہم نے ان کی جیپ اور ان کے دس اونٹوں کو بھی گولی مار کر ان کی لاشوں کے ساتھ ہی دفن کر دیا ہے۔ ان لوگوں سے متعلق کوئی چیز بھی باقی نہیں رہنے دی۔ اسے جلا دیا گیا ہے یا دفن کر دیا گیا ہے۔"

"یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔"

"لیکن ہمیں کرنا پڑا۔ تھوڑی بہت مخالفت بھی ہوئی لیکن بستی کے عام لوگوں میں شدید غم و غصہ پایا جا رہا تھا' اور پھر چچا ابو آیان کے بیٹے کی ہلاکت کا بھی لوگوں پر بہت اثر تھا۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ بستی کے بے گناہ مقتولوں کو دفنانے سے پہلے پہلے ان کا انتقام لیا جائے۔"

"کیا اس بات کا اندیشہ نہیں کہ کچھ لوگ مرنے والوں کو تلاش کرتے ہوئے اس بستی تک پہنچ جائیں؟"

"اب یہ امکان بہت کم ہے اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو یہاں سے انہیں مرنے والوں کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔"

"تم ایک شخص کو بھول رہی ہو۔ شیخ عاصم۔ اس کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ وہ اس ریگستان سے نکل کر واپس ابوظہبی جا پہنچا ہو۔ وہ اس بستی کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے۔"

"یہ قریباً ناممکن ہے۔ یہاں سے کسی بھی سمت میں سفر کریں تو صحرا سے نکلنے کے لیے پانچ چھ روز کا سفر بنتا ہے۔ اس شخص کے پاس سواری تھی اور نہ ہی اتنا پانی تھا کہ وہ یہ مہم جوئی کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا سراغ اردگرد کی کسی بستی سے لگ جائے گا یا پھر اس کا ڈھانچا کہیں ریت میں دبا ہوا مل جائے گا۔"

"یعنی تمہیں یقین ہے کہ ان امیر زادوں کا قتل ہمیشہ کے لیے اس بستی کی ریت میں دفن ہو چکا ہے؟"

"ہاں! ہم نے یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"کیا تم لوگ ہم پر اعتبار کر پاؤ گے؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا تمہیں اور بستی کے دیگر معززین کو اس بات کی فکر لاحق نہیں ہوئی کہ ہم یہاں سے واپس جا کر اس ہلاکت خیز واقعے کا راز فاش کر دیں گے؟"

شاری کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے بلوری صراحی میں سے شراب سرخ کے دو جام بھرے۔ ایک میرے سامنے رکھ دیا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک ہی سانس میں جام خالی کر کے اس نے مخمور نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "مجھے لگتا ہے کہ قدرت کو ہمارا ساتھ دیر تک منظور ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کیا یہاں دیر تک رہنے کے لیے یہ پُرسکون بستی مناسب نہیں ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کہیں تم مجھے یہ تو نہیں سمجھا رہی ہو کہ اب ہم یہاں سے جا نہیں سکیں گے؟"

"وہ ہو تم تو ڈر گئے۔" شاری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "میں تو یونہی ایک بات کر رہی ہوں' کوئی فیصلہ تو صادر نہیں کر رہی۔" پھر ذرا توقف سے بولی "ویسے شاہ جہاں! اگر تمہیں یہاں رکنے کے لیے کہا بھی جائے تو یہ نامناسب تو نہیں ہوگا۔ اس صحرا سے باہر تمہارے لیے بہت سے خطرات ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ گمشدہ امیر زادوں اور اغوا کنندگان کی تلاش زور و شور سے ہو رہی ہوگی۔ جونہی تم صحرا سے نکلو گے' کسی متلاشی پارٹی کے ہاتھوں دھر لیے جاؤ گے۔ اس میں کیا مضائقہ ہے کہ کچھ عرصہ تم یہیں رک جاؤ۔"

"میں اس بارے میں فوری طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

شاری نے مسہری پر نیم دراز ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز بہت نمایاں نظر آنے لگے۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "کچھ روز پہلے جب تم اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ یہاں سے چلے گئے تھے تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی تھی۔ میں نے سوچا تھا' اب دوبارہ تمہاری صورت کہاں دیکھ پاؤں گی مگر قدرت تمہیں گھیر کر پھر یہاں لے آئی۔ میرے پاس' میری خواب گاہ میں۔ آخر اس میں کوئی نہ کوئی راز تو ہوگا۔"

"ہاں ایک راز ہے۔" میں نے کہا "شاید قدرت یہ

چاہتی ہے کہ میں تمہیں ایک بہت بڑی غلط فہمی سے نکالوں اور ایک بہت بڑی حقیقت سے روشناس کراؤں۔" ایک لمحہ توقف کر کے میں نے کہا "کل سہ پہر "مبارزت" سے پہلے میں نے الماجد کو تمہارے لیے ایک خط دیا تھا' امید ہے کہ تمہیں مل گیا ہوگا۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ ایک دم خفا نظر آنے لگی "ہاں وہ خط میں نے دیکھ لیا تھا۔ مجھے نہیں یقین کہ یہ میرے والد کے خیالات ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ والد مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک ایسا غلام جو میرے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہتا ہے' میرا دولہا بن کر میری سیج پر بیٹھے۔ وہ یقیناً الماجد کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کے گلے میں ذلت کا ہار ڈال دیں۔ میرے والد تو دور کی بات ہے' مجھے یقین ہے کہ بستی کا کوئی عام آدمی بھی میرے حق میں اتنا برا نہیں سوچ سکتا۔ اگر یہ خط تمہاری طرف سے نہ ہوتا تو شاید میں خط بھیجنے والے کی گردن مار دیتی۔ سورج مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن میرے والد ایسا نہیں سوچ سکتے۔"

میں نے کہا "وہ سوچ سکتے ہیں اور انہوں نے سوچا ہے۔ پتا ہے انہوں نے کیوں سوچا ہے' اس لیے کہ وہ تمہارے والد ہیں اور تمہارے دل میں جھانک سکتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ بظاہر تمہارا سلوک الماجد کے ساتھ کیسا بھی ہو لیکن تمہارے اندر کہیں الماجد کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ تم اسے۔۔"

"اسٹاپ اٹ!" شاری یکایک چیخ کر بولی "تم حد سے تجاوز کر رہے ہو۔"

"سچی بات اکثر کڑوی ہوتی ہے۔" میں نے کہا "بلکہ میرا تو ایک اور خیال بھی ہے مس شاری۔ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے لگاوٹ کا جو اظہار کر رہی ہو اس کے پیچھے بھی الماجد کو ستانے اور تڑپانے کی خواہش چھپی ہوئی ہو۔"

وہ کڑک کر بولی "گیٹ آؤٹ۔ آئی سے گیٹ آؤٹ۔" اس کے ساتھ ہی وہ غصیلی بلی کی طرح مجھ پر جھپٹی۔ اس کا ہاتھ لگنے سے میرا زخمی بازو جھنجھنا اٹھا۔ سفید پٹی پر ایک دم خون ابھر آیا تھا۔

میری تکلیف محسوس کر کے شاری کا چڑھا ہوا پارا کچھ نیچے آیا۔ وہ بولی "مسٹر شاہ جہاں' اگر تم آئندہ مجھ سے اس سلسلے میں بات نہ کرو تو یہ بہتر ہوگا۔"

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے اپنے بیشتر کپڑے اتار پھینکے اور دہکتا ہوا عیش خانۂ کمی...

کپڑے اتار پھینکے اور دمدماتی ہوئی حوض نما ٹب میں لیٹ گئی "اب تم جا سکتے ہو۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"مگر تمہارا ارادہ آج پھر ڈوبنے کا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں' ایک ہی مرتبہ ڈوب کر بہت پچھتا رہی ہوں۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں۔"

"اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ میں جا رہا ہوں' بستی چھوڑ کر۔ غزالہ اور بچے کو بھی لے جا رہا ہوں۔"

وہ اطمینان سے بولی "پہرے داروں کو تمہارے بارے میں تفصیلی ہدایات دی جا چکی ہیں' وہ تمہارے بدن میں درجن بھر سوراخ کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچائیں گے۔"

پھر اس نے ٹب میں لیٹے لیٹے مخصوص انداز سے تالی بجائی۔ دو حبشی کنیزیں اندر داخل ہوئیں۔ شاری نے انہیں مقامی زبان میں کوئی حکم دیا۔ انہوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور باہر جا کر پہرے داروں کے سپرد کر دیا۔ ان میں الماجد بھی موجود تھا۔ وہ دکھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پہرے دار مجھے لے کر زنداں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں مجھے ہر طرف سوگواری کی کیفیت نظر آئی۔ کل ہونے والے قتلِ عام کی وجہ سے لوگوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ پتا نہیں یہ اس سوگواری کا ہی اثر تھا کہ چاند بھی آج گدلا گدلا سا نظر آتا تھا۔ ایک جگہ میں نے چند افراد کو دیکھا۔ وہ افراتفری کے عالم میں زمین پر جوتے برسا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک مکڑی کو ہلاک کر رہے ہیں۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں زنداں میں واپس پہنچ گیا۔ غزالہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ بچہ اس سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر غزالہ کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت نمودار ہوئی۔ اس نے بچے کو بڑی آہستگی کے ساتھ خود سے جدا کر دیا۔ وہ میرے پاس آ بیٹھی اور شاری سے میری ملاقات کا احوال پوچھنے لگی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت ملی ہے یا نہیں۔ درحقیقت قتل و غارت کے اس ماحول میں وہ بے حد سہم چکی تھی۔ اسے یہ بھی یقین ہو چکا تھا کہ شیخ عاصم یہاں نہیں ہے لہٰذا وہ چاہتی تھی کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔ میں شاری کی طرف روانہ ہوا تھا تو غزالہ نے خاص طور سے تاکید کی تھی کہ میں شاری سے یہاں سے جانے کی اجازت مانگوں۔ اب میں واپس آیا تو وہ جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

آخر اس نے پوچھ ہی لیا "واپس جانے کے بارے میں بات ہوئی؟"

"ہاں میں نے پوچھا تھا۔ وہ کہتی ہے یہ فیصلہ اتنی جلدی نہیں کیا جاسکتا۔ چند روز تک اس بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے گی۔"

غزالہ ذرا توقف سے بولی "کیا ہم اپنے طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش نہیں کرسکتے؟"

"یہ بڑا مشکل کام ہے غزالہ۔ سواری' سامان رسد اور رہبر کے بغیر ہم یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ویسے بھی ہمیں اتنا بڑا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔ شاری نے صرف چند دن انتظار کرنے کو کہا ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"کیسا نہیں ہوگا؟"

"میرا مطلب ہے کہ ان لوگوں نے امیرزادوں کے قتل کا کھوج مٹانے کے لیے بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ ہر وہ چیز تلف کردی ہے جس کا تعلق قتل ہونے والوں سے تھا۔ آخری کھوج ہم رہ گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں بھی مٹانے کی کوشش کی جائے۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"شنکر اب کہاں ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔ شنکر کا نام لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز جاتی تھیں۔

"وہ شفا خانے میں بے ہوش پڑا ہے۔ مشکل سے بچے گا۔ اگر بچ بھی گیا تو قبیلے کے قانون کے مطابق قتل کروا دیا جائے گا۔"

میں نے غزالہ سے یہ بات چھپائی کہ قبیلے کے قانون کے مطابق شنکر کو مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا ہوگا۔ غزالہ مجھ سے لڑائی (مبارزت) کا احوال جاننا چاہتی تھی' میں نے مختصرا بتایا اور یہ بھی بتایا کہ یہ لڑائی میں کیونکر جیت سکا ہوں۔ میں نے برملا لڑائی سے ایک رات پہلے والے اس واقعے کا ذکر کیا جب وہ ایک اتفاق کے تحت میری بانہوں میں چلی آئی تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ اس واقعے نے میرے اندر امید اور جوش و خروش کا جو دریا بہایا تھا شنکر اسی دریا کی روانی میں بہا ہے۔ غزالہ نے میری بات پر کوئی بھی تبصرہ کرنے سے گریز کیا تھا۔

رات بھیگتی رہی۔ میں غزالہ سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ پرسوں ہونے والی خوں ریزی نے اس کے اعصاب کو ایک بار پھر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ گدیلے پر بچے۔۔۔ کے قریب لیٹ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان آج بھی فاصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ پہلے سے کم تھا۔ بس بچے کے جسم کا فاصلہ تھا ہمارے درمیان۔ میں جانتا تھا غزالہ کی اس قربت کو کوئی اور معنی پہنانا سو فی صد غلط ہے۔ وہ صرف انجانے خدشات کے سبب میرا اور اپنا فاصلہ کم کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ تحفظ چاہتی تھی۔

اگلی صبح حشر ساماں تھی۔۔۔ طلوع ہوتے ہی سورج سوا نیزے پر آگیا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد میں باہر نکل آیا۔ زنداں کے بدو پہرے دار نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں چہل قدمی کے انداز میں بستی کے وسطی حصے کی طرف چلا گیا۔ راستے میں ملنے والے لوگ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اصطبل کے سائبان تلے مجھے الماجد نظر آگیا۔ وہ ایک گھوڑے کی مالش (کھر کھرا) کررہا تھا' دو گھوڑے قریب کھڑے تھے' یہ شاری کے ذاتی گھوڑے تھے اور ان میں وہ خوب صورت چت کبری گھوڑی بھی شامل تھی جس پر شاری عام طور پر سواری کرتی تھی۔ گھوڑوں کی مالش کرتے ہوئے الماجد کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ عجیب تمتمایا ہوا سا تھا اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

میں نے پوچھا "الماجد! طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ابکائی آئی اور اس نے زمین پر بیٹھ کر قے کردی۔ قے کو ریت سے ڈھانپ کر وہ کھڑا ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ انگارا نظر آئیں۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح تپ رہی تھی۔

"تمہیں تو سخت بخار ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں یونہی جسم گرم ہے۔"

میں نے اس کے بازو کا زخم دیکھا۔ لگتا تھا کہ زخم خراب ہو رہا ہے۔ زخم کے مقام پر سے اس کا بازو سوجا ہوا اور سرخ تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا آلہ تو نہیں تھا کہ جسم کی حرارت ناپ سکتا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ الماجد کو شدید قسم کا بخار ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ سے مالش والا کنگھا (کھرا) پکڑلیا اور اسے گھوڑے سے پیچھے ہٹا دیا "تم شفا خانے جاؤ اور دوا لینے کے بعد آرام کرو۔" میں نے کہا۔

"نہیں' شاری بہت ناراض ہوگی۔ وہ مجھے تاکید کرکے گئی ہے کہ اس کے آنے تک گھوڑے تیار رہیں۔ وہ کہیں جانا چاہتی ہے۔"

"لیکن یہ کام کوئی اور بھی تو کرسکتا ہے۔"

"مگر وہ میرے ذمے لگا کر گئی ہے۔ گھوڑوں کا سائیس ...سوں کے ہنگامے میں زخمی ہوگیا ہے۔ اب یہ کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔"

"کوئی اور بھی کرسکتا ہے۔ تم ایک سپاہی ہو۔ شاری کی حفاظت کرتے ہو' تم ایسے معمولی کاموں کے لیے نہیں ہو۔"

"لیکن۔۔۔"

"تم نہیں کرو گے یہ کام۔" میں نے تحکم سے کہا "جاؤ آرام کرو تم۔ شاری کو میں خود جواب دوں گا۔"

میں اسے دھکیلتا ہوا اصطبل سے باہر لے گیا۔ وہاں ...قا مجھے ابو آبان کا ملازم خاص نظر آگیا۔ یہ شخص بھی ...زی بہت انگریزی جانتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ...ماجد کو شفا خانے لے جائے اور اس کی مرہم پٹی کرانے کے ...اسے گھر چھوڑ آئے۔ وہ الماجد کو لے کر چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد شاری آوارد ہوئی۔ اس نے آتے ...اپنی گھوڑی کا معائنہ کیا۔ گھوڑی کے بالوں میں ابھی گرد ...موجود تھی' وہ پوری طرح تیار نہیں تھی۔ شاری کی ...ئیوں پر بل پڑ گئے "ماجد۔۔۔ ماجد" وہ زور زور سے پکارنے ...

"الماجد یہاں نہیں ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا ...نے اسے گھر بھیج دیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" شاری پاؤں پٹخ کر بولی "میں نے یہاں ...کی ڈیوٹی لگائی تھی' اس کی جرأت کیسے ہوئی یہاں سے ...نے کی۔"

"اس کو جرأت تو نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بڑی ...سے بھیجا ہے۔ وہ سخت بیمار ہے۔ وہ اسی طرح کام میں ...رہتا تو شاید بخار سے اس کے دماغ کی نس پھٹ جاتی۔"

"مائی فٹ۔" شاری جھنجلا کر بولی "تم کوئی بہت بڑے ...ہو؟ اور اگر ہو بھی تو تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ ...ے نوکروں کو چھٹی دو یا انہیں کام پر لگاؤ۔"

"الماجد تمہارا ادنیٰ نوکر ہی نہیں' قبیلے کا ایک دلیر جنگ... ہے۔ قبیلے کے لیے اور تمہارے گھرانے کے لیے اس کی ...ت غیر معمولی ہیں۔ میرے خیال میں۔۔۔"

"اوہ شٹ اپ!" شاری دہاڑی۔

اس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں ...ہوا کہ وہ چابک سمیت مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ اس کا ...والا ہاتھ بلند بھی ہوا لیکن بالکل آخری لمحے میں اس ...نے پر قابو پایا۔ اس کا رنگ سرخ انگارا ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر تیزی سے پلٹی اور اچک کر ایک مشکی گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اس کا پالتو بندر بابی جست لگا کر اس کے عقب میں بیٹھ گیا۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ گھڑ سواری کرسکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

شاری نے جواب دیے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ میں چند سیکنڈ سوچتا رہا' پھر میں نے بھی ایک گھوڑے کی باگ سنبھالی اور جست لگا کر اس پر سوار ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گھوڑے آندھی و طوفان کی طرح صحرا میں دوڑے چلے جارہے تھے۔ شاری واقعی غضب کی گھڑ سوار تھی۔ وہ گھوڑے کی پشت سے چپکی ہوئی تھی اور اس کا چابک نما ہنٹر بار بار گھوڑے کی پشت پر برستا تھا۔ گھوڑا اپنی استطاعت سے زیادہ برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پالتو بندر بابی اپنی مالکن کی پشت سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے اس کے جسم کا ہی ایک حصہ ہو۔ شاری کی گھڑ سواری کا نظارہ واقعی قابل دید تھا' وہ ایک شعلہ تھی اور ہوا میں پرواز کررہی تھی۔ جس بھی اپنے گھوڑے کو حتی المقدور رفتار سے بھگا رہا تھا۔ یہ بھی ایک شاندار گھوڑا تھا اور شاری والے گھوڑے کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں چابک نہیں تھا' اگر ہوتا بھی تو میں اتنی بے دردی سے گھوڑے کی پشت پر برسا نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاری والا گھوڑا آگے جارہا تھا۔

صحرا میں قریباً چار پانچ میل تک اندھا دھند گھوڑا بھگانے کے بعد شاری ٹھہر گئی۔ شاری کے ساتھ میں بھی رک گیا۔ دونوں گھوڑے شرابور تھے اور بری طرح ہانپ رہے تھے۔ شاری کی آنکھوں میں غضب کی چنگاریاں اب ذرا ماند نظر آرہی تھیں۔ شاید وہ اپنا بیشتر غصہ گھوڑے پر اتار چکی تھی۔ وہ جست لگا کر گھوڑے سے اتری' میں بھی اتر آیا۔ ہمارے چاروں طرف ویران صحرا تھا۔ ریت کے کئی ٹیلے بیس تیس فٹ تک بلند تھے۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا میں دھوپ اور ریت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

شاری لمبے لمبے ڈگ بھرتی ایک ٹیلے کے دامن میں پہنچی اور خود کو پشت کے بل ریت پر گرا دیا' وہ بلا جھجک پھیل کر لیٹ گئی تھی۔ بندر بابی ادھر ادھر اٹکھیلیاں کرنے لگا۔ میں شاری کے قریب ہی ریت پر بیٹھ گیا۔ جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا ٹیلوں کے سائے سمٹ رہے تھے اور گرمی بڑھ رہی تھی۔ تاہم ابھی یہ گرمی قابل برداشت تھی۔ میں نے شاری سے پوچھا "تمہیں اتنا غصہ کیوں آتا ہے الماجد پر؟"

"مجھے اس پر نہیں اپنے آپ پر غصہ آرہا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اپنی بے وقوفی پر کڑھ رہی ہوں۔ آخر میں نے اس بدذات گنوار کو کیوں اپنے قریب رکھا ہوا ہے' کہیں اور دفع کیوں نہیں کردیتی۔"

"یہی سوال ایک دن میں نے بھی تم سے پوچھا تھا لیکن تم کوئی جواب نہیں دے سکی تھیں۔ میرے خیال میں تمہارے پاس اب بھی اس سوال کا کوئی ٹھوس جواب نہیں ہے۔"

"اب ہے میرے پاس جواب۔ اور وہ جواب یہ ہے کہ میں بے وقوفی کررہی تھی۔"

"اور اب؟ یعنی آئندہ؟"

"آئندہ نہیں کروں گی یہ بے وقوفی۔ اس کمینے کو کہیں دفع کردوں گی۔ چچا ابو تبان کو سونپ دوں گی۔ وہ جہاں چاہیں گے بیچ دیں گے اسے۔"

"تم بہت جذباتی ہو۔ میرے خیال میں الماجد۔۔۔"

"اسٹاپ اٹ ناؤ۔" وہ کڑک کر بولی "میں اس موضوع پر کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"اچھا کس موضوع پر سننا چاہو گی؟"

"کسی بھی موضوع پر۔" اس نے پاؤں سے ریت اچھالی اور اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے بالوں کو ادھر سے ادھر اچھال دیا۔

میں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ غصے میں وہ بالکل سردار شماص نظر آتی تھی لیکن جب اس کا موڈ بہتر ہوتا تھا تو لہجے میں گداز آجاتا تھا اور اس کی باتوں میں شبنم کی سی ٹھنڈک نمودار ہوجاتی تھی۔ ایسے میں اس جنگجو دوشیزہ کے اندر سے وہی پڑھی لکھی شائستہ بلغارین خاتون جھانکنے لگتی تھی جو برسوں پہلے اس بستی میں آئی تھی اور سردار شماص کی بیوی بنی تھی۔

باتوں باتوں میں' میں نے شاری سے پوچھا "تم خوب صورت جوان لڑکی ہو' تمہاری زندگی میں کبھی کوئی آیا نہیں؟"

وہ گہری سانس لے کر بولی "اگر تم رشتوں کی بات کرتے ہو تو بہت سے رشتے آئے۔ ان میں بستی کے باحیثیت نوجوان بھی تھے اور بستی سے باہر کے بھی لیکن کوئی بات بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ اکثر کو تو والد اور چچا نے ہی ٹھکرا دیا۔ دو چار کی بات مجھ تک بھی پہنچی لیکن میں نے انہیں پسند نہیں کیا۔ ہاں ایک مرتبہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر ذرا توقف سے بولی

"یہ ڈھائی تین برس پہلے کی بات ہے' ایک نوجوان نے میرے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ ہماری بستی سے ایک دن کی مسافت پر جنوب کی طرف "جومان" نام کی ایک بستی ہے۔ اس بستی کے سردار کا بیٹا اتمش لڑکپن میں ہی خانہ بدوشوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ڈھائی تین برس پہلے بہت کوششوں کے بعد اس کا سراغ لگا اور ایک زبردست لڑائی کے بعد اسے رہائی ملی۔ اس کی بازیابی کی خوشی میں جومان کے سردار نے ایک بڑی ضیافت دی۔ میں بھی چچا ابو تبان کے ساتھ اس ضیافت میں شریک ہوئی تھی۔ وہیں اتمش نے مجھے دیکھا اور میری طرف مائل ہوگیا۔ بہانے بہانے سے وہ دو تین مرتبہ ہماری بستی میں آیا' ایک دفعہ ہم شکار پر بھی گئے۔ وہ دن رات میری خوب صورتی کے قصیدے پڑھتا تھا۔ شروع میں' میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی لیکن اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر مجھے بھی اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ میں ہمیشہ صاف سیدھی بات کرتی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے ہنستی بولتی تھی اور کبھی کبھی اس کی عشقیہ باتیں بھی برداشت کرلیتی تھی مگر پھر اچانک یہ سارا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اتمش نے مجھ سے شادی کی درخواست کی۔ میں نے اس درخواست پر غور کیا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں غلطی پر تھی' اتمش وہ شخص نہیں جو میرا شریک حیات بن سکتا ہو۔ اتمش میں کئی خامیاں تھیں۔ وہ جن لوگوں میں رہا تھا انہی کا رنگ اس پر چڑھ گیا تھا اور ان میں ایک رنگ کم ہمتی کا بھی تھا۔ وہ جنگ و جدل سے گھبراتا تھا جب کہ ہماری بقا کا تو دارومدار ہی جنگ و جدل پر ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر صحرا میں لڑنے کے لیے نکلوں اور میرا شوہر نام دار بستی میں باغ کی رکھوالی کررہا ہو۔۔۔ لہٰذا میں نے شادی سے انکار کردیا۔"

"اب وہ ذات شریف کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اب وہ اپنی بستی میں ہے۔ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے یقین تھا کہ اگر تمہاری کوئی کہانی ہو تو اسی قسم کی ہوگی۔"

"کیا مطلب؟ تم نجوم یا غیب دانی کا دعویٰ کرنا چاہتے ہو۔"

"تمہاری آنکھیں دیکھ کر مجھے "علم غیب" خود بخود آ جاتا ہے۔"

"کیا ہے میری آنکھوں میں؟"

"تمہاری آنکھوں میں یہ صاف صاف لکھا ہے کہ

ایک الجھی ہوئی لڑکی ہو۔ ہر دم اپنے آپ سے لڑتی رہتی ہو۔ تم کسی سے شادی کر ہی نہیں سکتی ہو۔ تمہارے دل کے اندر گہرائی میں کوئی چور چھپا ہوا ہے۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"بکواس نہیں' سو فیصد حقیقت ہے اور یہ حقیقت مجھے اس رات بھی معلوم تھی اور آج بھی معلوم ہے۔"

"کس رات کی بات کر رہے ہو؟"

"اسی رات کی جب تم نے مجھے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ بلند آواز سے کسی رومانی ناولوں کی بات کی تھی اور میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھا تھا۔"

"تو تم مجھے جھٹلا رہے ہو؟"

"جھٹلا نہیں رہا' سمجھا رہا ہوں۔ یہ بتا رہا ہوں کہ جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش مت کرو۔ تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔ تم کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتی ہو۔ یہ وقتی ابال ہے جو تمہارے ذہن میں آیا ہے۔ بالکل جیسے التمش کے بارے میں آیا تھا۔ اگر میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دوں گا تو کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہم چند بار بغل گیر ہو لیں گے' ایک دوسرے کو چوم لیں گے۔ اس کے بعد... اس کے بعد جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟" وہ بے ساختہ بولی۔

"اس کے بعد جب تم دیکھو گی کہ بات آگے بڑھ گئی ہے اور شادی بیاہ تک پہنچ رہی ہے تو تم وہی کرو گی جو التمش کے ساتھ کیا تھا۔ تم ایک دم بدل جاؤ گی۔ کوئی نہ کوئی خامی کوتاہی تمہیں مجھ میں بھی نظر آ جائے گی۔"

"میں کیوں کروں گی ایسا؟"

"اس کی وجہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں لیکن تم مانو گی نہیں۔"

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی "اگر تم نے الماجد کا ذکر کیا... تو میں تمہارا... منہ توڑ دوں گی۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی گھوڑے تک پہنچی۔ جست لگا کر اس پر سوار ہوئی اور ہوا ہو گئی۔ میں نے بھی گھوڑا سنبھالا اور بستی کی طرف واپس چل دیا۔

○☆○

اگلے روز دوپہر کے وقت الماجد سے ملاقات ہوئی' وہ ہماری کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کا بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور گلے میں لٹکا تھا۔ الماجد کا چہرہ بے حد ستا ہوا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے رنج و غم کے آکٹوپس نے جکڑ رکھا ہے۔ میں نے یہی سمجھا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔

"کیا بات ہے الماجد... بخار تو ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بخار تو اب ٹھیک ہے۔"

"پھر رونے والی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟"

وہ بے دم سا ہو کر دہلیز پر بیٹھ گیا۔ بھرائی ہوئی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی "آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے میرا کام کرنے دیں۔ آپ نے مجھے اصطبل سے گھر بھیج دیا۔ شاری سخت ناراض ہوئی ہے۔ اس نے... اس نے مجھے نکال دیا ہے۔ اب میں اس کے ذاتی محافظوں میں شامل نہیں۔"

الماجد کا لہجہ اشکبار ہو گیا "میری خدمات ابو آبان کو سونپ دی گئی ہیں۔ وہ مجھے جہاں چاہے بھیج سکتے ہیں۔"

الماجد ایک بہادر جنگجو تھا۔ اس کے فولادی جسم کو دیکھ کر دشمن کا پتا پانی ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزیدہ اور ہلکا پھلکا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے یہ سب کچھ سن کر افسوس ہوا ہے لیکن تمہیں یوں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کہیں جلاوطن تو نہیں ہو رہے ہو۔"

الماجد نے کہا "جلاوطن ہی سمجھیں۔ بستی سے باہر چند میل کے فاصلے پر ایک کنواں اور چند باغات ہیں۔ ابو آبان کو چند ایسے مزدوروں کی ضرورت ہے جو رات دن وہیں رہیں' مجھے یقین ہے کہ ابو آبان مجھے وہاں بھیج دیں گے۔ شاید کئی کئی ہفتے میں بستی میں نہیں آ سکوں گا۔"

"اگر ایسا ہوا بھی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اب تم کون سا شاری کو بانہوں میں بھرے پھرتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دور جانے سے حالات میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔"

"وہ پتھر دل ہے۔ اس پر کبھی کوئی اثر ہوا ہے اور نہ ہوگا اور پھر میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک حقیر غلام زادہ ہوں۔ میری قسمت بس اسی پر ناز کرتی ہے کہ میں اس کے قدموں کی خاک بنا رہوں۔ میرے لیے یہ احساس دنیا کی ہر دولت سے بڑھ کر ہے کہ وہ میرے آس پاس موجود ہے۔"

"اگر تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو تو پھر خود کو اتنا گراتے کیوں ہو؟ محبت تو انسان کا سر بلند کرتی ہے' اسے خود پر فخر کرنا سکھاتی ہے۔ جس محبت میں اتنا دم خم ہی نہ ہو کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے وہ شعلہ کیا بنے گی اور محبوب کے دل کو کیا پگھلائے گی۔ تم بے شک شاری سے عقیدت رکھو۔ اس کے راستے میں آنکھیں بچھاؤ لیکن جب سوال محبت کی سربلندی اور انا کا ہو تو پھر اپنی یا محبت کی توہین مت ہونے دو۔ شاری تمہیں خود سے دور کر رہی ہے تو کیا ہوا۔ وہ تمہارے دل سے تو دور نہیں ہے۔ تم یہ فیصلہ خوش دلی سے قبول کر لو' ہو سکتا ہے کہ تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو۔"

الماجد نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا دیا اور مایوس لہجے میں بولا "مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں ایک بار شاری سے ضرور ملوں گا۔ اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ اس نے پہلے بھی میری بات مان لی تھی' اب بھی مان لے گی۔"

میں نے الماجد کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا "دیکھو الماجد! محبت کرتے ہیں لیکن شان اور آن بان سے کرتے ہیں۔ محبت بھیک میں نہیں لی جاتی' یہ اپنا تن من جگر جلا کر حاصل کی جاتی ہے۔ کبھی مقصد کے حصول میں کامیابی ہوتی ہے اور کبھی ناکامی لیکن کامیاب بھی تو وہی ہوتے ہیں جن میں ناکامی برداشت کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ تم ایک دلیر شخص ہو۔ اپنے عشق کے معاملے میں بھی دلیری کا مظاہرہ کرو۔ اگر شاری تمہیں ابو آبان کے حوالے کر رہی ہے تو کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دوری ہی تمہارے لیے قربت کا وسیلہ بن جائے۔"

الماجد غزالہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوال سا طنز تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے اس "میدان" میں کون سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک بات یاد رکھنا دوست... چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہوتا ہے۔"

میں کافی دیر اسے شاری کے حوالے سے سمجھاتا بجھاتا رہا۔ آخر اسے نیم رضامند کر لیا مگر اس کی آنکھوں میں شک کی ہلکی سی لہر بدستور موجود تھی۔ یہ شک اسی دن سے الماجد کی آنکھوں میں پایا جاتا تھا جب شاری نے پہلے روز مجھے اپنی خواب گاہ میں طلب کیا تھا۔ اب بھی شاید الماجد یہی سوچ رہا تھا کہ میں اسے بستی سے باہر جانے کا مشورہ دے رہا ہوں تو اس میں میرا کوئی مفاد پوشیدہ ہے۔

اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ کر میں نے پوچھا "کہاں پہنچ گئے ہو؟"

"کہیں بھی نہیں۔ یہیں تو ہوں۔"

"یہاں نہیں ہو۔ بات کرتے کرتے تم غائب ہو جاتے ہو۔ بڑی تیز رفتاری سے کہیں بہت دور پہنچ جاتے ہو۔"

"مجھ میں تیز رفتاری کہاں۔" وہ اداسی سے بولا "میں تو ایک کچھوا ہوں' رینگ رینگ کر چلنے والا۔ بچپن سے رینگ رہا ہوں' ابھی تک چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کر پایا۔"

"شاید تم شاری کے حوالے سے بات کر رہے ہو۔" وہ خاموش رہا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ میرے سوال کا جواب اثبات میں دے رہا ہے۔ میں نے کہا "اس ناتے سے تو تم مجھے خرگوش سمجھو گے جو دوڑتا اور چھلانگیں لگاتا کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ شاید اسی لیے تم مجھے مسلسل شک کی نظر سے دیکھتے رہتے ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

"ایسی بات ہے لیکن میرے صفائی پیش کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آنے والا وقت خود ہی صفائی پیش کر دے گا۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو پریشان مت کرو۔"

میری بات پر الماجد کو تو پتا نہیں اعتبار آیا یا نہیں لیکن میں نے غزالہ کے چہرے پر ایک اُجالا سا ضرور دیکھا۔ یہ اُجالا مجھے اچھا لگا۔ درحقیقت میں نے ابھی جو بات کہی تھی وہ الماجد کے ساتھ ساتھ غزالہ کو بھی سنائی تھی۔ میں اپنے اور شاری کے بارے میں غزالہ کا ذہن بالکل صاف کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز صبح سردار شماس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں شماس کے ذاتی محافظوں کے ساتھ شماس کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ اس کی طبیعت آج کچھ بہتر نظر آتی تھی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہڈیوں بھرے جسم پر صرف ایک زیر جامہ تھا۔ بے شک وہ بہت کمزور ہو چکا تھا لیکن کھنڈرات بتا رہے تھے کہ عمارت عظیم تھی۔ سردار شماس نے سب سے پہلے مجھے "مبارزت" میں کامیابی پر مبارک باد دی پھر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مبارزت کا اختتام ہنگامے اور خون ریزی پر ہوا۔ کچھ دیر بعد سردار شماس نے اپنے سر کی مخصوص حرکت سے خلوت کا اشارہ کیا۔ کوتاہ قد سیاہ فام خادمہ اسوہ سمیت سارے ملازم باہر نکل گئے۔

سردار شماس نے مجھ سے پوچھا "تم نے شاری سے بات کی تھی؟"

سردار شماس کا مطلب الماجد والی بات سے تھا "ہاں سردار! میں نے ایک خط کے ذریعے ساری بات شاری صاحبہ کے گوش گزار کر دی تھی۔ بعد میں' میں نے خود بھی بات

کی۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر کیا نتیجہ نکالا تم نے؟"

"آپ کا یہ قیافہ درست ہے کہ شاری صاحبہ الماجد کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہیں مگر وہ اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہیں۔ بلکہ اگر یہ بات ان کے سامنے کی جائے تو وہ کچھ جھنجلا سی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن کی یہ گرہ کھل جائے۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ کھلے۔"

"جی ہاں' یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

سردار شماس نے پیار بھرے لہجے میں اٹک اٹک کر کہا "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میرے علم میں تم وہ واحد شخص ہو جس کی بات شاری سن لیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں اسے سمجھاؤ۔ الماجد صرف میرے کو غلام زادہ ہے ورنہ وہ اس بستی کا سب سے پسندیدہ اور بہادر نوجوان ہے۔ یہ میرے دل کی آرزو ہے کہ اگر شاری اس سے شادی کرے تو اس کی متبرک ماں کی دعائیں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گی اور وہ ایک مسرت بھری زندگی گزارے گی۔ اس شادی سے ہماری بستی میں ایک ایسی اعلیٰ مثال قائم ہو گی جو آنے والے دنوں میں بہت سی برکتوں اور کامرانیوں کا سبب بنے گی۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا جناب۔ ویسے اگر آپ بھی مناسب سمجھیں تو شاری صاحبہ سے بات کریں۔"

سردار شماس چند لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گیا۔

کچھ دیر میرے اور سردار شماس کے درمیان شاری کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر بات چیت کا رخ شنکر شکرا کی طرف مڑ گیا۔ سردار نے کہا "یہ خدا کی کرم نوازی ہے کہ اس نے تمہیں ایک نہایت طاقت ور اور ہوشیار مدمقابل پر فتح نصیب فرمائی ہے۔ اب صرف رسمی کارروائی باقی ہے۔ تمہیں اپنے مدمقابل کو ہلاک کرنا ہے۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ یہ کام میں اپنے ہاتھوں سے انجام دوں؟"

"ہاں ہمارے رواج کے مطابق یہ بہت ضروری ہے پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ بستی کے لوگوں نے یہاں کے دستور کے مطابق اس لڑائی پر بڑی بڑی شرطیں لگا رکھی ہیں۔ شرط جیتنے والوں کو رقوم اس وقت ملیں گی جب تمہارا مدمقابل اپنے انجام کو پہنچے گا۔"

"لیکن وہ تو شفا خانے میں بے ہوش پڑا ہے۔"

سردار شماس نے کہا "میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن میری ملازمہ اسوہ اسے شفا خانے میں دیکھ چکی ہے۔ اسوہ بڑی ہوشیار اور تیز نظر عورت ہے۔ اسے شک ہے کہ شاید وہ شخص اتنا بیمار نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔ اس کی کنپٹی کا زخم گہرا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ مسلسل بے ہوش ہی پڑا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مکر کر رہا ہو۔"

میں نے کہا "میں نے خود بھی اسے نہیں دیکھا' مجھے بھی صرف اطلاع ہی ملی ہے۔"

سردار بولا "مقابلے کی جو روداد مجھ تک پہنچی ہے اس کے مطابق تم نے مدمقابل کو زخم لگانے کے لیے وہ حربہ استعمال کیا تھا جو اوپر شاخ سے لٹک رہا تھا۔ مبارزت کے اصول کے مطابق وہ حربہ زہر آلود نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اگر وہ شخص مسلسل بے ہوش ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے' اس کے دماغ تک پہنچنے والی کوئی شریان وغیرہ کٹ گئی ہے۔"

پھر سردار شماس ہانپتے ہوئے لہجے میں ایک پرانا واقعہ سنانے لگا' جب شاری پہلی بار "ہدف" پر حملہ کرنے کے لیے قبیلے کے گھڑ سواروں کے ساتھ گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی جیتے جاگتے شخص پر جو پہلا وار کیا تھا وہ برچھی کا تھا' یہ وار ایک ادھیڑ عمر شخص کی کنپٹی پر لگا تھا اور وہ اسی وقت بے ہوش ہو کر اونٹ سے نیچے گر گیا تھا۔ یہ شخص پورے پندرہ روز بے ہوش رہا تھا اور پھر راہی عدم ہو گیا تھا۔

میں سردار شماس کے پاس قریباً دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ وہ مجھ سے باتیں کر کے بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تکیے کے غلاف میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور مجھے چند تصویریں دکھائیں۔ یہ شماس کے حسین ماضی کی جھلک تھی۔ ان تصویروں میں اس حسین و جمیل خاتون کی تصویر بھی تھی جسے اس دارِ فانی سے کوچ کیے قریباً بائیس برس ہو چکے تھے لیکن جس کی سہانی یادیں ابھی تک یہاں کے لوگوں کے دلوں میں موجود تھیں۔ وہ اخلاق اور علم کا جو بیج اس راہزن قبیلے کے لوگوں میں بو گئی تھی وہ چھوٹے بڑے پودوں کی شکل میں لہلہا رہا تھا۔ وہ واقعی سحر انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ ایک تصویر میں وہ اپنے قوی ہیکل شوہر (سردار شماس) کے پہلو میں بیٹھی تھی اور اپنی ٹھوڑی اس کے چوڑے شانے پر ٹکا رکھی تھی۔ ایک دوسری تصویر میں وہ کمسن شاری کو اٹھائے ہوئے نظر آ رہی تھی' سردار شماس نے بڑے فدویانہ انداز میں اس کے خوب صورت شانوں پر اپنا بازو رکھا ہوا تھا۔

میں نے اس خوب رو و باوقار عورت کی صرف تصویریں دیکھی تھیں لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے دل و نگاہ کو بے حد متاثر پایا تھا' جن لوگوں نے اسے جیتے جاگتے دیکھا تھا اور اس کے حسنِ سلوک سے آشنا ہوئے تھے وہ اسے کیسے بھول سکتے تھے۔ ایک ایسی دل نواز نسوانیت اور شبنمی ٹھنڈک نظر آتی تھی اس خاتون میں جو آنکھوں کے راستے براہ راست دل پر اثر کرتی تھی۔ وہ پکڑ کر اس صحرائی قبیلے میں لائی گئی تھی' یقیناً اسے زبردستی سردار شماس کی بیوی بنایا گیا تھا لیکن ان تصویروں کو دیکھ کر فوری طور پر یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ عورت اسی ماحول کا ایک حصہ ہے اور اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی مجبوری اور ناپسندیدگی کا احساس نہیں۔ اگر صرف دو لفظوں میں سارہ کی شخصیت کا خاطہ کیا جاتا تو وہ "دل آویز" تھی اور اس دلآویزی کی تھوڑی بہت جھلک کہیں نہ کہیں خود سر اور شعلہ مزاج شاری میں بھی پائی جاتی تھی۔

اپنی محبوب بیوی سارہ کی باتیں کرتے ہوئے عمر رسیدہ سردار کی آنکھوں میں ایک ایسی سحر انگیز چمک آ گئی جو مجھے کھینچ کر ماضی میں لے گئی' جب ان در و دیوار میں سارہ کی آواز گونجتی تھی' ان ہواؤں میں اس کے سانسوں کی مہک تھی اور اس کے وجود کی روشنی سے سردار شماس کا گھر منور رہتا تھا۔ میں سردار شماس کی باتوں میں کھویا ہوا تھا جب تیز قدموں کی چاپ سنائی دی پھر مجھے دروازے پر ابو آبان کی پریشان صورت نظر آئی۔ اس نے سردار شماس کو تعظیم پیش کی۔

سردار نے کہا "کیا بات ہے ابو آبان! تم کچھ پریشان ہو؟"

"نہیں تو بڑے بھائی۔" ابو آبان نے کہا "پھر نظر بچا کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ابو آبان کے پیچھے ہی پیچھے کمرے سے نکل آیا۔ ابو آبان مجھے ایک گوشے میں لے گیا' وہ واقعی پریشان تھا۔ چہرہ بالکل ستا ہوا نظر آتا تھا۔ صرف پانچ ماہ پہلے اس کا جوان سال بیٹا اسے داغِ مفارقت دے گیا تھا' اس کا غم زدہ ہونا فطری بات تھی لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ بات اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ اگلے چند لمحوں میں یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔

ابو آبان نے کہا "تمہارے لیے بلکہ ہم سب کے لیے بری خبر ہے۔ تمہارا مدمقابل شنکر شکرا شفا خانے سے غائب ہے۔" میں بھونچکا رہ گیا اور ابو آبان کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ بولا "یہ واقعہ آج صبح صادق کے وقت پیش آیا ہے۔ ہم اب تک رازداری سے اسے تلاش کر رہے تھے۔ میرے اور تمہاری کے علاوہ صرف چند افراد کو اس بارے میں علم تھا مگر ظاہر ہے اس بات کو زیادہ دیر تک نہیں چھپایا جا سکتا۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟"

"ہماری اب تک کی چھان بین کے مطابق بستی ہی کے ایک شخص نے فرار ہونے میں شنکر کی مدد کی ہے۔ اس کا نام تابان ہے اور وہ رئیس حرسانی کا کارندہ خاص ہے۔ میرے خیال میں تمہیں یاد ہی ہو گا۔ یہ رئیس حرسانی وہی ہے جس نے تمہاری ہار پر شاری سے بھاری بھرکم شرط لگائی تھی۔ میرے خیال میں ہار کی ندامت اور شرط کے مالی نقصان سے بچنے کے لیے شنکر کو یہاں سے نکالا گیا ہے۔ یہ سارا کام بڑی منصوبہ بندی سے کیا گیا ہے۔ اس قسم کے واقعات پہلے بھی ہوتے رہے ہیں لیکن آج ہونے والے واقعے میں زبردست چال بازی پائی جاتی ہے۔"

"کیا آپ کچھ وضاحت کریں گے؟"

ابو آبان بولا "سب سے پہلی چال بازی تو یہی ہے کہ شنکر اتنا زخمی نہیں تھا جتنا وہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی مسلسل بے ہوشی بھی ایک چال ہی تھی۔ تابان نامی وہ شخص جس نے شنکر کو فرار ہونے میں مدد دی ہے' اسی شفا خانے میں نگرانی کا کام کرتا ہے۔ اس کی بیوی بستی کے قہوہ خانے میں رقص کرتی ہے اور اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ شنکر کے فرار کی منصوبہ بندی شفا خانے کے اندر ہی ہوئی ہے اور اس منصوبہ بندی میں تابان کی بیوی بھی شامل تھی۔ رات کو شفا خانے کے دروازے پر دو مسلح پہرے دار تھے۔ تابان کی رقاصہ بیوی نے بڑی عیاری سے ان دونوں کو اپنے ساتھ الجھائے رکھا اور وہ صدر دروازے کے قریب ہی ایک کمرے میں داد عیش دیتے رہے۔ دوسری طرف تابان شتر خانے پہنچا۔ وہاں سے اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ شاری کے خاص اونٹوں میں سے دس اونٹ نکالے اور ان کے ساتھ بستی کے مضافات میں پہنچ گیا۔ شنکر بھی شفا خانے سے نکل کر وہاں پہنچ چکا تھا' اجالا ہونے سے پہلے پہلے وہ بستی سے بہت دور نکل گیا۔"

"دس اونٹوں والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تم جانتے ہی ہو صحرا میں قدموں کے نشانات سے تعاقب کرنا بہت آسان ہوتا ہے شنکر اور تابان نے دس اونٹوں کے ذریعے اس آسانی کو "مشکل" میں بدل دیا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے بستی سے باہر نکل آئے تھے۔ ہمارے سامنے حد نگاہ تک صحرا کی وسعت تھی۔ سورج دھیرے دھیرے نصف النہار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سرخی

نائل ریت کے ٹیلوں کے سلسلے دیکھ کر دل میں ہیبت سی جاگتی تھی۔ ان ٹیلوں میں کہیں کہیں خشک کانٹے دار گھاس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ ہم پیدل چلتے کافی آگے تک نکل آئے۔ ایک ٹیلے پر چار پانچ گھڑسوار جمع تھے۔ وہ تھکے ماندے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے اور لباس دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ صبح سویرے سے اب تک انہوں نے شنکر کی تلاش میں بہت خاک چھانی ہے۔

ٹیلے کی بلندی پر پہنچ کر ابو آبان نے ایک طرف اشارہ کیا' یہاں بہت سے اونٹوں کے "نقوش پا" تھے۔ ابو آبان بولا "شنکر اور تابان نے بڑی عیاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ شنکر تو ظاہر ہے کہ ایک اونٹ پر ہی فرار ہوا ہے' باقی اونٹوں کو انہوں نے مختلف سمتوں میں ہنکا دیا ہے۔ یہ بڑے سدھے ہوئے اونٹ ہیں۔ بغیر سوار کے بھی اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اب تم اس ٹیلے سے دور تک دیکھ سکتے ہو۔ ریت پر پاؤں کے نشانات تو موجود ہیں لیکن وہ اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔"

"تابان کو پکڑا ہے آپ لوگوں نے؟"

"ہاں بیوی سمیت پکڑ رکھا ہے۔ دونوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ شنکر کے پاس کافی مقدار میں پانی موجود ہے' اس کے علاوہ خشک راشن بھی ہے۔ وہ سات آٹھ روز تک با آسانی سفر جاری رکھ سکتا ہے۔"

میں نے ابو آبان سے کہہ کر اپنے لیے گھوڑا منگوایا۔ میں اور ابو آبان گھوڑوں پر سوار ہو کر صحرا میں دور تک گئے لیکن یہ ساری بھاگ دوڑ بے کار ہی رہی۔

شنکر کا فرار کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس سے بہت کچھ اتھل پتھل ہو سکتا تھا۔ اگر وہ کسی طرح صحرا میں سے زندہ سلامت باہر نکل جاتا تو پھر اس صحرائی بستی کی زندگی و سلامتی سو فی صد خطرے میں پڑ جاتی۔ قریباً چودہ امیرزادوں کے قتل کی پاداش میں ابوظہبی کے شیوخ اس بستی کو پیوند خاک کر سکتے تھے۔ مجھے خود پر افسوس ہونے لگا۔ میں شنکر کو لڑائی کے اکھاڑے میں ہی ڈھیر کیوں نہ کر سکا یا پھر شفا خانے میں ہی اس کا قصہ تمام کر دیا جاتا۔ وہ ایک سانپ تھا اور سانپ کا سر کچلنے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ اسے پہلے ہوش میں لایا جائے یا اس کی مرہم پٹی کی جائے۔ اسے تو جہاں اور جس حالت میں ہو "ختم" کر دینا چاہیے۔

میں شاری کے پاس پہنچا تو وہاں بھی ہلچل کے آثار نظر آئے۔ شاری کے خوب صورت چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے گھر کے احاطے میں کھڑی تھی اور گھڑسواروں کو مختلف ہدایات دے رہی تھی۔ اس کا لباس دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی صبح سویرے سے بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے سارے مسائل کا ذمے دار مجھے ہی سمجھ رہی ہے۔

گھڑسوار اور شترسوار نئی ہدایات لے کر واپس گئے۔ وہ بے قراری سے احاطے میں ٹہلنے لگی۔ اس کا ب[illegible] اس کے عقب میں تھا اور ٹہلنے میں ناگن کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ گاہے گاہے ہاتھ میں پکڑے آئینے سے سورج کا عکس بھی در و دیوار پر منتقل کر رہا تھا۔ میں شاری سے بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جب مجھے الماجد کی صورت نظر آئی۔ وہ احاطے کے بیرونی دروازے پر گھوڑے سے اترا۔ پہلے اس نے رکوع کے بل جھک کر شاری کو تعظیم دی پھر اپنی روداد سنانے لگا۔ یقیناً وہ بھی ان تھکے ماندے سواروں میں شامل تھا جو کئی گھنٹوں سے صحرا میں چکرا رہے تھے اور شنکر کا کھوج لگا رہے تھے۔

الماجد کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی سے خون رس رہا تھا اور وہ خود بھی چہرے مہرے سے بیمار دکھائی دیتا تھا۔ الماجد کی بات سننے کے بعد شاری کی چڑھی ہوئی تیوریاں کچھ اور چڑھ گئیں۔ وہ ایکا ایکی الماجد پر برس پڑی۔ الماجد سر جھکائے خاموشی سے یہ ڈانٹ سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور دکھ کے تاثرات تھے پھر وہ تعظیم پیش کر کے خاموشی سے نکل گیا۔

"کیوں بگڑ رہی تھیں اتنا؟" میں نے شاری سے پوچھا۔ وہ پہلے خاموش رہی پھر بگڑے بگڑے لہجے میں بولی "اس کو کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔ ناکامی کی اطلاع دینا تھی تو چچا ابو آبان کو دے دی ہوتی۔ میں اسے [illegible] کر چکی ہوں۔ چچا نے اسے اپنے باغ میں ذمے داری دی ہوئی ہے۔ اب بستی میں اس کا کوئی کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اگر آ ہی گیا تھا تو کون سی قیامت ٹوٹ گئی ہے۔ دیکھو کہ وہ تمہارے سارے ہرکاروں کے بعد پہنچا ہے۔ خبر نہیں کتنی دور تک گیا ہوگا۔ بیماری اور تکلیف کے باوجود وہ اپنی جان مار رہا ہے۔ ایسے بندے کی چھوٹی موٹی غلطی معاف کر دینی چاہیے۔"

"معاف ہی کیا ہے تو جانے دیا ہے۔ ورنہ چمڑی نہ ادھیڑ دیتی۔"

"ہاں چمڑی ادھیڑنے کی کسر ہی تو رہ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا کر دیا ہے میں نے؟"

"تم نے نہیں کیا لیکن تمہاری وجہ سے تو ہوا ہے۔ اس نے تمہاری طرف آنے والی گولی اپنے جسم پر کھائی ہے۔ مجھے کبھی کبھی تمہاری بے حسی پر حیرت ہونے لگتی ہے۔"

"اچھا تم زیادہ وکیل صفائی بننے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے ہی تمہاری وجہ سے ہم کافی مصیبت میں ہیں۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ آخر شاری کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی تھی۔ شاری نے بھی شاید میرے بدلے ہوئے تاثرات کو محسوس کر لیا' بات بدلنے کی کوشش میں بولی "بہت بہتر ہوتا کہ اس بدبخت کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا جاتا۔ اسے شفا خانے لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "شاری! جو بات تم نے ابھی کہی ہے میں اس سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ بستی پر جو مصیبتیں آ رہی ہیں ان کی بیشتر ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے میں تہ دل سے شرمندہ ہوں۔"

"تم نے شاید محسوس کر لیا ہے۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔

"مجھے محسوس کرنا ہی چاہیے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں' مجھے اپنی پیدا کردہ مشکلات پر دکھ ہے۔"

"خیر اب یہ اتنا سنگین مسئلہ بھی نہیں۔" وہ بولی "مجھے کافی امید ہے کہ ہمارے شتر اور گھڑسوار اندین (شنکر) کو شام تک ڈھونڈ نکالیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو اس صحرا سے اس کا زندہ بچ نکلنا آسان نہیں۔ راہبر کے بغیر مسافر کے بھٹکنے کا امکان پچاس فی صد سے زائد ہوتا ہے' پانی ختم ہوتے ہی پیاس بندے کو ختم کر دیتی ہے اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بننے کے لیے ریت میں دفن ہو جاتا ہے۔"

"بالفرض یہ سب کچھ نہ ہوا اور شنکر ابوظہبی جا پہنچا تو پھر؟"

"پھر ہم ہر مشکل کا مقابلہ کریں گے۔" وہ سینہ تان کر بولی "مرنا مرنا ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"اگر بہت زیادہ قوت کے ساتھ تم پر حملہ کیا گیا تو؟"

"ہمارے پاس کئی راستے ہیں۔ ہم یہاں سے نقل مکانی بھی کر سکتے ہیں اس سے پہلے بھی شدید خشک سالی میں ہم کئی مرتبہ ایسا کر چکے ہیں۔ ہم صحرا کے شمال مغربی حصے کی طرف نکل جاتے ہیں۔ بہت دور گہرائی میں جہاں ہمیں ڈھونڈنے والے کے مقدر میں "پیاسی موت" کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"اور یہ بستی؟"

"اسے کون اٹھا کر لے جائے گا۔ یہ یہیں رہتی ہے۔ جب ہم واپس آتے ہیں تو در و دیوار کو مرمت کر کے پھر آباد کر لیتے ہیں۔"

"اور تمہاری والدہ کی قبر بھی تو یہیں ہے؟"

"والدہ کی قبر کی حفاظت ایک خاندان کے ذمے ہے۔ وہ خاندان ہمیشہ مرقد پر رہتا ہے۔ وہ لوگ صرف اور صرف مرقد کے لیے وقف ہیں۔"

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "شاری! مجھے ازحد افسوس ہے کہ بستی میں قتل و خون ہوا ہے اور اب سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ شنکر فرار ہو گیا ہے۔ میں فوراً اس کے تعاقب میں جانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میری غیر موجودگی میں میری ساتھی غزالہ اور بچے کی حفاظت کی جائے۔"

شاری بولی "کیا تمہارے پاس جادو کا چراغ ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں اسے اور پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ تم بھی انجانے راستوں کی خاک چھانتے پھرو۔"

"پھر بھی میں کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

شاری نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے اصرار کر کے ایک تازی گھوڑا منگوا لیا۔

○☆○

پورے چوبیس گھنٹے دیگر گھڑسواروں کے ساتھ صحرا میں سرگرداں رہنے کے بعد میں واپس بستی آ گیا۔ شنکر کا کھوج نہیں مل سکا تھا۔ خبر نہیں یہ کیسا ویرانہ تھا۔ انسان کو نگل لیتا تھا یا اٹھا کر کہیں دور پھینک دیتا تھا۔ غزالہ میری غیر حاضری میں سخت پریشان رہی تھی حالانکہ میں اسے سب کچھ بتا کر گیا تھا۔ اس کی پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شنکر سے خوف زدہ تھی۔ مجھے واپس اپنے پاس دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی جو کیفیت نمودار ہوئی وہ بڑی سہانی اور یادگار تھی۔ میرا دل چاہا کہ میرے پاس کیمرا ہوا اور میں غزالہ کے یہ تاثرات ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لوں۔ اس کے ہونٹ جن میں دھیمی سی مسرت چھپی تھی' اس کی پیشانی جس پر تشکر کی چمک تھی اور آنکھیں جن میں وارفتگی اور اپنائیت کا خوب صورت رنگ تھا۔ اس نے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ بچے کے پیچھے تھا۔ وہ ایک آنکھ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"شکر ہے آپ آ گئے۔" اس نے کہا۔

"اس قدر خوشی کا اظہار مت کرو کہ پھر جانا پڑے تو جا بھی نہ سکوں۔"

اس کے چہرے پر اندیشوں کے سائے لرز گئے "کیا پھر...؟"

"شاید۔" میں نے کہا اور اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

"لیکن کیوں؟ آپ کیوں چھوڑ جاتے ہیں ہمیں؟"

"مجبوری ہوتی ہے۔ اگر میرے بس میں ہو تو ایک لمحے کے لیے آنکھ سے اوجھل نہ کروں۔"

میرے معنی خیز لہجے نے اسے گڑبڑا دیا۔ اس نے آنکھوں پر لرزتی پلکوں کا سایہ کر لیا۔

"کوئی میرا پوچھنے آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ آج صبح سے دو تین دفعہ عبال آچکا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ بتا رہا تھا شاری صاحبہ نے دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ آئے ہیں یا نہیں۔"

میں منہ ہاتھ دھو کر اور شام کا کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ عبال پھر آگیا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ شاری مجھے یاد کر رہی ہے۔

میں بہت تھکا ہوا تھا نیند بھی آرہی تھی۔ میں نے بہانہ بنایا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ عبال واپس چلا گیا۔

اگلے روز منہ اندھیرے ہی وہ پھر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک محافظ بھی تھا۔ یہ انگریزی میں بات کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شاری صاحبہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ مجھے ساتھ لے کر آئیں۔

محافظ کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ مجھے یہ لہجہ ناگوار گزرا۔ ویسے بھی ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی' میں کچھ دیر اور سونا چاہ رہا تھا۔ میں نے پھر کہہ دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

محافظ مجھے کڑی نظروں سے دیکھتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اور ایک بار پھر گہری نیند سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کوئی میرا شانہ ہلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا' وہ شاری تھی۔ وہ انگریزی لباس میں تھی۔ نہایت چست پتلون پر اس نے نیلی کلر شرٹ پہن رکھی تھی' سر پر تنکوں کا ہیٹ تھا۔ وہ پرفیوم کی خوشبو میں مہک رہی تھی۔ غزالہ اور بچہ کوٹھڑی میں موجود نہیں تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' غزالہ بچے کو نہلانے کے لیے غسل خانے میں لے گئی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاری شدید خفا ہو گی لیکن اس کا چہرہ دیکھا تو بالکل مختلف تاثر نظر آیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ یہی لمحے ہوتے تھے جب اس جنگجو لڑکی کے اندر سے اس کی بلنارین ماں اپنی جھلک دکھانے لگتی تھی۔ وہ آہستہ سے بولی "ناراض ہو؟"

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر میرے بار بار بلانے پر آئے کیوں نہیں؟"

"پرسوں شام اور کل سارا دن تمہارے کارندوں کے ساتھ میں بھی بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ کچھ تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔"

"بالکل غلط۔" وہ انگلی اٹھا کر بولی "تم اس بات سے ناراض ہو جو پرسوں میں نے تم سے کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہماری مصیبتیں تمہاری وجہ سے ہیں۔" وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی "بتاؤ۔ ہے نا یہ بات؟"

"ہاں۔ اس وقت تو ذرا دکھ ہوا تھا لیکن اب تمہارا رویہ دیکھ کر سب کچھ بھول گیا ہوں۔"

"شکریہ۔" اس نے کہا پھر میرے بازو کے زخم کو غور سے دیکھنے لگی۔ یہاں اب بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ نرمی سے پٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "اب درد تو نہیں ہوتا؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی' میں نے کہا "کتنا اچھا ہوتا اگر تم یہ سوال کسی اور سے بھی پوچھتیں۔"

"اور کون؟"

"وہی جسے مجھ سے زیادہ گہرا زخم آیا ہے اور آیا بھی تمہاری وجہ سے ہے۔"

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ یوں لگا جیسے وہ کوئی سخت جواب دے گی لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور اٹھ کھڑی ہوئی "ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم اس غلام زادے کی اتنی حمایت کیوں کرتے ہو۔ کیا تم نے اس بات کا ٹھیکا لے رکھا ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا کرو... جو کہ کبھی نہیں ہو سکتی۔"

"میں نے کب کہا ہے' میں جگہ پیدا کروں گا۔ جگہ پہلے سے ہے۔ بس تمہیں یہ احساس دلاتا ہے کہ حقیقت ہے۔"

"مجھے احساس ہے۔"

"اگر ہوتا تو اپنے آپ سے جنگ نہ کرتیں تم۔ جذبے سے آنکھ نہ چراتیں جو تمہارے دل میں موجود لیکن جسے تم اپنی زبان تک نہیں آنے دیتیں۔"

"تم زیادہ نفسیات داں بننے کی کوشش مت کرو۔ میں کچھ ہوں وہ مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے۔"

"اگر معلوم ہے تو پھر تم زیادہ قصوروار ہو۔ تم جانتی ہو الماجد تم پر جان نچھاور کرتا ہے۔ اس نے تمہاری خاطر

آنے والی گولی اپنے بازو پر کھائی۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ تمہارے روز مرہ کے کام بھی کرتا رہا۔ بجائے اس کے کہ تم اس کو سراہتیں' تم نے اسے ذلیل کر کے ابو آبان کے مجبور کر دیا اور ابو آبان نے اسے بستی سے نکال دیا۔ اگر یہی تمہارا انصاف ہے تو پھر تمہارے غلاموں اور تمہاری "رعایا" کا خدا ہی حافظ ہے۔"

شاری نے سر جھٹک کر بالوں کو چہرے سے ہٹایا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ دروازے تک جا کر رکی اور پلٹ کر بولی "جو بات میں تم سے کہنے آئی تھی وہ بیچ میں ہی رہ گئی۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ تمہیں اب تک زنداں میں رہنا پڑا۔ میں ابھی محافظوں کو ہدایت کرتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے دوسری رہائش کا بندوبست کر دیں گے۔"

O☆O

دوپہر تک ہمیں اسی رہائشی مکان میں منتقل کر دیا گیا جہاں ہم اس سے پہلے بھی قیام کر چکے تھے۔ یہ خاصا ٹھنڈا اور ہوادار گھر تھا۔ ٹھنڈے پانی اور نہانے کی سہولت موجود تھی۔ یہاں آکر غزالہ کئی روز کے بعد نہائی۔ میں نے اسے دیکھا' وہ شبنم میں دھلا پھول سی ہو گئی تھی۔ آہ... یہ پھول صرف شیخ عاصم کے کالر میں سجنے کے لیے تھا۔ سینے سے ایک آہ بلند ہوئی لیکن میں نے اسے لبوں تک نہیں آنے دیا۔

الماجد کے خیال نے مجھے صبح سے اداس کر رکھا تھا۔ غزالہ کو دیکھنے کے بعد یہ اداسی کچھ اور گہری ہو گئی۔ نجانے کاتب تقدیر نے محبت کرنے والوں کے نصیب میں ازل سے اشکوں کے دریا کیوں لکھ رکھے ہیں۔ اپنی اور غزالہ کی دوری کا سوچتا تھا تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ دوری ابدی ہو چکی ہے۔ اب اسے کوئی واقعہ' کوئی حسین اتفاق مٹا نہیں سکتا۔ اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو پھر زندگی کیا معنی رکھتی تھی۔ میں کیوں خواہ مخواہ جیا چلا جا رہا تھا۔

محبت کرنے والے کا غم ایک محبت کرنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں الماجد کا غم سمجھ رہا تھا۔ اس روز اس نے صرف میرے کہنے پر شاری کی ایک چھوٹی سی حکم عدولی کی تھی اور اس کا خمیازہ اسے بستی سے نکالے جانے کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا۔ میں جانتا تھا' وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہو گا۔ اشکبار آنکھوں سے اس بستی کے رخ پر دیکھتا ہو گا اور دل شگاف آہیں بھرتا ہو گا۔ میرا دل چاہا کہ اسے دیکھنے جاؤں' اب میری حیثیت قیدی کی نہیں تھی۔ میں آزادانہ گھوم پھر سکتا تھا۔ جو دو ملازم میری خدمت گزاری پر مامور کیے گئے تھے ان میں سے ایک عبال بھی تھا۔ میں نے عبال سے کہہ کر گھوڑا منگوایا اور الماجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبال دوسرے گھوڑے پر میرے ساتھ تھا۔

الماجد جن باغات میں کام کرتا تھا' وہ میری اطلاع کے مطابق بستی سے قریباً آٹھ میل کی مسافت پر مشرق کی جانب تھے۔ عبال کے ہمراہ میں نے یہ سفر خاصی تیزی سے طے کیا اور شام سے پہلے منزل پر پہنچ گیا۔ جنہیں میں باغات سمجھ رہا تھا وہ کچھ اور ہی چیز نکلے' یہاں دو چھوٹے چھوٹے "پیاسے کنوئیں" تھے۔ ساٹھ ستر کھجور کے درخت تھے اور اتنے ہی تاڑ اور بیری وغیرہ کے تھے۔ کچھ سوکھی سڑی بیلیں بھی تھیں جن کی شناخت مجھ سے نہیں ہو پائی۔ یہاں کارندوں کی رہائش کے لیے نیچی چھت والے مٹی کے چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر میری نظر سب سے پہلے ایک خستہ حال عمر رسیدہ بدو پر پڑی۔ وہ ایک بکری کے تھنوں سے دودھ نکالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے پوچھا "انگلش جانتے ہو؟"

وہ بولا "ہاں گزارہ کر لیتا ہوں۔"

بولنے کو تو وہ انگلش بول رہا تھا لیکن اکثر بدوؤں کی طرح اس کا لہجہ ایسے ہی تھا جیسے لفظوں سے کشتی لڑ رہا ہو۔ بہرحال اس دور دراز صحرائی بستی میں "انگلش" موجود تھی' یہی بہت بڑی بات تھی۔ میں نے الماجد کا پوچھا تو بوڑھا بولا "اس کے دماغ میں عشق کا ناسور ہے اور عاشقوں کا ٹھکانا تو ویرانہ ہی ہوتا ہے۔ بیٹھا ہو گا کہیں کسی درخت کے نیچے۔" اس بوڑھے بدو کا نام مورث تھا۔

میں اور عبال' الماجد کی تلاش میں نکلے۔ باغ میں بھی صحرا جیسی ویرانی تھی۔ ایک دو جگہ پر سیاہ فام کارندے کام کرتے دکھائی دیے لیکن الماجد کہیں نظر نہیں آیا۔ ہم اسے ڈھونڈتے ہوئے باغ کے دوسرے سرے پر جا نکلے۔ تب میری نظر الماجد پر پڑی۔ وہ ایک جگہ کیچڑ میں لت پت اوندھا پڑا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت اور دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ عبال نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ سرخ انگارا آنکھوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس نے کوئی نشہ آور شے استعمال کی ہے۔

میں اور عبال اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر کچے مکان کے قریب لائے۔ یہاں ایک مقامی کارندے کے ساتھ مل کر ہم نے اس کا سر منہ دھویا۔ سر پر پانی پڑنے سے اس کے حواس قدرے بحال ہوئے۔ عمر رسیدہ شخص بھی

اب موقع پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر کہا "یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ بستی کے نوجوان اکثر بالتی کا نشہ کرتے ہیں۔ بالتی ایک صحرائی جڑی بوٹی ہے اور اس علاقے میں اکثر مل جاتی ہے۔"

الماجد کا بالائی جسم تو ہمیشہ کی طرح عریاں ہی تھا۔ اس نے صرف ایک پتلون پہن رکھی تھی۔ ہم نے پتلون اس کے جسم پر ہی دھو دی۔ کچھ دیر بعد الماجد کے حواس بحال ہوگئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ہمیں پہچان رہا تھا' تاہم زبان میں لکنت تھی۔ رات کا کھانا ہم نے الماجد کے ساتھ ہی کھایا۔ میں اس سے مسلسل دل جوئی کی باتیں کرتا رہا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ حالات اس کے لیے بہتر ہونے والے ہیں۔ امید ہے کہ شاری کے رویے میں آہستہ آہستہ تبدیلی واقع ہوگی۔ وہ سنتا رہا اور میں اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی زخمی مسکراہٹ دیکھتا رہا۔ اس ویران باغ کے ایک نیم روشن کمرے میں ہم نے جو کی روٹی' شہد اور ترکاری کے ساتھ کھائی۔ اس کے بعد بکری کا ٹھنڈا دودھ پیا اور کمرے کی چھت پر خوشگوار ہوا میں کھجور کی چٹائیاں بچھا کر لیٹ گئے۔ سر پر تاروں کے جھرمٹ تھے اور کہکشاؤں کی دنیا آباد تھی۔ باغ میں کام کرنے والا کوئی کارندہ کنوئیں کے کنارے بیٹھا تھا اور بانسری بجا رہا تھا۔ بانسری کی لے پُر سوز تھی۔ مجھے وہ کہاوت یاد آئی' بانسری میں درد ہے کیونکہ ایک روز اسے درخت سے جُدا کر دیا گیا تھا۔

میں نے کہا "الماجد! تم ایک بہادر سپاہی ہو۔ تمہارا لوہا پورا قبیلہ مانتا ہے' بہادر وہی نہیں ہوتا جو میدان جنگ میں دشمن کو گراتا ہے' بہادر وہ بھی ہوتا ہے جو اپنے دکھ اور اپنی مشکلات سے لڑتا ہے بلکہ میرے نزدیک اصل بہادر وہی ہوتا ہے" آج تمہاری حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا ہے۔"

وہ آزردگی سے بولا "کیا کروں' کچھ بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ میں بستی میں تھا اور شاری سے دور رہتا تھا تو لگتا تھا کہ زندگی سے دور ہو گیا ہوں۔ اب تو میں بستی میں بھی نہیں ہوں۔ لگتا ہے کہ پل پل مرتا جا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ تم میری بات بھول گئے ہو۔ میں نے کہا تھا کہ بعض دفعہ دوری بھی قربت کا سبب بن جاتی ہے۔ تم ایک عرصہ شاری کے قریب رہے ہو' اس کی قدم بوسی کرتے رہے ہو' تمہیں کیا حاصل ہوا ہے۔ اب ذرا دور ہو کر بھی دیکھ لو۔ شاید یہ تمہارے حق میں بہتر ہو جائے۔"

"آپ اسے تین چار ہفتے سے جانتے ہیں' میں اسے بچپن سے جانتا ہوں' وہ نہیں بدلے گی' وہ کبھی نہیں بدلے گی۔"

"مستقبل کے بارے میں صرف خدا جانتا ہے' ہم صرف اندازے لگا سکتے ہیں اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اس میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئے گی۔ تم نے خاموشی سے بستی چھوڑ کر حوصلے کا ثبوت دیا ہے۔ اگر تم شاری کے سامنے گریہ زاری کر کے اس سے رحم کی درخواستیں کرتے تو مجھے یقین ہے اس کا فیصلہ نہ بدلتا' ہاں یہ ضرور ہوتا کہ تمہارا مقام اس کی نظروں میں تھوڑا سا اور پست ہو جاتا۔"

"میری رائے آپ سے مختلف ہے۔" الماجد نے کہا۔

"میں تمہیں رائے بدلنے پر مجبور نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تم چند روز اپنے صبر و برداشت کو آزماؤ۔ شاری ویسے بھی تو تم سے دور ہی ہے" "ایسے بھی سہی۔"

وہ رات ہم نے الماجد کے ساتھ گزاری۔ میں اور عبال دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بازو کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میں نے الماجد سے وعدہ کیا کہ بستی واپس جاتے ہی میں شفا خانے سے کسی معالج کو یہاں بھیجوں گا تاکہ وہ زخم کو دیکھ سکے۔

نصف شب کے بعد ہم سو گئے۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب دھوپ کی تمازت مجھے اپنے پورے جسم پر محسوس ہونے لگی۔

دیر سے اٹھنے کے سبب طلوع آفتاب کا منظر تو میں نے کھو دیا تھا' تاہم جو منظر اب نگاہ کے سامنے تھا وہ بھی کچھ کم دل فریب نہیں تھا۔ سورج نے اس عظیم الشان صحرا کو اپنی کرنوں کے جال میں جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ ہر کرن ریت کے ذروں میں کروڑوں سورج چمکا رہی تھی اور یہ سب سورج مل کر آنے والی گھڑیوں کو ایک جہنم سے آشنا کرنے والے تھے۔ میں نے کمرے کی چھت پر سے دور تک دیکھنے کی کوشش کی لیکن ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بستی مغرب کی طرف تھی لیکن اس طرف ٹیلے کچھ بلند تھے لہٰذا بستی کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔

بوڑھے مورث نے کل مجھے بتایا تھا کہ ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک اونچا ٹیلا ہے۔ وہاں چڑھ کر دیکھیں تو بستی سے اٹھنے والے دھوئیں کے آثار نظر آ جاتے ہیں۔ بوڑھے مورث کے مطابق الماجد شام ہوتے ہی اس ٹیلے کی طرف چلا جاتا تھا اور دیر تک کھڑا رہتا تھا۔ مورث نے مجھے الماجد کے بارے میں اور بھی کئی باتیں بتائیں۔ یہ باتیں اس وقت ہوئیں جب الماجد اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر ناشتا

تیار کر رہا تھا۔ یہ وہی ساتھی تھا جس نے رات دل سوز لے میں بانسری بجائی تھی۔

موورث کے پاس قدیم طرز کا چھوٹا سا حقہ تھا۔ وہ حقہ گڑ گڑاتا ہوا میرے قریب آ بیٹھا اور بولا "میں سردار شامس کا ہم عمر ہوں اور ہم جولی بھی۔ گئے زمانے میں ہم نے بہت سا وقت اکٹھے گزارا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ میں آج جس طرح الماجد کو سردار شاری کے عشق میں پاگل دیکھتا ہوں اسی طرح میں نے کبھی سردار شامس کو سارہ کے عشق میں مبتلا دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ الماجد کا عشق بیاہ سے پہلے کا ہے اور سردار شامس کا عشق بیاہ کے بعد کا تھا۔ سارہ قید ہو کر اس قبیلے میں آئی تھی۔ اس کی اپنی کوئی مرضی ہی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سردار شامس نے اسے جسمانی طور پر باآسانی حاصل کر لیا تھا۔ اس نے سارہ سے زبردستی بیاہ کیا تھا مگر بیاہ کے بعد دو تین ماہ تک سارہ اس کے پاس ہو کر بھی اس سے بہت دور تھی۔ سردار شامس سارہ کے جسم کا ہی نہیں اس کی محبت کا بھی خواہش مند تھا۔ وہ تھی ہی ایسی "شاندار" اسے ایک نظر دیکھنے والا مرد و زن اس کی الفت میں گرفتار ہو جاتا تھا اور سردار شامس تو ہر گھڑی اس کے قریب رہتا تھا' اس کی تنہائی کا ساتھی بنتا تھا۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ وہ بیوی کے پاس ہو کر بھی اس کے پاس نہیں تو اس کے دل میں درد جاگتا تھا۔ وہ خود کو اکیلا اور بے چارہ محسوس کرنے لگتا تھا۔ اس کے یہی خیالات تھے جنہوں نے بیاہ کے دو تین ماہ بعد ہی شامس کو سارہ کے عشق میں گرفتار کر دیا تھا۔ وہ رات دن آہیں بھرتا تھا۔ اس نے داڑھی بڑھالی تھی اور کپڑوں کی طرف سے بے پروا رہتا تھا۔ کچھ دن کے لیے وہ بستی چھوڑ کر ابو آبان کے ان باغات میں بھی چلا آیا تھا۔ ان دنوں سردار شامس کو بستی کے معاملات کی کچھ خبر نہیں تھی' سب کچھ ابو آبان نے ہی سنبھال رکھا تھا۔ بستی کے لوگ سمجھتے تھے کہ شاید سردار شامس کوئی چلہ کاٹنے کے لیے باغ میں جا بیٹھا ہے... مگر اس کے "بہت قریبی" ساتھیوں کو معلوم تھا کہ وہ دن رات ایک ایسی عورت کی جدائی میں جل رہا ہے جو دن رات اس کے قریب موجود ہے۔ سردار شامس کوئی ڈیڑھ ماہ اسی باغ میں رہا تھا۔ یہاں قیام کے دوران میں ہی اسے ایک بار ملیریا بھی ہوا۔ میں ہی شفا خانے سے دوا لا لا کر اسے زبردستی کھلاتا تھا۔ دو ہفتے بعد وہ ٹھیک ہو گیا لیکن اس نے بستی واپس جانے سے انکار کر دیا پھر ایک روز پتا ہے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

موورث کے جھریوں بھرے چہرے کی جھریاں کچھ اور بڑھ گئیں' شاید وہ زیرِ لب مسکرایا تھا' اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا "پھر یہ ہوا کہ حسن خود چل کر عشق کے پاس آگیا۔ سارہ یہاں آئی اور سردار کو بڑی محبت سے منا کر بستی میں واپس لے گئی۔ اس کے بعد ہر آنے والے دن میں ان کی محبت بڑھتی ہی رہی۔ سارہ نے سردار شامس کیا' پوری بستی پر ہی جادو کر دیا تھا' ہر کوئی اسے محبت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اب میں اس غلام زادے الماجد کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ سارہ جیسا جادو اس کی بیٹی شاری میں بھی موجود ہے۔ بے شک شاری مختلف لڑکی ہے۔ وہ مار دھاڑ کرتی ہے اور شعلہ مزاج بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی مہربان ماں کی کوئی کوئی خصوصیت بھی اس میں موجود ہے۔ جیسے اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو وہ باپ سے ضد کر کے چند سال کے لیے شہر چلی گئی تھی اور وہاں کسی اسکول میں پڑھتی رہی تھی' ہے نا عجیب بات۔ ایک صحرائی قبیلے کی خانہ بدوش لڑکی اور اسکول میں تعلیم حاصل کرے۔"

میں نے کہا "یہ واقعہ مجھے معلوم ہے اور یہ بھی پتا ہے کہ شاری کی ایسی کی وجہ یہ تھی کہ سردار بیمار ہو گیا تھا اور بستی کی سرداری کے قابل نہیں رہا تھا۔"

موورث بولا "میں سمجھتا ہوں کہ شاری میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک اچھے سردار میں ہونی چاہئیں۔ اس کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ ابھی نو عمر ہے۔ طبیعت میں لاابالی پن ہے۔ آہستہ آہستہ جب اس میں ٹھہراؤ آئے گا تو وہ پوری بستی کے دل اپنی مٹھی میں کر لے گی۔ بڑی کامیاب سردار بنے گی یہ... سب لوگوں کی شکایتیں دور ہو جائیں گی۔"

"اور الماجد کی شکایتیں؟"

"کیا مطلب؟"

"الماجد کا کیا بنے گا۔ یہ شاری سے ... محبت کرتا ہے۔"

"اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ غلام ... شاری کے لیے یہ ایک بہت بڑی تہمت ہوگی کہ اس نے ایک غلام زادے سے بیاہ کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ یہ تو دیوانہ ہے' میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں۔ ابو آبان کے ایک غلام کی بیٹی بڑی خوب صورت ہے۔ ابو آبان نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا بھی تھا کہ یہ الماجد ... بڑا موزوں رشتہ رہے گا۔ یہ ایک بار ہاں کہے ... [illegible]

کے اندر اس کی شادی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ شادی کے اخراجات ابو آبان اپنی گرہ سے ادا کرے گا۔"

اسی دوران میں الماجد اور عبال ناشتا لے کر آ گئے۔ ہم ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ الماجد کی شوخ شوخ آنکھیں دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ کسی وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ واقعی خود کو ایک لاحاصل تمنا میں برباد کر رہا ہے۔ شاری کے ساتھ اس کا ملاپ رات اور دن کا ملاپ محسوس ہوتا تھا لیکن جب میں الماجد کی آرزو کی شدت دیکھتا تھا تو خیال آتا تھا کہ شاید کسی طور اس کی بات بن ہی جائے۔

میں نے اس ویران باغ پر ایک نگاہ دوڑائی۔ مردہ ریگستان کے درمیان یہ روکھی پھیکی زندگی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ یہی جزیرہ تھا جہاں ایک روز سارہ دبے قدموں آئی ہوگی اور اپنے روٹھے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے منا کر لے گئی ہوگی۔ کسے معلوم تھا کہ چند دنوں یا چند مہینوں یا چند سالوں بعد شاری بھی اسی طرح یہاں آئے اور اس غلام زادے کو پکارے جو سراپا اس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا' جس کے لیے زندگی اپنی محبوبہ کے ایک بھرپور بوسے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ناشتے کے بعد میں نے الماجد کے بازو کا زخم اچھی طرح دیکھا' اس میں انفیکشن ختم نہیں ہوئی تھی' غالباً اس کی ایک وجہ الماجد کی بے احتیاطی بھی تھی۔ میں نے الماجد سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے زخم کی طرف سے احتیاط برتے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ بستی جا کر میں ابھی معالج کو اس کی طرف بھیج رہا ہوں۔ اسی دوران میں چار گھڑسوار ہمیں دور سے آتے دکھائی دیے۔ ان کے رنگ دار عمامے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ یقیناً وہ بستی سے ہی آئے تھے۔ چار پانچ منٹ میں یہ لوگ باغ میں داخل ہوئے اور ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک ابو آبان بھی تھا۔ وہ خاصی جلدی میں محسوس ہوتا تھا۔ اس نے میری خیریت دریافت کی پھر موورث سے چند رسمی باتیں کیں' تب وہ الماجد کی طرف متوجہ ہو گیا' اس نے حکمیہ لہجے میں الماجد سے چند باتیں کیں۔ یہ گفتگو عربی میں تھی لہٰذا میری سمجھ سے باہر رہی۔ الماجد اطاعت مندی سے سر ہلاتا جا رہا تھا۔

یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں نے ابو آبان سے پوچھا "محترم کیا بات ہے؟ شاید آپ کو الماجد سے کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں' شکایت والی تو کوئی بات نہیں۔" ابو آبان نے عربی نما انگلش میں جواب دیا "دراصل ہم نے احتیاطی تدبیر کا سوچا ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اندین (ٹھگ) بستی سے فرار ہو گیا ہے۔ بے شک اس کے بچ نکلنے کا امکان بہت کم ہے' پھر بھی امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بستی کے سرکردہ افراد نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی بھی ممکنہ خطرے کا سدباب کیا جائے۔"

"ممکنہ خطرے سے آپ کی مراد باہر سے کسی کا حملہ آور ہونا ہے؟"

"ہاں... اندین کے بچ نکلنے کی صورت میں یہ خارج از امکان نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بستی کی طرف آنے والے راستوں کی نگرانی کی جائے اور یہ نگرانی بستی سے کم از کم ایک دن کی مسافت پر ہو۔ اس سلسلے میں چار مقامات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہر مقام پر دو افراد ہوں گے۔ بھیجے جانے والوں میں الماجد کا نام بھی ہے۔ میں اسے یہی اطلاع دینے کے لیے آیا تھا۔ آج رات اسے نگرانی والے مقام کی طرف روانہ ہونا ہے۔"

میں نے الماجد کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی زخمی مسکراہٹ تھی جو میں کل سے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ اطمینان سے کھڑا تھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو' اب بتاؤ' تم تو کہتے تھے کہ شاری اور بستی سے دور جا کر میرے لیے نزدیکی اور قربت کا کوئی راستہ نکلے گا۔ دیکھو کیا شان دار راستہ نکلا ہے۔ مجھے اور دور بھیجا جا رہا ہے۔ بالکل ویرانے میں۔

میں نے کہا "محترم ابو آبان! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

ابو آبان نے رعونت سے اشارہ کیا۔ الماجد سمیت دو تین کارندے وہاں موجود تھے' وہ سب باہر نکل گئے "ہاں کہو۔" ابو آبان بولا۔

میں نے کہا "محترم! مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ الماجد کا زخم ٹھیک نہیں۔ اسے آرام اور علاج کی ضرورت ہے' میں تو آپ سے یہ درخواست کرنے والا تھا کہ اس سے باغ میں کام لینے کے بجائے واپس بستی میں بلا لیا جائے۔"

"کیا ہوا ہے اس کے زخم کو؟" ابو آبان نے درشت لہجے میں کہا "میں نے دیکھا ہے اس کا بازو۔ معمولی نقص ہے' ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم صحرائی لوگ سخت جان ہوتے ہیں۔ تم اپنے ماحول اور اپنی برداشت کے حساب سے بات کر رہے ہو۔"

میں نے ایک دو دلیلیں دیں لیکن وہ بے سود ثابت ہوئیں۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ابو آبان نے

الماجد کو صحرا میں بھیجنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور وہ اسے بھیج کر رہے گی۔ یقیناً اسے بھی الماجد کی اس دیوانگی کا علم تھا جو وہ شاری کے لیے رکھتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ الماجد شاری سے دور ہی رہے۔

میں نے ابو آبان سے پوچھا "ان لوگوں کو نگرانی پر کتنے دن مامور رہنا ہوگا؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ انڈین (ٹنکی) زندہ یا مردہ حالت میں گرفتار ہوگیا تو خطرہ ٹل جائے گا' دوسری صورت میں جب تک خطرہ نہیں ٹلے گا یہ لوگ وہیں موجود رہیں گے۔"

"یعنی دو تین ہفتوں کی بات ہے؟"

"ممکن ہے دو تین ماہ بھی لگ جائیں۔"

ابو آبان واپس چلا گیا۔ الماجد سر جھکائے کھڑا تھا۔ جس یہاں اس کا حوصلہ بندھانے کے لیے آیا تھا لیکن نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ مزید اُداس ہو گیا تھا۔

O☆O

میں دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے بستی واپس پہنچ گیا۔ شاری کی رہائش گاہ کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نظر اصطبل پر پڑی۔ شاری اصطبل کے دروازے کے سامنے موجود تھی اور بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ بستی میں جس قسم کے حالات تھے اس کے خوش ہونے کی وجہ تو نہیں بنتی تھی۔ اگر وہ خوش تھی تو اس کا مطلب تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔

میں شاری کے پاس پہنچا۔ وہ مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اصطبل کی طرف لے گئی۔ وہ گھڑ سواری کے لباس میں تھی۔ سر پر نکٹوں کا خوب صورت ہیٹ تھا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ بہت خوش ہو؟"

"بات ہی خوشی کی ہے۔" اس نے کہا اور اصطبل کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں ایک شان دار مشکی گھوڑا کھڑا تھا۔ یہ کسی خاص نسل سے تھا۔ اس کے کانوں کی بناوٹ اور سُموں کا رنگ خاصا مختلف تھا۔ وہ دیکھنے میں ہی ایک شان دار جانور نظر آتا تھا۔ شاری نے بڑے ناز سے اس کی پیٹھ تھپکی اور بولی "کیسا ہے؟"

میں نے کہا "زبردست ہے۔"

"ہم مقامی بولی میں اس گھوڑے کو راغ کہتے ہیں۔ یہ کم یاب نسل ہے۔ بڑی مشکل سے ملا ہے۔"

"تو تمہاری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ ایک کم یاب گھوڑا تمہیں مل گیا ہے۔"

"ہاں یہ بھی خوشی کی وجہ ہے اور اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

شاری ایک دم خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے پہلی بار جھینپتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اصطبل کے سائیس کی طرف رخ کرکے اسے ہدایات دینے لگی۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ میں سمجھ گیا کہ شاری جو بات خود نہیں بتانا چاہ رہی وہ اب سائیس مجھے بتائے گا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ سائیس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں مجھے بتایا کہ شاری کے اصطبل میں راغ نسل کی ایک گھوڑی پہلے سے موجود ہے۔ وہ عرصے سے اس کوشش میں تھی کہ راغ نسل کا کوئی گھوڑا ملے اور وہ اسے گھوڑی سے ملا سکے۔ وہ افزائش نسل کے لیے بڑے عرصے سے سوچ رہی تھی۔

میں نے سائیس کی بات سننے کے بعد شاری کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں خوشی کے علاوہ شرم کا ہلکا سا رنگ بھی تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے خوب صورت لگا۔ اس نے مجھے پورا اصطبل دکھایا۔ وہ گھوڑوں کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی اور ماہر گھڑ سوار بھی تھی۔ اصطبل کے معاملات کے حوالے سے اس کی معلومات گہری اور وسیع تھیں۔

شام کو مجھے شاری نے اپنی خلوت گاہ میں طلب کیا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی' اس خوشی کی ایک علامت اس کا بھڑکیلا لباس بھی تھی۔ میرے ذہن میں الماجد کی شبیہہ ابھر آئی۔ وہ نجانے کتنا اداس اور دکھی تھا لیکن یہاں شاری کے دل میں اور چہرے پر لڈو پھوٹ رہے تھے۔ غالباً اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ خیال موجود نہیں تھا کہ بستی سے نکلنے کے بعد الماجد کہاں اور کس حال میں ہوگا۔ اس نے اپنے پالتو بندر کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچا پھر ہلکی شراب کا ایک گلاس چڑھایا اور مسرت بھرے لہجے میں بولی "تمہیں میری حرکتیں دیوانوں کی سی لگ رہی ہوں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آج بہت خوش ہوں۔ ایک دیرینہ تمنا پوری ہوگئی ہے میری۔"

میں نے کہا "خوشی میں غم زدہ لوگوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔"

وہ میری بات سمجھے بغیر بولی "کیوں یاد نہیں رکھوں گی۔ بستی کے ایک سو افراد کو آج میری طرف سے کھانا کھلایا گیا

ہے۔ اس کے علاوہ بھی غریب غربا میں کافی کچھ تقسیم کیا ہے۔"

میں نے کہا "کچھ غم زدہ لوگ اور طرح کے ہوتے ہیں' ان کی دل جوئی اور طرح سے کی جاتی ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً محبت کے مارے لوگ جنہیں محبت درکار ہوتی ہے۔"

ایک دم شاری کو کچھ یاد آیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے' اس نے تالی بجا کر کہا "او گاڈ' میرے ذہن سے ہی نکل گیا۔ میں تمہیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔"

"کیسی چیز؟"

"ابھی جس کا تم ذکر کر رہے تھے۔"

پھر اس نے دوبارہ تالی بجائی۔ فربہ اندام حبشی کنیز تعظیم پیش کرکے اندر داخل ہوگئی۔ مالکن کی خوشی پر وہ بھی خوش نظر آ رہی تھی۔ شاری نے کہا "جاؤ لڑکی کو لے کر آؤ۔" وہ انگلش میں بولی تھی۔ شاید مجھے سنانا چاہتی تھی۔

حبشی خادمہ حکم سن کر واپس چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جھلملاتے لباس والی ایک لڑکی سر جھکائے اندر داخل ہوئی۔ حبشی کنیز نے اسے بازو سے تھام رکھا تھا۔ لڑکی نے شاری کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تعظیم پیش کی۔ وہ سانولی لیکن قبول صورت لڑکی تھی' میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا' وہ شاری کی خادماؤں میں شامل تھی۔

شاری چہک کر بولی "اس کا نام رباب ہے۔ یہ میری چند مستعد کنیزوں میں سے ایک ہے۔ میں اسے انعام کے طور پر ابن نصیر کو دے رہی ہوں۔ ابن نصیر کو جانتے ہو کون ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شاری بولی "یہ اصطبل کے سائیس کا بیٹا ہے۔ یہی ہے جو میرے لیے گھوڑا تلاش کرکے لایا ہے۔ وہ بہت خوش ہوگا رباب کو حاصل کرکے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے پسند بھی کرتا ہے۔" پھر وہ بجی سنوری لڑکی سے مخاطب ہو کر کچھ بولی۔ لڑکی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ شاری مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "میں نے پوچھا تھا کہ ابن نصیر تمہیں پسند کرتا ہے نا؟ جواب میں اس کے چہرے پر جو مسکراہٹ آئی تھی وہ تم نے بھی دیکھ لی ہوگی۔"

شاری نے حبشی کنیز کو اشارہ کیا۔ وہ بجی سنوری لڑکی کو لے کر باہر نکل گئی۔ میں نے کہا "ابن نصیر آج کتنا خوش ہوگا۔ دیر تک دل میں پلنے والی تمنا اگر پوری ہو جائے تو انسان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا مگر ایسا ہوتا بہت کم ہے' اکثر دل کے ارمان دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔"

شاری بولی "لگتا ہے کہ تم کسی قبرستان میں سے گزر کر آئے ہو۔ اس خوشی کے موقع پر مسلسل اداسی اور ویرانی کی باتیں کر رہے ہو۔"

میں نے کہا "قبرستان سے تو نہیں گزرا' ہاں ایک نیم مردہ کو دیکھ کر ضرور آ رہا ہوں۔ تم بھی اسے اچھی طرح جانتی ہو۔"

شاری چونک گئی۔ ایک دم غرا کر بولی "خبردار جو اس کی بات کی تو...... میں سر توڑ دوں گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے شراب کی خالی صراحی گردن کی طرف سے پکڑ لی تھی۔

"ٹھیک ہے چھوڑ دو سب۔" میں نے سر جھکا کر کہا "اس خوشی کے موقع پر تھوڑی سی رنگینی تو ہونی چاہیے۔"

میرے انداز نے اس کا غصہ کافور کر دیا۔ صراحی واپس رکھتے ہوئے بولی "میں واقعی آج بہت خوش ہوں اور اس کا ثبوت بھی مجھے مل گیا ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں تمہاری بات سننے کے بعد ضرور تمہارا سر پھوڑ دیتی۔"

"بڑی عجیب بات ہے' تمہاری خوشی کا پیمانہ بھی مار دھاڑ ہی ہے۔"

"پیمانے تو بہت سے ہیں لیکن میں کیا کروں۔ جب میں خوش ہوتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ خوب ناچوں' رات بھر ناچتی رہوں لیکن تم جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میرے سر پر سرداری کا بھاری بھرکم پگڑ رکھ دیا گیا ہے۔ مجھے ادب احترام کی ایک ایسی مسند پر بٹھا دیا گیا ہے جہاں میں پتھر کی طرح ساکت بیٹھنے پر مجبور ہوں۔"

"یہ تو واقعی بڑی زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔" میں نے منہ سے "چچ چچ" کی آواز نکالی۔

"لیکن میں زیادتی برداشت کرنے والی نہیں ہوں۔ میں کسی نہ کسی طرح من مرضی کرنے کا موقع نکال ہی لیتی ہوں۔ بلکہ میں اب بھی نکال سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ٹھہرو' ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب گئی۔ کھڑکی کا پردہ برابر کیا پھر اس نے کمرے کی اکلوتی الماری کھولی۔ الماری کے ایک خانے میں مجھے کار بیٹری کی جھلک نظر آئی۔ یہ بیٹری ایک چھوٹے سے کیسٹ پلیئر کے ساتھ منسلک تھی۔ شاری نے کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ "راک اینڈ رول" کی دُھن کمرے میں بکھرنے لگی پھر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں نے شاری کو محوِ رقص دیکھا۔ وہ ناچ رہی تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر

قاتلوں پر شب خون مارنے والی جنگ جو حسینہ بالکل مختلف روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کا ردھم تھا' ہاتھ پاؤں بجلی کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ بے حد خوب صورت انداز تھا اس کے رقص کا۔ مجھے اس کی صلاحیت نے دنگ کر دیا۔

دس پندرہ منٹ تک خوشی سے بھرپور رقص کرنے کے بعد وہ ہانپ کر بستر پر گر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کے رخسار شہابی ہو رہے تھے "کیسا ہے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"بہت خوب۔ اور میں یہ بات رسمی طور پر نہیں کہہ رہا۔ تم واقعی اچھا رقص کرتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی۔ چہرے پر اطمینان کا اجالا پھیل گیا۔ انسان کے اندر جب کوئی صلاحیت موجود ہو تو اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اظہار کرے' کوئی اس کی صلاحیت کو دیکھے اور سراہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو اندر ہی اندر ایک وسیع خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ شاید شاری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

میں نے باتوں باتوں میں کوشش کی کہ شاری کا دھیان الماجد کی حالت زار کی طرف جائے لیکن اس سلسلے میں اس کی رائے بڑی سخت تھی یا شاید اس نے سخت بنائی ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک یہ بے حد خوشی کا موقع تھا کہ اس نے مطلوبہ نسل کا گھوڑا حاصل کر لیا تھا۔ اب خوشی کے اس موقع کو وہ الماجد کے ناپسندیدہ ذکر سے ہرگز غارت کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

دوسرے روز میں نے سردار شماس سے ملاقات کی۔ میں نے سردار کو بتایا کہ شاری نے الماجد کی خدمات ابو آبان کے سپرد کر دی ہیں اور ابو آبان نے الماجد کو صحرائی راستے کی نگرانی پر بھیج دیا ہے' حالانکہ وہ زخمی اور بیمار ہے۔ میں نے سردار سے کہا کہ وہ ابو آبان سے کہہ کر کسی طرح الماجد کو بستی میں واپس لانے کا انتظام کرے۔

سردار شماس نے وعدہ کیا کہ وہ ابو آبان سے بات کرے گا۔

میں نے کہا "آپ سے درخواست ہے کہ اس میں میرا نام نہ آئے۔"

"تم بے فکر رہو' میں اپنے طور پر بات کروں گا۔" چند لمحے توقف کر کے سردار شماس نے پوچھا "شاری کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی؟"

میں نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو شاری صاحبہ اسے اپنی خدمت سے علیحدہ کر کے محترم ابو آبان کے حوالے نہ کرتیں۔ حالانکہ اس نے کوئی اتنی بڑی خطا بھی نہیں کی تھی۔ شدید زخمی اور تکلیف میں ہونے کے باوجود وہ شاری صاحبہ کے گھوڑوں کی مالش کر رہا تھا' میرے ہی اصرار پر وہ آرام کرنے کے لیے چلا گیا۔ شاری صاحبہ اس پر تیخ پا ہو گئیں اور اگلے روز اسے ابو آبان صاحب کے سپرد کر دیا۔"

بوڑھے اور قریب المرگ سردار کے شکن شکن چہرے پر کچھ اور شکنیں ابھر آئیں۔ میں اس کے اندر کا درد محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی اکلوتی اولاد کے لیے جو کچھ چاہ رہا تھا وہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ سردار کو اس امر پر پختہ یقین تھا کہ اگر الماجد شاری کی زندگی میں آ جائے تو شاری ایک پُر مسرت زندگی گزار سکتی ہے مگر سردار اب اتنا بیمار اور کمزور تھا کہ حالات پر اس کی گرفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ہر دل عزیز سردار ہونے کے باوجود وہ مجھے ایک تنہا انسان محسوس ہوا۔ میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا اور دل جوئی کی باتیں کرتا رہا۔

سردار شماس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ الماجد کو بستی میں واپس بلائے گا اور اس کا علاج معالجہ کرائے گا لیکن مجھے سو فی صد امید نہیں تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ عین ممکن تھا کہ ابو آبان اسے کسی طور پر ٹالنے کی کوشش کرتا۔ تاہم مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب دو روز بعد میں نے الماجد کو بستی میں دیکھا۔ میں شاری کی طرف جا رہا تھا۔ الماجد شفا خانے سے مرہم پٹی کروا کے واپس آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے سانولے سلونے چہرے پر مسرت کی چمک ابھری۔

"کب آئے تم؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آپ نے بلایا ہے اور آپ ہی کو نہیں پتا۔"

"میں نے بلایا ہے؟"

"ہاں۔ سردار شماس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ سردار کی ہدایت پر ہی محترم ابو آبان نے مجھے بلانے کے لیے کارندہ روانہ کیا تھا۔" مجھ سے باتیں کرتے کرتے الماجد کے چہرے پر ایک دم تناؤ نمودار ہوا۔ وہ کسی شخص کو دیکھ کر چونکا تھا۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ میری نظر براؤن بالوں والے ایک دراز قد نوجوان پر پڑی۔ وہ ابو آبان کے گھر سے نکلا تھا اور لمبے ڈگ بھرتا اصطبل کی طرف جا رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے الماجد سے پوچھا۔

"ہے ایک مہمان ابو آبان کا۔"

اچانک مجھے براؤن بالوں سے بہت کچھ یاد آ گیا۔ شاری

نے قریبی بستی "جومان" کے جس نوجوان التمش کا ذکر کیا تھا اس کے بال بھی تو براؤن ہی تھے۔ شاری نے بتایا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے التمش نامی یہ نوجوان شاری کے چکر میں رہا تھا' شاری نے بھی کسی حد تک اس میں دلچسپی محسوس کی تھی لیکن یہ دلچسپی اس حد تک نہیں بڑھ سکی تھی کہ وہ اس سے شادی ہی کر سکتی پھر ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں رہا تھا لیکن اب وہی نوجوان مجھے ابو آبان کے گھر سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے الماجد سے پوچھا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ یہی التمش ہے۔

الماجد بولا "یہ کبھی کبھار محترم ابو آبان کے پاس آتا ہے۔ ابو آبان بھی اس پر بہت مہربان ہیں۔ وہ اکثر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ شاری کو التمش کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر آمادہ کر لیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ کسی طرح التمش اس قبیلے کا داماد بن جائے۔"

میں نے الماجد کی پوری بات سن لی تو مجھے اس میں وزن محسوس ہوا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ ابو آبان کا رویہ الماجد کے حوالے سے اتنا منفی کیوں ہے۔ اس نے موقع ملتے ہی الماجد کو بستی سے باہر بھیج دیا تھا' اگر مزید موقع ملتا تو شاید وہ اسے ویسے ہی کہیں غائب کروا دیتا۔ میں الماجد کے پاس کھڑا تھا مگر میرا پورا دھیان التمش کی طرف ہی تھا۔ وہ اونچا لمبا تھا مگر زیادہ مضبوط جسم کا مالک نہیں تھا۔ چال میں بھی کسی حد تک نزاکت تھی۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو میں بھی الماجد کو خدا حافظ کہہ کر شاری کی طرف چلا گیا۔ حبشی کنیز نے خلوت گاہ میں شاری کو میری آمد کی اطلاع دی۔ تھوڑی ہی تاخیر کے بعد اس نے مجھے اندر بلا لیا۔ غالباً میری آمد سے پہلے وہ گرمی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹب نما حوض میں گھس بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں سے ابھی تک پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ ایک بڑا تولیا اس نے اپنے جسم کے گرد بڑے اسٹائل سے لپیٹ رکھا تھا۔ یہ تولیا اس کا بمشکل تیس فی صد جسم ہی ڈھانپ پا رہا تھا۔

میں نے کہا "ایسی جلدی بھی نہیں تھی' تم پورا لباس تو پہن لیتیں۔"

وہ عجیب انداز سے بولی "چلو لباس تو ہے۔ تم تو..."

اس نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ فقرہ میرے دماغ کے اندر ایک لمحے میں مکمل ہو گیا "چلو لباس تو ہے۔ تم تو مجھے بغیر لباس کے بھی دیکھ چکے ہو۔"

یہ ادھورا فقرہ اسی واقعے کی طرف اشارہ تھا جب میں نے نشے میں دھت شاری کو ٹب سے نکال کر مسہری تک پہنچایا تھا۔

میں نے کہا "شاری! تم نے تو بتایا تھا کہ التمش سے تمہارا تعلق یکسر ختم ہو چکا ہے مگر ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بستی میں آتا جاتا رہتا ہے اور محترم ابو آبان کے ذریعے ابھی تک اس کوشش میں ہے کہ کسی طرح تمہیں بیاہ پر آمادہ کر لے۔"

"یہ اس کا فعل ہے اور میں اس کی ذمے دار نہیں ہوں۔"

"مگر تم اس قبیلے میں سردار کے فرائض انجام دے رہی ہو۔ اگر تم التمش کو بستی میں آنے سے روکنا چاہو تو وہ کیسے آ سکتا ہے۔"

وہ مسکرائی "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ التمش کے لیے اب بھی کامیابی کا کوئی امکان موجود ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ارادہ بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔"

"یہ تمہاری سوچ ہے اور تمہیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہو' سوچو۔"

میں نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور شاری کو تھما دیا

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پڑھ کر دیکھ لو۔" میں نے کہا۔

وہ پڑھنے لگی۔ یہ عربی کے وہی شعر تھے جو میں نے چند روز پہلے اکھاڑے کی دیوار پر کوئلے سے لکھے دیکھے تھے۔ یہ الماجد نے لکھے تھے' میں نے انہیں کاغذ پر نوٹ کر لیا تھا۔ مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

"میں اس ہوا کو چومتا ہوں جو اس کے مہکتے بدن سے چھو کر آتی ہے' میں اس کرن کو سجدہ کرتا ہوں جو اس کے گلابی رخسار پر چمکتی ہے۔ صحرا میں ریت کے جتنے ذرے ہیں میرے دل میں اس کے لیے اتنے ہی ارمان ہیں۔ میں اس کی ایک مسکراہٹ کے عوض اپنی زندگی دے سکتا ہوں۔"

"کیسی تحریر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے۔ دل پر اثر کرتی ہے۔" وہ ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

"پتا ہے یہ کس نے لکھی ہے اور کس کے لیے؟"

"کس کے لیے؟"

"تمہارے لیے... اور الماجد نے لکھی ہے۔"

یکایک شاری کے چہرے نے رنگ بدل لیا۔ اس نے کاغذ کو توڑ موڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور مجھے کڑی نظروں

سے گھورنے لگی "تم میرا دماغ خراب کرنے کی کوشش نہ کرو اور نہ ہی اپنا دماغ خراب کرو۔ اگر تمہیں یہ امید ہے کہ میں اس غلام زادے کے بارے میں اپنا رویہ بدل لوں گی تو یہ امید قیامت تک بر نہیں آئے گی۔ اسے زندگی کا ساتھی بنانے کے بجائے میں زہر کھانے کو ترجیح دوں گی۔"

"حالانکہ یہ تمہارے والد گرامی کی خواہش بھی ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیا وہ اپنے دل کی حسرت دل میں ہی لے کر چلے جائیں گے۔"

"خدا کرے انہیں میری زندگی بھی لگ جائے۔ میں ان کے لیے اپنی جان تو قربان کر سکتی ہوں لیکن زندہ درگور نہیں ہو سکتی۔"

جب میں شاری کی ایسی دو ٹوک باتیں سنتا تھا تو مجھے شبہ ہونے لگتا تھا کہ شاید میرا ہی اندازہ غلط ہے۔ شاری کے دل میں الماجد کے لیے بس اتنی ہی جگہ ہے جتنی اس کے رویے اور سلوک سے ظاہر ہوتی ہے۔

اگلے ایک ہفتے تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ الماجد کے بازو کا زخم بڑی تیزی سے اچھا ہو رہا تھا۔ میں اور غزالہ دو تین ہفتے زنداں میں گزارنے کے بعد اب ایک بہ نسبت اچھی جگہ قیام پذیر تھے۔ غزالہ کا رویہ اب میرے ساتھ کافی بہتر تھا۔ وہ میرا خیال رکھتی تھی‘ مجھ سے ہر موضوع پر بات کرتی تھی۔ میں گھر سے باہر جاتا تو میری واپسی تک وہ فکر مند رہتی اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مسرت "صحرا کی چاندنی" کے مانند دمک اٹھتی لیکن ایک بات ضرور تھی۔ وہ کسی وقت ایک دم اداس ہو جاتی۔ مجھ سے‘ بچے سے اور اردگرد کے ماحول سے کوسوں دور چلی جاتی۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی سوچوں کا محور شیخ عاصم ہوتا تھا۔

وہی شیخ عاصم جس نے ایک ہوس پرست‘ بے رحم خاوند کی حیثیت سے غزالہ پر کئی جسمانی اور روحانی مظالم توڑے تھے لیکن وہ اسے یاد کرتی تھی۔

شاری اپنے حال میں مگن تھی۔ اس سے یہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی کہ وہ راغ نسل کی گھوڑی کو اس کے نر سے ملانے میں کامیاب ہو گئی ہے اور اب عن قریب اصطبل کے آنگن میں ایک دو پھول کھلنے والے ہیں۔ وہ مجھے الماجد اور اس کے غم سے کوسوں دور نظر آتی تھی۔ شنکر کا ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا تھا‘ یہی وجہ تھی کہ صحرائی بستی کی جانب آنے والے راستوں کی نگرانی مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مفرور شنکر کی تلاش بھی جاری تھی۔ مبارزت پر لگی ہوئی شرطوں کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ شاری کے حکم کے مطابق تمام شرطیں اس وقت تک کالعدم قرار دے دی گئی تھیں جب تک اس لڑائی کا کوئی حتمی نتیجہ سامنے نہ آجاتا۔ اس فیصلے پر کچھ لے دے بھی ہوئی تھی کیونکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ میں اصولی طور پر یہ لڑائی جیت چکا ہوں۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں مجھے ایک بار پھر اتش کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ شام کے بعد ابو آبان کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اس کا گارڈ تھا۔

یہ دوسرے ہفتے کی بات ہے‘ میں الماجد سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ یہ چھوٹے چھوٹے کوارٹر نما مکان ایک طویل قطار میں تھے۔ ان سب میں شاری اور ابو آبان کے غلام و خدمت گار رہتے تھے۔ دو کمرے کے اس مختصر مکان میں الماجد اپنی بوڑھی خالہ کے ساتھ رہتا تھا۔ الماجد کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ دیکھنے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بڑی دیر تک اور بڑی شدت سے روتا رہا ہے۔ الماجد نے مجھے دیکھ کر ناک سے "سوں سوں" کی آواز نکالی اور مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسے زکام وغیرہ ہے۔ اس کے بازو کا زخم اب بہت بہتر تھا۔ پٹی وغیرہ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ میرے پوچھے بغیر ہی بتانے لگا "اب کافی بہتر ہوں‘ زخم بند ہو رہا ہے۔"

"لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ روز بہ روز کھلتا جا رہا ہے۔"

"کیا مطلب۔ یہ دیکھیں۔" اس نے بازو کا زخم دکھایا۔

"ہاں بازو کا زخم تو ٹھیک ہو رہا ہے۔"

"آپ کس زخم کی بات کر رہے تھے؟"

"میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔ خیر کہاں سے آ رہے ہو تم ابھی تھوڑی دیر پہلے میں ادھر سے گزرا تھا تو تم گھر میں نہیں تھے۔"

"آقا ابو آبان کی طرف گیا تھا۔" وہ بجھے بجھے لہجے میں بولا۔

الماجد کا حال چال پوچھنے کے بعد میں واپس آگیا مگر تھوڑی دور آکر مجھے یاد آیا کہ الماجد کی خالہ کو تو دیکھا ہی نہیں۔ اس نہایت عمر رسیدہ عورت کو دیکھنے کا مجھے اشتیاق تھا۔ میں واپس الماجد کی طرف گیا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو کمرے کے اندر سے "ٹھن ٹھن" کی آوازیں آئیں۔ جیسے لوہے سے پتھر پر ضرب لگائی جا رہی ہو۔ میں نے ایک کھڑکی کی جھری میں سے دیکھا‘ میری نظر الماجد پر پڑی‘ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ اس نے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ کر رکھا تھا اور اس کے چوبی دستے کو بار بار پتھر پر مار رہا

تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دستہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ الماجد نے بڑی نفرت سے باقی رائفل ایک طرف پھینک دی۔ میں نے دیکھا وہ زارو قطار رو رہا تھا۔

مجھے اس کی چند دن پہلے کی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے بڑی اداسی سے اپنی رائفل کو دیکھا تھا اور کہا تھا‘ یہ رائفل جب میں شاری کی حفاظت کے لیے اٹھاتا تھا تو مجھے اپنے ہی جسم کا حصہ محسوس ہوتی تھی‘ اب یہ منوں بھاری لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے پھینک دوں کہیں۔۔۔ اور خود بھی کہیں صحرا میں کھو جاؤں۔

مجھے اندازہ ہوا کہ الماجد گہری مایوسی کا شکار ہے۔ وہ ابو آبان کی طرف سے آ رہا تھا‘ شاید وہیں کوئی بات ہوئی تھی۔ میں الماجد کو اس کے حال پر چھوڑ کر ابو آبان کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت دن بھر کی جھلسا دینے والی تمازت کے بعد شام کے مہربان سائے بستی پر پھیلے ہوئے تھے۔ ابو آبان کے گھر کے وسیع احاطے میں مجھے چہل پہل نظر آئی۔ میں نے چار دیواری کے اوپر سے دیکھا‘ احاطے میں پندرہ بیس افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے لباس مقامی معیار کے مطابق امیرانہ تھے۔ ان میں بستی کے معززین کے علاوہ اردگرد کی ایک دو بستیوں کے افراد بھی تھے۔ یہاں مجھے بہت سے موٹے بڑے بندر نظر آئے۔ سفید‘ سیاہ‘ براؤن ہر رنگ اور سائز کے بندر تھے۔ ان کے بال صاف ستھرے تھے اور انہیں خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ کسی کے گلے میں موتیوں کی مالا تھی‘ کسی نے کام دار واسکٹ پہن رکھی تھی‘ کسی کے پاؤں میں چھانجریں تھیں۔ اس کے علاوہ چند تازی کتے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تماشائیوں کے عین درمیان تین چار بندر موجود تھے اور وہ اپنے مالکوں کے اشاروں پر مختلف کرتب دکھا رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان علاقوں میں کچھ لوگ بندر پالنے کا شوق رکھتے ہیں۔

میرے قریب ہی بستی کا ایک تماشائی کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟"

وہ اکثر لوگوں کی طرح ٹوٹی پھوٹی انگلش جانتا تھا‘ اس نے سات آٹھ فقروں میں جو کچھ بتایا اس کا مفہوم یہ تھا کہ بستی میں ہر چھ ماہ بعد اسی قسم کا ایک میلہ ہوتا ہے۔ لوگ اپنے گھوڑے اور بندر لاتے ہیں اور ان کے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ یہ کافی بڑا میلہ ہوتا ہے لیکن اس دفعہ چونکہ بستی میں اموات ہوئی ہیں اور کئی گھروں میں ابھی تک فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کا سوگ منایا جا رہا ہے لہٰذا اس میلے کو چار دیواری تک محدود رکھا گیا ہے اور چند ایک افراد ہی اس میں شریک ہوئے ہیں۔

اچانک میری نظر اتش پر پڑی۔ وہ اس تقریب کے شرکا میں شامل تھا۔ اس کی نشست ابو آبان اور شاری کے قریب تھی۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اتش کو دیکھتے ہی میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ الماجد یہاں سے اتنا غم زدہ کیوں گیا ہے۔ وہ شاری کا دیوانہ تھا۔ اس کے پہلو میں اتش کو دیکھ کر یقیناً اس کے دل پر جذبۂ رقابت نے اندھا دھند وار کیے تھے‘ وہ لہولہان ہو کر لوٹا تھا اور اس کے زخموں کا خون آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے رسنے لگا تھا۔

میں شاری کو دیکھ سکتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی‘ میں اس کے چہرے کے تاثرات پر غور کرنے لگا۔ وہ ہنس رہی تھی اور باتیں کر رہی تھی۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے حوالے سے کتنا دکھی ہے اور کیسے کیسے تڑپ رہا ہے پھر میرے دل میں ایک اور خیال آیا‘ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ جان بوجھ کر الماجد کو دکھ پہنچاتی ہو۔ اس کے ایسے رویے کی کئی مثالیں میرے سامنے تھیں۔ وہ الماجد کی ننگی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہوا کرتی تھی۔ اسے پہروں اپنے کمرے کے دروازے سے باہر کھڑا رکھتی تھی‘ معمولی باتوں پر اسے بری طرح جھاڑ دیتی تھی۔

○☆○

اس بستی میں ہمیں قریباً دو ہفتے مزید گزر گئے۔ بستی کے لوگوں میں "بیرونی حملے" کا جو خدشہ پایا جاتا تھا وہ دھیرے دھیرے معدوم ہو گیا۔ شیخ عاصم کی طرح شنکر کا بھی کوئی کھوج نہیں لگ سکا تھا۔ شنکر کو فرار کرانے کے الزام میں شفا خانے کے ملازم تابان کو گرفتار کر لیا گیا تھا‘ بعد ازاں اس کی نشان دہی پر حرسانی کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ بستی کے لوگوں میں حرسانی کے خلاف بہت غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ بعض لوگ اس کا گھر جلانے اور اسے سرعام گولی مارنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بہرحال وقت جوں جوں گزر رہا تھا اور حملے کا خطرہ کم ہو رہا تھا‘ حرسانی کے خلاف لوگوں کے غم و غصے میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی۔

غزالہ اس ماحول سے سخت اکتا گئی تھی‘ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ قریباً روزانہ ہی ناشتے کے وقت وہ یہاں سے جانے کی بات چھیڑ دیتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں شاری سے یہاں سے جانے کی اجازت طلب کروں اور اگر وہ نہیں مانتی تو اس سلسلے میں سردار شماس سے بات کروں۔ آخر غزالہ ہی کے اصرار پر میں نے ایک روز شاری سے دو ٹوک بات کی۔ میں نے کہا "شاری! تم نے بارہا کہا ہے کہ میں نے

تمہیں ڈوبنے سے بچا کر تم پر بڑا احسان کیا ہے۔ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے لیکن اگر تم واقعی اسے احسان سمجھتی ہو تو پھر میں اس کے بدلے تم سے تمہارا تھوڑا سا اعتبار چاہتا ہوں۔"

"اعتبار؟ میں سمجھی نہیں۔"

"تمہیں اس بات پر اعتبار کرنا ہوگا کہ ہمیں بستی سے جانے کی اجازت دے کر تم اس بستی کے لیے کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لو گی۔ ہم تمہارے بارے میں اور اس بستی کے بارے میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھیں گے۔"

وہ کچھ دیر تک گم صم سی میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس بھر کر بولی "لیکن تم اس بات کی یقین دہانی نہیں کرا سکتے کہ تمہیں کوئی پکڑے گا نہیں اور تمہیں تشدد کے شکنجے میں کس کر تم سے سب کچھ اگلوا نہیں لے گا۔"

میں نے کہا "ہم ابوظہبی جائیں گے ہی نہیں۔۔۔ ہم ساحل پر پہنچ کر سمندری راستہ اختیار کریں گے اور بذریعہ لانچ، خلیج کے ساحل کے ساتھ ساتھ دبئ کی طرف نکل جائیں گے۔"

"کچھ بھی ہو اس میں رسک تو بہرحال موجود رہے گا اور اگر تم پکڑے گئے تو جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا وہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ جو امیرزادے یہاں قتل ہوئے ہیں ان کی موت کا ذمے دار بھی یقیناً تمہیں ہی ٹھہرایا جائے گا اور اس جرم کی پاداش میں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے، کم ہے۔ تم ہمارے بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کا دعویٰ کر رہے ہو لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ تشدد کی چکی میں پس کر پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔"

اس موضوع پر میرے اور شاری کے درمیان کافی دیر بات ہوئی۔ وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی اور میں اسے۔ وہ میرے کچھ دلائل مان بھی رہی تھی مگر ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دینے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاری سردار کے عہدے پر تو فائز ہے لیکن ابھی اس میں فیصلہ کرنے کی وہ قوت موجود نہیں جو ایک سردار میں ہونی چاہیے۔ وہ اکثر فیصلوں میں اپنے چچا ابو آبان اور اس کے ایک دو دوستوں سے مشورہ لیتی تھی۔

آخر میں نے اس سلسلے میں سردار شماس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سردار کے ساتھ میری گفتگو اسی نیم تاریک کمرے میں ہوئی جہاں سردار نے پچھلے چار پانچ برسوں سے موت سے جنگ جاری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سردار کے سامنے اپنی تمام تر گزارشات پیش کیں۔ وہ ہولے ہولے کراہتا رہا مگر توجہ اور ہمدردی سے سنتا رہا۔ وہ اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر رہا تھا کہ مجھے اور غزالہ کو بچے سمیت دیر تک بستی میں پابند رکھنا مناسب نہیں۔ سردار نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں شاری اور ابو آبان سے مشورہ کرے گا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ یہ معاملہ جلد طے ہو جائے گا اور میری مرضی کے مطابق طے ہو جائے گا۔ جو کچھ بھی ہوا ایک خوشگوار حیرت لیے ہوئے تھا۔ صبح میں سو کر اٹھا تو آبان گھر میں موجود تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے ہی آیا تھا۔

"مبارک ہو۔" اس نے اپنے سفید براق بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تمہیں بستی سے جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ تم جب چاہو ہمیں خدا حافظ کہہ سکتے ہو۔ تاہم اس کے لیے ایک دو شرطیں ہوں گی۔"

"جی فرمائیں۔"

"کوئی ایسی خاص شرطیں نہیں ہیں۔ ہمارے آدمی تمہیں صحرا کی حدود سے نکالنے کے لیے ساتھ جائیں گے۔ سفر کے دوران میں تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی رہے گی۔ صحرا سے نکل کر تم ابوظہبی کی طرف نہیں جاؤ گے، سمندری راستہ اختیار کرو گے، اس کے علاوہ بھی ایک آدھ چھوٹی موٹی شرائط ہیں، مجھے امید ہے تمہیں ان پر اعتراض نہیں ہوگا۔"

ابو آبان ہمارے لیے ایک جاں فزا خبر لے کر آیا تھا۔ اس جہنم زار کی صعوبتیں برداشت کرتے اب ہمیں چھ ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ سکون کی نیند، زندگی کی سہولتیں کی تمنا تھی، یہ سب خواب کی باتیں لگتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جدید دنیا سے کٹ کر ہم کسی قدیم بستی میں آ پہنچے ہیں اور اب ہمیں مر کر یہیں دفن ہونا ہوگا۔ میں تو پھر بھی باہر نکل کر گھوم پھر لیتا تھا لیکن غزالہ تو چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر وقت گزاری کے لیے بچہ اس کے پاس نہ ہوتا تو وہ مرنے کی حد تک بور ہو جاتی۔ میں نے دیکھا کہ ابو آبان کی بات سن کر غزالہ کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کی نمی تھی۔

شام کے بعد الماجد ہماری قیام گاہ پر چلا آیا۔ اس نے اداس لہجے میں ہمیں مبارک باد دی۔ وہ بہت بے چارہ نظر آ رہا تھا۔ ٹوٹا پھوٹا اور شکستہ حال۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اس نے کئی دن سے شیو نہیں کی۔ دو دن پہلے بھی میں نے اس سے اس کی بے پناہ اداسی کا سبب پوچھا تھا، وہ بولا تھا "مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں روز بہ روز

اس سے دور جا رہا ہوں۔ اس کی نگاہوں میں گرتا جا رہا ہوں۔ میرے نصیب میرے اور اس کے درمیان دائمی دوری حائل ہونے والی ہے۔"

میں نے پوچھا تھا "کہیں تمہاری مایوسی کی وجہ الحشن تو نہیں ہے۔" وہ خاموش ہو گیا تھا، چہرے پر غم کے بادلوں نے یورش کر دی تھی پھر ایک کراہتی ہوئی سی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔

"مجھے کسی سے شکوہ نہیں شاہ جہاں صاحب۔ میری اپنی قسمت میں ہی خرابی ہے۔"

آج دو روز بعد وہ میری قیام گاہ پر مبارک باد دینے آیا تھا تب بھی اس کے لب و لہجے میں وہی پہلے والی اداسی تھی۔ میں بغور الماجد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سانولا چہرہ، نہایت سفید دانت، دلکش نقوش، بہت روشن آنکھیں اور فولادی جسم۔ اس کی پیشانی پر بلند اقبالی کی چمک تھی اور یہ چمک سردار شماس کی جہاں دیدہ نگاہ نے دیکھ رکھی تھی۔ شاید اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ شاری الماجد کو اپنا جیون ساتھی چن لے مگر اب عمر اور بیماری کے ایسے اسٹیج پر تھا کہ صرف چاہ سکتا تھا، اپنے اختیار استعمال کر کے کچھ منوا نہیں سکتا تھا۔ الماجد کا چہرہ دیکھتے دیکھتے اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ یقین کی ایک لہری میرے اندر سے اٹھی اور میرے دل نے گواہی دی کہ میری رائے الماجد کے لیے بڑی مفید ثابت ہوگی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "الماجد! یہ بستی چھوڑ دو، ہمارے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"جہاں ہم چلیں۔ میں تمہیں سردار شماس سے اجازت دلا دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔"

"لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں الماجد۔ یہاں رہ کر تم اپنے آپ کو ہلکان کرنے کے سوا اور کیا کر رہے ہو۔ تم خود کہہ رہے ہو کہ شاری تم سے دور ہے اور دور ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس بازی میں ہارنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ دلیری سے ہارا جائے۔ بجائے اس کے کہ شاری تمہیں چھوڑ دے، تم اسے چھوڑ دو۔ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دو اسے۔ اس کے دل و دماغ کو ایسی یادیں دے جاؤ جنہیں وہ ہمیشہ یاد رکھے۔ تم دنیا کے جس کونے میں بھی جاؤ یہ خوش کن تصور تمہارے ساتھ رہے کہ اس صحرائی بستی میں کوئی کبھی کبھار تمہارے بارے میں سوچتا ہے اور تمہیں یاد کرتا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ الماجد کی آنکھوں میں ایک چمک انگڑائی لے کر بیدار ہوئی لیکن پھر۔۔۔ دو ہی لمحے بعد بجھ گئی، وہ بے ساختہ بول اٹھا "لیکن شاہ جہاں صاحب! اتنی۔۔۔ پہاڑ سی زندگی کیسے گزرے گی، کیسے گزرے گی زندگی شاری کے بغیر؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "الماجد جب انسان ہمت سے قدم اٹھاتا ہے تو راستے خود بخود نکلتے ہیں اور ایسے راستے بھی نکلتے ہیں جن کی انسان کو توقع نہیں ہوتی۔ تم قدم اٹھاؤ تو ہو سکتا ہے کوئی ایسا راستہ بھی نکل آئے جس کا تمہیں وہم و گمان نہ ہو۔ ان غیر متوقع راستوں میں سے ایک راستہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاری ہی تمہاری طرف لوٹ آئے۔ وہ جب دیکھے کہ تم ہمیشہ کے لیے اسے الوداع کہہ رہے ہو تو اس کے دل میں چھپی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے۔"

"مگر یہ تو تب ہو سکتا ہے جب کوئی چنگاری موجود ہو۔"

"ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے الماجد۔۔۔ صرف میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہارا بستی چھوڑ جانا، بستی میں رہنے سے کہیں بہتر ہوگا۔ تم نے سب کچھ کھو بھی دیا تو بھی تمہاری محبت تو زندہ رہے گی۔"

میں بہت دیر الماجد کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بولا "شاہ جہاں صاحب، آپ نے مجھے دو بار بستی سے دور بھیج کر دیکھ لیا ہے۔۔۔ پہلے کیا فرق پڑا ہے جو اب پڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "الماجد! تم شاید میری بات بھول گئے ہو۔ فتح وہی پاتے ہیں جو ہارنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتے ہیں۔ جنگ کے میدان کی طرح محبت کے میدان میں بھی اعصاب کی مضبوطی کا امتحان ہوتا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کی برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کڑی آزمائش سے گزارتے ہیں۔ دانا کہتے ہیں کہ محبت کے کھیل میں کوئی بات بھی حتمی نہیں ہوتی، جو کچھ ایک موقع پر ناممکن نظر آتا ہے کچھ عرصے بعد وہی ممکن بلکہ عین ممکن نظر آ سکتا ہے۔"

اس وقت تو الماجد بغیر کوئی جواب دیے چلا گیا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ تذبذب کا شکار ہے اور گھر جا کر اس بارے میں بہت سوچ بچار کرے گا۔

اگلے روز سے میں اور غزالہ روانگی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ابو آبان نے اپنے ملازمین سے کہہ دیا تھا کہ ہمیں رختِ سفر میں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، ہمیں مہیا کی جائے۔ ویسے ہمیں زیادہ کچھ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابو آبان کی اطلاع کے مطابق ہمیں دس آدمیوں کے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہونا تھا۔ یہ قافلہ مکمل ساز و سامان سے لیس تھا۔

اگلے دو روز میں، میں نے الماجد سے دو تین ملاقاتیں

کہیں اور اسے آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ میرے ساتھ ہی بستی چھوڑ جائے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے اس سلسلے میں سردار شامس سے تفصیلی بات کرلی ہے اور سردار نے اس سلسلے میں ابو آبان کو آگاہ کردیا ہے۔ الماجد کو میری اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں اسے ابو آبان کے پاس لے گیا۔ اتفاقاً وہاں شاری کے علاوہ چند دیگر معززین بھی موجود تھے۔ ابو آبان نے ان سب کے سامنے اعلان کیا کہ اس نے الماجد کو بغیر کسی معاوضے کے آزاد کردیا ہے اور اب وہ جہاں اور جس کے ساتھ جانا چاہے' جاسکتا ہے۔

درحقیقت ابو آبان کو الماجد کی آزادی کے سلسلے میں آمادہ کرنے میں مجھے یا سردار شامس کو کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ابو آبان خود ہی چاہتا تھا کہ الماجد یہاں سے کہیں چلا جائے۔ جب سردار شامس کی سفارش بھی شامل ہوگئی تو اس نے فوراً الماجد کو بلا معاوضہ آزادی "بخشنے" کا فیصلہ کرلیا۔ اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ الماجد اس آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں۔ بستی چھوڑ جانے کے سلسلے میں وہ ابھی تک شدید کشمکش کا شکار تھا۔ میں جانتا تھا بستی سے نکلنا اس کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا جسم سے جان کا نکلنا۔

آغاز سفر سے ایک شب پہلے کھلے صحرا میں تاروں کی چھاؤں تلے الماجد اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بالآخر وہ میری بات ماننے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے اپنے ذہن کی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور سوچنے سمجھنے کا سارا کام میرے ذمے لگا دیا۔ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "ٹھیک ہے شاہ جہاں صاحب! آپ میرے حق میں جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کریں۔ میں تو شاید مایوسی کے اس درجے میں ہوں کہ اپنے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔"

میں نے اسے گلے سے لگالیا "الماجد! مجھے یقین ہے کہ تم ایک نئی اور بہتر زندگی شروع کرو گے۔"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا "خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

○☆○

اور وہ آغاز سفر کی صبح تھی۔ اندھیرے پر دھیرے دھیرے اجالا غالب آرہا تھا۔ اجالا جو اگلے چند گھنٹوں میں آگ کا لباس پہننے والا تھا۔ روانگی سے پہلے مقامی دستور کے مطابق ہم نے اس مرقد پر حاضری دی جہاں اس بستی اور قبیلے کی ہر دل عزیز ہستی برسوں سے محو خواب تھی۔ مقامی رواج کے مطابق میں اور غزالہ قریباً آدھ گھنٹا سارہ کی قبر پر موجود رہے اور پھول وغیرہ نچھاور کیے۔

وہاں سے ہم سردار شاری کے ساتھ الوداعی ملاقات کے لیے روانہ ہوگئے۔ شاری اپنی رہائش گاہ کے احاطے میں موجود تھی۔ وہ نہا کر نکلی تھی۔ حبشی کنیز اس کے منور صورت بالوں میں کنگھی کررہی تھی۔ ایک دوسری کنیز اس کے پاؤں کے ناخن تراشنے میں مصروف تھی۔ شاری خاموش سی نظر آئی۔

"تو آخر تم نے بستی کو خدا حافظ کہنے کا ارادہ کر ہی لیا" وہ بولی۔

"ہم سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔" میں جواب دیا۔

بچہ غزالہ کی گود میں تھا۔ شاری نے بچے کو اٹھا کر پیار کیا پھر واپس غزالہ کی گود میں دے دیا۔

"سنا ہے تم ڈاکٹر ہو؟" اس نے غزالہ سے پوچھا۔

"اب تو لگتا ہے کہ کبھی تھی۔ اب نہیں ہوں" غزالہ بے دلی سے مسکرائی۔

"کیوں اب کیا ہوا ہے؟"

"محسوس ہوتا ہے کہ برسوں بیت گئے ہیں اس بستی میں رہتے ہوئے۔ اس لیے نہیں کہ یہ رہنے کے لیے اچھی نہیں یا یہاں کے لوگوں نے مجھے پیار نہیں دیا۔ بس سخت موسم کی عادت نہیں تھی پھر اپنوں سے دوری بھی کرتی رہی ہے۔"

"کچھ اپنے تو تمہارے ساتھ ہی موجود ہیں۔" وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولی پھر اچانک اس نے موضوع بدلا "ہاں مجھے یاد آیا شاہ جہاں۔ میں نے سنا ہے تم الماجد کو بھی اپنے ساتھ لے جارہے ہو۔"

"وہ اپنی مرضی سے جارہا ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا واقعی وہ جارہا ہے؟"

"ہاں وہ جارہا ہے۔"

"کیوں؟ یہاں اسے کیا تکلیف تھی؟"

"یہ سوال تو تمہیں اس سے کرنا چاہیے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس سے ملنا ہی پسند نہیں ہے۔"

وہ ایک دم کھوسی گئی "ایسی بات نہیں ہے۔ تم نے کہا ہے کہ مجھے اس سے ملنا پسند نہیں۔ لیکن۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

اس نے بالوں کو سمیٹ کر کانوں کے پیچھے اڑسا۔ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کے لب تھرا کر رہ گئے "خیر چھوڑو اس بات کو۔" وہ بولی۔

"میرے خیال میں یہ بات اتنی غیر اہم نہیں ہے۔" کے ساتھ ہی میں نے نظر بچا کر غزالہ کو اشارہ کیا۔

پیشاب کرانے کے بہانے باہر چلی گئی۔

میں نے کہا "شاری! الماجد تم سے دور جارہا ہے لیکن یقین کرو اس کی نگاہیں اب بھی تم پر لگی ہیں۔ اس کے کانوں کو یہ آس ہے کہ شاید تم اسے آواز دو گی اور روک لو گی۔ زندگی میں ایسے دوراہے بڑے کٹھن ہوتے ہیں شاری! لیکن ایک بار جب چلنے والا آگے بڑھ جائے تو پھر بہت دور نکل جاتا ہے۔"

شاری کی آنکھوں میں پہلی بار کرب کی ہلکی سی لہر نظر آئی۔ معلوم نہیں یہ بھی میرا وہم ہی تھا یا حقیقت تھی۔ وہ بولی "میں نے اسے جانے کے لیے نہیں کہا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

"اس کی مرضی تو تمہاری مرضی کی تابع ہے شاری! تم جانتی نہیں' وہ تمہیں کیا سمجھتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے "دین دنیا" کا محور صرف تم ہو۔ وہ تمہیں پیار نہیں کرتا' تمہیں پوجتا ہے شاری! اگر روک سکتی ہو تو اسے روک لو۔"

"تم بے کار کی باتیں کررہے ہو۔" شاری نے جھنجلا کر کہا "میں اسے کیوں روکوں گی۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں۔"

وہ اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ دونوں حبشی کنیزیں اس کے غصے سے سہمی ہوئی تھیں۔ میں اس کے پیچھے ہی پیچھے کمرے میں گیا۔ وہ آئینے کے سامنے تھی اور اپنے بالوں کو یونہی ادھر سے ادھر پھینک رہی تھی۔ یہ اس کی جھلاہٹ کا انداز تھا۔ اس نے آئینے میں میرا عکس دیکھا اور کچھ مزید برہم نظر آنے لگی۔

میں نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "شاری! تم اپنے آپ سے بھاگنے کی کوشش کررہی ہو اور یہ لاحاصل کوشش ہے۔ اگر آج تم نے اپنی جھوٹی آنا اور شان و شوکت کی دیوار برقرار رکھی تو بہت کچھ ختم ہوجائے گا۔ تم پڑھی لکھی ہو' سمجھ دار ہو' اگر تم جیسے لوگ بھی انسانوں میں آقا اور غلام کی تقسیم کو درست سمجھیں گے تو پھر ایسی لعنتوں کو ختم کون کرے گا۔ تم سے بہتر اپنے دل میں اور کون جھانک سکتا ہے' وہاں جھانکو اور جو کچھ نظر آرہا ہے اسے دل سے تسلیم کرلو۔"

شاری نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا "تم۔ اپنی نکالے بازی بند نہیں کرسکتے۔" وہ غرائی اور آئینے کے سامنے سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے پہلی بار اس کی چال میں ڈگمگاہٹ سی دیکھی۔

اس دوسرے کمرے میں جاکر شاری نے دروازہ اندر سے مقفل کرلیا تھا۔ میں نے کئی بار دستک دی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے کہا "شاری! تم اپنے آپ سے جھوٹ بول رہی ہو' خود سے چھپنے کی کوشش کررہی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حبشی کنیزیں مجھے کڑی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ اگر میں کچھ دیر مزید وہاں کھڑا رہا تو وہ مجھے زبردستی وہاں سے نکالنے کی کوشش شروع کردیں گی۔

میں دھیمے قدموں سے واپس پلٹ آیا۔ بے شک شاری کا رویہ مثبت نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے اندر ایک ہلچل سی ضرور برپا ہوئی ہے۔ وہ اپنے تاثرات کے ذریعے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ تنہائی میں سوچتی اور اگر راکھ میں اس کے اندر چنگاری قسم کی کوئی چیز موجود تھی تو وہ بھڑک اٹھتی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ایک بار شاری کے اندر کچھ بھڑک اٹھا تو پھر اس میں بہت سی ناپسندیدہ چیزیں جل کر راکھ ہوجائیں گی لیکن اگر سرے سے کوئی چنگاری ہی موجود نہیں تھی تو پھر کیا کہا جاسکتا تھا۔

پھر وہ لمحے آگئے جب ہمیں یہ بستی چھوڑنی تھی۔ دس شتر سواروں کا دستہ ہمارے ساتھ تھا۔ ایک اونٹ پر میں سوار تھا' ایک دوسری اونٹنی پر غزالہ بچے کے ہمراہ سوار تھی۔ الماجد ایک سرخ اونٹ پر تھا۔ ٹوٹی ہوئی رائفل جو فی الوقت بیکار تھی اس نے اپنے کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ شاری اور سردار شامس کی طرف سے ہمیں کئی تحائف دیے گئے تھے اور سب سے بڑا تحفہ وہ پانی تھا جو وافر مقدار میں ہمارے سامان میں موجود تھا۔ مجھے آخر وقت تک آس رہی کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہوجائے اور شاری الماجد کو ہمارے ساتھ جانے سے روک لے اور یہ آس صرف مجھے ہی نہیں تھی' یہ آس سو گنا شدت کے ساتھ الماجد کی آنکھوں میں موجود تھی اور اس کے ہونٹوں پر لرز رہی تھی اور اس کی سانسوں میں سفر کررہی تھی۔

ہم آہستہ آہستہ بستی سے دور ہوتے گئے' یہاں تک کہ بستی سرخ ریت کے ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور دونوں کی مہاریں باہم مربوط کردی گئیں۔ جلتے ہوئے لق و دق صحرا میں ہمارا طویل سفر شروع ہوگیا۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھنے سے نظر قید ہوگئی تھی لیکن میں خوش بھی تھا۔ میں الماجد کا مایوس چہرہ دیکھنے سے بچ گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا' اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی اور جو کچھ اس کے دل پر بیت رہی تھی اس کا براہ راست اثر میرے دل پر ہورہا تھا۔ یہ بات مجھے تو معلوم تھی کہ کھیل میں

بار جیت ہوتی ہے لیکن معلوم نہیں الماجد اس صورت حال کو قبول کر رہا تھا یا نہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی سواری اس کے پاس لے جاؤں۔ اس سے تسلی تشفی کی باتیں کروں لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں تھا۔

ہم نے دن ڈھلے تک سفر کیا پھر یہ قافلہ لق ودق صحرا کے وسط میں کہیں رک گیا۔ ہماری آنکھوں پر سے پٹیاں ہٹا دی گئیں۔ خیمے استادہ کردیے گئے۔ میں نے الماجد کی طرف دیکھا' وہ اپنے سرخ اونٹ کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ غم' پریشانی' افسوس' کوئی کیفیت بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔ جس طرح آنسو آنکھوں سے خشک ہوتے ہیں شاید اسی طرح تاثرات بھی چہرے سے روٹھ جاتے ہیں۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ الماجد نے جو بازی کھیلی تھی وہ میرے کہنے پر ہی کھیلی تھی اور اس بازی میں وہ ہار گیا تھا۔ وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی شاری کی انا اور نخوت کی دیوار نہیں گرا سکا تھا۔ مجھ پر پچھتاوے کا احساس غالب آنے لگا' تاہم میں نے بہت جلد اس احساس پر قابو پالیا۔ اگر میں ہی حوصلہ چھوڑ جاتا تو الماجد کی ڈھارس کون بندھاتا۔ اسے کون بتاتا کہ زندگی اپنے نئے امکانات اور نئی امیدوں کے ساتھ اس کے سامنے بازو پھیلائے کھڑی ہے اور یہ بات اسے کون سمجھاتا کہ سب کچھ کھو کر بھی اس نے اپنی "محبت" بچائی ہے۔

میں دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھا۔ بڑی کوشش کر کے میں نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ غروب ہوتے سورج کا عکس الماجد کی سیاہ آنکھوں کو روشن تر کر رہا تھا۔ اس کے لب تھرائے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا "الماجد! ہار کو شان سے برداشت کرنا جیت کے برابر ہوتا ہے اور اگر ـــ"

اچانک مجھے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ دور مغربی افق پر جہاں شام کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور پیش منظر میں سرخ ٹیلے نظر آرہے تھے' ایک گھڑ سوار دکھائی دیا۔ وہ تیز رفتاری سے ہماری طرف اڑا چلا آرہا تھا۔ اس کا دامن ہوا میں.... پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا' وہ شاری تھی۔

وہ سو فی صد شاری تھی۔ قافلے کے سارے ارکان حیرت سے منجمد ہوگئے تھے اور اپنی سردار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاری ہمارے عین سامنے آکر رک گئی۔ اس کی طرح اس کا گھوڑا بھی ہانپا ہوا تھا۔ چہرے پر طویل مسافت کی گرد تھی۔ میں نے دیکھا' اس کی حسین آنکھیں الماجد پر مرکوز تھیں یا وہ بے خودی کے عالم میں اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔ پھر وہ گھوڑے سے اتری اور ہمارے پاس پہنچ گئی۔ میں نے پہلی بار شاری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ جنگجو قبائلی سردار رو بھی سکتی ہے اور اس سے بھی حیرت ناک بات یہ تھی کہ شاری کے یہ آنسو ایک غلام زادے کے لیے تھے۔

یہی وہ لمحے ہوتے تھے جب مجھے اس اُجڈ لڑکی کے اندر سے اس کی بلغارین والدہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ پھولوں کی نزاکت اور شبنم کی ٹھنڈک والی جھلک.....

"شاری! تم یہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ الماجد کی طرف دیکھ رہی تھی' چونک کر میری طرف دیکھنے لگی' بالکل یوں لگا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ "شاری! تم یہاں کیسے آگئیں؟"

وہ بولی۔ "ایک اہم اطلاع دینا تھی تم لوگوں کو۔"

"اگر تم اتنی دور سے صرف کسی اطلاع کے لئے یہاں پہنچی ہو تو یقیناً یہ نہایت اہم اطلاع ہوگی؟"

"ہاں ایسا ہی سمجھو۔"

میں نے کہا۔ "چلو اندر خیمے میں جا کر بات کرتے ہیں۔"

میں اور شاری خیمے کی طرف چل دیے۔ شاری کا دُم چھلا اس کا پالتو بندر ربابی اس کے ساتھ ہی تھا۔ گھڑ سوار دستے کا سالار مستقیم میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ وہ بڑے ادب سے ناف پر ہاتھ باندھے ہوئے تھا۔ خیمے میں شاری کو پانی پیش کیا گیا۔ اس نے تھوڑے سے پانی کے ساتھ اپنا چہرہ اور بازو وغیرہ دھوئے۔ گیلے کپڑے سے بالوں کو اور گردن کو صاف کیا۔ سورج غروب ہونے کے بعد اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا' ہوا میں تھوڑی سی ٹھنڈک آگئی تھی۔ یہ ٹھنڈک ہم سب کو راحت پہنچا رہی تھی۔

میں نے شاری سے کہا۔ "مجھے حیرانی ہے کہ تم اتنی دور اکیلی آگئی ہو۔ اگر آنا ضروری تھا تو کسی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔"

"یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔" وہ بارعب لہجے میں بولی۔ "میں صحرا میں بہت دور تک اکیلی گئی ہوں' بلکہ کئی راتوں کو مجھے بستی سے باہر بھی رہنا پڑا ہے۔ تم شہر کے ماحول کے مطابق بات کرتے ہو' اس صحرا کے رات دن بالکل اور طرح کے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی میں تمہاری دلیری اور سخت جانی کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ویسے میرے ساتھ دو گھڑ سوار ہیں۔ وہ پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔" تھوڑا سا توقف کر کے اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک بہت بڑا ٹڈی دل صحرا میں گھوم رہا ہے۔ صحرا میں گھومنے والے ایسے ٹڈی دل بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ قافلوں پر حملے کرتے ہیں اور انہیں برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جس ٹڈی دل کی ہمیں اطلاع ملی ہے' وہ بہت زیادہ نقصان کر رہا ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی ٹڈی ہے جسے "حاریف" کہا جاتا ہے۔ ایسے ٹڈی دل شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ عموماً یہ ربع الخالی کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔ جس ٹڈی دل کا میں ذکر کر رہی ہوں' یہ جنوب مشرق کی سمت نظر آیا ہے۔ صحرا کے اندر واقع ایک بستی "ابیل اشراق" میں اس ٹڈی دل نے جو نقصان پہنچایا ہے' اجناس تباہ ہوئی ہیں' درجنوں جانور ہلاک ہوئے ہیں اور بستی میں ایک دو افراد کی جانیں بھی گئی ہیں۔"

"یہ تو بڑی تشویش ناک بات ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بستی میں بھی میں نے اس قسم کی اطلاعات سنی تھیں کہ علاقے میں کوئی ٹڈی دل موجود ہے۔ بستی میں عجیب وضع کی اِکّا دُکّا ٹڈیاں بھی دیکھنے میں آئی تھیں۔"

شاری نے کہا۔ "تم لوگوں کو بڑی احتیاط سے سفر کرنا ہوگا۔ بلکہ بہتر ہے کہ ایک دو روز تک تم لوگ اس پڑاؤ میں رہو' کھلی جگہ پر یہ ٹڈی دل بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہماری حیثیت تو اس قافلے میں قیدیوں کی سی ہے۔ ہم نے وہی کرنا ہے جو تمہارے محافظ کہیں گے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں تفصیل سے سب کچھ سمجھا دو۔"

"وہ تو میں کروں گی ہی لیکن تمہیں بھی مطلع کرنا ضروری تھا۔" وہ قدرے خشک لہجے میں بولی۔

پھر وہ گھڑ سوار دستے کے سالار سے عربی میں بات چیت کرنے لگی۔ سالار مستقیم مسلسل اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاری سالار کو جو کچھ بتا رہی ہے وہ اسے پہلے سے معلوم ہے۔ بلکہ ٹڈی دل کے خطرے سے بھی وہ آگاہ تھا۔ یہ اطلاع اس کے لئے نئی نہیں تھی۔

درحقیقت شاری یہ اطلاع لے کر نہ بھی آتی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ شاری صرف اس اطلاع کے لئے یہاں تک دوڑی نہیں آئی۔

موت سے پنجہ کشی کرنے والے سرفروشوں کی دل ہلا دینے والی داستان

یہاں آنے سے اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہی مقصد جو ابھی تک شاری کی زبان پر نہیں آیا تھا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی آنکھوں میں چمکا تھا اور اس کی پیشانی سے کسی روشن لکیر کے مانند پھوٹا تھا۔ جب اس نے گھوڑے کو روکنے کے بعد الماجد کی طرف دیکھا تھا تو چند لمحوں کے لئے وہ اپنے اردگرد سے بالکل غافل ہوگئی تھی۔ بس اس کی آنکھیں تھیں اور الماجد کا چہرہ تھا۔ انہی لمحوں میں اس کے چہرے نے اس "مقصد" کی چغلی کھائی تھی۔ ایک مرحلے میں تو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ بے قرار ہو کر گھوڑی سے اتر آئے گی اور الماجد کی بانہوں میں چلی جائے گی لیکن پھر شاید اس کی انا اور حیثیت آڑے آئے تھی اور اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔... اب وہ ایک بار پھر اپنے خول میں چھپی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر استقامت تھی اور لہجے میں راجوں' مہاراجوں والی تمکنت.... میں اس کے رنگ بدلتے مزاج کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔

اپنی گفتگو کے آخر میں شاری نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ رات پڑاؤ میں گزار کر علی الصباح بستی واپس روانہ ہو جائے گی۔ اس نے سالار مستقیم کو ہدایت کی کہ اس کی گھوڑی کو دانہ پانی فراہم کیا جائے اور مالش وغیرہ کر کے تازہ دم کردیا جائے۔ وہ خود بھی کھانا کھا کر آرام کرنا چاہ رہی تھی۔ شاری گھڑ سواری کے لباس میں تھی۔ میں نے غزالہ سے کہا اور اس نے اپنا شب خوابی کا لباس شاری کو دے دیا۔

شاری کے لئے ایک علیحدہ خیمہ مختص کردیا گیا۔ یہ پڑاؤ کا سب سے بڑا اور صاف ستھرا خیمہ تھا۔ شاری نے کھانا میرے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے دوران میں اس نے زیادہ بات چیت نہیں کی۔ کھانے کے بعد میں خیمے سے باہر آگیا۔ شاری کے پیچھے آنے والے دونوں گھڑ سوار بھی اب پڑاؤ میں پہنچ چکے تھے۔ شاری کی طرح وہ بھی خاصے تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ میری رسٹ واچ ابوظبی کے ٹائم کے مطابق رات کے نو بجا رہی تھی۔ سیاہ آسمان تاروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی

گھنٹیاں ہولے سے بجتیں تو ہوا موسیقی سے لبریز ہو جاتی۔ میں دھیمے قدموں سے چلتا اپنے خیمے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ غزالہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ جب سے عاصم لاپتا ہوا تھا' غزالہ کے ذہن میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ شاید اسے یہ وہم تھا کہ میں بھی ان بھول بھلیوں میں کہیں کھو جاؤں گا اور وہ اس انجانے صحرا میں انجانے لوگوں کے درمیان یکسر تنہا رہ جائے گی۔

ابھی میں اپنے خیمے سے کچھ دور ہی تھا کہ الماجد نظر آگیا۔ قریبی خیمے کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب شاری یہاں پہنچی تھی تو الماجد کی آنکھوں میں امید کے بے شمار دیے روشن ہو گئے تھے' لیکن اب پھر اس کی آنکھوں میں ناامیدی کا دھواں تھا۔ وہ بولا۔ "شاہ جہاں صاحب' مستقیم کہہ رہا ہے کہ سردار شاری صبح سویرے واپس چلی جائے گی۔"

"تو کیا تم چاہتے ہو' وہ یہیں جھونپڑا ڈال کر بیٹھ جائے اور دھونی رما لے۔ بستی کی سرداری وغیرہ چھوڑ کر سادھو بن جائے۔"

"نہیں' میں یہ کب کہہ رہا ہوں' لیکن میں چاہتا ہوں۔۔۔" کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا۔

"ہاں ہاں بولو۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ۔۔۔ آپ اسے رکنے کا کہیں۔ وہ رک جائے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہم یہاں ہیں۔۔۔ جب ٹڈی دل کا خطرہ نہ رہے تو وہ واپس چلی جائے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ جانا تو اسے پھر بھی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ اس کے دل میں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے دل میں کسی طرح کی نرمی آجائے۔ وہ میرے بارے میں اپنا رویہ بدلنے پر آمادہ ہو جائے۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم اسے رکنے کا کہیں تو وہ صبح کے بجائے ابھی روانہ ہو جائے۔۔۔ تم اس کے مزاج کی تیزی طراری کو جانتے ہی ہو۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔" الماجد کی آواز رندھ گئی۔

"صبر کیا جائے اور حالات کا رخ دیکھا جائے۔ اس موقع پر تمہاری طرف سے ظاہر ہونے والی ذرا سی کمزوری معاملے کو بگاڑ بھی سکتی ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاری یہ چاہ رہی ہو کہ ہم خود اسے روکیں۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن بات پھر وہیں آجاتی ہے پیارے الماجد؟ محبت میں محبت کرنے والوں کو کبھی کبھی اپنے اعصاب کی مضبوطی کا امتحان بھی دینا پڑتا ہے' سمجھو کہ یہ تمہارے اعصاب کی مضبوطی کا امتحان ہے۔ تم خود کو کسی طرح کی پیش قدمی سے روکے رکھو اور یہ دیکھو کہ شاری رویہ اختیار کرتی ہے۔"

"اگر وہ اتنی دور آکر واپس چلی گئی تو۔۔۔ مجھ سے صدمہ برداشت نہیں ہوگا شاہ جہاں صاحب۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "الماجد! اطمینان رکھو۔۔۔ جو قدرت اسے اتنی دور سے چلا یہاں لے آئی ہے۔ وہ اس سے اور بھی بہت کچھ کروا سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کل کا سورج تمہارے لئے اچھی اطلاع لائے گا۔"

وہ ساری رات میں نے اور الماجد نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ سالار مستقیم بھی ہمارے ساتھ جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے دو مرتبہ شاری کے خیمے کی طرف بھیجا۔ اس نے دونوں مرتبہ بتایا کہ خیمے کے اندر چراغ کی لو اونچی ہے۔ اس اندازہ ہوتا ہے کہ سردار جاگ رہی ہے۔"

جوں جوں صبح قریب آرہی تھی' الماجد کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شاری نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ میں پو پھٹتے ہی اس کے خیمے میں حاضر ہو جاؤں۔ پو پھٹنے کے تھوڑی دیر بعد میں اس کے خیمے میں چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تھوڑی سی تسلی ہوئی کہ شاری نے ابھی تک گھڑ سواری کا لباس نہیں پہنا تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ رات سوئی نہیں اور اگر سوئی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے بے آرامی کی نیند سوئی ہے۔"

اس نے اپنے بال جوڑے کی شکل میں سمیٹے اور خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ آسمان پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔ بولی۔ "ایسے غبار میں ٹڈی دل بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ہوا کے رخ پر دور تک چلے جاتے ہیں۔"

"ہاں غبار تو واقعی موجود ہے۔" میں نے کہا "اور ہوا کا رخ بھی تشویش ناک ہے۔"

"لیکن ابھی تو سورج طلوع نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہو جائے۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خیمے میں آکر بیٹھ گئی۔ تذبذب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ناشتا کرو گی؟"

"نہیں' دل نہیں چاہ رہا۔"

"پھر بھی اتنا لمبا سفر ہے۔ کچھ نہ کچھ کھا کر جانا چاہیے۔"

"اچھا۔۔۔ تھوڑا سا دودھ اور میٹھا پنیر لے لوں گی۔" اس نے کہا۔

میں نے مستقیم سے کہا۔ وہ ناشتا لے آیا۔ شاری بے دلی سے کھانے لگی۔ برائے نام کھا کر اس نے خوان پوش سے طشتری ڈھانپ دی۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر اٹھ کر خیمے میں ٹہلنے لگی۔ اس کا بند رحسب عادت اس کے عقب میں ٹہل رہا تھا۔ کسی وقت بالکل شاری ہی کے انداز میں وہ اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ لیتا تھا۔

شاری نے ایک دو بار پردہ اٹھا کر باہر بھی جھانکا۔ آسمان پر غبار تو موجود تھا اور ہوا ابھی جنوب مغرب سے مشرق کی طرف چل رہی تھی لیکن سفر ملتوی کرنے کے لئے یہ کوئی اچھا بہانہ نہیں تھا۔ غالباً یہ شاری کے اندر ہی کا موسم تھا جو اسے تذبذب میں مبتلا کر رہا تھا۔

سورج کچھ اوپر آگیا تو مطلع کافی بہتر ہو گیا۔ شاری اپنے آپ میں کھوئی رہی' پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنا ہاتھ گھڑ سواری کے لباس کی طرف بڑھا دیا۔ میں خیمے سے باہر آگیا۔ پانچ دس منٹ بعد شاری نے مجھے خیمے میں بلایا۔ یہ دیکھ کر مجھے ہلکا سا دھچکا لگا کہ وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ بے شک اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا لیکن ارادہ مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے اور سالار مستقیم کو ایک بار پھر آئندہ سفر کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور خیمے سے نکل آئی۔ باہر آکر اس نے ناقدانہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیم گرم ہوا چل رہی تھی اور ہلکا سا غبار اب بھی موجود تھا۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ شاری میری یا سالار مستقیم کی زبان سے کچھ سننا چاہ رہی ہے۔ شاید اب بھی اس کی خواہش تھی کہ ہم موسم کی بات کریں اور ٹڈی دل کے خطرے کا ذکر کر کے شاری سے کہیں کہ وہ واپسی کا ارادہ کل تک ملتوی کر دے۔ سالار تو پاس ادب کی وجہ سے چپ تھا۔ میں نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

شاری نے باہر آکر بالوں کو زور سے دائیں بائیں جھٹکا پھر انہیں بل دے کر جوڑے کی صورت میں باندھ لیا۔ لمبے ریشمی کپڑے کی پگڑی اس نے بڑی تیزی سے سر پر لپیٹی اور اس کے پلو کو نقاب کی طرح استعمال کر کے اپنا نصف چہرہ اس میں چھپا لیا۔ اب اس کا آدھا چہرہ نظر آرہا تھا لیکن جو نظر آرہا تھا وہ زیادہ حساس تھا کیونکہ اس میں آنکھیں شامل تھیں۔ آنکھیں جو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیتی ہیں اور یہ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ بخوشی واپس نہیں جا رہی۔ اپنے دل و دماغ پر لاکھوں ستم توڑے ہیں تو خود کو واپسی پر آمادہ کر سکی ہے۔ گھڑ سوار دستے کے ارکان ایک قطار میں مئودب کھڑے تھے۔ الماجد اور غزالہ گھڑ سواروں کے عقب میں تھے۔ گھوڑی پر سوار ہونے سے پہلے شاری نے غزالہ کے قریب رک کر چند باتیں کیں۔ بچے کے گال کو چھو کر اسے پیار کیا۔ اس دوران میں صرف چند لمحوں کے لئے اس کی نگاہ الماجد کے چہرے پر رکی۔ جیسے کوئی متلون مزاج چڑیا چند ساعتوں کے لئے کسی شاخ پر بسیرا کر کے آگے بڑھ جائے۔

دھیمے قدموں سے چلتی وہ اپنی گھوڑی تک پہنچی اور اس پر سوار ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر واپس جا رہی تھی۔ میرے سینے میں ہلچل تھی۔ میں جانتا تھا ایسی ہی ہلچل بلکہ اس سے کئی گنا شدت کے ساتھ الماجد کے سینے میں موجود ہوگی لیکن وہ بھی میری ہی طرح خاموش تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی طرف دیکھنا مجھے نہایت دشوار کام محسوس ہو رہا تھا۔ شاری کی چتکبری گھوڑی دم بہ دم آگے بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس کی چال میں تیزی نہیں تھی۔ اپنی مالکن کی طرح جیسے وہ بھی ہر گام پر سوچ رہی تھی۔ ہر اٹھنے والا قدم جیسے اس کے اپنے دل پر پڑ رہا تھا پھر وہ رک گئی۔ ظاہر ہے وہ خود سے نہیں رکی تھی۔ اسے شاری نے روکا تھا۔ شاری نے باگ موڑ کر ہماری طرف دیکھا۔۔۔ پھر وہ دوبارہ ہماری طرف آنے لگی۔ شاید وہ کچھ بھول گئی تھی۔۔۔ شاید وہ بہت دیر سے کچھ بھول رہی تھی' کئی دنوں سے' کئی برسوں سے۔۔۔ وہ الماجد کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا' اس کا چہرہ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس غم نے اس کے خدوخال کو ایک ایسا گداز دے رکھا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ وہ دختر صحرا ایک عجیب روپ میں میرے سامنے تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے اپنی بلغارین ماں کی تصویر لگی۔ اس نے آنسو بھرے لہجے میں الماجد سے کچھ کہا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اس نے کہا تھا۔ "الماجد! مجھے روکو گے نہیں؟"

الماجد چند لمحے خاموش رہا پھر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ رو پڑا۔ "رک جاؤ شاری' رک جاؤ۔" اس نے کہا۔

یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ اس دور دراز صحرا میں پلنے والی ایک عجیب داستان محبت کا انجام میرے روبرو ہو رہا تھا۔ شاری گھوڑی سے اتری پھر وہ بے خودی کے عالم میں الماجد سے لپٹ گئی۔ الماجد کے فولادی بازوؤں نے اس کے حسین جسم کو یوں سمیٹا جیسے سمندر شوریدہ سر دریا کو جھوم کر اپنی آغوش میں لیتا ہے۔ شاری کی مخملی پگڑی اچھل کر ریت پر جا گری۔ اس کے ریشمی بال کھل گئے' وہ دونوں گرد و پیش سے غافل ہو کر ایک دوسرے میں سما گئے تھے' وہ رو رہے تھے اور ان کے ساتھ ریت کا ہر ذرہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔۔۔ بے شک یہ آنسو تھے لیکن ان میں ہزار ہا قمقموں کی خوشی بھی سمٹی ہوئی تھی۔ میں نے شاری کی آنکھوں میں اکثر جس محبت کی موہوم جھلک دیکھی تھی' آج وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر سب کے سامنے تھی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی ہوئی ایک معمولی چنگاری آخر شعلہ جوالہ بن گئی تھی۔

میں نے سالار مستقیم کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کھسر پھسر کی اور وہ سب مستقیم سمیت اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ میں بھی غزالہ اور بچے کو لے کر خیمے میں آگیا۔ میں چاہتا تھا کہ مدت سے بچھڑے ہوئے اگر ملے ہیں تو اطمینان سے ملیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد مجھے اپنے خیمے کے باہر الماجد کی آواز سنائی دی۔ میں باہر آیا۔ الماجد چند لمحے تک آبدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر مجھ سے لپٹ گیا اور خاموشی سے آنسو بہانے لگا' تاہم اس کے سینے سے بلند ہونے والی ہچکی بار بار میں اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔ "الماجد! میں نے کہا تھا نا کہ کبھی کبھی جدائی بھی قربت کا سبب بن جاتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ آپ نے کہا تھا۔"

میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ "اب کہاں ہے شاری؟"

"خیمے میں۔"

"کیا کہہ رہی ہے۔۔۔؟"

"ابھی تو کچھ نہیں کہہ رہی۔۔۔ اس نے اپنے گھڑسواری والے بوٹ اتار دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم آج تو وہ واپس نہیں جائے گی۔"

میں نے الماجد کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اب کبھی بھی واپس نہیں جائے گی اور جب جائے گی تو تم اس کے ساتھ ہو گے۔"

الماجد کی خوبصورت شربتی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

دوپہر کو میں نے سالار مستقیم کو اپنے خیمے میں بلایا۔ میں نے کہا۔ "مستقیم' میرا دل چاہ رہا ہے کہ آج شام کا کھانا زبردست ہو۔"

"کیا مطلب جی!" وہ شکستہ انگلش میں بولا۔

"الماجد اور شاری کے ملنے کی خوشی میں تھوڑا سا جشن کیا جائے۔"

مستقیم بولا۔ "خوشی تو سب کو ہے جی اور حیرانی بھی ہے۔ کسی کو اپنی نگاہ پر یقین نہیں آ رہا۔ یہ تو بستی میں بہت سے لوگوں کو معلوم تھا کہ الماجد' سردار شاری کے عشق میں گرفتار ہے اور ان کا نام لے لے کر آہیں بھرتا ہے' لیکن یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن سردار شاری۔۔۔ الماجد کی بانہوں میں چلی جائے گی۔ یہ تو آسمان اور زمین کا ملاپ ہے جی۔"

"تو پھر اس انوکھے ملاپ کی خوشی میں تھوڑا سا اہتمام تو ہونا چاہیے۔"

"لیکن اس صحرا میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نپا تلا راشن ہے۔ آگے ایک طویل سفر پڑا ہے۔"

"کیوں نہ وہ بچہ اونٹ ذبح کر لیا جائے۔"

مستقیم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ قافلے کے اونٹوں میں ایک چھوٹا اونٹ بھی تھا۔ راستے میں مستقیم نے بتایا تھا کہ اس عمر کے اونٹ کا گوشت بڑا نرم اور لذیذ ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارے آدمی یہ سارا گوشت ہضم کر لیں گے۔"

"نہیں' سارا تو نہیں کھا سکیں گے۔" وہ بولا۔ "یہ تو تیس پینتیس آدمیوں کا کھاجا ہے۔ ہاں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ باقی کا گوشت ابال کر خشک کر لیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' اونٹ ذبح کر لو۔"

سہ پہر کے وقت اونٹ ذبح کر لیا گیا۔ مستقیم کے ساتھیوں نے کچھ گوشت پکانے کے لئے رکھ لیا۔ باقی خاص طریقے سے ابال کر محفوظ کرنے کے لئے چھاؤں میں بچھا دیا۔۔۔ شام کو پڑاؤ میں واقعی جشن کا سا سماں تھا۔ دو تین قسم گوشت پک رہا تھا۔ تین دیگچے ایک قطار میں رکھے تھے۔ خشک کھجور' خشک انگور' میدے اور دودھ کو ملا کر ایک زبردست سوئٹ ڈش تیار کی جا رہی تھی۔ مستقیم کے ساتھی بھی ترنگ میں تھے۔ وہ کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ مدھم سُروں میں گانے بھی لگتے تھے۔ شروع میں وہ گاتے ہوئے کچھ ڈرے بھی۔۔۔ غالباً انہیں سردار شاری کا ڈر تھا لیکن جب سردار شاری نے خیمے سے باہر آ کر از خود ان کا گانا سنا تھا اور مسکراہٹ کی صورت میں داد دی تھی تو ان کی جھجک دور ہو گئی تھی اور ان کی تانیں بلند ہو گئی تھیں۔

وہ ساز کے لئے مختلف برتن استعمال کر رہے تھے۔ ایک شخص اونٹوں کے گلے سے دو گھنٹیاں اتار لایا تھا۔ ایک دوسرے شخص نے اپنی بانسری کے سُر بکھیرنے شروع کر دیے تھے۔ بڑا پُرلطف ماحول بن گیا تھا' صحرائی موسیقی شام کی خنکی کھانے کی خوشبو اور دور افق پر گل رنگ سرخی۔۔۔ سب نے مل جل کر سماں باندھ دیا۔

ایندھن کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ سالار مستقیم کی ہدایت پر ایک شخص نے لمبی کلہاڑی پکڑی اور اونٹنی پر سوار ہو کر ایندھن کی تلاش میں نکل گیا۔ صحرائی علاقوں میں اکثر کانٹے دار خشک جھاڑیاں مل جاتی ہیں۔ وہ کسی اور کام کی نہیں ہوتیں۔ ہاں ایندھن کے کام آ جاتی ہیں۔

شاری بدستور خیمے میں تھی۔ الماجد دوسرے خیمے میں تھا۔ شاید وہ دونوں اپنی اپنی جگہ حیران ہو رہے تھے کہ قدرت نے ان کے حصے کی اتنی زیادہ خوشی اب تک کہاں چھپا رکھی تھی۔ وقت ان پر مہربان ہوا تھا اور ٹوٹ کر ہوا تھا۔

خیموں کے قریب ہی کھلی جگہ پر دسترخوان بچھا دیا گیا۔ شام کے بعد کا منظر تھا اور بے حد سہانا تھا۔ غروب ہونے والا

سورج افق پر دلفریب سرخی چھوڑ گیا تھا۔ اندھیرا نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر اِکا دُکا تارے چمکنے لگے تھے۔ دیگچوں کے نیچے آگ مسلسل جل رہی تھی۔ ایندھن ختم ہونے کے قریب تھا لیکن جو شخص ایندھن لینے گیا تھا ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ سالار مستقیم ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا اور اپنے ساتھی کا راستہ دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے مستقیم کے چہرے پر اُلجھن کے آثار دیکھے۔ وہ آنکھیں سکوڑ کر دور کوئی منظر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بھی بھاگ کر ٹیلے پر چڑھ گیا اور مستقیم کی نگاہ کا تعاقب کرنے لگا۔ مجھے وہ شخص نظر آیا جو اونٹنی پر سوار ہو کر ایندھن کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ اونٹنی کو تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا واپس لا رہا تھا۔ اس کا چابک والا ہاتھ بار بار اوپر اٹھتا تھا اور اونٹنی کی پشت پر چابک کی ضرب لگتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اونٹنی کے پیچھے جو لکڑیاں گٹھے کی صورت میں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے گر رہی تھیں لیکن اونٹنی سوار کو ان کی پروا بھی نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اونٹنی سوار سخت ہراساں ہے۔

مستقیم خود کلامی کے انداز میں بولا۔ "اس نے کسی کو دیکھا ہے یا کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

"ہاں لگ تو یہی رہا ہے۔" میں نے کہا۔

پانچ دس منٹ میں اونٹنی سوار ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ قریباً سارا ایندھن راستے میں ہی گراتا آیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ وہ اونٹنی سے جست لگا کر اترا اور تیز لہجے میں مستقیم کو کچھ بتانے لگا۔ اس گفتگو میں ابوظبی' جیپ (جیپ) اور جمل وغیرہ کے الفاظ میری سمجھ میں آ سکے۔ مستقیم کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا تھا۔ اونٹنی سوار کی بات سننے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بہت بری خبر ہے جی۔ پچھلے ایک ماہ سے جس بات کا ڈر تھا وہ ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"خدا کرے میرا اندازہ غلط ہو لیکن یوں لگ رہا ہے کہ ابوظبی سے مسلح افراد کی ایک بڑی جمعیت یہاں پہنچ گئی ہے۔ ہمارے ساتھی نے خود انہیں دیکھا ہے۔" چند لمحے توقف کر کے وہ بولا۔ "ان لوگوں کو یہاں لانے والا یقیناً وہی بدبخت انڈین ہے۔"

مستقیم کا اشارہ شنکر کی طرف تھا۔

میں نے دور دور تک نگاہ دوڑائی لیکن کہیں کسی شخص کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میرے اترنے سے پہلے ہی مستقیم ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ وہ دوڑتا ہوا پڑاؤ میں پہنچا اور دہائی دینے لگا۔ چند لمحوں کے اندر پورے پڑاؤ میں کھلبلی مچ گئی۔ دیگچوں کے نیچے جلتی ہوئی آگ فوراً بجھا دی گئی۔ مستقیم کے ساتھیوں نے رائفلیں نکال لیں اور سروں پر پگڑیاں کس

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر ۱۱ جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے ابھرا ایک لچی' خوشی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نامہ کے مختلف چار روپ' ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۲۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں۔

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور Ph: 7247414

لیں۔ میں شاری کے پاس پہنچا تو وہ بھی سخت پریشان نظر آئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم نے دیکھا ہے؟ کیا وہ واقعی ابو ظبی کے شیوخ ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں نے نہیں دیکھا' لیکن جو دیکھ کر آیا ہے' وہ بڑے یقین سے یہی بتا رہا ہے۔"

"او خدایا! یہ تو بہت برا ہوا۔" وہ سوالیہ نظروں سے الماجد کی طرف دیکھنے لگی۔

الماجد نے کہا۔ "سردار شاری! میری درخواست ہے کہ آپ اپنی گھوڑی پر یہاں سے نکل جائیں۔ آپ کا بستی میں موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ ہم یہاں ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے کہ ہم بلندی پر ہیں۔ ہم پوزیشن لے کر تادیر ان کا راستہ روک سکتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ بات مناسب ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" شاری نے مضطرب انداز میں سر ہلایا۔ "آنے والے افراد تعداد میں بہت زیادہ لگتے ہیں۔ میں تم لوگوں کو یہاں مرنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر مرنا ہے تو پھر سب ایک ساتھ مریں گے اور اگر بستی کی طرف پیچھے ہٹنا ہے تو پھر سب ہٹیں گے۔"

"سب پیچھے ہٹیں گے تو سب پکڑے جائیں گے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "بہتر حکمت عملی یہی ہے کہ ہم یہاں حملہ آوروں کو اپنے ساتھ الجھانے کی کوشش کریں اور جتنا زیادہ وقت حاصل کر سکتے ہیں' کرلیں۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے ہمیں برتری حاصل رہے گی۔ تم ایک سوار کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ اور بستی والوں کو اس مشکل کے لئے تیار کرو۔"

شاری کے چہرے پر شدید الجھن تھی۔ وہ بولی۔ "نہیں۔ میں تم لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اگر یہاں رہی تو ہو سکتا ہے کہ بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ ان لوگوں سے بات چیت بھی کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک بستی والوں کو ہوشیار کرنے کی بات ہے' ہم ایک شخص کو پیام دے کر روانہ کر دیتے ہیں۔"

میں نے الماجد کی طرف دیکھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ خود شاری سے بات کرے۔ الماجد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دبے دبے لہجے میں بولا۔ "سردار شاری۔ ہمارے لئے مناسب راستہ یہی ہے کہ آپ چلی جائیں اور بستی کے لوگوں کو دفاع کے لئے تیار کریں۔ اگر آپ بہتر سمجھیں تو شاہ جہاں صاحب کی ساتھی غزالہ اور بچے کو بھی لے جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں ان لوگوں کو بڑے اچھے طریقے سے روک رکھیں گے۔ جب نہ روک سکے تو ہتھیار پھینک دیں گے۔"

"تاکہ وہ تم سب کو گولیوں سے بھون کر چیلوں کوؤں اور گدھوں کے لئے یہاں ٹیلوں میں چھوڑ دیں۔"

چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ ماحول میں زبردست سنسنی پائی جاتی تھی۔ ہر فرد اپنے طور پر کچھ سوچ رہا تھا۔ شاری نے چند سیکنڈ تک بے تابی سے چہل قدمی کی پھر وہ اس شتر سوار کے پاس پہنچ گئی جو حملہ آوروں کی اطلاع لے کر پہنچا تھا۔ شاری دو تین منٹ اس سے مکالمہ کرتی رہی۔ یقیناً وہ تفصیل سے جاننا چاہ رہی تھی کہ کتنے لوگ ہیں؟ کس قسم کے حلیے ہیں' یہاں سے کتنی دور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شتر سوار سے بات کر کے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "شاہجہاں! ابھی ہم پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ کون ہیں۔ مستقیم کے ساتھی نے انہیں کافی فاصلے سے دیکھا ہے۔ وہ ان کی تعداد کے بارے میں بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ صرف ایک جیپ اور آٹھ دس شتر سوار دیکھ سکا ہے۔ کچھ لوگ ان کے پیچھے بھی آ رہے تھے۔ صرف جیپ کی وجہ سے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق ابو ظبی کے امیرزادوں سے ہے۔"

"پھر اب تم کیا چاہتی ہو۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے' بہت جلدی کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

اچانک ٹیلے پر کھڑا مستقیم زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں' الماجد اور شاری دوڑتے ہوئے ٹیلے پر پہنچے۔ جو منظر نظر آیا وہ تشویش ناک تھا۔ ہمیں نشیب میں صرف چند فرلانگ کی دوری پر بہت سی مشعلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کم از کم تین جیپوں کی ڈگمگاتی روشنیاں تھیں۔ مشعلوں کی روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا جتھا ہے۔ یہ لوگ تیزی سے قریب آ رہے تھے۔ ان کا رخ سیدھا ہماری طرف تھا۔ سمندر کی طرح صحرا میں بھی راستے نہیں ہوتے' مسافر کسی بھی سمت سفر کر سکتا ہے لیکن یہ لوگ سیدھے ہماری طرف آ رہے تھے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی۔ آنے والوں نے مستقیم کے اس ساتھی کی اونٹنی کے پاؤں کے نشان ڈھونڈ لئے تھے جو ایندھن تلاش کرنے نکلا تھا۔ ہموار ریت پر اونٹنی کے پاؤں کے نقوش ان کی رہنمائی کر رہے تھے اور وہ سیدھے ہمارے پڑاؤ میں پہنچ رہے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ ہم پوزیشن لے لیں۔

درحقیقت آنے والے ہماری توقع سے زیادہ رفتار سے آئے تھے اور پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ زیادہ دور نہیں تھے۔ انہیں کسی ٹیلے نے اپنے عقب میں چھپا رکھا تھا لہٰذا ہم انہیں دیکھ نہیں پائے تھے پھر جونہی وہ ٹیلے کے عقب سے نکلے تھے اور انہوں نے روشنیاں جلائی تھیں۔ وہ ہمیں عین

سامنے دکھائی دینے لگے تھے۔ گاڑیوں کے انجن کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی شتر سوار کا للکارا بھی ہوا کے دوش پر سوار ہو کر ہم تک پہنچ جاتا تھا۔

سالار مستقیم کے اشارے پر اس کے ساتھیوں نے رائفلوں کے فالتو میگزین تیار کر لئے اور ٹیلے کی بلندی پر مناسب جگہیں سنبھال لیں۔ وہ اپنے دفاع کے سلسلے میں بڑے پُرعزم نظر آ رہے تھے۔ شاری کی جادو کلامی نے بھی ان کا حوصلہ بڑھانے میں بڑی مدد کی تھی۔ ان سب کے چہرے جوش سے تمتما گئے تھے۔ درحقیقت یہ لڑ مرنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے شاید بچپن سے اب تک لڑنے کے سوا کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔ آگ اور خون کا کھیل ان کے لئے زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ الماجد کی رائفل تو ٹوٹی ہوئی تھی تاہم سالار کے پاس ایک فالتو رائفل موجود تھی۔ وہ الماجد نے حاصل کر لی۔ شاری کے پاس اپنی نہایت طاقتور گن موجود تھی۔ اس نے ایک ماؤزر اور اس کے بہت سے راؤنڈ میرے حوالے کر دیئے۔ شاری نے کہا۔ "ہم حملے میں پہل نہیں کریں گے' صرف ہوا میں فائر کریں گے تاکہ انہیں ہماری موجودگی کا اندازہ ہو اور وہ فاصلے پر رک جائیں۔ ان کے رکنے کے بعد ہم ان سے بات کریں گے مگر بات چیت کے دوران میں مستقیم کے ساتھی اپنی پوزیشنوں پر بالکل چوکس رہیں گے۔"

میں نے خیمے میں جا کر غزالہ کی ڈھارس بندھائی۔ اپنا پسٹل میں نے غزالہ کو دے دیا۔

وہ بولی۔ "آپ سب لڑیں گے' مجھے یہاں خیمے میں تنہا رہنا اچھا نہیں لگے گا۔"

میں نے کہا۔ "تم پر اس معصوم جان کی ذمے داری ہے' تمہیں خیمے میں ہی رہنا ہوگا۔"

"مگر۔"

"مگر کچھ نہیں' غزالہ! تم یہیں رہو' ہاں اگر ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لوں گا۔"

غزالہ آبدیدہ تھی۔ ایک دم وہ جذبات کے دھارے میں بہہ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بے اختیار میرے بازو سے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ موت کی پرچھائیوں سے ڈھکا ہوا یہ اجنبی صحرا پچھلے چند ہفتوں میں ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔ خاص طور سے جب سے عاصم لاپتا ہوا تھا' غزالہ کو اپنے اردگرد میرے سوا کوئی سہارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ غیر محسوس طور پر کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے غزالہ سے تسلی تشفی کے بول بولے۔ اسے سمجھایا کہ اگر لڑائی میں میرے ساتھ کچھ ہو گیا تو وہ الماجد اور شاری پر کلی اعتماد کر سکتی ہے۔ غزالہ نے بے قراری سے سر ہلایا۔ "خدا کے لئے ایسی بات منہ سے مت نکالیں۔ اسی لئے میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے بھی اس لڑائی میں شریک کرلیں۔ جو کچھ بھی ہونا ہے ہم دونوں کے ساتھ ہو۔"

میں نے کہا۔ "جب میں اپنے لئے تمہاری فکر مندی دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم صحیح سلامت اس صحرا میں سے نکلیں گے اور آباد دنیا کی فضا میں سانس لیں گے۔"

غزالہ کی ڈھارس بندھا کر میں ماؤزر سمیت خیمے سے نکل آیا۔ آنے والے اب بہت قریب آ گئے تھے۔ انجنوں کا شور بالکل واضح سنائی دے رہا تھا۔ میں ٹیلے پر پہنچا تو مشعلوں کی روشنیاں صرف ایک فرلانگ کی دوری پر دکھائی دیں۔ محتاط اندازے کے مطابق شتر سواروں کی تعداد پندرہ سے کم نہیں تھی۔ تین جیپوں میں جتنے بھی لوگ سوار تھے وہ یقیناً اس کے علاوہ تھے۔ جب ہماری پوزیشنوں سے ان لوگوں کا فاصلہ سو ڈیڑھ سو گز رہ گیا تو شاری کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے ہوائی فائرنگ کی۔ گولیوں کے دھماکوں سے صحرا گونج اٹھا۔ نتیجہ حسب توقع رہا۔ مشعلوں کی حرکت سے اندازہ ہوا کہ آنے والے نہ صرف رک گئے ہیں بلکہ پھیل کر ٹیلوں کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم چونکہ بلندی پر تھے لہٰذا ان کی نقل و حرکت ہماری نگاہ کے سامنے تھی۔

قریباً ایک منٹ تک خاموشی رہی پھر جوابی فائرنگ ہوئی۔ یہ بھی ہوائی فائرنگ ہی تھی۔ اس فائرنگ کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک جیپ حرکت میں آئی اور آہستہ آہستہ ہماری پوزیشنوں کے بالکل سامنے پہنچ گئی۔ صحرا کی ریت میں بکتر بند کی طرح چلنے والی یہ "مختلف" قسم کی جیپیں تھیں۔ جیپ رک گئی تو اس کے دروازے کھلے اور ہیڈ لائٹس میں ایک شخص نظر آیا۔ "کون ہو تم لوگ؟" اس نے پکار کر کہا۔ وہ عربی میں بولا تھا۔

شاری کے اٹھنے سے پہلے ہی الماجد کھڑا ہو گیا۔ وہ ٹیلے کی ڈھلوان پر پہنچا اور بلند آواز میں بولا۔ "تم کون ہو؟"

جیپ سے نکلنے والا چند قدم مزید آگے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چھ سوا چھ فٹ قد کا مجیم شحیم شخص تھا۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی

تھی۔ فرنچ کٹ داڑھی تھی' سر پر سرخ و سفید عمامہ تھا۔ ہاتھوں میں قیمتی انگوٹھیوں کی چمک دور ہی سے محسوس ہوتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ ابوظہبی کا کوئی کھاتا پیتا شیخ ہے۔ الماجد اس کے سامنے پہنچ گیا۔ دونوں دھیمے لہجے میں بات کرنے لگے۔ ان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی تاہم ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ الماجد نووارد شخص کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب اس امر میں شک کی ذرہ بھر گنجائش نہیں رہی تھی کہ آنے والوں کا تعلق ابوظہبی سے ہے۔ یقیناً شکرا انہیں لے کر آیا تھا۔ وہ خود ابھی پس منظر میں تھا۔ تاہم مجھے توقع تھی کہ وہ جلد ہی سامنے آجائے گا۔ عجیب بات تھی کہ بستی میں ہم سب پورے ایک ماہ تک اس اندیشے کا شکار رہے تھے کہ شکرا ابوظہبی سے کمک لے کر پلٹ آئے گا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ اب جبکہ سب مطمئن ہو چکے تھے تو وہ سارے اندیشے یکلخت حقیقت کا روپ دھار گئے تھے اور یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب ہم اس صحرا کو خیرباد کہنے کے مرحلے میں تھے۔ یعنی "شوئی کماں کمند" والا معاملہ تھا۔ الماجد اور نووارد کی گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ نشیب میں تمام مشعلیں ساکت تھیں۔ جیپوں کے انجن بند کر دیئے گئے تھے اور ان کی ہیڈلائٹس آف تھیں۔

شاری میرے پہلو میں ریت پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی اور وہ جنگ و جدل کے لئے پوری طرح آمادہ نظر آتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کا یہ "سپاہیانہ" روپ دیکھ رہا تھا۔ گمبھیر حالات کے باوجود اس کے چہرے پر خوف یا گھبراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کی آنکھوں میں کسی عقاب کی سی جارحیت پائی جاتی تھی۔ اب وہ اس لڑکی سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ جس نے آج صبح دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر الماجد کی بانہوں میں پناہ لی تھی اور بے خودی میں اس کے گالوں پر بوسے دیتے ہوئے آنسو بہائے تھے۔ شاید اس وقت وہ اپنی ملنسار والدہ کی بیٹی تھی اور اب اپنے قبائلی باپ کا خون اس کی رگوں میں جوش مار رہا تھا۔ نرمی و سختی' محبت و نفرت اور خوب روئی و سخت جانی کا یہی سنگم تھا جس نے شاری کی شخصیت کو ایک دل گداز حسن بخش دیا تھا۔

نجانے میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر شاری کا کندھا آہستگی سے دبایا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "شاری! یہ بہت مناسب وقت ہے۔ تم اپنی گھوڑی لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہارے جانے سے پوری بستی کا بھلا ہوگا۔"

مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ شاری آسانی سے یہ بات مان جائے گی۔ اس وقت مجھے بہت حیرت ہوئی جب چند لمحے گم صم رہنے کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خوشی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ "بس تم فوراً نکل جاؤ۔ سمجھو یہ آخری موقع ہے۔"

شاری نے اپنے قریب لیٹے مستقیم سے کھسر پھسر کی۔ غالباً اسے آخری ہدایات دیں' پھر وہ ٹیلے کی ڈھلوان پر سے پھسل کر اپنی گھوڑی کی طرف بڑھ گئی۔ گھوڑی نے اپنی کنوتیاں کھڑی کر رکھی تھیں اور بے قراری سے پاؤں بدل رہی تھی۔ اسے جیسے اپنی سوار سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ مستقیم دوڑ کر خیمے میں گیا اور اس نے دونوں خرجینیں شاری کو تھما دیں۔ ان خرجینوں میں پانی کے علاوہ ایک دن کا راشن بھی موجود تھا۔ شاری نے خرجینیں گھوڑی پر رکھیں اور خود بھی سوار ہو گئی۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ گھوڑی سمیت صحرا کی تاریکی کا حصہ بننے والی تھی۔ اس نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ یہ اس گھوڑی کے لئے شاری کی آخری ایڑ تھی۔ گھوڑی ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ دو فائر ہوئے۔ میں نے شاری کو گھوڑی کی پشت سے اچھل کر اوندھے منہ ریت پر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑی کی طویل چیخ بھی فضا میں گونجی۔ وہ زور سے مچلی اور پھر اپنے پہلو کے بل گر گئی۔ وہ ایک خیمے پر گری تھی اور اسے بھی اپنے ساتھ ہی زمین بوس کر گئی تھی۔ میں ٹیلے سے اترا اور لپک کر شاری کے پاس پہنچا۔ وہ بے حرکت تھی۔ "شاری۔" میں نے اسے پکارا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے ماؤزر سے کئی فائر کئے۔ یہ فائر اسی سمت میں تھے جہاں سے شاری پر فائرنگ ہوئی تھی۔ میری فائرنگ کے جواب میں پھر دو فائر ہوئے یہ ایم جی کے فائر تھے اور شاری کو اوندھے منہ ریت پر گرنا پڑا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! ٹھیک ہوں۔" جواب ملا۔

گھوڑی خیمے کی رسیوں میں الجھی ہوئی تھی اور تڑپ رہی تھی۔ شاری اٹھی اور جھک کر دوڑتی ہوئی گھوڑی کے پاس پہنچ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں چتکبری گھوڑی کی گردن بالکل سیاہ نظر آ رہی تھی۔ یہ سیاہی اس خون کی تھی جو گھوڑی کے زخموں سے بہ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' ایک گولی گھوڑی کے سر میں لگی تھی اور دوسری گردن چیر کر گزر گئی تھی۔ یہ دونوں نہایت

مہلک زخم تھے۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر شاری کی یہ نہایت لاڈلی گھوڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ شاری نے گھوڑی کا منہ اپنے بازوؤں میں لیا اور سسکنے لگی۔ اس دوران میں مسلسل فائر بھی ہو رہے تھے۔ یہ فائر ہمارے عقب میں ہو رہے تھے لیکن ہم ایک ٹیلے کی اوٹ میں تھے۔ لہٰذا محفوظ تھے۔ ویسے بھی ہماری پوزیشن بلندی پر تھی۔

عقب سے ہونے والی فائرنگ نے ہم پر یہ انکشاف کیا تھا کہ حملہ آور بڑی منصوبہ بندی سے یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ دو حصوں میں بٹ کر آئے تھے۔ کچھ لوگ ہمارے سامنے رہے تھے۔ ان لوگوں نے مشعلیں روشن کر رکھی تھیں اور گاڑیوں کی ہیڈلائٹس بھی آن تھیں۔ یوں انہوں نے ہماری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی۔ دوسرا جتھا مکمل تاریکی میں آگے بڑھا تھا اور کلاوا کاٹ کر ہمارے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب شاری نے اس راستے سے نکلنا چاہا تو انہوں نے فائر کھول دیا تھا۔ عقب سے ہونے والی فائرنگ میں کافی "ورائٹی" تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کم و بیش دس پندرہ افراد اس سمت بھی موجود ہیں۔ اکا دکا سامنے سے بھی فائر شروع ہو گیا۔ شروع میں یہ فائرنگ مستقیم وغیرہ نے ہی کی تھی مگر پھر دو طرفہ گولیاں چلنے لگیں۔ جوابی فائر بڑا شدید اور موثر تھا۔ محفوظ بلندی پر ہونے کے باوجود پہلے ہلے میں ہی ہمارے دو ساتھی نشانہ بن گئے۔ ایک شخص کے کندھے میں گولی لگی۔ دوسرے نے عین پیشانی پر گولی کھائی اور ٹیلے کی بلندی پر سے لڑھکتا ہوا میرے اور شاری کے قدموں میں آن گرا۔

شاری نے چیخ کر اپنے کارندوں کو ہدایات دیں پھر وہ خود بھی ٹیلے پر چڑھ گئی اور آڑ لے کر فائر کرنے لگی۔ "الماجد کہاں ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"میں یہاں ہوں۔ آپ بھی اسی طرف آجائیں۔" الماجد کی آواز آئی۔

میں نے دیکھا کہ وہ عقبی سمت سے آنے والے فائر کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے دو ساتھیوں کی مدد سے گھوڑی کی لاش کو گھسیٹا تھا اور اسے ایک محفوظ آڑ کی شکل دے دی تھی۔ وہ بہت پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی فائرنگ سے حملہ آوروں کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں کہنیوں کے بل کرالنگ کرتا ہوا الماجد کے قریب پہنچا۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی بڑے اعتماد سے مقابلہ کر رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ موت کا کھیل نہیں کھیل رہے' تاش کی بازی لگا رہے ہیں۔ فائرنگ کرتے ہوئے وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

اچانک الماجد اپنی جگہ سے اٹھا اور چیتے کی طرح زقند بھر کر تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔ دو سیکنڈ بعد اسے میں نے ایک بلند ٹیلے پر دیکھا۔ بلندی سے اس کی رائفل نے چار پانچ دفعہ شعلے اگلے۔ نشیب سے ایک چیخ سنائی دی' پھر دو تین سائے نظر آئے جو پسپا ہو رہے تھے۔ ایک اونٹ بیس تیس گز کی دوری پر چکرا رہا تھا۔ مستقیم کا ایک ساتھی بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھا اور دوڑ کر اونٹ کی نکیل پکڑ لی۔ بڑی چابک دستی سے وہ اسے کھینچتا ہوا پڑاؤ میں لے آیا۔ اس اونٹ پر سامان موجود تھا۔

عقبی جانب سے فائرنگ تھم گئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ آور پیچھے ہٹ گئے ہیں لیکن وہ گئے نہیں تھے۔ ان کی موجودگی کا اندازہ اکا دکا مشعلوں سے ہو رہا تھا۔ سامنے سے فائرنگ ہو رہی تھی مگر اس میں پہلی سی شدت نہیں تھی۔ غالباً حملہ آوروں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم محفوظ پوزیشن میں ہیں اور وہ صرف اپنا ایمونیشن ضائع کر رہے ہیں۔

شاری کی ہدایت پر پڑاؤ میں مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ شاری نے کچھ افراد کو تو پوزیشنوں پر ہی براجمان رکھا تھا باقی نیچے آگئے تھے اور شاری کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔ ہلاک ہونے والے بدو کی لاش ایک خیمے میں چھپا دی گئی اور اسے چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ زخمی ہونے والے کی مرہم پٹی غزالہ نے اپنے ہاتھ سے کی۔ شاری کی آنکھیں نمناک تھیں لیکن اس کا حوصلہ پہلے سے بھی کچھ بلند نظر آ رہا تھا۔

الماجد نے مردہ گھوڑی کی لاش کو ریت سے بھری ہوئی بوری کی طرح استعمال کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شاری کو یہ ناگوار گزرے لیکن اس نے بالکل نوٹس نہیں لیا۔ وہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور حقیقت یہی تھی کہ گھوڑی اب ہلاک ہو چکی تھی۔ چند لمحے اس کی لاش پر آنسو بہانے کے بعد شاری اب مکمل طور پر سنبھل چکی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے پڑاؤ میں چکرا رہی تھی اور اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایات دے رہی تھی۔ وہ پریقین تھی کہ نہ صرف حملہ آوروں کو روکا جا سکتا ہے بلکہ پسپائی پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ بستی کے بہترین نشانچی تھے' وافر مقدار میں ایمونیشن تھا اور اہم بات یہ تھی کہ وہ بلندی پر پوزیشن لئے ہوئے تھی۔

میں نے شاری سے پوچھا۔ "کیا کمک کی کوئی امید ہے؟"

رو پڑی۔ "ہاں۔۔۔ یہ امید بھی ہے۔ میں بستی میں یہ کہہ کر آئی تھی کہ کل شام تک واپس آجاؤں گی۔ یعنی اس وقت بستی میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ ممکن ہے کل تک وہ لوگ انتظار کریں پھر وہ میری تلاش میں نکلیں گے۔۔۔ گھوڑی کا کھرا اٹھا لیا گیا تو وہ لوگ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

"میری رائے تو یہ ہے کہ آج رات کسی وقت ہم میں سے کوئی اس گھیرے میں سے نکلنے کی کوشش کرے اور جیسے بھی ہو بستی تک پہنچے۔"

"ہاں' یہ کوشش تو ضرور کریں گے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کوئی ایکسپرٹ بھی موجود ہے' کوئی ایسا شخص جو صحرائی لڑائی کا تجربہ رکھتا ہے' وہ ان لوگوں کو بڑی دانش مندی کے ساتھ گائیڈ کر رہا ہے۔ ان کی کوشش یہی ہے کہ ہم میں سے کوئی یہ مقام چھوڑ نہ سکے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولی۔ "تمہارے اس انڈین (شنکر) کی صورت اب تک نظر نہیں آئی۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے کہ یہ بھی اس کی کوئی چال ہو۔ پھر ایک امکان اور بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ زخمی ہونے کے سبب وہ از خود اس جتھے کے ساتھ نہ آسکا ہو۔"

"ہوں۔۔۔ امکانات تو کئی ایک ہیں۔" شاری نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے تاریک آسمان کو تک رہی تھی۔

"کیا نڈی دل کو ڈھونڈ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' اس کا خطرہ بھی تو تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا ہے۔" اس نے چونک کر کہا۔

"اتنا بڑا صحرا ہے' یہ کیا ضروری ہے کہ نڈی دل ہمارے اوپر ہی حملہ آور ہو؟"

"صحرا اتنا بڑا ہے تو کیا ہم ہر خطرے سے بے نیاز ہو جائیں۔" اس نے ایک ابرو اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

کبھی کبھی کسی کا معمولی سا انداز بھی کسی دوسرے شخص کی یاد دلا دیتا ہے۔ شاری کے ابرو اٹھانے سے میرے ذہن میں سروج آگئی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے سروج کے ساتھ بہت قربت کا وقت گزارا تھا۔ بڑے رنگین شب و روز تھے لیکن ان میں رنگ ہی رنگ تھے۔ تصویر کہیں نہیں تھی' جیسے روح کے بغیر جسم ہو۔۔۔ یا نقوش کے بغیر چہرہ ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پاکستان سے آنے کے بعد وہ مجھے ایک دو مرتبہ ہی یاد آسکی تھی۔

چاند کی ہلکی روشنی اب چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ یہ بڑا حسین منظر تھا لیکن اس کا حسن ہمارے لئے نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا' یہاں ہوا میں موت کی سرگوشیاں تھیں اور بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جو اونٹ مستقیم کا ساتھی پکڑ کر لایا تھا' اس پر کھانے پینے کے سامان کے علاوہ ایک رائفل اور گولیوں کے دو بیلٹ بھی موجود تھے۔ دیگر سامان میں ایک دوربین' ایک نہایت قیمتی کیمرا' دو چھتریاں' تھرماس اور جوتے تھے' اس کے علاوہ ایک جدید قسم کی اینٹی ڈارک عینک بھی شامل تھی۔ ان اشیا کا تعلق یقیناً ابوظبی کے کسی امیرزادے سے تھا۔ اب معلوم نہیں یہ امیرزادہ فائرنگ میں ہلاک ہو گیا تھا یا ویسے ہی اونٹ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

شاری کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے ٹیلے کی بلندی پر نیم دائرے کی شکل میں ایک خندق کھود لی تھی۔ اس خندق کو کھودنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی' پندرہ بیس منٹ میں انہوں نے ریت اور مٹی نکال کر خندق تیار کر لی تھی۔ تقریباً تین فٹ گہری اس خندق میں رائفل مین بہترین پوزیشن لے سکتے تھے۔ ایک ایسی ہی چھوٹی خندق پڑاؤ کی عقبی جانب بھی تیار کی جا رہی تھی۔ یہ کام صحرائی بدو اتنی تیزی اور مہارت سے کر رہے تھے کہ حیرانی ہوتی تھی' یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایسے مرحلوں سے گزرنا ان کے لئے روز کا معمول ہے۔

میں اور شاری باتیں کر رہے تھے جب الماجد بھی ہمارے قریب چلا آیا' اس کے چہرے پر تشویش کے آثار میں نے دور ہی سے دیکھ لئے۔ وہ ہمارے قریب آکر بولا۔ "سردار شاری' میرا خیال ہے کہ یہ لوگ بھرپور حملے کے لئے صف بندی کر رہے ہیں۔" الماجد نے یہ فقرہ انگلش میں ادا کیا تھا تاکہ میں بھی سمجھ سکوں۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" شاری نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ پڑاؤ کے عقب میں ہم نے جو فائرنگ کی ہے اس میں ان لوگوں کا اچھا خاصا جانی نقصان ہو گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین افراد ہلاک ہوئے ہیں اور تین چار زخمی ہوئے ہیں۔"

شاری نے ہونٹ سکوڑے۔ میں نے الماجد سے پوچھا۔ "لیکن تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ تین بندے مارے گئے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں نے خود تین لاشیں دیکھی ہیں' چاند کی روشنی میں اب سب نظر آ رہا ہے۔ اس سامنے والے ٹیلے پر

جا کر آپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ شاید ایک آدھ اور بھی ہو لیکن تین لاشیں تو مجھے صاف نظر آ رہی ہیں۔"

الماجد کا کہنا درست ہی تھا' ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک دم فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی' پڑاؤ کے مشرق اور مغرب سے گولیاں چل رہی تھیں' ہم نے خود کو فوراً ریت پر گرا دیا۔ شاری نے چیخ کر اپنے جانثاروں کو ہدایات دیں۔ وہ چھلانگیں لگا کر خندقوں میں گھس گئے اور جوش و خروش سے جوابی فائر کرنے لگے۔ میرے نزدیک غزالہ اور بچے کے لئے خیمے سے زیادہ خندق محفوظ تھی۔ میں جھک کر دوڑتا ہوا خیمے میں پہنچا' غزالہ بچے کے ساتھ ایک گوشے میں دبکی بیٹھی تھی۔ چراغ کی لو اس نے بہت نیچی کر رکھی تھی' میں نے غزالہ کا بازو پکڑا اور بچہ اس کی گود سے لے لیا۔ ہم دونوں جھک کر چلتے بالائی خندق تک پہنچ گئے۔ غزالہ کے ساتھ میں خندق میں اترا تو ایک دم تحفظ کا احساس ہوا۔ یقیناً یہ خندق خیمے سے کئی گنا محفوظ تھی۔ میں اور غزالہ خندق میں نیم دراز ہو گئے' بچہ میں نے پھرتی سے غزالہ کو تھما دیا۔ خود میں نے ماؤزر کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ریت کے ڈھیر سے پر ہاتھ نکال کر اکا دکا فائر کرنے لگا۔

غزالہ کو خیمے سے نکالنے کا فیصلہ بہت درست ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ بعد جب دو طرفہ فائرنگ عروج پر تھی تو خیمے میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ خیمے میں مٹی کے تیل والا ٹنک کا گیلن موجود تھا' یقیناً کوئی گولی گیلن میں لگی تھی اور تیل بہہ نکلا تھا۔ بعد ازاں اسی تیل نے چراغ سے یا کسی گولی کے دہکتے ہوئے سیسے سے آگ پکڑ لی تھی۔۔۔ تقریباً پندرہ منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے سیکڑوں راؤنڈ چلائے گئے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ حملہ آوروں میں سے چار افراد دو جیپوں کی آڑ لے کر ہمارے قریب چلے آئے۔ اس موقع پر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دو تین منٹ میں ٹیلے پر چڑھ آئیں گے اور اندھا دھند ہم پر ٹوٹ پڑیں گے' لیکن الماجد اور اس کے ایک ساتھی نے اس مرحلے میں بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ وہ ہمت کر کے خندق سے نکل آئے اور ٹیلے سے تقریباً بیس گز دور کھڑے ہو کر ان پر تابڑ توڑ فائرنگ کی۔ اس نہایت جارحانہ انداز نے دونوں گاڑیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ ڈھلوان پر لڑھکتی ہوئی کافی دور چلی گئیں۔

اونٹ پر لدے سامان میں سے برآمد ہونے والی اینٹی ڈارک عینک مستقیم کی جیب میں تھی۔ میں نے اس سے عینک لے کر آنکھوں پر لگائی اور غور سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ان لمحات میں وہ عینک میرے لئے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ میں نے ٹیلے کی ڈھلوان پر ایک سیاہ لکیر سی دیکھی۔ یہ قریباً تین چار انچ چوڑی لکیر ہوگی جو دور نشیب تک چلی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ابھی جو دونوں گاڑیاں پسپا ہو کر نشیب میں گئی ہیں ان میں سے کسی گاڑی کی فیول لائن یا فیول ٹینک میں گولی لگی ہے اور اس کا آئل لیک ہوا ہے۔ میں نے خندق سے نکلنے کے لئے حرکت کی تو غزالہ نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھام لیا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟" وہ گھگیائی۔

"ابھی ایک سیکنڈ میں آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔" وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ ایک خوبرو' نازک اور نفیس طبع ڈاکٹر جسے اس وقت کسی صاف ستھرے اسپتال میں اپنی ڈیوٹی پر ہونا چاہیے تھا' میرے ساتھ اس دور دراز صحرا میں موجود تھی۔ ریت اور مٹی میں لتھڑے ہوئے کپڑوں کے ساتھ ایک خندق میں پڑی تھی اور ہر پل قریب آتی موت کی سرگوشیاں سن رہی تھی۔

میں نے اپنا آپ بمشکل اس سے چھڑایا۔ خندق سے نکل کر میں ہاتھوں پاؤں کے بل چلتا خیموں کے قریب پہنچا' ہمارا خیمہ جل کر بجھنے کے قریب تھا' میں نے پڑاؤ میں سے دو مشعلیں اکھاڑیں اور واپس خندق تک پہنچ گیا' لیکن واپس خندق میں جانے کے بجائے میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا آگے گیا۔ یہ خطرناک اقدام تھا لیکن میرا تجربہ ہے کہ گھمسان کی لڑائی میں اس طرح کے رسک لینا اتنا زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوتا' اور پھر جب کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے والے الماجد اور مستقیم جیسے ساتھی ہوں تو جوش و خروش اور بڑھ جاتا ہے۔ میں نے دس بارہ گز دور جا کر ایک مشعل اس سیاہ پٹی پر پھینکی جو میرے اندازے کے مطابق آئل کے بہاؤ سے بنی تھی۔ پہلی مشعل ہی ٹھیک نشانے پر لگی۔ مشعل سیاہ پٹی پر گری اور پلک جھپکتے میں آگ کی لکیر دور تک کھنچ گئی پھر وہی ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ آگ کی لکیر ایک جیپ تک پہنچی' چند لمحے سکوت رہا پھر ایک دم "بھک بھک" کی بلند آواز کے ساتھ جیپ میں سے شعلے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگ میں لپٹ گئی۔

خندق میں سے الماجد میری اس کارروائی کو بغور دیکھ رہا تھا' اس نے ناقابل فہم الفاظ میں کوئی پرجوش نعرہ بلند کیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہم آہنگ ہو کر اس نعرے کا جواب دیا۔ میں کرالنگ کرتا ہوا خندق میں واپس آگیا۔

جیپ سے سرخ اور نارنجی شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ان

شعلوں سے ارد گرد کے ٹیلے روشن ہو گئے تھے' اکا دکا فائر بھی ہو رہے تھے۔ فائرنگ کی شدت غالباً اس لئے کم ہو گئی تھی کہ دونوں فریق اپنا ایمونیشن بچانا چاہ رہے تھے۔ موجودہ صورتِ حال میں فائرنگ جاری رکھنے کا مطلب ایمونیشن ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا' ہم بالکل محفوظ پوزیشن پر تھے' اسی طرح مخالف فریق نے بھی ٹیلوں کے عقب میں پوزیشن لے رکھی تھی اور ان کے نشانچی کسی طرح کا رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا' دس پندرہ منٹ تک جاری رہنے والی اس دھواں دھار فائرنگ میں دونوں طرف سے کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا' صرف ایک شخص ری پیٹر کے چھرے لگنے سے زخمی ہوا' یا پھر جیپ میں ایک دم آگ بھڑکنے سے دو افراد زخمی ہوئے۔

میں خندق میں واپس پہنچا تو غزالہ نے بڑی مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا' اس کی انگلیوں میں بلا کی سختی تھی۔ یہ انگلیاں جیسے بہ زبان خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ "ایسا مت کریں' آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ میرے لیے زندہ رہنے کا کیا جواز باقی رہ جائے گا۔"

خندق میں جگہ بہت تنگ تھی' ہم ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھے ہوئے تھے' مسلسل دھماکوں کے شور سے بچہ رونے لگا تھا۔ غزالہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور تھپک تھپک کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد فائرنگ بالکل بند ہو گئی۔ مستقیم اور اس کے ساتھی خندق میں بڑے مطمئن بیٹھے تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی خونریز لڑائی میں شریک ہیں' وہ جیسے تفریح پر نکلے ہوئے تھے اور آتش بازی دیکھ رہے تھے۔ جو شخص ہلاک ہوا تھا اس کا ایک چچا زاد بھائی بھی مستقیم کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ مجھے تو اس کے چہرے پر بھی کوئی خاص ملال نظر نہیں آیا۔ بلکہ لڑائی میں اس کا جوش و خروش دوسروں سے سوا نظر آ رہا تھا۔

رات کا کھانا خندقوں کے اندر ہی کھایا گیا۔ خندق سے پڑاؤ تک آنے جانے والوں کو جھک کر چلنا پڑتا تھا' ایک دو مقامات زیادہ خطرناک تھے وہاں سے وہ بھاگ کر گزر جاتے تھے۔ روشنی کے لئے خندق کے کنارے پر چند مشعلیں لگا دی گئی تھیں۔ بڑا عجیب لگ رہا تھا' یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم جنگِ عظیم کے اتحادی فوجی ہیں اور میدانِ کارزار میں مورچوں میں بیٹھ کر ایک ایسا ڈنر کر رہے ہیں جس کے بارے میں ہمیں شک ہے کہ یہ ہمارا آخری ڈنر ہو سکتا ہے۔ اور یہ ڈنر اسی اونٹ کا گوشت تھا جو آج سہ پہر ہم نے بڑے چاؤ سے ذبح کیا تھا اور کئی طرح سے پکایا تھا۔ "جنگ کا سائرن" بجنے کی وجہ سے یہ گوشت بھی کچا پکا ہی رہ گیا تھا۔ دسیع دستر خوان کے بجائے تنگ و تاریک خندق تھی اور میوزک کی جگہ گاہے گاہے کسی گولی کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی تھی۔

الماجد میرے پہلو میں آ بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں ایک ایسی امنگ ترنگ دوڑ رہی تھی' جو میں نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی' اس کے جسم کا رواں رواں مسرت اور جوش سے سرشار تھا۔ اس کی یہ کیفیت ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ آج کا دن کیسا بھی تھا لیکن آج کا دن الماجد کی زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ آج اس نے اپنا مقصد پا لیا تھا۔ وہ حسنِ دل سوز جس کے جوتے کو بوسہ دینا بھی وہ اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا تھا' اس کی بانہوں میں سمٹ آیا تھا' جس پری پیکر کو وہ خواب میں چھونے کا تصور نہیں کر سکتا تھا' وہ اس کی آغوش میں تھی اور اس کے احمریں لبوں سے الماجد نے اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھائی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتا کم تھا۔ الماجد کی آنکھوں میں دیکھتا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ جاگ نہیں رہا' سو رہا ہے اور خود کو کسی حسین و جمیل خواب کا تصور کر رہا ہے۔ وہی خواب جو وہ اپنے بچپن سے دیکھتا تھا۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ "الماجد بہت خوش ہو؟"

اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "دل چاہتا ہے کہ اسی خندق میں مر جاؤں۔ جتنی خوشی آج دیکھ لی ہے' اس کے بعد چھوٹے سے چھوٹا غم دیکھنے کی سکت بھی دل میں نہیں رہی۔"

"یہ تو ناامیدی اور کم ہمتی والی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "قدرت کی عنایتیں بیکراں ہیں۔ ہمیں جب اور جو مانگنا چاہیے تو دل کھول کر مانگنا چاہیے۔ اس کے ہر خوشی سے بڑی خوشی موجود ہے۔ بات صرف ہمارے حوصلے اور ظرف کی ہے کہ ہم کتنی خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔" "حاصل کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں غم اور تکلیف برداشت کرنے کا کتنا حوصلہ ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "آج سے کچھ عرصہ پہلے میں ایک مقام پر تھا جو اس صحرا سے بالکل مختلف تھا۔ جس طرح حدِ نگاہ تک ریت نظر آتی ہے' وہاں حدِ نگاہ تک برف دکھائی دیتی تھی۔ آباد دنیا سے دور وہ ایک بے کنار برفستان تھا۔ اس برفستان میں زمین کے اندر گہری سرنگوں میں ایک قبیلہ آباد ہے۔ اس قبیلے کے سردار کا نام سانوس ہے۔ زبردست مقناطیسی قوت کا مالک ایک انوکھا شخص ہے۔

میں اس سے مل چکا ہوں۔ بے شک مجھے اس شخص کی بہت سی باتوں سے شدید اختلاف تھا لیکن اس کی ایک بات ایسی ہے جو میرے ذہن کی تختی پر ان مٹ حروف میں نقش ہو چکی ہے۔ وہ ایسی بات ہے جس کی تشریح میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں' لیکن میں وہ بات تمہیں مختصر ترین الفاظ میں ہی بتاؤں گا۔ سانوس نے کہا تھا کہ انسان ہو یا کوئی بھی جانور۔ اس دنیا میں اتنی ہی خوشی اور راحت پا سکتا ہے جتنا دکھ اور جتنی تکلیف وہ سہتا ہے۔ اگر کوئی ایسا پیمانہ ایجاد ہو جائے کہ جاندار کی موت کے بعد اس کی خوشیوں اور تکلیفوں کا ٹھیک ٹھیک حساب لگایا جا سکے تو ان کی مجموعی مقدار میں رتی کے ہزارویں حصے کا بھی فرق دریافت نہیں ہو گا۔ لہٰذا قدرت کی طرف سے ہمیں جو تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں' انہیں خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں آگے بڑھ کر ان تکالیف کو گلے سے لگا لینا چاہیے اور یہ پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ ان تکالیف کا صلہ ہمیں بہر صورت مل کر رہے گا۔

الماجد توجہ سے میری بات سن رہا تھا اور مسلسل سر ہلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "الماجد۔ غور کرو' اگر انسان کو غم اور خوشی کے اس توازن پر پختہ یقین ہو جائے تو زندگی میں من چاہی مقدار میں خوشی اور راحت حاصل کرنا اس کے لئے کتنا آسان ہو جائے گا۔ ارادی طور پر خوشی حاصل کرنا تو شاید مشکل کام ہو لیکن تکلیف حاصل کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر ایک شخص کاہلی و سستی کو لات مار کر صبح سے رات گئے تک اپنے شعبے میں سرتوڑ محنت مشقت کرتا ہے تو وہ اپنے جسم پر تکلیف جھیلتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے کھاتے میں جتنی مشقت یا تکلیف چاہے ڈپازٹ کر سکتا ہے۔ اب اتنی ہی مقدار میں خوشی اس کا مقدر ہو گی۔ یہ خوشی قدرت اسے کسی نہ کسی صورت میں پہنچا کر رہے گی۔"

الماجد نے کہا۔ "آپ کی باتیں مجھے غور و خوض کی دعوت دے رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یونہی دل رکھنے کو کہہ رہے ہو یا واقعی ان میں وزن محسوس کر رہے ہو۔"

"سو فیصد محسوس ہوا ہے جی۔ یہ بڑی سیدھی سادی باتیں ہیں۔ پہلے بھی کئی دفعہ سنی ہوں گی لیکن آپ نے جس انداز سے بتائی ہیں وہ بالکل نئی لگ رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "وقت ملا تو تمہیں اس بارے میں کچھ اور بتاؤں گا۔"

الماجد بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں آپ سے بہت کچھ حاصل کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج مجھے اپنی زندگی کی جو سب سے بڑی خوشی ملی ہے وہ بھی آپ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے آپ نے میری انگلی تھام کر مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ میری کہاں ہمت تھی کہ میں اس برف کو پگھلا سکتا جو میرے اور شاری کے درمیان دیوار بنی ہوئی تھی۔ آپ ہی کے دیئے ہوئے حوصلے اور طاقت سے میں اس دیوار کو توڑنے میں کامیاب ہوا ہوں۔"

غزالہ بچے کو تھپکتے تھپکتے خود بھی خندق کی دیوار سے ٹیک لگا کر سو گئی تھی۔ سچ کہتے ہیں' نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں نے مدھم چاندنی میں اس کے خوابیدہ چہرے کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کا ایک پاؤں میرے پاؤں سے چھو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس نے جان بوجھ کر اپنے پاؤں کو میرے پاؤں سے مس کر رکھا ہے۔ وہ جیسے حالتِ نیند میں بھی میری موجودگی کا احساس اپنے ذہن میں رکھنا چاہتی تھی۔ حقیقت میں یہ میری موجودگی ہی تھی جس نے اسے تحفظ کا احساس دیا تھا کہ اس خندق میں بھی اس کی آنکھ جھپک گئی تھی۔

چاند کی روشنی اب قدرے زیادہ ہو گئی تھی' اطراف میں خاموشی تھی لیکن یہ امن کی خاموشی نہیں تھی' یہ لڑائی کے درمیان آنے والا وہ وقفہ تھا جس میں حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے اور صفیں درست کی جاتی ہیں۔ سناٹے میں کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز ابھرتی تھی اور تاریکی کا سینہ چیر کر دور تک پھیل جاتی تھی۔

اچانک مستقیم کی آواز نے مجھے چونکایا۔ اس نے الماجد کو عربی میں مخاطب کیا تھا اور انگلی سے ایک جانب اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے بھی الماجد کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ ٹیلے کے عقب میں ایک جگہ سے بار بار ریت اچھلتی نظر آئی۔ یقیناً ہماری طرح ہمارے مخالفین بھی خندق وغیرہ کھود رہے تھے۔ انہوں نے اپنی زیادہ تر مشعلیں بجھا دی تھیں' صرف چند ایسی مشعلیں روشن تھیں جو ہمیں براہِ راست دکھائی نہیں دیتی تھیں' صرف ان کی سرخ پھڑپھڑاتی روشنی کی ٹیلوں کے پیچھے سے جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس روشنی میں کبھی کبھی کوئی سایہ سا تیزی سے حرکت کرتا نظر آ جاتا تھا۔

"ان لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔" میں نے کہا۔

"ہاں جانی نقصان کی وجہ سے یہ لوگ مشتعل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی تو مشکل ہے' ایک قتل ہو جائے تو مقتولین کے لواحقین بدلہ لینے تک چین سے نہیں بیٹھتے پھر اس ایک قتل کے نتیجے میں کشت و خون کا سلسلہ چل نکلتا

ہے۔"

"مگر یہاں جارح ہم تو نہیں ہیں۔ لڑائی ان لوگوں نے شروع کی ہے اور دیکھا جائے تو پہلا جانی نقصان بھی ہمارا ہی ہوا ہے۔"

میں اور الماجد باتیں کرتے رہے اور یہ رنگ بدلتی 'سنگین شب آہستہ آہستہ آگے کو کھسکتی رہی۔ غزالہ ایک دو بار کسمسا کر پھر سو گئی تھی۔ بچہ اس کے سینے سے لگا تھا اور وہ بھی سو رہا تھا۔ غزالہ کی نیند گہری نہیں تھی۔ اس کا سر بار بار ایک طرف کو ڈھلک جاتا تھا پھر یہ سر میرے شانے سے آلگا۔ اس کے بدن کی مانوس خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کے نرم بال میری گردن سے چھو رہے تھے لیکن یہ سب کچھ میرے پاس ہونے کے باوجود بھی بہت دور تھا کیونکہ یہ میرا نہیں تھا' میرا کوئی حق نہیں تھا اس خوشبو پر اور اس خوبصورتی پر۔ یہ حق غزالہ نے اپنی مرضی سے کسی اور کو سونپ دیا تھا۔ مجھ سے پوچھنا یا مجھے مطلع کرنا تو دور کی بات ہے' شاید یہ حق سونپتے وقت اس نے میرے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ کیسی شام ہوگی جب وہ دلہن بنی ہوگی' اس کے ہاتھوں پر سہاگ کی مہندی لگی ہوگی' شہنائیوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں شاید چند لمحوں کے لئے اس نے میرے بارے میں سوچا ہو یا شاید نہ سوچا ہو۔ کتنے غیر معمولی لمحے ہوتے ہیں وہ۔ جب دو ایسے افراد کے راستے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں جنہوں نے ایک پل کے لئے بھی جدا ہونے کا نہیں سوچا ہوتا۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری جنبش سے وہ جاگ جائے گی۔ اچانک غزالہ کے سینے سے لگا بچہ کسمسا اٹھا۔ وہ جاگا تو غزالہ بھی جاگ گئی۔ میرے شانے اور اس کے سر کا رشتہ ختم ہو گیا۔ جاگنے کے بعد اسے بالکل بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ قریباً آدھ گھنٹے تک میرے کندھے پر سر رکھے سوتی رہی ہے۔

رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صبح کا اجالا پھیلا تو اردگرد کے مناظر وضاحت سے نظر آنے لگے۔ شاری کی گھوڑی کی لاش ریت پر پڑی تھی۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون اردگرد کی ریت کو خاکستری مائل کر چکا تھا۔ ہمارا خیمہ جل کر خاک ہو چکا تھا۔

سامان بھی ناقابل شناخت ہو گیا تھا۔ جس خندق میں ہم بیٹھے تھے وہاں سامنے کی طرف ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی۔ اس ڈھلوان پر وہ جیپ صاف نظر آ رہی تھی جو رات کو نذر آتش ہوئی تھی۔ جیپ کے قریب ہی گولیوں کے بہت سے خول چمک رہے تھے اور ایک دو خالی میگزین بھی پڑے تھے۔

میں خندق سے نکلا اور احتیاط سے جھک کر چلتا ہوا ... کے بلند ترین حصے پر پہنچ گیا۔ یہاں الماجد پہلے سے موجود وہ ریت پر اوندھا لیٹا ہوا تھا' میں بھی اس کے قریب گیا۔ یہاں سے اردگرد کا منظر دور تک دکھائی دے رہا تھا۔

الماجد نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ جلدی جانے والے نہیں لگتے۔۔۔ وہ دیکھئے۔۔۔ انہوں نے خندقیں اس طرف کھودی ہیں۔ تیسری ہمارے عقب میں اور میرا خیال ہے کہ اس سامنے والے ٹیلے کے پیچھے بھی ان کی پوزیشن موجود ہے۔"

"تعداد بھی ہماری توقعات سے زیادہ ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل یہی بات میں کہنے لگا تھا۔ تین جیپوں پر کم بیس افراد تو سوار ہوں گے۔ پندرہ بیس اونٹ بھی ہیں۔ کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کی تعداد پینتیس سے کم ہے۔"

"شاری کیا کہتی ہے؟"

"اس نے کیا کہنا ہے۔ ایسے موقعوں پر جب ایک مار ماری شروع ہو جائے تو پھر اسے ٹالنا بہت مشکل ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم یہاں ان لوگوں کے ... مریں گے؟"

"ایسا ہونا تو نہیں چاہیے لیکن لگتا ہے کہ ہو کر رہے گا یا یہ لوگ لاشیں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے' یا ہمیں گھیر کر ... کر دیا جائے گا۔"

"یہ تو بڑی نادانی کی بات ہوگی' میرا خیال ہے کہ بات چیت کے ذریعے کوئی درمیانی راستہ نکالنا چاہیے۔ بلکہ ... کو شاری کہہ بھی رہی تھی کہ صبح وہ ان لوگوں کو گفتگو ... کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"گفتگو تو ضرور ہونی چاہیے۔" الماجد نے کہا۔ "میری دلی دعا ہے کہ یہ کامیاب ہو لیکن ابوظہبی کے یہ اب اتنی آسانی سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر معاملہ رات کو لڑائی میں مرنے والے چار پانچ بندوں کا ہوتا کچھ سوچا جاسکتا تھا مگر بستی میں ہم نے جن ایک در جن زادوں کو گولی سے اڑایا ہے ان کا انتقام بھی تو یہ لوگ آپ پر واجب سمجھ رہے ہوں گے۔"

"خیر اس معاملے پر تو بستی میں جا کر بھی بات ... ہے۔ فی الوقت ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اپنا محاصرہ کیسے ...

جائے۔"

الماجد بولا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ابھی تک وہ بدبخت انڈین (شنکر) سامنے کیوں نہیں آیا جو اس فساد کی جڑ ہے۔"

اسی دوران میں شاری بھی ہمارے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے جنگی لباس میں تھی۔ اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ہولسٹر میں پسٹل تھا۔ رائفل ہاتھ میں تھی۔ پریشانی کا اثر اس کے چہرے پر نہ ہونے کے برابر تھا۔۔۔ ہاں ہلکا سا غم کا تاثر تھا جس کی وجہ یقیناً گھوڑی کی ہلاکت تھی۔ وہ بولی۔ "میں ان لوگوں سے بات کرنے جا رہی ہوں۔"

"ایسی بات ہے تو میں بھی جاؤں گا۔" الماجد نے کہا۔

"نہیں۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم ان لوگوں کو فوری طور پر لڑا تو سکو گے۔"

میں نے کہا۔ "تو پھر میں چلا جاتا ہوں۔ میرے کندھوں پر ایسی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔"

شاری کے بولنے سے پہلے ہی الماجد بول اٹھا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے" آپ سردار شاری کے ساتھ جائیں۔"

شاری نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد گہری سانس لی اور مجھے ساتھ لے جانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

مستقیم کے ایک ساتھی کے پاس سفید عمامہ موجود تھا۔ قانون دستور کے مطابق اس عمامے کو جھنڈے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ایک لمبی چھڑی پر اس عمامے کو لہرایا گیا۔ چار پانچ منٹ کی تاخیر سے دوسری جانب سے بھی ایسا ہی سفید کپڑا لہرایا گیا۔ میں اور شاری ٹیلے سے اتر کر جلی ہوئی جیپ کے باہر ... کی طرف بڑھے۔ شاری کا بندر بھی اچھلتا کودتا ... کے پیچھے چل دیئے شاری نے بمشکل اسے واپس ... ہم نے تیس چالیس گز فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ... سری جانب سے بھی دو افراد ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ ہماری طرح وہ بھی غیر مسلح تھے۔ ان میں سے ایک تو ... لحیم شحیم شخص تھا جس نے کل رات الماجد سے بات کی ... دوسرا ایک نیم گنجا پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے لمبی ... پہن رکھی تھی۔ مجھے شک گزرا کہ میں نے اس شخص ... کہیں دیکھا ہے۔

ہم ایک ٹیلے کے دامن میں آمنے سامنے پہنچ گئے اوپر ... پر مجھے مستقیم کے ساتھیوں کی رائفلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ ماہر نشانچی ایک اشارے پر گولیوں کی ... کرنے کے لئے تیار تھے' دوسری طرف یقیناً ابوظہبی ... بھی انگلیاں ٹریگر پر رکھے بیٹھے تھے۔ آنے والوں میں سے لحیم شحیم شخص نے کرخت لہجے میں شاری سے پوچھا۔ "تو تم ہو قبیلے کی سردار؟"

"ہاں۔ میں ہوں۔" شاری نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

"رات تمہاری فائرنگ سے ہمارے پانچ ساتھیوں کی جانیں گئی ہیں۔ تم لوگوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔"

"یہ بات مت بھولو کہ پہل تمہاری طرف سے ہوئی تھی۔" شاری ترم ٹھونک کر بولی۔ یقیناً لحیم شحیم شخص بھی کوئی تلخ جواب دیتا لیکن میں فوراً بول اٹھا۔

"تمہارا ساتھی شنکر کہاں ہے؟"

میرا خیال تھا کہ میرے سوال پر مخاطب چونک جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا' وہ تعجب سے بولا۔ "کون شنکر؟"

ایک دم میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ ہم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ شنکر کے ساتھی نہیں ہیں۔

شاری بھنا کر بولی۔ "زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ شنکر تمہارے ساتھ ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ اور میں تمہارے بے معنی سوالوں کا جواب دینا ضروری بھی نہیں سمجھتا۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر رہے ہو یا یہ فیصلہ خون خرابے کے بعد کرو گے۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر!۔۔۔ میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"یاسر۔" وہ تنک کر بولا۔ "شیخ یاسر بن ریحان۔ یہ میرے ساتھی شیخ ابی داؤد ہیں۔"

میں نے کہا۔ "محترم یاسر صاحب! آپ نے ابھی جو مطالبہ پیش کیا ہے ہم اس پر غور کر سکتے ہیں' وجہ یہ ہے کہ ہم مزید خون خرابا نہیں چاہتے مگر ہم یہ جاننے کا حق تو رکھتے ہیں کہ ہم خود کو جن لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں' وہ کون ہیں' اور کس مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ آپ شکاری وغیرہ نہیں ہیں' نہ ہی آپ راستہ بھٹک کر یہاں پہنچے ہیں۔ آپ کے پاس جو گاڑیاں ہیں وہ خاص طور سے ایسے ہی علاقے میں سفر کے لئے استعمال کی جاتی ہیں جیسے علاقے میں آپ موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کسی خاص پروگرام کے تحت اس علاقے میں آئے ہیں۔"

"تم ایک غیر متعلق بات چھیڑ رہے ہو۔ یہ علاقہ کتنا بھی دور دراز ہے لیکن ابوظہبی کا حصہ ہے۔ امارات کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہم یہاں تک آسکتے ہیں اور اس سے آگے بھی سفر کر سکتے ہیں۔"

"ہم بھی ابوظبی کے باشندے ہیں۔" شاری تنک کر بولی۔ "اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دشمن دار لوگ ہیں ہمیں اپنے علاقے میں نقل و حرکت کرنے والے ہر فرد پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود ہم نے تمہیں روکا نہیں ہے نہ تم پر حملہ کیا ہے۔ الٹا تم لوگوں نے ہمیں روکا ہے اور ہمارے پڑاؤ کا گھیراؤ کیا ہے۔ ہم پر پہلے گولی بھی تمہاری طرف سے چلائی گئی ہے اور پہلا آدمی بھی ہمارا مارا گیا ہے۔ یہاں جو بھی جانی نقصان ہوا ہے یا ہونے والا ہے اس کا مجھے ازحد افسوس ہے لیکن اس کے ذمے دار صرف اور صرف تم لوگ ہو۔"

میں نے محسوس کیا کہ یاسر نامی وہ جسیم تخشیم شخص کچھ دبا دبا نظر آ رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شاری کے سوالات کے درست جواب دینے سے قاصر ہے۔ یا پھر شاید وہ اس گروہ کا لیڈر ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور ہٹ دھرمی تو نظر آ رہی تھی لیکن معاملہ فہمی نہیں تھی۔

شاری کے بار بار پوچھنے کے باوجود اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کیا۔ وہ بس ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ "ہم ابوظبی کے باشندے ہیں اور ابوظبی کے علاقے میں ہیں۔ تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو کہ ہم یہاں کیوں ہیں۔"

میں نے صلح صفائی سے معاملہ طے کرنے کی بات کی تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ "تمہارے پاس جان بچانے کا بس ایک ہی طریقہ ہے، تم غیر مشروط طور پر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

اس کی باتوں سے یہ تاثر بھی مل رہا تھا جیسے ان کے مزید ساتھی بھی اس علاقے میں موجود ہیں اور وہ عنقریب ان تک پہنچنے والے ہیں۔ میں نے یاسر نامی شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بات کا برا نہ ماننا لیکن مجھے لگتا ہے کہ تم اس گروپ کے لیڈر نہیں ہو۔ شاید یہ ذمے داری کسی اور شخص کے کندھوں پر ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے جو دیگر ساتھی اس صحرا میں موجود ہیں گروپ لیڈر ان میں شامل ہو؟"

یاسر کے چہرے پر رنگ سا گزرا، مجھے شبہ ہوا کہ میری بات کافی حد تک درست ہے۔ جو بات میں نے نوٹ کی وہ شاری نے بھی نوٹ کر لی تھی۔ وہ اب برہم نظر آنے لگی تھی۔ اس نے یاسر نامی جسیم تخشیم شخص کے ساتھ ایک دو ترش تلخ باتیں کیں۔ وہ بھی اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھا، بیچ پا نظر آنے لگا۔ شاری نے کہا۔ "تم ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ کسی ایسے بندے کو بھیجو جو اپنا دماغ ٹھنڈا رکھ کے ہم سے بات کر سکے۔"

"ہمارے پانچ آدمی گولیوں سے بھون کر تم دماغ ٹھنڈا رکھنے کی بات کر رہی ہو۔" وہ غرایا۔

"ایک بات مت بھولنا۔" شاری ترخ کر بولی۔ "یہ صحرا ہے' یہاں پورے پورے لشکر دفن ہو چکے ہیں' اپنی تعداد اور اسلحے کے غرور میں رہو گے تو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

میں نے شاری کا بازو دبا کر اسے تلخ کلامی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بات ایک اٹل حقیقت تھی کہ محاذ آرائی میں ہمارا شدید نقصان تھا۔ یہ لوگ ہمیں تین اطراف سے گھیر چکے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا اور یہ مرنے مارنے پر آمادہ بھی نظر آتے تھے۔ اگر کشیدگی بڑھ جاتی تو لوگ بدعہدی پر بھی اتر سکتے تھے۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہاں سے با آسانی ہمیں گن پوائنٹ پر رکھا جا سکتا تھا۔ اب تک ان لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ شاری ہی قبیلے کی سردار ہے۔ وہ شاری کو جسمانی طور پر ختم کرنے کا سوچ سکتے تھے۔ سردار کے ختم ہونے سے اس بات کا قوی امکان پیدا ہو جاتا کہ باقی لوگ بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔

یاسر اور اس کے ہم مزاج ساتھی کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر میں نے شاری کا بازو دبایا' میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ ہمیں واپس جانا چاہیے۔ بہتر ہوا کہ شاری میری مرضی جان گئی۔ بات چیت مختصر کر کے ہم واپس آ گئے۔ میں نے یاسر نامی شخص سے کہا تھا کہ ہتھیار ڈالنے کے سلسلے میں ہم اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیں۔ یاسر نے تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔ "ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر جواب نہیں آیا تو ہم اپنی منشا کے مطابق کارروائی کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔"

پڑاؤ میں واپس پہنچ کر میں' الماجد' شاری اور مستقیم جوڑ کر بیٹھ گئے۔ صورت حال گمبھیر تھی۔ وہ لوگ تعداد میں کافی زیادہ تھے اور جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ لڑائی میں ان کا پلا یقیناً بھاری رہتا۔ دوسری صورت میں اگر ہم ہتھیار ڈال دیتے تو بھی وہ ہم سے اچھا سلوک نہ کرتے۔ شاری کو یرغمال بنا کر وہ پورے قبیلے کو گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ کر سکتے تھے۔ امید کی بس ایک ہی کرن تھی۔ شاری کو تلاش کرتے کرتے بستی سے کچھ لوگ یہاں پہنچ جاتے اور یوں ہمیں بستی سے کمک مل جاتی لیکن دوسری طرف ہمارے مخالفین کو بھی کمک ملنے کی امید تھی۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ علاقے میں ان کے کچھ مزید ساتھی موجود ہیں اور وہ عنقریب ان سے ملیں گے۔ معلوم نہیں' یاسر وغیرہ نے جان بوجھ کر ایسا تا

ثر دیا تھا یا واقعی کوئی ایسی بات تھی۔ بہرحال اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا پھر ایک اور سوال بار بار میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ جب ہم نے یاسر سے اندین شنکر کا ذکر کیا تھا تو اس نے بالکل لاعلمی ظاہر کی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ واقعی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر ان لوگوں کا تعلق شنکر سے نہیں تھا تو پھر وہ کون لوگ تھے اور یہاں کیوں پہنچے تھے۔

ابھی ہم یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ مستقیم اپنے ایک ساتھی کے بلانے پر اٹھ کر خیموں کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "صاحب! ایک نقصان ہو گیا ہے۔"

شاری اور الماجد بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ تھوک نگل کر بولا۔ "اس سامنے والے کالے خیمے میں پانی کی چھاگلیں اور دو بڑے مشکیزے تھے۔ ایک بڑے مشکیزے اور دو چھاگلوں کا پانی ضائع ہو گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" شاری قریباً چیخ پڑی۔

"سردار! رات کی فائرنگ میں کارتوس کے چھرّے وغیرہ لگے ہیں۔ ساری رات تھوڑا تھوڑا پانی رستا رہا ہے اور ریت میں جذب ہوتا رہا ہے۔ اب مشکیزہ اور چھاگلیں قریباً خالی پڑی ہیں۔"

یہ تشویش ناک خبر تھی' پانی ہمارے پاس پہلے ہی وافر مقدار میں نہیں تھا۔ شاری نے اس شخص کو بلایا جو پانی اور خیمے کی حفاظت پر مامور تھا اور اسے سخت جھاڑ پلائی۔

بہت دیر تک سوچ بچار کرنے کے باوجود ہم کوئی نتیجہ نہیں نکال سکے۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ ابھی مخالفین کو دو ٹوک جواب نہ دیا جائے۔ اس معاملے کو زیادہ سے زیادہ لٹکانے کی کوشش کی جائے۔ عین ممکن ہے کہ اس دوران میں بستی سے کچھ لوگ یہاں پہنچ جائیں یا بہتری کی کوئی اور صورت نکل آئے۔

ہمارے مخالفین کا الٹی میٹم دو گھنٹے کا تھا۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد جب ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔ دوسری طرف بھی خاموشی رہی۔ تاہم دوپہر کے وقت جب گرمی اپنے عروج پر تھی اکا دکا فائر ہونے شروع ہو گئے۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے شام تک جاری رہا۔ مستقیم کے نشانچی بھی اس فائرنگ کا مؤثر جواب دیتے رہے تھے۔ شام کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ بہرحال اپنی طرف سے ہم پوری طرح چوکس تھے اور گرد و پیش پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہماری کل تعداد سترہ تھی۔ جن میں سے ایک شخص جاں بحق اور دوسرا زخمی تھا۔ یعنی لڑنے والے افراد کی تعداد غزالہ سمیت پندرہ تھی۔ ان میں سے کم از کم دس افراد ہر وقت پوزیشن پر چوکس رہتے تھے۔ شاری نے بڑی مہارت سے ذمے داریوں کی تقسیم کی تھی۔ ہر شخص کو آرام بھی مل رہا تھا اور دیگر ضروریات بھی پوری ہو رہی تھیں۔

میری ڈیوٹی رات کے پہلے پہر تھی۔ نصف شب تک میں پوزیشن پر موجود رہا۔ بھاری بھر کم آٹھ ایم ایم رائفل میرے سامنے تھی اور میں خندق میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ قریباً ڈیڑھ سو گز کی دوری پر مشعلوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی کے قریب ہی ہمارے "مہربانوں" کی خندق تھی۔ نصف شب تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ہماری طرح شاید ہمارے "مہربان" بھی کمک کے انتظار میں تھے۔ نصف شب کے بعد میری جگہ الماجد نے لے لی۔ وہ بہت تر و تازہ اور ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ اس کا ہر انداز ایک لذت آفریں نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ زمین پر ہوتے ہوئے بھی وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر دل میں خوشی ہو تو پھر ہر روز عید اور ہر مقام بہشت نظیر ہوتا ہے۔ ہم آگ اور بارود کے گھیرے میں تھے لیکن چونکہ الماجد کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی لہٰذا اس کے لئے یہ جلتا ہوا ویرانہ گلستان تھا اور ہر طرف بہار ہی بہار تھی۔

الماجد نے میری جگہ سنبھال لی تو میں خیمے میں واپس آ گیا۔ اب ہم خیمے کافی پیچھے لے گئے تھے' یہ جگہ فائرنگ سے بالکل محفوظ تھی۔ میں خیمے میں پہنچا تو بچے کی چیخیں سنائی دیں۔ یہ خوشی کی چیخیں تھیں۔ وہ معصوم اپنے حالات اور انجام سے قطعی بے خبر کلکلیں کرنے میں مصروف تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ بچے کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ غزالہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کے بال کھینچنے میں مصروف تھا۔ کبھی اس کی گردن سے لٹک جاتا تھا اور اسے اپنے بالکل اوپر جھکا لیتا تھا۔ غزالہ اسے پچکار رہی تھی مگر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ بچے کی شوخیوں سے لطف اندوز ہوتی تھی مگر اب اپنے اوپر جبر کر کے یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

میں تھکا ہوا تھا' آتے ساتھ ہی لیٹ گیا اور سو گیا۔ رات آخری پہر صحرا میں تیز ہوا چلی پھر یہ آندھی میں تبدیل ہو گئی۔ مشعلیں بجھ گئیں۔ ہمارے خیمے میں بھی مکمل تاریکی چھا گئی۔ خیمہ کسی دیوہیکل پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرے نیم خوابیدہ ذہن میں اندیشہ جاگا کہ کہیں یہ

آندھی دل کی آمد تو نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ ایک گردباد ہی تھا۔ ریت اور گرد کی وجہ سے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ غزالہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی پھر اس نے میرا شانہ ہلایا۔ "شاہ جہاں دیکھیں' کتنی تیز آندھی آئی ہے۔"

"دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

غزالہ کا ہاتھ میرے شانے پر ہی دھرا رہا۔ شاید اس طرح وہ خوف اور اکیلے پن کا احساس دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دم گھٹنے کی وجہ سے بچہ بھی جاگ گیا تھا اور گاہے گاہے ٹھنکنے لگا تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ گہری تاریکی اور ریت کے اس طوفان کا فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اگر میں کسی طرح اس محاصرے میں سے نکل کر بستی تک پہنچ جاتا تو حملہ آوروں کو بے دست و پا کیا جا سکتا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا' اندھیرے میں ٹٹول کر اپنا ماؤزر تلاش کیا' اس کی گولیاں جیبوں میں ٹھونسیں اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ "اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟" غزالہ کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔

"کہیں دور نہیں جا رہا' ابھی آتا ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"لیکن —" اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

میں اس سے تسلی تشفی کے دو بول بول کر باہر نکل آیا۔ ریت کے ذرے زہریلی سوئیوں کی طرح میرے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکرائے۔ میں نے چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور ان دو گھوڑوں کی طرف بڑھا جن پر شاری کے ساتھی یہاں پہنچے تھے' یہ گھوڑے پڑاؤ کے پیچھے چوبیں ٹھونک کر باندھے گئے تھے۔ تیز ہوا میں' میں جیسے خود بخود اڑتا ہوا سا ان گھوڑوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے ایک گھوڑا کھولا اور اس کی راسیں پکڑ کر ڈھلوان کی طرف بڑھنے لگا۔ گھوڑے کی راس میرے بائیں ہاتھ میں اور ماؤزر دائیں ہاتھ میں تھا۔ میں گھوڑے کی آڑ لے کر چل رہا تھا' اگر بائیں جانب سے فائر ہوتا تو ٹانگوں کے سوا میرا جسم تقریباً محفوظ تھا۔ میں بڑی احتیاط سے تقریباً پچاس گز تک چلا گیا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی بالکل قریب موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا دفاع کرتا' ایک پرچھائیں اڑتی ہوئی سی مجھ پر آن پڑی۔ یہ ایک مضبوط جسم کا شخص تھا' اس نے مجھے دور تک ریت پر رگید دیا۔ وہ میرے لئے ایک مشکل مدمقابل ثابت ہوتا لیکن اس کی بدقسمتی کہ مجھ سے لپٹتے ساتھ ہی اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آگئی۔ اسے بدقسمتی ہی کہنا چاہیے کیونکہ اسے زیر دام لانے کے لئے مجھے ذرا سی کوشش بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس نے جیسے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹے گا اور جھپٹتے ساتھ ہی اپنی گردن تحفے کے طور پر میرے حوالے کر دے گا۔ میں اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھانے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور میرے پرجوش مدمقابل کا جسم ایک لمحے میں ڈھیلا پڑ گیا۔

وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا' تاہم اس حالت کو پہنچنے سے پہلے اس نے چیخ کر کسی کو پکارا تھا۔ اس پکار کا ردعمل فوراً سے پہلے ظاہر ہوا۔ یکایک میرے عین سامنے دس پندرہ گز کی دوری پر کئی روشنیاں چمکیں۔ یہ ٹارچوں کی روشنیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم فائرنگ شروع ہو گئی۔ گھوڑے کی راسیں ابھی تک میرے ہاتھ میں تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ پیچھے ہٹوں یا پھر آگے نکل جاؤں۔ یہ میرے لئے فیصلے کا لمحہ تھا' میں جس مقام پر موجود تھا وہاں سے گھیرا توڑ کر نکل سکتا تھا اور واپس اپنے پڑاؤ کی طرف بھی جا سکتا تھا۔ دونوں صورتوں میں کچھ خطرات کا سامنا تھا اور کچھ فوائد بھی تھے۔ میرے اس تذبذب کو ختم کرنے کے لئے گھوڑے نے اپنا تعاون پیش کیا اور دہ یوں کہ دھماکوں سے بدک کر وہ ایک دم مڑا اور پڑاؤ کی طرف بھاگ اٹھا۔ میں نے اس کی راسیں چھوڑ دیں۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میں پشت کے بل ریت پر پڑا تھا اور میرے اوپر نامعلوم شخص کا بے ہوش جسم تھا اور گولیاں سائیں سائیں کرتی ہمارے اوپر سے پرواز کر رہی تھیں۔ گھوڑے کی پسپائی کے بعد میرے لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ گھیرا توڑ کر آگے بڑھنے کا سوچوں۔ میں نے بے ہوش شخص کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنے آگے رکھا اور اٹھ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ ایک دو بار گولی نے کان کے بہت قریب سرگوشی کی پھر ایک گولی میرے سینے کے بالکل سامنے لگی لیکن میرے سامنے چونکہ انسانی ڈھال تھی لہٰذا میں محفوظ رہا۔ حتی الامکان تیزی سے میں واپس اپنے پڑاؤ کی طرف پسپا ہو گیا۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی شاری کے نشانچیوں نے بھی رائفلوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ سوا ہوا ویرانہ ایک دم شورِ محشر سے جاگ اٹھا تھا۔ تیز آندھی میں سنسناتی ہوئی گولیوں کی سیٹیاں عجیب صوتی تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ میں پڑاؤ میں واپس پہنچتے ہی خندق میں کودا اور مستقیم کے ساتھ مل کر خود بھی فائرنگ کرنے لگا۔ اس اندھا دھند فائرنگ میں مستقیم کے ایک ساتھی کو خودکار رائفل کا

برسٹ لگا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ ایک دوسرا شخص معمولی سا زخمی ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد فائرنگ تھم گئی اور اس کے ساتھ ہی آندھی کا زور بھی ٹوٹ گیا۔

آندھی تھم جانے کے بعد پڑاؤ میں پھر سے روغنی شعلیں جلا دی گئیں۔ جس شخص کو ڈھال بنا کر میں پڑاؤ میں واپس پہنچا تھا وہ خندق کے قریب بے سدھ پڑا تھا۔ گولی اس کے منہ میں لگی تھی اور تالو میں گھس گئی تھی۔ وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ وہ قیمتی کپڑے کی پتلون قمیص میں تھا۔ سر پر عمامہ بھی تھا جو میرے ساتھ دھینگا مشتی کے دوران میں گر گیا تھا۔ شاری نے متوفی کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ ایک کی رنگ' پستول کا ایک بھرا ہوا میگزین اور ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی بھی موجود تھا۔ تلاشی کے دوران میں میرا ہاتھ متوفی کے سینے سے ٹکرایا تو مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ وہاں کوئی سخت چیز موجود تھی۔ میں نے قمیص کے بٹن کھول کر دیکھا تو بلٹ پروف جیکٹ کی جھلک نظر آئی۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا' یہ یو ایس اے کی بنی ہوئی "ونڈر" نامی معروف جیکٹ تھی' میری معلومات کے مطابق اس جیکٹ کی قیمت میں ایک شاندار لگژری گاڑی خریدی جا سکتی تھی۔ اس شخص کے سانس پورے ہو چکے تھے لہٰذا یہ نہایت قیمتی جیکٹ بھی اس کی موت کا راستہ نہیں روک سکی تھی۔ جیکٹ کی حدود سے صرف آٹھ دس انچ اوپر' موت بڑی آسانی سے اس کے جسم میں داخل ہو گئی تھی۔ ہم نے یہ جیکٹ مرنے والے کے جسم سے علیحدہ کر لی۔

میں کافی دیر واکی ٹاکی کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کا سسٹم بڑا پیچیدہ سا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اسے آن کرنے میں کامیاب نہیں ہوا

مرنے والے بدو کی لاش کو خیمے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ متوفی کے ساتھیوں کے چہروں پر ہلکے سے ملال کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ لوگ پیدائشی جنگجو تھے۔ جیسے مچھلی پانی میں شاداں رہتی ہے' یہ میدانِ کارزار میں خوش رہتے تھے۔ کندھے سے کندھا ملا کر دلیرانہ حملے کرنا اور پھر اپنے ساتھیوں کی لاشیں پھلانگ کر پیش قدمی جاری رکھنا ان کا وتیرہ تھا۔ جس گھوڑے پر میں نے "فرار" ہونے کی کوشش کی تھی وہ برستی گولیوں میں سے صحیح سلامت واپس آگیا تھا۔ اسے قابو کر کے دوبارہ دوسرے جانوروں کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

جہاندیدہ شاری بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ میرے بتائے بغیر ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رات کے اس آخری پہر اکا دکا فائرنگ کیوں شروع ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "تمہاری کوشش تو اچھی تھی اور اس کے لئے تم نے وقت کا انتخاب بھی ٹھیک کیا لیکن تمہیں کم از کم مجھے تو باخبر کرنا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا۔ "بس جو کچھ ہوا' اچانک ہوا۔ یہ کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ بہرحال اس سے ایک بات بہت اچھی طرح ثابت ہو گئی ہے' محاصرہ کرنے والوں نے محاصرے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ انہوں نے مکمل ناکا بندی کر رکھی ہے۔"

میں نے شاری کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی تشویش دیکھی۔ وہ بولی۔ "پانی بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اگر محاصرہ طول پکڑ گیا تو سخت وقت پیش آئے گی۔"

"تمہارا خیال تھا کہ بستی والے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔"

"ہاں۔ اس حوالے سے بھی پریشانی ہے۔ اگر وہ ہمارے قدموں کے نشان ڈھونڈ لیتے تو اب تک انہیں یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اب تو ان کے پہنچنے کا امکان بھی کم ہو گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی جو طوفان آیا اس نے ریت پر ہمارے قدموں کے نشان ملیا میٹ کر دیئے ہوں گے۔"

یہ واقعی مایوس کن بات تھی۔ میں نے شاری سے پوچھا۔ "ایمونیشن کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ایمونیشن تو بہت ہے۔ جو اونٹ پرسوں ہم نے پکڑا ہے اس پر بھی ایمونیشن موجود ہے۔ راشن کی بھی کمی نہیں مگر پانی کا مسئلہ پیش آئے گا۔ بہرحال ابھی دو تین روز تک تو پانی کی بھی فکر نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ہمیں اس معاملے کو کہاں تک طول دینا چاہیے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک اور بات بھی مدنظر رکھنا ہو گی جیسا کہ یاسر نامی اس بندے نے اشارہ دیا تھا' ان لوگوں کو بھی ہماری طرح کمک کا انتظار ہے۔ اگر ہم سے پہلے انہیں کمک مل گئی تو کیا ہو گا' ان کی تعداد پہلے ہی زیادہ ہے' کمک مل جانے کی صورت میں ممکن ہے کہ وہ فوراً ہم پر بھرپور حملہ کر دیں۔"

"ہاں۔ اس پہلو سے میں نے بھی سوچا ہے۔"

"پھر کیا نتیجہ نکالا ہے؟"

"یہی کہ مزید سوچنا چاہیے۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

میں نے کہا۔ "مشکل ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس دوسرے گروپ کے ساتھ ہو جس کا یاسر

وغیرہ انتظار کر رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ محاصرہ کرنے والوں کا تعلق لشکر اور عشارب وغیرہ سے نہ ہو۔"

"ہاں امکان تو یہ بھی ہے۔"

اچانک دھماکے سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔ ہم خندق میں کچھ اور دبک گئے۔ ایسے اِکا دُکا فائر سارا دن ہوتے رہتے تھے۔

دو تین گھنٹے بعد اگلے روز کا آگ برساتا سورج طلوع ہوا اور دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرنے لگا۔ یہ سارا دن بھی سخت گرمی، حبس اور ان دیکھے دشمن کی گولی کے خوف کا سامنا کرتے گزر گیا۔ الماجد نے اندازہ لگایا تھا کہ ہمارے دشمنوں نے محاصرہ کچھ اور تنگ کر دیا ہے۔ وہ ہمارے عقب میں اپنی پوزیشن کچھ اور آگے لے آئے تھے۔ انہیں کہیں سے کھجور کے سوکھے سڑے خشک تنے مل گئے تھے۔ انہوں نے ان تنوں کو اوپر نیچے رکھ کر محفوظ آڑ کی شکل دے دی تھی۔ وہ تنے نیچے رکھ کر ان کے اوپر ایک تنا لٹکا دیا تھا۔ یوں افقی رخ پر ایک دیوار سے بن گئی تھی۔ اس تین چار فٹ اونچی دیوار کے عقب سے وہ با آسانی ہمارے پڑاؤ کے ایک حصے کو نشانہ بنا سکتے تھے۔

پڑاؤ کو فائرنگ کی زد سے بچانے کے لئے ہم نے اپنے خیمے اکھاڑ لئے اور انہیں کچھ پیچھے لے گئے۔ شام کو مستقیم میرے پاس آیا۔ وہ مقامی رواج کے مطابق ایک چھوٹا سا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا (حالانکہ آج صبح اس نے اپنے ایک ساتھی کی لاش ریت میں دفن کی تھی) وہ خندق میں میرے قریب بیٹھ گیا۔ ایک بدو نے قہوے کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں ہمیں تھما دیں۔ بے شک اس قہوے کی تاثیر گرم تھی لیکن یہ گرمی کا مقابلہ کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا تھا۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے مستقیم کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا پھر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ بولا۔ "جناب! میں اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو یہ رائے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ آپ سردار شاری کے قریب ہیں اور وہ آپ کی بات توجہ سے سنتی ہیں۔"

"ہاں ہاں کہو۔" میں نے حوصلہ افزائی کے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ "چھوٹا منہ بڑی بات ہے جی۔۔۔ لیکن بات جب منہ میں آ جائے تو اسے روکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔۔۔ ہم سب اس بات پر بہت خوش ہیں کہ سردار شاری نے ایک ایسے شخص کی محبت کا دم بھرا ہے، جو ہمارے طبقے کا ہے، بلکہ ہم میں سے ہی ایک ہے۔ الماجد اور سردار شاری کے ملاپ نے ہمارے دل مسرت سے بھر دیئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پوری بستی کے غلام زادوں اور غلام زادیوں کو انسان کہلانے کی اجازت مل گئی ہے۔"

"ہاں۔ یہ واقعی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"ہماری یہ خواہش ہے جی کہ یہ خیال خوشی اب جلد سے جلد حقیقت کے روپ میں ڈھل جائے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"جناب زندگی بڑی بے بھروسا چیز ہے۔ اگلے پل کا پتا نہیں ہوتا کہ کیا ہو جائے۔ ہم جہاں موجود ہیں یہاں تو ایک ایک سانس موت کے سائے میں ہے۔ ہم کل کا انتظار کیوں کریں۔ جو خوشی آج مل سکتی ہے وہ کیوں نہ آج ہی حاصل کر لیں۔۔۔ ہم چاہتے ہیں جناب کہ آج رات ہی سردار شاری اور الماجد کو رشتہ ازدواج میں باندھ دیا جائے۔"

مستقیم نے ایک چونکا دینے والی بات کی تھی، یہ بات نہ صرف قابل غور تھی بلکہ قابل عمل بھی ہو سکتی تھی۔ میرے چہرے کے موافق تاثرات دیکھ کر مستقیم کے دو اور ساتھی بھی میرے قریب چلے آئے اور مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

مستقیم نے اپنی رائے کے حق میں کچھ دلائل دیئے جو خاصے وزنی تھے۔ میں نے کہا۔

"لیکن شاری کا کوئی سرپرست یہاں موجود نہیں ہے۔"

مستقیم بولا۔ "اس شادی کے لئے سب سے ضروری اور معتبر رائے سردار شاری کے والد محترم سردار شماس کی ہے اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہ صرف اس شادی کے حق میں ہیں بلکہ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی ہے۔ بے شک وہ یہاں موجود نہیں ہیں لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس شادی کی خبر کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری قرار دیں گے۔"

میں نے مستقیم سے پوچھا۔ "تم لوگوں نے الماجد سے بات کی ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اس نے ہماری رائے کی حمایت نہیں کی تو مخالفت بھی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب کچھ ہم پر چھوڑ دینا چاہتا ہے۔"

"سردار شاری کا عندیہ کیا ہے؟"

"یہ عندیہ آپ کو معلوم کرنا ہوگا۔" مستقیم نے کہا۔ "آپ کے سوا یہ کام اور کوئی نہیں کر سکتا۔ شاید الماجد بھی نہیں کر سکتا۔"

کافی دیر اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی پھر یہ طے پایا کہ میں شاری کے خیمے میں جاؤں اور اس سلسلے میں اس کی رائے لوں۔

میں خیمے میں پہنچا تو شاری ایک تکیے سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھی تھی۔ بندر بابی بھی اس کے قدموں میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ بے خیالی میں ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

"لگتا ہے کہ کوئی خاص بات کہنا چاہتے ہو۔" وہ بولی۔

"ہاں۔۔۔ بہت ہی خاص ہے۔۔۔ میں ایک ایسی بات کہنا چاہ رہا ہوں جو کسی بھی لڑکی کی زندگی میں سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔" وہ بولی۔

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "شاری! میں تم سے تمہارے بیاہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھوں گا کیونکہ ہمارے پاس ایسی باتوں کا وقت نہیں۔۔۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مستقیم سمیت ہم سب کی یہ رائے ہے کہ آج رات ہی الماجد کے ساتھ تمہارا بیاہ کر دیا جائے۔۔۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

شاری کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ بے شک وہ جنگجو قبیلے کی جنگجو سردار تھی لیکن تھی تو ایک لڑکی۔ جس کی رگوں میں ایک تعلیم یافتہ مہذب خاتون کا لہو تھا۔ اس کی پلکیں جھک گئی تھیں، کتنی ہی دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سنجیدگی کی دبیز تہہ کے نیچے شوخی کی ایک دلنشین لہر تھی۔ وہ بولی۔ "شاہ جہاں! اگر میں اس سوال کا جواب تم سے مانگوں تو؟"

میں نے کہا۔ "میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جواب دوں گا کہ تم اپنے ساتھیوں اور الماجد کی دلی خواہش کے مطابق ابھی الماجد سے بیاہ کر لو۔"

اس کی پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں مگر اب چہرے پر شرم کا رنگ نہیں تھا، ایک سردار کی سی تمکنت تھی۔ خیمے میں ایک گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ بابی اپنی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے مسلسل شاری کو دیکھ رہا تھا۔ آخر شاری کی آواز خیمے میں ابھری۔ "شاہ جہاں! میں اس بارے میں تھوڑا سا سوچنا چاہتی ہوں۔ تمہارے سوال کا جواب میں ایک دو گھنٹے تک دے سکوں گی۔"

شاری کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ میں نے مزید اصرار مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے شام کے بعد اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا جواب ہم سب کی توقعات کے مطابق ہوگا۔"

میں خیمے سے باہر نکلا۔ ایک ساتھ تین فائر ہوئے۔ ایک گولی میرے پاؤں کے بالکل قریب ریت میں لگی۔ ریت اوپر تک اچھلی، دوسری گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی گزر گئی تھی۔ میں نے خود کو اوندھے منہ ریت پر گرایا پھر جلدی سے لوٹ لگا کر دوبارہ خیمے میں گھس گیا۔

میری طرح شاری کے چہرے پر بھی حیرت نظر آنے لگی تھی۔ پڑاؤ کا یہ حصہ فائرنگ کی زد میں نہیں تھا پھر یہ گولیاں اس رخ پر کیسے چلی آئی تھیں۔ اس کا جواب اگلے ہی سیکنڈ میں ہمیں مل گیا۔ خیمے کے روزن میں سے میں نے الماجد کو دیکھا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر فائر کر رہا تھا۔ اس کی رائفل کا رخ ایک قریبی ٹیلے کی طرف تھا۔ الماجد نے یکے بعد دیگرے پانچ فائر کئے۔ اس کے ہاتھ میں دس کارتوس والا ری پیٹر تھا۔ اس کی آواز دھماکے سے مشابہ تھی۔ میں نے ایک شخص کو قلابازی کھا کر ٹیلے کی بلندی سے گرتے دیکھا۔ یہی شخص تھا جس نے خیمے سے نکلتے وقت مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اس شخص کے گرنے کے بعد دونوں طرف سے دو تین منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی پھر بتدریج خاموشی چھا گئی۔ اس فائرنگ کے دوران میں، میں اور شاری خیمے کے اندر ہی رہے تھے۔

فائرنگ رکنے کے بعد میں احتیاط کے ساتھ خیمے سے نکل آیا۔ ابھی میں دو قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے شاری کی آواز آئی۔ "رکو شاہ جہاں۔" میں رک گیا۔ گھوم کر میں نے واپس خیمے میں جانا چاہا تو خیمے کا پردہ ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے شاری؟" میں نے باہر ہی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسے تم سب کی مرضی ہے ویسے کر لو۔" اندر سے آواز آئی۔

مجھے خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا۔ میں اسی خوشگوار احساس کے ساتھ اس خندق کی طرف بڑھا جہاں الماجد پوزیشن لئے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ٹیلے کی اوٹ میں بلایا۔ وہ آ گیا تو میں نے اسے گلے سے لگایا اور مبارکباد دی۔

"کیسی مبارک جی؟ ابھی تو لڑائی جاری ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "ہاں، یہ لڑائی تو جاری ہے لیکن پیار کی

لڑائی تم جیت گئے ہو۔ تمہارے "محبوب دشمن" نے ہار مان لی ہے۔"

"کیا مطلب! میں سمجھا نہیں؟" الماجد بولا۔

"میں نے شاری سے بات کی ہے۔ آج ہی شام تم دونوں کا بیاہ ہو رہا ہے۔ انہی خندقوں کے درمیان ــــ پورے رسوم و رمز کے ساتھ۔"

الماجد کا گندمی چہرہ حیا آمیز خوشی سے سرخ ہو گیا۔

سورج غروب ہونے کے قریباً دو گھنٹے بعد ہلکی ہلکی چاندنی اور مشعلوں کی روشنی میں الماجد اور شاری کے بیاہ کی مختصر رسومات ادا ہو گئیں۔ یہ رسومات اسلامی طرز کی تھیں تاہم اس میں کئی ایک اضافی چیزیں بھی شامل تھیں۔ غزالہ نے شاری کو دلہن کی حیثیت سے تیار کیا۔ اس نے اصرار کر کے اپنے بندے اور کنگن وغیرہ شاری کو پہنا دیے۔ وہ آخر تک سب کچھ پہننے سے انکار کرتی رہی۔ مستقیم کے ساتھیوں میں جو سب سے معمر شخص تھا اس نے نکاح پڑھایا۔ خیمے میں الماجد اور شاری ساتھ ساتھ بیٹھے تھے تاہم ان کے درمیان ریشمی کپڑے کا پردہ حائل کر دیا گیا تھا۔ نکاح کے بعد خشک کھجوریں اور کشمش تقسیم کی گئی۔ بعد میں الماجد اور شاری کے درمیان لٹکا ہوا ریشمی پردہ ہٹا دیا گیا۔ اس پردے کو ایک چادر کی طرح ان دونوں کے اوپر ڈال دیا گیا۔ چار پانچ افراد ان کے گرد چکر لگانے لگے۔ وہ تالیاں بجا رہے تھے اور ساتھ ساتھ کچھ گا بھی رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ان دونوں کے اوپر سے چادر اتار لی گئی۔

غزالہ نے شاری کو مبارک باد دی۔ شاری نے اسے گلے لگایا۔ الماجد کی نظریں خواب ناک تھیں اور ہونٹ تھرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حالت خواب میں چل رہا ہے یا پھر اتنی خوشی تھی اس کے دل میں کہ وہ اس پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

آخری رسم کے طور پر الماجد نے اپنی نئی نویلی دلہن کو بازوؤں میں اٹھانا اور حجلۂ عروسی یعنی خیمے میں لے جانا تھا۔ وہ دلہن کے سامنے کھڑا تھا لیکن یہ آخری رسم ادا کرنے کی اس کو جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک اس ادب و احترام کے دائرے سے نکل نہیں سکا تھا جو شاری کے حوالے سے الماجد کی نس نس میں رچا ہوا تھا۔ آج وہ شاری کا دولہا تھا لیکن آج بھی وہ کسی پجاری کی طرح اس کے حضور میں سرنگوں کھڑا تھا۔ یوں لگا کہ صدیاں گزر جائیں گی لیکن وہ ایک شوہر کی حیثیت سے شاری کے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا اور اگر لگائے گا تو فرط حیرت اور احساس مرعوبیت سے غش کھا کر گر جائے گا۔

"الماجد! آگے بڑھو کیا سوچ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ فولادی جسم کے مالک اس شیر دل نوجوان کو اس کی خوش بختی نے یوں مسحور کیا تھا کہ پتھر کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے دیکھا شاری کے لبوں پر مدھم مسکراہٹ ابھری۔ غالباً اس نے الماجد کی دلی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے ایک ادا سے اپنے بازو الماجد کے گلے میں ڈال دیے۔ یہ ایک طرح سے ٹھٹھرے ہوئے الماجد کی "خاموش حوصلہ افزائی" تھی۔ اس "حوصلہ افزائی" نے الماجد پر خاطر خواہ اثر کیا۔ اس کے زرد چہرے پر خون کی سرخی دوڑی۔ اس نے جھجک کر شاری کو کسی پھول کی طرح گود میں اٹھا لیا۔ اس موقع پر ایک مرتبہ پھر تالیاں بجائی گئیں اور داد و تحسین کے کلمات ادا کیے گئے۔ مستقیم نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم بستی میں ہوتے تو اس موقع پر زبردست ہوائی فائرنگ کی جاتی۔"

میں نے کہا۔ "اب ایسی غلطی نہیں کرنا۔ ورنہ تمہارے "مہربان" جوابی فائرنگ شروع کر دیں گے اور ایک بار پھر خون خرابے کا ماحول بن جائے گا۔"

الماجد شاری کو لے کر خیمے میں چلا گیا۔ شاری کا بندر بابی اس کے پیچھے جانا چاہ رہا تھا لیکن مستقیم نے اس کی زنجیر تھام لی تھی۔ بندر پہلے تو "خوخو" کرتا رہا پھر حیران نظروں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگا۔ شاید وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آج وہ اپنی مالک کے ساتھ خیمے میں کیوں نہیں جا سکا۔

میں اور غزالہ اپنے خیمے میں واپس آ گئے۔ بچہ دیر ہوئی سو چکا تھا۔ غزالہ اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ شاری کو خوشبو لگاتے ہوئے اس کے اپنے لباس پر بھی تھوڑی بہت خوشبو لگ گئی تھی۔ اب یہ خوشبو خیمے کو مہکا رہی تھی۔ خوشبو کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے لیکن جب خوشبو لگانے والی ہی خاموش تھی تو خوشبو کیا بولتی۔ ہاں درد اور جدائی کا ایک میٹھا میٹھا احساس تھا جو اس خوشبو کے ساتھ خیمے میں چکرا رہا تھا۔

مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ ایک سگریٹ پینے کے لئے میں خیمے سے باہر نکل آیا۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ کچھ فاصلے پر الماجد کے خیمے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ الماجد اور ساری کے خیمے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں اس روشنی کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں "محبت کے سیلاب" پر خوشی محسوس کرتا رہا۔ یہ ٹیلے، یہ صحرا، یہ چاندنی اور یہ خندقیں ــــ سب مل جل کر ایک عجیب منظر

پیش کر رہے تھے۔ موت کے سمندر میں شاری اور الماجد کا خیمہ زندگی کا چھوٹا سا جزیرہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد خیمے کی روشنی بجھ گئی اور زندگی کا یہ جزیرہ کچھ اور بھی خوبصورت نظر آنے لگا۔

اگلی صبح میں نے الماجد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں رت جگے کی سرخی تھی لیکن ہونٹوں پر ایک ایسی مسکان تھی جس پر ہزار راتوں کی نیندیں قربان کی جا سکتی تھیں۔ میں نے ناشتا الماجد اور شاری کے ساتھ ان کے خیمے میں کیا۔ شاری اس خوبصورت صحرائی پھول کے مانند دکھائی دیتی تھی جو رات بھر شبنم میں بھیگتا رہا ہو۔ اس کے انگ انگ سے مستی اور خوشی کے چشمے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا بندر بابی اس کی گود میں گھسا بیٹھا تھا اور لاڈ میں بار بار اس کے کندھے سے سر لگا رہا تھا۔ شاری نے اس کا سر چوما اور پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

میں نے کہا۔ "تم بندر کو پیار کر رہی ہو یا الماجد کو جلانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"دونوں کام کر رہی ہوں۔" وہ ادا سے بولی۔

"الماجد! میری ایک بات لکھ لو۔" میں نے کہا۔ "یہ بندر مستقبل میں تمہارا رقیب روسیاہ ثابت ہونے والا ہے۔"

الماجد مسکرایا تو اس کے نہایت سفید دانت کلیوں کی طرح کھل اٹھے۔ شاری نے بندر کو سینے سے لگایا۔ "خبردار! جو کسی نے میرے بابی کی مخالفت کی تو ــــ اور تم شاہ جہاں ــــ تم تو بابی کی مخالفت بالکل بھی نہیں کرو گے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم پر بابی کا ایک احسان ہے ــــ یاد ہو گا تمہیں کہ ابڈین کے ساتھ لڑائی میں بابی نے تمہاری مدد کی تھی۔ اس کے آئینے کا لشکارا ہی تھا جس نے تمہیں سنبھلنے میں مدد دی تھی۔"

"ہاں یہ بات تو میں ہرگز نہیں بھول سکتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بابی نے وہ "مہربانی" از خود کی تھی یا تم نے اسے اکسایا تھا؟"

"اس نے خود بھی کی تھی اور میں نے اکسایا بھی تھا۔"

"کیا مطلب۔" میں نے پوچھا۔

"عملی مظاہرہ دکھاؤں؟" شاری نے کہا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ شاری نے بابی کو اشارہ کیا۔ وہ ایک کونے میں پڑا ہوا وہ چھوٹا گول آئینہ اٹھا لایا جو اکثر اس کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ آئینہ پکڑ کر وہ پھر شاری کی گود میں آ بیٹھا اور یونہی آئینے کو گھمانے لگا۔ خیمے کے روزن میں سے سورج کی شعاعیں اندر آ رہی تھیں۔ وہ ان شعاعوں کا عکس میری حسب عادت ادھر ادھر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاری نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آئینے کا رخ اچانک میرے چہرے کی طرف ہو گیا۔ سورج کے عکس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

شاری بولی۔ "بس اس وقت بھی ایسے ہی ہوا تھا۔"

"بس جو کچھ بھی ہوا تھا یادگار ہوا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔"

شاری مسکرا کر رہ گئی۔

کچھ دیر شاری کے پاس بیٹھ کر میں اور الماجد خیمے سے باہر نکل آئے۔ آسمان صاف تھا اور سورج آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔ رات بڑے سکون سے کٹی تھی۔

خندقوں میں دونوں طرف نشانچی موجود رہے تھے لیکن ایک بھی گولی نہیں چلی تھی۔ الماجد بولا۔ "شاہ جہاں صاحب! کہیں یہ فیصلہ کن حملے سے پہلے کی خاموشی تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔ "صحرا میں مار دھاڑ کرنا تم لوگوں کے لئے ایک معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم پیش گوئی کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہو۔"

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر خواب ناک سے لہجے میں بولا۔ "شاہ جہاں صاحب! آج اتنا خوش ہوں میں کہ موت چیونٹی سے بھی حقیر محسوس ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ وہ ساری خوشی جو آج مجھے حاصل ہے، سینے سے لگا لوں اور مر جاؤں۔"

ہم کافی دیر ٹیلوں کی اوٹ میں گھومتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ شاری نے جو ڈیوٹیاں تقسیم کی تھیں ان کے مطابق اب مجھے خندق میں سات گھنٹے کی ڈیوٹی دینا تھی۔ میں خندق میں اترنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ مستقیم بھاگا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ مشرق کی طرف ٹیلوں کے پیچھے گرد و غبار نظر آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے کچھ لوگ خندقوں کی طرف آ رہے ہیں۔

میں اور الماجد بھاگم بھاگ موقع پر پہنچے۔ اپنے پڑاؤ کے سب سے اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہم نے دیکھا گرد و غبار واقعی نظر آ رہا تھا۔ شاری بھی وہاں موجود تھی۔ اس کی آنکھوں پر وہ طاقتور ٹیلی اسکوپ تھی جو ہمیں "مال غنیمت" میں سے ملی تھی۔ شاری کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز

نکلی۔ "تو آخر وہ پہنچ گئے۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"ان حرامزادوں کے ساتھی۔" وہ غرائی۔

میں نے شاری سے ٹیلی اسکوپ لے کر اپنی آنکھوں سے لگائی۔ گرد و غبار کے اندر کئی شتر سوار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک جیپ بھی تھی۔ شتر سواروں کے لباس اور حلیے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ یاسر وغیرہ کے ساتھی ہیں۔۔۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر یہ لوگ خندقوں تک پہنچ گئے۔ آنے والوں کی تعداد کا درست اندازہ تو ہم نہیں لگا سکتے تھے۔ بہرحال یہ قیاس تھا کہ ان کی نفری پندرہ اور پچیس کے درمیان ہے۔ ان کے پہنچتے ہی ہمارے مخالفین میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے ہوا میں فائرنگ کی تھی اور غالباً نعرے وغیرہ بھی بلند کیے تھے۔

صورت حال ہمارے حق میں مخدوش ہو گئی تھی۔ ہمیں مخالفین کی طرف سے پہلے ہی فیصلہ کن حملے کا خطرہ تھا اب یہ خطرہ مزید بڑھ گیا تھا۔ بہرحال مجھے شاری اور اس کے ساتھیوں کی ہمت کی داد دینی پڑ رہی تھی۔ سنگین صورت حال کے باوجود وہ مطمئن اور پرسکون نظر آتے تھے۔ فتح و شکست اور زندگی و موت کے لئے وہ پوری طرح تیار تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جوں جوں خطرہ بڑھ رہا ہے ان کے جوش و خروش میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

شاری بڑی گہری نظروں سے اپنی پوزیشنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے فوری طور پر نئی صف بندی کی۔ تمام رائفل مینوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ فالتو میگزین بھر لیں اور متوقع حملے کے لئے تیار ہو جائیں۔ میں خیمے میں پہنچا تو غزالہ کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے خطرے کی شدت محسوس کر لی تھی۔ ڈبڈبائی نگاہوں سے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ "اپنا خیال رکھیے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا' لیکن یہ بات اتنی ضروری ہے کہ مجھے پھر کہنا پڑ رہی ہے۔۔۔ دیکھو اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم شاری پر مکمل اعتبار کر سکتی ہو' اور اگر شاری بھی نہ ہو تو پھر الماجد اور مستقیم ہیں۔۔۔ یہ مہمان نواز لوگ ہیں اور مہمان کی جان و آبرو کے لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ سب کچھ ہے جو ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں پناہ دی اور اس پناہ کا بھرم رکھنے کے لئے وہ سروں پر کفن باندھے ہوئے ہیں۔"

وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔ "آپ کو یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اگر آپ کو۔۔۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ رہنے کے بجائے تو مرنا پسند کروں گی۔"

غزالہ کے یہ الفاظ بے پناہ اپنائیت لئے ہوئے تھے۔ یہ الفاظ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مسز غزالہ عاصم نہیں بلکہ چند برس پہلے کی غزالہ جلیس میرے سامنے کھڑی ہے۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل آیا۔

خندق میں بیٹھ کر میں نے دیکھا کہ مخالفین کی طرف کافی ہلچل نظر آ رہی ہے۔ پچاس ساٹھ گز دور ایک جیپ آن کھڑی ہوئی تھی' اس جیپ کی اوٹ سے کئی رائفلیں جھانک رہی تھیں۔ ہمارے عین سامنے جو خندق تھی اس میں بھی پہلے سے زیادہ نفری نظر آ رہی تھی۔ ہماری عقبی جانب بھی دباؤ بڑھا دیا گیا تھا۔ ٹیلوں کی آڑ لے کر حملہ آور کافی نزدیک آ گئے تھے۔ اس جانب دو تین ٹیلے ایسے تھے کہ ہم بلندی پر ہونے کے باوجود ان کی اوٹ میں لیٹے ہوئے افراد کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میری بائیں جانب مستقیم تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوش کا طوفان تھا اور ہاتھ بڑی مضبوطی سے "بی کی" کے آہنی دستے پر جمے ہوئے تھے۔

شاری اور الماجد پاس پاس بیٹھے تھے۔ آج ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا دن تھا اور آج ہی انہیں موت کی پرچھائیوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے مستقیم کے ہاتھ سے دوربین لی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ہمارا خدشہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ کمک پہنچتے ہی ہمارے مخالفین نے ہم پر بھرپور دھاوا بولنے کی تیاری کر لی تھی۔ اب کسی بھی لمحے اس ویران صحرا میں آگ اور بارود کی بارش ہو سکتی تھی۔ جس لمحے کو کئی دن سے ٹالنے کی کوشش کی جا رہی تھی وہ نہیں ٹلا تھا اور اب کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ لڑائی کو آخری وقت تک روکنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے شاری سے کہا۔ "کیوں نہ ایک بار پھر ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو نئے لوگ آئے ہیں' ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی زیادہ سمجھ بوجھ والا ہو۔"

الماجد بولا۔ "یہی بات میرے دماغ میں بھی آ رہی ہے۔ جس یاسر نامی شخص سے ہم نے بات چیت کی ہے وہ گروپ لیڈر نہیں لگتا تھا' ممکن ہے کہ گروپ لیڈر ان نئے آنے والوں میں موجود ہو۔"

"اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نئے گروپ میں ہمیں شنکر بھی مل جائے۔" میں نے کہا۔ "شنکر کو دیکھ کر ہمیں کم از کم یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ ہم کن لوگوں سے برسرپیکار ہیں۔"

الماجد تفہیمی انداز میں سر ہلا رہا تھا' لیکن شاری کے

چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ اس کی نظریں دور اس جیپ پر جمی ہوئی تھیں جو سرکتی ہوئی اب کچھ اور آگے آ گئی تھی۔ انجن کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جیپ کے پیچھے دبکے ہوئے افراد اسے دھکیل کر آگے لا رہے ہیں۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ شاری نے کہا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ اب یہ لوگ ہمیں مزید وقت دیں گے' میرا خیال ہے کہ بات چیت کا وقت گزر چکا ہے۔"

معاً میری نگاہ ٹیلی اسکوپ میں سے ایک شخص پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ میں نے شیخ عاصم کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر ایک جیپ کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ وہ سو فیصد شیخ عاصم تھا۔ اسی دوران میں ہمارے مخالفین کی طرف سے پہلا فائر ہو گیا۔ مستقیم کے ایک ساتھی نے اس فائر کا جواب دینے کے لئے رائفل کا دستہ کندھے سے لگایا۔ "رک جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے لپک کر اس کی رائفل کی نال نیچے جھکا دی۔ "کوئی فائر نہیں کرے گا۔ الماجد! انہیں سمجھا دو کہ کوئی فائر نہیں کرے گا۔" میں نے ایک بار پھر چلا کر کہا۔

الماجد اور شاری حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" شاری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں نے پہچان لیا ہے کہ یہ لوگ کون ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "اب تک جو ہوا ہے' غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"کیسی غلط فہمی؟" الماجد نے پوچھا۔

"میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اپنی سفید قمیص میں نے پھرتی سے اتاری اور اسے درخت کی ایک شاخ پر رکھ کر سفید جھنڈا بنا لیا۔ پہلے میں نے یہ جھنڈا خندق کے اندر سے لہرایا' پھر باہر نکل آیا۔

"کیا کرتے ہو شاہ جہاں۔" شاری چلائی۔ "وہ گھٹنے گولی چلا دیں گے۔"

"تم خطرناک کام کر رہے ہو۔" الماجد نے کانپتی آواز میں شاری کی تائید کی۔

مستقیم نے شاری کے اشارے پر مجھے واپس خندق میں کھینچنا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک نہایت خطرناک کام کر رہا ہوں لیکن ہم خونریز لڑائی کے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ تاخیر کی گنجائش نہیں تھی' مجھے ہر صورت میں یہ رسک لینا ہی تھا۔ سفید جھنڈا لہراتا ہوا میں ٹیلے کی بلندی سے نیچے اترا۔ دھوپ کی بے رحم تمازت میں اپنے عریاں جسم پر محسوس کر رہا تھا' اور اس دھوپ سے بڑھ کر ان بے رحم نگاہوں کی تمازت تھی جو خندق کے اندر سے اور جیپ کے پیچھے سے مجھے گھور رہی تھیں۔ سیاہ رائفلوں کے پیچھے رائفل برداروں کے چہرے جھلک دکھا رہے تھے۔ یقیناً ان رائفل برداروں کی انگلیاں ٹریگرز پر تھیں۔ ان میں سے کسی کی انگلی کا ہلکا سا دباؤ میری زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا۔ انگلی کی صرف ایک جنبش میرے بدن میں درجن بھر سوراخوں کا سبب بن سکتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس موقع پر اگر میں نے ذرا سی کمزوری دکھائی تو فائرنگ کا آغاز ہو جائے گا' اور اگر ایک بار یہ فائرنگ شروع ہو جاتی تو پھر اسے روکنا ممکن نہیں تھا۔ شاید آخری گولی اور آخری آدمی تک دونوں فریق یہ لڑائی جاری رکھتے۔

خندق سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر میں ٹھہر گیا۔ جیپ سے میرا فاصلہ بھی تقریباً پچاس ساٹھ گز ہی تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ "شیخ عاصم۔۔۔ یہ میں ہوں شاہ جہاں۔"

دو سیکنڈ بعد مجھے جیپ کے عقب سے شیخ عاصم کی صورت نظر آئی۔ وہ بے پناہ حیرت سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھنڈا لہرایا اور ساتھ میں اپنا بایاں ہاتھ بھی لہرایا۔ شیخ عاصم نے مجھے پہچان لیا۔ وہ دوڑ کر چند قدم آگے آ گیا پھر اچانک ٹھہر گیا۔ شاید اسے خدشہ لاحق ہوا تھا کہ مخالف سمت سے کہیں کوئی گولی نہ چلا دے۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ "عاصم! اپنے ساتھیوں کو ہدایت کرو کہ گولی مت چلائیں۔ ادھر سے بھی کوئی فائر نہیں کرے گا۔"

عاصم کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچی لیکن اس کے انداز سے پتا چلا کہ وہ اپنے قریب کھڑے یاسر کو کچھ سمجھا رہا ہے۔

یاسر سے بات کرنے کے بعد عاصم میری طرف بڑھا۔ میں نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کے قریب چلا آیا۔ عاصم نے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا' اس کے چہرے پر ہیجان کے تاثرات تھے۔ بیماری نے اسے کافی کمزور کر رکھا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے عاصم۔ تمہیں معلوم نہیں ہم تمہارے لئے کس قدر پریشان رہے ہیں۔"

"مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے۔۔۔" عاصم نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ایک لمحہ توقف کرکے بولا۔ "غزالہ تو ٹھیک ہے نا؟"

مجھے ایک دم جھٹکا سا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اچانک

میرے اور غزالہ کے درمیان ایک بلند دیوار حائل ہو گئی ہے۔ وہ جو پچھلے دنوں میں میرے کچھ قریب آئی تھی' ایک دم پھر لامتناہی فاصلوں پر چلی گئی تھی لیکن یہ دوری تو ایک ٹھوس حقیقت تھی اور عاصم کی صورت میں میرے سامنے کھڑی تھی' میں اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

"کہاں کھو گئے۔" عاصم نے تیزی سے پوچھا۔ "غزالہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بھی یہیں موجود ہے' اسی میدان جنگ میں۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا۔ کیسے شروع ہوئی یہ ساری مارا ماری۔" عاصم کے لہجے میں شدید تعجب تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ باتیں یہاں کھڑے ہو کر کرنے کی نہیں ہیں۔ ان کے لئے مکمل سکون اور اطمینان چاہیے۔ جب کہ یہاں انگلیاں لبلبی پر رکھی ہیں۔"

"تو چلو آؤ' بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"اس ٹیلے کے پیچھے خیمے لگے ہیں۔ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔" عاصم نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ تمہارے ساتھی اچانک حملہ کر دیں۔"

"بظاہر تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔" عاصم نے کہا۔

"یہ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔ دونوں طرف کے کئی افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ دونوں طرف غم و غصہ بھی عروج پر ہے۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے آدمی تمہارے قابو میں ہیں۔"

"قابو میں ہیں تو کہہ رہا ہوں کہ فائرنگ نہیں ہو گی پھر بھی اگر تمہیں خدشہ ہے تو میں دوبارہ سختی سے ہدایت کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم انہیں ہدایت کرو' میں بھی واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو فائرنگ بند رکھنے کی تاکید کرتا ہوں۔"

شیخ عاصم اپنے پڑاؤ کی طرف چلا گیا' میں اپنے پڑاؤ کی طرف آ گیا۔ قریباً پانچ منٹ بعد ہم پھر جلی ہوئی جیپ کے ڈھانچے کے پاس ملے۔ عاصم مجھے لے کر اپنے پڑاؤ میں آ گیا۔ یہاں کم و بیش دس خیمے استادہ تھے۔ سواری کے جانور ان خیموں کے عقب میں باندھے گئے تھے۔ خیموں کے آس پاس بہت سا سامان بکھرا ہوا تھا۔ یقیناً یہ نئے آنے والوں کا سامان تھا۔ یہاں مجھے مجیم شیخ کا سر بھی نظر آیا۔ وہ مجھے معاندانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہم ایک کشادہ خیمے میں داخل ہو گئے۔ کمر کی تکلیف کے باعث عاصم جھک کر چل رہا تھا۔ میٹریل سے بنا ہوا یہ خیمہ اندر سے کافی ٹھنڈا تھا۔ روزمرہ ضروریات کے دیگر سامان کے علاوہ چھوٹا سا وائر بھی موجود تھا۔ میں اور عاصم ایک دری پر قریب قریب گئے اور باتیں کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے لئے ہمارے پاس بے شمار سوالات تھے۔ سوال کرنے میں پہل شیخ عاصم نے ہی کی۔ وہ بولا۔ "میں تم سے زیادہ بے صبری محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تم بتاؤ کہ میرے بعد کیا ہوا اور تم اب تک کہاں تھے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں نے بندر کو مار ڈالا تھا جو تم پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کے فوراً بعد مسلح بدوؤں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا تھا۔"

"ہاں یہ واقعہ میں کیسے بھول سکتا ہوں۔" عاصم نے کہا۔ "اگر تم بروقت گولی نہ چلاتے تو وہ خونی جانور یقیناً میری گردن ادھیڑ دیتا۔ اس کے لئے مجھے تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بندر کی ہلاکت کے بعد بدوؤں نے ہم پر جال پھینک کر مجھے پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھے اور غزالہ کو بیچ سمیت اپنی بستی میں لے گئے۔ یہ بستی یہاں سے قریباً ایک دن کی مسافت پر مغرب کی جانب واقع ہے۔ پورا ایک قبیلہ اس بستی میں آباد ہے۔ قبیلے کا سردار عرصہ چار پانچ سال سے علالت پر ہے۔ اس کی جواں سال بیٹی شاری قبیلے کی سربراہی کرتی ہے۔ جو بندر ہلاک ہوا تھا وہ شاری کا ہی تھا۔ وہ شراب پی کر بھاگ نکلا تھا۔ شاری کے کارندے اس کے تعاقب میں تھے۔ شاری ایک نہایت تو کھی اور جنگجو لڑکی ہے۔ اب بھی میرے ساتھ موجود ہے۔ ممکن ہے کہ آج ہی کسی وقت تمہارے ساتھ اس کی ملاقات ہو جائے۔ میں اور غزالہ ابھی تک شاری ہی کی تحویل میں رہے ہیں۔ شروع میں ان لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ غیریت کا تھا' مگر پھر ایک دو واقعات ایسے ہوئے کہ یہ رویہ اپنائیت میں بدل گیا اور ہمیں بستی میں باقاعدہ مہمان کی حیثیت دے دی گئی۔"

"کیسے واقعات؟" عاصم نے پوچھا۔

"حیران کن واقعات۔ کم از کم میرے لئے تو یہ حیران کن تھے' شاید تمہارے لئے بھی انکشاف انگیز ثابت ہوں۔۔۔ شنکر شکرا اور عشارب کے ساتھی ایک بڑے گروپ کی صورت میں ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔"

عاصم کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ میں۔

سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ واقعہ بستی میں ہمارے قیام کے پچھلے ساتویں روز پیش آیا تھا۔ اس گروپ میں شنکر کے علاوہ عشارب کا بہنوئی شیخ سالم بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بستی والوں کو بتایا کہ میں اور غزالہ ان کے مجرم ہیں لہٰذا ہمیں ان کے حوالے کردیا جائے۔ شاری چونکہ میرا بہت احترام کرنے لگی تھی لہٰذا اس نے انکار کردیا۔ طے یہ ہوا کہ شنکر اور شیخ سالم وغیرہ ہمیں بستی میں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہاں کھلے صحرا میں اگر وہ ہمارا پیچھا کرکے ہمیں ڈھونڈ سکیں تو ڈھونڈ لیں۔ ہمیں ایک روز صبح سویرے بستی سے روانہ کردیا گیا۔ شرائط کے مطابق شنکر اور شیخ سالم کو اپنے ساتھیوں سمیت کم از کم آٹھ پہر تک بستی میں ہی رکنا تھا..... لیکن یہاں بھی شنکر نے اپنی روایتی کمینگی اور عیاری کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ بڑی خاموشی سے ہمارے پیچھے روانہ ہوگیا۔"

شیخ عاصم بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک سب کچھ اس کے گوش گزار دیا۔ شنکر کی بدعہدی سے لے کر بستی میں ہماری واپسی تک اور "مبارزت" کی خونی لڑائی سے لے کر بارہ امیرزادوں کی سزائے موت تک سب کچھ عاصم کو بتادیا۔ وہ بھونچکا سنتا رہا۔ آخر میں میں نے اسے بتایا کہ کس طرح زخمی شنکر بستی کے شفا خانے سے فرار ہوا اور کس طرح بستی کے لوگ قریباً ایک ماہ تک "بیرونی حملے" کے شدید خطرے میں گھرے رہے۔

میری روداد کے دوران میں شیخ عاصم کا چہرہ کئی رنگ بدلتا رہا تھا۔ میں نے یہ روداد ختم کرتے ہوئے کہا۔ "قریباً دو ہفتے پہلے میں نے شاری پر زور دے کر کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے واپس جانے کی اجازت دے دے۔ میرے پیہم اصرار کو دیکھتے ہوئے وہ بالآخر رضامند ہوگئی۔ پانچ دن پہلے جب ہم روانہ ہوئے تو بستی کا ایک نوجوان الماجد بھی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔ ہمیں آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر بستی سے روانہ کیا گیا۔ ایک مسلح دستہ ہمیں بحفاظت صحرا سے نکالنے کے لئے ہمارے ساتھ تھا۔ ایک دن کی مسافت کے بعد ہم نے یہاں پڑاؤ کیا۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں ہماری مڈھ بھیڑ مسلح افراد سے ہوجائے گی اور ہمیں اپنے دفاع کے لئے یوں مورچا زن ہونا پڑ جائے گا۔ شروع میں ہمارا خیال یہی تھا کہ ہمارا راستہ روکنے والوں کا تعلق شنکر شکرا سے ہے لیکن جب شنکر شکرا کی صورت نظر نہ آئی تو ہم تذبذب میں پڑ گئے۔ ان لوگوں سے بہت پوچھا لیکن انہوں نے کچھ بھی بتانے سے انکار کیا۔ تمہارے یاسر او سے ضرور اتنا معلوم ہوا کہ یہ لوگ دو گروپس کی شکل اور ایک گروپ ابھی پیچھے آرہا ہے۔ اپنی طرف نے بہت کوشش کی تھی کہ یہاں گولی نہ چلے لیکن تی ہے ہونی ہو کر رہتی ہے۔ بہرحال ببل یاسر اور ا ساتھیوں کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ ایک بار یہ سلسلہ نکلا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ ہمارے تین آدمی ہلاک ہیں جبکہ دو شدید زخمی ہیں۔ اس طرف بھی کئی ہلاک ہیں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ابھی تھوڑی دیر زبردست تصادم ہونے والا تھا۔ اچانک ٹیلی اسکوپ میری نگاہ تم پر پڑی اور میں نے سفید جھنڈا لہرا دیا۔"

میری تمام بات سننے کے بعد عاصم نے ایک گہری لی اور اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔ سکا کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم میرے بارے چاہتے ہوگے۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تمہیں نہیں کہ غزالہ اور میں کتنا پریشان رہے ہیں تمہارے میں۔ میری درخواست پر شاری نے دس پندرہ افراد سنری تلاش پر لگا رکھے تھے۔ قریباً ہر روز ہی میں شا اس بارے میں پوچھتا تھا بلکہ جب بھی ملاقات ہو شاری سے میرا پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ عاصم کا نہیں۔"

"کیا واقعی؟" عاصم نے عجیب سے انداز میں کہ "میں جانتا ہوں تمہیں آسانی سے یقین نہیں لیکن حقیقت کو نہ مانا جائے تو وہ جھوٹ نہیں بن جاتی عاصم نے کہا۔ "بے شک مجھے بھی احساس تمہیں سخت پریشان چھوڑ آیا ہوں اور سخت مصی بھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد واپ پہنچوں اور تمہیں اس زہریلے صحرا سے نکالوں اس میں تاخیر بھی ہوئی۔ بہرحال میری روداد کچھ ز نہیں ہے۔ تمہیں یاد ہی ہوگا جب اس منحوس بندر تنہ کیا تو پسٹل میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ میں دور کھڑا تھا لہٰذا جب بدوؤں نے تمہیں گھیرے میں اندازہ ہوا کہ میرے پاس بھاگ نکلنے کا موقع ہے شدید الجھن میں تھا۔ تم دونوں کو سخت مصیبت میں نکل جانا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا پھر میں نے رہ کر بھی میں تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ اگر پس ہاتھ میں ہوتا تو بھی کوئی بات تھی۔ میں خاموشی

گیا۔ ابھی میں چالیس پچاس قدم دور ہی آیا تھا کہ بدو نمودار ہوا اور اس نے مجھے رائفل کے نشانے پر یا۔ میں نے ہاتھ کھڑے کردیئے۔ میرا خیال تھا کہ مسلح بدو واپس تم لوگوں کے پاس لے آئے گا لیکن پھر مجھے ہوا کہ میرا قیاس غلط ہے۔ بدو کی آنکھوں میں لالچ کی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے ہاتھوں کی قیمتی انگوٹھیوں پر وئی تھیں۔ اس نے مجھے انگوٹھیاں اتارنے کا حکم دیا۔ خطرے کا شدید احساس ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی انگوٹھیاں وغیرہ اتروا کر یہ شخص مجھے گولی مار دے گا اور اپنے ساتھیوں کو بتائے گا کہ اس نے مجھے فرار ہونے سے روکنے کے لئے گولی چلائی تھی۔ میں نے بدو پر جھپٹ پڑنے کا کرلیا۔ انگوٹھیاں اتار کر میں نے اس کی طرف دیں۔ اس نے کہا۔ "میری طرف پھینک دو" لیکن پھر اس سے کہ تاریکی میں انگوٹھیاں ڈھونڈنا مشکل ہوگا' اس آگے بڑھ کر انگوٹھیاں میرے ہاتھ سے لینا چاہیں' میں دم اس پر جھپٹ پڑا۔ رائفل کی نال میں نے جھکا دی تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اس پر قابو پانے میں ب ہوگیا۔ نیچے گری ہوئی رائفل میں نے اٹھائی اور کے سر سے لگا دی۔ بعد ازاں میں نے رائفل کے دستے اس کے سر پر دو تین بھرپور ضربیں لگائیں اور اسے بے کردیا۔

بے ہوش بدو کو اسی کے اونٹ پر لاد کر میں دو تین میل لے گیا۔ یہاں صحرائی جھاڑیوں کے درمیان مجھے ایک سی نظر آئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ بدو کا قد کاٹھ میرے بہ سا ہے۔ بدو کا لباس میرے بہت کام آسکتا تھا۔ میں نے کا لباس اتار کر پہن لیا اور عمامہ سر پر اوڑھ کر نقاب کی چہرے پر لپیٹ لیا۔ شدید ضربوں کی وجہ سے بدو راہی ہوچکا تھا۔ میں نے اس کی لاش اپنے کپڑوں سمیت کھوہ ریت میں دفن کردی اور اس کا اونٹ لے کر مشرق جانب روانہ ہوگیا۔ راستے میں دو تین جگہ مجھے شتر سوار اور گھڑ ملے۔ یہ وہی لوگ تھے جو میری تلاش میں چکرا رہے ایک گھڑ سوار نے مجھے روکا بھی۔ اس نے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں جارہا ہوں۔ میں چونکہ خود قبائلی ہوں مقامی لہجے میں عربی بول سکتا ہوں۔ میں نے گھڑ سوار کو تسلی بخش جواب دیا اور وہ مطمئن ہوکر آگے بڑھ گیا۔

کو میں رات کے وقت میں "جوہان" نامی بستی میں بستی سے باہر ہی ایک نخلستان میں سعد نامی ایک کسان میری ملاقات ہوگئی۔ میں نے اس کی جھونپڑی میں تھوڑی دیر آرام کیا۔ اپنی ایک قیمتی انگوٹھی کے عوض میں نے سعد سے ایک سرخ اونٹنی حاصل کی۔ اس کے علاوہ وافر مقدار میں پانی اور راشن وغیرہ بھی لے لیا۔ صبح سویرے میں "جوہان" سے روانہ ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ صحرا سے نکلنے کے لئے مجھے ایک کٹھن سفر کی مشکلات سہنا ہوں گی۔ اپنے سفر کے دوسرے روز میں راستے سے بھٹک گیا اور میرے تین دن ضائع ہوگئے۔ تاہم راستہ مل جانے پر میں نے بڑی احتیاط سے سفر دوبارہ شروع کردیا۔ ایک روز رات کو جب میں خیمے میں آرام کررہا تھا' ایک تیز چبھن سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بچھو یا کسی دوسرے زہریلے کیڑے نے کاٹ کھایا تھا۔"

عاصم نے اپنی پتلون کا پائنچہ اٹھا کر مجھے پنڈلی دکھائی۔ ایک جگہ بوٹ پالش کی ڈبیا کے قطر کا نیلگوں نشان تھا۔ اس نشان کے اردگرد جلد پر جھریاں سی پڑ گئی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ نشان تین چار ہفتے پرانا ہے۔ عاصم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شام تک مجھے تیز بخار ہوگیا۔ خوش قسمتی سے اسی روز میں ایک چھوٹی سی صحرائی بستی "سوق حامد" پہنچ گیا۔ بستی میں اترتے اترتے میں نیم بے ہوش ہوچکا تھا۔ اگلے پندرہ بیس دن میرے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھے۔ بس کبھی کبھی آنکھ کھلتی تھی' غنودگی کی حالت میں مجھے اپنے آس پاس چند چہرے نظر آتے تھے' تب ایک بار پھر میں اندھیروں میں ڈوب جاتا تھا۔ دو تین ہفتوں بعد میری طبیعت کچھ سنبھلی اور میں اپنے حالات کے بارے میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا' بہرحال اتنی سکت مجھ میں اب بھی نہ تھی کہ بات کرسکتا یا ازخود اٹھ کر بیٹھ سکتا' یا کروٹ بدل سکتا..... دس پندرہ روز بعد جب مجھے اپنی حالت کچھ بہتر محسوس ہوئی تو میں نے سفر دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس گھرانے نے میری تیمارداری کی تھی وہ مجھے سفر کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن میرا دھیان ہر گھڑی تمہاری اور غزالہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ بہ مشکل میں نے ان لوگوں سے اجازت لی اور روانہ ہوگیا۔ باقی سفر کی روداد بھی خاصی طویل اور دردناک ہے بہرحال میں اپنے سفر کے پانچویں روز صحرا سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ابو ظہبی میں میری گمشدگی کا چرچا تھا۔ یہاں مجھے کئی ایک مسائل کا سامنا کرنا پڑا' جن میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے فیملی ڈاکٹر سے چیک اپ کرا بیٹھا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے جسم میں زہریلے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے زبردستی کلینک میں داخل کرکے پورا ایک ہفتہ زیرِ علاج رکھا۔

بہرحال اپنے ان مسائل کو جھٹک کر میں جلد از جلد

واپس یہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً ایک پارٹی تیار کی۔ چند ایسے افراد کی خدمات حاصل کی گئیں جو صحرا میں مہمات سر کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یاسر بھی ان میں سے ایک ہے۔ صحرا میں سفر کے لئے چار خصوصی جیپوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کے لئے لائسنس یافتہ اسلحے کا انتظام بھی کیا گیا۔ یہ ساری کارروائی بڑی رازداری سے کی گئی۔ ابوظہبی میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی کہ میں واپس آ چکا ہوں اور ابوظہبی میں موجود ہوں۔ یہ رازداری عشارب اور اس کے کارندوں کی وجہ سے برتی گئی۔ پچھلے ہفتے ہم ابوظہبی سے روانہ ہوگئے۔ صحرا میں ایک دن تک ہم نے اکٹھے سفر کیا' پھر پروگرام کے مطابق ہم دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروپ کی قیادت یاسر کے پاس تھی۔ دوسرا گروپ میرے ساتھ تھا۔ ہمیں دو مختلف راستوں پر سفر کرتے ہوئے "سوق حامد" نام کی صحرائی بستی میں ملنا تھا۔ دراصل میں اسی مقام کا درست اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جہاں مسلح بدوؤں سے ہماری مڈھ بھیڑ ہوئی تھی اور بندر والا واقعہ پیش آیا تھا' ہاں اس مقام کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں موجود تھا' میں نے یاسر وغیرہ کو تفصیل سمجھا دی تھی۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہاں کس قسم کے درخت ہیں اور زمین کی مختلف رنگت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔

لیکن یہاں یہ اپ سیٹ ہوا کہ راستے میں یاسر اور اس کے ساتھیوں کا ٹاکرا تمہارے ساتھ ہوگیا اور تم لوگ آپس میں الجھ گئے۔ ہم پروگرام سے ایک دن پہلے یعنی منگل کے روز ہی "سوق حامد" پہنچ گئے تھے۔ وہاں ہم نے دو روز تک یاسر اور اس کے ساتھیوں کا انتظار کیا۔ آخر پریشان ہوکر ان کی تلاش میں نکلے۔ ہمارے پاس چھوٹی رینج کا ایک وائرلیس سیٹ بھی موجود تھا۔ آج صبح سویرے اس وائرلیس سیٹ پر ہمیں سگنل موصول ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ یاسر جنوب کے رخ پر ڈھائی تین میل دور موجود ہے' ہم یہاں پہنچ گئے۔"

عاصم کی روداد ختم ہوئی تو ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی واقعات کی کڑیاں جوڑ رہے تھے۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ عاصم نے کتنا سچ بولا ہے اور کتنا جھوٹ مگر اس کی پنڈلی پر نیلگوں نشان اور اس کی قدرے گری ہوئی صحت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ روز بیمار رہا ہے پھر بھی واپس آنے میں اس نے غیر ضروری تاخیر کی تھی۔ نہ جانے کیوں "نہ چاہنے" کے باوجود مجھے اس کی سری لنکا والی بے حسی یاد آ رہی تھی۔ اس وقت وہ غزالہ کو شدید بیماری کی حالت میں چھوڑ کر اتارات چلا گیا تھا اور سیر و شکار میں مصروف رہا تھا۔

حالات کتنے غیر متوقع ثابت ہوئے تھے۔ یاسر کے ساتھیوں کو دیکھ کر ہمیں ننانوے فیصد یقین ہو گیا کہ شنکر شکیا کمک لے کر واپس آگیا ہے مگر یہ بالکل دوسرا نکلا تھا۔ ہم شیخ عاصم کو قریباً بھلا بیٹھے تھے لیکن وہ نمودار ہوگیا تھا۔

"میں غزالہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" عاصم کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

خبر نہیں کیوں دل پر چوٹ سی لگی۔ "کیا سو رہی ہو؟" عاصم نے پوچھا۔

"جہاں اتنی دیر انتظار کیا ہے تھوڑا اور کرلو۔ ہوں کہ پہلے دونوں طرف کے مورچابند افراد کو پیچھے ہٹا لیا جائے' یہ نہ ہو کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے بھڑک اٹھے۔"

شیخ عاصم بولا۔ "میں اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دیتا ہوں کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ اصل مسئلہ تمہارا ہے۔ لوگ بڑے خود دماغ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لئے پیچھے ہٹنے سے انکار کردیں۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں انہیں سمجھا لوں گا۔ بندے تو دونوں طرف مارے گئے ہیں۔"

میں واپس اپنے پڑاؤ میں پہنچا۔ میں نے ابھی تک اصل بات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ الماجد' شاری' سب مضطرب تھے۔ میں نے انہیں خوشخبری سنائی۔ کہا۔ "محاصرہ ختم ہوگیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" شاری نے چیخ کر پوچھا۔

"ان مسلح افراد کا تعلق شنکر شکیا سے نہیں بلکہ عاصم اور اس کے ساتھی ہیں' میرا ابھی شیخ عاصم سے مل کر آرہا ہوں۔"

میرے منہ سے "شیخ عاصم" کا نام غزالہ نے سن لیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ رنگ میں حیرت کے ساتھ اطمینان بھی تھا پھر یہ اطمینان... خوشی میں ڈھل گئے۔ مجھے غزالہ کی طرف دیکھتے رہنا دشوار محسوس ہوا۔ میں نے اپنی نگاہ پر مرکوز کردی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کہاں ہے شیخ؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔"

"میں ابھی تمہیں اس سے ملواؤں گا۔"

"اوہ خدایا۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور بچے کو کندھے سے لگا کر ریت کے ڈھیر پر بیٹھ گئی۔ بچہ

...ہے وہ جس شدید تناؤ کا شکار تھی وہ ایک دم ختم ہوگیا ...یہی کیفیت الماجد اور مستقیم وغیرہ کی بھی تھی۔ ...وں نے دیکھ لیا تھا کہ مخالفین اپنی خندقیں چھوڑ کر پیچھے ...ے رہے ہیں۔ میرے اشارے پر مستقیم نے بھی اپنے تمام ...تھیوں کو ہدایت کردی کہ وہ خندقوں سے پیچھے ہٹ جائیں۔ ...وں نے مستقیم اور شاری کے حکم کی تعمیل کی۔ حالانکہ ان ...چہروں سے ناگواری ظاہر ہورہی تھی' پتا نہیں کس مٹی ...بنے ہوئے تھے وہ۔ دیکھ بھی رہے تھے کہ مخالفین کی ...ادبہت زیادہ ہے اور وہ انہیں روند سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ...نے مرنے میں لذت محسوس کررہے تھے۔

غزالہ جھجکتی ہوئی سی میرے قریب چلی آئی۔ بچہ اس ...گود میں تھا۔ آہستہ سے بولی۔ "کہاں ہیں عاصم؟"

"بس تھوڑا سا انتظار اور۔" میں نے کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ شاید میرے الفاظ میں طنز کا ...تلاش کررہی تھی لیکن طنز وہاں نہیں تھا۔ کرب کی ایک ...ی تھی۔ ممکن ہے اس نے محسوس کی ہو' ممکن ہے نہ کی ...شاری مکمل صورت حال جاننے کے لئے بے تاب تھی۔ اسے خیمے میں لے آیا اور مختصر الفاظ میں اسے ضروری ...باتوں سے آگاہ کردیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوئی کہ شیخ عاصم ...بدو کا لباس پہن کر اور اسی کی سواری پر فرار ہوا تھا۔ ...ی نے عاصم کے بارے میں کئی سوالات کئے جس کے میں ...تسلی بخش جواب دیئے اور اسے بتایا کہ وہ ہمارے ساتھ ...دی نہیں کرے گا۔

شاری نے کہا۔ "میں پھر بھی اندیشہ محسوس کررہی ...ہوں۔ لڑائی میں ہمارے تین افراد ہلاک ہوئے ہیں جبکہ ...رے گننے کے مطابق دوسری طرف چھ کے قریب بندے ...ے گئے ہیں۔"

"دو طرفہ لڑائی میں یہ سب کچھ تو چلتا ہے' باقی اگر تم ...تعداد ہی پوری کرنی ہے تو پھر تم اس بندے کی ہلاکت بھی ...حساب میں شامل کرلو جو فرار کے وقت شیخ عاصم کے ...ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کے علاوہ تم اپنے پالتو سوبالو کا خوں بہا ...طلب کرسکتی ہو۔ یوں دونوں طرف کی ہلاکتوں میں تھوڑا ...توازن ہو جائے گا۔"

شاری' شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی جنگی طاقت ...پریشان نظر آتی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے ...مطمئن کرلیا۔ دونوں طرف سے فائر بند ہو چکا تھا اور ...تعلق ...بھی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ میں غزالہ اور بچے کو لے کر شیخ ...کے پڑاؤ میں آگیا۔ ہم اس خیمے میں داخل ہوئے جو شیخ

عاصم کے لئے مخصوص تھا۔ شیخ عاصم بے چینی سے ٹہل رہا تھا' غزالہ کو دیکھتے ہی وہ بے تابانہ اس کی طرف بڑھا اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کا منہ چوم لیا۔ میں الٹے قدموں خیمے سے باہر آگیا۔ ان دونوں کے ملاپ کا منظر کسی زہریلے تیر کی طرح میری نگاہوں میں کھب گیا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے عاصم کے ہونٹ دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں جنہوں نے غزالہ کے ہونٹوں کے ساتھ میرے دل کو بھی جھلسا ڈالا ہے' لیکن شاید میں غلط سوچ رہا تھا' غزالہ کے ہونٹ نہیں صرف میرا دل جھلسا تھا' شاید عاصم جان بوجھ کر ایسے کام کرتا تھا جن سے میری نگاہ اور میرے ذہن کو اذیت پہنچے۔ وہ کوئی ناوان لڑکا نہیں تھا۔ بے شک غزالہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اسے ہزار دفعہ بانہوں میں لے سکتا تھا اور چوم سکتا تھا لیکن اس کے لئے وہ میرے باہر نکلنے کا انتظار کر سکتا تھا۔ وہ تو جیسے پہلے سے ہی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ابھی بمشکل ہم نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ اس نے غزالہ کو تھام لیا تھا۔ مجھے سری لنکا کے مناظر یاد آ گئے۔ غزالہ کے ساتھ اپنے ہنی مون کے دوران میں وہ جان بوجھ کر میری نگاہ کی اذیت کا سامان کرتا تھا۔ کبھی وہ مجھے چائے لانے کا آرڈر دیتا تھا اور جب میں چائے لے کر کمرے میں پہنچتا تھا تو اسے غزالہ کے ساتھ مصروف پاتا تھا' کبھی پائیں باغ میں ٹہلتے ٹہلتے عاصم کی نگاہ اچانک مجھ پر پڑ جاتی تھی اور وہ غزالہ کو اپنے "قریب تر" کرلیتا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ سری لنکا لے کر ہی اس لئے گیا تھا کہ ہر ہر پل مجھے میری بربادِ محبت کا تماشا دکھائے اور روز و شب میرے زخموں کو کھرچ کھرچ کر خون آلود کرتا رہے۔ کون شوہر نوبیاہتا بیوی کے ساتھ اپنی تنہائی کے لمحوں کو یوں آشکار کرنا چاہتا ہے۔ وہی کرتا ہے جو بیوی کو بیوی نہ سمجھتا ہو' جس کے لئے یہ مقدس رشتہ دستِ انتقام کا کھلونا ہو یا کوئی وقتی ضرورت ہو اور شیخ عاصم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ یہ میں ہی سخت جان تھا کہ یہ سب کچھ جھیل کر بھی ہوش و حواس سے محروم نہیں ہوا تھا اور زندہ بھی رہا تھا۔

چند لمحے بعد شیخ عاصم نے مجھے خیمے میں سے پکارا۔ اس کی دوسری پکار پر میں اندر گیا۔ غزالہ آنکھوں سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ شیخ عاصم گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا پھر خادم کو آواز دی۔ خادم اندر آیا تو عاصم نے مجھے اور غزالہ کو واٹر کولر سے ٹھنڈا پانی پلوایا۔ اس جہنمی صحرا میں ٹھنڈے پانی سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی تھی۔ یہ نعمت شیخ عاصم کے پاس موجود تھی۔ خبر نہیں کہ وہ اس پانی کو اب تک ٹھنڈا رکھنے میں کیونکر کامیاب

ہوئے تھے۔

شیخ عاصم نے کہا۔ "شاہ جہاں! سب سے پہلے تو میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے غزالہ کی دیکھ بھال کی اور اسے میری کمی محسوس نہیں ہونے دی۔"

"تمہارے شکریے سے اپنائیت کے بجائے بیگانگی کا اظہار ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا تم ہی بتاؤ اپنائیت کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے' تم تو ایسے معاملوں میں تجربہ کار ہو۔ لفظوں کا بہترین استعمال کر سکتے ہو۔"

عاصم کے لہجے میں چھپی ہوئی وہی طنز کی دھار تھی جو اکثر مجھے بے حال کر دیا کرتی تھی۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ غزالہ کی نگاہ عاصم کی پنڈلی پر پڑ گئی۔ وہ ننگے پاؤں تھا اور قالین پر بیٹھنے سے اس کی پتلون کا پائنچہ تھوڑا سا اوپر ہو گیا تھا۔ غزالہ نے اس کی پنڈلی کو چھوا اور بے قراری سے بولی۔ "یہاں کیا ہوا عاصم؟"

وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔ "کچھ چوٹ لگ گئی تھی۔"

"یہ چوٹ نہیں ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ تو کسی کیڑے وغیرہ نے کاٹا ہے۔"

"بیوی کا ڈاکٹر ہونا بھی ایک مصیبت ہوتا ہے۔" عاصم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم جان عذاب میں آجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بندہ چوبیس گھنٹے اسپتال میں ہے اور اگر بیوی غزالہ جیسی فکر مند ہو تو لگتا ہے کہ آئی سی یو میں ہے۔ یہ نہیں کھانا' یہ نہیں پینا' یہ پہننا ہے' یہ دیکھنا ہے' ایسے سونا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تمہیں کیا پتا ڈیئر شاہ جہاں' تم نے تو ابھی بیوی ہی نہیں دیکھی۔ "ڈاکٹر بیوی" تو دور کی بات ہے۔"

میں خاموش رہا تو عاصم نے ذرا توقف کے بعد گہری سانس لی اور غزالہ کو مختصر الفاظ میں بتانے لگا کہ اس کی پنڈلی پر یہ نیلگوں نشان کیسا ہے۔ غزالہ پریشانی کے عالم میں سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خبر نہیں کہ چپکے چپکے یہ کیسی تبدیلی آگئی تھی میرے اندر' میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ایک "عام رقیب" کے سے انداز میں سوچنے لگا تھا۔

غزالہ کے ساتھ عاصم کی گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میں بے کار بیٹھا تھا' میں نے سوچا کہ باہر جا کر حالات کا جائزہ لوں۔ میں کھڑا ہوا تو عاصم نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پڑاؤ کی طرف جا رہا ہوں۔ شاری کو بتاتا ہوں کہ تم اس سے ملاقات کرنا چاہ رہے ہو۔"

"ٹھیک ہے تم اسے لے آؤ۔" عاصم نے کہا۔

غزالہ بولی۔ "کیوں نہ ہم وہاں چلے جائیں۔ یوں اعتماد بڑھے گا۔"

"چلو ایسا کر لیتے ہیں۔" عاصم نے کہا۔

میرے ساتھ ساتھ غزالہ اور عاصم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے غزالہ کی نظر مجھ سے ملی۔ اور میرے درمیان اچانک پیدا ہو جانے والے فاصلے کو اس نے بھی محسوس کیا تھا۔

ہم خیمے سے باہر نکلے۔ اب دس گیارہ کا وقت۔ سورج آنکھیں دکھا رہا تھا اور ریت کا ہر ذرہ "الامان" ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اتنی چمک تھی دھوپ میں کہ آنکھ چندھیا رہی تھیں۔ رائفل برداروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم اپنے پڑاؤ کی طرف بڑھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب اس صحرا کے جنگل سے نکل جانے کا وقت آ رہا ہے۔ میں سب سے آگے تھا' میرے پیچھے عاصم اور میں غزالہ تھی۔ ابھی ہم جلی ہوئی جیپ کے ڈھانچے تھوڑی دور ہی تھے کہ اچانک عقب سے ایک سریلی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دو دو چکارا کی تو آئیں۔ شیخ عاصم کے پڑاؤ میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ میں اور شیخ عاصم ٹھٹک کر رک گئے پھر میری نگاہ خیموں کے درمیان ایک دراز قد شخص پر پڑی' اس کے ہاتھ میں کوئی شے تھی' وہ بڑی تیزی سے جھک کر بھاگا جا رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی مفرور شخص ہو' وہ ہم سے دس گز کی دوری سے گزرا تھا۔

"او گاڈ!" عاصم کے منہ سے نکلا۔ "پکڑو اسے" غیرارادی طور پر ہوا۔

میں نے فرار ہونے والے شخص کے پیچھے دوڑا' بھاگتے بھاگتے میں نے اپنا ماؤزر قمیص کے نیچے سے ا[illegible] تھا۔ ریت پر تیزی سے بھاگنا مشکل ہوتا ہے لیکن مجھے اس کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ برق رفتاری سے میں نے ستر میٹر کا فاصلہ طے کیا۔ مجھے بھاگنے والے کی جھلک نظ[ر آئی]۔ وہ سواری والے جانوروں کے قریب سے گزرا تھا اور ان کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں پڑاؤ کی سمت سے عاصم کے چند کارندوں نے بھاگنے والے پر فائر[نگ کی]۔ اس سے بھاگنے والے کو تو نقصان نہیں پہنچا' البتہ اونٹ زمین پر گر گیا اور تڑپنے لگا۔ دوسرا نقصان اس سے یہ ہوا کہ میں نے شاری کے پڑاؤ کی طرف اچھل

ہینا ان لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ شاید فائرنگ دوبارہ شروع ہونے والی ہے لہٰذا وہ اپنی پوزیشنوں پر آ گئے تھے۔ بھاگنے والا اونچے نیچے ٹیلوں کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں ان ٹیلوں تک پہنچا تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ہاں ہموار ریت پر اس کے قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میری انگلی ماؤزر کی لبلبی پر تھی۔ تیزی مگر احتیاط سے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے بڑے بڑے سیاہ پتھر بھی تھے اور ان کے قریب تک صحرائی گھاس موجود تھی۔ اس گھاس کی لمبائی کہیں کہیں پانچ فٹ تک تھی۔ اس گھاس کے کنارے تیز تھے اور جسم کے عریاں حصوں کو لہولہان کر دیتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مفرور انہی پتھروں اور گھاس کی اوٹ میں کہیں موجود ہے۔

میں نے ہوائی فائر کیا اور چلا کر انگلش میں کہا۔ "جہاں ہو باہر نکل آؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

جواب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں قدموں کے نشان ڈھونڈتا آگے بڑھتا گیا۔ بڑے بڑے سیاہ پتھر دھوپ میں تپے ہوئے تھے اور انہیں ہاتھ تک لگانا دشوار تھا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ مفرور ایک بڑے پتھر کے عقب میں موجود ہے۔ میں آواز پیدا کئے بغیر اس چٹان نما پتھر پر چڑھ گیا۔ احتیاط سے دوسری جانب دیکھا تو وہ مجھے پتھر کے ساتھ لگا نظر آیا۔ ایک چمکدار چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے ماؤزر کے زور پر ہینڈز اپ کرا دوں لیکن وہ اپنے لباس سے بدو نظر آتا تھا۔ جسم پر سفید قبا تھی' سر پر نسواری رنگ کی پگڑی تھی جو اس نے ڈھاٹے کی طرح باندھ رکھی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں اسے ماؤزر دکھاتا تو وہ چاقو مجھ پر کھینچ مارتا اور گولی کی پروا کئے بغیر بھاگ نکلتا۔ میں نے اپنے جسم کو تولا اور پتھر کے اوپر سے مفرور پر چھلانگ لگائی۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی آواز نکلی اور وہ اوندھے منہ میرے نیچے گرا۔ میرے جسم کا بوجھ اس کی پشت پر تھا۔ میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ کو دبوچا مگر وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا اور زور آور نکلا۔ کسی خون آشام مچھلی کی طرح اس نے میرے نیچے حرکت کی اور تڑپ کر مجھے پشت کے بل پتھر سے دے مارا۔ میری آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے تھے مگر میں نے اس پر اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ میں نے اس کی گردن اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ گردن گرفت میں آجاتی تو میں ایک لمحے میں اسے بے بس کر ڈالتا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت چند اور بڑھ گئی کہ وہ میرا یہ داؤ بھی صاف بچا گیا۔ اس کے جسم میں کسی جنگلی گھوڑے کی سی قوت تھی۔ اس نے میری ٹھوڑی پر سر کے عقبی حصے کی ضرب لگائی' جواب میں' میں نے اس کی پسلیوں میں گھٹنے کی چوٹ رسید کی۔ وہ غرایا' اور مجھے اپنے عقب سے جھٹکنے کے لئے زور لگانے لگا۔

اس کی غراہٹ' اس کی زور آوری مجھے کچھ یاد دلا رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں جنگلی گھوڑے جیسے اس سرکش جسم سے کبھی پہلے بھی زور آزمائی کر چکا ہوں۔ کبھی پہلے بھی سر کی ایسی ہی ضرب میری ٹھوڑی پر لگ چکی ہے اور کبھی پہلے بھی کوئی اسی طرح اپنی گردن میرے بازو کے شکنجے سے صاف بچا چکا ہے۔ میرا یہ جانا پہچانا حریف کون ہے... کون ہے؟ سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ ساری باتیں میرے ذہن میں سے گزر گئیں۔ ایک دم ذہن کے کمپیوٹر میں بجلی لہر تڑپی' مجھے چند موسم پہلے کا ایک ابر آلود دن یاد آگیا' میں ایسے ہی شخص سے گتھم گتھا ہوا تھا لیکن کون تھا وہ؟ وہ شکل اور وہ لمحہ میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اور میرا مدمقابل لڑتے ہوئے اب صحرا کی گرم ریت پر گر گئے تھے۔ اچانک ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ میرے مدمقابل کی آواز تھی۔

اگر صحرا پھٹ جاتا' یا آسمان ٹوٹ پڑتا' یا میرے اردگرد کے تمام سیاہ پتھر زندہ ہو کر جانداروں کی طرح بولنے لگتے تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی یہ آواز سن کر ہوئی تھی۔ میں پاکستان سے سیکڑوں میل دور اس لق و دق صحرا میں یہ آواز سننے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

یہ میرے یار صفدر کی آواز تھی' اسی نے مجھے "شاہ جہاں صاحب" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں نے وحشت میں ہاتھ مارا اور اس کی پگڑی گرا دی۔ وہ واقعی صفدر تھا۔ اس کے چہرے پر معمولی سی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ یہ ویڈی کا سبز میک اپ کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود میری آنکھ کے لئے اسے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ وہ صد فیصد صفدر تھا۔ میرا یار غار۔ میرا ہمدم' میرا ہم نفس' روشن آنکھوں اور چوڑے شانوں والا وہ گبرو جو جب میرے کندھے سے کندھا ملاتا تھا تو مصیبتوں کے پہاڑ ہمارے سامنے روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگتے تھے اور حوادث کی دیو قامت لہریں ہمارے پاؤں چھو کر واپس چلی جاتی تھیں۔ صفدر کا ساتھ میرے اندر ایک ایسا جوش و خروش بھر دیتا تھا جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

"اوئے صفدر' تم؟" میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ لیکن اب میری گرفت میں وحشی کا غضب نہیں' محبت کی وارفتگی تھی۔ ہم دونوں بغل گیر ہوئے اور پھر پیچھے ہٹ کر ایک دوسرے کو

دیکھنے لگے۔ اسی دوران میں وہ لوگ جو پڑاؤ سے صفدر کے پیچھے بھاگے تھے، موقع پر پہنچ گئے۔ یہ سب شیخ عاصم کے ساتھی تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں رائفلیں نظر آرہی تھیں۔ مجھے اور صفدر کو یکجا دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ صفدر نے انہیں دیکھا تو چاقو بند کرکے اپنی قبا کی جیب میں رکھ لیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" عاصم کا ایک کارندہ تنک کر بولا۔

معاملے کا تو ابھی مجھے بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا لیکن بدتمیز کارندے کو جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے صفدر کی طرف اشارہ کرکے کارندے سے کہا۔ "اوئے گھامڑ! تم نے اسے پہچانا نہیں۔ اسی سے تو تمہاری ہمشیرہ کی شادی ہوئی ہے۔ آج دعوتِ ولیمہ تھی۔ یہ مجھے بلانے کے لئے آیا تھا تم پتا نہیں کیا سمجھ کر اس کے پیچھے لگ گئے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" کارندے نے تاؤ کھا کر کہا۔

میں نے کہا۔ "تمہیں بہنوئی سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔ کیوں شروع میں ہی بہن کا گھر اجاڑنے پر تل گئے ہو۔"

اسی دوران میں شیخ عاصم بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ یہ لوگ جیپ پر سوار ہو کر آئے تھے۔ جیپ کی پچھلی سیٹ پر غزالہ بھی موجود تھی۔ میری طرح وہ بھی تھوڑی سی کوشش کے بعد صفدر کو پہچان گئی۔ میری طرح اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں اور چہرے پر دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی۔ یقیناً میری طرح اس کے ذہن میں بھی یہی سوال گونج رہا تھا کہ صفدر یہاں کیسے پہنچا ہے؟

شیخ عاصم بڑے غور سے کبھی میری طرف اور کبھی صفدر کی طرف دیکھ رہا تھا "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میرا خیال ہے کہ تم بھی اسے پہچانتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کچھ جانا پہچانا تو یہ لگتا ہے مجھے... کیا تمہارا کوئی ساتھی ہے؟"

میں نے کہا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہ تمہارے پڑاؤ میں کیسے تھا اور تمہارے بندے اس کے پیچھے کیوں بھاگے؟"

"پانچ چھ دن پہلے ہم نے اسے پڑاؤ میں سے پکڑا تھا، یہ ایک خیمے میں سے سامان چوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"سامان نہیں پانی چوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" صفدر نے تصحیح کی۔ وہ اردو میں بولا تھا۔

اردو سے شیخ عاصم کو بہت چڑ آتی تھی۔ وہ بھنا کر بولا "کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

میں نے کہا "کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا جس تمہیں غصہ آئے۔"

"لیکن یہ ہے کون؟"

"یہ باتیں یہاں کھڑے ہو کر کرنے کی نہیں ہیں۔ نے کہا "چلو پڑاؤ میں، تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

ہم سب پڑاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیخ عاصم نے اور صفدر کو بھی اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا لیا تھا۔ پڑاؤ قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ صورتِ حال دونوں طرف گرم ہے۔ دونوں طرف کے رائفل مین ایک بار پھر خندقوں پوزیشن لے چکے تھے اور ذرا سی غلط فہمی کے سبب خون فائرنگ شروع ہو سکتی تھی۔ دراصل جب شیخ عاصم

کارندوں نے بھاگتے ہوئے صفدر پر فائر مارے تو شاری اس کے ساتھیوں کا چوکنا لازمی ہو گیا۔ وہ یہی سمجھے کہ ان پر حملہ ہونے لگا ہے وہ فوراً پوزیشنوں پر آگئے۔ انہیں دیکھ کر عاصم کے ساتھیوں نے بھی رائفلیں کندھوں سے اتار لیں۔

پڑاؤ میں پہنچ کر شیخ عاصم نے اپنے ساتھیوں کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کی اور انہیں خندقوں سے باہر نکال لیا۔ نے بھی جا کر شاری اور الماجد وغیرہ کو تسلی دی اور انہیں اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میرے کہنے پر شاری بھی دو تین رائفل برداروں کے سوا سب کو خندقوں نکال لیا۔

میں واپس شیخ عاصم کے پڑاؤ میں پہنچا۔ شیخ عاصم قراری سے خیمے میں ٹہل رہا تھا۔ صفدر کو دوسرے خیمے بٹھایا گیا تھا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی شیخ عاصم نے پوچھا "ہاں کون ہے یہ بندہ؟"

میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ یہ بندہ تمہارے پاس کیسے آیا؟"

عاصم بولا "ہم ابوظہبی سے پچھلے منگل کو روانہ ہوئے تھے۔ صحرا میں سفر کرتے ہمیں دوسرا دن تھا۔ رات کو اچانک مجھے شور و غل سنائی دیا۔ میں خیمے سے باہر آیا تو یاسر وغیرہ اس شخص کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا یاسر کے ساتھیوں میں سے ایک نیم بے ہوش ریت پر پڑا تھا یاسر نے بتایا کہ یہ شخص خیمے میں چوری کی نیت سے داخل ہوا ہے۔ پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ہمارے بندے کے سر میں لٹھ مار کر اسے شدید زخمی کر دیا۔ پکڑنے کے بعد اس شخص سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن یہ صرف اردو بولتا رہا۔ اس نے ظاہر کیا کہ یہ انگلش یا عربی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔

ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ مقصد یہ تھا کہ جب کوئی مترجم ملے گا تو اس کی بات کا مطلب سمجھا جائے گا۔ میں نے یاسر کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہے۔ یاسر نے اس کی مشکیں کس رکھی تھیں، اور شام کے وقت صرف تھوڑی دیر کے لیے اسے آزاد کیا جاتا تھا۔ آج پتا نہیں کس طرح اس نے رسی کی گرہیں ڈھیلی کر لیں اور خیمے میں سے ایک چاقو لے کر بھاگ نکلا۔ یہ تمہارا شناسا نکل آیا ہے۔"

میں نے جب شیخ عاصم کو بتایا کہ یہ میرا یارِ غار صفدر ہے تو وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے "او مائی گاڈ!" اس کے ہونٹوں سے نکلا "اسی لیے تو میں کہتا تھا کہ صورت کچھ شناسا لگتی ہے۔ لل... لیکن یہ یہاں کیسے پہنچا؟"

میں نے کہا "اس سوال کا جواب تو تمہاری طرح مجھے بھی بڑی شدت سے درکار ہے۔"

شیخ عاصم اور غزالہ کو ان کے خیمے میں چھوڑ کر میں اس دوسرے خیمے میں پہنچا جہاں صفدر مسلح افراد کے درمیان موجود تھا۔ میں نے مسلح افراد کو باہر جانے کا حکم دیا اور انہیں کہا کہ اب اس پہرے داری کی ضرورت نہیں۔ مسلح افراد قدرے تذبذب کے بعد باہر چلے گئے۔

"کافی بھاری ہے تمہارا ہاتھ۔" میں نے جبڑے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "میں شرمندہ ہوں لیکن کسر آپ نے بھی نہیں چھوڑی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت وزنی بوری اچانک مجھ پر آن گری ہے اور پھر خدا کا لاکھ شکر ہے کہ میری کمزور گردن آپ کے ہاتھ میں نہیں آئی ورنہ اب تک یقیناً منکر نکیر میرا انٹرویو شروع کر چکے ہوتے۔"

صفدر کی ایک کہنی بری طرح چھل گئی تھی اور میرا مکا لگنے سے اس کے گھٹنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔

میں اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا اور بڑی توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولا "کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟"

"سینگ نکل آتے تو شاید مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا اچانک تمہیں یہاں دیکھ کر ہوا ہے۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق تم انڈیا میں تھے اور چھبی کشور اور مسرجی کلارک کے ساتھ مل کر نوادرات کا کھوج لگا رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں دیکھ کر میں چکرا گیا تھا، میرے چکراتے ہوئے ذہن میں پہلا خیال تو یہی آیا تھا کہ شاید ہم ابوظہبی کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے کہیں انڈیا کے صحرائی علاقے راجستھان کی طرف جا نکلے ہیں۔ بندہ بوکھلایا ہوا ہو تو پھر ایسے بے سروپا خیالات بھی ذہن میں آسکتے ہیں۔ پھر میرے ذہن میں آیا کہ شاید عزت مآب سائیں عالی صاحب نے کوئی ناقابلِ یقین کرشمہ دکھایا ہے اور جس طرح وہ خود آسیب کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتا ہے اس طرح اس نے تمہیں پھونک مار کر انڈیا سے ابوظہبی میں لا پھینکا ہے۔"

صفدر نے کہا "سائیں کی پھونک کی طاقت سے تو انکار نہیں مگر آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ بہت پھونک پھونک کر پھونک مارتا ہے۔ اس کی پھونکیں مروج کے لیے مخصوص ہیں اور ہمارا شمار ہوتا ہے اپروں غیروں میں۔"

میں نے کہا "یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تو ہمارے آسمانی کی طرح یہاں کیسے نازل ہوا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے یہ بتاؤ کہ پاکستان کی کیا خیر خبر ہے۔ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟"

آخری خبریں آنے تک تو خیریت تھی اور میرے پاس جو آخری خبر ہے وہ قریباً چار ہفتے پرانی ہے۔ پورا ایک مہینہ ہو چکا ہے جب میں انڈیا سے سرپٹ بھاگتا ہوا اسلام آباد اور وہاں سے لاہور پہنچا تھا۔"

"سرپٹ کیوں بھاگے تھے۔ کیا انڈیا سے پیما مالینی تمہارے پیچھے لگ گئی تھی۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب! یہ کافی سیریس بات ہے۔" صفدر کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"نوادرات کا کوئی چکر ہے؟"

"بس یہی سمجھ لیں... یہ اس معاملے کی نزاکت اور خطرناکی ہی ہے کہ سخت تکلیف کے باوجود میں آپ تک پہنچنے کے لیے پچھلے قریباً بیس روز سے مسلسل سفر میں ہوں۔"

"کیسی تکلیف؟" میں نے پوچھا۔

صفدر نے بائیں بازو کے اوپر سے کپڑا ہٹایا۔ اس کے بازو پر کہنی اور کندھے کا درمیانی حصہ پلاستر میں جکڑا ہوا تھا "یہ کیا ہوا؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"فریکچر ہو گیا تھا۔ ایک مہینہ پہلے مدراس کے ایک ہوٹل میں زبردست مارا ماری ہوئی تھی۔ اسی کی نشانی ہے یہ۔"

"اور تم اس ٹوٹے بازو کے ساتھ ہی دنگا فساد کرتے پھر رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی دھینگا مشتی کی ہے۔ عجیب بے پروا انسان ہو تم۔ ٹوٹی ہڈی کے ساتھ ایسی خرمستیاں کرو گے تو بازو تباہ ہو کر رہ جائے گا۔"

"ہوتا ہے تو ہو جائے۔ بلکہ اگر ہو بھی چکا ہے تو فکر کی بات نہیں۔ آپ مل گئے ہیں۔ بس یہ خوشی ہر اندیشے پر حاوی

ہے۔"

"تو تم مجھے تلاش کر رہے تھے؟"

"ایسی ویسی تلاش جناب۔ میں گزارش تو کر رہا ہوں کہ پچھلے بیس تیس روز سے مسلسل سفر میں ہوں۔ انڈیا سے پہلے میں اسلام آباد پہنچا۔ وہاں سے بائی روڈ لاہور آیا۔ لاہور میں صرف ساہی صاحب سے ہی مختصر ملاقات ہو سکی۔ نامعلوم افراد دو تین مرتبہ انہیں جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ساہی صاحب کے سینئر افسران ان کی سلامتی کے لیے فکر مند ہیں اور انہوں نے ساہی صاحب کے لیے کڑے حفاظتی انتظامات کر رکھے ہیں۔ ساہی صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ آپ ابوظہبی میں ہیں۔ ساہی صاحب سے ہی مجھے سلطانہ نامی خاتون کا ایڈریس بھی معلوم ہوا۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ آپ اس خاتون کے ہاں قیام پذیر ہیں اور اگر نہیں بھی ہیں تو یہ خاتون آپ کے ٹھکانے کے بارے میں بتا سکتی ہے۔ ابوظہبی پہنچ کر میں نے بمشکل ان خاتون کا پتا تلاش کیا لیکن خاتون کی رہائش گاہ پر پولیس کا پہرا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ چند روز پہلے خاتون کو پُراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے پھر مجھے چند روز پرانے ایک اخبار سے اس واقعے کی تفصیل معلوم ہو گئی۔ اس میں لکھا تھا کہ خوب رو مصری خاتون سلطانہ جو اردو اور فارسی کی ٹیچر بھی تھیں عصمت دری کے بعد بے دردی سے قتل کر دی گئیں۔ ان کی لاش ابوظہبی کے مضافات [illegible] سے ملی تھی۔ خبر میں سلطانہ کی گمشدہ بچی کا ذکر تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سلطانہ معروف تاجر و صنعت کار شیخ عاصم کے پاس ملازمت بھی کرتی رہی ہیں (جیسا کہ میں بتا چکا ہوں سلطانہ شیخ عاصم کو اردو اور غزالہ کو عربی پڑھانے کے لیے ملازم رکھی گئی تھی) خبر کے آخر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ممکن ہے یہ قتل شیخ عاصم کے خاندان میں موجود چپقلش کا نتیجہ ہو۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں حالات آپ کے لیے نہایت سنگین جا رہے ہیں۔ میں تندہی سے آپ کو تلاش کرنے لگا۔ میں نے شیخ عاصم کے گھر کام کرنے والے ایک باورچی عباس کو پکڑا اور اسے ذرا دھمکا کر اس سے معلومات حاصل کیں۔ میں اس سے غزالہ اور شیخ عاصم کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے کہیں غزالہ کے آثار مل رہے تھے اور یہ شیخ عاصم کے عباس نامی یہ باورچی میری توقع سے زیادہ سخت جان ثابت ہوا تھا۔ بہرحال میری مار کھانے کے بعد جب ایک بار اس کی زبان کھلی تو پھر کھلتی چلی گئی۔ اس نے کئی غیر متوقع انکشافات کیے۔ مجھے اس سے معلوم ہوا کہ شیخ عاصم اور غزالہ سلطانہ کے قتل کے بعد سے گھر میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ عاصم کی پہلی بیوی تہمینہ اور ثمر بھی نہیں ہیں۔ دو تین دن تک یہ اندیشہ تھا کہ یہ تینوں کسی دردناک انجام سے دوچار ہو چکے ہیں لیکن پرسوں اچانک شیخ عاصم صاحب نمودار ہو گئے ہیں۔ وہ پہلے ہی بیمار تھے اب اور بھی کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ ریگستان میں سفر کرتے ہوئے ان کی پنڈلی پر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے جس کے سبب وہ کئی ہفتے بخار میں رہے ہیں لیکن آرام کرنے کے بجائے اب وہ پھر کہیں روانہ ہونے کی تیاری کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ تیاری بڑی رازداری سے ہو رہی ہے اور امکان ہے کہ ایک دو روز تک وہ روانہ ہو جائیں گے۔

معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے باورچی کو چھوڑ دیا تھا لیکن اسے اس قدر ڈرایا دھمکایا تھا کہ مجھے یقین تھا وہ واپس جا کر اپنی زبان بند رکھے گا۔ میرے ذہن میں تجسس کا جاگنا قدرتی عمل تھا۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ شیخ عاصم کے سفر کا تعلق غزالہ سے ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ سے بھی ہو۔ اس کے علاوہ میرے دل نے یہ بھی گواہی دی تھی کہ صحرا میں کوئی تشویش ناک چکر چلا ہے۔ میں نے اپنے طور پر شیخ عاصم کی گاہ پر نگاہ رکھی۔ مجھے پُراسرار سرگرمی کا احساس ہوا۔ اسی دوران میں میں نے مسٹر جی کارک صاحب کے ایک [illegible] تعاون سے صحرا میں سفر کی تیاری کر لی۔ ان صاحب نے بغیر کوئی سوال جواب کیے مجھے سامان خورد و نوش کے علاوہ اونٹ بھی مہیا کر دیے۔ میں نے اپنے طور پر بازار سے دیہاتی طرز کا لباس بھی خرید لیا۔ دیہاتی طرز کا لباس خریدنے کے لیے مجھے شہر کے ایک مضافاتی قصبے میں جانا پڑا تھا۔ میں اونٹ پر سوار ہو کر گیا تھا تاکہ سواری کی تھوڑی بہت پریکٹس ہو جائے۔ جب میں شہر کی طرف واپس آ رہا تھا تو ایک منظر نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ میں نے چند شتر سواروں کو دیکھا جو صحرا کی طرف جانے والی سڑک پر رواں دواں تھے۔ کچھ اونٹوں پر سامان بندھا ہوا تھا۔ شتر سواروں میں عباس کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

"عباس کون؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھی آپ کو بتایا تو ہے۔ یہ شیخ عاصم کے باورچیوں میں سے ایک ہے۔ عباس کو دیکھ کر میری چھٹی حس نے اطلاع دی کہ شیخ عاصم اپنا قافلہ لے کر روانہ ہو چکا ہے۔ میں سٹپٹا رہ گیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں واپس شہر جاتا اور پوری تیاری کے ساتھ شیخ عاصم کے تعاقب میں روانہ ہوتا۔ میں جس حالت میں تھا شتر سواروں کے پیچھے روانہ

ہوا۔ صحرا میں تعاقب کرنے کے بارے میں میں نے کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ صحرا میں کسی شخص یا قافلے کا تعاقب کرنا از حد آسان ہوتا ہے۔ ریت پر قدموں کے نشانات اور جانوروں کا فضلہ وغیرہ راستہ دکھاتا ہے اور تعاقب کرنے والا اپنے ہدف سے میلوں دور رہ کر بھی تعاقب جاری رکھ سکتا ہے۔ شتر سوار جن میں باورچی عباس بھی شامل تھا، جب صحرا میں دس بارہ کلومیٹر تک گھس گئے تو مجھے مزید شتر سوار نظر آئے اور پانچ جیپیں بھی دکھائی دیں۔ یہ صحراؤں میں استعمال ہونے والی ایک خاص قسم کی جیپیں تھیں جو بڑی کارآمد ہیں۔ میں نے اپنا اونٹ ان جیپوں اور شتر سواروں سے کافی فاصلے پر روک لیا تھا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت اس نہایت کٹھن سفر کا آغاز ہوا جس نے اس قافلے کو اور مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ یہ میرے لیے بھوک پیاس، گرمی اور ناقابل برداشت چلچلاتی دھوپ کا سفر تھا۔ میں اس قافلے سے قریباً پانچ کلومیٹر پیچھے رہ کر تعاقب کر رہا تھا۔ میرے پاس پانی کی صرف ایک چھاگل تھی، مشکل سے ایک لیٹر پانی ہوگا۔ یہ پانی میں نے پہلے روز ہی استعمال کر لیا۔ بس دو تین گھونٹ بچے جو اگلے روز میں دوپہر کے وقت میرے حلق کو تر کرنے کی ناکام کوشش کر کے ناپید ہو گئے۔ اب میں تھا اور میری جھلسی ہوئی زبان تھی۔ جہنم نظیر صحراؤں کی آدم خور پیاس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ سچ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے تو میرے دل میں آئی کہ واپس چلا جاؤں لیکن واپس جانا آسان نہیں تھا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ شیخ عاصم اپنے قافلے کے ساتھ کسی ایسے مقام کی طرف جا رہا ہے جہاں غزالہ موجود ہے اور شاید آپ بھی ہیں۔ میں اب تک بڑی کامیابی اور سہولت سے تعاقب کر رہا تھا اور اس امر کی قوی امید تھی کہ میں کامیابی سے اپنا مقصد حاصل کر لوں گا لیکن مسئلہ "جان عذاب میں ڈال دینے والی" پیاس کا تھا۔ اس رات مجبور ہو کر میں نے شیخ عاصم کے پڑاؤ کا رخ کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ گہری تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے کچھ پانی اور راشن حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ پیاسا مرنے سے تو بہرحال یہی بہتر تھا کہ کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔ میں ایک منتخب خیمے میں گھس گیا۔ میرا قیاس بالکل درست نکلا۔ خیمے میں پانی اور راشن موجود تھا۔ ایک کونے میں پڑا ہوا واٹر کولر اس وقت مجھے دنیا کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جی بھر کر اپنا حلق تر کیا، پھر دو بڑے تھرماسوں میں پانی بھر لیا۔ میں اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا لیکن ایک پہرے دار کے چونک جانے سے اچانک بازی الٹ گئی۔ پہرے دار خیمے میں گھسا اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نے اس کے سر پر لکڑی کی وزنی لٹھ سے ضرب لگائی اور چاروں شانے چت کر دیا مگر اسی دوران میں مزید افراد موقع پر پہنچ گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ بعد ازاں میرے اونٹ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ خود کو انگلش اور عربی سے نابلد ظاہر کروں۔ میں اس کوشش میں کامیاب رہا اور مجھے ان لوگوں کا بہت زیادہ تشدد برداشت نہیں کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے میری مشکیں کسنے کے بعد مجھے اپنا ہم سفر بنا لیا۔ دو روز تک مزید سفر کرنے کے بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اب موجود ہیں۔ یہاں پہنچ کر معرکہ آرائی شروع ہوئی اور پھر طویل ہوتی چلی گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ معرکہ کس کے ساتھ اور کیوں ہو رہا ہے، بس اتنی خبر تھی کہ یاسر اور اس کے ساتھیوں نے چند مسلح افراد کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور ان سے اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ شیخ عاصم جو راستے ہی میں چند افراد کے ساتھ قافلے سے علیحدہ ہو گیا تھا آج صبح سویرے پھر قافلے سے آن ملا۔ اس کے آنے کے فوراً بعد پڑاؤ میں زبردست جوش و خروش پایا جانے لگا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اب یہ لوگ گھیرے ہوئے افراد پر بھرپور حملہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اسی دوران میں خیمے کے اندر

- ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
- ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے
ڈاک خرچ ۲۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ!

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۲۰

سے میری نظر ایک ایسے منظر پر پڑی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ معلوم ہے میں نے کیا دیکھا؟"

"کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو دیکھا۔ مجھے آپ کی صرف ایک جھلک نظر آئی لیکن یہی جھلک میرے لیے کافی تھی۔ میں نے آپ کو سامنے ٹیلے سے نیچے اترتے دیکھا' آپ نے ایک کپڑے کو سفید جھنڈے کی شکل دے رکھی تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر اتر رہے تھے۔ میرے لیے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ جو لوگ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں' ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ پچھلے تین دن سے میرے لباس میں ایک چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو میں نے خیمے میں سے ہی حاصل کیا تھا۔ کوشش کے باوجود اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے چاقو کا استعمال کیا اور اپنی پشت پر بندھے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد میں نے اپنے پاؤں آزاد کیے۔ ابھی پاؤں کی رسیاں کٹی ہی تھیں کہ ایک پہرے دار اندر داخل ہو گیا۔ میں نے کٹی ہوئی رسیاں چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا' اس کے بعد میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں نتائج سے بے پروا ہو کر حرکت میں آجاتا۔ میں پہرے دار کے منہ پر مکا رسید کر کے بھاگ نکلا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے وہ آپ کو بھی پتا ہے۔"

صفدر کی روداد ختم ہوئی تو میں نے ایک طویل سانس لی۔ میں نے کہا "صفدر پیارے' ذہن میں سوالات تو بے شمار ابھر رہے ہیں لیکن پہلے مجھے ایک سوال کا جواب ذرا تفصیل سے دے دو۔ شفتا تو ٹھیک ہے نا؟"

صفدر بولا "میں نے بھی ساہی صاحب سے یہ سوال خصوصی طور پر پوچھا تھا۔ ان کا جواب یہی تھا کہ شفتا اور انجم دونوں بالکل محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور ان کے لیے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔"

"خبر نہیں کیوں صفدر! زندگی میں پہلی بار میرا دل اس بری طرح شکوک و شبہات میں گھر گیا ہے۔ مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پاکستان میں شفتا کے ساتھ کوئی سنگین مسئلہ نہ ہو جائے۔ درحقیقت شیخ عاصم کا پورا قبیلہ ہاتھ دھو کر شفتا کے پیچھے پڑ چکا ہے۔ ان لوگوں نے شفتا کے حصول کو اپنی ضد بنا لیا ہے اور اس ضد کے لیے ہر انتہا تک جانے کو تیار ہیں۔ بلکہ عاصم کے قبیلے کے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس ضد کے معاملے میں شیخ عاصم سے بھی چند ہاتھ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اگر ہم سب اس دور دراز صحرا میں نظر آ رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی ضد ہے۔ قبیلے کے اندر شیخ عاصم کے کچھ مخالفین کا خیال ہے کہ غزالہ سے شادی کے بعد عاصم کا رویہ تبدیل ہو گیا ہے اور وہ اس بے عزتی کو بھول گیا ہے جو لاہور سے برات خالی ہاتھ واپس آنے کی صورت میں قبیلے کو جھیلنی پڑی تھی۔ یہ لوگ شیخ عاصم کے بھی مخالف ہو گئے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ عاصم کے رویے میں واقعی تبدیلی آئی ہے؟"

"کاش ایسا ہوتا لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ شیخ عاصم کی سوئی بھی وہیں اٹکی ہوئی ہے جہاں اس کے مخالفین کی ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ مقصد تک پہنچنے کے لیے دونوں کے راستے جدا ہیں۔ شیخ عشار اور اس کے ساتھی شفتا تک پہنچنے کے لیے فوری کارروائی کرنا چاہتے ہیں جبکہ شیخ عاصم بیمار ہے۔ وہ پہلے اپنی صحت کی بحالی چاہتا ہے۔ اس کے بعد وہ حکمت عملی کے ساتھ شفتا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ شفتا اور اس کے بچے کی بات طے ہو چکی ہے۔ اب شفتا کو ہر صورت میں اس خاندان کی بہو بننا ہے۔"

صفدر کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ یہی صفدر کی خوبی تھی۔ وہ میرے درد کو ہمیشہ اپنے درد کی طرح محسوس کرتا تھا۔ ایک لمحے میں وہ میری پریشانی کو اپنی پریشانی بنا لیتا تھا اور اسے دور کرنے کی کوشش میں لگ جاتا تھا۔ وہ سچا دوست تھا اور سچا دوست اسی طرح رگ جاں کے قریب ہوا کرتا ہے۔ اس کے تاثرات میں مجھے غیظ و غضب کی عجیب سی جھلک نظر آئی۔ وہ سرگوشی میں بولا "شاہ صاحب! میں تو کہتا ہوں کہ شیخ عاصم کا قصہ پاک کر دیجیے۔ اگر آپ کسی وجہ سے اس پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتے تو مجھے اجازت دیں۔ ہماری پیاری بہن شفتا کی زندگی پر اسی منحوس شخص کا سایہ پڑ رہا ہے۔ اگر یہ جڑوں سے کٹ گیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب معاملہ صرف ایک فرد تک محدود نہیں رہا صفدر۔" میں نے کہا "تمہیں بتایا ہے نا کہ اب کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہیں۔ وہ مجھ سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے جوش میں عاصم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال تو شیخ عاصم دوسرے خیمے میں بے قراری سے انتظار کر رہا ہے۔ ہم صرف چند ضروری باتیں کر لیتے ہیں۔ اس وقت سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے اپنے یہاں آنے کی اصل وجہ نہیں بتائی۔"

صفدر نے ایک طویل آہ بھر کر شفتا کی مشکلات کا خیال ذہن سے جھٹکا اور اپنا داہنا ہاتھ اپنے میلے کچیلے گریبان میں ڈال دیا۔ جب اس کا بازو کہنی تک گریبان میں گھس گیا تو اس نے اپنی بنیان کی کسی خفیہ جیب میں سے ایک کاغذ برآمد کیا۔ کاغذ پولی تھین میں لپٹا ہوا تھا' یقیناً یہ کوئی خط تھا۔ خط کی ابتری حالت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ہفتوں صفدر کی بغل میں چھپا رہا ہے۔ اس پر پسینے اور میل کچیل کے دھبے تھے' تہیں پرانی ہو چکی تھیں۔ میں نے تہیں کھولیں۔ یہ مسٹر جی کلارک صاحب کا خط تھا۔ وہی امریکی صاحب جس نے گمشدہ نوادرات اور نسخے کی بازیابی کو اپنا مقصد حیات بنا رکھا تھا۔ ایک لمحے میں میں نے جی کلارک صاحب کی تحریر پہچان لی۔ خط پر قریباً چار ہفتے پہلے کی تاریخ درج تھی۔ کلارک صاحب نے لکھا تھا۔

"شاہ جہاں۔

خدا کرے تم جہاں ہو خیریت سے ہو۔ میں خط میں زیادہ تفصیل نہیں لکھ سکتا' بس یوں سمجھو کہ مافوق الفطرت سائیں کی پیش گوئی پوری ہو گئی ہے۔ ہم دو نسخے اور نوادرات کے قریب پہنچ چکے ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ اب ہم تمہارے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ایک ہٹ دھرم کی جانب سے ایک ایسی شرط ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہے جسے صرف تم ہی پورا کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے اس لکھے کو زیادہ جانو اور جس طرح بھی بن پڑے صفدر کے ساتھ یہاں چلے آؤ۔ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں کہ تمہارا کم از کم تین چار دن کے لیے انڈیا آنا از حد ضروری ہے۔ میں اور مجتبیٰ کنور جھول سائیں عالی صاحب' شدت سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

خط پڑھ کر میں حیرت سے صفدر کی طرف دیکھنے لگا "یہ کیا سلسلہ ہے بھائی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

صفدر بولا "ساری بات کا تو مجھے بھی علم نہیں ہے۔ بس بتا سکتا ہوں کہ جی کلارک اور مجتبیٰ کنور اس وقت انڈیا کے شہر بھوپال میں موجود ہیں۔ شہر کے مضافات میں ایک خاندانِ نواب کی محل نما رہائش گاہ ہے' وہاں یہ دونوں حضرات شدت سے آپ کے منتظر ہیں۔ سائیں عالی بھی وہیں ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کب اور کیسے وہاں پہنچا ہے۔ اس کی سرمستیاں عروج پر ہیں۔ مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور کو اس نے چکرا رکھا ہے۔ میں اس دن جس روز جی کلارک صاحب کے حکم پر میں آپ کی تلاش میں بھوپال سے روانہ ہوا اس روز بھی سائیں عالی نے زبردست اودھم مچایا تھا۔ وہ تک دھڑنگ ایک گرلز کالج کے مینا بازار میں گھس گیا' کئی لڑکیاں بے ہوش ہو گئیں' کالج کی ادھیڑ عمر وائس پرنسپل کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ یہ خبر اگلے روز باقاعدہ اخبار میں بھی چھپی تھی۔"

میں نے کہا "صفدر! مجھے جو آخری اطلاع ملی تھی' اس کے مطابق تم لوگ مدراس میں تھے اور کسی لڑکی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ غالباً شگفتہ نام تھا اس کا۔"

"جی ہاں۔ یہی وہ شادی شدہ خاتون تھی جس نے جون چارلس سے جسمانی تعلق استوار کیا اور بعد ازاں اسے تحائف کی صورت میں نوادرات دیے۔ جب ہم جون چارلس کی رہنمائی میں انڈیا پہنچے اور شگفتہ کا پتا چلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنا ٹھکانا بدل چکی ہے۔ بعد ازاں ہمیں شگفتہ اور اس کے پتی کے بارے میں بعض اطلاعات ملیں لیکن وہ غلط ثابت ہوئیں۔ جی کلارک صاحب کی سرکردگی میں ہم نے شگفتہ اور اس کے پتی کی تلاش جاری رکھی اور بالآخر انہیں ڈھونڈ لیا۔ اس تلاش میں' میں نے بھی کافی کردار ادا کیا۔ آپ کلارک صاحب سے ملیں گے تو وہ اس بات کا اعتراف کریں گے۔ بہرحال شگفتہ اور اس کے پتی کو ڈھونڈ کر میں نے مدراس ائرپورٹ پر کلارک صاحب اور مجتبیٰ صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات میری نگاہ سے اوجھل ہیں اور میرے خیال میں ویسے بھی ان واقعات کی "تفصیل" فی الوقت آپ کے لیے کارآمد نہیں ہو گی۔ تازہ ترین صورت حال یہی ہے کہ کلارک صاحب' مجتبیٰ صاحب اور سائیں عالی مع اپنے کئی ورجن ساتھیوں کے بھوپال شہر میں ہیں اور خاصے پرجوش نظر آ رہے ہیں۔ خاص طور سے کلارک صاحب آپ کو ہر صورت اور ہر قیمت پر بھوپال میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس ایمرجنسی کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ میں کہاں سے چلا ہوں اور کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہوا آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں کہ کتنے بڑے رسک لیتا رہا ہوں میں۔ اگر ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں رسیاں کاٹ کر خیمے سے فرار ہوا تھا' کوئی گولی مجھے چاٹ جاتی تو یقیناً یہ بہت ہی میری قبر بنتی۔ بقول شاعر نہ کہیں جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا۔ آپ لوگ زندگی بھر سوچتے رہتے کہ وہ صفدر نامی ناہنجار جس کے ہاتھوں پر ابھی مہندی بھی لگنی تھی' نجانے کہاں روپوش ہو گیا۔ زمین کا رزق بن گیا یا آسمان نے اسے اٹھا لیا۔"

صندور مختصر ترین وقت میں مجھ سے بہت سی باتیں پوچھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے سینے کی تکلیف کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آپریشن کے بعد سے میں بالکل ٹھیک ہوں پھر اس نے سروج سے متعلق پوچھا۔ میں نے مسکرا کر کہا "یہ بڑا ہی رنگین اور سنگین موضوع ہے۔ اس پر بعد میں بات کریں گے۔" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

ہماری طویل گفتگو کے سبب شیخ عاصم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا کارندہ بھیجا اور پوچھا کہ ابھی گفتگو کتنی دیر جاری رہے گی۔

میں کارندے کے ساتھ ہی خیمے سے باہر آگیا اور شیخ عاصم کے پاس پہنچ گیا۔ شیخ عاصم کا نوادرات اور دفینے سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ اس سلسلے میں اس نے کبھی کوئی دلچسپی ظاہر کی تھی۔ لہٰذا میں نے اس امر میں کوئی عار نہیں سمجھی کہ اسے وہ سب کچھ بتا دوں جو صندور نے ابھی مجھے بتایا تھا۔ صرف چند باتوں کو حذف کر کے میں نے سب کچھ عاصم کے گوش گزار کر دیا۔ غزالہ بھی وہیں موجود تھی، وہ بظاہر لاتعلق بیٹھی تھی لیکن غور سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی شاری پھر وہاں آگئی۔ اس مرتبہ الماجد اور مستقیم بھی اس کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری غیر موجودگی میں عاصم نے ہی انہیں آنے کی دعوت دی تھی۔ اب دوپہر کا وقت ہونے والا تھا۔ پہلے ٹھنڈے پانی سے شاری وغیرہ کی تواضع کی گئی پھر کھانا کھایا گیا۔ کوئی عرب جب کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نے اپنا دل ہر قسم کے بغض اور دشمنی سے پاک کر لیا ہے۔ اس کھانے کے بعد شاری اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کا طویل دور ہوا۔ اس گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ شاری اور شیخ عاصم دونوں ہی صلح پر آمادہ تھے۔ درحقیقت آپس میں ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی، جو کچھ ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور دونوں طرف کے آدمی مارے گئے۔ جانی نقصان کا افسوس تو دونوں طرف تھا، بہرحال اب اس معاملے کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لڑائی کے دوران میں شاری کے ساتھیوں نے جو اونٹ پکڑا تھا وہ واپس کر دیا اور ساتھ ہی وہ قیمتی سامان بھی جو اونٹ پر لدا تھا۔ اس صلح میں، میں نے بھی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنا کردار ادا کیا اور کوشش کی کہ کسی بھی مرحلے پر بات بگڑنے نہ پائے۔ شاری کی طبع میں جوش اور غصہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ بات کرتے کرتے ایکدم اس کی رگوں میں صحرائی خون جوش مارتا تھا اور اس کا سانولا چہرہ لال بھبوکا ہو جاتا تھا۔ اپنی سردار کو غصے میں دیکھ کر الماجد اور مستقیم کے نتھنے فوراً پھول جاتے تھے۔ ایسے موقع پر میں فوراً مداخلت کر کے شاری کا ٹمپریچر نیچے لے آتا تھا۔ بہرحال، صلح کا مرحلہ طے پا گیا۔ جب میری زبانی شیخ عاصم کو پتا چلا کہ صرف آٹھ دن پہلے شاری کی شادی الماجد سے ہوئی ہے تو عاصم نے دونوں کو تحائف دیے۔ جواب میں شاری نے بھی غزالہ کو اس بات پر مبارک باد دی کہ بالآخر اس کے گمشدہ شوہر کا پتا چل گیا ہے۔ شاری نے زمرد کی ایک جڑاؤ انگوٹھی بھی اپنی انگلی سے اتار کر غزالہ کی انگلی میں پہنائی۔

شاری نے ہم سب کو دعوت دی کہ ہم اس کے ساتھ بستی میں چلیں اور چند روز قیام کریں۔ شیخ عاصم نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ رات کا کھانا دونوں طرف کے افراد نے ایک ساتھ کھایا۔ چند گھنٹے پہلے جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے وہ ایک دسترخوان پر جمع ہوئے تھے۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے صحرا کا حسن پوری حشر سامانی کے ساتھ جلوہ گر تھا۔۔۔ اور پھر رخصت کا لمحہ آ گیا۔ اب ہمارے راستے جدا ہو رہے تھے۔ مجھے شیخ عاصم، غزالہ وغیرہ کے ساتھ ابو ظبی کا رخ کرنا تھا جبکہ شاری کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس اپنی بستی میں جانا تھا۔ صحرائی بستی جو سارا دن چلچلاتی دھوپ کا سامنا کرتی تھی، رات کو تاروں کی چادر اوڑھ کر اور خنک ہوا کے جھونکے لپیٹ کر سو جاتی تھی۔ بظاہر وہ ایک ویران اور اجاڑ بستی تھی لیکن اگر غور کیا جاتا تو اس ویرانی اور بے سرو سامانی میں ایک حسن تھا۔ صحرا کا حسن جسے محسوس کرنے کے لیے ایک خاص قسم کی نگاہ کا ہونا ضروری تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شاری واپس جائے گی تو اسے یہ بستی پہلے سے بھی حسین پر بہار نظر آئے گی۔ وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ شاری جب بستی سے روانہ ہوئی تھی تو اکیلی تھی، اب اس کے ساتھ الماجد تھا اور الماجد کا پیار پہاڑی دریا جیسا پرجوش پیار تھا۔ شاری کے ذہن میں رہ رہ کر یہ سوال بھی اٹھ رہا تھا کہ امیرزادوں کو بستی میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے ان کے وارث کون لوگ ہیں۔ میں نے شاری کو بتایا کہ ان لوگوں کا تعلق شیخ عاصم کی مخالف پارٹی سے ہے اور اگر ننکا صحرا سے زندہ بچ کر نہیں نکلا تو پھر اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ لوگ خوں بہا کے لیے اس دور دراز علاقے تک پہنچیں۔

رخصت کے وقت شاری مجھے ایک طرف لے گئی۔ اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور بولی "جہاں! میں تمہارے بارے میں بہت تھوڑا جانتی ہوں

پھر بھی تم بہت اپنے لگتے ہو۔ پتا نہیں یہ کیسا تعلق ہے۔ کیا میں امید کروں کہ تم یہاں سے بہت دور اپنے سرسبز شہر میں بیٹھ کر اس جلتے صحرا کو اور اس کی بیکراں وسعت میں آباد ایک بستی کے لوگوں کو یاد رکھو گے۔"

میں نے کہا "ضرور یاد رکھوں گا، خاص طور سے دو افراد کو تو بہت یاد رکھوں گا۔ ایک تم اور ایک الماجد۔ یقین رکھو اگر تم خوش رہو گے تو یہ خوشی مجھ تک بھی پہنچے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تمہارے رنج کو میرا دل بھی محسوس کرے گا۔ بتاؤ مجھے رنجیدہ تو نہیں کرو گے تم لوگ؟"

شاری کی آنکھوں میں نمی جاگ گئی۔ اس نے میرے ہاتھوں کو آہستگی سے دبایا "نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔" پھر ذرا توقف سے بولی "کیا کبھی تم واپس لوٹو گے؟"

"زندگی ہو تو ملنے کا امکان باقی رہتا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

شاری نے کہا "اگر کبھی واپس لوٹو تو ایک کام کرنا۔"

"وہ کیا؟"

"بہت خوش خوش لوٹنا۔"

"کیا اب میں تمہیں غم زدہ لگتا ہوں؟"

"لگنے کی بات نہیں تم غم زدہ ہو... شاید تمہیں معلوم نہیں لیکن تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں، تمہارا لہجہ سب اس بات کے گواہ ہیں کہ تم غم زدہ ہو اور میں شاید اس غم کی وجہ بھی جانتی ہوں۔ تمہارے غم کا تعلق ایک ایسا شخص ہے جو اب تمہارا نہیں، کسی اور کا ہو چکا ہوگا۔ ہے نا یہی بات؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر ایسا ہے بھی تو پھر؟"

"زندہ رہنے کے لیے نئے راستے تلاش کرو شاہ جہاں۔ ہمارے ہاں عربی کی ایک کہاوت ہے۔ جس کا مطلب ہے... زندگی ایک آزمائش ہے لیکن یہ اپنا انعام خود ہوتی ہے۔"

اسی دوران میں الماجد بھی ہمارے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ پسندیدہ نگاہوں کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "شکریہ۔"

اس نے بہت مدھم آواز میں کہا تھا لیکن شاری نے پھر بھی سن لیا۔ وہ مسکرائی "کس بات کا شکریہ ادا ہو رہا ہے؟"

"ہے کوئی بات۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تو پھر ایک بات کے لیے میری جانب سے بھی شکریہ۔"

"کس بات پر؟" میں نے پوچھا۔

"ہے کوئی بات۔" وہ بولی اور اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس واقعے کی جانب ہے۔ وہ اس رات کا ذکر کر رہی تھی جب وہ پانی کے حوض میں ڈوب گئی تھی اور میں نے چھت سے اوپر لٹکے ہونے کے باوجود اس کی زندگی بچائی تھی۔

میں نے کہا "میں تمہارا شکریہ قبول کرتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔"

"ہاں بولو۔"

"جو مشن تمہاری والدہ ادھورا چھوڑ گئی تھی اسے پورا کرو۔ اس قبیلے کے لوگوں میں علم کی پیاس موجود ہے۔ تمہاری اور الماجد کی تھوڑی سی کوشش سے وہ علم سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔"

چند منٹ تک اس موضوع پر ہماری گفتگو ہوئی۔ یہ مختصر سی گفتگو تھی لیکن اس کے باوجود شاری کی آنکھوں میں ترنگ سی جاگ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ اس معاملے پر سوچے گی اور بہت دیر تک اور بہت سنجیدگی سے سوچے گی۔

کچھ ہی دیر بعد شاری اور الماجد اپنے قبیلے کے افراد کے ساتھ بستی کی جانب واپس روانہ ہو گئے۔ میں دور تک انہیں دیکھتا رہا۔ جو چیز مجھے اس قافلے میں آخر تک دکھائی دیتی رہی وہ شاری کا بندر اور اس کے گول آئینے کا لشکارا تھا، وہی لشکارا جو ایک جان لیوا لمحے میں میری زندگی کی ضمانت بنا تھا۔ اہل قافلہ رواں رہے۔ ان کے اونٹوں اور گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد بہت فاصلے تک نظر آتی رہی، آخر کار وہ افق میں اوجھل ہو گئے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے تجربہ ہوا کہ سمندر کی طرح ہموار صحرا پر بھی مسافروں کو بہت دور تک دیکھا جا سکتا ہے۔

شیخ عاصم نے بھی اپنا پڑاؤ اٹھانے کا حکم دے دیا تھا۔ شاری کے رخصت ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہم بھی مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ غزالہ اب بھی میری ہم سفر تھی لیکن میں اکیلا تھا۔ وہ ائیر کنڈیشنڈ جیپ میں عاصم کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عاصم نے میرے لیے بھی ایک جیپ میں جگہ نکال لی تھی لیکن میں نے حسب سابق اونٹ پر سواری کو ترجیح دی تھی۔ عاصم کا ایک قریبی دوست بھی میرے ساتھ اونٹ پر ہی سفر کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ صندور تھا۔ صندور کو چھوڑ کر میں بھلا کیسے ائیر کنڈیشنڈ جیپ میں بیٹھ سکتا تھا۔ شیخ عاصم کے سامنے میرے طویل بیان کے بعد صندور کو رہائی مل گئی تھی۔ اس پر سے حفاظتی پہرے ہٹا لیے گئے تھے، نہ صرف اسے سواری مہیا کی گئی تھی بلکہ ایک عدد ریوالور مع ایمونیشن بھی دیا گیا تھا۔

درحقیقت یہ صفدر ہی کا ریوالور تھا۔ چند روز پیشتر جب اسے بلاز نے انڈرنٹ گرفتار کیا گیا تھا' یہ ریوالور عاصم کے محافظوں نے قبضے میں لے لیا تھا۔

صفدر جلد سے جلد واپسی کے سلسلے میں بڑا پرجوش تھا۔ مخصوص چھڑی سے اونٹ کو ہنکاتے ہنکاتے اس نے کہا "شاہ جہاں صاحب! میرا دل چاہتا ہے کہ ہم دونوں کے پر لگ جائیں اور ہم اڑتے ہوئے سیدھے بھوپال جا پہنچیں۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ جی کلارک صاحب آپ کے لیے کتنے بے چین ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے پنجابی کی وہ مثال نہیں سنی "کالیاں اٹے لوہے" یعنی جتنی جلدی کریں گے اتنی ہی دیر لگے گی۔ پیارے ابھی ہمیں بہت سے مرحلے طے کرنے ہیں' پھر کہیں انڈیا کا رخ کرسکیں گے۔ مثلاً پہلا مرحلہ تو یہ صحرا ہی ہے۔ اسے کراس کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے بعد شیخ عاصم کا رویہ دیکھنا ہوگا کہ وہ ہمیں جانے بھی دیتا ہے یا نہیں' پھر امیگریشن کے مسائل ہوں گے۔ شیخ عشارب اور اس کے ساتھیوں کی صورت میں جو "تو پتھر اسکواڈ" ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے اس کی طرف سے بھی خطرات موجود ہیں۔"

صفدر نے کہا "آئندہ کے متعلق شیخ عاصم سے کوئی بات نہیں ہوئی ابھی؟"

"بس رسمی سی بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے اردگرد حالات بہت خراب ہوگئے ہیں' وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کچھ عرصے کے لیے جاپان چلے جانا چاہتا ہے۔ وہ مجھے بھی مشورہ دے رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ بہرحال یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ غزال کے سامنے خود کو میرا ہمدرد ظاہر کرنے کی کوشش میں یہ باتیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے' یہ باتیں بس وہی جانتا ہے۔ وہ بہت گہرا شخص ہے اور مجھے اس کا تجربہ ایک سے زائد مرتبہ ہوچکا ہے۔"

ہم باتیں کرتے رہے اور ساری رات محو سفر رہے۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوا میں یہ سفر قدرے آسان ثابت ہورہا تھا۔ اونٹ پر ایک خاص اسٹائل میں بیٹھا جاتا ہے۔ اکثر اوقات دونوں ٹانگیں ایک ہی طرف ہوتی ہیں۔ ہر اونٹ سوار کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی ہے جس سے وہ اونٹ کو احکامات دیتا رہتا ہے۔ اونٹ کو بھگانا ہو تو اس کی پسلیوں میں خاص طریقے سے ٹانگ رسید کی جاتی ہے اور ساتھ ہی منہ سے "بچ بچ" کی مخصوص آواز نکالی جاتی ہے۔ اونٹ ایک دم دوڑنے لگتا ہے لیکن اونٹ کو مسلسل دوڑانا بھی ٹھیک نہیں ہوتا' اونٹ کے ساتھ ساتھ اونٹ سوار بھی تھک کر چور ہوجاتا ہے۔ ہم بھی اس قاعدے کو مدنظر رکھ کر چل رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے اونٹوں کو بھگاتے تھے پھر چلنے کی رفتار پر لے آتے تھے۔ جس وقت اونٹ بھاگتے تھے گھڑسوار اور جیپ سوار بھی اپنی رفتار تیز کرلیتے تھے۔ کہیں کہیں ریت بہت نرم ہوجاتی تھی اور اونٹوں اور گھوڑوں کے پاؤں زیادہ دور تک ریت میں دھنسنے لگتے تھے۔ ایسے میں سوار جانوروں سے اتر جاتے تھے اور ان کی راسیں تھام کر پیدل چلتے تھے' خاص طور سے ٹیلوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر یہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اکثر جانوروں کے گلے میں گھنٹیاں تھیں۔ جب وہ ایک ساتھ بجتی تھیں تو ایک مترنم شور اطراف میں پھیل جاتا تھا۔

ہم نے ساری رات سفر جاری رکھا۔ صبح دم ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں صحرا کے بیچوں بیچ بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ لاکھوں سال سے سورج کی تپش برداشت کرتے کرتے... یہ دیوہیکل چٹانیں سیاہ ہوچکی تھیں۔ ان گنت صدیوں سے تند و تیز ریتیلی ہوا ان سے ٹکرا رہی تھی اور انہیں عجیب و غریب شکلوں میں تراش رہی تھی۔ کہیں ان چٹانوں میں بڑے بڑے سوراخ تھے' کہیں نامانوس ٹیڑھی میڑھی شکلیں بن گئی تھیں۔ ایک نہایت بنجر پتھریلی پہاڑی ہماری دائیں جانب دو ڈھائی فرلانگ تک ایک دیوار کی طرح چلی گئی تھی۔ لق و دق صحرا میں ان مناظر کو دیکھ کر دل پر ہیبت سی طاری ہوجاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم زمین کے بجائے کسی ویران سیارے میں ہیں' جس کی بانجھ دھرتی پر ہزاروں میل کے دائرے میں کہیں روئیدگی یا زندگی موجود نہیں۔

دوپہر سے تھوڑی دیر قبل اچانک ہمیں رکنا پڑا۔ ہماری دائیں جانب صحرا بالکل ہموار تھا اور افق پر زمین و آسمان باہم ملے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ اسی افق پر اچانک ہی گرد نظر آنے لگی تھی۔ عاصم کے قافلے میں ماہر ترین مہم جو یاسر ہی تھا۔ اس نے اپنی زندگی انہی ویرانوں کی سیاحی میں گزاری تھی۔ سب سے پہلے اسی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے گلے میں لٹکی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جیپیں بھی نصرانی تھیں اور ان میں موجود کئی امیرزادوں کی آنکھوں پر دوربینیں نظر آرہی تھیں۔ شیخ عاصم کے اونٹ سوار دوست عبداللہ کے پاس بھی ایک چھوٹی ٹیلی اسکوپ موجود تھی۔ میں نے یہ ٹیلی اسکوپ آنکھوں پر لگائی تو بہت دور کسی قافلے کے

آثار دکھائی دیے۔ تپش کی وجہ سے ہوا میں لہریں سی بن رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ قافلہ کسی دریا کو پھلانگ رہا ہے۔ اسی نظری دھوکے کے لیے "سراب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمارا قافلہ رک گیا تھا اور ہر نگاہ "آنے والوں" پر لگی تھی۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر یاسر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی رائفلیں نکال لی تھیں۔ یہ جدید دور مار رائفلیں تھیں اور ان پر دوربینیں بھی "فکس" تھیں۔ میں جان چکا تھا کہ جیپوں میں بھی نہایت جدید اسلحہ موجود ہے۔ ان میں دستی بم اور چھوٹے سائز کے دو راکٹ لانچر بھی تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد قافلہ اتنا نزدیک آگیا کہ دوربینوں کے ذریعے آنے والوں کے لباس اور سواریاں وغیرہ دیکھنا ممکن ہوگیا۔ یہ نظارہ اتنا تشویش ناک تھا کہ ہر چہرہ لڑائی کی آماجگاہ نظر آنے لگا۔ میری دلی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ میں اس قافلے میں شتر سواروں کے علاوہ جیپیں بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ بالکل ویسی ہی جیپیں تھیں جو عاصم وغیرہ کے زیر استعمال تھیں لیکن یہ لوگ عاصم کے ساتھی ہرگز نہیں تھے۔ عاصم کا حیران پریشان چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھی نہیں ہیں۔

پھر یہ کون لوگ تھے؟ شکاری حضرات بھٹک کر اتنی دور آجائیں یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ نہ ہی یہ کوئی فلمی یونٹ تھا' نہ مہم جوؤں کی پارٹی تھی' نہ فوجی تھے۔ صرف ایک خیال ہی بار بار ہتھوڑے کی طرح ذہن پر برس رہا تھا۔ کہیں یہ شنکر اور اس کے پشت پناہ عشارب کے ساتھی تو نہیں؟

عاصم نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ اب وہ اپنی ائرکنڈیشنڈ جیپ سے باہر نکل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ جیپ میں غزال بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں عاصم کی طرف متوجہ ہوگیا۔ عاصم بولا "خدا کرے میرا اندازہ غلط ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ آنے والوں کا تعلق شیخ عشارب سے ہے۔ ہمیں فوراً پوزیشن سنبھالنا ہوگی۔"

میں نے کہا "اگر واقعی ایسا ہے تو پھر پوزیشن سنبھالنے کے لیے یہ جگہ بہترین ہے۔ ہمارے عقب میں چٹانیں ہیں اور یہ قدرے بلندی پر بھی ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

میں نے کہا "سب کے سب کو تو نہیں لیکن کچھ افراد کو پوزیشن ضرور سنبھال لینی چاہیے۔"

"تمہارے خیال میں کتنے افراد کو پوزیشن سنبھالنی چاہیے؟"

"دس پندرہ کافی ہوں گے۔ یہ جو لوگ پیچھے کھڑے ہیں یہ بڑی آسانی سے پتھروں میں روپوش ہوسکتے ہیں۔ اگر آنے والے ہمیں ٹیلی اسکوپس سے دیکھ بھی رہے ہیں تو وہ شاید ان افراد کی روپوشی کو محسوس نہ کرسکیں۔"

شیخ عاصم نے اپنے کارواں کے عقب میں جاکر ساتھیوں سے کھسر پھسر کی۔ ایک درجن کے لگ بھگ مسلح افراد ٹیلوں میں روپوش ہوگئے۔ اتنی دیر میں نوارد ہمارے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اب وہ ٹیلی اسکوپ کے بغیر بھی صاف دیکھے جاتے تھے۔ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھنے پر ان کی شکلیں صاف پہچانی جارہی تھیں۔ وہ شیخ عشارب کے ساتھی تھے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ شیخ عشارب بنفس نفیس اس قافلے میں موجود تھا۔ وہ ایک کھلی جیپ میں کھڑا تھا۔ اپنے بہت بڑے سر اور چہرے کی وجہ سے وہ باآسانی پہچانا جاتا تھا۔ اس کی شکل شیخ عاصم سے تھوڑی بہت ملتی تھی تاہم شیخ عاصم کے مقابلے میں اس کا قد اور وزن زیادہ تھا۔

تقریباً پچاس گز کی دوری پر شیخ عشارب کا قافلہ رک گیا۔ شیخ عشارب جیپ سے اتر کر ہماری طرف بڑھا۔ ہماری طرف سے شیخ عاصم اور اس کے دو قریبی ساتھی شیخ عشارب کی طرف گئے۔ عاصم جھک کر آہستگی سے چل رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ بار بار کمر پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔ دوسری طرف شیخ عشارب اکڑ کر چل رہا تھا۔ دونوں قافلوں کے درمیان کھلی جگہ پر دس پندرہ منٹ تک عشارب اور عاصم میں گفتگو ہوئی پھر عاصم واپس آگیا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہورہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ غصے کے سبب ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ حرام زادہ سمجھتا ہے کہ اس کا بہنوئی سالم اور دیگر افراد ہمارے پاس ہیں۔ وہ ان کی واپسی کا مطالبہ کررہا ہے۔"

"شنکر بھی ان کے ساتھ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ویسے وہ نظر تو نہیں آیا۔" عاصم کے ساتھی عبداللہ نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہیں ہوگا۔" میں نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہوتا تو عشارب کو معلوم ہوتا کہ شیخ سالم اور اس کے ساتھی "بہت دور" جاچکے ہیں۔"

یاسر نے شیخ عاصم سے پوچھا "آپ نے اندازہ لگایا کہ ان کے قافلے میں لڑنے والے کتنے بندے ہیں اور کیا اسلحہ ہے ان کے پاس؟"

عاصم بولا "تعداد اور اسلحے کے لحاظ سے وہ ہم سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ اسلحے کے اعتبار سے شاید انہیں کچھ برتری ہی حاصل ہو۔"

چند لمحے توقف کر کے عاصم نے عبداللہ اور یاسر سے کہا "ان لوگوں کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اپنا اسلحہ تیار کر لینا چاہیے۔"

ابھی عاصم کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اچانک شیخ عشارب اور اس کے ساتھی حرکت میں آ گئے۔ یہ حرکت بالکل اچانک اور بہت تیز تھی۔ اونٹ تیزی کے ساتھ ہماری طرف دوڑے، اس کے ساتھ ہی جیپیں لہراتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ایک غضبناک شور سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ یہ "سرپرائز" دینے والی کارروائی تھی۔ فوجی اصطلاح میں اسے "چارج" کہا جاتا ہے۔ یکایک پوری قوت سے مد مقابل کی طرف بڑھا جاتا ہے اور اسے اعصابی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس طرز کے حملے کیے تھے اور غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ہمارا اور شیخ عشارب کا درمیانی فاصلہ ساٹھ ستر میٹر سے زیادہ نہیں تھا، یہ فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہو سکتا تھا۔

جونہی فائرنگ شروع ہوئی، سب لوگ چٹانوں کی طرف بھاگے۔ جیپوں میں بیٹھے ہوئے افراد نے بھی جیپیں چھوڑ دیں اور بلند و بالا چٹانوں میں پناہ لی۔ اس وقت کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ اگر حملہ آوروں کو روکا نہ جا سکا تو جیپوں اور دیگر ساز و سامان پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو جائے گا۔ صرف چند اونٹوں کو ہی چٹانوں میں لایا جا سکا۔ ان میں سے ایک اونٹ کی نکیل میں نے تھام رکھی تھی۔ صنوبر نے بھی بھاگتے ہوئے تھوڑی سی دلیری دکھائی تھی، وہ نہ صرف غزالہ کو بحفاظت جیپ سے نکال لایا تھا بلکہ جیپ سے ہی اس نے دو عدد رائفلیں بھی اٹھا لی تھیں۔ شیخ عاصم کے کم از کم تین ساتھی اندھا دھند فائرنگ کی نذر ہو گئے تھے۔ ان کی لاشیں جیپوں کے ارد گرد پڑی تھیں۔ چٹانوں کی اوٹ میسر ہوتے ہی ہماری طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہمارے پہلے ہی حملے میں عشارب کے چار ساتھی جاں بحق ہو گئے۔ یہ سب گراٹ کے فوجی تھے اور اونٹوں پر سوار تھے۔ عشارب اور اس کے ترجیحی ساتھی جیپوں میں تھے، انہوں نے جیپوں کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی۔ پانچ جیپیں ہماری تھیں۔ ایک ٹرک نما گاڑی اور دو جیپیں شیخ عشارب کے پاس تھیں۔ یہ کل ملا کر آٹھ گاڑیاں بن جاتی تھیں۔ ان گاڑیوں کی آڑ کے سبب عشارب اور اس کے ساتھی شدید جانی نقصان سے بچ گئے۔ فائرنگ سے گاڑیوں میں سوراخ ہو گئے اور ان کی اسکرینیں چکنا چور ہو گئیں۔ بہرحال اس لڑائی میں ہمارا نقصان یہ ہوا کہ آناً فاناً ہی ہمارا تقریباً تین چوتھائی سامان جس میں پانی اور خشک راشن بھی شامل تھا مخالفوں کے قبضے میں چلا گیا۔ (اس سامان میں کچھ ہتھیار اور ایمونیشن وغیرہ بھی شامل تھا) یہ ایک زبردست ہزیمت تھی جو ہمیں بالکل اچانک اٹھانا پڑی۔ اس ہزیمت کا سبب یقیناً وہ بالکل غیر متوقع اور تیز رفتار حملہ تھا جو عشارب اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا۔

یقیناً شیخ عشارب نے سریع الخیالی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے عاصم کے ساتھ دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں جان لیا تھا کہ یہ "بات" لڑائی پر ہی ختم ہونی ہے اور جب یہ بات طے تھی تو پھر وہ کیوں نہ پہل کا فائدہ اٹھاتا۔ اس نے پہل کی بھی اور خاصا کامیاب رہا تھا۔ دونوں طرف سے ہونے والی اس اندھا دھند فائرنگ میں ریوالور سے لے کر "ایم جی" جیسی وزنی گن تک تمام ہتھیار استعمال ہوئے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے تو "فوجی جنگ" کا سا منظر نظر آنے لگا تھا۔ اس فائرنگ میں تین اونٹ بھی ہلاک ہوئے تھے، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں سے دو اونٹ ہمارے اور ایک شیخ عشارب کا تھا۔ اپنے دو زخمی اونٹوں کو تھوڑی دیر بعد عشارب کے ساتھیوں نے خود گولی مار دی تھی۔

فائرنگ تھمی تو ہمیں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا خیال آیا۔ ہم جن چٹانوں میں چھپے تھے گو کہ وہ بالکل محفوظ تھیں لیکن آگ کی طرح تپی ہوئی تھیں۔ انہیں ہاتھ سے چھونا بھی دشوار تھا۔ شیخ عاصم نے کہا "کسی سایہ دار جگہ کی تلاش ہونی چاہیے۔"

یاسر اور میں کسی بہتر جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر جھکنے لگے۔ تاہم اس دوران میں ہم نے یہ دھیان بھی رکھا ہوا تھا کہ کہیں مد مقابل رائفلوں سے چلنے والی گولیاں ہمارا مزاج نہ پوچھ لیں۔ ایک کھوہ کارآمد دکھائی دی۔ میں اور یاسر سرکتے رکتے گئے۔ کھوہ کا مستطیل دہانہ قریباً آٹھ فٹ چوڑا تھا اور تین چار فٹ کے لگ بھگ اونچا۔ یاسر اپنے تجربے کی روشنی میں بولا "ایسے غار اندر سے عموماً کافی کشادہ اور ٹھنڈے ہوتے ہیں۔" اس نے اپنے کٹ بیگ میں سے ٹارچ نکال کر روشن کی اور غار میں گھس گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

غار اندر سے شاندار تھا۔ کچھ آگے جا کر اس کی چھت بلند ہو گئی تھی اور وہ کافی کشادہ بھی ہو گیا تھا۔ غار میں حشرات الارض موجود تھے اور جالے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ تاہم صفائی کر کے یہاں نہ صرف پناہ لی جا سکتی تھی بلکہ گرمی کی بے پناہ شدت سے بھی محفوظ رہا جا سکتا تھا۔

غار دیکھ کر میں اور یاسر واپس پلٹے اور شیخ عاصم کو آگاہ کیا۔ باہمی مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ بے پناہ گرمی سے بچنے کے لیے کچھ افراد غار میں پناہ لے لیں جبکہ باقی اونچی چٹانوں کے سائے میں اپنی پوزیشن سنبھالے رکھیں۔ جتنا خون خرابہ یہاں ہو چکا تھا اس کے بعد اب کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ جس طرح شیخ عشارب اور اس کے ساتھیوں نے پہلے اچانک حملہ کیا ہے اس طرح ایک بار پھر نتائج سے بے پروا ہو کر اندھا دھند ہم پر چڑھ دوڑیں۔ لہٰذا ہمارا مکمل طور پر چوکس رہنا اشد ضروری تھا۔

شام تک عشارب اور اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ ان میں سے کچھ تو ٹیلوں اور پتھروں کی اوٹ میں ہو گئے تھے، کچھ نے جیپوں کے عقب میں محفوظ پناہ لے لی تھی۔ ان کے تیور بدستور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ عاصم اور عشارب کے درمیان کس نوعیت کی بات ہوئی تھی کہ دونوں فریق آگ بگولا ہو گئے تھے اور پھر پلک جھپکنے میں دونوں طرف سے لاشیں گر گئی تھیں۔

عشارب نے شیخ عاصم سے جو سوالات کیے تھے ان سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ شنکر ان کے ساتھ نہیں ہے بلکہ امیرزادوں کے قتل کے بعد ابھی تک شنکر سے ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ از خود اپنے (مرزوم) ساتھیوں اور شنکر وغیرہ کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ غالباً انہوں نے شیخ سالم اور شنکر وغیرہ کی صحرا سے واپسی کا طویل انتظار کیا تھا اور پھر بے قرار ہو کر ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ شیخ عشارب اور اس کے ساتھی صحرا میں ہماری دائیں جانب سے نمودار ہوئے تھے، ان کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف تھا جبکہ اصولی طور پر یہ رخ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف ہونا چاہیے تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ بے سمت سفر کر رہے تھے۔ غالباً یوں ہی صحرا میں بھٹک رہے تھے، انہیں اپنی منزل کا علم تھا اور نہ رخ کا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ یونہی صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے ان کی ملاقات سالم اور دیگر امیرزادوں سے ہو جائے گی۔

دن بھر کی وحشت ناک گرمی کے بعد شام کو حسب معمول خوشگوار خنکی محسوس ہونے لگی۔ میں نے غار میں جا کر دیکھا، عاصم کے کارندوں نے اسے شیشے کی طرح صاف کر دیا تھا۔ غار کے کسی حصے سے ہوا بھی اندر داخل ہوتی تھی جس کی وجہ سے اندرونی حصہ قدرے ٹھنڈا رہتا تھا۔ غزالہ بچے کے ساتھ ایک گوشے میں موجود تھی لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ غار کے اس حصے میں ایک پردہ لٹکا کر اسے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس پردے کی دوسری جانب صرف عاصم جا سکتا تھا۔ وہ جو ایک روز پہلے تک میرے ساتھ کمرے میں تنہا ہوتی تھی، اتنا پاس ہوتی تھی کہ اس کی سانس بھی مجھے سنائی دیتی تھی، اب میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

شام کے بعد غار میں دو مشعلیں جلا دی گئیں جن سے خاصی روشنی ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہو رہی تھی اور یہ دھڑکا کہ ابھی کسی وقت عشارب اور اس کے ساتھی ہم پر ہلہ بول دیں گے، قدرے کم ہو گیا تھا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سب نے کفایت شعاری سے پانی پیا۔ کھانے کے بعد شیخ عاصم میرے ساتھ غار کے دہانے پر آ بیٹھا۔ ہم دونوں کے ہاتھ میں رائفلیں موجود تھیں۔ شیخ عاصم کے چہرے پر کرب کے آثار تھے، دراصل دوپہر کو ہونے والی لڑائی میں عاصم پوزیشن لینے کے لیے دوڑا تھا تو ایک پتھر کی ملائم سطح سے پھسل گیا تھا۔ اس کی کمر کے لیے ایسے جھٹکے بڑے تکلیف دہ ثابت ہوتے تھے۔

میں نے پوچھا "اب کیا حال ہے تمہارا؟"

وہ مسکرایا "حال تو ڈاکٹر کو معلوم ہو گا، مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ درد ہو رہا ہے۔"

"ڈاکٹر؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی غزالہ اور کون۔ اسی کا مستقل مریض ہوں میں۔"

واقعی ان لمحوں میں میرے ذہن سے غزالہ اور اس کی ڈاکٹری بالکل نکلی ہوئی تھی۔ عاصم سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "بہت فکر مند ہو جاتی ہے، دوپہر کو تو رونے کے قریب تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آپ کی تکلیف نے تو مجھے بھی بیمار کر دیا ہے۔ حالانکہ خود ہلکا سا بخار تھا اسے، پھر بھی میری کمر کے نخرے اٹھانے میں لگی رہی۔ دو انجکشن لگائے، پھر ایک گھنٹا مالش کرتی رہی۔ میں نے کہا، تمہیں بخار ہے اور تم میری مٹھی چاپی میں لگی ہوئی ہو۔ بس ایسی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی ہے۔"

میں نے کہا "تم ایک خوش قسمت شخص ہو کہ تمہاری زبان اپنی بیوی کی تعریفیں کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ ایسے

شوہر بہت کم ہوتے ہیں۔"

"ایسی بیویاں بھی تو کم ہوتی ہیں۔ سچ بتاؤ شاہ جہاں! غزالہ کی خوبیوں کا اگر میں ذکر کرتا ہوں تو کیا غلط بیانی کرتا ہوں۔ تم بھی تو اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ تم ہی بتاؤ کیا اس کے قریب رہنے والا کوئی شخص ان خوبیوں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے؟"

میں نے کہا "تم اس کے شوہر ہو، جتنی اچھی طرح تم اسے جانتے ہو کوئی اور نہیں جان سکتا۔"

"لیکن تم بھی تو اسے سمجھتے ہو۔ اس کے قریب رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

اس نے ایک دم بات بدلی "میرا مطلب ہے کہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے تم اس صحرا میں ہو اور اس کے قریب رہے ہو۔"

میں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عاصم بات سے بات نکالے گا اور ایسی گفتگو جاری رکھے گا جس کا مقصد مجھے ذہنی اذیت پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کئی بار مجھ سے یہ کھیل کھیل چکا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پھر مجھ سے سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ کی ہر ہر تفصیل جاننا چاہ رہا تھا۔ اس تفصیل میں سے اس کی خصوصی توجہ میرے اور غزالہ کے شب و روز پر تھی۔ ہم کتنے دن کہاں رہے؟ کس جگہ رہے؟ رات کو کہاں سوتے رہے، کھانا اکٹھے کھاتے رہے یا الگ؟ تنہائی میں ہم باتیں کرتے تھے یا خاموش رہتے تھے، اگر باتیں ہوتی تھیں تو کس طرح کی ہوتی تھیں۔ عاصم کا ذکر ہوتا تھا یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس تفتیش کے دوران میں شیخ عاصم نے کئی ایسے بھونڈے سوال کیے کہ جی چاہا اس کے منہ پر تھپڑ دے ماروں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ پختہ عمر کا ایک جہاں دیدہ شخص ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میں رقابت کے مارے ہوئے کسی کالج اسٹوڈنٹ سے باتیں کر رہا ہوں۔ ایک طرف وہ مجھے غزالہ کی والہانہ محبت اور شوہر پرستی کی باتیں سناتا تھا اور دوسری طرف شکی مزاج شوہروں جیسے اوچھے سوالات کر کے اپنی کم ظرفی کا ثبوت فراہم کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ مجھے ایک دم ایب نارمل لگنے لگتا تھا۔ ایسا شخص جس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔ اس نقاب کے پیچھے ایک بالکل اجنبی چہرہ موجود تھا۔

جب اس نے میرے چہرے پر سخت بے زاری کے آثار دیکھے تو ایک دم گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "میں نے غزالہ کو بہت اداس محسوس کیا ہے۔ کیا تم نے بھی یہ تبدیلی دیکھی ہے؟" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی بولا "میرا خیال ہے کہ سلطانہ کی موت کا اس کے ذہن پر گہرا اثر ہے۔ دن میں وہ تین چار بار مجھ سے اس کا ذکر کر چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سلطانہ نے اس کی طرف آنے والی موت کو اپنے گلے لگایا تھا۔ وہ اپنی جان قربان کر کے ہمیشہ کے لیے اس کے دل پر ایک نہ مٹنے والا بوجھ رکھ گئی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے کہا "سلطانہ نے ایک یادگار مثال قائم کی ہے۔ میں اس سارے واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں مجبور تھا، کال کوٹھڑی میں سے صرف دیکھ سکتا تھا، کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ شنکر، غزالہ کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہ نشے میں چور تھا اور کسی منت سماجت کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ آخری حربے کے طور پر سلطانہ نے شنکر اور اس کے ساتھی پر حملہ کیا۔ شنکر یہ دلیری کہاں برداشت کرتا، وہ غزالہ کو نظر انداز کر کے سلطانہ کے پیچھے پڑ گیا اور گھسیٹتا ہوا اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اگلی صبح اس کی برہنہ لاش چھت کے پنکھے سے الٹی لٹکی ہوئی تھی اور اس کی معصوم بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔"

"شنکر اور عشارب کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔" عاصم نے گمبھیر لہجے میں کہا "شنکر کا انجام تو میں اور عبرت ناک بناؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

اچانک "تڑ تڑ" کی آواز گونجی۔ میں اور عاصم دونوں چونک گئے۔ یہ برین گن کا برسٹ تھا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید عشارب کے ساتھیوں نے کسی اور زخمی اونٹ کو ہلاک کیا ہے لیکن جب ایک دم اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی تو پتا چلا کہ عشارب کے ساتھیوں نے ایک بار پھر بھرپور حملہ کر دیا ہے۔ میں اور عاصم بھی لپک کر اپنی پوزیشنوں پر آ گئے۔ ہم نے رائفلیں کندھوں سے لگائیں اور جوابی فائر کرنے لگے۔ عشارب اور اس کے ساتھیوں کی "فائر پاور" بہت زیادہ تھی۔ گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح آ رہی تھیں۔ پگھلا ہوا سیسہ جب چٹانوں سے ٹکراتا تھا چنگاریاں چھوٹتی تھیں۔ رائفل، ریپیٹر، خودکار رائفل، ایم جی۔ غرض ہر قسم کا فائر ہو رہا تھا۔ بالفاظ دیگر اگر کمی تو آر ٹلری کی تھی۔ فائرنگ شروع ہونے کے فوراً بعد غار میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی۔ عاصم کے خوابیدہ اور نیم خوابیدہ ساتھی رائفلیں پکڑے باہر آ گئے تھے اور پوزیشنیں سنبھال کر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ عشارب اور اس کے ساتھی پر

جوش میں دکھائی دیتے تھے، ان کے للکارے اتنے بلند تھے کہ فائرنگ کے شور کے باوجود سنائی دے رہے تھے۔ ایکا ایکی مجھے اندازہ ہوا کہ دائیں جانب سے وہ لوگ آگے بڑھ رہے ہیں۔ پھر ایک ساعت شکن دھماکہ ہوا۔ چمک سے غار کا دہانہ اور آس پاس کی جگہ روشن ہو گئی۔ پتھر کے بہت سے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہمارے ارد گرد گرے۔ یقیناً مخالف فریق کی طرف سے راکٹ لانچر استعمال کیا گیا تھا۔ جہاں راکٹ لگا تھا وہاں عاصم کے دو ساتھیوں کے بے حرکت جسم پڑے تھے۔ عاصم کے باقی ساتھی پوزیشنیں چھوڑ کر پیچھے بھاگے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر شکست خوردگی کے آثار تھے، یہ بڑے نازک لمحے تھے، اگر بھرپور مزاحمت نہ کی جاتی تو پلک جھپکنے میں عشارب کے ساتھی پوری طرح چھا جاتے۔

میں نے عاصم کے ساتھیوں کو پکارا اور انہیں ایک بڑی چٹان کے پیچھے جم جانے کا حکم دیا۔ عاصم نے بھی چیخ پکار کر کے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس چٹان کی اوٹ سے ہم نے آگے بڑھنے والے افراد پر زبردست فائرنگ کی۔ میرے اندازے کے مطابق ایک منٹ میں قریباً ایک ہزار راؤنڈ تو فائر ہوئے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آگے بڑھنے والے اپنی چٹانوں کی اوٹ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اسی دوران میں صفدر نے غار کے اندر سے لکڑی کا وہ بڑا ڈبا اٹھا لیا تھا جس میں دستی بم موجود تھے۔ اگر ہم پر دوبارہ راکٹ فائر کیا جاتا تو ہم یہ دستی بم استعمال کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہ صرف یہ کہ دوبارہ راکٹ نہیں چلایا گیا بلکہ فائرنگ بھی بتدریج تھم گئی۔ اس زوردار جھڑپ کے بعد یہ ہوا کہ شیخ عشارب اور اس کے ساتھی کچھ مزید آگے آ گئے۔ اب غار کے دہانے سے ان کا فاصلہ بمشکل پچاس گز تھا۔ اس جھڑپ میں ہمارے دو زخمی ہلاک ہوئے۔ دو افراد راکٹ کے ٹکڑے لگنے سے زخمی بھی ہوئے۔ جیسا کہ بعد ازاں پتا چلا، اس زوردار فائرنگ میں عشارب کا صرف ایک کارندہ زخمی ہوا تھا۔

زخمی ہونے والے افراد کو غار میں لایا گیا۔ شیخ عاصم بلند بخت نے سفری بیگ میں پوری ڈسپنسری بند کر کے ساتھ لے رکھی تھی۔ غزالہ نے اپنے ہاتھ سے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ بلند بخت کے چہرے پر اسے دس بارہ ٹانکے لگانا پڑے۔

وہ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صفدر کے پلستر شدہ بازو میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا، وہ بھی ساری رات جاگتا رہا اور دل کی کیفیت سے دھیان ہٹانے کے لیے بھوپال کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں صورت حال پُراسرار ہے۔ اگلا روز پھر اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ سر پر تھا۔ بہت تناؤ کی کیفیت تھی، صورت حال گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے عاصم سے کہا کہ "خون ریزی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ یہ معاملہ بات چیت سے طے کرنے کی کوشش کی جائے۔ عشارب کا یہ خیال غلط ہے کہ شنکر اور اس کے ساتھی ہمارے پاس ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہر طرح اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔"

عاصم غرایا "وہ حرام زادہ دلیل اور منطق کی زبان نہیں سمجھتا صرف طاقت کو سجدہ کرتا ہے۔"

عشارب کا نام آتے ہی عاصم کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کل ان دونوں کے درمیان خاصی تلخ گفتگو ہوئی ہے... لیکن اس گفتگو کے بارے میں عاصم نے مجھے بہت تھوڑا بتایا تھا۔ اس نازک صورت حال میں بھی عاصم مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے عشارب اور اس کے مسلح ساتھیوں نے ہمارے گرد گھیرا کچھ اور تنگ کر دیا۔ وہ گاہے گاہے بلند آواز میں ہمیں للکار بھی رہے تھے۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، ناظم عبداللہ نے مجھے بتایا کہ وہ ننگی گالیاں دے رہے ہیں۔ عاصم اب کافی دبا دبا نظر آ رہا تھا۔ دیگر افراد کی طرح یقیناً وہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ عشارب کا پلڑا بھاری ہے۔ دور مغربی افق پر جہاں جلتا ہوا صحرا اور آسمان مل رہے تھے، سورج ایک بڑے سرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا۔ شام ہونے والی تھی۔ میں اور صفدر محویت سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، ایکا ایک مجھے یوں لگا جیسے کسی بادل نے سورج کو ڈھانپ لیا ہے۔ لیکن بادل تو آس پاس کہیں نہیں تھا۔ شاید یہ کوئی گرد باد یا صحرائی بگولا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گرد باد پھیل گیا اور آسمان کا ایک حصہ ڈھکا ہوا نظر آنے لگا۔ میرے ساتھ ساتھ اب کئی اور افراد بھی اس منظر کو محویت سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے قریب خاموش کھڑا ایک ادھیڑ عمر عرب حلق کی پوری قوت سے چلایا اور غار کی طرف بھاگا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی کئی افراد اندھا دھند غار کی طرف لپکے۔ وہ بادل جو کچھ دیر پہلے بہت فاصلے پر نظر آ رہا تھا اب ایک دم بہت قریب آ گیا تھا، بادل کیسا بھی ہو، اتنا سریع الحرکت تو نہیں ہوتا۔ پھر میرے ذہن میں ایک لفظ پوری شدت سے گونجا اور میں سرتاپا لرز گیا۔ کہیں یہ "ٹڈی دل" تو نہیں تھا۔

اب عاصم اور ریاض عرف غبرہ بھی سینے کی پوری قوت سے چیخ رہے تھے اور ساتھیوں کو غار میں پناہ لینے کی ہدایات دے رہے تھے۔ جو سامان غار سے باہر بکھرا پڑا تھا وہ ہم نے افرا

تنزی میں سمٹا اور غار میں گھس گئے۔ "یہ ٹڈی دل ہے" عاصم نے خوف سے لرزاں آواز میں چیخ کر مجھے بتایا۔ غار میں اندر کی طرف ایک بڑا پتھر موجود تھا۔ رات کو ہم نے یہ پتھر لڑھکایا تھا اور غار کا دہانہ بند کر دیا تھا۔ عاصم اور یاسر کی ہدایت پر ایک بار پھر سب نے مل کر اس پتھر کو حرکت دی اور غار کا دہانہ بند کر دیا۔ جو تھوڑی بہت درزیں رہ گئیں ان میں کپڑے ٹھونس دیے گئے۔ غار میں ہر چہرے پر دہشت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اور صفدر اس خطرے سے ناواقف تھے تاہم اپنے ساتھیوں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ واقعی خوف کھانے کا مقام ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ غار سے باہر شیخ عشارب اور اس کے ساتھی کس حال میں ہیں اور اپنی حفاظت کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ اچانک غار کے دہانے سے باہر چیخ و پکار سنائی دی۔ یہ چیخ و پکار پندرہ بیس گز کی دوری سے آرہی تھی۔ میں نے پہچان لیا اور میرے علاوہ بھی یقیناً بہت سے لوگوں نے پہچان لیا کہ ابی باقر کی آواز تھی۔ ابی باقر یاسر کے مہم جو ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ دوپہر کے وقت ابی باقر کے پاؤں پر گولی لگی تھی اور اندر ہی پھنس گئی تھی۔ غزالہ نے اس کے گھٹنے پر کٹ دے کر یہ گولی نکالی تھی اور مرہم پٹی کر دی تھی۔ غزالہ نے اسے درد کش اور خواب آور دوا بھی دی تھی۔ غالباً خواب آور دوا کے زیر اثر ہی وہ دہانے سے کچھ فاصلے پر سو رہا تھا۔ ایک ہموار چٹان اس کا بستر تھا۔ افراتفری میں سب اندر گھس آئے تھے اور ابی باقر، جو خود سے چل بھی نہیں سکتا تھا، وہیں پڑا رہ گیا تھا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے شیخ عاصم کی طرف دیکھا، شیخ عاصم نے سوالیہ نظروں سے یاسر کی طرف دیکھا۔ عاصم کی طرح یاسر کے چہرے پر بھی دہشت منجمد تھی۔ عاصم خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر۔۔۔ اگر اس کی قسمت ہو گی تو بچ جائے گا۔"

غار کے دہانے سے باہر ابی باقر کی چیخیں لرزہ خیز ہوتی چلی جارہی تھیں۔ وہ عربی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یقیناً منت سماجت ہی کر رہا تھا۔ میں نے کہا "عاصم! وہ ہمارا ساتھی ہے۔ ہمارے ساتھ مل کر لڑتے ہوئے زخمی ہوا ہے، ہمیں اسے یوں بے آسرا نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"میرے خیال میں یہ بے وقوفی ہو گی۔ ایک شخص کے لیے ہم سب اپنی جان خطرے میں ڈال لیں گے۔"

"مگر ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔ ہم پتھر کو پیچھے ہٹا کر تھوڑا سا راستہ پیدا کریں۔ دیکھیں تو سہی کہ وہ کس حال میں ہے۔"

"اگر مکڑیاں اندر آگئیں تو سب کو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

چند سیکنڈ تک میرے اور عاصم کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا پھر عاصم قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے یاسر کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر زور لگایا۔ پتھر سرک گیا اور اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ ایک شخص باہر نکل سکے۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر نکل گیا۔ ابی باقر خود کو گھسیٹتا ہوا قریباً بیس پچیس فٹ کی دوری پر آچکا تھا۔ غار وہ گرا ہی تھا۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ عجیب وقت تھا جب میں نے ٹڈی دل کو دیکھا۔ خدا کی پناہ یہ نظارہ ناقابل فراموش تھا۔ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا لیکن اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ زردی مائل ٹڈیوں کے ایک بہت بڑے بادل نے پورے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ ارد گرد کے پتھر اور نشیب و فراز بالکل زرد نظر آرہے تھے۔ ایک لرزہ خیز بھنبھناہٹ تھی جو ایک گونج کے ساتھ ہر طرف پھیل رہی تھی۔ یہ گونج ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک ٹڈی جس کی جسامت درمیانے سائز کے مینڈک سے کچھ ہی کم ہو گی پٹاخ کی آواز سے میری گردن کے سامنے والے حصے سے چپک گئی۔ میں نے اسے نوچ کر پھینکا اور نیچے جھک کر ابی باقر کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ ابی باقر چیخ رہا تھا۔ دراصل دو تین مکڑیاں اسے بھی چپکی ہوئی تھیں۔ حتی الامکان تیزی سے میں واپس غار کے دہانے پر پہنچا۔ شاید مجھے چند لمحوں کی تاخیر ہو جاتی تو غار میں موجود افراد خود کو مکڑیوں کی یورش سے بچانے کے لیے دہانہ بند کر دیتے۔ میں جونہی اندر گھسا، یاسر کے ساتھیوں نے (جو پہلے ہی پتھر پر ہاتھ دھرے کھڑے تھے) زور لگا کر پتھر کو حرکت دی اور دہانہ بند کر دیا۔ دہانے کی درزوں کو کپڑے سے بند کرتے کرتے بھی تین چار مکڑیاں فراٹے سے اندر آگئیں۔ غار میں موجود افراد نے چند لمحوں کے اندر انہیں تلف کر دیا۔ دو مکڑیاں ابھی تک ابی باقر کی گردن سے پیوست تھیں۔ صفدر نے انہیں نوچ کر کھینچا اور مسل دیا۔ یہ بد وضع مکڑیاں بالکل اسی شکل و صورت کی تھیں جیسی میں نے کچھ روز پہلے بستی میں دیکھی تھیں۔ ان کے سر کے قریب سیاہ دھبے نظر آتے تھے۔ جہاں سے انہیں علیحدہ کیا گیا تھا وہاں ابی باقر کی گردن پر سرخ نشان نظر آرہے تھے اور خون رس رہا تھا۔ ابی باقر سسکیاں لے رہا تھا۔ نہیں کہہ سکتا یہ جان بچنے کی خوشی تھی یا پھر ان آنسوؤں کا سبب جسمانی تکلیف تھی جو اسے اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے پاؤں پر لپٹی ہوئی سفید پٹی خون سے رنگین ہو چکی تھی اور چہرہ

لہولہان تھا۔ غزالہ پردے کی اوٹ سے نکلی اور عاصم کی ہدایت پر ابی باقر کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔

غار کا دہانہ مکمل طور پر بند تھا، چھوٹی سی درز بھی نظر نہیں آرہی تھی پھر بھی ہر چہرہ دہشت کی آماجگاہ تھا۔ میرے ذہن میں ایک وسوسہ بار بار ابھر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ غار میں کسی طرف سے ہوا داخل ہوتی ہے جس کے سبب غار کی اندرونی فضا ٹھنڈی رہتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ غار کے دوسرے سرے پر کوئی رخنہ وغیرہ موجود ہے، اگر ایسا تھا تو یہ رخنہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ غار بہت طویل تھا اور آگے جا کر تنگ ہو جاتا تھا۔ میں کل رات کچھ فاصلے تک گیا تھا مگر پھر واپس آگیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ غار کو ہوا مہیا کرنے والا راستہ کہیں ہمارے لیے کسی مصیبت کا باعث نہ بن جائے۔ بہرحال میں نے اپنا اندیشہ اپنے تک رکھا اور دوسروں کی پریشانی میں اضافہ نہیں کیا۔

اچانک غار کے بالکل قریب سے کچھ بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی کی مدھم چیخ بھی ابھری۔ چند لمحے بعد پھر سناٹا چھا گیا۔

عاصم نے کہا "میرا خیال ہے کہ عشارب اور اس کے بدبخت ساتھی پناہ کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔"

"بہت سے تو جیپوں میں گھس گئے ہوں گے۔" یاسر نے کہا۔

"جیپوں میں نہیں گھس سکتے۔" میں نے کہا "ایک آدھ گاڑی کے سوا سب کے شیشے ٹوٹ چکے ہیں۔"

قریباً بیس منٹ تک ہم سب غار میں دم سادھے بیٹھے رہے۔ اس دوران میں مجھے ہر لحظہ دھڑکا لگا رہا کہ غار کے کسی نادیدہ راستے سے مکڑیاں اندر آجائیں گی، بہر طور خیریت گزری۔ غزالہ ایک گوشے میں گم صم بیٹھی تھی۔ بچہ اس کی گود میں تھا اور اپنی گول گول معصوم آنکھوں سے ایک ایک کی صورت تک رہا تھا۔ ماحول کے اثر سے وہ بھی سہما ہوا تھا۔ ایک دو بار میری اور غزالہ کی نگاہ ملی لیکن ہم نے کوئی بات نہیں کی۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد شیخ عاصم دہانے کی طرف بڑھا، اس نے ایک درز میں گھسایا جانے والا کپڑا با آہستگی نکالا۔ ایک مکڑی گولی کی رفتار سے اندر آئی اور دیواروں سے ٹکرانے لگی، ایک اور مکڑی اندر گھسنا چاہ رہی تھی لیکن عاصم نے اسے کپڑے سے ہی مسل ڈالا اور کپڑا دوبارہ درز میں ٹھونس دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اندر گھسنے والی مکڑی کو بھی مار دیا گیا۔ کپڑا ہٹانے سے اندازہ ہوا تھا کہ ٹڈی دل ابھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ یا پھر یہ دو حصوں میں تھا، ایک تو آگے نکل گیا تھا، دوسرا اب گزر رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ تک مزید انتظار کرنے کے بعد جب دوبارہ کپڑا ہٹایا گیا تو مطلع صاف نظر آیا۔ احتیاط سے پتھر کو سرکایا گیا۔ صرف ایک آدمی کی جگہ بنا کر ہم یکے بعد دیگرے باہر نکلے۔ چاروں طرف اب گہرا اندھیرا تھا۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں اور ہم بالکل چوکس تھے۔ ارد گرد سناٹا تھا۔ میں اس نامانوس سناٹے پر غور کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ میرے ہاتھ میں مشعل تھی، ایسی ہی مشعلیں تین چار دیگر افراد نے بھی تھام رکھی تھیں۔ عاصم کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹارچ تھی۔ قدرے بلندی پر پہنچ کر ہم نے احتیاط سے عشارب اور اس کے ساتھیوں کی پوزیشنوں کی طرف دیکھا، وہاں گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ بہرحال احتیاط ضروری تھی، ہم کچھ دیر پتھروں کی اوٹ سے نشیب کا جائزہ لیتے رہے پھر نیچے اتر آئے۔ شیخ عشارب کا پڑاؤ بکھر چکا تھا۔ کچھ خیمے گر چکے تھے، کچھ خالی پڑے تھے۔ خیموں کے قریب ہی ایک جیپ الٹی ہوئی تھی، اس کے نیچے دو افراد کی لاشیں دبی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ واقعہ صرف آدھ پون گھنٹا پہلے پیش آیا ہے۔ ہماری جیپوں میں سے تین ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔ باقی منظر سے غائب تھیں۔ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر چٹانوں کے قریب ایک اونٹ کی لاش نظر آئی۔ مکڑیوں نے اس اونٹ کو بری طرح بھنبھوڑا تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے سرخ نشان نظر آرہے تھے۔ مکڑیوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں اونٹ بلندی سے لڑھکا تھا اور پتھریلی زمین پر گر کر مر گیا تھا۔ یقیناً جیپ کے الٹنے کی وجہ بھی افراتفری اور بدحواسی ہی تھی۔ قریب ہی سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ شیخ عاصم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ یہ شیخ عشارب کا ساتھی تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر گہرے زخم نظر آرہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس کی دونوں ٹانگوں میں فریکچر تھا۔ اس شخص نے ہاتھ میں رائفل پکڑ رکھی تھی اور خوف زدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مکڑیوں کی یورش سے لہولہان تھے لیکن چہرہ اور باقی جسم بچا ہوا تھا۔ جسم لباس کے سبب بچا تھا اور چہرہ اس وجہ سے بچا تھا کہ اس نے اپنے عمامے کو بڑی مضبوطی سے اپنے منہ اور سر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

رائفل اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ رائفل چلا نہیں سکے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر رائفل اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس نے عربی میں جو کچھ

عاصم کو بتایا اس سے اندازہ ہوا کہ تھوڑے فاصلے پر الٹی ہوئی جیپ دراصل اسی شخص سے ٹکرا کر الٹی تھی۔ اس کی ٹانگیں جیپ کی ٹکر سے زخمی ہوئی تھیں۔ شیخ عاصم کے مسلح کارندوں نے اس شخص کو تحویل میں لے لیا۔ تین جیپیں جو ہمیں واپس ملیں گو کہ ان کی کھڑکیاں وغیرہ ٹوٹ چکی تھیں لیکن وہ چلنے کے قابل تھیں۔ ان جیپوں میں نہ صرف پانی کے چند کین جوں کے توں پڑے تھے بلکہ ہماری پانچ چھ رائفلیں بھی موجود تھیں۔ صرف ایک جیپ کے دو پہیوں میں گولیوں کے سوراخ تھے۔ ان پہیوں کو عاصم کے کارندوں نے پانچ دس منٹ میں بدل دیا۔

اسی دوران میں عاصم کے تین ساتھی چادر میں لپٹی ہوئی کوئی شے اٹھا کر لائے' یہ بھی عشارب کے ایک ساتھی کی لاش تھی۔ ٹڈیوں نے اس کا حشر کیا تھا اور وہ زندگی بچانے کی دیوانہ وار کوشش میں بلندی سے کھائی میں گر کر ہلاک ہوگیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ وہی شخص ہو جس کی چیخیں ہمیں غار کے قریب سنائی دی تھیں۔ اس شخص کی جدید رائفل اور پانی کی بوتل بھی دو تین پتھروں میں پڑی مل گئی تھی۔

معلوم نہیں تھا کہ ٹڈی دل کے حملے کے دوران میں اس جگہ کیا قیامت برپا ہوئی تھی۔ بس آثار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جو ہوا ہے بہت برا ہوا ہے۔ جان بچانے کے فطری عمل کے تحت عشارب اور اس کے ساتھی جدھر منہ اٹھا تھا' بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے کوچ کرنے کے لیے ہمارے پاس یہ بہترین موقع تھا۔ عاصم بھی اس موقع کی اہمیت سمجھتا تھا' اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور فوری روانگی کا حکم دیا۔ عشارب کے اچانک حملے کے وقت جو پانچ اونٹ ہم کھینچ کر اوپر غار کے قریب لے گئے تھے وہ ٹڈیوں کی یورش میں زخمی تو ہوئے تھے لیکن معجزاتی طور پر بچ گئے تھے۔ ہم انہیں کھینچ کر نیچے لے آئے' جیپوں کو اسٹارٹ کیا گیا' اسی دوران میں یاسر اور اس کے ساتھی صحرا میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے چھ سات اونٹ مزید لے آئے۔ ان کے علاوہ دو تازی گھوڑے بھی تھے۔ یہ سب جانور ٹڈی دل کی زد میں آکر زخمی تو ہوئے تھے لیکن سفر کرنے کے قابل تھے۔

غار سے نکلنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اب سوار زیادہ تھے اور سواریوں کی کمی تھی۔ اس سلسلے میں ایڈجسٹمنٹ کی گئی۔ بہت سے افراد کو پیدل سفر کرنا پڑا۔ رات بھر ہم نے تاروں کی چھاؤں میں سفر جاری رکھا۔ نصف شب کے وقت ہمیں تین مزید اونٹ اور کافی مقدار میں پانی دستیاب ہوگیا۔ یہ اونٹ بھی عشارب کے قافلے کے تھے اور ٹڈی دل کے حملے کے بعد صحرا میں گھوم رہے تھے۔ ان اونٹوں کے ساتھ کوئی سوار نہیں تھا۔ نصف شب کے بعد شیخ عاصم نے اپنے ایک ساتھی کو جیپ سے اتارا اور مجھے زبردستی بٹھانے کی کوشش کی مگر میں نے انکار کیا۔ عاصم سمجھ گیا کہ میں صفدر کے بغیر نہیں بیٹھوں گا۔ آخر اس نے ایک جیپ میں صفدر کے لیے بھی جگہ پیدا کر اور مجھے کھینچ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا۔ اس جیپ میں عشارب کا وہ ساتھی بھی سوار تھا جس کی دونوں ٹانگوں پر جیپ کی ٹکر سے زخم آئے تھے۔ وہ اس قیامت کا چشم دید گواہ تھا جو ٹڈی دل کے حملے کے بعد عشارب اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹی تھی۔ وہ رقت آمیز انداز میں ٹڈی دل کا ماجرا بیان کر رہا تھا۔ وہ عربی میں بات کر رہا تھا' عبداللہ مجھے ترجمہ کرکے بتا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ خون آشام ٹڈیاں بھاری کنکروں کی طرح ہر شے سے ٹکرا رہی تھیں۔ بہت سے افراد زمین پر لیٹ گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے کچھ نے جیپوں کے نیچے اور پہیوں کے اندر پناہ لینے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ جن افراد نے موقع کی نزاکت جلدی محسوس کرلی تھی انہوں نے اپنے عبائے اور پگڑیاں وغیرہ اس طرح منہ سر سے لپیٹی تھیں کہ آنکھوں کے سوا کچھ عیاں نہیں رہا تھا۔ یہ افراد تو کافی حد تک محفوظ رہے تھے لیکن دیگر افراد کا حال برا ہوا تھا۔ ٹڈیوں نے نہ صرف ان کے چہرے لہولہان کیے تھے بلکہ گریبان کے ذریعے ان کے لباس میں بھی گھس گئی تھیں اور کاٹ کاٹ کر حشر کردیا تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی تھی' ہر شخص کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا لیکن ان ٹڈیوں پر یہ اسلحہ بیکار تھا۔ رائفل' مشین گن' دستی بم' راکٹ لانچر کوئی شے ان ٹڈیوں کو روک سکتی تھی اور نہ ان سے بچاؤ میں مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ طاقت اور اسلحے کے باوجود وہ لوگ قطعی بے بس تھے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' بھاگ نکلا اور بھاگتا چلا گیا۔

زخمی ہونے والے شخص کی روداد کافی طویل اور سنسنی خیز تھی۔ جس جس نے یہ روداد سنی اس کے دل میں ٹڈی دل کے حوالے سے موجود خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ یہ بات کم و بیش سبھی کو معلوم تھی کہ ٹڈی دل ایک بار گزر جانے کے بعد واپس نہیں آتا لیکن یاسر کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صحرا میں چکراتے ہوئے کسی ٹڈی دل سے ایک ہی قافلے کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔ یاسر کی بات نے ہر شخص کے ذہن میں سب معنی اندیشے جگا دیے اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں

میں بھی شامل تھا۔ ذہن بار بار اس کراہت آمیز بھنبھناہٹ کی طرف چلا جاتا تھا جو کل شام ہم نے غار کے دہانے سے باہر سنی تھی۔ نگاہ میں بار بار لاشوں کے وہ مناظر گھوم رہے تھے جو ٹڈی دل کی یلغار کے بعد ہم نے غار کے ارد گرد دیکھے تھے۔

صبح کے آٹھ نو بجے تک ہم نے مسلسل سفر جاری رکھا اور غار سے کم و بیش تیس میل آگے نکل آئے۔ نئے دن کا سورج پوری آب و تاب سے طلوع ہوچکا تھا۔ تاریکی میں لپٹا ہوا خاکستری صحرا پہلے روشن ہوا تھا اور اب روشن تر ہوتا جا رہا تھا۔ بالکل ہموار ریت کے ٹیلے تھے جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ بڑی نفاست اور نرمی نظر آتی تھی اس ہموار ملائم ریت میں۔ لیکن جب اسی ریت میں حرارت کا الاؤ جاگتا تھا تو یہ مسافر کے لیے جہنم بن جاتی تھی۔ ایک ایسا جہنم جس میں صرف پیاس اور موت کے ببول اگتے تھے۔ ایک جگہ چٹانوں کے سائے میں ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے میں بسکٹ' پنیر اور ڈبا بند دودھ تھا۔ لق و دق ویرانے میں بیٹھ کر ناشتا کرتے ہوئے یوں لگا جیسے ابوظہبی کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ناشتے کے یہ سارے لوازمات شیخ عاصم ابوظہبی سے لے کر چلا تھا' لوازمات اور آسائشیں تو اور بھی بہت سی تھیں لیکن تقریباً نصف سامان اونٹوں اور جیپوں کے ساتھ ہی صحرا میں تتر بتر ہوگیا تھا۔ میں اور صفدر چائے پی رہے تھے کہ ابی باتر لنگڑاتا ہوا ہمارے پاس آن بیٹھا۔ اس نے بڑے احترام سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا "یا اخی! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ جب سارے مجھے چھوڑ چکے تھے' آپ نے یاد رکھا اور مجھے موت کے منہ سے نکال لیا۔ آپ نے مجھے دوسری زندگی دی ہے اخی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ وہ بولا "جب میں اندھے منہ پتھروں پر گرا اور ٹڈیاں پتھروں کی طرح میرے جسم سے ٹکرائیں تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میں نے سمجھا کہ یہی میری تقدیر ہے لیکن... لیکن اگر آپ بھی یہی سمجھ لیتے کہ یہی میری تقدیر ہے اور غار سے باہر نہ آتے تو پھر میری موت یقینی تھی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آدمی اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔"

میں نے کہا "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ تم ہمارے ہم سفر تھے' تمہیں بچانا ہمارا فرض تھا۔"

وہ رندھے لہجے میں بولا "اخی! زیادہ فرض تو ان کا تھا جو میرے ہم قوم تھے' میرے ساتھی تھے' جو مجھے یہاں لے کر آئے تھے لیکن انہوں نے میرے لیے راستہ بند کردیا اور مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔"

اسی دوران میں شیخ عاصم ہماری طرف چلا آیا اور ابی باتر بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگیا' شیخ عاصم نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا "ہمیں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے زور سے تالی بجائی' یہ ایک طرح سے کوچ کا اعلان تھا۔ سب لوگ اپنی جگہوں سے کھڑے ہوگئے۔ ایک بار پھر یہ تھکا ہارا قافلہ روانہ ہوگیا۔ درحقیقت یہ شیخ عشارب اور اس کے ساتھیوں کا خوف ہی تھا جو ہمیں مسلسل چلنے پر مجبور کر رہا تھا ورنہ بے آرامی نے سب کا برا حال کر رکھا تھا۔ خاص طور سے قافلے میں جو دو چار زخمی افراد تھے وہ سخت کرب کی کیفیت میں تھے۔ ان میں خود شیخ عاصم کو بھی شمار کیا جاسکتا تھا۔ وہ آرام دہ جیپ میں بیٹھا تھا لیکن ہچکولے تو وہاں بھی لگتے تھے کہیں کہیں جیپ پھنس جاتی تھی اور اسے دھکا لگا کر جھٹکے سے باہر لانا پڑتا تھا۔ ایسے میں عاصم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوجاتا تھا۔ قافلہ روانہ ہوا تو میں نے دور جنوب مغرب کی طرف دیکھا۔ میری نگاہِ تصور کے سامنے وہ صحرائی بستی آگئی جہاں میں نے کئی ہفتے گزارے تھے۔ میں نے سوچا کہ شارق اور الماجد بستی میں واپس پہنچ چکے ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ ان کی شادی کی خوشی میں کوئی بڑا جشن برپا ہونے والا ہو۔ میں وہ جشن اب کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ شارق و الماجد کے خوشی سے مخمور چہرے دیکھ سکتا تھا۔

سخت گرمی اور تھکن کے باوجود ہمارا سفر جاری رہا۔ یہ بہت اکتا دینے والی مسافت تھی۔ کوئی نیا منظر نہیں تھا' بس تپی ہوئی ریت کے ٹیلے تھے اور دھوپ میں جلی ہوئی کرخت چٹانیں تھیں لیکن یہ چٹانیں بھی بس کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ چٹانوں کی ہیئت ایسی عجیب و غریب ہوتی تھی کہ چند لمحوں کے لیے یکسانیت کی بے زاری ختم ہوجاتی تھی لیکن اس کے بعد پھر وہی بور ریت اور تھکن کا عذاب ہوتا تھا۔ میں عذاب اور اذیت کے لفظ محاورتاً استعمال نہیں کر رہا' صحرا کا مسلسل سفر حقیقتاً صبر آزما ہوتا ہے۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا' کسی طرف نگاہ نہیں اٹھ رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور چہرے گرد آلود۔ بس ساری توجہ جمع کرکے صرف سفر کاٹا جا رہا تھا۔

جیپ سوار افراد قدرے سکون میں تھے۔ شیشے وغیرہ ٹوٹ جانے سے ائرکنڈیشنر تو موثر نہیں رہے تھے پھر بھی پیدل چلنے اور شتر سواری سے جیپ کی سواری بدرجہا بہتر تھی۔ میری نظر جب بھی غزالہ کی طرف اٹھی میں نے اسے اپنی ہی

جانب دیکھتے پایا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ شیخ عاصم کی موجودگی کے باوجود وہ میری طرف متوجہ تھی، شاید اسے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ وہ جیپ میں تھی اور میں اور صفدر شتر سواری کرنے اور کبھی پیدل چلنے پر مجبور تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ میں نے جب بھی غزالہ کی طرف دیکھا، مجھے اپنے جسم میں سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے غزالہ کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت نظر آتی تھی۔ شاید غزالہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ ایک تقسیم شدہ عورت ہے۔ وہ ایک طرف اپنے شوہر کے لیے دل میں محبت بھرا گوشہ رکھتی ہے اور دوسری طرف میری محبت کو بھی دل سے نکال نہیں سکی لیکن میں جانتا تھا اس کشمکش کا فیصلہ جب بھی ہوا، شوہر کے حق میں ہی ہوگا۔ عاصم کو ہر لحاظ سے مجھ پر برتری حاصل تھی۔

شام کو ہم نے کھجور کے چند خشک درختوں کے قریب پڑاؤ کیا۔ تھکاوٹ اتنی زیادہ تھی کہ خیمے لگتے ہی جو جہاں گرا، وہاں سو گیا۔ نیند تو مجھے بھی بے تحاشا آ رہی تھی لیکن میں نے جاگتے رہنا مناسب سمجھا۔ ہم ابھی شیخ عشارب اور مذی دل کے خطرے سے بہت دور نہیں ہوئے تھے، اس کے علاوہ صحرا میں چکرانے والے لٹیروں کے خطرے کو مدنظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ شاید اس صحرا کی تنہا لٹیری نہیں تھی۔ اور بھی کئی راہزن ہو سکتے تھے۔ بچہ رو رہا تھا، غزالہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی، شیخ عاصم اس کے قریب ہی نیم دراز تھا اور اونگھ رہا تھا۔ غزالہ گاہے گاہے اچٹتی سی نگاہ مجھ پر بھی ڈال لیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

صفدر اور ابی باقر خیمے میں پاس پاس سوئے ہوئے تھے۔ صفدر اور ابی باقر میں خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ سفر کے دوران میں دونوں کے حصے میں ایک ہی اونٹنی آئی تھی۔ وہ راستہ بھر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے اور خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔ ابی باقر کا پاؤں اب پہلے سے بہتر تھا۔ وہ لکڑی کے سہارے چل لیتا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہی ابی باقر کی نگاہوں میں احسان مندی کے ایسے جذبات ابھرتے تھے کہ میں شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا، اور صرف ابی باقر ہی نہیں، شیخ عاصم کے اس قافلے میں نچلے طبقے کے جتنے بھی افراد تھے وہ مجھے احترام سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ شیخ عاصم کے قریبی آٹھ دس امیرزادوں کے علاوہ باقی تمام افراد کو معاوضے پر یہاں لایا گیا تھا، یاسر بھی ان میں شامل تھا۔

اس رات آخری پہر تک ہم نے آرام کیا اور صبح منہ اندھیرے پھر روانہ ہو گئے۔ قافلے میں موجود زخمی اور دیگر افراد کو غزالہ بڑی خوبی سے طبی امداد فراہم کر رہی تھی۔ کسی کو دوا کھلاتی نظر آتی تھی، کسی کو انجکشن لگا رہی ہوتی تھی۔ شیخ عاصم اپنے ساتھ جو ادویات لایا تھا وہ اس ویرانے میں بے حد کام آ رہی تھیں۔ قافلے میں تین قطب نما (COMPASS) موجود تھے، یہ قطب نما بتا رہے تھے کہ ہم شمال مغرب کی طرف جا رہے ہیں اور دو تین روز کے اندر اس صحرا سے نکل جائیں گے۔

رات کو ہم نے ایک قدرے بہتر جگہ پر پڑاؤ ڈالا۔ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا۔ یہاں ایک کنواں بھی موجود تھا۔ یہ بہت گہرا کنواں تھا۔ اس میں سے ایک طویل رسی اور "ڈبوکے" کے ذریعے پانی نکالا جا سکتا تھا۔ شام کے وقت یہاں کا ماحول بہت خوشگوار محسوس ہوا۔ چونکہ قافلے کے لیے اب خطرات کم ہو گئے تھے لہٰذا سب پرسکون نظر آ رہے تھے۔ کنوئیں سے پانی کھینچ کر سب نے منہ ہاتھ دھویا اور نسبتاً تر و تازہ نظر آنے لگے۔ شام کے کھانے کے بعد عاصم نے مجھے اپنے خیمے میں بلایا۔ وہ صرف ایک پتلون میں تھا، اس کا بالا جسم جو پہلے گینڈے کی طرح مضبوط نظر آتا تھا، بیماری کی وجہ سے قدرے کمزور پڑ چکا تھا۔ کہیں کہیں چربی ڈھلکی ہوئی نظر آتی تھی۔ غزالہ اس کی گردن کے پچھلے حصے پر کسی دوا کا مساج کر رہی تھی۔ وہ بڑے سکون سے پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ غزالہ کا یہ خدمت گاروں کا سا انداز مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ شیخ عاصم کی شریک حیات تھی لیکن اس کے سامنے دبی دبی اور کم فہم نظر آنے لگتی تھی۔ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک قابل اور معروف ڈاکٹر ہے۔

مجھے دیکھ کر اور میرے جذبات کو محسوس کر کے شیخ کی آنکھوں میں سرور کی کیفیت دکھائی دینے لگی۔ ایسا سرور جس میں تکبر کی جھلک بھی تھی۔ شاید شیخ عاصم شعوری یا لاشعوری طور پر چاہتا بھی یہی تھا۔ اس کی یہ دلی خواہش رہتی تھی کہ میں غزالہ کو کسی نہ کسی طور اس کے تصرف میں دیکھوں۔ شاید اس طرح وہ خود کو فاتح محسوس کرتا تھا اور اس کے جذبہ عداوت کی تسکین ہوتی تھی۔ ایسے لمحات میں مجھے یہ شخص سراپا قبائلی نظر آتا تھا۔

شیخ عاصم نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ بغیر کسی تمہید کے بولا "شاہ جہاں! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ لاہور میں جو کچھ ہوا تھا وہ بہت برا ہوا تھا۔ برات کا خالی ہاتھ واپس لوٹ آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میں اس سلسلے میں تمہیں ہی قصور وار نہیں ٹھہراتا، غلطیاں دونوں طرف سے ہوئیں۔

ذاتی طور سے میرے BEHALF پر جو کچھ شنکر نے کیا وہ کبھی ناقابل قبول تھا۔ بہرحال یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ انہیں چھیڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ میری پوزیشن میرے قبیلے کے حوالے سے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں مگر میں اس دباؤ کی بھرپور مزاحمت کر رہا ہوں۔ میں تم سے کسی بھی صورت میں ٹکراؤ نہیں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے تمام معاملات بات چیت کے ذریعے طے ہوں۔ اور اس کے لیے میں نے بات چیت کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور یہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ میں اس سلسلے میں کسی طرح کی عجلت کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا۔ ہمارے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے بہت وقت ہے۔"

میں نے کہا "عاصم! تم اس وقت اور اس ماحول میں یہ ذکر نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جس بات کا ذکر تم کر رہے ہو وہ کیا تھی۔ وہ طاقت کے نشے میں بدمست لوگوں کا ایک گروہ تھا جو میری بہن کو بزور بازو اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ خدا کا شکر کرو کہ تم اور وہ سب لوگ صحیح سلامت زندہ بچ کر واپس آ گئے۔ میرے بس میں ہوتا تو ان سب لوگوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیتا اور لاشوں کو آگ لگا دیتا۔"

عاصم نے اپنے اندرونی غضب پر قابو پاتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! میں جانتا ہوں تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہیں اپنے دوستوں اور ان کی بیویوں سے ہونے والی بدسلوکی کا غم ہے۔ تمہارا گلہ بجا لیکن تم جانتے ہو کہ اس کارروائی کا اصل ذمے دار شنکر ہی تھا۔ اس نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا۔"

"تم رات کو دن ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے تلخی میں عاصم کی بات کاٹی "میں جانتا ہوں کہ اس کارروائی میں شنکر کا حصہ کتنا تھا اور تمہارا کتنا۔"

گفتگو کا رخ دیکھ کر غزالہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولی "عاصم! آپ لوگ پرانی باتوں کو کیوں کرید رہے ہیں۔ جس بات کے لیے آپ نے انہیں بلایا تھا وہ کیوں نہیں کرتے۔"

عاصم نے سگار سلگایا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! تم سمجھو یا نہ سمجھو لیکن میں اب بھی ایک ایسی صورت حال کی تلاش میں ہوں جس میں ہم دونوں کی بہتری ہو۔ میرا ایک ہی خواب ہے، کسی طرح ہم دونوں کی تلخی ختم ہو جائے۔ بہرحال اس ذکر کو پھر کسی موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "اب کس "ذکر" کے لیے مجھے بلایا تھا؟"

میرے فقرے میں تلخی موجود تھی۔ اس تلخی کو بمشکل برداشت کرنے کے بعد شیخ عاصم نے کہا "دیکھو اب ہمارا سفر آخری مرحلے میں ہے۔ حالات ٹھیک رہے تو ہم دو تین روز تک ابو ظہبی پہنچ جائیں گے۔ تم نے آئندہ کا لائحہ عمل کیا سوچا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

عاصم بولا "میں تو اس تناؤ کی زندگی سے اکتا گیا ہوں۔ جو حالات پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں پیش آئے ہیں اس سے یہ تناؤ مزید بڑھ جائے گا۔ میں کچھ عرصے کے لیے بالکل کنارہ کش ہو جانا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جاپان کے ایک مضافاتی علاقے میں میری بڑی خوبصورت ذاتی رہائش گاہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خاموشی سے چند ماہ کے لیے وہاں منتقل ہو جاؤں۔ بلکہ اگر میرے دل کی بات پوچھتے ہو تو تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ ہمارے ساتھ جاپان چلو اور کچھ دن وہاں مکمل سکون کے ساتھ گزار دو۔ حالات کی اڑائی ہوئی یہ گرد دب جائے تو پھر واپس آ جانا۔ میں دل سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ پاکستان اور ابو ظہبی میں جتنے خطرات میرے لیے موجود ہیں شاید اتنے ہی تمہارے لیے بھی ہیں۔ شیخ عشارب اور اس کے ہم خیال کھلم کھلا دشمنی پر اتر آئے ہیں۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں دشمنی کی یہ آگ مزید پھیلے گی۔"

میں نے کہا "تمہارا مشورہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن میرے اپنے بھی کچھ مسائل ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، صفدر کئی ہفتوں سے مجھے دیوانہ وار تلاش کر رہا تھا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ میں جلد سے جلد اس کے ساتھ واپس جاؤں۔ انڈیا میں وی جی کلارک صاحب بہت بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیا واقعی یہ نوادرات والا چکر ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

"میں نے تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ جو معلوم تھا وہ تمہیں بتا دیا ہے۔"

غزالہ بڑی توجہ سے عاصم کی گردن کا مساج کرنے میں مصروف تھی لیکن ظاہر ہے وہ ساتھ ساتھ ہماری باتیں بھی سن رہی تھی۔ مساج کرتے ہوئے اس کی چوڑیاں کھنکتی تھیں تو خیمے میں موسیقی کی لہریں پیدا ہونے لگتی تھیں، میں کوشش کے باوجود اس موسیقی کو نظر انداز نہیں کر پا رہا تھا۔

عاصم نے سگار کا ایک طویل کش لے کر دھواں بے

پروائی سے میری اور غزالہ کی جانب چھوڑا اور بولا "میں تمہیں مجبور نہیں کرسکتا' بہرحال میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اب تمہیں شنکر کے ساتھ ساتھ عشارب سے بھی بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ لوگ تمہیں اور مجھے اپنا دشمن نمبر ایک تصور کررہے ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے' دو روز پہلے انہوں نے کس طرح وحشیانہ انداز سے ہم پر چڑھائی کی ہے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ دونوں طرف سے بہت زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا' ورنہ جس طرح کھلم کھلا فائرنگ شروع ہوئی تھی درجنوں افراد ہلاک ہوسکتے تھے۔"

میں نے کہا "میں بہت سے افراد کے لیے دشمن نمبر ایک ہوں' اگر ان افراد میں چند ایک کا اضافہ ہوجائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔"

غزالہ نے محسوس کرلیا تھا کہ اس نکتے سے ہماری گفتگو کوئی تلخ رخ اختیار کرسکتی ہے۔ اس نے مداخلت کی اور رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی "عاصم! آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے۔ ویسے بھی نو بج گئے ہیں۔ اب آپ کو سوجانا چاہیے۔"

میں موقع غنیمت جان کر شیخ عاصم کے پاس سے اٹھ گیا۔

وہ ساری رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ڈھائی ماہ کی رفاقت کے بعد اب ایک بار پھر غزالہ سے دور ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ایک بار پھر ہمارے روز و شب ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہونے والے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اب پھر کب ملاقات ہونی ہے۔ زندگی اور موت کی چھینا جھپٹی ہمارے اردگرد اس قدر تیز ہوچکی تھی کہ ایک پل کا بھروسا نہیں تھا' میرا دل بار بار مجھے مجبور کررہا تھا کہ میں غزالہ کو ایک گہری کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے کچھ کروں۔ جو میں دیکھ رہا تھا وہ نہیں دیکھ رہی تھی' اگر وہ نہیں دیکھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں بھی اپنی آنکھیں بند کرلوں۔ یہ سوچ کر کہ غزالہ بار بار میری رائے کو ٹھکرا رہی ہے' میں اپنی انا کے خول میں چھپ جاؤں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں۔

رات بھر میرے اندر ایک زبردست کشمکش جاری رہی۔ یہ حقیقت ہے کہ جھوک ضامن کی حویلی میں قیام کے دوران میں' میں نے حتمی فیصلہ کرلیا تھا کہ غزالہ کو اس کے حال پر چھوڑ دوں گا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے لاتعلق ہوجاؤں گا اور سمجھ لوں گا کہ اس نام کی لڑکی میری زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے بھی آگ میں کودنے کی کوشش کرے گی تو اسے روکوں گا نہیں۔ اپنی آنکھیں بند کرلوں گا اور ہر احساس کو کچل ڈالوں گا لیکن آنکھیں بند کرنا اور احساس کو کچلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اور پھر جب معاملہ ایک ایسی ہستی کا ہو جو لہو بن کر رگوں میں دوڑتی رہی ہو اور جس کی محبت زندگی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھ کر رگِ جاں قرار پائی ہو تو آنکھیں بند کرنا اور احساس کو کچلنا اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ جھوک ضامن میں جاگیردار قادر زماں کی حویلی کے ایک کمرے میں چند ماہ پہلے میرے اور غزالہ کے درمیان ایک زوردار بحث ہوئی تھی۔

میں نے غزالہ سے اس کا جواب "ہاں" یا "نہ" کی صورت میں مانگا تھا' غزالہ کوشش کے باوجود ہاں میں جواب نہیں دے سکی تھی اور ان لمحات میں' میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ غزالہ سے اب کوئی تعلق نہیں رکھوں گا مگر حالات نے ایک بار پھر میرے دل میں اس کے لیے تڑپ پیدا کردی تھی۔ میں بارہا غزالہ سے ترکِ تعلق کے ارادے باندھتا تھا اور توڑتا تھا۔ ہر بار یہی لگتا تھا کہ یہ ارادہ حتمی اور آخری ہے لیکن ہر بار کوئی بات ایسی ہوجاتی تھی کہ وہ ارادہ آخری نہیں رہتا تھا۔ خدا جانے کیا بات تھی اس تعلق میں کہ یہ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔ اس کی بظاہر پُرسکون سطح کے نیچے ایک ایسا مہیب طوفان تھا جو میرے ہر مضبوط ارادے کو جڑوں سے اکھاڑ دیتا تھا اور اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

کئی بار غزالہ کی پتھر خاموشی سے سر ٹکرانے کے باوجود ایک بار پھر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس خاموشی سے سر پھوڑوں۔ ایک بار اسے اپنا دل چیر کر دکھا دوں اور بتا دوں کہ میں صرف اور صرف اس کی بھلائی چاہتا ہوں۔ اسے اس خطرناک دشمن سے بچانا چاہتا ہوں جس نے ایک "عاشق شوہر" کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور ہمہ وقت اس کے قریب ہے۔ وہ کسی بھی وقت اپنا لبادہ اتار کر پھینک سکتا ہے اور اسے بدترین عذابوں سے دوچار کرسکتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی سچائی تھی جس کی جھلکیاں اس سے پہلے غزالہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ جب وہ سب کچھ دیکھ چکی تھی تو پھر اس نے اپنی عقل اور سمجھ پر "شوہر پرستی" کی مہر کیوں لگا رکھی تھی اور کیوں ایک اندھی بہری مفلوج روح بن کر رہ گئی تھی۔ وہ بار بار اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی اور اس نے جو آخری دھوکا کھایا تھا وہ تو نہایت سنگین تھا۔ اور کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شیخ عاصم کے ایما پر میرے دوستوں کی بیویوں سے جو سلوک ہوا تھا وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

اگلے دو روز بھی ہم نے صحرا میں سفر جاری رکھا۔ یہ گرمی پیاس اور خدشات کا سفر تھا۔ صحرائی بگولے ہمارے اردگرد چکراتے رہتے تھے۔ یہ بگولے کبھی کبھی کسی مینار کی طرح بلند اور سیدھے نظر آتے تھے۔ گرد باد اٹھتے تھے اور ریت کے ٹیلوں کو دیکھتے ہی دیکھتے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کردیتے تھے۔ تیز ہوا کے بعد ریت پر لہروں کے نقوش ابھر آتے تھے اور ہمیں بالکل یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ریت کے سمندر میں ہیں اور اونٹوں کی کشتیوں پر سفر کررہے ہیں۔ صحرا اپنے تمام تر عجائبات اور طلسمات کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت ہم ایک لمبی ڈھلوان سے گزرے جہاں پر ریت پھسلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس موقع پر ہمارا صحرائی رہنما یاسر اچانک چیخنے لگا۔ وہ عربی میں چیخ رہا تھا' عبداللہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ ہمیں راستہ بدلنے کا حکم دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ایسی پھسلتی ہوئی ریت پر چلنا خطرناک ہوتا ہے۔

میں نے اور صفدر نے عبداللہ سے تفصیل معلوم کی تو پتا چلا کہ خطرناک صحراؤں میں بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جو دلدل کی طرح انسان کو ہڑپ کرلیتے ہیں۔ اس ریت پر بوجھ پڑے تو وہ نیچے ہی نیچے دھنستی چلی جاتی ہے اور جو جاندار یا بے جان چیز ریت کے اوپر ہوتی ہے وہ اندر دھنستی چلی جاتی ہے۔ ایسی ریت کو مقامی زبان میں "ریگِ رواں" کہا جاتا تھا اور مسافر اپنی دعاؤں میں ایسی جان لیوا آفت سے پناہ مانگتے تھے۔ یہ باتیں سن کر مجھے معروف زمانہ انگلش فلم "لارنس آف عریبیا" یاد آگئی۔ وہی فلم جس میں ضیا محی الدین اور عمر شریف نے بھی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے ایک دردناک سین میں ہیرو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ دمشق کی طرف رواں ہوتا ہے کہ "ریگِ رواں" میں پھنس جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا ایک ساتھی ریتلی دلدل میں پھنستا ہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔ اس سین کے تصور نے میرے رونگٹے کھڑے کردیے اور میں اس ناقابلِ گمان کرب کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا جو ایک پیاسا انسان آگ کے مانند تپتی ہوئی ریت میں زندہ درگور ہوکر محسوس کرتا ہوگا۔

اس سفر کے دوران میں میری کوشش رہی کہ غزالہ سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع مل جائے لیکن شیخ عاصم سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ ہمہ وقت غزالہ کو اپنے آپ میں مشغول رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سو بھی رہا ہوتا تھا تو غزالہ اس کی تیمارداری میں لگی ہوتی تھی۔ کبھی اس کی گردن سہلا رہی ہوتی تھی' کبھی اسے دوا کھلانے کے لیے جاگ رہی ہوتی تھی۔ پتا نہیں اتنی شوہر پرستی کہاں سے آگئی تھی اس کے اندر۔ اس کی والدہ یعنی چچی ناخرہ تو ایسی ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اسے تو الٹ کہنا چاہیے۔ شاید یہ غیر متزلزل جذبہ اس کے اندر باپ کی طرف سے آیا تھا۔ غیر مشروط وفاداری جو اب بے وقوفی کی حد کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اس سفر کے دوران میں ابی باقر اور صفدر میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ اکٹھے سفر کرتے اور ساتھ ساتھ بلا تکان باتیں بھی کرتے رہتے۔ عشارب کا جو ساتھی پکڑا گیا تھا اس کی حالت خراب تھی۔ دونوں ٹانگوں کے زخم خراب ہوگئے تھے اور غزالہ کی سخت کوشش کے باوجود اس کا بخار بھی نہیں اتر رہا تھا۔ اس کے برعکس ابی باقر کا پارٹنر بالکل ٹھیک تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسے دعائیں دیتا تھا' اس کی دعاؤں کا دوسرا "مرکز" میں تھا۔ وہ درجنوں بار اس واقعے کا ذکر کرچکا تھا جب میں غار سے باہر نکل کر اسے اپنے ساتھ غار میں لے گیا تھا۔ غزالہ کے ساتھ سفر کرنے والے بچے کی اٹھکیلیاں اور شوخیاں ماند پڑی ہوئی تھیں۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے سفر نے بڑوں کا حشر نشر کردیا تھا۔ وہ تو پھر دودھ پیتا بچہ تھا۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ شیخ عاصم کو غزالہ کی بچے میں دلچسپی پسند نہیں آئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عاصم کی موجودگی میں غزالہ بچے کی طرف کم توجہ دیتی تھی اور ہمہ وقت شیخ عاصم کے چارچونچلوں میں ہی لگی رہتی تھی۔

بالآخر تیسرے روز دوپہر کے وقت اس طویل صحرائی سفر کا خاتمہ ہوا اور ہم اس چمکتی ہائی وے پر پہنچے جو ساحل کے ساتھ ساتھ ابوظہبی کی طرف جاتی تھی۔ یہاں ایک ویران فلنگ اسٹیشن سے عاصم کا کارندہ ابوظہبی فون کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دو ائرکنڈیشنڈ کوچز موقع پر پہنچ گئیں۔ کوچز کی کھڑکیوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ پورا قافلہ سہولت کے ساتھ ان میں سوار ہوگیا۔ اونٹوں اور جیپوں وغیرہ کو ٹھکانے پر پہنچانے کے لیے عاصم کے پندرہ بیس کارندے موقع پر ہی رہ گئے۔ یخ بستہ کوچز میں بیٹھ کر اور دو ائرکولر کا شفاف پانی پی کر یوں لگا کہ ستر ہزار برس تک جہنم پار کرنے کے بعد ہم جنت میں پہنچ گئے ہیں۔

مخصوص راستوں سے گزر کر یہ کوچز ابوظہبی کے مضافات میں ایک محل نما عمارت میں پہنچیں۔ عمارت کے اطراف میں خوب صورت باغ تھا اور پانی سے لبالب بھرے ہوئے دو شاندار سوئمنگ پول تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ عاصم کے ایک شیخ دوست کی خفیہ رہائش گاہ تھی۔

ممان نامی یہ دوست بھی ہمارا ہم سفر رہا تھا۔ کل کے یخ بستہ کمروں میں ہم نے ایک رات مکمل سکون سے سو کر گزاری۔ ہم یعنی میں اور صفدر اگلے روز دوپہر تک سوتے رہے۔ اگلے روز دوپہر کا پرتکلف کھانا کھاتے ہوئے جب میں نے اسنابری کے جوس کا یخ بستہ گلاس ہاتھ میں اٹھایا تو نجانے کیوں ذہن ان افراد کی طرف چلا گیا جو صحرا میں ہمارے ساتھ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے تھے لیکن ہمارے ساتھ صحرا سے نکل نہیں سکے تھے۔ وہیں تپتی ہوئی ریت پر جاں گسل پیاس اوڑھ کر سو گئے تھے۔ میری مراد ان پانچ افراد سے ہے جو شیخ عشارب کے جنونی حملوں میں جاں بحق ہوئے تھے۔ ہم ان کی لاشیں وہیں سرخی مائل پیاسی ریت میں دفنا کر آ گئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں شیخ عاصم سے ملنے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ صفدر بہت بے چین تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد شیخ عاصم سے اجازت لے کر یہاں سے نکل چلوں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ شاید مجھے برق آسمانی پر بٹھا کر انڈیا پہنچا دیتا۔ میں شیخ عاصم کے کمرے پر پہنچا تو گارڈ نے بتایا کہ وہ ابھی بس پندرہ منٹ پہلے کسی ضروری کام سے نکل گئے ہیں۔ اتنے میں مجھے غزالہ دروازے پر نظر آئی۔ وہ ایک کھلے لبادے میں تھی اور اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"عاصم کہاں ہے!" میں نے پوچھا۔

"وہ شہر گئے ہیں' کوئی بہت ارجنٹ کام تھا۔ کہہ رہے تھے کہ شام سات آٹھ بجے تک آجاؤں گا' اگر نہ آیا تو پھر کل صبح آؤں گا۔"

"لیکن... مجھے اور صفدر کو آج یہاں سے جانا تھا۔"

"آپ کو عاصم سے مل کر جانا چاہیے۔" غزالہ کے لہجے میں التجا کا رنگ تھا۔

"کیا اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں؟"

غزالہ نے کہا "آپ ان کے منیجر سے پوچھ لیں' شاید بتا کر گئے ہوں۔"

منیجر سے پوچھا تو اس نے بھی وہی بات بتائی جو غزالہ نے بتائی تھی۔

شام تک میں نے اور صفدر نے شدت سے عاصم کا انتظار کیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ شام تک بھی نہ آیا تو ہم روانہ ہو جائیں گے۔ ہم اس کے ماتحت یا غلام نہیں تھے کہ اس کے حکم کے منتظر رہتے۔ لیکن پھر شام کو میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ شیخ عاصم یہاں موجود نہیں تھا۔

کئی روز سے میں جو بات غزالہ سے کرنا چاہ رہا تھا وہ آج کر سکتا تھا۔ آج رات مجھے وہ موقع مل سکتا تھا جو صحرا میں کوشش کے باوجود نہیں مل سکا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ غزالہ والے کمرے کی عقبی کھڑکی ایک چھوٹے سے باغیچے میں کھلتی تھی۔ کھڑکی میں گرل وغیرہ موجود نہیں تھی۔ ہاں پورے باغیچے میں آٹھ دس فٹ اونچا آہنی جنگلا لگا ہوا تھا۔ جنگلے میں ایک دروازہ تھا جو مقفل تھا۔ اگر میں جنگلے میں داخل ہو جاتا تو غزالہ کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ سکتا تھا۔ میں بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ شیخ عاصم ابھی تک نہیں آیا تھا لہٰذا یقینی بات تھی کہ وہ اب کل صبح ہی لوٹے گا۔ غزالہ کے کمرے کے دروازے پر دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ ان کی نگاہ بچا کر غزالہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں عقبی باغیچے میں داخل ہو کر کھڑکی استعمال کرتا اور غزالہ تک پہنچ جاتا لیکن یہ بھی رسکی طریقہ تھا۔ شیخ عاصم میرے حوالے سے پہلے ہی شکوک و شبہات میں گھرا ہوا تھا۔ وہ پچھلے چھ سات روز میں کئی بار مجھے کریدنے کی کوشش کر چکا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ صحرائی بستی میں قیام کے دوران میں میرا اور غزالہ کا تعلق کس طرح کا رہا ہے۔ اس کی گفتگو میں شک کے پھنکارتے ہوئے سانپ صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ اب اگر کسی طرح اسے پتا چل جاتا کہ میں رازداری سے غزالہ کے کمرے میں داخل ہوا ہوں تو یقیناً اس کی رقابت شعلۂ جوالہ بن جاتی اور غزالہ کے لیے بہت ہی مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ صاف سیدھے طریقے سے جا کر غزالہ سے مل لوں۔ میں یہاں سے واپس جا رہا تھا' جانے سے پہلے الوداعی ملاقات کرنا نارمل سی بات تھی۔ میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ دس بجنے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ ملاقات کے لیے یہ معقول ٹائم تھا۔ صفدر ابی باقر کے کمرے میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا' میں نے اسے بتایا کہ غزالہ کی طرف جا رہا ہوں۔ کوریڈور میں آیا تو غزالہ کے کمرے کے سامنے گارڈز موجود نہیں تھے' معلوم ہوا کہ غزالہ لان میں ہے۔ میں نے برآمدے میں جا کر دیکھا۔ وہ سوئمنگ پول کے کنارے خوب صورت درختوں تلے تنہا بیٹھی تھی۔ بچہ اس کے قریب سرسبز گھاس پر کھیل رہا تھا۔ گفتگو کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ دونوں گارڈز کافی فاصلے پر تھے اور ہماری گفتگو کی پہنچ سے دور تھے۔

میں نے کہا "غزالہ! جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں تم

ے میرے آخری سوال کا جو آخری جواب دیا تھا' اس کے مجھے اب تو نہیں رہتا کہ تم سے ایک بار پھر اسی موضوع پر ت کروں۔ لیکن پتا نہیں کیوں اس معاملے میں مجھے اپنے پر اختیار نہیں۔ شاید اس میں کچھ قصور حالات کا بھی ہے وہ پھر نہیں ایک دوسرے کے قریب لے آئے تھے۔ کہتے ہیں کہ تنکے کو اوجھل پہاڑ اوجھل لیکن جب میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں تو پھر پہاڑ کو اوجھل کیسے سمجھ لوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں خاموش رہوں گا تو اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اپنی ہی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو جاؤں گا۔ لہٰذا میں اپنی نظروں میں ذلیل ہونے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہاری نگاہوں میں کچھ اور ذلیل ہو جاؤں..."

نے ایک لمحہ توقف کر کے کہا "میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تم آنکھیں بند کر کے ایک اندھے اور زہریلے کنویں میں چھلانگ لگا رہی ہو۔ یہ بات تو طے ہے کہ تم عاصم کی خصلت بہت اچھی طرح جان چکی ہو۔ تمہارا موقف یہ ہے کہ تم اسے سدھارنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مجھے تمہارے موقف سے مکمل اختلاف ہے۔ جس طرح پانی کو سو سال تک بلونے سے بھی مکھن نہیں نکالا جا سکتا اسی طرح عاصم کے اندر سے بھی شرافت برآمد نہیں کی جا سکتی۔ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن مرے ہوئے کو نہیں۔ عاصم کے اندر کوئی اکّا دکّا اچھائی موجود تھی بھی تو وہ اس کی مسلسل سیاہ کاریوں کے بوجھ تلے دب کر مر چکی ہے۔"

غزالہ کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہونٹ تھرا رہے تھے وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔

میں نے کہا "غزالہ! یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس محبت میں کوئی مفاد پوشیدہ نہیں اور جس محبت میں کوئی مفاد نہیں ہوتا اس میں خیانت بھی نہیں ہوتی۔ تمہیں پانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے لیکن اس خواہش کے لیے میں کسی قیمت پر اخلاقی قدر کا خون کرنا بھی گناہ سمجھتا ہوں' پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں "مجازی خدا" سے دور کرنے کی کوشش کروں۔ اگر میں کر رہا ہوں تو اس لیے کہ وہ مجازی نکما ہے۔ اگر تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ میرے موقف کے پیچھے میرا کوئی مفاد پوشیدہ ہے تو تم جیسی قسم مجھ سے چاہو لی ہو یا اس کے علاوہ تمہیں یقین دلانے کا کوئی طریقہ ہو تو بتاؤ۔"

غزالہ نے اشک بار نظروں سے مجھے دیکھا لیکن بولی پھر بھی نہیں۔ وہ بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ ابھی اٹھ کر چل دے گی۔

"صرف ایک آخری بات غزالہ۔" میں نے کہا "میں تمہاری قسم ہی کھاتا ہوں کہ آئندہ زندگی میں کبھی بھی اس موضوع پر تم سے بات نہیں کروں گا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ پوری دیانت داری سے کہا ہے اور میری عقل و سمجھ کے مطابق وہ بالکل صحیح ہے لیکن بالفرض اگر زندگی میں کسی موقع پر میرا کہا غلط ثابت ہو جائے تو اسے میری بشری غلطی سمجھ کر معاف کر دینا۔"

وہ مرتعش لبوں کے ساتھ پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں چند لمحے تک اس کے جواب کا منتظر رہا پھر مستحکم لہجے میں اسے "خدا حافظ" کہہ کر واپس لوٹ آیا۔ گھاس پر کھیلتے ہوئے بچے نے توتلی زبان میں مجھ سے کچھ کہا مگر میں سنی ان سنی کر کے رہائشی حصے کی طرف چلا گیا۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی۔ غزالہ آج بالکل خاموش رہی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس موضوع پر جب بھی گفتگو ہوئی تھی وہ خاموش نہیں رہی تھی۔ خاص طور سے جب بھی میں نے شیخ عاصم کے لیے کوئی سخت لفظ استعمال کیا تھا اس نے فوری جواب دیا تھا اور عاصم کا دفاع کیا تھا۔ آج بھی میں نے عاصم کے لیے مردہ ضمیر اور بدخصلت جیسے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن غزالہ کے ہونٹ صرف تھرا کر رہ گئے تھے۔ کیا یہ غصے کی انتہا تھی کہ وہ کچھ بول نہیں سکی تھی یا پھر اس کے رویے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ میں بہت دیر اس معاملے میں الجھا رہا لیکن کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا۔ اسی دوران میں مجھے صفدر کی صورت نظر آئی۔ وہ ابی باقر کے ساتھ کوریڈور میں چلا آ رہا تھا۔ ابی باقر چھڑی کے سہارے چل رہا تھا۔ دونوں سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ وہ اکثر اسی انداز میں بات کرتے نظر آتے تھے۔

مجھے دیکھ کر صفدر میری طرف چلا آیا' ہم کمرے میں آ بیٹھے۔ صفدر بولا "کہیے جناب! غزالہ سے ملاقات کیسی رہی؟"

"بس نارمل۔"

"لیکن آپ کا موڈ تو نارمل نہیں لگتا۔" وہ کریدنے پر تلا ہوا تھا۔ مجھے اس کے لہجے میں ایک خاص کیفیت محسوس ہوئی۔ جیسے وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جو میں نہیں جانتا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کہنا نہیں' دکھانا چاہ رہا ہوں۔"

"کیا دکھانا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"پہلے آپ بتائیں کہ غزالہ سے آپ کی ملاقات کیسی رہی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ نارمل تھی یا ابنارمل تھی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "اگر میں کہوں کہ ابنارمل تھی تو پھر؟"

"مجھے یقین ہے کہ ابنارمل ہی رہی ہو گی کیونکہ آپ سے پہلے میں غزالہ سے مل چکا ہوں۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔"

صفدر نے جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک مختصر لیکن نہایت اہم خط ہے۔ آج شام میں یہ خط غزالہ کو دکھا چکا ہوں۔"

یہ خط انگلش میں تھا، تحریر دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ یہ خط شیخ عاصم کا لکھا ہوا تھا۔ مکتوب الیہ کا نام عشارب تھا۔ عشارب کے نام نے مجھے چونکا دیا۔ خط کی پہلی دو سطور پڑھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عاصم نے شیخ عشارب کو یہ خط چند روز پہلے صحرا میں لڑائی کے دوران میں لکھا تھا۔ خط پر اسی دن کی تاریخ تھی جس دن عشارب کے مسلح ساتھیوں نے غار سے باہر ہمارا محاصرہ کر رکھا تھا اور دم بدم اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔ خط کچھ یوں تھا۔

"عشارب! تم نے میرے باغی کارندے شنکر کے ساتھ مل کر میری غیر موجودگی میں جو کچھ کیا وہ ہر لحاظ سے ایک سنگین غلطی تھی۔ میری شریک حیات جمیلہ نور تمہاری سازش کی بھینٹ چڑھی اور میرے ساتھیوں کو شنکر کے ہاتھوں شدید ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا (ان میں وہ خوبرو خاتون سلطانہ بھی شامل ہے جو میرے پاس اتالیق کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ شنکر نے عصمت دری کے بعد اسے قتل کر دیا) جو کچھ تم کر چکے ہو یہ ایک طویل دشمنی کی بنیاد ڈالنے کے لیے بہت کافی ہے مگر میں اب بھی اس دشمنی اور قتل و غارت کا راستہ روکنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری دشمنی کی بنیاد کھوکھلی ہے اور اب تک جو ہوا ہے وہ وقتی اشتعال یا غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم جمیلہ نور کے قتل کے معاملے کو بھی اپنے قبائلی قانون کے مطابق سلجھا سکتے ہیں۔

میں نے لکھا ہے کہ ہماری دشمنی کی بنیاد کھوکھلی ہے۔ شاید تم اس بات کی وضاحت چاہو گے۔ اگر غور کرو تو یہ وضاحت تمہیں خود مل سکتی ہے۔ ہماری چپقلش کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ پاکستان سے ایاز کی برات خالی ہاتھ لوٹنے کے سبب ہماری توہین ہوئی ہے۔ تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اس توہین کا بدلہ لیا جائے یا پھر جس لڑکی سے ایاز کی نسبت طے ہوئی تھی اسے دلہن بنا کر ابوظہبی لایا جائے۔

بخدا عشارب! میرا اپنا موقف بھی یہی ہے۔ صرف ہمارے طریقہ کار میں فرق ہے۔ تم فوری کارروائی چاہتے ہو جبکہ میں حکمت عملی کے تحت آگے بڑھ رہا ہوں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی ہماری بہو بن کر یہاں آئے گی اور ضرور آئے گی۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکالیں گے۔ بے شک لڑکی کا بھائی شاہ جہاں ایک سرکش گھوڑا ہے لیکن میں نے اس گھوڑے کو کچے دھاگے سے یوں باندھ رکھا ہے کہ جہاں چاہوں ایک اشارے سے کھینچ کر لے جا سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ جس خاندان کی لڑکی ہم لانا چاہ رہے ہیں اس خاندان کی ایک لڑکی میرے حرم میں موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اس خاندان کی مجال نہیں کہ پر مار سکے۔

ہم ایک ہیں، ہمارا خون ایک ہے۔ اپنی اور قبیلے کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم خون ریزی سے باز رہیں۔ تم اپنے آدمیوں کو غار کے دہانے سے پیچھے ہٹا لو، میں بھی اپنے محافظوں کو فائر نہ کرنے کی ہدایت کر دیتا ہوں۔

تمہارے جواب کا منتظر عاصم بن ارشد۔"

یہ ایک سنسنی خیز خط تھا اور اس سے بھی زیادہ سنسنی بات میرے لیے وہ تھی جو صفدر بتا رہا تھا۔ صفدر کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ عاصم کا یہ خط غزالہ کو پڑھا چکا ہے۔ میں نے صفدر سے پوچھا "یہ خط تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟"

وہ اطمینان سے سگریٹ کا کش لے کر بولا "یہ بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ میں اس کا سارا کریڈٹ آپ کو دیتا ہوں۔"

"صفدر پہیلیاں مت بجھواؤ۔" میں نے بے قرار ہو کر کہا "کس نے دیا ہے یہ خط؟"

"ابی باقر نے۔" صفدر نے جواب دیا "غار کے محاصرے والے دن جب عشارب اور اس کے ساتھی گھمسان جنگ کرتے چلے جا رہے تھے، عاصم نے یہ خط عشارب کے نام لکھا تھا اور ابی باقر کی ذمے داری لگائی تھی کہ وہ خط عشارب تک پہنچائے۔ ابی باقر سفید رومال لہراتا ہوا عشارب اور اس کے ساتھیوں کی طرف بڑھا تھا لیکن اسی وقت ایک آوارہ گولی نے ابی باقر کے پاؤں کا مزاج پوچھ لیا تھا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا غار میں واپس آ گیا تھا۔ غار میں غزالہ نے اس کی مرہم پٹی

کی ابھی اس واقعے کو تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ صحرا میں دل کا منظر دنیا تھا۔ اس حملے کے بعد ایسی افراتفری مچی خط والی بات ہی شیخ عاصم کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ کی طرف ابی باقر بھی بھول گیا تھا کہ اس کی جیب میں خط پڑا ہے۔ صحرا میں تین چار روزہ سفر کے دوران میں ابی باقر میں سے کسی کو بھی وہ خط یاد نہیں آیا تھا۔ آپ کو پتا ہے کہ صحرائی سفر کے دوران میں ہی ابی باقر بے تکلف ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرنے لگے تھے اور کھل کر دل کی بات کرتے تھے۔ ابی باقر کو طرح معلوم ہو چکا تھا کہ غزالہ کی شادی سے پہلے آپ پسند کرتے تھے اور یہ کہ اس پرانے تعلق کے سبب آپ سے رقابت رکھتا ہے۔ ابی باقر ایک قابل بھروسا ہے۔ خاص طور سے آپ کا تو وہ اس قدر احسان مند آپ کے لیے گردن کٹانے پر بھی تیار ہے۔ ابی باقر کے میں نے اسے یہ بتایا کہ شیخ عاصم نے کس طرح صرف انتقام کی تسکین کے لیے غزالہ کو اپنے حرم میں شامل اور اسے کیسی کیسی ذہنی و جسمانی اذیتوں سے گزارا ہے۔ ابی باقر کے دل و دماغ پر اس روداد نے گہرا اثر کیا۔ کل جب ہم طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تو سب کی طرح ابی نہایا اور اس نے اپنے کپڑے بدلے۔ کپڑے بدلتے ہوئے اسے پسینے اور میل میں ڈوبا ہوا یہ خط ملا جو پتلون کی جیب میں پڑا رہ گیا تھا۔ اس نے بڑے غور سے یہ خط پڑھا۔ اس خط میں غزالہ کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے اس نے ان باتوں کی تصدیق ہوتی تھی جو میں نے سفر کے دوران ابی باقر کو بتائی تھیں۔ ابی باقر کے ذہن نے گواہی دی کہ یہ خط آپ کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ سفر کے دوران میں اپنے حسن آقاؤں کے لیے دل میں جو نفرت پروان چڑھی تھی وہ اپنا اظہار چاہتی تھی۔ اس نے یہ خط مجھے دکھایا۔"

"اور تم نے کیا کیا؟" میں نے لرزاں لہجے میں صفدر سے پوچھا۔

وہ مستحکم لہجے میں بولا "میں نے وہی کیا جو ایک دوست کو دوست کے لیے کرنا چاہیے۔ مجھ سے کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے شاہ جہاں صاحب۔ میں آپ دونوں کی ضد کو اتنا ہی سمجھتا ہوں جتنا کہ شاید آپ خود سمجھتے ہیں۔ ان تمام دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہے کہ غزالہ کی انا خود پرستی اسے تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ آج شام جب آپ سو رہے تھے، میں غزالہ کے کمرے میں گیا تھا۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹا اسے سمجھانے میں صرف کیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مجھ سے کتنا بھی تلخ بولے گی لیکن میں اپنی بات کر کے رہوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ آخر میں، میں نے عاصم کی تازہ ترین سوچ بھی اس خط کی صورت غزالہ تک پہنچا دی۔ خط پڑھ کر غزالہ کے ہاتھ کانپنے لگے اور چہرہ زرد ہو گیا۔ پہلے اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے پھر اس نے سر میرے کندھے سے لگا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔"

میں سناٹے میں صفدر کی باتیں سن رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے غزالہ میرے سامنے خاموش کیوں بیٹھی رہی تھی۔ اس کا جھکا ہوا سر اور لرزاں ہونٹ مجھے یاد آ گئے۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

میں نے کہا "حیرت کی بات ہے کہ چھ سات روز گزرنے کے باوجود عاصم اتنا اہم خط بھولا ہوا ہے۔"

"ہنگامہ خیز حالات کے دوران میں کئی اہم اور غیر اہم باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں۔" صفدر نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر خط کے مندرجات غور سے پڑھے اور خط صفدر کو تھما دیا "اب اس خط کا کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ابی باقر کل سے یہی سوچ رہا ہے۔ کبھی فیصلہ کرتا ہے کہ خط کو ضائع کر دے، کبھی سوچتا ہے کہ عاصم کے حوالے کر دے۔ دونوں صورتوں میں خطرہ پوشیدہ ہے۔ خط ضائع کر دے تو شیخ عاصم بے پروائی کا الزام لگا سکتا ہے۔ اگر عاصم کو واپس کر دے تو اس میں بھی نقصان ہے۔ ایک تو عاصم کو بھولی بسری بات یاد آ جائے گی۔ دوسرے وہ ابی باقر کو مطعون کر سکتا ہے کہ اتنی دیر اس نے خط اپنے پاس کیوں رکھا۔"

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "بہتر یہی ہے کہ خط عاصم کو واپس کر دیا جائے۔ ابی باقر کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، وہ اصل حقیقت بتا سکتا ہے کہ خط اس کے لباس کی اندرونی جیب میں پڑا رہا، جب کپڑے بدلے تو پتا چلا۔"

"میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خط والی بات شیخ عاصم کے ذہن سے صاف ہو چکی ہو اور اب سات روز بعد عاصم کو خط واپس کر کے ابی باقر خواہ مخواہ اس کے غصے کا نشانہ بنے۔"

"بہرحال اس بارے میں تم دونوں سوچ بچار کر سکتے ہو۔ اہم بلکہ بہت اہم بات یہ ہے کہ "خط" غزالہ کی نظر سے گزر

گیا ہے۔ دیکھا جائے تو اب اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی ہے۔"

"میں نے غزالہ میں کافی تبدیلی محسوس کی ہے۔ یقیناً آپ نے بھی کی ہوگی۔" صفدر نے کہا۔

"مجھے تو کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی اور مجھے توقع ہے کہ آئندہ بھی نظر نہیں آئے گی۔"

"کہیں آپ ضرورت سے زیادہ مایوسی کا اظہار تو نہیں کر رہے۔"

"تم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہو کہ پچھلے سال ڈیڑھ سال میں تم غزالہ سے بہت کم ملے ہو۔ تم جانتے نہیں کہ وہ اپنی خود ساختہ پابندیوں میں کتنا جکڑی جا چکی ہے۔ اس نے اپنے ذہن کو اتنا تنگ کر لیا ہے کہ اس میں شیخ عاصم کے سوا کچھ سما ہی نہیں سکتا۔"

"لیکن کبھی کبھی جمود ٹوٹ بھی تو جاتا ہے۔"

"کچھ جمود زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں۔"

"شاہ جہاں صاحب! مجھے یقین ہے کہ غزالہ کی سوچ میں تبدیلی واقع ہوگی۔ وہ کتنی بھی اصول پرست سہی، ہے تو گوشت و پوست کی انسان۔ اس کے سینے میں متاثر ہونے والا دل دھڑکتا ہے۔ وہ کب تک اپنے احساسات سے جنگ لڑ سکتی ہے۔"

"وہ جنگ جیت چکی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو فنا کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس میں ایسا کوئی احساس ہی باقی نہیں رہا جو اسے شیخ عاصم کے محاصرے سے نکلنے میں مدد دے سکے۔"

"میں آپ سے اتفاق نہیں کر رہا۔" صفدر نے کہا "مجھے یقین ہے کہ غزالہ میں تبدیلی آئے گی، زیادہ نہ آئے گی تو تھوڑی آئے گی لیکن آئے گی۔"

دروازہ کھلا اور عاصم کا دوست عبداللہ اندر آگیا۔ وہ شیخ عاصم کے قافلے میں واحد شخص تھا جس کے چہرے پر کبھی کبھار مسکراہٹ کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ وہ اس بات سے بہت متاثر تھا کہ میں نے ایک نہایت نازک وقت میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی مدد کی تھی۔ اس دن سے وہ مجھے اخی (بھائی) کہہ کر بلانے لگا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بولا "یا اخی! میں نے سنا ہے کہ آپ کل جا رہے ہیں؟"

"نہیں فی الحال پروگرام ملتوی ہوگیا ہے۔" صفدر جلدی سے بولا۔

"ویری گُڈ۔" عبداللہ نے کہا "لیکن پروگرام بنا کیسے اور ملتوی کیسے ہوا؟"

صفدر بولا "بنا تو ضرورت کے سبب تھا لیکن ملتوی اس لیے ہوا ہے کہ موسم میں کچھ تبدیلی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس تبدیلی کو دیکھنے کے بعد ہی لائحہ عمل بنائیں۔"

"ہاں موسم تو واقعی کچھ تبدیل ہوا ہے۔" عبداللہ نہ سمجھتے ہوئے بولا "بارش کے آثار بھی ہیں اور ہاں یاد آیا آپ کے کاغذات وغیرہ بھی تو تیار ہونے ہیں۔"

"کاغذات تو تیار ہی ہیں۔ بس ٹکٹ وغیرہ لینا ہوگا بلکہ صرف شاہ جہاں صاحب کو ٹکٹ لینا ہوگا۔ میرے پاس ریٹرن ٹکٹ ہے۔"

دو دن پہلے تک صفدر کو جانے کی جلدی تھی لیکن اب مُصر تھا کہ ہم ایک دو روز مزید یہاں رکیں۔ میں اس اصرار کی وجہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یہ توقع تھی کہ غزالہ کے رویے اور سوچ میں کوئی نمایاں تبدیلی آنے والی ہے۔ زبان سے نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ شیخ عاصم کے سلسلے میں غزالہ کے صبر و برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور وہ اس بارے میں کوئی بڑا فیصلہ کرنے والی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "تمہارے خیال میں وہ بڑا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔"

وہ بولا "میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور۔ ہو سکتا ہے کہ ــــ" کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ غزالہ واپس پاکستان جانے کا فیصلہ کر لے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کوئی کلیدی قسم کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ شیخ عاصم کے لیے اگر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ تھا بھی تو وہ یہ خط دیکھنے کے بعد مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بہروپیے کے ساتھ مزید رہنا پسند نہیں کرے گی۔"

"تم غزالہ کی مزاج شناسی کا دعویٰ کر رہے ہو جو بالکل غلط ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا فیصلہ وقت کر دے گا۔" صفدر بڑے اعتماد سے بولا۔

جانے وہ کیا سمجھے بیٹھا تھا۔ ایک ہمدرد اور مخلص دوست کی حیثیت سے اس کے خیالات میرے لیے قابلِ قدر تھے۔ وہ ان محرومیوں کو سمجھتا تھا جو بچپن سے اب تک میرے ساتھ رہی تھیں۔ وہ اپنی دانست میں مجھے ان محرومیوں کے گھیرے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وقت کا پہیا میرے لیے الٹا چل جائے۔ وقت کا جادوگر کوئی ایسا سحر پھونکے کہ حالات کا رخ بدل جائے۔ شاید وہ اپنے تصور کی نگاہ سے ایک بار پھر میرے ہاتھوں میں غزالہ کا ہاتھ دیکھ رہا تھا لیکن یہ صرف ایک ہمدرد دوست کا بھٹکا ہوا تصور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہونا اب ممکن نہیں۔

شیخ عاصم اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب لوٹا۔ وہ بڑے پریشان نظر آتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ عشارب اور اس کے ساتھیوں نے ہمارے خلاف زبردست طوفان بنا رکھا ہے۔

"عشارب اور اس کے ساتھی واپس آ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

عاصم نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا "وہ قریباً ہمارے ساتھ ہی صحرا سے واپس لوٹے ہیں۔ بس پانچ چھ گھنٹے کا فرق پڑا ہوگا۔ ہم سہ پہر چار بجے لوٹے اور وہ رات دس بجے کے قریب آئے ہیں۔"

"انہیں معلوم ہے کہ ہم بھی واپس آ گئے ہیں؟"

"یہ معلوم ہو گیا تو حالات اور خراب ہو جائیں گے۔ ابھی تک ہماری آمد صیغۂ راز میں ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں وہ لوگ؟"

"وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو صحرا میں کہہ رہے تھے۔ وہ تمہیں اور اس کے ساتھ جانے والے مقامی نوجوانوں کی زندگی کا ذمے دار ہمیں ٹھہرا رہے ہیں۔"

ہم راہداری میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اسی دوران راہداری کے موڑ سے غزالہ برآمد ہوئی۔ اس نے نقاب رکھا تھا۔ عاصم کو دیکھ کر وہ جیسے ٹھٹک سی گئی۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ واپس مڑ جائے گی لیکن اب فاصلہ اتنا کم تھا کہ وہ واپس بھی نہیں جا سکتی تھی۔

"ہیلو غزالہ! کیسی ہو۔" عاصم نے رسمی انداز میں کہا۔

پھر ایک دم وہ چونک گیا۔ غزالہ کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے "کیا ہوا غزالہ؟ خیریت تو ہے؟" عاصم نے بڑھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں زکام سا ہے۔" غزالہ نے کہا۔

"اگر زکام ہے تو پھر بہت ہی خوفناک قسم کا ہوگا۔" اس کے لہجے میں طنز کی ہلکی سی کاٹ تھی "کوئی دوا وغیرہ لی؟"

"نہیں۔" غزالہ نے کہا۔

"بھئی یہ تو غلط بات ہے۔ ایسے شدید نزلے کی تو دوا ضرور لینی چاہیے۔ ایسے ہی نزلے بگڑ کر انفلوائنزا اور ٹائیفائڈ وغیرہ بن جاتے ہیں۔ کیوں شاہ جہاں؟" اس نے آخری الفاظ میری طرف متوجہ ہو کر کہے۔

"ہاں شدید نزلے کی دوا تو ہونی چاہیے۔" میں نے رسماً کہا۔

عاصم بولا "یار! میں یہاں نہیں تھا تو کیا ــــ تم تو تھے۔ دیکھو کیا حال بنا رکھا ہے اس نے۔ تم ہی کوئی دوا کرتے۔"

"ڈاکٹر تو اپنا علاج خود کر لیا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن کچھ تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جن کے علاج کے لیے ڈاکٹروں کو بھی دوسروں کے پاس ہی جانا پڑتا ہے۔ یعنی مسیحا کو مسیحا کی تلاش ہو جاتی ہے۔"

عاصم کی ساری گفتگو پہلو دار تھی۔ غزالہ ہمارے پاس سے گزری اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

غزالہ کی غم زدہ صورت دیکھ کر عاصم بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صحرا میں پر ہنگام صورتِ حال کے دوران میں اس نے عشارب کے نام جو چند الفاظ لکھے تھے وہ کہاں سے ہوتے ہوئے کہاں پہنچے ہیں اور انہوں نے پڑھنے والوں پر کیا تاثر چھوڑا ہے۔ واقعات کی تیز رفتاری میں وہ شاید ان الفاظ کو بھول چکا تھا لیکن الفاظ نے اسے فراموش نہیں کیا تھا۔

اسی روز شام کو میں نے دیکھا کہ صفدر اور غزالہ باغ کے فوارے کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کوئی نہایت سنجیدہ قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ صفدر بار بار اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد صفدر میرے پاس کمرے میں آیا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

"کیوں خیریت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ــــ ابھی میں غزالہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ بڑی بکھری ہوئی سی نظر آتی ہے۔ اس نے ــــ اس نے کہا ہے کہ ہم جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے صفدر کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی آگئی تھی۔

"تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ غزالہ کھل کر بات کیوں نہیں کرتی۔ کیوں وہ اپنا ہر دکھ آہنی پردے کے پیچھے چھپائے ہوئے ہے۔"

"دکھ اپنوں کو بتائے جاتے ہیں، اب وہ ہمیں اپنا نہیں سمجھتی۔ وہ شیخ عاصم کو اپنا سمجھتی ہے اور ان کو اپنا سمجھتی ہے جو شیخ عاصم کے اپنے ہیں۔"

"شاہ جہاں صاحب! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن مجھے یقین ہے کہ غزالہ کے دل و دماغ پر طاری سکوت ٹوٹ چکا ہے۔ وہ کتنی بھی مضبوط سہی لیکن آج اپنی یادوں سے الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔"

"اگر ایسا ہوتا صفدر! تو وہ تم سے اپنا دکھ بیان کرتی' یہ کیوں کہتی کہ تم اور میں جلد سے جلد یہاں سے چلے جائیں۔"

صفدر اب بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ پرسوچ انداز میں بولا "ہو سکتا ہے کہ وہ شیخ عاصم سے دوٹوک بات کرنا چاہتی ہو۔ اسے اندیشہ ہو کہ دونوں میں جھگڑا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ وہ ہماری موجودگی میں یہ جھگڑا پسند نہیں کرے گی۔"

"جھگڑا۔" میں بے اختیار مسکرا اٹھا "وہ شیخ عاصم سے جھگڑا کیا کرے گی۔ اس کی تو روح فنا ہوتی ہے شیخ کے ماتھے پر بل دیکھ کر۔۔۔ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے صفدر۔ وہ شیخ کے حوالے سے بے حد مرعوبیت کا شکار ہے۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ شیخ نے اپنے دبدبے سے اسے ہپناٹائز کر رکھا ہے۔ وہ اس کے سامنے گنگ ہو جاتی ہے۔"

"گنگ زبانیں بھی کبھی کبھی بول اٹھتی ہیں شاہ جہاں صاحب۔۔۔ اور جب وہ بولتی ہیں تو بولنے کا حق ادا کر دیتی ہیں۔"

"لیکن یہ مختلف کیس ہے پیارے۔"

صفدر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اب بھی میری بات سے مکمل اتفاق نہیں کر رہا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا "شاہ جہاں صاحب! ہم ایک کام کرتے ہیں۔ یہاں سے چلے جاتے ہیں لیکن یہاں بھی رہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم شیخ عاصم کو بتاتے ہیں کہ ہم یہاں سے واپس انڈیا جا رہے ہیں لیکن رخصت ہونے کے باوجود ہم ابوظبی سے رخصت نہیں ہوتے اور یہیں کہیں رک کر حالات کا رخ دیکھتے ہیں۔"

"حالات کے رخ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ غزالہ شیخ عاصم کے خلاف کوئی زبردست قسم کا ایکشن شروع کرنے والی ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہونے والا جس سے کسی "مجازی خدا" کی عزت آن پر ہلکی سی گرد بھی پڑے۔"

صفدر نے میری آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آج آپ میری ا[...] مان لیں۔"

اس نے کچھ ایسے انداز سے کہا تھا کہ میں [...] کر سکا۔ اس انداز سے تو وہ جان بھی مانگتا تو شاید میں تیار ہو جاتا۔ اس نے کبھی مجھ سے اصرار کیا ہی نہیں [...] جانتا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے وہ ہونے والا نہیں [...] کا دل رکھنے کو میں نے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ جیسا تم کرلو۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔"

○☆○

اگلے روز نو بجے کے قریب ہم شیخ منان کے ا[...] دار محل سے روانہ ہونے کو تیار تھے۔ پہلے تو ہمارا [...] یہی تھا کہ شیخ عاصم سے رخصت ہو جائیں اور ائرپور[ٹ] کے بجائے سیدھے صفدر کے میزبان حماد حسنی کی رہا[...] جا اتریں۔ یہ حماد حسنی وہی صاحب تھے جن کا تعلق کلارک صاحب سے تھا اور جنہوں نے ابوظبی میں ہر طرح کی سہولت فراہم کی تھی لیکن پھر یہ پروگرام شیخ عاصم کو حقیقت حال بتانا پڑی۔ دراصل شیخ عاصم کے خطرے کی وجہ سے بہت احتیاط سے کام لے رہا [...] یقیناً ہمیں اپنے گارڈز کی نگرانی میں ائرپورٹ پہنچا[...] ہمیں جہاز میں سوار کرانے کے بعد ہی واپس آتے او[ر] ممکن تھا کہ وہ خود ہمیں سی آف کرنے کے لیے سا[...] پڑتا۔ لہٰذا ہم نے شیخ عاصم کو صاف صاف بتا دیا کہ [...] حسنی (صفدر کے میزبان) کے ہاں جا رہے ہیں اور وہا[ں] دو روز قیام کر کے انڈیا روانہ ہوں گے۔

شیخ عاصم نے حسب توقع کسی طرح کا اعتراض [...] کیا۔ وہ بڑے دوستانہ لہجے میں ہمیں بار بار احتیاط کی [...] کرتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ ہم جب تک ابوظبی [...] عشارب کے خوں خوار کارندوں سے بے حد ہوشیا[ر] [...] اس کی پرزور خواہش تھی کہ ابوظبی میں ہماری موجو[دگی] [...] پر ظاہر نہ ہو۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ہم چار دیوا[ری] [...] محدود رہیں گے۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ [...] شیشوں والی وہ اسٹیشن ویگن موقع پر پہنچ گئی جو ہمیں [...] کی رہائش گاہ پر لے جا رہی تھی لیکن عین آخری [...] ہمیں اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا اور ایک روز مزید عبا[...] کی محل نما کوٹھی میں قیام کرنا پڑا۔ عین ہماری روا[...] وقت شیخ عاصم کو وائرلیس پر ایک پیغام موصول ہوا۔ پیغام میں بتایا گیا تھا کہ شیخ عشارب کا ایک قریبی ساتھی موجودہ قیام گاہ کے آس پاس دیکھا گیا ہے۔

اس پیغام نے شیخ عاصم کو بری طرح ہراساں کر دیا۔ بات [...]ی بھی پریشانی کی۔ جیسا کہ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ [...]شارب اور اس کے ساتھی بھی ہماری طرح صحرائی سفر سے [...]پس آ چکے ہیں' اب ان کی طرف سے شیخ عاصم کو بے حد [...]ار رہنے کی ضرورت تھی۔ ہماری رہائش گاہ کے اردگرد [...]شارب کا ایک ساتھی منڈلاتا ہوا پایا گیا تھا۔ عین ممکن تھا [...] ہمارا یہ ٹھکانا ان لوگوں کی نظر میں آ چکا ہو۔ ایسے میں [...]ا یہاں سے نکلنا زبردست خطرے کا باعث تھا۔ شیخ کے [...]نے پر ہم نے روانگی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بہرحال سہ پہر کے [...]ت شیخ عاصم کو فون پر جو رپورٹ ملی وہ تسلی بخش تھی۔ عاصم [...]ے کارندوں نے مہارت سے چھان بین کی تھی اور یہ نتیجہ [...]ا تھا کہ ہماری قیام گاہ کی نگرانی نہیں کی جا رہی۔ قیام گاہ [...]ے قریب عشارب کے ساتھی کا پایا جانا محض ایک اتفاق [...]

وہ ویک اینڈ کی شام تھی۔ عاصم اور اس کے دوست و[...] [...]نی صحرا میں ایک کٹھن سفر کے بعد واپس آئے تھے لہٰذا [...]نے ان کی دل بستگی کا سامان کیا تھا۔ اس محل نما رہائش گاہ [...]ے اندر ہی وہ سب کچھ فراہم کر دیا گیا تھا جو کسی فائیو اسٹار [...]ل یا کلب میں مہیا ہو سکتا تھا۔ ڈنر میں شراب پانی کی طرح [...]ئی گئی۔ اس محل نما عمارت میں جتنی بھی خوب صورت [...]دائیں و داشتائیں موجود تھیں انہیں جشن طرب کے لیے [...]کر لیا گیا۔ کچھ حسین چہرے باہر سے بھی لائے گئے تھے۔ [...]نو آواز کی گونج میں محفل نشاط و طرب خوب جمی۔ ایک [...]ل گرل کے حصول کے لیے عاصم کے تین دوست امیر [...]دوں کے درمیان تنازعہ ہو گیا۔ تینوں آج کی شب اسے [...]ا خواب گاہ کی زینت بنانا چاہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک [...]تو عاصم نے یوں راضی کر لیا کہ ماڈل گرل کے بجائے دو [...]ل نوخیز سری لنکن لڑکیاں اس کے حوالے کر دیں۔ (یعنی [...]و سالہ ماڈل گرل کا حساب برابر کرنے کے لیے چودہ چودہ [...]ل کی دو کال گرلز) باقی دو خواہش مندوں کو ماڈل گرل نے [...]و راضی کر لیا اور وہ یوں کہ اپنی رات آدھی آدھی دونوں [...]ا بانٹ دی۔ یعنی جسم کی گرمی' بانہوں کا گداز' سانسوں کی [...]ل' آوازیں کی خوب صورتی سب کچھ آدھا آدھا تقسیم کر دیا [...]ن ایک چیز ایسی تھی جو تقسیم ہونے والی نہیں تھی اور وہی [...]ب سے اہم تھی۔ وہ محبت تھی لیکن محبت کا تو شاید ذکر ہی [...]ول ہے۔ وہ یہاں کہیں نہیں تھی۔

رات بھر اس محل نما عمارت کے بند کمروں سے جنس[...] [...]آوازیں ابھرتی رہیں۔ نشیلے قہقہے گونجتے رہے اور مخمور لہجے سنائی دیتے رہے۔ نصف شب کے بعد میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ سوئمنگ پول میں تین چار جوڑے موجود تھے اور خرمستیاں کر رہے تھے' یورپ کے کسی "نیوڈ کلب" کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔

اگلے روز دس بجے ہم شیخ منان کی اس رہائش گاہ یا تفریح گاہ سے روانہ ہو گئے۔ تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن کے ذریعے ہمیں مسٹر کلارک کے شناسا حماد حسنی کے گھر پہنچایا گیا۔ حماد حسنی کی رہائش گاہ شہر کے نہایت خوب صورت علاقے میں تھی۔ حماد حسنی درمیانی عمر کے نہایت خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے۔ وہ مسٹر کلارک کی ایک کیمیکل پراڈکٹ کے مقامی ڈسٹری بیوٹر تھے۔ ان کے گھر پہنچ کر ہمیں بے حد آرام اور تحفظ کا احساس ہوا۔ یہاں آنے سے قبل صفدر' ابی باقر کے ذمے ایک اہم کام لگا آیا تھا۔ اس نے ابی باقر سے کہا تھا کہ وہ شیخ عاصم اور غزالہ پر نگاہ رکھے۔ اگر ان دونوں کے حوالے سے اسے کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو فوراً اطلاع دے۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ حماد حسنی کے گھر پہنچتے ہی صفدر کی نگاہ فون سیٹ پر لگ گئی تھی۔ اسے توقع تھی کہ جلد یا بدیر ابی باقر کی طرف سے کوئی نہ کوئی اطلاع آئے گی۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں صفدر نے ابی باقر کی کال کا انتظار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ سوتے وقت بھی فون سیٹ اس کے سرہانے رکھا تھا۔۔۔ رات گزر گئی اور پھر اگلا دن بھی گزر گیا۔ صفدر کا انتظار ختم نہیں ہوا۔ رات قریباً دس گیارہ بجے تک وہ فون کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا پھر میں اسے زبردستی ایک قریبی ریستوران میں لے گیا۔ دن بھر کی تپش کے بعد ابوظبی کی سڑکیں اب روشن اور بارونق نظر آ رہی تھیں۔ شفاف تارکول پر چمکتی دمکتی گاڑیاں فراٹے سے گزر جاتی تھیں۔ ہم جس ریستوران میں داخل ہوئے اس کا نام ہی نخلستان تھا۔ اندرونی آرائش بہت منفرد تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی یوں لگتا تھا جیسے ہم صحرا کے درمیان کسی نخلستان میں آ گئے ہیں۔ فرش دیکھ کر بالکل یوں لگتا تھا جیسے ریت بچھی ہوئی ہو' کھجوروں کے درخت' چشمہ' اونٹ سب کچھ تصویروں کی شکل میں موجود تھا۔ ہلکے ہلکے میوزک کی گونج میں ہم باتیں کرتے رہے۔ صفدر نے دوپہر کے وقت بھوپال میں مسٹر جی کلارک صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے بھی کلارک صاحب سے چند فقروں کا تبادلہ کیا۔ وہ بھوپال میں بڑی بے قراری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی آواز میں مسرت کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس مسرت کی وجہ یہ

تھی کہ میں مل گیا تھا۔ کلارک صاحب کی بے چینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ وہ میری اور صفدر کی فوری روانگی کے لیے چارٹرڈ طیارہ تک بھیجنے کو تیار تھے لیکن جب ہم نے انہیں بتایا کہ واپسی کے سفر میں کوئی دشواری حائل نہیں اور ہم کل ہر صورت روانہ ہوجائیں گے تو انہیں قدرے اطمینان ہوا۔ صفدر اور میں دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ صفدر نے بتایا کہ مسز کلارک اور مجتبیٰ کنور کی طرح سائیں عالی بھی بے حد پرجوش ہے' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا جوش سب سے زیادہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ساری رات جاگتا ہے اور کسی پُراسرار زبان میں جاپ کرتا رہتا ہے۔ صفدر کے بقول جب وہ فون پر کلارک صاحب سے بات کررہا تھا' اس وقت بھی بیک گراؤنڈ میں سائیں عالی کے "نعرہ ہائے فلک شگاف" سنائی دے رہے تھے۔

باتیں کرتے کرتے میں اور صفدر اچانک کھڑکی سے باہر دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔ ایک لڑکی ریستوران کے بیرونی دروازے پر کھڑی چیخ رہی تھی' اس نے اپنا چہرہ دروازے کے شیشے سے لگا رکھا تھا اور دربان سے درخواست کررہی تھی کہ وہ اس کے لیے دروازہ کھول دے۔ لڑکی کی صورت دیکھ کر میری رگوں میں خون منجمد ہوگیا۔ یقیناً صفدر کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔ وہ لڑکی غزالہ تھی۔ بچہ اس کی بانہوں میں تھا' بالوں کی منتشر لٹوں نے غزالہ کا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اور صفدر ایک ساتھ اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔ اس دوران میں دربان نے دروازہ کھول دیا تھا۔ غزالہ لپکتی ہوئی اندر آئی۔ اس کے پیچھے ہی تین چار افراد بھرّا مار کر اندر گھس آئے۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ وہ شیخ عاصم کے پالتو کتے تھے۔ ریستوران میں ایک دم ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے خوش پوش مرد و زن ٹھٹک گئے تھے اور حیران نظروں سے پریشان حال غزالہ کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ یہ نیویارک کا کوئی نائٹ کلب نہیں تھا' ابوظہبی کا پُرسکون ریستوران تھا۔ ایسی جگہوں پر دنگا فساد کے مناظر دیکھنے کو کہاں ملتے ہیں۔ غزالہ کے پیچھے اندر داخل ہونے والے چاروں افراد اس کے پیچھے لپکے' غزالہ چیختی ہوئی ایک گوشے کی طرف بڑھی۔ اس نے ابھی تک ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ قابلِ رحم نظر آرہی تھی۔ یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا' عمل کرنے کا وقت تھا۔ ہم چند لمحے تاخیر کرتے تو عاصم کے غنڈے غزالہ کو پکڑ لیتے اور یقیناً مارپیٹ شروع کردیتے' یا گھسیٹتے ہوئے ریستوران سے باہر لے جاتے۔ میرے اور صفدر کے درمیان جلتی نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر ہم دونوں نے نتائج سے بے پروا ہو کر عاصم کے غنڈوں سے ٹکر لے لی۔ پورا ہال خوف زدہ چیخوں سے گونج اٹھا۔ کرسیاں الٹ گئیں' شیشے ٹوٹ گئے' پورے ریستوران میں بھگدڑ مچ گئی۔ صفدر نے ایک غنڈے کو اٹھا کر بارلیش منیجر کے کاؤنٹر پر دے مارا تھا۔ دوسرا غنڈا اپنی کٹی ناک پر میرے سر کی دھواں دار ٹکر کھا کر فرش پر تڑپ رہا تھا۔ پانچ دس سیکنڈ میں باقی غنڈے بلبلاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

غزالہ ایک کونے میں سہمی کھڑی تھی اور ہمیں دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بچہ اس کی بانہوں میں منہ پھاڑ کر چیخ رہا تھا' میں نے غزالہ کا بازو تھاما' صفدر نے بچہ اپنی بانہوں میں لیا اور ہم تیزی سے ریستوران کی پارکنگ کی طرف بڑھے۔ جب میں اور صفدر کسی مصیبت میں ہوتے تو ہم دونوں کے درمیان آپوں آپ جیسے کوئی مواصلاتی رابطہ قائم ہوجاتا تھا۔ ایک لفظ کہے یا سنے بغیر ہم ایک دوسرے کا منشا سمجھ لیتے تھے اور وہی قدم اٹھاتے تھے جس کی صورت حال کے تحت ضرورت ہوتی تھی۔ اس وقت ضرورت تھی کہ ہم فوراً یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ کم از کم اس جگہ سے تو فوراً ہٹ جائیں' کسی بھی وقت عاصم کے مزید کارندے یہاں پہنچ سکتے تھے اور ہمیں مشکل میں ڈال سکتے تھے۔ فی الوقت یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ غزالہ یہاں کیسے پہنچی ہے اور اس کے پیچھے آنے والے کون ہیں' اس وقت صرف اپنے دفاع کے بارے میں سوچنا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکال لیا تھا۔ سامنے ہی ایک آف وائٹ مرسیڈیز کھڑی تھی' باوردی ڈرائیور پاس ہی موجود تھا۔ میں نے بے دریغ ریوالور ڈرائیور کی کنپٹی سے لگایا اور چابی اس سے لے لی۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے غزالہ کو پچھلی نشست پر دھکیلا اور خود صفدر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ صفدر کے مضبوط ہاتھوں میں تھا۔ اگلے ہی لمحے مرسیڈیز کے پہیے چرچرائے اور وہ تیز رفتاری سے مین روڈ کی طرف بڑھی۔

مین روڈ تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو تین ذیلی سڑکوں سے گزرنا تھا۔ دو تین فرلانگ آگے جونہی صفدر ایک ذیلی سڑک پر مڑا' بغلی راستے سے ایک شیورلیٹ گاڑی آئی اور ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ صفدر نے بریک پیڈل دبایا اور پہیوں کی احتجاجی چیخ سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ ہماری گاڑی شیورلیٹ سے صرف تین چار قدم کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ شیورلیٹ کا بایاں اگلا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور میں نے عاصم کو دیکھا۔ وہ کسی تند بگولے کی طرح گاڑی سے نکلا'

ہماری طرف بڑھا۔ وہ قمیص پتلون میں تھا لیکن قمیص پتلون کے اندر نہیں تھی۔ ٹائی اس کے گلے میں تھی لیکن گریبان کا بالائی بٹن بند نہیں کیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ لباس بدلتے بدلتے وہ بہت افراتفری میں یہاں چلا آیا ہے۔ اس نے ایک قہر آلود نگاہ ہم دونوں پر ڈالی پھر بغیر کچھ کہے سنے اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ غزالہ بچے سمیت کونے میں سمٹ گئی تھی۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آرہا تھا' یوں لگتا تھا کہ اس پر سکتہ طاری ہے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل سکتی ہے نہ بول سکتی ہے۔

"چلو۔" شیخ عاصم کی تحکمانہ آواز گونجی' اس نے اپنا ہاتھ غزالہ کی طرف بڑھا دیا "میں کہتا ہوں چلو۔" وہ ایک بار پھر گرجا اور غزالہ لرزنے لگی۔

صفدر نے کہا "شیخ صاحب' آپ ہم سے بات کریں۔ اگر آپ ــــ"

"شٹ اپ!" شیخ عاصم غرایا "یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ تم اس میں نہیں بول سکتے۔"

اس نے اپنا ہاتھ ایک مرتبہ پھر غزالہ کی طرف بڑھا دیا "چلو غزالہ! اس طرح سرِعام تماشا بننا ٹھیک نہیں۔" اس مرتبہ عاصم کی آواز قدرے نرم تھی۔

تاہم اس کی نرم آواز بھی غزالہ کی وحشت میں تخفیف نہیں کرسکی۔ وہ اپنی جگہ جامد بیٹھی رہی۔ بچہ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا اور وہ بھی خالی خالی نظروں سے عاصم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عاصم نے غزالہ کی کلائی تھام لی اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ عاصم کے غضب کے سامنے غزالہ کی حالت اس تنکے کی سی تھی جو سیلابی پانی میں بلامزاحمت بہتا چلا جاتا ہے۔ غزالہ نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں بے بسی ولاچاری تو تھی لیکن مداخلت کی دعوت اب بھی نہیں تھی۔

میں نے شدید غصے کے عالم میں غزالہ سے پوچھا "تم اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

میں نے دل ہی دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اگر اس نے میرے سوال کا جواب انکار کی صورت میں نہیں دیا تو میں بھی اس معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اگر اس کے اپنے اندر ہی خود کو بچانے کی خواہش نہیں تھی تو میں اسے کیسے بچا سکتا تھا' میری سوالیہ نظریں غزالہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور میں اس نہایت اہم سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ ایک لمحے میں جیسے صدیاں گزر گئیں۔ غزالہ کے چہرے نے گواہی دی کہ وہ اذیت کی انتہا کو چھو رہی ہے۔ میں نے ایک بار پھر چلا کر کہا "تم اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

غزالہ کی آنکھوں سے دو تنومند آنسو ٹپکے اور ـــ پھر اس نے بڑے یقین کے ساتھ اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

یوں لگا جیسے خلاؤں میں کہیں بہت بڑا دھماکا ہوا ہے اور اس نے اربوں کھربوں نوری سال کے دائرے میں ہر شے کو فنا کردیا ہے' ایک ہی لمحے میں ایک کائنات چکنا چور ہوگئی ہے اور ایک بالکل نئی کائنات وجود میں آگئی ہے۔ غزالہ کے سر کی اس چھوٹی سی جنبش نے اس طلسم کو پاش پاش کردیا تھا جس میں وہ اب تک جکڑی ہوئی تھی اور [illegible] رہی تھی۔ غزالہ کے سر کی یہ جنبش دیکھنے کے بعد مجھے کچھ اور پوچھنے یا سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے غزالہ کی کلائی پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے عاصم کی کلائی پکڑلی۔

عاصم نے اسی ہاتھ سے غزالہ کا بازو تھام رکھا تھا۔ میں نے زور لگا کر غزالہ کا بازو عاصم کے ہاتھ سے چھڑا دیا۔

عاصم ہکا بکا میری طرف دیکھ رہا تھا "پیچھے ہٹ جاؤ عاصم! ورنہ خون خرابا ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔ میرے لہجے میں موجود فیصلہ کن کیفیت نے شیخ عاصم کو جیسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔

اور یہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوا۔ ورنہ اس موقع پر شیخ عاصم کی لاش گرانا میرے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کسی کیچوے کو مسلنا۔ جونہی عاصم پیچھے ہٹا' صفدر نے ایک جھٹکے سے کلچ چھوڑ کر ایکسیلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ طاقتور مرسیڈیز کمان سے نکلے تیر کی طرح شیورلیٹ کی طرف بڑھی' سڑک پر ایک جانب چار پانچ فٹ کا راستہ کھلا رہ گیا تھا۔ صفدر کا رخ اسی راستے کی طرف تھا۔ مرسیڈیز کا دایاں حصہ شیورلیٹ کی رم سے ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ چنگاریاں چھوٹیں اور مرسیڈیز' شیخ عاصم کی شیورلیٹ کو راستے سے ہٹاتی ہوئی آگے نکل گئی۔

"کدھر جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" صفدر نے کہا۔

"فی الحال مین روڈ پر چلو اور وہاں سے دائیں جانب رخ کرو۔"

"کیوں' پھر صحرا میں گھسنے کا ارادہ ہے؟" صفدر کی شوخیٔ طبع اس نازک موقع پر بھی جھلک دکھا رہی تھی۔

"یہ مرسیڈیز صحرا میں گھس سکتی ہے تو ضرور چلو۔" میں نے کہا۔

"صحراؤں میں گھسنے کے لیے گاڑیوں کی نہیں حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے شاہ جہاں صاحب۔ سسی پنوں کی کہانی تو

آپ نے پڑھی ہوگی۔"

غزالہ ہماری گفتگو سے بے نیاز گوشے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سر بچے پر یوں جھکایا تھا کہ بچہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ ہچکیوں سے روتی چلی جارہی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ فی الحال غزالہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی صفدر نے گاڑی کا رخ شہر کے مضافات کی طرف کردیا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس موقع پر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ صفدر کی طرح میری نظر بھی بار بار عقب نما آئینے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ ابھی تک ہمیں اپنے تعاقب کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ابوظہبی کی پولیس سے بھی اب ہمیں خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ ابوظہبی کی پولیس یوں تو بہت سخت ہے اور قانون نافذ کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتی لیکن اس میں بہت زیادہ پھرتی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عملی تجربے کی کمی نے ان کی کارکردگی کو متاثر کیا ہے۔

ہم مین روڈ پر ڈیڑھ دو کلو میٹر سفر کر چکے تو ایک دم میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ صفدر نے شیخ عاصم کے ایک باورچی کا ذکر کیا تھا۔ صفدر نے عباس نامی اس باورچی کو اغوا کرکے اس سے گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں اور اسے خاصا "مرعوب" کیا تھا۔ میں نے صفدر سے باورچی کا ذکر کیا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بولا "آپ نے خوب یاد دلایا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت عباس کا گھر ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ مجھے دیکھتے ہی عباس اور اس کے اہل خانہ کی خوف سے گھگی بندھ جائے گی۔ وہ میری آنکھ کے اشاروں پر چلیں گے۔ ہم عباس کے گھر میں بڑے اطمینان سے کچھ وقت گزار سکتے ہیں۔"

"اس کا گھر ہے کہاں؟"

"خوبی کی بات یہ ہے کہ ہم اس کے گھر کی جانب ہی جارہے ہیں۔ اگلے چوک سے ہم دائیں جانب مڑیں گے تو پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد عباس کے محلے میں داخل ہوجائیں گے۔"

"دیکھ لو۔ کہیں کوئی مسئلہ تو پیش نہیں آئے گا۔ میرا مطلب ہے کہ ہم عاصم سے چھپ رہے ہیں اور اسی کے باورچی کے گھر میں پناہ لیں گے۔"

"یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" صفدر نے اطمینان سے گاڑی کو چوراہے سے دائیں جانب موڑتے ہوئے کہا۔

"عباس کے اہل خانہ جانتے ہیں تمہیں؟"

اہل خانہ کے لفظ پر صفدر مسکرایا "جناب! اہل خانہ کو آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ بس دو بیویاں ہیں اس کی۔ دیکھنے کی چیزیں ہیں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد ہم ایک درمیانے سائز کے مکان میں داخل ہوئے۔ یہ مکان رہائشی علاقے میں تھا لیکن دوسرے مکانوں سے قدرے الگ تھا۔ بیرونی احاطے کا گیٹ کھلا مل گیا تھا "اندرونی حصے کی "کال بیل" اندرونی دروازے پر تھی۔ کال بیل پر ایک سرخ و سپید قندھاری انار جیسی فربہ اندام عورت نے دروازہ کھولا۔ صفدر کی صورت نظر آتے ہی عورت کا رنگ اتر کے لبوں پر آگیا۔ اس کا بھاڑ سا منہ کھلا رہ گیا تھا اور منہ ہی کی طرح دروازہ بھی کھلا رہ گیا تھا۔ میں اور صفدر عورت کو دھکیل کر اندر گھس گئے۔ صفدر نے اشاروں کنایوں میں عورت نما لڑکی کو سمجھایا کہ اگر اس نے چیخنے کی کوشش کی تو وہ اسے عین ماتھے پر گولی مار کر عدم آباد روانہ کردے گا۔

صفدر کے اشاروں کنایوں کو واضح کرنے کے لیے ریوالور بھی اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ کمرے کی روشنی میں' میں نے دھیان سے دیکھا۔ جیسے شروع میں' میں نے عورت سمجھا تھا وہ اتنی "عورت" بھی نہیں تھی۔ بمشکل پچیس چھبیس سال عمر رہی ہوگی' ہاں بے حد صحت مند ہونے کے سبب وہ بڑی عمر کی نظر آتی تھی' وہ خوف زدہ تھی لہٰذا اس کے جسم کی چربی یوں ہل رہی تھی جیسے لرزے کا بخار چڑھا ہوا ہو۔ اس کے ہونٹوں سے مقامی زبان میں پتا نہیں کیا کچھ نکل رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک نہایت سُریلی نسوانی چیخ برآمدے کی طرف سے سنائی دی۔ میں نے دیکھا کہ تر و تازہ گوشت کا ایک اور خوب صورت پہاڑ وہاں بھی موجود تھا۔ یہ عورت نما لڑکی بھی شکل و صورت اور قد کاٹھ میں پہلی جیسی لگتی تھی۔ صفدر کو دیکھ کر اس کی بھی خوف کے مارے بری حالت ہوگئی۔ وہ شاید نہائی ہوئی نکلی تھی۔ اس کے بال گیلے تھے اور ایک بڑے سائز کا تولیا اس کے چربی دار جسم پر لپٹا ہوا تھا۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی شڑاپ سے واپس کمرے میں گھس گئی اور اندر سے کنڈی لگالی۔

"اندر فون تو نہیں ہے۔" میں نے صفدر سے پوچھا۔

صفدر نے اطمینان سے نفی میں جواب دیا اور مجھے بتایا کہ یہی دونوں عباس کی گھروالیاں ہیں۔ وہ آپس میں کزن تھیں۔ صفدر نے اشاروں کنایوں میں عباس کی لرزہ براندام بیوی سے پوچھا کہ عباس کہاں ہے۔ جواب یہ تھا کہ وہ ڈیوٹی پر

ہے اور ابھی گھر نہیں آیا۔ صفدر نے اسے دھمکی آمیز انداز میں کچھ سمجھایا۔ وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ وہ بالکل سدھائی ہوئی گائے کی طرح ایکٹ کررہی تھی۔

غزالہ ابھی تک بچے سمیت گاڑی میں ہی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ غزالہ کو اس وقت لایا جائے جب یہاں گھر میں سب کچھ ہماری منشا کے مطابق ہوجائے۔ گھر کے ڈائننگ روم میں فون موجود تھا' صفدر نے اس کا تار نکال دیا۔ عباس کی دونوں بیویوں میں سے ایک تو قدرے حوصلے والی تھی لیکن وہ جو باتھ روم سے نکلی تھی اس کی طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں وہ چیخ و پکار شروع نہ کردے۔ صفدر نے پچھلے کمرے میں اس خوب صورت موٹی کو ایسا اڑنگا لگایا کہ وہ چاروں شانے چت ہوگئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پیشتر کہ آواز اس کے حلق سے برآمد ہوتی' صفدر نے ایک تولیا اس کے منہ میں ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ بعد ازاں اس کے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔ مشکیں کسے جانے کے بعد وہ کچھ اور بھی گول مٹول اور مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی۔ صفدر بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ موٹی کو باندھتے ہوئے وہ گنگنا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سگریٹ کے کش بھی لگا رہا تھا۔ خطرات میں گھر کر اس کی شوخی طبع کچھ اور بھی نکھر آتی تھی۔ اسی باندھنے کے دوران میں صفدر فربہ اندام عورت پر جھکا تو اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ عورت کے گھٹنے سے چھوگئی۔ وہ چیخی لیکن آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے پورے جسم پر زلزلہ طاری ہوگیا تھا۔ جتنی تکلیف اسے ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ اظہار وہ کررہی تھی۔ پورے جسم کی چربی تھل تھل کررہی تھی۔ صفدر بولا "میرا خیال ہے کہ گائے کو "مرگی" پڑگئی ہے۔ کیوں نہ جلدی سے چھری پھیر لیں۔"

میں نے کہا "یہ کیا آفتیں ہیں بھئی؟"

صفدر بولا "آفتیں نہیں جی۔ عباس کی بیویاں ہیں۔ اسے فربہ اندام عورتیں پسند ہیں۔ یہ دونوں مصری تربوز گھر میں ادھر اُدھر لڑھکتے ہیں تو عباس کی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھتے ہیں۔ زریں گل یہاں ہوتا تو ان دونوں پر ضرور کوئی نہ کوئی یادگار گانا اسے یاد آجاتا۔ حالانکہ میں زریں گل نہیں پھر بھی میرا دل چاہ رہا ہے کہ ان دونوں پر کوئی شان دار گانا فٹ کردوں۔ مثلاً پتلی کمر ہے ترچھی نظر ہے۔"

گھر کے ماحول اور مکینوں سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد صفدر نے مجھ سے کہا کہ میں غزالہ کو لے آؤں۔ میں غزالہ کی طرف روانہ ہوا۔ مرسیڈیز ہم نے عباس کی رہائش گاہ سے تقریباً ایک فرلانگ دور ایک نیم تاریک گلی میں کھڑی کی تھی۔ گاڑی کی ایک سائیڈ شیو رلیٹ سے ٹکرانے کے بعد پچک چکی تھی۔ وہ سائیڈ صفدر نے دیوار کی جانب رکھی تھی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا مرسیڈیز تک پہنچا۔ شیخ عاصم سے غزالہ کی "بغاوت" کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے بہت دور رس نتائج نکلنے والے تھے۔ ایک وفا شعار صابر بیوی کی ذات میں اٹھنے والا یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو شیخ عاصم نامی شوہر کو عرش سے فرش پر لے آیا تھا۔

میں نے مرسیڈیز کے پاس پہنچ کر اندر جھانکا۔ غزالہ وہاں نہیں تھی۔ غزالہ اردگرد کہیں بھی نہیں تھی۔ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ غزالہ بچے سمیت غائب تھی۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید غزالہ کو زبردستی کہیں لے جایا گیا ہے۔ لیکن پھر میری نگاہ مقفل گاڑی کے اندر ڈیش بورڈ پر پڑی۔ وہاں ایک رقعہ موجود تھا۔ ایک مختصر کاغذ جس پر چند سطور گھسیٹی گئی تھیں۔

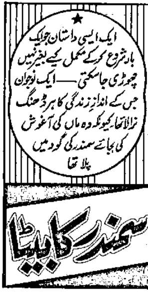

مرسیڈیز کے دروازے اندر سے لاک تھے۔ میں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور رقعہ نکال لیا۔ وہ غزالہ کی ہی تحریر تھی۔ اس نے بڑی جلدی میں لکھا تھا ورنہ عام ڈاکٹروں کے برعکس اس کی تحریر بڑی خوب صورت تھی۔ غزالہ نے لکھا تھا۔

"شاہ جہاں! میں ایک دوراہے پر کھڑی ہوں۔ ایک طرف عاصم تھے' دوسری طرف آپ۔ جو راستہ عاصم کی طرف جاتا تھا وہ آج میں نے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے' کیونکہ اس سے زیادہ صبر و برداشت مجھ میں نہیں ہے۔ دوسرا راستہ آپ کی طرف جاتا ہے مگر مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اس راستے پر قدم رکھ سکوں۔ لہٰذا میں آپ دونوں سے دور جا رہی ہوں۔ ابھی میرے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی ہے شاید میں اس موقع پر ٹھیک سے کوئی فیصلہ بھی نہیں کر سکتی ہوں۔

بس ایک بات یاد رکھیے گا' میں جہاں بھی رہوں گی۔ آپ کو یاد رکھوں گی۔ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کو بھولوں گی نہیں۔ میں ایک ایسی عورت ہوں جس کے ساتھ بے شمار مجبوریاں چمٹی ہوئی ہیں۔ اگر اس طرح اچانک میرے چلے جانے سے آپ کی دل آزاری ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں شاید کچھ عرصے بعد آپ کو ایک آخری خط لکھوں گی۔ اس خط میں آپ کو اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بتاؤں گی۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش کار آمد نہیں ہوگی۔ اس میں وقت ضائع نہ کیجیے گا۔

فقط غزالہ۔"

میں خط ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر گم صم کھڑا رہا۔ غزالہ نے بالکل اچانک ایک غیر متوقع فیصلہ کیا تھا۔ میرے سینے میں درد کی ایک ٹیس اٹھی' وہ پتا نہیں کیوں مجھے مسلسل کانٹوں میں گھسیٹ رہی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے اس کے حوالے سے امید کی کرن نظر آتی تھی تو دوسرے ہی لمحے مایوسی کا پہاڑ سر پر آن گرتا تھا۔

ابھی تک تو مجھے ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ شیخ عاصم کے پاس سے کیسے بھاگی تھی اور کیسے اس ریستوران تک پہنچی تھی جہاں میں اور صفدر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اب وہ بے شمار نئے سوالات چھوڑ کر پھر اوجھل ہو گئی تھی۔

اتنے میں مجھے صفدر اپنی طرف آتا دکھائی دیا "غزالہ کہاں ہے؟" اس نے پاس آ کر پوچھا۔

میں نے خط اس کی طرف بڑھا دیا' خط پڑھ کر صفدر کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا "میرا خیال ہے کہ ہمیں اسے ڈھونڈنا چاہیے۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔" صفدر نے کہا۔

میں گاڑی پر اور صفدر پیدل۔ دو مختلف اطراف میں روانہ ہو گئے۔ یہ ایک رہائشی علاقہ تھا' سڑکیں زیادہ کشادہ نہیں تھیں' کچھ زیادہ چہل پہل بھی نہیں تھی۔ غزالہ نے فیروزی رنگ کی پھول دار قمیص پہن رکھی تھی۔ میری نگاہ اس قمیص کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ غزالہ نے ایسا کیوں کیا اور آئندہ اس کا کیا ارادہ ہے لیکن اس نے جو کچھ بھی کیا تھا خاصا خطرناک تھا۔ شیخ عاصم کے ہرکارے اسے ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور وہ بچے کے ساتھ تن تنہا نکل گئی تھی پھر میرے دل میں آیا کہ شاید پہلے سے اس نے پلاننگ کر رکھی تھی کہ شیخ عاصم سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ کہاں جائے گی ورنہ وہ اتنی بے وقوف تو نہیں تھی کہ یوں خود کو سنگین مشکلات کے حوالے کر دیتی۔

قریباً ایک گھنٹے تک آبادی کی سڑکوں پر گاڑی گھمانے کے بعد میں بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ پانچ دس منٹ بعد صفدر بھی خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ ہم دونوں پریشان اور بہت حد تک مایوس بھی تھے۔ صفدر اکیلا واپس نہیں آیا تھا' اس کے ساتھ ابی باقر بھی تھا۔ ابی باقر سے صفدر کی ملاقات محض اتفاقاً ہو گئی تھی۔ وہ صفدر کو ابو ظہبی کے ایک پبلک پارک میں منڈلاتا ہوا مل گیا تھا۔ ابی باقر کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ سنان کے عشرت کدے سے ہمارے آنے کے بعد غزالہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ ابی باقر نے بتایا کہ کل رات شیخ عاصم اور ان کی بیگم صاحبہ کے کمرے سے بلند لہجے میں بولنے کی آوازیں آئیں۔ شیخ عاصم بہت زور سے گرج برس رہے تھے۔ آج شام اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد شیخ عاصم کے ڈرائیور ناصر نے بڑی راز داری سے ابی باقر کو بتایا کہ بڑے صاحب (شیخ عاصم) کی مسز اپنے کمرے میں نہیں ہیں اور بڑے صاحب انہیں گھر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد پورچ سے کئی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ ان میں شیخ عاصم کی نئی شیورلیٹ بھی تھی۔ کئی مسلح آدمی ایک جیپ پر سوار تھے۔ ابی باقر نے صاف محسوس کیا کہ یہ لوگ مسز عاصم کے تعاقب میں گئے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ابی باقر کو ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا۔

میں نے ابی باقر کو مختصر الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ شیخ عاصم اور اس کے کارندے واقعی غزالہ کے پیچھے گئے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ میں نے ابی باقر سے کہا کہ اگر اسے کہیں غزالہ کا کھوج ملے تو وہ فوراً ہمیں مطلع کرے۔ اس کے علاوہ میں نے اسے شیخ عاصم

اور اس کے کارندوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی ہدایت بھی کی۔ ابی باقر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ شاید یہ اس کی تمنا تھی کہ میں اسے کسی کام کے لیے کہوں۔ اس کے چہرے اور گردن پر ابھی تک مکڑیوں کے کاٹنے کے نشانات موجود تھے۔ اس نے صفدر کو بتایا تھا کہ ان نشانات کو دیکھ کر وہ اکثر ٹنڈی دل والے ہولناک واقعے کو یاد کرتا رہتا ہے۔

وہ رات ہم نے عباس کے گھر میں اس کی دونوں فربہ اندام عورتوں کی میزبانی میں گزاری۔ رات کو عباس بھی واپس آ گیا تھا۔ اپنی زوجین کی طرح وہ بھی صفدر سے بے حد مرعوب تھا۔ صفدر کا چہرہ دیکھتے ہی اسے لرزے کا بخار چڑھ گیا اور وہ صفدر کے احکامات پر بلا چوں و چرا عمل کرنے لگا۔ عباس کی ایک بیوی کو تو صفدر نے مشکیں کس کے پچھلے کمرے میں دھکیل دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شور شرابا کرتی تھی' دوسری بیوی آزاد تھی اور شوہر کے ساتھ مل کر ہماری خدمت گزاری میں مصروف تھی۔ وہ واقعی کسی تربوز کی طرح ادھر سے ادھر لڑھکتی پھر رہی تھی اور رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ اس کے قدم ذرا سست پڑتے تو صفدر کڑک کر بولتا۔ عورت کے جسم کا سارا گوشت تھرا اٹھتا اور رفتار ایک دم تیز ہو جاتی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم گوشت کی اس گیند کو یوں لڑھکتے دیکھ کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکتے لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ غزالہ کی اچانک غیر موجودگی نے ہمیں پریشان کن سوچوں کے حوالے کر رکھا تھا۔ اس نے بڑا عجیب و غریب قدم اٹھایا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گھر ہی سے سب کچھ سوچ کر نکلی تھی کہ کہاں جانا ہے اور کس طرح جانا ہے۔ یقینی بات تھی کہ وہ فی الوقت ائرپورٹ کا رخ نہیں کرے گی' وہ ابو ظہبی کے اندر ہی کہیں موجود تھی۔ اب معلوم نہیں تھا کہ اتنے بڑے شہر میں وہ کون سی چار دیواری ہے جس نے اسے پناہ فراہم کر رکھی ہے۔

غزالہ کا چھوڑا ہوا خط میں اور صفدر کئی بار پڑھ چکے تھے۔ ہر بار ہم نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ اب کبھی عاصم کے پاس واپس نہیں جائے گی' بالآخر اس نے عاصم سے اپنا راستہ جدا کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ وہ اب پاکستان بھی واپس جانا نہیں چاہتی۔ اپنے والدین کے پاس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غزالہ کو بخوبی معلوم تھا کہ اس کے شوہر کے ہاتھ کتنے لمبے اور بے رحم ہیں' وہ لاہور سے اسے باآسانی واپس اپنے گھر لا سکتا تھا بلکہ شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے وہ غزالہ کو واپس نہ لا سکتا ہو۔

خط میں غزالہ کا یہ جملہ اہم تھا کہ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی ہے اور وہ ٹھیک سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی کسی آخری فیصلے پر نہیں پہنچی ہے۔ غزالہ کے اس جملے کے کئی معنی ہو سکتے تھے اور ایک معنی ایسا بھی تھا جس سے مجھے بیتے دنوں کی مدھم خوشبو آئی تھی' اپنے گاؤں جل کوٹ کی کچی دیواروں کی خوشبو' باغوں کی خوشبو اور سرما کی اس سنہری دھوپ کی خوشبو جو سرسوں کے کھیتوں پر چمکتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ ابو ظہبی میں غزالہ کے لیے بے شمار خطرات ہیں۔ وہ اس اجنبی شہر میں دشمنوں کے نرغے میں تھی۔ میرا دل کسی طرح یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ میں اسے یہاں چھوڑ کر صفدر کے ساتھ بھوپال روانہ ہو جاؤں۔ صفدر بھی میری دلی کیفیت سمجھتا تھا' حالانکہ وہ بھوپال پہنچنے کے سلسلے میں بہت بے تاب تھا لیکن کل شام پیش آنے والے واقعات کے بعد اس کے ہونٹوں پر بھی تالا لگ گیا تھا۔

رات کو میں اور صفدر دیر تک سگریٹ پھونکتے رہے اور سوچ بچار کرتے رہے اب ہم حماد حسنی کے پاس کسی صورت واپس نہیں جا سکتے تھے۔ شیخ عاصم' غزالہ کو ہمارے ساتھ حماد حسنی کی گاڑی میں دیکھ چکا تھا۔ اب یقینی بات تھی کہ حماد حسنی بلکہ اس کے بہت سے عزیز و اقارب بھی شیخ عاصم کی کڑی نگرانی میں ہوں گے۔ باورچی عباس کے گھر میں بھی ہم زیادہ دیر قیام نہیں کر سکتے تھے۔ عباس کے گھر میں کوئی مہمان آتا تو اسے پہلی نگاہ میں گڑبڑ کا احساس ہو سکتا تھا۔

اگلے روز ہم نے حماد حسنی کی مرسیڈیز گاڑی وہیں چھوڑی اور خاموشی سے ابو ظہبی کے ایک گمنام ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ یہ چھوٹا سا ہوٹل تھا اور ایک پستہ قد اردنی کی ملکیت تھا۔ اس ہوٹل میں ہمارے قیام کا علم ابی باقر کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی بھی طور پر غزالہ کا کھوج مل سکے لیکن وہ ایسی اوجھل ہوئی تھی کہ کوئی نام و نشان چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ ہم خود تو ہوٹل سے نکل نہیں سکتے تھے کیونکہ عاصم کے شکاری کتے ہماری تاک میں تھے' تاہم ابی باقر غزالہ کی تلاش کے کام میں ہماری کمی پوری کر رہا تھا۔ وہ واقعی کام کا آدمی تھا۔ ہر مشکل سے نپٹنے کے لیے ہر وقت تیار۔ ابو ظہبی میں سیکڑوں افراد سے اس کی جان پہچان تھی۔ انتظامیہ کے ہر شعبے میں ایسے لوگ تھے جو اس کے کام آ سکتے تھے۔ وہ اپنے چند قریبی ساتھیوں سے مل کر زور و شور سے غزالہ کی تلاش کا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ دوسری طرف وہ ہمیں شیخ عاصم کے متعلق بھی رپورٹیں دے رہا تھا۔ شیخ عاصم پر گہری مایوسی طاری تھی۔ ابی باقر کی زبانی معلوم ہوا کہ شراب نوشی کے علاوہ وہ کثرت سے خواب آور گولیاں کھا رہا ہے اس بد اعتدالی کی وجہ سے اس کی صحت جو

پہلے ہی خراب تھی مزید خراب ہو رہی تھی اسے اٹھنے بیٹھنے میں سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی اور وہ کمر پر ہاتھ رکھے بغیر چل نہیں سکتا تھا۔" ابی باقر نے یہ بھی بتایا کہ شیخ عاصم کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس پٹی کی اصل وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے غزالہ سے مار پیٹ کی ہو جس کے سبب اس کے ہاتھ پر چوٹ لگی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ تعاقب کے دوران میں اسے یہ چوٹ آئی ہو۔ ابی باقر نے بتایا "شیخ صاحب اس خبر کو راز رکھنے کی سخت کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے بہت قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ غزالہ صاحبہ ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ شیخ صاحب نے یہ تاثر دیا تھا جیسے کسی ناراضی کے سبب غزالہ صاحبہ چلی گئی تھیں لیکن اسی شام وہ انہیں واپس لے آئے تھے۔"

ابی باقر ہمیں بہت فائدہ پہنچا رہا تھا۔ اگر ابی باقر اندرون خانہ خبریں ہم تک نہ پہنچاتا تو یقیناً اس اطلاع سے ہمیں مزید تشویش لاحق ہو جاتی کہ غزالہ پھر شیخ عاصم کے پاس پہنچ گئی ہے۔ تین چار روز کی سرتوڑ کوشش کے بعد جب ہمیں غزالہ کی طرف سے ناکامی ہوئی تو بادل ناخواستہ ہم نے انڈیا روانہ ہونے کا پروگرام بنایا۔ درحقیقت میں مسٹر جی کلارک اور مجیتی کنور وغیرہ کا مزید امتحان لینا نہیں چاہتا تھا۔ اتوار کے روز ہم نے انہیں بتایا تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر ہم بھوپال پہنچ رہے ہیں اور اب اس بات کو قریباً چھ روز ہو چکے تھے۔ صفدر کے سفری کاغذات اب تک حماد حسنی کے پاس موجود تھے، صفدر نے عقل مندی یہ کی تھی کہ چار روز پہلے جونہی ہم حماد حسنی سے ملے تھے اس نے اپنے کاغذات ان سے لے لیے تھے۔ میرے کاغذات میرے لباس کی ایک اندرونی جیب میں موجود تھے اور معجزانہ طور پر ابھی تک بالکل محفوظ تھے۔ جب ابوظبی کے نواح میں لشکر نے مجھے پکڑا تو اس کے آدمیوں نے سرسری طور پر میری جامہ تلاشی لی تھی۔ اس جامہ تلاشی میں یہ کاغذات بچ گئے تھے پھر جب صحرائی بستی میں شاری کے مسلح محافظوں نے مجھے اور غزالہ کو قید خانے میں ڈالا تو اس وقت ہم دونوں کی مکمل تلاشی لی گئی۔ اس تلاشی میں کاغذات شاری کے چچا ابو آبان کے ہاتھ لگے لیکن اس نے مجھے واپس کر دیے۔ ان کاغذات کی موجودگی میں مجھے ابوظبی چھوڑنے کے لیے صرف ٹکٹ کی ضرورت تھی، لیکن ایک بات طے تھی کہ ائرپورٹ جانے میں ہمارے لیے بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔ شیخ عاصم اور شیخ عشار اب دونوں ہماری تلاش میں تھے۔ یقیناً ابوظبی میں ان دونوں کی رسائی بہت دور تک تھی۔ دونوں زبردست افرادی قوت کے مالک بھی تھے۔ یہ یقینی بات تھی کہ ائرپورٹ ان کی نگرانی میں ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ بہت سے لوگوں کو میرے اور صفدر کے علاوہ غزالہ کا حلیہ بھی ازبر کرا دیا گیا ہو یا ہماری تصویریں فراہم کر دی گئی ہوں۔ اس صورت حال میں سوچ بچار کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ائرپورٹ کے بجائے سمندر کا رخ کیا جائے اور لانچ وغیرہ کے ذریعے ابوظبی سے نکلا جائے۔ ہمارے ہمدرد اور خیر خواہ ابی باقر کا بھی یہی مشورہ تھا۔ لانچوں کی غیر قانونی آمد و رفت کا کام کرنے والے ایک شخص کو ابی باقر جانتا تھا۔ اس شخص کے حوالے سے ابی باقر نے ہمیں یہ خوش خبری سنائی تھی کہ دو لانچیں ایک دو دن میں ابوظبی سے بندر عباس کے لیے روانہ ہو رہی ہیں، ہمیں ان میں جگہ مل سکتی ہے غور و خوض کے بعد ہم نے ابی باقر کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

○☆○

بذریعہ لانچ بندر عباس تک ہمارا سفر خوشگوار اور محفوظ رہا۔ ہم نے قریباً سو میل تک ایران کے ساحلی علاقے میں بذریعہ بس سفر کیا مکرانی ساحل کے قریب سے دوبارہ لانچ میں بیٹھ گئے۔ اس لانچ نے طوفانی رفتار سے سفر کر کے تین روز میں خلیج کچھ کے اندر ہندوستانی بندرگاہ جام نگر تک پہنچا دیا۔ مغربی ہند کے اس شہر سے خشکی کے راستے ہم بھوپال تک کیسے پہنچے یہ ایک طویل لیکن غیر دلچسپ روداد ہے۔ اگر اس سارے سفر کا تذکرہ کروں گا تو قارئین کو کئی صفحات پڑھنے پڑیں گے۔ اس سفر میں ایک دو واقعات قابل ذکر بھی ہیں لیکن میں ان سے بھی گریز کر رہا ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ کوسٹ گارڈز اور مغربی ہند کی کالی بھجنگ پولیس سے بچتے بچاتے ہم قریباً سات روز بعد احمد آباد اور احمد آباد سے بھوپال پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ منگل کا دن تھا، موسم گرم اور خشک تھا۔ بارشیں نہیں ہوئی تھیں لہٰذا ٹمپریچر معمول سے بڑھا ہوا تھا۔ صفدر نے احمد آباد سے ہی بذریعہ فون مجیتی کنور کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی، لہٰذا ہم جونہی بھوپال کے دھواں دھوں بس اڈے پر بس سے اترے چند بانکے چھبیلے بھوپالیوں نے بڑے احترام سے ہمیں لپک لیا۔

"آئیے صفدر صاحب! ہم آپ اچ کا انتظار کر رہے تھے۔"

شیروانی اور تنگ موری کے پاجامے والے ایک شخص نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "آئیے حضور! آپ بھی تشریف لائیے۔"

ہم ایک ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھے اور یہ گاڑی بھوپال کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بھوپال اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ بازاروں میں چہل پہل بڑھ رہی تھی، رنگین ساڑھیاں بہار دکھا رہی تھیں۔ رنگ برنگی اچکنیں نظر کو بھاتی تھیں، سڑکوں پر چھڑکاؤ ہو رہا تھا اور بے فکروں کی ٹولیاں یہاں وہاں خوش گپیوں میں مصروف دکھائی دیتی تھیں۔ ایک بہت بڑی پان شاپ کے سامنے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ یوں لگا جیسے ٹی وی پر کوئی میچ وغیرہ دکھایا جا رہا ہے۔ صفدر نے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں، یہ بھوپال کی گنی چنی پان شاپس میں سے ایک ہے۔ یہاں ایسے ہی جم غفیر موجود رہتا ہے۔

بھوپال میں اترتے ہی کچھ نہایت تلخ یادوں نے مجھے گھیر لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کے وہ شب و روز یاد آ گئے تھے جو کسی سادہ دل لڑکی کی والہانہ محبت سے عبارت تھے۔ ہاں یہی وہ ماحول تھا جس کا تعلق نواب زادی شاہین سے تھا، وہ شاہین جس کے اندر ایک پاک معصوم اور حسین روح کا بسیرا تھا۔ جس نے مجھے یوں ٹوٹ کر چاہا تھا کہ شاید قدرت بھی ششدر رہ گئی تھی۔ وہ طوفانی دھارے جیسی محبت تھی طوفان کی طرح آئی تھی، مجھے اپنے ساتھ بہایا تھا اور پھر طوفان ہی کی طرح نکل گئی تھی لیکن وہ محبت تنہا نہیں گئی تھی، اپنے ساتھ نواب زادی شاہین کو بھی لے گئی تھی۔ اسی گہر اجل میں جہاں ڈوب کر آج تک کوئی نہیں ابھرا۔ ہاں وہ ڈوب گئی تھی، میری آنکھوں کے سامنے، میرے ہاتھوں میں، وہ الوداعی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ نہیں کر پایا تھا۔ جب وہ ڈوبی تھی تو اس کے ساتھ ہی ایک جہان بھی ڈوب گیا تھا۔ وہ جہان جو شاہین نے اپنے تصور میں سجا رکھا تھا۔ ایک خوب صورت چھوٹا سا گھر جس میں وہ میری شریک حیات کی حیثیت سے رہتی تھی، اس گھر کے آنگن میں پھول کھلتے تھے اور بچے چہکتے تھے، وہ گھر شاہین کے ساتھ ڈوبا تھا، اور وہ حسین شامیں ڈوبی تھیں جو ہم نے حیدر آباد کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے گزاری تھیں اور وہ تہوار جو ہم نے ایک ساتھ منانا تھے اور پیار کے وہ سارے موسم بھی جو اب ایک دائمی خزاں کا روپ دھار چکے تھے۔ پھر شاہین کے قاتل مینی جان کا خونی انجام میری نگاہوں کے سامنے آ گیا لال کوٹھی کی ایک نیم تاریک راہداری میں میرے خنجر نے اس کا پیٹ چاک کیا تھا اور اس کی کٹی ہوئی انتڑیاں باہر نکل آئی تھیں، ان لمحوں میں جو

عصرِ حاضر کی عکاسی

سرفروش

خوف دہراس درندہ صفت مینی جان کی آنکھوں میں نظر آیا تھا اس کی یاد نے میرے زخمی دل پر مرہم سا رکھ دیا لیکن درد بہت زیادہ تھا، مرہم بہت تھوڑا تھا۔ بس اڈے سے منزل تک پہنچتے پہنچتے میں درد و کرب کے ایک جلتے صحرا سے گزر گیا پھر مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں میں نمی ہے۔ صفدر کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

بھوپال میں ہماری منزل ایک عالی شان عمارت تھی۔ اس تین منزلہ عمارت میں اس کثرت سے کھڑکیاں تھیں کہ انہیں شمار کرنا دشوار تھا۔ عمارت کے بیرونی دروازے پر درگا دیوی کی کانسی سے بنی ہوئی ایک عظیم الشان مورتی نصب تھی۔ میں مورتی کی لمبائی چوڑائی دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ عمارت کا لان بہت وسیع و عریض تھا۔ یہاں کئی فوارے لگے تھے اور خوب صورت روشوں کی دونوں جانب کیاریوں میں پھول مہک رہے تھے۔ گراسی لان میں کئی جگہ رنگ برنگی چھتریاں تھیں۔ ان چھتریوں کے نیچے بید کی میزیں اور کرسیاں وغیرہ دھری تھیں۔ ایک ایسی ہی چھتری تلے مجھے مسٹر جی کلارک اور مجیتی کنور صاحب بیٹھے نظر آ گئے۔ ایک لڑکی ان کے قریب کھڑی تھی لیکن اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی اور بڑی محویت سے کوئی میگزین وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ ہماری گاڑی پورچ میں داخل ہوئی تو چھتری کے نیچے بیٹھے افراد ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ اب میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا، وہ سوج تھی۔ میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ گاڑی سے اتر کر میں اور صفدر لان کی طرف بڑھے عین اس وقت مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک شخص بلائے ناگہانی کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں اس کے دھکے سے اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ وہ میری پشت پر سوار ہو گیا اور اپنے بازوؤں سے میری گردن جکڑ لی۔ اضطراری حرکت کے تحت میں نے حملہ آور کے پہلو میں اپنی کہنی رسید کرنے کا ارادہ کیا لیکن ایک دم میرے نتھنوں میں ایک جانی پہچانی بو گھسی اور حق ہو کی مخصوص آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ سائیں عالی تھا۔ وہ پیر تسمہ پا کی طرح میری پشت سے چمٹ گیا تھا اور اترنے کا نام نہیں لے رہا

تھا۔ وہ اپنے جسم کو یوں حرکت دے رہا تھا جیسے میں کوئی گھوڑا قسم کا جانور ہوں اور وہ مجھے ہانکنا چاہ رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔ مسٹر جی کلاوک، مجتبٰی کنور اور سروج مودب کھڑے خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے بمشکل خود کو سائیں عالی کے چنگل سے نکالا۔ اب سائیں عالی نے باقاعدہ دھمال ڈالنا شروع کر دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا، بابو باد اس کا نعرہ گونجتا تھا "دل وحزکا سائیں کا ۔۔۔ دل وحزکا" پھر اس نے سبز گھاس پر قلابازیاں کھانا شروع کر دیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح ایک لبے چوغے میں تھا۔ قلابازی کھاتے ہوئے وہ نیم عریاں ہو جاتا تھا لیکن ایسی باتوں کی اسے کہاں پروا ۔۔۔ تھی۔ دو تین درجن قلابازیاں کھانے کے بعد وہ بے دم سا ہو گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، وہ پیلے دانت نکال کر ہنس رہا تھا اور میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

مسٹر کلاوک اور مجتبٰی کنور مجھ سے بغل گیر ہوئے اور گرم جوشی سے استقبال کیا۔ تاہم سروج جوں کی توں وہاں کھڑی رہی۔ پھنسے پھنسے اسکرٹ میں اس کا جسم چیختا ہوا محسوس ہوتا تھا، اس نے مجھے بس دور ہی سے نمستے کیا اور ناراض ناراض نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے سمجھا کہ شاید وہ ناراضی کی وجہ سے میرے پاس نہیں آئی لیکن تھوڑی دیر بعد مجتبٰی کنور کی زبانی پتا چلا کہ سائیں عالی نے اسے صبح سے دھوپ میں کھڑا رہنے کی سزا دے رکھی ہے۔

"کیوں اس نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ پوچھو اس نے کیا نہیں کیا۔" مجتبٰی کنور بولا "پندرہ بیس روز پہلے جب فون پر تم سے ابوظہبی میں بات ہوئی تھی تو یہ سروج بھی پاس ہی موجود تھی۔ جب مسٹر کلاوک اور میں تم سے بات کر چکے تو سائیں عالی نے سروج سے کہا کہ وہ بھی تم سے بات کرے۔ اس نے ریسیور ہاتھ میں پکڑ لیا لیکن جھجکتی رہی۔ شاید کچھ ناراضی تھی اسے تم سے۔ اسی دوران میں لائن کٹ گئی۔ سائیں صاحب جلال میں آ گئے، اس کی پیٹھ پر ڈنڈا رسید کیا اور دھوپ میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اس دن سے یہ صبح دس بجے سے شام تک روزانہ دھوپ میں کھڑی رہتی ہے۔ دوپہر کو صرف ایک گھنٹے کے لیے کھانے وغیرہ کی اجازت ہے، پھر جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

مسٹر کلاوک بولے "یہ گرو اور چیلی کا معاملہ ہے، ہم کیا کہہ سکتے ہیں، بہرحال دونوں بہت دلچسپ کریکٹر ہیں اور بہت غیر معمولی بھی۔"

"غیر معمولی آپ کس لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔" میں نے مسٹر کلاوک سے پوچھا۔

وہ بولے "اب یہ سائیں کا غیر معمولی پن نہیں تو کیا ہے کہ ہم دفینے کے قریب پہنچ کر بھی اس سے دور ہیں اور تمہارے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔ سائیں عالی اب تک یہی کہتا آیا ہے ناں کہ شاہ جہاں کے بغیر ہم دفینے تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"کیوں ایسی کیا رکاوٹ آ گئی ہے جناب۔ جو میں ہی دور کر سکتا ہوں۔"

"رکاوٹ سی رکاوٹ ہے۔" مسٹر کلاوک نے کہا۔ مجتبٰی کنور کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔ مجتبٰی کنور نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو آؤ اندر۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

میں اور صفدر دونوں سینئر حضرات کے ساتھ عمارت کے اندر آ گئے۔ پورچ میں دو تین اعلیٰ نسل کی گاڑیاں موجود تھیں، اس کے علاوہ ایک ایمبولینس بھی دکھائی دے رہی تھی۔ عمارت دلکش انداز میں سجی ہوئی تھی۔ محرابی دروازے، کنگرے دار چھجے، سنگ سرخ کی جالیاں، راہداریوں تک میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ کوئی بہت مال دار شخص لگتا تھا اور کافی حد تک رنگین مزاج بھی۔ عمارت میں ایسی تصاویر کثرت سے نظر آتی تھیں جن میں رقص و سرود کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ میں نے ایک سفید وردی والے خدمت گار کو ٹرے میں شراب و کباب کے لوازمات لے جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ کوتاہ قد خدمت گار اس وسیع عمارت کے نجانے کس حصے سے آیا تھا اور کس گوشے کی طرف جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ ٹرے میں لے جا رہا تھا۔ وہ نجانے کس کے لیے تھا یا کس کس کے لیے تھا۔ اس عمارت کے تمام اسرار و رموز ابھی میری نگاہ سے اوجھل تھے۔

ہم نشست گاہ میں آ کر بیٹھ گئے۔ چائے کا دور چلا۔ مسٹر کلاوک مجھ سے اور صفدر سے اب تک کی روداد سننے کے لیے بے چین تھے۔ ہم نے انہیں باری باری رپورٹ دی۔ میری رپورٹ زیادہ طویل تھی کیونکہ میں بہت عرصے سے جدا تھا، بلکہ جاگیردار قلو زماں کی موت کے بعد ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں نے کلارک صاحب کو تفصیل سے بتایا کہ ان کے انڈیا آنے کے بعد پاکستان میں کیا حالات پیش آئے۔ کس طرح سروج کے دماغی دوروں کی خاطر مجھے شب و روز اس کے قریب رہنا پڑا پھر کس طرح شیخ عاصم نے شگفتہ کے رشتے کے حوالے سے مجھے مجبور کرنے کے لیے زرین اور عالم قریشی کو ان کی بیویوں سمیت اغوا کیا اور فریال کو بھی وہاں

پہنچا۔ میں نے ابوظہبی سے آنے والی برات اور اس کے ہاتھ واپس جانے کے تمام واقعات بھی مسٹر کلارک کو بتائے۔ آخر میں، میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح مجھے غزالہ کی ایک دوست نے غزالہ کو درپیش مشکلات کے بارے میں بتایا اور مجھے اس کے پیغام پر امارات پہنچنا پڑا۔

یہ طویل روداد قریباً ایک گھنٹے میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد صفدر نے اپنی کارگزاری سنائی۔ رات کے کھانے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

مسٹر کلاوک نے کہا "تم طویل سفر سے تھکے ہوئے ہو۔ نہا دھو کر کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

میں نے کہا "جناب! تجسس سے میرا برا حال ہے۔ ان کے حالات کے متعلق صفدر نے مجھے کچھ نہیں بتایا، آپ بھی کل پر ٹرخا رہے ہیں۔"

وہ بولے "باتیں واقعی اہم ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ اطمینان سے بیٹھ کر ڈسکس کریں گے۔" یہاں تک کہ کلارک صاحب نے اپنی آواز مزید دھیمی کر لی اور فی الوقت اشارے کے لیے یہ سمجھو کہ ہم دفینے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ بس ایک شخص ہے ہمارے اور دفینے کے درمیان۔"

"لیکن وہ ایک شخص بھی سو کے برابر ہے۔" مجتبٰی کنور نے لقمہ دیا۔

"بس یوں سمجھو کہ ایک نہایت خبطی بڈھے سے ہمارا پالا پڑ گیا ہے، اگر وہ رام ہو گیا تو کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی اور اگر رام نہ ہوا تو سمجھو کہ ہم کنوئیں کے پاس پہنچ کر بھی پیاسے رہیں گے۔"

نہایت پرتکلف باتھ روم میں نہا دھو کر ہم نے رات کا کھانا کھایا اور سونے کے لیے چلے گئے۔ مجھے اپنے بیڈ روم تک پہنچے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ سروج عرف الو کی پٹھی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ مجھے اس کی طرف سے ہلکا سا اندیشہ تو تھا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میری آمد کے فوراً بعد ہی بج دھج کر فرشتہ بنے گی اور مجھ پر نازل ہو جائے گی۔ اس کا گورا رنگ تھوڑا سا سانولایا ہوا تھا۔ شاید کئی دن تک دھوپ میں کھڑا رہنے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ بہرحال اس کی مجموعی فتنہ انگیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مکمل طور پر غارت گر ہوش و خرد تھی۔

سروج سے میری آخری ملاقات لاہور میں میرے امارات جانے سے پہلے ہوئی تھی۔ امارات سے میرے سے پہلے غزالہ کی دوست سلطانہ (مرحومہ) کے کئی فون آئے تھے لیکن سروج نے مجھے بے خبر رکھا تھا۔ اسی بات پر سروج سے میری جھڑپ ہوئی تھی اور میں نے سروج سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ انہی حالات میں، میں امارات چلا گیا تھا۔ اب کئی ماہ بعد ملاقات ہوئی تھی تو سروج مجھے منانے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں کہ مجھے منانے کی تحریک اس کے دل میں از خود پیدا ہوئی تھی یا وہ اپنے گرو گھنٹال کے کہنے پر ایسا کر رہی تھی۔ وہ ڈبل بیڈ پر کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر آہستہ سے بولی "کیسے ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟"

"میں کبھی بھی تمہارے ساتھ راضی نہیں ہوا۔ سمجھو جو کچھ تھا وہ مجبوری کے تحت تھا۔"

"تم اس سے بھی زیادہ سخت لفظ استعمال کر لو لیکن میں تمہیں اپنے من سے نہیں نکال سکتی۔"

"تم یوں کہو کہ دولت کی خواہش کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ تم جو کچھ کرتی رہی ہو اور کرنا چاہتی ہو صرف دولت کے لیے ہے۔"

"ہاں یہ دولت کے لیے تھا اور ہے۔ لیکن اب اس میں کچھ اور سوچیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ مجھے اپنی جان لیوا بیماری سے تمہاری قربت کے کارن چھٹکارا ملا ہے۔ اگر تم مجھے نہ سنبھالتے، مجھے پریم نہ دیتے تو میں شاید اس آسیب سے کبھی خلاصی نہ پا سکتی جو گلگت کی وادی سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ معلوم نہیں کہ تم میری بات پر وشواس کرو گے یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اب بھی وادی کے پردہ نشین سردار کی ہیبت ناک آنکھوں کو اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔ کسی مقناطیس کی طرح وہ آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اگر میں ان آنکھوں کا مقابلہ کر رہی ہوں تو صرف اس آسرے پر کہ تم میرے ساتھ ہو۔ مجھے یہ آشا رہتی ہے کہ تم مجھے اس جان لیوا دماغی الجھن کے حوالے نہیں کرو گے جو میں سوغات کے طور پر اس وادی سے لے کر آئی ہوں۔"

سروج کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ مجھے اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں اب بھی یہ ڈر موجود تھا کہ اگر میں نے سروج کی طرف سے بے اعتنائی برتی تو وہ پھر انہی جان لیوا دوروں کا شکار ہو جائے گی جو اس کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتے تھے اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ کچھ

بھی تھی' میرے اور اس کے خیالات کتنے بھی مختلف تھے لیکن وہ ایک عرصے سے ہماری ساتھی تھی۔ حالات نے کئی برس سے ہمیں ایک ہی کشتی میں سوار کر رکھا تھا۔ سورج کے بارے میں سوچتا تھا تو میں خود کو ایک دوراہے پر محسوس کرتا تھا۔ جہاں سورج کے قریب جانا مجھے گناہ محسوس ہوتا تھا وہاں اس سے دور رہنا بھی گناہ لگتا تھا۔

میں نے اپنا لب ولہجہ نرم کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے پاس ہی تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی "شاہ جہاں! خبر نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم میرے جیون کے لیے بہت اہم ہو گئے ہو' صرف تم ہی ہو جس کے سہارے میں زندہ رہ سکتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے منہ موڑو گے تو وہ منحوس آنکھیں مجھے کھینچ کر واپس اپنے پاس لے جائیں گی۔"

میں سورج سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے خاموش لیٹی رہی۔ اس کی قربت میرے لیے بڑی صبر آزما تھی' میں اس کو جھٹک سکتا تھا نہ اپنے قریب کر سکتا تھا۔ میرا تذبذب اس کا حوصلہ بڑھانے کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ایک شوریدہ سر کوہی نالے کی طرح تھی جو مجھے اپنے ساتھ بہا لے جانا چاہتا تھا۔ اپنے آپ سے اور سورج کے ترم گرم سانسوں سے الجھتا ہوا میں نجانے کب نیند کی وادی میں چلا گیا۔

اگلا روز بہت چمکیلا اور خوشگوار تھا۔ سورج ناراض نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو' بہت بے وقوف ہو تم۔ اس رات کے دامن میں تمہارے لیے کیا کچھ نہیں تھا۔ خوشبو' نرمی' حرارت' محبت سب کچھ تھا لیکن یہ حسین و جمیل چھ گھنٹے تم نے سو کر برباد کر دیے۔ ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر اس نے اپنے بازو پھیلائے تو سلیپنگ گاؤن کے کھلے گریبان میں سے اس کے دودھیا سینے کا وسطی حصہ جھانکنے لگا۔ یہاں مجھے وہی اکھنی جیسا منحوس نشان نظر آیا جس کے اندر اڑتے ہوئے عقاب کی شبیہہ تھی۔ یہ نشان ہر اس مرد و زن کے سینے پر موجود رہتا تھا جو مقدس دیوار کے پار سانوس کی طلسماتی دنیا میں رہنے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس نشان کو وادی واخان میں بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ میں جب بھی اس نشان کو دیکھتا تھا سورج کے حوالے سے انجانے اندیشے میرے ذہن میں سر اٹھانے لگتے تھے۔

ناشتا میں نے مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور کے ساتھ کیا۔ ناشتے کے بعد ہم نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ مسٹر جی کلارک نے اپنے طلائی لائٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے "شاہ جہاں' میں تمہیں ایک انوکھے شخص سے ملانے ہوں' اس کا نام گوپی ناتھ چوپڑا ہے۔ یہ عظیم الشان عمارت جس میں ہم قیام پذیر ہیں اسی کی ملکیت ہے۔ اس کے بھی بھوپال میں اس کی پراپرٹی موجود ہے۔ گوپی ناتھ ایک لٹ شخص ہے لیکن اب بھی بھوپال کے خوش حال لوگوں شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ تمہارا زبردست پرستار ہے۔"

"میرا پرستار؟"

"ہاں۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمہیں فوری طور یہاں بلایا ہے۔ وہ تم سے ملنے کا بہت خواہش مند۔ درحقیقت وہ ایک موذی بڈھا ہے۔ جو بات اس کے دماغ سما جاتی ہے پھر سما جاتی ہے۔ وہ ہماری کوئی بھی بات سننے کو نہیں تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم سے چھپا پھرتا تھا' نہ پر کوئی ترغیب اثر کرتی ہے نہ مصلحت۔ پھر ایک دن باتوں باتوں میں مجتبیٰ کی زبان سے تمہارا نام نکل گیا۔ گوپی ناتھ کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نہ صرف تمہیں جانتے بلکہ تم ہمارے ساتھ مل کر کام بھی کرتے ہو تو وہ ششدر گیا۔ اس نے فوراً یہ اصرار شروع کر دیا کہ ہم تمہیں بلوائیں۔"

"لیکن یہ صاحب مجھے جانتے کیسے ہیں۔ میں ایک سے زیادہ بھوپال نہیں آیا' نہ ہی گوپی ناتھ کا نام کبھی پہلے ہے۔"

"اس نے تمہیں بمبئی میں دیکھا تھا۔ یہ آج سے گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ بمبئی کے وسطی علاقے اروتا نام کا ایک بہت بڑا ہوٹل ہے۔ اس میں کئی اسٹار نام سے ایک قمار خانہ بھی ہے۔ تم اس قمار خانے میں کرتے تھے۔ گوپی ناتھ نے تمہیں وہاں اکثر دیکھا ہے۔"

"کیا گوپی ناتھ بھی وہاں کھیلنے جاتا تھا؟"

"نہیں کھلانے جاتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ اس قمار خانے کا مالک ہے بلکہ اروتا ہوٹل میں وہ ایک چوتھائی کا حصے دار تھا۔"

ایک دم میرے ذہن میں مدھم سی تصویر ابھری درمیانے جسم کا ایک عمر رسیدہ شخص وہ مونچھوں اور سر کلف لگاتا تھا۔ اس کے لب ولہجے میں بلا کی سختی اور تحکم ہوتی تھی وہ اکثر کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھ کر عقابی نظروں سے قمار خانے کا جائزہ لیتا رہتا تھا مجھے اس کا نام بھی یاد آنے لگا۔

گوپی ناتھ ہی نام تھا' لیکن وہ تو خاصا بوڑھا تھا' اس وقت اس کی عمر پچپن سے اوپر تھی' اس کا مطلب تھا کہ اب بچھتر اسی سال کا ہو چکا ہو گا۔

"کچھ یاد آیا تمہیں؟" مجتبیٰ کنور نے پوچھا۔

"ہاں کچھ کچھ آ تو رہا ہے۔" میں نے کہا "اس کی پر ایک زخم بھی ہے' بائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک پہچان رہے ہو تم۔"

"لیکن وہ تو کوئی بھلا آدمی نہیں تھا۔"

"کیسینو (قمار خانہ) چلانے والا بھلا آدمی کیسے ہو گا۔"

"ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا شمار جرائم پیشہ افراد ہوتا تھا۔ سنا تھا کہ وہ اسمگلنگ میں بھی ملوث ہے۔"

"تم نے ٹھیک ہی سنا ہو گا۔" کلارک صاحب نے کہا "اتنی بڑی عمارت اور پراپرٹی وغیرہ اس کا ثبوت ہے' لیکن بات اور بھی ہے' ہماری مصدقہ اطلاعات کے مطابق یہ شروع سے ایسا نہیں تھا۔ یہاں گوپال کے علاقے میں بھی وہ پانچ مرلے کا مکان موجود ہے جہاں گوپی ناتھ نے بچپن اور جوانی کے ابتدائی دن گزارے۔ وہاں کے اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ ایک شریف النفس آدمی تھا اس کی دوستی کسٹم کے ایک اہلکار سے ہو گئی۔ دھیرے دھیرے وہ غلط سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے لگا اور ریونیو آفس کی سرکاری نوکری چھوڑ کر پراسرار کاموں میں مصروف ہو گیا۔ بہرحال یہ غیر متعلقہ باتیں ہیں۔ جو متعلق بات سب سے اہم وہ یہ ہے کہ یہ بڈھا فی الحال اب ایک گراں قدر راز کا مالک ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی کہہ لو' حکمت کہہ لو یا کرشمہ یہ شخص جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے ان انمول جواہرات اور زر و جواہر کا مالک ہے جو کچھ عرصہ پہلے چنے چلی حویلی سے برآمد ہوئے اور انڈیا پہنچے تھے۔"

"کیا آپ یہ بات پورے یقین سے کہہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس بات پر اتنا ہی یقین ہے جتنا یہ کہ تم اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہو۔"

میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ تو بالآخر ہم اس تک پہنچ گئے تھے جس نے ایک مدت سے ہمارے پاؤں اپنے لیے باندھ رکھے تھے' اور ہمارے ارد گرد خونی ہنگاموں کی بساط کر رکھی تھی۔ یہ ایک طویل سفر تھا جس میں ہم نے بے شمار خاک چھانی تھی اور ان گنت زخم کھائے تھے۔

مجتبیٰ کنور نے پرجوش لہجے میں کہا "ہاں شاہ جہاں! یہ سو فیصد کنفرم ہے کہ دفینہ یا دفینے کا بیشتر حصہ گوپی ناتھ کے

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۲۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور۔
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

پاس موجود ہے۔ یقینی بات ہے کہ اس میں وہ نوادرات بھی شامل ہوں گے جن کی قیمت کا ابھی ٹھیک سے تعین بھی نہیں ہو سکا۔"

"یہ بات کیونکر معلوم ہو سکی کہ دفینہ گوپی ناتھ کی تحویل میں ہی ہے؟"

"گوپی ناتھ نے خود بتایا ہے۔" مجتبیٰ کنور نے کہا۔

"گستاخی معاف' آپ خود کہہ رہے ہیں کہ گوپی ناتھ ایک خبطی بڈھا ہے۔"

کلارک صاحب بولے "گوپی ناتھ کے بتانے سے مراد یہ ہے کہ ہمیں یہ بات گوپی ناتھ کے حوالے سے معلوم ہوئی ہے۔ ہمارے ہاتھ گوپی ناتھ کا خفیہ روزنامچہ لگا ہے' اس روزنامچے میں دفینے کا ذکر صراحت سے موجود ہے۔"

"اس سلسلے میں گوپی ناتھ کا موقف کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

کلارک صاحب بے دلی سے مسکرائے "میں نے کہا ہے ناں کہ وہ ایک انوکھا شخص ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ دفینہ اس کے پاس ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اس کا راز اپنے ساتھ چتا میں لے جائے گا اور جلا ڈالے گا۔ کسی وقت موڈ زیادہ خراب ہو تو وہ خود کو اور اپنے مخاطب کو نہایت غلیظ قسم کی گالیاں بھی دینے لگتا ہے۔ اس سے بات کرنا دودھاری تلوار کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے قریبی عزیز اور خدمت گار وغیرہ سب اس کے غصے کے سبب لرزاں رہتے ہیں۔ وہ انہیں ننگی گالیاں دیتا ہے۔ اپنی پوری برادری اس کے قبضے میں ہے۔ اولاد تو اس کی ہے نہیں بس بھتیجے بھانجے ہیں لیکن کسی میں اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں۔ بھوپال کا ایک ریٹائرڈ آئی جی مسٹر شیورت اس کا مربی اور غیر مشروط دوست ہے۔ شیورت کے ہوتے ہوئے کسی عزیز رشتے دار کو سکت نہیں کہ گوپی ناتھ کو عدالت سے مخبوط الحواس قرار دلانے کی کوشش کرے۔ سب اس کی خرمستیاں ولن ترانیاں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ سمجھو کہ بد دماغی اس کی بیماری ہے۔ ہم کئی ہفتوں سے یہ بد دماغی برداشت کر رہے ہیں۔ اس بد دماغی میں تھوڑا سا افاقہ تمہارے نام کی وجہ سے ہوا ہے۔ سائیں عالی کو پختہ یقین ہے کہ تم گوپی ناتھ اور اس کے بگڑے ہوئے موڈ پر قابو پانے میں کامیاب رہو گے' اور ہمیں بھی سائیں عالی کی اس بات میں وزن محسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں حاضر ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

کلارک صاحب نے کہا "اس سوال کا جواب ہم سب کو مل کر ڈھونڈنا ہے۔ فی الحال تم صرف یہ کرو کہ گوپی ناتھ سے ملو۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے ملتا ہے' کیا کہتا ہے' میرا خیال ہے کہ وہ تم سے پرانے دنوں کی باتیں سننا چاہے گا' لڑائیوں اور دربارکنائیوں کا تذکرہ جو بمبئی میں تمہارے' شنکر گروپ کے درمیان ہوتی رہی ہیں۔ اس کے ذہن میں تمہارا ایک تصور ہے۔ ایک ایسا شخص جو ناقابل شکست ہے اور کسی بھی لڑائی میں ہارتا نہیں۔ بہتر ہے کہ تم اس کے سامنے صرف ان واقعات کا ذکر کرو جن میں تمہاری جیت ہوئی ہے۔ باتوں باتوں میں اس سے ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کرو لیکن یہ خیال رہے کہ کسی بھی موقع پر اسے یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم اسے بوڑھا یا ناکارہ سمجھتے ہو۔ وہ بزعم خود بہت توانا اور دیدار مغز شخص ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے خوبصورت خواتین کا تذکرہ اس کے دل کو بھاتا ہے۔ وہ جب ایسی باتوں میں دلچسپی لیتا ہے تو اس کا کرخت موڈ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور کسی وقت تو وہ باقاعدہ خوش بھی نظر آنے لگتا ہے۔"

اس دوران میں عمارت کے کسی حصے سے گرجدار آواز کی آوازیں سنائی دیں کوئی بڑے غصے میں ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجتبیٰ کنور زیر لب مسکرایا "یہی تمہارا پرستار۔ کسی نوکر کے لتے لے رہا ہے۔"

"پھر تو اس سے ملنے کے لیے یہ وقت زیادہ مناسب نہیں۔"

مجتبیٰ کنور بولا "اگر اسے نامناسب وقت سمجھو گے تو پھر تمہیں شاید کئی ہفتے انتظار کرنا پڑے۔ یہ سلسلہ تو یونہی چلتا ہی رہنا ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر پہنچ جاؤ' مجھے امید ہے تمہیں دیکھ کر اس کے انگاروں پر ضرور پانی پڑے گا۔"

"اور ہاں' اس کے سامنے اس کی بیماری کا ذکر نہ کرنا۔" کلارک صاحب نے کہا۔

"تو کیا وہ بیمار بھی ہے۔"

"ہاں۔ کئی ایک عوارض چمٹے ہوئے ہیں اسے۔ دمہ بھی ہے۔ بولتے بولتے سانس پھول جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اس کے الفاظ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئیں لیکن تم اثبات میں سر ہلاتے رہنا۔ اسے جتانا کچھ نہیں۔"

ہدایات اور مشوروں سے لیس ہو کر میں اپنے پرستار کی طرف روانہ ہوا۔ مجتبیٰ کنور میری رہنمائی کر رہا تھا۔ مجتبیٰ کنور نے مجھے بتایا تھا کہ گوپی ناتھ کئی روز سے بے قراری سے میرا انتظار کر رہا ہے لیکن ابھی اسے

میرے متعلق بتایا نہیں گیا۔ در حقیقت کلارک صاحب اور مجتبیٰ اس خبطی بڈھے کو سرپرائز دینا چاہ رہے تھے۔

ایک قالین پوش طویل راہداری سے گزر کر ہم ایک بھاری دروازے کے سامنے پہنچے۔ یہ منقش دروازہ دستکاری اور آرائش کا بہترین نمونہ تھا۔ دروازے کے خوب صورت ہینڈل پر سونے کا اسپرے تھا۔ عمارت کے اس حصے میں مکمل خاموشی تھی' سفید وردیوں والے خادم جو شکلوں سے ہی مہذب "نظر آتے تھے' دبے قدموں آ جا رہے تھے۔ مجتبیٰ نے دروازے پر مدھم سی دستک دی۔ چند لمحے بعد ایک ملازم نے دروازہ کھولا۔ مجتبیٰ کنور نے اس کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ وہ شخص چند لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مجتبیٰ کنور نے آہستگی سے "گڈ لک" کہا۔

میں کمرے میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ بلند چھت والا ایک وسیع کمرا تھا۔ ائرکنڈیشنر کی خنکی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے ایک اسّی پچاسی سالہ بوڑھے کو دیکھا۔ سر کے ساتھ ساتھ بھوؤں کے بال بھی سفید تھے۔ کمر کسی حد تک خم کھا چکی تھی' گردن کا گوشت لٹکا ہوا تھا' لیکن اس کی آنکھیں۔ اس کی آنکھیں سارے وجود سے جدا تھیں۔ ان میں زندگی کی ہوس تھی اور ایک خاص قسم کی چمک تھی' جو یا تو حد درجہ حریص لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے یا ان لوگوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے جن کے سامنے کوئی بہت بڑا مقصد ہو۔ اس بوڑھے کا تعلق غالباً پہلی قسم کے لوگوں سے تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بوڑھا گوپی ناتھ ٹریک سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ورزشی اسپرنگ تھے۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک وہ ان اسپرنگوں سے کھینچا تانی کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہانپا ہوا ہے اور بڑی حیرت سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا "کون ہو تم؟"

مجھے اندر لانے والا سوٹڈ بوٹڈ شخص بولا "سر' یہ شاہ زیب صاحب ہیں۔ کل رات ہی بھوپال پہنچے ہیں۔"

چھ فٹ کا خمیدہ بڈھا ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اسپرنگ رکھ کر لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میز سے عینک اٹھائی اور آنکھوں پر سجا کر میرے قریب چلا آیا۔ اس کا چہرہ جذبات کی زد میں تھا۔

"او شاہ جہاں! مائی سویٹ جہنمی استاد! یہ تم ہو؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "کب پہنچے تم۔ مجھے۔ مجھے کسی نے بتایا کیوں نہیں۔ اچھا۔ میں سمجھا۔ وہ مجتبیٰ کنور بہت

شیطان کا بچہ ہے وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا ہوگا۔"

وہ چند لمحے بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھتا رہا' پھر میرا ہاتھ تھام کر مجھے صوفے تک لے آیا "بیٹھو جہانی! شانت ہو کر بیٹھو۔ میں تمہیں دیکھ کر اتنا ایکسائٹڈ ہوا ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔"

میں صوفے پر بیٹھ چکا تو اس نے ایک بار پھر بغور میرا جائزہ لیا اور بولا "تم آج بھی اتنے ہی صحت مند اور چوکس ہو جتنے دس سال پہلے تھے۔ بہت تھوڑا فرق آیا ہے تم میں۔"

مجھے فوراً کلارک صاحب کی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا "اور آپ بھی تو ویسے کے ویسے ہی نظر آ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں آپ کی کئی اسٹار کلب والی تصویر اب تک موجود ہے۔"

بڈھے گوپی ناتھ کی باچھیں ایک دم کھل گئیں "ریئلی سرپرائزنگ۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم بھی مجھے جانتے ہو۔ اگر واقعی ایسا ہے تو بھگوان جانتا ہے میرے لیے خوشی کی بات ہے۔"

میں نے کہا "میری یادداشت بہت اچھی تو نہیں لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں ایک بار دیکھ کر مدتوں یاد رکھا جا سکتا ہے۔ غالباً آپ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ آج کی طرح اس وقت بھی عمر کے لحاظ سے آپ کی صحت قابل رشک تھی۔"

آخری فقرہ ادا کر کے میں خود بھی چونک گیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے گوپی ناتھ کی "طویل عمر" کا ذکر کر دیا تھا۔ بہرحال خیریت گزری۔ فرط مسرت میں گوپی ناتھ نے میری کوتاہی پر غور نہیں فرمایا۔ وہ بدستور مسکراتا رہا۔ اس کے پوپلے منہ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بہت کم ہنستا ہے۔ اس کے چہرے پر جتنی بھی لکیریں تھیں وہ سب غیظ و غضب والی تھیں۔ اکثر عمر رسیدہ افراد کی طرح گوپی ناتھ کی باچھوں سے بھی بات کرتے ہوئے تھوک بہنے لگتا تھا۔ اس تھوک کو وہ بار بار اپنے رومال سے پونچھ رہا تھا۔

ہم نے پانچ دس منٹ تک بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں کیں' پھر گوپی ناتھ بولا "اگر تم چھما کرو تو میں شاور لے لوں۔ اس کے بعد بیٹھ کر شانتی سے باتیں کرتے ہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ گوپی ناتھ بولا "تم یہاں سے کوئی میگزین لے کر پڑھو' میں دس منٹ میں فارغ ہو جاتا ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمر جھکی ہوئی تھی اور پورے جسم کا گوشت لٹک رہا تھا مگر اس میں کوئی ایسی بدروح گھسی بیٹھی تھی جو اس عمر میں بھی اسے اکڑ کر چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ

باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے اس خوب صورت کمرے کا جائزہ لیا۔ سائڈ ٹیبل پر بہت سی دوائیں پڑی تھیں۔ ان دواؤں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ چند ایک عام سی بیماریوں کو چھوڑ کر تمام بیماریاں اس بڈھی روح کو لاحق ہیں۔ ان میں دمہ، اختلاج قلب، درد شقیقہ، ہائی بلڈ پریشر اور شوگر وغیرہ پیش پیش تھیں۔ ان ساری بیماریوں کی موجودگی میں بھی اگر اس پیر فرتوت کے بستر کے نیچے ورزش کے آلات نظر آرہے تھے تو یہ قدرت کا کرشمہ ہی تھا۔

میں سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے میگزین اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھ میں آنے والا پہلا میگزین ہی توبہ شکن تھا۔ یہ پلے بوائے سے بھی آگے کی کوئی چیز تھی۔ حسینوں کے جھرمٹ، مادی لباس سے قریباً قریباً بے نیاز نظر آرہے تھے۔ میں نے میگزین ایک طرف رکھ دیا۔ دوسرا میگزین اٹھایا وہ بھی اسی قسم کا تھا۔ تیسرا ایک ہندی کتابچہ تھا۔ عنوان تھا، پوشیدہ امراض کا علاج علم وید کی رو سے۔

میں اٹھ کر بک شیلف کے قریب پہنچ گیا۔ شیلف کے اوپر پتھر کی ایک بہت پرانی سل رکھی تھی۔ اس کی پیمائش تین فٹ ضرب آٹھ انچ ہوگی۔ اس سل پر کچھ تصویریں کندہ تھیں۔ شاید فراعین مصر کے دور کا کوئی منظر تھا۔ ایک محفل میں شراب نوشی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ مسند پر بیٹھے ہوئے سردار کے ایک ہاتھ میں جام تھا، دوسرا ہاتھ ایک نیم عریاں رقاصہ کی کمر میں تھا۔ دراصل سنگتراشی کا یہ نمونہ نقل بمطابق اصل کے تیار کیا گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ قدیم دور سے تعلق رکھنے والا اصل نمونہ لاہور کے میوزیم میں موجود ہے۔

میں وقت گزاری کے لیے بند روم میں ٹہلنے لگا۔ ٹھیک دس منٹ بعد بڈھا گوپی ناتھ باتھ روم سے باہر نکلا۔ اس نے سرخ شرٹ اور سفید چمکیلی پتلون پہن کر اپنے حسن کو دو آتشہ کر لیا تھا۔ پھولدار ٹائی الگ بہار دکھا رہی تھی۔ پاؤں میں نہایت نفیس چم چم کرتے جوتے تھے۔ وہ سرتاپا جاپانی کی خوشبو میں مہکا ہوا تھا۔ یہ بہت خوب صورت خوشبو تھی لیکن اس کے نیچے سے گوپی ناتھ کا بیمار بڑھاپا صاف جھلک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی نے کوڑے کرکٹ پر عطر کی شیشی انڈیل دی ہو۔

جونہی گوپی ناتھ باتھ روم سے نکلا ایک خوب رو لڑکی ناشتا لے کر آگئی۔ لڑکی کی عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ اس میں بڑی خاص قسم کی متانت اور دلکشی تھی۔ اس نے ناشتے کی ٹرے مقررہ جگہ پر رکھی۔ ٹرے میں ایک طرف موتیے کے کچھ پھول بھی تھے۔ یہ پھول لڑکی نے بڑی نفاست سے گلدان میں سجائے اور یہ گلدان کھڑکی میں ایسے رکھ دیا کہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ خوشبو سیدھی گوپی ناتھ کے نتھنوں میں گھستی چلی جائے۔ اس کے بڑے پیار سے اس نے گوپی ناتھ کے گلے میں نیپکن با اور اس کے قریب بیٹھ کر ابلا ہوا انڈا اپنے گورے گو ہاتھوں سے چھیلنے لگی۔

گوپی ناتھ اسے "نرس" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، وہ "سر" کہہ کر پکار رہی تھی۔ "سر" کہتے ہوئے اس کے میں بڑی کوملتا آجاتی تھی۔ بالکل جیسے وہ کسی بچے کو کر رہی ہو۔ جس طرح گوپی ناتھ کی میز پر ہر قسم کی اد موجود تھیں، اسی طرح ناشتے کی ٹرے میں ہر قسم کی پرہ بھی موجود تھی۔ ہائی بلڈ پریشر کے لیے انڈا اور نمک کے لیے مارملیڈ جام، دمے کے لیے تازہ دہی اور اختلاج قلب کے لیے بالائی والا دودھ۔ غرض یہ اہم بیماریوں کے لحاظ سے ایک مکمل ناشتا تھا۔ مجھے وہ ایمبو یاد آگئی جو پورچ میں کھڑی رہتی تھی۔ اس عمر میں ایسا کرنے والے کے لیے واقعی ایک ایمبولینس کو پورچ میں رہنا چاہیے۔

میں صاف دیکھ رہا تھا کہ گوپی ناتھ کو بھوک نہیں۔ شاید وہ اپنی درازی عمر اور معیار صحت کی خاطر زبردستی اندر ٹھونس رہا تھا پھر بھی بڈھے معدے میں تیزابیت گیس وغیرہ کی موجودگی میں کتنا کچھ ٹھنس سکتا تھا۔ بھری ٹرے میں سے اس نے بمشکل دو ڈھائی سو گرام کھایا۔ کھاتے ہوئے اس کا سر مسلسل ہل رہا تھا اور مزے کی یہ تھی کہ یہ سر انکار میں ہل رہا تھا، یعنی گوپی ناتھ کھا بھی رہا تھا اور انکار بھی کرتا جا رہا تھا۔

ناشتے کے بعد گوپی ناتھ نے باہر برآمدے میں تصور کیا۔ نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر واکنگ اسٹک دی۔ جیسے روز محشر کی مردے اپنی مرضی کے خلاف قبر بیدار ہوں گے گوپی ناتھ صاحب بھی اپنی کرسی سے نکلے ڈگمگاتے ہوئے میرے ساتھ راہداری کی طرف چل مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ گوپی ناتھ گر جائے گا اسے سہارا پیش کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مجھے بتا چکا تھا کہ گوپی ناتھ اپنی دانست میں بھلا چنگا ہے اور خود کو بزرگ کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ ہم جیسے تیسے بر میں پہنچے۔ سرسبز لان میں مور چہل قدمی کر رہے تھے۔ گھ پر سے شبنم کے قطرے ابھی پوری طرح اوجھل نہیں ہوئے تھے، ہم لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہوئے

ں کو پھر قسطوں میں حرکت کرنا پڑی۔ پہلے اس نے گھٹنے ائے پھر بیٹھ بہت پیچھے لے گیا، پھر گھٹنوں کو تھوڑا سا آگے با پھر کمر کو جھکایا، تب مضبوط واکنگ اسٹک پر زور دے کر م سے بیٹھ گیا۔ اس کوشش میں اس کی سانس دھونکنی کی ح چلنے لگی تھی اور باچھوں سے بہتا ہوا تھوک نمایاں یا تھا۔ اسی دوران میں خوب رو نرس آگئی۔ اس نے ایک ل میں لگے ہوئے کچھ کاغذات ادب سے جھک کر گوپی ھ کے سامنے تپائی پر رکھ دیے۔ گوپی ناتھ کی نگاہ بے ساختہ س شوبھا کے کھلے گریبان میں گھس گئی۔ اس لمحے مجھے گوپی ھ کی آنکھوں میں پھر وہی حریص چمک نظر آئی جو کسی لیس رالے کی طرح چپچپی اور کراہت آمیز محسوس ہوتی ی۔ گوپی ناتھ نے کانپتے ہاتھوں سے کچھ کاغذات پر دستخط یے۔ شوبھا نے "تھینک یو سر" کہا اور دلکش چال چلتی پس چلی گئی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ شوبھا کو دیکھتے ہی پی ناتھ کے کرخت چہرے پر رونق آجاتی ہے۔

ایک سہمی سہمی ملازمہ گوپی ناتھ کے لیے اخبار لے کر ی۔ گوپی ناتھ نے اسے جھاڑ پلائی کہ وہ پڑھنے والی عینک لانا وں بھول گئی ہے۔ وہ لرزتی کانپتی واپس دوڑی اور بجلی کی ار سے عینک لے کر واپس آگئی۔ چند لمحے بے پروائی سے ار کا مطالعہ کرنے کے بعد گوپی نے اخبار تپائی پر رکھ دیا ر بولا "جانی! میرے ذہن میں بمبئی کے دن رات آج بھی لے دن کی طرح تازہ ہیں۔ ...ی اسٹار کلب میں تمہیں تقریباً زانہ ہی دیکھتا تھا۔ بڑا مزہ آتا تھا تمہارے طور طریقے دیکھ ر۔ ان دنوں تمہارے ہاتھ میں اکثر چاقو نظر آیا کرتا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ چاقو تمہارا ٹریڈ مارک بن کر رہ گیا تھا۔ گاہے ے کلب میں اور کلب سے باہر تمہاری لڑائی بھی ہو جاتی ی۔ ایک دفعہ تو تم نے میرے ہی دو بندوں کو پھینٹی لگا دی ی، بعد میں تمہاری اپنی غلطی نکل آئی تھی اور تم نے مجھ ے معافی مانگ لی تھی۔"

"ہاں، مجھے بھی کچھ کچھ یاد آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے پوپلے منہ میں زبان گھما کر بولا "سچ پوچھو تو اپنی طی مان کر ہارنے میں جو بڑائی ہے وہ غلطی پر اڑ کر جیت نے میں نہیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ ے کوئی بندہ دوسرے کو یاد رہ جاتا ہے۔"

میں اثبات میں سر ہلاتا چلا جا رہا تھا۔ گوپی ناتھ چند لمحے موشی سے مجھے گھورتا رہا پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا، بولا "ور ایک دفعہ تم نے کلب میں چاقو کے کرتب بھی تو دکھائے م، ہوا میں ایک کنگن اچھال کر چاقو پھینکا تھا اور چاقو کنگن کے اندر سے گزر گیا تھا۔ پھر ایک چاقو پھینک کر دروازے میں پیوست کیا تھا اور ایک دوسرا چاقو اس طرح پھینکا تھا کہ وہ پہلے چاقو کے لکڑی کے دستے میں پیوست ہو گیا تھا اور وہ پاؤں والا کرتب۔"

"ہاں وہ کرتب مجھے یاد ہے۔"

"کیا آج بھی تم... وہ کرتب دکھا سکتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ کوشش کروں تو دکھا سکتا ہوں۔"

"پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کرتب دکھاؤ اور آج بھی کوئی بنگالن تمہارے منہ پر اپنا منہ رکھ کر چوم لے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم بھول گئے ہو جانی، جب تم نے یہ کرتب دکھائے تھے تو سادھنا نام کی ایک بنگالی لڑکی تم سے چمٹ گئی تھی اور پھر... شاید چار پانچ مہینے تک چمٹی ہی رہی تھی۔"

"آپ کو تو وہ کچھ بھی یاد ہے جو میں بھول چکا ہوں۔"

"بڑھاپے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن ابھی تک تو بھگوان کی کرپا سے یادداشت ٹھیک ٹھاک ہے۔" گوپی ناتھ نے دمے کی ماری آواز میں کہا۔

میں نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ گوپی بولا "خیر ایسی کون سی جلدی ہے، ابھی تو تم آئے ہو، ایک دو روز آرام کرو پھر لمبی نشستیں ہوں گی۔"

جب اس نے "نشستیں" کہا تو بہت سا تھوک اڑ کر میرے چہرے پر آن پڑا۔ اس کے بعد میں دھیان رکھنے لگا جب بھی وہ ش یا س بولنے پر آمادہ نظر آتا میں چہرہ پیچھے ہٹا لیتا۔

ہم کافی دیر پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گوپی ناتھ تازہ کرتا رہا۔ میں گاہے گاہے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا یا کوئی چھوٹا موٹا فقرہ بطور اضافہ پیش کر دیتا تھا۔ اس دوران میں گوپی ناتھ کی فصیح و بلیغ گالیاں سننے کا اتفاق بھی ہوا۔ ان گالیوں میں دکن اور راجستھان کا ملا جلا رنگ پایا جاتا تھا۔ ان گالیوں کا نشانہ زیادہ تر گوپی ناتھ کے ملازم ہی بنے، اس کے علاوہ ہمارے ارد گرد منڈلانے والی مکھیاں، رک رک کر چلنے والی ہوا، ایک آوارہ بلی اور چند مور بھی ان گالیوں سے نوازے گئے۔ اس دوران میں بمبئی کی چند خوب صورت خواتین کا ذکر بھی ہوا، جن میں مسمات ہیما مالنی، شرمیلا ٹیگور اور آشا پاریکھ وغیرہ شامل تھیں۔ اس قسم کی گفتگو واقعی گوپی ناتھ کو ریلیکس کرتی تھی۔ اس کا کڑوا کسیلا موڈ کچھ دیر کے لیے پس منظر میں چلا جاتا تھا اور چہرے پر کسی نہایت لالچی بچے جیسی چمک نظر آنے لگتی تھی۔

باچھوں میں چمکنے والا تھوک نمایاں ہو جاتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اگر اس نے رومال سے منہ پونچھے بغیر بات کی تو اس کی رال ٹپک پڑے گی۔ ہیما مالینی کا نام وہ اتنی مٹھاس سے لیتا تھا کہ ہونٹ آپس میں چپک چپک جاتے تھے جبکہ شرمیلا ٹیگور اور آشا پاریکھ کے نام میں چونکہ ش آرہا تھا لہٰذا تھوک کی پھوار دور تک جا رہی تھی۔ آخر میں اس نے بمبئی کی ایک معروف ماڈل گرل ہشپا کا ذکر بھی کیا اور بڑے فخر سے بتایا کہ وہ عین اپنی ۷۵ ویں سالگرہ کے روز اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ یہ افیئر ڈیڑھ دو سال تک چلا تھا یہاں تک کہ اس نے ہشپا کو شادی پر بھی راضی کر لیا تھا مگر پھر انہی دنوں ہشپا کے ایک سابق شوہر نے اس کے خلاف کیس دائر کر دیا اور یہ شادی والا معاملہ لٹک کر رہ گیا۔ گوپی ناتھ اس کیس کی تفصیل بتانے پر آمادہ نظر آتا تھا لیکن میں نے کوشش کر کے موضوع بدل دیا۔ میں کیس کی تفصیل سے خوف زدہ نہیں تھا' اس بات سے خوف زدہ تھا کہ اس تفصیل میں بار بار ہشپا کا نام آئے گا اور چونکہ ہشپا میں بھی "ش" موجود تھا لہٰذا میں اپنے چہرے پر تھوک کا چھڑکاؤ نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد گوپی کا روئے سخن مسٹر رجی کلارک اور مجتبیٰ کنور وغیرہ کی طرف ہو گیا کہنے لگا "یہ لوگ جو خود کو تمہارے ساتھی کہہ رہے ہیں مجھے تو تمہارے ساتھی نہیں لگتے۔ انہیں دفینے والی بات کے سوا اور کوئی بات آتی ہی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ دفینے کا خیال کسی راکھشس کی طرح ان کے دماغ میں گھس گیا ہے۔ ان کی باتاں سنو تو یوں لگتا ہے کہ سنسار میں دفینے کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔" میں اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ گوپی ناتھ نے فلسفہ جھاڑا "بھائی! میرا تو وچار ہے کہ جو دھن بغیر محنت اور کٹھنائی کے حاصل ہو وہ بیکار ہے۔ اسے ہاتھ لگانا بھی پاپ ہے۔ دفینہ ڈھونڈنا تو دور کی بات ہے' مجھے تو ایسے لوگاں سے بھی نفرت ہے جو لاٹری' انعام اور پرائز بانڈ وغیرہ کے چکر میں پڑتے ہیں۔"

میں نے ذہن میں سوچا کہ تم تو خود قمار خانہ چلاتے رہے ہو تم بغیر محنت کے حاصل کی ہوئی دولت کو برا کیسے کہہ سکتے ہو۔ زیادہ بولنے سے گوپی ناتھ کا دم پھول گیا تھا اور زبان اس کے پوپلے منہ میں بل کھا رہی تھی۔ اس نے بڈھوں کے انداز میں دو تین بار سر کو جھٹکا دیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا "[illegible] میرے پاس ہے۔ میں یہ مانتا ہوں' لیکن میں کیوں دوں کسی کو۔ کوئی مجھے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا۔ امریکا یا روس کا صدر بھی نہیں کر سکتا۔ دراصل انسان کو تین چیزیں مجبور کرتی ہیں۔ لالچ... موت کا خوف... اور تکلیف کا خوف۔ مجھ پر یہ تینوں چیزیں بے اثر ہیں۔ پوچھو کیوں؟"

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تین گہری سانسیں بھر کر بولا "لوگاں کا خیال ہے کہ میں بوڑھا نہیں سمجھتا اور کوئی مجھے بوڑھا سمجھے تو بھڑک ہوں' یہ باتاں بالکل درست ہیں' لیکن یہ باتاں بھی درست ہیں کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بولو درست نہیں؟"

میں عجیب الجھن میں تھا' نہ انکار کر سکتا تھا نہ اقرار۔ میری الجھن رفع کرتے ہوئے بولا "تمہاری خاموشی بڑھاپے کو جوانی میں نہیں بدل سکتی۔ میں بوڑھا ہوں' یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ سورگ باشی ہونے والا ہوں۔ جب (جسم) میں خون ہی نہ ہو تو تکلیف کا کیا ڈر ہے' اور جب قبر میں ہوں تو موت کا کیا ڈر؟ باقی رہ گیا لالچ' تو دفینہ ہوتے ہوئے مجھے اور کیا لالچ ہو سکتا ہے۔"

خبطی بڈھے کی دھندلی آنکھوں میں شرارت کی ابھر آئی۔ وہ کچھ دیر مسلسل کھانستا رہا پھر رومال سے پونچھ کر بولا "بڈھے لوگاں اکثر اپنی اولاد کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان کے پوتے پوتی کے سر پر پستول لے تو وہ ہر بات مان جاتے ہیں۔ میرا آگے پیچھے ہے ہی نہیں۔ بس ایک بہن تھی وہ بھی آج سے نصف صدی بھگوان کو پیاری ہو گئی۔ اب اکیلی جان ہوں۔ کسی کے اپنی جان کا روگ نہیں بنایا' کسی طوطے میں اپنی جان ڈالی۔ کسی نے میرا جو بگاڑنا ہے بگاڑ لے۔ میں کسی کے... سے نہیں ڈرتا... اپنی مرضی کا مالک ہوں۔"

بڈھے کی آنکھوں میں مجھے ایسا عزم نظر آیا جو جوان... شہ زوروں کی آنکھوں میں بھی دکھائی نہ دیا۔ واقعی ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب کمزوری و ناتوانی بندے کی طاقت بن جاتی ہے۔ موت اس قدر قریب ہے کہ اس میں اور زندگی میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میرے احساسات کو محسوس کر کے خرانٹ بڈھے کی آنکھوں میں شرارت اور ڈھٹائی کچھ اور بڑھ گئی۔ "تمہارا باس مسٹر کلارک ارب پتی شخص ہے لیکن اس کی ہوس اس کی دولت سے زیادہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اور دولت مند ہو کر کیا کرے گا۔"

میں نے کہا "جہاں تک میرا خیال ہے مسٹر کلارک دولت سے زیادہ نوادرات کی خواہش ہے۔ وہ قدیم [illegible] کرنے کے زبردست شوقین ہیں۔"

"لیکن میرا وچار کچھ اور ہے' خیر چھوڑو ان باتاں کو۔ مجھے وشواس ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سے مختلف آدمی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ کلب میں بھی تم ہزاروں جیت کر ادھر ادھر بانٹ دیا کرتے تھے۔ بندے کو دھن دولت کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے' پھر حسین چھوکریوں کی طرح اس کے سارے ناز نخرے دھرے رہ جاتے ہیں۔ وہ بندے کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔"

بڈھا گوپی ناتھ چالاکی دکھا رہا تھا۔ اپنی دانست میں وہ مجھے دفینے کے ذکر سے دور رکھنے کا اہتمام کر رہا تھا۔ مجھے کوئی پروا نہیں تھی' کیونکہ اتنی جلدی میں بھی یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں گوپی ناتھ کے پاس بیٹھا اس کی دلچسپی کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں سائیں عالی بھی اس جانب نکل آیا۔ اس کی گھنٹیاں اور مالائیں دور ہی سے بجتی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ وجد میں تھا' ناچتا ہوا آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ خوب صورت موروں کے درمیان ایک بوسیدہ مور گھس آیا ہے۔ گوپی ناتھ' سائیں عالی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے گوپی ناتھ کی کرسی کے گرد چند چکر لگائے پھر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ گوپی ناتھ خوش دلی سے بولا "بیٹھ جاؤ سائیں۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

سائیں عالی بلا تکلف زمین پر بیٹھ گیا۔ وجد میں بولا "عجیب آدمی ہو بیٹھے ہوئے پر بٹھا رہے ہو۔"

"کرسی تو خالی ہے برادر۔" گوپی نے کہا۔

"گوپی ناتھ' تمہیں نظر نہیں آرہا' کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا ہے اور بیٹھنے والا معمولی نہیں ہے۔ سمجھو کہ یہ جنات کا صدر حافظ الاسد ہے۔ پچھلے ساڑھے تین سو سال سے یہ پرستان میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہے۔ اس کے خاندان کا یہ وتیرہ ہے کہ جب یہ لوگ کرسی پر بیٹھتے ہیں تو پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ میری کیا مجال ہے کہ اسے اٹھاؤں یا اس کی جگہ پر خود بیٹھوں۔"

"چلو ٹھیک ہے جہاں دل چاہے بیٹھ جاؤ برادر۔"

سائیں عالی نے حسب عادت آلتی پالتی مار لی اور آنکھیں بند کر کے آگے پیچھے جھولنے لگا۔ گوپی ناتھ نے کہا "برادر! آج وہ تمہاری چیلی نظر نہیں آرہی۔ کیا آج اسے دھوپ میں کھڑا نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔ اس کی باقی سزا معاف ہو گئی ہے۔ اس کا پتی واپس آگیا ہے۔"

گوپی ناتھ مسکرایا "پتی بھی کوئی جن ہی ہو گا۔"

"ہاں جن ہی سمجھو صاحب۔"

گوپی ناتھ چند لمحے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستا رہا پھر بولا "برادر! جنات سے تمہارے زبردست رابطے ہیں اور تم نے بتایا ہے کہ جنات میں علم نجوم پر پی ایچ ڈی ہوتی ہے اور بڑے بڑے قابل نجومی پائے جاتے ہیں' اگر ایسا ہے تو میری شادی کی لکیر کا بھی پتا کراؤ کہ میرے ہاتھ میں ہے یا نہیں۔"

"تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے۔" سائیں نے کہا۔

"ضرورت ہے تو کہہ رہا ہوں۔"

"جس کی تمہیں ضرورت ہے وہ گھڑے کی مچھلی ہے' جب چاہو اسے پکڑ سکتے ہو' پھر شادی کے دریا میں چھلانگ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

گوپی اور سائیں کی باتیں معنی خیز تھیں۔ اس دوران میں گوپی ناتھ کا سوٹڈ بوٹڈ پرسنل سیکریٹری ایک اور فائل لے کر حاضر ہو گیا۔ گوپی ناتھ نے کانپتے ہاتھوں سے دستخط کیے' کچھ دیر بے دلی سے فائل کے ورق پلٹتا رہا پھر فائل واپس کر دی۔ پرسنل سیکریٹری کے طرز گفتگو سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی گوپی کو خبطی اور مخبوط الحواس سمجھتا ہے لیکن بوجوہ اس کا احترام کرنے اور اس کے احکام ماننے کا پابند ہے۔

فائل سے فارغ ہو کر گوپی ناتھ اپنی کرسی کھینچ کر سائیں عالی کے بالکل قریب لے گیا' سائیں سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرنے لگا' کبھی کبھی گوپی بھی کسی بات کا جواب دے دیتا تھا۔ بس اڑتے اڑتے سے لفظ میرے کانوں میں پڑ رہے تھے' بوڑھ کا دودھ' خشک انگور' منہ نہار' روزانہ... تجربہ کار... ان الفاظ سے مجھے اندازہ ہوا کہ سائیں عالی' گوپی کو کسی حکیمی نسخے کے بارے میں بتا رہا ہے۔ میرے کھسکنے کے لیے یہ موقع غنیمت تھا' میں برآمدے سے اٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔

مجتبیٰ کنور اور رجی کلارک صاحب میرے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ گوپی ناتھ سے اچھے ماحول میں بات چیت ہوئی ہے۔ وہ گاہے گاہے مسکراتا بھی رہا ہے اور بے تکلفی کی باتیں کرتا رہا ہے۔"

"کوئی خاص بات بھی ہوئی؟" مجتبیٰ نے پوچھا۔

"خاص بات سے اگر آپ کی مراد نوادرات کی بات ہے تو وہ نہیں ہوئی۔"

مسٹر کلارک بولے "میرے خیال میں یہ کامیابی بھی بہت ہے کہ وہ تم سے ہنس بول رہا ہے' ورنہ تو اس کی بددماغی عروج پر نظر آتی تھی۔ کم از کم ہم نے تو پچھلے دو تین ہفتوں میں اسے مسکرانے کی غلطی کرتے نہیں دیکھا۔"

مجتبیٰ کنور نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا' تو برآمدے کا

منظر نظر آنے لگا۔ سائیں عالی مسلسل گوپی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ مجتبیٰ بڑبڑایا "بدبخت! اسی سال کی عمر میں بھی اسے جوانی اور طاقت کی ضرورت ہے' سائیں عالی سے تیر بہدف حکیمی نسخے پوچھتا رہتا ہے۔ سائیں بھی ایک آفت ہے۔ خبر نہیں کہ کیا کیا گن بھرے ہوئے ہیں اس کے اندر۔ ہزاروں نسخہ جات اسے یاد ہیں' کل دعویٰ کر رہا تھا کہ بھارتی فلم انڈسٹری کے سترفی صد لوگ اس سے شباب آور دواؤں کے نسخے پوچھتے آتے ہیں' اس حوالے سے بھارتی اداکار دیو آنند اور جیتندر اس کے سب سے پرانے مداح ہیں۔"

"یہ نرس شوبھا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کا تو مسئلہ ہے" مجتبیٰ شوخی سے بولا "یہی سارے نسخوں کی جڑ ہے۔ باباجی اس عمر میں بھی نظربازی فرماتے ہیں۔ آج کل بلکہ پچھلے ڈیڑھ دو برس سے "نظر شریف" اس لڑکی پر ہے' عزیز و اقارب اور ملازمین کی فوج میں سے اگر کسی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں تو وہ یہی نرس ہے۔ اس کی بات برداشت کر بھی جاتے ہیں' مگر پھر کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس پر بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ تاہم اتنا لحاظ ضرور فرماتے ہیں کہ اسے گالیاں نہیں دیتے۔"

میں اسی سالہ رنگین مزاج بڈھے کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ نہ اس کے منہ میں دانت تھا نہ پیٹ میں آنت' پھر بھی اس نے اپنے جذبۂ خودی کو اتنا بلند کر رکھا تھا کہ بدستور عشق کی "سعادت" حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ جس لڑکی شوبھا کا ذکر مجتبیٰ کنور کر رہا تھا وہ عمر میں باباجی کی عمر کا ایک تہائی تھی' پھر بھی باباجی نے اس پر رال ٹپکا رکھی تھی۔ مجھے اس پلپلے سے بڈھے کو دیکھ کر ہی گھن آ رہی تھی' معلوم نہیں کہ وہ نفیس لڑکی اس کا عشق کیسے برداشت کر رہی تھی۔ انسان کی بھی کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن حالات کے تحت یہاں ملازمت کر رہی ہے' کیا کیا مسائل ہیں جنہوں نے اسے باندھ کر اس چار دیواری میں رکھا ہوا ہے اور وہ شب و روز ایک "بیماریوں کھائے" شخص کے قریب رہنے پر مجبور ہے۔

اس روز مسٹر کلارک' مجتبیٰ کنور' صفدر اور میں تادیر بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ جون جاڈل (فلپائنی کوہ پیما) ان لوگوں کے ساتھ ہی انڈیا آیا تھا۔ اس کی آمد کا مقصد در اس میں شکنتلا نام کی اس عورت کی نشان دہی کرنا تھا جس نے اسے کچھ ایسی چیزیں تحفے میں دی تھیں جو دفینے کا حصہ تھیں۔ مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کنور کو شکنتلا سے ملانے کے بعد جون جاڈل واپس چلا گیا تھا۔ اس نے وہ نوادرات بھی مسٹر کلارک کو واپس کر دیے تھے جو اسے شکنتلا سے تحفے میں ملے تھے وہ اس معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا' اس نے مسٹر کلارک وغیرہ سے صرف یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ شکنتلا یا اس کے پتی پر کسی طرح کی سختی نہیں کریں گے۔ اس کے بعد کی کہانی دلچسپ تھی۔ مسٹر کلارک اور مجتبیٰ نے شکنتلا سے نوادرات کے بارے میں پوچھا' پہلے تو وہ انکاری رہی کہ یہ نوادرات اس کو کسی نے تحفے میں دیے ہیں' بالآخر مان گئی' اور یہ بھی مان گئی کہ یہ نوادر ایک بہت بڑے ذخیرے کا حصہ ہیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ ذخیرے کے بارے میں کچھ اور بتاتی ایک دم وہ غائب ہو گئی۔ اس کا پتی سنجیو کمار بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ دونوں مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کی کڑی نگرانی میں تھے' ان کی کوٹھی کے گرد کم از کم چھ نگران موجود تھے' اس کے باوجود وہ دونوں جل دے کر نکل گئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا شکنتلا ٹی وی ڈراموں وغیرہ میں بھی کام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ٹی وی کی میک اپ آرٹسٹ بھی تھی۔ میک اپ کا سامان اس کے گھر میں موجود تھا۔ گھر کی نگرانی کرنے والوں سے بچنے کے لیے شکنتلا نے خود کو اور اپنے پتی کو ایک ادھیڑ عمر جوڑے کے روپ میں ڈھال لیا اور چھ نگرانوں کے سامنے کوٹھی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ قریباً تین ہفتے بعد دوبارہ پکڑے گئے' ان کے دوبارہ پکڑے جانے کی روداد بھی کافی لمبی ہے' بہرحال' انہیں ایک ڈرامے کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران میں پکڑا گیا۔ پیار محبت اور ترغیب کے ذریعے مسٹر کلارک نے میاں بیوی کو تعاون پر آمادہ کر لیا۔ شکنتلا کا پتی سنجیو کمار دراصل ایک امیر سیٹھ کے پاس بطور پرائیویٹ سکریٹری کام کرتا تھا۔ یہ امیر سیٹھ یہی گوپی ناتھ تھا۔ شکنتلا کا پتی وہ سوٹڈ بوٹڈ شخص تھا جسے ابھی کچھ دیر پہلے میں نے برآمدے میں گوپی ناتھ سے کسی فائل پر دستخط کراتے دیکھا تھا۔ شکنتلا کو وہ تحائف اپنے پتی دیو سے ملے تھے اور پتی دیو کو گوپی ناتھ سے ملے تھے۔ دفینے کی تفتیش یہاں پر آ کر رک جاتی تھی۔ گمان غالب یہی تھا کہ وہ عظیم الشان دفینہ گوپی ناتھ کی تحویل میں ہے یا وہ اس کے بارے میں جانتا ہے لیکن گوپی ناتھ سے کچھ اگلوا لینا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی کو ہر چیز پر مقدم سمجھتا تھا۔ مسٹر کلارک نے بڑی ہوشیاری اور دانش مندی سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ گوپی ناتھ کو انہیں بطور مہمان اپنے گھر ٹھہرانا پڑا۔ مسٹر کلارک نے اپنی انٹرنیشنل کمپنی "ایف ایم" کے ذریعے پہلے بھوپال میں ایک آفس خریدا' یہ آفس ایک ایسی بلڈنگ میں بنایا گیا جو گوپی ناتھ کی ملکیت تھی۔ یوں گوپی

ناتھ سے راہ و رسم بڑھانے کے مواقع پیدا ہوئے۔ گوپی ناتھ کو جب معلوم ہوا کہ مسٹر کلارک اپنی کمپنی کی برانچ اسٹیبلش کرنے کے لیے چند ہفتے بھوپال میں رکنا چاہتے ہیں تو اس نے انہیں اپنے گھر کی انیکسی میں ٹھہرانے کی پیشکش کردی۔ تھوڑے سے انکار کے بعد مسٹر کلارک کی طرف سے یہ پیشکش قبول کرلی گئی۔ مسٹر کلارک، مجتبیٰ کنور اور صفدر کی رسائی گوپی ناتھ کے گھر تک ہوگئی تو ان کے لیے آگے بڑھنا آسان ہوگیا۔ ایک روز گوپی ناتھ کے پرائیوٹ سیکریٹری سنجیو کمار کے ذریعے مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کنور کی رسائی گوپی ناتھ کی ذاتی ڈائری تک ہوگئی۔ اس ڈائری میں جسے گوپی ناتھ نے روزنامچے کا نام دیا تھا دفینے کا ذکر موجود تھا، اور اس بات کی وضاحت بھی موجود تھی کہ وہ دفینہ گوپی ناتھ کی تحویل میں ہے۔

مسٹر کلارک کے اشارے پر مجتبیٰ کنور نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ یہ دراصل کسی ڈائری کے دو صفحات کا فوٹو اسٹیٹ تھا۔ میں نے یہ فوٹو اسٹیٹ دیکھا۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ بوڑھے گوپی ناتھ کے کانپتے ہاتھوں کی تحریر تھی۔ اوٹ پٹانگ گوپی ناتھ کی طرح اس کی تحریر بھی اوٹ پٹانگ تھی۔ کوئی فقرہ ترچھا لکھا تھا، کوئی اتنی تیزی سے گھسیٹا گیا تھا کہ پڑھنا مشکل تھا۔ ایک فقرہ جس کے اوپر دس ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی یوں تھا "سامان واقعی زبردست ہے۔ کئی چیزیں تو بہت قیمتی لگتی ہیں، لیکن ہیرے کی اصل قیمت تو جوہری ہی لگا سکتا ہے۔"

اسی تاریخ میں ایک اور جملہ بھی تھا "صندوق بہت وزنی ہیں، ہلانا ممکن نہیں ہے۔ اور مزدوروں کو شامل کرنا بھی خطرناک ہے لہٰذا سوچا ہے کہ جوں کے توں پڑے رہیں۔"

دس پندرہ روز بعد کی تاریخ میں، یہ تین چار فقرے درج تھے "سامان کی قیمت میری توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ نوادرات کو چھوڑ کر باقی سامان کی قیمت بھی لگائی جائے تو بدھی (عقل) حیران رہ جاتی ہے۔ چند چیزیں میں نے لی ہیں۔ ایک ہار تو بہت سندر ہے۔ من چاہتا ہے شوبھا کو بھینٹ کروں۔"

اس کے بعد کچھ بے معنی فقرے تھے جو کم از کم میری سمجھ سے تو بالاتر ہی تھے پھر ایک جگہ لکھا تھا "کل نریندر کمار آیا تھا، اسے یہ تو معلوم نہیں کہ صندوقوں میں کیا تھا، لیکن اتنا وہ جانتا ہے کہ کوئی قیمتی سامان تھا۔ نذرانہ وغیرہ مانگ رہا تھا میں نے اگلے منگل وار پر ٹال دیا ہے۔"

بغور دیکھنے کے بعد میں نے فوٹو اسٹیٹ مجتبیٰ کنور کو واپس کردی۔

"کیا خیال ہے۔" مجتبیٰ نے پوچھا۔

میں نے کہا "شکنتلا اور سنجیو کمار کے بیان کے اس روزنامچے سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ دفینہ گوپی ناتھ کی تحویل میں ہے بلکہ مجھے تو تھوڑی سی حیرانی بھی ہو رہی ہے"

"حیرانی کس بات کی؟" مسٹر کلارک نے پوچھا۔

"گستاخی معاف، اب تک آپ لوگوں کو دفینے تک جانا چاہیے تھا۔" میری آواز میں جوش کی لہر خود مجھے محسوس ہو رہی تھی۔

مسٹر کلارک نے ایک گہری سانس لی "یہ خبطی بڈھا سادہ نہیں... جتنا نظر آتا ہے شاہ جہاں۔ اس کی کھوپڑی میں کسی عیار کوے کا دماغ ہے۔ ہم نے یہاں پہنچنے کے بعد تگ و دو کی ہے لیکن کوئی ایسا کلیو نہیں ملا جو ہمیں دفینے تک پہنچا سکے۔ گوپی ناتھ کی کوئی اولاد ہے، نہ اس کا کوئی راز دوست، نہ کوئی ایسا ملازم جس پر وہ مکمل اعتماد کرتا ہو۔ وہ پہاڑی سلسلے کی بلند ترین چوٹی کی طرح اپنے گرد و پیش سے الگ اور تنہا ہے۔ اس کے چند عزیز جن میں اس کا بھائی اور بھتیجا چندر پرکاش شامل ہیں، اس کوٹھی میں اس کے ساتھ رہتے ہیں لیکن وہ انہیں کسی گنتی میں نہیں سمجھتا۔ بھتیجا چپکے چپکے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ گوپی ناتھ کے کاروبار میں اس کا حصہ ہے اور گوپی ناتھ کا جائز وارث وہی ہے، تاہم گوپی ناتھ کے سامنے یہ بات کہنے کی جرات اسے بھی نہیں۔ بہرحال کاروبار کی دیکھ بھال وہی کررہا ہے اور دیگر امور میں بھی اس کا عمل دخل ہے پھر بھی گوپی ناتھ نے معاملات پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ وہ بہانے بہانے سے معاملے میں ٹانگ اڑا دیتا ہے اور بیماری کے باوجود ہر روز ایک دو چکر دفتر اور فیکٹری کے لگاتا ہے۔ اکثر فائلیں وہ گھر منگواتا ہے اور انہیں دیکھنے کے بعد دستخط کرتا ہے۔ بینک اکاؤنٹس بھی اس نے اپنے قبضے میں رکھے ہوتے ہیں۔ گوپی ناتھ کی بھرپور کوشش ہے کہ وہ جلد سے جلد صحت یاب ہوجائے اور کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے۔" کلارک نے چند لمحے توقف کرکے نیا سگریٹ سلگایا اور بولا "یہاں آکر ہم نے حالات کا بغور جائزہ لیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ گوپی ناتھ کے قرب و جوار میں صرف اور صرف تین افراد ایسے ہیں جن کو دفینے کے ٹھکانے کے بارے میں تھوڑا بہت یا زیادہ علم ہوسکتا ہے۔ نمبر ایک گوپی ناتھ کا قریبی اور جگری دوست ریٹائرڈ آئی جی مسٹر شیووت، نمبر دو گوپی ناتھ کی خدمت گار اور منظور نظر شوبھا، اور نمبر تین بھتیجا چندر

پرکاش۔ بے شک چندر پرکاش کے ساتھ گوپی کی کچھ بنتی نہیں ہے، پھر بھی وہ کرتا دھرتا ہے اور گوپی کی تمام ذمے داریاں نبھا رہا ہے۔

"ہم نے سب سے پہلے ریٹائرڈ آئی جی شیووت پر کام کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں بجا یقین ہوگیا کہ شیووت کو دفینے کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اس کے بعد شوبھا کی باری آئی۔ وہ بے حد ضرورت مند ہے۔ باپ فوت ہوچکا ہے، بھائی چھوٹے ہیں۔ ایک بھائی کی گردن میں کینسر ہے۔ دس افراد پر مشتمل کنبے کی کفالت کررہی ہے۔ ہم نے اسے مالی مدد کی ترغیب دی۔ اس نے اعتراف کیا کہ گوپی ناتھ نے اسے ایک قیمتی ہار دیوالی کے موقع پر تحفے میں دیا ہے لیکن دفینے کے بارے میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکی۔ اس کے دل میں گوپی ناتھ کے لیے ہمدردی کا گوشہ موجود ہے۔ ہم نے اسے سمجھایا کہ وہ دفینہ گوپی ناتھ کی زندگی کے لیے سخت منحوس ثابت ہوسکتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کے کئی گروہ اس دفینے کے پیچھے ہیں۔ خبطی گوپی ناتھ نے جس طرح ہمارے سامنے اعتراف کرلیا ہے کہ دفینہ اس کے پاس موجود ہے وہ اوروں کے سامنے بھی کرسکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ دفینہ برآمد ہو اور اس معاملے کو ملکی قانون کے مطابق ہینڈل کیا جائے۔ ہمارا یہ موقف بھی سودمند ثابت نہیں ہوسکا اور شوبھا مسلسل اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی رہی۔ میں نے ذاتی طور پر جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہی ہے کہ شوبھا واقعی لاعلم ہے۔ اب رہ جاتا ہے گوپی ناتھ کا بھتیجا چندر پرکاش۔ ہمیں اس سے پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کو بھی کسی طرح معلوم ہوچکا ہے کہ قیمتی نوادرات اور زیورات وغیرہ کا ایک بڑا ذخیرہ اس کے خبطی تایا کی تحویل میں ہے۔ وہ اپنے طور پر ذخیرے کا کھوج لگانے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے بھی دفینے کے درست ٹھکانے کا علم نہیں۔ اب آخر میں رہ جاتا ہے گوپی ناتھ خود۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے وہ ایک عجیب کردار ہے۔ نہ اس پر کوئی ترغیب اثر کرسکتی ہے اور نہ خوف۔ اتنی جان تو اس میں ہے ہی نہیں کہ اسے مارا پیٹا جائے، وہ جاں بحق ہونے کے لیے بالکل تیار بیٹھا ہے۔ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ کسی وقت کسی سے بھی بات کرنے سے انکار کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک دو بار اس نے آئی جی شیووت کو بھی دروازے سے واپس لوٹا دیا ہے اور ملازموں سے کہلوا دیا ہے کہ گوپی ناتھ صاحب سو رہے ہیں یا گھر میں نہیں ہیں، زبردست موڈی شخص ہے۔ میں نے بتایا ہے نا کہ پچھلے تین ہفتوں کے بعد ہم نے آج اسے مسکراتے دیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ تمہاری بہت بڑی کامیابی ہے کہ تم نے اس سے اتنی دیر تک گفتگو کرنے کا "شرف" حاصل کیا ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چندر پرکاش بھی وہاں آگیا۔ وہ درمیانے قد اور کشادہ پیشانی والا ایک قبول صورت شخص تھا۔ عمر قریباً پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں چالاکی اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی شدید خواہش نظر آتی تھی۔ وہ خوش پوش اور خوش اخلاق بھی تھا۔ کلارک اور مجتبیٰ کنور کو اس نے بڑی بے تکلفی سے انکل کہہ کر مخاطب کیا، پھر تعارف طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

مجتبیٰ نے کہا "تمہیں بتایا تھا ناں کہ ابو ظہبی سے ہمارے ایک ساتھی آرہے ہیں۔ یہی ہیں وہ....."

چندر پرکاش نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ شاہ جہاں نام ہے ناں آپ کا؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا "میرا نام چندر پرکاش ہے۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔" میں نے دستاً کہا۔

"صفدر صاحب، آپ کا کیا حال ہے؟" چندر نے قریب بیٹھے صفدر سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لگتا ہے کہ کہیں بہت ہی دور سے ڈھونڈ کر لائے ہیں شاہ جہاں صاحب کو۔ آپ کا تو رنگ ہی سانولا گیا ہے۔"

"اچھی چیز کی تلاش میں، میں بہت دور تک نکل جاتا ہوں۔" صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا "اور ہاں آپ کے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔ آپ کو لان ٹینس کے لیے پارٹنر درکار تھا، شاہ جہاں صاحب کی صورت میں آپ کو ایک اچھا پارٹنر مل سکتا ہے۔ لاہور میں بہت ٹینس کھیلی ہے انہوں نے۔"

"ویری گڈ!" چندر پرکاش جوش سے بولا۔ ایک بار پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا "آپ سے مل کر بہت ہی زیادہ خوشی ہوئی۔ اگر آپ مصروف نہ ہوں تو آئیے اسی خوشی میں چائے کا ایک کپ ہوجائے۔"

"چلیں آئیں۔" میں نے رضامندی ظاہر کی۔

چندر پرکاش مجھے لے کر کامن روم میں آگیا۔ وہ ورزشی جسم کا مالک تھا اور اس کی گفتگو میں قائل کرلینے والا اسپارک تھا۔ چائے کے دوران میں وہ مسلسل باتوں میں مصروف رہا۔ معلوم ہوا کہ اس نے ابھی شادی نہیں کی اور

آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے تایا گوپی ناتھ کے بارے میں اس کے خیالات دوسرے لوگوں جیسے ہی تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ تایا اب زندگی کے ایسے حصے میں ہیں کہ انہیں مکمل طور پر ریٹائر ہو کر آرام کرنا چاہیے' لیکن وہ ریٹائرمنٹ کی بات سننے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ چندر پرکاش کہنے لگا "تایا نے جان بوجھ کر اپنی زندگی کو عذاب میں ڈال رکھا ہے' بیماری کی حالت میں بھی ہانپتے کانپتے دفتر پہنچ جاتے ہیں اگر منع کریں تو اور غصے میں آجاتے ہیں' دسمبر جنوری میں انہیں زکام تھا' میں نے کہا' سردی بہت ہے فیکٹری مت جائیں۔ نہیں مانے اور نمونیہ کرا کے واپس آئے ایک ان کی وہ چہیتی نرس ہے' اسے تو بھگوان سمجھے۔ وہ ہمیشہ انہیں الٹی پٹی پڑھاتی ہے۔ کہتی ہے فارغ بیٹھنے سے انسان کا جسم ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مصروف رہا کریں۔ ہفتے میں دو تین بار دفتر جایا کریں۔ وہ بڑی گہری عورت ہے۔ اس نے تایا کی سوچ پر قابو پا رکھا ہے۔"

چندر پرکاش کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ شاید وہ شوبھا کے بارے میں اور بھی کچھ کہتا لیکن یہ سوچ کر کہ میری اس سے یہ پہلی ملاقات ہے وہ چپکا رہا۔ چائے پینے کے بعد ہم باہر لان میں آ گئے۔ بمشکل صبح دس بجے کا وقت ہوگا۔ یہ چھٹی کا دن تھا لہٰذا چندر پرکاش ایزی موڈ میں تھا۔ وہ مجھے لان کے گوشے میں واقع ڈریسنگ روم میں لے گیا۔ یہاں وارڈ روب میں بہت سے لباس موجود تھے۔ یہ کرکٹ اور ٹینس کے لباس تھے۔ ٹینس کھیلنے کے لیے میں نے ایک سفید نیکر اور شرٹ منتخب کی۔ کپڑے بدل کر کلائیوں پر "رسٹ بینڈ" چڑھائے اور باہر آ گیا۔ یہاں نیٹ لگا ہوا تھا کورٹ سے باہر گیند روکنے والی قناتیں بھی موجود تھیں' مالی کے دو لڑکے ہمیں گیند وغیرہ پکڑانے کے لیے موجود ہو گئے۔ ہم کھیلنے لگے۔ میں ایک عرصے سے آؤٹ آف پریکٹس تھا' بہرحال دس پندرہ منٹ میں' میں نے "ردھم" حاصل کر لیا۔ چندر پرکاش بہت خوش ہو رہا تھا۔ پکار کر بولا "آپ کے دوست صفدر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اچھی چیز ڈھونڈنے کے لیے بہت دور نکل جاتا ہے۔ آپ میری توقع سے بڑھ کر کھیل رہے ہیں۔"

چندر پرکاش ان لوگوں میں سے تھا جو بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ مجھ سے بے تکلف دوستوں کی طرح بات کر رہا تھا لیکن اسے دوست کہنا اتنا آسان نہیں تھا' اور میرے جیسے شخص کے لیے تو بہت ہی مشکل تھا۔ میں انسانوں کے ایسے ایسے روپ دیکھ چکا تھا کہ خود اپنے سائے پر بھی یقین کرنا دشوار تھا۔

شام کو ہم نے پھر ایک گھنٹا ٹینس کھیلی۔ چندر کے کردار کی کچھ جھلکیاں اس کے کھیل میں بھی نظر آتی تھیں۔ وہ ایک چالاک کھلاڑی تھا۔ خاص طور سے اس کی سروس اور ڈراپ شاٹس بہت DECIEVING تھے۔ صبح کو تو میں ہار گیا تھا لیکن شام تک سنبھل گیا اور اس کا اچھا مقابلہ کیا۔ دو سیٹ اس نے جیتے ایک میں جیت گیا۔ کھیل کے بعد ہم پسینے سے شرابور کرسیوں پر آ بیٹھے۔ ایک بوڑھے ملازم نے ہمیں تولیے پیش کیے' ایک اینگلو انڈین خادمہ اورنج جوس لے کر پہنچ گئی۔ جوس کی چسکیاں لیتے لیتے چندر بغیر کسی تمہید کے بولا "مسٹر کلارک ارب پتی آدمی ہیں پھر بھی دفینے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ بھگوان جانے کیا جادو ہے اس دفینے میں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دولت میں جادو تو ہوتا ہے۔ کیا تم پر یہ جادو اثر نہیں کرتا۔"

"اثر تو کرتا ہے لیکن میں ہوا میں تلوار چلانے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے نہیں وشواس کہ تاؤ (تایا) درست کہہ رہے ہیں۔ وہ خبطی ہیں۔ وہ ایسی باتیں نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ وہ قریباً گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ زیادہ وقت گھر پر گزارتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیا جائے کہ کسی ذریعے سے دفینے کے نوادرات ان تک پہنچے تو سوچنے کی بات ہے کہ کب پہنچے۔ ہم کیوں بے خبر رہے اور اب وہ نوادرات کہاں ہیں۔ انھیں زمین نے کھایا ہے یا آسمان نے نگلا ہے۔ مجھے تو وشواس ہے کہ تاؤ دوسروں کا وقت برباد کر رہے ہیں اور اپنی زندگی کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ مسٹر کلارک تصدیق کر چکے تھے کہ چندر پرکاش اپنے طور پر شب و روز دفینے اور نوادرات کے چکر میں رہا ہے اور کسی نہ کسی طور اب بھی اس چکر میں ہے۔

جوس کا گھونٹ بھر کر چندر نے کرسی پر بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں اور بولا "شاہ جہاں ڈیئر! تمہارا کیا وچار ہے؟ کیا وہ دفینہ واقعی ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے؟"

میں نے کہا "اس بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں' بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ مسٹر کلارک یہاں اپنی کمپنی "ایف ایم" کی برانچ کھولنا چاہ رہے ہیں اور اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے' یہاں ان کی ملاقات آپ کے "تاؤ" صاحب سے ہو گئی۔ انہوں نے کلارک صاحب کو دفینے کے چکر میں ڈال دیا۔"

"ویسے مجھے اس بات پر وشواس نہیں۔" چندر بولے

ہے مسکرایا "مسٹر کلارک ارب پتی ہیں اور ارب پتی بننے کے لیے بندے کا نہایت جہاں دیدہ اور ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ کلارک صاحب نے ایک مخبوط الحواس شخص کی بات پر اتنا پختہ یقین کر لیا ہو اور بھوپال میں اپنے اصل کام سے توجہ ہٹا کر دفینے کے پیچھے لگ گئے ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ پہلے سے اس چکر میں تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کلارک صاحب کو دفینے کے متعلق کوئی "کلیو" ملا ہے اس لیے وہ یہاں انکل گوپی ناتھ کے پاس آئے ہیں۔"

"عین ممکن ہے۔" چندر نے کہا۔

"لیکن دوسری طرف تم یہ کہہ رہے ہو کہ تاؤ مخبوط الحواس ہیں اور ان کی بات کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔"

"مگر جب میں مسٹر کلارک کی سنجیدگی کو دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید واقعی کوئی بات ہے۔"

"چلو آنے والے وقت میں اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔"

"لیکن مسٹر شاہ جہاں! مجھے پریشانی اور چنتا اس بات کی ہے کہ تاؤ تشویش ناک حد تک "اموزی" ہیں۔ انہوں نے آپ لوگوں کے سامنے برملا اعتراف کیا ہے کہ دفینہ ان کی تحویل میں ہے' کل کلاں وہ بھوپال کے کسی بازار میں جا کر علی الاعلان یہ بات کہہ دیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے اس دفینے کی وجہ سے قرب و جوار کے علاقے میں بہت کشت و خون ہوا ہے اور ایسی دشمنیوں کی بنیاد رکھی گئی ہے جو مدتوں چلیں گی' مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ تاؤ کے خبط کی وجہ سے کہیں تاؤ کے ساتھ ساتھ ہم سب کی زندگیاں بھی خطرے نہ پڑ جائیں۔ یہ معاملہ جلد سے جلد ختم ہونا چاہیے یا اپنے منطقی انجام کو پہنچنا چاہیے۔"

"تمہارے لیے تو یہ کام بہت آسان ہے۔ تم تاؤ کے اکلوتے لائق بھتیجے ہو۔ سارا کام تم نے ہی سنبھال رکھا ہے۔ تم سیدھے سیدھے تاؤ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھ لو کہ اصل بات کیا ہے؟"

وہ مسکرایا "اگر یہ سب کچھ اتنا آسان ہوتا تو میں کب کا کر چکا ہوتا' بلکہ مجھ سے بھی پہلے تمہارے باس مسٹر کلارک کر چکے ہوتے۔ تاؤ جلیبی کی طرح گول گول ہیں' انہیں سیدھا کر لینا ناممکن ہے۔"

چندر پرکاش سے ملنے کے بعد میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ بڑا گھاگ شخص تھا اور زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام گر جانتا تھا۔ یقیناً چنے پل سے برآمد ہونے والے دفینے کے متعلق اسے سب کچھ معلوم تھا' یہ ایک ایسی خبر تھی جو بڑے تواتر سے سنی سنائی جا رہی تھی' اتنی اہم خبر کسی سے چھپی رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنے مخبوط الحواس تایا کی زبان سے یہ بات سننے کے بعد کہ وہ دفینہ اس کی تحویل میں ہے' چندر پرکاش کے ذہن میں دو طرح کے خیالات ابھرے تھے۔ ایک طرف تو اس کے دل و دماغ میں سنسنی اور جوش و خروش کا سمندر موجزن ہو گیا تھا' اگر واقعی وہ عظیم الشان دفینہ کسی طور اس کے تاؤ کی تحویل میں آ گیا تھا تو پھر وہ اس کے وارث کی حیثیت سے انتہائی خوش قسمت انسان تھا۔ دوسری طرف یہ خبر سننے کے بعد چندر پرکاش کے ذہن میں شدید قسم کی بے یقینی بھی پیدا ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں اتنی بڑی خوش خبری سما نہیں پا رہی تھی۔ وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ نوادرات اور زر و جواہر پر مشتمل اتنا بڑا دفینہ جس کے لیے مسٹر کلارک جیسے لوگ سرگرداں ہیں ایک ایسے شخص کی تحویل میں ہے جس کی "زندگی کا ہاتھی" گزر چکا ہے اور بس اب دم باقی رہ گئی ہے۔

اس رات سروج پھر میرے پہلو میں تھی۔ نہایت باریک ریشمی گاؤن اس کے چمکتے دمکتے بدن پر سرسرا رہا تھا۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہہ رہی تھی لیکن اس کے بدن کا انگ انگ بول رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکا لیکن میں جانتا تھا کہ وہاں نشے کا دریا بہہ رہا ہے۔ ایک ایسی طغیانی ہے جو وزنی چٹانوں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جا سکتی ہے۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"کیوں میں مریض لگ رہا ہوں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اگر مجھے کوئی مرض ہے بھی تو اس کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"ابھی تک معاف نہیں کیا مجھے؟" وہ ناز سے بولی۔

"تم مجھے منانے کی کوشش نہ کرو' کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان روٹھنے منانے کا رشتہ ہی نہیں ہے۔"

وہ بے مزہ ہونا تو جیسے جانتی ہی نہیں تھی۔ میرے کچھ اور نزدیک کھسک آئی بڑی محبت سے بولی "تم دو پہر کو بتا رہے تھے کہ تمہارے سر میں درد ہے۔ اب کیسے ہو؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی "لگتا ہے کہ ابھی درد ہے۔ سر دبا دوں۔"

میں اب بھی خاموش رہا۔ وہ اپنی نرم ہتھیلیوں سے میری پیشانی دبانے لگی۔ اس نے اپنے لمبے بال اس طرح کھلے چھوڑ رکھے تھے کہ وہ بار بار میرے چہرے سے چھو جاتے تھے۔ وہ اپنے ترکش کا ہر تیر مجھ پر آزما رہی تھی لیکن میں اس کے پاس تھا ہی کہاں۔۔۔ میں تو بہت دور تھا۔۔۔ ابوظہبی کی گلیوں میں بھٹک رہا تھا اور فیروزی قمیص والی غزالہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی جدائی کا منظر رہ رہ کر میری آنکھوں میں کانٹے چبھو رہا تھا۔ وہ کیوں اس طرح چھوڑ گئی تھی مجھے؟ کیا مجھے بار بار آس دلا کر دکھ اور مایوسی کے حوالے کرنے سے اسے سکھ ملتا تھا۔ وہ کیوں میرے دل کو کھلونا بنائے ہوئے تھی؟ کیا وہ مجھ سے اس دور کا بدلہ لے رہی تھی جب میں اس کی محبت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اس کی ہر پیش قدمی کا جواب مکمل سرد مہری سے دیا کرتا تھا۔ غزالہ کا آخری خط ابھی تک میرے پاس موجود تھا اور میں اسے بار بار پڑھ چکا تھا۔ بلاشبہ غزالہ نے ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا اور شیخ عاصم سے بغاوت کر کے بے شمار ارضی و سماوی آفات کو اپنے پیچھے لگایا تھا مگر پھر اس نے دوسری غلطی یہ کی تھی کہ اس تشویش ناک صورت حال میں میرے اور صفدر کے پرخلوص تعاون سے منہ پھیر لیا تھا اور تن تنہا درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں گم ہو گئی تھی۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ شیخ عاصم غزالہ کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گا۔ عین ممکن تھا کہ غزالہ کی اس اعلانیہ بغاوت کے بعد پاکستان میں اس کے والدین اور قریبی عزیزوں پر بھی عرصہ حیات تنگ ہو جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ چچی فاخرہ بیمار ہے اور چچا جلیس میں اتنی سکت نہیں کہ شیخ عاصم کے غیظ و غضب کا مقابلہ کر سکیں۔ میرا دل چاہا کہ میں کسی طرح پاکستان میں چچا جلیس سے رابطہ کروں اور انہیں بتاؤں کہ وہ شخص جو ان کا چہیتا داماد تھا آخر اپنے خول سے باہر آ گیا ہے اور اب کسی بھی وقت ان پر مصیبت بن کر نازل ہو سکتا ہے لہٰذا وہ اپنا انتظام کر لیں۔

وہ رات یونہی نہایت پریشان کن سوچوں کے نرغے میں گزر گئی۔ اگلے روز میں پاکستان فون کرنے اور چچا جلیس کو صورت حال سے آگاہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سہ پہر کو چندر پرکاش اور میں پھر ٹینس کھیلتے رہے۔ اس مرتبہ تماشائیوں میں مسٹر جی کلارک، مجتبیٰ کنور اور گوپی ناتھ بھی شامل تھے۔ مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ نے بھی کھیل میں حصہ لیا۔ مجتبیٰ اچھی ٹینس کھیل لیتا تھا۔ ایک طاقت ور سیاست داں ہونے کے علاوہ مجتبیٰ کو بہت سے شعبوں میں مہارت حاصل تھی۔ وہ بہترین شکاری تھا، گھڑ سوار تھا، پالتو جانور رکھنے کا شوقین تھا، یہ اور بات تھی کہ جب وہ پالتو جانوروں کا ذکر کرتا تھا تو اس میں کچھ ایسی "پالتو چیزوں" کا نام بھی آ جاتا تھا جنہیں پالتو چیزوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے لیکن مجتبیٰ کے معیار کچھ اور تھے۔ وہ صنف نازک کو برتنے کی چیز سمجھتا تھا اور اس حوالے سے اس کی رنگین داستانیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔

گوپی ناتھ کی خواہش تھی کہ میں آج رات کھانے کے بعد چاقو زنی کے فن کا مظاہرہ کروں۔ اس خواہش کو ٹھکرانا میرے بس میں ہوتا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ٹھکرا دیتا کیونکہ اس قسم کی "مظاہرے بازی" مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہی تھی اور نہ میں اس قسم کے تماشائیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن یہاں معاملہ گوپی ناتھ کا تھا، اس کی خواہش کو رد کرنا ہمارے لیے کسی طور سود مند نہیں تھا۔ وہ مجھے تلوار کی دھار پر چلنے کو کہتا تو یقیناً کلارک صاحب کی یہ خواہش ہوتی کہ میں اسے یہ مظاہرہ بھی کسی نہ کسی طور کر دکھاؤں۔۔۔

اس موقع پر مجتبیٰ کنور نے ایک بڑی پتے کی بات کہی۔ وہ بولا "میرا قیاس ہے کہ بڈھا اس موقع پر چند مہمانوں کو بھی بلائے گا۔ اگر اس نے اپنے لنگوٹیے یار ریٹائرڈ آئی جی شیووت کو بلایا تو یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ میری اطلاع کے مطابق شیووت بڑا گھاگ پولیس آفیسر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شاہ جہاں کو پہچان لے یا گوپی ناتھ ہی اسے شاہ جہاں کے بارے میں بتا دے۔ ایسی صورت میں شیووت شاہ جہاں کی مخبری کر سکتا ہے اور یہ بات تو ہمیں پتا ہی ہے کہ انڈیا کی پولیس پاگلوں کی طرح شاہ جہاں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔" مسٹر کلارک نے مجتبیٰ سے مشورہ طلب کیا۔

"گوپی ناتھ سے کہا جائے کہ وہ شاہ جہاں کی یہاں موجودگی کو راز رہنے دے۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ شیووت جیسے لوگوں کو شاہ جہاں کی یہاں موجودگی کا علم نہ ہو۔"

کلارک صاحب مسکرائے "تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں گوپی ناتھ سے یہ بات کہہ چکا ہوں۔ اس نے بڑی بدتمیزی سے جواب دیا تھا، بہرحال جواب معقول تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ آئی جی شیووت اس کا دوست ہے اور اتنا قریبی دوست ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی پردہ ہی نہیں ہے لہٰذا ہم لوگوں کو یہ بات دماغ میں ہی نہیں لانی چاہیے کہ شیووت اس چاردیواری کی کوئی بات لیک آؤٹ کرے گا۔"

رات کا کھانا بہت پرتکلف تھا۔ یہ مغلائی طرز کا کھانا

گوپی ناتھ کے باورچیوں نے خاص اہتمام سے تیار کیا تھا۔ ...ابی قورمہ، بریانی، ریشمی کباب، نرگسی کوفتے، میرا تھی ...انھا اور ایک خاص قسم کی چٹنی جو صرف بھوپال میں ہی ...لائی اور جو اپنی مثال آپ تھی۔ چندرہ میں تو اہل خانہ ہی ...ے، ان میں گوپی ناتھ کے دو بھائیوں کے اہل خانہ، گوپی ...ی دو بھانجیاں مع اپنے ایک درجن بچوں کے اور ...ے چچا زاد بھائی بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ باہر کے تین ...افراد بھی شامل تھے جن میں ریٹائرڈ آئی جی شیووت بھی ...۔ شیووت چوڑا چکلا شخص تھا۔ وہ ساٹھ اور ستر سال کے ...میان تھا، تاہم صحت عمر کے لحاظ سے بہتر تھی۔ یہ سب ...ے مجھے کن انکھیوں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے سر ...سینگ ہیں یا میں سرکس کا کوئی بین الاقوامی شہرت والا فن ...ر ہوں۔ شاید اگر میری شہرت اچھی ہوتی تو نوجوان لڑکیوں ...کا ایک ٹولی مجھ سے آٹوگراف وغیرہ لینے کی کوشش بھی کرتی، ...لیکن میری شہرت یہاں ایک استاد چاقو زن کی تھی اور ایک ...ایسے "جتھ جھٹ" کی تھی جو بمبئی میں بگڑے تگڑے غنڈوں ...کو پکڑ کر ان کی دم میں نمدہ فٹ کر دیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ...اس قسم کے تعارف کے بعد مجھے بھی غنڈوں کے قبیل کا ہی ...ایک فرد سمجھا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال مجھے پسند نہیں تھی ...لیکن اس سے فرار بھی ممکن نہیں تھا۔

کھانے کے بعد سب لوگ عمارت کے کامن روم میں ...جمع ہو گئے۔ اس وسیع و عریض کامن روم کو کامن ہال کہنا ...زیادہ مناسب ہو گا۔ یہاں دیواروں کے ساتھ بہت سے ...صوفے رکھے تھے اور چالیس پچاس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ...موجود تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا تختہ آویزاں کیا گیا ...تھا۔ تختے کی لمبائی سات فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے قریب ...تھی۔ اس پر سرخ رنگ سے "چاند ماری" کے دائرے بنائے ...گئے تھے۔ گوپی ناتھ نے ریٹائرڈ آئی جی کے قریب بیٹھے ایک ...درمیانی عمر کے کالے بھجنگ شخص کا تعارف مجھ سے کراتے ...ہوئے کہا "اس کا نام رشید عرف شیدا ہے، تمہاری طرح یہ ...بھی چاقو چلانے میں ماہر ہے۔ بھوپال کے علاوہ آس پاس کے ...علاقوں میں بھی اس کی دھوم ہے۔ میں نے سوچا تمہارا چھوٹا ...سا مقابلہ ہی کرا دیا جائے۔"

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مقابل گوپی ناتھ تھا ...ورنہ میرا جواب بڑا سخت ہوتا۔ میں اور شیدا شانہ بشانہ ...کھڑے ہو گئے۔ ہمیں عام نشانہ بازی کے انداز میں چاقو ...پھینکنا تھا اور درمیان والے سب سے چھوٹے دائرے کو ...نشانہ بنانا تھا۔ سب دائروں کے نمبر تھے۔ شیدے کو دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا، وہ صورت سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش اور سزا یافتہ مجرم نظر آتا تھا۔ خبطی بڈھے نے شیدے کو میرے مقابل کھڑا کر کے مجھے شیدے ہی کی کیٹگری میں شامل کر دیا تھا۔ بہرحال مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مقابلہ تو مجھے کرنا ہی تھا۔ پہل شیدے نے کی۔ اس نے پانچ مرتبہ چاقو پھینکا اور تین نشانے بالکل ٹھیک لگا کر پینتالیس پوائنٹ حاصل کیے۔ میں نے پہلی ہی باری میں شیدے کو آؤٹ کلاس کر دیا، پانچوں نشانے بالکل ٹھیک لگائے۔ تالیوں سے کامن روم گونج اٹھا۔ شیدے نے تین کوششیں مزید کیں اور تینوں بار ناکام ہوا۔ میرے بیس نشانوں میں سے صرف ایک نشانہ خطا گیا تھا، لیکن وہ بھی اتنا قریب تھا کہ بال برابر فرق رہ گیا تھا۔ شیدے کی پھونک نکل گئی تو خاموشی سے ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ فراخ دلی سے اپنی ہار کا اعتراف کر لیتا تو اچھا تھا لیکن ایسے تھرڈ کلاس غنڈوں میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں ہوتی ہے۔ وہ جز بز نظر آ رہا تھا اور بار بار پیشانی سے شرمندگی کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

پھر گوپی ناتھ کی فرمائش پر مجھے کنگن اور چاقو کے دستے والا کرتب دکھانا پڑا۔ کرتب دکھانے سے پیشتر میں نے حاضرین سے معذرت کی اور کہا کہ بہت عرصے سے میں مارشل آرٹ کے تمام شعبوں سے دور ہوں، ان میں چاقو زنی بھی شامل ہے۔ لہٰذا میں کوشش کرتا ہوں، اگر آپ کو کسی طور مایوسی ہو تو اس کے لیے پیشگی معذرت۔

حاضرین نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ پہلے میں نے کنگن والا مظاہرہ پیش کیا۔ چاندی کا ایک کنگن ہوا میں اچھالا اور اپنا رام پوری خنجر تول کر اس طرح پھینکا کہ وہ بغیر آواز پیدا کیے کنگن کے اندر سے گزر کر لکڑی کے تختے میں پیوست ہو گیا۔ گوپی ناتھ سمیت حاضرین نے دل کھول کر داد دی۔ ان میں سروج بھی شامل تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، وہ آخر تک تالیاں بجاتی رہی۔

اس کے بعد چاقو پر چاقو پیوست کرنے کی باری آئی۔ پہلے میں نے لکڑی کے دستے والا ایک چاقو پھینکا جو تختے میں پیوست ہو گیا، بعد ازاں میں نے خنجر سے چاقو کے دستے پر نشانہ لگایا۔ یہ ایک نہایت مشکل نشانہ تھا۔ پہلا نشانہ خطا گیا۔ دوسرا اور تیسرا بھی خطا گیا، لیکن چوتھا کامیاب رہا۔ رام پوری خنجر کی نوک چاقو کے چوبی دستے میں پیوست ہو گئی۔ اس کے بعد گوپی ناتھ کی فرمائش پر میں نے حاضرین کو بتایا کہ گراری دار چاقو کو کس طرح آستین میں چھپایا جاتا ہے، اور پھر بازو کے مخصوص جھٹکے کے ساتھ چاقو کس طرح

اچانک چاقو زن کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اس قسم کے چند چھوٹے چھوٹے کرتبوں کے بعد سب سے مشکل مظاہرے کی باری آئی۔ سب سے پہلے میں نے قریباً بارہ سال پہلے کئی اسٹار کلب میں یہ مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے بعد اور کئی لوگوں نے بھی اس میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دو تین کو کامیابی ہوئی باقیوں کو اپنے پاؤں کی انگلیوں سے محروم ہونا پڑا۔ اس مظاہرے کو یار لوگ "نائف اینڈ فٹ" کہنے لگے تھے اور ابھی تک اس مظاہرے کو اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

میں نے اپنا بوٹ اتارا۔ جراب اتاری اور ننگا پاؤں لکڑی کے ایک تختے پر رکھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اپنے پاؤں کی انگلیاں میں نے حتی الامکان حد تک کھول لیں۔ ایسا کرنے سے پانچوں انگلیوں کے درمیان تھوڑی تھوڑی درز پیدا ہوگئی۔ چھوٹے سائز کے چار گراری دار چاقو میں نے آج دوپہر ہی ایک ملازم کے ہاتھوں منگوا لیے تھے۔ یہ چاقو ایک سائز کے تھے' اور سہ پہر کے وقت میں نے آدھ پون گھنٹا ان کے ساتھ مشق کی تھی لیکن وہ صرف ریہرسل تھی۔ میں نے تختے پر اپنے پاؤں کا نقشہ کھینچ کر انگلیوں کی درمیانی درز میں چاقو پیوست کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن اب ریہرسل نہیں تھی' عملی مظاہرہ تھا۔ مجھے اپنی انگلیوں کی درمیانی درز میں چاروں چاقو پھینک کر پیوست کرنے تھے' ذرا سی غلطی انگلی کو شدید زخمی کرسکتی تھی یا کاٹ کر علیحدہ پھینک سکتی تھی۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور پوری توجہ کے ساتھ پہلا چاقو پاؤں کی طرف پھینکا' وہ نشانے پر لگا' یعنی انگوٹھے اور انگلی کے درمیانی خلا میں پیوست ہوگیا۔ کامن روم جہاں سناٹا طاری تھا ایک دم تالیوں سے گونج اٹھا۔۔۔ یہ عمل میں نے چار بار دہرایا اور چاروں بار تالیوں کے شور سے در و دیوار گونج اٹھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ہیں اور دل کی رفتار معمول سے بڑھی ہوئی ہے۔

میں نے اپنا پاؤں پیچھے ہٹایا اور جراب پہننے کے لیے جھکا۔۔۔ اس لمحے وہی کچھ ہوا جو آج سے دس بارہ برس پہلے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پہلی بار یہ مظاہرہ کیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ ایک بنگالن لڑکی تیزی سے میرے قریب آئی اور اس نے بڑی گرم جوشی سے میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ میں چکرا کر رہ گیا۔۔۔ یہ تو وہی بنگالن سادھنا تھی۔ گو اس کی چمک دمک اب ماند پڑچکی تھی لیکن میں نے ایک لمحے میں اسے پہچان لیا۔ یہ

کیا ہوا تھا؟ کیا وقت میرے لیے "ری وائنڈ" ہوگیا تھا' ویسے ہی ماحول میں' ویسے ہی مظاہرے کے بعد وہی سادھنا والہانہ انداز میں میری طرف بڑھی تھی اور مجھے دیا تھا۔

میں نے حیرت سے پہلے سادھنا اور پھر گوپی ناتھ طرف دیکھا۔ بڈھے گوپی ناتھ کی آنکھوں میں شوخی نظر آ تھی۔ وہ واکنگ اسٹک کے سہارے لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب آیا اور بولا "کہو کیسی رہی۔ پرانی یاد تازہ ہوا نہیں؟"

"یاد۔۔۔ یاد تو تازہ ہوئی لیکن۔۔۔ سادھنا یہاں کیسے؟"

"یہ تم اس سے پوچھو تو زیادہ اچھا ہے۔" گوپی ناتھ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

سادھنا مسلسل ہنستی جارہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آج کل بھوپال میں ہی ہے اور ایک بوتیک چلا رہی۔ گوپی ناتھ سے اکثر آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ سادھنا کی با سے معلوم ہوا کہ کل سادھنا کو گوپی ناتھ کا فون آیا تھا۔ ناتھ نے سادھنا کو کہا تھا کہ وہ اس کے ذریعے ایک دوست سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ وہ یہی سرپرائز تھا جو ابھی تھوڑی پہلے مجھے ملا تھا۔ سادھنا نے میرا ہاتھ تھاما اور نشستوں لے آئی' ہم دونوں باتیں کرنے لگے' وہ پرانی یادوں کو کررہی تھی۔ میری نظر سروج پر پڑی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ زبردست رقابت محسوس کررہی۔ بظاہر وہ میری اور سادھنا کی طرف سے بے پروا نظر آنے کی کوشش کررہی تھی اور مہمانوں سے ہنس بول رہی تھی لیکن اس کا دھیان میری ہی طرف لگا ہوا تھا اور سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

ماضی کے حوالے سے سادھنا میرے ساتھ کافی بے تکلف تھی' مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی تو وہی دس سال پہلے والی بے تکلفی پھر عود کر آئی۔ کامن روم کے ساتھ ڈانسنگ فلور بھی تھا۔ یہاں باقاعدہ رقص کا پروگرام تھا میں نے سادھنا کے ساتھ رقص بھی کیا۔ سادھنا بنگالی حسن کا جادو تھی لیکن اب یہ جادو اپنا اثر بڑی حد تک کھو چکا تھا۔ اس کا جسم ڈھل گیا تھا اور چہرے میں بھی وہ پہلی سی دلکشی نہ رہی تھی۔ درحقیقت وہ اپنی عمر سے آٹھ دس برس بڑی نظر آرہی تھی۔ میں نے سادھنا سے گوپی ناتھ کے بارے میں پوچھا۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی "کچھ نہ پوچھو' بابا کے شریر (جسم) میں بڑی ڈھیٹ قسم کی روح ہے۔ اس عمر

بھی کوئی سندر لڑکی دیکھتے ہیں تو ایک سیکنڈ میں پھسل جاتے ہیں۔ کوئی اٹھارہ بیس عشق تو فرماتے ہیں انہوں نے' آخری عشق تا حال جاری ہے اور معاشقے چھپاتے بھی کچھ نہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر اپنی خرمستیوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔"

"آخری عشق کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تمہیں پتا ہے' تم صرف مجھ سے تصدیق چاہتے ہو۔ باباجی کا موجودہ اسکینڈل نرس شوبھا سے ہے۔ مجھے تو بے چاری پر ترس آتا ہے۔ کافی پڑھی لکھی ہے' قبول صورت بھی ہے۔ مجبوری کے ہاتھوں یہاں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے معاشی حالات ٹھیک نہیں' وہ اپنے ایک بھائی کو امریکا بھیجنا چاہتی ہے۔ گوپی ناتھ صاحب نے اسے آسرا دلا رکھا ہے کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کرکے اس کے بھائی کا کام کروا دیں گے' شوبھا کے ایک دوسرے بھائی کی گردن میں کینسر ہے اس کے علاج معالجے کے لیے بھی وہ اکثر گوپی ناتھ صاحب سے ہی رقم قرض لیتی رہتی ہے۔ گوپی ناتھ حسب عادت اس کی مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں کبھی بھی اس طرح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور وہ برملا اپنی اس مطلب پرستی کا اعتراف بھی فرماتے ہیں۔ ان کے بیس معاشقوں میں سے چار پانچ معاشقے تو ضرور ایسے ہیں جن کی بنیاد گوپی ناتھ صاحب کی مطلب پرستی اور کسی خوب صورت عورت کی مجبوری رہی ہے۔"

"میرا اندازہ ہے کہ حضرت 'طوائفوں' کے چکر میں بھی رہے ہوں گے۔"

"سو فی صد درست اندازہ ہے۔" سادھنا نے کہا "ناچ گانا اور شراب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ تم خود سوچو جب ایک سو ایک بیماریوں اور بڑھاپے کی موجودگی میں وہ ان چیزوں سے پرہیز نہیں کرتے تو صحت مندی کے عالم میں کیا گل کھلاتے ہوں گے۔"

سادھنا سے ملاقات کافی اچھی رہی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گوپی ناتھ کی نجی زندگی کے بارے میں مجھے گراں قدر معلومات فراہم کرسکتی ہے۔ میں نے سادھنا سے پھر ملنے کا وعدہ لینے کے لیے کہا۔

"پھر کب ملوگی؟"

"کیوں؟" اس نے نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔

"کیوں ہم مل نہیں سکتے؟"

"مل تو سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تمہارا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔"

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان.
ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے
قیمت:
جلد اوّل: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

"کیا مقصد کے بغیر کوئی بات نہیں ہو سکتی؟"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اگر مقصد کے بغیر تم نے کوئی بات کہنی ہوتی تو اس وقت کہتے جب میں خوب صورت اور جوان تھی۔ اب کیا رہا ہے مجھ میں۔ اپنے آپ کو اتنا استعمال کیا ہے میں نے کہ اندر سے کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہوں۔"

وہ بات تو بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی غلطی کیسے کر سکتا تھا۔ میں بات ہنسی مذاق کی طرف لے گیا' وہ مسکرانے لگی تو قدرے بہتر دکھائی دینے لگی۔ اسی دوران میں اچانک سائیں عالی آدھمکا۔ وہ بڑی تیزی سے کامن روم میں آیا تھا' اس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سائیں عالی سیدھا میری اور سادھنا کی طرف آیا۔ سادھنا اسے دیکھ کر ڈر گئی۔ سائیں کی مٹھی میں کوئی شے دبی ہوئی تھی' اس سے پہلے کہ میں ٹھیک سے سمجھتا' سائیں نے وہ چیز سادھنا کے گریبان میں ڈال دی۔ سادھنا چند لمحے تو سکتے کی کیفیت میں رہی پھر اچانک اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ... اپنے بلاؤز پر آ گئے اور وہ مسلسل چیخنے لگی۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ سائیں عالی نے کوئی شے سادھنا کے گریبان میں ڈالی ہے۔ سادھنا کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے بالائی جسم سے ساڑی اتار پھینکی۔ موقع پر موجود شوبھا نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور سادھنا کو کھینچ کر ایک قریبی کمرے میں لے گئی بند دروازے کے پیچھے سادھنا کی چیخیں مسلسل گونج رہی تھیں۔

"تم نے کیا ڈالا ہے اس کے کپڑوں میں؟" میں نے چیخ کر سائیں سے پوچھا۔

اس نے قہقہہ لگایا "کچھ بھی نہیں۔ چھوٹا سا مینڈک تھا۔"

"تیرا ستیاناس ہو سائیں عالی۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

تقریباً ایک منٹ تک کمرے کے اندر سے سادھنا کی ہذیانی چیخیں سنائی دیتی رہیں' پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد نرس شوبھا باہر نکلی۔ اس نے کاغذ میں کوئی شے لپیٹ رکھی تھی اور اسے چٹکی میں پکڑ رکھا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" گوپی ناتھ نے پوچھا۔

نرس شوبھا نے کاغذ فرش پر پھینک دیا۔ اس میں مینڈک کی پچکی ہوئی لاش تھی۔ دہشت زدہ سادھنا نے بلاؤز کے اندر مینڈک کو اتنے زور سے بھینچا تھا کہ وہ بے چارہ راہیِ عدم ہو گیا تھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے سائیں عالی؟" میں نے گرج کر پوچھا۔

"یہ بے ہودگی نہیں۔ بے ہودگی وہ بدذات کر رہی تھی۔" سائیں نے قلندرانہ انداز میں کہا "ایسی عورتیں مردوں کو پھانس کر ان کی زندگیاں تباہ کر دیتی ہیں۔ ان کا گھر بار' بیوی بچے' یار دوست سب چھڑا دیتی ہیں ان سے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"میرا تو ٹھیک ہے لیکن اس کا خراب تھا جو اب اندر بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے۔ اس کو حیا آنی چاہیے کہ سب کے سامنے ایک شادی شدہ مرد پر ڈورے ڈال رہی تھی۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تمہاری پتنی تصدیق کرے گی کہ میں بکواس نہیں کر رہا۔ میں نے جو کچھ کہا یا کیا وہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے۔"

میں سائیں کو کوئی سخت جواب دینا چاہ رہا تھا لیکن مسز کلارک نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

سائیں عالی نے حق ہو کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ گوپی ناتھ کے علاوہ دیگر حاضرین بھی متحیر کھڑے تھے۔ سائیں کی عجیب و غریب شخصیت نے سب کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ گوپی ناتھ نے مسکراتے ہوئے کلارک صاحب کو مخاطب کیا "یہ سائیں صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں؟"

سائیں ترنگ میں بولا "اس سے کیا پوچھتے ہو' مجھ سے پوچھو۔ یہ لڑکی سروج' شاہ جہاں کی پتنی ہے۔ دونوں پرانے پریم پجاری ہیں۔ چپکے چپکے شادی کر رکھی ہے۔ بس گنے چنے لوگوں کو بتا رکھا ہے لیکن بندہ پوچھے پریم ہی کیا ہے کوئی چوری تو نہیں کی۔ سب کو کیوں نہیں بتاتے۔ پوری دنیا کو بتاؤ' ساتوں زمینوں اور ساتوں آسمانوں کو بتاؤ۔ پاگلو! اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے۔ کل جب تمہارے پریم کی پیاری سی نشانی سامنے آئے گی تو بھی تو دنیا کو پتا چلے گا ہی۔"

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن مسز کلارک نے ایک بار پھر مجھے اشارے سے منع کر دیا۔ گوپی ناتھ نے رومال سے اپنی باچھیں پونچھتے ہوئے کہا "ہاں بھئی جہانی! یہ سائیں صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ اگر یہ سب درست ہے تو پھر تمہیں اس معاملے میں بھی چھپا رستم ہی کہنا چاہیے۔"

"رستم کیا چیز ہے' یہ تو مہا رستم ہے۔" سائیں نے چہک کر کہا "آؤ میں تمہیں بتاؤں اس کے بارے میں۔ بڑی چٹپٹی باتیں ہیں۔"

اس نے کمال بے تکلفی سے بوڑھے گوپی ناتھ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کامن روم سے باہر نکل گیا۔ سب ہکا بکا اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان لمحوں میں مجھے ایک پرانا منظر یاد آ گیا۔ یہ ان مناظر میں سے تھا جو میری یاد کے پردے پر انمٹ روشنائی سے نقش تھے۔ فرید کوٹ کے نواح میں ہم کچھ عرصہ پہلے ایک ویران کھنڈر میں چھپے ہوئے تھے۔ وہاں غزالہ کو میرے قریب دیکھ کر سائیں عالی نے اسے بھی اسی طرح بے عزت کیا تھا' اور بے حجابی کے طعنے دیے تھے۔ میں نے سائیں کی یہ حرکت اس کی مخبوط الحواسی کے پیش نظر درگزر کر دی تھی' لیکن آج کے واقعے نے میرا وہ زخم پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ مجھے سائیں عالی اور اس کی چیلی سروج پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ سائیں عالی یہاں سے چلا گیا تھا ورنہ کلارک صاحب کی موجودگی کے باوجود میری زبان سے اس کے لیے کوئی سخت بات نکل جاتی۔ سادھنا ایک پرانی دوست تھی جو بہت عرصے بعد مجھے ملی تھی' اس کے ساتھ سائیں عالی کا یہ سلوک میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

کامن روم میں موجود سب لوگ سائیں عالی کے متعلق مسکراتی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میں نرس شوبھا کے ساتھ اندر کمرے میں پہنچا تو سادھنا صوفے پر بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ میں نے اس تکلیف دہ واقعے پر سادھنا سے معذرت کی اور اس کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اسی دوران میں اہل خانہ میں سے بھی دو تین افراد اندر آ گئے اور انہوں نے سادھنا کو دلاسا دیا۔

رات کو سروج حسب معمول چمک دمک کر میرے بیڈ روم میں براجمان تھی۔ پرفیوم کی خوشبو سے کمرا مہک رہا تھا۔ جونہی میں بیڈ پر بیٹھا اس نے خالص ہندوستانی عورت کا انداز اختیار کیا' پہلے نمستے کیا اور پھر پتی ساوتری بنتے ہوئے اپنے ہاتھ میرے بوٹوں کی طرف بڑھا دیے۔ وہ تسمے کھولنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کی چند ہفت رنگ چوڑیاں ٹوٹ کر قالین پر جا گریں۔ "ہائے رام کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ میرے غصے میں تپے چہرے کو دیکھ کر بولی۔

میں نے کہا "ابھی کچھ ہوا ہی نہیں؟ تم نے اور تمہارے اس گرو نے میری زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔ قدم قدم پر میرے لیے مصیبتیں کھڑی کرتے ہو۔"

"کس مصیبت کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا "زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں جانتا ہوں یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ سادھنا کو میرے ساتھ دیکھ کر تم نے ہی سائیں عالی کو ہماری طرف بھیجا ہو گا۔"

"بھگوان... بھگوان جانتا ہے میں نے ایسا نہیں کیا۔"

وہ نظریں چرا کر بولی۔

"کیا تمہارے انکار کرنے سے اس "بے عزتی" کا مداوا ہو جائے گا جو میری اور سادھنا کی ہوئی۔ وہ پرانی دوست تھی' دس بارہ سال بعد مجھے ملی تھی۔ سائیں عالی نے اس کے ساتھ جو گھٹیا حرکت کی ہے وہ ہم سب کے لیے قابل شرم ہے۔"

وہ معذرت کے انداز میں بولی "شاہ جہاں! تم جانتے ہی ہو کہ سائیں جی مست ہیں' وہ ایسی حرکتیں..."

"ایسی حرکتیں وہ صرف میرے ساتھ کرتا ہے۔" میں نے سروج کی بات کاٹی "اس سے پہلے اسی طرح وہ غزالہ کی توہین کر چکا ہے۔ اور وہ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے کرتا ہے۔ کیا وہ اس طرح تمہیں میرے قریب لے آئے گا؟ قیامت تک ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس طرح کرتا رہے گا' تو ہم اور دور ہوتے جائیں گے۔ مجھے تمہاری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں رہے گا۔"

سروج کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور خوب صورت آنکھوں میں خوف اور غم کی کیفیت تھی۔ وہ میرا کندھا تھام کر بولی "شاہ جہاں! سمجھنے کی کوشش کرو... پلیز۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تم جانتے ہو سائیں جی اپنے آپ میں نہیں رہتے۔"

"لیکن تم تو مخبوط الحواس نہیں ہو... اور میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ تم نے ہی باہر جا کر سائیں عالی کو اطلاع دی تھی کہ کسی لڑکی نے میرا منہ چوما ہے اور میں اب اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہا ہوں۔"

"شاہ جہاں! ایسا نہیں تھا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور خود کپڑے بدلنے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو سروج بستر پر کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ اس کی کمر کی جنبش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ جس کلائی سے چوڑیاں ٹوٹی تھیں وہاں سے خون رس رہا تھا۔ اس نے جوڑے سے لپٹے ہوئے موتیے

کے ہار اور کانوں سے موتیے کے گجرے اتار کر ڈسٹ بن میں پھینک دیے تھے۔ میں نے نائٹ بلب کو آن کیا اور خاموشی سے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ بیڈ روم میں ایک نامانوس آواز گونج رہی تھی۔ جیسے کسی جانور کے گلے میں کوئی شے پھنس گئی ہو اور سانس لینے کی کوشش میں اس کے حلق سے "کھیں کھیں" کی آواز نکل رہی ہو۔ یک دم میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ یہ آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ گلگت سے آگے اسی برفانی ویرانے میں۔ وادی راخان کی وہ تحیر خیز شب مجھے آج بھی یاد تھی۔ ایک تاریک کمرے میں اسی طرح سروج میرے ساتھ موجود تھی جب اس پر پہلا پراسرار دورہ پڑا تھا۔ اس وقت سب سے پہلے ایسی ہی آواز میرے کانوں میں گونجی تھی۔ یہ آواز جو اب آرہی تھی اس آواز سے قدرے مدھم تھی لیکن آواز کی نوعیت بالکل وہی تھی۔

میں تڑپ کر اٹھا اور نائٹ آن کردی۔ سروج بالکل سیدھی پڑی تھی۔ وہ غنودگی کی حالت میں تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار جمع ہو رہے تھے اور چہرے کی رنگت سرخی کی طرف مائل تھی۔ بے شک وہ اداکارہ تھی لیکن فی الوقت وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی، میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ اداکاری نہیں کر رہی۔ اس کا جسم اذیت کے کسی شکنجے میں جکڑا چلا جا رہا تھا۔ یہی لمحے ہوتے تھے جب سروج کے لیے میری نفرت کہیں روپوش ہو کر بہت دور چلی جاتی تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں جو گریز تھا وہ ناپید ہو جاتا تھا اور مجبوری میں لپٹی ہوئی ایک ایسی آمادگی ذہن میں نمودار ہوتی تھی جس میں تلخی اور شیرینی یکجا محسوس ہوتی تھی۔

میں نے سروج کو اس کے نیم عریاں شانوں سے پکڑا "سروج... آنکھیں کھولو۔ سروج!"

میری دو تین صداؤں کے بعد اس کے پپوٹوں میں حرکت ہوئی۔ بے انتہا کوشش کے ساتھ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن لگتا تھا کہ کہیں بہت دور دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں کی کیفیت نے میرا دل کاٹ کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے وادی راخان کی پراسرار برف سے دو فولادی ہاتھ برآمد ہوئے ہیں اور طویل ہوتے ہوتے سروج کے کندھوں تک آپہنچے ہیں، اب وہ ہاتھ سروج کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے سروج کے گرم انگارا چہرے پر بے تحاشا بوسے دیے اور پھر اسے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کا بدن آگ ہو رہا تھا۔ ایک ہیجانی سی لرزش پورے [illegible] تھی۔ "سروج! آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو۔ میں شاہ جہاں ہوں۔" میں بار بار اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگا۔ اس کے قریب تر ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن غیر متوقع طور پر اب بھی مجھ سے بہت دور تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں خوف اجاگر ہونے لگا۔ میرا دل چاہا کہ سائیں عالی کو بلاؤں، شاید وہ اس موقع پر کچھ کر سکے۔ میں اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ میری "قربت" سروج پر اثر انداز ہونے لگی۔ اس کے جسم کا نامانوس تناؤ ختم ہونے لگا۔ اس کی سانسوں کا خوفناک سکون تلاطم میں بدلنے لگا۔ وہ بے ترتیب ہو رہی تھی، میں نے اسے کچھ اور بے ترتیب کر دیا کہ یہی بے ترتیبی زندگی کی علامت تھی۔ ایک بہاؤ میں بہنے لگی۔ کمرے کے وحشی اندھیرے کو سرکش جذبات کا ایک تند ریلا ڈھانپتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اور سروج کے درمیان فاصلہ ختم ہو گیا تھا۔

صبح منہ اندھیرے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ سروج چادر اوڑھے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا، دوسری طرف غیر متوقع طور پر مسٹر جی کلارک تھے۔ انہوں نے کہا۔

"سوری ٹو ڈسٹرب یو مسٹر شاہ جہاں... لیکن بات اہم تھی۔"

"جی فرمائیے۔" میں نے کہا۔

وہ بولے "سائیں عالی کا شدید اصرار ہے کہ تمہیں یہاں شادی شدہ ہی ظاہر کیا جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ کل اس نے کامن روم میں جو بات کہی تھی تم اس کی تردید نہ کرو۔ ساری رات میرا دماغ چاٹتا رہا ہے اور کہتا رہا ہے کہ اگر ایسا کریں گے تو سب اچھا ہو جائے گا ورنہ سب چوپٹ ہو جائے گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کا ذاتی خیال ہے؟"

چند لمحے کے توقف سے مسٹر کلارک بولے "سائیں عالی میں کوئی ایسی بات ہے ضرور جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ تو ہماری سائنس بھی مانتی ہے کہ وجد میں رہنے والے لوگوں کے منہ سے کبھی کبھار کوئی ایسی بات بھی نکل جاتی ہے جو سو فیصد مستقبل بینی کے زمرے میں آتی ہے۔ لہٰذا اگر اس میں کوئی حرج نہیں تو سائیں کی بات مان کر دیکھ لینا چاہیے۔ کم از کم یہ تو ہو گا کہ سائیں کی ایک دیرینہ تمنا کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "اگر میرے تردید نہ کرنے سے سائیں خوش ہوتا ہے تو میں تردید نہیں کروں گا۔"

"ہاں! صرف سائیں کو ہی خوش کرنے کی نہیں۔" مسٹر رک نے کہا "ممکن ہے کہ اس میں سے واقعی ہماری زن کی کوئی شکل نکل آئے۔ سائیں کی پہلی بات تو بھوپال بالکل درست ثابت ہو گئی ہے، وہ پچھلے ڈیڑھ دو برس مسلسل یہی کہہ رہا ہے کہ شاہ جہاں کے بغیر ہم نوادرات نہیں پہنچ سکتے۔ اب تم خود دیکھ لو، ہمیں تمہیں کہاں ڈھونڈ کر یہاں لانا پڑا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ کبھی کبھی کے منہ سے بڑی پتے کی بات نکل جاتی ہے۔ باقی اس الٹی سیدھی حرکات واقعی کسی وقت دکھ پہنچاتی ہیں۔ جیسے ہوا۔ یقیناً وہ نہایت نازیبا حرکت تھی۔ مجھے ذاتی طور پر حد دکھ ہوا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "آپ کا کیا خیال ہے، ئیں عالی مجھے شادی شدہ ظاہر کر کے کیا فائدہ حاصل کرنا تا ہے۔"

"ابھی اس بارے میں میرا کوئی آئیڈیا نہیں ہے لیکن لگتا ہے کہ گوپی ناتھ کی کوئی دکھتی رگ اس کے ہاتھ میں ہوئی ہے۔"

مسٹر جی کلارک سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میں باتھ روم میں گھس گیا۔ کپڑے بدل کر باہر نکلا تو سروج بھی بیدار بھی تھی۔ اس کی بھید بھری آنکھوں میں ابھی تک نیند کا ر تھا۔ وہ بالکل پرسکون نظر آرہی تھی۔ مجھے یوں محسوس کہ رات غنودگی کی حالت میں اس پر دورے کی جو ابتدائی ت طاری ہوئی تھی وہ اس سے قطعی بے خبر ہے۔ میں بھی اس نکھری نکھری پرسکون صبح میں وہ ذکر چھیڑنا مناسب ں سمجھا۔

میں مظفر کے کمرے کی طرف جانے کے لیے باہر نکلا تو ری میں ہی سائیں عالی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ عجیب و ب کھانے کھانے کا شوقین تھا۔ اس وقت بھی اس کے میں پلیٹ تھی اور وہ مٹھیاں بھر بھر کر اس میں سے چاول رہا تھا، لیکن ان چاولوں پر اس نے چینی کی جگہ خشک آٹا ل رکھا تھا اور غالباً گھی کی جگہ شربت انڈیلا ہوا تھا۔ اس ارد گرد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں لیکن وہ ان کی یورش سے لکل بے پروا تھا۔ سائیں کو دیکھ کر مجھے تاؤ آگیا۔ جی چاہا کہ سے بے پروا ہو کر بے نقط سنا دوں لیکن پھر مسٹر کلارک بات یاد آئی۔ انہوں نے اس سلسلے میں تحمل کا مشورہ دیا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "سائیں! کل رات تم اچھا نہیں کیا۔"

"کس رات کی بات کر رہے ہو۔ اس دنیا کی رات یا کوہ ف کی رات۔" سائیں نے بے نیازی سے پوچھا۔

"بے پر کی مت اڑاؤ سائیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو رات تم نے اس لڑکی کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

سائیں عالی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اچھا تم اس مینڈک کی بات کر رہے ہو جو میں نے چھوڑا تھا... وہ بڑا عجیب قصہ ہے شفیع محمد... وہ مینڈک... دراصل مینڈک نہیں تھا، پتا ہے وہ مینڈک کیا تھا؟ وہ مینڈک ایک جن تھا... ہاں... میری بات کو مذاق مت سمجھو۔ ایک دن یہ چھوکری بھوپال کے ناز سنیما سے دیو آنند کی مشہور فلم بمبئی کا بابو دیکھ کر نکلی ہی تھی کہ اس جن کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ یہ سو جان سے اس لڑکی پر فدا ہو گیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ شادی شدہ جن تھا اور اس کی جننی بڑی سخت مزاج تھی۔ ویسے بھی وہ جنات کی طاقتور ترین نسل میں سے تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنے جن شوہر کو مار مار کر بھوت بنا دیتی تھی۔ سمجھو کہ وہ جنوں کی پھولن دیوی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر نامدار ایک آدم زادی پر عاشق ہے تو وہ بہت غصے میں آگئی۔ اس نے پہلے تو شوہر کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ یہ آدم زادیاں سخت بے وفا ہوتی ہیں۔ شوہر جن ہو تو بھی ان آدم زادیوں کو کسی حوالے سے مطمئن نہیں کر سکتا۔ اپنے شوہروں کو زندہ درگور کرنے کی خواہش ان آدم زادیوں کی فطرت میں شامل ہے وغیرہ وغیرہ لیکن جب عاشق جن کسی طور راہ راست پر نہیں آیا تو جننی مع اپنے چند درجن بچوں کے ماں کے گھر چلی گئی، اس کی ماں کوہ قاف کی مانی ہوئی جادوگرنی ہے۔ اس نے پہلے تو میاں بیوی میں صلح صفائی کی کوشش کی پھر مایوس ہو کر اپنے سابق داماد کو مینڈک بنا دیا اور کوہ قاف سے اس دنیا میں پھینک دیا۔ پتا نہیں کہاں کہاں سفر کرتا یہ مینڈک بھوپال کے ایک نواحی گاؤں میں پہنچا اور گاؤں کے جوہڑ سے ایک دودھ فروش کے دودھ میں منتقل ہو کر بھوپال آگیا۔ اس نے مجھے اپنی پوری رام کہانی سنائی اور بتایا کہ اگر اسے اپنی محبوبہ کا وصال نہ ملا تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا..."

"لہٰذا تم نے اسے سارجنا کے گریبان میں ڈال کر اس کی دیرینہ خواہش پوری کر دی۔" میں نے سائیں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یار شفیع محمد! میں نے تو اسے بہت منع کیا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ آدم زادیاں چوہوں مینڈکوں وغیرہ سے بہت ڈرتی ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے مزے کی خاطر جان سے جاؤ گے لیکن وہ نہیں مانا۔"

میں نے سرد لہجے میں کہا "سائیں! تم کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتے ہو۔"

سائیں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اسی دوران میں گوپی ناتھ کی صورت نظر آگئی۔ وہ واکنگ اسٹک کے سہارے چلتا ہماری طرف آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ خوب صورت نرس شوبھا بھی تھی۔ سائیں عالی کے ساتھ میری گفتگو کو فل اسٹاپ لگ گیا۔

اگلے چار پانچ روز اسی وسیع و عریض عمارت میں گزرے جس کا نام گوپی ناتھ کے نام پر "گوپی ناتھ مینشن" تھا معلوم نہیں کہ اس عمارت کو یہ نام کیوں دیا گیا تھا بہرحال یہ ایک خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے سبزہ زاروں' فواروں' کیاریوں اور چھتریوں سے سجے ہوئے لانوں میں شام کے اترنے کا منظر بڑا حسین ہوتا تھا۔ ان حسین شاموں میں غزالہ کی یاد زیادہ شدت سے میرے دل و دماغ پر حملہ آور ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا کہ اس حسین شام سے نگاہ چرا کر کمرے میں بند ہوجاؤں' لیکن کمرے میں بند ہونا بھی میرے لیے بے سکونی کا باعث تھا' وہاں سروج اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ وہ حیلوں بہانوں سے مجھے رجھانے کی کوشش کرتی۔ وہ میری طرف جتنا زیادہ مائل ہوتی میری طبع میں اتنی ہی بے زاری پیدا ہونے لگتی۔ یہ بے زاری اس لیے اور بھی تکلیف دہ ہوتی تھی کہ میں اس کا برملا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اندیشہ بہرحال میرے دل میں موجود تھا کہ کہیں میرے رویے سے سروج پھر ذہنی الجھنوں کا شکار نہ ہوجائے۔ اس کی نفسیاتی کیفیت میرے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔

سارا دن تو سروج کی نگاہ سے اوجھل رہتا تھا لیکن رات کو بہرطور مجھے اس کا سامنا کرنا ہی ہوتا تھا۔ وہ حسن و شباب کے تمام تر ہتھیاروں سے لیس ہوکر میرے روبرو ہوتی تھی۔ میں جسمانی طور پر سروج کے قریب ہوتا تھا لیکن ذہنی طور پر سروج سے ہزاروں میل دور ابو ظہبی کی گلیوں میں بھٹک رہا ہوتا تھا۔ مجھے اپنی غزالہ کی تلاش ہوتی تھی۔ میں برہنہ پا اسے ڈھونڈتا تھا' میرے پاؤں میں کانٹے ٹوٹتے تھے' میرے نقش پا خون سے رنگین ہوتے تھے' لیکن میری آنکھوں کی پیاس مجھے کشاں کشاں چلاتی رہتی تھی' ایسے میں سروج کی ہوش ربا قربت میرے لیے اور بھی اذیت ناک ہوجاتی تھی۔

گوپی ناتھ سے میری ملاقاتیں جاری تھیں۔ وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہوچکا تھا۔ سیاست' کھیل' ثقافت اور عورتوں سمیت مجھ سے ہر موضوع پر بات کرتا تھا لیکن دفینے اور نوادرات کا ذکر اس نے دوبارہ نہیں کیا۔ یہ موضوع جیسے اس کی فہرست سے بالکل خارج ہوچکا تھا۔ میں نے بھی یہ ذکر چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ گوپی ناتھ کے مزاج کا میں بخوبی اندازہ کرچکا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک رنگین مزاج بڈھا تھا۔ اس نے بڑی طوفانی زندگی گزاری تھی' اگر وہ کہتا تھا کہ اس نے اٹھارہ تہلکہ خیز عشق کیے ہیں تو یقیناً درست کہتا تھا۔ جو شخص ان گنت بیماریوں اور بڑھاپے کی یلغار کے باوجود بلند حوصلہ اور "پرعزم" تھا وہ نوجوانی اور جوانی میں کیا نہ کرتا رہا ہوگا۔ خوب رو نرس شوبھا اس کا تازہ ترین عشق تھی اور یہ صرف زبانی کلامی عشق نہیں تھا۔ گویا "حسب توفیق" اس عشق کو عملی شکل دینے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ جس طرح وہ مزے لے لے کر اپنے سابق معاشقوں کی بات کرتا تھا اسی طرح اس عشق کے بارے میں بھی اظہار کرتا تھا۔ شوبھا کے ساتھ عشق جھاڑنے کے لیے اسے کو موقع تاکنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو گھڑے کی مچھلی تھی۔ رات نو دس بجے تک وہ گوپی ناتھ کے کمرے میں آتی جاتی رہتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ گوپی ناتھ کی منظور نظر ہے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ اس بارے میں زبان کھولے۔ صرف چندر پرکاش تھا جو کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی واضح انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن اس کی اپنی حیثیت کچھ نہیں تھی' جو کچھ تھا گوپی ناتھ کے پاس اور اس کے نام تھا۔ وہ چندر پرکاش کو کھڑے کھڑے ختم کرسکتا تھا۔

چندر پرکاش کی طرح دیگر تمام رشتے دار بھی گوپی ناتھ سے از حد بے زار تھے لیکن وہ گالیاں سننے اور زہر کے گھونٹ بھرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ اگر گوپی ناتھ ان میں سے کسی کو اپنے پاس طلب کرتا تو خوف سے اس کی ٹانگیں لرزنے لگتی تھیں اور چہرہ سفید پڑجاتا تھا۔ شاید سب اس انتظار میں تھے کہ بوڑھے گوپی ناتھ کی ذہنی حالت کچھ اور ابتر ہوجائے اور جب وہ بالکل ہی اول فول بکنے لگے تو اس کو عدالت سے مخبوط الحواس قرار دلا دیا جائے۔ مجھے گوپی ناتھ کی ہڈی بڑی سخت نظر آتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ خود پاگل ہونے سے پیشتر وہ اپنے کئی بدخواہوں کو پاگل کرکے چھوڑے گا۔ وہ جسمانی طور پر بھی خاصا ڈھیٹ تھا۔ جتنی انواع و اقسام کی بیماریاں اسے چمٹی ہوئی تھیں ان کی موجودگی میں تو بعض لوگ از خود زندگی سے استعفیٰ دے دیتے ہیں مگر وہ بیماریوں کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا' بلکہ مزید بیماریوں کا بھی کھلے دل سے استقبال کررہا تھا۔

ایک صبح مجھے موصوف کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آیا۔ شوبھا بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی۔ کبھی سکنجبین پلا رہی تھی' کبھی دوا کھلا رہی تھی۔ کبھی اس کے

کندھے دبانے لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر حقیقی پریشانی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے مختصراً بتایا کہ "سر" کی طبیعت خراب ہے۔

بہرحال دس پندرہ منٹ کے اندر مجھے چندر پرکاش سے سب کچھ معلوم ہوگیا۔ چندر پرکاش نے کہا "یہ سب کچھ آپ کے ساتھ آنے والے ملنگ صاحب کا کیا دھرا ہے۔"

وہ سائیں عالی کو ملنگ کہہ رہا تھا "کیوں اس نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "جس طرح اس نے مادھنا کے گریبان میں مینڈک چھوڑ دیا تھا' اسی طرح تاؤجی کے پیٹ میں چھپکلا چھوڑ دیا ہے' یعنی چھپکلی کا مذکر۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "اس نے تاؤجی کے لیے طاقت کی کوئی دوا بتائی تھی۔ اس میں نر چھپکلی کا جگر استعمال ہوتا ہے۔ پانچ چھ نر چھپکلیوں کے جگر جلا کر ان کی راکھ بنائی گئی اور ایک سفوف میں شامل کرکے تاؤجی کو کھلائی گئی۔ تاؤجی بڑے پرجوش نظر آرہے تھے۔ ان کا وچار تھا کہ دو چار دن میں ان کے اندر اتنی شکتی پیدا ہوجائے گی کہ وہ جل خانہ کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے شملہ جاسکیں گے۔ وہاں شوبھا انہیں اپنے ہاتھ سے قیمے والے پراٹھے بنا بنا کر کھلائے گی لیکن یہ سارا پروگرام دھرا رہ گیا کیونکہ کل شام زود اثر دوا کی تیسری خوراک کھاتے ہی تاؤجی کو زبردست ہیضہ ہوگیا۔ ساری رات ان کی طبیعت بہت خراب رہی ہے۔ پچھلے پہر گلوکوز کی ڈرپ لگ گئی ورنہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے کہا۔

"کس کے لیے؟" چندر نے پوچھا۔

"تمہارے تاؤجی کے لیے اور... اس کے علاوہ شاید سائیں عالی کے لیے بھی۔"

"انہیں دونوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایسی زود اثر دواؤں کا خمیازہ تاؤجی درجنوں مرتبہ بھگت چکے ہیں۔ ہر بار ایسی کشتوں پر ان کے اعتقاد میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اب دیکھنا دو چار روز تک وہ پھر تمہارے سائیں عالی کے پاس بیٹھے ہوں گے اور زندگی میں امنگ ترنگ لانے والے کسی اور نسخے پر غور ہو رہا ہوگا۔"

اچانک گوپی ناتھ کے گرجنے برسنے کی آوازیں آئیں۔ ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ چندر پرکاش کان لگا کر سنتا رہا پھر بولا "کسی نوکر کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اس سے کہہ رہے ہیں کہ وہ چائے لے کر کیوں آیا ہے' شوبھا کیوں نہیں آئی۔"

ابن آدم کی نئی کتاب

ایک نوجوان کی داستان مسلسل جو اپنے حقوق کے لیے جاگیردارانہ نظام سے ٹکرا گیا

جس کو اپنے مفادات کے لیے کٹھن مراحل کا سامنا کرنا پڑا!

ایک نہایت خوبصورت کہانی جو مزاح، سسپنس اور ایڈونچر سے بھرپور ہے

ناشر:-

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور فون ۷۲۴۷۴۱۴

میں نے کہا "وہ رات بھر کی جاگی ہوئی ہے' کہیں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی ہوگی۔"

"لیکن تاؤ کو کون سمجھائے۔ ان کے لیے تو وہ آکسیجن ہے۔ ذرا دیر کے لیے نہ ملے تو ان کا سانس اکھڑنے لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس میں کافی سے زیادہ دوش خود شوبھا کا بھی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر تاؤ جی کو اپنا عادی بنایا ہے۔"

اچانک مجھے شوبھا نظر آئی۔ اس کے بال منتشر تھے اوڑھنی پاؤں میں گھسٹ رہی تھی اور وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی گوپی ناتھ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ وہ کہیں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی تھی اور اسے جھپکی آ گئی تھی۔ مجھے بے ساختہ اس پر ترس آیا۔ پتا نہیں کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر پلپلے بدبودار گوپی ناتھ کو کیسے برداشت کر رہی تھی۔ بوڑھے گوپی ناتھ کی باچھوں سے بہنے والا لیس دار لعاب میرے ذہن میں آیا اور نجانے کیوں مجھے افریقہ کے آدم خور درختوں کے بارے میں سنی ہوئی کہاوتیں یاد آ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے گوپی ناتھ ایک بہت بوڑھا آدم خور درخت ہے۔ اس کی بوسیدہ شاخوں نے ایک ناتواں لڑکی کو گھیر رکھا ہے اور اس کے پتوں سے نکلنے والا لیس دار لعاب اس لڑکی کو ڈھانپتا چلا جا رہا ہے۔ مجبوری کی ڈور سے بندھ کر عورت کیسے کیسے مشکل راستوں پر بخوشی چل نکلتی ہے اس کا اندازہ مجھ شوبھا کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

دو تین روز میں گوپی ناتھ ٹھیک ہو گیا۔ یعنی ویسا ہی ہو گیا جیسا چھپکلی کا جگر کھانے سے پہلے تھا۔ ایک روز اس نے رات کے کھانے کے بعد مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ میرے ساتھ سروج کو بھی طلب کیا۔ ہم دونوں گوپی ناتھ کے بیڈ روم میں پہنچے تو وہ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور شوبھا اس کے نیم گنجے سر میں دھنیا کے تیل کی مالش کر رہی تھی۔ پورے کمرے میں دھنیا کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مالش کرنے کی وجہ سے شوبھا کو جو مشقت اٹھانا پڑ رہی تھی اس کے سبب اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے۔ گوپی ناتھ پہلے سے کمزور نظر آ رہا تھا لیکن گردن کی اکڑ جوں کی توں تھی۔ ہمیں دیکھ کر گوپی ناتھ نے شوبھا کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلی گئی تو گوپی نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور ہم دونوں کو بڑی محبت سے دیکھنے لگا۔ وہ بالکل خاموش تھا' بس گھورے جا رہا تھا۔ اس کے انداز نے سروج کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گڑبڑا دیا۔ سروج نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ یہ کیا چکر ہے بھیّا۔ کہیں بڈھے کی نیت میں تو فرق نہیں آ گیا ہے۔

ایک دم میں چونک گیا' مجھے گوپی ناتھ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نظر آئی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ گوپی ناتھ جیسا رنگ رنگیلا بڈھا کسی بات پر اتنا ملول ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں نمی آ جائے۔

گوپی ناتھ نے ایک بہت گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "جہانی! کیا تم آواگون کے نظریے پر یقین رکھتے ہو۔"

یہ بالکل غیر متوقع سوال تھا۔ میں نے کہا "تاؤ جی آپ کو اس وقت کیسے یاد آ گیا۔"

وہ بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولا "یاد آیا نہیں کسی نے یاد کرایا ہے۔"

"سائیں عالی نے تو نہیں کرایا۔"

"یہی سمجھ لو۔"

"آپ کو تو معلوم ہے وہ بے پر کی اڑاتا ہے۔ بہرحال کہا ہے اس نے؟"

"اس نے بہت کچھ کہا ہے جہانی۔ بہرطور اتنی بات میں بھی مکمل وشواس رکھتا ہوں کہ انسان صرف ایک جنم کے ساتھ اس سنسار میں نہیں آیا۔ ہر جنم کے بعد ایک جنم ہوتا ہے اور اس جنم میں انسان کو پہلے جنم کے پاپ پُن کا پھل ملتا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ سے عقیدے کی بحث میں نہیں چاہتا' تاہم میرا عقیدہ آپ سے مختلف ہے۔"

گوپی ناتھ نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے آہستگی سے سروج کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا "بیٹی! تمہاری شادی کب ہوئی تھی۔"

سروج نے اس سوال کا جواب پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ اس نے جھٹ چند ماہ پہلے کی ایک تاریخ بتا دی۔ گوپی ناتھ سروج سے اس کے والدین اور گھربار کے بارے میں پوچھنے لگا۔ سروج روانی سے جواب دیتی رہی' پھر گوپی ناتھ نے مجھ سے بھی اسی قسم کا انٹرویو شروع کر دیا۔ گاہے گاہے اس کا سانس پھول جاتی تھی اور الفاظ منہ کے اندر ہی گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ یہ سوال و جواب ہم دونوں کو بڑے پراسرار محسوس ہو رہے تھے۔ اس گفتگو میں ایک مرحلے پر گوپی ناتھ جذباتی ہوا تھا۔ جب سروج نے اسے اپنی تاریخ پیدائش بتائی تھی تو گوپی کے اندر ایک دم سے کوئی چیز روشن ہو گئی۔ اس کی دھندلائی ہوئی سفید آنکھوں میں عجیب سی روشنی آنے لگی تھی۔ وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں کچھ بڑبڑایا' اس کی بڑبڑاہٹ میں سے مجھے صرف ایک فقرہ ہی سمجھ آ سکا تھا۔ اس نے کہا تھا "مجھے وشواس تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔"

سائیں عالی نے اس افلاطونی بڈھے کو پتا نہیں کیا

عادی تھی۔ وہ پہلے ہی خبطی تھا اب "خبطی تر" نظر آنے لگا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی تھی کہ اس [illegible] نے بڑی متانت سے سروج کو بیٹی کہہ کر پکارا تھا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیٹھا رہا تھا۔ اس نے جو آواگون کی بات چھیڑی تھی وہ بھی فی الحال میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہم دونوں میں "کسی اپنے پہچانے شخص کا" دوسرا جنم تلاش کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد گوپی ناتھ نے ہم دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ ہم اس کے بیڈ روم سے نکلے تو یوں لگا جیسے اسپتال کے کسی [illegible] وارڈ سے نکلے ہیں۔ بہت حوصلہ تھا شوبھا کا کہ وہ اس ماحول میں گوپی ناتھ کی خدمت کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کا عشق بھی جھیل رہی تھی۔

اگلے دو روز مکمل خاموشی سے گزرے' تیسرے روز شام کے بعد گوپی ناتھ نے پھر مجھے طلب کیا۔ شام سے سیاہ بادل چھائے تھے اور بجلی کے کوندے رہ رہ کر گوپی ناتھ مینشن کی ان گنت کھڑکیوں میں چمکتے تھے۔ ان کھڑکیوں سے باہر پیپل' جامن اور سرو کے درخت بھیگ رہے تھے اور ہوا میں دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ موسم میں بڑی خوشگوار سی خنکی در آئی تھی' عمارت کے ائرکنڈیشنرز بند تھے' گوپی ناتھ نے اپنے کمرے کی برآمدے کی جانب والی کھڑکیاں کھلوا رکھی تھیں اور تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ قریب ہی میز پر چند فائلیں بھی دھری تھیں' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب اس کی طبیعت کافی بہتر ہے۔

مجھے دیکھ کر گوپی ناتھ نے نظر کی عینک آنکھوں سے اتاری اور ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے قریب ہی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی منقش تپائی پر فرانس کی بنی ہوئی بہترین برانڈ کی بیئر پڑی تھی۔ وہ آج بھی کھوئے کھوئے موڈ میں تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "جہانی! تم نے میرا لائف اسٹائل دیکھ ہی لیا ہے۔ میرا وشواس ہے کہ اوروں کی طرح تمہیں بھی اس عمر میں میری یہ رنگین مزاجیاں اچھی نہیں لگی ہوں گی۔ میں جانتا ہوں کہ پیٹھ پیچھے میرے بارے میں کیا کچھ کہا جاتا ہے لیکن مجھے اس کی بالکل پروا نہیں ہے۔ ہاں میں یہ ضرور بتا دوں کہ میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ میں ایک ذمے دار انسان اور شریف شہری تھا' محنت کی کمائی پر وشواس رکھتا تھا اور کم آمدنی والے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اچھے دنوں کی آشا رکھتا تھا۔ میرے باپو دھرم پر بڑا پکا یقین رکھتے تھے اور شاید انہی کی وجہ سے میرے اندر بھی دھرم سے لگاؤ کے جراثیم موجود ہیں۔ حالانکہ یہ سب کچھ میرے لائف اسٹائل سے میل نہیں کھاتا' پھر بھی تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ میرے گھر کے مین دروازے پر درگا دیوی کی کتنی بڑی مورتی نصب ہے۔ میرے خیال میں دیوی کی اتنی بڑی دھاتی مورتی ہندوستان میں شاید ہی کہیں موجود ہو۔ بہرحال میں تم سے ذکر کر رہا تھا اپنی شروع کی زندگی کا۔ میرا ناتا ایک درمیانے طبقے سے تھا' درمیانے طبقے کے گھر میں جو بھی چھوٹی بڑی خوشیاں اور تکلیفیں ہوتی ہیں وہ میرے گھر میں بھی تھیں۔ میری ایک بڑی سندر بہن تھی' اس کا نام بھی سروج تھا' اور وہ مجھ سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ ایک اچھا رشتہ آیا تو باپو نے اس کا بیاہ کر دیا۔ وہ کھاتے پیتے لوگ تھے' ہمارا ان کا مقابلہ نہیں تھا لیکن سنجوگ لکھے تھے لہٰذا بیاہ ہو گیا۔ پانچ چھ ماہ وہ لوگ بھوپال میں رہے پھر کلکتے چلے گئے۔ کلکتے سے اس کے پتی کا ٹرانسفر رنگون ہو گیا اور وہ سروج کو لے کر وہاں چلا گیا۔ دو سال میں وہ لوگ صرف ایک بار ہمیں ملنے کے لیے آئے۔ پہلے سروج کے خط باقاعدگی سے آتے تھے' پھر وہ بے قاعدہ ہو گئے اور آخرکار آنے بند ہو گئے۔ میں اپنے کاموں میں مصروف تھا' باپو اپنے کاموں میں مصروف تھے' اس سنسار میں ہر کسی کو آپا دھاپی پڑی رہتی ہے۔ کسی کو بہت دیر تک یاد رکھنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ہم بھی سروج کو بس بھولے سے گئے تھے پھر ایک دن۔۔۔ اچانک ہم نے سروج کو اپنے گھر کی دہلیز پر دیکھا۔ اسے دیکھ کر ہم سب کانپ گئے تھے لیکن میرا حال تو بہت برا ہوا تھا۔ بڑا پریم تھا ہم بہن بھائی میں۔ سروج ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہی تھی' کیول اٹھائیس برس کی عمر میں ہی چالیس سالہ عورت نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا پتی کہاں ہے' دونوں بچے کہاں ہیں لیکن وہ ہر بات کا گول مول جواب دے رہی تھی۔ چند دن بعد اس نے بتایا کہ اس کا پتی اور بچے رنگون میں ہی ہیں۔ پتی نے بچے چھین لیے تھے اور اسے دھکے مار کر گھر سے نکال دیا تھا۔ سروج بیمار تھی' آٹھ دس روز بعد ہم پر انکشاف ہوا کہ اسے پھیپھڑوں کا کینسر تھا اور بیماری بالکل آخری اسٹیج پر پہنچ چکی تھی' وہ تو ایک مہمان کی طرح ہمارے گھر میں آئی تھی۔ اپنے پیاروں کی صورت دیکھنے کے لیے۔ ان در و دیوار کو دیکھنے کے لیے جہاں اس کا خوب صورت بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ وہ سنسار چھوڑنے سے پہلے آخری بار اپنا بچھڑا ہوا سنسار دیکھنا چاہتی تھی۔ میری آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک پڑے۔ میں بہن کو اسپتال لے گیا اور وہاں داخل کرا دیا۔ جو جمع پونجی تھی وہ سب میں نے اس کے علاج پر لگا دی لیکن موت کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں۔ میرے بے حد اصرار پر میری بہن نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ اپنے پتی کے ساتھ اس کی کبھی بھی بنی نہیں۔ شادی کے تین

چار ماہ بعد ہی اسے غربت اور کم جہیز کے طعنے ملنا شروع ہو گئے تھے۔ دھیرے دھیرے ساس اور نندوں نے اس کا ناک میں دم کر دیا۔ پہلے پہل تو پتی تھوڑی بہت اس کی حمایت کرتا رہا لیکن پھر وہ بھی ماں اور بہنوں کے بہکاوے میں آ گیا۔ سسرال کی چار دیواری میں میری بہن پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ وہ جانور کی طرح صبح سے رات گئے تک تن تنہا پورے کنبے کا کام سنبھالتی' ساس کی جھڑکیاں سنتی' پتی کی مار کھاتی لیکن ہونٹوں سے اف تک نہ کرتی۔ اس نے اپنے خطوں میں ہمیشہ اپنی خوشی اور شانتی کا ذکر کیا' ان تمام دکھوں پر پردہ ڈالے رکھا جو دن رات اسے گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔ ایک بار۔ ایک بار بھی اس نے ہمیں اشارہ نہیں دیا کہ سسرال میں اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سارے دکھ اپنے سینے پر جھیلتی رہی اور رات دن کولہو کے بیل کی طرح چل کر سرتوڑ کوشش کرتی رہتی کہ اس کے پتی اور ساس نندوں کو اس کے حال پر رحم آ جائے لیکن غریبی ایک ایسا پاپ تھا جو ان لوگوں کے نزدیک بالکل ناقابل معافی تھا۔"

یہاں تک کہہ کر گوپی ناتھ بری طرح ہانپ گیا۔ اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پانی پی کر اس نے اپنے سانس بحال کرنے کی کوشش کی پھر جیب سے "ان ہیلر" نکال کر سونگھا۔ کچھ دیر تک اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا "کم جہیز کے طعنوں سے شروع ہونے والی کدورت اس انتہا کو پہنچی کہ بالآخر سروج کے پتی نے دوسری شادی کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ وہ پاتھرے فیملی کی ایک مال دار ودھوا (بیوہ) سے رسم و رواہ بڑھا رہا تھا۔ پتی کے ترکش کا یہ آخری زہریلا تیر میری بہن کی برداشت سے باہر تھا' بیمار تو وہ پہلے سے ہی تھی ایک دم وہ چارپائی پر آ پڑی۔ انکشاف ہوا کہ اسے کینسر ہو گیا ہے۔ اب اس کے پتی کے راستے میں کون سی رکاوٹ باقی تھی۔ اس نے فیصلہ کن انداز اختیار کر لیا اور کہا کہ وہ شادی کر کے رہے گا۔ سروج پانچ چھ ماہ تک مزید ان حالات سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی رہی' آخر شوہر نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اب سروج کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسی دہلیز پر واپس آ جائے جہاں سے اسے یہ کہہ کر ڈولی میں بٹھایا گیا تھا کہ اب سسرال کے گھر سے تیری ارتھی ہی اٹھنی چاہیے۔"

گوپی ناتھ پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ کافی دیر بعد سنبھل سکا۔ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے وہ بولا "میں اپنی بہن کو بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا مکان تک بیچ ڈالا۔ حیدر آباد کے سب سے اچھے اسپتال میں میری بہن کا علاج ہو رہا تھا' اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس کی زبان پر بس ایک ہی بات تھی "بھیا! میری آنکھیں بند ہونے سے پہلے مجھے اپنے دونوں بچوں کی صورت دکھا دو۔"

"میں نے کئی بار رنگون میں سروج کے پتی سے فون رابطہ کیا۔ اسے بھگوان کے واسطے دیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ کسی صورت بچوں کو ہندوستان لانے کو تیار نہیں تھا۔ میرا اصرار جب بہت بڑھا تو اس نے مجھے دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور کہا کہ وہ مجھے ایسے مقدمے میں پھنسائے گا کہ اپنا آپ بیچ کر بھی میں اس سے نکل نہیں سکوں گا۔ میں نے اپنی بہن کا جیون بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن بھوپال آنے کے قریباً چھ مہینے بعد سردیوں کی ایک شام وہ اسپتال کے نیم تاریک کمرے میں میری گود میں سر رکھے رکھے مر گئی۔ مجھے یاد ہے جہانی' آخری وقت تک اس کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کا انتظار کر رہی تھی' اسے وشواس تھا کہ بھگوان اس کی ضرور سنے گا اور وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے بچوں کو ضرور دیکھ سکے گی لیکن جہانی۔ بھگوان بھی یہاں صرف دھن دولت والوں کی سنتا ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے اور مشاہدہ بھی۔ اس میں جو کچھ بھی ہے دولت ہے۔ شراب' عورت' شان شوکت' لذت' خوشی' پیسے سے اس سنسار میں ہر شے خرید جا سکتی ہے اور تو اور اس پیسے سے زندگی بھی خریدی جا سکتی ہے۔ دیکھو میری عمر اسی سال کے لگ بھگ ہے۔ بھوپال کے محلہ "گوپانی" میں میرے جو ہم جولی تھے وہ سب کے سب سورگ باشی ہو چکے ہیں۔ سب کے سب۔ ایک بھی نہیں ہے ان میں سے' اس لیے کہ وہ غریب تھے' ان کو جیون کا آرام سکون حاصل نہیں تھا۔ وہ مہنگے ڈاکٹروں کی فیسیں نہیں بھر سکتے تھے' بیرون ملک سے دوائیں نہیں منگوا سکتے تھے۔ اب ان کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ان کے سانس پورے ہو چکے تھے' بھگوان نے ان کے حصے میں اتنا ہی جیون لکھا تھا۔"

چند لمحے توقف کر کے گوپی ناتھ نے "ان ہیلر" استعمال کیا اور بولا "جہانی! میں نے بہت کم لوگوں کو یہ بتایا ہے۔ جس روز سروج مری میں نے دراصل اسی روز اپنا لائف اسٹائل بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے شرافت کو اپنی پتلون کی پھٹی ہوئی جیب سے نیچے پاؤں کی طرف گرا دیا تھا اور رگید دیا تھا حرام زادی کو۔ اس دن کے بعد سے میرا دین دھرم پیسہ ہے اور وہ خوشیاں ہیں جو میں زندگی سے کشید کرتا ہوں اور بھگوان کی کرپا سے جیون کی آخری ہچکی تک کرتا رہوں گا۔"

گوپی ناتھ اپنی ترنگ میں بہت دیر تک اپنا فلسفہ بیان کرتا رہا۔ وہ بار بار "ان ہیلر" لے رہا تھا اور اپنی باچھوں سے بہتا لعاب بھی رومال سے پونچھ رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں گالیوں کی بھرمار تھی' خاص طور سے وہ جب بھی "دولت" کا لفظ استعمال کرتا تھا تو اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگتی تھیں۔ اس نے جتنی بار بھی "دولت" کا لفظ بولا' اس کے ساتھ ماں کی گالی جوڑ دی۔ یوں لگتا تھا کہ جس طرح وہ تھوک اڑائے بغیر بات نہیں بول سکتا اسی طرح ماں کی گالی کے بغیر "دولت" کا لفظ نہیں بول سکتا۔

میں نے کہا "جناب! دو تین روز پہلے آپ نے آواگون کے ذکر کے دوران اس کی طرف آپ کا دھیان کیسے چلا گیا؟"

گوپی ناتھ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور ایک بار پھر جیسے کہیں کھو سا گیا۔ خواب ناک انداز میں بولا "جہانی! میرے سائیں عالی نے مجھے ایک انوکھے چکر میں ڈال دیا ہے۔ میں کئی روز سے رات دن اس بارے میں وچار کر رہا ہوں اور جتنا وچار کر رہا ہوں اتنا ہی سائیں کا ہم خیال ہوتا جا رہا ہوں۔ اس بات پر میرا وشواس دن بدن پختہ ہوتا چلا جا رہا ہے کہ سائیں کا کہا درست ہے۔"

میں نے کہا "اس قسم کی بات تو آپ نے پہلے بھی کہی تھی لیکن وضاحت اس وقت کی تھی نہ اب کر رہے ہیں۔"

کھڑکیوں سے باہر بجلی کی چمک تھی اور دھواں دھار بارش کا شور تھا۔ چند منٹ پہلے تیز ہوا کے بعد گوپی ناتھ مینشن کی روشنیاں بجھ گئی تھیں اور اب دیگر کمروں کی طرح اس کمرے میں بھی شمع دان روشن تھا۔ شمعوں کی روشنی نے ماحول کو کچھ اور بھی خواب ناک کر دیا تھا۔ لرزتے سایوں کے درمیان "نون صدی" پرانا بوڑھا کسی قدیم استخوانی ڈھانچے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی نہایت گھنی بھویں اس کی آنکھوں پر سایہ فگن تھیں۔ وہ عجیب ڈرامائی لہجے میں بولا "میرے من میں یہ وشواس پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم اور ہماری پتنی سروج۔ مجھ تک یونہی نہیں پہنچے ہو۔ اس کے پیچھے۔ اس کے پیچھے ایک گہرا راز ہے۔"

"کیسا راز؟" میں نے پوچھا۔

"شاید۔ تم دونوں۔ میری بہن سروج اور اس کے پتی جگجیت کمار کا دوسرا جنم ہو۔"

"دوسرا جنم؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں جہانی۔ میری بات کو مذاق مت سمجھنا۔ سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے دنیا کہاں بھی پہنچ جائے لیکن سنت جگ (اواگون جنم) کے نظریے کو جھٹلایا نہیں جا سکے گا۔ آواگون ایک اٹل حقیقت ہے اور رہے گی۔"

میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا "میں آپ کی بات بے حد سنجیدگی سے سن رہا ہوں' لیکن آپ کو یہ خیال گزرا کیسے کہ ہم دونوں کسی کا دوسرا جنم ہیں۔"

"اس کی کوئی ایک وجہ نہیں' بہت سی وجوہات ہیں۔"

میں نے ذرا سوچ کر کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا نام شاہ جہاں ہے جبکہ آپ کے بہنوئی کا نام جگجیت تھا۔ ان دونوں ناموں کے معنی ملتے جلتے ہیں۔ ان ناموں کی وجہ سے آپ کا دھیان۔"

"یہ بھی ایک وجہ ہے۔" گوپی نے میری بات کاٹی "لیکن یہ ایک چھوٹی وجہ ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی بڑی بڑی اور ٹھوس وجوہات ہیں۔" گوپی کا انداز وجدانی تھا۔

وہ یقیناً بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اگر اس کے ورثا نے توقع لگا رکھی تھی کہ وہ عن قریب بہکی بہکی باتیں کرنے لگے گا اور اسے عدالت سے فاترالعقل قرار دلوایا جا سکے گا' تو یہ کوئی ایسی غلط توقع نہیں تھی۔ مجھے گوپی کی آنکھوں میں جنونیوں کی سی چمک نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی بات کو بے حد زور سے بیان کر رہا تھا۔ وہ بولا "جہانی ڈیئر! مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ تمہارا سائیں کتنا پہنچا ہوا ہے یا کتنا پہنچا ہوا بنتا ہے' لیکن جو باتیں اس نے مجھے بتائی ہیں ان میں۔ یقیناً بہت وزن ہے۔"

جس طرح دو روز پہلے گوپی ناتھ نے سروج کا ہاتھ تھاما تھا اسی انداز میں آج میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ محویت سے مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ بڑے دھیمے لہجے میں بولا "تم۔ تم بالکل ویسے ہی ہو جیسا سروج تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ تحمل' دلیری' محبت' رکھ رکھاؤ سب کچھ وہی ہے۔ تم تو شاید غیرارادی طور پر لباس بھی وہی پہنتے ہو جو سروج کو پسند تھے۔ بات بھی اسی انداز میں کرتے ہو جس میں وہ چاہتی تھی۔ سروج نے تمہیں اسی روپ میں پا لیا ہے جو روپ اسے بھاتا تھا۔"

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ گوپی ناتھ تو اب بڑھاپے کی اس اسٹیج پر پہنچنے ہی والا ہے جہاں ہوش و حواس کی بات کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

گوپی ناتھ نے سائڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا اور بڑے پیار سے بولا "جہانی! مجھے بیئر کا آدھا گلاس دو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں میں گلاس لیا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ عجیب شخص تھا وہ۔ ساری عمر اٹکھیلیوں میں گزار رہی تھی' اب موت سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ ایک طرف سانس بحال کرنے کے لیے بار بار "ان ہیلر" لے رہا تھا' دوسری طرف شراب و شباب سے بھی شغل جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ چسکیاں لیتا رہا اور کھڑکی سے باہر اودھم مچانے والی بارش کو محسوس کرتا رہا۔ ان لمحات میں وہ جیسے میری موجودگی کو بالکل

فراموش کرچکا تھا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے پھر ایک دم گوپی ناتھ میری طرف متوجہ ہوا۔ بغیر کسی تمہید کے اس نے کہا "جہانی! وہ دفینہ جس کے لیے بہت سے لوگ پاگل ہوئے پھرتے ہیں' میرے پاس ہے۔ چند روز پہلے تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ دولت میرے کس کام کی ہے' لیکن اب یہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی ہے۔ ہاں۔۔۔ اب آنے لگی ہے یہ بات میری سمجھ میں۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"میں تمہیں سمجھاؤں گا۔ تمہیں اور سروج دونوں کو سمجھاؤں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔" گوپی ناتھ نے خبطیوں کے انداز میں سرہلایا۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا خادم تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے حیدر آبادی لہجے میں کہا "صاحب جی! غضب اج ہو گیا جی۔۔۔ چھوٹی بی بی صاحبہ (شوبھا) اپنے گھر نا ئیں پہنچیا ہیں جی۔"

"گھر نہیں پہنچی' وہ تو صبح دس بجے نکل گئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کیوں گئی تھی۔"

"جی ہاں جناب۔ ان کے گھر سے ٹیلی فون آیا تھا جی۔ ان کو کسی نے بتایا تھا کہ ان کے بھیا کی طبیعت بڑی ناساز ہے وہ جلدی سے گھر آجائیں۔"

"کس کے ساتھ گئی تھی۔" گوپی ناتھ نے پوچھا۔

"ڈرائیور رنائیں تھا جی۔ میں نے کہا میں ٹیکسی پر چھوڑ آتا ہوں۔ وہ بولیں کوئی بات نائیں ہے' ہم اکیلے چلے جاویں گے۔ وہ باہر نکلیں تو دروازے کے پاس ہی ٹیکسی مل گئی' وہ اس میں بیٹھ کر میرے سامنے چلی گئیں۔۔۔ اب دو منٹ پہلے چھوٹی بی بی کی والدہ کا فون آیا ہے جی' وہ پوچھ رہی ہیں کہ بی بی کہاں ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ چھوٹے بھیا کی طبیعت خراب نہیں تھی۔"

گوپی ناتھ کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ لرزتی آواز میں بولا "وہ کتے کا بچہ چندر پرکاش کہاں ہے۔ اسے بلاؤ۔"

ایک نوکر چندر پرکاش کو بلانے کے لیے باہر دوڑا' اسی دوران میں ایک بھیگی ہوئی لرزاں ترساں عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شوبھا کی ماں ہو گی۔ وہ کرلاتی ہوئی آواز میں بولی "صاحب جی! ہائے میری بچی کا کچھ کریں۔ پتا نہیں وہ کہاں ہو ئیں گی۔ کس حال میں ہو ئیں گی' وہ تو بہت تھوڑ دلی ہے' خوف سے اج مرجاوے گی۔"

"حوصلہ کر۔۔۔ حوصلہ کر۔" گوپی ناتھ نے اسے ڈانٹا۔

"کیسے حوصلہ کروں صاحب جی!" وہ سر پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولی "میری بچی کے ساتھ ضرور کچھ ہو گیا ہے۔ مجھے وشواس ہے۔ دو تین دن سے کچھ لوگاں اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ آپ کو نائیں بتاتی تھی کہ آپ پریشان ہو گے۔ اس کو بڑا خیال تھا آپ کا۔۔۔"

"کون پیچھے پڑا ہوا تھا اس کے؟" گوپی ناتھ نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

عورت آلتی پالتی مار کر قالین پر بیٹھ گئی اور روتے ہوئے بولی "پرسوں سویرے جب وہ گھر سے آپ کی طرف آ رہی تھی تو کچھ مسٹنڈوں نے اس کا پیچھا کیا اور پھر کھینچ کرا ویگن میں ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ تو بھگوان کی کرپا ہوئی' پولیس کی ایک گاڑی ادھر سے گزری اور مسٹنڈے اسے چھوڑ کر بھاگ لیے' ورنہ رام جانے کیا ہوتا۔ وشواس ہے میری بٹیا کو ان غنڈوں نے اج پکڑا ہے۔"

عورت کا انداز بین کرنے والا تھا۔ گوپی ناتھ نے ساختہ عورت کو ایک گالی دی اور چلا کر کہا کہ اگر کوئی واقعہ پیش آیا تھا تو ان لوگوں نے اسے بتایا کیوں نہیں۔

عورت نے کہا "صاحب جی! مجھ کرماں ماری کو کیا معلوم ہو ئیں گا کہ کیا بتانا ہے اور کیا نہیں۔ یہ تو بٹیا شوبھا کا کام تھا کہ آپ کو یہ بات بتاتی۔"

شوبھا کا نام آتے ہی گوپی ناتھ کے انگاروں پر پانی کے چھینٹے پڑ جاتے تھے۔ عورت کو کوئی سخت جواب دینے کے بجائے وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اتنی دیر میں ساتھ والے کمرے کے اندر فون کی گھنٹی بجی' گوپی ناتھ فون سننے کے لیے اندر چلا گیا۔ عورت قالین پر بیٹھی مسلسل سسکیاں لے رہی تھی' ملازمین حیران پریشان کھڑے تھے۔ میرا دل بھی یہ گواہی دے رہا تھا کہ شوبھا کے ساتھ یقیناً کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ گوپی ناتھ اپنے خبط کی وجہ سے اس عظیم الشان دفینے کی ملکیت کا دعویٰ کرچکا تھا جس نے اب تک درجنوں افراد کی جان لی تھی۔ اس تناظر میں دیکھا جاتا تو اب گوپی ناتھ اور اس کے ارد گرد موجود افراد کو بھی سخت خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ اس کی ایک مثال شوبھا ہی تھی۔ شوبھا گوپی ناتھ کے بہت قریب تھی۔ یہ خیال کسی کے دل میں بھی آسکتا تھا کہ گوپی ناتھ نے شوبھا کو دفینے کے حوالے سے کسی اہم راز سے آگاہ کیا ہو۔

نجانے کیوں میرا دھیان گوپی ناتھ کے ہوشیار چندر پرکاش کی طرف چلا گیا۔ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ بڑی راز داری کے ساتھ اپنے تاؤ کے بیان کی تصدیق کرنے میں مصروف ہے' یعنی دفینے اور نوادرات کی ٹوہ لے رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ شوبھا کے یوں غائب ہونے میں چندر پر

کاش کا ہاتھ ہو۔ وہ گھر کا بھیدی تھا اور گھر کے بھیدی کے لیے لنکا ڈھانا بہت آسان ہوتی ہے۔

اسی دوران میں چندر پرکاش بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا پہنچ گیا۔ وہ سیدھا اس کمرے میں گیا جہاں اس کا تاؤ کوئی ضروری فون سننے میں مصروف تھا۔ میں کمرے سے باہر آگیا' بارش اب رک چکی تھی' بس بہت باریک پھوار پڑ رہی تھی۔ میں بڑی بے چینی سے ایک روش کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ میری چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس دفینے اور نوادرات کی نحوست "گوپی ناتھ مینشن" کے در و دیوار کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے' مجھے فضا میں خون اور بارود کی بو رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں جہاں ٹہل رہا تھا وہاں مکمل تاریکی تھی۔ مجھے گوپی ناتھ اور چندر پرکاش کی باتوں کی آواز آئی۔ وہ جس کمرے میں موجود تھے وہاں شمع دان روشن تھا۔ میں تاریکی میں تھوڑا سا آگے بڑھا تو ادھ کھلی کھڑکی میں سے دونوں کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ وہ دونوں سخت پریشان دکھائی دے رہے تھے' تاہم ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اچانک مجھے اپنے عین عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں بڑی تیزی سے گھوما لیکن پھر بھی دیر ہو گئی۔۔۔ ایک انگارا سا میرے کندھے میں اتر گیا۔ یہ کسی تیز دھار آلے کا زخم تھا جو میرے کندھے پر لگا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ حملہ آور چھریرے بدن کا پھرتیلا سا شخص تھا۔ اس نے اپنے چہرے اور سر پر ایک پگڑی بڑی مضبوطی سے لپیٹ رکھی تھی۔ صرف اس کی آنکھیں ہی دیکھی جاسکتی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان ہے' اس کی آنکھوں میں مجھے بجلی کی تڑپ کوندتی رہی تھی۔ اس نے بے دریغ مجھ پر دوسرا وار بھی کیا' یہ وار بھی میرے کندھے پر تھا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کے ساتھ ہی اپنی پنڈلی سے رام پوری خنجر کھینچ لیا۔ شاید میں خنجر نہ کھینچتا مگر میں نے دیکھ لیا تھا کہ دائیں جانب گارڈینا کی اونچی باڑ کے پیچھے سے ایک اور شخص برآمد ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر بھی ڈھاٹا اور ہاتھ میں کوئی چاقو نما شے تھی۔ جونہی دوسرا حملہ آور میری طرف بڑھا میں نے ٹانگ چلائی اور اسے پھر سے گارڈینا کی باڑ کے پیچھے اچھال دیا۔ پہلا حملہ آور ایک بار پھر اپنا چاقو تول کر میری طرف بڑھا۔ اس کا چاقو پکڑنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ نوجوان ہونے کے باوجود وہ چاقو زنی کے فن سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے قدموں کی حرکت میں بڑی ترتیب تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے' کندھے ذرا آگے جھکے ہوئے تھے۔ وزن دونوں ٹانگوں پر بالکل متوازی تھا۔ ایک لمحے میں وہ کسی بھی سمت میں حرکت کر سکتا تھا۔ مجھے چند ہفتے پہلے کا وہ سین یاد آگیا' جب سردار شاری کی صحرائی بستی میں میرے اور شنکر کے درمیان خوف ناک لڑائی (مبارزت) ہوئی تھی۔ بالکل اسی انداز میں ہم آمنے سامنے ہوئے تھے لیکن شنکر۔۔۔ شنکر ہی تھا۔ اس وقت جو نوجوان میرے روبرو کھڑا تھا وہ ماہر چاقو زن ہونے کے باوجود شنکر کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ وہ جوش اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا' ایسے مدمقابل کو زیر کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بھوپالی چاقو زن کون ہے؟ اس کے ارادے کیا ہیں؟ لیکن اسے دیکھ کر میرے دل میں ترنگ سی جاگ اٹھی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل اس کے ساتھ کھیلنے کو چاہا۔ شاید میرے اندر کے استاد جہانی کو تھوڑی سی "خطرناک تفریح" درکار تھی۔ میں نے مدمقابل کو خود پر وار کرنے کا موقع دیا۔ اس نے دو تین وار کیے جو میں نے بڑی سرعت سے بچائے۔ ہنگامے کی آوازیں سن کر آس پاس ہلچل مچ گئی تھی۔ پہلے ملازمین دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے پھر چند اہل خانہ بھی نظر آنے لگے۔ ان میں چندر پرکاش اور گوپی ناتھ بھی تھے۔ گوپی ناتھ کے اشارے پر اس کے دو مسلح گارڈز نے رائفلیں نکال لیں اور دونوں حملہ آوروں کو چھاپ لیا۔۔۔ یوں میری تفریح کو فل اسٹاپ لگ گیا۔ دونوں حملہ آوروں سے چاقو چھین کر گارڈز نے ان کی زبردست پٹائی کی۔ ان کے ڈھاٹے کھل گئے اور چہرے لہولہان ہو گئے۔ اسی دوران میں لائٹ بھی آگئی' جس نوجوان نے میرے کندھے پر چاقو کا چھوٹا سا زخم لگایا تھا وہ اب بھی خونی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اسے پہچان کر گوپی ناتھ کا ایک ملازم پکارا "ارے یہ تو شیدے کا چیلا صلو ہے۔"

شیدے کے نام سے مجھے فوراً بھوپال کا وہ استاد چاقو زن یاد آگیا۔ جسے چند روز پہلے گوپی ناتھ نے خواہ مخواہ میرے مدمقابل لا کھڑا کیا تھا۔ شیدا مجھے ایک تھرڈ کلاس غنڈا نظر آیا تھا' ایسے لوگ کینہ پروری میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس دن کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے یہ حملہ کیا گیا ہو۔ "محترم" صلو صاحب اپنے استاد گرامی شیدا صاحب کے ہونہار شاگرد تھے۔ ان کے دماغ میں اپنے استاد کی ہزیمت کا بدلہ لینے کا کیڑا حرکت کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن پھر جب میں نے صلو کی طرف دیکھا تو ایک ایسی شے نظر آئی جس نے مجھے چکرا دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ میری توقع سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

صلو کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت اور کدورت کا ایک سمندر موجزن نظر آ رہا تھا۔ گوپی ناتھ کے گارڈز اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل نکل کر جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ گوپی ناتھ پر جھپٹنا چاہ رہا ہے پھر اپنے اندر کا غیظ و غضب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا اور اس کے حلق سے گالیاں ابل پڑیں۔

وہ چیخ رہا تھا "مردود بڈھے! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔ حرام زادے! تو بہو بیٹیوں کی عزت برباد کرتا ہے۔ سارے بھوپال کے لوگوں کے سامنے تیری لاش نہ گھسیٹی تو میرا نام صلو نہیں۔"

گوپی ناتھ کے گارڈز نے صلو کے منہ پر زوردار تھپڑ مارے اور پھر اس کی زبان بند کرنے کے لیے اس کا منہ دونوں ہاتھوں سے بھینچ دیا۔ صلو بدستور خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ گوپی ناتھ کے گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے احاطے کی طرف لے گئے۔ صلو کے ساتھی کو بھی اسی طرح مارپیٹ کر وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ یہ بات مجھے واضح طور پر محسوس ہوئی تھی کہ کوٹھی میں گھسنے والے یہ دونوں افراد منصوبہ بندی کے تحت یہاں پہنچے تھے اور ان کا مقصد گوپی ناتھ تک پہنچنا تھا۔ غالباً وہ گوپی ناتھ کے کمرے میں کھڑکی کے راستے داخل ہونے کے لیے باغیچے کی طرف آئے تھے۔ وہ گاردینا کی باڑ کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ میں ٹہلتا ہوا بے خبری میں باڑ کی طرف گیا تو وہ نکل کر مجھ پر جھپٹ پڑے۔

دیگر اہل خانہ کی طرح گوپی ناتھ کے چہرے پر بھی قدرے ہراس نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہر دم ہشاش بشاش چندر پرکاش بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اہل خانہ کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے پھر عمارت کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔ پانچ دس منٹ بعد میں نے گوپی کے بھتیجے چندر پرکاش کو کامن روم سے نکلتے دیکھا تو اس کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ کیا معاملہ ہے چندر پرکاش؟" میں نے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے چندر میرے کندھے کا زخم دیکھنے لگا۔ معمولی زخم تھا۔ میں نے صفدر سے پٹی کروالی تھی "تم ٹھیک تو ہو نا۔" اس نے فکرمندی کے لہجے میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "جیسا سنا تھا تمہیں ویسا ہی پایا ہے۔ بھئی بڑی دلیری سے لڑے ہو تم۔ بالکل کسی فلم کا سین لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار چاقوؤں کی جیتی جاگتی فائٹ دیکھی ہے میں نے۔"

"تم چند سیکنڈ کی مختصر سی جھڑپ کو فائٹ کہہ رہے ہو، یہ تو ایسا ہی ہے کہ گلی محلے میں ہونے والی لڑائی کو پانی پت کی جنگ کہا جائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے اپنا سوال پھر دہرانا پڑ رہا ہے۔ یہ کیا چکر تھا سارا؟"

چندر پرکاش نے گہری سانس لی "دراصل تاؤ اپنے لیے خود مصیبتیں کھڑی کرتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں شوبھا والی خبر مل ہی گئی ہوگی۔ وہ آج صبح سے غائب ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی ماتا یہاں آئی ہے اور مسلسل رو پیٹ رہی ہے۔ شوبھا جہاں رہتی ہے وہاں پورے محلے میں یہ خبر پھیل گئی ہے۔ اکثر لوگ تاؤ کی رنگین مزاجی سے واقف ہیں۔ ان میں شوبھا کے محلے کے لوگ بھی شامل ہیں۔ انہیں شک گزرا ہے کہ شوبھا کے غائب ہونے میں تاؤ جی کا ہاتھ ہے۔ ابھی جو دو لڑکے پکڑے گئے ہیں۔ وہ شوبھا کے محلے دار ہی ہیں۔ ان میں سے ایک شوبھا کا پڑوسی ہے اور دوسرا تھوڑی دور رہتا ہے۔ یہ لوگ تاؤ جی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوٹھی کی باؤنڈری پھلانگ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ بھگوان کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے کہ باغیچے میں ان کی مڈھ بھیڑ تم سے ہو گئی اور وہ سیدھے تاؤ جی تک نہیں پہنچ سکے۔"

"یہ تو کافی سنگین معاملہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔" چندر نے تائید میں سر ہلایا "ایک طرف تو ہم شوبھا کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان ہیں، دوسری طرف یہ پریشانی لگ گئی ہے کہ لوگ تاؤ جی پر شک کر رہے ہیں۔ ابھی صلو نام کے جس لڑکے کو پکڑا گیا ہے وہ چیخ چیخ کر یہ کہہ رہا ہے کہ شوبھا کو تاؤ جی نے غائب کروایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تاؤ اس سے غلط کام کروانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں مانی تو اسے غائب کروا دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ تین دن پہلے شوبھا پر غنڈوں کا حملہ بھی تاؤ نے ہی کروایا تھا۔"

میں چندر کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان اپنی عمر کی وجہ سے نہیں اپنے کاموں کے سبب قابل احترام ٹھہرتا ہے۔ تعجب کی بات تھی کہ ایک پچھتر اسی سال کے بوڑھے پر ایک جواں سال لڑکی کی گمشدگی کا الزام لگ رہا تھا۔

میں نے چندر سے پوچھا "اب شوبھا کی گمشدگی کا کیا ہوگا۔ کیا پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے گی؟"

"ہاں رپورٹیں تو دو تین درج ہوں گی۔ ایک رپورٹ شوبھا کے محلے دار تاؤ جی کے اور میرے خلاف کروائیں گے۔ ایک رپورٹ ہم نے شوبھا کے حوالے سے نامعلوم مجرموں

کے خلاف کروائی ہے۔ اب ایک اور رپورٹ دونوں چاقو بردار حملہ آوروں کے خلاف درج ہوگی۔ تاؤ کے دوست سابق آئی جی شیو دت ایسے معاملوں میں بڑے تیز رفتار ہیں۔"

"دونوں لڑکے اب کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو انہیں کوٹھی ہی کے ایک کمرے میں بند کیا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"ان میں سے ایک کو تم لوگ شیدے چاقو زن کا شاگرد بتا رہے ہو لیکن شیدا تو تمہارے تاؤ کا بڑا عقیدت مند ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری بات درست ہے۔ تاؤ نے شیدے کو طلب کیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا اور بتائے گا کہ صلو نے کوٹھی میں داخل ہونے کی جرأت کیوں کی ہے۔"

اسی دوران میں کامن روم کے اندر سے گوپی ناتھ کے گرجنے برسنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کسی پر بری طرح بگڑ رہا تھا پھر میں نے دیکھا کہ شوبھا کی ماں دھکا کھا کر کامن روم کے دروازے سے باہر گری۔ اسے دھکا دینے والا یقیناً گوپی ناتھ ہی تھا۔ وہ بالکل آگ بگولا ہو رہا تھا۔ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور منہ سے غصے کے سبب جھاگ اڑ رہا تھا۔ وہ عورت کو ایک غلیظ گالی دینے کے بعد دہاڑا "اگر تو سمجھتی ہے کہ اسے میں نے چھپایا ہے تو پھر میں نے ہی چھپایا ہے۔ تو نے جو کرنا ہے کر لے۔ کھلی چھٹی ہے تجھے۔"

عورت تڑپ کر اٹھی اور گوپی ناتھ کے پاؤں میں گر پڑی "بھگوان کے لیے ایسا مت کہیں صاحب جی۔ مجھ کرماں ماری کی زبان سڑ جائے جو میں نے ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہو۔ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ۔۔۔"

"بند کر بکواس اور دفع ہو جا یہاں سے۔" گوپی ناتھ نے پھر اسے ٹھوکر رسید کی۔

ٹھوکر لگنے سے وہ چاروں شانے چت لیٹ گئی لیکن پھر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے گوپی ناتھ کے پاؤں پکڑ لیے "صاحب جی! آپ ہمارے مائی باپ ہیں، اگر آپ ایسے ہم سے منہ موڑیں گے تو ہم کس طرف جائیں گے۔ بھگوان کے لیے مجھے چھما کریں۔ مجھے بڑا پیار ہے شوبھا سے۔ میں پاگل ہو گئی ہوں اس کے لیے۔"

شوبھا کا نام جب بھی آتا تھا گوپی ناتھ کی آتش مزاجی پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ جاتے تھے۔ اس نے عورت کو اپنے قدموں سے ہٹایا اور گارڈز کو ہدایت کی کہ وہ اسے دوسرے کمرے میں لے جائے۔

جس وقت گارڈز روتی سسکتی عورت کو کمرے سے باہر لے جا رہے تھے، ایک جانی پہچانی صورت اندر داخل ہوئی۔ یہ بھوپال کا مشہور چاقو زن رشید عرف شیدا تھا۔ حسب سابق اس نے چست پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پھول دار انگرکھا تھا جس کے گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ سر پر ترچھی ٹوپی تھی۔ مقامی رواج کے مطابق اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ گوپی ناتھ کے سامنے پہنچ کر اس نے ادب سے سلام کیا۔ گوپی ناتھ بغیر کسی تمہید کے سخت لہجے میں بولا "کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ نرس کو میں نے اڑا لیا ہے؟"

"کک۔۔۔ کون بدبخت کہہ رہا ہے جی ایسا؟"

"تمہارے محلے کے سب لوگاں کہہ رہے ہیں اور تو اور، تمہارا شاگرد صلو بھی کہہ رہا ہے اور صرف کہنے کی بات نہیں، وہ مرغی کا بچہ تو چاقو لے کر میرے گھر میں گھس آیا ہے۔ یہ دیکھو۔ یہ دیکھو میرے مہمان کو گھائل کیا ہے اس نے۔"

گوپی ناتھ نے میرے کندھے کا زخم شیدے کو دکھایا۔

شیدے کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ ہکلا کر بولا "اگر۔۔۔ اگر صلو نے ایسا کیا ہے۔۔۔ تو بہت برا کیا ہے جی۔۔۔ آپ یقین رکھیں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ اور جہاں تک نرس کی بات ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا جی کہ آپ کے خلاف کوئی بات کروں۔ دوسروں کے لیے ہم بدمعاش ہوں گے لیکن آپ کے تو ادنیٰ خادم ہیں جی۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔"

چندر پرکاش بولا "شیدے! صلو تمہارا شاگرد ہے، اور میں جانتا ہوں کہ فرماں بردار شاگرد ہے۔ تمہاری مرضی اور ایما کے بغیر وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے۔"

شیدا بولا "اس حرامی کو میرے سامنے لائیں جی، ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

گوپی ناتھ کے اشارے پر دو گارڈز صلو کو لینے کسی اندرونی کمرے میں چلے گئے۔ چندر پرکاش، چاقو زن شیدے کو واقعے کی تفصیل بتانے لگا، اس نے زور دے کر کہا کہ صلو تاؤ جی پر حملہ کرنے کے لیے کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں صلو حاضر ہو گیا۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی، چہرے پر مارپیٹ کے نشانات تھے۔ گوپی ناتھ کے گارڈز نے اس کے دونوں ہاتھ رسی کی مدد سے پشت پر باندھ دیے تھے۔ اتنی مار کھانے کے باوجود اس کا چہرہ اب بھی تپا ہوا نظر آتا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسے دیکھتے ہی ایک دم رشید عرف شیدا کا پارا چڑھ گیا۔ وہ گارڈز کی پروا کیے بغیر صلو پر پل

پڑا۔ پہلے وہ اسے گھونسے اور تھپڑ لگاتا رہا پھر ٹھوکریں رسید کرنے لگا' ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا۔

"بتا حرام زادے! میں نے بھیجا تھا یہاں تجھے؟ بتا' کس نے بھیجا تھا تجھے۔ بتا کس نے بھیجا تھا؟"

صلو مار کھاتے کھاتے بولا "میں خود آیا تھا۔ میری ٹانگیں ٹوٹی ہوئی نہیں ہیں کہ میں خود چل کر نہ آسکتا۔"

"تیری ٹانگیں ٹوٹ جاتیں تو اچھا تھا' کیوں آیا تھا یہاں؟ کیوں ایسی بچی حرکت کی تو نے؟"

گوپی ناتھ کے گارڈز نے شیدے کو بمشکل صلو سے علیحدہ کیا۔ شیدا کچھ دیر تک صلو کو اور اس کے ساتھی کو صلواتیں سناتا رہا' پھر گوپی ناتھ سے معذرت کرنے لگا کہ اس کے بے عقل شاگردوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے۔ آخر میں اس نے کہا۔

"صاحب جی! آپ فکر مت کریں۔ بھوپال کا کونا کونا اپنی نظر میں ہے۔ کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں کہ شوبھا بی بی کو اپنے پاس رکھ سکے۔ یہ آپ ہی کا نہیں ہم سب کی عزت کا معاملہ ہے۔ جب تک شوبھا بی بی کا پتا نہیں چلتا' میں اور میرے بندے چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

اس سے پہلے کہ گوپی ناتھ جواب میں کچھ کہتا' شیدا برآمدے میں رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور دھیمی آواز میں بولنے لگا۔ ایک غنڈے کی حیثیت سے یقیناً اسے شہر بھر کے غنڈوں کے اڈے ٹھکانے معلوم تھے۔ یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ کون سا غنڈا کس قسم کی وارداتیں کرتا ہے اور کون سے گروہ کن جرائم میں ملوث ہیں۔ اب وہ ذرائع یہاں بیٹھا کراچی کی چٹکیوں کو حرکت میں لا رہا تھا تاکہ گوپی ناتھ کی گمشدہ منظور نظر کا سراغ لگایا جاسکے۔

فون کرنے کے بعد شیدا خود بھی فوراً اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔ اس کا بنا کنا چھیل گن مین رنجیت راجا بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان کے جانے کے بعد گوپی ناتھ کا یار غار رینائرڈ آئی جی شیووت آدھمکا۔ وہ دونوں ایک کمرے میں گھس گئے اور پندرہ بیس منٹ معروف گفتگو رہے۔ شوبھا کی گمشدگی کے بعد "گوپی ناتھ مینشن" میں ہلچل سی مچ گئی تھی' ملازم خاص طور سے ہراساں نظر آرہے تھے۔ شاید انہیں خوف تھا کہ تفتیش میں پولیس انہیں بھی گھسیٹے گی۔ کچھ دیر بعد شیووت چلا گیا۔

شیدا قریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ اپنی کرولا گاڑی سے از کر وہ سیدھا گوپی ناتھ کے پاس پہنچا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ کوئی خاص خبر لایا ہے۔ دونوں برآمدے کے ایک گوشے میں چلے گئے اور دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر گوپی ناتھ میرے پاس آیا اور بولا "یہاں بازارِ حسن میں ایک سکھ عورت مالنی کور ہے۔ اسے عام طور پر مالاں کہا جاتا ہے۔ مالاں بڑی خطرناک چیز ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ دھندا کراتی ہے۔ نہ صرف دھندا کراتی ہے بلکہ اس پر لڑکیوں کے اغوا کے کیس بھی بنتے رہے ہیں۔ ایسی عورتوں کی پہنچ عام طور سے بہت اوپر تک ہوتی ہے' مالاں کے بھی خاصے لمبے چوڑے تعلقات ہیں۔ ان تعلقات کے سبب وہ اکثر بچ جاتی ہے۔ شیدا ایک اہم خبر لے کر آیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ پچھلے ۴۸ گھنٹے میں مالاں کو کسی اچھے تگڑے گاہک کی تلاش تھی۔ آج شام سات بجے کپور ہوٹل میں کپور ہوٹل کے مالک اجیت کپور سے مالاں کی ملاقات ہوئی۔ نئی لڑکی کے لیے پچاس ہزار روپے میں ان کا سودا طے ہوا۔ دس ہزار روپیہ شراب اور کھانے پینے کے خرچ کے طور پر اجیت کپور نے دینا تھا۔ لیکن ابھی دو گھنٹے پہلے جب اجیت رات گزارنے کے لیے مالاں کی کوٹھی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا' مالاں کا فون آگیا' اس نے بڑی معذرت کے ساتھ سودا کینسل کردیا اور وجہ یہ بتائی کہ پولیس کے چھاپے کا شدید خطرہ ہے۔ اب شیدا یہ شبہ ظاہر کر رہا ہے کہ ہو نہ ہو یہ اغوا شدہ لڑکی ہماری شوبھا ہے۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے گوپی ناتھ کی سانس پھول گئی اور آواز کانپنے لگی۔

"کیا شیدے کو اس سلسلے میں کوئی خاص کلیو ملا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کلیو بس یہی ہے کہ وہ لڑکی پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں اغوا ہو کر مالاں کے پاس پہنچی ہے اور ہندو ہے۔ بہرحال اگر یہ کلیو معمولی بھی ہے تو ہمیں نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ چند دن پہلے بھی شوبھا کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ مقامی غنڈے ہی تھے' مالاں نے بھی ایسے بہت سے غنڈے پال رکھے ہیں۔"

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے۔ کیا پولیس کے ذریعے مالاں کے اڈے پر۔"

"نہیں نہیں۔" گوپی نے میری بات کاٹی "ایسے چھاپے سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔ شیدا خود بات کرنے مالاں کی طرف جا رہا ہے۔ وہ مجھ سے صرف آگیا (اجازت) لینے آیا تھا۔"

"کیا آپ بھی ساتھ جا رہے ہیں؟"

"سوچ تو رہا ہوں کہ چلا جاؤں۔"

"کسی کو ضرور جانا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ شیدا کس قماش کا آدمی ہے اور آپ سے وہ کتنا وفادار ہے لیکن ایسے لوگوں پر کلی بھروسا کرنا اکثر غلط ثابت ہوتا ہے۔"

ایک دم گوپی ناتھ کی آنکھوں میں چمک آئی۔ وہ بولا "کیوں نہ تم چلے جاؤ اس کے ساتھ۔ میں جانتا ہوں ایسے معاملے ہینڈل کرنے کا تمہارا بہت تجربہ ہے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن۔"

"لیکن کچھ نہیں۔" گوپی بے قرار لہجے میں بولا "بس تم تیار ہو جاؤ۔ مجھے تم پر پورا وشواس ہے اور بہت مان بھی ہے۔"

میں نے پہلو بچانے کی کوشش کی لیکن گوپی ناتھ نے میری ایک نہیں چلنے دی۔ اسی دوران میں چمپئی کنور بھی وہاں آگیا۔ اس نے بھی گوپی ناتھ کی تائید کی۔ بابا نے یہ مشورہ ضرور دیا کہ میں شہر میں نکلنے سے پہلے اپنا حلیہ تھوڑا سا تبدیل کرلوں۔ ریڈی میڈ میک اپ کا سامان مونچھیں' اسپرنگ' ہیئر کلر وغیرہ سروج کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔ چمپئی کنور نے اسی سامان سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں رشید عرف شیدے کے ہمراہ کرولا کار میں سوار شہر کے وسطی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ گن مین راجا بیٹھا تھا' میں اور شیدا عقبی نشست پر تھے۔ ناک میں اسپرنگ پھنسا کر اور گالوں میں خصوصی پیڈ رکھ کر میں نے اپنے چہرے میں خاصی تبدیلی کرلی تھی۔ اوپر کو اٹھی ہوئی نہایت گھنی مونچھوں اور ٹوپی نے بھی تبدیلی کے تاثر کو گہرا کیا تھا۔ رہی سہی کسر لکھنوی طرز کے پاجامے اور انگرکھے نے پوری کردی تھی۔

رات کے دس بج چکے تھے' تاہم بھوپال کی سڑکیں بدستور بارونق تھیں۔ لوگوں کے ہجوم میں آنچل لہرا رہے تھے اور قہقہے بکھر رہے تھے۔ اسی ہجوم میں کہیں وہ معصوم صورت شوبھا بھی وجود تھی جو آج صبح گوپی ناتھ مینشن سے ٹیکسی پر سوار ہو کر اپنے بیمار بھائی کو دیکھنے روانہ ہوئی تھی۔ اسے ایک سازش کے تحت بھائی کی بیماری کی اچانک اطلاع دی گئی تھی۔ غالباً وہ ٹیکسی بھی اس سازش کا ایک حصہ تھی جو مین گیٹ سے باہر نکلتے ہی شوبھا کو مل گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ ٹیکسی میں ڈرائیور کے علاوہ کوئی اور فرد بھی موجود ہو جس نے خود کو کسی طور سیٹوں کے درمیان چھپا رکھا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ راستے میں آناً فاناً کوئی مسلح غنڈا ٹیکسی میں گھس بیٹھا ہو اور اس نے شوبھا کو بے بس کردیا ہو۔ کئی امکانات ہوسکتے تھے۔ راستے میں شیدا اور میں انہی امکانات پر بات کرتے رہے۔ شیدے کی باتوں سے تجربہ جھلکتا تھا' مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک بیدار مغز غنڈے کی حیثیت سے وہ بھوپال کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ وہ پورے شہر کو اپنی جیب میں لیے پھرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر مالاں سے اس کی ملاقات ہوگئی تو کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ اغوا شدہ لڑکی کے بارے میں انہیں مکمل معلومات حاصل ہو جائیں گی اور اگر وہ لڑکی شوبھا ہی تھی تو پھر اسے مالاں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے بھی شیدا موثر کردار ادا کرسکتا تھا۔

ان باتوں سے قطع نظر میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ شوبھا کو کسی کسبی عورت نے صرف اس لیے اغوا کرایا ہے کہ وہ اس کے جسم کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہے یا اس سے دھندا کرانا چاہتی ہے۔ بھوپال میں ایک سے ایک حسین اور جوان لڑکی موجود تھی پھر درمیانی شکل و صورت والی شوبھا ہی کیوں؟ مجھے یقین تھا کہ شوبھا اگر اغوا ہوئی تھی تو صرف اور صرف گوپی ناتھ اور دفینے کے حوالے سے ہوئی تھی۔

قریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک نیم رہائشی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں دکانیں بھی تھیں اور فیشن ایبل قسم کے مکانات بھی۔ کرولا گاڑی ایک شان دار دو منزلہ عمارت کے سامنے رکی۔ ڈرائیور گاڑی میں ہی رہا۔ میں اور شیدا گن مین راجا کے ساتھ مین گیٹ میں داخل ہوگئے۔ یہاں احاطے میں پانچ چھ کاریں موجود تھیں۔ پہلے مسلح چوکیدار نے ہمیں گھورا پھر ایک سفید پوش شخص آگے بڑھا۔ اس نے شیدے کو پہچان کر سلام کیا۔ اس کے بعد بڑی احتیاط سے ہماری جامہ تلاشی لی۔ شیدے نے جامہ تلاشی سے پہلے ہی اپنا ریوالور نکال کر سفید پوش کے حوالے کردیا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں' اور جو تھا وہ تلاشی لینے والے کے ہاتھ تو نہیں لگ سکتا تھا' وہ میرا رام پوری خنجر تھا۔ یہ خاص تکنیک کے ساتھ میری پنڈلی سے چپکا رہتا تھا۔ اس کا دستہ موٹائی میں صرف ایک بٹا آٹھ انچ تھا۔ یعنی انچ کا قریباً آٹھواں حصہ۔ اس دستے میں پھل کے قریب ایک چھوٹا سا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ جب میں اس کھٹکے کو دباتا تھا' دستے کے اندر موجود اسپرنگ اسے پھیلا دیتے تھے اور دستے کی موٹائی بڑھ کر قریباً ایک انچ ہو جاتی تھی۔ پنڈلی کے ساتھ باندھتے وقت دستے کی موٹائی چونکہ صرف انچ کا ساتواں آٹھواں حصہ ہوتی تھی لہٰذا وہ پنڈلی کا حصہ ہی بن جاتا تھا۔

گن مین باہر ہی رہ گیا تھا' میں اور شیدا اندر داخل ہوئے۔ ہم ایک ہال نما کمرے میں پہنچے۔ فرش پر قیمتی قالین تھے۔ دیواروں کے ساتھ صوفے اور گاؤ تکیے وغیرہ رکھے تھے۔ اگر بتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور چوڑی پاجامے والا ایک کمسن لڑکا بڑے ادب سے مہمانوں کو پان سگریٹ وغیرہ پیش کر رہا تھا۔ سازندے ساز بجا رہے تھے اور ایک لڑکی جس نے باریک ساری پہن رکھی تھی' دھیرے دھیرے ناچ رہی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے مالاں کو پہچان لیا۔ وہ ایک چوڑی چکلی عورت تھی۔ عمر چالیس سے زیادہ نظر آتی تھی۔ رنگ کسی وقت گندمی رہا ہوگا لیکن اب سیاہی مائل ہو چکا تھا جو یقیناً کثرت سگریٹ نوشی کا نتیجہ تھا۔ وہ شکل سے ہی کرخت اور بدلحاظ قسم کی عورت نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے بری چیز اس کے دانت تھے۔ پان کے رنگ میں رنگے ہوئے یہ ٹیڑھے میڑھے دانت جنتے ہوئے اور بھی کراہت آمیز ہو جاتے تھے۔

ہم اندر داخل ہوئے تو سازندوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ رقاصہ بھی پسینہ پونچھتی ہوئی ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ مالاں نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ مردانہ لب و لہجے میں بات کر رہی تھی اور شیدے کو بار بار "اوئے" کہہ کر پکار رہی تھی۔ شیدے نے میرا تعارف سلیم اختر کے نام سے کروایا اور بتایا کہ میں حیدر آباد کا ایک شوقین مزاج صنعت کار ہوں۔ کام کے سلسلے میں بھوپال آیا ہوا ہوں اور شیدا مجھے دل پشاوری کے لیے یہاں لے آیا ہے۔ مالاں مسکرا کر بولی۔

"یار شیدے' تیرا مہمان ہے تو پھر ہمارا بھی مہمان ہے۔ حکم کر کیا خدمت شدمت کی جائے۔"

شیدے نے مالاں کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ ہمیں لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گئی۔ شیدا ٹھیٹ بازاری انداز میں بولا "کوئی تگڑا مال بھی ہے کہ نہیں!"

مالاں بولی "شیدے! تو بڑا مردود ہے۔ کیا تجھے کبھی ایسا مال دیا ہے جو تگڑا نہ ہو؟"

"تو پھر نکال کوئی دانہ۔"

وہ ذرا توقف سے بولی "یار! آج بڑی مجبوری ہے۔ تجھے پتا ہے میں خاص بندوں کو انکار نہیں کرتی لیکن آج بات کچھ ایسی ہے۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں کوئی نیا حرام زادہ آیا ہے۔ آج بڑے سخت چھاپے کی خبر اڑی ہوئی ہے۔"

شیدا مونچھیں مروڑ کر بولا "دیکھ لے مالاں! پھر ہم سے بھی بول چین لگانی ہے نا' کم از کم مجھے تو چھاپے شاپے کا ڈراوا نہ دے۔ مجھے پتا ہے' تیرے پاس تین تین کوٹھیاں ہیں اور ایک کوٹھی تو ایسی ہے جہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

"کون سی؟"

"گلارنس روڈ والی۔"

"تو واقعی بڑا کمینہ ہے شیدے۔" وہ شیدے کے سینے پر دوہتڑ مار کر بولی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر کہنے لگی "چل ٹھیک ہے۔ تو کڑی پسند کر لے۔ میں اسے شام تک بھجوا دیتی ہوں۔"

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ مالاں فون سننے لگی۔ وہ حسب سے کچھ زیادہ ہی موٹی اور چوڑی چکلی نظر آتی تھی۔ "ہیلو۔ کون ہے۔ او یار اونچا بول۔" وہ جھنجلا کر بولی "اچھا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔ بس نخرے کر رہی ہوگی۔ ویسے بھی گرمی ہے ذرا "اے سی" لگا دو مگر ہوشیار رہنا ہے کوئی چالاکی نہ دکھائے۔"

کچھ دیر فون پر باتیں کرنے کے بعد اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ہمیں ساتھ لے کر ایک کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ اس نے کھڑکی کے سامنے سے پردہ کھینچا۔ ایک جگمگاتے کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہاں سات آٹھ خوب رو لڑکیاں موجود تھیں۔ کوئی ساری پہنے ہوئے تھی' کوئی جینز' کسی نے چوڑی پاجامہ اور کرتا زیب تن کر رکھا تھا۔ ہم انہیں دیکھ سکتے تھے لیکن وہ نیم تاریکی کی وجہ سے ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ سب مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ کوئی کپڑے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ دو لڑکیاں قالین پر اوندھی لیٹی لڈو کھیل رہی تھیں۔ بے شک وہ ایک سے بڑھ کر ایک تھیں لیکن انہیں دیکھ کر شیدے نے فوراً ناک بھوں چڑھائی۔

"مالاں! کچھ واہ گرو کا خوف کر۔ اسے جان دیتا ہے یا نہیں۔ یہ سڑا ہوا مال ہمارے لیے ہی رہ گیا ہے۔ خدا کی بندی' میں نے تجھ سے تگڑا مال مانگا ہے تو پیسے بھی تگڑے ہی دوں گا۔ کوئی نیا نکور دانہ ہے تو دکھا جیسیں ورنہ ایسی گری پڑی تو ابھی ایک ہزار اکٹھی کر دوں گا۔"

مالاں تنک کر بولی "شیدے! تجھے پتا ہے کہ میں پیسے کی پروا نہیں کرتی۔ جو چیز ہے وہ تجھے دکھا دی ہے۔"

"مالاں! تو ڈنڈی مار رہی ہے آج۔ مجھے تو کچھ اور طرح کی خبر ملی تھی۔"

"مثلاً کیا؟"

"کوئی نئی نکور لڑکی کھینچ کی ہے تو نے۔"

مالاں کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن ایسا صرف

ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر ایک بااعتماد عورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے جھوٹی خبر اڑانے والے کو ایک زوردار گالی دی اور اس کی خواتین خانہ کے ساتھ بہت سے نامعقول مردوں کے رشتے جوڑ دیے۔

شیدا اطمینان سے سنتا رہا۔ آخر میں بولا "بہرحال مالاں جی! تھوڑی بہت آگ ہو تو دھواں نکلتا ہے نا۔"

مالاں صاف مکر گئی تھی کہ پچھلے ایک دو روز میں اس کے پاس کوئی نئی لڑکی آئی ہے۔ ہمیں مایوس دیکھ کر اس نے بالائی منزل پر ہمیں دو اور لڑکیاں دکھائیں۔ یہ لڑکیاں ماڈلنگ کے شعبے سے نئی نئی اس دھندے میں آئی تھیں اور واقعی خاصے کی چیز تھیں۔ مالاں نے انہیں "وی وی آئی پی" کے لیے رکھا ہوا تھا۔ بہرحال ان لڑکیوں کو دیکھ کر بھی ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر مالاں کے پاس بیٹھنے اور اس کی خبیث بازاری باتیں سننے کے بعد ہم وہاں سے واپس آ گئے۔

گوپی ناتھ بڑی بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ رشید عرف شیدے نے گوپی ناتھ کو مکمل رپورٹ دی۔ شیدے کی طرح میرا خیال بھی یہی تھا کہ مالاں اغوا شدہ لڑکی کے بارے میں چھپا رہی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اغوا شدہ لڑکی شوبھا ہی ہو گی لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ اس کے پاس ایک اغوا شدہ لڑکی موجود ہے۔ اطلاعات کے مطابق اسے پچھلے ۴۸ گھنٹے کے اندر اغوا کیا گیا تھا اور وہ لڑکی ہندو تھی۔

گوپی ناتھ ایک دم آگ بگولا نظر آنے لگا تھا۔ مالاں اگر کوئی معمولی پیشہ ور عورت ہوتی تو گوپی ناتھ ابھی اسے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کراتا اور پولیس کو پیسہ لگایا جائے تو وہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن مالاں کے ہاتھ بھی گوپی ناتھ ہی کی طرح لمبے تھے۔ اس کے علاوہ مالاں ایک نہایت خطرناک عورت بھی تھی۔ عین ممکن تھا کہ مالاں پر چڑھائی کی جاتی تو وہ کھلم کھلا دشمنی پر اتر آتی اور شوبھا کو مار کاٹ کر غائب کروا جاتا۔ بوڑھا گوپی ناتھ صاف طور پر اعصاب زدگی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس کا ناتواں جسم اس کے طاقتور غصے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھا اور مسلسل ہانپ رہا تھا۔

گوپی ناتھ کچھ دیر گہری سوچ میں کھویا رہا پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کمرے میں لے گیا۔ کچھ دیر تک وہ شدت سے کھانستا رہا پھر اس نے اِن ہیلر لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "کبھی کبھی بھگوان بھی عجیب کھیل دکھاتا ہے۔ میں تم سے ملاقات کا شوقین تھا اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے ان ہنگاموں کے واقعات سنوں جو آج سے دس بارہ سال پہلے تمہارے اور شنکر کے درمیان بمبئی میں ہوئے تھے لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ ویسا ہی ایک ہنگامہ یہاں بھی شروع ہو گیا ہے۔ وشواس کرو کہ ترس شوبھا کی گمشدگی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں یقیناً تمہیں پریشان نظر آ رہا ہوں گا لیکن پتا نہیں کیا بات ہے کہ تمہاری موجودگی نے میری پریشانی کو نصف سے بھی کم کر دیا ہے۔ ایک عجیب طرح کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے میری۔ اور یہی بات ہے کہ مجھے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ڈھارس کیوں بندھی ہوئی ہے۔"

"میرے لیے خوشی کا مقام ہے کہ آپ میرے بارے میں ایسا سوچ رہے ہیں۔"

وہ کچھ دیر ڈرامائی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر حسب عادت بلا کسی تمہید کے اچانک بولا "کیا شوبھا کی تلاش میں تم میری مدد کرو گے؟"

میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

"تھینکس۔ ویری تھینکس۔" گوپی جوش سے بولا پھر وہ اسٹک کے سہارے تین چار قدموں میں جسم کو جھکولے دے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ اپنے بھتیجے چندر پرکاش کو ایک شاندار گالی دینے کے بعد اور اسے اپنی "گڈ بک" سے خارج کرنے کے بعد بولا "یوں تو چار پانچ خطرناک قسم کے بندے موجود ہیں میرے پاس لیکن میرے نزدیک ان کی حیثیت جسم فروشوں سے زیادہ نہیں۔ کرایہ دے کر ان سے کوئی بھی مشکل کام کروایا جا سکتا ہے لیکن آنکھیں بند کر کے ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور شوبھا کا معاملہ ایسا ہے کہ میں اس میں کسی طرح کا رسک لینے کو تیار نہیں۔ یہ شیدا کسی حد تک وشواس کے قابل ہے لیکن مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ اس میں صلاحیت کتنی ہے۔ اگر تم اس کے ساتھ مل کر کوشش کرو تو میرا من کہتا ہے کہ ایک [illegible] تم لوگ شوبھا کو ڈھونڈ نکالو گے۔"

میں نے کہا "مجھے آپ کے [illegible] خوشی [illegible] لیکن۔۔۔"

"پھر وہی لیکن۔" گوپی ناتھ نے میری بات کاٹی "مجھے لفظ لیکن اچھا نہیں لگتا شاید اس لیے بھی کہ وہ خبیث چندر یہ لفظ بہت استعمال کرتا ہے۔"

چندر پرکاش نے گوپی ناتھ کا سارا کاروبار سنبھالا ہوا تھا اور ہر معاملے میں وہی کرتا دھرتا تھا۔ اس کے بارے میں گوپی

ناتھ اس کے لیے خبیث، حرامی اور راسکل وغیرہ کے القاب کثرت سے استعمال کرتا تھا۔ تایا بھتیجے میں یہ قربت اور بیگانگی کا رشتہ عجیب و غریب تھا۔ شاید اس میں کسی حد تک جنریشن گیپ کو بھی دخل تھا۔

گوپی ناتھ کے پیہم اصرار کو دیکھ کر میں نے کہا "ٹھیک ہے تاؤ جی! میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ خوش ہو گیا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس کی باچھوں میں فراوانی سے تھوک چمکنے لگا۔ میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تاؤ جی! میرا خیال ہے کہ آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ تفتیش کا پہلا اصول یہی ہوتا ہے کہ اپنا ذہن کھلا رکھا جائے۔ نہ تو کسی پر بے تحاشا شک کیا جائے اور نہ کسی مشکوک کو غیر ضروری طور پر نظر انداز کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے آپ اپنے گھر پر نگاہ دوڑائیں۔ کیا یہاں آپ کو کوئی ایسا فرد نظر آتا ہے جس کو شوبھا کی گمشدگی سے کسی طرح کا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ اگر کوئی ایسا فرد آپ کی نگاہ میں ہے تو پھر بلا تردد مجھے اس کے بارے میں بتائیں۔"

گوپی ناتھ کی جھریوں بھری پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں نظر آنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا دھیان ادھر مبذول ہو گیا ہے جدھر میں مبذول کرانا چاہ رہا ہوں۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا "چندر کے بارے میں میری رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ یہ میری رحم دلی ہے کہ میں نے کاروبار اس کے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔ جو کام وہ کرتا ہے وہ میں دس پندرہ ہزار روپے تنخواہ پانے والے منیجر سے بھی لے سکتا ہوں بلکہ ممکن ہے کہ وہ منیجر اس سے اچھا کام کرے۔ چندر پرکاش ایک ایسا شخص ہے کہ جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں چھید کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ اکاؤنٹس میں بھی ہیرا پھیری کرتا ہے۔ کئی فائلوں میں میں نے اس کے گھپلے پکڑے بھی ہیں۔ کہنے سے مقصد یہ ہے کہ اس چھوکرے میں لالچ حد سے بڑھا ہوا ہے۔ سور کا تخم چاہتا ہے کہ راتوں رات ارب پتی بن جائے۔ اگر میں اپنے اہل خانہ میں سے کسی پر شک کر سکتا ہوں تو پھر یہ چندر ہی ہے لیکن مجھے توقع نہیں کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ابھی آپ نے خود فرمایا ہے کہ چندر میں لالچ کا مادہ موجود ہے اور یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ لالچ اکثر آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔"

گوپی ناتھ نے چونک کر مجھے دیکھا "چندر کے بارے میں اس سے ملتی جلتی بات ایک اور شخص نے بھی کہی ہے۔" وہ پرخیال انداز میں بولا۔

میں نے کہا "میں خدانخواستہ چندر کو ملزم نہیں ٹھہرا رہا لیکن تفتیش کے ابتدائی مرحلے میں پولیس والے ہلکے سے ہلکے شک کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔"

گوپی ناتھ کے جسم پر ایک بار پھر شدید کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ غضب ناک انداز میں بولا "اگر اس معاملے میں اس حرامی چندر کا ہاتھ نکلا تو بھگوان کی سوگند میں اسے برباد کر کے رکھ دوں گا۔ سڑکوں پر بھیک نہ منگوا دی باپ بیٹے کو تو میرا نام گوپی ناتھ نہیں۔"

میں نے کہا "تاؤ جی! میں آپ کے دلی جذبات سمجھ رہا ہوں لیکن بہتر یہی ہے کہ اس موقع پر تحمل سے کام لیا جائے۔"

وہ بولا "تم اندر جا کر شوبھا کی ماں کے بین سن لو تو تم بھی مجھے تحمل کا مشورہ نہ دے سکو۔ جہانی! یہ ایک جوان سندر لڑکی کا معاملہ ہے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اس کی عزت اور اس کے جیون کے لیے خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے بہت جلدی کرنا ہے۔"

میں نے کہا "کیا آپ کوئی ایسا آدمی فراہم کر سکتے ہیں جو چندر پرکاش کی نقل و حرکت پر مکمل نظر رکھے اور ہمیں فوری طور پر رپورٹ بھی پہنچاتا رہے۔"

گوپی بولا "میری دواؤں کی پیکنگ کی فیکٹری میں ایک آدمی بہت بھروسے کا ہے۔ وہ اکثر مجھے چندر کی کارستانیوں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "فیکٹری یا دفتر کا بندہ نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی ایسا شخص ہو جسے چندر پہچانتا نہ ہو۔ ایسا شخص آسانی سے اس کا پیچھا کر سکے گا اور اس کے قریب رہ سکے گا بلکہ اگر ایسے دو بندے ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔"

گوپی نے کہا "میں ابھی ڈی جی شیودت کو فون کرتا ہوں وہ انتظام کر دیتا ہے۔"

فون کرنے کے تھوڑی دیر بعد مجھے گوپی نے بتایا کہ انتظام ہو گیا ہے۔ کوٹھی سے باہر تھوڑے فاصلے پر دو موٹر سائیکلوں پر دو افراد موجود ہیں۔ اگر چندر کوٹھی سے نکل کر کہیں جاتا ہے تو وہ بڑے اچھے ڈھنگ سے اس کا پیچھا کریں گے۔

چندر کی طرف سے میرا دھیان کچھ ہٹا تو ایک بار پھر چوڑی چکلی مالاں میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ مجھے بار بار اس کی وہ مختصر گفتگو یاد آ رہی تھی جو اس نے ٹیلی فون پر کی تھی۔ اس نے کسی مرد کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی کوئی

بات نہیں' لڑکی نخرے کررہی ہے' ٹھیک ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ بھی لڑکی کے متعلق اس نے فون پر کچھ ہدایات دی تھیں۔ فون پر ہونے والی اس گفتگو کے علاوہ مجھے وہ منظر بھی یاد آرہا تھا جب مالاں کے چہرے نے ایک دم رنگ بدلا تھا۔ شیدے نے کہا تھا' مالاں! مجھے تو پتا چلا ہے کہ کوئی نئی نکور لڑکی پھنچ کی ہے تو نے۔ اس فقرے کے نتیجے میں مالاں ایک لمحے کے لیے اپنے تاثرات پر قابو نہیں رکھ سکی تھی اور اسی لمحے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے پھر مالاں کے حوالے سے ایک بات غور کرنے والی اور بھی تھی۔ ابھی باتوں باتوں میں گوپی ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ مالاں بھوپال کے باخبر ترین افراد میں سے ایک ہے۔ اس نے باقاعدہ ایک گروہ ترتیب دے رکھا ہے۔ اس گروہ کے افراد بھوپال شہر کے مختلف حصوں میں موجود رہتے ہیں اور اخباری نامہ نگاروں کے سے انداز میں مالاں کو تازہ ترین خبریں دیتے رہتے ہیں۔ اگر واقعی ایسی بات تھی تو پھر مالاں پر شک کرنے کی مناسب وجہ موجود تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی طور اس بات سے بھی آگاہ ہوگئی ہو کہ بیتے پل والی حویلی کا معروف دفینہ بھوپال میں موجود ہے اور اسی سالہ بڈھا گوپی ناتھ یہ دعویٰ کررہا ہے کہ دفینہ اس کی تحویل میں ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ واقعی باخبر عورت تھی تو پھر یہ بات بھی اس کے علم میں آسکتی تھی کہ گوپی ناتھ کے گھر میں موجود افراد در حقیقت دفینے کے شکاری ہیں اور ان میں ایک ایسا فرد بھی شامل ہے جس کا شمار امریکا کے گنے چنے امرا میں ہوتا ہے۔

اگر ایسی بات تھی تو پھر یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ دفینے کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے گوپی ناتھ کی منظور نظر اور رازداں شوبھا کو اغوا کرلیا ہو۔

مجھے سوچ میں گم پاکر مسٹر جی کلارک میرے پاس آن کھڑے ہوئے "ہاں' مسٹر شاہ جہاں! کیا سوچا ہے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں سر! کہ کیا سوچنا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بولے "گوپی ناتھ کا دل جیتنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ اگر تم شوبھا کی برآمدگی میں اس کی مدد کرسکے تو مجھے یقین ہے کہ یہ خبطی بڈھا تمہاری مٹھی میں ہوگا۔"

اسی دوران میں شیدا آتا دکھائی دیا' مسٹر کلارک نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "اپنی پوری کوشش کرو۔ گڈلک۔" وہ لان کی طرف چلے گئے۔ جہاں ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی تھی اور آدھی رات کو بھی دن کا سماں نظر آرہا تھا۔ لان میں لگی ہوئی رنگین چھتریاں بہت بھلی لگتی تھیں۔ ایسی ہی ایک چھتری کے نیچے کنور بیٹھا صفدر سے باتیں کررہا تھا۔ ان کے قریب ہی سائیں عالی ٹھنڈی گھاس پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اسے بے سُدھ پڑے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بالائی منزل کی چھت سے لان میں گرا ہے اور گرتے ہی جاں بحق ہوگیا ہے۔

شیدا اور میں لان کے ایک دور افتادہ کونے میں چھتری کے نیچے آرام دہ کرسیوں پر جا بیٹھے۔ میں نے شیدے سے کہا "صورت حال کے مطابق ہمیں ڈائریکٹ ایکشن کی ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہم براہ راست مالاں پر ہاتھ ڈال دیں۔"

"کیا مطلب؟" شیدے نے پوچھا۔

"مالاں سے ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا ہے کہ اس پر شک کرنا عین مناسب ہے۔ اس شک کو غلط یا درست ثابت کرنے کے لیے ہمیں وقت کی ضرورت ہے لیکن وقت ہمارے پاس موجود نہیں۔ تو پھر کیوں نہ ہم ڈائریکٹ مالاں کی گردن دبوچ لیں' بے شک وہ غنڈی ہے لیکن جب کنپٹی پر پستول ہو اور پستول رکھنے والا گولی چلانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو تو بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہوجاتا ہے۔"

شیدے کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! یہ مالاں صرف بدمعاش ہی نہیں بہت ٹیڑھی عورت بھی ہے۔ میری رائے تو یہی ہے کہ اس کے ساتھ سیدھی سیدھی ٹکر لینے سے معاملہ خراب ہوجائے گا۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟"

شیدا کچھ دیر سوچ میں رہنے کے بعد بولا "ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے' اگر مالاں نے پولیس کے خوف سے اغوا شدہ لڑکی کو کہیں چھپایا ہے تو پھر وہ ضرور بہ ضرور اس کی لارنس روڈ والی کوٹھی پر ہوگی۔ یہ مالاں کا سب سے محفوظ ٹھکانا ہے۔ اس نئے ٹھکانے کے بارے میں چند لوگوں کے سوا ابھی کسی کو معلوم نہیں۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ کوٹھی پر چھاپا مارا جائے؟"

"نہیں۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ اول تو مقامی پولیس مالاں کے خلاف اس قسم کی کارروائی کرنے سے گریز کرے گی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس میں مالاں کے بے شمار ٹاؤٹ ہیں' اور اگر گوپی ناتھ صاحب کے اثر رسوخ کی وجہ سے ایسی کارروائی ہوئی بھی تو اتنا نقصان ہوگا۔ مالاں بہت زہریلی عورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شوبھا کو پولیس کے ہاتھ دینے کے بجائے ویسے ہی قتل کروا دے۔ اس کی سفاکی کی ایک خبر

تو پچھلے دنوں ہی اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی اس کے کوٹھے سے بھاگ کر تھانے پہنچ گئی تھی' تھانے والوں کو نہ صرف لڑکی' مالاں کو واپس کرنا پڑی بلکہ چند روز بعد لڑکی کی کٹی پھٹی لاش ایک سڑک پر سے ملی۔ ساری رات اس پر سے ٹریفک گزرتا رہا تھا اور جسم کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ جب جسم کا قیمہ ہوگیا ہو تو بھلا پوسٹ مارٹم سے کیا ملتا ہے۔ اور پوسٹ مارٹم کرنے والے بھی کون سے پاک پوتر ہوتے ہیں' ان کی جیب میں نوٹ ٹھونسے جائیں تو ہر طرح کی رپورٹ مل سکتی ہے۔ لوگوں کو بس یہی پتا چلا کہ لڑکی ایک بار پھر فرار ہو کر بھاگ رہی تھی کہ ٹرک کے نیچے آکر کچلی گئی۔ حقیقت بس خاص خاص لوگوں کو معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ لڑکی کو مالاں کے پالتو غنڈوں نے کئی روز تک بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔ بیک وقت کئی کئی آدمیوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور جب وہ کمزور و ناتواں اپنے جسم پر ان گنت زخم کھا کر اور سسک سسک کر مرگئی تو اس کی لاش سڑک پر پھینک کر کئی مرتبہ اس کے اوپر سے گاڑی گزار دی گئی۔ ایسے معاملوں میں مالاں بڑی بے رحم ہے۔ آج تک یہی سنا تھا کہ مرد عورتوں پر ظلم توڑتے ہیں لیکن یہ اپنی ہی ذات کا خون پینے والی عورت ہے۔ اس کے قبضے میں جو لڑکیاں ہیں ان کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے۔ بس وہی سکون سے رہتی ہیں جو مالاں کی ہربات بے چون وچرا مانتی ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پولیس کے ذریعے مالاں پر چڑھائی کی گئی تو مغویہ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا؟"

"بالکل ایسا ہی ہوگا۔" شیدے کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"تو پھر؟"

"اگر کسی چال کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہوا جاسکے تو اور بات ہے لیکن میں تو کہوں گا کہ اس میں بھی بے شمار خطرات ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ کب شوبھا کی کٹی پھٹی لاش کسی سڑک پر سے ملے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں لیکن اس کام میں جو خطرات ہیں' وہ میں نے آپ کو بتا دیے ہیں۔"

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا "چلو آؤ چلیں۔" میں نے کہا۔

"کہاں؟"

"مالاں کی لارنس روڈ والی کوٹھی۔" میں نے جواب دیا۔

شیدا بھوپال کا نامی گرامی بدمعاش تھا پھر بھی اس کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم شیدے کی کرولا گاڑی میں بھوپال کے شمالی حصے کی طرف جارہے تھے۔ اس مرتبہ گاڑی شیدا خود ڈرائیو کررہا تھا' اس کا گن مین راجا عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ صفدر تھا۔

صفدر بولا "شاہ جہاں صاحب! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔ اگر مالاں کے ہاتھوں اغوا ہونے والی لڑکی نرس شوبھا ہی ہے اور اسے دفینے کے چکر میں اغوا کیا گیا ہے تو پھر اسے اغوا کرنے کے فوراً بعد مالاں نے اس کا گاہک ڈھونڈنا کیوں شروع کردیا۔"

"اس کا جواب آپ کو میں دے سکتا ہوں۔" شیدے نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا "مالاں کی بے رحمی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑی لالچی عورت بھی ہے۔ کہیں سے ایک پیسے کا فائدہ بھی ہو رہا ہو تو اسے چھوڑتی نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ شوبھا سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ شوبھا بتانے سے انکار کررہی ہو۔ مالاں نے فیصلہ کیا ہو کہ لڑکی سے مارپیٹ کی جائے لیکن مالاں کی مارپیٹ کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ وہ خالی گھونسے مار مار کر ہی لڑکیوں کی کھال ادھیڑ دیتی ہے۔ جب ایک بار وہ کسی لڑکی کو مارنے پر آجاتی ہے تو پھر یہ نہیں سوچتی کہ اس کا کیا بچے گا اور کیا رہے گا۔ ہوسکتا ہے مارپیٹ سے پہلے اس کے دل میں یہ خیال آگیا ہو کہ لڑکی کے پیسے کھرے کرلیے جائیں۔"

"لیکن پھر اس نے سودا خود ہی کینسل بھی کرڈالا۔" صفدر نے نکتہ اٹھایا۔

"اس کی بھی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شوبھا وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہوگئی ہو جو مالاں پوچھنا چاہ رہی تھی۔ یوں اس کے سر سے یہ بلا ٹل گئی ہو۔"

اسی طرح کی قیاس آرائیوں میں راستہ کٹ گیا اور ہم درختوں سے گھری ہوئی ایک بالکل سنسان سڑک پر سفر کرنے کے بعد ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے سے گزرے۔ اس علاقے میں سب کوٹھیاں بڑی بڑی تھیں اور ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں۔ شیدے نے چلتی گاڑی میں سے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ یہ وہ کوٹھی ہے جہاں مالاں نے اڈا قائم کر رکھا ہے۔ میں دیکھ کر حیران ہوا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر منسٹر اے آر چوپڑا کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

شیدے نے قریباً ایک فرلانگ آگے جاکر گاڑی درختوں میں روک لی۔ میں نے کہا "یہ منسٹر کی نیم پلیٹ کا کیا چکر

ہے؟"

وہ بولا "چند ماہ پہلے تک اس کوٹھی میں صوبائی وزیر اے آر چوہدری کی رہائش تھی۔ اب وہ مستقل طور پر وہاں شفٹ ہوگئے ہیں۔ وزیر صاحب کی اجازت سے اس کوٹھی میں مالاں نے پکے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ اکثر لوگ ابھی تک یہی سمجھتے ہیں کہ یہ منسٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی چھوٹے موٹے پولیس افسر کو کوٹھی کے قریب پھڑکنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی کیونکہ اس کوٹھی میں "دھندا" وغیرہ نہیں ہوتا لہٰذا قرب و جوار کے رہائشی بھی مطمئن ہیں۔"

کوٹھی کی بیرونی دیوار کم از کم پندرہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے اوپر باہر کی طرف مڑی ہوئی خم دار سلاخیں لگی تھیں۔ تمام باؤنڈری وال پر روشنی بھی موجود تھی۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا، پھر بھی گیٹ پر دو مسلح افراد چوکس موجود تھے۔ کوٹھی کے اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں نگرانی کے انتظامات مکمل ہیں۔

اچانک دو سائیکل سواروں کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں پیڈل چلاتے مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ ایک سائیکل سوار کے ہاتھوں میں ربڑ کے موٹے دستانے تھے اور سائیکل کے ہینڈل سے تھیلا جھول رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بجلی کے محکمے کے لائن مین ہیں اور کسی "شکایت" کے نتیجے میں نکلے ہوئے ہیں۔ میں نے آواز دے کر انہیں روکا اور شیدے کو ہدایت کی کہ وہ گاڑی ریورس کرے۔ گاڑی سائیکل سواروں کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ وہ دونوں سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پچھلے چند سیکنڈ کے اندر میں ایک اہم فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے صفدر کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ ہم دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ سائیکل سوار جہاں رکے تھے وہاں روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد دونوں لائن مین کرولا گاڑی کی پچھلی نشست پر بے ہوش پڑے تھے اور شیدے کا گن مین ان کے ہاتھ باندھ رہا تھا۔ ایک لائن مین کی گردن پر میں نے اپنے بازو کا مخصوص داؤ آزمایا تھا، دوسرے کو تھوڑا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی کو صفدر نے ریوالور کے دستے سے بجایا تھا۔

لائن مینوں کے کپڑے اتار کر میں اور صفدر سڑک کے کنارے گھنے درختوں میں چلے گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم لائن مینوں کے روپ میں بالکل تیار تھے۔ صفدر پر یہ لباس بالکل فٹ بیٹھتا تھا، تاہم مجھے ذرا سا تنگ تھا۔ پسینے سے بھیگی ہوئی میلی کچیلی قمیص میں سے سخت مشقت کی ناگوار خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے قمیص کی چھوٹی آستینیں چھپانے کے لیے انہیں اڑس لیا تھا اور پتلون ذرا نیچے کرکے باندھی تھی تاکہ ٹخنے ننگے نہ ہوں۔

شیدے کو معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں کیا کرنے جا رہے ہیں لیکن ہمیں معلوم تھا، حالانکہ ہم نے آپس میں اس موضوع پر کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔ بس یہ ذہنی ہم آہنگی تھی کہ خطرناک صورت حال میں کارروائی کے وقت میں اور صفدر بغیر کچھ کہے سنے بہت کچھ سمجھ جاتے تھے۔ میں نے شیدے اور اس کے گن مین کو مختصر الفاظ میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ یہیں گاڑی میں موجود رہیں۔ شیدا پوری بات سمجھ گیا تھا، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اور صفدر پیدل چلتے ہوئے واپس اس کوٹھی پر پہنچے جس کے گیٹ پر منسٹر کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ ہم دونوں نے سائیکلوں پر سوار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی تاہم سائیکلیں ہمارے پاس موجود تھیں۔ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم نے اندازہ لگالیا کہ کوٹھی کو بجلی سپلائی کرنے والا موٹا تار کوٹھی کے عقب میں گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ بجلی کی سپلائی عقبی لائن سے لی گئی تھی۔ ہم عقبی سڑک پر پہنچے اور معمولی کوشش سے اس کھمبے کا سراغ لگالیا جس کے ساتھ کوٹھی کی سپلائی لائن منسلک تھی۔ میں نے کمر میں پیٹی باندھی، ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور کھمبے پر چڑھ گیا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اے آر چوہدری کی پوری کوٹھی گہری تاریکی میں ڈوب گئی۔ میں اطمینان سے نیچے اترا۔ صفدر اور میں سائیکلوں پر سوار ہوئے اور واپس گاڑی تک پہنچ گئے۔ سائیکلیں درختوں میں چھپانے کے بعد ہم بھی گاڑی میں جا بیٹھے۔ گرمی کافی زیادہ تھی۔ ایسے میں پوری کوٹھی کی بجلی کا منقطع ہونا۔ یقینی بات تھی کہ مکین ائیرکنڈیشنڈ کمروں میں سے گھبرا کر نکل آئے ہوں گے۔ اب انہیں فوری طور پر بجلی کے قریبی دفتر سے رابطہ کرنا تھا۔ یہ رابطہ بذریعہ فون ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی ملازم از خود بجلی کے دفتر کی طرف دوڑ لگا دیتا۔

صرف پانچ دس منٹ کے اندر ہی نتیجہ ہمارے سامنے آگیا۔ کوٹھی کا مین گیٹ کھلا اور ملازمین نظر آئے۔ ایک ملازم کے ہاتھ میں پندرہ بیس فٹ لمبا بانس تھا۔ دو ملازم بانس سمیت کوٹھی کی عقبی سڑک پر چلے گئے۔ میں نے آگے جا کر دیکھا تو ایک ملازم بانس کے ذریعے مین سپلائی لائن سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یوں ہلانے جلانے سے برقی رو بحال ہو جائے گی لیکن میں کنکشن مکمل طور پر منقطع کر آیا

تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ملازم نامراد واپس آگئے۔

اب میرے اور صفدر کے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے شیدے کو سمجھا دیا کہ اگر محکمہ بجلی کے اصل لائن مین کوٹھی کی طرف آتے دکھائی دیں تو وہ کسی نہ کسی طور انہیں کوٹھی میں داخل ہونے سے روک لے۔ میرے پاس دس گولی والا اٹالین ماؤزر اور صفدر کے پاس پستول تھا۔ ہم نے اپنے یہ دونوں ہتھیار اوزاروں والے تھیلے میں ڈالے، تھیلا میں نے اپنی سائیکل سے لٹکایا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک خطرہ بہرحال موجود تھا اور وہ یہ تھا کہ عین ممکن ہے کوٹھی کے مکینوں نے ابھی تک "بجلی کے دفتر" فون نہ کیا ہو۔ بغیر شکایت کے لائن مینوں کا کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ جانا گارڈز کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا مگر اس کے لیے بھی دلیل موجود تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم سڑک سے گزر رہے تھے، منسٹر صاحب کی کوٹھی میں تاریکی دیکھ کر رک گئے۔

تاہم خیریت گزری۔ کوٹھی کے خونخوار صورت والے گارڈز نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا بلکہ ہمیں دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ ہم سائیکلوں سمیت اندر گھس گئے۔ یہ منسٹر کی کوٹھی تھی لہٰذا اس کا شان دار ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ کوٹھی کے کسی کسی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ موم بتیوں اور ٹارچوں وغیرہ کی روشنی تھی۔

"مین سوئچ کس جانب کو ہے صاحب جی۔" میں نے حتی الامکان بھوپالی لہجے میں ایک گارڈ سے پوچھا۔

وہ بولا "مین سوئچ تو برآمدے میں ہوئیں گا لیکن اپن کا خیال ہے کہ ادھر باہر کھمبے سے تار ہلا ہے۔"

"چلو وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ پہلے فیوز وغیرہ تو دیکھ لیں۔"

"بھئی، فیوز وغیرہ دیکھنے کے بعد اچ تو تمہیں فون کیا ہے۔ فیوز کا باتاں ہوتا تو ہم لوگاں خود نہ ٹھیک کرلیتے۔ اوپر کھمبے سے تار ہلا ہے بھئی۔"

صفدر نے بڑی اطاعت مندی سے سر ہلایا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ہم کوٹھی کے عقبی دروازے سے باہر آئے۔ میں ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر کھمبے پر چڑھ گیا۔ صفدر نے نیچے سے ٹارچ کی روشنی پھینکنا شروع کردی۔ وہ روشنی تو ضرور پھینک رہا تھا لیکن ایسے زاویے سے پھینک رہا تھا کہ مین لائن سے اترا ہوا تار نیچے سے نظر نہ آئے۔ میں یونہی ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا۔ کھمبے پر سے کوٹھی کا عقبی صحن نظر آرہا تھا۔ میں کوٹھی کا حدود اربعہ ذہن نشین کرنے میں مصروف ہوگیا۔ نیچے سے صفدر نے کہا "استاد جی! اماں دھیان سے۔ ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"یہ کیا بانگ رہا ہے۔" میں نے اوپر سے کہا "شادی تیری نہیں ہوئی اور دھیان سے میں رہوں؟"

"تو ذرا سمجھا کرو استاد۔ کرنٹ کھا کر گرو گے تو میرے اوپر ہی گرو گے نا۔"

"ارے تو تو ہٹ جانا نیچے سے۔"

"واہ یہ کیا باتاں ہوئی۔ استاد کو اپنے اوپر گرتے دیکھ کر نیچے سے ہٹ جاؤں۔ یہ کوئی استاد کا احترام تو نہ ہوا نا۔"

"یار! تم نے کیا جگت بازی شروع کردی ہے، ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ۔" ایک گارڈ ترش لہجے میں بولا۔

میں نے جو ہاتھ چلانا تھا وہ تو آدھ پون گھنٹا پہلے ہی چلا دیا تھا۔ یونہی دو تین منٹ گزار کر میں نیچے آگیا۔

"اوپر سے تو ٹھیک ہے جی۔" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا "خرابی کہیں اندر ہی ہوئیں گی۔"

"ہاں اندر ہی ہوئیں گی۔" صفدر نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

ہم دونوں ہی کے ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی تھی اور ہم مار دھاڑ کے موڈ میں تھے لیکن مسئلہ مغویہ کا تھا۔ اگر وہ واقعی اندر موجود تھی تو پھر ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا تھا۔ ہم دونوں گارڈز کے ساتھ واپس کوٹھی میں پہنچے۔ ایک موٹی عورت جو صورت سے ہی نائیکا نظر آتی تھی، پکار کر بولی "ارے مستری۔ کتنی دیر لگے گی بھئی۔ ادھر تو ہم لوگاں کا سارا عرق نکل گیا ہے۔" وہ ایک ہاتھ سے بڑی تیزی کے ساتھ پنکھا جھل رہی تھی۔

میں نے کہا "میڈم! خرابی کا پتا چل جائے کہ کہاں ہے، پھر ایک منٹ میں ٹھیک کردیں گے۔"

صفدر نے معنی خیز انداز میں تائید کی "ہاں جی۔ بس خرابی کا پتا چل جائے کہ کہاں ہے، پھر کوئی مسئلہ اچ نائیں ہے۔ ایک منٹ میں خرابی دور ہے اور ہم بھی دور۔" آخری الفاظ اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہے۔

ہم نے مین سوئچ والا بکس کھولا۔ مین سوئچ کے ساتھ ہی بورڈ بھی موجود تھا۔ پندرہ بیس کریکس لگے ہوئے تھے۔ ان کریکس کے عقب میں سرخ اور نیلے تاروں کا جال تھا۔ میں نے بڑے ماہرانہ انداز میں ان تاروں کا جائزہ لیا۔ کچھ پلے نہیں پڑا لیکن میں اور صفدر مسلسل تفتیشی انداز میں سر ہلاتے رہے۔ میں نے دو تین جگہ سے تار کاٹ دیے اور انہیں یونہی ادھر ادھر جوڑ دیا۔ اس کے بعد تمام کریکس چیک کیے۔ کوٹھی کے بیشتر مکین ہمارے اردگرد اکٹھے ہو چکے تھے۔

ان میں دو تین مکین تو خاصے خوب صورت تھے۔ یہ خوب رو لڑکیاں تھیں۔ گرمی کے سبب وہ کپڑوں سے باہر ہو رہی تھیں بلکہ ایک تو بہت ہی مختصر لباس میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے پورے جسم پر بمشکل آدھ گز کپڑا تھا۔ یونہی خانہ پُری کے لیے اس نے ایک باریک سی شال کندھوں پر ڈال لی تھی۔ گرمی تو غالباً بہانہ ہی تھی ورنہ اس عریانی کا سبب یقیناً کچھ اور "مصروفیات" رہی ہوں گی۔ مردوں میں دو نوجوان سال تھے اور ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ مجھے لڑکی کی طرف دیکھتے پا کر صفدر بولا "استاد جی! دھیان سے۔ بہت کرنٹ ہے۔"

"کرنٹ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے مگر اصل خرابی کا پتا چلے تو پھر ہے نا۔" میں نے کہا۔

"کہیں کسی کمرے میں نہ ہو۔" صفدر ممنایا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

پانچ دس منٹ کی رفاقت کے بعد ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں موجود حضرات میں سے کسی کو بھی "بجلی" کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی لہٰذا آہستہ آہستہ ہماری جھجک دور ہو رہی تھی۔

میں نے پوچھا "اے۔ سی کتنے کمروں میں لگا ہے؟"

موٹی عورت بولی "تین کمروں میں ہے۔"

"ذرا دکھا سکتی ہیں؟"

"کیوں۔ وہاں خرابی ہے؟"

"ہاں جی۔ بعض اوقات تار گرم ہو کر آپس میں مل بھی جاتے ہیں۔"

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد موٹی عورت سینئر گارڈ سے بولی "مستری کو اے سی دکھا دو۔"

"چلو۔" گارڈ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

صفدر بھی میرے ساتھ چل دیا۔ اوزاروں والا تھیلا وہیں پڑا رہ گیا تھا۔ میں نے کہا "او لے چندر! وہ تھیلا تو پکڑ لے۔ تھیلے کے بغیر اپنی ماں کا سر ٹھیک کرے گا۔"

"او ہو۔ واقعی تھیلے کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔" صفدر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"اوئے! تم دونوں باتیں بہت کرتے ہو۔" سینئر گارڈ نے نہایت سنجیدگی سے ہمیں ڈانٹا۔

وہ ہمیں لے کر اندرونی کمرے کی طرف بڑھا۔ میرے ذہن میں وہ فقرہ ابھی تک گونج رہا تھا جو آج رات پہلے پہر مالاں نے ٹیلی فون پر کہا تھا۔ اس نے کسی لڑکی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اپنے کسی ماتحت سے کہا تھا "کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ بس ذرا نخرے کر رہی ہو گی۔ ویسے بھی گرمی ہے۔ ذرا اے سی لگا دو۔"

میرے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ عین ممکن ہے کہ مالاں نے اس وقت اسی کوٹھی میں بات کی ہو اور وہ مغویہ لڑکی اسی کوٹھی میں کسی "اے سی" والے کمرے میں موجود پائی جائے۔ ہم نے پہلے کامن روم دیکھا۔ یہاں چاروں طرف صوفے لگے ہوئے تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات پہلے پہر یہاں زبردست محفل جمی رہی ہے۔ شراب کی خالی بوتلیں، سگریٹوں کے ٹکڑے اور تاش کے پتے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک نہایت "ایڈوانس" گھرانا تھا اور ایسے لوگ گھر میں کام کے لیے آنے والے معمولی مستریوں سے کچھ چھپایا نہیں کرتے بلکہ غیر شعوری طور پر یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان "جاہل" لوگوں پر ان کے ماڈرن ازم کی دھاک بیٹھ جائے۔

میں نے اے سی کا معائنہ کیا۔ اس کا سوئچ اور ساکٹ وغیرہ دیکھی "یہاں تو کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

صفدر نے حسب معمول تائید کی "ہاں جی! یہاں تو کچھ نہیں ہے۔"

اس کے بعد ہم نے دوسرا "اے سی" دیکھا۔ یہ ایک بیڈ روم میں تھا۔ اس کے بعد تیسرے کی باری آئی۔ یہ بھی ایک بیڈ روم میں تھا۔ اس بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہاں بیڈ پر ایک لڑکی موجود تھی۔ غالباً ہماری آمد کی وجہ سے اس نے لیٹے لیٹے اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا تھا اور جسم پر ایک باریک اوڑھنی پھیلا لی تھی۔ لڑکی کے قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر چند ایک دوائیں پڑی تھیں۔ کمرے میں پورٹ ایبل لائٹ جل رہی تھی۔ ایک ملازمہ لڑکی کے سرہانے کھڑی اسے مسلسل پنکھا جھلنے میں مصروف تھی۔ تاہم جب ہم اندر آئے تو یہ ملازمہ کسی کام سے باہر نکل گئی۔ اس کمرے میں پہنچتے ہی گارڈ ایک دم چوکس نظر آنے لگا تھا۔ کندھے سے لٹکی ہوئی جی تھری رائفل پر اس نے اپنا داہنا ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس قسم کی حرکتیں اضطراری ہوتی ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو بہت سے انکشاف کر جاتی ہیں۔ جس وقت میں نیچے بیٹھ کر "اے سی" کا معائنہ کر رہا تھا، میری نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑی جس نے ایک ہی لمحے میں مجھے یقین دلا دیا کہ بیڈ پر لیٹی ہوئی لڑکی مغویہ لڑکی ہے۔ لڑکی ذرا سا ہلی تو اوڑھنی اس کے سر سے ہٹ گئی۔ مجھے لڑکی کی ایک کلائی نظر آئی، یہ کلائی اس نے موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا، کلائی پر دھاریوں جیسے دو تین زخم تھے۔ بالکل جیسے سرخ لکیریں کھینچ دی گئی

ہوں۔ یہ زخم چوڑیاں ٹوٹنے سے آئے تھے۔ میں نے نظر بچا کر صفدر کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے اوزاروں کے تھیلے میں ہاتھ ڈال لیا لیکن نکالا کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پستول تھام کر بیٹھا ہوا تھا۔ گارڈ جھنجلا کر بولا "یار! تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ آدھا گھنٹا ہو گیا ہے تمہیں پھرتیاں دکھاتے ہوئے۔ ہم کر۔۔۔"

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ میں عقب سے جھپٹا اور اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی، اس کے ہونٹوں سے "اوہ" کی بس ہلکی سی آواز ہی نکل سکی۔ عین اسی لمحے صفدر نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی تھی اور ہمارے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہونے والی موٹی عورت (نائیکا) کو چھاپ لیا۔ اس کا ہاتھ نائیکا کے منہ پر آیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے نائیکا کی کنپٹی پر ۳۸ بور کا پستول رکھ دیا۔ وہ کسی ڈولفن مچھلی کی طرح صفدر کے مضبوط بازوؤں میں۔۔۔ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی نے کروٹ بدل کر کمرے کا منظر دیکھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت جم گئی۔ لڑکی کی آنکھوں میں حیرت تھی تو اس کے مقابلے میں ہماری آنکھوں میں مایوسی تھی۔ مایوسی کی وجہ یہی تھی کہ لڑکی شوبھا نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر طمانچے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا اور خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

میں نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا "گھبراؤ نہیں، ہمارا تعلق (تعلق) پولیس سے ہے۔ ہم تم کو چھڑانے آئے ہیں۔"

اس کا منہ جو حیرت سے کھلا ہوا تھا کچھ اور کھل گیا۔ میرے بازو کے شکنجے میں پھنسنے والا گارڈ گردن پر دباؤ پڑنے کے سبب کم از کم ایک گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ میں نے اسے فرش پر لٹا دیا۔ صفدر کا خیال تھا کہ موٹی نائیکا کے سر پر پستول کے دستے سے طبلہ بجا دے لیکن وہ بڑی سیانی نکلی۔ طبلہ بجنے سے پہلے خوف سے ہی بے ہوش ہو گئی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس کے ہونٹوں اور ناک پر صفدر کی ہتھیلی تھی اور اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ صفدر نے نائیکا کو آرام سے صوفے پر لٹا دیا۔ لڑکی ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں ہمیں دیکھ رہی تھی۔ غالباً اسے ہماری اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم پولیس والے ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ ہمارے لباس مستریوں والے تھے، ہاتھ وغیرہ بھی کالے ہو رہے تھے لیکن اتنی بات تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ مستری یا مزدور وغیرہ اس طرح تھیلوں میں سے پستول نہیں نکال لیتے۔ اب صفدر کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھ میں بھی ماؤزر نظر آنے لگا تھا اور ہم دونوں اپنے اردگرد سے پوری طرح چوکس تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر ملائمت سے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور کہا "چلو آؤ ہمارے ساتھ۔"

لڑکی کھڑی ہو گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ اس نے چپل بھی نہیں پہنی۔ صفدر نے جلدی سے چپل اس کے پاؤں کے پاس رکھی۔ میں نے پورٹ ایبل لائٹ بجھا کر صوفے کے نیچے کھسکا دی۔ لائٹ بجھنے سے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ عقبی راہداری اور پچھلا صحن پہلے ہی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ عقبی دروازے سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ ہم برآمدے میں پہنچے اور وہاں سے صحن میں آ گئے لیکن جونہی ہم عقبی دروازے کے پاس پہنچے، ایک سایہ ہمارے قریب آیا "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں "ری پیٹر" صاف نظر آ گئی تھی۔

میں نے صفدر کے کان میں کہا "تم نکلو۔"

صفدر لڑکی کا بازو تھام کر دروازے کی طرف بڑھا۔ مسلح شخص نے قدرے بلند آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

میں اس انتظار میں تھا کہ وہ ذرا قریب آ جائے۔ جونہی اس نے قریب آنے کی غلطی کی، میں نے لپک کر اس کی گن پر ہاتھ ڈالا۔ اس لمحے ذرا سی چوک بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایک لمحے میں ڈھائی انچ لمبے کارتوس کے چھرے میرے سینے میں درجن بھر سوراخ کر دیں گے۔ میرا ہاتھ گن کی نال پر پڑا اور میں نے فوراً اسے اوپر اٹھا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگلے ہی لمحے ری پیٹر کا سماعت شکن دھماکا ہو گا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا حالانکہ میرے اندازے کے مطابق مدمقابل نے گھوڑا دبانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی، ری پیٹر کو سیفٹی کیچ لگا ہوا تھا۔ مدمقابل کے پاس اتنی مہلت ہی نہیں تھی کہ وہ کیچ ہٹا سکتا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنا رسید کیا۔ وہ تڑپ کر دہرا ہو گیا لیکن گن پر سے اس نے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ زاویہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کرتا۔ میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا، وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے سر پر لگنے والی ضرب کی آواز میرے لیے بڑی تسلی بخش تھی۔ یہ آواز سننے کے بعد مجھے ایک سو ایک فی صد یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص یا تو ہلاک ہو جائے گا یا کئی ہفتے اسپتال میں گزارے گا۔ وہ اندھیرے میں گرا تھا اور پھسل کر دور چلا گیا تھا۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر کی طرف دوڑا۔ گن مین کے دیوار سے ٹکرانے کی آواز اتنی زوردار

تھی کہ کوٹھی میں موجود دیگر گارڈز کا ہوشیار باش ہوجانا ایک لازمی امر تھا۔ میں عقبی دروازے سے باہر نکلا اور گاڑی کی سمت دوڑتا چلا گیا۔

میں گاڑی میں پہنچا تو صفدر اور لڑکی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ہمارے آنے سے پہلے شیدے نے یہ عقل مندی کی تھی کہ دونوں برہنہ لائن مینوں کو پتلونیں پہنا کر ڈکی میں بند کردیا تھا۔ جونہی میں گاڑی میں بیٹھا' شیدے کے گن مین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیدے کی جگہ اب وہ خود ڈرائیونگ کرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر صفدر بیٹھا تھا۔ شیدا میرے اور لڑکی کے درمیان پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جس منظر نے مجھے حیران کیا وہ یہ تھا کہ لڑکی نے شیدے کا بازو تھام رکھا تھا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ شیدا تسلی دینے والے انداز میں اس کی پشت تھپک رہا تھا' تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ حیران بھی نظر آتا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے وقتی طور پر شیدے اور لڑکی سے توجہ ہٹائی اور اپنے عقب میں دیکھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر وہ کوٹھی نظر آرہی تھی جہاں سے ہم لڑکی کو نکال کر لائے تھے۔ مجھے ایک گاڑی کی سرخ ٹیل لائٹس نظر آئیں پھر یہ لائٹس سفید لائٹس میں بدل گئیں۔ کوئی کار کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی۔ نوے فی صد امکان اس بات کا تھا کہ وہ ہمارے تعاقب میں نکل رہی ہے۔ میں نے گن مین راجا سے کہا "گاڑی تیز چلاؤ۔"

اس نے تیسرا گیئر لگایا اور گاڑی کو ہوائی جہاز بنا دیا۔ اس موقع پر شیدے کی حاضر دماغی کافی کام آئی۔ وہ بھوپال شہر کی سڑکوں اور گلیوں کو اپنے ہاتھ کی لکیروں سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کی ہدایت پر راجا نے تین چار گلیوں میں گاڑی موڑی اور پھر ایک کشادہ سڑک پر آگیا۔ اس سڑک پر ہم نے قریباً چار کلومیٹر تک گاڑی چلائی' ہمیں اپنے عقب میں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ یقیناً ہم اپنے پیچھے آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

لڑکی مسلسل رو رہی تھی۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں' میں نے دیکھا' اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ گریبان پھٹا ہوا تھا اور اس کا اندرونی لباس نظر آرہا تھا۔ دونوں کلائیوں پر گہری خراشیں تھیں۔ ایک رخسار پر طمانچے کا نشان غور سے دیکھنے پر صاف نظر آجاتا تھا۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ یہ بات تو اب صاف ظاہر تھی کہ یہ لڑکی شیدے کو جانتی ہے اور شیدا بھی اسے اچھی طرح جانتا ہے لیکن ان کا تعلق کیا تھا یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لڑکی نے روتے روتے کہا۔

"بھائی جان! کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ۔۔۔ آپ تو میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔"

"اللہ مدد کرنے والا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دیتا ہے۔" شیدے نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا پھر وہ ذرا چونک کر بولا "ارے! تجھے تو بخار بھی ہے۔" اس کا ہاتھ لڑکی کی پیشانی پر تھا۔

مجھے یاد آیا کہ لڑکی جس کمرے میں لیٹی ہوئی تھی وہاں تپائی پر کچھ دوائیں بھی رکھی تھیں۔

تھوڑی دیر میں ہم گوپی ناتھ مینشن واپس پہنچ گئے۔ اب صبح ہونے والی تھی' ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور مشرق کی طرف سے اُجالا نظر آنے لگا تھا۔ جونہی ہماری گاڑی گوپی ناتھ مینشن میں داخل ہوئی' وہاں موجود گارڈز اور ملازمین میں ہلچل سی مچ گئی۔ دراصل ان لوگوں نے گاڑی میں ایک لڑکی کی موجودگی نوٹ کرلی تھی۔ گاڑی کے اندر چونکہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا وہ سمجھے تھے کہ شاید ہم شوبھا کو ڈھونڈ لائے ہیں۔ لڑکی کی صورت دیکھ کر ان سب لوگوں کو مایوسی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ گوپی ناتھ بھی مایوس نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے کہ وہ شوبھا کی صورت دیکھنے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔

گاڑی سے اترنے کے فوراً بعد میں صفدر کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے پوچھا "بھئی یہ کیا چکر ہے۔ یہ چھوکری ہماری شکر گزار ہونے کے بجائے شیدے کا شکریہ ادا کررہی ہے۔"

صفدر بولا "یہ ایک عجیب تماشا ہوا ہے جناب۔ میں لڑکی کو لے کر کار میں آیا تو شیدا اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید اسے اپنی نظر پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لڑکی بھی شیدے کو دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر دھاڑیں مار کر شیدے سے لپٹ گئی۔ انکشاف یہ ہوا ہے کہ یہ لڑکی شیدے کی ایک چچا زاد بہن ہے۔ وہ بھوپال کے قریب ہی ایک قصبے میں ہائی اسکول کی استانی ہے۔ شیدے کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم جس لڑکی کو کوٹھی میں سے چھڑا کر لائیں گے وہ اس کی قریبی رشتے دار نکل آئے گی۔ دوسری طرف لڑکی ابھی تک یہی سمجھ رہی ہے کہ شیدے نے اسے غنڈوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کارروائی کی ہے۔ وہ اسے اپنا محسن سمجھ کر اس سے لپٹ چمٹ رہی تھی۔"

واقعی یہ ایک دلچسپ اور حیران کن اتفاق ہوا تھا۔ آج

ساری رات شیدا ہمیں مالاں اور اس کے اثر و رسوخ سے ڈراتا ہی رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہم مالاں سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کریں۔ وہ پوری طرح اس تجویز کے حق میں بھی نہیں تھا کہ ہم مالاں کے کسی ٹھکانے پر چڑھائی کریں اور مغویہ کا کھوج لگائیں۔ یہاں تک کہ مسز رائے آر چوپڑا کے نام والی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر بھی وہ ہمیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ بات غالباً اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ جس لڑکی کو برآمد کرنے کی کوشش میں روڑے اٹکا رہا ہے وہ اس کی چچا زاد بہن ہے۔ کبھی کبھی حالات انسان کو ایسے تماشے بھی دکھاتے ہیں۔

گوپی ناتھ' مجتبیٰ کنور اور مسٹر جی کلارک صاحب میرا اور صفدر کا لباس دیکھ دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ یہاں سے جانے کے بعد کیا ماجرا پیش آیا ہے پھر ہم نے کار کی ڈکی کھول کر انہیں بے ہوش لائن مین بھی دکھائے۔ ان کے جسم پر صرف پتلونیں تھیں اور وہ ڈکی میں مڑے تڑے پڑے تھے۔ بے چارے خواہ مخواہ میں پکڑے گئے تھے۔ میں نے دونوں کا معائنہ کیا۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔ انہیں طبی امداد نہ بھی فراہم کی جاتی تو ایک آدھ گھنٹے کے اندر انہیں ہوش میں آجانا تھا۔

جب بندہ کسی چیز کا کھوج لگاتا ہے تو اکثر اس قسم کے واقعات پیش آجاتے ہیں۔ ڈھونڈا کسی اور چیز کو جارہا ہوتا ہے' مل کوئی اور چیز جاتی ہے' پولیس کی کارروائی میں ایسی صورت احوال اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ پولیس نے کسی اسمگلر کو پکڑنے کے لیے "ریڈ" لگا رکھی ہوتی ہے اور پکڑا کوئی مفرور قاتل جاتا ہے۔۔۔ یا ہیروئن کی تلاش میں گاڑیوں کی تلاشی لیتے لیتے اسلحہ برآمد ہوجاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی آج کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم گوپی ناتھ کی منظور نظر شوبھا کی تلاش میں نکلے تھے اور برآمد یہ راحت نامی لڑکی ہوگئی تھی اور اب پتا چل رہا تھا کہ یہ شیدے کی کوئی چچا زاد بہن تھی۔

میں نے دونوں لائن مینوں کو ڈکی سے نکلوایا۔ ان دونوں کے لباس میرے اور صفدر کے بدن پر تھے۔ ہماری پتلونیں شیدے نے انہیں پہنا دی تھیں۔ یہ لباس ایک بار پھر تبدیل کیے گئے۔ جب لائن مینوں کے جسم پر ان کے اپنے لباس آگئے تو میں نے چپکے سے پانچ پانچ سو روپے ان دونوں کی جیبوں میں رکھ دیے۔ ظاہر ہے کہ ہماری طرف سے ان کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ دونوں افراد کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا گیا۔ ان کا اوزاروں کا تھیلا اور دیگر سامان بھی ان کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا۔ ان دونوں کی سائیکلیں اسی جگہ پڑی تھیں جہاں وہ ہمارے ہاتھوں بے ہوش ہوئے تھے۔ ان دونوں سائیکلوں کو صفدر نے تالا لگا دیا تھا۔ تالوں کی چابیاں لائن مینوں کی جیب میں ڈال دی گئیں۔ میں نے گوپی ناتھ کے ڈرائیور سے کہا کہ ان دونوں صاحبان کو یہاں سے دور کسی ویران سڑک پر اتار دو۔

اسی دوران میں شیدا میرے پاس چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں خجالت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ احسان مندی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے انگرکھے کا گریبان آج کم کھلا ہوا تھا اور ٹوپی بھی زیادہ ترچھی نہیں تھی۔۔۔ وہ بولا "میں اپنے آپ میں بہت شرمندگی محسوس کررہا ہوں جناب۔ اگر آپ دونوں میرے کہے میں آجاتے اور مالاں کی ادرس روڈ والی کوٹھی میں کارروائی نہ کرتے تو پتا نہیں اس بے چاری کا کیا حشر ہوتا۔ یہ تو شاید اس کی قسمت اچھی تھی کہ کل صبح اسے اچانک شدید بخار ہوگیا اور سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی' ورنہ مالاں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتی۔"

"کیا مطلب؟ بات کی وضاحت نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔

شیدا بولا "اس کا نام راحت ہے۔ یہ رشتے میں میری چچا زاد ہے۔ کچھ عرصے سے یہ لوگ بھوپال چھوڑ کر نزدیکی قصبے "میرانی" میں شفٹ ہوگئے ہیں۔ پرسوں صبح آٹھ بجے جب راحت اپنی ڈیوٹی پر اسکول جارہی تھی' دو افراد نے اسے دھوکے سے ایک کار میں بٹھایا اور اغوا کرلیا۔ یہ لوگ اسے مالاں کی کوٹھی پر لے گئے۔ مالاں کو لڑکی پسند آئی اور اس نے لڑکی دس ہزار میں خرید لی۔ ایسے کام مالاں اکثر کرتی رہتی ہے۔ خاص طور پر جن دنوں مندا ہو' وہ ضرور کوئی نہ کوئی ایسا خطرناک کھیل کھیلتی ہے۔ اس کے بعد مالاں نے جو کچھ کیا وہ آپ کو معلوم ہی ہے' وہ کل سہ پہر کپور ہوٹل کے عیاش مالک اجیت کپور کے پاس پہنچی اور اس سے ایک رات کی عیاشی کا سودا طے کیا لیکن حرام زادی کی آس پوری نہ ہوسکی یا یوں کہہ لیں کہ اوپر والے نے راحت کی عزت بچانا تھی۔ اسے سہ پہر کو ہی شدید بخار ہوگیا اور اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ پہلے تو مالاں نے سمجھا کہ وہ مکر فریب کررہی ہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ بات واقعی سنگین ہے۔ مجبوراً مالاں نے اجیت کپور سے کیا ہوا سودا منسوخ کردیا اور راحت کو حفاظت کی غرض سے اپنے لارنس روڈ والے اڈے پر بھیج دیا۔"

میں نے کہا "تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مالاں

کو یہ معلوم نہیں تھا کہ لڑکی سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟"

"ہاں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملال یقیناً اب تک میرے ہاتھوں سے قتل ہو چکی ہوتی۔" شیدے نے بڑے غصیلے لہجے میں کہا "پھر بھی میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ اسے لڑکی سے اور لڑکی کے ماں باپ سے معافی مانگنی ہوگی اور جن کتے کے بچوں نے اسے سڑک سے اٹھایا تھا انہیں تو زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا کر چھوڑ دوں گا۔"

شیدے کا غصہ قابل فہم تھا۔ اس کا شمار بھوپال کے خطرناک ترین غنڈوں میں ہوتا تھا۔ اس کی ایک رشتے دار لڑکی پر ہاتھ ڈالا گیا تھا، وہ حشر بھی برپا کر دیتا تو کم تھا۔ آخر وہ ایک غنڈا تھا، لڑکیاں اٹھانے اور انہیں بے آبرو کرنے جیسے کام دوسرے لوگ کرنے لگتے تو پھر اس کے کرنے کے لیے کیا رہ جاتا۔ یہ اس کی غیرت کی بات ہی نہیں تھی اس کے پیشے کا تقاضا بھی تھا کہ وہ راحت کو اغوا کرنے والے نامعقول غنڈوں کو عبرت نگاہ بنا دے۔ آئندہ کسی چھوٹے غنڈے کو ہمت نہ ہو کہ وہ کسی بڑے غنڈے کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈال کر اپنی دنیا و عاقبت خراب کرے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں شیدے نے بتایا کہ کل جن دو لڑکوں کو کوٹھی میں زبردستی گھسنے کی وجہ سے پکڑا گیا تھا، انہیں گوپی ناتھ صاحب نے پولیس کے حوالے نہیں کیا اور وعدہ کیا ہے کہ معافی تلافی کے بعد انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

شیدے کی آنکھوں میں میرے لیے گاہے گاہے ممنونیت نظر آنے لگی تھی۔ وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا "آپ نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ کسی بھی طرح آپ کے کام آؤں۔" ذرا توقف کر کے اس نے بات جاری رکھی "میں آپ کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ اس بات کا تعلق شوبھا کی گمشدگی سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس بات پر غور کر لیں تو شوبھا کی بازیابی آسان ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی..."

ایک دم شیدے کو خاموش ہونا پڑا۔ گوپی ناتھ اپنے کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ صبح کی روشنی میں اس کا رنگ معمول سے زیادہ زرد نظر آ رہا تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے اور رات بھر جاگنے کے سبب آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ اس نے ہانپی ہوئی دمہ زدہ آواز میں کہا "شاہ جہاں، ذرا اندر آؤ... اور شیدے تم بھی آ جاؤ۔"

پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں اوجھل ہو گیا۔ میں اور شیدا اس کے کمرے میں پہنچے تو وہاں گوپی ناتھ کے علاوہ ایک لمبا چوڑا پولیس انسپکٹر بھی موجود تھا، گوپی ناتھ نے تعارف کرایا "یہ انسپکٹر انور پاشا ہے۔ نرس شوبھا کے کیس کی تفتیش یہی کر رہا ہے۔"

انسپکٹر سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ شیدے کو اچھی طرح جانتا ہے بلکہ اس کا احترام بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے وہ پولیس والا تھا اور پولیس غنڈوں کا احترام نہ کرے گی تو کیا معزز شہریوں کا کرے گی؟ معزز شہری انہیں مسائل کے علاوہ کیا دیتے ہیں؟ غنڈوں سے وہ ماہواری وصول کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر دعوتیں اڑاتے ہیں، مجرے دیکھتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے انسپکٹر انور پاشا اور گوپی ناتھ کے درمیان شوبھا کے معاملے پر کافی بات چیت ہو چکی ہے۔ انسپکٹر کے سامنے میز پر ایک فائل پڑی تھی جس پر ملازمین کے بیانات لکھے تھے اور دیگر تفصیل درج تھی۔

گوپی ناتھ نے دو تین گہری سانسیں لے کر کہا "انسپکٹر انور میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ ہم اس کے سامنے اتنی ہی بے تکلفی سے باتاں کر سکتے ہیں، جتنی بے تکلفی سے آپس میں کرتے ہیں۔ کیوں انسپکٹر انور؟"

"بالکل تاؤ جی۔" انسپکٹر نے سعادت مندی سے سر ہلایا "ہم ہر قسم کی باتاں کر سکتے ہیں، بلکہ وہ باتاں بھی کر سکتے ہیں جو نہیں کرنی چاہئیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

انسپکٹر انور بولا "ہمیں نے آپ کو پہچان لیا ہے مسٹر شاہ جہاں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم برآمدے میں تھے تو تاؤ جی نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ آپ ابج شاہ جہاں ہیں۔ بہرحال آپ کو پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ آف دی ریکارڈ ہے اور رہے گا۔"

شاید میں اور انسپکٹر اس موضوع پر مزید بات کرتے لیکن بڈھا گوپی ناتھ بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔ اس نے ایک کاغذ میرے سامنے پھیلا دیا اور بولا "جہانی! اب تک ہم نے جو بھی بھاگ دوڑ کی ہے اس کے نتیجے میں تین مشکوک بندے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ یہ دیکھو، یہ ہیں ان کے نام۔ نمبر ایک گلاب سنگھ۔ یہ بھوپال کے نامی گرامی بدمعاشوں میں سے ایک ہے۔ چند روز پہلے جن غنڈوں نے سربازار شوبھا کو اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی ان میں سے ایک غنڈے کو قریبی دکان دار نے پہچان لیا تھا۔ اس دکان دار نے اس شرط کے ساتھ کہ اس کا نام ظاہر نہیں کیا جائے گا، یہ بیان دیا ہے

کہ اس غنڈے کا نام راموں ہے اور وہ گلاب سنگھ کے گینگ ہی شامل ہے۔ مشکوک افراد میں دوسرے نمبر پر ایک شخص بابول کمار ہے۔ یہ نوجوان تین چار سال پہلے شوبھا کا منگیتر رہا ہے۔ پھر جعلی دوائیں اسٹاک کرنے کے الزام میں یہ پکڑا گیا تھا اور قریباً ایک سال جیل میں رہا تھا۔ اسی دوران میں شوبھا سے اس کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ جیل سے باہر آنے کے بعد اس لونڈے نے ایک دو بار شوبھا کو دھمکیاں بھی دیں لیکن پھر میرے ڈر سے خاموش ہو گیا۔ شوبھا کے سلسلے میں میرے متعلق جو غلط سلط باتیں پھیلی ہیں ان میں اس لونڈے کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ تیسرے مشکوک شخص کے بارے میں، میں آپ کو صرف اس شرط پر بتاؤں گا کہ آپ یہ بات صرف اور صرف اپنے تک رکھیں گے، کم از کم اس وقت تک جب تک میں نہ کہوں۔"

میں نے کہا "آپ بے فکر رہیں تاؤ جی۔"

شیدے نے بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

گوپی ناتھ نے "ہائے ایشور" کہہ کر اپنی بگڑی تگڑی سانس درست کی اور بولا "تیسرا مشکوک شخص چندر پرکاش ہے۔ بے شک وہ میرا بھتیجا ہے۔ وہ کاروبار میں بھی میرا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ میں بہت سے معاملوں میں اس پر وشواس کرتا ہوں لیکن اس کی کچھ عادات میرے لیے سخت پریشانی کا کارن بھی ہیں۔ اس میں لالچ انتہا سے زیادہ ہے اور لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ شوبھا کی گمشدگی کے سلسلے میں، میں چندر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

شیدے نے کہا "صاحب جی! آپ نے یہ موضوع چھیڑا ہے تو اب مجھے بھی حوصلہ ہو رہا ہے کہ میں اس بارے میں ایک بات کہوں۔ میں یہ بات کل رات سے کہنا چاہ رہا تھا لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "ہمارے اندازوں کے مطابق شوبھا بی بی کل صبح ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان غائب ہوئی ہیں۔ کل صبح قریباً یہی وقت تھا جب میں چوہدری گارڈن میں موجود تھا۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ چوہدری گارڈن میں دو بڑے سوئمنگ پول اور ٹینس کھیلنے کے گراؤنڈ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں ایک شاندار ریسٹورنٹ بھی ہے۔ ریسٹورنٹ کا منیجر اور سوئمنگ پول کا انچارج جارج گونڈ میرا دوست ہے۔ میں بھی کبھار اس سے ملنے چوہدری گارڈن جاتا رہتا ہوں۔ کل صبح بھی میں وہاں موجود تھا۔ ٹینس کورٹ میں ٹینس کے مقابلے ہو رہے تھے۔ کئی معزز لوگ بھی وہاں نظر آ رہے تھے، اس کے علاوہ تماشائی بھی تھے۔ میں نے وہاں چندر بابو کو بھی دیکھا۔ چندر بابو کا میچ ایک انگریز سیاح سے ہوا۔ دلچسپ مقابلہ تھا۔ جارج گونڈ تو کسی کام گیا ہوا تھا، میں میچ دیکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میچ کے دوران میں ہی کوئی دس بجے کے قریب ایک باوردی بیرے نے گراؤنڈ میں آ کر چندر بابو کے کان میں کچھ کہا۔ چندر بابو کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے اور وہ فوراً اٹھ کر کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک فون سنا اور ان کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ میچ بالکل آخری مرحلے میں تھا لیکن انہوں نے کھیل ادھورا چھوڑ دیا اور اپنی فیاٹ گاڑی میں بیٹھ کر بڑی تیزی سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد کھلاڑی اور تماشائی کئی منٹ تک چہ میگوئیاں کرتے رہے پھر ایک نیا میچ شروع کر دیا گیا۔ اب وہ سارا منظر بار بار میری نظر میں آ رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ چندر بابو کی اچانک روانگی اور شوبھا بی بی کی گمشدگی میں... تھوڑا بہت تعلق موجود ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر وہ ایسا کون سا سنگین ترین مسئلہ تھا جس کے لیے چندر بابو کو سب کچھ چھوڑ کر اچانک واپس آنا پڑا۔"

شیدے کی بات قابل غور تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے شیدا مجھے جو اہم بات بتانا چاہ رہا تھا وہ یہی تھی۔ گوپی ناتھ اور انسپکٹر انور کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ گوپی ناتھ نے کہا "شیدے! تم کل صبح دس بجے کی بات کر رہے ہو نا؟" شیدے نے اثبات میں سر ہلایا۔ گوپی ناتھ بولا "مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ کل دس ساڑھے دس بجے کے قریب چندر کی کار بڑی تیزی سے اندر آئی تھی۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا تھا اور پھر وہاں سے کوئی چیز لے کر افراتفری میں واپس چلا گیا تھا۔"

انسپکٹر انور کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اپنے مخصوص حیدرآبادی لہجے میں بولا "تفتیش کے لیے یہ واخعہ (واقعہ) ایک بنیاد بن سکتا ہے۔ ہم لوگاں معلوم کر سکتے ہیں کہ کل صبح نو اور دس بجے کے درمیان ایسا کیا واقعہ پیش آیا جس کی خاطر چندر بابو کو افراتفری میں ٹینس کورٹ سے بھاگنا پڑا۔ اس سلسلے میں دفتر سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ چندر کے دوستوں سے بھی ٹوہ لی جا سکتی ہے۔"

گوپی ناتھ بولا "اچھا یہ کام میں خود کرتا ہوں۔ ایک بندہ ہے میرے پاس اس کام کے لیے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے میں اپنی رپورٹ دے دے گا۔"

قریباً ایک گھنٹے بعد جب میں سروج کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا، ساحیں عالی اپنی گھنٹیاں اور مالا میں کھڑکھڑاتا اندر

آگیا۔ سورج نے جلدی سے اٹھ کر اس کے پاؤں چھوئے اور ساری کا پلو سر پر لے لیا۔ سائیں نے دعا دینے والے انداز میں اس سے کہا "ایک اچھی پتنی کی طرح اس کی سیوا کرو۔ تمہیں پھل ضرور ملے گا۔ ساری کھیتی ہری بھری ہو جائے گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اور تم بھی شفیع محمد! ایک اچھے نیک پتی بن کر دکھاؤ۔ یہ تمہارے لیے بڑی بھاگوان ثابت ہوگی۔"

پتا نہیں کیوں سائیں عالی ہمارے درمیان ہر وقت پتی پتنی کا رشتہ جوڑنے پر تُلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی کوششوں سے یہاں تک تو نوبت پہنچ گئی تھی کہ سورج ہر رات میرے بستر پر سوتی تھی۔ اب اس سے آگے معلوم نہیں سائیں کیا چاہتا تھا۔ شاید وہ سچ مچ سورج کے ساتھ میرے بول پڑھوانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سورج نے بڑے ادب سے کہا "کوئی سیوا سائیں جی؟"

سائیں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "گوپی ناتھ تمہیں یاد کر رہا ہے۔ ذرا جلدی سے پہنچ جاؤ وہاں۔ بڈھے کو مٹھی میں رکھو۔ سمجھو فیند بھی تمہاری مٹھی میں ہے۔"

پھر وہ "حق ہو" کے نعرے لگاتا باہر چلا گیا۔ میں گوپی ناتھ کے کمرے میں پہنچا تو وہاں انسپکٹر انور پہلے سے موجود تھا۔ گوپی ناتھ نے کہا "جمائی اَبات کچھ آگے بڑھی ہے۔ ابھی مجھے ایک خانساماں سے معلوم ہوا ہے کہ کل جب چندر پرکاش افراتفری میں گھر آیا تھا تو وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا تھا۔ خانساماں کا دعویٰ ہے کہ چندر ایک کپڑے میں پستول لپیٹ کرلے گیا تھا۔ دفتر سے بھی معلوم ہوا ہے کہ چندر پرکاش کل صبح دفتر نہیں آیا۔"

"لیکن کل تو چھٹی تھی۔" میں نے کہا۔

"چھٹی تو تھی لیکن وہ چھٹی کے روز صبح نو دس بجے دفتر کا ایک چکر ضرور لگاتا ہے۔ وہاں دو تین اخبارات آتے ہیں۔ وہ گھر لے آتا ہے۔ اس کے علاوہ چوکی داروں سے دس پندرہ منٹ گپ شپ کر لیتا ہے۔ یہ اس کا ہر اتوار کا معمول ہے۔ بہرحال دفتر کا چکر نہ لگانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ غیر معمولی بات یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی غلط بیانی کر گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ دفتر گیا تھا اور وہاں پانچ دس منٹ رکا تھا جبکہ چوکی دار ہاشم خاں نے اس کی تردید کی ہے۔"

"دال میں کالا نظر آتا ہے۔" انسپکٹر نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

گوپی ناتھ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے چوکی دار ہاشم خاں کو یہاں بلایا ہے۔ وہ ابھی پانچ منٹ میں پہنچ جائے گا۔ اسے اور چندر کو آمنے سامنے بٹھا کر پوچھو کہ جھوٹا کون ہے۔"

انسپکٹر انور بولا "اگر چندر پرکاش کا جھوٹ ثابت ہو جائے تو پھر میرے خیال میں اسے فوراً شامل تفتیش کرنا چاہیے۔"

اسی دوران میں کال بیل کی آواز سنائی دی اور ایک ملازم نے اندر آکر بتایا کہ چوکی دار ہاشم خاں آگیا ہے۔ گوپی ناتھ نے حکم دیا کہ اسے فوراً اندر لاؤ۔ چوکی دار ہاشم خاں اور گوپی ناتھ کے درمیان ایک بند کمرے میں چار پانچ منٹ بات ہوئی پھر چندر پرکاش بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ کمرے کی کھڑکیاں دروازے بند تھے اندر ہونے والی بات چیت کا لب و لہجہ ہماری سماعت سے بہت دور تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد دروازہ دھماکے سے کھلا اور چندر پرکاش غصے میں بھرا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہانپتا کانپتا گوپی ناتھ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ ہمارے پاس پہنچا اور ملازمین کی پروا کیے بغیر گرج کر بولا "حرام زادہ! مجھے پاگل سمجھتا ہے۔ میں تو اس کی۔۔۔" اور اس سے آگے ننگی گالیوں کی بوچھار تھی۔ دو خاتون ملازمہ وہاں موجود تھیں، وہ کان لپیٹ کر باہر نکل گئیں۔ گوپی ناتھ گالیوں کا کوٹا پورا کر چکا تو انسپکٹر سے مخاطب ہو کر گرجا "انسپکٹر مجھے اپنی نرس شوبھا کے اغوا کے سلسلے میں اپنے بھتیجے چندر پر شک ہے۔ تم اسے شامل تفتیش کر سکتے ہو۔" گوپی کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔

میں نے کہا "تاؤ جی! لیکن بات کیا ہوئی ہے۔ چندر کیا کہہ رہا ہے دفتر نہ جانے کے بارے میں؟"

گوپی ناتھ پھنکارا "جو شخص منہ پر جھوٹ بولے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں چوکی دار ہاشم خاں کو بیس برس سے جانتا ہوں۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا اور وہ کیوں بولے گا جھوٹ؟ وہ کہتا ہے کہ چندر صاحب آفس نہیں آئے تھے۔ ہاں وہ صرف پانچ منٹ کے لیے قریب کی دکان سے چائے لینے گیا تھا۔ وہ دکان بالکل پاس ہی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس "پانچ منٹ" کے دوران میں چندر دفتر آیا ہو، اس نے تالے کھولے ہوں، اندر بیٹھا ہو، اخبار دیکھا ہو اور پھر گاڑی لے کر چلا گیا ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کمینہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک سو ایک فی صد بکواس کر رہا ہے۔ مجھے اب یہ شک ہو رہا ہے کہ اس کتے نے کل صبح کوئی خطرناک کھیل کھیلا ہے۔"

اسی دوران میں چندر پرکاش کا باپ یعنی گوپی ناتھ کا

بھائی رام بھی آگیا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا "کیا ہوا بھائی صاحب۔ کیوں اتنا غصہ کر رہے ہیں۔"

"میرا دماغ چل گیا ہے۔ حواس کھو بیٹھا ہوں میں۔ عقل خانے جمع کرا دو۔" گوپی ناتھ چیخا پھر لہجہ بدل کر بولا "یہ پوچھنا ہے اپنے اس لاڈلے پوت سے پوچھ۔ اس کے لیے اچھا ہے کہ سب کچھ صاف صاف اگل دے۔ ورنہ مجھے ان کی سوگند، تھانے میں وہ جوتے لگواؤں گا کہ اگلی پچھلی نکل جائے گی۔"

"مگر اس نے کیا کیا ہے؟"

"یہ پوچھ کیا نہیں کیا اس نے۔ ہمارا یہ شبہ اب یقین میں بدل رہا ہے کہ شوبھا کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر یہ کیوں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہے کیوں چکر دے رہا ہے۔ پوچھ جا کر اس سے کہ کل وہ پستول لے کر کہاں گیا تھا۔ سہ پہر تین چار بجے تک کہاں رہا تھا۔۔۔" اس سے آگے چندر پرکاش کے لیے گالیوں کی ایک طویل بوچھاڑ تھی۔

ایک دم چندر پرکاش کسی اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اب تک وہ گوپی ناتھ سے دبے لہجے میں بات کرتا رہا تھا، اب بلند آواز میں بولا "تاؤ جی! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے منہ نہ کھولنا پڑے۔ میں اپنے کسی دوست کی وجہ سے چپ تھا، میں اس لیے چپ تھا کہ میرے بولنے سے کسی کا نقصان ہوتا تھا۔ اب آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے تو میرے ساتھ، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کل میں کہاں تھا۔"

"کہاں لے جانا چاہتے ہو ہمیں۔ یہیں بتاؤ کیا بات ہے۔" گوپی نے کہا۔

"یہاں نہیں بتا سکتا۔ آپ کو موقع دکھاؤں گا اور اس بندے سے بھی ملواؤں گا جس کے لیے یہ سب کچھ چھپانا پڑا ہے۔"

"اس بندے کو یہیں بلوا لو۔" انسپکٹر انور نے کہا۔

"بہت خوب! آپ تفتیش کے لیے نکلے ہوئے ہیں اور قدم چلنا بھی آپ کو گوارا نہیں ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو پولیس والے ایک جیب کترے کو پکڑنے کے لیے ساری ساری رات موٹر سائیکل بھگاتے ہیں۔"

گوپی ناتھ تنک کر بولا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ زیادہ بک بک نہ بناؤ۔ چلو دکھاؤ ہمیں کیا دکھانا ہے۔"

انسپکٹر انور کھڑا ہوا تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن چندر پرکاش بولا "آؤ شاہ جہاں! تم بھی آؤ۔" اس نے باقاعدہ میرا بازو پکڑ لیا۔

ہم کمرے سے نکل کر پورچ میں پہنچے، یہاں چندر کی شاندار لینڈ کروزر جیپ موجود تھی، اس کی فیاٹ کار بھی پاس ہی موجود تھی لیکن اس کا سائلنسر خراب تھا جس کی وجہ سے چندر اسے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ میرے اور انسپکٹر انور پاشا کے علاوہ چندر کا پتا رام بھی جیپ میں بیٹھ گیا۔ چندر پرکاش نے بڑی تیزی سے جیپ نکالی اور ٹائروں نے ایک طویل احتجاجی چیخ مار کر اشارہ دیا کہ چندر واقعی بہت برہم ہے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" گوپی ناتھ نے تحکم سے پوچھا۔

"اسٹور پر۔"

"وہاں کیا ہے۔"

"خود جا کر دیکھ لیجیے گا۔" چندر نے کہا۔

چندر کے اس مختصر جواب کے بعد گاڑی میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ یہ اسکول اور آفس ٹائم تھا لہٰذا سڑکوں پر رش تھا۔ چندر کا ایک ہاتھ مسلسل ہارن پر تھا اور وہ بڑی رف قسم کی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ میں ہم ایک بہت بڑے آہنی شٹر والے گودام کے سامنے پہنچ گئے۔ گودام کی پیشانی پر "گوپی ناتھ میڈیکوز" کے الفاظ درج تھے اور نیچے "اسٹاکسٹ" لکھا تھا۔ میں نے ایک چیز خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ گوپی ناتھ کا سارا کاروبار اور جائداد وغیرہ اپنے نام سے تھی۔ مثلاً گوپی ناتھ فارما۔ سیونکل۔ گوپی ناتھ اسٹیٹ ایجنسی، گوپی ناتھ مینشن وغیرہ۔ غالباً معاملات کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے اس نے ہر جگہ اپنا نام استعمال کیا تھا۔

گودام سے باہر ایک کرسی پر ایک لمبا تڑنگا شخص بیٹھا تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ چہرے پر بالکل چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ اس کا نام یعقوب تھا۔ یعقوب کے بارے میں مجھے گوپی ناتھ پہلے بھی بتا چکا تھا۔ اس نے ملازمین میں سے جس بندے کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس کے بھروسے کا ہے اور اسے فیکٹری اور گودام وغیرہ کے حالات سے باخبر رکھتا ہے، وہ یعقوب ہی تھا۔ یعقوب کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ یعقوب یہاں گودام میں اسٹور کیپر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے چونکہ یہیں رہتا تھا لہٰذا اس نے گوپی کو چوکی دار رکھنے کے خرچے سے بھی بچا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یعقوب کچھ خاموش اور گم صم سا بیٹھا ہے۔ گوپی ناتھ اور چندر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک

دم ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا۔ چندر پرکاش نے اس کے قریب پہنچ کر سخت لہجے میں کہا "چابیاں کہاں ہیں؟"

یعقوب کا رنگ کچھ اور زرد ہوگیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چابیاں نکال کر چندر کو تھمائیں پھر ایک دم وہ سسک کر رو پڑا۔ اس نے گوپی ناتھ کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "مجھے معاف کردیں بڑے صاحب۔ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

وہ گوپی ناتھ اور چندر کے قدموں میں جھکا جارہا تھا۔ گوپی ناتھ حیران نظر آرہا تھا۔ ہماری طرح اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ اسٹور کیپر یوں گریہ زاری کیوں کررہا ہے۔ بہرحال یہ تو اس کے چہرے پر درج تھا کہ اس نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ ہم گودام کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک بڑا ہال تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ دواؤں کے بے شمار کارٹن پڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گیلریاں بنا کر ان پر بھی کارٹن رکھے گئے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ادویات کی بڑی بڑی سربمہر بوتلیں تھیں۔ دواؤں کی بو سے دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا حالانکہ چھت پر پنکھے چل رہے تھے اور ایگزاسٹ فین بھی موجود تھے۔

چندر پرکاش ہمیں گودام کے ایک دور افتادہ گوشے میں لے گیا۔ یہاں کا منظر دیکھ کر ہمارے ساتھ ساتھ گوپی ناتھ بھی سناٹے میں رہ گیا۔ ایک نوخیز لڑکی فوم کے گدے پر لیٹی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور سفید ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی تھیں۔ اس کے قریب ہی گلوکوز کا خالی بیگ بھی پڑا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے تک اسے ڈرپ لگی رہی ہے۔ لڑکی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ کوڑا کرکٹ چننے والی کوئی خانہ بدوش ہے۔ بہرحال وہ کچرا اکٹھا کرنے والی عام عورتوں کی طرح زیادہ میلی کچیلی نہیں تھی اور ویسے بھی قبول صورت تھی۔ وہ گہری غنودگی میں تھی۔

اسے دیکھ کر ہم پیچھے ہٹ گئے "یہ کیا چکر ہے؟ یہ کون لڑکی ہے ہمارے گودام میں؟" گوپی ناتھ نے پھنکار کر چندر سے پوچھا۔

چندر بولا "اگر آپ یہ سوال یعقوب سے پوچھتے تو زیادہ اچھا تھا۔ بہرحال اب وہ تو بول نہیں سکتا' مجھے ہی بتانا ہوگا۔ کل صبح سویرے یعقوب نے اس لڑکی کو گودام میں لاکر اس سے بلادکار کیا ہے۔"

گوپی ناتھ بتانے میں رہ گیا "یہ۔۔۔ تم کیسے کہہ سکتے؟"

"مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ یعقوب خود اقبال کرچکا ہے۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟" انسپکٹر انور نے پوچھا "یہاں کوئی اور بندہ موجود نہیں تھا۔"

"آپ کو پتا ہی ہے' کل چھٹی تھی۔ یہ سارا گودام علاقہ ہے' چھٹی کے دن تو خاص طور سے یہاں ہو کا عالم ہوتی ہے۔ یہ کچرا اٹھانے والی لڑکی شاید ایک دو دفعہ پہلے یعقوب سے مل چکی ہے۔ کل صبح سویرے وہ کچرے کے لئے آئی تو یعقوب کو موقع مل گیا۔ یعقوب کے رہنے کے لئے گودام سے باہر جو چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی ہے اس کا دروازہ وغیرہ نہیں ہے لہٰذا وہ گودام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے گودام کا تالا کھولا اور لڑکی کو لے کر اندر چلا گیا۔ ایک اتفاق تھا کہ میرا اسسٹنٹ امیر علی اس طرف آنکلا۔ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یعقوب اپنی ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ گودام کے چھوٹے دروازے پر تالا بھی موجود نہیں تھا۔ یعقوب کی بھری ہوئی رائفل کوٹھڑی میں فرش پر پڑی تھی۔ امیر علی کو شک گزرا کہ شاید یعقوب کے ساتھ کچھ ہوگیا ہے۔ دو دن پہلے بھی ایک قریبی گودام میں ڈاکا پڑ چکا تھا۔ امیر علی نے بار بار گودام کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ یعقوب اس وقت لڑکی کے ساتھ مشغول تھا۔ امیر علی گھبرا گیا' اس نے فوراً مجھ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں چوہدری گارڈن میں ٹینس کھیل رہا ہوں۔ اس نے فوراً مجھے وہاں فون کیا اور بتایا کہ گودام میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اسٹور کیپر یعقوب موجود نہیں اور اس کی رائفل کوٹھڑی میں پڑی ہے۔ اس کے علاوہ گودام کے اندر کوئی موجود ہے اور بار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود دروازہ نہیں کھول رہا۔ میں فوراً کھیل چھوڑ کر گھر آیا' وہاں سے بھرا ہوا ریوالور لیا اور یہاں گودام پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک یعقوب نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ خوف سے زرد اور پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گودام میں سو رہا تھا۔ اس کی بات پر یقین کرنا ناممکن تھا۔ گودام میں گرمی اور دواؤں کی شدید بو کے سبب سونے کی حماقت نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر گودام کا جائزہ لیا۔ سامنے والی دیوار کے پاس پہنچا تو اچانک ایک بڑے ڈرم کا ڈھکنا کھلا اور ایک برہنہ لڑکی نظر آئی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ڈرم سے نکلنے کی کوشش کی اور چکرا کر ڈرم سمیت ایک طرف لڑھک گئی۔ یہ وہی کچرا اٹھانے والی لڑکی تھی جو اب وہاں بیمار پڑی ہے۔ ہم نے لڑ

کو اٹھا کر قوم پر لٹایا اور اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ لڑکی پر غشی طاری تھی اور وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اگر اسے اسپتال لے جایا جاتا تو بدنامی کا خطرہ تھا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے ایک دوست ڈاکٹر کو یہیں گودام میں بلا لیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ لڑکی کی یہ حالت دم گھٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ دراصل جب امیر علی نے باہر سے گودام کا دروازہ کھٹکھٹانا جاری رکھا تو یعقوب نے گھبرا کر لڑکی کو اس خالی ڈرم میں بند کر دیا اور اوپر سے ڈھکن لگا دیا۔ ڈرم میں کسی کیمیکل کی آلائش بھی موجود تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ دس منٹ میں لڑکی کا سانس پھنسنے لگا اور جی بری طرح متلانے لگا۔ وہ کراہتی ہوئی باہر نکلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

ایک لمحہ توقف کر کے چندر پرکاش نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولا "تاؤ جی! میں یعقوب کی اس ذلیل حرکت کے بارے میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن یہ میرے پاؤں پڑ گیا۔ بڑی دیر تک منت سماجت کرتا رہا۔ آخر میں نے آئندہ کے لیے اس سے مکمل نیک چلنی کا وعدہ لیا اور اسے تسلی دی کہ یہ بات تاؤ جی تک نہیں پہنچے گی۔ یہی وجہ تھی کہ آج صبح مجھے آپ سے کئی جھوٹ بولنے پڑے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ یعقوب پر زد نہ آئے لیکن اب یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ بہرحال آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ یعقوب نے تہ دل سے معافی مانگی ہے اور سوگند کھائی ہے کہ آئندہ ایسی کوئی بات اس کی طرف سے سننے میں نہیں آئے گی۔"

یہ ساری گفتگو انکشاف انگیز تھی۔ چندر پرکاش نے نہ صرف اپنی صفائی پیش کر دی تھی بلکہ کسی حد تک یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ اخلاقی قدروں پر یقین رکھتا ہے۔ یعقوب کی پردہ پوشی کا جو وعدہ اس نے کل کیا تھا، اسے نبھانے کی اس نے پوری کوشش کی تھی اور خاصا دباؤ برداشت کیا تھا لیکن جب بات حد سے آگے نکل گئی تھی تو اسے زبان کھولنی پڑی تھی۔

یعقوب لرزاں و ترساں دروازے میں کھڑا تھا۔ یقیناً وہ گوپی ناتھ کے بے پناہ غضب سے ڈر رہا تھا، تاہم خیریت ہی گزری۔ گوپی ناتھ ان لمحوں میں اتنا پریشان تھا کہ شاید اس کے پاس غصہ کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس نے قدرے نرم لہجے میں چندر پرکاش سے پوچھا "بڑھیا کے پیچھے تو کوئی نہیں آیا؟"

"اس کی ماں ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں پہنچی تھی۔ یہ کل رات نو دس بجے کا واقعہ ہے۔ میں نے بڑھیا کو لڑکی سے ملا دیا ہے اور ہر طرح کی تسلی بھی دے دی ہے۔ دو ہزار لے کر بڑھیا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس واقعے کے بارے کسی کو نہیں بتائے گی اور جونہی اس کی بیٹی کی طبیعت ہو گی، وہ اسے یہاں سے لے جائے گی۔"

چندر پرکاش کی طرح اس کا پتا رام بھی گوپی ناتھ بہت ناراض نظر آ رہا تھا۔ گوپی ناتھ گالیاں بھی تو ایسی بک رہا تھا جو کانوں کے راستے دماغ میں گھس کر بیٹھ جاتی اور نکلنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

○☆○

چندر پرکاش کے بارے میں ہمارا شبہ کافی حد تک ثابت ہو گیا تھا۔ جس معاملے کے حوالے سے چندر پرکاش جا رہا تھا وہ ایک بالکل مختلف معاملہ نکلا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بالواسطہ طور پر ثابت ہوتی تھی کہ جن اوقات میں شوبھا غائب ہوئی، چندر پرکاش ایک دوسرے مسئلے میں الجھا ہوا تھا (یعنی گودام والے مسئلے میں)۔

شام کو میں نے گوپی ناتھ سے ملاقات کی۔ اس کی آج ضرورت سے زیادہ پھولی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا: بلڈ پریشر بھی بہت ہائی ہے، اس کے باوجود وہ کانپتے ہاتھوں بلیک کافی کی چسکیاں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولا "شوبھا کو غائب ہوئے تیرہ ہونے کو آئے ہیں مگر ہم اب بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں چلے تھے۔"

میں نے کہا "میں بڑے احترام کے ساتھ آپ سے اختلاف کرنے کی جرأت کروں گا۔ ہم زیادہ نہیں تو بہت آگے بڑھے ہیں، سوچیں۔ ہمیں سب سے پہلے ... شک پڑا تھا۔ ہم نے چھان بین کی اور یہ شک غلط ثابت ... پھر آپ نے چندر صاحب پر شک کا اظہار کیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شبہ بھی اب پچانوے فی صد دور ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے دو مشکوک افراد اور ہیں۔ ان میں سے ایک نام آپ گلاب سنگھ بتا رہے ہیں اور دوسرا شوبھا کا سابق ... راہول کمار ہے۔ گلاب سنگھ کے بارے میں تو آپ نے فرمایا تھا کہ انسپکٹر انور سرگرمی سے تفتیش کر رہا ہے اور دس بارہ گھنٹے میں کوئی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔ باقی رہا شوبھا کا سابق منگیتر راہول۔ تو اگر آپ کا حکم ہو تو اسے ٹٹول کر دیکھ لیتے ہیں۔"

راہول کے نام پر گوپی ناتھ کی گدلی آنکھوں میں ... پھر نفرت اور شک کی چمک نظر آنے لگی۔ وہ بولا "وہ ایک کمینہ شخص ہے اور بڑے سے بڑے کام کی توقع

رکھی جا سکتی ہے۔ شاید اسے بھی شک پڑ گیا ہے کہ پولیس ہاتھ ڈال سکتی ہے، وہ اپنے کسی ٹھکانے پر موجود نہیں ہے۔ انسپکٹر انور نے دو سادہ کپڑوں والے اس کی تلاش میں لگا رکھے ہیں۔"

گوپی ناتھ پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور کافی کی پیالی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ میں نے جلدی سے پیالی پکڑ لی۔ تھوڑی دیر گوپی ناتھ کا ہڈیوں بھرا سینہ ملا اور پھر بستر پر جسم دراز کر دیا۔ وہ ملازمین کو ننگی گالیاں دینے لگا کہ سب سر شام کس ماں کے پاس چلے گئے ہیں۔ گالیاں بکنے کے بعد اس کے غصے کا لیول ذرا نیچے آیا تو چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش بھی ٹھیک ہو گئے۔ وہ سگریٹ پینا چاہتا تھا۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی میں نے سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میری "فرماں برداری" اور ذمہ داری کا یہ انداز اسے پسند آیا۔ کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تمہارے سائیں عالی کی بات پر میرا وشواس روز بروز پختہ ہوتا جا رہا ہے۔" وہ بولا۔

"کس بات پر؟"

"یہی کہ تم اور سروج، میری بہن اور بہنوئی کا دوسرا جنم ہو۔ وہ دونوں تمہارے شریر کو اپنا کر ایک بار پھر اس جگ میں آئے ہیں تاکہ میرے گھائل دل کو مرہم مل سکے۔" پھر وہ یک دم چونک کر بولا "میں نے سروج کو ایک جوڑا دیا تھا۔ میری بہن کے داج کے کپڑوں میں سے تھا۔ وہ بڑی سندر لگتی تھی اس جوڑے میں۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اب تمہاری پتنی سروج بھی وہی جوڑا پہنے۔ پتا نہیں اس نے ابھی تک کیوں نہیں پہنا۔ شاید بھول گئی ہے۔"

"میں اس سے کہوں گا کہ وہ پہنے۔" میں نے گوپی کو تسلی دی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اپنے کمرے کی طرف گیا تو اندر سے سائیں عالی کی غصیلی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ سروج کی دبی دبی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"ہائے رام میں مر گئی۔ سائیں جی! مجھے چھما کر دیں۔ بھگوان کے لیے۔" وہ منت سماجت کر رہی تھی۔

میں نے ادھ کھلے دروازے سے جھانکا تو منظر چونکا دینے والا تھا۔ سائیں عالی نے سروج کو ایک میز پر کھڑا کر رکھا تھا اور چھڑی سے اس کی پنڈلیوں اور کمر پر ضربیں لگا رہا تھا۔ غصے کے سبب سائیں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"حرام زادی! تو زبانی کلامی ماننے والی ہے ہی نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انسان ہے ہی نہیں تو۔ کتے کی دم ہے۔ اللہ نے اچھی بھلی صورت دی ہے لیکن اپنی بے پروائی سے اپنا ستیاناس کر رکھا ہے تو نے۔ اگر تیرے اندر ذرا سی بھی لیاقت ہو تو وہ شفیع محمد تیرے تلوے چاٹتا نظر آئے۔ لیکن دو ڈھائی سال میں تو اتنا بھی نہیں کر سکی کہ اس کی زبان سے اپنے لیے پتنی کا لفظ ہی نکلوا سکے۔ بتا اس نے کبھی ایک بار بھی تجھے پتنی یا بیوی کہا ہے؟"

سروج کراہتے ہوئے بولی "میں کیا کروں سائیں جی... اگر میں کوئی کوتاہی کر رہی ہوں تو مجھے بتائیں۔ اس کے من پر تو مجھے اختیار نہیں۔"

سائیں نے پے در پے کئی ضربیں اس کی پنڈلیوں پر لگائیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ سائیں غرایا "آگے سے زبان چلاتی ہے۔ زبان چلاتی ہے آگے سے۔"

سروج نے ہاتھ جوڑ دیے "میری اتنی جرأت کہاں سائیں جی۔ میں تو۔۔۔"

"خاموش" سائیں عالی دہاڑا "تمہارے جیسی ناری اگر چاہے تو سخت سے سخت مرد کا دل اپنی مٹھی میں کر سکتی ہے مگر تیرا دھیان پتا نہیں کس طرف رہتا ہے اور تو اور تو گوپی ناتھ کا دل بھی نہیں جیت سکی۔ بڈھا تجھے اپنی سگی بہن کہہ رہا ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے، اس نے تجھے کپڑوں کا جوڑا دیا تھا تو اتنی مغرور ہے کہ تو نے اب تک وہ جوڑا نہیں پہنا۔ اگر پہن لیتی تو اس کا من خوش ہوتا اور الو کی بچی! یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جن سے کسی کا دل جیتا جاتا ہے۔"

"سائیں جی! مجھے نہیں پتا تھا کہ انہوں نے ابھی پہننے کو دیا تھا۔ میں نے سوچا کسی دن پہن لوں گی۔"

"تو جھوٹ بولتی ہے، تو نے صرف نخرے کی وجہ سے نہیں پہنا ہو گا۔"

"مجھ سے جو جی چاہے سوگند لے لیں۔ میں نے ایسا نہیں کیا سائیں جی۔"

سروج ایک تیز طرار انڈین ایکٹریس تھی۔ اپنے مخاطب کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی لیکن سائیں عالی کے سامنے وہ ہمیشہ بھیگی بلی نظر آتی تھی اور سائیں کا غضب اس کے جسم پر تھرتھراہٹ طاری کر دیتا تھا۔ گرو اور چیلی کے اس رشتے میں محبت، عقیدت اور غیظ و غضب کا عجیب سا امتزاج نظر آتا تھا۔

سائیں عالی نے سروج کی پنڈلی پر آخری دو ضربیں لگائیں اور کرخت آواز میں بولا "چل دفع ہو۔ اپنا حلیہ ٹھیک کر اور ابھی وہ کپڑے پہن۔ میں شفیع محمد کو تیری طرف بھیجتا

ہوں۔ رات کا کھانا تم دونوں گوپی ناتھ کے ساتھ کھاؤ گے۔ سمجھ میں آئی میری بات؟"

"جی سائیں جی۔" سروج اپنی پنڈلیاں سہلاتے ہوئے بولی۔

اسی دوران میں میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ سروج ٹھٹک کر میز سے نیچے اتر آئی تاہم سائیں عالی کے چہرے پر چونکنے کے آثرات نظر نہیں آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے سائیں عالی دروازے کے پیچھے میری موجودگی سے آگاہ تھا۔ کم از کم اسے یہ شک ضرور تھا کہ میں دروازے کے پاس موجود ہوں۔ اس کے باوجود وہ اپنی چیلی پر چھڑیاں برساتا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اس طرح میرے دل میں سروج کے لیے جذبہ ترحم ابھارنا چاہتا تھا یا چاہتا تھا کہ سروج کی بے چارگی دیکھ کر میں اس کے لیے اپنا دل کچھ اور کشادہ کرلوں۔ وہ اکثر ایسی حرکات کرتا تھا جو بظاہر بے معنی ہوتی تھیں لیکن بعد میں ان کے دور رس نتائج سامنے آتے تھے۔

مجھے دیکھ کر سائیں نے وجد کے انداز میں سر ہلایا اور زوردار نعرہ لگایا "دل دھڑکا دفینے کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔۔۔ دل دھڑکا دفینے کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔۔۔ ہا ہا دل دھڑکا۔" اپنے پاؤں کو رقص کے انداز میں حرکت دیتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔

سروج خاموش کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ آنسو پونچھ کر اس نے وارڈ روب کھولی، ایک لباس نکالا اور جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ میں وہیں ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور گرو چیلی کے عجیب و غریب کرداروں پر غور کرتا رہا پھر میرا دھیان سائیں عالی کے نعرے کی طرف چلا گیا۔ اس نعرے میں سائیں عالی ہر مرتبہ کوئی نیا لفظ استعمال کرجاتا تھا۔ اب کی بار اس نے "دفینے" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شاید یہ بھی کوئی اشارہ تھا۔ ممکن تھا کہ سائیں عالی یہ بتانا چاہ رہا ہو کہ ہم دفینے اور نوادرات کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور اب ہمیں اس سلسلے میں بہت زیادہ سنجیدہ ہو جانا چاہیے۔

پندرہ بیس منٹ بعد سروج نہا دھو کر نکل آئی۔ وہ بہت نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔ اس کے جسم پر ایک بھاری بھرکم حیدرآبادی لباس تھا۔ عنابی رنگ کی شلوار اور عنابی پھولوں والی قمیص تھی۔ قمیص پر چھوٹے چھوٹے آئینے ٹکے تھے اور کڑھائی کا نہایت خوب صورت کام تھا۔ گریبان اور آستینوں پر رنگین ڈوریاں سی لٹک رہی تھیں۔ اوڑھنی بھی بھاری بھرکم تھی۔ سروج نے اوڑھنی سر پر لینے کے بجائے تہ کرکے ایک کندھے پر ڈال لی تھی۔ موسم کے لحاظ سے تو لباس ٹھیک نہیں تھا بہرحال سروج کو اچھا لگ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ سنگار میز کے سامنے گزارنے کے بعد سروج تیار ہوگئی۔ وال کلاک آٹھ کا وقت بتا رہا تھا۔ یہ ڈنر ٹائم تھا۔ سائیں عالی کی ہدایت کے مطابق ہمیں ڈنر گوپی ناتھ کے ساتھ کرنا تھا۔ ہم ڈائننگ ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ سائیں عالی کی ہدایت تھی کہ گوپی ناتھ کے سامنے ہمیں بالکل پتی پتنی نظر آنا چاہیے اور پتی پتنی بھی ایسے جو ایک دوسرے کے پریم میں غرق ہوں۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہونے سے پہلے میں نے سروج کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ سسکاری لے کر رہ گئی۔ سائیں عالی کی پٹائی نے یقیناً اس کی کمر کو بھی متاثر کیا تھا۔

ہم نے کھانا گوپی ناتھ کے ساتھ کھایا۔ گوپی ناتھ مسلسل سروج سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی وہ اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ کبھی اس کے سر پر دست شفقت رکھتا۔ رنگین مزاج بڈھے کا روپ اس کی عام زندگی سے قدرے مختلف تھا۔ قریباً چھبیس برس پہلے سورگ باشی ہوجانے والی بہن کا عکس اسے سروج میں نظر آنے لگا تھا اور اس حوالے سے وہ مجھے بھی پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت دینے لگا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ پہلے مجھے صرف جہانی کہہ کر مخاطب کرتا تھا لیکن اب بڑے اہتمام سے شاہ جہاں کہتا تھا۔ شاید ایسا وہ اس لیے کرتا تھا کہ "شاہ جہاں" اور "جگجیت" کے ناموں میں کافی مشابہت تھی اور جگجیت اس کا سابق بہنوئی تھا۔

کھانے کے دوران میں زیادہ گفتگو شوبھا کی گمشدگی پر ہوتی رہی۔ اسے لاپتا ہوئے اب دو دن ہونے کو آئے تھے اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ گوپی ناتھ کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ کھانے کے بعد میں اور سروج اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ سائیں عالی کی چھڑی نے سروج کی پشت پر لاسیں ڈال دی تھیں۔ اوپر سے گرمی بھی تھی، لہٰذا بھاری بھرکم لباس اسے بری طرح کاٹ رہا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے لباس اتار پھینکا اور ہلکی پھلکی نائٹی پہن لی۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئنٹ منٹ تھا۔ بولی "یہ ذرا میری کمر پر لگا دو۔"

دوا کا لگوانا تو بس ایک بہانہ ہی تھا، وہ قریب آنا چاہ رہی تھی اور وہ قریب آگئی۔ اس کی بانہیں آکٹوپس کی طرح مجھے جکڑنے لگیں۔ میں اس میں الجھا رہا اور سوچتا رہا کہ دانا شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ عورت کے دل میں جھانکنا دنیا کا سب سے دشوار کام ہے۔ سروج ہر دم میرے قریب تھی لیکن میں اسے ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس کی طرح اس کی قربت

بھی سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ قربت کس بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ ممکن تھا کہ اس قربت کا سبب سائیں عالی کی ہدایات ہوں یا پھر سروج کی نفسیاتی الجھنیں اسے میرے قریب آنے پر مجبور کرتی ہوں یا پھر دفینے اور نوادرات کا لالچ اسے مجبور کرتا ہو کہ وہ ایک پتنی کی حیثیت سے میرے ساتھ رہے اور میری بے رخی کے باوجود مجھ سے چمٹی رہے اور پھر وہ بات بھی ہو سکتی تھی جو سروج کہتی تھی۔ سروج کا موقف یہ تھا کہ بے شک میرے قریب آنے میں اس کا مفاد پوشیدہ ہے لیکن بات اب صرف مفاد ہی کی نہیں رہی، وہ مجھ سے حقیقی وابستگی محسوس کرنے لگی ہے، خصوصاً جب سے راوی داخان والا واقعہ پیش آیا ہے، اسے یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ میرے بغیر ادھوری اور ناکارہ ہے۔

علی الصباح شیدا مع اپنے گن مین کے آدھمکا۔ کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! رات بھر نیند نہیں آئی۔ دل آپ ہی میں اٹکا رہا۔"

"کیوں، میرا چہرہ کسی پری جمال سے ملنے لگا ہے!"

وہ میرے مذاق کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "میری چچا زاد راحت والے واقعے نے مجھے تہ دل سے آپ کا مشکور کیا ہے۔ راحت اور اس کے گھر والے میری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے، ان کا خیال یہی ہے کہ راحت کی عزت اور زندگی میری وجہ سے بچی ہے۔ انھیں یہ خبر نہیں کہ میں تو مجبوراً وہاں گیا تھا اور راحت کو چھڑانے کی ساری کارروائی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ ان لوگوں کے منہ سے میں جتنی بار اپنی تعریف سنتا ہوں اتنی بار مجھے آپ یاد آتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں کہ کبھی کبھی کچھ اتفاق انسان کو ایک دوسرے کے کتنا قریب کر دیتے ہیں۔ ابھی یہ زیادہ دن کی بات نہیں کہ آپ سے چاقو زنی کا مقابلہ ہارنے کے بعد میں نے آپ سے سخت رنجش محسوس کی تھی لیکن اب وہ سوچ سراسر حماقت محسوس ہوتی ہے۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "گوپی ناتھ صاحب نے ہم دونوں پر شوبھا بی بی کو ڈھونڈنے کی ذمے داری ڈالی ہے، خاص طور سے آپ پر انہیں بہت اعتماد ہے۔ میں رات بھر یہی سوچتا رہا ہوں کہ اس اعتماد پر کیسے پورا اترا جاسکتا ہے۔"

"پھر کیا نتیجہ نکالا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہم شوبھا کے منگیتر کی طرف چلیں گے۔"

"یعنی راہول کی طرف۔"

"جی ہاں۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل بھی کی ہیں۔ وہ آج کل ڈاکٹر بنا بیٹھا ہے۔ اندال پورہ میں اس نے باقاعدہ کلینک کھول رکھا ہے۔ حکمت، ہومیو پیتھک اور پتا نہیں کون کون سے پیتھک چلا رہا ہے لوگوں کو۔ خیر ہمیں اس سے غرض نہیں۔ ہمیں تو شوبھا بی بی کا کھوج چاہیے۔"

"تو کیا خیال ہے، سیدھا سیدھا ہاتھ ڈالنا ہے اس پر یا کوئی پلاننگ وغیرہ ہے؟"

"پلاننگ تو ہے ایک میرے ذہن میں۔ لیکن اس میں دو چار روز کا وقت لگے گا جبکہ گوپی ناتھ صاحب مزید تاخیر کے موڈ میں نہیں۔"

ہم کچھ دیر اس معاملے پر بات کرتے رہے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ شوبھا کے سابق منگیتر محترم راہول صاحب پر براہ راست ہاتھ ڈالا جائے اور کسی محفوظ مقام پر ان کی "میزبانی" کا شرف حاصل کیا جائے۔ یوں تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی کرایا جاسکتا تھا مگر اس میں کئی ایک قباحتیں بھی موجود تھیں، (ایک قباحت یہ بھی تھی کہ راہول کا بڑا بھائی بھوپال پولیس میں تھانے دار تھا) لہٰذا شیدا چاہتا تھا کہ پولیس کو زحمت دینے کے بجائے ہم خود حرکت میں آئیں۔

نو بجے کے لگ بھگ ہم ایک بند اسٹیشن ویگن میں بیٹھے اور گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے پر پہنچ گئے۔ راہول کا کلینک یہاں پاس ہی واقع تھا۔ ہم نے ویگن اس کے کلینک سے قریباً پچاس گز کی دوری پر پارک کردی۔ میں ابھی تک اسی ریڈی میڈ میک اپ میں تھا جس میں مالاں کے کوٹھے پر گیا تھا۔ میرا لباس بھی عام بھوپالیوں جیسا تھا۔ کلینک کے سامنے کافی اسکوٹر، موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ دو تین کاریں بھی نظر آرہی تھیں۔ مطلب یہ کہ کلینک میں کافی رش تھا، آثار بتا رہے تھے کہ ابھی یہ رش بڑھے گا۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ایک اچھا معالج ہی عوام میں مقبول ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جھاڑ پھونک کرنے والے فراڈیے جو طب کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوتے، اپنے گرد مریضوں کا ہجوم اکٹھا کرلیتے ہیں۔ سادہ لوح لوگ ایسے عطائیوں سے دوا لینے کے لیے قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں اور دنوں تک انتظار کرتے ہیں۔ خاص طور سے برصغیر میں یہ توہم پرستی بہت عام ہے۔ راہول کے کلینک پر بھی کچھ ایسی ہی صورت حال نظر آتی تھی۔

"یہ تو گڑبڑ ہو گئی۔" میں نے کہا "اتنے بندوں میں سے قبلہ ڈاکٹر صاحب کو کیسے نکالیں گے؟"

"ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔" شیدے نے تائید کی "بہتر تھا کہ ذرا جلدی آجاتے اور خبیث کو گھر سے ہی کیچ کر لیتے۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو یہ کلینک آگیا ہے' شام کو ہی واپس جائے گا اور شام تک انتظار کرنا بڑا مشکل ہے' خاص طور سے گوپی ناتھ صاحب تو اتنی تاخیر کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "ایک طریقہ ہے' مریض دکھانے کے بہانے اسے کلینک سے نکالا جائے اور گاڑی میں بٹھا لیا جائے۔ ہے تو لالچی آدمی۔ ممکن ہے کہ بھاری فیس کی امید دلائی جائے تو کلینک سے اٹھنے کو تیار ہو جائے۔"

ہم نے اس معاملے پر تھوڑی سی سوچ بچار کی۔ شیدا خود تو کلینک میں داخل نہیں ہو سکتا تھا' اسے خدشہ تھا کہ راہول اسے پہچانتا ہے۔ شیدے کے بعد اس کا گن مین رنجیت راجا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ میں کلینک میں جاؤں گا اور راہول کو اپنی بیوی کی نازک حالت کا بتا کر اپنے ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔

میں کلینک میں داخل ہوا۔ کلینک عورتوں' مردوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب" کی معاونت کے لیے دو کمپاؤنڈر اور ایک میلی کچیلی نرس بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایک اسسٹنٹ بھی تھا جو مریضوں کے منہ میں تھرما میٹر گھسیڑ رہا تھا اور ان کے کوائف وغیرہ درج کر رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کی تختی والے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اسسٹنٹ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹا "کیا بات ہے' کیا آفت آگئی ہے؟" وہ کرخت لہجے میں بولا۔

"بس آفت ہی آگئی ہے جی۔ میری بیوی کی حالت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے بات کرنی ہے۔"

اسسٹنٹ مجھے روکتا ہی رہ گیا' میں بجڑا مار کر "مشورے" والے کمرے میں گھس گیا۔ ڈاکٹر کی صورت دیکھ کر یقین نہیں آیا کہ ڈاکٹر ایسے بھی ہوتے ہیں' اسے دیکھ کر یوں لگا کہ ایک مریض کے سامنے دوسرا مریض بیٹھا ہے اور دونوں حالات کی سختی اور دنیا کی بے ثباتی پر غور کر رہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا وزن بمشکل ۹۰ پاؤنڈ اور قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا' رنگ گندمی تھا اور چہرے پر بلاوجہ کی خشکی و آدم بیزاری تھی۔ اسکول میں جیسے پتلے پتلے لڑکوں کو دیکھ کر ہم کہا کرتے تھے ___ اللہ کی شان دیکھو' کانے میں جان دیکھو۔

نجانے کیوں محترم ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر برسوں بعد یہی شعر ذہن میں آگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں سب سے جاندار شے ان کا لباس تھا۔ انہوں نے اپنی خداداد جسمانی کمزوری کو شان دار پتلون قمیص اور ٹائی میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے نہایت چڑچڑے پن سے ارشاد فرمایا۔

میں نے وہی بات کی جو چند لمحے پہلے اسسٹنٹ صاحب سے عرض کی تھی "کہاں ہے مریضہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں ___ میں گاڑی لایا ہوں۔ آپ کی جو بھی فیس ہے' میں دینے کو تیار ہوں۔"

وہ میری توقع سے زیادہ چڑچڑا اور بد مزاج نکلا۔ بگڑ کر بولا "فیس کا تم سے کسی نے پوچھا ہے جو وضاحتیں پیش کر رہے ہو۔ باقی یہ میرا کلینک کا ٹائم ہے' میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ ہاں مریضہ کو کسی طرح یہاں لے آؤ تو میں جلدی دیکھ لوں گا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب' اس کی حالت اس قابل نہیں۔ پلیز ___"

"تو کسی اور کے پاس لے جاؤ' یہاں بہت سے کلینک ہیں۔ اینٹ اکھاڑیں تو نیچے سے ڈاکٹر نکل آتا ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب ___"

میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس سڑیل نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کر دیا تھا' وہ بڑی بدتمیزی کے ساتھ مجھے دھکیل کر کمرے سے باہر لے آیا۔ جی میں تو آئی کہ ریوالور نکال کر ڈاکٹر صاحب کی مرغے جیسی گردن پر رکھ دوں اور بغل میں دبا کر باہر گاڑی میں لے جاؤں لیکن اس میں شدید شور شرابے اور نقص امن کا خطرہ تھا' لہٰذا دل ہی دل میں ڈاکٹر کو کوس کر باہر آگیا۔ گاڑی میں پہنچا تو شیدا اور گن مین راجا شدت سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر کی گردن میں سریا ہے۔

شیدے نے کہا "میرے خیال میں یہ کہنا چاہیے کہ سریے کی گردن میں سریا ہے۔ یہ بڑا کمینہ شخص ہے۔ اس نے ایک بڑی بے ہودہ قسم کی کم بختی گوپی ناتھ صاحب کے ساتھ بھی کی تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ گوپی ناتھ صاحب کو طاقت ور حکیمی نسخے کھانے کا شوق ہے۔ اسی شوق کے چکر میں وہ ایک عطائی ڈاکٹر سری کانت کے پاس بھی جاتے تھے۔ سری کانت اور راہول گہرے دوست ہیں۔ کبھی کبھی دونوں مل کر بھی حکیمی اور ہومیو پیتھک نسخے تیار

کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ایسا نسخہ تیار کیا جسے چار پانچ روز کھانے سے ہی بندے میں بے پناہ طاقت آجاتی تھی' بھوک کئی گنا بڑھ جاتی تھی اور طبیعت اتنی ہشاش بشاش ہو جاتی تھی کہ بندے کا دل چاہتا تھا وہ کسی کو مار بیٹھے لیکن چار پانچ روز کے بعد دوا ایک دم اثر کھو دیتی تھی۔ کھانا دیکھ کر ابکائی آنے لگتی تھی' دل و دماغ ماؤف ہو کر رہ جاتے تھے۔ کمزوری مکمل ناتوانی میں بدل جاتی تھی۔ اس نسخے کے بد اثرات دیکھ کر سری کانت اور راہول نے اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن نسخے کی تیاری پر جو رقم خرچ ہوئی تھی وہ بھی تو وصول کرنی تھی۔ راہول کے کہنے پر سری کانت نے اپنے امیر ترین مریض گوپی ناتھ صاحب کو نشانہ بنایا۔ ان سے ایڈوانس میں کافی ساری رقم لے کر انہیں یہ نسخہ بنا دیا اور خود اپنے اہل خانہ اور کلینک سمیت اتر پردیش چلا گیا۔ بعد میں گوپی ناتھ صاحب کی جو حالت ہوئی وہ بڑی دردناک تھی۔ وہ قریباً قریباً فوت ہی ہو گئے تھے۔ اسپتال کے آئی سی یو میں قریباً دس روز بالکل بے ہوش پڑے رہے۔ بہرحال ابھی سانس باقی تھے جو موت کے منہ سے نکل آئے۔ بعد ازاں انہوں نے سری کانت اور راہول پر کیس بھی بنوایا۔ یہ کیس ابھی تک چل رہا ہے۔ سری کانت پانچ چھ ماہ جیل کاٹنے کے بعد پچھلے مہینے ہی ضمانت پر رہا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "سنا ہے کہ راہول اپنی سابق منگیتر شوبھا کے حوالے سے گوپی ناتھ صاحب کو بدنام کرنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہے؟"

"یہ بالکل درست ہے۔ وہ شوبھا کے محلے میں برملا کہتا پھرتا ہے کہ بڈھا رنگین مزاج ہے اور اس نے شوبھا کو اپنی "تفریح" کے لیے رکھا ہوا ہے۔ راہول کی اسی لگائی بجھائی کا نتیجہ ہے کہ شوبھا کے گم ہونے پر اس کے محلے کے دو نوجوان بپھرے ہوئے گوپی ناتھ مینشن پہنچ گئے تھے۔"

میں نے شیدے کو بتایا کہ راہول نے کلینک سے باہر آنے سے انکار کر دیا ہے۔ میری طرح وہ بھی سوچ میں گم ہو گیا' بھرے پرے کلینک میں سے راہول کو اٹھانا ایک دشوار کام تھا۔ دوسری طرف ہم شام تک انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں نے اسٹیشن ویگن سے اتر کر سڑک پار کی اور ایک پی سی او پر پہنچ گیا۔ میں نے صنوبر سے رابطہ کیا۔ اسے راہول کے کلینک کا پتا تفصیل سے سمجھایا اور ہدایت کی کہ وہ سروج کو لے کر یہاں پہنچ جائے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد صنوبر اور سروج ایک سفید واکس ویگن (ٹیکسی) میں وہاں پہنچ گئے۔ سروج نیلی ساری میں تھی اور اس پر تارے سے چمک رہے تھے۔ سفید دودھیا بانہیں کہنی سے اوپر تک نظر آرہی تھیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سروج اچھے لباس میں ہو۔ میں نے سروج کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے' وہ اثبات میں سر ہلاتی رہی اور کچھ دیر بعد بڑے اطمینان سے راہول کے کلینک میں داخل ہو گئی۔ میں اسٹیشن ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں یوں چھپ گیا کہ آسانی سے مجھے دیکھنا ممکن نہ رہا' صنوبر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ شیدا اپنے گن مین راجا کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق قریباً دس منٹ بعد سروج "ڈاکٹر صاحب" کو لیے ہوئے کلینک سے برآمد ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا اور وہ بانس کے پودے کی طرح بڑی شان سے لہراتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ جو کام میں نہیں کر سکا تھا وہ سروج نے بہ آسانی کر لیا تھا۔ میری "بیمار پتی" کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس دس منٹ کا وقت بھی نہیں تھا' سروج کے بیمار پتی کو دیکھنے کے لیے وہ خراماں خراماں چلے آرہے تھے اور ان کی صورت دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اس سندر ناری کو اپنے ڈیڑھ دو گھنٹے بہ آسانی دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چال دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ خدمت خلق کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

سروج اور ڈاکٹر راہول ویگن میں بیٹھے تو صنوبر نے تیزی سے ڈرائیونگ شروع کر دی۔ میں پچھلی سیٹ پر سر جھکائے بیٹھا تھا' ڈاکٹر محترم کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سروج سے گفتگو فرما رہے تھے۔ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے اور ہر لفظ شہد میں لپٹا ہوا تھا "پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے بی بی۔ اس کے پیچھے کیا بھاگنا' اصل چیز تو انسانیت کا درد ہے" ڈاکٹر صاحب نے بڑی تمکنت سے فرمایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کلینک میں آپ کے اتنے زیادہ مریض بیٹھے ہیں' وہ انتظار کرتے رہیں گے۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' میرا اسسٹنٹ ریاض کافی تجربہ کار ہے' وہ سنبھال لیتا ہے' آپ بے فکر رہیں۔"

"میں ایک بار پھر معذرت چاہوں گی کہ میں فیس نقد ادا نہیں کر سکوں گی۔ دراصل ہم لوگ گھر میں پیسے نہیں رکھتے۔ بس خرچے کے پیسے ہوتے ہیں' آج صبح میں نے چیک کیش کروانا تھا' ابھی بینک جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ انہیں اٹیک ہو گیا۔"

"کوئی بات نہیں بی بی۔ فیس کا کیا ہے پھر آجائے گی بلکہ اگر آپ کو رقم کی فوری ضرورت ہے تو مجھ سے لے لیں۔"

چیک کیش ہوگا تو رسے دو جے گا۔"

"صفدر! پٹرول ہے؟" سوج نے پوچھا۔

"بس جی سوئی اینڈ پر آئی ہوئی ہے۔"

سروج نے پٹرول پمپ سے بیس لیٹر پٹرول ڈلوایا۔ ادائیگی ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔ ہمیں پروگرام کے مطابق شہر سے ایک ویران مندر میں جانا تھا۔ شیدا اور اس کا کن مین ٹوکسی میں ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ جب اسٹیشن ویگن ہائی وے کی طرف مڑی تو ڈاکٹر صاحب چونک گئے "بی بی! آپ نے تو کہا تھا۔۔۔"

ابھی ڈاکٹر صاحب کا فقرہ ادھورا تھا کہ میں نے ریوالور ان کی پسلیوں سے لگا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟" وہ سروج سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہی تو میرے پتی ہیں۔"

"لل۔۔۔ لیکن تم نے کہا تھا انہیں دورہ پڑا ہے۔"

"دورہ ہی تو پڑا ہے۔" سروج اٹھلا کر بولی "آپ دیکھتے نہیں ہاتھ میں ریوالور ہے اور آنکھیں سرخ نظر آرہی ہیں' اب اگر کوئی بات بھی ان کی مرضی کے خلاف ہوگی تو تمہیں سے گولی چلا دیں گے۔"

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم لوگوں نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے۔" ڈاکٹر جھنجلا کر بولا "ابھی کچھ دیر پہلے یہ میرے پاس آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی بیمار ہے' اسے مرگی کا دورہ پڑا ہے۔ اب تم کہہ رہی ہو کہ اسے پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔"

"اسے ہی پڑا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اسے ہی پڑا ہے۔ کیا آپ کو لگ رہا ہے کہ میں مرگی کی حالت میں یہاں بیٹھی ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آرہا ہے اور مجھے وشواس ہے کہ یہ اسے چلا بھی دے گا۔"

"میں۔۔۔ میں تم لوگوں کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔" راہول کا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

"فی الحال تو تم ہمارے حوالے ہو۔" میں نے اطمینان سے کہا "ابھی ہم تمہیں مجسٹریٹ شیدا صاحب کے سامنے پیش کرکے تمہارا جسمانی ریمانڈ لیں گے اور تمہیں الٹا لٹکا کر تفتیش کریں گے۔ تم سے کئی سوال پوچھے جائیں گے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی ہوگا کہ خوب صورت لڑکیوں کو دیکھ کر تم کیوں کلینک سے اٹھ جاتے ہو اور مردوں کو دیکھ کر کیوں کڑک مرغی کی طرح بیٹھے رہتے ہو؟"

اسی قسم کی باتوں کے دوران میں ہم ایک شکستہ مندر تک پہنچ گئے۔ مندر پہنچنے سے چند منٹ پہلے ہی میری ہدایت پر سروج نے راہول کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ یہ مندر سڑک سے ذرا ہٹ کر کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ احاطے میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا اور درختوں کے کٹے ہوئے تنے پڑے تھے۔ ہم دونوں گاڑیاں اندر ہی لے گئے۔ مندر کے تہ خانے میں شیدے کا ڈیرا تھا۔ یہاں اس کے تین چار تخنڈا صورت ساتھی بھی موجود تھے' انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سب کے سب تجربہ کار چاقو زن ہیں۔ عجیب سی بات تھی' ابھی تک میں نے ان کی گفتگو نہیں سنی تھی' ان کا ہنر نہیں دیکھا تھا اس کے باوجود ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ وہ چاقو زن ہیں۔ مندر باہر سے بالکل ویران نظر آتا تھا لیکن تہ خانہ کافی صاف ستھرا تھا' در و دیوار کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شیدے کے دو چار ساتھی ہر وقت یہاں موجود رہتے ہیں۔ شیدے کے ساتھی بڑے احترام سے پیش آئے' خصوصاً مجھے وہ بڑی اہمیت دے رہے تھے۔ شاید ان تک بھی یہ خبر پہنچی تھی کہ میں نے ان کے استاد کو چاقو زنی کے مقابلے میں ہرایا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن تھا کہ "راحت" کی برآمدگی والا واقعہ بھی انہیں معلوم ہو۔

تہ خانے میں ایک وائرلیس سیٹ بھی موجود تھا' مجھے معلوم تھا کہ ایسے اڈے عموماً پولیس کی ملی بھگت سے قائم ہوتے ہیں۔ یہیں ممکن تھا کہ پولیس والے بنفسِ نفیس یہاں آتے ہوں اور شیدے کو شرفِ میزبانی بخشتے ہوں۔ اسی تہ خانے میں ایک چھوٹا سا کمرا باقاعدہ حوالات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہاں کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں اور فرش پر بوسیدہ سی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ تہ خانے میں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب تھر تھر کانپنے لگے تھے اور ہر لحظہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی ڈھیلی ڈھالی پتلون کمر سے کھسک کر پاؤں میں جا گرے گی۔ ڈاکٹر صاحب کی دگرگوں حالت دیکھ کر سروج کو ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔ میرا ریوالور بدستور راہول کی گردن سے لگا ہوا تھا اور وہ گاہے گاہے ریوالور کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے موت کے فرشتے کا چہرہ دیکھ رہا ہو۔ تہ خانے میں پہنچ کر اس نے باقاعدہ منت سماجت شروع کردی اور بار بار میرے پاؤں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر راہول کی طرح کا کردار رکھنے والے لوگ کتنی بھی تن فن والے ہوں لیکن مصیبت پڑنے پر ایسے ہی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ ان کی اکڑ فوں لمحوں میں پانی بن کر ناک کے رستے بہہ جاتی ہے۔

حوالات نما کوٹھڑی میں پہنچ کر جب شیدے نے راہول کو پہلا تھپڑ مارا تو وہ مرے چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر جا گرا

اور آناً فاناً ہلدی کی طرح زرد ہوگیا۔ بالکل یوں لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے۔ شیدے نے غرا کر کہا "بتا کدھر ہے شوبھا بابا؟"

وہ بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا کہ شوبھا کی گمشدگی سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ پچھلے آٹھ نو ماہ سے اس نے شوبھا کی شکل بھی نہیں دیکھی۔

میں نے کہا "شکل تو تم نے گوپی ناتھ کی بھی نہیں دیکھی تھی پھر بھی اس کو ہیجڑا بنانے والی دوا کھلادی۔ تیرے جیسے لوگ بہت سے کام خود نہیں کرتے' دوسروں سے کرواتے ہیں۔ ممکن ہے کہ شوبھا کو بھی تیرے کسی "ہم نوالہ ہم پیالہ" نے اغوا کیا ہو۔"

جواب میں راہول نے درگا دیوی۔۔۔ لکشمی دیوی' کالی دیوی اور ہر اس دیوی دیوتا کی قسم کھائی جس کے بارے میں وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ وہ دہائی دینے لگا کہ پچھلے سال ڈیڑھ سال سے اس نے شوبھا کا خیال بالکل دل سے نکال دیا ہے' کبھی سوچا تک نہیں اس کے بارے میں۔

صفدر نے کہا "اس کے باوجود آدھے شہر میں یہ چرچا ہے کہ راہول لوگوں کو گوپی ناتھ کے خلاف بھڑکا رہا ہے اور یہ اعلان کر رہا ہے کہ شوبھا گوپی ناتھ کی ملازمہ نہیں اس کی داشتہ ہے۔"

"یہ سب افواہیں ہیں۔ بھگوان کرے میری زبان جل جائے اگر میں نے کبھی گوپی ناتھ کا نام بھی لیا ہو۔ گوپی ناتھ صاحب کے بارے میں سب لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو خود ہر محفل میں بتاتے پھرتے ہیں کہ اٹھارہ عشق کر چکے ہیں اور۔۔۔ انیسواں کر رہے ہیں۔"

"لیکن شوبھا کے بارے میں جس قسم کی گندی باتیں سننے میں آرہی ہیں وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔" شیدے نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں رسید کی۔

راہول کچھ دیر کراہتا رہا پھر ایک دم اسے نجانے کیا ہوا کہ وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ پہلے تو یہی لگا کہ وہ مکر کر رہا ہے لیکن جب میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا تو واقعی بے ہوش پایا۔ اس کا پیشاب بھی پتلون میں خطا ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نبض وغیرہ دیکھی' بے ہوشی گہری تھی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ راہول کا میڈیکل باکس اس کے ساتھ ہی تہ خانے میں آیا تھا۔ میں نے اس میں سے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی نکالی اور راہول کی زبان کے نیچے رکھ دی۔ بعد ازاں باہمی مشورے سے ہم نے اسے "کورامین" کا انجکشن بھی لگایا۔ عجیب صورت حال تھی۔ جو ڈاکٹر صاحب علاج معالجے کے لیے اپنے کلینک سے نکلے تھے وہ اس تہ خانے میں پہنچ کر خود مریض بن گئے تھے اور ان کی دوائیں ان ہی پر استعمال ہو رہی تھیں۔

راہول کی سانسیں ذرا بحال ہوئیں تو ہم نے اسے اٹھا کر حوالات نما کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ بہتر تھا کہ اسے کچھ دیر آرام کرنے دیا جاتا۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ شوبھا کی گمشدگی معما بنتی جا رہی تھی۔ ماماں۔۔۔ چندر پرکاش' ڈاکٹر راہول سب سے پوچھ گچھ کی جاچکی تھی' ابھی تک کوئی چھوٹا سا کلیو بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ شوبھا کی گمشدگی کو آج تیسرا روز تھا' اب یہ واقعہ اخباروں کی زینت بھی بن چکا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا' شوبھا کے بارے میں خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔ تین روز پہلے اتوار کی صبح دس بجے وہ گوپی ناتھ مینشن سے اپنے گھر جانے کے لیے نکلی تھی اور ایک ٹیکسی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا' پولیس ہر جگہ اسے تلاش کر چکی تھی' اسپتال' پرائیویٹ کلینک' شمشان گھاٹ' بے سہارا لڑکیوں کو پناہ دینے والے رفاہی ادارے' غرض کوئی جگہ چھوڑی نہیں گئی تھی' یہاں تک کہ کل رات گوپی ناتھ کی ہدایت پر چندر پرکاش بھوپال کے سارے مردہ خانے بھی دیکھ آیا تھا۔

ڈاکٹر راہول کو حوالات نما کوٹھڑی میں بند کرکے شیدے نے باہر سے تالا لگا دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ گوپی ناتھ صاحب پریشان ہوں گے۔ انہیں اپنے بارے میں اطلاع دے دینی چاہیے۔ شیدا بولا "ٹھیک ہے جی! میں جاتا ہوں اور گوپی ناتھ صاحب کو رپورٹ دیتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں رات بھی یہیں رکنا پڑے' لہٰذا گوپی صاحب کا باخبر ہونا ضروری ہے۔"

میں سروج کو شیدے کے ساتھ واپس بھیج دینا چاہتا تھا لیکن سروج نے کہا کہ وہ اکیلی جائے گی تو ساس جی لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گی کہ پتی کو کہاں چھوڑ کر آئی ہو۔ شیدا گوپی ناتھ صاحب کو اطلاع دینے چلا گیا۔ میں اور صفدر سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور صورت حال پر غور کرنے لگے۔ صفدر بھی اس بات سے پوری طرح متفق تھا کہ خبطی بڈھے کو اپنی مٹھی میں کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اگر ہم شوبھا کو ڈھونڈ نکالتے تو بڈھے سے ہر بات منوائی جا سکتی تھی۔ شیدے کے ساتھیوں نے دوپہر کو ہمیں پر تکلف کھانا کھلایا۔ سہ پہر تک ڈاکٹر راہول نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ وہ بار بار بڑبڑانے

لگتا تھا "مجھے چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔"

اس کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ اس سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ سہ پہر کے وقت میں بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ آنکھ کھلی تو شام گہری ہو چکی تھی۔ تہ خانے میں بلب روشن تھے' موسم گرم تھا اس کے باوجود تہ خانہ ٹھنڈا تھا اور اندرونی کمروں میں بھی ہوا کی آمد و رفت موجود تھی۔ قریباً ہر کمرے میں پنکھے کا انتظام بھی تھا۔ میں نے حوالات نما کمرے میں جھانکا۔ ڈاکٹر راہول اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ صفدر اس کے قریب چٹائی پر بیٹھا تھا اور پوچھ گچھ کرنے میں مصروف تھا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ راہول اپنے دوپہر والے موقف پر اڑا ہوا تھا۔ صفدر گھما پھرا کر بات کر رہا تھا تاکہ راہول کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے بات آگے چلائی جاسکے۔ اچانک میری نگاہ سلاخ دار کھڑکی کے بالائی سرے پر پڑی' میں چونک گیا۔ کھڑکی کی سلاخیں جن اینٹوں میں گڑی ہوئی تھیں وہ اینٹیں اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ خاص طور سے دو اینٹیں تو بالکل دیوار سے جدا تھیں لیکن بظاہر وہ دیوار سے پیوست ہی دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے اینٹوں کو ہلایا تو انہوں نے بہ آسانی جگہ چھوڑ دی۔ اینٹوں کے ہٹنے کے بعد سلاخوں کو کھڑکی میں سے نکالنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میرے ساتھ ساتھ صفدر کو بھی حیرانی ہوئی۔ ہم ڈاکٹر راہول سے تو یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اتنی جلدی اس قسم کی کارروائی کر سکتا ہے' پھر یہ کس کا کام تھا۔ ممکن تھا کہ اس سے پہلے جو شخص یا اشخاص کوٹھڑی میں بند ہوں' انہوں نے یہ کارروائی کی ہو پھر کھڑکی کی سلاخیں اکھاڑنے سے پہلے ہی وہ رہا ہو گئے ہوں یا کسی اور طریقے سے فرار ہو گئے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس خستہ حال کوٹھڑی کی اینٹیں ویسے ہی اپنی جگہ سے ہل گئی ہوں' بہرحال جو بھی وجہ تھی' یہ کھڑکی محفوظ نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ رات کو کسی وقت ڈاکٹر راہول سلاخیں نکالتا اور یہاں سے راہ فرار اختیار کرتا۔ میں شیدے کو اس بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ ابھی شہر سے واپس ہی نہیں آیا تھا۔

میں اور صفدر ڈاکٹر راہول سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اس کے بیانوں میں کہیں کہیں تضاد موجود تھا جس سے یہ شک پڑتا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ مثلاً ایک طرف وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے آٹھ نو ماہ سے شوبھا کی صورت تک نہیں دیکھی' دوسری طرف وہ یہ انکشاف بھی کرتا تھا کہ شوبھا جب کبھی بھی اپنے گھر آتی تھی رات گئے آتی تھی اور اس کے ساتھ کوپل ناتھ کا ایک پٹھان گارڈ بھی ہوتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شوبھا کو آتے جاتے دیکھتا تھا' اس طرح اور کئی بیانات بھی آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ آٹھ نو بجے کے قریب شیدا بھی واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر کے غائب ہونے سے کھلبلی مچی ہوئی ہے اور ڈاکٹر کے لواحقین نے تھانے میں رپورٹ بھی درج کرائی ہے۔

شیدے کی باتیں سننے کے بعد ڈاکٹر راہول نے ایک بار پھر چیخ پکار شروع کر دی۔ کبھی وہ ہم سب کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتے لگتا تھا' کبھی ایک دم منت سماجت پر اتر آتا تھا۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں ان لمحوں کو ہزار بار کوس چکا تھا جب وہ سروج کے ہوش ربا حسن کے اثر میں آکر خراماں خراماں کلینک سے نکل آیا تھا۔ کچھ دیر چیخ پکار کرنے کے بعد راہول کا رنگ ایک بار پھر اچانک ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ اس نے اپنے سینے کو مسلا' چند گہری سانسیں لیں اور ایک بار پھر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

"اب تو یہ یقیناً مکر کر رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

شیدے کے ایک ساتھی نے اسے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شیدا حوالات نما کوٹھڑی سے باہر اطمینان سے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"چھوڑو اسے۔ میرا خیال ہے یہ کچھ نہیں بتا سکے گا۔"

"کیوں نہیں بتا سکے گا؟" صفدر نے پوچھا۔

"اسے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"بس ہے ایک وجہ۔" شیدے نے کہا۔

"کیا وجہ ہے۔ کیا کوئی کلیو ملا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کلیو تو نہیں ملا لیکن شوبھا سے مل کر آرہا ہوں۔"

ہم حیرت سے تقریباً اچھل پڑے "کیا مطلب؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مطلب یہی ہے کہ ابھی شوبھا سے مل کر آرہا ہوں۔"

میں اور صفدر سناٹے میں تھے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ شوبھا مل گئی ہے؟"

وہ بولا "ملتا تو وہ ہے جو گم ہو گیا ہو۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ شوبھا گم نہیں ہوئی تھی؟"

"ہاں' وہ گم نہیں ہوئی تھی۔"

"تو کہاں گئی تھی وہ؟"

"میرے پاس تھی۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ اب تک ہم بہت بڑے دھوکے میں رہے ہیں۔ شوبھا ایک ایسے شخص کے قبضے میں ہے جو اب تک ہمارے ساتھ رہا ہے بلکہ ہمارے ساتھ مل کر

شوبھا کو ڈھونڈتا رہا ہے۔

"یہ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟" صفدر غرایا۔

میرا دھیان شیدے کے ہاتھ کی طرف چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چابی نظر آرہی تھی۔ یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ شیدے نے دروازے کے ہینڈل میں چابی گھما کر اسے باہر سے مقفل کر دیا ہے۔ میں نے جلدی سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا۔ وہ واقعی باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ شیدا سلاخ دار کھڑکی سے باہر کھڑا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی واضح قسم کی کمینگی نظر آرہی تھی۔ میرا دھیان فوراً اپنے ریوالور کی طرف گیا لیکن وہ تو ساتھ والے کمرے میں تکیے کے نیچے پڑا تھا۔ یقیناً شیدا ابھی آگاہ تھا کہ ریوالور میرے پاس نہیں ہے۔ اس نے ہم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بہترین وقت چنا تھا۔ صفدر بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر شیدا اس کے سامنے ہوتا تو دونوں میں سے ایک کی ملاقات ضرور فرشتہ اجل سے ہو جاتی۔

میں نے کہا "شیدے! تم تو کہتے تھے کہ تمہیں میرے احسان کے بوجھ نے دبا رکھا ہے۔ کیا یہی احسان مندی ہے تمہاری؟"

وہ ڈھٹائی سے بولا "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم نے راحت کو اگر مالاں کے چنگل سے چھڑایا تھا تو کسی نیک جذبے کے تحت نہیں چھڑایا تھا' وہ تو بس ایک اتفاق تھا۔ ایسا اتفاق کسی بھی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ساتھ ہو سکتا تھا۔"

"شوبھا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ تمہارے اور اس کے درمیان صرف نو انچ کا فاصلہ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارے دائیں طرف والی دیوار... اس کی دوسری طرف شوبھا ہے۔"

میں ایک بار پھر سناٹے میں رہ گیا۔ پچھلے بارہ چودہ گھنٹے سے شوبھا ہمارے بالکل پاس موجود تھی اور ہم بے خبر تھے۔

"ملنا چاہتے ہو اس سے؟" شیدے نے کہا۔

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے اپنے گن مین رنجیت راجا کو اشارہ کیا۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا دائیں طرف اوجھل ہو گیا۔ تالا کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد دروازے کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ رنجیت راجا نے تحکمانہ انداز میں کچھ کہا پھر رنجیت اور شوبھا کھڑکی کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ شوبھا کی حالت دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ بدمعاشوں کے اس اڈے پر اس سے برا سلوک ہوا ہے۔ اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر تشدد کے نشانات تھے۔ ساڑی کا پلاؤز کندھوں سے ادھڑا ہوا تھا' بال منتشر تھے اور آنکھوں میں اجاڑ قبرستانوں جیسی ویرانی تھی۔ دو تین دنوں میں ہی وہ دو تین مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ شوبھا مجھے تو پہچاننے میں ناکام رہی کیونکہ میں ابھی تک اسی ریڈی میک میک اپ میں تھا جو میں نے مالاں کی طرف جاتے ہوئے کیا تھا' تاہم اس نے صفدر کو فوراً پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیر گئے۔

میں نے کہا "شیدے! میں تجھے بدمعاش تو سمجھتا تھا لیکن مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ تیرے اندر کسی نہ کسی درجے کی غیرت موجود ہے۔"

وہ بولا "میں نے کون سی بے غیرتی کی ہے؟"

میری نظر شوبھا کے اجڑے بکھرے سراپا پر جم کر رہ گئی۔ میں نے کہا "ایک مجبور و کمزور عورت کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے کو بے غیرت اور بزدل نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟"

"مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لو جو میں نے اس چھوکری کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ ہاں رنجیت کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس میں بہت بھوک گھسی ہوئی ہے۔ کھانے کی بھی... اور عورت کی بھی۔" وہ اپنے انگرکھے کا گریبان بڑے اسٹائل سے درست کرتے ہوئے بولا۔

گن مین رنجیت کی گھنی مونچھوں تلے بڑی کمینی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ شوبھا کو واقعی بڑی ندیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شیدے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "بہرحال تمہیں زیادہ نراش ہونے کی ضرورت نہیں استاد جانی۔ یہ شوبھا کوئی ایسی پاک پوتر دوشیزہ نہیں ہے کہ دو چار بار رنجیت کا ہاتھ لگنے سے میلی ہو جائے گی۔ اس نے پہلے ہی بہت کما بی رکھا ہے۔ کوپل ناتھ جیسے شوقین بڈھے کے پاس رہ کر کوئی بے چاری کب تک بچ سکتی ہے۔ وہ تو خود ہر محفل میں چٹخارے لے لے کر بتاتا ہے کہ شوبھا بڑی مزے دار لڑکی ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں وہ بات آئی جو میں کچھ دیر پہلے شیدے کو بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اوپر والے کا شکر ادا کیا کہ یہ بات میں نے شیدے سے کہہ نہیں دی تھی۔ یہ سلاخ دار کھڑکی کی ان "دو اینٹوں" کی بات تھی جو اپنی جگہ موجود ہونے کے باوجود موجود نہیں تھیں اور یہ بہت اہم بات تھی۔ خاص طور سے موجودہ پوزیشن میں بہت ہی اہم ہو گئی

تھی۔ ایک دم مجھے خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں شیدے کی نگاہ ان اینٹوں پر نہ پڑ جائے' حالانکہ یہ بے معنی خدشہ تھا۔ خبر نہیں کہ کب سے یہ اینٹیں اسی طرح تھیں اور شیدے اور اس کے ساتھیوں کی نگاہ ان پر نہیں پڑی تھی۔

صفدر بڑی جلتی ہوئی نظروں سے شیدے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ گمبھیر لہجے میں بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس لڑکی کو اغوا کرنے اور یوں رسوا کرنے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟"

وہ بولا "پیارے! مقصد تو وہی ہے جو تمہیں معلوم ہے اور ہمیں بھی۔۔۔ یہ سب مایہ جال ہے' اسی دفینے کی پسوڑی ہے جس نے تم لوگوں کو بھی تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ تمہاری طرح ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ یہ چھوکری بڈھے کے بہت قریب ہے' رات دن اس کی بغل میں گھسی رہتی ہے' لہٰذا بڈھے نے اسے کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہوگا لیکن یہاں پہنچ کر ہمارا یہ خیال تقریباً غلط ثابت ہو گیا ہے۔ ہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن یہ کچھ بھی بتا نہیں سکی ہے۔ ایک دم بیکار نکلی ہے یہ۔ میں نے سوچا چلو بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ سو اسے رنجیت کے سپرد کر دیا۔"

"ہمارے ساتھ تمہاری کیا دشمنی ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"اس چھوکری کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ دشمنی تو کسی کے ساتھ نہیں پیارے۔"

"ہم تمہیں دفینے کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں؟" صفدر تنک کر بولا۔

"تم نہیں بتا سکتے ہو گے لیکن تمہارے اور ہم سب کے یہ استاد صاحب تو بتا سکتے ہیں۔" شیدے کا اشارہ میری طرف تھا "بڈھا گوپی ناتھ ان پر خاص طور سے مہربان ہے۔ ہر وقت ان کو گھٹنے سے لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔ ہم برسوں سے اس کے قریب ہیں' ہم پر اتنا بھروسا نہیں جتنا چار دن میں استاد صاحب پر کرنے لگا ہے۔ ویسے بھی تو استاد صاحب دفینے پر اتھارٹی ہیں۔ جتنا یہ دفینے کے پیچھے بھاگے ہیں اتنا اور کون بھاگا ہوگا۔"

صفدر بولا "اگر میں کہوں کہ شاہ جہاں صاحب بھی فی الوقت دفینے کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہم سب کو معلوم ہے تو پھر۔۔۔"

شیدے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "تو پھر وہی ہوگا جو شاہ جہاں صاحب کی اور تمہاری تقدیر میں لکھا ہے۔ تمہارے علامہ اقبال صاحب کیا خوب فرما گئے ہیں۔۔۔ عمل سے زندگی بنتی ہے' جنت بھی جہنم بھی۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔ مطلب یہ کہ تم اپنے رویے کے ذریعے اس تہ خانے کو جنت بھی بنا سکتے ہو اور جہنم بھی۔ جس کمرے میں تم کھڑے ہو یہاں میں نے کئی چپوں کو بولتے دیکھا ہے۔"

شیدے کا لہجہ بہت بدلا ہوا تھا اور بے حد دھمکی آمیز بھی تھا۔ اب یہ بات بخوبی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ شیدا منصوبہ بندی کے تحت ہمیں یہاں لے کر آیا ہے۔ ڈاکٹر راہول کو کلینک سے اٹھا کر یہاں لانا تو ایک بہانہ تھا۔ درحقیقت شیدا مجھے یہاں لانا چاہتا تھا اور یہ بات تسلیم کرنا پڑ رہی تھی کہ وہ ہمیں بڑی صفائی سے دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ درحقیقت شوبھا کی گمشدگی کی تحقیق کے دوران میں ہمارا ذہن ایک بار بھی شیدے کی طرف نہیں گیا تھا۔ اگر ایک بار بھی ایسا ہوا ہوتا تو شاید ہم یہاں آنے میں کچھ احتیاط کرتے۔ وہ صحیح معنوں میں آستین کا سانپ نکلا تھا۔

اسی دوران میں' میں نے شیدے اور رنجیت راجا کو چونکتے دیکھا۔ ان کے چونکنے کی وجہ فوراً ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی اور مجھے بھی چونکنا پڑا تھا۔ کہیں قریب سے ہی ایک کار کے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ کار کا سائلنسر شاید لیک تھا' اس کے سبب انجن کی آواز میں تھوڑا سا بھاری پن آ گیا تھا۔ میں اس آواز کو فوراً پہچان گیا' یہ گوپی ناتھ کے بھتیجے چندر پرکاش کی فیاٹ کار کی آواز تھی۔

چند ہی لمحے بعد شیدے کا ایک کارندہ بھاگا ہوا آیا اور اس نے شیدے کے کان میں کھسر پھسر کی۔ شیدا باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے رنجیت راجا بھی نکل گیا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اینٹیں ہٹا کر سلاخوں سے زور آزمائی کی جائے مگر پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس میں بہت رسک تھا۔ ممکن تھا کہ شیدے یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی واپس آ جاتا اور ہمارے بچاؤ کا یہ واحد راستہ بھی مسدود ہو جاتا۔

"چندر پرکاش کی یہاں آمد ہمارے لیے نیک فال ثابت ہو سکتی ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" میں نے جواب دیا "ویسے چندر ہے تو دلیر شخص مگر۔۔۔" ایک دم مجھے خاموش ہونا پڑا' قدموں کی آواز قریب سے آ رہی تھی پھر آواز تھم گئی اور گفتگو کی مدھم صدا سنائی دینے لگی۔ شوبھا ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ ہم اپنی سلاخ دار کھڑکی میں سے اسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ رنج و الم کی تصویر نظر آتی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اسے بری طرح نوچا کھسوٹا گیا ہے۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ یہاں کُل کتنے بندے ہیں؟"

ں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"رات کو پہرے دار ہوتا ہے؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

"ایک راستہ دوسری طرف بھی تھا لیکن اب انہوں نے ینٹوں اور سیمنٹ سے بند کر دیا ہے۔"

شوبھا کے لہجے میں تھکاوٹ تھی اور وہ غم سے نڈھال ظر آتی تھی۔ بڑے مایوسی بھرے انداز میں وہ دیوار سے ٹیک گا کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ فرش پر ے ڈاکٹر راہول نے اب کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ رہوش میں آنا چاہتا تھا' دوبارہ بے ہوش ہونے کے لیے۔

اچانک شوبھا زور سے چیخی "چندر بابو۔۔۔ چندر بابو۔۔۔ ائے۔۔۔ بھگوان کے لیے۔"

اس نے ایک بند دروازے میں موجود سوراخ سے آنکھ ا رکھی تھی اور سینے کی پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ یقیناً س نے دروازے کے سوراخ میں سے چندر پرکاش کو دیکھ لیا ا۔

چند لمحے بعد دروازہ دھماکے سے کھلا اور شیدے کی ورت نظر آئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے چندر پرکاش بھی اندر گیا۔ وہ نصف آستین کی بوشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ ھلے گریبان میں اس کا ورزشی جسم جھلک دکھا رہا تھا۔ اکثر لاڑیوں کی طرح وہ ہمیشہ چاق چوبند نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر وبھا اس کی طرف لپکی لیکن رنجیت راجا نے اسے راستے ہی ں دبوچ لیا اور بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ چیخنے لگی "چندر بابو۔۔۔ ھے بچالو۔"

چندر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ نظر آئی' اس نے گے بڑھ کر شوبھا کے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک زور کا انچہ اس کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے رائی اور فرش پر گر گئی۔ چندر نے پھر اسے بالوں سے پکڑ کر ٹھایا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور بے چارگی و حیرانی کی ویر نظر آتی تھی۔ چندر پھنکارا "چندر بابو تمہیں بچائے گا ن تم خود بھی تو بچنے کی کوئی کوشش کرو۔ اگر منہ میں اسی رح گھنگنیاں ڈال کر رکھو گی تو سمجھو آتما ہتیا کرو گی۔"

"میں۔۔۔ مجھے کچھ معلوم نہیں چندر بابو' میں ہر سوگند ھانے کو تیار ہوں۔"

چندر نے وحشیانہ انداز میں اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں ی بارش کر دی۔ ساتھ وہ اسے انگلش اور اردو کی منتخب گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھی اب ریزہ ریزہ نظر آنے لگی۔ اس کی حالت قابل رحم تھی لیکن چندر کی آنکھوں میں رحم کی جگہ غضب تھا۔ شاید آج وہ اپنی ان برسوں پرانی کدورت کا غبار نکال رہا تھا جو قطرہ قطرہ اس کے دل میں جمع ہوتی رہی تھی۔ چندر پرکاش تاؤ کا سگا بھتیجا تھا لیکن تاؤ چندر سے کہیں زیادہ اہمیت شوبھا کو دیتا تھا۔ چندر نے ایک دن خود مجھ سے کہا تھا کہ شوبھا نے تاؤ کو مٹھی میں لے رکھا ہے اور وہ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ شوبھا کی ناک سے خون بہہ نکلا اور اس کی ایک آنکھ دیکھتے ہی دیکھتے سوج گئی۔ رنجیت راجا اسے گھسیٹ کر دوسری طرف لے گیا۔

چندر پرکاش اب ہماری طرف متوجہ ہوا۔ وہ بلا جھجک میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں تھی۔ میں نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے ایسے بہت سے چہرے دیکھے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر بولا "ہم تو شاہ جہاں صاحب! بہت ڈرے ہوئے تھے تم سے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں تمہاری خطرناکی اور چالاکی سے محفوظ رکھا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کیسا لگ رہا ہے اس چوہے دان میں پھنس کر؟" وہ تمسخر کے لہجے میں بولا۔

"تمہیں کیسا لگ رہا ہے ہمیں یہاں پھنسا کر؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔۔۔ ایک نہایت خوشگوار احساس ہے۔ وہ استاد جہانی جس کی مشہوری بڑے بڑے جگادریوں سے سنی ہے' آج ہماری گرفت میں ہے اور بے دست و پا ہے۔ نہ یہاں کوئی اس کی چیخ پکار سن سکتا ہے' نہ مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ ہم جب چاہیں صرف ایک گولی کا خرچہ برداشت کر کے اسے مارنے کا اعزاز حاصل کر سکتے ہیں۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم دونوں کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو' ایک کانٹا چبھنے کی اذیت بھی برداشت نہ کرنی پڑے لیکن مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہوگا نہیں۔ یہاں بہت چیخ پکار مچے گی۔ بڑا ظلم و ستم دیکھنے میں آئے گا۔ اگر تم یہ سب کچھ روکنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں اور تمہارے استاد گرامی کو ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

"کس سلسلے میں؟" صفدر نے پوچھا۔

"دفینے اور نوادرات کے سلسلے میں۔" چندر نے چبا چبا

کر کہا۔

میں نے کہا "تمہاری اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"جواب تو تمہارے پاس ہر بات کا ہے استاد جمانی لیکن اگر تم آسانی سے بتادو گے تو تمہیں استاد جمانی کون کہے گا۔ باقی اگر تم میرے دل کی بات پوچھتے ہو تو میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تم کوئی قومی ہیرو نہیں ہو' نہ ہی کوئی تمہارا ایسا کارنامہ ہے جس پر فخر کیا جاسکے لیکن پھر بھی جو کچھ تمہارے بارے میں سنا ہے اس کے بعد خود بخود دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ شوا اس کو' میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یہاں برہنہ کر کے مارا جائے اور جانوروں کی طرح چیخنے پر مجبور کیا جائے لیکن۔۔۔ لیکن اگر تم تعاون نہیں کرو گے تو پھر دل پر پتھر رکھ کر ہمیں یہ سب کچھ کرنا پڑے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ کرنا پڑے۔"

شیدے نے نہایت گمبھیر لہجے میں کہا "استاد جمانی! ہم تمہیں سوچنے کے لیے آج رات کی مہلت دیتے ہیں۔ خوب اچھی طرح غور و فکر کرلو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ علی الصباح ہمیں جواب درکار ہو گا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ بڈھا گوپی تمہیں اور سوج کو دفینے کے مقام کے بارے میں بتا چکا ہے۔ صبح ہمیں صرف اس سوال کا جواب درکار ہو گا کہ دفینہ کہاں ہے۔"

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی شیدا اپنے گن مین رنجیت راجا کی طرف متوجہ ہوا "رنجیت! میرے خیال میں تمہیں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ آج کی رات استاد جمانی تمہارا مہمان ہے۔ آج تمہیں ہمیشہ سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے' اپنے ساتھیوں کو بتادو کہ انہیں صبح تک اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھنے ہیں۔"

شیدا' چندر پرکاش اور گن مین رنجیت باتیں کرتے ہوئے دوسری جانب چلے گئے۔

○☆○

وہ تاریک رات تھی اور نہایت پر اندیش بھی۔ حوالات نما کوٹھڑی میں' میں اور صفدر تنہا تھے۔ ڈاکٹر راحول کو نکال کر کہیں اور لے جایا جاچکا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بجلی روشنی ہو رہی تھی' رنجیت راجا اور اس کے ساتھی وہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ گاہے گاہے ان کے قہقہوں سے تہ خانے کے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ہماری نیم تاریک کوٹھڑی کی سلاخ دار کھڑکی سے باہر ایک رائفل بردار فرش پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نیلی فین اپنے چہرے کے عین سامنے لگا رکھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگائے لگائے اونگھنے لگا تھا۔

سوج بھی اسی تہ خانے کے کسی کمرے میں موجود تھی۔ بے شک چندر اور شیدے نے زور دے کر کہا تھا کہ آج کی رات ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جارہا ہے اور صبح تک کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن پھر بھی سروج کے بارے میں میرے اندیشے کم نہیں ہوئے تھے۔ شیطان صفت غنڈوں کے درمیان ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا تھا۔ شوبھا کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ میں اور صفدر اس انتظار میں تھے کہ دروازے کے سامنے بیٹھا پہرے دار نیند کی آغوش میں چلا جائے تو ہم یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل کریں۔

انتظار کا وقت کاٹے نہیں کٹتا' میں اپنے ذہن کو ادھر ادھر الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذہن میں بار بار شیدے اور چندر پرکاش کے نام آرہے تھے۔ درحقیقت ان دونوں نے اپنی عیاری اور چالبازی ثابت کی تھی۔ یہ بات اب وضاحت طلب نہیں رہی تھی کہ وہ دونوں شروع سے ہی "ساتھی" تھے اور اپنے گہرے تعلق کو رازداری کے پردے میں چھپائے ہوئے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ جس وقت ہم شوبھا کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے شیدے نے بار بار چندر پرکاش پر اپنے شک کا اظہار کیوں کیا تھا۔ ایک سے زائد مرتبہ شیدے نے کہا تھا کہ اسے چندر پرکاش پر شک ہے پھر وہ یہ اطلاع بھی لایا تھا کہ اتوار کے روز عین جس وقت شوبھا اغوا ہوئی' چندر پرکاش افراتفری کے عالم میں ٹینس کورٹ سے چلا گیا تھا۔ درحقیقت یہ سب کچھ ایک منصوبے کا حصہ تھا۔ اس منصوبے کے تحت شیدے نے ہمیں چندر پرکاش کے خلاف ایک ایسا سراغ دیا جس پر تحقیق کرنے کے نتیجے میں چندر بے گناہ ثابت ہو گیا اور اس کی طرف سے ہماری توجہ بالکل ہٹ گئی۔ گودام میں اسٹور کیپر یعقوب کے ہاتھوں لڑکی کی آبرو ریزی کا سارا واقعہ اس منصوبے کا حصہ تھا۔ وقوعہ کے روز صبح منہ اندھیرے جان بوجھ کر یعقوب کی ملاقات اس کچرا اٹھانے والی لڑکی سے کرائی گئی تھی۔ اس ملاقات کا نتیجہ وہی نکلا جو منصوبہ ساز چاہتا تھا۔ یعقوب نے گودام میں جا کر لڑکی کے ساتھ وقت گزارا۔ اسی دوران میں پروگرام کے تحت چندر پرکاش ٹینس کورٹ میں اپنا کھیل ادھورا چھوڑ کر گودام میں جا پہنچا اور شیدے نے ہمیں شک آمیز انداز میں یہ اطلاع بہم پہنچا

دی کہ شوبھا کی گمشدگی کے وقت چندر پراسرار انداز میں ٹینس کورٹ سے غائب ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب اس حوالے کی تحقیق کی جائے گی تو چندر بے۔ شوبھا کے حوالے سے کلیئر ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پولیس کی زبان میں اس قسم کی اطلاع کو "تفتیش بھٹکانے والی اطلاع" کہا جاتا ہے۔ شیدے اور چندر پرکاش نے بھی یہ ہتھکنڈا استعمال کیا تھا اور خوب کیا تھا۔

"سو گیا ہے حرام زادہ!" صفدر کی سرگوشی نے مجھے چونکایا۔

واقعی پہرے دار گود میں رائفل رکھے سو گیا تھا۔ یہ ہمارے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں تاہم یہ آوازیں پہلے سے کم تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ تاش کھیلنے والوں میں سے کچھ افراد سو گئے ہیں۔ میں آہستگی سے آگے بڑھا۔ نیم تاریکی کے باوجود مجھے وہ "دو اینٹیں" ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوئی جو اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود موجود نہیں تھیں۔ میں نے ان اینٹوں کو ایک دو بار ہلایا اور پھر دیوار سے جدا کر کے فرش پر رکھ دیا۔ کھڑکی میں لگی ہوئی چار سلاخوں کے سرے ننگے ہو گئے۔ میں صفدر کو اس ساری صورت حال کے بارے میں بتا چکا تھا لہٰذا اسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ میں نے دو سلاخوں کو پکڑ کر زور لگایا اور انہیں دہرا کر کے فرش سے لگا دیا۔ دوسری دو سلاخوں کے ساتھ صفدر نے بھی یہی سلوک کیا۔

اس کارروائی کے دوران میں ہماری جان آنکھوں میں اٹکی رہی اور آنکھیں خوابیدہ پہرے دار پر مرکوز رہیں۔ اگر ذرا سی بھی آہٹ پیدا ہوتی تو اس خبیث کی آنکھ کھل جاتی۔ ہم بالکل نہتے تھے' اس کے پاس بھری ہوئی رائفل تھی اور اسے ہمارے بارے میں بڑی سخت ہدایات دی گئی تھیں۔ جونہی کھڑکی میں سے گزرنے کا راستہ پیدا ہوا پہلے میں اور پھر صفدر کھڑکی سے باہر آگیا۔ رائفل بردار پہرے دار ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر بیٹھا تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے' بالکل اس کرکٹر کی طرح جس کے سامنے گیند زمین پر پڑی ہو اور اسے اطمینان ہو کہ اگر بیٹسمین نے رن لینے کی کوشش کی تو وہ بہ آسانی اسے رن آؤٹ کر دے گا۔ میری اور صفدر کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملیں' ہمارے جسموں میں برق سی کوند گئی اور سینے جذبے سے لبریز ہو گئے۔ ہم ایک ساتھ ہوتے تھے تو بڑے سے بڑا خطرہ بھی ہیچ محسوس ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ہر مصیبت حتیٰ کہ موت تک ہم سے آنکھیں چرا رہی پھر رہی ہے۔

"ایکشن؟" صفدر نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"ہیں ایکشن!" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

میں نے آگے بڑھ کر خوابیدہ پہرے دار کی گردن میں اپنا بازو ڈالا اور ایک مخصوص جھٹکے سے اس کی نیند کو گہری بے ہوشی میں بدل دیا۔ پہرے دار کا منہ کھل گیا اور وہ لڑھک کر پہلو کے بل جا گرا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی صفدر نے اسے رائفل کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔

میں نے کہا "جو خالی ہاتھ ہو اس کی ٹانگوں پر گولی مارو۔ جو مسلح ہو اسے اڑا دو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے پنڈلی سے اپنا چمک دار خنجر نکال لیا۔ صفدر اور میں ایک ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں تاش کی بازی چل رہی تھی۔ سرخ دری پر پانچ چھ افراد بیٹھے تھے' کچھ یہاں وہاں لیٹے ہوئے تھے۔ پورے کمرے میں سگریٹ کا دھواں اور الکوحل کی بو تھی۔

"خبردار کوئی ہلا تو!" صفدر گرجا۔

دو تین افراد بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ ان میں سے ایک نے قمیص اٹھا کر شلوار کے نیفے سے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی۔ صفدر نے ٹریگر دبایا۔ گن سے سنگل شاٹ فائر ہوا۔ گولی دھماکے سے مدمقابل کے چہرے پر لگی اور وہ چت سے دری پر جا گرا۔ دوسرا فائر صفدر نے ایک تنومند شخص کی ران پر کیا' وہ چیخا اور کیچوے کی طرح دہرا ہو کر گرا۔ اس کے ساتھ ہی صفدر نے گن کو "برسٹ" پر سیٹ کر لیا۔

یہی وقت تھا جب مجھے اپنے پہلو میں مدھم آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے گھوما۔ کوئی مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر بے دریغ خنجر گھمایا اور حملہ آور کا پیٹ ایک فٹ تک چاک کر دیا۔

میں نے دیکھا وہ رنجیت راجا تھا۔ شوبھا کی عزت سے کھلونے کی طرح کھیلنے والا۔ میں نے دوسرا وار اس کے سینے پر کیا اور پھر اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔

عین اسی وقت کسی قریبی کمرے سے سروج کی چیخ سنائی دی۔ میرے سر پر خون سوار ہو رہا تھا۔

سروج کی چیخ تہ خانے کے عقبی حصے سے سنائی دی تھی۔ میں آواز کی سمت بڑھا لیکن اس سے پہلے میں نے تڑپتے ہوئے رنجیت راجا کی قمیص کے نیچے سے ریوالور کھینچ لیا تھا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں خون آلود رام پوری خنجر تھا۔ جاں بہ لب رنجیت راجا کو پھلانگ کر میں تنگ راہداری کی طرف بڑھا۔ یہ راہداری حوالات نما کوٹھڑی کے سامنے سے گزر کر عقبی حصے میں جاتی تھی۔ میں نے بھاگ کر آٹھ دس قدم کا فاصلہ طے کیا اور پھر ایک دم مجھے رکنا پڑا۔ مجھے شیدا نظر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا گراری دار چاقو تھا۔ شیدا بھوپال کا استاد چاقو زن ہی نہیں اس تہ خانے کا کرتا دھرتا بھی تھا۔ وہ حیدر آبادی لباس میں تھا۔ اس نے حسب معمول اپنے انگرکھے کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں اور بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں کر رکھی تھیں۔ اسے سامنے دیکھ کر میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کچھ اور روشن ہو گئی۔ میں ایک لمحے میں اسے گولی سے اڑا سکتا تھا' تاہم میں نے ریوالور جیب میں ڈالا اور خنجر سے شیدے پر حملہ کیا۔ شیدے نے پھرتی سے خود کو بچانا چاہا لیکن راہداری اتنی تنگ تھی کہ وہ مکمل طور پر بچ نہیں سکا۔ خنجر اس کے بازو کو کندھے کے پاس سے ادھیڑتا ہوا گزر گیا' جب چاقو یا خنجر دشمن کے گوشت سے ٹکراتا ہے تو ہاتھ میں پیدا ہونے والا ارتعاش ایک انوکھا مزہ دیتا ہے۔ اس لطف کو کچھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے کسی ایسے رد و مقابلے میں حصہ لیا ہو۔ زخم کھا کر شیدا بری طرح تلملایا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا وار میری گردن پر کیا۔ چاقو کی نوک گردن سے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا وار بھی میں نے نیچے جھک کر بچایا اور اس کے ساتھ ہی شیدے کی ناف کو نشانہ بنایا۔ یہ جان لیوا وار تھا لیکن یہاں شیدے کی استادی کی تھوڑی سی جھلک نظر آئی' اس نے قابل ذکر تیزی سے میرا یہ وار اپنی کلائی پر روکا اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پینترا بدل کر میرے بائیں پہلو سے حملہ آور ہو گا مگر یہاں ایک دم اس نے ہمت ہار دی۔ وہ چاقو جس کے سبب وہ پورے بھوپال میں جانا جاتا تھا اس کے ہاتھ میں تھا اور حریف بھی سامنے تھا لیکن شیدے نے وہ چاقو پھینک دیا اور اپنے چوڑے پائنچے کے نیفے سے ریوالور نکال لیا۔ ایک طرح سے اس نے اپنی شکست فاش کا اعلان کیا تھا۔ یہ شکست فاش ہی تو تھی۔ میں نے اسے مقابل پا کر اپنا ریوالور جیب میں رکھا تھا اور اس نے مجھے مقابل پا کر اپنا ریوالور ہاتھ میں لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ریوالور میری طرف سیدھا کرتا' میں تڑپ کر ایک ادھ کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ شیدے کی چلائی ہوئی گولی دروازے کے تختے میں لگی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا۔ شیدا بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے پاس ریوالور موجود ہے لہٰذا اس نے راہداری میں مزید رکنے کی غلطی نہیں کی اور سیڑھیوں کی جانب چلا گیا۔

صفدر فل ایکشن میں تھا۔ رہ رہ کر اس کی خود کار رائفل کی آواز تہ خانے میں گونج رہی تھی۔ اس گونج میں گاہے گاہے سروج کی چیخ بھی شامل ہو جاتی تھی۔ وہ کسی کمرے میں بند تھی اور بڑی شدت سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ میں ریوالور بدست آواز کی طرف دوڑا اور اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جہاں سروج بند تھی۔ دروازے کو باہر سے چٹخنی لگائی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سہمی ہوئی سروج نظر آئی۔ کسی متوقع خطرے سے نمٹنے کے لیے اس نے لوہے کی ایک راڈ دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے راڈ چھوڑی اور باہر آ گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ ہیجانی انداز میں چیخی۔

"یہ بعد میں بتاؤں گا' فی الحال یہاں سے نکلو۔"

سروج کو اپنی اوٹ میں لے کر میں تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ عین اسی وقت شوبھا بھی کہیں سے نکل کر ہمارے پاس آ گئی۔ اس کے بال منتشر تھے اور آنکھوں میں دہشت منجمد ہو چکی تھی۔ وہ راہداری کی طرف سے آئی تھی اور یقیناً چند لمحے پہلے اس نے رنجیت راجا کی خون آلود لاش دیکھی تھی۔ ابھی ہم سیڑھیوں سے کچھ دور ہی تھے کہ ایک شخص ہمارے سامنے آیا اور اس نے بڑی پھرتی سے چاقو پھینک کر مجھے مارا۔ یہ وار بڑی مہارت سے کیا گیا تھا' میں نے بروقت جھک کر خود کو بچایا۔ سروج اور شوبھا کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جوابی وار کے طور پر ریوالور سیدھا کیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ٹریگر دباتا' دھماکا ہوا اور وہ شخص الٹ کر سیڑھیوں میں گرا۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ اسے نشانہ بنانے والا صفدر تھا' وہ ایک ستون کی اوٹ سے نکلا اور داد طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"شیدا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ باہر نکل گیا ہے۔" صفدر نے تیزی سے کہا۔

"اور چندر پرکاش؟"

"میں نے اسے دیکھا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی باہر چلا گیا ہے۔"

اسی دوران میں سیڑھیوں کے اوپر سے دو تین فائر ہوئے اور گولیاں قریبی دیوار سے ٹکرائیں۔ میں اور صفدر دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ سروج اور شوبھا پیچھے تھیں' لہٰذا

فائرنگ سے محفوظ تھیں۔ صفدر نے اشارے سے ان دونوں کو ہدایت کی کہ وہ کمرے کے اندر چلی جائیں۔ انہوں نے ہدایت پر عمل کیا۔ ہم دونوں نے سیڑھیوں کے بالکل قریب مورچا جمالیا۔ صفدر کے پاس ۲۲۲ رائفل تھی اور چار پانچ بھرے ہوئے میگزین اس نے جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ میرے پاس ۳۸ بور کا طاقت ور ریوالور تھا۔ سیڑھیوں کا بالائی دروازہ کھلا تھا اور فائرنگ وہیں سے ہوئی تھی۔ صورت حال کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ ایک طرح سے ہم تہ خانے کے اندر پھنس گئے تھے۔ دراصل سروج اور شوبھا کو نکالنے میں ہمیں جو تھوڑا سا وقت لگا تھا اس میں شیدا اور اس کے تین چار کارندے باہر نکل گئے تھے اور انہوں نے تہ خانے کے دروازے پر پوزیشن لے لی تھی۔

میں نے صفدر سے کہا "یار! معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ ہمیں نکلنے میں جلدی کرنی چاہیے تھی۔"

صفدر نے کہا "گڑبڑ تو ہے لیکن زیادہ خطرے کی بات نہیں۔ ان کے کم از کم تین زخمی بندے ابھی تہ خانے میں ہیں۔ وہ ہمارے لیے ڈھال کا کام دے سکتے ہیں۔"

تہ خانے کے بالائی دروازے سے ایک برسٹ آیا اور دیوار کا بہت سا پلستر اکھڑ کر ہمارے قدموں میں آن گرا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی "ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ ورنہ اندر راج بھون ڈالیں گے۔"

اسی دوران میں بالائی دروازے کے قریب کسی کا سر نظر آیا' میں نے ریوالور سے فائر کیا' سر فوراً غائب ہو گیا۔

تقریباً پانچ منٹ تک اوپر سے گاہے گاہے فائر آتا رہا' ہم بھی حسب توفیق جواب دیتے رہے۔ جس شخص کے سینے میں صفدر کی گولی لگی تھی۔ وہ اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ تہ خانے کی چھت پر جلتے بلب کی روشنی میں مرنے والے کا منہ کھلا ہوا نظر آ رہا تھا اور اندر سونے کا ایک دانت چمک رہا تھا۔ میں نے صفدر سے کہا "میں یہاں فائر کا جواب دیتا ہوں تم تہ خانے کا چکر لگاؤ اور دیکھو کہیں کوئی زخمی مسئلہ کھڑا نہ کر دے۔"

صفدر نے اپنی رائفل مجھے تھمائی اور میرا ریوالور لے کر اندر چلا گیا۔ میں نے رائفل کندھے سے لگائی اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ سروج اور شوبھا کمرے کے اندر تھیں۔ سروج گاہے گاہے کھڑکی سے جھانک رہی تھی اور مختلف مشورے دے رہی تھی۔ ایک ایسے ہی مشورے کے دوران میں باہر سے آنے والی ایک گولی عین اس کے سر کے اوپر سے گزری۔ سروج کو پتا نہیں چلا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ گولی صرف چند انچ کے فاصلے سے اس کے سر کو مس کر گئی ہے۔

میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ وہ دروازے سے جھانکنے کی حماقت نہ کرے۔

اسی اثنا میں صفدر واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال کی رائفل اور گولیوں کی بیلٹ تھی۔ اس نے سرگوشی میں مجھے بتایا کہ تہ خانے میں کل تین بندے ہیں: ایک تو وہی پہرے دار ہے جسے میں نے گردن کی رگ مسل کر بے ہوش کیا تھا۔ دو دیگر افراد ہیں۔ ان میں سے ایک کی ران میں گولی لگی ہے' دوسرے کی گردن زخمی ہے اور وہ نیم بے ہوش پڑا ہے۔ صفدر نے کہا "میں ان دونوں کو اسٹور میں بند کر کے باہر سے تالا لگا آیا ہوں۔ اب ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔"

اچانک ایک بار پھر ایک سایہ سا تہ خانے کے بالائی دروازے پر نظر آیا۔ میں رائفل سیدھی ہی کر رہا تھا کہ سایہ غائب ہو گیا مگر غائب ہونے سے پہلے اس نے کوئی شے تہ خانے میں گرا دی تھی۔ میں اور صفدر دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ پانچ دس سیکنڈ گزر گئے' کوئی دھماکا وغیرہ نہیں ہوا' لیکن اسی دوران میں کچھ اور چیزیں بھی اڑتی ہوئی تہ خانے میں آگری تھیں۔ یہ جلتی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے تھے اور کسی جیپ کا ٹائر تھا جسے آگ لگائی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تہ خانے میں دھواں بھرنا شروع ہو گیا۔ میں نے اور صفدر نے رومال بھگو کر چہروں پر باندھ لیے۔ شوبھا اور سروج نے بھی یہی احتیاطی تدبیر اختیار کی۔ اتفاقاً سروج کو کمرے میں پانی سے بھری ہوئی ایک ٹب نما بالٹی نظر آ گئی۔ اس نے شوبھا کے ساتھ مل کر بروقت اقدام کیا اور لکڑی کے سلگتے ہوئے ٹکڑے بجھا دیے' بعد ازاں صفدر نے جلتے ہوئے ٹائر کو رائفل کی نال کے ذریعے اٹھایا اور ٹب نما بالٹی میں ڈبو دیا۔ یوں ہم فوری طور پر دم گھٹنے سے بچ گئے لیکن یہ کوئی مستقل علاج نہیں تھا۔ شیدا اور اس کے کارندے دھوئیں کے لیے مزید چیزیں اندر پھینک سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اس بند تہ خانے میں دھواں بھر جاتا تو پھر ہمارے پاس دو ہی راستے رہ جاتے تھے' دم گھٹ کر اندر ہی مر جائیں یا ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔

"صفدر! ہمیں آگے جانا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"کہاں؟"

"کم از کم تہ خانے کے دروازے تک۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ ہم سیڑھیاں چڑھ جائیں؟"

"اس کے سوا چارہ نہیں۔"

"لیکن سیڑھیاں تو زد میں ہیں۔"

"یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

ہم ایک ساتھ اٹھے' ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تابڑتوڑ فائر کرتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ دوڑے۔ دو دو زینے پھلانگتے ہوئے ہم نے پلک جھپکنے میں فاصلہ طے کیا اور تہ خانے کے دروازے پر جا پہنچے۔ جب دروازے کی دونوں سائیڈوں پر پوزیشن لے کر ہم نے فائرنگ شروع کی تو شیدے کے ساتھیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک رائفل مین کرشن بھگوان کی قد آدم مورتی کے عقب میں کھڑا تھا۔ میری گولی اسے لگی اور وہ زمین پر گر کر تڑپتا نظر آیا۔ تین چار افراد اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر محفوظ اوٹ کی تلاش میں بھاگے۔ شکستہ مندر میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ صفدر کا حوصلہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ فائرنگ کے ساتھ ساتھ شیدے کے کارندوں کو باقاعدہ للکار رہا تھا۔ اور یہ بے مقصد للکار نہیں تھی۔ ایسی لڑائی میں اس قسم کے للکارے بے حد سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ حریف کے دل میں وحشت بیٹھ جاتی ہے اور وہ کسی اچانک حملے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دو تین منٹ تک شدید فائرنگ ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ غالباً شیدا' چندر اور ان کے کارندے پوزیشنیں تبدیل کر رہے تھے۔ ہم نے بھی رائفلوں سے نئے میگزین اٹیچ کر لیے اور دو دو میگزین لوڈ کر کے پاس رکھ لیے۔ خاموشی کے اس وقفے میں مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہتھیاروں کی کھڑکھڑ تھی۔ قدموں کی چاپ تھی جو مندر کے پتھریلے فرش پر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ گاہے گاہے شیدے کی للکارتی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ اس کی آواز میں غیظ و غضب کے ساتھ ساتھ کرب بھی شامل تھا۔ یقیناً یہ کرب خنجر کے اس زخم کی وجہ سے تھا جو میں نے اس کے کندھے پر لگایا تھا۔ ان آوازوں کے درمیان ہی مجھے شیدے کے ایک کارندے کی آواز سنائی دی۔ وہ شیدے سے مخاطب ہو کر پکارا تھا "استاد جی! گاڑی کی ٹینکی میں گولی لگی ہے شاید۔ پٹرول لیک ہو رہا ہے۔"

شیدے نے چلا کر کہا "اس بات کو لیک ہونے دے۔ میں نے جو کہا ہے وہ کر۔ جیب سے ٹارچ لے کر آ۔"

میں نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر دیکھا۔ مندر کے مین دروازے پر کھڑی اسٹیشن ویگن صاف نظر آ رہی تھی۔ ہم اسی اسٹیشن ویگن پر ڈاکٹر راہول کے کلینک سے اس کھنڈر نما مندر میں پہنچے تھے۔ اسٹیشن ویگن مندر کے احاطے میں تھی اور مین دروازے کے بالکل سامنے تھی۔ دو طرفہ فائرنگ میں کوئی گولی ویگن کے آئل ٹینک میں لگی تھی۔

دو تین منٹ کے پر اندیشہ وقفے کے بعد فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ شیدے کے کارندے باقاعدہ پوزیشنیں لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔ تہ خانے کا دروازہ قریباً چار انچ موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا' اگر یہ عام دروازہ ہوتا تو اب تک اس کے پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ ہمارے پاس رائفلوں کے زیادہ راؤنڈ نہیں تھے۔ بڑی کفایت شعاری کے ساتھ بھی فائرنگ کرتے تو ہم ایک گھنٹے سے زیادہ مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوال بڑی شدت سے ہم دونوں کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ امید کی صرف ایک کرن بار بار ذہن میں چمک رہی تھی اور وہ یہ کہ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ سڑک سے گزرتی ہوئی پولیس کی کوئی "موبائل گاڑی" یہ آواز سن لیتی اور موقع پر پہنچ جاتی۔

اچانک مجھے بو محسوس ہوئی۔ میں نے صفدر کو دیکھا' وہ بھی نتھنے سکوڑ رہا تھا۔ میرا دھیان اپنے پاؤں کی طرف گیا۔ وہاں کوئی سیال شے نظر آئی "او مائی گاڈ!" صفدر کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "یہ تو پٹرول ہے۔"

واقعی یہ پٹرول تھا۔ اسٹیشن ویگن سے بہہ کر یہ پٹرول مندر کے فرش پر آیا تھا' اور وہاں سے تہ خانے میں ٹپکنے لگا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پٹرول سیڑھیوں پر نیچے تک چلا گیا۔ اسی اثنا میں نیچے سے سورج کی خوف زدہ آواز آئی "شاہ جہاں! یہ بو کیسی ہے۔ کہیں یہ لوگ.... پٹرول تو نہیں پھینک رہے۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" صفدر نے اسے تسلی دی۔

میں نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر دیکھا۔ شیدے کے دو تین ساتھیوں نے اسٹیشن ویگن کے عقب میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ یقیناً شیدا ابھی وہیں موجود تھا۔ اس کی آواز جتنی مرتبہ بھی سنائی دی تھی' ویگن کے پیچھے سے ہی سنائی دی تھی۔

صفدر نے سرگوشی کی "شاہ جہاں صاحب! کہیں یہ لوگ سچ مچ پٹرول کو آگ نہ دکھا دیں۔ تہ خانہ تو جہنم بن جائے گا۔"

میں نے دیکھا' پٹرول اب سیڑھیاں طے کر کے تہ خانے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ غالباً ابھی شیدا اور اس کے کارندے اس بات سے بے خبر تھے کہ پٹرول تہ خانے کے اندر پھیل رہا ہے۔ اگر انہیں پتا چل جاتا تو وہ یقیناً اب تک ہمیں اس حوالے سے دھمکی دے چکے ہوتے۔ بے شک شیدے کے تین بے ہوش ساتھی بھی ہمارے ساتھ تہ خانے میں موجود تھے لیکن ہمیں یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ تین

...دو شیدے کے لیے کتنے اہم یا غیر اہم ہیں۔ عام طور پر ...ے جیسے بدقماشوں کے لیے ان کے کارندے شطرنج کے ...وں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

پٹرول تیزی سے تہ خانے کے وسطی حصے کی طرف جا رہا ...۔ میں جانتا تھا کہ اسٹیشن ویگن کی ٹینکی میں خاصا پٹرول ...ہے۔ ڈاکٹر راہول کے کلینک سے مندر کی طرف آتے ہوئے ...ہ کی ٹینکی سورج نے ڈاکٹر راہول کے پیسوں سے فل ...وائی تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال برق کی ...ح کوندا۔ کیوں نہ ہم ابھی وہ کام کر گزریں جو کچھ دیر بعد ...ے اور چندر پرکاش نے کرنا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں ...ے صفدر سے دو منٹ کی اجازت لی اور نیچے تہ خانے میں ...یا۔ یہاں ایک کونے میں کچھ اینٹیں اور ریت سے بھری ...ی دو بوریاں پڑی تھیں۔ جیسا کہ شوبھا نے مجھے بتایا تھا کہ ...خانے کا ایک دروازہ اینٹوں کی چنائی کر کے بند کیا گیا تھا۔ یہ ...ل اسی کام سے بچا ہوا تھا۔ میں نے ریت کی ایک بوری ...ی اور اسے سیڑھیوں پر کھینچتا ہوا تہ خانے کے بالائی ...وازے تک لے آیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"تم آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟" میں نے کہا اور ریت ...بوری سیڑھیوں پر دروازے کے پاس الٹ دی۔

"اس سے کیا ہوگا؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہوگا تو وہی جو منظور خدا ہوگا۔ لیکن کم از کم اتنا تو ...ور ہوگا کہ اگر پٹرول کو آگ دکھائی گئی تو وہ تہ خانے میں ...ں جا سکے گی۔"

بات صفدر کی سمجھ میں آ گئی۔ سیڑھیوں میں ریت کا ڈھیر ...لگ گیا تھا۔ یوں سیڑھیوں میں بہتا ہوا پٹرول دو حصوں ...تقسیم ہو گیا تھا۔

ایک دم صفدر کی آنکھیں اندرونی روشنی سے چمک ...یں۔ وہ سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں صاحب! شیدے اور ...کے تین کارندوں نے اسٹیشن ویگن کے پیچھے پناہ لے رکھی ...۔ کیوں نہ ہم خود پٹرول کو آگ دکھا دیں۔"

"بے شک میں یہی کرنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ...سے لائٹر نکال کر سگریٹ سلگا لی۔

"وینڈرفل!" صفدر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے نیا میگزین رائفل سے اٹیچ کیا اور رائفل کے ...ے پر اس کی گرفت مضبوط تر ہو گئی۔ میں نے کہا "جونہی ...کو آگ لگے گی' شیدا اور اس کے ساتھی اپنی پوزیشن ...ڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہی وقت ہمارے باہر نکلنے کا

ایک نئی سدا بہار تخلیق

ایم اے راحت

اور انہیں شوٹ کرنے کا ہوگا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سینے یا سر میں گولی مارنا' یہ سب کے سب لٹیرے اور قاتل ہیں' کسی رعایت کے حق دار نہیں۔"

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی ہیں اور کشادہ سینہ جوش سے لبریز ہے۔ میں اور صفدر ریت سے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے۔ سگریٹ کے چند کش لینے کے بعد میں نے اسے پٹرول پر پھینک دیا۔ سگریٹ پھینکنے کا جو نتیجہ نکلا وہ ہماری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک اور تیز رفتار تھا۔

دو سیکنڈ میں تہ خانے کے دروازے سے لے کر اسٹیشن ویگن تک آگ کی ایک چوڑی لکیر کھنچ گئی۔ اس کے بعد بھک بھک کی دو آوازیں آئیں اور ایک دھماکے سے اسٹیشن ویگن آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ بالکل یوں لگا جیسے ویگن میں کوئی ٹائم بم پھٹا ہو۔ مندر کے مین دروازے پر روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا' ویگن کے عقب سے دو افراد نکلے' ان کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ چلاتے ہوئے مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے' میں اور صفدر ایک ساتھ تہ خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ ایک شخص کرشن مہاراج کی مورتی کے عقب سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ اس سے پیشتر کہ اس کی رائفل کا رخ ہم دونوں کی طرف ہوتا' میری رائفل نے دو شعلے اگلے اور تنومند شخص پشت کے بل شکستہ فرش پر گرا' تاہم اس دوران میں اس کی انگلی ٹریگر دبا چکی تھی۔ رائفل سے گولیوں کی بوچھار نکلی اور مندر کی چھت سے جھولتی ہوئی بڑی بڑی زنگ آلود گھنٹیاں پلک جھپکتے میں.... جھنجھنا اٹھیں' اور ان کی گونج در و دیوار میں پھیل گئی۔ میں اور صفدر جھک کر بھاگتے ہوئے آگے بڑھے اور دو ستونوں کی اوٹ لی۔ اسٹیشن ویگن میں دھماکے سے بھڑکنے والی آگ نے ہمارے حریفوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ پوزیشن چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ ایسے ہی دو بھگوڑوں کی ٹانگوں پر فائر کر کے صفدر نے انہیں گرایا۔ اچانک میری نگاہ چندر پرکاش پر پڑی۔۔۔ ہاں وہ چندر پرکاش ہی

تھا۔ گوپی ناتھ کا بھتیجا۔ اسٹیشن ویگن کو لگی ہوئی آگ کی روشنی میں وہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے ایک گرے ہوئے ساتھی کے ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اتنی افراتفری میں تھا کہ ریوالور نکال نہیں پا رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ ریوالور نکالنے کی کوشش ترک کر کے وہ اندھا دھند مخالف سمت میں دوڑا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ ایک دم وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چکمہ دے کر مندر کی سیڑھیاں چڑھ گیا ہے۔ میں واپس پلٹا اور سیڑھیاں چڑھ کر مندر کی چھت پر آ گیا۔ میں بہت محتاط تھا مگر پھر بھی جب یکایک ایک پتھر سا اڑتا ہوا میرے کندھے پر لگا تو میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا۔ یہ پتھر درحقیقت کسی دیوی کا ٹوٹا ہوا سر تھا' میرے کندھے سے ٹکرا کر یہ سر سیڑھیوں پر لڑھک گیا۔ ایک برجی کی اوٹ سے سایہ سا نکلا اور مخالف سمت میں بھاگا۔ یقیناً یہ چندر پرکاش ہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' چندر دوسری طرف کی سیڑھیوں سے نیچے اترنا چاہتا تھا' وہ اس مندر کے حدود اربع سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کر اس کا تعاقب کیا اور سیڑھیوں کے نزدیک اسے جا لیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے' چندر پرکاش میری توقع سے زیادہ پھرتیلا تھا لیکن کچھ بھی تھا' یہ ٹینس کا کھیل نہیں تھا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ یہ ریکٹ اور بال کا نہیں مکے اور لات کا کھیل تھا۔ میرے دو زوردار گھونسوں نے اس کے کس بل نکال دیے اور وہ کسی شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ یونہی جھومتے جھومتے اس نے مجھ پر مکا چلایا' میں نے جھک کر وار خالی دیا تو چندر کا توازن خراب ہوا۔ وہ بالکل چھت کے کنارے کھڑا تھا۔ لڑکھڑایا اور نیچے جا گرا۔ میں نے نیچے دیکھا' خوش قسمتی سے ایک درخت کی شاخ اس کے ہاتھ آ گئی تھی اور وہ زمین سے تقریباً تیس فٹ کی بلندی پر جھول رہا تھا۔ یہ خاصی اونچائی تھی۔ وہ یہاں سے گرتا تو ہڈی پسلی ٹوٹنا لازمی تھی۔ میں نے چھت کی منڈیر پر جھک کر اپنا ہاتھ اسے پیش کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے چھت پر کھینچ لوں لیکن اس نے میری مدد لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوسرا راستہ چنا اور دوسرا راستہ یہی تھا کہ وہ تیس پینتیس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دیتا۔ انسان کی موت وقت مقررہ پر انسان کو دبوچنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ چندر پرکاش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے شاخ چھوڑ کر خود کو نیچے گرایا تھا تاکہ پاؤں کے بل زمین پر آ جائے لیکن چند فٹ نیچے اس کا جسم تاریکی میں چھپی ہوئی کسی دوسری شاخ سے ٹکرایا اور وہ قسمت کا مارا UP SIDE DOWN ہو گیا۔ اس کی کھوپڑی جب مندر کے پختہ فرش سے ٹکرائی تو یہ آواز مجھے سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ وہ اب اس "سنسار" میں نہیں رہا اور جیون کے دکھوں سے مکتی پا گیا ہے۔ وہ سر کے بل گرا تھا اور آنجہانی ہونے کے لیے یہ حادثہ کافی تھا۔

میں تیزی سے زینوں کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب مجھے سڑک کی طرف سے کسی گاڑی کی ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں اور پولیس کا مخصوص سائرن سنائی دیا۔ میں زینے اتر کر نیچے پہنچا تو صفدر بدستور ایک ستون کی اوٹ میں موجود تھا اور اپنی رائفل سے گاہے گاہے فائر نکال رہا تھا۔ اسٹیشن ویگن کے شعلے بدستور بھڑک رہے تھے اور ان شعلوں کی روشنی میں ویگن کے نزدیک دو مردہ جسم دکھائی دے رہے تھے۔ سروج اور شوبھا کو بھی صفدر نے تہ خانے سے باہر نکال لیا تھا اور اب وہ دونوں پوجا کے کمرے میں ایک گوشے میں کھڑی تھیں۔

"بھاگ گئے سالے۔" صفدر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"پولیس بھی آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"اب نہ بھی آتی تو کیا تھا۔" صفدر نے کہا۔

"بھئی پولیس کو تو آنا ہی اس وقت ہوتا ہے جب کھیل ختم ہو چکا ہو۔"

"اور یہ تو پھر انڈین پولیس ہے۔ پاکستانی پولیس سے ہاتھ آگے۔"

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے صفدر کے ہاتھ پاؤں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہوں' اور آپ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ ہاں چندر پرکاش سورگ باش ہو گیا ہے۔" میں نے انکشاف کیا۔ صفدر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

اسی دوران میں پولیس کی دو گاڑیاں مندر کے عین سامنے پہنچ چکی تھیں۔ پولیس کے جوانوں نے گاڑیوں سے نکل کر درختوں اور گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں لینا شروع کر دیں۔ پھر کسی پولیس والے کی للکارتی ہوئی آواز آئی "تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔"

چاروں طرف سے گھیرنے والی بات کسی طور درست نہیں تھی۔ پولیس والے صرف مندر کے سامنے موجود تھے لیکن ایسے موقعوں پر پولیس والے عموماً یہی جملہ ادا کیا کرتے

ہیں کہ "چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔"

میں نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہ شیدے اور اس کے کارندوں میں سے اردگرد کوئی موجود نہیں' صفدر کو اشارہ کیا۔ ہم مندر کے مین دروازے سے باہر نکل آئے۔ یہاں "ٹیوب لائٹ" کی روشنی موجود تھی اس کے علاوہ جلتی ہوئی اسٹیشن ویگن کے شعلے بھی ابھی بجھے نہیں تھے۔ ہم دونوں نے اپنی رائفلیں پھینک دیں۔ پولیس کے چار پانچ رائفل مین بھاگتے ہوئے آئے اور انہوں نے ہمارے اردگرد گھیرا ڈال لیا۔ ایک انسپکٹر آگے بڑھا' اس نے بڑی احتیاط سے ہم دونوں کی تلاشی لی۔ حسب توقع میرا خنجر ایک بار پھر محفوظ رہا۔ اس خنجر نے تھوڑی دیر پہلے رنجیت راجا کا خون پیا تھا' اب وہ سیر ہو کر اطمینان سے میری پنڈلی سے چپکا ہوا تھا۔ ہمارے پیچھے ہی پیچھے سروج اور شوبھا بھی باہر آ گئی تھیں۔ اپنے اردگرد لاشیں دیکھ کر پولیس والے از حد محتاط بلکہ کسی حد تک خوف زدہ ہو گئے تھے۔ انسپکٹر نے نہایت سنجیدگی سے سروج اور شوبھا کی تلاشی بھی لی' اس کے بعد ہم چاروں کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ ایک سب انسپکٹر گاڑی کی وائرلیس پر موجود تھا۔ وہ اپنے کسی افسر کو مندر میں ہونے والی سنگین واردات کی اطلاع دے رہا تھا اور مزید نفری بھی طلب کر رہا تھا۔ تین گن مین ہمارے سروں پر چوکس کھڑے تھے۔ دو افراد کی جلی ہوئی لاشیں اسٹیشن ویگن کے سلگتے ہوئے ڈھانچے کے پاس پڑی تھیں۔ لاشیں سیاہ ہو گئی تھیں اور اس سیاہی میں سے جھانکنے والا سرخ سرخ گوشت بڑا خوفناک لگ رہا تھا۔ سروج اور شوبھا نے ان عریاں لاشوں سے نگاہ بچانے کے لیے اپنے رخ پھیر لیے تھے۔ خاص طور سے شوبھا بہت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو تیرنے لگتے تھے۔

انسپکٹر اور اس کا عملہ لاشوں کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک لاش کو سیدھا کیا گیا تو میں اور صفدر بری طرح چونک گئے۔ وہ شیدے چاقو زن کی لاش تھی۔ بھوپال کا مانا ہوا غنڈا فرشِ خاک پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا جو اس نے میرے خنجر سے خوف زدہ ہو کر نکالا تھا۔ یہ ریوالور اس کے ہاتھ میں شکستِ فاش کے سرٹیفکیٹ جیسا تھا۔

پولیس والوں نے تین لاشیں اور تین زخمی مندر کے تہ خانے سے نکالے۔ جبکہ ایک لاش کے علاوہ ایک زخمی پوجا کے کمرے سے ملا۔ ایک لاش مندر کے پہلو میں پختہ فرش پر پائی گئی۔ یہ چندر پرکاش کی لاش تھی۔ اس کا سر چٹکے ہوئے تربوز کے مانند نظر آ رہا تھا۔ لاشوں کو زمین پر ایک قطار میں ڈال کر مختلف کپڑوں سے ڈھک دیا گیا۔ فضا میں دھوئیں' بارود اور جلے ہوئے گوشت کی ملی جلی بو تھی۔ اسی دوران میں ایک اور پولیس کار بھی موقع پر پہنچ گئی۔ ہر طرف پولیس اہلکار دکھائی دینے لگے۔ جو انسپکٹر پہلے موقع پر پہنچا تھا وہ ہمیں لے کر تھانے روانہ ہو گیا۔ مجھے اور شوبھا کو ایک گاڑی میں جبکہ صفدر اور سروج کو دوسری گاڑی میں بٹھایا گیا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں تین تین مسلح اہلکار موجود تھے۔

تھانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تقریباً دو میل کی مسافت طے کر کے ہم پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ انسپکٹر کا رویہ نہایت سخت تھا۔ وہ مجھے اور صفدر کو ہتھکڑی لگانا چاہ رہا تھا۔ اس کا ارادہ دیکھ کر میں نے کہا "انسپکٹر میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔"

"فون بھی کروا لیتے ہیں۔ ذرا حوصلہ کرو۔" اس نے دراز سے ہتھکڑیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"اگر ہتھکڑیاں لگانے سے پہلے فون کروا دو تو زیادہ اچھا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"دھمکی دے رہے ہو؟" انسپکٹر چیخا اور مارنے کے لیے صفدر کی طرف بڑھا۔ میں دونوں کے درمیان آ گیا اور بمشکل انسپکٹر کو روک کر اسے ٹھنڈا کیا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا اور میز کے نیچے سے ٹیلی فون نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ میں نے پہلے گوپی ناتھ کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں مرتبہ فون انگیج ملا۔ تیسری مرتبہ میں نے براہِ راست ریٹائرڈ آئی جی شیووت کا نمبر ملایا' انسپکٹر بری طرح چونکا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے رابطہ منقطع کر دیا۔

"یہ کس کا نمبر ملا رہے ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"آئی جی شیووت کا۔" میں نے کہا۔

"ان سے تمہارا کیا تعلیغ (تعلق) ہے؟" انسپکٹر کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

"بس دوست ہیں۔"

"تم نے ان سے کیا باتاں کہنی ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے کیا باتاں کہنی چاہیے؟"

انسپکٹر ذرا گڑبڑا گیا "دیکھو میاں! یہ چھ سات تو میاں کے قتل کی وارداتاں ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگاں نے تم سے کوئی سختی نہیں کی۔ بڑے آرام سے یہاں لے کر آئے ہیں۔ شیووت صاحب کو بے شک فون کرو' لیکن کوئی ایسی باتاں نہیں کہنا جس سے ہمارے بارے میں انہیں غلط فہمی ہو۔"

"ٹھیک ہے آپ مجھے فون تو کرنے دیں۔"
انسپکٹر نے فون میری طرف کھسکا دیا۔ میں نے شیووت کو فون کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں کامیابی ہوئی۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ شیووت کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "کون بول رہا ہے؟"

میں نے اپنا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ یہاں کیا واقعہ رونما ہو گیا ہے۔ میری بات سن کر شیووت کے لہجے سے نیند اُڑن چھو ہو گئی۔ چندر پرکاش اور رشیدے کی موت کی اطلاع ایسی نہیں تھی جسے سن کر بھی شیووت پر نیند کا خمار طاری رہتا۔ اس کے لہجے میں لرزش آ گئی۔ یقیناً وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟" شیووت نے پوچھا۔

میں نے کہا "میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ تھانے میں ہوں۔ باقی تفصیل آپ کو ایس ایچ او صاحب بتا سکتے ہیں۔"
"اسے فون دو۔" شیووت نے کہا۔

میں نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ انسپکٹر بڑے مؤدب لہجے میں شیووت سے بات کرنے لگا۔ "یس سر۔ یس سر" کہتے ہوئے اس کی زبان سوکھ رہی تھی۔ بے شک شیووت ریٹائرڈ آئی جی تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ محکمۂ پولیس میں اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ اس کی وجہ بھی چند روز بعد مجھے معلوم ہوئی۔ شیووت کے دو بیٹے پولیس میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ایک ایس ایس پی اور دوسرا ایس پی تھا۔ اس کے علاوہ شیووت کا بڑا بیٹا عن قریب ڈپٹی کمشنر بننے والا تھا۔

شیووت سے بات کرنے کے بعد انسپکٹر نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ہمارے لیے گرما گرم چائے اور بسکٹ لانے کا آرڈر دیا۔ ایک دم ہی ہم چاروں کو تھانے میں وی آئی پی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ انسپکٹر دوستانہ ماحول میں ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں شیووت اپنے چھوٹے بیٹے ایس پی مہیش کے ساتھ تھانے پہنچ گیا۔ آتے ساتھ ہی ان لوگوں نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اگلے دو تین روز ہم نے بڑے سکون سے گوپی ناتھ کی عظیم الشان کوٹھی کے دو کمروں میں گزارے۔ باہر کے حالات کے بارے میں ہمیں شوبھا کی زبانی گاہے گاہے خبریں ملتی رہتی تھیں۔ مندر میں ہونے والے خون ریز واقعے سے پولیس نے ہمارا نام بالکل خارج کر دیا تھا اور وہ شواہد بھی مٹا دیے تھے جن سے مندر میں ہماری موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔
یوں پولیس کو ایک فائدہ بھی ہوا تھا اور وہ یہ کہ مندر پر "ریڈ" کر کے شوبھا کو بازیاب کرنے کا سارا کریڈٹ پولیس کو مل گیا تھا۔ مندر کے تہ خانے سے خاصی مقدار میں ناجائز اسلحہ اور منشیات وغیرہ بھی برآمد ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ مندر میں ہلاک ہونے والے افراد میں سے دو اشتہاری ملزم بھی نکلے تھے۔ چندر پرکاش کی موت نے گوپی ناتھ مینشن میں زبردست تہلکہ مچایا تھا۔ چندر، گوپی ناتھ کا بھتیجا تھا۔ چندر کی موت پر اس کے پتا "رام" نے بے تحاشا واویلا کیا تھا اور اس قتل کو گہری سازش قرار دیا تھا۔ شوبھا کی زبانی ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ دونوں بھائیوں یعنی گوپی ناتھ اور رام ناتھ میں زبردست لڑائی ہوئی ہے۔ رام نے اعلان کیا ہے کہ شوبھا کے اغوا سے اس کے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اسے سازش کے تحت مروایا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ گوپی ناتھ پر اپنے بیٹے کے قتل کا مقدمہ درج کرائے گا۔ شوبھا نے یہ اطلاع بھی دی کہ چندر کی آخری رسومات کے فوراً بعد رام اپنے بھائی گوپی ناتھ کا گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

یہ چوتھے روز شام کا واقعہ ہے۔ نرس شوبھا دوڑتی ہوئی ہمارے پاس آئی۔ اس نے ہمیں اطلاع دی کہ گوپی ناتھ صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ سینے میں سخت درد محسوس کر رہے ہیں۔ میں اور صفدر، شوبھا کے ساتھ گوپی ناتھ کے بیڈ روم کی طرف گئے۔ ایک طویل برآمدے سے گزر کر ہم بیڈ روم میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ گوپی ناتھ صاحب کو اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ وہ ایمبولینس جو چوبیس گھنٹے پورچ میں کھڑی رہتی تھی، آج حرکت میں تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایمبولینس "ڈرائیو وے" پر آئی اور سائرن بجاتی برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔

کوٹھی کے ملازم اور دیگر اہلِ خانہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ خاص طور سے شوبھا کی پریشانی نمایاں تھی۔ بے شک بڈھے گوپی ناتھ میں بے شمار برائیاں تھیں اور بہت سی بیماریاں بھی اسے چمٹی ہوئی تھیں، لیکن اس کے باوجود شوبھا اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی وابستگی رکھتی تھی۔ اس نے گوپی ناتھ کو اس کی تمام تر برائیوں اور بیماریوں سمیت قبول کر رکھا تھا یا شاید اس نے اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا آپ اس قدر مار لیا تھا کہ اسے اب گوپی ناتھ جیسے پلپلے بڈھے سے نفرت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ایک بھائی کو کینسر تھا، دوسرے بے روزگار بھائی کو وہ بیرونِ ملک بھجوانا چاہتی تھی اور ایسی ہی کئی اور "مفلس مجبوریاں" تھیں جنہوں نے اس

کمزور ذات کو گھیر رکھا تھا۔ وہ ان مجبوریوں کی سولی چڑھ گئی تھی اور اس نے اپنی جوانی ایک بیمار بڑھاپے کی نذر کر دی تھی۔

میں نے چند ہفتے پہلے جب شوبھا کو پہلی بار دیکھا تھا تو وہ ایک مجبور اور غم زدہ لڑکی نظر آئی تھی لیکن اب تو اس کا خوب صورت چہرہ بالکل ہی کسی قبرستان کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ اس کے جسم پر ہر وقت ایک ہلکی سی لرزش طاری رہتی تھی۔ یہ ویرانی اور لرزش اس جبر و ستم کا نتیجہ تھی جو رشیدے اور اس کے ساتھیوں نے اس پر مندر میں روا رکھا تھا۔ رنجیت راجا نے اس کومل لڑکی کو اپنی وحشت تلے روند کر ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے جسم پر کئی خراشیں اور چوٹیں تھیں لیکن جو خراشیں اور چوٹیں اس کی روح پر آئی تھیں وہ زیادہ سنگین اور تکلیف دہ تھیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کے بعد وہ بالکل باؤلی سی نظر آنے لگی تھی۔ میرے خیال میں یہ بھی اس کی ہمت تھی کہ وہ واپس آنے کے فوراً بعد گوپی ناتھ کی خدمت میں لگ گئی تھی، ورنہ خدانخواستہ کسی لڑکی کے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آ جائے تو وہ مہینوں کسی تاریک کمرے میں پڑی رہتی ہے۔

رات قریباً نو بجے اسپتال سے اطلاع آئی کہ گوپی ناتھ مجھے اور سروج کو یاد کر رہا ہے۔ ہم دونوں کو گوپی کی ذاتی کار میں فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ تین گھنٹے آئی سی یو میں گزارنے کے بعد وہ ایک پرائیویٹ کمرے میں منتقل ہو گیا تھا۔

میں اور سروج اس کے پاس پہنچے تو اسے ڈرپس وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ قریب ہی آکسیجن سلنڈر بھی پڑا تھا، اس کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس نے سروج کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی۔ شاید دواؤں کا اثر تھا یا کمزوری کا کرشمہ تھا۔ میں نے دیکھا گوپی ناتھ کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے ہیں۔ وہ خواب ناک لہجے میں سروج سے مخاطب ہوا "تم میری بہن ہو۔ سروج ہو نا۔"

سروج خاموش رہی۔
"بولو نا سروج۔" گوپی نے اصرار کیا۔
"ہاں جی۔ میں آپ کی بہن ہوں۔" سروج بولی۔
"تم کیوں مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ تمہیں پتا نہیں تھا میں تم سے کتنا پریم کرتا ہوں۔ اپنے دکھوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے تم نے مجھے اتنا بڑا دکھ دے دیا۔" سروج اب بھی خاموش رہی۔ گوپی ناتھ کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے

خون آشام
مصنف: ایم اے راحت
قیمت -/50 روپے
ڈاک خرچ -/20 روپے
ایک ایسے بڑھے سادھو کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔
وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔
اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پہ روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی
— پبلشرز —
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور
— اسٹاکسٹ —
علی بک سٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

جھریوں بھرے رخساروں تک آگئے۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا "تم اب تو خوش ہونا۔ اب تو وہی کچھ تمہیں مل رہا ہے جس کی تمہیں تمنا تھی۔"

سروج نے کہا "اب میں بہت خوش ہوں۔ بس آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں۔"

اب گوپی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ خمار آلود آواز میں بولا "اس بار سروج کو بہت خوش رکھنا' اس بار اسے کوئی دکھ نہ دینا۔"

"آپ کو ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہیے۔"

"یہ بچوں کی بہت ترسی ہوئی ہے۔ اس بار بھگوان تمہیں بچہ دے تو اس بچے کو سروج کے زخموں کے لیے مرہم بنانا۔ ذرا اس ماں کے دکھ کا تصور کرو جو بستر مرگ پر ہو' جس کی آنکھیں دن رات دروازے پر لگی ہوں۔ وہ آخری بار اپنے بچوں کی شکل دیکھنا چاہتی ہو۔ پھر وہ دروازے کو دیکھتے دیکھتے بھگوان کے پاس چلی جائے۔ سروج کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے ظالم سسرالیوں نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ یہاں تک کہ اس کی آخری آشا بھی مٹی میں ملا دی۔"

میں نے کہا "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ایسی باتیں نہ کریں جس سے آپ کا دکھ تازہ ہو۔"

گوپی ناتھ نے اپنی سفید سفید آنکھوں سے مجھے دیکھا "تم مجھے ان باتاں سے شاید اس لیے منع کر رہے ہو کہ تمہیں ان پر وشواس نہیں۔ تم جنموں کے عقیدے کو جھوٹ سمجھتے ہو۔ تمہارے نزدیک جو کچھ ہے بس یہی ایک جنم ہے۔ تمہارے خیال میں میرا دماغ ہلا ہوا ہے اور میں الٹی سیدھی باتاں کر رہا ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے تاؤ جی۔ ہمارے آدرش بھی وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔ ہم آپ کو جھٹلانے کا سوچ بھی نہیں سکتے لیکن ڈاکٹروں نے آپ کو بولنے سے منع کیا ہے۔"

اتنے میں نرس گوپی ناتھ کو انجکشن لگانے کے لیے آگئی اور گوپی ناتھ کو نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہونا پڑا۔

گوپی ناتھ کو دل کا 'درمیانی شدت کا' اٹیک ہوا تھا۔ غالباً اس اٹیک کی وجہ وہ سنگین واقعات تھے جو پچھلے چار پانچ روز میں پیش آئے تھے 'سونے پر سہاگا وہ جھگڑا تھا جو گوپی ناتھ اور اس کے بھائی رام کے درمیان ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی سنگین گرما گرمی نے گوپی کے بڈھے سینے میں درد جگا دیا تھا۔ ہارٹ اٹیک تو خیریت سے گزر گیا لیکن اگلے روز گوپی ناتھ کا شوگر لیول بہت اونچا ہو گیا' اس کے ساتھ ہی گردے کا پرانا درد بھی جاگ اٹھا اور شدید قسم کا دمہ تو اسے تھا ہی۔ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کے ڈھیر لگ گئے۔ دو روز اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر منتقل ہو گیا' کیونکہ گھر میں بھی تقریباً وہ تمام سہولیات موجود تھیں جو اسپتال میں میسر آسکتی تھیں۔ ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر چوبیس گھنٹے گھر میں موجود رہتا تھا۔ اس کے علاوہ نرس شوبھا بھی تھی۔ گوپی ناتھ قریباً بستر سے لگ کر رہ گیا تھا۔ نرس شوبھا یا سروج کے سہارے وہ بمشکل باتھ روم تک جا پاتا تھا۔ سروج اس کی بہت خدمت کر رہی تھی' وہ ہمہ وقت سروج کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے ارد گرد میری موجودگی بھی اسے پسند تھی۔ باقی افراد اس بیماری کی حالت میں بھی بے تحاشا گالیاں پڑتی تھیں اور رات دن ان کے لتے لیے جاتے تھے۔

ایک روز میں اور صفدر کمرے میں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے کہ سروج آدھمکی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی' کہنے لگی "شاہ جہاں! اس بڈھے نے میرا تو دماغ گرم کر دیا ہے۔ ہر وقت پہلے جنم دوسرے جنم کا رونا روتا رہتا ہے۔ عجیب عجیب فرمائشیں کرتا ہے۔ اب تازہ فرمائش یہ ہے کہ رات کو میرے ساتھ چھت پر چہل قدمی کرنا چاہتا ہے۔ اب سوچو اس کی حالت ہے چہل قدمی کرنے والی۔ بلکہ میرے خیال میں تو چھت پر پہنچتے پہنچتے ہی اس کا دم نکل جائے گا۔"

صفدر نے کہا "بھئی جب بندے کی زندگی کا سفر ختم ہو جاتا ہے تو وہ بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کرنا چاہتا ہے۔ عجیب و غریب خواہشیں دماغ میں پیدا ہوتی ہیں' زندگی تو خیر ہر کسی کی ناپائیدار ہے لیکن باباجی تو بالکل کنارے پر نظر آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسی لیے ایسی فرمائشیں بھی کر رہے ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" سروج نے کہا "ابھی صبح کے وقت کہہ رہا تھا کہ میرا من چاہتا ہے جی بھر کر بدپرہیزی کروں۔ ایک پورا دن جو جی چاہے کھاؤں پیوں۔"

"ماشاء اللہ نیک خیالات ہیں۔" صفدر نے سر ہلایا۔

"لیکن میرا تو ناطقہ بند ہو رہا ہے۔" سروج چڑ کر بولی "ایسی ایسی بدبوئیں آتی ہیں بڈھے کے پاس سے کہ دم نکل جاتا ہے۔"

"بھگوان سے ڈرو سروج! وہ تمہیں بہن سمجھتا ہے اور تم اسے بڈھا بڈھا کہہ رہی ہو۔ اس لحاظ سے تو تم خود کو بھی بڈھی تسلیم کر رہی ہو۔"

"وہ تو شاہ جہاں کو بھی بہنوئی سمجھتا ہے' اس کے سمجھنے سے شاہ جہاں بڈھا تو نہیں ہو جائے گا۔"

"بھئی! تم اپنی لڑائی لڑو۔ مجھے بیچ میں مت گھسیٹو۔" میں

نے کہا۔

وہ بولی "شاہ جہاں! پلیز کچھ کرو۔ گوپی ناتھ کے قریب رہتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وبائی امراض کے اسپتال میں آگئی ہوں اور ہر طرف سے خطرناک بیماریوں کے جراثیم نکل نکل کر مجھ پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ خاص طور سے جب اسے سہارا دے کر باتھ روم میں لے جانا پڑتا ہے تو آتما فنا ہو جاتی ہے۔"

ایک دم کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا اور سروج پر پل پڑا۔ وہ سائیں عالی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں سروج کے بال پکڑے اور دو تین چکر دیے' پھر وہ اسے دو ہنٹر مارنے کے ساتھ ساتھ وہ غراہٹ بھری آواز میں سروج کی نقل اتار رہا تھا "میری آتما فنا ہو جاتی ہے۔ میری آتما فنا ہو جاتی ہے۔ کیوں فنا ہو جاتی ہے تیری آتما؟ گندی نالی کی کیڑی۔ جب گندی نالی میں رینگتی تھی اس وقت تیری آتما کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔"

سروج اس اچانک افتاد سے حواس باختہ تھی اور مار سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ میں سائیں عالی اور سروج کے بیچ میں آگیا اور بمشکل سائیں سے اس کی جان چھڑائی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور سائیں سے معافیاں مانگ رہی تھی "غلطی ہو گئی سائیں جی۔ چھما کر دیں۔ آئندہ ایسی بات نہیں کہوں گی۔"

سائیں عالی پھنکارا "کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ خوش حالی یوں ہی نہیں ملتی ہے۔ اس کے لیے جان مارنا پڑتی ہے۔ بدبو کس میں نہیں ہے۔ انسان ہم سب بدبو اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اگر آئندہ ایسی بات تیری زبان پر آئی تو خدا کی قسم ایسا جن چھوڑوں گا تیرے اوپر جو سو سال میں صرف ایک بار نہاتا ہے۔ چھوٹے سے بڑی جوئیں ہیں اس کے سر میں' تیرا حشر نشر کر ڈالے گا۔" سائیں کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کہیں سائیں خود ہی تو وہ جن نہیں ہے؟" صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

سائیں ایک دم صفدر کی طرف متوجہ ہو گیا' اپنی لال لال آنکھیں نکال کر بولا "کیا بکواس کی ہے تم نے؟"

"کچھ نہیں سائیں عالی! میں تو کہہ رہا تھا کہ سائیں کی شخصیت میں خاص قسم کا رعب ہے جس کی وجہ سے ہر بندہ اس کے سامنے مؤدب ہو جاتا ہے۔"

"لیکن تیرے جیسے تلنگے مؤدب نہیں ہوتے' وہ اس وقت مؤدب ہوتے ہیں جب واقعی ان پر جن چھوڑا جاتا ہے۔ تیرے جیسے ایک نافرمان بھوپالی کو پچھلے مہینے سزا دی تھی میں نے۔ اسے کوہ قاف پہنچایا تھا اور وہاں ایک پری سے اس کی شادی کر دی تھی۔ وہ پری۔ پریوں کی ایک خاص قسم میں سے ہے۔ وہ ہر روز ایک بچہ پیدا کرتی ہے اور وہ بچہ ایک ہفتے میں جوان بھی ہو جاتا ہے۔ دو دن پہلے اس بھوپالی نے کوہ قاف میں اپنی بارہ بیٹیوں کے ہاتھ ایک ساتھ پیلے کیے ہیں' پانچ بچیوں کا جہیز دھڑا دھڑ بن رہا ہے' چھ بچوں کو اسکول میں داخل کروانے کا مسئلہ ہے اور پانچ جوان لڑکے بے روزگاری کی وجہ سے آوارہ پھر رہے ہیں۔" سائیں عالی صفدر کو گھورتا ہوا' وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

سروج شرمندہ شرمندہ سی اپنے بکھرے بال سمیٹ رہی تھی۔ صفدر نے کہا "سروج! اس سائیں نے تو تمہیں اسکول کی بچی بنا کر رکھ دیا ہے۔ جب جی چاہا پٹائی کر دی' جب جی چاہا کان سے پکڑ کر تھپڑ لگا دیا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر تمہاری بے عزتی کرتا ہے تاکہ تم اسے چھوڑ کر چلی جاؤ۔"

سروج تنک کر بولی "یہ میرا اور سائیں جی کا معاملہ ہے' تمہیں اس میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کھڑے کھڑے میری کھال بھی ادھیڑ دیں تو اف نہیں کروں گی۔"

میں نے کہا "سروج! تم یہ بات تو نہ کہو۔ چند دن پہلے جب سائیں تمہیں چھڑیاں مار رہا تھا' تم نہ صرف "اف اف" کر رہی تھیں بلکہ چیخیں بھی مار رہی تھیں۔"

"تم بات کو مذاق میں لے جا رہے ہو شاہ جہاں۔ بہرحال یہ تم بھی جانتے ہو کہ سائیں جی کے لیے میرے دل میں کتنا احترام ہے۔"

"میرے خیال میں یہ سائیں کا احترام نہیں وفینے کا احترام ہے۔" صفدر نے کہا "تمہارا اصل پیر و مرشد سائیں نہیں دفینہ ہے۔ اس دفینے کے لیے تم تھیا تھیا کر کے ہر گلی کوچے میں ناچ سکتی ہو۔"

بحث تلخی کی طرف جا رہی تھی لہٰذا میں نے مداخلت کی اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ چند روز پہلے ویران مندر میں ہونے والی خون ریزی پر بات ہونے لگی۔ چندر پرکاش کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا' اس کا ذکر بڑے تواتر سے اخباروں میں آرہا تھا' اس کے علاوہ شیدے کی موت کا تذکرہ بھی زبان زد عام تھا۔ شیدے کے گرفتار شدہ ساتھیوں میں سے ایک دو نے بیان دیا تھا کہ مندر میں فائرنگ اور مار دھاڑ کرنے والے افراد پولیس اہلکار نہیں تھے بلکہ وہ دو مقامی تھے۔ ان میں سے ایک بھوپالی لباس میں تھا (یعنی میں) اور دوسرا پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا (یعنی صفدر) پولیس حکام نے

ان بیانوں کے جواب میں یہ کہا تھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس وہ دونوں افراد درحقیقت پولیس کے لوگ ہی تھے۔ ظاہر تھا کہ اپنے بیان کو سچا ثابت کرنے کے لیے پولیس کو ایک ہزار جھوٹ بھی مزید بولنا پڑے تو وہ بول لیں گے۔

اگلے روز گوپی ناتھ نے وہی کچھ کیا جس کا اظہار اس نے دبے لفظوں میں سروج سے کیا تھا۔ اس نے بڑے طنطنے سے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک پورا دن صرف اور صرف اپنی مرضی کے مطابق گزارے گا اور اس سلسلے میں کسی ڈاکٹر یا اہلِ خانہ کی "ایڈوائس" کو خاطر میں نہیں لائے گا۔

گوپی ناتھ کی نگہداشت پر مامور ڈاکٹر پرشاد میرے پاس آیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"شاہ جہاں صاحب! آپ ہی کچھ کریں۔ گوپی صاحب سراسر خودکشی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر ۱۳۰ اور ۱۸۰ ہے۔ کولیسٹرول ۳۰۰ ہے اور شوگر لیول ۲۰۰ تک پہنچا ہوا ہے' ایسے میں اگر وہ روغنی نان اور تکے کھائیں گے اور ساتھ میں گلاب جامن سے شوق کریں گے تو پھر شاید اوپر والا بھی انہیں نہ بچا سکے' کیونکہ معجزوں کا دور اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "جہاں آپ لوگ اور اہلِ خانہ کچھ نہیں کر سکتے وہاں میں کیا کر پاؤں گا؟"

"وہ آپ کی بات مانتے ہیں' آپ انہیں سمجھا سکتے ہیں۔ وہ بالکل خبطیوں کی طرح ایکٹ کر رہے ہیں۔ میں دلیل پیش کرتا ہوں تو جواب میں گالیاں دیتے ہیں۔ ایسی ایسی گالیاں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔ بلڈ پریشر کی انہیں ایک گولی دی جا رہی ہے' فرما رہے ہیں کہ یہ ڈوز دوگنا کر دو۔ ایک پُرعیش دن گزارنے کے لیے اپنی زندگی کو شدید خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ فرما رہے ہیں کہ شوگر کے لیے ایک انسولین کے بجائے مجھے تین انسولین لگا دو۔"

"گردے کا درد بھی تو ہو رہا ہے انہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کا حل بھی سوچ لیا ہے انہوں نے۔ فرما رہے ہیں کہ اپنی مرضی کے چوبیس گھنٹے میں آج دوپہر بارہ بجے سے شروع کروں گا۔ گردے کے درد کی پندرہ بیس گولیاں انہوں نے اپنی دراز میں رکھ لی ہیں۔ غالباً کل بارہ بجے تک ساری کی ساری کھا لینا چاہتے ہیں اور کھائیں گے بھی شراب میں مکس کر کے۔ اب سوچیں' ایک تو گردے کا درد' اوپر سے شراب۔ جب نشہ ٹوٹے گا تو کیا حال ہو گا ان کا لیکن انہیں کوئی پروا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو چوبیس گھنٹے میں درد کی چار سے زیادہ گولیاں نہیں کھانی چاہئیں' کہنے لگے زیادہ کھالوں گا تو کیا ہو گا۔ مر مر کر ایک سال جینے سے بہتر ہے کہ خوش ہو کر ایک دن جی لیا جائے۔ میں تو ان کی سخت جانی دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

ڈاکٹر کے اصرار سے مجبور ہو کر میں گوپی ناتھ کے بیڈ روم میں پہنچا۔ وہ دیواروں کا سہارا لے لے کر کمرے کے اندر ہی ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے رکا۔ جھک کر اپنا جائزہ لیا۔ مونچھوں کو تاؤ دے کر اوپر اٹھانے کی ناکام کوشش کی پھر سر پر انگلیاں پھیرنے لگا اور کنپٹی کے چند بالوں کو سنوارنے لگا۔ شوبھا ابھی ابھی کھڑکی میں تازہ گلابوں کا گلدستہ رکھ کر گئی تھی۔ گلابوں کی خوشبو' مختلف دواؤں کی بو سے دست و گریباں ہو رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر گوپی ناتھ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' تاہم اس قہقہے میں بھی اس کا جسمانی اور روحانی کرب شامل تھا "آؤ شاہ جہاں! آؤ۔۔۔ شاید تم بھی مجھے سمجھانے بجھانے کا فرض ادا کرنا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا "جناب! بات ہی ایسی ہے کہ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ ہم سب آپ کی صحت اور سلامتی چاہتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کو۔۔۔"

"کم آن شاہ جہاں۔" گوپی ناتھ نے میری بات کاٹی "کم از کم تم تو ایسی رسمی باتاں مت کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میری کتنی اہمیت ہے اور میرے اردگرد موجود لوگاں کو میری کتنی ضرورت ہے۔ جس کے دل میں میرے لیے جتنی محبت ہے وہ بھی مجھے معلوم ہے۔ ان باتاں کو چھوڑو' کوئی اور موضوع چھیڑو۔ مثلاً۔۔۔ مثلاً مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس "ویک اینڈ" کو میرے لیے خوشگوار سے خوشگوار بنانے کے لیے کیا کر سکتے ہو۔ ٹھیک ہے کہ چند روز پہلے کچھ ناخوشگوار واقعات پیش آئے ہیں' لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔۔۔ آج کی شام تھوڑا بہت ہلا گلا ہونا چاہیے یہاں۔۔۔ کوئی ایسی تفریح جو میرے ساتھ ساتھ سب کو اچھی لگے۔ میں آج کی شام اور رات کو بہت سندر دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا دچار ہے کہ کوئی اور ماں کا۔۔۔ سمجھے نہ سمجھے' تم میری باتاں ضرور سمجھ رہے ہو۔"

میرے سینے میں اداسی کی لہر سی اٹھی۔ میں کھوئی کھوئی نظروں سے گوپی ناتھ کو دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں یہ افلاطونی بڈھا مجھے اس گھڑی کچھ "کم برا" لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ ایک بجھتا ہوا چراغ ہے اور بجھنے سے پہلے آخری بار بھڑکنا چاہتا ہے۔ زندگی کو آخری بار قریب سے دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ مجھے لڑکپن میں پڑھی ہوئی ایک انگلش نظم

یاد آگئی' ایک شہزادی کو محل کے اندر دبیز پردوں میں چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ وہ محل کی کھڑکیوں سے شہر کے آزاد لوگوں کو آزادانہ گھومتے پھرتے دیکھتی تھی اور سوچتی تھی' کتنا اچھا ہو کہ گھٹن اور قید کی طویل زندگی کے بدلے اسے آزادی اور خود مختاری کا ایک دن میسر ہو جائے' صرف ایک دن۔ وہ اس شہر کی گلیوں میں گھومے' لوگوں سے ملے' ان کی باتیں سنے' دریا کے کنارے کنارے ریت پر دور تک بھاگے اور بھاگتی چلی جائے۔ اس کے بعد بے شک دوبارہ اسے محل میں قید کر دیا جائے لیکن اس کے پاس ایک خوشگوار دن کی یادیں تو ہوں گی۔ اسے ساری زندگی اطمینان تو رہے گا کہ۔۔۔ وہ اپنے من چاہے طریقے سے ایک آزاد دن گزار چکی ہے۔

گوپی ناتھ نے وہی کیا جو اس کا دل چاہتا تھا۔ دوپہر ٹھیک بارہ بجے اس نے گردے کے درد کی دو تین گولیاں وہسکی کے پیگ میں گھول کر پی لیں۔ درد کی گولیوں نے اس کا درد دور کیا اور وہسکی اسے ترنگ میں لے آئی۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں آگیا اور برآمدے میں کرسی ڈلوا کر بیٹھ گیا۔ شراب جو اس کے لیے زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتی تھی اس کے سامنے پڑی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے شوبھا کو اشارہ کرتا تھا' وہ ایک چھوٹا سا پیگ بنا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔ وہ نشہ ٹوٹنے نہیں دے رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نشہ ٹوٹ گیا تو تمام تر بیماریاں اپنے اذیت ناک جبڑوں کے ساتھ اسے بھنبھوڑنے لگیں گی۔ سہ پہر کو گوپی ناتھ نے ٹینس لان میں کرسیاں لگوائیں۔ وہاں وہ شام تک ٹینس دیکھتا رہا اور اچھا کھیلنے والوں کو داد دینے کے ساتھ ساتھ برا کھیلنے والوں کو گالیاں بھی دیتا رہا۔ شام کی تفریح کے لیے اس نے ایک انوکھا پروگرام بنایا۔ پروگرام یہ تھا کہ وہ فلم دیکھے گا اور وہ بھی سینما میں۔ سینما میں فلم دیکھنے کے بعد وہ مشہور ریجنٹ ہوٹل میں جائے گا اور وہاں کینڈل ڈنر کرے گا۔ ڈاکٹر پرشاد کی پریشانی عروج پر تھی' وہ بار بار میرے کان میں سرگوشی کر رہا تھا "مسٹر شاہ جہاں! اٹ از ٹو مچ۔ مجھے نہیں یقین کہ گوپی صاحب زندہ واپس آسکیں گے' وہ دوپہر سے نصف بوتل وہسکی پی چکے ہیں اور چھ درد کش گولیاں کھا چکے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں' اٹ از ٹو مچ۔ یہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو کر "کومے" میں جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر تم انہیں ڈاکٹر ہو کر نہیں روک سکتے تو اور کون روک سکتا ہے' وہ کسی کی نہیں مانتے' ہاں ایک شوبھا ہے' شاید وہ کچھ کر سکے۔"

"مس شوبھا نے بھی بہت کوشش کی ہے جی۔ منت سماجت بھی کرتی رہی ہیں لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم ہیں۔"

"تو پھر کیا ہو سکتا ہے' دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ اللہ کرے وہ کسی بڑے صدمے سے بچے رہیں۔"

شام کو گوپی ناتھ نے باقاعدہ نہا دھو کر شاندار لباس پہنا۔ گلابی قمیص' سفید پینٹ' پھول دار ٹائی اور سر پر فرانسیسی ہیٹ۔ نشے نے اس کے بیمار جسم میں نئی توانائی پیدا کر دی تھی۔ وہ واکنگ اسٹک کے ذریعے بہ آسانی چل رہا تھا۔ وہ بڑے اہتمام اور کروفر کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ یعنی رشتے داروں میں سے دس بارہ افراد ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ شوبھا' ڈاکٹر پرشاد اور دو تین ملازم بھی ہمراہ جا رہے تھے۔ مقامی سینما میں سارے کے سارے باکسز اس مقصد سے پیشگی بک کرا لیے گئے تھے۔ گوپی ناتھ کے پسندیدہ اداکار راج کپور کی فلم "کل' آج اور کل" لگی ہوئی تھی۔ اس پروگرام میں مجھے اور صفدر کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ شام چھ بجے پانچ گاڑیوں کا قافلہ بڑے کروفر سے فلم دیکھنے روانہ ہوا۔ انڈیا کے سینما ہال بہت کشادہ اور وسیع و عریض ہوتے ہیں۔ باکسز بھی قدرے اونچے تھے۔ ان باکسز کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ نیچے ہال میں دیکھا تو یوں لگا کہ کسی مینار پر چڑھے ہوئے ہیں۔ گوپی ناتھ نے اپنے لیے ایک خاص باکس منتخب کیا۔ شوبھا کی زبانی مجھے پتا چلا کہ چھ سات سال پہلے تک گوپی صاحب اکثر فلم دیکھا کرتے تھے' وہ ہمیشہ اسی باکس کو ترجیح دیتے تھے۔ غالباً اب بھی گوپی ناتھ اپنی اسی پرانی یاد کو تازہ کرنا چاہ رہا تھا۔

انسان کا ذہن بھی کیا گورکھ دھندا ہے۔ بندہ کتنا بھی سنجیدہ اور حقیقت پسند ہو' اس کے اندر کہیں نہ کہیں رومانیت اور خیال پرستی چھپی رہتی ہے۔ ماضی کی سہانی یادیں اور بیتے ہوئے اچھے روز و شب اس کے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ گزرا ہوا وقت اسے کشش کرتا ہے اور اس کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش چھپی رہتی ہے کہ وہ بیتے ہوئے دنوں کو آواز دے سکے۔

گوپی ناتھ کے باکس میں اس کے ساتھ شوبھا اور ڈاکٹر پرشاد موجود تھے' اس کے علاوہ ایک ملازمہ بھی تھی۔۔۔ فلم اچھی رہی۔ فلم دیکھنے کے بعد گوپی ناتھ نے گاڑی میں ہی چند دوائیں کھائیں' ایک انجکشن لگوایا اور وہسکی کا ایک بڑا پیگ پی کر ریجنٹ ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریجنٹ ہوٹل کے شاندار ہال میں بھی آٹھ دس میزیں مخصوص تھیں۔ LIVE موسیقی کا انتظام تھا۔ موم بتیوں کی روشنی نے ماحول کو خواب ناک بنا رکھا تھا۔ اس مرتبہ گوپی ناتھ نے مجھے

لفٹ کرائی۔ شوبھا کے علاوہ میں بھی اس کی میز پر موجود تھا۔ اس کے علاوہ گوپی کی کوئی ادھیڑ عمر عزیزہ بھی تھی۔ ہاں ڈاکٹر پرشاد نہیں تھا۔ ڈاکٹر پرشاد کو ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ گوپی ناتھ نے اپنے لیے جس قسم کا مینیو منتخب کیا تھا اسے دیکھ کر یقیناً ڈاکٹر پرشاد کو اختلاج قلب ہو جاتا۔ اس میں چکن جلفریزی تھا۔ مٹن جنجر تھا۔ فنگر فش تھی اور قورمہ تھا۔ دو قسم کے سلاد' سویٹ ڈشز' آئس کریم۔ غرض ہر قسم کی بدپرہیزی اس میں موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ گوپی ناتھ بہت تھوڑا کھائے گا لیکن وہ ہر قسم کا کھانا اپنے سامنے سجانے کا شوقین تھا۔ کھانا آگیا تو ہم مصروف ہو گئے۔ شوبھا بڑی نزاکت اور نفاست سے ہر شے تھوڑی تھوڑی گوپی ناتھ کی پلیٹ میں ڈال رہی تھی۔ گوپی ناتھ کی نگاہوں میں بڑی ترس ناک کیفیت تھی۔ وہ ان کھانوں کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو خود کو حلق تک ٹھونس لیتا لیکن وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی شے دو تین چمچ سے زیادہ نہیں کھا سکتا اور یہ گنجائش بھی صرف اس لیے تھی کہ اس نے پین کلرز کے ذریعے اپنا جسمانی درد دبا رکھا تھا اور شراب کے ذریعے خود میں مصنوعی توانائی پیدا کر رکھی تھی۔

"آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ونڈر فل۔" وہ بولا "ہر چیز نگاہوں کے سامنے گھومتی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ میری پسندیدہ ترین شراب ہے۔ اس ماں کے.... ڈاکٹر نے تین مہینے سے مجھے اس کے لیے ترسا رکھا تھا۔ اور پھر تمہیں معلوم ہے' جب نرس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے تو سب کچھ سندر ہو جاتا ہے.... کیوں نرس؟" اس نے پوچھا۔

"یس سر۔" وہ شرما گئی۔ اس شرم کے باوجود اس کے چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں بھی موجود تھیں۔

گوپی ناتھ نے کیف کے عالم میں اپنا چہرہ چھت کی طرف کرتے ہوئے کہا "بہت عشق کیے' بڑے پاپڑ بیلے' لیکن جو مزہ شوبھا کی محبت میں ملا' کہیں نہیں ملا۔"

شوبھا کی پیشانی پر پسینے کی نمی چمک گئی۔ اس نے ویٹر کو بلانے کے بہانے اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرلی۔

گوپی ناتھ تو اپنی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔ اس نے دل کھول کر شوبھا کی تعریف کی پھر چندر پرکاش کے لتے لینے لگا' جس نے شوبھا کو رسوا کیا۔ بولتے بولتے وہ جوش میں آگیا۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہنے لگا کہ وہ چندر کے باپ رام اور اس کے خیر خواہوں کو کوڑی کوڑی کا محتاج کردے گا۔ انہیں کوٹھی سے نٹ پاتھ پر لے آئے گا۔ شوبھا نے اس کا ہاتھ تھاما اور لجاجت سے بولی "سر آپ زیادہ نہ بولیں۔ آپ کی طبیعت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر پرشاد بار بار کہہ رہے ہیں کہ دوا کے باوجود شوگر لیول بڑھا ہوا ہے۔"

گوپی ناتھ ایک دم ریلیکس ہو گیا' ہنس کر بولا "تم بہت تیز ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ شوگر کا تذکرہ کرو گی تو میں سویٹ ڈش کھانے کا ارادہ ترک کردوں گا۔ نہیں مائی ڈیئر! ایسا نہیں ہوگا' ہرگز نہیں ہوگا۔ اس ہوٹل کی رس ملائی کھانے کے لیے تو میں جان بھی ہتھیلی پر رکھ سکتا ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ 'ہتھیلی پر نہیں تو اور کہاں رکھی ہوئی ہے۔'

گوپی ناتھ نے نہ صرف رس ملائی کھائی بلکہ آئس کریم کے دو چمچ بھی لیے۔ آئس کریم کھانے میں شوبھا نے گوپی کی مدد کی اور اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ کو سہارا دے کر چمچ گوپی ناتھ کے منہ تک پہنچایا۔ شوبھا آج خوب صورت نظر آرہی تھی۔ غالباً آج اس نے تیار ہونے میں اہتمام کیا تھا۔ ہلکی گلابی ساڑی تھی جس میں کہیں کہیں تارے سے ٹکے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کے خوب صورت کنگن تھے۔ ہلکا سا میک اپ بھلا لگ رہا تھا۔ صرف چند روز پہلے وہ ایک قیامت سے گزری تھی۔ ایک بدقماش شخص نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن شوبھا نے حیرت انگیز تیزی سے خود کو سنبھالا تھا' اور آج وہ گوپی ناتھ کی خوشی کی خاطر رنج و الم کی ہر پرچھائیں اپنے چہرے پر سے سمیٹ چکی تھی۔

کھانے کے بعد رات قریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل ریجنٹ سے ہم واپس گھر روانہ ہوئے۔ ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے ہوئے گوپی ناتھ نے قافلے میں موجود خواتین کے لیے موتیے کے ہار اور گجرے وغیرہ خریدے۔ تاہم یہ بات بھی زیادہ مشکل نہیں تھی کہ ہار اور گجرے وغیرہ خریدنے کی اصل وجہ "شوبھا" ہی ہے۔ بعد ازاں راستے میں بھوپال کی مشہور و معروف دکان سے خوشبودار پان بھی لے لیے گئے۔

دس پندرہ منٹ میں ہم گوپی ناتھ مینشن پہنچ گئے۔ سائیں عالی کو انفلوئنزا کی شکایت تھی' سورج چوبیس گھنٹے اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ انفلوئنزا کی شکایت کی وجہ بھی بڑی معقول تھی۔ دو دن پہلے رات کو سائیں عالی نے آم کے اچار اور دہی کا "ملک شیک" پیا تھا' پھر ایک سیر جلیبیاں' مرغے کی یخنی میں ڈبو کر کھائی تھیں اور ساری رات کوٹھی کے گراسی لان میں سر کے بل کھڑا رہا تھا۔ صبح وہ اوس سے نچڑا ہوا تھا اور دھواں دھار چھینکیں مار رہا تھا۔ بہرحال اب اس کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔

ہم گاڑیوں سے اترے تو گوپی ناتھ' شوبھا کا ہاتھ پکڑ کر ب گاہ کی طرف چلا گیا۔ شوبھا کی حرکات و سکنات میں معنی خیز سیلا پن اور خاموشی تھی۔ گوپی ناتھ ڈاکنگ اسٹک کے ے قدم جما کر چل رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور صفدر چہل قدمی کے لیے لان نکل آئے۔ کھانا مزے دار تھا اور پیٹ بھر کر کھایا تھا' سونے سے پہلے سیر گشت ضروری تھا۔ لان میں چہل قدمی تے ہوئے میری نگاہ ان کھڑکیوں کی طرف اٹھ گئی جو گوپی ی خواب گاہ میں کھلتی تھیں۔ ہم ذرا قریب سے گزرے ب گاہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ شیشے کی انتہائی خوب رت میز پر نہایت مہنگی شراب موجود تھی' قریب ہی یٹ اور گلاس وغیرہ پڑے تھے۔ شوبھا کھڑکیوں کے پردے ت کر رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ کھڑکی بھی بند ہو گئی جس ہمیں "انتظام و انصرام" کی جھلک نظر آئی تھی۔ صفدر معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور مسکرا دیا۔ کہنے لگا ں رنگ رنگیلے بابے کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ پتی حویلی کا دفینہ کسی اندھی کھائی کے کنارے پڑا ہے۔ ہوا چلے گی تو یہ دفینہ لڑھک کر ہزاروں فٹ گہری کھائی چلا جائے گا اور ناپید ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب.... میں سمجھا نہیں؟"

"آپ دیکھ ہی رہے ہیں بابے کے کرتوت.... اپنی نالیوں اور بدپرہیزیوں کے سبب کسی بھی وقت لڑھک ہے۔ اگر یہ اچانک لڑھک گیا تو دفینے کا پتا ٹھکانا ناپید ہو جائے گا۔ سب کچھ اس کے ساتھ ہی چتا میں چلا جائے گا۔"

"ہاں یہ رسک تو بہرحال موجود ہے۔" میں نے کہا۔

صفدر بولا "میرے خیال میں یہ بات بھی غلط ہے کہ گوپی پر کسی طرح دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ ٹھیک ہے کہ اس کی اولاد نہیں' نہ ہی کوئی اور قریبی رشتے دار ہے جس کو بت میں دیکھ کر گوپی ناتھ پسیج سکے لیکن.... شوبھا تو ہے۔ صاف دیکھ رہے ہیں کہ بڈھا اس پر بری طرح فریفتہ ہے۔"

"میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔" میں نے کہا "میرے خیال کے مطابق شوبھا بڈھے کی ضرورت تو ہے لیکن کمزوری نہیں۔ ویسے بھی جو شخص اٹھارہ بیس عشق بھگتا چکا ہو اس سے زیادہ سنجیدگی کی توقع کرنا عبث ہے۔ شوبھا سے گوپی ناتھ کی وابستگی تو ضرور ہے لیکن اس وابستگی کی اس نے حدیں مقرر کر رکھی ہیں۔"

اسی دوران میں سامنے سے مسز جی کلارک اور نجمی کنور آتے دکھائی دیے' وہ بھی ہماری طرح سیر گشت کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ میں مسز جی کلارک اور نجمی کنور کو مندر میں پیش آنے والے تمام واقعات سے آگاہ کر چکا تھا' تاہم مسز کلارک کے ذہن میں کچھ باتیں ابھی وضاحت طلب تھیں۔ ہم وسیع و عریض لان میں ایک فوارے کے پاس رنگین چھتری تلے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

رات کو ہم دیر سے سوئے تھے لہٰذا صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ سورج چونکہ سائیں عالی کی تیمارداری کر رہی تھی لہٰذا صبح سویرے ہی اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر گوپی ناتھ کے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں۔ وہ بولا "سو رہے ہیں۔"

گیارہ بجے کے قریب پتا چلا کہ گوپی ناتھ صاحب بیدار ہو گئے ہیں اور بیڈ ٹی لے رہے ہیں۔ شوبھا سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ بدلی بدلی سی رنگت رات کا افسانہ کہہ رہی تھی.... گوپی ناتھ سے میری ملاقات بارہ بجے کے لگ بھگ پائیں باغ میں ہوئی۔ اس نے اپنا بستر ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے لگوایا تھا۔ قریب ہی چند کرسیاں پڑی تھیں۔ میز پر تازہ انگلش اخبار' دو چار رسالے اور ریڈیو پڑا تھا۔ ہمارے تمام تر خدشات کے برعکس بڈھا ٹھیک ٹھاک ہی نظر آرہا تھا۔ شوبھا اس کی پائنتی کی طرف کرسی پر بیٹھی تھی' اور بڑی نفاست سے سیب کی قاشیں کاٹ کاٹ کر پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔

گوپی ناتھ مجھے دیکھ کر مسکرایا "کیا بات ہے شاہ جہاں! تم کچھ حیران نظر آرہے ہو' شاید تمہارا خیال تھا کہ میں آج کا سورج نہیں دیکھ سکوں گا۔"

"نہ ناجی! خدا آپ کی عمر دراز کرے' آپ کو تو ابھی بہت ذمے داریاں نبھانی ہیں۔"

"میں تمہیں چہرے سے کیسا نظر آرہا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔" میں نے جواب دیا "بلکہ کل سے بھی کچھ بہتر ہی لگ رہے ہیں۔"

"لو اب بتاؤ۔" گوپی ناتھ شوبھا سے مخاطب ہوا "تم تو مجھے واقعی بڈھا کر کے چھوڑو گی۔ وہ ڈاکٹر پرشاد کیا کم تھا جو اب تم بھی ہر وقت مجھے دنیا کا بیمار ترین شخص ثابت کرنے پر تلی رہتی ہو۔ جب میں اپنے آپ کو خود بوڑھا اور بیمار محسوس نہیں کرتا تو تم کیوں ہر وقت مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہو.... اب دیکھو کل تمہارے سامنے کیا کچھ نہیں کیا۔

کھایا پیا' سیر کی' فلم دیکھی۔ کوئی اثر پڑا مجھ پر۔ اس ٹائم بھی تقریباً ٹھیک ہوں۔ بس گردے میں ہلکا ہلکا درد ہے' ابھی دوا کھاؤں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

گوپی ناتھ کو دیکھ دیکھ کر مجھے دلی حیرت ہو رہی تھی۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ اس کے منصوبے بھی طویل تھے۔ وہ اب باقاعدگی سے صبح کی سیر کا پروگرام بنا رہا تھا اور سینئر ڈاکٹر کے مشورے سے اپنی خوراک میں ضروری تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر پرشاو بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے گوپی ناتھ کا ٹمپریچر لیا' بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا' اس کی ہدایت کے مطابق نرس شوبھا نے گوپی کو دوا کھلائی اور انجکشن لگایا۔

گوپی ناتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور گپ شپ لگانے لگا۔ وہ مجھ سے بمبئی کے واقعات سن کر محظوظ ہوتا تھا' اس کی خواہش کے مطابق میں اسے انڈیا کے ایک مشہور ولن کے سگے بھائی کی موت کا واقعہ سنانے لگا۔ یہ واقعہ گوپی ناتھ کے قمار خانے "لکی اسٹار" کے قریب ہی ایک بلڈنگ میں پیش آیا تھا۔

انہی باتوں کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ گوپی ناتھ کچھ بے چین سا ہے' وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا' لیکن اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک دم گوپی ناتھ کی پتلیاں اوپر چڑھ گئیں' اس نے کھینچ کھینچ کر دو تین سانسیں لیں اور پہلو کے بل لڑھک گیا۔ شوبھا نے چیخ ماری۔ میں نے گوپی ناتھ کو سنبھالا اور ملازم سے چلا کر کہا کہ وہ ڈاکٹر پرشاو کو بلا لائے۔ ملازم سرپٹ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بھاگے۔ گوپی ناتھ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے اور حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ یہ شدید ہارٹ اٹیک کی نشانیاں تھیں۔ میں نے گریبان کے بٹن توڑ کر گوپی ناتھ کا سینہ عریاں کر دیا اور اسے اوپر نیچے دبانے لگا۔ بالکل یوں لگا جیسے گوپی ناتھ کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے اور منہ آپوں آپ کھل گیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کے تھوک سے گیلے ہونٹوں کو دیکھا' اور اس بو کو محسوس کیا جو اس کے لیس دار حلق میں سے خارج ہو رہی تھی۔ یہ کراہت آمیز منظر تھا لیکن یہ ایک انسانی جان کا معاملہ بھی تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہونٹ گوپی ناتھ کے ہونٹوں پر رکھے اور اسے اپنی سانس دینے لگا۔ پہلے میں زور سے اس کے منہ میں ہوا دھکیلتا' پھر ساری ہوا اپنے سینے میں کھینچ لیتا۔ ساتھ ساتھ میں اس کے سینے کو بھی دبا رہا تھا۔ دس پندرہ سیکنڈ کی کوشش کے بعد نتیجہ نمودار ہوا۔ گوپی ناتھ کی سانس جو بالکل رک سی گئی تھی' دوبارہ چلنے لگی۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر پرشاو بھاگا ہوا آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے ایمبولینس بھی دوڑی چلی آ رہی تھی۔

ڈاکٹر پرشاو نے بڑی تیزی سے گوپی کا معائنہ کیا "سیویئر ہارٹ اٹیک۔" اس نے کہا۔

گوپی ناتھ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔ ہم نے جلدی سے اٹھا کر اسے ایمبولینس میں ڈالا۔ شوبھا ہچکیوں سے رو رہی تھی اور ایمبولینس میں گھسنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ ایمبولینس کے سائرن نے چیخنا شروع کیا اور وہ برق رفتاری سے بھوپال کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ڈاکٹر پرشاد نے ایمبولینس کے اندر ہی دو انجکشن تیار کیے اور یکے بعد دیگرے گوپی کو لگا دیے۔ تاہم اس کے چہرے پر مایوسی ہی مایوسی تھی۔ گوپی ناتھ کا رنگ بتدریج زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس کے سینے کے زیر و بم میں روانی نہیں تھی' جھٹکے تھے' اور یہ سینہ تھا جس میں ایک انمول راز پوشیدہ تھا۔ دس پندرہ منٹ میں گوپی ناتھ اسپتال پہنچ چکا تھا۔ اسے فوری طور پر کارڈیالوجی وارڈ کے آئی سی یو میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔

رات قریباً دس بجے سینئر ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض کی حالت جوں کی توں ہے اور ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ کئی قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ تاہم اگلے روز علی الصباح گوپی ناتھ نے کچھ افاقہ محسوس کیا۔ اسے ہوش آ گیا تھا اور وہ دھیمے لہجے میں بات کر سکتا تھا۔ پہلے سروج اور پھر شوبھا کو اس سے ملاقات کی اجازت دی گئی۔ شوبھا مختصر ملاقات کے بعد وارڈ سے باہر آئی تو اس نے مجھے بتایا "سر نے اپنے وکیل کو بلایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آپ سے اور مسز سروج سے ایک ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس موقع پر گوپی ناتھ صاحب زیادہ بات چیت نہیں کرنی چاہیے۔"

شوبھا روتے ہوئے بولی "ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہے ہیں لیکن سر کسی کی سنتے نہیں۔ وہ زور زور سے بولنے کی کوشش کر رہے تھے اور گیس ماسک منہ سے اتار اتار پھینک رہے تھے۔ سینئر ڈاکٹر نے کہا کہ مریض کے لیے یہ چیز ٹھیک نہیں۔ یہ جس سے کہہ رہے ہیں انہیں ملا جائے۔"

تھوڑی دیر بعد انچارج نرس آئی اور مجھے سروج سمیت ئی سی یو میں لے گئی۔ یہاں شیشے کے کیبن بنے ہوئے تھے۔ ن کیبنوں میں وہ لوگ پڑے تھے جو اپنے دل کی کج روی کے عث موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کے جسموں کے ساتھ بہت سے کیبلز اور نالیاں وغیرہ منسلک تھیں۔ کئی کے چہروں پر گیس ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ انہی لوگوں میں لوپی ناتھ بھی موجود تھا۔ وارڈ کی "پن ڈراپ" خاموشی میں مرف اسی پیر فرتوت کی بڑبڑاہٹ گونج رہی تھی۔ میں نے لفاظ نہیں سنے لیکن یہی لگ رہا تھا کہ وہ کسی نامعقول ڈاکٹر کی ل بہن ایک کر رہا ہے۔ مجھے اور سروج کو دیکھ کر اس کے ہرے پر نرمی اور آنکھوں میں مدھم سی چمک آ گئی۔ اس نے بی کمزور آواز میں ہمیں بیٹھنے کو کہا' یہ آواز بمشکل ہم دونوں لک پہنچ سکی۔ ہم بیٹھ گئے۔ گوپی ناتھ خلاف توقع کچھ بولا میں' بس کھوئی کھوئی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اس کا سینہ ھونکنی کی طرح چل رہا تھا پھر یوں لگا جیسے اسے نیند آنے لگی ہے۔ اس کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔ وہ بڑبڑانے الے انداز میں بولا "کتنا سکون... ملتا ہے... تم دونوں کو یکھ کر۔ من چاہتا ہے... تمہیں دیکھتا رہوں... اور وجاؤں... میرا یہ وشواس... اب پختہ ہو چکا ہے کہ وہ بمبئی ا ملنگ (سائیں عمالی) ٹھیک کہتا ہے... وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔"

اس نے اپنا ہاتھ سروج کی طرف بڑھایا۔ سروج نے اپنا تھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے لا "وہی ناک' وہی ہونٹ' وہی آنکھیں' تم نے اس جنم میں ی بہت حد تک وہ شکل پائی ہے۔" گوپی ناتھ کے ہونٹوں ے سرسراتی ہوئی آواز نکلی "جب میں نے تمہیں پہلی بار ہاں بھوپال میں دیکھا تھا تو چونک گیا تھا۔ مجھے تمہارے ہرے کے اندر سے کسی کا چہرہ جھانکتا نظر آیا تھا... وہی چہرہ ے میں نے اس جیون میں بے تحاشا پیار کیا ہے..." میرے لاوہ سروج کے لیے بھی یہ ایک انکشاف تھا کہ اس کی شکل گوپی ناتھ کی کسی سورگ باشی بہن سے ملتی ہے۔ نام کے بعد شکل کا بھی مل جانا کچھ عجیب سا تھا' بہرحال ایسے اتفاقات دتے ہیں۔

بہت دیر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے کے بعد گوپی ناتھ نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا۔ وہ میرا ہاتھ بھی تھامنا باہ رہا تھا' میں نے ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ ہم دونوں کے ہاتھ تھامے کئی سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے ہمارے ہرے دیکھتا رہا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا "میں تم دونوں کو ان صندوقوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو سونے چاندی کے جڑاؤ زیورات سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں بہت سے نوادرات بھی شامل ہیں۔"

سروج کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا' تاہم میں اپنے دلی جذبات چھپانے کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ گوپی ناتھ نے سرگوشی کے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی "وہ کل بیس صندوق ہیں۔ نہ زیادہ بڑے ہیں نہ چھوٹے۔ وہ تمام صندوق "گوپی ناتھ میڈیکوز" کے گودام میں موجود ہیں... یہ گودام... تم نے دیکھا ہوا ہے شاہ جہاں... چندر کے ساتھ ہم اکٹھے اس گودام میں گئے تھے۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ گوپی ناتھ اسی گودام کا ذکر کر رہا تھا جس میں چندر ہمیں لے کر گیا تھا اور ہم نے وہاں اسٹور کیپر یعقوب کے ہاتھوں عزت گنوانے والی خانہ بدوش لڑکی کو دیکھا تھا۔ گوپی ناتھ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا اور اس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی "وہ سارے صندوق دوائیوں والے کارٹنوں کے اندر رکھے گئے ہیں۔ ان کی چابیاں بھی ایک کارٹن کے اندر ہی موجود ہیں۔ میرے علاوہ صرف نریندر کمار کو ان صندوقوں کے بارے میں پتا ہے لیکن اس بات کا پتا ٹھیک سے نریندر کو بھی نہیں کہ صندوقوں کے اندر اصل میں کیا ہے۔" گوپی ناتھ نے ہم دونوں کا ہاتھ آہستگی سے دبایا اور بولا "میں تم دونوں کو... ہاں تم دونوں کو ان صندوقوں کا وارث ٹھہراتا ہوں۔ اس کے علاوہ سروج کو میری جائیداد سے بھی معقول حصہ ملے گا۔ میں نے وصیت لکھوانے کے لیے اپنے وکیل کو طلب کیا ہے' اس میں ہر بات تفصیل سے لکھوا دوں گا۔ کسی سالے کنجر کو کوئی پھڈا کھڑا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

میں نے سروج کو ٹھوکا دیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور گلوگیر آواز میں بولی "آپ... ایسی باتیں مت کریں۔ بھگوان کے لیے خاموش رہیں۔ اوپر والا آپ کو میرا جیون بھی لگا دے۔ آپ ضرور ٹھیک ہوں گے' اپنے پاؤں پر چل کر گھر جائیں گے۔"

گوپی ناتھ کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ وہ اپنی "زندگی" کو ایک فحش گالی دے کر بولا "یہ زندگی... بہت لمبی ہو گئی ہے۔ جو شے جتنی لمبی ہو جائے اتنی ہی کمزور ہو جاتی ہے' کسی بھی وقت جھٹک سے ٹوٹ جاتی ہے۔ سو جس نے کل ٹوٹنا ہے وہ آج ہی ٹوٹ جائے۔"

"اگر آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں یہاں سے چلی

جاؤں گی۔" سروج آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی اچھی ایکٹر ہونے کے باوجود بالی ووڈ میں کیوں ناکام رہی۔ شاید اس لیے ناکام رہی کہ اچھی ایکٹر تھی۔

باتیں کرنے سے گوپی ناتھ کی سانس اکھڑنے لگی تھی' میں نے گیس ماسک اس کے منہ سے لگا دیا۔ چند گہری سانسیں لینے کے بعد اس نے ماسک پھر چہرے سے ہٹا دیا۔ اس کی آنکھوں کی خواب ناکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک نفیس قسم کا سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر آ گیا۔ وہ وکیل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوش نما فائل تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گوپی ناتھ وکیل سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں اور سروج اٹھ کر باہر آ گئے۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گوپی ناتھ نے جو کچھ بتایا تھا وہ میری تمام تر توقعات کے خلاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر دفینے کے صندوق واقعی گوپی ناتھ کے پاس موجود ہیں تو وہ کسی نہایت خفیہ ٹھکانے پر حفاظت سے رکھے گئے ہوں گے۔ یہ تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صندوق "گوپی ناتھ میڈیکوز" کے گودام میں موجود ہیں۔ چند روز پہلے میں گوپی ناتھ کے ساتھ قریباً آدھ گھنٹا اس گودام میں موجود رہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف دواؤں سے بھرے ہوئے کارٹن تھے۔ اس وقت میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ مجھے کہ ان کارٹنوں میں چند کارٹن ایسے بھی ہیں جن میں چنے پلی کی حویلی کا نادر دفینہ بھرا ہوا ہے۔

وکیل کے ساتھ گوپی ناتھ کی ملاقات خاصی طویل رہی۔ بعد ازاں اس ملاقات میں گوپی ناتھ کا سیکرٹری سنجیو کمار بھی شامل ہو گیا۔ دس گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹروں کا راؤنڈ شروع ہو گیا اور ہم اسپتال سے واپس آ گئے۔ ہم گوپی ناتھ مینشن میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری ملاقات صفدر سے ہی ہوئی۔ وہ گوپی ناتھ کی "اسٹڈی" میں موجود تھا اور کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا "کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب۔ آپ کی آنکھوں میں مجھے دبا دبا جوش نظر آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری نگاہ واقعی بہت تیز ہو گئی ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بات تو کچھ خاص ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے اسٹڈی کا دروازہ اندر سے بند کیا اور ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے "نوادرات کا پتا چل گیا ہے۔" میں نے اچانک کہا۔ صفدر کو یہی محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر بم کا دھماکا ہوا ہے' وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔

میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "اسپتال میں گوپی ناتھ کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھے اور سروج کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ بتا دیا ہے جو ہم جاننا چاہتے تھے۔"

صفدر کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں گوپی ناتھ کے انکشاف سے آگاہ کیا۔ صفدر کو بھی یہ جان کر بے حد تعجب ہوا کہ دفینہ کسی محفوظ اور الگ تھلگ مقام پر ہونے کے بجائے' دواؤں کے ایک ایسے گودام میں پڑا ہے جہاں روزانہ درجنوں لوگ آتے جاتے ہیں۔

صفدر نے سرسراتی آواز میں پوچھا "مسٹر جی کلارک کو بتا دیا ہے آپ نے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ یہ بات ابھی صرف میرے' تمہارے اور سروج کے درمیان ہے۔"

صفدر کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ ذرا توقف کر کے وہ بولا "ہمارے سامنے اب دو راستے ہیں۔ پہلے ہم خود گودام میں جائیں اور دفینے کی موجودگی کی تصدیق کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور کو بھی حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے اور ان کے مشورے سے قدم اٹھایا جائے۔"

میں نے کہا "تمہاری اپنی رائے کیا ہے؟"

چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا "یہ بے حد اہم نوعیت کا معاملہ ہے۔ دفینہ پاکستانی علاقے سے برآمد ہوا ہے۔ جس جگہ سے برآمد ہوا ہے وہ جگہ قانونی طور پر سروج اور مسز افراہیم کی ملکیت ہے۔ اس طرح حکومت کے علاوہ سروج اور افراہیم بھی دفینے کی ملکیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔" میں نے کہا "دفینہ برآمد ہونے کے بعد جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے دو تین گروہ اس معاملے میں ملوث ہوئے۔ دفینے کی تلاش جاری رکھنے اور اسے قابضین کے قبضے سے چھڑانے والوں کا بھی اس پر حق ہے۔"

صفدر نے ہنکارا بھرا۔ کچھ دیر سر ہلانے کے بعد بولا "خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ فی الوقت تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ان بیس عدد صندوقوں کو اپنے ہاتھ میں کیسے کیا جائے؟ اور آیا ہمیں مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کنور کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں۔"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے سروج سے میری بات ہوئی ہے۔ اس کی رائے تو یہی ہے کہ مسٹر جی کلارک اور

بتی کو آگاہ کرنا نادانی ہوگی۔ ظاہر ہے مسٹر کلارک کے اپنے بادات ہیں۔ وہ ہم پر اپنی رائے ٹھونسنے کی کوشش کر سکتے ہے۔ سروج کی رائے میں بہتر یہی ہے کہ پہلے صندوق اپنے نے میں کر لیے جائیں اور انہیں محفوظ مقام پر پہنچایا جائے' ں کے بعد مسٹر کلارک سے ڈیل کرلی جائے۔"

"کیا آپ سروج کی رائے سے متفق ہیں؟"

"اگر میں کہوں "ہاں" "تو پھر؟"

"تو پھر میں بھی متفق ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز کے بھ مثبت پہلو بھی ہیں۔"

"لیکن میں متفق نہیں ہوں۔" میں نے کہا "ہم اب ۔ ایک ٹیم کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ جب ٹیم ک ہوتا ہے تو اس میں نقصان اور فائدے مشترک ہوتے ہے۔ مسٹر کلارک اب تک ایک مخلص ساتھی ثابت ہوئے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس اہم ترین موقع پر انہیں ندھیرے میں رکھوں۔"

"میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔" صفدر نے کہا ں میں بھی مثبت پہلو ہیں۔"

اسی دوران میں اسٹڈی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ گوپی ناتھ کا ایک ملازم نظر ۔ اس کے عقب میں دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ۔ چوڑی ناک اور پکے رنگ کا فربہ اندام شخص تھا' سرے کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ گوپی ناتھ میڈیکوز کا ور کیپر یعقوب تھا۔ یہی شخص تھا جو پکڑا اٹھانے والی لڑکی ساتھ کچھ رنگین وقت گزارنے کے لیے گودام میں گھسا اور بعد میں پکڑا گیا تھا۔ پکڑے جانے کے خوف سے اس لڑکی کو چونکہ ایک ڈرم میں بند کر دیا تھا' لہٰذا وہ نیم بے ں ہو گئی تھی اور اسے طبی امداد دینا پڑی تھی۔ یعقوب نے پی ناتھ سے معافی تلافی کر کے اپنی نوکری بچائی تھی۔

گوپی کے ملازم نے بھوپالی لہجے میں کہا "صاحب! میں ڑی اچ دیر پہلے اسپتال سے آیا ہوں۔ بڑے صاحب نے ونوں لوگوں کو آپ کی طرف بھیجا ہے۔ یہ دونوں آپ ساتھ گودام میں جائیں گے اور آپ کو آپ کا سامان ۔ کروائیں گے۔"

کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں گوپی ناتھ کا اشارہ نہ سمجھتا۔ نے چوڑی ناک والے شخص سے تعارف حاصل کرنا چاہا ں نے اپنا نام نریندر کمار بتایا۔ میری نگاہوں کے سامنے گوپی ناتھ کی اس ڈائری کے اوراق گھوم گئے جو مسٹر رک نے مجھے دکھائی تھی۔ اس میں نریندر کا نام موجود تھا اور ساتھ میں یہ لکھا گیا تھا کہ نریندر بخشش دغیرہ کا تقاضا کر رہا ہے' لیکن میں نے اسے چھوڑن کے لیے ٹال دیا ہے۔

میں نے بغور نریندر کا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک وفادار قسم کا محنتی شخص نظر آتا تھا۔ نریندر کی آنکھوں میں معنی خیز چمک تھی جبکہ یعقوب قدرے حیران دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم نے اپنا کون سا سامان چیک کرنا ہے اور گودام میں دواؤں کے علاوہ اور کس قسم کا سامان موجود ہے۔

نریندر نے مؤدب لہجے میں پوچھا "آپ ابھی جانا چاہیں گے یا کچھ دیر بعد چلیں گے؟"

میں نے کہا "ہمارے ساتھ دو تین اور افراد نے بھی جانا ہے۔ تمہیں قریباً آدھ گھنٹا انتظار کرنا ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔ ہم آپ کا خادم ہے۔ سارا دن انتظار کر سکتا ہے۔"

میں اور صفدر سیدھے مسٹر جی کلارک کے پاس پہنچے۔ مجتبیٰ کنور بھی وہیں موجود تھا۔ کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا اور چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کو وہی خوش خبری سنائی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے صفدر کو سنائی تھی۔ ان دونوں کا ردِ عمل توقع کے مطابق تھا۔ مسٹر کلارک کے چہرے پر مسرت کے ساتھ ساتھ دبا دبا جوش بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ نوادرات کے شیدائی تھے۔ میں جانتا تھا ان کی بھوک زر و جواہر کے لیے نہیں صرف نوادرات کے لیے ہے۔ یہ ان کا ذوق تھا جو انہیں اب تک کشاں کشاں دفینے کے تعاقب میں لیے پھرا تھا۔ میں نے مسٹر کلارک کو مکمل تفصیل بتائی کہ گوپی ناتھ کے انکشاف کے مطابق دفینے کے سامان سے بھرے ہوئے بیس صندوق کہاں اور کس حال میں ہیں۔ میں نے انہیں نریندر کمار اور یعقوب کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ دونوں ہمیں گودام میں لے جانے کے لیے یہاں پہنچ چکے ہیں۔

"انہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟" مجتبیٰ نے پوچھا۔

"گوپی ناتھ نے۔ اس نے اپنے وکیل کو وصیت بھی لکھوائی ہے۔ اس کی حالت زیادہ تسلی بخش نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ سارے کام جلدی جلدی نمٹانا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سٹورگ باشی چندر پرکاش کی جیپ میں "گوپی ناتھ میڈیکوز" کے گودام کی طرف جا رہے تھے۔ جیپ صفدر ڈرائیو کر رہا تھا۔ مسٹر کلارک کے علاوہ مجتبیٰ اور سراج بھی جیپ میں موجود تھے۔ نریندر اور یعقوب پچھلی

نشستوں پر بیٹھے تھے۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ گوداموں کے علاقے میں بھی مارکیٹ کی طرح ہُو کا عالم طاری تھا۔ بس اِکا دُکا چوکی دار نظر آ رہے تھے۔ دور کہیں کسی مسجد میں ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ واقعی خدا کی بڑائی میں کس کو کلام ہے۔ وہ سات کوٹھریوں میں چھپے ہوئے فرد تک ملک الموت کی رسائی کا اہتمام کرتا ہے اور میدان جنگ میں تابڑ توڑ برستے گولوں کے درمیان زندگی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ایک ایسا ہی کرشمہ دفینے کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ وہ کسی محفوظ مقام پر ہونے کے بجائے ایک عام سے گودام میں پڑا تھا' اور ہر نگاہ غلط انداز سے محفوظ رہا تھا۔ کم از کم ہماری اطلاع کے مطابق تو محفوظ ہی تھا۔

اسٹور کیپر یعقوب نے گودام کی چابیاں نریندر کے حوالے کر دیں' اور خود جا کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا۔ نریندر نے گودام کا وسیع و عریض گیٹ کھولا' پھر اندرونی دروازہ وا کیا اور ہمیں لے کر گودام میں داخل ہو گیا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے گودام کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا۔

گودام بہت وسیع و عریض تھا۔ اس میں کئی پورشن بنے ہوئے تھے۔ گودام کو ائر کنڈیشنڈ کیا گیا تھا۔ مختلف دواؤں کی بو پورے گودام میں چکرا رہی تھی۔ چاروں طرف کارٹنوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ نریندر ہمیں ان دیواروں سے گزار کر گودام کے عقبی حصے میں لے آیا۔ اس حصے میں بڑے بڑے کارٹن اوپر تلے رکھے تھے اور ان پر گرد و غبار کی بلکی سی تہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ عرصے سے انہیں چھیڑا نہیں گیا۔ ان میں سے کچھ کارٹنوں کے اوپر "EXPIRED" کی مہر لگی ہوئی تھی' کچھ پر سرخ سیاہی سے کراس کے بڑے بڑے نشان تھے' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں موجود ادویات صحیح سالم حالت میں نہیں یا کسی اور وجہ سے ناقابل فروخت ہیں۔

"جناب! یہ ہیں وہ کارٹن جن میں اٹیچی کیس موجود ہیں" نریندر نے ایک لائن میں اوپر تلے رکھے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں کچھ چونک سا گیا۔ یہ ڈبے (کارٹن) زیادہ بڑے نہیں تھے۔ لمبائی تقریباً چار فٹ اور چوڑائی و اونچائی ڈھائی فٹ کے قریب تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان میں موجود اٹیچی کیس بھی زیادہ بڑے نہیں ہوں گے۔ گوپی ناتھ کے بقول یہ کل بیس اٹیچی کیس تھے۔ جبکہ یہ بات مجھے اچھی طرح یاد تھی کہ جب دفینہ چنبیل والی حویلی سے برآمد ہوا تھا تو وہ چھوٹے بڑے سائز کے پچیس صندوقوں پر مشتمل تھا۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ یہ مکمل دفینہ نہیں ہے۔ یہ خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور سوچوں کو ایک نئے محور میں ڈال گیا۔

نریندر نے صفدر کے ساتھ مل کر سب سے اوپر والے کارٹن کو اتار کر فرش پر رکھا۔ ایک کپڑے سے اس کی گرد وغیرہ جھاڑی اور پھر PINS اکھاڑ کر کارٹن کھول دیا۔ کارٹن کے اندر "EXPIRED" دواؤں کے بجائے ایک شاندار اٹیچی کیس رکھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ اٹیچی واٹر پروف تھا اور اسے نہایت مضبوط قفل لگے ہوئے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ ایسا شاندار اٹیچی میں نے پہلے کبھی دیکھا ہو۔

نریندر نے جھک کر کارٹن کے اندر ہاتھ گھمایا اور چابیوں کا ایک گچھا نکال لیا۔ یہ بیس عدد چمکتی دمکتی چار چار چابیاں تھیں اور یقیناً ان کا تعلق اٹیچی کیسوں سے تھا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد نریندر نے چابیاں میری طرف بڑھا دیں۔ سروج کے ماتھے پر شکن نظر آئی لیکن فوراً ہی غائب ہو گئی۔ میں نے نریندر سے کہا "تم تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔ ہم ذرا تنہائی چاہتے ہیں۔"

نریندر نے ادب سے سر جھکایا اور گودام کا مقفل دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا۔ اب فیصلے کا لمحہ تھا۔ سب چہروں پر ہیجان پایا جا رہا تھا۔ خود میرا دل بھی تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ بے شمار شب و روز ہم نے اس دفینے کے تعاقب میں گزارے تھے۔ ان گنت ہنگامے' درجنوں قتل اور لاتعداد معرکے اس دفینے سے وابستہ تھے اور آج اس یخ بستہ گودام میں ہم ایک بار پھر اس کی جھلک دیکھنے والے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس جھلک کے پس منظر میں ہمارے لیے کیا تھا' خوشی تھی یا غم' منزل یا راستہ' کامیابی تھی یا ناکامی۔ میں نے چابیوں کا گچھا مسٹر کلارک کی طرف بڑھا دیا "آپ کھولیں جناب!"

مسٹر کلارک نے پہلے تو انکار کیا لیکن میں نے اصرار کیا تو انہوں نے چابیاں تھام لیں۔ ہر اٹیچی میں تین قفل تھے۔ مسٹر کلارک نے یکے بعد دیگرے تینوں قفل کھولے پھر صفدر نے بڑی احتیاط سے اٹیچی کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی براہ راست اٹیچی پر پڑی۔ ہم سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اٹیچی نیچے سے اوپر تک نہایت بیش قیمت جڑاؤ زیورات سے بھرا ہوا تھا۔ سرخ یاقوت' سبز زمرد' نیلگوں فیروزہ اور پتا نہیں کون کون سے پتھر نظر آ رہے تھے۔

صفدر نے اٹیچی بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور اب دوسرے کارٹن میں سے اٹیچی نکال لیا۔ ہر تالے پر نمبر موجود

اور اسی طرح ہر چابی پر بھی تھا۔ مطلوبہ چابی ڈھونڈ کر صفدر نے یہ اٹیچی کھولا۔ اس میں بھی بیش قیمت زیورات اور دھارا آرٹ کے انتہائی نادر نمونے تھے۔ میں' صفدر اور وج ان اشیا کی جھلک پہلے بھی دیکھ چکے تھے' لہٰذا ہم اب آنکھیں بند کر کے کہہ سکتے تھے کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں لیکن ایک بات ایسی تھی جو ہم تینوں کے ذہن میں اور شاید پانچوں کے ذہن میں بری طرح کھٹکنا شروع ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ اگر اٹیچی واقعی بیس عدد تھے... تو پھر یہ "دفینہ" پورا نہیں تھا۔ چنبیل والی حویلی سے جو صندوق ہم نے برآمد کیے تھے وہ ان اٹیچی کیسوں سے زیادہ نہیں تو دوگنا بڑے ضرور تھے اور ان کی تعداد پچیس تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر یہ سارے اٹیچی کیس بھرے ہوئے ہیں تو پھر بھی یہ سامان اس دفینے کا نصف ہے جو ہم نے حویلی کے تہ خانے سے نکالا تھا۔

چند لمحے کے لیے مایوسی کی لہر سی محسوس ہوئی لیکن جلد ہی میں نے خود کو نارمل محسوس کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے مایوس ہو کر میں نے نادانی کی ہے۔ ہمارے سامنے کروڑوں کی مالیت کے زیورات اور ایسے نوادرات پڑے تھے جن کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا اور یہ سب کچھ ہماری دسترس میں تھا۔ ہمیں بغیر کسی لمبے چوڑے ہنگامے یا خون خرابے کے حاصل ہو گیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ اصل دفینے کا نصف بھی تھا تو بھی یہ اتنی زیادہ دولت تھی کہ اس کی بازیابی کو گنے چنے کمالات میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ دوسرا اٹیچی کیس کھلا پڑا تھا۔ گودام میں سنسنی خیز خاموشی طاری تھی۔

میں' مسٹر جی کلارک اور مجتبیٰ کور ایک گوشے میں چلے گئے اور مشورہ کرنے لگے۔ دس پندرہ منٹ کی نہایت اہم گفتگو میں یہ فیصلہ ہوا کہ نوادرات اور دیگر ساز و سامان کو جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ گوپی ناتھ کی آنکھیں کسی بھی وقت بند ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد ان تمام اٹیچی کیسوں کو یہاں سے نکالنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا۔ گوپی کے وارث خدا جانے کیا کیا تنازعے کھڑے کرتے لیکن ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ سامان کو نکال کر پہنچایا کہاں جائے اور اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہو۔ مسٹر جی کلارک نے پیشکش کی کہ سامان کو یہاں سے نکالنے اور بھوپال میں ہی محفوظ مقام پر پہنچانے کی تمام ذمے داری لیتے ہیں۔

انہوں نے کہا "بھوپال میں میری کمپنی "ایف ایم" کا دفتر ایک وسیع عمارت میں ہے۔ عمارت کے کسی بھی اندرونی کمرے میں ان صندوقوں کو پوری احتیاط سے رکھا جا سکتا ہے۔ کمپنی کے مسلح گارڈز پوری ذمے داری سے چوبیس گھنٹے سامان کی نگہداشت کریں گے۔"

میں نے کہا "اور سامان کو یہاں سے لے جانے کا کیا انتظام ہو گا؟"

"یہ کام بھی "ایف ایم" کے کارندے ہماری نگرانی میں بہ آسانی سرانجام دے لیں گے۔" مسٹر کلارک نے پورے اعتماد سے کہا۔

مسٹر کلارک کا کام پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا اور اب پچھلے چند ماہ سے بھوپال بھی اس نیٹ ورک میں شامل ہو گیا تھا۔ گوپی ناتھ کے قریب آنے کے لیے مسٹر کلارک نے اپنی انٹرنیشنل کمپنی ایف ایم کی ایک پوری برانچ بھوپال میں "اسٹیبلش" کر دی تھی۔ یقیناً اس میں لاکھوں ڈالر خرچ ہوئے تھے لیکن مسٹر کلارک جیسے دولت مند کے لیے یہ ایک معمولی بلکہ ناقابل ذکر پراجیکٹ تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت میں طاقت ہوتی ہے۔ یہ دولت کی طاقت ہی تو تھی کہ امریکا سے ہزاروں میل دور بھوپال میں مسٹر کلارک کو ہر قسم کی سہولت میسر تھی اور ہر نوعیت کی خدمت سرانجام دینے کے لیے کارندے بھی مہیا تھے۔ دوسرے لفظوں میں دولت کے طفیل مسٹر جی کلارک کے لیے ہر ملک اور ہر شہر اپنا ملک اور اپنا شہر تھا۔

تمام تفصیلات طے ہو گئیں تو صفدر نے ایک نہایت کارآمد تجویز پیش کی۔ اس کی رائے تھی کہ نریندر کمار بے شک گوپی کا مخلص اور وفادار کارندہ نظر آتا ہے مگر اس کے سلسلے میں کسی طرح کا رسک نہ لیا جائے۔ جب تک دفینے کا سامان محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتا' نریندر کمار کو اپنی تحویل میں رکھا جائے۔

نریندر کمار کو گودام میں بلایا گیا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس کے علاوہ ان اٹیچی کیسز کے بارے میں اور کسی کو معلوم ہے؟ نریندر کمار نے اپنے علاوہ اپنے ایک بھائی موہن کمار کا نام لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گوپی ناتھ کے ایک شاپنگ سینٹر میں بطور سیلز مین کام کرتا ہے۔ وہ شاپنگ سینٹر گودام سے زیادہ دور نہیں تھا اور اتوار کے روز بھی کھلا رہتا تھا۔ ہم نے نریندر کمار کو صفدر کے ساتھ بھیجا اور وہ دونوں دس منٹ میں نریندر کمار کے چھوٹے بھائی موہن کمار کو بھی گودام میں لے آئے۔ موہن کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بھی نریندر کی طرح صورت سے ہی "وفادار ابن وفادار" قسم کی چیز نظر آتا تھا۔ میں نے ان دونوں کو بتایا کہ دونوں بھائی ایک دو روز تک ہمارے ساتھ رہیں گے' اگر وہ اپنے گھروں میں اطلاع پہنچانا چاہیں تو بذریعہ فون پہنچا سکتے ہیں' یا پھر کسی اور طریقے سے پیغام بھیج سکتے ہیں۔

وہ دونوں کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آنے لگے تھے۔
میں نے انہیں تسلی دی کہ انہیں کسی طرح کا گزند نہیں پہنچے گا۔ وہ بے حد آرام سے رہیں گے اور انہیں انعام و اکرام بھی دیا جائے گا۔

نریندر کمار عاجزی سے بولا "صاحب! کیا میں اس بارے میں بڑے صاحب جی (گوپی ناتھ) سے بات کر سکتا ہوں؟"

"یہ سب کچھ گوپی ناتھ صاحب کی ہدایت کے مطابق ہی کیا جا رہا ہے۔" صفدر نے کہا "ہم تمہاری بات بھی ضرور کرا دیتے لیکن تم دیکھ ہی چکے ہو کہ گوپی ناتھ صاحب کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

سروج کی رائے تھی کہ اسٹور کیپر یعقوب کو بھی اپنی تحویل میں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ بات تو اس نے بھی محسوس کر لی ہوگی کہ گودام کے اندر خفیہ قسم کی بات چیت ہو رہی ہے؟

مجتبیٰ کنور نے بھی سروج کی تائید کی' لہٰذا یعقوب کو بھی گودام میں بلا لیا گیا۔ مسٹر جی کلارک صاحب نے کہا "مجھے ایک ٹیلی فون چاہیے تاکہ میں "ایف ایم" کے مقامی جی ایم سے بات کر سکوں۔ گودام میں فون لائن موجود تھی۔ فون سیٹ یعقوب کے کیبن میں رکھا تھا۔ تار میں گنجائش موجود تھی لہٰذا فون سیٹ گودام کے اندر لایا گیا اور مسٹر کلارک نے پانچ دس منٹ تک "ایف ایم" کے جنرل منیجر سے بات چیت کی۔ اس گفتگو کے بعد مسٹر کلارک بالکل مطمئن نظر آنے لگے۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد گودام کے دروازے پر ایک ٹیکسی کار آکر رکی اور اس میں سے پانچ افراد برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک پتلون قمیص میں تھا جبکہ باقی اپنے حلیے سے مزدور پیشہ نظر آ رہے تھے۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں تھے۔ پتلون قمیص والا ان مزدوروں کو لے کر اندر آ گیا۔ میرے اور صفدر کے لیے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ مزدوروں کے بھیس میں انتہائی تربیت یافتہ گارڈز گودام میں آئے ہیں' اور انہیں مسٹر جی کلارک نے بلایا ہے۔ ان گارڈز کے پاس نہایت جدید قسم کے پستول اور ریوالور تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مقامی لوگ نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق برما یا تھائی لینڈ وغیرہ سے ہے۔ بعد ازاں تصدیق بھی ہو گئی کہ یہ تمام گارڈز برمی تھے۔ بہرحال ان پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ انڈیا کے انتہائی مشرقی علاقوں مشرقی بنگال وغیرہ کے باشندوں کی صورتیں بھی برمی باشندوں سے ملتی جلتی ہی ہوتی ہیں۔

مسٹر کلارک مجھے گودام سے باہر لے آئے۔ انہوں نے گودام سے پچاس ساٹھ گز دور کھڑے ایک آئس کریم والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "شاید تمہیں یاد ہو' جب ہم یہاں آئے تھے تو یہ آئس کریم والا یہاں موجود نہیں تھا۔ پانچ دس منٹ پہلے ہی اپنی ریڑھی کے ساتھ یہاں پہنچا ہے۔ اور وہ شخص جو سڑک کے موڑ پر کار کا بونٹ کھولے بیٹھا ہے وہ بھی ابھی ابھی یہاں آیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس پورے علاقے کو غیر محسوس طور پر گھیر لیا گیا ہے۔" مسٹر کلارک نے کہا "ہمارے کم و بیش پچیس افراد گودام کے ارد گرد کی گلیوں میں موجود ہیں۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا "ہمیں کسی طرح کا رسک نہیں لینا چاہیے۔"

اسی دوران میں مسٹر کلارک کو کوئی کام یاد آیا اور جلدی سے گودام کے اندر چلے گئے۔ مجتبیٰ کنور میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس کا چہرہ اندرونی جوش و خروش کے سبب سرخ نظر آتا تھا "بہت بڑی کامیابی ہے۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ خواب دیکھ رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں لیکن..." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔ چپ کیوں ہو گئے؟"

اس نے سگریٹ کے دو طویل کش لیے اور بولا "یہ... پورا سامان ہے۔ میرا مطلب ہے کہ دفینے کے بارے میں جو کچھ میں نے سنا ہے اس کے مطابق... سامان کچھ زیادہ تھا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے علاوہ تم نے خود بھی بڑے سائز کے پچیس صندوقوں کا ذکر کیا تھا۔"

"آپ کے ذہن میں اٹھنے والا سوال درست ہے۔" میں نے کہا "میرا قیاس ہے کہ جو سامان آج ہمیں اس گودام سے ملا ہے وہ اصل دفینے کا نصف یا اس کے لگ بھگ ہے۔"

چند لمحے میرے اور مجتبیٰ کنور کے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔ مجتبیٰ نے ایک طویل کش لیا اور دھواں شام کے دھندلکے میں چھوڑتے ہوئے بولا "کچھ بھی ہے شاہ جہاں۔ یہ سب بہت... ونڈر فل ہے۔ بچپن میں علی بابا چالیس چور کی کہانی پڑھی تھی۔ آج تو یہی محسوس ہوا ہے کہ سم سم کا غار دیکھا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جن دو ایجنسیوں کا سامان ہم نے

ہے وہی کروڑوں کا ہے۔"

مجتبیٰ نے مجھے بھی سگریٹ پیش کیا' پھر خود ہی طلائی لائٹر سے میرا سگریٹ سلگایا اور بولا "آج میں تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔"

"کیوں آج میں نے کیا کیا ہے؟"

"آج تم نے ایک بہت عمدہ فیصلہ کیا ہے۔ ایسا فیصلہ جس نے تمہیں جہاں بے شمار مشکلات سے بچایا ہے وہاں ایک ایسے شخص کا مان بھی رکھا ہے جو تم پر بے حد بھروسا کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "میں سمجھ نہیں پا رہا' کیا آپ وضاحت کریں گے۔"

مجتبیٰ بولا "مسٹر کلارک تم پر بہت اعتماد کرتے ہیں۔ اگر آج تم غلط فیصلہ کر لیتے تو ان کے اعتماد کا خون ہو جاتا اور شاید تمہیں بھی بری طرح پچھتانا پڑتا۔"

"آج میں نے کون سا فیصلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجتبیٰ کنور انکشاف انگیز لہجے میں بولا "آج دوپہر تمہارے اور صفدر کے درمیان اسٹڈی روم میں جو بات چیت ہوئی تھی وہ سب کی سب مسٹر کلارک نے سنی تھی۔ تمہاری باتوں سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ گوپی ناتھ نے تمہیں دفینے کی اصل لوکیشن سے آگاہ کر دیا ہے پھر تم دونوں نے آئندہ کی جو پلاننگ کی وہ بھی سب کی سب مسٹر کلارک کے کانوں تک پہنچی۔ تمہارے بقول سروج کا خیال تھا کہ دفینے کی لوکیشن کے بارے میں مسٹر کلارک کو فی الحال کچھ نہ بتایا جائے اور مکمل رازداری سے کام لیا جائے' لیکن تم نے سروج کے اس خیال کو رد کیا اور دفینے کی تلاش کے کام کو ٹیم ورک قرار دیتے ہوئے مسٹر کلارک کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا۔"

میں حیرت سے مجتبیٰ کنور کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ لفظ بہ لفظ وہی باتیں دہرا رہا تھا جو میرے اور صفدر کے درمیان گوپی ناتھ کی اسٹڈی میں ہوئی تھیں۔

مجتبیٰ کنور چند سیکنڈ تک میری حیرت سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولا "گوپی ناتھ کی اسٹڈی میں اور بیڈ روم میں ڈکٹا فون لگے ہوئے ہیں۔ یہ ڈکٹا فون مسٹر کلارک نے گوپی کے سیکرٹری ہی کی مدد سے لگوائے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ گوپی کی گفتگو سے کوئی کام کی بات معلوم کی جا سکے۔ آج اسٹڈی میں تمہارے اور صفدر کے درمیان ہونے والا مکالمہ اسی ڈکٹا فون پر سنا گیا ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ اگر مجتبیٰ کی بات درست تھی تو پھر واقعی میں اور صفدر آج دوپہر ایک نہایت ہی نازک موضوع پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ مسٹر کلارک کے ساتھ میرے تعلق میں سچائی تھی اور اس سچائی کا اظہار میری بے خبری میں بھی ہوا تھا۔ درست کہتے ہیں کہ سچا جذبہ اپنا صلہ آپ ہوتا ہے۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں مسٹر کلارک کافی مصروف رہے۔ مجتبیٰ کنور اور صفدر بھی ان کے ساتھ تھے۔ تمام "سامان" بڑی حفاظت کے ساتھ دواؤں کے گودام سے "ایف ایم" کے مرکزی دفتر کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں مسٹر کلارک نے اپنے مسلح گارڈز کا پہرا بٹھا دیا۔ میں اس دوران میں سروج کے ساتھ گوپی ناتھ کی تیمارداری میں مصروف رہا تھا۔ وہ بدستور اسپتال کے آئی سی یو وارڈ میں تھا۔ کسی وقت اس کی حالت قدرے بہتر نظر آنے لگتی تھی اور کسی وقت یہ لگتا تھا کہ بس دم سینے میں اٹکا ہوا ہے۔ درحقیقت گوپی ناتھ کا "آخری جشن" اسے لے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی مرضی کا ایک دن تو گزار لیا تھا مگر اب بہت سے دن قیامت کے گزارنے پڑ رہے تھے۔ تاہم اس کے ذہن میں پچھتاوا نام کو نہیں تھا۔ ایک دن شام کو میں اس کے پاس بیٹھا اس کا بازو دبا رہا تھا کہ اس نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے پیشاب وغیرہ کی حاجت ہو رہی ہے مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا "یہ مت سمجھنا کہ میں پچھتا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ پچھلا ویک اینڈ میرے جیون کا آخری ویک اینڈ ہو لیکن وہ یادگار تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے جلد بازی کی' لیکن میں جلد بازی نہ کرتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی حاصل نہ کر سکتا جو میں نے کیا ہے۔"

میری موجودگی گوپی ناتھ کو پسند تھی۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اس کے بیڈ کے قریب موجود ہوتا تو اسے سکون رہتا۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتا اور بڑی دھیمی آواز میں مجھ سے کہتا کہ میں اسے کوئی پرانا واقعہ سناؤں۔ بمبئی میں میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا وہ میں اب تک کئی بار دہرا چکا تھا' میں تھک گیا تھا لیکن گوپی نہیں اکتایا تھا۔ وہ گاہے گاہے سروج کو بھی اپنے پاس بلا لیتا تھا اور ٹک ٹک اس کی صورت دیکھتا چلا جاتا تھا۔ غالباً وہ سروج کے نقوش میں اپنی سورگ باشی بہن کی مشابہت تلاش کرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنی بہن سروج کی ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھی دکھائی تھی۔ گوپی ناتھ کی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تصویر اور سروج میں کسی حد تک مشابہت ہے۔ مگر اس مشابہت کو "آواگون" کے

نظریے سے منسلک کرنے والی بات کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آسکتی تھی' پھر میرا دھیان سائیں عالی کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ شروع سے یہ پیش گوئی کرتا آیا تھا کہ دفینے تک رسائی صرف اور صرف اسی وقت ہو سکے گی جب میں اس سلسلے میں کوشش کروں گا۔ وہ اس ضمن میں میرا اور سوروج کا ساتھ بھی ضروری قرار دیا کرتا تھا' بلکہ اگر دیکھا جائے تو غزالہ کے مجھ سے دور رہونے کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی کہ سائیں عالی غزالہ کو میرے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سوروج میرا دُم چھلا بن کر رہے۔ سائیں عالی کے یہ خیالات ایک وقت تک ہمیں پریشان کرتے رہے تھے لیکن اب یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خیالات اتنے غیر اہم نہیں تھے جتنا اہم انہیں سمجھ رہے تھے۔ سائیں عالی کی پُراسراریت ایک بار پھر ہم سب کے دل و دماغ کو متاثر کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ مسٹر جی کلارک جیسا روشن خیال امریکن بزنس مین بھی سائیں عالی کی روحانیت کا معترف نظر آ رہا تھا۔ ان دو تین دنوں میں صفدر نے میرے ساتھ مل کر ایک اور کام بھی کیا تھا۔ ہم نے گوپی ناتھ مینشن میں ان تمام جگہوں کو احتیاط سے دیکھا تھا۔ جو ہمارے استعمال میں رہتی تھیں۔ ہمیں شبہ تھا کہ کہیں اور بھی ڈمنا فون نہ لگا ہوا ہو۔ بہرحال یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

میں نے اور سوروج نے گوپی ناتھ کو بتا دیا تھا کہ ہم نے نوادرات سمیت تمام سامان گودام سے نکال کر ایک محفوظ مقام تک پہنچا دیا ہے۔ اس "محفوظ مقام" کی تفصیل گوپی ناتھ نے نہیں پوچھی' نہ ہی ہم نے بتائی تھی۔ اگر ہم بتاتے کہ سامان مسٹر کلارک کے پاس محفوظ کیا گیا ہے تو گوپی یقیناً بہت جز بز ہوتا۔ وہ ہم دونوں کو متعدد بار تنبیہہ کر چکا تھا کہ مسٹر کلارک نامی امریکی ہے اور ہم اس سے بہت محتاط رہیں۔

یہ گوپی ناتھ کے اسپتال داخل ہونے کے چھٹے دن کی بات ہے۔ میں اور شوبھا دونوں گوپی ناتھ کے پاس موجود تھے۔ شوبھا گوپی ناتھ کو ایک میگزین پڑھ کر سنا رہی تھی۔ گوپی ناتھ سن رہا تھا۔ کسی کسی وقت اس کے منہ سے "ہوں" کی آواز نکلتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہنکارا بھر رہا ہے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس نے کافی دیر سے ہنکارا نہیں بھرا۔ میں نے چونک کر گوپی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں' روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ گوپی کا ہاتھ میرے بالکل سامنے بستر پر دھرا تھا' میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ وہ مر چکا تھا۔

سخت جانی بالآخر موت سے ہار گئی تھی۔ شوبھا صورتِ حال سے بے خبر پڑھتی جا رہی تھی۔ "جارج کہتا ہے' انسان جینا اس وقت سیکھتا ہے جب وہ مرنے کے قریب ہوتا ہے۔ زندگی کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب وہ بہت مختصر رہ جاتی ہے۔ انسان تمام لذتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ وہ انہیں دہرانا چاہتا ہے لیکن لذتیں اس سے روٹھ جاتی ہیں۔ کاش ہم اس وقت زندگی کی قدر کرنا سیکھ جائیں جب سب کچھ ہمارے بس میں ہوتا ہے۔" شوبھا پڑھتی جا رہی تھی لیکن سننے والا موجود نہیں تھا۔ میں نے میگزین اس کے ہاتھ سے لیا تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی' پھر اس کی نگاہ گوپی ناتھ کے مردہ چہرے پر جم گئی۔ چند لمحے وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی' پھر اس نے سر میرے کندھے سے ٹکا دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ خبر پورے بھوپال میں پھیل چکی تھی کہ گوپی ناتھ "رام پیارا" ہو گیا ہے۔

گوپال ناتھ کی ڈیڈ باڈی گوپی ناتھ مینشن میں لائی گئی اور آخری رسومات کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گوپی ناتھ کے رشتے دار ان تیاریوں میں پیش پیش نظر آ رہے تھے۔ آج ان کی پیشانیوں پر درد تھا اور آنکھوں میں نمائشی ڈر رہا تھا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ سخت جان بڈھا جاتے جاتے بھی اپنے ان نافرمان رشتے داروں کو بہت سخت قسم کی چٹکیاں کاٹ گیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ گوپی ناتھ کو شمشان گھاٹ لے جانے کا اعلان کب ہوتا ہے۔ اچانک ایک ملازم اندر داخل ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ میرے لیے فون ہے۔ میں نے کامن روم میں جا کر فون سنا۔ دوسری طرف ایک نسوانی آواز تھی۔ میں آواز پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا جب آواز نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا "آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں بہت اچھی طرح آپ کو جانتی ہوں اور کیوں نہ جانوں گی' آپ نے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہے جو میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتی۔"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے کہا "کہیں تمہارا نام راحت تو نہیں؟"

وہ خوش ہو کر بولی "آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا۔ میں آپ کی بڑی احسان مند ہوں جی۔ میں آپ سے اس وقت لمبی بات نہیں کر سکتی' بس اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے' میں جان چکی ہوں کہ اس رات مالاں اور اس کے غنڈوں سے میری عزت بھائی رشید (شیدے) نے نہیں بچائی تھی بلکہ آپ نے بچائی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ بھائی رشید کے گن مین رنجیت راجانے بتایا تھا۔ میں آپ کی

ناشکر گزار ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "راحت بی بی! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ اتفاق کے تحت تھا۔"

وہ میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی "اس وقت میں نے آپ کو ایک بہت خاص اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ بھائی رشید (شیدا) اور مالاں ہی میں گہرے دوستوں کی طرح تھے۔ مالاں اس بات پر شرمندہ تھی کہ بے خبری میں اس کے آدمیوں نے مجھے اغوا کیا اور کوٹھے پر پہنچا دیا۔ وہ کئی بار مجھ سے اور رشید سے معافی مانگ چکی تھی۔ بہرحال میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ قدرت نے مالاں کے ہاتھوں ایسا گھناؤنا کام کروا کے مالاں اور رشید دونوں کو ان کے کرموں کی سزا دی ہے۔ میرے ساتھ تو جو ہونا تھا سو ہو گیا اور اس کا دکھ تو زندگی کے ساتھ رہے گا لیکن دونوں بھی پچھتاوے کی آگ میں جل جل کر خاک ہوتے رہے۔"

میں نے کہا "دانا کہتے ہیں کہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اب دیکھو یہ بھی شکر کا مقام ہی ہے ناکہ ۴۸ گھنٹے تک تم جیسی غنڈا صفت عورت کے چنگل میں رہنے کے باوجود تمہاری عزت محفوظ رہی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی' پھر کہنے لگی "میری بات پھر درمیان میں ہی رہ گئی ہے جی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ مالاں بے حد کینہ پرور عورت ہے۔ وہ یہ دکھ بھول نہیں سکی کہ آپ اس کی لارنس روڈ والی کوٹھی میں داخل ہوئے اور اس کے دو کارندوں کو زخمی کرنے کے بعد مجھے چھڑا کر لے گئے۔ وہ پہلے تو بھائی رشید کی وجہ سے چپ رہی تھی لیکن بھائی رشید کے قتل ہونے کے بعد اسے کوئی ڈر فکر نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گی۔ بلکہ مجھے ایک خاص اطلاع یہ بھی ملی ہے کہ پچھلے تین چار روز سے مالاں کے کارندے مسلسل آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

راحت نے دو تین منٹ تک مزید مجھ سے بات کی۔ اس نے جو اطلاع دی تھی وہ بڑی فکر انگیز تھی۔ فون بند کر کے میں کتنی ہی دیر وہیں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ اگر مالاں کے کارندے واقعی پچھلے تین چار روز سے میری نگرانی کر رہے تھے تو یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ وہ گودام پر ہونے والی کارروائی سے آگاہ ہو گئے ہوں گے یا کم از کم انہیں یہ شک ہو گیا ہو گا کہ گودام سے کچھ نکالا گیا ہے اور کہیں پہنچایا گیا ہے۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پچھلے تین چار روز میں مجھے خود بھی ایک آدھ بار اپنے تعاقب کا شبہ ہوا ہے۔ بلکہ مجھے یاد تھا کہ میں نے اپنے اس شک کا اظہار صفدر سے بھی کیا تھا۔ میں جوں جوں اس بارے میں سوچ رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ نوادرات اور دیگر سامان کا معاملہ اتنا حساس تھا کہ اس حوالے سے کسی طرح کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ بات باہر نکل جاتی تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی تھی۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں تھی کہ جرائم پیشہ لوگوں کے گروہ علاقے میں موجود ہیں اور دفینے کے بارے میں کوئی اطلاع سننے کے لیے سراپا سماعت بنے ہوئے ہیں۔ مالاں کے بارے میں' میں نے اب تک جو کچھ سنا تھا اس سے یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک نہایت باخبر عورت ہے۔ بھوپال میں پتا بھی ہلے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ اب راحت کی بات سننے کے بعد مجھے یوں لگ رہا تھا کہ بھوپال میں رہتے ہوئے مجھے مالاں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ میرا اس کے ساتھ ٹکراؤ بھی ہو چکا تھا۔ درحقیقت شوبھا کے اغوا کے معاملے نے ہمیں پچھلے دنوں اتنا الجھائے رکھا تھا کہ اور کسی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا' پھر شوبھا برآمد ہوئی تو گوپال ناتھ بسترِ مرگ پر جا لیٹا۔ یوں مالاں اپنی تمام تر خطرناکی کے باوجود میرے اور صفدر کے ذہن سے اوجھل رہی۔

معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ مالاں سے فوری طور پر دو دو ہاتھ کر ہی لیے جائیں۔ گودام پر ہونے والی کارروائی کے سلسلے میں اگر وہ کچھ جان چکی تھی تو پھر اسے زیادہ ڈھیل دینی مناسب نہیں تھی۔ وہ خود کو بہت بم قسم کی چیز سمجھتی تھی اور ایسے لوگ اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے بعض اوقات بہت ہی الٹے کام کر جاتے ہیں۔

میں نے فوری طور پر صفدر سے مشورہ کیا۔ صفدر کا خیال بھی یہی تھا کہ مالاں نامی یہ عورت بزعم خود بھوپال کی ٹھیکے دارنی بنی ہوئی ہے اور شہر میں ہر قسم کی سرگرمی پر نگاہ رکھتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسے گودام میں ہونے والی کارروائی کی بھنک پڑ چکی ہو۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس پر فوراً ہاتھ ڈالنا ضروری تھا' مشورے کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ گوپی ناتھ کے کریا کرم کے بعد ہم مالاں کے اڈے پر جائیں گے۔

سہ پہر قریباً تین بجے گوپی ناتھ مینشن سے گوپال ناتھ کی ارتھی اٹھی۔ یہ بھی ویک اینڈ تھا' پچھلے ویک اینڈ کو قریباً اسی

وقت گوپال ناتھ اپنے جشن مرگ کا آغاز کرچکا تھا۔ ڈھول کھول کر اپنی پسندیدہ شراب پی رہا تھا اور ایک رنگ بھری شام گزارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اسی مقام سے اس کی ارتھی اٹھ رہی تھی اور سفید کپڑوں میں ملبوس افراد "بولو رام" کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ ارتھی کا جلوس گوپال ناتھ مینشن سے نکلا اور شمشان گھاٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہر دم بولنے اور گرجنے برسنے والا گوپال لوگوں کے کاندھوں پر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ مرچکا تھا لیکن اب بھی یوں لگ رہا تھا کہ وہ ایک دم اٹھ بیٹھے گا اور اپنے جلوس میں موجود اپنے ناپسندیدہ رشتے داروں اور ملازموں کو گالیاں دینا شروع کردے گا۔

ارتھی ایک بڑی سڑک سے گزر رہی تھی جب اچانک میری نگاہ ایک سیاہ رنگت والے شخص پر پڑی۔ اس نے سفید چادر کندھوں پر ڈال رکھی تھی اور میرے پہلو میں چل رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس شخص کو میں نے غالباً مالاں کے کوٹھے پر دیکھا تھا۔ اس نے ہماری جامہ تلاشی لی تھی اور ریوالور وغیرہ نکال کر اندر جانے دیا تھا۔ میرے غور سے دیکھنے پر سیاہ رنگت والا شخص ایک دم گھبرا گیا۔ اس نے میرا اور اپنا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا' لیکن جب میں مسلسل اسے گھورتا رہا تو وہ کچھ اور پیچھے چلا گیا۔ مجھے شک گزرا کہ اس شخص نے چادر کے نیچے کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہے۔ میں نے صفدر کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ مجھے صفدر کے کان میں بات کرتے دیکھ کر سیاہ فام شخص بری طرح ڈر گیا اور ارتھی کے جلوس سے نکل کر ایک دم بھاگ کھڑا ہوا۔

میں اور صفدر جلوس سے نکلے اور سیاہ فام شخص کے پیچھے ہی ایک بغلی گلی میں داخل ہوگئے۔ وہ قریباً سو گز کے فاصلے پر بگٹٹ بھاگا جا رہا تھا۔ ہم دونوں نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ گلیوں کے جال میں اوجھل ہوگیا۔

میں نے کہا "صفدر پیارے! اب اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ مالاں حرام زادی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور اگر وہ چار پانچ روز سے پیچھے پڑی ہوئی ہے تو پھر سمجھو کہ گودام سے اٹیچی کیسز کی منتقلی بھی راز نہیں ہے۔"

"تو کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے کہ گوپال ناتھ کا کریا کرم تو ہمارے بغیر بھی ہوجائے گا' اور جو کچھ اس کے ساتھ منکر نکیر نے کرنا ہے وہ بھی ضرور کریں گے تو پھر ہم کیوں نہ سیدھے مالاں صاحبہ ہی کی طرف چلیں۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ ہم مالاں کو منکر نکیر بن کر جائیں۔"

"بالکل اگر ہم منکر نکیر نہیں بنیں گے تو وہ ملک الموت بن جائے گی۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے' ارتھی کے جلوس میں بھی اس کا مسلح کارندہ موجود تھا۔"

ہم دونوں کے پاس ریوالور موجود تھے' صفدر نے فوراً ایک ٹیکسی کار روک لی اور ہم مالاں کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ یہ ہفتے کا دن تھا۔ دفتر اور اسکولوں میں ہاف ڈے تھا۔ لوگوں پر چھٹی کا موڈ سوار تھا' پارکوں اور سینماؤں میں رش نظر آرہا تھا۔ ایک جگہ بڑا جلوس دکھائی دیا۔ یہ ہندوؤں کا جلوس تھا۔ ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ ہنومان اور راون وغیرہ کے بڑے بڑے پتلے بنائے گئے تھے اور انہیں ہاتھوں میں نچایا جا رہا تھا۔ ہندو مالا عجیب و غریب کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں ان گنت روایات اور رسمیں ہیں' سینکڑوں ہی میلے اور تہوار ہیں۔ قریباً ہر دوسرے یا تیسرے روز کوئی نہ کوئی میلہ یا تہوار تو ہوتا ہے۔ ہم جلوس سے کنی کترا کر گاندھی روڈ کی طرف نکل گئے اور وہاں اپنا رخ مالاں کے اڈے کی طرف کرلیا۔

مالاں کا اڈا ایک بارونق علاقے میں تھا۔ یہ علاقہ ذرا مختلف قسم کا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے' یہاں رہائشی کوٹھیاں بھی تھیں اور ساتھ ہی بازار بھی واقع تھا۔ ٹیکسی ایک بڑی سی پان شاپ کے سامنے جا کر رکی۔ ہم کرایہ ادا کرکے مالاں کی کوٹھی میں داخل ہوگئے۔ بیرونی دروازے پر ایک چوکیدار موجود تھا اور ہر آنے جانے والے کو کڑی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بہرحال اس نے ہم سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ ہم اندر داخل ہوگئے۔ اصل عمارت سے پہلے ایک چھوٹا سا احاطہ تھا' یہاں گارڈینا کی باڑ تھی اور مورپنکھ کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گارڈینا کی باڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنی قمیض کے نیچے سے ریوالور نکالا اور مورپنکھ کے پودے میں پھینک دیا۔ اندرونی دروازے پر ایک کرخت چہرہ گارڈ موجود تھا' اس کے کندھے سے چھوٹی نال کی خودکار رائفل لٹک رہی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے ہم دونوں کی تلاشی لی۔ صفدر کا ریوالور نکال کر ایک الماری میں رکھ دیا' یہاں ایک بندوق اور دو ریوالور پہلے بھی پڑے تھے۔ ہم آگے بڑھے۔ گھونگھروں کی مدھم صدا کانوں میں پڑنے لگی۔ ہم ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک لڑکی مختصر لباس میں

انے کی دھن پر رقص کر رہی تھی۔ تماش بین نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے پان چبا رہے تھے اور سگریٹ پھونک رہے تھے۔ رقاصہ لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی' کوئی اسے چوم رہا تھا کوئی چٹکی کاٹ لیتا تھا۔ کسی کی کوشش تھی کہ اسے گود میں بھر کر بیٹھ جائے پھر ایک شخص اٹھ کر لڑکی کے ساتھ ہی محو رقص ہوگیا۔ لڑکی کافی خوب صورت تھی' لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ موقع پر موجود سب تماش بین نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے لباس' حلیے اور ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے نوٹ' سب اس امر کے گواہ تھے کہ وہ بس چھوٹے موٹے دکان دار اور کلرک وغیرہ ہیں۔ حالانکہ مالاں کا اڈا جتنا بڑا اور مشہور تھا وہاں بس بڑے بڑے سیٹھوں اور زمین داروں کو ہی قدم رنجہ فرمانا چاہیے تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ سخت گیر مالاں نے اکثر لڑکیوں کو ماہانہ ادائیگی کا پابند کر رکھا تھا۔ ان لڑکیوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر مہینے کے آخر میں مقررہ رقم مالاں کی ہتھیلی پر دھریں۔ اگر کوئی لڑکی مقررہ رقم ادا نہیں کرسکتی تھی تو مالاں مار مار کر اس کا حشر کردیتی تھی۔ اس کے وحشیانہ سلوک نے لڑکیوں کو مجبور کر رکھا تھا کہ وہ جیسے بھی ہو مقررہ رقم مقررہ مدت میں پوری کریں۔ مہینے کے آخر میں لڑکیوں کی جان پر بن جاتی تھی۔ وہ اپنی "سیل" لگا دیتی تھیں۔ اپنی دامیں اور اپنا جسم رعایتی نرخوں پر بیچنے کو تیار ہوجاتی تھیں۔ جب مال سستے داموں ملتا تھا تو تھوڑی قوت خرید رکھنے والے لوگ بھی دکان پر پہنچ جاتے تھے۔ بے شک وہ نچلے طبقے کے نشے باز اور بدمزاج لوگ ہوتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی گھٹیا ہوتا تھا لیکن مالاں کی مار کے ڈر سے لڑکیاں یہ سب کچھ جھیلنے پر مجبور تھیں۔ "کلیئرنس سیل" میں مال فروخت کرنے کے لیے مالاں نے کوٹھی کا ایک بیرونی کمرا مخصوص کر رکھا تھا۔ یہاں درمیانے درجے کی ڈیکوریشن تھی اور قالین و فرنیچر وغیرہ بھی پرانا تھا۔

ہم اس کمرے میں سے گزر کر آگے گئے تو ایک شان دار رقص گاہ میں مالاں سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مسند پر پھیل کر ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں پیتل کے ایک بڑے تھال میں تھے اور ایک ملازم اس کے تلوے نیم گرم پانی سے دھو رہا تھا۔ ایک خوب رو لڑکی اپنے نازک ہاتھوں سے اس کے موٹے بھدے کندھے دبا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مالاں یوں کرسی سے اچھلی جیسے پیتل کے تھال میں کرنٹ آگیا ہو۔

"تت... تم؟ اوئے تم یہاں کیسے؟"

"کیوں' مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟"

"آج تو گوپال ناتھ کا کریا کرم تھا۔"

"گوپال ناتھ کا نام تو تم یونہی لے رہی ہو' تمہارے خیال میں آج میرا کریا کرم تھا' کیونکہ تم نے اس کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔"

"پتا نہیں کیا بکواس کر رہا ہے تو۔" مالاں نے کہا اور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ وہ پہاڑ کا پہاڑ نظر آتی تھی۔

صفدر نے کہا "زبان سنبھال کر۔ ہم زبان گدی سے کھینچ بھی لیا کرتے ہیں۔"

مالاں کے پہاڑ جیسے جسم میں زلزلہ پیدا ہوا۔ وہ قدرے حیرت سے صفدر کو دیکھنے لگی شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی کوٹھی میں گھس کر اس سے ایسے لہجے میں بات کی جائے گی۔ وہ دو قدم چل کر صفدر کے بالکل سامنے پہنچ گئی اور غضب ناک لہجے میں بولی "کیا بدی تے کیا بدی کا شوربا۔ اوئے تیرے جیسے مچھروں کو تو میں انگوٹھے کے نیچے مسل دیتی ہوں۔"

میں نے کہا "اگر تیرے پلید خون میں اتنی طاقت ہوتی تو سامنے آکر للکارتی' خاندانی کنجروں کی طرح کرائے کے غنڈوں سے میرا پیچھا نہ کرواتی۔"

مالاں نے آنکھیں نکالیں "مجھے لگتا ہے... تجھے کسی کی بددعا لگی ہوئی ہے' ورنہ یوں مالاں کے گھر میں آکر بک بک نہ کرتا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اور صفدر کو دھکا دے کر راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

صفدر نے اس کی کلائی تھام لی۔ مالاں کی آنکھیں ایک بار پھر حیرت سے پھٹ گئیں "اوئے حرامی! مجھے ہاتھ لگاتا ہے۔" وہ صفدر پر چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زوردار طمانچہ صفدر کے منہ پر رسید کردیا۔ چٹاخ کی آواز سے رقص گاہ گونج اٹھی۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا' اگر صفدر کوئی مؤثر جواب نہ دیتا تو یہ بہت بڑی بے عزتی تھی' لیکن صفدر کہاں چوکنے والا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے بھی ایک زبردست طمانچہ مالاں کے منہ پر جڑ دیا۔ الائچی سپاری پان کی سرخ رال مالاں کے منہ سے اچھل کر قالین پر جا گری۔ اب مالاں کے حیران ہونے کی باری تھی۔ حیرت اور غضب اس کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئے تھے پھر غضب نے حیرت کو ڈھانپ لیا۔ مالاں نے چیخ کر ایک اور تھپڑ صفدر کے منہ پر مارا۔ صفدر نے بھی پہلے والے انداز میں تھپڑ کا منہ توڑ جواب دیا۔ مالاں نے جب تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو صفدر نے

ہاتھ روک لیا اور دھکا دے کر مالاں کو پیچھے ہٹا دیا۔ مالاں کا پاؤں پتیل کے تھال میں پڑا اور تھال سمیت لڑھک کر دور جا گری۔ کوٹھی میں ایک دم کہرام سا مچ گیا تھا۔ لڑکیاں چیختی چلاتی ہوئی چاروں طرف بھاگیں۔ مالاں بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے منہ سے صفدر کے لیے گالیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ ایک بار مونیم اٹھا کر وہ صفدر پر حملہ آور ہوئی۔ صفدر نے وار بچا کر ٹانگ رسید کی۔ وہ اڑتی ہوئی دروازے سے ٹکرائی اور بیرونی ہال میں جا گری۔ وہ اور صفدر بری طرح گتھم گتھا ہو گئے اور لڑتے بھڑتے باہر احاطے میں پہنچ گئے۔ مالاں غضب سے پاگل ہو رہی تھی۔ وہ بالکل مردانہ انداز میں گھونسے چلا رہی تھی اور گالیاں بک رہی تھی۔ اس کا مردانہ انداز دیکھ کر صفدر نے بھی یہ بھلا دیا تھا کہ وہ ایک عورت ہے۔ وہ اس کے تابڑ توڑ حملوں کا جواب بالکل اسی انداز میں دے رہا تھا جس انداز میں کسی مرد کے حملوں کا جواب دیتا۔ وہ ایک گھونسا مارتی تھی تو وہ دو رسید کرتا تھا۔

اسی دوران میں مالاں کے حیرت زدہ ڈشکروں کو بھی ہوش آ گیا۔ ان میں سے دو نے ریوالور نکالے لیکن میں اس سے پہلے ہی مورچھل کے اندر سے اپنا ریوالور برآمد کر چکا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تین فائر کیے۔ دونوں ریوالور بردار فرش پر گر کر تڑپنے لگے۔ میں نے ان میں سے ایک کا ریوالور چھین کر جیب میں ڈال لیا۔ ایک کارندے نے مجھے عقب سے دبوچنے کی کوشش کی' میں نے اسے گھما کر پختہ دیوار سے دے مارا اور ٹانگ پر گولی مار کے اسے ناکارہ کر دیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ سہ پہر کے چار پانچ بجے مالاں کے اس اڈے پر زیادہ کارندے موجود نہیں تھے۔ جو موجود تھے ان میں سے کچھ تو سازندے اور گھریلو ملازم تھے' محافظ ٹائپ کے چار پانچ افراد تھے اور ان میں سے بھی تین زخمی ہو کر تڑپ رہے تھے۔

صفدر نے مالاں کی شدید مزاحمت دیکھی تو اس کا میٹر بھی پورے کا پورا گھوم گیا۔ وہ مالاں کے ساتھ گتھم گتھا تھا۔ اسے گھسیٹتا ہوا باہر بازار میں لے آیا۔ بازار کے چوراہے میں سیکڑوں لوگوں کے درمیان مالاں اور صفدر میں تین چار منٹ تک زبردست مار دھاڑ ہوئی۔ دونوں کے چہرے لہولہان تھے۔ مالاں کا گھونسا کسی ہیوی ویٹ باکسر کے پنچ سے کم نہیں تھا۔ شاید شیدے نے ٹھیک ہی بتایا تھا کہ کوئی بدقسمت لڑکی مالاں سے بغاوت کرنے کی کوشش کرے تو یہ مار مار کر اس کے چہرے کی کھال ادھیڑ دیتی ہے۔ وہ واقعی ہر لحاظ سے ایک سفاک غنڈی تھی۔ صفدر اور مالاں کی دھواں دھار لڑائی کے دوران میں دو تین افراد ایک دم مجھ پر پل پڑے۔ ان میں سے ایک نے چھرے کے وار سے میری ایک ہتھیلی پر معمولی زخم لگایا لیکن اس کوشش میں اس کی گردن خود بخود میرے بازو کے شکنجے میں چلی آئی۔ میں نے ایک لمحے میں اسے ادھ موا کر کے ایک دکان کے تھڑے پر پھینک دیا۔ دوسرے دو افراد میں سے ایک نے میرے ریوالور کی گولی اپنے گھٹنے پر ریسیو کی اور لنگڑاتا ہوا بھاگ گیا۔ دوسرے کو میں نے دو چار گھونسوں میں لمبا لٹا دیا۔

صفدر اور مالاں کی دن توڑ لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ انوکھی لڑائی تھی' حالانکہ مرد اور عورت کے درمیان ہو رہی تھی لیکن یہی لگتا تھا کہ دو مردوں کے درمیان ہو رہی ہے.... پھر اچانک صفدر کا وار چل گیا۔ مالاں نے اینٹ اٹھا کر صفدر کو ماری۔ اینٹ صفدر کے سینے پر لگی۔ جواب میں صفدر نے قریبی دکان سے کولڈ ڈرنک کی بوتل اٹھا کر مالاں پر چلائی' یہ بوتل سیدھی مالاں کی پیشانی پر لگی اور خون کی دھار بہہ نکلی۔ مالاں تیورا کر ایک ریڑھی پر گری۔ صفدر نے اسے چھاپ لیا اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

لوگ دکانوں کے تھڑوں پر' سڑک پر اور چوباروں کی چھتوں پر محو حیرت کھڑے تھے۔ انہوں نے آج تک اس بے لگام عورت کو گرجتے برستے اور دندناتے ہی دیکھا تھا۔ کسی مرد دوزن میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے چھو بھی سکتا۔ آج وہ خونچکاں جسم کے ساتھ سڑک پر اوندھی پڑی تھی اور پاگلوں کی طرح واویلا کر رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک قریبی بیوٹی پارلر سے آٹھ دس افراد ہاکیوں' ڈنڈوں اور چھریوں سے مسلح ہو کر نکل آئے۔ میرے ساتھ ساتھ صفدر نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ مالاں کے گماشتے تھے۔ میں نے صفدر کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام رسانی کی۔ اس نازک موقع پر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اپنا ریوالور مالاں کی کنپٹی سے لگا دوں اور اس کے گماشتوں کو خود سے دور رہنے کی ہدایت کروں۔ میں ریوالور سمیت مالاں کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک بالکل مختلف منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ بیوٹی پارلر میں سے برآمد ہونے والے مسلح افراد نے ہم پر حملہ آور ہونے کے بجائے مالاں کے اڈے کا رخ کیا اور توڑ پھوڑ کرتے ہوئے اندر گھس گئے۔ مالاں کے دو ملازم ان کے ساتھ آئے تو ان کو بھی روئی کی طرح دھنک دیا گیا۔ چند سیکنڈ

بعد مالاں کی کوٹھی کے اندر سے فاحشہ لڑکیوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں اور شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بازار میں سے کچھ اور لوگ بھی کوٹھی میں گھس گئے۔ اندر موجود لڑکیاں چیختی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی تھیں اور تتر بتر ہو گئی تھیں۔ درمیانی عمر کا ایک باریش شخص پُرجوش انداز میں پکارا "یہ بدکار عورتیں ہیں۔ انہوں نے پورے علاقے میں گند ڈال رکھا ہے' ہم انہیں یہاں سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔" پُرجوش نوجوانوں کی ایک اور ٹولی ڈنڈے سوٹے لہراتی ہوئی کوٹھی کی طرف بڑھی۔

"مارو سالوں کو۔" کوئی چیخا۔

"ہاتھ پاؤں توڑ ڈالو۔" ایک دوسری آواز آئی۔

"آگ لگا دو۔" ایک اور صدا آئی۔

کوٹھی کی چھت سے رائفل کے دو تین فائر ہوئے۔ جواب میں مجمع میں سے بھی کسی نے ریوالور چلایا۔ ایک دم ہلچل سی مچ گئی تھی۔ میں نے مالاں کو دیکھا۔ پیشانی سے بہنے والا خون اس کی آنکھوں میں بھرا ہوا تھا' وہ گھسٹ گھسٹ کر سڑک کے کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ قریب ہی وہ ٹیکسی کار موجود تھی جس میں ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دیا تھا لیکن وہ غالباً کسی اور سواری کی تلاش میں ابھی تک یہاں موجود تھا' اب وہ دنگا فساد کا منظر دیکھنے کے لیے ٹیکسی سے باہر نکل گیا تھا' ڈرائیونگ سیٹ کی طرف والا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر پچھلا دروازہ کھولا اور مالاں کو گھسیٹ کر اندر ڈال لیا۔ صفدر نے پلک جھپکنے میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور پھرتی سے ٹیکسی آگے بڑھائی۔ مالاں چیخنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اس کے بھاڑ جیسے منہ پر اپنی ہتھیلی جما دی تھی' افراتفری کے عالم میں کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ مالاں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور ٹیکسی کیونکر حرکت میں آ گئی ہے۔ ہاں ٹیکسی ڈرائیور سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ کتنا بھی غافل سہی بہرحال یہ اس کی ٹیکسی تھی۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کے پیچھے بھاگا لیکن میرا دھکا کھا کر دور جا گرا۔ ٹیکسی نے برق رفتاری سے ٹرن لیا اور بڑی سڑک پر آ گئی۔ وہ مالاں جو آج تک اغوا کرتی یا کراتی رہی تھی۔ آج خود اغوا ہو گئی تھی۔ بھوپالیوں کی پھولن دیوی دو لاہوریوں کے شکنجے میں تھی۔

راستے ہی میں' میں نے مالاں کی گردن کے مخصوص حصے پر دباؤ ڈالا اور اسے کچھ دیر کے لیے مکمل گم کر دیا۔ "اس غنڈی کو لے جانا کہاں ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔ ابھی سیدھے چلتے رہو۔" میں نے کہا۔

قریباً پانچ کلومیٹر آگے آنے کے بعد میں نے کہا "اب بائیں طرف مڑ جاؤ۔ رفتار آہستہ رکھو۔ کھیتوں کے درمیان سے جو پہلا راستہ بائیں جانب جائے گا' اس پر موڑ لینا۔"

صفدر نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ اندازاً دو کلومیٹر آگے جانے کے بعد میں نے صفدر کو گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔ یہاں کھیتوں کے درمیان ایک بس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ بس ایک کھیت میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے اکثر شیشے سلامت تھے لیکن نشستیں وغیرہ جل چکی تھیں۔ یہ بدقسمت بس دراصل چار پانچ ہفتے پہلے ایک سانحے کا شکار ہوئی تھی۔ یہ فیکٹری کی بس تھی اور کارکنوں کو لے کر جا رہی تھی۔ فیکٹری مزدوروں کے ایک مخالف دھڑے نے دو جیپوں پر بس کا تعاقب کیا۔ یہ یونین کے لوگ تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔ بس ڈرائیور نے اپنی اور سواریوں کی جان خطرے میں دیکھی تو بس کو روٹ سے ہٹا کر یہاں لے آیا مگر یہاں بھی موت نے پیچھا نہ چھوڑا' افراتفری میں بس ایک گیلے کھیت میں چلی گئی اور پھنس گئی۔ تعاقب کرنے والوں نے باقی افراد کو تو چھوڑ دیا لیکن اپنے مخالف دھڑے کے اٹھارہ افراد کو بس کے اندر ہی گولیوں سے بھون ڈالا اور بس کو آگ لگا دی۔

چند روز پہلے جب ہم لوگ شوبھا کی تلاش میں بے طرح سرگرداں تھے' چندر نے ہی مجھے یہ ڈھانچہ دکھایا تھا اور واقعہ بھی سنایا تھا۔ اس وقت میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ جلد ہی میں دوبارہ اس مضافاتی سڑک پر آؤں گا' اس وقت چندر بھورگ باشی ہو چکا ہوگا اور میرے ساتھ ایک غنڈا عورت ہوگی جس سے پوچھ تاچھ کرنے کے لیے مجھے یہ بس SHELTER فراہم کرے گی۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ہم نے ٹیکسی کار جنتر کے گھنے درختوں میں پارک کر دی اور مالاں کو اٹھا کر بس میں لے آئے۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ پگڈنڈی فاصلے سے گزرتی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی شخص پگڈنڈی سے گزرا بھی تو بس کی طرف آنے یا اس میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جن گاڑیوں میں اموات ہو جاتی ہیں' ان کے ڈھانچے اکثر سڑکوں کے کنارے پڑے رہتے ہیں۔ لوگ ان ڈھانچوں میں گھسنے کی کوشش نہیں کرتے۔ شاید انہیں ایک طرح کی نحوست کا احساس ہوتا ہے' یا پھر خوف غالب آ جاتا ہے۔ خاص طور سے رات کے وقت تو ایسی کوشش دل گردے والا بندہ بھی نہیں کرتا۔ میں اور صفدر مالاں کو اٹھا کر گاڑی میں

لے آئے تھے۔ ٹیکسی کے اندر سے ہی ہمیں ایک ٹارچ بھی مل گئی تھی۔ مالاں کو گاڑی کے فرش پر لٹا کر میں نے ٹارچ کی روشنی میں اچھی طرح اس کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی کے زخم سے خون رسنا اب بند ہو گیا تھا۔ ہم نے مالاں ہی کی ایک پھٹی ہوئی آستین استعمال کی اور اس کی پیشانی کا زخم صاف کر کے پٹی باندھ دی۔ اس کے چہرے پر مزید چھوٹے بڑے زخم بھی تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد مالاں ہوش میں آ گئی۔ وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھتی رہی پھر جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے یہ احتیاط کی تھی کہ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی' ناکام ہو کر زور زور سے ہانپنے لگی اور ہمیں قہرناک نظروں سے گھورنے لگی۔ شاید وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ہم کس ٹائپ کے لوگ ہیں۔ وہ اتنے اثر رسوخ کی مالک تھی کہ بڑے بڑے حکومتی عہدے دار اس کی مرضی کے خلاف بولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ہم نے بڑے دھڑلے سے سرِبازار اس کی پٹائی کی تھی' اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ اب تک دوسروں کی کھنچائی کرتی رہی تھی اور انہیں اغوا کراتی رہی تھی' اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گا۔

وہ غرائی "یا تو تم پاگل ہو یا میرے بارے میں جانتے نہیں ہو۔"

صفدر نے کہا "تمہاری دوسری بات تو سراسر غلط ہے ہاں پہلی بات میرے حوالے سے صحیح ہو سکتی ہے۔ تم واقعی پاگل کر سکتی ہو۔ تمہارے اندر پاگل کر دینے کی شکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ پھر غرائی۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔" صفدر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "میں خدانخواستہ تمہارے رنگ و روپ کی بات نہیں کر رہا ہوں' وہ تو شاید تمہیں چالیس برس پہلے تم سے چھن گیا تھا' میں تمہارے اندر کی اس بھیانک عورت کی بات کر رہا ہوں جو گالم گلوچ میں مردوں کو پیچھے چھوڑتی ہے اور برائلر مرغی کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتی ہے۔"

مالاں نے بھنا کر اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن صفدر نے بلا جھجک اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور اسے دوبارہ فرش پر لٹا دیا "تم عورت کہلانے کی حق دار ہی نہیں ہو لہٰذا تمہیں ایک عورت جیسی عزت اور رعایت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم اینٹ مارو گی تو اس کا جواب پتھر سے ملے گا۔"

"پتھر سے نہیں کوک کی بوتل سے۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں کوک کی بوتل سے اور اگر ہماری بات نہیں مانو گی تو بات اس سے بھی آگے جا سکتی ہے۔"

"اوئے کیسی بات!" مالاں تنک کر بولی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تم اس عمر سے گزر چکی ہو جب ہم تم سے کوئی ایسی ویسی بات منوانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ہم تم سے بس چند ضروری سوال پوچھنا چاہتے ہیں' اگر جواب دے دو گی تو جان چھوٹ جائے گی ورنہ بدصورت انداز میں قتل کرنے کے ایک ہزار ایک طریقے ہمیں آتے ہیں۔" صفدر کے لہجے میں قائل کر دینے والی قوت تھی۔

میں نے مالاں کے چہرے پر پہلی بار خوف کے تاثرات دیکھے۔ یقیناً وہ یہ تصور کرنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ اس کا پالا ایک خطرناک پاگل سے پڑ گیا ہے۔

مالاں کی سانس گلے میں پھنس رہی تھی' صفدر نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر سے ہٹا لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈھیلی پڑ جائے گی' لیکن اس کا تو کوئی پیچ بھی ڈھیلا لگتا تھا۔ جونہی پاؤں گردن سے ہٹا وہ تڑپی اور اٹھ کر بیٹھ گئی' اس کے ساتھ ہی اس نے صفدر کو بے تحاشا گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ اپنے گلے کی پوری قوت استعمال کر رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ کوئی آتا جاتا اس کی چیخ و پکار سنے گا اور موقع پر پہنچ جائے گا' لیکن اس کا یہ خیال سو فی صد غلط تھا۔ یہ خاصا ویران علاقہ تھا' پھر ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ گھپ اندھیرے میں گاؤں سے دو تین کلو میٹر چل کر یہاں کس نے آنا تھا۔

صفدر نے دوبارہ اسے فرش پر لٹانا چاہا تو اس نے اچانک صفدر کی ران میں اپنے دانت گاڑ دیے' وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے' بس میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ دھینگا مشتی میں مالاں کا بالائی لباس پھٹ کر جسم سے علیحدہ ہو گیا اور وہ برہنہ ہو گئی' لیکن اسے اس امر کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی' وہ صفدر پر ٹانگیں چلا رہی تھی اور اسے دانتوں سے بھنبھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تاہم کچھ دیر میں صفدر نے مالاں پر قابو پا لیا' اس نے بجلی کے ایک تار کی مدد سے مالاں کو ایک ٹوٹی ہوئی نشست سے باندھ دیا اور اس کا پھٹا ہوا لباس اس کے منہ میں ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی' وہ پھر بھی کسی زود فہم مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور پوری بس میں زلزلہ جگا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ آسیب زدہ بس میں موجود کسی مسافر کی بد روح مالاں میں گھس گئی ہے اور اسے تھنگنہ بہا

نے پر مجبور کر رہی ہے۔ واقعی یہ بڑا آسیبی سا منظر تھا۔ جلی بس کی باڈی میں گولیوں کے سوراخ تھے نشستوں کے جلے ہوئے جوتوں اور کپڑوں کی راکھ تھی۔ یوں محسوس تھا کہ سوختہ گوشت کی بو اس بس کی باڈی میں رچ بس گئی اور مرنے والوں کی آخری چیخیں یہاں موجود ہر شے میں بت کر گئی ہیں۔

صفدر کچھ دیر تو مالاں کو زبانی کلامی سمجھاتا رہا کہ وہ اپنے سب کچھ اگل دے لیکن وہ نہیں مانی تو اس نے بس کے پڑا ہوا لوہے کا ایک موٹا پائپ اٹھا لیا' وہ مالاں پر جھپٹا تھا جب میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ اپنے طور پر ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مالاں کو نرم میں سمجھایا کہ اس موسلا دھار موسم میں' اس ویرانے اندر اس کی مدد کو کوئی آنے والا نہیں لہٰذا وہ خواہ مخواہ ٹوٹنے کی کوشش نہ کرے۔

دراصل ہم یہ جاننا چاہ رہے تھے کہ مالاں کے کارندے سے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ گودام میں ہونے والی ڈاکہ زنی کے بارے میں وہ کیا جانتے ہیں۔ آیا انہیں یہ ہے کہ گودام سے جو سامان "ایف ایم" کے آفس میں کیا گیا تھا وہ کیا تھا؟ اور اگر وہ جانتے ہیں تو یہ بات اور کس کو معلوم ہو چکی ہے؟

لیکن ان تمام سوالوں کے جواب تو دور کی بات ہے' تو اس بات سے ہی انکاری ہو رہی تھی کہ اس کے ہمارے نگرانی کرتے رہے ہیں۔ وہ تکرار سے کہہ رہی تھی کہ راحت والے واقعے کو وہ بھول چکی ہے' اس لیے میرے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہیں ہے' اور دشمنی نہیں تھی تو پھر وہ میرا یا میرے کسی ساتھی کا پیچھا کرواتی۔ اگر یہ بات صرف راحت نے ہمیں بتائی تو ہم شاید تذبذب میں پڑتے لیکن آج سہ پہر گوپال کی کے جلوس میں ہم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکے اب اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پچھلے پانچ چھ روز سے ہماری اور خاص طور سے میری کروا رہی تھی۔ اور اگر ایسا تھا تو پھر یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ مالاں اینڈ کمپنی دفینے کی موجودگی اور نقل و حمل سے آگاہ ہو چکی تھی۔

اور اگر یہ ہوئی ہو گئی تھی تو پھر بہت سے اندیشے منہ سامنے آ جاتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ دفینے کے سامان اور رات پر شب خون مارنے کے لیے خفیہ ہی خفیہ کوئی تیار ہو چکی ہو۔

میں نے اچھی سی کوشش کی لیکن مالاں ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ صفدر نے مجھ سے کہا "شاہ جہاں صاحب! یہ لاتوں کی بھوتنی ہے باتوں سے نہیں مانے گی۔ آپ جا کر ذرا ٹیکسی کار میں آرام کریں' میں ایک آدھ گھنٹے میں اسے بالکل رام بلکہ رام رام کر لیتا ہوں۔" لوہے کے پائپ پر صفدر کی گرفت مضبوط تھی اور آنکھوں میں مصمم ارادہ نظر آتا تھا۔

میں بس کا دروازہ کھول کر نکلا اور بارش سے بچنے کے لیے دوڑتا ہوا ٹیکسی کار میں جا گھسا۔

ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ اسٹریچ کر کے میں نیم دراز ہو گیا۔ جنتر کے گھنے درختوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی' فضا میں بھیگی مٹی اور کھیتوں کھلیانوں کی خوشبو تھی۔ تاریکی کے سبب میں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میرے اردگرد یہ سب کچھ موجود تھا۔ میں دفینے کے بارے میں سوچنے لگا' بہت سے سوال ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

دفینہ خبطی گوپی ناتھ تک کیونکر پہنچا۔ اسے پہنچانے والے کون لوگ تھے۔ کیوں وہ اسے درویشانہ طور پر گوپی ناتھ کے حوالے کر گئے۔ باقی آدھا دفینہ کہاں ہے۔ اس کی ملکیت کے دعوے دار کون ہیں؟ یہ سب کے سب بہت اہم سوال تھے' لیکن ان کے جواب کون دیتا۔ اگر تھوڑا بہت کوئی بتا سکتا تھا تو وہ گوپی کا خاص کارندہ نریندر کمار اور اس کا بھائی موہن کمار تھا۔ انہی دونوں بھائیوں نے وہ میں عدد ایچی کیس "گوپی ناتھ میڈیکوز" کے گودام میں اسٹور کیے تھے۔

میں نے ایک جانب کا شیشہ تھوڑا سا کھول رکھا تھا۔ بس زیادہ دور نہیں تھی۔ گاہے گاہے بس کے اندر سے صفدر کی دہاڑ سنائی دے جاتی تھی۔ ایک دو بار مالاں کی غضب ناک چیخ بھی سنائی دی' اس کا انداز بین کرنے والا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ صفدر اسے لوہے کے راڈ نما پائپ سے ضربیں لگا رہا ہے۔ بے شک مالاں عورت تھی لیکن ایسی کسی رعایت کی حق دار نہیں تھی جو عورتوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ وہ سراپا ایک وحشی غنڈا تھی۔ لڑکیوں کے چہرے بگاڑنے والی' انہیں اپنے ہاتھ سے اذیت دے کر سکون محسوس کرنے والی اور ان پر بھوکے مرد چھوڑنے والی۔ وہ صفدر کی مار کھا کر چیختی تھی تو یوں لگتا تھا کہ کوئی بد روح شعلوں میں گھر کر واویلا کر رہی ہے۔

میں نے ان چیخوں کو اپنی سماعت سے دور رکھنے کے لیے کار کی کھڑکی بند کر دی اور ہلکی آواز میں ریڈیو لگا دیا۔ پتا نہیں کیوں دو چار روز سے زریں گل بڑی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس کی اپنائیت بھری باتیں' اس کا مزاحیہ انداز' اس کی جاں

تاری' ہر چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر سوچتے سوچتے میرا دھیان حبطی گوپی ناتھ کی طرف چلا گیا۔ یقیناً بڈھے کے دماغ میں زبردست خلل موجود تھا' ورنہ اس دور میں تو بڑے بڑے پنڈت پجاری بھی جنموں والی بات پر اتنی شدت سے یقین نہیں رکھتے۔ میں اپنی سوچوں میں کھویا رہا۔ ریڈیو سے ہندی سماچار سنائی جا رہی تھیں پھر موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ ایک بھولے بسرے گیت کے بول گونجنے لگے... کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا' تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ گاڑی کے شیشوں سے بارش کی بوچھاڑ ٹکرا رہی تھیں۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور قرب و جوار چند ساعتوں کے لیے روشن ہو جاتے تھے۔ دور تک درختوں اور کھیتوں کی ایک جھلک نظر آتی تھی اور پھر سب کچھ تیرگی میں ڈوب جاتا تھا۔ بڑا رومانی سا ماحول تھا اور گیت کے بول دل میں گداز جگا رہے تھے۔ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔

غزالہ کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح میرے قریب آتی تھی اور پھر اوجھل ہو جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی جدائی کی آگ شب و روز میرے سینے میں بھڑک رہی ہے' وہ میری بے زبانی کو بھی جانتی تھی' اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں دن رات اس کے لیے تڑپتا رہوں گا لیکن کبھی اس کے سامنے جھکوں گا نہیں' اپنی خود داری سے منہ موڑ کر اس سے محبت کی بھیک نہیں مانگوں گا' پھر کیوں وہ میرا اتنا سخت امتحان لے رہی تھی' وہ اتنی چھڑول تو نہ تھی' اسے یہ کیا ہو گیا تھا۔ کسی وقت میں غزالہ کی طویل اور مسلسل بے رخی کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ خوف محسوس ہونے لگتا تھا کہ کہیں میرا دل بھی آہستہ آہستہ چھڑبنا شروع نہ ہو جائے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ مجھے جلد از جلد غزالہ کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے۔ شیخ عاصم شوہر کا نقاب اتار کر اپنے اصل روپ میں آ چکا تھا' اب وہ غزالہ کے لیے بے حد سفاک ثابت ہو سکتا تھا۔ امارات میں رہتے ہوئے غزالہ اس سے کب تک محفوظ رہ سکتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ امارات میں ہی رہی تو وہ پاتال سے بھی اسے ڈھونڈ نکالے گا اور عبرت نگاہ بنا دے گا۔ اپنی آن بان سے بڑھ کر شیخ عاصم کو کچھ بھی عزیز نہیں تھا اور اس اعتبار سے دیکھا جاتا تو وہ غزالہ کو قتل بھی کر سکتا تھا۔

ٹارچ کی چمک نے مجھے چونکایا۔ صفدر بس کے اندر سے مجھے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے ریوالور ایک کپڑے میں لپیٹ کر جیب کے اندر ٹھونسا اور بارش میں دوڑتا ہوا بس کے ڈھانچے تک پہنچ گیا۔ مالاں پر پہلی نظر پڑتے ہی میں صفدر کی کاریگری مان گیا۔ حبشی کی مالاں بس کی چھت سے الٹی لٹکی ہوئی تھی' اس کی ایک آنکھ سوج کر کپا ہو گئی تھی۔ ہونٹ بھی سوجے ہوئے تھے۔ منہ سے رال اور ناک سے رقیق مادہ بہ رہا تھا۔ اس کی شکل جو پہلے ہی خوف ناک تھی' مار کھا کر مزید بھیانک ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "صفدر! اس طرح تو بکرے کی کھال اتارتے ہیں' تم نے بھینس کو لٹکا دیا ہے۔"

"یہ بھی تو دیکھیں کتنی مشکل سے لٹکایا ہے۔" صفدر بے رحم لہجے میں بولا۔

"سچ کہتے ہیں کہ بھینس کے آگے بین بجانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"بین تو میں نے بھی بجائی ہے جی' لیکن لوہے کی بجائی ہے۔" صفدر نے آہنی پائپ ہاتھ میں لہراتے ہوئے کہا۔

ٹارچ کی روشنی میں مالاں کی چربی دار کمر پر نیلگوں نشان نظر آ رہے تھے۔ یقیناً یہ پائپ کی ضربوں سے آئے تھے۔

صفدر آلتی پالتی مار کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا "ہاں مالاں جی' جو کچھ مجھے بتایا ہے' اپنی مبارک زبان سے ذرا ان کو بھی بتا دیں۔"

"مم... میں نہیں بتاؤں گی' صیب... پہلے مجھے یہ اتارو۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"پھر وہی بات۔" صفدر غرایا "میں کہہ رہا ہوں اتار دوں گا لیکن پہلے تمہیں شاہ جہاں صاحب کے سامنے ساری بات دہرانی ہو گی۔"

مالاں تکرار کرنا چاہ رہی تھی لیکن جب صفدر نے آہنی پائپ سے اس کی کمر پر پٹاخ سے ضرب لگائی تو وہ کسی بدروح کی طرح چیخی اور پھر ایک دم نارمل ہو گئی۔ کراہتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا "یہ بات سچ ہے کہ میرے دل میں غصہ موجود تھا۔ میں تم دونوں سے اس بات کا بدلہ لینا ضرور چاہتی تھی کہ تم میری کوٹھی میں گھسے اور وہاں سے راحت نام لڑکی کو نکال کر لے گئے۔ تم نے میرے علاوہ میرے کارندوں کو بھی زخمی کر دیا۔ میں نے اپنے دو بندے تمہارے پیچھے لگائے تاکہ تمہارے آنے جانے پر نظر رکھیں۔ بعد میں ایک بندے کو ہٹا لیا گیا کیونکہ وہ تمہاری نظر میں آ گیا تھا اس کی جگہ ایک اور بندے کو ڈیوٹی دی گئی۔"

"گودام والی بات بتاؤ۔" صفدر نے کہا۔

"مجھے صرف اتنا پتا چلا تھا کہ تم لوگ گودام میں گئے اور وہاں کچھ دیر رہے ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید وہی خا

بدوش لڑکی والا معاملہ ہے جس کے ساتھ اسٹور کیپر نے برا بھلا کیا تھا۔ بعد میں میرے بندے نے یہ اطلاع دی کہ آدھی رات کو ایک بند لوڈر میں کچھ سامان گودام سے نکالا گیا ہے' میرے کارندے نے لوڈر کا پیچھا کرنا ضروری نہیں سمجھا اور گودام کے آس پاس ہی موجود رہا۔ اس لیے اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ سامان کہاں لے جایا گیا ہے اور... دفینے والی بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "تمہاری یہ آخری بات دل کو کچھ لگتی نہیں ہے۔ یہ اطلاع تو تم تک بھی پہنچ چکی تھی کہ گوپی ناتھ اپنے پاس دفینے کی موجودگی کا دعویٰ کر رہا ہے پھر جب تمہیں پتا چلا کہ بند لوڈر میں بڑی احتیاط سے کچھ سامان گوپی ناتھ میڈیکوز کے گودام سے نکالا گیا ہے تو تمہارا دھیان دفینے کی طرف کیوں نہیں گیا۔"

صفدر نے اس موقع پر مداخلت کرتے ہوئے کہا "یہ بڑی بڑی قسمیں کھاتی ہے کہ اسے گوپی ناتھ کے دعوے کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔"

مالاں کی بات میں تھوڑا بہت وزن موجود تھا۔ یہ بات میرے علاوہ صفدر نے بھی محسوس کی تھی کہ گوپی ناتھ کے دعوے کا علم بس اس کے قریبی لوگوں کو ہے اور ان میں سے بھی بہت سے ایسے ہیں جو اس دعوے کو گوپی کا خبط سمجھتے ہیں۔

قصہ کوتاہ' مالاں اس بات سے بالکل انکاری تھی کہ اسے گوپی ناتھ میڈیکوز میں نوادرات کی موجودگی یا منتقلی کا علم ہے۔ اور جب وہ اپنی باخبری ہی تسلیم نہیں کر رہی تھی تو پھر کسی اور کو اطلاع پہنچانے یا اطلاع "فروخت" کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صفدر بھی اس نکتے کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ اس نے اس نکتے پر کافی "محنت" کی تھی لیکن مالاں سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ ایک طرح سے یہ صورت حال ہمارے لیے تسلی بخش تھی۔

صفدر نے تحکمانہ لہجے میں کہا "وہ شرمیلا اور ٹیلی فون والی بات بتاؤ۔"

مالاں نے ایک بار پھر اڑیل پن کا مظاہرہ کیا اور صفدر سے کہا کہ وہ پہلے اسے نیچے اتارے۔ صفدر بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ بولا "چاہے یہاں لٹکے لٹکے تمہارا دم نکل جائے' لیکن اتاروں گا اسی وقت جب تمہاری بات مکمل ہو جائے گی۔"

تھوڑی سی چیخ پکار کرنے کے بعد مالاں نے پھر صبر کا گھونٹ بھر لیا اور بولی "مجھے پتا چلا تھا کہ گوپی ناتھ کے گھر ایک امریکی ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے علاوہ بھی دو تین مہمان ہیں۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ یہ امریکی کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے اپنی ایک لڑکی شرمیلا سنہا کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ امریکی کے قریب ہونے کی کوشش کرے۔ لڑکی نے کوشش کی۔ امریکی تو ٹھنڈا ٹھار نکلا لیکن اس کا ایک ساتھی جس کا نام مجتبیٰ کنور ہے' لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ شرمیلا کے ساتھ بھوپال کی تاریخی جگہوں کی سیر کرنے گیا اور اس کے علاوہ گوپی کے گھر میں بھی دونوں کی دو چار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ بہرحال وہ شخص ہے بہت خرانٹ۔ لڑکی کو استعمال تو کرتا رہا ہے' لیکن اس سے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جسے کام کی بات کہا جا سکے۔"

"فون والی بات بتاؤ۔" صفدر نے کہا۔

"گوپی ناتھ کی موت سے ایک دن پہلے مجتبیٰ کنور نے پھر لڑکی کے ساتھ رات گزاری تھی۔ آدھی رات کے بعد پاکستان سے مجتبیٰ کنور کا فون آیا۔ وہ دیر تک کسی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا' شرمیلا سنہا سو رہی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ مجتبیٰ نے محکمہ آثار قدیمہ کے کسی بڑے افسر سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ساتھی افسر کے ساتھ جلد از جلد بھوپال پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس نے افسر سے کہا کہ سمجھو پھل بالکل پکا ہوا ہے' اگر ہم نے توڑنے میں دیر کی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ راز و نیاز کی باتیں انہوں نے کیں جس کی شرمیلا کو سمجھ نہیں آ سکی..."

صفدر نے آگے بڑھ کر وہ رسی کھول دی جو بس کی چھت کے طویل ہینڈل سے باندھی گئی تھی۔ بھاری بھرکم مالاں واقعی ذبح شدہ بھینس کی طرح بس کے فرش پر گری اور بس کے پورے ڈھانچے کو لرزہ براندام کر دیا۔

"اب اس بھینس کا کیا کرنا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ اب اسے چھوڑ تو سکتے نہیں۔ ورنہ یہ ہماری پسلیوں میں سینگ مارے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی! یہ دفینے کے معاملے سے باخبر ہو گئی ہے' اب اس کی رسی کیسے کھول سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو طے ہے کہ اسے اب قتل ہی کرنا پڑے گا۔" صفدر نے اطمینان سے کہا۔

کوئی اور عورت ہوتی تو خوف سے اچھل پڑتی' لیکن مالاں کا دل گردہ بھی شاید لوہے کا بنا ہوا تھا۔ وہ بالکل سکون سے بیٹھی رہی اور عجیب نظروں سے ہمیں دیکھتی رہی' شرم و حیا یا نسوانیت تو اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ ذلیل ہو کر بھی وہ

اپنی ذلت کو کچھ زیادہ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا بالائی دھڑ ڈھانپنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

مجتبیٰ کنور کے حوالے سے مالاں کے ذریعے جو بات معلوم ہوئی تھی۔ اس نے صفدر کی طرح مجھے بھی چونکا دیا تھا۔ مجتبیٰ از حد گھرا شخص تھا' وہ یونہی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا طاقت ور سیاست داں شمار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے توقع تھی بلکہ یقین تھا کہ وہ موقع ملنے پر اپنی "کرانی" ضرور دکھائے گا۔ پاکستان میں فون پر اس نے جو بات کی تھی اس کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں تھیں لیکن جو کچھ بھی سامنے آیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دال میں کالا ہے۔ ہر محکمے کی طرح یقیناً محکمہ آثار قدیمہ میں بھی مجتبیٰ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ موجود تھے۔ کسی ایسے ہم نوالہ کے ساتھ ہی مجتبیٰ نے راز و نیاز کیا تھا اور اسے فوراً بھوپال آنے کے لیے کہا تھا۔ میں بلا تردد یہ بات کہہ سکتا تھا کہ مجتبیٰ کنور ایک کرپٹ شخص ہے' اور اس نے ہمیشہ ہر عوامی اور نجی معاملے میں ذاتی مفاد کو ترجیح دی ہے۔ اب بھی اس سے خیر کی توقع نہیں تھی۔

میں نے صفدر سے کہا "جس لڑکی کی یہ بات کر رہی ہے اسے میں نے تو مجتبیٰ کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"میں نے ایک دو بار دیکھا تھا۔" صفدر نے کہا "کافی زور دار لڑکی تھی۔ بڑا بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ عمر چوبیس پچیس سال سے کم نہیں تھی۔"

"تم نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔"

"میں نے سوچا' یہ کون سی اہم بات ہے۔ اہم بات تو یہ ہوتی کہ مجتبیٰ کسی لڑکی کے بغیر یہاں رہ رہا ہوتا۔"

بات تو صفدر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجتبیٰ کنور کی شراب نوشی اور عورت بازی اس کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ جس طرح کسی کو کھانا کھاتے دیکھ کر چونکا نہیں جاتا اسی طرح مجتبیٰ کو بھی ان "لوازمات" کے قریب دیکھ کر قطعاً حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید اگر میں خود بھی مجتبیٰ کو لڑکی کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھتا تو برائے نام نوٹس لیتا۔

مالاں کو پکڑ کر یہاں لاتے اور اس پر اتنی "محنت" کرنے سے ہمارا مقصد کچھ اور تھا۔ ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ مالاں کو نوادرات کی لَو لگ گئی ہے اور مالاں کے ذریعے یہ بات بھوپال میں پھیل سکتی ہے۔ ہمارا یہ اندیشہ تو غلط ثابت ہوا تھا (کم از کم صفدر کا یقین تو یہی تھا کہ یہ اندیشہ غلط ہے) ہاں مالاں پر محنت کا صلہ ہمیں اس صورت میں ضرور مل گیا تھا کہ ہمارا دھیان مجتبیٰ کی سرگرمی کی طرف چلا گیا تھا۔ پاکستان میں فون پر اس نے جو رازدارانہ گفتگو کی تھی وہ کسی طور نظر انداز کیے جانے والی نہیں تھی۔

مالاں اور صفدر کو وہیں بس میں چھوڑ کر میں بذریعہ ٹیکسی ہائی وے پر پہنچا۔ ٹیکسی کو زیادہ دیر تک اپنے پاس رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ ہائی وے کے قریب میں نے ٹیکسی ایک قبرستان میں چھوڑ دی اور خود لاری میں بیٹھ کر بھوپال شہر پہنچ گیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ موسلا دھار بارش تھم گئی تھی تاہم بوندا باندی جاری تھی۔ میں نے ایک فون بوتھ سے مسٹر جی کلارک کو فون کیا۔

مسٹر کلارک کو ہماری غیر حاضری نے پریشان کر رکھا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آج سہ پہر اندرون شہر ایک مشہور نائیکہ کے اڈے پر زبردست ہنگامہ ہوا ہے۔ جس میں ایک بندہ قتل ہو گیا ہے اور چھ سات فائرنگ سے زخمی ہوئے ہیں۔ یہ اڑتی اڑتی سی اطلاع مسٹر کلارک کو بھی مل چکی تھی کہ اس ہنگامے میں میرا اور صفدر کا کردار ہے۔

میں نے مسٹر کلارک کو بتایا "آپ کو ٹھیک اطلاع ملی ہے۔ اس عورت پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری تھا۔ تفصیل تو میں آپ کو آ کر بتاؤں گا' فی الحال یہ کہنا ہے کہ وہ عورت اس وقت بھی ہماری تحویل میں ہے۔ ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ اسے قتل کر دیں یا پھر کہیں بند کر دیں کم از کم اس وقت تک جب تک نوادرات اور دیگر سامان کسی محفوظ ٹھکانے تک نہیں پہنچ جاتا اور ہم بھی انڈیا سے نکل نہیں جاتے۔"

"اب تم کیا چاہ رہے ہو؟" مسٹر کلارک نے پوچھا۔

"کوئی ایسا ٹھکانا جہاں اس عورت کو چند روز یا چند ہفتے حفاظت سے رکھا جا سکے اور اس کے علاوہ ایک گاڑی اور ڈرائیور۔ اس عورت کو شہر لانے کے لیے۔"

"کیا تم شہر کے باہر سے بول رہے ہو۔"

"نہیں اس وقت تو شہر میں ہی ہوں لیکن صفدر اور وہ عورت شہر سے باہر ہیں۔"

میں نے مسٹر کلارک کو سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ مسٹر کلارک نے کہا کہ دس پندرہ منٹ میں گاڑی' ڈرائیور اور تین مسلح افراد مجھ تک پہنچ جائیں گے۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد پبلک فون بوتھ کے عین سامنے ایک بڑی جیپ آ کر رکی۔ اس جیپ اور جیپ میں موجود افراد کا تعلق مسٹر کلارک کی کمپنی "ایف ایم" سے تھا۔ میں جیپ میں بیٹھا اور بھوپال کے مضافات کی طرف روانہ ہو گیا۔

O☆O

مالاں کے نبٹنے سے فارغ ہو کر میں اور صفدر مسٹر کلارک کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ بھوپال شہر کی

ایک بالکل نئی ماڈرن کالونی میں یہ ایک کافی بڑی کوٹھی تھی۔

ابھی اس کا ایک حصہ زیر تعمیر تھا۔ اس کوٹھی میں مجتبیٰ کنور کے علاوہ سائیں عالی اور سروج بھی موجود تھے۔ درحقیقت گودام میں موجود بیس ایچی کیسز کا سراغ ملنے کے بعد ہمیں گوپی ناتھ مینشن میں رہنے اور وہاں کے بکھیڑوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مسٹر کلارک نے بروقت اقدام کیا تھا کہ گوپی ناتھ کی ارتھی اٹھنے سے پہلے ہی سروج اور سائیں عالی وغیرہ کو لے کر گوپی ناتھ مینشن سے نکل آئے تھے۔ اب یہ سب لوگ جس ٹھکانے پر تھے اس کا علم مسٹر کلارک کے دو تین نہایت قریبی خدمت گاروں کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ اگر مسٹر کلارک ابھی تک گوپی ناتھ مینشن میں ہوتے تو مالاں کے اڈے پر ہونے والے خون ریز ہنگامے کے بعد ان کے لیے مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ عین ممکن تھا کہ مقامی پولیس مونچھوں کو تاؤ دے کر گوپی ناتھ کے گھر پہنچ جاتی اور ہماری تلاش میں ناکامی کے بعد مسٹر کلارک' مجتبیٰ کنور اور سروج وغیرہ کے درپے ہو جاتی۔ یہ ہر لحاظ سے بہتر ہوا تھا کہ ہم اس خفیہ ٹھکانے پر منتقل ہو گئے تھے۔

میں نے مسٹر کلارک اور مجتبیٰ کنور کو پوری تفصیل بتائی کہ ہمیں مالاں پر ہاتھ کیوں ڈالنا پڑا اور ہم اسے اس کے اڈے سے اٹھا کر کہاں لے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ مجتبیٰ کنور والی بات میں مجتبیٰ کنور اور مسٹر کلارک کے سامنے بیان نہیں کر سکتا تھا' وہ میں نے گول کر دی۔

مجھے مشہور عالم فلم میکیناز گولڈ یاد آ رہی تھی۔ ایک ٹیم یک جان ہو کر سونے کی تلاش میں نکلتی ہے لیکن جب بے شمار مصائب جھیلنے کے بعد سونا مل جاتا ہے تو ٹیم کے ممبران آپس میں ہی ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں اور یہ کوئی ایک فلم کی بات نہیں تھی' اس موضوع پر تخلیق کی جانے والی اکثر فلموں اور کہانیوں کا انجام اس سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ دفینے کا ایک حصہ حاصل کرنے کے بعد ہم سب کے دلوں میں کسی نہ کسی وجہ کی ہلچل موجود تھی۔ سب سے پہلے تو سروج نے ہی بے اعتباری کا اظہار کر دیا تھا' اس نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں نوادرات کے سلسلے میں مسٹر کلارک پر یوں اندھا اعتماد نہ کروں۔ وہ چاہتی تھی کہ ایچی کیسز کی نقل و حرکت ہم سب کی نگرانی میں ہو۔ سروج کے بعد مجتبیٰ کنور کی خفیہ سرگرمی اور جداگانہ سوچ کا سراغ بھی لگا تھا۔ آئندہ نجانے کیا ظہور میں آنا تھا۔

گفتگو کے دوران میں ہی میں ہاتھ دھونے کے لیے باہر گیا۔ میں ہاتھ روم میں واش بیسن پر جھکا ہوا تھا جب ایک دم چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے سے آ رہی تھیں جہاں ہم اب تک بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ میں دوڑتا ہوا واپس کمرے میں پہنچا' یہاں عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ سائیں عالی اور مجتبیٰ کنور گتھم گتھا تھے۔ سائیں عالی مجتبیٰ کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ مسٹر جی کلارک اور صفدر' سائیں کو مجتبیٰ سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے' لیکن سائیں میں تو جیسے جن گھس گئے تھے۔ بے حد قوت آ گئی تھی اس میں۔ دوسری طرف مجتبیٰ بھی کوئی نرم و نازک مرد نہیں تھا۔ اس نے سائیں کی دونوں کلائیاں [illegible] سے پکڑ رکھی تھیں اور انہیں موڑ کر سائیں کو نیچے گرانے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس کا داؤ چل گیا۔ سائیں پہلو کے بل گرا لیکن گرتے ساتھ ہی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پھرتی دیدنی تھی۔ اس نے لپک کر ایک گارڈ کے ہولسٹر میں سے پسٹل کھینچ لیا۔ ایک دم کمرے میں برق سی کوند گئی۔ ہر چہرہ فق نظر آنے لگا۔

مجتبیٰ ابھی تک فرش پر گرا ہوا تھا۔ اس کا انتہائی قیمتی کوٹ سامنے سے ادھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سائیں عالی نے وحشیوں کی طرح چیختے ہوئے کئی ہوائی فائر کیے۔ دھماکوں سے در و دیوار گونج اٹھے۔ سائیں ایک مخبوط الحواس شخص تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گولی داغ دیتا۔ صفدر اور مسٹر کلارک تیزی سے باہر نکل آئے۔ میں بھی دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اب کمرے میں مجتبیٰ اور سائیں عالی رہ گئے تھے۔ مجتبیٰ سائیں عالی کے نشانے پر تھا۔ سائیں عالی کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی۔ مجتبیٰ ایک دبنگ شخص تھا لیکن صورت حال کی سنگینی نے اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا دیا۔

سائیں عالی نے دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھام کر ایک اور فائر کیا۔ گولی مجتبیٰ کنور کے قریب سے گزر گئی۔

"سائیں عالی!" میں نے چیخ کر کہا۔

سائیں عالی نے وحشیانہ قہقہہ لگایا' اور مجتبیٰ کنور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "دل دھڑکا چور کا' بادل دھڑکا۔ دل دھڑکا چور کا' بادل دھڑکا۔"

سائیں عالی کی دونوں انگلیاں ٹریگر پر تھیں' وہ کسی بھی لمحے مجتبیٰ کو شوٹ کر سکتا تھا۔ یہ بڑی نازک گھڑیاں تھیں۔ میں نے دیوار کے ساتھ لگے لگے ایک قدم دروازے کی طرف بڑھایا۔

"سائیں عالی' رُک جاؤ۔ گولی مت چلانا۔" میں نے ایک بار پھر چلّا کر کہا۔

سائیں عالی کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک بدستور موجود رہی۔ اس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکوس رکھے تھے اور پسٹل پر اس کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔ مجتبیٰ کتور کی پشت زمین پر تھی اور بالائی دھڑ دونوں کہنیوں کے زور پر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے پہلی بار مجتبیٰ کے چہرے پر خوف کی جھلک دیکھی تھی۔ تاہم اس خوف نے اس کا رنگ زرد نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے پر بدستور سرخی موجود تھی۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ وہ ان لمحوں میں بھی دلیر شخص نظر آ رہا تھا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں سائیں سے کہا "سائیں! اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو مجھے بتاؤ۔ ہم تمہارا مسئلہ حل کریں گے' یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن تم گولی نہیں چلاؤ گے۔"

"کیوں نہیں چلاؤں گا۔" سائیں گرجا "دشمن کو پہلی فرصت میں ختم کرنا چاہیے اور رہی مسئلے کی بات۔ تو تم میرا مسئلہ حل کرنے والے کون ہوتے ہو۔ یہ جنات کی فوج کیا میں نے بھاڑ جھونکنے کے لیے پال رکھی ہے۔ میرے ایک اشارے پر یہ جنات پورے انڈیا میں بھونچال لا سکتے ہیں۔ اس موچھندر کی حقیقت ہی کیا ہے۔" سائیں کا اشارہ مجتبیٰ کی طرف تھا۔

"مگر تمہارا جھگڑا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چور سے سپاہی کا کیا جھگڑا ہوتا ہے؟ یہ چور ہے۔ دغا باز ہے۔ یہ تم سب کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ اگر میں نے ڈھیل دی تو یہ سب کا بیڑا غرق کروا لے گا۔"

سائیں نے ایک بار پھر مجتبیٰ کے سر کا نشانہ لے لیا تھا۔ اس نے پسٹل کو ذرا حرکت دی تو مجتبیٰ کا جسم لرز کر رہ گیا۔ سائیں نے جنونی انداز میں قہقہہ لگایا۔ پھر آنکھیں گھما کر بولا "بڑا پیارا ہے زندگی سے۔ ابھی اور کتنی شراب پینی ہے تم نے۔ اور کتنی عورتوں سے کھیلنا ہے۔ اتنا پی کر بھی کیا تمہارا پیٹ نہیں بھرا ہے۔ یاد رکھو' انسان کا پیٹ صرف قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ ہاں صرف قبر کی مٹی۔"

میں نے ایک قدم اور سائیں عالی کی طرف بڑھایا تو وہ ایک دم چوکس ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے اپنے پسٹل کا رخ میری طرف کر لیا اور چیخ کر بولا "شفیع محمد! تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اگر آگے آئے تو میں تمہیں بھی اڑا دوں گا۔"

میں رک گیا۔ درحقیقت میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر میں اس سوئچ بورڈ کے بالکل قریب آ گیا تھا جس پر کمرے کی واحد ٹیوب لائٹ کا بٹن موجود تھا۔ میں ہاتھ اٹھائے بغیر صرف کندھے کے دباؤ سے ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کمرے میں اندھیرا ہوتے ہی مجتبیٰ کتور اپنی جگہ چھوڑ دے گا اور سائیں عالی کے فائر سے بچ نکلے گا۔ وہ خطرناک صورت حال میں تیزی سے فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ میں نے کندھے کے دباؤ سے ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا۔ ٹرچ کی آواز آئی۔ اندھیرا ہوتے ہی میں اپنی جگہ چھوڑ کر سائیں پر جھپٹنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر زبردست دھچکا لگا کہ ٹیوب لائٹ آف نہیں ہوئی۔ بس ذرا سا ٹمٹما کر رہ گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ بٹن خراب ہے۔

سائیں عالی سے میری یہ حرکت چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا اور اس کے ساتھ ہی ایک فائر میرے قدموں میں جھونک مارا "چالاکی دکھاتا ہے کاکے!" وہ ہنکارا۔

سائیں کی توجہ میری طرف دیکھ کر مجتبیٰ نے اپنی جگہ سے حرکت کی لیکن سائیں کی عقابی نظریں پورے کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ ویسے بھی وہ کمرے کے بالکل کوشے میں کھڑا تھا۔ وہ معمولی جنبش کر کے مجھے اور مجتبیٰ کو ایک ساتھ نشانہ بنا سکتا تھا۔ سائیں نے پسٹل کا رخ مجتبیٰ کی طرف کر لیا اور اسے ایک وحشیانہ دھمکی دی۔

مجتبیٰ لاچار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ عجب تماشا تھا۔ ایک نہایت با اثر اور طاقت ور سیاست داں ایک مفلوک الحال دیوانے کے رحم و کرم پر تھا۔ ان لمحوں میں کوئی اس کی مدد کر سکتا تھا اور نہ اس کی ڈھارس بندھا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سائیں عالی مجتبیٰ پر گولی چلا دے گا۔ مجتبیٰ کی چھٹی حس نے بھی اسے خبردار کر دیا اور میں نے اس کے چہرے پر موت کی زردی لپکتے دیکھی۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا' ایک دم سائیں عالی کا موڈ بدل گیا۔ اس کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ آنکھوں کی دہشت بھی کم ہو گئی۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ تینوں گولیاں مجتبیٰ کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ پسٹل خالی ہو گیا تھا۔ سائیں عالی نے اسے دیوار پر دے مارا' پھر قہقہہ لگایا "دل دھڑکا چور کا۔ بادل دھڑکا۔"

جونہی مجتبیٰ نے دیکھا کہ سائیں عالی نے پسٹل پھینک دیا ہے' وہ عقاب کی طرح سائیں پر جھپٹا لیکن میں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ میں نے مجتبیٰ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ مجتبیٰ گرج رہا تھا "میں اسے سبق سکھا دوں گا۔ سارا پاگل پن نکال دوں گا اس کا' سالا ڈرامے باز۔"

میں نے اور صفدر نے بمشکل مجتبیٰ کو روکا اور اسے دھکیل کر کمرے سے باہر لے گئے۔ مجتبیٰ غرا رہا تھا "ساری

ی کسی نے اس طرح میری بے عزتی نہیں کی۔ میں اسے ے نہیں کروں گا۔ اس نے اس نے اپنی موت کو آواز ہے۔"

مسٹر جی کلارک نے کہا "مسٹر مجتبیٰ! آپ کی برہمی بجا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو سائیں عالی کی مجذوبانہ بت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔"

مجتبیٰ نے قدرے نرم پڑتے ہوئے کہا "میں مانتا ہوں کہ دل نہیں' لیکن اس نے کبھی کسی اور کے ساتھ تو ایسا کیا۔ مجھ پر ہی اتنی مہربانی کیوں۔ مجھ میں کیا خاص برائی تی ہے اسے۔"

"یہ تو واقعی سوچنے کی بات ہے۔" صفدر زیر لب ۔ میرے سوا کسی اور نے اس کی سرگوشی نہیں سنی۔

مجتبیٰ کا رنگ گندمی تھا' لیکن جب وہ غصے میں ہوتا تھا تو کا چہرہ سرخ نظر آنے لگتا تھا۔ وہ سائیں عالی کے خلاف رہا تھا تو بالکل یوں لگتا تھا کہ جلسہ عام میں مخالف پارٹی خلاف دھواں دھار تقریر کر رہا ہے۔ بہرحال جلد ہی اس خود کو سنبھال لیا۔ اعصاب کو مزید پرسکون کرنے کے لیے نے سگریٹ سلگا لیا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اسی دوران صفدر نے مجھے آواز دی۔ میں اندر کمرے میں گیا۔ صفدر بورڈ کے قریب کھڑا تھا اور قدرے حیران نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ بولا "یہ دیکھیے۔ یہ بٹن کتنی آسانی سے کام کر رہا ہے۔"

اس نے ٹیوب لائٹ کے بٹن کو آف کیا' لائٹ بجھ گئی۔ کیا' لائٹ روشن ہو گئی۔ اس نے دو تین بار یہ عمل یا۔

یک لخت میری سمجھ میں آیا کہ صفدر کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے جب سائیں نے مجتبیٰ پر پسٹل تان رکھا تھا' نے ٹیوب لائٹ بجھانے کی کوشش کی تھی تاکہ اندھیرا نے ہی میں سائیں کو جھاپ سکوں۔ لیکن اس وقت بٹن ہونے کے باوجود لائٹ آف نہیں ہوئی تھی۔ یہ معمولی تھی لیکن توجہ طلب تھی کیونکہ اس کا تعلق سائیں عالی تھا اور جب بات سائیں کے حوالے سے ہوتی تھی تو پھر میں خواہ مخواہ پُراسراریت شامل ہونے لگتی تھی' کبھی ر سوئچ خراب ہو جاتے ہیں۔ ممکن تھا کہ اس سوئچ میں کوئی خرابی ہو' لیکن اب یہ خرابی کہیں نظر نہیں آ رہی ۔

ایسے موقعوں پر میرے جسم میں عجب سنسنی سی دوڑ تھی' صفدر کے چہرے پر بھی دلچسپ حیرت موجود تھی۔

مسٹر کلارک نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا "شاہ جہاں! مسٹر مجتبیٰ کافی برہم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ برہم ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سائیں عالی مجذوب ہیں۔ بے خودی کی حالت میں ایسے لوگ کچھ بھی کر جاتے ہیں۔ اب دیکھو' سورج ان کی چہیتی چیلی ہے' اپنی ترنگ میں ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ بہرحال اپنا اپنا ذہن ہوتا ہے۔ مسٹر مجتبیٰ کا ذہن مختلف انداز سے سوچ رہا ہے۔ تم ان کو اچھے طور پر سمجھانے کی کوشش کرو۔ امید ہے کہ وہ سمجھ جائیں گے۔ دوسری طرف ہمیں سائیں عالی کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ وہ کوئی نقصان دہ حرکت کر جائے۔ میری رائے ہے کہ تم صفدر کی ڈیوٹی لگا دو۔ وہ سائیں عالی پر نگاہ رکھے۔"

رات کے کھانے پر میں نے مجتبیٰ سے بات کی۔ وہ اب نارمل نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سائیں عالی کے ناخنوں سے خراشیں آئی تھیں' وہاں اس نے کوئی مرہم لگا رکھا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں دفینے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس حوالے سے مجتبیٰ محکمہ آثار قدیمہ کے ان اعلیٰ افسران کا ذکر کرے گا جنہیں وہ پاکستان سے یہاں بلا رہا تھا لیکن مجتبیٰ نے اس موضوع پر کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اس کی یہ خاموشی اس کے بارے میں شکوک کو تقویت دے رہی تھی۔ ہم اب تک ایک ٹیم کی طرح کام کرتے رہے تھے۔ دفینے کے حوالے سے کوئی بات بھی کسی سے چھپائی نہیں گئی تھی لیکن اب مجتبیٰ ایک نہایت اہم خبر کو اپنے تک محدود رکھ رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی نیت میں فرق آ چکا تھا۔

رات کو جب میں اور صفدر بستر پر لیٹے تو تھوڑی دیر تک سائیں عالی کی باتیں کرتے رہے۔ سائیں نے آج مجتبیٰ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ حیرت انگیز تو تھا ہی' معنی خیز بھی تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں کے پاس کوئی نے قسم کا جن بھی موجود ہے جو کوہ قاف کی سیکرٹ سروس کے لیے کام کرتا ہے اور سائیں کو ہر خبر بجم پہنچا دیتا ہے۔ ہم دونوں کا خیال یہی تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا ہے لیکن اگر اتفاقاً بھی ہوا تھا تو یہ بہت برموقع اتفاق تھا۔ سائیں کے جارحانہ انداز نے یقیناً مجتبیٰ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں اور یقینی بات تھی کہ وہ جو کچھ بھی کرنے جا رہا ہے اس سلسلے میں کچھ محتاط ہو گیا ہو گا۔

میں نے صفدر سے کہا "تمہیں چند دن کے لیے ایک ڈیوٹی کرنا ہو گی۔"

"جی فرمایئے۔"

"مجتبیٰ کنور کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا ہوگی۔ میرا اندازہ ہے کہ آج کل میں مجتبیٰ محکمہ آثار قدیمہ کے افسران سے ملاقات کرے گا۔"

صفدر بولا "لیکن مسٹر کلارک تو مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مجھے سائیں عالی پر نگاہ رکھنی چاہیے۔"

"بھئی ایک ہی بات ہے۔" میں نے کہا "سائیں عالی پر نگاہ اس لیے رکھی جا رہی ہے تاکہ وہ کہیں مجتبیٰ کو نقصان نہ پہنچا جائے۔ جب مجتبیٰ تمہاری نگاہ میں ہوگا تو پھر مجتبیٰ کی حفاظت کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا۔"

"نگرانی صرف دن کے وقت ہوگی یا رات کو بھی؟"

"میں تو چاہتا ہوں کہ چوبیس گھنٹے ہو۔"

صفدر بولا "مجتبیٰ پر چوبیس گھنٹے نظر رکھنا ایک دشوار کام ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "مجتبیٰ پر نظر رکھی جائے گی تو پھر ایک نظر کو بہت کچھ دیکھنا پڑے گا' خاص طور سے رات کے وقت۔ وہ بستر پر اکیلا کم ہی ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "چوبیس گھنٹے نظر رکھنے سے یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ تم اس کے تو اٹلٹ میں بھی گھس جاؤ۔"

صفدر نے آہ بھری "اس وقت تو زریں گل یاد آ گیا ہے۔ شاید آپ کے علم میں نہیں' ایک مرتبہ لاہور کے ایک مضافاتی گاؤں میں' میں نے اسے ایک چوہدری صاحب کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور کہا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے اس پر نظر رکھے۔ اس نے چوبیس گھنٹے کا مطلب پورے چوبیس گھنٹے ہی لیا۔ اگلے روز صبح سویرے وہ چوہدری کے ساتھ ہی کماد (گنے) کے کھیت میں گھس گیا۔ چوہدری وہاں رفع حاجت کے لیے گیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا' زریں گل اس کے سر پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں خوب لڑائی ہوئی اور دونوں گندے پانی کے ایک جوہڑ میں جا گرے۔"

مجھے یاد آیا کہ اس قسم کا ایک واقعہ زریں گل نے مجھے سنایا تھا۔ صفدر بولا "چوہدری اس واقعے سے اس قدر خوف زدہ ہوا تھا کہ گاؤں آکر تین دن بے ہوش پڑا رہا تھا۔ بے ہوشی میں وہ بڑبڑاتا تھا کہ سن پچاس میں قتل ہونے والے کسی پٹھان کی روح اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

زریں گل کی بات شروع ہوئی تو پھر ہم اسی کی باتیں کرنے لگے۔ زریں سے جدا ہوئے اب مجھے چار مہینے ہونے کو آئے تھے۔ جب میں پاکستان سے آیا تھا تو زریں کی نوبیاہتا بیوی گلثوم امید سے تھی۔ اب وہ دونوں نجانے کہاں اور کس حال میں تھے۔

اگلے دو روز ہم نے اس الگ تھلگ کوٹھی میں کافی سکون سے گزارے۔ خلاف توقع سائیں عالی نے کوئی نئی مستی نہیں کی۔ وہ دن کا بیشتر حصہ کوٹھی کے باغ میں سرسبز بیل کنج میں کھڑے ہو کر گزارتا تھا۔ سروج اس کے ارد گرد موجود رہتی تھی اور گاہے گاہے اسے کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ سائیں عالی کے کھانے ظاہر ہے کہ اپنی طرز کے انوکھے ہوتے تھے۔ مرغ کی یخنی میں جلیبیاں ڈبو کر وہ شوق سے کھاتا تھا۔ ایک دن مسٹر کلارک نے اسے میٹھی سویوں پر گوبھی گوشت کا سالن ڈال کر کھاتے دیکھا اور خود بھی ایک آدھ بار کر قائل ہو گئے کہ بھوپال میں چائنیز کھانے بڑے مزے کے بنائے جاتے ہیں۔

بیس کے بیس اٹیچی کیس ابھی تک "ایف ایم" کے آفس میں موجود تھے اور ان کی سخت حفاظت کی جا رہی تھی۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ ان اٹیچی کیس کو جتنی جلد ہو سکے "ایف ایم" کے آفس سے نکال کر اس کوٹھی میں پہنچا دیا جائے۔ گوپی ناتھ مینشن کی خبریں بھی ہمیں وقفے وقفے سے مل رہی تھیں۔ گوپی ناتھ کی موت کے بعد وکیل نے اس کی وصیت پڑھی تھی' اس وصیت کے مطابق جائیداد کا ایک بڑا حصہ رگھا دیوی کی مورتیوں کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ ایک قطعہ اراضی اور ایک بلڈنگ کے علاوہ بہت سا نقد روپیہ نرس شوبھا کے حصے میں آیا تھا۔ سروج کے نام بھی گوپی ناتھ نے کافی کچھ چھوڑا تھا' لیکن ہم یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے واپس گوپی ناتھ مینشن نہیں جا سکتے تھے۔ وہاں جائیداد کے ساتھ ساتھ پھانسی کا پھندا بھی ہمارا منتظر ہو سکتا تھا۔ اور ہمیں ضرورت بھی کیا تھی۔ دفینے کے سامنے اس جائیداد کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ گوپی ناتھ کی باقی جائیداد قریبی رشتے داروں میں تقسیم کی گئی تھی۔ گوپی ناتھ کے بھائی رام ناتھ نے اس تقسیم پر سخت واویلا مچایا تھا اور الزام لگایا تھا کہ وصیت تبدیل کی گئی ہے' لیکن گوپی ناتھ بھی پکے کام کرنے والا تھا۔ امید نہیں تھی کہ رام ناتھ کچھ کر پائے گا۔ ایک حیرت کی بات اور بھی تھی اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ جائیداد کے اس سارے شور شرابے میں دفینے کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ شاید گوپی کے لواحقین میں سے کسی نے گوپی کے بیان کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ بڈھے نے اپنے خبط میں ایک بڑ ہانکی تھی اور یہ بڑ اس کے ساتھ ہی چتا میں جل گئی ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بڈھا واقعی اپنے ترکے میں ایک ایسی دولت چھوڑ گیا ہے' جس کو ابھی تک ٹھیک سے شمار بھی نہیں کیا جا سکا

ہے۔ وہ بیس اٹیچی کیس ہی دراصل گوپی کا اصل ترکہ تھے۔ اس کی ساری جائیداد کی مالیت کو ۱۰۰ سے ضرب دے دی جاتی تو شاید وہ پھر بھی اس ایک اٹیچی کیس کی مالیت سے کم ہوتی۔

مسٹر کلارک کو بجا طور پر شبہ تھا کہ شاید پولیس کے لوگ "ایف ایم" کے مرکزی دفتر کی نگرانی کر رہے ہوں۔ مالاں کے اڈے پر ہونے والی ہنگامہ آرائی میں ایک بندہ قتل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مالاں بھی اغوا کر لی گئی تھی۔ ان واقعات کے فوراً بعد مسٹر کلارک سمیت ہم سب گوپی ناتھ مینشن سے رفو چکر ہو گئے تھے۔ یہ سارے معمولی واقعات نہیں تھے۔ بھوپال کی پولیس مالاں کی بازیابی کے لیے پوری طرح متحرک ہو چکی تھی اور مشکوک افراد میں ہم سب یقیناً سرفہرست تھے۔ اس صورت حال میں یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ خفیہ طور پر "ایف ایم" کے مرکزی دفتر کی نگرانی کی جا رہی ہو۔ بہرحال مسٹر کلارک مطمئن تھے کہ اگر پولیس نے دفتر کی تلاشی لی بھی تو وہ ان اٹیچی کیس کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکیں گے۔

تیسرے روز صفدر نے بتایا کہ شام کو مجتبیٰ کنور کوٹھی سے باہر جا رہا تھا۔ رات نشے کی حالت میں جلتا ہوا سگریٹ مجتبیٰ کے ہاتھ سے چھوٹ کر وارڈ روب میں گر گیا تھا۔ مجتبیٰ کی ناپ کے بس دو ہی سوٹ تھے' دونوں کئی جگہ سے جل گئے تھے۔ مجتبیٰ چاہتا تھا کہ بازار سے تین چار سوٹ لے آئے۔ مسٹر کلارک نہیں چاہتے تھے کہ مجتبیٰ یوں کھلے عام بھوپال میں گھومے لہٰذا انہوں نے ملازم کے ذریعے سوٹ منگوانے کی رائے دی تھی۔ مگر مجتبیٰ کا کہنا تھا کہ وہ اپنے کپڑے ہمیشہ خود خریدتا ہے۔ وہ ایک بند اسٹیشن ویگن میں ڈرائیور کے ساتھ بازار جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

صفدر نے مجھے بتایا "ڈرائیور کو اپنا خاص بندہ سمجھیں۔ اس کا نام گوپال ہے' وہ گجرات سے نقل مکانی کر کے ہندوستان آیا تھا۔ اپنے شہر اور اپنے ہی محلے کا رہنے والا نکل آیا ہے۔ بہت چالاک بلکہ جینئس شخص ہے۔ میں نے رات کو ہی اس سے معاملہ طے کر لیا تھا۔ مجتبیٰ کنور جہاں بھی جائے گا اور جو بھی کرے گا' گوپال ہمیں اس کی خبر دے گا۔"

میں نے کہا "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ راستے میں مجتبیٰ سے بھی معاملہ طے کر لے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی ماماں چاچا' مجتبیٰ کے گاؤں کا رہنے والا نکل آیا تو پھر کیا ہوگا؟"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" صفدر نے آنکھ میچی "بات صرف رانا محلے والا ہونے کی نہیں۔ میں نے گوپال کی جیب بھی گرم کی ہے' اور اتنی گرم کی ہے کہ پندرہ بیس روز ٹھنڈی نہیں ہوگی۔"

"کتنے دیے ہیں؟"

"چار ہزار۔"

"اتنے کہاں سے لیے؟"

"مالاں کے اندر سے نکلے تھے۔"

"مالاں کے اندر سے۔ کیا مطلب؟"

"سمجھا کریں جی۔ مالاں کے اندر کے لباس سے۔" صفدر نے کہا "جب بیبی کے ڈھانچے میں اس کی ٹکائی کی تھی۔۔۔ حرام کی کمائی تھی' رشوت میں چلی گئی' کیا مضائقہ ہے۔"

"چار ہزار کچھ زیادہ نہیں دے دیے۔ میرا مطلب ہے وہ ہضم کر لے گا؟"

"ہضم کر لے گا۔ اور یہ کچھ اتنے زیادہ بھی نہیں ہیں۔ کم از کم ہمارے لیے تو زیادہ نہیں ہیں۔ اب کوئی ایویں شیویں چیز نہیں ہیں ہم۔ دفینے کے مالک ہیں جناب۔ اتنی دولت آنے والی ہے کہ اپنا بینک کھول سکتے ہیں۔" صفدر نے گردن اکڑا کر مزاحیہ انداز میں کہا۔

"جب آئے گی تب بینک بھی کھول لینا۔ فی الحال تو اس دولت کو بد نظروں سے بچانے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ مجتبیٰ کنور کے مہمان آ گئے ہیں۔"

"یعنی آثار قدیمہ کے افسران!"

"بالکل وہی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے ملنے جانے کے لیے ہی مجتبیٰ نے بہانہ بنایا ہو۔"

"کیسا بہانہ؟"

"یہی کہ اس کے کپڑے جل گئے ہیں اور وہ شاپنگ کرنا چاہتا ہے۔"

"میرا تو دل چاہتا ہے شاہ جہان صاحب کہ میں اس معاملے کو خود دیکھوں۔ کوئی اسکوٹر یا موٹر سائیکل مل جائے تو میں اسٹیشن ویگن کا پیچھا کر سکتا ہوں۔"

"مگر میرا نہیں خیال کہ مسٹر کلارک تمہیں کوٹھی سے باہر جانے دیں گے۔ وہ اس سلسلے میں بہت احتیاط کر رہے ہیں اور ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔"

اسی دوران میں اسٹیشن ویگن اسٹارٹ ہونے کی آواز

[illegible]

پتھر

(دو جلدیں)

[illegible]

آئی۔ مجتبیٰ ڈرائیور کے ساتھ نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگیا۔

گوپال اگلے روز ہی صفدر کو رپورٹ دے سکا۔ اس نے صفدر کو جو کچھ بتایا اور جو کچھ مجھے صفدر سے معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے۔ مجتبیٰ کل شام رسطی شہر کی راجا مارکیٹ میں گیا تھا۔ وہاں گارمنٹس اور شوز وغیرہ کی بہت سی دکانیں ہیں۔ مجتبیٰ نے ڈرائیور گوپال کو اسٹیشن ویگن کے قریب چھوڑا اور خود بازار چلا گیا۔ گوپال نے وین لاک کرنے کے بعد بڑی ہوشیاری سے مجتبیٰ کا پیچھا کیا۔ یہ پیچھا اس لیے کامیاب رہا کہ بازار میں رش کافی تھا۔ مجتبیٰ ایک دکان میں داخل ہوا اور پانچ دس منٹ میں اس نے اپنے لیے دو تین سوٹ پیک کروالیے۔ شاپنگ بیگ وہیں دکان پر چھوڑ کر مجتبیٰ بازار کے دوسرے سرے کی جانب چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے بازار پیچھے چھوڑ دیا اور سڑک کراس کرکے ایک بڑے ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہوگیا۔ یہاں دو سوٹڈ بوٹڈ افراد اس کے منتظر تھے۔ وہ دونوں ہی شکل سے اعلیٰ افسر نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک پائپ پی رہا تھا۔ یہ لوگ مجتبیٰ کے ساتھ ہوٹل میں چلے گئے۔ ان تینوں کی واپسی قریباً دو گھنٹے میں ہوئی۔ تینوں ہی نشے میں محسوس ہوتے تھے اور بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ دو خوش شکل لڑکیاں بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ سوٹڈ بوٹڈ افراد اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ مجتبیٰ کی واپسی کے آثار دیکھے تو ڈرائیور گوپال بھاگم بھاگ مجتبیٰ سے پہلے ہی واپس اسٹیشن وین تک پہنچ گیا۔

ڈرائیور گوپال نے اپنی کارروائی یہاں تک ہی نہیں رہنے دی تھی۔ وہ واقعی جینئس نکلا تھا۔ مجتبیٰ کو گھر چھوڑنے کے بعد وہ واپس اس ہوٹل میں پہنچا تھا جہاں تینوں افراد نے قریباً دو گھنٹے گزارے تھے۔ ہوٹل کے ایک دو بیروں سے مل کر گوپال نے معلوم کرلیا تھا کہ مجتبیٰ کے ساتھ ملاقات کرنے والے کون لوگ تھے۔ ان میں سے ایک نام ارباز عثمانی اور دوسرے کا عبدالمنان تھا۔ دونوں پاکستانی تھے۔ وہ کل رات ہی ہوٹل میں پہنچے تھے اور خوب فیاضی اور رنگین مزاجی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

میرے اور صفدر کے لیے یہ سمجھنا اب ہرگز مشکل نہیں تھا کہ مجتبیٰ جن لوگوں سے مل کر آیا ہے وہی محکمہ آثار قدیمہ کے افسران ہیں (جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا' ان میں سے ایک افسر آثار قدیمہ کا اور دوسرا مالیات کا تھا) اس روز میں اور صفدر دیر تک مشورہ کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ مجتبیٰ کنور اپنے طور پر کوئی کھچڑی پکا رہا ہے۔ پاکستان سے دو اعلیٰ افسران کا یہاں پہنچنا اور مجتبیٰ کے ساتھ طویل ملاقات کرنا اس امر کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ دفینے کے بارے میں اہم بات چیت ہوئی ہے۔ بے شک مذکورہ افسروں کو دفینے کے متعلق تحقیق کرنے اور سامان کو اپنی تحویل میں لینے کا حق تھا لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ ملی بھگت کے ذریعے اس حق کو کس طرح استعمال کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان کے نام پر منان اور ارباز عثمانی جیسے کرپٹ افسر نوادرات اور دیگر سامان کی ایسی بندر بانٹ کرسکتے تھے کہ کوئی عدالت قیامت تک اس خرد برد کا سراغ نہ لگا سکتی۔ اور پھر جب ایسے جرائم پیشہ افسروں کی پشت پر مجتبیٰ کنور جیسے سیاسی دیو ہوں تو جو کچھ بھی ہوجائے کم ہوتا ہے۔ میں نے آج تک دفینے کے بارے میں جب بھی سوچا تھا' ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ دفینے کے حوالے سے قانون کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں۔ خاص طور سے وہ نوادرات جن کا تعلق پاکستان سے ہے' پاکستان میں ہی رہنے چاہئیں۔ مگر اب میں مجتبیٰ کنور کے اطوار دیکھتا تھا تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سارے کا سارا اثاثہ مع بیش قیمت زیورات کسی کھوہ کھاتے میں جانے والا ہے۔

میں اور صفدر رات گئے تک اس سلسلے میں مشورہ کرتے رہے۔ مسٹر کلارک غیر ملکی تھے۔ انہیں جنون کی حد تک نوادرات کا شوق تھا' اس وقت بیس کے بیس اہم کیس مسٹر کلارک کی تحویل میں تھے۔ اصولی طور پر ہمیں مسٹر کلارک کی طرف سے خطرہ ہونا چاہیے تھا کہ کہیں وہ دفینے کے سامان کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی کارروائی نہ کرجائیں لیکن ہمیں یہ خطرہ مسٹر کلارک کے بجائے مسٹر مجتبیٰ کنور سے تھا۔ ایک ایسا پاکستانی جو پاکستانی ہونے کے باوجود پاکستان کا خیر خواہ نہیں تھا۔ کم از کم ہمیں تو نظر نہیں آیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میں دفینے کے حوالے سے غیر ملکی مسٹر کلارک پر تو اعتماد کرسکتا ہوں لیکن ہم وطن مجتبیٰ پر نہیں کرسکتا۔ اور یہ بات مجھے اندر ہی اندر شرمسار کر رہی تھی۔

اسی دوران میں میری نگاہ پورچ کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں میں نے ایک لمبی سیاہ کار دیکھی۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ملازم سے پوچھا' یہ کس کی گاڑی ہے؟ ملازم کے جواب دینے سے پیشتر ہی مسٹر کلارک ادھر پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ مجتبیٰ کے دو تین مقامی دوست ان سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجتبیٰ کا ادھر کون سا دوست تھا۔ غالباً وہ بھوپال میں بھی پہلی مرتبہ ہی وارد ہوا تھا۔

"کون لوگ ہوسکتے ہیں؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔ صفدر بھی سوچ میں نظر آنے لگا۔

مسٹر کلارک بولے "ہم لوگوں نے ملنے جلنے میں جتنی احتیاط کریں اتنا ہی بہتر ہے۔ دفینے کے سامان کے ساتھ ساتھ ہم سب اس وقت رسک پر ہیں۔"

جب مسٹر کلارک بات کر رہے تھے' صفدر اٹھ کر پورچ کی طرف چلا گیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ... وہاں ڈرائیور گوپال کھڑا تھا اور اس نے اشارے سے صفدر کو پاس بلایا تھا۔ چند لمحے بعد جب مسٹر کلارک انیکسی کی طرف چلے گئے تو ان دونوں نے مجھے بھی پورچ میں بلالیا۔ ڈرائیور گوپال نے بڑے رازدارانہ لہجے میں تصدیق کی کہ مجتبیٰ سے ملنے کے لیے آنے والے لوگ دراصل وہی افسر ہیں جو ہوٹل میں اس سے ملے تھے۔ ایک تیسرا فرد بھی ان کے ساتھ تھا اور اس کی شناخت نامعلوم تھی۔

گوپال بڑی رازداری اور احتیاط سے ہم دونوں کو کوٹھی کے پائیں باغ میں لے گیا۔ یہاں ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اسی کے متصل برآمدے میں جو کھڑکی کھلتی تھی وہ اس کمرے کی تھی جس میں مجتبیٰ کنور اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کھڑکی بند تھی تاہم ایک جگہ سے پردہ کچھ سرکا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ کمرے میں مجتبیٰ کے علاوہ تین افراد موجود تھے۔ دو افراد کو تو بطور کرپٹ ہم وطن میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ دونوں موٹے تازے تھے اور چہرے پر حرام کی سرخی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رشوت خور اور بے ایمان قسم کے بیوروکریٹ ہیں۔ ان میں سے ایک سفید شلوار قمیص میں تھا' اس کا رنگ بھی خاصا سرخ و سپید تھا۔ ایک آنکھ میں معمولی سا نقص نظر آتا تھا۔ دوسرا چینک کوٹ میں تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ تیسرا شخص جواں سال اور اسمارٹ تھا۔ اس کا تعلق مشرقی ہند یا بنگال وغیرہ سے تھا۔ اپنے ہم نشینوں کی طرح اس کے چہرے پر بھی ایک مکار سی مسکراہٹ تھی۔

سامنے بیش قیمت تپائی پر اسکاچ وسکی کی بوتل کھلی پڑی تھی اور جام چھلک رہے تھے۔ کمرے کے اندر کی آواز باہر نہیں آرہی تھی۔ میں صرف تاثرات دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً کسی اہم موضوع پر بات ہورہی تھی۔ میرے بعد صفدر نے بھی یہ منظر دیکھا۔ گوپال نے سرگوشی کے لہجے میں ہمیں بتایا کہ ہو نہ ہو یہ تیسرا بندہ انٹرپول کا ہے۔

"انٹرپول کا؟ تمہیں کیسے پتا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔ ڈرائیور کے منہ سے انٹرپول کا نام سن کر میں بھی چونک گیا تھا۔

گوپال نے کہا "بھگوان کی کرپا سے میں خود انٹرپول کے محکمے میں ڈھائی سال ملازمت کرچکا ہوں۔ میرا رینک کانسٹیبل کا تھا۔ پھر میں ایک واقعے میں زخمی ہوگیا اور مجھے سروس چھوڑنی پڑی۔ اس بندے نے جو گھڑی باندھ رکھی ہے وہ عام طور پر انٹرپول کے افسروں کے پاس ہی ہوتی ہے۔"

ڈرائیور گوپال ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تیز نظر آتا تھا' اب اس تیزی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ انٹرپول کی ملازمت کرچکا تھا اور اس کے علاوہ نہ جانے کہاں کہاں دھکے کھا چکا تھا۔ وہ ہرفن مولا قسم کا شخص نظر آتا تھا۔ صفدر نے اس سے دوستی کرکے ٹھیک ہی کیا تھا۔

واپس آکر میں اور صفدر دیر تک گم صم بیٹھے رہے' صورت حال تشویش ناک تھی۔ اگر ڈرائیور گوپال کا "انکشاف" درست تھا اور تیسرا بندہ واقعی انٹرپول کا تھا تو معاملات گمبھیر تر تھے۔ مجتبیٰ ہمیں اپنے ارادوں سے بالکل بے خبر رکھے ہوئے تھا۔ محکمہ آثار قدیمہ اور مالیات کے دو اہم افسروں کو دفینے کے معاملے میں ملوث کرنے کے بعد اب وہ انٹرپول کے کسی بظاہر کرپٹ افسر کو کھینچ لایا تھا۔ اس کے ارادے نیک نظر نہیں آتے تھے۔ صفدر نے سگریٹ سلگا رکھا تھا۔ وہ دھواں فضا میں چھوڑتا تو ایک دائرہ سا بن جاتا اور چکراتا ہوا کمرے کی کھڑکی سے باہر چلا جاتا۔ کھڑکی سے باہر۔ جہاں تاریک آسمان پر چاند تاروں کی محفل سجی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاند دراصل ایک ماہ رخ مغنیہ ہے۔ اس نے بھوپال کی شاعرانہ فضا میں کوئی پرسوز نغمہ چھیڑ رکھا ہے۔ ستارے سامعین ہیں اور دم بخود سن رہے ہیں۔ نغمے کی دل گداز لے ان کی آنکھوں کو بار بار ڈبڈباتی ہے۔

"پھر کیا کیا جائے شاہ جہاں صاحب؟" صفدر نے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' میری نظر اوھ کھلے دروازے سے گزر کر کوریڈور میں کھڑی سروج پر پڑی۔ وہ بالکل گم صم تھی اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ صفدر نے بھی سروج کو دیکھ لیا اور اس کا انداز بھی بھانپ لیا۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا "غالباً آپ کو یاد کیا جارہا ہے؟"

میں اٹھ کر سروج کے پاس پہنچا۔ وہ بڑی بنی سنوری ہوئی تھی۔ گلابی ساڑی میں اس کا جسم دمکتا دکھائی دیتا تھا۔ کانوں میں موتیے کے جھمکے مہک رہے تھے۔ میں اس کے پاس آیا تو ایوننگ ان پیرس کی خوشبو نے مجھے لپیٹ میں لے لیا۔ پچھلے تین چار دن سے وہ بہت خوش تھی۔ اور کیوں خوش نہ ہوتی۔

"اسے اپنی منزل مراد سامنے نظر آرہی تھی۔ اور یہ منزل مراد "دفینہ" تھی۔ بے شک ہم پورا دفینہ حاصل نہیں کرسکے تھے لیکن جو کچھ بھی مل رہا تھا وہ بہت تھا۔ ہم میں سے ہر کوئی اتنا مال دار تھا کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ بیسیوں افراد کی زندگیاں بدل سکتا تھا۔ وہ سارے خواب پورے کرسکتا تھا جو کسی بھی انسانی آنکھ میں اتر سکتے ہیں۔ یہ ہماری زندگیوں کا ایک کایا پلٹ موڑ تھا' بے شک ہمارے ذہن ابھی اس تبدیلی کو پوری طرح قبول نہیں کررہے تھے' لیکن یہ تبدیلی اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں سروج کو بھی آج کل بے حد مسرور اور پر امید دیکھ رہا تھا۔ لیکن رات کے اس پہر جب وہ مجھے کوریڈور میں کھڑی ہوئی ملی تو بہت کھوئی کھوئی اور خاموش تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی تیز و طرار سروج ہے جو زبان سے نہیں پورے جسم سے بولتی ہے اور اپنے مخاطب کو چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا "کیوں بلایا ہے؟"

اس نے میری قمیص کا کالر درست کیا اور بولی "کیا آج رات بھی دور ہی رہو گے؟"

"آج رات۔۔۔؟ آج رات کیا ہے؟"

"آج آخری رات ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کل میں واپس بمبئی جارہی ہوں۔"

"کیوں۔۔۔ کون بھیج رہا ہے؟"

"سائیں جی کا حکم ہے۔ وہ خود یہیں رہیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ دفینے کے سامان میں سے جو کچھ میرے حصے میں آئے گا وہ مجھے بمبئی ہی میں مل جائے گا۔ اب یہاں میری ضرورت نہیں ہے۔"

"سائیں کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔"

"اور تمہارے کام؟" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"اتنے دن تو کوئی جانور بھی ساتھ رہے تو اس سے پیار ہوجاتا ہے۔ ہم ساری رات ایک چھت تلے رہتے ہیں پھر بھی کوسوں دور رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "سروج میں تمہیں بتا چکا ہوں' میرے اور تمہارے درمیان کوئی جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ وہ جو کچھ تھا' حالات کا تقاضا تھا۔ ان دنوں تم پر بار بار مدہوشی طاری ہوجاتی تھی۔ وادی واخان سے جو ذہنی دباؤ تم اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں' اس نے تمہیں بیمار کر رکھا تھا۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرا اور تمہارا تعلق صرف اس بیماری سے لڑنے کے لیے تھا۔"

"صرف بیماری سے لڑنے کے لیے۔" سروج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"ہاں۔"

میرا خیال تھا کہ وہ ایک دم برہم ہوجائے گی لیکن وہ بھیگی آنکھوں کے باوجود مسکرا دی۔ وہ پہلی بار مجھے ایک عورت نظر آئی' ورنہ اس سے پہلے میں نے اسے جب بھی دیکھا تھا' ایکٹریس دکھائی دی تھی۔ ایک ایسی ایکٹریس جو دولت کے لیے اسٹیج پر ناچ رہی تھی اور ہر حد تک جانے کے لیے تیار تھی۔ وہ یوں بھی ناچ سکتی تھی کہ اس کے جسم پر لباس کا ایک تار نہ ہو اور یوں بھی ناچ سکتی تھی کہ بند کمرے میں اسے صرف ایک مرد کی حریص آنکھیں دیکھ رہی ہوں' لیکن اس وقت وہ مجھے یکسر مختلف نظر آئی تھی۔

اس نے ملائمت سے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور آہستگی سے بولی "تو کیا تمہیں قریب لانے کے لیے مجھے پھر بیمار ہونا پڑے گا۔ اگر یہی شرط ہے تو میں یہ شرط بھی پوری کردیتی ہوں۔ کچھ کھا کے لیٹ جاتی ہوں' جب مرنے لگوں گی تو تم بانہوں میں لے لینا۔"

"تمہارے لیے مرنا اتنا آسان نہیں ہے۔" میں نے بھی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا "تمہاری جان تو دفینے میں اٹکی ہوئی ہے۔"

"بڑے بدگمان ہو تم مجھ سے۔ چلی جاؤں گی تو یاد کرو گے۔ بڑا پریم کیا ہے میں نے تم سے۔"

"تم نے صرف دولت سے پریم کیا ہے اور سائیں عالی کی ہدایات سے پیار کیا ہے۔ وہ جیسے تم سے کہتا رہا ہے تم کرتی رہی ہو۔ اگر وہ تم سے کہتا کہ دفینے کے حصول کے لیے تمہیں کسی بھکشی کی گود میں بیٹھنا ہوگا تو تم ضرور بیٹھ جاتیں۔"

"تم میری توہین کررہے ہو۔" وہ بدستور نرم لہجے میں بولی "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ پہلے پہل میرے لیے دفینہ ہی سب کچھ تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ کچھ اور جذبے بھی اس میں شامل ہوگئے۔ سچ پوچھو شاہ جہاں! تو میں تمہارے حوالے سے خود کو جذباتی محسوس کرتی ہوں۔"

"یہ فقرہ اس سے پہلے کتنے مردوں سے کہہ چکی ہو تم؟"

"ہوسکتا ہے کہ کہا ہو' لیکن اتنے پرخلوص لہجے میں نہیں کہا تھا اور نہ کہہ سکتی ہوں۔"

"پھر کب ملوگی؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے جدا تو ہولو۔" وہ عجیب انداز سے مسکرائی اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

ہم دونوں کمرے میں چلے آئے۔ نائٹ بلب روشن تھا اور کھڑکیوں پر احتیاط سے پردے کھینچے گئے تھے۔ کمرے میں میری پسندیدہ خوشبو والا ائر فریشنر استعمال کیا گیا تھا اور میز پر میرے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ رکھے تھے۔ خواب ناک روشنی میں سائیں عالی کی چہیتی چیلی سراپا قیامت نظر آرہی تھی۔ میں نے صوفے پر پھیلتے ہوئے کہا "مجھے تو نہیں لگتا کہ تم جاؤ گی۔ اور اگر جاؤ گی بھی تو پھر واپس آجاؤ گی۔ کیونکہ ابھی تمہارا ٹارگٹ پورا نہیں ہوا۔ قریباً نصف دفینہ ابھی بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔"

"یہ تو سائیں جی ہی کو معلوم ہے کہ آؤں گی یا نہیں۔"

اس نے صوفے کے ہتھے پر بیٹھ کر بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور قریب تر ہوگئی۔ اس کی گرم سانسیں میرے چہرے اور گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔ عجیب لہجے میں کہنے لگی "شاہ جہاں! آج تک میری بیماری کے لیے میرے قریب آتے رہے ہو' آج میرے لیے آجاؤ۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے۔"

الوداع کا لفظ ہمیشہ میرے دل پر دردناک چوٹ کی طرح لگا ہے۔ آج بھی لگا۔ سروج کی توبہ شکن اداؤں کے نرغے میں ہونے کے باوجود میں گم صم سا ہوگیا۔ سوچنے لگا' یہ آخری ملاقات' الوداع' جدائی' دائمی دوری جیسے الفاظ کیوں وجود میں آئے ہیں۔ آخری ملاقات کیوں ہوتی ہے۔ آخری بات کیوں کہی جاتی ہے' آخری بار کسی کو کیوں چھوا جاتا ہے۔ اس "آخر" کے ساتھ مجھے ہمیشہ سے نفرت رہی تھی۔ امی اور ابو کی وفات کے بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میں نے امی کو آخری بار کب چھوا تھا۔ اور جب میں انہیں چھو رہا تھا مجھے کیا معلوم تھا اس کے بعد میں کبھی یہ لمس نہیں پاسکوں گا۔ جب میں ان سے آخری بات کررہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آخری بات ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو میں اس بات کو مہینوں اور برسوں تک طول دے دیتا۔ اسی طرح کبھی کبھی میں غزالہ کے بارے میں بھی سوچتا تھا۔ کیا پتا کہ غزالہ کے چہرے پر میری کون سی نگاہ آخری ثابت ہوجاتا تھی۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھنا تھی۔ کس بات کے بعد کوئی بات نہیں ہونا تھی' کس لمس کے بعد کوئی لمس نہیں تھا۔ میں جب بھی اس انداز سے سوچتا تھا' میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ میں شاعرانہ انداز کے خیالات کو ذہن میں جگہ دینے لگتا تھا۔ اچھی اور خوشگوار کیفیات کا "آخر" کیوں ہوتا ہے۔ کیوں وہ ہمیشہ نہیں چلتی رہتیں' اور اگر ہمیشہ نہیں چل سکتیں تو کم از کم ان کی واپسی کی آس تو موجود رہے۔ کیوں کبھی کبھی سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ آس بھی ختم ہوجاتی ہے اور ایک خوشگوار کیفیت پر آخری فل اسٹاپ لگ جاتا ہے۔

آج سروج نے "الوداع" کی بات کہی تھی تو یہ سارے قدیم خیالات میرے ذہن سے گزر گئے تھے' اور اس کے ساتھ ہی سروج کی طرف سے میرا کھچاؤ کم ہوگیا تھا۔ سروج نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی "کہاں کھو گئے شاہ جہاں؟"

"کچھ دور چلا گیا تھا" میں نے کہا۔

"غزالہ کے پاس!" وہ چبھتے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"اس سے بھی آگے۔ اپنے لڑکپن میں۔" میں نے کہا۔

"چلو اب جوانی میں واپس آجاؤ۔" وہ میری بانہوں میں سماتے ہوئے بولی۔ اس کے جسم کا ہر انگ بولتا تھا اور اپنی توبہ شکن اداؤں سے وہ اپنے جسم کی اس گویائی کو چیخ و پکار میں تبدیل کردیتی تھی' یعنی اس کا پورا بدن چیختا چنگھاڑتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کمرے کے ریشمی اندھیرے میں سروج کی سرگوشیاں سرسرا رہی تھیں۔ ان دہکتی دہکتی لشکارے مارتی سرگوشیوں کی حدت سے وہ سلگنے لگی اور پھر شعلے کا روپ دھار گئی۔ اچانک ایک آواز نے مجھے اور سروج کو ٹھٹکایا۔ یہ زوردار دستک کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی سائیں عالی کی گرج سنائی دی "دروازہ کھولو۔ جلدی کھولو دروازہ۔"

سروج نے جلدی سے اپنا لباس درست کیا اور بستر سے اٹھ گئی۔ بال سمیٹتی ہوئی وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی' میں صوفے پر بیٹھ کر میگزین دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد سائیں دندناتا ہوا اندر داخل ہوا' آتے ساتھ ہی بغیر کسی تمہید کے اس نے ایک زوردار لاٹھی سروج کی ٹانگ پر رسید کی۔ سروج کا رنگ زرد ہوگیا۔

سائیں چنگھاڑا "رنگ رلیاں مناتی ہے۔ تجھے پتا بھی ہے کہ شاہ جنات کا جواں سال بیٹا ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوگیا ہے۔ ابھی تو اس کی میت بھی گھر میں پڑی ہے اور تجھے ترمستی سوجھ رہی ہے۔ چل نکل یہاں سے۔ چل دوسرے کمرے میں جاکر سو۔ اور سونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ صبح چھ بجے تیری فلائٹ ہے۔ جا تیاری وغیرہ کرلے۔"

"اچھا سائیں جی۔" سروج نے آزردہ لہجے میں کہا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"اس کی طرف کیا دیکھ رہی ہے۔" سائیں پھر گرجا "اب تیرا اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ سب کچھ ضرورت

کے لیے تھا۔ اب وہ ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے تعلق بھی نہیں رہا۔ اور یہ بھی یاد رکھ کہ یہ شفیع محمد کسی اور سے پیار کرتا ہے' اور وہ بھی اس سے پیار کرتی ہے۔ وہ بڑا سچا اور کھرا پیار ہے۔ کوئی کھوٹ نہیں ہے اس میں۔ تم اس پیار کے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"جی سائیں جی۔" سروج نے سر جھکا کر کہا۔

"چل اب خدا حافظ کہہ لے اسے۔" سائیں نے حکم دیا۔

سروج نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور "خدا حافظ" کہا۔

سائیں غرایا "یہ خدا حافظ کہہ رہی ہے یا لٹھ مار رہی ہے اس کے سر پر؟ آرام سے خدا حافظ کہہ۔ لیکن ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگنا چاہیے۔ میں باہر کھڑا ہوں دروازے پر۔ گیارہ بج کر بیس منٹ پر میں نے جنازہ پڑھانے جانا ہے۔"

سائیں کی باتیں ایسی ہی اوٹ پٹانگ ہوتی تھیں۔ وہ باہر نکلا تو سروج مجھ سے چمٹ گئی۔ وہ دیر تک میرے گلے لگی رہی اور میرا چہرا اپنے چہرے پر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ پھر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

شاعر نے سچ کہا ہے۔ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ کبھی زمین اور کبھی آسماں نہیں ملتا۔ سروج "بھرپور طریقے" سے مجھے الوداع کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی تھی حالانکہ اس سے پہلے ہمیں باہم ملنے کے وافر مواقع ملتے رہے تھے۔ بلکہ سائیں عالی خود لٹھ لے کر سروج کے پیچھے پڑا رہتا تھا کہ وہ مکمل طور پر میری بیوی بن کر رہے۔ سائیں عالی کی باتیں سمجھ میں آجاتیں تو پھر اسے سائیں عالی کون کہتا۔ وہ ایک پراسرار شخص تھا اور اس کی ذہانت مخبوط الحواسی کے دبیز پردوں میں کہیں چھپی ہوئی تھی۔ اب غزالہ کے بارے میں جو باتیں ابھی اس نے کی تھیں وہ بھی حیران کن تھیں۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ غزالہ کے خلاف ہی بولا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ میرے اور غزالہ کے درمیان جتنا بھی فاصلہ بڑھایا جاسکے "بڑھا دیا جائے۔ لیکن آج اس نے سروج کے سامنے غزالہ کے پرخلوص پیار کا اعتراف کیا تھا اور سروج کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس پیار کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ یہ کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی۔ کیا یہ سب دفینے کی بازیابی کا کرشمہ تھا۔ مگر دفینہ بھی ابھی پورا کہاں ملا تھا۔ سائیں نے غزالہ والی بات کیوں کی ہے؟ یہ سوال بڑی تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا۔ سائیں نے یہ بات ایسے وقت میں کی تھی جب دور دور غزالہ کا پتا نہیں تھا۔ وہ

کس حال میں تھی' کہاں تھی؟ میرے اور غزالہ کے پیار کے حوالے سے حالات بڑے تاریک تھے۔ کہیں امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر اس کے باوجود سائیں کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ سائیں کے اندر روحانیت ہے' کوئی ایسی طاقت ہے اس کے اندر جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔ اس نے دنیا کی راحتوں سے منہ موڑ رکھا تھا۔ چیتھڑے پہنتا تھا۔ فرش خاک پر سوتا تھا' اور ایسا کھانا کھاتا تھا جس میں لذت کا دور دور تک نشان نہیں ہوتا تھا۔ وہ مکمل طور پر مجرد زندگی گزار رہا تھا۔ شاید اسی نفس کشی نے اس کے اندر خاص قسم کی توانائی پیدا کر دی تھی۔ مجھے وہ منظر ابھی تک یاد تھا جب وادی واخان کے ایک تاریک غار میں سائیں عالی نے پُراسرار پردہ نشین' سانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا' اور اس کے مسمریزم کو نیچا دکھایا تھا۔ بے شک اس پراسرار مقابلے کے نتیجے میں سائیں عالی کے سارے جسم پر چھالے نمودار ہو گئے تھے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

○☆○

اگلے روز صبح سویرے مجتبیٰ کنور سے ملاقات ہوئی۔ حسب معمول اس کی آنکھوں میں رات کی مے نوشی کا خمار تھا۔ ہم برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجتبیٰ رات کو آنے والے مہمانوں کے بارے میں کچھ بتائے گا۔ میرا خیال درست نکلا' مجتبیٰ نے بتایا لیکن جس انداز سے بتایا وہ مزید پریشان کرنے والا تھا۔ اس نے دونوں محکمہ جات کے پاکستانی افسروں کو اپنے بھوپالی دوست بتایا' اور انٹرپول کے آفیسر کے بارے میں کہا کہ وہ کوئی بیمہ ایجنٹ تھا۔ یہ سفید جھوٹ تھا۔ اور اس جھوٹ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو رہی تھی کہ مجتبیٰ کنور گیم کھیلنے والا ہے۔

اورنج جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے مجتبیٰ کنور ذرا میری طرف جھک آیا اور رازداری کے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! میں مسٹر کلارک کے ساتھ ایف ایم کے آفس گیا تھا۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھی تھی جہاں ان اٹیچی کیس کو محفوظ کیا گیا تھا۔ بے شک وہ جگہ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے مسلح بندے بھی ہیں' لیکن اٹیچی کیس کا دیر تک وہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ تم مسٹر کلارک سے بات کرو۔ میں بھی کرتا ہوں۔ جس طرح بھی ہو' اگلے چوبیس گھنٹوں میں اٹیچی کیس "ایف ایم" کے آفس سے منتقل ہو جانے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور۔" مجتبیٰ نے اپنا لہجہ کچھ اور دھیما کر لیا "دولت ایسی چیز ہے جو بڑوں بڑوں کی نیت میں فرق ڈال دیتی

ہے۔ مسٹر کلارک بہت اچھے انسان ہیں' میں خدانخواستہ ان پر شک نہیں کر رہا۔ لیکن ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایف ایم کے آفس سے اٹیچی کیس نکالتے وقت ہم بھی موقع پر موجود ہوں۔ اس کے بعد بھی مسٹر کلارک نے جو بھی کارروائی کرنی ہے ہمارے سامنے ہو۔"

میں نے کہا "مجتبیٰ صاحب! مسٹر کلارک جتنے میرے قریب ہیں اتنے ہی آپ کے بھی ہیں۔ ہم دونوں انہیں اچھی طرح جانتے ہیں' بہرحال احتیاط کرنا تو کوئی غلط بات نہیں۔ میں پوری طرح آپ سے متفق ہوں۔"

مجتبیٰ نے کہا "ہم پہلے بھی اس موضوع پر بات کر چکے ہیں۔ دفینے کے نوادرات میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ جن کا تعلق یورپ اور مشرق وسطیٰ وغیرہ سے ہے۔ تاہم گندھارا آرٹ اور آٹھویں نویں صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوادرات ہماری سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا ورثہ ہیں۔ دفینے کی جو بھی تقسیم ہو یہ نوادرات ہمارے حصے میں آنے چاہئیں۔"

میں نے کہا "میں نے اس سلسلے میں مسٹر کلارک سے تفصیلی بات کی تھی۔ وہ تقریباً اس بات پر متفق ہو چکے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ہم گورنمنٹ آف پاکستان کے کسی نمائندے کو یہاں بلانا چاہتے ہیں تو بلا سکتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی بھی کام غیر قانونی طریقے سے ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ انڈین گورنمنٹ اور دیگر غیر متعلقہ لوگ بھی اس میں "انوالو" ہو جائیں اور ایک ملغا کھڑا ہو جائے۔"

"سامان کا کچھ تخمینہ لگایا جاسکا ہے یا نہیں؟"

"مسٹر کلارک نے بتایا تھا کہ ایک اٹیچی کیس کا سامان نکال کر دیکھا گیا تھا۔ اس میں صرف زیورات اور ڈائمنڈ وغیرہ تھے۔ اس سامان کی مالیت پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ ظاہر ہے کہ مکمل تخمینہ تو سارا سامان چیک ہونے کے بعد ہی لگے گا۔"

میں اور مجتبیٰ کافی دیر تک باتوں میں مصروف رہے۔ اسی دوران میں سائیں عالی اور صفدر ایک بند اسٹیشن ویگن میں سوار کوٹھی میں داخل ہوئے۔ وہ سروج کو ائرپورٹ پر سی آف کر کے آئے تھے۔ سائیں عالی کچھ اداس نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی چہیتی چیلی تھی اور ہر وقت خدمت میں مصروف رہتی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر لیٹ گیا۔ ذرا

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول دل میں ازنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی دلچسپی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۱۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نوہو کے مختلف جلوہ روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۲۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

علی میاں پبلیکیشنز
20- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

آنکھ لگ گئی۔ اٹھا تو صفدر میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی "کیا ہوا صفدر؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مسٹر کلارک یہاں نہیں ہیں۔ نہ ہی ان کا کوئی ملازم ہے۔ پوری کوٹھی خالی پڑی ہے۔"

"کہاں گئے ہیں؟ بتا کر نہیں گئے؟"

"میں تو سو رہا تھا۔ مجتبٰی صاحب اپنے مہمانوں کے ساتھ انیکسی میں تھے۔ مہمان رخصت ہوئے تو مجتبٰی صاحب نے دیکھا کہ کوٹھی خالی پڑی ہے۔ پورچ میں تینوں گاڑیاں بھی موجود نہیں۔"

اسی دوران میں مجتبٰی کنور بھی آگیا۔ اس نے ایک چوکیدار کو گریبان سے پکڑ رکھا تھا اور بڑے غصے کے عالم میں اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر رہا تھا "کہاں ہے دوسرا چوکیدار؟" اس نے کڑک کر کنور کھا چوکیدار سے پوچھا۔

"صاحب جی! وہ بھی ساتھ ہی گیا ہے۔" چوکیدار نے لرز کر کہا۔

مجتبٰی نے چوکیدار کو دھکا دے کر دور پھینکا اور بولا "شاہ جہاں! تمہیں کہا تھا نا' یہ بے خبری اچھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی زبردست قسم کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

ہم دونوں قریباً دوڑتے ہوئے باہر پورچ میں آئے۔ واقعی وہاں کوئی گاڑی بھی نہیں تھی۔ صرف سامنے عالی فرش پر ٹائیگر پیارے سو رہا تھا اور اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ صفدر بھی ہمارے پیچھے ہی پورچ میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً ایف ایم کے دفتر پہنچنا چاہیے۔"

"تم ٹیکسی لاؤ۔" مجتبٰی نے تیزی سے کہا۔

صفدر ٹیکسی کے لیے باہر نکل گیا۔ اسی اثنا میں مجتبٰی بھاگتا ہوا کمرے میں گیا اور اپنا امریکن بلزر لے آیا۔ میں نے بھی اپنا ریوالور لوڈ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ صفدر نے ٹیکسی لانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ہم نے کوٹھی کے چوکیدار کو ایک باتھ روم میں لاک کیا اور خود بذریعہ ٹیکسی کار تیز رفتاری سے "ایف ایم" کے مرکزی آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجتبٰی نے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا "مجھے صبح سے ہی شک سا تھا۔ مسٹر کلارک کے ملازم ایک اٹیچی کیس میں اس کا سامان پیک کر رہے تھے۔ مجھے [illegible] رہا ہے کہ وہ شخص ہمیں دھوکا دے گیا ہے۔"

"لیکن۔۔۔ اگر انہوں نے ایسا کام کرنا ہوتا تو رات کا انتظار کرتے؟ دن دہاڑے وہ کیوں نکل گئے۔"

"جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ وہ تینوں گاڑیاں بھی لے گئے ہیں اور میں مسٹر کلارک کا کمرا بھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ وہاں سامان کے نام پر ایک تنکا بھی نہیں ہے۔"

صفدر کی بار بار کی ہدایت کے باوجود ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی آہستہ چلا رہا تھا۔ صفدر نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیونگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ڈرائیونگ اور نشانے بازی دو ایسے ہنر تھے جن میں صفدر کو بلا کی مہارت حاصل تھی۔ صفدر نے تیز رفتار سے ڈرائیونگ کی اور پانچ منٹ میں ہمیں "ایف ایم" کے مرکزی آفس پہنچا دیا۔ عام طور پر آفس کے سامنے آٹھ دس گاڑیاں موجود رہتی تھیں لیکن آج صرف ایک گاڑی دکھائی دے رہی تھی۔ استقبالیہ پر بھی کوئی چہل پہل نظر نہیں آئی۔

مجتبٰی کنور نے لرزاں آواز میں کہا "معاملہ گڑبڑ ہے بھئی۔"

میں اور مجتبٰی قریباً چلتی گاڑی سے ہی نیچے اتر گئے۔ ہم دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے۔ اندرونی گیٹ آدھا بند کر دیا گیا تھا۔ مجتبٰی نے رائفل بردار چوکیدار سے پوچھا "آفس بند کیوں ہے؟"

چوکیدار نے کہا "ایم ڈی صاحب کے کوئی عزیز فوت ہو گئے ہیں۔"

مجتبٰی نے اندر جانے کے لیے قدم اٹھایا تو چوکیدار نے راستہ روکا۔ مجتبٰی کے منہ سے ایک غلیظ گالی نکلی اور وہ چوکیدار کو دھکا دیتا ہوا بڑے رعب سے اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے آگیا۔ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے ہم اوپر والی منزل پر پہنچ گئے۔ مجتبٰی کے ساتھ ساتھ میں نے بھی ریوالور نکال لیا تھا۔ پورا آفس بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ لفٹ بھی بند تھی۔ ہم سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ مجتبٰی تیسری منزل کی سیڑھیاں بھی چڑھ گیا اور چھت پر پہنچ گیا۔ یہاں پانی کے دو بڑے ٹینکر موجود تھے۔ ایک کا رنگ سیاہ اور دوسرے کا سرخ تھا۔ مجتبٰی نے اِدھر دیکھا نہ اُدھر' جھٹ سے سرخ ٹینکر کی سیڑھی پر چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ ٹینکر کے اوپر جا [illegible] دار ریوالونگ ڈھکن تھا۔ مجتبٰی نے ڈھکن [illegible] سایا۔ وہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ مجتبٰی نے گھٹنوں کے بل جھک کر جلدی سے ٹینکر کے اندر جھانکا۔ اس کے منہ سے ایک غلیظ گالی نکلی اور اس نے زور کے ساتھ ڈھکن بند کر دیا۔ [illegible]ن سے اندازہ ہوا کہ ٹینکر کے اندر پانی نہیں ہے بلکہ وہ بالکل خالی ہے۔

مجتبٰی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے پورے [بد]ن پر بجلی سی لرزش نظر آ رہی تھی۔ "لے گیا حرام زادے سب کچھ لے گیا۔" وہ بے حد تاسف سے بولا۔

میری طرح صفدر بھی دم بخود کھڑا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کون کیا لے گیا ہے؟ مجتبٰی نے یقیناً مسٹر کلارک کی بات کی تھی اور ان اینٹی[ک]س کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اس ٹینکر میں موجود نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی اور اس خبر نے قرب و جوار میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی۔

اسی دوران میں دو افراد دوڑتے ہوئے چھت پر پہنچے۔ ان میں سے ایک چوکیدار تھا اور دوسرا کورین گارڈ۔ مجتبٰی ٹینکر سے نیچے اتر چکا تھا۔ اس نے عقاب کی طرح جھپٹ کر کورین گارڈ کو دبوچ لیا۔ چوکیدار نے اپنے ساتھی کی مدد کے لیے رائفل کندھے سے اتارنا چاہی لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کی رائفل سے اس کی کنپٹی پر ایک زوردار ضرب رسید کی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح دھم سے فرش پر گرا۔ مجتبٰی پر جنون طاری تھا۔ اس کا یہ [بہت] ہی غصیلا روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک [ہی] لمحے کے اندر گارڈ سے اس کا پستول چھین کر پھینک دیا اور اس کی وردی کی قمیص تار تار کر دی' پھر وہ اسے ٹانگوں سے [پکڑ] کر گھسیٹتا ہوا چھت کے کنارے کی طرف لے گیا۔ گارڈ اس کے وحشیانہ حملے سے اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ معمولی سی [مزاحم]ت بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

مجتبٰی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے چھت سے نیچے [لٹکا] دیا لیکن ایک ٹانگ پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ گارڈ سر کے بل ہوا میں جھول رہا تھا۔ یہ تیسری منزل کی [چھت] تھی' وہ نیچے گرتا تو چکنا چور ہو جاتا۔ مجتبٰی ہیجانی لہجے [میں چلا]یا "کہاں ہے تیرا مالک۔ کہاں گئے ہیں سب لوگ!" [وہ انگ]لش میں بولا تھا۔

گارڈ نے الٹے لٹکے لٹکے ہاتھ جوڑ دیے "مجھے کچھ پتا [نہیں] صاحب جی۔ کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ لوگ یہاں سے گیا [ہے۔]"

"یہ ٹینکر کب کھولا گیا تھا؟"

"یہ۔۔۔ یہ رات کو کھولا گیا تھا۔"

"کیا سامان نکالا گیا تھا؟" مجتبٰی نے اسے لٹکائے لٹکائے [پوچھا۔]

"[پتا] نہیں۔۔۔ سامان تو میں نے نہیں دیکھا جی' لیکن وہ سامان [ٹین]ک کے ایک بند لوڈر میں رکھا گیا تھا اور وہ لوڈر رات کو گیراج میں کھڑا رہا تھا۔"

"اب لوڈر کہاں ہے؟"

"وہ صبح سویرے یہاں سے چلا گیا تھا۔"

مجتبٰی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ وہ مایوسی کے عالم میں بے گناہ گارڈ کو نیچے پھینک دے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر گارڈ کی ٹانگ پکڑی اور اسے چھت پر کھینچ لیا۔ اس کا رنگ ہلدی تھا اور پیشاب کپڑوں کے اندر خطا ہو چکا تھا۔

"کہاں گئے ہوں گے حرام زادے؟" مجتبٰی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

میں نے کہا "ہمیں سب سے پہلے ائرپورٹ دیکھنا چاہیے۔"

ہم تیزی سے نیچے اترے اور ٹیکسی کار کی طرف بڑھے' لیکن ٹیکسی کار وہاں نہیں تھی۔ غالباً ٹیکسی ڈرائیور نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے سو وہ اپنے کرایے پر لعنت بھیج کر نکل گیا تھا۔ ہم نے آفس کے باہر کھڑی اکلوتی کار کا شیشہ توڑا اور صفدر ایک دو منٹ کے اندر اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم آندھی و طوفان کی رفتار سے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم مقامی پولیس کو مطلوب تھے' اوپر سے صفدر ڈرائیونگ بھی اندھا دھند کر رہا تھا' ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں دھر لیے جائیں گے۔ بہرحال خیریت گزری۔ ہم ائرپورٹ پہنچے۔ لیکن وہاں مسٹر کلارک کا نام و نشان نہیں تھا۔ مسٹر کلارک کا کوئی کارندہ نظر آیا اور نہ کوئی ایسی گاڑی دکھائی دی جس کا تعلق مسٹر کلارک یا "ایف ایم" سے ہوتا۔

مجتبٰی کنور رسک لیتے ہوئے گاڑی سے اتر آیا اور ائرپورٹ کے اندر چلا گیا۔ یقیناً وہ انکوائری کرنے گیا تھا کہ پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کون کون سی فلائٹس روانہ ہوئی ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد مجتبٰی کنور واپس آگیا۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ پچھلے دو گھنٹے میں صرف دو فلائٹس روانہ ہوئی ہیں۔ ایک دہلی کے لیے تھی اور دوسری فرینکفرٹ کے لیے۔ ائرپورٹ پر مجتبٰی کو اتفاقاً پی آئی اے کا ایک فلائٹ انسپکٹر مل گیا تھا۔ مجتبٰی نے اس کے ذمے کام لگایا تھا کہ نیو دہلی اور فرینکفرٹ جانے والی پروازوں کی "پیسنجر لسٹ" کا پتا کرے۔ غم و غصے کی زیادتی نے مجتبٰی کی صورت بگاڑ رکھی تھی۔

ہم ائرپورٹ سے واپس اپنے ٹھکانے پر آگئے۔ کوٹھی کا اکلوتا چوکیدار بدستور باتھ روم میں بند تھا۔ سائیں سائیں کرتی

پورچ میں ٹانگیں پسارے خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ مجتبیٰ ائرپورٹ پر اپنے پاکستانی دوست کو اسی کوٹھی کا نمبر دے کر آیا تھا۔ ابھی ہم کوٹھی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مجتبیٰ کے دوست نے اسے دونوں فلائٹس کے مسافروں کی فہرست فراہم کر دی تھی۔ نیو دہلی والی فہرست میں چار پانچ غیر ملکیوں کے نام موجود تھے۔ ان میں مسٹر کلارک کا نام نہیں تھا' لیکن یہ بات بھی ضروری نہیں تھی کہ مسٹر کلارک نے اصل نام سے ہی سفر کیا ہو۔ مجتبیٰ کنور نے اپنے فلائٹ آفیسر دوست کو فوراً ہدایت کی کہ وہ دہلی کے لیے اگلی پرواز میں اس کے لیے نشست حاصل کرے۔ اگلی پرواز شام پانچ بجے روانہ ہونا تھی۔ جوں جوں پانچ بجے کا وقت قریب آ رہا تھا' مجتبیٰ کنور کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دو تین بار اپنے دوست سے رابطہ کر چکا تھا تاہم ابھی تک اسے نشست حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ چار بجے کے لگ بھگ وہ فون پر باقاعدہ چیخنے لگا۔ اس نے فلائٹ آفیسر کو آڑے ہاتھوں لیا اور ائر انڈیا کے کسی افسر کی ماں بہن ایک کی۔

صفدر اور میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھے مجتبیٰ کی چیخم دھاڑ سن رہے تھے۔ صفدر نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔ کچھ آپ بھی سوچیں۔ اگر واقعی پانچ بجے کی فلائٹ سے مجتبیٰ صاحب روانہ نہ ہو سکے تو کیا ہوگا۔"

میں نے کہا "سائیں عالی بھی تو کہتا ہے کہ وہ پی آئی اے یعنی پرستان ائر لائنز کے ذریعے کسی بھی وقت کسی کو کہیں بھی پہنچا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے' اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔"

صفدر نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا "سوا چار تو بج گئے ہیں۔ اب مجتبیٰ صاحب کا جانا مشکوک ہی نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ چلا بھی گیا تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مسٹر کلارک دہلی میں ہیں ہی نہیں۔"

صفدر نے چونک کر پوچھا "آپ کو کیسے پتا ہے؟"

میں نے کہا "سائیں عالی کے ساتھ رہ رہ کر کچھ روحانیت میرے اندر بھی داخل ہو گئی ہے۔"

صفدر ایک دم الرٹ ہو کر بیٹھ گیا "آپ۔۔۔ آپ ضرور کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"تم سے اور زریں گل سے کیا چھپا سکتا ہوں۔ تم دونوں تو آنکھوں آنکھوں میں میرا ایکسرے کر لیتے ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو' لو یہ گنڈیریاں چوسو۔۔۔ بھوپال کی اسپیشل گنڈیریاں ہیں۔"

صفدر کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا تھا' وہ سمجھ گیا تھا کہ صورت حال اتنی مایوس کن نہیں' جتنی بظاہر نظر آ رہی ہے۔ وہ بولا "آپ کی گنڈیریاں سر آنکھوں پر لیکن کچھ بتائیں بھی تو۔ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ مسٹر کلارک دہلی میں نہیں۔ اور اگر وہ دہلی میں نہیں تو کہاں ہیں؟"

میں نے صفدر کو اشارے سے کہا کہ وہ دروازہ بند کر دے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تجسس اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر کلارک ابھی بھوپال میں ہی ہیں اور تمام اٹیچی کیس بھی۔ لیکن کل رات تک یہ سامان اپنی منزل تک پہنچ چکا ہوگا۔"

"منزل۔۔۔ کون سی منزل؟"

"یہ تو مسٹر کلارک ہی جانتے ہیں۔ بہرحال وہ دفینے کا سامان اپنے ذرائع کی مدد سے امریکا شفٹ کر رہے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" صفدر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا "ہم اتنی دولت کا کیا کرتا تھا۔ مسٹر کلارک غریب ملک کے غریب باشندے ہیں۔ ان کی زندگی میں تھوڑی سی خوش حالی آ جائے گی۔ بے چارے دو چار بحری جہاز خرید لیں گے یا ایک آدھ صنعتی شہر قائم کر لیں گے۔ مسٹر کلارک جیسے لوگوں کی زندگی میں بس یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو ہوتی ہیں۔"

"آپ بات کو مذاق میں ٹال رہے ہیں۔ مسٹر کلارک اگر دفینے کا سامان امریکا شفٹ کر دیں گے تو ہمیں کیا ملے گا۔ اور پھر۔ آپ ان نوادرات کو کیوں بھول رہے ہیں' جن کا تعلق ہمارے ملک سے ہے' ہماری سرزمین سے ہے۔ وہ سب ہمارا اثاثہ ہے۔"

"ہمارے پاس جو اثاثے پہلے موجود ہیں ان کی کون عزت افزائی ہو رہی ہے۔ کہیں بھینسوں کے باڑے بنے ہوئے ہیں' کسی اثاثے کے اوپر سے گندا نالا چل رہا ہے' کسی اثاثے کی لاش پر پلازا کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بزرگان نحیف و کمزور بابے۔۔۔ یہ بھی تو کسی قوم کا اثاثہ ہی ہوتے ہیں' دیکھ لو کیسے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں ہماری گلیوں میں۔"

"آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں جناب' لیکن میں نوادرات کی بات کر رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ بھی رہے ہیں' لیکن کچھ بتانا نہیں چاہ رہے۔"

"اچھا تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ نوادرات جن کا تعلق

پاکستان سے ہے' کہاں ہوں گے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے وہ نوادرات مسٹر کلارک کے حوالے نہیں کیے ہوں گے۔"

میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور گنڈیری چوستے ہوئے کہا "تمہارا یقین بالکل یقینی ہے۔ وہ نوادرات مسٹر کلارک کے سامان میں شامل نہیں ہیں۔"

"تو کہاں ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

اسی دوران میں جھلایا ہوا مجتبیٰ کنور اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ہمارے سامنے گنڈیریاں دیکھ کر اس نے مزید جھلا جانا تھا' لہٰذا میں نے اس کی نگاہ سے پہلے ہی گنڈیریاں ایک طرف کر لی تھیں۔

مجتبیٰ نے کہا "شاہ جہاں! ہمیں فوراً فارن منسٹری کو صورت حال سے آگاہ کرنا ہوگا۔"

"بالکل جناب! اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔

دل میں' میں نے سوچا کہ جب منسٹری کو آگاہ کرنے کا موقع تھا اس وقت حضرت چپکے چپکے اپنے منظور نظر افسران کو بلا آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ اب جبکہ معاملہ گڑبڑ ہوتا دکھائی دے رہا ہے منسٹری کی یاد آ گئی ہے۔

صفدر نے پوچھا "ٹکٹ کا کیا بنا مجتبیٰ صاحب؟"

"ٹکٹ مل گیا ہے۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "وہاں پہنچتے ہی تمہیں فون کروں گا۔ باقی باتیں فون پر ہوں گی۔"

وہ افراتفری میں باہر چلا گیا۔ وہ ایک ایسے شخص کو پکڑنے دہلی جا رہا تھا جو یہیں بھوپال میں موجود تھا' اور یہاں سے کچھ اتنا دور بھی نہیں تھا۔

مجتبیٰ صحرائی بگولے کی طرح باہر نکل گیا تو صفدر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ بہت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ بولا "شاہ جہاں صاحب! کچھ تو بتائیں یہ ماجرا کیا ہے؟"

"ماجرے کا تھوڑا بہت تو تمہیں بھی علم ہے۔ میری طرح تم نے بھی مجتبیٰ کی آنکھ میں سؤر کا بال دیکھ لیا تھا۔ مجھے کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم دفینے کے سلسلے میں مسٹر کلارک پر تو اعتماد کر سکتے ہیں لیکن مجتبیٰ پر نہیں۔ میں نے اتوار کے روز مسٹر کلارک سے بات کی تھی۔ اس بات چیت میں' میں تمہیں بھی شریک کرنا چاہتا تھا لیکن تم مجتبیٰ کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہم نے دو ڈھائی گھنٹے تبادلۂ خیال کیا۔ اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مسٹر کلارک دفینے کا سامان اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ صرف وہ نوادرات یہاں رہنے دیے جائیں گے جن کا تعلق پاکستان سے ہے۔ ان نوادرات کی کل تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ چھوٹے بڑے تمام نوادر اس میں شامل ہیں۔ یہ تمام نوادر بھوپال ہی کے ایک مکان میں بالکل محفوظ ہیں۔ باقی سامان آج کسی وقت مسٹر کلارک کے ساتھ امریکا جا رہا ہے۔ مسٹر کلارک اس سارے سامان کی ٹھیک ٹھیک مالیت معلوم کریں گے۔ جو کچھ فروخت کرنا ہوگا فروخت کر دیں گے' جو اپنے پاس رکھنا ہوگا رکھ لیں گے۔ اس کے بعد برابر حصے کیے جائیں گے اور ہر حصے دار کو اس کا حصہ اس کے ٹھکانے پر مل جائے گا۔ جو کچھ طے ہوا ہے اس کے مطابق میرا' تمہارا' سروج اور مجتبیٰ کا ایک ایک حصہ ہوگا۔ زریں گل اور سائیں عالی کا آدھا آدھا حصہ ہوگا' اگر سائیں عالی اپنا آدھا حصہ نہ لینا چاہے گا تو وہ سروج کو مل جائے گا۔ مسٹر کلارک نے دفینے کی تلاش میں جہاں اپنا نہایت قیمتی وقت صرف کیا ہے' وہاں لاکھوں ڈالر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔ نوادرات کے اس خونی تعاقب میں مسٹر کلارک کے کئی آدمیوں کی جانیں بھی گئی ہیں۔ وہ چاہتے تو زیادہ حصہ بھی طلب کر سکتے تھے یا کم از کم زیادہ حصے کی خواہش رکھ سکتے تھے۔ لیکن مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ وہ بھی ہم سب کی طرح صرف ایک حصے پر اکتفا کر رہے ہیں' میرے اصرار کے باوجود وہ اپنی بات پر قائم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ اپنے حصے سے زیادہ کچھ نوادرات اپنے پاس رکھنا چاہیں گے تو اس کی قیمت ادا کریں گے۔"

صفدر حیرت آمیز دلچسپی سے میری باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا "اگر آپ نے مسٹر کلارک پر اس طرح بھروسا کیا ہے تو ٹھیک ہی کیا ہوگا۔ مجھے آپ کی معاملہ فہمی پر اعتماد ہے۔"

"مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔" میں نے خوش ہو کر کہا "بہرحال اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال ابھر رہا ہے تو پوچھ لو۔"

"ہر سوال کا جواب آپ خود ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"پھر بھی کوئی نہ کوئی سوال تو ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ہمیں ہمارا شیئر کب تک ملے گا؟ کیش میں ملے گا یا اثاثہ جات کی صورت میں؟ اور وہ نوادرات جن کا تعلق پاکستان سے' کہاں ہیں اور پاکستان کیسے پہنچیں گے؟"

"ہاں' یہ آخری سوال ذہن میں ضرور ابھر رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

میں نے کہا "ابھرنا بھی چاہیے' کیونکہ زندگی کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ تمہیں ان نوادرات کا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے' اگر میں راہی عدم ہو جاؤں تو وہ سب کچھ بے نشاں تو نہ

ہو جائے۔"

جس کوٹھی نما مکان میں نوادرات رکھے گئے تھے وہ ایف ایم کے مرکزی دفتر کے عقب میں واقع تھا۔ میں نے اس کے بارے میں صفدر کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ فی الحال یہ سارا سامان اسی مکان میں محفوظ رہے گا۔ جب حالات کی گرد ذرا بیٹھ جائے گی تو اسے رازداری سے پاکستان منتقل کر دیا جائے گا۔ شیئرز کے بارے میں بھی میں نے صفدر کو تمام تفصیل بتائی۔

صفدر نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے؟"

"بس یہ باقی کی گنڈیریاں ختم کر کے پاکستان چلنے ہیں۔"

"کیا اتنا ہی آسان ہے پاکستان جانا؟!"

"نہیں ' ہے تو واقعی مشکل۔ پہلے تو یہ گنڈیریاں ہی ہم سے ختم نہیں ہوں گی اور اگر ہو بھی گئیں تو سائیں عالی کوئی نہ کوئی نیا کھڑا کر دے گا۔ وہ کل سے ایک بدروح کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا ہے ' کہتا ہے کہ میرے ساتھ کوہ قاف چلو۔ وہاں شب برات کے موقع پر ایک بہت بڑا جلوس نکلتا ہے اور زبردست قسم کی قوالیاں ہوتی ہیں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ میں نے بہت قوالیاں سنی ہوئی ہیں بلکہ یہاں بھی جنات قسم کے انسان ہی قوالیاں کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں لیکن وہ نہیں مانتا۔ کہتا ہے کہ اصلی جن کی قوالی کا کچھ اور ہی مزہ ہوتا ہے۔ اور تو اور سامعین کو دیکھنے کا بھی لطف آتا ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ جن ہوتے ہیں ' اوپر سے ان پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔"

صفدر مسکرایا "تو آپ چلے کیوں نہیں جاتے پرستان۔ بس سائیں عالی کا ہاتھ پکڑیں اور پرواز کر جائیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے کندھے پر اٹھاؤ اور پاپیادہ پرستان چلو براستہ اندور اور جلگاؤں وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ راستے میں احمد نگر کے قریب سے پرستان جانے کا راستہ نکلتا ہے۔"

صفدر نے کہا "اگر پرستان نہیں جانا تو پھر پاکستان جانے کا ہی کچھ سوچیں۔"

"ہاں یہ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ بلکہ زیادہ دیر سوچا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ ٹکٹ کنفرم ہو چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" صفدر چونک گیا۔

میں نے قریبی دراز کھول کر ایک خاکی لفافہ نکال لیا۔ اس میں ہم دونوں کے پاسپورٹ مع ویزا اور ٹکٹ موجود تھے۔ یہ دونوں پاسپورٹ اور دیگر کاغذات فرضی ناموں سے تھے۔ پاسپورٹس پر جو تصویریں لگائی گئی تھیں ' وہ ایسے وقت کھینچی گئی تھیں جب میں اور صفدر میک اپ میں تھے۔ اب ہمیں اپنے حلیے میں دوبارہ سے تصویروں کے مطابق معمولی تبدیلی کرنی تھی۔ میں نے اپنی جو شیو بڑھا رکھی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ تصویر میں میری کلین شیو نہیں تھی۔ ان سفری کاغذات کے مطابق ہمیں بھوپال سے بنکاک پہنچنا تھا اور وہاں سے بذریعہ پرواز کے ذریعے پاکستان روانہ ہونا تھا۔ کاغذات دیکھ کر صفدر کی آنکھیں کھلی رہ گئیں "یہ سب کیسے ہوا؟"

"ویسے ہی ہوا جیسے منظور خدا ہوا۔ تمہیں پتا ہے کہ دولت میں بہت طاقت ہوتی ہے اور اس اعتبار سے مسٹر کلارک ہرکولیس ہیں۔ یہ سارا انتظام انہوں نے ہی کیا ہے۔ ہمیں کل دوپہر یہاں سے بنکاک کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کل رات ہی کسی وقت ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔"

"اور سائیں عالی؟"

"سائیں عالی بالغ ہے اور عاقل بھی ہے ' بلکہ کچھ زیادہ ہی عاقل ہے۔ اپنا بھلا برا خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس کی رہائش بمبئی میں ہے۔ وہ جب وہاں جانا چاہے گا ' چلا جائے گا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ براستہ جلگاؤں اور احمد نگر پرستان بھی اسے لیے جانا چاہتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے کندھوں پر بیٹھ کر بمبئی جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔"

"ہاں یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔"

اتنی دیر میں سائیں عالی آ گیا۔ دیر تک سونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آتے ساتھ ہی سائیں عالی نے ایک بار پھر یہ رٹ لگا دی کہ میں اس کے ساتھ کوہ قاف چلوں۔ صفدر زیر لب مسکرانے لگا۔ میں انکار کر رہا تھا۔ سائیں بڑا اپنی ہانکے جا رہا تھا۔ کہنے لگا "ایک قوالی تو ایسی ہے کہ مردہ بھی سنے تو جاگ جائے اور کسی پرانے عشق کی یاد میں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے۔ قوالی کے بول ہیں ۔۔۔ تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے ' عشق تیرا ستائے تو میں کیا کروں۔"

میں نے زچ ہو کر کہا "آخر تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو؟"

وہ عجیب لہجے میں بولا "پیچھے تو میں واقعی تمہارے پڑا ہوا تھا۔ میں پچھلے دو سال میں مسلسل تمہیں تمہارے راستے سے بھٹکاتا رہا ہوں۔ تمہیں سوچ کے قریب لانے کے لیے اس لڑکی سے دور کرتا رہا ہوں جو تمہاری رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ جو تمہاری اصل منزل ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ تمہارے اندر کی خوشی کو مار دیا ہے ' تمہارا دل مار دیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہ دل پھر سے زندہ ہو ' اس میں امنگ ترنگ پیدا ہو۔"

"اور اس لیے تم مجھے کوہ قاف لے جا کر یہ قوالی سنانا چاہتے ہو۔ بہت اچھا طریقہ ہے مردہ دل کو زندہ کرنے کا۔"

"اچھا تم کوہ قاف نہیں جانا چاہتے تو نہ جاؤ لیکن یہ قوالی سننا ضرور۔ چاہے پاکستان جا کر سننا۔ پورے غور اور توجہ سے سننا۔ اس قوالی کے اندر تمہارے لیے ایک پیغام ہے۔ لیکن اب یہ مت پوچھنا کہ کون سا پیغام ہے۔ جب سنو گے تمہیں خود پتا چل جائے گا۔"

صفدر کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے ہی سائیں نے "حق ہو" کا نعرہ لگایا اور جھوم جھوم کر گانے لگا "تیری صورت نگاہوں میں پھرتی رہے۔ عشق تیرا ستائے تو میں کیا کروں"

گانے کے دوران میں جب تھوڑا سا وقفہ آتا تو سائیں ایک پیالے میں سے شڑاپ شڑاپ کچھ پینے لگتا۔ یہ چکن سوپ تھا جس کا بیڑا غرق کرنے کے لیے سائیں نے اس میں چھوٹی مکھی کا شہد ملا رکھا تھا۔

○☆○

اگلے روز رات دس بجے ہم لاہور ایئرپورٹ پر کھڑے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے حلیے میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کی تھی اور خود کو پاسپورٹ پر لگی ہوئی تصویروں کے مطابق بنا لیا تھا۔ انڈیا اور بنکاک میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی ' لاہور میں بھی سب ٹھیک ہی رہا تھا۔ لاہور بادو باراں کی زد میں تھا۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہم نے فی الوقت لاہور میں اپنی آمد بالکل خفیہ رکھنی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) کے کسی ہوٹل میں قیام کر لیا جائے۔

میں اور صفدر ابھی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ میری نگاہ ایک درمیانے قد کے شخص پر پڑی۔ اس نے برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ چہرہ بھی برساتی میں قریباً چھپا ہوا تھا۔ وہ شخص ہمارے بالکل پاس سے گزرا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی چند لمحے پہلے بھی میں اسے دیکھ چکا ہوں۔ جب تیسری مرتبہ وہ شخص ہماری طرف آیا تو مجھے اور صفدر کو ایک دم الرٹ ہونا پڑا۔ وہ شخص آگے بڑھ کر ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے جسم سے مجھے جو سب سے پہلے بو آئی وہ نسوار کی تھی۔ میرے ذہن نے نعرہ لگایا "زریں گل"

ہاں وہ زریں گل ہی تھا۔ اس نے مجھے اتنی زور سے بھینچا کہ پسلیوں کے کڑاکے نکال دیے پھر وہ صفدر کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا "اوئے زریں کے بچے ' تم یہاں کیسے؟" میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

"اور تم نے ہمیں پہچانا کیسے؟" صفدر نے بھی سرگوشی کی۔

"ارے پیارے صیدو صیب ' ام اپنے یاروں کو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے ' اور جب دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے تو پھر چہرہ کیسا بھی ہو ' بندے کا شناخت ہو جاتا ہے۔" زریں کی آنکھیں خوشی سے چمکارے مار رہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا "استاد صیب! یہاں زیادہ دیر کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ ام تینوں کے لیے یہاں خطرہ موجود ہے۔ ام گاڑی لے کر آیا ہے۔ آئیے اس میں بیٹھتے ہیں۔"

اس نے ایک بڑی چھتری کھول کر ہم دونوں کے سروں پر تان دی۔ ہم دوڑتے ہوئے عمارت سے باہر نکلے اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ گاڑی خیر سے ایک رکشا تھا اور اس کا ڈرائیور زریں گل خود تھا۔ بہرحال ایک لحاظ سے یہ سواری بہتر ہی تھی ' کیونکہ اس میں شیشہ کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ جونہی ہم بیٹھے ' زریں نے بڑے اسٹائل سے لیور کھینچ کر انجن اسٹارٹ کیا اور دو سیکنڈ میں رکشے کو طوفان میل بنا دیا۔

صفدر بولا "لگتا ہے کہ جہاز سے اتر کر پھر جہاز میں بیٹھ گئے ہیں۔"

"بھئی یہ تین ٹانگ کی سواری ہے ' ذرا دھیان سے۔ پھسلن بھی بہت ہے۔" میں نے کہا۔

"خو آپ بالکل فکر نہ کریں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا ' ام تو رکشے پر کابل اور تاران تک گیا ہے۔"

رکشے کی اندرونی سجاوٹ بتا رہی تھی کہ یہ یقیناً کسی خان صاحب کا رکشا ہے۔ براندے ' آئینے ' مسرت شاہین اور رائفل بردار بچے کی تصویر سب کچھ موجود تھا۔

صفدر نے جھلا کر کہا "یار زریں! یہ تو بتا ہمیں پہچانا کیسے تو نے؟"

"آپ کے کپڑوں سے۔ آپ کے لباس کے بارے میں ام کو بتا تھا۔"

"بتایا کس نے تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ ام سے پوچھ رہا ہے کہ کس نے بتایا تھا۔ استاد

صیب نے ہی تو کل بھوپال سے ٹیلی گرام بھجوایا تھا۔ اس پر دن' وقت اور فلائٹ نمبر وغیرہ سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ام آپ کو فلاں فلاں لباس سے پہچانے۔"

میں حیرت سے صفدر کی طرف دیکھنے لگا۔ صفدر کو بھی معلوم تھا کہ ٹیلی گرام میں نے نہیں بھجوایا۔ اور ہم بھجوا کیسے سکتے تھے' ہمیں معلوم ہی کہاں تھا کہ زریں گل کس جگہ قیام پذیر ہے۔ ہمارا اندازہ تو یہ تھا کہ وہ پشاور یا وہاں سے آگے قبائلی علاقے میں ہو گا' لیکن وہ عین لاہور میں دندناتا ہوا پایا گیا تھا اور وہ بھی تین ٹانگ والی سواری پر۔

صفدر نے زریں کی گردن پر دھپ لگاتے ہوئے کہا "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے زریں خان۔ ہم نے کوئی ٹیلی گرام نہیں بھیجا تمہیں۔"

"اچھا تو ام کو خواب آیا ہے؟" زریں نے تیزی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"ٹیلی گرام ہے تمہارے پاس؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اماری جیب میں ہے۔" زریں نے کہا اور فوراً ایک ہاتھ چھوڑ کر جیب سے ٹیلی گرام نکالنا چاہا۔ رکشا بری طرح لہرایا لیکن زریں نے ذرا پروا نہیں کی۔ ٹیلی گرام نکال کر اس نے مجھے دیا۔ میں ششدر رہ گیا۔ ٹیلی گرام کل دوپہر بھوپال سے ارسال کیا گیا تھا۔ نیچے میرا نام لکھا تھا۔ زریں گل کا ایڈریس یکی کالونی نزد ریلوے اسٹیشن تھا۔ جو اطلاع دی گئی تھی وہ سو فی صد درست تھی۔ ہم نے وہی لباس پہن رکھے تھے جن کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اتنی مکمل اطلاعات دینے والا کون تھا۔ مسٹر کلارک نے تو یہ کام ہرگز نہیں کیا تھا' جس وقت ٹیلی گرام ارسال کیا گیا' مسٹر کلارک امریکا کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی کارندہ بھی نہیں بھیج سکتا تھا۔ کسی کو زریں کا ایڈریس ہی معلوم نہیں تھا۔ اور تو اور' ہمیں پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ پھر ایک دم میرا ذہن سائیں عالی کی طرف چلا گیا۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ کہیں یہ کام اس کا تو نہیں تھا۔ وہ ایسے پُراسرار کاموں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی تھیں جن پر غور کیا جاتا تھا تو ان سے سائیں کی روحانیت جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ نجانے کیوں مجھے ایک دن وہ ٹین والا واقعہ یاد آگیا۔ ٹین آف ہونے کے باوجود ٹیوب لائٹ آف نہیں ہوئی تھی۔ ہم سائیں عالی کے حوالے سے جو عجیب باتیں نوٹ کرتے تھے' ممکن تھا کہ وہ ساری کی ساری پُراسرار نہ ہوتی ہوں لیکن ان میں سے کئی ایک ضرور پُراسرار ہوتی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر غور سے ٹیلی گرام پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔ زریں بولا "آپ کا یادداشت اتنا کمزور کیسے ہو گیا استاد صیب۔ شاید آپ مذاق فرما رہا تھا لیکن اگر یادداشت واقعی کمزور ہے تو اس کے لیے بڑا مجرب نسخہ کلثوم کے پاس موجود ہے۔ بادام کے مغز میں تھوڑا سا اورک اور خشخاش ملا کر دیسی گھی میں بھونتا ہے۔ بہت کمال کا نسخہ ہے۔ امارے چچا زاد رستم خان نے کھایا ہے' اس کا دماغ ایک دم روشن ہو گیا ہے۔ بہت دعائیں دیتا ہے کلثوم کو۔ وہ کہتا تھا کہ بھابی کا بتایا ہوا نسخہ تم بھی کھاؤ۔ ام نے کہا ام کو آج کل کمزور یادداشت ہی سوٹ کرتا ہے۔"

"کمزور یادداشت کیوں سوٹ کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اس کا دو وجہ ہے استاد صیب۔ ایک تو یہ کلثوم نویاہتا بیوی ہے' وہ ام سے فرمائشیں بہت کرتا ہے۔ کچھ فرمائشیں تو ام پوری کرتا ہے۔ کچھ بازار جا کر بھول جاتا ہے۔ بھول چوک خدا تعالیٰ معاف کر دیتا ہے' لیکن اگر امارا یادداشت بہتر ہو گیا اور ام کو سارے کا سارا فرمائشیں یاد رہیں تو پھر امارا نقصان ہو جائے گا۔ آج کل امارا ہاتھ تو ویسے بھی تنگ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ تو ایک جگہ ٹکتا نہیں ہے' کبھی ابوظہبی' کبھی انڈیا اور کبھی سری لنکا۔ ام آپ کو یاد کر کے پریشان ہوتا رہتا ہے' اگر امارا یادداشت کمزور ہو گا تو آپ ام کو زیادہ یاد نہیں آئے گا اور امارے لیے آسانی رہے گا۔"

میں نے کہا "شادی کے بعد تمہاری زبان کچھ اور تیز چلنے لگی ہے۔"

"ایسا بات نہیں ہے جناب! دراصل ام کو گھر میں بولنے کا موقع کم ملتا ہے' لہٰذا گھر سے باہر نکل کر باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اور آپ سے تو ام نے اتنا باتیں کرنا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"چلو یہ دکھ بھی برداشت کر لیں گے مگر اتنا تو بتاؤ ہمیں لے جا کہاں رہے ہو۔ اور اگر اپنے دولت کدے لے جا رہے ہو تو وہاں اور کون کون تشریف فرما ہے؟"

"یہ دولت کدہ امارا نہیں ہے جی' میرے چچا زاد بھائی رستم خان کا ہے۔ یہ رکشا بھی اسی کا ہے۔ وہ یہاں یکی کالونی میں اپنے بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ام اور کلثوم بھی اسی کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"اچھا یہ ٹیلی گرام تمہیں رستم خان کے ایڈریس پر ملا تھا؟"

"بالکل جناب' ام اور کلثوم بدرمنیر کا فلم "دلہن ایک رات کی" دیکھ کر واپس آیا تو یہ ٹیلی گرام امارا انتظار فرما رہا تھا۔"

زریں گل بڑی چابک دستی سے رکشا چلا کر ایک تنگ گلی میں لے گیا۔ چند ناہموار گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے جا کر رک گئے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ قریب ہی گوبر کا ڈھیر تھا اور ایک گھوڑا اپنے تانگے سے کچھ فاصلے پر کھڑا دُم ہلا رہا تھا۔ بارش اب تھم گئی تھی۔ پاس ہی کسی نیم پختہ مکان میں ریڈیو بجنے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں رکشے کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ دستک سے پہلے ہی مکان کا دروازہ کھلا' ٹاٹ میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک لمبا تڑنگا پٹھان باہر نکل آیا۔ یہ زریں کا چچا زاد تھا' وہ ہمیں بڑے احترام سے اندر لے گیا۔ دو تین کمرے تھے' ایک کچا پکا صحن تھا۔ برآمدے کا اکلوتا بلب صحن کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"کلثوم' دیکھو یہ کون آیا۔" زریں گل نے ہانک لگائی۔

کلثوم تیزی سے باہر نکلی۔ وہ امید سے تھی لہٰذا اس کا جسم تھوڑا سا فربہ ہو گیا تھا' تاہم اس تبدیلی نے اسے تھوڑا اور دلکش بنا دیا تھا۔ وہ حیرت آمیز معصومیت سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ میک اپ کے سبب وہ مجھے یا صفدر کو پہچان نہیں سکی تھی۔ زریں گل نے کہا "ارے بتر کیا دیکھتی ہے' یہ اپنا استاد صیب ہے۔ سلام کرا نہیں۔ یہ صفدر صیب ہے۔"

کلثوم کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ زریں نے اسے بتایا کہ ہم نے اپنے چہروں میں کچھ تبدیلی کر رکھی ہے تاکہ دشمنوں کی نظر سے بچا جا سکے۔ کلثوم نے دوڑے اور الجھے سے انداز میں ہمیں سلام کیا اور جلدی سے اندر چلی گئی۔ زریں نے کھانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر اس نے ہمارے سامنے کھانا چن دیا۔ مسالے دار دیسی مرغ' روغنی نان' حلوا اور چاول تھے۔ یقیناً یہ انتظام زریں نے اپنے چچا زاد بھائی کے تعاون سے کیا تھا۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارے اس پُرتکلف کھانے کے لیے ان لوگوں کو کافی کشٹ اٹھانا پڑا ہو گا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ ہم کچھ تھکے ہوئے تھے کے باوجود ساری رات جاگتے رہے اور زریں گل سے باتیں کرتے رہے۔ زریں گل نے اپنے بارے میں اور یہاں کے حالات کے متعلق جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

ہمارے اندیشوں کے عین مطابق شیخ عاصم کے خطرناک کارندے لاہور میں موجود تھے اور شفتا کا کھوج لگاتے پھر رہے تھے۔ اس کے علاوہ یقیناً انہیں غزالہ کی تلاش بھی تھی۔ غزالہ نے شیخ عاصم سے بغاوت کر کے جو جرم کیا تھا وہ شیخ کے نزدیک کسی صورت قابلِ معافی نہیں تھا۔ میرے اندازوں کے مطابق تو اسے فی الوقت شفتا سے بھی زیادہ غزالہ کی تلاش تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ جس گھڑی شیخ عاصم کے ہتھے چڑھی اس کی بدترین سزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اس سزا کا اختتام غزالہ کی موت پر ہو گا۔ شفتا اور غزالہ کے ساتھ ساتھ شیخ کے کارندوں کو ان تمام افراد کی تلاش بھی تھی جن سے کسی طور شفتا یا غزالہ کا سراغ مل سکتا تھا۔ یقیناً ان میں غزالہ کے والدین اور ساہی صاحب کے علاوہ زریں گل' عالم قریشی اور چند دیگر افراد بھی تھے۔ زریں گل کی اطلاع کے مطابق یہ تمام افراد میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے روپوش ہو گئے تھے یا انہوں نے اپنی حفاظت کا مکمل انتظام کر لیا تھا۔ روپوش ہونے والوں میں غزالہ کے والدین اور زریں گل وغیرہ تھے۔ جبکہ حفاظت کا انتظام کرنے والوں میں رجال ساہی صاحب اور عالم قریشی تھے۔ زریں گل کچھ عرصہ تو قبائلی علاقے میں روپوش رہا تھا پھر وہ وہاں سے اکتا گیا اور لاہور آگیا۔ لاہور آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کلثوم کا پاؤں بھاری تھا اور اس کی طبیعت کبھی کبھی خراب ہو جاتی تھی۔ یہ پہلا بچہ تھا لہٰذا زریں کی خواہش تھی کہ زچہ کو ہر قسم کی طبی سہولت مل سکے۔ وہ یہاں اپنے چچا زاد رستم خان کے پاس آگیا تھا۔ رستم خان اور اس کی بیوی ان دونوں کی بہت دیکھ بھال کر رہے تھے۔ کلثوم رستم کی بیوی کے ساتھ ہفتے میں ایک آدھ بار قریبی کلینک میں چلی جاتی تھی اور معائنہ کروا لیتی تھی۔ زریں نے بتایا کہ وہ خود بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اور اگر نکلنا بھی ہو تو رات کے اندھیرے میں جاتا ہے اور جلدی لوٹ آتا ہے۔ اسے لاہور آئے ہوئے ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ اس دوران میں وہ کسی شناسا سے نہیں ملا تھا۔

اپنی روداد کے آخر میں زریں گل نے کہا "امارے پاس آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ بلکہ خوش خبرا ہے۔"

میں نے کہا "خوش خبری کا لفظ تمہارے منہ سے سنا ہے تو لگتا ہے کہ یہ لفظ صدیوں پہلے سنا تھا۔"

"خیر یہ مکمل خوش خبری تو نہیں' بس خوشخبری کی جھلک ہے۔ لیکن ام کو یقین ہے کہ یہ جھلک بھی آپ کو ضرور خوش کرے گا۔"

"کچھ بتاؤ بھی۔" صفدر نے کہا۔

"غزالہ بی بی بھی یہاں لاہور میں ہے۔" زریں نے کہا۔

میں اور صفدر اچھل پڑے۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" صفدر نے کہا۔

"ام نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ غزالہ بی بی نے چادر لیا ہوا تھا۔ بس تھوڑا سا چہرہ نظر آرہا تھا۔ لیکن ام تو ان کا ایک انگلی دیکھ کر انہیں پہچان سکتا ہے۔ جیسے ہم نے انہیں دیکھا' انہوں نے بھی ام کو دیکھ لیا۔ ام کو دیکھ کر وہ ایک دم ایک گلی میں مڑ گیا۔ ام نے ان کا پیچھا کیا۔ خو امارا چاچا زاد اور رستم خاں بھی امارے ساتھ تھا۔ یہ انارکلی بازار کا بات ہے' وہاں رش بہت تھا۔ ام لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا جب بڑی سڑک تک آیا تو غزالہ بی بی تیزی سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ ام نے بہت آواز دیا لیکن وہ بیٹھ کر چلا گیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہی کوئی پندرہ روز پہلے کا۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ غزالہ ہی تھی؟"

"امارا دماغ ایک دم روشن ہے صفدر صاحب۔ اگر آج ام نے آپ کو بدلے ہوئے حلیے میں پہچان لیا تو کیا غزالہ بی بی کو اصل حلیے میں نہیں پہچان سکتا تھا۔ اور پھر اکیلی اماری ہی بات نہیں۔ اب کوئی ایک ہفتہ پہلے رستم خاں نے بھی غزالہ بی بی کو دیکھا ہے۔ وہ تمہیں کہتا ہے کہ یہ وہی خاتون تھی جو ام نے انارکلی میں دیکھا تھا۔ بچہ بھی اس کے ساتھ تھا جسے اس نے چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ مال روڈ کے چوک پر جہاں پرانا انارکلی ختم ہوتا ہے وہاں غزالہ بی بی رستم کو ایک رکشا میں بیٹھتا نظر آیا۔ اس نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا رکھا تھا صرف آنکھیں دکھائی دے رہا تھا۔ مگر لباس وہی تھا جو پہلے ام نے دیکھا تھا۔ رستم خاں کا رکشا اس وقت پنکچر تھا اور وہ سڑک کے کنارے ٹائر بدل رہا تھا۔ اگر رکشا ٹھیک ہوتا تو وہ ضرور بہ ضرور غزالہ بی بی کا پیچھا کرتا۔"

زریں گل بڑے یقین اور جوش سے بات کر رہا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ غزالہ کے ساتھ بچے کی موجودگی کا ذکر بھی کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ غزالہ کے پاس ایک خانہ بدوش بدو فیملی کا بچہ موجود ہے۔

میرے اور صفدر کے لیے یہ اطلاع سنسنی خیز تھی۔ ہم غزالہ کے حوالے سے سخت فکر مند تھے' ہم نے آخری مرتبہ اسے ابوظہبی میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ مرسیڈیز کار میں ایک خط میرے نام چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ وہ جب تک امارات میں رہے گی اس کی آبرو اور زندگی کو شدید خطرات لاحق رہیں گے۔

میں نے زریں گل سے اس اطلاع کے حوالے سے کچھ مزید سوالات پوچھے۔ بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ غزالہ لاہور میں موجود ہے۔ وہ دونوں مرتبہ انارکلی کے قرب و جوار میں دیکھی گئی تھی اور وقت بھی دوپہر سے ذرا پہلے کا تھا۔ صورت حال ہمارے دماغ میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھی۔

اگلے دو روز ہم نے سکون کے ساتھ رستم خاں کے گھر میں گزارے۔ رستم خاں عرصہ دراز سے یہاں مقیم تھا اس کے پٹھان بچے بڑی روانی سے اردو اور پنجابی بولتے تھے۔ گھر میں مفلسی کا دور دورہ تھا لیکن پھر بھی یہ لوگ ناخوش نہیں تھے۔ صرف ایک رکشے کی آمدن پر رستم خاں نہ صرف اپنا گھر چلا رہا تھا بلکہ پچھلے ایک مہینے سے زریں اور گلثوم کا خرچا بھی برداشت کر رہا تھا۔ زریں نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح اس سے خرچا لے لے لیکن خان ابن خان کی روایتی مہمان نوازی نے یہ گوارا نہیں کیا تھا۔ زریں گل نے کہا "ام کو معلوم ہے استاد صیب! رستم خاں بہت خوددار آدمی ہے۔ وہ اپنا آپ بیچ سکتا ہے' اپنا رکشا بیچ سکتا ہے' مکان بیچ سکتا ہے لیکن ام سے یا آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں لے سکتا' ام اگر ایک سال بھی یہاں رہے گا تو وہ ام کو اسی طرح رکھے گا جس طرح آج رکھ رہا ہے۔ امارا خیال ہے اس نے اپنی بیوی کا بالیاں وغیرہ بیچا ہے' ام کو اس کا کان خالی نظر آرہا ہے۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ رستم خاں کو اس حرکت سے کیسے باز رکھا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تم مناسب سمجھو تو ہم سب کہیں اور انتظام کر لیتے ہیں۔"

"نہیں استاد صیب! رہنا تو ام کو یہیں ہے' کیونکہ اس سے محفوظ جگہ پورے لاہور میں ام کو نہیں مل سکتا۔ بار جب ام یہاں سے جائے گا تو رستم خاں کے بیوی بچوں کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کر کے جائے گا۔ رستم خاں کا رکشا اب بہت پرانا ہو گیا ہے۔ یہاں میکلوڈ روڈ پر ایک رکشا ڈیلر امارا پرانا واقف ہے۔ ام نے اس سے بات کیا ہے۔ وہ ام کو رستم خاں کے لیے بالکل نیا رکشا دے گا' پرانا رکشا وہ خود رکھ لے گا' باقی رقم کا ادائیگی ام آسان قسطوں میں خود کرے گا۔"

ان لمحوں میں مجھے زریں گل ایک بالکل سادہ اور قناعت پسند شخص نظر آیا۔ جب سے ہم یہاں آئے تھے اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ دفینے اور نوادرات کا کیا ہے۔ شاید اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دفینے کا بہت بڑا حصہ ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے اور اب ہم اس کے مالک ہیں۔ جو کچھ زریں گل کے حصے میں آنے والا تھا وہ اتنا زیادہ تھا کہ زریں گل خود رکشے بنانے کی فیکٹری لگا سکتا تھا۔ وہ "گروز پتی" کی منزل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے پشاور میں تکے کباب لگائے تھے' کوہاٹ میں لکڑیاں ڈھوئی تھیں' لاہور میں دربدر کی خاک چھانی تھی اور اپنی مزدوری سے چار چار آنے بچا کر لالہ سدھیر' محمد علی اور بدر منیر کی فلمیں دیکھی تھیں۔ آج قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہوئی تھی اور یوں ہوئی تھی کہ سارے ولدر دور ہو گئے تھے۔ تھڑے پر تکے کباب لگانے والا اتنا ثروت مند ہونے والا تھا کہ کھڑے کھڑے فائیو اسٹار ہوٹل کھول سکتا تھا۔ لالہ سدھیر کی جھلک دیکھنے کے لیے پہروں شاہ نور اسٹوڈیو کے گیٹ پر کھڑا رہنے والا اپنی ذاتی فلمیں بنا سکتا تھا۔ جن گلیوں میں اس نے در در کی خاک چھانی تھی وہاں اس کے لیے سرخ کارپٹ بچھ سکتے تھے اور گل بدن حسینائیں اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر سکتی تھیں۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور بہت جلد ہونے والا ہے۔ بہرحال ابھی میں کچھ بھی زریں کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے صفدر سے بھی کہہ دیا تھا کہ یہ خوش خبری اپنے تک رکھے۔

جب سے لاہور میں قدم رکھا تھا' دل شفتا اور حمزہ وغیرہ سے ملنے کو مچل رہا تھا۔ شفتا تو ساہی صاحب کی تحویل میں تھی اور ہم نے طے کر رکھا تھا کہ شفتا کے ٹھکانے سے لاعلم ہی رہیں گے' کیونکہ اسی میں شفتا کی بہتری تھی۔ ہاں حمزہ سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میرے امارات جانے سے پہلے حمزہ کی زخمی ٹانگ تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ حمزہ کی تیمارداری کے دوران میں' میں رات دن اس کے قریب رہا تھا۔ اس چوبیس گھنٹے کے ساتھ نے ہم دونوں کو ایک درجے کے کافی قریب کر دیا تھا۔ بے شک وہ شفتا کا ہونے والا شوہر تھا' پھر بھی ہمارے درمیان زبردست بے تکلفی موجود تھی۔ امارات میں جب غزالہ نے شیخ عاصم سے بغاوت کی تو یہ بات طے تھی کہ شیخ کے کارندے اب لاہور پر چڑھائی کریں گے اور ہر اس شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے جس کا تعلق کسی نہ کسی طور غزالہ یا شفتا سے ہو گا۔ اس خطرے کے پیش نظر میں نے لاہور میں تین چار فون کیے تھے اور دیگر افراد کے ساتھ ساتھ حمزہ کو بھی وارننگ دی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کہیں ادھر ادھر ہو جائے۔ اب معلوم نہیں تھا کہ اس نے میری وارننگ کو اہمیت دی ہے یا نہیں۔

میں اور صفدر بدستور میک اپ میں تھے۔ یہ بہت عمدہ قسم کا میک اپ تھا۔ اسپیشلسٹ کے بغیر ایسا میک اپ ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اسپیشلسٹ ہمیں مسٹر کلارک نے ہی فراہم کیا تھا۔ اسپیشلسٹ نے اس میک اپ کے لیے اصلی جلد جیسے آمیزہ' مصنوعی نشوز استعمال کیے تھے۔ چہرے کے میک اپ یا پلاسٹک سرجری وغیرہ کا تجربہ بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ لہٰذا عام لوگ اس کیفیت سے قطعی ناآشنا ہیں جو تبدیل شدہ شکل کے ساتھ جانے پہچانے لوگوں کے سامنے جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ دل میں ایک عجیب سی گدگدی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب کسی شناسا کی نظریں آپ کے چہرے پر پڑتی ہیں اور ان میں اجنبیت کی جھلک نظر آتی ہے تو اپنے بہروپ کی کامیابی پر یقین ہو جاتا ہے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی نگاہ آپ کے چہرے پر جم کر رہ جاتی ہے۔ اس میں الجھن نظر آتی ہے۔ وہ نگاہ آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے لیکن پہچان نہیں پا رہی ہوتی۔ یہ صورت حال بھی لطف دیتی ہے۔

تیسرے روز دس بجے کے لگ بھگ میں اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھے اور حمزہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا جو انارکلی اور پرانی انارکلی میں سے ہو کر گزرتا تھا' جب سے زریں گل نے غزالہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ لاہور میں ہے' ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات میرے ذہن سے نکل نہیں تھی۔ اب بھی غیر ارادی طور پر میں انارکلی کے علاقے سے گزرنا چاہتا تھا۔ دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ کیا پتا وہ کسی دکان پر کھڑی نظر آجائے' کسی راستے سے گزرتی دکھائی دے جائے۔ لیکن آرزوئیں اتنی آسانی سے پوری کب ہوتی ہیں۔ تمنا اپنے حقیقی کو سو بار خون میں نہلاتی ہے پھر بھی تمنا ہی رہتی ہے۔ انارکلی سے گزر کر ہم لوئر مال روڈ کی طرف آگئے اور پھر ڈاکٹر حمزہ کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

مجھے اندیشہ تھا کہ میک اپ کے باوجود حمزہ مجھے پہچان لے گا' اور اگر پہچانے گا نہیں تو شدید قسم کی الجھن میں ضرور پڑ جائے گا۔ میں نے صفدر سے کہا "میں ٹیکسی میں بیٹھوں گا اور گھر سے ذرا فاصلے پر رہوں گا۔ تم جا کر کال بیل بجانا۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہونا تاکہ جب حمزہ چل کر تمہاری طرف آئے تو میں دیکھ سکوں کہ اس کی ٹانگ کتنی بہتر ہے۔"

"اس سے کہنا کیا ہے؟"

"بس یہی کہ میں شاہ جہاں کا دوست ہوں۔ دو تین دن پہلے ہی امارات سے آیا ہوں۔ اسے تسلی دینا کہ سب اچھا ہے۔ میں اور شفتا دونوں بالکل سلامتی کے ساتھ ہیں اور

عنقریب ملاقات ہوگی۔"

"مگر اس نے آپ کا ایڈریس مانگا تو؟"

"بس اچھے طریقے سے ٹال دینا۔"

"میرے خیال میں اسے سخت مایوسی ہوگی۔"

"لیکن جب تم یہ بتاؤ گے کہ دس پندرہ روز میں ملاقات متوقع ہے تو یہ مایوسی دور ہو جائے گی۔"

ٹیکسی اس مکان کے سامنے جا رکی جہاں حمزہ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی گرد و پیش دیکھ کر بہت سی پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ وہی جاں گسل لمحے جب مجھے اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر شیخ عاصم کے بھتیجے ایاز کے لیے شمنا کے رشتے کی ہاں کرنا پڑی تھی۔ میں شمنا کو لے کر چلا گیا تھا اور حمزہ اسی مکان کی بالکونی میں اداس کھڑا مجھے دیکھتا رہا تھا۔ ناکام آرزوؤں کا عکس اس کے چہرے پر اتنا نمایاں تھا کہ میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ حمزہ کا وہ چہرہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں ٹیکسی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ صفدر نے کال بیل بجائی اور کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر نکلنے والا حمزہ ہی تھا۔ وہ پہلے سے کافی دبلا ہو گیا تھا۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی غم زدہ صورت دیکھ کر مجھے اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ جی چاہا کہ مصلحت کو ایک طرف رکھ کر باہر نکلوں اور اسے گلے لگاؤں لیکن پھر میں نے خود پر قابو پا لیا۔

یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ حمزہ بہ آسانی چل رہا ہے۔ صفدر پانچ دس منٹ اس سے باتیں کرتا رہا' پھر دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور صفدر ٹیکسی کار کی طرف لوٹ آیا۔ حمزہ جب تک واپس گھر میں داخل نہیں ہو گیا' میں اسے دیکھتا رہا۔ خوشی تو تھی ہی لیکن ایک طرح کی اداسی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں شمنا اور حمزہ کو جلد از جلد رشتہ ازدواج میں منسلک کر دوں۔ لیکن خطرناک حالات نے میرا گھیراؤ کر رکھا تھا' اور چند دنوں کی مہلت بھی نہیں مل پا رہی تھی۔

ٹیکسی واپس روانہ ہوئی۔ انارکلی میں سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر غزالہ کا خیال پوری آب و تاب سے میرے ذہن میں جگمگا اٹھا اور میرا دل چاہا کہ کہیں اور جانے کے بجائے میں انہی سڑکوں پر گھومتا رہوں۔ غزالہ کو ڈھونڈتا رہوں۔ یہ بالکل ایک عاشق نوجوان کی سی سوچ تھی لیکن کیا کرتا' یہ میرے دل کی آواز تھی۔ غزالہ کی دوری نے مجھے اتنا ستایا تھا کہ اب کبھی کبھی اپنے اندر کی زخمی رومانیت پر میرا اختیار نہیں رہتا تھا۔ کبھی کبھی تنہائی میں میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتا تھا "غزالہ! اتنی بے رخی' ایسی سنگ دلی۔ کیوں یوں پتھر بن کر رہ گئی ہو تم۔ بے شک میں گناہگار ہوں لیکن اتنی لمبی سزا تو نہ دو کہ میرا دم گھٹ کر رہ جائے۔" مجھے اپنی سخت جانی پر مان تھا' لیکن اب واقعی کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ غزالہ کی دائمی جدائی کے سبب میرا سانس کسی وقت میرا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ میں جب تک مصروف رہتا تھا یہ غم مجھ سے قدرے فاصلے پر رہتا تھا تاہم جونہی فرصت کے چند لمحے ملتے تھے یہ غم مجھے دبوچ لیتا تھا۔

میں نے صفدر سے کہا "یار! ہمیں کہیں آنا جانا تو ہے نہیں۔ ٹائم ہی ٹائم ہے ہمارے پاس۔ کیوں نہ کچھ دیر یہیں رکیں۔ یہ علاقہ ویسے بھی مجھے بہت پسند ہے۔ بہت وقت گزارا ہے میں نے یہاں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ یہ علاقہ آپ کو پسند ہے لیکن آج کچھ زیادہ ہی پسند آ رہا ہے۔" صفدر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں نے ٹیکسی کو فارغ کیا اور پیدل ہی انارکلی کے گرد و نواح میں گھومنے لگے۔ اس علاقے کے چپے چپے سے میری یادیں وابستہ تھیں۔ ہم انارکلی کی طرف سے آئے' مال روڈ کراس کی اور پرانی انارکلی میں داخل ہو گئے۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ نوتنشن مارکیٹ کی مخصوص خوشبو سونگھتے ہوئے ہم اگلے چوراہے کی طرف نکل گئے۔ یہاں ہم نے ایک دکان پر بیٹھ کر فالودہ کھایا' دو دو گرم سموسے' سرخ چٹنی کے ساتھ اڑائے اور پھر پنجاب پبلک لائبریری کی طرف نکل گئے۔ اس عمارت سے بھی میری بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی شاموں میں کالج سے فارغ ہو کر میں اکثر یہاں آ بیٹھتا تھا۔ ایک مخصوص خوشبو تھی اس لائبریری کے طویل و عریض کمروں میں۔ اس لائبریری کی شفاف میزوں پر سر جھکا کر میں نے پہروں غزالہ کو یاد کیا تھا۔ یہاں کے در و دیوار' یہاں کے درخت' یہاں کے نشیب و فراز میری یادوں کے امین تھے۔ یادیں جو قدیم کتابوں کی طرح ورق ورق ماہ و سال کی الماریوں میں رکھی تھیں۔ کچھ دیر میں اور صفدر لائبریری میں گھومتے رہے اور اخبارات کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر لائبریری کے ریڈنگ روم کی طرف آ گئے۔

ایک دم میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میری نگاہ ایک رنگین آنچل پر جم کر رہ گئی۔ یہ کوئی خوب رو خاتون تھی جو

ہماری طرف پشت کیے بیٹھی تھی اور کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ ہموار شانے' اوڑھنی سے جھانکتے ہوئے نرم بال' دودھیا بازو جس پر کانچ کی چند چوڑیاں آڑی ترچھی اٹکی ہوئی تھیں' میرے دل نے پکار کر گواہی دی "یہ غزالہ ہے۔"

مجھے نہیں معلوم' میں نے درمیانی فاصلہ کیسے طے کیا۔ تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے اس پر جھک سا گیا۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ دل پر چوٹ لگی۔ وہ غزالہ نہیں تھی۔ میں نے شرمسار ہو کر سوری کہا۔ وہ ذرا تند مزاج نکلی۔ بگڑ کر بولی "آپ کیسے آدمی ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔"

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ اپنی دھن میں' میں نے شاید خاتون کے شانے کو چھوا تھا یا شاید میرا جسم اس کے جسم سے لگ گیا تھا۔

میں نے کہا "میں معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے آپ پر اپنی ایک عزیزہ کا گمان ہوا تھا۔ اس لیے......"

"ایسے موقع پر اسی قسم کے بہانے سننے کو ملتے ہیں۔" خاتون بولی۔

اسی دوران میں محترمہ کے محترم بھی تشریف لے آئے۔ وہ درمیانے قد کے جواں سال شخص تھے۔ عینک بھی لگا رکھی تھی۔ وہ میری اور محترمہ کی گفتگو سن چکے تھے "کیا بات ہے مسز!" انہوں نے بھی تلخ لہجے میں پوچھا۔

میں نے فوراً ان صاحب سے بھی معذرت کرلی بلکہ دست بستہ معافی مانگ لی' وہ خوش ہو گئے اور گردن تھوڑی سی اور تن گئی۔ اخلاقیات پر ایک چھوٹا سا لیکچر پلا کر انہوں نے بہ زبان خاموشی ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ ہم باہر آ گئے اور ٹہلتے ہوئے ایک بار پھر مال روڈ کی طرف نکل آئے۔ ہم بالکل ایزی موڈ میں تھے۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! کبھی کبھی بندہ کتنے بڑے خطرے کے قریب سے ہو کر گزر جاتا ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا۔ اب لائبریری میں بیٹھے ہوئے اس بندے کو ہی دیکھیں۔ چند لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ایسے آثار نظر آئے تھے جیسے وہ آپ سے الجھنا چاہتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ استاد جہانی سے الجھنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "ایسا تو ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ماضی میں کہیں نہ کہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا ہو۔ بے خبری میں ہم نے کسی خطرناک شخص سے پنگا لینے کی کوشش کر ڈالی ہو۔ اور خوش قسمتی سے بچ گئے ہوں۔"

"آپ کے ساتھ تو معلوم نہیں کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں لیکن میرے ساتھ ضرور ہوا ہے۔"

"کب کی بات ہے؟"

"جب میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کئی برس گزر گئے لیکن جھوک خانس کے نواح میں وہ موسلا دھار بارش کا منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔ آپ جاگیردار قادر زماں کی حویلی کی باؤنڈری وال کے ساتھ موجود تھے۔ میں کھیتوں میں سے نکلا تھا اور پوری طاقت سے آپ کے ساتھ بھڑ گیا تھا۔ میں نے آپ پر گراری دار چاقو کا وار کرنا چاہا تھا۔ آپ نے میری کلائی پکڑ لی تھی۔ ہم چار پانچ منٹ تک اس چاقو کے لیے زور آزمائی کرتے رہے تھے۔ کیچڑ میں لت پت ہو کر بالکل ہی بھوت بن گئے تھے ہم۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایک مانے ہوئے چاقو زن اور استاد اسٹریٹ فائٹر سے نبرد آزما ہوں۔ میری قسمت اچھی تھی جو میں بچ گیا۔"

"خیر ایسی بات تو نہیں۔" میں نے کہا "تم سارا کریڈٹ قسمت کو دے رہے ہو۔ قسمت کا عمل دخل بھی ضرور ہوگا لیکن تمہارے اندر اتنی طاقت اور مہارت بھی تھی کہ تم نے نہ صرف اپنا دفاع کیا بلکہ میرے لیے بھی اس لڑائی کو ڈرا کا رہنا دیا۔"

"یہ تو آپ مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔"

"نہیں صفدر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "میرے خیال میں کسی کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا بھی بددیانتی کی ایک قسم ہے۔ میرا ذاتی نظریہ ہے' اگر کسی میں کوئی خوبی ہے یا کسی نے کسی حوالے سے آپ کو متاثر کیا ہے تو اپنی دلی کیفیت کا اظہار ضرور کرنا چاہیے۔"

صفدر نے دو پاہن سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بات کو کسی اور طرف لے جانے لگا ہے۔ وہ بولا "میں مانتا ہوں کہ آپ دوسروں کی خوبیوں کا برملا اعتراف کرتے ہیں' اور اگر کسی کی خوبیوں سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے چھپاتے نہیں ہیں۔ لیکن ایک "کیس" ایسا ہے جس میں آپ نے اصولوں سے انحراف کیا ہے اور کرتے چلے آ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں غزالہ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ غزالہ سے متاثر تھے لیکن ایک طویل عرصے تک آپ نے اپنے دلی جذبات غزالہ سے چھپائے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اب تک چھپاتے چلے آ رہے ہیں۔ آپ برا نہ مانیں تو کہوں گا کہ آپ اپنے ساتھ ایک طویل اور لاحاصل جنگ میں مصروف رہے

ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن آپ کے دوست اور مزاج شناس کی حیثیت سے میں یہ ضرور دیکھ رہا ہوں کہ غزالہ ہر وقت آپ کے ذہن میں موجود رہتی ہے۔ حالات و واقعات' درمیانی فاصلے کچھ بھی اس کیفیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں گستاخی نہ ہو جائے لیکن میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ جن دنوں شیخ عاصم اور غزالہ بظاہر خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے' ان دنوں بھی غزالہ کی خواہش آپ کے دل و دماغ میں موجود تھی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں بے پناہ برداشت ہے' آپ اپنی آرزو کی شدت کو بہت دبا کر رکھتے ہیں' لیکن کبھی کبھی یہ آرزو سات آہنی پردوں کے اندر سے بھی جھلک دکھا جاتی ہے۔ بالکل جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا ہے۔ آپ کو اس خاتون پر غزالہ کا شبہ ہوا۔ اور آپ بالکل غیر ارادی طور پر اس کی طرف بڑھ گئے' بلکہ شاید اس کا رخ اپنی طرف پھیرنے کے لیے آپ نے اسے چھوا بھی۔ یہ بظاہر معمولی سا واقعہ آپ کے اندر موجود اس وسیع و عریض خلا کی نشان دہی کرتا ہے جو کم ہونے کے بجائے دن بدن پھیل رہا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"تم کچھ کہہ رہے ہو؟" میں نے حیرت سے کہا "میں تو سمجھا تھا کہ تقریر کر رہے ہو۔"

"اچھا تقریر ہی سمجھ لیں لیکن اس معاملے پر اب آپ کو بہت سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ آپ دونوں کوئی ٹین ایجرز نہیں۔ اچھے بھلے میچور لوگ ہیں۔ آپ مل بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل سوچ سکتے ہیں۔ کوئی مناسب راستہ نکال سکتے ہیں۔ یہ بات تو اب طے ہے کہ شیخ عاصم سے غزالہ نے اپنا راستہ جدا کر لیا ہے' وہ اب اس کی طرف لوٹ کر نہیں جائے گی۔ اور جب یہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کو آئندہ کے بارے میں سوچنے اور بات کرنے کی شدید ضرورت ہے۔"

"یار! تم تو واقعی تقریر کرنے لگے ہو اور مجھے لگ رہا ہے کہ میں اگلی صف میں بیٹھا ہوں اور میرے لیے واہ واہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ تمہاری منطق بالکل ٹھیک ہے۔ میچور لوگوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے مل بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ لیکن بات کرنے کے لیے دو میچوروں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک میچور تو تمہارے ساتھ موجود ہے' اب دوسرا ملے تو بات بنے نا۔"

"غزالہ کو ڈھونڈنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔" صفدر نے پُرسوچ لہجے میں بولا۔

"وہ کیا؟"

"مجھے یقین ہے کہ اگر وہ لاہور پہنچی ہے تو اس نے اپنے والدین سے ملنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔"

"اس نے نہیں کی ہوگی کیونکہ میری اطلاع کے بعد چچا جلیس نے شیخ عاصم کی طرف سے خطرے کی بو سونگھ لی ہوگی اور کہیں روپوش ہو گئے ہوں گے۔ غزالہ اگر اپنے گھر گئی بھی ہوگی تو بند دروازے دیکھ کر لوٹ گئی ہوگی۔"

"پھر ہو سکتا ہے کہ وہ ساہی صاحب کی طرف گئی ہو؟"

"اس بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ غزالہ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ شیخ عاصم کے لوگ ساہی صاحب کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ بہرحال اگر تم تصدیق کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔"

"وہ کس طرح؟"

"تمہارا میک اپ میرے میک اپ سے کافی بہتر ہے۔ تم بالکل پہچانے نہیں جا رہے ہو۔ اسی میک اپ میں ساہی صاحب کی طرف چلے جاؤ۔ غزالہ کا پتا نہ بھی چلا تو باقی لوگوں کی خیر خیریت تو معلوم ہو جائے گی۔"

ہم کافی دیر انارکلی میں چہل قدمی کرتے رہے اور تبادلہ خیال میں مصروف رہے۔ اس چہل قدمی کے دوران میں ایک دو شناسا چہرے بھی دکھائی دیے لیکن کوئی ہمیں پہچان نہ سکا۔ ان شناسا چہروں میں ایک چہرا ایس پی برکت کا بھی تھا۔ وہ ایک جیپ سے اتر کر ہمارے بالکل پاس سے گزرا لیکن ہمیں شناخت نہ کر سکا۔

اگلے روز صفدر نے ساہی صاحب سے ملاقات کر لی۔ اس ملاقات کے لیے اسے کئی پاپڑ بیلنے پڑے' بہرحال یہ ملاقات خاصی مفید رہی۔ ہمیں شتا اور انجم کی خیر خیریت کا علم ہوا۔ ساہی صاحب سے اس خدشے کی بھی تصدیق ہوئی کہ شیخ عاصم کے خوں خوار کارندے لاہور میں موجود ہیں اور غزالہ کو سرگرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ غزالہ کے ساتھ ان کی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ غزالہ لاہور میں موجود ہے۔ ساہی صاحب کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ چچا جلیس اور چچی فاخرہ اپنا مکان چھوڑ کر کہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ ساہی صاحب مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھے تاہم انہیں ان خدشات کا بھی علم تھا جو اس سلسلے میں درپیش تھے۔

ابوظبی کی طرح لاہور میں بھی غزالہ کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ یوں غائب ہوئی تھی کہ عنقا ہو گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ابوظبی میں صفدر اور میں نے دیوانوں کی طرح اسے تلاش کیا تھا۔ سارا سارا دن اور ساری ساری

رات اس کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے۔ شاید اسی دیوانہ وار تلاش کا اثر تھا کہ کل لائبریری میں غزالہ کے قد کاٹھ اور چلنے والی خاتون دیکھ کر میں چکرا گیا تھا اور اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے جھپٹ پڑا تھا۔ میں اور صفدر اسی بارے میں سوچ رہے تھے کہ زریں گل بھی کمرے میں آگیا۔ وہ آج کل کلثوم کا بے حد خیال رکھ رہا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کلثوم کو تنکا دہرا کرنے کی زحمت بھی نہ ہو۔ وہ گھر میں کہیں ادھر ادھر ہوتی تھی تو زریں کو مصیبت پڑ جاتی تھی۔ اسے آوازیں دیتا پھرتا تھا۔ ایک روز تو اس نے حد کر دی تھی۔ کلثوم غسل خانے میں تھی۔ زریں نے ہانک لگائی "اوئے کلثوم۔"

وہ اندر سے بولی "جی۔"

زریں نے کہا "تم اندر ہی ہو نا۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ زریں میری طرف آیا تو میں نے کہا "جی چاہتا ہے تیرے سر پر دو جوتے رسید کروں۔ ارے کم بخت' وہ اندر ہی تھی تو اس نے "جی" کہا تھا نا' پھر تجھے یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اندر ہی ہو نا؟"

وہ ذرا خجل ہو گیا مگر پھر سنبھل کر بولا "وہ بہت بھولی ہے استاد صیب۔ اس کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے' کیا کر رہی ہے۔"

"اوئے چریے! کتنی بھی بھولی تھی لیکن تھی تو غسل خانے کے اندر ہی نا۔"

"وہ۔ بس۔۔۔ ام نے یوں ہی پوچھ لیا تھا' امارا مطلب یہ تھا کہ نہا رہی ہو نا۔" زریں گل نے جواب دیا تھا۔

زریں گل اور کلثوم کی ایسی ہی کئی حماقتیں روزانہ دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ بہرحال اس روز ڈیڑھ دو گھنٹے زریں گل ہمارے پاس بیٹھا اور ہم غزالہ کی تلاش کے سلسلے میں کارآمد باتیں کرتے رہے' زریں گل کو یقین تھا کہ جس طرح دو مرتبہ پہلے غزالہ انارکلی کے علاقے میں نظر آئی ہے پھر بھی نظر آ سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی رہائش ادھر ہو یا وہ کسی کام سے وہاں آتی ہو۔ زریں گل نے پُرجوش انداز میں کہا "استاد صیب! ام نے اپنے چچا زاد رستم سے بھی بات کیا ہے۔ ام نے اس سے کہا ہے کہ "سواری مواری" کو رکشے پر بٹھانے کا خیال چھوڑو۔ ام دونوں کل سے انارکلی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں گھوما پھرا کرے گا۔ آپ اور صیدر بھی ایسا ہی کر سکتا ہے۔ ام کو پکا پکا یقین ہے کہ جلدی یا تھوڑا دیر سے ام کو اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ملے گا۔ اس کے علاوہ امارا ایک اور بھی پروگرام ہے۔"

"وہ کیا؟" صفدر نے پوچھا۔

"اگر آپ پسند فرمائے تو امارا رستم خاں سے کہتا ہے۔ رستم کا کئی پٹھان دوست یہاں رکشا چلاتا ہے۔ ام ان کو غزالہ بی بی کا حلیہ بتاتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس خاتون کے ساتھ میں سانولے رنگ کا ایک سال سوا سال کا بچہ بھی ہوتا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ رکشا والا لوگ سارا دن بلی کے مافق گھومتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شہر میں کسی نہ کسی کا نظر امارا غزالہ بی بی پر پڑ جائے۔"

صفدر نے کہا "تمہاری پہلی تجویز تو قابل عمل ہے' لیکن دوسری تجویز میرے خیال میں فی الوقت مناسب نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے شاہ جہاں صاحب؟"

میں نے کہا "میں تمہارا ہم خیال ہوں۔" پھر میں نے انگلش میں کہا "تجاویز تو دونوں ہی زیادہ اچھی نہیں ہیں لیکن چونکہ یہ زریں گل کی تجویزیں ہیں اور ان کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے' لہٰذا کچھ نہ کرنے سے کچھ کرتے رہنا بہتر ہے۔"

زریں گل بہت سٹپٹایا کہ ہم باتیں کرتے کرتے ایک دم فرنگیوں کی زبان میں کیوں بولنے لگتے ہیں جب کہ ہم جانتے بھی ہیں کہ اسے اس زبان سے چڑ ہے۔ ہم نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا۔ وہ اس شرط کے ساتھ ٹھنڈا ہوا کہ اگر ہم نے اچھی بھلی زبان میں انگریزی کی ملاوٹ نہیں چھوڑی تو وہ بھی حسب موقع اور حسب ضرورت اردو میں خالص پشتو کا ٹانکا لگایا کرے گا۔

اگلا سارا دن میں نے صفدر کے ساتھ انارکلی اور اس کے گرد و نواح میں گھومتے ہوئے گزارا۔ زریں گل چونکہ اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا لہٰذا اس کا زیادہ گھومنا پھرنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اسے ہر وقت کلثوم کی فکر لاحق رہتی تھی۔ ہاں اس کا چچا زاد رستم خاں بھی ہماری ہی طرح غزالہ کی تلاش میں مصروف رہا۔ وہ دو مرتبہ اپنی آنکھوں سے غزالہ کو دیکھ چکا تھا لہٰذا مجھے یقین تھا کہ اگر خوش قسمتی سے وہ اسے دکھائی دے گئی تو وہ پہچان لے گا۔ ہم سارا دن جیسے "ایزی موڈ" میں چکراتے رہے۔ لنچ ہم نے پرانی انارکلی کے ایک معمولی لیکن صاف ستھرے ہوٹل میں کیا۔ لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھ کر قورمہ اور ماش کی دال گرم تنوری روٹی کے ساتھ کھانے کا لطف آگیا اور برسوں پرانی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ہم نے کچھ وقت پنجاب پبلک لائبریری میں بھی گزارا اور اس کے چھوٹے سے باغیچے میں لکڑی کی گول بینچ پر بیٹھ کر سہ پہر کی چائے پی اور دو دو گرم سموسے کھائے۔

درحقیقت ان دنوں ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ مسٹر کلارک کی ہدایت کے مطابق مجھے تین ہفتے بعد مسٹر کلارک سے فون پر رابطہ کرنا تھا۔ فون نمبر اور نیویارک میں اپنا ایڈریس مسٹر کلارک نے مجھے فراہم کردیا تھا۔ اب مسٹر کلارک سے رابطہ کرنے تک ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ سروج اور سائیں عالی انڈیا میں ہی رہ گئے تھے۔ لیکن فاصلے پر ہونے کے باوجود یہی لگتا تھا کہ وہ پاس ہی ہیں۔ گئے دنوں میں بھی وہ دونوں جب چاہتے تھے ہمارے درمیان آ سکتے تھے۔ خاص طور سے گرو گھنشال سائیں عالی تو کسی چھلاوے سے کم نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ وہ واقعی پرستان ائرلائنز کے ذریعے سفر کرتا ہے اور ہمہ وقت جنات کے کندھوں پر سوار رہتا ہے۔ جہاں تک مجتبیٰ کنور کا تعلق تھا' ہمیں یقین تھا کہ وہ سخت عذاب میں ہوگا۔ وہ اپنی تفتیش کے نتیجے میں بھاگا بھاگا دہلی پہنچا تھا۔ یقینی بات تھی کہ دہلی میں اسے مسٹر کلارک ملے تھے اور نہ نوادرات کی نوہ لگی تھی۔ اس ناکامی کے بعد اس نے یقیناً پاکستان کا رخ کرنا تھا' اور عین ممکن تھا کہ وہ پاکستان آ بھی چکا ہو۔ نہ صرف آچکا ہو بلکہ ہمیں تلاش بھی کررہا ہو۔ صفدر کا خیال تھا کہ مجتبیٰ کنور سے مل لیا جائے' تاکہ ہماری طرف سے اس کے دل میں شک پیدا نہ ہو۔ میرا خیال مختلف تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ابھی ہم کسی طرح کا رسک نہ لیں۔

یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں اور صفدر پرانی انارکلی اور جین مندر کے درمیانی علاقے میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بہت سے ہومیو پیتھک معالج ملتے ہیں' اس کے علاوہ طب سے تعلق رکھنے والے حضرات کی دکانیں بھی ہیں۔ ایک بغلی سڑک سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ایک بورڈ پر پڑی۔ لکھا تھا "بچوں کے ضدی اور لاعلاج امراض کا اسپتال۔ دنیا بھر کے ڈاکٹروں سے مایوس ہونے والے مریض یہاں شفا پاتے ہیں۔"

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہاں مریضوں کا رش لگا ہوا تھا۔ کلینک کے علاوہ کلینک سے باہر بھی لوگ بیٹھے تھے۔ سڑک کی ایک جانب کئی کاریں بھی کھڑی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ہر طبقے کے لوگ آتے ہیں۔ جس چیز نے میری توجہ پوری شدت سے اپنی طرف کھینچی وہ ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار تھی۔ ٹویوٹا کار پر ڈاکٹر کا لیبل لگا ہوا تھا۔ باوردی ڈرائیور کار کے قریب ہی کھڑا تھا۔ بظاہر یہی محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے علاج کے لیے اس "نان کوالیفائڈ" معالج کے پاس آئے ہیں' جس نے ہر مرض کے شافی علاج کی گارنٹی اپنے بورڈ پر درج کررکھی ہے۔ صفدر نے ڈرائیور سے بات کی تو ہمارا یہ اندازہ سو فی صد درست نکلا۔ ڈرائیور کی بات نے ہمیں حیران کردیا۔ اس نے بتایا "میرے صاحب! آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ ان کے چار سالہ بچے کو ڈیڑھ دو سال سے دست کی بیماری ہے جو کسی طور ٹھیک نہیں ہوتی۔ پچھلی سردیوں میں یہ لوگ انگلینڈ تک سے ہو آئے ہیں۔ اب کسی نے بتایا ہے اور یہ لوگ جہلم سے یہاں پہنچے ہیں۔"

میں نے کہا "عجیب بات ہے۔ ایک ڈاکٹر ہوکر تمہارے صاحب دیسی طریقے سے علاج کرانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

وہ جہلمی لہجے میں بولا "بات صرف ہمارے صاحب کی نہیں۔ بہت سے ڈاکٹر لوگ شوق سے چل کر یہاں آتے ہیں اور اللہ وتا صاحب سے علاج کراتے ہیں۔ خاص طور سے بچوں کے علاج میں تو ان کو ماہر سمجھا جاتا ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ڈرائیور نے بچوں کے علاج کی بات کی تھی۔ اسپتال کے بورڈ پر بھی نمایاں طور پر بچوں کا ذکر تھا۔ یہاں نظر آنے والے زیادہ تر لوگوں کے پاس بھی بچے ہی نظر آرہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ غزالہ بھی بچے کو لے کر کسی ایسی ہی غرض سے یہاں آئی ہو۔ اسے یہاں دو مرتبہ دیکھا گیا تھا اور دونوں مرتبہ وہ اس سڑک کے بالکل پاس ہی نظر آئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ بچہ بھی تھا۔ یہ بات بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکی کہ وہ بچہ جو پچھلے ڈھائی تین ماہ سے غزالہ کے پاس تھا' کچھ کمزور اور علیل تھا۔ غزالہ نے کئی بار مجھے بتایا تھا کہ اسے بھوک کم لگتی ہے اور کسی وقت حرارت بھی ہوجاتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ غزالہ بچے کی طویل بیماری سے گھبرا کر اسے یہاں لے آئی ہو۔ یہ بات فوری طور پر دل میں اتر نہیں رہی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی نہایت روشن خیال ڈاکٹر تھی۔ وہ اپنی تعلیم اور اپنے نظریات کی نفی کرکے ایک عطائی کی طرف کیونکر رجوع کرسکتی تھی۔ میں اور صفدر کچھ دیر اس بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی لیکن مایوسی کے عالم میں انسان امید کی موہوم سی کرن کو بھی روشنی کا سیلاب تصور کرنے لگتا ہے۔ اگر غزالہ اس اسپتال کے آس پاس دیکھی گئی تھی اور اس کے ساتھ بیمار بچہ بھی تھا تو پھر ہمیں اس کلینک کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس روز شام تک ہمیں اس کلینک اور یہاں کے ماسٹر مائنڈ اللہ وتا کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہوگئیں۔ اللہ وتا کا نام سن کر ذہن میں جو تصویر ابھری تھی وہ کسی بارش ادھیڑ عمر شخص کی تھی' جس کا حلیہ پیروں فقیروں جیسا تھا اور

جس کی باتوں میں عاملوں جیسی پُراسراریت تھی۔ لیکن اللہ وتا اس کے بالکل برعکس نکلا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص تھا۔ داڑھی مونچھ صاف تھی۔ بظاہر اس میں کوئی متاثر کن بات نظر نہیں آئی تھی' تاہم اس کی گفتگو میں ایک اسپارک سا تھا۔ وہ لب ولہجے کے ذریعے اپنے مخاطب کو مسحور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

صفدر نے معالج اللہ وتا کو اعتماد میں لینے کے بعد کہا "میری بہن اپنے خاوند سے جھگڑنے کے بعد گھر سے چلی گئی ہے۔ دو تین ہفتوں سے اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ اس کا نام غزالہ ہے اور لے پالک بچہ اس کے ساتھ ہے۔ میرے ایک جاننے والے نے اسے آپ کے اسپتال سے نکلتے دیکھا ہے۔ میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی وہ بچے کو علاج کی غرض سے آپ کے پاس لائی تھی۔"

اللہ وتا نے کہا "میں روزانہ سیکڑوں بچوں کو دیکھتا ہوں۔ بہرحال آپ بچے اور اس کے والد کا نام بتائیں۔ میں ملازم سے کہتا ہوں کہ وہ ریکارڈ میں چیک کرے۔ آپ کل شام آکر معلوم کرجائیں۔"

صفدر نے اللہ وتا کی تھوڑی سی منت سماجت کی۔ اس نے بس اتنی رعایت کردی کہ کل شام آنے کے بجائے ہم کل صبح پتا کرلیں۔ میں نے اللہ وتا کو بچے کا نام اور حلیہ وغیرہ بتایا۔ (بچے کا نام مجھے معلوم تھا اور نہ غزالہ کو۔ غزالہ اسے پیار سے تابی کہہ کر بلاتی تھی۔ پھر میں بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگا تھا) ولدیت افتخاب تھی جو میں نے بتادی۔

اللہ وتا نے کہا "آپ نے بچے کا نام محمد تابی بتایا ہے۔ یہ کچھ عجیب سا نام ہے۔ اگر پہلے میری نظر سے گزرا ہوتا تو یاد رہتا' بہرحال ہم ریکارڈ چیک کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جو لڑکی بچے کو ساتھ لے کر آئی تھی وہ خود بھی ڈاکٹر ہے۔ شاید اس نے کسی حوالے سے اپنے بارے میں بتایا ہو۔"

اللہ وتا دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔ بے نیازی سے بولا "یہاں اکثر ڈاکٹر حضرات بھی آتے رہتے ہیں۔ اس خاکسار نے اسی کمرے میں اسی معمولی کرسی پر بیٹھ کر بڑے بڑے اسپیشلسٹ حضرات اور ان کے بچوں کا معائنہ کیا ہے۔ بہرحال میں ریکارڈ چیک کرلیتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

جس وقت میں پروفیسر اللہ وتا (وہ خود کو پروفیسر بھی کہلواتا تھا) سے بات کررہا تھا' چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا ایک سانولا سا شخص بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس شخص کی آنکھوں میں کسی جانور کی سی چمک نظر آئی۔ غیر ارادی طور پر میں یہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ ایسی چمک کس جانور کی آنکھوں میں ہوتی ہے پھر مجھے یاد آیا کہ یہ شخص اپنے چہرے پر ہوبہو ریچھ کی آنکھیں رکھتا ہے۔

جب ہم پروفیسر اللہ وتا سے گفتگو کرکے باہر نکلے تو ریچھ کی آنکھوں والا شخص ہمارے پیچھے آیا۔ میرے قریب آکر بڑی شائستگی سے بولا "سر! گستاخی معاف۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ خاص طور سے آپ کی آواز مجھے بہت جانی پہچانی لگی ہے۔ لگتا ہے بہت مرتبہ یہ آواز میں نے سنی ہے۔"

اس شخص کے چہرے پر صاف طور سے الجھن دکھائی دے رہی تھی۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا "صورتوں سی صورتیں اور آوازوں سی آوازیں ہوتی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' لیکن یہ آواز' یہ لب ولہجہ۔ پتا نہیں میرے دماغ میں کیوں کوئی شے بار بار چبھ رہی ہے۔"

اسی دوران میں ایک ٹیکسی کار بڑی تیزی سے اسپتال کے سامنے آکر رکی۔ دو تین افراد ایک جاں بلب بچے کو لے کر اسپتال میں داخل ہوئے۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا' ریچھ کی آنکھوں والا شخص بھی جلدی سے اندر لپک گیا۔

اگلے روز میں اور صفدر اللہ وتا کے کلینک پہنچے تو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا' اللہ وتا نے بتایا کہ "محمد تابی" نام کے کسی بچے کا اندراج ریکارڈ میں نہیں ہے۔ اس نے بات ہی ختم کردی تھی' اب مزید تحقیق ہم کیا کرتے۔

وہ سارا دن ہم نے لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے گزارا۔ ایک عجیب سا نشہ تھا یوں لاہور کی سڑکوں کو ناپنے میں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں الٹی چل گئی ہیں اور میں اپنے سہانے ماضی میں لوٹ گیا ہوں۔ ہم کبھی کسی پارک میں بیٹھ گئے' کبھی بس میں سفر کیا' کبھی میلوں فٹ پاتھ پر ہی چلتے چلے گئے۔ ساتھ ساتھ ہم حالات حاضرہ پر تبصرے بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ نجانے کیوں مجھے یہ پروفیسر اللہ وتا کوئی اچھا شخص نہیں لگا تھا۔ وہ جتنا گہرا نظر آتا تھا اس سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔ کسی وقت تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال یہ خیال جتنی بار میرے ذہن میں آیا' میں نے خود ہی رد کردیا۔

صفدر کے ذہن میں بار بار ریچھ کی آنکھوں والے سانولے شخص کا خیال آرہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس شخص نے مجھے میری آواز سے پہچان لیا ہے' اور اگر مکمل طور پر

پہچان نہیں سکا تو شدید شک کا شکار ضرور ہو گیا ہے۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ چہرے کی تبدیلی کے ساتھ آواز کی تھوڑی سی تبدیلی بھی ضروری سمجھی جاتی ہے اور میں نے اس ٹیکنیکل پوائنٹ کو ہمیشہ مدنظر رکھا تھا لیکن اس مرتبہ کچھ لاپروائی ہو گئی تھی۔

ہم نے دوپہر کا کھانا میکلوڈ روڈ پر کھایا۔ یہاں مرغ چنے کی ایک دکان صنوبر کی پسندیدہ ترین دکان تھی۔ کھانا کھا کر اور تھوڑا سا پنجابی میوزک سن کر طبیعت میں کچھ اور کھلنڈرا پن آیا اور ہم ایک سینما میں ایک نہایت بے کار سی پنجابی فلم دیکھنے گھس گئے۔ زندگی میں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی کسی بے کار سے سینما میں بے کار سی پنجابی فلم دیکھ کر اور تماشائیوں کی فلک شگاف بڑھکیں سن کر بھی ماضی سے ناتا جوڑا جا سکتا ہے اور لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اتفاقاً یہ فلم سدھیر اور یوسف خاں کی تھی۔ فلم میں کافی دردناک سین تھے لہٰذا ہم شروع سے آخر تک ہنستے مسکراتے رہے۔ زریں گل کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہ فلم ہم اپنی تمام تر ہمدردی اور حب الوطنی کے باوجود صرف انٹرول تک ہی دیکھ سکے۔ شام کو ہم لارنس گارڈن کی طرف نکل گئے اور آزادانہ گھومتے پھرتے رہے۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ یہ دن ہم نے گھر میں ہی گزارا۔ زریں گل نے میری پسندیدہ ڈش شملے کی مرچیں اور قیمہ پکوایا۔ کھانا سامنے آیا تو ساتھ ہی شفتا کی یاد بھی آ گئی۔ دل چاہا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ کھانے کے بعد ہم شام تک کارڈ کھیلتے رہے اور زریں گل کی دلچسپ باتیں سنتے رہے۔ کلثوم گاہے گاہے ہمارے لیے چائے لاتی رہی۔ وہ اب تھوڑا بہت اردو بولنے لگی تھی۔

زریں گل نے کہا "ام سچ کہتا ہے استاد صیب! اشاروں کی زبان میں بات کر کر کے امارا تو بھیجا پلپلا ہو گیا ہے۔ ام چاہتا ہے کہ کلثوم اتنی اردو تو جان جائے کہ ام اندھیرے میں اس سے کوئی بات کر سکے۔"

"کیا مطلب؟" صنوبر نے پوچھا۔

"اندھیرے میں اشاروں کی زبان تو نہیں سمجھی جا سکتی نا۔" زریں نے کہا۔

میں اور صنوبر بے ساختہ مسکرا دیے۔ صنوبر نے کہا "تم اندھیرے میں بات نہ کیا کرو نا۔ جو کچھ کہنا ہو روشنی میں کہہ لیا کرو۔"

زریں کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ فوراً بات بدلتے ہوئے بولا "ویسے ام آج کل پورا کوشش فرما رہا ہے کہ یہ کچھ نہ کچھ بولنا سیکھ جائے۔ کم از کم اتنا تو ہو جائے کہ امارے ساتھ بیٹھ کر لالہ سدھیر اور بدر منیر صاحب کا فلم دیکھ سکے۔"

"ویسے تم بے وقوفی کر رہے ہو۔" میں نے کہا "اللہ تعالیٰ نے تم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ تم کو بے زبان بیوی دی ہے۔ میرے خیال میں تم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہو۔"

"شاہ جہاں صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" صنوبر نے میری تائید کی "ابھی تو وہ تمہاری زبان نہیں جانتی اس لیے فرمائشیں نہیں کرتی۔ جب اسے بازار میں بکنے والی ہر مہنگی چیز کا نام اور استعمال معلوم ہو جائے گا اس وقت کیا کرو گے؟"

زریں نے بے فکری سے قہقہہ لگایا "اللہ دینے والا ہے جی۔ وہ جب کلثوم کو زبان دے گا۔ ام کو پیسہ بھی دے دے گا۔ وہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کیا پتا کس وقت ام سب کو وہ دفینہ ہی مل جائے۔"

زریں نے یونہی رسمی انداز میں بات کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ دفینے کا ایک بڑا حصہ مل چکا ہے اور وہ عن قریب ایک امیر کبیر شخص کہلوانے والا ہے۔

سوموار کو نو بجے کے قریب میں اور صنوبر ایک بار پھر انارکلی کے علاقے میں نکل گئے۔ موسم آج بہت خوشگوار تھا۔ رات کی تیز بارش کے بعد اب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہم زمزمہ توپ کے قریب سے ہو کر نکلے اور پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کے گراؤنڈ میں جا کر بیٹھ گئے۔ انارکلی کی کسی دکان میں اونچی آواز میں ٹیپ بج رہا تھا۔ انڈین گانا تھا اور حسب حال تھا۔ لتا منگیشکر گا رہی تھی۔ لوٹ کر مرا جہاں چھپ گئے ہو تم کہاں ... اسی دوران میں زریں کا چچا زاد رستم خاں رکشا چلاتا ہمارے پاس سے گزرا۔ اس نے اشارے اشارے میں ہمیں بتایا کہ اس نے حسب معمول گشت شروع کر دیا ہے۔

کچھ دیر کے لیے لائبریری میں بیٹھ کر ہم پرانی انارکلی آ گئے اور وہاں سے کھانا کھانے چلے گئے۔ عوامی کھانا کھانے کا پروگرام تھا۔ جین مندر کی طرف سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ بہترین دال چاول یہاں ملتے تھے۔ صفائی بھی بہت تھی۔ ہم لکڑی کی بینچوں پر بیٹھ گئے۔ دو تین بابو ٹائپ لوگ بھی یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ دو لڑکے تیزی سے سروس کر رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ دائیں طرف اٹھی۔ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں بھی میزیں لگی تھیں۔ یہاں وہی چند روز پہلے والی خاتون بیٹھی تھیں جن سے

لائبریری کے اندر ایک ناخوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر نامدار کے ساتھ دال چاول کھانے میں مصروف تھیں۔ شوہر نامدار کا رخ دوسری طرف تھا لہٰذا انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا' ویسے بھی ہم ہوٹل کے اندر نہیں تھے بلکہ سڑک کے کنارے لگی میزوں پر بیٹھے تھے۔ ہاں محترمہ نے ہمیں دیکھ لیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی گوری چٹی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ غالباً وہ ہماری طرف سے کچھ شک میں پڑ گئی تھیں۔ ممکن تھا کہ وہ ہمارے بارے میں غلط سلط سوچ رہی ہوں۔ ہمارا معاشرہ ہی ایسا ہے۔ یہاں عورت کو ہر غیر مرد پر شک کرنا پڑتا ہے بلکہ اسے اپنا جانی دشمن سمجھنا پڑتا ہے۔

میں نے صنوبر کو کہنی مار کر خاتون کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بھی زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ بہرحال ہمیں خاتون سے کیا غرض ہو سکتی تھی۔ ہم کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد خاتون بھی کھانے سے فارغ ہو کر اٹھ گئیں اور اپنے شوہر کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے شوہر نامدار نے بڑی "شوہرانہ" نظروں سے ہمیں گھورا۔ صنوبر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد صنوبر پانی پی رہا تھا' میں نے سگریٹ سلگانے کے لیے لائٹر جلایا۔ اچانک میری نگاہ ایک جیپ پر جم کر رہ گئی۔ یہ جیپ بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ وہ سڑک کے بالکل کنارے پر تھی۔ ڈرائیور گھنی مونچھوں والا کوئی بھاری بھرکم شخص تھا۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ جیپ کا رخ سیدھا ہماری جانب تھا۔ تقریباً ساٹھ ستر کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے یہ جان لیوا "وزن" ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ صاف طور پر ہمیں کچلنے جا رہی تھی۔ صنوبر اس موت سے قطعی بے خبر تھا جو اس کے عقب میں صرف دس پندرہ گز کی دوری پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے صنوبر کو زوردار دھکا دیا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا دکان کے تھڑے کی طرف لڑھک گیا۔ دو تین قلابازیاں تو ہم نے کھائی ہوں گی۔ میں نے خوف ناک کڑاکے کی آواز سنی۔ لکڑی کی میزیں اور اسٹول تنکوں کی طرح ہوا میں اچھلے۔ پھر جیپ زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ دکان کے تھڑے سے ٹکرائی اور سلپ کرتی ہوئی ایک خوانچہ فروش کے خوانچے میں جا گھسی۔ خوانچے پر رکھے ہوئے حلیم کے پتیلے اور دیگر سامان دور دور تک بکھر گیا۔ میں نے ہوٹل کے ملازم لڑکے کو زخمی ہو کر ایک موٹر سائیکل کے قریب گرتے دیکھا۔ جیپ جتنی تیزی سے ٹکرائی تھی' اتنی ہی تیزی سے ریورس ہوئی اور بے حد پھرتی کے ساتھ ٹرن لے کر جین مندر کے چوک کی طرف نکل گئی۔ میں اور صنوبر اٹھ کر سڑک کی طرف دوڑے۔ جیپ نے واضح طور پر ہمیں کچلنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کا پیچھا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک دو گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ تیزی سے نکل گئیں۔ آس پاس کوئی اسکوٹر یا موٹر سائیکل سوار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران میں رکشے کی پھڑپھڑاہٹ گونجی۔ یہ رستم خاں تھا۔ اس نے چلا کر ہمیں دعوت دی کہ ہم اس کے رکشے میں آ جائیں تاکہ جیپ کا تعاقب کیا جا سکے۔ میں جانتا تھا کہ یہ تعاقب لاحاصل رہے گا۔ ادھیڑ عمر رکشے پر بیٹھ کر پجارو جیپ کا تعاقب کرنا تو ایسے ہی تھا جیسے سائیکل پر سوار ہو کر جنگل میں چیتے کا پیچھا کیا جائے۔ ہم دل مسوس کر رہ گئے۔

حادثے کا سن کر پرانی انارکلی کے چوک سے ٹریفک پولیس والے بوکھلائے ہوئے پہنچ گئے۔ یہ دونوں سب انسپکٹر تھے جو ایک موٹر سائیکل پر بیٹھ کر تشریف لائے تھے۔ اس حادثے میں افراتفری تو بہت مچی تھی اور مالی نقصان بھی ہوا تھا' تاہم خوش قسمتی سے جانی نقصان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ خوش قسمتی ہی تو تھی کہ جیپ کی یلغار کے وقت ہمارے قریب "دال چاول" کا کوئی اور شوقین موجود نہیں تھا' ورنہ یہ دن یقیناً اس کی زندگی میں آخری ہوتا۔ صرف ہوٹل کا ایک ملازم لڑکا تھوڑا سا زخمی ہوا تھا۔

سب لوگ ہمارے ارد گرد جمع تھے اور جان بچ جانے پر ہمیں "خیر خیرات" کی تلقین کر رہے تھے۔ بہت سے لوگ جیپ سواروں کو صلواتیں سنا رہے تھے' زیادہ تر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ جیپ سوار نشے میں تھے اور تیز رفتاری کے سبب گاڑی پر قابو نہ رکھ سکے۔ ٹریفک پولیس والے ہر کسی سے پوچھ رہے تھے کہ کسی نے جیپ کا نمبر نوٹ کیا ہے؟ حسب توقع اس سوال کا جواب انکار میں مل رہا تھا۔ اسی اثنا میں موبائل پولیس کی ایک گاڑی بھی وہاں پہنچ گئی۔ فربہ اندام انسپکٹر ہم دونوں سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں کہیں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ شاید ہم دشمن دار لوگ ہیں اور ہمارے کسی بدخواہ نے ہمیں کچلنے کی کوشش کی ہے۔ صنوبر نے اسے بتایا کہ ہماری سات پشتوں میں سے کسی نے دشمنی نہیں پالی۔ ہم تو نہایت ہی بھلے مانس خاندانوں کے بھلے مانس ترین لوگ ہیں۔ بلکہ ہمیں تو دشمنی کی ہجے تک معلوم نہیں۔ انسپکٹر نے صنوبر کی باتوں پر یقین کر لیا کیونکہ سچی باتوں کو جھٹلانا اور جھوٹی پر یقین کرنا پولیس کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے۔

کچھ دیر بعد رستم خاں کے رکشے پر بیٹھ کر ہم اپنی کچی بستی واپس لوٹ آئے۔ یہ معاملہ ہم دونوں کو بہت پر اسرار محسوس ہوا تھا۔ یوں تو ہمارے بیسیوں دشمن اور بد خواہ تھے لیکن میک اپ کے باوجود ہم پر ہونے والا یہ قاتلانہ حملہ شدید الجھن میں ڈال رہا تھا۔ راستے میں صفدر اور میں مسلسل تبادلہ خیال میں مصروف رہے۔ صفدر کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ بولا "شاہ جہاں صاحب! میں کل بھی آپ سے بات کرنے والا تھا لیکن پھر کہتے کہتے رہ گیا۔ کل شام آپ تو جلدی سو گئے تھے لیکن میں اور زریں گل کچھ دیر گلی میں ٹہلتے رہے تھے۔ گلی کے نکڑ پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں تین بندے تھے اور کچھ پر اسرار سے نظر آ رہے تھے۔ میں اور زریں پاس سے گزرے تو وہ ہمیں گھورنے لگے۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ چلے گئے لیکن رات گیارہ بجے کے قریب پھر آ گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے گاڑی رستم خاں کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کی تھی۔ گلی میں ہر آنے جانے والے کو وہ بری طرح گھور رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ زریں گل تاؤ کھا رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ جا کر ان لوگوں سے پوچھے کہ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اس دوران میں وہ لوگ چلے گئے۔"

میں نے کہا "میرا ذہن رہ رہ کر اس بندے کی طرف جا رہا ہے جس نے ہمیں اللہ دتا کے کلینک میں دیکھا تھا۔"

صفدر نے کہا "مجھے تو اسی وقت دال میں کالا نظر آ گیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ بندہ نہ صرف بہت خطرناک ہے بلکہ آپ کو پہچان بھی چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی پرانا بدخواہ ہو آپ کا۔"

شب سڑک پیش آنے والے اس سنگین واقعے نے رات مجھے دیر تک جاگنے اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایسے ہی حالات میں زندگی کی بے ثباتی کا احساس بے حد شدت سے ہونے لگتا تھا۔ میرے چاروں طرف جانی دشمنی موجود تھے۔ کسی بھی وقت کوئی اندھی گولی میری طرف روانہ ہو سکتی تھی۔ اور اندھی گولی کے آگے مہارت، طاقت اور تجربے کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے سورما لمحوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی پریشان کن سوچوں کے درمیان یہ خیال میرے ذہن میں آیا کرتا تھا کہ جتنی جلد ہو سکے میں شبنا کا بار اپنے سر سے اتار دوں۔ اسے ایک ایسا مضبوط سہارا فراہم کر دوں جو جیون بھر اس کے ساتھ رہے۔

صبح میں اور صفدر دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ کل کے واقعے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میک اپ کے باوجود ہماری اصلیت اب راز نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر ہم پر حملے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ ہم خود کو لاہور میں روپوش کیسے رکھیں۔ (دوسرا میک اپ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اور نہ ہی ہمارے پاس وہ لوازمات تھے کہ ہم اس بارے میں سوچ سکتے) صفدر کو یقین تھا کہ جن لوگوں نے کل ہم پر حملہ کیا ہے، وہ ہمارے اس ٹھکانے سے آگاہ ہو چکے ہیں اور اس وقت بھی ہمارے آس پاس کہیں موجود ہیں۔

میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور میں نے کہا "چلو اٹھو صفدر، ہم چلتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"کہیں بھی۔ کم از کم یہ تو پتا چلے کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہو رہا ہے تو یہ کار خیر کون کر رہا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد میں اور صفدر کپڑے بدل کر گھر سے باہر آ گئے۔ کچی پکی گلیوں سے گزر کر ہم بڑی سڑک پر پہنچے، جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ موٹر سائیکل پر سوار دو افراد ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔ سڑک پر آ کر ہم ایک ویگن پر سوار ہوئے اور جین مندر کی طرف روانہ ہو گئے۔ موٹر سائیکل مسلسل ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس پر سوار دونوں افراد صورتوں سے غنڈے دکھائی دیتے تھے تاہم ہمارے لیے وہ بالکل اجنبی تھے۔

جس وقت ہم "جی پی او چوک" کے قریب سے گزر رہے تھے، موٹر سائیکل اچانک غائب ہو گئی۔ یوں لگا کہ وہ کسی اور طرف مڑ گئی ہے۔ چند لمحوں کے لیے میں تذبذب کا شکار ہوا کہ کہیں ہمیں تعاقب کا صرف وہم ہی تو نہیں ہوا۔ مگر بہت جلد یہ غلط فہمی دور ہو گئی، اب ایک سوزوکی لوڈر مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ اس قسم کے تعاقب کو بعض لوگ "ریلے چیز" کہتے ہیں۔ ایک ہی گاڑی کسی کے تعاقب میں رہے تو وہ نگاہ میں آ جاتی ہے، لہٰذا اس قسم کے تعاقب میں پیچھا کرنے والی گاڑیاں بدلتی رہتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

میں اور صفدر جین مندر کے اسٹاپ پر اتر گئے اور پیدل ہی پرانی انارکلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارا تعاقب منظم طریقے سے جاری تھا۔ سوزوکی لوڈر کہیں پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے اترنے والے دو افراد کافی فاصلے پر رہ کر ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ میں اور صفدر دونوں مسلح تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ کسی ویران جگہ پر تعاقب کرنے والوں کو گھیرا جائے اور انہیں پکڑ لیا جائے۔ لیکن اس کارروائی کے لیے

ے صبر کی ضرورت تھی۔ ہمیں مناسب جگہ، مناسب موقع ر مناسب ماحول درکار تھا۔ بہر طور مناسب صورت حال کی اش میں ہم زیادہ آوارہ گردی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات ہم دیکھ ہی چکے تھے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے ہمیں جسمانی در پر ختم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ایسے میں یہ عین ممکن ما کہ ان کے ساتھی کہیں بھی گھات لگائے بیٹھے ہوں اور پانک ہم پر فائر کھول دیں۔

پانچ دس منٹ پیدل چلنے کے بعد مجھے سڑک کے کنارے یک پلازا نظر آیا۔ یہ نو تعمیر شدہ بلڈنگ تھی۔ صرف گراؤنڈ ور پر چند دکانیں آباد نظر آتی تھیں۔ لیکن ابھی چونکہ نو باڑھے نو کا وقت ہی تھا لہٰذا ایک دو کے سوا یہ دکانیں بھی رہی پڑی تھیں۔ میں نے معنی خیز نظروں سے صفدر کی طرف یکھا اور ہم پلازا میں داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم بڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور تیسری منزل کی ایک نسان گیلری میں کھڑے ہو گئے۔ اس نیم تاریک گیلری میں یں دیکھا نہیں جا سکتا تھا لیکن ہم نیچے دیکھ سکتے تھے۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ یقیناً ہمارا تعاقب رنے والے اس انتظار میں تھے کہ ہم پلازا میں سے باہر لیں۔ جب ہم نہیں نکلے تو انہیں فکر لاحق ہوئی۔ انہیں رشہ پیدا ہوا ہوگا کہ ہم کسی دوسرے راستے سے تو نہیں ل گئے۔ وہ پلازا کے اندر چلے آئے، کچھ دیر تک ادھر ادھر اک جھانک کرتے رہے، پھر دوڑتے ہوئے دوسری منزل پر گئے۔ وہ واضح طور پر بوکھلائے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی لونوں کی جیبیں بھاری تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مسلح ں۔ صفدر کے چہرے پر شکاریوں کی سی دلچسپی نظر آ رہی ی۔ کافی دن سے اسے ہاتھ صاف کرنے کا موقع نہیں ملا ما۔ جونہی دونوں مسلح افراد تیسری منزل کی طرف آئے، ہم وکس ہو گئے۔ وہ قدم قدم ہماری طرف بڑھ رہے تھے اور ں امر سے بے خبر تھے کہ ان پر کیا گزرنے والی ہے۔ مگر پھر یک بالکل غیر متوقع بات ہوئی۔ پتا نہیں کیسے ان دونوں میں ے ایک شخص کی عقابی نظر گیلری میں پڑ گئی۔ ہماری موجودگی احساس ہوتے ہی اس شخص نے جیب سے ریوالور نکالا۔ پلے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ ہم پر فائر کرے گا، مگر پھر کھلاہٹ میں وہ واپس پلٹا اور اپنے ساتھی سمیت بھاگ کھڑا وا۔

میں اور صفدر نکل کر ان کے پیچھے بھاگے۔ "رک جاؤ" ں نے چلا کر کہا۔

اس شخص نے گھوم کر اندھا دھند دو فائر کر دیے۔ پلازا کی خالی بلڈنگ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے ایک شخص کی ٹانگ پر فائر کرنا چاہا لیکن نشانہ خطا گیا۔ آگے پیچھے دوڑتے ہم پلازا کی بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ یہاں فائر کرنا خطرناک تھا کیونکہ راہ گیر بھی موجود تھے۔ نولکشن مارکیٹ کی طرف بس اسٹاپ پر درجنوں افراد کھڑے تھے۔ ہم دونوں کسی صورت فائر نہیں کر سکتے تھے، ورنہ اس موقع پر ان دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو ڈھیر کرنا آسان تھا۔ اسی اثنا میں وہی سرخ سوزوکی لوڈر نظر آئی جس نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ دونوں افراد بوکھلاہٹ کے عالم میں بھاگتے ہوئے سوزوکی لوڈر میں گھس گئے۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ لائبریری کے سامنے ایک چھوٹی برلیتا کار کھڑی نظر آئی۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے کار تک پہنچے۔ ڈرائیونگ سیٹ خالی تھی۔ ساتھ والی نشست پر ایک خاتون موجود تھی۔ میں نے دیکھا۔ اگنیشن میں چابی جھول رہی تھی۔ میں نے تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ خاتون نے پہلی چیخ ماری پھر دوسری چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی صفدر نے ریوالور اس کی پیشانی سے لگا دیا۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

خاتون کو غور سے دیکھ کر میں چونکا۔ زبردست اتفاق یہ تھا کہ یہ وہی خاتون تھیں جن کے ساتھ انہی گلیوں میں دو دفعہ پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی تھی۔ اس حسین و سنگین اتفاق پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ سوزوکی لوڈر لمحہ بہ لمحہ ہم سے دور ہو رہی تھی اور ہمیں اس تک پہنچنا تھا۔

میں نے "برلیتا" کا انجن اسٹارٹ کیا اور چند لمحوں میں اس کی رفتار چالیس پچاس تک پہنچا دی۔ خاتون تھر تھر کانپ رہی تھی اور ہاتھ جوڑ رہی تھی، اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ یقیناً پہلی دو ملاقاتوں میں اس کے ذہن میں جو وسوسے پیدا ہوئے تھے وہ پختہ یقین میں بدل چکے تھے۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہم دونوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اب اسے اغوا کرنے کے بعد اس کا حشر نشر کر دینا چاہتے ہیں۔

وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولی "اگر میں نے اس وقت غصے میں کوئی سخت بات کہہ دی تھی تو مجھے... معاف کر دو۔ پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔"

صفدر بھی جھنجلائے ہوئے موڈ میں تھا۔ وہ بولا "ایسا تو ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اور اگر تم نے چیخیں شیخیں ماریں تو پھر اس گاڑی میں ہی ملک الموت دبوچ لے گا تمہیں۔"

"نہیں! میں چیخیں نہیں ماروں گی۔ میں تم راز تک نہیں نکالوں گی۔ بے شک تم گاڑی بھی لے جاؤ۔ یہ۔۔۔ یہ انگوٹھیاں ہیں میری' یہ لے لو۔ یہ جھمکے بھی لے لو۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

صفدر نے آواز خوفناک بناتے ہوئے کہا "یہ سب چیزیں تو تم نہ بھی دو' یہ پھر بھی ہماری ہی ہیں۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ ہم پورے ایک سال سے تمہارے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہر جگہ تمہارا پیچھا کر رہے تھے۔"

خاتون کی باقاعدہ گھگی بندھ گئی تھی۔ اس کا سارا غصیلا پن اس کی تھرتھراہٹ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "یار! کیوں خواہ مخواہ ڈرا رہے ہو اسے۔ کہیں کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دینا۔"

صفدر نے کہا "جناب! یہ آپ کا شعبہ نہیں' آپ سوزوکی کو پکڑیں۔"

ابھی بمشکل صفدر کا فقرہ ہی مکمل ہوا تھا کہ آگے جاتی ہوئی سوزوکی کار سے اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ یقیناً کار کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دھماکوں کی آواز نے خاتون کو بری طرح چیخنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے صفدر سے کہا "اب بتاؤ۔۔۔ کون سا شعبہ لینا ہے؟"

"ہاں اب تو واقعی شعبہ بدلنا پڑے گا۔ دھمکیالوجی کے شعبے سے فائریالوجی کے شعبے میں آنا پڑے گا۔ اس نے ریوالور کھڑکی سے نکالا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کمال کا نشانے باز ہے۔ اس نے اپنی روایت قائم رکھی۔ صرف دو گولیوں میں اس نے برق رفتاری سے دوڑتی سوزوکی لوڈر کا ایک پچھلا ٹائر برسٹ کر دیا۔ سوزوکی کشمی چوک کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ٹائر بیٹھا تو وہ بری طرح لہرائی۔ ایک اسکوٹر سوار کو اٹھاتی ہوئی وہ جنگلے سے ٹکرائی اور کچھ دیر تو گھڑانے کے بعد رک گئی۔ سوزوکی میں سوار تین افراد لے سوزوکی رکنے سے پہلے ہی چھلانگیں لگا چکی تھیں اور راکس پارک کی طرف بھاگ نکلے تھے۔ یہ کافی گنجان علاقہ ہے اور گلیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔

میں اور صفدر بھی کار سے نکلے اور خاتون کو حیران پریشان چھوڑ کر سوزوکی سواروں کے پیچھے لپک گئے۔ راکس پارک میں ہر طرف قلمی دفاتر کے بورڈ لگے تھے۔ بڑے بڑے ہورڈنگز پر پینٹنگ ہو رہی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ میں اور صفدر چند منٹ تک ان گلیوں میں چکراتے رہے۔ پھر بیڈن روڈ کی طرف نکل گئے۔

سوزوکی لوڈر اور کار کی طرف واپس جانا خطرناک تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہو گا اور عین ممکن تھا کہ پولیس بھی پہنچ چکی ہو۔ مال روڈ کے ایک پی سی او سے میں نے ساہی صاحب سے رابطہ کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کشمی چوک کے قریب ایک سوزوکی لوڈر کھڑی ہے۔ اس میں کچھ لوگوں نے ہم پر فائرنگ کی تھی اور بھاگ گئے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ لوڈر کس کی ہے اور اس میں سوار کون تھے؟

ساہی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ڈیڑھ دو گھنٹے بعد دوبارہ رابطہ کروں تو ساری معلومات فراہم کر دیں گے۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ لاہور آتے ہی ہمارے ساتھ کوئی چکر چل گیا ہے اور یہ چکر صرف اس لیے چلا کہ ہم غزالہ کی تلاش میں پروفیسر اللہ دتا کے کلینک پر پہنچے۔ ایسا کیوں ہوا ہے؟ کوشش کے باوجود یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اگر "ریچھ کی آنکھوں" والے شخص کلینک میں مجھے پہچان بھی لیا تھا تو اسے کیا شدید خطرہ لاحق ہوا تھا کہ وہ ایک دم میری جان کے درپے ہو گیا تھا۔ کیا حوالے سے ان واقعات کا تعلق غزالہ سے تھا یا یہ کوئی معاملہ تھا۔

رات کو جب میں' صفدر اور زریں گل کھانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہے تھے تو میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "صفدر! ہمیں پروفیسر اللہ دتا اور اس کے کلینک کا پوسٹ مارٹم کرنا ہو گا۔ یہ جاننا ہو گا کہ یہ پروفیسر اللہ دتا کون ہے اور اس کی نجی و عوامی سرگرمیاں کیا ہیں۔"

زریں گل بولا "تھوڑی بہت معلومات رستم خان اکٹھا کیا ہے۔ یہ اللہ دتا ہر دل عزیز قسم کا بندہ ہے۔ ہر طرح لوگ بہت جلدی اسے پسند کرنے لگتا ہے۔ سنا ہے کہ کے ہاتھ میں شفا ہے اور لالچ نام کو نہیں۔ وہ غریب مریضوں کو مفت دوا دیتا ہے' بلکہ کئی مریضوں کا اپنے پاس سے مدد کر دیتا ہے۔ خوچے اس کے علاوہ وہ ریکروٹنگ کا کام بھی ہے۔ ام کو معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگوں کو باہر بھیجتا ہے ایمان داری سے بھیجتا ہے۔ اس کا بھیجا ہوا مزدور لوگ باہر کے ملک میں کافی پیسہ کما رہا ہے۔"

صفدر نے کہا "تمہاری باتوں سے تو محسوس ہوتا۔ یہ شخص دوزنیا کا بھتیجا ہے اور دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔"

"تو صدر صیب! ام نے تو جو کچھ سنا ہے' وہ آپ کو بتا رہا ہے' آگے کھوج لگانا تو آپ کا کام ہے۔"

"ٹھیک ہے آج کھوج لگاتے ہیں۔" صفدر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

رستم خان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "ام

ال، میں ریکروٹنگ کا کام اللہ دتا صاحب خود نہیں کرتا ہے۔ یہ کام ان کا چھوٹا بھائی کرتا ہے۔ اس کا نام ارشاد احمد ہے۔ وہ یہاں مسلم ٹاؤن میں رہتا ہے۔ ام اس کے ڈرائیور کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کا ڈرائیور بتاتا ہے کہ ارشاد ۔۔۔ کچھ زیادہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ ایک سال پہلے اس کا ۔۔۔ روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اور اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے گیا ۔۔۔ وہ نشہ وغیرہ بھی کرتا ہے۔ بہرحال یہ بات بھی سچ ہے کہ ۔۔۔ نے کافی زیادہ لوگوں کو ایمان داری سے باہر بھجوایا ہے۔"

صفدر نے کہا "کیوں نہ پہلے اسی شخص کو دیکھ لیا جائے۔ امریکہ کے دیوانے بن کر چلے جاتے ہیں اس کے پاس۔"

"امریکہ کے دیوانے؟ کیا مطلب؟"

"یہی کہتے ہیں کہ امریکہ کا ویزا چاہیے۔ وہاں جا کر محنت کرنا چاہتے ہیں' ڈالر کمانا چاہتے ہیں۔"

کچھ دیر تبادلہ خیال کرنے کے بعد ہم نے پروگرام طے کر لیا۔

شام سات بجے کے بعد میں اور صفدر مسلم ٹاؤن کی اس کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے جس کے گیٹ پر ارشاد احمد کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ہماری معلومات کے مطابق ارشاد احمد کے ساتھ صرف اس کی بیمار والدہ رہتی تھی' اس کے علاوہ ایک دو ملازم تھے۔ جس وقت ہم ارشاد احمد سے ملنے اس کے گھر گئے تھے اتفاقاً ایک ملازم کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ یہ ملازم بھی زبردست قسم کا چرسی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی ترنگ میں سر ہلانا شروع کر دیا "نہیں بھئی۔ آج کوئی نہیں گھر میں۔ سب شادی پر گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں مرغ پلاؤ کھائیں گے' ہم یہاں چکن آلو ہر بار کریں گے۔ وہ بارہ بجے آئیں گے۔ اس وقت ہم سو رہے ہوں گے۔ وہ گھنٹی بجاتے رہیں گے' ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارا بھی دل چاہتا ہے مرغ پلاؤ کھانے کو۔"

وہ کچھ دیر یونہی واہی تباہی بکتا رہا اور دروازے کے سامنے کھڑا جھومتا رہا۔ میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا اور پھر میرے ہاتھ چومنے لگا۔

میں نے کہا "ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ کیا یہاں بیٹھ کر ارشاد صاحب کا انتظار کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔" اس نے گیٹ پورا کھول دیا۔ حالانکہ ہم چھوٹے دروازے سے بھی اندر آ سکتے تھے۔ وہ جھوم رہا تھا اور سو کے نوٹ کو بار بار جیب میں تھپتھپا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں لے جانے کے بجائے وہ بدمست ہم کو سیدھا ارشاد احمد خاں کے بیڈ روم میں لے گیا' اور بڑی عزت و تکریم سے ہمیں صوفے پر بٹھا کر ہمارے سامنے ٹیلی فون سیٹ رکھ دیا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا "اس فون کو کیا کرنا ہے؟"

وہ بولا "جو مرضی کریں جی۔ جہاں دل چاہے فون کریں۔" وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک الماری کی طرف بڑھا اور وہاں سے میرے لیے شلوار قمیص نکال لایا "یہ کیا ہے بھئی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام بھئی نہیں' مصدق ہے جی۔ ڈرائیور مصدق۔"

"اچھا مصدق ہی سہی' لیکن اس شلوار قمیص کا میں کیا کروں؟"

وہ بولا "آپ نے پتلون قمیص پہن رکھی ہے۔ کپڑے بدل کر ایزی ہو جائیں اور آرام سے بیٹھیں۔"

"لیکن بندہ خدا! یہ تو ارشاد صاحب کے کپڑے ہیں۔"

وہ ترنگ میں بولا "ارشاد صاحب کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ میرے لیے وہی ارشاد صاحب ہے جو میرے لیے اچھا ہے۔ اس وقت آپ ہی میرے لیے ارشاد صاحب ہیں' میں آپ کا ڈرائیور مصدق ہوں۔" اس نے ایک بار پھر میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ تب لڑکھڑاتا ہوا الماری کی طرف گیا۔ وہاں سے ایک لائٹر اور سگریٹ کیس لے آیا۔ اس کے بعد شام کا اخبار اور عینک لے آیا۔ اس کے بعد فریج سے ٹھنڈی اوولٹین کا گلاس لے آیا۔ صفدر اور میں زیر لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ سب اشیا ارشاد احمد کی ہیں مگر وہ مجھے ہی ارشاد احمد بنانے پر تلا ہوا تھا۔ کیونکہ میں نے اس کی جیب کو سو کے نوٹ سے گرم کیا تھا اور آلو چکن کے بارے میں اس کے تمام دکھی خیالات کو تحلیل سا کر دیا تھا۔

اس دوران میں ایک اور نوعمر ملازم نے بھی اندر جھانکا۔ وہ قدرے متحیر نظر آیا' لیکن وہ ذرا سا لڑکا تھا اور اسے مصدق کے سامنے کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بیڈ روم میں ارشاد احمد کی تصویر بھی لگی تھی۔ اس کی عمر پینتیس سال سے زائد نہیں تھی۔ کم از کم تصویر میں تو یہی عمر نظر آ رہی تھی۔ اپنے بڑے بھائی پروفیسر اللہ دتا کی طرح وہ بھی کلین شیو تھا۔ دونوں بھائیوں کی صورت بھی کافی ملتی تھی۔ ڈرائیور مصدق سے دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد ہمیں پتا چل گیا کہ گھر میں ان دو ملازموں اور ارشاد احمد کی

بوڑھی والدہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ بوڑھی والدہ کا ہونا نہ ہونا بھی ایک برابر تھا۔ وہ کوٹھی کی بالائی منزل پر نیند کی دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ بالائی منزل تک محدود تھی' سیڑھیاں اترنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہمارے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ ارشاد احمد کے گھر میں گھوم پھر کر اس کے رہن سہن اور طور اطوار کا جائزہ لے سکیں۔ لیکن ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کال بیل بج اٹھی۔

ہم چونکے۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں ارشاد احمد ہی واپس نہ آگیا ہو لیکن مصدق نے بتایا تھا کہ وہ شادی پر گیا ہے اور اس کی جلد واپسی ممکن نہیں۔ آنے والا ارشاد احمد نہیں تھا بلکہ ایک گوری چٹی جوان سال لڑکی تھی۔ وہ کچھ سہمی سہمی سی اندر داخل ہوئی۔ چپڑی مصدق اسے سیدھا ہمارے پاس بیڈ روم میں ہی لے آیا۔ لڑکی نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر ہمیں سلام کیا۔

مصدق میری طرف اشارہ کرکے بولا "یہ ہیں ارشاد احمد صاحب۔ ان سے زیادہ ارشاد احمد اور کون ہوگا۔ یہ سر سے پیر تک ارشاد احمد ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی جیب تھپتھپائی اور نہال نظر آنے لگا۔

لڑکی نے سہمی سہمی آواز میں کہا "سر۔ میرا نام راحتی ہے۔ فوزیہ آنٹی نے پرسوں آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا۔ دوہا باہر جانے کے بارے میں۔"

"ہاں ہاں یاد آیا۔" میں نے کہا "پرسوں بات کی تھی فوزیہ نے۔"

وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی پھر مدھم آواز میں بولی "بس مہربانی کردیں جی۔ میں اور میرے گھر والے ساری زندگی آپ کے احسان مند رہیں گے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھنے لگی۔ "اُدھر نہیں ڈیئر ادھر۔" میں نے اپنے پہلو میں خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا لیکن یہ تیر بڑی حد تک نشانے پر لگا۔ لڑکی کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی۔ اس نے اپنی انگلیاں مروڑیں اور پھر میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے مصدق کو اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

راحتی نامی یہ لڑکی مجھے ارشاد احمد سمجھ رہی تھی اور میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا توقع لے کر میرے پاس آئی ہے اور مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ ارشاد احمد ایک ہیجلے کردار کا شخص ہے' میں اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے بات کر رہا تھا۔

کمرے میں کچھ دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر لڑکی نے کہا "مجھے افسوس ہے جی کہ نورین باجی نے آپ کے ساتھ جھگڑا کیا۔"

"ہاں' افسوس تو مجھے بھی ہوا تھا۔"

"آپ کو کس چیز کی کمی ہے جی۔ اس پاگل نے اپنا ہی نقصان کیا نا۔ بنا بنایا کام بگاڑ لیا۔"

"تم مجھے اپنی باجی سے کہیں زیادہ سمجھدار لگتی ہو۔" میں نے کہا۔

اس کے گالوں پر ایک بار پھر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ میں نے کہا "مجھے امید نہیں تھی کہ تم اکیلی آؤ گی۔ لیکن تم نے آکر ثابت کردیا کہ تمہارے اندر حوصلہ ہے اور آگے بڑھنے کی پختہ خواہش بھی۔"

"میں نے پاسپورٹ بنوالیا ہے جی۔ سات آٹھ ہزار روپیہ بھی اکٹھا ہوگیا ہے۔ اس مہینے امی کی کمیٹی نکلی ہے۔ وہ ملا کر پندرہ ہزار ہو جائیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے' کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا قریب کرلیا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔

ان لمحوں میں مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ بے چاری ایک ایسے چوزے کی طرح نظر آرہی تھی جو آنکھیں بند کیے عقاب کے سامنے بیٹھا ہو اور اس انتظار میں ہو کہ اسے شکار کرلیا جائے۔ وہ ان بے شمار لڑکیوں میں سے ایک تھی' جو اپنی مجبوریوں کی زنجیروں میں بندھ کر ہوس پرست مردوں کی خواب گاہوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ارشاد احمد کے کردار کے کئی تاریک پہلو میری نگاہ میں آگئے تھے۔ میں لڑکی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ ارشاد احمد کے بہروپ میں رہتے ہوئے میں نے لڑکی سے کئی ایک باتیں پوچھیں۔

میری ادھر اُدھر کی باتوں نے لڑکی کو قدرے پریشان کردیا۔ شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں کر رہا۔ میری ناراضگی کا مدھم سا اندیشہ اس کی آنکھوں میں نظر آنے لگا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے سہلانے لگی۔

اچانک دروازہ تیزی سے کھلا اور لڑکی اُچھل پڑی۔

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات گیارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں!

تاوان

بار اوّل ———— ۲۰۰۰ء
مطبع ———— یونینڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ —— المدینہ کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ———— ۶۰ روپے

ISBN 969-517-021-8

اندر آنے والا صفدر تھا۔ لڑکی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ صفدر کے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے۔ وہ تیزی سے بولا "ارشاد صاحب۔ دروازے پر ایک گاڑی آئی ہے۔"

پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ اصلی ارشاد احمد واپس آگیا ہے' اور ہم اس کے گھر میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے ہیں۔ لیکن پھر فوراً ملازم مصدق کی بات یاد آئی۔ وہ ایک سے زائد مرتبہ کہہ چکا تھا کہ ارشاد شادی کی جس تقریب پر گیا ہے وہ جلد ختم ہونے والی نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ وہیں بیٹھے میں ابھی آتا ہوں۔

صفدر کے ساتھ میں باہر پورچ میں آیا۔ بیرونی گیٹ بند تھا اور گیٹ کی دوسری جانب ایک پجارو کی ہیڈ لائٹس نظر آرہی تھیں۔ اسی دوران میں چڑی مصدق بھی لڑکھڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جاکر دیکھے کون ہے۔

مصدق گیٹ کی طرف گیا تو میں اور صفدر قریبی کمرے میں گھس گئے۔ کمرے میں تاریکی تھی' ادھ کھلے دروازے میں سے ہم دونوں مصدق کی کارروائی دیکھنے لگے۔ وہ پجارو کے قریب کھڑا پجارو سوار سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پجارو میں بیٹھے ہوئے فرد یا افراد کو پہچانتا ہے یا نہیں۔۔۔ اسی دوران میں کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ٹیبل لیمپ روشن کیا پھر ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس پر رومال رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں "ہیلو" کہا۔

"کون؟" دوسری طرف سے بھاری بھرکم مردانہ آواز آئی۔

"ارشاد بول رہا ہوں۔" میں نے کھانستے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی! بندہ پہنچا کہ نہیں؟"

"کون؟"

"یار! وہی رجب جان۔"

ایک دم میرا دھیان پجارو سوار کی طرف چلا گیا۔ شاید میرا مخاطب اسی کی بات کر رہا تھا۔

میں نے کھانستے ہوئے کہا "ہاں ایک پجارو آئی تو ہے گیٹ پر۔"

"ہاں ہاں وہی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اس سے معاملہ طے کرلو۔ تھوڑا بہت ایڈوانس بھی دے دو۔ بندہ بالکل بھروسے کا ہے۔ صبح مجھے فون کرکے بتانا کیا بات ہوئی' باقی اور سناؤ فرزانہ والا معاملہ کیسا جا رہا ہے؟"

"بس وہ تو۔۔۔" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر ایک دم سلسلہ منقطع کردیا۔ دوسری طرف یہی سمجھا گیا ہوگا کہ اچانک لائن ڈراپ ہوگئی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھ سے بات کرنے والے کو میری آواز پر شک ہو۔

صفدر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں

اس کی نظروں کو نظر انداز کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ بجارو اب پورچ میں آچکی تھی۔ اندر سے ایک لمبا تڑنگا آدمی نکلا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ اس کے شانے بہت مضبوط اور چوڑے تھے۔ گلے میں سونے کی زنجیر دور ہی سے دمک رہی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں نے کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں اسے دیکھا ہوا ہے۔ وہ مجھے جرائم کی جانی پہچانی دنیا کا کوئی "سکہ بند" چہرہ دکھائی دیا۔ جیسے وہ میرے لیے اجنبی تھا یقیناً میں بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس کے علاوہ فون پر اطلاع دینے والے کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ رجب جان اور ارشاد ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور یہ ان کی پہلی ملاقات ہے۔

مصدق نے اسے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مصدق بھومتا لڑکھڑاتا میرے پاس واپس آیا۔ پتا نہیں وہ کس ترنگ میں تھا۔ حالانکہ سو روپیہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن وہ سو روپے کی نپ پر صدقے واری ہوا جا رہا تھا۔ اس نے جیب سے نوٹ نکال کر ایک بار پھر اسے چوما۔ تب بڑے ادب سے مجھے "آپ جناب" کا خطاب دیتے ہوئے بولا "کوئی رجب جان صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں۔"

یقینی بات تھی کہ مصدق ابھی تک چرس کے نشے میں دھت تھا اور مجھے ہی ارشاد احمد ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یقیناً آنے والے مہمان کو بھی وہ یہی بتا کر آیا تھا کہ ارشاد احمد صاحب گھر میں ہیں اور وہ انہیں لینے جا رہا ہے۔ چند لمحے بعد ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ رجب جان ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بارعب لہجے میں کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے فون پر مجھے تمہاری آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ تم رجب جان ہو نا...؟"

"جی ہاں۔ کل سیٹھی صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں پہلی فرصت میں آپ سے مل لوں۔"

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی ارشاد صاحب۔" رجب جان نے رسماً کہا۔ صفدر سے مصافحے کے بعد وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر ہم تینوں بیٹھ گئے۔ میں نے مصدق کو چائے لانے کو کہا۔

رجب جان کے چہرے پر قدرے حیرت نظر آئی۔ وہ جس سوسائٹی کا بندہ نظر آ رہا تھا وہاں چائے نوشی کو بچکانا شغل سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے کہا "ہم نے ابھی ڈرنکس لیے ہیں۔ اگر تم لینا چاہو تو منگوا لیتے ہیں۔ بہت اچھی شیمپین آئی ہے میرے پاس۔"

وہ مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے مصدق کو چائے کے علاوہ شیمپین کے لیے بھی کہا۔ پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ بظاہر مناسب حلیے اور لباس میں نظر آنے والا یہ شخص چھٹا ہوا بدمعاش اور خطرناک غنڈا ہے۔ وہ چند ماہ پہلے صوبہ سرحد سے اسلحہ لاتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور جیل کاٹ کر حال ہی میں رہا ہوا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم اصل موضوع پر آ گئے۔ رجب جان نے سگریٹ سلگا کر ڈرامائی لہجے میں پوچھا "آپ جس بندے کو "پار" کرانا چاہتے ہیں اس کو ذاتی طور پر جانتے تو ہیں نا...؟"

میں نے کہا "بالکل جانتا ہوں۔"

وہ بولا "پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ آپ میرے ذمے کس قدر مشکل کام لگا رہے ہیں۔"

"بڑے معاوضے مشکل کاموں کے لیے ہی دیے جاتے ہیں۔"

وہ مسکرایا تو اس کا دائیں طرف کا ٹوٹا ہوا دانت نمایاں ہو گیا "کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی نہیں کیے جا سکتے۔ بہرحال میں آپ کے لیے یہ کام ضرور کروں گا۔ اور میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھ کام کر کے مزہ آئے گا۔"

عجیب صورت حال تھی۔ میں ایک بندے کو قتل کرانے کے بارے میں کرائے کے قاتل سے بات کر رہا تھا اور مجھے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کسے قتل کرانا چاہتا ہوں۔ میں بڑے محتاط انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ اس معاملے کی ساری گرہیں رجب جان کی زبان سے ہی کھل جائیں۔ رجب نے بندے کو پار کرنے کی بات کی تھی' اس سے مطلب یقیناً یہی تھا کہ وہ کسی کو قتل کرنے کا ذکر کر رہا تھا۔ پھر رجب سے گفتگو کے دوران میں ایک دم مجھ پر اور صفدر پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ "مقتول" کون ہے!

رجب نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے آج کل بھیس بدل رکھا ہے؟"

"کس نے؟" میں نے پوچھا۔

"استاد جہانی نے" رجب نے کہا۔ اور یہی لمحہ تھا جب مجھ پر اور صفدر پر انکشاف ہوا کہ رجب اب تک کس کو پار کرنے کی بات کرتا رہا ہے۔ میں نے تیزی سے سنبھلتے ہوئے کہا "ہاں حلیہ تو اس نے واقعی بدل رکھا ہے۔"

"پھر شناخت کیسے ہوئی اس بدبخت کی؟"

"بس ہو گئی کسی طرح۔" میں نے کہا۔

"سنا ہے کہ آپ کے بندوں کے ساتھ اس کی کوئی

جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جہانی نے اپنا تعاقب کرنے والوں پر فائر کیے تھے اور لکشمی چوک میں ایک "موٹر" بھی الٹ گئی تھی۔"

"ہاں' یہ واقعہ کل ہوا تھا' لیکن لوڈ رانٹی میں تھی ابھی اس کا ناٹ ریسٹ ہوا تھا۔"

"جہانی استاد کا ٹھکانا تو معلوم ہے نا.... آپ لوگوں کو؟"

"آج صبح تک تو معلوم تھا' اب کا کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

صفدر بولا "عین ممکن ہے کہ اس نے گھر بدل لیا ہو۔"

رجب مسکرایا اور اس کا ٹوٹا ہوا دانت پھر نمایاں ہو گیا۔ طنزیہ لہجے میں بولا "گویا میرا یہ اندازہ درست ہے کہ آپ لوگ شاہ جہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے یا یوں کہہ لیں کہ بہت زیادہ نہیں جانتے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ خود پر ہونے والے ایک ناکام حملے سے ڈر کر یا اپنے تعاقب سے خوف زدہ ہو کر وہ اپنا ٹھکانا بدل لے گا تو آپ زبردست غلط فہمی میں ہیں۔ شاہ جہاں جیسے لوگوں کے لیے اس قسم کے واقعات روزمرہ کا معمول ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک میں شاہ جہاں کو جانتا ہوں وہ اس سے سوگنا دباؤ بھی آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔"

اپنے منہ پر اپنی تعریفیں سن کر عجیب سا لگ رہا تھا اور تھوڑا تھوڑا مزہ بھی آ رہا تھا' خاص طور سے صفدر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اب رجب کی گفتگو کسی حد تک ہماری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ یہ بات آہستہ آہستہ واضح ہو رہی تھی کہ ارشاد احمد ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر خطرناک شخص ہے۔ اس کے علاوہ دو باتیں مزید واضح ہوئی تھیں' پہلی تو یہ کہ ارشاد احمد کسی غیر قانونی اور گھناؤنے دھندے میں ملوث ہے اور اسے یہ شک پڑ گیا ہے کہ استاد جہانی یعنی میں اس کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ وہ مجھ سے بری طرح دہشت زدہ ہو گیا ہے اور رجب جان نامی کرائے کے قاتل سے میرا پتّا صاف کرانا چاہتا ہے۔

یہاں سوچنے کی بات تھی کہ ارشاد احمد کو یہ شبہ کیونکر ہوا کہ مجھے اس کے دھندے کی سن گن لگ گئی ہے اور میں اس کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ اس حوالے سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی۔ میں اور صفدر چند روز پہلے غزالہ کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک پر گئے تھے ہم میک اپ میں تھے اس کے باوجود ریچھ سی آنکھوں والے ایک شخص نے ہمیں تاڑ لیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ سارا چکر وہیں سے چلا تھا۔ غالباً اللہ دتا' ارشاد احمد اور اس کے کارندوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم دونوں ان کے دھندے کی ٹوہ میں کلینک تک آئے ہیں۔ وہ ایک دم "ریڈ الرٹ" ہو گئے تھے اور پیش بندی کے طور پر مجھے جسمانی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کے اس فیصلے سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی تھی اور وہ یہ کہ یہ بہت گہرا اور گمبھیر معاملہ تھا۔ اگر یہ کوئی چھوٹا موٹا چکر ہوتا تو عین ممکن تھا کہ مجھ سے خوف زدہ ہونے والے مجھ سے ٹکرانے کے بجائے مجھ سے کنی کترانے کا فیصلہ کرتے۔ اپنا دھندا سمیٹ کر کسی اور جگہ چلے جاتے یا اسی طرح کوئی اور طریقہ اختیار کرتے۔ لیکن ان کے ردِعمل سے ان کی طاقت اور ان کے سنگین ارادوں کا سراغ ملتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میری موجودگی کی تصدیق ہونے کے بعد وہ اپنے دھندے کے لیے معمولی سا رسک بھی لینا نہیں چاہتے اور قتل جیسے انتہائی اقدام پر آمادہ ہیں۔

رجب نے شیمپین کا پیگ چڑھانے کے بعد نیا سگریٹ سلگایا اور بولا "کراچی اور بمبئی میں ایک دو دفعہ شاہ جہاں سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ اس کی خوں خواری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ پرلے درجے کا سفاک اور بے رحم شخص ہے۔ جس کسی سے چمٹتا ہے بلا کی طرح چمٹتا ہے۔ جن دنوں میں بمبئی میں تھا ناجائز شراب کا دھندا کرنے والے ایک پنجابی سیٹھ سے اس کی ٹھن گئی تھی۔ کافی خون خرابا ہوا تھا سیٹھ نے سوگند کھائی تھی کہ وہ یہ دھندا جاری رکھے گا اور اگر وہ مر گیا تو اس کا بیٹا یہ کام کرے گا بمبئی کے کئی افسر لوگ پنجابی سیٹھ سے ملے ہوئے تھے' لیکن پھر ایک دن سیٹھ یوں بمبئی سے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کئی ماہ تک کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی' پھر ایک روز پتا چلا کہ سیٹھ زبردست مذہبی شخص بن گیا ہے اور امرتسر کے دربار صاحب میں معمولی خدمت گار کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔"

"ہاں یہ واقعہ تو میں نے بھی سنا ہوا ہے۔ اس سیٹھ کا نام امریش سنگھ تھا شاید۔" میں نے کہا "اور امریش کا اکلوتا بیٹا بھی اس ہنگامے میں ہلاک ہوا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی۔" رجب نے جواب دیا "اور یہ تو میں نے تمہیں صرف ایک مثال دی ہے۔ کیونکہ امریش سنگھ والا سارا واقعہ میرے سامنے ہوا تھا۔ اس طرح کی ایک سو ایک مثالیں موجود ہیں۔ کراچی' بمبئی' امرتسر اور جالندھر وغیرہ میں جرائم کے اڈوں پر ڈبل ایس کا ذکر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ہمارے خبرناموں میں روزانہ حکمرانوں کا ذکر ہوتا ہے۔"

"ڈبل ایس کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آپ لوگ جرم کے تالاب میں بسنے والے بڑے بڑے مگرمچھوں کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے ہو۔ ڈبل ایس کا لفظ عام طور پر شاہ جہاں اور شنکر شکرا عرف شنکر بھارتی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں خونی نام "ایس" سے شروع ہوتے ہیں۔ شاہ جہاں کی طرح شنکر شکرا بھی سفاکی اور خونریزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ دونوں آپس میں بھی سخت دشمن ہیں۔ میرے خیال میں شاہ جہاں اگر اپنے کسی دشمن کو گنتی میں لاتا ہے تو وہ یہی شنکر شکرا ہے۔"

میں اور صفدر پوری توجہ سے رجب کی باتیں سن رہے تھے اور حسب موقع حیرت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں معاملے کی بات بھی شروع ہو گئی۔ معاوضہ لے کر کسی کو قتل کرنے کے گھناؤنے فعل کو عموماً "سپاری اٹھانے" کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں رجب نامی یہ قاتل میرے نام کی سپاری اٹھانے کے لیے یہاں آیا تھا اور میرے ہی سامنے بیٹھ کر سپاری اٹھا رہا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے کا معاملہ مجھ سے ہی طے کر رہا تھا۔ یہ بڑی دلچسپ صورت حال تھی اور ایسی صورت حال سے میرا سابقہ پہلی دفعہ پڑا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہمیں یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اصلی ارشاد احمد کسی بھی وقت شادی کی تقریب سے واپس آجائے گا اور ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ ہوسکتا ہے چرسی ملازم مصدق علی کے حواس ہی بحال ہوجائیں اور وہ جو نشے کے عالم میں مجھے ارشاد احمد بنانے پر تلا ہوا ہے مجھے ارشاد احمد ماننے سے انکار کر دے۔ پھر راجی نامی لڑکی کی پریشانی بھی تھی۔ وہ ارشاد احمد کے بیڈ روم میں موجود تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

رجب کے ساتھ اپنے قتل کا معاملہ کافی بحث و تکرار کے بعد میں نے نو لاکھ میں طے کیا۔ "ایڈوانس" کوئی نہیں تھا، ساری رقم "کام" کے فوراً بعد ادا کی جانی تھی۔ اس سودے کے دوران میں رجب کے ساتھ ہم دونوں کی کافی بے تکلفی ہو گئی۔ درحقیقت یہ بے تکلفی میں نے جان بوجھ کر پیدا کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رجب کے اندر کی زیادہ سے زیادہ باتیں ہمارے سامنے آجائیں۔ میں رجب جان کو "یار رجب" کہہ کر پکارنے لگا، وہ بھی بے تکلفی سے مجھے ارشاد بھائی کہنے لگا۔ زیر زمین ہونے والے جرائم کی باتیں ہوئیں، شراب اور لڑکیوں کی باتیں ہوئیں، دولت کمانے کے نت نئے طریقوں کا تذکرہ ہوا۔ رجب پر اب شیمپین کا نشہ چڑھ چکا تھا اور وہ کھل کر باتیں کر رہا تھا۔

وہ ایک آنکھ میچ کر کہنے لگا "آپ کے مطلب کا کچھ مال میرے پاس بھی ہے، میں خود لے کر مڈل ایسٹ جانا چاہتا تھا لیکن اب اس شاہ جہاں والے معاملے کی ذمے داری اٹھالی ہے، اس کے علاوہ بھی کراچی میں ایک دو کام ہیں۔ شاید جا نہ سکوں۔ مال زیادہ دیر پڑا رہے تو مسئلہ بن جاتا ہے، بلکہ ایک دفعہ تو میرا آدھا مال پڑا پڑا ضائع ہو گیا تھا۔ سوچ رہا ہوں کسی کو فروخت کردوں۔ اگر آپ کو ضرورت ہے تو ایک نظر دیکھ لیں۔ مجھے یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔"

پتا نہیں تھا کہ رجب کس مال کا ذکر کر رہا ہے لیکن صورت حال کا تقاضا تھا کہ میں اس سے کوئی سوال نہ کروں اور ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔ میں نے کہا "ہاں۔ یہ سارے مسئلے تو پھر ہوتے ہی ہیں، ویسے مجھے تو اس وقت ضرورت نہیں۔ نہ ہی اتنی گنجائش ہے کہ پے منٹ کر سکوں۔ تم کسی اور پارٹی سے بات کرلو۔"

"اگر پے منٹ کی بات ہے تو معاملہ طے کرلیتے ہیں۔"

رجب نے شیمپین کا پیگ چڑھاتے ہوئے کہا "دس فی صد ایڈوانس کردیں، باقی ایک مہینے میں دے دیں۔"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "ٹھیک ہے، اگر تم اصرار کرتے ہو تو پہلے مال دکھاؤ، پھر بات کریں گے۔"

وہ بولا "کسی بھی وقت غریب خانے پر حاضر ہوجائیں۔"

صفدر نے کہا "اگر دیکھنا ہے تو پھر ابھی دیکھ لیتے ہیں۔ بعد میں تین چار دن تو شاید فرصت نہ ملے۔"

"کہیں جانا ہے آپ کو؟" رجب نے پوچھا۔

"ہاں سنگاپور میں تھوڑا سا کام ہے۔" میں نے کہا۔

رجب بولا "تو پھر کل صبح ہی آجائیں۔ بلکہ اگر مناسب سمجھیں تو ابھی چلے چلیں میرے ساتھ۔ ابھی کوئی اتنی رات تو نہیں ہوئی۔"

"جانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھی صاحب نے آپ کو میرا ایڈریس دیا تو تھا۔"

"اچھا اچھا۔" میں نے جلدی سے کہا "مال وہیں پڑا ہے؟"

"جی ہاں۔ نیچے کافی بڑا بیسمنٹ ہے۔ اور محفوظ بھی بہت ہے۔"

"کوالٹی کیسی ہے مال کی؟" میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں تیر پھوڑا۔

"بالکل اے ون اور فریش۔ طبیعت خوش ہوجائے گی آپ کی۔"

میں چاہتا تھا کوئی ایسی بات رجب کے منہ سے نکلے کہ مال کی نوعیت کا پتا چل جائے لیکن وہ ہر بات ڈھکے چھپے انداز میں کر رہا تھا، یا شاید اس کا انداز ہی یہی تھا۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ منشیات کی بات کر رہا ہے، کبھی نوادرات وغیرہ کا شبہ ہوتا تھا۔ یقیناً میری طرح صفدر بھی چکر میں پڑا ہوا تھا لیکن اس نازک موقع پر ہم کوئی ایسا سوال نہیں کر سکتے تھے جس سے رجب کو ہم پر کسی طرح کا شبہ ہوتا اور وہ بدک جاتا۔

صفدر نے کہا "مسٹر رجب! ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں۔ خراب مال ہم نہیں اٹھائیں گے۔ سیٹھی صاحب جانتے ہی ہیں ہم نے کوالٹی پر آج تک سمجھوتا نہیں کیا۔"

"اس کے بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں آپ کو ایک ایک پیس چیک کراؤں گا۔ اگر کسی پر ذرا سا بھی شک ہو تو آپ چھوڑ دیں۔ میں تو خود اس معاملے میں بڑا سخت مزاج ہوں۔" اس کے بعد اس نے اپنے کسی "ہم پیشہ" کو بہن کی غلیظ گالی دی اور اس کے بارے میں انکشاف کیا کہ وہ پرلے درجے کا بددیانت اور فراڈیا ہے۔ اور صرف اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی بدنام ہو رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس شخص کا نام رجب نے فرانسس بتایا۔

ہمارے پاس وقت کم تھا۔ اس چار دیواری میں زیادہ دیر رکنا ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہیں تھا۔ میں اور صفدر، رستم خاں کے رکشے پر سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے، رکشا اب واپس جا چکا تھا۔ اب ہمیں رجب کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر جانا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ ارشاد احمد اپنی گاڑی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے رجب سے بہانہ بنایا کہ میرے ڈرائیور کو اپنے ایک قریبی عزیز کی شادی پر جانا تھا لہٰذا وہ گاڑی لے گیا ہے۔ رجب فراخ دلی سے بولا "کوئی بات نہیں بھائی ارشاد! میں آپ کو اپنی گاڑی پر چھوڑ جاؤں گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چرسی ملازم مصدق نشے کی زیادتی کے سبب کوریڈور میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دیکھا، بے ہوشی کی حالت میں وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ شاید آلو بینگن کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں لڑکی ابھی تک میرے انتظار میں تھی۔ انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے اس نے ایک میگزین کھول رکھا تھا۔ بظاہر اس کی نگاہیں میگزین کے صفحات پر ٹکی تھیں لیکن چہرے سے عیاں تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور ہے۔ یقیناً وہ بے نام اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی جوانی اور خوب صورتی کو ایک طشتری میں سجا کر یہاں لائی تھی۔ لیکن اسے انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ امتحان سے گزر جاتی تو اور بات تھی لیکن وہ انتظار کے امتحان سے گزر رہی تھی۔ اس نے مجھے کمرے میں آتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے ایک بہت ضروری کام کے لیے جانا پڑ رہا ہے۔ اس سے پھر ملاقات ہوگی۔

وہ ایک دم روہانسی ہو گئی۔ ساری امیدیں، سارے خواب جیسے ایک دم دھندلا گئے تھے۔ کمزور آواز میں بولی "اگر آپ۔۔۔ جلدی آجائیں گے تو میں آپ کا انتظار کرلیتی ہوں۔"

میں نے کہا "مجھے دیر ہوجائے گی۔ بہتر ہے کہ تم گھر چلی جاؤ۔"

"مگر۔۔۔"

مجھے ایک دم اس پر طیش آگیا۔ میں نے غصیلی سرگوشی کی "تم بے حد بے وقوف لڑکی ہو۔ اپنی زندگی اور عزت کو داؤ پر لگا رہی ہو۔ میں تم پر ترس کھا کر تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں ارشاد احمد نہیں ہوں۔ میرا تعلق پولیس سے ہے۔ ارشاد کی سخت کم بختی آنے والی ہے، اگر آئندہ تم ارشاد کے آس پاس نظر آئیں تو ساتھ ہی لپیٹی جاؤگی۔"

لڑکی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو محسوس ہوا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ یہاں سے نکل جائے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔ اس کے فوراً بعد میں نے رجال ساہی صاحب کو فون کیا۔ وہ تو نہیں ملے لیکن ان کا پرانا ڈرائیور حیات محمد مل گیا۔ حیات محمد ساہی صاحب کے لیے بے حد بھروسے کا آدمی تھا۔ میں نے حیات محمد کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ میں نے اسے زریں گل کا ایڈریس دیا اور کہا کہ وہ زریں گل کو میری یہ ہدایت پہنچا دے کہ زریں گل اور اس کی بیوی فوراً اپنا ٹھکانا بدل لیں۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہم رجب کی پجارو گاڑی میں سوار لاہور کے مضافات میں واقع ایک وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے۔ کوٹھی کے چاروں طرف آم، امرود اور لیچی کے باغ تھے۔ دریائے راوی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں کھجور کے درخت بھی کثرت سے نظر آ رہے تھے۔

کوٹھی کے پورچ میں چار عدد نہایت جسیم ہاؤنڈ نسل کے کتے موجود تھے۔ دیواریں اونچی تھیں اور ان پر کانچ کے ٹکڑے بڑے اہتمام سے لگائے گئے تھے۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر ایک خطرناک صورت گن مین چوکس کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر پجارو کا دروازہ کھولا اور ہم دونوں رجب کے ساتھ ایک ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ایک خوب صورت لڑکی نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ وہ رجب کی رکھیل ہے۔ وہ چست پتلون قمیص پہنے ہوئے تھی اور رجب کو بڑے تواتر سے ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ اگر ہم کمرے میں موجود نہ ہوتے تو وہ ابھی بے تکلفی سے رجب کی گود میں بیٹھ جاتی۔

"ڈرنک لیں گے۔" لڑکی نے ہم سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے ہم مال دیکھ لیں۔" میں نے رجب سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ ہمیں لے کر کوٹھی کے وسیع و عریض بیسمنٹ میں اتر گیا۔ یہ جگہ خوب صاف ستھری تھی۔ سیلن اور تہ خانوں کی مخصوص بو یہاں بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ابھی تک ہمیں مطلق اندازہ نہیں ہوا تھا کہ رجب ہمیں کون سا مال دکھانا چاہ رہا ہے۔ رجب کسی ماہر سوداگر کی طرح مسلسل بولے چلا جا رہا تھا "دیکھیں جی' مال کبھی بھی مہنگا نہیں ہوتا' بس اس کی ڈیمانڈ ہونی چاہیے۔ میں نے آج تک گھٹیا مال خریدا ہی نہیں۔ بیس دانوں میں سے تین چار بھی خراب نکل آئیں یا ضائع ہو جائیں تو ٹوٹل انویسٹ کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ پھر ساکھ علیحدہ خراب ہوتی ہے۔ میرا تو اس بات پر یقین ہے' بے شک چھ مہینے فارغ بیٹھے رہو لیکن کام اس وقت ہی کرو جب مال اچھا ملے۔ اب جو کھیپ میں آپ کو دکھا رہا ہوں یہ ساری کی ساری چنی ہوئی ہے۔ اصل پنجاب کا مال ہے۔ اس کو ہم سپر کرنل کہتے ہیں۔"

"سپر کرنل تو چاول کی قسم ہے۔" صفدر نے کہا۔

"اس کو بھی چاول ہی سمجھو جی۔ خوب لمبا' موٹا تازہ' سڈول اور چمکدار۔ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم ایک طویل راہداری سے گزرے۔ رجب نے "اصل پنجاب کا مال" کہا تھا۔ ان الفاظ سے مجھے ایک شبہ ہو رہا تھا۔ اس شبے کی بھول بھلیوں میں الجھا میں ایک کوریڈور میں پہنچ گیا۔ ایک کھڑکی میں سے مجھے ایک ہال نما کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ دو تپائیوں کے سوا کسی قسم کا فرنیچر نظر نہیں آ رہا تھا۔ قریباً بیس عدد افراد یہاں موجود تھے۔ یہ قریباً سب کے سب نوجوان تھے۔ ان میں سے کچھ نے پتلون قمیص اور کچھ نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ہال نما کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کچھ سامان پڑا تھا۔ یہ سفری بیگ اور اٹیچی کیس وغیرہ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سامان کمرے میں موجود افراد کا ہے۔ ایک طرف کیرم بورڈ رکھا تھا۔ سات آٹھ نوجوان اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ وڈیو پر انڈین فلم لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے بالکل قریب دو نوجوان قالین پر ہی سو رہے تھے۔ وہ شکل و صورت اور لباس سے لاہور یا آس پاس کے کسی علاقے کے لگتے تھے۔

"کیسا لگا مال؟" رجب نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میرے دماغ میں زلزلہ سا جاگ گیا تھا۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اب تک رجب جس مال کا ذکر کرتا رہا ہے وہ کوئی بے جان جنس نہیں ایک زندہ جنس ہے۔ وہ اشرف المخلوقات حضرت انسان ہے۔ صفدر کے بظاہر پُرسکون چہرے کے پیچھے بھی تحیر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہی وہ نوجوان افراد تھے جن کے لیے رجب بڑی رسان سے مال۔۔۔ دانے۔۔۔ اور کھیپ جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں نیم تاریکی تھی۔ ہال نما کمرا خوب روشن تھا اور وہاں کا منظر ہمیں بہ آسانی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے برعکس ہال نما کمرے کے افراد خصوصی کوشش کے بغیر ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ سارے نوجوان کافی خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ ان کی صحت بھی اچھی تھی۔ وہ سب کے سب لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ بالکل جیسے وسطی پنجاب لاہور' فیصل آباد' سیالکوٹ اور گجرات وغیرہ کے لوگ ہوتے ہیں۔

رجب کاروباری انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "۲۰ بندوں میں سے چنے ہوئے بندے ہیں۔ سب کے سب نمبر ون۔۔۔ محنتی اور صحت مند۔ کوئی ہوشیاری چالاکی نہیں۔ آپ لوگ انہیں بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں۔"

"خیر ایسی بھی بھیڑ بکریاں نہیں ہیں۔ ان میں کئی ایک مجھے رستم ہوتے ہیں۔ ایک کھیپ میں ایسا تجربہ ہو چکا ہے مجھے۔"

رجب بولا "آپ کا تجربہ بے شک مجھ سے زیادہ ہوگا' لیکن کام تو میں بھی یہی کرتا ہوں نا۔۔۔۔" "مال" کو چرے میرے سے نہ بچاتا تو پھر کیا کیا۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگا "آئیں

اندر آئیں۔ بات چیت کر کے دیکھیں ان سے۔"

وہ آگے بڑھ کر ہال نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اور صفدر بھی اس کے پیچھے اندر گئے۔ نوجوانوں نے رجب کو سلام کیا۔ کئی ایک اپنی جگہ سے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ رجب نے میرا اور صفدر کا تعارف کراتے ہوئے کہا "دوستو! یہ دونوں صاحبان میرے پارٹنر ہیں۔ کل ہی امریکا سے آئے ہیں۔ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے تھے۔"

میرے سامنے کھڑے ہوئے دو نوجوان بڑے رشک سے مجھے دیکھنے لگے۔ اور رشک کیوں نہ کرتے وہ مجھ پر۔۔۔؟ میں امریکا سے ہو کر آیا تھا۔ اس ملک سے پلٹا تھا جسے بعض لوگ جنت ارضی کہتے ہیں اور جہاں پہنچنے کے خواب آنکھوں میں سجا کر زندگی بھر کانٹوں پر چلتے رہتے ہیں۔ میرے اردگرد موجود نوجوانوں کی آنکھوں میں بھی ایسے ہی خواب نظر آ رہے تھے۔ کسی کی آنکھوں میں بہنوں کی شادی کا خواب تھا۔ کوئی آنکھ قرضے سے نجات کا خواب دیکھ رہی تھی' کسی آنکھ میں شادی اور خوش حال زندگی کا خواب تھا۔ کسی آنکھ میں اپنی "محبت" حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ یہ نوجوان نجانے کس کس شہر سے اور کس کس گلی سے اٹھ کر آئے تھے۔ اپنے پیاروں سے منہ موڑ کر اپنے وطن کی خاک کو چھوڑ کر دور دیس جانے کے لیے آمادہ تھے۔ اپنے خون پسینے سے پاؤنڈ اور ڈالر کما کر اپنی ریزہ ریزہ زندگی کو جوڑنا چاہتے تھے۔ میں چشم تصور سے ان نوجوانوں کے بوڑھے والدین کو دیکھ سکتا تھا۔ اس ماں کو دیکھ سکتا تھا جو مصلے پر بیٹھی اپنے بیٹے کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس خمیدہ کمر باپ کو دیکھ سکتا تھا جس نے اچھے دنوں کی آس کے عوض اپنا گبرو بیٹا فاصلوں کے سپرد کیا تھا۔۔۔ اور اب وہ بیٹا اور اس کی طرح کے اور بہت سے بیٹے ایک ایسے شخص کی تحویل میں تھے جو انہیں "مال" کہہ رہا تھا اور ان کا بھاؤ تاؤ کرنے کی فکر میں تھا۔

میں نے بھوری آنکھوں اور مضبوط کاٹھی والے ایک لڑکے سے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟"

وہ سوالیہ نظروں سے رجب کو تکنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ جواب میں زبان کھولے یا نہ۔۔۔ رجب نے کہا "ہاں ہاں بھئی۔ بتاؤ انہیں۔ یہ تم لوگوں سے بات چیت کرنے ہی تو آئے ہیں۔"

نوجوان لڑکے نے کہا "میرا نام ابرار ہے۔ میں جہلم سے آیا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"کینیڈا۔۔۔ جی۔" ابرار نے ذرا شرما کر جواب دیا۔

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان. ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۳

"کیوں چھوڑ رہے ہو اپنا وطن؟"

"بس جی' خوشی سے کون چھوڑتا ہے۔ گھر میں غریبی ہے۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں بن بیاہی بیٹھی ہیں' ان کی شادیاں... ماں ساری زندگی کرائے کے گھر میں رہی ہے اور اپنے گھر کا خواب دیکھتی رہی ہے۔ اس کی یہ خواہش بھی پوری کرنی ہے۔"

"کیا خیال ہے تمہارا کینیڈا جانے سے تمہاری یہ خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔"

"کیوں نہیں ہوں گی جی۔ وہاں جان مار کر کام کریں گے اور پیٹ کاٹ کر پیسہ جمع کریں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم کس کس طرح وہاں جا رہے ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھیں ویزے کی رقم جمع کرانے کے لیے گھر کی چیزیں تک بیچنی پڑی ہیں مجھے۔ آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس کس کے آگے ہاتھ پھیلایا ہے۔"

میں ان نوجوانوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ لاہور کے نوجوان دو تین ہی تھے' باقی سب چھوٹے شہروں اور مضافات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم واجبی سی تھی۔ بہت سوں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بیرون ملک جا کر ہر طرح کا کام کرنے پر آمادہ تھے۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ اگلے پانچ چھ روز کے اندر وہ کینیڈا میں ہوں گے' اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے جو آج تک صرف فلموں اور تصویروں میں دیکھتے آئے ہیں اور جس کے فسانے لوگوں سے سنتے آئے ہیں' انہیں یہ بھی اعتماد تھا کہ انہیں کینیڈا بھجوانے والے کینیڈا میں انہیں چھوٹے موٹے جاب ڈھونڈنے میں بھی مدد دیں گے۔ جب ایک بار انہیں جاب مل جائیں گے تو پھر سارے دلدر خود بخود دور ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک دو سال کے اندر وہ نہ صرف اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بلکہ اس قابل بھی ہو جائیں گے کہ اپنے عزیز و اقارب کو کینیڈا بلوانے کا سوچ سکیں۔

ان لوگوں سے ملنے کے بعد ہم کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ رجب کی خوب رو رکھیل ایک صوفے پر نیم دراز سو رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا ایلیشین کتا اس کی گود میں تھا۔ ہماری آہٹ سن کر وہ اٹھ بیٹھی اور کتے کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہمارے اور رجب کے درمیان معاملے کی بات چیت شروع ہوئی۔

رجب نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا "دیکھیں جی وہ استاد جمالی والا معاملہ بالکل الگ ہے۔ ہمارے اس سودے کا اس معاملے پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔"

میں نے کہا "بھئی وہ معاملہ تو طے ہے۔ موجودہ معاملے میں بھی کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے۔ یہ تو من مرضی کی بات ہے۔ تمہارا مال ہے تم جو چاہو قیمت لگاؤ۔ ہماری سمجھ میں آئے گا تو ہم مال اٹھالیں گے' ورنہ کوئی اور سبب لگ جائے گا تمہارا۔"

وہ بولا "دیکھیں جی' مال آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب جو مناسب ہے وہ آپ خود ہی بتا دیں۔ آپ سے کون سی بات ڈھکی چھپی ہے۔"

"نہیں رجب... تمہاری چیز ہے تم بتاؤ۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بولا "آپ کے ساتھ پہلا سودا ہے' میں چاہتا ہوں کہ ہم آئندہ بھی کام کریں۔ اس تعلق کو بنانے کے لیے میں تھوڑا بہت گھاٹا برداشت کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ آپ ایسا کریں کہ فی بردہ ۵۷ ہزار روپیہ دے دیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس قیمت پر آپ کو ایسا بردہ کہیں سے نہیں ملے گا۔"

بردے کا لفظ میں پہلی بار رجب کی زبان سے سن رہا تھا۔ بردے کا مطلب عام طور پر بندہ یا غلام لیا جاتا ہے۔ اسی لفظ سے ایک اور معروف لفظ بردہ فروش بھی بنتا ہے۔ میں اپنے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر رجب کی صورت میں ایک بردہ فروش کو دیکھ رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ غلاموں کی سوداگری کا دور بیت چکا ہے لیکن میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے غلام دیکھے تھے اور اب ان کے سوداگر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ سوداگر مجھ کو بھی اپنے ہی جیسا ایک سوداگر سمجھ رہا تھا اور ایک کھیپ کا بھاؤ تاؤ کرنا چاہ رہا تھا۔

میں نے کہا "۵۷ ہزار تو بہت زیادہ ہیں۔ آج سے صرف دو ماہ پہلے میں نے اس سے بہتر کوالٹی کا مال اس سے نصف قیمت پر خریدا ہے۔"

رجب ہنستے ہوئے بولا "رشلو بھائی! یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ مال خریدنے سے زیادہ مشکل کام مال کو اس کے اصل ٹھکانے تک پہنچانا ہے۔ کھیپ میں اگر ایک بردہ بھی ہوشیار چالاک ہو تو ہر وقت پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ پچھلے سے پچھلے مہینے کراچی کے اسحاق جالندھری کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ صرف ایک چالاک بردے کی وجہ سے پوری لانچ میں بغاوت ہو گئی تھی۔ جالندھری کا بھائی مارا گیا' وہ خود زخمی ہوا۔ بردے بھی گئے اور ۲۵لاکھ کی لانچ بھی پولیس کے قبضے میں گئی۔"

"ہوشیاری چالاکی کسی کی پیشانی پر تو نہیں لکھی

ہوتی۔" صفدر نے کہا۔

"لکھی ہوتی ہے بھائی' لکھی ہوتی ہے۔ صرف پڑھنے والی آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"یار! اتنے گاؤدی ہم بھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا "بڑا بڑا ہوشیار بردہ دیکھا ہے اور بڑا بڑا تیز طرار بھی۔ تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ ہم مال کو منزل تک کیسے پہنچائیں گے تم صرف مال کی بات کرو۔"

وہ بولا "اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کو سستا مال دکھا دیتا ہوں۔ آپ پینتیس چالیس ہزار کی بات کر رہے ہیں' میں آپ کو بیس ہزار میں دے دیتا ہوں۔"

"بیمار اور مریل چوہوں کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔" صفدر نے کہا۔

"بیمار اور مریل نہیں بالکل صحت مند ہیں۔ دو لڑکیاں بھی ہیں ان میں۔"

"کوئی نہ کوئی مسئلہ تو ہوگا ان کے ساتھ؟" میں نے کہا۔

"مسئلہ وہی ہے جو آپ کو بتایا ہے' انہیں سپلائی کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ سب کے سب خوف زدہ اور ڈرے ہوئے بردے ہیں۔ کسی پولیس والے یا کوسٹ گارڈ کی نگاہ بھی پڑ گئی ان پر تو اسے پتا چل جائے گا کہ یہ اغوا شدہ لوگ ہیں... لانچ پر بٹھایا جائے گا تو چیخ و پکار شروع کر دیں گے' اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"یار! تم یہ باتیں چھوڑو۔" میں نے قطع کلامی کی "تمہاری طرح یہ سارے پاپڑ ہم نے بھی بیل رکھے ہیں۔ وہ بردے اگر تمہارے پاس ہیں تو دکھاؤ۔ اگر ہماری سمجھ میں آئے گا تو ان کی بات بھی کر لیں گے۔"

"تو آئیں پھر۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میرے اور صفدر کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ ہم اپنی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ ہماری بول چال اور نشست و برخاست وغیرہ ہمارے کرداروں کے عین مطابق تھی۔ رجب ہمیں ایک طویل راہداری میں چلا کر بیسمنٹ کے بالکل عقبی حصے میں لے گیا۔ یہاں سے سیڑھیاں مزید نیچے جاتی تھیں۔ یعنی تہ خانے کے نیچے پھر ایک تہ خانہ تھا۔ اس تہ خانے کا داخلی راستہ لکڑی کے ایک موٹے دروازے سے بند کیا گیا تھا۔ دروازے پر پیتل کا مضبوط قفل پڑا تھا۔ قفل کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں ہمیں جیل کی طرز کی تین چار بیرکیں نظر آئیں۔ ایک بیرک میں کئی افراد بند تھے۔ ان کے چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ جسموں پر بوسیدہ کپڑے تھے۔ کئی ایک صرف پتلون اور بنیان میں نظر آ رہے تھے۔ ان نیم عریاں افراد کے جسموں پر ایسے نشانات تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں چھڑی یا بید وغیرہ سے ضربیں لگائی جاتی رہی ہیں۔ یہ افراد خوراک کی کمی کا شکار بھی نظر آتے تھے۔ میں نے گنا ان کی تعداد بائیس تھی۔ عمریں بیس اور اٹھائیس سال کے درمیان ہوں گی۔ ان میں لڑکی کوئی نہیں تھی۔ شاید جن دو لڑکیوں کا ذکر رجب نے کیا تھا انہیں علیحدہ رکھا گیا تھا۔ رجب کو دیکھتے ہی بیرک میں بند افراد کی آنکھوں میں خوف کے آثار نظر آنے لگے۔

اس بیرک کے قریب ایک ہٹا کٹا اور کفل بردار پہرے دار موجود تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سیاہ اور چہرے پر سفاکی جھلک رہی تھی۔ رجب کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بالکل چوکس کھڑا ہو گیا تھا۔ رجب نے بڑی بے پروائی سے بیرک کا قفل کھلوایا۔ دیوار کے ساتھ بید کی ایک لمبی چھڑی رکھی تھی اس نے چھڑی ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر بیرک کے اندر داخل ہو گیا۔ بیرک کے تمام قیدی ڈرے ڈرے انداز میں ایک طرف سمٹ گئے۔ یہ بڑا عجیب منظر تھا۔ یوں لگا جیسے ہم کسی قدیم دور میں چلے گئے ہیں اور کوئی سفید فام آقا ہنٹر لے کر حبشی غلاموں کے باڑے میں داخل ہوا ہے۔ میں اور صفدر دیکھ رہے تھے کہ قیدیوں کے تاثرات عجیب سے ہیں۔ شدید خوف کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کی نفرت بھی پائی جا رہی تھی۔ نجانے کیوں ان لمحات میں وہ بائیس افراد مجھے انسانوں سے زیادہ جانور دکھائی دیے۔ ان قیدیوں کا تعلق کسی ایک علاقے سے نہیں تھا۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے قیدی بھی ان میں شامل تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے سر مونڈ دیے گئے تھے۔ چند افراد کی بھویں بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ شاید یہ عمل کسی سزا کا نتیجہ تھا۔

"چلو قطار بناؤ۔" رجب نے بید کی چھڑی ہوا میں لہرائی۔

چھڑی کی "شائیں" نے قیدیوں کے چہرے زرد کر دیے۔ وہ جلدی سے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے دیوار کی طرف تھے۔

"کپڑے اتارو۔" رجب نے دوسرا حکم دیا۔

وہ سب جلدی جلدی کپڑے اتارنے لگے۔ ان کے انداز سے بدحواسی عیاں تھی۔ جیسے وہ ڈر رہے ہوں کہ اگر ذرا سی بھی دیر ہو گئی تو کپڑوں میں آگ لگ جائے گی۔ چند ہی لمحے بعد وہ سب کے سب عریاں کھڑے تھے۔ رجب جواب طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے توقع کر رہا ہو کہ میں

اس کے "مال" کی کوالٹی کے بارے میں کوئی رائے دوں گا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال میں کیا کہوں۔

رجب نے ایک نوجوان کی کمر پر چھڑی کی نوک ٹکائی' یہاں چند ہفتے پرانا ایک زخم نظر آرہا تھا۔ غالباً گولی کا زخم تھا۔ جسم سے گولی نکالنے کے بعد ٹانکے لگائے گئے تھے۔ رجب بولا "بس اس بردے کی پیٹھ پر یہ زخم ہے۔ یہ بھی اب ٹھیک ہو رہا ہے۔ باقی کسی کے بندے پر نشان تک نہیں۔ آپ خود چیک کر سکتے ہیں' کوئی بیماری' کوئی مسئلہ نہیں۔" پھر اس نے قیدیوں سے مخاطب ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا "میری طرف گھوم جاؤ۔"

وہ سب کے سب ایک ساتھ ہماری طرف گھوم گئے "ٹانگیں کھولو" رجب نے حکم جاری کیا۔ سب نے ٹانگیں اس طرح کھول دیں کہ دونوں پاؤں کے درمیان قریباً چار فٹ کا فاصلہ پیدا ہو گیا۔ وہ بے چارگی کی جیتی جاگتی تصویر نظر آرہے تھے۔ رجب چھڑی سے قیدیوں کی رانوں کو چھوتے ہوئے بولا "دیکھ لیں جی' کوئی خارش' دَنی زخم' کوئی تکلیف نہیں۔"

میں حیران ہو رہا تھا۔ یہ بائیس افراد اگر ایک دم ہم پر پل پڑتے تو ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ مسلسل تشدد نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر چھوڑا تھا۔ اپنے ہی جیسے آدم زادوں کی یہ تذلیل دیکھ کر دل گھبرانے لگا۔ میں صفدر کے ساتھ باہر آگیا۔ رجب نے بھی قیدیوں کو کپڑے پہننے کا حکم دیا اور ہمارے پیچھے ہی پیچھے باہر نکل آیا۔

میں نے کہا "رجب! تم بتا رہے تھے کہ دو لڑکیاں بھی ہیں ان بردوں کے ساتھ۔"

"ہاں۔ انہیں علیحدہ رکھا گیا ہے۔ آئیں میں دکھاتا ہوں۔"

ہم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی بیسمنٹ میں پہنچے۔ یہاں ایک کمرے میں دونوں لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک پلنگ پر بیٹھی سویٹر بُن رہی تھی۔ دوسری لیٹی ریڈیو سن رہی تھی۔ دونوں کے جسم تو بے شکن تھے مگر ان کے لباس بوسیدہ تھے اور اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح وہ بھی ڈری سہمی نظر آتی تھیں۔ جونہی رجب کمرے میں داخل ہوا دونوں جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف اور بے چارگی کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے ایک خاص چیز نوٹ کی۔ دونوں لڑکیوں کی آنکھیں گہری براؤن اور بال سیاہ تھے۔ دونوں نہ صرف متوازن جسم کی تھیں بلکہ کافی خوب صورت بھی تھیں۔ دونوں کے قد لانبے اور گردنیں صراحی دار تھیں وہ جیسے دو خوش نما مورتیوں کی طرح ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔ رجب نے کمال بے تکلفی سے ایک لڑکی کے بال مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ میرے عین سامنے کرتے ہوئے بولا "آپ نے ان دونوں کی آنکھیں دیکھیں۔ گہری براؤن آنکھوں کے ساتھ عموماً بال بھی براؤن یا شہد رنگ ہوتے ہیں۔ لیکن براؤن آنکھوں کے ساتھ مکمل سیاہ بال کم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ کئی لوگ اس قسم کے چہروں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جس طرح او نیگیٹو خون مشکل سے ملتا ہے اسی طرح براؤن آنکھوں کے ساتھ سیاہ بال بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ وہ ساری خوبیاں بھی ڈھونڈنی پڑتی ہیں جو ایک خوب صورت عورت میں ہونی چاہئیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لڑکیوں کی یہ جوڑی کتنی مشکل سے ملی ہو گی۔"

"یہ آرڈر کا مال ہے؟" میں نے پوچھا۔

رجب نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک لڑکی کی نائٹی اس کے گھٹنے تک اٹھا کر اس کی پنڈلی دکھائی اور بولا "دیکھیں یہی شفاف جلد ہے' جیسے پالش کر رکھی ہو۔ ابھی تو یہ بند گی پڑی ہیں۔ ذرا کھلی ہوا میں نکلیں' کھائیں پئیں تو ایسی تازگی آئے ان پر کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔" وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے لڑکیوں کے بجائے نایاب جانوروں کی جوڑی کی بات کر رہا ہو۔

اس کے بعد رجب نے ڈری سہمی لڑکیوں کو وہی حکم دیا جو اس سے پہلے بیرک میں بند مردوں کو دیا تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھ اپنے لباس کی طرف بڑھے۔ لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا تھا۔ میں نے رجب سے کہا "بس رہنے دو ٹھیک ہے۔ ان کی جوانیاں تو کپڑوں کے اندر سے بھی چیخ چلا رہی ہیں۔"

رجب نے لوفرانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کا ٹوٹا ہوا دانت اس کی ہنسی کو کچھ اور بدصورت بنا گیا۔ ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ رائفل بردار محافظ نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکیاں بلوچی ہیں اور کسی دور دراز علاقے کی رہائشی ہونے کی وجہ سے اردو نہیں سمجھتیں۔ مجھے یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ شاید وہ آپس میں کزن یا رشتے دار ہیں۔

صفدر نے رجب سے پوچھا "تمہیں یہ بردے ملے کیسے؟"

رجب کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ آنکھیں نچا کر بولا "یہ وہی بردے ہیں جو تین ماہ پہلے اسحاق جالندھری کی لانچ سے فرار ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بندے کو پشت پر اسحاق کی گولی بھی لگی تھی۔ اس زخمی کو ابھی تم نے دیکھا بھی ہے۔"

اپنی دانست میں رجب نے ہم پر ایک بڑا انکشاف کیا تھا۔ ہم دونوں نے ضروری سمجھا کہ اپنے چہروں پر خاطر خواہ حیرت سجالیں "لیکن یہ تمہارے پاس کیسے پہنچے؟" میں نے پوچھا۔

رجب بولا "یہ لوگ ساحل کے ساتھ ساتھ مکران کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک مکرانی سردار نے انہیں پکڑ لیا۔ اس وقت ہمارا ایک بندہ بھی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے قبائلی سردار سے بات کی اور یہ بردے خرید لیے۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ یہ وہی بردے ہیں جو اسحاق جالندھری کی لانچ سے فرار ہوئے تھے۔ اسحاق جالندھری زخمی تھا اور پولیس کے ڈر سے روپوش تھا۔ کوئی تین ہفتے بعد اس کے ساتھ میرے کارندے کی ملاقات ہوئی۔ کارندے نے ساری بات اسے بتائی' اور یہ اطلاع بھی دی کہ اس کے مفرور بردے ہمارے پاس ہیں۔ جالندھری ان دنوں بڑا مایوس تھا۔ وہ کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ دن کہیں آرام سے روپوش رہ کر گزارے۔ اس نے ہم سے کچھ رقم وصول کر لی کچھ رقم مکرانی سردار نے اسے دے دی۔ یوں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اگر آپ اپنے طور پر اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تصدیق کرنے کی کیا ضرورت ہے' تمہاری زبان ہی کافی ہے۔ بہرحال تم اس مال کا لو گے کیا؟"

وہ بولا "چلیں ایسا کرتے ہیں یہ معاملہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ جو مناسب سمجھیں دے دیں۔ ہاں لڑکیوں کی بات علیحدہ کر لیں۔ میں آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا ہوں۔ خدا گواہ ہے' میں نے مکرانی سردار کو ان لڑکیوں کا ڈیڑھ لاکھ فی کس دیا تھا۔ اس کے بعد پچاس ہزار روپے فی کس اسحاق جالندھری کو بھی دینا پڑا۔ پچھلے ڈھائی ماہ کا خرچا وغیرہ ڈال لیا جائے تو ایک لڑکی قریباً سوا دو لاکھ میں گھر پڑ رہی ہے۔"

صفدر نے کہا "رجب! یہ تو تم خالص سوداگروں والی باتیں کر رہے ہو۔ یہ لڑکیاں اس کھیپ میں شامل ہیں۔ ان کا معاملہ اس کھیپ کے ساتھ ہی طے کرنا ہو گا۔"

"بے شک یہ کھیپ میں شامل ہیں' لیکن میں نے آپ دونوں کو بتایا ہے نا... کہ یہ آرڈر کا مال ہے۔ ایسا مال ڈھونڈنے میں جان جوکھم میں ڈالنا پڑتی ہے۔"

"لیکن اب تو یہ آرڈر کا مال نہیں ہے نا...؟" میں نے کہا۔

"اب بھی آرڈر کا ہی سمجھیں۔ میں نے بتایا ہے نا... کہ آج کل بہت سے خریداروں میں ایسے چہروں کا کریز پیدا ہو رہا ہے۔ خاص طور سے یورپ وغیرہ میں تو ایسا چہرہ منٹوں میں بکتا ہے اور منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔ خدا گواہ ہے' آپ بھینک بھی دیں گے تو تین چار لاکھ کما لیں گے۔"

کافی دیر تک ہمارے درمیان بھاؤ تاؤ ہوتا رہا۔ اس دوران میں ڈرنکس کا دور بھی چلا۔ آخر کار رات کے آخری پہر تین چار بجے کے قریب سارا معاملہ طے ہو گیا۔ ہم نے "زبانی کلامی" ہی سہی لیکن رجب سے تمام کے تمام چوالیس بردے خرید لیے۔ ان میں سے بیس عدد بالائی بیسمنٹ کے تھے' ان کا ریٹ ساٹھ ہزار روپے فی بردہ طے ہوا۔ وہ بائیس افراد جو نیچے والی بیرک میں بند تھے' اٹھارہ ہزار روپے فی کس کے حساب سے خریدے گئے۔ اس سودے سے رجب کافی مایوس نظر آرہا تھا۔ درحقیقت سودے کی گرما گرمی میں اس کے منہ سے بیس ہزار روپے فی کس نکل گیا تھا' ورنہ میرے خیال میں وہ ان افراد کو تیس ہزار روپے فی کس سے کم میں بیچنا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے پر کافی بحث ہوئی' آخر ان کی بات تین لاکھ میں طے ہو گئی۔

سودا طے ہونے کی خوشی میں رجب ہمیں اصل رشین وڈکا پلانا چاہتا تھا لیکن میں نے حیلے بہانے سے اسے ٹال دیا۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ رجب فون سننے کے لیے باہر گیا تو صفدر نے بے ساختہ کانوں کو ہاتھ لگائے "شاہ جہاں صاحب' مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے بدہضمی کی حالت میں سو رہا ہوں اور کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ رہا ہوں۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنے ہی جیسے بندوں کی خرید و فروخت کے ایسے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ غزالہ کی تلاش میں نکلے تھے اور ڈھونڈ کچھ اور لیا ہے۔"

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟" میں نے کہا۔

"میرے ذہن میں تو ایک اور بات آرہی ہے۔" صفدر نے کہا "کیوں نہ لڑکیوں میں کسی ایک کو یہاں بلایا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھ ہی لیتی ہوں' کچھ تو معلوم ہو گا ان سے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' رجب فون سن کر واپس آگیا۔ صفدر نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے بازاری لہجے میں کہا "رجب صاحب! سودے کی خوشی

میں تھوڑی سی دل پشاوری ہی کروا ئیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں جان جگر۔۔۔ کیا چاہیے۔"

"وہ بڑے کپڑوں والی لڑکی کھبی ہوئی ہے میرے دل میں تو گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے بھیج دو یہاں۔"

رجب نے میری طرف دیکھ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ بولا "لگتا ہے آپ کے ساتھی کو اس ٹریڈ میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اگر ان کا تجربہ ہوتا تو ایسی بات کبھی نہ کہتے۔"

رجب کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں نے مسکرانا ضروری سمجھا۔ رجب اب صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "محترم! آپ کی خوشی کے لیے اس سے اچھی لڑکی پیش کر دیتا ہوں۔ اس کو معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہ کنواری لڑکیاں ہیں۔ کنواری کی قیمت عام لڑکی سے تین چار لاکھ تک زیادہ ہوتی ہے۔ شاید آپ نے کبھی اس طرح کا سودا ہی نہیں کیا ہے۔ یہ تو آپ کا بکا بکایا مال ہے۔ اسے خراب کیوں کر رہے ہیں۔" پھر اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے زور سے آواز دی "جانی او جانی۔"

چند لمحے بعد درمیانے قد کا ایک بالکل گنجا شخص اندر داخل ہوا۔ اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رجب نے پوچھا "گلنار کہاں ہے؟"

گنجا بولا "سو رہی ہے۔"

"جاؤ اس کتے کی بچی کو اٹھاؤ اور تیار کر کے فوراً یہاں لے آؤ۔" ملازم باہر کی طرف گھوما "نھو" رجب نے آواز دی "اس دوسری چھمک چھلو شاہینہ کو بھی لاؤ۔۔۔ اور جلدی کرو دس منٹ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں۔"

"شاہینہ۔۔۔ کا تو بچہ بیمار ہے۔" گنجے نے جھجک کر کہا۔

"بھاڑ میں جائے بچہ۔" رجب پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا "جلدی لاؤ ان کو یہاں۔"

گنجا بدک کر باہر نکل گیا۔ رجب مونچھوں کو مروڑا دے کر بولا "بچے والی ہے لیکن ہے غضب کی چیز۔ ایسا نشہ چڑھائے گی کہ رو بسر تک ہوش نہیں آئے گا آپ جناب کو۔"

میں اس کمرے میں لیٹا رہا جبکہ صفدر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد ایک خوب رو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھرپور جسم کی مالک تھی اور اس کے چہرے پر کشش بھی تھی مگر اس کشش کو بے چارگی اور دکھ کی پرچھائیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہی شاہینہ تھی۔ مجھے اس کی سرخ و سپید کلائیوں پر سیاہ نشان سے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ ایک پرانی مارپیٹ کا نتیجہ تھے۔ شاہینہ سہمی سہمی سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا "تمہارا بچہ بیمار ہے؟"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ شاید اسے مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو اپنی دانست میں ایک بہکے ہوئے شرابی مرد کے پاس آئی تھی جسے زبان سے زیادہ اپنے ہاتھوں سے کام لینا تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولی "ہاں میرے بچے کو تکلیف ہے۔ وہ کل سے مسلسل رو رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی لڑکی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ یہ ممتا کے آنسو تھے۔ ان لمحوں میں حسن و شباب کا وہ مجسمہ سراپا "ماں" نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کہاں ہے تمہارا بچہ۔"

وہ بولی "یہاں پاس ہی پچھواڑے کے کمرے میں ہے۔"

میں لڑکی سے تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اٹھ کر میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ صفدر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رجب بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے اندازے میں وہ ضرورت سے زیادہ چڑھا گیا تھا اور اب بستر پر گر کر سو گیا تھا۔ آس پاس کوئی اور شخص بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں شاہینہ نامی اس لڑکی کو لے کر بہ آہستگی باہر نکل آیا "کس کمرے میں ہے تمہارا بچہ؟" میں نے سرگوشی کی۔

اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے' صرف ڈھائی تین ماہ کا ایک خوش شکل بچہ بستر پر سو رہا تھا۔ شاہینہ نے بتایا کہ جانی (گنجے) کے کہنے پر اس نے بچے کو نیند کی گولی دی ہے۔ پھول سا بچہ نیند کی حالت میں بھی چہرے پر تکلیف سجائے ہوئے تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ گاہے گاہے بسورنے والے انداز میں اینٹھ جاتا تھا۔ پھول کی پنکھڑی جیسے اس ہونٹ کی یہ حرکت تڑپا دینے والی تھی۔

میں نے شاہینہ سے پوچھا "اسے ہوا کیا ہے؟"

وہ بولی "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پیٹ درد کی دوا کھلائی ہے' پیٹو پر بھی دوا لگائی ہے' کان میں قطرے بھی ڈالے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اس کے بازو میں کوئی تکلیف ہے۔"

میں نے بہ آہستگی بچے کا فراک ایک طرف سے اتار کر اس کا بازو باہر نکالا۔ ہڈیوں کے اتار چڑھاؤ کی تھوڑی بہت خبر مجھے بھی تھی۔ میں نے بچے کے نازک کندھے کو آہستہ آہستہ حرکت دی۔ سوتے میں بھی اس کا جسم اینٹھ گیا اور صورت رونی ہو گئی۔ میں نے کندھے کو اچھی طرح ٹٹولا۔ اس کا کندھا اترا ہوا تھا۔ میں اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد بچے کا بازو

سیدھا اوپر لے گیا اور ذرا سا دبا کر کندھا چڑھا دیا۔ بچہ رونے لگا لیکن پھر فوراً ہی چپ ہو گیا۔

"کیا تھا؟" شاہینہ نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کندھا اترا ہوا تھا۔ اب ٹھیک ہو گیا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

اوہ مائی گاڈ۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا' پھر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا میں نے بچے کا بازو دھیرے دھیرے ہلایا' وہ بالکل پرسکون رہا۔ میں نے کہا "اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ اطمینان سے سوئے گا۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "اس کے پیٹ میں صبح سے کچھ نہیں گیا۔ میں اسے دودھ پلا لوں؟"

میں نے کہا "تم اطمینان سے دودھ پلاؤ۔ جب یہ سو جائے تو آ جانا۔ میں اپنے کمرے میں ہی ہوں۔"

اس نے تشکر کی نظروں سے مجھے دیکھا اور بچے پر جھک گئی۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے تین چار سگریٹ پھونکے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ حالات کا بہاؤ عجیب و غریب تھا۔ بردہ فروش ارشاد احمد اور اس کے ساتھی مجھے رجب نامی اس غنڈے کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتے تھے۔۔۔ مگر ایک اتفاق کے تحت یہ غنڈا مجھے ہی ارشاد احمد سمجھنے لگا تھا۔ نہ صرف ارشاد احمد سمجھنے لگا تھا بلکہ بے خبری میں مجھ پر کئی راز بھی افشا کر چکا تھا' اور ان میں سے ایک راز یہ بھی تھا کہ رجب صرف کرائے کا قاتل ہی نہیں خود بھی بردہ فروشی جیسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے۔

کچھ دیر بعد آہٹ ہوئی اور شاہینہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ دور کہیں کسی مسجد میں موذن نے فجر کی اذان دینے کے لیے اسپیکر کھول لیا تھا اور اذان سے پہلے دعائیہ کلمات ادا کر رہا تھا۔ میں غور سے شاہینہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ان لمحات میں اس لٹی پٹی لڑکی کے چہرے پر اطمینان کی ایک یادگار کیفیت نظر آ رہی تھی۔ یہ اطمینان یقیناً اس بات کا تھا کہ اس کا بچہ سو رہا تھا اور وہ اس کی غذا اس تک پہنچا چکی تھی۔ میں نے شاہینہ سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ تذبذب میں تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بستر پر بیٹھے یا صوفے پر۔ میں نے اسے اس الجھن سے نکالا اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر حیرت اور طمانیت کے ملے جلے تاثرات نظر آئے۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیسے پہنچی ہے۔ میں نے جب اس موضوع پر بات کی تو اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ بے دھیانی میں اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ پھسل جائے۔ میں نے اسے اعتماد میں لے کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ مگر یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی "آپ جو کوئی بھی ہیں' میں آپ کی شکرگزار ہوں اور آپ کی عزت کرتی ہوں۔ لیکن اگر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ میں آپ کو اپنے بارے میں یا یہاں کے لوگوں کے بارے میں کچھ بتا سکوں گی تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

لڑکی کے لہجے میں ایسی قطعیت تھی کہ میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں خاموش تھا اور لڑکی بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔ خاموشی جب زیادہ طویل اور بے ڈھنگی ہو گئی تو لڑکی بے قراری سے پہلو بدلنے لگی۔ آخر بولی "آپ بھلے آدمی لگتے ہیں' آپ پر بھروسا کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ کاش میں آپ کو وہ زنجیریں دکھا سکتی جنہوں نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔"

میرا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ میں سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سر جھکایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی "مم۔۔۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں' میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔ میں نے کہا "ایک طرف تم مجھے بھلا آدمی کہہ رہی ہو۔ دوسری طرف' یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھاؤں گا۔"

وہ زخمی انداز میں ہنسی "مجبوری۔۔۔ یہ کوئی مجبوری نہیں۔ اب تو یہ زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔ اب تو اپنا آپ بہتے پانی کی طرح لگتا ہے جس میں کوئی بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔ نہ ہاتھ دھونے والے کو سوچنا پڑتا ہے نہ بہتے پانی کو کچھ فرق پڑتا ہے۔"

"یہ بچہ کس کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ دردناک لہجے میں بولی' "میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ میرا بچہ ہے' اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ہاں' وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ جس طرح گندگی سے خوش نما پھول کھل اٹھتا ہے' اسی طرح اس بچے نے بھی گناہ کی دلدل سے جنم لیا تھا۔ لیکن جس طرح پھول صرف پھول ہوتا ہے اس طرح وہ بچہ بھی صرف بچہ تھا۔ فرشتہ صورت'

معصوم آنکھوں والا اور پنکھڑی جیسے ہونٹوں والا۔ اس پر اپنی ممتا نچھاور کرنے کے لیے ماں کو صرف یہ یقین کافی تھا کہ بچے نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

سامنے میز پر اسپیشل رشین وڈکا کی چمکدار بوتل رکھی تھی۔ شاہینہ نامی اس لڑکی نے موضوع بدلنے کی خاطر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولی "آپ کے لیے گلاس بناؤں؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔ درحقیقت میں اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اصل ارشاد احمد فون پر یا کسی اور ذریعے سے رجب کے ساتھ رابطہ نہ کرلے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ ہوجاتا تو ہمارا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ جاتا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر نکل کر صفدر کے دروازے پر دستک دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی جاگ رہا ہوگا۔ اس کے کمرے میں بھی ایک لڑکی موجود تھی۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ میری طرح وہ بھی لڑکی سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ لڑکی کو اپنے کمرے میں بلانے سے اس کا مقصد بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ وہ اس الگ تھلگ عمارت اور یہاں کے نہایت تاریک ماحول کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ میری طرح اسے بھی ناکامی ہوئی ہوگی۔

کچھ دیر بعد صفدر باہر نکل آیا۔ میری دستک کی آواز نے رجب کے کارندے جانی کو بھی وہاں کھینچ لیا۔ وہ بولا "کیا بات ہے صاحب! آپ جا رہے ہیں؟"

"سونی صد جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن ماسٹر تو کہتے تھے آپ دوپہر تک یہیں رہیں گے۔" ماسٹر سے جانی کی مراد یقیناً "رجب" تھا۔

"ہاں رہنا تو تھا لیکن ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

جانی نے مشتبہ نظروں سے شاہینہ کی طرف دیکھا اور بولا "صاحب! کیا ان لڑکیوں میں سے تو کسی نے بدتمیزی نہیں کی۔"

"نہیں بھئی! ایسی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے ماسٹر کو بلاؤ۔"

"وہ تو سو رہے ہیں صاحب۔ ویسے انہوں نے کہا تھا کہ آپ دوپہر تک یہاں رہیں گے لیکن اگر پہلے جانا چاہیں تو ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہو۔"

جانی ڈرائیور کو مطلع کرنے چلا گیا۔ میں نے میز پر رکھی اسپیشل وڈکا کی بوتل اٹھائی اور کپڑے میں لپیٹ لی۔

"اس کا کیا کریں گے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یار! نایاب برانڈ کی بوتل ہے۔ کہیں کام آجائے گی۔" میں نے کہا۔

کھڑکیوں پر دن کا اجالا دستک دے رہا تھا۔ ہم باغات میں گھری ہوئی اس عمارت میں سے نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم رجب کے ڈرائیور کے ساتھ شہر کی طرف جا رہے تھے۔

زریں گل کے چچازاد بھائی رستم خاں والا ٹھکانا ہمارے بدخواہوں کی نگاہ میں آچکا تھا۔ وہاں کا رخ کرنا خود کو خطرات میں جھونکنا تھا۔ میں اور صفدر ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں بچارو سے اتر گئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ہم میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئے یہ سارا علاقہ چھوٹے بڑے ہوٹلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم نے درمیانے درجے کے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں ڈبل بیڈ کا کمرا لے لیا اور دروازہ بند کرکے حلوے پوری کا ناشتا کرنے لگے۔ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ غزالہ لاہور میں ہونے کے باوجود تاحال ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ اب یہ پروفیسر اخند وتا اور ارشاد احمد والا سنگین چکر سامنے آگیا تھا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ ارشاد احمد براہِ راست اسمگلنگ اور بردہ فروشی میں ملوث ہے۔ معلوم نہیں تھا کہ اس گھناؤنے کاروبار میں اور کون کون شریک ہے اور یہ جال کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ بہرحال آثار بتا رہے تھے کہ صوبائی دارالحکومت میں پولیس اور قانون کی ناک کے عین نیچے نہایت سنگین قسم کے جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ غالباً ہم اس معاملے کی تو کبھی بھی نہ لگا سکتے اگر پروفیسر اخند وتا کے کلینک میں وہ ریچھ نما شخص مجھے میری آواز سے نہ پہچانتا۔ اس کی ہوشیاری ہی اس کے لیے اور اس کے گروہ کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ ہمیں ٹھیک سے معلوم تو نہیں تھا لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے ٹھکانے پر دیکھنے کے بعد گروہ کے ارکان میں شدید قسم کی سراسیمگی پھیل گئی۔ اس سراسیمگی کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ مجھ پر اور صفدر پر اوپر تلے دو قاتلانہ حملے ہوئے۔ اور ہم ان حملوں کی وجہ معلوم کرنے کے چکر میں رجب سے جا ٹکرائے۔

غزالہ کے بعد جس دوسرے فرد کا خیال مجھے بار بار آرہا تھا وہ مجتبیٰ کنور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ان دنوں شدید قسم کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ وہ دفینے کے انتہائی قریب پہنچ کر اس سے دور ہوگیا تھا اور اس صورتِ حال کا وہ جس قدر بھی ماتم کرتا وہ کم تھا۔

جب ہم بھوپال سے پاکستان روانہ ہوئے تھے' مجتبیٰ کنور

جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ مسز کلارک کی تلاش میں وہ سرپٹ بھاگا ہوا دہلی پہنچا تھا اور اس کے علاوہ بھی نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی۔ اب ہماری آخری اطلاعات کے مطابق وہ زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا پاکستان واپس پہنچ چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ مجھ سے اور صفدر سے بھی وہ زیادہ "خوش" نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ ہم دونوں کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ شدید بدگمانیاں بھی جنم لے چکی ہوں۔ میرے خیال میں یہ ضروری تھا کہ مجتبیٰ کنور سے ملا جائے اور اس کے ذہن میں موجود بدگمانیوں کو مکمل دشمنی میں بدلنے سے روکا جائے۔ حلوے پوری اور مرغ چنے کا ناشتا ختم کرتے کرتے میں اور صفدر اس فیصلے پر پہنچ چکے تھے کہ ہمیں آج ہی مجتبیٰ کنور کے نیاز حاصل کرنے چاہئیں۔

دوپہر کے وقت ہم مجتبیٰ کی عظیم الشان محل نما کوٹھی پر پہنچے۔ لان میں ہی مسز مجتبیٰ یعنی "زلیخا" سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک بڑی فینسی قسم کی قینچی ہاتھ میں لیے پودوں کی تراش خراش میں مصروف تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ وہاں چوٹوں کے نیلگوں نشانات موجود تھے۔ اس طرح کے نشانات میں اس کے چہرے پر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ مجتبیٰ خراب موڈ میں ہو تو بیگم کی دھنائی کردیتا ہے۔ ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ مجتبیٰ کا موڈ بہت خراب ہوگا' اب "زلیخا" کا چہرہ دیکھ کر اس خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔ شوہر سے مار کھانے والی عورت عام طور پر اس واقعے کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر چہرے پر چوٹ آئی ہو تو بہانہ بنا دیا جاتا ہے کہ گرنے سے چوٹ آئی ہے یا بچے نے کوئی چیز دے ماری ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن زلیخا کے حوالے سے میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ اپنی چوٹ یا چوٹوں کو چھپاتی نہیں۔ شاید آہستہ آہستہ عزتِ نفس کا احساس ختم ہوگیا تھا اور مار کھانا اس کے لیے کھانا کھانے کی طرح معمول بن گیا تھا۔ ہم دونوں میک اپ میں تھے لہٰذا چوکیداروں کی طرح زلیخا بھی ہمیں پہچاننے میں ناکام رہی۔ ملازم میرا رقعہ لے کر اندر گیا تھا' تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہمیں دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ مجتبیٰ کنور غصے سے بھرا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ کثرتِ شراب نوشی کے سبب ورم زدہ تھا۔ بال منتشر اور آنکھیں سرخ نظر آرہی تھیں۔ وہ گھریلو لباس دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا اور سراپا دیہاتی نظر آرہا تھا۔ ہمارے سلام کا جواب اس نے روکھے پھیکے انداز میں دیا اور صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا "کہاں چلے گئے تھے تم دونوں۔" اس نے پوچھا۔

"بھوپال میں رکنا بالکل بے کار نظر آرہا تھا لہٰذا پاکستان آگئے۔" میں نے کہا۔

"کم از کم مجھے اطلاع تو دی ہوتی' تم تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ہو۔ اور آج دس بارہ روز بعد شکل دکھا رہے ہو۔"

"بس صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی۔" میں نے کہا "وہاں کچھ مشکوک افراد ہمارے اردگرد گھوم رہے تھے۔ بڑا غیر یقینی سا ماحول تھا۔"

مجتبیٰ تاسف سے بولا "سب کچھ برباد ہوگیا شاہ جہاں۔ ساری محنت ساری بھاگ دوڑ۔ وہ حرامی امریکن تمہارے اعتماد کی آڑ لے کر ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا گیا۔"

"اعتماد تو ہم سب نے اس پر کیا تھا مجتبیٰ صاحب۔ یہ مجھ اکیلے کا فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ میں نے تو کوئی فیصلہ کیا ہی نہیں۔ آخری فیصلہ تو ہمیشہ آپ ہی کرتے تھے۔"

"یہ بات نہ کہو شاہ جہاں۔" مجتبیٰ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "کلارک جتنا قریب تمہارے تھا اور کسی کے نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی تم بھول رہے ہو کہ دفینے کو بھوپال میں گوپی ناتھ میڈیکوز کے اسٹور سے نکال کر "ایف ایم" کے مرکزی آفس میں پہنچانے کا فیصلہ بھی تمہارا ہی تھا۔"

"آپ فیصلے کا لفظ غلط استعمال کر رہے ہیں۔ میں نے صرف رائے دی تھی۔ اس رائے کو مسترد کیا جاسکتا تھا۔ آپ کرسکتے تھے' مسترد کرسکتی تھی' اس وقت ہم سب کو اس سے بہتر کوئی اور صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

مجتبیٰ نے خشک لہجے میں کہا "بہرحال مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بھوپال میں مجھ سے کچھ باتیں چھپائی گئی ہیں۔ ہم سب ایک ٹیم کی طرح کام کر رہے تھے اور ٹیم ورک میں اگر ایک دوسرے سے پردہ رکھا جائے تو اس سے بڑی بددیانتی اور کوئی نہیں۔"

بعینہٖ یہی الفاظ میں بھی مجتبیٰ کنور سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے بھوپال میں ٹیم اور ٹیم ورک پر لعنت بھیج دی تھی اور خفیہ خفیہ بیورو کریسی کے دو کرپٹ نمائندوں کو بھوپال بلا کر اور ان سے مل کر نوادرات کی بندر بانٹ کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر ہمیں بروقت اس پلاننگ کا علم نہ ہوجاتا تو معلوم نہیں مجتبیٰ کنور نے اب تک نوادرات اور دیگر سامان کا کیا حشر کردیا ہوتا۔ مجتبیٰ کا تمتمایا ہوا چہرہ غصے سے اور تمتما گیا تھا۔ وہ براہِ راست ہم دونوں پر اٹیک نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے اشارے کنایے ہماری ہی طرف تھے۔ وہ

میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تم لوگ اتنے دن یہاں لاہور میں کیا کرتے رہے ہو؟"

"چھپتے پھرے ہیں اور کیا کیا ہے۔"

"چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟" مجتبیٰ نے پوچھا۔

"یہاں لاہور پہنچتے ہی کچھ لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ کئی دن مسلسل نگرانی بھی ہوتی رہی ہے۔"

"لیکن تم تو میک اپ میں ہو۔"

"یہی تو حیرانی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ مجھے بہت نزدیک سے جاننے والے کسی شخص نے آواز سے پہچانا ہے۔"

"کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ؟" مجتبیٰ نے کہا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

مجتبیٰ کے چہرے پر پھر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ وہ بولا "کہہ تو تم سب کچھ سکتے ہو لیکن شاید میں اس قابل نہیں کہ تم مجھے بتاؤ۔"

وہ خود پر بہت ضبط کیے ہوئے تھا مگر کسی بھی وقت اس کا ضبط جواب دے سکتا تھا اور وہ "تو تکرار" پر آسکتا تھا۔ میں نے اس کا مزید امتحان لینا مناسب نہیں سمجھا اور مسکراتے ہوئے کہا "معلوم نہیں، آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم آپ سے کوئی بات چھپائیں گے۔ اب دیکھیں ایک خوش خبری لی ہے اور سب سے پہلے آپ کو سنانے دوڑے ہیں۔ حالانکہ اس بات کا خطرہ بھی موجود تھا کہ کہیں ہمارا تعاقب نہ کیا جائے۔"

"کیسی خوش خبری؟" مجتبیٰ کنور نے چونک کر پوچھا۔

"آپ نے پوچھا نہیں کہ اس پلاسٹک بیگ میں میں کیا لایا ہوں؟" میں نے تپائی پر رکھے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے یہ؟" مجتبیٰ نے بیگ کو گھورا۔

"اصل رشین وڈکا کی اسپیشل بوتل۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو بہت پسند ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کے ساتھ ایک خوب صورت شام منانا پسند کریں گے۔"

"تم کسی اچھی خبر کا ذکر کر رہے تھے۔"

"مسٹر جی کلارک کا فون نمبر میرے پاس موجود تھا۔ میں نے کل انہیں نیویارک میں فون کیا۔ ان کے پرائیویٹ سیکریٹری نے فون اٹینڈ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں اپنا رابطہ نمبر دے دوں' آج یا کل کسی وقت مسٹر جی کلارک مجھ سے بات کریں گے۔ میں نے یہاں موہنی روڈ پر اپنے ایک دوست کے فون نمبر دے دیے۔ کل رات نیویارک سے ان کا فون آیا۔ ان سے طویل بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ تمام نوادرات اور دفینے کا دیگر سامان نیویارک میں ہے اور ان کی تحویل میں ہے' انہوں نے کہا ہے کہ دفینے کے حصول کے لیے جس جس نے جو جو کوششیں کی ہیں وہ ان کے علم میں ہیں' وہ کسی کا حق رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ٹیم کے ہر رکن کو اس کا پورا پورا حصہ پہنچائیں گے۔ وہ تمام نوادرات اور دیگر سامان بیچنا چاہتے ہیں۔ کچھ نوادر وہ خود خریدیں گے' باقی اوپن مارکیٹ میں بیچیں گے۔ یہ پراسس ایک ڈیڑھ ماہ میں مکمل ہو جائے گا اس کے بعد وہ دوبارہ ہم سے رابطہ کریں گے اور آئندہ کا لائحہ عمل بتائیں گے۔ انہوں نے زور دے کر کہا ہے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ نہیں ہے اور ویسا ہی ہے جیسا وہ کہہ رہے ہیں۔"

مجتبیٰ نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "اور تم ان باتوں پر یقین کر رہے ہو؟"

"یقین کرنے کی ایک چھوٹی سی وجہ ہے مجتبیٰ صاحب۔" میں نے کہا "جیسا کہ آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ مسٹر کلارک کا شمار امریکا کے گنے چنے امرا میں ہوتا ہے' ان کے وسائل لامحدود ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو کہیں اس طرح او جھل ہوتے کہ ہم مہینوں ان سے رابطہ ہی نہ کر سکتے۔ لیکن انہوں نے از خود مجھ سے رابطہ کیا ہے اور اس دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ کسی کا حق تلف کرنا نہیں چاہتے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے مجتبیٰ صاحب۔ مسٹر جی کلارک کو دولت کی کمی نہیں ہے۔ ان کا کریز صرف نوادرات کے حوالے سے ہے۔ وہ نوادرات اپنے ساتھ امریکا لے گئے ہیں۔ وہاں وہ اپنی من پسند اشیاء اپنے حصے میں وصول کر لیں گے یا قیمتاً اپنے پاس رکھ لیں گے۔ اس کے بعد ان کی کوئی ترجیح نہیں ہوگی۔"

مجتبیٰ بولا "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ استاد جمالی بول رہا ہے۔ اس سادگی پر کون مر نہ جائے خدا کرے۔"

"مجھے معلوم تھا کہ آپ یہ بات کہیں گے' لیکن مجتبیٰ صاحب! کبھی کبھی ہماری سوچوں کے بالکل الٹ کوئی ایسی بات بھی ہو جاتی ہے جو ہر منطق کو رد کر دیتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر پہلے خود یہ بات کہہ چکے ہیں کہ میں مسٹر کلارک کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہوں۔ اسی جان پہچان اور مزاج شناسی کے سبب میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شاید مسٹر کلارک واقعی وہ کچھ کر گزریں جو کہہ رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور انتظار کریں کہ مسٹر کلارک کب اپنا اخلاقی

محی الدین نواب کے نشتر قلم سے ایک لازوال ناول

- ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
- ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

شارٹ کٹ

قیمت: ۱۲۵ روپے
ڈاک خرچ ۲۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ!

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

فرض پورا کرنا ہے۔ اگر وہ فرض پورا کر دے تو ہم خدا کا شکر ادا کریں اور اگر نہ کرے تو صبر شکر کر کے بیٹھے رہیں اور یہ سوچیں کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی بہتری ہی ہوگی۔" مجتبیٰ کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

میں نے کہا "غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے مجتبیٰ صاحب! اور ہم سب سے بھی ایک غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائیں اور ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے لگیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں چند دن انتظار کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں یہ محسوس ہو کہ مسٹر کلارک اپنے وعدے سے پھر رہے ہیں تو پھر ہم پوری قوت سے حرکت میں آئیں اور جو کچھ کر سکتے ہیں کر گزریں۔"

"وہ کوئی وعدہ نہیں نبھائے گا۔ وہ صرف تاخیری حربے استعمال کر رہا ہے۔" مجتبیٰ نے بے حد مایوسی سے سر ہلایا۔

کافی دیر اس معاملے پر بات ہوتی رہی۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی مجتبیٰ کے ساتھ ہی کھایا۔ ہم مجتبیٰ کو مطمئن کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا مطمئن ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ اگر مسٹر کلارک کے وعدے پر یقین کر بھی لیتا تو بھی مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی نگاہ تو تمام نوادر اور تمام سامان پر تھی۔ وہ دفینے کے جز کا نہیں کل کا خواہش مند تھا۔ جتنی لمبی چوڑی خواہش اس نے کی تھی اتنی ہی وسیع و عریض مایوسی کا اسے سامنا تھا۔ بہرحال مجتبیٰ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو کسی حد تک سرد کر کے ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ ہم نے مجتبیٰ کو بتا دیا تھا کہ ہم ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ رابطے کے لیے اسے فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

ہم سہ پہر ڈھائی بجے کے لگ بھگ مجتبیٰ کنور کے گھر سے نکل آئے تھے۔ ٹیکسی پر سوار ہم مال روڈ پہنچے اور پھر لارنس گارڈن کے ایک تنہا گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ درحقیقت ہم دونوں کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ جو کچھ ہم نے ٹریول ایجنٹ ارشاد احمد اور کرائے کے قاتل رجب کے گھر میں دیکھا تھا وہ ہمارے دماغ کی چولیں ہلانے کے لیے کافی تھا۔ بالکل اتفاقیہ طور پر ہم پر کچھ لرزہ خیز انکشافات ہو گئے تھے۔ سلاخوں کے پیچھے بند قیدی ان کا بھاؤ تاؤ اور ان کی بے بسی کے مناظر ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ہم بیٹھے سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ایک رائے تو یہ تھی کہ رجال ساہی صاحب سے رابطہ کیا جاتا اور انہیں بتایا جاتا کہ غزالہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم بھڑوں کے کس چھتے کو ہاتھ لگا بیٹھے ہیں۔ رجال ساہی صاحب متعلقہ تھانے کو حرکت میں لاتے اور رجب کو مع اس کی انسانی کھیپ کے گرفتار کر لیتے، اس کے علاوہ فوری طور پر دونوں مشکوک بھائیوں یعنی پروفیسر اللہ دتا اور ارشاد احمد کو بھی حراست میں لے لیا جاتا۔ لیکن اس کارروائی کے حوالے سے کچھ اندیشے بھی ذہن میں آ رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ہم جن لوگوں کو پکڑیں ان کی حیثیت محض مہروں کی سی ہو یا وہ جرم کے اصل دریا کا ایک چھوٹا سا دھارا ہوں۔ اس صورت میں عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ جب مجرم اور تحقیق کرتا دھرتا ایک دم منظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور ساری بھاگ دوڑ بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

صفدر نے مشورہ دیا "شاہ جہاں صاحب! میری رائے تو یہ ہے کہ پولیس کو ملوث کرنے کے بجائے ہم از خود ارشاد احمد یا رجب پر ہاتھ ڈالیں۔"

"کیسے ڈالیں ہاتھ؟"

"بس اٹھا کر لے جاتے ہیں کہیں۔ جیسے اس حرام زادی مالاں کو لے گئے تھے۔ پھر الٹا لٹکا کر سب کچھ اگلوا لیں گے۔"

"چلو کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے یہ لوگ کافی خرانٹ نظر آ رہے ہیں۔ خاص طور سے یہ رجب تو کتے کی دم کی طرح ٹیڑھا نظر آتا ہے۔"

"اگر یہ زیادہ ٹیڑھا ہے تو پھر اسی پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ مشکل کام کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔"

"تو چلو ٹھیک ہے 'پھر کرو یہ مشکل کام' تم طریقۂ کار سوچ لو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ بولا "آیئے' سب سے پہلے تو چلتے ہیں رجب کے دولت کدے پر۔ پھر جیسی بھی صورتِ حال بنی ویسا ہی طریقہ اختیار کر لیں گے۔"

ہم دونوں کے پاس ریوالور موجود تھے۔ ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور شاہدرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ پتا نہیں کیوں جی چاہتا تھا کہ انارکلی کے قریب سے ہو کر گزریں۔ حالانکہ انارکلی ہمارے راستے میں نہیں آتی تھی پھر بھی ہم اسی جانب سے لوئر مال روڈ کی طرف گئے۔ ہماری آنکھیں امید بھری نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتی رہیں۔ دکانوں میں جھانکتی رہیں۔ فٹ پاتھوں پر بھٹکتی رہیں' ذہن میں یہ آس موجود تھی کہ شاید کہیں غزالہ کی شکل دکھائی دے جائے۔ انارکلی پیچھے رہ گئی لیکن آس میرے ساتھ چلتی رہی۔ شاہی مسجد کے قریب ایک ٹریفک سگنل پر ہماری ٹیکسی رکی۔ مخالف سمت سے آنے والا ٹریفک بھی رکا ہوا تھا۔ اچانک میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میں ٹھٹک گیا۔ نیلی پجارو جیپ میں رجب بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی ہماری نظریں ملیں صفدر نے بھی رجب کو دیکھ لیا۔ رجب نے ہاتھ سے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور اپنی پجارو گاڑی کو سڑک سے اتار کر کچے پر لے گیا۔ ہم نے بھی ٹیکسی سڑک سے اتار کر رکوا دی۔

صفدر اور میں پوری طرح الرٹ ہو گئے تھے۔ رجب سے جدا ہوئے ہمیں اب دس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ اس چکر سے آگاہ ہو چکا ہو جو رات ہم نے چلایا تھا۔ اصل ارشاد احمد نے فون کر کے رجب سے پوچھ لیا ہو کہ وہ رات کیوں نہیں آیا تھا' یا رجب ہی دوبارہ اس کے گھر چلا گیا ہو۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر رجب کے ساتھ ہماری یہ سرِ راہ ملاقات کسی سنگین ہنگامے کا سبب بن سکتی تھی۔ بہرحال جب رجب گاڑی سے نکل کر اور سڑک کراس کر کے ہمارے قریب آیا تو اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات ہی دکھائی دیے۔ اس نے آتے ساتھ ہی ہم سے مصافحہ کیا اور قدرے حیرت سے بولا "آپ ٹیکسی پر ارشاد صاحب؟"

"ہاں وہ ذرا ڈرائیور بدبخت رات کا سواری پر گیا ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

"کہاں جا رہے تھے؟" رجب نے پوچھا۔

"تمہاری ہی طرف جا رہے تھے۔"

"ویری گڈ۔ اچھا اتفاق ہے' میں آپ کی طرف آ رہا تھا۔"

"کیوں؟ خیریت تھی۔" میں نے پوچھا۔

"شاہ جہاں کے سلسلے میں ہی آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔"

"چلو آؤ پھر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"آئیں گھر چلتے ہیں۔" رجب نے کہا۔

ہم نے ٹیکسی کو فارغ کیا اور رجب کے ساتھ اس کی پجارو گاڑی میں آ بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دریائے راوی کے پار رجب کی وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے۔ باغات اور درختوں سے گھری ہوئی یہ کوٹھی یقیناً اس دھندے کے لیے بے حد موزوں تھی جو رجب کر رہا تھا۔ عمارت کے اندر اور اردگرد خوفناک شکلوں والے رکھوالے کتے چکرا رہے تھے۔ ہم اسی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ جہاں بیٹھ کر کل رات ہم نے "غلاموں" کے سودے طے کیے تھے۔

رجب کے رویے سے واضح طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تک اصل ارشاد احمد یا اس کے کسی کارندے سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ایپل جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے رجب نے کہا "میرے کارندوں نے آج وہ مکان دیکھا ہے جہاں استاد جمالی اور اس کے ساتھی کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ کچی آبادی کے اس مکان میں بس رستم خاں نام کا ایک شخص ملا ہے' وہ رکشا چلاتا ہے۔ ہاں یہ معلوم ہوا ہے کہ استاد جمالی کا ایک دیرینہ ساتھی زریں گل بھی ایک روز پہلے تک اس مکان میں موجود تھا' بہرحال اب زریں گل اور اس کی بیوی یہ مکان چھوڑ گئے ہیں۔ مکان کے آس پاس بظاہر تو کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ پولیس کے سفید پوش اہلکار وہاں موجود ہیں۔"

یہ ساری اطلاعات ہمارے لیے تسلی بخش تھیں۔ میں نے رات کو ارشاد کے گھر سے ساہی صاحب کو فون پر جو مشورہ دیا تھا وہ انہوں نے قبول کیا تھا اور اس کے مطابق عمل کیا تھا۔

میں نے رجب سے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے تمہارا۔"

وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا "آپ لوگوں کے دو ناکام حملوں کے بعد استاد جمالی چوکس ہو چکا ہے۔ اب اس پر کافی محنت کرنا پڑے گی۔"

میں نے کہا "ناکام حملہ تو بس ایک ہی تھا۔ لب سڑک جمالی اور اس کے ساتھی پر گاڑی چڑھانے کی کوشش کی گئی تھی دوسرے واقعے کو حملہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو ایک تعاقب تھا جس میں تھوڑی سی مار ماری ہو گئی تھی۔"

"جو کچھ بھی ہے' ان واقعات نے میرا کام کافی مشکل کر دیا ہے۔" رجب نے کہا "کچھ دیر توقف کر کے بولا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ استاد جمالی کی بہن شفتا یہیں لاہور میں ہے اور ایس ایس پی رجال ساہی صاحب نے اسے اپنی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ کسی طرح اس لڑکی کے ٹھکانے کا علم ہو جائے تو استاد جمالی کو ٹریس کیا جا سکتا ہے۔"

"میرے خیال میں تمہاری معلومات اس سلسلے میں زیادہ نہیں ہیں۔" میں نے کہا "شاہ جہاں کی ہمشیرہ ایس ایس پی ساہی کی تحویل میں نہیں۔ میں اس سلسلے میں پوری تصدیق کرا چکا ہوں۔ یقیناً تمہیں اس تنازعے کا علم ہوگا جو اس لڑکی کے رشتے کے سلسلے میں کھڑا ہوا تھا' امارات کا ایک بہت بڑا شیخ اپنے بھتیجے کی برات لے کر لاہور پہنچ گیا تھا اور مایوس ہو کر واپس گیا تھا' اس واقعے کے بعد سے شاہ جہاں نے اس لڑکی کو کہیں روپوش کر دیا ہے۔ امارات کے شیخ کی سخت کوششوں کے باوجود اس لڑکی کا کچھ کھوج نہیں ملا۔"

"شاہ جہاں کے دوست صفدر کی ایک منگیتر بھی تو تھی۔

شاید انجم نام تھا اس کا۔"

صفدر بولا "وہ انجم نام کی لڑکی بھی شاہ جہاں کی ہمشیرہ کے ساتھ ہی کسی پناہ گاہ میں چھپی بیٹھی ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں کا خیال تو تم ذہن سے نکال ہی دو۔"

"ٹھیک ہے نکال دیتے ہیں۔" رجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا کرو گے۔"

"سچ پوچھو ارشاد صاحب! تو ہمیں بہت زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کی وجہ سے شاہ جہاں کچھ محتاط ہو گیا ہے۔ لیکن زیادہ دیر محتاط رہنا اس بدبخت کے بس میں نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق چند دن کا وقفہ دے کر وہ پھر حرکت میں آجائے گا۔ جونہی وہ اللہ دتا صاحب کے کلینک کے آس پاس نظر آئے گا یا آپ سے ملاقات کی کوشش کرے گا' موت کا فرشتہ اس کے سر پر پہنچ جائے گا۔"

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے رجب کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک لہرائی۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک کرائے کا قاتل نظر آیا۔ وہ یقینی طور پر ایک ایسا بندہ تھا جو "سپاری اٹھا" کر کسی بھی شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کا عمل انجام دے سکتا تھا' لیکن اس کے باوجود وہ مجھے کچھ بہت زیادہ متاثر نہیں کر سکا تھا۔ اگر میں اس کا موازنہ شنکر شکرا' عینی جان یا شیخ عاصم جیسے قاتلوں سے کرتا تو ان میں اور رجب میں وہی فرق تھا جو کسی کلب کے کھلاڑی اور قومی کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود رجب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسی وقت کلب کا کھلاڑی بھی قومی کھلاڑیوں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر جاتا ہے اور آناً فاناً سپر اسٹار کہلانے لگتا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی دروازہ کھلا اور رجب کی رکھیل رخشی اندر داخل ہوئی۔ وہ رات ہی کی طرح چست پتلون اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ سامنے سے ٹی شرٹ کے بیشتر بٹن کھلے تھے اور جسم عریاں ہو رہا تھا' لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ تیز نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ بال بکھرائے ڈولتی ہوئی آئی اور اس صوفے کے ہتھے پر چڑھ کر بیٹھ گئی جہاں رجب بیٹھا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے ہمارے سامنے ہی اس نے رجب سے بوس و کنار شروع کر دیا۔ وہ بچ بچ بہکی ہوئی تھی اور اگر رجب اسے ذرا ڈھیل دیتا تو شاید وہ ہماری موجودگی کو خاطر میں لائے بغیر رجب کی آغوش میں گر پڑتی۔

رجب نے ہم سے معذرت چاہی اور اسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔ رخشی کا لیڈی کتا بھی چیختا چلاتا ان دونوں کے پیچھے جا رہا تھا۔ میں اور صفدر اس طور پدر آزاد رکھیل کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے اور ڈرائنگ روم میں رجب کی واپسی کا انتظار کرتے رہے' لیکن وہ تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ صفدر نے مسکراتے ہوئے کہا "گدھا گیا اور ساتھ رسّی بھی گئی۔"

"بھئی وہ بہکی ہوئی تھی اسے سنبھال رہا ہوگا۔"

"یا ساتھ خود بھی بہک گیا ہوگا۔" صفدر نے پھلجھڑی چھوڑی۔

اچانک قدموں کی آہٹ سنائی دی' پھر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو تین افراد وہاں آبیٹھے۔ ان میں ایک تو گنجا جانی تھا' باقی دو نامانوس مہمان تھے۔ وہ اونچی آواز میں بات کر رہے تھے' ان کی گفتگو میں بار بار سیون ایم ایم۔۔۔ بریٹا پسٹل اور ایم جی وغیرہ کے نام آ رہے تھے۔ وہ اسلحے کے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہے تھے' اور خود کو ایک دوسرے سے بڑھ کر اسلحہ شناس ظاہر کر رہے تھے۔۔۔ رجب کو واپس لوٹنے میں واقعی دیر ہو گئی تھی۔ شاید صفدر سچ ہی کہہ رہا تھا۔ رجب واقعی کہیں مصروف ہو گیا تھا۔

میں اٹھا اور ٹہلنے والے انداز میں اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میں نے اندر جھانکا' کمرے میں صرف دو افراد تھے۔ گنجا جانی شاید ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔ دونوں افراد صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی ریچھ کی آنکھوں والا شخص تھا' جس سے چند روز پہلے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں تھا اور پھیل کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں کئی طرح کی انگشتریاں نظر آرہی تھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے لیکن فی الوقت کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ چند لمحے بعد جانی اس مسلح محافظ کو لے کر اندر داخل ہوا جو کل رات قیدیوں والی بیرک کے سامنے نظر آیا تھا۔ ریچھ کی آنکھوں والے نے اسے بے تکلفی سے غیاثا کہہ کر مخاطب کیا اور بولا "یار! کیا بات ہے' کل رات رجب صاحب آئے نہیں؟"

"کہاں نہیں آئے؟" غیاثے نے پوچھا۔

"گھر اور کہاں۔۔۔ ارشاد صاحب کے ساتھ ان کا آٹھ بجے کا وقت طے ہوا تھا۔ انتظار کر کر کے وہ دس بجے کے لگ

بھگ گھر سے نکلے۔ انہیں ایک شادی پر جانا تھا۔"

غیاث نامی محافظ کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔ وہ ریچھ کی آنکھوں والے شخص سے مخاطب ہو کر بولا "میرا خیال ہے کہ کل سے تمہاری اپنے باس کے ساتھ بات نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! رجب صاحب سے ارشاد صاحب کی ملاقات تو کل رات ہی ہو گئی تھی۔ بلکہ ارشاد صاحب یہاں بھی آئے تھے۔ ان کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ دونوں قریباً چار گھنٹے یہاں رہے۔ لمبی چوڑی گفتگو ہوتی رہی ہے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" ریچھ کی آنکھوں والا بھڑک کر بولا "میں ابھی ایک گھنٹا پہلے ارشاد صاحب سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ پریشان ہو رہے ہیں کہ رجب صاحب آئے نہیں اور نہ فون پر رابطہ کیا ہے کسی نے۔"

جانی بولا "میں آپ دونوں سے زیادہ حیران ہوں۔۔۔ اور وہ اس لیے کہ رات والے مہمان تو اب بھی آئے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

ریچھ کی آنکھوں والے شخص کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا "وہ دونوں کون ہیں۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا' اگر اب بھی میں حرکت نہ کرتا تو پھر سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ وہاں سے صفدر کو ساتھ لیا۔ ہم دونوں نے اپنے ریوالور ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ ابھی ہم رجب کی تلاش میں ڈرائنگ روم سے نکلے ہی تھے کہ وہ واپس آتا دکھائی دیا "سوری۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" اس نے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کی نگاہ ہمارے ہاتھ میں پکڑے ریوالورز پر پڑی۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع کا سوچتا' صفدر نے بجلی کی طرح تڑپ کر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا اور پتلیاں حیرت سے پھیل گئیں۔ صفدر کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کرائے کا یہ ڈبل قاتل منہ سے آواز تک نہیں نکال سکا۔ اسی دوران میں کوریڈور کی طرف سے تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر جانی کے علاوہ محافظ غیاثا اور ریچھ نما شخص دکھائی دیا۔ اپنے باس کو جڑا کی طرح ایک عقاب کے پنجوں میں جکڑا دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ محافظ غیاثے نے اپنی گن سیدھی کرنی چاہی لیکن صفدر کی للکار نے اسے جہاں کا تہاں روک دیا "خبردار!" صفدر گرجا "اگر کوئی حرکت کی تو اسے یہیں ڈھیر کر ڈالوں گا۔"

تینوں افراد سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئے۔ میں دیکھ رہا تھا' ریچھ نما شخص کا ہاتھ بہ آہستگی اپنی جیب کی سمت جا رہا تھا۔ میرے ریوالور نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور ریچھ نما اپنی ٹانگ پکڑ کر پہلو کے بل گر گیا۔ خون اس کی نیلی جین کو تیزی سے بھگو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی پتلون سے بریٹا پسٹل نکالا تو وہ بالکل بھی مزاحمت نہیں کر سکا۔ یہ بالکل نئے ماڈل کا پسٹل تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس ریچھ نما شخص کو اسلحے میں گہری دلچسپی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ساتھ والے کمرے میں اس کی گفتگو سنی تھی۔

صفدر نے رجب کو ایک بھاری بھرکم گالی دی اور غرا کر بولا "ان کتوں سے کہو کہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں اور کوئی ہتھیار ہے تو فرش پر پھینک دیں۔"

رجب نے ہاتھ کے اشارے سے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ایسا ہی کریں۔ غیاثا اور جانی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ غیاثے نے اپنی وزنی گن فرش پر پھینک دی اور گولیوں والی بیلٹ بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ جانی کے پاس سے چاقو برآمد ہوا۔

صفدر نے رجب سے پوچھا "اس عمارت میں تمہارے اور کتنے کارندے ہیں؟"

رجب نے جواب دینے کے بجائے ایک رم اپنا آپ چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس کی یہ حرکت بڑی غیر متوقع تھی۔ نہ صرف یہ کہ ریوالور رجب کی کنپٹی سے ہٹ گیا بلکہ ایک سیکنڈ کے لیے صفدر کا توازن بھی خراب ہو گیا۔ تاہم صفدر نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر فیصلہ کیا اور اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے گولی چلا دی۔ صفدر نے بھی میری طرح رجب کی ٹانگ پر گولی ماری تھی۔ رجب تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی گردن پر صفدر کی گرفت ایک بار پھر مضبوط ہو گئی۔

اب یقینی بات تھی کہ اس عمارت میں موجود تمام افراد کھنچے ہوئے یہاں چلے آئیں گے۔ دو گولیاں چل چکی تھیں اور یہ کارروائی عمارت میں موجود ہر ذی نفس کو یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ صفدر کو کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال میں اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں کا استعمال کر سکتا تھا۔ وہ رجب کو کھینچ کر ایک کارنر میں لے گیا اب وہ دائیں بائیں اور عقب سے قریباً محفوظ تھا۔ میں نے ایک دروازے کی

اوٹ میں پوزیشن لے لی۔ کان ہر لحظہ بھاگتے قدموں کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ بیس تیس سیکنڈ گزرے' پھر پورا ایک منٹ گزر گیا۔ نہ کسی کے چیخنے بولنے کی آوازیں آئیں نہ قدموں کی چاپ ابھری۔ یہاں مکمل خاموشی تھی۔ کافی تاخیر سے ایک ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ یہ کوئی اکیلا فرد تھا اور یوں سست روی سے چلا آرہا تھا جیسے فائرنگ کی آواز پر نہیں کال بیل کی آواز پر آرہا ہو۔

پھر وہ موقع پر پہنچا۔ وہ مرد نہیں عورت تھی اور خاصی موٹی عورت تھی۔ شمالاً جنوباً دور تک پھیلی ہوئی۔ اس کے ہاتھ گیلے آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ یہاں کی باورچن ہے۔ اس نے قدرے تعجب سے صورت حال کا جائزہ لیا' پھر تفہیمی انداز میں سرہلا کر ایک جانب کھڑی ہوگئی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو کہ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" ریچھ نما شخص پاس ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ فربہ اندام عورت نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے جیسے معمول ہی کا حصہ تھا۔

"اس عمارت میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟" میں نے فربہ عورت سے پوچھا۔

"اور بھی بہت سے ہیں' لیکن یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ ان کے کمرے کو باہر سے قفل لگا ہوا ہے۔" عورت نے کہا۔

میں سمجھ گیا۔ عورت کا اشارہ اس تہ خانے کی طرف تھا جس میں ایک بیرک کے اندر قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا گیا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ دوسرے نوجوان تو آزاد تھے جنہیں ہم نے کامن روم کے ساتھ ایک ہال نما کمرے میں دیکھا تھا۔ کل رات وہ بے فکروں کی طرح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ٹی وی وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ غالباً وہ آج بھی رہیں تھے لیکن فائرنگ کی آواز سن کر یہاں نہیں پہنچے تھے۔

پانچ منٹ کے اندر اندر میں نے مضبوط رسی سے رجب اور اس کے دونوں ساتھیوں کی مشکیں کس دیں۔ صفدر کی چلائی ہوئی گولی رجب کی ران کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ زخم زیادہ سنگین نہیں تھا۔ میں نے خود ہی پٹی باندھ کر اس کا خون بند کردیا۔ اس ریچھ نما شخص کو لگنے والی گولی اس کی ٹانگ میں ہی تھی۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

ہم نے فربہ اندام باورچن سمیت ان تمام افراد کو ایک محفوظ کمرے میں بند کرکے دروازہ مقفل کردیا۔ اس کے بعد میں باہر گیا اور عمارت کا مین گیٹ باہر سے مقفل کردیا۔

واپس عمارت میں آنے کے لیے مجھے دیوار پھلانگنا پڑی۔ اتنی دیر میں صفدر رجب کی بیچارو اسٹارٹ کرکے اسے عمارت کے ایک عقبی باغیچے میں لے جاچکا تھا۔ گیٹ پر موجود خوفناک صورت والا چوکیدار ساری رات جاگنے کے بعد اب اپنے کیبن میں گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے بڑی تسلی سے اس کی گردن کے مخصوص حصوں پر دباؤ ڈالا اور اس کی نیند کو بے ہوشی میں تبدیل کردیا۔ چوکیدار کی مشکیں کسنے کے لیے میں نے اس کی طویل پگڑی استعمال کی۔ احتیاط کے طور پر اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تاکہ وہ ہوش میں آکر واویلا نہ کرے۔ ہم نے ایک اور احتیاط بھی کی اور وہ یہ کہ ٹیلی فون کا تار کاٹ ڈالا۔ علاوہ ازیں رکھوالی کرنے والے خطرناک کتوں کا بھی "ٹھیک ٹھاک" بندوبست کردیا گیا۔

ان کاموں سے فارغ ہوکر میں اور صفدر اس ہال نما کمرے کی طرف گئے جہاں کل شب ہم نے بائیس عدد خواب پرست نوجوانوں کو دیکھا تھا' ہاں وہ خواب پرست ہی تو تھے جو اپنے اردگرد سے آنکھیں بند کیے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ رہے تھے اور انجام سے بے خبر تھے۔ جب ہم تہ خانے کے ہال نما کمرے میں پہنچے تو اس کا دروازہ باہر سے بند نظر آیا۔ اسے کنڈی لگادی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ احتیاط یہاں کی باورچن ریشماں نے کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر سارے نوجوان اس طرف بھاگے چلے جائیں۔ میں اور صفدر کھڑکی میں پہنچے تو کئی نوجوان ایک ساتھ بولنے لگے۔ انہیں اندازہ ہوچکا تھا کہ کوٹھی میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ پہلے انہوں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں' پھر میرے اور صفدر کے گرج دار لہجے ان تک پہنچے تھے۔ ایک لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ یہاں کیا معاملہ ہوا ہے۔

میں نے کہا "کوئی خاص بات نہیں۔ ایک اُچکا گھر میں گھس آیا تھا۔ اسے پکڑ لیا ہے۔"

وہ بولا "رجب صاحب کہاں ہیں؟"

"رجب صاحب معمولی زخمی ہوئے ہیں' ابھی آجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

اتنے میں ایک مجیم شحیم نوجوان آگے آیا۔ وہ ان نوجوانوں میں عمر کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا لگتا تھا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھ سے بات کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ گونگا بہرا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کیوں ہے؟

میں نے بتایا کہ دروازے کو کسی نے باہر سے تالا لگا رکھا

ہے۔ میری یہ بات گونگے نوجوان کے ایک ساتھی نے اشاروں کے ذریعے اس تک پہنچائی۔ گونگا نوجوان جس کا نام ہمیں معلوم ہوا عدیل تھا حیران نظر آنے لگا۔ دیگر چہروں پر بھی حیرت کے آثار نظر آئے۔ کمرے میں بند نوجوانوں کو چونکہ دروازہ نظر نہیں آرہا تھا لہٰذا میرا یہ جھوٹ نبھ گیا کہ دروازہ مقفل ہے۔ درحقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ نوجوان فی الحال اس کمرے سے نکلیں اور افراتفری دیکھ کر خود بھی پریشانی کا شکار ہوں۔

میں اور صفدر ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک ہوا تھا۔ ہمیں ایک دم کھل کر سامنے آنا پڑ گیا تھا۔ اب ہمارے لیے موزوں یہی تھا کہ رجب پر بہت سخت ہاتھ ڈال دیں۔ اسے زبان کھولنے پر مجبور کریں تاکہ پتا چل سکے کہ اس دھندے کا مکمل حدود اربعہ کیا ہے۔

جس وقت صفدر اور میں مشورہ کررہے تھے چیخنے چلانے کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں جہاں ہم نے رجب اور اس کے ساتھیوں کو بند کیا تھا۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ چیخ پکار رجب ہی کررہا ہے۔ میں اور صفدر موقع پر پہنچے۔ بند کمرے کے اندر رجب گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا اور ہمیں صلواتیں سنا رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد و کرب کی کیفیت بھی موجود تھی۔ اس کیفیت کا سبب گولی کا وہ زخم تھا جو رجب کی ران پر آیا تھا۔ میں اور صفدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔ رجب ہمیں خوفناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ صفدر نے اس کے منہ پر چند زوردار طمانچے رسید کیے۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور ٹھوڑی خون سے رنگین ہوگئی۔ جونہی ایک بار پھر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا' صفدر نے اس کے منہ میں ایک پرانا کپڑا گھسیڑ دیا اور پھر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اب رجب بالکل بے بس تھا۔ ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے اب چیخنے چلانے سے بھی قاصر ہوگیا تھا۔

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ رجب کے ساتھی جشولی باورچن ریشماں کچھ ادھوری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ریچھ نما شخص ان لوگوں کو ہماری اصلیت سے آگاہ کرچکا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ ریچھ نما شخص نے رجب کو بتا دیا تھا کہ وہ کتنے بڑے دھوکے میں رہا ہے' جس شخص سے وہ استاد جانی کے قتل کا معاملہ طے کرتا رہا ہے وہ خود استاد جانی ہی ہے۔ میرے اشارے پر صفدر نے رجب کو بازو سے

پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ رجب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا مگر صفدر کی گرفت کافی مضبوط تھی۔

"کہاں لے جارہے ہو اسے؟" ریچھ نما شخص نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تہ خانے میں لے جارہے ہیں۔ اس کے بعد تمہاری باری ہے۔" میں نے جواب دیا اور دروازہ پھر باہر سے مقفل کردیا۔

میں چاہتا تھا کہ ایک دو گھنٹے میں ہم رجب سے جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں کرلیں۔ اس کے بعد رجال ساہی صاحب کو اطلاع دے دی جائے اور وہ پولیس کے ہمراہ یہاں پہنچ کر خاموشی سے ٹیک اوور کرلیں۔ ہم رجب کو کھینچتے کھینچتے لوتھ پر گھسیٹتے ہوئے عمارت کی عقبی سمت میں لے آئے۔ یہاں باغیچے میں سرونٹ کوارٹر کی طرز کے کمرے بنے ہوئے تھے۔ قریب ہی بڑے سائز کے دو کتے بھی بندھے ہوئے تھے۔ ہم رجب کو ایک کمرے میں لائے اور اسے کھردری چارپائی پر لٹا دیا۔ یہ کمرا ایک خستہ ٹرنک اور دو کرسیوں کے علاوہ بالکل خالی تھا' فرش گرد آلود تھا اور ایک کونے میں جالے لگے ہوئے تھے۔

صفدر نے کہا "چلو ایک سہولت تو موجود ہے۔ بجلی سپلائی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سالے کو کرنٹ وغیرہ لگانے میں آسانی رہے گی۔"

رجب کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ ایک گھاگ مجرم تھا' لہٰذا یہ بات تو اسے پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی کہ اس پر سخت وقت آنے والا ہے۔

صفدر نے اس کی زخمی ران پر ریوالور کے دستے سے ضرب لگائی تو وہ بری طرح چیخنے لگا۔ لیکن ان چیخوں کی نوے فی صد آواز اس کے حلق کی گہرائی میں ہی گونج کر رہ گئی۔ اس کے مکروہ چہرے کے تاثرات اور اس کے گلے کی پھولی ہوئی رگوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی شدت سے چلایا ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا پروگرام ہے رجب جان صاحب! گدھے کی طرح مار کھا کر چیخنا چلانا ہے یا انسانوں کی طرح بات مان لینی ہے۔" اس کے گلے کی رگیں ایک بار پھر پھول گئیں اور چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔ یقیناً وہ میرے سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں دے رہا تھا۔ غالباً وہ مجھے اور صفدر کو بزدلی کا طعنہ دے رہا تھا اور کچھ اس قسم کی بات کہہ رہا تھا کہ ہم نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو

اسے کھول کر اس سے دو بدو مقابلہ کریں وغیرہ وغیرہ۔ یہ مخالف کو اشتعال دلانے کا ایک گھسا پٹا حربہ تھا۔ ہم ایسی بے وقوفی کیونکر کر سکتے تھے جبکہ ہم جانتے بھی تھے کہ یہ گن فٹ کرایے کا قاتل ہم سے دو دو ہاتھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس جیسے دو بندے ہوں تو بھی صفدر انہیں چند سیکنڈ کے اندر ناک آؤٹ کر ڈالے۔ اس نے ہمارے قتل کی سپاری اٹھا کر غلطی کی تھی۔ اور اس سے بھی بڑی غلطی اس نے کی تھی جس نے اس گن ٹکے سیکنڈ کلاس بدمعاش سے ہمارے قتل کی سپاری اٹھوانے کا ارادہ کیا تھا۔

صفدر نے کہا "جناب! آپ کار بتا رہے ہیں کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے اس سے اسی زبان میں بات کرتے ہیں جو یہ سمجھتا ہے۔"

صفدر کی طرح میرے ذہن میں بھی مکروہ صورت رجب کے لیے بے رحمی پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ ماؤں کے جگر گوشے چھین کر انہیں بیرون ملک نامعلوم جہنموں میں دھکیلنے والا رعایت کا مستحق کیسے ہو سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ زبان نہیں کھولے گا تو اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا۔ اچانک مجھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی جیسے کسی کا پاؤں باغیچے میں سوکھے پتوں پر پڑا ہو۔ میں نے سن گن لینے کی کوشش کی مگر آواز دوبارہ نہیں آئی۔ مگر پھر چند سیکنڈ بعد اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے ہمارے بالکل قریب ایک یا دو افراد موجود ہیں۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا۔ شام کے جھٹپٹے میں امرود کے درختوں میں دو سائے متحرک نظر آئے۔

"صفدر گڑ بڑ ہے۔" میں نے کہا "یہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔"

ہم نے بندھے ہوئے رجب کو اٹھایا اور جستی ٹرنک کا ڈھکنا کھول کر اس میں ڈال دیا۔ ٹرنک کی تہ میں ایک دو بوسیدہ لحاف بھی رکھے تھے۔ رجب ان میں دھنس سا گیا۔ میں نے ڈھکنا بند کر دیا تاہم اس کو مکمل بند نہیں کیا بلکہ ہوا کی آمد و رفت کے لیے اس میں تھوڑی سی درز رہنے دی۔

درختوں میں نظر آنے والے دونوں سائے اب اوجھل ہو چکے تھے۔ میں اور صفدر کافی دیر سن گن لیتے رہے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب باغیچے کے آس پاس کوئی موجود نہیں۔ ہم دونوں ریوالور بدست باہر نکل آئے۔ پہلے باغیچے کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر عمارت کی سمت بڑھے۔ ہم بڑی احتیاط سے ڈرائنگ روم کی جانب سے اندر داخل ہوئے۔ چند سیکنڈ بعد شدید خطرے کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے ہمارے بالکل نزدیک ایک سے زائد افراد موجود ہیں۔ اگر واقعی لوگ موجود تھے تو کہاں سے آئے تھے؟ ہوائی گیٹ تو باہر سے مقفل تھا۔ صفدر بھی خطرے کی بو محسوس کر چکا تھا اور ریوالور پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کی ہم نے ہرگز توقع نہیں کی تھی۔ ایک کمرے کا بند دروازہ دھماکے سے کھلا اور کم و بیش آٹھ افراد بھرا کر ڈرائنگ روم میں گھس آئے۔ ان میں سب سے آگے وہی گونگا بہرا نوجوان تھا جسے تھوڑی دیر پہلے ہم بند کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس کا نام ہمیں عدیل معلوم ہوا تھا۔ عدیل کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں گھسنے والے اس کے ساتھی ہی تھے۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر مجھ سے اور صفدر سے چمٹ گئے۔ میں نے چیخ کر انہیں خود سے دور رکھنا چاہا لیکن ناکامی ہوئی۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں ٹریگر نہیں دبا سکا۔ دباتا بھی کیسے۔ یہ نوجوان۔۔۔ ہاں یہ نوجوان تو میرے اپنے ہی جسم کا ایک قابل رحم حصہ تھے۔ انہیں زخم لگانے کا مطلب خود کو زخمی کرنا تھا۔ وہ ظالم نہیں مظلوم تھے۔ آنکھوں میں خواب سجا کر انجانے راستوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے خون پسینے کو ریال، پاؤنڈ اور ڈالر میں بدلنے کی تمنا رکھتے تھے۔ ان کی مائیں نجانے کہاں کہاں مصلوں پر بیٹھی ان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ میں ان پر گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ دو تین ہاتھ میرے ریوالور پر آئے اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسی دوران میں لڑکوں کی ایک اور مشتعل ٹولی کمرے میں گھس آئی۔ مجھے ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ یہ صفدر کا ہوائی فائر تھا۔ گونگا نوجوان میرے عین سامنے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ دو زور دار ٹکریں اس نے میرے چہرے پر رسید کیں اور میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگ تارے ناچ گئے۔ ضربوں کی تکلیف سے جھنجلا کر میں نیچے جھکا اور پنڈلی سے خنجر کھینچ لیا۔ نوجوان مجھ پر دیوانہ وار مکے برسا رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار ہے۔ میں ذرا تیزی سے خنجر استعمال کرتا تو لڑکوں کا گھیرا توڑ کر نکل سکتا تھا لیکن مسئلہ پھر وہی تھا۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں نشانہ بناؤں۔ وہ بیس بائیس کے قریب لڑکے تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ ہم دونوں پر حاوی ہو گئے۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا اور قمیص تار تار ہو گئی تھی۔

ہمیں اسی کمرے میں دھکیل دیا گیا جس کمرے سے نوجوانوں کی پہلی ٹولی برآمد ہوئی تھی کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ کمرا غالباً ٹی وی روم کے طور پر استعمال ہو تا رہا تھا لیکن اب ٹی وی وہاں موجود نہیں تھا۔ صرف دو طویل صوفے اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ فرش پر اونی دری بچھی ہوئی تھی۔ صفدر کی آنکھ سوج گئی تھی اور نتھنوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ میری قمیص تار تار ہوئی تھی لیکن جسم پر ہی تھی جبکہ صفدر کی قمیص سرے سے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس کی بنیان بھی ایک طرف سے پھٹ کر نیچے لٹکنے لگی تھی۔ ہم دونوں نہتے تھے "ہاؤ ڈو یو ڈو؟" میں نے پوچھا۔

"فائن۔۔۔ بٹ ان پین۔"

"تو پین نو گین والا مقولہ نہیں سنا تم نے؟"

"مقولہ تو سن رکھا ہے لیکن اب اس کا مطلب ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ کم بختوں نے اتنی ٹھوکریں ماری ہیں سر پر کہ یادداشت والا خانہ ہی متزلزل ہو گیا ہے۔"

"بے وقوفوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔" میں نے ہونٹوں سے خون پونچھتے ہوئے کہا۔

صفدر اٹھ کر دروازہ پیٹنے لگا۔ لیکن کئی منٹ کی کوشش کے باوجود کوئی ہماری طرف نہیں آیا۔ غالباً وہ لوگ مختلف کمروں میں رجب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جس کمرے میں ہمیں بند کیا گیا تھا وہاں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی میں آہنی گرل اور جالی لگی ہوئی تھی۔ از خود کوشش کر کے کمرے سے نکلنا بے حد دشوار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے ہی کمرے سے "نوجوان" کیسے باہر نکل آئے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس کمرے میں دو روشن دان بھی موجود تھے۔ ان روشن دانوں میں جالی تو تھی لیکن گرل نہیں تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ گونگے بہرے نوجوان اور اس کے ساتھیوں نے ہم پر ہلہ بول کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔۔۔ مگر ابھی انہیں اس نقصان کا علم نہیں تھا۔ وہ رجب کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ جو انہیں جادو کے قالین پر بٹھا کر کسی ایسے ملک میں پہنچانے والا تھا جہاں ان پر دولت کی بارش ہونا تھی۔ ہم نے اس "نجات دہندہ" پر ہاتھ ڈالا تھا اور اسے زخمی کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ یہ جوشیلے نوجوان ہمیں اپنی سنہری منزل کے راستے میں رکاوٹ سمجھنے لگے تھے اور آناً فاناً اپنے "نجات دہندہ" کی مدد کو نکل آئے تھے۔

چند منٹ بعد کمرے کے دروازے کے سامنے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر مشتعل نوجوان کھڑکی کے سامنے نظر آئے۔ لمبے بالوں والا گونگا بہرا نوجوان ان میں سب سے آگے تھا۔ ایک نوجوان نے چلا کر پوچھا "رجب صاحب کہاں ہیں؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم ان کے ساتھیوں کے سامنے انہیں گھسیٹ کر کمرے سے لے گئے تھے۔"

"جس نے تمہیں بتایا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔"

"جھوٹ تم بول رہے ہو۔ فرش پر گھسیٹے جانے کے نشان ہیں اور اس خون کے نشان بھی ہیں جو رجب صاحب کی ٹانگ سے بہہ رہا تھا۔ بتاؤ کہاں رکھا ہے تم نے انہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اگر وہ ہمارے ہتھے چڑھا ہوتا تو ہم اب تک اسے قتل کر چکے ہوتے لیکن افسوس کہ وہ نکل گیا۔"

"وہ انسان نہیں درندہ ہے۔" صفدر نے میری بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "وہ سوداگر ہے انسانوں کا۔۔۔ تم جیسے نجانے کتنے بے وقوفوں کو بیچ کر کھا چکا ہے وہ۔۔۔ تمہیں شکر کا سجدہ کرنا چاہیے کہ ابھی تک تمہاری واپسی کا راستہ بند نہیں ہوا۔۔۔"

"تم اپنی بک بک بند رکھو تو بہتر ہے۔" ایک جوشیلا نوجوان ریوالور لہرا کر بولا "ہمیں تمہاری تقریر نہیں رجب صاحب چاہئیں۔ ابھی اور اسی وقت۔" اس نے ریوالور میری طرف سیدھا کر لیا۔ گونگے بہرے نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر ریوالور کی نال جھکا دی۔ ورنہ ممکن تھا کہ ریوالور بردار جوش میں فائر ہی کر دیتا۔

ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا مجمع چیر کر آگے آیا۔ سرخ انگارا چہرے کے ساتھ وہ بولا "ہم نے اپنے گھروں کا سامان بیچ کر رجب صاحب کو رقم دی ہے۔ اگر یہاں ہمارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تو ہم آگ لگا دیں گے یہاں اور خود بھی جل مریں گے۔"

ایک دم کئی نوجوان شور مچانے لگے۔ ان سب کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم انہیں رجب صاحب کے بارے میں بتائیں۔ میں نے انہیں واضح الفاظ میں بتایا کہ رجب صاحب کا ہمیں کچھ پتا نہیں وہ یہاں سے نکل بھاگا ہے یا کہیں روپوش ہو گیا ہے۔

داڑھی والا ایک پٹھان نوجوان چیخ کر بولا "اوئے خدائی خوار! تم نے کیوں جھوٹ بولنے کا قسم کھا رکھا ہے۔ رجب صاحب کا ساتھی نے ام کو خود بتایا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم دونوں رجب صاحب کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے یہاں

سے گھسیٹ کرلے گیا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں ہے وہ شخص جس نے تمہیں یہ بتایا ہے۔"

"وہ۔ ادھر ہی ہے' تمہیں ملا دیں گے اس سے بھی۔" سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا بھڑک کر بولا۔

میں صاف محسوس کررہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لڑکوں کے ساتھ رجب کے دونوں ساتھی یعنی جانی اور غیاثا نظر نہیں آرہے تھے۔ ریچھ نما شخص تو چلو زخمی تھا لیکن جانی اور غیاثے کو تو نظر آنا چاہیے تھا۔ یہ بات بھی بعید از امکان تھی کہ وہ دونوں ابھی تک رسیوں سے بندھے اسی کمرے میں پڑے ہوں جہاں ہم انہیں چھوڑ آئے تھے۔ لڑکوں نے یقیناً انہیں آزاد کردیا تھا۔ پھر وہ کہاں گئے تھے؟

ہماری طرف سے مایوس ہو کر نوجوان لڑکے ایک بار پھر رجب کو تلاش کرنے کے لیے کوٹھی کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ صرف دو چار لڑکے کھڑکی کے سامنے کھڑے رہے' ان کا تعلق لاہور کے گردونواح سے تھا۔ وہ پنجابی بول رہے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے بند کمرے میں سے نکلنے کے لیے روشن دان کا راستہ ہی استعمال کیا تھا۔ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا جو ابھی مجھ سے بات کررہا تھا کافی ریلا پتلا بھی تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے روشن دان تک پہنچا تھا۔ اس کی جالی اکھاڑی تھی اور اپنے جسم کو موڑ توڑ کر روشن دان میں سے گزر گیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کی کنڈی کھول دی تھی۔ یوں گونگے نوجوان "عدیل" کی سرکردگی میں تمام لڑکے باہر نکل آئے تھے۔ پہلے انہوں نے رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاثے کو رہا کرایا تھا' پھر رجب کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے لڑکوں سے پوچھا کہ رجب کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟ لڑکوں نے ایک بار پھر گول مول سا جواب دیا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ جانی اور غیاثے کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہوگئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایک بار تو یہاں آتے۔ یہ بات جاننے کے بعد کہ ان کا واسطہ استاد جہانی اور صفدر سے پڑا ہے وہ خاصے خوف زدہ نظر آنے لگے تھے' کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ بھاگ ہی نکلے ہوں۔ مگر وہ چہرے مہرے سے ایسے بزدل بھی نظر نہیں آتے تھے۔ میں اور صفدر اسی سوچ بچار میں تھے کہ گونگا عدیل احمد اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھر آدھمکا۔ اس مرتبہ یہ لوگ پہلے سے بھی بڑھ کر مشتعل دکھائی دیتے تھے۔ وہ بلا تردد ہمیں گالیاں دے رہے تھے اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے چند لڑکوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھسنا چاہا لیکن دوسرے لڑکوں نے انہیں اس عمل سے باز رکھا۔ اور یقیناً انہوں نے دروازہ بند رکھ کر عقل مندی کا کام کیا تھا۔ پٹھان لڑکے نے ایک بار پھر کھڑکی کے راستے مجھ پر ریوالور تان لیا۔ وہ چیخ رہا تھا کہ اگر ہم نے رجب صاحب کا پتا نہیں بتایا تو وہ ہمیں گولی مار دے گا۔ اس کی جنونی کیفیت دیکھتے ہوئے ہمیں ڈرنا چاہیے تھا مگر ہم ڈر نہیں رہے تھے' کیونکہ ہم دونوں ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ لڑکا گولی نہیں چلا سکتا۔ درحقیقت عدیل کے سوا ان میں کوئی لڑکا بھی دم خم والا نہیں تھا۔ وہ سب معمولی ہنرمند یا محنت کش لڑکے تھے' مارا ماری کے کاموں سے ان کا واسطہ نہیں تھا۔ یہاں تو سب ایک گروپ کی شکل میں تھے لہٰذا ان کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا ورنہ کسی اکیلے لڑکے کو کسی اجنبی جگہ پر کوئی تھپڑ بھی ماردیتا تو شاید وہ اس کا جواب نہ دیتا۔

لڑکے کچھ دیر تک ہمیں کھلی دھمکیاں دیتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ غالباً وہ ایک بار پھر کوٹھی کے طول و عرض میں رجب کو تلاش کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اندیشوں کے سائے تھے اور چہرے زرد ہورہے تھے۔ وہ ہماری یہ بات ماننے کو ہرگز آمادہ نہیں تھے کہ رجب ست بڑا فراڈ ہے اور ان کی زندگیاں برباد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی دوران میں کوٹھی کی بجلی چلی گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں اور صفدر کمرے کی دری پر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بہت سے سوال' جواب طلب تھے۔ جیسے یہ سوال کہ لڑکے رجب کو ڈھونڈ سکیں گے یا نہیں۔ یہ بات قرین قیاس نہیں تھی کہ رجب کو تلاش کرنے والے لڑکے سرونٹ کوارٹرز میں نہیں پہنچے ہوں گے۔ وہ یقیناً ہر کوارٹر میں جھانک کر دیکھ چکے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ جستی ٹرنک کھول کر اندر نہ جھانک سکے ہوں گے۔ تاہم یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا تھا۔ رجب جستی ٹرنک میں ضرور بند تھا لیکن ہوش و حواس میں تھا۔ وہ جستی ٹرنک کو اپنے پاؤں سے بجا کر آواز پیدا کرسکتا تھا اور کوارٹر میں آنے والوں کو متوجہ کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا تھا؟ یہ بڑا اہم بلکہ کسی حد تک تشویش ناک سوال تھا۔ میں نے ٹرنک کا ڈھکنا پوری طرح بند نہیں کیا تھا کہ کہیں رجب کا دم نہ گھٹے۔ اس لیے یہ اندیشہ تو نہیں تھا کہ وہ دم گھٹ کر بے ہوش یا ہلاک ہوگیا ہوگا ہاں ایک بات ہوسکتی تھی۔ رجب کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ ممکن تھا کہ زیادہ اخراج خون کے سبب اس پر نقاہت

طاری ہوگئی ہو جو بے ہوشی پر منتج ہوئی ہو۔ بہرحال اس صورت میں بھی ہمیں تشویش ہونا لازمی تھی۔ ہم رجب کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہمارے پاس "بردہ فروشی" کے اس گھناؤنے دھندے کا واحد سراغ تھا۔

میں اور صفدر رات تیسرے پہر تک جاگتے رہے۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تھوڑا سا حبس بھی محسوس ہورہا تھا۔ ہمیں جسم کے مختلف حصوں پر جو چوٹیں آئی تھیں وہ اب تکلیف دے رہی تھیں' تاہم یہ تکلیف ہم دونوں کے لیے قابل برداشت تھی' بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ صفدر اس تکلیف سے باقاعدہ لطف اندوز ہورہا تھا۔ مارپیٹ اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلے سے کم نہیں تھی۔ کئی موقعوں پر تو راہ چلتے چلتے صفدر کی طبیعت مچل جایا کرتی تھی۔ وہ کہیں کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتا تھا تو صرف ہاتھ سینکنے کی غرض سے پھڈا شروع کردیتا تھا۔ کم از کم چار پانچ ٹریفک کانسٹیبلان کو تو وہ میرے سامنے پیٹ چکا تھا۔ اب بھی وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا اور مستقبل قریب میں ہونے والے کسی ہنگامے کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ عمارت میں اس وقت مکمل خاموشی تھی لہٰذا یہ آواز مدھم ہونے کے باوجود صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے اور صفدر کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید رجب کے دونوں ساتھیوں (یعنی جانی اور غیاثے) میں سے کوئی آیا ہے۔ لیکن ان کے دیدار کی خواہش اب بھی پوری نہیں ہوئی۔ آنے والا گونگا عدیل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی موم بتی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کا چوڑا اور لمبے بال پراسرار نظر آرہے تھے۔ اس نے موم بتی کھڑکی کی چوکھٹ پر استادہ کی اور آہنی گرل کے پار سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں عجیب سوئی سوئی سی کیفیت تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ بستر پر بہت دیر کروٹیں بدلنے کے بعد یہاں آگیا ہے۔ وہ مجھے اپنے تمام ساتھیوں میں سے زیادہ معاملہ فہم اور دلیر نظر آرہا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں کی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ رجب ان کا دوست نہیں بدترین دشمن ہے۔ وہ انہیں بیرونی ملک نہیں بھیج رہا ہے ان کے پیسے کھرے کررہا ہے۔ میں نے عدیل کو ان فاقہ زدہ قیدیوں کے بارے میں بھی بتانے کی کوشش کی جو ہمارے قدموں کے نیچے تہ خانے میں موجود تھے۔ عدیل ہاتھوں کو بار بار سوالیہ انداز میں حرکت دینے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے دونوں کلائیاں جوڑ کر "قیدی" کا اشارہ دیا پھر فرش کی طرف اشارہ کرکے تہ خانے کے بارے میں بتایا۔ اور بتایا کہ اس تہ خانے کے نیچے بھی ایک تہ خانہ موجود ہے۔ پھر انگلیوں پر گن کر بتایا کہ بائیس قیدی تہ خانے میں موجود ہیں۔ ہاتھ کو کوڑا مارنے والے انداز میں لہرا کر عدیل کو بتایا کہ رجب ان سے سخت مار کرتا ہے۔

میری یہ تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ عدیل کے چہرے پر بدستور الجھن بچی ہوئی تھی۔ جو کچھ میرے اور صفدر کے ذہن میں تھا اس کا ابلاغ عدیل تک نہیں ہورہا تھا۔ وہ میری اشاراتی زبان کے جواب میں جوابی اشارے کررہا تھا' یہ اشارے ہماری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ درحقیقت وہ تہ خانے کا اشارہ ہی نہیں سمجھ پارہا تھا۔ صفدر نے اشاروں میں اس سے پوچھا کہ کیا وہ لکھ پڑھ سکتا ہے۔ صفدر کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہم بتانا چاہ رہے ہیں وہ لکھ کر بتا دیا جائے لیکن عدیل نے ہمیں یہ بتا کر مایوس کردیا کہ وہ کورا ان پڑھ ہے۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ پہلے فرش کی طرف اشارہ کیا' پھر انگلیوں سے سیڑھیاں اترنے کا اشارہ دے کر اسے سمجھایا کہ تہ خانے کے نیچے تہ خانہ موجود ہے۔ اس مرتبہ عدیل تہ خانے کا اشارہ سمجھ گیا' مگر ساری بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ زندگی میں دوسری بار مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ان پڑھ اور گونگے بہرے شخص تک اپنا مافی الضمیر پہنچانا کس قدر مشکل ہے۔ میں نے اشاروں میں عدیل سے کہا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو بلائے تاکہ میں اسے اپنی بات سمجھا سکوں۔ اس موقع پر عدیل نے انکشاف کیا کہ اس کے تمام ساتھی اس عمارت سے جاچکے ہیں۔

میں نے ٹوٹے دانت کا اشارہ دے کر پھر رجب کا ذکر کیا اور عدیل سے پوچھا کہ اس کے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

یہ بات بھی عدیل کی سمجھ میں نہیں آسکی یا شاید اس مرتبہ وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا تھا۔ معاملہ الجھتا جارہا تھا۔ جانی' غیاث اور ریچھ نما شخص کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اب عدیل بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھی بھی یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اب ہم عدیل کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ ہماری زبان سمجھ رہا تھا اور نہ ہم پر بھروسا کررہا تھا۔ میں اسے ان قیدیوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو تہ خانے میں رجب کے ظلم و ستم کا شکار تھے اور رجب کے مجرمانہ ارادوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ وہ اس بات کی تہ تک نہیں پہنچ پارہا تھا اور مجھ سے بار بار ایک ہی سوال کررہا تھا کہ رجب کہاں ہے؟ ہر بار جب وہ اپنا سوال دہراتا تھا تو اس کے لہجے میں پہلے سے کچھ زیادہ تلخی آجاتی تھی۔

اس کی پتلون کی دائیں جیب پھولی ہوئی تھی اور صاف

پتا چلتا تھا کہ اس میں ریوالور وغیرہ موجود ہے۔ وہ اس بند کمرے میں کھڑکی کے راستے ہمیں کسی بھی طرح کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ "اب کیا کیا جائے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔
وہ بولا "اس کو غصہ دلا کر دیکھیں، شاید دروازہ کھول دے۔"

میں نے کہا "یہ دروازہ نہیں کھولے گا۔ میرا خیال ہے کہ جانی اور غیاثے نے ان لڑکوں کے سامنے ہماری کافی "تعریف توصیف" کی ہے، یہ ہمیں ہٹلر اور چنگیز خاں کا ہم نشیں سمجھ رہے ہیں۔ یہ جو بات کرے گا کھڑکی سے ہی کرے گا۔"

"اور کھڑکی سے ہی گولی مارے گا۔" صفدر نے کہا۔
"بالکل ایسا ہی ہوگا۔"
"تو پھر کیا کریں، گولی کھائی جائے یا اسے رجب کا پتا بتا دیا جائے۔"

"میری تو یہ خواہش تھی کہ یہ کسی طرح ان قیدیوں تک پہنچ جائے اور ان کی حالت زار دیکھ لے۔"

ایک دم میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میں چونک کر عدیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم یہی چاہتے تھے نا... کہ عدیل اور اس کے ساتھی نچلے تہ خانے کا منظر دیکھ لیں اور انہیں رجب کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے۔ یہ مقصد ایک اور طریقے سے بھی حل ہو سکتا تھا۔ "تہ خانے" کا اشارہ عدیل کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ رجب کا اشارہ بھی سمجھ رہا تھا۔ جب بھی میں دانت کو انگلی لگاتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا کہ میں رجب کی بات کر رہا ہوں۔ ان دونوں اشاروں کی مدد سے میں عدیل کو بتا سکتا تھا کہ رجب تہ خانے میں ہے۔ پھر کلائیاں جوڑنے والے اشارے سے اسے سمجھایا جا سکتا تھا کہ ہم نے اسے وہاں قید کر رکھا ہے۔

میں نے نئے سرے سے عدیل کے ساتھ اشاراتی زبان شروع کی۔ اس مرتبہ مجھے کامیابی ہوئی۔ میں عدیل تک یہ بات پہنچانے میں کامیاب ہو گیا کہ جس رجب کی تلاش میں وہ مرا جا رہا ہے، وہ تہ خانے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ میں نے عدیل کو یہ بھی بتا دیا کہ تہ خانے کا دروازہ بالائی تہ خانے کے شمالی گوشے میں موجود ہے۔

عدیل موم بتی سمیت بڑی تیزی سے واپس چلا گیا۔ ہمارے کمرے میں اور ارد گرد ایک بار پھر گہری تاریکی پھیل گئی۔ چند منٹ بعد روشنی دوبارہ دکھائی دی۔ عدیل تہ خانے کا مقفل دروازہ دیکھ آیا تھا اور اب مجھ سے دروازے کی چابی مانگ رہا تھا۔ یہ ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ چابی میرے پاس نہیں تھی۔ وہ رجب کے پاس تھی اور ممکن تھا کہ اس کی جیب میں ہی ہو۔ میں عدیل کو رجب کے بارے میں بتا دیتا تو پھر سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اس سوال کا جواب میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے عدیل کو بتایا کہ رات پہلے پہر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے ہماری جو پٹائی کی تھی اسی دوران میں چابی میری جیب سے کہیں گر گئی ہے۔

صفدر نے عدیل کو سمجھایا کہ وہ ڈرائنگ روم کے آس پاس چابی تلاش کرنے کی کوشش کرے، اگر چابی نہ ملے تو وہ تالا توڑ ڈالے۔

عدیل کچھ دیر تک بے یقینی کی کیفیت میں ہماری طرف دیکھتا رہا پھر ہمارے کہنے کے مطابق کمرے سے باہر اور ڈرائنگ روم کے آس پاس "چابی" تلاش کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اپنی اس کوشش میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ شمع کی روشنی چار پانچ منٹ تک ڈرائنگ روم کے آس پاس چکراتی رہی پھر دور ہوتی چلی گئی۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ عدیل مایوس ہو کر تہ خانے کے دروازے کی طرف چلا گیا ہے۔

ہمارے منصوبے کی کامیابی کا انحصار اسی بات پر تھا کہ عدیل تہ خانے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جائے اور دیکھے کہ تہ خانے کی اس نچلی منزل میں موجود لوگوں کے ساتھ رجب کا سلوک کیسا ہے۔ ہم اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ کیا سامنے آتا ہے۔ اگر عدیل اس کوٹھی میں واقعی اکیلا تھا تو پھر اسے کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آسکتی تھی۔ دس پندرہ منٹ اسی گومگو کی کیفیت میں گزرے، تب ایک ساتھ بریٹا پسٹل کے تین دھماکے ہوئے اور عمارت کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ گونگے عدیل نے تہ خانے کے دروازے کے آہنی قفل پر فائرنگ کی ہے۔ چند منٹ بعد خود کار را ئفل سے دو برسٹ مارے گئے۔ برسٹ کی آوازوں سے در و دیوار لرز گئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ فائرنگ بھی عدیل نے تہ خانے کے دروازے پر کی تھی۔ اس کے نتیجے میں دروازے کا قفل والا حصہ ٹوٹ گیا تھا اور دروازہ کھل گیا تھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ اب ہمیں عدیل کو سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تہ خانے میں نظر آنے والے مناظر اسے رجب جان کی اصلیت سے اچھی طرح آگاہ کر دیں گے۔ قریباً پندرہ منٹ تک ہم نتیجے کے منتظر رہے۔ اسی دوران میں عمارت کی بجلی بھی آگئی۔ روشنی ہونے کے چند منٹ بعد ہی کامن روم کی طرف سے ملی جلی آوازیں آئیں۔

پھر میں نے عدیل کو دیکھا، اس کے علاوہ بوسیدہ کپڑوں والے وہ دق زدہ چہرہ لوگ بھی نظر آئے جنہیں رجب "بردے" کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور جن کا سودا اس نے ہمارے ساتھ فی بردہ اٹھارہ ہزار کے حساب سے طے کیا تھا۔ میں نے دیکھا عدیل کے چہرے پر اب ہمیں وہ پہلے سی درشتگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہی کچھ ہوا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ عدیل نے ہمارے زنداں کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے رویے سے کسی حد تک ندامت کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ ندامت اس مار پیٹ کے لیے تھی جو رات پہلے پہر ہم سے کی گئی تھی۔ جو چیز دیکھ کر میں اور صفدر بری طرح چونکے وہ دو عدد لاشیں تھیں۔ یہ لاشیں برآمدے کے قریب کوریڈور کے وسط میں پڑی تھیں۔ میں نے دیکھا یہ صفا چٹ سر والے جانی اور غیاثے کی لاشیں تھیں۔ ان لاشوں کے قریب ہی کانچ کی چوڑیوں کے بہت سے ٹکڑے پڑے تھے اور ایک زنانہ جوتی دکھائی دے رہی تھی۔

گنجے سر والے جانی کے پیٹ میں گولی لگی تھی جبکہ غیاثے کے سینے اور پیٹ پر کسی تیز دھار آلے کے دو گہرے زخم تھے۔ زخموں سے بہنے والا خون کوریڈور کے فرش پر لوتھڑوں کی صورت میں جما ہوا تھا۔ ہماری سمجھ میں اب یہ بات اچھی طرح آ رہی تھی کہ رات نو دس بجے کے بعد سے ہمیں جانی اور غیاثے کی صورت نظر کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک سنگین واقعے کا شکار ہو کر راہی عدم ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ کیا تھا؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے لاشوں کی طرف اشارہ کر کے عدیل سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے ناک پر انگلی رکھ کر لڑکی کا اشارہ دیا پھر غیاثے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ شخص لڑکی کو زبردستی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا، جانی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ غیاثا باز نہیں آیا۔ دوسری طرف جانی بھی اسے روکنے سے باز نہیں آیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غیاثے نے جانی کو گولی مار دی۔ جواب میں جانی نے غیاثے پر چاقو سے حملہ کیا اور اسے دو مہلک زخم لگا دیے۔ کچھ دیر بعد دونوں ہی تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔

میں نے عدیل سے پوچھا کہ لڑکی کون تھی؟ اور اب وہ کہاں ہے؟

عدیل پہلے سوال کا صحیح جواب تو نہ دے سکا، بہرحال دوسرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ لڑکی صحیح سلامت ہے اور اسی عمارت کے ایک محفوظ کمرے میں ہے۔ ہم لڑکی کو دیکھنے سے پہلے رجب کو دیکھنا چاہتے تھے، اس کے بارے میں ہم دونوں کو بجا طور پر تشویش تھی۔ میں اور صفدر تیزی سے صحن کراس کر کے سرونٹ کوارٹرز کی طرف آگئے۔ عدیل ہمارے پیچھے تھا اور اس کے عقب میں وہ سارے قیدی تھے جو ابھی ابھی اپنی طویل قید سے رہا ہوئے تھے۔ ہم سرونٹ کوارٹرز کے اندر داخل ہوئے۔ صفدر نے لائٹ جلائی۔ میں نے جستی ٹرنک کا ڈھکنا اٹھایا۔ رجب اندر موجود تھا مگر بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ہم نے اسے جستی ٹرنک میں سے باہر نکالا۔ نیچے کے لحاف خون سے بھیگے ہوئے تھے، ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ اخراج خون کی وجہ سے رجب بے ہوش ہو چکا ہے۔ بلب کی روشنی میں اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد نظر آ رہا تھا اور سانس کھینچ کھینچ کر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی وہ بہت سست اور نا قابل محسوس تھی۔ رجب کو فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے صفدر سے مشورہ کیا۔ صفدر کا خیال تھا کہ ساہی صاحب کو اطلاع کر دی جائے۔ لیکن اگر ساہی صاحب آ جاتے اور ان کے ساتھ پولیس پہنچ جاتی تو پھر رجب کو ہمارے ہاتھ سے نکل جانا تھا۔ ہم ذاتی طور پر اس سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر تو جو کچھ کرنا تھا پولیس نے ہی کرنا تھا۔ ابھی ہم سوچ بچار ہی کر رہے تھے کہ میری نگاہ عدیل کے دو ساتھیوں پر پڑی۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف آ رہے تھے۔ یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ عدیل نے کچھ دیر پہلے اشاروں کنایوں میں ہمیں بتایا تھا کہ اس کے تمام ساتھی عمارت چھوڑ کر جا چکے ہیں، لیکن اب ان میں سے دو بالائی منزل سے اتر رہے تھے اور غالباً مزید بھی موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ دونوں لڑکے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ وہ دونوں خوف سے زرد ہو رہے تھے۔ پٹھان لڑکے نے روہانسے لہجے میں کہا "یہ امارے ساتھ کیا ہو رہا ہے صاحب۔ یہ ام سب کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ ام تو سیدھا سادہ مزدور لوگ ہے۔ اس مارا ماری سے امارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

ایک لاہوری لڑکا پنجابی لہجے میں اردو بولنے لگا "ہمارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ ہمیں تو ہمارے پیسے مل جائیں تو ہم واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ہمارے اندر ان چکروں میں پڑنے کی ہمت نہیں ہے۔"
میں نے لڑکے سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"
وہ بولا "محمد اسلم۔ لاہور گڑھی شاہو کا رہنے والا ہوں۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم بھی ہمیں پیٹنے والوں میں شامل تھے۔"

وہ ایک دم لرز کر رہ گیا "معاف کر دیں جی۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ یہ سارا قصور گونگے عدیل کا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا رہا ہم کرتے رہے۔ ہم رجب کو اپنا خیر خواہ اور آپ کو دشمن سمجھ رہے تھے' جبکہ معاملہ الٹ نکلا۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ تہ خانے سے نکلنے والے بندوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ تو بہت بڑا چکر چلنے والا تھا ہمارے ساتھ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔" محمد اسلم کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو تیر گئے۔

صفدر نے پوچھا "اب تک کہاں تھے تم لوگ؟"

وہ بولا "ہم اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں تھے۔"

"تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"وہ بھی سب یہیں ہیں۔ دراصل۔۔۔ دراصل دو زخمیوں اور دو لاشوں کو دیکھ کر ہم بہت ڈر گئے تھے۔ چند لڑکے تو یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ دوسروں نے انہیں بمشکل روکا کہ ہم بے قصور ہیں' بھاگ کر خود کو مجرم کیوں بنائیں۔ ایک طرف ہمیں رجب کا کم ہونا پریشان کر رہا تھا۔ دوسری طرف رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاث نے ہمیں یہ کہہ کر ڈرا دیا تھا کہ آپ دونوں (یعنی میں اور صفدر) نہایت خطرناک مجرم اور بے رحم قاتل ہیں۔ ہم سب اتنے پریشان رہے ہیں کہ ساری رات ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سو سکے۔ ہم اوپری منزل کے ایک کمرے میں تھے اور دروازے کو اندر سے تالا لگا رکھا تھا۔

اسی دوران میں کچھ اور ڈرے ڈرے لڑکے بھی بالائی منزل سے اتر آئے اور سرونٹ کوارٹرز میں پہنچ گئے۔ اب صبح ہو گئی تھی اور اجالا پھیل گیا تھا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ وہ تین سال ایک ڈاکٹر کے ساتھ کمپاؤنڈری کرتا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر اسے ایک سرنج مہیا کر دی جائے اور موٹر سائیکل دے دی جائے تو وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر رجب کے لیے مطلوبہ خون مہیا کر سکتا ہے۔ اور نہ صرف مہیا کر سکتا ہے بلکہ لگا بھی سکتا ہے۔ یہ پیشکش ہماری ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ہم رجب کو اسپتال لے جانا نہیں چاہتے تھے' دوسری طرف اسے خون کی بھی اشد ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے ہمیں عمارت کے اندر سے ہی انجکشن کی سرنجیں مل گئیں۔ عاطف نام کے اس لڑکے نے چابک دستی سے رجب کا بلڈ لے لیا۔ اب اسے سواری کی ضرورت تھی۔ رجب کی پجارو کی چابی صفدر کے پاس تھی۔

میں نے صفدر سے کہا کہ وہ اس لڑکے کو جیپ پر ساتھ لے جائے اور جتنی جلدی ہو سکے بلڈ کا انتظام کرے۔ جتنی دیر میں صفدر جیپ اسٹارٹ کرکے مین گیٹ تک لایا' عاطف نامی اس لڑکے نے بڑی مہارت سے رجب کو تازہ پٹی کر دی اور اس کا رستا ہوا خون بند کر دیا۔

صفدر جب لڑکے کو لے کر بلڈ کا انتظام کرنے روانہ ہو گیا تو میں نے عدیل کے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا واقعہ ہوا ہے جس کے نتیجے میں رجب کے دونوں ساتھی ہلاک ہو گئے ہیں۔ لڑکوں نے اپنے اپنے انداز میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

گہری بڑی آنکھوں اور سیاہ بالوں والی جو دو لڑکیاں ہم نے کل رات دیکھی تھیں وہی اس دہرے قتل کا سبب بنی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کو شانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ رجب کا قریبی ساتھی اور گارڈ غیاث شانی پر نظر رکھتا تھا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے سر پر شانی کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ جب رات کو اس عمارت میں افراتفری مچی اور گولیاں چلیں تو غیاث کی نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ بعد ازاں جب عدیل اور اس کے ساتھی کوشش کے باوجود "اغوا شدہ" رجب کو عمارت کے اندر سے تلاش نہ کر سکے تو غیاث نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ اس نے ڈری سہمی لڑکی کو پجارو میں لے جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر رجب کے وفادار ساتھی جانی نے غیاث کی شدید مزاحمت کی۔ نتیجے میں غیاث نے اسے کوریڈور میں گولی مار دی۔ جانی کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو تھا' اس نے گولی کھانے کے باوجود غیاث پر حملہ کیا اور اسے دو مہلک زخم لگا دیے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں ٹھنڈے ہو گئے۔

وہ دونوں لڑکیاں اب بھی عمارت کے زیریں تہ خانے میں موجود تھیں۔ میں نے عدیل اور اس کے دو ساتھیوں کو بھیجا۔ وہ پانچ دس منٹ میں لڑکیوں کو اس بندی خانے سے نکال کر لے آئے۔ ایک لڑکی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ اس کی ایک کلائی پر ٹوٹ جانے والی چوڑیوں کے زخم تھے اور قمیص بھی کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یقیناً یہی شانی تھی۔ وہ قابل رحم حد تک خوف زدہ تھی۔ بالکل ایک ایسی ہرنی کی طرح جو تاریک جنگل میں تنہا تھی اور اپنے ارد گرد شیروں کی دہاڑیں سن رہی تھی۔ لڑکی کی ظاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اغوا کی کوشش کرتے وقت غیاث نے اسے بری طرح نوچا کھسوٹا بھی ہے۔

میں صاف دیکھ رہا تھا کہ یہاں موجود تمام افراد سخت

گھبرائے ہوئے ہیں۔ اگر بردہ فروش رجب کی زبان میں بات کی جائے تو یہ بردوں کی دو ٹولیاں تھیں۔ ایک ٹولی یا کھیپ ان بردوں کی تھی جو اسحاق جالندھری نام کے اسمگلر کی لانچ سے فرار ہوئے تھے اور دوبارہ پکڑے گئے تھے۔ ان افراد نے چونکہ بے حد سختی دیکھی تھی اور زندگی کو موت سے بدتر ہوتے دیکھا تھا لہٰذا وہ اپنے آزاد ہو جانے کو ہی اپنی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھ رہے تھے اور جلد از جلد اپنا آپ بچا کر اس عمارت سے نکل جانا چاہتے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی اس ٹولی میں شامل تھیں۔ دوسری ٹولی ان افراد کی تھی جو اب تک یہاں بڑے عیش و آرام سے رہے تھے اور مستقبل کے خواب بُنتے رہے تھے۔ ان پر رجب کا اصل روپ کل رات کھلا تھا۔ اب وہ خوف اور صدمے کی ملی جلی کیفیت میں تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ رجب اتنا بڑا دھوکے باز ہو سکتا ہے۔ اس ٹولی میں سے کچھ لڑکے تو ہر چیز پر لعنت بھیج کر یہاں سے نکل بھاگنا چاہتے تھے لیکن دس بارہ لڑکے ایسے تھے جو رجب کا گریبان پکڑنا چاہتے تھے اور اس سے اپنی رقم وصولنے کے خواہش مند تھے۔ ان نوجوانوں کی دلی آرزو تھی کہ رجب کی زندگی بچ جائے۔

میں نے تقریر کرنے والے انداز میں تمام لڑکوں کو سمجھایا۔ میں نے کہا "تم لوگوں کو گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور گھبرانے کی بات بھی کیا ہے۔ تم مجرم نہیں ہو' تم مدعی ہو۔ تمہارا حق مارا گیا ہے۔ یہ حق ہم انشاء اللہ تمہیں لے کر دیں گے۔ میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ یہاں تم میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پولیس تم سے ہمدردی کا سلوک کرے گی اور جو دو بندے یہاں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں تم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ آپ سب لوگ سکون سے رہیں۔ جو کچھ آپ پر گزری ہے وہ پوری دیانت داری کے ساتھ ہمیں بتائیں۔ ہم نہ صرف اس رجب نام کے بردہ فروش کو انجام تک پہنچائیں گے بلکہ اس کے ساتھیوں کو بھی قانون کی گرفت میں لائیں گے۔"

میرے سمجھانے بجھانے سے تمام افراد قدرے پُرسکون نظر آنے لگے۔ وہ مدقوق چہرہ افراد جو رجب کے بدترین تشدد کا شکار ہوئے تھے' آبدیدہ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے مجھے اپنے جسم پر تشدد کے نشانات دکھائے۔ اس خیال سے کہ ان کے جسموں پر گہرے زخم نہ آئیں اور ان کی قیمت میں کمی واقع نہ ہو انہیں کند آلات سے ضربیں لگائی جاتی تھیں یا پھر بید کی چھڑیوں سے پیٹا جاتا تھا۔

صفدر اور عاطف نامی نوجوان کو واپس آنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا لیکن وہ ناکام واپس نہیں آئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے خون کی گروپنگ اور کراس میچنگ وغیرہ کرالی تھی بلکہ تین بیگ بھی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ تین بیگ (بوتل) خون رجب کے لیے کافی تو نہیں تھا تاہم اسے وقتی طور پر سنبھالا دے سکتا تھا۔ عمارت کے ایک آرام دہ کمرے میں عاطف نے رجب کو خون لگا دیا۔ ہم اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ بالکل جیسے کسی بجھتے ہوئے چراغ میں پھر سے تیل ڈال دیا جائے اور اس کی لو اونچی ہو جائے رجب کے زرد چہرے پر بھی زندگی نمودار ہونے لگی۔

دو بوتل خون لگنے کے بعد رجب کی حالت کچھ سنبھل گئی اور سانس بھی ہموار ہو گئی لیکن اس کی بے ہوشی برقرار تھی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا نظر نہیں آتا تھا جتنا ہم سمجھے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حضرات بتاتے ہیں خون اور آکسیجن کی شدید کمی سے بعض اوقات دماغ بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ میں نے اور صفدر نے محسوس کیا کہ رجب کو اسپتال پہنچایا جانا ضروری ہے۔ خون دینے سے فوری طور پر تو اس کی زندگی محفوظ ہو گئی تھی مگر یہ ناکافی "ٹریٹمنٹ" تھی۔ اگر فرض محال رجب ہوش میں آ بھی جاتا تو ہم اس سے فوری طور پر پوچھ گچھ شروع نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف یہ مسئلہ بھی تھا کہ اب ہم زیادہ دیر اس عمارت میں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس امر کا قوی امکان تھا کہ رجب کے اس کالے دھندے میں اور لوگ بھی شریک ہوں گے۔ اس کے علاوہ رجب کے ساتھی اور کارندے تھے' ان میں سے کوئی بھی اس عمارت تک پہنچ جاتا تو اسے محسوس ہو جاتا کہ یہاں زبردست قسم کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ایسے میں ہمارے ساتھ ان تمام افراد کی زندگیوں کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو سکتا تھا جو ہمارے ساتھ یہاں موجود تھے۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ساہی صاحب کو یہاں بلا ہی لیا جائے۔

ٹیلی فون کا تار جو ہم نے رات کو کاٹ دیا تھا پھر سے جوڑا گیا۔ میں نے ساہی صاحب کو رنگ کیا۔ وہ ابھی گھر ہی میں تھے اور ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ معقول نفری لے کر یہاں پہنچ جائیں۔

تقریباً پون گھنٹے بعد ہمیں کوٹھی کے نواح میں پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔ یہ تین گاڑیاں تھیں اور ان میں دو تھانوں کے تقریباً ۲۵ مسلح اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے گاڑیوں سے اترتے ہی کوٹھی کی وسیع چار دیواری کے گرد

گھیرا ڈال لیا۔ تین چار رائفل مین کوٹھی کے داخلی دروازے پر چوکس کھڑے ہو گئے۔ ایس ایچ او نے مجھ سے بات کی اور بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایس ایس پی صاحب بھی موقع پر پہنچ رہے ہیں۔ اپنی گاڑی کے وائرلیس سیٹ پر ایس ایچ او کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں ساہی صاحب راوی کا پل کراس کر رہے تھے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ساہی صاحب پہنچ گئے۔ وہ وردی میں تھے۔ ان کی جیپ میں ایک انسپکٹر کے علاوہ دو تین اے ایس آئی بھی تھے۔ ساہی صاحب مجھے میک اپ کے باوجود پہچان گئے۔

ساہی صاحب مجھے اور صفدر کو لے کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہاں توڑ پھوڑ کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ توڑ پھوڑ اس دھینگا مشتی کا نتیجہ تھی جو ہمارے اور مدیل وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب کو ذرا تفصیل کے ساتھ تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بے حد حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ قانون کی ناک کے عین نیچے کچھ لوگ اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کی خرید و فروخت کا دھندا کر رہے ہیں۔ ساہی صاحب کو تمام حالات بتانے کے بعد میں نے انہیں جانی اور غیاث کی لاشیں دکھائیں۔ یہ لاشیں رات سے جہاں کی تہاں پڑی تھیں، انہیں کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ساہی صاحب نے دیگر پولیس افسران کے ساتھ لاشوں کا معائنہ کیا۔ زخمی "ریچھ نما" بھی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ گولی اس کی پنڈلی کی ہڈی میں لگی تھی۔ رات میں اس کی ٹانگ سوج کر کپا ہو چکی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ ساہی صاحب نے پولیس افسران کے ہمراہ بالائی اور زیریں تہ خانے کا بھی معائنہ کیا۔ وہ یہ کیبن دیکھیں جہاں لوگوں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ ایک کمرا ایسا تھا جسے دیکھ کر دوسری جنگ عظیم میں نازیوں کے عقوبت خانے یاد آ گئے۔ یہاں نافرمان قیدیوں کو سزا دینے کے لیے نہایت بھیانک قسم کے آلات رکھے تھے۔ آہنی شکنجے، ناخن کھینچنے کے لیے پلاس، الٹا لٹکانے کے لیے لوہے کے کڑے، جسم کو حدت پہنچانے کے لیے ہیٹر اور پتا نہیں کیا کچھ۔

پولیس پارٹی کے ساتھ فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ وہ ہر جگہ کی تصویریں لے رہا تھا۔ ساہی صاحب ماتحت افسران کو مسلسل ہدایات جاری کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موقع سے چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ وہ تمام افراد کے بیانات بھی اپنی موجودگی میں قلم بند کروانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف رجب کا بھی مسئلہ تھا۔ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچایا جانا ضروری تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ جائے واردات کا نقشہ بنانے اور بیان وغیرہ قلم بند کرانے کا کام ایک ماتحت کو سونپ کر ہمارے ساتھ روانہ ہو گئے۔ رجب کو جیپ کی پچھلی لمبی نشست پر لٹایا گیا تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور ڈرائیور اگلی نشستوں پر موجود تھے۔ میں اور صفدر ساہی صاحب کے ساتھ پچھلی گاڑی میں تھے۔ اس گاڑی میں دو مسلح ہیڈ کانسٹیبل بھی موجود تھے۔

ہم رجب کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ساہی صاحب خاصے حیران نظر آ رہے تھے۔ وہ جب میرے ٹیلی فون پر گھر سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی اہم خبر ان کی منتظر ہے۔ نہایت گھناؤنے کاروبار میں ملوث ایک گروہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ اور مع لیڈر کے گرفتار ہوا تھا۔ (اس وقت تک ہم رجب کو ہی سرغنہ سمجھ رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ رجب تو اس وسیع کاروبار میں ایک معمولی سا مہرہ ہے نہ ہی ہمیں ابھی اس کاروبار کے صحیح حجم کا اندازہ تھا) زخمی رجب والی جیپ آگے تھی جبکہ ہماری گاڑی عقب میں آ رہی تھی۔ نزدیک ترین اسپتال "لیڈی ولنگڈن" تھا۔ ہم شیخوپورہ روڈ پر تھے اور ابھی راوی کے پل سے تقریباً ایک کلو میٹر دور تھے۔ اچانک ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی نے جیپ کو اوور ٹیک کیا اور پھر جیپ کو سائڈ پر دباتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر کر رکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ منظر ہم سب کو ریڈ الرٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اترے اور کوسٹر کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوسٹر کی اگلی کھڑکیوں سے خود کار رائفل کی فائرنگ ہوئی۔ ایک کانسٹیبل کے سینے اور سر پر گولیاں لگیں، وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے کانسٹیبل نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کیا اور بمشکل فائرنگ سے بچایا۔ کانسٹیبل کے اچانک قتل نے ہمیں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ کوسٹر نے ترچھا کھڑا ہو کر جیپ کا راستہ بالکل مسدود کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے جو دراصل ساہی صاحب کا تجربہ کار ڈرائیور حیات محمد تھا، تیزی سے جیپ کو بائیں رخ پر موڑا اور کھیتوں میں اتار دیا۔ جیپ کھیتوں کے درمیان واقع کچے راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی اس کے پیچھے گرد کا ایک بادل بلند ہوا۔ کوسٹر سے جیپ پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی یہ منظر دیکھ کر ہم نے بھی پولیس موبائل کے اندر سے کوسٹر کی کھڑکیوں پر فائرنگ کی۔ کئی شیشے چھناکے سے

ٹوٹ گئے۔ کوسٹر کا انجن اسٹارٹ تھا، اس نے ٹرن لیا اور جیپ کے پیچھے دوڑی۔ موبائل کے ڈرائیور نے بھی ساہی صاحب کے اشارے پر گاڑی کوسٹر اور جیپ کے پیچھے کچے راستے پر ڈال دی۔ اسی دوران میں ایک برسٹ آیا اور موبائل کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ ایک گولی ڈرائیور نذیر محمد کے بازو میں لگی دوسری صفدر کا کندھا چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور نذیر محمد کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

ساہی صاحب نے بلند آواز میں پوچھا "گاڑی چلا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے رفتار تیز کرو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہماری گاڑی گرد کے بادل میں تقریباً چھپ سی گئی تھی۔ ہمیں یہ تسلی تھی کہ ہم پر نشانہ لے کر فائر نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اندھی گولیوں کا اندیشہ ہر لحظہ موجود تھا۔ ہم نے سر حتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیے تھے۔ صرف ڈرائیور نذیر سیدھا بیٹھا تھا اور یہ اس کی مجبوری تھی۔ بہرحال گاڑی کو حرکت میں رکھنے کے لیے کسی ایک شخص کو تو رسک لینا ہی تھا۔ یہ رسک واقعی "رسک" ثابت ہوا۔ کوسٹر سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ایک گولی نذیر محمد کے سر میں لگی اور وہ اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گر گیا۔ میں نے پیچھے جھکے جھکے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام لیا۔ مگر اسی دوران میں دم توڑتے ہوئے نذیر کا پاؤں ایکسیلریٹر سے ہٹ گیا اور گاڑی دو چار جھٹکے کھا کر رک گئی۔

گولی نذیر کی پیشانی پر لگی تھی۔ اس کے بچنے کا ایک فیصد چانس بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کا جسم دھکیل کر گاڑی سے نیچے گرایا اور خود اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اس سے پہلے کہ میں انجن اسٹارٹ کرتا مجھے اندازہ ہوا کہ کوسٹر رک گئی ہے۔ گرد کے بادل میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آنے لگا تھا۔ کوسٹر کے رکنے کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں، اس کے ٹائر برسٹ ہو گئے تھے یا پھر آگے جاتی ہوئی جیپ رک گئی تھی۔ ہمارا دوسرا خیال درست تھا۔ جیپ رکی ہوئی تھی۔ اور وہ جس طریقے سے رکی ہوئی تھی وہ نہایت مخدوش تھا۔ جیپ بے قابو ہو کر کچے راستے سے اتر گئی تھی اور ایک نشیبی کھیت میں گر گئی تھی۔ وہ پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کے پہیے ابھی تک گھوم رہے تھے۔ جیپ میں موجود سب انسپکٹر دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ میں سے نکل آیا تھا اور اب جیپ کی اوٹ لے کر کوسٹر والوں پر ریوالور سے فائر کر رہا

تھا۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لی اور کوسٹر پر فائر کرنے لگے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوسٹر میں کم از کم سات آٹھ افراد ہیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ ہمارے کانسٹیبلوں کے پاس وہی دقیانوسی رائفلیں تھیں۔ ایک تھری ناٹ تھری تھی۔ دوسری پرانے ماڈل کی سیون ایم ایم تھی مگر یہ برسٹ نہیں مار سکتی تھی۔ یہ رائفل صفدر نے لے لی اور ایک تناور درخت کی آڑ لے کر فائر کرنے لگا۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور پہلے تین چار فائرز میں ہی کوسٹر کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ کر دیے۔ اسی دوران میں جیپ کی آڑ لے کر فائر کرتے ہوئے سب انسپکٹر کی بدقسمتی نے اسے آواز دی۔ اس نے تابڑ توڑ فائرنگ سے گھبرا کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک قریبی درخت کی جانب دوڑ لگائی تھی لیکن ابھی وہ بمشکل جیپ کے عقب سے نکلا ہی تھا کہ دو گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہو گئیں اور وہ کھیت کی کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ساہی صاحب کا ڈرائیور حیات محمد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ زخمی ہے اور جیپ کے اندر ہی ہے۔ موبائل کے وائرلیس سیٹ کا رابطہ ہیڈ کوارٹر سے تھا، کوئی چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "یہ کیا ہو رہا ہے سر؟ یہ فائرنگ کیسی ہے۔ آپ کہاں ہیں سر۔ ہیلو ہیلو انسپکٹر بشیر کالنگ۔ آپ کہاں ہیں سر۔"

ساہی صاحب نیچے جھکے جھکے وائرلیس سیٹ تک پہنچے اور ریسیور اٹھا کر بولے "ہیلو انسپکٹر بشیر... ایس ایس پی ساہی اسپیکنگ۔ یہاں شیخوپورہ روڈ پر موڑ سے ایک کلو میٹر پیچھے پولیس مقابلہ ہو گیا ہے۔ راوی روڈ تھانے میں کال کرو... ایس ایچ او نفری کے ساتھ فوراً پہنچے..."

دوسری طرف سے آواز آئی "سر ایک موبائل شاہدرہ کے قریب موجود ہے میں اسے کال کرتا ہوں۔"

اسی دوران میں ایک برسٹ گاڑی کو لگا۔ وائرلیس سیٹ اچھل کر نشست پر جا گرا اور خاموش ہو گیا۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بردہ فروش رجب کے ساتھیوں نے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کارروائی کی ہے۔ میں نے دیکھا تابڑ توڑ فائرنگ کی آڑ میں دو افراد کوسٹر کے اندر سے نکلے اور بھاگ کر ایک کچی دیوار کے عقب میں اوجھل ہو گئے۔ یہ دیوار الٹی ہوئی جیپ کے بالکل قریب ہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کوسٹر والوں کا اگلا قدم اب کیا ہو گا۔ وہ الٹی ہوئی جیپ کے پیچھے پوزیشن لینا چاہتے تھے اور زخمی رجب کو جیپ میں سے نکال کر کوسٹر میں لے جانا چاہتے تھے۔

گھیرا ڈال لیا۔ تین چار رائفل مین کوٹھی کے داخلی دروازے پر چوکس کھڑے ہوگئے۔ ایس ایچ او نے مجھ سے بات کی اور بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ایس ایس پی صاحب بھی موقع پر پہنچ رہے ہیں۔ اپنی گاڑی کے وائرلیس سیٹ پر ایس ایچ او کو مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں۔ ساہی صاحب راوی کا پل کراس کررہے تھے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ساہی صاحب پہنچ گئے۔ وہ وردی میں تھے۔ ان کی جیپ میں ایک انسپکٹر کے علاوہ دو تین اے ایس آئی بھی تھے۔ ساہی صاحب مجھے میک اپ کے باوجود پہچان گئے۔

ساہی صاحب مجھے اور صفدر کو لے کر کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہاں توڑ پھوڑ کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ توڑ پھوڑ اس دھینگا مشتی کا نتیجہ تھی جو ہمارے اور نعیل وغیرہ کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب کو ذرا تفصیل کے ساتھ تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بے حد حیرت اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ قانون کی ناک کے عین نیچے کچھ لوگ اس طرح جیتے جاگتے انسانوں کی خرید و فروخت کا دھندا کررہے ہیں۔ ساہی صاحب کو تمام حالات بتانے کے بعد میں نے انہیں جانی اور غیاث کی لاشیں دکھائیں۔ یہ لاشیں رات سے جہاں کی تہاں پڑی تھیں، انہیں کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ساہی صاحب نے دیگر پولیس افسران کے ساتھ لاشوں کا معائنہ کیا۔ زخمی "ریچھ نما" بھی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ گولی اس کی پنڈلی کی بڑی ہڈی میں لگی تھی۔ رات میں اس کی ٹانگ سوج کر کپا ہوچکی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ ساہی صاحب نے پولیس افسران کے ہمراہ بالائی اور زیریں تہ خانے کا بھی معائنہ کیا۔ وہ بیرکیں دیکھیں جہاں لوگوں کو جانوروں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ ایک کمرا ایسا تھا جسے دیکھ کر دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں کے عقوبت خانے یاد آگئے۔ یہاں نافرمان قیدیوں کو سزا دینے کے لیے نہایت بھیانک قسم کے آلات رکھے تھے۔ آہنی شکنجے، ناخن کھینچنے کے لیے پلاس، الٹا لٹکانے کے لیے لوہے کے کڑے، جسم کو حدت پہنچانے کے لیے ہیٹر اور پتا نہیں کیا کچھ۔

پولیس پارٹی کے ساتھ فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ وہ ہر جگہ کی تصویریں لے رہا تھا۔ ساہی صاحب ماتحت افسران کو مسلسل ہدایات جاری کررہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موقع سے چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ وہ تمام افراد کے بیانات بھی اپنی موجودگی میں قلم بند کروانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف رجب کا بھی مسئلہ تھا۔ اسے جلد از جلد اسپتال پہنچایا جانا ضروری تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ جائے واردات کا نقشہ بنانے اور بیانات وغیرہ قلم بند کرانے کا کام ایک ماتحت کو سونپ کر ہمارے ساتھ روانہ ہوگئے۔ رجب کو جیپ کی پچھلی لمبی نشست پر لٹایا گیا تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور ڈرائیور اگلی نشستوں پر موجود تھے۔ میں اور صفدر ساہی صاحب کے ساتھ پچھلی گاڑی میں تھے۔ اس گاڑی میں دو مسلح ہیڈ کانسٹیبل بھی موجود تھے۔

ہم رجب کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ ساہی صاحب خاصے حیران نظر آرہے تھے۔ وہ جب میرے ٹیلی فون پر گھر سے روانہ ہوئے تھے تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی اہم خبر ان کی منتظر ہے۔ نہایت گھناؤنے کاروبار میں ملوث ایک گروہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا اور بیع لیڈر کے گرفتار ہوا تھا۔ (اس وقت تک ہم رجب کو ہی سرغنہ سمجھ رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ رجب تو اس وسیع کاروبار میں ایک معمولی سا مہرہ ہے نہ ہی ہمیں ابھی اس کاروبار کے صحیح حجم کا اندازہ تھا) زخمی رجب والی جیپ آگے تھی جبکہ ہماری گاڑی عقب میں آرہی تھی۔ نزدیک ترین اسپتال "میڈی وکنگز" تھا۔ ہم شیخوپورہ روڈ پر تھے اور ابھی راوی کے پل سے قریباً ایک کلو میٹر دور تھے۔ اچانک ایک کوسٹر ٹائپ گاڑی نے جیپ کو اوورٹیک کیا اور پھر جیپ کو سائڈ پر دباتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر کر رکنے پر مجبور کردیا۔ یہ منظر ہم سب کو ریڈ الرٹ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبل چھلانگیں لگا کر گاڑی سے اترے اور کوسٹر کی طرف بڑھے۔ اسی وقت کوسٹر کی اگلی کھڑکیوں سے خودکار رائفل کی فائرنگ ہوئی۔ ایک کانسٹیبل کے سینے اور سر پر گولیاں لگیں، وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دوسرے کانسٹیبل نے خود کو گاڑی کی اوٹ میں کیا اور بمشکل فائرنگ سے بچایا۔ کانسٹیبل کے اچانک قتل نے ہمیں سکتے کی سی کیفیت سے دوچار کردیا۔ کوسٹر نے ترچھا کھڑا ہوکر جیپ کا راستہ بالکل مسدود کردیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے جو دراصل ساہی صاحب کا تجربہ کار ڈرائیور حیات محمد تھا، تیزی سے جیپ کو بائیں سمت موڑا اور کھیتوں میں اتار دیا۔ جیپ کھیتوں کے درمیان واقع کچے راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی اس کے پیچھے گرد کا ایک بادل بلند ہوا۔ کوسٹر سے جیپ پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی یہ منظر دیکھ کر ہم نے بھی پولیس موبائل کے اندر سے کوسٹر کی کھڑکیوں پر فائرنگ کی۔ کئی شیشے چھناکے سے

ٹوٹ گئے۔ کوسٹر کا انجن اسٹارٹ تھا، اس نے ٹرن لیا اور جیپ کے پیچھے دوڑی۔ موبائل کے ڈرائیور نے بھی ساہی صاحب کے اشارے پر گاڑی کوسٹر اور جیپ کے پیچھے کچے راستے پر ڈال دی۔ اسی دوران میں ایک برسٹ آیا اور موبائل کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی۔ ایک گولی ڈرائیور نذیر محمد کے بازو میں لگی دوسری صفدر کا کندھا چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور نذیر محمد کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

ساہی صاحب نے بلند آواز میں پوچھا "گاڑی چلا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے رفتار تیز کرو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہماری گاڑی گرد کے بادل میں قریباً چھپ ہی گئی تھی۔ ہمیں یہ تسلی تھی کہ ہم پر نشانہ لے کر فائر نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اندھی گولیوں کا اندیشہ ہر لحظہ موجود تھا۔ ہم نے سرحتی الامکان حد تک نیچے جھکالیے تھے۔ صرف ڈرائیور نذیر سیدھا بیٹھا تھا اور یہ اس کی مجبوری تھی۔ بہرحال گاڑی کو حرکت میں رکھنے کے لیے کسی ایک شخص کو تو رسک لینا ہی تھا۔ یہ رسک واقعی "رسک" ثابت ہوا۔ کوسٹر سے اندھا دھند فائرنگ ہورہی تھی۔ ایک گولی نذیر محمد کے سر میں لگی اور وہ اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گر گیا۔ میں نے پیچھے جھکے جھکے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام لیا۔ مگر اسی دوران میں دم توڑتے ہوئے نذیر کا پاؤں ایکسیلریٹر سے ہٹ گیا اور گاڑی دو چار جھٹکے کھا کر رک گئی۔

گولی نذیر کی پیشانی پر لگی تھی۔ اس کے بچنے کا ایک فیصد چانس بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کا جسم دھکیل کر گاڑی سے نیچے گرایا اور خود اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اس سے پہلے کہ میں انجن اسٹارٹ کرتا مجھے اندازہ ہوا کہ کوسٹر رک گئی ہے۔ گرد کے بادل میں سے اس کا ہیولا صاف نظر آنے لگا تھا۔ کوسٹر کے رکنے کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں، اس کے ٹائر برسٹ ہوگئے تھے یا پھر آگے جاتی ہوئی جیپ رک گئی تھی۔ ہمارا دوسرا خیال درست تھا۔ جیپ رکی ہوئی تھی۔ اور وہ جس طریقے سے رکی ہوئی تھی وہ نہایت مخدوش تھا۔ جیپ بے قابو ہوکر کچے راستے سے اتر گئی تھی اور ایک نشیبی کھیت میں گرتی تھی۔ وہ پہلو کے بل گری ہوئی تھی۔ اس کے پہیے ابھی تک گھوم رہے تھے۔ جیپ میں موجود سب انسپکٹر دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ میں سے نکل آیا تھا اور اب جیپ کی اوٹ لے کر کوسٹر والوں پر ریوالور سے فائر کررہا تھا۔ ہم نے بھی اپنی گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن لی اور کوسٹر پر فائر کرنے لگے۔ اندازہ ہورہا تھا کہ کوسٹر میں کم از کم سات آٹھ افراد ہیں اور ان کے پاس جدید اسلحہ ہے۔ ہمارے کانسٹیبلوں کے پاس وہی دقیانوسی رائفلیں تھیں۔ ایک تھری ناٹ تھری تھی۔ دوسری بھی اسی ماڈل کی سیون ایم ایم تھی مگر یہ برسٹ نہیں مار سکتی تھی۔ یہ رائفل صفدر نے لے لی اور ایک تناور درخت کی آڑ لے کر فائر کرنے لگا۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور پہلے تین چار فائرز میں ہی کوسٹر کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ کردیے۔ اسی دوران میں جیپ کی آڑ لے کر فائر کرتے ہوئے سب انسپکٹر کی بدقسمتی نے اسے آواز دی۔ اس نے تابڑ توڑ فائرنگ سے گھبرا کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک قریبی درخت کی جانب دوڑ لگائی تھی لیکن ابھی وہ بمشکل جیپ کے عقب سے نکلا ہی تھا کہ دو گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہوگئیں اور وہ کھیت کی کیچڑ میں لوٹ پوٹ ہوگیا۔ ساہی صاحب کا ڈرائیور حیات محمد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ زخمی ہے اور جیپ کے اندر ہی ہے۔ موبائل کے وائرلیس سیٹ کا رابطہ ہیڈ کوارٹرز سے تھا، کوئی چیخ چیخ کر پوچھ رہا تھا "یہ کیا ہورہا ہے سر؟ یہ فائرنگ کیسی ہے۔ آپ کہاں ہیں سر۔ ہیلو ہیلو انسپکٹر بشیر کالنگ۔ آپ کہاں ہیں سر۔"

ساہی صاحب نیچے جھکے جھکے وائرلیس سیٹ تک پہنچے اور ریسیور اٹھا کر بولے "ہیلو انسپکٹر بشیر... ایس ایس پی ساہی اسپیکنگ۔ یہاں شیخوپورہ روڈ پر موڑ سے ایک کلو میٹر پیچھے پولیس مقابلہ ہوگیا ہے۔ راوی روڈ تھانے میں کال کرو۔ ایس ایچ او نفری کے ساتھ فوراً پہنچے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "سر ایک موبائل شاہدرہ کے قریب موجود ہے میں اسے کال کرتا ہوں۔"

اسی دوران میں ایک برسٹ گاڑی کو لگا۔ وائرلیس سیٹ اچھل کر نشست پر جاگرا اور خاموش ہوگیا۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بردہ فروش رجب کے ساتھیوں نے اسے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کارروائی کی ہے۔ میں نے دیکھا تابڑ توڑ فائرنگ کی آڑ میں دو افراد کوسٹر کے اندر سے نکلے اور بھاگ کر ایک کچی دیوار کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ یہ دیوار الٹی ہوئی جیپ کے بالکل قریب واقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ کوسٹر والوں کا اگلا قدم اب کیا ہوگا۔ وہ الٹی ہوئی جیپ کے پیچھے پوزیشن لینا چاہتے تھے اور زخمی رجب کو جیپ میں سے نکال کر کوسٹر میں لے جانا چاہتے تھے۔

ہمیں جیپ کی دوسری سمت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ ڈرائیور حیات محمد یا زخمی رجب میں سے کوئی ایک جیپ سے باہر گرا پڑا ہو۔

میں نے بلند آواز میں کہا "صفدر! یہ لوگ رجب کو اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔ یہ رانی خاں کے سالے بھی ہوں گے تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی صفدر نے بڑی دلیری سے اپنی پوزیشن چھوڑی اور چند گز آگے ایک بیل گاڑی کے عقب میں بیٹھ گیا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو یہ بیل گاڑی کھیت کی کیچڑ میں پھنسی ہوئی تھی اور چند افراد اسے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فائرنگ اور ہنگامے سے خوف زدہ ہو کر وہ لوگ کھیتوں میں نکل بھاگے تھے۔ بیل گاڑی کی اوٹ سے صفدر بہ آسانی اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا جو جیپ کی طرف آنے کی کوشش کرتا۔ نشانہ لگانے میں صفدر کی صلاحیت تسلیم شدہ تھی۔ اس نے کفایت شعاری سے گولیاں چلائیں۔ اس کے باوجود دیوار کے پیچھے پوزیشن لینے والے دونوں افراد کو واپس کوسٹر کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

جب وہ دونوں افراد کوسٹر میں واپس پہنچے تو ایک دم نقشہ بدل سا گیا۔ کوسٹر والوں نے ہم پر فائرنگ کرنے کے بجائے جیپ کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوگ رجب کو چھیننے میں ناکام ہو کر اسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ جیپ الٹی ہوئی تھی' ممکن تھا کہ اس کا ڈیزل وغیرہ بہہ رہا ہو۔ ایسے میں ایک گولی جیپ کو جہنم بنا سکتی تھی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو تابڑ توڑ فائرنگ سے حیات محمد اور رجب اندر ہی ہلاک ہو سکتے تھے۔

میں نے تیزی سے ایک فیصلہ کیا۔ ہماری گاڑی ذرا ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ میں اور کانسٹیبل گاڑی کو بہ آسانی نشیبی کھیت کی طرف دھکیل سکتے تھے۔ میں نے کانسٹیبل کو بتایا کہ ہمیں گاڑی نشیب کی طرف دھکیلنی چاہیے اور خود بھی اس کی اوٹ میں حرکت کر کے نشیب میں پہنچ جانا چاہیے۔ ہم نے گاڑی کو ڈھلوان پر دھکیلا اور اس کے پیچھے ہی پیچھے دوڑتے ہوئے نشیبی کھیت میں پہنچ گئے۔ ساہی صاحب وہیں چند درختوں کی اوٹ میں کھڑے رہے تھے۔

ہماری گاڑی کھیت میں پہنچی تو جیپ سے اس کا فاصلہ بمشکل آٹھ دس گز رہ گیا۔ ہم زور لگا کر گاڑی کو تھوڑا مزید آگے لے گئے۔ کھیت میں کیچڑ تھی اور ہمارے پاؤں بار بار پھسل رہے تھے۔ بہرحال گاڑی کی اوٹ میں ہم بالکل محفوظ تھے۔ کوسٹر میں سے گاڑی پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ گاڑی دوسری جانب سے چھلنی ہو گئی ہے۔ جیپ سے ہمارا فاصلہ اب چند قدم رہ گیا تھا جیپ کا پچھلا دروازہ آدھا کھلا تھا اور اس میں سے مجھے رجب کا ایک پہلو صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ڈرائیور حیات کی نیلی قمیص کی ایک جھلک بھی مجھے دکھائی دی۔ میں اوندھا لیٹ گیا اور کرالنگ کرتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے' کوسٹر قدرے بلندی پر تھی' وہاں سے فائر ہونے والی کوئی بھی اندھی گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ جیپ کے نزدیک پہنچ کر میں نے رجب کا چہرہ دیکھا۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر گولی لگی ہے اور وہاں سے خون رس رہا ہے۔ غالباً اس میں خون ہی اتنا تھا کہ بہہ نہیں سکتا تھا بس رس سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کا بالائی دھڑ جیپ میں سے نکل آیا مگر اس کی ٹانگیں خبر نہیں کہاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں کھینچ رہا تھا مگر ٹانگیں نکل نہیں پا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اندھا دھند فائرنگ سے کسی بھی وقت جیپ کو آگ لگ جائے گی اور ہم تینوں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔

"حیات محمد!" میں نے ڈرائیور کو آواز دی۔

جواب میں ایک کراہ سنائی دی۔ میں نے گردن لمبی کر کے دیکھا۔ حیات محمد نشستوں کے درمیان بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن پر کارتوس کے باریک چھرے لگے تھے اور پورا چہرہ زخمی نظر آ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ حیات محمد رجب کو جیپ سے نکالنے میں میری مدد کرے لیکن وہ بے چارہ تو خود قابلِ رحم حالت میں تھا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے میری جانب دیکھا اور کچھ کہا لیکن میں سمجھ نہیں سکا۔ جیپ کا وائرلیس سیٹ ابھی تک آن تھا اور اس میں سے کئی افراد کے بولنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے رجب کی پھنسی ہوئی ٹانگیں چھڑانے کے لیے ایک بار پھر زور لگایا۔ یہی وقت تھا جب میرے نتھنوں میں ایک خوف ناک بو گھسی۔ یہ ڈیزل کی بو تھی۔ جیپ کا ڈیزل بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اب کسی بھی لمحے یہ جیپ آگ کا گولا بن سکتی تھی۔ مجھے صفدر کی پکار سنائی دی۔ وہ مجھ سے فریاد کر رہا تھا کہ میں جیپ سے پیچھے ہٹ جاؤں۔ چند لمحے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ چیخ و پکار کیوں کر رہا ہے۔ انجن کی سمت جیپ میں آگ لگ گئی تھی۔ اب جیپ کے قریب ٹھہرنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے رجب کا بازو چھوڑا اور

پیچھے کی جانب حرکت کی۔ ایک دم دھماکا ہوا اور پوری جیپ آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ میں جھک کر بھاگتا ہوا موبائل کی اوٹ میں آ گیا۔ ایک ہی لمحے میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تھے۔ اس احساس کے ساتھ شعلوں کو دیکھنا کہ ان میں دو افراد زندہ جل رہے ہیں' بڑا کرب ناک تھا۔ کوسٹر والے اپنے مقصد میں کامیاب رہے تھے' وہ رجب کو پولیس سے چھین تو نہیں سکے تھے تاہم وہ اسے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہی وقت تھا جب مجھے ایک بڑی لینڈ کروزر جیپ نظر آئی۔ وہ کچے پکے راستے پر بڑی تیزی سے اچھلتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ پہلے تو ذہن میں یہی خیال آیا کہ شاید ہمیں کمک پہنچی ہے لیکن پھر اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ جیپ سیدھی کوسٹر کی طرف گئی اور اس جانب جا کر رک گئی جو ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جیپ کوسٹر کے اگلے دروازے (ڈرائیور کے دروازے) کے پاس جا کر رکی تھی۔

صفدر کی چلاتی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں صاحب! وہ فرار ہو رہے ہیں۔" صفدر کا اشارہ یقیناً کوسٹر والوں کی طرف تھا۔

میں نے گاڑی کی اوٹ سے دیکھا' صفدر کی اطلاع درست تھی۔ ڈرائیور والے دروازے کی سمت اچھل نظر آ رہی تھی۔ فضا میں جلتے ہوئے گوشت کی بھیانک بو تھی اور یہ بو ہمیں پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم کوسٹر والوں کو نہ جانے دیں۔ صفدر کے پاس ایمونیشن ختم ہو گیا تھا۔ وہ ان افراد کو نشانہ نہیں بنا سکتا تھا جو بڑی تیزی سے کوسٹر میں سے نکل کر جیپ میں سوار ہو رہے تھے۔ خوش قسمتی سے ہماری گاڑی یعنی پولیس موبائل کا کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا تھا۔ میں نے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ صفدر دوڑتا ہوا آیا اور گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے کانسٹیبل کی ڈیڈ باڈی کے پاس رکا تھا اور اس کی جیب میں سے سیون ایم ایم کے دو بھرے ہوئے میگزین نکال لیے تھے۔ کانسٹیبل نے بھی اپنی تھری ناٹ تھری سمیت گاڑی میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے گاڑی کو ریورس کرنا چاہا۔ کھیت کی کیچڑ میں پہیے بے تحاشا رفتار سے گھومتے چلے گئے۔ گاڑی کئی بار لہرانے کے بعد کھیت میں سے نکل آئی۔ اس وقت تک دیوہیکل لینڈ کروزر جیپ حرکت میں آ چکی تھی۔ ہم جیپ کے پیچھے لپکے۔ ساہی صاحب نے ہمیں پکارا "ٹھہر جاؤ شاہ جہاں" یقیناً وہ ہمارے ساتھ لینڈ کروزر کے تعاقب میں جانا چاہتے تھے۔ میں نے سنی ان سنی کر دی۔ صفدر نے بھی ان کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ ہم انہیں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چند قدم ہمارے پیچھے آئے پھر گرد و غبار کے بادل میں گم ہو گئے۔ میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر چپک رہے تھے۔ یہ ڈرائیور نذیر کا خون تھا۔ ہم نے رن لیا' ڈرائیور نذیر اور کانسٹیبل کی لاشوں کے پاس سے گزر کر ہم لینڈ کروزر کے پیچھے گئے۔

"صفدر! اس کے ٹائر پھاڑنے کی کوشش کرو۔" میں نے اپنا ریوالور صفدر کو دیتے ہوئے کہا۔

صفدر نے نشانہ لے کر تین گولیاں چلائیں۔ مگر تینوں رائیگاں گئیں۔ ایک تو دیوہیکل لینڈ کروزر سے ہمارا فاصلہ زیادہ تھا دوسرے گرد و غبار نے لینڈ کروزر کو ہماری نگاہوں سے تقریباً اوجھل کر رکھا تھا۔ یہ صبح نو دس بجے کا وقت تھا دور تک کھیتوں میں چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ کاشت کاروں کی ٹولیاں یہاں وہاں کھڑی حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات سے یہ ہنگامہ آرائی دیکھ رہی تھیں۔ میں نے تیسرا گیئر لگا کر کلچ چھوڑا تو "بارہ سو سی سی انجن" کی گاڑی کمان سے نکلے تیر کی طرح لینڈ کروزر کی طرف بڑھی۔ ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کے ٹکڑے ہر جھٹکے کے ساتھ ہمارے قدموں میں بکھر رہے تھے۔ صفدر نے لینڈ کروزر کا نشانہ لینے کے لیے سیون ایم ایم رائفل تھام لی۔ نیا میگزین رائفل سے اٹیچ کرنے کے بعد وہ فائرنگ کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔

"صفدر! ان لوگوں نے چار بندے مارے ہیں۔ ان کو نکلنا نہیں چاہیے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔" صفدر نے بڑے عزم سے کہا۔

بمشکل صفدر کا فقرہ پورا ہوا تھا کہ لینڈ کروزر کی طرف سے "ایم جی" کے برسٹ کی آواز آئی۔ ہم نیچے جھک گئے۔ گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں۔ تاہم شکر کا مقام تھا کہ کسی ٹائر کو نقصان نہیں پہنچا۔ لینڈ کروزر کچے پکے راستے پر تقریباً ساٹھ ستر میل کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی۔ اس کی تیز رفتاری کے سبب اس کے عقب میں گرد و غبار کا بادل بلند ہو رہا تھا۔ یہ گرد و غبار ہمارے حق میں اس لحاظ سے بہتر تھا کہ لینڈ کروزر سے ہمیں ٹھیک ٹھاک نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف یہی فائدہ لینڈ کروزر والوں کو بھی حاصل تھا۔ صفدر ماہر ترین نشانہ باز ہونے کے باوجود لینڈ کروزر کے ٹائر کو اپنی رائفل کا نشانہ نہیں بنا پا رہا تھا۔ قریباً دو تین کلومیٹر تک یہ اندھا دھند دوڑ جاری رہی۔ اونچے نیچے راستوں پر ہماری گاڑی کے مقابلے میں لینڈ کروزر بہت اچھے طریقے سے دوڑ رہی تھی۔

اس کے علاوہ لینڈ کروزر کا ڈرائیور بھی خاصا مشاق نظر آتا تھا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ مایوس کن صورت حال تھی۔ لینڈ کروزر والوں کا پکڑا جانا ضروری تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک فرد بھی گرفتار ہو جاتا تو کئی سنسنی خیز انکشافات ہو سکتے تھے۔

جب ہمارا اور لینڈ کروزر کا فاصلہ زیادہ بڑھ گیا تو مجبوراً میں نے شارٹ کٹ لگانے کے لیے کار ایک کھیت میں ڈال دی۔ اس کھیت میں چارا تھا۔ مجھے امید تھی کہ ہم قریباً ایک فرلانگ تک کھیتوں میں سفر کرکے دوبارہ نیم پختہ راستے تک پہنچ جائیں گے۔ اور لینڈ کروزر سے ہمارا فاصلہ خاصا کم ہو جائے گا لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ کھیتوں کے درمیان ایک جگہ زمین خاصی نرم تھی۔ ہماری گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی اور پہیے گھوم کر رہ گئے۔ چند سیکنڈ تک کوشش کرنے کے بعد میں نے انجن بند کر دیا اور گہری آہ بھر کر پشت سے ٹیک لگالی۔

صفدر بھی اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ یہ بات اب بالکل واضح تھی کہ ہم لینڈ کروزر کو کھو چکے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کاشتکار بھاگم بھاگ ہم تک پہنچے۔ جس کاشت کار کے کھیت میں سے ہم نے گاڑی گزاری تھی، وہ خاصا پریشان نظر آتا تھا مگر وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ اس کے کھیت میں گھسنے والی گاڑی پولیس کی ہے۔ اس کے علاوہ باوردی پولیس کانسٹیبل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اپنے نقصان پر تلملانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ہم کچھ خطرناک مجرموں کا تعاقب کر رہے تھے، کاشتکاروں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئی تھیں۔ موقع پر اکٹھے ہو جانے والے کھیت مزدوروں نے مل جل کر ہماری گاڑی کو کیچڑ میں سے نکالا۔ لینڈ کروزر کے تعاقب میں جانا اب بیکار تھا۔ کار میں موجود وائرلیس سیٹ فائرنگ کے دوران میں ناکارہ ہو چکا تھا ورنہ اس موقع پر ہم لینڈ کروزر کے حوالے سے پولیس کے لیے کوئی پیغام نشر کر سکتے تھے۔ بہتر یہی تھا کہ اب ہم واپس روانہ ہوں۔ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے ساتھ ہم موقع واردات کی طرف واپس چل دیے۔

موقع واردات پر اب پولیس کی چار پانچ گاڑیاں جمع ہو چکی تھیں۔ کھیتوں میں دور تک لوگوں کی ٹولیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہر چہرے پر خوف و ہراس پایا جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا موقع واردات پر کئی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور جلے ہوئے گوشت کی سڑاند فضا کو بوجھل کر رہی تھی۔ پولیس جیپ ابھی تک سلگ رہی تھی۔ اس کے اندر ڈرائیور حیات محمد اور رجب کی لاشیں جل کر کوئلہ ہو گئی تھیں۔ رجب کی مسخ لاش میں نے سونے کی اس چمکتی زنجیر سے پہچانی جو اس کی گردن میں بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اس خوب صورت زنجیر کا کچھ نہیں بگڑا تھا لیکن اسے پہننے والا موت کے رخش پر سوار نامعلوم منزلوں کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور روانہ ہونے والا یہ شخص وہی تھا جس نے چند دن پہلے میرے قتل کی سپاری اٹھائی تھی۔

ڈرائیور نذیر محمد اور ہیڈ کانسٹیبل کی لاشیں کھیت سے باہر زمین پر پڑی تھیں، انہیں چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ دو لاشیں کوسٹر کے اندر سے بھی ملی تھیں۔ یہ دونوں لاشیں حملہ آوروں کی تھیں۔ وہ دونوں مقامی تھے اور صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے، تاہم عام بدمعاشوں کے برعکس ان کے جسموں پر قیمتی لباس تھے اور ان کے قریب پائے جانے والے ہتھیار بھی اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ ایک برٹش ماؤزر تھا جو کوسٹر کی دو نشستوں کے درمیان پھنسا رہ گیا تھا۔ ایک ۳۸ بور پسٹل تھا۔ میں نے غور کیا اور مجھ پر ایک توجہ طلب انکشاف ہوا۔ ہلاک ہونے والوں میں سے ایک شخص کے جسم پر سیون ایم ایم کی گولیوں کے دو زخم آئے تھے لیکن جو زخم اس کی فوری ہلاکت کا سبب بنا تھا وہ ایم جی کی گولی کا تھا اور یہ گولی بہت کم فاصلے سے عین اس کی پیشانی پر ماری گئی تھی۔

صورت حال بالکل واضح تھی۔ حملہ آوروں کا یہ ساتھی، پولیس فائرنگ سے شدید زخمی ہوا تھا۔ بھاگتے وقت حملہ آور اسے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے، انہوں نے بہتر سمجھا تھا کہ گولی مار کر اسے ختم کر دیں۔ یہ بہت توجہ طلب بات تھی۔ اس سے پہلے وہ رجب کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کر چکے تھے۔ پہلے انہوں نے رجب کو پولیس پارٹی سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی تھی، ناکام ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ پولیس کو اپنا سراغ دینے کے سلسلے میں بے حد محتاط ہیں اور اس حوالے سے معمولی سا رسک بھی لینا نہیں چاہتے۔

اچانک میرا دھیان رجب کی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں ہم کم از کم ایک فرد ایسا ضرور چھوڑ آئے تھے جو ہمارے لیے معلومات کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ میری مراد اس ریچھ نما شخص سے ہے جس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی اور وہ عمارت کے ایک کمرے میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ درحقیقت یہی شخص اس نئے ہنگامے کی بنیاد تھا۔ اس نے پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں مجھے شناخت کیا تھا اور پھر ہنگامہ خیز واقعات

کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کی توجہ ریچھ نما شخص کی طرف دلائی تو وہ بھی فکر مند نظر آنے لگے۔

میں نے کہا "کہیں ایسا نہ ہو جناب کہ اسے بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں فوراً اس تک پہنچنا چاہیے۔"

"تو ٹھیک ہے چلو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہم ایک جیپ میں آ بیٹھے۔ اس میں وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ رجب کی رہائش کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہی ساہی صاحب نے اپنے ایک انسپکٹر سے رابطہ کرلیا یہ انسپکٹر اپنے تھانے کی نفری کے ساتھ رجب کی رہائش گاہ پر موجود تھا۔ ایس پی صاحب نے باسط نامی اس انسپکٹر سے پوچھا کہ مجرمان میں سے زخمی ہونے والا شخص کہاں ہے۔

انسپکٹر باسط نے جواب دیا "وہیں، اینکسی کے ساتھ والے کمرے میں پڑا ہے جناب۔ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔"

ساہی صاحب نے کہا "اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ وہ بہت اہم شخص ہے۔ اسے کسی صورت اوجھل نہیں ہونا چاہیے اور نہ کوئی نقصان پہنچنا چاہیے۔ ہم پانچ دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"

انسپکٹر نے ہمیں پوری طرح تسلی دی لیکن جب دس منٹ بعد ہم باغات میں گھری ہوئی رجب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو انسپکٹر باسط علی کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آئیں۔

"کیا ہوا انسپکٹر؟" میں نے اس کے تیور بھانپ کر پوچھا۔

وہ تھوک نگل کر بولا "جناب۔ گڑبڑ ہوئی ہے سر۔ وہ بندہ بلڈنگ میں موجود نہیں ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے؟" ساہی صاحب دہاڑے۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب! آپ کا پیغام آتے ہی میں اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ بے ہوش پڑا تھا۔ کمرا خالی تھا۔ فرش پر گھسٹنے کے نشان ہیں جن سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ بے ہوش نہیں تھا صرف مکر کیے پڑا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ اپنی زخمی ٹانگ گھسیٹتا ہوا نکلا اور اینکسی کی جانب سے باہر چلا گیا۔"

"وہ انسان تھا کہ چھلاوا تھا۔" ساہی صاحب غرائے "زن وبازی ہے وہ تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہیں نہیں گیا، مجھے یقین ہے کہ وہ اس چار دیواری میں کہیں چھپا ہوگا۔ اسے ڈھونڈو۔ ہر صورت میں ڈھونڈو۔ اس کا ملنا اشد ضروری ہے۔"

انسپکٹر نے سر جھکا کر کہا "ہم نے ہر جگہ دیکھا ہے جی۔"

ساہی صاحب غرائے "اگر وہ یہاں نہیں ہے تو پھر تم لوگوں میں سے ہی کوئی قصوروار ہے۔ میں یہ بات کسی صورت نہیں مان سکتا کہ وہ بھاگا ہے۔ اسے بھگایا گیا ہوگا۔"

انسپکٹر سمیت عملے کے کئی ارکان کے چہرے بجھ گئے۔ ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ریچھ نما شخص کو رکھا گیا تھا۔ گرد آلود فرش پر گھسٹنے کے نشانات موجود تھے، اب یہ تو کوئی ماہر ہی بتا سکتا تھا کہ وہ از خود گھسٹتا ہوا باہر نکلا تھا یا کسی نے گھسیٹ کر اسے نکالا تھا۔ گھسٹنے کے نشانات اینکسی کے پورچ سے ہوتے ہوئے گیٹ کی طرف چلے گئے تھے اور پھر اوجھل ہو گئے تھے۔ حتمی رائے تو قائم نہیں کی جا سکتی تھی تاہم ایک امکان یہ بھی تھا کہ مضروب جان بوجھ کر "بے ہوش" بنا پڑا رہا ہو اور جب اس نے پولیس اہلکاروں کو ادھر ادھر مصروف پایا ہو، خاموشی سے کھسک گیا ہو۔

صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "جناب، مجھے اندیشہ ہے کہ اس گینگ تک پہنچنے کے رہے سہے سراغ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ میرا مطلب ارشاد احمد اور اس کے بھائی پروفیسر اللہ دتا سے ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دونوں برادران بھی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جائیں۔"

میرا ذہن خود بھی اسی لائن پر سوچ رہا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کو مطلع کیا، ہم فوراً گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ عمارت کے احاطے میں وہ تمام افراد موجود تھے جنہیں رجب کی قید سے رہائی ملی تھی۔ ان میں وہ نوجوان بھی تھے جو اپنے اپنے سفری بیگوں کے ساتھ امریکا اور یورپ جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے اور وہ مفلوک الحال افراد بھی تھے جنہوں نے ایک بردہ فروش کی لانچ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور اب رجب کے اس زمین دوز قید خانے میں اذیت ناک قید جھیل رہے تھے۔ مسلسل تشدد نے ان کی ذہنی حالت دگرگوں کر رکھی تھی اور وہ انسانوں سے زیادہ، خوف زدہ... بکریوں کا ریوڑ نظر آتے تھے۔ بکریاں جو نامعلوم خوف کے سبب ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھی ہوئی تھیں اور ذرا سی آواز پر بدک اٹھتی تھیں۔ براؤن آنکھوں اور سیاہ بالوں والی دونوں خوب رو لڑکیاں بھی دیگر قیدیوں کے ساتھ موجود تھیں۔ انہیں گراسی لان کے بجائے کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ کرسیوں پر یوں بیٹھی تھیں جیسے یہ کرسیاں لکڑی کے بجائے کاغذ کی بنی ہوئی ہیں اور ذرا سا بوجھ پڑتے ہی زمین بوس ہو جائیں گی۔ پولیس کا ماتحت عملہ حسب عادت لڑکیوں کو دزدیدہ نگاہوں سے گھور رہا تھا اور حسب توفیق تبصرے بھی کر رہا تھا۔

لانچ کے قیدی مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھ آئے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں جوڑنے لگے اور مجھ سے درخواست کرنے لگے کہ میں انہیں جلد از جلد ان کے گھروں میں جانے کی اجازت دے دوں۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ میں بھی سادہ لباس میں کوئی پولیس اہلکار ہی ہوں۔ میں نے انہیں تسلی تشفی دی اور کہا کہ قانونی کارروائی مکمل کرنے کے فوراً بعد انہیں گھروں تک پہنچانے کا انتظام کیا جائے گا۔ اسی دوران میں پولیس والوں کی گفتگو سے چند قیدیوں کو پتا چل گیا کہ رجب پولیس مقابلے کے دوران میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش پولیس جیپ کے اندر ہی جل گئی ہے۔

یہ خبر کئی قیدیوں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو لے آئی اور ان کے چہروں پر منڈلاتے ہوئے خوف کے سائے قدرے سمٹ گئے۔ انسپکٹر باسط علی کو دونوں لڑکیوں کے بارے میں خصوصی احتیاط کا حکم دے کر ساہی صاحب ہمارے ساتھ ایک پرائیویٹ کار میں آبیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ کار برق رفتاری سے انارکلی کی طرف رواں ہو رہی تھی۔ اس کار میں دو مسلح پولیس اہلکار موجود تھے' اس کے علاوہ ایک اور پرائیویٹ کار بھی ہمارے عقب میں آرہی تھی۔ اس میں بھی سادہ کپڑوں میں پولیس کی نفری موجود تھی۔۔۔ ہم سب سے پہلے ارشاد احمد کے گھر پر چھاپا مارنا چاہتے تھے۔

ہم ارشاد احمد کے گھر پہنچے تو اب وہاں مسلح گارڈ موجود تھا۔ تاہم جب اس گارڈ کو معلوم ہوا کہ آنے والے "مہمانوں" کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ "خوش آمدید" نہ کہے جانے کی صورت میں اس کی چمڑی بھی ادھیڑ سکتے ہیں تو وہ پولیس پارٹی کے راستے سے ہٹ گیا۔ ہم کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری ملاقات اسی چرسی مصدق سے ہوئی جس نے مجھ سے سو روپے کا نوٹ لے کر مجھے بڑے خلوص سے ارشاد احمد کا درجہ دے دیا تھا' اور پھر پروانے کی طرح میرے آگے پیچھے گھومتا رہا تھا۔ اس نے آلو بینگن کی شان میں بھی چوڑی ہجو پڑھی تھی اور میری سخاوت مندی کے صدقے واری گیا تھا۔ وہ آج بھی نشے میں نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے سو کا نوٹ دیا تو وہ ایک بار پھر کتے کی طرح میرے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ وہ عجیب خصلت کا شخص تھا یا پھر شاید نشے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو جاتی تھی۔ آج اس نے بلا تردد مجھے "ڈی آئی جی صاحب" کا رتبہ دے دیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بار بار مجھے سلیوٹ کرنے لگا۔ میں نے پوچھا "تمہارا مالک ارشاد احمد کہاں ہے؟"

وہ بولا "ڈی آئی جی صاحب! اگر مجھے پتا ہوتا تو خدا کی قسم آپ کو ضرور بتا دیتا۔" پھر اپنے لہجے کو سرگوشی میں بدلتے ہوئے بولا "بے شک یہ شخص میرا مالک ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جہنم کے سب سے گہرے گڑھے میں گرائے جانے کا حق دار ہے۔ اس شخص نے ہم نوکروں کو آلو بینگن اور ٹینڈے کدو کھلا کھلا کر ہماری زندگی عذاب کر دی ہے۔ خود اس کے لیے کڑاہی گوشت اور سیخ کباب بنتے ہیں جبکہ ہمیں سبزیوں کے شوربے میں ڈبکیاں دی جاتی ہیں' یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ خدا کسی دشمن کو ایسے بینگن۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ایسی زندگی نہ دے۔ آپ ذرا انصاف کریں کہ۔۔۔۔"

"انصاف تو انشاءاللہ ضرور ہوگا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "لیکن فی الحال یہ بتاؤ کہ ارشاد احمد مل کہاں سکتا ہے؟"

وہ میرے پاؤں کو ہاتھ لگا لگا کر بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا "ڈی آئی جی صاحب' مجھے میرے بچوں کی قسم' مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس تھوڑی دیر پہلے وہ آندھی کی طرح آئے اور ایک اٹیچی کیس لے کر طوفان کی طرح گھر سے نکل گئے۔ وہ بڑی پسوڑی میں نظر آتے تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہاں گئے ہوں گے؟"

"شاید بازار گئے ہوں گے' کسی ریڑھی پر انہیں بڑے سستے آلو بینگن نظر آئے ہوں گے۔ اٹیچی کیس بھر کر لے آئیں گے ہمارے لیے۔"

مصدق نشے میں اول فول بک رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ گھر کی بالائی منزل پر ارشاد احمد کی بیمار والدہ رہتی ہے۔ شاید وہ عورت اپنے بیٹے کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ میں اور صفدر پولیس والوں کے ہمراہ بھاگم بھاگ بالائی منزل پر پہنچے جہاں ایک دو ملازم موجود تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ ہم سیدھے اس کمرے میں پہنچے جہاں ایک شان دار پلنگ پر ایک جسیم عورت چادر اوڑھے نیم دراز تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک دم خوف ابھر آیا۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوئی پھر اس نے زور زور سے چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ میں نے اور ساہی صاحب نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل چیختی چلی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ خود کو ہم سے چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر ہم چند لمحے مزید اس کمرے میں رہے تو یہ عورت بے ہوش ہو جائے گی یا پھر اسے دل کا دورہ وغیرہ پڑ جائے گا۔ میں نے ساہی صاحب کو اشارہ کیا اور ہم اس ادھیڑ عمر عورت کے بیڈ روم سے نکل آئے۔ دو گھریلو ملازماؤں نے عورت کو سنبھال لیا اور اسے لٹا کر دوا

وغیرہ پلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

ساہی صاحب کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے کوٹھی کی تلاشی شروع کر دی۔ گھر میں چوکی دار سمیت کل چار ملازم تھے' انہیں ایک کمرے میں اکٹھا کر لیا گیا۔ کوٹھی کی تفصیلی تلاشی کے نتیجے میں ایک گودام سے ولایتی شراب کے دو کریٹ برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ تین خودکار رائفلیں' ایک ریوالور اور ان ہتھیاروں کا ایمونیشن ملا۔ ایک کمرے کی الماری میں بہت سے جعلی پاسپورٹ' شناختی کارڈز اور غیر ملکی سفارت خانوں کی مہریں برآمد ہوئیں۔ اس الماری کے دو خانے کھلے ہوئے ملے۔ ان اندرونی خانوں میں کوئی شے موجود نہیں تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ افراتفری میں یہاں سے کچھ کاغذ سمیٹے گئے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ کاغذ اسی اٹیچی کیس میں رکھے گئے ہوں جو بوقتِ رخصت ارشاد احمد کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ ایک الماری سے ہمیں ایک خطرناک قسم کا اسپرے بھی ملا۔ اس اسپرے سے کسی شخص کو کئی گھنٹوں کے لیے اعصابی طور پر مفلوج کیا جا سکتا تھا۔ ارشاد احمد کی خواب گاہ میں ایسے آثار نظر آئے' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی اکثر راتیں رنگین جلوؤں کے نرغے میں گزرتی ہیں۔

ارشاد احمد تو راہِ فرار اختیار کر چکا تھا' اب ہمارے ہاتھ میں آخری "کلیو" پروفیسر اللہ دتا رہ گیا تھا۔ خدشات تو اس کے بارے میں بھی موجود تھے مگر عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک پولیس کے چھاپوں سے بے خبر ہو یا پھر اپنے مریضوں میں گھرا ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ پھرتی نہ دکھا سکا ہو اور ہم اسے گردن سے جا دبوچیں۔ ساہی صاحب نے وائرلیس پر اپنی ایک موبائل سے رابطہ کیا اور موبائل میں موجود پولیس پارٹی کو ہدایت کی کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کے کلینک کو اپنی نگرانی میں لے لیں۔ یہ پولیس پارٹی مال روڈ کے جی پی او چوک سے گزر رہی تھی' پانچ منٹ کے اندر پرانی انارکلی میں پروفیسر کے کلینک پر پہنچ گئی۔ پولیس پارٹی کی طرف سے ہمیں یہ خوش کن اطلاع ملی کہ پروفیسر اللہ دتا صاحب کلینک میں ہی موجود ہیں اور مریضوں کا معائنہ فرما رہے ہیں۔

ہم بھی تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ پروفیسر کے کلینک پہنچ گئے۔ حسبِ معمول کلینک کے سامنے کاروں اور موٹر سائیکلوں کی قطاریں موجود تھیں' خوب رش نظر آرہا تھا یا تو پروفیسر اللہ دتا ابھی تک ہنگامۂ محشر سے بے خبر تھا یا جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھ سے کہا "شاہ جہاں' تم اور صفدر اندر جاؤ۔ ساتھ میں ایک مسلح سفید پوش کو لے جاؤ۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں اور صفدر ایک سادہ پوش اے ایس آئی کے ساتھ کلینک میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی بڑا سا بورڈ آویزاں تھا "بچوں کے ضدی امراض کی واحد علاج گاہ" اندر مریضوں کا ہجوم تھا۔ زیادہ تعداد خواتین اور بچوں کی تھی۔ پروفیسر اللہ دتا کے کمپاؤنڈر اور ملازمین بے حد مصروف تھے۔ میں اور صفدر دندناتے ہوئے مشورہ گاہ میں گھس گئے۔ مشورہ گاہ کے دروازے پر موجود چوکیدار نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ میں پروفیسر کی میز کے سامنے پہنچ گیا' پروفیسر کے سامنے بیٹھی ہوئی مریضہ خاصی جوان اور خوب رو تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونکا' وہ فلم انڈسٹری کی ایک جانی پہچانی ہیروئن تھی۔ میں یہاں اس کا اصل نام نہیں لکھوں گا۔ آپ اس کا فرضی نام نوشین تصور کر لیں۔ اس نے ایک سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی اور چہرے کا صرف بالائی حصہ نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں اندر گھستے دیکھ کر پروفیسر کے ساتھ ساتھ نوشین کے چہرے پر بھی ناگواری کی شکنیں ابھریں۔

پروفیسر نے بھنا کر کہا "کیا بات ہے۔ کیوں بدتمیزی کر رہے ہو؟"

صفدر نے کہا "بدتمیزی ابھی ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی ہے اور اگر آپ کے مریضوں کے سامنے ہوئی تو یہ بڑے نقصان کی بات ہوگی۔ بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ہمارے ساتھ باہر آجائیں۔"

"تم ہو کون؟"

"ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" پروفیسر اللہ دتا نے اکڑ کر بولا۔

اے ایس آئی نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا۔

پروفیسر نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے میز پر پھینک دیا "تم جیسے دو ٹکے کے پولیس والے کی یہ ہمت کہ مجھ پر حکم چلائے۔ جاؤ اپنے کسی بڑے کو بھیجو۔" پروفیسر نے سب انسپکٹر کو باقاعدہ دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"بڑے بھی آجائیں گے اور وارنٹ بھی آجائیں گے لیکن فی الحال تم باہر چلو ہمارے ساتھ۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"اگر میں نہ جاؤں تو؟" پروفیسر اللہ دتا سینہ تان کر بولا۔

"تو میں گردن سے دبوچ کر لے جاؤں گا۔" میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت میری آنکھوں کے سامنے پھلجھڑی سی

چھوٹ گئی۔ میرے پہلو میں کھڑی فلم ایکٹریس نوشین نے بڑے زور سے میرے منہ پر طمانچہ رسید کردیا تھا۔ مجھے یا صفدر کو اس حرکت کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی' لہٰذا ہم دونوں حیران رہ گئے پھر جیسے ایک دم صفدر کا میٹر گھوم گیا۔ وہ نوشین پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ اس کا بھرپور جوابی تھپڑ نوشین کے گال پر پڑتا' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں صفدر۔" میں نے چیخ کر کہا۔

صفدر غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے نوشین کے لیے گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ وہ خود کو میری گرفت سے نکالنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا اور نوشین کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ نوشین چند لمحے تو بڑبڑ کرتی رہی' پھر ایک دم ڈر کر خاموش ہوگئی۔ شاید اسے صفدر کی طرف سے ایسے زبردست ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ صفدر کو اگر کسی دوسرے نے سنبھال رکھا ہوتا تو وہ یقیناً اب تک خود کو چھڑا چکا ہوتا اور مجھے طمانچہ رسید کرنے کی پاداش میں نوشین نامی اس ایکٹریس کا حشر خراب کرچکا ہوتا لیکن میری گرفت بہت مضبوط تھی اور صفدر کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ڈری ہوئی نوشین سے چیخ کر کہا "دفع ہو جا یہاں سے۔"

وہ ایک لمحہ تذبذب میں رہی پھر خبر نہیں کہ کیا بکواس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ شور سن کر پروفیسر کے کئی کارندے مشاورہ گاہ میں گھس آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ یہ کارندے پروفیسر کے حکم پر میری اور صفدر کی جانب متوجہ ہوتے' ساہی صاحب اپنے عملے کے ساتھ اندر داخل ہوگئے۔ مسلح اہلکاروں کو دیکھ کر پروفیسر اینڈ کمپنی کی سٹی گم ہوگئی۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تاہم پروفیسر قدرے حوصلے میں نظر آتا تھا۔ وہ ابھی تک گردن اکڑائے کھڑا تھا اور تیز لہجے میں بول رہا تھا "مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔" اس نے ساہی صاحب کو باقاعدہ وارننگ دی۔

ساہی صاحب نے کہا "میں ایس ایس پی ساہی ہوں۔ تمہیں تحویل میں لینا ضروری ہے۔"

ساہی صاحب کا عہدہ جان کر اس کا رویہ ذرا سا نرم ہوا لیکن ظاہری تن فن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بولا "میں ایک ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔" پھر ساہی صاحب کی اجازت کا انتظار کیے بغیر اس نے ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنا شروع کردیے۔ چند لمحے بعد وہ بولا "ہیلو سلیمان صاحب! میں اللہ دتا بول رہا ہوں۔ جی ہاں۔۔۔ خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔ آپ کا کوئی ساہی نام کا ایس ایس پی کلینک میں گھس آیا ہے۔ اس کے عملے نے سخت بدتمیزی کی ہے اور مجھے پکڑنا چاہ رہے ہیں۔ جی جی۔۔۔ یہ تو آپ ان سے ہی پوچھیے۔ بالکل بالکل۔۔۔ میرے سامنے کھڑا ہے۔"

اس کے بعد اللہ دتا نے ریسیور ساہی صاحب کو تھما دیا۔ ساہی صاحب دوسری طرف سے کی جانے والی بات مؤدب انداز میں سنتے رہے اور "ہوں ہاں" میں جواب دیتے رہے۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے کوئی اعتراض کرنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف سے غالباً تند و تیز لہجے میں بات کی جا رہی تھی لہٰذا وہ خاموش رہ گئے۔ آخر میں انہوں نے "بہت اچھا" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ چہرے پر مایوسی واضح نظر آرہی تھی۔ انہوں نے عملے کو اشارہ کیا۔ سادہ پوش اہلکار پروفیسر اللہ دتا کے اردگرد سے پیچھے ہٹ گئے۔ اللہ دتا کے کارندوں میں سے ایک کے سوا سب کو چھوڑ دیا گیا۔ اس کے پاس سے ریوالور برآمد ہوا تھا۔

اللہ دتا اپنے زیرِ حراست کارندے کی طرف اشارہ کرکے گرجا "اسے بھی چھوڑ دو۔"

"ریوالور کا لائسنس دیکھ کر چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں لائسنس دکھا دیتے ہیں۔" اللہ دتا نے کہا پھر اپنے کسی سجاد نامی کارندے کو آواز دے کر کہا' ایس پی کو ریوالور کا لائسنس دکھایا جائے۔

ہم سب اللہ دتا کی مشاورہ گاہ سے باہر نکل آئے۔ ہنگامہ دیکھ کر بہت سے مریض کھسک گئے تھے' جو موجود تھے وہ بھی حیران پریشان نظر آرہے تھے۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کس کا فون تھا؟"

"ہوم سیکریٹری کا۔" انہوں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا "لگتا ہے کہ حرام زادے کی پہنچ کافی اوپر تک ہے۔"

اسی دوران میں ایک انسپکٹر واکی ٹاکی لیے ہوئے ساہی صاحب کے پاس پہنچ گیا "آئی جی صاحب کا فون ہے جناب۔" اس نے مشینی لہجے میں کہا۔

ساہی صاحب نے اپنے افسرِ اعلیٰ کا فون سنا اور چند بار "یس سر۔۔۔ یس سر!" کہہ کر رہ گئے۔

آئی جی صاحب نے بھی پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے ہی بات کی تھی اور ساہی صاحب کو مطلع کیا تھا کہ پروفیسر کی شنوائی کافی اوپر تک ہے' لہٰذا اس پر بلا کسی بہت ٹھوس ثبوت کے ہاتھ ڈالنا ازحد خطرناک ہے۔ ابھی ساہی صاحب ہم سے آئی جی کے فون کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے کہ ایک شاندار مرسیڈیز کار کلینک کی تنگ سڑک پر رکتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ایک خاکستری جیپ بھی تھی۔ میں اس گاڑی

اور جیپ کو پہچانتا تھا' یہ مقامی ایم این اے کی گاڑیاں تھیں۔ ایم این اے صاحب بنفسِ نفیس مرسیڈیز میں موجود تھے۔ وہ توند مٹکاتے ہوئے باہر تشریف لائے اور سیدھے ساہی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ان کے رائفل بردار کارندے ادب سے عقب میں چلے آرہے تھے۔ میں ان ایم این اے صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ چند سال پہلے یہ لندن کے ایک فلیٹ سے اس حالت میں پکڑے گئے تھے کہ ایک وقت تین عدد برہنہ لڑکیوں کے ساتھ کشتی فرما رہے تھے اور نشے میں انہیں ماں بہن کا درجہ بھی دے رہے تھے اور یہ تو ایک مثال ہے ایسی بہت سی روشن مثالوں کے تمغے ان کے سینے پر سجے ہوئے تھے۔

ایم این اے صاحب بے تکلفی سے ساہی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور تھوڑی دیر گفتگو فرماتے رہے۔ یقیناً یہ گفتگو عزت مآب پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے ہی تھی۔ ایم این اے صاحب پروفیسر صاحب کی سفارش کر رہے تھے اور ڈھکے چھپے الفاظ میں ساہی صاحب کو وہ بات سمجھا رہے تھے جو حکمران اور طاقت ور طبقہ اپنے ماتحت اور کم اختیار والے لوگوں کو ہمیشہ سے سمجھاتا آیا ہے۔ طاقت کے دریا میں روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرو کیونکہ تیز بہاؤ میں پتھر لڑھک لڑھک کر اپنی شناخت کھو دیتے ہیں اور بالآخر ریت بن کر بکھر جاتے ہیں۔ ایم این اے کے الفاظ کچھ بھی رہے ہوں لیکن ان کا اصل مفہوم اس سے ملتا جلتا ہی رہا ہوگا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ساہی صاحب کو درجنوں فون آگئے' جن میں ساہی صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کی شان میں گستاخی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ساہی صاحب نے اپنے اعلیٰ افسران کو تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ سب سے پہلے انہیں شیخوپورہ روڈ لے جاکر موقع واردات دکھایا گیا۔ پولیس کی جلی ہوئی جیپ جس میں گولیوں کے سیکڑوں سوراخ تھے' حملہ آوروں کی جارحیت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ چار پولیس اہلکاروں کی لاشیں بھی ابھی موقع سے ہٹائی نہیں گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بردہ فروش رجب اور اس کو چھڑانے کے لیے آنے والوں کی دو لاشیں بھی موقع پر موجود تھیں۔ جائے وقوعہ کا ہر ہر چپا گواہی دے رہا تھا کہ یہاں ایک زوردار اور حقیقی پولیس مقابلہ ہوا ہے۔ اس کے بعد افسران کی ٹیم کو رجب کی رہائش گاہ کا دورہ کرایا گیا۔ افسران نے غیرقانونی طور پر محبوس رکھے جانے والے قریباً چالیس افراد سے ان کے بیانات سنے' اور وہ تہ خانے بھی دیکھے جہاں قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا جاتا تھا۔ یہاں افسران نے رجب کے ساتھیوں جانی اور غیاث کی لاشوں کا معائنہ بھی کیا۔ اس امر میں شک شبے کی ہلکی سی گنجائش بھی نظر نہیں آتی تھی کہ رجب منظم طریقے سے بردہ فروشی کا کام کر رہا تھا۔

میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ اب پولیس کو اپنے رویے پر نظرِثانی کرنی پڑے گی۔ رجب کی رہائش گاہ پر وہ اسکوٹر موجود تھا جس پر سوار ہو کر ارشاد احمد کا کارندہ یعنی ریچھ نما شخص یہاں پہنچا تھا۔ اس اسکوٹر کی رجسٹریشن ارشاد احمد کے نام پر تھی۔ ارشاد احمد کے اسکوٹر کی یہاں موجودگی اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ رجب اور ارشاد احمد میں کوئی نہ کوئی ربط ہے۔ ارشاد احمد خطرے کی بو سونگھ کر فرار ہوگیا تھا اور اس کا مفرور ہونا اس کی حیثیت کو مزید مشکوک بناتا تھا۔ ساہی صاحب نے اپنے ساتھی افسران کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ انہوں نے کہا "مزید تفتیش کے مطابق' پروفیسر اللہ دتا کے بھائی ارشاد احمد اور بردہ فروش رجب جان کے درمیان بردوں کے لین دین کا معاملہ چل رہا تھا۔ یہ اسکوٹر سوار جو ارشاد احمد کا قریبی ساتھی ہے' اسی لین دین کے سلسلے میں

مشتاق احمد قریشی کے سحر کار قلم سے نیا ناول
پاتال
فطرت کے باغی شخص کا فسانۂ عبرت
ناشر علی میاں پبلی کیشنز
علمی بک سٹال

یہاں آیا تھا۔ یہاں بردہ فروشوں اور قیدیوں میں گولی چل گئی۔ اسی ہنگامے میں یہ شخص بھی زخمی ہوا اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ یہ آٹھ پہر زخمی حالت میں یہاں پڑا رہا پھر موقع دیکھ کر فرار ہو گیا۔"

ایک اعلیٰ افسر نے ساہی صاحب سے سوال کیا "آپ کو یہ ساری باتیں کس ذریعے سے معلوم ہوئیں؟"

ساہی صاحب نے بڑے اعتماد سے مجھے اور صفدر کو پولیس افسران کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے پولیس افسران کو میرا نام احمد' اور صفدر کا شجاع بتایا اور انہیں آگاہ کیا کہ ہم دونوں ان کے لیے مخبر کے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہم دونوں میک اپ میں تھے لہٰذا قانون کی آنکھ ہمیں دیکھنے اور پہچاننے سے قاصر تھی۔ اگر یہ میک اپ ہمارا پردہ نہ ہوتا تو اب تک ہم دونوں کو ہتھکڑیاں لگ چکی ہوتیں' اور مجھے تو غالباً بیڑیاں بھی پہنائی جا چکی ہوتیں۔ پولیس افسران میں سے سی آئی اے کے ایک انسپکٹر نے ہم دونوں سے بھی چند سوالات کیے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس گھاگ انسپکٹر کے سامنے کم سے کم جھوٹ بولا جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح چند روز پہلے میں پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد سے ملنے اس کی کوٹھی پہنچا تھا اور کس طرح ارشاد کے ایک چپڑاسی ملازم نے مجھ سے سو کا نوٹ وصول کر کے مجھے ارشاد احمد بتا دیا۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد رجب جان کی بدقسمتی اسے ارشاد کی رہائش گاہ پر کھینچ لائی۔ رجب اور ارشاد کی وہ پہلی ملاقات تھی۔ رجب بھی مجھے ہی ارشاد سمجھا۔ وہ مجھ سے باتوں باتوں میں کافی بے تکلف ہو گیا۔ اس نے روانی میں اس راز سے پردہ اٹھا دیا کہ وہ بھی ارشاد احمد کی طرح بردہ فروشی کے دھندے میں ملوث ہے۔ وہ مجھے بردوں کی ایک کھیپ فروخت کرنے کے لیے اپنی رہائش گاہ پر لے آیا۔ اس کے بعد کے واقعات بھی میں نے تفصیل سے انسپکٹر کے گوش گزار کر دیے کہ کس طرح ارشاد کا ساتھی ریچھ نما شخص اپنے اسکوٹر پر رجب کی رہائش گاہ پر پہنچا اور اس کی آمد کے سبب یہ بھانڈا پھوٹ گیا کہ میں ارشاد احمد نہیں۔

سی آئی اے کے انسپکٹر نے ساہی صاحب کی موجودگی میں میرا اور صفدر کا طویل بیان قلم بند کیا۔ ساہی صاحب کی موجودگی کے سبب انسپکٹر نے زیادہ تند و تیز سوال پوچھنے سے گریز کیا تھا۔ بیانات سے فارغ ہو کر میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "اب کیا خیال ہے آپ کا؟ پروفیسر اللہ دتا پر ہاتھ ڈالا جا سکے گا یا نہیں؟"

ساہی صاحب کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں مزید گہری ہو گئیں۔ وہ بولے "پروفیسر اللہ دتا کا اثر و رسوخ ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ بحیثیت معالج جن لوگوں کو اس نے [illegible]

پہنچا ہے یا پہنچ رہا ہے ان میں اعلیٰ افسران اور انتظامیہ کے عہدے دار بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ شد و مد سے پروفیسر کی حمایت کر رہے ہیں اور اس کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ وہ اسے ایک زبردست معالج ہی نہیں ایک زبردست انسان بھی قرار دے رہے ہیں۔"

"لیکن اب تو بات واضح ہو گئی ہے جناب۔" میں نے کہا "بردہ فروش رجب جان اور پروفیسر کے بھائی کا تعلق ظاہر ہو رہا ہے۔ بھائی کے مفرور ہونے کے بعد ظاہر ہے پولیس کو پروفیسر پر ہی ہاتھ ڈالنا ہوگا۔"

ساہی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ ہے شاہ جہاں! کہ بردہ فروش رجب اور پروفیسر کے بھائی ارشاد کا تعلق ابھی واضح طور پر ثابت نہیں ہوا۔ ہمارے پاس فی الحال واحد ثبوت اسکوٹر کی وہ رجسٹریشن کاپی ہے جس پر ارشاد احمد کا نام موجود ہے۔ یہ ایک کاغذی ثبوت ہے اور اس میں سے بہ آسانی سقم برآمد ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ اسکوٹر سوار زخمی" رجب کی رہائش گاہ میں سے مل جاتا تو کیس مضبوط ہو جاتا تھا۔ اس شخص سے یہ بات اگلوائی جا سکتی تھی کہ ارشاد احمد سے اس کا کیا تعلق ہے اور ارشاد نے اسے رجب کے پاس کس کام سے بھیجا تھا۔"

صفدر نے کہا "ارشاد کا چپڑاسی ملازم مصدق بھی اپنے مالک کی سیاہ کاریوں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے' اس کے علاوہ وہ ارشاد اور رجب کے تعلق کے بارے میں بھی تصدیق کر سکتا ہے۔"

ساہی صاحب نے کہا "بالفرض یہ تصدیق ہو بھی جائے تو ہمارا مقصد فی الفور حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ پروفیسر اللہ دتا ایک کائیاں شخص نظر آتا ہے۔ اپنے بھائی کے ریکروٹنگ بزنس سے اس نے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھا ہوا تھا۔ بلکہ ویسے بھی وہ بھائی سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ اب اگر ہم اس پر ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے بھائی کے قول و فعل سے اس کا کوئی تعلق نہیں' لہٰذا اسے بدنیتی کی بنا پر اس معاملے میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ یہاں کے ایک کثیر الاشاعت روزنامے کا مالک بھی پروفیسر صاحب کے بہی خواہوں میں شامل ہے۔ اب تک تین دفعہ اس کا فون آ چکا ہے۔ وہ اور اس جیسے دوسرے لوگ شور مچا دیں گے کہ پولیس اصل مجرموں کو تو پکڑ نہیں سکی اور اب بے گناہ شہریوں کی گردن دبوچ رہی ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی خبروں کو کتنا اچھالا جاتا ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ اتنی انسانی جانوں کے زیاں کے باوجود ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں۔" ایک انسپکٹر نے کہا۔ "مرنے والے ہمارے ساتھی [illegible]

کا خون رائیگاں نہیں جانے دیں گے۔" ایک سب انسپکٹر جوش سے بولا۔

"حوصلہ رکھو بھئی۔ سب کچھ ہوگا لیکن ذرا انتظار کرنا پڑے گا۔" ساہی صاحب نے کہا۔

ہم دونوں خاموشی کے ساتھ اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ متوسط درجے کے اس ہوٹل میں ہمارے ٹھکانے کا علم کچھ پولیس افسروں اور ساہی صاحب کے سوا ابھی کسی کو نہیں تھا۔ صفدر بے حد برہم دکھائی دیتا تھا۔ اس کی برہمی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم اتنی مار دھاڑ اور خون ریزی کے باوجود ایسے کسی ایک شخص پر بھی ہاتھ نہ ڈال سکے تھے جو ہمیں بردہ فروشی کے اس گھناؤنے دھندے کے بارے میں کوئی سراغ دے سکتا۔ اس برہمی کی دوسری اور زیادہ اہم وجہ وہ واقعہ تھا جو پروفیسر اللہ دتا کی مشورہ گاہ میں پیش آیا تھا۔ ایکٹریس نوشین نے بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھے تھپڑ جڑ دیا تھا۔ اس تھپڑ کے بعد صفدر کا جو حال ہوا تھا وہ میں ہی جانتا تھا۔ غصے نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اگر میں اسے نوشین پر جھپٹنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا تو وہ یقیناً اس کا بہت برا حشر کرتا۔ اس واقعے کو بارہ دس گھنٹے گزر چکے تھے مگر وہ اب بھی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ قسم کھا کر کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب! میں اس کتیا سے اس تھپڑ کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ ایسا ذلیل کروں گا اسے کہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ الو کی پٹھی' دو دو ٹکے میں بکنے والی ایکٹریس اور یہ مجال۔۔۔ حرام زادی کو سرِ عام ننگا کر کے نہ گھسیٹا تو صفدر نام نہیں میرا۔"

صفدر ایک تحمل مزاج اور روشن دماغ شخص تھا۔ میں نے کبھی اسے جذبات میں فیصلہ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن آج وہ سراپا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "یار صفدر! سچ پوچھتے ہو تو مجھے تمہارا رویہ دیکھ کر مایوسی ہوئی ہے۔ تم ایک نابالغ لڑکے جیسا ردعمل پیش کر رہے ہو۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لڑکی نے مجھے انجانے میں تھپڑ مارا ہے اور یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ شاید اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔ پروفیسر کے لیے اس کی عقیدت ایک دم ہی اس کے غصے کا سبب بن گئی۔ میں اس لیے بے عزتی محسوس نہیں کر رہا کہ میں اس کے لیے انجان تھا۔ ہاں اگر میں اس کے لیے شناسا ہوتا' وہ میرے کوائف سے واقف ہوتی اور پھر ایسا کرتی تو شاید مجھے قلق ہوتا۔"

صفدر بولا "آپ میں اتنا حوصلہ ہوگا لیکن مجھ میں نہیں۔ میں اسے یہ تھپڑ معاف نہیں کر سکتا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم ایک اور بات بھول رہے ہو پیارے۔ ہم دونوں اپنی اصلی صورتوں میں نہیں۔ لہٰذا تھپڑ بھی میرے چہرے پر نہیں لگا اس چہرے پر لگا ہے جو میک اپ کے بعد بنا ہے۔"

صفدر بھنایا ہوا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اتنی دیر میں ویٹر نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ویٹر نے بتایا کہ میرا فون ہے۔ میں استقبالیہ کاؤنٹر پر جا کر سن لوں۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ساہی صاحب ہیں۔" ویٹر نے جواب دیا۔

میں فوراً چپل گھسیٹ کر نیچے کاؤنٹر پر پہنچا۔ ساہی صاحب نے کہا "بھئی! کوئی ملنا چاہ رہا ہے تم سے۔"

"کون ہے؟"

"ملک کی ایک بڑی فلم اسٹار۔۔۔ مس نوشین!"

میں چونک گیا "اسے مجھ سے کیا کام ہے؟"

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔ پہلے دو مرتبہ اس کے سیکرٹری نے رابطہ قائم کیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ خود بات کر رہی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ اس کا تم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اس کے پاس تمہارا اتا پتا نہیں ورنہ وہ یقیناً اسی وقت تم پر چڑھ دوڑتی۔"

"کچھ اندازہ تو لگایا ہوگا آپ نے کہ کیا مسئلہ ہے اس کا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ اللہ دتا کے کلینک میں پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے وہ کوئی بات کرنا چاہ رہی ہے۔ شاید تم سے معذرت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"لیکن مجھے اس کی معذرت کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ساہی صاحب ہلکے پھلکے انداز میں بولے "خدا کا خوف کرو بھئی۔ اتنی بڑی فلم اسٹار ہے۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اسٹوڈیو کے گیٹ پر کھڑے رہتے ہیں۔ اور تم اس سے ملنا نہیں چاہ رہے ہو۔"

"میرے خیال میں وقت ضائع کرنے کے اس سے بہتر طریقے بھی ہیں۔" میں نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

ساہی صاحب قدرے سنجیدہ لہجے میں بولے "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ شاید وہ پروفیسر اللہ دتا کے حوالے سے بھی کوئی بات کرے۔ اگر تم اس سے ایک مختصر ملاقات کر ہی لو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' اگر آپ کہتے ہیں تو کر لیتا ہوں۔"

ساہی صاحب نے کہا "مگر تمہارا یہ ہوٹل والا ٹھکانا پوشیدہ ہی رہے تو بہتر ہے۔ ملاقات کے لیے کوئی اور جگہ مقرر کر لو۔ انٹرنیشنل ہوٹل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تم پانچ بجے تک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچ جانا۔ آج شام کی چائے تم مشہور و معروف فلم اسٹار نوشین کے ساتھ پیو گے۔"

میں نے کہا "جناب! اس مشہور و معروف فلم اسٹار کے ساتھ مجھے ملنا کس حیثیت سے ہے؟"

"احمد کی حیثیت سے۔ تم باقاعدہ طور پر پولیس میں شامل نہیں ہو۔ تاہم پولیس کے لیے مخبر کے فرائض انجام دیتے ہو۔ اعلیٰ پولیس افسران سے تمہارے تعلقات ہیں۔ تمہارے ساتھی (صفدر) کا نام شجاع ہے اور وہ تمہاری ہدایات کے تحت کام کرتا ہے۔"

ساہی صاحب نے مزید کچھ باتیں بتانے کے بعد سلسلہ منقطع کردیا۔ میں واپس کمرے میں آکر سوچنے بیٹھ گیا۔ یہ فلمی پری مجھ سے کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ صرف معذرت کرنا چاہ رہی ہو لیکن یہ کسی قسم کی چال بھی ہوسکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی اور شخص فلمی پری کو استعمال کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ بہرحال اصل بات تو اس سے ملنے کے بعد ہی کھل سکتی تھی۔

میں نے کمرے کی کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ صفدر ہوٹل کے برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ وہ بظاہر ایک میگزین دیکھ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی نگاہیں اور دماغ کہیں اور ہیں۔ وہ اندر سے آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ میرے چہرے پر فلمی ہیروئن کے طمانچے کو اس نے اپنی اور میری بہت بڑی بے عزتی تصور کیا تھا اور اب اس لڑکی کو سبق سکھانا چاہ رہا تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ دل ہی دل میں باری یا شاہ نور اسٹوڈیو کے اندر گھسنے اور فلمی پری کو سرعام ذلیل کرنے یا اٹھا لے جانے کا پروگرام بنا چکا ہو اور اگر سنجیدگی سے سوچا جاتا تو صفدر جیسے شخص کے لیے یہ سب کچھ کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ کسی نگار خانے میں گھس کر فلمی پری کے درجنوں محافظوں کی موجودگی میں بھی اسے تگنی کا ناچ نچا سکتا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے اندر بلا کر تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کروں۔

میں نے کھڑکی کھول کر اسے آواز دی۔ وہ پژمردہ قدموں سے اندر آگیا۔

○☆○

شام کو میں اکیلا ہی انٹرنیشنل ہوٹل کے لیے روانہ ہوا۔ صفدر کو میں سب کچھ بتا چکا تھا اور وہ قدرے مطمئن نظر آرہا تھا' بہرحال اس کے دل میں مختلف شکوک بھی موجود تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ فلمی ہیروئن سے میری ملاقات کے دوران میں وہ بھی میرے آس پاس موجود رہے گا لہٰذا مجھ سے ایک گھنٹا پہلے ہی وہ ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ میں ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تو صفدر کو گوشے کی ایک میز پر بیٹھے پایا۔ اخبار دیکھنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہال میں ادھر ادھر نظر دوڑائی اور ساہی صاحب کی ہدایت کے مطابق ایک میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ یہ میز ہمارے لیے پہلے سے مخصوص تھی۔ مجھے بیٹھے بمشکل تین چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ فلمی پری ہال میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ میں نے اسے اس کی چال ڈھال اور قدوقامت سے پہچانا۔ وہ ایک چلتی پھرتی "دلکش قیامت" تھی۔ قد لانبا تھا' شانے چوڑے' نقوش بھی خوب صورت تھے۔ مگر اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی دودھیا رنگت اور انتہائی ملائم و نفیس جلد تھی۔ لگتا تھا کہ اپنے حسن و شباب کی دیکھ بھال کے حوالے سے اس کا بجٹ لمبا چوڑا ہے۔ وہ ہال میں داخل ہوئی تو اس کا سراپا ایک طویل چادر میں چھپا ہوا تھا۔ آنکھوں پر ہلکی رنگت والی عینک تھی۔ زیریں چہرہ چادر کے پلو نے چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہال میں نگاہ دوڑائی اور پھر سیدھی میری میز پر آگئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔

"السلام علیکم" اس نے نہایت کھنک دار آواز میں کہا۔

میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک نفیس ہینڈ بیگ تھا۔ سرخ و سپید ہاتھ میں ہیرے کی دو انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ چند لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ بولی "ایس ایس پی ساہی صاحب سے مجھے آپ کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی میرے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو جانتے ہوں گے۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اقرار میں سرہلایا۔ حالانکہ میں نے پوسٹروں اور اخباروں میں صرف اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ ہاں زریں گل یہاں موجود ہوتا تو وہ یقیناً اس کا پورا شجرہ نسب بیان کردیتا۔

اس نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ چند لمحے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی رہی پھر دبی ہوئی آواز میں بولی "مسٹر احمد' آج دوپہر پروفیسر صاحب کے کلینک پر جو واقعہ ہوا میں اس کے لیے بے حد شرمندہ ہوں ... اور آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

اس کے حسین چہرے پر ندامت بارش کی طرح برس

رہی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں اضطراری کیفیت میں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔

میں نے کہا "اگر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ انسان کو تحمل کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی "پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں پروفیسر صاحب سے بہت عقیدت رکھتی ہوں۔ وہ میرے معالج ہی نہیں' ایک طرح سے میرے پیرو مرشد بھی ہیں۔ میں اس قدر جذباتی ہوئی کہ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ بہرحال اس کے بعد آپ نے جس برداشت اور صبر کا ثبوت دیا اور جس طرح اپنے مشتعل ساتھی کو روکے رکھا' اس نے مجھے بہت متاثر کیا' اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔"

اسی دوران میں ویٹر آگیا۔ ہم نے اسے چائے کا آرڈر دیا۔ میں نے نوشین سے پوچھا "آپ کتنے عرصے سے پروفیسر کے پاس آرہی ہیں؟"

وہ بولی "تقریباً دو سال ہوئے میری بہن صادقہ کا بیٹا جو صرف دو سال کا تھا' سیڑھیوں سے گرا اور پانچ روز اسپتال میں رہا۔ بعد میں اس پر وقتاً فوقتاً غشی کے دورے پڑنے شروع ہوگئے۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن وہ دن بدن لاغر اور بیمار ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے ایک خاص قسم کا اعصابی مرض لاحق ہے۔ یہ مرض ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں وقفے وقفے سے مریض کے اعضا شل ہوجاتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے حرکت نہیں دے سکتا۔ میں اپنے بھانجے کو دو مرتبہ امریکا بھی لے کر گئی لیکن وہاں سے بھی صرف تسلی تشفی ہی مل سکی۔ انہی دنوں میرے ایک ملازم نے مجھے پروفیسر اللہ دتا صاحب کے بارے میں بتایا۔ مصیبت میں انسان ہر قسم کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ میں اَن کوالیفائڈ معالجوں پر یقین نہ رکھنے کے باوجود بھانجے کو پروفیسر صاحب کے پاس لے آئی اور پھر یہ معجزہ ہوا کہ میرا دو ڈھائی سال کا بھانجا جو موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا' پھر سے جی اٹھا۔ ڈیڑھ دو ہفتے اس کی حالت جوں کی توں رہی' پھر وہ تیزی سے سنبھلنے لگا۔ صرف دو ماہ بعد وہ بھلا چنگا تھا۔

"ان واقعات کے چند ماہ بعد مجھے جلد کی تکلیف ہوگئی۔ میرے ہاتھوں کی پشت اور کمر کے نچلے حصے میں سفید داغ سے نظر آنے لگے۔ ہلکی خارش بھی ہوتی تھی۔ میں نے لاہور کے بہترین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ وقتی طور پر آرام آجاتا تھا پھر تکلیف ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا' یہ طویل عرصے تک چلنے والی تکلیف ہے۔ دوا وغیرہ کھانے سے کنٹرول رہے گی مگر مکمل طور پر ختم ہونے میں وقت لگے گا۔ آپ کو تو پتا ہے شوبز میں رہنے والوں کو اپنی ظاہری حالت کا کتنا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی مسئلہ ہوجائے تو پورا کیریئر برباد ہوجاتا ہے۔ میں اپنا پرابلم لے کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچی اور پھر دوسرا معجزہ ہوا۔ پروفیسر صاحب نے صرف ستر اسی روپے میں ایک مرہم بنا کر دیا اور اس نے میری تکلیف کو چند ہفتوں میں جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

"اس واقعے نے مجھے اور میری فیملی کو پروفیسر صاحب کا مستقل عقیدت مند بنا دیا۔ میں اکثر یہاں آتی جاتی رہتی ہوں۔ کبھی دوا لینے کے لیے آنا پڑتا ہے' کبھی یوں ہی چلی آتی ہوں۔ پروفیسر صاحب کی شخصیت یوں تو عام سی نظر آتی ہے لیکن ان سے دو چار بار ملنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اندر سے بہت بڑے اور "کرنی والے" ہیں۔"

میں نے کہا "بہت بڑے سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ وہ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر کس میں شک ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ برا مان جائے گی لیکن پھر ایک دم یوں لگا وہ اپنے آپ میں ہی کہیں کھوگئی ہے۔ شاید میرا سوال اتنا رائیگاں نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

"آپ کچھ پریشان ہوگئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ نے بات ہی ایسی کی ہے۔"

"لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ میری بات اتنی بے موقع نہیں تھی۔ بے شک آپ پروفیسر صاحب سے بھرپور عقیدت رکھتی ہیں اور ان پر بہت اعتماد بھی کرتی ہیں پھر بھی ان کے حوالے سے کوئی چیز آپ کو الجھن میں ڈالتی ہے۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا لیکن یہ نشانے پر لگا۔ نوشین کے خوب صورت چہرے پر ایک بار پھر سوچ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ وہ کچھ دیر بے خیالی میں گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتی رہی پھر اپنے خیالات جھٹک کر میری جانب دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ میں گہرائی اور کھوج تھا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ میری توقعات سے مختلف نکلی تھی۔ دیکھنے میں وہ سراپا فلمی پری نظر آتی تھی لیکن اس کی بول چال اور اداؤں میں ایک خاص قسم کا رکھ

رکھاؤ اور دھیما پن تھا۔ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ اس کے شرمانے کا انداز' اس کی مسکراہٹ' اس کا لہجہ' یہ سب کچھ اسے عام فلمی پریوں سے جُدا ثابت کرتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے فلمی حسیناؤں کے بارے میرے تمام منفی تصورات کو دھڑام سے زمیں بوس کر دیا تھا۔

وہ نزاکت سے بولی "ایس ایس پی ساہی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ پولیس کے خاص الخاص "انفارمر" ہیں۔ آپ کو اعلیٰ افسروں کی طرف سے اہم کام سونپے جاتے ہیں۔ کیا میں آپ کو پرائیویٹ جاسوس قسم کی چیز سمجھوں؟"

میں نے کہا "محترمہ! یہ پرائیویٹ جاسوس اور ان کی جاسوسیاں صرف مغربی ملکوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ مجھے تو آپ سیدھے سادے لفظوں میں انفارمر ہی کہیں۔"

وہ بولی "میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ وہ نہیں جو خود کو ظاہر کر رہے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہے آپ نے اور آپ کے ساتھی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ خاص طور سے آپ پر میرا دل اعتماد کرنے کو چاہتا ہے۔"

نوشین کی گفتگو میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ مجھے اپنی عمر سے کہیں زیادہ معاملہ فہم اور زیرک نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "آپ کے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ میں شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"آپ بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ باقاعدہ مجھے تھپڑ بھی مار سکتے ہیں۔" وہ ہنسی تو اس کی آواز نے ماحول کو جگمگا دیا۔

میں نے کہا "جو واقعہ بیت گیا' اسے بھول جائیں۔"

"ٹھیک ہے بھول گئے۔" وہ ادا سے بولی۔ "کوئی نئی بات کریں۔"

اس کے چہرے پر ایک دم گہری سنجیدگی چھا گئی اور حسین آنکھیں کچھ سوچنے میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' ہال میں موجود لوگ اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ملک کی مشہور و معروف ایکٹریس ان کے درمیان موجود ہے۔ صفدر اپنی گوشے والی میز پر موجود تھا۔ وہ کافی پی رہا تھا۔ اس نے رخ تھوڑا سا پھیر کر رکھا تھا۔ نوشین کے لیے ممکن نہیں تھا کہ آسانی سے اسے دیکھ سکتی اور پہچان سکتی۔

نوشین کے پُرسوچ انداز کا اختتام ایک سرد آہ پر ہوا۔ وہ بولی "کیا کل پھر یہیں پر ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"نہیں یونہی۔ آپ سے مل کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ آپ ضرور کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"ہاں شاید ایسا بھی ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میں پھر آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ نوشین شدید تذبذب میں ہے۔ وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھی اور رزرو بھی رہی تھی۔ شاید وہ سوچنے کے لیے مزید کچھ وقت چاہتی تھی۔ اسی دوران میں آٹھ دس سال کی ایک بچی ہمارے پاس آ گئی۔ وہ چند لمحے شرمائی شرمائی سی نوشین کی طرف دیکھتی رہی' پھر بولی "میرے ممی پاپا نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ فلم اسٹار نوشین ہیں نا؟"

نوشین نے ایک سرد آہ بھری پھر مسکراتی نظروں سے بچی کو دیکھ کر بولی "ہاں نوشین ہی ہوں میں۔۔۔ فرمایئے۔"

بچی نے جھٹ سے آٹوگراف بک آگے کی "آٹوگراف پلیز۔"

نوشین نے آٹوگراف دیے۔ بچی کے والدین کچھ فاصلے پر بیٹھے مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ "تھینک یو باجی" بچی نے کہا اور لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اب کچھ اور لوگ بھی کھوجی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگے تھے۔ نوشین نے کہا "ہم لوگوں کے ساتھ یہ بہت پرابلم ہوتا ہے۔ پرائیویٹ لائف ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب دیکھیے' چادر میں منہ چھپا رکھا ہے' پھر بھی پہچانی گئی ہوں۔"

"ہاں شہرت کے ساتھ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل تو ہوتے ہی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ کل ایمبیسیڈر ہوٹل میں ملیں۔ وقت یہی آج والا مناسب رہے گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد ہم ڈائننگ ہال سے اٹھ گئے۔

اگلے روز کے اخبارات میں کل کے واقعات کی دھواں دھار خبریں شائع ہوئی تھیں۔ پولیس مقابلے کی تفصیلات بھی آئی تھیں۔ رجب کا نام ایک بردہ فروش کے طور پر شائع ہوا تھا تاہم ارشاد احمد اور اس کے بھائی پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں کوئی خاص خبر نہیں آئی تھی۔ صرف ایک اخبار نے اتنا لکھا تھا کہ ہلاک ہونے والے بردہ فروش رجب میاں کے گھر سے ایک اسکوٹر برآمد ہوا ہے' جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ پروفیسر اللہ دتا کے بھائی ارشاد احمد کے نام رجسٹرڈ ہے۔

اس روز میرے اور صفدر کے پاس کافی فرصت تھی۔

ہم دونوں نے تقریباً تین گھنٹے آئینے کے سامنے گزارے اور اپنے اپنے میک اپ کو "ری ہیٹ" کیا۔ جو میک اپ ہم نے کر رکھا تھا اس میں ایک کیمیکل ایسا تھا جس میں سوڈیم کی کافی مقدار تھی۔ بھیگنے سے اس کی رنگت تبدیل ہو جاتی تھی لہٰذا ضروری تھا کہ ہر سات آٹھ روز بعد اسے مخصوص ٹریٹ منٹ دی جائے۔

اس روز ایمبیسیڈر ہوٹل میں پری چہرہ نوشین سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ اس مرتبہ نوشین نے لمبی چوڑی تمہید کے بغیر ہی بات شروع کر دی۔ وہ بولی "اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ میں اور میری فیملی پروفیسر صاحب سے غیر مشروط عقیدت رکھتے ہیں' لیکن ایک بات ایسی ہے جو پچھلے کچھ ماہ سے مجھے مسلسل پریشان کر رہی ہے۔ میرے ایک دور کے انکل رب نواز کا بیٹا شاہد بی اے کے بعد بے روزگار تھا۔ وہ فلموں میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روکا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اسے باہر بھجوا دوں گی' اور ہو سکتا ہے کہ امریکا سیٹل کروا دوں۔ ایک روز باتوں باتوں میں پروفیسر صاحب سے شاہد کا ذکر ہوا تو میں نے اس کا مسئلہ بیان کیا۔ پروفیسر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کیا کہ وہ یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے۔ غرض میں نے شاہد کو پروفیسر کے چھوٹے بھائی ارشاد صاحب کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے بہت کم اخراجات لے کر شاہد کو کینیڈا بھجوا دیا اور وہاں ایک ملازمت بھی دلوا دی۔ دو تین ماہ تک تو کینیڈا سے شاہد کے خطوط آتے رہے۔ اس نے اپنے والدین کو کچھ پیسے بھی بھیجے پھر اچانک خطوط آنا بند ہو گئے۔ اس کے والدین نے سمجھا کہ وہ امریکا جانے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا' شاید اسی چکر میں کہیں چلا گیا ہو۔ مگر پھر کوشش کے باوجود اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ ان لوگوں نے پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد سے رابطہ کیا' انہوں نے کینیڈا اور امریکا میں اپنے جاننے والوں سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ شاہد کا پتا چلائیں' مگر یہ ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ ایک ماہ پہلے میں اپنی اردو فلم کی شوٹنگ کے لیے امریکا گئی تو میں نے بھی شاہد کا کھوج لگانے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب یہ مسئلہ یوں اور بھی گمبھیر ہو گیا ہے کہ شاہد کی والدہ کو دل کی تکلیف ہو گئی ہے اور وہ رات دن بیٹے کی واپسی کی دعائیں مانگ رہی ہیں۔"

میں نے کہا "آپ نے ایک ایسی اطلاع دی ہے جس کی میں پہلے سے توقع کر رہا تھا' بلکہ میں اس سے زیادہ کی توقع کر رہا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ میری توقع درست ہو۔ آپ کے پاس اس سے بھی بڑی کوئی اطلاع ہو۔"

وہ میری تفتیشی نظروں سے گھبرا کر میز کی سطح کو گھورنے لگی۔ آخر بولی "اس سے بڑی اطلاع تو نہیں' لیکن اس جیسی ہی ایک اطلاع ضرور ہے۔"

"کیا میں سن سکتا ہوں؟"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ ہو یا نہ ہو' لیکن نقصان نہیں ہوگا۔ یہاں جو بھی بات ہوگی صرف میرے اور آپ تک رہے گی۔"

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "کل پروفیسر صاحب کے کلینک میں اتفاقاً میری ملاقات خانیوال سے آنے والی ایک مائی سے ہو گئی۔ شریفاں نامی یہ مائی بھی پروفیسر صاحب کی پرانی عقیدت مند ہے۔ پانچ چھ ماہ پہلے اس کی بیٹی کو ارشاد صاحب نے آیا کی حیثیت سے ابوظہبی پہنچایا تھا۔ دو ماہ تک نجمہ نامی اس لڑکی کے خط آتے رہے ہیں اور پیسے وغیرہ بھی ملتے رہے ہیں۔ اب اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اس کا کفیل بھی غائب ہے' بلکہ اب معلوم ہوا ہے کہ اس نام کا شخص کہیں موجود ہی نہیں تھا۔ لڑکی جوان اور اچھی شکل و صورت کی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں بھٹک رہی ہے اور کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟ اصل بات کا پتا تو تب ہی چل سکتا ہے جب وہ ملے یا اس کا خط وغیرہ آئے۔ مائی بے حد پریشان ہے اور رو رو کر بینائی ضائع کر رہی ہے۔ وہی شاہد کے مسئلے سے ملتا جلتا مسئلہ ہے۔"

وہ خاموش ہو کر سوچ میں کھو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ پروفیسر صاحب کے لیے اس کی عقیدت اس "تلخ حقیقت" سے دست و گریباں ہے جو پچھلے چند ہفتوں میں اس کے سامنے آئی ہے۔

میں نے کہا "نوشین صاحبہ! مجھے ایک بات کی خوشی ہے۔ آپ نے اپنے دل کی سچائی کو عقیدت کی بھینٹ نہیں چڑھایا ہے۔ پروفیسر کو اپنا مسیحا ماننے کے باوجود آپ نے وہ بات بیان کی ہے' جو آپ کے دل میں کھٹک رہی تھی۔۔۔ اب میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟ اگر ارشاد احمد نے واقعی کسی قسم کا غیر قانونی کام کیا ہے تو کیا یہ صورت حال پروفیسر صاحب کے علم میں ہوگی؟"

نوشین نے اضطراب کے عالم میں اپنا سر دائیں بائیں ہلایا "میرا دل یہ بات کسی طور نہیں مانتا۔ پروفیسر صاحب کے بارے میں' میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر ان کے بھائی ارشاد احمد نے کوئی ایسا کام کیا بھی ہے تو وہ یقیناً پروفیسر صاحب کے علم میں نہیں ہوگا۔ پروفیسر صاحب اپنے کام سے

کام رکھنے والے شخص ہیں۔ انہیں اپنے مریضوں اور ان کے مسئلوں سے ہی فرصت نہیں۔ جو وقت بچتا ہے وہ اپنی فارمیسی میں صرف کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ذاتی دواخانے کی دوائیں ہی استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک اتنا بڑا اور وقت طلب کام ہے کہ پروفیسر صاحب کو اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اور تو اور وہ اپنی بیٹی تک کو توجہ نہیں دے سکتے حالانکہ اس اکیلی بچی کے سوا ان کا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان کو اپنے بھائی کی مصروفیات کے بارے میں زیادہ معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ پروفیسر صاحب پر کوئی دباؤ ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے بھائی کی طرف سے یا کسی اور طرف سے۔ کوئی بلیک میلنگ وغیرہ کا سلسلہ؟"

نوشین کچھ دیر سوچ میں گم رہ کر بولی "مجھے تو اس قسم کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کو کوئی کیوں بلیک میل کرے گا۔ بلیک میلنگ کی وجہ تو عموماً کسی کی کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ بلیک میلر اس کمزوری کو دھمکی بنا لیتے ہیں۔ پروفیسر صاحب تو بطور انسان اتنے اچھے ہیں اور اتنی صاف ستھری زندگی گزار رہے ہیں کہ سب کچھ شیشے کی طرح صاف نظر آتا ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ صاف نظر آنے اور "صاف ہونے" میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے سوچ میں گم دیکھ کر نوشین بولی "کل والے واقعات کے بعد سے ارشاد احمد صاحب روپوش ہیں۔ ان کی روپوشی کی وجہ سے میرے شبے کو تقویت مل رہی ہے اگر وہ بے گناہ تھے تو انہوں نے پولیس کا سامنا کیوں نہیں کیا۔"

"آپ کا ذاتی خیال ارشاد احمد صاحب کے بارے میں کیا ہے۔ کیا وہ بھی پروفیسر صاحب جیسا مزاج رکھتے ہیں یا کچھ مختلف ہیں؟"

نوشین بولی "پروفیسر صاحب اور ان کے بھائی کے مزاج میں نمایاں فرق ہے۔ میں زیادہ تو نہیں جانتی لیکن اتنا معلوم ہے کہ وہ طبیعت کے سخت ہیں۔ ان کی وائف ایک سال پہلے روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھی۔ صرف اپنی بیمار والدہ کے ساتھ تنہا مکان میں رہتے ہیں۔ کچھ رنگین مزاج بھی سمجھے جاتے ہیں۔ پچھلے برس جب ان کا ریکارڈنگ کا کام مندا تھا، پروفیسر صاحب بڑے بھائی کی حیثیت سے ان کی مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود ارشاد صاحب کے کام میں انہوں نے کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ دلچسپی لی۔"

نوشین اور میں دیر تک اس بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ نوشین کی دلی خواہش تھی کہ میں یہ ساری باتیں فی الحال اپنے تک محدود رکھوں اور ہو سکے تو اپنے ذرائع سے ارشاد احمد کے بارے میں ٹوہ لینے کی کوشش کروں۔ آخر میں اس نے پھر ملتجیانہ لہجے میں کہا "میں نہیں چاہتی کہ اس معاملے میں کسی بھی حوالے سے پروفیسر صاحب کا نام آئے۔ وہ پہلے ہی بڑے دکھی شخص ہیں۔ ان کو زخموں کی نہیں مرہم کی ضرورت ہے۔"

میں نے نوشین سے وعدہ کیا کہ میں اپنے طور پر ارشاد احمد صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور میں یہ کارروائی صرف اپنے تک محدود رکھوں گا۔ وہ میری بے حد مشکور نظر آنے لگی۔

عجب بات تھی کہ ایمبیسیڈر ہوٹل کے ہال میں بھی نوشین کو پہچان لیا گیا۔ تین چار نوجوان لڑکے جو صورتوں سے ہی اوباش نظر آتے تھے، نوشین کے اردگرد منڈلانے لگے۔ کبھی اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتے، کبھی کوئی گانا گنگنانے لگتے۔ میں اور نوشین اٹھ کر باہر پارکنگ میں آگئے۔ نوشین اپنی ٹویوٹا گاڑی پر آئی تھی۔ باوردی ڈرائیور دروازہ کھولے تیار کھڑا تھا۔ نوشین نے مجھے اپنے فون نمبرز دیئے اور کہا کہ ہماری اگلی ملاقات اب اس کے گھر میں ہوگی۔

میں ہوٹل میں واپس پہنچا تو صفدر بے قرار سا ٹہل رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پاس کوئی اہم اطلاع یا خبر ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور مسکرا کر بولا "کافی دیر لگا دی آپ نے کہیں کوئی فلمی کہانی سننے تو نہیں بیٹھ گئے تھے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نرم لفظ استعمال کر رہے ہو، ورنہ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کہیں میں کوئی فلمی کہانی "بنانے" تو نہیں بیٹھ گیا تھا۔"

وہ بولا "آپ پر تو پورا اعتماد ہے جناب لیکن یہ فلمی پریاں بڑی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہیں۔ اچھے بھلے بندے کی مت مار دیتی ہیں۔"

"اب تو مت ماری ہی جائے تو بہتر ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں، یادِ ماضی عذاب ہے یارب، چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ نے غزالہ کی تلاش کے حوالے سے مایوس ہونا شروع کر دیا ہے۔"

"میں بھی انسان ہوں پتھر تو نہیں۔ بے شک میں مایوس ہو رہا ہوں اور مایوس ہونا گناہ ہے۔ اس گناہ سے بچنے کے لیے سوچا ہے کہ اگر ایک چھوٹی سی پارٹ ٹائم محبت کر لی

جائے تو کیا مضائقہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

صفدر نے میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں یونہی بے پر کی اڑا رہا ہوں۔ ورنہ غزالہ کی یادوں سے پیچھا چھڑا لینا میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا زندگی کی موجودگی میں سانسوں کی آمد و رفت سے یا دل کی دھڑکن سے پیچھا چھڑا لینا۔ فلم ایکٹریس نوشین بہت خوب صورت تھی لیکن اس جیسی درجنوں لڑکیوں کی خوب صورتی اور نسوانیت کو بھی یکجا کر لیا جاتا تو میرے لیے غزالہ کی ایک مسکراہٹ ان پر بھاری تھی لیکن وہ اپنی مسکراہٹ لے کر نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ وہ ہمارے آس پاس ہونے کے باوجود ہم سے بہت دور تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ واہمہ ہونے لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر مجھ سے دور ہے۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے پھر بھی وہ خود کو مجھ سے چھپا رہی ہے۔

صفدر نے مجھے میرے خیال سے چونکایا "آج کی ملاقات کا کیا نتیجہ رہا؟" اس نے پوچھا۔

"نوشین کے نزدیک پروفیسر اللہ دتا ایک بے قصور شخص ہے۔ اگر اس کا کوئی قصور ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ ارشاد احمد کا بڑا بھائی ہے لیکن میں نوشین سے متفق نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ وہ پروفیسر کی بہت سی خامیوں کو نظرانداز کر رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ پروفیسر کا اپنے بھائی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن کچھ ایسے شواہد بھی ملے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر اپنے عقیدت مندوں کو مختلف مسائل کے حل کے لیے اپنے بھائی ارشاد احمد کی طرف بھیجتا تھا۔ ان میں ایک اہم مسئلہ بیرون ملک جانے کا بھی ہوتا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس اندھے اعتماد کا فائدہ اٹھا رہا تھا جو لوگ اس پر کرتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں اور لڑکیاں پروفیسر پر بے حد بھروسا رکھتی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ اسی بھروسے کے سبب بہت سی لڑکیاں اور عورتیں ارشاد احمد کے جال میں جا پھنسی ہوں۔"

"مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ایسا شخص زیادہ دیر اپنی نیک نامی برقرار نہیں رکھ سکتا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں اور میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ ہر طبقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو پروفیسر کو بے حد عزت و احترام دیتے ہیں، اور اب یہی لوگ پولیس اور پروفیسر کے درمیان دیوار بنے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "عوام الناس میں توہم پرستوں اور کمزور عقیدے والوں کی کمی نہیں۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پروفیسر اور اس کے بھائی نے اپنی کارستانیوں کا سلسلہ حال ہی میں

کشمیر کے سلگتے موضوع
پر
علیم الحق حقی کی ناقابلِ فراموش
لہو رنگ تحریر
طوفان کے بعد
قیمت: /۱۵۰ روپے
بھارت کی سرزمین پر جنم لینے والے ایک طوفان کی رگوں میں لہو کی گردش تیز کرنے والی سنسنی خیز کہانی۔
ناشر علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۳۱۴

شروع کیا ہو۔ جس طرح بڑے جہازوں کو ڈوبتے ہوئے کچھ دیر لگتی ہے' ایسے ہی بہت مشہور لوگوں کی شہرت کا خاتمہ ہوتے کچھ وقت تو لگتا ہے۔"

صفدر نے سگریٹ سلگایا اور دبے دبے جوش سے کہا "ایک تحفہ ہے آپ کے لیے۔"

"کیسا تحفہ؟"

"ابھی دیکھ لیجیے گا۔" وہ باتھ روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ باتھ روم کے اندر کوئی گنگنا رہا ہے۔ پھر باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ گنگنانے کی آواز واضح ہو گئی "تمہی ہو محبوب میرے۔۔۔ ام کیوں نہ تمہیں پیار کرے۔"

پھر دروازہ کھلا اور زریں گل بڑی بے نیازی سے اپنی شلوار کے بل درست کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے گانے کو بریک لگ گئے۔ چہرے پر خوشی کی سرخی لہرائی اور وہ لپک کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

میں نے حیران ہو کر صفدر سے پوچھا "بھئی! یہ خانِ اعظم کہاں سے ٹپک پڑا۔"

صفدر بولا "ٹپکا تو یہ آج سے انتیس تیس سال پہلے تھا' اب تو یہ احمقوں کے فرقے کا ایک جانا پہچانا شخص ہے۔ یہ حضرت آج شام گلستان سینما سے فلم "پردے میں رہنے دو" دیکھ کر نکلے تھے اور عین لکشمی چوک میں سڑک کے کنارے لکڑی کی چوکی پر بیٹھے نان حلیم کھا رہے تھے۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا اتفاقاً میری نگاہ پڑ گئی بس پکڑ کر ادھر لے آیا۔"

"تو کیوں لے آئے یہاں؟"

"آپ نے ایک بالکل بے موقع سوال کیا ہے۔" صفدر نے کہا "آپ کو یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ خان ابنِ خان محترم زریں گل صاحب' جو اکثر ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے' فرشِ خاک پر بیٹھ کر نان حلیم کیوں تناول کر رہے تھے۔"

"کیوں بھئی' کیوں تناول کر رہے تھے؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

زریں بولا "استاد صیب! آپ جانتے نہیں صیدر صیب حسبِ عادت بات کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا ہے۔ وہ کوئی ایسا گیا گزرا ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اچھے خاصے لکڑی کے بنچ رکھے ہوئے تھے' کھانا بھی ٹھیک ٹھاک ہی تھا اور سب سے بڑا بات یہ ہے کہ ام کو وہاں کھانا اچھا لگ رہا تھا۔ ام کئی سال پہلے جب لاہور میں تھا اور لکڑی کے ٹال پر کام کرتا تھا تو اکثر اس ہوٹل میں کھانا مرحمت فرماتا تھا۔"

"شاید تم کہنا چاہتے ہو کہ نوش فرماتا تھا۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں بالکل یہی بات۔ اس ہوٹل سے امارا بڑا یادیں ہے۔"

"اوئے خدا کا خوف کرو۔" صفدر نے زریں کی [illegible] کاٹتے ہوئے اس کی گردن پر دوہتڑ مارا "تم اسے ہوٹل [illegible] ہو۔ اس کے سامنے تو بھٹیار خانہ بھی فائیو اسٹار ہوٹل [illegible] دیتا ہے۔"

زریں نے ذرا زچ ہو کر کہا "اچھا صیدر صیب! [illegible] ہے کہ ام نے ایک سستی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔ تو اب میں ایسا کون سا قیامت برپا ہو گیا۔ کچھ دن پہلے آپ [illegible] نے بھی تو بیٹن منڈی کے قریب سڑک کے کنارے لکڑی اسٹولوں پر بیٹھ کر دال چاول مرحمت فرمایا تھا۔۔۔ امارا مطلب ہے کہ نوش فرمایا تھا۔"

زریں گل نے بات تو ٹھیک کی تھی لیکن صفدر بھی چوکنے والا تھا' فوراً بولا "وہ اور بات تھی۔ ہم نے وہاں چاول فیشن کے طور پر مرحمت فرمائے تھے' لیکن تم آج کل تنوروں اور بھٹیار خانوں پر تین تین روپے میں کھانا کھا رہے ہو' وہ اس لیے کہ تمہارا ہاتھ آج کل تنگ ہے۔ ایک ایک پائی کو دانتوں سے پکڑ رہے ہو' اور اپنی اس حالت کو دوستوں سے چھپا رہے ہو۔ اگر ہمیں اتنا ہی غیر سمجھتے ہو تو پھر لعنت ہے تم پر اور تمہاری سوچ پر۔ کیا اتنے طویل عرصے ساتھ کے بعد اتنا بھی حق نہیں ہے ایک دوسرے پر۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی کھڑکی سے نیچے پھینک کر [illegible] دوں تمہارا۔۔۔ لیکن پھر پیاری سی بہن گل ثوم کا خیال آتا کہ وہ بیوہ ہو جائے گی۔"

زریں گل نے ہنستے ہوئے کہا "ام آپ کے جذبات قدر فرماتا ہے لیکن امارا ہاتھ اتنا بھی تنگ نہیں ہے جتنا آپ غصہ فرما رہا ہے۔ تھوڑا بہت تنگی ترشی تو آتا ہی رہتا ہے۔ رنگیلا صیب کا گانا نہیں سنا آپ نے۔ کبھی ہے غم اور کبھی خوشی کبھی سراسر فاقہ مستی ہے۔ بتا اے دنیا والے یہ کیسا بستی ہے۔" پھر زریں نے مسکراتے ہوئے اپنے ہونٹ میں نسوار کی چٹکی رکھی اور مزاحیہ انداز میں بولا "ویسے بھی امارا دن پھرنے ہی والا ہے صیدر صیب۔۔۔ وہ نیلا مل گیا تو؟ کس نے پاکستان میں رہنا ہے اور کس نے لکشمی چوک کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر نان حلیم کھانا ہے پھر تو ہم ہوگا اور پیرس لو نیویارک کا فرنگی لوگ ہوگا۔ ام نے تو ارادہ کر رکھا ہے کہ غریب فرنگیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو بھیک دے گا اور ان

ازلوں خاک میں ملا کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کرے گا۔"

زریں گل جانتا نہیں تھا کہ جو بات وہ ہنسی ہنسی میں کر رہا ہے' وہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔ وہ عن قریب ایک بہت بڑے اثاثے کا بلا شرکتِ غیرے مالک بننے والا ہے۔ وہ اپنی پیرس اور نیویارک جا سکتا ہے اور وہاں گلیوں میں پھرنے والے بھک منگوں کو خیرات دے کر ثواب دارین حاصل کر سکتا ہے۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "خیر چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم اپنے چچا زاد رستم خان کے اڈے سے اڑنے کے بعد کس چھتری پر جا کر بیٹھے ہو۔"

"شاید آپ یہ پوچھ رہا ہے کہ ام کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "ام رستم خان کے گھر سے زیادہ دور نہیں گیا۔ دراصل ام اس ڈاکٹر سے زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا' جس سے کلثوم اپنا چیک اپ (چیک اپ) کراتا ہے۔ وہیں گلشن روڈ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا لے رکھا ہے ام نے آپ کی طرح۔"

صفدر بولا "ویسے شاہ جہاں صاحب! مذاق تو مذاق رہا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ زریں گل کا یہاں پہنچنا ہمارے لیے بڑا سود مند ثابت ہوا ہے۔ اس نے یہاں آتے ہی ایک اتنی شان دار تجویز پیش کی ہے اور اس تجویز کا اتنا اچھا نتیجہ نکلا ہے کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

"کیا پہیلیاں بجھوانے کا ارادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں پہیلی ہی سمجھیں۔۔۔ اور پہیلی یہ ہے کہ ہم دونوں ابھی تھوڑی دیر پہلے پرانی انارکلی میں تھے۔۔۔ اور وہاں ایک ایسے حکیم صاحب سے گفتگو فرما رہے تھے جو پرانی انارکلی اور اردگرد کے علاقے میں سب سے پرانے معالج مانے جاتے ہیں۔ چند برس پہلے جب ابھی پروفیسر اللہ دتا صاحب نے اس علاقے میں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا' حکیم صاحب کا کام بہت زوروں پر تھا۔ یعنی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ بہ الفاظ دیگر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم قبلہ اللہ دتا صاحب کے ایک کاروباری رقیب سے مل کر آ رہے ہیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔"

"اور یہ امارا آئیڈیا ہے جناب۔۔۔ دراصل ام کو اس کا تجربہ کئی سال پہلے پشاور میں ہوا تھا جب ام وہاں تکا کباب لگاتا تھا۔ جس بازار میں ام نے تکا کباب لگانا شروع کیا وہاں پاس ہی پاک باز خان کا دکان تھا۔ وہ بھی تکا کباب لگاتا تھا اور امارا بڑا پکا دوست تھا۔ لیکن جب ام نے تکا کباب لگایا اور خدا تعالیٰ کے کرم سے امارا کام چلنا شروع ہوا تو پاک باز خان کا آنکھیں بدلنے لگا' جوں جوں امارا کام چلتا گیا وہ خدائی خوار ام سے دور ہوتا گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچا کہ اس نے ام پر الزام لگا دیا کہ ام اپنے کبابوں میں بھنگ کا نشہ ملاتا ہے اور لوگوں کو نشے پر لگا رہا ہے۔ اگلے روز ہمارے اڈے پر چھاپا پڑا اور پولیس والا ام کو گوشت سمیت اٹھا کر لے گیا۔ خیر امارا کیا بگڑنا تھا۔ امارا دامن چاندنی کے مافق صاف تھا۔ ام چھوٹ کر واپس آ گیا اور ساتھ میں امارا فائدہ بھی ہو گیا۔"

"فائدہ کیسے ہو گیا؟" صفدر نے پوچھا۔

"فائدہ یہ ہو گیا صیدر صیب کہ آہستہ آہستہ امارا کام اور زیادہ چلنا شروع ہو گیا۔ کچھ لوگ تو امارے پاس اس لیے آتا تھا کہ انہیں امارا کباب مزے دار لگتا تھا۔۔۔ کچھ لوگ امارے پاس اس لیے آنے لگا کہ وہ بھنگ والے کباب کھانا چاہتا تھا۔ ام بھنگ رنگ تو ملاتا نہیں تھا لیکن نہ انکار کرتا تھا اور نہ اقرار۔۔۔ جو صرف کباب کھانا چاہتا تھا ان کو بھی مزہ آتا تھا جو بھنگ والے کباب کھانا چاہتا تھا ان کو بھی مزہ آتا تھا۔ بلکہ ام نے کئی شوقین لوگوں کو تو کباب کھانے کے بعد باقاعدہ نشے میں جھومتے ہوئے بھی دیکھا۔ کوئی لہک لہک کر گانے لگتا۔ کوئی ڈگمگاتا ہوا اٹھ کر چلا جاتا حالانکہ ام خدا کا قسم کھا سکتا ہے کہ ام نے کبھی بھنگ کا ایک پتی بھی قیمے میں نہیں ملایا۔"

صفدر نے کہا "تمہاری باقی بات تو سمجھ میں آتی ہے' لیکن۔۔۔ بغیر بھنگ کے کسی کو نشہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

زریں بولا "صیدر صیب! آپ یہ کیوں بھول رہا ہے کہ کباب کھانے والا بھی امارا پٹھان بھائی ہی تھا۔ ان کو بغیر وجہ کے بھی سرور آنے لگتا تھا۔"

میں نے کہا "اوئے زریں کے بچے! بات کہاں کی تھی اور تم کہاں لے گئے ہو۔ وہ حکیم صاحب کیا کہہ رہے ہیں جن سے مل کر آئے ہو؟"

صفدر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "حکیم صاحب کا نام محمد ادریس انبالوی ہے۔ انہوں نے پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں کئی اہم انکشافات باقاعدہ ثبوتوں کے ساتھ کیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ارشاد احمد جو بھی دھندا کرتا ہے اس میں پروفیسر اللہ دتا برابر کا شریک ہے۔ اس نے صرف اپنے ہاتھ پاؤں بچانے کے لیے خود کو بھائی کے کام سے لاتعلق ظاہر کیا ہوا ہے۔ اگر تھوڑا سا کھوج لگایا جائے تو صاف صاف پتا چل جائے گا کہ اللہ دتا کا کلینک درحقیقت ارشاد احمد کے شکار کے لیے جال کا کام دیتا ہے۔ کلینک میں عورتیں اور لڑکیاں کثرت سے آتی ہیں۔ یہ خواتین اللہ دتا پر اندھا دھند

اعتماد بھی کرتی ہیں۔ اللہ دتا ان میں سے اپنے مطلب کی خواتین ڈھونڈ لیتا ہے اور انہیں کسی نہ کسی طرح ارشاد احمد کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنے مسئلوں کے حل کے لیے ارشاد احمد سے ملتی جلتی رہتی ہیں۔ آخر اس کے دام میں پھنس جاتی ہیں۔ ارشاد احمد ان خواتین کے کسی قریبی عزیز، بھائی یا بیٹے وغیرہ کو باہر بھجوانے کا جھانسا دیتا ہے یا ان خواتین کو ہی بیرون ملک جانے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ خاص طور سے مڈل ایسٹ میں اس نے کافی لوگ بھجوائے ہیں۔ سنا ہے کہ ان لوگوں میں سے اکثر مصیبت میں ہیں، ان کے سفری کاغذات آجروں کے قبضے میں ہیں اور وہ بہت کم معاوضے پر سخت محنت کرنے پر مجبور ہیں۔ بعض لوگ لاپتا بھی ہوگئے ہیں۔ یوں تو ارشاد احمد ڈیڑھ دو سال سے یہ کام کررہا ہے مگر پچھلے آٹھ دس ماہ میں اس نے کھل کھلا کر کام کیا ہے اور بیسیوں لوگوں کو مڈل ایسٹ اور یورپ امریکا میں بھجوایا ہے۔ چونکہ پروفیسر اللہ دتا کی ساکھ ہے اس لیے لوگ اس کے بھائی پر بھی فوراً بھروسا کرلیتے ہیں۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔ پروفیسر کا علاج معالجے کا کام بھی کافی وسیع ہے۔ اس کی اپنی فارمیسی ہے جس میں تیار ہونے والی دوائیں نہ صرف اس کے اپنے کلینک میں بے تحاشا استعمال ہوتی ہیں بلکہ مارکیٹ میں بھی فروخت ہوتی ہیں۔ لوگوں کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر کے ہاتھ میں شفا بھی ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہے، اور اپنے روشن حال کی طرح پروفیسر کو اپنا مستقبل بھی روشن تر نظر آرہا ہے تو پھر اسے بردہ فروشی جیسے گھناؤنے کام میں اپنے ہاتھ گندے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دولت کی ہوس۔۔۔ اور کیا۔" صفدر نے جواب دیا۔

"مجھے یہ معاملہ بہت الجھا ہوا نظر آتا ہے۔"

"جتنا الجھا ہوا ہے، اتنا ہی گمبھیر بھی ہے۔ اب یہی دیکھیے، حکیم محمد اویس کے پاس سے یہ خط ملا ہے۔ یہ خط چند ماہ پہلے پروفیسر کے بھائی ارشاد احمد نے ملتان کی ایک خاتون کو لکھا تھا۔ یہ جواں سال خوب رو خاتون پچھلے دنوں اپنی کسی تکلیف کے سلسلے میں حکیم محمد اویس سے ملی تو اس نے شکوے شکایات کے دفتر کے ساتھ ساتھ یہ خط بھی حکیم صاحب کو دکھایا۔"

یہ خط کی فوٹو اسٹیٹ تھی۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ ارشاد احمد نے اپنے ہاتھ سے یہ تحریر لکھی تھی۔ خاتون کو مسز چوہدری کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ ارشاد نے لکھا تھا۔

"مسز چوہدری! آپ کا خط ملا۔ احوال سے آگاہی ہوئی۔ میں نے آپ کے بچے کے سلسلے میں بھائی اللہ دتا صاحب سے خود بھی بات کی ہے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ بچے کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اور پاکستان میں اس کے علاج کی کوئی امید نہیں۔ میری بہن! آپ جانتی ہی ہیں کہ بیرون ملک علاج کس قدر مہنگا اور دشوار ہے۔ ایک دن میں ہزاروں روپیہ خرچ ہوجاتا ہے۔ سفر اور ویزے وغیرہ کے اخراجات الگ ہیں۔ بہرحال بڑے بھائی صاحب کا حکم ٹالنا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ میں انشاء اللہ اپنی بساط سے بڑھ کر آپ کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔

"بھائی صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کے شوہر حیات نہیں ہیں۔ کوئی بھائی یا دیور وغیرہ بھی نہیں جو ساتھ جاسکے لہٰذا آپ کو خود ہی بیٹے کے ساتھ جانا پڑے گا۔ اس کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیں۔ کسی بھی سوموار یا جمعرات کے روز لاہور تشریف لے آئیں۔ نکاح نامہ، شناختی کارڈ اور پراپرٹی کی ایک دو رجسٹریاں بھی ہمراہ لے آئیں۔ فوری طور پر ڈیڑھ دو لاکھ کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد دو تین ماہ میں کم از کم اتنے ہی اور درکار ہوں گے۔ جس وقت انتظام ہوجائے آپ لاہور تشریف لے آئیں۔ میں آپ کے لیے اپنی پوری کوشش کروں گا۔ فی الحال بچے کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں۔ کوئی اور بات دریافت کرنی ہو تو میں نیچے اپنا فون نمبر درج کررہا ہوں۔"

میں مکمل خط پڑھ چکا تو صفدر نے کہا "یہ بدقسمت بچہ ایک ماہ بعد ہی فوت ہوگیا تھا، تاہم اس سے پہلے ارشاد احمد دکھیاری ماں سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد وصول کرچکا تھا۔ ان واقعات کو چار پانچ ماہ گزر چکے ہیں۔ مذکورہ خاتون کئی مرتبہ ارشاد احمد سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرچکی ہے لیکن وہ پہلے ٹال مٹول سے کام لیتا رہا ہے، اب صاف انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رقم اسپتال کے پیشگی اخراجات اور ویزے وغیرہ کے چکر میں لگ گئی ہے۔

"حکیم اویس صاحب کا کہنا ہے کہ ارشاد احمد اور اس کے پروفیسر بھائی نے شروع سے آخر تک فراڈ کیا ہے۔ حکیم صاحب نے بھی وہ بچہ دیکھا تھا۔ اس کی حالت علاج کے قابل تھی ہی نہیں۔ کوئی بھی معالج اسے ایک نظر دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ علاج کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔ ارشاد احمد نے اس بچے کے بیرون ملک علاج کے لیے ٹوٹل ڈھائی تین لاکھ روپیہ طلب کیا تھا۔ اس سے بھی اس کی بدنیتی واضح ہوجاتی ہے۔ ایسے سفر اور علاج کے لیے چودہ پندرہ لاکھ روپے کی رقم بھی تھوڑی سمجھی جاتی ہے۔ ارشاد احمد مجبور عورت سے

صرف رقم اینٹھنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی ارشاد احمد کا کوئی پروگرام ہو۔ بچے کی ماں خوب صورت اور جوان تھی۔ وطن سے ہزاروں میل دور اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ فلم ایکٹریس نوشین کے چچازاد کی طرح وہ بھی دیارِ غیر میں عدم پتا ہوسکتی تھی۔"

پھر صفدر نے مجھے اخبار کا ایک تراشہ دکھایا۔ یہ تراشہ بھی اسے حکیم محمد اویس اچھالوی کے پاس سے ملا تھا۔ اس تراشے میں چار پانچ ماہ پرانی ایک خبر تھی۔ اس خبر میں درج تھا "کل صبح منہ اندھیرے ایک نوجوان دیہاتی دوشیزہ مسلم ٹاؤن روڈ پر ایک تیز رفتار مزدا لوڈر کے نیچے آکر کچلی گئی اور موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ لوڈر کا ڈرائیور لوڈر بھگا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ تفصیل کے مطابق آج علی الصباح چار بجے کے قریب ایک لڑکی اسٹریٹ نمبر اٹھارہ کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے جسم کے صرف بالائی حصے پر لباس تھا۔ وہ حواس باختہ تھی اور چیخ رہی تھی۔ چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے خود کو چھڑا کر سڑک پار کرنے کی کوشش کی اسی اثنا میں مزدا لوڈر اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ بعد ازاں ہونے والی تفتیش سے پتا چلا کہ لڑکی گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں کی رہنے والی ہے اور علاج کرانے کے لیے لاہور آئی ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ تین چار دن سے داتا دربار میں مقیم تھی۔ متوفیہ کی والدہ کے پاس سے پروفیسر اللہ دتا صاحب کے کلینک، واقع انارکلی کی پرچی برآمد ہوئی ہے جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ وہ پروفیسر کے زیر علاج تھی۔ اس بات کی تصدیق کے بعد پولیس کا دھیان اس طرف چلا گیا کہ کہیں یہ نیم برہنہ لڑکی ارشاد احمد کی کوٹھی سے ہی نہ نکلی ہو۔ ارشاد احمد کی کوٹھی مسلم ٹاؤن روڈ کی اسٹریٹ نمبر گیارہ میں ہی واقع ہے۔ پولیس پوچھ گچھ کے لیے ارشاد احمد کے گھر پہنچ گئی۔ اسی دوران میں فونوں کی گھنٹیاں کھڑکنے لگیں اور درجنوں سفارشیں پہنچ گئیں کہ پروفیسر کے بھائی صاحب کو شامل تفتیش نہ کیا جائے۔"

صفدر اور زریں گل جو کچھ بتا رہے تھے۔۔۔ اور دکھا رہے تھے اس سے یہ شک پختہ ہورہا تھا کہ پروفیسر کے حوالے سے بھی دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بے شک وہ ہر دل عزیز تھا اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا مگر ہر دل عزیز ہونا اور عزت کی نظر سے دیکھا جانا اس بات کی گارنٹی نہیں ہوتا کہ ایک شخص واقعی اُجلے کردار کا مالک بھی ہے۔ ہم حکیم محمد اویس کے بیانات پر کاروباری رقابت کا لیبل لگا سکتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ اس نے بات کو اچھالنے کی کوشش کی ہے، لیکن جو کچھ ٹھوس ثبوتوں کی شکل میں تھا اس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے صفدر اور زریں گل کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا کہ ہم پروفیسر اللہ دتا کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کریں گے۔

اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ رات کے کسی پہر زبردستی پروفیسر کی رہائش گاہ میں گھسا جاتا اور گن پوائنٹ پر اسے سب کچھ صاف صاف بتانے پر آمادہ کیا جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ فلم اسٹار نوشین کے ذریعے پروفیسر سے رابطہ کیا جاتا اور نسبتاً پُرامن ماحول میں بیٹھ کر پروفیسر کے مسائل سنے جاتے اور اپنے سنائے جاتے۔ صفدر اور زریں سے مشورے کے بعد مجھے دوسرا طریقہ زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ ویسے بھی میں نوشین سے وعدہ کرچکا تھا کہ اس کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے پروفیسر پر کوئی "آفت" نہیں آئے گی، لہٰذا بہتر تھا کہ پروفیسر کا "انٹرویو" نوشین کی رضامندی اور وساطت سے ہوتا۔ میں نے اسی وقت نوشین سے فون پر بات کی۔ وہ اپنے گھر میں تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں پروفیسر سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم پریشانی کے اس دور میں پروفیسر کی کوئی مدد کرسکیں۔۔۔ اور اگر میرے خدشے کے مطابق وہ واقعی کسی دباؤ میں ہیں تو انہیں اس دباؤ سے نکالا جاسکے۔

نوشین رضامند ہوگئی۔ اس نے کہا "میں ابھی یا کل صبح پروفیسر صاحب سے فون پر رابطہ کرلیتی ہوں پھر ان سے جو بھی وقت ملا وہ فون پر آپ کو بتادوں گی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں علی الصباح آپ کو فون کروں گا۔ آپ کی "علی الصباح" کتنے بجے ہوتی ہے؟"

وہ ہنسی اور ادا سے بولی "ساڑھے دس بجے۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے میں فون کرلوں گا۔"

وہ بولی "یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ مجھے اپنا فون نمبر نہیں دیں گے۔ کہیں آپ واقعی کوئی پرائیویٹ جاسوس قسم کی چیز تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی سیکرٹ ایجنٹ۔ زیرو زیرو سیون، دی جینٹ، شرلاک ہومز، کولمبو۔۔۔ وغیرہ۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو صرف پولیس کا "انفارمر" ہوں۔ آپ کسی فلم میں چانس وغیرہ دلا دیں تو شاید کچھ کر گزروں۔"

وہ ہنسی تو گھنٹیاں سی بجنے لگیں "طمانچے کا اتنا سخت انتقام لے رہے ہیں آپ؟" تھوڑی دیر تک خود ہی ہنستی رہی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "خیر یہ تو ایک مذاق تھا۔۔۔ اگر آپ

فلموں میں آنا چاہیں تو واقعی آ سکتے ہیں۔ آج کل تو لمبے قد والوں کی بہت کمی ہے انڈسٹری میں۔"

میں نے کہا "اگر فلموں میں قد کو ناپ کر داخلہ ملتا ہے تو پھر ہمارے کمرے کا دیٹر آپ لوگوں کو زیادہ سوٹ کرے گا اور آپ کی انڈسٹری میں دھومیں مچا دے گا۔"

کچھ دیر ہلکی پھلکی گفتگو کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز ساڑھے دس بجے میں نے فون کیا تو نوشین کی خمار آلود آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پروفیسر صاحب ملاقات پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ انہوں نے دوپہر دو بجے کا وقت دیا ہے۔

"کہاں ملیں گے؟"

"اپنے گھر میں۔۔۔ وہ ان کے آرام کا وقت ہوتا ہے' ہمارے لیے خود کو بے آرام کر رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ تھوڑی سی بے آرامی ان کے لیے زیادہ آرام کا سبب بن جائے۔ بہرحال مجھے بتا دیں کہ کتنے بجے مجھے کہاں آنا ہے؟"

وہ بولی "ایورنیو اسٹوڈیو میں آج میری شوٹنگ ہے۔ آپ ایک بجے تک ایورنیو اسٹوڈیو ہی پہنچ جائیں' وہاں سے میری گاڑی میں پروفیسر صاحب کی طرف نکل جائیں گے۔"

"لیکن مجھے اسٹوڈیو میں گھسنے کون دے گا؟"

"آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ ہنسی "میں چوکیدار کو چیٹ پہنچا دوں گی۔ اگر وہ روکے تو آپ صرف اپنا نام بتا دیجئے گا۔ دوسرا فلور ہے۔ شہزاد پروڈکشن کی فلم ہے۔"

زریں گل میرے پاس ہی کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے گفتگو ختم کی تو اس نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کون بات کر رہا تھا؟ کس فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے؟ یہ نوشین فلم اسٹار خود بول رہی تھی یا اس کی کوئی سیکریٹری وغیرہ تھی؟ میں نے ان سوالوں کے جواب دیے لیکن زریں کی بے تابی برقرار رہی۔ وہ فلموں کا عاشق تھا۔ اور اس عشق کے سبب اسے فلم اسٹوڈیو' شوٹنگ اور فلم اسٹاروں کی دید سے بھی عشق تھا۔ یہ علم ہونے کے بعد کہ میں دوپہر کو ایورنیو اسٹوڈیو جا رہا ہوں' جہاں نوشین شوٹنگ کر رہی ہے' وہ کبوتر کی طرح پھڑپھڑانے لگا "ام آپ کے ساتھ جائے گا جناب!" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بھئی! میں وہاں کام سے جا رہا ہوں۔ نوشین کو لے کر پروفیسر صاحب سے ملنے جانا ہے۔"

"خو تو آپ چلے جائیے گا پروفیسر سے ملنے۔ ام وہاں اسٹوڈیو میں گھومے پھرے گا۔ جب آپ نوشین صاحبہ کو واپس اسٹوڈیو چھوڑنے آئے گا تو ام آپ کے ساتھ واپس ہوٹل آ جائے گا۔"

میں نے کوشش کی کہ زریں گل کو ساتھ نہ لے جانا پڑے مگر وہ اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔

صفدر کو ضروری ہدایات دے کر میں اور زریں گل بارہ بجے ہوٹل سے روانہ ہوئے اور بذریعہ ٹیکسی اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ ہم ذرا جلدی ہی پہنچ گئے تھے یعنی ابھی صرف ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی زریں کے چہرے پر خوشی سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ بالکل یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی خشکی سے پھسل کر پانی میں آ گئی ہے۔ راستے میں ایک دو جگہ جانے پہچانے فلمی چہرے نظر آئے' زریں گل نے باقاعدہ آگے بڑھ کر اور ادب سے جھک کر مصافحہ کیا اور ان کا حال احوال پوچھا (حالانکہ وہ بے چارے ثانوی قسم کے اداکار تھے) ایک راہداری میں زریں کی نظر معروف اداکارہ نغمہ پر پڑ گئی۔ وہ ایک بار پھر خوشی سے کبوتر کی طرح پھڑکنے لگا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر خوش شکل اداکارہ سے مصافحہ کرے بلکہ بڑے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اسے گلے بھی لگا لے۔ معروف اداکارہ کے اردگرد خطرناک صورت ملازم موجود تھے۔ اگر زریں گل اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے پر اتر آتا تو یقیناً اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچانا پڑتا' نگاہوں نگاہوں میں نغمہ صاحبہ کی قدم بوسی کر کے زریں گل میرے ساتھ آگے بڑھا اور فلور نمبر 2 میں داخل ہو گیا۔ یہاں خواب کا سیٹ لگا ہوا تھا اور کورس فلم بند ہو رہا تھا۔ خواب کے اس سیٹ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری فلموں کے ہیروز اور ہیروئنیں پچھلے بیس تیس سال سے بڑے اتفاق کے ساتھ ایک ہی قسم کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ طویل سیڑھیاں تھیں جو اوپر جا کر کہیں بادلوں میں گم ہوتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر روئی کے سفید سفید گالے پڑے تھے۔ سیٹ پر پہلی یا دوسری تاریخ کا بہت بڑا چاند بنایا گیا تھا۔ اس چاند کے اردگرد نیلے آسمان پر بے شمار تارے ٹمٹما رہے تھے۔ نیچے ایک فوارہ تھا جس میں سے رنگ دار پانی نکلتا تھا۔ فوارے کے اردگرد بہت سے پھول پودے تھے۔ بارش میں بھیگی ہوئی لڑکیوں کی ایک لمبی قطار ان پودوں کے درمیان جذبات انگیز انداز میں کولہے مٹکا رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو زریں گل یقیناً اس معیوب منظر اور رعایت نا اندیش لڑکیوں کو برا بھلا کہتا لیکن اس وقت تو وہ اتنا خوش تھا کہ اسے "نیک و بد" کی پہچان یاد نہیں تھی۔

نوشین سیٹ پر موجود تھی۔ اس نے ہمیں فلور میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا' وہ سیدھی ہماری طرف آئی اور خوش دلی سے ہمارا استقبال کرنے کے بعد ہمیں فلم کے ہدایت کار اور فوٹوگرافر وغیرہ کے پاس لے آئی۔ یہ لوگ روشنیوں سے ہٹ کر ایک جانب کرسیوں پر بیٹھے تھے اور گپ شپ کر رہے تھے۔ زریں گل ان لوگوں میں بیٹھ کر بہت فخر محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ لقے کبوتر کی طرح پھول گیا۔ جب میں نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ زریں صاحب اپنی سادگی سے قطع نظر ایک نہایت مالدار شخص ہیں اور فلم پروڈیوس کرنے کا سوچ رہے ہیں تو زریں کا سیروں خون بڑھ گیا اور گردن اصیل مرغ کی طرح اکڑ گئی۔۔۔ اور میں نے کوئی اتنا بڑا جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ زریں ایک مالدار شخص بن چکا تھا یہ اور بات ہے کہ ابھی اسے خبر نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ مالدار ہونے کے بعد وہ فلم بھی بنا سکتا تھا اور ایک فلم کیا درجنوں بنا سکتا تھا۔

کورس میں نوشین کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ تقریباً فارغ ہی تھی لیکن اس کا سیکریٹری گاڑی لے کر گھر گیا ہوا تھا کیونکہ وہ اگلی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا لباس گھر ہی بھول آئی تھی۔ اب سیکریٹری کے واپس آنے تک ہمیں وہیں بیٹھنا تھا۔ زریں گل تھوڑی دیر تو بار بار رہا پھر اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فلم کے ہدایت کار صاحب بھی خیر سے پشتو وال پٹھان نکل آئے تھے۔ وہ اس سے پہلے پشتو فلمیں بناتے رہے تھے' یہ ان کی دوسری اردو فلم تھی' ان کا نام بہار خان تھا۔ زریں گل ان سے پشتو آمیز اردو میں باتیں کر کے بہت خوش ہو رہا تھا۔ میرے مالدار ساتھی کا کردار نبھاتے ہوئے اس نے ہدایت کار کو باقاعدہ مشورے دینے شروع کر دیے۔ "بہار خان صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات ہے' ام فلم وغیرہ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا لیکن یہ بات بہت دفعہ امارے دل میں آتا ہے کہ ام کو اب عام ڈگر سے ہٹ کر فلم بنانا چاہیے۔ نیا نیا کہانی ہو۔ نیا نیا سوچ ہو۔ اب ضروری نہیں کہ ہر فلم کے آخر میں شادی ہو۔ شادی فلم کے شروع میں بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر فلم کے اینڈ میں سائڈ ہیرو مر جائے۔"

"بے شک" میں نے تائید کی "سائڈ ہیرو فلم کے شروع میں بھی مر سکتا ہے بلکہ شروع ہونے سے پہلے بھی مر سکتا ہے۔"

ہدایت کار خان صاحب اور ہیروئن نوشین دونوں مسکرانے لگے مگر زریں اپنی دھن میں مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ہدایت کار کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ لوگ پرانے کرداروں پر تو فلمیں بناتا ہے' آپ کو نئے کرداروں پر بھی بنانا چاہیے۔"

"نئے کرداروں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" ہدایت کار بہار خان نے پوچھا۔

زریں نے ڈبیا سے نسوار کا چونڈا نکال کر ہونٹ میں رکھا۔ پھر ایک شریر نگاہ مجھ پر ڈال کر بولا "پاکستان میں بھی بڑے بڑے کردار ہیں۔ اس وقت امارے ذہن میں نہیں آ رہا۔ آپ بشیر ساربان پر فلم بنائیں' مجیبی کنور پر بنائیں' سیٹھ عابد پر بنائیں' بھولو پہلوان پر بنائیں۔۔۔ اور پھر شنکر ڈنگرا اور شاہ جہاں پر بنائیں۔ شاہ جہاں کو جانتے ہیں نا آپ۔ استاد جہانی۔"

"ہاں کافی بدنام نام ہے۔۔۔" ہدایت کار خان نے کہا۔

"بدنام بھی اور نیک نام بھی۔" زریں گل نے کہا "آپ نے وہ واقعہ نہیں سنا جس کی وجہ سے شاہ جہاں کو جرم کی دنیا میں کودنا پڑا۔"

ہدایت کار خان مسکرایا "بھئی اس قسم کا ایک واقعہ تو ہر چھوٹے بڑے مجرم کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔"

"خو چہ۔۔۔ لیکن یہ واقعہ تھوڑا سا مختلف ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے بھی کچھ سنا تو ہوا ہے۔" نوشین نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "شاید امارات سے شکار کے لیے آنے والے کسی شہزادے کا چکر تھا۔ اس نے شاہ جہاں کی بہن سے بدتمیزی کی تھی۔ کچھ ایسی ہی بات تھی نا؟"

جواب میں زریں گل نے پورا واقعہ سنا دیا۔ بلکہ اس کے بعد اور بھی کئی واقعات سنا دیے۔ گاہے گاہے وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔ آخر میں وہ بولا "ام تو آپ کو مشورہ دے گا کہ ایسے کرداروں پر زبردست قسم کا فلمیں ضرور بننا چاہیے۔"

ہدایت کار خان نے کہا "بھئی! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ مزدوری پر کام کرتے ہیں۔ فلمیں تو آپ جیسے سیٹھ لوگ بناتے ہیں۔ آپ جب حکم دیں گے ہم فلم شروع کر دیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" زریں گل نے کہا "اگر ام استاد جہانی پر فلم بنائیں گے تو اور بھی آسانی رہے گا۔"

"وہ کیوں؟" نوشین نے پوچھا۔

"آپ نے استاد جہانی کو دیکھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ شاید ایک دو سال پہلے اخبار میں تصویر دیکھی تھی۔"

"تصویر کی بات چھوڑیں جی۔ ہم نے بقلم خود استاد جہانی کو دیکھا ہوا ہے۔ اسی لیے ہم فرما رہا ہے کہ استاد جہانی پر فلم بنانے میں ہم کو ایک دم آسانی رہے گا۔ ہم کو فلم کا ہیرو بنا بنایا مل جائے گا۔ یہ احمد صاحب کو دیکھو۔ بالکل یہی قد کاٹھ یہی عمر۔ یہ بہت ملتا جلتا ہے اس کردار سے۔"

ہدایت کار خان زیرِ لب مسکرانے لگا، میں نے بھی مسکرانے میں اس کا ساتھ دیا۔ ہدایت کار خان کو اب شک ہونا شروع ہو گیا تھا کہ زریں گل واقعی ایک کھاتی پیتی اسامی ہے یا میں نے یونہی "بڑ" ماری ہے۔ خوش قسمتی سے اسی وقت نوشین کا سیکریٹری مع ڈرائیور اندر آتا دکھائی دیا اور ہم سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔

زریں گل ادھر ہی سیٹ پر موجود رہا، میں اور نوشین ڈرائیور کے ساتھ پروفیسر اللہ دتا کی طرف روانہ ہو گئے۔ اللہ دتا کا گھر پرانی انارکلی کی بھول بھلیوں سے دور گلبرگ کے علاقے میں واقع تھا۔ اللہ دتا کی کوٹھی میری توقعات سے زیادہ شان دار تھی۔ گیٹ پر ایک گارڈ بھی موجود تھا۔ اللہ دتا کی شان دار ٹویوٹا کرولا گیراج میں موجود تھی۔ بے شک میں پروفیسر اللہ دتا کو ایک عطائی کا درجہ دے رہا تھا لیکن کسی بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کا گھر بھی ایسا شان دار کیا ہو گا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وال ٹو وال قالین نظر آئے۔ کوٹھی ڈیکوریشن پیس سے سجی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا فارن کے ٹور وغیرہ بھی لگا چکا ہے۔ بہرحال اس کی کوٹھی کی سج دھج دیکھ کر کچھ زیادہ حیرانی کی ضرورت نہیں تھی۔ پروفیسر کے کلینک اور فارمیسی کی اتنی آمدن ضرور تھی کہ وہ ایسی کوٹھی کا مالک بن سکتا تھا۔

ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب ظہر کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ پانچ دس منٹ بعد دروازے پر پروفیسر کی صورت نظر آئی۔ صفاچٹ داڑھی مونچھ اور پتلون قمیص کے ساتھ وہ ایک عام سا شخص نظر آ رہا تھا، تاہم اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی اور بولنے کا انداز دل پذیر تھا۔

ہم کچھ دیر رسمی گفتگو کرتے رہے۔ پھر پروفیسر نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا "پولیس کو تو شریفوں کی پگڑیاں اچھالنے کا شوق ہے۔ اب دیکھو دو دن سے کیسی کیسی لایعنی باتیں کی جا رہی ہیں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو میں تو ہتکِ عزت کا دعویٰ کروں گا۔"

میں نے ذرا دبے لہجے میں کہا "پروفیسر صاحب! ایک بات ہمیں ماننا پڑے گی۔ اگر ارشاد صاحب یوں اچانک روپوش نہ ہوتے تو معاملہ اتنا نہ الجھتا۔ جب ان کا دامن صاف تھا تو انہیں حالات کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔"

پروفیسر نے ناراض لہجے میں کہا "بھئی ابھی تو ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خود کہیں گیا ہے یا اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔ میں تو خود حیران ہوں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا ہے۔"

نوشین نے کہا "پروفیسر صاحب! وہ اسکوٹر کا کیا چکر ہے؟"

"کون سا اسکوٹر؟"

"اخبار میں لکھا تھا کہ رجب کی کوٹھی پر پولیس ایکشن کے وقت ایک اسکوٹر بھی ملا ہے اور پولیس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی رجسٹریشن ارشاد صاحب کے نام پر تھی۔"

"اسکوٹر۔۔۔ اسکوٹر۔ میرے تو کان پک گئے ہیں یہ بات سن سن کر۔ بھئی وہ اسکوٹر بے شک ارشاد احمد کے نام پر تھا لیکن اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ارشاد بردہ فروشی کے کام میں ملوث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی کارندہ اپنے طور پر وہاں گیا ہو یا اسکوٹر چوری ہوا ہو۔"

اسی دوران میں ملازم نے اطلاع دی کہ مولوی رحمان صاحب آئے ہیں۔ پروفیسر کے چہرے پر چند لمحے تک تذبذب کے آثار نظر آئے، پھر اس نے کہا "بھیج دو۔" چند لمحے بعد درمیانی عمر کے ایک مولانا صاحب ایک جوان سال عورت کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ عورت کا بیشتر چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ دونوں نے بے حد عقیدت کے ساتھ پروفیسر کو سلام کیا۔ پروفیسر نے کہا "اب کیا حال ہے مولانا؟"

"بہت بہتر ہیں جی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔"

پروفیسر اللہ دتا نے ہمارے سامنے ہی عورت کی چادر میں ہاتھ ڈال دیا، بڑی بے تکلفی سے اس کے پیٹ اور کمر وغیرہ کو ٹٹولتا رہا۔ پھر بولا "بہن جی! اب آپ بہت بہتر ہیں۔ دوائی جاری رکھیں۔ ایک ہفتے بعد کلینک آ کر دکھا لیں۔"

مولانا صاحب اور ان کی واقف نے ایک بار پھر پروفیسر سے بھرپور عقیدت کا اظہار کیا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اب تک بہت سے لوگوں سے سنا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اب میں اپنی آنکھوں سے بھی اس قسم کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ یوں بھی پروفیسر صوم و صلوٰۃ کا پابند اور اصول پسند شخص نظر آتا تھا، لیکن دوسری طرف خفی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بھائی ارشاد احمد کی غیر مشروط حمایت کر رہا تھا، حالانکہ ارشاد احمد کے "شان دار" کردار کی جھلک میں اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر چکا تھا۔ راجی نامی وہ لڑکی مجھے اچھی طرح یاد تھی جو

چند روز پیشتر مجھے ارشاد احمد سمجھ کر میرے پاس اپنا کوئی مسئلہ لائی تھی اور اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی عزت آبرو سب کچھ ارشاد کی بھینٹ چڑھانے پر تلی ہوئی تھی۔ نجانے ایسی کتنی عورتیں اور لڑکیاں اپنے مسائل کے حل کے لیے یہی راستہ اختیار کر چکی تھیں اور ارشاد احمد کے شیطانی ہاتھوں میں کھیل چکی تھیں۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ملازم ایک بار پھر اندر آیا اور پروفیسر کے کان میں کوئی سرگوشی کر کے اسے باہر لے گیا۔ ہم نے پانچ دس منٹ پروفیسر کا انتظار کیا، لیکن وہ نہیں آیا۔ نہ ہی کوئی ملازم آیا اور اس نے بتایا کہ پروفیسر صاحب کتنی دیر میں تشریف لائیں گے۔ نوشین کے پاس وقت محدود تھا، وہ بے قراری سے پہلو بدل رہی تھی۔ اسے واپس جا کر شوٹنگ میں حصہ لینا تھا۔ اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور پروفیسر کا فربہ اندام ملازم اندر آیا۔ اس نے مؤدب انداز میں کہا "میڈم! آپ ایک منٹ کے لیے تکلیف کریں۔ پروفیسر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"

نوشین نے الجھن آمیز انداز میں میری طرف دیکھا، پھر مجھ سے ایکسکیوز کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوشین کے جانے کے بعد دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔ پانچ دس منٹ بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ابھی میں اپنا لائحہ عمل سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ پھر کھلا۔ اس مرتبہ پروفیسر کی صورت دکھائی دی "معاف کرنا۔ مجھے تھوڑی دیر ہو گئی۔" اس نے کہا۔

"مس نوشین کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی آ رہی ہے۔" پروفیسر بولا۔

پروفیسر کے پیچھے ہی پیچھے دو مزید افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی چادر کے اندر سے طاقت ور اے کے 47 رائفل نکالی اور تین چار فٹ کی دوری سے مجھے نشانے پر لے لیا "خبردار!" وہ درندگی سے بھرپور آواز میں غرایا "اڑا ڈالوں گا۔"

میں نے حیرانی سے دیکھا۔ یہ وہی ریچھ نما شخص تھا، جو اس سارے فساد کی جڑ تھا اور جو تین روز پہلے شدید زخمی حالت میں رجب کی رہائش گاہ سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز، اس کے تیور، اس کا لب و لہجہ، سب کچھ اس بات کا گواہ تھا کہ وہ ایک تجربہ کار "شوٹر" ہے اور گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا۔ اس نے یہ ریوالور نیچے جھکا رکھا تھا، تاہم اس کے تیوروں سے بھی ظاہر تھا کہ وہ موقع پڑنے پر ایک لمحے میں گولی چلا سکتا ہے۔

ریچھ نما شخص نے خوف ناک لہجے میں کہا "اپنا ریوالور نکال کر فرش پر رکھ دو۔ بالکل آہستہ آہستہ۔۔۔ تمہاری ایک تیز جنبش تمہیں موت کا مزہ چکھا سکتی ہے۔"

میں نے رائفل بردار کی ہدایت پر عمل کرنے میں بہتری سمجھی۔ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے چھوٹے سائز کا انگلش ریوالور فرش پر رکھ دیا۔

"اسے ٹھوکر مار کر میری طرف بڑھا دو۔" ریچھ نما شخص نے دوسرا حکم جاری کیا۔ میں نے اس پر بھی عمل کیا۔

"تمہاری پنڈلی کے ساتھ رام پوری خنجر بھی موجود ہے۔ وہ بھی اتار کر فرش پر رکھو۔"

میرا یہ قیاس بالکل درست ثابت ہو رہا تھا کہ ریچھ نما شخص مجھے نہ صرف جانتا ہے بلکہ میرے بہت قریب بھی رہ چکا ہے۔ میں نے اس کی دوسری ہدایت پر بھی عمل کیا۔ ریوالور کی طرح خنجر بھی ریچھ نما کے قبضے میں پہنچ گیا۔

پروفیسر اللہ دتا جو مجھ سے دور ہٹ کر کمرے کے گوشے میں چلا گیا تھا، احتیاط کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے غیر مسلح ہونے کے بعد اس کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جانب سے نوشین بھی نمودار ہوئی اور دروازے سے باہر کھڑی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے انتہائی حسین چہرے پر سراسیمگی کے علاوہ حیرانی بھی نظر آ رہی تھی "یہ سب کیا ہے پروفیسر؟ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہے میڈم۔۔۔ سو فی صد یہی ہے۔" پروفیسر کے بجائے ریچھ نما شخص نے جواب دیا "اس نے بہروپ بھر رکھا ہے۔ یہ شاہ جہاں عرف جہانی استاد ہے۔ نہایت خطرناک قاتل اور بدنام ترین مجرم۔۔۔ آپ کی خوش بختی ہے کہ اس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، ورنہ یہ تو وہ آگ ہے جس کے پاس سے گزرنے والا بھی محفوظ نہیں رہتا ہے۔"

"لل۔۔۔ لیکن ان کی صورت۔۔۔" نوشین نے ہکلا کر کہا۔

"پلاسٹک سرجری کے ذریعے اس نے اپنے چہرے میں کچھ تبدیلیاں کر رکھی ہیں۔ تاہم اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو اس کے چہرے میں آپ کو استاد جہانی کی شباہت نظر آ جائے گی۔"

نوشین کے ساتھ ساتھ اب پروفیسر کی سراسیمہ نظریں بھی میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ نوشین نے لرزاں آواز میں پوچھا "یہ میں کیا سن رہی ہوں آپ کے بارے میں۔۔۔ مم میرا مطلب ہے کہ آپ۔۔۔ کیا واقعی آپ شاہ جہاں ہیں۔"

ریچھ نما شخص گرجا "یہ بدبخت کیا بتائے گا آپ کو۔۔۔ یہ

کچھ نہیں بتائے گا۔ ہم اس کو بتانے پر مجبور کریں گے۔"

میری خاموشی نے نوشین کو سمجھا دیا تھا کہ رائفل بردار کا انکشاف حقیقت پر مبنی ہے۔ اس احساس کے بعد نوشین کے چہرے پر بے شاد حیرت سمٹ آئی تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی نادر عجوبہ دیکھ رہی ہو۔ ابھی قریباً ایک گھنٹا پہلے وہ اسٹوڈیو میں اپنے ہدایت کار اور فوٹو گرافر وغیرہ کے ساتھ بیٹھی شاہ جہاں عرف استاد جہانی کی باتیں سن رہی تھی۔ زندگی کی ان لوگوں کو مشورہ دے رہا تھا کہ شاہ جہاں جیسے کرداروں پر "ہالی ووڈ" کے معیار کی فلمیں بنائی جانی چاہئیں۔ اب وہی استاد جہانی اس کے روبرو کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھ سے بے تحاشا مرعوب نظر آ رہی ہے۔

دیکھ نما شخص نے مجھے کمرے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ وہ بڑی احتیاط سے مجھے کور کیے ہوئے تھا اور معمولی سی غلطی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے تسلی بخش تھی۔ جب کوئی شخص بے حد محتاط ہوتا ہے تو وہ نینس بھی ہوتا ہے۔ اس ٹینشن میں وہ کسی بھی وقت۔۔۔ جلد یا بدیر کوئی غلطی کر سکتا ہے۔ دیچھ نما شخص نے بھی یہ غلطی کی۔ اس کی ایک ٹانگ رجب کی رہائش گاہ پر ہی شدید زخمی ہو چکی تھی۔ اب بھی وہ بری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا میرے عقب میں آیا۔ جب ہم دروازے میں سے گزرے تو ایک لمحے کے لیے دیچھ نما کا ساتھی میرے اور رائفل کے درمیان آ گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گھوم کر اسے دھکا دیا۔ وہ دیچھ نما شخص پر گرا۔ اس بالکل غیر متوقع افتاد کے سبب دیچھ نما کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔ "اے کے ۵۶" رائفل "برسٹ" پر سیٹ کی گئی تھی۔ دس گولیوں کا طویل برسٹ اس میں سے نکلا اور ریوالور بردار کی پشت پھاڑتا ہوا کمرے کی مختلف دیواروں میں لگا۔ اس امر میں ایک فی صد شبہ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ دیچھ نما شخص کا ساتھی فرش پر گرنے سے پیشتر ہی جہنم داصل ہو چکا ہے۔ جسم میں دس روشن دان کھلنے کے بعد بقید حیات رہنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دیچھ نما شخص پر جست لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کی رائفل پر آیا۔ میں نے رائفل کی نال اوپر اٹھا دی۔ اب اگر وہ ٹریگر دباتا بھی تو پھلا ہوا میسا کسی کو نقصان نہ پہنچا سکتا۔ دیچھ نما شخص کسی دیچھ ہی کی طرح مضبوط تھا، پھر بھی میں اس پر بہ آسانی قابو پا سکتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ زخمی تھا۔ وہ اپنی جدوجہد میں صرف ایک ٹانگ استعمال کر سکتا تھا، لیکن جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی اڑ گئیں۔ میری گردن پر کسی وزنی شے سے زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے حواس معطل سے ہو گئے۔ یہ ایک لمحہ میرے گھاگ مدِمقابل کے لیے بہت تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ میری گرفت سے نکلا۔ اس کوشش میں "اے کے ۵۶" اس کے ہاتھ سے نکل کر راہداری کے چکنے فرش پر گری اور پھسل کر ایک صوفے کے نیچے چلی گئی۔ اسی دوران میں میری نگاہ اپنے رام پوری خنجر پر پڑ گئی۔ خنجر ریچھ نما کے لباس میں کیس تھا۔ جب وہ میرا دھکا کھا کر گرا تو خنجر کسی جیب میں سے نکل آیا۔ میرا ہاتھ خنجر تک پہنچا تو ریچھ نما شخص حواس باختہ ہو کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے لپکنا چاہتا تھا مگر مجھے کسی نے عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ یہ پروفیسر کی کوٹھی کا گارڈ تھا، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا میری گردن پر پختہ اینٹ کی زوردار ضرب بھی اسی گارڈ نے لگائی تھی۔ میں نے گھوم کر گارڈ کی تومند گردن اپنے بازو میں جکڑی اور مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر اسے دم بخت کر دیا۔ ایک ہی سیکنڈ میں وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گرا۔ ریچھ نما شخص اس وقت تک لنگڑاتا ہوا سیڑھیاں عبور کر چکا تھا۔ میں تین تین زینے پھلانگتا ہوا اس کے عقب میں گیا۔ میں چھت پر پہنچا تو دیچھ نما شخص ایک عقبی کوٹھی کی چھت پر کودتا نظر آیا۔ میں اس چھت پر پہنچا تو وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دیچھ نما شخص کے تعاقب میں ٹاک ٹوئیاں مارنے سے اور محلے داروں میں خوف و ہراس پھیلانے سے بہتر ہے کہ جو ل رہا ہے وہ حاصل کر لیا جائے یعنی پروفیسر اللہ وتا۔ وہ ابھی تو کوٹھی میں موجود تھا۔ آئندہ چند منٹوں میں کیا ہو جائے گا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں واپس پروفیسر اللہ وتا کی چھت کی طرف دوڑا۔ اس وقت تک اللہ دتا کا ایک ہوشیار ملازم چھت کا دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا جو نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔

میری سمجھ میں سب سے پہلی بات یہی آئی کہ پروفیسر کے فون کا تار کاٹ دینا چاہیے۔ یہ تار چھت کی منڈیر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چھت پر ایک طرف گملوں کے پاس باڑ کاٹنے والا ایک زنگ آلود کترا (بڑی قینچی) پڑا تھا۔ میں نے اس کی مدد سے تار کاٹ دیا۔ پھر منڈیر کے جنگلے سے لٹک کر نیچے کھڑکیوں کے شیڈ پر کودا اور وہاں سے کود کر کوٹھی کی بغلی راہداری میں آ گیا۔ اسی وقت میری نگاہ پروفیسر کے ایک سہمے سہمے ملازم پر پڑی۔ وہ راہداری کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی دروازہ اب کوٹھی کے اندر داخل ہونے کا واحد راستہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ملازم دروازے کو مکمل بند کر دیتا میں نے زوردار دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا اور ملازم الٹ کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر

مخصوص انداز کا مکا (راؤنڈ پنچ) رسید کیا۔ مہارت سے رسید کیا گیا ایسا صرف ایک ہی مکا اچھے بھلے مدِمقابل کو بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میرا یہ مدِمقابل بھی آدھ پون گھنٹے کے لیے اپنے مسائل اور گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ پروفیسر اللہ وتا پر پڑی۔ اس نے فون کا ریسیور کان سے لگا رکھا تھا اور بڑے اضطراب میں "ہیلو۔۔۔ ہیلو" پکارتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے خنجر بدست اپنے سامنے دیکھ کر پروفیسر نے ریسیور ہاتھ سے چھوڑا اور پورچ کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہ تو اتنا پھرتیلا تھا اور نہ اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت تھی۔ میں نے چند گز آگے راہداری میں اسے جا لیا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ شاید اس طرح وہ اڑوس پڑوس والوں کو اپنے مصائب سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوتی، میں نے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا اور میرے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی نے اس کے ہونٹوں کو بڑی مضبوطی سے ڈھانپ لیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ کوٹھی میں اس وقت کوئی اور ملازم یا کارندہ موجود نہیں تھا ورنہ اب تک اس نے ضرور شور مچا دیا ہوتا۔ جس رائفل سے برسٹ مارا گیا اس پر بھی زبردست قسم کا سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ توقع یہی تھی کہ پڑوس کی کوٹھیوں والے اس ہنگامے سے بے خبر ہوں گے جو پروفیسر کی کوٹھی میں برپا ہوا تھا۔

اچانک میرا دھیان فلم اسٹار نوشین کی طرف چلا گیا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ تو کیا وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ کوٹھی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر پورچ کی طرف دیکھا۔ نوشین کی نیلگوں پردوں والی شان دار مرسیڈیز پورچ میں ہی موجود تھی۔ فاصلہ زیادہ تھا تاہم غور سے دیکھنے پر مجھے ڈرائیور بھی نظر آ گیا۔ وہ شیشے چڑھائے آرام سے سو رہا تھا اور اس ہلچل سے قطعی بے خبر رہا تھا جو کوٹھی کے اندرونی حصے میں برپا ہوئی تھی۔۔۔ تو پھر نوشین کہاں تھی؟ صرف دو تین سیکنڈ بعد مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ نوشین مجھے کمرے کے دروازے پر نظر آئی۔ اس کا سفید چہرہ سفید تر ہو رہا تھا اور میں اسے دور سے دیکھ کر ہی جان سکتا تھا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔ تاہم وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

"پلیز مسٹر جہانی۔" وہ کپکپاتی آواز میں بولی "آپ۔۔۔ پروفیسر صاحب کو چھوڑ دیں۔"

"چھوڑ دوں گا۔ لیکن پہلے ان کا انٹرویو کرنا ہے۔ ان سوالوں کے جواب پوچھنے ہیں جو میرے ذہن میں ہیں اور ان سوالوں کے جواب بھی جو آپ کے ذہن میں ہیں۔"

"م۔۔۔ میرے ذہن میں کوئی سوال نہیں۔ بس۔۔۔ آپ انہیں چھوڑ دیں۔"

"اگر نہ چھوڑوں تو؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

نوشین نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے پرس میں سے چھوٹے سائز کا لیڈیز پسٹل نکال لیا "میں کہتی ہوں آپ چھوڑ دیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟"

"میں گولی چلا دوں گی۔"

"آپ کبھی بھی نہیں چلا سکتیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

میرے لب و لہجے نے نوشین کو مزید کنفیوز کر دیا۔ اس نے پرس پھینک کر دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھام لیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ دس ہاتھوں سے بھی پسٹل تھام لے تو گولی نہیں چلا سکتی۔ یہ فلم کی شوٹنگ نہیں تھی، حقیقی زندگی کی ایک حقیقی سچویشن تھی۔ یہاں "وقت" ہدایت کار تھا اور ری ٹیک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میرا خنجر پروفیسر اللہ دتا کی شہ رگ کاٹ ڈالتا تو اس منظر میں رد و بدل نہیں ہو سکتا تھا، اگر نوشین کی انگلی ٹریگر پر دب جاتی اور گولی میرے سینے سے پار ہو جاتی تو اس منظر کی ایڈیٹنگ بھی ناممکن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نوشین بے حد محتاط نظر آ رہی تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کانپ رہا تھا اور اس کی زبان بار بار خشک ہونٹوں پر حرکت کر رہی تھی۔

میں بڑے سکون سے پروفیسر کو دھکیل کر صوفے تک لے آیا۔ پروفیسر مجھے نہایت خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ پہلے اس نے پولیس کے دو تین اعلیٰ افسران کے نام لیے، پھر ایک وزیر کا ڈراوا دیا، پھر اس سے بھی آگے بڑھا اور چیف منسٹر تک آ گیا "تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں تمہارے اگلے پچھلوں کا خانہ خراب کرا دوں گا۔ تمہاری ساری بدمعاشی پیشاب کے راستے نہ نکلوا دی تو اللہ دتا نام نہیں۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔۔۔ تم ہیجڑوں کو ڈرا دھمکا کر بدمعاش بن گئے ہو گے، اب تمہارا واسطہ مرد سے پڑا ہے۔" اللہ دتا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

پھر وہ نوشین سے مخاطب ہو کر چیخا "تم دیکھتی کیا ہو۔ چلا دو اس پر گولی۔۔۔ میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ توڑ دو اس کا کھوپڑا۔"

میں نے کہا "نوشین صاحب! آپ نے میرا کھوپڑا نہ توڑا تو پروفیسر صاحب کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ٹریگر دبا ہی دیں۔"

"میں۔۔۔ میں سچ مچ دبا دوں گی۔ آپ۔۔۔ انہیں چھوڑ دیں۔"

"میں تو خود چاہتا ہوں کہ آپ دبا دیں۔ آپ کی فلم

ایڈمنڑی کو ایک اچھی اور مکمل اسٹوری مل جائے گی۔"

میں نے پروفیسر کو صوفے پر اوندھا گرا دیا اور ایک ٹائی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھنے شروع کر دیے۔ پروفیسر سینے کی پوری قوت سے چیخنے لگا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ یہ چیخ و پکار اس کے پڑوسیوں کو ہوشیار کر سکے گی۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ یہ کوٹھی کا اندرونی کمرا تھا۔ ویسے بھی یہ کوٹھیاں تین تین کنال میں تھیں۔ ایسی وسیع کوٹھیوں کے مکینوں کی چیخ و پکار پڑوسیوں تک پہنچنی ممکن نہیں ہوتی۔ ہاں ایک خطرہ تھا کہ کہیں گاڑی میں محوِ خواب ڈرائیور بیدار ہو کر اندر نہ آ جائے لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو ڈرائیور پر قابو پانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پروفیسر کے ہاتھ باندھنے کے بعد میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

نوشین کی بے بسی انتہا پر تھی۔ اپنی دھمکیوں کا کھوکھلا پن اب اس پر بھی آشکار ہو چکا تھا۔ اس نے تھک ہار کر پستول ایک طرف رکھ دیا اور التجائیہ لہجے میں پروفیسر کے لیے اپیل کرنے لگی۔

میں نے اسے کمرے سے باہر لے جا کر کہا "دیکھیں نوشین صاحبہ! مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ جو وعدہ میں نے آپ سے کیا ہے' وہ ہر صورت نبھاؤں گا۔ پروفیسر کے ساتھ میری طرف سے کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ میرا رویہ اس کے ساتھ ہمدردی کا ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک وہ مجرم ثابت نہیں ہو جاتا۔ اگر اس کے ہاتھ صاف ہیں تو اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں اس سے صرف چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کی اجازت دیں گی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے' اگر آپ مداخلت کریں گی تو پھر ضرور کوئی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

نوشین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ میں اور نوشین واپس کمرے میں آ گئے۔ میں نے نوشین سے کہا کہ وہ اپنے ڈرائیور کو سمجھا آئے کہ ابھی تقریباً ایک گھنٹا اسے یہاں مزید رکنا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ بیرونی گیٹ کو بھی اندر سے مقفل کر آئے۔

نوشین نے اطاعت مندی سے سر ہلایا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے ہلاک ہو جانے والے شخص کی لاش اٹھا کر ایک غسل خانے میں بند کر دی۔ اس لاش کو دیکھ کر نوشین کا "نروس بریک ڈاؤن" ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے بے ہوش گارڈ کو بھی موقع سے ہٹا لیا۔ چند لمحے بعد نوشین اپنے دونوں کام نمٹا کر واپس آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہے۔ پروفیسر کے ساتھ اس کی "بے پناہ عقیدت" اپنی جگہ تھی تاہم اصل صورت حال جاننے کی خواہش مند وہ بھی تھی۔

پروفیسر کا منہ میں نے کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا تھا' اس کے باوجود وہ حلق سے غوں غاں کی "شدید" آوازیں نکال رہا تھا۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے مسلسل اپنے وسیع تعلقات کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ خود پر قابو پائے اور احمقانہ حرکات نہ کرے' کیونکہ جب تک وہ ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کرے گا' اس کا چھٹکارا ممکن نہیں۔ غالباً میرے لب و لہجے نے پروفیسر پر اثر کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا' شدید قسم کا تذبذب اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ پھر ایکا ایکی اس کے چہرے نے رنگ بدلا' غیظ و غضب کی جگہ خوف اور سنگین قسم کی فکرمندی نے لے لی۔

میں نے یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے منہ میں سے کپڑا نکال لیا۔ اسے نجانے کیا ہوا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کا پورا وجود خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر وہ گھگیانے لگا "خدا کے لیے... خدا کے لیے رحم کرو اپنے آپ پر اور مجھ پر۔ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں... بہت بے رحم... اتنے بے رحم کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟" میں نے استفسار کیا۔

"کچھ مت پوچھو... کچھ بھی مت پوچھو۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ زندگی میں موت کا مزہ چکھ لو گے اور سو بار مر کر بھی موت نہیں آئے گی۔" وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کا یہ روپ میرے لیے بالکل نیا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ پروفیسر کی ایک بیٹی بھی تو تھی۔ اصولی طور پر اس لڑکی کو یہاں ہونا چاہیے تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ نہ کہیں ایسے آثار نظر آئے تھے جن سے پتا چلتا کہ اس گھر میں کوئی خاتون بھی رہتی ہے۔ میں نے اللہ دتا سے پوچھا "تمہاری بیٹی کہاں ہے؟"

پروفیسر اللہ دتا نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ بدستور خوف اور دہشت کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور عالمِ بے بسی میں پھڑپھڑا رہا تھا "تم لوگ میری بات آخر کیوں نہیں سنتے ہو؟ کیوں خود کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے ہو... میری بات دھیان سے سنو' جہانی استاد... تم کسی غلط فہمی میں نہ رہو۔ تم نے بڑے بڑے جگرے لوگ دیکھے ہوں گے... لیکن جن کی میں بات کر رہا ہوں' وہ انسان ہیں ہی نہیں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں تمہیں کچھ بتا سکوں۔ بس تم دونوں چلے جاؤ

یہاں سے۔ جو بندہ یہاں مرا ہے اس کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔ خدا کے واسطے۔" وہ ایک بار پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

وہ جس انداز میں آہ و بکا کر رہا تھا وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی تھا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی کچھ سفاک قسم کے لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ ان کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ کہیں وہ سفاک شخص پروفیسر کا بھائی ہی تو نہیں تھا؟ میں نے سوالیہ نظروں سے نوشین کی طرف دیکھا۔ وہ بولی "پروفیسر صاحب کی بیٹی شائستہ اسلام آباد میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں رہتی ہے۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

اسی دوران میں پروفیسر کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ یکایک اس کی سانس اکھڑ گئی اور جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ نوشین خوف زدہ آواز میں بولی "پروفیسر صاحب کو دل کی تکلیف بھی ہے۔"

پروفیسر کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آ رہے تھے اور وہ بار بار اپنے پہلو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نوشین روتے ہوئے بولی "کچھ کریں جہانی صاحب۔"

پروفیسر اپنی پتلون کی جیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے' مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جیب سے کچھ نکالنا چاہ رہا ہے' شاید کوئی گولی وغیرہ تھی۔

میں نے جلدی سے اس کی جیب ٹٹولی۔ سو سو کے چند نوٹ نکلے۔ ایک چھوٹی سی تسبیح نکلی اور زبان کے نیچے رکھنے والی دو گولیاں نکلیں۔ میں نے جلدی سے ایک گولی نکال کر اللہ دتا کی زبان کے نیچے رکھی۔ تاہم گولی رکھنے سے پہلے ہی وہ سنبھل چکا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں اور ہاتھوں کی بندش کچھ ڈھیلی کر دی۔ اس کی گردن سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ نڈھال سا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے پوچھ گچھ کی جا سکتی۔ اس کے ہونٹوں سے مسلسل کراہیں نکل رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس کی بیمار والدہ یاد آ گئی جس سے ارتاوے کے گھر بالائی منزل پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح بے تحاشا خوف زدہ تھی اور ہمیں دیکھ کر اس نے دیوانوں کی طرح چلانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ وہ شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا' الٹا اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا' غالباً اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ ہاں یا نہ میں جواب دے سکتا۔

پروفیسر کو کمرے میں مقفل کرنے کے بعد میں نے کوٹھی کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ پروفیسر کے بیڈ روم سے مجھے چابیوں کا ایک گچھا مل گیا۔ اس گچھے کی مدد سے میں اور نوشین جلدی جلدی مختلف کمروں کے دروازے کھولنے لگے۔ ایک اندرونی کمرے کے اندر سے کسی کے بولنے کی مدھم آوازیں آئیں۔ اب تک تو ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ ایک گارڈ اور ایک ملازم کے سوا کوٹھی میں کوئی بھی موجود نہیں لیکن اس آواز نے ہمارے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے کر بہ آہستگی دروازے پر دباؤ ڈالا' وہ مقفل نہیں تھا اور نہ ہی اندر سے بند کیا گیا تھا۔ دروازہ نرمی سے کھل گیا۔ اندر ایک بوڑھا مسہری پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ نیچے قالین پر جائے نماز بچھا ہوا تھا۔ قریب ہی تپائی پر دواؤں کی مختلف شیشیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ میں نے بوڑھے کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی ریوالور دوبارہ پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ بوڑھے کی سفید براق داڑھی اور بال بکھرے بکھرے تھے۔ وہ شکل سے ہی مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔ وہ آگے پیچھے جھول رہا تھا اور بار بار ایک ہی جملہ ادا کر رہا تھا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔ مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔"

بوڑھا وسطی پنجاب کا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور ہر جھری میں غم کی کہانی تھی۔ میں نے کہا "کیا بات ہے بابا جی؟"

وہ بولا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی نہیں آتا۔" اس کے لہجے میں دیوانگی کی جھلک تھی اور وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ نوشین اس بزرگ کو پہچانتی ہے۔ وہ مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی "یہ کچھ نہیں بتائے گا۔"

"آپ اسے جانتی ہیں؟"

"ہاں ایک دو بار میں نے اسے پروفیسر صاحب کے کلینک میں دیکھا ہے' بس ہر وقت یہی فقرہ دہراتا رہتا ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی "چالیس پینتالیس سال پہلے اس کا بچہ گم ہو گیا تھا' اسی کے غم میں حواس کھو بیٹھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کی جیب میں بچے کی تصویر بھی دیکھی تھی۔"

"لیکن یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ بات تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہوگی۔ شاید انہوں نے ترس کھا کر یہاں رکھ لیا ہے۔ لگتا ہے کہ علاج معالجہ بھی کر رہے ہیں۔"

بوڑھے نے لرزتے ہاتھوں سے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر ہمارے سامنے کر دی۔ کسی خدا ترس نے تصویر کو محفوظ رکھنے کے لیے

اسے لیمینیشن کرا دیا تھا۔ تصویر میں چار پانچ سال کا ایک پھول سا بچہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گیس سے بھرا ہوا غبارا تھا۔ اسے ایک جواں سال شخص نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ بڑی ادا سے جواں سال شخص کے رخسار کو چومنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرا غور کرنے سے صاف پتا چل گیا کہ جواں سال شخص یہی نیم پاگل بوڑھا ہے۔ بوڑھے کا دردناک جملہ ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجا اور دل دہل گیا۔ یوں لگا جیسے اس جملے میں ان سیکڑوں ہزاروں والدین کی آہ و بکا شامل ہو گئی ہے جو زندگی کے کسی موڑ پر اس بوڑھے جیسے المیے کا شکار ہوئے ہیں۔ کسی "خوشہ چیں ہاتھ" نے ان کے گلشنِ بہار سے کسی پھول کو نوچا ہے اور ہمیشہ کے لیے اوجھل کیا ہے۔ ماؤں کی برستی آنکھیں۔۔۔ اداس کھلونے۔۔۔ الماریوں میں لٹکے رہ جانے والے رنگ برنگے کپڑے، اَدھ پڑھی کتابیں، کسی معصوم کے انتظار میں دن رات کھلے رہنے والے دروازے۔۔۔ ایک ہی لمحے میں نجانے کیا کچھ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

میں نے تصویر بوڑھے کو واپس کی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ میں نے نوشین کے ساتھ مل کر مختلف کمروں کی الماریاں کھولیں، درازیں دیکھیں۔۔۔ کاغذات الٹ پلٹ کیے لیکن کوئی خاص چیز ہاتھ نہیں لگی۔ دواؤں کے نسخے تھے۔ حکمت اور ہومیو پیتھک وغیرہ کی کتابیں تھیں۔ مختلف کیمیائی مرکبات اور تیار شدہ ادویات بھی یہاں وہاں پائی گئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پروفیسر اللہ وتا کو اپنے پروفیشن سے واقعی گہری دلچسپی ہے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں پروفیسر کے لیے غیر محسوس طور پر ہمدردی کے جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔

چابیوں کے گچھے میں ایک بڑی اسپیشل چابی بھی موجود تھی۔ یہ کسی بیش قیمت تالے کی چابی تھی۔ اس کے چار پہلو تھے یعنی چابی کے چار کناروں پر دندانے موجود تھے۔ مجھے اس چابی کے تالے کی تلاش ہوئی۔ یہ تلاش بالآخر بالائی منزل کے ایک پُرسکون کمرے کے سامنے جا کر ختم ہوئی۔ راہداری میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کمرا پروفیسر خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ چار پہلو والی چابی کے ذریعے دروازے کا لاک کھولنے میں کافی دقت پیش آئی۔ چابی کو پہلے دو مرتبہ بائیں طرف گھمانا پڑا پھر ایک دفعہ دائیں جانب گھمانے کے بعد دروازہ کھل سکا۔ میں اور نوشین کمرے میں داخل ہوئے۔ سوئچ بورڈ تلاش کر کے میں نے لائٹ آن کی اور ششدر رہ گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے نوشین بھی دوچار ہوئی تھی۔ پورا کمرا تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تصویریں کمرے کی چاروں دیواروں پر لگی تھیں، اس کے علاوہ چھت پر بھی چسپاں کی گئی تھیں۔ یہ کیمرے سے کھینچی گئی رنگین تصویریں تھیں۔ ان میں سے کچھ پوسٹر سائز تھیں اور کچھ پوسٹر سے بھی بڑی تھیں۔ یہ کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویریں نہیں تھیں، نہ ہی قدرتی مناظر کی منظر کشی تھی۔ یہ بے حد عجیب تصویریں تھیں۔ قریباً ہر تصویر میں پروفیسر اللہ وتا نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور گرانڈیل شخص بھی تھا تاہم اس نے اپنا چہرہ اونی نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کی گرم ٹوپی تھی جس میں سے صرف آنکھیں ہی نظر آسکتی تھیں۔ تصویر میں آنکھوں پر بھی عینک نظر آرہی تھی۔

یہ بڑی لرزہ خیز تصویریں تھیں، اور ہر تصویر پروفیسر اللہ وتا کی بے بسی اور لاچاری کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کسی تصویر میں وہ نقاب پوش سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ کسی تصویر میں اس نے اپنا نیم گنجا سر نقاب پوش کے پاؤں میں رکھا ہوا تھا اور گڑگڑا رہا تھا۔ ایک جہازی سائز کی تصویر میں اللہ وتا کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان دکھائی دے رہے تھے، وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور دو پاؤں اسے ٹھوکریں رسید کرنے میں مصروف تھے۔ یقیناً یہ نقاب پوش کے پاؤں ہی تھے۔ پورے کمرے میں اسی طرز کی تصویریں تھیں۔ انہیں جدید کیمرے سے کھینچا گیا تھا اور بڑی مہارت سے انلارج کیا گیا تھا۔ تصویروں میں نقاب پوش کے جسم کا صرف ایک حصہ نظر آتا تھا اور وہ اس کے ہاتھ تھے۔ اس کے ہاتھوں کی رگیں تھوڑی سی ابھری ہوئی تھیں۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ محسوس ہوتی تھی۔ ہاتھوں کی رنگت سے وہ سفید فام نظر آتا تھا۔

ان تصویروں میں ایک تصویر بڑی ہی لرزہ خیز تھی۔ اس جہازی سائز کی تصویر کو چھت سے چسپاں کیا گیا تھا۔ اس میں پروفیسر اللہ وتا مادر زاد برہنہ نظر آرہا تھا، وہ کسی چوپائے کی طرح اپنی کہنیوں اور گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ اس تصویر میں دو سیاہ بوٹ بھی نظر آرہے تھے۔ یہ نقاب پوش ہی کے بوٹ تھے۔ پروفیسر نے اپنا اشک بار چہرہ ان بوٹوں پر جھکا رکھا تھا، وہ جانور کی طرح زبان نکال کر بوٹوں کو چاٹ رہا تھا۔ تصویر میں اس بدنصیب شخص کے تمام ظاہری و پوشیدہ اعضا صاف نظر آرہے تھے۔ تصویر کی کوالٹی ایسی تھی کہ جسم کا ہر مسام دکھائی دیتا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر نوشین کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور خوف سے اس کی خوب صورت آنکھیں پھیل گئیں۔

یہ کمرا یقیناً پروفیسر خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ٹیبل پر اس کی عینک رکھی تھی اور آج کا اخبار بھی رکھا تھا۔ یہ سوچ ہی دل ہلا دینے والی تھی کہ پروفیسر

اللہ وتا اس کمرے میں سوتا ہوگا۔ اس کمرے میں جو ایک اور چیز عجیب و غریب نظر آئی وہ ایک زنانہ لباس تھا۔ ایک کڑھائی دار قمیص تھی، ایک شلوار تھی، ایک دوپٹا تھا اور ایک مخصوص زنانہ لباس تھا۔ یہ سارے کپڑے بیڈ کے سامنے والی دیوار کے نچلے حصے میں بڑے اہتمام سے ٹنگے ہوئے تھے، جیسے انہیں کسی شوکیس میں ڈسپلے کیا گیا ہو۔ یہ تمام "سجاوٹ" اور آرائش ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ بہرحال میرا دل اس بات کی گواہی ضرور دے رہا تھا کہ ان تصویروں اور کپڑوں وغیرہ کا کوئی نہ کوئی تعلق پروفیسر کی بیٹی شائستہ سے ہے۔ عین ممکن تھا کہ پروفیسر کو ذہنی ٹارچر دینے کے لیے یہ اشیا جان بوجھ کر اس خواب گاہ میں سجائی گئی ہوں اور پروفیسر کو زبردستی یہاں سونے پر مجبور کیا جاتا ہو یا اس قسم کی کوئی اور بات ہو سکتی تھی۔

اسی اثنا میں نیچے والے کمرے سے پروفیسر کے واویلے کی دردناک صدا بلند ہونے لگی۔ یقیناً پروفیسر بڑی شدت سے چیخ رہا تھا، جبھی یہ مدھم آواز ہم تک پہنچ پا رہی تھی۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر مفہوم ہمارے علم میں تھا۔ پروفیسر اللہ وتا جن نامعلوم لوگوں سے دہشت زدہ تھا انہی سے ہمیں بھی دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آواز کسی آسیبی گونج کی طرح در و دیوار میں چکرا رہی تھی۔ وہ بظاہر ایک بلند حوصلہ اور مضبوط شخص تھا، اخلاق کے حوالے سے بھی لوگ اسے اچھا سمجھتے تھے اور عوام الناس کی ایک بڑی تعداد اس کی گرویدہ تھی لیکن ان لمحات میں یہ مضبوط اور جہاں دیدہ شخص ایک خوف زدہ بچے کی طرح ایکٹ کر رہا تھا، اور بلک بلک کر رو رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سا ایسا خوف تھا جس نے اسے نفسیاتی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے نوشین سے کہا "میرا خیال ہے آپ پروفیسر کے پاس جائیں۔ انہیں سنبھالنے کی کوشش کریں۔ میں باقی کی تلاش مکمل کر کے آتا ہوں۔"

"جلدی آئیے گا۔" نوشین نے کہا "مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"پروفیسر صاحب جس انداز میں آہ و بکا کر رہے ہیں، اس سے میرا دل دہلنے لگا ہے۔ وہ اتنے کم حوصلہ نہیں ہیں۔ اگر وہ اس قدر ڈرے ہوئے ہیں تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"وجہ ہی تو ڈھونڈنا چاہ رہے ہیں ہم۔" میں نے کہا۔

نوشین میری ہدایت کے مطابق نیچے پروفیسر کے پاس چلی گئی۔ پروفیسر کی آہ و بکا کچھ دیر تو جاری رہی، پھر مدھم پڑ گئی۔ غالباً نوشین اسے سمجھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا اور کسی حد تک میرا تجربہ بھی تھا کہ یہ فلمی حسینائیں اکثر ناقابلِ اعتبار ثابت ہوتی ہیں لیکن پتا نہیں کیوں نوشین پر اعتبار کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے فلمی مزاج کی لڑکی نہیں لگی تھی۔ عجیب سا دھیما پن اور سادگی تھی اس میں۔۔۔ اگر تو یہ ایکٹنگ تھی تو پھر بہت باکمال تھی۔

پروفیسر کی اس بالائی خواب گاہ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد میں ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرا پروفیسر اسٹڈی کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہیں مجھے پروفیسر اللہ وتا کی تعلیمی اسناد وغیرہ بھی ملیں۔ میری توقعات کے برخلاف اس اَن کوالیفائڈ معالج نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھا تھا۔ اسٹڈی میں کیمسٹری کے علاوہ طب و حکمت وغیرہ کے موضوع پر بھی بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ اچانک کچھ مدھم نسوانی چیخوں نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ چیخیں زیریں منزل سے بلند ہوئی تھیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، یہ نوشین کی چیخیں تھیں۔ میں نے ریوالور جیب سے نکالا اور دوڑتا ہوا سیڑھیوں پر آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میرے کانوں میں عجیب سی غراہٹیں گونجیں۔ یہ غراہٹ کسی جانور کی نہیں تھی لیکن انسان کی بھی نہیں تھی۔ ایسی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ غراہٹیں راہداری کی طرف سے ابھر رہی تھیں، میرے نیچے اترتے اترتے وہ آہستہ ہوئیں اور معدوم ہو گئیں۔ تاہم نوشین کی چیخیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ میں خواب گاہ کے دروازے کے سامنے پہنچا اور سناٹے میں رہ گیا۔ قالین پر نوشین کے ڈرائیور رمضان علی کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ نوشین اسے اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چلانے لگی "جمالی صاحب، یہ شدید زخمی ہے، یہ مر جائے گا۔ خدا کے لیے اسے اسپتال پہنچائیں۔ پلیز جلدی کریں۔" اس کی آواز وحشت سے پھٹی ہوئی تھی۔

میں نے جھک کر ڈرائیور کو دیکھا۔۔۔ خدا کی پناہ۔۔۔ اس کی گردن پر ایک گہرا گھاؤ تھا۔ ادھڑے ہوئے گوشت میں سے گردن کی ہڈی تک صاف نظر آرہی تھی۔ جیسے کسی درندے نے اس کا نرخرا ادھیڑ ڈالا ہو۔ نوشین اسے اسپتال پہنچانے کی بات کر رہی تھی، لیکن وہ مر چکا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں جو تھوڑی بہت جنبش تھی وہ جان کنی کی تھی۔ چند لمحے میں یہ جنبش بھی ختم ہو گئی۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے تاثرات منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ سفید وردی والا وہی صاف ستھرا شخص ہے جو تھوڑی دیر پہلے ائرکنڈیشنڈ گاڑی کی آرام دہ نشست پر سویا ہوا تھا۔

میں نے ڈرائیور کی لاش فرش پر ڈالی اور ریوالور سمیت

اردگرد کے کمروں میں تیزی سے گھوم گیا۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ بس خواب گاہ میں پروفیسر موجود تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا "وہ تمہیں مار ڈالے گا۔۔۔ اور مجھے بھی۔ چلے جاؤ یہاں سے خدا کے لیے دفعان ہو جاؤ۔"

دہشت کی ایسی کیفیت تھی اس کی آواز میں کہ روح تک لرز رہی تھی۔

نوشین اپنے ڈرائیور کو مسلسل جھنجوڑ رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ میں نے کہا "نوشین! کوئی فائدہ نہیں۔ یہ۔۔۔ مرچکا ہے۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں" وہ ہیجانی انداز میں چیخی "آپ جھوٹ بول رہے ہیں' یہ زندہ ہے۔۔۔ آپ اسے اٹھائیں۔ اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں۔"

"نہیں یہ مرچکا ہے۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ دیکھیں۔۔۔ یہ ہل رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا' یہ مرچکا ہے۔ اسے چھوڑ دیں۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔"

"نہیں یہ زندہ ہے۔ یہ مرا نہیں ہے۔"

وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی اور میرے سینے پر مکے چلانے لگی۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ میں نے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا۔ اس کا ہانڈی کی طرح ابلتا ہوا ہیجان کچھ سرد پڑا۔ میں نے پوچھا "کس نے حملہ کیا ہے اس پر؟"

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی "مجھے نہیں معلوم' میں پروفیسر سے باتیں کر رہی تھی۔ کمرے سے باہر آئی تو یہ تڑپ رہا تھا۔"

بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ پروفیسر کی آہ و بکا سن کر ڈرائیور گاڑی میں سے نکلا تھا اور تجسس کی انگلی تھام کر اندر آگیا تھا۔ یہاں نامعلوم حملہ آور نے اس پر جان لیوا حملہ کیا تھا اور شہ رگ ادھیڑ کر بھاگ گیا تھا۔ یقیناً وہ ابھی کوٹھی کے اندر ہی تھا۔ انہی دیواروں میں اور اسی چھت کے نیچے موجود تھا۔ اور یہ احساس بڑا لرزہ خیز تھا۔ نوشین شدید صدمے سے نڈھال ہو کر ایک گوشے میں بیٹھ گئی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید تھا۔

چیخ چیخ کر پروفیسر اللہ رکھا کی آواز بالکل بیٹھ گئی تھی۔ وہ آہ و بکا تو اب بھی کر رہا تھا لیکن یہ آواز سرگوشیوں کی طرح تھی اور مزید مدھم ہو رہی تھی۔ ہر بار جب وہ زور سے کوئی جملہ ادا کرتا تھا تو اس کی گردن کی رگیں پھول جاتی تھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں نے بڑے دھیان سے اردگرد کی آہٹوں پر کان لگائے تو چھت پر کسی متنفس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

ایک ہلکی سی چاپ تھی جو بالائی منزل کے شمالی گوشے کی طرف سے ابھر رہی تھی "خدا کے لیے جہانی صاحب! یہاں سے نکلیں۔" نوشین روتے ہوئے بولی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرایا اور ایک بار پھر غور سے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ آواز موجود تھی اور اب چھت کے وسطی حصے کی طرف آگئی تھی "پلیز جہانی صاحب! آپ مجھے باہر جانے دیں۔ میں صحن میں نکل کر شور مچاتی ہوں۔ لوگ آجائیں گے' پھر وہ جو بھی ہے پکڑا جائے گا۔"

میں نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے سختی سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ قدموں کی آواز اب چھت کے وسطی حصے میں چکرا رہی تھی۔

یہ کوئی بھاری بھرکم شخص تھا اور دونوں پاؤں گھسیٹ کر چلتا تھا۔ میں نے کہا "نوشین! آپ کا پسٹل کدھر ہے؟" پھر نوشین کے جواب دینے سے پہلے ہی میری نظر اس کے پسٹل پر پڑ گئی۔ وہ کمرے کے اندر پڑا تھا۔ میں نے پسٹل نوشین کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا کہ وہ چوکس ہو کر بیٹھے' میں اوپر جا رہا ہوں۔

اس نے میرا بازو تھام لیا "پلیز جہانی صاحب' ایسا مت کریں۔ یہاں دو جانیں پہلے جا چکی ہیں۔ خدا کے لیے نکل جائیں یہاں سے۔۔۔ تھانہ یہاں پاس ہی ہے' ہم دو منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"دیکھیں۔۔۔ آپ فی الحال مجھے ہدایت کار سمجھیں اور جو میں کہتا ہوں وہ کریں۔"

میرے لہجے کی سختی نے نوشین کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ صرف دو گھنٹے پہلے وہ بڑی تمکنت سے اسٹوڈیو میں موجود تھی اور بڑی آن بان کے ساتھ شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی' اس کی شامتِ اعمال اسے میرے ساتھ اس منحوس چار دیواری میں کھینچ لائی تھی اور یہاں اوپر تلے سنسنی خیز واقعات پیش آ رہے تھے۔ وہ کورس گانا فلم بند کرانے کے لیے جو لباس پہنے ہوئے تھی اس کی قیمت کم و بیش پچیس تیس ہزار روپے تھی۔ اب یہ لباس خون سے داغ دار ہو چکا تھا۔ نہایت قیمتی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں' میک اپ کا تیا پانچا ہو گیا تھا اور اس کے ایک رخسار پر میرے طمانچے کا نشان تھا۔

میں نے تیزی سے سمجھا بجھا کر اسے پروفیسر کے قریب رہنے پر رضامند کرلیا' پھر بھی احتیاط کے طور پر میں نے گراؤنڈ فلور سے باہر جانے کے راستے کو اندر سے مقفل کر دیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ

میرے سیڑھیاں چڑھتے ہی نوشین خوف زدہ ہو کر باہر صحن میں نکل جائے اور اپنے منصوبے کے مطابق شور مچا کر اڑوس پڑوس کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرے۔

بے آواز قدموں سے میں سیڑھیوں کی طرف گیا۔ راستے میں وہ کمرا بھی پڑتا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے مخبوط الحواس بڈھے کو بستر پر بیٹھ کر آگے پیچھے جھولتے دیکھا تھا۔ بوڑھا ابھی بستر پر موجود تھا' اور آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ اپنے کمرے سے باہر ہونے والے ہنگامے کی اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ میں بوڑھے کو نظر انداز کرتا ہوا دوسری منزل پر آگیا۔ طاقت ور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اپنی پشت راہداری کی دیوار کے ساتھ لگائی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ایک ناما نوس سی حیوانی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ یہ کسی جانور کی بو تو نہیں تھی۔ شاید کسی بدبودار انسان کا گزر ہوا تھا یہاں سے۔ سیڑھیوں سے دس بارہ قدم آگے مجھے قالین پر خون کے دو تین قطرے نظر آئے۔ یہ بالکل تازہ خون تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ نوشین کے بدنصیب ڈرائیور کا خون ہے۔ میں نے انگلی سے خون کو چھوا۔ یہی لمحے تھے جب مجھے ایک مدھم آواز سنائی دی' یہ چینی کا گلدان ٹوٹنے کی آواز تھی۔ آواز نیچے کی راہداری سے آئی تھی۔ فرش پر ہر طرف دبیز قالین موجود تھے' گلدان گر کر نہیں ٹوٹ سکتا تھا' یقیناً اسے دیوار پر پٹخا گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے ایک بار پھر زیریں منزل کی طرف کھینچا۔ میں واپس مڑا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر وہی خوفناک غراہٹ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی جو میں چند منٹ پہلے سن چکا تھا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ غراہٹ موجود تھی اور میرے بالکل قریب تھی۔ پھر میں خواب گاہ کے سامنے پہنچا اور میری آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر کسی بھیانک خواب کا شبہ ہوتا تھا۔ ایک ہیبت ناک حبشی جس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور جسم کسی پہاڑ کی طرح مضبوط تھا' خوب صورت نوشین سے چمٹا ہوا تھا۔ حبشی کے جسم پر ایک انڈر ویئر کے سوا اور کچھ نہیں تھا' اس کا بالوں سے بھرا ہوا جسم اس کی سیاہ رنگت کو سیاہ تر بنا رہا تھا۔ حبشی نے نوشین کا لباس تار تار کر دیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ نوشین کی گردن کے گرد بل کھا کر اس کے ہونٹوں پر اتنی مضبوطی سے جما ہوا تھا کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکتی تھی۔ کچھ بھی تھا' وہ ایک جواں سال صحت مند لڑکی تھی۔ حبشی کے خلاف نوشین کی مزاحمت نظر آنی چاہیے تھی۔ مگر یوں لگتا تھا کہ وہ ایک خوفناک آکٹوپس کے چنگل میں ہے اور موت کو سامنے دیکھ کر سکتے میں چلی گئی ہے۔ وہ چیخ ضرور رہی تھی لیکن یہ چیخیں اس کی مزاحمت کا حصہ نہیں تھیں۔ یہ چیخیں صرف اس اذیت کے سبب تھیں جو اس کے جسم کو پہنچ رہی تھی۔ خوفناک حبشی نوشین کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ وہ بدنصیب ڈرائیور کے جسم کی طرح اس کے جسم سے بوٹی تو علیحدہ نہیں کر رہا تھا لیکن جہاں کاٹتا تھا اتنی زور سے کاٹتا تھا کہ خون رس آتا تھا۔ خاص طور سے وہ اس کے "بالائی جسم" کو نشانہ بنا رہا تھا۔ تاہم اس کے انداز میں جنسیت کے بجائے خالص درندگی نظر آتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے نوشین کو زور سے دھکا دیا۔ اس کی یہ حرکت اتنی اچانک تھی اور اس حرکت کے پیچھے اتنی زیادہ طاقت تھی کہ میں بالکل اپنا دفاع نہ کر سکا۔ نوشین مجھ سے ٹکرائی۔ اس کے سر کا تصادم میری ٹھوڑی کے نچلے حصے سے ہوا تھا' پھر وہ لڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور چیخ کر بے سُدھ ہو گئی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں بھی پشت کے بل فرش پر گرا تھا اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بڑے گلدان کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ گلدان نوشین نے ٹانگ مار کر گرایا تھا تاکہ گلدان ٹوٹنے کی آواز مجھے اس کی طرف متوجہ کر سکے۔

دیو ہیکل حبشی ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں فرش سے اٹھنے کی کوشش میں تھا' ایک بار پھر زمین بوس ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں یک لخت کئی ٹن فولادی بوجھ کے نیچے آگیا ہوں۔ بدبو کا ایک جھونکا میرے دماغ میں گھسا اور چہرے پر ناگوار سانسوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ آدم خور جبڑا جس نے کچھ دیر پہلے بدنصیب ڈرائیور رمضان علی کا نرخرا ادھیڑا تھا' میرے بالکل قریب تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح ہاتھ چلائے اور مدمقابل کے گھونگریالے بال مٹھی میں جکڑنے میں کامیاب ہوا۔ پورا زور لگا کر میں نے حبشی کا چہرہ خود سے دور کیا اور پھر اپنے پاؤں کے زور سے اسے پیچھے اچھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ گرانڈیل حبشی کے ایک کان میں نیلے رنگ کا بڑا سا بالا نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکے کے ساتھ ایک فلم سی چل گئی۔ جن دنوں میں بمبئی میں تھا' میں نے ایک بہت بڑے مصری تاجر کے پاس ایک عجوبۂ روزگار غلام دیکھا تھا۔ اس دیو ہیکل حبشی غلام کے کان میں بھی ایسا ہی بالا تھا اور اس کے گلے میں ہر وقت لوہے کی زنجیر رہتی تھی۔ مصری تاجر نے انکشاف کیا تھا کہ اس شخص کا تعلق مشرقی افریقہ کے جنوب میں بسنے والے ایک نہایت خطرناک اور "آدم خور" قبیلے سے ہے جسے "مسا" کہا جاتا ہے۔ تاجر نے بتایا تھا کہ افریقہ کے جنگل جو وحشی قبائل بھی مسائیوں کی دہشت اور بربریت سے کانپتے

ہیں اور انہیں جنات کا نطفہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں مجھے ان مسائی حبشیوں کے بارے میں معلوم ہوئی تھیں۔ میرے سامنے جو حبشی کھڑا تھا وہ ہو بہو ایسا ہی حبشی جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ عام نیگروز کے برعکس اس کے ہونٹ کچھ پتلے تھے اور ناک مخروطی تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے خوفناک چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ یہ آنکھیں انسانی آنکھیں ہونے کے باوجود انسانی نہیں لگتی تھیں۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اپنی زندگی کے ایک کٹھن ترین مرحلے سے دوچار ہو گیا ہوں۔ میرے سامنے انسان نہیں تھا' افریقہ کے تاریک جنگلوں سے آیا ہوا ایک درندہ تھا' مگر مشکل یہ تھی کہ وہ فقط درندہ ہی نہیں تھا' اس میں انسان کی ذہانت اور عیاری بھی موجود تھی۔ اس نے اپنے دونوں قوی ہیکل بازو خوفناک انداز میں پھیلا رکھے تھے اور حملے کے لیے تیار تھا۔ میری نگاہ اس کے نہایت سفید دانتوں پر پڑی' ان دانتوں پر رمضان علی اور نوشین کے خون کی سرخی موجود تھی اور یہ سرخی اس کے ہونٹوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بالکل سفید آنکھوں میں جھانکنے سے جسم میں جھرجھری پیدا ہوتی تھی' یہ آنکھیں پیاس پیاس پکار رہی تھیں اور یہ گوشت اور خون کی پیاس تھی۔ مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا جب میں نے دیکھا کہ حبشی مجھ پر حملہ آور ہونے کے بجائے ایک بار پھر نیم عریاں نوشین پر جھپٹ پڑا ہے۔ اس مرتبہ نوشین کے لیے اس کا انداز زیادہ جارحانہ تھا۔ شاید وہ اپنے دانتوں سے اس کا گوشت نوچ لینا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے بے ہوش نوشین اس کے شکنجے میں تھی' یہ لمحوں کی مہلت تھی۔ میں جانتا تھا کہ کسی بھی وقت "حبشی درندے" کے دانت نوشین کی شہ رگ میں پیوست ہو سکتے ہیں۔ میں نے چھلانگ لگائی اور مسائی حبشی کی نہایت توانا گردن اپنے بازو میں جکڑ لی۔ یہ میرا سب سے خطرناک داؤ تھا اور مسائی اس داؤ کی زد میں تھا۔ میں نے اس کی گردن کو مخصوص جھٹکا دیا۔ میں نے کافی طاقت صرف کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے دم ہو کر میری بانہوں میں جھول جائے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ میری توقع سے بہت کم تھا۔ حبشی ذرا سا لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ نہ صرف سنبھل گیا بلکہ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے میری آنکھوں میں انگلیاں دے ماریں۔ یہ اندھا کر دینے والا بے رحم وار تھا۔ میری دونوں آنکھوں پر ضرب آئی لیکن ایک آنکھ سے تو باقاعدہ خون کا فوارہ نکل پڑا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ میری ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے' ذہن میں نیلی پیلی چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ میں نے داہنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر زخمی آنکھ سے دیکھنے کی اضطراری حرکت کی۔ خون کی سرخی کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ دل ایک دم ڈوب سا گیا۔ اسی

دوران میں ایک فولادی ہتھوڑا سا میرے سر سے ٹکرایا۔ یہ مسائی حبشی کا مکا تھا۔ میں تیورا کر فرش پر گرا۔ حبشی کی کئی زوردار ٹھوکریں میرے پیٹ کے بالائی حصے میں پسلیوں کے درمیان لگیں۔ محسوس ہوا کہ بس ابھی پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ یوں لگتا تھا کہ اس درندہ نما انسان کو انسانی جسم کے نازک حصوں پر ضربات لگانے میں خصوصی مہارت حاصل ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرا مقابل یہ مہلت دینے کو ہرگز تیار نہیں تھا' اس نے مجھے کھینچ کر دیوار سے دے مارا۔ یہ میری زندگی کے کٹھن ترین مواقع میں سے ایک موقع تھا۔ درحقیقت آنکھوں پر لگنے والی ضرب نے میری مزاحمت کو چند ہی لمحوں میں مسمار کر کے رکھ دیا تھا۔ اب عقل مندی یہ نہیں تھی کہ حبشی سے مقابلہ جاری رکھا جاتا اور نتیجے میں خود کو موت کے منہ میں دھکیلا جاتا' لڑائی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب حکمت عملی کے تحت پسپائی اختیار کرنا ضروری ہوتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ اس درندہ نما حبشی کی جان لیوا لپیٹ سے نکلنے کی کوشش کروں' لیکن پھر فوراً میرا دھیان نوشین کی طرف چلا گیا۔

میں حبشی کے تیور دیکھ چکا تھا۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ میں یہاں سے باہر نکلا تو حبشی میرے پیچھے نہیں آئے گا' وہ فوراً نوشین کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ اس کا کومل بدن دانتوں سے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔ اور یہ مجھے کسی صورت منظور نہیں تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ جب بھی کوئی ایسا نازک موقع آتا تھا' نواب زادی شاہین کی صورت میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ میں اسے درندہ صفت حبشی جان سے بچا نہیں سکا تھا۔ یہ پچھتاوا کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ خاص طور سے جب کوئی شخص میری وجہ سے جان کے خطرے کا شکار ہوتا تھا' ماضی کا وہ خونی واقعہ اپنی تمام تر تلخی کے ساتھ میرے ذہن میں اودھم مچا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کن انداز کے ساتھ ایک بار پھر حبشی پر حملہ کیا' میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اڑنگا لگا کر نیچے گرا دیا۔ جب ستاروں کی گردش ساتھ نہ دے رہی ہو تو سیدھے کام سے بھی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔ حبشی میری کوشش سے گرا ضرور مگر وہ بے ہوش نوشین کے اوپر گرا۔ وحشت اور دیوانگی کے عالم میں اس نے ایک بار پھر اپنے دانت نوشین کے جسم میں گاڑ دیے۔ اس مرتبہ نوشین کے جسم کا نازک ترین حصہ اس کی زد میں تھا۔ وہ اس کی گردن پر دانت جمائے ہوئے تھا۔ سوچنے کے لیے ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں تھی' میں نے تڑپ کر اپنی انگلیاں حبشی کی باچھوں میں گھسیڑ دیں۔ اپنی پوری قوت صرف کر کے میں اس کا خونی جبڑا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے پہلی

مرتبہ انسانی جبڑے کی بے پناہ قوت کا احساس ہوا۔ کسی طاقت ور ہائیڈرالک پریس کی طرح جبڑا میری انگلیوں کو پیستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا زور حبشی کی باچھوں کی طرف منتقل کیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسے نوشین سے پیچھے ہٹا لیا۔ بالکل جیسے کوئی درندہ ایک شکار کو چھوڑ کر دوسرے پر جھپٹتا ہے' حبشی مجھ پر جھپٹا۔ ایک بار پھر اس نے میری آنکھوں میں انگلیاں گھسیڑنے کی بے رحمانہ کوشش کی' اس مرتبہ میں نے یہ کوشش ناکام بنائی۔ حبشی نے جھکا کر میری ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ ایسی نازک ضربات لگانے میں اس وحشی کو یقیناً خصوصی مہارت حاصل تھی۔ یہ "ضرب" میری قوت مزاحمت کو ایک بار پھر صفر پر لے آئی۔ مجھے فرش پر نیم بسمل چھوڑ کر حبشی تیسری مرتبہ نوشین پر جھپٹا' اس کے منہ کو نوشین کا خون لگ گیا تھا۔ اس نازک بدن کے نرم ملائم گوشت کی بھوک' جیسے حبشی کے پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں شاید نوشین کو بچا نہیں سکوں گا۔ مگر جب تک میرے حواس کام کر رہے تھے' میں اس لڑکی کو درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے میں پھر اٹھا اور حبشی پر جھپٹ پڑا۔ میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا کہ کاش میرا خنجر میری پنڈلی کے ساتھ ہوتا۔ کسی ہتھیار کے بغیر میں خود کو بالکل بے کار محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اوراک ہو رہا تھا کہ میرے بازوؤں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ میں اس شہ زور درندے کو من مانی سے روک سکوں۔ میں نے دونوں ہاتھ حبشی کی کمر میں ڈال دیے اور اسے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ حبشی کے جسم پر ایک انڈرویئر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ یہ انڈرویئر پھسل کر اس کے گھٹنوں پر آ گیا ہے۔ حبشی اب بالکل عریاں تھا مگر اس عریانی کی اسے مطلق پروا نہیں تھی اور ہوتی بھی کیوں؟ وہ انسان سے زیادہ درندہ تھا' اور درندے کے لیے لباس بے معنی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے اور پھر جب مدمقابل ایسا کمینہ ہو اور برا اوچھا ہتھکنڈا استعمال کر رہا ہو تو حدود کا خیال رکھنا کبھی کبھی حماقت کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ میں نے حبشی کے جسم کے نازک حصے پر دو تین بے رحم ضربیں لگائیں' وہ دھاڑ سا اٹھا تو میں نے اسے عقب سے کھینچ کر دیوار سے دے مارا۔ وہ ایک واش بیسن سے ٹکرایا اور واش بیسن آئینے سمیت چکنا چور کر گیا۔ تاہم اس نے دوبارہ اٹھنے میں ایک ساعت کی تاخیر نہیں کی۔ ٹانگوں میں الجھے ہوئے انڈرویئر کو اس نے اتار کر دور پھینک دیا اور حلق سے ایک جنگلیوں جیسی غصیلی آواز برآمد کر کے مجھ پر جھپٹا۔ چند ساعتوں میں اس نے میرے جسم پر دو وحشی ضربیں

لگائیں اور نیم جان کر دیا۔ شنکر شکرا سے دوبدو مقابلوں کے دوران میں مجھ پر چند ایک "سخت مقامات" آ چکے تھے لیکن یہ صورت حال ان سب سے زیادہ سنگین تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے جسم کے کئی حصوں سے خون نکل رہا ہے' سب سے زیادہ پریشان کن اور حوصلہ شکن چوٹ آنکھ کی تھی۔ میں یہ چوٹ دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم اس وقت مجھے اتنی فی صد یقین تھا کہ میری ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ درحقیقت یہی چوٹ تھی جس نے مجھے ناک آؤٹ ہونے کے بالکل قریب کر دیا تھا۔

مجھے نیم جان کر کے مسائی حبشی حسب سابق پھر نوشین کی طرف بڑھا تو میں نے آخری کوشش کے طور پر اس کا ٹخنا پکڑ لیا۔ ساتھ ساتھ میں چیخ رہا تھا "کوئی ہے.... کوئی ہے؟" پروفیسر چند گز دور تھا لیکن اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے باندھا تھا' وہ میری مدد کو کیسے آ سکتا تھا۔ اور اگر کھلا بھی ہوتا تو کیا معلوم کہ آتا یا نہیں۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید قریبی کمرے میں بیٹھا مخبوط الحواس بوڑھا متوجہ ہو جائے اور کوٹھی کے صحن میں نکل کر چیخ و پکار شروع کر دے۔ لیکن یہ خیال بھی خام ہی ثابت ہوا۔ مسائی حبشی نے میرے زخمی چہرے کو تین چار ٹھوکروں سے مزید زخمی کیا اور خود کو چھڑا لیا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ میں قالین پر اوندھا پڑا تھا۔ اچانک میری نگاہ صوفے کے نیچے چلی گئی۔ یہاں وہ طاقت در "اے کے ۵۶" رائفل موجود تھی جو ریچھ نما کے ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔ یہ سائیلنسر لگی رائفل میرے اور نوشین کے لیے زندگی کا پیام بن سکتی تھی۔ میرے نیم جان بدن میں ایک

اجازت
+ روزی کی تلاش میں سات سمندر پار جانے والوں کا المیہ۔
+ دو محبت کرنے والوں کی انوکھی داستان۔
قیمت -/150 ... -/20
اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
ناشر

بار پھر حوصلے کی لہر دوڑ گئی۔ میرا اور رائفل کا فاصلہ چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے معطل ہوتے ہوئے حواس کو سنبھالا دیا اور صوفے کے نیچے ہاتھ ڈال کر رائفل نکال لی۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا میگزین نصف سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا، رائفل دس گولی کے برسٹ پر سیٹ تھی۔ میگزین پر اپنی اسپرنگ تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے رائفل درندہ نما حبشی کی طرف سیدھی کی۔

"ادھر دیکھو کالیے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

وہ مادر زاد برہنہ میری طرف گھوما۔ میری ٹھوڑی سے بہنے والا خون قطرہ قطرہ رائفل کے نقرئی دستے پر گر رہا تھا۔ میرے اور حبشی کے درمیان نوشین کے قیمتی لباس کی دھجیاں بکھری ہوئی تھیں اور اس گلدان کے ٹکڑے تھے جو نوشین نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے توڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر حبشی کے چہرے پر ذرا سا تردد نظر آیا پھر اس کے ہونٹوں سے وہی لرزہ خیز غراہٹ نکلی جس میں کانگو کے تاریک ترین جنگلات کی وحشت چھپی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ مجھ پر جھپٹنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے جسم میں جنبش پیدا ہوتی، میں نے ٹریگر دبا دیا۔ پہلا برسٹ حبشی کے سینے پر لگا اور وہ اس کے دھکے کے سبب دیوار سے جا ٹکرایا۔ رائفل کے دوسرے برسٹ نے اس کی تنا ور گردن چھلنی کی اور کھوپڑی کا ایک حصہ اڑا کر رکھ دیا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح ڈرائیور رمضان علی کی لاش کے پہلو میں گر گیا۔ اس کے خون سے کمرے کا سرخ قالین سرخ تر ہونے لگا۔

میں نے رائفل قالین پر رکھ دی اور اوندھے منہ لیٹے لیٹے اپنا سر زمین سے ٹکا دیا۔ جسم کے ہر حصے سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قریباً ایک منٹ اسی طرح گزرا۔ پھر میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ راہداری میں واش بیسن کے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے ایک ٹکڑا اٹھایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آنکھ کی حالت کیا ہو گی... میں اپنی آنکھ دیکھوں گا؟ اس کی جگہ ایک گڑھا دیکھوں گا؟ یا آنکھ کے ڈھیلے کو زخم زخم دیکھوں گا؟ نجانے کیوں ایک بے معنی اور بے موقع سا خیال میرے ذہن میں آنے لگا۔ یہ غزالہ کا خیال تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں ایک آنکھ سے معذور ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا؟

میں نے شیشے کا ٹکڑا چہرے کے سامنے کیا۔ بائیں آنکھ کے مقام پر خون کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ پلکوں پر بھی گہرا زخم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹھیک آنکھ ہاتھ سے بند کر کے زخمی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی... خون کی سرخی اور روشنی و تاریکی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آنکھ مکمل تباہی سے بچ گئی ہے۔

میں نے باتھ روم میں گھس کر شاور کھول دیا اور نیچے کھڑا ہو گیا۔ کتنی ہی دیر میں سرد پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ زخموں اور خراشوں سے خون گھل گھل کر بہتا رہا... پھر میں نے تولیے سے چہرہ صاف کیا۔ زخمی آنکھ کی بینائی پہلے سے بہتر محسوس ہونے لگی، تاہم درد پہلے سے شدت اختیار کر گیا۔ میں نے نوشین کا نیم عریاں جسم ایک چادر سے ڈھانپا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر چوٹ آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ نہایت خوب صورت شفاف گردن پر مسائی حبشی کے دانتوں کے نشان موجود تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے اور ہاتھ پاؤں کی مالش کی۔ وہ مکمل ہوش میں تو نہیں آئی لیکن اس کی سانس بہتر ہو گئی اور نبض معمول کے مطابق چلنے لگی۔ میں نے اسے اٹھا کر خواب گاہ کے بستر پر لٹا دیا۔

یہیں صوفے پر پروفیسر اللہ دتا بندھا پڑا تھا۔ اللہ دتا دروازے میں سے وہ طویل اور خونی جدوجہد دیکھ رہا تھا جو میرے اور مسائی حبشی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس دوران میں اللہ دتا یقیناً چیختا چلاتا بھی رہا ہو گا لیکن اس کا گلا چونکہ بالکل بیٹھ چکا تھا لہٰذا یہ آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے دیکھا، پروفیسر اللہ دتا جو بہت سے لوگوں کے لیے مسیحا تھا، اب خود برسوں کا مریض دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی رنگت بالکل مٹی ہو رہی تھی اور آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا اور بڑے دکھی انداز میں میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دل میں نجانے کیا بات آئی۔ میں نے اس کی ٹانگوں کی بندش کھول دی اور ہاتھ بھی کھول دیے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہو گا۔ بالکل غیر متوقع طور پر اس نے بازو پھیلائے اور روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

"میں نے تمہارے بارے میں بہت سنا تھا شاہ جہاں صاحب... آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تم ایک باہمت شخص ہو۔ تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ میں... میں تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں بناوٹ یا خوشامد کا شائبہ تک نہیں تھا۔

وہ بے ساختہ میرے کندھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولا "نہیں... میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا شاہ جہاں... ایک ایک بات بتاؤں گا... میں نے فیصلہ کر لیا ہے، کچھ نہیں چھپاؤں گا... ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی اور آواز کی یہ عجیب لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ حیرت انگیز انکشافات کرنے جا رہا ہے۔

"وہ حیرت انگیز انکشافات کیا ہو سکتے ہیں؟"

یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گونج رہا تھا مگر اس سوال کا جواب اسی وقت مل سکتا تھا جب پروفیسر اللہ دتا اپنی زبان کو حرکت دیتا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایک دل دوز ہچکی اس کے سینے کو دہلا جاتی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی پروفیسر اللہ دتا ہے جسے لوگ مسیحا مانتے ہیں، جس کے پاؤں چھوتے ہیں اور جس کے ایک ٹیلی فون پر کمشنر تک بھاگا چلا آتا ہے۔ نجانے ایسا کون سا ظلم ہوا تھا پروفیسر پر کہ جس نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور یہ ایسا ظلم تھا جس کی مزاحمت کرنا پروفیسر جیسے بارسوخ شخص کے بس میں بھی نہیں تھا۔

پروفیسر کی نگاہ میری زخمی آنکھ پر پڑی تو وہ کچھ دیر کے لیے رونا دھونا بھول گیا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی دونوں ٹیوب لائٹس جلا دیں، ان کی روشنی میں بڑے غور سے میری آنکھ کا معائنہ کیا۔ اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "تمہیں ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے لے کر ایک قریبی کمرے میں پہنچا۔ یہ کمرا چھوٹی سی ڈسپنسری کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور ٹیبل لیمپ کی روشنی میری آنکھ پر مرکوز کر دی۔ پہلے اس نے کسی محلول سے میری آنکھ اور ٹھوڑی کو صاف کیا، پھر کوئی دوا لگانے میں مصروف ہو گیا۔

کہنے لگا "مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تمہارے چہرے پر پلاسٹک میک اپ موجود ہے لیکن اب میں خود دیکھ رہا ہوں۔ ٹھوڑی کے کٹ پر میک اپ کی فالتو جھلی صاف نظر آ رہی ہے۔"

وہ قریباً آدھ گھنٹا میری آنکھ اور ٹھوڑی کے ساتھ مصروف رہا۔ اس نے آنکھ پر پٹی باندھ دی اور ٹھوڑی پر روئی کا پھایا رکھ کر میڈیکل ٹیپ چپکا دی۔ جسم کے دیگر حصوں پر بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ پروفیسر نے جہاں جہاں ضروری سمجھا، دوا لگا دی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ ایلوپیتھک یا ہومیوپیتھک دوا نہیں تھی بلکہ پروفیسر کی اپنی فارمیسی کی تیار کردہ تھی۔

مجھے ٹریٹ کرنے کے بعد پروفیسر نوشین کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے سر اور گردن کا زخم دیکھا۔ ان زخموں پر اس نے چابک دستی سے مرہم پٹی کر دی۔ نوشین کے "بالائی جسم" پر بھی کاٹنے کے نشانات موجود تھے۔ میں نے نوشین کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔ پروفیسر نے چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ان زخموں پر مرہم وغیرہ لگایا۔ پھر ایک ایلوپیتھک انجکشن اس کے بازو میں لگا دیا۔ نوشین سے فارغ ہو کر ہمیں ان دو ملازموں کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو بے ہوش پڑے تھے۔ ان میں سے ایک گارڈ تھا جسے میں نے گردن دبا کر بے ہوش کیا تھا، دوسرا گھریلو ملازم تھا جو ٹھوڑی پر میرا "واونڈ پنچ" کھانے کے بعد ابھی تک غافل پڑا ہوا تھا۔ جس وقت پروفیسر اللہ دتا ان دونوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے فون کا کٹا ہوا تار دوبارہ سے جوڑا اور ساہی صاحب کو کال کر دی۔

ساہی صاحب صرف پندرہ منٹ کے اندر اپنی نفری کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گئے۔ ان پندرہ منٹ کے اندر میں نے صرف ایک کام کیا تھا۔ میں بالائی منزل کے اس کمرے میں پہنچا تھا جہاں پروفیسر کی شرمناک تصویریں لگی تھیں اور زنانہ کپڑے دیوار سے ٹنگے ہوئے تھے (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کپڑے پروفیسر کی اکلوتی بیٹی کے تھے) میں نے تمام تصویریں دیواروں سے اتار لیں اور کپڑے بھی لپیٹ کر ایک صندوق میں بند کر دیے۔ تصویریں میں نے صحن میں جا کر نوشین کی گاڑی میں چھپا دیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس کی خانہ تلاشی کے دوران میں یہ سب کچھ منظر عام پر آ جائے اور پروفیسر کی جگ ہنسائی ہو۔

○☆○

پروفیسر نے جن انکشافات کا ذکر کیا تھا وہ اس نے اگلے روز دوپہر کے وقت کیے۔ ہم پروفیسر کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازے بند تھے اور کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کل جو معاملات اس چار دیواری میں پیش آئے تھے، انہیں ساہی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ ڈرائیور رمضان علی اور مسائی حبشی کے قتل کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ ایف آئی آر پروفیسر کی طرف سے درج ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نیم پاگل غیر ملکی نیگرو ان کی کوٹھی میں گھس آیا تھا۔ اس وقت مس نوشین کا ڈرائیور اتفاقاً کوٹھی میں موجود تھا۔ نامعلوم نیگرو نے اس پر اچانک حملہ کر کے گردن ادھیڑ دی۔ رمضان علی نے شدید زخمی ہونے کے باوجود رائفل سے حبشی پر فائرنگ کی اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد ازاں ڈرائیور رمضان خود بھی ڈھیر ہو گیا۔ اخبار والوں کو اس واردات کی تفصیل سے حتی الامکان دور رکھا گیا تھا۔

پروفیسر نے اپنا گلا صاف کرنے کے لیے منہ میں کوئی گولی رکھی اور رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا "میں سمجھتا ہوں

کہ نوشین نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر وہ تمہیں میرے بارے میں نہ بتاتی تو تم اس کوٹھی میں نہ آتے' اور اگر تم یہاں نہ آتے تو میں کل اپنی آنکھوں سے وہ منظر بھی نہ دیکھ پاتا جس نے میرے دل و دماغ کو تبدیل کیا ہے اور میں اپنی زبان کھولنے پر آمادہ ہوا ہوں۔"

"آپ کس منظر کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہی۔۔۔ کل حبشی کے ساتھ تمہاری لڑائی کا منظر۔ زخمی ہونے کے باوجود تم نے جس طرح کوشش جاری رکھی اور آخر تک حوصلہ نہیں ہارا' وہ نہ بھولنے والا واقعہ ہے۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر تم اس خونی سے پیچھا چھڑا کر باہر نکل جاتے تو وہ بھی تمہارے پیچھے نہ جاتا۔ وہ نوشین پر جھپٹ پڑتا اور اسے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ پھر اس کے بعد وہ شاید۔۔۔ میری طرف آجاتا۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" میں نے کہا "بہرحال اب تو یہ سب کچھ بیت گیا۔ اب یہ تذکرہ چھیڑ کر پریشان ہونے سے کیا فائدہ!"

پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔ چند لمحے تک اس کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آیا پھر اس نے ڈرامائی لہجے میں بولنا شروع کیا "تمہیں معلوم ہے' کچھ عرصہ پہلے علاقہ مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر ہلاک ہو گیا تھا؟ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ چھانگا مانگا کے نزدیک دونوں کی گاڑی الٹ گئی تھی۔ ویران جگہ پر میاں بیوی کی لاشیں ساری رات پڑی رہی تھیں اور جنگلی جانور انہیں نوچتے کھسوٹتے رہے تھے۔"

مجھے یاد آگیا' یہ واقعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ مجسٹریٹ درجہ اول شیر محمد ڈوگر اور اس کی بیوی کی المناک موت کی خبر اخبارات میں تفصیل سے چھپی تھی۔ میں نے کہا "ہاں پروفیسر صاحب' میں نے یہ نیوز پڑھی تھی۔ یہ تو کوئی دس گیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔"

وہ بولا "اور ڈی ایس پی کمانڈو کے بارے میں کچھ پتا ہے؟ وہ پنجاب پولیس کے بہت نڈر اور دلیر افسروں میں سے ایک تھا۔ کئی اصلی پولیس مقابلے اس کے کھاتے میں ہیں۔"

"وہ شاید کچھ عرصے سے غائب ہے۔ ایک اخباری خبر میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے کسی نے گاڑی سمیت اغوا کر لیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اور وہ گاڑی بعد میں پولیس کو ایک ویران مقام سے مل بھی گئی تھی۔"

"کیا یہ دونوں وارداتیں ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں؟"

"بے شک ایسا ہی ہے۔" پروفیسر اللہ دتا کی آواز ڈرامائی ہوتی چلی جا رہی تھی "ان دونوں نہایت بااثر افراد کو ایک ہی بندے نے قتل کیا ہے۔"

"کیا مطلب' ڈی ایس پی کمانڈو بھی ہلاک ہو چکا ہے؟"

"ہاں' وہ بھی مر چکا ہے۔"

"کس نے مارا ہے؟"

"میں جو کچھ تمہیں بتاؤں گا شاید تم اس پر یقین نہ کر سکو مگر یہ ہے بالکل سچ۔" پروفیسر کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا "مرنے والے یہ دونوں افراد میرے دوستوں میں سے تھے اور ان کی ہلاکت کی وجہ بھی میں ہی ہوں۔ مجھ سے دوستی کا رشتہ ہی ان کی موت کا سبب بن گیا۔"

میری سوالیہ نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پروفیسر نے کہا "اس کہانی کا آغاز آج سے قریباً ڈھائی سال پہلے ہوا تھا۔ میرا بھائی ارشاد ایک ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہا تھا' ایک روز ایک شخص اس سے ملا اور اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتا ہے' اس غیر ملکی سیاہ فام شخص نے اپنا نام مائیکل بتایا۔ اس کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ وہ بظاہر بے حد مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ارشاد احمد پر اس کے جوہر کھلنے لگے۔ وہ ایک نہایت بے رحم اور سفاک قسم کا بردہ فروش ثابت ہوا۔ وہ انسانوں کا سوداگر تھا اور پاکستان میں اس کی موجودگی بھی اسی پیشے کے سلسلے میں تھی۔ اس نے ارشاد احمد کو بھی آہستہ آہستہ اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ مائیکل کے ساتھ مل کر کام کرنے پر رضامند ہو گیا۔ مجھے اس صورت حال کا پتا چلا تو سخت پریشانی ہوئی۔ میں نے ارشاد احمد کو نہایت سخت لفظوں میں سمجھایا بلکہ اسے وارننگ دی کہ اگر وہ اس معاملے سے الگ نہیں ہوا تو میں پولیس میں اطلاع دوں گا۔ ارشاد احمد مجھ سے تو یہی کہتا رہا کہ وہ مائیکل سے الگ ہو گیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کام میں اور بری طرح ملوث ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے راہ روی کا شکار بھی ہو رہا تھا۔ اس نے شراب پینا شروع کر دی تھی اور اکثر نوجوان لڑکیاں اس کے دفتر میں دیکھی جاتی تھیں۔ انہی حالات سے دل برداشتہ ہو کر ارشاد احمد کی بیوی بھی اس سے روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ وہ میرے ساتھ اسی گھر میں رہا کرتا تھا مگر اس کا رہن سہن دیکھتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست کر لے۔ انہی دنوں اس نے مسلم ٹاؤن والی کوٹھی بنوائی اور وہاں شفٹ

ہوا۔ بہرحال وہ اکثر یہاں بھی آتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک دو روز میرے پاس رہتا تھا۔ گھر کا ایک کمرا اب بھی اسی کے پاس تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ارشاد احمد سادہ لوح لوگوں کو مڈل ایسٹ اور یورپ بھجوانے کا جھانسا دے کر مائیکل کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ارشاد ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بھی اس گھناؤنے کاروبار کی طرف مائل کرنے لگا۔ ایک روز مشتعل ہو کر میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ پولیس کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دوں گا۔ اسی روز مائیکل نامی وہ شخص ارشاد احمد کے ساتھ میرے گھر آیا اور اس نے مجھے میری بچی سمیت یرغمال بنا لیا۔ مائیکل ایک لمبے چوڑے شخص کا نام ہے۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے زائد ہے۔ ہر وقت تھری پیس سوٹ میں نظر آتا ہے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگاتا ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک نہایت مہذب شخص دکھائی دیتا ہے لیکن اس کی اصل کچھ اور ہے۔ اس جیسا بے رحم اور بے خوف شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ شاید آئندہ دیکھوں۔"

ایک لمحہ توقف کرکے پروفیسر اللہ دتا نے ایک طویل آہ کھینچی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "تمہارے خیال میں افریقہ کے دور دراز جنگلوں میں بسنے والے آدم خور قبائلی کیسے ہوتے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"آدم خور قبائلیوں کا حلیہ تمہارے خیال میں کیسا ہوتا ہے؟"

"وہ ننگ دھڑنگ لوگ ہوتے ہیں یا بہت مختصر لباس پہنتے ہیں۔ چہرے پر دھاریاں وغیرہ بناتے ہیں۔ بلند آواز میں چیختے چلاتے ہیں یا صرف مقامی زبان بولتے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا "لیکن میں ایک ایسے وحشی آدم خور کو جانتا ہوں جو انگلش میں بات کر سکتا ہے۔ آنکھوں پر چشمہ لگاتا ہے اور تھری پیس سوٹ پہنتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے۔" ایک لمحہ رک کر پروفیسر نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "مائیکل ایک آدم خور ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے انسانی گوشت کھاتے دیکھا ہے۔"

کمرے میں چند لمحے گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ پروفیسر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "مائیکل نے جب میرے ہی گھر میں مجھے اور میری بچی کو یرغمال بنایا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک خطرناک کام کر رہا ہے۔ میں اسے جیل میں بھجوا کر دم لوں گا۔ میری اس بات پر مائیکل بے حد غصے میں آگیا۔ پھنکار کر کہنے

خونِ آشام
مُصنّف: ایم اے راحت
قیمت -/۵۰ روپے
ڈاک خرچ -/۲۰ روپے
ایک ایسے بزرگ سادھو کی داستان جس کی زندگی میں ایک نوجوان داخل ہو گیا۔
وہ بوڑھا صدیوں سے زندہ تھا۔ اُس کی آنکھیں پاتال میں جھانک سکتی تھیں۔
اُس بہادر نوجوان کی پُراسرار سرگزشت جو ایک نئے اور خوفناک سفر پر روانہ ہوا۔ اور کامیابی اُس کے قدم چومتی رہی
— پبلشرز —
علی میاں پبلی کیشنز عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور
— اسٹاکسٹ —
علی بکسٹال نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

لگا کر تمہیں اپنے تعلقات پر بڑا بھروسا ہے میں تمہیں تمہارے تعلقات کی حیثیت بتاتا ہوں۔ اس بات کے صرف دو گھنٹے بعد ڈی ایس پی کمانڈو اور علاقہ مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر میرے سامنے پہنچ گئے۔ ڈی ایس پی مختار عرف کمانڈو کو مائیکل کے کارندوں نے اس کے گھر سے اٹھایا تھا جبکہ شیر محمد ڈوگر اپنی بیوی کے ساتھ سیر پر نکلا ہوا تھا کہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ مائیکل نے مجھ سے کہا کہ تمہارے فرینڈز میں سے جو دو سب سے بڑے پھنے خاں تھے انہیں میں اٹھا لایا ہوں۔ اگر کسی اور کو بلانا چاہتے ہو تو اسے بھی بلا لو۔ اگر وہ لاہور میں ہے تو دو گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد ان تینوں کے ساتھ جو سلوک ہوا میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ شخص بلا دریغ قتل کرتا ہے اور قتل بھی ایسے سفاکانہ کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے نیچے ایک تہ خانہ ہے۔ دراصل یہ اس پرانی عمارت کا تہ خانہ ہے جو پہلے اس جگہ پر موجود تھی۔ انہوں نے نئی عمارت بنائی مگر تہ خانہ موجود رہا۔ مائیکل ہم سب کو اس تہ خانے میں لے گیا۔ اس نے شیر محمد ڈوگر اس کی بیوی اور ڈی ایس پی کمانڈو کو میرے سامنے قتل کیا۔ وہ ایک ایسا منظر تھا جسے میں مر کر بھی نہیں بھول سکوں گا اور نہ میری بیٹی بھول سکے گی۔ اور تو اور یہ منظر دیکھنے کی تاب اس جہنمی ارشاد احمد میں بھی نہیں تھی جو مائیکل کا دست راست بنا ہوا ہے۔"

پروفیسر نے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں اور کتنی ہی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے رس رہے تھے۔ ایک آہ بھر کر بولا "مائیکل اپنے تین ساتھیوں کو لے کر آیا تھا۔ یہ ویسے ہی لمبے تڑنگے حبشی تھے جیسا تم نے کل دیکھا تھا۔ ان کے جسم پر بس واجبی سا لباس تھا۔ یہ تینوں مائیکل ہی کے قبیلے سے تھے اور آدم خور تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ ان تینوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پہلے شیر محمد ڈوگر کو لایا گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھا۔ وہ ایک بانس کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ بالکل جیسے کسی سالم بکرے کو کوئلوں پر روسٹ کرنے کے لیے باندھا جاتا ہے۔ یہ بانس قریباً نو دس فٹ کی بلندی پر افقی رخ پر یوں رکھ دیا گیا کہ شیر محمد ڈوگر کی بلندی فرش سے قریباً سات فٹ تھی۔ تینوں حبشی بھوکے کتوں کی طرح شیر محمد ڈوگر پر ٹوٹ پڑے۔ بانس چونکہ بلندی پر تھا لہٰذا وہ اچھل اچھل کر شیر محمد ڈوگر کے جسم سے بوٹیاں نوچنے لگے۔ ڈوگر کی چیخیں کربناک تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میری بیٹی بے ہوش ہو گئی لیکن تماشا جاری رہا۔ حبشی اچھل اچھل کر شیر محمد ڈوگر کے جسم سے گوشت کے لوتھڑے علیحدہ کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے دانتوں کی مدد سے شیر محمد ڈوگر کے جسم سے جھول جاتے تھے۔ ان کے چہرے خون رنگین تھے۔ وہ تھوڑا گوشت چبا رہے تھے اور زیادہ ادھیڑ کر پھینک رہے تھے۔ کمرے کا خون آلود فرش ... آمیز منظر پیش کر رہا تھا۔ بدنصیب شکار کو بلندی پر باندھ... مقصد یقیناً یہی تھا کہ حبشی ایک ہی بار میں اس کا ... کر دیں بلکہ آہستہ آہستہ گوشت نوچ نوچ کر اسے ماریں... محمد ڈوگر قریباً دس منٹ میں مر گیا لیکن سیاہ فام دیر تک ... نوچتے رہے۔

"اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے شیر ... کی جوان سال بیوی اور ڈی ایس پی کمانڈو کے سا... بالکل یہی سلوک کیا گیا۔ میری بیٹی شائستہ کو بار بار غش... تھی۔ اسے ہوش میں لایا جاتا تھا اور میرے ساتھ یہ ... دیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ شیر محمد ڈوگر کی بیوی تو پانچ منٹ... ہی دم توڑ گئی تاہم بدنصیب کمانڈو جو صحت مند جسم کا... تھا دیر تک تڑپتا اور چیختا چلاتا رہا۔ وہ بار بار التجا کر رہا تھا... اسے گولی مار دی جائے لیکن آدم خور سیاہ فاموں کی لذت... چیخوں میں اس کی پکار نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔ ... ایک سیاہ فام نے چھلانگ لگا کر دانتوں سے اس کا ... ادھیڑا اور اسے ناقابل بیان اذیت سے رہائی ملی۔ اس... بعد جب مائیکل نے یہی سلوک میری بیٹی کے ساتھ کر... ارادہ ظاہر کیا اور اسے میرے سامنے بے لباس کیا گیا ... مائیکل کے قدموں میں گر پڑا۔ میں نے گڑگڑا کر اسے ... وفاداری کا یقین دلایا اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس کا غلام ... کر رہوں گا۔ وہ میری بیٹی کی جاں بخشی کر دے۔ مائیکل سفاک... انداز میں ہنستا رہا اور مجھے ٹھوکریں رسید کرتا رہا۔ اس... مجھے جی بھر کر ذلیل کیا اور میری بے بسی کی تصویر کشی بھی ... بہت دیر کے بعد اس نے میری گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے ... یہ خوش خبری سنائی کہ ارشاد احمد کی سفارش پر وہ مجھے ... معافی دے رہا ہے۔ اس نے کہا کہ جب تک میں اس کے ... ارشاد احمد کے احکامات پر بلا چون و چرا عمل کروں گا میری ... معافی برقرار رہے گی۔ جہاں کہیں میں نے ذرا سی سر... دکھائی میری بیٹی کو اذیت دے کر مار دیا جائے گا۔ میری ... تصویریں کھینچی گئی تھیں وہ شائستہ کے لباس سمیت میری ... خواب گاہ میں لگا دی گئیں اور مجھے پابند کیا گیا کہ میں ... خواب گاہ میں سویا کروں گا۔ درحقیقت مائیکل چاہتا تھا کہ ... بے بسی کا منظر ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہے اور ... مزاحمت کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں ... اس خواب گاہ میں سونا میرے لیے کتنا دشوار تھا لیکن مجھے ... سب کرنا پڑتا تھا۔ وہ خواب گاہ نہیں عذاب گاہ تھی لیکن ...

کیا کرتا؟ کہاں جاتا؟ میں ان لوگوں کی دہشت اور درندگی دیکھ چکا ہوں اور مجھے یقین ہے جو ایک بار یہ درندگی دیکھ لیتا ہے پھر زندگی بھر بھول نہیں سکتا۔ میں نے پچھلے ایک سال میں وہی کچھ کیا جو ارشاد اور مائیکل نے مجھ سے کہا۔ میں اپنے عقیدت مندوں کو دھوکا دیتا رہا۔ ان کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ میں نے ایک سال میں کم از کم دو ڈھائی سو افراد کو ارشاد احمد کے چنگل میں پھنسایا ہے۔ لوگ مجھ پر اندھا دھند اعتماد کرتے ہیں اور میرے حوالے سے وہ ارشاد احمد پر بھی بھروسا کرنے لگتے تھے۔ بلکہ بوقت ضرورت ارشاد احمد کے کسی شکار کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے اپنی ضمانت بھی دینا پڑتی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ پچھلے چند ماہ میں میں نے کتنی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ خدا سے رو رو کر باعزت موت اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا ہوں۔ اس دوران میں میں نے کئی بار سوچا کہ خودکشی کر لوں لیکن یہ حرام موت مر کر بھی میں اپنی نصیبوں جلی بیٹی کا کچھ بھلا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً درندوں کے چنگل میں تھی اور میں اسے اس حال میں چھوڑ کر مر بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے مائیکل نے اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ لاہور ہی میں کسی جگہ ایک کوٹھی میں بند ہے۔ پچھلے قریباً ایک سال میں مائیکل اور ارشاد نے صرف تین مرتبہ مجھے اس کی صورت دکھائی ہے۔ تینوں مرتبہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا اور ایک مختصر ملاقات کے بعد وہ لوگ مجھے واپس لے آئے۔ اپنی بدنصیب شائستہ سے میری آخری ملاقات کوئی تین ہفتے پہلے ہی ہوئی ہے۔" پروفیسر کی آنکھوں میں ایک دم آنسو رواں ہو گئے اور کتنی ہی دیر اس کے ہونٹ تھراتے رہے۔ تب وہ حوصلہ جمع کر کے بولا "آخری ملاقات میں مجھے پتا چلا کہ شائستہ امید سے ہے۔ وہ بیمار بھی تھی۔ زرد پتے جیسی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ بے رحم مردوں کے چنگل میں تھی۔ کب تک اس کی آبرو محفوظ رہتی۔ مجھے تو اب لگتا ہے کہ یہی صورت حال رہی تو وہ وہیں گھٹ کر مر جائے گی۔ اتنے لوگوں کی زندگیاں برباد کر کے اور انہیں بردہ فروشوں کے چنگل میں پھنسا کر بھی مجھے میری شائستہ واپس نہیں ملے گی۔ مجھے نہیں ملے گی میری شائستہ واپس۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا پروفیسر" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ اور شدت سے رونے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو گیا تو میں نے پوچھا "پروفیسر! ایک سال پہلے جن تین افراد کو تہ خانے میں قتل کیا گیا ان کی لاشوں کا کیا بنا؟"

پروفیسر نے کہا "مجسٹریٹ شیر محمد ڈوگر اور اس کی بیوی کی لاش کو گاڑی سمیت ویرانے میں لے جایا گیا۔ گاڑی کو ایک نشیب میں اس طرح پھینکا گیا کہ یہ ایک اتفاقیہ حادثہ نظر آئے۔ لوگوں کو یہی معلوم ہوا کہ ڈوگر اور اس کی اہلیہ حادثے میں ہلاک ہوئے۔ ان کی لاشیں رات بھر جنگل میں پڑی رہیں۔ پولیس نے یہی سمجھا کہ جنگلی جانور انہیں نوچتے رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ڈی ایس پی مختار عرف کمانڈو کی لاش کو پھینکا نہیں گیا تھا بلکہ کسی اور طریقے سے ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔"

"مائیکل سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہی تین ہفتے پہلے جب میں نے شائستہ کو دیکھا تھا۔ ارشاد احمد بھی وہیں موجود تھا۔"

"آپ نے اپنے ملنے جلنے والوں اور اہل خانہ کو شائستہ کے بارے میں کیا بتایا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟"

"ہمارے کوئی زیادہ رشتے دار یہاں ہیں نہیں۔ صرف دو تین دور پار کے لوگ ہیں۔ انہیں میں نے کہہ دیا تھا کہ شائستہ اسلام آباد میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ صرف میری والدہ کو معلوم تھا کہ شائستہ کسی سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔ جس روز اس چار دیواری میں مائیکل نے ڈی ایس پی کمانڈو، مجسٹریٹ شیر محمد اور اس کی اہلیہ کو قتل کیا، میری والدہ بھی یہیں موجود تھیں۔ انہوں نے مرنے والوں کے ساتھ ساتھ اپنی پوتی شائستہ کی چیخیں بھی سنی تھیں۔ پچھلے ایک برس سے وہ مسلسل مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ شائستہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ میں انہیں کچھ نہیں بتا سکا۔ صرف ان کے سر کی قسم کھا کر اتنا یقین دلایا ہے کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ پوتی کے غم میں وہ جسمانی اور ذہنی طور پر بیمار ہو گئی ہیں۔ ارشاد احمد انہیں اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی کے گھر میں ہیں۔"

مجھے وہ بیمار بوڑھی عورت یاد آ گئی جو ارشاد کے گھر کی بالائی منزل پر رہتی تھی۔ میں صرف ایک بار اس سے ملا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہسٹریائی انداز میں چیخیں مارنے لگی تھی۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ کل جو مسائی حبشی میرے ہاتھوں ہلاک ہوا وہ کون تھا اور یہاں کیسے موجود تھا۔

پروفیسر نے جواب دیا۔ "اس خوں خوار کتے کا نام سائمن تھا۔ مائیکل نے اسے یہاں صرف مجھے ہراساں کرنے

کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ صرف اشاروں کی زبان سمجھتا تھا اور صرف ارشاد کا حکم مانتا تھا۔ جنگلی ہونے کے باوجود وہ بے حد ذہین اور شاطر تھا۔ اس کی خطرناکی تم کل دیکھ ہی چکے ہو۔"

کل کی باتیں یاد کرکے پروفیسر کو ایک بار پھر جھرجھری سی آگئی۔ اس کا چہرہ غم واندوہ کی تصویر بن گیا۔

میں نے پوچھا "کیا یہ انہی تین سیاہ فاموں میں سے ایک تھا جنھوں نے ڈاکٹر "اس کی اہلیہ اور کمانڈو کو قتل کیا؟"

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں۔۔۔ لیکن اس جیسے کم وبیش دو اور درندے مائیکل کے پاس موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے زیادہ ہوں لیکن ارشاد نے مجھے یہی بتایا تھا کہ مائیکل کے پاس اس قسم کے تین بندے ہیں۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی ماریطانیہ سے یہاں لایا تھا۔"

میں نے پروفیسر سے کہا "کوئی اور خاص بات جو آپ اس سلسلے میں مجھے بتانا چاہتے ہوں؟"

پروفیسر آنسو پونچھتے ہوئے بولا "نہیں۔۔۔ جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا' میں نے بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "ارشاد احمد کے بارے میں کوئی بات؟"

"ارشاد احمد کا رویہ عجیب سا ہے۔ وہ جب مجھ سے ملتا ہے تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تمام ہمدردیاں میرے اور شائستہ کے ساتھ ہیں لیکن چونکہ وہ مائیکل کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے لہٰذا اس کی بات ماننے پر مجبور ہے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی آکر یہاں رہتا ہے' پچھلے دنوں بھی وہ چار پانچ روز یہاں آکر رہا تھا۔ کہتا تھا کہ یہاں سے جاکر بھی اس کا دل اسی گھر کے درودیوار میں اٹکا رہتا ہے۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن بات ہونٹوں میں ہی رہ گئی۔ کوٹھی میں رہائش پذیر غم زدہ بوڑھے باپ کی آواز قریبی راہداری میں گونج رہی تھی "مرجائے تو صبر آجاتا ہے۔۔۔ گم ہوجائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔ مرجائے تو صبر آجاتا ہے۔"

یہ آواز نہیں ایک نوحہ تھا جو دل ودماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ بچھڑے ہوؤں کا غم اس آواز میں یوں شامل تھا کہ سنتے ہی آنکھ نم ہوجاتی تھی۔ پروفیسر نے دو تین بار زیر لب "استغفراللہ" کہا۔ آواز پہلے قریب آئی پھر آہستہ آہستہ کوٹھی کے کسی اور حصے میں چلی گئی اور معدوم ہوگئی۔

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتائیں پروفیسر صاحب' ہم مائیکل نام کے اس افریقی سے مل کیسے سکتے ہیں؟"

"یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے۔" پروفیسر نے کہا "مجھے اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں۔ وہ جتنی بار مجھ سے ملا ہے خود ہی ملا ہے۔ ارشاد کو اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ میں نے ایک دوبار پوچھا بھی لیکن ارشاد نے نہیں بتایا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پولیس کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔ ارشاد کے علاوہ صرف ایک شخص کو معلوم ہے کہ مائیکل لاہور میں کہاں رہتا ہے اور یہ وہی شخص ہے جس نے تم پر کل "اے کے ۴۷" سے فائر کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر گن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس کا نام کاربین ہے۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ پروفیسر اللہ دتا اسی ریچھ نما شخص کی بات کررہا تھا جو اس سارے فساد کی جڑ تھا اور جس نے مجھے پروفیسر کے کلینک میں شناخت کیا تھا۔ پروفیسر نے اس کا نام کاربین بتایا تھا۔ کاربین کا نام سنتے ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ ریچھ نما آنکھیں کس کی ہیں اور یہ ریچھ کون ہے۔ واقعات کی ایک فلم سی ذہن میں چل گئی تھی۔ کاربین نامی اس خطرناک بدمعاش کا تعلق مرحوم جاگیردار قادر زماں سے تھا۔ اس شخص سے دو تین مرتبہ میرا معرکہ ہوچکا تھا۔ کاربین کو میں نے آخری مرتبہ کئی ماہ پہلے جاگیردار قادر زماں کی حویلی میں ہی دیکھا تھا۔ انہی دنوں حویلی میں قادر زماں قتل ہوگیا تھا اور پھر حویلی میں ہونے والے خوفناک بارودی دھماکوں نے حویلی کے ایک حصے کو جلا کر راکھ کردیا تھا۔ اب پروفیسر اللہ دتا مجھے کاربین کے متعلق بتا رہا تھا لیکن کاربین کی شکل تو میں بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

پروفیسر نے میری الجھن دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں' لیکن اس کا چہرہ؟"

"یہ چند ماہ پہلے جل گیا تھا۔ کراچی سے چہرے پر پلاسٹک سرجری کرائی ہے اس نے۔"

ایک دم واقعات کی کڑیاں مل گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ قادر زماں کی حویلی میں بھڑکنے والی شدید آگ میں کاربین زخمی ہوا ہوگا۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ اس آتشزدگی میں کاربین کا ایک بازو اور چہرے کا ایک رخ بری طرح جل گیا تھا۔ قادر زماں کے بھائی نے اس کا علاج معالجہ کرایا تھا اور پلاسٹک سرجری بھی کروائی تھی۔ اس سرجری نے کاربین کی شکل قریباً ستر فی صد بدل ڈالی تھی۔ اس کی شکل بدل گئی تھی لیکن چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھیں تو وہی تھیں۔ یہی آنکھیں تھیں جو میرے ذہن کو بار بار کچوکے لگاتی تھیں اور کچھ یاد دلاتی تھیں۔ آج پروفیسر کی زبان سے ادا ہونے والے صرف ایک فقرے نے ساری الجھن دور کردی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کمینہ

دشمن کاربین جاگیردار قادر زماں کی حویلی سے بردہ فروش ارشاد احمد تک کیسے پہنچا لیکن یہ بات بہرحال ثابت ہوچکی تھی کہ پروفیسر کے کلینک میں مجھے آواز سے پہچاننے والا اور ارشاد کو خبردار کرنے والا یہی کاربین تھا۔

پروفیسر نے کہا "یہ شخص ارشاد احمد کا ہرکارہ تھا۔ مائیکل اور ارشاد احمد نے میری نگرانی کے لیے اسے میرے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ یوں سمجھو کہ یہ چوبیس گھنٹے مجھ سے چپکا رہتا تھا۔"

"میرے خیال میں کل اسی نے مجھے پہچانا تھا۔"

"ہاں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میرا ملازم مجھے تمہارے پاس سے اٹھا کر باہر لے گیا تھا' تھوڑی دیر بعد ہم نے فلم اسٹار نوشین کو بھی باہر بلا لیا تھا۔ اسی وقت کاربین نے ہمیں بتایا تھا کہ اندر کمرے میں جو شخص خود کو پولیس کا انفارمر بتا رہا ہے اور اپنا نام احمد ظاہر کررہا ہے وہ درحقیقت شاہ جہاں المعروف بہ استاد جہانی ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے پروفیسر۔ کیا کاربین دوبارہ آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا؟"

"میرے خیال میں نہیں۔ وہ بے حد محتاط رہتا ہے۔ خاص طور سے رجب کی موت کے بعد سے تو وہ بے حد چوکنا ہے۔ اسے یقیناً معلوم ہوچکا ہوگا کہ اس کوٹھی کے گرد سادہ پوش پولیس موجود ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو وہ اب اس علاقے میں ہی نہیں پھٹکے گا۔"

میں نے کہا "میری رائے میں یہی بات اب مائیکل نامی اس افریقی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" پروفیسر نے تائید کی "اغوا شدہ افراد کی دو کھیپوں کا پکڑے جانا ہی چھوٹا صدمہ نہیں تھا۔ اوپر سے رجب بھی پولیس کی حراست میں ہلاک ہوگیا۔ مائیکل نامی وہ درندہ اب یقیناً سمجھ چکا ہے کہ پولیس پوری طاقت سے اس کے خلاف حرکت میں آگئی ہے۔ اب وہ کسی پناہ گاہ میں گھس کر بیٹھ گیا ہوگا۔"

"میں ایک نازک سوال آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' معلوم نہیں آپ جواب دینا پسند کریں گے یا نہیں۔"

پروفیسر نے حوصلہ افزائی کے انداز میں کہا "پوچھو بھی۔"

"آپ جانتے ہی ہیں کہ پولیس کارروائی کے بعد ارشاد احمد اپنے گھر سے غائب ہے۔ کیا آپ اس کی موجودہ "لوکیشن" کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرسکتے ہیں؟"

پروفیسر نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے اسے نازک سوال کیوں کہا؟"

"کچھ بھی ہے' ارشاد احمد آپ کا بھائی ہے۔"

پروفیسر نے بڑی نفرت سے انکار میں سر ہلایا "وہ جو کردار ادا کرچکا ہے اس کے بعد میں اسے اپنے ہاتھوں سے دس بار قتل کرنے کو تیار ہوں۔ وہ کیسا بھائی ہے جو ایک سال سے ایک بے رحم درندے کے ساتھ مل کر مجھے بدترین عذاب دے رہا ہے۔ اس کی سگی بھتیجی کو ایک سال سے خطرناک ڈاکوؤں نے یرغمال بنا رکھا ہے اور اسے آہستہ آہستہ مار رہے ہیں لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اگر میں اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو تمہیں بتانے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہ کرتا۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے سوال میں واقعی کچھ زیادہ وزن نہیں تھا۔ غالباً مایوسی کے عالم میں یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ پروفیسر نے دیر تک کھنکارنے کے بعد گلا صاف کیا اور بولا "میرا قیافہ تو یہی ہے کہ وہ بدبخت اپنے جنسی پارٹنر کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔۔۔ افریقی مائیکل کے پاس؟"

"بالکل۔۔۔ وہ اس کے دل ودماغ پر حاوی ہوچکا ہے۔ ایک شیطان کی طرح اس کے اندر گھس چکا ہے۔ اس نے ارشاد کو ایسی راہ پر لگایا ہے کہ وہ خود بھی پورا شیطان بن چکا ہے۔ ضرورت مندوں کو ان کی جمع پونجی سے محروم کرنا' غریب مسکین لڑکیوں کو بیرون ملک بھجوانے کا جھانسا دے کر ان کی عزتوں سے کھیلنا' ہنستے بستے گھروں کو برباد کرنا' یہ سب کچھ اس کے لیے روزمرہ کا معمول ہے۔"

میں اور پروفیسر دیر تک اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ پروفیسر حقیقتاً ایک نہایت دکھی شخص تھا۔ بے راہ رو بھائی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مائیکل نامی درندہ صفت غیر ملکی کے ہاتھوں اس بری طرح بلیک میل ہورہا تھا کہ تصور کرنا بھی محال تھا۔ آدم خور وحشیوں کے بارے میں صرف کہانیوں میں پڑھا اور سنا جاتا ہے لیکن پروفیسر نے ان درندوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی بربریت کا نظارہ کیا تھا۔ اب اس کی لاڈلی بیٹی انہی درندوں کے چنگل میں تھی اور یہ کوئی چند دنوں کی بات نہیں پورے ایک سال کا ماجرا تھا۔ اگر میں نے پروفیسر کی روداد دو چار روز پہلے سنی ہوتی تو شاید ان واقعات پر یقین کرنے میں مجھے دشواری ہوتی لیکن کل کوٹھی میں ہونے والے ہنگامے کے بعد میرے لیے شک شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

میں نے ساڑھے چھ فٹ لمبے اس خونی درندے کو اپنی گناہگار

آنکھوں سے دیکھا تھا جسے انسان کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی تھی۔ اس نے میرے سامنے ظلم اسٹار نوشین کے نازک جسم کو دانتوں سے بھنبھوڑا تھا اور اس سے پیشتر وہ نوشین کے ڈرائیور رمضان کا نرخرا ادھیڑ چکا تھا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو پھر یقیناً تھری پیس سوٹ والا وہ "انگلش وان" توم خور بھی سچ تھا جس کا تذکرہ ابھی پروفیسر نے مجھ سے کیا تھا لیکن انسانی لباس میں چھپا ہوا وہ درندہ کہاں تھا؟ اس وقت یہی سوال سب سے اہم تھا۔ بقول پروفیسر' صرف دو افراد اس کے ٹھکانے سے آگاہ تھے اور وہ دونوں غائب تھے۔ یعنی پروفیسر کا بھائی ارشاد احمد اور اس کا کارندہ ریکھ نما کارین۔

میری زخمی آنکھ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے ایک ہاتھ سے آنکھ کو دبایا' دوسری آنکھ سے پروفیسر کو دیکھا۔ ایک دم مجھے پروفیسر کے چہرے پر چونکنے کے آثار نظر آئے۔ اسے کچھ یاد آیا تھا' وہ بولا "شاہ جہاں! تم اپنے ایک دوست کے ساتھ چند روز پہلے میرے کلینک آئے تھے۔ تم نے مجھ سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھا تھا' وہ کوئی لیڈی ڈاکٹر تھی' اس کا نام غزالہ تھا اور اس کے ساتھ "محمد تابی" نام کا کوئی بچہ بھی تھا۔"

میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہاں ہم آئے تھے۔

پروفیسر اللہ دتا نے کہا "تم میری مجبوریاں جان ہی چکے ہو۔ میں نے مجبوری کے تحت اس وقت تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں اس لڑکی کے بارے میں جانتا ہوں۔"

میرا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔ میں سراپا سماعت پروفیسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ بولا "غزالہ نام کی وہ لیڈی ڈاکٹر اپنے بچے کے ساتھ دو تین دفعہ میرے پاس آئی تھی۔ وہ بچے کی بیماری کے سلسلے میں کافی مایوس نظر آتی تھی۔ پہلے خود اس کا علاج کرتی رہی تھی' پھر کئی اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کو دکھایا تھا۔ تمام ٹیسٹ وغیرہ بھی صحیح تھے لیکن بچے کا بخار اترنے میں نہیں آتا تھا۔ دو تین روز بخار ہوتا تھا پھر ایک روز کا وقفہ پڑ جاتا تھا' اس طرح لیکن مسلسل بخار نے بچے کو ادھ موا کر چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ٹیسٹ رپورٹس اور ایکسریز وغیرہ کا پورا پلندہ لے کر آئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ سب کچھ صحیح ہے لیکن بچہ صحیح نہیں ہے' میں نے اسے تسلی دی کہ بچہ بھی صحیح ہو جائے گا۔ میری تسلی تشفی پر وہ آبدیدہ ہو گئی۔ اس قسم کے ایک دو مریضوں سے میرا پہلے بھی پالا پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی فارمیسی کی دو دوائیں دیں اور کہا کہ وہ چند روز بعد بچے کو دوبارہ دکھائے۔

اگلی مرتبہ وہ آئی تو قدرے مطمئن تھی۔ اس نے بتایا کہ بہتری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔۔۔ لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ میرے کلینک میں آ کر وہ کتنی بڑی مصیبت کا شکار ہو گئی ہے۔"

ایک بار پھر پروفیسر اللہ دتا کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ وہ آہ بھر کر بولا "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مائیکل اور ارشاد احمد کا کارندہ کارین سائے کی طرح میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ وہ کلینک میں بھی میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میری نگرانی کے علاوہ اس کا ایک کام یہ بھی ہوتا تھا کہ میرے مریضوں میں سے مناسب شکار کا انتخاب کرے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ارشاد احمد خود بھی کلینک آتا تھا اور ایسے لوگوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا جو اس کے "مقصد" میں کام آ سکتے تھے۔ اتفاق سے جس دن وہ لیڈی ڈاکٹر غزالہ کلینک میں آئی' ارشاد احمد خود بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا اور منتخب کر لیا۔ کارین کے ذریعے اس نے مجھے لیڈی ڈاکٹر کے بارے میں ہدایت جاری کر دی۔ اس ہدایت کے مطابق مجھے لڑکی کو بچے کے علاج کے لیے بیرون ملک بھجوانے کا جھانسا دینا تھا' اور اس کام کے لیے لڑکی کو ارشاد احمد کے پاس بھیجنا تھا۔ میں نے کارین کو بتایا کہ یہ کوئی عام لڑکی نہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ یہ لوگ اثر و رسوخ رکھتے ہیں' اگر انہوں نے بچے کو باہر لے جانا ہو گا تو از خود لے جائیں گے۔

"کارین نے میرا پیغام ارشاد تک پہنچا دیا۔ وہ خبیث اگلے روز خود میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "مائیکل اس لڑکی کو ہر صورت اپنی اگلی کھیپ میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ سمجھو کہ وہ "آرڈر" کا مال ہے۔ اگر یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو پھر ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا پڑے گا۔"

"میں نے کہا کہ اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔ لڑکی دو دفعہ میرے کلینک میں آئی تھی۔ تیسری مرتبہ وہ دو ہفتے کے بعد آئی۔ اتفاقاً اس وقت دو تین بڑے اہم لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں لڑکی سے تفصیلی بات نہ کر سکا۔ اس کے بعد ارشاد احمد چند روز کے لیے اسلام آباد چلا گیا۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جب وہ واپس آیا تو دوسرے تیسرے روز سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ رجب پولیس مقابلے میں ہلاک ہوا۔ اس کے گھر سے کارین کا اسکوٹر برآمد ہوا اور یوں ارشاد کو افراتفری میں روپوش ہونا پڑ گیا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ غزالہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"نہیں۔ پھر نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا "میں اس لڑکی سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر اللہ دتا نے پوچھا "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"وہ میرے سگے چچا کی بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل سے میں پھر کبھی بتاؤں گا' فی الحال میں جلد سے جلد اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"اللہ کرے وہ ابھی تک سلامتی سے ہو۔" پروفیسر نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور جلدی سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نیلی جلد والی ایک ڈائری تھی۔ اس ڈائری میں بہت سے مریضوں کے نام پتے لکھے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے کہا "جب چند روز پہلے تم کلینک آئے تھے تو تم نے میرے رجسٹر میں غزالہ یا اس کے بچے کا نام ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ یہ نام رجسٹر میں نہیں ملے تھے۔ یہ نام دراصل اس ڈائری میں تھے۔ جن لوگوں پر ارشاد کی نظر بد پڑ جاتی تھی' مجھے ان کے نام علیحدہ سے لکھنے پڑتے تھے۔ اس کام کے لیے یہی منحوس ڈائری استعمال ہوتی تھی۔"

پروفیسر اللہ دتا نے جلدی جلدی ڈائری کی ورق گردانی کی اور ایک صفحے پر انگلی رکھ دی۔ یہاں غزالہ کا نام' مریض بچے محمد تابی کا نام اور غزالہ کا مکمل پتا لکھا تھا۔ یہ پتا میرے لیے ایک بہت بڑے انکشاف سے کم نہیں تھا۔ لکھا تھا "معرفت سید اکبر علی۔ ذیشان پارک' اسٹریٹ نمبر8' ہاؤس نمبر2' صدر لاہور۔"

○☆○

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اور صفدر ذیشان پارک کی اسٹریٹ نمبر8 میں کھڑے تھے۔ ہم دونوں ایک سوزوکی کار میں تھے۔ یہ کار میرے لاہوریے دوست عالم قریشی نے مہیا کی تھی۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مکان نمبر2 ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گیٹ پر سید اکبر علی کی نیم پلیٹ بھی دور سے نظر آ رہی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس گیٹ کے پیچھے اور ان دیواروں کے عقب میں وہ ہستی بھی موجود ہے یا نہیں جسے ہم پچھلے کئی ہفتوں سے دیوانہ وار ڈھونڈ رہے ہیں۔ ذہن میں ان گنت اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ مائیکل' ارشاد احمد اور کارین جیسے خطرناک لوگوں کی موجودگی میں غزالہ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اب تک اس مکان سے لاپتا ہو چکی ہو اور کسی چار دیواری میں مجبور و بے بس پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کا دشمن اول شیخ عاصم ہی اس تک پہنچ گیا ہو اور ایک ظالم شوہر کی طرح اسے گھسیٹ کر واپس امارات لے گیا ہو۔ غرض ان گنت اندیشے تھے جو بڑے بڑے منہ پھاڑے میرے چاروں طرف گردش کر رہے تھے اور میں مکان نمبر دو کے سفید گیٹ کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ ہم عالم قریشی کے ایک ملازم کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے یا صفدر نے جا کر کال بیل بجائی تو ہو سکتا ہے کہ غزالہ باہر آنے سے انکار کر دے بلکہ یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ گھر کے کسی عقبی دروازے سے نکل جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں لہٰذا پروگرام کے مطابق عالم قریشی کے ملازم کو جا کر بیل دینا تھی اور باہر آنے والے کو یہ بتانا تھا کہ وہ پروفیسر اللہ دتا کے کلینک سے آیا ہے اور مسز غزالہ سے ملنا چاہتا ہے۔ ایک بار غزالہ دروازے پر آ جاتی تو پھر میں اور صفدر اس کے سامنے آ سکتے تھے۔

ہم نے سوزوکی کار اس انداز سے کھڑی کی کہ عقب نما آئینے میں مکان نمبر دو کا گیٹ نظر آتا رہے۔ ملازم اتر کر گیٹ کی طرف گیا۔ ہم نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔ ذیشان پارک صدر کا ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ اسٹریٹ کے سامنے ایک کشادہ بازار تھا۔ رکشا ٹیکسی تانگا ہر قسم کی سواری یہاں موجود تھی۔ مکان دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں متوسط طبقہ رہائش پذیر ہے۔

کال بیل کی آواز پر ایک ادھیڑ عمر خاتون گیٹ پر نظر آئی اور ملازم سے باتیں کرنے لگی۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ اچانک صفدر نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میں نے چونک کر پہلے صفدر کی طرف اور پھر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا۔ حسیات سمٹ کر آنکھوں میں جمع ہو گئیں۔ چند لمحوں کے لیے جیسے گردش دوراں تھم گئی تھی۔ سامنے سے غزالہ آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت بچہ گاڑی تھی جسے وہ دھکیلتے ہوئے لا رہی تھی۔ غزالہ نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور ساکت و جامد کھڑی ہو گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ پلٹے گی اور شاید بھاگ جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں خوف' حیرت اور اندیشے ایک ساتھ نظر آئے تھے۔ وہ تھرا سی گئی تھی۔ میں اور صفدر تیزی سے باہر نکلے اور غزالہ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" صفدر نے کانپتی آواز میں کہا۔

جواب میں غزالہ خاموش رہی۔ اس کے ہونٹ بس تھرا کر رہ گئے تھے۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "غزالہ بہت دکھ دیا

ہے تم نے۔ تمہیں معلوم نہیں ہم تمہارے لیے کہاں کہاں خوار ہوئے ہیں۔"

اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ بچہ گاڑی کی ہتھی کو اس نے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اتنی مضبوطی سے کہ اس کے ہاتھوں کی جلد کھچ سی گئی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں عجیب انداز سے بولی "پلیز... پلیز آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مت تلاش کریں مجھے۔"

وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ صفدر آگے بڑھ کر بولا "غزالہ! یہ کیا بات کہہ رہی ہو تم۔ تمہیں معلوم نہیں کتنے خطرات میں ہو تم۔"

"میں اب عادی ہو چکی ہوں خطروں کی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" وہ عجیب بے رخی کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں اور صفدر منہ دیکھتے رہ گئے۔ پھر میں ہمت کر کے تیزی سے غزالہ کے پیچھے گیا "غزالہ!" میں نے ذرا تحت آواز میں کہا "تم کالجیٹ لڑکیوں کی طرح BEHAVE مت کرو۔ یہاں لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ہم کہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ ہم کتنی مشکلوں سے تم تک پہنچے ہیں۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" اس نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"تمہیں سننا پڑے گا۔ اپنی سلامتی کے لیے اس بچے کی سلامتی کے لیے۔"

اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ اس نے فیروزی چادر سے اپنا منہ ڈھانپا۔ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ تب ایک بار پھر آگے بڑھ گئی۔ گھر کا مین گیٹ کھلا تھا۔ وہ بچہ گاڑی دھکیلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ادھیڑ عمر عورت حیرت سے ہمیں دیکھتی رہی، پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

میری طرح صفدر بھی الجھن میں تھا' تاہم میری طرح اس کی آنکھوں میں بھی امید کی کرن موجود تھی اور امید یہ تھی کہ شاید غزالہ اندر جا کر سوچے اور اپنا رویہ تبدیل کر لے۔ میں' صفدر اور ملازم گاڑی کے قریب کھڑے رہے۔ ہر سیکنڈ گھنٹے کی سست رفتاری سے حرکت کر رہا تھا' پھر میرے ذہن میں یہ خدشہ جاگا کہ کہیں غزالہ گھر کے کسی عقبی دروازے سے یا چھت کے ذریعے اس چاردیواری سے نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اچانک دیکھ کر اتنی ہراساں نظر آئی تھی کہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے عالم تشویش کے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ مکان کی عقبی سمت میں چلا جائے۔ وہ میری ہدایات کے مطابق چلا گیا۔ میں اور صفدر وہیں کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ آخر ہمیں کیا کرنا ہے۔ اچانک مکان کا چھوٹا دروازہ کھلا اور ایک دبلے پتلے ملازم نما شخص کی صورت نظر آئی۔ شکل اور حلیے سے وہ نکھٹو ٹائپ نظر آتا تھا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا اور شائستگی سے بولا "آئیے اندر تشریف لے آئیے۔"

"اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔" ہم نے فوراً گاڑی لاک کی اور اپنے میزبان کے ساتھ اندر چلے گئے۔ چھوٹے سے صحن سے گزر کر ہم ایک ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ڈرائنگ روم مختصر تھا تاہم سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ہم صوفے پر گم صم بیٹھ گئے اور غزالہ کا انتظار کرنے لگے۔ آنکھ کے زخم کی وجہ سے میں نے تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ ڈرائنگ روم میں روشنی تھی مگر پھر بھی عینک کے سبب سے تاریکی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر غزالہ کی صورت نظر آئی۔ وہ پھول دار شلوار قمیص میں تھی۔ سر پر چادر تھی' وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر اندوہ کی پرچھائیاں تھیں۔

میں نے کہا "غزالہ! میں پچھلی باتوں کو چھیڑنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ ابو ظہبی میں تم اچانک ہمیں کیوں چھوڑ گئی تھیں۔ اب تک کہاں رہیں اور پاکستان کیونکر پہنچی ہو؟ تم ہر لحاظ سے اپنی مرضی کی مالک ہو۔ اگر بتانا چاہو تو تمہاری صوابدید ہے۔ نہ بتانا چاہو تو ہم مجبور نہیں کر سکتے۔ فی الوقت میں اور صفدر صرف اس لیے یہاں پہنچے ہیں کہ تمہیں ایک شدید خطرے سے آگاہ کر سکیں اور یہ خطرہ کوئی اندیشہ نہیں ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اگر ہم پر بھروسا نہیں تو پروفیسر اللہ دتا بھی اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

پروفیسر کے نام پر غزالہ چونکی "آپ کو میرا پتا پروفیسر سے ملا ہے؟"

"ہاں۔" صفدر نے کہا "اور شکر کا مقام ہے کہ مل گیا ہے۔"

اس کے بعد صفدر نے شروع سے آخر تک ساری کہانی غزالہ کے گوش گزار کر دی۔ وہ حیرت زدہ سی سنتی رہی۔ کبھی اس کا چہرہ زرد ہو جاتا' کبھی وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی۔ پروفیسر کے بھائی ارشاد اور رجب کے بارے میں وہ کچھ اخبارات میں خبریں دیکھ چکی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ پروفیسر کا بھائی ارشاد ایک گھاگ بردہ فروش ہے۔ یہ بات جان کر کہ یہ گھاگ بردہ فروش پروفیسر اللہ دتا کو بلیک میل کرنے میں مصروف تھا اور پروفیسر کے ذریعے وہ بے شمار شکار

پھانس کر ان کے پیسے کھرے کر چکا ہے' غزالہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

صفدر نے کہا "غزالہ! جس روز تم پہلی مرتبہ پروفیسر کے کلینک پر گئیں وہاں اتفاقاً ارشاد احمد موجود تھا۔ اس کی بد نگاہ تم پر پڑی اور اس نے پروفیسر کو حکم جاری کر دیا کہ اس لڑکی کو ہر صورت میں پھانسا جائے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی تمہارے لیے بہتری کی شکل نکل آئی۔ ایک بردہ فروش رجب پکڑا گیا اور نتیجے میں پولیس ارشاد احمد کے پیچھے بھی لگ گئی لیکن پروفیسر کا کہنا ہے کہ تم اب بھی خطرے میں ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ اب ارشاد احمد یا اس کے کارندے کسی اور طریقے سے تم تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ بقول پروفیسر' وہ ایک بار جس کے پیچھے لگتے ہیں اسے مشکل سے ہی چھوڑتے ہیں۔ اگر ریکروٹنگ ایجنسی کے ذریعے شکار قابو میں نہ آئے تو پھر اسے اغوا بھی کر لیا جاتا ہے۔ وہ لوگ بہ آسانی اس چاردیواری تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"لیکن کس طرح؟" غزالہ نے پوچھا۔

"جس طرح ہم پہنچے ہیں۔" میں نے جواب دیا "تمہارا ایڈریس پروفیسر کی پرائیویٹ ڈائری میں درج ہے اور یہ ڈائری ارشاد کے لیے بھی اتنی ہی پرائیویٹ تھی۔ پروفیسر نے بتایا ہے کہ ارشاد اس ڈائری کے ہر اندراج سے آگاہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے پاس تمہارا ایڈریس بھی موجود ہو۔"

غزالہ کے چہرے پر پریشانی نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اور صفدر غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے وعدے کے مطابق غزالہ سے کوئی غیر متعلقہ بات نہیں کی۔ نہ یہ پوچھا کہ وہ ابو ظہبی میں ہمیں ایک دم چکما دے کر کیوں نکل گئی تھی۔ نہ اس خط کے بارے میں کوئی بات کی جو وہ جاتے جاتے کار میں چھوڑ گئی تھی۔ نہ ان مشکلات کا ذکر کیا جو ہم اب تک اس کی تلاش کے سلسلے میں اٹھاتے رہے تھے۔ اس کے موجودہ حالات کا ذکر بھی ہم نے نہیں چھیڑا... کہ وہ لاہور کیونکر پہنچی ہے۔ چچا چچی کو اس کی یہاں موجودگی کا علم ہے یا نہیں۔ وہ یہاں کس کے مکان میں اور کس حیثیت سے رہ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ صرف بچے محمد تابی کی خیر خیریت ہم نے دریافت کی اور اس کی صحت کی تازہ ترین صورت حال کے متعلق پوچھا۔

غزالہ نے بتایا "تابی اب کافی بہتر ہے۔ بخار میں شدت نہیں رہی اور وقفہ بھی طویل ہو گیا ہے۔ میں اسے کل پروفیسر کے پاس لے جانے کا سوچ رہی تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں اب وہاں جانے کا۔" میں نے کہا "پروفیسر کا کلینک بند پڑا ہے اور پتا نہیں کب تک بند پڑا رہے۔ پروفیسر صاحب پولیس کی تحویل میں ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مختلف جرائم کے سلسلے میں انہیں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔"

غزالہ کی پیشانی پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ دیر تک اپنے پاؤں کی انگلیوں کو گھورتی رہی پھر بولی "آپ دونوں کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے ایک سنگین خطرے سے آگاہ کیا۔ میں آج ہی اس کا سدباب کرتی ہوں۔ ممکن ہے کہ میں یہ گھر چھوڑ جاؤں۔ لاہور ہی میں میری ایک دوست کئی مرتبہ مجھے اپنے پاس آنے کا کہہ چکی ہے۔ میرے خیال میں اب میرے لیے اس کا گھر مناسب ٹھکانا رہے گا۔"

"لیکن اگر ہم تمہیں اس طرح بے سہارا نہ چھوڑنا چاہیں تو؟" صفدر نے کہا۔

"بے سہارا سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" وہ بدستور غیرت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم ایک تنہا عورت ہو اور بہت سے خطروں میں گھری ہوئی ہو۔ ان میں سے ایک بڑا بلکہ بہت بڑا خطرہ خود تمہارا شوہر ہے۔ وہ تمہیں ڈھونڈنے اور عبرت نگاہ بنانے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا ہے۔ غزالہ! شیخ عاصم سے بغاوت کر کے تم نے ایک بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ بے شک یہ قدم اٹھانے میں تم نے بہت تاخیر کی ہے پھر بھی تمہاری جرأت اور دلیری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے مگر اب دلیری کے ساتھ ساتھ عقل مندی کی ضرورت بھی ہے۔ تم تنہا بہت دیر تک شیخ عاصم کی بدخواہی کی مزاحمت نہیں کر سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں سچے دوستوں اور مخلص ساتھیوں کی ضرورت ہے۔"

صفدر دیر تک غزالہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ سنتی رہی۔ کبھی اس کے چہرے پر شدید اضطراب نظر آتا' کبھی وہ غم کی تصویر بن جاتی۔ اس طویل گفتگو میں غزالہ نے بس ایک جملہ چند بار ادا کیا "میں گزری باتوں کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔ میں ہر ایک سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔"

صفدر جب تھکا تھکا نظر آنے لگا تو میں نے ایک اور زاویے سے بات کی۔ میں نے کہا "دیکھو غزالہ! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم اپنی مرضی کی خود مالک ہو۔ ہم تمہیں کسی بھی بات پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن یہ پروفیسر اللہ دتا والا معاملہ ایسا نہیں جسے تم آسانی سے نظر انداز کر دو۔ بے شک تم ان خطرات کو اہمیت مت دو جو تمہاری ذات اور بچے کی ذات کو

لاحق ہیں لیکن ان خطرات کو تو اہمیت دو جو بے شمار معصوم اور بے گناہ لوگوں کو لاحق ہیں۔ اگر اس گینگ کے سرغنہ ارشاد احمد اور افریقی مائیکل پکڑے نہیں جاتے تو سوچو کہ کتنے لوگوں کی آزادی اور زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ یہاں سے رفوچکر ہو جائیں، کسی اور شہر یا پھر کسی اور ملک کا رخ کرلیں۔ وہاں بھی تابی جیسے معصوم بچے ہوں گے اور راجی جیسی ضرورت مند لڑکیاں ہوں گی۔ یہ لوگ ان شکاریوں کے جال میں پھنسیں گے اور زندگی بھر کے لیے سسک سسک کر جینے پر مجبور ہوں گے۔ تمہیں اور ہم سب کو اس گینگ کے مکمل خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور میں سمجھتا ہوں غزالہ! کہ اس وقت تم ہماری واحد امید ہو۔"

"وہ کس طرح؟" وہ ذرا دبی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میری تقریر دل پذیر نے اس پر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت اثر ضرور کیا ہے۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "رجب مر چکا ہے، ارشاد احمد لاپتا ہے اور کارین بھی غائب ہے ان تینوں کے سوا کوئی بھی مائیکل کے اتے پتے سے آگاہ نہیں۔ اگر کوئی ہے بھی تو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس وقت مکمل اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ اگر اس وقت امید کی کوئی مدھم سی کرن ہے تو وہ یہ ہے کہ ارشاد احمد جو ہر صورت تمہیں اپنی تازہ کھیپ میں شامل کرنا چاہ رہا تھا، تم تک پہنچے اور پولیس کے شکنجے میں جکڑا جائے۔"

غزالہ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کئی سیکنڈ بعد اس کے ہونٹوں نے حرکت کی "پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں ایک نہایت اچھے کاز کے لیے تھوڑی سی قربانی دینا ہوگی۔ تمہیں یہ گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت امکان اس بات کا ضرور ہے کہ ارشاد احمد خود یا اس کا کوئی کارندہ تم تک رسائی کی کوشش کرے۔ ساہی صاحب کے تعاون سے ہم اس مکان کے ارد گرد پولیس کے سادہ پوش متعین کردیں گے۔ وہ چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میں اپنی ذات کے لیے ہر خطرہ مول لے سکتی ہوں لیکن تابی۔۔۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو؟"

"کچھ نہیں ہوگا غزالہ۔۔۔ نہ اسے نہ تمہیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "جیسے ہم پہلے بہت سی آزمائشوں میں سرخ رُو ہوئے ہیں، انشاء اللہ اس آزمائش میں بھی ہوں گے۔"

غزالہ خاموش رہی۔ یہ خاموشی اس بات کی علامت تھی کہ وہ نیم رضامند ہے۔ ہم سے بے تحاشا اختلاف رکھنے کے باوجود وہ ارشاد احمد والے معاملے میں ہم سے اختلاف نہیں کر پا رہی تھی۔ پوری روداد سننے کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس کی تھوڑی سی قربانی بہت سے بے گناہوں کی زندگیاں اجیرن ہونے سے بچا سکتی ہے۔

میں اور صفدر قریباً دو گھنٹے غزالہ کے پاس بیٹھے۔ اس دوران میں ہم نے چائے بھی پی۔ غزالہ اپنی ایک پرانی ٹیچر کے ہاں قیام پذیر تھی۔ ان کا نام سیدہ مہرالنساء تھا۔ وہ غزالہ کو بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں (غزالہ کی اس طرح کی ایک استاد مسز رقیہ بھی تھیں جن کے کلینک میں، میں زیر علاج رہا تھا) ہم نے معصوم صورت "تابی" کو بھی دیکھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور نظر آرہا تھا لیکن غزالہ نے بتایا کہ اب وہ بہت بہتر ہے۔ غزالہ کے ساتھ بچے کی ایسوسی ایشن بالکل "ماں اور بچے" جیسی تھی۔ وہ جتنی دیر ہمارے سامنے رہا، غزالہ سے چمٹ کر بیٹھا رہا اور گاہے گاہے بڑے پیارے انداز میں اس کے رخسار پر بوسہ دیتا رہا۔ میں نے بھی اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ انتخاب میری سیاہ عینک پر چلی گئی۔ وہ عینک اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور آخر کامیاب رہا۔ میری آنکھ کی چوٹ نے غزالہ کو چونکا دیا۔ بے اختیار اس کے ہونٹ تھرائے۔ وہ آنکھ کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید ہمت ہی نہیں ہو سکی تھی۔ غزالہ سے کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ صفدر نے ہمت کر کے شیخ عاصم کا ذکر بھی چھیڑا لیکن غزالہ اس بارے میں کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی کتاب میں سے شیخ عاصم کا ورق پھاڑ چکی ہے۔ مگر اس ورق کے پھٹنے سے شاید ایک اور ورق بھی زندگی کی کتاب سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ اس دوسرے ورق پر کیا کچھ لکھا تھا یہ صرف غزالہ ہی کو معلوم تھا۔ شام سے کچھ پہلے جب ہم غزالہ سے رخصت ہوئے تو ہم تینوں میں کافی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ غزالہ، ارشاد احمد تک پہنچنے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون پر تیار تھی۔

اگلے تین روز بڑی بے یقینی کی کیفیت میں گزرے۔ غزالہ کی قیام گاہ کے ارد گرد سفید پوش پولیس اہلکار متعین کر دیے گئے تھے۔ یہ اے ایس آئی اور سب انسپکٹر رینک کے اہلکار تھے۔ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور

اے ایس آئی گھر کے سامنے متعین تھے۔ سب انسپکٹر نے ٹروٹ کی ریڑھی لگا رکھی تھی۔ جبکہ اے ایس آئی بھک منگے کے حلیے میں تھا اور گھر کے عین سامنے فٹ پاتھ پر فالج زدہ شخص کے روپ میں بیٹھا تھا۔ ایک اہلکار بازار میں تعینات تھا جبکہ دو اے ایس آئی مکان کی عقبی گلیوں میں خوانچہ فروشوں کی حیثیت سے چکراتے رہتے تھے۔ یہ بڑے گھاگ قسم کے اہلکار "ریکی" کے ماہر تھے۔

دوسری طرف میں اور صفدر اپنے طور پر بھی کارین اور ارشاد احمد کا کھوج لگانے کی سعی کر رہے تھے۔ ساہی صاحب کا ایک تجربہ کار انسپکٹر خورشید شاہ ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ساہی صاحب خود بھی اس معاملے میں بہت پُرجوش تھے۔ انہوں نے مجھے ایک غیر ملکی میگزین میں چھپنے والا آرٹیکل دکھایا تھا۔ اس آرٹیکل کا عنوان تھا "غلامی آج بھی موجود ہے" اس مضمون میں واضح ثبوتوں کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک میں آج بھی انسانوں کی خرید فروخت جاری ہے۔ آج بھی غلاموں اور کنیزوں کے لیے سرعام نیلامی ہوتی ہے اور بولیاں دی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں SLAVERY کی وہ مختلف اقسام بتائی گئی تھیں جو موجودہ دور میں رائج ہیں اور ان پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ افریقہ، مڈل ایسٹ اور یورپ میں کون کون سے ممالک ہیں جہاں بردہ فروشی اور غلامی مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ ایک جگہ مضمون نگار نے لکھا تھا "اور تو اور انسانی حقوق کے ایک بہت بڑے علم بردار ملک برطانیہ میں بھی SLAVERY موجود ہے اور اقوام متحدہ کی ناک کے عین نیچے اس کی قراردادوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔" مضمون نگار نے ثبوتوں کے ساتھ بتایا تھا کہ آج بھی بہت سے انگریز لارڈز کے محلات میں ایشین اور افریقی مرد و زن غلاموں کی صورت میں موجود ہیں۔ بعض امرا اچھی نسل کے گھوڑوں کی طرح اچھی نسل کے غلاموں کے حصول کے لیے بھی سخت کوشش کرتے ہیں۔

مضمون میں جنوبی ایشیا کے کئی ایسے پس ماندہ ممالک کا ذکر کیا گیا تھا جہاں سے غلاموں کی کھیپیں ترقی یافتہ اور دولت مند ملکوں میں پہنچائی جاتی ہیں۔ اب اس گھناؤنے دھندے کے آثار ہمیں اپنے ارد گرد بھی نظر آئے تھے۔ اس معاملے کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ ساہی صاحب بھی اس بات کو پوری پوری اہمیت دے رہے تھے۔

ہم نے ارشاد احمد کے ملنے جلنے والوں سے پوچھ گچھ کی پھر بھکر میں جھوک ضامن کا دورہ کیا اور کارین کے اہل خانہ سے تفتیش کی۔ بعد ازاں لاہور اور بھکر میں چار پانچ جگہوں پر چھاپے بھی مارے گئے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ ارشاد احمد اور افریقی مائیکل سے وابستہ تمام افراد زیر زمین چلے گئے ہیں۔ میرا لاہوریا دوست عالم قریشی بھی اس سلسلے میں سرگرم تھا، اس نے لاہور کے تمام بہترین ہوٹلوں میں "کھانے کھائے" اور مائیکل کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے صرف اور صرف اتنا سراغ ملا کہ چند روز پہلے ایک دراز قد جسیم حبشی نے ہوٹل میں لنچ اور ڈنر کیا تھا، اس کے ساتھ ایک مقامی شخص تھا اور وہ لوگ کئی گھنٹے مسلسل گفتگو میں مصروف رہے تھے۔ مقامی شخص کا جو حلیہ معلوم ہوا اس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ارشاد احمد ہوگا۔

بردہ فروش رجب کی کوٹھی سے برآمد ہونے والی دونوں خوب رو لڑکیوں کی بھنک اخبار نویسوں کو بھی پڑ گئی تھی۔ ہر روز لڑکیوں کے بارے میں کوئی چھوٹی بڑی خبر شائع ہو جاتی تھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی کہ گہری براؤن آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں والے افراد شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں اور ان دونوں خصوصیات کی حامل یہ لڑکیاں 'بردہ فروش' "آرڈر کے مال" کی حیثیت سے اسمگل کر رہے تھے۔ بردہ فروشوں کے نزدیک یہ دونوں لڑکیاں نایاب جانوروں کی جوڑی کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے، میں پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں اس کے ساتھ موجود تھا۔ پروفیسر بے حد پریشان تھا۔ اس کی پریشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ اس کی لاڈلی بچی وحشت زدہ لوگوں کے قبضے میں تھی اور ان لوگوں کا اب کچھ پتا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ قانون کے خوف سے وہ لوگ بیرون ملک فرار ہو چکے ہوں، ایسے میں وہ SHELTER کے طور پر اس کی بچی کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ پولیس کارروائیوں کے جواب میں وہ لوگ لڑکی کو جان سے ہی مار ڈالیں۔ ان کے ذہنوں میں بجا طور پر یہ شبہ بیٹھ سکتا تھا کہ ان کے خلاف قانون کے حرکت میں آنے کی وجہ پروفیسر اللہ دتا ہے۔ میں پروفیسر کو مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ میں نے کہا "پروفیسر! آپ مذہبی آدمی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خدا نے موت کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موت ہر پل زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ آپ خدا سے دعا کریں اور اس امر پر یقین رکھیں کہ

مارنے والے کے مقابلے میں بچانے والا بہت طاقت ور ہے۔ آپ نے قانون کا ساتھ دے کر ایک بہت بڑا کام کیا ہے' میرا دل گواہی دیتا ہے' قدرت آپ کو اس اچھے کام کا صلہ ضرور دے گی۔"

میری گفتگو کے دوران میں مسیحا صفت پروفیسر کی انگلیاں مسلسل تسبیح پر گردش کرتی رہی تھیں۔ پروفیسر میرے اس تصور سے بالکل مختلف نکلا تھا جو میں نے شروع میں اس کے متعلق قائم کیا تھا۔ شروع میں میں نے اسے کوئی میٹرک پاس قسم کا عطائی ڈاکٹر سمجھا تھا' جو اپنی چرب زبانی اور عیاری سے لوگوں کو بے وقوف بنا رہا تھا' پروفیسر سے ایک بار ملنے کے بعد بھی میری رائے میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن جب ملاقاتیں شروع ہوئی تھیں تو آہستہ آہستہ پروفیسر کی نہایت سنجیدہ' متین اور گہری شخصیت سامنے آنے لگی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ تعلیم یافتہ تھا بلکہ اس کے پاس اپنے پیشے کے لیے خداداد صلاحیتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کیمسٹری سے اسے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور وہ اپنی اس کوالی فیکیشن کو ادویہ سازی کے کام میں بڑے اچھے طریقے سے استعمال کرتا تھا۔ تاہم علاج معالجے اور ادویہ سازی کے حوالے سے وہ صرف اپنی سائنٹیفک اپروچ پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا' اس کے ہنر میں ایک خاص قسم کی روحانیت بھی موجود تھی۔ میں نے اس کی فارمیسی میں مٹی جیسے ایک باریک سفوف کے کئی تھیلے دیکھے تھے۔ اس سفوف کے کئی رنگ تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا اپنی تیار کردہ بیشتر ادویات میں یہ سفوف استعمال کرتا ہے۔

میں اور پروفیسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب اچانک صفدر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! باہر چلیں۔ ایک بڑی مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو باہر جا کر آپ کو خود دیکھنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ پریشان تو تھا مگر پریشانی میں دبی دبی مسکراہٹ بھی تھی۔

میں اٹھ کر باہر پورچ میں آیا۔ یہاں وہی سوزوکی کار کھڑی تھی جس پر تین روز پہلے میں اور صفدر غزالہ کی رہائش گاہ پر پہنچے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا' گاڑی کی پچھلی نشست پر زریں گل نظر آ رہا تھا لیکن ایسی حالت میں کہ اسے دیکھ کر ہنسی روکنا مشکل تھا۔ کوئی شخص اس کی کمر پر سوار تھا اور بازو اس کی گردن میں حمائل کر رکھے تھے۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ پیرِ فرتوت شاہ جنات کا مشیرِ خاص سائیں عالی تھا۔

میں بری طرح چونک گیا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ آفت کا پرکالا جب بھی ٹپکے گا' بالکل اچانک ہی ٹپکے گا لیکن پھر بھی اسے اچانک زریں کے سر پر سوار دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

وہ بولا "ہم ہوٹل سے نکل کر گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ اچانک بھیڑ میں سے بندر کی طرح اچھلا اور زریں گل سے چمٹ گیا۔ زریں ایک دم گھبرا گیا۔ شاید اگر میں نہ ہوتا تو وہ سائیں عالی سمیت کسی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آ جاتا۔ میں نے مشکل سے اسے سنبھالا اور سائیں کو نیچے اتارنے کی کوشش کی مگر وہ ایک ہی تکرار کیے جا رہا تھا "چل چل گھوڑے شفیع محمد کے پاس چل۔ چل چل گھوڑے۔" وہاں ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ میں نے تماشا بننے سے بہتر سمجھا کہ زریں اور سائیں عالی سمیت گاڑی میں گھس جاؤں۔ کچھ آگے جا کر میں نے گاڑی روکی اور دوبارہ کوشش کی کہ سائیں کو زریں کی گردن سے اتار سکوں لیکن ناکامی ہوئی۔ مجبوراً ہم یہاں آ گئے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ زریں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور وہ روہانسے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی دونوں ننگی ٹانگیں زریں کی کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھیں اور اس کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی بے شمار مالائیں اور گھنٹیاں وغیرہ زریں کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی سائیں عالی نے کسی گیگڑے کی طرح چھلانگ لگائی اور زریں کی گردن پر سے اتر کر فرش پر آ گیا۔ لاٹھی ہمیشہ کی طرح اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر پروفیسر کا رائفل بردار گارڈ ایک دم چوکس ہو گیا۔ اس نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ میں نے گارڈ کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔

سائیں عالی نے کہا "شفیع محمد! میں تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا تھا۔ پورے ایک سو جنوں کا گینگ میں نے تیری تلاش میں لگایا ہوا تھا۔"

"کیوں' میری کیا ضرورت آن پڑی؟"

"بڑی سخت ضرورت۔۔۔ بہت ہی سخت ضرورت۔ یوں ہی تو بمبئی سے سرپٹ بھاگا ہوا نہیں آیا ہوں۔ چل کہیں اکیلے میں سب کچھ بتاتا ہوں تمہیں۔" وہ بے تابی سے مجھے مین گیٹ کی طرف کھینچنے لگا۔

میں نے کہا "ادھر کہاں جاتے ہو۔ اندر آؤ کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

میں اسے لے کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ سائیں عالی نے ڈراؤنی شکل بنائی اور اپنی آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے کہا "بہت خطرہ ہے' بہت زیادہ خطرہ ہے۔"

"کس کے لیے؟"

"غزالہ کے لیے۔"

"کیا مطلب؟"

"کل بہت شدید زلزلہ آنے والا ہے۔ رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر۔ اندرون شہر کئی خستہ حال مکان گر جائیں گے۔ صفدر کے جس تین منزلہ مکان میں غزالہ اپنی نیچر مہرالنساء کے ساتھ رہ رہی ہے وہ بھی بہت بوسیدہ ہے۔ وہ بھی گر جائے گا۔ غزالہ کو وہاں سے نکال لو۔ فوراً نکال لو۔ میں اس کا ستارہ دیکھ رہا ہوں' وہ سخت گردش میں ہے۔ میرے منہ میں خاک' اگر غزالہ وہاں رہی تو یہ نہ ہو کہ تم دونوں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت دکھ کی بات ہو گی' میرے لیے تو بہت ہی دکھ کی بات ہو گی۔ تم دونوں کی جدائی کا سبب میں بنا تھا' میں تمہاری اس جدائی کو ہمیشہ کی جدائی نہیں بننے دوں گا۔ تم دونوں ملو گے اور ضرور ملو گے لیکن صرف میرے کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم دونوں کو بھی بہت ہمت کی ضرورت ہو گی۔ بولو کرو گے نا ہمت؟"

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کیا تم غزالہ سے مل چکے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو سیدھا بمبئی سے آ رہا ہوں۔ بذریعہ پرستان ائر لائنز۔"

"اگر تم غزالہ سے ملے نہیں تو تمہیں کیسے معلوم کہ وہ صفدر کے علاقے میں اپنی ٹیچر مہرالنساء صاحبہ کے پاس ہے؟"

"میرے جنات وائی فائی کے ذریعے مجھے پل پل کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو ہونے والا ہے۔ تم نے غزالہ کو مجرم پکڑنے کے لیے چارا بنا رکھا ہے لیکن اس کا کچھ فائدہ ہونے والا نہیں۔ پولیس والے ایک سال بھی مونگ پھلی' فروٹ اور دہی بھلے (دہی بڑے) بیچتے رہیں تو کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہاں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

سائیں عالی کی معلومات مرعوب کن تھیں۔ میں نے کہا "سائیں' تم بات گھما پھرا کر کیوں کرتے ہو۔ صاف کیوں نہیں بتاتے کہ غزالہ کو کیا خطرہ ہے؟"

وہ بولا "اوئے چندر! بتایا تو ہے کہ زلزلے کا خطرہ ہے۔ ٹھیک گیارہ بج کر چالیس منٹ پر۔ میں زمین پر ناک رکھ کر زلزلے کی لہریں محسوس کر سکتا ہوں۔ مجھ سے یہ ہنر سیکھنے کے لیے شاہِ جنات نے مجھے پرستان کے سب سے بڑے صوبے کی گورنری پیش کی تھی مگر میں نے انکار کر دیا لیکن میں تجھے یہ ہنر سکھا دوں گا' شرط یہ ہے کہ تو ہر بات یقین کے ساتھ مان لیا کر اور بے تکے سوالات مت پوچھا کر۔"

"مگر سائیں۔۔۔"

"پھر وہی مگر۔" سائیں نے میری بات کاٹی "یہ مگر مجھے مگرمچھ سے بھی برا لگتا ہے۔ تجھے کہا ہے ناکہ جس طرح بھی ہو غزالہ کو وہاں سے نکال لے ورنہ۔۔۔ گیارہ بج کر چالیس پر تم دونوں کی جدائی کا گھڑیال بج جائے گا۔ ٹن ٹناٹن ٹن۔ ٹن ٹناٹن ٹن۔"

اس دوران میں صفدر بھی وہاں آ گیا۔ سائیں نے اس کے سامنے بھی وہی باتیں دُہرائیں جو میرے سامنے کی تھیں۔ وہ گیارہ بج کر چالیس منٹ کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے زلزلے کے بجائے غروب آفتاب کی بات کر رہا ہو۔

صفدر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "محترم سائیں صاحب! ہم تو غزالہ کو یہاں لاتے سے رہے۔ وہ ہمارے کہنے پر نہیں آئے گی۔ اگر زلزلے کی آمد کا ٹائم آپ نے کنفرم کر لیا ہے تو پھر آپ خود کوشش کر کے دیکھ لیں۔"

"کیا کوشش کر کے دیکھ لوں؟"

"غزالہ کو یہاں لانے کی کوشش۔"

سائیں نے صفدر کو گھورا "میں نہیں لا سکتا۔"

"آپ کے پاس سیکڑوں جری قسم کے جنات ہیں اور آپ ہماری درخواست پر ایک لڑکی کو یہاں نہیں لا سکتے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا' اس بات کو چھوڑو۔ میں تو۔۔۔" ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ گہری سانس لے کر بولا "ٹھیک ہے۔ اس قسم کا نازک کام تم جیسے بچھوروں پر چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔ میں۔۔۔ خود ہی جاتا ہوں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا یوں باہر نکلا جیسے غزالہ سامنے صحن میں موجود ہو اور وہ اسے بازو سے پکڑ کر یہاں لانا چاہتا ہو لیکن جلدی میں اس نے باہر نکلنے کے بجائے بغلی کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ صفدر نے بازو پکڑ کر اسے باہر کا راستہ دکھایا۔ برآمدے میں زریں گل موجود تھا۔ وہ سائیں عالی کو دیکھ کر بدک گیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ سائیں عالی پھر پھدک کر اس کی گردن پر سوار ہو جائے گا لیکن اس مرتبہ سائیں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیر کی طرح سیدھا نکلتا چلا گیا۔

زریں گل بولا "یہ انسان ہے یا چھلاوا۔ کبھی کبھی تو ہم کو لگتا ہے کہ اس نے واقعی جن پال رکھے ہیں۔"

میں نے کہا "بے وقوف جن پالے نہیں جاتے' پلے پلائے ہوتے ہیں۔"

"تمہاری طرح۔" صفدر نے زیر لب کہا۔

"آپ کیا بول رہا ہے۔" زریں نے چونک کر پوچھا۔

صفدر نے فوراً بات بدلی "میں کہہ رہا ہوں کہ کبھی کبھی تو مجھے بھی شک ہوتا ہے کہ شاید اس کے پاس واقعی جن شن موجود ہیں۔ اب ذرا سوچیں 'بغیر پاسپورٹ بغیر ویزا وہ کس طرح خراماں خراماں انڈیا سے پاکستان چلا آیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر آج ہم آسٹریلیا چلے جائیں تو پرسوں وہ بھی سڈنی کی گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آئے گا۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ سائیں عالی کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی روحانیت موجود ہے۔ وہ اپنے لب ولہجے سے مخاطب کو متاثر کرتا ہے اور اپنی بات منوا لیتا ہے' اوپر سے اس کا حلیہ بھی ایسا ہے کہ ہر کوئی اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اچھے بھلے تعلیم یافتہ لوگ بھی دو چار منٹ کی گفتگو کے بعد سائیں کے پاؤں چھونے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔"

صفدر بولا "حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ نہ صرف انڈیا سے پاکستان پہنچا ہے بلکہ غزالہ کا ٹھکانا بھی اسے معلوم ہو چکا ہے۔"

"بھئی' وہ تو آئندہ کی خبر بھی دے رہا ہے' یعنی کل گیارہ بج کر چالیس منٹ پر زلزلہ آنے والا ہے۔"

صفدر بولا "اگر وہ اتنے یقین سے کہہ رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ زلزلہ اس نے خود ہی لانا ہو۔ اس کے پاس ایک سو بارہ جنات ہیں۔ اتنے جنات بہ آسانی زلزلہ لا سکتے ہیں۔"

زریں بولا "آپ لوگ تو مذاق فرما رہا ہے۔ سنجیدگی سے سوچنے کا بات یہ ہے کہ سائیں عالی' غزالہ صاحبہ کی طرف گیا ہے۔ کہیں وہ انہیں زبردستی یہاں آنے پر مجبور نہ کرے۔"

"اگر وہ آ بھی گئی تو کیا مضائقہ ہے۔" صفدر نے کہا "مجھے نہیں امید کہ ارشاد احمد یا اس کا کوئی ساتھی غزالہ کے پیچھے وہاں پہنچے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے شاہ جہاں صاحب؟"

"ہاں لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا "وہ لوگ زیر زمین چلے گئے ہیں یا پھر ہو سکتا ہے کہ لاہور میں ہی نہ ہوں۔"

صفدر نے پُرسوچ لہجے میں کہا "مجھے شیخ عاصم کی طرف سے بھی بہت خطرہ ہے۔ شیخ کے ہرکارے ہر جگہ غزالہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

زریں گل مسلسل اپنی گردن مسل رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ صفدر نے اسے اوندھا لٹا کر اس کی گردن کا مساج شروع کر دیا۔

ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قریباً ایک گھنٹے بعد سائیں عالی واقعی غزالہ کو لے کر پروفیسر اللہ وتا کی رہائش گاہ پر چلا آیا۔ وہ دونوں ٹیکسی سے اترے' بچہ غزالہ کی گود میں تھا۔ ایک بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا' ٹیکسی ڈرائیور نے اتر کر سائیں عالی کے غلیظ ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کرایہ لیے بغیر واپس چلا گیا۔

غزالہ ہکا بکا سی نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر شکن آلود قمیص تھی۔ لگتا تھا کہ سائیں نے اسے لباس بدلنے کی مہلت بھی نہیں دی۔

"یہ سائیں عالی کو کیا ہو گیا ہے۔" وہ بولی "ایک منٹ بھی مجھے وہاں رکنے نہیں دے رہے تھے۔ کہہ رہے ہیں کہ وہاں بہت خطرہ ہے۔ سارا سامان بھی سمیٹنے کو کہہ رہے تھے میں نے بڑی مشکل سے راضی کیا کہ سامان پھر منگوا لوں گی۔"

صفدر نے کہا "ہمیں بھی کچھ معلوم نہیں۔ بس یہی کہہ کر گئے تھے کہ وہاں بہت خطرہ ہے' میں غزالہ کو لینے جا رہا ہوں۔"

"وہاں اتنی زور زور سے نعرے لگا رہے تھے کہ گلی محلے والے اکٹھے ہونے لگے تھے۔" غزالہ بولی "بالکل مست حال ہو رہے تھے۔ اگر میں کچھ دیر اور وہاں رکتی تو سارا بازار اکٹھا ہو جاتا۔ میں نے آنے میں پس و پیش کیا تو انہوں نے اپنی گدڑی میں سے واکی ٹاکی نکال کر میرے کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف ابو بول رہے تھے۔ انہوں نے کہا "سائیں صاحب! جو کہہ رہے ہیں درست کہہ رہے ہیں' تم جہاں بھی ہو فوراً ان کے ساتھ چلی جاؤ۔" میں مزید بات کرنا چاہتی تھی مگر سائیں عالی نے واکی ٹاکی میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں راستے میں بہت کہتی رہی ہوں کہ وہ ابو سے دوبارہ میری بات کرا دیں لیکن کہتے ہیں کہ میرے پاس کوئی واکی ٹاکی نہیں' وہ تو غائب کی آواز تھی جو جناتی طریقے سے مجھ تک پہنچی تھی۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو اب ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔" غزالہ بچے کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"خیر ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں۔ ہاں پریشان ہوا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

سائیں ٹیکسی سے اترنے کے بعد وہیں لان کی گھاس پر

اکڑوں بیٹھ گیا تھا اور مراقبے میں چلا گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے کچھ پڑھ رہا تھا اور ہوا میں پھونکیں مار رہا تھا۔

غزالہ ہمارے ساتھ اندر آ گئی۔ پروفیسر اللہ وتا اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے غزالہ کی گود میں سے بچہ لے لیا۔ اسے پیار کیا پھر غزالہ سے بچے کا حال احوال دریافت کیا۔ غزالہ نے بتایا کہ کئی دن کے افاقے کے بعد بچے کو آج پھر بخار ہوا ہے۔ پروفیسر بڑے یقین سے بولا "انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ فوری طور پر بخار اتار دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اس کا مستقل علاج چاہتا ہوں۔ آج مہینے کا آخری ہفتہ ہے۔ مہینے کے آخری ہفتے بڑے میاں صاحب بھی یہاں آتے ہیں۔ اگر وہ تشریف لائے تو میں ان سے بھی بچے کا معائنہ کرواؤں گا۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی' پروفیسر اللہ وتا فون سننے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "یہ بڑے میاں صاحب کون ہیں؟"

غزالہ نے بتایا "پروفیسر کے مرشد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں بھی بہت شفا ہے' نیم مردہ لوگوں میں زندگی دوڑا دیتے ہیں۔"

شام کے فوراً بعد واقعی پروفیسر کے پیرو مرشد سے ملاقات ہو گئی۔ ایک نئی مارک ٹو گاڑی کوٹھی کے پورچ میں آ کر رکی۔ ایک وہیل چیئر پہلے سے پورچ میں موجود تھی۔ گاڑی کے اندر سے ایک بزرگ کو نکال کر بڑے احترام سے وہیل چیئر پر بٹھایا گیا۔ میں' صفدر اور زریں گل دنگ رہ گئے۔ یہ بزرگ ہمارے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ہم اسے لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں دیکھ چکے تھے۔ اس مسیحا صفت شخص نے حمزہ کی ٹانگ کا علاج کیا تھا اور اسے مکمل طور پر معذور ہونے سے بچا لیا تھا۔ میانی صاحب قبرستان کی وہ رات میرے لیے ناقابلِ فراموش تھی جب ہم جاں بہ لب حمزہ کو اس بزرگ کے پاس علاج کے لیے لے کر گئے تھے۔ میں نے اس سفید ریش بزرگ کو ایک نیم روشن کمرے میں ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلتے دیکھا تھا۔ وہ کسی کسی خاص تکلیف میں مبتلا تھا اور مسلسل کراہتا رہتا تھا۔ اس کے دوا خانے میں بیش قیمت دوائیں نہیں تھیں۔ بس مختلف رنگوں اور نسلوں کی مٹی تھی۔ اس شخص نے اسی مٹی سے ڈاکٹر حمزہ کا علاج کیا تھا۔ ممکن ہے کہ مٹی میں دواؤں کی آمیزش بھی ہو مگر بظاہر وہ مٹی ہی نظر آتی تھی۔

میں نے دیکھا' وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا بزرگ مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا' اسی حالت میں دیکھا تھا۔ خدا جانے اس کی یہ "ہوں ہوں" نیند میں بھی ختم ہوتی تھی یا نہیں۔ لوگوں میں حیرت انگیز طور پر شفا بانٹنے والا یہ شخص خود ایک مسلسل کرب میں مبتلا تھا۔ پروفیسر اللہ وتا اسے بڑے احترام سے ایک اندرونی کمرے میں لے گیا۔ ساتھ تین چار افراد اور بھی تھے۔ کمرے میں غالباً کھانے وغیرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ بہرحال ہم میں سے کوئی اندر نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر کا ایک ملازم باہر آیا اور غزالہ کی گود سے ننھے "تابی" کو لے کر اندر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد بچہ باہر آ گیا۔ اسے غالباً کوئی دوا بھی پلائی گئی تھی جو اس کے ہونٹوں پر لگی تھی۔ اچانک میرا دھیان ان مختلف رنگوں کے سفوف جات کی طرف چلا گیا جو میں نے چند دن پہلے پروفیسر کی فارمیسی میں دیکھے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ وہ سفوف بھی مٹی کی ہی پسی ہوئی شکل ہوں۔ میانی صاحب قبرستان کے اس بزرگ اور پروفیسر اللہ وتا کا طریقۂ علاج انوکھا ہونے کے باوجود اپنی افادیت کے ٹھوس ثبوت رکھتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میانی صاحب کے تاریک قبرستان میں ایک سنسان چار دیواری کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر نہ آتیں اور پروفیسر اللہ وتا کے کلینک پر ہر طبقے کے لوگوں کا ہجوم نہ ہوتا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جوہرِ قابل کی کمی نہیں لیکن اسے دریافت نہیں کیا جاتا اور نہ پروان چڑھایا جاتا ہے۔ قریباً دو گھنٹے قیام کے بعد وہ سفید ریش پُراسرار معالج جتنی خاموشی سے آیا تھا اتنی ہی خاموشی سے واپس چلا گیا اور میرے ذہن میں ان گنت سوال چھوڑ گیا۔

غزالہ واپس جانا چاہتی تھی لیکن سائیں عالی ہر گھڑی اس کا پہرا دے رہا تھا۔ اس کا نادر شاہی فرمان یہ تھا کہ غزالہ یہاں رہے گی' کم از کم کل رات گیارہ بج کر چالیس منٹ تک یہاں رہے گی۔ کیونکہ کل رات لاہور میں ایک خوفناک زلزلہ آنے والا ہے جو کوئٹہ کے زلزلے کی یاد تازہ کر دے گا۔ سائیں عالی کی بات کو کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا' تاہم یہ بات تو ہم دونوں بھی محسوس کر رہے تھے کہ غزالہ اس چار دیواری میں ذیشان پارک والے مکان سے کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ صفدر کے علاوہ زریں گل کا بھی زبردست اصرار تھا کہ غزالہ کم از کم کل کا دن یہاں رہے۔ وہ اپنی حاملہ بیوی گل تُرم کو یہاں لانا چاہتا تھا اور اس کا معائنہ کرانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی غزالہ کے ساتھ زریں گل کو بہت لگاؤ تھا۔ صفدر اور زریں کے پیہم اصرار پر غزالہ رک گئی۔ میرے ساتھ وہ بہت واجبی سی بات کر رہی تھی۔ زریں گل اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور صفدر کو آنکھوں آنکھوں میں

معنی خیز اشارے کر رہا تھا۔ غزالہ دوسرے کمرے میں تھی۔ زریں گل گنگنانے لگا "کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتا ہے کتنا پیارا۔ چپ رہ کے بھی نظر میں ہے پیار کا اشارہ۔ کچھ لوگ۔"

صفدر نے کہا "زریں گل میرا خیال ہے کہ آج تو ضرور مار کھائے گا۔"

"کس سے؟"

"ڈاکٹر صاحب سے اور کس سے؟"

"ام کو تو غزالہ صاحب کو منانے کے لیے اپنا جان بھی قربان کرنا پڑے تو فوراً کر دے گا۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر ڈاکٹر صاحب ناراض ہو گئیں تو کل تمہاری زوجہ محترمہ کا چیک اپ کون کرے گا۔"

"زوجہ کا چیک اپ کیا ام تو زوجہ کو بھی استاد صیب کی چھوٹی سی خوشی کے لیے قربان کر سکتا ہے۔"

وہ بڑے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک پلیٹ کو اٹھا کر طبلہ بنایا اور لٹک لٹک کر گانا شروع کر دیا "روٹھے ہو تم۔۔۔ تم کو کیسے مناؤں خوچے۔ بولو ناں۔۔۔ بولو ناں۔"

میں نے زریں کی گردن دبوچی "او دبے تان سین کی اولاد! یہ گانے بجانے کا موقع نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب سخت پریشان ہیں۔ ان کی بچی کی زندگی خطرے میں ہے اور یہی نہیں پچھلے ہفتے یہاں تین بندے بھی قتل ہو چکے ہیں۔ ایسی سوگوار فضا میں تم فلمی گانے گاؤ گے تو ضرور پروفیسر صاحب سے پھینٹی کھاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے اب ام فلمی گانے نہیں گائے گا بلکہ مکالموں سے کام چلائے گا۔ ام جا رہا ہے غزالہ صاحب کے پاس۔"

"کیا کرو گے وہاں جا کر؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے دل میں آپ کے لیے نرم خوشہ پیدا کرے گا۔"

"خوشہ نہیں گوشہ۔" صفدر نے تصحیح کی۔

میں نے کہا "نرم گوشے سے پہلے میں جوتے مار مار کر تیرا سر نرم کر دوں گا۔ چپکا بیٹھا رہ یہاں، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

زریں گل دکھی لہجے میں بولا "استاد صیب! آپ امارا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔ ام سچ کہتا ہے اب ام سے آپ کا غم نہیں دیکھا جاتا۔ آپ کیوں اپنے آپ پر اتنا ظلم فرماتا ہے۔ یہ بہت زیادہ ظلم ہے۔ اتنا زیادہ ظلم تو۔۔۔"

"ظلم تائلہ میں نسیم آرا پر بھی نہیں ہوا تھا۔" صفدر نے فوراً لقمہ دیا۔

"آپ مذاق کی بات کرتا ہے، ام ایک دم سنجیدہ ہے۔ ام جانتا ہے کہ آپ غزالہ بی بی کو چاہتا ہے۔ ام جانتا ہے کہ غزالہ بی بی بھی آپ کو چاہتا ہے لیکن ام یہ نہیں جانتا کہ آپ ایک دوسرے کو کیوں نہیں مل سکتا۔ ام تو آج تک یہی سنتا آیا ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ کتنا لمبا صبر کیا ہے آپ نے۔ اگر اتنے لمبے صبر اور انتظار کا پھل بس انتظار ہی ہے تو پھر کڑوا پھل کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "تیرے سوال کا جواب ایک زوردار جھانپڑ کے سوا اور کچھ نہیں۔"

"تو پھر ام کو مار دو نہ جھانپڑ لیکن جو امارے دل میں ہے وہ ام ضرور بولے گا اور امارے دل میں وہی بات ہے جو اب سائیں عالی کے دل میں ہے۔"

"اور سائیں عالی کے دل میں کیا بات ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"خو سائیں صیب فرماتا ہے کہ غزالہ بی بی اور استاد صیب کا ستارہ آپس میں ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اگر کسی تیسرے ستارے نے ٹانگ نہ اڑایا تو پتا نہیں کون سے برج میں یہ دونوں ستارہ مل جائے گا۔"

زریں گل نے آخری فقرہ بڑی اونچی آواز میں کہا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں غزالہ بھی سن لے۔ مجھے زریں پر غصہ آرہا تھا۔ اس کی یہ بکواس سن کر غزالہ برہم بھی ہو سکتی تھی۔ ایسے میں ممکن تھا کہ وہ فی الفور واپس روانہ ہو جاتی۔ میں نے بہانے سے زریں کو باہر بھیج دیا۔

رات کو ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غزالہ بھی بچے کو سلا کر آگئی اور ہمارے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے شیخ عاصم اور امارات کے حوالے سے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا تھا، ہم نے بھی اس موضوع کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہماری گفتگو بس ان حالات کے گرد گھومتی رہی تھی جو ہمارے آس پاس موجود تھے۔ بردہ فروشوں اور ان کی کارروائیوں کا مسئلہ بے حد توجہ طلب تھا۔ یہ لوگ نجانے کب سے اس دھندے میں مصروف تھے اور ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے غیر ملکی افراد کے ملوث ہونے سے یہ معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔ بردہ فروشی کا ذکر آتے ہی ذہن میں بیگار کیمپوں کا خیال آجاتا ہے یا پھر ایسے جرائم پیشہ گروہوں کا تصور ابھر آتا ہے جو نو عمر بچوں کو معذور کرتے ہیں اور منظم طریقے سے ان سے بھیک منگواتے

یا پیشہ کراتے ہیں یا پھر کچھ لوگ اس ضمن میں انسانی اعضا کی خرید و فروخت کا ذکر بھی کرتے ہیں لیکن زیر نظر واقعات بالکل مختلف نوعیت کے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بردہ فروشی "غلامی اور ملکیت" کے خالص اہتمام کے حوالے سے ہے۔ ایس ایس پی ساہی صاحب نے اس سلسلے میں اعلیٰ حکام سے رابطہ کر لیا تھا اور اب اس معاملے کو نہایت سنجیدگی سے لیا جا رہا تھا۔ رجب اور کارندین کی تلاش شب و روز جاری تھی اور ان دونوں سے بھی زیادہ اہمیت ازرقی مائیکل کو دی جا رہی تھی۔ اس کی آدم خوری کی خبر بھی اب زبان زد خاص و عام ہو گئی تھی۔ اخباروں میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی کہ ایک سال پہلے مجسٹریٹ شیر محمد زرگر اور اس کی بیوی کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا تھا اس کا تعلق بھی ازرقی مائیکل اور اس کے ساتھیوں سے تھا۔ شیر محمد زرگر اور اس کی اہلیہ کی لاشیں جنگل سے ملی تھیں اور ان کے بارے میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ گیدڑوں اور آوارہ کتوں نے انہیں بھنبھوڑ ڈالا ہے لیکن اب پروفیسر کے بیان کے بعد واضح ہوا تھا کہ وہ آدم خور حبشیوں کے ہاتھوں اذیت ناک موت مرے تھے۔ تیسرا شخص ڈی ایس پی کمانڈو بھی حبشیوں ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا مگر اس کی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ لاش کیوں دستیاب نہیں ہوئی تھی؟ یہ سوال بھی کئی اور سوالوں کی طرح جواب طلب تھا۔

اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ زریں گل اپنی اہلیہ گل ثوم کو لے آیا۔ اس کا وزن تھوڑا سا بڑھ گیا تھا لیکن مجموعی خوب صورتی میں فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے شرمائے لجائے انداز میں ہمیں سلام کیا۔ غزالہ نے اسے گلے سے لگایا۔ وہ اب تھوڑی بہت اردو بولنے لگی تھی۔ سکھانے والا چونکہ زریں گل تھا لہٰذا وہ بھی "ہم" کو ام ہی کہتی تھی اور مذکر مونث میں بھی دلچسپ گڑبڑ کرتی تھی بلکہ اس معاملے میں وہ زریں سے بھی کچھ آگے ہی تھی۔ کہنے لگی "اللہ بڑی اچھی ہے۔ اس نے امارا دعا قبول کیا۔ آپ کو ام سے ملایا۔"

وہ پہلے سے کچھ شوخ بھی ہو گئی تھی۔ نوخیز لڑکیوں کی طرح ہر کام پھرتی سے کرتی نظر آتی تھی۔ غزالہ کا رخسار چوم کر کہنے لگی "آپ ام کو بہت پسند ہے۔ امارا دل چاہتی ہے ام آپ کے لیے اپنے ہاتھ سے روٹا پکائے اور کھلائے۔"

"او خدائی خوار! روٹا نہیں روٹی۔" زریں نے درست کیا۔

"ہاں آج کا روٹی یعنی کھانا، ام خود پکائے گا انشاء اللہ۔"

زریں نے اسے ہر بات کے ساتھ انشاء اللہ اور ماشاء اللہ وغیرہ کہنا بھی سکھا دیا تھا۔

غزالہ نے اس کا سرخ و سپید ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "گل ثوم! اس حالت میں تمہارے لیے زیادہ کام کاج مناسب نہیں، تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو۔"

"کیوں ام کو کیا ہوا۔ زریں بھی ہر وقت یہی کہتی رہتی ہے۔"

صفدر کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا "بہت خوب۔۔۔ زریں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ خود بھی مذکر مونث کا بہت بیڑا غرق کرتا تھا۔"

ہمارے منع کرنے کے باوجود گل ثوم کچن میں گھس گئی اور برتن کھڑکھڑانے لگی۔ مجبوراً غزالہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ دونوں بے تکلفی کے ماحول میں باتیں کرتی رہیں۔ گل ثوم کی بلند و بالا آواز کچن سے باہر تک آرہی تھی۔

"آپ کا شادی بن گیا؟" اس نے غزالہ سے پوچھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔"

"آپ نے کیوں نہیں بنایا۔ اس میں بڑا مزہ آتا۔ دل خوش ہو جاتا۔ آپ کب خوش ہوئے گا؟"

"پتا نہیں۔" غزالہ نے جھنجلا کر کہا۔

"زریں بتاتی تھی۔ آپ ماشاء اللہ کسی سے پیار کرتا۔ آپ ام کو بتائے گا کہ کس سے کرتا؟" غزالہ غالباً غصے کے سبب خاموش رہ گئی تھی۔ گل ثوم کھلکھلا کر ہنس دی "آپ بہت شرماتا لجاتا ہے لیکن ام کو کچھ کچھ پتا ہے۔"

اس کے بعد شاید گل ثوم کو ڈانٹ پڑی تھی اور اس کی آواز بہت مدھم ہو گئی تھی۔

کھانا مزے دار تھا۔ غزالہ کے ہاتھ کی بھولی بسری لذت یاد آگئی۔ بھنی ہوئی مرغی کے ساتھ ماش کی دال اور گوشت کی ڈش تھی۔ ساتھ میں گاجر کی کھیر یعنی گجریلا تھا۔ کھانے کے بعد میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے لان میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گل ثوم ننگے سر اور ننگے پاؤں لان میں بھاگ رہی تھی۔ بھاگتی بھاگتی وہ بیرونی سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھی کی چھت پر چلی جاتی پھر نیچے اترتی اور لان کا ایک چکر لگا کر دوبارہ چھت پر چڑھ جاتی۔ ملازم حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، کوٹھی سے باہر موجود پولیس کے باوردی اور سفید پوش ملازمین کو بھی یہ منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو راہداری میں غزالہ اور زریں گل کھڑے تھے۔ غزالہ کے

چہرے پر ہراس نظر آرہا تھا۔ یقیناً میری طرح وہ بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ گل ثوم پر کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "زریں! اس پاگل کو روکو۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہو رہی ہے۔ اس کی حالت... بھاگنے دوڑنے والی نہیں۔"

زریں بوکھلایا ہوا باہر نکلا اور گل ثوم کو آوازیں دینے لگا۔ وہ تیسری بار چھت پر چڑھنے کے بعد نیچے اتر رہی تھی، زریں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی بلکہ سہم گئی۔ زریں نے اسے ڈانٹا اور پھر کھینچ کر اندر لے آیا۔ وہ لال بھبوکا ہو رہی تھی اور ہانپی ہوئی تھی۔

"یہ کیا چکر تھا؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

"یہ ایک دم بے وقوف ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے کھوپڑے میں مغز کی جگہ لکڑی پتھر بھرا ہوا ہے۔ ام کو اگر وظیفے میں سے حصہ مل گیا تو ام اس کا دماغ ضرور تبدیل کرائے گا۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"پاگل کا بچی کہتا ہے کہ غزالہ بی بی کے ہاتھ میں بڑا لذت ہے' اس نے اتنا اچھا گجریلا پکایا کہ ام ضرورت سے زیادہ کھا گیا۔ اب اسے ہضم کرنے کے لیے دوڑیں لگا رہا تھا۔"

صفدر ہنسا "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ بات کوئی اور ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ یہاں آس پاس کوئی پہاڑی یا ٹیلا ہے۔ میں نے کہا اللہ کی بندی یہ لاہور ہے' یہاں جو ٹیلا آس پاس ہے وہ بھی سو ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ہے لیکن تم نے ٹیلے کو کیا کرنا ہے۔ کہنے لگی' کچھ نہیں' بس یونہی کسی ٹیلے پر چڑھنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"پھر کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"تم تو فوراً تھانے دار بن جاتے ہو۔ آرام سے پوچھو گے تو بتا دے گی۔"

"اچھا ام ابھی پوچھتا ہے۔" زریں گل لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔

زریں کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ خوش نظر آرہا تھا "ہاں بھئی کیا بات تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا' ٹالنا چاہا۔ دیکھ رہا تھا کہ غزالہ تو آس پاس نہیں پھر اپنے مخصوص انداز میں بولا "ام نے اسے خواہ مخواہ پاگل کا بچی کہہ دیا' وہ خاصا سمجھ دار ہے۔ وہ دراصل استاد صیب اور غزالہ بی بی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔"

"یہ کیسی دعا تھی جو جوگنگ بھاگ کر مانگی جاتی ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہ دعا مانگنے کا قبائلی طریقہ ہے جناب! اگر ایک مرد اور عورت آپس میں پیار فرماتا ہو لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے کھچا کھچا رہتا ہو تو ان کا کوئی دوست یا خیر خواہ ان کی مشکل آسان فرمانے کے لیے یہ عمل کرتا ہے۔ مرد کے سر کا ایک بال اکھاڑ کر عورت کے سر میں ڈال دیا جاتا ہے اور عورت کے سر کا ایک بال مرد کے سر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دعا مانگنے والا کھلی جگہ پر چلا جاتا ہے اور کسی ٹیلے پر سات مرتبہ چڑھ کر سات مرتبہ اترتا ہے۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پڑھتا بھی جاتا ہے۔ یہاں کوئی ٹیلا وغیرہ تو تھا نہیں اس لیے کلثوم نے چھت کو ٹیلا بنا لیا۔"

"اور یہ رہا جناب وہ بال۔" صفدر نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک لمبا سا بال اتار لیا۔ یقیناً یہ غزالہ ہی کا تھا۔

"یار! کن پاگلوں میں پھنس گئے ہیں ہم۔" میں نے صفدر سے کہا "یہ سائیں عالی اور زریں۔ کیا کم تھے جو یہ آفت بھی نازل ہو گئی ہے۔"

یہ بات میں نے انگریزی میں کہی تھی۔ زریں کو ایک بار پھر تاؤ چڑھ گیا۔ "فرنگیوں" کی زبان سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا اور پھر جب کسی انگریزی فقرے میں زریں کا نام آجائے تو جلتی پر تیل کا کام ہو جاتا تھا۔ اُن گنت بدگمانیاں اسے گھیر لیتی تھیں۔ وہ سراپا لالہ گُل محمد بن جاتا تھا۔ اسی میں مشہور فلموں "آگ کا دریا" "فرنگی" "سرحد کی گود میں" کے مکالمے فر فر اس کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اور قریباً نصف گھنٹا زریں کے اندر کا لالہ گُل محمد مدح خراقی رہی۔

زریں کی سادگی کو گل ثوم کی معصومیت نے دو چند کر دیا تھا۔ ان دونوں کو خوش دیکھ کر میرے دل کی گہرائیوں میں مسرت کی لہر اٹھتی تھی۔ اردگرد کے سنگین حالات کے سبب میں ان کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ ارشاد احمد' ناجی اور ان کے کارندے کسی بھی وقت اس خوب صورت جوڑے کے لیے نقصان کا باعث بن سکتے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ارشاد احمد اور افریقی مائیکل گرفتار نہیں ہوتے' زریں اور گل ثوم میرے ساتھ پروفیسر کی رہائش گاہ ہی پر رہیں گے۔ یہ ایک وسیع کوٹھی تھی اکاموڈیشن کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں مکمل تحفظ تھا۔ ساجی صاحب

کوٹھی سے باہر سادہ پوش پولیس متعین کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ مسلح گارڈز بھی تھے جو چوبیس گھنٹے پہرا دے رہے تھے۔ اس بات کا امکان تو کم ہی تھا کہ مائیکل یا اس کا کوئی کارندہ اس کوٹھی کا رخ کرے گا پھر بھی چھوٹے سے چھوٹے امکان کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ میری تو یہ بھی خواہش تھی کہ غزالہ بھی دونوں بڑے مجرموں کی گرفتاری تک یہیں رہے لیکن وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کل دوپہر تک یہاں سے جانے پر اصرار کرے گی۔

رات کا کھانا ہم نے اکٹھے ہی کھایا۔ سائیں عالی بھی اس کھانے میں شریک تھا۔ اس نے بھنے ہوئے قیمے میں بہت سی چینی ڈالی اور یوں بچر بچر کھانے لگا کہ دل مالش کرنے لگا پھر اس نے پودینے کی چٹنی گجریلے میں ڈالی' اس میں تھوڑی سی کوک ملائی اور آدھا ڈونگا اٹھا کر پی گیا۔ ہم سب تو خیر پہلے سے جانتے تھے لیکن پروفیسر اللہ دتا سائیں عالی کی کارروائیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ سائیں عالی بے حد سنجیدہ تھا۔ شاید رات کو آنے والے زلزلے کے شدید جھٹکوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بار بار غزالہ کو تنبیہہ کر رہا تھا کہ وہ گھر نہیں جائے گی' ہرگز گھر نہیں جائے گی۔

کھانے کے بعد میں اور صفدر اپنے کمرے میں آ گئے۔ صفدر مونگ پھلی کا شوقین تھا۔ مونگ پھلی کھاتے ہوئے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھا "کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ہو سکتا ہے کہ مائیکل یا ارشاد احمد میں سے کسی نے یہاں آنے کی کوشش کی ہو لیکن کوٹھی کے آس پاس سفید پوش پولیس کو پہچان کر واپس چلا گیا ہو۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اب کوٹھی میں پیش آنے والے خونی واقعے کو پندرہ سولہ روز گزر چکے ہیں۔ کیوں نہ ایک رسک اور لیا جائے۔ کوٹھی کے آس پاس سے سفید پوش پولیس ہٹا لی جائے' معمول کے ایک گارڈ کے سوا یہاں کوئی حفاظتی انتظام نہ ہو۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر پروفیسر تک پہنچنے کی کوشش کریں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' خاموش راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور یہاں رہنے والے نامعلوم بوڑھے کی وہی کرب ناک آواز سنائی دی جو اکثر ہماری سماعت کو جھنجوڑ دیتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "مر جائے تو صبر آ جاتا ہے' گم ہو جائے تو کبھی صبر نہیں آتا۔"

ہر بار جب وہ یہ فقرہ ادا کرتا تھا تو اس کی آواز میں غم کی شدت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ یہ آواز مجھے یوں اداس کرتی تھی کہ دل و دماغ میں ایک صحرا سا پھیل جاتا تھا۔ اس صحرا میں ان گنت لوگ ننگے سر ننگے پاؤں سرگرداں نظر آتے تھے۔ وہ اپنے پیاروں کی تلاش میں چہروں پر مٹی کی گرد سجائے ہوتے تھے' کسی کو بیٹے کی' کسی کو بھائی کی' کسی کو پوتے یا پوتی کی تلاش ہوتی تھی۔ میں ان کی ویران اور تھکی آنکھوں میں جھانکتا تھا اور خود بھی اندر سے کھنڈر ہو جاتا تھا۔ بوڑھا صدا دیتا ہوا کوٹھی کے کسی دوسرے حصے میں چلا گیا اور اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ پروفیسر اللہ دتا ہمارے ساتھ والے کمرے میں تھا' اس کی ہچکیوں کے ساتھ رونے کی آواز آئی اور سوگوار فضا کو اور سوگوار کر گئی۔ پروفیسر کو اپنی اکلوتی بیٹی کا غم اکثر نالۂ شب پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرنا ہمارے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پورے ایک برس سے اس کی بیٹی پنجۂ ستم میں تھی۔ وہ جن لوگوں کے چنگل میں تھی وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً انسانوں کو کچا چبا جاتے تھے۔ وہ اب نہ صرف اپنی عزت گنوا چکی تھی بلکہ بیمار بھی تھی۔ اسے یرغمال بنانے والوں نے موجودہ واقعات کے بعد خبر نہیں اسے زندہ بھی چھوڑا تھا یا نہیں۔

پروفیسر کی سسکیاں آدھی رات کے بیتنے تک گونجتی رہیں۔ کوٹھی کے بند دروازوں کے اندر ایک بیکراں غم [illegible] لیتا رہا اور بند دروازوں سے باہر رکھوالی کے کتے بھونکتے رہے اور مسلح گارڈز کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔

کچھ دیر بعد اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پروفیسر کے سلیپروں کی چاپ میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ بڑی بے قراری کے عالم میں ہمارے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ پھر اس نے دھڑا دھڑ دروازے پر دستک دی۔ ساتھ ہی دبی دبی چیختی ہوئی آواز میں چلایا تھا "شاہ جہاں۔۔۔ دروازہ کھولو۔"

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ پروفیسر کا چہرہ دہشت سے بگڑا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آ گیا۔ صوفے پر گر کر اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا "میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔۔۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔ یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے!" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"کیا ہوا پروفیسر؟" میں نے پوچھا۔

وہ اپنی دہشت زدہ آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر "شاہ جہاں! میں نے۔۔۔ اس کو دیکھا ہے۔ ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کس کو؟"

وہ خوف سے پھٹی آواز میں بولا "اسی خونی قاتل کو۔۔۔ وہ میرے گھر میں موجود ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

"لیکن کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" صفدر نے استفسار کیا۔

"اسی درندے مائیکل کی۔ ابھی دو منٹ پہلے وہ مجھے کمرے کی کھڑکی میں نظر آیا ہے۔ وہ گہرے رنگ کے سوٹ میں ہے' سرخ ٹائی لگا رکھی ہے۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔"

مجھے پروفیسر کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ مائیکل کو پورے لاہور میں کھوجا جا رہا تھا۔ وہ اس عمارت میں کیسے پہنچ سکتا تھا۔ چاروں طرف سے پولیس نے عمارت کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اندر بھی کئی مسلح گارڈز موجود تھے۔ میں نے پروفیسر کو تسلی دی اور اسے یقین دلایا کہ اگر کوئی یہاں ہے بھی تو وہ ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا' صفدر نے بھی بستر کے فوم کے نیچے سے آٹو جیک رائفل نکال کر تکیے پر رکھ دی تھی۔ پروفیسر کی حالت بدستور بگڑی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے دو تین سگریٹ پھونکے' میں نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے ہی کمرے میں سو رہے۔ پروفیسر کسی لحاظ سے بھی کمزور اعصاب کا مالک نظر نہیں آتا تھا لیکن حالات کے شکنجے میں کس جانے کے بعد وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں واپس جانے پر زور نہیں دیا۔ صفدر صوفے پر لیٹ گیا جبکہ پروفیسر میرے ساتھ والے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ اعصاب کو پرسکون کرنے والی کوئی دوا لے لے لیکن اس نے انکار کیا۔

کمرے میں نائٹ بلب روشن کر کے میں بھی بستر پر دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد اونگھ سی آ گئی۔ یک لخت ایک چیخ نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ یہ پروفیسر ہی کی چیخ تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا "وہ ہے۔۔۔ وہ یہیں ہے۔ میں نے ابھی اسے پھر دیکھا ہے۔"

میں نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلائی۔ اس مرتبہ مجھے صفدر کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا "میرا خیال ہے کہ ابھی کوئی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا۔"

صفدر نے آٹومیٹک رائفل ہاتھ میں لے لی تھی میں نے بھی ریوالور تھام لیا اور پوری طرح چوکس ہو گیا۔ صفدر نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور محتاط انداز میں ارد گرد دیکھا' راہداری دور تک خالی تھی۔ ٹی وی لاؤنج کی طرف بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے سرگوشی میں صفدر سے کہا "ہو سکتا ہے کوئی ملازم ہو۔ پروفیسر کا کمرا خالی دیکھ کر ہمارے کمرے میں جھانک رہا ہو۔"

"نہیں' میں نے بھاری بوٹوں کی آواز سنی ہے۔" صفدر نے فوراً جواب دیا۔

کمرے کی فضا میں ایک سراسیمگی سی محسوس ہوئی۔ اس چار دیواری میں صرف ہم ہی نہیں تھے۔ غزالہ بھی معصوم بچے سمیت موجود تھی۔ اس کے علاوہ زریں گل' گل ثوم اور سائیں عالی بھی تھے۔ اگر انسان کے روپ میں ایک آدم خور وحشی اس چار دیواری میں موجود تھا تو وہ سب شدید خطرے میں تھے۔ میں سب سے پہلے اس کمرے میں پہنچا جہاں غزالہ اور گل ثوم سو رہی تھیں۔ ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا' نائٹ بلب کی روشنی میں وہ دونوں محو خواب نظر آئیں۔ بچہ محمد ثانی غزالہ سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ بالکل جیسے ایک بچہ اپنی ماں سے پیوست ہو۔ پھر میں نے زریں گل اور سائیں عالی کو دیکھا۔ وہ دونوں بھی بخیریت تھے۔ زریں سو رہا تھا جبکہ سائیں عالی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے گہرے مراقبے میں تھا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو صفدر اور پروفیسر کو محو گفتگو پایا۔ صفدر پوچھ رہا تھا "اگر آپ کے خیال میں مائیکل اسی چار دیواری میں ہے تو وہ خود کو کہاں چھپا سکتا ہے؟"

پروفیسر نے لرزاں و ترساں آواز میں کہا "وہ۔۔۔ دوسری منزل کے کسی۔۔۔ عقبی کمرے میں ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک بیس منٹ بھی ہے۔ یہ وہی بیس منٹ ہے جہاں مائیکل نے مجسٹریٹ اور اس کی بیوی کو ڈی ایس پی کمانڈو سمیت اذیت دے کر قتل کیا تھا۔ اس وقت سے بیس منٹ (تہ خانہ) بند پڑا ہے۔"

صفدر نے کہا "چلیں آئیں' پہلے اوپر کی منزل پر چلتے ہیں پھر بیس منٹ دیکھتے ہیں۔"

صفدر کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ ارد گرد کے سارے کمرے اور راہداریاں دیکھ چکا ہے۔ بیس منٹ کے ذکر پر پروفیسر کے چہرے پر زردی سی پھیل گئی۔ شاید اسے ایک سال پہلے کے وہ خونی مناظر یاد آ گئے تھے جو اس نے اور اس کی بیٹی نے تہ خانے میں ملاحظہ کیے تھے۔ ان مناظر کی دہشت جیسے ابھی تک پروفیسر کی آنکھوں میں جمی ہوئی تھی۔

ہم پہلے بالائی منزل پر گئے۔ بڑی احتیاط سے مشکوک کمروں کا جائزہ لیا۔ ہم نے بالائی منزل کا ایک ایک چپا دیکھا اور پھر نیچے بیس منٹ کی طرف آ گئے۔ کافی طویل سیڑھیاں

اتر کر ہم ایک آہنی دروازے کے سامنے پہنچے۔ گرد آلود سیڑھیاں اترتے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کوٹھی کے اس حصے میں طویل عرصے سے کوئی نہیں آیا۔ آہنی دروازے پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا اور کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ صفدر نے پروفیسر سے پوچھا "بیس منٹ کب سے بند ہے؟"

پروفیسر بولا "مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اس کی چابی میرے ملازم اشرف کے پاس تھی۔ کبھی کبھار وہ اندر کی صفائی کراتا تھا۔"

میں نے تالے کو ہلایا جلایا، کنڈی کو کھینچ کر دیکھا، صاف پتا چلتا تھا کہ دروازہ عرصے سے بند ہے لیکن دروازے کے قریب پہنچتے ہی مجھے ایک عجیب بات کا احساس ہوا۔ میں نے صفدر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ شاید واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "اس تہ خانے میں جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟"

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "تالے کی چابی مل سکتی ہے؟"

پروفیسر نے کہا "اشرف تو یہاں نہیں ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"آٹھ دس روز سے گاؤں گیا ہوا ہے۔ چابی بھی اسی کے پاس ہے۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں صفدر سے کہا "صفدر، یہ تالا توڑنا ہو گا۔"

صفدر کے پاس وہی "ایم جی" تھی جس سے میں نے مسائی حبشی کو گولیوں سے بھونا تھا۔ اس رائفل پر جدید قسم کا سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کا بالائی دروازہ بند تھا لہٰذا امید تھی کہ تہ خانے میں ایم جی چلنے کی آواز کوٹھی سے باہر سنائی نہیں دے گی۔ میری ہدایت کے مطابق صفدر نے تالے پر ایم جی کا برسٹ مارا اور وہ کنڈی سمیت ٹوٹ گیا۔ میں نے ٹانگ مار کر دروازہ کھولا۔ ہم چند لمحے دیواروں کی اوٹ میں ساکت کھڑے رہے، پھر صفدر نے اندر گھس کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور بیس منٹ کی لائٹیں روشن کر دیں۔ اندر کا منظر حیرت ناک تھا۔ یقیناً ہمارے ساتھ ساتھ پروفیسر کو بھی شدید دھچکا لگا تھا۔ بیس منٹ اندر سے بالکل صاف ستھرا تھا۔ وہاں پختہ پارٹیشن نظر آ رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ہم کسی تہ خانے کے بجائے ایک سجے سجائے فلیٹ میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک کمرے کی آرائش سٹنگ روم کے طور پر کی گئی تھی، ایک دوسرا کمرا ہو بہو بیڈ روم کا منظر پیش کر رہا تھا۔

یہاں لباس اور جوتے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص یہاں رہائش پذیر ہے۔ پروفیسر شدید خوف کے ساتھ شدید الجھن کا شکار بھی تھا۔ وہ ہکلا کر بولا۔

"میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں... جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ شائستہ سے ملانے کے لیے۔" فی الحال پروفیسر کی بات پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم نے بے حد احتیاط سے سارے بیس منٹ کا معائنہ کیا۔ کوئی متنفس نظر نہیں آیا مگر شواہد مل رہے تھے کہ یہاں کوئی رہائش پذیر ہے اور تو اور کچن میں استعمال شدہ برتن بھی موجود تھے اور پھر ایک ایسی شہادت نظر آئی جس نے ہمیں سر تا پا ہلا دیا۔ میں نے کچن میں موجود ریفریجریٹر کھولا۔ فریزر کے اندر فروزن گوشت پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا... یہ ران کا گوشت تھا... انسانی ران کا۔ گھٹنے کے ذرا اوپر سے کاٹی ہوئی یہ ران صاف پہچانی جا رہی تھی۔ ران پر برف جمی تھی اور برف کی سفیدی کے اندر سے سیاہ انسانی بال صاف نظر آ رہے تھے۔ ابکائی میں نے بمشکل روکی اور پیچھے ہٹ گیا۔ صفدر نے بھی یہ منظر دیکھا اور اس کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ پروفیسر کی نگاہ پڑنے سے پہلے ہی میں نے ریفریجریٹر کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں دو اور اہم چیزیں بھی نظر آئیں۔ ایک تو ڈیپ فریزر تھا۔ دوسرا ایک طاقت ور وائرلیس سیٹ تھا جس میں سے بہت سے تار وغیرہ نکل کر میز کے نیچے چلے گئے تھے۔ میں اس وائرلیس سیٹ کو دیکھ رہا تھا جب اچانک ایک آواز نے ہمیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے سنائی ہوئی تھی۔ آواز کا ماخذ وہ چھوٹا سا سوراخ تھا جو ایگزاسٹ فین کے لیے رکھا گیا تھا لیکن ابھی فین اس میں لگایا نہیں گیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمیں شدید جھٹکا لگا کہ سوراخ میں سے آٹومیٹک رائفل کی خوفناک نال جھانک رہی تھی۔ ہماری ایک غلط جنبش ہمارے جسم میں درجنوں سوراخ بنا سکتی تھی۔ بولنے والے نے اپنے الفاظ پھر دہرائے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

"اپنے ہتھیار پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو۔" پھر ذرا توقف سے بولا "ورنہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری تم پر ہو گی۔"

اس کی آواز میں موجود دھمکی آمیز لرزش نے مجھے بتا دیا کہ وہ خوف ناک ارادہ رکھتا ہے اور ہماری معمولی سی مزاحمت کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ ہمیں صاف دیکھ

رہا تھا اور خود ہماری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل تھا۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے ہتھیار پھینک دیے۔

"پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھو۔" ایگزاسٹ فین کے سوراخ سے دوسرا حکم جاری ہوا۔

میں نے اور صفدر نے اس حکم پر عمل کیا۔ پروفیسر بھی لڑکھڑاتا ہوا ہمارے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کا زرد چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ابھی اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ایسے وحشت زدہ چہرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

روزن کے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ میری نگاہیں روزن سے نکلی ہوئی رائفل کی نال پر مرکوز تھیں۔ اگر رائفل کی نال روزن سے اوجھل ہوتی تو ہم مزاحمت کی کوشش کر سکتے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ ایک لمبا تڑنگا حبشی دروازے سے اندر آ گیا۔ اس کا حلیہ ہی اس کی شناخت تھا۔ وہ تھری پیس گرے سوٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور بال چمک رہے تھے۔ وہ سونڈیوٹڈ آوم خور مائیکل تھا۔

اس انسان نما درندے کے چہرے پر جو سب سے نمایاں چیز مجھے نظر آئی وہ اس کے غیر معمولی حد تک چوڑے اور مضبوط جبڑے تھے۔ ناک حبشیوں کی طرح چپٹی اور ہونٹ موٹے تھے۔ اگر اس کے غیر معمولی چوڑے جبڑوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ ایک لمبا تڑنگا مہذب سیاہ فام نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید ماؤزر تھا اور چہرے پر ایک نہایت عیار مسکراہٹ تھی۔ اس کی پتلون کی دائیں جیب بہت پھولی پھولی تھی۔ معلوم نہیں اس نے وہاں کیا ٹھونس رکھا تھا۔ حبشی کے چہرے کی عیار مسکراہٹ دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ اس نے ہمیں چکما دیا ہے۔ وہ ہماری توقع سے زیادہ ہوشیار تھا۔ روزن میں آٹومیٹک رائفل کے پیچھے وہی تھا اور اب ہمارے سامنے ماؤزر تھامے بھی وہی کھڑا تھا۔ اگر رائفل اب بھی روزن میں نظر آ رہی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رائفل کو روزن میں پھنسا دیا تھا۔

"خوش آمدید۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور ایک ٹانگ پر وزن ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

ہمارے لیے مائیکل کی یہاں موجودگی ایک حیرت انگیز انکشاف تھی۔ ہم اس بدبخت کو پورے شہر میں تلاش کرا رہے تھے اور وہ پروفیسر کی رہائش گاہ میں ہی چھپا ہوا تھا۔ یہ تو چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ ہو سکتا ہے پروفیسر کی مصیبت زدہ بیٹی بھی اسی بیس منٹ میں کہیں موجود ہو لیکن فی الحال اس بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ فی الحال تو ہمیں ایک خطرناک ہتھیار اور انسان نما درندے کا سامنا تھا۔ ماؤزر کا رخ میری اور صفدر کی طرف تھا۔ پروفیسر میں مائیکل کو غالباً اتنا دم خم ہی نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں اس وقت آپ لوگوں کی کچھ زیادہ خدمت نہیں کر سکتا۔" مائیکل نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس نے پتلون کی پھولی ہوئی جیب میں سے ایک ماسک نکالا اور منہ پر چڑھا لیا پھر اسی جیب میں سے اس نے شیشے کی ایک لیبوریٹری بوتل نکالی۔ یہ ایک اسپرے تھا۔ بالکل ایسا ہی ایک اسپرے ہمیں ارشاد احمد کی خانہ تلاشی کے دوران میں ایک کمرے سے ملا تھا۔ اس کمرے میں سے بہت سے جعلی پاسپورٹ، شناختی کارڈز اور غیر ملکی سفارت خانوں کی مہریں بھی برآمد ہوئی تھیں۔ یہ اسپرے جو مائیکل کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا، نہایت خطرناک تھا۔ اس کی مدد سے کسی بھی شخص کو کئی گھنٹوں کے لیے اعصابی طور پر یکسر مفلوج کیا جا سکتا تھا پھر میں نے دیکھا کہ بوتل کے "اسپرنگ نوزل" سے دھند جیسی تیز گیس خارج ہوئی اور مختصر کمرے میں پھیلنے لگی۔ اس موذی گیس میں سانس لینے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور یہ کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ ایک دم ہی ریڑھ کی ہڈی اور دماغ میں ایک سرد لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی، اس کے ساتھ ایک تیز بو نے ذہن کو جکڑ لیا۔

"خبردار کوئی حرکت نہ کرے۔" ماسک کے عقب سے حبشی مائیکل کی آواز پھر ابھری۔ چند سیکنڈ بعد یکایک ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر گھٹنوں کے بل گرا۔ نگاہ کے سامنے زرد رنگ سا پھیلتا جا رہا تھا۔ اس رنگ میں، میں نے صفدر کو لڑکھڑاتے ہوئے اور دیوار سے ٹکراتے دیکھا، اس کے بعد ذہن یک لخت کورے کاغذ کی طرح سفید اور سادہ ہو گیا۔ کوئی احساس نہ رہا۔ تکلیف کا، پریشانی کا نہ گرد و پیش کا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں نیم وا ہیں۔ سب کچھ نظر آ رہا تھا لیکن ادراک کسی شے کا نہیں تھا۔ جیسے انسان یکسر بے خیالی میں کسی شے کو دیکھتا چلا جا رہا ہو اور بس دیکھتا چلا جا رہا ہو۔ میں نے نوٹ کیا کہ میرا چہرہ سن ہے اور ہونٹوں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اپنے چہرے تک لے جانا چاہا لیکن... کہاں تھا میرا ہاتھ؟ میں کوشش کے باوجود نہ جان سکا کہ میرا

ہاتھ کہاں ہے اور وہ حرکت میں کیوں نہیں آرہا۔ زندگی میں ایسی کیفیت میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

پتا نہیں اس کیفیت میں کتنا عرصہ گزرا۔ میں وقت کا ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا پایا' تاہم میرا خیال ہے کہ دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کس رخ سے اور کس آسن میں فرش پر گرا ہوا تھا۔۔۔ اور گرا ہوا تھا یا بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ یا ہوا میں معلق تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک زردی مائل پردہ تھا اور اس پردے میں سے کمرے کے دھندلے منظر نظر آرہے تھے۔ میں افریقی مائیکل کو دیکھ رہا تھا لیکن یوں دیکھ رہا تھا جیسے پردہ اسکرین پر کسی اجنبی کردار کو دیکھا جاتا ہے۔ مائیکل کو دیکھ کر ذہن میں کسی بھی قسم کی کیفیت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ لاتعلق سی لاتعلقی تھی یا یوں کہہ لیں کہ بے حسی سی بے حسی تھی۔ اچانک مجھے ایک اور جسم نظر آیا' یہ غزالہ کا جسم تھا۔ وہ دبے پاؤں آئی اور میں نے اسے اندھا دھند مائیکل پر جھپٹتے دیکھا۔ اس نے مائیکل کا ماؤزر والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر نیچے جھکا دیا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی کہ مائیکل اس ہاتھ کو دوبارہ سیدھا نہ کر سکے۔ ساتھ ساتھ وہ چلا بھی رہی تھی۔ یقیناً مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اٹھ کر مائیکل پر جھپٹ پڑوں لیکن غزالہ کی آواز مجھے کہیں دور' بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس سنگین ترین منظر کو دیکھ کر بھی میرے ذہن میں کوئی کیفیت نہیں ابھری تھی۔ ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی اور شاید صاف نہ بھی ہوتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے اعضا کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے دیکھا' غزالہ نے اپنے دانت مائیکل کی کلائی پر گاڑ دیے تھے اور ایسی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی جن میں انتہا درجے کی التجا کے ساتھ انتہا درجے کی حیرت بھی پوشیدہ تھی پھر میں نے دیکھا کہ مائیکل نے قریب رکھی ہوئی آٹومیٹک رائفل اٹھائی اور اس کے دستے سے غزالہ کے سر پر ضربیں لگانے لگا۔ چوٹیں کھانے کے باوجود غزالہ پوری جان کے ساتھ حبشی سے چمٹی رہی۔ ہر ضرب سے غزالہ کے بال اس کے چہرے پر بکھرتے جارہے تھے لیکن اس منظر سے میرا تعلق وہی تھا جو پردہ اسکرین کے منظر سے ہوتا ہے۔ جب میں نے غزالہ کی پیشانی پر خون کی سرخ لکیر دیکھی تو ایک ساعت کے لیے' صرف ایک ساعت کے لیے ذہن میں کرب کا احساس جاگا۔ جیسے گھٹا ٹوپ تاریکی میں ایک جگنو سا چمکے۔ میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن زبان نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ غزالہ کے ہاتھوں سے مائیکل کی کلائی چھوٹ گئی۔ وہ نیم جان ہو کر اوندھے منہ فرش پر گری۔ مائیکل کی ٹانگ بار بار حرکت کرنے لگی۔ وہ اسے ٹھوکریں رسید کر رہا تھا۔ میں نے یونہی نیم دلی سے کوشش کی کہ آنکھیں بند کر لوں مگر آنکھیں بند کرنا بھی میرے بس میں نہیں تھا یا تو میری آنکھوں پر پلکیں نہیں تھیں یا پلکوں سے رابطہ نہیں تھا پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں کھلی آنکھوں کے ساتھ ہی سو گیا ہوں۔

بے ہوش انسان جب ہوش میں آتا ہے تو ایک دو منٹ کے اندر اس کے حواس بحال ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک بے ہوشی (یا بے حسی) تھی جو آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوش میں تبدیل ہوئی۔ پہلے دل و دماغ پر چھائی ہوئی اتھاہ مایوسی اور قنوطیت میں افاقہ ہوا پھر نگاہ کے سامنے چھائی ہوئی زردی کی کثافت کم ہوئی۔ کاسۂ سر اور ریڑھ کی ہڈی میں جگہ جگہ ہلکی سی حرارت کا احساس ہونے لگا پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میں پلکیں جھپکا رہا ہوں اور میرے پاؤں کی انگلیاں میری مرضی سے حرکت کر رہی ہیں۔ یوں آہستہ آہستہ میں اپنے اعضا کو حرکت دینے اور اپنے خیالات مجتمع کرنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے صفدر کو دیکھنے کی کوشش کی' وہ میرے قریب ہی موجود تھا اور بے سدھ پڑا تھا۔ غالباً اس پر اعصاب شکن گیس کا اثر مجھ سے زیادہ ہوا تھا۔ (میں نے آخری لمحات میں سانس روک لی تھی' صفدر یہ نہیں کر سکا تھا) پروفیسر اوندھا منہ پڑا تھا۔ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا اور پھر میری نگاہ اس ہستی پر پڑی جو میری عزیز ترین تھی۔ میں نے غزالہ کو دیکھا' وہ قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے صرف ایک پاؤں میں جوتی تھی۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اس پر بغیر آستین کا سویٹر تھا۔ اس کی اوڑھنی قریب ہی پڑی تھی۔ غزالہ کے سر پر پٹی باندھ دی گئی تھی تاہم رخساروں اور گردن پر ابھی تک خون جما ہوا تھا۔ اس کی ایک کلائی بھی سوجی ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غزالہ کو خواب آور دوا دی گئی ہے۔ نیند کے باوجود وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی' وہ باہر سے بند تھا۔ کھڑکیوں میں لوہے کی گرل اور جالی لگی تھی۔ کمرے میں ایک الماری' ایک بیڈ اور تھوڑا سا فرنیچر تھا۔ میں نے الماری میں سے ایک تولیا نکالا' باتھ روم جا کر گرم پانی سے تولیے کا ایک حصہ بھگویا۔۔۔ اور غزالہ کا چہرہ اور گردن سے خون اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں پانی سے تر کیا۔ غزالہ کی کلائی اتری ہوئی تو نہیں تھی غالباً اس میں

شدید موچ آئی تھی۔ مجھے الماری کے ایک خانے میں وِکس کا مرہم نظر آگیا۔ میں نے کلائی پر مرہم لگا کر تولیے سے ایک پٹی پھاڑی اور باندھ دی۔

میرے اس عمل کے دوران میں ہی صفدر کے حواس بحال ہونا شروع ہو گئے تھے پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل تھیں اور بالکل خالی خالی نظر آرہی تھیں "غزالہ ٹھیک تو ہے؟" اس نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ صفدر نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور دیر تک گم صم ساکت بیٹھا رہا۔

درحقیقت اعصاب شکنی کی کیفیت نے ہمیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ حواس بحال ہونے کے باوجود طبع پر عجیب سی پژمردگی اور غنودگی چھائی تھی۔ اعصاب شکنی سے پہلے کے واقعات حالانکہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے پیش آئے تھے لیکن وہ دور دراز کے واقعات لگتے تھے۔ ہمارا تہ خانے میں داخل ہونا' جہاں کسی کی موجودگی اور رہائش کا احساس ہونا' فریج میں انسانی گوشت کا فروزن لوتھڑا پھر مائیکل کی آمد۔ اس کے چہرے کا نیلگوں گیس ماسک اور اسپرے۔ ایک ناگوار بو نتھنوں میں گھسنے لگی اور دل مالش کرنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ بیس منٹ میں داخل ہونے سے قبل میں نے تیل کے چولھے کی بو بھی محسوس کی تھی۔ درحقیقت یہی مدھم بو تھی جس نے مجھے بیس منٹ کا تالا تڑوانے اور اندر داخل ہونے پر مجبور کیا تھا۔ جب تیل کے چولھے پر کھانا پکایا جاتا ہے تو ایک مخصوص باس سی در و دیوار میں پھیل جاتی ہے اور یہی باس مجھے بیس منٹ کے دروازے پر محسوس ہوئی تھی۔

غنودگی اور نقاہت کے زیر اثر میں پھر لیٹ گیا۔ نجانے کب آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو چار پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ ہم ایک نہایت خطرناک آدم خور وحشی کے قبضے میں ہیں۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ پروفیسر اب صوفے پر نیم دراز تھا اور سسکیوں سے رو رہا تھا۔ صفدر کمرے میں ٹہل رہا تھا' اس کے پھونکے ہوئے سگریٹ کا دھواں کمرے میں موجود تھا۔ میں نے غزالہ کو دیکھا' وہ قالین پر ہی لیٹی ہوئی تھی۔ صفدر نے اس کے سر کے نیچے ایک صوفے کی گدی رکھ دی تھی اور جسم پر گرم چادر ڈال دی تھی۔ میں نے صفدر سے پوچھا "یہ جاگی نہیں؟"

وہ بولا "نہیں۔۔۔ بس غنودگی میں پانی مانگ رہی تھی۔ میں نے پانی پلایا ہے۔"

میں نے غزالہ کو چھوا تو اس کا جسم تپ رہا تھا "میرا خیال ہے کہ اسے بخار ہے۔" میں نے صفدر کو اطلاع دی۔

صفدر نے بھی غزالہ کو چھو کر دیکھا "ہاں کافی تیز بخار ہے۔"

میں نے غزالہ کو جگانا چاہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹ جائے لیکن وہ بدستور نیم بے ہوشی میں رہی۔ میں نے اسے اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس بھاری بھرکم چاپ نے مجھے سمجھا دیا کہ انسان نما درندہ کھڑکی کی طرف آرہا ہے پھر وہ کھڑکی پر نظر آیا۔ تھری پیس سوٹ' عینک اور سرخ ٹائی۔ اس کی حرکات و سکنات میں واشنگٹن ڈی سی کے کسی ڈپلومیٹ کا سا رکھ رکھاؤ تھا لیکن اس کی درندگی کا ثبوت میں فریج کے بالائی خانے میں ملاحظہ کر چکا تھا۔ اس کی ایک کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہی جگہ تھی جہاں غزالہ نے آخری کوشش کے طور پر اپنے دانت گاڑے تھے۔ ان لمحوں میں غزالہ کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت بھی مجھے ابھی تک یاد تھی۔۔۔ اس حیرت کی وجہ یقیناً میری بے عملی ہی تھی۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا' غزالہ ہمارے پیچھے ہی پیچھے تہ خانے تک چلی آئی تھی۔ جب ہم تالا توڑ کر اندر گھس آئے تو وہ بھی تھوڑے سے وقفے کے بعد اندر آگئی تھی۔ اس وقت تک مائیکل ہمیں گن پوائنٹ پر لے چکا تھا اور ہم اعصاب شکنی کی کیفیت میں زیرِ دام تھے۔ غزالہ نے مائیکل کے ہاتھ میں ماؤزر دیکھا تھا اور ہمیں ایک موقع دینے کے لیے بے دریغ مائیکل پر جھپٹ پڑی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی مگر ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔

کھڑکی کے سامنے پہنچ کر مائیکل نے اپنے نہایت صاف دانتوں کی نمائش کی اور بولا "میں آپ کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید ہے کہ ہمارا سفر اچھا گزرے گا۔"

"سفر؟ کیسا سفر؟" میں نے پوچھا۔

"زندگی کا سفر۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

یہ معمولی سا جملہ تھا لیکن میرے جسم میں سردی کی لہری دوڑ گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے حوالے سے مائیکل کے ارادے بڑے طویل اور دور رس ہیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مائیکل' یہ بھول جاؤ کہ تم یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہو۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے انجام کو دردناک ترین بنا رہے ہو۔"

"میری فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے حیران کن اعتماد اور شائستگی سے کہا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص انسانی گوشت کھاتا تھا۔

پروفیسر نے چیختے ہوئے کہا "میری بیٹی کہاں ہے۔ خدا!

کے لیے مائیکل... مجھے بتاؤ میری شائستہ کہاں ہے؟"

"حوصلہ رکھو ڈیئر' وہ یہیں پر ہے۔" مائیکل نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

پروفیسر نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے "مجھے اس سے ملا دو مائیکل... میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب لے لو۔ بس میری بیٹی مجھے دے دو۔ میں اسے لے کر کہیں بہت دور چلا جاؤں گا۔ بس اپنی بیٹی کو لے کر۔"

"دور جانے کے لیے بیٹی کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔" مائیکل کمینگی سے ہنسا "اور فی الحال وہ زیادہ صحت مند نہیں۔ کچھ زنانہ قسم کے معاملات ہیں اس کے۔ بائی گاڈ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پتا نہیں کس کی شرارت ہے۔ بہرحال ایک دو ماہ میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا پھر اسے جہاں جی چاہے لے جانا۔"

"وہ جیسی بھی ہے' بس دے دو مجھے... مائیکل میری جھولی میں اس کی بھیک ڈال دو۔ وہ بڑے تھوڑے دل کی ہے۔ یہ نہ ہو اس کی جان چلی جائے۔ وہ مر رہی ہے مائیکل... وہ بجھتی جا رہی ہے۔"

پروفیسر نے عاجزی کی انتہا کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رگڑنا شروع کر دیا۔

مائیکل کی گردن نخوت سے کچھ اور اکڑ گئی۔ وہ امریکی لہجے میں انگلش بول رہا تھا۔ کہنے لگا "چھوڑ دیں گے ڈیئر۔ چھوڑ دیں گے مگر ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر تم سے بہت سا حساب کتاب بھی تو کرنا ہے۔"

"میرا سب کچھ لے لو۔ میری جان بھی لے لو مگر میری شائستہ کو اور دکھ نہ دو۔ وہ تم لوگوں کا ظلم نہیں سہہ سکتی۔"

"ظالم ہم نہیں۔ ظلم تم نے اپنے آپ پر کیا ہے ڈیئر۔" مائیکل مسکرایا "تمہارے بھائی ارشاد احمد نے تمہیں کتنا سمجھایا۔ کتنا سر پھوڑا تمہارے ساتھ۔ کیا کیا جتن کیے۔ لیکن تم پر اپنی "من مرضی" کا بھوت سوار رہا۔ تم نے ہم سے کھلی جنگ کی... اور جنگ میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ مار دیا مر جاؤ۔ اگر ہم تمہیں نہ مارتے تو تم ہمیں مار دیتے۔"

روتے روتے پروفیسر کی ہچکی بندھ گئی۔ اگر مائیکل کمرے کے اندر ہوتا تو پروفیسر یقیناً اس کے پاؤں میں اپنا سر رکھ دیتا اور مائیکل کے ایک اشارے پر اس کے پاؤں چاٹنا شروع کر دیتا۔ مائیکل کا رعب کچھ اس طرح طاری تھا اس پر کہ دیکھ کر ترس آتا تھا اور نہ صرف ترس آتا تھا بلکہ شرمندگی بھی ہوتی تھی۔

میں نے مائیکل سے کہا "پروفیسر کا کہنا ہے کہ تم نے ان کی بیٹی کو کسی اور جگہ حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے اور تم پروفیسر کو وہاں لے جانے کے لیے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیا کرتے تھے؟ اب تم کہہ رہے ہو کہ پروفیسر کی بیٹی یہیں ہے؟"

"وہ بھی درست تھا اور یہ بھی درست ہے۔" مائیکل مسکرایا۔

"کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے؟"

"تم لوگوں کے لیے انکشاف یہ ہے کہ ڈیئر پروفیسر کی بیٹی پچھلے دس گیارہ مہینے سے اسی تہ خانے میں ہے... اور میں بھی یہیں تھا۔"

میں نے دیکھا کہ اس انکشاف پر پروفیسر اللہ دتا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ناقابلِ یقین نگاہوں سے مائیکل کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ مائیکل نے کہا "در حقیقت میں یہاں سے کہیں گیا ہی نہیں۔ مجھے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے سارے کام یہیں پر ہو رہے تھے۔"

مائیکل ناقابلِ یقین بیان دے رہا تھا۔ وہ پچھلے قریباً ایک سال سے اس کوٹھی کے تہ خانے میں موجود تھا اور کسی کو خبر نہیں تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ ٹھیک ہے کہ تین دردناک اموات کے بعد تہ خانہ بند پڑا تھا اور کوئی اس جانب آتا نہیں تھا مگر ملازم تو کبھی کبھار آتے ہوں گے' خاص طور سے ملازم اشرف۔ جس کے پاس تہ خانے کی چابی تھی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس تہ خانے میں خوراک اور زندگی کی دوسری سہولیات کیسے اور کس کے ذریعے پہنچتی تھیں۔

عیار آنکھوں والا مائیکل بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ امریکن اسٹائل کی انگلش میں بولا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کیا سوال ابھر رہے ہیں۔ تم سوچ رہے ہو کہ اس تہ خانے میں رہتے ہوئے' باہر کی دنیا سے میرا رابطہ کیونکر بحال تھا۔" ایک لمحے توقف کر کے وہ مسکرایا اور بولا "میرا رابطہ ارشاد احمد اور ملازم اشرف علی کے ذریعے بحال تھا۔ اشرف علی ڈیئر پروفیسر کا واحد ملازم تھا جس کے پاس تہ خانے کی چابی تھی اور جو بھی کبھار تہ خانے میں آتا تھا۔ اشرف کا ایک ساتھی ملازم بھی اس سلسلے میں اس کا رازداں تھا۔"

پھر مائیکل ارشاد احمد کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کب اور کیسے اس سے رابطہ کرتا تھا۔ مائیکل بڑے موڈ میں نظر آتا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں اپنی عیاری کی تمام تفصیل ہمیں بتائی اور تہ خانے کے حوالے سے کئی انکشافات کیے۔ اس کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب درج ذیل ہے۔

قریباً گیارہ ماہ پہلے جب مائیکل نے ارشاد احمد کے ساتھ مل کر مجسٹریٹ ذوکر اور ڈی ایس پی کمانڈو کو قتل کیا اور پروفیسر کی بیٹی کو یرغمال بنایا تو اس نے پروفیسر کے گھر میں واقع تہ خانے کو ہی اپنا مستقل ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ تہ خانہ کافی گہرائی میں واقع تھا اور ہر لحاظ سے محفوظ تھا پھر اس طرف کوئی آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ پروفیسر کی بیٹی کو یرغمال بنانے کے بعد مائیکل اور ارشاد احمد نے پروفیسر کو پانچ چھ ہفتوں کے لیے ایبٹ آباد بھیج دیا تھا۔ پروفیسر کی اس غیر حاضری کے دوران میں ان دونوں نے نہایت رازداری سے تہ خانے میں تبدیلیاں کرائیں اور یوں تہ خانہ ایک لگژری فلیٹ کی سی شکل اختیار کر گیا۔ اس کام میں پروفیسر کا ملازم اشرف اور اس کا ساتھی خشنا ارشاد احمد کے رازداں تھے۔

تہ خانے میں داخلے کے دو راستے تھے۔ ایک تو وہی آہنی دروازہ جس کا تالا تڑوا کر ہم اندر داخل ہوئے تھے اور بعد میں غزالہ بھی داخل ہوئی تھی' دوسرا راستہ ارشاد احمد کے ذاتی کمرے میں سے تھا۔ جیسا کہ پروفیسر نے مجھے بتایا تھا کہ اپنی علیحدہ رہائش گاہ بنانے کے باوجود ارشاد احمد نے اس گھر میں اپنا ذاتی کمرا نہیں چھوڑا تھا اور اکثر یہاں آتا رہتا تھا' درحقیقت یہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا۔ ارشاد احمد کے اس کمرے کے ساتھ ایک اسٹور بھی ملحق تھا۔ اس اسٹور کے اندر سے بھی تہ خانے میں اترنے کے لیے ایک راستہ بنایا گیا تھا۔ ارشاد احمد کے کمرے کی طرح اس اسٹور کو بھی تالا لگا رہتا تھا اور چابیاں ارشاد احمد کے پاس ہوتی تھیں یا پھر ملازم اشرف کے پاس۔ پروفیسر اپنے کلینک اور فارمیسی میں زیادہ مصروف رہتا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ کون آتا ہے' کون جاتا ہے؟ دونوں اہم ملازم چونکہ ساتھ ملے ہوئے تھے' لہٰذا ارشاد احمد اور مائیکل کو کسی طرح کی دشواری نہیں تھی اور یوں وہ لاڈلی بیٹی جس کے لیے پروفیسر دن رات تڑپ رہا تھا' اسی فرش کے نیچے دکھ جھیلتی رہی تھی جس پر پروفیسر چلتا پھرتا تھا۔ یہ عیاری اور دیدہ دلیری کی ایک حیران کن مثال تھی۔ ایک ایسا ملزم جس کو پورے شہر میں تلاش کیا جا رہا تھا' مدعی ہی کے گھر میں ایک سال سے روپوش تھا۔ مائیکل کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پروفیسر کو چکما دینے کے لیے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی پھر اسے گاڑی پر بٹھا کر یونہی قریبی سڑکوں پر تھوڑی دیر گھمایا جاتا تھا اور واپس کوٹھی میں لا کر تہ خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا جہاں وہ اپنی مصیبت زدہ بیٹی سے ملاقات کرتا تھا۔ بعد ازاں یہی عمل پھر دہرایا جاتا تھا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے گاڑی میں تھوڑی سی سیر کرائی جاتی تھی اور واپس کوٹھی میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

مائیکل کے یہ انکشاف ہمارے لیے تعجب خیز تھے۔ خاص طور سے پروفیسر اللہ دتا کی آنکھیں تو پھٹی رہ گئی تھیں۔

میں نے مائیکل سے پوچھا "ملازم اشرف اب کہاں ہے؟"

"تمہارے خیال میں وہ کہاں ہے؟" مائیکل نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"میری معلومات کے مطابق وہ آٹھ دس روز سے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔"

"نہیں... وہ یہیں ہے۔" مائیکل مسکرایا "اس کی ٹانگ کا ایک حصہ تم فریج میں دیکھ چکے ہو۔"

"کیا؟" پروفیسر چیخا۔

"ہاں... وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ بہت دکھی ہو رہا تھا۔ میں نے اسے سکھی کر دیا ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کا ایک انداز یہ بھی تو ہے۔"

"اور اسے سکھی کرنے کے بعد تم نے اس کا گوشت کھانا شروع کر دیا؟"

اس نے قہقہہ لگایا "انگریزی محاورے کے مطابق اسے ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ سکھی ہونے والا تو سکھی ہو گیا تھا۔ اب اگر اس کا بے جان جسم کسی کام میں آ جاتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ یوں سکھ پانے والے کی آتما بھی سکھی ہو جاتی ہے۔"

"اب تک اس تہ خانے میں کتنی آتماؤں کو سکھی کر چکے ہو تم؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا "کچھ زیادہ نہیں۔ میں نے اپنی خواہش پر بہت قابو رکھا ہے۔ پچھلے دس گیارہ مہینوں میں بمشکل چار پانچ آتمائیں ہی سکھی ہوئی ہوں گی۔"

میں اس کی ڈھٹائی پر ششدر تھا۔ مقدر نے کہا "یعنی چار پانچ انسانوں کو مار کر ان کا گوشت کھانے کا اعتراف کر رہے ہو تم؟"

وہ بولا "اعتراف تو جرم یا گناہ کا کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک تو یہ صرف ایک اطلاع ہے۔ میں نیامی حبشی ہوں۔ اگر تم افریقہ کے بارے میں اور وہاں کے لوگوں کے متعلق تھوڑا بہت بھی جانتے ہو تو تم نے "نیامیوں" کا ذکر ضرور سنا ہوگا اور مجھے یہ بتاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی کہ "نیامیوں" کی وجہ شہرت آدم خوری ہے۔ ہمارے رسم و رواج اور عقائد کے مطابق انسان کا گوشت کھانا ایک قطعی معمول کا عمل ہے۔ ہر خطے کے لوگوں کی کوئی بنیادی اور

مرغوب غذا ہوتی ہے۔ جیسے پاکستان میں گندم شوق سے کھائی جاتی ہے' بنگال میں مچھلی اور چاول' امریکا میں آلو' سری لنکا میں پلاؤ اور ناریل کا تیل' مڈل ایسٹ میں زیتون اور کھجوریں۔ اسی طرح ہم لوگوں کے لیے انسانی گوشت پسندیدہ غذا ہے۔ انسانی گوشت کی خواہش خود ہماری پیدا کردہ نہیں ہے' یہ صدیوں سے ہمارے خون میں سفر کررہی ہے۔ ہم چاہیں بھی تو تین چار صدیوں تک اس عادت سے مکمل چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ بالکل جیسے بنگال' امریکا اور سری لنکا وغیرہ کے لوگ اپنی اپنی مرغوب غذاؤں کی خواہش سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دنیا کے دوسرے باشندوں کی نسبت ہمارے لیے اپنی پسندیدہ خوراک کو ترک کرنا کہیں زیادہ دشوار ہے۔ انسانی گوشت کی لذت کے متعلق تم نے بہت کچھ سنا ہوگا اور جو کچھ تم نے سنا ہے حقیقت اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔"

میرا دل مالش کررہا تھا۔ صفدر بھی شاید بمشکل اپنی ابکائیاں روکے ہوئے تھا۔ ہم حیرت سے مائیکل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمارے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ جو خوش لباس شخص ہمارے سامنے کھڑا عمرانیات اور نفسیات وغیرہ پر بات کررہا ہے وہ ایک پیدائشی آدم خور ہے۔

صفدر نے پوچھا "جو چار پانچ افراد تمہاری "پسندیدہ خوراک" کی صورت تمہارے فریج میں پہنچے ہیں اور کچن کی زینت بنے ہیں' وہ کون تھے؟"

"بس' میری اور تمہاری طرح کے انسان ہی تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی ڈی ایس پی کمانڈو تھا جو ہم نے شروع میں ہلاک کیا تھا۔ اس کا گوشت اچھا تھا۔ میں نے اس کی لاش باہر نہیں پھنکوائی تھی۔ اس کا فروزن گوشت وقفے وقفے سے ڈیڑھ ماہ تک استعمال ہوا۔ بعد ازاں ارشاد احمد دو مزید افراد کو یہاں لایا۔ دونوں جواں سال تھے اور امریکا جانے کے خواہش مند تھے۔ وہ امریکا کو جنت قرار دیتے تھے۔ ہم نے انھیں ارضی جنت کے بجائے اصلی جنت میں پارسل کردیا۔ پروفیسر کا ملازم منشا بھی بے حد دکھی اور زندگی سے بیزار تھا۔ اس کی نجات کا کریڈٹ بھی مجھے ہی جاتا ہے۔"

"او! مائی گاڈ!" پروفیسر چیخا "تم نے منشا کو بھی مار ڈالا۔"

"او' تم تو یوں چلائے ہو جیسے خدانخواستہ تمہاری بیٹی کام آگئی ہے۔ بھئی وہ ملازم تھا' ایک معمولی ملازم۔"

میں نے کہا "منشا اور اشرف تو تمہارے ساتھ ملے ہوئے تھے پھر انھیں کیوں قتل کیا تم نے؟"

"بس وہ بہت زیادہ دکھی ہوگئے تھے۔ وہ منشا کتے کا بچہ! اتنا دکھی تھا کہ اس سے اپنا دکھ سنبھالا ہی نہیں گیا اور وہ ایک رات پاگل بھینسے کی طرح ڈیئر پروفیسر کی بچی پر جا پڑا۔ وہ نرم و نازک لڑکی اس بپھرے ہوئے مسٹنڈے کا مقابلہ کہاں تک کرتی۔ میرے باخبر ہونے تک اور موقع پر پہنچنے تک وہ اپنا کام کرچکا تھا۔ میں نے ڈیئر پروفیسر سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کی بیٹی پانچ برس بھی میرے پاس رہے تو اس کی آبرو پر کوئی حرف نہیں آئے گا لیکن اس بدبخت کی وجہ سے میرے وعدے کے ٹکڑے ہوگئے۔ جس منحوس رات لڑکی کی آبرو قتل ہوئی' اسی رات میں نے آبرو کے لٹیرے کو بھی قتل کردیا۔" مائیکل کے چہرے پر تشنج کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ تاہم اس کے چہرے سے اس کی سچائی یا دروغ گوئی کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔

میں نے پوچھا "اور اشرف کا کیا قصور تھا؟"

"اس کا قصور بھی صرف یہی تھا کہ وہ دکھی تھا۔"

"تم سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری لعنتی بھوک ان کی زندگی کے خاتمے کا سبب بن گئی تھی۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں تاکہ میں نے ان پانچوں میں سے کسی ایک شخص کو بھی بے سبب نہیں مارا۔ وہ بے چارے دکھی ہی اتنے تھے کہ انھیں مارنا مجھے کار ثواب محسوس ہوا۔ ہاں جب وہ مرگئے تو پھر ان کے جسموں کو بیکار پھینکنے کے بجائے میں نے انھیں استعمال میں لانا مناسب سمجھا۔ آخر میں اشرف کو دکھوں سے نجات حاصل ہوئی۔ وہ منشا کے اچانک غائب ہوجانے سے پریشان تھا۔ بے چارے کو یہ اندیشہ لاحق ہوگیا تھا کہ منشا میرے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ میں نے جب یہ دیکھا کہ اس کا اندیشہ پختہ ہوتا جارہا ہے اور وہ میرے لیے یا اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرلے گا تو میں نے اس کا خاتمہ بالخیر کردیا۔"

ہماری طرح پروفیسر بھی دم بخود سن رہا تھا۔ غزالہ گرم چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور قالین پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ بخار کی نشان دہی کررہا تھا۔ مائیکل نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈیئر! آج میں نے تم کو سب کچھ صاف بتادیا ہے۔ تمہیں اب اس بات پر یقین کرلینا چاہیے کہ تمہاری بیٹی کے سلسلے میں میں اپنے وعدے پر قائم رہا ہوں۔ بس۔۔۔ بس وہ ایک حادثہ تھا جو ہوگیا۔"

"میں مانتا ہوں۔ سب مانتا ہوں۔" پروفیسر نے کہا "مجھے تم سے کوئی گلہ شکایت نہیں' بس مجھے میری شائستہ کی صورت دکھادو۔"

"اچھا دکھا دیتے ہیں۔ دکھا دیتے ہیں لیکن تھوڑا صبر کرو۔" مائیکل نے جھنجھلا کر کہا۔

میں نے پوچھا "تمہارا دستِ راست ارشاد کہاں ہے؟"

"اس کے بارے میں میری معلومات بھی وہی ہیں' جو تمہاری ہیں بلکہ شاید تمہاری کچھ زیادہ ہی ہوں۔ تم نے کئی روز ارشاد احمد کا روپ دھارے رکھا ہے بلکہ ارشاد بن کر اپنے ہی قتل کے سودے بھی طے کرتے رہے ہو۔"

میں نے کہا "میری معلومات تو یہی ہیں کہ ارشاد احمد پولیس چھاپے سے پہلے ہی فرار ہوگیا تھا۔"

"میرے خیال میں تمہاری معلومات درست ہیں۔ وہ پولیس کے خوف سے روپوش ہے۔ اس وقت یہ بیس منٹ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی مگر باہر پولیس موجود ہے لہٰذا وہ یہاں بھی نہیں آسکتا۔ ویسے پروفیسر جیسے چالاک شخص کا حقیقی بھائی ہونے کے باوجود کبھی کبھی وہ بے وقوفی کا ثبوت دیتا ہے یا شاید لالچ میں آکر اس سے بے وقوفی سرزد ہوجاتی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آج سے چار ماہ پہلے میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اب کام سمیٹ لینا چاہیے لیکن وہ بضد رہا کہ نہیں' ابھی کچھ دیر اور یہ سلسلہ چل سکتا ہے' وہ پروفیسر کی پروفیسری کو پوری طرح نچوڑ لینا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پروفیسر کے عقیدت مندوں میں ابھی عقیدت موجود ہے۔ اس کا نظریہ غالباً یہ تھا کہ کام اس وقت چھوڑنا چاہیے جب پروفیسر کو اس کے عقیدت مندوں سے جوتیاں پڑنا شروع ہوجائیں یا لوگ خشوع و خضوع کے ساتھ جمع ہوکر آئیں اور ریکارڈنگ ایجنسی کے دفتر کو آگ لگا دیں۔ تم مشرقی لوگوں کی یہی تو مصیبت ہوتی ہے۔ جب ڈرتے ہو تو چھپکلی سے بھی ڈرتے ہو' جب دلیری دکھاتے ہو تو آنکھیں بند کرکے بھڑوں کے چھتے میں ٹکر دے مارتے ہو۔"

"پھر ایسے لوگوں سے تو بالکل نہیں ڈرنا چاہیے جبکہ تم نے ہمیں پنجرے میں بند کرکے رکھا ہوا ہے۔"

"سارے ایک جیسے نہیں ہوتے۔" مائیکل نے فوراً جواب دیا "میرا خیال ہے کہ مجھے یہاں تمہاری عیاری کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ تم نے ارشاد احمد اور اس کے چرسی نوکر کی بے وقوفی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ نہ صرف تم آناً فاناً رجب تک پہنچ گئے بلکہ "پروفیسر ڈیئر" کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے' کرے کوئی بھرے کوئی۔ بے وقوفی ارشاد احمد کے چرسی نوکر نے کی تھی اور نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے اپنے ایک مخلص اور جاں نثار ساتھی سے محروم ہونا پڑا۔ میں سائمن کا ذکر کررہا ہوں جو پچھلے دنوں تمہارے ہاتھوں شوٹ ہوا۔"

"چلو اپنے دکھوں سے نجات پالی اس نے۔" میں نے مائیکل کا فقرہ اسی پر الٹ دیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر سنبھل کر بولا "لیکن وہ دکھی نہیں تھا۔ وہ تو بہت سکون سے تھا' تم نے ایک غلط آدمی کو مارا اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو ناحق قتل کرتا ہے اس کی اپنی آتما دکھی ہوجاتی ہے اور زندگی اس کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس بوجھ کو اتار دینا نیکی کا کام ہے لیکن گھبراؤ مت' کم از کم میں تو یہ نیک کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔"

"تو کیا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے اس کے منصوبے کی ٹوہ لینا چاہی۔

"بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔" وہ مسکرایا۔

"پھر بھی کوئی ہنٹ تو دو۔" صفدر نے کہا۔

وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑے کچھ اور بھی چوڑے نظر آنے لگے تھے۔ تب وہ سنجیدگی سے بولا "میں یہاں سے جارہا ہوں۔ یہاں میرا کام ختم ہوچکا ہے۔ میری منزل اب ماریطانیہ ہے۔"

"اور ہماری منزل؟" صفدر نے پوچھا۔

"تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اس تہ خانے سے باہر یقیناً دوپہر ہوچکی تھی لیکن یہاں وقت کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ اور تو اور' ہمارے پاس گھڑیاں بھی نہیں تھیں۔ اس کمرے میں پابند کرنے کے بعد ہماری مکمل جامہ تلاشی لی گئی تھی اور لباس کے سوا کوئی چیز نہیں رہنے دی گئی تھی حتیٰ کہ میرا خنجر بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کمرے میں ایک وال کلاک موجود تھا مگر مائیکل اور غزالہ کی شدید چھینا جھپٹی کے دوران میں وہ بھی دیوار سے گر گیا تھا اور فرش پر ٹوٹا پڑا تھا۔

میں نے غزالہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ صفدر گلاس میں پانی لے آیا۔ میں نے رومال بھگو بھگو کر اس کی پیشانی پر رکھنا شروع کردیا۔ کچھ دیر بعد غزالہ کا بخار ہلکا ہوگیا مگر شام کے بعد پھر تیز ہوگیا۔ اس بخار کا سبب یقیناً سر کی چوٹیں ہی تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا

کہ اس تہ خانے سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ غزالہ کا بچہ کس حال میں ہے۔ زریں گل' گل ثوم اور سائیں عالی ہماری گمشدگی کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور خود کس حال میں ہیں؟ عمارت کے اردگرد پولیس موجود تھی اور ساہی صاحب بھی قریباً روزانہ ہی چکر لگاتے تھے۔ معلوم نہیں مائیکل نے ساہی صاحب اور ان کے عملے کو مطمئن کرنے کے لیے کیا قدم اٹھایا تھا؟ پھر میرا دھیان ان سنگین اعترافات کی طرف چلا گیا جو خوں خوار مائیکل نے کیے تھے۔

مجھے لگا جیسے اس تہ خانے میں ابھی تک شبر محمد ڈوگر' اس کی اہلیہ' ڈی ایس پی کمانڈو اور دیگر چار مقتولین کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ خدائے ذوالجلال نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا لیکن وہ کبھی کبھی خود کو درندوں سے بھی بدتر ثابت کردیتا ہے۔ ایسا شقی القلب بن جاتا ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی جیسے انسان کو تڑپا تڑپا کر مارتا ہے۔ اس کے نالے سنتا ہے' اس کی آخری ہچکیوں کا ارتعاش محسوس کرتا ہے لیکن اس پر رحم نہیں کھاتا۔

پروفیسر رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا اور رات کو جلدی سو گیا تھا۔ صفدر بھی صوفے پر بیٹھا بیٹھا نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ میں غزالہ کے قریب موجود تھا اور گاہے گاہے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ وہ گہری نیند میں بخار کے زیر اثر... بڑبڑانے لگتی تھی۔ اس نے کئی بار بچے "تابی" کا نام لیا' پھر ایک دو بار اپنی والدہ کو پکارا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اٹھے اور کچھ کھا پی لے۔ میں نے کئی بار اسے شانوں سے جھنجوڑا۔ اس نے آنکھیں نیم وا کیں اور پھر بند کرلیں۔ کچھ دیر بعد وہ بے ہوشی میں بڑبڑائی "میرا جانا ہی بہتر ہے شاہ جہاں... میں آپ کے پاس رہوں گی تو بہت دکھ جھیلوں گی۔ آپ کو کیا پتا کتنا چاہتی ہوں آپ کو... آپ کے پاس رہ کر آپ سے دور رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ کسی دن... کسی دن سب کچھ میرے بس سے باہر ہو جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو اس عہد کا کیا ہوگا جو میں نے خود سے کیا ہے۔ میں اپنی نظروں میں خود ہی گر جاؤں گی اس لیے مجھے جانے دیں شاہ جہاں۔ ہم ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی ایک دوسرے کو یاد رکھ سکتے ہیں۔ بتائیں رکھ سکتے ہیں نا یا نہ؟"

"ہاں رکھ سکتے ہیں۔" میں نے اس کی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے میری بات کہاں سننا تھی۔ وہ اپنی روانی میں بولتی رہی "میں آپ کو اپنا پتا نہیں بتاؤں گی مگر کبھی کبھی آپ کو خط لکھا کروں گی... اور جب "تابی" بڑا ہو جائے گا تو وہ بھی آپ کو خط لکھا کرے گا۔ ہم دور رہ کر بھی ہمیشہ آپ کے قریب رہیں گے۔"

کچھ دیر وہ خاموش رہی پھر اس نے کروٹ بدلی اور ایک دم بڑبڑانے لگی "اچھا' مجھے آپ ہی بتائیں۔ میں کیسے رہ سکتی ہوں یہاں۔ میں کیسے توڑ دوں اپنا عہد۔ اگر ایک بار توڑوں گی تو پھر بار بار توڑوں گی۔ میں پہلے ہی بہت کمزور ہوں' پلیز آپ میرے حوصلے کو طاقت دیں' مجھے اور کمزور مت کریں۔ پلیز شاہ جہاں۔"

رات آخری پہر تک وہ اسی طرح بڑبڑاتی اور کراہتی رہی۔ تاہم علی الصباح اس کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر کی درخواست پر مائیکل نے پروفیسر کا میڈیکل باکس کمرے میں پہنچا دیا۔ پروفیسر نے نہ صرف غزالہ کے سر کی پٹیاں تبدیل کردیں بلکہ کھانے کے لیے دوا بھی دی۔ دوا کھانے سے غزالہ کی طبیعت مزید بہتر ہوئی اور مجھے اس کی طرف سے کافی تسلی ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی غزالہ نے تابی کو دیکھنے کا مطالبہ کردیا۔ مائیکل کا موڈ غالباً اچھا تھا۔ اس نے غزالہ کا مطالبہ مانتے ہوئے نہ صرف یہ کہ تابی کو تہ خانے میں پہنچا دیا بلکہ پروفیسر کا وہ مطالبہ بھی مان لیا جو پروفیسر کل رات سے بار بار دہرا رہا تھا۔ تابی کو تہ خانے میں لانے کے چند ہی منٹ بعد مائیکل پروفیسر کی بیٹی شائستہ کو بھی کمرے میں لے آیا۔ اس کی عمر بمشکل بیس سال تھی۔ وہ یقیناً قبول صورت رہی ہوگی مگر حالات کی تاریک پرچھائیوں نے اس کے حسن کا چاند گہنا دیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یہ تلخ حقیقت کھل جاتی تھی کہ اس کا پاؤں بھاری ہے۔ پروفیسر کو دیکھتے ہی وہ چلا کر اس سے لپٹ گئی اور باپ بیٹی زار و قطار رونے لگے۔ مائیکل نے دروازہ باہر سے دوبارہ مقفل کردیا تھا۔ صفدر نے پروفیسر کو اور میں نے شائستہ کو دلاسا دیا اور انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔

دوپہر کا کھانا مائیکل کے ایک حبشی ملازم نے ہم تک پہنچایا۔ یہ بھی ایک دراز قد اور قوی ہیکل شخص تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک انڈرویئر تھا جو گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ اس کی صورت میں ایک ایسی کرختگی تھی جو عام انسان کے خدوخال میں نہیں ہو سکتی۔ یقیناً یہ شخص بھی مائیکل کے قبیل سے ہی تعلق رکھتا تھا اور اس کے ان تین حواریوں میں سے تھا جن میں سے ایک کو میں ہلاک کرچکا تھا۔ کھانا انگزاسٹ فین کے روزن کے ذریعے ہی ہم تک پہنچایا گیا۔ کھانے میں روٹی چاول اور گوشت کا شوربا تھا۔ اس تہ خانے میں آنے کے بعد

گوشت کے لفظ سے ہی نفرت ہونے لگی تھی۔ بے شک یہ گوشت بکرے کا تھا مگر کچھ ایسی کراہت دل میں پیدا ہو رہی تھی کہ پروفیسر سمیت کسی نے سالن کو ہاتھ نہیں لگایا۔

کھانے کے بعد صفدر قیلولے کے لیے لیٹ گیا۔ مجھے بھی غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں صفدر کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا۔ غزالہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بچہ اس کے پہلو میں چمٹ لیٹا تھا اور فیڈر سے دودھ پی رہا تھا۔ غزالہ کو محو خواب دیکھ کر وہ اٹھا اور بے تکلفی سے میرے سینے پر آکر اوندھا لیٹ گیا۔ میں نے پیار سے اس کے گھنگریالے بالوں کو بوسہ دیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ وہ لاڈ سے میری سرخ آنکھ میں انگلی چبھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کی انگلی پکڑ کر دانتوں سے ہلکا سا دبائی۔ وہ شکایتی انداز میں "ماما" پکارنے لگا۔ غزالہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور اپنے پہلو میں دیکھا پھر اس کی نگاہ تابی پر پڑی جو میرے سینے پر اوندھا پڑا تھا۔ غزالہ خاموشی سے تابی کو دیکھتی رہی پھر نقاہت بھری آواز میں بولی "کیوں ستاتے ہو انہیں۔ آجاؤ میرے پاس۔"

تابی نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا اور دوبارہ میری آنکھ میں انگلی چبھونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے غزالہ کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ جب سے وہ دوبارہ ملی تھی یہ پہلی مسکان تھی جو میں نے اس کے سنجیدہ ہونٹوں پر دیکھی تھی مگر افسوس کہ اس مسکان کی عمر فقط ایک لمحہ تھی۔ اگلے ہی لمحے پھر سنجیدگی کی پرچھائیوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ میں غزالہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وہ کیوں اس تہ خانے میں گھسی اور اپنی جان شدید خطرے میں ڈال کر مائیکل پر حملہ آور ہوئی۔ کیوں اس نے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی اتنا بڑا قدم اٹھالیا؟ مگر اس موقع پر یہ سوال غزالہ کو پریشان کرسکتے تھے لہٰذا میں خاموش رہا... تابی میرے سینے پر بدستور اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ غزالہ نے آنکھیں پھر سے موندلی تھیں لیکن... مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس کی بظاہر بند آنکھوں میں ایک معمولی سی درز موجود ہے جس میں سے وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ یہ معمولی سی درز امید کی ایک کرن جیسی تھی... اور کرن تو خواہ کتنی بھی چھوٹی ہو' تاریکی کے بڑے سے بڑے سمندر کا سینہ چیر سکتی ہے۔

امید کی اس کرن کے خوشگوار احساس کو سینے میں جذب کرکے میں لیٹا رہا۔ دھیرے دھیرے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی چلی گئیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد طبیعت میں ذرا بھاری پن آجاتا ہے لیکن یہ بھاری پن معمول سے قدرے زیادہ تھا۔ میں اس غیر معمولی بھاری پن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید میرے ذہن میں خطرے کی ایک آدھ گھنٹی بھی بجی تھی لیکن پھر اچانک ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

○☆○

اس کے بعد کے واقعات مجھے ایک دھندلے خواب کی طرح یاد ہیں اور یہ خواب مختصر نہیں تھا' بہت طویل تھا۔ شاید کئی دنوں پر محیط تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنے اردگرد آوازوں اور لمس کا احساس ہوتا تھا مگر یہ احساس واضح ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ آوازیں کہیں دور' بہت دور سے آرہی ہیں اور لمس بھی جیسے کسی دھند میں چھپا ہوا ہے پھر کسی وقت یوں محسوس ہوتا جیسے میں ایک ریل گاڑی پر سوار ہوں۔ ریل گاڑی ایک کوچ کے ساتھ کسی طویل سرنگ میں سفر کر رہی ہے۔ چلتی جارہی ہے' بس چلتی ہی جارہی ہے۔ کہیں کوئی اسٹیشن نہیں' کوئی منزل نہیں۔ کسی وقت گہری غنودگی میں مجھے اپنے بازو پر چبھن کا احساس ہوتا اور پورے بازو پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں۔ ذہن کی انتہائی تاریکی میں سے یہ موہوم سا احساس ابھرتا کہ شاید مجھے انجکشن لگایا جارہا ہے۔

پھر ایک روز مجھے یوں لگا جیسے میں کسی گودی پر ہوں۔ میرے اردگرد پانی کا شور ہے۔ باربردار مزدوروں کی چیخ و پکار ہے۔ مسافروں کی بے قرار آوازیں ہیں جیسے کہیں دور کوئی جہاز یا بجرا اپنا بلند بانگ ہارن بجا رہا ہے اور اس کی آواز ساحلی ہوا کے دوش پر ڈوب ابھر رہی ہے۔ کیا یہ محض میرا تصور تھا یا اس میں کوئی حقیقت تھی۔ میں نے گہری غنودگی میں سرتوڑ کوشش کرکے اپنے حواس مجتمع کرنے چاہے لیکن ناکامی ہوئی۔ پلکوں پر منوں بوجھ تھا۔ سخت جدوجہد کے باوجود میں انہیں کھول نہیں پایا' بے حسی اور بے اختیاری کا تند دھارا ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ بہا کرلے گیا۔

پہلی بار جب میرے حواس مکمل طور پر بحال ہوئے تو میں ایک سخت سطح پر پشت کے بل لیٹا تھا۔ میں کتنی ہی دیر خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہا۔ چھت لکڑی کے تختوں کی تھی اور ان پر رنگ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لکڑی کے "گرینز" اور گرہیں وغیرہ صاف نظر آرہی تھیں۔ میں جس سطح پر لیٹا تھا وہ متحرک تھی اور ایک تھرتھراہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنی قوت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میری نگاہ اپنے پاؤں پر گئی۔ پاؤں ننگے تھے اور جسم پر جو لباس نظر آرہا تھا وہ بھی میرے لیے اجنبی تھا۔ میں سوچ

کپڑے کے ایک براؤن پاجامے کرتے میں تھا۔ بلب کی روشنی میں مجھے اپنے اردگرد دس افراد اور نظر آئے۔ وہ سب براؤن پاجامے کرتے میں تھے۔ ان سب کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال منتشر تھے۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے کی طرف چلا گیا۔ میری شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ کم از کم ایک ہفتہ پرانی شیو تھی۔ ہم سب لوگ لکڑی کے ایک مضبوط کیبن میں تھے۔ اس کیبن میں صرف ایک دروازہ تھا کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ ایک کھلا بیت الخلا بھی اسی کیبن کے اندر نظر آرہا تھا۔ اکلوتے نلکے میں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک کر بیت الخلا میں گر رہا تھا۔ طہارت کے لیے لوٹے کی وضع کا ایک برتن بھی یہاں پایا جاتا تھا۔ میرے اردگرد موجود تمام افراد محوِ خواب تھے۔ وہ لکڑی کے سخت فرش پر یوں بے سُدھ لیٹے تھے جیسے نرم فوم پر استراحت کر رہے ہوں۔ میں نے ان کی صورتیں غور سے دیکھیں۔ ان میں دو تین سندھی یا بلوچی تھے' باقی سب پنجابی تھے۔ ان میں مجھے صرف ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور وہ صفدر کا تھا۔ صفدر کی شیو بھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور وہ کافی مدقوق نظر آرہا تھا۔ ایک چیز نوٹ کر کے میں بری طرح چونک گیا۔ صفدر اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا۔ اسے میک اپ کے بغیر دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گیا۔ میرا میک اپ بھی صاف کیا جا چکا تھا۔۔۔ چہرے کو چھونے کے لیے جب میں نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو کندھے کے قریب چبھن کا احساس ہوا۔ میں نے آستین اوپر اٹھا کر بازو دیکھا۔ وہاں چار پانچ جگہ ہلکے نیل نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ انجکشن کے نشانات تھے۔ ایسی ہی چبھن اور نشانات کا احساس مجھے اپنے کولہے پر بھی ہوا۔

میں صفدر کی حالتِ زار دیکھ چکا تھا' اب مجھے اپنی جسمانی کمزوری کا احساس بھی ہوا' جسم پہلے سے دبلا محسوس ہو رہا تھا۔ نقاہت بھی نمایاں تھی۔ یوں لگا جیسے پچھلے سات آٹھ روز تک ہمیں صرف انجکشن وغیرہ کے ذریعے ہی خوراک پہنچائی گئی ہے۔ میں اٹھ کر صفدر کے پاس پہنچا۔ جب میں فرش پر کھڑا ہوا تو پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ جس مرتعش فرش پر میں موجود ہوں وہ پانی پر تیر رہا ہے۔ مجھے بمبئی میں ایک مرتبہ ایک بڑے اسٹیمر جہاز پر سفر کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا' کچھ اسی قسم کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا۔۔۔ میں صفدر کے پاس بیٹھ گیا اور اسے جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے صفدر بیدار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں اور رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

"آپ کیسے ہیں شاہ جہاں صاحب؟" اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اور تم؟"

"میں بھی آپ کے سامنے ہوں۔ میں کچھ دیر پہلے جاگ گیا تھا۔ آپ کو جگانے کی کوشش کی' آپ نہیں جاگے تو پھر میں بھی سو گیا۔ میرا خیال ہے کہ چار پانچ گھنٹے تو سویا ہوں گا۔"

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ یہ ہم کس چیز پر سوار ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی بڑا بجرا یا جہاز وغیرہ ہے۔ یہ ہلکورا تم محسوس کر رہے ہو نا' یہ لانچ یا چھوٹی موٹی کشتی کا نہیں ہو سکتا۔"

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "مجھے اندیشہ ہے کہ۔۔۔ ہم۔۔۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کے قبضے میں ہیں اور ہمیں شاید پاکستان سے باہر لے جایا جا رہا ہے۔"

میں چند لمحے سناٹے کی سی کیفیت میں صفدر کا چہرہ تکتا رہا پھر میں نے پوچھا "کیا تم نے یہاں ان میں سے کسی کو دیکھا ہے؟"

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "اس کیبن جیسے یہاں پانچ چھ کیبن مجھے اور نظر آئے ہیں۔ ان سب میں بھی لوگ بند ہیں۔"

"تم نے کیسے دیکھ لیا۔ دروازہ تو بند ہے۔"

"دروازہ کھلا تھا لیکن پورا نہیں کھلا تھا۔" صفدر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور درمیان میں انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں سے ایک تختہ سلائیڈ کر کے پیچھے چلا گیا تھا۔ مشکل سے آٹھ نو انچ چوڑا خلا پیدا ہوا تھا۔ اس میں سے دو لڑکیوں نے کھانے کی دو ٹرے اندر پہنچائی تھیں۔ اس وقت میں باہر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"

"لڑکیاں کون تھیں؟"

"یقیناً وہ بھی ہماری طرح پکڑ کر لائی گئی ہیں۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک لمبا چوڑا سیاہ فام مسٹنڈا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک لمبی چھڑی تھی جسے لڑکیاں خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ غالباً لڑکیوں نے کسی طرح کی مزاحمت کی کوشش کی تھی جس کے بعد انہیں مارا پیٹا گیا تھا۔ باہر ایک ٹرالی پر بہت سی ٹرے رکھی ہوئی تھیں' لڑکیوں نے وہ سب اٹھا اٹھا کر کیبنوں میں پہنچائی تھیں۔ کھانے میں مرغی کا گوشت اور روٹیاں تھیں جو یقیناً انہی لڑکیوں نے پکائی تھیں۔ ہمارے کیبن میں میرے علاوہ صرف دو بندے اور جاگ رہے تھے۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور باقی کھانا واپس

کر دیا۔"

"زریں یا سائیں عالی تو نظر نہیں آیا؟"

"نہیں ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔" صفدر نے کہا۔

"اور غزالہ یا گل نوسر؟"

"نہیں۔ ان میں سے بھی کوئی نہیں۔"

"اس میں ایک پہلو امید کا بھی ہے۔" میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ کسی طور بچ گئی ہوں یہاں آنے سے۔"

"اور امید پر دنیا قائم ہے۔" صفدر کے لہجے سے بدستور ابری جھلک رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم قریباً ایک ہفتہ بے ہوشی کی حالت میں رہے ہیں۔" میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور اس بے ہوشی کی ابتدا بھی آپ کو یاد ہے یا نہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہی دوپہر کا کھانا جو ہم نے بیس منٹ کے کمرے میں کھایا تھا۔ سالن کو تو ہم میں سے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ چاولوں میں کچھ ملایا گیا تھا۔"

"مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ سات دن ہم کہاں رہے۔ اب ہم کہاں ہیں۔۔۔ اور کہاں جا رہے ہیں؟" صفدر نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

نجانے کیوں اس لمحے مجھے بدبخت مائیکل کا کہا ہوا وہ فقرہ یاد آگیا جو بیس منٹ میں اس کی کالی زبان سے ادا ہوا تھا۔ اس نے امریکن اسٹائل انگلش میں کہا تھا "خوش رہو۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا سفر اچھا گزرے گا۔" میں نے پوچھا تھا کہ سفر سے اس کی کیا مراد ہے۔ اس نے جواب دیا تھا "زندگی کا سفر۔"

معلوم نہیں کہ کیا منصوبے تھے اس بدبخت کے۔۔۔ ہمارے اردگرد جو آٹھ افراد موجود تھے وہ بالکل انہی لوگوں جیسے تھے جو ہمیں بردہ فروش رجب کے ٹھکانے پر ملے تھے۔ سب کے سب نوجوان' جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے' غریب اور متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے۔ ایک کے سوا ان سب کی عمریں بائیس اور پچیس سال کے درمیان تھیں۔ اب یہ سارے افراد ہمارے ہم سفر تھے اور ہم نامعلوم سمت میں پانی کی سطح پر سفر کر رہے تھے۔ مستقبل کا دھندلا سا نقشہ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور یقیناً صفدر کی نگاہوں کے سامنے بھی گھوم رہا ہو گا مگر فی الحال ہم دونوں اس سلسلے میں بات کرنے سے کترا رہے تھے۔

صفدر گہری سوچ میں تھا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "سائیں عالی بھی ہمارے ساتھ کوٹھی کے اندر تھا' معلوم نہیں اس کا کیا بنا؟"

"اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ برے سے برے حالات میں بھی اپنا بچاؤ کر لیتا ہے۔"

"ویسے یہ سائیں عالی ہے واقعی پُراسرار۔"

"شاید تم اس واقعے کا ذکر کر رہے ہو جب میں نے بھوپال کی اس کوٹھی میں ٹیوب لائٹ بجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ بٹن دبانے کے باوجود نہیں بجھی تھی۔"

"ہاں وہ واقعہ بھی حیران کن تھا لیکن میرا دھیان سائیں کی اس زلزلے والی بات کی طرف جا رہا ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"آپ کو یاد ہو گا۔ سائیں نے اس روز کتنی تکرار سے کہا تھا کہ کل رات گیارہ بج کر چالیس منٹ پر زلزلہ آئے گا۔"

"ہاں یاد تو ہے۔"

"اور آپ کو وہ وال کلاک بھی یاد ہے جو بیس منٹ میں مائیکل اور غزالہ کی جھڑپ کے دوران میں گر کر ٹوٹا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

صفدر ڈرامائی لہجے میں بولا "شاید آپ نے نوٹ نہیں کیا۔ وال کلاک گرنے کے بعد گیارہ بج کر اڑتالیس منٹ پر رک گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بیس منٹ میں پیش آنے والے نہایت سنگین واقعات کا آغاز گیارہ بج کر چالیس منٹ کے لگ بھگ ہوا تھا۔"

صفدر کی بات نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی چونکا دیا۔ صفدر خالی خالی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ سائیں نے جس خوفناک زلزلے کا اشارہ دیا تھا وہ یہی زلزلہ ہو جو بیس منٹ میں آیا اور سب کچھ تہ و بالا کر گیا۔"

صفدر کی بات سوچنے کی دعوت دے رہی تھی۔ آدم خور مائیکل ایک زلزلہ ہی تو تھا جو اچانک تہ خانے میں نمودار ہوا اور ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا گیا۔ ممکن تھا کہ عام شخص اسے ایک اتفاق کہتا بلکہ ہم بھی سائیں کو جانتے نہ ہوتے تو اسے اتفاق ہی کہتے مگر ہم سائیں کے حوالے سے ایسے اتنے اتفاقات دیکھ چکے تھے کہ اب ایسے واقعات کو محض اتفاق کہنا دشوار محسوس ہوتا تھا۔

صفدر اور میں کتنی ہی دیر اپنی اپنی سوچ میں گم رہے۔ ہمارے کیبن کے ایک دو مزید ساتھی بھی اب اٹھ گئے تھے۔ صفدر نے ان سے بات کرنا چاہی لیکن وہ بے حد ڈرے ہوئے

تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں لب تک ہلانے کی ہمت نہیں۔ بس ہاتھوں کے ڈرے ہوئے اشاروں سے انہوں نے یہ کہا کہ وہ کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔ ایک شخص کے بازوؤں پر مجھے ہنٹر یا بید کی چھڑی کے سیاہی مائل نشان نظر آئے۔ ایک دوسرے شخص کی آنکھ پر چوٹ لگی ہوئی تھی جو غالباً کسی زوردار مکے کا نتیجہ تھی۔ ایک نوجوان اٹھا تو اس کے چہرے پر بے قراری کی کیفیت نظر آئی۔ یقیناً اسے ٹوائلٹ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں علیحدہ سے انتظام نہیں تھا۔ کمرا ہی ٹوائلٹ تھا اور ٹوائلٹ ہی کمرا تھا۔ وہ کچھ دیر تو جھجکتا رہا اور ادھر ادھر چکراتا رہا، جب کچھ بھی بس میں نہ رہا تو ہمارے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بلا جھجک فارغ ہو گیا۔ بند کیبن میں بُو کا پھیلنا ضروری تھا لیکن جتنا اندیشہ تھا اتنی بُو نہیں پھیلی۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ چھت کے ایک کونے میں ایگزاسٹ فین موجود ہے۔ پرانا سا فین تھا لیکن کام کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر ذہن پر بوجھ سا محسوس ہوا کہ اگر ہم تادیر یہاں رہے تو ہمیں بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ بہرحال ایسے حالات کا انسان بہت جلد عادی ہو جاتا ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ لچک قدرت نے بڑے اہتمام سے رکھی ہوئی ہے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ منظر میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا جس کا نقشہ صفدر نے کھینچا تھا۔ کیبن کے بند دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک آواز آئی جس سے اندازہ ہوا کہ کسی کیبن کے دروازے کا تختہ کھینچا گیا ہے اور کھانے کے ٹرے اندر پہنچائے گئے ہیں۔ وقت کا اندازہ تو ہمیں نہیں ہو سکتا تھا لیکن گمان غالب یہی تھا کہ یہ رات کا کھانا ہے۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہمارے کیبن کے عین سامنے سنائی دی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازے کا ایک تختہ سلائیڈ کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ آٹھ انچ چوڑے اور تقریباً تین فٹ لمبے خلا میں سے دو لڑکیوں کے چہرے نظر آئے۔ وہ خاصی خستہ حال نظر آتی تھیں۔ چہروں سے تھکاوٹ کا اندازہ ہوتا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کتنے افراد کا کھانا پکانا پڑ رہا تھا انہیں۔ ان کے عقب میں ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص تھا۔ وہ لوہے کی ایک بڑی ٹرالی دھکیل رہا تھا۔ اس ٹرالی پر کھانوں کے ٹرے تھے اور پانی کے جگ تھے۔ یہ جگ عجیب وضع کے تھے۔ ان کی اونچائی کم اور قطر زیادہ تھا۔ یقیناً یہ جگ ان کیبنوں کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ ان کا سائز ایسا رکھا گیا تھا کہ آٹھ نو انچ کے خلا میں سے بہ آسانی گزر سکیں۔

صفدر کے بیان کے عین مطابق دروازے کے خلا میں سے پانچ عدد کیبن نظر آ رہے تھے۔ مگر میں نے چار منزلہ ٹرالی میں رکھی ہوئی ٹرے گنیں تو وہ ۱۸ تھیں۔ دو کیبنوں میں کھانا تقسیم ہو چکا تھا۔ اس حساب سے دیکھا جاتا تو ابھی ۸ کیبن اور تھے۔ یعنی یہاں کل دس کیبن تھے۔ اگر ایک کیبن میں دس افراد رکھے گئے تھے تو پھر یہاں حبسِ بے جا میں رکھے گئے افراد کی تعداد ۱۰۰ کے قریب تھی۔ صفدر نے بتایا تھا کہ زری گل یا سائیں عالی اسے قیدیوں میں نظر نہیں آئے لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ بھی ان ۱۰۰ قیدیوں میں ہی کہیں موجود ہوں۔

جب لڑکیاں کھانے کی ٹرے اندر پہنچا رہی تھیں میں نے ایک لڑکی سے بات کرنا چاہی۔ میں نے اردو میں کہا "اگر تم بتا سکتی ہو کہ ہم کس چیز پر سفر کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

ابھی میرا سوال بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ سیاہ فام تڑپ کر آگے آیا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی موٹی چھڑی تھی۔ اس نے یہ چھڑی نیزے کی طرح دو دفعہ میری گردن میں چبھوئی اور مجھے دور ہٹا دیا۔ ساتھ ہی اپنی زبان میں اس نے تند و تیز بکواس بھی کی تھی۔ چھڑی کی دوسری ضرب اتنی شدید تھی کہ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ دونوں لڑکیاں کھانا دے کر سہمی ہوئی سی پیچھے ہٹ گئیں پھر ایک اور سیاہ فام آگے آیا۔ یہ قد میں چھوٹا تھا اور اس کا جسم بھی زیادہ توانا نہیں تھا۔ وہ پتلون قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی راڈ تھی۔ لوہے کی اس راڈ کے ایک سرے پر تانبے کی پتی سے ایک فٹ قطر کا حلقہ سا بنا ہوا تھا۔ اس حلقے کے ساتھ تانبے ہی کا ایک تار منسلک تھا جو راڈ کے ساتھ ساتھ سیاہ فام کے ہاتھ تک چلا گیا تھا۔ سیاہ فام افریقی نے راڈ دروازے کے خلا میں سے کیبن میں داخل کی اور اس کے سرے کا حلقہ طوق کی طرح ایک شخص کی گردن میں ڈال دیا پھر اس نے تار کھینچا تو حلقہ گردن میں بالکل فٹ ہو گیا۔ تب اس شخص نے زور لگا کر اس شخص کو دروازے کے خلا کے قریب کھینچ لیا۔ یہ تھر تھر کانپتا ہوا شخص وہی تھا جس کی آنکھ پر مکے کی چوٹ کا زخم تھا۔ اسے خلا کے قریب کھینچ کر سیاہ فام افریقی نے اس کے زخم پر ایک مرہم لگایا اور پھر احتیاط سے بینڈیج کر دی۔ یہ عمل دیکھ کر بالکل یہی محسوس ہوا جیسے کوئی حیوانات کا ڈاکٹر جانوروں کے ریوڑ میں سے ایک جانور کو شکنجہ لگا کر مرہم پٹی کر رہا ہے۔ ڈیڑھ منٹ کے بعد تانبے کا حلقہ قیدی کی گردن میں سے نکال لیا گیا اور وہ کسی جانور ہی کی

طرح دُم دبا کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

کیبن میں موجود تمام قیدیوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری طرح وہ بھی اس کیبن میں نئے ہیں۔ کھانے کی ٹرے ان کے سامنے پڑی تھیں اور وہ جھجک جھجک کر لقمے لے رہے تھے۔ کھانے میں شوربے والے مٹر تھے اور روٹیاں تھیں۔ میں نے اور صفدر نے بھی چند نوالے لیے۔ ہم دونوں کے سوا کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بے شک وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں لائے گئے تھے مگر اس سے پہلے ان پر کافی ظلم و ستم توڑا جا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی حالت سدھائے ہوئے جانوروں کی سی نظر آ رہی تھی۔

غزالہ کا دھیان ہر پل میرے ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ منظر بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا جب ننھا محمد تابی میرے سینے پر چڑھ کر اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے غزالہ یہ منظر دیکھ کر مسکرائی ہے۔ وہ مدھم مسکراہٹ میرے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ تاریکی کے بیکراں سمندر میں میرے لیے امید کی ایک کرن موجود ہے۔ لیکن حالات کے اس پلٹے نے ایک بار پھر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ غزالہ کہاں اور کس حال میں تھی، مجھے کچھ علم نہیں تھا۔

صفدر نے جیسے میرے ذہن کا خیال پڑھتے ہوئے کہا "غزالہ کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟"

"میں نہیں سوچتا، وہ خود بخود سوچ میں آ جاتی ہے۔"

وہ بولا "اگر سائیں عالی کی زلزلے والی پیش گوئی کو سچ مان لیا جائے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غزالہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"سائیں عالی نے یہی کہا تھا نا کہ غزالہ کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے کیونکہ زلزلے کی آمد آمد ہے، یہ نہ ہو کہ زلزلے میں وہ ہم سے بچھڑ جائے۔"

میں نے کہا "ہم سائیں عالی کی باتوں کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دینے لگے ہیں!"

"مشکلات میں انسان کا یقین روحانیت پر بڑھ جاتا ہے اور اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ ہم اس جدید دور میں بھی قدیم زمانے کے غلاموں کی طرح پابہ زنجیر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جائے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "صفدر، خبر نہیں کیوں میرے دل میں ایک وہم سا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر۔۔۔ غزالہ اس بار بھی مجھ سے دور ہو گئی تو پھر میں اسے کبھی نہ پا سکوں گا۔ سب کچھ ہمیشہ کے لیے ایک حسرت بن کر رہ جائے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب آپ خود بھی سائیں عالی کی باتوں کو اہمیت دے رہے ہیں۔"

"نہیں۔ تمہارا تجزیہ غلط ہے۔" میں نے کہا۔

ایک دم جیسے صفدر کو کچھ یاد آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی قمیص کے نیچے پائجامے کے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور مڑے تڑے اخبار کا ایک ٹکڑا نکال لیا "ہمارے لیے ایک بے حد اہم خبر ہے؟" اس نے کہا۔

"کس بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"وینیسے کے بارے میں۔" اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔

مصنف ایم۔ اے راحت کے سدا بہار
قلم سے ایک شاہکار ناول
باغی
معاشرے کی سنگلاخ چٹانوں پر
سفر کرنے والے بیٹے کی داستان
★
جس نے ماں کے لئے ذہن کی پستیاں سمیٹ لیں
★
قہقہوں کے درمیان چھپے آنسوؤں کی داستان
★
طنز و مزاح کا پیکر ناول
★
خوبصورت سرورق دیدہ زیب گیٹ اپ
علی میاں پبلی کیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 7247414

اس نے اخبار کے مڑے تڑے کاغذ کو سیدھا کیا۔ یہ بائیس تاریخ کا اخبار تھا۔ یعنی اگر ہم ایک ہفتہ بے ہوشی کی حالت میں رہے تھے تو یہ اخبار پانچ روز پہلے کا تھا۔ صفدر نے ایک سرخی پر انگلی رکھ دی۔ پہلے صفحے پر یہ چار کالمی سرخی کافی نمایاں تھی۔ جلی حروف میں لکھا تھا "چھتے پُل کی حویلی کے نوادرات ایک سازش کے تحت غائب کیے گئے۔"

ذیلی سرخی تھی "سارا چکر شاہ جہاں عرف استاد جہانی نے چلایا۔"

مزید ذیلی سرخیاں یوں تھیں "استاد جہانی نے ایک امریکی ادب چی سے ملی بھگت کرکے ملک کو قیمتی اثاثے سے محروم کیا اور کروڑوں کا نقصان پہنچایا۔"

اس تہلکہ خیز خبر میں مجتبیٰ کنور کے حوالے سے کئی انکشافات کیے گئے تھے۔ مجتبیٰ کنور نے کہا تھا کہ شاہ جہاں نے اپنے کچھ بہی خواہوں کے ساتھ مل کر دفینے کے حوالے سے بہت بڑا فراڈ کیا ہے۔ ان لوگوں نے انمول نوادرات اور قریباً بیس کروڑ کے جواہر اور سونا انڈیا سے یو ایس اے منتقل کردیا ہے۔ مجتبیٰ کنور نے اس سلسلے میں چند ثبوت بھی پیش کیے تھے۔ مسٹر کلارک کی کمپنی ایف ایم کے دو انڈین ملازم تھے جنہوں نے بیان دیا تھا کہ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے کئی بریف کیس ایف ایم کی بھوپال برانچ میں لائے گئے تھے۔ بعد ازاں انہیں راز داری سے کسی اور جگہ منتقل کروایا گیا تھا۔ انڈین ائیر لائن کی ایک انٹرنیشنل فلائٹ کے کارگو کی تفصیل بھی شواہد میں شامل تھی۔ اس تفصیل میں بیس عدد بریف کیسوں کا ذکر موجود تھا۔ اس کے علاوہ گوپی ناتھ میڈیکوز کے گودام کا اسٹور کیپر بھی شاملِ تفتیش ہوا تھا۔ اس نے خانہ بدوش لڑکی کی عصمت دری کا اعتراف کیا تھا' اس کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ گودام میں کئی ہفتے تک کچھ پُراسرار قسم کا سامان اسٹور رہا ہے۔

اندازہ ہوتا تھا کہ مجتبیٰ کنور پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہا۔ اس نے اپنے وسیع ذرائع استعمال کرتے ہوئے معاملے کی چھان بین جاری رکھی تھی اور آخر یہ کھوج پالیا تھا کہ بریف کیس کیسے اور کب بھوپال سے نیویارک منتقل کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو پانے کے بعد مجتبیٰ کنور کا آگ بگولا ہونا لازمی تھا۔ وہ میرے سامنے نہیں تھا' تاہم میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح کھول رہا ہے اور اس کے منہ سے شعلے خارج ہورہے ہیں۔ درحقیقت مجتبیٰ کنور کے لیے یہ سزا تھی اس لالچ کی جو اس نے دفینے کے حوالے سے کیا تھا۔ اگر وہ لالچ نہ کرتا اور ہم سے بالا ہی بالا سرکاری افسران سے ساز باز شروع نہ کردیتا تو یہ سارا معاملہ باہمی مشورے سے طے ہوتا۔ ہم دفینے کا سارا سامان قانونی طریقے سے پاکستان لاتے اور قانونی طریقے سے ہی اس کے حق داروں کا فیصلہ بھی ہوتا۔ اب مجتبیٰ کنور جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا اور بارودی دھماکوں جیسے بیانات دے رہا تھا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ہمارے خلاف انتظامیہ کی ساری مشینری کو حرکت میں لے آیا ہوگا اور جگہ جگہ ہماری گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جارہے ہوں گے۔ یعنی جو دشمنی اب تک ڈھکی چھپی تھی وہ کھل کر سامنے آگئی تھی۔

مجتبیٰ کنور نے اس خبر کو وطن دشمنی کے نقطۂ نظر سے بھی اچھالا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ملک کو گراں قدر ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے محروم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ ایسے بیسیوں نوادرات جن کا تعلق صرف پاکستان سے تھا' پیسے کے لالچ میں امریکا پہنچا دیے گئے ہیں اور اس گھناؤنے فعل کے ذمے دار استاد جہانی کے علاوہ اس کے کئی ساتھی بھی ہیں۔ مجتبیٰ کنور کو معلوم نہیں تھا کہ وہ تمام نوادرات جن کا تعلق پاکستان سے تھا ہم نے بھوپال ہی میں بڑی ذمے داری سے محفوظ کردکھے ہیں۔

صفدر نے پچھلے صفحے پر باکس میں ایک اور سنگین خبر کی طرف اشارہ کیا۔ یہ محترم ایس ایس پی ساہی صاحب کی معطلی اور گرفتاری کی خبر تھی۔ خبر میں لکھا گیا تھا کہ اعلیٰ حکام کی ہدایت پر استاد جہانی سے خصوصی تعلق رکھنے والے اس سینئر پولیس آفیسر کو بھی لائن حاضر کرکے گرفتار کرلیا گیا ہے اور اس سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ خبر میں "بھی" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھ سے تعلق رکھنے والے کچھ اور لوگوں کو بھی پکڑا گیا تھا۔ میرا دھیان چاروں طرف گھوم گیا۔ میرا اور کون ہوسکتا تھا۔ شفتا اور انجم تو یقیناً محفوظ پناہ گاہ میں تھیں اور مجھے بھروسا تھا کہ پولیس ان تک نہیں پہنچ سکتی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ساہی صاحب کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

صفدر نے کہا "گرفتاری کی اس خبر میں کہیں غزالہ اور اس کے والدین کی طرف تو اشارہ نہیں؟"

"ممکن ہے۔ اور پھر زریں گل اور کلثوم بھی تو نظر نہیں آرہے۔ ان کے علاوہ عالم قریشی ہے۔ سائیں عالی اور مروج ہیں۔ غزالہ کی استاد مسز رقیہ اور مہرالنساء بھی ہیں۔"

صفدر اور میں کافی دیر گم صم بیٹھے رہے۔ صفدر کے چہرے پر تاسف نظر آرہا تھا۔ گہری سانس لے کر بولا "ایک بات بار بار ذہن میں آتی ہے شاہ جہاں صاحب۔"

"کیا؟"

"کہیں ہم سے واقعی غلطی تو نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے' کہیں ہم نے مسٹر کلارک پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تو نہیں کرلیا۔ اب دیکھیے نا۔ قریباً دو مہینے ہونے کو آئے ہیں لیکن مسٹر کلارک کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اسے ہم سے مسلسل رابطہ رکھنا چاہیے تھا۔ ہمیں بتانا چاہیے تھا کہ نوادرات اور زیورات کی فروخت کس مرحلے میں ہے اور یہ کام کب تک مکمل ہوگا۔"

میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ میں جانتا تھا کہ زریں کی طرح صفدر بھی لالچی نہیں۔ مگر دفینے کے سامان کا معاملہ اتنا بڑا اور گمبھیر تھا کہ ذہن میں بے اختیار اندیشے ابھرتے تھے اور معروضی انداز میں سوچا جاتا تو میں نے واقعی ایک بڑا رسک لیا تھا' بغیر کسی گارنٹی اور تحفظ کے کروڑوں کا سامان مسٹر کلارک کے حوالے کردیا تھا تاکہ وہ اسے بیرون ملک لے جائیں۔ اب اگر ان کی نیت میں فرق آجاتا تو ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ مسٹر کلارک جیسے نہایت بارسوخ شخص کے لیے کسی حیلے بہانے سے یہ دولت ہضم کرنا مشکل نہیں تھا۔

"آپ مسکرا رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"مسکراہٹ اطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یعنی آپ مسٹر کلارک کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہیں؟"

"پوری طرح مطمئن تو کبھی بھی نہیں ہوا جاسکتا لیکن میرے دل کی گواہی ہے کہ مسٹر کلارک اچھے انسان ہیں' وہ اپنا وعدہ ایفا کریں گے۔"

"مگر اچھا انسان کبھی کبھی برے حالات میں بھی تو پھنس جاتا ہے!"

"برے حالات میں تو ہم بھی پھنس سکتے ہیں بلکہ پھنسے ہوئے ہیں۔"

"گستاخی معاف۔۔۔ میرا مطلب یہ تھا شاہ جہاں صاحب کہ بے شک ہم دفینے کا سامان پاکستان نہ لاتے' ہم اسے انڈیا میں ہی کہیں محفوظ کردیتے۔ مسٹر کلارک کا حصہ دے کر انہیں رخصت کردیا جاتا۔ سامان انڈیا میں ہوتا تو سامان اور حالات پر ہماری گرفت ہوتی۔"

"اوّل تو ہم انڈیا میں اسے محفوظ رکھ ہی نہیں سکتے تھے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو سامان کی فروخت اور مناسب قیمت ملنے کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل موجود تھے۔"

"میں کوئی اعتراض نہیں کررہا ہوں جناب۔ مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ مسٹر کلارک کی طرف سے اتنی تاخیر کیوں ہوئی ہے۔"

"کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ بہرحال مسٹر کلارک کی ذات پر مجھے اب بھی مکمل اعتماد ہے۔"

"اگر آپ کو ہے تو پھر ہمیں بھی ہے۔" صفدر مسکرایا "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

پھر شاید اس کا دھیان ساہی صاحب کی طرف چلا گیا تھا' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ پُرسوچ لہجے میں بولا "ساہی صاحب معلوم نہیں کس حال میں ہوں گے۔"

"مجھے ان سے زیادہ فکر زریں اور کلثوم کی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے ہیں تو بہت برا ہوا ہے۔ زریں کے پاس تو وکیل کرنے کے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔ عالم قریشی مدد کرسکتا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ بھی پکڑا گیا ہو' یا پھر روپوش ہوگیا ہو۔"

صفدر ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ وہ سٹپٹایا ہوا تھا "میں پوچھتا ہوں ان لوگوں سے کہ وہ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر سے بٹھالیا "ابھی تمہارے سامنے میں نے بھی یہی پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" میں نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ سیاہ فام نے مجھے چھڑی سے جو بے رحم ٹھوکا دیا تھا اس نے گردن پر گہرا نیل ڈال دیا ہے۔

صفدر مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا۔ اچانک ایک شخص نے بلند آواز سے رونا شروع کردیا۔ پھر وہ بے حال ہوکر چیخنے لگا "ہائے میں کیا کروں۔ نسرین میں کدھر جاؤں۔۔۔ ہائے نسرین میں کیا کروں۔"

پھر وہ تیزی سے اٹھا اور غم سے نڈھال ہوکر اس نے دروازے کی مضبوط چوکھٹ سے سر ٹکرانا شروع کردیا۔ یہ پورا کیبن لکڑی کا تھا۔ اس کے سر کی ضربوں سے مہیب آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ سر ٹکرانے والے کی پیشانی پھٹ گئی اور خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں نے دیکھا کہ یہ وہی شخص تھا جس کی آنکھ پر تھوڑی دیر پہلے سیاہ فام پہرے دار نے مرہم لگا کر پٹی باندھی تھی۔

صفدر نے بھاگ کر اسے شانوں سے پکڑا۔ حیرت کی بات تھی کہ باقی سب افراد دم بخود بیٹھے تھے۔ جیسے کچھ دیکھ رہے ہوں نہ سن رہے ہوں۔ وہ شخص صفدر کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہا تھا لیکن یہ کسی عام شخص کی گرفت نہیں تھی' وہ صرف اپنے نچلے دھڑ کو حرکت دے پا رہا تھا۔ یوں لگتا

تھا کہ اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔ پوری قوت سے ٹانگیں چلا رہا تھا وہ۔ میں نے بمشکل اس کی ٹانگیں قابو کیں۔

اسی دوران میں دروازے میں موجود سلائیڈنگ تختہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور آٹھ نو انچ چوڑے خلا میں سے دو حبشیوں کی خوں بار آنکھیں نظر آئیں۔ ایک حبشی کے منہ سے غراہٹ برآمد ہوئی' اس نے بڑی چابک دستی سے کوئی شے کیبن کے اندر داخل کی۔ یہ وہی راڈ تھی جس کے اگلے سرے پر سٹیل کا پھندا لگا ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ پھندا مضروب کی گردن میں فٹ ہو گیا۔ حبشی نے صفدر کو اشارہ کیا کہ وہ مضروب کو چھوڑ دے۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد صفدر نے اسے چھوڑ دیا۔ میں ٹانگیں پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ حبشی نے ایک بے رحم جھٹکے سے مضروب کو خلا کے قریب کھینچ لیا۔ گلا دبنے سے مضروب کی گردن کی رگیں پھول گئی تھیں اور پیشانی سے رسنے والا خون باقاعدہ بہنے لگا تھا۔ وہ چیخنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ لمبے تڑنگے طاقت ور حبشی نے زور لگا کر مضروب کا سر خلا میں سے باہر نکال لیا۔ پھر اس نے آہنی راڈ کو ایک کنڈے میں یوں پھنسا دیا کہ مضروب واپس کیبن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اب اس کا سر کیبن سے باہر اور دھڑ کیبن کے اندر تھا۔ سیاہ فام حبشی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کی چھڑی حرکت میں آئی اور شائیں سے مضروب کی گردن پر لگی۔ وہ چیخ پڑا۔ یہ اتنی زوردار ضرب تھی کہ مضروب کی گردن کی کھال پر فوراً سرخ لکیر نمودار ہو گئی اور خون رسنے لگا۔ دوسری ضرب اس کے رخسار پر لگی' یہاں سے بھی گوشت ادھڑ گیا۔ پھر تو جیسے سیاہ فام پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اندھا دھند ضربیں لگانے لگا۔ وہ اتنی قوت سے ہاتھ چلا رہا تھا جیسے جیتے جاگتے انسان پر نہیں مٹی کی دیوار پر ضربیں لگا رہا ہو۔ شاید اس کا ارادہ تھا کہ چہرے کا قیمہ بنا کر چھوڑے گا۔ بدقسمت شخص کے ایک رخسار سے کھال لٹک گئی تھی اور اب ہر ضرب سے خون کے باریک چھینٹے اڑ رہے تھے۔ وہ چیخ چیخ کر نیم جان ہو گیا تھا۔ کیبن کے اندر اس کا نچلا دھڑ تکلیف کی شدت سے کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔

میں نے چلا کر کہا "چھوڑ دو اسے۔ کیا اب اس کی جان لے لو گے؟"

میں نے یہ جملہ انگلش میں کہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ خونخوار سیاہ فام صرف قبائلی زبان سمجھتے تھے۔ مضروب کے چہرے کا بھرتا سا بن گیا تھا۔ پہلے اس کی صرف ایک آنکھ زخمی تھی اب پورا چہرہ خون رنگ ہو رہا تھا۔ چھڑی چلانے کے ساتھ ساتھ سیاہ فام اپنی زبان میں کچھ بک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مضروب کی چیخیں مدھم ہو گئیں پھر اس کا سر ایک دم نیچے کی طرف جھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے منہ سے خون کے ساتھ ساتھ رال بہہ کر فرش پر گر رہی تھی۔ ناک سے بھی مواد بہہ رہا تھا۔ چہرے کی ایک جانب کی جلد خوفناک انداز میں لٹکی ہوئی تھی۔

سیاہ فام نے اس کے زخم زخم چہرے پر نفرت بھری نگاہ ڈالی اور گردن سے پھندا نکال کر واپس کیبن میں پھینک دیا۔ وہ لکڑی کے مضبوط فرش پر لاش کی طرح کھٹاک سے گرا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کے ساتھی ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ کسی نے اٹھ کر اسے دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان سسکیوں سے رو رہا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں سسکیوں کی آواز بلند نہ ہو جائے وہ بار بار اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیتا تھا۔ میں نے اور صفدر نے مضروب کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ صفدر نے پلاسٹک کے گلاس میں مٹکے سے پانی لے کر اسے پلانے کی کوشش کی مگر وہ بے سدھ تھا۔ دروازے کا نو انچ چوڑا اور تین فٹ لمبا خلا پھر سے بند ہو چکا تھا۔ بدنصیب شخص کے رخسار سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ کیبن میں کوئی ایسی شے موجود نہیں تھی جس سے خون کو روکا جا سکتا یا مرہم پٹی کی جا سکتی۔ ہم اس کے چہرے کو دھونے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ کیبن میں بوسیدہ لیکن صاف ستھرے کمبل موجود تھے۔ کیبن کے ایک کونے میں دو کمبل بچھا کر مضروب کو لٹا دیا اور دو کمبل اس کے اوپر ڈال دیے۔ اس کارروائی کے دوران میں کوئی دوسرا شخص اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ صرف درمیانی عمر کے ایک شخص نے مضروب کو اٹھا کر کمبل پر لٹانے میں ہماری مدد کی تھی۔

میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا "اس بندے کا کیا نام ہے؟"

"اسلم۔" اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

"اور تمہارا نام؟"

"نثار علی۔ یہ بندہ میرے ہی محلے کا ہے۔" اس نے مضروب اسلم کی طرف اشارہ کیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟"

"وزیر آباد سے۔ دبئی جانا چاہتے تھے۔ ان ظالموں کے چنگل میں پھنس گئے۔"

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ہم کس شے پر سفر کر رہے ہیں۔ کوئی لانچ ہے یا۔۔۔؟"

"تمہاری طرح مجھے بھی اس کمرے میں ہی ہوش آیا ہے۔ یہاں جتنے بندے ہیں ان سب کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔"

"پہلے کہاں تھے تم لوگ؟"

اس سے پہلے کہ نثار نامی وہ شخص جواب دیتا' دروازے کے پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ لرز کر خاموش ہو گیا۔ نہ صرف خاموش ہو گیا بلکہ دور ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ بھاری قدموں کی آہٹیں دروازے کے بالکل پاس پہنچیں۔ یہ ایک سے زائد افراد تھے۔ دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ اس مرتبہ دروازے میں خلا پیدا نہیں ہوا بلکہ دروازہ پورا ہی کھل گیا۔ خود سے صرف سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر مجھے ایل ایم جی (لائٹ مشین گن) کی خوفناک نال نظر آئی۔ یہ ایک دیوہیکل سیاہ فام تھا۔ اس کے پہلو میں ایک اور قد آور سیاہ فام نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بدبخت خیابی تھا جس نے چھڑی کی ضربوں سے اسلم کے چہرے کی کھال ادھیڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پستول بردار نے بڑی کرخت آواز میں کچھ کہا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں اٹھ کر کیبن سے باہر آ گیا۔ دروازہ ایک بار پھر جھٹکے سے بند کر دیا گیا۔ پستول بردار نے اپنا پستول پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور جیب ہی سے ایک چابی نکال کر کیبن کے وزنی دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ مشین گن والا اس دوران میں بالکل چوکس کھڑا رہا تھا۔ میں ان لوگوں کی درندگی دیکھ چکا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ بندہ مارنا ان کے لیے مکھی مارنے کی طرح ہے۔ قریب ہی لکڑی کی دیوار پر ایک کھونٹی تھی اور اس پر تین عدد ہتھکڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ پستول بردار نے ایک ہتھکڑی اتاری اور انگلی کے اشارے سے مجھے گھوم جانے کا آرڈر دیا۔ میں نے اپنا رخ دیوار کی طرف کر لیا۔ سیاہ فام نے میرے ہاتھ پشت کی طرف موڑے اور کلائیاں ہتھکڑی میں جکڑ دیں۔ تب اس نے بڑی بے رحمی سے میری کمر میں اپنی منحوس چھڑی سے ٹھوکا دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری پسلیاں توڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے وہ میری گردن میں بھی ایسے ہی پرغضب ٹھوکے دے چکا تھا۔ میرے لیے اس کے دل میں خصوصی عناد محسوس ہوتا تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں ان کے ایک ساتھی (سائرن) کو ہلاک کیا تھا۔ اس سخت مقابلے کا ہر ہر منظر مجھے اب تک یاد تھا۔ یقیناً ان جنگجوؤں کے ذہن میں بھی یہ واقعہ ابھی ترو تازہ تھا۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر ایک بڑے دروازے تک لائے۔ دروازہ کھولا گیا تو سامنے لکڑی کی ہی تنگ و تاریک سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گن بردار میرے عین عقب میں تھا۔ میرے نتھنوں میں عجیب سی بو گھس رہی تھی بلکہ اسے خوشبو کہنا چاہیے۔ یہ جانی پہچانی خوشبو تھی۔ ذہن پر زور دیا تو اندازہ ہوا کہ یہ باسمتی چاولوں کی خوشبو ہے۔ پرانے باسمتی چاولوں کی بوری کھولی جائے تو اس میں سے ایسی ہی مہک آتی ہے۔

قریباً تیس عدد زینے طے کرنے کے بعد ہم کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے ایک اسٹور میں پہنچے۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں' تیل کے خالی ڈرم' مچھلیاں پکڑنے کے جال۔ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے کنٹینرز' بہت کچھ بھرا ہوا تھا اس اسٹور میں۔ اس کاٹھ کباڑ میں سیڑھیوں کا بالائی دروازہ یوں چھپا ہوا تھا کہ آسانی سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اسٹور کا دروازہ اندر کی طرف کھلا۔ سامنے بھری ہوئی بوریوں کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی دن کی روشنی بھی دکھائی دی۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ رات تھی لیکن باہر دیکھا تو سہ پہر کا منظر نظر آیا۔ درحقیقت کیبن میں کچھ دیر پہلے ہمیں دوپہر کا کھانا دیا گیا تھا۔ اس سے چند گھنٹے پہلے دیا جانے والا کھانا صبح کا تھا۔ دروازہ کھلنے کے باوجود آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ بوریوں کی اونچی اونچی قطاروں نے دروازہ مسدود کر رکھا تھا۔ گن بردار نے ذرا آگے بڑھ کر بوریوں کی ایک قطار کو ٹانگ سے دھکیلا تو میں ششدر رہ گیا۔ دو عمودی قطاروں میں رکھی ہوئی قریباً بیس عدد بوریاں ایک دم سلائیڈ کر کے پیچھے ہٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بوریوں کے درمیان ایک پانچ فٹ چوڑا راستہ نظر آنے لگا۔ بالکل "کھل جا سم سم" والا معاملہ تھا۔ پیچھے ہٹنے والی بوریاں درحقیقت ایک سلائیڈنگ تختے پر رکھی گئی تھیں۔ یہ تختہ چھوٹے چھوٹے پہیوں کے ذریعے دو شاندار پٹڑیوں پر بے حد روانی سے حرکت کرتا تھا۔ میرے سامنے گن بردار نے صرف ایک ٹانگ کے زور سے اس میکنیزم کو بہ آسانی حرکت دے دی تھی۔ ہم چار پانچ فٹ چوڑے راستے میں داخل ہو گئے۔ ہمارے دونوں جانب بوریوں کے قریباً ۲۰ فٹ اونچے ڈھیر تھے۔ اس کے اوپر بڑے بڑے شیڈ نظر آ رہے تھے۔ خوشبو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ان بوریوں میں بہترین کوالٹی کے باسمتی چاول ہیں۔ ہم قریباً پچاس گز طویل راستے سے گزر کر کھلی جگہ پر آ گئے۔ میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ہم ایک وسیع و عریض جہاز پر تھے۔ اپنے دائیں کندھے کے اوپر سے میں اس جہاز کے پہلے عرشے

کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا عرشہ تھا اور پھر جہاز کا شان دار "برج" دکھائی دیتا تھا۔ دونوں عرشوں پر جہاز کے باوردی ملازم چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ان کی وردیاں نیلی تھیں اور سروں پر زرد ٹوپیاں تھیں۔ ان کی نیلی جیکٹوں پر پشت کی جانب کچھ پرنٹ بھی تھا۔ یہ ایک مونوگرام تھا جس میں "ااا" کے الفاظ نمایاں تھے۔ میں پہلی نگاہ میں پہچان گیا تھا کہ یہ ایک مال بردار جہاز تھا۔ جہاز نہ تو نیا تھا نہ بہت پرانا۔ ہاں اس کے کچھ حصے قدرے بوسیدہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے جہاز سے آگے نیلے سمندر پر نظر ڈالی۔ دور تک سمندر ہی دکھائی دیتا تھا اور سمندر سے آگے بھی سمندر ہی تھا۔ سمندر کی کوئی قسم نہیں ہوتی۔ کوئی سمت اور کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ یہ بس سمندر ہی ہوتا ہے۔ اپنے سینے میں ہزاروں طوفان، ان گنت راز اور لاتعداد دنیائیں سمیٹے ہوئے، یہ ایک اور ہی جہان ہے۔ یہ ایک کہانی ہے اور اس کے اندر لہر در لہر ہزاروں کہانیاں ہیں۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نیلے سمندر کی طرح نیلے آسمان نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم کس راہ پر محو سفر ہیں۔ دور دور تک کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ ہم کھلے سمندر میں، ساحل سے بہت دور ہیں۔

سیاہ فام نے ایک بار پھر بے دردی سے میری کمر میں ٹہوکا دیا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ سیاہ فام بے حد کرخت لہجے میں بولنے لگا۔ شکر ہے کہ میں اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا ورنہ ناحق میں خون جلاتا۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم پہلے عرشے پر آئے اور وہاں سے دوسرے عرشے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی کسی جنس کی بے شمار بوریاں پڑی دکھائی دیں۔ یہیں پر ایک طرف رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ لگژری کمرے نظر آتے تھے۔ درمیان سے ایک قالین پوش راہداری گزرتی تھی۔ دوسرے عرشے پر پہنچتے ہی پُرنم سمندری ہوا کے جھونکے شدت سے محسوس ہونے لگے۔ بہرحال سمندر پُرسکون تھا اور مطلع بھی بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور کیوں۔

ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر چھڑی بردار حبشی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک آواز بلند ہوئی اور حبشی مجھے لے کر اندر داخل ہو گیا۔ گن بردار سیاہ فام بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے اندر آیا۔ یہ کمرا اندر سے خاصا کشادہ تھا اور غیر متوقع طور پر کافی سجا ہوا بھی تھا۔ درحقیقت چھوٹے سائز کے دو تین کمروں پر مشتمل یہ ایک اپارٹمنٹ تھا۔ سامنے شیشے کی ایک بڑی کھڑکی تھی جس میں سے نیلگوں سمندر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے علاوہ جہاز کا مستول بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ کیبن نما کمرے میں جو شخص صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا، میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ بدبخت مائیکل تھا۔ کانگو کے جنگلات سے وارد ہونے والا پُراسرار آدم خور۔ ہمیشہ کی طرح وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ نظر کا چشمہ اتار کر اس نے شفاف میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس میز پر وہسکی کی بوتل اور گلاس وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔

مائیکل مجھے دیکھ کر پُراسرار انداز میں مسکرایا پھر امریکی لہجے میں بولا "مجھے تم سے مصافحہ کرنا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ تم اپنے ہاتھ آگے نہیں لا سکتے ہو۔ بہرحال گڈ آفٹرنون جینٹل مین۔ مجھے امید ہے تمہارا سفر اچھا گزر رہا ہوگا۔"

"ضرورت سے زیادہ اچھا گزر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے۔"

اس نے سیاہ فام کارندوں کو اشارہ کیا، وہ خاموشی سے باہر چلے گئے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ مائیکل اسی طرح بے پروائی سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ میری آمد کے بعد اس نے اپنے کوٹ کے نیچے لگے ہولسٹر سے پسٹل نکال کر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری آنکھ کی چوٹ اب کافی بہتر ہے۔ ہلکی سی سرخی رہ گئی ہے۔"

"میری آنکھ کے متعلق فکرمند ہونے کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

"مسٹر! ہم تو ہر ایک کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس چیز کی قدر نہ کرے تو اور بات ہے۔ اب پروفیسر کی بیٹی شاستے (شائستہ) ہی کو دیکھو۔ وہ بیمار تھی۔ میں نے سوچا کہ پروفیسر ساری دنیا کو شفا بانٹتا ہے، بیٹی کو کیوں تندرست نہ کرے گا لہٰذا میں شاستے کے علاج کے لیے پروفیسر ڈیئر کو بھی ساتھ ہی لے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ شائستہ یہاں ہے؟"

"ہاں۔ وہ میرے ساتھ ہی جا رہی ہے۔"

"اور پروفیسر؟"

"وہ بھی یہیں ہے۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"پروفیسر تو شاید مصروف ہوگا۔ شاستے سے تم ابھی مل سکتے ہو۔" اس نے اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے بڑی ملائمت سے پکارا "شاستے! ادھر آؤ پلیز۔"

اس کی دوسری صدا پر کمرے کے اندرونی دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور میں شائستہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بڑے نفیس ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ گلے میں قیمتی پتھروں کی جگمگاتی مالا تھی۔ میں نے پہلی بار ذرا غور سے شائستہ کو دیکھا۔ بقول پروفیسر اس کی عمر قریباً بیس سال تھی لیکن اپنی معصومیت اور سادگی کے سبب وہ عمر سے تین چار برس چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا تاہم یہ زردی اس کی خوب صورتی کو پوری طرح ڈھانپ نہیں سکی تھی۔ مائیکل نے کہا "ڈارلنگ سلام کرو۔ یہ تمہارے ڈیڈی کے دوست اور تمہارے ہم وطن ہیں۔ اور تم ان سے پہلے مل بھی تو چکی ہو۔"

شائستہ نے دھیمی آواز میں "گڈ آفٹرنون" کہا۔ میں نے جواب دیا۔ شائستہ سوالیہ نظروں سے مائیکل کو دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ "میں جاؤں؟"

مائیکل نے اس کا مطمح نظر سمجھتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ گھومی لوربائی درست کرتی دروازے میں اوجھل ہو گئی۔ میرے کانوں میں ابھی تک ڈارلنگ کا لفظ گونج رہا تھا۔ مائیکل نے شائستہ کو ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

میں نے مائیکل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "پروفیسر کی بیٹی یہاں کس حیثیت سے ہے؟"

"میری بیوی کی حیثیت سے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک گیا "لاہور میں تو تم نے کچھ اور بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہ تمہارے ایک ملازم نے شائستہ کے ساتھ زیادتی کی تھی جس کی وجہ سے وہ پریگنینٹ ہو گئی۔"

"وہ میرا ملازم نہیں تھا۔ پروفیسر ہی کا ملازم تھا۔"

"جو بھی تھا لیکن تم نے کہا تھا کہ اس نے شائستہ پر مجرمانہ حملہ کیا، جس کی پاداش میں تم نے اس شخص کو جان سے مار دیا۔"

"ہاں ایسا ہوا تھا۔" مائیکل نے تاسف سے کہا "مجھے شاستے پر بہت ترس آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے شادی کر لوں تاکہ اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ جائے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے دکھ ختم ہو جائیں یا وہ خود ہی ختم ہو جائے۔۔۔ ایک دم۔۔۔ جسٹ ان اے سیکنڈ۔"

اس نے جام بھرا اور تلخ وہسکی گھونٹ گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس مکروہ شخص کا چہرہ نوچ لوں۔ اس کے چہرے پر کمینگی درج تھی اور آنکھوں میں تمسخر چھپا ہوا تھا۔

میں نے کہا "مائیکل! تم پرلے درجے کے بے غیرت شخص ہو۔ تمہارا جھوٹ تمہارے لعنتی چہرے پر لکھا نظر آتا ہے۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"یہی جھوٹ کہ شائستہ کی آبرو کا لٹیرا پروفیسر کا ملازم تھا جسے تم نے قتل کر دیا۔۔۔ اور اس کا گوشت فریج میں محفوظ کر لیا۔ سچ کیا ہے، یہ تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ شائستہ کی آبرو کسی اور نے نہیں، تم نے برباد کی اور اب بھی تم نے اسے اپنی حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس کے مجبور باپ کو بھی بے دردی سے بلیک میل کر رہے ہو۔"

"تم جو چاہو کہہ سکتے ہو بلکہ چاہو تو مجھے گالیاں بھی دے سکتے ہو۔ جب موقع آئے گا، میں ہر بات کا حساب چکا دوں گا۔ باقی رہی شاستے کی بات۔۔۔ تو اس کے حوالے سے تمہارے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ وہ اب میری وائف ہے۔ تم اس کے بھائی یا باپ نہیں ہو لیکن اگر تم چاہو تو میں اس میرج کے قانونی کاغذات تمہیں دکھا سکتا ہوں۔ یہ شادی شاستے کی مکمل آمادگی اور رضامندی سے ہوئی ہے۔"

"تم ایک لعنتی بردہ فروش ہو مائیکل۔ تمہاری زبان پر بیوی اور شادی جیسے الفاظ آ کر ناپاک اور حقیر محسوس ہونے لگتے ہیں۔ تم ایسے تمام الفاظ کو معاف ہی رکھو تو بہتر ہے۔"

"چلو معاف رکھتا ہوں۔ اور کوئی خدمت؟"

"میرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"کون سے ساتھی؟"

"میڈی، ڈاکٹر غزالہ، میرا دوست زریں گل اور اس کی بیوی۔"

مائیکل زور سے ہنسا۔ اس کا سیاہ چہرہ کچھ اور سیاہ ہو گیا "تو تم انہیں ساتھی کہہ رہے ہو۔ وہ اب تمہارے ساتھی نہیں ہیں۔ تمہارے ساتھی اب ہم ہیں۔۔۔ ہم۔" وہ اپنے چوڑے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "ساتھی بھی، ہم سفر بھی اور دوست بھی۔"

"چلو جو بھی ہے لیکن وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"میری یادداشت کافی کمزور ہے لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو آخری بار میں نے ڈیمبر دیفسر کی کوٹھی میں دیکھا تھا۔"

"شاید تم بتانا نہیں چاہ رہے ہو۔"

"یہ ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

اچانک میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کو دیکھا۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ وہ معمولی لباس میں تھا۔ چہرے پر مسکینی تھی اور تفکرات کی جھریاں تھیں۔

"پروفیسر آپ یہاں؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

پروفیسر خاموش رہا۔ میں نے اردو میں سوال کیا تھا اس کے باوجود مائیکل نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے کیا پوچھا ہے۔ وہ پروفیسر کی جگہ جواب دیتے ہوئے بولا "یہ چھوٹے موٹے کام پروفیسر ڈیر اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ میں بہت کہتا ہوں کیا ضرورت ہے۔ نصف درجن ملازم موجود ہیں لیکن فارغ بیٹھنا پروفیسر ڈیر کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور کوئی کام نہ ملے تو جھاڑ پونچھ ہی شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا ہے۔ آپ رشتے میں میرے "فادر ان لا" ہیں۔ آپ کے معمولی کام کرنے سے لوگ کیا سوچیں گے مگر ان کا کہنا ہے کہ محنت میں عظمت ہے اور کوئی کام بھی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔"

مائیکل کے چہرے پر وہی مسکراتہ کمینگی نظر آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے پروفیسر کو اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کیا تھا۔ پروفیسر کے دل کا ٹکڑا مائیکل کے قبضے میں تھا۔ وہ ایک مجبور باپ کی مجبوری کو تماشا بنا رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پروفیسر کے لیے اس کے دل میں زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی یہ خطا معاف کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ اپنے بھائی ارشاد کی طرح پروفیسر نے اس کی طرف دستِ تعاون نہیں بڑھایا تھا اور پولیس کے پاس جانے کی دھمکی دی تھی۔

پروفیسر نے دھیمے لہجے میں پوچھا "کتنی چینی؟"

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے کہا۔

"کیوں مسلمان نہیں ہو تم۔" مائیکل نے پوچھا۔

"مسلمان کے لیے کیا چائے پینا ضروری ہے؟"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم شراب تو پیو گے نہیں لہٰذا چائے پی لو۔"

"فی الحال کچھ نہیں پیوں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر ہاتھ بندھے ہیں تو ڈیئر پروفیسر تمہیں اپنے ہاتھ سے پلا دیں گے۔"

"نہیں شکریہ۔"

مائیکل نے بڑی رعونت سے پروفیسر کو اشارہ کیا۔ وہ ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر چلا گیا۔

مائیکل نے کہا "تمہیں یہاں بلانے سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں تمہیں اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نے سائمن کو مارا ہے اور سائمن کو دوبدو مقابلے میں مارنا آسان نہیں تھا۔ تم نے بے خبری میں ایک بڑا کام کیا ہے۔ سائمن ایک منتخب لڑاکا تھا۔"

"اللہ نے چاہا تو میں تمہیں آئندہ بھی حیران ہونے کا موقع دوں گا۔"

"مجھے لگ رہا ہے۔" وہ تنقیدی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"اگر آزمانا چاہو تو ابھی آزما سکتے ہو۔ میں تم میں سے کسی کے ساتھ بھی ایک صاف ستھرے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

"تمہیں یہ موقع ضرور ملے گا مگر ابھی نہیں۔" مائیکل کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں تھیں۔

اس نے افریقی زبان میں کسی کو پکارا۔ دروازہ کھلا اور مشین گن والا دیوہیکل حبشی دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور گن پوائنٹ پر باہر لے آیا۔ اپارٹمنٹ کے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے میں رک گیا۔ میں نے مائیکل سے مخاطب ہو کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مائیکل' اسے میری درخواست سمجھو' اطلاع سمجھو یا وارننگ' اگر غزالہ اور کلثوم تمہارے پاس موجود ہیں تو انہیں کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے۔"

مائیکل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔ مسکراہٹ بھی پتھر تھی۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔ جہاز کے عرشے سے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ پروفیسر اللہ دتا پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پلاسٹک کی ایک بالٹی میں سے سبزی کے چھلکے سمندر میں پھینک رہا ہے۔ میری طرف اس کی پشت تھی لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آیا۔ ایک قابل معالج' ہزاروں لوگوں کا مسیحا اور بارسوخ شخص حالات کی چکی میں پس کر خاک سے باریک ہو گیا تھا۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی خاطر وہ ایک نوکر کی طرح ان لوگوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے ابھی بتایا تھا کہ وہ پروفیسر کو شائستہ

کے علاج کے لیے اپنے ساتھ لایا ہے مگر میں جانتا تھا کہ مائیکل کے دیگر جھوٹوں کی طرح یہ بھی ایک جھوٹ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ پروفیسر خود منت سماجت کر کے اس سفر میں شریک ہوا ہو گا۔ وہ کسی بھی صورت اپنی بیٹی کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ مائیکل نے اپنے جذبۂ حاکمیت کی تسکین کے لیے پروفیسر کو ایک خدمت گار کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

گن بردار سیاہ فام مجھے لے کر سیڑھیوں پر آیا۔ طویل سیڑھیاں طے کر کے ہم زیریں عرشے پر پہنچے' پھر اس گودام میں داخل ہوئے جہاں فرش سے چھت تک بوریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ گودام میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک نظر نیلگوں سمندر پر ڈالی۔ آسمان شفاف تھا۔ سورج کے جھکاؤ سے میں نے اندازہ لگایا کہ مغرب ہمارے عقب میں ہے اور ہم مشرق یا جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اگر ہم کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے تھے اور ہمارا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم افریقہ یا ماریطانیہ کی طرف نہیں جا رہے۔ تو پھر ہم کہاں جا رہے تھے؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جہاز کے نچلے حصے تک جانے والا خفیہ راستہ گودام کی سیکڑوں بوریوں کے درمیان سے ہی کہیں نکلتا تھا۔ ایک اجنبی کے لیے اس راستے کو ڈھونڈ لینا آسان نہیں تھا۔ یہ ہاستی کی آڑ میں بردہ فروشی کا راستہ تھا۔ ہم ایک خاص مقام پر پہنچے تو بوریوں کی دو قطاریں سلائیڈنگ تختے پر پھسلتے ہوئے پیچھے ہٹ گئیں اور ہم کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے اسٹور روم میں داخل ہو گئے۔

اسٹور روم سے سیڑھیاں اتر کر ہم پھر سے جہاز کے پیندے میں پہنچ گئے۔ میری الٹی ہتھکڑی کھولی گئی اور اسی کیبن میں پہنچا دیا گیا جہاں سے نکالا گیا تھا۔ تمام افراد گم صم بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا سب کو تکلے بھرے ہیں۔ معتوب محمد اسلم ابھی تک نیم بے ہوش پڑا تھا۔ بے ہوشی میں اس کی زبان پر بار بار نسرین نامی عورت کا نام آ رہا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ عورت کون ہے اور اس مصیبت میں وہ اسے کیوں یاد کر رہا ہے۔

مجھے صفدر کے چہرے پر اضطراب نظر آیا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "پتا نہیں۔ مجھے اس اطلاع پر خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔ لیکن اطلاع بڑی اہم ہے۔"

"کیا؟"

"زریں گل یہیں ہمارے ساتھ ہے۔"

میں دم بخود رہ گیا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی آواز سنی ہے۔ وہ ہماری دائیں جانب دو کیبن چھوڑ کر تیسرے کیبن میں ہے۔ دراصل وہ بلند آواز میں حبشیوں کو گالیاں دے رہا ہے اور انہیں دھمکا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اس کی بیوی سے کوئی بدتمیزی کی تو وہ انہیں زندہ درگور کر دے گا۔"

ابھی صفدر کی بات منہ ہی میں تھی کہ کہیں قریب سے زریں گل کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی "ام تم سب کا بیڑا غرق فرمائے گا۔ کتے کے بچو! تم ام کو جانتا نہیں۔ ام مرنے سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم کسی لاپتا باپ کی اولاد نہیں ہو تو آؤ۔ ایک ایک کر کے نہیں آ سکتے تو دو دو کر کے آ جاؤ۔ ام تمہاری دم میں نمدہ نہ فٹ کرے تو امارا نام زریں خاں نہیں۔"

پھر وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کوئی جواب نہیں آیا تو وہ دوبارہ چنگھاڑا "ام خدا کا قسم کھاتا ہے اگر تم نے اماری بی بی کو بری نظر سے دیکھا تو ام اس مکان کو جہنم بنا دے گا۔ آگ لگا کر پھونک دے گا سب کچھ۔"

صفدر نے مجھے ٹھوکا دیا "موصوف جہاز کو مکان فرما رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے حبشیوں کو "کالے لنگور" کا خطاب دے رہے تھے۔"

"یہ بڑی گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا "یہ بے وقوف ایک دفعہ پہلے بھی اسی طرح پٹ چکا ہے۔"

"ہاں مجھے بھی یاد ہے۔ بڑی مار پڑی تھی۔"

"میرا خیال ہے' اسے منع کیا جائے؟"

"ٹھیک ہے' میں کرتا ہوں۔"

صفدر نے بلند آواز سے کہا "زریں گل۔۔۔ او زریں گل۔۔۔ ہم بھی ادھر ہیں۔"

چند لمحے بعد مسرت سے بھرپور آواز سنائی دی "صیدر صیب۔۔۔ یہ آپ ہی کا آواز تھا ناں؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے میں ہوبہو نقل اتار رہا ہوں۔"

زریں نے پکار کر کہا "خدا کی قسم صیدر صیب! ام بہت پریشان تھا۔"

"اب تو ساری پریشانیاں دور ہو گئیں نا۔ کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ۔"

"آپ کیا بات کر رہا ہے صیدر صیب! ام تو پریشانی سے بے حال ہو رہا ہے۔ کلثوم کا کچھ خبر ہے نہ استاد صیب کا۔"

"استاد صیب یہاں میرے ساتھ ہی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہوش کے ناخن لو۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم اسی طرح

واویلا کرکے پٹ چکے ہو۔ یہ لوگ تو ویسے بھی بہت ظالم ہیں۔ ابھی ایک بندے کا بھرتا بنا دیا ہے انہوں نے۔ بہتری ہے کہ کان لپیٹ کر چپکے بیٹھے رہو۔"

"کیا یہ استاد صیب نے فرمایا ہے؟"

"بالکل بنفس خود۔"

"صفدر صیب! بس ایک دفعہ ام کو استاد صیب کا آواز سنا دو۔ امارا دل معترف (مطمئن) ہو جائے گا۔"

"تم دل معترف نہ کرو۔ بس چپ کرکے بیٹھے رہو۔ وہ لوگ سخت غصے میں ہیں۔ بس اب کوئی بات نہیں کرنا۔ سمجھو لائن کٹ گئی۔"

"کیا کٹ گیا۔"

"تیرا سرکٹ گیا۔ بس اب چپکا بیٹھا رہ۔"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال ام نہیں بولے گا۔ بس ام کو ایک بات بتا دیں۔ یہ ام کس چیز میں بیٹھا ہوا ہے؟"

"مکان میں۔۔۔ ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا۔"

"تو ہے اتنا پاگل نہیں ام۔۔۔ خو ام کو معلوم ہے کہ یہ مکان نہیں ہے۔ وہ تو ام نے جان بوجھ کر کہا تھا۔۔۔ کہ شاید امارا غلطی درست کرنے کے لیے وہ کالا لنگور دروازہ کھولے اور ام کچھ کر سکے۔"

"وہ بھی اتنا پاگل نہیں۔ ویسے یہ بحری جہاز ہے۔۔۔ اب خاموش ہو جاؤ اور بولنا نہیں ہے۔" صفدر نے سختی سے کہا۔

شکر ہے کہ زریں گل خاموش ہو گیا۔ ہمارے ساتھ رابطہ ہونے کے بعد اس کی کافی ڈھارس بندھی تھی۔ اس کے لب و لہجے میں زندگی دوڑ گئی تھی۔

میں نے صفدر کو تمام احوال سنایا۔ اس کو بتایا کہ یہ ایک بڑا مال بردار جہاز ہے جو کھلے سمندر میں جنوب مشرق کی طرف حرکت کر رہا ہے۔ میں نے اسے اطلاع دی کہ جہاز میں پروفیسر اللہ دتا کی بیٹی شائستہ کے علاوہ خود پروفیسر بھی ہے۔ یہ جان کر صفدر کو از حد حیرانی ہوئی کہ شائستہ کو مائیکل نے اپنی بیوی بتایا ہے اور وہ اس کے ساتھ دوسرے عرشے پر ایک لگژری اپارٹمنٹ میں ہے۔

صفدر نے پُرسوچ لہجے میں کہا "شاہ جہاں صاحب! میرا تو پہلے دن سے یہی خیال تھا کہ لڑکی سے زیادتی کرنے والا یہی بدبخت مائیکل ہے۔ گھر کے تہ خانے میں اس کے سوا بھلا کون یہ جرأت کر سکتا تھا۔"

"لیکن اگر ایسی بات تھی تو شائستہ نے باپ سے اپنی ملاقاتوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ پروفیسر کے بقول اس نے بھی یہی کہا کہ ایک رات اندھیرے میں کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔"

"ممکن ہے مائیکل نے اسے ڈرا دھمکا کر یہ بیان دینے پر مجبور کیا ہو۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس تہ خانے میں صرف ایک ہی بار شائستہ پر مجرمانہ حملہ کیا گیا ہو اور یہ جرم مائیکل نے تاریکی میں کیا ہو۔"

"یہ بات کچھ منطقی نہیں لگتی۔" میں نے کہا "کیونکہ مائیکل نے اگر ایک بار لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنایا تھا تو پھر بار بار ایسا کرنے سے اسے کس نے روکا۔ وہ اس تہ خانے میں شائستہ پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔"

"ہاں یہ جھول تو ہے لیکن ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں ہے۔ مختلف مزاج کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ مختلف حالات میں مختلف رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔"

اچانک ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ ہمارے کیبن نما کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا تھا' پھر سیاہ فام کی نہایت کرخت بکواس سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ ہمارے بولنے پر برہم ہو رہا تھا۔

ادھیڑ عمر نثار علی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہم سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔ چند سیکنڈ تک چیخنے چلانے کے بعد سیاہ فام بھوت واپس چلا گیا۔ ادھیڑ عمر نثار میرے قریب کھسک آیا اور ہاتھ جوڑ کر سرگوشی کی "خدا کے لیے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ یہ وحشی غصے میں آ گئے تو باہر نکال کر ایک ایک کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

میں نثار سے اس کے حالات کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی خوف زدہ صورت دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ باقی چھ افراد بھی پتھریلے مجسموں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے تھے۔ ان میں سے کبھی کبھی کسی کی مدھم سسکی سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ یہ سب لوگ سنہری سپنوں کے مسافر تھے۔ بیرون ملک جانے کی آس لے کر گھروں سے نکلے تھے۔ کسی کو گھر بنانا تھا' کسی کو بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے تھے' کسی کو بیمار ماں کا علاج کرانا تھا اور کوئی محبت کی بازی میں ہارنے سے بچنا چاہتا تھا۔ اب یہ لوگ گردش دوراں کے بے رحم شکنجے میں تھے اور گئے وقت پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔ سب سے پتلی حالت اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کی تھی جس کی ہچکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مجھے اس کے ہاتھوں پر چوٹوں کے پرانے نشان نظر آئے جو یقیناً سخت مار پیٹ کا نتیجہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں جب تاریک براعظم افریقہ سے لوگوں کو غلام بنا کر سمندر پار لے جایا جاتا تھا تو ان میں ایک خاص قسم کی اداسی اور قنوطیت پیدا ہو جاتی

تھی اور کبھی کبھی یہ کیفیت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ غلاموں کی کیپ کی کیپ بیمار پڑ جاتی تھی اور ان میں سے اکثر مر جاتے تھے۔ اس بیماری کو "وطن سے دوری کا غم" قرار دیا جاتا تھا اور مختلف زبانوں میں اس بیماری کے مخصوص نام تھے۔ نجانے کیوں ان گم صم بیٹھے ہم وطنوں کو دیکھ کر مجھے یہ ساری تفصیل یاد آ گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان تمام لوگوں سمیت قدیم دور میں چلا گیا ہوں اور "وطن سے دوری کے غم" میں مبتلا ہوں۔

اگلے دو روز اسی حالت میں گزر گئے۔ دروازے میں ہر روز تین مرتبہ باقاعدگی سے خلا پیدا ہوتا تھا اور کھانے کی دو بڑی ٹرے اندر آ جاتی تھی۔ ان میں ہم دس افراد کے لیے کافی کھانا ہوتا تھا۔ یہ پاکستانی کھانا اکثر چپاتی' چکن اور چاول مشتمل ہوتا تھا۔ یقیناً کھانے کی تیاری انہی خواتین سے کرائی جاتی تھی جو اس جہاز میں قیدیوں کی حیثیت سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ میں روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے اکثر سوچتا تھا کہ کیا پتا یہ غزالہ یا کلثوم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی ہو۔ غزالہ اور کلثوم کے حوالے سے میں نے جو بات کہی تھی مجھے امید تھی کہ وہ مائیکل کے ذہن میں ہو گی۔

کھانا سرو کرنے میں قیدی خواتین ہی مدد کرتی تھیں۔ یہ کل چار پانچ عورتیں تھیں۔ ہم ہر روز اس اندیشے کے تحت باہر دیکھتے تھے کہ شاید ان میں غزالہ یا کلثوم ہوں' لیکن ابھی تک یہ اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا تھا۔

کمرے میں موجود تین چار افراد ناصاف پانی کے سبب بدہضمی کا شکار ہو گئے تھے۔ انہیں بار بار ٹوائلٹ کی ضرورت پیش آتی تھی۔ شروع میں تو یہ سب کچھ تکلیف دہ تھا لیکن اب روٹین میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔ معتوب اسلم کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ اس کے چہرے کے زخموں سے خون رسنا بند ہو گیا تھا اور اب وہ کھانے کے لیے اپنے منہ کو حرکت بھی دے سکتا تھا۔ وہ کوئی غم ناک کہانی سینے میں چھپائے ہوئے تھا اور ہمہ وقت اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ تاہم کڑی سزا جھیلنے کے بعد اس نے دوبارہ بہ آواز بلند رونے دھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ اور صرف اسلم ہی نہیں' تمام کیبنوں میں موجود تمام قیدی اس واقعے کے بعد مزید سہم گئے تھے۔

ایک رات سمندر میں شاید مدوجزر تھا۔ جہاز بری طرح ہچکولے کھاتا رہا۔ تاہم تین چار گھنٹے بعد یہ ہچکولے بتدریج کم ہو گئے اور ہم جو نیم خوابی کی حالت میں تھے' پُرسکون نیند سو گئے۔ ابھی ہمیں سوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بلند آوازوں کی وجہ سے دوبارہ آنکھ کھل گئی۔ یہ زریں گل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' اس نے سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ بلند آواز میں حبشی پہرے داروں کو للکارنے لگا اور انہیں وارننگ دینے لگا کہ اگر اس کی بیوی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا بھی گیا تو وہ قیامت برپا کر دے گا۔

میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ خاموش رہے ورنہ سب کے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ پکار کر بولا "سب کے لیے کیوں ہو گی استاد صیب۔۔۔ صرف امارے لیے ہو گی اور ام ہر مصیبت کے لیے تیار ہے۔"

وہ بحث پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے حکمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا "زریں! بے وقوف مت بنو۔ کلثوم یہیں ہمارے ساتھ ہے' وہ بالکل خیریت سے ہے۔"

"آپ۔۔۔ آپ نے کیسے دیکھا اسے؟"

"کل وہ لوگ مجھے عرشے پر لے کر گئے تھے۔ وہاں اسے دوسری عورتوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور حفاظت سے ہے۔"

"اور غزالہ بی بی؟"

"وہ بھی وہیں ہے۔ وہ خیریت سے ہیں۔ کم از کم منزل پر پہنچنے تک وہ بالکل خیریت سے رہیں گی۔" میں نے زریں کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"استاد صیب! آپ کہیں امارا تسلی کے لیے تو نہیں کہہ رہا؟"

صفدر نے تلملا کر کہا "یار! تم اپنی بک بک بند کرتے ہو یا نہیں۔"

شکر ہے کہ اس کے بعد زریں کی آواز نہیں آئی۔ خیر نہیں وہ ناراض ہو گیا تھا یا صفدر کی فکرمندی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ سیاہ فام وحشی جہاز کے اس حصے میں موجود نہیں تھے' ورنہ زریں سے یہ مکالمے بازی ہمیں بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔

تیسرے دن جہاز رک گیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کس جگہ اور کیوں کھڑے ہیں۔ ایک دو بار کسی جہاز کا سائرن سنائی دیا تھا۔ اس آواز سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ شاید ہم کسی بندرگاہ پر ہیں۔ جہاز کے جس حصے میں ہم موجود تھے وہاں بیرونی آوازیں نہیں پہنچتی تھیں۔ اگر کوئی بلند آواز پہنچتی بھی تھی تو بے حد مدھم ہوتی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں گھڑیاں نہیں تھیں' نہ ہی وقت معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ تھا۔ بس تین وقت کھانے کی آمد سے یہ پتا چلتا تھا کہ یہ دن کا کون سا حصہ ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ یہ عارضی قیام ہے اور ہم پھر روانہ ہوجائیں گے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہم مسلسل رکے رہے۔ اب ہمیں یقین ہوچکا تھا کہ ہم کسی بندرگاہ پر ہی ہیں۔ عرشے سے آنے والی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاز پر کچھ لادا جارہا ہے۔ یہ کام بندرگاہ پر پہنچنے کے چوبیس گھنٹے بعد شروع ہوا اور پھر شروع ہی رہا۔ بھاری کنٹینرز تھے جو کرین کے ذریعے جہاز پر آتے تھے پھر انہیں پہیوں پر چلا کر مطلوبہ جگہ پر پہنچایا جاتا تھا۔ یہ ساری آوازیں مسلسل ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ کارروائی پہلے دن آٹھ گھنٹے اور اگلے دن بھی تین چار گھنٹے جاری رہی۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی' مال بردار جہاز اکثر راستے سے اسی طرح مال اٹھاتے اور اتارتے ہیں۔ جب مال چڑھانے کی کارروائی ختم ہوگئی تو ہمیں امید پیدا ہوئی کہ جہاز پھر چل پڑے گا اور ہمیں حبس کی اس کیفیت سے نجات ملے گی جو یہاں پہنچنے کے بعد محسوس ہورہی تھی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جہاز مسلسل بندرگاہ پر کھڑا رہا۔ تیسرے روز مائیکل اپنے خوں خوار کارندوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا۔ اس وقت ہم دوپہر کا کھانا کھاچکے تھے۔ مائیکل نے پہلے ہمارے ساتھ والے دو کیبنوں کا معائنہ کیا' پھر ہمارے کیبن پر پہنچ گیا۔ سلائیڈنگ تختہ ہٹا کر دروازے میں خلا پیدا کیا گیا۔ مائیکل نے تمام قیدیوں (یعنی بردوں) کا بغور معائنہ کیا۔ وہ بدبخت حسب معمول تھری پیس سوٹ اور ٹائی کے ساتھ تھا۔ تہذیب کی اوٹ میں چھپا ہوا ایک قدیم وحشی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا اٹھا۔ خلا کے قریب جھک آیا "کیسے ہو مسٹر شاہ جہاں!" اس نے کہا۔

"تمہاری کرم فرمائی سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

"لیکن کچھ کمزور نظر آرہے ہو۔ شاید بڑھی ہوئی شیو کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے۔" پھر وہ اپنے کارندوں کی طرف متوجہ ہوا اور کسی افریقی زبان میں انہیں کچھ ہدایات دیں۔ تب ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں نے تم سب لوگوں کی شیو اور حجامت وغیرہ کا کہہ دیا ہے۔ سب لوگوں کے غسل اور کپڑوں کی صفائی کا حکم میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ آج تمہیں دھلے ہوئے کپڑے بھی ملیں گے' امید ہے کہ تم سب اس تبدیلی کو انجوائے کروگے۔۔۔ مگر ڈسپلن اپنی جگہ ہے' ہم ڈسپلن کی خلاف ورزی کسی صورت برداشت نہیں کرسکتے۔" اس نے آخری الفاظ شہادت کی انگلی اٹھا کر کہے تھے۔

اس کے ہاتھ صاف شفاف تھے' جیسے دفتر میں کام کرنے والے کسی آفیسر کے ہاتھ ہوں مگر یہ ہاتھ درحقیقت ایک درندے کے خونی پنجے تھے۔ گوشت نوچنے اور ادھیڑنے والے پنجے۔

صفدر نے کہا "ایک درخواست ہے اگر آپ جناب کی طبیعت پر ناگوار نہ گزرے تو۔"

"ہاں ہاں کہو' لیکن صرف ایک درخواست ہونی چاہیے۔"

"ہمارا ساتھی دو کیبن چھوڑ کر تیسرے کیبن میں بند ہے۔ ذرا جذباتی بندہ ہے۔ پریشان ہو کر واویلا کرنے لگا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ آپ کے کارندے مشتعل ہو کر اسے مارنے پیٹنے نہ لگ جائیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔" مائیکل نے کہا "اسے تمہارے کیبن میں منتقل کردیا جائے گا۔ یہاں سے ایک بندے کو اس کیبن میں بھیج دیا جائے گا۔"

پھر اس نے اپنے کارندوں سے کچھ کھسر پھسر کی اور صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "اور کوئی خدمت؟"

میں نے کہا "کیا دیگر ساتھیوں سے ہماری ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"دیگر ساتھیوں سے تمہاری مراد شاید وہ دونوں لڑکیاں اور بچہ ہے۔ لیکن ان سے ملاقات کے لیے ضروری ہے کہ وہ تینوں اس جہاز میں ہوں۔"

"تو کیا وہ جہاز میں نہیں ہیں؟"

"یہ تمہاری تیسری درخواست ہے۔ یعنی تم جاننا چاہتے ہو کہ وہ لوگ جہاز میں ہیں یا نہیں۔ میں نے صرف ایک درخواست کی اجازت دی تھی۔" وہ مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ چوتھے کیبن کے معائنے میں مصروف تھا۔

اس معائنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تین سیاہ فام حجام وہاں آن موجود ہوئے۔ ان کے ساتھ تین چار ہیلپر بھی تھے۔ کیبنوں کے سامنے تین کرسیاں رکھ دی گئیں۔ تینوں کیبنوں میں سے ایک ایک بندہ نکالا جاتا۔ اس کی شیو بنائی جاتی اور اگر بال لمبے ہوتے تو حجامت بھی کردی جاتی۔ اس کے علاوہ ہر کیبن میں ایک بالٹی' ایک ڈونگا اور صابن تولیا بھی دے دیا گیا۔ دھلے ہوئے ڈس ڈس براؤن کرتے پاجامے بھی ہر کیبن میں پہنچا دیے گئے۔ یہ لباس بھی ہمارے پہلے لباس کی طرح استعمال شدہ تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کئی بار پہلے بھی پہنا اور دھویا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ جہاز کے اس کمپارٹمنٹ میں جس طرح کے کیبن بنے ہوئے تھے اور دوسرے انتظامات تھے انہیں دیکھ کر یقین ہوجاتا تھا کہ اس مال بردار

جہاز کو پہلے بھی انسانوں کی اسمگلنگ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ کارروائی تقریباً چھ سات گھنٹے جاری رہی۔ میں نے اور صفدر نے بھی شیو بنوائی اور بال ترشوائے۔ اس کے بعد نیم گرم پانی سے غسل بھی کیا۔ دھلے ہوئے کپڑے پہن کر کسی قدر تازگی کا احساس ہوا۔ شام کا کھانا قدرے پر تکلف تھا۔ اس میں مٹر پلاؤ' قورمہ اور چائے تھی۔ سرو کرنے والی لڑکیاں بھی قدرے تر و تازہ نظر آتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کئی روز کے بعد انہیں بھی دھلے ہوئے کپڑے نصیب ہوئے تھے۔ دوسری وجہ شاید یہ ہوگی کہ آج کھانے میں چاول تھے اور لڑکیوں کو دو تین سو چپاتیاں پکانے کی مشقت نہیں کرنا پڑی تھی۔

کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد میں اور صفدر لیٹ گئے۔ زریں گل کے سلسلے میں ابھی تک وعدہ پورا نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی اسے ہمارے والے کیبن میں نہیں پہنچایا گیا تھا۔ ہم شدت سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت رات کے نو بجے ہوں گے جب ایک بار پھر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ پانچ چھ افراد کے قدموں کی چاپ تھی۔ باری باری کیبنوں کے سلائیڈنگ تختے پیچھے ہٹنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جس طرح صبح مائیکل نے قیدیوں کا معائنہ کیا تھا اسی طرح کوئی اور ہستی معائنے پر تشریف لائی ہے۔ ہمارے کیبن میں تیز لائٹس روشن ہو گئی تھیں۔ یقیناً دیگر کیبنوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔

کچھ دیر بعد ہمارے کیبن کے دروازے میں بھی خلا پیدا ہوا اور معائنہ کرنے والوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کیبن سے باہر کی تمام لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ وہ لوگ چونکہ اندھیرے میں کھڑے تھے لہٰذا نظر نہیں آ رہے تھے۔ صرف اتنا پتا چل رہا تھا کہ ان لوگوں میں مائیکل بھی موجود ہے۔ اس کی آواز خاصی واضح سنائی دے رہی تھی۔ اس نے انگلش میں ہمیں "اسٹینڈ اپ" ہونے کا حکم دیا تھا۔ بعد ازاں وہ کھسر پھسر کے انداز میں اپنے ساتھیوں سے بات کرنے لگا۔ تیز روشنی کے سبب ہماری آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ ان لمحوں میں یہی محسوس ہوا جیسے کیبن میں موجود ہم کسی شوکیس میں سجی ہوئی اشیا ہیں جنہیں خریدار تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک بڑا ہی ذلت آمیز احساس تھا۔ اس کی اذیت وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اپنی بدقسمتی کے سبب اس مرحلے سے گزرا ہو۔ غزالہ اور شیخ عاصم کے ہی مکوں کے دوران میں' میں نے شیخ عاصم کے ہاتھوں بڑی توہین برداشت کی تھی بلکہ توہین کا لفظ بھی درست نہیں' اسے ذلت کہنا چاہیے۔ شیخ عاصم نے میرے ہاتھوں پر خاص قسم کے دستانے چڑھا دیے تھے جن کے سبب میں کسی طرح کا ہتھیار استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور شیخ عاصم پوری بے فکری سے مجھے گھریلو ملازم کی ذمے داریاں سونپ سکتا تھا مگر ذلت کا ایسا احساس اس وقت بھی نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازے کا خلا پُر ہو گیا اور قدموں کی چاپ اگلے کیبنوں کی طرف چلی گئی۔ اس معائنے کے بعد طبیعت سخت مکدر ہوئی تھی' تاہم کچھ ہی دیر بعد اس کدورت کا ازالہ بھی ہو گیا۔ لمبے تڑنگے خیابی گن بردار نے کیبن کا دروازہ کھولا اور اپنی زبان میں بک بک کرنے کے بعد زریں گل کو اندر دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بے پروائی سے ایک قیدی کی گردن دبوچی اور اسے گھسیٹ کر باہر کھینچ لیا۔ کیبن کا دہنی دروازہ ایک مہیب آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

زریں گل جذباتی انداز میں مجھ سے لپٹ گیا' میرے رخسار چومنے کے بعد وہ صفدر سے بغل گیر ہوا۔ وہ یوں خوش نظر آ رہا تھا جیسے آزاد ہو گیا ہو۔ ان لمحوں میں شاید کلثوم کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ ہم تینوں ایک کونے میں بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے' زریں گل کی آواز بلند تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ سرگوشی میں بات کرے۔ میں نے اسے بتایا کہ حبشی پہرے دار پہلے ہی اس کی طرف سے بھڑکے ہوئے ہیں' کہیں یہ نہ ہو کہ وہ اس کی جان کو آ جائیں۔

زریں گل نے پہرے داروں کو بے نقط سنائیں اور دیر تک سرگوشیوں میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ آخر میں اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

صفدر نے کہا "یہ سوال پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن ذہن میں آ رہا ہے کہ یہ شکر کس سلسلے میں ہے؟"

وہ بولا "ام اس لیے شکر ادا کر رہا ہے کہ ام کو ان کالے لنگوروں کا زبان نہیں آتا۔ اگر ام کو ان کا بک بک سمجھ میں آ جاتا تو ام کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا اور ام اب تک ان میں سے دو تین کو مار کر خود بھی مرقعہ اجل بن چکا ہوتا۔"

"مرقعہ اجل نہیں لقمۂ اجل۔" صفدر نے تصحیح کی۔

زریں عطف لمباحث میں سر ہلایا اور بولا "مستلو صیب' آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے کلثوم اور غزالہ بی بی کو یہاں

دیکھا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ قدموں کی تیز چاپ ہمارے کیبن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دراصل غیر ارادی طور پر زریں گل کی آواز پھر بلند ہو گئی تھی' مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ قدموں کی اس چاپ کا تعلق زریں کی بلند آواز سے ہی ہے۔ ہم دم سادھے انتظار کرتے رہے' ادھیڑ عمر شار خشمگیں نظروں سے زریں کو گھور رہا تھا۔ غالباً اس کا خیال بھی یہی تھا کہ پہرے دار زریں کی آواز کی وجہ سے دروازے کی طرف آیا ہے۔ چند لمحے بعد دروازے کا سلائیڈنگ تختہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ دو پہرے داروں کی کرخت آوازیں سنائی دیں پھر اچانک لوہے کی طویل راڈ اندر آئی۔ اس سے پہلے کہ میں یا صفدر کچھ سمجھ پاتے' تانبے کا حلقہ زریں گل کی گردن میں آ چکا تھا۔ زریں نے اضطراری کیفیت میں راڈ کو تھام لیا۔ اسی دوران میں حلقہ زریں کی گردن کے گرد فٹ ہو گیا اور وہ ایک جھٹکے سے دروازے کے خلا کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سر کیبن سے باہر اور دھڑ کیبن کے اندر تھا۔ وہ چیخنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میری نگاہ میں وہی تین روز پہلے کا منظر گھوم گیا جب ہمارے روم میٹ محمد اسلم کو اسی طرح شکنجے میں کس کر زخموں سے چور کر دیا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی ادھڑی ہوئی کھال ابھی تک کریہہ منظر پیش کرتی تھی۔ میں اور صفدر' زریں گل کو واپس کیبن میں کھینچنے کی کوشش کرنے لگے مگر عملاً ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کی گردن میں تانبے کی پتری کا حلقہ تھا۔ یہ حلقہ آہنی راڈ سے منسلک تھا اور راڈ کو ریوار سے اسٹک کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ بردہ فروش تھے۔ اگر کسی بردے کے چہرے کی کھال ادھڑ جائے تو یقیناً اس کی قیمت بہت کم رہ جاتی ہے مگر باقی قیدیوں کے لیے عبرت ناک مثال بنانے کے لیے ایک دو قیدیوں کا نقصان یہ لوگ برداشت کر لیتے تھے۔ درحقیقت زریں گل سے بھی کچھ بے وقوفی ہوئی تھی۔ وہ میرے اور صفدر کے منع کرنے کے باوجود پچھلے تین چار دن سے بار بار بول رہا تھا۔ پہرے دار اسے دو تین بار دبی سختی سے منع بھی کر چکے تھے مگر اس پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ پہرے داروں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا۔ لمبے تڑنگے خیابی پہرے دار کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے پہلے زریں کے سر پر دو زور دار ٹھوکریں رسید کیں' پھر وہی خونی چھڑی اٹھائی جس سے اس نے اسلم کے چہرے کا بھرتا بنایا تھا۔ یہ لچک دار بید کی چھڑی تقریباً چار فٹ لمبی تھی۔ جس وقت شائیں سے چھڑی کی پہلی ضرب زریں کے چہرے پر لگی' میں نے دروازے کے خلا میں سے اپنا سر نکالا اور لپک کر خیابی پہرے دار کا گریبان پکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا' میں نے اسے پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ دروازے کا خلا صرف نو انچ چوڑا تھا۔ خیابی پہرے دار کا چہرہ بُری طرح دروازے سے ٹکرایا اور وہ ڈکرا کر رہ گیا۔ دوسرا پہرے دار اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان بھی دبوچ لیا۔ تھوڑا سا پیچھے دھکیل کر میں نے انہیں دوبارہ قوت سے اپنی طرف کھینچا' ایک بار پھر ان کے چہروں کا خوفناک تصادم دروازے سے ہوا۔ وہ چیخ اٹھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ یک لخت ایسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میں نتائج سے بے پروا ہو گیا تھا اور دل میں ٹھان لی تھی کہ جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں نے تین چار بار دونوں پہرے داروں کو انتہائی شدید جھٹکے دیے اور ہر بار ان کا بالائی دھڑ مضبوط دروازے سے ٹکرایا۔ ان دونوں کے چہرے زخمی ہو گئے تھے' صفدر نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خیابی پہرے دار کی جیب میں سے بھرا ہوا ریوالور نکال لیا۔ میں نے جب دیکھا کہ صفدر نے ریوالور کو ایک پہرے دار کی کنپٹی سے لگا دیا ہے تو میں نے دوسرے پہرے دار کو یوں گھمایا کہ اس کی پشت دروازے سے لگ گئی' میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ وہ بہت لمبا تڑنگا تھا مگر گردن قابو آنے کے باوجود زور لگا رہا تھا۔ میں نے چابی کی تلاش میں اس کی جیبیں ٹٹولیں مگر ناکامی ہوئی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ پہرے داروں کے ساتھی نازل ہو گئے ہیں۔ ہمارے کیبن میں موجود افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بس ایک شخص ہسٹیریائی انداز میں چلّا رہا تھا اور یہ وہی نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام شہزاد معلوم ہوا تھا۔ دوسرے تمام کیبنوں میں موت کا سکوت طاری تھا۔

چند لمحے بعد سیاہ فام گن بردار ہمارے سامنے پہنچ گئے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ دو کے پاس رائفلیں اور ایک کے ہاتھ میں لمبا چھرا تھا "خبردار!" صفدر نے پکار کر کہا "کوئی آگے آیا تو ان دونوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ کر دوں گا۔"

مسلح افراد جہاں کے تہاں رک گئے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے کشادہ تھیں۔ یقیناً وہ حیران تھے کہ ان کے دو منہ زور آناً فاناً زیرِ دام کیسے آ گئے۔ صفدر نے ایک بار پھر پکار کر وارننگ دی۔ تینوں مسلح افراد ایک ادب میں ہو گئے اور

بلند آواز میں افریقی بولنے لگے۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے مزید قدموں کی آواز ابھری۔ اس مرتبہ دو افراد اندر داخل ہوئے اور ان میں سے ایک مائیکل خود تھا۔ اندر کی سنگین صورتِ حال دیکھ کر اس کے چہرے پر اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ اس نے رکا کر اپنے کارندوں سے کچھ کہا، غالباً یہ کہا تھا کہ وہ گولی نہ چلائیں پھر وہ ہماری طرف آگیا۔ شستہ انگلش میں بولا "یہ کیا ہو رہا ہے۔ چھوڑ دو ان لوگوں کو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ سارا کیا دھرا تمہارے انہی غنڈوں کا ہے۔ یہ ہر بندے کو ذلیل و خوار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس معاملے پر بات کر لیتے ہیں۔ تم ان کو چھوڑ دو۔" مائیکل نے تحکم سے کہا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح خود بھی ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔

"اگر نہ چھوڑیں تو؟" میں نے کہا۔

"ہمارے نزدیک ان آدمیوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن ان کے مرنے کی وجہ سے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم ان سادہ لوح لوگوں کی طرح ہمیں بھیڑ بکریاں مت سمجھو۔ اگر مزاحمت پر آگئے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا تمہیں اور تمہارے چیلوں کو۔"

مائیکل مسکرایا "میں جانتا ہوں کہ تم معمولی غنڈے نہیں ہو لیکن حالات بڑوں بڑوں کو ناک رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پروفیسر اللہ دتا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ کوئی معمولی بے آسرا شخص تھا؟ اپنی برہنہ بیٹی کو گوشت خوروں کے نرغے میں دیکھ کر اس نے اپنی زبان سے میرے بوٹ چاٹے تھے۔ یہی سب کچھ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟" میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

"جو کچھ میں کہنا چاہ رہا ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری محبوبہ غزالہ اور اس کابلی خاں کی بیوی ہماری تحویل میں ہیں۔ ذرا سوچو نازک مزاج شہری لڑکیوں کو اذیت دینے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔" مائیکل کے چہرے پر سفاکی اور کمینگی بارش کی طرح برس رہی تھی۔

ایک دم جیسے میرے بازوؤں کی توانائی زائل ہو گئی۔ صفدر کا تمتمایا ہوا چہرہ بھی ماند پڑ گیا تھا۔

مائیکل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "پورا اطمینان رکھو۔ میں تمہاری شکایت رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا اور یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم لوگ ڈسپلن کی پابندی کرو گے تو تم سے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ میں گھوڑے کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے ضیائی حبشی کی گردن چھوڑ دی، وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتا ہوا مائیکل کی طرف چلا گیا۔ میرے اشارے پر صفدر نے بھی دوسرے پہرے دار کی کنپٹی سے ریوالور ہٹالیا اور اسے دور مائیکل کی طرف پھینک دیا۔

مائیکل نے اپنے مسلح کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ اوٹ میں سے نکل آئے۔ ان ہی میں سے ایک کارندے نے صفدر کا پھینکا ہوا ریوالور اٹھالیا۔ مائیکل دھیمی آواز میں اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایات دینے لگا۔ زریں کی گردن ابھی تک حلقے میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی طرف مائیکل سمیت کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔

میں نے مائیکل کی توجہ زریں گل کی طرف مبذول کرائی اور کہا کہ اسے چھوڑا جائے۔ مائیکل نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور ہونٹوں پر کمینی سی مسکراہٹ سجا کر ہمارے قریب آگیا۔ "مجرم کو اس کے کیے کی سزا تو ملنی چاہیے۔" اس نے کہا۔

"دیکھو تم اپنے کہے سے پھر رہے ہو۔" میں نے کہا "ابھی تم نے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہیں ہوگی۔"

"لیکن یہ تو انصاف ہے۔ تمہارے اس ساتھی نے بار بار کی تنبیہہ کے باوجود ڈسپلن توڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب اگر اسے معاف کر دیا جائے گا تو پھر دوسرے بھی رعایتوں کے طلب گار ہوں گے۔"

"یہ بدعہدی ہے۔" صفدر نے کہا "جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ اگر آئندہ ایسا ہوا تو پھر ہم ذمے دار ہوں گے۔"

"یعنی تم اس کے لیے معافی کی درخواست کر رہے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے کارندے کو اشارہ کیا۔ اس نے آہنی راڈ کا سرا دیوار کے کنڈے میں سے نکال دیا اور تانبے کا حلقہ ڈھیلا کر کے زریں کی گردن آزاد کر دی۔ زریں کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر بلند آواز سے بولنا شروع کر دے گا۔ میں نے اس کا شانہ تھاما اور سختی سے ہدایت کی کہ وہ ایک لفظ منہ سے نہیں نکالے گا۔

کچھ دیر بعد مائیکل اور اس کے ساتھی واپس چلے گئے۔ ضیائی پہرے دار ہمیں مسلسل خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے زریں گل کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ تحقیر آمیز اشارے کیے اور پھر ایک جھٹکے سے دروازے کا سلائیڈنگ تختہ چلا کر خلا بند کر دیا۔

زریں گل بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ آزاد ہوتا تو یقیناً سیاہ فام پہرے داروں سے بھڑ جاتا۔ ادھیڑ عمر نثار نزی نے زریں گل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور سرگوشی میں بولا "خدا کے لیے خان صاحب! خود پر رحم کرو! وہ ہمارے اوپر بھی بم کو ٹانگ مارنا کوئی بہادری نہیں ہوتی، یہ لوگ بم سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ جس پر غصہ کرتے ہیں اس کے چیتھڑے اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔"

صفدر نے کہا "چلو ایک بات تو ثابت ہوئی۔ غزالہ اور کلثوم بھی جہاز پر ہیں۔"

"اس بات کے ثابت ہونے سے ہمارے ہاتھ پاؤں کچھ اور بندھ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

صفدر پُرسوچ لہجے میں بولا "اگر پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی میں موجود تمام افراد اس وقت جہاز پر ہیں تو ممکن ہے کہ سائیں عالی بھی یہیں ہو۔"

ضیائی پہرے دار کے بھاری قدموں کی چاپ دروازے کے بالکل قریب محسوس ہونے لگی تو ہم بالکل خاموش ہو گئے۔

رات کافی ہو چکی تھی، تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب اپنے اپنے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کچھ خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں بیک وقت خوشی اور غم چھپا ہوتا ہے۔ غزالہ کی جہاز پر موجودگی بھی ایک ایسی ہی خبر تھی۔ اس کے پابندِ سلاسل ہونے کا دکھ تھا اور اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ وہ لاپتا نہیں بلکہ ہماری ہم سفر ہے۔ اس رات بارہ ایک بجے کے لگ بھگ سیڑھیوں کی طرف سے کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جن سے اندازہ ہوا کہ کچھ اور قیدی جہاز پر سوار کیے جا رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد مردوں کی تھی تاہم کچھ عورتیں بھی تھیں۔ چند عورتوں کی فریاد کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچیں۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سیاہ فام پہرے داروں کی منت سماجت کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں سن کر ہم پر انکشاف ہوا کہ جہاز پر سوار ہونے والے نئے قیدیوں کا تعلق انڈیا سے ہے۔ جو جملے ہم تک پہنچے تھے وہ ہندی میں تھے۔ نئے آنے والوں کو اسی کیبن کے کسی حصے میں بھیج دیا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ان بدنصیب مسافروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا پھر خاموشی چھا گئی۔

رات گزر گئی اور اگلا دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ اس تمام عرصے میں ذہن کے اندر ان گنت سوال سر اٹھاتے رہے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ہماری منزل کون سی ہے اور ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی خاصا اہم تھا کہ غزالہ اور کلثوم کے بارے میں مائیکل کا بیان سچ ہے یا جھوٹ۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ غزالہ اور کلثوم بھی جہاز پر موجود ہیں لیکن یہ اس کی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ہمیں اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے وہ اس قسم کے اور بھی کئی جھوٹ گھڑ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی پریشان کن تھا کہ اس وقت ہم کہاں لنگر انداز ہیں اور کب تک رکے رہیں گے۔

اگلے روز رات کو ایک بار پھر مجھے کیبن میں سے نکالا گیا۔ حسبِ سابق کیبن سے نکال کر مجھے پہلے ہتھکڑی لگائی گئی، پھر "ایل ایم جی" کے نشانے پر سیڑھیاں چڑھا کر عرشے پر لایا گیا۔ وہاں سے میں اس لگژری اپارٹمنٹ میں پہنچا جہاں مائیکل سے ملاقات ہوئی تھی۔ مائیکل ایک آرام دہ صوفے میں دھنسا ہوا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کے پہلو میں معصوم صورت شائستہ بھی موجود تھی۔ اس نے ایک ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ مائیکل کو بھی میں نے پہلی بار تھری پیس سوٹ کے علاوہ کسی اور لباس میں دیکھا۔ غیر متوقع طور پر اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شاید اس لباس کے ذریعے اس نے شائستہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شائستہ ۔۔۔ جو مائیکل کے بقول اس کی بیوی تھی۔ ایک جواں سال ملازمہ مائیکل اور شائستہ کے سامنے سے کافی کے برتن ہٹا رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر مائیکل کی ساری توجہ مجھ پر مبذول ہو گئی۔ اس نے بڑے شائستہ لہجے میں شائستہ سے کہا "پلیز ڈارلنگ! تم ذرا اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔"

شائستہ فرمانبرداری سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ مائیکل نے مجھے خوش آمدید کہا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس مہذب شخص کو دیکھ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہی "افریقہ کا وحشی آدم خور" بھی ہے۔ مائیکل کے اشارے پر خوش پوش ملازمہ نے کھڑکی پر سے پردہ ہٹا دیا اور باہر چلی گئی۔ کھڑکی سے باہر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ یہ ایک بڑی بندرگاہ تھی۔ کچھ فاصلے پر دو بڑے جہاز اور ان کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کھلے سمندر میں بھی کئی چھوٹی بڑی روشنیاں متحرک تھیں۔ یہ وہ چھوٹی کشتیاں اور لانچیں وغیرہ تھیں جو سمندر اور ساحل کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ساحل سے آگے ایک عظیم الشان شہر کی روشنیاں دکھائی

دے رہی تھیں۔ سیکڑوں بلند عمارتیں اور ان کے اندر روشنیوں کے ہزار ہا نقطے' اور جلتے بجھتے نیون سائن۔ روشنیوں کی کئی ایک متحرک لڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ یہ شہر کی بارونق سڑکوں کی جھلک تھی۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم بمبئی میں ہیں۔"

مائیکل مسکرایا "مجھے یقین تھا کہ تم پہچان لو گے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اس شہر کے شناور رہو۔ اب ثبوت بھی مل گیا۔"

یہ شبہ تو مجھے پہلے سے ہی تھا کہ شاید ہم بمبئی یا رتناگری میں ہیں۔ اب میں بمبئی کو اپنے رو برو دیکھ رہا تھا۔ ایک مشہور بندرگاہ' ہندوستان کا بہت بڑا تجارتی مرکز اور انڈین فلم انڈسٹری کا محور۔ یہ ہزار ہا قسم کے ہزار ہا انسانوں کا شہر تھا۔ یہاں عظیم الشان پلازوں کے سائے میں پھٹی پرانی جھونپڑیاں بھی نظر آتی تھیں اور بڑے بڑے ہندو سیٹھوں کی چمک دار گاڑیوں کے ارد گرد کیچوؤں جیسے حقیر انسان بھی رینگتے تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" مائیکل نے مجھے چونکایا۔

"سوچ رہا ہوں کہ اس شہر جیسے شہر ہمیشہ غلام پیدا کرتے رہیں گے اور تم جیسے لوگ ان غلاموں کو جمع کر کے ہمیشہ انسانوں کی منڈیاں سجاتے رہیں گے۔ تمام تر تمدنی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود شاید یہ سلسلہ رکنے میں نہ آسکے۔"

"میں نے تمہیں یہاں فلسفے کی کلاس لینے کے لیے نہیں بلایا" ایک کام سے بلایا ہے۔"

"کیسا کام؟"

"ایک ایسا کام جو عام شخص کے لیے مشکل ہو سکتا ہے لیکن تمہارے لیے زیادہ مشکل نہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنے لیے گلاس تیار کیا اور ڈرامائی لہجے میں بولا "میں تمہیں بمبئی بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے... تم تو پریشان ہو گئے۔ زیادہ دن کے لیے نہیں بھیجوں گا' صرف ایک دو روز کی بات ہے۔ اس کے بعد تم پھر اپنی جانِ جاناں کے پاس اس جہاز میں ہو گے۔"

"کس جانِ جاناں کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا تمہاری ایک سے زیادہ جانِ جاناں ہیں۔" وہ مسکرایا "اگر یہ بات لیڈی ڈاکٹر غزالہ کے کانوں تک پہنچ گئی تو تمہیں پریشانی لاحق ہو جائے گی۔"

"کیا تم صاف سیدھے لہجے میں بکواس نہیں کر سکتے ہو؟"

مائیکل نے مانٹو کیے بغیر وہسکی کا ایک گھونٹ بھرا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تم ان دو لڑکیوں کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو جو رجب کے گھر سے دوسرے بائیس عدد بردوں کے ساتھ برآمد ہوئی تھیں۔ گہرے سیاہ بالوں اور براؤن آنکھوں والی وہ دونوں لڑکیاں میرے لیے بہت اہم تھیں' ان کی حیثیت آمدار کے مال کی سی تھی۔"

"لیکن یہاں ان لڑکیوں کا ذکر کیسے آگیا۔ وہ تو لاہور میں پولیس کسٹڈی میں ہیں؟"

"تمہارے ملک میں جو چیز پولیس کسٹڈی میں ہو وہ کہیں بھی پہنچ سکتی ہے... عالم بالا میں بھی۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"وہ دونوں لڑکیاں اس وقت بمبئی میں ہیں۔ کیسے اور کن ہاتھوں سے ہو کر یہاں پہنچی ہیں' میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر کہاں اور کس کے پاس ہیں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میری اطلاعات کے مطابق پولیس نے احاطہ کچہری سے لڑکیوں کے فرار کا ڈراما رچایا تھا اور ان کے پیسے کھرے کیے تھے۔ اس کے بعد وہ کسی اسمگلر کے ذریعے انڈیا آگئیں۔ اب وہ بمبئی میں ایک اور مطلوبہ لڑکی کے ساتھ موجود ہیں۔ جس شخص کے پاس وہ موجود ہیں اس کا نام سن کر شاید تمہیں جھٹکا لگے گا۔ اس کا نام بسواجیت چاپڑ ہے۔"

بسواجیت چاپڑ کا نام سن کر میں واقعی چونک گیا۔ میں بمبئی کے اس نامی گرامی نوجوان غنڈے کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس شخص کو شنکر شکرا کا دستِ راست بھی کہا جا سکتا تھا۔ بسواجیت چاپڑ سے کچھ عرصہ پہلے انڈیا میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ چاپڑ درحقیقت ایک نہایت امیر کبیر خاندان کا فرد تھا۔ اس نے جرائم کا راستہ صرف تفریح طبع کے لیے اختیار کیا تھا ورنہ اس کے صنعت کار باپ کے پاس اتنی دولت موجود تھی کہ چاپڑ کی کئی نسلیں بغیر کچھ کیے عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتی تھیں۔ درحقیقت بمبئی کے کئی نامی گرامی مجرموں کی طرح بسواجیت چاپڑ بھی اسٹوڈنٹس پالیٹکس کی پیداوار تھا۔ وہ ایک بڑے کالج کی یونین کا صدر رہا تھا۔ وہیں سے اس ہونہار سپوت پر شنکر شکرا کی جوہر شناس نگاہ پڑتی۔ بسواجیت کا دل ایک بڑے فوجی افسر کی خوب صورت بیوی پر آیا ہوا تھا۔ شنکر شکرا نے بسواجیت کی خاطر اس بجرام سنگھ نامی افسر کو قتل کروا ڈالا اور لڑکی کو بسواجیت کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس واقعے کے بعد بسواجیت دل و جان سے شنکر شکرا کی شاگردی میں آگیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا دستِ

راست بن گیا۔ اب اس مال بردار جہاز کے لگژری اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر مائیکل مجھے بتا رہا تھا کہ لاہور سے لاپتا ہونے والی لڑکیاں بمبئی شہر میں بسواجیت کے قبضے میں ہیں۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" مائیکل نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ جھوٹ واقعی بہت بڑی لعنت ہے۔ جھوٹے بندے کے منہ سے سو اچھی بات بھی نکل جائے تو اس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"گویا تم میری بات پر یقین نہیں کر پا رہے ہو!"

میں نے کہا "اگر یقین کر بھی لوں تو یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ تم نے مجھے یہاں طلب کیوں کیا ہے اور مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہو۔"

وہ بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم بسواجیت سے ڈیل کر کے ان لڑکیوں کو یہاں جہاز میں لاؤ۔"

"یہ شبھ کام کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔ تم بہتر طور سے کر سکتے ہو۔ تم اس شہر کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کے علاوہ شنکر شکرا اور اس کے ساتھیوں سے نبرد آزما ہونے کا طویل تجربہ تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں اور خطرناک لوگوں سے نمٹنے کا حق دار تم سے بڑھ کر اور کون ہو گا۔"

میں نے کہا "میں یہ حق تمہیں دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہاری خطرناکی اور خوں خواری کو بھی سلام پیش کرتا ہوں۔"

"شکریہ... کسرِ نفسی مت کرو ڈیئر۔" وہ مسکرایا "اس وقت جہاز میں میری حیثیت کپتان کی سی ہے' میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بمبئی میں میں بھی ویسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا جیسا تم کر سکتے ہو۔"

"شاید تمہیں معلوم نہیں' میں عرصہ تین سال سے نہایت شدت کے ساتھ انڈین پولیس اور دیگر ایجنسیوں کو مطلوب ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بمبئی میں داخل ہوتے ہی میں پہچانا جاؤں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہ جہاز بھی اپنے تمام بردوں کے ساتھ قانون کی گرفت میں آسکتا ہے۔"

"یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں' تمہارے سوچنے کی نہیں۔ تمہارے سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ تم بسواجیت اور اپنے دیگر "دوستوں" کے ساتھ کس طریقے سے ڈیل کرتے ہو اور ان لڑکیوں کو کتنی جلدی جہاز میں لاتے ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ ہم زیادہ دیر بندرگاہ میں نہیں رک سکتے۔ تم جتنی جلدی لڑکیوں کو لے آؤ گے' ہم اتنی ہی جلدی یہاں سے روانہ ہو سکیں گے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ میری یادداشت خاصی کمزور ہے۔ میں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔"

"جب تم کچھ بتانا نہیں چاہتے ہو تو یادداشت کو بیچ میں گھسیٹ لیتے ہو۔"

"جب تمہیں معلوم ہے تو پھر کیوں اصرار کرتے ہو؟"

"اچھا اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟ میرا مطلب ہے کہ جہاز سے اتر کر شہر جانے سے انکار کر دوں تو؟"

"تم کر ہی نہیں سکتے۔ میں اس سلسلے میں پوری ریسرچ کر چکا ہوں۔ اپنے دوست تمہیں جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ انہی دوستوں کی خاطر تم کچھ عرصہ قبل لاہور میں ایک ایسا کام کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جو واقعی نہایت دشوار تھا۔ امارات کے ایک شیخ نے تمہارے دو دوستوں اور ان کی بیویوں کو یرغمال بنایا تھا' ان یرغمالیوں کی باعزت رہائی کی خاطر تم اپنی اکلوتی بہن کا رشتہ اپنے ایک دشمن سے کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ سچ پوچھو تو میں نے بھی اماراتی شیخ کا راستہ اپنانے کی ہی کوشش کی ہے۔"

"کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"بالکل دھمکی دے رہا ہوں' اور اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ بھی رکھتا ہوں۔" مائیکل کا لہجہ ایک دم سنگین ہو گیا تھا' وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا "میں تمہیں پھر آگاہ کرتا ہوں کہ تمہاری لیڈی ڈاکٹر غزالہ' اس کا لے پالک بچہ تابی اور کلثوم نامی لڑکی میرے قبضے میں ہیں اور اسی جہاز پر ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق بمبئی جانے سے انکار کیا یا وہاں جا کر کسی طرح کی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھیوں کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ یاد رہے کہ تمہارے ساتھیوں میں صفدر اور وہ کابلی خاں بھی شامل ہیں۔"

مائیکل کے لہجے میں ہراساں کر دینے والی سنجیدگی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ ہو اور میں انسانی لباس میں چھپے ہوئے اس درندے کی گردن دبا سکوں۔ "بمبئی جانے اور بسواجیت سے ملنے" کے موضوع پر میرے اور مائیکل کے درمیان تا دیر گفتگو ہوئی۔ وہ دونوں لڑکیاں مصدقہ اطلاعات کے مطابق بسواجیت چاپڑ کے پاس تھیں۔ بمبئی پورٹ پر لنگر انداز ہونے کے بعد مائیکل کے کارندوں نے بسواجیت سے رابطہ کیا تھا اور لڑکیوں کی واپسی پر بات کی تھی لیکن بسواجیت اڑ گیا تھا۔ وہ لڑکیاں واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکیاں میری ملکیت

ہیں، چاہے میں انہیں پچاس روپے میں بیچ دوں، چاہے پچاس لاکھ میں بھی نہ بیچوں۔ دراصل بسواجیت دل پھینک قسم کا بندہ تھا۔ خوب صورت عورتوں کی اسے تلاش رہتی تھی۔ لڑکیاں اسے پسند آگئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کے بدلے میں اس نے مائیکل کی آفر کی ہوئی ایک بڑی رقم ٹھکرا دی تھی۔ دوسری طرف مائیکل کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر لڑکیوں کو اپنے "سامان" میں شامل کرکے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لڑکیوں اور بسواجیت کے ذکر پر مائیکل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ بولا "تم نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا۔۔۔ ایک بڑھیا نے اپنے بیٹے کی طرف سے ایک ایسی نایاب مینا کا تحفہ وصول کیا تھا جو کئی زبانوں میں گانے گاتی تھی اور کہانیاں سناتی تھی۔ نادان بڑھیا مینا کو پکا کر کھاگئی تھی۔ کچھ یہی حال اس بسواجیت کا ہے۔ وہ بڑھیا والا کردار ادا کر رہا ہے۔ ان لڑکیوں کی قدر و قیمت سے بے خبر ہے اور چند راتیں ان کے ساتھ سو کر انہیں بے کار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بے وقوف، جاہل انڈین۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن تم تو لڑکیوں کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ ہو، تم ان کی قیمت کیوں نہیں بڑھا دیتے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ہر چیز قابلِ فروخت ہوتی ہے، صرف بیچنے والے کو اس کی قیمت لگنی چاہیے۔"

"اسی لیے تو اس انڈین کو بے وقوف اور جاہل کا خطاب دے رہا ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے۔ ضد پر آگیا ہے۔ کہتا ہے کہ کسی بھی قیمت پر لڑکیاں حوالے نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک انڈین کی سائیکی کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہو اور اس شخص کو تو تم ویسے بھی اچھی طرح پہچانتے ہو۔ اس سے ڈیل کرو۔ کوشش کرو کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آئے، نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکال لو۔ بہرحال لڑکیاں ہر صورت میں ملنی چاہئیں اور "صحیح سالم" حالت میں ملنی چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔ لڑکیوں کی دوشیزگی برقرار رہنی چاہیے ورنہ ان کی اصل قیمت کا عشرِ عشیر بھی نہیں مل سکے گا۔"

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی۔" میں نے کہا "یہ لڑکیاں تو پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے رجب کے پاس تھیں۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ یہ تمہارے لیے آرڈر کا مال ہیں۔"

"یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں پیارے۔ یہ لڑکیاں کراچی کے اسحاق جالندھری نے میرے ہی لیے حاصل کی تھیں۔ اسحاق جالندھری پر چھاپا پڑگیا اور یہ لڑکیاں دوسرے بندے کے پاس چلی گئیں جس کا نام تم رجب بتا رہے ہو۔ بہرحال کچھ بھی ہے۔ اب یہ پھر ہمارے پاس آجائیں گی۔"

"بہت بھروسا ہے تمہیں؟"

"مجھے تم پر بھروسا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام چٹکی بجاتے کرگزرو گے۔"

"اس کے بدلے مجھے کیا حاصل ہوگا؟"

"تم سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو ڈیئر۔ پھر بھی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے بہتر سلوک کیا جائے گا۔"

"اس بہتر سلوک کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرسکو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"میں اپنی ساتھی لڑکیوں غزالہ اور کلثوم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مائیکل نے ایک گہری سانس لی، پھر اس کے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی "اس دوسری لڑکی کا نام تو تم نے یونہی لیا ہے، درحقیقت تم لیڈی ڈاکٹر سے ملنا چاہتے ہو۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

"چلو جو بھی سمجھ لو۔"

"ٹھیک ہے، ابھی تھوڑی دیر میں اس کا انتظام کردیتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا، اپنے ساتھ چالاکی کرنے والے کو میں اکثر ایک بہت سرد مقام پر بھیج دیتا ہوں۔ وہاں درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے کئی درجے نیچے ہوتا ہے اور جگہ جگہ تو اتنی تنگ ہوتی ہے کہ بندے کو ٹکڑوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مائیکل معنی خیز انداز میں ڈیپ فریزر کا ذکر کر رہا تھا اور مجھے وہ منظر یاد دلا رہا تھا جو میں نے پروفیسر کے گھر کے تہ خانے میں دیکھا تھا۔

اسی دوران میں اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ "کم اِن" مائیکل نے کہا۔ فربہ جسم کی ایک یورپین ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

اس نے انگلش میں کہا "سر! پروفیسر صاحب پھر آئے ہیں، کہتے ہیں کہ مسز شائستہ سے ملنا ہے۔"

مائیکل کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔ دبی آواز میں بولا "ایک تو اس بڈھے نے ناک میں دم کردیا ہے۔" پھر ملازمہ سے مخاطب ہو کر کہا "جاؤ اس سے کہہ دو کہ وہ ابھی سو رہی ہے۔ صبح آکر مل لے۔"

کسی اندرونی کمرے سے شائستہ کی مدھم آواز آئی "کون ہے مائیکل؟"

"تمہارے مطلب کی بات نہیں ڈارلنگ۔" مائیکل نے بڑی نرمی سے کہا پھر ابرو کے اشارے سے ملازمہ کو ہدایت کی کہ وہ باہر چلی جائے۔

ملازمہ چلی گئی۔ میں نے کہا "یہ ظلم کیوں کر رہے ہو مائیکل؟"

وہ بولا "تمہیں تو یہاں ہر طرف ظلم ہی ظلم نظر آتا ہے اور میں شاید دنیا کا ظالم ترین شخص۔۔۔ جس کا نام جلد از جلد گنیز ریکارڈ بک میں درج ہونا چاہیے۔"

"آئیڈیا کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔"

وہ مسکرایا "اچھا اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ تم فی الحال اپنی جانِ جاناں سے مل لو۔ اس کے بعد میں تمہیں تمہارے کام کے بارے میں ضروری ہدایات دوں گا۔"

اس نے بیل بجائی۔ دیوہیکل نیپالی گن مین اندر داخل ہوگیا۔ اس کی موٹی بھدی سیاہ انگلی بڑے خطرناک انداز میں ہر وقت ٹریگر پر رہتی تھی۔ سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ میرے عقب میں چلتے چلتے نیپالی کو کہیں ٹھوکر بھی لگ جائے تو ایل ایم جی کے منہ سے موت کا قہقہہ بلند ہوجائے۔

دونوں پہرے دار مجھے لے کر زیریں عرشے پر آگئے۔ تھوڑی دیر مجھے ایک نشست گاہ میں بٹھایا گیا۔ نشست گاہ میں میری الٹی ہتھکڑی کھول دی گئی پھر وہاں سے سیدھا ایک ایسے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں غزالہ ایک سالہ بچے محمد علی کے ساتھ موجود تھی۔ غزالہ شلوار قمیص میں تھی۔ چہرے کی کھلی کھلی رنگت اور بالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی نہا کر نکلی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور تحیر کے ملے جلے آثار تھے۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا "مجھے یقین تھا کہ آپ۔۔۔ اس جہاز میں موجود ہیں لیکن ان لوگوں میں سے کوئی بتاتا نہیں تھا۔"

"تم خیریت سے تو ہو نا۔۔۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور آپ؟" وہ بولی۔

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ زریں گل اور صفدر بھی یہیں موجود ہیں۔ زریں گل کلثوم کے لیے بہت پریشان ہے۔"

"کلثوم بھی قیدی عورتوں میں شامل ہے۔" غزالہ نے اطلاع دی۔

"کہاں ہیں وہ عورتیں؟"

"جہاز کے نچلے حصے میں۔ وہاں جانے کے لیے چور راستہ استعمال ہوتا ہے۔ چاول کی بہت سی بوریوں کے درمیان یہ ایک خفیہ راستہ ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ غزالہ کس راستے کی بات کر رہی ہے۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "باقی عورتیں وہاں ہیں تو تم یہاں کیوں ہو؟"

"جہاز کا وائس کپتان ایک اٹالین ہے۔ فلیمنگ نام ہے اس کا۔۔۔ چند دن پہلے وہ ایک دم بیمار ہوگیا۔ میں نے اسے دوا وغیرہ دی۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا۔ اسی نے مائیکل سے میری سفارش کی تھی۔ اس سفارش کے نتیجے میں مجھے یہ علیحدہ رہائش دی گئی ہے۔ جہاز کے ملازمین میں سے تین چار افراد بیمار ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ پرسوں میں نے مائیکل سے کہا تھا کہ کلثوم کو بھی میرے پاس یہاں اپارٹمنٹ میں منتقل کردیا جائے۔ وہ نیم رضامند نظر آرہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آج کل میں کلثوم بھی یہاں آجائے۔"

"کل کتنی عورتیں ہیں یہاں؟"

"جس کیبن میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں کلثوم کے علاوہ آٹھ لڑکیاں اور عورتیں مزید تھیں۔ اس کے علاوہ بھی یہاں عورتیں موجود ہیں۔ وہ کچن میں کام کرتی ہیں اور لانڈری وغیرہ کا کام بھی ان سے لیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ ان کے ساتھ یہاں اچھا سلوک ہوتا ہوگا۔ تین روز پہلے جب جہاز یہاں بندرگاہ پر رکا تھا تو امیگریشن، کسٹم اور ہیلتھ ڈپارٹمنٹس کے افسران معائنے کے لیے جہاز پر آئے تھے۔ اس وقت کام کرنے والی ان عورتوں کو جہاز کے زیریں حصے میں چھپا دیا گیا تھا۔ یہ افسران کچھ دیر جہاز پر ٹھہر کر اور پُرتکلف کھانا کھا کر واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے جہاز کے تفصیلی معائنے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

میرے اور غزالہ کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ غزالہ کو بھی چند روز پہلے ہماری طرح اس جہاز پر ہی ہوش آیا تھا۔ غزالہ کی اتری ہوئی کلائی اب ٹھیک تھی۔ سر کی چوٹ کا بھی مدھم سا نشان ہی باقی رہ گیا تھا۔ وہ اب تک ہم سب کے بارے میں بے حد پریشان تھی۔ میں نے غزالہ کو اپنے اور ساتھیوں کے حالات کے بارے میں بتایا۔ غزالہ بھی یہ جان کر حیران ہوئی کہ پروفیسر اللہ دتا کی اکلوتی بیٹی شائستہ مائیکل کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہے اور مائیکل اسے اپنی بیوی بتا رہا ہے۔

ننھا تابی اب پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ اس کے سانولے

چہرے پر رونق اور سیاہ آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا پھر اس نے حسب سابق میری آنکھ میں انگلی چبھونے کی کوشش شروع کر دی۔ پتا نہیں یہ اسے کیا لت پڑ گئی تھی۔ اس کی یہ ادا واقعی بڑی پیاری لگتی تھی۔ جس دوران میں' میں غزالہ سے باتیں کر رہا تھا وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف تھا' غزالہ بار بار اسے منع کر رہی تھی' آخر اس نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ذرا غصے سے بولی "کیا کرتے ہو تابی؟"

وہ بھی ایک چنچل تھا۔ اس نے غزالہ کے بال اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑے اور تقریباً لٹک سا گیا۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بال چھڑانے کی کوشش میں دہری ہو گئی۔ وہ اسے پکارنے لگی "پلیز تابی... پلیز۔" وہ اس کی مٹھیاں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر زیادہ زور بھی نہیں لگا رہی تھی۔ یہ کشمکش دلچسپ تھی' بہرحال غزالہ نے بال چھڑائے اور تابی کو گود میں دبوچ کر بیٹھ گئی۔ دانا سچ کہتے ہیں کہ بچوں کی محفل میں صرف ایک بچہ بھی چلا جائے تو پوری محفل بارونق اور جاندار ہو جاتی ہے۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے غزالہ کے چہرے پر جو گہری سنجیدگی چھائی رہتی تھی اس میں معصوم تابی بار بار رخنہ ڈال رہا تھا۔ میری طرح غزالہ کے ذہن میں بھی موجودہ صورت حال کے حوالے سے بہت سے سوالات تھے ہماری منزل کیا تھی؟ وہاں ہمیں کس مقصد سے لے جایا جا رہا تھا؟ کیا کسی طرح اس چنگل سے نکلا جا سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

تابی تھوڑی دیر بعد غزالہ کی گود سے کھسک کر پھر میرے پاس آ گیا۔ کچھ دیر اٹکھیلیاں کرتا رہا تب اس نے دوبارہ وہی مشغلہ شروع کر دیا۔ اپنی ننھی ننھی بے ضرر انگلیوں سے میری آنکھ چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس کے ہاتھ تھامتا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔ اب وہ مجھے سچ مچ پیارا لگنے لگا تھا۔ وہ زیادہ خوب صورت تو نہیں تھا لیکن اس کے سانولے چہرے میں کوئی ایسی کشش تھی جو دل کو کھینچتی تھی۔ وہ جب زیادہ بے تکلف ہونے لگا تو غزالہ کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔ وہ بولی "آپ اسے پیچھے کیوں نہیں ہٹا دیتے' آنکھ چبھو دے گا آپ کی۔"

میں نے کہا "بچے کو سختی سے منع کرنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"لیکن یہ بدتمیزی کر رہا ہے۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے بال بھی تو پکڑے تھے اس نے' تم نے سختی سے منع کیوں نہیں کیا؟"

"میری بات اور ہے لیکن دوسروں سے ایسا کرے گا تو۔"

"یعنی میں دوسرا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "نہیں کب تک میں دوسرا ہی رہوں گا۔"

وہ ایک دم چونک کر خاموش ہو گئی۔ فضا اچانک بوجھل سی ہو گئی تھی۔ ہم کتنی ہی دیر چپ بیٹھے رہے۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی تابی کی کلکاری گونج جاتی تھی۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے ایک دو روز جہاز سے باہر رہنا پڑے گا' شہر میں کوئی کام ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتوار تک آ جاؤں گا۔"

"کیا مائیکل آپ کو جانے دے گا؟"

"مائیکل ہی کا کام ہے۔"

"کوئی خطرناک کام ہو گا؟"

"نہیں کچھ ایسا خطرناک بھی نہیں۔"

"شاید وہ آپ کو بلیک میل کر رہا ہے؟"

"فی الحال ہم اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

ننھا تابی غزالہ کی گود میں مچلنے لگا اور توتلی زبان میں ناقابل فہم الفاظ بولنے لگا۔ ان میں ایک آدھ لفظ اردو کا بھی سنائی پڑتا تھا۔ غزالہ بولی "کہہ رہا ہے کہ آپ مت جائیں۔"

یہ الفاظ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہے تھے۔ شاید اسے بھی فضا کی سنجیدگی اور بوجھل پن کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے تابی کو گود میں اٹھا کر تھوڑا سا پیار کیا۔

وہ پھر کوئی لاطینی قسم کی زبان بولنے لگا "یہ اب کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

وہ بولی "گونگے کی رمز گونگے کی ماں ہی جان سکتی ہے۔"

میں نے لمبی آہ بھر کر کہا "اور گونگے کی ماں کی رمز کون جانے گا؟"

آواز مدھم تھی۔ غزالہ تک نہیں پہنچ سکی۔ وہ بولی "کیا کہا ہے آپ نے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر سرخ رنگ سا لہرا گیا "کچھ تو کہا ہے۔"

"بس یہی سوچ رہا تھا کہ... اگر تابی والی بات تم نے کہی ہوتی تو... میرا مطلب ہے کہ مجھے جانے سے روکا ہوتا۔"

اس کی پلکیں جھک گئیں اور چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ معلوم نہیں یہ ناراضگی کی سرخی تھی یا شرم کی یا پھر دونوں کی۔ میں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

باہر گن بردار خیالی موجود تھا۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر واپس اسی کیبن میں لے آیا جہاں میں اور صفدر اپنے

آٹھ ساتھیوں کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ صفدر بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک اسے تمام بات بتائی۔ ہم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ زریں گل بھی گاہے گاہے اس گفتگو میں شریک ہوتا رہا۔

اگلے روز سہ پہر کے بعد مائیکل نے مجھے دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں طلب کیا۔ وہ حسب معمول تھری پیس سوٹ میں تھا اور بڑے ٹھاٹ سے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایک موالی قسم کا بندہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خالص بمبئی کا رہائشی لگتا تھا۔ جیکٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔ جیکٹ کے نیچے سرخ رنگ کی ڈبی دار قمیص تھی۔ گلے میں رومال اور سر پر ٹوپی تھی۔ اس نے بال بڑے فلمی اسٹائل میں بنا رکھے تھے اور بڑے ایکشن کے ساتھ بات کرتا تھا۔ مائیکل نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا "اس کا نام رمیش عرف ہیرو ہے۔ یہ بمبئی میں میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہے۔ یہ شہر میں ساری اونچ نیچ سے واقف ہے اور ہمارے ٹارگٹ کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ میرا مطلب بسواجیت چاپڑ کے موجودہ ٹھکانے سے ہے۔ اس نے تصدیق کر رکھی ہے کہ دونوں لڑکیاں چاپڑ کے پاس ہیں اور اس کی رہائش گاہ پر موجود ہیں۔ رمیش تمہارے لیے شہر میں سواری اور رہائش کا انتظام کرے گا اور اس کے علاوہ بھی جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو گی یہ بہم پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

میں نے رمیش نامی اس جواں سال شخص سے چند باتیں کیں۔ وہ بولتا بھی فلمی اسٹائل سے تھا۔ مجھے یہ انداز کچھ جانا پہچانا لگا۔ غور کیا تو پتا چلا کہ یہ مشہور انڈین اداکار ششی کپور کا انداز ہے۔ موصوف کی شکل میں بھی تھوڑی بہت ششی کپور کی جھلک پائی جاتی تھی۔ یقیناً وہ بزعم خود اپنے آپ کو ششی کپور ہی سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسے ہیرو کا خطاب ملا ہوا تھا۔

"ششی کپور" کا تعارف کرانے کے بعد مائیکل نے اسے باہر بھیج دیا اور مجھے اس "ڈیل" کے متعلق بتانے لگا جو میں نے بسواجیت چاپڑ سے کرنا تھی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے بہرصورت لڑکیاں چاپڑ سے حاصل کرنا تھیں۔ اس سلسلے میں' میں اسے اپنی صوابدید کے مطابق پچاس ہزار سے لے کر دس لاکھ تک کوئی بھی رقم آفر کر سکتا تھا۔ اگر کام سیدھی انگلیوں سے نہ نکلتا تو میں انگلیاں ٹیڑھی بھی کر سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے آزادی تھی کہ میں آٹھ دس بندے پار کر دیتا اور اگر ضروری سمجھتا تو خود بھی خراماں خراماں اپنے خالق حقیقی سے جا ملتا۔ مائیکل کو فقط لڑکیوں سے غرض تھی۔ مائیکل نے میرے لیے ایک رائفل کا انتظام بھی کیا تھا' یہ رائفل فی الوقت رمیش کی تحویل میں تھی۔

مائیکل کی پوری بات سننے کے بعد میں نے اس کے سامنے صرف ایک شرط رکھی۔ میں نے کہا کہ میرا ساتھی صفدر میرے ساتھ جائے گا۔ تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ مائیکل نے یہ بات مان لی۔

○☆○

رات کے نو بجے تھے جب میں اور صفدر "ہیرو" کے ساتھ جہاز سے نیچے اترے تو جہاز کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ نیچے اترنے کے لیے رسے کی سیڑھی استعمال کی گئی۔ اس سیڑھی نے ہم تینوں کو ایک ڈونگے میں پہنچا دیا۔ ڈونگے کا انجن اسٹارٹ تھا' ہمارے بیٹھتے ہی وہ کنارے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر ہم نے جہاز کا نام اس کے پہلو پر لکھا دیکھا۔ جہاز کا نام "ہرکولیس" تھا۔ ہمارے اردگرد بہت سے جہازوں' اسٹیمروں اور لانچوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوسٹ گارڈز کی ایک لانچ شور مچاتی ہمارے قریب سے بھی گزری مگر کسی نے ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دی۔ جلد ہی ہم کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں بھی کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ "ہیرو" بڑی ہوشیاری سے ہمیں پورٹ سے نکال لے گیا۔ صرف ایک جگہ دو افراد نے ہمیں روکا۔ غالباً ان کا تعلق امیگریشن سے تھا۔ ہمارے "ہیرو" نے تقریباً ایک منٹ ان سے کھسر پھسر کی اور انہوں نے بلا تامل ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ یقیناً یہ پورٹ کے ان کرپٹ افسران میں سے تھے جو جہاز رانوں سے تحفے تحائف لے کر ہر قسم کے معاملات کی طرف سے آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹیکسی اسٹینڈ پر موجود تھے' تاہم ہیرو نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بجائے ایک پبلک بوتھ سے فون کیا اور چند منٹ بعد اچھی حالت کی ایک ہل مین کار ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی۔ ہیرو نے ششی کپور کے انداز میں اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کے استعمال کے لیے ہے چیف... یہ لیجیے چابی۔"

اس نے چابی میری طرف بڑھا دی اور میرے لیے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ صفدر نے میری طرف دیکھ کر ستائشی انداز میں بھویں اچکائیں۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی' صفدر ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہیرو بڑے ایکشن سے جھک کر پچھلی نشست پر براجمان ہو گیا۔ جو شخص گاڑی لے کر آیا تھا وہ وہیں پورٹ پر رہ گیا۔ میں اور

صفدر پینٹ قمیص میں تھے' صفدر نے جیکٹ اور میں نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ براؤن رنگ کا منحوس کرتہ پاجامہ ہم ہوائی جہاز پر اتار آئے تھے۔ مائیکل کی طرف سے ہم دونوں کو کولٹ پسٹل فراہم کیے گئے تھے۔ دونوں پسٹل کے وافر راؤنڈ بھی ہمارے پاس موجود تھے۔ وقت رخصت آٹھ ہزار کے کرنسی نوٹ بھی مائیکل نے میری جیب میں ڈال دیے تھے۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے ہیرو سے پوچھا۔

"مالا بار ہل۔" اس نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے بولا "میرے خیال میں اپن کو راستہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔ آپ اس شہر کو جانتے ہی ہیں۔"

"شہر کو بھی جانتا ہوں اور شہر کے لوگوں کو بھی۔ میرا خیال ہے کہ تم مراٹھی ہو۔"

"جی۔۔۔ جی ہاں۔"

"پھر ہندی کیوں بولتے ہو۔ مراٹھی کیوں نہیں بولتے؟"

اس نے ششی کپور کے انداز میں منہ ٹیڑھا کیا "بس جی عرصہ ہو گیا بمبئی میں رہتے ہوئے اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ہندی زبان ہر دوسری زبان کو کھا جاتی ہے۔"

ہم شہر کے مغربی حصے سے گزرتے ہوئے مالا بار ہل کی طرف جا رہے تھے۔ جونہی ہم نے نہرو پارک کی طرف جانے والی سڑک کراس کی "ہیرو" نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وڑی یہ رہا آپ کا ہوٹل۔ یہاں فلور نمبر ایک میں دو ڈبل بیڈ کمرے آپ دونوں کے لیے ریزرو ہیں۔ کمرا نمبر بیس اور اکیس۔ یہ رہیں کمروں کی چابیاں۔" اس نے دو چابیاں صفدر کی طرف بڑھا دیں۔

میں نے کہا "تم نے کمرے تو ایسے ریزرو کرائے ہیں جیسے ہم یہاں پندرہ دن کے تفریحی دورے پر ہیں۔ بھائی میرے ہمیں زیادہ سے زیادہ دو دن یہاں رکنے کی اجازت ملی ہے اور اگر کام اس سے پہلے ہو گیا تو پہلے ہی واپس جانا ہو گا۔"

"اپن نے فی الحال بکنگ بھی دو دن کی کرائی ہے جناب۔۔۔ بھگوان کرے آپ کا کام آج ہی ہو جائے لیکن اگر کوئی اندھیر سویر ہو گئی تو پھر رکنا تو پڑے گا۔ مائیکل صاحب ہر صورت چھوکریوں کو جہاز پر دیکھنا مانگتے ہیں۔"

"تم اتنے وثوق سے کیسے کہتے ہو کہ چھوکریاں جاپر کی رہائش گاہ پر ہی ہیں؟"

"اس کی تفصیل میں جانے کا ٹائم نہیں ہے جناب۔۔۔ مگر اپن آپ کو پوری گارنٹی دیتا ہے کہ دونوں بلکہ تینوں لڑکیاں اس وقت جاپر کی کوٹھی پر ہیں۔"

صفدر نے جاپر کی کوٹھی کا محل وقوع دریافت کیا اور اس سلسلے میں دیگر باتیں "ہیرو" سے پوچھیں۔ معلوم ہوا کہ دشمن داری کے سبب جاپر کی کوٹھی پر حفاظت کے سخت انتظامات ہیں۔ اصل عمارت کے چاروں طرف کھلا احاطہ ہے اور اس احاطے کو چودہ پندرہ فٹ اونچی چار دیواری سے محفوظ کیا گیا ہے۔ جاپر کے مسلح کارندے ہر وقت چار دیواری کے اندر اور باہر پہرا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پولیس کے مستقل گارڈز کا انتظام بھی ہے۔ جاپر کے بارے میں معلوم ہوا کہ آج کل وہ گاڑیاں بدل بدل کر سفر کرتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ہر وقت بلٹ پروف جیکٹ پہنے ہوتا ہے۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے "ہیرو" کے لہجے میں خفیف سی لرزش آگئی تھی۔ یہ لرزش اس بات کی گواہ تھی کہ وہ بسواجیت جاپر کی طاقت اور حیثیت سے بری طرح مرعوب ہے۔

کچھ دیر گاڑی میں خاموشی رہی پھر ہیرو نے پوچھا "وڑی آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے' اپن کا مطلب ہے کہ جاپر صاحب سے کیسے ملنا ہے۔ وہ اپوائنٹ منٹ کے بغیر کسی سے ملتے نہیں ہیں۔۔۔ اور اگر کسی چال کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہونا ہے تو بھی اچھی طرح منصوبہ بندی کر لینی چاہیے۔"

میں نے کہا "تم بے فکر رہو۔ ہم صاف سیدھے طریقے سے کوٹھی میں داخل ہوں گے اور بغیر کسی اپوائنٹ منٹ کے ہوں گے۔"

"شاید جاپر صاحب سے آپ کا دوستی کا رشتہ ہے!"

"دوستی کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط رشتہ ہے۔ دشمنی کا رشتہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہیرو حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ بہرحال مزید کوئی سوال پوچھنے کی اسے جرأت نہیں ہوئی۔ باقی کا سفر قریباً خاموشی سے ہی طے ہوا۔ ہم مالا بار ہل پہنچے اور پھر ہیرو کی ہدایات کے مطابق ایک ماڈرن آبادی میں پہنچ گئے۔ یہاں کوئی کوٹھی بھی تین چار کنال سے کم نہیں تھی۔ غالباً اس آبادی کا شمار بمبئی کی امیر ترین آبادیوں میں ہوتا تھا۔ پانچ چھ کنال کی ایک شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ہم رکے۔ پُرشکوہ گیٹ پر دو مسلح چوکی داروں نے ہمیں روکا۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک جگر پاش نظروں سے ہمارا معائنہ کیا۔ میں نے ذرا تند لہجے میں کہا۔

"جاؤ۔۔۔ جاپر سے کہو استاد جہانی تم سے ملنے آیا ہے۔"

"استاد جہانی۔ کون استاد جہانی؟" ایک چوکی دار نے کہا۔

"تیرا باپ استاد جہانی؟" میں نے سختی سے جواب دیا

"جاؤ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کرو۔"

چوکی دار جو شکل سے ہی آکڑ خاں لگتا تھا' ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اپنے غصے پر قابو پاتا ہوا اور مجھے گھورتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے مؤدب لہجے میں کہا کہ ہم اپنا اسلحہ اس کے حوالے کر دیں۔ جب ہم لوٹیں گے تو اسلحہ واپس کر دیا جائے گا۔

میں نے صفدر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے اپنے ہتھیار چوکی دار کو دے دیے۔ دوسرے چوکی دار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی پورچ میں پہنچی تو وہاں اپنی شاندار کار کے پہلو میں جاپر خود ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ سرخ و سپید چہرے پر رعونت اور سفاکی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گلے میں سونے کی چین' ہاتھوں میں نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں' وہ شکل و صورت سے ہی ایک بگڑا بگڑا خطرناک رئیس زادہ نظر آتا تھا۔

"آؤ استاد جہانی' تم نے تو ایک دم حیران کر دیا۔"

"کیوں' میں قطب شمالی میں تو نہیں رہتا۔ تمہارے پڑوس میں رہتا ہوں۔ کسی بھی وقت ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری ملاقات کسی نہ کسی قیامت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔"

"قیامتیں تو تم خود پالتے ہو جاپر۔"

"میری طرف سے بہت بدظن لگتے ہو۔"

"بدظن کا لفظ تو شک کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ جنوبی بھارت کے پچاس فی صد فتنے شکرا اور اس کے ہونہار شاگرد جاپر کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا تذلیل؟"

"تذلیل کے لیے عزت کا ہونا شرط ہے۔"

"دیکھو تمہاری حیثیت اس وقت تک ایک مہمان کی ہے۔ مجھے اپنے ملازموں کے سامنے بد تمیزی پر مجبور نہ کرو۔"

"میں یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا۔ ایک معاملہ طے کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"تو کیا یہاں پورچ میں کھڑے کھڑے طے کرو گے؟"

"نہیں۔۔۔ بیٹھیں گے۔ بڑے آرام سے بیٹھیں گے۔"

"تو پھر مہمان ہی تو ہوئے نا۔۔۔ چلو آؤ۔" وہ مسکرایا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور صفدر' جاپر کے ساتھ ایک وسیع نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ ہیرو باہر کے کمرے میں رہ گیا تھا۔ ہمارے سامنے چائے کے لوازمات رکھے تھے مگر میں نے یا صفدر نے چائے پینے کا رسک نہیں لیا تھا۔ جلد ہی ہم اصل موضوع پر آگئے۔

میں نے کہا "جاپر! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس دو اسمگل شدہ لڑکیاں ہیں۔"

وہ مکاری سے مسکرایا "مجھے معلوم تھا کہ تمہاری آمد کی وجہ کیا ہے۔"

"شاید اسے ہی چور کی داڑھی میں تنکا کہتے ہیں۔ بہرحال' اب تمہارے کیا ارادے ہیں۔ ان لڑکیوں کا اصل مالک مائیکل نام کا نیگرو ہے اور وہ یہاں بمبئی میں ہی موجود ہے۔ میری معلومات کے مطابق مائیکل کا نمائندہ لڑکیوں کا معاملہ طے کرنے کے لیے دو تین بار تم سے ملاقات کر چکا ہے۔"

جاپر نے اپنی انگلی اٹھائی "سنو جہانی! پہلی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں لڑکیوں کی حیثیت کٹی پتنگوں کی سی ہے اور کٹی پتنگ اسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ہو۔ کوئی اس کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔۔۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے ان لڑکیوں کے سلسلے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میں انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرو گے ان لڑکیوں کا؟"

"اچار ڈالوں گا۔"

"ایسے اچار کی تمہارے پاس کمی نہیں ہے۔ مرتبانوں کے مرتبان بھرے پڑے ہیں۔ میرے خیال میں تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہو۔ یہ کانچ ہوائے کی سی ضد تم جیسے نامی گرامی بدمعاش کو زیب نہیں دیتی۔ اپنے پیر استاد کی طرح جرائم کی دنیا میں نام کمانا ہے تو ذرا حقیقت پسند بنو۔ اب دیکھو ان لڑکیوں کے عوض تمہیں ٹھیک ٹھاک منافع مل رہا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ تم ایک سنگین قسم کی دشمنی سے بچ جاؤ گے۔ یہ مت بھولو کہ جرائم کی دنیا میں دشمنیاں بڑھنے لگیں تو دوستیاں گھٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔"

"تم دو ٹوک بات کرو۔ تم کس حیثیت سے یہاں آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں مائیکل کی طرف سے ہی آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ لڑکیوں کا معاملہ طے کر لو' کچھ تم نیچے آؤ' کچھ وہ اوپر آ جاتا ہے۔"

"لیکن وہ اتنی ہٹ دھرمی کیوں کر رہا ہے۔ وہ ایک بردہ فروش ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے مال میں کچھ ویسٹیج بھی چلی جاتی ہے۔ یعنی طویل سفر کے دوران میں دو تین فی صد بردے مر بھی جاتے ہیں۔ وہ سمجھ لے کہ یہ دونوں لڑکیاں بھی مر گئی ہیں۔"

"یعنی تمہارا فیصلہ ہے کہ وہ لڑکیاں تم نہیں چھوڑو گے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔"

"لیکن وہ لڑکیاں تمہیں بہرصورت دینا پڑیں گی۔"

"تو تم اپنی اصلیت پر آ گئے ہو۔ دھمکی دے رہے ہو۔"

"ظاہر ہے کہ جب بات چیت کے راستے بند کر دو گے تو زور آزمائی کا راستہ ہی رہ جائے گا۔"

"کتنا مال لیا ہے اس کالے سے؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مال کی میرے نزدیک بھی کوئی حیثیت نہیں رہی۔"

"مگر جیون کی اہمیت تو ہے۔ اب تو سنا ہے کہ تمہیں بہت بڑی دولت بھی ملنے والی ہے۔ اگر جیون ہو گا تو اس دولت سے فائدہ اٹھاؤ گے نا ورنہ وہ کس کام آئے گی۔ تمہارا تو کوئی وارث بھی نہیں ہے۔"

"میں تم سے مکالے بازی کا مقابلہ کرنے نہیں آیا۔ مجھے وہ لڑکیاں چاہئیں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

اس نے قیمتی برانڈ کا سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا "ٹھیک ہے۔ دے دیتے ہیں لڑکیاں۔ تم بتاؤ تم کیا خرچ کر سکتے ہو ان کے لیے۔"

"مجھے تمہاری کمینی فطرت کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم صرف قیمت بڑھانے کے لیے یہ ناٹک رچا رہے ہو۔"

"چلو ایسے ہی سہی۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "بولو کیا خرچ کرو گے ان پر؟"

"بہتر ہے کہ تم اپنے منہ سے پھوٹ دو۔"

وہ گہرا کش لیتے ہوئے بولا "معاشے! پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں وہ دونوں نہیں تینوں لڑکیاں خریدنا ہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا ٹھیک ٹھاک خرچا ہوا ہے ان پر۔ پندرہ لاکھ تو میں نے کیش دیا تھا۔ نائیکا کو جو تحفے تحائف دیے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ پھر پولیس درمیان میں کود پڑی تھی۔ اس کا منہ بھی بڑی مشکل سے بند ہوا تھا۔ بہرحال یہ ساری غیر اہم باتیں ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں ان دو لڑکیوں کو بیچنا نہیں چاہتا۔ اب تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ میرے مجبور کیے جانے کی کوئی قیمت تو ہو گی۔"

صفدر نے کہا "پہلے ایک بات کلیئر کر لو۔ وہ لڑکیاں ہمیں اسی حالت میں چاہئیں جس حالت میں لاہور سے گئی تھیں۔"

وہ مسکرایا "تم بڑا نازک سوال پوچھ رہے ہو۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ لڑکیاں اسی حالت میں ہیں۔ وہ دربدر بھٹکتی ہوئی یہاں نہیں پہنچیں بلکہ ویسے ہی آئی ہیں جیسے آپ دونوں "شوں" کر کے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لاہور سے انہیں ایک مشہور سپلائر میڈم ڈیبی نے پولیس کے تاوٹ سے خریدا تھا اس نے انہیں سیدھا انڈیا پہنچایا۔ وہ انہیں دہلی کے بازارِ حسن میں لے جانا چاہتی تھی لیکن بیچ میں اس کا ٹاکرا مجھ سے ہو گیا۔ اس طرح لڑکیاں میں نے خرید لیں۔ ابھی تک وہ بالکل بچل مال ہے۔ کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا انہیں۔ اگر تم چاہتے ہو تو۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔" میں نے قطع کلامی کی "تم بولو کیا مانگتے ہو لڑکیوں کا؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "سنو جمائی! اگر وہ لڑکیاں تمہیں اپنے ساتھ لے جانی ہیں تو تم کو کروڑ روپیہ کیش یہاں رکھنا ہو گا۔"

میں سناٹے میں رہ گیا "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے چاپر۔ تم یہ کیا مانگ رہے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم وہ لڑکیاں چھوڑنا نہیں چاہتے ہو۔"

اس نے قہقہہ لگایا اور کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "تم اتنے بھولے نہیں ہو شاہ جہاں۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ منزل پر پہنچ کر ان لڑکیوں کی قیمت کیا ہو گی۔ وہ حرام زادہ ٹیگرو انہیں یورپ یا امریکا کے کسی شوقین کے سامنے پھینک بھی دے گا تو آٹھ دس لاکھ ڈالر اٹھا لے گا۔ اس کالے دھندے پر تھوڑی بہت نگاہ ہماری بھی ہے۔ ہمیں جانکاری ہے کہ کھلی مارکیٹ میں کس مال کا کیا بھاؤ جا رہا ہے۔ پچھلے مہینے اٹلی میں جو مقابلۂ حسن ہوا تھا اس میں اسی رنگ و روپ کی ایک لڑکی کی بولی تین لاکھ اسی ہزار ڈالر تک پہنچی تھی۔"

میں جانتا تھا کہ چاپر ایک پرلے درجے کا مکار اور جھوٹا شخص ہے۔ وہ آسانی سے قابو آنے والا نہیں تھا۔ اس نے اتنی قیمت بتا دی تھی کہ مائیکل لڑکیاں خرید ہی نہ سکے اور اگر خریدے تو اسے دانتوں پسینہ آ جائے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لڑکیاں خود بیچنے کے چکر میں ہے۔ اس جیسے کائیاں شخص کے لیے یہ بالکل مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں کو بہترین جگہ پر لے جا کر بہترین قیمت پر بیچ سکتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پیر استاد شنکر شنکرا نے اسے ایسا کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ میں نے چاپر سے شنکر شنکرا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے گول مول انداز میں جواب دیا اور بتایا کہ وہ اس وقت انڈیا میں نہیں۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر بہتر ہی تھا کہ شنکر سے ٹاکرے کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔

اس معاملے میں ہمارے اور چاپر کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ چاپر کا عندیہ یہی تھا کہ وہ اپنی طلب شدہ قیمت میں زیادہ سے زیادہ چار پانچ لاکھ کی کمی قبول کرے گا۔ رات قریباً گیارہ بجے ہم چاپر سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ہم اس سلسلے میں اصل خریدار مائیکل سے مشورہ کر لیں۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے ہم نے چاپر سے کہا کہ ہم لڑکیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ معمولی تذبذب کے بعد چاپر آمادہ ہو گیا۔ اس کے حکم پر تینوں لڑکیوں کو کسی عقبی کمرے سے نکال کر ڈرائنگ روم میں لایا گیا۔ وہ بالکل بھیڑ بکریوں کی طرح چاپر کے گارڈز کے اشاروں پر چل رہی تھیں۔ اشارے پر رکتی تھیں، بیٹھتی تھیں اور اٹھتی تھیں۔ رجب سے برآمد ہونے والی دونوں لڑکیوں کے چہرے پر مجھے دیکھ کر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ اس سے پہلے وہ مجھ سے لاہور میں رجب کی رہائش گاہ پر مل چکی تھیں۔ میں نے انہیں حتی المقدور حوصلہ دیا تھا اور ان کا خوف دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اسی اچھے سلوک کے حوالے سے وہ مجھے اب بھی دیکھ رہی تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں امید کی ایک موہوم کرن سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ میں لڑکیوں سے ان کا حال چال پوچھنا چاہتا تھا مگر چاپر نے پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ ہم لڑکیوں سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ تیسری لڑکی بھی کافی خوب صورت تھی بلکہ کافی سے زیادہ خوب صورت تھی حالانکہ اس کا لباس بھی باقی لڑکیوں جیسا تھا لیکن نجانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر غم کے گہرے سائے تھے۔ وہ ہمارے سامنے کسی معصوم جانور کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز دیکھ کر دل کٹ سا گیا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سرخ داغ تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سے دست درازی بھی کی جاتی رہی ہے۔ چاپر کے اشارے پر تینوں لڑکیوں کو واپس بھیج دیا گیا۔ ہم بھی اٹھ کر باہر آ گئے۔ یہاں ہمارا گائیڈ ہیرو ششی کپور کے فلمی انداز میں ٹہل ٹہل کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم پورچ میں پہنچے۔ یہاں چاپر کے گارڈز نے ہمارے پستول ہمیں واپس کر دیے۔ پھر ہم گاڑی میں بیٹھ کر ہم بسواجیت چاپر کی شاندار کوٹھی سے باہر نکل آئے۔

کچھ دیر میں نے یونہی مالابار کی سڑکوں پر ادھر ادھر گاڑی گھمائی۔ جب یقین ہو گیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جا رہا تو میں نے اسی ہوٹل کی طرف رخ کر لیا جس کے بارے میں ہیرو نے بتایا تھا کہ وہاں ہمارے لیے کمرے بک ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم ہوٹل ڈان کے ایک آرام دہ کمرے میں بیٹھے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میری طرح صفدر کے چہرے پر بھی سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا "یعنی آپ کا خیال ہے کہ مائیکل سے رابطہ کرنا بیکار ہے۔"

"ہاں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ چاپر نے جو رقم مانگی ہے وہ کسی طور بھی مائیکل کو قبول نہیں ہو گی بلکہ شاید وہ اس کا چوتھا حصہ دینے کو بھی تیار نہیں ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ سودا طے نہیں ہو سکتا؟"

"ناممکن ہے۔ چاپر نے اتنی ڈیمانڈ ہی اس لیے کی ہے کہ سودا طے نہ ہو سکے۔"

"پھر اب کیا کرنا ہے؟"

"کچھ سوچنا پڑے گا۔"

"میرا تو خیال ہے کہ آپ نے کچھ سوچ بھی لیا ہے۔"

"بڑے مزاج شناس ہوتے جا رہے ہو۔"

"آپ کی دعا ہے۔"

"ہوں۔"

"تو کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میری معلومات کے مطابق چاپر کی ایک محبوبہ ہے۔ چاپر نے خفیہ شادی کر رکھی ہے اس سے۔ وہ چاپر کے ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس لڑکی کے بارے میں معلوم ہے۔ وہ ایک زبردست گلوکارہ تھی۔ انڈین فلم انڈسٹری میں اس کا مستقبل بڑا روشن تھا لیکن اب وہ صرف اور صرف چاپر کی خاطر گمنامی کی زندگی گزار رہی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ چاپر بھی اس سے محبت کرتا ہے بلکہ شاید وہ واحد ہستی ہے چاپر کو جس کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے۔"

"ہاں یہ تو میں نے بھی سنا تھا کہ چاپر کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔"

"بس وہی لڑکی اور بچہ اس کا "آگا" بھی ہے اور "پیچھا" بھی۔ وہ دونوں بمبئی میں ہی کہیں رہتے ہیں۔ اگر کسی طرح ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہو جائے تو کام بن سکتا ہے۔"

صفدر نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں صفدر! جس طرح چاپر نے لڑکیوں کو یرغمال بنا رکھا ہے، ہم چاپر کی محبوبہ کو یرغمال بنا کر اس سے اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔"

"لیکن... انہیں ڈھونڈیں گے کہاں۔ یہ تو ایک کروڑ انسانوں کا شہر ہے۔"

ڈھائی تین سال پہلے جب میں بمبئی آیا تھا تو شنکر شکرا سے میرا ٹاکرا ہوا تھا۔ ایک روز میں شنکر شکرا کا تعاقب کر رہا تھا۔ وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں شنکرا ایک کوٹھی پر دو تین منٹ کے لیے رکا تھا۔ جب وہ باہر آیا تھا تو اس کے ساتھ چاپر بھی تھا۔ دونوں کار میں بیٹھ کر پھر روانہ ہو گئے تھے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ وہی کوٹھی تھی جہاں چاپر نے اپنی گلوکارہ بیوی کو رکھا ہوا ہے۔"

"لیکن آپ کے بقول اس بات کو ڈھائی تین سال گزر چکے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ گلوکارہ ابھی تک اپنے بچے کے ساتھ وہیں مقیم ہو۔"

"ہاں امکانات تو بہت سے ہیں۔ بہرحال چیک کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"کیا ہم خود چیک کرنے جائیں گے۔"

"نہیں' یہ ہیرو کس مرض کی دوا ہے۔ اسے بھیجتے ہیں۔"

میں نے ہیرو کو آواز دی۔ وہ باہر بالکونی میں بیٹھا تھا۔ پہلی ہی آواز پر بال پیشانی سے جھٹکتا ہوا اندر آگیا۔ میں نے اسے پاس بٹھالیا اور سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ رات ہم نے ہوٹل کے کمرے میں ہی گزاری۔ ہیرو اپنی رہائش گاہ پر واپس چلا گیا تھا۔ وہ بہت چلتا پرزہ تھا اور بڑی حد تک ایک وفادار شخص بھی تھا۔ اگلے روز وعدے کے عین مطابق گیارہ بجے کے قریب اس نے ہمیں ہوٹل آکر رپورٹ دے دی۔ وہ میری ہدایت کے مطابق وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں گیا تھا اور میرے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچا تھا۔ اس نے مطلوبہ مکان میں رہنے والوں کے متعلق اہم معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بتایا "وڈی اپن نے کوٹھی نمبر ۱۸ سی بی کا مکمل سروے کیا ہے۔ اپن نے ایک قریبی دکان دار کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور اس سے تفصیل معلوم کی۔ اس تفصیل کے مطابق اس کوٹھی میں ایک سندر عورت اپنے چار پانچ سال بیٹے اور چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا پتی بیرونِ ملک میں ہے اور وڈی کسی بڑے عہدے پر کام کرتا ہے۔ جوان سال عورت کا نام مسز رائے معلوم ہوا ہے۔"

ہیرو کی اطلاع نہ صرف چونکا دینے والی تھی بلکہ نہایت خوش کن بھی تھی۔ میں نے اندھیرے میں جو تیر چھوڑا تھا وہ عین نشانے پر لگا تھا۔ ہم چاپر کی محبوبہ دل نواز کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مجھے اور صفدر کو یہی توقع تھی کہ اگر چاپر کی داشتہ تنہا ہوئی اس کوٹھی میں مقیم ہوئی تو پتا چلے گا کہ اس کا شوہر کہیں بیرونِ ملک کام کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال ایک اور اہم اطلاع بھی ہیرو نے ہمیں دی۔ اس نے بتایا "کوٹھی کے اندر لان میں شامیانے وغیرہ لگ رہے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ کوٹھی میں کافی مہمان موجود ہیں۔ اپن کو اندازہ ہوا کہ یہاں کوئی فنکشن وغیرہ ہے۔ اپن نے دکان دار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ جو عورت یہاں رہتی ہے اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ رات کو کافی بڑا فنکشن ہونے والا ہے۔"

صفدر نے پوچھا "فنکشن کا ٹائم کیا ہے؟"

"اپن کو ٹھیک سے جانکاری نہیں لیکن خیال ہے کہ رات نو دس بجے کے بعد ہی ہوگا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ہیرو! پھر وہاں جاؤ۔ ساری بات ٹھیک ٹھیک معلوم کر کے آؤ۔ فنکشن کتنے بجے شروع ہوگا' کب ختم ہوگا۔ برات کہاں سے اور کب آئے گی وغیرہ وغیرہ۔"

ہیرو فوراً اٹین شین ہو گیا اور بڑے خاص انداز سے سلیوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ اس مرتبہ وہ شام کے وقت واپس آیا۔ معلومات کے حوالے سے وہ ہماری توقعات پر پورا اترا تھا۔ اس نے بتایا کہ برات نہرو پارک کے علاقے سے آئے گی۔ تقریباً دس بجے رات فنکشن شروع ہوگا اور صبح چار پانچ بجے تک جاری رہے گا۔ کوٹھی کے وسیع لان میں تقریباً چار سو مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس نے ایک خاص بات یہ بھی بتائی کہ شادی کے فوراً بعد یعنی کل دوپہر دولہا دلہن ہنی مون کے لیے سنگاپور روانہ ہو جائیں گے۔ مسز رائے اور ان کا بچہ بھی نوبیاہتا جوڑے کے ساتھ جائیں گے۔

یہ آخری اطلاع ہمارے لیے ذرا پریشان کن تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں جو بھی کرنا ہے' آج رات ہی کرنا ہے۔ کل "مسز رائے" نے اپنے بچے کے ساتھ اڑن چھو ہو جانا تھا۔ اس نئی اطلاع کی روشنی میں آج رات کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ میں' صفدر اور ہیرو ڈیڑھ دو گھنٹے سر جوڑے بیٹھے رہے اور ہم نے ایک مکمل لائحۂ عمل تیار کر لیا۔ اس لائحۂ عمل کے مطابق ہمیں براتیوں میں شامل ہو کر اس فنکشن میں شرکت کرنا تھی۔ ہیرو کو بھی ہمارے ساتھ رہنا تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ ہم تینوں اپنی پلی متھ کار میں ہوٹل سے نکلے اور وکٹوریا گارڈنز کے علاقے میں مطلوبہ کوٹھی تک پہنچ گئے۔ رہائشی علاقے میں گھری ہوئی وہ کوٹھی روشنیوں سے بقعۂ نور بنی تھی۔ کوٹھی سے باہر چھوٹی بڑی

گاڑیوں کی طویل قطار نظر آرہی تھی۔ رنگین ساڑیوں کے آنچل لہرا رہے تھے اور نقرئی قہقہے سرد ماحول کو گرما رہے تھے۔ برات ابھی نہیں پہنچی تھی۔ ہم نے اپنی کار کوٹھی سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور خاموشی سے انتظار کرنے لگے۔ آخر برات کا شور سنائی دیا۔ مقامی رواج کے مطابق برات ایک شاندار بگھی کے ساتھ آرہی تھی۔ آتش بازی کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بگھی کے پیچھے پیدل براتی تھے اور ان کے پیچھے کاروں کی طویل قطار تھی۔ ہم تینوں بھی برات میں شامل ہو گئے اور بہ آسانی کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔ ایسے موقع پر کسی آؤٹ سائیڈر کا پہچانا جانا آسان نہیں ہوتا' اور جہاں جوش و خروش جتنا زیادہ ہوتا ہے' بے خبری اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ بمبئی کے پوش علاقے میں یہ ماڈرن لوگوں کی ایک رنگین محفل تھی۔ لان کے ایک گوشے میں شاندار سنگھاسن بھی بنایا گیا تھا۔ یہاں دولہا اور اس کے دوست براجمان ہو گئے۔ سرد اور گرم مشروبات مہمانوں کے درمیان گردش کرنے لگے۔ میں' صفدر اور ہیرو خود کو مصروف رکھنے کے لیے مسلسل باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بسوا جیت یا پھر اس کا کوئی قریبی ساتھی اس فنکشن میں شریک نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی اس محبوبہ اور بیٹے کو زمانے کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ اگر وہ یہاں آتا بھی ہوگا تو رات کے اندھیرے میں چوری چھپے آتا ہوگا اور چوری چھپے چلا جاتا ہوگا۔ سرعام اپنی سالی کی شادی میں شریک ہو کر وہ برسوں پرانے اس راز کو خطرے سے دوچار کیسے کر سکتا تھا۔ اس قسم کے راز پالنے والے لوگوں کو اس طرح کی قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ نجانے اس سے پہلے بھی اس کوٹھی میں کتنے فنکشن چاپر کے بغیر ہو چکے تھے اور آئندہ بھی ہونا تھے۔

میں اور صفدر تھری پیس سوٹ میں تھے جبکہ ہیرو کلف دار کرتے پاجامے اور واسکٹ میں تھا۔ وہ بال بھی اپنے پسندیدہ اداکار کے انداز میں بناتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کپڑے بھی ویسے ہی پہنے۔ اسے دور سے دیکھنے والا یقیناً ایک بار چونکتا ضرور ہوگا۔ اس محفل میں رقص و سرود کا انتظام بھی تھا۔ موسیقی کی تانیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ جسم تھرک رہے تھے' قہقہے بکھر رہے تھے اور نگاہوں کا تصادم ہو رہا تھا۔ ہماری دائیں جانب لڑکیوں کا ایک گروپ تھا' وہ کورس میں گانے گا رہی تھیں اور لڑکوں کو چوٹ کر رہی تھیں۔ پھر لڑکوں نے بھی ایک گروپ بنالیا اور لڑکیوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ اس ہنگامہ ہائے ہو میں صفدر اور میں ایک دوسری ہی دنیا کے لوگ تھے' خوش باش لوگوں کی اس رنگین محفل میں ہم تھوڑی دیر کے لیے اترے تھے پھر ہمیں اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ کتنا فرق تھا ہم میں اور ہمارے اردگرد ناچتے گاتے لوگوں میں۔ آرکسٹرا... نے اپنی دھن بدلی تو ڈانسنگ فلور پر جوڑے پاؤں تھرکانے لگے۔ پتلون قمیص والی ایک نہایت ماڈرن پارسی لڑکی نے صفدر کو رقص کی پیشکش کی مگر صفدر نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ بے شک بسوا جیت چاپر یا اس کا کوئی کارندہ اس محفل میں نظر نہیں آیا تھا' مگر پھر بھی ہمارے پہچانے جانے کا چانس موجود تھا۔ ممکن تھا کہ چاپر یا شنکر شکرا کا کوئی ایسا ساتھی یہاں موجود ہو جسے ہم نہ جانتے ہوں لیکن وہ ہمیں جانتا ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی اجنبی ہی ہمیں پہچان لیتا۔ وقفے وقفے کے ہنگامے کے حوالے سے ہماری تصویریں انڈین اخبارات میں چھپتی رہی تھیں اور پولیس کے دل میں تو خاص طور سے ہمارے لیے بڑی "محبت و عقیدت" پائی جاتی تھی۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ اگنی کے گرد پھیرے ہوئے اور پھر پُرتکلف "بھوجن" دیا گیا۔ بھوجن کے دوران میں ہی میں نے مسز رائے یعنی چاپر کی حسین داشتہ کو پہچان لیا تھا۔ اس کی شکل دلہن سے اتنی ملتی تھی کہ کسی تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر بھی احتیاطاً ہیرو نے اپنے طور پر تصدیق کر لی تھی کہ یہی دلہن کی بڑی بہن "مسز رائے" ہیں۔ ہمیں مسز رائے کو اغوا کرنا تھا... اور مجبوری یہ تھی کہ اسی بھری پُری محفل سے اغوا کرنا تھا کیونکہ کل صبح وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ سنگاپور اڑن چھو ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد دلہن کو بھی دولہا کے ساتھ بٹھا دیا گیا اور رواجی رسمیں شروع ہو گئیں۔ اس موقع پر سب مہمان آپس میں گھل مل گئے۔ خوش گپیوں اور چٹکلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میری اور ہیرو کی گھڑی آپس میں ملی ہوئی تھی' دونوں میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں تھا۔ میں نے ہیرو کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر کوٹھی کے گیراج کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اور صفدر ٹہلتے ہوئے اسٹیج کے قریب چلے گئے۔ میری نگاہ مسز رائے پر تھی۔ وہ بار بار اپنی زرنگار ساری کا آنچل سنبھالتی ہوئی بمبئی کی معزز خواتین سے گفتگو میں مصروف تھی۔

میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا "ہیلو مسز رائے' کیسی ہیں آپ؟"

وہ مجھے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی "بالکل ٹھیک ٹھاک اور... آپ کیسے ہیں؟"

"فائن۔۔۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔" آپ کو مبارک ہو۔"

"اور آپ کو بھی۔۔۔ آپ۔۔۔ اکیلے ہی آئے ہیں؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ آپ کی بہن بھی ہیں۔"

"او میں نے دیکھا ہی نہیں۔۔۔ کہاں ہیں وہ؟"

ظاہر ہے' وہ یہ ساری گفتگو مجھے پہچانے بغیر کر رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ گفتگو کے دوران میں ہی اسے میرا حدود اربعہ یاد آجائے اور وہ خجالت سے بچ جائے۔ میں اسے اس پریشانی سے نکالنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی' گھڑی کی سوئیاں مطلوبہ مقام پر پہنچ چکی تھیں۔ ایک دم تاریکی چھا گئی۔ ایک ساتھ بہت سی نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے مسز رائے کے منہ پر ہاتھ رکھا اور صراحی دار گردن کو اپنے دائیں بازو میں جکڑ لیا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچلی لیکن آواز نہیں نکال سکی۔ میں نے گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور اس کے حواس معطل کر دیے۔ اس کا خوشبودار گداز بدن کسی بے جان شے کی طرح میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے کندھے پر لاد لیا اور لوگوں کے درمیان سے گیراج کی طرف بڑھا۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ ابھی لوگ صرف شور مچا رہے تھے۔ کسی نے لائٹر یا ماچس وغیرہ نہیں جلائی تھی۔ پوری کوٹھی گہری تاریکی میں ڈوب چکی تھی اور یہ کام ہیرو نے کوٹھی کا مین سوئچ آف کرکے اور پلگ نکال کر کیا تھا۔ پلاننگ کے مطابق ہیرو مل مین کار کو مین گیٹ کے بالکل پاس لے آیا تھا' اور اس کا رخ اس نے سڑک کی طرف رکھا تھا۔ چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی۔ جس وقت میں نے مسز رائے کو گاڑی میں لاکر ڈالا' صفدر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایک طرف سے ہیرو برآمد ہوا اور پھرتی سے صفدر کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک لان میں ماچسیں وغیرہ روشن ہو گئی تھیں۔ ایک آدھ ٹارچ کی روشنی بھی گردش کر رہی تھی۔ کئی قسم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مہمان اونچی آواز میں بجلی کے فیل ہونے پر تبصرہ کر رہے تھے لیکن بجلی اتنی جلدی آنے والی نہیں تھی کیونکہ سفید رنگ کے تین بڑے بڑے پلگ ہیرو نے اپنے سامنے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے تھے۔

"مشن کمپلیٹ؟" صفدر نے پوچھا۔

"یس' مشن کمپلیٹ۔" میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

اس نے گیئر لگایا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ مین گیٹ پر موجود ایک مسلح چوکیدار ہم سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر موجود تھا مگر اسے بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہوا ہے اور چوکیدار پر ہی کیا موقوف' ہم چار ساڑھے چار سو مہمانوں کے درمیان سے مسز رائے کو مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے آئے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہم اپنے "شکار" کو سیدھا پارسی ٹاورز کے عقب میں واقع ایک متوسط آبادی میں لے گئے۔ ہمارے "ہیرو" کا گھر اسی آبادی میں واقع تھا۔ یہ دس مرلے کی مکان نما کوٹھی تھی۔ بیوی بچے بالائی منزل پر رہتے تھے' نچلی منزل ہیرو نے اپنی جائز و ناجائز سرگرمیوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ یہاں ہمیں ہر سہولت میسر آسکتی تھی اور سب سے بڑی سہولت ٹیلی فون کی تھی۔ ہم گاڑی کو گھر کے گیراج میں لے گئے۔ گیراج میں بے ہوش مسز رائے (یا جو بھی اس کا اصل نام تھا) کو نکالا اور ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے گرد و پیش کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے چاند ستاروں سے سجی ہوئی ایک رنگین محفل میں تھی۔ اب ایک نیم روشن کمرے میں پڑی تھی اور اپنے اردگرد بوسیدہ فرنیچر دیکھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں' پھر کھولیں۔۔۔ پھر زور سے چیخنا چاہا مگر اس چیخ و پکار کا انتظام صفدر پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس نے ایک میز پوش کا گولا بنا کر مسز رائے کے منہ میں گھسیڑ دیا تھا اور اوپر سے کس کر ایک پٹی باندھ دی تھی۔ ایسی ہی ایک دوسری پٹی سے مسز رائے کے دونوں پاؤں بھی باندھ دیے گئے تھے۔

وہ خوب ہی سنوری تھی۔ ڈیڑھ دو لاکھ کے تو زیورات ہی اس کے جسم پر تھے۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہاں وہ پوری طرح محفوظ اور سلامتی سے رہے گی' شرط یہی ہے کہ وہ ہماری ہدایات پر بلا چون و چرا عمل کرے۔ میں نے کہا "یہ بات بھی دل سے نکال دو کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو پہنچ سکے گا یا تم چیخ و پکار کرکے ہمارا کوئی نقصان کر سکو گی۔"

عورت کچھ سمجھ دار لگتی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے اور اب وہ مکمل طور پر مسلح مردوں کی دسترس میں ہے۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے یقین دلایا کہ اگر میں اس کے منہ میں سے کپڑا نکال دوں تو وہ شور نہیں مچائے گی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے اس کا منہ آزاد کردیا۔ وہ آنسو بہانے لگی اور اپنا دوش پوچھنے لگی۔

میں نے کہا "شریمتی! دوش نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے کیونکہ یہ حساب کتاب شروع ہو گیا تو پھر تمہاری جان آسانی سے نہیں چھوٹ سکے گی۔ بس تم ہم سے تعاون کرو۔ ہم کوشش کریں گے کہ تمہیں جلد آزاد کر سکیں۔"

"میں کیا کروں۔ جو کچھ میرے پاس ہے تم لے لو۔ اگر اور چاہیے تو میں انتظام کرا دیتی ہوں۔" اس نے زیور اتار اتار کر بستر پر پھینکنے شروع کر دیے۔

صفدر نے کہا "شریمتی جی! ہمیں آپ کے گہنوں کی ضرورت نہیں۔۔۔ اور نہ ہی نوٹوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں کچھ اور درکار ہے۔ تمہارے پتی صاحب نے تین عدد جوان لڑکیاں اغوا کرکے اپنے قبضے میں رکھی ہوئی ہیں اور کسی صورت بھی انہیں آزاد کرنے پر تیار نہیں۔ وہ لڑکیاں چھوڑ دے' ہم تمہیں باحفاظت واپس پہنچا دیں گے۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو۔ میرے پتی تو امریکا میں ہیں۔"

"ایک وقت میں کتنے پتی رکھتی ہو تم؟" صفدر نے پھنکار کر پوچھا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ میں نے کہا "دیکھو مسز رائے! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسز رائے تمہارا اصل نام نہیں ہے۔ پانچ چھ سال پہلے تک تم روپا جان کے نام سے گلوکاری کرتی تھیں۔ پھر تم نے گلوکاری چھوڑ کر بسواجیت چاپڑ کی داشتہ کا رتبہ حاصل کرلیا اور اب تم اس کے بچے کی ماں ہو۔"

"یہ غلط ہے۔ میں داشتہ۔۔۔" وہ ایک دم کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ داشتہ نہیں ہو' دھرم پتنی ہو لیکن ہو تو چاپڑ کی پتنی نا۔ اس سے تو ہزار درجے بہتر تھا کہ تم کسی نیم شریف آدمی کی داشتہ ہوتیں۔"

روپا جان کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ غم اور خوف کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ بار بار اپنی مسلی ہوئی گردن سہلا رہی تھی۔

میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور بسواجیت چاپڑ کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر میں نے کل کی ملاقات میں اس سے حاصل کیا تھا۔ تیسری چوتھی گھنٹی پر چاپڑ کے کسی ہرکارے نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے اس سے تعارف کرایا اور کہا کہ چاپڑ کو بلاؤ۔ میرا نام سن کر روپا جان بھی چونک گئی۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے میرا نام سن رکھا ہے۔ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ ریسیور پر چاپڑ کی آواز سنائی دی "ہاں۔ شاہ جہاں! کیا حال ہے۔ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ابھی انڈیا میں ہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے ابھی ہمارے سروں پر خطرات منڈلا رہے ہیں۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"بے شک منڈلا رہے ہیں بلکہ تم خود چاہ رہے ہو کہ یہ خطرات منڈلاتے رہیں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں بھیا۔۔۔ میں نے تو ہر بات کھول کر تمہیں بتا دی ہے۔ اب جو فیصلہ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے۔"

"ہم فیصلہ کرنے والے کون ہیں' ہم تو گزارش ہی کرسکتے ہیں۔ وہ لڑکیاں ہمیں درکار ہیں اور ہر صورت میں درکار ہیں۔"

"تو لے لو نا بھئی۔ انکار کون کرتا ہے۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "تمہاری ایک پتنی ہے روپا جان۔۔۔ وہ مسز رائے کے نام سے "گارڈن ویو" کی کوٹھی نمبر ۱۸ سی۔ بی میں رہائش پذیر ہے۔"

دوسری طرف چاپڑ کے سر پر غالباً بم کا دھماکا ہو گیا تھا۔ وہ تین چار سیکنڈ تک کچھ بول نہیں سکا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" آخر اس کی لرزاں آواز ابھری۔

میں نے ریسیور روپا کے منہ سے لگا دیا اور اشارے سے اسے کہا کہ وہ پتی کو اپنی خیریت سے آگاہ کرے۔

روپا نے لرزتی سسکتی آواز میں کہا "ہیلو۔۔۔ مم۔۔۔ میں روپا بول رہی ہوں۔ ان لوگوں نے میرے پاؤں باندھ رکھے ہیں اور پستول لیے میرے سر پر کھڑے ہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔ بھگوان جانے کون سی جگہ ہے۔"

میں نے ریسیور روپا کے ہاتھ سے چھین لیا "ہیلو چاپڑ!" میں نے کہا "امید ہے کہ تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی۔"

دوسری طرف سے چاپڑ غرایا "میں تیرا خون پی جاؤں گا جانی۔۔۔ اگر روپا کو کسی نے میلی نظر سے دیکھا بھی تو بھگوان کی سوگند میں اس کے لیے قیامت لے آؤں گا۔"

"واہ۔۔۔ کیا بات ہے۔ اپنی عزت کی اتنی رکھوالی اور دوسروں کی آبرو کا ایسا تیا پانچا۔ قربان جانے کو جی چاہتا ہے تمہارے وچاروں پر۔ اب کیا خیال ہے تمہارا' اگر ان لڑکیوں کے بدلے ہم تمہاری روپا کو نیگرو مائیکل کے پاس لے جائیں۔ کھلی مارکیٹ میں کیا قیمت ہوگی اس کی۔ بچے والی ہے لیکن ہے تو بڑی زوردار چیز۔ کسی شوقین کے آگے پھینک بھی دیں گے تو خرچا پانی تو پورا ہو ہی جائے گا۔"

دوسری طرف چاپڑ کا پارا ساتویں آسمان کو چھو گیا تھا۔ وہ

ٹیلی فون پر دہاڑ رہا تھا۔ جو منہ میں آرہا تھا بک رہا تھا۔ جب اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پر آیا تو میں نے کہا۔

"دیکھو چاپر! تمہیں اور تمہارے گرو گھنشال کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے کبھی خالی خولی دھمکی نہیں دی۔ تمہاری چنی' محبوبہ یا داشتہ جو بھی ہے' ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے۔ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ تم وہ تینوں لڑکیاں ہمارے حوالے کردو' ہم روپا دیوی کو بحفاظت تمہارے پاس پہنچا دیں گے۔"

"تم اسے لائے کہاں سے ہو؟" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"جہاں تم نے اسے رکھا ہوا تھا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن وہاں تو آج شادی کا فنکشن تھا۔"

"شادی کے فنکشن سے ہی لائے ہیں۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بہت جلدی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد روپا دیوی اپنے گھر واپس پہنچ جائے۔ ابھی تو مہمانوں کے ہجوم میں ٹھیک سے روپا کی گمشدگی کا پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ اگر دس پندرہ منٹ یا آدھ پون گھنٹے میں روپا واپس پہنچ جائے تو وہ اپنی غیر حاضری کے سلسلے میں کوئی قابل قبول بہانہ بنا سکتی ہے لیکن اگر دیر ہوگئی تو پھر یہ گرما گرم خبر ہر طرف پھیل جائے گی۔"

دوسری طرف یقیناً چاپر دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ لائن پر کئی سیکنڈ تک خاموشی چھائی رہی' پھر چاپر نے ایک گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے جانی! مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔" اس کی آواز میں شکست خوردگی واضح طور سے محسوس ہو رہی تھی۔

"ویری نائس۔ یہ ہوئی نا بات۔ اب ذرا جلدی سے بتا دو کہ روپا کے ساتھ لڑکیوں کا تبادلہ کیسے اور کہاں ہوگا۔ میں ایک بار پھر تمہیں مشورہ دوں گا کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ہمارے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور۔ مجھے معلوم ہے کہ جنوبی بھارت کے کمینوں میں کوئی تمہارا اور شنکر کا ثانی نہیں۔ اگر تم نے کسی طرح کی چالاکی دکھائی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ روپا کو لاش بنانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ آئی ریئلی مین اٹ!"

"بولو۔ تم لڑکیوں کو کہاں حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

"بندرگاہ پر۔" میں نے کہا۔

"مقام اور وقت بتاؤ۔"

میں نے چاپر کو ہولڈ کرایا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ہیرو سے مشورہ کیا۔ ہیرو کی رائے تھی کہ بندرگاہ کے جیٹی نمبر دو کے سامنے یہ تبادلہ ٹھیک رہے گا۔ میں نے چاپر کو مقام بتا دیا۔ وقت ایک گھنٹے بعد یعنی ڈھائی بجے کا طے ہوا۔ چاپر نے بتایا کہ وہ دونوں لڑکیوں کے ساتھ نیلے رنگ کی شیورلیٹ میں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ صرف دو بندے اور ہوں گے۔

میں نے کہا "دو لڑکیاں کیوں۔ تینوں لڑکیاں ہوں گی۔ روپا نے خود کہا تھا کہ جو بھی معاملہ ہوگا تینوں لڑکیوں کا ہوگا۔"

"شاہ جہاں! وہ سودا تھا' یہ زبردستی اور دھونس ہے۔"

"سودے کو زبردستی اور دھونس میں بدلنے والے بھی تم ہی ہو۔"

کچھ دیر تک اس سلسلے میں میرے اور چاپر کے درمیان تکرار ہوئی۔ آخر چاپر کو میری بات ماننا ہی پڑی۔ میں نے ہاتھ ہی ایسی جگہ پر ڈالا تھا کہ وہ تڑپ پھڑک نہیں سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ جس طرح جن کی جان کسی نہ کسی طوطے میں ہوتی ہے' اسی طرح مضبوط سے مضبوط شخص کا بھی کوئی نہ کوئی ویک پوائنٹ ہوتا ہے۔ اگر اس ویک پوائنٹ کا کھوج لگ جائے تو اسے پچھاڑنا مشکل نہیں ہوتا۔

چاپر سے ڈھائی بجے کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اب چالیس پچاس منٹ ہمیں اسی مکان میں گزارنے تھے۔ سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہیرو مکان کی بالائی منزل پر گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک ٹرے میں گرم گرم چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے آیا۔ ہم نے چائے پی لی۔ روپا کو بھی اس چائے میں شریک کیا۔ اس کا خوف اب کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور اگر اس کے عاشق نامدار چاپر نے ہمارا مطالبہ پورا کر دیا تو ہمیں اسے چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اب کسی حد تک پرسکون بھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی "کیا ایسا نہیں ہو سکتا مسٹر جانی! کہ تم فون پر میرے گھر بات کرا دو۔ دیکھو میری بہن کی برات آئی ہوئی ہے' اگر میری گمشدگی کی خبر نکل گئی تو بہت برا ہوگا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' بات کرا دیتے ہیں لیکن تم کہو گی کیا؟"

"میں کچھ نہ کچھ کہہ لوں گی۔ پلیز آپ میری بات کرا دیں۔"

صفدر نے روپا کے گھر کا نمبر ملا کر ریسیور اسے تھما دیا۔ وہ بات کرنے لگی۔ اس نے اپنی کسی آنٹی کو بتایا اور اسے سمجھانے لگی کہ اسے بڑی ایمرجنسی کی حالت میں اسپتال آنا پڑ گیا ہے' یہاں اس کی ایک دوست حادثے میں زخمی ہو کر بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے اپنی آنٹی یا موسی سے یہ بھی کہا

کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ تمام معاملات سنبھال کر رکھے اور اس کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس نہ ہونے دے۔

فون پر روپا (مسز داسے) کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابھی صرف چند منٹ پہلے کوٹھی کی لائٹ بحال ہو سکی ہے اور روپا کی غیر موجودگی کا ابھی کسی کو پتا نہیں تھا۔ فون کرنے کے بعد روپا کے چہرے پر خاصا اطمینان نظر آنے لگا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "مسٹر شاہ جہاں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ کے ساتھ آپ کا نامی گرامی ساتھی صفدر ہے۔"

"لگتا ہے کہ کافی کچھ جانتی ہو تم ہمارے بارے میں۔"

"آج کل اخباروں میں آپ کے بارے میں خبریں آرہی ہیں۔ کیا آپ دونوں اخبار نہیں پڑھتے۔"

"پڑھنے کو دل تو چاہتا ہے لیکن بڑے لوگ پڑھنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ اس سے اخلاق خراب ہوتا ہے۔" صفدر نے جواب دیا۔

وہ صفدر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "سنا ہے کہ آپ کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے مسٹر شاہ جہاں۔ امریکی صنعت کار جی کلارک نے آپ کے ساتھ فراڈ کیا ہے اور وہ دفینہ جس کے پیچھے آپ کئی سال سے تھے' اڑا کر لے گیا ہے۔"

"یہ خبر تم نے اخبار میں پڑھی ہے؟"

"اخبار میں پڑھی ہے اور ویسے بھی سنی ہے۔ آج کل مختلف حلقوں میں اس خبر کا چرچا ہے۔"

میں نے کہا "پہلی بات تو یہ ہے کہ تم پورے دفینے کی بات کر رہی ہو جبکہ پورا دفینہ ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے' دوسری بات یہ ہے کہ مسٹر کلارک نے کوئی فراڈ نہیں کیا ہے۔ بے شک وہ امریکی ہے لیکن تمہارے عاشق چاپر اور اس کے پیر استاد شنکر جیسے بہت سے مشرقی لوگوں سے بہتر ہے۔"

"مگر اخبار میں تو لکھا ہے کہ وہ کہیں روپوش ہو گیا ہے۔"

"اخبار کل کلاں تمہیں دلیپ کمار کی بیوی لکھ دیں گے تو مان لوگی؟"

"آپ تو خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔ میں تو وہی کچھ بتا رہی ہوں جو کہا اور سنا جا رہا ہے۔ آپ کے اپنے ساتھیوں کے بیانات آرہے ہیں جنہوں نے آپ پر الزام لگایا ہے کہ آپ نے سب کو اندھیرے میں رکھ کر دفینے کا سامان امریکی صنعت کار کو سونپ دیا اور وہ اڑن چھو ہو گیا۔"

"اوہ! اچھا تم مجتبیٰ کنور کی بات کر رہی ہو۔ وہ کبھی میرا ساتھی نہیں تھا۔"

"لیکن وہ آپ کے ساتھ ایک عرصہ دفینے کی تلاش میں شامل رہا ہے۔ وہ اندر کی ساری باتیں جانتا ہے۔"

"وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو اس فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا تھا لیکن صفدر نے پھر مجتبیٰ کنور کے بیانات کی بات چھیڑ دی۔ یوں لگتا تھا کہ کبھی کبھی مسٹر کلارک پر اس کا اعتماد بھی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ قریباً پون گھنٹے بعد ہم نے دوبارہ چاپر سے فون پر رابطہ کیا۔ اس کی ہیجانی آواز سنائی دی "میں لڑکیوں کو لے کر روانہ ہو رہا ہوں۔ تم بھی چل پڑو۔ ایک بار پھر وارننگ دیتا ہوں تمہیں۔۔۔ روپا کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"بے فکر رہو۔" میں نے کہا "وہ بہت انجوائے کر رہی ہے اپنے اغوا کو۔ اسے تو افسوس ہے کہ وہ اس سے پہلے اغوا کیوں نہیں ہوئی۔"

"مسخری مت کرو شاہ جہاں! میں نے تمہاری تمام شرطیں مانی ہیں' اب کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔" چاپر کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں ہوگی چندا۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اگر تمہاری نیت میں فتور نہیں تو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہاری شہزادی اپنی بہن کی شادی میں واپس پہنچ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں لڑکیوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ رہا ہوں۔"

فون بند کرتے ہی میں نے روپا سے کہا "چلو شریمتی جی! تمہیں تمہارے چاہنے والے کے پاس لے چلیں۔" صفدر نے اس کے پاؤں کھول دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم کل تین گاڑی میں بیٹھے بندرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ اب رات کے سوا دو بج چکے تھے۔ بمبئی دن رات جاگنے والا شہر ہے مگر رات کے اس پہر یہاں بھی سڑکیں خالی خالی نظر آ رہی تھیں۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہیرو میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور کسی گائیڈ کے سے انداز میں بتاتا جا رہا تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں اور ہمارے اردگرد کون سی مشہور عمارات واقع ہیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری معلومات اس سے کچھ زیادہ ہی تھیں۔ تاہم اس کا دل رکھنے کے لیے میں نہ صرف خاموش تھا بلکہ گاہے گاہے اس کی اطلاعات پر گہری دلچسپی کا اظہار بھی کرتا تھا۔ روپا اور صفدر پچھلی نشست پر تھے۔ صفدر نے بڑی "ملائمت اور شائستگی" کے ساتھ پسٹل کی نال روپا کی پسلیوں سے لگا رکھی تھی۔ روپا مشکل میں تھی

اس کے باوجود وہ مجھ میں اور صفدر میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ بالکل جیسے ہم کوئی مشہور و معروف اداکار ہوں اور اتفاقاً ایک عادی فلم بین سے ہماری ملاقات ہو گئی ہو۔ اس نے صفدر کے ساتھ پھروہی دھڑ دھڑ لینے والا موضوع چھیڑ رکھا تھا۔

وہ بولی "میں آپ دونوں سے چھپا چاہتی ہوں' لیکن میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی کہ آپ جیسے جہاں دیدہ لوگوں نے ایک غیر ملکی پر اتنا اعتماد کیوں کرلیا؟"

میں نے کہا "ایسے سوالوں کا جواب دیا نہیں جاسکتا' صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔"

"تو مجھے بھی محسوس کرا دیں۔"

صفدر نے کہا "فی الحال تم صرف یہ محسوس کرو کہ تم مشکل میں ہو اور بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہارا عاشق یا پتی دیو جو بھی ہے' کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے اور تمہارا سندر شریر (جسم) گولیوں کے سوراخوں سے محفوظ رہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم بندرگاہ کے علاقے میں داخل ہو گئے مہاراشٹر کی یہ بندرگاہ اپنی وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں چوبیس گھنٹے رونق رہتی ہے۔ کنارے پر لگی ہوئی بڑی بڑی فیریوں' لانچوں اور کشتیوں کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم چینل نمبر دو کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں قدرے خاموشی تھی۔ شپ یارڈ کے عقب میں ایک وسیع احاطہ تھا' اردگرد کاٹن کے گودام تھے اور تاروں کی روشنی میں "پام" کے بلند و بالا درخت آخر شب کی ساحلی ہوا میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔ کنارہ ہماری دائیں جانب تھا اور یہاں وہ ڈونگا موجود تھا جو ہمیں مال بردار جہاز "ہرکولیس" سے ساحل پر لایا تھا۔

حسبِ توقع احاطے میں جابر کی نیلی شیورلیٹ موجود تھی۔ اس نے ہیڈلائٹس دو بار آن کر کے بجھا دیں۔ ہم اپنی کار شیورلیٹ کے بالکل قریب لے گئے۔ شیورلیٹ کی اندرونی لائٹ روشن ہوئی۔ اندر تینوں لڑکیوں کی موجودگی کا پتا چل رہا تھا۔ وہ عقبی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ہم نے بھی اندرونی لائٹ جلائی اور جابر کو روپا جان کی موجودگی کا ثبوت دے دیا۔ چند لمحے بعد شیورلیٹ کے دروازے کھلے۔ پہلے جابر اور اس کا ساتھی نکلے' پھر تینوں لڑکیاں برآمد ہو گئیں۔ صفدر بھی روپا جان کو لے کر باہر نکل آیا۔ روپا نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا اور جابر کی طرف چلی گئی۔ تینوں لڑکیاں ہمارے پاس آگئیں۔ وہ ڈری سہی ہوئی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ہم نے انہیں گاڑی میں بٹھالیا۔ کسی متوقع خطرے سے نمٹنے کے لیے میں نے ٹریل نورا نکال اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ یہ رائفل کار کے اندر ہی موجود تھی اور اس کا اہتمام مائیکل نے کیا تھا۔

بہرحال کسی پیچیدگی کے بغیر یہ معاملہ نمٹ گیا۔ ہم لڑکیوں کے ساتھ ڈونگے پر پہنچ گئے۔ ڈونگے کا "ڈرائیور" ہم اپنی جگہ چوکس موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اسی دوران میں ایک پولیس جیپ ہمارے سامنے سے گزری۔ جابر کی شیورلیٹ کے پاس سے ہو کر وہ آگے نکل گئی۔ چالیس پچاس گز آگے جا کر جیپ نے بریک لگائے اور ریورس ہو کر واپس شیورلیٹ کے پاس آگئی۔ غالباً پولیس والوں کو شیورلیٹ پر کسی قسم کا شک گزرا تھا۔ ہم یہ سارا منظر ڈونگے کے اندر سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس پارٹی چھلانگیں لگا کر جیپ سے نیچے اتر آئی' پھر میں نے دیکھا کہ پارٹی کا انچارج جو یقیناً ڈی ایس پی تھا' جابر سے مکالمہ کر رہا تھا۔ اچانک ماؤزر کے دو فائر ہوئے' میں نے دو پولیس والوں کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی روپا کی شریلی چیخ سنائی دی تھی۔ ماؤزر یقیناً جابر کے ہاتھ میں تھا۔ فائرنگ ہوتے ہی پولیس والے ایک دم تتر بتر ہو گئے۔ جابر' روپا اور ان کا ایک ساتھی کنارے کی طرف بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے جابر نے پولیس والوں کی طرف تین فائر کیے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جابر کنارے پر کھڑے ایک بڑے لوڈر کے عقب میں پوزیشن لینا چاہ رہا ہے مگر ابھی وہ لوڈر سے کچھ دور ہی تھا کہ اندھیرے میں شرارے چمکے اور اوپر تلے تین چار دھماکے ہوئے۔ یہ فائرنگ پولیس والوں کی طرف سے تھی۔ جابر کے ساتھی کو پشت میں گولیاں لگیں اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ جابر اور روپا لوڈر کے عقب میں پوزیشن لینے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈرائیور نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "دوڑی بڑا زبردست لفڑا ہو گیا ہے۔ اپن نکل چلیں یہاں سے۔"

میں نے اس کا کندھا دبایا "نہیں ابھی رکو۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ جابر اپنی ساتھی سمیت پولیس والوں میں گھر گیا تھا۔ وہ تین اطراف سے اس پر گولیاں چلا رہے تھے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم بہ آسانی یہاں سے نکل سکتے تھے لیکن جانے کیوں مجھے اس عورت کا خیال آرہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا' اسے شادی کی تقریب سے اٹھا کر یہاں لانے کے ذمے دار ہم ہی تھے۔ میرے ذہن نے قبول نہیں کیا کہ ہم دونوں ان کو نصف درجن مسلح پولیسوں کے نرغے میں چھوڑ کر یہاں سے نکل جائیں' خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ہم بہ آسانی ان کی مدد بھی کر سکتے تھے۔ پھر ایک اور خاص بات... بہت خاص بات بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمکی اور

میں نے پولیس والوں کی مزاحمت کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے مشورہ طلب نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اثبات میں سرہلایا۔ اس کے ہاتھوں میں تو بڑی دیر سے کھجلی ہو رہی تھی۔ میں اس کے مزاج کو بخوبی سمجھتا تھا' جب ہم دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر گھڑی ہنگامے اور ایڈونچر میں گزرے۔ ہم دونوں راہ چلتے جھگڑے مول لیں۔ مار کٹائیاں کریں اور ضروری نہیں کہ ماریں ہی' بے شک مار بھی کھائیں۔ اس کا خیال تھا کہ بوقتِ ضرورت مار کھانے اور زخمی ہونے کا بھی ایک لطف ہوتا ہے اور جو شخص مار کھانے سے ڈرتا ہے وہ کسی کو مار بھی نہیں سکتا۔

صفدر کی طرف سے تائید ہوتے ہی میں نے ڈونگے کے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ڈونگے کو کنارے کے ساتھ چلا کر سڑک پر کھڑے لوڈر کی طرف لے جائے۔ ڈرائیور نے تذبذب دکھایا تو میں نے ہیرو کو اشارہ کیا۔ ہیرو کے کہنے پر وہ ڈونگے کو لوڈر کی طرف لے گیا۔ ہیرو بل مین کار سے ٹریل نو نکال کر ڈونگے میں ہی لے آیا تھا۔ میں نے ٹریل نو تھامی اور چلا کر کہا "جابر! پیچھے ڈونگے میں آجاؤ۔"

جابر نے میری بات سن لی اور سمجھ بھی لی۔ میں نے اور صفدر نے ڈونگے سے پولیس والوں پر فائر کھول دیا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ یہ شیر دل پولیسیے اکیلے بندے کو دیکھ کر بہادر بنے ہوئے تھے' جب انہیں اندازہ ہوا کہ مزاحمت کرنے والے زیادہ ہیں تو ایک دم پوزیشنیں چھوڑ کر مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اس موقع پر جابر نے ہوشیاری کا مظاہرہ کیا اور روپا کے ساتھ بھاگ کر ڈونگے میں کود گیا۔ اسے فرار ہوتے دیکھ کر دو ڈھیٹ قسم کے پولیس والے ایک دم ڈونگے کی طرف لپکے' میں نے بے دریغ ان کی ٹانگوں پر فائر مار کر انہیں زخمی کر دیا۔ اسی دوران میں صفدر نے ڈرائیور کا کندھا دبا کر اسے چلنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ڈونگا مڑا اور برق رفتاری سے کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چلتے ڈونگے پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ جس جگہ ڈونگا کھڑا تھا وہاں اردگرد کوئی دوسرا ڈونگا یا لانچ وغیرہ موجود نہیں تھی۔ پولیس والے ہمارا پیچھا کرنے سے قطعی طور پر قاصر تھے۔ جب تک وہ طویل چکر کاٹ کر شپ یارڈ کی دوسری جانب پہنچتے اور کوئی سواری حاصل کرنے کی کوشش کرتے' ہم دور نکل سکتے تھے مگر خاص بات یہ تھی کہ ہم دور نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اپنا رخ گودی کی طرف رکھے۔ ڈرائیور الجھن سے میری طرف دیکھنے لگا۔

صفدر نے میرے کان میں کہا "اگر ہم سیدھا جہاز کی طرف نکلیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"لیکن میں "زیادہ اچھا" نہیں چاہتا۔" میں نے بھی جوابی سرگوشی کی "میں چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے پیچھے آئیں۔"

"کون؟"

"پولیس والے!" میں نے کہا۔

صفدر نے تعجب سے میری طرف دیکھا' پھر جیسے ایک دم ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے چہرے پر روشنی سی لپک گئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ اگر ہم پولیس کی نظروں میں آجاتے ہیں اور ہماری وجہ سے مائیکل کا مال بردار "ہرکولیس" مشکوک ہو جاتا ہے تو اس میں بھی ہمارا ہی فائدہ ہے۔ جہاز پر پولیس کی چڑھائی ہو جاتی تو اس "غیر قانونی و مجرمانہ سفر" کو بریک لگ جاتے جو ہمیں اور سیکڑوں دوسرے لوگوں کو کسی انجانی منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس وقت اس اذیت ناک سفر کا رکنا ہی سب باتوں سے زیادہ اہم تھا۔

قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک بجرا کھلے سمندر میں لنگر انداز تھا۔ اس کی بیشتر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہمارے ڈونگے کو بجرے کے قریب سے گزرنا تھا۔ میں نے جابر سے کہا۔

"جابر ڈیئر! تم اور تمہاری ڈارلنگ چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم اس بجرے پر آسانی سے پناہ حاصل کر لو گے۔"

جابر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور روپا کا بازو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ روپا کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ پانی میں ہاتھ پاؤں چلانا جانتی ہے۔

جابر بولا "میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں لیکن افسوس کہ ہمارا رشتہ دشمنی کا ہے۔"

"چلو تمہارا ایک لفظ بچ گیا۔"

"تمہارے بھی تو ستر لاکھ بچ گئے۔" جابر نے طنز کیا۔

"چلو پھر حساب کتاب کرلیں گے۔" میں نے کہا "شکر سے بولنا کہ یہ قرض بھی ڈائری میں لکھ لے۔"

بجرا بالکل قریب آگیا تھا۔ اس کا ڈیک زیادہ اونچا نہیں تھا۔ جابر نے پہلے ماؤزر ڈیک پر پھینکا' پھر تیکھی سنوری روپا کے ساتھ ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ یہی وقت تھا جب کہیں دور... عقب میں کسی لانچ کی متحرک روشنیاں دکھائی دیں اور مخصوص ہارن کی آواز آئی۔

"کوسٹ گارڈز آرہے ہیں۔" ہیرو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کوسٹ گارڈز آرہے ہیں۔ اب کیا کریں؟" ہیرو نے دوبارہ چیخ کر کہا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کوسٹ گارڈز ہیں؟"

"کیا آپ نے سائرن کی آواز نہیں سنی۔ یہ کوسٹ گارڈز کا خاص سائرن ہے۔ پھر آپ بڑی لائٹس کے اوپر وہ چھوٹی سرخ لائٹ بھی تو دیکھ رہے ہیں۔ یہ لائٹ گارڈز کی لانچوں پر ہی ہوتی ہے۔" اس نے دور لانچ کی روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟" صندور نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا۔

"اپن کا پرسنل خیال ہے کہ ہم دائیں طرف جائیں۔ وہاں کنارے پر بڑے بڑے جہاز کھڑے ہیں۔ ان کی اوٹ میں پہنچ کر ہم ڈونگے سے نکل بھاگتے ہیں۔"

"لیکن ان جہازوں تک پہنچتے پہنچتے یہ لانچ ہمیں آلے گی۔"

"رازی آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری رائے تو یہ ہے کہ ہم "ہرکولیس" کی طرف ہی جائیں۔ سیڑھی لٹک رہی ہوگی' ہم لانچ کے پہنچنے تک شپ پر پہنچ جائیں گے۔ خالی ڈونگا چالو حالت میں سمندر پر چھوڑ دیں گے۔ وہ خود ہی کسی طرف نکل جائے گا؟"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر اپن کو جلدی کرنا ہوگی۔" ہیرو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا' پھر وہ میرے بولنے سے پہلے ہی ڈونگے کے ملاح کو احکامات جاری کرنے لگا۔

ڈونگے کی رفتار تیز ہوگئی اور اس کا رخ سیدھا مال بردار جہاز "ہرکولیس" کی طرف ہوگیا۔ ہرکولیس کا ہیولا سمندر میں صاف نظر آرہا تھا۔ وہ دو دوسرے جہازوں کے پہلو میں لنگر انداز تھا۔ اس کی بیشتر روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ تاریک افق کے پیش منظر میں وہ ایک طویل پرچھائیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ہمارا ڈونگا تاریک پانی کو کاٹتا ہوا تیزی سے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ملاح نے اس کی لائٹس آف کردی تھیں' مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کو ہیڈ لائٹ آن کرنا پڑتی تھی۔ تینوں لڑکیاں جاری افراتفری سے بے نیاز ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھیں۔ تیز رفتاری کے سبب کسی وقت ڈونگے کو زور سے ہچکولا لگتا تو وہ ایک دوسری کے اوپر ڈھیر سی ہوجاتیں۔ ایک مرتبہ تو ہچکولا اتنا زوردار تھا کہ ایک لڑکی کے منہ سے ہلکی چیخ نکل گئی۔ جوں جوں ہم جہاز کے قریب پہنچ رہے تھے اس کی جسامت اور بلندی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ سیڑھی جہاز کی دوسری جانب تھی۔ ہمیں گھوم کر سیڑھی کی طرف جانا تھا۔ لانچ اب کافی نزدیک آچکی تھی۔

ہیرو نے مایوسی سے کہا "اپن کا خیال ہے کہ ہم اوپر نہیں جا سکیں گے۔"

"چلو کوشش تو کرنی چاہیے۔"

"اس کوشش میں انہوں نے گولی چلا دی تو ہم سب پھڑک جائیں گے۔" وہ جھلا کر بولا۔

"پھر اب کیا کریں؟"

"تم نے سخت بے وقوفی کی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پھنسا دیا ہے۔"

ڈونگا اب چکر کاٹ کر سیڑھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لانچ کی روشنیاں بالکل واضح دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان کا فاصلہ بمشکل دو ڈھائی سو گز تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ ایک پرچھائیں سی ڈونگے سے اچھل کر سمندر میں جاگری۔ یہ ہیرو تھا۔ اس نے ڈونگے کے پچھلے حصے سے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی اور سطح کے نیچے غائب ہوگیا تھا۔ ابھی میں اور صندور ہیرو کو ہی دیکھ رہے تھے کہ ڈونگے کو پھر جھٹکا لگا۔ اور ایک پرچھائیں اچھل کر سمندر میں غائب ہوگئی۔ اس مرتبہ ڈونگا چلانے والے نے سمندر میں جست لگائی تھی۔ میں اور صندور ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں احساس ہوا کہ یہ دونوں افراد کوسٹ گارڈز سے کتنے دہشت زدہ تھے۔

ڈونگا بغیر کسی کنٹرول کے برق رفتاری سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ بے مہار تھا لہٰذا اپنی مرضی سے بائیں رخ پر مڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے صندور سے کہا "ان لڑکیوں پر نظر رکھو۔"

صندور اپنا ریوالور نکال کر چوکس کھڑا ہوگیا۔ میں نے ڈونگے کا کنٹرول سنبھالا۔ اس سے پہلے میں نے کنٹرول کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ویسے بھی تاریکی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہیل گھمایا تو ڈونگا ایک دم بائیں رخ پر جھک گیا۔ لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے ایکسیلیریٹر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اسی دوران میں ڈونگے کی رفتار کم ہوگئی اور اسے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔ جہاز سے لٹکتی ہوئی سیڑھی ہمیں سامنے نظر آ رہی تھی۔ اوپر عرشے پر چند ایک ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً انہوں نے ڈونگا پہچان لیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا رہے تھے اور بلند آواز میں چلا رہے تھے۔ ڈونگا اب ایک دائرے کی شکل میں گھومتا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں کوشش کرتا تو اسے سیدھا کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن اسے سیدھا کرنے میں مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ کوسٹ گارڈز کی لانچ جلد از جلد ہم تک آ جائے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جس وقت ہمارا ڈونگا سمندر میں جھولتی ہوئی سیڑھی کے قریب پہنچا' ساحلی محافظوں کی لانچ بھی موقع پر پہنچ گئی۔ لانچ کو دیکھتے ہی جہاز والوں نے

سیڑھی فوراً اوپر کھینچ لی۔ لانچ کافی بڑی تھی۔ اس کے اوپر لمبی نال کی گن صاف نظر آ رہی تھی۔ گن کے عقب میں باوردی محافظوں کی ٹوپیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لانچ پر سے میگا فون کے ذریعے اعلان کیا گیا "خبردار تم لوگ ہمارے نشانے پر ہو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو پار ہو جاؤ گے۔ اپنی بتیاں جلا دو اور انجن بند کر دو۔"

بھاگنا کون کافر چاہتا تھا۔ ہماری تو خواہش تھی کہ ہم پکڑے جائیں اور نتیجے میں یہ مال بردار "ہرکولیس" بھی پکڑا جائے۔ ہرکولیس پکڑا جاتا تو "غلاموں" کی وہ کھیپ بھی پکڑی جاتی جو اس جہاز کے ذریعے نامعلوم منزل کی طرف لے جائی جا رہی تھی۔

لانچ پر سے دوبارہ اعلان کیا گیا "اپنی زندگی رکھنا چاہتے ہو تو بتیاں جلا دو اور انجن بند کر دو۔"

میں نے دائیں بائیں ہاتھ چلا کر اگنیشن سوئچ تلاش کیا اور انجن بند کر دیا۔ لانچ ہمارے ڈونگے کے ساتھ آن لگی۔ کوسٹ گارڈز چھلانگیں لگا کر ڈونگے پر آ گئے۔ ان کے پاس خودکار رائفلیں تھیں اور تیور خطرناک تھے۔ ہمیں ہینڈز اپ کرایا گیا۔ پھر ہمارے ریوالوروں کے علاوہ نزلی تو اکفل بھی قبضے میں لے لی گئی۔ کوسٹ گارڈز کے ساتھ پولیس کا ایک ڈی ایس پی بھی تھا' یقیناً یہ وہی ڈی ایس پی تھا جس نے پولیس پارٹی کے ساتھ جاپر کو روکا تھا اور نتیجے میں فائرنگ شروع ہوئی تھی۔ کوسٹ گارڈز کا انچارج تجیم تحیم جسم والا ایک خطرناک صورت شخص تھا۔ اس نے بے حد للچائی ہوئی نظروں سے تینوں لڑکیوں کو دیکھا اور اپنی مونچھوں کو بل دینے لگا "کھڑی ہو جاؤ!" اس نے گرج کر کہا۔

وہ تینوں سہم کر کھڑی ہوگئیں۔ انچارج نے ہمارے علاوہ ان تینوں کی جامہ تلاشی بھی لی۔ اس کی تلاشی کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ "دست درازی" کر رہا ہے۔ کوئی اور لڑکیاں ہوتیں تو انچارج کی اس دراز دستی پر سخت احتجاج کرتیں مگر وہ تو زر خرید کنیزیں تھیں۔ پچھلے چند ماہ میں ان کی عزت نفس اور احساس خودی کو اتنے چرکے لگ چکے تھے کہ وہ مٹی کی مورتیں بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کا اپنا کوئی ارادہ تھا نہ احساس اور نہ سوچ۔ ان کی حالت دیکھ کر ترس آتا تھا' کیونکہ عورت کی اصل کشش اس کی آن بان اور ادائے بے نیازی میں ہی ہوتی ہے۔

ہم پانچوں کو ڈونگے میں سے نکال کر لانچ پر سوار کر دیا گیا۔ ڈونگے کو رسی کی مدد سے لانچ کے پیچھے باندھ دیا گیا۔ انچارج جو ایک سیاہی مائل ہندو تھا' مجھ سے مخاطب ہو کر کرخت لہجے میں بولا "ہاں جی! سرکار ہیں کدھر سے تشریف

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول' دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی' تڑپتی اور بھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
Ph: 7247414 ... 20

لائی ہیں اور ان چھوکریوں کو کہاں سے اڑایا ہے؟"

"ہم یہیں بمبئی کے رہنے والے ہیں اور یہ لڑکیاں ہماری دوست ہیں۔"

ڈی ایس پی غرایا "اس دوستی کی تو بڑی اچھی طرح تفتیش کریں گے ہم۔ پہلے یہ بتاؤ کہ چاپر اور اس کی ساتھی لڑکی کہاں ہیں؟"

"مجھے ان دونوں کا نام معلوم نہیں۔" میں نے کہا "بہرحال وہ جو بھی تھے انہوں نے راستے ہی میں کہیں چھلانگ لگا دی تھی۔ ارد گرد بہت سی کشتیاں موجود تھیں۔ مجھے نہیں امید کہ تم انہیں ڈھونڈ سکو گے۔"

ڈی ایس پی نے کہا "انہیں ڈھونڈنا ہمارا کام ہے بچو۔ تم بتاؤ کہ اپنے اس مامے چاپر سے کیا سمبندھ (تعلق) ہے تمہارا؟"

"میں نہیں جانتا کہ تم کس چاپر کی بات کر رہے ہو۔ ہم نے بس اتنا دیکھا کہ ایک اکیلے بندے اور اس کی ساتھی لڑکی پر جھت سے لوگ فائرنگ کر رہے ہیں۔ اس ڈونگے کے ملاح نے ان دونوں کی مدد کے لیے انہیں ڈونگے میں بلا لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ فائرنگ کرنے والے تو پولیس کے بندے ہیں بس اتنی سی بات ہے۔"

ڈی ایس پی نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور دانت پیس کر کہا "بس اتنی سی بات ہے۔ اور وہ پولیس پر فائرنگ کس بہن کے بھتکنے نے کی تھی؟"

صفدر بولا "مہاراج! ہم سوگند کھا سکتے ہیں کہ ہم نے فائرنگ نہیں کی۔ بلکہ ہمیں پتا چل جاتا کہ مقابلے میں پولیس ہے تو شاید ہم ان دونوں کی مدد بھی نہ کرتے۔"

ڈی ایس پی نے صفدر کو گالی دی اور "ٹریل ٹو" پر ہاتھ رکھ کر بولا "یہ مال جو تمہارے ڈونگے سے نکلی ہے یہ کس کی ہے۔ اسی سے فائرنگ کر کے دو پولیس اہلکاروں کو زخمی کیا گیا ہے۔"

"رائفل بے شک ہماری تھی لیکن فائر اسی بندے نے کیا تھا جسے تم چاپر کہہ رہے ہو۔"

کوسٹ گارڈز کے انچارج نے بڑی کمینی نظروں سے لڑکیوں کو گھورا اور بولا "جب تمہارے سامنے تمہاری ان چھوکریوں کی "عزت افزائی" کروں گا تو یہ سب کچھ بتائیں گی اور تم بھی بتاؤ گے۔"

صفدر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غالباً وہ انچارج کی بات کا کوئی کڑا کے دار جواب دینا چاہ رہا تھا مگر پھر اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ جہاز کے اوپر سے لانچ پر نہایت تیز روشنی پھینکی گئی۔ ہم سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر جہاز کے اوپر سے

نائب کپتان نے میگا فون کے ذریعے لانچ والوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ وہ جہاز کا نائب کپتان فلیمنگ بول رہا ہے اور ... کے عملے سے بات کرنا چاہتا ہے۔

لانچ پر سے کوسٹ گارڈز کے انچارج نے کہا "جو ... بات کرنا چاہتا ہے وہ نیچے آ کر بات کرے اور خبردار اسے ... مسلح ہونا چاہیے۔"

نائب کپتان نے کہا "ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے ... ہم نیچے آ رہے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد جہاز کے پہلو سے لٹکی ہوئی سیڑھی ... تین افراد نظر آئے۔ کم روشنی کے باوجود میں پہچان گیا۔ ان میں سے ایک مائیکل خود تھا۔ سیڑھی سے اتر کر وہ ایک ... پر بیٹھے اور ہماری لانچ کے قریب پہنچ گئے۔ مائیکل نے لانچ ... دونوں مطلوبہ لڑکیوں کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ ... سے مخاطب ہو کر بولا "تم ٹھیک تو ہو؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہی رہو گے۔" مائیکل نے کہا۔ اس کے لہجے ... گہرا اعتماد تھا۔

میں نے ایک خاص چیز نوٹ کی۔ مائیکل کو دیکھ کر کوسٹ گارڈز کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ ... کے ساتھ ہی ان کے چہروں پر نظر آنے والی درشتی بھی ... ہو گئی تھی۔

"آپ سے شاید کہیں پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔" انچارج نے مائیکل سے کہا۔

"ضرور ہوئی ہوگی۔ بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہارا نام امرناتھ ہے شاید۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بھی آپ کا اسم شریف یاد ... ہے۔" امرناتھ نے کہا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈونگے میں چلے گئے۔ ڈی ایس پی بھی ان کے پیچھے ڈونگے میں چلا گیا۔ مسلح کوسٹ گارڈز نے ہم پر رائفلیں تان رکھی تھیں اور کسی طرح کا رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے اور صفدر کو قیدیوں کی طرح لانچ کے فرش پر بٹھا رکھا تھا اور خود ہمارے سروں پر مسلط تھے۔ یہ کل چار افراد تھے۔ ان میں سے دو قدرے سست تھے جبکہ دو تیز تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اور صفدر مزاحمت پر اتر آئیں تو ان چاروں افراد کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتے ہیں۔ لیکن مزاحمت ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھی اور نہ ہی ہم کرنا چاہتے تھے۔

ڈونگے میں مائیکل، وائس کپتان فلیمنگ، کوسٹ گارڈز کے انچارج اور ڈی ایس پی کے درمیان مذاکرات طول

ہو گئے۔ ڈونگے کے سامنے والے حصے میں سائبان سا موجود تھا۔ وہ چاروں سائبان کے عقب میں تھے۔ ہمیں ان کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں، تاہم بلند آواز میں کہا گیا کوئی کوئی فقرہ ہم تک پہنچ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد کوسٹ گارڈز کا انچارج امرناتھ اپنے ساتھی ڈی ایس پی کے ساتھ نمودار ہوا اور ان دونوں نے تینوں لڑکیوں کو بڑے احترام کے ساتھ ڈونگے میں واپس پہنچا دیا۔ یہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر حیرت ناک واقعہ یہ تھا کہ ہمیں بھی ہماری "ٹریل ٹو" رائفل سمیت بصد احترام ڈونگے میں پہنچا دیا گیا۔ نہ صرف ڈونگے میں پہنچا دیا گیا بلکہ ڈی ایس پی نے میرے بال کھینچنے اور انچارج نے ہمیں زمین پر بٹھانے پر باقاعدہ معذرت بھی کی۔ یہ طرفہ تماشا تھا۔ ہم نے واضح طور پر چاپر اور اس کی داشتہ کی مدد کی تھی، بلکہ ان دونوں کی طرف سے لڑتے ہوئے پولیس والوں پر گولیاں بھی برسائی تھیں۔ اس فائرنگ سے دو پولیس اہلکار زخمی ہوئے تھے اور ٹھیک ٹھاک زخمی ہوئے تھے۔ مگر ہمارے یہ سارے پاپ پلک جھپکتے میں معاف ہو گئے تھے اور ہم باعزت بری ہو کر لانچ سے ڈونگے میں جا رہے تھے۔ یہ ساری تعلقات کی کرامات تھی اور مایا دیوی کا کرشمہ تھا۔ پتا نہیں کہ افسران اور جہاز رانوں کی ملی بھگت کے ذریعے اس بندرگاہ پر کیا کیا ہو رہا تھا۔ ڈونگے میں پہنچ کر میرا اور صفدر کا چہرہ لٹک گیا۔ جو ہم نے سوچا تھا وہ نہیں ہو سکا تھا۔ ہم بھارت دیش کے محترم "قانون" کو اپنے پیچھے لگا کر جہاز تک لے آئے تھے لیکن اس کے باوجود قانون بردہ فروشوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ بلکہ لانچ میں قانون اور بردہ فروشوں کے درمیان راز و نیاز ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں تینوں لڑکیوں سمیت واپس جہاز پر پہنچا دیا گیا۔ مائیکل اور نائب کپتان فلیمنگ انڈین افسران سے نمٹ کر واپس جہاز پر آ گئے تھے۔ انڈین افسروں کو کچھ قیمتی تحفے تحائف پیش کیے گئے تھے۔ یہ تحائف ایک پیٹی میں بند تھے۔ اس کے علاوہ یقیناً ان کی مٹھیاں بھی ٹھیک ٹھاک گرم کی گئی تھیں۔ پولیس افسران سے فارغ ہو کر مائیکل میرے اور صفدر کے پاس آ بیٹھا۔ وہ اس واقعے کی پوری تفصیل جاننا چاہ رہا تھا۔ میں نے شروع تا آخر سب کچھ مائیکل کے گوش گزار کر دیا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ بسواجیت چاپر سے لڑکیوں کا سودا طے کرنے میں ناکام ہو کر ہم نے اس کی داشتہ اغوا کر لی تھی۔ عین ساحل پر پیش آنے والے واقعے کے متعلق بھی میں نے سب کچھ بتایا۔ اس معاملے میں سچ بولنا بہتر تھا۔ کیونکہ اگر ہیرو یا ڈونگے کا ملاح جہاز پر پہنچ جاتے

تو انہوں نے ساری حقیقت مائیکل کو بتا دینا تھی۔ ایسی صورت میں ہماری غلط بیانی ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے مائیکل کو بتایا کہ ہم نے صرف چند فائر دو پولیس والوں کو زخمی کرنے کے لیے کیے تھے۔ اس کے علاوہ اس پولیس مقابلے میں ہمارا کوئی کردار نہیں تھا۔

مائیکل بولا "تمہیں کیا ضرورت تھی ہیرو بننے کی؟ لڑنے مرنے دیا ہوتا اس حرامی (چاپر) کو پولیس والوں کے ساتھ۔"

"اس کے ساتھ لڑکی تھی اور وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی، اس وقت ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے پولیس کے بندے ہیں۔ لڑکی کی چیخ و پکار سن کر بس کیڑا رینگ گیا دماغ میں۔ ایسے موقعوں پر یہ رینگ ہی جایا کرتا ہے۔"

میں مائیکل کو کیسے بتا سکتا تھا کہ دماغ میں کیڑا ویڑا کوئی نہیں رینگا تھا۔ ہم نے اپنے انداز میں اسے اور اس کے جہاز کو مشکوک بنانے کی ایک کوشش کی تھی جو ناکام ہو گئی۔

مائیکل نے کہا "تم نے خواہ مخواہ ٹانگ اڑا کر غلطی کی۔ اس غلطی سے ہمیں شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو ہماری خوش بختی ہے کہ جہاز کی چیکنگ کی نوبت نہیں آئی۔"

مائیکل شاید زیادہ غم و غصے کا اظہار کرتا لیکن ہم چونکہ کامیاب لوٹے تھے اور ہماری "کامیابی" تین نہایت خوب صورت لڑکیوں کی صورت میں مائیکل کے پاس تھی لہٰذا اس نے زیادہ سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی "ٹریل ٹو" رائفل ہم سے لے لی گئی تھی۔ وہ کرنسی نوٹ جو مائیکل نے روانگی کے وقت ہمیں دیے تھے میں نے اسے جوں کے توں واپس کر دیے۔ وہ قدرے خوش نظر آنے لگا۔ بات تھی بھی خوش ہونے والی۔ ہم نہ صرف دو کے بجائے تین لڑکیاں جہاز پر لائے تھے بلکہ مائیکل کی وہ خطیر رقم بھی بچالی تھی جو وہ لڑکیوں کے عوض بسواجیت چاپر کو دینے پر آمادہ تھا۔

ہمیں واپس جہاز کے نچلے حصے میں بھیج دیا گیا۔ تاہم بھیجنے سے پہلے ہمیں وہی براؤن پاجامہ کرتہ پہنا دیا گیا جو اب تک ہم نے یہاں زیب تن کیے رکھا تھا۔ یہاں کیبن میں ہمارے ساتھی ہمارے منتظر تھے۔ وہ حیران تھے کہ تین دن تک ہم کہاں غائب رہے ہیں اور اب واپس کیسے آ گئے ہیں۔

شاید ان کو خدشہ تھا کہ ہمیں کسی غلطی کی پاداش میں سمندر کی نذر کر دیا گیا ہے اور اب تک ہماری لاشیں مچھلیوں کے نظام ہضم میں پہنچ چکی ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ظاہر ہے کہ زریں گل کو ہی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ دل ہی دل میں وہ یقیناً کوئی طربیہ قسم کا گانا گنگنا رہا تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر اس نے ہمیں گا کر سنایا تھا۔ ام کو خوشیوں کے نال ہے۔ آج چڑھ گئے ہیں حال ہے۔ اور پھر وہ اردو گانا "ام خوشی سے کیوں نہ گائے" امارا دل بھی تو گا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے کیبن کے ساتھی حسب معمول گم صم اور سہمے ہوئے جانوروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ زخمی چہرے والے اسلم کو پھر بخار تھا اور وہ غنودگی کی حالت میں بار بار نسرین کا نام پکار رہا تھا۔ بڑا کرب تھا اس کی آواز میں۔ کسی وقت وہ کسی جمشید کا نام لیتا اور اس سے معافیاں مانگنے لگتا۔ کبھی بالکل ناقابل فہم باتیں کرتا۔ اس کے چہرے کے زخم جو چند دن پہلے ٹھیک نظر آ رہے تھے اب پھر خراب ہو گئے تھے۔ بخار بھی شاید انہی زخموں کی وجہ سے تھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ترس آ رہا تھا۔ زریں گل نے بتایا کہ کل پھر اس پر شدید دورہ پڑ گیا تھا۔ اٹھ اٹھ کر بھاگتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے نسرین کے پاس لے چلو۔ وہ دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ وہ اور جمشید کیا سوچیں گے۔

ہمیں کیبن میں پہنچے بمشکل دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ جہاز حرکت میں آ گیا۔ بتدریج اس کی رفتار بڑھتی گئی۔ بندرگاہ کی حدود سے نکل کر وہ درمیانی رفتار سے کسی نامعلوم سمت میں بڑھنے لگا۔ (ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا کہ شاید مائیکل اور ہیرو کی ملاقات پھر ہو جائے) ساری رات یہ سفر جاری رہا۔ مضروب اسلم رات بھر کراہتا رہا۔ اس کا ادھیڑ عمر ساتھی شاہد اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتا رہا۔ صبح تک اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ چہرے کی ایک جانب سوج گئی تھی اور انفیکشن کے آثار بڑے واضح تھے۔ مضروب کو طبی امداد کی شدید ضرورت تھی لیکن یہاں کوئی سننے والا نہیں تھا۔ یہ اُجڈ حبشی بر وقت خوں خوار کتوں کی طرح ہمیں گھورتے رہتے تھے۔ خاص طور سے آدم خور ضیائی پہرے دار تو جہاز کے اس حصے میں موت کا سا سناٹا چاہتے تھے۔ ان آدم خور ضیائیوں کی تعداد تین تھی اور اگر مائیکل کو بھی شمار کر لیا جاتا تو یہ چار تھے۔

میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ ہمارے کارنامے کے صلے میں مائیکل ہمارے ساتھ کچھ نہ کچھ رعایت ضرور برتے گا اور کچھ نہیں تو ہمیں ان بدبودار سرد کیبنوں سے نکال کر نسبتاً بہتر جگہ پر منتقل کر دیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے پہرے دار پہلے سے زیادہ سختی کا مظاہرہ کرنے لگے ہیں۔ بمبئی کی بندرگاہ سے جو نئے افراد "بردوں" کی حیثیت سے سوار ہوئے تھے، ان میں عورتیں اور چند بچے بھی تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی ایک ہی قبیلے یا برادری کے لوگ ہیں۔ ان عورتوں اور بچوں میں سے کوئی کسی وقت گھبرا کر رونے دھونے لگتا تو حبشی شعلۂ جوالہ بن جاتے۔ وہ رونے والے کو بری طرح ڈراتے دھمکاتے تھے اور مار پیٹ سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

یہ اسی شام کا ذکر ہے۔ میں اور صفدر کیبن کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے، صفدر نے پائجامے کے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور سونے کا ایک چھوٹا سا ہار مجھے دکھانے لگا۔ ہار میں زمرد کے ٹکڑے تھے اور یہ چھوٹا ہونے کے باوجود خاصا قیمتی تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کس کا ہے؟"

وہ مسکرایا "جابر کی بیوی نما داشتہ روپا کا۔"

"تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

"پار کیا ہے۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

"مگر کیسے؟" میں حیران رہ گیا۔

وہ بولا "یہ ہیرو بڑی واہیات قسم کی چیز تھا۔ شکل شتنی کپور جیسی تھی لیکن اندر سے پریم چوپڑہ تھا۔ جب پولیس مقابلے سے بچ کر جابر اور روپا ہمارے ڈونگے میں کودے تو ہار روپا کے گلے سے نکل کر گر گیا تھا۔ ہیرو نے سب کی نظر بچا کر جیب میں ڈال لیا۔ میں نے دیکھ لیا اور موقع دیکھ کر اس کی جیب سے نکال لیا۔ اس وقت تک روپا اور جابر ڈونگے سے اتر چکے تھے لہٰذا یہ میرے پاس ہی پڑا رہ گیا۔"

اس دلچسپ پچویشن پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی طرف سے ہیرو نے تیر مارا تھا اور جب وہ ڈونگے سے سمندر میں کودا تھا تو اس زعم میں تھا کہ ہار اس کی جیب میں ہے۔

"بدبخت شکل سے ہی اول درجے کا خرانٹ نظر آتا تھا۔"

"خرانٹ جیسا خرانٹ جناب۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ہماری جیبوں میں کرنسی نوٹ موجود ہیں۔ میرے سامنے بار بار اپنی بیوی کی بیماری کا رونا رو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقتِ رخصت ہم سے اچھی خاصی ایڈ حاصل کر لے گا۔ وہ تو اسے افراتفری میں بھاگنا پڑا ورنہ اس کھوچل سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔"

"وڑی جان تو اس لیے چھوٹی کہ لفڑا ہو گیا تھا ورنہ

بمبئی کا یہ بابو اپن کو ضرور کوئی چوٹ دے جاتا۔" میں نے ہیرو کے لہجے میں کہا تو صفدر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میں اور صفدر باتوں میں مصروف رہے، رات قریباً نو بجے کا وقت تھا جب ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ غزالہ بچے "تابی" کو اٹھائے سیڑھیاں اتر رہی ہے۔ اس کے عقب میں رائفل مین تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ غزالہ کو بھی اب انہی کیبنوں میں رکھا جائے گا۔ یہ عجیب صورت حال تھی۔ تین دن پہلے اپنی آخری ملاقات میں غزالہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جہاز کے نائب کپتان کا علاج کر رہی ہے اور اس کے صلے میں اسے جہاز کے بالائی حصے میں آرام دہ رہائش دی گئی ہے وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی سفارش پر کلثوم کو بھی کیبنوں سے نکال کر اس کے پاس منتقل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اب بالکل الٹی گنگا بہتی نظر آ رہی تھی۔ غزالہ خود بھی ان سیلن زدہ کیبنوں میں آ رہی تھی۔

غزالہ اور تابی ہمارے کیبن کے سامنے سے گزر کر آگے چلے گئے۔ غزالہ کی نگاہ ایک ثانیے کے لیے مجھ سے ملی۔ اس کی نگاہ میں کئی سوال تھے اور دوری کا احساس تھا۔ کچھ دیر بعد خوفناک ضیائی پہرے دار دو دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہمارے دروازے کے سامنے پہنچا۔ یہ تینوں افراد مسلح تھے۔ صفدر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جڑاؤ ہار دوبارہ نیفے میں ڈال لیا۔ حسب سابق کیبن کا دروازہ کھولا گیا۔ سب سے پہلے مجھے باہر نکلنے کا حکم ملا۔ پھر صفدر اور زریں کو دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔ دو رائفلوں کے نشانے پر ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا "کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری لاٹری نکل آئی ہے۔" ایک حبشی نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم لوگوں کو تمہاری معشوقاؤں کے ساتھ بند کیا جا رہا ہے۔ کھاؤ پیو اور رات کو اندھیرا کر کے موج اڑاؤ۔" حبشی نے کہا۔

یہ پہلی بار تھا کہ وہ ڈھنگ سے کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ میں نے کہا "پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ابھی سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آ جائے گا۔" حبشی نے مجھے رائفل سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

کیبنوں کی طویل قطار کے سامنے سے گزر کر ہم آخری کیبن کے سامنے پہنچ گئے۔ ضیائی حبشی نے آگے بڑھ کر کیبن کا دروازہ کھولا۔ یہ کیبن پہلے کیبن سے نسبتاً کشادہ اور آرام دہ تھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے غزالہ اور کلثوم پر پڑی۔

"کلثوم تم یہاں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ سسک پڑی۔ غزالہ نے اسے کندھے سے لگا لیا۔

مجھے کیبن میں بھیج کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ میں نے کلثوم سے اس کا حال چال پوچھا اسی دوران میں کیبن کا دروازہ دوبارہ کھل گیا۔ اس مرتبہ دروازے پر جو ہستی نظر آئی اسے دیکھ کر کلثوم کا چہرہ گلنار ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھی چمک گئے۔ یہ زریں گل تھا۔ کلثوم نے جلدی سے آگے بڑھ کر زریں گل کی دونوں پنڈلیاں پکڑ لیں۔ یہ کوئی قبائلی رسم تھی جس سے زریں گل قطعی ناواقف تھا۔ وہ بری طرح بدکا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے تحاشا پشتو بولنے لگے۔ یوں لگا جیسے یہ پشتو بہت دنوں سے ایک جگہ جمع ہو رہی تھی "اب بند ٹوٹا ہے اور پشتو کا سیلاب سا آ گیا ہے۔" مطلع ذرا صاف ہوا تو میں نے کہا "زریں! اگر ہم کہیں تمہارے سامنے انگریزی بول بیٹھیں تو تم ہماری جان کو آ جاتے ہو۔ اب یہ جو پشتو کی آندھی چلا رہے ہو یہ کس حساب میں ہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ جانتا ہے کہ میاں بیوی کو ایسی باتیں بھی کرنا ہوتی ہیں جو وہ سب کے سامنے نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "ایسی ساری باتیں تم کر چکے ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔" آخری الفاظ میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہے تھے۔

یہ کیبن قریباً دس ضرب پندرہ فٹ کا تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا سا ٹوائلٹ بھی موجود تھا۔ دروازے اور دراڑے میں پیدا ہونے والے خلا کا سسٹم وہی تھا جو دوسرے کیبنوں میں تھا۔ ہم سب تو ایک دوسرے کے حال سے واقف تھے، ہاں کلثوم سے اس جہاز پر پہلی دفعہ ملاقات ہو رہی تھی۔ ہم نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پہلے تو یہاں کافی سختی تھی اور سیاہ فام پہرے دار بڑی بدتمیزی سے پیش آتے تھے لیکن جب سے غزالہ نے وائس کپتان فلیمنگ کا علاج کیا تھا اور اسے افاقہ ہوا تھا، غزالہ کے ساتھ ساتھ کلثوم سے بھی نرمی کا سلوک ہونے لگا تھا۔

آج سردی معمول سے زیادہ تھی۔ ہم نے کیبن کے فرش پر بستر وغیرہ بچھا لیے اور گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہم قید سخت سے "قید نرم" میں آ گئے تھے۔ یہ تبدیلی ہمیں بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ ہم نہ صرف آرام دہ کیبن میں تھے بلکہ اکٹھے بھی تھے۔ شاید یہ بھی اس کارکردگی کا

انعام تھا جو میں نے اور صفدر نے لڑکیوں کو جہاز پر لانے کے حوالے سے دکھائی تھی۔ مگر سوال پھر وہی ذہن میں ابھر رہا تھا۔ ہمیں عرشے پر کوئی اپارٹمنٹ دینے کے بجائے یہاں جہاز کے نچلے حصے میں کیوں رکھا گیا تھا اور تو اور اب غزالہ کو بھی یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بار بار میرے ذہن میں آ رہی تھی اور یہی بات صفدر نے بھی نوٹ کی تھی۔ جہاز کی رفتار معمول سے کافی زیادہ تھی۔ ہمیں ویسے تو باہر سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' زیادہ اسپیڈ کا اندازہ اس تھرتھراہٹ سے ہوتا تھا جو جہاز میں محسوس ہو رہی تھی یا پھر ان ہچکولوں سے ہوتا تھا جو ہمیں مسلسل لگ رہے تھے۔

میں نے کہا "یار صفدر! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی جہاز کے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس علاقے میں انڈیا کی ساحلی پولیس اور نیوی گشت پر رہتی ہے۔ ممکن ہے کسی کو "ہرکولیس" پر شک پڑ گیا ہو۔"

"تو کیا انڈیا کا پولیس ام سب کو پکڑ لے گا؟"

میں نے کہا "دعا کرو ذریں گل کہ ایسا ہو جائے۔ انڈیا کی پولیس سے تو ہم چھوٹ بھی سکتے ہیں مگر ان حبشیوں کے جال سے نکلنا آسان نظر نہیں آتا۔ پتا نہیں یہ کہاں لے جائیں گے اور کس کنوئیں میں دھکیلیں گے۔"

"مگر استاد صیب! انڈیا کی پولیس کے ہاتھ آنا بھی تو کوئی عزت کا بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تمہارے خیال میں عزت کی خاطر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ام کو تیل دیکھنا چاہیے اور تیل کا دھار دیکھنا چاہیے۔ ابھی سپدو صیب ام کو بتا رہا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ کالا لنگور ام کو افریقہ میں لے جانا چاہتا ہو۔ افریقہ میں جانا تو امارے لیے بالکل اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیوں اچھا نہیں ہوگا۔ وہاں انڈین پولیس کا دور دور تک پتا نہیں ہوگا اور یوں تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔"

"خو وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہاں اور بھی تو کئی طرح کا مسئلہ ہوگا۔ سنا ہے کہ وہاں بڑا بڑا مچھر ہوتا ہے اور لوگوں کو زرد بخار ہو جاتا ہے۔ وہاں کا ملیشیا (ملیریا) بھی مشہور ہے۔ پھر گھنے جنگلوں میں بڑا خطرناک قسم کا دلدل ہوتا ہے جو لوگوں کو زندہ نگل جاتا ہے۔ کانگو کے جنگلات میں ایک ایسی دلدل کو ام نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک شیر اور بھینسا لڑتے لڑتے اس دلدل میں گر گئے تھے۔"

"یہ تم خیر سے کس سن میں افریقہ گئے تھے؟"

"ام افریقہ نہیں گیا تھا' ام نے فلم دیکھا تھا۔"

"میرے خیال میں تو سندر بن کی کسی فلم کی شوٹنگ افریقہ میں نہیں ہوئی۔"

"آپ مذاق فرما رہا ہے استاد صیب۔ ام تو انگریزی فلم کی بات کر رہا ہے۔ خیر اس قسم کا خطرات تو ہر علاقے اور ملک میں ہوتا ہے' مگر ایک خطرہ ام کو ذاتی قسم کا بھی ہو سکتا ہے۔"

"بر حق نہیں لاحق۔" صفدر نے تصحیح کی۔

"جی ہاں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ اب دیکھیں ناں کلثوم کا گود ہرا ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر لوگ فرماتا ہے اور خود غزالہ بی بی بھی فرماتا ہے کہ جب عورت کا گود ہرا ہونے والا ہو تو اس کو اچھے اچھے منظر دیکھنا چاہیے۔ اس کے اردگرد خوب صورت بچوں کا تصویر ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ام لوگ افریقہ پہنچ گیا تو وہاں تو چاروں طرف یہی چپٹی ناک والا حبشی ہوگا اور ان کا بچہ لوگ ہوگا۔ او خدایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امارے گھر میں کالا پٹھان پیدا ہو جائے۔"

کالے پٹھان کی اصطلاح پر ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور تو اور غزالہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم سب بھول گئے کہ ہم ایسے قید خانے میں بند ہیں جو پانی پر رواں دواں ہے اور ہمیں آدم خور پہرے داروں سمیت کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔

جہاز کی رفتار گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب پورا جہاز کانپ رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم ایک دیوہیکل مال بردار جہاز کے بجائے کسی لانچ میں بیٹھے ہیں جو متلاطم سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ جہاز کے نچلے حصے سے ایک مہیب آواز پیدا ہو رہی تھی۔ یہ پانی کی کاٹ کا شور تھا۔ درحقیقت یہ کسی حد تک پرانا جہاز تھا۔ اب اسے انتہائی رفتار سے چلایا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے "جسم" پر لرزہ طاری تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر اس کی اسپیڈ مزید بڑھائی گئی تو شاید یہ ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر میں بکھرنا شروع ہو جائے گا۔

اسی دوران میں جہاز کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی ٹھوس چیز نے پہلو سے جہاز کو زوردار ٹکر ماری ہے۔ کیبنوں میں بند قیدی چیخ اٹھے۔ ہمارے کیبن میں بھی سب کے چہرے پر ہراس نظر آنے لگا۔ کلثوم کے منہ سے تو باقاعدہ چیخ نکل گئی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے استاد صیب؟" زریں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ جہاز کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ اس مرتبہ کسی دیوہیکل شے کے ٹوٹنے کی آواز بھی آئی۔ کیبنوں میں موجود عورتیں اور بچے بری طرح چیخنے لگے۔ ان میں سے کچھ تو ہندی میں واویلا کر رہے تھے اور کچھ کرناٹکی یا تامل زبان بول رہے تھے۔ اس دوسرے جھٹکے کے سبب غزالہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی تھی اور اس کی گود میں ننھا ذر کر رونے لگا تھا۔ زریں گل بھی لڑھک کر میری گود میں آن گرا تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھ گئے اور اگلے جھٹکے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلا جھٹکا تو نہیں لگا لیکن غور سے سننے پر ایک خوفناک انکشاف ضرور ہوا۔ باہر سے فائرنگ کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یہ بھاری ہتھیاروں کی فائرنگ تھی اور ان میں "ایم 16" قسم کی مشین گن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ جہاز کا کسی دوسرے جہاز یا بڑی کشتی وغیرہ سے تصادم ہو گیا ہے۔ گمان غالب یہی تھا کہ یہ کوئی 'قانون نافذ کرنے والا ادارہ' ہے جس نے "ہرکولیس" کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

فائرنگ کی آوازیں وقفے وقفے سے مسلسل آ رہی تھیں۔ جہاز کی رفتار میں بھی مطلق کمی نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو مرتبہ جہاز نے کافی تیزی سے موڑ کاٹا تھا اور ہمارے کیبن میں رکھی ہوئی مختلف اشیا سلپ کر کے دیوار سے جا لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دو حبشی محافظ دوڑتے ہوئے ہمارے کیبن کے سامنے پہنچے' وہ تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے کیبن کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا گیا اور غزالہ کو باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ غزالہ کے چہرے پر تذبذب تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے کہا کہ وہ پہرے داروں کی بات مانے۔ وہ بچے سمیت کیبن سے نکل آئی۔ پہرے دار نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں اسے حکم دیا کہ وہ بچے کو یہیں کیبن میں چھوڑ دے۔

غزالہ نے پہرے دار کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ بچہ اس کے بغیر نہیں رہے گا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہرے داروں کے پاس بحث کا وقت نہیں ہے۔ وہ منع کرنے کے باوجود غزالہ کو بچے سمیت باہر لے گئے۔

"یوں لگتا ہے جیسے کچھ لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔" صفدر نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں پہرے داروں کی گھبراہٹ سے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔"

فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی مگر اب اس میں وقفہ پڑنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی لگ رہا تھا کہ فائرنگ کے جواب میں ہونے والی فائرنگ دائیں جانب کچھ فاصلے سے ہو رہی ہے۔

کیبنوں میں موجود لوگ مسلسل چیخ و پکار کر رہے تھے۔ انہیں خاموش کرانے کے لیے حبشی پہرے دار ان سے بھی بلند آواز میں چیخ رہے تھے۔ قیدیوں کو دھمکانے کے لیے وہ کیبنوں کے دروازوں کو چھڑی کے ذریعے زور زور سے بجاتے تھے اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ قریباً بیس پچیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر غزالہ کو لے جانے والے دونوں حبشی پہرے دار دوبارہ اندر آ گئے۔ انہوں نے حسب سابق ہمارے کیبن کا دروازہ کھولا اور رائفل کے اشارے سے مجھے باہر آنے کا حکم دیا۔ باہر نکلتے ہی مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی گئی اور سیڑھیاں چڑھا کر اور گودام کے خفیہ دروازے سے نکال کر عرشے پر پہنچا دیا گیا۔

ساری رات گزر چکی تھی۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ مشرقی افق سرخ ہو رہا تھا اور سمندر پر اجالے کی چادر سی پھیلتی جا رہی تھی۔ چاولوں کی بوریوں کی طویل قطاروں سے گزر کر ہم کھلی جگہ پر آئے' منظر چونکا دینے والا تھا۔ زریں عرشے پر ایک جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ قریباً دس مربع فٹ جگہ جل کر کوئلہ ہو چکی تھی اور جہاز کا باوردی عملہ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بجھا دیے گئے اور متاثرہ جگہ کے اردگرد گاڑھا سفید دھواں پھیل گیا۔ عرشے کے جنگلے کے پاس مجھے ایک تنومند حبشی کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کی خودکار رائفل بھی پاس ہی پڑی تھی۔ یقیناً یہ شخص فائرنگ کا شکار ہوا تھا۔ جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا عرشے کے ایک حصے پر لگنے والی آگ بھی فائرنگ ہی کا نتیجہ تھی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ غزالہ کو جہاز کے نچلے حصے میں کیوں بھیج دیا گیا تھا اور پہرے دار ہمیشہ سے زیادہ محتاط کیوں نظر آ رہے تھے۔ درحقیقت کچھ لوگ جہاز کے تعاقب میں تھے اور جہاز والوں کے لیے صورت حال کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بالائی عرشے پر پہنچے۔ اب اردگرد کا سمندر میں زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ جہاز کے عقب میں دو قریباً نصف میل کی دوری پر مجھے ایک چھوٹے جہاز کا ہیولا نظر آیا۔ ایسے جہاز کو ایک بڑی کشتی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ جہاز سمندر میں بڑی تیزی سے حرکت کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور عام طور سے کوسٹ گارڈز اپنی سمندری حدود کی

یادداشت کے لیے انھیں استعمال کرتے ہیں (سفید رنگ کا یہ جہاز کافی فاصلے پر تھا اس کے باوجود اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری طرح مسلح ہے) بالائی عرشے پر بھی مجھے خون کے دھبے دکھائی دیے اور گولیوں کے بے شمار خول پڑے ملے۔

اچانک دور مار رائفل کی تڑتڑ گونجی، میرے ساتھ چلنے والے دونوں حبشی بے اختیار جھک گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی مجھے بھی جھکنا پڑا، ہم بھاگ کر برج کی اوٹ میں ہو گئے۔ اسی دوران میں ہرکولیس کے بالائی عرشے سے جوابی فائرنگ ہوئی، اور تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ ہم تینوں جھک کر بھاگتے ہوئے ان لگژری اپارٹمنٹس میں داخل ہو گئے جہاں اس سے پہلے تین چار مرتبہ مائیکل سے ملاقات ہو چکی تھی۔

مائیکل اب بھی اپنے شاندار اپارٹمنٹ میں موجود تھا، وہ بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا اور وہاں تازہ تازہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ کی سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں خوفناک نمائی سیاہ فام "ایم جی" لیے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب بھی درجنوں خول بکھرے تھے اور دوربین پڑی تھی۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک اس کھڑکی میں سے اندھا دھند فائرنگ کی جاتی رہی ہے۔

مائیکل نے میرے ساتھ آنے والے پہرے داروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اس بے وقوف کو سمجھاؤ۔ وہ بچوں کی طرح ضد کر رہی ہے۔ اگر فلیمنگ کو کچھ ہو گیا تو وہ بری طرح پچھتائے گی۔ میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

فلیمنگ جہاز کے وائس کپتان کا نام تھا۔ میں نے مائیکل سے پوچھا "کیا ہوا ہے فلیمنگ کو؟"

وہ پریشان لہجے میں بولا "اسے گولی لگی ہے۔ یہاں سینے میں، دل کے بالکل پاس۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ہم ڈاکٹر غزالہ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ اس کا آپریشن کرکے گولی نکالنے کی کوشش کرے، لیکن وہ مان نہیں رہی۔ ڈر رہی ہے۔ فلیمنگ کا خون بڑی تیزی سے ضائع ہو رہا ہے۔ اگر آپریشن نہ بھی ہوا تو وہ پانچ دس منٹ میں ختم ہو جائے گا، تو پھر کیوں نہ آپریشن کا چانس لے لیا جائے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری بات مان جائے گی، تم اس بے وقوف کو سمجھاؤ کہ وہ آپریشن کر ڈالے۔"

"کہاں ہے ڈاکٹر غزالہ؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" مائیکل نے کہا "لیکن ذرا ٹھہرو، پہلے تمہارے ہاتھ کھلوا دوں۔"

اس نے پہرے داروں کو آواز دی۔ وہ لپک کر اندر آئے اور مائیکل کے اشارے پر میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ مائیکل مجھے ساتھ لے کر جہاز کے درمیانی حصے میں آ گیا۔ یہاں دو تین کمروں کو ملا کر چھوٹا سا کلینک بنایا گیا تھا۔ اس کلینک میں ضروری ادویات کے علاوہ سرجری کے بنیادی آلات بھی موجود تھے۔ بہرحال اس کلینک نما جگہ کو آپریشن تھیٹر ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک اسٹریچر پر زخمی فلیمنگ پڑا تھا، غزالہ پریشانی کے عالم میں اسے ایک انجکشن لگا رہی تھی۔ فلیمنگ کی حالت واقعی بہت خراب نظر آتی تھی۔ اس کے کپڑے خون میں لت پت تھے اور وہ گہری بے ہوشی کی حالت میں کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ ایک باوردی ملازم گیس کا سلنڈر لے کر دوڑتا ہوا آیا اور اس نے گیس ماسک وائس کپتان کے منہ پر چڑھا دیا۔

غزالہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "شاہ جہاں! یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ پورا سینہ کھول کر آپریشن کرنا پڑے گا۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اور یہاں تو ایسا سامان ہی نہیں کہ یہ آپریشن کیا جا سکے۔"

میں نے کہا "غزالہ! یہ ویسے بھی تو مر رہا ہے۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ یہ مر رہا ہے۔ تم کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے اس کی جان بچ جائے۔"

غزالہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ شاید وہ خود بھی یہ بات سمجھ رہی تھی کہ مضروب کو بچانے کی ایک کوشش کی جانی چاہیے۔ وہ بے چارگی کے ساتھ کبھی جراحی کے آلات کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی فلیمنگ کے زخمی سینے کی طرف۔ "کوشش کرو غزالہ! تم ایک تجربے کار ڈاکٹر ہو، تم یہ کر سکتی ہو۔" میں نے اسے حوصلہ دیا۔

اسی دوران میں دور مار رائفل کا ایک برسٹ آیا اور کسی قریبی اپارٹمنٹ کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ گئے۔ غزالہ اور میں بے اختیار نیچے جھک گئے۔

"بتائیں۔ میں یہاں آپریشن کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"سب کچھ ہو جائے گا، تم بسم اللہ کرو۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں ایک جواں سال حواس باختہ عورت بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں خون کے دو بیگ تھے۔ وہ انگلش میں بولی "یہ لو ڈاکٹر۔ خون مل گیا ہے۔ پلیز اب کچھ کرو۔"

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، گھرے بالوں والی یہ اطالین عورت فلیمنگ کی بیوی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ

انگارہ ہو رہی تھیں اور وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دے کر کمرے سے باہر بھیج دیا اور غزالہ سے کہا کہ وہ جاں بلب شخص کے لیے جو کچھ کر سکتی ہے کر گزرے۔

غزالہ نے قمیص اور بنیان وغیرہ کاٹ ڈالی۔ اس کے کہنے پر میں نے کلینک نما کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بڑی گھبراہٹ میں لیکن بڑی تیزی کے ساتھ غزالہ نے مضروب کو خون کی منتقلی کا انتظام کیا۔ اس کے بعد میں نے آپریشن کا ایک ایسا منظر دیکھا جو میرے لیے تو ناقابل فراموش تھا ہی یقیناً غزالہ کے لیے بھی ناقابل فراموش تھا۔ بالکل ناکافی سامان کی مدد سے اس نے مضروب کا پیٹ پسلیوں سے اوپر تک چیر ڈالا۔ آنتیں، پھیپھڑے، معدہ سب کچھ ہمارے سامنے تھا۔ غزالہ کے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا اور ساتھ ساتھ حوصلہ بھی دیتا جا رہا تھا۔ مضروب کو آکسیجن لگی ہوئی تھی اور خون اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا لیکن جتنا منتقل ہو رہا تھا اس سے زیادہ نکل رہا تھا، اور اس خون میں غزالہ کے دستانے بلکہ کہنیاں تک لتھڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کے باہر سے گاہے گاہے مسز فلیمنگ کے رونے کی آواز آ جاتی تھی اور کبھی کبھی فائرنگ کی زوردار آواز بھی در و دیوار کو لرزا جاتی تھی۔ جہاز کی رفتار بدستور طوفانی تھی۔ اس رفتار کی وجہ سے شدید ہچکولے لگ رہے تھے، یہ ہچکولے غزالہ کے نہایت دشوار کام کو دشوار تر بنا رہے تھے۔

غزالہ نے جلد ہی گولی کا زخم ڈھونڈ لیا۔ گولی بائیں پھیپھڑے سے سلپ کرتی ہوئی دل کی طرف گئی تھی اور اسے زخمی کرکے عقبی پسلیوں میں کہیں گم ہوئی تھی۔ غزالہ کو نامناسب آلات کی مدد سے مضروب کے دل تک پہنچنا پڑا۔ وہ خون آلود گوشت کا ایک گولا نظر آ رہا تھا، جس میں زندگی ایک بے قرار دھڑکن کی صورت میں موجود تھی۔ دل کا نچلا حصہ زخمی تھا اور ہر دھڑکن کے ساتھ خون اگل رہا تھا جو مسلسل جوف سینہ میں جمع ہو رہا تھا۔ غزالہ کی ہدایت پر میں روئی کے بڑے بڑے پھاہوں کی مدد سے یہ خون صاف کرتا جا رہا تھا اور غزالہ زخم تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ آپریشن یوں ہو رہا تھا جیسے پوسٹ مارٹم ہو رہا ہو۔ دل کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر غزالہ نے ہمت ہار دی "شاہ جہاں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ یہ مر رہا ہے۔"

"تم جو کر سکتی ہو، وہ کرو۔" میں نے اسے پچکارا۔

دل کی کچھ رگیں کٹی ہوئی تھیں اور خون وہیں سے ابل رہا تھا۔ غزالہ نے آلات سنبھالے اور ان رگوں کو "سٹیچ" کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مسئلہ وہی خون کے بہاؤ کا تھا۔ اخراج خون کے سبب کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسری رکاوٹ حرکت قلب تھی۔ مسلسل حرکت کرتے ہوئے ٹشوز کو ٹانکے لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر جب غزالہ ایک بار اس کام میں لگ گئی تو پھر لگی رہی۔ کئی کوششیں ناکام ہوئیں لیکن وہ ہر بار نئے عزم سے شروع ہو گئی۔ رکوع کے بل جھکے جھکے اسے قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے مگر وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے چند لمحے سستانے کی کوشش کی تو موت سے اس جنگ میں ہماری شکست ہو جائے گی۔

مسز فلیمنگ اور دیگر افراد بار بار ایک کھڑکی سے اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غزالہ کی ہدایت پر میں نے کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا۔ خون کی کمی کے سبب فلیمنگ کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا، دل کی دھڑکن بھی بہت سست ہو گئی تھی، لگتا تھا کہ اب وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے "اب میں کیا کروں شاہ جہاں۔" غزالہ نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

غزالہ کی مایوسی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ٹانکے لگانے کی ناکام کوششوں کے بعد فلیمنگ کے دل کا نچلا حصہ قیمے کی سی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ ایسے پارہ پارہ دل کے ساتھ ابھی تک زندہ کیسے ہے۔ "طب کی دنیا" میں محیر العقول واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، شاید یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یا پھر شاید یہ مجھے زیادہ محیر العقول لگ رہا تھا۔ جب غزالہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے دل کے مسخ شدہ حصے کو گول گول لپیٹا اور ٹانکے لگا دیے، جو پورشن ٹانکے لگانے کے قابل ہی نہیں تھا اسے کسی "ٹیپس واوماوے" کی مدد سے جوڑ دیا۔ کوئی ہارٹ سرجن یہ کارروائی دیکھتا تو شاید اپنا سر پیٹ لیتا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس صورت حال میں اس کے علاوہ کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات ہمارے لیے یہی تھی کہ فلیمنگ اب تک زندہ تھا اور سانس لے رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور ہر دھڑکن قدرت کی کرشمہ سازی کا ثبوت تھی۔ غزالہ نے جیسے تیسے مضروب کا سینہ بند کر دیا اور پیٹ کو ٹانکے لگا دیے۔ لیکن اس سے پہلے وہ مضروب کی عقبی پسلیوں سے گولی نکالنا نہیں بھولی تھی۔ یہ دور مار رائفل کی گولی تھی اور جہاں لگی تھی وہاں سے سلپ ہو کر کافی دور نکل گئی تھی۔ غزالہ قریباً دو گھنٹے اس کام میں ہمہ تن مصروف رہی تھی، آپریشن کے دوران میں غزالہ کا ہاتھ بٹانے اور حوصلہ بڑھانے کے لیے میں مسلسل اس کے ساتھ موجود رہا

تھا۔ آپریشن کے بعد ہم نے دروازہ کھول دیا۔ مسز فلیمنگ روتی ہوئی آئی اور شوہر کے پاس سے چھوٹ کر رونے لگی۔ دیگر افراد بھی اندر آ گئے۔ ان میں مائیکل بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ حسبِ معمول ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔

اب دن چڑھ آیا تھا لیکن سطحِ آب پر ہلکی ہلکی دھند تھی اور سورج بھی بادلوں کی اوٹ سے پوری طرح برآمد نہیں ہوا تھا۔ جہاز کی رفتار اب بھی خاصی تیز تھی مگر فائرنگ کا سلسلہ رک چکا تھا۔ میری نگاہ برج کی طرف گئی۔ وہاں عملے کے دو سینئر افسران موجود تھے۔ انہوں نے آنکھوں سے طاقت ور دوربینیں لگا رکھی تھیں اور اپنے عقب میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غالباً ہلکی دھند کی وجہ سے انہیں دشواری پیش آ رہی تھی۔ تاہم ان کا اندازہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ جہاز کا تعاقب ابھی تک جاری ہے۔

مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو مائیکل کھڑا تھا۔ وہ بولا "تمہاری لیڈی ڈاکٹر نے کافی محنت کی ہے۔ امید نہیں تھی کہ فلیمنگ تادیر سانس لے سکے گا۔"

"مگر اسے زخمی کرنے والے کون ہیں؟"

"شاید تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ ہمارا تعاقب کون لوگ کر رہے ہیں؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"یہ کچھ پرانے دوست ہیں۔ اکثر ہم سے محبت جتاتے رہتے ہیں، ہم بھی ان کی محبت کا جواب پوری گرم جوشی سے دیتے ہیں۔"

"کیا ان کا تعلق انڈین فورسز سے ہے؟"

"نہیں۔ نہیں، ان میں اتنا کس بل کہاں۔"

"تو پھر؟"

"بھئی کہا ناں۔ ہیں کچھ پرانے دوست۔"

اچانک برج میں کھڑے دونوں افسران مضطرب نظر آنے لگے۔ ان میں سے ایک افسر نے ہاتھ کے اشارے سے مائیکل کو کچھ سمجھایا۔ مائیکل بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھا اور برج میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے دوربین اس کی آنکھوں پر تھی اور وہ بڑے غور سے اپنے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے میگا فون کے ذریعے اپنے عملے کو افریقی زبان میں کچھ ہدایات دیں۔ ایک دم عملے میں شدید اضطراب نظر آنے لگا۔ بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ کچھ مسلح افراد جہاز کے مختلف حصوں میں پوزیشنیں لینے لگے، کچھ کنٹرول روم کی طرف دوڑے، برج میں بھی غیر معمولی سرگرمی نظر آنے لگی۔ چار پانچ منٹ بعد جہاز کے فرش میں واضح طور پر ارتعاش محسوس ہونے لگا۔ یہ ارتعاش اس امر کا اشارہ تھا کہ جہاز کی رفتار ایک دم بڑھا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاز نے ایک قوس کی شکل میں بائیں رخ پر مڑنا شروع کر دیا۔ میرے قریب ہی ایک نگرو نے خالی ڈرموں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیمسن ایم ایم رائفل تھی اور قریب ہی کئی بھرے ہوئے میگزین فرش پر رکھے تھے۔ مسلح نگرو نے اپنی دوربین بھی فرش پر رکھ دی تھی۔ وہ پھسلتی ہوئی کچھ دور چلی گئی۔ میں نے دوربین اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ تقریباً ڈھائی تین میل کے فاصلے پر مجھے دو جہازوں کے ہیولے نظر آئے۔ ان میں سے ایک تو وہی ہلکا پھلکا کشتی نما سفید جہاز تھا جو اس سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔ دوسرا جہاز قدرے بڑا تھا۔ دونوں جہازوں پر کوئی شناختی نشان نظر نہیں آیا تاہم دونوں جہازوں پر مسلح افراد موجود تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ جو جہاز نسبتاً بڑا تھا اس پر موجود افراد وردی میں تھے۔ یہ دونوں جہاز بڑی تیزی سے ہرکولیس کے قریب آ رہے تھے۔ ایک تو وہ وزن میں ہلکے تھے، دوسرے ہرکولیس کے مقابلے میں کہیں تازہ دم اور نئے تھے۔ بوڑھا "ہرکولیس" کم از کم دوڑ میں تو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عقب میں آنے والے ایک جہاز کا رخ تھوڑا سا تبدیل ہوا تو میں چونک گیا۔ مجھے اس کے مستول پر ایک چھوٹا سا جھنڈا نظر آیا تھا، یہ ایران کا جھنڈا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والوں کا تعلق ایران سے ہے۔ میں دل ہی دل میں ان دونوں جہازوں کے لیے دعائے خیر کرنے لگا۔ درحقیقت یہ دونوں جہاز ہمارے لیے امید کی دو روشن کرنوں جیسے تھے۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ کرنیں کہاں سے اور کیسے طلوع ہوئی ہیں۔ بہرحال اس وقت یہ مجھے روشن اور واضح تر نظر آ رہی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا برج کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں بلندی پر سے دور دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ برج کے چاروں طرف شیشہ لگا تھا۔ اندر زبردست قسم کی سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ جہاز کا اصل کپتان جم نام کا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی آنکھیں کثرتِ شراب نوشی کے سبب ہر وقت سوجی رہتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کچھ سست اور بیمار نظر آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جہاز کی اصل کمانڈ مائیکل ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جم ہر کام مائیکل سے مشورے کے بعد کرتا تھا۔ اس وقت بھی برج میں مائیکل بہت سرگرم نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک بڑا نقشہ پھیلا رکھا تھا اور کپتان جم کے ساتھ گرما گرم بحث میں مصروف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خطرناک صورتِ حال کے باوجود مائیکل کے لب و لہجے میں پریشانی کی بجائے جوش و خروش کی

جھلک تھی۔ وہ ایک ایسے پیدائشی جنگجو کی طرح نظر آ رہا تھا جس کا چہرہ اپنے مسلح دشمن کو دیکھ کر تمتما اٹھتا ہے۔

اچانک میں پروفیسر اللہ دتا کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ مہینوں کا بیمار نظر آ رہا تھا اور بے دم سا ہو کر برج سے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح گردش کر رہی تھی اور ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ شاید میری طرح وہ بھی دعا گو تھا کہ ایرانی جہاز ہرکولیس کو گھیر لیں اور اس سفر کو فل اسٹاپ لگ جائے جو ہمیں نامعلوم خطرات کی طرف لے جا رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر پروفیسر کا حال چال دریافت کیا۔ وہ پہلے تو بالکل گم صم دکھائی دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری بات کا جواب ہی نہیں دے گا، مگر پھر اس نے حوصلہ کر لیا۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا ”ہمارے پیچھے آنے والا سفید جہاز پہلے تو بہت قریب آ گیا تھا، پھر وہ کیوں چلا گیا؟“

”مائیکل کے آدمیوں نے زبردست مزاحمت کی تھی۔“ پروفیسر نے سرگوشی میں کہا ”تقریباً ایک گھنٹے تک بڑی زوردار فائرنگ ہوئی ہے۔ مائیکل کے دو بندے مارے گئے ہیں۔ تین چار زخمی بھی ہوئے ہیں۔ ان میں نائب کپتان فلیمنگ بھی ہے۔“

میں نے کہا ”غزالہ نے دو گھنٹے تک اس کا نہایت خطرناک آپریشن کیا ہے، وقتی طور پر تو اس کی جان بچ گئی ہے۔“

پروفیسر نے سرگوشی میں کہا ”زبردست مزاحمت کے بعد ایرانی جہاز پیچھے چلا گیا تھا، مگر اس نے پیچھا پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر رہ کر وہ مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دوسرے جہاز کا انتظار کر رہا تھا، جونہی دوسرے جہاز کی کمک پہنچی ہے، وہ پھر قریب آنے لگا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دوسرے جہاز میں وافر ہتھیار اور مسلح افراد موجود ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ حرامی مائیکل اور اس کے ساتھی ان دونوں ایرانی جہازوں سے ٹکر لے سکیں گے؟“

”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ باقی یہ لوگ ہیں بڑے خطرناک، مرنا مارنا ان کے لیے کھیل کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ لگتا ہے کہ ایسی لڑائیوں بھڑائیوں کا انہیں وسیع تجربہ بھی ہے۔ ہر بندہ بڑا اچاوا اور چوکس ہے۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ کل کتنے بندے ہیں یہاں؟“

”میرے خیال میں عملے کے افراد ملا کر کل تیس کے قریب لوگ ہیں اور سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو سو فی صد خونخوار درندوں کے مانند ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ مائیکل ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے؟“

”کچھ معلوم نہیں۔“ پروفیسر اللہ دتا نے مایوسی سے سر ہلایا ”میں نے شائستہ بیٹی سے بھی پوچھا تھا، وہ بھی لاعلم ہے اس کے علاوہ۔۔۔“

ایک دم پروفیسر بولتے بولتے سہم کر خاموش ہو گیا۔ برج میں موجود ایک سیاہ فام ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے سرگوشی میں کہا ”تم دوسری طرف چلے جاؤ۔ یہ شک کریں گے۔“

میں اٹھا اور اس کلینک نما کمرے کی طرف آ گیا جہاں نائب کپتان فلیمنگ اپنے کرشماتی آپریشن کے بعد لیٹا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوشی میں تھا۔ آکسیجن کے علاوہ خون بھی لگا ہوا تھا۔ غزالہ پلک جھپکائے بغیر اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ سرخ بالوں والی مسز فلیمنگ بھی وہیں موجود تھی۔ تیز رفتاری کے سبب جہاز کو لگنے والے ہچکولوں کی وجہ سے فلیمنگ کا بے ہوش جسم بری طرح ہل رہا تھا۔ غزالہ پریشانی سے بولی ”یہ کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں، ان لوگوں نے جہاز کی رفتار پھر کیوں بڑھا دی ہے۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟“

مسز فلیمنگ غزالہ سے بھی زیادہ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ انگلش میں بولی ”یہ کیپٹن جم کیا کر رہا ہے۔ خدا اس کو سمجھے۔ یہ شرابی ضرور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کرے گا۔“

”کیا بات ہے محترم خاتون۔“ میں نے پوچھا۔

وہ سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”جہاز کا رخ دیکھو۔ یہ ساحل کی طرف جا رہا ہے۔ میں اس علاقے کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں سمندر بہت اتھلا ہے۔ ”ہرکولیس“ جیسا جہاز اتنی کم گہرائی میں چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ کہیں نہ کہیں پھنس جائے گا۔ او گاڈ۔۔۔ یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔“

اسی دوران میں عملے کا ایک اطالین اہلکار اندر داخل ہوا۔ وہ بھی پریشان نظر آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مسز فلیمنگ بولی ”یہ کیا ہو رہا ہے بھئی۔ یہ کیپٹن جم خودکشی پر کیوں تلا ہوا ہے۔ تم جانتے ہو سمندر اس ساحل کے قریب کتنا اتھلا ہے۔“

”میں جانتا ہوں میڈم! اور میں بھی وہی خطرہ محسوس کر رہا ہوں جو آپ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ جناب مائیکل کے کہنے پر کیا جا رہا ہے۔ بلکہ وہی سب کچھ کروا

رہے ہیں۔“ اس نے ایک کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور کنٹرول روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”وہ دیکھیے میڈم! مسٹر مائیکل وہاں خود موجود ہیں۔“

میں نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ کنٹرول کی ایک کھڑکی میں سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ مائیکل جہاز کے کیپٹن جم کے ساتھ اس پہیے کے قریب کھڑا تھا جس کو گھما کر جہاز کا رخ متعین کیا جاتا ہے۔ وہ بڑی توجہ کے ساتھ کیپٹن جم اور دیگر عملے کو ہدایات دے رہا تھا۔ ان لمحوں میں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کیپٹن وہ خود ہے۔

”مائیکل کا ارادہ کیا ہے؟“ مسز فلیمنگ نے الجھن سے کہا۔

عملے کا رکن بولا ”میڈم، جہاں تک میرا اندازہ ہے جناب مائیکل کی یہ سوچی سمجھی چال ہے کہ وہ جہاز کو کم گہرے پانی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ شاید وہ اس پانی کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ انہیں وہ خاص راستے معلوم ہیں جہاں پانی بہت کم نہیں ہے۔ وہ دیکھیں۔ وہ کیپٹن جم کو ساتھ ساتھ بتاتے جا رہے ہیں۔“ اس شخص نے کنٹرول روم کی طرف اشارہ کیا۔

کنٹرول روم میں واقعی بہت سرگرمی نظر آ رہی تھی۔ جہاز کی رفتار بہت زیادہ تیز تو نہیں تھی، تاہم وہ بار بار اپنا رخ تبدیل کر رہا تھا۔ سمندر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ساحل کہیں قریب ہی ہے۔ پانی کے اندر سے کہیں کہیں مونگے کی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ آسمان پر اکا دکا آبی پرندے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کی دور دراز آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مطلع اب بالکل صاف ہو گیا تھا۔ ہم ان کی دوربین کے بغیر بھی اپنے عقب میں دونوں ”ایرانی“ جہازوں کو دیکھ سکتے تھے۔ جہاز اب کافی قریب آ گئے تھے۔ ہم ان کے عرشوں پر افراد کی نقل و حرکت دیکھ سکتے تھے اور دور مار رائفلوں کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ جس جہاز پر باوردی افراد نظر آ رہے تھے وہ زیادہ قریب تھا۔ اچانک اس جہاز پر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ چند طویل برسٹ بالائی عرشے کے آس پاس کہیں لگے۔ جواب میں مائیکل کے کارندوں نے بھی زوردار فائرنگ کی۔ پروفیسر اللہ دتا اپنی جگہ پر حیران بیٹھا تھا۔ وہ کھلی جگہ پر تھا اور یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ پروفیسر کو جا کر کمرے میں لے آؤں کہ ایک طرف سے کوئی دوڑتا ہوا آیا۔ یہ پروفیسر کی بیٹی شائستہ تھی۔ اس نے چیخ کر پروفیسر سے کچھ کہا، پھر اس کا بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ اسے لے کر محفوظ آڑ کی طرف بھاگی، مگر ابھی راستے ہی میں تھی کہ ایک اور زوردار برسٹ آیا۔ وہ پروفیسر کو لے کر ایک دم بیٹھ گئی۔ ان کے قریب پڑا ہوا ایک ڈرم الٹ کر دور جا گرا۔ پتا چلا کہ گولیاں ان کے بالکل قریب سے گزری تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں دوربین سے دیکھ کر باقاعدہ نشانہ بنایا گیا ہو۔ کنٹرول روم سے مائیکل نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اب وہ باپ بیٹی پر بڑی قہرآلود نگاہ ڈال رہا تھا۔ اگلا برسٹ آنے سے پہلے پہلے شائستہ اور پروفیسر جھک کر دوڑتے ہوئے ایک ”وینس“ کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ باپ بیٹی کی محبت کے بارے میں کچھ اندازہ تو مجھے تھا، اب اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت بھی مل گیا تھا۔ شائستہ امید سے تھی۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ یوں بھاگ دوڑ کرتی مگر وہ خود کو شدید خطرے میں ڈال کر والد کے لیے باہر نکل آئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ تک جہاز نے مزید زگ زیگ راستے پر سفر کیا۔ اس دوران میں عقب سے وقفے وقفے کے ساتھ فائرنگ بھی ہوتی رہی۔ پھر یہ دیکھ کر میرے سینے میں مایوسی سی پھیل گئی کہ ہمارے عقب میں آنے والے دونوں جہاز بہت سست ہو گئے ہیں اور ہمارے ساتھ ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ اتنے میں بالائی عرشے سے شوروغل کی آواز آئی۔ وہاں چند ملاح خوشی سے ناچ رہے تھے، پھر ان میں سے ایک نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ میں باہر نکلا۔ کنٹرول روم اور برج میں بھی شادمانی کے مناظر نظر آئے۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ ہمارے عقب میں۔۔۔ آنے والے دونوں جہاز سمندر کے بیچوں بیچ رک چکے تھے۔ وہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ مائیکل کی شاطرانہ چال کامیاب رہی ہے۔ وہ خود تو کچھ مخصوص راستوں سے گزر کر آگے نکل آیا ہے، جبکہ تعاقب کرنے والے جہازوں کو اس نے ریت میں دھنسا دیا ہے۔ اب وہ لوگ اپنے آپ پر غصہ کھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے کنٹرول روم میں جھانکا۔ سب افراد خوش نظر آ رہے تھے لیکن مائیکل کے چہرے پر ابھی تک تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ بار بار میٹرز کا معائنہ کر رہا تھا اور ایک نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ الیکٹرانک دوربین کے ذریعے اپنے عقب میں بھی جھانک لیتا تھا۔ تعاقب میں آنے والے بہت دور رہ گئے تھے۔ اب ہم جہازوں کے بس بالائی حصے ہی دیکھ سکتے تھے۔ اچانک ”ہرکولیس“ کو جھٹکا لگا۔ بالکل جیسے کسی گاڑی کو بریک لگائے گئے ہوں۔ کیپٹن جم سمیت تمام سیلرز کے چہرے اترے ہوئے نظر آنے لگے۔ کنٹرول روم میں ایک بار پھر سرگرمی نظر آنے لگی۔ کیپٹن جم اور مائیکل بلند آواز میں بول

رہے تھے۔ میں کنٹرول روم کے کچھ قریب گیا تو آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

کیپٹن جم کہہ رہا تھا "جہاز کا ہلم تقریباً چالیس فٹ پانی کے اندر ہے "اب تم خود اندازہ لگالو۔"

"لیکن بائیں رخ پر جائیں گے تو اور مصیبت میں پڑیں گے۔ ہمیں کچھ پتا نہیں آگے کیا ہے؟"

"لیکن چانس تو ہوگا۔ یہاں تو سب کچھ سامنے نظر آرہا ہے۔" کیپٹن جم بولا۔

"چانس ادھر بھی ہے پیارے۔ تم حوصلہ کرو۔" مائیکل نے کہا۔

"اگر حوصلے کے ساتھ جہاز ریت میں چل سکتے تو پھر صحراؤں میں اونٹوں وغیرہ کی ضرورت نہ رہتی۔" کیپٹن جم نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ صحرا نہیں سمندر ہے۔ ہاں تم مجھے ضرور" اونٹ والے "لگ رہے ہو۔"

کیپٹن جم نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔ جہاز ایک بار پھر روانی سے چلنے لگا تھا لیکن اردگرد کے سمندر کو دیکھ کر اندازہ سا ہوتا تھا کہ آگے بھی کم گہرا پانی موجود ہے۔ "رفتار تیز کرو۔" مائیکل نے کیپٹن جم کو مشورہ دیا۔

معمولی تذبذب کے بعد کیپٹن جم نے کنٹرول پینل سے چھیڑ چھاڑ شروع کی' چند لمحے بعد جہاز کے در و دیوار میں ایک بار پھر تھرتھراہٹ نمودار ہوئی۔ جیسے کوئی بیمار شخص نقاہت کے باوجود دوڑ کر سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جہاز کے اطراف میں لگے ہوئے "کٹر" یقیناً بڑی تیزی کے ساتھ پانی کو کاٹنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ کنٹرول روم میں موجود افراد کے چہروں پر شدید تناؤ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے بہت سے افراد نے مختلف اشیاء کو سہارے کے لیے تھام رکھا ہے۔ یقیناً جہاز کو جھٹکا وغیرہ لگنے کا امکان تھا۔ میں نے بھی ایک پائپ کا سہارا لیا۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزرے' پھر ایک دم جہاز کو بریک لگے اور وہ بری طرح تھرا گیا۔ ایک عجیب گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ جہاز کی "بریک" طویل ہوتی جارہی تھی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ جہاز اتھلے پانی میں ہے اور اس کا پیندا ریت اور کیچڑ سے رگڑ کھا رہا ہے۔ یہ ساری "مومینٹم" کی کارفرمائی تھی' ہزاروں ٹن وزن اپنی زبردست "جھونک" کے سبب ریت اور کیچڑ پر پھسلتا چلا جارہا تھا۔ یہ پُرخطر لمحات تھے' کسی بھی وقت کوئی خوفناک حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔ جہاز کو نقصان پہنچ سکتا تھا' وہ کسی ایسی جگہ پھنس سکتا تھا جہاں سے مہینوں نہ نکالا جاسکے۔ کم و بیش دو منٹ تک جہاز نے ریت اور کیچڑ پر اپنا سفر جاری رکھا' تب اسے ایک بار پھر ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ گہرے پانی میں پہنچ گیا۔ جہاز کے در و دیوار میں جاگنے والی زبردست... تھرتھراہٹ معدوم ہوگئی' پھر بتدریج اس کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا۔ مائیکل سمیت اب سب کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا۔ میں نے برج کے قریب بلندی پر جاکر دیکھا' جہاز کے عقب میں سمندر کے نیلے پانی پر ایک چوڑی سی گدلی پٹی نظر آرہی تھی۔ درحقیقت یہ وہ کیچڑ اور ریت تھی جو جہاز کے پیندے کی رگڑ کے سبب سطح آب پر نمودار ہوئی تھی۔ یہ گدلی پٹی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھیل کر کافی وسیع ہوگئی۔ جہاز نے نیم دائرے کی شکل میں ایک طویل موڑ کاٹا اور کھلے سمندر میں پہنچ گیا۔ یہ صورت حال مائیکل اور اس کے جہاز رانوں کے لیے یقیناً بڑی خوش کن تھی' لیکن مجھ جیسے ان تمام لوگوں کے لیے بدقسمتی کی علامت تھی جو اس جہاز میں پابہ زنجیر تھے۔ اگر جہاز پکڑا جاتا یا پھر کہیں ریت میں دھنس جاتا تو ہماری رہائی کے امکانات پیدا ہوسکتے تھے' لیکن ابھی قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔

میں کلینک نما کمرے میں واپس پہنچا تو غزالہ اور مسز فلیمنگ جس کا نام ڈوروتھی تھا' بہت پریشان نظر آرہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا تو ڈوروتھی نے چھوٹتے ہی پوچھا

"جہاز کھلے سمندر میں پہنچا یا نہیں؟"

"لگتا ہے کہ پہنچ ہی گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"تھینک گاڈ!" ڈوروتھی نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سکھ کی سانس لی۔ جو اطلاع ڈوروتھی کے لیے نیک فال تھی وہ ہمارے لیے بدفال تھی۔ ڈوروتھی نے خودکلامی کے انداز میں کہا "خدا کرے' اب دوسرا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔"

"کون سا مسئلہ؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ایک دم بات بدل گئی۔

شاید اسے یاد آگیا تھا کہ ہم کتنے بھی "اچھے" سہی' ہیں تو زرخرید بردے ہی۔ ہمارے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں تھا اور نہ ہی یہ ضروری تھا کہ ہمیں اندرونی معاملات میں شریک کیا جائے۔ اور اگر وہ ایسا کرتی تو ممکن تھا کہ اس کا بگ باس مائیکل اس سے ناراض ہوجاتا۔

فلیمنگ کی بے ہوشی برقرار تھی۔ تاہم اس کی سانس میں اب روانی آگئی تھی اور کبھی کبھی پلکوں میں جنبش بھی پیدا ہوتی تھی۔ غزالہ نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی آرام نہیں کیا

تھا۔ آپریشن کے آغاز سے لے کر اب تک وہ ہمہ تن مصروف تھی۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کمرے سے باہر کیا ہو رہا تھا اور کیا ہو رہا ہے۔ شاید ان لمحوں میں تابی کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکلا ہوا تھا۔ اس نے تابی کو خواب آور دوا کھلا دی تھی اور وہ چہرے پر معصومیت سجائے ایک صوفے پر گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے کہا "غزالہ! تھوڑی دیر آرام کرلو۔"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ فلیمنگ کا آکسیجن ماسک درست کرتے ہوئے بولی۔

مسز ڈوروتھی فلیمنگ نے کہا "بیٹی! تم بہت تھک گئی ہو۔ تین گھنٹے سے کھڑی ہو۔ کچھ دیر بیٹھ ہی جاؤ۔"

غزالہ فلیمنگ کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی لیکن ایک دو منٹ بعد ہی دوبارہ اٹھ گئی اور فلیمنگ کا ٹمپریچر وغیرہ لینے میں مصروف ہوگئی۔

شام تک مائیکل دو تین بار اپنے رائس کپتان کی مزاج پرسی کے لیے آیا اس کا اپنا ہاتھ بھی زخمی تھا۔ دو طرفہ فائرنگ میں کارتوس کے باریک چھرے اس کے ہاتھ کی پشت پر لگے تھے۔ غزالہ نے اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی بھی کردی تھی' تاہم میں نے دیکھا تھا کہ مائیکل کے جسم کو چھوتے ہوئے غزالہ کے چہرے پر نفرت آمیز جھلک نظر آئی تھی۔۔۔ مائیکل نے اپنی کامیاب چال سے تعاقب کرنے والوں کو مات دے دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ کچھ پریشان سا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے جہاز میں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس مجھے بھی ہوا تھا بلکہ شاید جہاز میں موجود دیگر مسافروں کو بھی ہوا تھا۔ جہاز کے عقب سے گھرر گھرر کی ایک مسلسل آواز سنائی دیتی تھی۔ جہاز کی رفتار بڑھتی تھی تو یہ آواز نسبتاً زیادہ بلند ہوجاتی تھی' غالباً یہی وجہ تھی کہ رفتار بار بار کم کردی جاتی تھی۔

شام کے وقت جب سورج دور مغربی افق پر ایک بہت بڑے سرخ گولے کی طرح نظر آرہا تھا میں نے مائیکل اور کچھ دیگر لوگوں کو جہاز کے عقبی حصے میں جنگلے کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ ان میں سفید بالوں اور ورم زدہ آنکھوں والا کپتان جم بھی تھا۔ عملے کے چند افراد جن کی نیلی وردیوں پر ۱۱۱ کے الفاظ پرنٹ تھے کپتان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ میں بھی ٹہلتا ہوا اس طرف جا نکلا۔ جنگلے پر سے جھک کر نیچے دیکھا تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا کہ جہاز کے عقبی حصے میں پانی کی سطح سے ذرا اوپر ایک بہت بڑا "آہنی" نظر آرہا تھا۔ تقریباً پندرہ ضرب پانچ فٹ کے رقبے میں جہاز کی بیرونی چادر پچک کر اندر چلی گئی تھی اور اس میں کریکس بھی نظر آرہی تھیں۔ اسی مقام پر جہاز کا وہ دیوہیکل پہیہ تھا جو پانی کو پیچھے کی سمت دھکیلتا تھا' یہ پہیہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور نظر نہیں آرہا تھا' مگر عین ممکن تھا کہ جہاز کی پچکی ہوئی چادر کی طرح اس پہیے کو بھی نقصان پہنچا ہو۔

جہاز کے اس متاثرہ حصے کو دیکھ کر مجھے فوراً وہ زبردست دھچکا یاد آگیا جو علی الصباح ہم نے محسوس کیا تھا۔ اس دھچکے کے نتیجے میں کوئی شے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی اور کیبنوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ درحقیقت اس زوردار دھچکے کا سبب تعاقب کرنے والے جہاز تھے۔ ان دونوں میں سے ایک جہاز نے "ہرکولیس" کو ٹکر ماری تھی۔ یہ ٹکر ایسے زاویے سے لگی تھی کہ "ہرکولیس" کو خاصی مہنگی پڑی تھی۔ اب جہاز کے تکنیک کار سر جوڑ کر یہ مشورہ کر رہے تھے کہ اس نقصان کی تلافی کیسے کی جائے۔ غالباً آج دوپہر مسز ڈوروتھی نے بھی اسی مسئلے کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا' خدا کرے ہمارا دوسرا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔ میں نے مسئلے کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ جواب گول کرگئی تھی۔

جہاز کا رخ بدستور مغرب کی طرف تھا' اس کا مطلب تھا کہ ہم بحیرہ ہند سے نکلنے کے بعد بحیرہ عرب کی طرف جارہے ہیں۔ ایرانی ساحل ہماری دائیں جانب تھا۔

میں کلینک نما کمرے میں پہنچا تو غزالہ بدستور اپنے "سیریس مریض" کے سرہانے موجود تھی۔ فلیمنگ اب ہولے ہولے کراہ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ جب اس کے زخم زخم دل کا تصور میرے ذہن میں آتا تھا تو حیرانی ہونے لگتی تھی کہ وہ زندہ کس طرح ہے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی وال کلاک کے بکھرے ہوئے پرزوں کی پوٹلی سی باندھ کر وال کلاک میں رکھ دی جائے اور اس کی سوئیاں حرکت کرنے لگیں۔

مسز ڈوروتھی نے مجھے دیکھ کر کہا "مسٹر شاہ! میں نے مائیکل سے بات کرلی ہے۔ تم نیچے کیبن میں نہیں جاؤ گے' رات کو یہیں ہمارے پاس رہو گے۔"

"میرے یہاں رہنے سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"تمہاری موجودگی سے ڈاکٹر کو حوصلہ رہے گا۔ وہ زیادہ اچھے طریقے سے مسٹر فلیمنگ کی دیکھ بھال کرسکے گی۔"

"آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میری موجودگی سے ڈاکٹر کو حوصلہ رہے گا؟"

مسز ڈوروتھی ہولے سے مسکرائی "میں سب جانتی ہوں۔۔۔ مائیکل نے مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے

سے پیار کرتے ہو' اور اکٹھے ہی رہتے ہو۔"

غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا' وہ جلدی سے بولی "آپ کو غلط بتایا گیا ہے' ایسی کوئی بات نہیں۔ مم... میں شادی شدہ ہوں۔"

"میں جانتی ہوں تم شادی شدہ ہو' لیکن شاید تمہاری علیحدگی ہو چکی ہے۔ علیحدگی کے بعد اور DIVORCE سے پہلے جوان خواتین کو عموماً نئے ساتھی کی تلاش ہوتی ہے' اگر تم نے ایسا کر لیا ہے تو اس میں کوئی برائی کی بات نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں۔" غزالہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"پھر تم اکٹھے کیوں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "دیکھیں مسز ڈورتھی! ہمارے ہاں اکٹھے رہنے کا مطلب وہ نہیں جو آپ کے ہاں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں قربت اور دوری کے پیمانے اور ہیں۔ یہ ایک طویل اور غیر متعلق موضوع ہے' بہتر ہے خیال میں ہم کسی اور موضوع پر بات کر لیں۔"

"تم مشرقی لوگ بھی عجیب ہوتے ہو۔" مسز ڈورتھی نے کہا "سیدھا کام بھی پُرپیچ طریقے سے کرتے ہو۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہو۔ پھر ایک ہی جگہ رہتے ہوئے ایک ہی کمرے میں سوتے ہوئے تم..."

"خدا کے لیے آپ چپ رہیں۔" غزالہ نے مسز ڈورتھی کی بات کاٹی "اگر آپ یہ موضوع چھوڑنا نہیں چاہتیں تو میں یہ کمرا چھوڑ دیتی ہوں۔"

"کون کمرا چھوڑ رہا ہے؟" دروازے کی طرف سے مائیکل کی گرج دار آواز ابھری اور وہ دندناتا ہوا اندر آ گیا۔

غزالہ سہم کر چپ ہو گئی۔ مسز ڈورتھی جلدی سے بولی "نہیں کوئی بات نہیں... ہم یونہی آپس میں بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہی... میں تہ دل سے اس کی مشکور ہوں۔"

مائیکل غزالہ سے مخاطب ہو کر غرایا "یہ بات مت بھولنا ڈاکٹر... تمہاری حیثیت یہاں قیدی کی سی ہے۔ یہاں وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔ اگر زیادہ پھیلو گی تو یہاں ڈنڈے کے زور پر بھی مسیحائی کرائی جا سکتی ہے۔"

شاید مائیکل کچھ اور بھی بکتا مگر اسی دوران میں فلیمنگ نے "پانی پانی" پکارا۔ یہ پہلی آواز تھی جو زخمی ہونے کے بعد اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوئی تھی۔ مسز ڈورتھی جلدی سے پانی لینے کے لیے اٹھی۔

"نہیں... ابھی پانی نہیں پلایا جا سکتا۔" غزالہ نے تیزی سے کہا۔

مسز ڈورتھی ٹھٹک کر رک گئی۔ مائیکل نے کڑے تیوروں سے غزالہ کو دیکھا۔ اسے غزالہ کا تحکمانہ لہجہ ناگوار گزرا تھا۔ وہ غرایا "دیکھو ڈاکٹر! اپنا لہجہ درست کرو' ورنہ میں چیر دیا کرتا ہوں۔"

غزالہ کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا اور ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ مائیکل نے حکم دیا "چلو اپنے لہجے کی وجہ سے سوری بولو مسز ڈورتھی کو۔"

غزالہ نے سٹپٹائی ہوئی نظروں سے مائیکل کو دیکھا' پھر وہ ڈورتھی کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈورتھی جلدی سے کھڑی ہو گئی "ارکے... ارکے' میں نے بالکل مائینڈ نہیں کیا۔" پھر وہ مائیکل سے مخاطب ہوئی "سب ٹھیک ہے مائیکل! پلیز جاؤ۔ ڈاکٹر کو معائنہ کرنے دو۔ وہ ہوش میں آ رہے ہیں' پلیز۔"

مائیکل غزالہ کو خونی نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ غزالہ اسٹیتھو اسکوپ کے ذریعے فلیمنگ کی دھڑکنیں چیک کرنے لگی۔ مائیکل کی دہاڑیں سننے کے بعد اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد فلیمنگ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سرگوشیوں میں بولنے لگا اور ڈورتھی اس پر جھک کر اس کی سرگوشیاں سننے لگی۔ لگتا ہے کہ وہ شوہر کے ہونٹوں پر بوسے بھی دے لیتی تھی۔ کچھ دیر وہ طرح طرح گفتگو کرتے رہے۔ پھر فلیمنگ نے ہاتھ سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی بیوی سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اور غزالہ باہر آ گئے۔ میاں بیوی دس پندرہ منٹ تنہائی میں باتیں کرتے رہے۔ پھر غزالہ اندر چلی گئی۔ اس نے ڈورتھی کو کہا کہ مریض کا زیادہ بولنا اس کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ بولنے کے بعد والے کپتان کی سانس اکھڑی اکھڑی محسوس ہونے لگی تھی۔ غزالہ ایک بار پھر اس کے ساتھ جت گئی۔ وائٹل سائنز لینے کے بعد وہ جلدی جلدی اس کے لیے انجکشن تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔ سر کی چوٹوں کے بعد وہ ابھی خود بھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی مگر اپنے مریض کے لیے اس کی تگ و دو انتہا کو چھو رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹا فلیمنگ کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد وہ قدرے مایوس نظر آنے لگی۔ فلیمنگ ایک بار پھر غنودگی میں چلا گیا تھا۔ اس کا مسئلہ یہ ہوا تھا کہ اس کا بلڈ پریشر اوپر نہیں آ رہا تھا۔ غزالہ بار بار بی پی اپریٹس استعمال کر رہی تھی۔ آخر اس نے اپریٹس ایک طرف پھینک دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"کتنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ساٹھ اور پچاس۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"انہیں کسی اچھے اسپتال کی فوری ضرورت ہے۔"

"اور اسپتال کا فاصلہ یہاں سے سیکڑوں میل ہوگا۔"

ہم سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔ مسز ڈورتھی کے کان کھڑے ہو گئے "تم کیا کہہ رہے ہو۔ ان کی حالت تو ٹھیک ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہاں... آپ دعا کریں۔" غزالہ نے کہا۔

"دعا تو میرا رواں رواں کر رہا ہے۔ فلیمنگ کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ تم نے جس طرح میرے شوہر کی زندگی کے لیے جدوجہد کی ہے' میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔ خدا ان کو زندگی دے' ہم دونوں ساری عمر تمہارے شکر گزار رہیں گے۔"

غزالہ نے تسلی تشفی دے کر مسز ڈورتھی کو باہر بھیج دیا اور ایک بار پھر فلیمنگ کی حالت سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس رات پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے پیشے کے حوالے سے کتنی محنتی اور جفاکش ہے۔ وہ رات بھر جاگتی رہی اور میں بھی جاگتا رہا۔ رات تیسرے پہر تابی اٹھ گیا۔ وہ مچل مچل کر غزالہ کی گود میں جانا چاہ رہا تھا لیکن غزالہ کو بالکل فرصت نہیں تھی۔ میں نے تابی کو اٹھا لیا اور باہر نکل کر عرشے پر ٹہلنے لگا۔ تاریک آسمان کے نیچے حد نگاہ تک تاریک سمندر تھا اور ان دونوں لامتناہی تاریکیوں کے درمیان یہ نیم روشن جہاز اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ جہاز کے نچلے حصے سے گھڑگھڑاہٹ کی آواز مسلسل بلند ہو رہی تھی' لگا اب یہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔

ہوا کی خنکی قابل برداشت تھی۔ میں تابی کو لے کر ٹہلتا رہا' وہ میرے کندھے سے لگا لگا سو گیا۔ میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور تابی کو دیکھنے لگا۔ نجانے کیوں مجھے ثنا کی یاد آ گئی' بچپن میں وہ بھی تو اسی طرح میرے کندھے سے لگی لگی سو جایا کرتی تھی اور اپنے گھر کے برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے میں اسے دیکھتا رہتا تھا۔ یہ بھی کچھ ویسی ہی پوزیشن تھی۔ سمندری ہوا سے تابی کے خوب صورت گھونگریالے بال ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ جیسے صحرائی رقص کر رہے ہوں۔ میں یہ رقص دیکھنے لگا۔ اس وقت مار دھاڑ کرنے والا اور اپنی زندگی سے کھلونے کی طرح کھیلنے والا شاد جہانی مجھ سے جدا ہو کر کہیں دور چلا گیا تھا' اب وہ شاد خان رہ گیا تھا' جسے خوب صورت تصویروں سے اور موسیقی سے پیار تھا۔ جسے پھول پرندے اور پہاڑی مناظر پسند تھے' اور جو بچوں کو کائنات کی سب سے حسین چیز تصور کرتا تھا۔

ایک دم ایک مدھم آہٹ سے میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ غزالہ نجانے کب سے میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے ریشمی بال ہوا سے منتشر ہو کر اس کے ملیح چہرے پر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "لائیے' تابی کو مجھے دے دیجیے۔"

میں نے بڑی آہستگی کے ساتھ تابی کو غزالہ کی گود میں دے دیا' ایسا کرتے ہوئے ہم دونوں بالکل قریب آ گئے تھے' میرے ہاتھ غزالہ سے چھو رہے تھے اور ہمارے درمیان صرف تابی تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ ایک مرد اور عورت کے درمیانی فاصلے کو مٹانے کا سبب بن جاتا ہے۔ میری احتیاط کے باوجود تابی کسمسا کر جاگ گیا۔ غزالہ کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ اس سے چپک گیا۔ غزالہ اس کا سر اور رخسار چومنے لگی۔ شاید دانا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بچہ گود میں ہو تو عورت مکمل نظر آتی ہے اور بچے کی موجودگی میں اس کی نسوانیت اور دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں نے تابی کو دیکھتے ہوئے کہا "شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ بچہ قدرت کی سب سے حسین تخلیق ہے۔"

اس نے ایک بار پھر تابی کا سر چوما "آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں؟" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"ہاں... بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"تو پھر آپ..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا "میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ تم کہنا چاہتی ہو کہ پھر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں۔"

اس نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر اثبات میں سر ہلایا "تو پھر کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈ دو ناں میرے لیے۔ تم سے زیادہ کسے معلوم ہوگا کہ مجھے کیسی لڑکی پسند آئے گی۔ اس لڑکی کا ظاہر باطن سب کچھ تمہیں معلوم ہے۔" وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا "بولتی کیوں نہیں؟ ڈھونڈو گی ناں؟"

"اچھا۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"لیکن میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں۔ تم نہیں ڈھونڈ سکو گی۔ کیونکہ اپنے جیسی تم بس خود ہی ہو۔" وہ گڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی' کلینک نما کمرے کے اندر سے مسز ڈورتھی کی آواز آئی۔ اس نے غزالہ کو بتایا کہ مسٹر فلیمنگ پانی مانگ رہے ہیں۔

"اچھا میں خود آتی ہوں۔" غزالہ نے کہا۔

اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور تابی کو لے کر اندر چلی گئی۔ چار پانچ منٹ اسی طرح گزر گئے' تب میں نے مسز ذور تھی کو تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھا۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی میڈیسن وغیرہ تھی۔ صرف چند سیکنڈ بعد غزالہ کی چیختی ہوئی سی آواز اندر آئی "شاہ جہاں۔ جلدی سے اندر آئیں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں اندر پہنچا تو فلیمنگ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مسز ذور تھی دھاڑیں مار رہی تھی' اور بار بار شوہر سے لپٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ غزالہ نے چیخ کر کہا "شاہ جہاں! انہیں سنبھالو۔"

میں نے مسز ذور تھی کو بانہوں میں لے لیا۔ غزالہ بار بار دونوں ہاتھوں سے فلیمنگ کا سینہ دبا رہی تھی۔ یہ ڈوبتی ہوئی دھڑکن کو بحال کرنے کی آخری کوشش تھی۔ چند سیکنڈ بعد فلیمنگ کی سانس بالکل رک گئی اور آنکھیں پتھرا گئیں' وہ مرچکا تھا۔ غزالہ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ وہ کچھ دیر فلیمنگ کی نبض ٹٹولنے کی کوشش کرتی رہی' پھر اس نے اپنے ہاتھ سے فلیمنگ کی آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے ذور تھی کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے محبوب شوہر سے لپٹ کر چیخ و پکار کرنے لگی۔ ننھا تابی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا اور وہ بھی زور زور سے رونے لگا۔ دو تین منٹ کے اندر کپتان جم اور مائیکل سمیت کئی افراد کمرے کے اندر اور باہر جمع ہو گئے۔

مائیکل نے غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک سیاہ فام سے کہا "ڈاکٹرز کا کام اب ختم ہو گیا۔ اس کو اور اس کے ساتھی کو واپس کیبن میں پہنچا دو۔"

سیاہ فام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اس نے اپنی "ایم جی" ہاتھ میں کی اور مجھے غزالہ سمیت نیچے لے آیا۔ چاول کی بوریوں کے بہت بڑے انبار میں سے گزر کر ہم خفیہ دروازے تک پہنچے اور وہاں سے نکل کر زیریں کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔ ہم تقریباً چوبیس گھنٹے بعد لوٹے تھے۔ ہمارے کیبن میں زریں گل اور کلثوم' صفدر سمیت سخت پریشان تھے جونہی ہم کیبن میں داخل ہوئے انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں وہ بھی سنتے رہے تھے' ہم نے انہیں بتایا کہ یہ فائرنگ کس کی طرف سے تھی اور اس کا انجام کیا ہوا ہے۔ ہم نے وائس کپتان فلیمنگ کی موت کا احوال بھی بتایا۔

ایک دم شور کی آواز آئی۔ میں پہچان گیا۔ یہ معتوب اسلم کی آواز تھی۔ وہی اسلم جس کے چہرے پر چند دن پہلے چھڑیاں برسا برسا کر حبشیوں نے اس کا حشر کر دیا تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں بولا تھا "میں جاؤں گا' مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نسرین کے پاس جاؤں گا میں جاؤں گا۔"

ہمارے کیبن میں اضافی سہولتیں موجود تھیں اور ان میں سے ایک سہولت "چھوٹا سا ایک سوراخ" بھی تھا۔ ہم اس سوراخ سے آنکھ لگا کر باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر سوراخ سے آنکھ لگائی اور باہر کا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ اسلم کیبن سے باہر کھڑا تھا' اور اپنے ادھیڑ عمر ساتھی نثار کو بازو سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا "چاچا! آجا' یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"

نثار کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں' وہ اسلم کی منت سماجت کر رہا تھا "اسلم پاگل مت بن۔ وہ یہیں کہیں ہوں گے۔ وہ زندہ نہیں چھوڑیں گے تجھے۔ کیوں موت کو آواز دیتا ہے۔" وہ اسے اندر کیبن میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کوئی نہیں ہے۔ سب چلے گئے ہیں۔" اسلم نے دانت پیس کر کہا اور پورا زور لگا کر نثار کو کھینچنے لگا۔

میں نے دیکھا کہ کیبن کے دروازے کی چابی دروازے کے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ بے خیالی میں حبشی پہرے دار کیبن کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہے اور دروازہ کھلا پا کر اسلم نامی یہ نوجوان قسمت آزمائی پر تل گیا ہے (بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ وائس کپتان فلیمنگ کی موت کا سن کر اس کمپارٹمنٹ میں موجود حبشی افراتفری میں اوپر چلے گئے تھے اور یہ دروازہ کھلا رہ گیا تھا) اسلم نامی یہ نوجوان جذباتی بلکہ کسی حد تک مخبوط الحواس نظر آتا تھا۔ اس کا ساتھی نثار اس کی نسبت کہیں باہوش اور دور اندیش تھا۔ وہ بجا طور پر اسلم کو واپس کیبن میں کھینچ رہا تھا مگر اس پر تو جیسے بھوت سوار تھا' وہ دیوانہ وار زور لگا رہا تھا۔

میں نے سوراخ میں سے پکار کر کہا "نثار! اس کو نکلنے مت دینا۔ وہ چھوڑیں گے نہیں۔"

لیکن میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اسلم نے خود کو نثار کی گرفت سے چھڑا لیا اور سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ نثار اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا۔ یہی وقت تھا جب ایک طرف سے خوں خوار ضیائی پہرے دار نمودار ہوا۔ اس نے خودکار رائفل سیدھی کی اور چیخ کر کچھ کہا۔ اس وقت تک اسلم اور نثار آگے پیچھے بھاگتے سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ سیڑھیوں کے ساتھ دیوار پر ایک رائفل آویزاں لگی ہوئی تھی۔ اسلم شاید اس رائفل تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ابھی اس نے سیڑھیوں پر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ ضیائی حبشی نے عقب سے گولی چلا دی۔ گولی پیچھے آنے والے نثار علی کی پشت میں لگی اور سینہ پھاڑ کر سامنے سے نکل گئی۔ وہ سیڑھیوں کے بالکل سامنے پٹ سے فرش پر گرا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔

اسلم نے نثار کو گولی کھا کر گرتے دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر چیخ کر پلٹا اور نثار کی لاش سے لپٹ گیا۔ وہ اسے جھنجوڑنے لگا "اٹھ جا چاچا۔ اٹھ جا۔ میں کہتا ہوں اٹھ جا۔"

لیکن "چاچا" وہاں کہاں تھا۔ وہ تو دور جا چکا تھا' اپنے جسم سے دور اور اس قید خانے سے بھی دور۔ اب کوئی قانون' کوئی لاک اپ' کوئی زنجیر اسے پابند نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسلم اس سے لپٹ کر اسے جھنجوڑتا رہا' پھر ایک دم بجلی کی طرح تڑپ کر وہ ضیائی پہرے دار پر جھپٹ پڑا۔ اس کے انداز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ ضیائی پہرے دار نے اپنی رائفل استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی' وہ... لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا' مگر کچھ بھی تھا وہ اسلم کے مقابلے میں کہیں زیادہ جسیم اور طاقت ور تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں سنبھل گیا' دونوں کے درمیان چند لمحے تک زبردست کشمکش ہوئی پھر ضیائی غالب آ گیا۔ وہ اسلم کو گرا کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ سر تا پا ایک مشتعل درندہ نظر آ رہا تھا' ایک درندے ہی کی طرح اس نے اسلم کے کندھے میں اپنے دانت گاڑے اور گوشت کا ایک لوتھڑا اکھاڑ لیا۔ اسلم کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے اپنے دوست کی موت پر دیوانہ سا ہو گیا تھا' اب بالکل بے بس نظر آیا۔ اس کا پُرجوش حملہ چند ہی لمحے کے اندر کربناک بے چارگی میں ڈھل گیا تھا۔ حقیقت ایسی ہی ناہموار اور کھردری ہوا کرتی ہے۔ یہ فلم نہیں تھی جس میں اپنے دوست کی موت پر سراپا غضب بن جانے والا شخص دشمن کے لیے موت بن جاتا ہے' یہ زندگی تھی جس میں کبھی کبھی جرأت کو بھی سرنگوں ہونا پڑتا ہے اور دلیری بھی پشیماں ہوتی ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اسلم کی دلدوز چیخوں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ منظر ایسا دردناک تھا کہ مجھ جیسے شخص کو بھی اپنا دل ہولتا ہوا محسوس ہوا۔ ضیائی حبشی واقعی درندہ بن گیا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی طور پر چوڑے اور مضبوط جبڑوں کی مدد سے اسلم کو بھنبھوڑ رہا تھا اور اس کی کھال ادھیڑتا چلا جا رہا تھا' خدا کی پناہ' یہ منظر "نگاہ کا عذاب" تھا اور ناقابل برداشت عذاب تھا۔ مجھے لاہور میں پروفیسر اللہ دتا کی کوٹھی کا منظر یاد آ گیا۔ وہاں سائمن نام کے حبشی نے اسی طرح فلم ایکٹریس توشین کے ڈرائیور رمضان کو بھنبھوڑا تھا اور جان سے مار ڈالا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے معتوب اسلم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ میری آنکھوں کے عین سامنے ضیائی حبشی نے اپنے دانت گاڑ کر اسلم کی گردن سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکالا اور اس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ میں اس سے آگے نہیں دیکھ سکا اور سوراخ پر سے آنکھ ہٹا لی۔ صفدر نے جلدی سے آگے بڑھ کر میری جگہ لی' تاہم چند ہی لمحے بعد وہ بھی زرد چہرہ لیے پیچھے ہٹ آیا۔ زریں گل آگے آنا چاہتا تھا مگر صفدر نے اسے منع کر دیا۔ کیبن کے باہر چند گز کی دوری سے ضیائی حبشی کی غرائٹیں سنائی دے رہی تھیں' اور انہیں سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ انسانی آواز ہے۔

اسی دوران میں ایک اور شور برپا ہو گیا۔ یہ شور ان کیبنوں کی طرف سے بلند ہو رہا تھا جہاں بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہونے والے قیدی رکھے گئے تھے۔ یہ لوگ عجیب وحشت زدہ آوازوں میں واویلا کر رہے تھے اور رو رہے تھے۔ میرا اور صفدر کا خیال تھا کہ ان میں سے زیادہ تر قیدی کسی ایک ہی قبیلے یا برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کورس کی شکل میں روتے تھے اور ان کا لب و لہجہ بھی مختلف قسم کا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر شور مچایا تو پھر مچاتے ہی چلے گئے۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار ان پر اس قسم کا دورہ پڑا تھا مگر پہرے داروں کی ڈانٹ پھٹکار سن کر وہ جلد ہی چپ ہو گئے تھے' تاہم اس مرتبہ وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہے تھے' صفدر کا قیافہ تھا کہ انہوں نے ضیائی پہرے دار کو آدم خوری کرتے دیکھ لیا ہے' اور غیر معمولی طور پر دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ بعد ازاں صفدر کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوا۔ جس وقت وحشت زدہ اسلم نے کیبن سے فرار ہونے کی کوشش کی دو کیبنوں میں دوپہر کا کھانا پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کیبنوں کے دروازوں میں موجود خلا کھلے ہوئے تھے۔ اندریں قیدیوں نے نہ صرف نثار کو گولی لگتے دیکھی بلکہ بدنصیب اسلم کی موت کا دلدوز منظر بھی دیکھا۔ ضیائی حبشی کی "آدم خوری" دیکھ کر ان کی دہشت انتہا کو پہنچ گئی اور انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ پورے کمپارٹمنٹ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ قیدی آہ و بکا کر رہے تھے۔ دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے اور پہرے دار ان سے بھی زیادہ شور مچا رہے تھے۔ وہ انہیں خاموش کرانے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ جتنی زیادہ کوشش کرتے تھے قیدیوں کا واویلا اتنا ہی بڑھتا جاتا تھا۔ قیدیوں سے مارپیٹ بھی ہو رہی تھی' ہمیں یہ منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی قیدی

کو شکنجے کی سزا دی جا رہی ہے۔ دوسری گردن میں چپل کا پھندا لگا کر چہرے پر چھریاں برسانے والی سزا۔ جس بدنصیب کو مارا جا رہا تھا اس کی چیخیں فلک شگاف تھیں۔ وہ اپنی آواز سے کوئی نوجوان ہی لگتا تھا۔ اس کی سزا کا خوفناک منظر دیکھ کر اس کے ساتھیوں کی آوازیں سہم سی گئیں۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا کہ معتوب کے چہرے کی کھال دھجیوں سے جدا ہو کر لٹک رہی ہے اور خون سے کمپارٹمنٹ کا فرش سرخ ہو رہا ہے۔ چند ہی لمحوں میں کیبنوں کے اندر موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ پہرے دار قیدیوں کو چپ کرانے کی کوششوں میں بالآخر کامیاب رہے تھے۔ بس چند بچے رو رہے تھے یا پھر ایک عورت چیخ رہی تھی۔ یہ عورت سزا پانے والے کی کوئی قریبی عزیز تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اس عورت کو دیکھا۔ وہ گندمی رنگت کی جواں سال عورت تھی' سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ حلیے اور لباس سے وہ شمالی ہند اور اترپردیش کی باسی لگتی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ دو حبشیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور کمپارٹمنٹ کے عقبی حصے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ عورت ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ حبشیوں کی نیت عورت کے بارے میں درست معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کا بچہ چھین کر واپس کیبن میں بھیج دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے عقبی حصے میں لے گئے۔

قیدیوں نے ایک بار پھر دبی دبی آوازوں میں آہ و بکا شروع کر دی تھی' مگر جونہی یہ آوازیں ذرا بلند ہوئیں پہرے دار دوبارہ گرجنے برسنے لگے۔ ان کی دہاڑیں سن کر قیدیوں کی آوازیں حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں صاحب! یہ لوگ تو ظلم کی انتہا کر رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

میں نے کہا "انتہا تو کسی چیز کی نہیں ہوتی' نہ ظلم کی نہ صبر کی۔ نہ غم کی نہ خوشی کی۔ بعض اوقات ہم جسے انتہا سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ محض ابتدا ہوتی ہے۔"

زریں بولا "خوچہ! جہاز میں کتنا پہرے دار ہوگا۔ کتنا عملہ ہوگا۔ یہ سارا لوگ ملا کر بھی تیس چالیس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اب آپ دیکھیں ادھر تین سو کے قریب قیدی لوگ ہے' اگر یہ سب بغاوت کر دے تو ان بردہ فروشوں کا ایک ایک بوٹی بھی حصے نہ آئے۔"

"تو تم لیڈر بن جاؤ اس جنگ آزادی کے۔" صفدر نے مشورہ دیا۔

"اگر آپ بنائے گا تو ام بن بھی جائے گا اور سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے گا۔"

"اب بات بات پر نذرانہ پیش نہ کیا کرو۔ اس نذرانے میں کسی اور کا حصہ بھی ہے۔" صفدر نے کلثوم کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ بھی اماری طرح پٹھان کا بچی ہے۔ ام کو ایک دم اجازت مرحمت فرمائے گا۔ کیوں کلثوم؟ ام ٹھیک کہہ رہا ہے ناں۔"

"ہاں ہاں۔ جب بھی وقت آیا۔ ام آپ کو ایک دم شہید کرائے گا۔ انشاء اللہ۔" وہ بڑے جوش سے بولی۔

"یہ تو تم دونوں کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔" صفدر نے آنکھیں گھمائیں۔

"آوا۔ ام کو بھی لگتا ہے۔" کلثوم بولی۔

"کیا لگتا ہے؟"

"کہ آوا بگڑا ہوا ہے۔ بلکہ اب تو۔ شاید۔ رک بھی گیا ہے۔"

"کیا رک گیا ہے؟"

زریں بولا "جناب! وہ جہاز کو آوا سمجھ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ آوا۔ امارا مطلب ہے کہ جہاز رک گیا ہے۔"

جہاز واقعی رکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "لگتا ہے کہ رک گیا ہے یا پھر بہت آہستہ ہو گیا ہے۔"

"نہیں' میرا خیال ہے کہ رک ہی گیا ہے۔" میں نے کہا "گھڑ گھڑ کی آواز بالکل نہیں آ رہی۔"

میں نے سوراخ سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا۔ حبشی پہرے دار راکفلیں ہاتھ میں لیے ٹہل رہے تھے۔ وہ معمول سے زیادہ چوکس نظر آتے تھے۔ جس کیبن میں سے کسی قیدی کی مدھم سی آواز بھی سنائی دیتی وہ اس کیبن کا دروازہ چھڑی کے ساتھ زور سے بجاتے اور خوفناک آواز میں دہاڑتے۔ جو چھڑی وہ استعمال کرتے تھے وہ عجیب سی تھی۔ اس کی لمبائی قریباً پانچ فٹ تھی۔ یہ دستے کی طرف سے موٹی تھی پھر بتدریج پتلی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اسے کوڑے کی جدید قسم بھی کہا جا سکتا تھا۔ وہ بعد کی اس چھڑی کو مقامی زبان میں "شال" یا پھر "ڈی بوکو" کہتے تھے۔ میں نے دیکھا کمپارٹمنٹ کے فرش پر سیڑھیوں کے قریب دو جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ایک تو اس جگہ جہاں نثار علی کو گولی لگی تھی اور دوسرے جہاں ضیاعی حبشی نے بدنصیب اسلم کو اپنے دانتوں سے ادھیڑا تھا۔ اس اندوہناک واقعے کا اصل سبب اسلم ہی تھا۔ اس نے اپنی ہیجانی کیفیت میں ایک خطرناک بے وقوفی کی تھی اور نقمۂ اجل بنا تھا۔ نثار علی صرف اسلم کو روکنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگا تھا مگر موت کا شکار ہو گیا تھا۔

میرے ذہن میں "نسرین" کا نام گونجنے لگا۔ یہی نام تھا جو اسلم ہوش میں اور بے ہوشی میں بار بار پکارتا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نام کے پیچھے کوئی کہانی تھی۔ یہ کہانی اسلم جانتا تھا یا پھر نثار علی کو معلوم تھی۔ یہ دونوں راہی عدم ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی کہانی بھی ناپید ہو گئی تھی۔ اب ہمیں کسی نے نہیں بتانا تھا کہ وہ دونوں کہاں سے آئے تھے' ان کے دلوں میں کیا ارمان اور ارادے تھے۔ وہ اپنے پیچھے اپنے کن کن پیاروں کو دست بدعا چھوڑ آئے تھے۔ انہیں آج کسی وقت سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جانا تھا اپنی تمام خواہشوں اور آرزوؤں سمیت۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کی لاشوں کے کچھ منتخب حصے قاتلوں کی آتش شکم کو بجھانے کے لیے فریج میں محفوظ کر لیے جاتے' اور باقی اجزا بچا گوشت مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر کی سطح پر پھینک دیا جاتا۔

صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! ان دو موتوں سے مائیکل کو دوہرا نقصان ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک تو دو بردے ضائع ہوئے' دوسرا قیدیوں میں خاص طور سے انڈین قیدیوں میں سراسیمگی پھیل گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سراسیمگی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔"

"ہاں دبی دبی آوازیں تو اب بھی آ رہی ہیں۔"

"دیسے زریں گل کی بات کوئی ایسی ناممکن بھی نہیں۔ اگر یہاں موجود سارے لوگ مزاحمت پر اتر آئیں تو مائیکل اینڈ کمپنی کو چھٹی کا دودھ یاد آ سکتا ہے۔"

"لیکن اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "ان لوگوں نے یہ کاروبار کوئی نیا نیا شروع نہیں کیا۔ تم یہ کیبن ہی دیکھ لو' اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عرصہ دراز سے ہم جیسے بردوں کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے ہم جیسی ترکیبیں سوچی ہوں گی اور مائیکل اینڈ کمپنی نے اس کا توڑ کیا ہوگا۔"

"لیکن پہلے لوگوں میں کوئی استاد جہانی تو نہیں ہوگا ناں۔"

"اور نہ ہی صفدر صیب ہوگا۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔

فضا میں عجیب سی سراسیمگی اور دہشت رچی ہوئی تھی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے اور وہ ماتم کناں دبی دبی آوازیں سنتے رہے جو انڈین قیدیوں کے کیبنوں سے بلند ہو رہی تھیں۔ کبھی یہ آوازیں رونے دھونے کی ہوتی تھیں اور کبھی ان میں پوجا پاٹ کا آہنگ محسوس ہوتا تھا۔ جہاز واقعی رک چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی مرمت کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہو۔ ایسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ساحل یا بندرگاہ پر رکا ہو۔ لیکن کوئی ایسی آواز ابھی تک ہم تک نہیں پہنچی تھی جس سے پتا چلتا کہ ہم واقعی بندرگاہ پر ہیں چہار سو مکمل سکوت تھا۔ اس سکوت کی وجہ سے یہ خیال آتا تھا کہ شاید جہاز چلتے چلتے اچانک خراب ہو گیا ہے اور اسے کہیں ویران سمندر میں رکنا پڑ گیا ہے۔

ہم باتوں سے ماحول کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر یہ کوئی ایسی کامیاب کوشش نہیں تھی۔ باتوں کے باوجود ہمارا دھیان انہی اموات کی طرف لگا ہوا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں ہوئی تھیں' کانوں میں رہ رہ کر اس انڈین لڑکی کی آہ و بکا گونج رہی تھی جسے سیاہ فام ہمارے سامنے گھسیٹتے ہوئے کسی کمرے میں لے گئے تھے۔

O☆O

اگلے چار روز بڑی گومگو کی کیفیت میں گزرے۔ جہاز ویران سمندر میں اسی مقام پر رکا رہا۔ بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے مسلسل مغرب کی طرف سفر کیا تھا۔ اس کا یقینی مطلب یہ تھا کہ ہم بحیرہ عرب میں سفر کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے کہیں راستے میں رخ تبدیل نہیں کیا تھا تو ہو سکتا تھا کہ ہم خلیج عدن کے آس پاس پہنچ چکے ہوں۔ ان چار دنوں میں کمپارٹمنٹ کی فضا سوگوار سی رہی تھی۔ اس سوگواری کی سب سے بڑی وجہ ان انڈین قیدیوں کی آہ و زاری تھی جو کسی دور دراز علاقے سے پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ وہ عجیب سی زبان بولتے تھے اور کسی وقت جانوروں کے ایک ریوڑ کی طرح یک لخت چیخنے چلانے لگتے تھے۔ ایسے میں پہرے داروں کی دہاڑوں سے کمپارٹمنٹ گونجنے لگتا تھا۔ ان انڈین قیدیوں میں سے کئی ایک کے ساتھ سخت مار پیٹ بھی ہو چکی تھی۔ لیکن اس مار پیٹ سے الٹا اثر ہوتا تھا' وہ مزید خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ اس ماحول نے دیگر محبوس افراد پر بھی اثر کیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ گم صم نظر آنے لگے تھے۔ خاص طور سے جس کیبن میں سے نکلنے والے دو افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا وہاں پر اس کی فضا کچھ زیادہ ہی تھی۔

غیر یقینی صورت حال کے باوجود ہمارے کیبن میں زریں گل اور کلثوم کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں۔ کلثوم ہر ذکر کو

مونث اور ہر مونث کو مذکر بنا دیتی تھی۔ اس کے علاوہ زریں گل کی زیر ہدایت انشاءاللہ اور ماشاءاللہ کا استعمال اتنا زیادہ کرتی تھی کہ اکثر باتیں مذاق بن جاتی تھیں۔

یہ پانچویں روز کی بات ہے۔ علی الصباح ایک ضیائی پہرے دار دو دیگر حبشیوں کے ساتھ ہمارے کیبن کے دروازے پر پہنچا۔ پہلے مجھے کیبن سے نکال کر الٹی ہتھکڑی لگائی گئی پھر غزالہ کو باہر نکال لیا گیا۔ تالی سو رہا تھا غزالہ نے اسے کلثوم کے سپرد کیا اور میرے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ مسلح پہرے دار ہمارے عقب میں تھے اور پوری طرح چوکس تھے۔ حسب معمول پہلے ہم اسٹور میں پہنچے اور وہاں خفیہ راستے کے ذریعے چاولوں کے عظیم الشان گودام میں پہنچ گئے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کس سلسلے میں طلب کیا گیا ہے۔ عرشے پر پہنچے تو دور تک کھلا سمندر اور اوپر نیلا آسمان نظر آیا۔ چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر کسی چھوٹے سے جزیرے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ جزیرے پر سبزہ تھا اور بلند و بالا درخت تھے۔ ہوا میں وہ خوشگوار حرارت موجود تھی جو عرب اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی خصوصیت ہے۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ ہم کہاں اور کس مقام پر ہیں لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مائیکل کے آرام دہ کمرے میں اس کے سامنے موجود تھے۔ وہ حسب معمول پھیل کر صوفے پر بیٹھا تھا اور وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ اس کا موڈ قدرے خوشگوار نظر آیا۔

میرا حال چال پوچھ کر غزالہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "اچھا کیا تم اس بچو نگڑے کو ساتھ نہیں لائی ہو۔"

"کیا کام ہے ہم سے؟" میں نے پوچھا۔

"کام بھی بتا دیتے ہیں' پہلے کپڑے تو بدل لو۔۔۔ تمہیں کہیں لے کر جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو۔ کیا جہاز کچھ زیادہ پسند آ گیا ہے؟"

"کیا مطلب۔ ہم جہاز سے باہر جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں' جلد ہی واپس آ جائیں گے۔"

"اگر۔۔۔ ہم نہ جانا چاہیں تو۔۔۔؟"

"اگر مگر کی گنجائش تو تمہارے پاس ہے ہی نہیں۔"

مائیکل کے لہجے میں سختی عود کر آئی "چلو کپڑے بدل لو۔"

ایک اینگلو انڈین ملازمہ ہم دونوں کے لباس لیے موجود تھی۔ اس نے میرا لباس مجھے تھما دیا اور دوسرا لباس غزالہ کو تھما کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ مائیکل کے اشارے پر میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور میں کپڑے بدلنے کے لیے ایک بغلی کمرے میں چلا گیا۔ مجھے پہننے کے لیے کارڈرائے کی پتلون اور آدھے بازو کی پھول دار بش شرٹ دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ پالش شدہ جوتے تھے اور سفید براق رومال تھا۔ جس وقت میں کپڑے بدل رہا تھا کمرے کے باہر سے مجھے پروفیسر اللہ دتا کی آواز آئی۔ وہ مائیکل سے مخاطب ہو کر بڑی التجا سے بولا "میں شائستہ سے ذرا دیر کے لیے مل لوں؟"

"وہ باتھ روم میں ہے۔" مائیکل نے خشک لہجے میں کہا۔

"وہ کب تک آ جائے گی؟"

"اب مجھے کیا پتا کہ اس نے کتنی دیر میں نہانا ہے۔" مائیکل نے بھڑک کر جواب دیا۔

"مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جہاز پر کب واپس آ جائے گی؟"

"کل تک آ جائے گی۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر پروفیسر کی گھگیائی ہوئی آواز آئی "کیا میں۔۔۔ کیا میں ساتھ جا سکتا ہوں۔ ذرا میرا بھی جی اور ہو جائے گا۔"

"تم اپنا جی یہیں پر رہ کر بہلاؤ۔" مائیکل نے کہا۔

"میں۔۔۔ تمہارا۔۔۔ سامان وغیرہ اٹھا لوں گا بیٹا۔"

"بڑا شوق ہے تمہیں سامان اٹھانے کا۔ کیا گودام کے مزدوروں میں بھیج دوں تمہیں؟"

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"تم تو صرف یہ چاہتے ہو کہ سایہ بن کر رات دن بچی کے ساتھ رہو۔ خبطی بڈھے' وہ اب دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ اس کی جان چھوڑ دو۔ ذرا آزادی سے جینے دو اسے' کیوں اس کے دماغ کا روگ بن رہے ہو۔ اس دن صرف اور صرف تمہاری وجہ سے وہ پاگل پن پر اتر آئی تھی۔ کیا اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ برستی گولیوں میں بھاگ دوڑ کرتی اور تمہاری پھٹی پرانی زندگی کو بچانے کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگاتی۔"

پروفیسر اللہ دتا' مائیکل کی کڑوی کسیلی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی پروفیسر اللہ دتا ہے جس کے کلینک کے باہر گاڑیوں کی طویل قطار نظر آتی تھی

اور جس کے ایک فون پر سرکاری دفاتر میں ہر طرف "ایمرجنسی" کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔ اپنی اولاد کی محبت میں جھکے سے حقیر ہو کر یہ شخص سمندر کے تھپیڑے کھا رہا تھا اور بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی منت سماجت کا مائیکل نے مثبت جواب نہیں دیا اور اسے واپس بھیج دیا۔

میں کپڑے بدل کر باہر نکلا تو تھوڑی ہی دیر بعد شائستہ بھی کمرے میں آ گئی۔ وہ اُجلے پھول کی طرح نظر آ رہی تھی۔ رنگین کپڑوں میں اس کا طویل حسن ایک خوب صورت "کنٹراسٹ" پیش کر رہا تھا۔ مائیکل نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے سامنے ہی اس کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔۔۔ کچھ دیر بعد غزالہ بھی لباس بدل کر آ گئی۔ مائیکل نے ضیائی کو آواز دی۔ اس نے اندر آ کر مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگا دی' تاہم اس مرتبہ اتنی رعایت کی گئی کہ ہتھکڑی سامنے کی طرف لگائی گئی۔

"چلو آؤ۔" مائیکل نے تحکم سے کہا۔

ہم مائیکل اور شائستہ کے پیچھے پیچھے چلتے باہر زیریں عرشے پر آ گئے۔ یہاں سے جزیرہ نسبتاً صاف نظر آ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے جزیرے کی شکل پان کے پتے یا دل سے ملتی جلتی تھی۔ جزیرے کا فاصلہ تقریباً ایک میل رہا ہو گا۔ اردگرد سمندر گہرا نیلا تھا اور دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ جہاز کے پہلو سے رسے اور پائپ کی بنی ہوئی مضبوط سیڑھی لٹک رہی تھی' اس سیڑھی کی لمبائی پچیس فٹ سے زائد نہیں تھی۔ نیچے سمندر میں جہاز ہی کی ایک کشتی موجود تھی۔ اس کشتی میں ایک قیادی سمیت تین مسلح سیاہ فام موجود تھے۔ کینوس کے دو بڑے تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان تھا' اس کے علاوہ درمیانے سائز کے دو واٹر کولر بھی کشتی میں رکھے تھے۔ ہم یکے بعد دیگرے سیڑھی اتر کر کشتی میں پہنچے۔ ہتھکڑی کے سبب مجھے اترنا خاصا دشوار محسوس ہوا۔ ہمارے بیٹھتے ہی تنومند حبشیوں نے چپو سنبھالے اور کشتی کو جزیرے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مائیکل ہمیں جزیرے پر کیوں لے جا رہا ہے اور یہ کہ جزیرے پر لے جانے کے لیے اس نے ہم دونوں کا انتخاب ہی کیوں کیا ہے۔

کشتی جہاز سے سو ڈیڑھ سو گز دور گئی تو ہمیں جہاز کی عقبی سمت بھی نظر آنے لگی۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہاں جہاز کے متاثرہ حصے کی مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ تین کشتیاں رسوں سے باندھ کر ایک پلیٹ فارم سا تیار کیا گیا تھا۔ چھ سات باوردی مکینک اور دیگر افراد یہاں موجود تھے۔ دو افراد غوطہ خوری کے لباس میں بھی نظر آ رہے تھے۔ جہاز کی متاثرہ چرخی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ "غوطہ خوری" کا لباس اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

میں نے مائیکل سے پوچھا "کیا زیادہ نقصان ہوا ہے؟"

"نہیں اتنا زیادہ تو نہیں' بہرحال ایک دن اور لگ جائے گا۔"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جزیرے پر۔۔۔ میں نے سوچا چلو اس دوران میں تھوڑی سی تفریح ہی ہو جائے' یہ جزیرہ جو تم دیکھ رہے ہو' بڑا خاص جزیرہ ہے۔ اس کی شکل انسانی دل سے ملتی ہے۔ اس لیے یار لوگ اسے محبت کا جزیرہ کہتے ہیں۔ جن جہاز رانوں کو موقع ملتا ہے اور وہ کیپٹن جم کی طرح بڈھے کھوسٹ بھی نہیں ہوتے' وہ اس جزیرے پر ایک آدھ رات کے لیے ضرور رکتے ہیں۔ ہمیں تو جہاز کی مرمت کے سبب خصوصی موقع ملا ہوا ہے۔"

"تو کیا۔۔۔ ہم یہاں رات گزاریں گے؟"

"اس میں حرج بھی کوئی نہیں۔ یہ بہت صاف ستھرا جزیرہ ہے۔ کوئی کیڑا مکوڑا نہیں۔ کوئی پریشانی نہیں۔ موسم تو تم دیکھ ہی رہے ہو' بغیر خیمے کے بڑے مزے سے رات گزاری جا سکتی ہے۔ تھوڑا بہت مچھر ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے لیے آئل ہے ہمارے پاس۔۔۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم ہمیں کیوں لے جا رہے ہو اپنے ساتھ؟"

"کیوں' تم کیوں نہیں جا سکتے؟ تم دونوں محبت نہیں کرتے ایک دوسرے سے؟"

میں نے چونک کر غزالہ کی طرف دیکھا' وہ ذرا فاصلے پر بیٹھی تھی اور سمندر کی طرف متوجہ تھی۔ تالی کی دوری اسے پریشان کر رہی تھی۔ مائیکل نے کہا "تم مشرقی لوگ بدکتے کیوں ہو محبت کے نام سے؟"

میں نے کہا "معاف کرنا' تمہارے خون آشام منہ سے "محبت' خوب صورتی" اور اس قسم کے دوسرے لفظ کچھ اچھے نہیں لگتے۔"

"میں نے تمہیں تبصرہ فرمانے کو نہیں کہا ہے۔" مائیکل غرایا "اگر کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے تو چونچ بند کر کے بیٹھے رہو۔"

خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ پُرسکون نیلے سمندر میں چپوؤں کی چھپ چھپ موسیقی کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ جہاز لحہ بہ لحہ ہم سے دور ہو رہا تھا اور جزیرہ قریب تر آ رہا تھا۔ غزالہ کی پریشان سوالیہ نگاہیں بار بار میری طرف اٹھ جاتی تھیں۔ لیکن مجھے خود کچھ معلوم نہیں تھا اسے کیا بتاتا'

اور اگر معلوم ہوتا بھی تو ان لوگوں کے سامنے کیسے بتا سکتا تھا۔ چپو چلانے سے سیاہ فاموں کو پسینہ آگیا اور ان کے بدن کا فولاد سورج کی روشنی میں چمکنے لگا۔ خیابی پہرے دار ہاتھوں میں "ایم جی" لیے بالکل چوکس بیٹھا تھا۔ دوسرے سیاہ فاموں کی طرح اس کے جسم پر بھی صرف ایک پتلون تھی۔ اس نے بڑے مہنگے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس خیابی کو دوسرے سیاہ فاموں سے جو شے جدا کرتی تھی وہ اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑے تھے۔ ان جبڑوں کو دیکھنے سے ہی ان کی مضبوطی اور خوں خواری کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے میں ہم جزیرے کے ساحل سے جا لگے۔ ہم "ول" کے چونچ والے حصے کی طرف اترے تھے۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ واقعی خوب صورت اور پُرسکون تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ہر جھونکے میں جنگلی پھولوں اور دیگر نباتات کی مہک رچی بسی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جوں جوں سورج اوپر آئے گا اس دل آویز مہک میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہم کنارے پر کھڑے ہو کر جہاز کو دیکھتے رہے۔ "ہرکولیس" کے حروف جہاز کے پہلو پر چمک رہے تھے۔ عرشے پر حرکت کرتے ہوئے افراد نقطوں کی طرح نظر آتے تھے۔ ایک لہر شور مچاتی، جھاگ اڑاتی ہوئی آئی اور ہمیں پنڈلیوں تک بھگو گئی۔

مائیکل کی ہدایت کے مطابق خیابی پہرے دار کشتی کے قریب پہرے پر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا پہرے دار جزیرے پر کچھ آگے چلا گیا اور ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ تیسرے سیاہ فام نے ہمارا سامان خورد و نوش اٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔ ہم جزیرے کے قریباً وسط میں آگئے۔ یہاں کھجوروں کے کئی جھنڈ تھے اور خود رو پودے نظر آرہے تھے۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھار یہاں اکا دکا لوگ آتے رہتے ہیں۔ کئی درختوں کے تنوں پر عورتوں اور مردوں کے نام کندہ تھے۔ کہیں کہیں خالی ٹن اور خالی بوتلیں وغیرہ بھی پڑی نظر آجاتی تھیں۔ کسی فنکار سیاح نے فرصت کے اوقات میں کھجور کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے کو بڑی خوب صورتی سے تراشا تھا اور دوبارہ سے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اس چار پانچ فٹ اونچے تنے کو بڑی چابک دستی مگر بے حجابی سے مرد عورت کی شکل دی گئی تھی۔ وہ برہنہ حالت میں ایک دوسرے کے اندر غرق تھے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں ایک دو ایسے ہی مکمل اور نامکمل مجسمے نظر آرہے تھے۔ کچھ لوگوں نے اپنے نام بھی کندہ کر رکھے تھے۔ ایسے ہی دو ناموں کے نیچے مارکر کی پکی روشنائی سے لکھا تھا "محبت کے جزیرے پر تین حسین راتوں کی یاد میں!"

سیاہ فام خدمت گار نے ایک ہموار جگہ پر بڑی سی قالین نما دری بچھا دی اور سامان رکھ دیا۔ ایک ایسی ہی دری اس نے چند گز دور کھجوروں کے نیچے بچھا دی۔ مائیکل نے شائستہ سے کہا "ڈاکٹر کو لے کر گھومو پھرو۔"

شائستہ نے اثبات میں سر ہلایا اور غزالہ کو لے کر کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی۔ غزالہ کے چہرے پر تذبذب اور پریشانی صاف پڑھی جاسکتی تھی۔

میں نے مائیکل سے کہا "یہ سب کیا ہے؟"

"تفریح ہے اور کیا ہے۔ ہم یہاں شب گزاریں گے، کل جہاز پر واپس چلے جائیں گے۔ پرانے جہاز رانوں کا عقیدہ ہے کہ جو جوڑے اس جزیرے پر رات گزارتے ہیں، ان کی محبت کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔"

"تمہیں نئی زندگی کی ضرورت ہوگی، ہمارے لیے پرانی زندگی ہی کافی ہے۔"

"ناشکری مت کرو۔" وہ تحکم سے بولا "تمہیں پورے چوبیس گھنٹے آزادی اور تفریح کے مل رہے ہیں اور تمہاری سویٹ ہارٹ بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

"اس مہربانی کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"بہت خاص تو نہیں۔ بہرحال تم نے بمبئی جاکر اور وہاں سے دونوں لڑکیوں کو پار کر کے میرا ایک مسئلہ حل کیا ہے۔ سمجھو اسی کا انعام ہے یہ۔"

"میرے خیال میں یہ اتنا بڑا انعام نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اور ڈاکٹر اس انداز میں یہاں رات نہیں گزار سکتے جس انداز میں تم چاہتے ہو۔"

"وہ کیوں؟" مائیکل نے آنکھیں نکالیں "کیا تم ایک دوسرے سے پیار نہیں کرتے ہو؟"

"کرتے ہیں۔ لیکن تمہارے پیار اور ہمارے پیار میں فرق ہوتا ہے۔"

"میں کسی بوگس فرق کو نہیں مانتا۔ کیا تم جسمانی طور پر اسے حاصل کرنا نہیں چاہتے؟"

"شاید چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ جسمانی طور پر تمہارے قریب آنا نہیں چاہتی؟"

"شاید چاہتی ہو... لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ زیادہ سادھو اور اوتار بننے کی کوشش مت کرو۔ اگر اس کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہے یا اُن کا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں دو منٹ میں یہ مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔"

"کیا تم نفسیاتی ماہر بھی ہو؟"

"ہاں نفسیاتی ماہر بھی ہوں اور یہ دیکھو میری ڈگری!" اس نے اپنے کوٹ کے نیچے سے ۳۸ بور کا ریوالور نکالتے ہوئے کہا "تمہاری سویٹ ہارٹ کو بلکہ تم دونوں کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔"

"یہ تو ایسے ہی ہے جیسے دھوپ سے نڈھال شخص کو آگ تاپنے پر مجبور کیا جائے۔ محبت کوئی زبردستی والی چیز نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں تبصرے کرنے کی اجازت نہیں دی، صرف تفریح کی اجازت دی ہے۔" اس نے ریوالور کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔

مائیکل کے نادر شاہی حکم کے مطابق میں نے دن کا باقی حصہ غزالہ کے ساتھ گھومتے پھرتے گزارا۔ جزیرے کا رقبہ بمشکل ایک مربع میل ہوگا۔ مائیکل کی اطلاع کے مطابق یہ واقعی ایک صاف ستھرا جزیرہ تھا، حشرات الارض نہ ہونے کے برابر تھے۔ کھجوروں اور ناریل کے درمیان کہیں کہیں ریتلے رقبے بھی تھے۔ ہم نے جوتے اتار دیے اور ساحل کے ساتھ ننگے پاؤں گھومتے رہے۔ غزالہ نے کہا "یہ شخص ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟"

"کہتا ہے کہ تفریح کے لیے لایا ہوں۔"

"مگر ہمیں ہی کیوں لایا ہے؟"

"بس اس کی مرضی ہے۔"

"میں تابی کے لیے بہت پریشان ہوں۔ وہ جاگتے ہی مجھے ڈھونڈنا شروع کر دے گا۔"

"چلو کلثوم تو ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سنبھال لے گی۔"

"ہاں، اس کے ساتھ تھوڑا بہت وقت گزار لیتا ہے۔"

"ویسے یہ تابی بڑا پیارا بچہ ہے، اور جتنا پیارا ہے اتنا ہی خوش قسمت بھی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تمہارا پیار ملا ہے اسے۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی، پھر بات بدل کر بولی "کیا آپ نے مائیکل سے معلوم کیا کہ ہم کس جگہ پر ہیں؟"

"ہاں، میں نے ابھی پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہم اومان کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور اب خلیج عدن کے آس پاس ہیں۔ ہماری بائیں جانب "حدی بُو" کا مشہور جزیرہ ہے۔ اگر مائیکل کی بات کو درست مانا جائے تو پھر میرے نالج کے مطابق ہم افریقہ کے مشرقی ساحل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم سیدھے چلتے رہیں تو غالباً صومالیہ کے علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اگر بائیں رخ پر مڑ گئے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ منزل کون سی ہو۔"

"میرا دل... بہت ڈر رہا ہے شاہ جہاں! پتا نہیں آنے والے دنوں میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں، یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے، میں ہی بدقسمت ہوں۔"

"کیوں، تم نے کیا کیا ہے؟"

"نہ آپ مجھے لاہور میں ڈھونڈتے، نہ پروفیسر اللہ رکھا سے آپ کی ملاقات ہوتی اور نہ یہ سارا چکر چلتا۔"

"بدقسمتی کا یہ معیار ہے تو پھر دنیا میں آج تک کوئی خوش قسمت پیدا نہیں ہوا۔ خوشگوار اور ناخوشگوار قسم کے تمام واقعات انسانوں کے وسیلے سے ہی جنم لیتے ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے ہم سمندر سے دور درختوں میں چلے آئے۔ کھجوروں کے جھنڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے غزالہ کا چہرہ ایک بار پھر حیا سے سرخ ہو گیا۔ یہیں پر کسی نامعلوم سیاح کی "فنکاری" عریاں مجسمے کی صورت میں نصب تھی۔ ہم نگاہیں چرا کر آگے بڑھ گئے۔ اگر زریں گل ساتھ ہوتا تو وہ یقیناً مجسمے پر بھرپور لعنت ارسال کرتا اور بار بار لعنت ارسال کرنے کے لیے بار بار بھرپور نظروں سے دیکھتا۔

رات کا کھانا ہم نے سورج غروب ہوتے ہی کھا لیا۔ یہ ایک پُرتکلف کھانا تھا لیکن ایک آدم خور کی صحبت میں یہ کھانا زہر لگ رہا تھا۔ غزالہ تو بس ایک دو لقمے لے کر ہی رہ گئی۔ میں اس کی احتیاط پر دل ہی دل میں محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے گوشت کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ بھی کسی اشرف المخلوقات کا گوشت ہوگا۔ شائستہ البتہ کھا رہی تھی اور گاہے گاہے مائیکل سے بات بھی کر رہی تھی۔ مائیکل اسے یہاں تنہائی کے لمحات گزارنے کے لیے لایا تھا، یہی وجہ تھی کہ پروفیسر شدید خواہش کے باوجود یہاں ہمارے ساتھ نہیں آسکا تھا۔ مائیکل نے اسے جہاز پر ہی رہنے پر مجبور کیا تھا۔ شائستہ جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس کے بال بار بار اڑتے تھے جنہیں وہ سمیٹ کر کانوں کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر ترس بھی آتا تھا، ابھی اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یونیورسٹی کی طالبہ لگتی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ بچے کی ماں بننے والی تھی، اور اس بچے کا باپ ایک ایسا شخص

تھا جسے انسان کہتے ہوئے بھی زبان لڑکھڑاتی تھی۔ وہ ایک غیر قوم' غیر مذہب اور غیر فطرت کا شخص تھا اور اس کا پیشہ دنیا کا بدترین پیشہ بردہ فروشی تھا۔

کھانے کے بعد میں اور مائیکل اکیلے ہی دری پر بیٹھے رہ گئے' مشرق کی طرف چاند روشن تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ انیسویں بیسویں تاریخ کا چاند تھا۔ اس کی روشنی میں درختوں سے جھانکتا ہوا سمندر کا پانی چمکنے لگا اور جزیرے کی نیم ریتلی زمین پر اندھیرے اُجالے کی بساط بچھ گئی۔ مائیکل تکیے سے ٹیک لگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا' وہ آج تھری پیس سوٹ میں ہی یہاں آیا تھا مگر سہ پہر کے بعد اس نے لباس بدل لیا تھا' اب وہ افریقی طرز کے ایک رنگ دار لبادے میں تھا۔ اسکرٹ سے مشابہ اس طویل لبادے کی دونوں جانب دو بڑی بڑی جیبیں تھیں اور ان میں سے ایک جیب کے اندر بھرا ہوا ریوالور تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس ریوالور کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اسی کی ہدایت پر خدمت گار حبشی نے آگ جلائی اور جن کی بوتل' پیالے سمیت مائیکل کے سامنے رکھ دی۔ مائیکل نے مجھے دعوت دی پھر اکیلا ہی گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ میں نے کہا "مائیکل! ایک بات پوچھوں؟"

وہ بولا "مجھے یہ فقرہ بہت اچھا لگا ہے' میں چاہتا ہوں کہ تم ہر سوال سے پہلے یہ فقرہ بول لیا کرو۔"

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کیا شائستہ پر واقعی پروفیسر کے ملازم "منشا" نے مجرمانہ حملہ کیا تھا؟"

"کیوں' تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ خود سے حاملہ ہو گئی ہے۔"

"نہیں' یہ خیال تو نہیں لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ اُس تہ خانے میں کسی اور کی مجال نہیں تھی کہ وہ شائستہ تک رسائی حاصل کر سکتا۔ اسی طرح تمہاری یہ بات بھی کچھ دل کو نہیں لگتی کہ تم نے منشا کو مجرمانہ حملے کی پاداش میں قتل کیا اور دوسرے ملازم اشرف کو اس لیے مارا کہ وہ منشا کی موت سے آگاہ ہو گیا تھا۔"

مائیکل خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا' سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہنے لگا "اچھا' تم بتاؤ' تمہارا کیا تجزیہ ہے ان واقعات کے بارے میں؟"

"میرا تجزیہ شاید تمہیں پسند نہ آئے۔"

"میری پسند کی فکر نہ کرو۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک رات نشے میں دھت ہو کر تم شائستہ کے کمرے میں جا گھسے اور پروفیسر اللہ دتا کے ساتھ کیا ہوا یہ وعدہ بھول گئے کہ شائستہ دس سال بھی تمہاری تحویل میں رہے تو اس کی عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ تم نے تہ خانے کی تاریکی میں بے بس و لاچار لڑکی کو ہوس کا نشانہ بنایا۔ تمہاری اس کارروائی کو منشا نے دیکھ لیا۔ وہ تمہارا رازدار اور ساتھی تھا مگر اس کے علاوہ منشا کی ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ وہ پروفیسر اللہ دتا کے گھر میں بچپن سے تھا اور دل ہی دل میں شائستہ کو پسند کرتا تھا۔ اس نے شائستہ کی چیخ و پکار سنی تو خود پر قابو نہ رکھ سکا اور نتائج سے بے پروا ہو کر تم پر پل پڑا' تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاش غائب کر دی۔ تمہارے دوسرے رازدار ساتھی اشرف کو شبہ ہو گیا کہ تم نے منشا کو مار ڈالا ہے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اشرف کا یہ شبہ تقویت پکڑتا گیا' یہاں تک کہ تمہیں خوف محسوس ہوا کہ اشرف تہ خانے میں تمہاری موجودگی کا راز فاش کر دے گا۔ تم نے اسے بھی مار ڈالا۔ تمہاری درندگی کا ثبوت اشرف کے گوشت کی شکل میں ہمیں تمہاری فریج سے ملا۔"

میں خاموش ہو کر مائیکل کی صورت دیکھنے لگا۔ شراب کے اثر نے اس کا چہرہ تمتما دیا تھا' آگ کی روشنی میں یہ تمتمایا ہوا سیاہ چہرہ کچھ اور بھی عجیب لگ رہا تھا۔ وہ بولا "جو کچھ تم نے کہا ہے یہ سب تمہارا تصور ہے اور ذہن کی اختراع ہے۔ اصلیت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ سو فی صد حقیقت ہے۔"

اس کے آخری الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے سفید دانت دیکھ کر کسی درندے کا تصور ذہن میں آ جاتا تھا "ہاں۔۔۔ تمہارا تجزیہ سو فی صد نہیں تو پچانوے فی صد ضرور درست ہے۔ اب معلوم نہیں اتفاقاً ایسا ہوا ہے یا واقعی تم نے شیطان کا دماغ پایا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو چکا ہے مجھے اس پر شرمندگی نہیں۔ اگر ہم کاتبِ تقدیر کے وجود کو مانتے ہیں تو ہمیں کسی انسان کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیے۔"

"لیکن تم نے اس وقت جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"اس وقت کچھ مجبوریاں تھیں' جو اب نہیں ہیں۔"

اچانک غزالہ کی چیخ سنائی دی۔ میں اور مائیکل دوڑ کر غزالہ تک پہنچے' شائستہ بھی پاس ہی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ ان دونوں کی نگاہیں ریت پر جمی ہوئی تھیں۔ مدھم چاندنی میں ریت پر کوئی چپکلی قسم کی شے نظر آ رہی تھی۔ اسے مینڈک اور چھپکلی کی درمیانی شکل کہنا چاہیے۔

مائیکل نے قہقہہ لگایا "یہ واحد جاندار ہے جو یہاں کھلے عام گھومتا پھرتا نظر آتا ہے' بالکل بے ضرر ہے یہ۔"

اس نے مینڈک نما چھپکلی کو ہاتھ میں پکڑ لیا' پھر کمال بے تکلفی سے اس نے اس جاندار کا سر اپنے منہ میں ڈالا اور دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ شائستہ اور غزالہ کی چیخیں نکل گئیں' مائیکل نے سر ایک طرف تھوک کر دھڑ زمین پر پھینک دیا۔ وہ ذرا دیر تڑپ کر ساکت ہو گیا۔

غزالہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ مائیکل نے کہا "تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو ڈاکٹر۔ ایک طرف اتنے بڑے بڑے آپریشن کر لیتی ہو دوسری طرف مینڈک کو دیکھ کر چیخ اٹھتی ہو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے' اگر زیادہ پریشانی ہے تو میں تمہارے بستر کے قریب بھی آگ جلوا دیتا ہوں۔"

پھر اس نے حبشی خدمت گار کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔ خدمت گار بھاگتا ہوا آیا۔ مائیکل نے افریقی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ وہ کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا اور اس دوسری دری کے قریب آگ جلانے لگا جو کھجوروں کے عین نیچے بچھائی گئی تھی۔

آگ جل چکی تو مائیکل نے کہا "جاؤ' اب تم دونوں بھی آرام کرو۔"

میں اور غزالہ کھجوروں کے جھنڈ کی طرف چل دیے۔ ہم پندرہ بیس قدم آگے گئے ہوں گے جب مائیکل نے مجھے آواز دے کر واپس بلا لیا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مجھے غصہ مت دلانا۔ ورنہ تم دونوں کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔"

"کیا مطلب؟"

"دھوکا بازی نہیں چلے گی۔ تمہیں یہ رات ویسے ہی گزارنی ہے جیسے میں نے کہا ہے۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اس کا لہجہ ایک دم خطرناک ہو گیا "یہ میرا حکم ہے' اور یاد رکھو' میرا حکم یہاں قانون ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے' لیکن تمہیں ہمارے مزاج کا تو خیال رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں اکٹھے رات کیسے گزار سکتے ہیں؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میرا مطلب ہے کہ ہم اپنے بستر کہیں اور بچھا لیتے ہیں۔"

"اور کیا سمندر میں اتر جاؤ گے' بس ٹھیک ہیں جہاں بچھے ہیں۔۔۔ اب جاؤ' جو میں نے کہا ہے' وہ ذہن میں رکھنا۔"

نشے نے اس کی آواز کو بھاری بھرکم بنا دیا تھا۔

میں غزالہ کے ساتھ کھجوروں کے نیچے بچھی دری پر جا بیٹھا۔ چاند دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہا تھا' چاندنی کے پاؤں میں لہروں کے شور نے پائل سی باندھ رکھی تھی۔ بڑا خوب صورت منظر تھا' لیکن یہ خوب صورتی ایک بخشش کی طرح تھی اور اس پر جبر کی تہمت بھی لگی ہوئی تھی۔

"کیا کہہ رہا تھا مائیکل؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ بے فکر ہو کر سو جاؤ۔"

"کچھ اور بھی کہہ رہا تھا؟" غزالہ کے لہجے میں شک تھا۔

"نہیں بھئی۔ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔"

میں لیٹ گیا' غزالہ بیٹھی رہی' کچھ دیر بعد وہ بھی لیٹ گئی۔ وہ دری کے بالکل کنارے پر لیٹی تھی۔ اس کے کانوں کے بندے چاندنی میں دمک رہے تھے۔

مائیکل اور شائستہ کے بستر کے قریب جلتا ہوا الاؤ نظر آ رہا تھا اور ان کے مدھم ہیولے بھی دکھائی دیتے تھے۔ میں حیت لیٹا اپنی ہتھکڑی کو دیکھتا رہا' کیسی آزاد فضاؤں میں یہ کیسی تکلیف دہ پابندی تھی۔ ہتھکڑی کی بندش سے میری کلائیاں جلتی سی لگی تھیں۔ اچانک میں چونک گیا' ہمارے سروں کی طرف کوئی موجود تھا۔ اس کا سایہ میرے اور غزالہ کے درمیان خالی جگہ پر رینگ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا۔ وہاں مائیکل کھڑا تھا۔ نشے میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"میں نے کیا کہا تھا تم سے؟" وہ بے حد سخت لہجے میں بولا۔

"تم نے یہی کہا تھا کہ۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ کسی درندے ہی کی طرح دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ کچھ دیر خونی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا' پھر بولا "میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ یاد رکھو کہ یہ آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد میں تمہاری جگہ خدمت گار جوزف کو بھیج دوں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟ تمہاری جگہ میں جوزف کو بھیجوں گا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا۔ لیکن بہت دور نہیں گیا' وہ ہمارے اردگرد ہی منڈلا رہا تھا۔ کسی بھی وقت وہ ہماری خبرگیری کے لیے دوبارہ آ سکتا تھا۔ میں نے کہا "غزالہ! ہمیں۔۔۔ ایک دوسرے کے قریب لیٹنا پڑے گا ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"ورنہ ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں آپ سے پوچھ رہی تھی ناں کہ کیا بات ہے' اور آپ مجھ سے چھپا رہے تھے۔ ابھی کیا کہا ہے مائیکل نے؟"

"کچھ نہیں کہا۔ بس تم قریب آجاؤ۔"

کتنی ہی دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ ساکت لیٹے رہے۔ مائیکل کے دھمکی آمیز لہجے کی بازگشت میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور شاید غزالہ کے کانوں میں بھی گونج رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے قریب... سرسراہٹ محسوس کی' غزالہ میرے قریب سرک آئی تھی۔ اس کے بدن کی خوشبو اور اس کی قربت کا ریشمی احساس میرے آس پاس تھا' لیکن یہ جبر کی قربت تھی اس میں خود سپردگی کو نہیں مصلحت کو دخل تھا۔ میں نے دیکھا مائیکل کسی آسیب کی طرح ہمارے قریب منڈلا رہا تھا۔ اس کا فاصلہ ہم سے پندرہ بیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ چاندنی میں اس کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی' میں نے اپنے بازوؤں کا حلقہ سا بنایا اور غزالہ کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ میری بانہوں میں آگئی۔ یہ بڑی ہوش ربا قربت تھی۔ ایک عرصے بعد۔۔۔ ایک طویل عرصے بعد میں غزالہ کے بدن کو محسوس کر رہا تھا' اس کے دل کی دھڑکن سن رہا تھا' اس کے سانسوں سے چھو رہا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہیں تھا۔ اس خوب صورت زنجیر میں "آمادگی" کی کڑی غائب تھی۔

مگر قربت پھر بھی قربت ہوتی ہے۔ بے شک یہ مصنوعی قربت تھی مگر مجھ پر ستم کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ میرے ہونٹ غزالہ کے مہکتے بالوں سے چھو رہے تھے۔ یہ میرے جانے پہچانے بال تھے' یہ میری جانی پہچانی مہک تھی' لیکن اب اس جان پہچان پر اجنبیت کا سایہ تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا "غزالہ! تم اس مجبوری کو سمجھ رہی ہو۔ مجھے معاف کرنا' ہم ایک جنونی کے رحم و کرم پر ہیں۔"

وہ خاموش رہی' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس رات کے دامن میں کیسی سنسنی تھی' اس چاندنی کی ٹھنڈک میں کیسا انوکھا پن تھا۔ ساحلی ہوا کا لمس ایک طلسم کی طرح میرے بدن میں سرایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر ہمارے ارد گرد منڈلانے کے بعد مائیکل اپنے ٹھکانے کی طرف چلا گیا۔ غالباً وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ ہم اس کے کہے پر چل نکلے ہیں' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا ہو مگر اس کا نشہ اسے شائستہ کی خوب صورتی کی طرف کھینچ رہا ہو۔ وہ اسے بانہوں میں بھر کر اس رات کو رنگین کرنا چاہ رہا ہو۔ مائیکل چلا گیا تو میرے سینے میں ایک سرد لہر سی پھیل گئی۔ میں جانتا تھا کہ اب غزالہ مجھ سے دور ہٹ کر لیٹ جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ہاں ایسا ہوا نہیں۔ میرے لیے یہ شادیٔ مرگ کا مقام تھا کہ ہم اسی طرح لیٹے رہے۔ میں ان لمحات کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو شاید نہ کرسکوں۔ مجھے لگا جیسے میں ایک ناقابلِ یقین خواب دیکھ رہا ہوں اور ابھی یہ سب کچھ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ چند منٹ اسی طرح گزرے پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاند کھجور کے گھنے جھنڈ کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ ہم جہاں لیٹے تھے وہاں گہری تاریکی پھیل گئی۔ آگ بھی بجھ چکی تھی اور ہم مکمل اندھیرے میں تھے۔ میرے ذہن میں خیال جاگا کہ غزالہ اب ضرور میری بانہوں کے حصار سے نکل جائے گی۔ مگر اس مرتبہ بھی میرے ان بدترین خدشات نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کی نیم گرم سانسیں میری گردن کے نچلے حصے سے ٹکراتی رہیں۔ یہ ان اجنبی لمحوں کی مٹھی میں خوشی کی کیسی کہکشائیں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہکشائیں اچانک ہی میرے سامنے آگئی تھیں اور مجھے ایک مہربان روشنی کے سمندر میں غرق کردیا تھا۔ غزالہ پہلے بھی میرے قریب تھی مگر پہلے سینے کے گنبد میں دل نقارے کی طرح نہیں بج رہا تھا۔ وارفتگی کے عالم میں میرے ہونٹ پھسلتے ہوئے غزالہ کے ہونٹوں سے جا ٹکرائے۔ ایک طویل بوسہ تھا' ایک طلسمی لمس' جس کو بیان کرنے کے لیے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ خبر نہیں کہ کتنی دیر بعد میں اس طلسم سے آزاد ہوا۔ غزالہ کی کراہتی ہوئی سی سرگوشی میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں۔۔۔ یہ۔۔۔ گناہ ہے۔"

"نہیں غزالہ! میری محبت گناہ نہیں ہے۔" مجھے اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

غزالہ نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں کی زد سے ہٹا لیے۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے نرم ریشمی بالوں میں دفن کردیا۔ محبت کے اس جزیرے میں زلفوں کی ایسی چھاؤں میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ مجھے لگا جیسے میں مزید کسی خواہش کے بغیر اسی طرح آنکھیں بند کیے اسی مقام پر پوری زندگی گزار سکتا ہوں۔ سالہا سال اسی طرح لیٹا رہ سکتا ہوں' اندھیروں اُجالوں اور موسموں سے لاتعلق۔ غزالہ کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوئے اور اس کی زلفوں کے سائے میں آرام کرتے ہوئے مجھے بھلا کس شے کی خواہش ہوسکتی تھی۔۔۔ ہم اسی طرح دراز رہے' میں اپنے بدن کو جنبش تک نہیں دے رہا تھا کہ مبادا یہ طلسم ٹوٹ جائے اور میں خود کو جدائی کے خارزار میں بھٹکتا ہوا پاؤں۔ وہ طویل رات بیت

وہیں گزر گئی۔

سپیدۂ سحر طلوع ہوا تو صحرا کی تاریکی نے دامن سمیٹ لیا۔ مائیکل سمندر میں نہا رہا تھا اور شائستہ کو بھی پانی میں بلا رہا تھا۔ میں اور غزالہ بھی اٹھ بیٹھے۔ ایک عجیب سا تناؤ تھا غزالہ کے چہرے پر لیکن وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رت جگا ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم سمندر کے عین کنارے پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ ناشتے میں ٹن پیک کھانے تھے جنہیں حبشی … گار جوزف نے گرم کیا تھا' اس کے علاوہ پائن ایپل … تھا اور پھلوں کی سلاد تھی۔

ناشتے کے فوراً بعد مائیکل نے اپنا تھری پیس سوٹ پہن لیا اور ٹائی کس لی تھی۔ جیسے وہ جزیرے کی سیر کے لیے نہیں' آفس میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے جا رہا ہے۔ وہ … بہت چست نظر آتا تھا اور کسی سیکرٹ ایجنٹ کی طرح … رہا تھا۔ مجھے اس کی وہ شاطرانہ چال یاد آگئی جب اس نے ایرانی جہازوں کو اپنے پیچھے لگا کر ریت میں پھنسا دیا تھا۔ نبیل اور شائستہ کی طرح میں اور غزالہ بھی جزیرے میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ غزالہ تابی کے لیے پریشان تھی۔ اس کی نگاہ بار بار سمندر کی طرف اٹھ جاتی تھی' قریباً ایک … کے فاصلے پر ہرکولیس صاف نظر آرہا تھا۔ اسی ہرکولیس پر تابی تھا اور ہمارے دیگر ساتھی بھی تھے۔ یقینی بات … کہ وہ ہمارے لیے از حد پریشان ہوں گے۔ مائیکل ہمیں … بہلا کے وہاں سے اٹھا لایا تھا' تابی اس وقت سو رہا تھا' … کے بعد اس نے جو کچھ کرنا تھا وہ غزالہ کو اچھی طرح معلوم تھا' ان دونوں کے درمیان بالکل ماں اور بچے والی … "پیدا" ہو چکی تھی۔

نو دس بجے کے قریب مائیکل کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ ہم واپس جہاز پر جا رہے ہیں۔ ہم کشتی پر پہنچے تو ہمارا سارا سامان پہلے ہی وہاں رکھا جا چکا تھا۔ دونوں پہرے دار بھی … تھے۔ میں نے الوداعی نظروں سے محبت کے اس مختصر جزیرے کو دیکھا۔ یہاں گزری ہوئی رات میرے لیے یادگار ہے۔ اس رات نے میرے دامن میں وصل کی چند ایسی گھڑیاں ڈالی تھیں جنہیں فراموش کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ غزالہ کے ہونٹوں کا "طویل" لمس میری رگ رگ میں اتر گیا تھا۔ اور اس لحاظ سے یہ واقعی محبت کا جزیرہ ثابت ہوا تھا۔ کشتی لحہ بہ لحہ محبت کے جزیرے سے دور ہوتی گئی اور ہرکولیس کے قریب پہنچ گئی۔ جہاز کے زیریں عرشے پر کپتان … اور مسز ڈورتھی سمیت کئی افراد مائیکل کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بہرحال ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ میرا دھیان فوراً ان انڈین قیدیوں کی طرف چلا گیا جو پچھلے کئی روز سے ان بردہ فروشوں کے لیے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ مسئلہ زیادہ گمبھیر ہوگیا ہے۔ جہاز پر پہنچنے کے بعد میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ کپتان جم نے چھوٹتے ہی مائیکل کو بتایا کہ دو انڈین قیدیوں نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی ہے اور باقی سخت خراب حالت میں ہیں۔ جم نے بتایا "وہ کچھ بھی کھانے پینے سے انکار کر رہے ہیں' اور ان میں کئی بیمار بھی ہوگئے ہیں۔"

"یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔" مائیکل غرایا "دو چار کو الٹا لٹکا کر چمڑی ادھیڑ دو حرام زادوں کی!"

"یہ بھی کر کے دیکھ لیا ہے۔" جم نے کہا۔

میں اور غزالہ دیگر افراد کے ساتھ ہی جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں پہنچے۔ یہاں کیبنوں کے بیچوں بیچ ذرا کشادہ جگہ پر دو قیدی الٹے لٹک رہے تھے' یہ دونوں مرد تھے۔ وہ سراپا برہنہ تھے اور ان کے جسم پر "بی بوکو" (مخصوص چھڑی) کے سیکڑوں نشانات تھے۔ کھال جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی اور زخموں سے خون رس رہا تھا۔ ان کے زخموں پر کچھ سفید سفید بھی نظر آرہا تھا' غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ نمک ہے۔ ان کے زخموں پر محاورتاً نہیں حقیقتاً نمک چھڑکا گیا تھا۔ یہ دونوں قیدی نیم بے ہوش تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اذیت سہہ سہہ کر اب ان کے لیے اذیت کا احساس ہی ختم ہوگیا ہے۔ کیبنوں کے اندر نیم جان قیدیوں کا واویلا مسلسل جاری تھا۔

"کب سے کھانا نہیں کھایا ان لوگوں نے؟" مائیکل نے کپتان جم سے پوچھا۔

"آج تیسرا دن ہے۔" جم نے جواب دیا۔

مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کیبنوں کی طرف گیا جہاں انڈین قیدیوں کو رکھا گیا تھا۔ اس نے ایک کیبن کے دروازے کے تختے کو پیچھے ہٹوایا۔ آٹھ نو انچ چوڑا اور تین فٹ لمبا خلا پیدا ہوگیا۔ اندر قریباً پندرہ افراد بند تھے۔ ان میں تین عورتیں' دو بچے اور باقی مرد تھے۔ یہ سب کے سب گندمی یا سیاہی مائل رنگت کے تھے۔ لباس نہایت غریبانہ تھا' اکثر مردوں نے دھوتیاں اور شلوکے پہن رکھے تھے۔ عورتیں نہایت میلی کچیلی ساڑیوں میں تھیں' انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق سیتاپور اور بریلی کے آس پاس کے علاقے سے ہے۔

فاقہ کشی اور مسلسل رونے دھونے کے سبب یہ تمام افراد خاصے کمزور نظر آرہے تھے۔ مائیکل نے پریشانی کے عالم میں انھیں دیکھا۔ یہ پریشانی اس پولٹری فارمر کی سی پریشانی تھی جو اپنی بیمار مرغیوں کو دیکھ کر فکر مند ہو جاتا ہے کہ اپنے پیسے کیسے پورے کرے گا "یہ تو مرجائیں گے اس طرح!" وہ جھنجلائے لہجے میں بولا۔

کپتان جم بولا "ہاں ایسے ہی بھوک ہڑتال پر رہے تو جنت میں پہنچ جائیں گے۔"

"کل کتنی تعداد ہے ان کی؟"

"کل انڈین بردے تو دو سو ہیں' لیکن ان بھوک ہڑتالی بے وقوفوں کی تعداد ۸۰ کے لگ بھگ ہے۔ چار کیبنوں میں رکھے گئے ہیں۔"

"باقی سب کی بھی یہی پوزیشن ہے؟"

"بالکل یہی۔" کپتان جم نے کہا۔

"یہ تو زبردست نقصان ہے بھئی۔ انھیں کسی طرح سنبھالنے کی کوشش کرو۔" مائیکل نے تاسف سے کہا۔

کھانے کی دو ٹرالیاں پاس ہی کھڑی تھیں۔ مائیکل نے اپنے دو کارندوں کو اشارہ کیا کہ وہ کھانا اندر لے کر جائیں۔ جونہی دو لمبے تڑنگے حبشی کھانا لے کر اندر پہنچے' قیدیوں کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ عورتیں سہم کر دیواروں سے لگ گئیں' مرد بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے اور ایک طرف سمٹنے لگے۔ کارندوں نے کھانے کی ٹرے فرش پر رکھ دیں' اور اشاروں سے انھیں کہا کہ کھانا کھاؤ۔ کسی نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حبشی کارندے نے ایک ادھیڑ عمر شخص کو بازو سے پکڑ کر کھانے کی ٹرے کے قریب کھینچ لیا' وہ لرزیدہ لہجے میں بولا "ہم... ہم دھرم کھاوت ہیں' ہم کو کوئے بھوک نہیں۔ ہم دھرم کھاوت ہیں۔"

ایک عورت کے منہ میں زبردستی لقمہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تو وہ ہسٹیریائی انداز میں چلانے لگی اور چلاتی چلی گئی۔ وہ بار بار ہاتھ جوڑ رہی تھی اور کارندے کے پاؤں پڑ رہی تھی' جیسے اسے خدشہ ہو کہ کھانے کی جگہ اسے زہر دیا جا رہا ہو۔ اچانک جھماکا سا ہوا ایک کم سن لڑکی کیبن کے اندر سے نکل بھاگی۔ وہ بڑی تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ سیڑھیاں طے کر کے کسی بازار میں نکل جائے گی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنی مدد کے لیے بلا لے گی۔ کم از کم اس کے انداز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا' وہ سب جاری کیا جانتی تھی کہ اس کے چاروں طرف اس کی جان کے دشمن ہیں اور

اس سے آگے بیکراں سمندر ہے۔ اس نے ابھی دو کیا چند ہی فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ پہرے داروں نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کر واپس مائیکل کے پاس لے آئے۔ یہ چودہ پندرہ سالہ لڑکی مسلسل چیخ رہی تھی "امار کا کوئے دوش نہیں۔ امار چھوڑ دیو۔ بھگوان کا واسطہ چھوڑ دیو۔"

لیکن اسے پکڑنے والوں نے چھوڑنے کے لیے نہ پکڑا تھا۔ مائیکل کا غصہ انتہا کو چھو رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ایک نیپالی پہرے دار کو مخاطب کیا اور غرا کر حکم دیا۔ اس حکم کو سنتے ہی پہرے دار نوعمر لڑکی کو کھینچ کر کیبن میں لے گئے۔ پہلے جھٹکوں سے اس کی کوشش کی پھر اسے بے لباس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کر پہرے داروں سے کہا کہ وہ دور ہٹ جائیں۔ وہ ٹھٹک کر مائیکل کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" مائیکل نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا "مائیکل! میں کسی حد تک ان لوگوں کی زبان سمجھتا ہوں۔ تم مجھے ایک موقع دو' میں انھیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کچھ نہیں ہو گا' تمہاری کوشش سے۔"

"تشدد سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے کہا "میں اس نسل اور علاقے کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔"

"تھوڑا جاننے سے بہتر ہے کہ نہ جانا جائے۔ تم ان کو جتنا ڈراؤ گے یہ اپنے آپ میں سمٹتے جائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم ان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اگر یہ سارے نہ بھی مرے تو بیسیوں تمھیں ضرور مرجائیں گے اور باقی اتنے لاغر ہو جائیں گے کہ تم ان کے بدلے کچھ بھی حاصل نہ کر پاؤ گے۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"تم مجھے ان سے بات کرنے دو۔ میں اپنے طور پر ان کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

مائیکل کی پیشانی پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں۔ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا' پھر بولا "ٹھیک ہے۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو۔ لیکن کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ کسی چالاکی کا انجام تمہارے تصور سے بھی زیادہ دردناک ہو سکتا ہے۔"

"تم کچھ نہ بھی کہو تو تمہاری سفاکی اور خوں خواری تمہارے چہرے پر لکھی ہے۔"

"تمھیں ہتھکڑی لگی رہے گی اور تم از خود کسی کیبن میں نہیں جاؤ گے۔"

"اگر ہتھکڑی لگی رہی تو پھر میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ یہ لوگ مجھے بھی اپنی ہی طرح کا بے بس قیدی سمجھیں گے اور میری بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔"

"اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے' ایک ساتھی قیدی کی حیثیت سے تم ان کا اعتماد جیت سکتے ہو اور وہ تم پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کی نفسیات میں تم سے بہتر سمجھ رہا ہوں۔ میری بات مان لینے میں تمہارا فائدہ ہو گا۔ دنیا کی کسی بھی منڈی میں یہ ڈھائی تین لاکھ ڈالر کا مال ہے۔"

"طنز کر رہے ہو؟"

"صرف تمہاری زبان میں بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم پر پُرزے نکالنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"یہ صرف تمہارا اندرونی خوف ہے۔ ورنہ میری بے بسی کا کیا شبہ ہے۔ ڈاکٹر غزالہ اور کلثوم سمیت میرے سب ساتھی تمہاری جابرانہ تحویل میں ہیں۔ میں ان کی جانوں کے لیے خطرہ مول لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد مائیکل میری ہتھکڑی کھولنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس نے ایک احتیاط یہ کی کہ غزالہ اور تانی کو کیبن سے نکلوا کر واپس لگژری اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا اور ان کی نگرانی پر مسلح گارڈ مقرر کر دیا۔ یہ سب کچھ اس نے مجھے سنا کر کیا' تاکہ مجھے معلوم رہے کہ میری کسی غلطی کے نتیجے میں غزالہ مشکل میں پڑ سکتی ہے۔

میری ہتھکڑی کھول دی گئی تو میں اس کیبن میں چلا گیا جہاں سے نوعمر لڑکی بھاگی تھی۔ لڑکی اب واپس کیبن میں پہنچ گئی تھی۔ اسے بے لباس کرنے کی کوشش میں پہرے داروں نے اس کا گریبان ادھیڑ دیا تھا اور وہ بار بار اپنے آپ کو اپنا آپ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ درمیانی عمر کی ایک گہری سانولی عورت نے لڑکی کو اپنی بانہوں میں لے کر اسے دلاسا دینے اور پچکارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لڑکی سردی میں ٹھٹھرے ہوئے چوزے کی طرح مسلسل کانپتی چلی جا رہی تھی۔ میں کیبن میں داخل ہوا تو لڑکی' عورت کی گود میں کچھ اور بھی سمٹ گئی۔ باقی افراد کے چہروں پر بھی ہراس نمایاں تر ہو گیا۔

میں اپنے قیمتی کپڑوں کی پروا کیے بغیر عورت کے پاس فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "مجھ سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی بھارتی ہوں اور آپ ہی جیسا ایک شخص ہوں۔ میں یہاں جہاز پر موجود نہیں تھا' ورنہ آپ لوگوں سے ایسا سلوک کبھی نہ ہوتا۔ اب بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

کیبن میں موجود افراد بس ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ نوعمر لڑکی کے سر سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے سفید رومال نکالا اور اس کی پیشانی پر بہہ آنے والا خون صاف کیا۔ بعد میں' میں نے رومال عورت کو تھما دیا۔ اس نے رومال کو روئی کی طرح زخم پر رکھ کر دبا دیا۔ نوعمر لڑکی مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر قریب پڑا آٹھ نو ماہ کا ایک لاغر سا بچہ بھی ریں ریں کرنے لگا تھا۔

میں نے نوعمر لڑکی سے پوچھا "یہ تمہاری ماں ہے؟" لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا "اور تمہارا باپ؟"

لڑکی نے کانپتی ہوئی انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ وہی ادھیڑ عمر شخص تھا' جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا "ہم دھرم کھاوت ہے' ہمیں بھوک نہیں ہے۔"

"تمہارے سر کی چوٹ میں درد تو نہیں ہو رہا؟" میں نے لڑکی سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا "تمھیں مجھ سے خوف تو نہیں لگ رہا؟" اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کئی سوال کیے۔ اس نے ہر سوال کا جواب سر ہلا کر ہاں یا نہ میں دیا' مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ میں نے ننھے بچے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ تمہارا بھائی ہے؟" اس نے نفی میں سر ہلایا "بھانجا یا بھتیجا ہے؟" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا "تمہارا کچھ نہیں لگتا؟" میں نے پوچھا۔ اس بار بھی لڑکی کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے زور دے کر پوچھا "آخر یہ کیا لگتا ہے تمہارا؟"

اس نے پہلی بار زبان کھولی "یہ ہمار بچہ ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ دبلی پتلی فاقہ زدہ لڑکی کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی اور وہ بچے کی ماں تھی۔ ہندوؤں میں نچلی ذات کے لوگ اکثر غربت کی چکی میں پستے ہیں۔ اور یہ غربت ان پر ہزار ہا مسائل کے دروازے کھول دیتی ہے۔ میں نے لڑکی سے نام پوچھا' تو وہ ڈرتے ڈرتے بولی "ہمار نام کملا ہے۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"بریلی کے ایک گاؤں کی۔"

"تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

اس نے پہلے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

پھر منہ میں گنگنا کر رہ گئی۔ میں نے کہا "دیکھو" میں تمہارا دشمن نہیں دوست ہوں' تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

لڑکی ہکلا کر بولی "ہم بھسہ نج ددر (مزدور) ہیں' ہم کو چھوڑ دو۔"

"چپ رہو سسری' یہ ہمارا بھید لیوت ہیں۔" لڑکی کا باپ دانت پیس کر بولا۔

باقی تمام افراد بھی منہ میں خبر نہیں کیا بدبدانے لگے۔ وہ سب اس بات پر ناراض اور خوف زدہ تھے کہ انہی نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی ہے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' تم لوگ نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہ سب کچھ جانے بغیر بھی تمہارا دوست ہوں۔"

میں کیبن سے باہر آ گیا۔ اس وقت تک الٹا لٹکائے گئے دونوں افراد کو مائیکل کی ہدایت پر نیچے اتارا جا چکا تھا۔ ان دونوں افراد کا تعلق ساتھ والے کیبن سے تھا۔ میں نے ان کے زخم اپنے ہاتھ سے صاف کیے اور مرہم پٹی بھی کی۔ باقی قیدی بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بہرحال ان میں سے کسی نے مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ضیائی پہرے دار کے ذریعے مائیکل کو پیغام بھجوایا کہ تمام انڈین قیدیوں کو صاف ستھرے لباس مہیا کیے جائیں اور اگر ہو سکے تو ان کے لیے نہانے کا انتظام کیا جائے۔ میری ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام تک قریباً ۶۰ فی صد انڈین قیدی نہانے پر آمادہ ہو گئے اور اکثریت نے لباس بھی تبدیل کر لیا۔ یہ لباس وہی براؤن کرتہ پائجامہ تھا جو کیبنوں میں موجود تمام افراد کو دیا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے جہاز کے یہ کیبن جیل کی بیرکوں جیسا منظر پیش کرتے تھے۔ بہرحال ابھی تک یہ لوگ کھانا کھانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے بات چیت کی تھی۔ حبشیوں اور خاص طور سے ضیائی حبشیوں کو دیکھتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ ان میں سے کچھ قیدیوں نے اپنی آنکھوں سے ایک ضیائی کو بدنصیب اسلم پر جھپٹنے اور اسے اپنے دانتوں سے بھنبھوڑتے دیکھا تھا۔

شام سے کچھ دیر پہلے ہی جہاز کی مرمت کا کام مکمل ہو گیا تھا' سورج غروب ہوتے ہی وہ ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اگلے روز بھی میں اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح ان قیدیوں کو کھانے پر آمادہ کر سکوں اور یہ نہیں تو وہ کم از کم مجھ سے بات چیت ہی کر لیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے' گزرنے والے وقت کے ساتھ ان کی جسمانی حالت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ جن دو افراد نے کل صبح خودکشی کر لی تھی' وہ سگے بھائی تھے۔ ان کی بڑی بہن بھی ان قیدیوں میں موجود تھی۔ وہ دھیمی دھیمی آواز میں کل سے مسلسل بین کر رہی تھی اور کسی وقت اس پر غشی بھی طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی مگر وہ مجھے دیکھ کر ہی چیخیں مارنے لگی۔ اچانک کوئی وحشیانہ انداز سے مجھ پر جھپٹا اور عقب سے میری گردن دبوچ لی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چنگھاڑ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت مضبوط تھی۔ میں حملہ کرنے والے کو ضرب بھی لگانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ حملہ آور ان مظلوم قیدیوں میں سے ہی ایک ہے۔ میں نے بمشکل اپنا رخ موڑا۔ اسی دوران حملہ آور نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ مجھے عقب سے ٹھوکر لگی اور میں گر گیا۔ حملہ آور اس کیبن کا سب سے توانا اور تنومند قیدی تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پیشانی پر زخم کا نشان تھا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں اور وہ ہذیانی انداز میں چنگھاڑتا چلا جا رہا تھا۔ تب وہ ایک بار پھر وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں دھات کی نوکیلی شے تھی جس سے وہ میرے چہرے پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے دائیں بائیں جھک کر اس کے دو تین وار بچائے۔ وہ ایک بار پھر پوری قوت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گیا۔ میں زمین سے جا لگا۔ دیگر افراد میں سے کسی نے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے جا رہے تھے۔ میں نے حملہ آور کا دایاں ہاتھ غیر محسوس طور پر یوں مروڑا کہ نوکیلی شے اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اسی اثنا میں حبشی پہرے داروں نے دروازے کے خلا میں سے ایک راڈ اندر گھسا دی جس کے ایک سرے پر پٹسن کی چادر کا منحوس حلقہ تھا۔ پلک جھپکنے میں یہ حلقہ حملہ آور کی گردن میں آ گیا اور اسے زوردار جھٹکوں کے ساتھ دروازے کے قریب تک کھینچ لایا گیا۔ اب حملہ آور کا سر دروازے کے آٹھ انچ چوڑے خلا سے باہر تھا اور دھڑ اندر کیبن میں۔ مچل رہا تھا۔ حملہ آور اب بھی ہسٹریائی انداز میں چلا رہا تھا مگر گردن پر پھندا لگنے سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔

میں نے پہرے داروں کو اشارے سے منع کیا کہ وہ اس شخص پر تشدد نہیں کریں گے' تاہم میرے منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے چند چھڑیاں اس پر برسا ہی دیں۔ میں نے حملہ آور کے چہرے پر ہاتھ رکھ لیے اور اسے کئی ہولناک ضربوں سے بچایا۔

بعد ازاں مسلح پہرے دار کیبن میں آ گئے۔ انہوں نے

حملہ آور کی مشکیں کس دیں اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ اس کا چہرہ اور گلے کی پھولی ہوئی رگیں بتا رہی تھیں کہ وہ مسلسل گلا پھاڑ رہا ہے۔ میں نے مسلح پہرے داروں سے کہا کہ وہ کیبن سے چلے جائیں اور دروازہ حسب سابق باہر سے بند کر دیں۔ پہرے دار متذبذب نظر آ رہے تھے' غالباً ان کا خیال تھا کہ میں غیر ضروری دلیری دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں' اور مجھے کیبن سے باہر آ جانا چاہیے۔ بہرحال میرے کہنے پر وہ چلے گئے۔ کچھ دیر بعد حالات ذرا پرسکون ہوئے تو میں نے نو عمر کملا سے پوچھا "یہ کون ہے؟" میرا اشارہ حملہ آور کی طرف تھا۔

وہ پہلے تو ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی پھر ہکلا کر بولی "اس کی لگائی رہ لے گئے۔"

یعنی اس شخص کی بیوی کو پہرے دار اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً دو پانچ روز پہلے کا تکلیف دہ منظر گھوم گیا۔ حبشی پہرے دار ایک جواں سال عورت کو گھسیٹتے ہوئے جہنوں کے عقب میں لے گئے تھے۔ نشے میں دھت سیاہ فاموں نے یقیناً اس کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا تھا۔

میں نے کملا سے پوچھا "وہ جس کے منہ پر چھڑیاں ماری گئی تھیں وہ کون تھا؟"

وہ حملہ آور کی طرف اشارہ کر کے بولی "ہمارے کو جیادہ نہ خبر۔ ساید اس کا بھیا لاگے تھا۔"

یعنی "مجھے زیادہ خبر نہیں' میرا خیال ہے کہ وہ اس کا بھائی تھا۔"

اس کا مطلب تھا کہ اپنے دیور یا جیٹھ کو پٹتے جانے پر اس بدنصیب عورت نے دہائی مچائی تھی اور نتیجے میں اسے کیبن سے نکال کر ہوس پر روند ڈالا گیا تھا۔ اب اس کا پتی پاگل ہو رہا تھا اور اس نے نتائج سے بے پروا ہو کر مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ کیبن کے ٹوائلٹ میں جو دھاتی ہینڈل لگا ہوا تھا اس کا چپٹا اکھڑا ہوا تھا۔ اسی اکھڑے ہوئے چپٹے کو سیدھا کر کے حملہ آور نے نوکیلی سلاخ کی شکل دے دی تھی۔ اس نوکیلے آلے کی وجہ سے میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چھل گئی تھیں اور تین چار انگلیوں سے خون رسنے لگا تھا۔

میں نے کیبن سے باہر آ کر پہرے دار جوزف سے پوچھا "جس لڑکی کو ہفتے کے دن کیبن سے لے جایا گیا تھا' وہ کس کے پاس ہے؟"

جوزف ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا "یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔"

سامون

نہایت منفرد پراسرار سلسلہ

★

مکمل تین حصوں میں شائع ہو گیا ہے

فی حصہ ۔/۵۰ روپے

"جاؤ اور مائیکل کو میرا پیغام دو۔ اس سے کہو کہ وہ لڑکی جس حالت میں بھی ہے جلد سے جلد واپس آنی چاہیے۔"

"میرے خیال میں اس کی حالت ایسی نہیں کہ وہ واپس آ سکے۔" حبشی کے چہرے پر مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"وہ مچھلیوں کا فضلہ بن کر سمندر میں بکھر چکی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اس کا شوہر تو جھوٹ نہیں بول رہا۔ وہ کیوں پاگل ہو رہا ہے۔ اس لیے ہو رہا ہے کہ اس نے کل دوپہر اپنی آنکھوں سے بیوی کی لاش دیکھی ہے۔"

"کیا ہوا تھا اسے؟" میں نے غمناک لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یہی بتایا گیا ہے کہ اس نے خودکشی کر لی تھی۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہیں جھوٹ بتایا گیا ہے' بلکہ تم خود ہی جھوٹ بک رہے ہو' تمہیں علم ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی۔"

حبشی جوزف ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس مسکراہٹ کی پاداش میں اس مردود کی گردن مروڑ دوں' لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں اور پاؤں میں نظر نہ آنے والی بڑی مضبوط زنجیریں تھیں۔ میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دل و دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ مال بردار ہرکولیس کے اس منحوس کمپارٹمنٹ میں چند روز کے اندر میں نے کیسے کیسے مناظر دیکھے تھے۔ حوادث کے سمندر میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے اندر بھی کبھی کبھی انسانی رشتے اور اخلاقی تقاضے اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں۔ اسلم کے دوست نے اس کی خاطر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اپنی جان دی تھی' ایک لڑکی اپنے دیور پر ہونے والا جبر دیکھ نہیں سکی تھی اور احتجاج کی پاداش میں قتل ہو گئی تھی' اب ایک خاوند اپنی بیوی کی موت کے غم میں پاگل ہو رہا تھا اور اس نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ پر

حملہ کیا تھا۔

میں خیالات کے اسی گورکھ دھندے میں الجھا ہوا کیبن میں واپس آگیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کیبن کے اکثر فاقہ زدہ قیدی نقاہت کے سبب نیم غنودگی کی کیفیت میں تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو گہری نیند سو رہے تھے۔ حملہ آور کا نام راجن تھا۔ اس کی مشکیں بدستور کسی ہوئی تھیں' وہ بھی نڈھال سا ہو کر پڑا تھا۔ میں کیبن میں گیا تو نو عمر کملا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا بچہ اپنی نانی کے زانو پر سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ بچے کی طرح نانی بھی سو رہی تھی۔ میں کملا کے قریب بیٹھ گیا' پیار سے اس کے خشک بوسیدہ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ بچی تھی اور دکھ کا مقام تھا کہ اس کی گود میں بھی بچہ تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا "کملا! تم لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے ہو' جب تمہارے جسم میں دودھ نہیں اترے گا تو تمہارے بچے کو کیا ملے گا۔ دیکھو وہ کتنا لاغر ہو گیا ہے' سوکھے کا مریض لگتا ہے۔"

"ہم کا کرے؟" وہ منمنائی۔

"تم میری مدد کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تم لوگ کیسے سنبھلو گے۔ تمہارا خوف کیسے دور ہو گا؟"

وہ بولی "ایک اپائے (طریقہ) ہے۔ سہار میں آج کل شرلی ماتا کا تہوار ہووت ہے۔ اس میں ہم لوگ کھاص بھوجن کھاوت ہے۔ اگر آپ وہ بھوجن پکائیں تو ہم کو چھوت ہے' کوئے بھی کھانے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر ہم تہوار کا خاص کھانا پکائیں تو سب لوگوں کو کھانا پڑے گا۔"

"ہاں یہی مطلب... مگر وہ بھوجن پکانا بڑو سکل (مشکل) ہووت ہے۔"

"میں مشکل کو آسان کر لوں گا۔ تم بتاؤ۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں مجھے بتانے لگی۔ بڑی انوکھی سی ترکیب تھی اور اس سے بھی انوکھا کھانا تھا۔ میں دھیان سے سنتا رہا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ان لوگوں کو کھانا کھلا کر چھوڑوں گا۔ یہ سب کچھ میرے لیے اب ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ان لوگوں کو قریب سے دیکھ کر مجھے ان پر اور بھی ترس آیا تھا اور بے تحاشا ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کسی نہایت دور دراز اور پس ماندہ علاقے کے رہائشی تھے۔ بہت سادہ اور بہت معصوم۔ وہ ہندوؤں کی ایک پسی کچلی ہوئی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ اب تک مجھے جو کچھ کملا سے معلوم ہوا تھا اس کے مطابق وہ لوگ کسی اجڈ ٹھاکر فیملی کے بھٹوں پر کام کرتے تھے۔ ان کی حیثیت وہاں بھی غلاموں کی سی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے تھے اور کرتے بھی کیسے' ان پر قرضوں کا اتنا بوجھ تھا کہ ان کی آئندہ نسلیں بھی نہیں اتار سکتی تھیں۔ ان کی بے بسی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ نو عمر لڑکی کملا تھی۔ وہ کسی ٹھاکر زادے کی تفریح طبع کا شکار ہو کر اس عمر میں بچے کی ماں بن چکی تھی۔ ایسے نجانے کتنے ظلم و ستم ان لوگوں کے سینوں میں دفن تھے۔

اگلے روز علی الصباح پہرے دار جوزف کمپارٹمنٹ میں پہنچا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ مائیکل کے حکم پر مجھے اوپر عرشے پر لے جانا چاہتا ہے۔

"کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں کام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ کو کام ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" پہرے دار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ مجھے گن پوائنٹ پر باہر لے آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں بالائی عرشے پر غزالہ کے رہائشی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر غزالہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ یقیناً جزیرے پر ہونے والی آخری ملاقات کا احوال اس کے ذہن میں آ گیا تھا۔ وہ لمحات جتنے عجیب و غریب تھے' اتنے ہی ناقابل فراموش بھی تھے۔

وہ بولی "مجھے... پتا چلا ہے کہ آپ پر کسی نے حملہ کیا تھا۔"

"حملہ تو نہیں تھا' چھوٹی سی جھڑپ تھی۔ انڈین قیدیوں میں سے ایک اپنے غم و غصے پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ خالی ہاتھ مجھ پر پل پڑا تھا۔"

"میں نے تو سنا ہے اس نے آپ کو کچھ مارا بھی تھا؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

میں نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دے رکھے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ زخمی انگلیاں دیکھ کر وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔ مگر وہ بھی ایسی کم فہم نہیں تھی۔ اس نے شکایت کناں نظروں سے میرے پوشیدہ ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ایک عجیب سا رنگ اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ پیار کا رنگ تھا یا ناراضگی کا۔ وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی "پوچھیں گے نہیں کیوں بلایا ہے؟"

"کیوں بلایا ہے؟"

"ایک... ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔" اس کے چہرے پر سرخی تھی۔ اور یہ سرخی گواہی دے رہی تھی کہ وہ کوئی خاص بات کہنے جا رہی ہے۔

"کیا کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

"ہاں خاص ہی سمجھیں۔" اس کے چہرے کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ پورے بدن میں سنسنی کی لہری دوڑنے لگی تھی۔ دل سے آواز آئی کہ غزالہ میرے اور اپنے برسوں پرانے تعلق کے حوالے سے کوئی خوشگوار بات کہنے جا رہی ہے۔ کوئی ایسی بات جو اس جاں گسل تڑپ کا صلہ ہوگی جو لڑکپن سے میری جاں کا روگ رہی ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میری ساکت نگاہ غزالہ کے چہرے پر جمی تھی۔ وہ پلکیں جھکائے کھڑی تھی اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ..." وہ خاموش ہو گئی اور فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر حوصلہ جمع کیا اور بولی "شاہ جہاں! میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ میں کسی صورت آپ کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتی' لیکن حالات جو بھی ہیں آپ کے سامنے ہیں' ان حالات میں... ان حالات میں ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے اپنے راستے پر چلتے رہیں۔" غزالہ کی آنکھ سے آنسو نکل کر اس کے شفاف رخسار پر پھسل گیا۔

میرے سینے میں مایوسی کی سرد لہر دوڑ گئی۔ دل گیر لہجے میں میں نے کہا "میں تو اپنے راستے پر چل رہا ہوں غزالہ... اور آخری سانس تک چلتا رہوں گا۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمیشہ مجھے کانٹوں پر گھسیٹتے رہیں گے۔ میں روز جیتی اور روز مرتی رہوں گی۔"

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے غزالہ؟"

"یہی تو بات ہے کہ آپ کچھ کہتے نہیں۔ بس خاموشی سے ایک زہر پیے جا رہے ہیں' میں نہیں چاہتی کہ آپ یہ زہر پئیں۔ آپ سب کچھ اپنے دل میں سے ختم کر دیں۔"

"کیا یہی کہنے کے لیے مجھے بلایا تھا؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ہاں شاہ جہاں! میرے دل پر بہت بوجھ ہے' پرسوں والے واقعے کے بعد سے یہ بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پرسوں رات جزیرے پر پیش آنے والے واقعے کی طرف ہے۔ میں نے پوچھا "تم کس بوجھ کی بات کر رہی ہو؟"

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "شاہ جہاں! میں نہیں چاہتی کہ آپ کے دل میں کوئی آس پیدا ہو۔ آپ مجھ سے کوئی توقع لگائیں۔ جو آس اور توقع پوری نہ ہو سکے وہ بہت دکھ دیتی ہے۔"

"بڑا خیال ہے میرے دکھ کا۔" میں نے کہا۔

"آپ جتنا چاہیں طنز کر لیں' جو چاہیں سزا مجھے دے لیں مگر میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' دل کی گہرائی سے کہہ رہی ہوں۔ میں آپ کے قابل شاید پہلے بھی نہیں تھی... اور اب تو بالکل نہیں ہوں۔ آپ کو شادی کے لیے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے' آپ اپنا گھر بسا سکتے ہیں۔ اپنے بچوں میں' ان کی خوشیوں میں خود کو مشغول رکھ سکتے ہیں۔ بہت جلد آپ کو سب کچھ بھول جائے گا۔ آپ کی زندگی نئے راستے پر چل نکلے گی' پلیز شاہ جہاں! آپ میری بات مان لیں۔ آپ ایسا کریں گے تو میرے دل کو بھی تھوڑا سا سکون نصیب ہو جائے گا۔ اگر میری تھوڑی بہت زندگی باقی ہے تو وہ آسانی سے کٹ جائے گی۔ میں اور تابی ایک دوسرے کے سہارے جی لیں گے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تو تم میری آس ختم کرنا چاہتی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا "اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ آس میرے لیے کوئی نئی شے ہے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔ یہ آس تو ہمیشہ سے میرے ساتھ رہی ہے اور میری زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔ اگر تم اس آس کو ختم کرنا چاہتی ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ اپنی اشک بار آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "مجھے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دو۔"

وہ نڈھال سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کوئی فلمی ڈائیلاگ نہیں ہے۔ اگر تمہاری زندگی میرے 'نہ ہونے' سے سکھی ہو سکتی ہے تو پھر اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دو۔ پستول تمہیں میں منگوا دیتا ہوں' تم مجھے کاغذ قلم دو' میں ابھی لکھ دیتا ہوں کہ اپنی موت کا ذمے دار صرف اور صرف میں خود ہوں۔"

"آپ چلے جائیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میں ایسے نہیں جاؤں گا۔ اگر تم مجھے زندہ واپس بھیجنا چاہتی ہو تو پھر تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا اور ابھی کرنا ہو گا۔ بولو کرو گی وعدہ؟"

اس نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں پر سے نہیں ہٹایا۔ میں نے دو تین بار کہا کہ وہ میری طرف دیکھے جب اس نے نہیں دیکھا تو میں نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کا سینہ

ہچکیوں سے وہل رہا تھا۔ میں نے کہا "مجھے اپنی آس اپنی جان سے بھی عزیز ہے' اب کبھی بھی اسے ختم کرنے کی بات نہ کرنا۔ میں نے زندگی میں تم سے کچھ مانگا ہے اور نہ آئندہ مانگوں گا لیکن اگر تم نے آئندہ آس ختم کرنے کی بات کی تو پھر تمہیں ایک چیز دینی ہوگی۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے موت دینی ہوگی۔"

میں گھوما اور تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔ ابھی میں نے دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ غزالہ کی بھیگی ہوئی آواز آئی "ٹھہریے!"

میں ٹھٹک کر رک گیا "کیا بات ہے؟" میں نے کمرے میں واپس آتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ سے ناراض مت ہوں۔" وہ بولی "میں نے پہلے ہی بہت دکھ دیے ہیں آپ کو۔ اب اور دکھی کرنا نہیں چاہتی۔"

"تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہ دکھ میری قسمت میں لکھے ہیں۔"

"آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔ میری مجبوریاں میرے پاؤں کی زنجیر ہیں۔ میں نے۔۔۔"

"خدا کے لیے غزالہ!" میں نے اس کی بات کاٹی "بار بار یہ ذکر مت کرو۔ میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا۔ کسی طرح کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ پھر تم کیوں اتنی آزردہ ہوتی ہو۔"

"مجھ سے۔۔۔ مجھ سے آپ کی مایوسی دیکھی نہیں جاتی۔"

"میں مایوس نہیں ہوں اور نہ انشاء اللہ زندگی کی آخری سانس تک ہوں گا' بس تم حالات کو جوں کا توں رہنے دو۔ ہم دونوں انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مستقبل کے پردے سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

"اور اگر۔۔۔۔"

"اگر حالات بدترین بھی ہوئے تو میں انہیں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ اتنا حوصلہ ہے مجھ میں' اور اس کا ثبوت گزرے ہوئے دس پندرہ سال ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ میں تمہارے غم سے گھبرا نہیں ہوں اور نہ ہی بھاگا ہوں' بلکہ اسے گلے سے لگایا ہے اور پیار کیا ہے۔"

اتنے میں قریب ہی بستر پر سویا ہوا تابی کسمسانے لگا اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ غزالہ نے جلدی جلدی آنسو پونچھے اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ تابی نیند سے اٹھا تھا اس لیے رونے لگا۔ غزالہ اسے بازوؤں میں لے کر ٹہلنے لگی اور چپ کرانے لگی۔ اسے بھوک لگی تھی جس کے سبب موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر لڑھکنے لگے تھے۔ غزالہ نے اسے صوفے پر بٹھایا اور بولی "آپ ذرا اس کا خیال رکھیے۔ میں فیڈر بنا کر لاتی ہوں۔"

میں نے تابی کو بانہوں میں اٹھا لیا اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ حدِ نگاہ تک نیلگوں سمندر تھا اور اس پر جھکا ہوا نیلا آسمان تھا۔ ان دو نیلاہٹوں کے درمیان انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی واحد شے یہ "ہرکولیس" تھا' جو پانی کو کاٹتا ہوا نامعلوم منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں تابی کو باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے چپ ہو جاتا تھا پھر وہی "ریں ریں" شروع کر دیتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے اپنے پہلو میں نیم گرم سیال کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے تابی کو پیچھے ہٹایا۔ اس نے پیشاب کر دیا تھا۔ میری قمیص ایک جانب سے نیچے تک بھیگ گئی تھی۔ اتنے میں غزالہ بھی فیڈر لیے اندر داخل ہو گئی "اوہو' یہ تو بہت گندا بچہ ہے۔" اس نے میری قمیص دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے قمیص کو چٹکی میں پکڑتے ہوئے کہا۔

تابی اب نہ صرف چپ ہو گیا تھا بلکہ شرمیلے انداز میں مسکرا بھی رہا تھا۔ غزالہ نے اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی اور لٹا کر فیڈر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس نے کھینچ کر اس کا نکر زور سے اتارا اور ٹانگیں صاف کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے سرزنش بھی کرتی جا رہی تھی۔

تابی سے فارغ ہو کر اس نے مجھے قمیص اتارنے کو کہا۔ میں نے کہا "رہنے دو' نیچے جا کر بدل لوں گا۔"

"نہیں' آپ اتاریں' ایک سائیڈ ہی گیلی ہوئی ہے' میں ابھی دھو دیتی ہوں۔ یہاں "ڈرائر" بھی ہے' ابھی سوکھ جائے گی۔"

میں نے قمیص اتار دی۔ نیچے سے بنیان بھی گیلی تھی۔ وہ بھی اتارنا پڑی۔ اسی دوران میں غزالہ کی نگاہ میری زخمی انگلیوں پر پڑ گئی۔ وہ ناراض لہجے میں بولی "آپ کی غلط بیانی پکڑی گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب آپ سمجھ ہی گئے ہیں۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں تابی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ قریباً دس منٹ بعد غزالہ آئی تو اس کے ہاتھ میں میری استری شدہ قمیص تھی۔ میرے عریاں جسم پر نگاہیں ڈالے بغیر اس نے بنیان قمیص مجھے تھمائی اور تابی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"معلوم کس نے کیا تھا آپ پر؟" اس نے تابی کے کپڑے

بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہے ایک سرپھرا۔ بے چارے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ جس دن ہم جزیرے پر تھے اس کی بیوی بھان جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔"

"کیا ہوا اسے؟"

"وہ رو چلا رہی تھی۔ پہرے داروں نے اسے زدوکوب کیا۔ کہیں کوئی خطرناک چوٹ لگ گئی اور وہ جاں بر نہ ہو سکی۔" میں اصل بات چھپا گیا۔

غزالہ الجھن سے بولی "ان لوگوں کی بھی تو سمجھ نہیں آتی۔ انہیں معلوم بھی ہے کہ پہرے دار انتہائی غصیلے اور سفاک ہیں۔ حکم عدولی برداشت نہیں کرتے' پھر بھی یہ لوگ احتجاج کرنے اور چیخنے چلانے سے باز نہیں آتے۔"

میں نے بتایا "سارے انڈین قیدی ایسے نہیں ہیں۔ ان میں اسی کے قریب افراد اتر پردیش کے ایک دور دراز علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت ہی سیدھے سادے اور ڈرپوک لوگ ہیں یہ۔ انہیں اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔ ڈر اور خوف کے سبب کھانا بھی ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ پچھلے کئی روز سے بالکل بھوکے پیاسے ہیں۔ حبشی پہرے داروں کی صورت دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ان میں سے دو افراد نے دہشت کے سبب خودکشی کر لی تھی۔"

غزالہ بولی "اب کیا ہوگا ان کا۔ وہ پہلے ہی فاقہ زدہ ہیں۔ اکثر میں خون کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ بھوکے پیاسے رہ کر تو ختم ہو جائیں گے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں انہیں کھلانے کی۔ ان دنوں وہ کسی شولی دیوی کا تہوار مناتے ہیں اور خاص پکوان تیار کرتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کے لیے خاص کھانا تیار کیا جائے۔"

میں نے غزالہ کو خاص پکوان کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

"مگر انہوں نے وہ بھی نہ کھایا تو۔" غزالہ نے کہا۔

"پھر تم ہو ناں۔"

"کیا مطلب؟"

"انہیں وٹامن کے انجکشن لگانا شروع کر دیں گے یا کوئی ایسا ہی اور طریقہ اختیار کریں گے۔"

میں اور غزالہ کافی دیر اس بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ وہ جو ایک شدید کشیدگی سی کچھ دیر پہلے پیدا ہو گئی تھی آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ ہم دونوں میں سے کسی نے وہ موضوع دوبارہ چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری گفتگو کے درمیان میں تابی اپنے حال میں مگن رہا۔ وہ کبھی میری اور کبھی غزالہ

اچھوت

کی گود میں بیٹھ جاتا' ساتھ ساتھ وہ میری آنکھ چھونے کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں غزالہ اور تابی کو خدا حافظ کہہ کر اپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ باہر حبشی جوزف رائفل لیے چوکس کھڑا تھا۔ عرشے پر چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ میں جہاز کے عملے کی نیلی وردیاں چمک رہی تھیں۔ میں نے کچھ فاصلے پر تنومند خیالی حبشی ٹام کو دیکھا۔ وہ ویٹ لفٹنگ میں مصروف تھا۔ اس کے گہرے سیاہ جسم کا ایک ایک مسل نمایاں ہو کر دمک رہا تھا۔ ٹام نے بڑی شعلہ فشاں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دو تین روز پہلے مائیکل نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایک ساتھی مجھ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہے' اور اس کے لیے خوب تیاری کر رہا ہے' کہیں یہ میرا وہی مدِمقابل تو نہیں تھا۔

میں نے پہرے دار جوزف سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

وہ بولا "تمہیں پتا نہیں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

جوزف بولا "سمجھو کہ یہ تمہارے لیے ایک "بہت بڑی مصیبت" ہے اور اس مصیبت کو دعوت دینے والے بھی تم خود ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم نے باس سے کہا تھا ناں کہ تم ہمارے میں سے کسی کے ساتھ دوبدو مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔"

"میں نے کسی اور کو نہیں' مائیکل کو چیلنج کیا تھا۔"

"ٹام سے بھگت لو تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ باس سے کیا لڑو گے تم۔"

"تو یہ مجھ سے لڑنے کی تیاری کر رہا ہے؟"

"بالکل کر رہا ہے۔ جب سے سائمن تمہارے ہاتھوں مرا ہے' اسے ایک پل چین نہیں۔ میں اسے تمہاری بدقسمتی سمجھوں گا کہ تمہیں ٹام کے مقابل آنا پڑ رہا ہے۔"

میں نے دیکھا پروفیسر اللہ دتا کسی خدمت گار کی طرح تولیہ پکڑے ٹام کے قریب کھڑا ہے۔ ٹام ورزش کا ایک۔۔ "STEP" مکمل کر کے اٹھا اور پروفیسر کے ہاتھوں سے تولیہ لے کر اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔

میں حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ منظر دیکھتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آگیا اور پھر جوزف کے آگے آگے چلتا جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ میں نے جوزف سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ مقابلہ کب ہوگا؟"

وہ شانے اچکا کر بولا "میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جب بھی ہوگا تمہارے لیے قیامت سے کم نہیں ہوگا۔"

"پھر بھی کچھ اندازہ تو ہوگا تمہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ مقابلہ حنل پر پہنچنے کے بعد ہوگا۔ دراصل جہاز پر اس قسم کا ہنگامہ مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے کیپٹن جم تو ایسے بلے گلے کے بے حد خلاف ہے۔ وہ اسے بدشگونی سمجھتا ہے۔ بہرحال تمہیں زیادہ ریلیکس ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت جلد تم خود کو تام کے رو برو پاسکتے ہو۔ لہٰذا ڈنٹر وغیرہ پیل لو اور خود کو تیار کرلو۔"

جوزف مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اب صبح کے دس بجنے والے تھے۔ کیبنوں میں موجود تمام قیدی جاگ گئے تھے اور ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے' صرف اتر پردیشی ایسے تھے جنہوں نے حسب معمول ناشتے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ فام پہرے دار قیدیوں کی صحت و تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کو بہترین کھانا دیا جاتا تھا۔ گرمی سردی سے بچانے اور نہانے دھونے کا بھی خاص انتظام تھا۔ تاہم یہ ساری احتیاط انسانیت کے ناتے سے نہیں تھی' تجارت کے ناتے سے تھی۔ یہ لوگ بکاؤ مال تھے اور فروخت کے وقت ان کا تندرست و توانا ہونا ضروری تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کے کیبن کے سامنے سے گزرا تو دروازے کا مستطیل خلا کھلا ہوا تھا۔ یہ لوگ ناشتا کرکے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے اندر جھانکا' صفدر لوانگٹ میں تھا کلثوم نیم دراز تھی جبکہ زریں گل کیبن میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپک آیا۔

"استاد صیب! آپ خود تو کھلی ہوا میں گھوم پھر رہا ہے' ام کو یہاں باندھ چھوڑا ہے۔"

"میں یہاں تفریح نہیں کر رہا ہوں۔"

"گستاخی معاف' تفریح بھی تو کر رہے ہیں۔ ام کو خود غزالہ بی بی نے بتایا ہے کہ آپ جزیرے پر گئے تھے اور خوب جوائن (انجوائے) کیا تھا۔"

"ایسا جوائن تمہیں کرنا پڑے تو نانی یاد آجائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی چونچ بند رکھو اور آرام سے بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔"

"مگر استاد صیب! اللہ اللہ کرنے کے لیے بھی تو دل کا سکون چاہیے اور ام اتنا پریشان ہے کہ آپ کو بتا نہیں سکتا' سخت تکلیف میں ہے ام۔"

"کیوں تمہاری عقل داڑھ نکل رہی ہے؟"

"خو عقل داڑھ تو بارہ سال کی عمر میں نکل آیا تھا' اب تو خود "عقل" ہمارے دماغ سے نکلتا جارہا ہے۔ ام کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔"

"مگر مسئلہ کیا ہے؟"

"خو کلثوم کا فکر لاحق ہے ام کو۔ وہ اچھا نہیں ہے' اس کے پیٹ میں کچھ ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کہ کچھ ہے۔ کچھ ہوگا تو تم ابا جان بنو گے۔"

"نہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کو کل بھی تکلیف ملکیف ہو رہا تھا۔ ام چاہتا ہے کہ آپ غزالہ بی بی کو ایک بار یہاں لے آئیں۔ وہ کلثوم کو دیکھ لے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اتنے میں کلثوم اٹھ کر ہمارے قریب چلی آئی "سلام لیکم صیب جی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جاکر سلام کیا۔

"وعلیکم سلام' کلثوم تم کیسی ہو؟"

"ام ماشاء اللہ ایک دم ٹھیک۔۔۔ زریں گل خواہ مخواہ پریشان ہوتا۔۔۔ بالکل خبیث ہے۔" وہ غالباً شرارتی کہنا چاہ رہی تھی' لیکن ابھی اس کے پاس لفظ زیادہ نہیں تھے اور نہ لفظوں کا صحیح استعمال آیا تھا۔ بے عزتی کے احساس سے زریں گل کا رنگ سرخ ہو گیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔

میں نے کہا "کلثوم! میں تم سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے۔"

"امارا اتنا خیال کرتا کہ ماشاء اللہ ام خود پریشان ہو جاتا۔ ام کو ڈاکٹرز کا ضرورت نہیں۔ اس کو ضرورت' اس کے دماغ کو ضرورت۔"

"بے شک ضرورت ہے۔ میں انشاء اللہ لے کر آؤں گا ڈاکٹر غزالہ کو۔"

"انشاء اللہ۔۔۔ انشاء اللہ۔ ام کو غزالہ بی بی ویسے بھی بہت شان دار لگتا' امارا دل ان کی طرف بھاگتا۔"

"تمہارا دل زریں گل کی طرف نہیں بھاگتا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو ہماری شوہر ہے' اس کی طرف تو بھاگتا' بلکہ بہت زور سے بھاگتا۔ لیکن ادھر ام کو موقع نہیں ملتا۔" وہ کھلے

لہجے میں بولی۔

زریں بوکھلایا "اوئے چپ کر۔ چپ کر جا۔ گدھی کے مافق جو منہ میں آئے بک دیتی ہے۔"

"جب ام بولتا تم ناراض ہوتا۔ جب نہ بولتا تب ناراض ہوتا۔ تم کیا ہوتا؟"

"ہاں بھاؤ زریں گل! تم کیا ہوتا۔ انسان ہوتا کہ جانور ہوتا۔" میں نے کہا۔

زریں گل سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ معصومیت سے بولی "کیا ام نے کوئی بکواس کیا؟"

"نہیں نہیں' تم نے ارشاد کیا' تمہارے منہ سے پھول جھڑا۔" زریں نے کراہ کر کہا "بکواس تو ام کرتا ہے' امارا اگلا پچھلا کرتا ہے۔"

ان دونوں کو نوک جھوک کرتے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔ اس کمپارٹمنٹ کا کچن کافی بڑا تھا۔ یہاں دو شفٹوں میں دس دس افراد کام کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں ہوتی تھیں۔ ان سب خدمت گاروں کا تعلق قیدیوں سے تھا۔ گیس سے جلنے والے کئی برنر یہاں لگے ہوئے تھے۔ میں نے کچن میں پہنچ کر حبشی جوزف کو بتایا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہڑتالی قیدیوں کو کھانا کھلانے کے لیے ہمیں ان کے واسطے تہوار کا خصوصی بھوجن پکانا ہوگا۔ اس بھوجن کی مکمل تفصیل اور ترکیب بھی میں نے جوزف کو بتائی۔ اس کھانے میں چاول دالیں اور پانچ چھ طرح کی سبزیاں استعمال ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ مسالا جات تھے۔ قریباً سب ہی اچھی اشیاء تھیں' سوائے ایک چیز کے۔ اور اسی چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ جس طرح پلاؤ وغیرہ بنانے کے لیے یخنی نکالی جاتی ہے' اسی طرح اس کھانے میں بھی ایک نامعقول چیز کی یخنی شامل تھی۔

اس قبیلے کی روایت کے مطابق تہوار کے اس خصوصی بھوجن میں کم از کم دو خوب صورت کنواری لڑکیوں کے سر کے بال استعمال ہوتے تھے۔ دوسرے معنوں میں ان دو لڑکیوں کو اپنے بالوں کی بھینٹ دینا پڑتی تھی۔ ان بالوں کو استرے وغیرہ کے ذریعے سر سے اتار کر ایک مضبوط سوتی کپڑے میں پوٹلی کی شکل میں باندھا جاتا تھا۔ پھر یہ پوٹلی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دی جاتی تھی۔ بعد ازاں یہی پانی دالیں اور چاول وغیرہ کے گلانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

اس رسم کی حکمت اور افادیت ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ بہرحال حالات کا تقاضا تھا کہ یہ کام کر گزرا جائے۔ میں نے جوزف کو سب کچھ بتایا تو وہ بولا "باقی سب کچھ تو ٹھیک ہے اور کسی نہ کسی طرح انتظام بھی ہو جائے گا لیکن اس دوسرے تماشے کے لیے باس (مائیکل) سے اجازت لینا پڑے گی۔"

"تم لڑکیوں کے سر مونڈنے کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں۔ لڑکی کے سر پر بال نہ ہوں تو اس کی خوب صورتی ایک چوتھائی رہ جاتی ہے اور اسی حساب سے قیمت بھی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے جاؤ' اس سے پوچھ کر آؤ۔ ساری بات تفصیل سے بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے' میں جاتا ہوں۔ اگر تمہاری ضرورت ہوئی تو آکر لے جاؤں گا۔"

جوزف کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس نے بتایا کہ باس نے اجازت دے دی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ آج رات تک ہر صورت ان لوگوں کی بھوک ہڑتال ٹوٹ جانی چاہیے۔

اگلے دو گھنٹے میں جوزف اور میں بے حد مصروف رہے۔ سب سے پہلے اتر پردیشی قیدیوں کے ایک کیبن میں پہنچے۔ میں نے نو عمر کملا کو بتایا کہ ہم تمہارے لیے بھوجن تیار کر رہے ہیں اور اس کے لیے دو کنواری کنیاؤں کے بال درکار ہیں۔ شاید عام حالات میں اس شبھ کام کے لیے دو کنواری کنیائیں فوراً دستیاب ہو جاتیں اور وہ خوشی خوشی اپنے بال بھی دان کر دیتیں لیکن خوف و ہراس کے اس ماحول میں سب الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ بہرحال تھوڑی سی پریشانی کے بعد ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور دو اتر پردیشی لڑکیاں سر منڈوانے پر آمادہ ہو گئیں۔ انہیں کیبن سے باہر لا کر ان کے بال اتارے گئے۔ میرا خیال تھا کہ پہلے لمبے بال قینچی سے اتار لیے جائیں اور بعد میں سر مونڈ دیا جائے لیکن کملا کی زبانی پتا چلا کہ بالوں کو کاٹا نہیں جائے گا بلکہ استرے کے ذریعے سر سے مونڈا جائے گا۔ بہرحال اس پابندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے دونوں لڑکیوں کے بال حاصل کیے۔ ان خستہ حال' الجھے سلجھے بالوں کو پہلے دھویا گیا' پھر پوٹلی میں باندھ کر ابلتے پانی میں ڈال دیا گیا۔ دو گھنٹے بعد اس پانی کی مدد سے دالیں اور چاول وغیرہ پکائے گئے' بعد میں سبزیاں ڈال دی گئیں۔ بعد میں ڈالی جانے والی چند سبزیوں کے سوا سب کچھ گل گیا اور ایک حلیم سا تیار ہو گیا۔ اس پکوان میں ایک مخصوص خوشبو تھی۔ کم از کم مجھے تو یہ خوشبو بہت کراہت آمیز محسوس ہو رہی تھی۔

کھانا پک گیا تو اسے کھلے برتنوں میں ڈال کر کیبنوں کے

اندر پہنچا دیا گیا۔ اس قبیلے کے دو معمر ترین افراد اسی کیبن میں بند تھے جس میں کملا اور اس کی ماں بند تھیں۔ میں اب تک کے مشاہدے میں یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ اگر اس کیبن کے لوگوں نے کھانا کھالیا تو باقیوں کو کھلانا مشکل نہیں ہوگا۔ جب باقی افراد دیکھیں گے کہ ان کے بزرگوں نے بھرت توڑ دیا ہے تو وہ بھی توڑ دیں گے۔ میری ہدایت پر حبشی پہرے دار کیبنوں میں داخل نہیں ہوئے (کیونکہ انہیں دیکھ کر قیدی بدک جاتے تھے) میں نے کچن میں کام کرنے والی خدمت گار عورتوں سے ہی کہا کہ وہ کھانا قیدیوں کے سامنے رکھیں۔ میں نے دونوں بزرگ افراد سے کہا "یہ شولی دیوی کے تہوار کا بھوجن ہے۔ میں نے بڑی چاہت سے تمہارے لیے بنوایا ہے۔ مجھے آشا ہے کہ تم لوگ مجھے مایوس نہیں کرو گے۔"

دونوں بوڑھوں نے ڈری سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر تذبذب صاف پڑھا جاتا تھا۔ یہ بات تو کملا نے یقیناً انہیں پہلے ہی بتا دی تھی کہ بھوجن آرہا ہے۔ ویسے بھی جب لڑکیوں کے سر مونڈے گئے تھے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ بھوجن تیار کیا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک خود کو آمادہ نہیں کرسکے تھے۔ میں نے بے حد نرم لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش جاری رکھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اور کچھ نہیں تو وہ اس بھوجن کی لاج ہی رکھ لیں۔

میری طویل تقریر بھی انہیں ٹس سے مس نہیں کرسکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ خوف کے ساتھ ساتھ شدید قسم کے شک میں بھی مبتلا ہیں۔ غالباً انہیں ڈر تھا کہ کھانے میں زہر یا بے ہوشی وغیرہ کی دوا ہوگی۔ معلوم نہیں کہ یہ شک ان کے ذہن میں کیسے داخل ہوا تھا۔ بہرحال اس شک کے سبب وہ نہایت شدید تذبذب میں مبتلا تھے۔ کھانے کے لیے ان کی آنکھوں میں عقیدت اور خواہش موجود تھی مگر ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے سے انکار کر رہے تھے۔

حبشی جوزف کیبن سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے ان سب کو ایک مشترکہ گالی دی اور گلابی انگلش میں بولا "میرا خیال ہے کہ ان کو زہر کا شک ہے۔"

"کیا تم اس شک کو دور کرسکو گے؟" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اگر تم ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دو لقمے اٹھالو۔"

حبشی نے بمشکل اپنی ابکائی روکی "میں لعنت بھیجتا ہوں اس کھانے پر۔"

"بہت خوب۔ کیا نفاست ہے۔" میں نے کہا "ایک طرف انسانی گوشت کھا جاتے ہو، دوسری طرف احتیاط کا یہ عالم ہے۔"

"گوشت خیاں کھاتے ہیں، ہم نہیں کھاتے۔ ویسے بھی گوشت کھانا اور بات ہے۔ گندے بالوں کی یخنی پینا اور بات۔"

"انسانی جانیں بچانے کے لیے خود پر تھوڑا سا جبر بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"تو تم کرو ناں یہ جبر۔"

"میں تو کروں گا ہی، لیکن تمہاری نفاست اور نزاکت پر سو جان سے قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔"

جوزف کچھ نہیں بولا۔ میں نے دل کڑا کیا اور آلتی پالتی مار کر ان لوگوں کے درمیان ہی بیٹھ گیا۔ دل میں کراہت موجود تھی مگر میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور بے تکلفی سے کہا "بزرگوار! چلیں آئیں مل کر کھاتے ہیں۔ آپ کو کوئی شبہ ہے تو دور ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ شولی دیوی کے تہوار کا بھوجن ہے۔ اس کا کھانا بھی پن ہے۔"

میں نے خوش دلی سے ایک چمچ بھر کر منہ میں رکھا، پھر دوسرا چمچ، پھر تیسرا۔ معدہ الٹنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دونوں معمر افراد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کی آنکھوں میں اپنائیت کے آثار نظر آئے۔ ان لمحوں میں خوف کسی پردے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ پھر ایک معمر شخص کا ہاتھ کھانے کی طرف بڑھا۔ اس نے میری تقلید میں ایک لقمہ لیا۔ حلق سوکھا ہوا تھا، اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا لیکن جلد ہی وہ سنبھل گیا اور دوسرے لقمے کے لیے تیار ہوگیا۔ اسے دیکھ کر دوسرے بوڑھے نے بھی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ان دونوں بوڑھوں کے دو دو لقموں نے پورے کیبن کی صورتِ حال تبدیل کردی۔ ڈرے ڈرے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ سب کھانے لگے۔ ان کے جبڑے چلنے لگے، ہر لقمے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے تھے جیسے میری موجودگی سے انہیں کھانے کی تحریک مل رہی ہو۔ پانچ دس منٹ کے اندر چاروں کیبنوں میں موجود اتر پردیشی قیدی ندیدوں کی طرح کھانے پر جھپٹ رہے تھے۔ ان بھوکی پیاسی روحوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر ترس آرہا تھا اور خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ان تمام قیدیوں میں سے اگر کوئی اب بھی کھانے سے دور تھا تو وہ راجن تھا۔ جوان سال چنی کی موت کا غم اب بھی انگارے کی طرح اس کی آنکھوں میں دہک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو جائے گا۔

میں نے آنکھوں آنکھوں میں کملا کو اشارہ کیا کہ وہ راجن کو کھلانے کی کوشش کرے۔ اس نے کوشش کی لیکن راجن زیادہ مشتعل نظر آنے لگا۔ میں نے اشارے سے ہی کملا کو منع کردیا۔

کھانے کے بعد سب کے چہرے پر قدرے رونق آگئی۔ نو عمر کملا کا شیر خوار بچہ مسلسل "ریں ریں" کر رہا تھا۔ اس کی ماں اتنی چھوٹی تھی کہ اسے ٹھیک سے سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔ درحقیقت بچے کی نانی ہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ جب کملا کھانا کھا چکی تو وہ ادھیڑ عمر عورت کملا اور نواسے کو ایک طرف لے گئی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر بیٹی کے اوپر ڈال دی اور بچے کو اس کے اندر گھسا دیا۔ وہ بچے کو دودھ پلانے کے سلسلے میں بیٹی کی مدد کر رہی تھی۔

میں ان لوگوں میں گھلنے ملنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتر پردیش کے لب و لہجے سے مجھے واقفیت تھی۔ میں اسی لہجے میں بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو باور کرایا کہ میں ایک سیکولر قسم کا انڈین ہوں اور ہندو، مسلم، سکھ ہر طبقے کے مذہب کو مانتا ہوں۔ میرے دس فقروں کے جواب میں وہ لوگ ایک فقرہ بولتے تھے اور وہ بھی ڈرا سہما ہوا۔ ان کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا۔ انہیں چھوڑ دیا جائے اور گھروں کو واپس جانے دیا جائے۔ کیسا معصوم مطالبہ تھا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی حیثیت درندے کے نوالے کی سی ہے۔ اور درندہ اپنا نوالہ واپس نہیں کرتا۔ کیبن میں موجود سب سے معمر شخص کی عمر قریباً ساٹھ سال تھی۔ اس کا نام سیوک کمار تھا۔ سیوک کی باتوں سے اس امر کی تصدیق ہوئی کہ اتر پردیش کے علاقے سے تعلق رکھنے والے یہ سارے لوگ بھٹا مزدور تھے اور مالکوں کے پاس گروی تھے۔ اس قسم کی "بانڈڈ لیبر" علاقے میں عام تھی۔ مالکوں نے انہیں بال بچوں سمیت کسی نامعلوم شخص کے ہاتھ فروخت کردیا تھا۔ وہ شخص انہیں یہ کہہ کر بریلی سے بمبئی لے آیا کہ یہاں انہیں نسبتاً آسان کام دیا جائے گا اور کھانے پینے کو بھی اچھا ملے گا۔ بمبئی میں وہ لوگ قریباً دو ہفتے ایک بہت بڑی فیکٹری کے گودام میں رہے۔ ان دو ہفتوں میں انہیں فیکٹری کے گودام سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا۔ یہاں انہیں کھانے پینے کو بہت اچھا دیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملِ مالک اور اس کے بیٹوں نے ان کی عورتوں کے ساتھ زیادتی بھی کی۔ (بہرحال یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے معمول کی حیثیت رکھتا تھا) دو ہفتے بعد انہیں بتایا گیا کہ وہ گووی پر کام کے لیے جائیں گے۔ سب بچوں بڑوں کو تین ٹرکوں میں ٹھونسا گیا اور بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد جہاز پر سوار کردیا گیا۔ کیبنوں میں بند ہونے تک ان سادہ لوح لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کہیں اور لے جایا جارہا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ انہیں جہاز سے سامان وغیرہ اتارنے کے کام پر لگایا جائے گا۔

ان لوگوں سے بات چیت کے بعد ان کے بے تحاشا خوف کی اصل وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ یہ درحقیقت تین وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو وطن سے دوری تھی، دوسری وجہ سمندری سفر تھا۔ ان لوگوں کے عقیدے اور توہمات ایسے تھے کہ سمندری سفر ان کے لیے ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ تو وطن سے دوری تھی، دوسری وجہ سمندری سفر تھا۔ ان لوگوں کے عقیدے اور توہمات ایسے تھے کہ سمندری سفر ان کے لیے ایک خوفناک چیز بن کر رہ گیا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ وہی تھی جس کا اندازہ میں پہلے لگا چکا تھا۔ ان لوگوں نے اتفاقاً وہ روح فرسا منظر دیکھ لیا تھا جس کا تعلق ضیائی حبشی اور اسلم نامی بدنصیب قیدی سے تھا۔ ضیائی حبشی نے مشتعل ہو کر اسلم پر کسی درندے ہی کی طرح حملہ کیا تھا اور سب کے سامنے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس منظر کی وحشت ان لوگوں کے ذہنوں سے مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ جونہی وہ حبشی پہرے داروں کی صورت دیکھتے تھے ان کے دل ان کے سینوں میں سمٹ سکڑ کر رہ جاتے تھے۔

رات تک ان لوگوں کی جھجک سو فی صد سے کم ہو کر پچاس ساٹھ فی صد رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس سے ایک بار پھر یہ لوگ بدک گئے۔ کھانا کھانے کے پانچ چھ گھنٹے بعد ساتھ والے کیبن میں دو افراد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ انہیں قے آرہی تھی اور پیٹ میں شدید درد تھا پھر تیسرے کیبن میں بھی ایک نو عمر بچہ اسی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ ان اتر پردیشی قیدیوں میں یک بارگی پھر سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ ان کے ذہنوں میں دبا ہوا یہ شک ایک دم ابھر کر سامنے آگیا کہ ان کے کھانے میں کچھ ملا دیا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر چار پانچ مزید افراد کی طبیعت خراب ہوگئی۔ یہ بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کھانا بالکل ٹھیک تھا اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو پھر سب کے سب بیمار پڑتے۔ یقیناً طویل فاقہ کشی کے بعد پیٹ بھر کر کھا لینے سے چند افراد کا نظام گڑبڑ ہوگیا تھا۔

کراہوں کی آواز سے کیبن گونجنے لگے۔ گاہے گاہے قے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ بیمار ہونے والے افراد کی تعداد

دس بارہ سے زائد نہیں تھی مگر یوں لگتا تھا کہ تمام کے تمام لوگ جان کنی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ کورس کی صورت میں رو رہے تھے اور واویلا کر رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ چمٹا بجانے کی بات بھی کر رہے تھے۔ اس "چمٹے" کی مجھے کبھی سمجھ نہیں آئی اور نہ ہی بعد میں کسی نے بتایا۔ شاید مصیبت ٹالنے کے لیے یہ لوگ چمٹا وغیرہ بجاتے ہوں گے۔ کچھ دیر پہلے جو دوستانہ فضا پیدا ہوئی تھی وہ یکسر ختم ہو گئی۔ اب ایک بار پھر وہ لوگ مجھے شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی طویل پرچھائیاں رینگنے لگی تھیں۔

میں نے فوری طور پر مائیکل کو اطلاع بھجوائی۔ وہ غزالہ کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا' دو کارندے دوائیں اور دیگر سامان اٹھائے ہوئے غزالہ کے ساتھ آ رہے تھے۔ غزالہ نے آستینیں اڑسیں اور فوری طور پر متاثرین کے علاج معالجے میں لگ گئی۔ انجکشن لگوانے سے وہ لوگ اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا رائفل کی گولی سے ڈرا جاتا ہے۔ ایک ایک مریض کو تین تین افراد نے جکڑا جس کے بعد غزالہ نے انہیں انجکشن لگائے۔ جس وقت انجکشن لگ رہا ہوتا تھا ارد گرد بیٹھے افراد نوحہ کناں ہو جاتے تھے' جیسے انجکشن نہ لگایا جا رہا ہو ان کے "پیارے" کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ غزالہ سرتاپا ایک پروفیشنل ڈاکٹر نظر آ رہی تھی۔ کسی بھی طرح کی کراہت کا مظاہرہ کیے بغیر وہ بڑی دل جمعی سے مریضوں کو ٹریٹ کر رہی تھی۔ اسے مختلف کیبنوں میں آنا جانا پڑ رہا تھا لہٰذا میرے مشورے پر مائیکل نے تمام بیمار قیدیوں کو ایک ہی کیبن میں منتقل کر دیا۔ یوں غزالہ کا کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ ہم ساری رات مصروف رہے۔ صبح تک باقی مریض تو ٹھیک ہو گئے لیکن ایک بچے اور عورت کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ وہ شدید پسینے میں جتلا تھے اور جسم ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو رہا تھا۔ جہاز میں موجود گلوکوز کا آخری بیگ بھی غزالہ بچے کو لگا چکی تھی۔ اب اس کے جسم میں مزید پانی نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ بچے کی عمر نو دس سال تھی۔ وہ پہلے ہی کچھ کمزور تھا' اب بالکل ہی ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی رات نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بچے کی ماں بھی وہاں موجود تھی۔ وہ رو رہی تھی اور مسلسل پرارتھنا کر رہی تھی۔ اس کی پرارتھنا میں بار بار کالی دیوی کا نام آتا تھا۔ گاہے گاہے وہ بھجن پڑھنے کا انداز بھی اختیار کر لیتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچے کی حالت ابتر ہونے لگی۔ اسے سانس ہچکیوں سے آنے لگا' آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور ہونٹ خشک ہو کر سیاہ ہو گئے تھے۔ مایوس کن صورت حال کے باوجود غزالہ اپنی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اپنی قابلیت اور دستیاب دواؤں کے مطابق وہ ہر چارہ کر رہی تھی۔ آخر بچے کے حلق سے "خرر خرر" کی منحوس آواز نکلنے لگی۔ کیبن میں موجود قیدیوں کے چہرے مجسم خوف بنے ہوئے تھے اور ان میں سب سے ترس ناک چہرہ بچے کی ماں کا تھا۔ اچانک ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ کونے میں بیٹھا ہوا تنومند راجن ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کے حملے میں کہیں زیادہ شدت اور وحشت تھی۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا "تم قاتل ہے۔ تم کو جندہ نائیں چھوڑت ہے۔ تم کو جندہ نائیں چھوڑت ہے۔"

اس نے عقب سے میرا گلا دبوچ لیا اور سر بار بار دیوار سے ٹکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بازوؤں میں غیر معمولی طاقت تھی یا شاید غیظ و غضب نے طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا یا کرتا' بچے کی ماں بھی زخمی جانور کی طرح چلا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر ایک ساتھ دو اور افراد نے بھی جنونی انداز میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ راجن نے مجھے پہلو کے بل گرا دیا تھا۔ اس کے بازو شکنجے کی طرح میری گردن کے گرد کسے ہوئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے کوئی سنگین ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا بلکہ قیدیوں میں سے کسی کو بھی زخمی کرنا یا چوٹ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان کے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور قریب ہونے کے لیے مُکا لات کا نہیں ملاقات کا سہارا لیا جاتا ہے۔

کیبن میں ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ غزالہ نے جب مجھے سخت مصیبت میں دیکھا تو میری مدد کے لیے آگے بڑھی۔ حملہ آوروں میں سے کسی ایک نے غالباً راجن نے ہی ٹانگ چلائی۔ ضرب غزالہ کے پیٹ میں لگی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ مگر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ پھر میری مدد کے لیے لپکی۔ اس نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھینچ کر ایک طرف لے گئی۔ ساتھ ساتھ وہ پہرے داروں کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ان سنگین لمحات میں بھی مجھے غزالہ کی پریشانی اور جدوجہد اچھی لگی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ایسے ہی میری مدد کے لیے وہ دیوانہ وار مائیکل کی طرف بڑھی تھی۔ وہ واقعہ لاہور میں پروفیسر اللہ دتا کے تہ خانے میں پیش آیا تھا۔ مجھے مائیکل سے بچانے کے لیے غزالہ نے اپنے سر پر بندوق کے دستے کی ضربیں برداشت کی تھیں اور لہولہان ہو گئی تھی۔

چند ہی لمحے میں جوزف اور دیگر پہرے دار دندناتے

ہوئے اندر آ گئے۔ اس دوران میں' میں نے بھی راجن کی پسلیوں میں چند ہلکی ضربیں لگا کر اپنی گردن چھڑا لی تھی۔ تاہم میرے چہرے پر ناخنوں سے کئی خراشیں آ گئی تھیں اور انگلیوں کے زخموں سے بھی دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ کھینچا تانی میں میری قمیص کا گریبان بھی "وسیع تر" ہو کر ناف پر پہنچ گیا تھا۔

پہرے داروں نے حملہ آوروں کو دبوچ لیا اور "ہی بوکو" سے پیٹنے لگے۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہے تھے اور فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ یقیناً ان کی خواہش تھی کہ انہیں تڑپانے کے بجائے ایک ہی دفعہ ان کی جان لے لی جائے۔ میں نے آگے بڑھ کر پہرے داروں کو روکا۔ ایک پہرے دار کے ہاتھ سے میں نے "ہی بوکو" چھین لیا۔ میں نے انگلش میں جوزف سے چیخ کر کہا "ان بدبختوں کو روکو' ورنہ میں ان کے منہ توڑ دوں گا۔"

جوزف کے سمجھانے پر پہرے دار پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ کیبن سے نکل جائیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے میں خود ہی سلجھا لوں گا۔ وہ تذبذب کا مظاہرہ کرنے کے بعد باہر چلے گئے۔ صرف جوزف کیبن میں رہ گیا۔ اس نے راجن کو دبوچ رکھا تھا جو مسلسل سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ ان میں سب سے خطرناک یہی راجن ہی تھا۔ میں نے جوزف سے کہا کہ اسے دوسرے کیبن میں لے جاؤ اور الٹی ہتھکڑی لگا دو۔ اس سے بعد میں بات کریں گے۔ باقی دونوں حملہ آور "ہی بوکو" کی شدید ضربیں سہنے کے بعد بے دم سے ہو کر فرش پر پڑے تھے۔ نیم جان بچے کی ماں کو بھی چند ضربیں لگی تھیں۔ وہ دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور بین کرنے والے انداز میں روتی چلی جا رہی تھی۔ اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے جاں بلب بچے کا چہرہ بھی دیکھ سکے۔

غزالہ بھی اس ہنگامے کے بعد تھر تھر کانپنے لگی تھی' میں نے اس کی نیچے گری ہوئی اوڑھنی اس کے کندھے پر رکھی اور اسے کہا کہ وہ اپنا کام جاری رکھے۔ غزالہ خود کو سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے اس کی ماں سے کہا "رونا دھونا مت کرو۔ اوپر والے سے اپنے بچے کا جیون مانگو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے اشک بار نظروں سے میری طرف دیکھا "ہمار بچہ ہم کو واپس دے دیو' ہم تم سب کی بنتی کرت ہے۔"

اس نے باقاعدہ میرے اور غزالہ کے سامنے جھولی پھیلا دی۔

میں نے کہا "ہم سے نہیں خدا سے مانگو۔"

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۵ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اُردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور

"خدا ہمار نہیں ہووت ہے۔ خدا امیروں کا ہووت ہے ٹھاکروں کا ہووت ہے۔"

وہ اپنا سر بے قراری سے اپنے گھٹنے پر پٹخنے لگی۔

غزالہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ اس نے پُرامید انداز میں سر ہلایا۔ میں نے دیکھا کہ بچے کے سانس میں روانی آگئی ہے اور اس کی پلکوں میں بھی جنبش موجود ہے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں بچے کی حالت مزید بہتر ہوگئی۔ غزالہ نے رسک لے کر بچے کی نس میں ایک انجکشن لگایا تھا اور یہ انجکشن مفید ثابت ہوا تھا۔ ہم دونوں رات گئے تک بچے کی دیکھ بھال میں لگے رہے۔ اس نے چمچ کی مدد سے تھوڑا تھوڑا پانی لینا شروع کردیا تھا اور یہ علامت تھی اس بات کی کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ بچے کی ماں مسلسل خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔ دیگر افراد بھی اب بیماری کے شدید حملے سے سنبھل گئے تھے اور ان کی نگاہوں میں میرے اور غزالہ کے لیے احسان مندی کی جھلک تھی۔ عمر رسیدہ سیوک کمار بار بار ڈوبدی، نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ اس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ وہ اس بات سے بہت متاثر نظر آتا تھا کہ میں نے پچھلے چند دنوں میں دو مرتبہ سیاہ فام پہرے داروں کو "ہی بوکو" کے وحشیانہ استعمال سے روکا ہے۔ پہلا واقعہ ہفتے کے دن پیش آیا تھا' جب راجن نے طیش سے بے قابو ہو کر مجھ پر حملہ کردیا تھا اور نتیجے میں سیاہ فام پہرے دار اتر پردیشی قیدیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس وقت میں نے "ہی بوکو" کی ضربیں اپنے ہاتھوں پر روکی تھیں۔ اسی طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے سیاہ فام بے حد غضب ناک نظر آئے تھے' اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو وہ یقیناً چند لمحوں میں راجن اور تین دیگر افراد کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہنے کے بعد سیوک کمار میرے قریب چلا آیا۔ اس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا "ہمار کو شما کر دیو۔ ہمار کو دوسواس ہو گیو تو کہ آپ دیالو ہے۔" (ہمیں معاف کر دیں۔ ہم کو اب یقین ہو گیا ہے کہ آپ رحم دل ہیں)

میں نے اس کا استخوانی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میری زخمی انگلیوں سے رسنے والا خون دیکھ کر سیوک کچھ اور بھی شرم سار نظر آنے لگا۔ وہ بولا "ہمار کو شما کر دیو۔ ہم نے آپ کے ساتھ جیادتی کیا۔"

"اور تمہارے ساتھ جو یہاں ہو رہا ہے' کیا وہ زیادتی نہیں ہے۔"

"ہمار کے تو نصیبن ہی بھگوان نے ایسو لکھت رکھے ہیں۔"

"بھگوان نصیب نہیں لکھتا' نصیب ہم خود بناتے ہیں یہ تم بھی بنا سکتے ہو۔ میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا' نہ تمہیں کوئی مارے گا' نہ تمہاری کسی عورت کے ساتھ برا سلوک ہوگا' نہ تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام لیا جائے گا۔ شرط صرف یہی ہے کہ تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ وقت پر کھانا کھانا ہوگا۔ رونے دھونے سے پرہیز کرنا ہوگا اور جو بیمار ہیں انہیں ڈاکٹر غزالہ کی ہدایت کے مطابق دوا لینا ہوگی۔"

"ہمار کو منجور ہے۔" وہ بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"تمہیں تو منظور ہے مگر کیا دوسرے لوگوں کو بھی منظور ہوگا۔"

"ہم پوری کوسس کرے گا کہ سب لوگن یہ بات مانیں۔"

"بہت اچھے۔ مجھے تم سے یہی آشا تھی۔"

"مگر ہم کو یہ تو بتا دیو کہ ہم غریبن کو آپ لوگن کہاں لے جاوت ہیں۔ اور ہمارے ساتھ وہاں کا ہووے گا۔"

"ان سوالوں کے جواب فی الحال میں نہیں دے سکتا' لیکن تم لوگوں کو نراش ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا ہے ناں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ میرا بہت ممنون نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا کہ اسے میرا انداز بہت پسند آیا ہے۔

میں نے پوچھا "کون سا انداز؟"

وہ بولا "آپ نے ہم غریبن کے ساتھ بھمین (زمین) پر بیٹھ کے ہمار کا بھوجن کھایا۔"

"یہ تو کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔" میں نے کہا "جو کھانا تم کھا سکتے ہو وہ ہم بھی کھا سکتے ہیں۔ ہم ایک ہی جیسے انسان ہیں۔"

اس کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے "ہم ایک جیسو نہیں۔ ہم ہریجن آپ بڑے لوگن بھگوان لوگن۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے میرے پاؤں چھوئے۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ میں نے کہا "اگر تم میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے' اپنی صحت کا خیال رکھو اور اپنے ساتھیوں کی صحت کا بھی۔"

بیمار بچے کی والدہ نے بھی میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی جو میں نے ناکام بنا دی۔ اس نے چھم چھم آنسو بہائے اور

مخصوص لہجے میں واویلا کرنے لگی۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں آئیں ان کا لب لباب یہ تھا کہ وہ غزالہ سے بی سے معافی مانگ رہی تھی۔ اسے بے حد افسوس ہو رہا اس نے ہمیں غلط کیوں سمجھا۔ کیوں یہ شبہ کیا کہ ہم نے بن میں کچھ ملایا ہے اور ان کی جان لینے کی سازش کی

میں نے عورت کو تسلی تشفی دی اور اسے کہا کہ وہ ڈاکٹر ل کے ساتھ مل کر مریضوں کی دیکھ بھال کرے۔

اگلے دو تین دن میں نے اتر پردیشی قیدیوں کے ساتھ ہی زارے۔ میرا کھانا بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ مائیکل کا ل تھا کہ مجھے ان کے ساتھ سونا نہیں چاہیے۔ ان کا کوئی ہا نہیں، کہیں وہ سوتے میں میرے خلاف کچھ کر نہ زریں لیکن مجھے یقین تھا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں ان کا تاد جیتنے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ میں رات کو بہ سبان ان کے درمیان رہتا تھا۔ ان سے باتیں کرتا تھا' ان ے مسائل معلوم کرتا تھا اور پھر بے فکر ہو کر سو جاتا تھا۔ ب دو روز کے اس ساتھ نے ہمارے درمیان انڈراسٹینڈنگ ا کردی تھی۔ بیمار ہونے والے تمام دس بارہ افراد کی ت اب ٹھیک تھی اور اپنے ساتھیوں کی طرح انہوں نے ل خوراک کھانا شروع کردی تھی۔ صرف راجن ایسا تھا ں کے تیور ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے' بہرحال دک ہڑتال اس نے بھی ختم کردی تھی۔

تیسرے روز مجھے جہاز میں کچھ گہما گہمی نظر آئی۔ پہرے رنگے لباس پہنے ہوئے تھے۔ کچن میں قیدیوں کے لیے موصی کھانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ بہت سا میدہ بیکنگ ڈر اور انڈے وغیرہ کچن میں گئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے بک تیار کیا جا رہا ہے۔ کسی وقت سیڑھیوں والا دروازہ کھلتا تھا اوپر عرشے کی طرف سے میوزک کی مدھم آواز بھی آتی ی۔ میں نے انگلش داں پہرے دار جوزف سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔

اس نے بتایا "آج ایسٹر ہے۔"

یہ تہوار ۲۱ مارچ کے لگ بھگ منایا جاتا ہے۔ اس کا طلب تھا کہ ہم مارچ کے وسط سے گزر چکے ہیں۔ جہاز میں ت تو دور کی بات ہے' تاریخوں اور مہینوں کا حساب بھی ٹھیک سے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ صبح نو دس بجے کے لگ بھگ میرے لیے مائیکل کا بلاوا آگیا۔ مجھے ہتھکڑی لگانے کا عمل اب ختم کر دیا گیا تھا۔ مائیکل کو معلوم ہو چکا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کے لیے میں معمولی سا خطرہ بھی مول نہیں لوں گا۔ میں حبشی جوزف کی رائفل کے سائے میں اوپر مائیکل کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہ بڑے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ کالر میں گلاب کا مہکتا ہوا پھول لگا تھا۔ یقیناً یہ پھول جہاز میں ہی کہیں اگایا گیا ہوگا۔ مائیکل کی "نصف بہتر" شائستہ اس کے قریب موجود تھی۔ وہ اسے یوں بغل میں لیے بیٹھا تھا جیسے کسی مجسم سیاہ بن مانس نے پلاسٹک کی گڑیا بغل میں دبوچ رکھی ہو۔ وہ بے تکلفی سے شائستہ کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتا جا رہا تھا۔ میری آمد کے باوجود اس کے انداز و اسٹائل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں تمہاری کارکردگی سے خوش ہوں۔" وہ بولا۔

"لیکن میں تمہاری کارکردگی پر ایسا تبصرہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے بردہ فروشی کے موضوع پر لیکچر نہیں چاہیے ورنہ موڈ سخت خراب ہو جائے گا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"کس لیے بلایا ہے؟"

"پچھلے تین چار روز تم نے خاصی ٹینشن میں گزارے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ تمہاری تھوڑی سی تفریح ہو جائے۔ آج ایسٹر نائٹ ہے۔ مین ہال میں ذرا ہلا گلا ہوگا تم بھی آ جانا۔ وارڈ روب میں تمہارے لیے کچھ لباس پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔"

میں نے کہا "میرے ساتھی تنگ و تاریک کیبن میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ ایسٹر نائٹ مناتا پھروں۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"میرے ساتھی صفدر اور زریں تازہ ہوا اور روشنی کے لیے ترس رہے ہیں۔"

"وہ اکیلے نہیں ترس رہے' ان کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ بہرحال اب زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ ہم جلد ہی خشکی پر اتریں گے۔"

"خشکی سے تمہاری مراد منزل ہے یا پہلے کی طرح راستے کا کوئی جزیرہ؟"

وہ مسکرایا "بہت خوب۔ میں نے تمہیں یہاں بلایا تھا' تفریح میں اپنے ساتھ شریک کرنے کے لیے۔ تم نے حسب معمول انٹرویو شروع کردیا ہے' میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے انٹرویو دینے سے سخت نفرت ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے مائیکل کہ تمہیں اپنے سوا ہر چیز سے نفرت ہے۔"

"بالکل غلط' مجھے بے شمار چیزوں سے محبت ہے۔ جیسے

ایسٹر کے جشن سے محبت ہے اور اس بات سے محبت ہے کہ تم ایسٹر نائٹ کی تقریب میں شرکت کرو اور تھوڑی دیر کے لیے اپنی پریشانیوں کو ہوا میں اڑا دو۔"

"لیکن ـــ میں اکیلا کیا خاک جشن مناؤں گا۔"

"تم اکیلے کہاں ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ــــ"

پھر ایک دم مائیکل کے ذہن میں کوئی بات آئی اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک ابھر آئی تھی۔ وہ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے مسٹر! ہم تمہارے اکیلے پن کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ تم اپنے ایک ساتھی کو اپنے ساتھ شریک کر سکتے ہو۔ مگر یہ ساتھی میری مرضی کا ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"تمہاری سویٹ ہارٹ ڈاکٹر غزالہ تمہارا ساتھ دے گی۔"

"لیکن وہ تو ـــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہارا اس سے بدکنا مجھے زہر لگتا ہے۔ چلو جاؤ اب ــ زیادہ سوال جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ وارڈروب سے اپنی مرضی کا لباس لے لو۔"

"دیکھو مائیکل! ہم مشرقی لوگ ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں۔"

"تمہارے مشرق کی تو ـــ" اس نے ایک غلیظ گالی نکالی اور غرا کر بولا "تم لوگ سچ کو جھوٹ کے پردے میں چھپاتے ہو' اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "مائیکل! تمہارا سر بڑا ہے لیکن اندر مغز چھوٹا ہے۔ میں تمہارے ساتھ بحث مناسب نہیں سمجھتا ورنہ اس موضوع پر ایک طویل گفتگو کی جا سکتی تھی۔"

"جب جی چاہے یہ شوق بھی پورا کر لینا' بے شک میں افریقی ہوں اور کسی آکسفورڈ یا کیمبرج میں نہیں پڑھا ہوں لیکن تمہارے ہر سوال کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں۔"

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دھواں میری طرف چھوڑ دیا۔

شائستہ اس کے پہلو میں کسمسا رہی تھی' شاید اس بیکار بحث سے اکتا کر اٹھنا چاہتی تھی۔ مائیکل نے محبت سے اس کی طرف دیکھا' پھر بڑی ادا سے اپنا سگریٹ شائستہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی' تب شوہر کی منشاء کو سمجھتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا کش لیا۔ اسے کھانسی آئی اور وہ رخ پھیر کر کھانسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم اب جا سکتے ہو۔" مائیکل نے کہا۔

میں باہر نکل آیا۔ حبشی جوزف راہداری میں بدستور چوکس کھڑا تھا' وہ مجھے لے کر زیریں عرشے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تنگ سیڑھیوں پر ریوایکل خیابی نام سے سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خشونت نظر آئی۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولا لیکن میرے پاس سے یوں گزرا کہ اس کا کندھا ہتھوڑے کی طرح میرے کندھے سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی بجلی کوند رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اگر میں نے اس کی بدتمیزی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو یہاں جھگڑا ہو جائے گا۔

میں خاموشی سے سیڑھیاں اتر آیا۔ جوزف نے کہا "جم بڑی بے چینی سے ساحل پر پہنچنے کا انتظار کر رہا ہے۔"

"کیوں' اسے کیا جلدی ہے؟" میں نے پوچھا۔

جوزف بولا "جب کوئی پہلوان مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مقابلہ منعقد ہونے میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔ جم بھی اس وقت پوری طرح تیار ہے' اس کے لیے صبر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ سنا ہے اس نے باس (مائیکل) سے یہ بھی کہا ہے کہ مقابلہ جہاز پر ہی منعقد کرا دیا جائے۔ مگر کیپٹن جم کو چونکہ جہاز میں اس طرح کا ہلا گلا پسند نہیں لہٰذا اس تجویز پر عمل نہیں ہو سکا۔"

جم کے متعلق گفتگو کرتے کرتے ہم گودام میں پہنچے اور وہاں سے زیریں کمپارٹمنٹ میں آ گئے۔

اس شام مال بردار جہاز "ہرکولیس" پر واقعی جشن کا سماں تھا۔ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تاریک سمندر میں یہ روشنیوں اور آوازوں کا چھوٹا سا جزیرہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسٹر کے خصوصی کھانے پکائے گئے تھے۔ بکرے اور سؤر کے منجمد گوشت کو ریفریجریٹروں سے نکال کر مختلف چائنیز اور یورپین ڈشوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ ہال نما کمرے کو کاغذی پھولوں اور جھالروں وغیرہ سے سجایا گیا تھا' یہاں میوزک اور ڈانسنگ پارٹی کا انتظام تھا۔ ڈنر سے پہلے ایک بڑا کیک بھی یہاں کاٹا جانا تھا۔ اس تقریب کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ بردوں کے طور پر لائی جانے والی کچھ عورتوں کو بھی زبردستی اس جشن میں شریک کیا گیا تھا۔ یہ انڈین لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے' بے شک ان کے چہرے مسکرا رہے تھے لیکن ان کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ اس جشن میں دل سے شریک نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں نادیدہ زنجیریں تھیں۔ انہیں "جبر" کے آتشیں کوڑے سے ہانکا جا رہا تھا۔ وہ کئی

عورتیں بھی اس تقریب میں نظر آ رہی تھیں۔ انہیں ہم نے اس جہاز میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ غزالہ بھی تھی۔ وہ مائیکل اور کیپٹن جم کے ساتھ ہال کے درمیان میں ایک میز پر بیٹھی تھی۔ میں اور غزالہ گوشے میں ایک میز پر تھے۔ غزالہ نے ایک گاؤن نما لباس پہن رکھا تھا' کندھوں پر شال تھی۔ وہ خاصی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی بیزاری تھی جو جشن میں مجبوراً شرکت کرنے والی انڈین لڑکیوں کے چہرے پر تھی۔

محفل کے شرکاء کے درمیان پیانے گردش کر رہے تھے۔ حاضرین کا نشہ جوں جوں تیز ہو رہا تھا ان کی خرمستیاں بڑھتی جا رہی تھیں پھر جوڑے ڈانسنگ فلور پر رقص کرنے لگے۔ مائیکل بھی شائستہ کو لے کر بڑے مہذب انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہماری میز کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے اور غزالہ کو بھی رقص میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے انکار کر دیا۔

"کیوں کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"سچ مچ تکلیف ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تکلیف ہے؟"

"تمہارے پالتو سائن کے ساتھ لڑائی میں آنکھ پر جو چوٹ لگی تھی وہ کبھی کبھی پھر سے درد کرنے لگتی ہے۔"

"بہانہ معقول ہے لیکن موقع کے لحاظ سے مضحکہ خیز ہے۔ رقص آنکھ سے نہیں ٹانگوں سے کیا جاتا ہے' بہرحال اگر تم ہماری خوشی میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو تمہاری مرضی۔"

مائیکل شائستہ کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ آرکسٹرا کا آہنگ بے تبدیل ہو گیا تھا۔ جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کناں ہو گئے۔ کچھ دیر بعد رقص اختتام کو پہنچا اور ڈنر کا آغاز ہو گیا۔ یہ بڑا پرتکلف ڈنر تھا۔ کئی طرح کا روسٹ گوشت' بکرے کی بھنی ہوئی سالم رانیں اور چائنیز کھانے اس ڈنر میں شامل تھے۔ سویٹ ڈش کے طور پر فریش کریم کیک تھا اور خاص قسم کا اٹالین حلوہ تھا۔ میں نے تھوڑی تھوڑی سب چیزیں چکھیں لیکن غزالہ نے ایک دو نوالے ہی لیے۔ پانی کے بغیر کچھ بھی اس کے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ مشروبات میں ہم نے سوفٹ ڈرنکس لیے۔ ڈنر کے دوران لاابالی نوجوانوں نے بے تحاشا شراب پی اور آپے سے باہر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ دھول دھپا کرنے لگے اور ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ حالت مستی میں ان میں سے اکثر یہ بات بھول چکے تھے کہ صرف چند روز پہلے جہاز پر نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آ چکا ہے جس میں ان کے دو ساتھیوں کے علاوہ جہاز کا نائب کپتان فلیمنگ بھی راہیٔ عدم ہو چکا ہے۔ ڈنر کے بعد رقص کا ایک اور دور ہونا تھا۔ غزالہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں مائیکل پھر ہماری طرف نہ چلا آئے۔ وہ ہمیں پھر "رقص" کا مشورہ دے سکتا تھا۔ غزالہ کا اندیشہ غلط نکلا' مائیکل ہماری میز کی جانب نہیں آیا۔ تاہم اس نے ایک اور حرکت کی اور یہ حرکت "رقص کے مشورے" سے کہیں زیادہ بے ہودہ اور ناقابل قبول تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ڈانسنگ فلور پر آیا' اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا "خواتین و حضرات! توجہ کریں۔ ہمارے درمیان ایک نہایت پیارا جوڑا موجود ہے۔ مسٹر شاہ جہاں اور ان کی سویٹ ہارٹ ڈاکٹر غزالہ۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ ہماری پرانی روایت پر عمل کرتے ہوئے ڈانسنگ فلور پر تشریف لائیں گے اور ایک دوسرے کو KISS کریں گے۔"

غزالہ بھونچکی رہ گئی۔ حاضرین مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے اور پھر ایک دم ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بہکی ہوئی مسرت آمیز چیخیں گونجیں اور ہم پر آوازے کسے جانے لگے۔ غزالہ کی پیشانی پر دیکھتے ہی دیکھتے پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ وہ ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

مائیکل نے پکار کر کہا "شاہ جہاں' میں یہاں اسٹیج پر تمہارا اور تمہاری سویٹ ہارٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں اپنی جگہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔ مائیکل نے حاضرین سے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ ایک بار پھر تالیاں بجائیں تاکہ اس خوب صورت جوڑے کو اندازہ ہو کہ آپ انہیں پیار کرتے دیکھنے کے کتنے خواہش مند ہیں۔" بدمست حاضرین نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ اور گورے بالوں والے ایک اٹالین جوڑے نے اسٹیج پر پہنچ کر ہماری حوصلہ افزائی کے لیے ایک دوسرے کو چوما۔ میں نے غزالہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ ہلدی ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو کر گر جائے گی۔

کیپٹن جم جو شراب کے نشے میں رہتا تھا آج بالکل ہی "غرق" تھا۔ اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "مائیکل تم خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ یہ نہیں اٹھیں گے۔ یہ مشرقی لوگ ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی "تشریف" کرسی کے ساتھ چپک جاتی ہے۔"

ایک زبردست قہقہہ پڑا اور ہر طرف سے ہم پر ہوٹنگ ہونے لگی۔ مائیکل نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! یہ

میرا حکم ہے۔ اپنی ساتھی کے ساتھ اسٹیج پر آجاؤ۔"

ہم اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ کیپٹن جم نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا "چھوڑو مائیکل! تم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ فنکشن کا مزہ ان بے وقوفوں کے لیے کرکرا مت کرو۔"

اتنے میں قریبی میز پر بیٹھا ہوا دیوہیکل ٹام میری طرف بڑھا۔ وہ افریقی زبان میں مجھ پر غرایا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن مفہوم یقیناً یہی تھا کہ وہ ہمیں مائیکل کا حکم ماننے کے لیے کہہ رہا تھا۔ میں اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے غزالہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ تسلی دینے کا ایک انداز تھا۔ ٹام غصے میں بھنایا ہوا میری طرف بڑھا اور اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باقاعدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی گرفت میں شکنجے کی سی سختی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کا سیاہ چہرہ خون کے دباؤ سے کچھ اور سیاہ ہو گیا۔ اس نے دوبارہ میرا بازو تھامنے کی کوشش کی میں نے پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کے حلق سے درندے کی سی غراہٹ نکلی اور اس نے میرا گریبان دبوچ لیا۔ میں نے بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کا گریبان پکڑ لیا دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال دھماکا خیز ہو گئی تھی۔ مائیکل نے اسٹیج پر سے چلا کر کہا۔

"رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

ٹام پر ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا۔ وہ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا' میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ وہ خوں خوار نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چوڑے آدم خور جبڑے ان لمحوں میں کچھ زیادہ ہی چوڑے اور مضبوط نظر آرہے تھے۔ دو حبشی پہرے داروں نے مجھے بازوؤں سے پکڑا اور دھکیل کر غیاث ٹام سے کچھ فاصلے پر لے گئے۔

اسٹیج پر سے مائیکل کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ وہ چند سیکنڈ تک مجھے اور ٹام کو گھورتا رہا پھر پُرجوش لہجے میں بولا "کیوں نہ ان دونوں کا مقابلہ آج ہی کروا دیا جائے۔ سب یہاں جمع ہیں' سب انجوائے کرنے کے موڈ میں ہیں۔ کیوں خواتین و حضرات' ایسٹرنائٹ کے اس پُرمسرت موقع پر آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب میں زبردست شور بلند ہوا۔ یہ شور اس امر کا گواہ تھا کہ حاضرین مائیکل کی رائے سے مکمل اتفاق کر رہے ہیں۔ وہ کئی دنوں سے اس مقابلے کا انتظار کر رہے تھے اور اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ ویسے بھی نشے کے عالم میں اس قسم کا ہلا گلا بہت بھاتا ہے۔ مائیکل نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا "اگر اس مقابلے کے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ تیار ہیں تو یہ مقابلہ ہم آج ہی منعقد کرا سکتے ہیں اسی جگہ اور ابھی۔"

ٹام نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا "میں تیار ہوں۔" اس نے یہ بات افریقی زبان میں کہی تھی' تاہم اس کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے کیا "فرمایا" ہے۔

مائیکل نے مجھ سے پوچھا "کیا تم تیار ہو؟"

میں نے بلند آواز میں کہا "جس وقت سے تم نے صورت دیکھی ہے اس وقت سے تیار ہوں۔ بہتر یہی تھا کہ تم خود مقابلے پر آتے' لیکن اس کے لیے دلیری چاہیے اور بزدل شخص دلیر نہیں ہو سکتا۔"

"میں تمہارے مقابلے میں ضرور آتا مگر مجھے ایک سو ایک فی صد یقین ہے کہ ٹام تمہیں زیر کر لے گا۔"

ٹام کے چہرے اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ وہ ایسے خوں خوار کتے کی طرح نظر آرہا تھا جو زنجیر تڑا کر اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہو۔ جوزف نے مجھے بتایا تھا کہ ٹام کو سائمن کی موت کا بہت دکھ ہے اور وہ شب و روز انتقام کے لیے تڑپ رہا ہے۔ وہ جسمانی لحاظ سے خاصا طاقت ور تھا۔ خصوصی خوراک اور سخت ورزشوں نے اسے سرتاپا فولاد بنا رکھا تھا' اس کی جسمانی قوت کا کچھ اندازہ مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ ٹام نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور یوں لگا تھا کہ اس کی انگلیوں نے میرا گوشت مسل ڈالا ہے۔

حاضرین میں ایک دم زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے میری اور ٹام کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مائیکل اور کیپٹن جم اسٹیج سے اتر کر میرے قریب چلے آئے۔ مائیکل نے مجھ سے کہا "ایک بار پھر سوچ لو۔ یہ کوئی معمولی لڑائی نہیں ہے۔ اس میں تم دونوں میں سے کسی ایک کی جان جا سکتی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ تمہاری جان جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ تمہاری یہ سویٹ ہارٹ جس نے چومنے سے انکار کیا ہے' بالکل بے یارومددگار رہ جائے گی۔ ذرا سوچو' غور کرو' تمہاری یہ ضد جہاں تمہارے لیے جان لیوا ہے وہاں اس سویٹ ہارٹ کے لیے بھی بہت نقصان دہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے چوم لو اور ٹام کے ساتھ اپنے جان لیوا مقابلے کو کچھ عرصے کے لیے ٹال دو۔ یہ مقابلہ ہم پھر کبھی منعقد کرا لیں گے۔ اور کیا معلوم خشکی پر پہنچ کر کیا حالات پیش آئیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مقابلہ ویسے ہی کینسل ہو جائے۔"

"تم مجھے جو "امید" دلا رہے ہو وہ میرے لیے "مایوسی" ہے۔ اب تو یہ مقابلہ ہو کر رہے گا' اگر تم نہیں کراؤ گے تو خود بخود ہو جائے گا۔" میں نے ٹام کو گھورتے ہوئے کہا۔

ٹام نے بے قراری سے پہلو بدلا اور اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم لڑنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"ارادہ ہی نہیں رکھتا یہ میری شدید ترین خواہش بھی ہے' اور میں چاہتا ہوں کہ یہ خواہش ابھی پوری ہو۔ کاش تم اندر سے اتنے بزدل نہ ہوتے اور اس پالتو کتے کے بجائے تم خود میرے مقابل آتے۔"

مائیکل نے ایک گہری سانس لی "تمہیں مقابلے کی شرائط معلوم ہیں؟"

"میں ضروری نہیں سمجھتا۔"

"لیکن میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مقابلہ تم دونوں میں سے کسی ایک کے مرنے کی صورت میں ہی ختم ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک رعایت موجود ہے۔ مقابلے کے کل تین راؤنڈ ہوں گے۔ پہلے دو راؤنڈ میں اگر کوئی فریق شدید زخمی ہو جاتا ہے تو وہ ہاتھ اٹھا کر اپنی ہار کا اعلان کر سکتا ہے' لیکن تیسرے راؤنڈ کے آغاز کے بعد ایسا کوئی آپشن باقی نہیں رہے گا۔ پہلے دونوں راؤنڈ پانچ پانچ منٹ کے ہوں گے' تیسرا راؤنڈ حتمی فیصلے تک جاری رہے گا۔"

"تمہاری ہر شرط مجھے منظور ہے۔ تم مقابلہ شروع کرلو۔"

"یہ میری شرطیں نہیں' مقابلے کی شرطیں ہیں۔ ایسے مقابلے جب بھی ہوتے ہیں' انہی شرطوں کے تحت ہوتے ہیں۔ میری صرف ایک شرط ہے۔ یہ شرط میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بشرطیکہ تم یہ شرط سننے کے لیے زندہ سلامت رہے۔"

"مقابلہ کہاں ہو گا؟"

"اسی خوب صورت ہال میں۔" مائیکل نے کہا "بے شک کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گی لیکن ٹوٹ پھوٹ دیکھنے کا بھی ایک اپنا مزہ ہوتا ہے۔ ہاں ایک بات اور ہے۔ یہ مقابلہ خالی ہاتھ ہو گا لیکن ایک سہولت حاصل ہو گی۔ مقابلے کے میدان میں موجود کوئی بھی شے تم لوگ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہو۔ چند ماہ پہلے ایک ایسے ہی مقابلے میں کرسی کی ٹوٹی ہوئی نوک دار ٹانگ سے مدمقابل کا پیٹ پھاڑ دیا گیا تھا۔"

حاضرین محفل ایک بڑے دائرے کی صورت میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کئی ایک کی بغل میں لڑکیاں تھیں اور ہاتھوں میں جام تھے۔ سگریٹ کے دھوئیں میں ہر شے دھندلی نظر آرہی تھی۔ جو پُرتکلف ڈنر کیا گیا تھا اس کے برتن ابھی میزوں سے سمیٹے نہیں گئے تھے۔ ٹام پتلون قمیص میں تھا۔ اس نے قمیص اب اتار پھینکی تھی اور اپنے پہاڑ جیسے ورزشی جسم کو نمایاں کرنے کے لیے بازوؤں کو حرکت دے رہا تھا۔ مجھے ایک گوشے میں مسکین صورت پروفیسر اللہ دتا کھڑا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کی کیفیت واضح تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شائستہ اور غزالہ کے چہرے پر بھی نظر آرہی تھی۔ غالباً ان کے ڈرے ہوئے تصور نے انہیں ابھی سے ٹام کی آدم خوری کے مناظر دکھانا شروع کر دیے تھے۔

کیپٹن جم نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ینگ مین! یہ ایک سنگین مقابلہ ہو گا' تم اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لو۔"

"تم بھی ایک پالتو کی لاش اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"میں نے تمہاری بات کا برا نہیں منایا۔" جم لڑکھڑاتے لہجے میں بولا "مجھے نہیں یقین کہ میں تم سے دوبارہ بات کر سکوں گا۔"

"تم اپنے ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہو؟" مائیکل نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ضروری نہیں سمجھتا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری مرضی ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو' چند لمحوں کے لیے انہیں باری باری یہاں بلا سکتے ہیں۔"

"تھینکس۔"

"اپنی سویٹ ہارٹ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہو تو کرلو۔"

"میں تمہاری اس لعنتی ہمدردی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم مجھے نفسیاتی دباؤ میں لانے کی بھونڈی کوشش بھونڈے طریقے سے کر رہے ہو۔"

مائیکل کی آنکھوں میں طیش کی بجلی چمکی لیکن گرجنے کی آواز نہیں آئی۔ غزالہ کا جسم لرز رہا تھا اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔ نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما "غزالہ! یہ لوگ خواہ مخواہ سنسنی پیدا کر رہے ہیں۔ ایسے مقابلے بڑے دیکھے ہیں ہم نے۔ تم حوصلہ رکھو۔ تمہارے حوصلے سے ہی مجھے حوصلہ ملے گا۔"

"آ... آپ نے خواہ مخواہ بات بڑھائی ہے۔"

"خواہ مخواہ نہیں بڑھائی ہے۔ یہ ہماری آن اور عزت کا مسئلہ تھا۔ باقی رہی مقابلے کی بات تو یہ تو ہونا ہی تھا۔ آج نہیں تو کل ہو جاتا۔ اچھا ہے ابھی ہو رہا ہے۔"

"آپ کی انگلیاں زخمی ہیں۔ آنکھ میں بھی درد ہوتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔

مجھے یقین تھا کہ میں اسے گلے لگالوں تو وہ سب کچھ بھول کر مجھ سے لپٹ جائے گی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گی لیکن میں خواہش کے باوجود ایسا نہیں کرسکا۔ زندگی میں پیار کرنے والوں کے لیے بے شمار ایسے مجبور لمحے آتے ہیں۔ کبھی موقع ہوتا ہے آمادگی نہیں ہوتی' کبھی آمادگی ہوتی ہے اور موقع نہیں ہوتا۔ اور کبھی سب کچھ ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

غزالہ کا ہاتھ آہستگی سے دبا کر اور "آنکھوں" سے اس کے نم ناک چہرے کو چوم کر میں حاضرین کی طرف پلٹ آیا۔ ہال نما کمرے میں ایک دائرہ بنالیا گیا تھا۔ درمیان میں سے میزیں اور کرسیاں ایک طرف ہٹا کر تقریباً پندرہ مربع فٹ جگہ بالکل خالی کردی گئی تھی۔ یہی لڑائی کا "رنگ" تھا۔ آدم خود تام مجھ سے پہلے ہی "رنگ" میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر جوش تو بے شک تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جان لیوا مقابلے کا تفکر بھی موجود تھا۔ میں نے اپنی قمیص اتار کر مسلح پہرے دار کے حوالے کردی' اس کے علاوہ دستی گھڑی بھی اتار دی۔ پہرے دار نے یہ دونوں اشیاء ایک کونے میں کھڑی غزالہ کے حوالے کردیں۔

تماشائی بپھرے ہوئے تھے اور ان کا جوش و خروش دیدنی تھا لیکن ایک بات نوٹ کرنے والی تھی۔ مسلح پہرے داروں میں سے کسی نے شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ ہال میں چاروں طرف چوکس کھڑے تھے۔ میں اور تام آمنے سامنے ہوئے۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے سفید دانت چمکائے' جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے سمجھا رہا ہو کہ مجھے شروع میں ہی تم پر برتری حاصل ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں مگر میرے پاس یہ بتیس دانت ہیں جو تمہیں چیرپھاڑنے کے لیے بالکل تیار اور مستعد ہیں۔ اس مقابلے میں ریفری کے فرائض جہاز کا ایک فورمین انجام دے رہا تھا۔ اس نومند افریقن کا نام ایڈی سن تھا۔ وہ افریقی زبان بھی جانتا تھا' اس نے مجھے انگلش میں اور تام کو افریقی میں ایک بار پھر مقابلے کی چیدہ چیدہ شرائط بتائیں۔ اس کے بعد ہم دونوں کی تلاشی لی کہ کہیں ہمارے پاس کوئی ہتھیار نما چیز نہ ہو۔ ہم دونوں کو آمنے سامنے کھڑا کرنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ یہ مقابلے کا پہلا راؤنڈ شروع ہونے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی آرکسٹرا نے زور و شور سے ڈرم بجانا شروع کردیے اور ہال ملی جلی آوازوں سے گونجنے لگا۔ تام میرے سامنے دونوں بازو پھیلائے کسی عفریت کی طرح کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ننگے پاؤں دیکھے۔ اس کے دائیں پاؤں پر دباؤ زیادہ تھا۔ اسٹریٹ فائٹر کو بڑی باریک بینی سے ایسی باتوں پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔ یہ باتیں باڈی لینگویج کے زمرے میں آتی ہیں اور انہیں نوٹ کرکے مدمقابل کی حرکات کا پیشگی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تام کے دائیں پاؤں پر نظر آنے والا اضافی دباؤ دو باتوں کی نشان دہی کرتا تھا۔ نمبر ایک یہ کہ وہ حملے میں پہل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا' نمبر دو یہ کہ اگر میں حملہ کروں تو وہ میرا وار خالی دینے کے لیے دائیں رخ پر حرکت کرے گا۔ میں نے اسے جھکائی دی اور پھر اچانک اس پر جھپٹا مارا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ دائیں طرف ہٹا' میرا زور دار مکا اس کے بائیں گال پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر چار پانچ قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے غراہٹ بلند ہوئی اور وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔ میں نے اس کے کئی طوفانی کے ہوا میں خالی دیے اور جھکائی دے کر کونے میں سے نکل گیا۔ میری اڑتی ہوئی سی نگاہ غزالہ پر پڑی' وہ سراپا غم نظر آرہی تھی۔ دعا ایک غیر مرئی چیز ہے' اسے دیکھا نہیں جاسکتا لیکن ان لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں غزالہ کے ہونٹوں پر دعا کو دیکھ سکتا ہوں۔

تام ایک بار پھر سانپ کی طرح پھن پھیلا کر میرے سامنے آگیا۔ ہم دونوں وار کرنے کے لیے بہتر موقع تلاش کررہے تھے۔ مگر اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ آغاز کے چند سیکنڈ بعد ہی مقابلہ رک گیا۔ جہاز میں خطرے کی اطلاع دینے والی گھنٹیاں زور و شور سے بجنے لگی تھیں۔ آرکسٹرا ایک ہچکی لے کر خاموش ہوگیا۔ حاضرین پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے والی یہ گھنٹیاں مسلسل بجتی چلی جارہی تھیں۔ خطرہ کئی طرح کا ہوسکتا تھا۔ جہاز میں کہیں آگ بھڑک سکتی تھی۔ کوئی چیز جہاز سے ٹکرا سکتی تھی یا پھر قیدیوں کی طرف سے کوئی سنگین مسئلہ پیش آسکتا تھا۔ مائیکل اور کیپٹن جم دیگر عملے کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گئے۔ مسلح محافظ رنگ میں داخل ہوگئے اور انہوں نے مجھے اور تام کو ایک دوسرے سے دور ہٹا دیا۔ ہر طرف افراتفری نظر آرہی تھی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی ہال نما کمرے سے نکل کر عرشے پر پہنچا۔ اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہلکی چاندنی دور تک سمندر پر بکھری ہوئی تھی۔ ہماری دائیں جانب صرف سو ڈیڑھ سو گز کی دوری پر ایک جہاز دکھائی دے رہا تھا۔ جہاز کی روشنیاں دو طویل قطاروں کی صورت میں نظر آرہی تھیں۔ وہ ہمارے جہاز کے متوازی چل رہا تھا اور بڑے جارحانہ انداز میں قریب تر ہوتا جارہا تھا۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ شاید ہم "بکانیرز" (بحری قزاقوں) سے ٹکرا گئے ہیں۔ قدیم زمانے کی طرح آج کے جدید دور میں بھی کھلے سمندر میں بحری قزاقی کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا سدباب کرنے کے لیے مختلف حکومتیں مختلف اقدامات اٹھاتی ہیں لیکن یہ سلسلہ کبھی بھی مکمل طور پر رک نہیں سکا۔ ہم ایک ویران سمندر میں تھے اور یہاں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں غور سے اس جہاز کو دیکھ رہا تھا جو ٹکر مارنے والے انداز میں ہرکولیس کے قریب تر ہو رہا تھا۔ جہاز کا اینگل تھوڑا سا تبدیل ہوا تو میں اسے زیادہ بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہوگیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہی سفید جہاز ہے جو ایرانی سمندر کے آس پاس ہمیں ملا تھا اور جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے مائیکل نے شاطرانہ انداز اختیار کیا تھا۔ یہ جہاز اپنے ساتھی جہاز سمیت ریت میں پھنس گیا تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ اب وہ پھر ہرکولیس کے مقابل نظر آرہا تھا۔

مائیکل نے میگا فون پر پکار پکار کر اپنے ساتھیوں کو الرٹ ہونے کا حکم دیا۔ ابھی مائیکل نے بمشکل اپنا اعلان مکمل کیا تھا کہ سفید ایرانی جہاز پر سے ہرکولیس پر اندھادھند فائرنگ ہونے لگی۔ یہ دور مار رائفلوں کی فائرنگ تھی۔ سفید جہاز بے شک ہرکولیس سے کافی چھوٹا تھا مگر نفری اور اسلحے کے لحاظ سے اس کی ہرکولیس پر برتری صاف نظر آتی تھی۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے مائیکل کے کارندوں نے عرشے پر پوزیشنیں لے لیں۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہرکولیس سے بھی جوابی فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی چاروں طرف پرواز کررہی تھیں۔ تاریکی میں چمکنے والی روشن لکیریں درحقیقت موت کی لکیریں تھیں۔ یہ پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ہر طرف اپنے ہدف کو ڈھونڈ رہا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" مجھے اپنے عقب سے غزالہ کی آواز آئی۔

میں نے کہا "یہاں کھڑے ہونا خطرناک ہے۔"

میں غزالہ کو لے کر ایک کیبن کی اوٹ میں ہوگیا۔ میری رسٹ واچ اور قمیص ابھی تک غزالہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیں۔ میں نے جلدی جلدی قمیص پہن کر گھڑی باندھ لی۔ اسی دوران میں مجھے پروفیسر اللہ دتا کی صورت نظر آئی۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا "ہم ایرانی جہاز کی مدد کرسکتے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"بڑا آسان اور کارگر طریقہ ہے' آؤ میرے ساتھ۔" پروفیسر نے کہا۔

میں اور غزالہ پروفیسر کے پیچھے چلتے زیریں عرشے پر پہنچے۔ ہم مختلف چیزوں کی آڑ میں چل رہے تھے۔ گولیاں اور کارتوسوں کے مہلک چھرے ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ دونوں جہاز اب اتنے قریب آگئے تھے کہ ہلکے ہتھیاروں سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم بالائی عرشے سے نیچے اترنے والی دو ہیکل سیڑھیوں کے نیچے پہنچے' یہاں ایک کمرے کا ادھ کھلا دروازہ نظر آرہا تھا۔ ایک حبشی وہاں سے ایک بیگ لے کر نکلا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا تیزی سے بالائی عرشے کی طرف چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق بیگ میں رائفل کا ایمونیشن تھا۔ پروفیسر اللہ دتا سرگوشی میں بولا "سارا ایمونیشن اسی کمرے میں پڑا ہے۔ یہ ایمونیشن ضائع ہوجائے تو کالے دس منٹ بھی مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اگر تم...."

ابھی پروفیسر کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ چند گز پیچھے چاولوں کے گودام کے پاس ایک زوردار دھماکا ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ ایک چھوٹے سائز کا راکٹ تھا جو ایرانی جہاز سے فائر کیا گیا تھا۔ ایسے ہی دو راکٹ بعد ازاں مزید فائر کیے گئے۔ ان میں سے ایک تو خطا ہوکر سمندر میں جاگرا اور دوسرا جہاز کے "پروپلر" کے پاس کہیں لگا' بہرحال اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ یہ وہی PROPELLER (پرخی) تھا جس کی مرمت چند دن پہلے بمشکل کی گئی تھی۔ اصل نقصان پہلے راکٹ نے ہی کیا۔ گودام کے قریب کیبنوں میں لکڑی کا کام کیا گیا تھا' یہاں آگ بھڑک اٹھی۔ عملے کے چند افراد لڑائی چھوڑ کر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئے۔

پروفیسر نے کہا "شاہ جہاں! یہ موقع غنیمت ہے۔ ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس ایمونیشن اسٹور میں پھینک دیتے ہیں۔"

پروفیسر کی تجویز معقول تھی۔ جہاز پر افراتفری مچی ہوئی تھی۔ عین جشن طرب کے موقع پر مارے جانے والے اس شب خون نے ہرکولیس کے رکھوالوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ جو تھوڑی دیر پہلے نشے میں چور موج میلہ کر رہے تھے اب برستی گولیوں میں اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ جہاز میں خطرے کی گھنٹیاں بدستور بجتی چلی جارہی تھیں۔ شاید انہیں بجھانے والا بند کرنا ہی بھول گیا تھا۔ فائرنگ کے شور میں گاہے گاہے مائیکل کی آواز میگا فون پر گونجتی تھی۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنے کارندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ کبھی وہ انگلش بولتا تھا اور کبھی افریقی زبان میں حکم جاری کرتا تھا۔

اس بدترین افراتفری سے فائدہ نہ اٹھانا واقعی بے وقوفی تھی۔ میں نے ایک نظر ایمونیشن اسٹور کا جائزہ لیا اور پھر آگ کی طرف بڑھا۔ آگ میں سے جلتی ہوئی لکڑی کھینچ کر ایمونیشن اسٹور میں پھینک دینا چنداں دشوار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی۔ جونہی میں شعلوں کی طرف بڑھا، شدید حدت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی میں آگ سے چند قدم دور ہی تھا کہ میری نگاہ دائیں طرف اٹھی۔ ایرانی جہاز ہرکولیس کے بالکل نزدیک آگیا تھا۔ یہ فاصلہ اتنا کم تھا کہ اگر کوئی شخص تیزی سے بھاگ کر ایرانی جہاز پر چھلانگ لگاتا تو وہاں پہنچ سکتا تھا۔ ایرانی جہاز پر پوزیشن لیے ہوئے کئی باوردی افراد کی جھلکیاں نظر آرہی تھیں۔ میرے عین سامنے قریباً پندرہ گز کی دوری پر ایک دور مار رائفل کا رخ میری جانب ہوا۔ میری چھٹی حس نے چیخ کر مجھے خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے جست لگائی اور سات آٹھ فٹ نیچے چاول کی بوریوں پر گرا، وہاں مجھ سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھا گیا اور میں لڑھک کر کئی فٹ نیچے جہاز کے پختہ فرش پر جا گرا۔ میں جہاں گرا تھا وہیں اوندھا پڑا رہا۔ گولیاں یہاں بھی مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ میں نے لیٹے لیٹے بائیں طرف دیکھا۔ قریباً ایک فٹ کی دوری پر ایک کیبن کی چوبی دیوار تھی۔ دیوار کے بالکل زیریں حصے میں برسٹ لگا تھا اور ایک مستطیل سوراخ سا ہو گیا تھا۔ اس سوراخ میں سے میری نگاہ نیچے گئی۔ ایک ہال نما کمرے کا منظر نظر آیا۔ یہ منظر چونکا دینے والا تھا۔ میں نے دیکھا کم و بیش بیس افراد یہاں موجود تھے۔ انہوں نے گوریلوں جیسی خاکی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ان میں سے چار پانچ سفید فام تھے باقی حبشی تھے۔ یہ افراد تین آہنی قسم کی گنیں اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔ میں یہ گنیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ گنیں دیکھنے میں اینٹی ایئر کرافٹ نظر آتی تھیں۔ قریباً آٹھ فٹ لمبے بیرل تھے۔ چھ سات انچ لمبی گولیوں کے اسٹیپ ان گنوں کے ساتھ اٹیچ تھے۔ یہ خوفناک گنیں اس سے پہلے میری نگاہ سے نہیں گزری تھیں اور نہ کمانڈو ٹائپ یونی فارم والے یہ افراد میں نے دیکھے تھے۔ کسی اندرونی کمرے سے ایمونیشن کے باکس بھی باہر لائے جاچکے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سیڑھیوں کے نیچے واقع چھوٹا سا کمرا ہی جہاز کا واحد "ایمونیشن ڈپو" نہیں تھا۔ اگر ہم اسے اڑا بھی دیتے تو یہ لوگ نیچے سے اور ایمونیشن لے آتے۔ بھاری بھرکم گنوں کی جھلک دیکھنے کے بعد میری چھٹی حس دہائی دینے لگی تھی کہ ہم اب تک مائیکل کی طاقت کو "انڈر اسٹیمیٹ" کر رہے تھے۔ مائیکل نے ابھی تک اپنی پوری قوت استعمال ہی نہیں کی تھی۔ یونہی "ایمونیشن" اسٹور کو بلاسٹ کرنے کا خیال ذہن سے نکال کر میں بھاگتا ہوا واپس غزالہ اور پروفیسر اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں۔" غزالہ نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ پروفیسر کے ساتھ ایک کیبن کے عقب میں دبکی ہوئی تھی۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"اس لڑائی میں ہمیں مائیکل وغیرہ کا ساتھ دینا ہوگا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں دینا ہوگا؟"

"اس لیے کہ جیت ان کی ہی ہونی ہے۔"

پروفیسر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پروفیسر کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ غزالہ کے ساتھ یہیں دبکا رہے۔ میں نیچے جھک کر دوڑتا ہوا برج کی طرف گیا، یہاں مائیکل آڑ لیے کھڑا تھا اور میگا فون کے ذریعے احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں M16 رائفل تھی۔ گاہے گاہے وہ میگا فون نیچے رکھ کر ایرانی جہاز کی طرف چند فائر بھی کر لیتا تھا۔ جہاز کے زیریں حصے سے زبردست مزاحمت کی جارہی تھی، اسی مزاحمت کا نتیجہ تھا کہ ایرانی جہاز جو تھوڑی دیر پہلے بے حد نزدیک آگیا تھا اور اس کے مسلح افراد ہرکولیس پر کودنے کی تیاری کر رہے تھے اب پھر پیچھے چلا گیا تھا۔

میں مائیکل کے قریب پہنچا تو وہ چیخ کر بولا "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نیچے جاؤ۔"

میں نے اطمینان سے کہا "میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک سیکنڈ کے لیے رائفل دو۔" میں نے مائیکل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آیا۔ میں نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ میرے ساتھی تمہارے قبضے میں ہیں۔ میں بمبئی جا کر واپس آگیا تھا تو اب رائفل بھی

کہاں جاؤں گا۔"

مائیکل نے اپنی رائفل تو نہیں دی لیکن پاس ہی رکھی ایک M16 نکال کر مجھے تھما دی۔ میں نے اوٹ میں کھڑے کھڑے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا پھر اس کا رخ اوپر کی طرف کیا اور چند برسٹوں میں ۳۶ گولی کا میگزین خالی کر دیا۔ میں نے جہاز کی زنگ آلود واٹر ٹینکی کو نشانہ بنایا تھا۔ واٹر ٹینکی میں درجنوں سوراخ ہو گئے اور پانی تیز دھاروں کی صورت میں نکلا۔ جہاز پر بھڑکنے والی آگ کا مقام بلند و بالا ٹینکی کے عین نیچے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھنا شروع ہو گئی اور گہرا سفید دھواں عرشے کو ڈھانپنے لگا۔ اسی دوران میں جہاز کے زیریں حصے سے ان ہیوی گنز کی فائرنگ سنائی دینے لگی جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اتفاقاً دیکھ لی تھیں۔ ان گنز کی فائرنگ شروع ہوتے ہی ایرانی جہاز تیزی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ قریباً ایک فرلانگ دور چلا گیا۔ دونوں جہاز کھلے سمندر میں تھے اور مغرب کی طرف جھکے ہوئے چاند کی روشنی میں بغیر روشنیوں کے بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ دونوں جہازوں کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ تاہم دونوں ایک جیسی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔

دونوں جہازوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے کے بعد فائرنگ تھم گئی۔ اس فائرنگ میں ہرکولیس کے عملے کا ایک کرین مین معمولی زخمی ہوا تھا، ہاں مالی نقصان کافی ہوا تھا۔ راکٹ لگنے سے جو آگ بھڑکی تھی اس نے جہاز میں قریباً دس مربع میٹر میں ہر شے کو خاک کر دیا تھا۔ ٹینکی سے نکلنے والی پانی کی دھاروں نے اس آگ کو بہت جلد سرد کر دیا تھا ورنہ یہ مزید پھیل سکتی تھی اور اگر چاول کے اسٹاک تک پہنچ جاتی تو پھر اس پر قابو پانا ناممکن تھا۔ اس اسٹاک کے قریب بمبئی سے لائے جانے والے کسی کیمیکل کی بے شمار بوریاں رکھی تھیں اور یہ کیمیکل اس جہاز کو جہنم بنا سکتا تھا۔

مائیکل نے رائفل مجھ سے واپس لے کر اپنے ایک کارندے کو پکڑا دی۔ کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "بہرحال! تمہارا آئیڈیا اچھا رہا ہے۔ واٹر ٹینک کا نقصان تو ہوا ہے مگر یہ نقصان ناقابل تلافی نہیں ہے۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ کچھ دیر پہلے میں اسے "ناقابل تلافی" نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اور بوجوہ وہ ارادہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔

مائیکل نے جوزف کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے واپس نیچے والے کمپارٹمنٹ میں لے جائے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ ایرانی جہاز کیونکر اور کیسے دوبارہ ہرکولیس کے مدمقابل پہنچ گیا؟ ایرانی جہاز کے لوگ کیا چاہتے ہیں؟ اور اس لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں یہ سارے سوال پوچھنے کے لیے یہاں نہیں رک سکتا تھا، کیونکہ مائیکل میری واپسی کا آرڈر جاری کر چکا تھا۔ جوزف نے مجھے آگے لگایا اور چور راستے سے گزار کر واپس کیبنوں والے کمپارٹمنٹ میں لے آیا۔ یہاں افراتفری نظر آرہی تھی۔ کیبنوں میں موجود قیدی جان چکے تھے کہ اوپر جہاز پر کوئی زبردست گڑبڑ ہوئی ہے۔ تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں ان تک پہنچی تھیں، اس کے علاوہ عرشے پر آگ لگنے سے جو بھاگ دوڑ مچی تھی اس کی آہٹیں بھی انہوں نے سنی تھیں۔ میں جونہی اتر کر قیدیوں کے کیبن میں داخل ہوا وہ سب کے سب میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ مخصوص زبان میں واویلا کر رہے تھے۔ سب کے سب ایک ہی بات پوچھ رہے تھے کہ اوپر کیا ہوا ہے؟

میں نے مناسب لفظوں میں انہیں سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بالکل محفوظ ہیں۔ سیوک کمار بولا "ہم کو ساگر کا سفر کبھی راس نہیں آوت۔ اماں کو خشکی پر اتار دیو، ورنہ جندہ نہیں بچے گا۔"

یعنی "ہمیں سمندر کا سفر کبھی راس نہیں آتا، تم لوگ ہمیں خشکی پر اتار دو ورنہ ہم زندہ نہیں بچیں گے۔"

میں نے کہا "گھبراؤ نہیں سیوک۔ تمہیں تو دوسروں کو بھی حوصلہ دینا چاہیے۔ منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔"

نوعمر کملا کی ماں نے میرا بازو تھام لیا "ہمار کو تم پر بڑا وشواس ہے۔ تم کاہے کو ہمیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔"

"ہم سے دور جا کر بھی میرا دھیان تم لوگوں کی طرف ہی رہتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

ان کے کیبن سے نکل کر میں اپنے ساتھیوں کے کیبن میں پہنچا، یہاں بھی تینوں کے چہروں پر پریشانی نظر آرہی تھی۔ حسب توقع زریں گل سب سے بڑھ کر پریشان تھا۔ اس نے فوراً مجھے ٹٹول کر دیکھا "آپ ٹھیک تو ہے ناں استاد صیب؟"

"بالکل۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آگیا ہوں۔ سارے پرزے گن لو۔ ایک بھی کم نہیں ہے۔"

"مگر اوپر فائرنگ تو ایسے ہو رہا تھا جیسے..."

"پنجابی فلموں میں ہوتا ہے۔" صفدر نے فقرہ مکمل کیا۔

"مگر وہ ساری فائرنگ مجھ پر تو نہیں ہو رہی تھی زریں صاحب۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اور غزالہ بی بی کیسا ہے؟"

"وہ بھی بالکل خیریت سے ہے۔"

"رات کو ام نے بہت برا خواب دیکھا تھا' ام کو غزالہ بی بی کا بہت ہی فکر ہے۔"

صفدر بولا "خواب اس نے کلثوم کے بارے میں دیکھا ہے اور فکر غزالہ بی بی کا ہے۔ بات سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔ یعنی غزالہ بی بی کا فکر نہیں لیڈی ڈاکٹر کا فکر ہے۔"

"صفدر صیب! آپ کو تو اماری ہر بات میں ہیر پھیر نظر آتا ہے حالانکہ ام جتنا "سٹریٹ فارورڈ" ہے اتنا آپ بھی نہیں ہے۔ ام نے ہمیشہ سیدھی سادی بات کی ہے۔" غالباً وہ اسٹریٹ فارورڈ کہنا چاہ رہا تھا۔

"اچھا سٹریٹ فارورڈ صاحب۔ میں الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

زریں گل نے ایک بار پھر مجھے ٹٹولا "ام کو معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ کسی کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرانے لگے تھے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"جوزف نے گول مول سی بات کی تھی۔" صفدر نے کہا۔

"ہاں ایک ایسا سلسلہ شروع تو کیا تھا انہوں نے لیکن پھر اوپر سے خدائی فوجدار آ گئے۔"

"کون سا فضائی روزگار؟" زریں نے پوچھا۔

"فضائی روزگار نہیں خدائی فوجدار یعنی ایرانی جہاز جس نے پہلے بھی اس جہاز کا پیچھا کیا تھا۔" زریں کے ساتھ ساتھ صفدر کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ پچھلے ایک گھنٹے میں کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے۔ وہ دونوں حیرت زدہ سے سنتے رہے۔ آخر میں ان کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ مایوسی ہی کی بات تھی۔ مائیکل اور اس کے کارندوں نے مہلک ترین اسلحے کی نمائش اور فائرنگ سے ایرانی جہاز کو "پسپا" ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اب کیا صورت حال ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ جب میں آیا تھا تو فائرنگ رک چکی تھی اور دونوں جہاز قریباً ٹھہر چکے تھے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ ایرانی جہاز واپس چلا جائے گا۔"

"اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے تو وہ بھی نہیں لگتے، لیکن اس جھڑپ کے بعد ایک بات بالکل واضح ہو گئی ہے۔ ہرکولیس کی طاقت اور نفری ایرانی جہاز سے زیادہ ہے۔"

"لیکن ممکن ہے کہ ایرانی جہاز کے پاس اور راکٹ ہوں۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ اور راکٹ ہوں گے۔ اگر ہوتے تو وہ ضرور چلا دیتے۔ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ہرکولیس پر زبردست افراتفری پھیل گئی تھی' اس وقت ایرانی بالکل قریب تھا' ایرانی ایک بار بھرپور حملہ کر کے جہاز پر ... سکتے تھے۔"

ہمارے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ فائرنگ کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ جہاز رکا ہوا ... بہت معمولی رفتار سے چل رہا تھا۔ کیبنوں کے درمیان ... جگہ پر خوں خوار صورتوں والے حبشی پہرے دار چکرا رہے تھے۔ اب اگر میں واپس عرشے پر جانا چاہتا تو وہ کسی صورت نہ جانے دیتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی۔ جہاز ... کھلے سمندر میں رکا رہا۔ اگلے دن بھی دوپہر تک حالات ... کے توں رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بردہ فروشوں اور ایرانی جہاز کے عملے میں کسی طرح کے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ شاید لڑائی سے بچنے کے لیے کوئی درمیانی راستہ اختیار کیا جا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا حالات میں امید کی کرن موجود تھی۔

دوپہر کے دو ڈھائی کا وقت تھا جب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور مجھے سیڑھیوں پر مائیکل اور اس کے مسلح ... کی شکلیں دکھائی دیں۔ مائیکل کے ساتھ ایک نیا شخص تھا۔ اس کا ڈیل ڈول دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بے حد ... اندام تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی گنبد نما توند ... طرح ہل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے سیڑھیاں اتر... سے پورا کمپارٹمنٹ لرزنے لگا ہے۔ وہ شکل و صورت ... ایرانی نظر آتا تھا۔ اس نے گیلس والی پتلون پہن رکھی تھی ... بالائی جسم کو نصف آستین کی بوشرٹ نے ڈھانپ رکھا تھا ... حبشی پہرے داروں نے تمام کیبنوں کے دروازوں ... موجود خلا کھول دیے۔ مائیکل اور فربہ اندام ایرانی معا... کرنے والے انداز میں کیبنوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ فربہ اندام شخص قریب پہنچا تو ہم اس کی صورت ... طریقے سے دیکھنے لگے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور ... داڑھی کانٹوں کی طرح تھی۔ چہرہ بسیار خوری اور شراب نوشی کے سبب ورم زدہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شریر سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کسی بھی زاویے سے مجھے اچھا شخص نظر نہیں آیا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا ایرانی جہاز کا ...

... کے کوسٹ گارڈز سے تھا لیکن جو شخص اب یہاں نظر ... کسی طور بھی کوسٹ گارڈ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے ... شخص کو تو کسی بھی قسم کی فورس میں بحال نہیں رکھا ... تھا۔ وہ دلچسپی سے ہر کیبن میں دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ... مائیکل سے تبادلۂ خیال بھی کرتا جا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ یہ ... جاری رہا پھر یہ لوگ واپس چلے گئے۔

صفدر نے کہا "یہ کیا چکر چل گیا ہے جناب۔ لگتا ہے کہ ... ایرانی جہاز سے یہاں آیا ہے۔"

"لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔"

"شاید مذاکرات کچھ زیادہ ہی کامیاب ہو گئے ہیں۔" ... نے کہا۔

"مذاکرات کوئی نہیں ہے جی۔" زریں بولا "یہ سارے لوگ اندر سے ایک ہی ہوتا ہے۔ خو مسلمانوں سے ... لینے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ام نے ایک ... درجنوں فلموں میں ایسا دیکھا ہے۔ ایک دو فلموں میں تو ... بولا جا سکتا ہے' ساری فلموں میں تو نہیں بولا جا سکتا۔ فلم والوں نے بھی خدا کو جان دینا ہے۔"

صفدر بولا "لیکن یہ موٹا تو کافر نہیں ہے۔ یہ تو ایرانی ..."

"کافر نام سے نہیں ہوتا کرتوت سے ہوتا ہے صفدر صیب۔ اب آپ دیکھیں' سنتوش دلیپ وغیرہ کا نام ... مانوں جیسا نہیں تھا لیکن وہ کلمہ گو مسلمان تھا۔ اور دوارہ ... سو میرے اچھا مسلمان اور کون ہوگا۔ اس نے اپنا جان ... بے میں ڈال کر جتنا فرنگی مارا ہے پوری ہسٹری میں کسی ... نہیں مارا۔"

"لیکن وہ تو فلموں میں مارے تھے۔" صفدر نے کہا۔

"فلموں کے علاوہ بھی مارا تھا۔ ام نے تو یہاں تک ... ہے کہ وہ بھیس بدل کر ویت نام کی جنگ میں بھی گیا تھا۔"

صفدر اور زریں گل میں نوک جھوک شروع ہو گئی۔ یہ ... جھوک خاصی طویل ہوتی مگر اسی دوران میں جوزف ... کے کیبن کے دروازے پر آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا ... مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"کیوں اب کیا مصیبت آئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو کوئی نہیں آئی' ممکن ہے کہ تمہارے اوپر ... نے کے بعد آ جائے۔"

میں اور جوزف اوپر پہنچے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ ... سے لمبے ہو رہے تھے۔ ایرانی جہاز تھوڑے ہی فاصلے پر لنگر انداز تھا۔ اس کے عرشے پر چلتے پھرتے کوسٹ گارڈز صاف نظر آ رہے تھے۔ جہاز کا نام "انارڈا" یعنی "تو" تھا اور صاف پڑھا جا رہا تھا۔ مستول پر ایرانی جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ عملے کے افراد عرشے پر ہاکی ٹائپ کا کوئی کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان کی چیختی ہوئی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہرکولیس کے عرشے پر جنگلے کے ساتھ چند میزیں رکھی تھیں۔ ان میزوں پر مختلف مشروبات رکھے تھے۔ مائیکل اور کپتان جم کے علاوہ فربہ اندام ایرانی بھی یہاں موجود تھا۔ یہ لوگ باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کر رہے تھے۔ یہاں دو ایرانی کوسٹ گارڈز بھی نظر آئے جو مائیکل کے ساتھیوں کے پاس بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ بڑا دوستانہ ماحول تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ صفدر کی یہ بات درست ثابت ہو گئی تھی کہ ایرانی جہاز کے لوگوں سے مائیکل وغیرہ کے مذاکرات ضرورت سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ایک روز پہلے ایرانی جہاز سے جھڑپ کے دوران میں' میں نے ایرانیوں کی مدد کا ارادہ کیا تھا۔ اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا کر یقیناً میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ اگر اس وقت میں اور دو ایک قیدی ایرانی جہاز کی مدد کرتے اور ہماری یہ "مخاصمت" مائیکل کی نظر میں آ جاتی تو اب ہمارا برا حال ہوتا۔

مائیکل نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فربہ اندام ایرانی سے مخاطب ہو کر بولا "مارکوس! یہ ہے وہ دوسرا بندہ۔ اس کا نام ماسٹر جہانی ہے۔"

مارکوس نامی موٹے نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا اور بولا "یہ کشتی وغیرہ تو پہلوانوں کا کام ہوتا ہے۔ یہ تو ڈیل ڈول سے پہلوان نظر نہیں آتا۔"

"ڈیل ڈول پر نہ جاؤ۔" مائیکل نے کہا "یہ کشتی کرتا ہے۔ بلکہ جب کل تم نے ہم پر ہلا بولا' اس وقت یہ کشتی کر رہا تھا۔ بڑے زور دار مقابلے کی امید تھی لیکن تمہاری آمد کے سبب یہ مقابلہ آغاز ہی میں ختم ہو گیا۔"

"اوہو' پھر تو ہم نے تمہاری تفریح برباد کرنے کی غلطی کی۔"

"ایسی غلطیاں تم دونوں بھائی پہلے بھی کرتے رہے ہو۔ بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا' ہم کل یہ مقابلہ دوبارہ منعقد کرائیں گے۔"

"بہت خوب!" فربہ اندام ایرانی مارکوس نے کہا۔ نام سے پتا چلتا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔

مائیکل مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شاہ جہاں! ان سے ملو۔ یہ ہیں ہمارے پرانے دوست مسٹر مارکوس! بڑی محبت

کرتے ہیں ہم سے مشہد میں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ تم سے محبت کرتے ہیں تو پھر ہمیں بھی ان سے بھرپور محبت کرنی چاہیے۔"

فربہ اندام مارکوس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں کھردرا پن اور قوت تھی۔ مائیکل بولا "شاہ جہاں! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ تام سے دوبارہ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ کل شام آٹھ نو بجے تم دونوں میں پھر جھڑپ ہو گی۔ اس مرتبہ اس لڑائی سے لطف اندوز ہونے والوں میں ہمارے دوست مسٹر مارکوس اور ان کے ساتھی بھی شامل ہوں گے۔ تم کل تک ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو تیار کر لو۔"

میں نے کہا "میں اس وقت بھی ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہوں۔ تم یہ مقابلہ آج شام بھی منعقد کرا سکتے ہو۔"

"زیادہ تیزی اچھی نہیں ہوتی۔ آدمی اوندھے منہ گر بھی جاتا ہے۔" مائیکل نے وارننگ دی۔

"میں اب جا سکتا ہوں؟"

"کہاں جاؤ گے؟"

"نیچے اپنے قید خانے میں۔"

"چلو تھوڑی دیر یہاں گھوم پھر لو۔ مقابلے سے پہلے یہ تمہاری آخری رات ہے۔ کل کیا پتا کیا ہو۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آج رات اپنی سویٹ ہارٹ کے پاس گزار لو۔"

"شاید تم پھر مجھ پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کوشش میں تمہیں اور تام کو صرف ناکامی "حاصل" ہو گی۔"

"اچھا چلو' تم اس وقت کو جس طرح گزارنا چاہو گزار لو۔" مائیکل نے فراخ دلی سے کہا۔

جہاز کے عملے کا ایک رکن اٹھا اور مجھے کھینچ کر اپنی میز پر لے گیا "چلو یار! یہاں بیٹھو ہمارے ساتھ۔ تاش واش کھیل لو۔"

میں خود بھی واپس کمپارٹمنٹ میں جانا نہیں چاہتا تھا' لہٰذا سیلر کی بات مانتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی خوشگوار شام تھی' اور بے حد خوب صورت بھی۔ موسم میں ہلکی سی حدت تھی' تاہم اس حدت کو شمالاً جنوباً چلنے والی ہوا کم کر رہی تھی۔ سورج کا آتشیں گولا دور مغرب میں نیلگوں سمندر کے اندر اتر رہا تھا۔ سمندر کی سطح بے حد پرسکون تھی۔ میں تاش کھیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں عقبی میز پر مائیکل' جم اور مارکوس کی باتیں سننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ پہلے یہ باتیں نئے ڈیزائن کی گاڑیوں اور زیورات وغیرہ کے گرد گھومتی رہیں' پھر اچانک نوادرات کا ذکر چھڑا اور اس کے ساتھ ہی دفینے کی بات ہونے لگی۔ یہ بات شروع کرنے والا ایرانی مارکوس ہی تھا۔ اس نے کہا "نہایت قیمتی نوادرات کا ایک بڑا ذخیرہ پاکستان سے چوری کر کے امریکا پہنچایا گیا ہے۔"

کپتان جم شرابی لہجے میں بولا "پاکستان سے نہیں انڈیا سے امریکا پہنچایا گیا ہے۔ میں نے خود اخبار میں پڑھا تھا۔"

"انڈیا میں تو وہ نوادرات عارضی طور پر پہنچے تھے۔" مارکوس نے کہا "اصل میں وہ ذخیرہ پاکستان ہی کا تھا۔"

"اور پاکستانی ہی کی بے وقوفی سے امریکا میں پہنچا۔" جہاز کے نئے نائب کپتان آرتھر نے کہا۔

"یہ امریکی بڑے چال باز ہوتے ہیں۔ بندے کو چونا لگا دیتے ہیں اور یہ امریکی مسٹر کلارک تو ویسے بھی بڑا ذہین فطین تھا۔" مارکوس نے کہا۔

"مگر اس پاکستانی کی بے وقوفی بھی تو دیکھو۔ اپنے ہاتھ سے سارا ذخیرہ امریکی کو سونپ دیا کہ جاؤ اسے اپنے ملک میں جا کر فروخت کر لو اور وہاں سے کیش ہمیں بھیج دینا۔"

نائب کپتان "آرتھر" نے کہا "مگر اس میں کوئی چکر ضرور ہو گا۔ سنا ہے کہ جمالی نام کے اس پاکستانی کو خطرہ تھا کہ کرپٹ بیورو کریٹس اور سیاست داں اس گراں قدر دفینے کی بندر بانٹ کر لیں گے' اور کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"یہ کوئی دلیل نہیں۔" کپتان جم نے کہا "اس کم عقل کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ کیسے بھی ہاتھوں میں رہے گا لیکن ملک کا اثاثہ رہے گا تو ملک میں۔"

"شاید ایک خبر آپ کی نظر سے نہیں گزری۔" آرتھر نے کہا "میں نے پڑھا تھا کہ جو نوادرات امریکا پہنچے ہیں' وہ دفینے کے تمام نوادرات نہیں ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ پاکستانیوں نے وہ تمام نوادرات "ذخیرے" میں سے نکال لیے ہیں جن کا تعلق پاکستانی سرزمین سے تھا۔"

"اگر ایسی بات تھی تو پھر ان نوادرات کو منظر عام پر آنا چاہیے تھا۔" مائیکل نے دلیل پیش کی۔

"ہو سکتا ہے کہ جان بوجھ کر انہیں منظر عام پر نہ لایا گیا ہو۔"

گفتگو کرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس سارے قصے کا ایک اہم کردار ان سے صرف چند گز کے فاصلے پر موجود ہے اور اپنے بارے میں پاس کیے گئے سارے ریمارکس سن رہا ہے۔ میں نے اب تک جس کی زبان سے سنا تھا یہی سنا تھا کہ میں نے دفینے کا سامان امریکی ارب پتی مسٹر کلارک کے

حوالے کر کے فاش غلطی کی ہے' حتیٰ کہ میرے نہایت قریبی ساتھی بھی اس سلسلے میں شکوک کا اظہار کر چکے تھے۔ لیکن میرا یقین متزلزل نہیں ہوا تھا۔ کم از کم ابھی تک تو میرے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ یہ میرے دل کی گواہی تھی کہ مسٹر کلارک اس اندھے اعتماد پر پورے اتریں گے جو میں نے ان پر کیا ہے۔ اچھے برے لوگ تو ہر قوم اور مذہب میں ہوتے ہیں۔ تاریک ترین راتوں کے بطن میں بھی روز روشن کی کرنیں موجود ہوتی ہیں۔ بہ حیثیت قوم امریکی کیسے بھی سہی مگر مسٹر کلارک مجھے مختلف فرد نظر آتے تھے۔

اندھیرا اب گہرا ہو گیا تھا۔ ستارے روشن تر ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم جہاز کے عرشے پر نہیں بیٹھے' کسی اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں اور مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میرے سامنے پائن ایپل کے جوس کا گلاس تھا اور میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ کچھ دیر بعد عرشے کی دائیں جانب واقع کیبن کے سامنے آرکسٹرا نے دھنیں بکھیرنی شروع کر دیں۔ ردھم حاصل کرنے کے بعد سازندوں نے ایک بڑی میٹھی سی کمپوزیشن شروع کر دی۔ کچھ عجیب سا تاثر تھا اس دھن کا' یہ دھن جیسے افریقہ کے گھنے جنگلوں میں سفر کر رہی تھی۔ صحراؤں میں بگولوں کی طرح چکرا رہی تھی' اور کسی دور دراز قبائلی بستی کی مہک اپنے ساتھ لا رہی تھی۔ میں نے دور مغرب کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹا پہلے غروب ہو جانے والے سورج کی سرخی ابھی افق پر باقی تھی۔ اس سرخی کے اردگرد گہری تاریکی تھی۔ اسی تاریکی میں تاریک براعظم افریقہ واقع تھا۔ ہم افریقہ کے مشرقی ساحل کی طرف سفر کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس موسیقی کا ساتھ دینے کے لیے ایک ڈانسر بھی آ موجود ہوئی۔ وہ بڑے ہیجان خیز لباس میں تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے اور اس کی اونچی ایڑی موسیقی کے ساتھ عرشے کے فرش پر ٹھک ٹھک بج رہی تھی۔ میں نے اس خوب صورت رقاصہ کو غور سے دیکھا۔ یہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہیں میں بمبئی سے لے کر آیا تھا۔ یہ وہ تیسری لڑکی تھی جو براؤن آنکھوں والی دو لڑکیوں کے ساتھ بونس کے طور پر مائیکل کو مل گئی تھی۔ یہ سیدھی سادی لڑکی واضح طور پر کسی دیہی علاقے سے تعلق رکھتی تھی مگر اس کی دلکشی اور جسم کی موزونیت میں کلام نہیں تھا۔ نگاہ اس پر جس زاویے سے بھی پڑتی تھی چونک کر رہ جاتی تھی۔ اب مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ لڑکی بہت اچھا رقص کرنا بھی جانتی ہے۔ وہ جیسے موسیقی کے ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ اگر اس کا چہرہ اداس نہ ہوتا اور آنکھوں میں ذری ذری پرچھائیاں نہ ہوتیں تو اس کے رقص کا تاثر کئی گنا بڑھ جاتا۔ حالانکہ اس کے اردگرد کوئی تشدد نہیں تھا مگر یہی لگتا تھا کہ کوئی کوڑا بردار حبشی اسے زبردستی نچا رہا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد اس کا خوف قدرے کم ہو گیا اور وہ نسبتاً زیادہ اچھے طریقے سے ناچنے لگی۔ سیلرز اور عملے کے دوسرے ارکان تالیاں بجا بجا کر اسے داد دے رہے تھے پھر ایک خوش پوش اٹالین نوجوان بھی اٹھ کھڑا ہوا اور رقص میں لڑکی کا ساتھ دینے لگا۔ یہ ہنگامہ جاری ہی تھا جب میں اٹھ کر غزالہ کے پاس چلا گیا' غزالہ اور تابی کی خیر خیریت دریافت کر کے میں ادھر ہی ایک گوشے میں لیٹ گیا۔ غزالہ نے پوچھا "نیچے کمپارٹمنٹ میں نہیں جائیں گے؟"

"آج مائیکل نے مجھے تھوڑی سی آزادی دی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کل شام تام کے ساتھ میرا مقابلہ دوبارہ ہو گا۔ مائیکل کا خیال ہے کہ اس مقابلے کا انجام ہم دونوں میں سے کسی ایک کی موت بھی ہو سکتا ہے' لہٰذا اس نے آج کی رات اور کل دن بھر کے لیے مجھے گھومنے پھرنے کی آزادی دی ہے۔"

غزالہ کا رنگ زرد ہو گیا "میں تو سمجھی تھی کہ مقابلہ اب ٹل گیا ہے۔"

"جو بات تمہارے لیے اطمینان کی ہے' وہ میرے لیے پریشانی کی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جو بھی سانپ نکلنا ہے' جلد سے جلد نکل جائے۔"

غزالہ گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر میرے یہاں رہنے سے پریشانی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی میں تھوڑی دیر کے لیے ہی لیٹا تھا' رات یہاں گزارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔"

غزالہ ذرا توقف سے بولی "مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' لیکن دوسروں کے اعتراض سے ڈر لگتا ہے' یہ لوگ... یہ لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

اس نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا "اچھا' تھوڑی دیر بیٹھ تو جائیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ دیکھا اس پر غزالہ کا ہاتھ مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ مجھے ہاتھ کی طرف دیکھتا پا کر غزالہ نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کے چہرے پر سرخی لپک گئی تھی۔ میں بیٹھ

گیا۔ وہ روہانسی ہو کر بولی "شعلہ جہاں! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتے؟"

"ہمارا پالا ایک عیار دشمن سے پڑا ہے۔ وہ ہم سب کی طرف سے بے حد چوکس رہتا ہے اور خاص طور پر میری طرف سے۔ پھر یہ کھلا سمندر ہے' یہاں سے بھاگ کر ہم جا کہاں سکتے ہیں۔ ہمیں صبر کرنا ہوگا اور کسی اچھے موقع کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"ایرانی جہاز کا عملہ بھی ان کے ساتھ مل گیا ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ ایرانی جہاز پر کچھ سویلین بھی سوار ہیں' جن میں ایک وہ موٹا مارکوس بھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہی لوگ سارے معاملات کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ ابھی عرشے پر ہونے والی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ لڑائی سے بچنے کے لیے دونوں جہازوں کے سرکردہ افراد میں کسی طرح کا معاہدہ ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ مائیکل نے ایرانی جہاز کے لوگوں کو کچھ دے دلا کر معاملہ ختم کردیا ہو۔ اس قسم کے کاموں میں یہ شخص بہت ماہر نظر آتا ہے۔"

"کیا اتنے لوگوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کھلم کھلا ظلم کے خلاف کچھ کر سکے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اس پورے سمندر میں کوئی ایسا نہیں جو کچھ کر سکے۔ کراچی سے بمبئی تک اور پھر بمبئی سے یہاں تک کم و بیش ۳۵۰۰ کلو میٹر سفر ہم نے طے کیا ہے' لیکن بردہ فروشوں کا یہ جہاز ہر جگہ سے بخیر و عافیت گزر رہا ہے۔ بالکل جیسے منشیات فروشوں کا ٹرک لنڈی کوتل سے کراچی تک سیکڑوں پولیس ناکوں سے بحفاظت گزر کر اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔"

ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے' بابل ہمارے آس پاس ہی اٹکھیلیاں کرتا رہا۔ وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ ان حالات سے قطعی بے خبر تھا جن میں سے ہم سب گزر رہے تھے۔ میں نے غزالہ کو ان تین عدد خوفناک اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کے بارے میں بھی بتایا جو میں نے جہاز پر دیکھی تھیں۔ سوویت یونین کی بنی ہوئی ان لایج کیلیبر گنوں میں قریباً ساڑھے چودہ ملی میٹر کی گولی چلتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق ان گنوں کا اصل نام تو بہت طویل تھا' عرف عام میں انھیں ZPU-4 کہا جاتا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ خالص فوجی گنیں مائیکل وغیرہ کے پاس کیسے پہنچی تھیں۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

غزالہ نے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ باہر عرشے پر جا کر سو جاتا ہوں۔ بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔"

"کیا آپ کو نیند آرہی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن تمہیں تو آرہی ہوگی۔"

"بالکل بھی نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"لیکن' تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ اگر میں یہاں رہوں گا تو مناسب نہیں ہوگا۔"

"چلیں پھر باہر عرشے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بڑی اچھی چاندنی ہوگی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا مگر اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ کہیں بالکل پاس کھٹکا ہوا اور ایک کراہ سی سنائی دی۔ یہ نسوانی آواز تھی۔ میں نے اور غزالہ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غزالہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کرکے میں باہر نکلا۔ دروازے پر رائفل بردار جوزف بالکل چوکس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح گردش کرنے لگیں۔ بہرحال اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ مائیکل کی طرف سے مجھے آج رات جہاز پر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ میں ٹہلنے والے انداز میں جہاز کی "عبو" کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے مختلف چیزوں کی آڑ میں چلتا ہوا واپس آیا اور اس مقام پر پہنچ گیا' جہاں آہٹ ابھری تھی اور پھر نسوانی کراہ سنائی دی تھی۔ یہاں ایک تنگ زینہ بل کھاتا ہوا برج کی طرف جاتا تھا۔ زینے کے ایک بل کے نیچے تنگ و تاریک خلا سا تھا' یہاں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ نیم تیرگی کے سبب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے عرشے کی طرف دیکھا' سرِ شام جہاں محفل جمی ہوئی تھی وہاں اب ویرانی کا ڈیرا تھا۔ نشے میں دھت جہاز کے دو خاکروب دو میزوں پر پڑے سو رہے تھے۔

اچانک مجھے کاٹھ کباڑ کے اندر معمولی سی حرکت محسوس ہوئی۔ یقیناً کوئی یہاں موجود تھا۔ میں تھوڑا سا مزید آگے بڑھا اور کاٹھ کباڑ میں جھانکا۔ چاندنی کی ایک شعاع دور ری سہمی آنکھوں پر پڑی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو سکڑی سمٹی خلا میں چھپی بیٹھی تھی "کون ہو؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولی' کچھ اور سمٹ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا' یہ وہی رقاصہ تھی جو شام کو عرشے پر اپنے فن کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اس لڑکی کو بمبئی سے لانے والا میں تھا لیکن اگر میں نہ بھی لاتا تو کوئی ایسا خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ بمبئی میں وہ زیادہ برے حالات کا شکار ہوتی۔ وہ

حسن فروشوں کے چنگل میں تھی اور اس چنگل میں اس کے لیے کہیں بھی اماں نہیں تھی۔ میں نے اسے باہر آنے کو کہا۔ وہ منمنائی "بھگوان کے لیے' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"لیکن تم باہر تو نکلو۔ یہاں چھپنے سے تمہیں بھلا کیا فائدہ ہوگا۔ تم جہاں بھی چھپو گی جہاز کے اندر ہی چھپو گی' وہ لوگ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے' چلو شاباش باہر آؤ' مجھے بتاؤ' تمہارا کیا مسئلہ ہے؟"

وہ ایک دم بلک پڑی "بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی طرح میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔"

"یہ اندر نگر کیا ہے؟"

"میرا گاؤں ہے۔ یہاں میری شادی ہوئی ہے۔"

"مجھے اندازہ ہوا کہ لڑکی میری توقع سے زیادہ سیدھی سادی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں سے چلی تھی اور کن کن ہاتھوں سے گزر کر یہاں پہنچی تھی۔ اس کی معصومیت اور دوشیزگی پر نہ جانے کتنی خراشیں آچکی تھیں لیکن اس کا بھولپن اب بھی برقرار تھا۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ کچھ اور سمٹ گئی "نہیں' میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ اس کی بدبو سے میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"کس کی بات کررہی ہو۔ کس کے پاس نہیں جاؤ گی؟"

"وہی موٹا' اس کے منہ سے مردار کی بو آتی ہے۔ میں رام کی سوگند کھاتی ہوں' اس کے منہ سے مرے ہوئے کتے کی بو آتی ہے۔ میں نہیں جاؤں گی اس کے پاس۔"

میں نے وضاحت چاہی تو معلوم ہوا کہ لڑکی اسی موٹے ایرانی مارکوس کی بات کررہی ہے۔ رقص کے دوران میں ہی مارکوس نے اس لڑکی کو اپنی رات چکانے کے لیے چن لیا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ لڑکی کو اپنے کیبن میں لے گیا۔ مگر کیبن میں پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد وہ بستر پر گر کر گہری نیند سو گیا۔ لڑکی اس کی بدبودار سانسوں کی زد سے نکل کر ایک گوشے میں جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد گوشت کا پہاڑ مارکوس نیم بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا اور لڑکی کی تلاش میں اندھوں کی طرح دائیں بائیں ہاتھ چلانے لگا۔ وہ کیبن کا دروازہ کھول کر نکلی اور سیڑھیوں کے نیچے پڑے کاٹھ کباڑ میں جا چھپی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد غالباً مارکوس پھر گہری نیند سو گیا تھا۔

دیہاتی مزاج کی یہ سیدھی سادی لڑکی سسک رہی تھی اور اپنی بپتا سنا رہی تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا۔ وہ بولی "انورادھا۔۔۔ گھر میں مجھے انو کہتے ہیں۔"

وہ اب میرے قریب کھسک آئی تھی اور اس کا حد سے بڑھا ہوا خوف بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی کتھک ناچ جانتی ہے' وہ اپنے گاؤں کے مندر میں ناچتی تھی۔ اس کے خاوند کا نام "جواہر" تھا۔ وہ اس سے بہت بہت پیار کرتا تھا۔ جے پور سے آنے والے ایک میراٹھی سیٹھ نے گاؤں میں انو کا ناچ دیکھا اور اسے بہلا پھسلا کر گاؤں سے لے آیا۔ سیٹھ کا کہنا تھا کہ وہ شہر کے مندر میں ناچے گی اور وہاں میاں بیوی کو بہت پیسہ بھی ملے گا۔۔۔ لیکن اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے موقعوں پر ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ہندو سیٹھ نے شہر پہنچ کر انو اور اس کے پتی جواہر سے دھوکا کیا۔ وہ انو کو ہوٹل کے کمرے سے لے اڑا اور نجانے کہاں کہاں گھماتا ہوا آخر بمبئی لے آیا۔ انو روتی بلکتی رہی۔ اپنے شوہر سے ملنے کی التجائیں کرتی رہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ اسے ڈرا دھمکا کر خاموش کردیا گیا۔ وہ مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی بالآخر اس جہاز پر پہنچ گئی۔

ابھی انورادھا کی گفتگو جاری تھی کہ دو حبشی پہرے دار دندناتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک تو وہی خون خوار خیابی تھا جس نے چند روز پہلے اپنے دانتوں سے جیتے جاگتے اسلم کا تیا پانچا کیا تھا' دوسرا جوزف تھا۔ جوزف نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا پھر اس کی نگاہ انو پر پڑی اور وہ بری طرح چونک گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ یہاں کیا کررہی ہے؟" اس نے گرج کر پوچھا۔

"بے چاری چھپنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی ڈاکو سے بچنے کے لیے ڈاکو کے گھر ہی میں چھپ جائے۔"

"تم زیادہ باتیں نہ بناؤ۔" جوزف نے منہ ٹیڑھا کرکے کہا "تم نے باس کی رعایت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ تمہیں گھومنے پھرنے کی اجازت ملی تھی۔ سازشیں کرنے کی نہیں۔"

اتنے میں عملے کے دو اطالین اہلکار بھی وہاں پہنچ گئے۔ جوزف نے انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایک اطالین نے کہا "میرا خیال ہے باس کو اطلاع دینی چاہیے۔"

"وہ سو رہے ہوں گے۔" دوسرے نے کہا۔

اتنے میں برج کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی

دی۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہماری ہی طرف آرہا ہے۔ رات کے اس پہر بھی وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ سرخ ٹائی چمک رہی تھی۔

"کیا بات ہے دوستو؟"

جوزف نے لنگڑی لولی انگلش میں مائیکل کو پوزیشن سے آگاہ کیا۔ مائیکل نے انو سے پوچھا کہ وہ کیبن چھوڑ کر یہاں کیوں چلی آئی تھی۔

انو انگلش نہیں جانتی تھی۔ وہ بس ڈری ڈری نظروں سے دیو ہیکل مائیکل کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے تھے۔

جوزف نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "باس! یہ دونوں یہاں ضرور کوئی سازش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک دم گھبرا گئے تھے۔"

اطالین اہلکار بولا "باس! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں' لیکن اس بندے کو آزادانہ گھومنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اور اگر ایسا کرنا ہی ہے تو پھر اسے ہتھکڑی لگائی جائے۔"

مائیکل بڑے اسٹائل سے مسکرایا۔ اس کے سپید آدم خور دانت چمکنے لگے "ہتھکڑی تو اسے لگی ہوئی ہے اور ہاتھوں کو ہی نہیں' پورے جسم کو لگی ہوئی ہے۔"

جوزف نے مؤدب ہو کر کہا "اس لڑکی کے بارے میں کیا حکم ہے باس؟"

"اسے مارکوس کے کیبن میں چھوڑ آؤ۔" مائیکل نے کہا۔

انو انگریزی سے نابلد ہونے کے باوجود تاڑ گئی کہ کیا کہا جارہا ہے۔ وہ سسک کر بولی "نہیں' میں نہیں جاؤں گی۔ اس کی بدبو سے میرا دم گھٹتا ہے۔ بھگوان کے لیے مجھ پر کرپا کرو' مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ مجھے میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔"

انو کی آہ و زاری دیکھ کر مائیکل بولا "ٹھیک ہے' اس روتی ہوئی کتیا کو نیچے دوسری لڑکیوں کے پاس بھیج دو۔ ویسے بھی اب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔"

مائیکل کا حکم ملتے ہی جوزف نے انو کو بازو سے پکڑا اور عرشے کے فرش پر گھسیٹتا ہوا اندرونی حصے کی طرف لے گیا۔

مائیکل نے مجھ سے کہا "آؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ اپنے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جارہا تھا۔ تاہم اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کے بجائے وہ مجھے اپارٹمنٹ کے عقب میں لے گیا' یہاں اس نے ایک دروازہ کھولا' ایک کول کمرے میں پانچ ٹی وی اسکرینیں نظر آرہی تھیں۔ ایک شخص اسٹول پر بیٹھا انگلش ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا اور سیب کھا رہا تھا۔ مجھے اور مائیکل کو دیکھ کر وہ اٹینشن کھڑا ہوگیا۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ دو اسکرینیں تو تاریک تھیں مگر تین پر مناظر نظر آرہے تھے۔ ایک پر زیریں کمپارٹمنٹ کے کیبنوں کا منظر تھا۔ حبشی کارندے یہاں چوکسی کے ساتھ پہرا دے رہے تھے۔ دوسرا منظر بالائی عرشے کا تھا۔ کیمرہ آٹومیٹک طور پر پین ہو رہا تھا' کیمرے کی حرکت پورے عرشے کو اسکرین پر لا رہی تھی۔ تیسرا منظر غزالہ کے اپارٹمنٹ کا تھا۔ یہ فکس کیمرہ تھا۔ پوری خواب گاہ اسکرین پر تھی۔ تابی بستر پر سو رہا تھا۔ غزالہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے کھڑکی کھول کر باہر بھی جھانکا۔ کھڑکی کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کمرے میں مائیکروفون بھی موجود ہے۔ غزالہ کی پریشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میں آہٹ سننے کے بعد قریباً آدھ گھنٹا پہلے کیبن سے باہر نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

مائیکل مسکرایا "تمہاری سویٹ ہارٹ بڑی بے چین نظر آرہی ہے تمہارے لیے۔ غالباً اسے آج کی رات ضائع جانے کا افسوس ہے۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ مائیکل نے مجھے چوبیس گھنٹے کے لیے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت کیوں دی تھی۔ جہاز کے بیشتر حصوں کو کیمرے کی خفیہ آنکھ دیکھ رہی تھی۔ خاص طور سے غزالہ تو ہر وقت ان لوگوں کی نگاہ میں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک غزالہ اور تابی ان کے قبضے میں ہیں' میں آزاد ہو کر بھی قیدی ہی ہوں۔

مائیکل بولا "میں اس لیے تمہیں یہاں لایا ہوں کہ تمہیں اپنی حدود کا علم ہوجائے۔ تمہاری سویٹ ہارٹ ہر وقت ہماری نظر میں ہے' ویسے یہ ہے بھی نظر میں رکھنے والی چیز۔ خوب ہاتھ مارا ہے تم نے۔" وہ آنکھ میچ کر بولا۔

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ مائیکل نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا اور ڈرامائی انداز میں بولا "بیڈ کے پاس یہ چھوٹی سی سائیڈ ٹیبل دیکھ رہے ہو۔ اس کے درمیان والی مقفل دراز میں چھوٹا سا لیکن طاقت ور بم موجود ہے۔ اس پورے اپارٹمنٹ کے پرخچے اڑا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اب تمہیں یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے کہ اس بم کا ریموٹ کنٹرول میرے پاس موجود ہے۔"

"مجھے تمہاری شیطانیت اور سفاکی پر پورا یقین ہے۔"

میں نے کہا۔

"ابھی تمہارے اور تمہاری سویٹ ہارٹ کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ ساری اس کمرے میں سنی گئی تھی۔ پھر وہ منظر بھی دیکھا گیا تھا جب تم تہمت سن کر جلدی سے باہر نکل گئے تھے۔ پہرے دار کو چکر دینے کے لیے پہلے تم یونہی اگلے حصے کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے ٹہلتے ہوئے واپس سیڑھیوں کی طرف آگئے۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تمہاری ہر بات سچ ہے اور سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔"

"ٹھیک ہے" اب تم جا سکتے ہو۔ حالات ٹھیک رہے تو کل شام ٹام کے ساتھ تمہارے دو دو ہاتھ ہوں گے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ غزالہ کے بیڈ روم والا منظر اب اسکرین پر نیم تاریک نظر آ رہا تھا' غزالہ نے بیڈ روم کی بڑی روشنی بجھا دی تھی اور میری واپسی سے مایوس ہو کر بانی کے پاس ہی لیٹ گئی تھی۔ دوپٹہ اس کے گلے میں تھا۔ جسم کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ کیمرے کی آنکھ پل پل اسے دیکھ رہی ہے۔ کمرے سے نکل کر میں غزالہ کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ غزالہ کو تادیر انتظار میں رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے دیکھا غزالہ کے دروازے کے سامنے مسلح محافظ الرٹ کھڑا ہے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ غزالہ کی صورت نظر آئی۔ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے دروازے سے باہر نکال لیا "تمہارے کمرے میں ٹی وی کیمرہ موجود ہے اور یہاں کی ساری آوازیں بھی سنی جاتی ہیں۔" میں نے تیزی سے سرگوشی کی۔

غزالہ پہلے تو ہکا بکا میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے باتیں کرتے گزار دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں سنسر شدہ تھیں کیونکہ دیکھنے والی آنکھ ہمیں دیکھ رہی تھی اور سننے والے کان سن رہے تھے۔ ناشتا میں نے غزالہ کے ساتھ اس کے کمرے میں ہی کیا۔ ناشتے کے دوران میں تانی خوب اٹکھیلیاں کرتا رہا اور کشیدہ صورت حال میں بھی میرے اور غزالہ کے مسکرانے کا سامان پیدا ہوتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ غزالہ کے حسین چہرے پر رہ رہ کر تفکر کی پرچھائیاں لہرا جاتی تھیں۔ غالباً اس تفکر و پریشانی کا تعلق اس مقابلے سے تھا جو آج شام میرے اور ٹام کے درمیان ہونا تھا۔ بکار میں ایک جان لیوا مقابلے کا انعقاد میرے نزدیک بے وقوفی کا مظاہرہ تھا' مگر اس قسم کی اور بھی بہت سی بے وقوفیاں اس جہاز پر ہو رہی تھیں۔ مائیکل اور اس کے ساتھی یقیناً صرف تفریح کے لیے یہ مقابلہ کرا رہے تھے اور اس بات کو نظرانداز کر رہے تھے کہ اس تفریح کا انجام دونوں میں سے کسی ایک کی موت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

ناشتے کے بعد میں باہر عرشے پر آ گیا۔ جہاز پر اور عرشے پر سنہری دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ دور قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایرانی جہاز "اے نو" بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ بے شک ایرانی جہاز کے افراد ہرکولیس پر موجود تھے اور یہاں بڑے دوستانہ ماحول میں گھوم پھر رہے تھے' اس کے باوجود ہرکولیس کے مسلح گارڈز نے ابھی تک اپنی پوزیشنیں نہیں چھوڑی تھیں۔ غالباً اسی طرح ایرانی جہاز پر بھی لوگ غافل نہیں تھے۔ ایرانی جہاز کے عرشے پر کوئی بندہ نظر نہیں آتا تھا' جہاز کے ایک بلند ترین مقام پر ایک مورچہ ابھی تک موجود تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جہاز کے میٹنگ ہال میں نہایت سنجیدہ قسم کی گفتگو ہو رہی ہے' اس گفتگو میں دونوں جہازوں کے با اختیار افراد حصہ لے رہے ہیں۔ ان با اختیار افراد میں ماورکوس کے علاوہ ایرانی جہاز کا نائب کپتان جمشید اور چیف انجینئر اوڈنگ شامل تھا۔ ہرکولیس کی طرف سے اس گفتگو میں مائیکل' کپتان جم اور نائب کپتان آوتھر حصہ لے رہے تھے۔ میٹنگ ہال کا دروازہ بند تھا اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں عرشے کی دھوپ میں بیٹھا تھا کہ پروفیسر اللہ دتا لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا "کیا ہوا پاؤں کو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یونہی پھسل گیا تھا۔" وہ مری مری آواز میں بولا۔

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے میٹنگ ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اندر کی کیا صورت حال ہے پروفیسر؟"

"ابھی تو مخدوش ہی ہے' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

پروفیسر کی بات نے مجھے مزید چونکا دیا۔ میں نے کہا "مخدوش سے کیا مطلب ہے' صلح صفائی تو ہو چکی ہے۔ یقیناً کوئی معاہدہ ہوا ہو گا تو ایرانی اس جہاز پر نظر آ رہے ہیں نا۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ معاہدہ ہوا ہے۔ ابھی کوئی معاہدہ نہیں ہوا اور مجھے تو ہونے کی امید بھی کم ہی نظر آتی ہے۔"

"تو پھر یہ میل ملاپ کیسا ہے اور یہ دار عیش یہاں کیوں دی جا رہی ہے؟"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جس طرح تین چار ایرانی یہاں آئے ہیں' اسی طرح دو تین سیاہ فام "ایرانی جہاز" پر بھی گئے ہیں۔ اگر مائیکل جہاز پر آنے والے ایرانیوں سے کوئی ناروا سلوک کرے گا تو ایسا ہی سلوک ایرانی جہاز پر جانے والے سیاہ فاموں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔"

"گویا دونوں جہازوں پر توازن قائم کیا گیا ہے۔"

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "گفتگو نازک مرحلے میں ہے۔ دونوں جہازوں پر خطرناک اسلحہ موجود ہے' اگر لڑائی ہوئی تو دونوں کا شدید نقصان ہو سکتا ہے' لہٰذا درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"کیسا راستہ؟"

"سنا ہے کہ ایرانی پولیس کے اہلکار ایک لاکھ ڈالر نقد اور کچھ تحفے تحائف مانگ رہے ہیں' اس کے علاوہ وہ ایندھن کا تقاضا بھی کر رہے ہیں' جبکہ ایندھن ہرکولیس کے پاس بھی کم ہے۔ یہ جگہ بحری راستوں سے بہت ہٹ کر ہے۔ افریقی ساحل تک پہنچنے کے لیے ایندھن کم پڑ گیا تو ہرکولیس کو سخت مشکل پیش آ سکتی ہے۔"

"لیکن ایرانی جہاز سے اتنا خوف زدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ میں نے جہاز پر زبردست قسم کی روسی گنیں ZPU-4 دیکھی ہیں۔ وہ تو ایرانی جہاز کا بھرکس نکال کر رکھ دیں گی۔"

"بھرکس نکالنے والی کچھ چیزیں ایرانی جہاز کے پاس بھی ہیں۔ انہوں نے پچھلی جھڑپ میں جو تین راکٹ استعمال کیے تھے' اس سے تین گنا بڑے دو اور راکٹ ان کے پاس ہیں۔ لڑائی بند ہونے سے پہلے انہوں نے یہ راکٹ چلانے کی باقاعدہ دھمکی دی تھی۔ یہ راکٹ جہاز کو ناکارہ نہ بھی کر سکیں تو شدید قسم کا جانی اور مالی نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں۔"

"راکٹ کسی نے دیکھے بھی ہیں؟"

"بالکل دیکھے ہیں۔ اسی لیے تو لڑائی بند ہوئی تھی۔ ورنہ مائیکل اب تک اپنی ہیوی گنوں کے زور سے "اے نو" پر قبضہ کر چکا ہوتا۔"

"تو یہ بات ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اچانک میٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور بلند لہجے میں بولنے کی آوازیں سنائی دیں' پھر فربہ اندام ماورکوس ایک اسمارٹ سے باوردی شخص کے ساتھ غصے میں تمتمایا ہوا باہر نکلا۔ باوردی شخص نے تیز لہجے میں کہا "آپ حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ بات اس طرح طے نہیں ہوتی۔"

کپتان جم نے آگے بڑھ کر باوردی شخص کا بازو تھام لیا اور انہیں سمجھا بجھا کر چند قدم پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹنگ روم کا دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔

پروفیسر اللہ دتا کی یہ اطلاع سچ نکلی تھی کہ اندر بڑی دھواں دھار قسم کی گفتگو ہو رہی ہے۔ میں نے اور پروفیسر اللہ دتا نے دیکھا کہ میٹنگ روم کے دروازے پر پیش آنے والے اس واقعے کے بعد جن افراد نے جہاز کے عرشے پر پوزیشنیں لے رکھی تھیں وہ مزید چوکس ہو گئے۔ ان مسلح افراد کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ تھی۔ ان میں دو اطالین اور باقی سیاہ فام تھے۔ سب کے پاس دو دھاری رائفلیں تھیں۔

میں اور پروفیسر ادھر ادھر گھوم کر جہاز کا جائزہ لیتے رہے' ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ پروفیسر نے دکھی لہجے میں بتایا کہ پچھلے دو روز سے شائستہ کے ساتھ اس کی بات نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ اس کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ اس نے کہا "پہلے وہ ہر روز تین چار بار کھڑکی سے جھانک لیا کرتی تھی۔ پرسوں شام سے کھڑکی بھی بند پڑی ہے۔ اللہ خیر کرے اس کی طبیعت ٹھیک ہو۔"

میں نے پروفیسر کو تسلی تشفی دی۔ پروفیسر کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ مائیکل کا رویہ اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز تھا۔ پروفیسر نے اس واقعے کا ذکر بھی کیا جب چند روز پہلے ایرانی ساحل کے قریب ایرانی جہاز اور ہرکولیس میں شدید جھڑپ ہوئی تھی۔ اس وقت شائستہ' پروفیسر اللہ دتا کو فائرنگ سے بچانے کے لیے باہر نکل آئی تھی اور پروفیسر کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی گر گئی تھی۔ مائیکل نے اس بات کا بہت برا منایا تھا۔ نہ صرف یہ کہ کئی روز شائستہ سے بات نہیں کی تھی بلکہ پروفیسر کو بھی بے نقط سنائی تھیں۔ پروفیسر کے پاؤں پر ٹخنے کے قریب چوٹ آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس چوٹ کے بارے میں بھی پروفیسر نے جھوٹ ہی بولا ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ چوٹ کسی سخت سلوک یا مار پیٹ کا نتیجہ ہو۔

جب میں اور پروفیسر گفتگو کر رہے تھے ٹام خود حبشی ٹام کی صورت بھی ہمیں نظر آگئی۔ دو گارڈز اس کے ہمراہ تھے' وہ مجھے بڑی خونی نظروں سے گھورتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے فحش اشارے کیے اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ پھر وہ نیچے والے عرشے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اور اس کے ساتھی باتیں کرنے لگے اور بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے۔ وہ افریقی زبان میں بول رہے تھے لیکن ان کا انداز یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ وہ میرے بارے میں

اشتعال انگیز گفتگو کر رہے ہیں۔ میں جب بھی نام کی طرف دیکھتا تھا وہ کوئی بے ہودہ اشارہ کر دیتا تھا۔ پروفیسر نے کہا "تم اس طرف مت دیکھو' وہ تمہیں غصہ دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"مجھے غصہ نہیں آئے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اگر آ بھی رہا ہے تو اس غصے کو نکالنے کا بہترین وقت شام کا ہوگا۔"

میٹنگ ہال کا دروازہ دوبارہ کھلا تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ یہ لنچ ٹائم تھا۔ لنچ کا انتظام کھلی فضا میں عرشے پر کیا گیا تھا۔ میٹنگ میں موجود تمام افراد کے چہرے پر زبردست تناؤ موجود تھا۔ وہ آپس میں زیادہ بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ خاص طور سے فربہ اندام مارکوس بہت برہم نظر آتا تھا اور یہ غصہ اس کے چہرے پر ہی نہیں پورے جسم پر نمایاں تھا۔ چلتے ہوئے اس کی توند ہل رہی تھی جیسے غصے میں تھر تھر کانپ رہی ہو۔ وہ اپنی پتلون کے گیلس میں بار بار انگوٹھے پھیر رہا تھا اور عرشے کے فرش پر تھوک رہا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھنے کے بجائے وہ عرشے کے ایک گوشے میں چلا گیا اور جیب سے واکی ٹاکی نکال کر بات کرنے لگا۔ یقیناً وہ اپنے جہاز "اے نو" پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو دور اے نو کے عرشے پر بھی ایک شخص جنگلے کے سہارے کھڑا نظر آیا۔ اس کے کان سے بھی واکی ٹاکی لگا ہوا تھا۔ مارکوس سے میرا فاصلہ زیادہ تھا۔ میں اس کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا' تاہم اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ "مذاکرات" کی کشیدہ صورت حال کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ واکی ٹاکی بند کر کے وہ کھانے کی میز پر آ بیٹھا اور بڑے غصیلے انداز میں مرغ کی ٹانگ بھاڑنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ واکی ٹاکی پر مارکوس کی گفتگو کے تھوڑی دیر بعد ہی اے نو کے زیریں حصے میں ہلچل نظر آنے لگی ہے۔ میں نے ایک رائفل مین کے پاس پڑی ہوئی دوربین اٹھائی اور "اے نو" کا جائزہ لینے لگا۔ معمولی کوشش سے مجھے وہ دو عدد راکٹ نظر آگئے جن کا ذکر پروفیسر اللہ دتا نے کیا تھا۔ یہ راکٹ 'میزائل سے مشابہ تھے۔ قطر کے مقابلے میں ان کی لمبائی زیادہ تھی۔ ان کی "سیرت" کے بارے میں تو معلوم نہیں تھا تاہم صورت بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھی۔ یہ دونوں راکٹ بالکل خاکستری رنگ کے تھے۔ بیرونی خول پر جو الفاظ لکھے تھے وہ فرنچ میں تھے' اس کا مطلب تھا کہ راکٹ فرانس ساختہ ہیں۔ ان کے لانچروں کے نیچے پہیے تھے۔ باوردی افراد ان پہیوں کے ذریعے راکٹوں کو آگے لا رہے تھے۔

میں نے جہاز کے نائب کپتان آرتھر کو بلا کر اسے بھی یہ منظر دکھایا۔ وہ دوربین کا فوکس تبدیل کر کے کچھ دیر "اے نو" کا جائزہ لیتا رہا پھر سر ہلاتا ہوا کھانے کی میز پر واپس چلا گیا۔ وہ مائیکل کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ مائیکل کی طرف جھک کر اس نے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ مائیکل کھانا کھاتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ مائیکل نائب کپتان کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔ کھانے کی میز سے سب سے پہلے اٹھنے والا نائب کپتان آرتھر ہی تھا۔ وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ یہ سرگرمی اشارہ کر رہی تھی کہ "اے نو" پر راکٹوں کو "پوزیشن" کیے جانے کے بعد مائیکل اور اس کے ساتھی بھی کوئی جوابی اقدام کر رہے ہیں۔

"اے نو" پر موجود راکٹوں کے سامنے والے حصے اب بغیر دوربین کے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں ان کی سرخ خوفناک چونچیں خطرے کا جان لیوا نشان بن کر چمک رہی تھیں۔ یہ سوچنا اور محسوس کرنا بڑا سنسنی خیز تھا کہ ان تباہ کن فرنچ راکٹس کا نشانہ ہرکولیس ہے اور ہم ہیں۔

عجیب ڈرامائی سی کیفیت تھی۔ تین چار ہفتے پہلے جب میں میکلوڈ روڈ لاہور میں صفدر کے ساتھ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں مقیم تھا' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کچھ دنوں بعد میں خود کو خلیج عدن کے کھلے پانیوں میں پاؤں گا۔ میرا ٹھکانا بردہ فروشوں کا ایک جہاز ہوگا۔ یہ جہاز ایک دوسرے جہاز کے روبرو یوں کھڑا ہوگا کہ کسی بھی وقت دونوں جہازوں پر بارود کی بارش ہو سکتی ہوگی۔ ہوٹل کے اس کمرے میں بیٹھ کر گنڈیریاں چوستے ہوئے افریقہ کے ساحل کے بارے میں سوچنا کتنا محال تھا۔ محبت کا دل نما جزیرہ 2PU-4' کنٹینر' فرانسیسی راکٹ' آدم خوروں سے ہتھ جوڑی' یہ سب باتیں اس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھیں مگر آج یہ سب کچھ حقیقت کے قالب میں ڈھل کر نگاہوں کے سامنے تھا اور ابھی معلوم نہیں کہ کیا کچھ سامنے آنا تھا۔ زندگی کی یہی نیرنگی اسے بھیانک بھی بناتی ہے اور خوب صورت بھی۔

تناؤ کی کیفیت پورے جہاز پر محسوس کی جا رہی تھی۔ مسلح افراد کے درمیان ہنسی مذاق کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ ہتھیار چیک کیے جا رہے تھے اور میگزین وغیرہ بھرے جا رہے تھے۔ مائیکل اور چند سرکردہ افراد کے علاوہ اصل صورت

حال کسی کو معلوم نہیں تھی' لہٰذا ایک بے چینی کی سی کیفیت تھی اور سب ایک دوسرے سے سوالیہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یقیناً دوسری طرف ایرانی جہاز "اے نو" پر بھی اسی قسم کی صورت حال تھی۔ عرشے پر چند افراد ہی نظر آ رہے تھے باقی اپنی پوزیشنوں پر تھے۔ اسی دوران میں بند کمرے کے اندر مذاکرات کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

یہ مذاکرات سہ پہر تین بجے کے قریب شروع ہوئے تھے۔ ان کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا اور رات کے آٹھ بج گئے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ تام کے ساتھ میرے "مقابلے" کا پروگرام آج دھرے کا دھرا رہ گیا ہے۔ اس سنگین معاملے نے تمام افراد کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ چند کڑی شرائط کے حوالے سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں۔ ان طویل مذاکرات کے دوران میں سات بجے کے لگ بھگ ایرانی جہاز کا چیف انجینئر سنجیدہ صورت لیے باہر آیا اور عرشے کے ایک گوشے میں کھڑا ہو کر واکی ٹاکی پر دیر تک بات کرتا رہا۔ ایک مرتبہ ہرکولیس کے اسٹور انچارج کو بھی میٹنگ میں بلایا گیا' غالباً اس سے "قبول" وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی گئی تھیں۔

یہ طویل بات چیت رات نو بجے سے تھوڑی دیر قبل اختتام پذیر ہوئی "شرکائے کانفرنس" کے چہرے دیکھ کر سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ان کے چہرے واشگاف اعلان کر رہے تھے کہ بالآخر معاملات طے ہوگئے ہیں۔ مارکوس کے چربی دار چہرے پر مسرت کی چمک تھی۔ مائیکل بھی مسکرا رہا تھا۔ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ فریزر میں لگی ہوئی شراب کی ٹھنڈی بوتلیں کھل گئیں۔ بکری اور دنبوں کا ابلا ہوا گوشت سرو کیا جانے لگا۔ سب لوگ ریلیکس نظر آنے لگے تھے۔

جن شرائط پر معاملہ طے ہوا تھا وہ ہمیں معلوم نہیں تھیں' صرف اتنا پتا چلا کہ ہرکولیس سے قبول کے ایک درجن بم نما کنٹینرز ایرانی جہاز اے نو پر پہنچائے جا رہے ہیں۔ دوسروں کی طرح پروفیسر اللہ دتا کے چہرے پر بھی اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ اسے اپنی جان کی مطلق پروا نہیں تھی۔ اس کی جان اپنے جسم میں تھی ہی کہاں' وہ تو شائستہ کے بدن میں تھی۔ وہ اب تک یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا تھا کہ اگر دونوں جہازوں نے ایک دوسرے پر واقعی بھرپور ہلہ بول دیا تو شائستہ کا کیا ہوگا۔ صبح سے اب تک اس کی انگلیاں تسبیح پر مسلسل گردش کرتی رہی تھیں اور گاہے گاہے اس کی پلکوں میں نمی چمکنے لگتی تھی۔

وہ بولا "خدا نے بڑا کرم کیا ہے۔ اگر یہ بدمعاش آپس میں لڑ پڑتے تو بڑا نقصان ہوتا۔ چاروں طرف سمندر ہے۔ تباہی کی صورت میں ڈوبنے کے سوا کیا چارہ رہ جاتا تھا۔ اور شائستہ بے چاری کو تو تیرنا بھی نہیں آتا۔ وہ بڑا ڈرتی ہے پانی سے۔" بات کرتے کرتے وہ ایک دم جیسے ماضی میں کھو گیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولا "ایک مرتبہ میں نے اسے پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں غوطہ دے دیا تھا۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی چیخ کر مجھ سے چمٹ گئی تھی اور پھر کئی روز تک پانی سے ڈرتی رہی تھی۔ منہ ہاتھ تک نہیں دھوتی تھی۔ وہ اب بھی ایسی ہی ہے۔ دلیر نظر آنے کی کوشش کرتی ہے مگر اندر سے بہت کمزور دل کی ہے۔"

"وہ آج سارا دن بھی دکھائی نہیں دی؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"نہیں۔ آج بھی کھڑکی بند ہی رہی ہے۔ سہ پہر کے وقت میں اس کا پوچھنے گیا تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ اسے کل سے بخار ہے۔ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہے۔"

جس وقت میں اور پروفیسر باتیں کر رہے تھے' عملے کے کئی افراد نچلے عرشے پر جمع ہوگئے۔ وہ ایک بڑی بوٹ سمندر میں اتارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مخصوص چرخیوں اور رسوں کے ذریعے پہلے بوٹ کو ہوا میں معلق کیا گیا پھر آہستہ آہستہ سمندر کی سطح پر اتار دیا گیا۔ اس بوٹ کو سمندر میں اتارنے کی وجہ کچھ دیر بعد سمجھ میں آئی۔ بارہ عدد "قبول کنٹینرز" کشتی میں اتارے گئے۔ ڈیزل سے بھرے ہوئے یہ کنٹینرز عام ڈرموں سے سائز میں قریباً ڈیڑھ گنا تھے اور ان پر سفید رنگ پھیرا گیا تھا۔ اندازے کے مطابق ان ڈرموں میں قریباً چار ہزار لیٹرز ڈیزل موجود تھا۔ یہ وہی ڈیزل تھا جو معاہدے کی شرائط کے مطابق ہرکولیس نے ایرانی جہاز کو دینا تھا تاکہ وہ ایرانی ساحل کی طرف اپنی واپسی کا سفر جاری رکھ سکے۔ اس کے علاوہ جو کچھ طے ہوا تھا۔ وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ یقیناً نقد رقم کے علاوہ کچھ تحفے تحائف بھی مارکوس اور اس کے ساتھیوں نے حاصل کیے تھے۔

بڑے سائز کی اس بوٹ میں انجن کی سہولت موجود تھی یا شاید عارضی طور پر بوٹ سے انجن اٹیچ کیا گیا تھا۔ آٹھ دس منٹ میں بوٹ اے نو تک پہنچ گئی اور اس میں سے ڈیزل ان لوڈ کر کے اوپر "اے نو" کے عرشے پر پہنچا دیا گیا۔ چاندنی میں یہ سارا منظر دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوربین سے دیکھا۔ ایرانی جہاز کے بہت سے ارکان عرشے پر جمع تھے۔ ہرکولیس کی طرح اے نو پر بھی خوشی کی لہر محسوس ہو رہی

تھی۔ اسی دوران میں مائیکل' مارکوس اور ان کے ساتھی ڈنر سے فارغ ہو کر باہر نکل آئے۔ شراب نوشی کے سبب ان سب کے چہرے تمتما رہے تھے۔ عرشے پر کھڑے ہو کر ان سب نے اپنے جام ٹکرائے اور پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے دوربین کی مدد سے دیکھا۔ اے نو کے عملے نے دونوں تباہ کن راکٹ اب پیچھے ہٹا لیے تھے۔ ہرکولیس کے عرشے کے پاس کچھ افراد نے آتش بازی شروع کر دی۔ رنگ برنگی ہوائیاں چھوٹیں اور فضا میں روشنی کے پھول سے بکھر گئے۔

درحقیقت ایرانی جہاز کی آمد کی وجہ سے ہرکولیس پر ایسٹر کا تہوار ادھورا رہ گیا تھا۔ دو روز پہلے ایسٹر نائٹ کی تقریب اپنے عروج پر تھی جب "اے نو" کی آمد پر خطرے کی گھنٹیاں بجی تھیں اور سب "حالتِ جنگ" میں آ گئے تھے۔ اب صورتِ حال بہتر ہوئی تھی تو ہرکولیس کے عملے کو گزرے ہوئے تہوار کا خیال آ گیا تھا۔ آتش بازی کا یہ سامان بھی تہوار ہی کے لیے جمع کیا گیا تھا جو اب استعمال ہو رہا تھا۔ فضا میں ہر طرف پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں اور رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ یہ بڑا دلکش منظر تھا۔ جہاز کے سارے لوگ اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے عرشے پر جمع ہو گئے۔ "اے نو" کے عرشے پر بھی ان جام نظر آنے لگا۔ آتش بازی کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی اور جہازوں پر روشنی کے جھماکوں کا عکس نظر آتا تو سماں بندھ جاتا۔ جب "فائر ورک" کے ذریعے آسمان پر کوئی زبردست قسم کا نمونہ بنتا تو دونوں جہازوں کے جہازی فلک شگاف نعرے لگاتے۔ اے نو قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھا' اس کے باوجود وہاں بلند ہونے والی آوازوں کی صدا ہم تک پہنچ رہی تھی۔ ہرکولیس کے قریباً تمام آزاد افراد آتش بازی دیکھنے کے لیے عرشے پر پہنچ گئے تھے' مگر شائستہ اب بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں فکر لاحق ہو گئی۔ اسی اثناء میں مجھے پروفیسر اللہ دتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ اداس نظر آ رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں چلتا میرے پاس آ گیا۔

میں نے پوچھا "شائستہ کا کچھ پتا چلا ہے؟"

وہ بولا "شائستہ جہاز میں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"وہ ایرانی جہاز میں ہے۔" پروفیسر نے انکشاف کیا "اسے دو دوسرے لوگوں کے ساتھ ایرانی جہاز میں بھیجا گیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔ تمہارا مطلب ہے کہ وہ ضمانت کے طور پر ایرانی جہاز میں ہے؟"

"ہاں۔" پروفیسر کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرا گیا "اس سے تم مائیکل کی فطرت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ ایک طرف وہ شائستہ کو "پیاری بیوی" کی حیثیت دیتا ہے' دوسری طرف مطلب برآری کے لیے اسے مارکوس کی بیوی کے پاس ایرانی جہاز میں بھیج دیا ہے۔ مارکوس نے شرط رکھی تھی کہ وہ ہرکولیس میں اسی صورت آئے گا جب مائیکل اپنی بیوی اور دو قریبی ساتھیوں کو ایرانی جہاز میں بھیجے گا۔ مائیکل نے شائستہ کے علاوہ اپنے ایک چچا زاد بھائی اور ایک قریبی دوست کو "اے نو" پر بھیجا تھا۔"

واقعی یہ مطلب پرستی کی ایک "شاندار" مثال تھی۔ بظاہر تو وہ لوگ سیر سپاٹے کے لیے اے نو پر گئے تھے مگر حقیقت اے نو والوں کو معلوم تھی اور سیاہ فاموں کو بھی۔ وہ لوگ ضمانت کے طور پر وہاں جمع تھے۔ اگر یہاں مارکوس اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک ہوتا تو ان ضمانتیوں کی جان فوراً عذاب میں آ جاتی۔

پروفیسر نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے خدا کا' یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ اگر لڑائی کی نوبت آ جاتی یا کوئی اور گڑبڑ ہو جاتی تو ان تینوں کے لیے سخت مشکل کھڑی ہو جاتی۔"

"کب واپس آ رہی ہے شائستہ؟" میں نے پوچھا۔

"آرتھر نے بتایا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں مارکوس اور اس کے ساتھی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وقت شائستہ اور مائیکل کے دونوں ساتھی ایرانی جہاز سے چل پڑیں گے۔ یوں دونوں طرف کے افراد کا تبادلہ ہو جائے گا۔"

اچانک میری نظر مائیکل پر پڑی' وہ مارکوس کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر نچلے عرشے پر جا رہا تھا۔ دونوں جہازوں کے وائس کیپٹن بھی ساتھ تھے۔ مائیکل کے چہرے پر مجھے عجیب سی چمک نظر آئی۔ یہ وہی چمک تھی جو اس سونڈ بونڈ آدم خور کو عام لوگوں سے جدا کرتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں پروفیسر کو وہیں چھوڑ کر مائیکل وغیرہ کے پیچھے گیا۔ نچلے عرشے کے نیچے وہ جگہ تھی جہاں ZPU-4 گنیں موجود تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ تینوں گنوں کو پہیوں پر چلا کر ایسی جگہ لا کر کھڑا کیا گیا تھا جہاں سے وہ براہِ راست "اے نو" کے پورے عرشے کو نشانہ بنا سکتی تھیں۔ گنوں کے پیچھے گن مین موجود تھے اور بالکل تیار حالت میں تھے۔ پروٹیکٹیو شیلڈز (حفاظتی آہنی چادروں) کے پیچھے یوں بیٹھے تھے جیسے ایک اشارے پر فائر کھول دیں گے۔

مارکوس اور "اے نو" کا نائب کپتان دونوں یہ منظر دیکھ

کر حیران نظر آنے لگے تھے۔ مجھ پر ابھی تک کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ میں تیزی سے حرکت کر کے ایک چوکور ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہاں تاریکی تھی' جب تک کوئی میرے بالکل پاس سے نہ گزرتا مجھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لوگ چونکہ روشنی میں تھے لہٰذا میں انہیں بہ آسانی دیکھ رہا تھا۔

مائیکل کے چہرے پر نظر آنے والی حیوانی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ مارکوس سے مخاطب ہو کر بے حد گمبیر لہجے میں بولا۔

"مارکوس! یہ لو اپنا دا کی تاکی۔"

"اس کو کیا کروں۔" مارکوس نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

"اپنے کپتان صاحب کو کال کرو۔ اسے کہو کہ "اے نو" کو ہرکولیس کے پاس لایا جائے۔"

"وہ کس لیے؟" نائب کپتان نے پوچھا۔

"اے نو پر موجود تمام افراد ہرکولیس پر آئیں گے۔"

"وہ کس لیے؟" مارکوس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"خوشی منانے کے لیے۔ ناچنے گانے کے لیے' یہ ایسٹر کا موقع ہے بھئی۔"

"بات کیا ہے؟" مارکوس نے مائیکل کو تیز نظروں سے گھورا "تم کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ سب تو معاہدے میں شامل نہیں۔"

"تو اب شامل کر لیتے ہیں۔" مائیکل کے چہرے پر درندگی کی چمک نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

"تو تم معاہدہ ختم کر رہے ہو۔" مارکوس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اے نو کے لوگ بھی ہمارے جہاز پر آ جائیں اور ہم مل کر اس صلح نامے کی خوشی منا سکیں۔" مائیکل کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

"اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو۔۔۔ تو"

مائیکل نے اسٹینڈ پر لگی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگا کر "اے نو" کا جائزہ لیا پھر مارکوس سے مخاطب ہو کر بولا "اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں صرف پانچ سیکنڈ کے اندر تمہارے اس لعنتی "اے نو" کو آگ کا گولا بنا دوں گا۔ اے نو کے نام پر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ تم نے۔۔۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" نائب کپتان چیخا۔

"میری بات مکمل ہونے دو۔" مائیکل گرجا' پھر اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور قدرے پُرسکون ہوتے ہوئے بولا "تم نے جو ڈیل حاصل کیا ہے وہ سارے کا سارا ابھی تک عرشے پر پڑا ہے۔ تم دوربین سے وہ سفید کنٹینر بہ آسانی دیکھ سکتے ہو۔ تمہارے جہاز کے تمام افراد بھی اس وقت عرشے پر موجود ہیں۔ یہ تین گنیں بارود کی بارش کریں گی تو صرف دو سیکنڈ کے اندر سب کچھ جہنم بن جائے گا۔ اس جہنم کے اندر تمہارے وہ دو منحوس راکٹ بھی بلاسٹ ہوں گے۔ تنکا تنکا ہو جائے گا تمہارا یہ حرامی اے نو۔"

"ایک بات شاید تم بھول رہے ہو۔" مارکوس مہیب آواز میں بولا "ان تنکوں کے ساتھ تمہاری بیوی اور دونوں ساتھیوں کے ٹکڑے بھی بکھریں گے۔"

"مجھے پروا نہیں ہے۔" مائیکل نے عجیب خوفناک آواز میں کہا۔ ان لمحوں میں اس کے سفید دانت ہونٹوں سے جھانکنے لگے تھے۔ اس کا چہرہ انسان سے زیادہ حیوان کا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا مطلب' تمہیں اپنی بیوی کی کوئی پروا نہیں ہے؟"

مائیکل مسکرایا "تم بہت بڑے دھوکے باز ہو مارکوس! لیکن یہاں تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو تین افراد اس جہاز سے تمہارے جہاز پر گئے ہیں' ان میں سے کسی کے جینے مرنے سے مجھے غرض نہیں۔ اگر تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے مجھے تمہارے جہاز پر حملہ کرنا پڑتا ہے اور اس حملے میں وہ تینوں بھی مرتے ہیں تو مجھے مطلق پروا نہیں۔ لہٰذا تمہارا یہ اہم ترین کارڈ ضائع ہو چکا ہے۔"

"تم۔۔۔ تم بکواس کر رہے ہو۔" مارکوس دانت پیس کر بولا۔

"میں تمہیں سچ سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ اور سچ یہی ہے موٹے بیل! کہ تم جیسے چغد کو تاوان دینے سے بہتر ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت سمندر میں ڈوب مروں۔ بہت جلد تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم نے ہمیں انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے' اور اس غلطی کی سزا میں' تمہیں اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال اتار کر اس میں بھس بھرنا پڑے گا۔ ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر تم اپنے دستِ مبارک سے خود کو حنوط کرو گے۔" مائیکل کی آواز خوفناک سے خوفناک ہوتی چلی جا رہی تھی۔

"تم تباہی کے راستے پر چل رہے ہو۔" نائب کپتان نے کہا۔

"ہاں یہ تباہی کا راستہ ہے' لیکن یہ صرف تمہاری تباہی ہے۔ تم ان اینٹی ائیر کرافٹ گنوں کی مار سے واقف نہیں ہو۔ سمجھو ان تین "گن مینوں" میں سے کسی ایک کی انگلی کا دباؤ بھی ٹریگر پر بڑھ گیا تو "اے نو" نابود ہو جائے گا' چار ہزار ٹن

ذیل آگ کا دریا بن جائے گا۔"

میں نے پہلی بار ہاتھی نما مارکوس کے چہرے پر غصے کے علاوہ پریشانی کے آثار بھی دیکھے۔ تینوں گن مین حبشی تھے۔ وہ کمانڈوز کے مخصوص لباس میں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انگلش میں ہونے والی یہ گفتگو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے' تاہم ان کے سیاہ چمکیلے چہروں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ صورت حال کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ ہیں' اور مائیکل کے صرف ایک اشارے پر "اے نو" پر حملہ کر دیں گے۔

مائیکل نے مارکوس کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "پیارے! تمہارے سامنے اب راستے دو ہی ہیں۔ پہلا راستہ سلامتی کا ہے۔ اس میں تمہارے تمام ساتھی بچ جائیں گے' جن میں تمہاری بیوی بھی شامل ہے۔ تم خود بھی محفوظ رہو گے۔ بے شک تم لوگوں کو آزادی میسر نہیں ہوگی مگر زندگی تو میسر ہوگی اور ہو سکتا ہے کسی وقت آزادی بھی میسر آجائے کوئی آقا تم کو آزاد کر دے' تم اپنی عیاری سے آزادی چھیننے میں کامیاب ہو جاؤ یا ایسا ہی کچھ اور ہو جائے' زندگی ہو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے میرے موٹے بیل۔۔ دوسرا راستہ واقعی تباہی کا ہے۔ میں بس تھوڑی دیر اور انتظار کروں گا' اس کے بعد تمہارے اس حرامی "اے نو" کو آگ کا گولا بنا دوں گا۔ یقیناً اس میں میرا نقصان ہوگا۔ قریباً چالیس عدد بردے ہاتھ سے نکل جائیں گے' اس کے علاوہ ایک قیمتی جہاز سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے مگر تمہیں یادگار سبق تو مل جائے گا۔ اس سبق کے بعد جو سزا تمہیں ملے گی وہ بھی اپنی مثال آپ ہوگی۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال کون اتارتا ہے؟ لیکن تمہیں اتارنا پڑے گی۔"

"تم۔۔۔ کچھ بھی کر لو' لیکن اے نو کے لوگ اس جہاز پر نہیں آئیں گے۔" مارکوس نے لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ کہا۔

"اگر وہ یہاں نہیں آئیں گے تو پھر اوپر جائیں گے۔ یہ لو واکی ٹاکی۔۔۔ میں تمہیں آخری بار ان سے رابطہ کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔

مارکوس نے واکی ٹاکی ایک طرف پھینک دیا۔ نائب کپتان نے بڑی پھرتی سے اپنا آفیشل ریوالور نکالنا چاہا مگر مائیکل کے گارڈ نے اسے عقب سے دبوچ لیا اور یوں اپنے شکنجے میں کسا کہ اس کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا' فریب اندام مارکوس نے گارڈ کی رائفل پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی مگر مائیکل نے اسے اڑنگا لگا کر اوندھے منہ گرا دیا۔ وہ ہاتھی کا ہاتھی یوں گرا کہ پورا فرش تھرا کر رہ گیا۔ مائیکل نے اس کی پشت پر گھٹنا رکھا اور اس کے دونوں بازو موڑ کر پشت سے لگا دیے۔

"میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں۔" مائیکل نے گرج کر کہا۔

"تمہیں پچھتانا پڑے گا۔" مارکوس نے کراہتے ہوئے جواب دیا "وہ لوگ ٹیلی اسکوپ سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے' میں انہیں پچھتاوے سے بچا لیتا ہوں۔" مائیکل نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ آتش بازی کے روشن جھماکوں کا عکس مائیکل کے چہرے پر تھا۔ سفید دانت چمک رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے انسانی کندھوں پر کسی آدم خور درندے کا چہرہ رکھا ہو۔

"فائر کرو!" اس نے چیخ کر حکم دیا۔

میرا پورا جسم جیسے سکتے کی زد میں آگیا۔ میرا دل چاہا کہ میرے کئی ہاتھ ہوں اور میں ان تمام ہاتھوں سے گن مینوں کو دبوچ لوں۔ اس بارود کا راستہ روک لوں جو ایرانی جہاز پر موت بن کر برسنے والا تھا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ مائیکل کی زبان سے وہ لفظ ادا ہو چکے تھے جنہوں نے ایرانی جہاز اور اس کے سواروں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا' وہ سوار جو جہاز کے عرشے پر بڑی دلچسپی سے آتش بازی دیکھ رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے' تالیاں پیٹ رہے تھے۔

ابھی میں بمشکل چوکور ستون کی اوٹ سے نکلا ہی تھا کہ ZPU-4 کے خوفناک قہقہوں سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ تینوں ہیوی گنوں نے ایک ساتھ آگ اگلنا شروع کی تھی موت بانٹنے والی سیکڑوں روشن لکیریں تڑپ کر ایرانی جہاز کی طرف گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہوئیں۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے "ہرکولیس" کی مسرت میں شامل ہونے کے لیے "اے نو" والوں نے بھی آتش بازی شروع کر دی ہے۔ یہ آتش بازی تو تھی مگر وہ آتش بازی تھی جس کے بعد بین کیے جاتے ہیں' گریبان پھاڑے جاتے ہیں اور سروں میں خاک ڈالی جاتی ہے۔ صرف چند سیکنڈ اور اس کے بعد ایک ایسا دھماکا ہوا جس کی چکاچوند نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ آگ کا ایک بہت بڑا ستون اے نو کے عرشے سے بلند ہوا اور اس نے پھیل کر پورے جہاز کو اپنے اندر چھپا لیا۔ اس منظر کی اصل شدت اور ہیبت کو بیان کرنا شاید لفظوں میں ممکن نہ ہو۔ درجنوں جیتے جاگتے چلتے پھرتے انسان دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے مہیب شعلوں میں گم ہو گئے تھے اور پھر چند لمحے بعد ایک سیکنڈ کے وقفے سے یکے بعد دیگرے دو سماعت شکن دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کی روشنی ہرکولیس

تک پہنچی۔ میں بے اختیار پیچھے جھک گیا۔ چند لمحے بعد میں نے دیکھا' آسمان سے جیسے شعلوں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ "اے نو" کے جلتے ہوئے ٹکڑے تھے۔ دونوں راکٹ جہاز کے اندر ہی پھٹ گئے تھے اور انہوں نے "اے نو" کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ مارکوس' مائیکل کے نیچے اوندھا پڑا ہوا دیوانوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت "اے نو" کے نائب کپتان کی تھی۔ میں دوڑتا ہوا پہلے عرشے پر پہنچا۔ کچھ دیر پہلے جو لوگ ہرکولیس پر گا بجا رہے تھے وہ سکتے کی سی حالت میں "اے نو" کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اے نو اب جلتے کے بہت سے جلتے ہوئے ٹکڑوں کا نام تھا۔ یہ چھوٹے بڑے ٹکڑے خلیج عدن کے تاریک پانی میں قریباً سو مربع میٹر کے رقبے میں بکھرے ہوئے تھے۔ ایرانی جہاز کا ایک حصہ ٹوٹ کر پہلو کے بل پانی پر تیر رہا تھا۔ اسے بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سرخ رنگ کے کسی مگرمچھ نے پانی سے منہ نکال رکھا ہو۔

ہرکولیس کے انجن اسٹارٹ ہو چکے تھے پھر وہ حرکت میں آیا اور تیزی سے جائے وقوع کی طرف بڑھنے لگا۔ دو منٹ سے بھی کم وقفے میں ہم جلتے ہوئے جہاز کے ٹکڑوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ دفعتاً میرا دھیان شائستہ کی طرف چلا گیا۔ دل گھونسا سا لگا۔ پروفیسر کی لاڈلی بیٹی' من موہنی صورت والی شائستہ بھی اسی بدنصیب جہاز پر سوار تھی۔ نجانے اس پر کیا گزری تھی اور جہاز کو تباہ ہوتے دیکھ کر پروفیسر پر کیا گزری تھی۔ میں عرشے پر پروفیسر کو تلاش کرنے لگا اور آوازیں دینے لگا۔ عرشے پر ہر طرف افراتفری نظر آرہی تھی۔ "ہو" کی طرف کچھ سیاہ فام جھنڈیاں لہرا لہرا کر فاتحانہ نعرے بلند کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ "اے نو" پر سوار کئی افراد زندہ بچ گئے تھے اور پانی پر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ان میں سے کچھ پانی پر تیرنے والی مختلف اشیاء سے چمٹے ہوئے تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ جلد ہی بڑے بڑے دو روشن دائرے پانی پر حرکت کرنے لگے۔ یہ دو ویکل سرچ لائٹس تھیں جو برج کے پاس لگی ہوئی تھیں۔ ہرکولیس کے پہلو سے رسی اور پائپ کی بنی ہوئی سیڑھیاں لٹکا دی گئیں۔ حبشی پہرے دار پھرتی سے نیچے اترنے لگے۔ یقیناً ان کی پھرتی انسانیت کے ناتے سے نہیں تھی' یہ ان کے کاروبار کے ناتے سے تھی۔ وہ انسانوں کو نہیں قیمتی سامان تجارت کو پانی سے نکالنے جا رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ جہاز کے عقبی حصے کی طرف اٹھ گئی۔ سرچ لائٹ کے متحرک دائرے میں مجھے صرف ایک سیکنڈ کے لیے پروفیسر اقدو دانا کی صورت نظر آئی

کالا بیل

تھی۔ وہ پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ میں نے پروفیسر کو اس کے بالوں کی سفیدی اور قمیص کے رنگ سے پہچانا۔ پروفیسر کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور کڑی سے کڑی مل گئی۔ پروفیسر کا جذباتی پن میرے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ بیٹی کے ساتھ اس کی محبت ایک تند و تیز دھارے کی طرح تھی۔ یقیناً اس نے پانی میں شائستہ کو دیکھا تھا اور اس کو بچانے کے لیے دیوانہ وار کود پڑا تھا' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کود پہلے ہو اور شائستہ پر اس کی نگاہ بعد میں پڑی ہو' بہرحال جو کچھ بھی تھا' وہ پانی کی زد میں تھا' اور یہ بھی ممکن تھا کہ شائستہ بھی اس کے ساتھ ہی مدد کے لیے چیخ چلا رہی ہو۔ وہی شائستہ جو پانی سے ڈرتی تھی۔ جو بچپن میں پانی میں غوطہ کھا کر باپ سے چمٹ گئی تھی' آج برسوں بعد اس نے پھر پانی میں غوطہ کھایا تھا لیکن آج وہ ٹب میں نہیں' سمندر میں ڈوبی تھی۔ سمندر جس کے سامنے اس کا کمزور باپ بے بس تھا' جس کے سامنے بڑے بڑے بیڑے بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہ سمندر جذباتی نہیں ہوتا بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اصول اور ضوابط ہوتے ہیں' ڈوبنے والا کتنا خوب صورت ہے' کتنا جوان ہے' اس کے اندر کس کس کی جان اٹکی ہوئی ہے' اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

مجھے لگا جیسے میرے کانوں میں معصوم صورت شائستہ کی چیخ گونجی ہے۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت' بہرحال میرے دل کے اندر سے آواز ابھری کہ مجھے باپ بیٹی کی مدد کرنی ہے۔ میں دو پہرے داروں کو پیچھے ہٹا کر تیزی سے رسی کی سیڑھی کی طرف بڑھا' سیڑھی پر پہنچ کر چند STEP نیچے اترا پھر میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

تاریک پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا میں اس سمت بڑھا جہاں مجھے پروفیسر اللہ دتا کی جھلک نظر آئی تھی۔ میرے اردگرد غوطے کھاتے ہوئے لوگوں کی چیخ و پکار تھی اور شعلوں کا رقص تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پانی کو آگ لگی ہوئی ہے۔ سرچ لائٹ کا روشن دائرہ میرے اوپر سے ہو کر گزرا۔ اس دائرے میں مجھے بہت سی چیزیں پانی پر تیرتی نظر آئیں۔ ملبے کے ٹکڑے، صوفوں کے کشن، شراب کی بوتلیں، ایرانی کوسٹ گارڈز کی ٹوپیاں اور جوتے وغیرہ اور اس کے ساتھ ساتھ کئی افراد بھی۔ ان میں سے کئی ایک کے چہرے زخمی تھے اور وہ "ہرکولیس" کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ اچانک آگ کے شعلوں میں مجھے پروفیسر کی نیلی اور سفید قمیص کی جھلک نظر آئی۔ میں تیزی سے پروفیسر کی طرف بڑھا، میں پروفیسر کو تھامنا چاہتا تھا لیکن جو جسم میرے ساتھ چمٹا وہ بہت نازک اور گداز تھا۔ میں ایک لمحے میں جان گیا کہ یہ شائستہ تھی۔ وہ بری طرح غوطے کھا رہی تھی اور سہارا ملتے ہی کسی آکٹوپس کی طرح مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا اور پروفیسر کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ چلائے۔ پروفیسر آس پاس کہیں نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بجلی کی طرح چمکا کہ پروفیسر ڈوب گیا ہے۔ میں نے جب اسے دیکھا تھا، اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں مجھے صاف نظر آیا تھا کہ وہ بری طرح غوطے کھا رہا ہے۔

"پروفیسر، پروفیسر" میں نے چیخ کر کہا۔

میری پکار کا جواب نہیں آیا۔ اسی دوران میں سرچ لائٹ کا دائرہ حرکت کرتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ میں نے دیکھا، پروفیسر تیرتا ہوا جہاز کی سیڑھی کی طرف جا رہا تھا۔

یقیناً وہ تیرنا جانتا تھا، وہ صرف شائستہ کے بوجھ کی وجہ سے ڈوب رہا تھا۔ اب شائستہ کو میرا سہارا مل گیا تھا۔ پروفیسر اپنی رہی سہی قوت جمع کر کے اپنی جان بچانے کی کوشش میں لگ گیا تھا۔ شائستہ کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، یقیناً اس کے پیٹ میں پانی بھرا ہوا تھا۔ میں نے لائف گارڈز کے انداز میں ایک بازو شائستہ کی کمر میں ڈالا اور منہ آسمان کی طرف کر کے "بیک اسٹروک" کے ذریعے تیرنے لگا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں جہاز کی ایک سیڑھی تک پہنچ گیا، ایک حبشی گارڈ نے شائستہ کو سہارا دیا اور اوپر کھینچ لیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو رہی تھی، حبشی اسے کندھے پر لاد کر سیڑھی چڑھنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر پانی میں ڈبکی لگائی اور ایک ایسے شدید زخمی شخص کو پانی سے نکال لایا جو بس ڈوبنے ہی والا تھا۔

یہ ہنگامہ آدھ پون گھنٹا جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اب سطح سمندر پر ملبے کے جلے ہوئے ٹکڑوں اور بیکار اشیا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ صرف ایک گھنٹا پہلے یہاں ایک صحیح سالم "اے ٹو" نامی جہاز موجود تھا اور اس پر ایرانی کوسٹ گارڈز "خوشی" منا رہے تھے۔ سمندر سے زندہ نکالے جانے والوں میں دس مرد اور تین چار عورتیں تھیں۔ چھبیس کے قریب افراد "اے ٹو" کے ساتھ ہی چیتھڑوں میں بدل گئے تھے اور پانی میں غرق ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں مائیکل کا چچا زاد بھائی بوب اور اس کا دوست بھی شامل تھے۔ یعنی ضمانت کے طور پر جو تین افراد "ہرکولیس" سے ایرانی جہاز پر گئے تھے ان میں سے صرف شائستہ ہی زندہ بچ سکی تھی۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے تین افراد زخمی تھے۔ ان میں سے دو تو بری طرح جھلسے ہوئے تھے اور ان کا بچنا محال تھا۔ زندہ بچنے والوں میں فربہ اندام مارکوس کی فربہ اندام بیوی بھی شامل تھی۔ اس گوری چٹی عورت کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے جسم پر گوشت اور چربی کی موٹی تہیں تھیں۔ ایرانی جہاز کے دیگر مسافروں کی طرح اس عورت کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ سکتے کی سی حالت میں تھی۔ زندہ بچ جانے والے اکثر افراد رو رہے تھے اور ان میں شائستہ بھی شامل تھی۔ وہ اپنے والد سے اسی طرح لپٹی ہوئی تھی کہ جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پروفیسر خود بھی ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ شائستہ کا کندھا زخمی ہوا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔

فربہ اندام مارکوس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ایرانی جہاز کی تباہی اور کھلے کی ہلاکت پر وہ نیم دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی چنگھاڑیں پورے جہاز میں گونج رہی تھیں۔ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ یقیناً اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گولیوں سے اڑا دیتا۔ مائیکل کے حکم پر اس کے طاقتور کارندوں نے مارکوس کو زمین پر گرا کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہونٹوں پر ایک چوڑا ٹیپ لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مشکیں بھی کس دی گئیں۔ وہ عرشے کے فرش پر کسی وہیل مچھلی کی طرح تڑپنے مچلنے لگا۔ دیوہیکل حبشی محافظ اسے اٹھا کر اندرونی حصے میں لے گئے۔

مائیکل کی اداکاری بڑی زبردست تھی۔ اس کے چچا زاد بھائی بوب کی لاش کا بالائی حصہ سمندر سے مل گیا تھا۔ مائیکل کی ہدایت پر لاش کے اس حصے کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا

گیا تھا۔ مائیکل لاش کے سرہانے کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے سوگواری بارش کی طرح برس رہی تھی۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل لاش کے پاس بیٹھ گیا، بڑے رقت آمیز انداز میں چادر پر ہاتھ پھیرتا رہا اور منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اس کے سیاہ فام ساتھی لمبے لمبے منہ لٹکائے ساکت کھڑے تھے اور اپنے "باس" کے غم میں شریک ہونے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے باس کے چہرے پر صرف دکھاوے کی سوگواری ہے، نہ ہی انہوں نے اپنے باس کے منہ سے تھوڑی دیر پہلے ادا ہونے والے الفاظ سنے تھے۔ وہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ الفاظ صرف میں نے سنے تھے اور میں نے ہی سمجھے تھے۔ مائیکل نے جب ایرانی جہاز کو آگ کا گولا بنا دینے کی دھمکی دی تھی تو مارکوس نے کہا تھا، "مت بھولو مائیکل کہ اگر ایرانی جہاز تباہ ہوا تو اس میں موجود تمہارے تین ساتھیوں کے پرخچے بھی اڑیں گے۔" جواب میں مائیکل نے غیر انسانی قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا، "مجھے ان میں سے کسی کی پروا نہیں۔ وہ میرے نزدیک بے حیثیت لوگ ہیں۔"

اور ان "بے حیثیت" لوگوں میں مائیکل کا چچا زاد بھائی ہی نہیں اس کی شریک حیات شائستہ بھی تھی۔ اب وہی مائیکل چچا زاد بھائی کے سرہانے بے حد "سوگوار" کھڑا تھا پھر وہ شائستہ کی طرف بڑھا۔ شائستہ اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا اور بڑبڑانے لگا "جیسے جو کچھ ہوا شائستہ، اچانک ہو گیا۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ ہم نے ایرانی جہاز کو ایندھن دے دیا تھا، باقی شرائط بھی مان لی تھیں لیکن ان کی نیت میں فتور تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ جونہی انہوں نے دیکھا کہ ہم لوگ آتش بازی میں مصروف ہیں، انہوں نے چالاکی دکھائی اور اپنے دونوں راکٹ آگے لا کر ہماری گنوں کا نشانہ لے لیا، اس کے ساتھ ہی اندھا دھند فائرنگ بھی کر دی۔ جواب میں مجھے فائرنگ کا حکم دینا پڑا۔"

"میرا خیال ہے کہ جو ڈیزل ہم نے دیا تھا وہ ابھی عرشے پر ہی پڑا تھا، فائرنگ سے اس میں آگ بھڑک اٹھی۔" کپتان جم نے خیال ظاہر کیا۔

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ بعد میں "اے ٹو" کے دونوں راکٹ بھی پھٹ گئے۔" مائیکل نے کہا۔

مائیکل سفید جھوٹ بول رہا تھا اور اس بات سے صرف میں آگاہ تھا۔ مائیکل نے اپنی آن اور انا کے لیے معاہدے کی دھجیاں اڑائی تھیں اور ایرانی جہاز کے ارکان کو یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے "اے ٹو" کے چیتھڑے اڑا ڈالے تھے۔ وہ صرف آدم خور ہی نہیں تھا، ایک نہایت سفاک اور منتقم المزاج شخص بھی تھا۔ اے ٹو کو دھماکے سے اڑاتے وقت اس کی آنکھوں میں جو وحشیانہ چمک دکھائی دی تھی وہ ابھی تک مجھے یاد تھی۔ اس نے اے ٹو کے خلاف نہایت عیارانہ چال چلی تھی۔ پہلے اے ٹو والوں کے مطالبے پر اے ٹو کو ڈیزل بھیجا تھا اور جب ڈیزل جہاز کے عرشے پر پہنچ گیا تھا تو اپنی ZPU-4 گنوں کا رخ عرشے کی طرف کر دیا تھا۔ مائیکل کی اس چال نے اس کی پہلی چال کی یاد تازہ کر دی تھی جب وہ اے ٹو اور اس کے ساتھی جہاز کو اپنے جہاز کے پیچھے لگا کر اتھلے سمندر میں لے گیا تھا اور وہاں دونوں جہاز ریت میں پھنسا ڈالے تھے۔

اے ٹو کے زندہ بچ جانے والے افراد کو نیچے کیبنوں میں بند کر دیا گیا۔ زخمی افراد کی دیکھ بھال غزالہ کے سپرد ہوئی۔ اس کے بعد اے ٹو میں مرنے والے دونوں سیاہ فاموں کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ لاشوں کے چہروں کو مختلف رنگوں سے رنگا گیا۔ ماتمی گیت وغیرہ گائے گئے اور انہیں "سپرد آب" کر دیا گیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں ہی صبح ہو گئی۔ یہ آگ اور خون سے رنگی ہوئی رات کی صبح تھی۔ مشرقی افق پر سرخ اجالا نمودار ہوا اور پھر آہستہ آہستہ سورج نے اپنا سر ابھارا۔ ہمارا جہاز اب تک وہیں کھڑا تھا جہاں رات کو خونیں معرکہ ہوا تھا۔ سطح سمندر پر دور تک "اے ٹو" کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ ایک دو لاشیں بھی تیرتی نظر آئیں۔ تباہ شدہ "اے ٹو" کا تقریباً چالیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا ایک بیضوی حصہ ابھی تک سمندر پر تیر رہا تھا۔ جہاز کے اس حصے پر ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا اور ایک مستول نما ٹوٹا ہوا پول بھی نظر آ رہا تھا۔ مائیکل کے حکم پر حبشی کارندے ایک کشتی پر بیٹھ کر اس ٹوٹے ہوئے حصے پر پہنچے، یہاں سے انہوں نے چند رائفلیں نکالیں، پھر دو اٹیچی کیس برآمد کیے۔ یقیناً ان میں بھی سامان وغیرہ بھرا ہو گا۔ اس کے بعد وہ لوگ ہر ایسی شے اکھاڑنے لگے جو تھوڑی بہت قیمت پر فروخت ہو سکتی تھی۔ لالچ سے ان لوگوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ پورے پورے لٹیرے نظر آ رہے تھے۔ کچھ حبشی ویسے ہی سمندر میں کود پڑے اور جہاز کے تیرتے ہوئے ٹکڑوں کا معائنہ کرنے لگے کہ کوئی "کارآمد" شے ضائع نہ ہو۔

مائیکل جہاز پر موجود تھا۔ میری نگاہ جب بھی اس کے

چہرے پر پڑتی تھی' نفرت کی ایک بلند لہر میرے سینے میں اٹھتی تھی۔ میں نے کل رات اس شخص کا ایک نہایت خطرناک اور سفاک روپ دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس سے بڑھ کر بھی سفاکی دکھا سکتا ہے۔ دوپہر کے وقت میں نیچے کمپارٹمنٹ میں پہنچا تو صفدر اور زریں وغیرہ کو سخت پریشان پایا اور یہی کیفیت دوسرے کیبنوں میں موجود قیدیوں کی تھی۔ انہوں نے رات کو پہلے پہر وہ خوفناک دھماکے سنے تھے اور اس کے علاوہ اینٹی ایئرکرافٹ گنوں کی فائرنگ کی زوردار آوازیں بھی ان تک پہنچی تھیں۔ میں نے صفدر اور زریں کو مختصر الفاظ میں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں ڈوب کر سنتے رہے۔ مائیکل کی عیاری اور سفاکی کا سن کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے۔ بہرحال میں نے صفدر اور زریں کو پابند کر دیا کہ وہ یہ باتیں صرف اپنے تک محدود رکھیں گے۔

صفدر نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے ملاح کے دو اطالین افراد یہاں آئے تھے۔ ہمارے کیبن میں ایک پرانا رسّا پڑا ہوا تھا' وہ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے پوچھا' رسّے کا کیا کرنا ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ دو بدمعاشوں کو پھانسی دینی ہے۔ پھر خود ہی کہنے لگا' اس کو مذاق مت سمجھو۔ باس واقعی دو بندوں کو لٹکا رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ وہ بولا' تمہارے ہی جیسے بندے ہیں' ایک گردن اور دو ٹانگوں والا۔"

"اس وقت سے ام بہت پریشان ہے استاد صیب۔" زریں نے کہا۔ "امارے دل میں بہت برا برا خیال آ رہا ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ بڑے کمینے انداز میں ہنس بھی رہا تھا۔" زریں کے چہرے پر پریشانی تھی۔ وہ صرف شلوار پہنے صفدر کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "تم نے ایسا کون سا خاص جرم کیا ہے جس کی پاداش میں وہ تمہیں پھانسی دے دیں گے؟"

"ام کو اپنا نہیں آپ کا فکر ہے استاد صیب! ام تو اس کمرے میں بند ہے' ام نے کیا جرم کرنا ہے؟ آپ جہاز پر گھومتا رہتا ہے' ام کو فکر تھا کہ شاید آپ سے اور غزالہ بی بی سے کوئی غلطی ملطی نہ ہو گیا ہو۔"

"ہم سے پچھلے چند روز میں کوئی غلطی نہیں ہوا تو اب کیوں ہو گا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

زریں نہیں سن سکا لیکن صفدر نے سن لیا اور مسکرانے لگا۔ "آپ نے کیا فرمایا ہے استاد صیب؟" زریں نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ کیبن میں بند رہ رہ کر تم کچھ وہمی ہو گئے ہو۔"

"آپ سچ کہہ رہا ہے۔ کسی وقت تو یہ کیبن ہمیں کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اور تو اور' کبھی کبھی ام کلثوم سے بھی جھگڑ پڑتا ہے۔"

"یہ تو واقعی اخبار میں چھپنے والی خبر ہے مگر یہ انہونی ہوئی کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ کلثوم سے لڑائی۔۔۔؟"

وہ بولا "بس اس پر اماری خدمت کا بھوت سوار ہے۔ ہر وقت یہی رٹ لگائے رکھتا ہے' ام تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہے' بتاؤ ام کیا کرے۔ ام نے کئی بار سمجھایا' اللہ کا بندی' ام تم کو کیا بتائے۔ ام تو خود یہاں قیدی ہے ذرا اونچی آواز میں بولے تو امارے سر پر ڈنڈا پڑتا ہے' ام تم سے کیا خدمت کرائے گا۔ اور خدمت کراتے ہوئے کیا اچھا لگے گا۔ وہ امارا ٹانگیں دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ ام تمہارے جسم کا مالش کرے گا' تمہارے سر سے جوئیں نکالے گا۔ آپ ہی بتائیں کیا اس کیبن میں سب کے سامنے یہ سارا کام ہو سکتا ہے؟"

"ہاں سارا کام تو واقعی سب کے سامنے نہیں ہو سکتا لیکن جتنا ہو سکتا ہے اتنا کرا لیا کرو۔" میں نے کہا۔

"بس اس کے اندر چین نہیں ہے استاد صیب! ہر وقت یہی کہتا ہے' ام کو کوئی خدمت بتاؤ۔ کرنے کو کوئی کام بتاؤ۔" زریں نے جلے ہوئے لہجے میں کہا "ام نے آج اپنا قمیص پھاڑ کر اسے دے دیا' ام نے کہا کہ چلو کونے میں بیٹھ جاؤ اور سوئی دھاگے سے اسے سیو۔ جب یہ سِل جائے گا تو ام اپنا شلوار پھاڑ کر دے دے گا' پھر اسے سیتی رہنا۔ بس اسی بات پر وہاں کونے میں منہ پھلائے ہوئے بیٹھا ہے۔" اب میری سمجھ میں آیا کہ زریں نے صرف شلوار کیوں پہن رکھی ہے۔

میں نے دیکھا' کلثوم واقعی ایک کونے میں گم صم بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے "کیا بات ہے کلثوم؟" میں نے پوچھا۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی "ام ادھر نہیں رہتا۔ ام کو گھر بھیجو۔"

میں نے کہا "جاؤ بھئی زریں! تانگا لے کر آؤ' کلثوم اپنے میکے جائے گی۔"

صفدر نے کہا "یہ زریں بہت خوچل ہے شاہ جہاں صاحب' اسے پتا ہے کہ کلثوم اپنے میکے نہیں جا سکتی اور اس

جہاز میں سے تو میکے جانے کا کوئی رستہ ہی نہیں لکھا اسی لیے تنگ کرتا ہے اسے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں میکے کا انتظام کرتا ہوں۔" میں نے کہا "غزالہ کے اپارٹمنٹ کو کلثوم کا میکا قرار دے دیتے ہیں۔ میں ابھی کلثوم کو میکے بھجواتا ہوں۔ چلو کلثوم' تم اپنا سامان باندھ لو۔ میں تمہیں میکے چھوڑ آتا ہوں۔"

زریں ایک دم چونک گیا' پھر کلثوم کے پیچھے ہو کر مجھے اشارے کرنے لگا کہ میں ایسی بات نہ کروں۔ ورنہ کلثوم سچ مچ یہاں سے جانے کی ضد کرنے لگے گی۔

صفدر نے کہا "یہ کیا اشارے کر رہے ہو۔ جو بات بھی کرنی ہے' کلثوم کے سامنے آ کر کرو۔" زریں بوکھلا گیا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ صفدر نے کہا "اب ہاتھ کیوں جوڑ رہے ہو۔ لوگ ہے باہر شیر بنتے ہو' اندر سے بھیگی بلی ہو۔"

زریں کے ہونٹ پھڑکنے لگے تھے۔ کلثوم نے گھبرا کر کہا "کہاں ہے شیر؟"

میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں تھا' اب بلی بن کر بھاگ گیا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ زریں کل بھی اسی طرح بھاگ جائے گا۔ نہیں بھاگے گا تو ہم بھگا دیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد میں عرشے پر گیا تو وہاں واقعی پھانسی گھاٹ کا منظر نظر آیا۔ جہاز کے دو پولوں پر ایک موٹی سی ولی (لکڑی) افقی رخ پر رکھ دی گئی تھی۔ اس ولی کے ساتھ ایک پھندا جھول رہا تھا۔ غالباً یہ وہی رسّا تھا جو صبح کے وقت نیچے کیبن سے لایا گیا تھا۔ اس عارضی پھانسی گھاٹ کے ارد گرد بہت سے افراد جمع تھے اور مزید جمع ہو رہے تھے۔

یہاں میری نگاہ انور اور عارف انویزی' وہی حسین مگر بد مزاج سیاہ پیراہن لڑکی جو دیگر دو لڑکیوں کے ساتھ بمبئی سے آئی تھی۔ وہ دو روز پیشتر وہ فربہ اندام مارکوس کی رات کو رنگین بنانے کے لیے اس کے پاس بھیجی گئی تھی۔ آج وہ اپنے آقاؤں کی سفاکی کا ایک اور مظاہرہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھی۔

پروفیسر اللہ دتا بھی مجھے ایک گوشے میں بیٹھا نظر آیا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا تو اس نے بتایا "ایرانی جہاز سے پکڑے جانے والے دو افراد کو لٹکایا جا رہا ہے۔"

"کون ہیں وہ؟"

"میرا خیال ہے کہ موٹا مارکوس اور ایرانی جہاز کا نائب کپتان جشید ہیں۔ ان پر ہرکولیس کے نائب کپتان ٹلیمنگ اور دو دیگر دو افراد کو قتل کرنے کا الزام ہے۔"

"لیکن یہ افراد تو دو طرفہ فائرنگ میں مارے گئے تھے!"

"مائیکل کا کہنا ہے کہ اس فائرنگ کی شروعات ایرانی جہاز کے حملے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے مارکوس اور جشید ان ہلاکتوں کے ذمے دار ہیں۔"

اچانک چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ میں نے دیکھا کہ مائیکل اپنے لگژری اپارٹمنٹ کی طرف سے برآمد ہوا۔ کوئی عورت اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی اور رو رو اویلا کر رہی تھی۔ یہ وہی سرخ و سپید صحت مند عورت تھی جو ایرانی جہاز سے پکڑی گئی تھی اور جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ مارکوس کی بیوی ہے۔ یہ عورت اب چیخ چیخ کر مائیکل سے رحم کی درخواست کر رہی تھی۔ یقیناً اس کی یہ درخواست اپنے شوہر مارکوس کے لیے تھی۔

وہ انگلش میں بول رہی تھی "مارکوس بے قصور ہے۔ اگر کپتان کی مرضی شامل نہ ہوتی تو حملہ کیسے ہوتا۔ حملہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" اس کے علاوہ بھی خبر نہیں وہ کیا کچھ کہہ رہی تھی لیکن مائیکل نے اپنے کان جیسے بند کر رکھے تھے۔

مائیکل نے اپنے دوسرے پاؤں کی ٹھوکر سے فربہ اندام عورت کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ پھر روتی ہوئی مائیکل کے قدموں سے چمٹ گئی۔ مائیکل نے حبشی کارندوں کو اشارہ کیا' وہ فربہ اندام عورت کو بازوؤں اور بالوں سے کھینچتے ہوئے پیچھے لے گئے۔ وہ اب بھی مائیکل کو خدا اور یسوع مسیح کے واسطے دے رہی تھی۔ حبشی پہرے داروں نے اس کے منہ پر چوڑا ٹیپ چپکا کر اس کی بولتی بند کر دی۔ عرشے پر ایک طرف تین چار قطاروں میں کرسیاں رکھی تھیں۔ مائیکل' کپتان جم' نائب کپتان آرتھر اور دیگر سرکردہ افراد اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ یہ درندہ صفت لوگ تھے اور درندگی کا مظاہرہ ان کے لیے دلچسپ تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مائیکل کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے مجھے بھی اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔

"کیا اس سزا کا سرِعام مظاہرہ ضروری تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں' اس میں کیا برائی ہے۔ مرنے والا تو مرے گا ہی' دیکھنے والوں کی تفریح مفت میں ہو جائے گی۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اس تفریح کو خواتین بھی دیکھیں گی' جن میں تمہاری "پیاری" بیوی شائستہ بھی ہے۔ اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔"

"اچھا اثر ہی پڑے گا۔ اسے معلوم ہو گا کہ اس کا خاوند کوئی کمزور شخص نہیں ہے۔ وہ اپنے مجرم کا پنجہ موڑنے کی

طاقت رکھتا ہے اور اسے عبرت ناک سزا بھی دے سکتا ہے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ سفاکی کے اس مظاہرے سے دوسروں پر تمہاری ہیبت طاری ہوگی۔ جن میں تمہاری مبینہ بیوی بھی شامل ہے۔"

"یہ تمہاری اپنی سوچ ہے جو سراسر غلط ہے۔" مائیکل نے کہا "مجھے شائستہ کا پورا پورا خیال ہے اور میں اس کی رائے کا احترام بھی کرتا ہوں۔ شاید تم یقین نہ کرو مگر یہ حقیقت ہے کہ شائستہ ہی کے کہنے پر میں ان دونوں افراد کو پھانسی دے رہا ہوں' ورنہ میں نے تو ان کے لیے ایسی سزا سوچی تھی کہ قیامت تک ان کی روحیں چیختی چلاتی رہتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ دونوں بدبخت اپنے ہاتھوں سے اپنی کھال اتارنے پر مجبور ہو جاتے۔ تین سی سی کا صرف ایک ایک انجکشن ان دونوں کو لگایا جاتا اور یہ خود کو کھجا کھجا کر اپنی چمڑی ادھیڑ ڈالتے۔ خود کو کھجاتے چلے جاتے' یہاں تک کہ مر جاتے۔"

میں لرز کر رہ گیا۔ اس بدنام زمانہ کیمیائی مرکب کے بارے میں' میں نے بھی سن رکھا تھا۔ اس مرکب کو اگر کسی طرح انسانی جسم میں داخل کر دیا جائے تو پوری جلد میں نہایت شدید قسم کی خارش شروع ہو جاتی ہے اور انسان خود کو اتنا کھجاتا ہے کہ اپنی جان تک لے لیتا ہے۔

"بہت خوب۔" میں نے کہا "خود کو رحم دل ثابت کرنے کی یہ مثالی دلیل ہے۔ میں تمہاری ذہانت کا معترف ہو گیا ہوں۔"

"معترف تو ابھی تمہیں بہت سی باتوں کا ہونا ہے ڈیئر! آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

اسی دوران میں دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ میں نے دیکھا ایک جانب سے دونوں مجرمان برآمد ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے جسموں پر صرف ایک ایک انڈرویئر تھا۔ دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور منہ پر چوڑا ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ ان دونوں کے رنگ بالکل سفید ہو رہے تھے اور آنکھوں میں وحشت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ توانا حبشی گارڈز ان دونوں کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے پھانسی گھاٹ تک لا رہے تھے۔

نائب کپتان جمشید تو خیر متناسب جسم کا تھا مگر فربہ اندام مارکوس کو برہنہ حالت میں نہایت ہی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ اس کا پہاڑ سا جسم تھل تھل کر رہا تھا اور توند عجیب انداز میں دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ اس کی توند دیکھ کر میدے کے بہت بڑے پیڑے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اپنے سامنے پھانسی کا پھندا دیکھ کر دونوں افراد کی حالت مزید پتلی ہو گئی تھی اور وہ خود کو چھڑانے کی بے تحاشا کوشش کرنے لگے تھے۔

سیاہ فام پہرے داروں نے نائب کپتان جمشید کو تو ایک پول کے ساتھ نائیلون کی رسی سے باندھ دیا۔ مارکوس کو وہ کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے پھندے کی طرف لے گئے۔ مارکوس ہاتھوں سے نکل نکل کر جا رہا تھا مگر پہرے داروں کے سامنے اس کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔ مارکوس کو ایک چار فٹ اونچے تختے پر کھڑا کر کے اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا پھر اس کے پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔ مارکوس کے ہونٹوں پر ٹیپ تھا مگر اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور منہ سے مسلسل "غوں غاں" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یقینی موت کو سامنے دیکھ کر اس کے حواس مختل ہو گئے ہیں اور وہ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہا ہے۔ مائیکل ٹہلتا ہوا مارکوس کے بالکل قریب جا کھڑا ہوا۔ مزاحیہ انداز میں بولا "موٹے بیل! تیری بسیار خوری اور شراب نوشی نے تیرا بیڑا غرق کیا ہے۔ اگر تیرے اندر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں اور تیرا گوشت قدرے بہتر ہوتا' تیری بیوی کی طرح تو تجھے شاید پھانسی کی سزا نہ ہوتی۔ تجھے بے ہوشی کا انجکشن لگا کر بڑی دردمندی سے ذبح کروا جاتا اور تیرا جسم مخلوقِ خدا کے پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آتا مگر افسوس ایسا نہیں ہو سکا۔ تیری چربی میں اتنا زہریلا پن ہے اور تیرے گوشت میں اتنی نمی ہے کہ تجھے پھانسی دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ لہٰذا میرے پیارے بیل! خدا تمہارا نگہبان ہو۔"

مائیکل پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر اٹالین فربہ اندام مارکوس کے قریب کھڑا ہو گیا اور انجیل سے کچھ اقتباسات پڑھنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے شائستہ کا چہرہ دیکھا' وہ مائیکل کی خوشنودی کے لیے حاضرین میں بیٹھی تھی مگر اس کی رنگت ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ہاں دیگر حاضرین بڑے خوش و خرم نظر آ رہے تھے' ان میں فلیمنگ کی بیوہ ڈورتھی بھی تھی۔ اس کی خوشی قابل فہم تھی۔ ان افراد کو سرعام پھانسی ہو رہی تھی جنہیں فلیمنگ اور دیگر افراد کے قتل کا ذمے دار قرار دیا جا رہا تھا مگر دوسرے افراد بھی بڑھ چڑھ کر مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ غالباً سفاکی کے ایسے مظاہرے دیکھ دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر مہریں لگ چکی تھیں۔ اب یہ سب کچھ ان کے لیے ایک دلچسپ تماشے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص انجیل پڑھ کر پیچھے ہٹا تو مائیکل نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لکڑی کا چار فٹ اونچا تختہ مارکوس کے پاؤں تلے سے کھینچ لیا گیا۔ پھندے کے دسے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مارکوس شدید جھٹکے سے نیچے گرتا اور اس کی گردن وغیرہ ٹوٹتی۔ تختہ کھسکنے سے وہ بس تین چار انچ نیچے آیا اور گلا گھٹ جانے سے تڑپنے لگا۔ یہ ایک دلدوز منظر تھا۔ مارکوس کا پہاڑ سا جسم جان کنی کے عذاب میں تھا۔ مارکوس کے چہرے کو نقاب سے چھپایا نہیں گیا تھا لہٰذا اس کے بھیانک تاثرات واضح نظر آ رہے تھے' آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور گلے سے "گیں گیں" کی خوفناک آواز نکل رہی تھی۔ تختہ ہٹانے سے چند سیکنڈ پہلے اس کے ہونٹوں پر چپکا ہوا ٹیپ ہٹا لیا گیا تھا' اب مارکوس کے کھلے ہوئے منہ سے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ قریباً ایک منٹ تک ماہیِ بے آب کی طرح پھندے میں تڑپتا رہا۔ پھر اس کے تڑپے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ جاں کنی کی خوفناک اذیت میں اس کا پیشاب بھی خارج ہو گیا تھا۔

ایرانی جہاز کا نائب کپتان جمشید بھی پول سے بندھا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط شخص دکھائی دیتا تھا مگر یقینی موت کو روبرو دیکھ کر اس کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ آٹھ دس منٹ تک مارکوس کی لاش پھندے سے جھولتی رہی پھر تختہ رکھ کر اسے نیچے اتار لیا گیا۔ اب جمشید کی باری تھی۔ حبشیوں نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا تو وہ بری طرح مچلنے لگا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مائیکل کے ذہن میں کوئی بات آئی اور اس نے جمشید کے ہونٹوں سے ٹیپ اتارنے کا حکم دیا۔

جمشید اور مائیکل کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔ مائیکل نے کہا "ہمارے تین بندے مارنے کی جو سزا تمہیں مل رہی ہے یہ بہت تھوڑی ہے اور اس پر تم خدا کا جتنا بھی شکر کرو کم ہے۔"

جمشید گھگھیایا "مائیکل' دیکھو ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے کیا۔ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی' نہ کوئی لالچ تھا' مجھے اعلیٰ افسروں کی طرف سے جو حکم ملا تھا وہی کرتا تھا۔"

"تم سو فی صد بکواس کر رہے ہو۔ اعلیٰ افسران کی بات ماننے کی ذمے داری تم سے زیادہ تمہارے کپتان پر عائد ہوتی تھی مگر اس نے پھر بھی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ ہمارے مقابلے میں آنے کے بجائے اس نے ہنگامی رخصت لے لی اور جہاز سے اتر گیا۔ تمہارا مسئلہ ڈیوٹی نہیں تھا۔ حرامی مارکوس سے تمہاری دوستی اور ڈیلنگ تھی۔ تم نے ایرانی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مارکوس اور اس کی بیوی کو سرکاری جہاز پر سوار کرایا اور اپنے جہاز کی کمان ایک طرح سے مارکوس کے سپرد کر دی۔ اور یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی تم دونوں منہ بولے بھائی ہمارے لیے ایسے ہی مصائب کھڑے کر چکے ہو' بولو کر چکے ہو یا نہیں؟"

جمشید گھگھیایا "تمہیں ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ہم دونوں میں دوستی ضرور تھی لیکن اس سے پہلے ہم نے۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" مائیکل دہاڑا "اس سے پہلے تم تین مرتبہ ہمارا تعاقب کر چکے ہو۔ میرے پاس پورے اعداد و شمار موجود ہیں۔ پچھلے سال ایک مرتبہ جون میں اور اس سے پچھلے سال جون اور دسمبر میں تم نے ہمارا پیچھا کیا۔ دسمبر میں ہمارے جہاز پر جو اندھا دھند فائرنگ ہوئی تھی اس کے ذمے دار بھی صرف تم ہی تھے۔ اس وقت بھی غیر قانونی طور پر یہ سویلین مارکوس تمہارے جہاز پر موجود تھا۔"

"لیکن اس وقت تو کپتان صاحب خود بھی اسے ٹوپ موجود تھے۔ میری حیثیت ماتحت کی تھی۔"

"تم ایک برس بھی اپنی صفائی میں دلائل دیتے رہو گے تو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ تمہاری سزا حتمی ہے۔"

دلائل کو ناکام ہوتے دیکھ کر جمشید کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کا چہرہ رنج و الم کی تصویر تھا۔ مائیکل گہری نظروں سے اس کو دیکھتا رہا پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اس نے کہا "لگتا ہے' لٹکنے سے بہت ڈرتے ہو تم۔۔۔ یا پھر مارکوس کا حشر دیکھ کر تمہارا پتا پانی ہو رہا ہے۔"

نائب کپتان جمشید کچھ نہیں بولا' فقط خوف زدہ نظروں سے مائیکل کو دیکھتا رہا۔ مائیکل نے اسٹائلش انداز میں کہا "اچھا تمہیں ایک آپشن دیتے ہیں۔ سمندر میں کود جاؤ۔"

"سس۔۔۔ سمندر میں۔" جمشید ہکلایا۔

"ہاں سمندر میں۔۔۔ یہ کوئی نئی چیز تو نہیں ہے تمہارے لیے' پچھلے دس بارہ سال سے سمندر میں گھوم رہے ہو۔ کوسٹ گارڈ کی ڈیوٹی دے رہے ہو۔ یقیناً تیراکی بھی خوب آتی ہوگی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا تو بہ آسانی تیر لیتے ہو گے۔ کیا پتا کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور تمہاری جان بچ جائے اور اگر کچھ نہیں تو ایک ڈیڑھ گھنٹا زندگی تو بڑھ جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"

جمشید کی زبان اس کے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ بڑی مشکل کے ساتھ اس کی زبان سے بس یہ جملہ ادا ہو سکا "میں تمہیں ہر طرح کا ہرجانہ دینے کو تیار ہوں۔"

"ہرجانے میں مجھے تمہاری جان چاہیے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ بات کو طول دینے سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا چھوٹے بیل۔ تمہارے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں۔ پھانسی کے لیے تیار ہو جاؤ یا پھر سمندر میں کود جاؤ۔"

"میرا بازو زخمی ہے' میں زیادہ دیر نہیں تیر سکوں گا۔ اگر تم مجھے۔"

"تقریر نہیں چاہیے۔" مائیکل نے اس کی بات کاٹی "بس دو حرفی فیصلہ کرو۔ گلے میں پھندا ڈالنا ہے یا پانی میں چھلانگ لگانی ہے؟"

دہشت کے سبب جمشید کا بدن پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ فقط ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ ان لمحوں میں وہ "اے ٹو" کا نائب کپتان نظر نہیں آ رہا تھا' ایک معمولی سا غبی شخص دکھائی دے رہا تھا جو اپنے سامنے ایک دوراہا دیکھ رہا ہو اور مفلوج ذہن کے ساتھ سوچتا چلا جا رہا ہو کہ کس طرف جائے۔ مائیکل نے جھنجلا کر اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے جمشید کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور رسی سے پھندے کی طرف کھینچنے لگے۔ وہ چیخنے لگا۔ بالکل کسی بچے کی طرح۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر شخص کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے۔ جب اسے لکڑی کے تختے پر چڑھایا گیا تو میں نے کن انکھیوں سے شائستہ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس کے اپنے بس میں ہوتا تو وہ غالباً ایک سیکنڈ بھی یہاں نہ بیٹھتی لیکن اسے وہاں بٹھانے والا اس کا شوہر نامدار مائیکل تھا۔ اس کے لیے یہاں سے اٹھنا ممکن نہیں تھا۔ جب پھانسی کا پھندا جمشید کی گردن کی طرف بڑھایا گیا تو اس نے نہایت بے قراری کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلایا اور پہرے داروں کو بتایا کہ وہ پھانسی پانا نہیں چاہتا۔

پہرے داروں نے جواب میں اس سے کہا کہ پھر اسے سمندر میں کودنا ہو گا۔

جمشید کے چہرے پر کرب کی ایک شدید لہر ابھری۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' پہرے داروں نے اس کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے اور رائفلیں اس کی طرف سیدھی کر لیں۔ پھر وہ اسے دھکیلتے ہوئے جنگلے کی طرف لے گئے۔ عین جنگلے پر پہنچ کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ جمشید نے بے بسی سے ارد گرد دیکھا۔ رائفلوں نے اس کا نشانہ لے رکھا تھا۔

ایک کراہ کے ساتھ اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا عریاں جسم سورج کی روشنی میں تیزی سے نیچے گرتا نظر آیا' پھر وہ ایک چھپاکے کے ساتھ سمندر میں پہنچ گیا۔ حاضرین میں سے بہت سے افراد اٹھ کر جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور جمشید کو ہاتھ پاؤں چلاتے دیکھنے لگے۔ وہ بغیر کسی امید اور آسرے کے تیر رہا تھا۔ یہاں کون تھا جس نے اسے بچانے آنا تھا اور جو یہاں موجود تھے وہ اسے بچا نہیں سکتے تھے' وہ تو اسے سزا دے رہے تھے۔ لوگ ایسی جگہوں پر ڈوبتے ہیں جہاں انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوتا' یہاں بے شمار بچانے والے تھے اور وہ سب کے سامنے ڈوب رہا تھا۔ وہ بار بار جہاز کی طرف آتا' اس سے ٹکراتا اور پھر چند فٹ پیچھے چلا جاتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولتے جا رہے تھے اور اس کی چیخ و پکار میں پہلے سی شدت نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا' میری حیثیت ایک بے بس قیدی کی سی تھی۔

میں جنگلے سے ہٹ کر واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ شائستہ اٹھ کر اپنے اپارٹمنٹ میں جا چکی تھی۔ پروفیسر اللہ دتا ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا "یہ تو ظلم کی انتہا ہے پروفیسر! وہ بدنصیب چیخ چیخ کر اور ہاتھ پاؤں چلا چلا کر ڈوب جائے گا۔"

"بے وقوف نے خود ہی یہ اذیت مول لی ہے۔" پروفیسر نے اداسی سے کہا "پھانسی پا لیتا تو ایک آدھ منٹ میں جان چھوٹ جاتی۔"

"انسان اپنی فطرت سے بھاگ تو نہیں سکتا' وہ آخر وقت تک جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے لیے تو لوگ لڑتے ہی ہیں' موت سے چند منٹ کی مہلت پانے کے لیے بھی لڑتے ہیں۔"

"اور یوں کبھی کبھی موت کو اور اذیت ناک بنا لیتے ہیں!" پروفیسر نے کہا۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے مائیکل کو دیکھا۔ وہ بڑی شان سے جنگلے پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ اس نے جمشید کی جان کنی کا منظر زیادہ وضاحت سے دیکھنے کے لیے آنکھوں پر ٹیلی اسکوپ لگا رکھی تھی۔ میرا جی چاہا' کسی حبشی گارڈ سے رائفل چھینوں اور اس مازرن آدم خور کو اڑا کر رکھ دوں۔ مگر وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا' اس نے مجھے حدود میں رکھنے کے لیے بڑا پکا بندوبست کر رکھا تھا۔ غزالہ کے اپارٹمنٹ میں لگا ہوا راڈیو کیمرا اور سائیڈ ٹیبل میں پڑا ہوا وہ طاقت ور بم جسے ایک سیکنڈ کے اندر ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ کیا جا سکتا

تھا۔ زبردست بندوبست ہی تو تھا۔ غزالہ ہر لحظہ نشانے پر تھی۔ میری کوئی بھی حرکت غزالہ اور میرے دیگر ساتھیوں کی زندگی کے لیے شدید خطرہ بن سکتی تھی۔ میں جنگلے سے دور ہٹ آیا تھا مگر اب مجھے یہاں بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سینے میں عجیب سی گھٹن بھرتی جا رہی تھی' میں اٹھ کر زیریں کپارٹمنٹ میں اپنے ساتھیوں کے پاس چلا آیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد مجھے پہرے دار جوزف کی زبانی خبر ملی کہ ایرانی جہاز کا نائب کپتان ایک گھنٹا مسلسل پانی میں تیرنے کے بعد ڈوب کر مر گیا۔ اس کا ایک بازو زخمی تھا اور وہ آخری آدھ گھنٹا ایک بازو سے ہی تیرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

اس رات میری آنکھ میں شدید درد ہوا۔ یہ وہی آنکھ تھی جس پر آدم خور سائمن سے لڑائی کے دوران میں چوٹ لگی تھی۔ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود آنکھ کے نچلے حصے میں ابھی تک تھوڑی سی لالی موجود تھی۔ کسی وقت سر جھکانے سے شدید ٹیس بھی اٹھتی تھی۔ رات کو شروع ہونے والا درد صبح تک جاری رہا اور سر کا ایک حصہ پھوڑا سا بن گیا۔ صبح نو دس بجے کے قریب مائیکل زیریں کپارٹمنٹ میں آیا۔ اس وقت میں کیبن کے فرش پر لیٹا ہوا تھا اور زریں کل میرے منع کرنے کے باوجود میرا سر دبا رہا تھا۔ مائیکل نے پوچھا "کیا ہوا؟"

صندر نے بتایا کہ رات سے آنکھ میں درد ہے "شب بیداری کی وجہ سے ہلکا سا بخار بھی ہو رہا ہے۔"

مائیکل نے مجھے فوراً اٹھنے کا حکم دیا اور غور سے میری آنکھ کا معائنہ کرنے لگا پھر بیزاری سے بولا "کچھ بھی نہیں ہے۔ ہلکی سی سرخی ہے' ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہارے تو اپنے گھر میں ڈاکٹر موجود ہے" وہ تمہاری سویٹ ہارٹ غزالہ۔ اس کو دکھاؤ' وہ منٹ میں تمہیں ہنستا کھیلتا کر دے گی۔" مائیکل کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"مشورے کا شکریہ۔" میں نے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

درحقیقت میرا دل مائیکل کی شکل دیکھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ میرے اندازوں سے زیادہ سفاک اور درندہ صفت نکلا تھا۔ اپنے غرور اور تکبر کا سر اونچا رکھنے کے لیے اس نے جس طرح "اے ٹو" کے پرخچے اڑائے تھے وہ ایک ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ یہ سب کچھ کر کے بھی اس بدبخت کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور اس نے کل دو افراد کو نہایت بے دردی سے سزائے موت دے دی تھی۔

بہرحال مائیکل کے جانے کے بعد صندر اور زریں نے بھی مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں ایک بار غزالہ کو آنکھ دکھاؤں بلکہ ایک طرح سے انہوں نے مجھے دھکیل کر کیبن سے باہر بھیج دیا۔ میں نے اوپر جا کر غزالہ کو صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے دھیان سے میری آنکھ کا معائنہ کیا' میں نے بھی اسے ساری کیفیت بتائی۔ غزالہ بظاہر تو پرسکون رہی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ اندر سے کچھ مضطرب ہو گئی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو بار میری آنکھ کے حوالے سے تشویش کا اظہار کر چکی تھی مگر اب اس کی تشویش بڑھی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس نے مجھے صوفے پر لٹا دیا اور سر درد کم کرنے کے لیے گولی دی۔ اس کے بعد اس نے پہرے دار جوزف کے ذریعے کلینک کے انچارج کو بلایا۔ یہ ایک کہا دیکھ دنما شخص تھا۔ شکل و صورت سے اطالین ہی نظر آتا تھا۔ غزالہ نے اس سے دستیاب دواؤں کے بارے میں پوچھا پھر اس نے چند دواؤں کے نام ایک کاغذ پر لکھ کر اطالین شخص کو دے دیے اور کہا کہ ان میں سے جو دوا بھی موجود ہو وہ لے آئے۔

اطالین کمپاؤنڈر کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے پاس ایک "آئی ڈراپس" اور کیپسول تھے۔ آئی ڈراپس ملنے پر غزالہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ آج سارا دن دو دو گھنٹے بعد یہ ڈراپس میری آنکھ میں ڈالے جانے چاہئیں۔ کیپسول غالباً اینٹی بایوٹک تھا' وہ اس نے مجھے فوراً ہی پانی کے ساتھ کھلا دیا۔ میں واپس جانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے کیبن میں ہی روک لیا تاکہ ڈراپس باقاعدگی سے آنکھ میں ڈالے جا سکیں۔

ننھا تابش میرے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ غزالہ نے اسے ڈانٹا "دیکھو تم آنکھ چھونے میں لگے رہتے تھے نا' آنکھ خراب ہو گئی ہے۔"

غزالہ کی بات کہاں اس کی سمجھ میں آئی ہو گی لیکن غزالہ کے لہجے اور تاثرات سے وہ سہم گیا۔ وہ اپنی گول گول آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً وہ اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ اس کی شرارتوں کی بات ہو رہی ہے اور میری زخمی آنکھ کی بات ہو رہی ہے۔ غزالہ نے حوصلہ دینے کے لیے اس کے سر پر ہلکی سی ایک چپت لگائی "بٹر بٹر کیا دیکھ رہے ہو۔ نظر نہیں آتا' انکل کی آنکھ کتنی سرخ ہو رہی ہے۔"

اس نے منہ بسورنے والے انداز میں نچلے ہونٹ کو حرکت دی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے نتھنے پھولے پچکے اور پھر ایک دم وہ پورے زور سے رو دیا۔ بچہ مار کھا کر بھی ناں ہی

کی طرف جاتا ہے۔" تانی بھی دوڑتا ہوا غزالہ کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی "میں بالکل نہیں بول رہی تم سے۔ تم بہت خراب بچے ہو۔" وہ اور زور سے رونے لگا۔

میں نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کرلیا۔ تھوڑا سا پچکارا' تھوڑا سا دلاسا دیا۔ میں لیٹا ہوا تھا' اس نے میرے پیٹ پر سر رکھ دیا اور کن انکھیوں سے غزالہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ہچکیاں بھی لیتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب غزالہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا تو اس کا رونا دھونا بند ہوا۔ غزالہ سارا دن میری دیکھ بھال میں لگی رہی۔ اس نے کھانا بھی میرے لیے خود بنایا۔ ٹائم کے عین مطابق وہ آنکھ میں ڈراپس بھی ڈالتی رہی۔ میں نے کہا "تم نے تو واقعی مجھے مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کسی آئی سی یو وارڈ میں ہوں۔ بھئی قریب المرگ نہیں ہوں میں۔ ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"میں بھی تو ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔" وہ زیر لب مسکرائی "سر پر معمولی چوٹیں آئی تھیں' آپ چوبیس گھنٹے میرے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔"

"وہ تو واقعی شدید چوٹیں تھیں۔"

"یہی تو۔۔۔ میرا مطلب ہے۔" وہ ایک دم گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی "آپ آنکھ کی چوٹ کو معمولی نہ سمجھیں۔ بے احتیاطی سے یہ بگڑ بھی سکتی ہے۔ سمندری ہوا اور موسمی تبدیلی بھی اس کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"چوٹ تو آنکھ میں ہے' سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آنکھ سے نکلنے والے اعصاب پیچھے تک جاتے ہیں' اس کے علاوہ خون کی بہت باریک رگیں ہوتی ہیں۔ جس طرح سر پر چوٹ لگنے سے بعض اوقات آنکھ میں سرخی جم جاتی ہے' اسی طرح آنکھ کی چوٹ سے سر کے کسی حصے میں درد شروع ہو سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ کی آنکھ کے اردگرد کسی رگ میں خون جما ہوا ہے' چند دن احتیاط کی جائے اور دوا وغیرہ لی جائے تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن اگر بے احتیاطی کی گئی تو خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپریشن تک کی نوبت آ سکتی ہے۔"

"لگتا ہے کہ ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

شام تک میری طبیعت کچھ بہتر ہو گئی۔ آنکھ کی چبھن میں بھی افاقہ ہوا۔ تانی میرے اردگرد موجود رہا' تاہم غزالہ کی سرزنش کام کر گئی تھی' اس نے میری آنکھ کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس غزالہ کے کہنے پر وہ بڑے پیار سے میری آنکھ پر ہاتھ پھیرتا رہا اور پھونکیں مارتا رہا۔ اس کی ادائیں واقعی دل لبھانے والی تھیں۔ کل آدھی رات سے ہمارا جہاز پھر حرکت میں تھا۔ وہ حسب سابق مغرب کی طرف سفر کر رہا تھا "کیا خیال ہے آپ کا' ہم کب تک ساحل پر پہنچ جائیں گے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا "مائیکل اور اس کے ساتھی جس طرح ایرانی جہاز کو ایندھن دینے سے ہچکچا رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحل اتنا قریب بھی نہیں ہے۔"

"کبھی تو دل چاہتا ہے کہ سفر جلد ختم ہو اور کبھی دل چاہتا ہے کہ ہم راستہ بھٹک جائیں اور اسی طرح سمندر میں گھومتے رہیں۔"

"کیوں بھٹکنے کا خیال کیوں ذہن میں آتا ہے؟"

"منزل کے ڈر سے۔" غزالہ نے اداس لہجے میں کہا "ہم نہیں کہ وہاں پہنچ کر کیا ہوگا۔ کیا حالات پیش آئیں گے ہم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ہم سب اکٹھے رہ بھی سکیں گے یا نہیں۔"

"ہاں یہ اندیشے تو واقعی ہیں۔" میرے لہجے میں آپوں آپ اداسی در آئی تھی۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟" غزالہ کی آنکھوں میں اچانک نمی آ گئی۔

"کس بات پر؟"

"ہر بات پر۔۔۔ اور اس بات پر بھی کہ میں آپ سے قریب ہو کر بھی آپ سے بہت دور رہوں۔"

"معاف تو غلطی پر کیا جاتا ہے اور یہ تمہاری غلطی نہیں مجبوری ہے۔"

"مجبوری بھی ہے لیکن۔۔۔ اس سے آپ کا دل تو دکھتا ہے نا۔"

"یہ بڑا پیارا دکھ ہے۔ ایسے دکھ کے حوالے سے معافی دینے یا مانگنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اس کی لرزتی پلکوں نے اس کی آنکھوں پر سایہ کر لیا' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "ان لوگوں نے مقابلے کی بات دوبارہ تو نہیں کی؟"

"نہیں پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید کچھ دنوں کے لیے یہ "احمقانہ پروگرام" ٹل ہی جائے۔ ویسے بھی اسے ٹو کو ہلاک کر کے ان لوگوں کی تفریح کا کوٹا پورا ہو ہی گیا ہو گا۔"

"شائستہ بھی کہہ رہی تھی کہ ایسے مقابلے عام طور پر نہیں ہوتے۔"

"چلو جب بھی ہو گا' دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

غزالہ نے رسٹ واچ دیکھی' ڈراپس کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھ میں ڈراپس ڈالے۔ اس کے ہاتھ کا لمس میرے رخسار پر تھا' انگلیاں میری ناک سے چھو رہی تھیں۔ وہ اتنا قریب تھی کہ میں اس کے سانسوں کی جانی پہچانی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے میں خاموش لیٹا رہا' ڈراپس ڈالنے کے بعد غزالہ اپارٹمنٹ کے چھوٹے سے کچن میں چلی گئی اور میرے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ میرے نتھنوں سے جو خوشبو ٹکرا رہی تھی وہ پیاز کے تڑکے والے چاولوں کی تھی۔ یہ خوشبو سونگھ کر دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ غزالہ جانتی تھی کہ ماش کی دال کی طرح پیاز کے تڑکے والے چاول بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ ہمارے لڑکپن کی کئی یادیں بھی ان تڑکے والے چاولوں کے ساتھ منسوب تھیں۔ دل کوٹ میں ان چاولوں کی خوشبو مجھے اکثر غزالہ کے گھر کی طرف کھینچ لیا کرتی تھی' پھر چچی فاخرہ کی گھرکیوں کے باوجود میں چاول کھائے بغیر نہیں ٹلا کرتا تھا۔ غزالہ چچی کے پہلو میں بیٹھ کر کبھی غصے سے اور کبھی شرارت سے مجھے دیکھا کرتی تھی۔ چچا جلیس ازراہ مذاق کہا کرتے تھے' شاہ جہاں کو چاولوں کی خوشبو تو سو میل دور سے بھی آ جاتی ہے۔ آج غزالہ ویسے ہی چاول پکا رہی تھی' شاید میری طرح وہ بھی ماضی کو بحال کر رہی تھی' سنہری دور کی سنہری یادوں کے لیے ایک خوب صورت اشارہ دے رہی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ سب میری خام خیالی ہی ہو۔ محبت کے مارے ہوئے لوگوں کو ایسے مغالطے اکثر ہوا ہی کرتے ہیں۔ کسی دانا نے سچ کہا ہے کہ اسیران محبت کے لیے زندگی ایک مسلسل آس ہے اور ہر آس ایک خوش فہمی۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اپنے قریب مجھے آہٹ سنائی دی' پھر غزالہ کی آواز آئی "آپ کو چاولوں کی خوشبو آئی؟"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے کہا "سچ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے' شاید اسی کو ٹیلی پیتھی کہا جاتا ہے۔ میں بھی تم سے ان چاولوں اور خوشبو کی بات ہی کرنے والا تھا۔"

"آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چاولوں پر ڈالنے کے لیے میں نے کیا سالن پکایا ہے؟"

"میرا خیال ہے ثابت مسور۔"

"سو فی صد درست ہے۔ لگتا ہے کہ آپ کے بچپن کی پسند برقرار ہے۔"

"برقرار ہے اور رہے گی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

میرے معنی خیز لہجے کو نوٹ کر کے غزالہ کے چہرے پر شفق کا رنگ دوڑ گیا۔ اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے ہمیں چونکا دیا۔ غزالہ نے سر پر آنچل درست کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ سامنے نائب کپتان آرتھر اور محافظ جوزف کھڑے تھے۔

آرتھر نے غزالہ سے پوچھا "ڈاکٹر! مسٹر شاہ جہاں کہاں ہے؟"

غزالہ نے کہا "وہ لیٹے ہوئے ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی عرشے کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا تھا جیسے بہت سے افراد وہاں جمع ہوں اور چاندنی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ آرتھر ایک قدم آگے بڑھا کر دروازے سے اندر آ گیا۔ مجھ سے کہنے لگا "چلو شاہ جہاں۔ تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"عرشے پر۔۔۔ آج تمہارا مقابلہ ہے بھئی۔"

میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ پچھلے کئی روز میں مقابلے کے لیے تیار رہا تھا بلکہ اب بھی تھا لیکن یوں بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے مقابلے کے RING میں دھکیل دیا جائے گا' اس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ میری طرح غزالہ بھی ششدر رہ گئی "کس مقابلے کی بات کر رہے ہیں آپ؟" غزالہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ' وہی مقابلہ جو پرسوں ہونا تھا۔ پرسوں چونکہ ایرانی جہاز کے ساتھ فساد ہو گیا لہٰذا مقابلہ نہ ہو سکا۔ آج باس کے حکم کے مطابق پہلی فرصت میں مقابلہ منعقد کرایا جا رہا ہے۔"

غزالہ میرے اور آرتھر کے درمیان کھڑی ہو گئی "یہ نہیں جا سکتے۔" غزالہ نے کہا۔

"کیوں؟" آرتھر نے پوچھا۔

"یہ صحت مند نہیں ہیں۔ یہ بات میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ رہی ہوں۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"ان کی آنکھ ٹھیک نہیں۔ آنکھ میں سرخی تم اب بھی دیکھ سکتے ہو۔ انفیکشن کی وجہ سے انہیں بخار بھی ہے' اگر یقین نہیں تو تم تھرمامیٹر استعمال کر سکتے ہو۔"

آرتھر مسکرایا "یہ معمولی باتیں ہیں بی بی۔ تم جیسی نازک مزاج لڑکی کے لیے ان کی اہمیت ہو سکتی ہے' شاہ جہاں تو ہٹا کٹا مرد ہے۔ اگر یہ ایسی باتوں کو اہمیت دے گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ یہ مقابلے سے بچنے کے لیے بہانے بازی کر رہا ہے' ایسے مردوں کے لیے یار لوگ "ہیجڑے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "اپنی زبان کو لگام دو آرتھر۔ ایسا نہ ہو کہ مقابلے سے پہلے ہی ایک مقابلہ یہاں تمہارے ساتھ ہو جائے۔ اگر تم نے ہیجڑے کا لفظ استعمال کرنا ہی ہے تو اپنے باس مائیکل کے لیے استعمال کرو۔ میں نے اسے مقابلے کی دعوت دی تھی لیکن وہ اپنے ایک چمچے کو مروانے کے لیے آگے لے آیا ہے۔"

آرتھر زہرخند لہجے میں بولا "تمہیں اپنے بارے میں جو شدید قسم کی غلط فہمیاں ہیں وہ ابھی تھوڑی دیر میں دور ہو جائیں گی۔"

"یہ یہاں سے نہیں جائیں گے' ان کی آنکھ میں شدید تکلیف ہے۔" غزالہ نے کہا "اگر تم لوگوں میں کوئی بندہ میڈیکل کی سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے تو اسے بلاؤ۔ میں اسے بتاتی ہوں کہ اس وقت شاہ جہاں کے لیے مکمل آرام کتنا ضروری ہے۔"

"ہاں بھئی ڈاکٹر جوزف' یہ ڈاکٹر صاحبہ کیا فرما رہی ہیں؟" آرتھر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر صاحبہ جو بات کر رہی ہیں وہ ان کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔" جوزف نے طنزیہ انداز میں کہا "شاہ جہاں صاحب خاصے بیمار ہیں اور ان کی بیماری کا علاج ڈاکٹر صاحبہ کے پاس ہی ہے۔ شاہ جہاں صاحب جتنا بھی آرام فرمائیں' کم ہے اور بہتر ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحبہ کے اپارٹمنٹ میں ہی آرام فرمائیں۔"

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے ایک قدم جوزف کی طرف بڑھایا' وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا اور رائفل کندھے سے لگا کر انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اس کا انداز خطرناک تھا۔ میں نے قدم روک لیے۔

آرتھر نے کہا "کول' مائی ڈیئر کول۔۔۔ دماغ گرم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا' اگر گرمی کھانی ہی ہے تو پھر ابھی تھوڑی دیر بعد کھانا۔ شاید مقابلے میں دو چار ہاتھ دکھا سکو تم۔"

"ٹھیک ہے' جاؤ کہہ دو اپنے ہیجڑے باس سے میں اس کے ہیجڑے چمچے سے مقابلے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں تمہاری تماشا گاہ میں۔"

آرتھر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت نو بجے ہیں۔ ٹھیک ٹھیک ٹائم بتاؤ کتنے منٹ میں پہنچ رہے ہو؟"

"پندرہ منٹ میں۔" میں نے کہا۔

"آپ نہیں جائیں گے۔ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔" غزالہ روہانسی آواز میں بولی۔

"سچ کہتے ہیں' عورتیں مردوں کو بہادر بناتی ہیں اور بزدل بھی وہی بناتی ہیں۔" آرتھر نے کہا۔

"تم اپنی بک بک بند کرو۔ میں تمہارے باس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" غزالہ غصے سے بولی۔

"غزالہ! پلیز تم خاموش رہو۔" میں نے قدرے تحکم سے کہا "اگر یہ ابھی مقابلہ چاہتے ہیں تو ابھی ہو گا اور اللہ نے چاہا تو میں جیت کر بھی دکھاؤں گا۔"

پھر میں نے آرتھر سے کہا کہ وہ جائے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ آرتھر زیر لب مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ میرے مدمقابل ٹام پر بے حد بھروسا رکھتا ہے اور ٹام کی کامیابی کا اسے پختہ یقین ہے اور یہ صرف آرتھر کی ہی توقعات نہیں تھیں' میرے تجزیے کے مطابق ہرکولیس پر موجود ۸۰ فی صد افراد کو یقین تھا کہ ٹام میرا حشر خراب کر دے گا۔

غزالہ نے دروازہ بند کیا' وہ ایک دم اداس اور پژمردہ نظر آنے لگی تھی۔ وہ بولی "شاہ جہاں! یہ مقابلہ ایک بے مقصد کشت و خون کے سوا اور کچھ نہیں۔ آپ اس میں حصہ لے کر خود کو شدید مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو انکار کرنا چاہیے تھا' اگر وہ لوگ دو مرتبہ مقابلے کو التوا میں ڈال چکے ہیں تو ایک مرتبہ آپ بھی ڈال سکتے تھے۔"

"کچھ نہیں ہو گا' تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم بس اپنے ہاتھ سے میری آنکھ میں قطرے ڈالو اور دو گلاس ٹھنڈا پانی مجھے پلا دو' اس کے بعد میں چلتا ہوں۔"

اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا "آپ کو اب بھی بخار ہے۔ اسی وجہ سے پیاس لگ رہی ہے۔ آپ کچھ بھی کھا نہیں رہے ہیں۔"

"جو بھی سمجھانا ہے' واپسی پر سمجھانا۔ بس اب مجھے جانے دو۔ ورنہ وہ یہ کہنے سے باز نہیں آئیں گے کہ میں ڈر کر اندر گھسا بیٹھا ہوں۔"

ایک دم غزالہ کی حسین آنکھوں میں نمی لرز گئی "میں نے تو آپ کے لیے کھانا بنایا تھا۔"

"زندگی رہی تو آ کر کھالوں گا۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

غزالہ کچھ دیر میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ عجیب سے تاثرات تھے اس کے چہرے پر۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لپک کر مجھ سے لپٹ جائے گی اور اتنا روئے گی کہ اس کے آنسوؤں میں سبھی کچھ بہہ جائے گا۔۔۔ مگر پھر اس کی غیر معمولی قوت ارادی نے اس کا ساتھ دیا اور وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی۔ وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی اور آنسو گرانے لگی۔ میں لیٹ گیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میری آنکھ میں دو ڈراپس ڈالے اور پانی کے ساتھ ایک کیپسول مجھے کھلا دیا۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے پندرہ منٹ کا فاصلہ طے کر رہی تھیں۔ اب صرف دو تین منٹ ہی رہ گئے تھے۔ میں نے غزالہ سے پوچھا "مقابلہ نہیں دیکھو گی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "تمہارے ہوتے ہوئے مجھے حوصلہ رہتا۔"

"میں یہیں سے آپ کے لیے دعا کروں گی۔" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ خوابیدہ تپائی کے پاس گم صم بیٹھی رہی۔ کمرے کی فضا میں مایوسی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتا' وہ کراہتی ہوئی آواز میں بولی "شاہ جہاں!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس نے کچھ نہیں کہا' بس کھڑی روتی رہی۔ شاید اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ لاچاری کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر اپنے پورے بازو کھول کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کتنی ہی دیر اس نے میرے سینے سے سر نہیں اٹھایا۔ اس کے آنسوؤں نے میرا گریبان بھگو دیا تھا۔ اور میری نگاہیں بھی دھندلا رہی تھیں۔ میں نے سر جھکا کر آہستگی سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ اس کا جسم تھرا کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے جدا ہوئی اور صوفے پر بیٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا' ہچکیاں مسلسل اس کے سینے کو دہلا رہی تھیں۔

"کیا ناراض ہو گئی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ یہ خاموشی جاں گسل تھی' میں نے اپنا سوال دہرایا "کیا ناراض ہو گئی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ چہرہ بدستور ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔

میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اچانک میرے اندر روشنی' محبت اور توانائی کا ایک دریا بہنے لگا ہے۔ میرے شانے حد نگاہ تک چوڑے ہو گئے تھے اور قد جیسے آسمان سے چھونے لگا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ میں کوئی کالجیئٹ لڑکا نہیں تھا جو اپنی محبوبہ کی طرف سے پہلی بار محبت کا جواب پا کر نیم دیوانہ ہو جاتا ہے اور خوشی میں آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے پھر بھی میری کیفیت اس لڑکے سے مختلف نہیں تھی۔ معلوم نہیں کہ قدرت نے انسان کی فطرت میں یہ کیسی کج روی رکھ دی ہے۔ وہ کسی وقت پیار کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا' کسی وقت نفرت کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا' ایک وقت تھا جب غزالہ میری ایک مہربان نگاہ کے لیے ترس رہی تھی لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں تھا۔ آج غزالہ کو اپنے دل پر اختیار نہیں تھا اور میں اس کے لیے ترس رہا تھا۔ پیاس کے صحرا کے لیے ایک گھونٹ پانی میسر آیا تھا اور میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ ہاں یہی زندگی کا انوکھا پن ہے' کبھی سمندر بیکار ہوتے ہیں' کبھی ایک ایک بوند کی اہمیت ہوتی ہے۔

غزالہ کا سر انکار میں ہلا تھا اور میرے ویران دل میں اثبات کا موسم اترنا شروع ہو گیا تھا۔ میں والہانہ نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کمرے میں ابھرنے والی ہر آواز ایک قریبی کیبن میں سنی جا رہی ہے اور ہر منظر ویڈیو کیمرے کے ذریعے دیکھا جا رہا ہے مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ یہاں جو کچھ تھا' سچ تھا اور سچ چھپانے کے لیے نہیں ہوتے۔ غزالہ کا چہرہ بدستور اس کی ہتھیلیوں پر جھکا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کے بالوں کو سہلایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر۔۔۔ جہاں ایک خوفناک مدمقابل ٹام کی صورت میں میرے لیے موجود تھا۔

میں باہر نکلا تو جوزف کو اپنی طرف آتے پایا۔ پندرہ منٹ پورے ہو چکے تھے اور وہ یقیناً دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا اور پھر اپنے ساتھ لے کر اسی ہال میں پہنچ گیا جہاں پانچ روز پہلے ایسٹر نائٹ منائی گئی تھی اور بعد ازاں آدم خور ٹام کے ساتھ میرے مقابلے کا آغاز ہوا تھا۔ آج بھی ہال میں پانچ روز پہلے کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ ویسے ہی کرسیاں رکھی تھیں' یہاں ہرکولیس کے من چلے "جہازی" بیٹھے پی پلا رہے تھے اور اپنی ساتھی لڑکیوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ پورا ہال مخمور قہقہوں سے گونج رہا تھا اور دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ آج ڈانسنگ فلور پر جوڑے نظر نہیں آ رہے تھے' ایک نیم برہنہ اطالین لڑکی اکیلی ہی رقص کر رہی تھی' تاہم اس کے ساتھ ایک انڈین لڑکی بھی موجود

تھی۔ یہ قبول صورت لڑکی ساڑی میں تھی اور گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ یقیناً یہ لڑکی بمبئی سے سوار کیے جانے والے بردوں میں سے تھی۔ اطالین لڑکی اسے کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ کررہی تھی۔ لڑکی رقص سے نا آشنا نظر آتی تھی اور گھبرائی ہوئی بھی تھی لہٰذا اس سے کچھ بن نہیں پا رہا تھا۔ اطالین لڑکی تشدد پر اتر آئی' اس نے انڈین لڑکی کو تھپڑ مارے اور ٹھوکروں سے تواضع کی۔ وہ لڑکی مار سے بچنے کے لیے الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ تماشائی قہقہے لگانے لگے اور آوازے کسنے لگے۔

ٹام ایک جانب کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور ٹیوب لائٹس کی روشنی میں سیاہ فولاد کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کے ماتحت ٹائپ کے دو ساتھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی مٹھی چاپی کررہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ٹام نے نفرت سے تھوکا اور منہ میں نجانے کیا بڑبڑانے لگا۔ جونہی میں ہال میں داخل ہوا تھا' وہاں موجود لوگ ایک دائرے کی صورت میں سمٹنا شروع ہوگئے تھے۔ اس دائرے کے درمیان کچھ خالی جگہ تھی۔ اس کے علاوہ کرسیاں اور میزیں بھی تھیں۔ کئی میزوں پر برتن بھی موجود تھے۔ ان چیزوں کو قصداً وہاں سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مقابلے کے دوران میں مختلف اشیا کی توڑ پھوڑ مقابلے کو سنسنی خیز بناتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈانسنگ فلور پر ہونے والا رقص ختم ہوگیا اور لوگ پوری طرح میری اور ٹام کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ڈانسنگ فلور ایک اسٹیج کے مانند نظر آتا تھا۔ اس اسٹیج پر مائیکل اور اس کے مقرب ساتھیوں کے لیے کرسیاں رکھ دی گئیں' میری نگاہ مائیکل پر پڑی تو تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس کی غیر معمولی سفاکی نے میرے دل میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت بھر دی تھی۔ وہ شائستہ کو پہلو میں لیے بیٹھا تھا اور اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کررہا تھا۔ وہ اسے اپنی محبوب بیوی کا درجہ دیتا تھا لیکن یہ میں جانتا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی محبوب ہے اور وہ اسے کیا حیثیت دیتا ہے۔ دو دن قبل اے ٹو کی تباہی سے چند لمحے پہلے میں نے مائیکل کی زبان سے جو الفاظ سنے تھے وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مائیکل نے آنجہانی مارکوس سے علی الاعلان کہا تھا کہ شائستہ کی زندگی یا موت کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے یہ الفاظ مارکوس کے علاوہ صرف میں نے سنے تھے لیکن مائیکل کو معلوم نہیں تھا کہ یہ الفاظ مارکوس کے علاوہ بھی کسی کے کانوں تک پہنچے ہیں۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اے ٹو کی ہولناک تباہی کے بعد مارکوس نے چیخنا چلانا شروع کیا تھا اور مائیکل نے فوراً اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ٹیپ چڑھانے کا حکم دیا تھا۔ شاید مائیکل کے پیش نظر یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں مارکوس کے منہ سے شائستہ اور دیگر دو شناختیوں کے حوالے سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ نکل جائے' کوئی ایسی بات جس کی وجہ سے اس کے اپنے ساتھی اس کے بارے میں منفی انداز میں سوچنے لگیں۔ بعد ازاں مارکوس کی آواز اس کے حلق میں ہی گھونٹ دی گئی تھی یعنی اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ اب مائیکل اسی شائستہ کو بڑے پیار سے پہلو میں بٹھائے ہوئے تھا جو اپنے ہونے والے بچے سمیت اس کے لیے ایک بیکار چیز تھی اور جس کی موت یا زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔

میں تماشائیوں کے دائرے کے درمیان پہنچا تو ہال میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ ٹام اپنی جگہ سے اٹھا اور پاؤں سے فرش کو کوٹتا ہوا میرے مقابل آگیا۔ جوش سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی' ریفری کے فرائض انجام دینے والا فورمین ایڈی سن آگے آیا' اس نے حسب سابق مجھے اور ٹام کو مقابلے کی شرائط بتائیں۔ ہم کوئی ہتھیار استعمال نہیں کرسکتے تھے' ہاں آس پاس موجود کسی بھی شے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ پہلے دو راؤنڈ پانچ پانچ منٹ کے تھے' ان راؤنڈز کے دوران میں کوئی بھی حریف مقابلے سے دستبردار ہوسکتا تھا لیکن تیسرا راؤنڈ حتمی نتیجے تک جاری رہنا تھا اور اس راؤنڈ کے آغاز کے بعد کوئی حریف ریٹائرمنٹ نہیں لے سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اپنی قمیص اور گھڑی اتار دی۔ ریفری نے ہم دونوں کی اچھی طرح تلاشی لی اور مقابلہ شروع کرانے کے لیے اجازت طلب نظروں سے مائیکل کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں ایک عورت میری طرف بڑھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ ڈورتھی تھی۔ ڈورتھی آنجہانی نائب کپتان فلیمنگ کی بیوہ تھی۔ غزالہ نے جس طرح فلیمنگ کی زندگی بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی اس سے ڈورتھی بے حد متاثر تھی۔ وہ اس سلسلے میں دو تین بار میرا اور غزالہ کا شکریہ بھی ادا کرچکی تھی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی' اس نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں میرا شانہ تھپتھپایا' چند رسمی کلمات ادا کیے۔ ان کلمات کے دوران میں اس نے بڑی تیزی کے ساتھ ایک سرگوشی بھی کرگئی۔ اس نے کہا: "

ٹام اپنا بایاں مکا بڑی بیدردی سے استعمال کرتا ہے۔ سیدھا کلیجے پر مارتا ہے اور بندے کو ختم کردیتا ہے۔"

ڈورتھی واپس چلی گئی لیکن اس کی یہ سرگوشی میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اگر اس نے درست اطلاع دی تھی تو پھر یہ بڑی کار آمد اور بروقت سرگوشی تھی۔ دوسری طرف مائیکل مقابلے کی اجازت دے چکا تھا۔ ریفری ایڈی سن نے ہاتھ کے اشارے سے مقابلے کا آغاز کیا اور ہمارے درمیان سے ہٹ گیا۔ مسلسل انتظار سے ٹام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا تھا' وہ تیندوے کی طرح جھپٹ کر مجھ پر آیا۔ میں نے پھرتی سے اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی۔ وہ میری ضرب سے نہیں بچ سکا مگر جوابی کارروائی کے طور پر اس نے میرا ٹخنا دبوچ لیا۔ اگر ٹانگ کا نچلا حصہ مدمقابل کی گرفت میں آجائے تو اس کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے کہ زمین کی طرف جھک کر اپنا وزن ہاتھوں پر ڈالا جاتا ہے اور دوسری ٹانگ سے مدمقابل کو ضرب لگا کر ٹانگ چھڑائی جاتی ہے اور اگر ہاتھوں پر وزن نہ ڈالا جاسکے تو ویسے ہی اچھل کر ٹانگ رسید کردی جاتی ہے مگر ٹام نے مجھے ان میں سے کوئی حربہ استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے میری ٹانگ کو گرفت میں رکھنے کے بجائے تیزی سے جھٹکا دیا اور گھما کر چھوڑ دیا۔ ادوگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں ناچ کررہ گئی۔ میں اڑتا ہوا سا کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا' سر میں رنگ دار پٹاخے سے چھوٹ گئے۔ تماشائیوں کی پُرمسرت چیخیں میرے کانوں میں گونجیں۔ مجھے لگا کہ بلندی سے کئی ٹن وزن مجھ پر گرا ہے۔ یہ ٹام تھا' اس نے جست لگا کر مجھے چھاپ لیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کا منحوس چہرہ میری آنکھوں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا' اس کی بدبودار سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں پھر مجھے اس کے دانت نظر آئے۔ بے حد سفید اور بے حد خوار دانت۔ یہ ایک آدم خور کے دانت تھے۔ میرے ذہن کو جھٹکا لگا اور میں نے ان دانتوں کو اپنے جسم سے دور رکھنے کے لیے ایک دم پوری قوت لگادی۔ میں نے نیچے اپنے جسم کو پہلے دائیں طرف موڑا اور پھر اچانک بائیں طرف زور لگا کر اسے الٹا دیا۔ اب ٹام نیچے اور میں اوپر تھا مگر یہ برتری تادیر برقرار نہیں رہ سکی۔ ٹام نے فوراً ہی مجھے ٹانگوں کے زور سے پیچھے اچھال دیا اور خود بھی جمپ کرکے کھڑا ہوگیا۔

ٹام کے ٹانگ کھینچنے کی وجہ سے میں ایک ستون سے ٹکرایا تھا اور اس ٹکر نے جہاں چند لمحے کے لیے میرے حواس معطل کردیے تھے وہاں میری آنکھ میں بھی شدید ٹیسیں اٹھنا شروع ہوگئی تھیں۔ آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہی ٹام نے ایک بار پھر چنگھاڑ کر مجھ پر حملہ کیا۔ پہلے اس نے کراٹے کے انداز میں ٹانگ چلائی پھر اس کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا' ڈورتھی کی نصیحت مجھے یاد تھی۔ میں نے اپنی بہترین کوشش کرکے خود کو ٹام کے طوفانی مکے کی زد سے نکالا۔ ڈورتھی کی اطلاع سو فی صد درست تھی۔ ٹام کے اس برق رفتار مکے نے میرے سینے کے زیریں حصے ہی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ٹام کے خالی مکے کی پاداش میں' میں نے اس کے چہرے پر تین چار تسلی بخش مکے رسید کیے اور پھر لات مار کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ ایک میز پر گرا اور اسے اپنے ساتھ ہی فرش بوس کرگیا۔ میز پر رکھی ہوئی کراکری چاروں طرف فرش پر بکھر گئی۔ میری اس کامیابی پر بھی داد کی آوازیں بلند ہوئیں مگر ان کی تعداد تین چار سے زائد نہیں تھی۔ شاید ان میں سے ایک آواز ڈورتھی کی بھی تھی۔ ٹوٹے ہوئے برتنوں میں سے ٹام نے شراب کی ایک خالی بوتل اٹھائی۔ اس بوتل کا نچلا حصہ ٹوٹ کر تیز دھار آلے کی سی شکل اختیار کرگیا تھا۔ ٹام بازو پھیلا کر میرے سامنے آیا اور ماہر چاقو زن کی طرح اس نے پے در پے کئی وار مجھ پر کیے۔ میں نے ہر بار حتی الامکان تیزی سے خود کو بچایا۔ سینے پر ایک معمولی خراش کے سوا میرا کچھ نہیں بگڑا۔ جونہی مجھے موقع ملا' میں نے تاک کر ٹام کی بغل کے نیچے لات رسید کی' وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا' اس کا سر پھٹ گیا اور بوتل چکنا چور ہوگئی۔

چوٹ کھا کر وہ زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ وہ اپنا مخصوص داؤ آزمانے کے چکر میں تھا' دوسری طرف میں بھی اس کی گردن ناپنے کے لیے موقع تاڑ رہا تھا' ڈیڑھ دو منٹ تک ہمارے درمیان شدید کشمکش ہوئی' وہ واقعی ایک سخت جان مدمقابل تھا پھر آدم خوری کے حوالے سے اس کی ایک خاص دہشت تھی۔ اس سے لڑتے ہوئے مجھے یہی محسوس ہورہا تھا کہ میں بیک وقت ایک انسان نما درندے اور ایک درندہ نما انسان سے لڑ رہا ہوں۔ اس شدید کشمکش کے دوران میں ٹام نے دو تین بار نہایت وحشیانہ بے حجابی کے ساتھ میرے جسم پر دانت آزمانے کی کوشش کی' ایک بار تو اس کا منحوس منہ میری گردن سے چھو ہی گیا تھا تاہم میں کسی نہ کسی طرح خود کو بچانے میں کامیاب رہا۔ اچانک ٹام نے مجھے اڑنگا لگایا' میں اوندھے منہ ایک میز پر گرا' اس کے ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زخمی آنکھ کے پیچھے دھماکے سے ہونے لگے ہیں' اس کے علاوہ درد کی ایک شدید ٹیس بھی محسوس ہوئی۔ یہ ٹیس میری داہنی کہنی سے اٹھی تھی۔ درحقیقت

مجھے میز پر اوندھا گراتے ہوئے ٹام نے میرے بازو کو پہلوانی انداز میں موڑا تھا اور کسی اندرونی پٹھے کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کہنی کی تکلیف اپنی جگہ شدید تھی مگر آنکھ میں اٹھنے والی ٹیسیں مجھے جسمانی کے علاوہ نفسیاتی نقصان بھی پہنچا رہی تھیں۔ کوشش کے باوجود دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو رہا تھا کہ شاید اس مارا ماری میں میری آنکھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے۔ ٹام نے عقب سے میرے بال مٹھی میں جکڑ رکھے تھے اور میرا سر بار بار آہنی میز سے ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے شک ایک طاقت ور شخص تھا' لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی آگاہ تھا لیکن وہ میرے لیے کبھی اتنا سخت مدِمقابل ثابت نہ ہوتا اگر میری آنکھ میں شدید تکلیف نہ ہوتی۔ اس تکلیف نے میری جسمانی و ذہنی توانائی کو آدھا کر رکھا تھا۔ کہنی پر دباؤ مزید بڑھا تو میں نے بے قرار ہو کر اپنی ایڑی سے ٹام کی ناف میں ضرب لگائی۔ جونہی بازو پر اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی' میں نے میز کا ایک کنارہ پکڑا اور خود کو میز سمیت الٹا دیا' یوں ٹام میرے اور میز کے نیچے آ گیا۔ پھرتی سے کروٹ بدل کر میں نے ٹام کی بھنی گردن اپنے بازو کی گرفت میں لینا چاہی۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا مگر اس کے ساتھ ہی مجھ پر یہ مایوس کن انکشاف ہوا کہ کہنی پر سے میرا بازو تقریباً سن ہو گیا ہے اور لرزتا چلا جا رہا ہے۔ میں زور لگانے کے باوجود ٹام کی گردن پر مخصوص دباؤ نہیں ڈال سکا۔ ٹام نے جھٹکا دے کر اپنی گردن میرے بازو کے شکنجے سے آزاد کرا لی۔ اپنے جس حربے پر مجھے ہمیشہ ناز رہا تھا وہ آج کام نہیں کر رہا تھا۔ آنکھ کی تکلیف کے بعد یہ دوسرا دھچکا تھا جو اس مقابلے میں مجھے پہنچا تھا۔

اگلے چار پانچ منٹ تک میرے اور ٹام کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی۔ میں نے اس کے چہرے پر مکے برسائے۔ اس نے بھی کئی بار میرے چہرے کو نشانہ بنایا۔ ہال میں زبردست ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ ہر طرف ٹوٹا ہوا فرنیچر اور برتن بکھرے تھے۔ غالباً کچھ لوگوں نے اس لڑائی پر شرطیں وغیرہ بھی لگا رکھی تھیں۔ وہ بڑھ چڑھ کر شور مچا رہے تھے۔ ٹام نے کئی بار مجھ پر اپنا مخصوص "پیچ" آزمانے کی کوشش کی مگر میں ہر بار بچ گیا' صرف ایک بار یہ پیچ اچٹتا ہوا سا میری پسلیوں پر لگا اور مجھے اس کی قوت و خطرناکی کا صحیح اندازہ ہوا۔ ذور تھی کی اطلاع میرے لیے واقعی بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھی۔

دوسرے راؤنڈ کے اختتام پر تین چار منٹ کا وقفہ ہوا۔ ریفری ایڈی سن نے ہم دونوں سے پوچھا کہ ہم میں سے کوئی ریٹائر ہونا تو نہیں چاہتا۔ ٹام نے انکار کر دیا' میں نے بھی انکار کیا۔ آخری اور فیصلہ کن راؤنڈ شروع ہو گیا۔ یہ راؤنڈ شروع ہونے کے ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی میری زخمی آنکھ کے قریب مکا لگا اور آنکھ سے باقاعدہ خون ٹپکنا شروع ہو گیا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ کو شدید نقصان پہنچ گیا ہے۔ اس مایوس کن خیال نے میرے اندر غم و غصے کی شدید لہر پیدا کی۔ میں نتائج سے بے پروا ہو کر اور پوری قوت جمع کر کے ٹام پر ٹوٹ پڑا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں اس لڑائی میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کیونکہ میرے پیچھے غزالہ تھی' اس کی عزت و آبرو تھی اور میرے دیگر ساتھی تھے۔ مجھے اپنے لیے زندہ رہنے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی ان کے لیے زندہ رہنے کی فکر تھی۔ میری ہار صرف میری ہار ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی' یہ میرے تمام ساتھیوں کی ہار تھی اور غزالہ کی ہار تھی۔ میں نے اسے سرِعام ننگا ہو کر شرمندہ ہونے سے بچایا تھا' اب اگر میں ہار جاتا تو وہ شرمندگی کئی گنا اضافے کے ساتھ غزالہ کی طرف واپس لوٹ آتی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ عین ممکن تھا کہ جو کام میں نے کرنے سے انکار کیا تھا' وہی کام میرا حریف ٹام انجام دیتا اور سب کے سامنے انجام دیتا' یا پھر اس سے بھی بدترین صورتِ حال کا سامنا غزالہ کو کرنا پڑتا۔ میں نے اپنی زخمی آنکھ بچانے کا خیال یکسر ذہن سے نکال دیا اور کشتیاں جلا کر ٹام پر ٹوٹ پڑا۔

یہ اس مقابلے کی شدید ترین لڑائی تھی۔ میرا ایک مکا کھا کر ٹام اڑتا ہوا سا تماشائیوں پر گرا۔ ہم تماشائیوں کا گھیرا توڑ کر ہال کے ایک گوشے میں لڑنے لگے' ٹام میرے بازو پر دو جگہ اپنے دانت گاڑنے میں کامیاب ہوا تھا اور دونوں جگہ سے اس نے گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ آخر ٹام ایک ایسے داؤ کی زد میں آ گیا جو مقابلے کے شروع میں اس نے مجھ پر آزمایا تھا' اس کی ٹانگ میری گرفت میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری ٹانگ استعمال کرتا' میں نے طوفانی جھٹکے کے ساتھ اسے ہوا میں معلق کر دیا۔ بالکل جیسے "ہیمر تھرو" کی جاتی ہے۔ میں نے اسے پورے زور سے دو چکر دیے اور دیوار سے دے مارا۔ اس کی قسمت نے تھوڑی بہت یاوری کی کہ دیوار سے ٹکرانے سے پہلے وہ ایک پہرے دار سے ٹکرایا ورنہ اس کی کھوپڑی خربوزے کی طرح پھٹ گئی ہوتی۔ کھوپڑی پھٹی نہیں لیکن اسے ناقابلِ برداشت ضعف ضرور پہنچا۔ ٹام اپنی جگہ لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔ یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا' میں ٹام کی گردن توڑ کر یہ کھیل ختم

کر سکتا تھا۔ میرے اردگرد تماشائیوں کا شور فلک شگاف ہوگیا تھا۔ اب بہت سے لوگ میرے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ غالباً وہ میری اس شدید مزاحمت سے متاثر ہوئے تھے جو میں نے زخمی آنکھ کے باوجود ثام کو پیش کی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک ماؤزر پر پڑی۔ یہ ماؤزر اس پہرے دار کی بیلٹ سے گرا تھا جو ابھی چند لمحے پہلے ثام سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نیم جان ثام آخری کوشش کے طور پر ماؤزر کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ یہ سراسر فاؤل پلے تھا مگر جب موت سامنے نظر آ رہی ہو تو کھیل کے قواعد و ضوابط پر کس کی نگاہ رہتی ہے۔ ثام کا ہاتھ ماؤزر سے تقریباً ایک فٹ کی دوری پر تھا مگر یہ ناقابلِ عبور فاصلہ تھا۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے ثام کو ایک اور زندگی درکار تھی۔

میں جانتا تھا کہ میں یہ مقابلہ جیت چکا ہوں۔ میں ثام پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت ثام کی گردن پر تھی۔ اس کا منکا توڑنے کے لیے بس ایک منذب سے جھٹکے کی ضرورت تھی مگر اس سے پہلے کہ میں یہ کام کر گزرتا، دو دھماکے ہوئے۔ میں نے ثام کی کنپٹی پر ایک نیم سرخ سوراخ نمودار ہوتے دیکھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دوسرا سوراخ اس کی سیاہ پیشانی پر نمودار ہوا تھا۔ ثام کے جسم نے جھٹکا کھایا اور میرے بوجھ تلے یک دم بے جان ہوگیا۔ اس کی گردن جو چند لمحے پہلے میرے ہاتھوں میں لکڑی کی طرح سخت تھی، باسی مولی کی طرح ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے دیکھا گولی چلانے والا مائیکل خود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اعشاریہ تین آٹھ کا کولٹ پسٹل صاف نظر آ رہا تھا۔ تماشائی چند لمحے کے لیے سکتے میں چلے گئے تھے پھر وہ ایک دم ہماری طرف لپکے۔ مجھے اور ثام کو گھیر لیا گیا۔ میں ثام کے اوپر سے اٹھ گیا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ہال کے فرش پر دور تک پھیل رہا تھا۔

مائیکل مستحکم قدموں سے چلتا ہوا ثام کے قریب پہنچا۔ اس نے پہرے دار کا گرا ہوا ماؤزر اٹھا لیا اور بڑے اسٹائل سے بولا "اصول اور ضابطے کی خلاف ورزی جو بھی کرے گا اسے سزا ملے گی۔ چاہے وہ ہمارا ساتھی ہی کیوں نہ ہو۔"

میں نے کہا "سزا تو اسے میرے ہاتھوں ملنے والی تھی مگر میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے ہاتھ سے سزا دینے کی جلدی تھی۔"

"اسی جلدی نے تمہیں شدید خطرے سے بچایا ہے۔" مائیکل نے کہا "اس کا ہاتھ ماؤزر تک پہنچ جاتا تو تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ کیا ہو سکتا تھا۔"

میں نے گہری نظروں سے مائیکل کو دیکھا، مجھے اس کی آنکھوں میں کینگی کی جھلک نظر آئی۔ وہ واقعی ایک گہرا، خطرناک اور کینہ دشمن تھا۔ میرے خیال میں ہال میں موجود دوسرے لوگوں کی طرح اس نے بھی صاف دیکھ لیا تھا کہ میں ثام کو تقریباً بے بس کر چکا ہوں اس نے صرف میری واضح برتری کو شک میں ڈالنے کے لیے گولی چلائی تھی۔ یہ ایک تیر سے دو شکار والا معاملہ تھا، ایک طرف اس نے مجھ پر احسان کیا تھا کہ اصول کی خلاف ورزی کرنے پر اس نے اپنے ہی ساتھی کو گولی سے اڑا دیا ہے، دوسری طرف میری صاف فتح کے تاثر کو دھندلا دیا تھا مگر سچائی بناوٹ کے اصولوں سے مکمل طور پر چھپائی نہیں جا سکتی، اردگرد کے لوگوں پر اس کا تھوڑا بہت اثر ہو کر رہتا ہے۔ میں تماشائیوں کے چہرے دیکھ رہا تھا، ان میں زیادہ تر ثام ہی کے حامی تھے، اس کے باوجود ان کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس مقابلے میں مجھے غالب سمجھ رہے ہیں۔

ذورتھی تماشائیوں کو چیرتی ہوئی آگے آئی۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور زور سے بھینچتے ہوئے بولی "تم کامیاب ہو شاہ جہاں۔ تم نے اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔ ثام کا ماؤزر پکڑنے کی کوشش کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مکمل طور پر ہار چکا تھا۔"

دو چار اور ہاتھ بھی تھپکی دینے والے انداز میں میرے شانوں پر آئے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر مجھے قمیص پہنا دی اور رسٹ گھڑی میرے ہاتھ پر باندھ دی۔ مائیکل چند لمحے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اعلان کرنے والے انداز میں بولا "مقابلے کے جو اصول اور قاعدے تھے ان کے مطابق تم فاتح ہو شاہ جہاں۔ میرے خیال میں اب تمہیں اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ایک بالکل صاف مقابلہ تھا اور ہم اس میں قطعی غیر جانبدار تھے۔"

اس اعلان پر چند پرجوش افراد کے سوا سب نے رسمی انداز میں تالیاں بجائیں اور منتشر ہونے لگے۔ ان کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ثام کی لاش کو سیدھا کیا گیا پھر ایک اسٹریچر پر ڈال کر وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ میرا ایک بازو ابھی تک لرزتا چلا جا رہا تھا، آنکھ کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ ذورتھی نے ٹیشو رومال سے میری آنکھ کا خون صاف کیا اور تشویش ناک نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ میں نے ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بصارت چیک کی، سرخی نے ہر شے کو دھندلا رکھا تھا۔ میں ذورتھی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہال سے باہر آ گیا۔ ذورتھی مجھے سیدھا

غزالہ کے پاس لے گئی۔

غزالہ کھڑکی سے لگی باہر دیکھ رہی تھی، وہ لپک کر باہر آئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پہلی نظر میں پتا چلتا تھا کہ وہ مسلسل روتی رہی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ذورتھی سے پوچھا "مقابلہ ختم ہو گیا؟"

"ہاں، مقابلہ ختم ہو گیا اور مقابلہ کرنے والا بھی۔"

غزالہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ میری آنکھ پر مرکوز کر دی۔ وہ ذورتھی سے بولی "ان کی آنکھ کو بڑی اچھی طرح دیکھنا پڑے گا۔ کیا ہم کسی طرح کلینک میں نہیں جا سکتے؟"

"اس کے لیے مائیکل سے اجازت لینا پڑے گی۔" ذورتھی نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی "اچھا میں کوشش کرتی ہوں، تم ادھر ہی رکو۔"

ذورتھی چلی گئی۔ اپارٹمنٹ کے دروازے پر مسلح پہرے دار چوکس کھڑا تھا۔ چند منٹ بعد ذورتھی واپس آ گئی، اس کے ساتھ ایک اور محافظ بھی تھا۔ ذورتھی نے کہا "مائیکل نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ تمہارے ہاتھ میں لاک لگا یا جائے گا۔" لاک سے ذورتھی کی مراد ہتھکڑی تھی۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ اگر میں اس کے نزدیک اتنا ہی ناقابلِ بھروسا ہوں تو وہ ہتھکڑی لگا لے۔"

محافظ نے آگے بڑھ کر میری کلائیاں ہتھکڑی میں جکڑ دیں۔ ہاں اتنی رعایت کی گئی تھی کہ ہتھکڑی سامنے کی طرف لگائی گئی تھی۔ درحقیقت غزالہ اس اپارٹمنٹ میں ایک یرغمالی کی حیثیت سے رکھی گئی تھی۔ دوسرے کیبن میں بیٹھا ہوا ایک شخص صرف ایک بٹن دبا کر غزالہ کے اپارٹمنٹ میں موجود بم کو بلاسٹ کر سکتا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے مشروط آزادی ملی ہوئی تھی یعنی میری آزادی کی شرط یہ تھی کہ غزالہ اور تانی اپارٹمنٹ میں موجود رہیں۔ اب چونکہ غزالہ میرے ساتھ کلینک میں جا رہی تھی لہٰذا مجھے ہتھکڑی ڈال دی گئی تھی۔ غزالہ مجھے لے کر کلینک نما کمرے میں پہنچی۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں چند روز پہلے ہم نے نائب کپتان فلیمنگ کا آپریشن کیا تھا۔ یہاں دوائیں اور طبی امداد کا کافی سامان موجود تھا۔ غزالہ نے مجھے صوفے پر لٹا دیا اور آنکھ کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ بعد ازاں اس نے کسی محلول سے آنکھ دھوئی اور ڈراپس وغیرہ ڈال کر پٹی باندھ دی۔ غزالہ کچھ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ کم از کم اتنی پریشان نہیں تھی جتنا میں

سمجھ رہا تھا کہ وہ ہوگی۔ آنکھ سے فارغ ہو کر اس نے میری کہنی کا معائنہ کیا اور کوئی دکس قسم کی چیز لگانے کے بعد پٹی کے ذریعے بازو میرے گلے میں لٹکا دیا۔ اس کے بعد اس نے میری چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ پر توجہ دی۔ ماہر مستری کی طرح کئی جگہ مجھے مرمت لگائی اور کھانے کے لیے بھی ایک دو گولیاں دیں۔

میں نے کہا "میری چشمِ بیمار کا کیا حال ہے؟"

"اتنا برا نہیں جتنا نظر آ رہا تھا اور جتنا مجھے اندیشہ تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ آنکھ کے پیچھے خون کا اخراج نہیں رہا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ شاک کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی اور سبب سے۔ بہرحال خون کا بہہ نکلنا آپ کے حق میں اچھا ہی رہا ہے۔"

میں نے کہا "شاید اسی قسم کے موقع کے لیے محاورہ استعمال کیا جاتا ہے کہ کبڑے کو لات راس آئی۔"

"آپ کو مذاق کی باتیں سوجھ رہی ہیں لیکن یہ کچھ مجھے ہی معلوم ہے کہ پچھلا ایک گھنٹا میں نے کیسے گزارا ہے۔ ہر لمحہ سولی پر لٹکی رہی ہوں۔ میں لڑائی دیکھ تو نہیں رہی تھی لیکن ساری آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے، چیزیں ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں پھر گولیوں کے دھماکے سنائی دیے۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہا تھا کہ ساتھ چلی چلو۔ سامنے کے خوف سے چھپا ہوا خوف زیادہ وحشت ناک ہوتا ہے۔"

"وہاں جاتی تو اسٹریچر پر ہی آتی۔"

"کیوں، اتنی اہمیت ہے میری؟"

ایک دم غزالہ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ بول گئی ہے، اس کے ساتھ ہی شاید اسے وہ "صورتِ حال" بھی یاد آ گئی تھی جس میں اسے چھوڑ کر "ڈنگل" میں شرکت فرمانے گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سرخی لہرائی۔ کچھ بولنے کے بجائے وہ ایک دم گم صم ہو گئی اور میرے لیے انجکشن تیار کرنے لگی۔ اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے میں نے بھی مزید مکالمے سے اجتناب کیا۔

انجکشن لگوانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوفناک مشقت کے بعد یوں لیٹنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں ایک جان لیوا مقابلے سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا مگر میرے ہونٹوں پر ابھی تک وہ لمس موجود تھا جو میرے لیے زندگی کا دوسرا نام تھا۔ اس لمس کے احساس کو ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا مگر اس لمس کی شیرینی اور مہک پہلے لمحے کی

طرح میرے ذہن پر موجود تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" غزال نے پوچھا۔

"جو سوچ رہا ہوں وہ مجھ تک ہی رہنے دو۔"

غزال نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "ایک ایڈوائس کرنا چاہتی ہوں آپ کو۔ سمندری ہوا سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کیجئے۔ اس میں نمک کے بخارات اور کئی دوسرے فاسد مادے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو کبھی کبھار ایسا سفر کرتے ہیں' اکثر متاثر ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دو تین دن تابی کو حرارت رہی ہے' اب شائستہ بھی بیمار ہے۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"بس ٹھیک نہیں ہے دم۔ سینے میں درد ہو جاتی ہے۔ کل بلڈ پریشر بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ یہاں بس گنتی کی دوائیں ہیں' ان میں سے ہی میں نے ایک دوا دی تھی۔ اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔ دراصل وہ موجودہ صورتِ حال کا اثر بھی بہت لے رہی ہے۔ ایرانی جہاز کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے لیے ایک وحشت ناک خواب کی طرح ہے۔ اگر آپ بروقت اسے غوطے کھانے سے نہ بچاتے تو شاید وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ اس واقعے کو یاد کر کے وہ دو تین بار تو میرے سامنے روئی ہے پھر اسے باپ کا غم بھی ہے۔ وہ پروفیسر سے ملنے کے لیے ترس رہی ہے مگر مائیکل نے باپ بیٹی کے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔ اس کی منطق یہ ہے کہ پروفیسر سے مل کر شائستہ روتی دھوتی ہے اور اس کی طبیعت مزید خراب ہو جاتی ہے۔"

"وہ بڑا کمینہ شخص ہے۔" میں نے کہا "میرے خیال میں وہ پروفیسر کو اس لیے شائستہ کے پاس نہیں جانے دے رہا کہ باپ بیٹی کے ملنے سے اس کا راز فاش ہو گا۔"

"کیسا راز؟"

"یہی کہ مائیکل نے شائستہ اور دیگر دونوں افراد کو سیر کے لیے ایرانی جہاز پر نہیں بھیجا تھا بلکہ ان کی حیثیت وہاں ضمانتیوں کی سی تھی۔"

"ہاں یہ بات بھی ہو سکتی ہے۔"

"سو فی صد یہی بات ہے۔ بلکہ ایک بات اس سے بھی بڑی ہے اور زیادہ گمبھیر بھی۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں کسی راز میں شریک کر کے کبھی افسوس نہیں ہوا۔"

"کیسی بات؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "غزال! یہ مائیکل بدبخت ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر سفاک اور بدباطن شخص ہے۔ شائستہ کی حیثیت اس کے نزدیک ایک زرخرید کنیز کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایرانی جہاز کی تباہی کے وقت اس نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے شائستہ کی موت کو بخوشی قبول کر لیا تھا۔ فربہ اندام مارکوس اور مائیکل کے درمیان ہونے والا مکالمہ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ یہ مکالمہ "سے تو" کی تباہی سے صرف چند سیکنڈ قبل ہوا تھا۔"

میں نے اس واقعے کی تفصیل غزال کو بتائی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بولی "اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اپنے چچا زاد بھائی اور تیسرے ساتھی کی موت کا ذمے دار بھی وہ خود ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔"

"لیکن چچا زاد کی موت پر تو وہ سوگ منا رہا تھا اور اپنے قبیلے والوں سے گلے مل مل کر ان سے تسلیاں لے رہا تھا۔"

"میں نے بتایا ہے نا کہ یہ ہماری توقعات سے بڑھ کر بدباطن ثابت ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جہاز کے حتمی پڑاؤ پر پہنچنے تک پروفیسر اور شائستہ کو ملنے نہیں دے گا۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ پروفیسر یوں غائب ہو جائے جیسے کبھی تھا ہی نہیں ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسے مار دیا جائے گا؟"

"مار دیا جائے۔ یا بیچ دیا جائے۔ یا کہیں اور بھیج دیا جائے' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

پہرے دار جوزف کلینک سے باہر چوکس کھڑا تھا۔ غزال میری مرہم پٹی سے فارغ ہو گئی تو جوزف نے غزال سے کہا کہ باس کی ہدایت کے مطابق اسے واپس اپنے اپارٹمنٹ میں جانا ہو گا۔ میں وہیں کلینک کے ایک صوفے پر لیٹا رہا' غزال گم صم سی ہو کر اپارٹمنٹ میں تابی کے پاس واپس چلی گئی۔ غزال کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک پہرے دار نے میری ہتھکڑی کھول دی تاکہ میں آرام سے لیٹ سکوں۔ مجھے نیند آ گئی مگر میں ساری رات درد سے کراہتا بھی رہا۔ بدن کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا۔ جہاں جہاں میرے آدم خور حریف نے اپنے دانت آزمائے تھے وہاں رات بھر جلن ہوتی رہی۔ سب سے زیادہ تکلیف دائیں بازو کی کہنی میں تھی۔ کروٹ بدلتا تھا تو فوراً آنکھ کھل جاتی تھی۔

علی الصباح میں اٹھ بیٹھا۔ ابھی اجالا اندھیرے پر غالب نہیں آیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا عرشے پر پہنچ گیا۔ میرا ارادہ غزال کی طرف جانے کا تھا۔ عرشے کی سیڑھیوں کے قریب مجھے پروفیسر اللہ دتا نظر آیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے فرش پر بیٹھا تھا' میں نے اسے آواز دی تو وہ چونک کر میری

طرف دیکھنے لگا' مجھے یوں لگا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک رو رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پروفیسر نے کہا "نئی زندگی مبارک ہو شاہ جہاں۔ نام سے مقابلہ جیتنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جیتا کہاں ہوں۔ وہ تو "باس صاحب" نے بروقت گولی چلا کر میری جان بچالی۔"

پروفیسر بولا "اس نے تمہاری فتح کو دھندلانے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت کو بناوٹ سے چھپایا نہیں جا سکتا۔ وہاں جو کچھ ہوا ہے وہ سب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"خیر چھوڑیں اس بات کو۔" میں نے کہا "آپ بتائیں۔ آپ کیوں اتنے گم صم نظر آ رہے ہیں؟"

میرے اظہارِ ہمدردی پر ایک دم پروفیسر کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولا "غزال نے تمہیں بتایا ہی ہو گا کہ شائستہ بیمار ہے۔"

میں نے کہا "مگر اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ سمندری سفر ہے' بہت سے لوگوں کی طبیعت مضمحل ہو رہی ہے۔"

"نہیں شاہ جہاں۔" پروفیسر نے بے قراری سے سر ہلایا "میری بیٹی بڑی نازک مزاج ہے۔ وہ شروع سے ہی ایسی تھی۔ وہ جتنے ناز و نعم میں پلی تھی اتنی ہی بڑی مصیبتیں اس پر آن پڑی ہیں۔ اس کے سینے میں جو درد ہے وہ سانس کی تکلیف کی وجہ سے ہے' یہ تکلیف ایک دو بار پہلے بھی اسے ہوئی ہے۔ اس کا علاج میں نے خود ہی کیا تھا۔ اب بھی کر سکتا ہوں۔ مگر مائیکل مجھے اس سے ملنے نہیں دے رہا۔ کتنے افسوس کی بات ہے شاہ جہاں! ایک خلقت کو میرے ذریعے سے شفا ملی ہے لیکن آج میں اپنی ہی بیمار بیٹی کو دوا نہیں دے سکتا۔ مائیکل مجھے نیم حکیم اور ڈھونگی کا خطاب دے رہا ہے۔"

پروفیسر کا چہرہ غم کی آماجگاہ بن گیا۔ میں نے پوچھا "کیا آپ نے اس سے کہا تھا کہ آپ شائستہ کا علاج کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں میں نے کہا تھا۔ میں نے مائیکل کو بتایا تھا کہ میں ایک دو بار پہلے بھی اس کا علاج کر چکا ہوں۔ وہ دو تین روز میں بھلی چنگی ہو جائے گی۔ جواب میں وہ بولا۔ تم بیٹی سے ملنے کے لیے صرف ڈھونگ رچا رہے ہو۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے دھونے والی باتیں کرو گے اور اسے بھی رلاؤ گے۔ میں نے قسم کھا کر مائیکل کو یقین دلایا کہ میری آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکلے گا' نہ ہی میں کوئی ایسی بات کروں گا مگر اس نے مجھے دھکے دے کر واپس بھیج دیا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے پہلو سے سوچ رہا ہو۔ آپ کے پاس یہاں اپنی دوائیں موجود نہیں ہیں۔ آپ شائستہ کو کیا دیتے؟"

"میں نے مائیکل کو اس بات کا جواب بھی دیا تھا۔" پروفیسر نے کہا "شاید تمہیں علم ہی ہو گا' میری دواؤں کا بنیادی جزو مٹی ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرح کا اناج اور چند ایلوپیتھک میڈیسن بھی یہاں موجود ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنا گزارہ کر سکتا ہوں مگر یہ سب باتیں تو اس وقت کی ہیں جب مائیکل رضامند ہو' وہ تو مجھے شائستہ کو دیکھنے تک کی اجازت نہیں دے رہا۔ یہ کیسا ستم ہے شاہ جہاں۔ وہ میری اولاد ہے' میں نے اسے پالا ہے' بیس سال وہ میرے جسم کے حصے کی طرح رہی ہے' آج اسی شائستہ پر میرا حق نہیں۔ وہ شخص اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے جسے کل تک وہ جانتی بھی نہ تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے۔ نہ اپنی مرضی سے بیٹھ سکتی ہے نہ اٹھ سکتی ہے' نہ سانس لے سکتی ہے۔"

پروفیسر بھی غالباً بہت سے لوگوں کی طرح آدابِ غلامی سے واقف نہیں تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ بااختیار انسان کبھی کبھی اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے لیے کتنا جابر اور قہرمان بن جاتا ہے۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ غزال شائستہ کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اسے امید ہے کہ شائستہ کی تکلیف طول نہیں کھینچے گی۔

پروفیسر نے دائیں بائیں دیکھا پھر سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں! میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

پروفیسر نے چادر کی بکل سی مار رکھی تھی۔ بکل کے نیچے اس نے کچھ ٹٹولا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ عرشے پر جس جگہ ہم بیٹھے تھے اسے دیکھا جا رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے خود ٹی وی کیمرے کے ذریعے عرشے کے اس حصے کا منظر دکھایا تھا۔ میں نے غیر محسوس طور پر بکل کے اندر ہی پروفیسر کا ہاتھ دبوچ لیا "نہیں' ابھی رہنے دیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" پروفیسر قدرے حیران تھا۔

"یہ آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال۔ آپ مجھے زبانی بتا دیں کہ یہ کیا چیز ہے۔"

"مگر۔ بات کیا ہے؟"

"دیکھیں۔ یہاں ان لوگوں نے ویڈیو کیمرا لگایا ہوا ہے۔ جہاز کے مختلف حصوں کی ہر وقت نگرانی کی جاتی ہے۔"

پروفیسر کے ہونٹ وائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا میں اسے مزید تفصیل بتاتا' بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دو حبشی پہرے دار وہاں پہنچے۔ ان کے ساتھ محلے کا ایک اٹالین رکن بھی تھا۔ اٹالین شخص نے پروفیسر کو بتایا کہ "باس" اسے یاد کر رہے ہیں۔ پروفیسر کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور یہ صرف پروفیسر کی بات ہی نہیں تھی' مائیکل کی وہشت ہی اتنی تھی۔ وہ کسی کو بھی طلب کرتا' اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ پروفیسر اٹھا اور پہرے داروں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

اگلے روز شام کو میں نچلے کیبنز میں پہنچا تو زریں گل نظر نہیں آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ٹوائلٹ میں ہو گا مگر صفدر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کتنے بھی بے تکلف سہی' اکٹھے تو ٹوائلٹ میں نہیں جا سکتے تھے۔ یقیناً ان دونوں میں سے ایک کیبن میں موجود نہیں تھا پھر میری نگاہ کلثوم پر پڑی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور خاصی اداس نظر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زریں گل کیبن میں نہیں ہے۔

میں نے کلثوم سے پوچھا "خیریت تو ہے' زریں کہاں ہے؟"

وہ بولی "زریں کو نوکری مل گیا۔ وہ ماشاءاللہ باہر گیا۔"

میں حیران رہ گیا' کلثوم تو ایسے کہہ رہی تھی جیسے جہاز کے اندر ہی زریں کا ویزا آ گیا ہو اور وہ فوراً ہی بن کر کویت یا دبئی وغیرہ چلا گیا ہو۔ میں نے پوچھا کہ کیسی نوکری؟

وہ بولی "تیل کا نوکری۔"

"یا خدا خیر۔ کہیں وہ تیل کا وزیر وغیرہ تو نہیں لگ گیا۔" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "تیل رگڑنے کا نوکری۔"

"تیل رگڑنے کی نوکری؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

اگر رگڑنے سے کلثوم کی مراد خرد برد کرنا تھی' تو پھر تو زریں ضرور وزیر پیٹرولیم لگ گیا تھا' ایسے لوگ سب کچھ رگڑ جاتے ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا۔

اسی دوران میں صفدر مسکراتا ہوا ٹوائلٹ سے باہر آ گیا۔ بولا "کلثوم کے سبب ہم سب کی زبان بہت اچھی طرح خراب ہو گی انشاءاللہ۔"

"انشاءاللہ۔" میں نے بھی کہا "لیکن یہ کہہ کیا رہی ہے اور زویں گل کا بچہ کہاں ہے؟"

صفدر بولا "وہ بتا تو رہی ہے کہ وہ تیل رگڑنے چلا گیا ہے' یعنی مالش کرنے۔"

"کس کی مالش؟"

صفدر نے بتایا "ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے موصوف میرے سر پر مالش کر رہے تھے۔ بڑے ایکشن کے ساتھ' بالکل مالشیوں والے انداز میں۔ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے تھے۔ اسی دوران میں نائب کپتان آرتھر اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ یہاں پہنچ گیا۔ میرا اور زویں کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ دونوں پیچھے کھڑے خاموشی سے زریں کے ایکشن دیکھتے رہے پھر آرتھر نے زویں گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تو زبردست مساج کرتا ہے بلکہ اسے تو مساج مشین کہنا چاہیے" پھر اس نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا "کیوں نہ یہ مشین باس کو تحفے میں دی جائے۔ ان کا بہت بڑا مسئلہ حل ہو گا اور خوش بھی بہت ہوں گے۔" بس اس کے بعد زریں گل کو باہر نکالا گیا۔ اس نے بتیرا پوچھا کہ کہاں لے جا رہے ہو۔ انہوں نے ایک نہیں سنی اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس وقت سے یہ بلبل صحرا چونچ لٹکائے بیٹھی ہے۔" صفدر کا اشارہ کلثوم کی طرف تھا۔

میں نے کلثوم کو سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ زریں گل پکی نوکری پر نہیں گیا۔ کچی نوکری ہے۔ تیل رگڑائی کے بعد واپس آ جائے گا۔

"انشاءاللہ۔ انشاءاللہ۔" کلثوم نے جلدی جلدی سر اوپر نیچے ہلایا "ہم کو اس کا بہت فکر۔ وہ ٹھیک نہیں۔ اس کا دماغ ہلتا ہے۔"

صفدر مسکرایا "دماغ ہلتا نہیں بلکہ ہلا ہوا ہے۔"

"نہیں ہلتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب سر ہلتا ہے تو دماغ بھی ہلتا ہے۔ اس کے سر میں درد ہوتا۔ اس کو ڈاکٹری کھلاؤ۔"

"ڈاکٹری نہیں کھلاتے' دوائی کھلاتے ہیں۔" صفدر نے تصحیح کی "اگر زریں ڈاکٹری ہی کھا گیا تو پھر جہاز کے مریضوں کا علاج کون کرے گا اور صرف مریضوں کا ہی نہیں اس کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کا نقصان ہو گا۔" صفدر نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

میں رات گئے تک صفدر اور کلثوم کے پاس رہا۔ ہم نے رات کا کھانا بھی کیبن میں ہی کھایا۔ صفدر نے بتایا کہ انڈین قیدیوں سمیت اب تمام قیدی سکون سے ہیں۔ اکثر پردیسی قیدی بھی اب باقاعدگی سے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے۔ حبشی پہرے داروں کے حوالے سے ان کا غیر معمولی خوف بھی اب قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے کیبن کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتے تھے تو اپنے مخصوص لہجے میں تیز تیز بولنے لگتے تھے اور ہاتھوں کے اشاروں سے مجھے اپنے پاس

بلاتے تھے۔ اگر میں قریب جاتا تھا تو وہ اپنے مسائل بیان کرتے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل ہوتے تھے۔ کسی کے بچے کو بخار ہوتا تھا' کسی کو رات میں اوڑھنے کے لیے چادر وغیرہ درکار ہوتی تھی' کسی کیبن میں پانی وغیرہ کا مسئلہ ہوتا تھا۔ میں پہرے داروں سے کہہ کر یہ مسائل حل کر دیتا تھا۔ میری اس معمولی سی کاوش کے بدلے میں وہ ایسی احسان مندی کی نظروں سے مجھے دیکھتے تھے کہ دل خوش ہو جاتا تھا۔ نو عمر ماں کلا خاص طور پر مجھ سے مانوس تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ جاتی تھی۔ ایک دو بار میں نے اس کا بچہ گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ایسی خوشی نظر آئی جسے لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ وہ ایک ماں تھی لیکن اپنے بچے ہی کی طرح معصوم اور سادہ دل نظر آتی تھی۔

رات دس بجے کے بعد سمندر میں ہلکی سی طغیانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس طغیانی کا اندازہ جہاز کو لگنے والے ہچکولوں سے ہوتا تھا۔ میں سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے زریں کمپارٹمنٹ سے باہر آ گیا۔ اب میرے اس طرح آنے جانے پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ میں پہلے عرشے پر پہنچا تو وہاں مکمل سکوت تھا۔ دور سیڑھیوں کے پاس بس ایک پہرے دار نظر آ رہا تھا۔ اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے' اکثر لوگ سو رہے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا لہٰذا جہاز کے ارد گرد لہروں کا نظارہ کرنا مشکل تھا۔ میں عرشے کے جنگلے کے ساتھ کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ غزال کی پیش گوئی کے عین مطابق آنکھ کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ جسم کی دیگر چوٹوں میں بھی افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آہٹ میرے عقب میں اسٹور روم کی طرف سے ابھری تھی۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے کوئی بھاگ کر اسٹور کے پیچھے چھپ گیا ہو۔ میں چوکنا ہو گیا۔ صرف ۴۸ گھنٹے پہلے حبشی ٹام سے میرا خون ریز مقابلہ ہو چکا تھا اور ٹام اس مقابلے کے نتیجے میں عدم آباد سدھار چکا تھا' یقینی بات تھی کہ ٹام کے ساتھیوں اور دوستوں نے یہ سب کچھ آسانی سے برداشت نہیں کیا ہو گا۔ مجھے ان لوگوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں نائب کپتان آرتھر نے بھی مجھے ہلکا سا اشارہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا "تم نے پہلے سائمن کو اور اب ٹام کو مار کر حبشیوں کے پورے ایک قبیلے کو اپنے خلاف کر لیا ہے۔"

میں تیزی سے اسٹور روم کی طرف آیا اور اس کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر کوئی واقعی یہاں موجود تھا تو وہ اسٹور روم کی دوسری طرف تاریکی میں تھا۔ میں چند لمحے تک سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا پھر بے آواز قدموں سے اسٹور کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ اسی دوران میں ایک بار پھر کھٹ پٹ ہوئی اور ایک سایہ اسٹور کے عقب سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے تیزی سے اس کا پیچھا کیا۔ سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سایہ دائیں جانب اپار ٹمنٹس کی طرف مڑ گیا۔ وہ بہت زیادہ پھرتیلا نظر نہیں آتا تھا' جسم بھی قدرے بھاری تھا۔ غالباً اسی لیے اس نے سیڑھیوں کا رخ نہیں کیا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اگر اس نے تیزی سے سیڑھیاں اترنے کی کوشش کی تو لڑھک جائے گا۔ عرشے پر بھاگ دوڑ کی آواز سن کر سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا محافظ بھی رائفل لہراتا ہوا دوڑا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر بھاگنے والا اپار ٹمنٹس تک پہنچ گیا تو پھر اس کے بچ نکلنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور پھر جست لگا کر اسے عقب سے دبوچ لیا۔ وہ میرا دھکا کھا کر اوندھے منہ گرا۔ چوٹ لگنے سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کراہ نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ وہ پروفیسر اللہ رکھا تھا۔ میرا ایک ہاتھ پروفیسر کی کمر پر اور دوسرا بازو پر تھا۔ میں نے پروفیسر کو جلدی سے سیدھا کیا۔ اسی اثنا میں رائفل بردار پہرے دار بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے عقب میں محلے کے دو اٹالین ارکان تھے۔ حبشی پہرے دار نے خوفناک انداز میں اپنی رائفل کی نال پروفیسر کے سینے پر رکھ دی۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس ایک اٹالین کے ہاتھ میں بھی ریوالور نظر آ رہا تھا۔

اس نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بہت خوب... تو یہ تم ہو بوڑھے گدھے۔"

اس نے پروفیسر کو قمیص کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ پروفیسر تھر تھر کانپ رہا تھا "ایک نمبر کے احمق ہو تم۔" اٹالین نے کہا "تمہارا نام تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں درج ہونا چاہیے۔ ریکارڈ کا نا کنگ ہونا چاہیے.... سیانی بتی کا ریوانہ باپ!"

چند لمحے میں وہاں مزید کچھ افراد بھی اکٹھے ہو گئے۔ پروفیسر مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ دونوں اطالویوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ پروفیسر چونکہ بار بار شائستہ سے ملنے کا تقاضا کرتا تھا لہٰذا مائیکل کے حکم پر اس کا داخلہ پہلے اور دوسرے عرشے پر قطعی بند کر دیا گیا تھا' مائیکل نے اسے پہرے داروں کی تحویل میں دے دیا تھا تاکہ وہ اسے گودام کے قریب واقع اپنے کیبنوں میں رکھیں۔ کل صبح جب میں اور پروفیسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے' مائیکل کے آدمی

آکر پروفیسر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس وقت مائیکل نے پروفیسر کے لیے یہی ہدایت جاری کی تھی۔

مائیکل لمبے لمبے ڈگ بھرتا موقع پر پہنچا تو سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ مائیکل اپنے سامنے کھڑے پروفیسر کو زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا پھر زہرخند لہجے میں بولا "ہاں پروفیسر ڈیئر! کہاں سے تشریف لا رہے ہیں جناب!" پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ریوالور بردار اطالوی نے کہا "سر! میرا اندازہ ہے کہ یہ چوری چھپے دوسرے عرشے پر گیا تھا' وہاں سے رابیں گودام کی طرف جا رہا تھا کہ کسی کو دیکھ کر اسٹور روم کے پیچھے چھپ گیا۔"

مائیکل نے اطالوی سے کہا "تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ پروفیسر ڈیئر یقیناً دوسرے عرشے سے آ رہے ہوں گے یا پھر وہاں جا رہے ہوں گے۔ اس عرشے کے علاوہ انہیں بھلا اور کہاں کام ہو سکتا ہے۔ کیوں پروفیسر ڈیئر؟"

پروفیسر نے گلوگیر لہجے میں کہا "خدا کے لیے مائیکل۔ خدا کے لیے اتنا ظلم مت کرو' ایک باپ کی محبت کا اتنا سخت امتحان مت لو۔ شائستہ کی طبیعت تمہارے اندازے سے زیادہ خراب ہے۔ اسے میری ضرورت ہے۔ میری بیٹی کو ضرورت ہے میری۔ میں مانتا ہوں وہ... تمہاری بیوی ہے لیکن اس کے بیوی بننے سے میرا حق بالکل ختم تو نہیں ہو جاتا۔"

مائیکل مسکرایا "پروفیسر ڈیئر! آپ کا حق تسلیم شدہ ہے۔ یہ حق تو اس وقت بھی ختم نہیں ہوگا جب وہ سو سال کی بڑھیا ہو جائے گی۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگا "ویسے آپ اچھے وکیل کبھی نہیں بن سکتے۔ آپ نے تو خود اپنے ہی خلاف دلائل دے دیے۔ یہ کہہ کر کہ میری بیوی کی طبیعت زیادہ خراب ہے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ ابھی اس سے مل کر واپس آ رہے ہیں۔"

"ہاں میں مل چکا ہوں اس سے۔" پروفیسر اشکبار آواز میں بولا "وہ میری بیٹی ہے' میں اس سے دور نہیں رہ سکتا۔ وہ رات دن میرا انتظار کرتی ہے۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کو ترستی ہے۔ میں آس پاس رہ کر بھی اس سے کیوں نہ ملوں۔"

"اوکے۔ اوکے۔" مائیکل نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "یہاں سب کے سامنے جذباتی ڈراما بولنے کی ضرورت نہیں۔ آیئے' میں آپ کو ملواتا ہوں شائستہ سے۔" اس نے بڑے احترام سے پروفیسر کو ساتھ چلنے کو کہا۔

پروفیسر چند لمحے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا پھر مائیکل کے ساتھ چل دیا۔

میں جانتا تھا کہ پروفیسر کے لیے مائیکل کا ادب و احترام طنزیہ ہے' وہ اس کے ساتھ برے سے برا سلوک بھی کر سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا سوچتا رہا کہ پروفیسر کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس وسیع و عریض سمندر میں ہرکولیس نامی اس جہاز پر ہم کچھ نہایت شاطر لوگوں کے نرغے میں تھے انہوں نے ہمیں اپنی اپنی جگہ اتنی ہوشیاری سے باندھ رکھا تھا کہ تلملانے کے سوا کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

○☆○

اگلے روز صبح سویرے میں نے زریں گل کو بالائی عرشے پر ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا' سر پر ٹوپی تھی۔ یہ وہی لباس تھا جو اس نے لاہور سے "فرار" ہوتے وقت پہن رکھا تھا۔ (جب سے ہمیں دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کر کے اول درجے کے کیبن میں جگہ دی گئی تھی' ہم پر قیدیوں کا مخصوص کرتہ پاجامہ پہننے کی پابندی بھی نہیں رہی تھی) غالباً زریں گل کو خطرہ تھا کہ اس کی ٹوپی تیز سمندری ہوا سے اڑ جائے گی' وہ بار بار ٹوپی کو سر پر سنبھالا دے رہا تھا۔ وہ کئی روز سے کھلا آسمان اور سمندر دیکھنے کے لیے بے قرار تھا' اب اس کی یہ آرزو پوری ہو گئی تھی۔ مالشیے کی حیثیت سے ہی سہی لیکن وہ اس تاریک زنداں سے باہر تو آیا تھا پھر یکایک میرا ذہن دوسرے پہلو سے سوچنے لگا۔ زریں گل سخت لاابالی اور من موجی شخص تھا۔ ہمارا تجربہ اس بات کا شاہد تھا کہ وہ دنگے فساد سے ڈرنے والا نہیں اور ہر قسم کے حالات میں مزاحمت جاری رکھنے والا شخص ہے۔ عین ممکن تھا کہ زریں کیپارٹمنٹ سے آزادی ملنے کے بعد اس کی سوچ پر پرزے نکالتی اور وہ کسی طرح کی مہم جوئی کی کوشش کرتا۔ اسے ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ غزالہ یہاں کتنے شدید خطرے کی زد میں ہے اور بات صرف غزالہ ہی کی نہیں تھی' ہمارے دیگر ساتھی یعنی صنوبر اور کلثوم بھی مکمل طور پر لاچار تھے' اگر ہم کسی طرح کی گڑبڑ کرتے تو ان تینوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی ہو سکتی تھی۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس سلسلے میں زریں کے کانوں کی کھڑکیاں کھول دوں۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی عرشے پر چلا گیا۔ یہاں دو تین مسلح افراد موجود تھے لیکن اب وہ میری نقل و حرکت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ زریں مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپک آیا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اس نے دو منٹ کے اندر اندر مجھے بتا اور سمجھا دیا کہ وہ کیسے اکب اور

کیونکر یہاں پہنچا ہے۔ یہ ساری باتیں مجھے پہلے ہی صنوبر اور کلثوم سے معلوم ہو چکی تھیں۔ آخر میں زریں گل نے کہا "استاد صیب! آپ یہ مت سمجھیں کہ ام یہاں آ کر بہت خوش ہوا ہے۔ ام کم کھاتا ہے' ام پریشان ہے۔ ام کو تو اپنی عزت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے کہا۔

وہ بولا "کل رات ام کو اس بدبخت مائیکل نے کمرے میں بلایا۔ ام نے دو گھنٹے تک اس کا مالش کیا۔ امارا بازو مازو بالکل شل ہو گیا۔ ام سمجھتا تھا کہ اب ام کو آرام فرمانے کا موقع ملے گا لیکن اس بدبخت نے ام کو فوراً ایک دوسرے کمرے میں ارسال کر دیا۔ اس کمرے میں امارے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ یہاں چالیس پینتالیس سال ایک ڈبرے جسم کی فرنگن موجود تھی۔ بالکل گوری چٹی جیسے سفید باندری (بندریا) ہوتا ہے۔ خو' امارا خیال ہے کہ وہ جہاز کے چیف انجینئر کا بدبخت بیوی ہے۔ ایک تو وہ عورت اوپر سے فرنگن۔ آپ ذرا اپنے دماغ سے سوچنے ام کو اس کا خدمت کرنا کتنا مشکل لگا ہوگا۔ امارا تو دل چاہتا تھا کہ پہلی فرصت میں اس کا گلا گھونٹ دے لیکن وہ اپنا ٹانگیں گھٹنوں تک ننگا کیے بیٹھا تھا اور ام سے فرماتا تھا کہ ام اس کی پنڈلیوں کا مالش کرے۔ ام خدا کا قسم کھاتا ہے کہ ام نے صرف آپ سب کی خاطر یہ ذلت برداشت کیا ہے۔ وہ سفید باندری ام سے مالش کراتا رہا۔ ساتھ ساتھ بیئر پیتا رہا اور ام کو گھورتا رہا۔ اس نے امارے گالوں پر چٹکیاں بھی کاٹا اور "سویٹ کابلی سویٹ کابلی" بھی بولتا رہا۔" زریں گل نے ذرا توقف کیا پھر بولا "ام کو بہت پریشانی لگ رہا ہے استاد صیب۔ اگر اس فرنگن نے ام کو پھر بلایا اور پھر امارے ساتھ ویدہ زیب (نازیبا) حرکت کیا تو ام چپ نہیں بیٹھے گا۔ جو امارا ایمان خراب کرنے کا کوشش کرے گا' ام اس کا بیڑا غرق فرما دے گا۔"

"ابھی اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری پیاری سی صورت دیکھ کر اسے اپنا کوئی چھوٹا یاد آ گیا ہو...."

"کچھ بھی ہو استاد صیب" زریں نے میری بات کاٹی "ام اس فرنگن کو پنڈلی سے آگے ہاتھ نہیں لگائے گا اور اگر ام کو لگانا ہی پڑا تو پھر اس کے گلے پر ہاتھ لگائے گا اور گھونٹ دے گا کم بخت کا گلا۔"

زریں گل کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے پوچھا "رات تم مائیکل کے پاس تھے؟"

"ہاں وہ تین گھنٹے رہا تھا۔" زریں نے جواب دیا۔

"وہاں پروفیسر تو نہیں تھا؟"

ایک دم زریں کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا "ہاں پروفیسر اللہ دتا بھی وہیں تھا۔ خو اس کے ساتھ بہت برا سلوک کر رہا ہے یہ مائیکل خنزیر کا بچہ۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہ پوچھیں جی کیا نہیں ہوا۔" زریں بولا "حشر خراب کر دیا ان لوگوں نے پروفیسر کا۔"

اس کے بعد زریں گل نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

"جس وقت مائیکل' زریں گل سے مالش کروا رہا تھا' پروفیسر کو وہاں لایا گیا۔ مائیکل نے پروفیسر کو بڑے احترام سے صوفے پر بٹھایا' حال چال دریافت کیا پھر اس سے پوچھنے لگا کہ آپ کیا پئیں گے۔ پروفیسر نے کچھ بھی لینے سے انکار کیا۔ مائیکل نے اصرار کر کے دودھ منگوا لیا۔ (یاد رہے کہ یہ ساری کارروائی مائیکل کے اپنے اپارٹمنٹ میں نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اس سے ملحقہ ایک دوسرا... اپارٹمنٹ تھا) پروفیسر نے مائیکل کے اصرار پر دودھ کا گلاس پی لیا۔ مائیکل بولا "پروفیسر ڈیئر کچھ اور پیجئے۔" ملازم ایک اور گلاس لایا' پروفیسر نے مائیکل کے اصرار پر وہ بھی پی لیا۔ اس کے بعد مائیکل نے ایک اور گلاس منگوا لیا۔ یہ بھی پروفیسر کو زبردستی پلایا گیا۔ پروفیسر کا دل متلانے لگا لیکن مائیکل کسی طرح تھمنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا گلاس منگوا لیتا تھا۔ پانچواں گلاس پینے کے بعد پروفیسر نے قے کر دی مگر اس کی خطا معاف نہیں ہوئی۔ اسے دودھ پلانے کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ پروفیسر نے ہاتھ جوڑے' منتیں کیں لیکن کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ پروفیسر پینے سے انکار کرتا تھا تو اس کے سر پر کھڑا محافظ ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگاتا تھا۔ یہ ضرب یوں لگائی جاتی تھی کہ خون نہ بہے اور تکلیف بھی زیادہ ہو۔ پروفیسر کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی' وہ جتنا دودھ پیتا تھا اتنا ہی باہر نکل آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور قے کر کر کے گلا رندھ گیا تھا۔ وہ رو رہا تھا مگر اس کا رونا دھونا بیکار تھا۔ آخر وہ نیم بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ مائیکل نے اپنے کارندوں سے کہا کہ پروفیسر ڈیئر شاید سیر ہو گئے ہیں۔ باقی کا دودھ رکھ لیں' یہ کل پی لیں گے۔"

پروفیسر کے بارے میں زریں کی یہ اطلاع سن کر مجھے خاصا دکھ ہوا۔ مجھے کل صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ پروفیسر کو

ذلیل و رُسوا کیا جائے گا۔ میرے لیے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ پروفیسر بے خبری میں میرے ہی ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ بل سے نکل کر واپس آرہا تھا' سیڑھیوں کے قریب پہرے دار کو دیکھ کر اس نے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کے سبب میں چوکنا ہوا اور پروفیسر مجھ سے بچنے کے لیے بھاگ نکلا۔

چند روز پہلے بھی جب شائستہ نے ڈائننگ کے دوران میں پروفیسر کو بچانے کی کوشش کی تھی تو مائیکل باپ بیٹی پر بہت ناراض ہوا تھا اور میری اطلاع کے مطابق نہ صرف اس نے پروفیسر کو برا بھلا کہا تھا بلکہ شائستہ سے بھی خفا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا کہ یہ سوٹڈ بوٹڈ آدم خود نفسیاتی مریض بھی ہے۔ اپنے اردگرد کے لوگوں کو دکھ دے کر اور انہیں تکلیف دہ طریقے سے حیران کر کے اسے خوشی حاصل ہوتی تھی۔

میں نے زریں سے پوچھا کہ اب پروفیسر کہاں ہے؟

زریں نے بتایا "خواجہ اپارٹمنٹ میں ہے۔ رات کو ام اس کے پاس ہی سویا تھا۔ شاید اس کو نیند کا کوئی گولی کھلایا گیا تھا' وہ ساری رات نیم بے ہوش پڑا رہا تھا۔"

میں زریں کے بتائے ہوئے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ اسی اپارٹمنٹ کے ایک حصے میں میں نے ٹی وی اسکرینیں دیکھی تھیں اور ان کے سامنے آپریٹر کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو پروفیسر سامنے ہی نظر آگیا۔ وہ ایک اُجلے بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے سرہانے ٹیبل پر سیب اور انار دھرے تھے۔ چند فٹ کے فاصلے پر مائیکل بھی ایک کرسی پر براجمان تھا۔ میں اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر مائیکل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل گئی۔

میں نے کہا "مائیکل! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ پروفیسر کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ ایسا خاص تو نہیں ہوا۔" مائیکل نے شانے اچکائے "بس کھانے پینے میں تھوڑی سی بے احتیاطی ہو گئی تھی' اب تو جناب بالکل ٹھیک ہیں۔"

"یہ تو کئی ہفتے کے بیمار نظر آرہے ہیں۔" میں نے پروفیسر کے زرد چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

مائیکل نے قہقہہ لگایا "تم خواہ مخواہ پروفیسر کی فکر میں دُبلا ہونے کی کوشش نہ کرو' یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس رات کو تھوڑی سی بد پرہیزی ہو گئی۔ شائستہ نے دو تین بار کہا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے پروفیسر ڈیئر دودھ پیتے ہیں۔ میں نے کہا' چلو اتنے دن نہیں پیا' آج جی بھر کر پی لیں گے' میں نے تھوڑا سا زیادہ منگوا لیا۔ پروفیسر ڈیئر بھی جوش میں تھے' سب پی گئے۔ بعد میں طبیعت ناساز ہو گئی لیکن دیکھیے' اب وہ کتنے چنگے ہیں۔ ابھی کہہ رہے تھے' باقی کا دودھ منگوا لوں گا۔"

میں نے دیکھا' دودھ کا نام سن کر ہی پروفیسر کے چہرے پر متلی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ پروفیسر نحیف آواز میں بولا "خدا کے لیے' میرے سامنے یہ بات نہ کرو' میرا معدہ الٹ جائے گا۔"

"چچ چچ چچ۔" مائیکل نے تاسف کا اظہار کیا "یہ شراب تو نہیں ڈیئر۔ دودھ ہے۔ دودھ جیسے حلال مشروب سے ایک مسلمان کو ایسی بیزاری نہیں دکھانی چاہیے۔ بہت بری بات ہے یہ۔"

پروفیسر نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کے کان کے پاس ایک جگہ تھوڑا سا خون جما ہوا تھا۔ زریں گل کی یہ اطلاع بالکل درست تھی کہ رات کو زبردستی دودھ پلانے کے دوران میں پروفیسر کو زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "مائیکل! تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔"

"جو ہو رہا ہے یہ سب پروفیسر ڈیئر کے مرتبے اور حیثیت کو مدنظر رکھ کر ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "اگر یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے تو پھر تمہیں یقیناً دماغی علاج کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر میں اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

دوسری بار پروفیسر سے میری ملاقات شام کو ہوئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے گیا۔ وہ اسی طرح بستر پر لیٹا ہوا تھا اور خزاں رسیدہ پتے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں میں شفا بانٹنے والا آج خود مسیحائی کا طلب گار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا غم زدہ چہرہ کچھ اور بھی غم زدہ نظر آنے لگا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر فریاد کناں لہجے میں بولا "شاہ جہاں! یہ شخص مجھے مار کر چھوڑے گا۔ آج سونے سے پہلے یہ پھر مجھے دودھ پلائے گا۔ پلیز تم مجھے کہیں سے نیند کی دو تین گولیاں لا دو۔ میں رات ہونے سے پہلے ہی سو جانا چاہتا ہوں۔ گہری نیند میں ہوں گا تو شاید یہ لوگ مجھے نہ اٹھائیں۔ پلیز میری مدد کرو۔"

پروفیسر کی حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ انسان بھی کتنا بے بس ہے۔ اسے سزا دینے کے لیے دہکتی ہوئی سلاخوں اور کوڑوں وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کی نہایت دل پسند چیزوں کے ذریعے بھی اسے زندہ درگور کیا جاسکتا ہے۔

آزاد خیال لوگوں کے نزدیک شراب' عورت اور گوشت خوری زبردست عیاشی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن اگر کسی شخص کو یہی چیزیں مسلسل زبردستی استعمال کرائی جائیں تو یقیناً اس کی جان لبوں پر آجائے گی اور یہ سب کچھ اس کے لیے بدترین سزا کا ذریعہ بن جائے گا۔

میں نے پروفیسر کو تسلی دی اور کہا کہ میں اس کے لیے خواب آور دوا کا انتظام کرتا ہوں۔ میں پروفیسر کے کمرے سے نکل کر ٹہلتا ہوا کلینک کی طرف چلا گیا۔ یہاں سلیپنگ پلز کی ایک شیشی موجود تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے دوا لینے پر کمپاؤنڈر کسی طرح کا اعتراض نہیں کرے گا۔ جہاز کا عملہ مجھے اہمیت دینے لگا تھا' خاص طور سے جب سے میں مائیکل کے ہمراہ خصوصی ساتھی کی حیثیت سے "محبت کے جزیرے" پر رات گزار کر آیا تھا' میری حیثیت مسلمہ ہو گئی تھی۔ میں کلینک میں داخل ہو کر مطلوبہ الماری تک پہنچا لیکن۔۔۔ مایوسی ہوئی' سلیپنگ پلز والی بوتل وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر پلز کہیں نہیں ملیں حالانکہ آج دوپہری میں نے وہ پلز الماری میں دیکھی تھیں۔ میں نے کمپاؤنڈر سے پوچھا۔ یہ اطالوی شخص بے حد کم گو تھا۔ اس نے مختصراً نفی میں جواب دیا۔ اسے بھی پلز کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

میں سوچتا ہوا باہر آگیا۔ کلینک سے چند قدم کے فاصلے پر ہی زریں گل سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں سے آرہا ہوں۔

میں نے اسے تفصیل بتائی۔ پروفیسر کی پتلی حالت کا سن کر وہ بھی افسردہ ہو گیا۔ میں نے کہا "ابھی دو تین گھنٹے پہلے ہی میں نے نیند کی گولیاں یہاں دیکھی تھیں' اب مل نہیں رہیں۔ کمپاؤنڈر بھی بے خبر ہے۔"

اچانک زریں کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑے' پھر وہ بولا "استاد صیب! کہیں وہ گولی شائستہ بی بی تو نہیں لے گیا۔ ابھی۔۔۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے ام نے اس کو کلینک سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے کندھوں پر نیلا شال لے رکھا تھا۔ اوہ خدایا۔۔۔ استاد صیب ام کو پورا یقین ہو گیا۔ پورا پورا یقین ہو گیا۔"

"کس بات کا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ وہ گولی سولی شائستہ بی بی لے کر گیا ہوگا۔" زریں کی آنکھیں حلقوں میں گول گول گھوم رہی تھیں۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟" میرے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

"ام یہ ایسے کہہ سکتا ہے کہ وہ بہت۔۔۔ بہت پریشان لگتا ہے۔ ام نے دیکھا ہے' اس کا آنکھیں رو رو کر آلو کے مافق سوجا ہوا ہے۔ بالکل۔۔۔ نیم پاگل سا نظر آرہا تھا وہ۔ اس کے ارادے میں ضرور کوئی خرابی ہے استاد صیب۔ ام سچ کہتا ہے' آپ اس کا پتا کریں' کہیں وہ کوئی الٹا سیدھا کام نہ کر جائے۔"

زریں بے شک اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہتا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ اردگرد کے حالات پر اس کی گہری نظر رہتی تھی۔ اس کے تجزیے اکثر درست ثابت ہوتے تھے۔ میں اور زریں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی عرشے پر پہنچے۔ اب شام کے جھٹپٹے میں آسمان پر اکا دکا تارے نظر آنے لگے تھے۔ مائیکل اور شائستہ کا اسپیشل اپارٹمنٹ چند گز کے فاصلے پر نظر آرہا تھا مگر ہم اس کے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ دروازے پر مسلح پہرے دار موجود تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو اندر داخل ہونا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اچانک زریں کی نگاہ عرشے کے آخری حصے کی طرف اٹھ گئی اور وہ چیخ پڑا "استاد صیب! شائستہ بی بی تو شاید وہ بیٹھا ہوا ہے۔"

میں نے دیکھا' نیلی شال اور سفید قمیص کی جھلک دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عرشے پر لگی ایک رنگ دار چھتری کے نیچے کرسی پر ساکت بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر چائے کے برتن رکھے تھے۔ اس کے خوب صورت بال سمندری ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو رہے تھے مگر وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ میں دھیمے قدموں سے چلتا اوپر عرشے پر پہنچ گیا۔ یہاں ہوا کافی تیز تھی اور سمندر دور دور تک نظر آتا تھا۔ غزالہ کی ہدایت پر میں نے آنکھ سے پٹی اتار دی تھی اور سن گلاسز استعمال کر رہا تھا "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے شائستہ سے شائستگی سے پوچھا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں کانپ گیا۔ اس کا چہرہ ایک خرابا نظر آرہا تھا اور آنکھیں اس خرابے میں دو ویران کھنڈروں کی طرح تھیں۔ وہ خشک لبوں کو حرکت دے کر بولی "بیٹھیے۔" میں اس کے سامنے کرسی سنبھال لی۔

"کیا بات ہے' آپ کچھ پریشان ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں سے دو آنسو لڑھک گئے "آپ ڈیڈی سے ملتے ہیں نا؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "میرا پیغام ان تک پہنچا دیجیے گا۔ ان سے بولیے گا' میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں' مجھے معاف کر دیں۔"

شائستہ کے لہجے میں غم کا ایک سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ بات آپ خود بھی تو اپنے ڈیڈی سے کہہ

سکتی ہیں۔"

"مجھے ان سے ملنے نہیں دیا جاتا۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

"چلیں آج نہیں' کل سہی' دس دن بعد سہی' آخر کبھی تو ملاقات ہوگی۔ اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پتا نہیں ہوگی یا نہیں۔" آنسو اس کی آنکھوں کے بند توڑ کر ریلے کی طرح بہہ نکلنا چاہتے تھے۔ ایک خوں خوار خیای چند گز کے فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شائستہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ شاید وہ خوف زدہ تھی کہ اس کے آنسو بہہ نکلیں گے اور خیای انہیں دیکھ لے گا۔

میں نے شائستہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنے ڈیڈی سے دوبارہ ملنے کے سلسلے میں اتنی مایوس کیوں ہیں؟" وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ خواب آور گولیاں آپ نے کہاں رکھی ہیں؟"

وہ بری طرح چونک گئی اور اس کے ہونٹ تھرا اٹھے۔ میں نے نرم لہجے میں کہا "مسز شائستہ! مسائل کا جو حل آپ سوچ رہی ہیں' وہ یکسر غلط ہے۔ آپ مشکلات سے فرار چاہ رہی ہیں۔ آپ کا یہ فرار آپ کے ڈیڈی کو زندہ در گور کر دے گا۔"

وہ ایک دم بھڑک اٹھی "وہ پہلے کون سا زندہ ہیں۔ ان کو بے عزت کیا جا رہا ہے' بے رحمی سے اذیت دی جا رہی ہے۔ میرے ڈیڈی۔۔۔ میرے ڈیڈی کو تنکے سے حقیر کر دیا گیا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی "اور یہ سب کس وجہ سے ہو رہا ہے؟ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ صرف میری وجہ سے۔ میں ہی نہ رہوں گی تو ڈیڈی کی مجبوریاں بھی نہ رہیں گی۔ میری موت ہی میرے ڈیڈی کے دکھوں کا علاج ہے۔"

اس نے سر میز سے ٹکایا اور ہچکیوں سے روتی چلی گئی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی اس نے گولیاں وغیرہ کھانے کی حماقت نہیں کی ہے مگر وہ اس حماقت کے لیے پوری طرح تیار نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "شائستہ حالات بے شک مشکل ہیں لیکن تم اس کا اثر ضرورت سے زیادہ لے رہی ہو۔ اگر تم۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹی "رات اپنے بیڈ روم میں' میں اپنے ڈیڈی کی آوازیں سنتی رہی ہوں۔ وہ ساتھ والے اپارٹمنٹ میں روتے رہے ہیں۔ بار بار رونے کرتے رہے ہیں۔ مجھے سب پتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہیں آخری حد تک ذلیل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس کا سبب میں ہوں۔ میں نہ رہوں گی تو مائیکل کے سینے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی اور ڈیڈی کی مصیبتیں بھی آسان ہو جائیں گی۔"

"لیکن آپ کی اس بے وقوفی سے وہ جس شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے اس کے بارے میں آپ کچھ جانتی ہیں؟ وہ جو آپ کی دوری نہیں برداشت کر سکتے' آپ کا "نہ ہونا" کیسے برداشت کریں گے؟"

"پھر میں کیا کروں۔ مجھ سے ڈیڈی کی یہ توہین اور تکلیف مزید برداشت نہیں ہوتی۔ میں انہیں ہر مجبوری سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں۔"

"دیکھیں شائستہ! خود کشی ایک سنگین جرم ہے لیکن آپ اس کے ساتھ ساتھ قتل بھی کریں گی۔ آپ کے جسم میں جو معصوم زندگی ہے اس کا خون بھی آپ کی گردن پر ہوگا پھر میں آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں' آپ ایک اور شخص کو بھی جان سے ماریں گی اور وہ آپ کے پیارے پاپا ہوں گے۔ اللہ نہ کرے اس کی نوبت آئے لیکن مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ آپ نے زندگی سے منہ موڑا تو وہ بھی موت کو گلے لگا لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مائیکل ہی کو مارنے کی کوشش میں زندگی ہار بیٹھیں۔"

میں بڑی نرمی اور ہمدردی سے شائستہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے اشتعال میں معمولی سا فرق محسوس ہونے لگا۔ وہ روتے ہوئے بولی "مسٹر شاہ جہاں! آخر ڈیڈی ایسے کیوں ہیں' وہ کیوں اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے؟ کبھی کبھی تو مجھے ان پر بھی غصہ آنے لگتا ہے' کیوں وہ مجھے میرے حال پر نہیں چھوڑ دیتے' جو میری قسمت میں لکھا ہے وہ میرے ساتھ ہو کر رہنا ہے۔ وہ کیوں میری ہر مشکل کو اپنے دل و دماغ کا روگ بنا رہے ہیں۔ وہ جب۔۔۔ مائیکل کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں تو میرا دل خون ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا حکم یوں مانتے ہیں جیسے یہ خدائی حکم ہو' مائیکل انہیں گھٹیا ترین کاموں پر آمادہ کرتا ہے اور وہ آمادہ ہوتے چلے جاتے ہیں' مائیکل کے کہنے پر انہوں نے برش سے قالین تک صاف کیے ہیں۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں برداشت ہوتا۔ کاش وہ اصرار کر کے اس جہاز پر سوار نہ ہوئے ہوتے۔ وہیں پاکستان میں رہ گئے ہوتے۔"

میں شائستہ کی ذہنی کیفیت کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا اور جب کسی کی ذہنی کیفیت کا پتا چل جائے تو پھر اس کو قائل کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ پہلے سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کیا سوال کرے گا اور پہلے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا

جواب کیا ہوگا اور جب ایسا ہو جائے تو پھر بات چیت میں ایک لیڈنگ پوزیشن حاصل ہو جاتی ہے۔ میں شائستہ کے ساتھ دس پندرہ منٹ مصروفِ گفتگو رہا۔ میں نے اسے ذرا ادائی انداز میں یقین دلایا کہ نہ صرف پروفیسر کے رویے میں نمایاں تبدیلی ہوگی بلکہ حالات بھی بڑی تیزی سے تبدیل ہوں گے۔ میں نے شائستہ سے کہا "دیکھیں۔ آپ مجھے صرف دو روز کی مہلت دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے پاپا کو ایک بدلا ہوا شخص پائیں گی' آپ کو ان کے حوالے سے کوئی ایسا منظر نظر نہیں آئے گا جس سے آپ کو شرمندگی ہو۔ اس کے علاوہ یہ مایوس کن حالات بھی بس چند دن کے مہمان ہیں۔ یہ سب کچھ بدلنے والا ہے۔"

میرے مسلسل سمجھانے بجھانے کے نتیجے میں شائستہ قدرے نارمل نظر آنے لگی' اس نے کہا "میری طرف سے خواہ مخواہ فکر مند نہ ہوں' میں کچھ نہیں کرنے جا رہی۔" مگر میں اتنی آسانی سے اس کی بات پر یقین کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سلیپنگ پلز مجھے واپس دے دے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی اور پس و پیش سے کام لیتی رہی' آخر میرے پیہم اصرار پر وہ میرے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں آئی اور اس نے گولیوں والی شیشی مجھے واپس کر دی۔ بہرحال مجھے شک رہا کہ اس نے زیادہ نہیں تو دو چار گولیاں ضرور پاس رکھی ہیں۔ اس کامیاب "مشن" کے بعد میں نیچے زریں گل کے پاس واپس آ گیا۔ وہ ایک کیبن کی اوٹ میں ایم ور راز بڑی بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا استاد صیب؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"کس چیز کا؟"

"گولیوں کا۔"

"ہاں گولیوں کا پتا چل گیا اور گولیوں والی کا بھی۔ وہ بے چاری کافی سے زیادہ دکھی ہو رہی ہے۔ بڑی مشکل سے سنبھالا ہے اسے۔۔۔ لیکن ابھی صرف پچاس ساٹھ فی صد ہی سنبھلی ہے۔"

"مگر جناب گولیاں تو آپ لے ہی آیا ہے نا۔"

"جس نے مرنے کا ارادہ کر لیا ہو اس کے پاس ایک سو ایک راستے ہوتے ہیں' بہرحال امید ہے کہ کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوگی۔"

زریں کے ہاتھ میں زیتون کے تیل کی شیشی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا چکر ہے بھئی؟"

وہ بولا "وہی مصیبت جی! اب ایک حبشی نورمین نے ام کو مالش کے لیے بلایا ہے۔ پتا نہیں ام سے کون سا گناہ ہوا تھا جو اللہ نے ام کو یہ مصیبت دکھایا۔ اگر ادھر امارے پشاور میں کسی کو پتا چل جائے کہ ام انگریزوں کا مالش کرتا رہا ہے تو سب ام پر تھو تھو کرے گا۔ ام کو تو علاء الدین کا وہ فلم یاد آنے لگا ہے' جس میں اس نے ایک ذلیل نوکری سے تنگ آ کر خود کشی کا کوشش کیا تھا۔"

میں نے کہا "اگر تم ایسی کوئی کوشش کرنا چاہو تو میں مدد کر سکتا ہوں' یہ نیند کی گولیاں حاضر ہیں۔"

زریں بولا "شاید کھا ہی لیتا' اگر کلثوم کا خیال نہ ہوتا تو۔۔۔ ویسے بھی کل ام نے مائیکل سے جو بات سنی ہے اس نے دل میں تھوڑا بہت امید پیدا کیا ہے۔"

"کیا بات؟"

"کل جب ام مائیکل کے گینڈے جیسے پنڈے کا مالش کر رہا تھا' وہ بولا تھا کہ ام بس تین دن بعد خشکی پر ہوگا۔"

زریں کی اطلاع واقعی اہم تھی مگر سوال یہ تھا کہ زریں تو انگریزی جانتا نہیں' اس نے مائیکل کی بات کیسے سمجھی۔ میں نے جب یہی بات زریں سے پوچھی تو وہ بولا "استاد صیب! ام آپ کا شاگرد ہے۔ اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہے۔ ام کو "بیچ" کا پتا ہے۔ بیچ وہی ہوتا ہے نا جہاں فرنگی لوگ ننگا ننگا نہاتا ہے پھر خوچے اپنا پیچھا آسمان کی طرف کر کے دھوپ میں لیٹا رہتا ہے؟" میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ زریں بولا "مائیکل نے ام کو بتایا کہ بیچ یا کوسٹ اب زیادہ دور نہیں۔ اس نے تین انگلیاں کھڑی کیں اور ساتھ میں DAYS کہا۔ یعنی تین دن بعد ام ساحل پر ہوگا۔"

"ممکن ہے کہ اس نے کچھ اور کہا ہو۔ مثلاً یہ کہ ساحل پر جا کر وہ تم سے تین دن مالش کرایا کرے گا اور باقی تین دن تمہیں چیف انجینئر کی موٹی تازی بیوی کی مالش کرنا پڑے گی۔"

"خدا کے لیے استاد صیب! امارے سامنے اس پلپلی فرنگن کا ذکر مت کرو۔ امارا تو منہ کو آنے لگتا ہے۔"

"پتا منہ کو نہیں آتا کلیجا منہ کو آتا ہے۔"

"جب دل زیادہ خراب ہو تو سب کچھ منہ کو آ جاتا ہے۔ باقی یہ سب ام آپ کو ابھی بتا دے کہ اگر اس فرنگن نے ام کو اپنی پنڈلیوں سے آگے جانے کو کہا تو ام قاتل بننے سے گریز نہیں کرے گا۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔" میں نے کہا "اگر تمہاری اطلاع واقعی درست ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگلے اڑتالیس گھنٹے میں ہم افریقہ کے کسی کنارے کو چھو سکتے

ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" زریں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ "ام تو چاروں طرف سمندر دیکھ دیکھ کر عاجز آگیا ہے' جی چاہتا ہے کہ کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر گانا شروع کردے۔ زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا۔ ام بھی تو انسان ہے پتھر تو نہیں۔"

"زندگی کی جگہ سمندر کا لفظ لگالو تو یہ گانا زیادہ فٹ بیٹھے گا۔"

زریں سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "رات ام سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچی پکی نیند میں اچانک ام کو یوں لگا جیسے سائیں عالی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بوری تھی۔ کہنے لگا' زریں گل ام تمہارے لیے نسوار لے کر آیا ہے۔ پشاور کا اصلی مسالے والا نسوار' تمہارا جی خوش ہو جائے گا' ام نے پوچھا' سائیں جی' ابھی امارا کتنا مشکل باقی رہ گیا ہے' ام اپنے وطن کب لوٹے گا۔ وہ بولا' تمہارا ستارہ ابھی گردش سے نکلا نہیں' میں نے اپنے ایک سو موکلوں کو حکم دیا ہے' وہ تمہارے ستارے کو باقاعدہ کھینچ کھانچ کر گردش سے نکالنے کا کوشش کرے گا۔ بالکل جیسے دلدل میں پھنسی ہوئی بیل گاڑی کو زور لگا کر نکالا جاتا ہے۔ ام نے پوچھا' سائیں جی پھر بھی کتنا دیر لگے گا' وہ بولا' جب تمہاری نسوار کا یہ بوری ختم ہو جائے گا تو تمہارا مشکل بھی ختم ہو جائے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا جی' ام ساری رات کچی پکی نیند میں رہا' ام کو یوں لگا کہ ام مٹھیاں بھر بھر کر نسوار اپنے منہ میں رکھتا رہا ہے اور بوری جلد سے جلد ختم کرنے کا کوشش کرتا رہا ہے۔"

"سائیں عالی دوبارہ تشریف نہیں لایا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو بس اک خیال تھا جی۔ وہ جس طرح وحید مراد صاحب کا گانا ہے نا' بھولی ہوئی ہوں داستاں' گزرا ہوا خیال ہوں۔"

زریں گل نے بیٹھے بٹھائے سائیں عالی کی یاد دلا دی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ اور سروج کہاں اور کس حال میں ہیں۔ سائیں سے آخری ملاقات لاہور میں ہی ہوئی تھی۔ جب اس نے فزالہ کے حوالے سے رات گیارہ چالیس پر کسی زلزلے کی پیش گوئی کی تھی اور ہم سب مائیکل جیسی آدم خور "مصیبت" کا شکار ہو کر اس بحری جہاز پر آن پہنچے تھے آج تک اس سے پہلے ہم جہاں کہیں بھی گئے تھے سائیں کسی پرچھائیں کی طرح ہمارے پیچھے ہی آگیا تھا اور اگر کبھی نہیں آیا تھا تو اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتا رہا تھا لیکن اس بار ایسا کوئی چمتکار نہیں ہوا تھا اور نہ ہی امید تھی کہ ہوگا۔

میں پروفیسر اللہ دتا سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں اپارٹمنٹ میں پہنچا تو دروازے پر مسلح پہرے دار موجود تھا۔ اپارٹمنٹ کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں' اندر سے کوئی آواز وغیرہ بھی نہیں آرہی تھی' پہرے دار جوزف سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب سو رہے ہیں۔ میں نے کہا "میرا ملنا ضروری ہے۔"

وہ بولا "باس نے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے۔ انہیں سونے دیا جائے۔"

میں سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا' اپارٹمنٹ کے اندر کسی طرح کی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد میں واپس آگیا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ پروفیسر چونکہ کل ساری رات کا جاگا ہوا تھا لہٰذا آج بغیر سلیپنگ پلز کے ہی سو گیا تھا۔

پروفیسر سے اگلی صبح دوسرے عرشے پر ملاقات ہوئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا اور بہت تھکا ماندہ نظر آرہا تھا۔ وہ بے دم سا ہو کر میرے پاس ہی ایک تختے پر بیٹھ گیا۔

"ہاں پروفیسر' کیا حال ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بس کچھ نہ پوچھو۔" اس نے مری مری آواز نکالی "یہ مائیکل۔ مجھے مار کر ہی چھوڑے گا۔"

میں نے دیکھا کہ پروفیسر کے گال اور گردن پر دو سرخ نشان سے نظر آرہے ہیں۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ لپ اسٹک سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ میں نے کہا "رات کو کوئی مشکل پیش تو نہیں آئی؟"

پروفیسر نے آہ بھر کر کہا "اس بدبخت نے ایک فاحشہ میرے کمرے میں بھیج دی تھی' رات بھر اس نے میرا جینا دوبھر کیے رکھا ہے۔ وہ ہر طرح مجھے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچا رہا ہے۔" شدت جذبات سے پروفیسر کی آواز بھرا گئی "اب ذرا سوچو' میری بیٹی کی عمر کی لڑکی مجھ سے واہیات باتیں کرے اور میرے ساتھ سونے پر اصرار کرے تو میری کیا حالت ہوگی۔ میں قسم کھاتا ہوں شاہ جہاں۔ اگر چند روز اور میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا تو میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔"

پروفیسر نے جو تفصیل بتائی اس سے معلوم ہوا کہ رات پروفیسر کی منت سماجت پر مائیکل نے "دودھ سے تواضع" کرنے والی سزا تو معطل کردی تھی مگر اس کے بدلے میں ایک اور سزا مسلط کردی گئی تھی اور پروفیسر کے لیے یہ سزا

بھی کچھ کم اذیت ناک نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھتے رہتے تھے پروفیسر ایک مذہبی شخص تھا۔ اکثر اس کے ہاتھ میں تسبیح نظر آتی تھی اور وظائف اس کے ہونٹوں پر رہتے تھے۔ ایسے شخص کو ایک نیا خاص قسم کی کم عمر لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند کروایا گیا تھا اور یقیناً لڑکی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پروفیسر کی پارسائی پر حملے کرکے ہر طرح اسے تاراج کرے۔

میں نے دیکھا کہ پروفیسر کا رنگ ہلدی ہو رہا ہے اور اس کا جسم ہولے ہولے کانپتا جا رہا ہے۔ پروفیسر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم سہم کر خاموش ہو گیا۔ وہ برج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ مجھے مائیکل نظر آیا۔ اس کے ساتھ جہاز کا شرابی کپتان جم تھا۔ دونوں جہاز کے مستول کی طرف جا رہے تھے۔ دیو ہیکل مائیکل کا سیاہ رنگ فولاد کے مانند دمک رہا تھا۔ وہ ایک مہذب درندہ تھا جو تھری پیس سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر چشمہ لگائے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ وہ جب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو پروفیسر کی جان میں جان آئی۔

میں نے کہا "پروفیسر! آپ مائیکل سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ آپ کا ہراس آپ کی بیٹی کا حوصلہ بھی پست کردے گا۔ اسے تو آپ سے بھی زیادہ حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ اسے دن رات مائیکل کے ساتھ رہنا ہے' اس کے ساتھ گزر بسر کرنی ہے۔ اسے نفسیاتی طور پر بہت مضبوط ہونا چاہیے۔"

پروفیسر نے کہا "میں کیا کروں۔ میں اپنی شائستہ سے دور نہیں رہ سکتا اور اس کے قریب رہنے کے لیے ضروری ہے کہ میں مائیکل سے کسی بات پر اختلاف نہ کروں۔"

میں نے ذرا بیزاری سے کہا "اختلاف کرنا اور بات ہے پروفیسر۔ خود کو کسی کے قدموں میں گرا دینا اور بات۔ باقی یہ جو آپ کہہ رہے ہیں تاکہ آپ شائستہ سے دور نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی بلند ہمتی کی نشانی نہیں ہے۔ آپ خدا پر بھروسا رکھنے والے شخص ہیں' آپ کو شائستہ کے سلسلے میں اس قدر پریشانی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"سچ جانو شاہ جہاں! میں نے پچھلے بیس برسوں میں شاید ایک دن کے لیے بھی اپنی بیٹی کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کیا۔ اب اسے مہینوں یا برسوں کے لیے خود سے جدا کرادوں۔ یہ سوچ کر ہی میری سانس رکنے لگتی ہے۔"

"پروفیسر! آپ شائستہ کو ایک دن کے لیے بھی خود سے جدا نہیں کرتے نا۔ لیکن کل رات وہ آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہونے جا رہی تھی۔" میں نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

پروفیسر کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا "کیا۔ کہہ رہے ہو۔ تم؟" وہ ہکلایا۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سلیپنگ پلز کی شیشی نکال لی "شائستہ کل رات خودکشی کرنے لگی تھی۔ یہ دیکھیں۔ یہ تھیں وہ گولیاں جو میں نے اس سے زبردستی لی ہیں۔"

کانپتا ہوا پروفیسر کچھ اور بھی لرزہ براندام ہو گیا۔ اس نے شیشی میرے ہاتھ سے لی اور دیکھتا چلا گیا۔ میں نے کہا "جب کل شام میں آپ کے لیے نیند کی دوا لینے گیا تو یہ شیشی الماری میں سے غائب تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ شیشی شائستہ کے پاس ہے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا وہ بھی میں نے پروفیسر کو بتایا۔ پروفیسر بالکل نڈھال سا ہو گیا۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا "پروفیسر اگر آپ اپنی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتے تو پھر خود کو سنبھالنا ہوگا۔ مجھے یہ بات کہنی نہیں چاہیے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اگر شائستہ آپ کو اسی طرح مائیکل کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھتی رہی تو وہ اپنی جان لے لے گی۔ میں اس کا نفسیاتی مسئلہ بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں' موجودہ حالات اسے دکھ تو دیتے ہیں لیکن وہ ان کا مقابلہ کر سکتی ہے بلکہ میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ ہر بڑی سے بڑی آفت کو بھی قبول کرلے گی' اگر کوئی بات اس کی برداشت سے باہر ہے تو وہ مائیکل کے ہاتھوں آپ کی مسلسل توہین اور رسوائی ہے۔ یہ سب کچھ اس کی روح کو چھید ڈالتا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" پروفیسر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ نے اپنے دل و دماغ پر مائیکل کا جو بے پناہ خوف طاری کر رکھا ہے اسے اتار پھینکیں۔ مائیکل کے سامنے آپ کی حد سے بڑھی ہوئی عاجزی اور بات بات پر منت سماجت کا رویہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچائے گا اور نہ شائستہ کو۔ الٹا یہ سب کچھ آپ کی جگ ہنسائی کا سبب بنے گا اور مائیکل کی آپ پر سختی بڑھتی چلی جائے گی۔"

"تم ایک بیٹی کے باپ نہیں ہو نا اس لیے ایسی بات کر رہے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ مجھ جیسے بدنصیبوں کی کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"میں بیٹی کا باپ نہیں ہوں لیکن آپ کا درد بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اور اس درد کو بھی سمجھ رہا ہوں جو

خدانخواستہ شائستہ کے کسی غلط قدم کی وجہ سے آپ کے حصے میں آسکتا ہے۔" پروفیسر کے ہونٹ ایک بار پھر کانپنے لگے۔

میں نے کہا "آپ کو یہی ڈر ہے ناکہ آپ کی حکم عدولی کی سزا شائستہ کو ملے گی۔ وہ مائیکل کی سفاکی کا نشانہ بنے گی اور اسے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ کم از کم چند ماہ تک تو اس قسم کا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شائستہ مائیکل کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ ہونے والے بچے کا مائیکل کو بہت چاؤ ہے اور اس سلسلے میں وہ محتاط بھی بہت ہے۔ اپنے ہونے والے بچے کی زندگی کے لیے وہ کسی قسم کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔ مائیکل جیسے درندہ صفت لوگوں کی نفسیات بہت عجیب ہوتی ہے' یہ کئی معاملات میں بہت حساس بھی واقع ہوتے ہیں۔"

میں نے غور سے پروفیسر کے تاثرات دیکھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری بات کسی حد تک اس کے دل کو لگی ہے۔ میں نے قریباً آدھ گھنٹے تک اس سے بات چیت جاری رکھی۔ میں نے یہ بات بڑی اچھی طرح اس کے ذہن میں ڈال دی کہ اگر وہ شائستہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے حالات کا مقابلہ حوصلے سے اور باوقار طریقے سے کرنا ہوگا۔ باوقار طریقے سے اذیت برداشت کر لینا یا جان دے دینا اور بات ہے لیکن ایک ظالم کے سامنے سرنگوں ہونا اور اس کے قدموں میں گر کر رسوا ہونا اور بات ہے۔

میں نے اپنی گفتگو میں دو تین بار قدموں میں گرنے کا ذکر کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پروفیسر کو مائیکل کا وہ ذلت آمیز سلوک یاد آجائے جب اس نے پروفیسر کو نہ صرف اپنے جوتے چاٹنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اس شرمناک منظر کی تصویر کشی بھی کرلی تھی۔ معلوم نہیں کہ پروفیسر کو وہ بات یاد آئی یا نہیں بہرحال اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری باتوں نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں پروفیسر کی نگاہ گاہے بہ گاہے سلیپنگ پلز کی شیشی پر چلی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ اندیشے امڈ آتے تھے۔

اچانک میں ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ یہ دُبلی پتلی اطالوی لڑکی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے صرف ایک آدھ بار ہی جہاز میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کا نام سوزی تھا اور یہ جہاز کے اس حصے میں رہتی تھی جہاں جہاز کی خفیہ فورس ۲۰ عدد کمانڈوز اور 4-Z1۲ گنوں کی صورت میں موجود تھی۔ یہ لڑکی خفیہ فورس کے ارکان کے دل بہلاوے کے لیے جہاز میں موجود تھی۔ وہ لنکتی مٹکتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی۔ اس نے براؤن نیکر پہن رکھی تھی اور اوپر نیلے رنگ کی پتلی سی ہاف سلیو شرٹ تھی۔ شرٹ لمبائی میں کافی کم تھی۔ شرٹ اور نیکر کی بیلٹ کے درمیان جو تین انچ کا فاصلہ تھا' اس میں لڑکی کا سرخ و سپید پیٹ جھانک رہا تھا' اس کی نہایت باریک شرٹ کا ہونا یا نہ ہونا بھی برابر ہی لگتا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو شانوں پر جھٹکتی اور اپنے انگ انگ کو حرکت دیتی ہوئی ہمارے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

"ہیلو ینگ مین' کیا حال ہے؟" وہ پروفیسر کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے بولی۔

مجھے پتا چلا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو رات کو پروفیسر کے لیے عذاب بنی رہی ہے۔ اس کا فراوا کے انگ انگ سے شوخی اور مستی ٹپک رہی تھی۔ آنکھیں یوں نیم باز تھیں جیسے پوری بوتل چڑھا کر آئی ہے لیکن یہ شراب کا نہیں اس کے اپنے خون کا نشہ تھا۔ اس نے پروفیسر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور ایک آنکھ میچ کر مسکرائی۔

پروفیسر نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر لڑکی سے بولا "جاؤ' اپنے کمرے میں جاؤ۔"

وہ سسکاری لے کر بولی "اُف گاڈ' اکیلی کیسے جاؤں۔ کمرا کاٹنے کو دوڑتا ہے تمہارے بغیر ینگ مین۔"

پروفیسر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا' دوسرا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا' اوپر برج پر اور مستول کے قریب تین چار افراد موجود تھے اور شوخ نظروں سے پروفیسر کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

سوزی نامی یہ لڑکی بڑی قاتلانہ ادا کے ساتھ پروفیسر کے پہلو میں بیٹھ گئی' وہ پروفیسر پر قربان ہی ہوئی جا رہی تھی "اوہ سویٹ۔ تمہیں چھو کر تو بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی سویا ہوا آتش فشاں ہو۔ اوپر سے ٹھنڈا' اندر سے انگارا۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا "لگتا ہے کہ گرمی تمہارے اندر بھی بہت زیادہ ہے؟" میں نے کہا۔

"تت۔۔۔ تم کون ہو؟" وہ ہکلائی۔

"جاگتا ہوا آتش فشاں۔" میں نے کہا۔

اس نے انگلش میں گالی داغ دی۔ جواباً میں نے بھی انگلش کی ایک کلاسیکل گالی دی۔ اس نے اپنا آزاد ہاتھ گھمایا۔ غالباً طمانچہ لگانا چاہ رہی تھی مگر گھوم کر رہ گئی۔ دوسری کلائی چونکہ میری گرفت میں تھی لہٰذا اس کا بازو مڑ کر کمر سے جا لگا۔ میں نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ پروفیسر کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ لڑکی لڑائی بھڑائی کی بھی شُدبُد رکھتی تھی' اس

مزاحمت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہی سیکنڈ بعد وہ عرشے کے فرش پر اوندھی پڑی تھی اور میں نے اپنا گھٹنا اٹھا لیا۔ اس کی کمر پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی شرٹ اوپر تک کھسک گئی تھی کمر قریباً کندھوں تک نظر آنے لگی تھی۔ مسلح حبشی دوڑتے ہوئے آئے۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں۔ انہوں نے مجھے سوزی سے علیحدہ کیا۔ جوزف نے رائفل کی نال بالکل میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔ سوزی جیسے غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر جھپٹی پھر اس نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ایک پہرے دار کے ہاتھوں میں "ای بوکو" نظر آیا۔ اس نے "ای بوکو" چھینا اور تند بگولے کی طرح میری طرف آئی۔ اس کے تیوروں سے لگتا تھا کہ چند سیکنڈ میں میری چمڑی ادھیڑ دے گی مگر اس سے پہلے کہ ای بوکو مجھ پر الٹتا' میری خیر خواہ ڈورتھی نے سوزی کا راستہ روک لیا۔ نائب کپتان فلیمنگ کی بیوہ اس سے پہلے بھی اپنی خیر خواہی کا ثبوت دے چکی تھی۔ وہ سوزی کو سنبھال کر ذرا پیچھے لے گئی۔ اسی دوران میں جہاز کا کپتان فربہ اندام جم بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ فل نشے میں نظر آرہا تھا۔ نشے میں اس کی آواز کچھ مزید بارعب اور آنکھیں چمک دار ہو جاتی تھیں۔

اس نے ای بوکو سوزی کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا "سویٹ گرل! میں کتنی بار تم لوگوں سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے جہاز پر دنگا فساد نہیں چاہیے۔ یہ میرا جہاز ہے اور میں اس پر کسی طرح کی نحوست نہیں دیکھ سکتا۔"

سوزی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا حسین چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کیپٹن جم نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "دماغ ٹھنڈا کرو لڑکی' دماغ ٹھنڈا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ کس سے جھگڑ رہی ہو؟"

"کون ہے یہ باسٹرڈ؟"

"جب تمہیں معلوم ہو جائے گا تو تم باسٹرڈ نہیں کہو گی اور نہ ہی تمہارا غصہ باقی رہے گا لیکن پہلے بیئر کے یہ دو گھونٹ پی لو تاکہ تمہارا درجۂ حرارت کچھ کم ہو۔"

اس نے بیئر کا ٹن سوزی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سوزی نے غصے میں کھولتے ہوئے دو گھونٹ لیے۔ کپتان جم اسے بازو سے پکڑ کر تھوڑی دور ایک کرسی پر لے گیا۔ وہ قدرے پُرسکون دکھائی دینے لگی۔ تاہم اس کا سینہ ابھی بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کپتان جم نے کہا "کل تم پوچھ رہی تھیں نا کہ ٹام کو مقابلے میں کس نے چت کیا تھا؟"

سوزی کی سوالیہ نظریں کپتان جم پر لگی تھیں۔

جم نے کہا "یہی ہے وہ شخص۔ اس کا نام شاہ جہاں ہے۔"

سوزی کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ کچھ دیر تک یک ٹک میری جانب دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے کے تمام نقوش ملائم اور مسکراتے ہوئے دکھنے لگے۔ وہ اٹھ کر میری طرف آئی "تو تم شاہ جہاں ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "مجھے بہت افسوس ہے کہ ہماری ملاقات اس انداز میں ہوئی۔ میں تو دو تین بار کپتان صاحب سے تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہوں۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولی "ٹام کا حشر خراب ہونے سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تو وہ انسان تھا ہی نہیں۔ اس کی ماں یقیناً کسی پاگل ریچھ کے ساتھ سوتی رہی تھی۔" اس نے نفرت سے فرش پر تھوک دیا۔

یقیناً سوزی نامی یہ لڑکی آنجہانی ٹام کے ہاتھوں کوئی زبردست قسم کی زک اٹھا چکی تھی جو اس کی موت پر اتنی خوش ہو رہی تھی۔

کپتان جم جھومتا ہوا ہمارے قریب آیا اور سوزی سے مخاطب ہو کر بولا "میرا خیال ہے کہ اب تو تمہیں ای بوکو کی ضرورت نہیں ہے؟"

"ضرورت تو ہے مگر اب میں یہ ای بوکو مسٹر شاہ جہاں کے ہاتھ میں تھمانا چاہتی ہوں۔ میں نے ان کی کافی بے عزتی کی ہے۔"

کپتان جم نے کہا "تیری اُجلی چمکیلی چمڑی پر ای بوکو کون برسانا چاہے گا' یہ تو پیار کرنے کے لیے بنی ہے۔"

سوزی نے مست نظروں سے میری طرف دیکھا' جیسے بے زبان خاموشی پوچھ رہی ہو "کیا خیال ہے کپتان جم کی رائے کے بارے میں؟"

میں نے محسوس کیا کہ مسز ڈورتھی خشک نظروں سے سوزی کو گھور رہی ہے۔ غالباً سوزی ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں بڑی عمر کی سنجیدہ عورتیں ایسی ہی نظروں سے گھورتی ہیں۔ میں نے سوزی کو ذرا لگاوٹ سے دیکھا "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے گرم جوشی سے ہاتھ دبایا۔ ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھچ گئے۔ یوں لگا کہ جیسے یہ ہونٹ خفیہ قسم کے اشارے کر رہے ہیں۔

اسی شام سات آٹھ بجے کے قریب سوزی سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں کنٹرول روم کے

عقب میں ریلنگ کے سہارے کھڑا تھا۔ کوئی دبے قدموں آیا اور میرے شانے سے شانہ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوزی تھی۔ اس کے سنہری بال سمندری ہوا کے جھونکوں سے اڑ رہے تھے اور میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اس نے انہیں سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بڑی حوصلہ افزا قسم کی ادا تھی۔ سوزی ٹائپ کی لڑکیاں ایسی اداؤں میں ماہر ہوتی ہیں۔ میں نے آج صبح جان بوجھ کر سوزی میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش کرے گی اور میرا یہ یقین درست ثابت ہوا تھا۔

میں اور سوزی ریلنگ کے سہارے کھڑے اپنے سامنے نیم تاریک سمندر کو گھورتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ رسمی سی باتیں تھیں، موسم کی، سمندر کی اور سفر کی۔ سوزی کا خیال بھی یہی تھا کہ ایک آدھ دن میں ہم منزل پر پہنچ جائیں گے۔ منزل کون سی تھی، اس بارے میں وہ نہیں جانتی تھی یا بہت سی دوسری باتوں کی طرح وہ اس موضوع پر بھی اظہار خیال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بہت محتاط گفتگو کر رہی تھی اور اپنے ٹائپ کی لڑکیوں کی طرح خاصی چالاک نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ ٹام کے ساتھ اس کی کیا دشمنی تھی، اس نے صرف اتنا بتایا کہ ٹام اسے جنسی طور پر ہراساں کیا کرتا تھا، تاہم اس کے انداز سے عیاں تھا کہ بات کچھ اور بھی ہے۔ جلد ہی میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے سوزی سے پوچھا کہ وہ ہاتھ دھو کر پروفیسر اللہ دِتا کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟

وہ بولی "میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرے دماغ میں خلل ہے کہ میں اپنی راتیں اس پلپلے اولڈ مین کے ساتھ برباد کروں۔ مجھے یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے اور میں اسے نبھانے پر مجبور ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ وہ یہی جواب دے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ پروفیسر اس کے ہاتھوں کتنا دکھی ہے اور آنے والے واقعات کا خوف اسے کس طرح ہلکان کر رہا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اس معاملے میں میرے کہنے پر پروفیسر سے خصوصی رعایت برتے۔ ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ سوزی مان گئی۔ وہ بڑی ذو فہم لڑکی تھی اور اس سارے معاملے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

جس وقت ہم گفتگو کر رہے تھے، ایک چھوٹی سی گیند فرش پر لڑھکتی ہوئی آئی۔ چند لمحے بعد گیند کے پیچھے ہی پیچھے ننھا تابی برآمد ہوا۔ تابی کے پیچھے غزالہ تھی۔ اس نے شام کے جھٹپٹے میں مجھے اور سوزی کو ریلنگ کے سہارے کھڑے دیکھا تو چونک سی گئی۔ اسی دوران میں سوزی نے جھک کر گیند اٹھائی۔ وہ بدستور نیکر اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اس کا جسم توبہ شکن انداز اختیار کر لیتا تھا اور وہ اپنی اس حشر سامانی سے پوری طرح آگاہ بھی رہتی تھی۔ تابی نے گیند لینے کے لیے سوزی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے تابی کو اٹھا کر "چٹ چٹ" اس کے دو تین بوسے لیے اور پھر اسے گیند سمیت غزالہ کے حوالے کر دیا۔ غزالہ تابی کو لے کر اپارٹمنٹ کی طرف چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو غزالہ کچھ خاموش خاموش نظر آ رہی تھی۔ آج کل میں اکثر و بیشتر غزالہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ذہن کی زمین پر جو پودا برسوں کی خشک سالی سے سوکھ گیا تھا وہ اب پھر زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے، اس کی شاخوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ ٹام کے ساتھ خونریز مقابلے سے پہلے میرے اور غزالہ کے درمیان قرب کا جو لمحہ آیا تھا وہ کئی روز و شب سے مسلسل میرے ذہن پر مسلط تھا۔ یہ کچھ عجیب سا احساس تھا لیکن میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے یہی لگ رہا تھا کہ جیسے غزالہ سے میری محبت ایک بار پھر پہلے قدم سے "آغاز" ہو رہی ہے۔ وہی روز و شب جو گردشِ ایام میں کہیں کھو گئے تھے، مجھے پلٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو غزالہ نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ وہ تابی کا فیڈر دھونے میں مصروف رہی۔ تابی میری ٹانگوں سے لپٹ گیا، میں نے اسے اٹھا لیا۔ تابی سے مخاطب ہو کر میں نے کہا "کیا بات ہے بھئی! آپ دونوں آج کچھ چپ چپ سے لگ رہے ہیں۔"

تابی نے جواباً میرے بال پکڑ لیے اور کھینچنے لگا "جواب لڑائی بھی شروع کر دی، لیکن بھئی وجہ تو معلوم ہو۔" میں نے کہا۔

غزالہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی یہ بے رخی مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس بے رخی میں ایک ایسا لطف تھا جسے کچھ میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ میں اس پیاری سی بے رخی کی وجہ جانتا تھا، غزالہ نے ابھی مجھے سوزی کے ساتھ اکیلے میں کھڑے دیکھا تھا۔ اس نے نوٹس لیا تھا۔ اس کا نوٹس لینا میرے لیے بے حد ۔۔۔ بے حد اہمیت رکھتا تھا ورنہ اس سے پہلے تو جب ہم ماوات کے صحرا میں تھے تو مجھے دن رات شادی کے ساتھ دیکھ کر بھی غزالہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ بالکل لاتعلق سی نظر آتی تھی، بس اپنے میں اور تابی میں گم۔

وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو میں نے سنجیدگی سے کہا "غزالہ! تم نے پوچھا نہیں کہ میں وہاں اطالوی لڑکی کے ساتھ کیوں کھڑا تھا؟"

"آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں، میں پوچھنے والی کون ہوتی ہوں۔"

"یہ تو ایک لطیفہ ہے کہ 'میں پوچھنے والی کون ہوتی ہوں۔' تم جانتی ہو کہ تمہارے لیے میری اہمیت کیا ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔"

پھر میں نے سنجیدگی کے ساتھ غزالہ کو ساری تفصیل بتائی۔ میرے سنجیدہ لہجے نے اسے جلد ہی مطمئن کر دیا۔ وہ کہنے لگی "یہ لڑکی یہاں کافی بدنام ہے۔ ذرا محتاط رہیے گا۔"

"سبحان اللہ۔ کیا بات ہے۔ بہت خوب!" میں نے کہا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"تمہاری اس نصیحت میں اتنی اپنائیت ہے کہ جی چاہتا ہے ۔۔۔ جی چاہتا ہے، جہاز میں ڈھیروں ڈھیر لڑکیاں ہوں اور سب ایک سے بڑھ کر ایک بدنام ہوں۔ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو اور قدم قدم پر مجھے ٹوکتی رہو۔"

اس کے حسین ہونٹوں کے گوشے مسکرانے والے انداز میں پھڑک گئے۔ اپنے ہونٹوں کی یہ جنبش چھپانے کے لیے اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ یہی وقت تھا جب میں اور غزالہ ایک ساتھ چونک گئے۔ آبی پرندوں کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز ساحل کی آمد آمد کا اعلان تھی۔ کئی روز تک ہم نے اس آسمان کے نیچے صرف اور صرف سمندر کا شور سنا تھا۔ آج یہ آواز اتنی بھلی لگی تھی کہ اس کا سرور کانوں کے راستے جسم میں اتر گیا تھا۔ میں غزالہ اور تابی کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا باہر آیا۔ دور کہیں مغربی افق پر روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک روشن لکیر سی تھی جو شمالاً جنوباً دور تک چلی گئی تھی۔ کسی ایسے ہی منظر کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں ترس گئی تھیں۔ یہ منظر خشکی کی علامت تھا۔ خشکی جو سمندر کے خاتمے کا اعلان تھی۔ عرشے پر ایک ہلچل سی نظر آ رہی تھی۔ جہاز کا عملہ تیز قدموں سے آ جا رہا تھا۔ حبشی پہرے دار بھی سرگرمی سے مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ میں واپس جا کر غزالہ کو ساحل کے بارے میں بتانا چاہتا تھا کہ پہرے دار جوزف نے مجھے روک لیا۔ حسبِ معمول گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ درشت لہجے میں بولا "تمہیں نیچے کیبن میں چلنا ہو گا۔"

"کیوں؟"

"میں نہیں جانتا۔ یہ باس کا حکم ہے۔ دوسرے لوگ بھی جا رہے ہیں۔"

"دوسرے لوگ کون؟"

"تمہارے اور عملے کے سوا باقی سب لوگ۔" جوزف نے جواب دیا۔

اسی دوران میں، میں نے غزالہ، تابی اور انڈین لڑکی انورادھا عرف انو کو دیکھا۔ ان تینوں کو ایک ضیائی پہرے دار بالائی عرشے سے زیریں کیپارٹمنٹ میں لے جا رہا تھا۔ غزالہ کچھ حیران نظر آ رہی تھی جبکہ سیدھی سادی دیہاتی انو باقاعدہ خوف زدہ تھی۔ کہتے ہیں کہ بے آسرا عورت کے لیے حسن ایک وبال ہوتا ہے اور اگر عورت حد سے زیادہ معصوم بھی ہو تو پھر یہ وبالِ جان بن جاتا ہے۔ انو کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ ہر کوئی اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا اور کچا چبا جانے کا خواہش مند تھا۔ انو کی لاچار صورت دیکھ کر میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب چند روز پہلے وہ ایرانی یارکوس کے پنجۂ ستم سے نکل کر سیڑھیوں کے نیچے جا چھپی تھی۔ میں کافی دیر تک سیڑھیوں کے نیچے اس کے پاس بیٹھا رہا تھا اور اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ وہ اپنے "اندو نگر والے گھر" جانا چاہتی تھی کیونکہ وہاں اس کا پتی رہتا تھا جو رات دن اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ اندو نگر کہاں تھا اور وہاں انو کا کون سا گھر تھا مگر ان لفظوں کے پیچھے بھی یقیناً کوئی کہانی ہی پوشیدہ تھی۔ انو میرے قریب سے ہو کر گزری تاہم اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ اسے نجانے کتنے ہفتوں یا مہینوں سے ماڈرن اور فیشن ایبل بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی اور وہ بظاہر نظر بھی آتی تھی مگر جب اسے ذرا دھیان سے دیکھا جاتا تھا تو اس کے اندر چھپی ہوئی سیدھی سادی دیہاتن صاف نظر آ جاتی تھی۔

وہ لوگ زیریں کیپارٹمنٹ کی طرف چلے گئے، تھوڑی دیر بعد جوزف نے مجھے بھی چور دروازے سے گزار کر وہاں پہنچا دیا۔ وہاں پروفیسر اللہ دتا اور زریں گل پہلے سے موجود تھے۔ اس کے علاوہ سیاہ بالوں اور براؤن آنکھوں والی وہ دو لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں جنہیں انو سمیت بمبئی سے جہاز پر لایا گیا تھا۔ یہ سب لوگ حیران دکھائی دے رہے تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو پروفیسر اللہ دتا ایک ضیائی حبشی سے الجھ رہا تھا۔ اس ضیائی نے کیپارٹمنٹ کے زینوں سے اترتے ہوئے انو کو دھکا دیا تھا اور وہ آخری زینے سے لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔ اب وہ ایک طرف کھڑی زار و قطار رو رہی تھی اور اپنی چھلی ہوئی کہنی سے خون صاف کر رہی تھی۔

پروفیسر کا ضیائی سے تکرار کرنا مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ

"تکرار" در حقیقت پروفیسر کے بدلے ہوئے خیالات کی ایک جھلک تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پروفیسر کے اندر مزاحمت کی کونپل پھوٹ نکلی ہے۔ آج صبح میں نے پروفیسر کے ساتھ جو طویل گفتگو کی تھی اس نے اس کونپل کے لیے آب پاشی کا کام دیا تھا۔ پروفیسر کی جھکی ہوئی عاجز اور مسکین گردن اب اپنے سر کا بوجھ سہارتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ آنے والے دنوں میں پروفیسر اپنے نام نہاد داماد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا اور نہ بھی کرتا تو کم از کم اتنا تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کا "ذلت آمیز عاجزی والا رویہ" بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ صبح میں نے پروفیسر کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ شائستہ اب مائیکل کے بچے کی ماں بننے والی ہے لہٰذا مائیکل شائستہ کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتا' میرا یہ بیان کسی لحاظ سے بھی درست نہیں تھا۔ کسی اور کو معلوم نہ ہو مگر مجھے تو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ آدم خور مائیکل کے نزدیک شائستہ کی زندگی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہونے والے بچے کی۔ اگر اس کے ذہن میں زچہ و بچہ کا تھوڑا بہت بھی خیال ہوتا تو شاید ایرانی جہاز کی تباہی کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں نے پروفیسر کے سامنے یہ "جھوٹ" صرف پروفیسر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بولا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی ہو گئی تھی۔

ہم نے وہ ساری رات کیبنوں کے اندر ہی گزاری۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ جہاز بدستور حرکت میں تھا مگر یہ بہت آہستہ حرکت تھی۔ پہرے دار بالکل چوکس نظر آتے تھے' اگر کوئی بلند آواز سے بولتا بھی تھا تو وہ اسے گھورنے لگتے تھے۔ ایک اُتر پردیشی قیدی کو گردے کا درد تھا۔ وہ درد سے بیتاب ہو کر گاہے بہ گاہے چلانے لگتا تھا۔ پہرے دار پہلے تو اسے منع کرتے رہے پھر ایک حبشی پہرے دار نے جھنجھلا کر پٹ سن کا منحوس پھندا کیبن کے اندر داخل کر دیا۔ پھندا بدنصیب شخص کی گردن میں فٹ ہوا' دو پہرے دار اسے کھینچ کر دروازے کے خلا کے قریب لے آئے۔ اب اس کا سر دروازے کے خلا سے باہر اور دھڑ اندر تھا۔ وہ کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک حبشی نے کی بوکو نکالا اور وحشت ناک انداز میں قیدی پر پل پڑا۔ میں اور صفدر اپنے کیبن کے سوراخ میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شڑاپ شڑاپ کی تحس آواز کمپارٹمنٹ میں گونجی اور بدنصیب شخص کے چہرے کی کھال ادھڑنا شروع ہو گئی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا' جوزف دہاڑا "چیخو اور زور سے چیخو۔"

قیدی اس ہدایت پر عمل کیسے کر سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی پورے زور سے چیخ رہا تھا۔ اس کی آواز پھٹ گئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اگر چند سیکنڈ کی بوکو مزید اس پر برستا تو یقیناً کھال چہرے سے علیحدہ ہونا شروع ہو جاتی۔ خبر نہیں کہ پہرے داروں کے ذہن میں کیا آیا' انہوں نے مضروب کی گردن شکنجے سے نکال کر اسے واپس کیبن میں دھکیل دیا۔

اس واقعے کے بعد کمپارٹمنٹ میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ بس پہرے داروں کے بھاری قدموں کی آوازیں تھیں جو راہداری میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ مجھے زیادہ فکر اُتر پردیشی قیدیوں کی تھی۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال میں بہت غم زدہ ہو جاتے تھے اور جب وہ غم زدہ ہوتے تھے تو ان کا دھیان میری طرف ہی جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں ہر مشکل میں ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح سویرے یوں لگا کہ جہاز رک گیا ہے۔ تاہم باہر سے کسی طرح کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ بالکل خاموشی تھی۔ اچانک کمپارٹمنٹ کے دروازے کھلے اور مزید آٹھ دس مسلح افراد اندر آ گئے۔ ان میں سے کچھ تو حبشی پہرے دار تھے جبکہ چار پانچ سفید فام عملے کے افراد تھے' ان کے ہاتھوں میں رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ تین چار نیاسی حبشیوں کے ہاتھوں میں کی بوکو بھی موجود تھے۔

سب سے پہلے تین کیبنوں کے دروازے کھولے گئے اور قیدیوں کو ہانک کر سیڑھیوں کی طرف لے جایا گیا۔ وہ ڈرے سہمے' پہرے داروں کے نرغے میں چلتے ہوئے کمپارٹمنٹ سے باہر چلے گئے۔ قریباً پانچ منٹ بعد پہرے داروں کی واپسی ہوئی' اس مرتبہ پھر تین کیبنوں کے دروازے کھولے گئے اور قیدیوں یعنی بردوں کو ہانک کر باہر پہنچا دیا گیا۔ یہ سلسلہ قریباً ایک گھنٹا جاری رہا پھر ہماری باری بھی آ گئی۔ مسلح پہرے دار ہمیں لے کر کمپارٹمنٹ کے چوڑے دروازے پر پہنچے۔ حسب معمول چاول کی بوریوں کی دو قطاریں سلائیڈنگ تختے پر پیچھے ہٹ گئیں اور ہم بوریوں کے انبار میں سے گزر کر عرشے پر آ گئے۔ ابھی صبح کا اجالا کافی دور تھا۔ قرب و جوار تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہرکولیس کسی ویران کھاڑی پر کھڑا تھا۔ یہاں کھجور اور تاڑ کے بلند و بالا درخت بادِ صبا میں جھوم رہے تھے۔ جہاز سے نیچے کھاڑی کے پلیٹ فارم پر اترنے کے لیے ایک کشادہ ڈھلوان راستہ تھا۔ یہ راستہ لکڑی کے بڑے بڑے تختوں کو لوہے کی پتریوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ ہم اس راستے سے پلیٹ فارم پر آ گئے۔

درختوں میں پانچ بڑے بڑے لوور کھڑے تھے' یہ چاروں طرف سے بند تھے' لوورز کی مدھم سرخ روشنیاں اندھیرے میں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ مسلح پہرے داروں نے ہمیں اپنے نرغے میں ایک خالی لوور تک پہنچایا۔ ہم تین چار زینے طے کر کے لوور میں داخل ہو گئے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ ننھا تابی' غزالہ کی گود میں تھا۔ وہ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لوور اسٹارٹ تھا۔ اس لوور میں غالباً اس سے پہلے تربوز وغیرہ بار کیے گئے تھے۔ فرش پر تربوز کے چھلکے نظر آ رہے تھے اور در و دیوار میں سڑے ہوئے تربوز کی باس رچی تھی۔ ہمیں لوور پر بٹھانے کے بعد دروازہ بند نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی اور افراد لوور پر بٹھائے جائیں گے۔ پہرے داروں کی حرکات و سکنات سے عیاں تھا کہ سب کام بہت جلدی جلدی میں کیے جا رہے ہیں۔

بمشکل آٹھ دس منٹ گزرے تھے کہ جہاز کی طرف چیخ و پکار سنائی دی۔ ہم نے لوور کے اندر سے دیکھا' یہ اُتر پردیشی قیدی تھے۔ انہیں جہاز سے پلیٹ فارم کی طرف لایا جا رہا تھا کہ انہوں نے اچانک چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔ معلوم نہیں کہ وہ کس وجہ سے ڈرے تھے مگر ڈر گئے تھے اور جب وہ ایک بار ڈر جاتے تھے تو پھر انہیں سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حبشی پہرے دار ان پر بے تحاشا کی بوکو برسا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ انہیں کھینچ رہے تھے اور دھکیل رہے تھے مگر قیدی پلیٹ فارم کی طرف آنے کے بجائے واپس جہاز کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ فرش پر لیٹ گئے تھے اور کچھ خوف زدہ بکروں کی طرح جہاز کی ریلنگ سے چمٹ گئے تھے۔ وہ سب کے سب بلند آواز میں بین کر رہے تھے۔

پہرے داروں نے بہت زیادہ کھینچا تانی کی تو چند قیدیوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ان میں ایک عورت اور دو مرد تھے۔ انہیں بچانے کے لیے تین چار اطالویوں کو سمندر میں کودنا پڑا۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔ مائیکل پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو ہدایات دے رہا تھا مگر کسی کا کچھ بس نہیں چل رہا تھا۔ مائیکل کے حکم پر حبشی محافظوں نے بید کی طویل چھڑیوں (کی بوکو) سے قیدیوں کو بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ کئی مرد و زن کے کپڑے پھاڑ دیے گئے اور انہیں بازوؤں اور ٹانگوں سے کھینچ کھینچ کر جہاز سے اتارنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کوشش بھی پندرہ بیس فی صد سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ قیدی قطعی طور پر اڑ گئے تھے اور جو شے ان کے قریب تھی اس کے ساتھ مضبوطی سے

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

چمٹ گئے تھے۔

غزالہ نے میرے کان میں سرگوشی کی "آپ ہی کچھ کریں۔"

لوور سے ادھر مسلح محافظ بالکل چوکس ہو گئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ آپوں آپ میری جانب ہو گیا تھا۔ میں مائیکل کے پاس پہنچا۔ پریشانی سے اس کا برا حال تھا' گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور آنکھیں سرخ انگارا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے کارندوں پر مسلسل چیخ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ مائیکل اور اس کے ساتھی بردوں کی نقل و حمل کا کام جلد سے جلد نمٹانے کے خواہش مند ہیں۔ شاید انہیں کسی جانب سے کوئی خطرہ تھا مگر اُتر پردیشی قیدی تھے کہ پتھر ہو کر رہ گئے تھے۔ مائیکل نے چلا کر نائب کپتان آرتھر سے کہا "ان میں سے دو چار حرام زادوں کو گولی سے اڑا دو۔"

آرتھر پہلے ہی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مائیکل کا حکم بجا لانے میں زیادہ تاخیر نہیں کرے گا۔ میں نے مائیکل سے کہا "دیکھو مائیکل! تشدد سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اپنے لشکروں سے کہو کہ پیچھے ہٹ جائیں اور اپنی شکلیں ذرا گم کر لیں۔ میں ابھی ان قیدیوں کو آمادہ کر لیتا ہوں۔"

مائیکل نے چونک کر میری طرف دیکھا' مجھ سے مدد لینے کا خیال غالباً اس کے ذہن سے بالکل نکلا ہوا تھا۔ وہ دوڑ کر عرشے پر پہنچا اور اپنے کارندوں کو مختلف ہدایات دینے لگا۔ دو تین منٹ کے اندر وہ سب کے سب پیچھے ہٹ گئے۔ اب ساری نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ افریقہ کی سرزمین پر جو کڑی آزمائشیں مجھے پیش آنا تھیں ان کا آغاز اس قدرے چھوٹی آزمائش سے ہو چکا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور عرشے کی طرف قدم بڑھائے۔ یہی وقت تھا جب کسی نے مجھ پر فائر کر دیا!

گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میں نے خود کو اوندھے منہ زمین پر گرالیا۔ اس کے ساتھ ہی گولی چلانے والا شخص بھی میری نگاہ میں آگیا۔ وہ راجن تھا۔ اتر پردیشی قیدیوں میں سے یہ شخص ابھی تک مجھ سے عناد رکھتا تھا۔ میں نے کافی کوشش کی تھی مگر اپنی طرف سے اس کا دل صاف کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آج اس نے موقع دیکھ کر میرے خلاف ایک سنگین قدم اٹھایا تھا۔ درحقیقت اس نے قریب کھڑے ایک اطالوی کے ہولسٹر سے پسٹل کھینچا تھا اور بے دریغ مجھ پر فائر جھونک دیا تھا۔ صرف ایک فائر کرنے کے بعد وہ چیختا ہوا عرشے کی ریلنگ کی طرف بھاگا۔ غالباً اپنے چند حواس باختہ ساتھیوں کی طرح وہ بھی سمندر میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ ریلنگ تک پہنچتا ایک حبشی محافظ نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اسی دوران میں وہ فربہ اندام اطالوی بھی دوڑتا ہوا پہنچ گیا جس کے ہولسٹر سے پستول کھینچا گیا تھا۔ وہ دونوں راجن کو فرش پر گرا کر بری طرح پیٹنے لگے۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا عرشے پر پہنچا اور راجن کو دو تین افراد کے نرغے سے نکالا۔ راجن کی براؤن قمیص پھٹ گئی تھی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسی اثنا میں نائب کپتان آرتھر تین حبشی محافظوں کے ساتھ دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے راجن کو ایک بار پھر فرش پر گرا دیا اور اس کی مشکیں کسنے لگے۔ خونخوار حبشی پہرے داروں کو اپنے قریب دیکھ کر خوف زدہ اتر پردیشی قیدی کچھ اور بھی سہم گئے۔ وہ ابھی تک جہاز کی مختلف اشیاء سے چمٹے ہوئے تھے اور ہراساں نظروں سے پلیٹ فارم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی خاموش نگاہیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ جہاز سے اتر کر اس اجنبی سرزمین پر قدم رکھنا نہیں چاہتے۔

میں نے نائب کپتان آرتھر کو مخاطب کر کے خشک لہجے میں کہا "میں آپ سے کئی درجن مرتبہ درخواست کر چکا ہوں کہ اپنے ان خون آشام سیاہ فاموں کو ان قیدیوں سے دور رکھو۔ ان کی صورتیں دیکھ کر ہی بے چاروں کی جان نکل جاتی ہے۔"

آرتھر نے حبشی محافظوں کو اشارہ کیا کہ وہ جہاز سے نیچے چلے جائیں۔ راجن کو اچھی طرح باندھا جا چکا تھا لہٰذا حبشی اسے چھوڑ کر پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ میں اتر پردیشی قیدیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اتر پردیشی قیدیوں کو فرداً فرداً سمجھانے کے بجائے ان کے دو تین سرکردہ افراد کو سمجھانا اور اپنا ہم خیال بنا لینا زیادہ آسان ہے۔ میں قبیلے کے سب سے معمر شخص کے پاس پہنچا۔ اس کا نام سیوک تھا۔ میں نے اسے فرش سے اٹھایا، وہ بری طرح لرز رہا تھا۔

"ہم مرجاوت نیچے نہیں اترت۔ ہم کو چھوڑ دیو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "لیکن تم نیچے اترنا کیوں نہیں چاہتے ہو۔"

وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں واویلا کرنے لگا۔ میں نے توجہ سے اس کی بات سنی تو سمجھ میں آیا کہ ان لوگوں کو جہاز سے اترنے پر تو کوئی اعتراض نہیں مگر وہ لوڈرز پر کسی صورت بیٹھنا نہیں چاہتے۔ پتا نہیں یہ بات ان کے دماغ میں کیوں گھس گئی تھی کہ وہ لوڈرز میں بیٹھے تو کہیں بہت دور پہنچا دیے جائیں گے۔ حالانکہ "بہت دور" تو وہ پہنچ ہی چکے تھے۔ پچھلے کئی روز سے وہ بحری جہاز پر سمندر میں سفر کرتے رہے تھے۔ یہ بس ان کی سادہ لوحی تھی کہ لوڈرز پر سوار ہونے سے بدک رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لوڈرز کے انجنوں کا شور انہیں مزید ڈسٹرب کر رہا ہے۔ میں نے آرتھر سے کہا کہ وہ لوڈرز کے انجن بند کرا دے اور ٹیل لائٹس بجھوا دے۔

آرتھر نے ایسا ہی کیا۔ اتر پردیشیوں کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ لوڈرز ہمیں زیادہ دور نہیں لے جائیں گے۔ ساحل سے تھوڑا آگے ایک محفوظ مقام پر ہمیں رکھا جائے گا۔ وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ جگہ گرمی اور مچھر مکھی وغیرہ سے محفوظ ہے۔ وہاں سب لوگ نہا دھو سکیں گے اور اچھا کھانا ملے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ وہاں خون خوار حبشیوں کے منحوس چہرے نظر نہیں آئیں گے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ میری آخری بات نے سیوک کمار کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ میں دھیمے لہجے میں کئی منٹ تک سیوک کمار اور دوسرے لوگوں کو سمجھاتا رہا۔ بالآخر وہ رضامند نظر آنے لگے۔ میں انہیں بڑی محبت سے ہاتھ پکڑ پکڑ کر نیچے لے آیا۔ انہیں لوڈر میں بٹھایا جانے لگا تو انہوں نے شرط پیش کی کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں گا۔ انہیں پرسکون اور خاموش رکھنے کے لیے مائیکل نے مجھے اور صفدر کو ان کے ساتھ بٹھا دیا۔

جلد ہی ہرکولیس کے تمام بردے ساحل پر کھڑے دو تین کل لوڈروں میں سوار ہو گئے۔ لوڈروں کے دروازے یکے بعد دیگرے بند کر دیے گئے تھے۔ سب سے آخر میں ہمارے لوڈر کا دروازہ بند کیا گیا۔ اس لوڈر میں سے کافی اور چائے کی خوشبو آ رہی تھی۔ کافی کے پتے بھی فرش پر بکھرے

ہوئے تھے۔ پانچ دس منٹ بعد ہمارا لوڈر حرکت میں آگیا۔ ظاہر ہے کہ باقی لوڈر بھی چل پڑے تھے۔ اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا مگر یہ لوڈرز چونکہ چاروں طرف سے بند تھے لہٰذا ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر لوڈر کی چھت پر ایک ایگزاسٹ فین موجود تھا مگر یہ فین اندر کے حبس اور گھٹن کو کم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ کچھ دیر تو لوڈر ہموار راستے پر چلتا رہا پھر اس نے ٹرن لیا اور ایک اونچے نیچے راستے پر آگیا۔ یہ نیم پختہ راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا چلا گیا۔ لوڈر کی رفتار بمشکل بیس میل فی گھنٹہ رہی ہوگی۔ گرمی اور حبس سے ہمارا برا حال تھا۔ جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ پسینے کی بو چائے اور کافی کی خوشبو میں شامل ہو کر عجیب سے رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ میرے اور صفدر کے اردگرد اتر پردیشی قیدی خوف زدہ جانوروں کی طرح ساکت و جامد بیٹھے تھے۔ میں نے گنا، اس لوڈر میں وہ ستر تھے۔ ان کے چند ساتھی ایک دوسرے لوڈر میں بٹھائے گئے تھے۔ اتر پردیشی قیدیوں کی نظریں رہ رہ کر میری طرف اٹھ جاتی تھیں۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں؟ وہ مجھے باخبر سمجھ رہے تھے مگر انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں بھی اتنا ہی لاعلم ہوں جتنے کہ وہ۔۔۔ شدید گرمی کے سبب بچے کملا سے گئے تھے اور مرد و زن نڈھال ہو رہے تھے۔ کم سن ماں "کملا" کا بھی برا حال تھا۔ مزید ستم یہ ہوا تھا کہ اس کا شیر خوار بچہ بھی بھوک اور پیاس کی وجہ سے بلکنے لگا تھا۔ وہ مسلسل رو رہا تھا۔ ماں کے قابو میں آ رہا تھا اور نہ نانی کے۔ یہاں تک کہ اس کا گلا بیٹھ گیا اور حلق سے "کیں کیں" کی آواز نکلنے لگی۔ اپنے بچے کی حالت دیکھ کر کملا کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔۔۔ وہ بار بار بچے کو اپنی میلی کچیلی ساڑی کے نیچے چھپا لیتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ چمٹاتی تھی، تھپکتی تھی، بچہ اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے بے قراری سے سر کو جنبش دیتا تھا اور ناکام ہو کر ایک بار پھر پورے زور سے چلّانے لگتا تھا۔ دراصل کمزوری، گرمی اور شدید پیاس کے سبب ماں کا دودھ بھی سوکھا ہوا تھا۔ بچے کا فیڈر کملا افراتفری میں جہاز کے اندر ہی بھول آئی تھی۔

لوڈر میں کم و بیش دس عورتیں ایسی تھیں جن کے پاس شیر خوار بچے تھے۔ ان میں سے چار پانچ کے پاس فیڈر بھی موجود تھے مگر کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ اپنے بچے کا دودھ کملا کے بچے کو دے دیتی۔ یہ بے یقینی، مصیبت اور بھوک پیاس کا سفر تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کتنی دیر [illegible] اس مشکل کا شکار رہنا ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں خدا ترسی ایک خاصا دشوار کام ہوتا ہے۔

اچانک صفدر نے میرا گھٹنا دبایا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیکٹ نظر آ رہا تھا۔ ایسے پیکٹ جہاز میں شیر خوار بچوں کی ماؤں کو دیے جاتے تھے۔

"یہ کہاں سے لیا ہے؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

اس نے اپنے قریب ہی اونگھتی ہوئی ایک اتر پردیشی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس نے لوڈر کی دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور اس کی گود میں ایک بچہ گہری نیند سو رہا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ صفدر نے یہ پیکٹ عورت کی ساڑی کے اندر سے کھسکایا ہے اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہم زیادہ دیر محو سفر نہیں رہیں گے اور منزل پر پہنچ کر سب کو خوراک میسر آ جائے گی۔ فی الوقت کملا کے بچے کو دودھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ میں نے پیکٹ کملا کے ہاتھ میں تھمایا تو اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو مسکرا اٹھے۔ اس نے تشکر کی نگاہوں سے مجھے اور صفدر کو دیکھا۔ کملا کی ماں نے ایک عورت سے خالی فیڈر حاصل کیا اور پیکٹ کا دودھ اس میں انڈیل کر کملا کو دے دیا۔

خوراک ملتے ہی بچے کی چیخ و پکار بند ہو گئی۔ صفدر نے میرا گھٹنا پھر دبایا اور اشارے سے مجھے پروفیسر کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے پر شدید کرب نظر آ رہا ہے۔ پھر اچانک وہ ہچکیاں لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کھانسی نے اس کے پورے بدن کو ہلا دیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر یکایک بات ذہن میں آ گئی۔ پروفیسر کی یہ حالت دودھ دیکھ کر ہوئی تھی۔ جہاز میں مائیکل کی طرف سے پروفیسر کو اتنی "محبت" سے اور اتنی زیادہ مقدار میں دودھ پلایا گیا تھا کہ اب دودھ کو دیکھ کر ہی اس کا "دل باغ باغ" ہو جاتا تھا۔

پروفیسر نے خود کو بمشکل سنبھالا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ خدا کی ایک ہی نعمت دو انسانوں کے لیے کس قدر مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بچے کے لیے دودھ بھوک پیاس سے نجات کا باعث بنا تھا اور اسے سکون حاصل ہوا تھا۔ ایک دوسرے شخص کے لیے اسی دودھ کو پینا تو درکنار دیکھنا بھی آنکھوں کا عذاب تھا۔ چند راتیں پہلے جہاز میں جو کچھ پروفیسر پر گزری تھی وہ میں نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھی تھی مگر اب اس لوڈر میں پروفیسر کی حالت زار دیکھ کر مجھے اس قیامت کا تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا۔

قریباً آدھ گھنٹا مزید چلنے کے بعد لوڈر رک گیا۔ ہمیں باہر نکالنے کے لیے دروازہ کھولا گیا۔ زندگی بخش ہوا دیوانہ وار اندر گھس آئی۔ باقی لوڈر بھی قریب ہی نظر آ رہے تھے۔ ان کے عقبی دروازے ابھی بند تھے۔ ہم ایک وسیع فارم نما جگہ پر کھڑے تھے۔ یہاں درخت تھے اور ایک ترتیب میں دور تک کھیت نظر آ رہے تھے۔ ان کھیتوں میں اگی ہوئی فصل چار پانچ فٹ تک اونچی تھی۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ کافی کے پودے ہیں۔ لمبوترے پتوں والے ان پودوں کے درمیان کئی کھیت مزدور نظر آئے۔ ان سیاہ فام افراد نے بغیر آستین کے شلوکے پہن رکھے تھے۔ نیچے نیکریں یا لنگوٹیاں تھیں۔ چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے ان لوگوں نے سروں پر تنکوں کی ٹوپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں چند سیاہ فام عورتیں بھی تھیں۔ ان کے سروں پر اسکارف نما سفید کپڑے نظر آ رہے تھے۔

یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ مسلح حبشی محافظوں کے نرغے میں ہمیں لوڈر سے نیچے اتارا گیا اور کافی کے پودوں کے درمیان سے گزار کر درختوں میں گھرے ہوئے ایک گودام نما مکان میں پہنچا دیا گیا۔ اس وسیع عمارت کی دیواریں گارے اور مٹی سے بنی ہوئی تھیں۔ چھت لکڑی اور درختوں کی چھال کی تھی اور اس پر بھی گارے کا لیپ تھا۔ اتر پردیش کے قیدی، جہاز میں سیاہ فام محافظوں کو دیکھ دیکھ کر دہشت زدہ ہوئے تھے، مگر یہاں تو ہر طرف سیاہ فام ہی نظر آ رہے تھے۔ بہرحال وہ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے اور کسی نے ہم پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں باقی تمام افراد بھی لوڈروں سے اتر کر عمارت میں پہنچ گئے۔ یہاں کئی ہوادار کمرے تھے، قیدیوں کو مختلف کمروں میں بانٹ دیا گیا اور دروازے باہر سے مقفل کر کے پہرے دار کھڑے کر دیے گئے۔ میں صفدر اور پروفیسر، اتر پردیش قیدیوں کے ساتھ علیحدہ کمرے میں تھے۔ اس کمرے کے دروازے کے عین سامنے ایک خوں خوار کتا بکرا رہا تھا۔ ایسے ہی چند اور کتے بھی یہاں موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کسی مقامی جاگیردار کی کافی اسٹیٹ میں ہیں۔ مائیکل ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا تھا؟ یہ ہماری مستقل منزل تھی یا عارضی؟ اگر عارضی منزل تھی تو پھر ہمیں آگے کس ذریعے سے سفر کرنا تھا؟ یہ ایسے سوال تھے جن کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کس ملک میں ہیں۔ میرے تاثر کے مطابق ہم افریقہ کے مشرقی ساحل پر تھے۔ اگر ہم مشرقی ساحل پر تھے تو پھر یہ ملک کینیا، تنزانیہ، موزمبیق کوئی بھی ہو سکتا تھا۔

میری طرح صفدر اور پروفیسر کا خیال بھی یہی تھا کہ یہ ہماری منزل نہیں ہے بلکہ رستے کا ایک پڑاؤ ہے۔ جب ہم لوگ بمبئی سے مشرق کی طرف روانہ ہوئے تھے تو ہم نے ماریطانیہ کا نام سنا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ ہم ماریطانیہ جا رہے ہیں... اور... ماریطانیہ افریقہ کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ اگر ہمیں ماریطانیہ ہی جانا تھا تو پھر یہیں ممکن تھا کہ ہمیں خشکی کا ایک طویل سفر درپیش ہوتا، لیکن یہ بات میرے اور صفدر کے ذہن میں کچھ جچ نہیں رہی تھی، بلکہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ پاپیادہ سفر، مصیبتوں کو خود دعوت دینے والی بات تھی۔ ہماری حیثیت اسمگلنگ کے مال کی سی تھی اور اسمگلنگ کا مال بحری جہازوں کے خفیہ خانوں سے بڑھ کر اور کہاں محفوظ ہو سکتا ہے۔

اچانک صفدر کی نگاہ ایک براؤن کاغذ پر پڑی۔ یہ کسی پیکنگ کا کاغذ تھا۔ صفدر اسے اٹھا کر پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ خبریں سنانے والے انداز میں بولا "صاحبان! تازہ ترین اطلاع کے مطابق ہم اس وقت تنزانیہ میں ہیں۔"

"کیا لکھا ہے اس پر؟"

صفدر نے کہا "لکھا ہے کہ دنیا کی بہترین کافی تنزانیہ کی کافی ہے اور اس فارم کی کافی تنزانیہ کی بہترین "کافیوں" میں شمار ہوتی ہے اور کافی کا یہ بلینڈ بہترین کافیوں میں سے بہترین ہے وغیرہ وغیرہ۔ اوپر فارم کا نام بھی لکھا ہے۔ "پرل فارم" یقیناً ہم اس وقت پرل فارم میں تشریف فرما ہیں۔" صفدر نے پوری تفصیل بتا دی۔ میں نے وہ براؤن کاغذ دیکھا۔ وہ کافی کی پیکنگ ہی کا کاغذ تھا۔ تنزانیہ کے الفاظ نمایاں نظر آ رہے تھے۔

کافی کے اس گودام سے باہر افریقہ کا سورج آگ برسا رہا تھا۔ جوں جوں دھوپ تیز ہو رہی تھی، حدت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ گودام میں بہت سے ایگزاسٹ فین لگے تھے اس کے علاوہ پنکھے بھی موجود تھے مگر پسینہ پھر بھی دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں کھانا دیا گیا۔ کوئی مقامی سبزی تھی۔ اس کے علاوہ گائے کا گوشت تھا۔ روٹیاں بھی عجیب ڈیزائن کی تھیں اور ان کا مزہ ڈبل روٹی جیسا تھا۔ اتر پردیش کے قیدیوں نے گائے کا گوشت پہچانتے ہی کھانے کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ میں نے حبشی کارندوں سے کہا کہ وہ گائے کا گوشت یہاں سے لے جائیں ورنہ پھر جہاز والے حالات پیدا ہو جائیں گے (جب ان قیدیوں نے طویل بھوک ہڑتال کر دی تھی اور جاں بلب ہو گئے تھے) کارندوں نے میری بات مان لی۔ بعد ازاں تھوڑی سی پس و پیش کے بعد یہ لوگ کھانا کھانے پر آمادہ ہو گئے۔

کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد مائیکل معائنے کے لیے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک گٹھے ہوئے جسم کا کوتاہ قد حبشی بھی تھا۔ اس نے نہایت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ گلے کی چین، انگوٹھیوں اور بٹنوں کی صورت میں اس کے جسم پر بہت سا سونا بھی نظر آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس شخص کا نام مبارک امین تھا اور یہ اس بہت بڑے کافی فارم کا مالک تھا۔ اس نے گودام میں حبس محسوس کیا تو اپنے سیاہ فام کارندوں کو کھڑکیاں وغیرہ کھولنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم پر ہمیں فوری طور پر کھانے کے لیے پھل بھی فراہم کیا گیا۔ پھل میں کیلے اور تربوز وغیرہ شامل تھے۔ معائنے کے دوران میں مائیکل کی نگاہ پروفیسر پر پڑی تو وہ فوراً اس کے قریب چلا آیا۔ بڑے احترام سے بولا "پروفیسر ڈیئر یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، آپ ان ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ یہاں فرش پر بیٹھے ہیں۔ چچ چچ۔ یہ تو ٹھیک بات نہیں۔ آپ میری عزت کا ہی کچھ خیال کر لیا کریں۔ چلیں اٹھیں، میں آپ کے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کرتا ہوں۔"

اس نے پروفیسر کو اٹھایا۔ پروفیسر کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا مگر میں نے ایک بات نوٹ کی۔ پروفیسر کے چہرے پر وہ حد سے زیادہ عاجزی اور مسکینی دکھائی نہیں دیتی تھی جو اس سے پہلے مائیکل کو دیکھتے ہی پروفیسر کو گھیر لیتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ عاجزی مائیکل کو مزید تشدد اور سفاکی پر ابھارتی تھی۔

اسی دوران میں مائیکل کی نگاہِ کرم مجھ پر بھی پڑ گئی۔ اس نے مجھے اشارے سے قریب بلایا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو شاہ جہاں۔ چلو تم میرے ساتھ، تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شمار تو وی آئی پیز میں ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا وی آئی پی بننے سے بہتر ہے کہ انسان جانوروں کے ساتھ رہائش اختیار کر لے۔"

"اوہو ہو... مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بدگمان ہوتے جا رہے ہو۔ آخر ایسا کیا دیکھ لیا ہے تم نے مجھ میں؟"

"گنواؤں گا تو غصے سے گیس کا بم بن جاؤ گے اور پھٹ جاؤ گے۔ لہٰذا اپنی اور میری بہتری کے لیے مجھے خاموش ہی رہنے دو۔"

مائیکل یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے ایک گہری سانس لی "چلو ٹھیک ہے بھئی۔ خاموش ہی رہو، لیکن یہاں سے تو چلو۔ میں تمہارے سلسلے میں ہلکا سا رسک بھی لینا نہیں چاہتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل نے مسکرا کر اپنے سیاہ فام پہرے داروں کی طرف اشارہ کیا "تمہیں ان کی طرف سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ پہلے تم نے ان کے ساتھی سائمن کو ہلاک کیا، اس کے بعد جہاز پر ہونے والے مقابلے میں ٹام کو تمہاری وجہ سے شوٹ کرنا پڑا۔ سائمن کی بات تو چلو قدرے پرانی ہو گئی ہے لیکن ٹام والا زخم تو بالکل تازہ تازہ ہے۔ ٹام کا کوئی دوست تمہارے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے اور یہاں جو لوگ پہرے پر مقرر ہیں وہ زیادہ تر ٹام ہی کے ساتھی ہیں۔"

مائیکل مجھے لے کر گودام سے باہر آ گیا۔ دوپہر اب سہ پہر میں ڈھل رہی تھی۔ میرے بازو پر گھڑی موجود تھی مگر اس پر ابھی تک بمبئی ہی کا وقت چل رہا تھا۔ مائیکل نے مجھے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو بڑے اسٹائلش انداز میں بولا "تنزانیہ کی گھڑیوں کے مطابق اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں۔ تم اپنی گھڑی پر وقت درست کر لو۔"

"تو گویا ہم تنزانیہ میں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو تنزانیہ میں ہی ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے تو پتا چلتا تھا کہ ہم ماریطانیہ جا رہے ہیں۔"

وہ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے مسکرایا "ماریطانیہ بھی پہنچ جائیں گے۔ تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ ایک آدھ دن یہاں کھلی فضا کا مزہ لو۔ کھاؤ، سوؤ، ٹھنڈی مشروب اڑاؤ اور کافی پیو لیکن ایک بار پھر تمہیں وارننگ دے رہا ہوں، اپنی بہت پرانی عادت کے مطابق کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ چالاکی تمہارے ساتھیوں اور خاص طور سے تمہاری

جرمِ وفا

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

سویٹ ہارٹ کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو گی۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کافی تو یہاں کی واقعی اچھی ہو گی لیکن میرا خیال ہے کہ تم صرف ہمیں کافی پلانے کے لیے یہاں نہیں لائے ہو۔ یقیناً کوئی اور وجہ ہو گی اس کی۔"

"اچھا تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" وہ سگریٹ کا کش لے کر ذرا بے تکلفی سے بولا۔

میں نے کہا "کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمہیں بحری راستے پر آگے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔"

وہ قدرے حیرانی سے مجھے دیکھ کر بولا "تمہارا اٹکل ٹھیک ہے۔ ہمیں کچھ ایسی ہی مشکل درپیش تھی۔"

"کہیں وہ ایرانی جہاز والا معاملہ تو درپیش نہیں؟"

"نہیں! یہ ان کے بھی باپ تھے۔ بہرحال امید ہے کہ کل تک ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا اور ہم اپنا سفر دوبارہ شروع کر سکیں گے۔"

"کیا مطلب؟ ہمیں پھر ہرکولیس پر سوار ہونا ہو گا؟"

"تو تم کیا سمجھتے ہو ہم پیدل ہی افریقہ کے دوسرے سرے پر پہنچیں گے؟"

اس نے اپنے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر مجھے دیا۔ وہ قدرے الجھے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ سخت گرمی کے باوجود مائیکل نے پینٹ کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ ہم ایک گھنے درخت کے سائے میں جا کھڑے ہوئے اور کافی کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مرد و زن کو دیکھنے لگے۔ مزدور عورتوں نے بڑے ہلکے پھلکے لباس پہن رکھے تھے۔ مائیکل کے خیالی کارندے ان عورتوں کو گاہے گاہے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ لیتے تھے۔

اچانک "بیپ بیپ" کی مخصوص آواز بلند ہوئی۔ یہ مائیکل کے طاقتور واکی ٹاکی کا سگنل تھا۔ مائیکل نے واکی ٹاکی کوٹ کی جیب سے نکالا "ہیلو۔ مائیکل اسپیکنگ!" اس نے کہا۔ دوسری طرف سے نہ جانے کیا کہا گیا کہ مائیکل کے چہرے پر افسردگی پھیل گئی۔ وہ قدرے پریشانی سے بولا "اور ڈبل زیرو پوائنٹ کی کیا پوزیشن ہے؟"

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف کی جانے والی بات سنتا رہا' پھر واکی ٹاکی پر کسی شخص کو ہدایات دینے لگا۔ واکی ٹاکی پر مائیکل نے جو گفتگو کی اس سے معلوم ہوا کہ آگے موزمبیق کے ساحل کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ناکا بندی کی گئی ہے۔ یہ ناکہ بندی اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلے میں تھی۔ غالباً اس ناکا بندی میں انٹرپول کا کوئی کردار بھی موجود تھا' کیونکہ مائیکل کی زبان سے دو تین بار میں نے انٹرپول کا لفظ بھی سنا۔ اسی ناکا بندی کی خبر ملنے کے بعد ہرکولیس کو افراتفری میں ویران کھاڑی میں لایا گیا تھا' ہمیں اس پر سے اتار کر اس "کافی اسٹیٹ" میں پہنچایا گیا تھا۔ مائیکل کا خیال یہ تھا کہ یہ ناکا بندی ایک آدھ دن میں ختم ہو جائے گی اور ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے' مگر مائیکل کو جو اطلاع ملی تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ناکا بندی ابھی جاری ہے اور شاید دو چار دن مزید جاری رہے گی۔

مائیکل نے مجھے فارم کے رہائشی حصے میں پہنچایا۔ رہائشی عمارت کافی آرام دہ اور ٹھنڈی تھی۔ یہاں ایئر کولر اور ائیر کنڈیشنر وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا وہاں زریں گل' کلثوم پہلے سے ہی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ میں نے مائیکل سے کہا کہ صفدر کو بھی یہاں پہنچا دیا جائے۔ معمولی تذبذب کے بعد مائیکل نے صفدر کو یہاں شفٹ کرنے کی ہامی بھر لی۔

میں نے زریں سے پوچھا "غزالہ کو تو نہیں دیکھا؟"

وہ بولا "غزالہ بی بی اور تابی دونوں اسی بلڈنگ کے کسی کمرے میں ہے' ابھی تھوڑی دیر پہلے ام کو بچے کے رونے کا آواز آیا تھا۔ ام کو پکا یقین ہے کہ وہ تابی ہی تھا۔"

مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ مائیکل غزالہ کو ہمارے ساتھ رکھنے کا رسک نہیں لے گا' جہاز کی طرح یہاں بھی غزالہ کی حیثیت یرغمالی کی سی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صفدر بھی کچھ مسلح افراد کی نگرانی میں ہم تک پہنچ گیا۔ صفدر کی موجودگی سے میری ڈھارس سی بندھ جاتی تھی' غالباً صفدر بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ ہمیں یوں لگتا تھا کہ ہمارے اردگرد کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' اور اگر ہے تو ہم اسے چٹکیوں میں حل کر لیں گے۔ صفدر نے بتایا کہ میرے چلے آنے سے اتر روشی بہت اواس ہو گئے ہیں۔ کملا کی آنکھوں میں تو باقاعدہ آنسو چمک رہے تھے۔

زریں گل سخت بے قرار نظر آ رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اسے تسلی تشفی دی اور جو معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں ان میں سے کچھ اس تک پہنچائیں۔

وہ بولا "استاد صیب! ایک تو ام کو اس کلثوم نے پاگل کر دیا ہے۔ اس کی ہر وقت بس ایک ہی رٹ ہے۔ یہ پشاور واپس جانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ام کو اپنے گھر لے جاؤ۔ ام رات دن تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے کپڑے دھونا چاہتا ہے' تمہارے لیے روٹی پکانا چاہتا ہے۔ جھاڑو دینا چاہتا ہے اور برتن مانجھنا چاہتا ہے۔ اب بتاؤ استاد صیب ام اس کو یہ سب کچھ کیسے مہیا کرے۔ اماری سمجھ میں تو بس

یہی بات آتا ہے آپ مائیکل سے کہہ کر بہت سے گندے کپڑوں اور جھوٹے برتنوں کا انتظام کرا دیں۔ ام اس کو کہتا ہے کہ یہ برتن مانجھو اور کپڑے دھو دھو کر استری کرو۔ شاید اسی طرح اس کا طبیعت کچھ بحال ہو جائے۔"

صفدر نے کہا "جھوٹے برتن اور گندے کپڑے منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ مائیکل سے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ وہ ہمارے روٹی کپڑے کی کوئی فکر نہ کرے' ہمارے پاس ایک رضاکار موجود ہے اور وہ اپنے شوہر اور اس کے دوستوں کی خدمت کے لیے تڑپ رہی ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں مسئلہ ایسے بھی حل نہیں ہو گا۔ تم نے کلثوم کی بات پر غور نہیں کیا۔ وہ زریں سے کہتی ہے کہ میں دن رات تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ ذرا الفاظ پر غور کرو' دن اور رات خدمت۔"

صفدر مسکرانے لگا مگر زریں کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا' وہ خاموش تھا۔ میں نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہے! آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ الفاظ پر غور کرو۔"

"پھر کیا سمجھ میں آیا؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں آیا۔ آپ نے غور ہی نہیں کرنے دیا۔"

"غور کرنے کے لیے ایک خاص چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔" صفدر نے فقرہ چست کیا۔

"ہاں وہ واقعی ختم ہو گئی ہے۔" زریں گل کے جواب نے ہمیں حیران کر دیا۔ یقیناً صفدر کا طنز اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا ختم ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جس کا ذکر صفدر صیب کر رہا ہے۔ وہ راستے ہی میں خرچ ہو گیا تھا۔"

"کیا خرچ ہو گیا تھا۔ اس کا نام بھی تو لو۔" میں نے کہا۔

زریں گل نے بڑی دانائی سے اوپر نیچے سر ہلایا "آپ نسوار کا ذکر کر رہا ہے ناں! یہ ٹھیک ہے کہ ام کو نسوار کے بغیر غور کرنے میں مشکل پیش آتا ہے' لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کے بغیر امارا عقل خبط ہو جائے۔"

"صفدر نسوار کی نہیں عقل کی بات کر رہا ہے۔ جو نسوار کے بغیر واقعی خبط ہو چکی ہے۔"

زریں گل چکرا کر رہ گیا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صفدر کو کوئی کرارے دار جواب دیتا۔ کلثوم سنبھالا لینے لگی۔ زریں ایک دم ساری چوکڑی بھول گیا اور تڑپ کر کلثوم کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس کے آگے پیچھے گھومنے لگا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں اور غزالہ کئی بار اسے سمجھا چکے تھے کہ ایسی حالت میں عورت کی طبیعت اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے لیکن زریں کی پریشانی۔۔۔ دلیل سے ختم ہونے والی چیز تھوڑی ہی تھی۔ جونہی کلثوم کا دل مالش کرتا تھا زریں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔

اس کمرے میں اگلے دو روز ہم نے بڑے آرام سے گزارے۔ ائر کنڈیشنر چوبیس گھنٹے چالو رہتا تھا۔ مچھر مکھی کا نشان تک نہیں تھا۔ کھانے کو بھی خوب مل رہا تھا۔ بہرحال کمروں سے باہر نکلنے کی آزادی نہیں تھی۔ اس دوران میں ہم کمرے کے اندر سے ہی حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ یہ کافی فارم بڑی سڑک اور آبادی سے خاصے فاصلے پر واقع تھا۔ اس کا مالک وہی چھوٹے قد کا سیاہ فام تھا جو قیمتی لباس پہنتا تھا اور جس کے گلے میں جھولتی ہوئی سونے کی موٹی چین دور ہی سے نظر آ جاتی تھی۔ یہ شخص مسلمان تھا اور اس کا نام مبارک امین تھا۔ مائیکل کے ساتھ اس شخص کی پرانی دوستی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مائیکل کو اپنا بحری سفر عارضی طور پر روکنا پڑا تو اس نے پناہ کے لیے مبارک امین کے کافی فارم کا انتخاب کیا۔ مبارک اپنے رنگ ڈھنگ سے خود بھی کوئی اچھا شخص نظر نہیں آتا تھا' تاہم مائیکل کے برعکس وہ تند مزاج نہیں تھا۔ وہ مائیکل اور اس کے تجارتی سامان (بردوں) کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہا تھا۔ یہ فارم وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ رہائشی حصے اور گودام کے اردگرد بڑے اہتمام سے خاردار باڑھ لگائی گئی تھی۔ غالباً جنگلی جانوروں سے حفاظت کی غرض سے ایسا کیا گیا تھا۔ رہائشی حصے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا گیٹ تھا۔ گیٹ کے قریب ہی گھاس مٹی اور کھجور کے دیوہیکل تنوں سے بنائے گئے بڑے بڑے سائبان تھے۔ ان سائبانوں کے نیچے ٹرالر کھڑے تھے اس کے علاوہ چند ایک کاریں اور جیپیں بھی نظر آتی تھیں۔ گیٹ پر سخت پہرا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ خاردار تار کے ساتھ ساتھ بھی مسلح حبشی دکھائی دیتے تھے۔ یقیناً ہماری آمد سے قبل یہاں اتنا سخت پہرا نہیں تھا۔

ان دو تین دنوں میں ہم نے خوب آرام کیا۔ صفدر اور زریں کی نوک جھونک گاہے گاہے دلچسپی کا سامان بھی پیدا کرتی رہی۔ کھانا ہمیں فارم کے ملازمین ہی دیتے تھے۔ ان میں ایک سوکھا سڑا ملازم ساوات بہت ہنس مکھ تھا۔ اس کی پیشانی پر نظر آنے والی محراب گواہی دیتی تھی کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے۔ صفدر خاص طور پر اس کی طبیعت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ساوات کے گیارہ بچے تھے' وہ فارم کے بیشتر ملازمین کی طرح "پکا ملازم" تھا اور فارم کی حدود کے اندر ہی واقع ایک بستی میں رہتا تھا۔ غربت' محنت اور قناعت پسندی ساوات کے چہرے پر یوں رقم تھی جیسے اخبار کی پیشانی

کو ہیڈ لائن ہوتی ہے۔ صفدر کے پاس وہ چھوٹا سا طلائی ہار ابھی تک محفوظ تھا جو اسے بمبئی کی بندرگاہ پر ملا تھا۔ ہمارے چالاک گائیڈ نے کوسٹ گارڈز کے خوف سے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ اس راستے سے چند لمحے پہلے صفدر نے یہ ہار اس کی جیب سے پار کر لیا تھا۔ صفدر نے بڑی ہوشیاری سے اب تک یہ اپنے لباس میں چھپائے رکھا تھا۔ وہ غریب صورت سادات پر اتنا مہربان ہوا کہ آدھا ہار اسے دے دیا۔ اس آدھے ہار میں بھی آٹھ طلائی موتی تھے' اور ان کی قیمت پانچ چھ ہزار پاکستانی روپے سے کم نہیں تھی۔

کانی فارم میں اپنے قیام کے تیسرے روز ہم پر انکشاف ہوا کہ مائیکل اور اس کے ساتھیوں کو ابھی راستے کی کلیئرنس نہیں ملی اور کم از کم چار پانچ روز مزید ہمیں یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ اس صورت حال پر مائیکل اور اس کے ساتھی کافی جھنجلائے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک روز ان کے ساتھ مجھے "جہاز ہرکولیس" کا شرابی کپتان جم بھی نظر آیا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہرکولیس ہم سے زیادہ دور نہیں ہے' وہ ساحل کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ کسی تکنیکی خرابی کا بہانہ کر کے اسے کھاڑی کے پاس ہی لنگر انداز کر دیا گیا ہو۔

میرے اور صفدر کے ذہن میں ایک خیال بار بار شدت سے پیدا ہو رہا تھا۔ اگر ہم بردہ فروش مائیکل کے چنگل سے نکلنا چاہتے تھے تو اس کے لیے یہ حالات بڑے سازگار تھے۔ غزالہ کی حیثیت اب بھی بے شک ایک یرغمالی کی سی تھی مگر جہاز والی صورت حال یہاں نہیں تھی۔ وہاں غزالہ ہر گھڑی ویڈیو کیمرے کی نظر میں تھی اور ہماری کسی غلطی کے سبب ایک لمحے میں اس کی جان جا سکتی تھی۔ پھر وہاں ہم سمندر کے قیدی تھے۔ جہاز سے فرار بھی ہو جاتے تو کہاں جاتے اور جہاز سے فرار ہونا بھی کون سا سہل تھا۔ ہمیں جہاز کے زیریں کمپارٹمنٹ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے نکلنا سوئی کے ناکے میں سے گزرنے کے برابر تھا۔ اب ہم ٹھوس زمین پر کھڑے تھے' یہاں حفاظتی انتظامات بھی عارضی نوعیت کے تھے۔ ان انتظامات میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ ہم سب ساتھی ایک ہی جگہ پر موجود تھے' صرف غزالہ کا مسئلہ تھا۔ اگر ہم کسی طرح اس تک پہنچ جاتے تو پھر یہاں سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آدھی رات کے بعد حفاظتی انتظامات کافی نرم ہو جاتے ہیں۔ خاردار تار کے قریب پہرا دینے والے اکثر افراد بھی رائفلوں کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتے تھے' اونگھنے لگتے تھے یا سو جاتے تھے۔ صرف دو عدد کتے تھے جو گیٹ کے قریب رات بھر جاگتے اور بھونکتے رہتے تھے۔

میں اور صفدر پہرے داروں کے معمولات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ صفدر باتوں باتوں میں ملازم سادات سے بھی معلومات حاصل کر رہا تھا۔ فارم کے رہائشی علاقے کا نقشہ سارا نقشہ صفدر نے سادات سے معلوم کر لیا تھا۔ جوں جوں ہماری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمیں یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا کہ ہمیں بردہ فروش مائیکل کے جال سے نکلنے کی ایک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم یہ کوشش کیے بغیر دوبارہ ہرکولیس پر پہنچ جاتے تو اس کا افسوس ہمیں تادیر رہتا۔ فارم میں ہمارے قیام کے چوتھے پانچویں دن کی بات ہے۔

صبح آنکھ کھلی تو ڈھول ڈھمکے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا' بہت سے حبشی ایک دائرے کی شکل میں ناچ رہے تھے اور اپنی بندوقیں لہرا رہے تھے۔ ان کے درمیان تین سیاہ فام لڑکیاں محو رقص تھیں۔ لڑکیوں نے رواج کے مطابق بڑی ہلکی پھلکی چولیاں نما شرٹس پہن رکھی تھیں۔ یہ شرٹس ان کے صحت مند جسمانی نشیب و فراز کو چھپانے کے بجائے اور نمایاں کر رہی تھیں۔ زیریں جسم پر لنگی کی طرح کا لباس تھا۔ یہ لباس لڑکیوں کو صرف گھٹنوں تک ہی ڈھانپ رہا تھا۔ افریقی طرز کے کچھ ساز بھی بجائے جا رہے تھے۔ ساز بجانے والوں نے اپنے چہرے جنگلیوں کے سے انداز میں رنگے ہوئے تھے۔ انہوں نے آنکھوں میں سرخ رنگ ڈال رکھا تھا جس کے سبب آنکھیں انگاروں کے مانند دکھائی دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد فارم کے ملازمین ہمیں ناشتا دینے کے لیے آئے تو وہ بھی نئے کپڑوں میں نظر آ رہے تھے۔ صفدر نے اپنے "یار" سادات سے پوچھا "یہ کیا چکر ہے بھئی؟"

وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "یہ یہاں کا مقامی تہوار ہے۔ اسے "سابورا" کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ آج کے روز جو دل کھول کر ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے سال بھر کے لیے دکھ اور غم اس سے دور رہتے ہیں۔"

اس روز رہائشی حصے کے اردگرد اور گودام کے قرب و جوار میں موج میلے کا سماں رہا۔ سب لوگ بہت خوش اور ہلکے پھلکے موڈ میں نظر آتے تھے۔ کانی کے کھیتوں میں کام بند تھا۔ عورتوں اور مردوں نے رنگ برنگ لباس پہن رکھے تھے اور ادھر سے ادھر چہکتے پھر رہے تھے۔ اتفاقاً اس روز چلچلاتا سورج سر پر نہیں تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور اس موسم نے لوگوں کو اور بھی نہال کر رکھا تھا۔ جس قسم کا یہ علاقہ تھا' وہاں ابر آلود موسم شاذ و نادر ہی جھلک دکھاتا ہے۔ لوگ اپنے

پیالوں میں ایک مشروب بڑے شوق سے پی رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ تاڑی تھی۔ تاڑی اس رس کو کہا جاتا ہے جو تاڑ کے درخت سے نکلتا ہے اور یہ نشہ آور مشروب ہوتا ہے۔ جوں جوں تاڑی سیاہ فاموں کے اندر جا رہی تھی ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ عجیب عجیب حرکتیں کر رہے تھے۔ کبھی چند افراد مل کر کسی عورت کو بازوؤں پر اٹھا لیتے اور اسے اٹھائے اٹھائے میدان کا چکر لگانے لگتے' کبھی نوجوان آپس میں دست و گریباں ہو جاتے اور ایک دوسرے کو غلیظ گالیوں سے نوازتے' اور بے ہودہ اشارے کرتے۔ کہیں پاس ہی لائیو میوزک بھی ہو رہا تھا لیکن سازندے اور گانے والے ہمیں کھڑکی میں سے نظر نہیں آ رہے تھے۔

مائیکل کے سیاہ فام ساتھی بھی اس ہلے گلے میں شریک تھے' تاڑی پینے والوں میں بھی وہ سب سے آگے آگے تھے۔ آدم خور نیامی حبشی نشے میں کچھ اور بھی خوں خوار نظر آنے لگے تھے۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ فارم کے عام حبشی ان نیامی حبشیوں کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان سے کنی کتراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نیامی حبشی عام سیاہ فاموں میں ایسے ہی تھے جیسے چرندوں میں چند درندے گھوم رہے ہوں۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں کہیں پاس ہی سے گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیں' جیسے کوئی عورت چیخنے کی کوشش کر رہی ہو مگر اس کا منہ کسی نے مضبوطی سے بند کر رکھا ہو۔ اس کے بعد دھما چوکڑی کی آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ عورت جدوجہد کر رہی ہے۔ چند مرد اس کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے پھر عورت کی جدوجہد دم توڑ گئی۔ کسی نیامی حبشی کی دبی دبی وحشیانہ ہنسی سنائی دی۔ خبر نہیں کہ یہ مظلوم عورت کون تھی اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ کھڑکی میں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ کمرے کے عقب میں نہیں بلکہ پہلو میں تھا۔ اچانک مجھے روشن دان کا خیال آیا۔ روشن دان میں دس بارہ فٹ کی بلندی پر ایک روشن دان موجود تھا۔ وہاں سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں اور صفدر ٹوائلٹ میں داخل ہوئے' میں صفدر کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا اور تنگ روشن دان میں سے دوسری طرف کا منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا عقبی صحن تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی اور کیلے کے دو درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں تلے جو منظر مجھے دکھائی دیا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اس چاروں طرف سے بند صحن میں چار نیامی حبشی تھے اور ایک عورت تھی۔ کچھ دیر پہلے دبی دبی آوازیں سننے کے بعد میرے اور صفدر کے ذہن میں یہ خدشہ جاگا تھا کہ شاید کسی بے کس قیدی خاتون کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر جو کچھ دکھائی دیا وہ زیادہ بھیانک تھا۔ مجھے اپنی بصارت پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے فربہ اندام ارانی مارکوس کی زندہ بچ رہنے والی بیوی کو دیکھا۔ اپنے آنجہانی خاوند کی طرح وہ بھی بے حد سرخ و سفید تھی اور تندرست و فربہ بھی تھی۔ بہرحال خاوند کی طرح اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا نہیں تھا اور نہ ہی اس پر فالتو چربی تھی۔ اسے ایک پرکشش موٹی عورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ اس حالت میں زمین پر پڑی تھی کہ اس کے پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے اور جس طرح گائے کو تکبیر پھیری جاتی ہے بالکل اسی طرح بدنصیب عورت کا گلا کٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون ایک چھوٹے سے گڑھے میں جمع تھا اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ عورت کے جسم پر لباس کے نام پر بس چند دھجیاں سی رہ گئی تھیں' اس کے بال مٹی اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ آدم خور حبشی اس کے بے جان جسم کو دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں بے نام خوشی کروٹیں لے رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے خون سے بھرے ہوئے گڑھے کو مٹی ڈال کر برابر کر دیا اور ذبح شدہ جسم کو ہاتھوں میں اٹھا کر اندر لے گئے۔ یہ جشن کا دن تھا' ایسے پرمسرت موقعوں کا حسن بہترین کھانوں سے دوبالا ہوتا ہے۔ یقیناً ان آدم خوروں کے لیے اس پرمسرت موقع کا حسن دوبالا ہو چکا تھا۔

میں روشن دان سے نیچے اتر آیا لیکن میری آنکھیں جیسے روشن دان میں ہی رہیں' میں تصور کی نظر سے وحشی نیامیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ تاڑی کے نشے میں بدمست ہو کر قہقہے لگا رہے تھے اور ساتھ ساتھ بدنصیب عورت کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے۔ صفائی سے کاٹے گئے گوشت کے چھوٹے بڑے لوتھڑے میری نگاہوں میں گھومنے لگے اور میرا دل اچھل اچھل کر حلق کی طرف آنے لگا۔

صفدر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! کیا ہے وہاں؟ کون عورت تھی؟"

"مارکوس کی بیوی۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"وہی موٹی عورت نا.... جس نے مارکوس کو پھانسی سے بچانے کے لیے بڑا واویلا کیا تھا؟"

"ہاں وہی۔ بعد میں مائیکل نے اس کی مشکیں کسوا دی تھیں۔"

"ہاں کیا ہوا اس کے ساتھ؟" صفدر کے لہجے میں بے قراری تھی۔

"وہ آج ضیامیوں کے جشن کو پرلطف بنانے کی خاطر ان کے کھانوں میں لذت پیدا کرے گی۔"

"کیا مطلب۔ وہ اس سے کھانا پکوا رہے ہیں۔"

میں نے اپنے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ محسوس کی "کھانا پکوا نہیں رہے وہ اسے کھانے میں شامل کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے کسی جانور ہی کی طرح ذبح کر دیا گیا ہے اب وہ درندے اس کے حصے بخرے کر رہے ہوں گے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" صفدر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

آدم خوری کے واقعات ہم پڑھتے اور سنتے آئے تھے، کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اب یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ابھی تک سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے واقعی یہ سب کچھ دیکھا ہے یا میرے تصور نے پختہ ہو کر ایک بھیانک منظر کی شکل اختیار کی ہے۔ جس وقت ہمیں کمرے کے باہر سے دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں اس وقت یقیناً کسی عورت کو زمین پر گرا کر ذبح کیا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے دھینگا مشتی کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت عورت کو زمین پر گرانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بدنصیب عورت کی لاش پر مجھے چوٹوں کے تازہ نشان نظر آئے تھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ شہ رگ کٹوانے سے پہلے اس نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔

ہم نے باقی ساتھیوں کو کچھ نہیں بتایا۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی دہکنے لگا تھا۔ میرے اندر سے جیسے آواز آ رہی تھی کہ مائیکل کے جال کو کاٹنے کا اس سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔ زیادہ تر پہرے دار اور مسلح افراد تاڑی کے نشے میں بدمست تھے۔ ان میں ڈسپلن نظر آ رہا تھا اور نہ کسی قسم کی ذمے داری کا احساس۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس نے ان لوگوں کو اور بھی مسرور کر دیا تھا۔ نیم تاریکی میں کئی افراد درختوں تلے لیٹے نظر آتے تھے' ہمارے کمرے کے دروازے پر بھی صرف ایک پہرے دار موجود تھا۔ میں نے دیکھا صفدر کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔ وہی امنگ وہی ترنگ جو ہمیں بے خطر مصائب سے ٹکرانے پر اکساتی تھی' وہی جوش جو ہمارے سینے میں لہر لیتا تھا تو موت ہمیں ایک حقیر اور بے وقعت شے نظر آنے لگتی تھی۔

میں نے زریں اور گلثوم سے کہا کہ وہ تیار ہو جائیں۔ زریں کا رنگ پہلے تو پھیکا پڑا مگر پھر اس کے چہرے پر بھی سرخی لہرا گئی۔ وہ میری بات کے معنی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ یہ معنی اس نے گلثوم کو بھی سمجھا دیے۔ میری توقع کے عین مطابق گلثوم کے چہرے پر بھی کسی طرح کا خوف و ہراس دکھائی نہیں دیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہاں سے نکلنے اور نکلنے کے سلسلے میں پیش آنے والے تمام خطرات کے لیے تیار تھی۔ وہ گلگت کے برف زاروں میں پرورش پانے والی ایک دلیر و جفاکش قبائلی لڑکی تھی' حوادث سے کھیلنا اس کے لیے کوئی انوکھا کام نہیں تھا۔

میں اور صفدر بڑی شدت سے آٹھ بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے چار روزہ جائزے کے مطابق ٹھیک آٹھ بجے فارم کا ایک ملازم دوپہر کے خالی برتن لینے کے لیے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ اپنی کارروائی کے آغاز کے لیے ہم نے اسی وقت کا انتخاب کر رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے آج بھی ملازم ٹھیک وقت پر ہی نمودار ہو گیا۔ مسلح محافظ نے دروازہ کھولا اور رائفل ہاتھ میں لے کر چوکس کھڑا ہو گیا۔ محافظ کی سانپ سی آنکھیں بے حد تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ وہ جیسے ایک ہی نظر میں کمرے کی ہر شے کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی ملازم کمرے میں داخل ہوا میں نے اپنا جسم تول لیا۔ ایک لمحے کے لیے ملازم میرے اور مسلح محافظ کے درمیان آیا۔ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اسی دوران میں صفدر نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر محافظ کو چھاپ لیا۔ محافظ کی توجہ چونکہ مکمل طور پر میری طرف تھی لہٰذا صفدر کو کسی طرح کی مشکل پیش نہیں آئی۔ بوکھلا کر محافظ اگر لبلبی دبا بھی دیتا تو نشانہ فارم کا ملازم ہی بنتا جسے میں نے ڈھال کی صورت اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ملازم کی گردن کو اپنے بازو کے مخصوص شکنجے میں جکڑا اور ایک جھٹکے میں اس کا تنا ہوا جسم میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ دوسری طرف صفدر نے محافظ کا سر پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا تھا۔ صفدر کے فولادی بازوؤں کی لگائی ہوئی یہ ایک ضرب ہی محافظ کے لیے تسلی بخش ثابت ہوئی اور رائفل اس کے ہاتھوں سے گر پڑی جسے زریں نے گرنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ صفدر نے احتیاط کے طور پر محافظ کا کھوپڑا ایک بار پھر دیوار سے ٹکرا دیا اور اس کے بعد اسے بڑے اطمینان سے فرش پر لمبا لٹا دیا۔ محافظ کی رائفل صفدر نے اپنے قبضے میں لے لی اور محافظ کی پتلون کی جیبوں سے دو بھرے ہوئے میگزین بھی نکال لیے۔ دونوں بے ہوش سیاہ فاموں کو گھسیٹ کر ہم نے ٹوائلٹ میں پہنچا دیا۔ زریں نے بڑی پھرتی کے ساتھ ایک چادر کی لمبی لمبی

پٹیاں پھاڑنی شروع کر دیں۔ وہ یقیناً ان پٹیوں کے ساتھ دونوں افراد کی مشکیں کسنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں اور صفدر کمرے سے باہر نکل آئے' صفدر کی ہدایت پر گلثوم نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ہم دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ وادی میں آگے بڑھے۔ وسیع احاطے میں سائبانوں تلے تین ٹرالر کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیں انہی میں سے کسی ایک ٹرالر کو پناہ کے لیے استعمال کرنا تھا لیکن اس سے پہلے غزالہ کی رہائی ضروری تھی۔ تابی کے رونے کی آواز اکثر آتی رہتی تھی۔ اس کی آواز سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ غزالہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہم اس کمرے تک پہنچ گئے یہاں بھی ایک محافظ موجود تھا۔ اس کے بے حد چوڑے جبڑے اس بات کے غماز تھے کہ وہ سیاہ فاموں کی آدم خور نسل سے تعلق رکھتا ہے' یعنی یہ انہی منحوس ضیامیوں میں سے ایک تھا جنہیں تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک عورت کو نہایت درندگی سے ذبح کرتے دیکھا تھا۔

یہاں مسئلہ یہ تھا کہ پہرے دار برآمدے کی طرف کھڑا تھا۔ اگر ہم وہاں جا کر اسے قابو کرتے تو عین ممکن تھا کہ درختوں کے نیچے موج میلہ کرنے والے لوگوں میں سے کسی کی نظر اس منظر پر پڑ جاتی اور یہ ایک سنگین رسک تھا۔ صفدر اور میں دیوار سے چپکے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ محافظ چہل قدمی کرتا ہوا ہماری جانب آئے اور ہم اس کی خیر خیریت پوچھ سکیں۔ وہ بدبخت چہل قدمی تو کر رہا تھا لیکن ہم سے سات آٹھ فٹ کی دوری پر آ کر واپس چلا جاتا تھا۔ تقریباً دو منٹ تک ہم نے سچے عاشقوں کی طرح اس کی آمد کا انتظار کیا لیکن وہ مسلسل ہم سے بے رخی برتتا رہا۔ آخر اسے اپنے قریب کرنے کے لیے صفدر نے اس کی طرف ایک "لولیٹر" پھینکا۔ یہ لولیٹر دراصل ایک کنکری تھی جو محافظ کی گردن پر لگی۔ اس نے وادی کی طرف دیکھا اور افریقی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً وہ اسے اپنے کسی ساتھی کی شرارت سمجھا تھا اور اس شرارت کے بدلے میں اسے کوئی بے تکلف قسم کی گالی دے رہا تھا' صفدر نے یکے بعد دیگرے دو کنکریاں اور ماریں۔ اب محافظ کے لیے تاریک وادی کی طرف آنا اور اندر جھانکنا ضروری ہو گیا۔ جونہی اس نے گردن لمبی کر کے وادی میں دیکھا' میں نے اس کی گردن یوں جکڑی کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکا۔ میں نے گردن کی رگ پر جونہی مخصوص دباؤ ڈالا مگر انڈیل آدم خور میرے بازوؤں میں تولیے کی طرح لٹک گیا۔ صفدر نے اس کی ٹریل ٹو گن تھام لی جبکہ

میں نے اس کی کمر میں اڑسا ہوا ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا کھینچ لیا۔ صفدر نے پھرتی سے اس کی جامہ تلاشی لی۔ ہماری خوش قسمتی کہ کمرے کی چابیاں اس کی پتلون کی جیب سے مل گئیں۔ میں نے دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے ہی پیچھے صفدر بھی آدم خور کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

غزالہ اور تابی کمرے میں موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر غزالہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ صفدر نے تابی کو اٹھایا' میں نے غزالہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ بڑے خطرناک لمحات تھے' احاطے میں موجود کسی نیگرو کی نگاہ بھی ہم پر پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وادی میں سے بھی کوئی مسلح شخص اچانک ہمارے روبرو آ سکتا تھا۔ میں نے گن کندھے سے لٹکائی تھی اور چھرا ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صفدر اور میں دونوں مرنے مارنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے اپنے دیگر ساتھیوں یعنی زریں اور گلثوم تک پہنچے وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ احاطے میں آ کر خاردار باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہم ان سائبانوں کے نیچے پہنچ گئے جہاں بڑے بڑے ٹرالر کھڑے تھے۔ یہ ایک خوش کن اتفاق تھا کہ ٹرالروں تک آتے آتے ہمیں کسی نے دیکھا نہیں' اور اگر دیکھا بھی تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ ہم نے ٹرالروں کے عقبی دروازوں کو آزمانا شروع کیا' تیسرے ٹرالر کا دروازہ کھل گیا۔ ہم یکے بعد دیگرے اندر گھس گئے۔ یہاں خشک کافی کے بڑے بڑے پیکٹ رکھے تھے اور فرش پر بھی خشک پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اب تک میں اور صفدر ٹرالروں کی آمد و رفت کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے "ٹرالر رات کے نو بجے احاطے سے نکل جاتے تھے اور ان کی واپسی اگلے روز بارہ بجے کے قریب ہوتی تھی۔ میری گھڑی کے مطابق سوا آٹھ بج چکے تھے' اگر معمول کے مطابق یعنی ٹھیک نو بجے ٹرالر یہاں سے نکل جاتے تو بھی ابھی ہمیں ۴۵ منٹ مزید انتظار کرنا تھا۔ یہ ۴۵ منٹ بہت دسک والے تھے۔ اگر اس دوران میں غزالہ کے کمرے یا ہمارے کمرے میں جھانک لیا جاتا تو پورے احاطے میں تہلکہ مچ جاتا۔ چاروں طرف ہماری تلاش شروع ہو جاتی' اور بڑی بات نہیں تھی کہ آٹھ دس منٹ کے اندر تلاشی لینے والے ان ٹرالروں تک بھی پہنچ جاتے۔ ہماری سلامتی اسی میں تھی کہ یہ چالیس پینتالیس منٹ خیریت سے گزر جائیں اور معمول کے مطابق نو بجے ٹرالر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

ہم نے ٹرالر کا دروازہ بند کر دیا تھا' اندر گھپ اندھیرا تھا

اور گرمی بھی بہت تھی۔ ہمیں زیادہ ڈر تانی کی طرف سے تھا۔ وہ گرمی سے بے قرار ہو رہا تھا' اگر وہ رونا شروع کر دیتا تو مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ میری گھڑی کا چمکنے والا ڈائل بتا رہا تھا کہ نو بجنے میں ابھی بھی تیس منٹ باقی ہیں۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر کٹ رہا تھا۔ اچانک ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ ٹرالر کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ صفدر نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل کا رخ دروازے کی طرف کر دیا اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر کسی بھی کارروائی کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ میں نے ڈیڑھ فٹ لمبے چھرے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اندھیرے میں مجھے صفدر کا صرف ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوسری دستک کا انتظار کیا۔ دوسری دستک پہلے سے زیادہ واضح انداز میں ہوئی' بہرحال وہ بھی بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ صفدر نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک اکیلا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز تھی مگر یہ ہتھیار نہیں تھا۔ یہ ایک ٹارچ تھی۔ صفدر کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "ساوات تم؟"

ساوات نے ٹارچ روشن کر کے ہمارے چہرے دیکھے اور اگلے ہی لمحے ٹارچ بجھا دی۔ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا "یہ آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔" صفدر نے کہا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

وہ شکستہ انگریزی میں بولا "میں گودام کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے آپ کو ٹرالر کی طرف آتے دیکھا' میرے دیکھتے ہی دیکھتے آپ لوگ دروازہ کھول کر اندر گھس گئے۔"

"کسی اور کو تو معلوم نہیں کہ ہم یہاں ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں نے تو کسی کو نہیں بتایا اور اگر میرے علاوہ کسی کو پتا ہوتا تو اب تک یہاں قیامت برپا ہو گئی ہوتی۔" ساوات کی بات منطقی تھی۔

"ایک بات پوچھوں' بتاؤ گے؟" صفدر نے کہا۔

اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے "میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ صاحب لوگ مجھے کسی کڑی آزمائش میں نہیں ڈالیں گے۔"

صفدر نے کہا "نہیں کڑی آزمائش تو نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دو کہ یہ ٹرالر آج بھی نو بجے نکل جائیں گے یا نہیں؟"

وہ ذرا ہچکچا کر بولا "امید تو یہی ہے کہ نکل جائیں گے' لیکن۔۔۔ آپ نے ایک غلطی کی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہ لوڈر جس میں آپ گھسے ہیں' خراب ہے' شاید آپ اندھیرے کی وجہ سے اس کا اگلا حصہ نہیں دیکھ سکے' اس کے اگلے حصے کو کھولا گیا ہے۔"

یہ اطلاع سن کر ہم سناٹے میں رہ گئے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد صفدر بولا "پھر اب کیا کرنا چاہیے۔"

اس نے بے قراری سے اپنے گھنگریالے بال کھجائے۔ یقیناً وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں غیرارادی طور پر کسی سازش کا حصہ نہ بن جائے۔ ممکن ہے کہ تذبذب کے ان لمحات میں اسے صفدر کا وہ حسنِ سلوک یاد آیا ہو جو وہ اس سے کرتا رہا تھا' اور پھر وہ فراخ دلی بھی یاد آئی ہو جو طلائی ہار کے سلسلے میں صفدر نے اس سے برتی تھی۔ وہ ہچکچاتے لہجے میں بولا "جو کچھ آپ نے سوچا ہے یہ کافی خطرناک ہے' بہرحال اگر آپ یہ کرنا ہی چاہتے ہیں تو پھر لوڈر تبدیل کر لیں اور بہتر ہے کہ اس لوڈر میں بیٹھیں جو گیٹ کی طرف ہے' امید ہے کہ وہ پہلے نکل جائے گا۔ باقی دونوں شاید بعد میں آئیں۔"

اتنا کہتے کہتے ساوات آگے نکل گیا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ چند سیکنڈ بھی مزید یہاں رکا تو اس کی دنیا اور عاقبت برباد ہو جائیں گی۔

میں نے اچھی طرح اردگرد کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے میں باہر نکلا اور احتیاط سے چلتا ہوا دوسرے لوڈر تک پہنچ گیا۔ لوڈر کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا یہاں بھی کالی کے بڑے بڑے بنڈل نظر آ رہے تھے۔ میرے اشارے پر صفدر اور باقی افراد بھی اس دوسرے لوڈر میں آ گئے۔ لوڈر کا دروازہ ہم نے اندر سے کھلا رہنے دیا' کیونکہ اگر لوڈرز کے روانہ ہونے سے پہلے کوئی شخص دروازہ چیک کرتا تو بند دروازے کی وجہ سے وہ الرٹ ہو جاتا۔ تاہم اگر وہ دروازہ کھول کر اندر جھانک بھی لیتا تو تاریکی کی وجہ سے ہمارا نظر آنا آسان نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ ٹارچ استعمال کرتا تو اور بات تھی۔

نو بجنے میں ابھی بھی بیس منٹ باقی تھے۔ میں اور صفدر ایک ایک پل گن کر گزار رہے تھے۔ اب تک کے جائزے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ یہاں وقت کی بے حد پابندی کی جاتی ہے۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا لیکن آج صورتِ حال کچھ مختلف تھی۔ بلے گلے اور مستی میں یہاں کا نظام اپ سیٹ ہو رہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ لوڈر بھی وقت پر یہاں سے نکل سکتے یا نہیں۔ اگر ان لوڈرز یعنی ٹرالرز کے نکلنے میں تاخیر ہو جاتی اور اندر کمروں میں بھانڈا پھوٹ جاتا تو یہ ٹرالر ہی ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہو سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے نو بجے' دو تین افراد کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کسی شخص نے ٹرالر کا دروازہ کھولا' بے دھیانی سے اندر جھانکا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ یہ مرحلہ تو بخوبی طے ہو گیا تھا' اب ٹرالر کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار تھا۔ گھڑی کی سوئیاں نو سے آگے بڑھتی چلی گئیں مگر ٹرالر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ آس پاس کسی طرح کی سرگرمی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

غزالہ کی پر تشویش آواز تاریکی سے ابھری "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔"

زریں نے بڑے عزم سے کہا "ام گڑبڑ سے ڈرنے والا نہیں ہے غزالہ بی بی! اگر گڑبڑ ہو گا تو ام جوابی گڑبڑ کرے گا۔ ایسے لوگوں کے خلاف لڑتے ہوئے اگر جان بھی چلا گیا تو پروا نہیں۔"

"لیکن تمہارے ساتھ صرف "جان" ہی نہیں "جانِ من" کا مسئلہ بھی ہے۔ میرا مطلب گلثوم سے ہے۔" صفدر فقرہ چسپاں کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

زریں کے بجائے گلثوم کی آواز ابھری "ام بڑی خوشی سے زریں کو ساتھ لے کر مرے گا صفدر صیب۔۔۔ ام انشاء اللہ ایک دم تیار ہے۔"

وہ ایسی ہی اوٹ پٹانگ اردو بول رہی تھی۔

نو بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے' ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ اچانک ایک تسلی بخش تھرتھراہٹ کے ساتھ ٹرالر اسٹارٹ ہو گیا۔ کچھ دیر اسٹارٹ رہنے کے بعد اس نے حرکت کی اور رینگتا ہوا خاردار باڑھ والے احاطے سے باہر آ گیا۔ ہمیں قدرے اطمینان محسوس ہوا اب کسی بھی جگہ ہم کیبن میں شور برپا کر کے ڈرائیور کو ٹرالر روکنے پر مجبور کر سکتے تھے' اس کے بعد ٹرالر کے ذریعے یا ٹرالر کے بغیر فرار ہونا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ہم کسی بھی نزدیکی پولیس اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ اس کے بعد اعلیٰ حکام سے ہمارا رابطہ ہو سکتا تھا یا کوئی بھی بہتر صورتِ حال سامنے آ سکتی تھی۔

ابھی ہمیں احاطے سے نکلے بمشکل چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ٹرالر کے عقب میں کسی گاڑی کا مسلسل ہارن سنائی دینے لگا۔ ہارن کی یہ آواز تشویش ناک تھی۔ جلد ہی یہ گاڑی ٹرالر کے عین عقب میں پہنچ گئی۔ ٹرالر اونچے نیچے راستے پر پندرہ بیس میل کی رفتار سے جا رہا تھا۔ اس کی رفتار ایک دم کم ہوئی اور پھر وہ راستے کے کنارے رک گیا۔ عقب میں آنے والی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ پھر چند افراد بلند آواز میں باتیں کرنے لگے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جو خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا وہ سامنے آ گیا ہے۔ ٹرالر کے عقب میں آنے والی گاڑی یقیناً اسے روکنے کے لیے آئی تھی اور وہ اسی لیے آئی تھی کہ فارم کے رہائشی کمروں میں ہماری کارروائی راز نہیں رہ سکی تھی۔

میں اور صفدر بالکل چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ اپنے دفاع کے لیے دو چار بندوں کو پھڑکانے کا ہم پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ میری ہدایت پر غزالہ۔۔۔ گلثوم اور زریں کالی کے بڑے بڑے پیکٹوں کی اوٹ میں چلے گئے اور ٹرالر کے تپتے ہوئے فرش پر اوندھے لیٹ گئے۔ میں اور صفدر ٹرالر کے کیبن کی دیواروں کے ساتھ چپک گئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ چند لمحے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور وہ کھل گیا۔ مجھے ایک لحیم شحیم شخص کا ہیولا نظر آیا' یقیناً وہ ٹرالر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی کیبن میں پھینکی۔ اس کی نگاہ صفدر پر پڑی' ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ناقابلِ فہم زبان میں چلا کر بھاگا۔ ٹرالر کے عین عقب میں ہمیں ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ اس کے دروازے کھلے تھے اور دروازوں کے عقب میں دو مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ ٹرالر ڈرائیور چیخ کر بھاگا تو دونوں مسلح افراد نے رائفلیں ہماری طرف سیدھی کیں مگر ان کے ٹریگر دبانے سے بہت پہلے ہماری رائفلوں نے دھماکوں کے ساتھ شعلے اگلے اور دونوں افراد تڑپ کر زمین بوس ہو گئے۔ اسی دوران میں جیپ کے پچھلے حصے سے آٹومیٹک رائفل کا برسٹ مارا گیا۔ یہ برسٹ ٹرالر کے ادھ کھلے دروازے میں لگا۔ شاید ایک آدھ گولی اندر کیبن میں بھی پہنچی ہو لیکن اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تاریکی میں چمکنے والے شعلوں کی وجہ سے ہمیں فائرنگ کے ٹھیک ٹھیک مقام کا اندازہ ہو گیا تھا' یہ فائرنگ جیپ کے عقبی حصے میں سے کی گئی تھی۔ حملہ آور ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا ہم نے جیپ کی عقبی نشست کا نشانہ لے کر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اچانک جیپ کے عقب سے شعلے بلند ہوئے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا جیپ کے عقبی دروازے پر آئل کا گیلن (کنٹینر) میں موجود تھا۔ گولیاں اس میں لگی تھیں اور جیپ دھماکے سے شعلوں کی زد میں آ گئی تھی۔ میں اور صفدر جست لگا کر ٹرالر سے اترے' میں نے ٹرالر ڈرائیور کی گری ہوئی طاقت ور ٹارچ اٹھائی۔ اسے روشن کیا' ڈرائیور کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ دکھائی نہیں دیا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ

موقع سے فرار ہو گیا ہے۔ صفدر دوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا۔ ٹرالر کی چابی اگنیشن میں موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈرائیور چابی سمیت فرار ہو گیا ہے۔ میں نے دیگر ساتھیوں کو ٹرالر سے اترنے کی ہدایت کی۔ وہ سب یکے بعد دیگرے پیکٹوں کی اوٹ سے نکلے اور نیچے آ گئے۔

یہی وقت تھا جب دور عقب میں گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ گاڑیاں ہماری ہی طرف آ رہی تھیں۔ فارم ہاؤس اتنا دور نہیں تھا کہ یہاں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ کی آواز وہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ آواز وہاں تک پہنچ گئی تھی اور مائیکل اپنے خوں خوار ساتھیوں کے ہمراہ ہمارے پیچھے لپک رہا تھا۔

"صفدر چلو نکلیں یہاں سے۔" میں نے کہا۔

ہم سب فوراً کچے پکے راستے سے اترے اور ایک میدان میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے عقب میں جلتی ہوئی جیپ کی روشنی تھی اور جلے ہوئے گوشت کی بو تھی۔ جس شخص نے عقبی نشست سے ہم پر برسٹ مارا تھا وہ ہماری فائرنگ کا نشانہ بننے کے بعد جیپ ہی میں جل گیا تھا۔ دیگر دو افراد کی لاشیں بھی آگ کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہم بڑی تیزی کے ساتھ راستے سے دور ہو رہے تھے اور گاڑیوں کی اچھلتی کودتی روشنیاں بھی تیزی کے ساتھ ٹرالر اور جیپ کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ غزال کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے زریں گل نے تابی کو اٹھایا تھا' گلثوم سب سے زیادہ چوکس نظر آ رہی تھی۔

اندازاً آدھ گھنٹے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ فارم ہاؤس سے آنے والی گاڑیوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا ہے' ان کی روشنیاں گاہے گاہے جھاڑیوں کے اندر سے چمک جاتی تھیں اس کے علاوہ ایک پُرخطر آواز بھی ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ یہ کتوں کی آواز تھی۔ متلاشی پارٹی کے ساتھ یقیناً کتے بھی موجود تھے۔ یہ ایک حبس زدہ رات تھی' پسینہ ہمارے جسموں سے دھاروں کی صورت نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پیاس بھی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارا اور گاڑیوں کا فاصلہ بتدریج کم ہو رہا ہے۔ گاڑیوں کی تعداد کم از کم چھ تھی' وہ پھیل کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کے ساتھ ساتھ اب انجنوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہماری دائیں جانب ایک نشیب سا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا' یہ دراصل ایک خشک آبی گزرگاہ تھی۔ اس گزرگاہ کی دوسری طرف زیادہ گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔

میں نے صفدر سے کہا "یار! ہم غلطی کر رہے ہیں۔ اس میدان میں گاڑیاں بڑی جلدی ہم تک پہنچ جائیں گی۔ کیوں نہ ہم یہ آبی گزرگاہ پار کر جائیں۔"

صفدر نے تائید کی "پرلی طرف کے درخت گھنے ہیں۔ اگر گاڑیاں یہ نالا پار کر بھی گئیں تو ان درختوں میں وہ تیز رفتاری سے نہیں چل سکیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے' پھر پار جاتے ہیں۔"

ہم نے رخ تبدیل کیا اور خشک آبی گزرگاہ میں اتر گئے۔ یہاں کافی نشیب و فراز تھے۔ تاریکی کے سبب پاؤں بہت سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ ٹارچ تو موجود تھی لیکن اسے روشن کرنے کا خطرہ ہم مول نہیں لے سکتے تھے۔ جیسے تیسے ہم نے گزرگاہ پار کی اور نسبتاً گھنے درختوں میں گھس گئے۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے اگا ہوا تھا۔ گڑھے بھی کافی تھے ہمیں قوی امید پیدا ہو گئی کہ متعاقب افراد کو اپنی جیپوں وغیرہ سے اترنا پڑے گا۔

ساحل تنزانیہ کی اس حبس زدہ رات میں زندگی اور موت کا یہ تعاقب دو گھنٹے جاری رہا۔ ہماری توقع کے عین مطابق متعاقب افراد کو گاڑیاں چھوڑنا پڑی تھیں اور وہ پا پیادہ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ میرے اور صفدر کے قیافے کے مطابق وہ کسی طرح بھی تیس سے کم نہیں تھے۔

انجانے راستوں پر ہمارے پاؤں چھل گئے تھے اور جھاڑیوں سے رگڑ رگڑ کر جسم پر جلتی ہوئی خراشیں آ گئی تھیں۔ تابی کی حالت ترس ناک تھی۔ ٹرالر کے اندر ہی اس کا پیاس سے برا حال تھا اور اب تو دو گھنٹے مزید گزر چکے تھے۔ وہ اب رو رو کر نڈھال ہو گیا تھا اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر بے سُدھ پڑا تھا۔ اچانک صفدر رک گیا "وہ دیکھیے شاہ جہاں صاحب۔" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

کچھ ٹارچوں کی روشنیاں' ہمیں اب جنوب کے رخ پر نظر آ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ اب قریب آنے کے بجائے دور جا رہی ہیں۔ چار پانچ منٹ میں یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ روشنیاں ہم سے دور جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی مدھم پڑ گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بُوگیر کتے کسی وجہ سے بھٹک گئے ہیں اور اپنے ساتھ اپنے مالکوں کو بھی بھٹکا رہے ہیں۔ یہ صورت حال ہمارے لیے بڑی خوش آئند تھی۔

زریں نے کہا "سائیں عالی نے ام کو ایک وظیفہ بتایا تھا

وہ ام مسلسل پڑھ رہا تھا۔"

صفدر بولا "کاش تم نے اس وقت بھی یہ وظیفہ پڑھ لیا ہوتا جب مائیکل ہمیں لاہور سے کراچی لانے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

"صفدر صیب! آپ وظیفے کا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

میں نے کہا "وظیفہ خواں سے مت بگاڑو ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ دو تین ٹولیوں میں بٹ گئے ہوں۔ جو لوگ ہم سے دور جا رہے ہیں وہ صرف ایک ٹولی کے لوگ ہوں' اتنے فاصلے سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانا تو ممکن نہیں ہے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ تابی نے بے تاب ہو کر ایک بار پھر رونا شروع کر دیا وہ میرے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا" میں نے اسے غزالہ کو تھما دیا۔ غزالہ نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر کوئی کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ یہ بے بسی ہم سب کے لیے تکلیف دہ تھی مگر ہم کر کچھ نہیں سکتے تھے' ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ معصوم بچے کی چیاؤں سے ہمیں اپنے حلق میں پڑے ہوئے کانٹے بھول گئے تھے۔ کچھ دیر بعد تابی پھر نڈھال ہو گیا اور غزالہ کے کندھے سے لگ کر سو گیا۔ بہرحال اس نیند کو نیم بے ہوشی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تقریباً معدوم ہو چکی تھیں اور اگر کبھی کوئی روشنی دکھائی بھی دیتی تھی تو وہ بہت فاصلے پر ہوتی تھی۔

یکا یک ہم بری طرح چونک گئے۔ ہمیں اپنی دائیں جانب بالکل پاس سے اچانک بہت سی روشنیاں دکھائی دیں اور اس کے ساتھ ہی خود کار رائفل کی "تڑ تڑ" سے جنگل کا سناٹا درہم برہم ہو گیا۔ "دوڑو!" میں نے پکار کر کہا۔

ہم سب جنوب کی سمت میں دوڑے' یہاں بلند و بالا سرکنڈے موجود تھے اور یہ سرکنڈے آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ قریباً تین چار ایکڑ میں پھیلے ہوئے تھے۔ عقب سے ایک بار پھر اندھا دھند فائرنگ ہوئی گولیاں درختوں کی شاخوں کو توڑتی اور کاٹتی ہوئی ہمارے قریب سے گزر گئیں۔ اس وقت سرکنڈے ہماری بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتے تھے۔ میں اور صفدر اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھے۔ دوڑتے دوڑتے ہم نے اپنے عقب میں چند برسٹ چلائے۔ مقصد یہی تھا کہ متعاقب افراد ہمارے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش نہ کریں۔ ان کا فاصلہ نصف فرلانگ کے قریب تھا۔ ہماری فائرنگ سے یہ فاصلہ کچھ بڑھ گیا۔ بالآخر ہم بلند و بالا سرکنڈوں کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں زمین کیچڑ آلود تھی اور پاؤں پھسل پھسل جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا الا بلا ان سرکنڈوں میں موجود تھا۔ مگر ہمارے پیچھے جو بلائیں لگی تھیں انہوں نے ہمیں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

آبی گزرگاہ کے بالکل کنارے پر سرکنڈوں کے درمیان ایک گڑھا سا تھا۔ اس میں بھی جھاڑیاں اور سرکنڈے نظر آ رہے تھے۔ ہم اس گڑھے میں گھسے اور چھپ کر بیٹھ گئے۔ یہ بڑے پُرخطر اور غیر یقینی لمحات تھے' ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمیں تلاش کرنے والوں کی صحیح تعداد کیا ہے اور ان کے پاس کس قسم کا اور کتنا اسلحہ ہے۔ ہم اردگرد سے آنے والی آوازوں کو بغور سن رہے تھے۔ وہ لوگ ہمارے آس پاس ہی موجود تھے۔ گاہے گاہے ان میں سے کوئی ہوائی فائر بھی کر دیتا تھا۔ ان میں ایک دو عورتیں بھی تھیں کیونکہ ان کی نسوانی آوازیں صاف پہچانی جا رہی تھیں۔ تاہم کتوں کی منحوس آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور یہ ایک اچھا شگون ہی تھا۔

کچھ دیر بعد ایک للکارتی ہوئی آواز سناٹے میں گونجی "ہو سکتا ہے کہ ان سرکنڈوں میں گھس گئے ہوں۔"

یہ بارعب آواز دہشت کی علامت تھی۔ یہ آدم خور مائیکل کے بدبخت گلے سے برآمد ہوئی تھی۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ مائیکل اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا کہ وہ سرکنڈوں کو گھیرے میں لیں۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھی دو درجن سے کم نہیں ہیں اور سب کے سب جدید اسلحے سے مسلح بھی ہیں۔ دو درجن مسلح افراد کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک نرل لو اور ایک سیون ایم ایم رائفل تھی۔ جبکہ ایمونیشن کی مقدار بس اتنی تھی کہ ہم دو تین منٹ سے زیادہ مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے لیے بہترین صورت حال یہی ہو سکتی تھی کہ مائیکل اینڈ کمپنی ہمیں ڈھونڈ نہ سکے۔ مگر عملاً ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ اپنی توجہ سرکنڈوں پر مرکوز کر چکے تھے' اور یوں آدھی کامیابی انہوں نے حاصل کر لی تھی۔

"فائر!" ایک کڑکتی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچی۔

اس کے فوراً بعد اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ تین اطراف سے کی جا رہی تھی اور اس کا ہدف سرکنڈوں کا یہی ذخیرہ تھا۔ دور مار رائفلوں کی گولیاں بارش کی بوچھاروں کی طرح برسیں اور ہمارے اردگرد سرخ لکیروں کا جال سا بچھ گیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم گڑھے میں تھے

ورنہ جانی نقصان اٹھائے بغیر نہ رہتے۔ چند سیکنڈ بعد فائرنگ ایک دم رک گئی۔ مائیکل کی چیختی ہوئی آواز رات کے سناٹے میں گونجی۔

"شاہ جہاں! تم لوگ گھیرے میں آ چکے ہو۔ زندگی چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ ورنہ اندر ہی بھون دیے جاؤ گے۔"

مائیکل نے اپنا یہ اعلان' الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ دو تین بار دُہرایا۔ اس کے بعد چند سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ ہم جانتے تھے یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے' اچانک ایک بار پھر یہ ویرانہ خود کار رائفلوں کے وحشیانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ یہ فائرنگ پہلے سے بھی زیادہ شدید تھی اور سرکنڈوں کے اس سارے جھنڈ کو کور کر رہی تھی۔ مائیکل اور اس کے ساتھی بے تحاشا ایمونیشن لے کر آئے تھے۔ غالباً اب ان کی خواہش تھی کہ سرکنڈوں میں داخل ہوئے بغیر ہمیں ختم کر ڈالیں۔ اور اگر ہم گڑھے کی گہرائی میں نہ ہوتے تو مائیکل لازماً اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ یہ گڑھا ہمارے لیے گوشۂ عافیت بن گیا تھا۔ خبر نہیں کہ یہ کن ہاتھوں نے کھودا تھا اور کس مقصد سے کھودا تھا۔ بعض اوقات ایسے گڑھوں میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے' جنگلی جانوروں کو پکڑنے کے لیے بھی اس قسم کے گڑھے کھودے جاتے ہیں' بہرحال کچھ بھی تھا اس گڑھے نے ہمیں "موت کے گڑھے" میں گرنے سے بچا رکھا تھا۔ ہم سب گڑھے کی تہہ سے چپک گئے تھے۔ پگھلا ہوا سیسہ ہمارے سروں کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا۔

"لگتا ہے کہ پاگل ہو گئے ہیں۔" صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

زریں نے کہا "وہ دیکھیں استاد صیب! وہاں آگ بھڑک اٹھا ہے۔"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا' خشک سرکنڈوں میں کئی جگہ اندھا دھند فائرنگ نے آگ لگا دی تھی۔ تاہم یہ آگ ایسی نہیں تھی کہ فوراً دور تک پھیل جاتی۔

قریباً تین منٹ بعد فائرنگ تھم گئی۔ شاید مائیکل کو یقین ہو چکا تھا کہ اب سرکنڈوں کے اندر گھسنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس نے للکار کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ سرکنڈوں کے اندر داخل ہو جائیں۔

ان لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ یا تو ہم راہی عدم ہو چکے ہیں یا پھر ان سرکنڈوں میں موجود ہی نہیں۔ وہ تینوں سمتوں سے سرکنڈوں میں داخل ہو گئے اور ہمیں تلاش کرنے لگے۔ ان کی روشن ٹارچوں سے ان کے رخ اور پھیلاؤ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ پچیس کے قریب افراد تھے۔ ان کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیر کر ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان میں اتالین بھی تھے۔ شرابی کپتان ٹم کی آواز تو میں نے صاف پہچانی۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہا تھا کہ ہم نے نہ صرف جشن کا مزہ کرکرا کیا بلکہ اتنی خوب صورت رات بھی برباد کر دی۔ طیش کے عالم میں وہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر بھی کر دیتا تھا۔ مائیکل بھی بلند آواز میں اپنے کارندوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہ لوگ ہمارے بالکل قریب پہنچ گئے تھے' ان کی ٹارچوں کے روشن دائرے ہمارے آس پاس تھے' ان کے قدموں سے سرکنڈے ٹوٹ رہے تھے اور یہ آوازیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ہم نے دم سادھ لیے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے حرکت ہو گئے تھے۔ افریقہ کا ساحلی مچھر غول در غول ہم پر حملہ آور تھا' چہرے پر چپیٹے سے برس رہے تھے اور جسم کے تمام کھلے حصے "الاماں" پکار رہے تھے مگر اتنی رعایت ہمیں حاصل نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتے۔

دو ٹارچیں ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں' یہاں تک کہ مجھے اور صفدر کو رائفل کے بیل نظر آنے لگے اور آنے والوں کی مدھم سرگوشیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک مرد تھا اور ایک عورت' تاہم رائفل دونوں کے پاس تھی۔ پھر ایک ٹارچ کا رخ دائیں جانب ہو گیا جبکہ دوسری ٹارچ سیدھی گڑھے کی طرف بڑھی۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی' ہمارا دیکھا جانا یقینی ہو گیا تھا۔ میں نے چھرے پر گرفت مضبوط کر لی۔ رائفل بردار دائیں بائیں دیکھتا ہیں گڑھے کے کنارے پر پہنچ گیا۔ نیم تاریکی میں مجھے اس کے فل بوٹ نظر آئے۔ فل بوٹوں کے اوپر ٹانگیں عریاں تھیں۔ یہ خوب صورت نسوانی ٹانگیں تھیں۔ ٹانگوں کی آخری حد پر مختصر نیکر نظر آ رہی تھی وہ لڑکی اس قدر نزدیک تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا اور اس کی خطرناک رائفل پکڑ کر اسے گڑھے میں بھی کھینچ سکتا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھینک رہی تھی مگر اپنے قدموں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے قدموں کی طرف دیکھا۔ اس کی ٹارچ کا روشن دائرہ مجھ پر اور صفدر پر پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے "اوہ" کی بے ساختہ آواز نکل گئی۔ مگر وہ چیخی نہیں اور اس کی یہی بردباشت اسے فوری موت سے بچا گئی۔ اس نے جلدی سے ٹارچ کا رخ پھیر لیا اور خود بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا ساتھی آٹھ دس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کی آواز آئی "کوئی ہے؟"

"نہیں.... ادھر بھی کوئی نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"تم نے اچھی طرح دیکھ لیا؟"

"ہاں دیکھ لیا۔" لڑکی نے جواب دیا۔

چند ہی لمحے بعد میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں ٹارچیں گردش کرتی ہوئی ہم سے دور جا رہی ہیں۔ میرے اور صفدر کے سینے سے ایک ساتھ اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔ ہم ایک قیامت کو چھو کر واپس آگئے تھے، کم از کم فوری اور شدید خطرہ تو ٹل ہی گیا تھا۔ میں نے آواز اور خدوخال سے لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ سوزی تھی۔ وہی آفتِ جاں لڑکی جو ہر کولیس پر محلے اور گارڈز کے "دل بہلاوے" کا سامان کرتی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ایک حصے سے جیسے شرارت اور شوخی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ چند روز پہلے جہاز پر مائیکل نے اسے پروفیسر اللہ دتا کو زچ کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ رات کو پروفیسر کے بیڈ روم میں چلی جاتی تھی اور پروفیسر کی نیند تو کیا زندگی بھی حرام کروا لیتی تھی، بعد ازاں میرے کہنے پر اس نے پروفیسر سے نرمی اختیار کر لی تھی۔ میرا اور سوزی کا تعلق صرف اتنا تھا کہ میرے ہاتھوں دو بدو مقابلے میں سوزی کا دشمن ٹام ہلاک ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کسی موقع پر ٹام نے سوزی کے ساتھ زبردستی کا برتاؤ کیا تھا جس کے بعد وہ اس کی شکل سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ٹام کی ہلاکت کے سبب یقیناً میرے کچھ دشمن بنے ہوں گے لیکن ایک دوست بھی بن گئی تھی۔ اور آج اسی دوست نے ایک نہایت "خطرناک لمحے" میں خاموش رہ کر دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ واپس چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی آس پاس موجود چند اور افراد بھی واپس چلے گئے تھے، اب وہ سب لوگ سرکنڈوں کے انتہائی جنوب میں ٹارچیں چمکا رہے تھے۔ گاہے گاہے مائیکل کی تحکمانہ آواز بھی سنائی دے جاتی تھی، وہ ساتھیوں کو مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ آٹھ دس منٹ بعد یہ لوگ آبی گزرگاہ کے ساتھ آگے نکل گئے۔

ہمارے اردگرد مکمل سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں بس مچھروں کی گھوں گھوں تھی یا گیدڑوں اور جنگلی کتوں کی دور افتادہ آوازیں تھیں۔ جن سرکنڈوں کو آگ لگی تھی وہ اب دھواں دے رہے تھے، کہیں کہیں اب بھی اکا دکا شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ شعلے بجھ بھی سکتے تھے اور مزید بھڑک کر آگ بھی پھیلا سکتے تھے۔ ہم بدستور گڑھے میں دبکے بیٹھے رہے۔ زریں گل نے سرگوشی میں پوچھا "کیا لڑکی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا؟"

"کبھی کبھی دیکھ کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔" صفدر نے کہا۔

میں نے کہا "داناؤں کا قول ہے کہ دشمنوں میں سے ہی دوست بھی مل جاتے ہیں۔ یہ دوسری عورت ہے جس نے ہماری مدد کی ہے۔"

"وہ پہلی کون تھی؟" غزالہ نے پوچھا۔

"وہی زوور تھی، جس کے زخمی خاوند کو بچانے کے لیے تم نے کئی گھنٹے جان ماری تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدم خود ٹام سے میں نے جو مقابلہ جیتا تھا اس میں زوور تھی کا اہم کردار تھا۔"

"کیا کوئی ٹیکنیکل پوائنٹ بتایا تھا اس نے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس نے عین مقابلے کے وقت مجھے ٹام کے ایک نہایت خطرناک داؤ کے بارے میں خبردار کیا۔ زوردار لڑائی میں یہ انفارمیشن میرے بہت کام آئی۔ کسی وقت تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔"

ہم قریباً پندرہ منٹ تک گڑھے میں رہے، پھر احتیاط سے باہر نکل آئے۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ ہمارے کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ چند گز کے فاصلے پر سرکنڈوں میں ایک خارپشت مرا پڑا تھا۔ کوئی اندھی گولی اس کا پیٹ چیر کر گزر گئی تھی۔ زیادہ دیر ٹارچ روشن رکھنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہم آبی گزرگاہ سے دور ہٹنے لگے۔ تھوڑا آگے سرکنڈوں میں لکڑ بگھے کی قسم کا کوئی جانور مرا نظر آیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، یہ ایک مادہ تھی۔ اس کے تھنوں سے دو بچے بھی چمٹے ہوئے تھے۔ وہ تینوں اندھی گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ زریں گل منمنایا "اگر ام گڑھے سے باہر ہوتا تو امارا حشر بھی اس سے ملتا جلتا ہی ہوتا تھا۔"

"پتا نہیں اتنا ایمونیشن کہاں سے آیا ان کے پاس۔ لگتا تھا کہ پورا اڈّہ لے کر آئے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

اچانک صفدر خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھٹک کر قد آدم جنگلی گھاس کی طرف دیکھنے لگا تھا، اس کے انداز میں شکاری جانور کی سی توجہ اور چوکسی تھی۔ پھر دو قدم دوڑ کر اس نے جست لگائی۔ بالکل جیسے سوئمنگ پول میں ڈائیو کی جاتی ہے۔ وہ جنگلی گھاس میں چھپے ہوئے ایک جاندار جسم پر گرا۔ دونوں گتھم گتھا نظر آئے۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی، دوسرے ہاتھ سے میں نے ٹارچ روشن کی، مجھے صفدر کے نیچے ایک سیاہ فام نظر آیا۔ وہ کیچڑ اور مٹی میں لتھڑ کر بھوت دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک رائفل دکھائی دے رہی تھی۔ یقیناً صفدر سے گتھم گتھا ہونے کے بعد یہ رائفل اس کے ہاتھ سے گری تھی۔ زریں گل نے لپک کر رائفل

اٹھائی۔ صفدر نے مدِمقابل کے منہ پر دو تہلکہ خیز گھونسے رسید کیے اور اسے بے بس کر ڈالا۔ زریں نے میرے اشارے پر آگے بڑھ کر رائفل کی نال حبشی کی کنپٹی سے لگا دی۔ صفدر اس کے اوپر سے اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی سی دشواری کے ساتھ ہم اس شخص کو پہچاننے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ مائیکل کے مسلح محافظوں میں سے سینئر ترین تھا۔ اس کا نام جوزف تھا۔ صفدر نے اسے اوندھا کرنے کے بعد اس کی پتلون کی بیلٹ سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟" صفدر نے کڑک کر پوچھا۔

"میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔" وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔

"ایسی صورت میں، میں تمہیں گولی مارنا ضروری سمجھتا ہوں۔" میں نے رائفل کی نال بے دردی سے اس کی گردن میں گھسیڑ دی۔

وہ قدرے خوف زدہ نظر آنے لگا۔ صفدر نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تھوک نگل کر بولا "تین ساتھی اور ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں ٹھیک سے بتا نہیں سکتا، آس پاس ہی ہیں۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد جو تھوڑا بہت شک تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔ ہم جوزف کو لے کر سرکنڈوں سے کافی دور چلے آئے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ہم اپنے عقب کا معائنہ بھی کرتے رہے۔ نہ ہمیں کوئی شخص نظر آیا اور نہ کسی طرح کی نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ رہی تھی کہ جوزف یہاں اکیلا ہی تھا۔ مائیکل اور اس کے ساتھی اسے غلطی سے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ غالباً واپسی پر وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ صفدر کی نگاہ اچانک اس پر پڑ گئی تھی، یا یوں کہہ لیجیے کہ صفدر کی نگاہ نے اس کی موجودگی کو بھانپ لیا تھا، ورنہ وہ ہمارے لیے سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے گڑھے سے نکلنے میں جو تاخیر کی تھی وہ بھی ہمارے حق میں گئی تھی۔ اگر ہم مائیکل کے چلے جانے کے فوراً بعد گڑھے میں سے نکل آتے اور جوزف کی نگاہ ہم پر پڑ جاتی تو وہ صرف ایک ہوائی فائر کر کے مائیکل کو واپس بلا سکتا تھا۔

جوزف کے پاس سے پانی کی ایک بوتل بھی برآمد ہو گئی۔ بوتل اس نے اپنی کمر سے اڑسی ہوئی تھی۔ یہ پانی ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ تابی پیاس سے رو رو کر نڈھال ہو چکا تھا۔ پہلے اسے پانی پلایا گیا، پھر سب نے ایک ایک گھونٹ لے کر حلق تر کیا۔ اس کے بعد ہم تیز قدموں سے شمالی رخ پر روانہ ہو گئے۔ ہم جتنی جلدی اس آبی گزرگاہ سے دور ہو جاتے ہمارے لیے اتنا ہی بہتر تھا۔ ہمارے اردگرد کا علاقہ آبی گزرگاہ ہی کی طرح خشک اور ویران تھا۔ درخت اور جھاڑیاں نظر آتی تھیں لیکن ہریالی کا شدید فقدان تھا۔ کسی وقت مدھم چاندنی میں قرب و جوار نسبتاً زیادہ روشن ہو جاتے۔ ہم دور تک نگاہ دوڑاتے، پام کے درختوں میں کہیں کہیں کسانوں کے اکا دکا مکانات نظر آ جاتے مگر کہیں کوئی شخص دکھائی دیتا اور نہ کوئی پگڈنڈی وغیرہ۔ پورے علاقے میں غربت اور افلاس کی جھلک نظر آتی تھی۔

ہمیں فوری طور پر کسی اچھی پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ ایسی پناہ گاہ جہاں ہم اپنے خشک گلے کو تر کر سکتے، اپنے جسموں کو آرام پہنچا سکتے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچ سکتے۔ کم و بیش ایک گھنٹے تک ہم سخت تناؤ کی کیفیت میں چلتے رہے، آخر ایک جگہ درختوں کے درمیان گھرا ہوا ایک تنہا مکان نظر آیا۔ مکان کے اردگرد چند کھیت بھی موجود تھے مگر یہ کھیت بھی درختوں ہی کی طرح سوکھے سڑے تھے۔ مکان میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ایک پھاٹک سے باہر ایک لاغر سا گھوڑا کھڑا تھا۔ ہم نو نے پھوٹے پھاٹک سے کچھ فاصلے پر درختوں میں رک گئے۔ میں جوزف کو لے کر پھاٹک پر پہنچا۔ پھاٹک اندر سے بند تھا۔ میں نے جوزف کو حکم دیا کہ وہ پھاٹک کھلوائے۔ جوزف نے دستک دی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ رائفل بدستور جوزف کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد اندر سے ایک بوڑھے کی کھانسی سنائی دی۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ جوزف نے جواب میں ایک دو فقرے بولے۔ پھاٹک کھل گیا۔ میں رائفل بدست تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی کمرے کی طرف سے عورتوں کی چیخیں سنائی دیں۔ میرے سامنے کھڑا بوڑھا دہشت زدہ نظروں سے رائفل کو تک رہا تھا۔ میں نے رائفل اس کے لرزتے ہوئے سر سے لگا دی۔ اس دوران میں صفدر، زریں اور باقی ساتھی بھی پھاٹک پر پہنچ گئے۔ صفدر اور زریں تو اندر صحن میں آ گئے جبکہ غزالہ.... گلثوم اور تابی باہر ہی کھڑے رہے۔ میں نے جوزف سے انگلش میں کہا "اس سے پوچھو کہ گھر میں اور کون ہے؟"

جوزف نے میرا سوال بوڑھے تک پہنچایا۔ اس نے لرزتی کانپتی آواز میں جوزف کو جواب دیا.... "گھر میں صرف

چار معصوم بچے اور ایک بوڑھی عورت ہے۔ اس کے علاوہ گھر میں ایک بھی قیمتی شے نہیں۔"

قیمتی شے کے بارے میں تو شاید بوڑھا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر گھر کے افراد کے بارے میں اس نے یقیناً غلط بیانی کی تھی۔ ابھی اندرونی کمرے سے مجھے ایک سے زیادہ عورتوں کی چیخیں سنائی دی تھیں۔

اسی دوران میں ہمیں ایک بوڑھی عورت اندرونی دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کی کلہاڑی تھی اور وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ نہایت تیز تیز لہجے میں اس نے کچھ کہا اور ڈری ہوئی نظروں سے ہمیں ڈرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میرے اشارے پر صفدر نے پھاٹک کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ ہم نے جوزف کے ذریعے سیاہ فام بوڑھے کو سمجھایا کہ ہم انہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے' صرف چند گھنٹے یہاں رک کر چلے جائیں گے' اگر اس گھر میں کوئی عورت ہے تو وہ ہماری ماں بہن کی طرح ہے۔

بوڑھے کا خوف قدرے کم ہوا۔ ہم اسے اور جوزف کو لے کر اندر آ گئے۔ بوڑھے کے کہنے پر بڑھیا نے کلہاڑی زریں گل کے حوالے کر دی۔ وہ بے چاری اتنی ناتواں تھی کہ صرف کلہاڑی اٹھا کر ہی ہانپ گئی تھی۔ بوڑھا بھی کمزور اور بیمار نظر آتا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگی نظر آ رہی تھی۔ مدھم روشنی میں بھی اس کی پوری پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بے شمار سلوٹیں تھیں اور گھنگریالے بالوں میں سیاہی کی بس چند لہریں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ یہ مکان چار پانچ خستہ حال کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ایک برآمدہ تھا اور جانور وغیرہ باندھنے کے لیے ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ یہاں بجلی کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمروں میں صرف دو گیس لیمپ روشن تھے' اتنی گرمی میں یہ لوگ پنکھے وغیرہ کے بغیر ہی گزارہ کر رہے تھے۔ ایک کمرے میں چار بچے نظر آئے۔ ان میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سب سے بڑے بچے کی عمر تقریباً آٹھ سال اور سب سے چھوٹے کی تین سال تھی۔ سب سے چھوٹے کے سوا تینوں بچے جاگ گئے تھے اور سہمے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے بھی بھوک اور غربت عیاں تھی۔ جوزف کی زبانی معلوم ہوا کہ بوڑھا اور بوڑھی بچوں کے دادا دادی ہیں۔ ان کا باپ روزگار کے سلسلے میں شہر گیا ہوا ہے اور والدہ بھی گھر میں موجود نہیں۔

ہم نے اندازہ لگایا کہ بچوں کی ماں کے سلسلے میں ہم سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہ یہیں موجود تھی۔ شاید خطرے کی وجہ سے ساس سسر نے بہو کو کہیں چھپا دیا تھا۔

میں نے جوزف کے ذریعے بوڑھے سے کہا "دیکھو بزرگوار! ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ نہ تم ہم سے جھوٹ بولو' نہ ہم بولتے ہیں۔ گھر میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟"

بوڑھے نے جوزف کے ذریعے جواب دیا "میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ بچوں کی ماں گھر میں نہیں ہے۔"

"لیکن جب ہم اندر آئے تو ہم نے خود ایک سے زیادہ عورتوں کی آواز سنی تھی۔"

"دوسری آوازیں بڑے بچوں کی ہوں گی۔" بوڑھے نے جوزف کے ذریعے جواب دیا۔

"جھوٹ بول رہا ہے۔" صفدر بڑبڑایا اور تفتیشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

مجھے بھی یقین تھا کہ ایک اور عورت موجود ہے۔ وہ یا تو اس چار دیواری میں کہیں چھپی ہوئی تھی۔ یا پھر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت زیادہ تشویش ناک تھی۔ میں نے صفدر کو جوزف اور بوڑھے جوڑے پر نگران مقرر کیا اور خود زریں کے ساتھ مل کر دوسری عورت کی تلاش شروع کر دی۔ ہم نے تینوں کمرے اچھی طرح کھنگالے لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب دو کمرے باقی تھے' ایک میں زریں اور دوسرے میں میں داخل ہو گیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے کونے کھدروں میں دیکھا۔ اچانک ایک تیز کی چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ ساتھ والے کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ میں رائفل بدست اس کمرے میں پہنچا تو زریں گل کو ایکشن میں دیکھا۔ اس نے کسی عورت کی ٹانگ پکڑ رکھی تھی اور پورے زور سے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ عورت یا لڑکی کا باقی جسم لکڑی کے ایک بیڈ کے نیچے تھا۔ ٹانگ کی پوزیشن سے اندازہ ہوتا تھا کہ عورت بیڈ کے نیچے اوندھی پڑی ہے اور اس نے نیچے سے کوئی چیز مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی تھی۔ زریں نے اس کی عریاں ٹانگ ٹخنے کے پاس سے پکڑ رکھی تھی اور یوں کھینچ رہا تھا جیسے کھیت میں بیٹھ کر شلجم یا مولی وغیرہ کو کھینچا جاتا ہے۔ زریں نے زیادہ زور لگایا تو بیڈ گھسٹ کر کمرے کے درمیان آ گیا مگر عورت نے بیڈ کو چھوڑا نہیں۔

میں نے زریں گل سے کہا کہ وہ ٹانگ چھوڑ دے۔ اس

نے ٹانگ چھوڑی تو ہم دونوں نے مل کر بیڈ کو الٹا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ہمارے سامنے ٹوٹے پھوٹے فرش پر ایک بیس بائیس سال کی لڑکی سمٹی سمائی پڑی تھی۔ اس سیاہ فام لڑکی کی ناک ضرورت سے زیادہ چپٹی تھی' بال چھوٹے اور گھونگریالے تھے۔ اس نے ترمی آستین کا لمبا افریقی چغہ پہن رکھا تھا' شکل و صورت کیسی بھی تھی بہرحال لڑکی جوان دکھائی دیتی تھی۔ میرے کندھے پر گن دیکھ کر وہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ چار بچوں کی ماں نہیں ہو سکتی۔ تو پھر یہ کون تھی؟ اور ماں کہاں تھی؟ ان سوالوں کے جواب جوزف ہی کے ذریعے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اس کمرے میں لے آیا جہاں سب موجود تھے۔

جوزف کو ترجمان بنا کر میں نے بوڑھے سے جو گفتگو کی وہ کچھ اس طرح تھی۔

میں نے بوڑھے سے کہا "تم تو کہہ رہے تھے کہ گھر میں اور کوئی عورت نہیں' یہ لڑکی کیا زمین میں سے اگ آئی ہے؟"

جواباً بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ منت سماجت کے لہجے میں بولا "مجھے معاف کر دو۔ میں نے جھوٹ بولا۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

میں نے پوچھا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ رتابہ نام ہے۔"

"اور تمہاری بہو۔ ان بچوں کی ماں؟"

"میں نے بتایا ہے نا... کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ... وہ اپنے والدین کے پاس گئی ہے۔"

"بچے ساتھ کیوں نہیں گئے۔ کم از کم چھوٹے بچے کو تو جانا چاہیے تھا۔"

"وہ... ذرا ناراض ہو کر گئی ہے۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں۔ مان جائے گی۔" بوڑھا ہکلایا۔

ہم نے محسوس کیا کہ بوڑھا اس سلسلے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ بہرحال یہ بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ گھر میں ان چار بچوں اور تین بڑوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا' نہ ہی میرے خیال میں کوئی یہاں سے فرار ہوا تھا۔ بوڑھے کی جہاں دیدہ نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم پانی کی شدید طلب محسوس کر رہے ہیں۔ اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ ہمارے لیے پانی کا انتظام کرے۔ اس کی بیٹی رتابہ پانی لینے گئی تو میں نے احتیاطاً زریں گل کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ چند منٹ بعد زریں اور لڑکی رتابہ دو لوٹا نما برتنوں میں میٹھا پانی لے کر آ گئے۔ اس پانی میں کوئی خوشبو بھی ملائی گئی تھی۔ اپنی طرف سے لڑکی نے ہماری تواضع کی تھی' اس کے بجائے وہ سادہ لیکن ذرا ٹھنڈا پانی لے آتی تو ہمیں زیادہ تسکین ہوتی۔ بہرطور یہ اہلِ خانہ کی طرف سے ایک طرح کی خیر سگالی کا اظہار تھا' اس خیر سگالی کے جواب میں ہم نے بھی اپنی رائفلیں ایک گوشے میں رکھ دیں۔ جوزف کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ باقی معمر جوڑے اور ان کی بیٹی کی طرف سے ہمیں کیا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ اس گھر میں ان کا واحد ہتھیار ایک زنگ آلود کلہاڑی تھی۔ یہ کلہاڑی زریں نے اٹھا کر گھر کی چھت پر پھینک دی۔

پیاس بجھ گئی تو ہماری آنکھوں میں کچھ روشنی آئی اور ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ دوبارہ "ہرکولیس" میں قید ہونے سے پہلے ہم بردہ فروشوں کا مضبوط جال توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کم از کم اب تک تو کامیاب ہی تھے۔ گزرے ہوئے واقعات کی فلم آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ فارم ہاؤس میں مارکوس کی بیوی کا ذبح ہونا۔ فارم ہاؤس سے ہمارا فرار۔ جیپ کا تعاقب' ہمارے اور جیپ سواروں کے درمیان اندھا دھند فائرنگ اور پھر جیپ کو آگ لگنا' سارے مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اس مقام پر مائیکل کے تین ساتھی ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دو لاشوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد سرکنڈوں کے جھنڈ میں مائیکل اینڈ کمپنی نے جو "والہانہ" فائرنگ کی تھی اس کی گونج ابھی تک ہمارے کانوں میں موجود تھی۔

صفدر کو جانوروں کی کوٹھڑی میں سے لوہے کی ایک زنجیر مل گئی۔ اس زنگ آلود زنجیر کی مدد سے اس نے مہمان خصوصی جوزف کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دیں اور اسے ایک نہایت "حرارت بخش" کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے بعد ہم اہلِ خانہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بے حد مسکین اور عاجز نظر آ رہے تھے۔ ان کی صورتیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ کلی طور پر ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ بوڑھے کا نام واراب تھا اور وہ بار بار میرے پاؤں کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً وہ اس بات پر معذرت خواہ تھا کہ اس کی سٹھیائی ہوئی بیوی نے ہم پر کلہاڑی اٹھانے کی گستاخی کی تھی۔

میں نے اشاروں کنایوں میں بوڑھے واراب کو تسلی دینے کی کوشش کی' اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم اس "اعلانِ جنگ" کو بھول چکے ہیں اور سامانِ جنگ (یعنی

کلہاڑی) ہم نے اٹھا کر کوٹھے پر پھینک دیا ہے' لہٰذا وہ بھی اس بات کو بھول جائے۔ اب رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ ضروری تھا کہ ہم بھی تھوڑا سا آرام کر لیں۔ اہلِ خانہ کو کمرے میں بند کر کے ہم نے باہر سے تالا لگا دیا۔ خود ہم برآمدے میں لیٹ گئے۔ زمین پر ہی ایک بڑا سا گدا بچھا ہوا تھا۔ کچھ موٹی چادریں بھی یہاں موجود تھیں۔ یہ چادریں اوڑھنے کے لیے تھیں۔ اکثر صحرائی لوگ گرمی سے مقابلہ کرنے کا اپنا ایک انداز رکھتے ہیں۔ وہ بغیر کسی پنکھیا اے کولر کے بند کمرے میں لیٹتے ہیں اور اوپر سے کوئی گرم کپڑا بھی لے لیتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کا لباس اور وہ خود پسینے میں تر ہو جاتے ہیں۔ یوں خود بخود قدرتی طور پر ان کے لیے ٹھنڈک کا انتظام ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گرمی کی انتہا ہی ان کے لیے سکون کا باعث بن جاتی ہے۔ اس گھر کے افراد بھی یقیناً اسی طریقے سے گرمی کا سامنا کرتے تھے' اس سے پہلے فارم ہاؤس میں بھی ہم چند افریقیوں کو سخت گرمی میں کمبل اوڑھے دیکھ چکے تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے سوتے جاگتے گزارا۔ غزالہ اور گلثوم تو بالکل نہیں سو سکی تھیں۔ صفدر' زریں گل اور میں نے باری باری آنکھ جھپک لی تھی۔ ہم اس وقت سخت غیر یقینی حالات میں تھے۔ مائیکل اور اس کے ساتھیوں سے ہمیں ابھی شدید خطرہ لاحق تھا۔ یہ بات ناممکن تھی کہ وہ ہمیں کھو کر آرام سے بیٹھ گئے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ہمیں پوری قوت اور سرگرمی سے ڈھونڈ رہے تھے۔ بے شک یہ مکان "وقوعہ" سے کافی فاصلے پر تھا اور ویسے بھی درختوں میں گھرا ہوا تھا' مگر کسی وقت بھی وہ لوگ یہاں پہنچ سکتے تھے۔

بہرحال رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح ہم نے جوزف کی مدد سے اہلِ خانہ اور قرب و جوار کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ یہ مسلمان فیملی تھی۔ داراب گھرانے کا سربراہ تھا۔ وہ دمے کا پرانا مریض تھا اور کام کاج سے قاصر تھا۔ اس کا ایک بیٹا اس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ اب وہ اپنے چھوٹے بیٹے واحد اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ گھر کے اردگرد کی اجاڑ زمین ان لوگوں کی اپنی تھی۔ اس زمین میں یہ لوگ چاول اور چارہ وغیرہ کاشت کرتے تھے' مگر پچھلے دو سال سے بارشیں نہ ہونے کے برابر ہوئی تھیں' لہٰذا فصلیں اجڑ کر رہ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ داراب اور اس کے اہلِ خانہ کو روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔ شکم سیر ہو کر تو انہوں نے پہلے بھی کبھی نہیں کھایا تھا' اب مسلسل فاقوں کی نوبت آگئی تھی۔ مجبور ہو کر واحد نے قریبی شہر KIRINOA کا رخ کیا تھا۔ چند ماہ اس نے تھوڑی تھوڑی رقم بھیجی تھی' اب دو ماہ سے اس کی طرف سے بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ داراب اور دیگر اہلِ خانہ کی حالت بہت پتلی تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں وہ اپنی دو لاغر بکریاں ذبح کر کے کھا چکے تھے' اب ان کے پاس ذبح کرنے کو بھی کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ سارا دن بھی ہم نے داراب کے گھر میں چھپ کر گزارا۔ ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچ جائیں۔ اس کے بعد عین ممکن تھا کہ اپنے سفارت خانے تک بھی ہماری رسائی ہو جاتی' مگر فی الحال تو پولیس اسٹیشن تک پہنچنا بھی دشوار تھا۔ درحقیقت یہ تنزانیہ کے ساحل کا ایک غیر آباد اور دشوار علاقہ تھا۔ قریبی پولیس اسٹیشن بھی کم و بیش تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ تیس کلو میٹر طے کرنے کا خطرہ ہم کسی صورت مول نہیں لے سکتے تھے۔

گھر میں راشن نہ ہونے کے برابر تھا۔ مٹھی بھر چاول اور تھوڑی سی خشک کھجوریں تھیں۔ جوزف کی پتلون کی جیب سے ہمیں کچھ مقامی کرنسی مل گئی تھی۔ اس کرنسی کی مدد سے راشن خریدا جا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس خریداری کے لیے جائے کون؟ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے داراب کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ داراب سمجھ دار تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی چالاکی دکھائی تو اس کے اہلِ خانہ سخت مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور اس سے بھی اہم ایک بات یہ تھی کہ اسے ہماری اندرونی شرافت پر یقین آ گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اگر وہ ہم سے سیدھا سیدھا چلتا رہا تو ہم بھی سیدھے چلتے رہیں گے' ہماری طرف سے اس کے اہلِ خانہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور جیسے ہی ہمارے لیے صورتِ حال بہتر ہوئی ہم اس کے گھر سے چلے جائیں گے۔

بوڑھا داراب قریباً ایک گھنٹے بعد کچھ دالیں اور چاول وغیرہ لے آیا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا سب سے چھوٹا پوتا مسلسل روتا رہا' اس کے آنے کے بعد بھی بچے کے رونے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ اتنے درد سے رو رہا تھا کہ ہمارے دل بھی بے چین ہو گئے۔ وہ بار بار ایک لفظ پکار رہا تھا' جوزف کے ذریعے پتا چلا کہ وہ ماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔ سب سے چھوٹے بچے کے لیے ماں کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے' کئی بچے تو چند منٹ کے لیے بھی خود کو ماں سے دور نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بچہ بھی ماں کے بغیر کچھ ایسی ہی بے قراری محسوس کر رہا تھا۔ وہ روتے روتے نڈھال ہو جاتا تو کچھ دیر کے

لیے خاموش ہو جاتا' تب ایک بار پھر نئے سرے سے رونا شروع کر دیتا۔ اس کا نام ناصر تھا۔ مقامی خدوخال کے لحاظ سے وہ ایک خوب صورت بچہ تھا' مگر ماں کی مسلسل جدائی میں رو رو کر وہ مرجھا گیا تھا۔ اس کی ناک مسلسل بہہ رہی تھی اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ غزالہ نے اسے چیک بھی کیا کہ شاید اسے کوئی تکلیف ہو لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی عمر تین سال کے لگ بھگ تھی' اس عمر کا بچہ اپنی تکلیف بتا سکتا ہے۔ ناصر بھی بتا رہا تھا' وہ اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا تھا۔

نجانے کیوں میری چھٹی حس اب بھی یہی کہہ رہی تھی کہ داراب اپنی بہو کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ کچھ چھپا رہا ہے وہ ہم سے۔ جلتے سورج کے نیچے پہاڑ سا گرم دن گزر گیا اور شام ہو گئی۔ رات کو بھی بچہ مسلسل روتا رہا۔ بچے سے بڑی بچی کی عمر بھی بمشکل چار پانچ سال تھی' وہ بھی گاہے گاہے ماں کے لیے ٹھنکنے لگتی تھی۔ رات ہوتے ہی ہم سب کو "مچھر کا تیل" لگانا پڑا۔ میں چٹائی پر لیٹا تو آنکھوں کے سامنے اتر پردیشی قیدیوں کی معصوم صورتیں گھومنے لگیں۔ وہ میرے ساتھ بہت مانوس ہو چکے تھے۔ پتا نہیں اب وہ کس حال میں تھے۔ گاہے گاہے پروفیسر اور شائستہ کا خیال بھی ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی مائیکل کے ہاتھوں سخت مشکل میں گرفتار تھے۔ رات قریباً دس بجے کے لگ بھگ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم اس قسم کی صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ سب لوگ پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ ہماری موجودگی کی جو ایک آدھ نشانی آس پاس موجود تھی فوراً ہٹا دی گئی۔ میں اس لیوٹری کوٹھڑی میں چلا گیا جو مویشی وغیرہ باندھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ رائفل میرے پاس موجود تھی اور کوٹھڑی کے اندر سے میں پورے صحن اور برآمدے وغیرہ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق بوڑھے داراب نے پھاٹک کھولا۔ سامنے ایک گیم بیم افریقی کھڑا نظر آیا۔ اس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا' اس کی مونچھیں گھنی تھیں اور چہرے سے کھاتے پیتے گھرانے کا نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر داراب خوف زدہ نظر آنے لگا۔ درمیانی عمر کے گیم تیم شخص نے داراب کو ایک گٹھڑی دی جو اس نے کچھ دیر ہچکچانے کے بعد لے لی۔ ایک وزنی تھیلا بھی اس شخص نے داراب کو دیا اور رعونت بھرے انداز میں کچھ کہنے لگا۔

جواب میں داراب معمول سے زیادہ عاجز اور کم تر نظر آنے لگا۔ وہ مقامی زبان میں گیم تیم شخص سے کچھ گزارش کرنے لگا۔ اس کا لہجہ منت سماجت کا تھا اور وہ بار بار نووارد کے پاؤں چھونے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ جواب میں نووارد کا لب و لہجہ جارحانہ تھا اور وہ داراب کی منت سماجت کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ داراب کی سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ شخص واپس چلا گیا۔

میں پانچ دس منٹ کوٹھڑی کے اندر ہی رہا۔ واپس کمرے میں پہنچا تو منظر کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ نووارد کی دی ہوئی گٹھڑی کھلی پڑی تھی' اس میں بچوں کے رنگ دار کپڑے اور کچھ کھلونے تھے۔ تھیلے میں راشن بھرا ہوا تھا اور مٹھائی وغیرہ تھی۔ دونوں بڑے بچے مٹھائی کھا رہے تھے۔ چھوٹی بچی ایک گڑیا سے کھیلنے لگی تھی مگر ننھا بچہ ناصر مسلسل رو رہا تھا۔ اس کی دادی بار بار اسے کھلونے سے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

میں نے جوزف کے ذریعے داراب سے پوچھا کہ ابھی جو شخص یہاں آیا وہ کون تھا؟

داراب نے بتایا "ہمارا دور کا رشتے دار ہے۔ شہر میں رہتا ہے۔ کافی کھاتا پیتا ہے۔ اپنی خوشی سے بچوں کے لیے سامان لے کر آیا ہے۔"

میں نے کہا "داراب! تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ بات کچھ اور ہے۔ وہ شخص تمہارے ساتھ بڑے غصے سے بات کر رہا تھا۔ تم مسلسل اس کی منت سماجت میں مصروف تھے۔ میں نے صحن کے کمرے میں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

داراب کے جھریوں بھرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ سنبھل کر بولا "ایسا کچھ نہیں تھا' آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

میں نے داراب کو سخت الفاظ میں سمجھایا کہ وہ چکردار بات کرنے کی کوشش نہ کرے' ورنہ سب کا نقصان ہو گا۔

داراب ہراساں نظر آنے لگا' اور اسے ہراساں دیکھ کر اس کی بیٹی بھی نروس ہو گئی۔ وہ خاص طور پر زریں گل سے بہت ڈر رہی تھی' زریں گل اسے گھورتا بھی ہلاکو خاں کی طرح تھا۔ دراصل کل رات جب زریں نے رتابہ نامی اس لڑکی کو بستر کے نیچے سے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے زریں کے منہ پر لات دے ماری تھی۔ بعد میں زریں نے جھنا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی اور جھٹکے دے دے کر اس کا انجر پنجر ہلا دیا۔ اب ان دونوں کے درمیان مخاصمت کی فضا موجود تھی۔

میں نے جوزف سے کہا کہ وہ داراب کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا جائے اور باتوں باتوں میں اس سے سچ اگلوائے کہ سامان دے کر جانے والا شخص کون ہے۔

جوزف کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے، زنجیر بیڑی کی طرح پاؤں میں ڈال دی گئی تھی۔ وہ دو فٹ سے لمبا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق جوزف بوڑھے داراب کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ ان کے درمیان آدھ پون گھنٹا گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں لڑکی رتاب روتی رہی اور چاروں بچے بالکل سہے بیٹھے رہے۔

گفتگو کے اختتام پر جوزف نے باہر آکر انکشاف کیا کہ داراب کی بہو میکے نہیں گئی بلکہ اسے ایک مقامی شخص زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ وہی مجیم شخص تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے گٹھڑی اور تھیلا لے کر آیا تھا۔

یہ ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ جوزف نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس شخص کا نام جلال ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر کافی کے چند کھیت اس کی ملکیت ہیں' اس کے علاوہ یہ ناریل کے تیل کی خرید و فروخت بھی کرتا ہے۔ تین چار برس سے اس نے داراب کی بہو پر بری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں وہ اتنا دلیر تھا کہ داراب کے علاوہ اس کے بیٹے واحد کو بھی برملا لالچ دیتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ واحد نے اپنے گھر میں اس کا آنا جانا بالکل بند کردیا۔ اب چونکہ پچھلے کئی ماہ سے داراب اور اس کے اہل خانہ سخت ابتلا میں تھے' لہٰذا جلال پھر سے متحرک ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاقہ کشی انسان کی عزت نفس پر کاری ضربیں لگاتی ہے اور اس کی مزاحمت کی قوت کو تباہ کرکے رکھ دیتی ہے۔ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا اور انہیں اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ کوششیں بار آور نہیں ہورہی تھیں' اسی دوران میں ان لوگوں کے حالات زیادہ خراب ہوگئے اور واحد کو محنت مزدوری کے لیے شہر جانا پڑ گیا۔ واحد کی غیر موجودگی میں جلال اور بھی شیر ہوگیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک ہفتہ پہلے وہ داراب کی بہو "بدر" کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ اس نے جاتے جاتے دھمکی دی کہ اگر داراب نے شور مچایا یا پولیس تک پہنچنے کی کوشش کی تو صورت حال مزید بری ہوجائے گی۔ اس نے اشارہ دیا کہ بہو کے بعد اس کی بیٹی کی [illegible]

باری بھی آسکتی ہے۔ وہ اثر و رسوخ والا شخص تھا' بوڑھا داراب اور اس کی بیوی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ مفلسی اور ناتوانی نے انہیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دو روز بعد بوڑھا داراب جلال کے ڈیرے پر پہنچا اور اس سے کہا کہ وہ اس کی بہو کو واپس کردے' مگر جلال نے اسے دھتکار کر واپس بھیج دیا۔ اب چھ روز ہو چکے تھے' بچے حد درجہ پریشان تھے۔ باپ کے بعد اب ماں بھی ان کے پاس نہیں تھی۔ خاص طور سے چھوٹا بچہ ناصر تو ماں کے بغیر بے حال تھا۔ وہ ماں کے بغیر پل نہیں گزارتا تھا اب اسے ماں کے لیے روتے چھ دن اور چھ راتیں ہوگئی تھیں۔ آج جلال نے ان پر احسان عظیم کیا تھا اور بچوں کے لیے کپڑے اور راشن وغیرہ دے کر چلا گیا تھا لیکن "بدر" ابھی بھی اس کے پاس تھی۔ بوڑھے داراب کی منت سماجت نے جلال پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ الٹا وہ داراب کو سمجھانے لگ گیا تھا کہ اگر وہ لوگ اس کی مرضی کے مطابق چلتے رہیں تو ان کے فاقہ زدہ گھر میں خوش حالی کا دور دورہ ہوجائے گا۔

میں نے جوزف سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا ہے؟"

وہ زہرخند انداز میں بولا "ابھی تو تم لوگ تشریف لائے ہو' ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہاں ہر قدم پر ایسے ہی مسئلے مسائل نظر آئیں گے' کس کس کو سلجھاؤ گے۔"

صفدر نے پوچھا "کیا یہ جلال نامی بندہ واقعی اتنے اثر و رسوخ والا ہے۔"

"اثر و رسوخ نہ بھی ہو تو یہاں سب چلتا ہے' اصل چیز پیٹ کی بھوک ہے جو ان لوگوں کے پاس ہے' اور اصل چیز خوراک ہے جو جلال کے پاس ہے۔ میری بات شاید تمہارے دل کو نہ لگے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں داراب اور اس کے گھر والوں کا بھی قصور ضرور ہوگا۔ کمانے والا مرد تو گھر سے چلا گیا' باقی بڈھا بڈھی اور بچے رہ گئے ہوں گے' جلال ان کو بڑی ڈالتا رہا ہوگا' یہ اٹھاتے رہے ہوں گے پھر اس کا حوصلہ بڑھ گیا ہوگا اور وہ "گھروالی" کو اٹھا کر لے گیا [illegible] پیٹ کی آگ ایک [illegible] ہوتی ہے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات بارھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ جون 2001ء کو شائع ہوگا۔

ثنا جہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل
12

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت

اگلے روز تین دوپہر کے وقت جب ہر طرف چلچلاتی دھوپ سائیں سائیں کر رہی تھی ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ بیرونی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ حسبِ سابق ہم سب پچھلے کمرے میں چلے گئے' صرف داراب اور اس کے اہلِ خانہ باہر رہے۔ اس مرتبہ میری جگہ صفدر صحن والی کوٹھڑی میں گیا تھا۔ دو چار منٹ بعد کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں اور کسی عورت کے رونے کی صدا سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کی ایک جھری سے بیرونی کمرے میں جھانکا۔ بیرونی کمرا خالی تھا۔ میں بہ آہستگی اس دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں میں نے کھڑکی میں تھوڑی سی درز پیدا کی اور معمولی کوشش کے بعد ساتھ والے کمرے میں جھانکنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں مجھے پھر کل رات والا تجیم شحیم شخص نظر آیا۔ بوڑھے داراب کی زبانی اس کا نام جلال معلوم ہوا تھا۔ آج جلال کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ جلال کی طرح عورت بھی سیاہ فام تھی' تاہم اس کا رنگ بالکل سیاہ نہیں تھا۔ اس کے نقوش بھی خوب صورت تھے' مقامی اعتبار سے اسے موزوں جسم والی ایک خوش شکل خاتون کہا جا سکتا تھا۔ اس نے کڑھائی دار چغہ پہن رکھا تھا۔ چغے کی طرح سر پر بھی نیا رنگ دار اسکارف نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہی داراب کی بہو بدر ہے۔ اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ناصر کو سینے سے چمٹا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں اور پیشانی پر مسلسل بوسے دیتی چلی جا رہی تھی۔ بچہ جسے ہم تین دن سے مسلسل روتا ہوا دیکھ رہے تھے' ماں کی گود میں آکر ایک دم پُرسکون ہوگیا تھا۔ تاہم کسی وقت اس کے ننھے سینے سے ایک ہچکی سی بلند ہو جاتی تھی۔

عورت دوسرے بچوں کے سر پر بھی ہاتھ پھیر رہی تھی اور انہیں پیار کر رہی تھی۔ جلال نرم لہجے میں داراب اور اس کی بیوی سے بات کر رہا تھا۔ داراب کی بیٹی رتابہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ جلال کی نگاہ سے دور رکھنے کے لیے اسے باورچی خانے میں بھیج دیا گیا تھا۔ جلال کے کندھے سے ہولسٹر لٹکا ہوا تھا اور ہولسٹر کے اندر سے ریوالور کا دستہ صاف نظر آرہا تھا۔ اپنے چہرے مہرے سے جلال ایک کرخت اور جو کس شخص دکھائی دیتا تھا' کچھ دیر بعد بوڑھے داراب کی عمر رسیدہ بیوی اٹھ کر باہر گئی اور وہی لوٹا نما برتن لے آئی جس سے ہم نے بھی شربت پیا تھا۔ جلال کے علاوہ بدر اور اس کے بچوں نے بھی پانی پیا۔ جلال بچوں پر مہربان نظر آرہا تھا' اس نے اپنی جیب سے کچھ سکے نکال کر بچوں کو دیئے جو تذبذب کے بعد انہوں نے رکھ لیے۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا' دنیا میں ہر جگہ ظلم و ستم ایک ہی انداز میں دندناتا ہے اور مظلومیت و بے چارگی ایک ہی ڈھنگ سے سسکتی نظر آتی ہے۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس قسم کی صورتِ حال میں نے ایک مرتبہ پنجاب کے ایک گاؤں میں بھی دیکھی تھی اور شاید ایک آدھ بار کہیں اور بھی ایسا ہی نقشہ نظر آیا ہو۔ غوث دلا وارثی ہر جگہ موجود تھی اور داراب اور واحد بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ جلال' بدر اور معصوم ناصر یہ سب لوگ ہزار ہا شکلوں میں ہزار ہا جگہوں پر موجود تھے۔

جلال اور بدر قریباً آدھا گھنٹا مزید کمرے میں موجود رہے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ بھی انہیں محسوس نہیں

باراوّل ـــــــ ۲۰۰۱ء
مطبع ـــــــ یوایشڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــ المدینہ کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ـــــــ ٦٠ روپے

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
تسیت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور

ISBN 969-517-022-6

ہوا کہ اس چار دیواری میں اہل خانہ کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ اپنے آپ میں ہی اتنے مگن تھے کہ ادھر ادھر دھیان دینے کی فرصت انہیں نہیں تھی۔ صرف ایک بار بدرو نے اٹھ کر اس کمرے کی طرف آنا چاہا جہاں میں موجود تھا' بوڑھے داراب نے نجانے کیا بات کی کہ وہ دروازے کے پاس سے ہو کر واپس چلی گئی' اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ سب کچھ درہم برہم ہو جاتا۔

آخر جلال اور بدرو جانے کے لیے اٹھ گئے۔ ننھے ناصر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے توتلی زبان میں ماں سے کچھ کہا۔ ماں نے اسے بازوؤں میں لے کر کچھ سمجھایا۔ بچے کی آنکھوں میں کرب نمودار ہوا اور وہ ایک دم پھر سے رونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ ضد کرنے والے انداز میں اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ بدرو اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر یہ بے سود کوشش تھی۔ بدرو بھی رونے لگی اور احتجاجی انداز میں جلال سے کچھ کہنے لگی۔ جلال کے چہرے پر نظر آنے والی نرمی ایک دم صحرا کی چھاؤں کی طرح غائب ہو گئی۔ اس کا چہرہ پر حرارت نظر آنے لگا۔ داراب داری نے بمشکل بچے کو بدرو سے جدا کیا۔ وہ ترس ناک انداز میں رو رہا تھا' چھوٹی بچی بھی آنسو بہانے لگی تھی۔ بچوں کو مغموم چھوڑ کر بدرو باہر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد جلال اور بدرو چار دیواری سے باہر جا چکے تھے۔ داراب گیا اور پھاٹک کو کنڈی لگا کر واپس آ گیا۔ صفدر لمبوتری کوٹھڑی سے نکل آیا تھا' ہم سب بھی بڑے کمرے میں پہنچ گئے۔ بوڑھے داراب نے جھنجلا کر روتے چلاتے بچے کو دو تھپڑ رسید کیے' وہ ایک دم سہم کر چپ ہو گیا۔ صرف اس کے حلق سے ایک دبی دبی کربناک آواز نکل رہی تھی۔ غزالہ نے بے قرار ہو کر بچے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ کلثوم بھی اسے پچکارنے لگی۔ بچے کو تھوڑا سا لاڈ ملا تو اس کے سینے میں گھٹی ہوئی آہ و زاری ایک بار پھر بلند ہو گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر باقی دونوں چھوٹے بچے بھی رونے لگے تھے۔ بوڑھا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا سر پیٹنے لگا۔

یہ بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ کمرے میں کئی کھلونے بکھرے ہوئے تھے' غزالہ معصوم ناصر کو کھلونا تھمانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ ہر کھلونا دور پھینک رہا تھا۔ اس کی بہتی آنکھوں اور بہتی ناک نے اس کا پورا چہرہ گیلا کر دیا تھا۔ غزالہ نے اپنے پلو کو بھگو کر اس کا چہرہ صاف کیا اور اسے بہلانے کے لیے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ کلثوم نے بھی تانی کی انگلی تھامی اور اسے غزالہ کے پیچھے لے گئی۔

باقی تینوں بچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر دل کٹ رہا تھا۔ دو روز پہلے ہم اس چار دیواری میں پناہ لینے کے لیے داخل ہوئے تھے۔ یہ لوگ ہمارے لیے اجنبی تھے اور ان کے دکھ درد سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی' مگر آج صرف دو دن بعد ان بچوں کا دکھ ہمیں اپنا ذاتی دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ مائیکل' اس کے ساتھی اور ان کا ہرکولیس سب کچھ دور دراز کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ اب اس چار دیواری میں ہمیں ۴۸ گھنٹے گزر چکے تھے اور اب یہ اندیشہ ہمارے ذہنوں سے محو ہونے لگا تھا کہ کوئی متلاشی پارٹی ہم تک پہنچ جائے گی۔ ہم نے جوزف سے جو معلومات حاصل کی تھیں وہ بھی حوصلہ افزا تھیں۔ جوزف نے بتایا تھا کہ مائیکل تا دیر فارم ہاؤس میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا' لہٰذا جس وقت بھی اسے راستے کی کلیئرنس ملی وہ یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ جوزف نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہرکولیس کھاڑی کے قریب ہی کھلے سمندر میں لنگر انداز ہے۔ اسے واقعی تھوڑی سی مرمت کی بھی ضرورت تھی اور یہ مرمت اس کے لنگر انداز رہنے کا ایک معقول بہانہ ہے' جوزف سے ایک اور بات کی تصدیق ہوئی تھی' اور اس کے علاوہ ایک اہم بات معلوم بھی ہوئی تھی۔ تصدیق یہ ہوئی تھی کہ ہرکولیس کی منزل افریقہ کے مغربی ساحل کا ملک ماریطانیہ ہی ہے۔ اور جو بات معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ماریطانیہ میں ایک کنگ براؤن نامی شخص کے پاس ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ جوزف کنگ براؤن نامی اس شخص کے بارے میں مزید کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ کم از کم وہ ظاہر تو یہی کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

داراب کے پوتے پوتیوں کی حالت زار ہماری توجہ بار بار اپنی جانب مبذول کرا رہی تھی۔ میں نے جوزف کو ترجمان بناتے ہوئے داراب سے کہا "کیا ہم اس سلسلے میں تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ بولا "نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ جلال نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک دو روز تک بدرو کو واپس پہنچا دے گا۔"

"زبردستی کے وعدے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔" میں نے کہا "اور میرے خیال میں تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ اس وعدے کی کوئی حقیقت نہیں۔"

داراب گڑبڑا گیا۔ اس کا چہرہ گواہ تھا کہ میری بات میں وزن ہے۔ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ہم۔ چند دن اور بہو کے لیے صبر کر لیں گے' لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ساری عمر اس کا انتظار کرنا پڑ جائے گا۔ وہ اسے

قتل کر ڈالے گا یا کہیں بیچ دے گا اسے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بے شک تمہارے پاس بندوقیں ہیں مگر وہ ان بندوقوں وندوقوں کو کچھ نہیں سمجھتا۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں خوف سا دکھائی دیتا تھا۔ صفدر نے کہا "لیکن تم بھی تو ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے بھی سیدھا کیا ہو۔"

اس مرتبہ داراب کے ساتھ اس کی بیوی بھی گھگھیانے لگی۔ وہ بولی "ہم پر رحم کرو۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے' یہی بہت ہے' تم لوگ تو جھگڑا کر یہاں سے چلے جاؤ گے لیکن ہمیں یہیں رہنا ہے۔ ہمارے بچے ہیں' جوان بچی ہے' وہ جانور ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔"

میاں بیوی' جلال کے ذکر سے ہی کانپ رہے تھے' میرے کہنے پر جوزف نے باتوں باتوں میں ان سے جلال کے ڈیرے کے بارے میں پوچھ لیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہاں کتنے افراد سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔

اپنی اپنی ہمت کی بات ہوتی ہے۔ جس جلال کو یہ ناتواں "بوڑھا جوڑا" ناقابل شکست اور انتہائی خطرناک محسوس کر رہا تھا وہ ہمارے لیے ایک عام غنڈا تھا۔ مجھے اور صفدر کو یقین تھا کہ ہم نہ صرف اسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں بلکہ کوئی ایسا پکا بندوبست بھی کر سکتے ہیں کہ وہ خدائی فوجدار ہمیشہ داراب اور واحد کے سامنے سرنگوں رہے۔ بدرو نامی اس خاتون کو جلال کے چنگل سے بحفاظت نکال لینا بھی کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ صفدر کا خیال تھا کہ ہمیں یہ کام کر گزرنا چاہیے۔ جیسا کہ داراب کے جملے سے ہی ظاہر ہو گیا تھا' اس کا اندیشہ موجود تھا کہ جلال مغویہ کو کہیں بیچ ہی نہ ڈالے' اگر خدانخواستہ کوئی ایسا کام ہو جاتا تو پھر بدرو کو ڈھونڈنا کوئی سہل کام نہیں تھا۔

شام تک ہم نے سوچ بچار کی اور پھر ایک لائحہ عمل تیار کر لیا۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد ہم کارروائی کے لیے تیار ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق صفدر کو یہیں داراب کے گھر میں رہنا تھا' مجھے اور زریں گل کو جلال کے ڈیرے پر جانا تھا اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے تھے۔

باہر اندھیرا خوب گہرا تھا۔ داراب کے گھر سے ہی ہمیں دو چغے مل گئے تھے۔ یہ نصف آستین کے رنگ دار چغے تھے' ایک میں نے پہن لیا' دوسرا زریں نے۔ زریں کا قد چونکہ چھوٹا تھا' اسے چغہ نیچے سے کاٹنا پڑا۔ آستینوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دو ڈھاٹوں میں ہم نے اپنے منہ سر چھپا لیے۔ یہاں اونٹوں پر سفر کرنے والے مسافر ایسے ڈھاٹے اکثر باندھے دکھائی دیتے تھے۔ گرد اور لُو سے بچنے کے لیے یہ ڈھاٹے بڑے کارآمد تھے۔ ہمارے چغے چونکہ کھلے تھے لہٰذا ان کے نیچے رائفلیں بہ آسانی چھپائی جا سکتی تھیں۔ میں نے رائفل کے علاوہ ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا بھی چغے میں چھپا رکھا تھا۔ زریں گل کو چغے اور ڈھاٹے میں دیکھ کر کلثوم کی ہنسی چھوٹ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیتی تھی۔

زریں گل نے کہا "استاد صیب! دیکھیں آپ لوگ کلثوم کی حمایت کرتا ہے۔ اب یہ کھلم کھلا ام پر ہنس رہا ہے' آپ اس کو منع کیوں نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "ہم کلثوم کو اس بات پر منع کیسے کر سکتے ہیں جس کے کرنے کو خود ہمارا دل بھی چاہ رہا ہے۔"

"یعنی آپ کا دل بھی ام پر ہنسنے کو چاہ رہا ہے؟"

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم لگ ہی ایسے رہے ہو۔ جو بھی دیکھے گا وہ ہنسنے پر مجبور ہو گا۔"

"دنیا کا تو اور بات ہے استاد صیب۔ کم از کم آپ لوگوں کو تو نہیں ہنسنا چاہیے۔"

"تم ہمارا شمار بھی دنیا میں ہی کر لو۔ ہاں کلثوم کی اور بات ہے۔ ویسے تم اسے پیار سے سمجھاؤ تو وہ باز بھی آ جائے گی' لیکن پیار سے سمجھانے کے لیے بھی تو تنہائی درکار ہے' اور تنہائی فی الحال تمہاری قسمت میں نہیں۔ لہٰذا تم اپنا کام کرو' کلثوم کو اپنا کام کرنے دو۔ وہ ہنس ہی رہی ہے نا... کوئی رو تو نہیں رہی۔"

"اگر یہ ایسے ہی ہنسے گا تو پھر اسے رونا پڑ جائے گا۔ خوام اگر کسی کے ساتھ دل سے ناراض ہو جائے تو قیامت تک نہیں مانتا۔"

"ہاں بچپن میں یہ عقل سے ناراض ہو گیا تھا آج تک نہیں مانا۔" صفدر نے فقرہ چپکایا۔

میں اور صفدر مسکرائے تو کلثوم بھی پھر مسکرانے لگی۔ زریں نے دانت پیسے "دیکھیں' دیکھیں وہ پھر ہنس رہا ہے۔ بہت سخت ہڈی ہے اس کا۔ اس حالت میں بھی ہنس رہا ہے' جب ٹھیک ہو جائے گا پھر کیا کرے گا۔"

"پھر کیا کرے گا... پھر اسی حالت میں ہو جائے گا" صفدر نے کہا "تمہارے تایا کے نو بچے ہیں اور تمہارے گھر والے بتاتے تھے کہ تم ہو بہو اپنے تایا پر گئے ہو۔"

صفدر کی بات پر زریں کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی اور اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ صفدر بولا "دیکھا نا۔ زیادہ بچوں والی بات کتنی دل کو لگی ہے۔"

زریں نے کہا "صفدر میب! ہم استاد میب کا احترام فرماتا ہے ورنہ آپ کو اس بات کا بڑا اچھا جواب دے سکتا تھا۔"

اس نوک جھونک کے بعد میں اور زریں گل مکان سے باہر آگئے۔ ہمارا رخ جلال کے ڈیرے کی طرف تھا۔ ڈیرے کا مکمل اتا پتا ہم سمجھ چکے تھے۔ گہری تاریکی میں ہم قریباً ایک فرلانگ تک سیدھے چلتے رہے۔ ہمارے اردگرد خشک درختوں اور خالی کھیتوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کہیں کہیں فاصلے پر کسی کاشتکار کا اجڑا بکھرا گھروندا نظر آجاتا تھا۔ ایک جگہ ہمیں پگڈنڈیوں کا دو شاخہ نظر آیا' ہم داہنی جانب والی پگڈنڈی پر ہو گئے۔ اس پگڈنڈی پر کچھ آگے جا کر چائے کے کھیت (یا باغات) موجود تھے' مگر فصل تباہ حال دکھائی دیتی تھی۔ ہم چائے کے چار پانچ فٹ اونچے خزاں رسیدہ پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک نسبتاً کشادہ راستے پر آگئے۔ یہاں ہمیں ایک گدھا سوار ملا۔ وہ گدھے پر کچھ لادے خراماں خراماں اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز علیک سلیک کی کوئی قسم ہے اور اخلاقاً نکالی گئی ہے۔ ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے خر سوار نے ایک بار پھر آواز نکالی۔ میں نے زریں گل سے کہا "یہ مقامی طریقے کے مطابق ہم سے سلام دعا کر رہا ہے۔ تم بھی ایسی ہی آواز نکال کر اس کا جواب دو۔"

زریں گل نے کھنکار کر گلا صاف کیا' اور بالکل ویسی ہی آواز نکال کر دکھا دی۔

گدھا سوار خوش ہوا۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور دوبارہ آواز نکالی' یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی نابالغ مرغا زور سے بانگ دینے کی کوشش کرے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈیرے پر پہنچ گئے۔ ڈیرے کے اردگرد کیلے اور ناریل کے بہت سے درخت نظر آرہے تھے۔ ڈیرا ایک وسیع احاطے اور سات آٹھ کمروں پر مشتمل تھا۔ مقامی طرزِ تعمیر کے مطابق احاطے کے گرد چار پانچ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ کمرے گارے اور مٹی سے بنے ہوئے تھے۔

دار اب نے ہمیں جو معلومات بہم پہنچائی تھیں ان کے مطابق آج ہفتے کی رات تھی۔ ہفتے کی رات جلال کے اکثر ملازم اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے اور ڈیرے پر صرف دو تین بندے ہی موجود ہوتے تھے۔ یوں آج کی رات ہماری کارروائی کے لیے مناسب ترین تھی۔ ہم نے چار دیواری کے پیچھے سے دیکھا' احاطے میں ایک جگہ آگ جل رہی تھی اور دو سائے متحرک نظر آتے تھے۔ ایک مرد تھا ایک عورت' ان دونوں کی مصروفیات کا جائزہ لینے کے لیے' ہم احاطے میں داخل ہوئے بغیر ان کے کچھ اور قریب چلے گئے۔ سیاہ فام عورت کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی اور وہ بڑی آزادی اور بے پروائی سے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ مرد آگ سے کچھ فاصلے پر نیم دراز تھا' وہ جس چیز کا نشہ کر رہا تھا وہ یقیناً تاڑی تھی کیونکہ اس کی بُو ہم آٹھ دس گز دور سے بھی سونگھ سکتے تھے۔ سیاہ فام مرد خاصے مضبوط جسم کا مالک تھا' اس کے قریب ہی طاقت ور رائفل اور گولیوں والی بیلٹ دھری تھی۔

بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا' عورت نے بڑی آہستگی کے ساتھ اسے خود سے جدا کیا اور سلو موشن میں جھک کر اسے چٹائی پر لٹا دیا۔ مرد نے عورت سے چھیڑ خانی کی' وہ دبی دبی آواز میں ہنسنے لگی۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی' آگ کی روشنی میں ان کے سیاہ جسم تصوراتی سا منظر پیش کر رہے تھے۔ عورت نے اپنے مرد کے ہاتھ سے سگریٹ لی اور چھوٹے چھوٹے دو کش لیے۔ میں اور زریں گل بہ آہستگی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے اور بلی کی چال چلتے سیاہ فام جوڑے کی طرف بڑھے۔ جوڑے کے قریب پہنچ کر ہمیں ٹرانسسٹر ریڈیو کی آواز بھی سنائی دی' اس پر موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ مرد کا سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم بالکل نزدیک پہنچ گئے تو مرد نے چونک کر اپنا سر گھمایا مگر اس وقت تک میرا دایاں بازو اس کی گردن میں فٹ ہو چکا تھا' اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی اور وہ بے سُدھ ہو کر اپنے ریڈیو کے اوپر گر گیا دوسری طرف زریں گل نے عورت کا منہ اپنے ہاتھ سے یوں بند کیا تھا کہ وہ آواز تک نہیں نکال سکی تھی۔ زریں اور میں عورت کو اٹھا کر ایک گوشے میں لے گئے۔ وہاں اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دیے۔ عورت کے ساتھی کی طرف سے مجھے پوری تسلی تھی وہ تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ نشے میں بھی تھا' عین ممکن تھا کہ صبح ہی اس کی آنکھ کھلتی۔ بچہ بھی بے خبر سو رہا تھا۔

ہم ڈیرے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھے۔ بڑی احتیاط سے گھوم پھر کر ہم نے تسلی کی۔ ایک کمرے کے سوا یہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ یہ کمرا اس جانب تھا

جہاں ناریل کے بلند درختوں کا ایک بڑا جھنڈ موجود تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں' تاہم روشن دان کھلے تھے اور وہاں سے مدھم روشنی باہر آرہی تھی۔ یہ ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ یہاں بجلی موجود ہے۔ یقیناً یہی کمرا تھا جہاں اس وقت جلال موجود تھا اور پدر کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔ مجھے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا۔ اس بچے کی معصوم ہچکیاں میرے کانوں میں زہر گھولنے لگیں جو اپنی ماں کے لیے رو رو کر نڈھال ہو گیا تھا۔

اب میرے اور زریں کے سامنے مسئلہ جلال کی خواب گاہ میں داخل ہونے کا تھا۔ وہ پوری طرح مسلح تھا اور ہماری ہتک کے جواب میں چوکس ہو سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ زریں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا' پھر وہ ایک الماری کی طرف بڑھا' اس میں سجاوٹ کے لیے چینی کے منقش برتن رکھے ہوئے تھے۔ زریں نے ایک مرتبان اٹھایا اور فرش پر پھینک دیا۔ فوراً خواب گاہ کے اندر سے جلال کی بھاری آواز ابھری۔ اس نے غالباً اپنے چوکیدار سے کچھ کہا تھا' میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا مگر دروازہ نہیں کھلا' چند سیکنڈ بعد زریں نے ایک اور برتن توڑ دیا۔ اس مرتبہ جلال کی آواز کافی بلند تھی۔ اس کے ساتھ ہی خواب گاہ کا دروازہ جھٹکے سے کھلا' مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ میں نے لپک کر جلال کی تناور گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی اور اسے گھسیٹ کر خواب گاہ میں لے گیا۔ زریں بھی رائفل بدست میرے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔ خواب گاہ خالی تھی۔ میں نے ذرا تعجب سے چاروں طرف دیکھا' مگر پتا چلا کہ جلال کے سوا یہاں اور کوئی موجود نہیں ٹیوب لائٹ روشن تھی' چھت کا پنکھا چل رہا تھا اور مسہری ایک مچھر دانی کے گھیرے میں تھی۔ زریں نے مچھر دانی اٹھا کر تسلی کی' مسہری بھی خالی تھی۔ میں نے جلال کو زور سے دھکا دیا۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ جلال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہی پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں؟ اور ہم نے اس کی "عزت و حشمت" کی "چھاؤنی" میں دخل اندازی کا "ہاتھ" ڈالنے کی جرأت کیسے کی ہے۔

اس سوال کے جواب میں' میں نے اپنے چہرے سے ڈھاٹا ہٹا دیا۔ زریں گل نے بھی ایسا ہی کیا۔ جلال کی آنکھوں میں حیرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے پوچھا "انگلش جانتے ہو؟"

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۵ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور۔

"کچھ کچھ۔" وہ بولا۔

"راحد کی بیوی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کون راحد؟" جلال نے تعجب سے کہا۔

"ایکٹنگ اچھی کر لیتے ہو۔ مگر یہ فلم نہیں' یہاں جتنی اچھی ایکٹنگ کرو گے اتنی ہی بری مار پڑے گی۔"

"تم کون ہو' اور یہ ساری بکواس کیوں کر رہے ہو؟"

"ہم خدائی فوجدار ہیں' اور تمہاری طبیعت صاف کرنے کے لیے آئے ہیں۔"

"تم یہاں گھسے کیسے ہو۔ مم۔ میرا چوکیدار کہاں ہے؟"

"اس کی طبیعت صاف ہو چکی ہے۔ وہ صبح تک کے لیے بے ہوش ہو کر احاطے میں پڑا ہے۔ اس کی بیوی۔۔۔ یا جو بھی وہ تھی' اس کے ہاتھ پاؤں ہم نے باندھ دیے ہیں' اب ان دونوں کی طرف سے کسی قسم کی امید رکھو گے تو صرف اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرو گے۔"

وہ غصے میں ایک دم افریقی بولنے لگا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ رانگ نمبر پر بات کر رہا ہے۔ اس کی افریقی ہم پر بے اثر تھی۔ جلد ہی وہ سنبھل گیا اور انگریزی میں بولا "میں تمہاری ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ میرا نام جلال ہے۔ اور جس نے بھی تمہیں میری طرف بھیجنے کی حماقت کی ہے اس نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

"تو تم ہم مظلوموں کی مدد کرو۔ ہمیں بتا دو کہ جو غلطی ہم سے ہو گئی ہے' اس کا کفارہ کیسے ادا ہو سکتا ہے۔"

وہ بولا "شاید تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی وقت اس ڈیرے پر میرے مزید بندے پہنچ جائیں گے اور وہ تمہارا حشر خراب کر کے رکھ دیں گے۔"

"جھوٹ بول کر تم اپنا نامۂ اعمال اور بھی سیاہ کر رہے ہو۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ پرسوں صبح آٹھ نو بجے سے پہلے یہاں تمہارا کوئی کارندہ نہیں آئے گا' اور اگر کوئی ایک آدھ آئے گا بھی تو ہم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منڈیر پر بٹھا دیں گے اور مرغے کی طرح بانگ دینے پر مجبور کر دیں گے۔"

غصے اور خوف سے جلال کا چہرہ سیاہ تر نظر آنے لگا تھا۔ وہ لہو کا گھونٹ بھر کر بولا "شاید تمہیں یہاں بھیجنے کی حماقت داراب نے کی ہے۔"

میں نے کہا "میرے کالے شہزادے! میں نے بتایا ہے نا۔ کہ ہم خدائی فوجدار ہیں۔ اور خدائی فوجدار کسی حماقت کے نتیجے میں نہیں' کسی ظلم کے نتیجے میں وارد ہوتے ہیں۔ اس چار دیواری میں ظلم ہوا ہے' یہاں کی ہر شے سے ظلم کی بو آ رہی ہے۔"

جلال نے ایک گہری سانس لی اور بولا "تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال تو یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ راحد کی بیوی بدنصیب کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس نہیں ہے' نہ ہی میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔" وہ خود سری سے بولا۔

میں نے اپنی رائفل زریں گل کے حوالے کی۔ جلال کے سرہانے ۳۸ بور کا بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ میں نے وہ بھی اٹھا کر زریں کو دے دیا۔ کمرے میں کوئی اور ہتھیار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے زریں کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے کے دروازے پر چوکس ہو کر کھڑا ہو جائے۔ زریں دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے گھیم شحیم جلال کو دبوچ لیا۔ میرے تین چار طوفانی مکے کھا کر وہ سنبھلا اور اس نے مجھ پر جوابی حملے کی کوشش کی۔ میرے مکوں نے اسے چکرا رکھا تھا' اس کے حملے میں غیر معمولی تیزی نہیں تھی۔ میں نے بہ آسانی اس کے وار بچائے۔ ایک دم وہ جھکا اور اس نے مسہری کے نیچے سے کلہاڑی کھینچنے کی کوشش کی' میں نے یہ کوشش ناکام بنائی اور ایک بار پھر اسے مکوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس کے ناک منہ سے خون بہنے لگا۔ لبادہ پھٹ گیا اور مچھردانی اپنے بانسوں سمیت ٹوٹ پھوٹ گئی۔ میں نے اسے بری طرح مارا' لیکن وہ بھی کافی سخت جان ثابت ہوا۔ وہ آخر تک چیختا چلاتا رہا اور نہ اس نے مزاحمت ترک کی۔ میرے آخری زور دار مکے کھانے کے بعد وہ بے دم ہو کر ایک جار پر گرا اور اسے توڑتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔ جار میں چھوٹی مکھی کا سفید شہد تھا' وہ فرش پر پھیل گیا۔

میں نے زریں کو اشارہ کیا۔ اس نے رائفل مجھے تھمائی اور آگے بڑھ کر ہانپتے کانپتے جلال کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ میں نے اسے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ اس کی ناک کا بانسہ سوج کر کپا ہو گیا تھا اور باچھوں سے بھی مسلسل خون رس رہا تھا۔ کڑھائی دار چغہ چیتھڑوں کی شکل اختیار کر کے اس کی کمر سے لٹک گیا تھا۔ چغے کے نیچے اس نے جانگیے کی طرز کا زیر جامہ پہن رکھا تھا جو اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔

میں نے رائفل اس کی گردن سے لگاتے ہوئے کہا "ہاں میرے کالے شہزادے! کہاں ہے واحد کی بیوی؟"

اس نے بڑی نفرت سے فرش پر تھوکا اور دزیل لہجے میں بولا کہ وہ مر جائے گا لیکن کچھ بتائے گا نہیں۔ اس کے ساتھ

ساتھ اس نے ہمیں ہمارے خوفناک انجام سے ڈرانے کی مقدور بھر کوشش بھی کی۔ آخر میں بولا "اگر تم نے ایسے ہی بدمعاشی دکھائی تو تمہارے ساتھ ساتھ وہ حرام کے جنے داراب اور راحد بھی پچھتائیں گے۔ واحد کی بیوی اگر دو دو روپیوں کی قیمت پر نہ بکی تو میرا نام جلال نہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ اس کے منہ سے خون کے چھینٹے اڑ کر دیوار پر جا گرے۔ میں نے کہا "زریں گل! یہ ایسے نہیں مانے گا۔ میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

میں نے زریں سے کہا کہ وہ اس کا دھیان رکھے' خود میں کمرے سے نکل آیا اور ایک نیم گول برآمدے سے گزر کر مکان کے عقبی احاطے میں پہنچ گیا۔ ناریل کے جھنڈ کے آس پاس تراشی ہوئی زرد گھاس تھی اور چھوٹے چھوٹے خود رو پودے تھے۔ میں اس احاطے میں ایک گڑھا تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جلال کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے اس گڑھے کے بارے میں مجھے بوڑھے داراب نے بتایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ جلال نے اپنے مکان کے پچھواڑے کھلے آسمان کے نیچے ایک پانچ چھ فٹ گہرا گڑھا کھود رکھا ہے۔ جلال نے جسے سخت سزا دینا ہوتی ہے اسے گڑھے میں زندہ دفن کر دیتا ہے لیکن اس طرح کہ چہرہ مٹی سے باہر رہے۔ جان لیوا گرمی اور دھوپ میں اس شخص کو سارا دن اور کبھی دو دو دن اس گڑھے میں دفن رکھتا ہے۔ بھوک پیاس سے بدنصیب شخص کی جان لبوں پر آ جاتی ہے' وہ جلال کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ داراب نے بتایا تھا کہ جلال کی اس سفاکی کا شکار ہو کر تین چار افراد جان سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ بوڑھے داراب کے بیان میں مبالغہ کتنا ہے اور سچ کتنا' بہرحال عقبی احاطے میں تلاش کرنے پر گڑھا مجھے مل گیا۔ اس کا قطر صرف دو فٹ اور گہرائی پانچ فٹ کے قریب تھی۔ گڑھے کے قریب ہی مٹی اور ریت کا ڈھیر سا لگا تھا۔

میں اندر گیا۔ زریں گل کے ساتھ مل کر میں نے جلال کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہم اسے مارتے ہوئے اور فرش پر گھسیٹتے ہوئے باہر عقبی احاطے میں لے آئے۔ گڑھے کو دیکھ کر وہ بری طرح مچلنے لگا اور ٹانگیں چلانے لگا۔ زریں گل نے رائفل کے دستے سے اس کی ٹانگوں پر زوردار ضربیں لگائیں۔ وہ بے دم سا ہو گیا۔ ہم نے اسے گڑھے میں پھینکنے سے پہلے اس کی ٹانگیں بھی باندھ دیں۔ بعد ازاں مردہ کتے کی طرح ہم نے اسے گڑھے میں پھینک کر اوپر بیلچے سے مٹی اور ریت ڈالنا شروع کر دی۔ زندہ دفن ہونے سے بچنے کے لیے وہ گڑھے کے اندر بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اسے تھوڑی تک دفن کر دیا' زریں گل نے اس کے سر پر دو تین ٹھوکریں لگائیں' اس کے حلق سے کراہنے کی گھٹی گھٹی آواز آنے لگی۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ تکلیف کے اظہار کے لیے اس نے آواز نکالی تھی۔

"ہاں جلال صاحب! اب آپ بتانا پسند کریں گے کہ راحد کی بیوی کہاں اور کس حال میں ہے۔"

اس کے حلق سے "غوں غاں" کی غصیلی آواز نکلی جس سے اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئی ہے' اور تن فن بھی باقی ہے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہم جلال کو وہاں مدفون چھوڑ کر کمرے میں واپس آ گئے۔ ہر کمرے میں ٹیوب لائٹ یا بلب موجود تھا۔ بڑے اطمینان سے ہم کمروں کی تلاشی لینے لگے۔ مگر بدر "شوکی" نہیں تھی کہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی اس کا سراغ نہ لگتا۔ وہ اس چار دیواری میں موجود ہی نہیں تھی۔ تاہم ایک دو ایسے ثبوت ضرور ملے جن سے اندازہ ہوا کہ اس بدنصیب کو یہاں لایا گیا تھا۔ ایک کمرے میں ایک زنانہ اسکارف موجود تھا اور یہ وہی اسکارف تھا جو میں نے بدر کے سر پر دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ رنگین شیشے کے کچھ ٹوٹے ہوئے کنگن ملے' ان کا تعلق بھی یقیناً بدر سے ہی تھا۔

زریں گل ایک الماری کے اندر جھانک رہا تھا۔ اس نے کہا "استاد صیب! ایک کام کا چیز ملا ہے۔"

میں نے دیکھا زریں کے ہاتھ میں کیمرا نظر آ رہا تھا "اس کا کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "استاد صیب! اس کے اندر فلم بھی ہے۔ ہمارا ایک مسئلہ حل ہو گیا ہے ہم یہی چاہتے ہیں ناں کہ کوئی ایسا بندوبست ہو کہ ہمارے جانے کے بعد بھی یہ کالا شہزادہ داراب کے گھر والوں کو تنگ نہ فرما سکے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ زریں بولا "تو بس ٹھیک ہے۔ ہم اس کیمرے سے وہی کام لے گا جو ایک مرتبہ آپ نے بھکر کے غنڈے کاربین کے خلاف لیا تھا۔ ہم دونوں اس کیمرے سے افریقی غنڈے جلال کا شرمناک تصویریں اتارے گا' اور اسے بتائے گا کہ اگر اس نے کبھی بھی داراب سے بدلہ لینے کا کوشش فرمایا تو یہ تصویریں ہم جائے کے پیکٹوں پر چھاپے گا اور اسے زندہ درگور کرے گا۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ ابھی تو اس کیمرے کو الماری میں رکھو۔" انھیں نے کہا۔

زریں نے کیمرا واپس الماری میں رکھ دیا۔

تلاشی کے دوران ہم گھر کی چھت پر بھی گئے۔ یہاں سے خود کار رائفلیں اور ڈھائی سو کے قریب راؤنڈ برآمد ہوئے' اس کے علاوہ کافی مقدار میں حشیش اور تاڑی وغیرہ بھی ملی۔ اس کے علاوہ ایک کمرے سے ایک اٹیچی کیس برآمد ہوا۔ اٹیچی کیس کو ہلانے سے یوں لگا جیسے اس کے اندر کوئی سیال چیز بھری گئی ہے۔ ایک اٹیچی کیس میں سیال شے کا ہونا اچنبھے کی بات تھی۔ ہم نے اٹیچی کیس کے تالے کھولنے کی کوشش کی مگر ریوالور سے فائر کیے بغیر تالے کھولنا مشکل تھا۔ اب اندر معلوم نہیں کیا چیز موجود تھی' ہمیں یوں تالا کھولنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ یہ اٹیچی ہم نے ایک طرف رکھ دیا۔

اس تلاشی سے اندازہ ہوا کہ جلال اسلحے کے زور پر اپنا رعب داب قائم رکھنے والا شخص ہے۔ اسے مقامی غنڈا کہا جا سکتا تھا' تاہم اس کے ساتھ وہ تھوڑا پڑھا لکھا بھی تھا۔ ناریل کے تیل کی خرید و فروخت سے اسے معقول آمدنی ہوتی تھی۔

..... میں نے چھت پر سے نیچے جھانکا۔ عقبی احاطے میں موجود جلال کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اسے گڑھے میں دفن ہوئے اب قریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے' میرا ارادہ تھا کہ رات کے آخری پہر ایک بار پھر اس کا مزاج پوچھیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ وہ ایک گرم ترین دن اس گڑھے میں گزارنے کے لیے تیار ہے کہ نہیں۔ زریں کو اچانک سیاہ فام پہرے دار کا خیال آگیا۔ بولا "استاد صیب! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ لکڑ بگا ہوش میں آجائے اور کوئی مسئلہ کھڑا کر دے۔"

میں نے کہا "ایسا کوئی امکان تو نہیں لیکن اگر تمہیں کوئی اندیشہ ہے تو وہ رفع کرلو۔ جا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ آتے ہیں' اس کے علاوہ عورت اور بچے کو بھی دیکھ آتے ہیں' کہیں بچہ ہی نہ جاگ جائے۔ ویسے اگر بچہ جاگے گا تو یہاں تک اس کی آواز ضرور پہنچے گی۔"

ہم چھت سے اترے اور اس سیاہ فام چوکیدار کے پاس پہنچ گئے جو میرے ہاتھوں "اٹا غفیل" ہوا تھا۔ وہ جہاں کا تہاں پڑا تھا۔ ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کی رائفل زریں گل پہلے ہی اندرونی کمرے میں چھپا چکا تھا۔ بے ہوش چوکیدار کو اٹھا کر ہم نے اس کی بیوی کے قریب ہی ڈال دیا۔ بچہ گہری نیند میں تھا۔ میں اسے بہ آہستگی اٹھا کر اندر لے گیا اور ایک مچھر دانی میں لٹا دیا' تاکہ وہ سکون کی نیند سوتا رہے۔ جس وقت میں بچے کو آرام دہ طریقے سے لٹا رہا تھا' باہر سے زریں گل کی پکار سنائی دی۔ وہ مجھے جلدی باہر آنے کا کہہ رہا تھا۔ میں باہر پہنچا تو زریں کو اس جگہ کھڑے پایا جہاں ہم نے دو ڈھائی گھنٹے پہلے جلال کو زمین میں گاڑا تھا۔ مجھے زریں کا ہیولا نظر آ رہا تھا' جلال کا سر زمین پر فٹ بال کی طرح پڑا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ "فٹ بال" ساکت نہیں ہے' ہل رہا ہے۔ جلال اپنا سر بے قراری سے دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر غور سے دیکھا اور چونک گیا۔ اس کے سر سے کئی کیڑے مکوڑے چمٹے ہوئے تھے اور ایک چھپکلی اس کے رخسار پر اطمینان سے بیٹھی تھی۔ بڑے سائز کے یہ مکوڑے بڑے زور سے کاٹتے ہیں اور یقیناً وہ جلال کو کاٹ بھی رہے تھے' کیونکہ اس کے حلق سے مسلسل "غوں غاں" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی جلال کے چہرے پر ڈالی' زریں گل نے اس کے سر کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ چھپکلی تڑپ کر غائب ہو گئی۔ مکوڑے بھی منتشر ہونے لگے۔ دراصل کمرے میں لڑائی بھڑائی کے دوران میں جلال کی ٹکر سے شہد کا ایک جار گر گیا تھا۔ تھوڑا بہت شہد جلال کے سر پر بھی لگ گیا تھا۔ اس شہد کے سبب کیڑے مکوڑوں نے فائف اس کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ جلال کے چہرے کی جلد سے صاف پتا چلتا تھا کہ کیڑے اس کا مزاج پوچھتے رہے ہیں۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر بالکل بند ہو گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہ ہماری مارپیٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ حشرات الارض کی کارستانی ہے۔

میں نے کہا "کیا ارادے ہیں میرے شہزادے۔ واحد کی بیوی کے بارے میں بتانا ہے یا نہیں؟"

اس مرتبہ جلال نے زیادہ "غوں غاں" نہیں کی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا ہے "دیکھو جلال!" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "تمہاری زبان کھلوانے کا ایک خوب صورت طریقہ ابھی ابھی ہماری سمجھ میں آیا ہے۔ ہم تمہارے چہرے پر تھوڑا سا شہد اور لگائیں گے اور رات بھر کے لیے تمہیں یہاں تنہا چھوڑ دیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ صبح تک کیڑے تمہاری آنکھوں اور ناک وغیرہ میں سوراخ کر ڈالیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آس پاس موجود چوہوں اور نیولوں وغیرہ کی بھی حوصلہ افزائی ہو اور وہ تمہارے رخ روشن کو گھن لگانے کے لیے یہاں پہنچ جائیں۔"

جلال کی آنکھوں میں اب واضح طور پر دہشت نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ وہ کراہنے لگا۔ اس کی حالت ہماری توقع سے زیادہ پتلی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کسی کیڑے نے اس کی آنکھ کے اندر کہیں

کاٹا ہے۔ آنکھ اب بالکل بند ہو گئی تھی۔ آنکھ کے اردگرد کا علاقہ بھی سوجتا جا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ کے اندر میں نے جلال کو باور کرا دیا کہ ہم اس کے ساتھ بڑے سے برا سلوک کرنے پر آمادہ ہیں' بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ ہمیں واحد کی بیوی کا پتا بتا دے۔ آخر جلال کی زبان کا بند تالا کھل گیا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا "وہ میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو کہاں ہے۔ تم اس کی آبرو کے دشمن ہو رہے تھے' تمہارے علاوہ وہ کس کے پاس ہو سکتی ہے۔"

"وہ میرے پاس صرف ایک رات کے لیے رہی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو کہ چند گھنٹے کے لیے رہی ہے' اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ نہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی ہے۔ بڑے آرام سے رکھا ہے۔"

"کیا مطلب۔ تم نے اس کے ساتھ زیادتی نہیں کی ہے؟"

"بالکل نہیں کی۔" وہ زور دے کر بولا "میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا' میں چاہتا تو اس چار دیواری میں اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا تھا' وہ کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتی تھی۔ مگر میں اسے زبردستی حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اتنی لمبی چاہت کا صلہ صرف جدائی ہے' اور اگر جدائی ہے تو مجھے یہ قبول نہیں۔ میں اسے حاصل کر کے چھوڑوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کتنا بھی انتظار کرنا پڑے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اس نے میرا پختہ ارادہ دیکھا تو مان گئی۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھی۔"

جلال نے چند لمحے توقف کر کے زریں گل کے ہاتھوں سے پانی پیا اور بولا "میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اور سچ یہی ہے کہ اس رات بدر میرے ساتھ رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اگلے روز دوپہر کے وقت اسے چھوڑ جاؤں گا' لیکن..... لیکن پھر ایک بڑی مچھلی آ گئی۔"

"بڑی مچھلی؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ اس علاقے میں بھی ایک بڑی مچھلی موجود ہے۔ وہ مجھ سا مچھلیوں کو بہ آسانی کھا سکتی ہے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ سیدھی بات کرو۔"

"میں اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کی بات کر رہا ہوں۔ اردگرد کافی کے زیادہ تر باغات اسی کی ملکیت ہیں۔ اس کے علاوہ شہر IRINGA میں اس کا ایک بہت بڑا کارخانہ بھی ہے جہاں کافی اور چائے وغیرہ کے بلینڈ تیار کیے جاتے ہیں اور انہیں ڈبا بند کیا جاتا ہے۔ اس شخص کا نام مبارک ہے۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ پھر ایک دم اس شخص کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ یہ وہی تھا جس کے وسیع کافی فارم میں مائیکل نے عارضی پناہ لی تھی۔ اس سیاہ فام کا پورا نام مبارک امین معلوم ہوا تھا۔ اس شخص کی دو خصوصیات اہم تھیں۔ ایک تو اس کی کوتاہ قامتی' دوسرے اس کے جسم پر انگشتریوں' بٹنوں اور ہار وغیرہ کی صورت میں سجا ہوا سونا۔

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟" جلال نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"شاید تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ بہرحال تم آگے بتاؤ کیا ہوا۔" میں نے کہا۔

جلال گہری سانس لے کر بولا "پچھلے بدھ کو مبارک امین اپنی گاڑی پر ادھر سے گزر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے میرے ڈیرے پر رک گیا۔ اس وقت بدر ابھی میرے ڈیرے پر ہی تھی۔ مبارک کی نظر بدر پر پڑ گئی اور اس کی نیت میں فرق آگیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں بدر کو چند دن کے لیے اس کے ساتھ بھیج دوں۔ میں نے بتیرا کہا کہ یہ بچوں والی ہے اور میں اسے اس کے گھر واپس چھوڑنے جا رہا تھا مگر مبارک پوری طرح فریفتہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے بالادست اور زور آور شخص ہے۔ جس طرح جھیل میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں ڈالا جا سکتا اسی طرح آس پاس کے قصبات میں کوئی مبارک سے بھی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ مجبوراً مجھے بدر کو مبارک کے ساتھ روانہ کرنا پڑا۔ اب پچھلے پانچ چھ روز سے وہ اس کے پاس ہے۔"

"لیکن..... دوپہر کو تو تم اسے اپنے ساتھ لے کر واراب کے گھر گئے تھے۔"

جلال نے چونک کر میری طرف دیکھا "تم اس وقت کہاں تھے؟"

"تمہارے بہت قریب تھا۔ بہرحال میری بات کا جواب دو۔"

جلال نے کہا "پرسوں مجھے واراب کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ بدر کا چھوٹا بچہ بہت روتا ہے اور بیمار ہو گیا ہے۔ میں آج سویرے مبارک امین کی طرف گیا۔ اس سے بمشکل دو تین گھنٹے کی اجازت لے کر میں بدر کو اپنے ساتھ لایا اور اس کے گھر والوں سے ملایا۔ بعد میں اسی طرح میں اسے مبارک کے پاس چھوڑ آیا۔"

یہ انکشافات میری توقع کے بالکل خلاف تھے۔ جلال کی یہ اطلاع بھی سنسنی خیز تھی کہ واحد کی بیوی کافی اسٹیٹ کے مالک مبارک امین کے پاس ہے۔ یہ مبارک امین اپنے نام کے برعکس ہمیں نہ تو مبارک نظر آیا تھا اور نہ بلند اخلاق۔ عیاشی اور بدباطنی جیسے اس کی آنکھوں میں درج تھی۔ یوں بھی جو شخص بردہ فروش مائیکل کا دوست تھا وہ نیک باطن کیسے ہوسکتا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ جلال کے بیان میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا' بہرطور یہ بات تو میں نے بھی محسوس کرلی تھی کہ بدر اس چاردیواری میں نہیں ہے اور نہ ہی جلال کے بیان میں مبارک امین کا کردار من گھڑت ہے۔

جلال کی تن فن اب کافی حد تک ختم ہوچکی تھی۔ ہم نے اسے گڑھے میں سے نکالا۔ اس کے جسم سے اتنا پسینہ بہا تھا کہ کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ زریں نے اس کے پاؤں کھول دیے۔ گن پوائنٹ پر ہم اسے اندر لے آئے اور پنکھے کے نیچے فرش پر بٹھا دیا۔ جلال نے سر جھکا رکھا تھا۔ زریں نے کہا "استاد صیب! جی چاہتا ہے کہ ام نعا پیں لگا لگا کر اس حرام زادے کا سر پلپلا کر دے۔ پہلے ایک بے گناہ عورت کو اغوا کیا' پھر اسے آگے اغوا کرا دیا۔ ام نے ایک فلم دیکھا تھا "چوروں کو پڑ گئے مور" اس میں بھی کچھ ایسا ہی پچویشن تھا۔ اس فلم میں دلہن کا بہت برا حال ہوا تھا۔"

"اگر واحد کی بیوی نہ ملی تو اس دلہن کا بھی بہت برا حال ہوگا۔" میں نے جلال کی طرف اشارہ کیا۔

چونکہ میرے اور جلال کے درمیان بات چیت انگریزی میں ہوئی تھی لہٰذا زریں کو مکمل تفصیل سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی پھر ہم نے جلال کا انٹرویو نئے سرے سے شروع کر دیا۔ ہم اس سے جاننا چاہتے تھے کہ یہ مبارک امین نامی بندہ اصل میں کیا شے ہے اور بدر کو اس سے کیسے چھڑایا جاسکتا ہے۔ (اگر بدر واقعی اس کے پاس ہے تو)

جلال کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مبارک کا آبائی قصبہ "اٹولی" ہے جو یہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اٹولی میں مبارک کی بہت بڑی کوٹھی ہے اور نوکر چاکر ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی اس کی ایک بڑی رہائش گاہ ہے۔ وہ ہفتے میں ایک آدھ چکر وہاں کا بھی لگاتا ہے۔ فارم کی دیکھ بھال زیادہ تر اس کا سب سے چھوٹا بھائی اور سب سے بڑا بیٹا کرتے ہیں۔ جلال نے مبارک کے بارے میں وہی بات کہی جو جلال کے بارے میں بوڑھے واراب نے کہی تھی۔ وہ ہمیں سمجھانے لگا کہ مبارک سے ٹکر لینا ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہیں۔ وہ بہت خطرناک شخص ہے اور اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ہر مچھلی کو کھانے کے لیے ایک بڑی مچھلی موجود ہوتی ہے۔"

اس نے حقارت سے ہماری طرف دیکھا اور بولا "تم تو مجھے وہ بڑی مچھلی نظر نہیں آتے ہو جو مبارک کو کھاسکے۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا۔" میں نے کہا "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ کوئی مچھلی بھی بڑی نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی بندہ ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ تم جیسے دودھ کے دانتوں والے بدمعاش کو بھی بعض بے چارے افلاطون قرار دیتے ہیں اور نام لے لے کر اپنے بچوں کو ڈراتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ کسی ایسے بدمعاش کو اس کے اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں چند گھنٹے کے لیے رہا دیا جائے تو وہ کسی آفت زدہ بیوہ کی طرح واویلا کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا تم بھی ہمیں سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو' صرف اتنا بتاؤ کہ تمہاری اس بہن کو مبارک کے چنگل سے نکالنے کا مناسب ترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے۔"

جلال کے چہرے پر شدید الجھن اور پریشانی نظر آنے لگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا "بدر کے واپس آنے کے دو راستے ہیں۔ پہلا تو خاموشی سے انتظار کرنے کا راستہ ہے۔ آج صبح مبارک نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ روز تک عورت واپس کر دے گا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس سے جھگڑا مول لیا جائے اور زبردستی کی جائے۔ اگر میری رائے لو تو میں یہی کہوں گا کہ چند دن صبر کر لینا بہت اچھا ہے۔"

"مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ بدر واپس مل جائے گی۔ مبارک بھی تو تمہارے ہی جیسا حرام زادہ ہے۔ جس طرح وہ تمہاری مردانگی پر پیشاب کر کے بدر کو تم سے لے گیا ہے' اسی طرح کوئی اس کی مردانگی پر موت سکتا ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے کسی لفنگے یار دوست کا دل بدر پر آجائے اور وہ خیرسگالی کے طور پر اسے آگے چلا دے۔ ایسے ہی کوئی مال زادہ اس بے چاری کے رام بھی کھرے کر سکتا ہے۔ تم جس بے غیرت قبیل سے تعلق رکھتے ہو وہاں یہ سب کچھ تو چلتا ہی ہے' لہٰذا میرے کالے شہزادے! تم اپنا اور میرا وقت ضائع مت کرو۔ میرے پاس تو وقت ویسے بھی بہت کم ہے۔ تم مجھے بس دوسرے طریقے کے بارے میں ہی بتاؤ تو تمہاری مہربانی ہے۔"

"دوسرا طریقہ تو وہی لڑائی جھگڑے والا ہے'

اس کے علاوہ تو میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔"

"تمہاری سمجھ میں آنی چاہیے۔ اور آئے گی بھی۔ لیکن اس کے لیے تمہیں ذہن پر زور دینا پڑے گا اور اگر نہیں دو گے تو پھر ہم تم پر "زور" دیں گے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس "زور" کے نتیجے میں تمہیں ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنا پڑے گا۔"

جلال نے کہا "آخر تم لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے بدر کو گھر سے اٹھا کر زیادتی کی ہے لیکن یقین کرو۔ اب میں اس کی برائی میں نہیں ہوں' میں دل سے چاہتا ہوں کہ وہ اپنے گھر واپس پہنچے۔"

"اگر دل سے چاہتے ہو تو پھر دل سے سوچو بھی۔ یہ مسئلہ تمہارا پیدا کیا ہوا ہے' اس کا بہتر اور آسان حل بھی تم ہی ڈھونڈ سکتے ہو۔"

جلال کے چہرے پر اب واضح طور پر کرب کے آثار نظر آنے لگے تھے' وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہنے کے بعد بولا "تم میری حالت تو دیکھ ہی رہے ہو۔ اس ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ میں تو کسی طور مبارک کی طرف نہیں جاسکتا' اور میرا خیال ہے کہ تم مجھے بھیجو گے بھی نہیں۔ بہرحال ایک بات میرے دماغ میں آرہی ہے۔ مبارک کی دوسری بیوی کا اس پر اب بھی کافی اثر و رسوخ ہے۔ یہ بیوی وہ شہر سے بیاہ کر لایا تھا' پڑھی لکھی عورت ہے۔ وہ اپنے ایک بچے کے ساتھ علیحدہ گھر میں رہتی ہے۔ لیلیٰ نامی یہ عورت مبارک کی زیادتیوں کو اکثر لگام ڈالتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم میں سے کوئی جا کر اس سے ملاقات کرے اور رازداری کے ساتھ اسے بدر کے پریشان حال بچوں کے بارے میں بتائے تو وہ ضرور مدد کرے گی۔ وہ اتنا اختیار رکھتی ہے کہ مبارک سے پوچھے بغیر بدر کو تمہارے ساتھ روانہ کر دے۔"

جلال ہمیں مبارک امین کی طرف بھیج رہا تھا اور مبارک امین کی طرف جانے میں کئی خطرات پوشیدہ تھے۔ سب سے بڑا خطرہ تو یہی تھا کہ ہم اس کے فارم ہاؤس سے فرار ہو کر آئے تھے۔ وہ دیکھتے ہی ہمیں پہچان لیتا اور اپنی ساری توانائی ہمیں پابہ زنجیر کرنے میں صرف کر دیتا۔ بہرحال میں نے جلال سے پوچھا کہ لیلیٰ نامی اس عورت سے کیسے اور کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟ وہ بولا "میرا خیال ہے کہ تم صبح نو بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک کسی بھی وقت لیلیٰ سے بہ اطمینان بات کر سکتے ہو۔ ان اوقات میں مبارک امین یا اس کے کسی سینئر کارندے سے تمہاری ملاقات ہرگز نہ ہوگی۔ دراصل مبارک آج کل اپنے ہی ایک چکر میں الجھا ہوا ہے۔"

"کیسا چکر؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے فارم ہاؤس پر اس کا ایک دوست آکر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس دوست کے پاس کچھ بکے کارندے (زرخرید نوکر) تھے۔ ان میں سے کچھ کارندے موقع دیکھ کر فرار ہوگئے۔ نہ صرف فرار ہوئے بلکہ جاتے جاتے تین لاشیں گرا گئے اور ایک قیمتی جیپ جلا کر راکھ کر گئے۔ اب مبارک امین اور اس کے کارندے آس پاس کے علاقے میں ان کی تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔ مبارک صبح کا نکلا شام کے بعد ہی لوٹتا ہے۔"

یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ جلال کی زبان سے ہمارا ہی ذکرِ خیر ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے چہرے کو بے تاثر رکھنے کی پوری کوشش کی اور کامیاب رہا۔ اپنے بارے میں یہ ایک اہم اطلاع ہمیں جلال کی زبانی ملی تھی۔ جلال سے پانچ دس منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جلال کم از کم اپنے' اس دعوے میں سچا ہے کہ وہ بدر کو واپس اس کے گھر دیکھنا چاہتا ہے۔ لیلیٰ نامی عورت کو ملنے کی جو تجویز اس نے پیش کی تھی وہ بھی کوئی ایسی ناقابلِ قبول نہیں تھی۔ کافی غور و خوض کے باوجود مجھے اس میں کوئی چال دکھائی نہیں دی۔

دوسرے کمرے میں جا کر میں نے زریں گل سے تفصیلی مشورہ کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ میں کل صبح جلال کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق مبارک کی بیوی لیلیٰ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ جیسا کہ معلوم ہوا تھا کہ وہ شہر کی پڑھی لکھی عورت ہے' یقیناً وہ انگریزی میں میرا مطلب جان سکتی تھی۔ وہ خود بھی بال بچے دار تھی' ایک ماں کا درد بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ کوئی مدد کر سکتی۔ پروگرام کے مطابق زریں گل کو یہیں جلال اور اس کے چوکیدار پر نگران رہنا تھا۔ میں نے کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اسے مکمل ہدایات دے دیں۔

○☆○

دن کے دس بجے تھے' میں ایک کشادہ کمرے میں ایک بارعب خاتون کے روبرو بیٹھا تھا۔ تیس پینتیس سالہ خاتون نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور اس کے گلے میں موتیوں کی بیش قیمت مالا دمک رہی تھی۔ یہی سیاہ فام خاتون لیلیٰ تھی۔ یہ "اٹولی" قصبے کا مضافاتی علاقہ تھا' میں یہاں تک جلال ہی کی ایک پرانے ماڈل کی جیپ کے ذریعے پہنچا تھا۔ جیپ میں نے قصبے سے باہر ہی درختوں میں چھوڑ دی تھی۔ میں اسی افریقی

لباس میں تھا جو میں بوڑھے داراب کے گھر سے پہن کر نکلا تھا۔ اس لباس کے نیچے میں نے جلال کا ریوالور بھی چھپا رکھا تھا۔

جلال کی اطلاع کے عین مطابق اس وسیع کوٹھی میں اس وقت چند گھریلو ملازمین اور ایک چوکیدار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لیلیٰ کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بھی اسکول جا چکا تھا' کمروں میں ایک خاموش ٹھنڈک تھی۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے خاتونِ خانہ کو بتایا کہ میرا نام ابراہیم ہے۔ میں پاکستان کی ایک چائے کمپنی میں ملازم ہوں اور اپنے کام کے سلسلے میں کافی عرصے سے یہاں مقیم ہوں۔

میرے کوائف جاننے کے بعد خاتونِ خانہ نے شائستگی سے کہا "فرمایئے ابراہیم صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "محترم خاتون! جو بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں' معلوم نہیں کہ وہ کہنی بھی چاہیے یا نہیں مگر آپ کی خدا ترسی اور ہمدردی کے بارے میں اتنا کچھ سنا ہے کہ یہ بات کہنے کا حوصلہ ہو رہا ہے۔"

اس تمہید کے بعد میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں محترمہ لیلیٰ صاحبہ کو بتایا کہ ان کے علاقے میں بدر نامی ایک غریب عورت کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ آخر میں میں نے بتایا "یہ خاتون اب پچھلے پانچ چھ روز سے مبارک امین صاحب کی تحویل میں ہے۔ خاتون کے بچوں کی جو حالت ہے وہ آپ دیکھ لیں تو شاید اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں۔ خاص طور سے اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تو ہلکان ہو رہا ہے۔ ایک روز پہلے جلال نامی وہ بندہ بدر کو بچوں سے ملانے کے لیے گھر پر لایا تھا' ایک گھنٹا بچوں کے پاس رہ کر جب خاتون پھر واپس جانے لگی تو اس کے چھوٹے بچے نے رو رو کر دل دہلا دیا۔"

میں بولتا رہا اور لیلیٰ صاحبہ بڑے تحمل اور توجہ سے سنتی رہیں۔ آخر وہ خاموشی سے اٹھیں' اور مجھے انتظار کرنے کا کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ غالباً وہاں سے انہوں نے کسی کو فون وغیرہ کیا۔ میں ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا' تاہم میری چھٹی حس نے کسی ناخوشگوار واقعے کی وارننگ نہیں دی۔ چند منٹ بعد میں نے دیکھا کہ لیلیٰ صاحبہ کندھے پر شال لیے کوٹھی کے پورچ کی طرف جا رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ملازم بھی بڑے ادب سے چلا جا رہا تھا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پتا چلا کہ وہ گھر سے باہر چلی گئی ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنے شوہر کی اس دوسری رہائش گاہ پر گئی ہیں جہاں بدر کے ملنے کی امید ہے۔

گھر پر موجود ملازم خاموشی سے میری خاطر تواضع کرتے رہے۔ اناناس کا شربت پلایا گیا۔ آم' سیب وغیرہ پیش کیے گئے۔ آخر میں چائے بھی آئی ظاہر ہے کہ یہ بہترین چائے رہی ہوگی کیونکہ یہ اپنے باغات کی چائے تھی۔

میں بیٹھا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ چائے کی مسحور کن خوشبو نے اور خوب صورت ماحول نے ذہن میں رومانی خیالات اُجاگر کر دیے۔ ایک منظر سمندر میں جیسے موتی کی طرح اچھل کر میری نگاہوں کے سامنے آیا اور جگمگانے لگا۔ یہ غزال کو چومنے کا منظر تھا۔ میں نے غزال کو چوما تھا لیکن مائیکل کے حکم کے مطابق سب کے سامنے نہیں' اپنی مرضی کے مطابق تنہائی میں ۔۔۔ اور شاید میری یہی ادا تھی جس کے سبب غزال نے میری اس "جرأت" کو جیسے تیسے معاف کر دیا تھا۔ تنہائی میں ذہن نجانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد گاڑی کی آواز دوبارہ سنائی دی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں انتظار کرتا رہا مگر گاڑی کوٹھی کے اندر نہیں آئی پھر وہی لمبا تڑنگا نیگرو ملازم اندر داخل ہوا جو کچھ دیر پہلے گاڑی پر لیلیٰ صاحبہ کے ساتھ گیا تھا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ مجھے باہر بلایا جا رہا ہے۔ میں ملازم کے پیچھے چلتا بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا۔ ملازم کی پتلون کی ایک جیب بھاری تھی' میرے لیے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا کہ اس کی جیب میں ریوالور ہے۔ ملازم مجھے لے کر باہر آگیا۔ یہاں گاڑی میں لیلیٰ صاحبہ موجود تھیں۔ جو دوسری عورت گاڑی میں بیٹھی تھی اسے دیکھ کر میں نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ وہ بدر ہی تھی۔ اس نے اوڑھنی ایک طویل گھونگھٹ کی طرح سر پر لے رکھی تھی اور سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ ملازم نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا' میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں اے سی کی ٹھنڈک تھی' کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ لیلیٰ کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل بھی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی ہے۔ اس پر وہی لمبا تڑنگا ملازم تھا۔ میں نے لیلیٰ صاحبہ پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں جلال ہی کی گاڑی پر یہاں پہنچا ہوں' لہٰذا جلال کی گاڑی جو میں درختوں میں چھپا کر آیا تھا وہیں پر چھپی رہ گئی۔

گاڑی خاموشی سے چلتی رہی۔ گاڑی میں بدر کی دبی دبی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ لیلیٰ صاحبہ اسے مقامی زبان میں سمجھانے بجھانے لگیں۔ آخر میں وہ مجھ سے مخاطب ہو کر

انگریزی میں گویا ہوئیں "تم نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے رابطہ کر لیا۔ بہرحال اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ باقی جو کچھ ہو چکا اس کے لیے تو معذرت ہی کی جا سکتی ہے' حالانکہ معذرت کا لفظ اس کے لیے بہت چھوٹا ہے۔"

مبارک امین کی خدا ترس بیوی نے نہ صرف بدر کو اس کے گھر تک پہنچایا بلکہ گھر کے اندر بھی گئی اور بچوں کو پیار کیا۔ قریباً آدھ گھنٹا ان لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد وہ واپس گئی۔ اس عورت سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ زندگی میں بہت سے کردار ملتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تھوڑے عرصے کے لیے مل کر بہت عرصے تک یاد رہتے ہیں۔ لیڈی لارڈ مبارک امین کی دلیر بیوی بھی ان میں سے ایک تھی۔

داراب اور اس کے اہلِ خانہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔ ماں اور بچوں کا ملاپ بھی دیدنی تھا۔ معصوم ناصر ماں سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ بھی اسے چوم چوم کر بے حال ہو رہی تھی لیکن اس ساری خوشی کے پس منظر میں اندیشوں کے سائے بھی لرز رہے تھے۔ میں اور صفدر مسلسل یہ سوچ رہے تھے کہ یہ خوشی کہیں عارضی ثابت نہ ہو۔ اس دور دراز مقام پر کوئی قانون دکھائی دیتا تھا اور نہ انتظامیہ۔ جو کچھ بھی تھے مقامی بارسوخ لوگ ہی تھے۔ ایسے ماحول میں بھوکے ننگے غریب کی آبرو تو ہوا کے رخ پر رکھا ہوا چراغ ہی ہوتی ہے۔ بدر مسلسل رو رہی تھی۔ غزالہ اور کلثوم اسے دلاسا دیتی رہیں یہاں تک کہ اس کے آنسو تھم گئے۔

دوپہر ایک بجے کے قریب میں واپس جلال کے ڈیرے پر پہنچا۔ یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ زریں نے میری ہدایت کے مطابق چوکیدار اور اس کی بیوی کو بچے سمیت ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا۔ جلال کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے اور زریں گل رائفل گود میں رکھے اس کے قریب موجود تھا۔ اس دوران میں صرف دو افراد ڈیرے پر آئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک باہر کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے پھر واپس چلے گئے تھے۔ جلال کی گاڑی ڈیرے پر موجود نہیں تھی لہٰذا انہوں نے یہی سمجھ لیا ہوگا کہ وہ ڈیرے سے باہر ہے۔

میں نے زریں گل سے پوچھا "کوئی خاص بات؟"

"نہیں سب ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔ آپ بتائیں کچھ کامیابی ہوئی کہ نہیں؟"

"کچھ کیا' مکمل کامیابی ہوئی۔" میں نے زریں کو تفصیل بتائی۔ وہ خوش نظر آنے لگا۔

زریں گل کے بعد میں نے جلال کو بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ بدر کی واپسی سے اسے اطمینان ہوا ہے۔ جلال کا دم خم کافی حد تک ختم ہو چکا تھا' ویسے بھی میرا خیال یہی تھا کہ وہ کسی مہم جوئی کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔ اس کے چہرے کا برا حال تھا۔ باچھوں سے ابھی تک خون رس رہا تھا' آنکھ کی سوجن کریہہ چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میں نے اسے واش بیسن پر منہ ہاتھ دھونے اور مرہم وغیرہ لگانے کی اجازت دی۔ زریں گل نے اسے ناشتا کرا دیا تھا مگر دوپہر کا کھانا زریں نے اکیلے ہی تناول فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ فریج میں موجود بیشتر فروٹ پر بھی وہ اکیلے ہی اکیلے ہاتھ صاف کر گیا تھا۔ فریج میں جو کچھ بچا کھچا موجود تھا وہ میرے کہنے پر زریں نے جلال کے سامنے رکھ دیا۔ وہ جوس کے دو تین گلاس غٹاغٹ چڑھا گیا پھر ڈبل روٹی پر اسپل جام لگا کر کھانے لگا۔

اسی دوران میں ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کسی کار کی آواز سنائی دی۔ ہم چوکس ہو گئے' تاہم کار ڈیرے کی طرف آنے کے بجائے سیدھی نکل گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ پرانے ماڈل کی اس کھٹارا کار پر ایک ایمپلی فائر رکھا تھا اور اندر بیٹھا ہوا ایک شخص لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بار بار کوئی اعلان کر رہا تھا۔

زریں نے بتایا "یہ گاڑی صبح نو دس بجے بھی ادھر سے گزری تھی۔ لگتا ہے کہ یہاں بھی ہمارے ملک کی طرح کاروں اور تانگوں پر دانتوں کا منجن بیچنے کا رواج ہے۔"

اعلان افریقی زبان میں ہو رہا تھا۔ میں نے جلال سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ جلال نے جوس کا ایک بڑا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔۔۔ کہ مبارک امین کے فارم ہاؤس پر رکھے گئے کچھ افراد "تین بندے" مار کر فرار ہو گئے ہیں۔ یہ ان ہی کی تلاش ہو رہی ہے۔ مقامی لوگوں کو ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے اور اعلان کیا جا رہا ہے کہ ان کی گرفتاری میں مدد دینے والے کو نقد انعام دیا جائے گا۔"

میں نے گہری نظروں سے جلال کو دیکھا۔ اسے ابھی تک ہم دونوں پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ یا پھر یہ بات تھی کہ شبہ تو ہوا تھا مگر اس نے ہم پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اعلان میں یقیناً ہمارے انڈین یا پاکستانی ہونے کا ذکر کیا گیا ہوگا۔ حلیے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہوگی۔ ایسی صورت میں ہم پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جلال نے مجھ سے تعارف

حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے بھی وہی کچھ بتایا تھا جو اس سے پہلے مسز مبارک امین کو بتایا تھا۔ یعنی ہم جاپان کی ایک پاکستانی کمپنی کے ملازم ہیں اور اپنے کام کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں۔ جلال نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے میری بات کو جھوٹ سمجھ کر زیادہ اہمیت ہی نہ دی ہو اور اگر ایسی بات نہیں تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واقعی ہم پر شک کر رہا ہو۔ بہرحال اس موقع پر وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اعلان کرنے والی گاڑی آہستہ آہستہ ادھر سے دور ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اناؤنسمنٹ کی آواز بھی مدھم پڑ گئی۔ جلال کے ریوالور کی گولیاں نکال کر میں نے ریوالور اسے واپس کر دیا۔ زریں گل سے میں نے کہا کہ وہ چوکیدار اور اس کے بیوی بچے کو دیکھ آئے اور اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو فراہم کرے۔ زریں گل اپنی رائفل سنبھال کر باہر نکل گیا۔ جلال نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور چند گہرے کش لے کر بولا "میں مانتا ہوں کہ میں نے بدرو کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ اب میرے دل میں اس کے لیے خیر خواہی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بدرو کو واپس لانے میں میں نے تمہاری مدد کی ہے۔"

"ہاں یہ تو ماننے والی بات ہے۔" میں نے بھی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"پھر میری ایک اور بات بھی مان لو۔ میں تمہیں بالکل درست مشورہ دینے جا رہا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"داراب اور اس کے گھر والوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اب یہ جگہ چھوڑ دیں۔ میں فی الحال اپنے بارے میں کچھ بھی کہوں، لیکن انسان خطا کا پتلا ہے۔ بندے کی نیت موسموں کی طرح بدل جاتی ہے۔ کیا پتا کل کلاں میں پھر بدرو کے خلاف کچھ کر گزروں۔ اور اگر میں نہ کروں تو کوئی اور کر گزرے۔ کسی وقت مبارک کی نیت میں ہی فتور آ سکتا ہے۔ بھوک اور خوب صورتی ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو ایسا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ بدرو کے گھر والے میری مزاحمت تو پھر بھی کر لیتے تھے، مبارک جیسے مگرمچھ کی مزاحمت کیسے کریں گے۔ اس لیے ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ اب اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ ویسے بھی اب اس زمین کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ نہیں دھرا ہے یہاں۔ میں ان لوگوں کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ یہ زمین اور گھر خرید لوں مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنی خوشی سے ایسا چاہیں۔ وہ اچھی جگہ کی قیمت لگوا لیں۔ جو زیادہ سے زیادہ قیمت ملے گی، میں اس سے دس بیس ہزار زیادہ دے کر خرید لوں گا۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا ہوں۔"

اس موضوع پر جلال میرے ساتھ آدھ پون گھنٹا بات کرتا رہا۔ شروع میں مجھے شک تھا کہ شاید وہ جگہ خریدنے کے چکر میں ہے لیکن پھر محسوس ہوا کہ اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ خلوص موجود ہے۔ جلال کی برائی میں تو کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے ایک عورت کو حرص کی نظر سے دیکھا تھا اور اسے اپنے گھر میں لا کر اس سے جنسی تعلق قائم کیا تھا مگر اب اس کے کردار میں کچھ مثبت تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جلال کے اندر کہیں گہرائی میں اچھائی کی رمق موجود تھی۔ اس رمق کی ایک جھلک اس واقعے میں نظر آئی تھی جب وہ بدرو کے بچوں کے لیے کھلونے اور مٹھائی وغیرہ لے کر داراب کے پاس پہنچا تھا۔ جلال جیسے لوگوں کی بدکرداری میں یہ "رمق" ایک چنگاری جیسی ہوتی ہے، جو بجھ بھی سکتی ہے اور بھڑک کر شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

میں اور زریں گل شام تک جلال کے پاس رہے۔ ہمارے درمیان ایک بات طے ہو گئی۔ بہ الفاظ دیگر ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس معاہدے کی رو سے میں نے جلال کو یقین دلایا کہ کل رات سے جو کچھ اس ڈیرے پر ہوا ہے وہ صرف ہمارے اور جلال کے درمیان رہے گا۔ جلال کے ساتھ جو مار پٹائی ہوئی ہے اور جس خفت و بے عزتی کا سامنا اسے کرنا پڑا ہے وہ بالکل راز رہے گی۔ اس کے علاوہ ہم بدرو کے اغوا کے سلسلے میں بھی مکمل خاموشی اختیار کریں گے۔ دوسری طرف جلال نے یقین دلایا کہ وہ ہم سے رہائی پانے کے بعد کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کرے گا۔ نہ ہی کسی طور پر داراب اور اس کے اہل خانہ کو تنگ کیا جائے گا۔ جلال جیسے لوگوں کے وعدوں پر یقین کرنا آسان تو نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی مشکل کام بھی کرنا پڑتے ہیں۔

میری ہدایت پر زریں گل نے چوکیدار اور اس کی بیوی کے ہاتھ پاؤں بھی کھول دیے اور چوکیدار کو اس کی خالی رائفل واپس کر دی۔ رات نو بجے کے لگ بھگ ہم جلال کے ٹھکانے سے واپس داراب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے جلال کی گاڑی کی چابی اسے واپس کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ "اٹولی" قصبے کے قریب گاڑی کہاں کھڑی ہے۔

واپسی کا سفر ہم نے اندھیرے میں ہی طے کیا۔ ہم عام راستوں سے ہٹ کر چلتے رہے۔ یوں کافی زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑا۔ وقت بھی خاصا صرف ہوا مگر یہ محفوظ سفر تھا۔ میرا ذہن مسلسل مصروف تھا۔ یہ بات بار بار ذہن میں آ رہی تھی کہ اب ہمارا جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ آثار

سے صاف ظاہر تھا کہ ہمیں تلاش کرنے والوں نے ہمت نہیں ہاری اور مسلسل ہمارا کھوج لگا رہے ہیں۔ اب صورت حال ہمارے لیے مزید خراب ہو گئی تھی۔ کئی افراد ہمیں دیکھ چکے تھے۔ ان میں جلال، اس کا چوکیدار، مسز مبارک امین اور اس کے دو تین نوکر شامل تھے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ کہیں ہم ہی تو "اشتہاری ملزمان" نہیں ہیں۔ ان میں سے جلال کے بارے میں تو مجھے بار بار شک ہو رہا تھا کہ وہ ہماری اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔

زریں گل بولا "ام کو لگتا ہے کہ حالات گڑبڑ ہوتا جا رہا ہے۔"

"پھر کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔

"امارا مطلب ہے کہ ام کو زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ام داراب کے گھر پہنچیں تو وہاں پہلے ہی گنجا مبارک یا اس کا کوئی کارندہ موجود ہو۔ وہ ام کو دیکھتے ہی پہچان لے اور مصیبت کھڑا ہو جائے۔ بالکل جس طرح سدھیر بھائی کی فلم "خونِ ناحق" میں ہوا تھا۔"

"نہیں یہاں ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے زریں کو تسلی دی "میرا نہیں خیال کہ مبارک یا اس کے کارندے اب اتنی جلدی داراب کے گھر کا رخ کریں گے۔ مبارک کی بیوی لیلیٰ کا کافی رعب داب ہے شوہر پر۔ وہ اگر بدرو کو وہاں سے لے کر آئی ہے تو اس کا بچاؤ بھی کرے گی۔"

"ویسے آپ کا یہ بات امارے دل کو لگا ہے کہ داراب اور اس کے گھر والوں کو اب یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

"ہم تو صرف رائے دے سکتے ہیں اور وہ ہم دے دیں گے۔ باقی یہاں سے جانا یا نہ جانا ان لوگوں کا اپنا معاملہ ہے۔ ہم یہ معاملہ طے کرنے کی پوزیشن میں نہیں اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہے۔"

زریں بولا "استاد صیب! وہ کالا لنگور جوزف تو فرماتا تھا کہ مائیکل امارے انتظار میں زیادہ دیر یہاں نہیں رکے گا۔ مگر جس طرح یہ لوگ اعلان کرتا پھر رہا ہے اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مائیکل اور اس کا جہاز ابھی تک یہیں ہیں۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔" میں نے کہا "عین ممکن ہے کہ مائیکل واپس جا چکا ہو اور جاتے جاتے مبارک کو ہمیں ڈھونڈنے پر لگا گیا ہو۔"

گیارہ بجے ہم داراب کے گھر پہنچ گئے۔ درختوں سے گھرے ہوئے اس گھر میں فقط دو لیمپس کی روشنی تھی۔ بوڑھا داراب گھر سے باہر ہی کھڑا تھا اور ایندھن کے لیے خشک لکڑی کلہاڑی سے پھاڑ رہا تھا۔ بہو کی واپسی پر وہ خوشی سے نہال نظر آتا تھا۔ جیسے چند ہی گھنٹوں میں اس کی بیماری اور کمزوری توانائی میں بدل گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیز تیز بولنے لگا مگر اس کی افریقی ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ زریں بس خوش اخلاقی کے طور پر سر ہلاتا جا رہا تھا مگر زریں کی سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا اس نے گلے سے وہی مرغے جیسی بلند آواز نکالی جو ہم نے کل راستے میں ایک راہ گیر سے سنی تھی۔ اس آواز کا مطلب ہمیں یہی سمجھ میں آیا تھا کہ یہ خیر سگالی کے طور پر نکالی جاتی ہے۔ آواز سن کر بوڑھا داراب مسکرانے لگا۔ زریں گل نے خوش ہو کر پھر آواز نکالی۔ داراب سر ہلانے لگا اور تیز تیز کچھ بولنے لگا۔ مجھے شک گزرا کہ آواز کا مطلب وہ نہیں جو زریں گل سمجھ رہا ہے۔ اسی دوران میں میری نگاہ غزالہ پر پڑ گئی۔ وہ گھر سے باہر ہی موجود تھی۔ تابی کو کندھے سے لگائے وہ درختوں میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میری طرف چلی آئی "السلام علیکم۔" وہ مسکرائی "کیسے ہیں آپ؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ اور تم؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں، لیکن تابی کا حال آپ تابی ہی سے پوچھیے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"صبح سے کئی بار آپ کو یاد کر چکا ہے۔ دوپہر کو تو مجھ سے لڑنے ہی لگا تھا۔ یہ دیکھیے میرے گلے پر ناخن مارا ہے۔"

غزالہ نے روشنی کی جانب کر کے اپنی گردن دکھائی۔ میں نے کہا "چلو کسی نے تو یاد کیا۔"

غزالہ کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا تابی غزالہ کے کندھے سے لگا لگا سو گیا تھا۔ میں نے تابی کو جگانا مناسب نہیں سمجھا مگر سونا تابی کی قسمت میں نہیں تھا، بلکہ ہم میں سے کسی کی قسمت میں نہیں تھا۔ یہ جاگنے کی رات تھی۔ اس رات میں خون اور آگ کی آمیزش تھی۔ میں تابی کے معصوم چہرے کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک تڑتڑاہٹ کی لرزہ خیز آواز سنائی دی۔ خودکار رائفل کا پورا برسٹ ہمارے قدموں میں زمین پر لگا۔ خشک گھاس اور مٹی ہمارے سروں تک اچھلی۔ غزالہ کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی درختوں کے جھنڈ سے کڑک دار آواز آئی "خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔"

میرا ہاتھ بے اختیار اپنے کندھے سے جھولتی رائفل کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کر سکتا قریبی درختوں سے پانچ چھ افراد کمانڈوز کی طرح جھپٹے اور ہم سے ٹکرائے۔ میں زمین پر گرا۔ میں نے محسوس کیا کہ رائفل میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ زریں گل بھی دھکے سے گرا تھا اور لڑھک کر نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔ اسی دوران میں میں نے دیکھا کہ دس بارہ افراد جنہوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے چارج کرتے ہوئے گھر کے پھاٹک کی طرف گئے۔ زریں گل

لڑھک کر پھاٹک کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا "زریں! پھاٹک بند کردو۔"

غالباً میرے کہنے سے پہلے ہی زریں ایکشن کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ میں واقعتاً حیران رہ گیا۔ وہ جست لگا کر پھاٹک میں داخل ہوا اور بے انتہا تیزی سے پھاٹک بند کردیا۔ مسلح افراد راستہ مسدود دیکھ کر چار دیواری کی طرف بڑھے تاکہ اندر کود جائیں۔ یہی وقت تھا جب اندر سے بھی زوردار فائرنگ شروع ہوگئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ صفدر تھا جس نے بروقت خودکار رائفل کا منہ کھول کر حملہ آوروں کو اندر گھسنے سے روک دیا تھا۔

تین چار افراد مجھ سے لپٹے ہوئے تھے اور درختوں کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ وہ ایک بات سے بے خبر تھے۔ وہ ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا میرے چغے کے نیچے موجود تھا جو میں نے پرل فارم ہاؤس میں حبشی محافظ سے چھینا تھا۔ موقع ملتے ہی میں نے چھرا نکالا اور بے دریغ ایک شخص کی توند میں گھونپ دیا۔ حملہ آوروں میں کھلبلی سی نظر آئی۔ میں نے اپنے سامنے والے شخص کی رائفل پر مضبوط ہاتھ ڈالا اور اس کے سینے پر ٹانگ رسید کرکے اسے نشیب میں پھینک دیا۔ باقی دو افراد مجھے چھوڑ کر اور بدحواس ہو کر بھاگے۔ غزالہ تابی سمیت ایک درخت کی اوٹ میں سمٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوڑتا ہوا ایک کچی دیوار کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ دیوار سے دو گز کے فاصلے پر واحد کا مریل گھوڑا گولیوں سے چھلنی ہو کر مرا پڑا تھا۔ دیوار کی اوٹ بڑی محفوظ تھی۔ یہاں مجھے بوڑھا داراب بھی دبکا ہوا نظر آیا۔ کلہاڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے رائفل سیدھی کی اور دیوار کی اوٹ سے حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ شروع کردی۔ مکان کے اندر سے صفدر اور زریں گل بھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہونے کے باوجود دیوار پھاندنے کے بجائے درختوں میں پوزیشن لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ میں نے حملہ آوروں میں سے ایک دو کو پہچان لیا تھا۔ وہ مبارک امین کے آدمی ہی تھے۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ ذہن میں بار بار جلال کی تصویر ابھر رہی تھی۔ اس کے سوا ہماری مخبری کرنے والا اور کون ہوسکتا تھا۔ حالات گواہی دے رہے تھے کہ میرے اندیشے درست تھے۔ جلال نہ صرف ہماری اصلیت سے آگاہ ہوچکا تھا بلکہ ہمیں پکڑوانے کا پختہ ارادہ بھی رکھتا تھا۔ ہم سے رہائی پاتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور مبارک امین کے ساتھ مل کر ہمارا گھیراؤ کرلیا تھا۔ اس سوچ کے خلاف ذہن میں ایک سوال بھی ابھر رہے تھے مگر ان کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی۔

اچانک میرے پہلو میں غزالہ چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی انگلیاں میرے بازو کے گوشت میں دھنس گئی تھیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ منظر ایسا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بوڑھا داراب میری پشت پر کھڑا تھا۔ اس نے چوڑے پھل کی کلہاڑی اپنے دونوں ہاتھوں میں بلند کر رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر جنون کی سی کیفیت تھی۔ وہ پوری طاقت سے میرے رائفل والے ہاتھ کو نشانہ بنا رہا تھا۔

میرے دائیں ہاتھ میں رائفل تھی۔ بائیں ہاتھ سے میں نے بوڑھے داراب کا وار روکا۔ کلہاڑی کا دستہ میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ٹانگ چلائی اور بوڑھا لڑھک کر دور جاگرا۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ گرتے ساتھ ہی بوڑھا اٹھا اور جنونی انداز میں پھر مجھ پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک اینٹ تھی۔ میں بدستور رائفل تھامے اپنی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کھڑے ہونے میں گولی لگ جانے کا رسک ہے۔ بوڑھا تیر کی طرح میری طرف آیا مگر ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ غزالہ اس سے ٹکرائی۔ وہ غزالہ کا دھکا کھا کر لڑکھڑایا اور کچی دیوار کے اوپر سے ہو کر کھلی جگہ پر جاگرا۔ تین اطراف سے اندھا دھند گولیاں برس رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھا داراب گولیوں کی زد میں آگیا۔ اس کے جسم کو دو تین جھٹکے لگے اور وہ اٹھنے کی کوشش میں دھڑام سے اوندھے منہ گرا۔ یقینی بات تھی کہ اسے گولیاں لگی ہیں۔

ایک طرف سے اس کی عمر رسیدہ بیوی چیختی ہوئی آئی اور اس کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ سخت خطرے میں تھی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اندھا دھند چلتی گولیوں میں سے ایک گولی پر اس سیاہ فام بڑھیا کا نام بھی تھا۔ گولی اس کے سر میں لگی اور بھیجا چیر کر کان کی طرف نکل گئی۔ ناتواں بڑھیا بے دم ہو کر اپنے شوہر کے قریب ہی گر گئی۔

مبارک امین کے مسلح کارندوں نے درختوں کی اوٹ لے رکھی تھی اور دو اطراف سے تابڑ توڑ فائرنگ کر رہے تھے۔ مکان کے اندر سے مسلسل جوابی فائر ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ زریں یا صفدر میں سے کوئی ایک مکان کی چھت پر چلا گیا ہے۔ چھت پر سے وہ زیادہ مؤثر طریقے سے حملہ آوروں کو جواب دے رہا تھا۔ دوسری طرف میں کچی دیوار کی اوٹ میں تھا اور مکان کے بیرونی پھاٹک کا دفاع کر رہا تھا۔

میری کوشش تھی کہ کوئی حملہ آور پھاٹک کے قریب بھی نہ پھڑک سکے۔ قریباً پانچ منٹ کی مسلسل فائرنگ کے بعد یہ سلسلہ تھم گیا۔ شاید حملہ آور کسی اور حکمتِ عملی پر غور کرنے لگے تھے۔ بہرحال وہ اپنی پوزیشنوں پر بدستور ڈٹے ہوئے تھے۔ صفدر، زریں اور میں بھی اپنی پوزیشنوں پر موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ فائرنگ دوبارہ شروع ہوجاتی، اچانک کچھ فاصلے پر پولیس کی گاڑیوں کے مخصوص سائرن سنائی دیے۔ گاڑیوں کی تعداد یقیناً تین چار سے کم نہیں تھی۔ وہ اسی رُخ پر آرہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے پیچھے ہلچل سی محسوس ہوئی، پھر دو جیپوں کے انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ حملہ آور راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔

ایک منٹ کے اندر اندر مبارک امین اور اس کے کارندے اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر فرار ہوگئے۔ صفدر اور زریں گل مکان کے پھاٹک میں سے باہر نکلے۔ میں اور غزالہ بھی دیوار کی اوٹ سے نکل آئے۔ داراب اور اس کی بیوی ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ جس شخص کی توند میں، میں نے چھرا گھونپا تھا وہ بھی راہیِ عدم ہوچکا تھا۔ صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! ہم کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ پولیس اسی طرف آرہی ہے۔"

میں نے زریں سے کہا کہ وہ کلثوم کو اندر سے لے آئے۔ زریں اندرونی حصے کی طرف لپکا۔ اسی دوران میں بوڑھے داراب کی بہو "بدر" اور بیٹی رتابہ باہر نکل آئیں۔ انہوں نے بوڑھے بوڑھی کی لاشیں دیکھیں تو بلند آواز میں واویلا کرنے لگیں۔ رتابہ باپ کی لاش سے لپٹ لپٹ جارہی تھی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس کی گاڑیاں ہماری طرف آنے کے بجائے آگے نکل گئی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم پولیس کے فوری خطرے سے محفوظ ہوگئے ہیں۔ پولیس کی گاڑیاں آگے کیوں نکل گئی تھیں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی تھی کہ وہ اس طرف آہی نہیں رہی تھیں۔ (مبارک امین کے ساتھی صرف گاڑیوں کی آوازیں سن کر خوف زدہ ہوگئے تھے) دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ پولیس کی گاڑیوں نے مبارک امین اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہوتے دیکھ لیا تھا اور ان کے پیچھے لگ گئی تھیں۔ بہرطور یہ صورتِ حال ہمارے لیے بڑی موزوں تھی۔ ہم بہ آسانی یہاں سے رفو چکر ہوسکتے تھے۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ بوڑھے داراب نے مجھ پر حملہ کیوں کیا۔ ہم نے تو اس کی پریشانی کو اپنی پریشانی بنا رکھا تھا۔ اس کے روتے بلکتے پوتے کو اس کی ماں سے ملانے کے لیے اپنی جان مصیبت میں ڈالی تھی۔ وہ ہمارا احسان مند نہ ہوتا، مگر یوں پیٹھ پیچھے وار تو نہ کرتا۔

اچھوت

گھر کے اندر ایک واٹر کولر موجود تھا۔ میں نے غزالہ سے کہا کہ وہ واٹر کولر میں پانی بھر کر لے آئے، کیونکہ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے اور راستے میں پانی کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

غزالہ آگے بڑھی تو کلثوم نے زبردستی اسے روک دیا "نہیں۔۔۔ ام خود پانی لائے گا۔" اس نے کہا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

غزالہ نے رحم آمیز نظروں سے بدر اور رتابہ کی طرف دیکھا۔ اب وہ مکمل طور پر بے آسرا تھیں۔ یہاں ان کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ جلال، مبارک امین، پولیس، سب ان کو آڑے ہاتھوں لے سکتے تھے۔ غزالہ نے مجھ سے کہا "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی یہاں سے نکل جائیں۔"

صفدر نے غزالہ کی تائید کی "میرا بھی یہی خیال ہے، یہ تنہا عورتیں یہاں بری طرح پھنس جائیں گی۔"

بدر بے دم سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ رونے کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنا ٹخنا بھی دبا رہی تھی۔ چہرے پر سخت تکلیف کے آثار تھے۔ غزالہ نے بتایا کہ فائرنگ شروع ہونے کے بعد بدر خوف زدہ ہو کر بچوں کی طرف بھاگی تھی اور پاؤں مڑ جانے سے گر گئی تھی۔ غزالہ نے بتایا کہ اس کے پاؤں میں شدید موچ آئی ہے۔

اسی دوران میں بدر کے بچے بھی دوڑے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ دادا دادی کی لاشیں دیکھ کر بڑے دونوں بچے رونے لگے۔ چھوٹے بچے اس وجہ سے رونے لگے کہ ان کی ماں اور "پھوپی" رو رہی تھیں۔ اچانک مجھے جوزف کا خیال آیا۔ اس کے ہاتھ بدستور زنجیر میں بندھے ہوئے تھے اور اسے ہم نے کمرے میں مقفل کر رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے کا مقفل دروازہ کھولا۔ سامنے جوزف موجود تھا مگر اس حالت میں کہ میں چونک کر رہ گیا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ ایک گولی کھڑکی کا تختہ توڑ کر اندر آئی تھی اور جوزف کے پہلو میں لگی

تھی۔ اس کے قریب ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ جوزف کی آنکھیں بند تھیں اور وہ غشی کی سی حالت میں ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجوڑا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اندھادھند فائرنگ میں معلوم نہیں کس کی گولی اسے چھید گئی تھی۔

میں صفدر کو آواز دینا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں صفدر نے مجھے آواز دے دی۔ وہ مجھے باہر بلا رہا تھا۔ میں باہر آیا تو صفدر نے کیلے کے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "وہاں ایک گاڑی موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔"

میں صفدر کے ساتھ کیلوں کے جھنڈ میں پہنچا' وہاں نشیب میں واقعی ایک گاڑی موجود تھی۔ ہم اس سے پہلے ان درختوں کی طرف نہیں آئے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ گاڑی کب سے یہاں کھڑی تھی۔ اس کا ڈیزائن جیپ سے ملتا جلتا تھا لیکن یہ جیپ نہیں تھی اور نہ ہی ویگن تھی' یہ ان دونوں کے درمیان ...... کی کوئی شے تھی۔ گاڑی کا اگلا ایک پہیہ کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اسے ریس دے کر کیچڑ سے نکالنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی تھی۔ گاڑی لنگڑوی ٹائپ لگتی تھی۔ ہمیں یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ کس کی گاڑی ہے' نہ ہی ہمیں کوئی بتا سکتا تھا۔ بدر اور رتابہ صرف افریقی بول سکتی تھیں اور ہمارے مترجم جوزف صاحب پسلی میں گولی کھا کر جاں بلب پڑے تھے۔

گاڑی کے اگنیشن میں چابی موجود نہیں تھی۔ صفدر نے اس کے تار جوڑے اور دو تین منٹ کے اندر اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گہرے اندھیرے میں یہ کام ٹارچ کے ذریعے انجام پایا۔ زریں گل اور کلثوم بھی موقع پر پہنچ چکے تھے' ہم سب نے مل کر زور لگایا تو یہ جیپ نما گاڑی گڑھے میں سے نکل آئی۔ درحقیقت وہ زیادہ بری طرح پھنسی بھی نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے نکالنے والوں نے بے دلی سے کوشش کی ہے۔ ڈیش بورڈ پر آئل کی سوئی بتا رہی تھی کہ گاڑی میں وافر پیٹرول موجود ہے۔ میں نے صفدر اور زریں سے مشورہ کیا' فیصلہ ہوا کہ اس گاڑی کو یہاں سے فرار ہونے کے لیے استعمال کیا جائے۔

ہم زخمی جوزف کو اٹھا کر گاڑی میں لے آئے۔ گاڑی میں کافی گنجائش موجود تھی۔ ہم سب کے علاوہ رتابہ اور بدر بھی بچوں سمیت گاڑی میں گھس گئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ صفدر نے سنبھال رکھی تھی۔ میری اور زریں کی گود میں بھری ہوئی رائفلیں موجود تھیں۔ زخمی جوزف کے زخم پر پٹی باندھ کر اسے ہم نے دو نشستوں کے درمیان خالی جگہ پر لٹا دیا تھا۔ اس کی ہتھکڑی بھی کھول دی گئی تھی۔

"کس طرف جانا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"اگر میری خواہش پوچھتے ہو تو میں سیدھا لاہور کی طرف جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

صفدر کے سوا کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ کچھ دیر قبل ہونے والے خون ریز ہنگامے نے سب کو مضمحل کر رکھا تھا۔ غزالہ تو خاص طور سے بالکل گم صم تھی۔ بوڑھا داراب غزالہ کا دھکا کھا کر کھلی جگہ پر گرا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے گولیوں کا نشانہ بنا تھا' اس کے بعد داراب کی بیوی کو گولی لگنے کا واقعہ بھی ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر پیش آیا تھا۔

اچانک ہم سب چونک گئے۔ ہمارے بالکل قریب جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر ایک تنومند سیاہ فام عورت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس کا قد چھ فٹ سے شاید ہی کچھ کم ہو۔ آنکھیں روشن تھیں اور چہرے سے اس کی سخت جانی کا اظہار ہوتا تھا۔ صفدر نے رائفل اس کی طرف سیدھی کر لی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی اور ہمیں دھیرج رکھنے کو کہا پھر وہ تیز قدموں سے ہمارے قریب چلی آئی۔ اس کے گلے میں صلیب چمک رہی تھی وہ رازدارانہ لہجے میں بولی "میرا نام میڈم جین ہے۔ تم مجھے بدر کا پڑوسی سمجھ سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت بدر اور اس کے بچوں کے لیے میں بہترین پناہ گاہ فراہم کر سکتی ہوں۔ یہاں سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر جنگل میں میرا چھوٹا بھائی رہتا ہے۔ میں بدر اور اس کے بچوں کو وہاں پہنچا دیتی ہوں۔ یہ چند دن وہاں رہیں' پھر ہم انہیں گرجے کی گاڑی میں شہر پہنچا دیں گے۔ خدا نے چاہا تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

میں نے بدر اور رتابہ کی طرف دیکھا۔ بدر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے وہ نہ صرف اس عورت کو جانتی ہے بلکہ اس پر کلی اعتماد بھی رکھتی ہے۔ شاید اس کے بس میں ہوتا تو وہ فوراً گاڑی سے اتر کر میڈم جین کے پاس جا کھڑی ہوتی۔

میں نے کہا "میڈم دیکھ لو۔ یہ بہت ذمے داری کا کام ہے۔ یہاں حالات بہت سنگین ہیں۔"

"میں سارے حالات جان چکی ہوں۔" میڈم جین نے تیزی سے میری بات کاٹی "بس تم جلدی سے ان لوگوں کو نیچے اتار دو' میں کرائسٹ کی قسم کھاتی ہوں۔ اپنی جان دے دوں گی مگر ان بچوں پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

میڈم جین کے لہجے میں سچائی اور خلوص کا دریا بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف جا کر صفدر سے مشورہ کیا۔ ہم بدر اور رتابہ کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے مگر ان کے تاثرات گواہ

تھے کہ وہ میڈم جین پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی ہیں۔

مشورے کے بعد میں نے میڈم جین سے کہا "آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے بھائی کا ٹھکانا یہاں سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ جائیں ہم آپ کو وہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔" میڈم جین نے کہا "جنگل بہت گھنا ہے۔ وہاں گاڑی تو کیا سائیکل بھی نہیں جا سکتی۔ اگر آپ میں سے کوئی ساتھ جانا چاہتا ہے تو اسے بھی پیدل جانا ہو گا۔"

"مگر بدر کے پاؤں میں چوٹ ہے' وہ تو چند قدم بھی نہیں چل سکے گی۔"

میڈم جین کے چہرے پر تشویش ابھر آئی۔ اس نے مقامی زبان میں بدر سے چند باتیں کیں پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "بدر کہہ رہی ہے کہ کوئی بات نہیں وہ سہارا لے کر چل لے گی۔"

ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی رتابہ اور بچے گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ بدر بھی غزالہ اور کلثوم کا سہارا لیتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی۔ میڈم جین ان لوگوں کی حفاظت کے سلسلے میں بہت پُراعتماد نظر آ رہی تھی۔ ہمیں یہی مناسب نظر آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو اپنا فیصلہ خود کرنے دیں۔ گاڑی سے نیچے اتر کر بدر نے رتابہ کے سہارے چند قدم چلنے کی کوشش کی تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ رنگ بالکل پھیکا پڑ گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ چل نہیں سکے گی۔ اسی دوران میں دائیں جانب نشیب سے کسی جیپ کے انجن کا شور سنائی دینے لگا۔ ہم سب کے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ میڈم جین جیسے کسی دوراہے پر کھڑی تھی۔ وہ شدید تذبذب کے عالم میں کبھی بدر کو دیکھتی تھی اور کبھی رتابہ اور بچوں کی طرف۔ اس کی معاملہ فہم نگاہوں نے جان لیا تھا کہ بدر کو پاپیادہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ چند لمحے شدید کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے مقامی زبان میں بدر سے کچھ کہا پھر بدر کا سب سے چھوٹا بچہ رتابہ کی گود سے لے کر بدر کی گود میں دے دیا اور بدر سے کہا کہ وہ واپس گاڑی میں سوار ہو جائے۔ بدر کے پاس بھی اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ میرے اور صفدر کے سہارے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔ وہ رو رہی تھی' میڈم جین نے اس سے تسلی بخش کلمات کہے پھر رتابہ اور بچوں کو لے کر تیزی سے درختوں میں گم ہو گئی۔ نشیب سے آنے والی جیپ کی آواز اب مزید قریب پہنچ گئی تھی۔ اب یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ شاید وہ ایک سے زیادہ گاڑیاں ہیں۔ ہم حتی الامکان تیزی سے گاڑی میں سوار ہوئے اور مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

دو تین فرلانگ آگے جا کر ہمیں کچھ تسلی ہوئی۔ گاڑی صفدر چلا رہا تھا۔ وہ گاڑی کی طاقت اور اچھی کنڈیشن سے متاثر نظر آتا تھا۔

عقبی نشست سے غزالہ نے کہا "چلے تو جا رہے ہیں' لیکن جانا کدھر ہے؟"

صفدر بولا "جتنی گرمی ہے اور جس قدر پیاس لگ رہی ہے' جی تو چاہتا ہے کہ اس جیپ کو سیدھا پاکستان لے جا کر روکوں' اور وہ بھی مری میں۔ سیدھا سیسل ہوٹل میں گھس جاؤں اور آٹھ دس کولڈ ڈرنکس ایک ساتھ ڈکار لوں۔"

میں نے کہا "خوشی کی بات ہے کہ ایسے سنگین حالات میں بھی تمہاری رگِ ظرافت بار بار پھڑک رہی ہے۔"

"ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں بہت سخت دل قسم کا لوگ ہے۔" عقب سے زریں نے تبصرہ کیا۔

"کون دونوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ صفدر صیب اور ہمارا ہاف بیٹر کلثوم!"

"ہاف بیٹر نہیں ہاف بیٹر۔" میں نے تصحیح کی۔

زریں بولا "اب آپ دیکھیں پچھلے چند دنوں میں کیسا کیسا سنگین واقعہ ہوا' ایرانی جہاز کا ٹکڑا ٹکڑا ہوا۔ مونے مارکوس کو صرف ایک انٹرویو میں پھانسی دیا گیا۔ اس کی بیوی کو آدم خوروں نے "پرل فارم" میں گائے کے مافق ذبح فرمایا' اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے داراب اور اس کی بیوی کا تڑپتا پھڑکتا لاش دیکھا ہے لیکن ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہے۔ ایک دم پتھر کا دل ہے' ان دونوں کا۔"

صفدر نے کہا "چلو اب تو سائنس ترقی کر گئی ہے۔ دل بدلے جا سکتے ہیں۔ ہاں کچھ خرچہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن اگر ہمیں دفینے کی رقم مل گئی تو خرچے کی کیا پروا؟ تم کلثوم کا دل تبدیل کروا لینا۔"

چند فقروں کے تبادلے کے بعد ہم سب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا "یار صفدر! یہ سوال واقعی اہم ہے کہ ہمیں جانا کدھر ہے۔"

صفدر نے کہا "میری رائے تو یہ ہے کہ ہم پختہ راستے پر سفر کرنے کے بجائے انہی کچے پکے راستوں پر آگے بڑھیں۔ یہاں ہمارے لیے خطرات کم ہوں گے۔"

"ہاں یہ جیپ ٹائپ گاڑی ہے۔ ٹائر وغیرہ بھی کافی مضبوط ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"لیکن رخ کون سا ہونا چاہیے؟"

"رخ کوئی بھی ہو' اصل بات یہ ہے کہ جائے واردات سے ہمارا فاصلہ بڑھنا چاہیے۔"

زریں گل گہری سوچ میں تھا۔ بولا "استاد صیب! اس بڈھے داراب نے یہ کیا کیا ہے۔"

"کیا کیا ہے؟"

"ام نے اوپر کی منزل سے سب کچھ اپنی آنکھوں سے مغالطہ (ملاحظہ) کیا ہے اس نے آپ پر کلہاڑی سے حملہ فرمایا تھا۔"

"مغالطے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھیں' ام بالکل سنجیدہ ہے۔ اماری سمجھ میں نہیں آرہا یہ سب کیوں ہو گیا' وہ بڈھا کوئی چال چل رہا تھا۔"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس کی وضاحت کون کرے گا' یہ دونوں عورتیں ہمارے لیے گونگی ہیں اور ہم بھی ان کے لیے گونگے ہیں۔"

صفدر بولا "ہمیں پکڑوانے کے لیے انعام کا اعلان کیا جارہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بڈھا یا اس کی بیوی انعام کے لالچ میں آگئے ہوں۔"

"بھوک ہوتی تو بڑی ظالم چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہو گئی ہو۔" میں نے کہا۔

اونچے نیچے راستے پر ہمارا سفر جاری رہا۔ کہیں سڑک نیم پختہ تھی کہیں بالکل کچا راستہ تھا۔ بدر مسلسل سسکیاں لے رہی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ بدر نے ہمارے ساتھ روانہ ہونے میں کوئی پس و پیش نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں بدستور اپنا خیر خواہ سمجھ رہی ہے۔ راستے میں ایک دو جگہ ہمیں چاول کے کھیتوں میں ٹریکٹر چلتے نظر آئے یا پھر اکا دکا گاڑی دکھائی دی۔ رات کے اس پہر یہ ویران علاقہ اور بھی ویران نظر آرہا تھا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کدھر جارہے ہیں اور پھر وہ بات ہو گئی جس کا ہمیں سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس وقت ہمیں کھیتوں کھلیانوں کے درمیان سفر کرتے تقریباً ایک گھنٹا ہوا تھا۔ اندازاً ہم نے بیس میل کا سفر کیا ہوگا' یا شاید کچھ زیادہ ہی ہو۔ اچانک ایک موڑ پر ہمیں ٹارچوں کی روشنی دکھائی دی۔ اس کے علاوہ "اسٹاپ" کا سائن بورڈ بھی لہراتا نظر آیا۔ یہ پولیس کا ناکا تھا۔ ان کی وردیاں دور ہی سے چمکنے لگی تھیں۔ کچھ اہلکاروں نے "ہیٹ" کی طرز کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ مسلح تھے ہمیں گاڑی روکنی پڑی۔ گاڑی رکنے سے پہلے پہلے میں نے اور زرین گل نے اپنی رائفلیں چھپالی تھیں۔ تاہم وہ اتنی دور بھی نہیں تھیں کہ ہم بروقت استعمال نہ کرسکتے۔

گاڑی رکتے ہی ایک ہٹا کٹا سیاہ فام اہلکار آگے آیا۔ ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی پھینکنے کے بعد وہ تیز تیز افریقی بولنے لگا۔ صفدر نے کہا "کیا آپ انگلش سمجھ سکتے ہیں؟"

ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور شکستہ انگریزی میں بولا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

صفدر نے کہا "یہی بات میں کہہ رہا ہوں کہ کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں روکا ہے؟"

"کون ہو۔ کہاں سے آرہے ہو۔ کاغذ دکھاؤ۔" اس نے ایک ہی سانس میں تین سوال داغ دیے۔

میں راستے میں گاڑی کے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر وہ مقفل تھا اور کھل نہیں سکا تھا۔ گاڑی کے کاغذات اگر تھے تو یقیناً اسی میں تھے۔ بہرحال کاغذ ہوتے بھی تو ہمارے لیے ان پولیس والوں کو مطمئن کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے پولیس اہلکار کو بتایا کہ کاغذات ڈیش بورڈ میں ہیں اور چابی مل نہیں رہی۔ اس نے سخت لہجے میں صفدر کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔

صفدر نے روایتی انداز میں منت سماجت کا لہجہ اختیار کیا اور پولیس اہلکار سے کہا کہ ہمیں ایک بزرگ کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے پہنچنا ہے' ہمارے ساتھ خواتین بھی ہیں لہٰذا ہمیں جانے دیا جائے۔

مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ صفدر نے آخری کوشش کے طور پر اس کی مٹھی میں چند نوٹ دینے کی کوشش بھی کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ رشوت کو قبول کرنے سے انکار کے بعد پولیس اہلکاروں کا رویہ مزید سخت ہو گیا۔ انہوں نے صفدر کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے اہلکار نے میری طرف کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ ڈال دیا۔ ہم خود بھی پولیس تک پہنچنا چاہ رہے تھے اور ان سے مدد طلب کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر اب تین افراد کے قتل کے بعد صورتِ حال یکسر بدل گئی تھی۔ پولیس تک پہنچنا خود کو سخت مصیبت میں ڈالنا تھا۔ دوسری طرف قانون کی مدد طلب کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ غالباً صفدر کا خیال بھی یہی تھا کہ پولیس والوں سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کی جائے' اور ان سے کہا جائے کہ ہم ان کے کسی اعلیٰ افسر سے ملنا چاہتے ہیں۔

ابھی میں یہ بات کہنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں میں نے دیکھا' بھاری بھرکم سیاہ موٹر سائیکل پر ایک ویسا ہی سیاہ اور بھاری بھرکم انسپکٹر براجمان تھا۔ اسے دیکھ کر نجانے کیوں یوگنڈا کے سربراہ عیدی امین کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی۔ انسپکٹر کے ہولسٹر میں سرکاری ریوالور تھا۔ وہ بڑی شان سے چلتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف آیا۔ اس کے ماتحتوں نے مقامی زبان میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ماتحت یقیناً پُرجوش تھے کہ ایک اچھا شکار ہاتھ آگیا ہے۔ انسپکٹر ان کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ مجھ سے ملی۔ اس نے بڑی صفائی سے مجھے آنکھ ماردی۔ اس کا یہ اشارہ حیران کن تھا۔ نجانے اس نے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

کھڑکی میں منہ ڈال کر انسپکٹر نے صفدر سے کہا "تم لوگوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"کہاں؟" صفدر نے پوچھا۔

"سوال کرنے کا حق میرا ہے' تمہیں صرف جواب دینے ہیں۔" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی معنی خیز انداز میں صفدر کا شانہ بھی دبادیا۔

میں نے صفدر کو مخاطب کرکے اردو میں سرگوشی کی "میرا خیال ہے کہ ہمیں اس موٹے انسپکٹر کے ساتھ چلنا چاہیے۔"

صفدر نے گہری سانس لیتے ہوئے انسپکٹر سے کہا "او کے آفیسر' لیٹ اس گو۔"

انسپکٹر نے ایک رائفل مین کو اشارہ کیا۔ وہ ہمارے ساتھ گھس کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ انسپکٹر نے بھاری بھرکم موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ تقریباً دو فرلانگ تک سیدھا جانے کے بعد ہم ایک بغلی راستے پر مڑگئے۔ اطراف میں چائے کے کھیت تھے اور پام کے بے شمار درخت نظر آرہے تھے' تاہم خشک سالی کے آثار ہر شے پر نمایاں تھے۔ کہیں کہیں کسانوں کے مخروطی چھتوں والے گول جھونپڑے دکھائی دیتے تھے۔ تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد ہم ایک حویلی نما عمارت کے سامنے پہنچے۔ اس دو منزلہ عمارت کی تعمیر میں مٹی' چونا اور لکڑی کثرت سے استعمال کی گئی تھی۔ عمارت کے وسیع احاطے میں چند گھوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ رکھوالی کے کتے بھی پھرا رہے تھے۔ عمارت کے مین دروازے کے سامنے چرخی سے پانی کھینچنے والا ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے پاس ہی ایک نئی مرسڈیز کھڑی تھی۔ یہ مرسڈیز کیچڑ آلود دیہی راستوں پر چل کر خستہ حال ہو رہی تھی۔ یہ جگہ پولیس اسٹیشن تو ہرگز نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ انسپکٹر تابش کا دولت کدہ تھا۔

حویلی نما عمارت میں پہنچتے ہی انسپکٹر تابش کا رویہ ہم سے کافی دوستانہ ہو گیا۔ اس کے کہنے پر ہم گاڑی سے اتر آئے۔ وہ بدر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک تھی۔ زرین گل کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر بھی اس نے کسی تعجب یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ انسپکٹر تابش کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ یہ غلط فہمی کیا تھی اس کا پتا تو آنے والے وقت میں ہی چل سکتا تھا۔

گاڑی کے عقبی حصے میں زخمی جوزف کو دیکھ کر انسپکٹر کی آنکھوں میں پہلی بار حیرانی دکھائی دی۔ وہ صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "یہ کون ہے؟"

"اس کے بارے میں ابھی آپ کو تفصیل سے بتاتے ہیں۔" صفدر نے حسبِ توقع جواب دیا۔

انسپکٹر تابش کے ساتھ آنے والے پولیس اہلکاروں نے زرین گل کے ساتھ مل کر جوزف کو اندر کمرے میں پہنچادیا۔ ہم سب بھی اندر چلے آئے۔ بدر کو غزالہ نے سہارا دے کر پہنچایا۔ اس عمارت میں مقیم افراد کی ٹھیک تعداد تو ہمیں معلوم نہیں تھی' بہرحال پہلی منزل پر دو تین نیم خوابیدہ ملازم ہی نظر آئے۔ عمارت کی اندرونی بناوٹ اور سجاوٹ دیہاتی طرز کی تھی۔ جس کمرے میں ہم کھڑے تھے وہاں ہرن اور چیتوں کے سروں کی نمائش کی گئی تھی۔ ایک دیوار پر دو بھالے آویزاں تھے۔ چھت پر مختلف رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ انسپکٹر تابش نے خواتین اور بچوں کو ساتھ والے کمرے میں بھیج دیا۔ ہم بید کے بنے ہوئے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ زرین گل زخمی جوزف ہی کے پاس تھا اور ایک گھریلو ملازم کے ساتھ مل کر اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ جوزف مکمل طور پر بے ہوش تھا۔

انسپکٹر تابش واجبی سی انگریزی بول لیتا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا کہ تم لوگ دوپہر بارہ ایک بجے تک پہنچ جاؤ گے۔ میں نے سہ پہر چار بجے تک تمہارا انتظار کیا' پھر گشت پر جانا پڑ گیا۔ بہرحال راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تمہیں؟"

"نہیں۔" صفدر نے مختصر جواب دیا۔

"لڑکی اچھی ہے' اور ہماری ڈیمانڈ کے مطابق ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مبارک بھائی پانچ دس ہزار زیادہ بھی مانگتے تو میں انہیں دلوا دیتا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا "مگر یہ باقی لوگ کس سلسلے میں آئے ہیں' اور وہ بندہ جو زخمی ہے؟"

میں اب صورتِ حال کو کافی حد تک بھانپ چکا تھا' صفدر کی جگہ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "بس اس لڑکی کے چکر میں ہی ساری گڑبڑ ہوئی ہے۔ کچھ مقامی لوگ بیچ میں کود پڑے تھے۔ ہم سب بھی نظر میں آگئے تھے' خطرہ تھا کہ پولیس تفتیش میں پکڑے گی۔ مبارک صاحب نے کہا کہ لڑکی لے جاؤ اور تم بھی دو چار دن کے لیے روپوش ہو جاؤ۔ بس ہم آپ کی طرف آگئے۔" میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

انسپکٹر تابش کے چہرے پر پریشانی نظر آنے لگی۔ وہ بولا "مبارک بھائی سے میں نے کہا بھی تھا کہ ہمارا آپس کا تعلق کم سے کم ہونا چاہیے۔ خیر اب تم لوگ آہی گئے ہو تو ٹھیک ہے۔" پھر ایک دم اسے جوزف کا خیال آیا "مگر اس بندے کو گولی کیسے لگی؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"اس کا نام جوزف ہے۔" میں نے کہا "یہی ہمیں آپ کی طرف لا رہا تھا۔ راستے میں پل کے پاس کچھ لوگوں نے گھات لگا کر گولی چلائی۔ لازمی بات ہے کہ وہ اس لڑکی کے خیر خواہ ہوں گے۔ ہم نے بھی جوابی فائر کیے' ایک دو بندے ان کے بھی زخمی ہوئے ہوں گے۔"

"یہ دونوں سفید لڑکیاں تمہاری فرینڈز ہیں؟" تابش نے پوچھا۔ اس کا اشارہ غزالہ اور کلثوم کی طرف تھا۔

میں نے کہا "ایک تو ہمارے ساتھی کی بیوی ہے' دوسری میری "فرینڈ" ہے۔"

اسی دوران میں بالائی منزل سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی' پھر ایک بھاری مردانہ آواز نے کسی کو پکارا۔ تابش جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا "اچھا' میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اپنے چوڑے شانے ہلاتا ہوا تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گیا۔ چند قدم چل کر رکا اور صفدر سے مخاطب ہو کر انگریزی میں بولا "تم مبارک صاحب کی گاڑی اندر گیراج میں کھڑی کر دو' اس کا کھلے میں رہنا ٹھیک نہیں۔"

ہم پر یہ نیا انکشاف ہوا کہ جس گاڑی میں ہم یہاں پہنچے ہیں' وہ مبارک کے زیر استعمال رہی ہے۔ یہ ایک حیران کن انکشاف تھا۔

صفدر اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے باہر چلا گیا۔

میرے ذہن میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اب پوری بات سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔ جیسے کڑی سے کڑی ملتی ہے اور زنجیر بن جاتی ہے۔ جس گاڑی پر ہم سب یہاں پہنچے تھے اس کا تعلق پرل کائی فارمز کے مالک مبارک امین سے تھا۔ جس وقت مبارک امین اور اس کے کارندوں نے واراب کے گھر کو گھیرے میں لیا اور ہم پر ہلہ بولا اس وقت یہ گاڑی بھی دیگر گاڑیوں میں شامل تھی۔ ہمیں مکان کے اندر گھیرنے کی غرض سے یہ گاڑی عقبی سمت سے لائی گئی تھی۔ وہاں یہ درختوں کے جھنڈ کے پاس گڑھے میں پھنس گئی۔ بعد ازاں جب مبارک امین اور اس کے کارندے ہمارا گھیراؤ چھوڑ کر افراتفری میں بھاگے تو یہ گاڑی وہیں پھنسی رہ گئی۔ ممکن تھا کہ اسے جلدی میں نکالنے کی کوشش بھی کی گئی ہو۔ بہرحال یہ کوشش ناکام رہی اور وہ لوگ گاڑی وہیں چھوڑ گئے۔ بعد ازاں یہ گاڑی ہماری نظر میں آ گئی۔ چونکہ یہ مکان سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی' یوں بھی مکان کی عقبی سمت میں تھی لہٰذا ہمارے ذہن میں نہیں آیا کہ اس کا تعلق بھی مبارک امین سے ہی ہوگا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو کر جائے واردات سے نکل آئے۔ بیس بائیس میل کا فاصلہ ہم نے بخیریت طے کیا' یہاں تک کہ چیکنگ پوسٹ پر پولیس نے ہمیں روک لیا۔

— دوسری طرف ایک اور سنگین چکر چل رہا تھا۔ بدبخت مبارک امین' بدر کے ساتھ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اسے آگے چلانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سلسلے ہمیں تفصیل معلوم نہیں تھی کہ انسپکٹر تابش اور مبارک امین کے درمیان کیا معاملہ طے ہوا اور کیوں ہوا' بہرحال بات اب واضح ہو چکی تھی کہ مبارک "غربت کی ماری بدر" انسپکٹر تابش کے حوالے کر رہا تھا۔ آج دوپہر پروگرام کے مطابق مبارک کے کارندوں نے بدر کو یہاں لا کر انسپکٹر تابش کے "ہینڈ اوور" کرنا تھا۔ اس سلسلے میں انسپکٹر تابش شدت سے مبارک کے کارندوں کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ زبردست اتفاق تھا کہ آج رات ہمیں انسپکٹر تابش کے علاقے میں ناکے پر روک لیا گیا۔ ناکے پر انسپکٹر تابش نے مبارک امین کی گاڑی پہچان لی۔ مگر وہ پولیس پارٹی کے سامنے ہم سے شناسائی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا' یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلے مجھے آنکھ رسید کی اور پھر صفدر کا شانہ دبایا۔ وہ گاڑی میں بدر کو بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ہمیں سیدھا اپنی رہائش گاہ لے آیا۔

اب صورت حال کافی پیچیدہ تھی۔ ابھی تک تو انسپکٹر تابش مغالطے میں تھا مگر یہ مغالطہ تادیر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔ انسپکٹر تابش یقیناً کوئی سیدھا سادہ شخص نہیں تھا۔ اسے بہت جلد گڑبڑ کا احساس ہونے والا تھا' پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی طور مبارک امین سے رابطہ کر لیتا اور حقیقت اس پر کھل جاتی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم انسپکٹر تابش کے چوکس ہونے سے پہلے حالات پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

صفدر گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے واپس آ گیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس کی آنکھوں میں بھی کئی سوال مچل رہے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا "جوزف کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فوراً کوئی اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔"

"دوائیوں اور سامان کے بغیر اس دور دراز علاقے میں کیا کوشش ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان ہو۔"

"تو پوچھ کر دیکھ لو۔" میں نے کہا۔

"کس سے پوچھیں' یہاں تو سب تاریک براعظم کی زبان بول رہے ہیں۔"

دو چار منٹ بعد انسپکٹر تابش اپنے بھاری بھرکم جسم کو ہچکولے دیتا ہوا بالائی منزل سے واپس آ گیا۔ صفدر نے اسے بتایا کہ زخمی کی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے فوری امداد کی ضرورت ہے۔

انسپکٹر بولا "یہاں تو بس معمولی مرہم پٹی کا سامان موجود ہے۔ آس پاس سات آٹھ میل تک کوئی ڈاکٹر وغیرہ بھی نہیں ملے گا۔"

صفدر نے کہا "چلو جو کچھ میسر ہے اسی سے کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

صفدر اور تابش اندر گئے۔ ایک منٹ بعد انسپکٹر تابش ایک میڈیکل باکس اٹھائے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ صفدر اور غزالہ بھی تھے۔ ابھی وہ دروازے میں ہی تھے کہ زریں گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا "استاد حبیب! وہ بندہ مر رہا ہے' اس کا سانس رک گیا ہے۔"

ہم باہر پہنچے' جوزف کے سانس واقعی پورے ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں الٹ گئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ غزالہ نے رسمی طور پر اس کی نبض وغیرہ دیکھی' وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔ پسلیوں میں لگنے والی گولی کے سبب اس کے جسم کا بہت سا خون نکل گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ ہرکولیس جہاز میں کسی عفریت کی طرح دندنانے والا سفاک بردہ فروش' اعشاریہ دو پانچ کی صرف ایک گولی کے سبب زندگی ہار گیا تھا۔ اس کا بے جان لاشہ ایک بے حقیقت شے کی طرح بستر پر پڑا تھا۔

○☆○

جوزف کی موت رات تین بجے کے لگ بھگ واقع ہوئی تھی۔ اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹا ہمارے لیے بڑا کٹھن تھا۔ ہم کچھ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ ہم انسپکٹر تابش اور اس کے دو تین ملازمین پر قابو تو پا سکتے تھے مگر ابھی ہمیں ٹھیک سے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اس حویلی نما عمارت میں کل کتنے افراد ہیں اور وہ کہاں کہاں موجود ہیں۔ جہاں تک تابش کا تعلق تھا وہ ابھی تک ٹھیک ہی جا رہا تھا۔ اس کی طرف سے ہمیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ اسے ہم پر کسی طرح کا شک ہوا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ابھی تک ہمارے بیان پر زیادہ غور و فکر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور ہم نے جو کچھ بتایا ہے فی الوقت وہ اسے ہی درست سمجھ رہا ہے۔

— میں نے گھڑی دیکھی' صبح کے چھ بج چکے تھے مگر اجالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صفدر نے کمرے کی کھڑکیوں سے پردہ ہٹایا

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانیاں جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، خوشبو اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
Ph: 7247414 ... 20

اور ہمیں معلوم ہوا کہ باہر گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے گرج چمک بھی ہونے لگی۔ ساحلی علاقوں کی بارش اکثر شدید تیز ہوا کرتی ہے' یہ بھی کوئی اسی قسم کا "پروگرام" ہی لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد واقعی گرج چمک کے ساتھ زوردار بارش شروع ہوگئی۔ عمارت میں موجود سب لوگ یکے بعد دیگرے جاگ گئے اور بارش سے لطف اندوز ہونے لگے۔ یہاں تک کہ انسپکٹر تابش کے سنجیدہ چہرے پر بھی رونق دکھائی دینے لگی۔ وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا "تم لوگوں کا آنا اچھا شگون رہا ہے۔ لوگ بارش کے لیے ترس رہے تھے' بہت عرصے بعد یہ بارش ہو رہی ہے' اور بارش بھی ایسی زوردار ہے۔ واہ مزہ آگیا ہے۔"

بارش کے مزے میں وہ اس بات کو بالکل فراموش کرگیا تھا کہ قریبی کمرے میں ہمارے ایک "ساتھی" کی لاش پڑی ہے اور ابھی ہمیں اس کی تجہیز و تکفین بھی کرنی ہے۔ بلکہ تابش سمیت کسی کو بھی احساس نہیں تھا کہ عمارت میں ایک بندے کی لاش موجود ہے۔ وہ سب لوگ صحن میں نکل آئے تھے اور اپنے بالائی لباس اتار کر نہانے لگے تھے۔ ہمارے اندیشے کے عین مطابق اس عمارت میں کافی افراد موجود تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان میں کچھ سفید فام مرد و زن بھی تھے۔ یہ لوگ عمارت کی بالائی منزل پر مقیم تھے۔ ان میں تین چار خوب رو لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے گرم موسم کے پیش نظر مختصر لباس پہن رکھے تھے۔ دو تین مرد بھی ہمیں نظر آئے۔ ان میں سے ایک بڑی عمر کا تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا اور اس کے سر کے سفید بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے آدھے بازو کی رنگ برنگی بش شرٹ پہن رکھی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ لوگ امریکی ہیں۔ موسم کی کروٹ پر یہ لوگ بھی بہت خوش نظر آرہے تھے۔ آپس میں خوش گپیاں کرتے ہوئے یہ لوگ نیچے اتر آئے اور پھر انہوں نے صحن میں نکل کر نہانا شروع کردیا۔ یہاں کے سیاہ فام مرد و زن پہلے ہی نہا رہے تھے' یہ امریکن بھی ان میں شامل ہوگئے۔ مردوں نے بالائی لباس اتار دیے' لڑکیوں نے بھی جہاں تک ہو سکتا تھا' لباس سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ بارش بھی بڑی دھواں دار تھی۔ آسمان سے زمین کی طرف جیسے آبشار سا بہہ رہا تھا۔ پام کے بلند درخت تیز ہوا میں جھومتے تھے تو لگتا تھا کہ مست ہو کر رقص کر رہے ہیں۔ خوب رو امریکن لڑکیوں کے لباس بھیگ کر اور بھی ہیجان خیز ہوگئے تھے' وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں اور چیخ پکار کررہی تھیں۔ زریں گل بار بار انہیں کن انکھیوں سے دیکھ لیتا اور لاحول پڑھ لیتا تھا۔ پھر ایک منچلے امریکی نے بالائی منزل پر جا کر ڈیک آن کردیا۔ دھماکا خیز میوزک کی لہریں بادلوں کی گھن گرج کا ساتھ دینے لگیں۔ امریکن لڑکیاں اور لڑکے محو رقص ہوگئے۔ نہ صرف خود محو رقص ہوگئے بلکہ انہوں نے کھینچ تان کر سیاہ فاموں کو بھی شامل کرلیا۔ زریں گل اس وقت بہت سٹپٹایا جب اس نے لاحول پڑھنے کے لیے ترچھی نظر لڑکیوں پر ڈالی اور دیکھا کہ ایک سیاہ فام لڑکی بالائی لباس کے بغیر ہی محو رقص ہے۔ زریں گل لاحول بھول کر لڑکی کو کوسنے لگا اور پھر منہ میں بڑبڑاتا ہوا بولا "خو ان لوگوں کو تو موت یاد ہی نہیں ہے' ادھر کمرے میں تازہ تازہ لاش پڑا ہے اور یہ لوگ اپنا بوٹی بوٹی نچا رہا ہے۔"

"واقعی لالہ محمد حیدر یا بدر منیر جیسا کوئی بندہ ادھر ہوتا تو ان کی بوٹی بوٹی کردیتا۔" صفدر نے تائید کی۔

زریں گل نے گھور کر صفدر کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اسی دوران میں ایک فربہ اندام امریکی بڑی سی رنگین چھتری لے آیا۔ چھتری کے نیچے ایک پستہ قد شخص تھا اور اس کے کندھے پر مووی کیمرا رکھا ہوا تھا۔ یہ بڑا جدید کیمرا تھا۔ پستہ قد شخص بارش میں نہاتے اور رقص کرتے افراد کی مووی بنانے لگا۔ لمبے سفید بالوں والے امریکی کو دیکھ کر مجھے شک سا گزرا تھا کہ شاید ان لوگوں کا تعلق کسی طور فلم لائن سے ہے' اب یہ جدید کیمرا دیکھ کر اس شک کو تقویت ملی تھی۔ خوب رو لڑکیوں اور اسمارٹ لڑکوں کے کھلے ڈلے انداز بھی اس شک کو توانا کر رہے تھے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا بارش ٹوٹ کر برسی اور ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ پھر بارش مدھم تو پڑگئی مگر رکی نہیں۔ میں نے اور صفدر نے دوسری منزل پر جا کر دیکھا۔ دور تک پام کے درخت ٹوٹے ہوئے تھے' عمارت کے اردگرد نصف فرلانگ تک بارش کا پانی کھڑا تھا اور جس راستے سے گزر کر ہم عمارت تک پہنچے تھے اس کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

صفدر نے کہا "اب تو یہاں سے جلدی نکلا بھی نہیں جاسکتا۔"

"چلو ایک دو روز آرام کرتے ہیں یہاں' زریں کو بھی تسلی سے لاحول پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"لیکن اس دوران میں اگر تار کول کے ڈرم (انسپکٹر تابش) کو مبارک امین سے رابطہ کرنے کا موقع مل گیا تو ہمیں بھی "جل تو جلال تو" کا ورد کرنا پڑ جائے گا۔"

"مجھے لگ رہا ہے کہ اس طوفانی بارش کے بعد کم از کم آج کا دن تو کوئی ایسا خطرہ نہیں ہے۔ تم دیکھ ہی رہے ہو' یہاں سے کشتی کے بغیر نہیں نکلا جاسکتا اور بارش ابھی جاری ہے۔ یہاں سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ممکن نہیں ہے۔ میں نے کافی دیکھا ہے' مجھے تو یہاں فون کا تار کہیں نظر نہیں آرہا۔ ویسے اگر فون ہوتا بھی تو ایسی بارش میں اس پر "فالج" کا حملہ ہونا یقینی تھا۔ ان سب باتوں سے اہم بات ایک اور ہے۔"

"وہ کیا؟" صفدر نے پوچھا۔

"آثار یہی کہہ رہے ہیں کہ انسپکٹر تابش نے مبارک امین کے ساتھ اپنے تعلق کو بالکل چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔ یہ صورت حال ہمارے حق میں جاتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ انسپکٹر تابش ہمارے بیان کی تصدیق کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں ایک آدھ دن تک تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔"

"مگر ہمارے سامنے جوزف کی لاش کا مسئلہ بھی تو ہے۔ اس کا کفن دفن کیسے ہوگا؟"

میں نے کہا "جیسے لاوارث لوگوں کا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے انسپکٹر تابش کو یہی بتایا ہے کہ جوزف کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ ہمارے علاوہ کسی کو اس کے آخری دیدار کی خواہش بھی نہیں ہوگی' لہٰذا اسے ہم جب اور جہاں چاہیں' دفن کرسکتے ہیں۔"

صفدر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن فوراً ہی اسے چپ ہونا پڑا۔ دو سفید فام لڑکیاں قہقہے لگاتی ہوئی ایک کمرے سے نکلیں اور اپنے گیلے زیر جامے کمال بے تکلفی سے ایک الگنی پر پھیلانے لگیں۔ نہا دھو کر وہ خوب نکھری ہوئی تھیں اور ان کے انگ انگ سے مستی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال ان دونوں نے ہم سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی' شاید انہیں ہم سے لاتعلق رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میری نگاہ کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے اندر گئی۔ وہاں مجھے کچھ بڑی بڑی لائٹس نظر آئیں' اس کے علاوہ مووی کیمروں کے اسٹینڈ اور ساؤنڈ ریکارڈنگ کے آلات نظر آرہے تھے' اس سارے سامان کا تعلق فلم میکنگ سے تھا' اب اس امر میں شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ یہ لوگ فلم لائن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے انسپکٹر تابش کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے جو اس نے یہاں پہنچنے کے فوراً بعد ہم سے کہے تھے۔ اس نے خوب رو بدر کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ لڑکی ہماری ڈیمانڈ کے عین مطابق ہے۔

اس قسم کے الفاظ عام طور پر پروڈیوسرز اور فلم ڈائریکٹرز وغیرہ ہی استعمال کیا کرتے ہیں۔ انسپکٹر تابش اپنی شخصیت کے اعتبار سے فلم پروڈیوسر یا ڈائریکٹر وغیرہ تو نظر نہیں آتا تھا مگر یہ ممکن تھا کہ اس کا تعلق فلم میکروں سے ہو۔ تابش نے بدر کے لیے لڑکی کا لفظ استعمال کیا تھا' وہ چار بچوں کی ماں تھی اس کے باوجود بادی النظر میں جواں سال ہی نظر آتی تھی۔ اس لحاظ سے تابش نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ اس کی گفتگو سے صاف عیاں ہوا تھا کہ بدر کو باقاعدہ خرید کر یہاں لائے جانے کا پروگرام تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ چار بچوں کی مفلس ماں میں ان فلم میکروں کو کیا بات نظر آئی تھی۔ اس سوال کی طرح ابھی اور کئی "جواب طلب" سوال ہمارے ذہنوں میں موجود تھے۔

صفدر نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ اس دن اگر آپ بوڑھے داراب کی بات مان لیتے تو بدنصیب بدر کا کھوج تک نہیں ملتا۔"

"کون سی بات؟"

"بوڑھا داراب یہی کہہ رہا تھا... کہ جلال نے بہو کو (بدر کو) ایک دو روز میں لوٹا دینے کا وعدہ کیا ہے' جبکہ آپ کو اندیشہ تھا کہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔"

"اور یہ اندیشہ درست تھا۔"

"یہی بات تو کہہ رہا ہوں' بدر... جلال سے مبارک امین کے پاس پہنچ چکی تھی اور مبارک امین اسے آگے انسپکٹر تابش کے پاس فروخت کرنے والا تھا اور وہ فروخت ہوجاتی تو ہم کہاں اسے ڈھونڈ سکتے۔ اس کا چھوٹا بچہ تو شاید رو رو کر مر ہی جاتا۔"

"اب بھی کون سا وہ محفوظ و مامون ہوگئی ہے۔ بلکہ کم و بیش وہی صورت حال ہے جو ہماری عدم مداخلت کی وجہ سے ہوتی۔ وہ اپنے خریداروں کے پاس ہی تو ہے۔"

"لیکن اب ہم دونوں تو یہاں ہیں۔" صفدر نے گہرے اعتماد سے کہا۔

اس کا یہی بااعتماد اور پرجوش انداز تھا جو مجھے بھی حوصلے سے لبریز کردیتا تھا۔ صفدر نے ذرا توقف کیا اور بولا "لیکن شاہ جہاں صاحب! ایک بات مسلسل ذہن کو کچوکے لگا رہی ہے۔ بڑھے داراب نے آپ پر حملہ کرنے کی کوشش کیوں کی۔ اس کے رویے کو دیکھا جائے تو پھر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم

پر مبارک امین کا حملہ بھی اسی نے کروایا تھا۔"

"شاید وہ بدبخت انعام کے لالچ میں آگیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ جلال اس معاملے میں بے قصور ہے؟"

"ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک ہی قصوروار ہے۔ جلال یا پھر اللہ بخشے بے چارا راب۔"

—— اس رات کھانے کے بعد میں اور صفدر انسپکٹر تابش سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انسپکٹر تابش خاصا پیٹو شخص تھا۔ اس نے تین چار "پلیٹ چاول" کے علاوہ ڈیڑھ دو مرغیوں پر ہمارے سامنے ہاتھ صاف کیا۔ اسے کھاتے دیکھ کر مجھے اپنا ٹھیٹ پنجابی یار عالم قریشی یاد آگیا۔ وہ بھی ایسا ہی آزاد مرد تھا۔ ہر کام سے فارغ ہو کر کھانے بیٹھتا تھا اور اس وقت اٹھتا تھا جب بہت سے کام لیٹ ہو چکے ہوتے تھے۔ انسپکٹر تابش کی پھولی ہوئی توند تناول ما حضر کے بعد کچھ اور پھول چکی تھی اور آنکھوں میں ویسا ہی نشہ تھا جو شکار کے بعد شیر کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ غیر متوقع طور پر انسپکٹر تابش کی انگریزی کچھ اچھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے گھر میں امریکی مہمان موجود تھے۔ یہ مہمان یقیناً پہلے بھی یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ شدید گرمی کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ جوزف کا کریا کرم ان لوگوں نے مکان کے پچھواڑے ہی کہیں کر دیا تھا۔ اس خاموش کریا کرم کے بعد ہمارے ذہن پر اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔

میں نے باتوں باتوں میں تابش سے پوچھا "بدر کو آپ نے پہلے کہاں دیکھا تھا؟"

اس نے رائن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "رہیں مبارک بھائی کے گھر ملاقات ہوئی تھی۔ جوجی صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔"

"یہ جوجی صاحب کون ہیں؟"

"وہی لمبے سفید بالوں والے امریکی۔ انہیں تم نے اوپر کی منزل میں دیکھا ہوگا۔ دراصل جوجی صاحب اپنا فلمی یونٹ لے کر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ڈیڑھ دو مہینے سے یہیں ہیں۔ ایک بڑی امریکن کمپنی کے لیے فلم بنا رہے ہیں۔ مبارک بھائی کے گھر میں جوجی صاحب کی نظر بدر پر پڑی تھی۔ وہ پھڑک اٹھے۔ کہنے لگے یہ لڑکی میری فلم کے ایک کردار کے لیے بالکل فٹ ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی طرح یہ لڑکی انہیں لے دوں، وہ اسے اپنے ساتھ امریکا لے کر جائیں گے۔ میں نے مبارک بھائی سے بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکی ان کے ایک جلال نامی دوست کی ہے اور وہ شاید اسے بیچنے پر تیار نہ ہو۔ جوجی صاحب نے زور دیا کہ جس طرح بھی ہو یہ لڑکی ملنی چاہیے۔ مبارک بھائی نے کہا کہ میں کوشش کروں گا مگر جوجی صاحب نے فوراً ایک لمبی رقم مبارک بھائی کے سامنے رکھ دی۔ مبارک بھائی پہلے نیم رضامند ہوئے پھر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ لڑکی کے مالک سے بات کر لیتے ہیں۔ امید ہے کہ کل تک لڑکی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔ جوجی صاحب نے کہا کہ آپ امید کی بات نہ کریں، لڑکی ہر صورت کل بارہ ایک بجے تک پہنچنی چاہیے، جہاں آپ نے ہماری اتنی بات مانی ہے، اتنی اور مان لیں۔ مبارک بھائی مسکراتے رہے پھر انہوں نے وعدہ کر لیا۔"

میں نے کہا "لیکن انسپکٹر صاحب! یہ تو سیدھی سادی دیہاتن ہے، یہ فلم میں ایکٹنگ کیسے کرے گی؟"

"بھئی یہ ہماری درد سری نہیں ہے۔ جوجی صاحب جانیں اور ان کا کام۔ وہ بڑے پرانے اور گھاگ ہدایت کار ہیں۔"

"مگر ہم نے سنا ہے کہ گود کے بچے کے علاوہ بھی بدر کے تین بچے ہیں۔ ان کا کیا ہوگا؟" صفدر نے پوچھا۔

تابش نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا "یہ دوسری درد سری مبارک بھائی کی ہے، ویسے بھی جہاں پیسہ پہنچ جاتا ہے وہاں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بچوں کا کیا ہے۔ ایک دو ہفتے پریشان ہو لیں گے، پھر جب اچھا کھانے اور پہننے کو ملے گا، آہستہ آہستہ سب بھول جائیں گے۔ غریبی میں رہنے والوں کے دل بڑے سخت ہو جاتے ہیں۔ رقم ملے تو یہ لوگ خونی رشتوں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں اور ہماری منی کی تو قسمت ہی یہی ہے۔ یہاں پر اپنے زمانوں سے انسان بکتا اور خریدا جاتا رہا ہے۔"

اچانک چیخیں سنائی دیں۔ یہ نسوانی چیخیں تھیں۔ انسپکٹر تابش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں اور صفدر بھی چونک گئے تھے۔ چیخیں سیڑھیوں کی طرف سنائی دی تھیں اور پھر برآمدے کی طرف چلی گئی تھیں۔ ہم برآمدے میں پہنچے تو وہاں خوب بدر نظر آئی۔ اس کا پاؤں پہلے سے بہت بہتر تھا۔ ابھی لیے وہ دونوں پاؤں پر برابر وزن ڈالے کھڑی تھی مگر اس کی سیاہ جلد پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ غزالہ اور کلثوم نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ میں نے غزالہ سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا۔ وہ بولی "بچے کے دھلے ہوئے کپڑے تار پر پھیلانے اوپر بالکونی میں گئی تھی۔ وہاں نہ جانے کیا دیکھا کہ چیختی ہوئی بھاگ آئی ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

وہ خوف زدہ انداز میں بالکونی کی طرف اشارے کرنے لگی اور فر فر افریقی بولنے لگی۔ اس کے اشاروں سے بس یہی بات سمجھ میں آئی کہ اس نے وہاں کوئی ڈرانے والا منظر دیکھا ہے، شاید لڑائی وغیرہ ہو رہی تھی۔

چند ہی لمحے بعد لمبے سفید بالوں والے "جوجی صاحب" اور ان کا ایک امریکی ساتھی غصے میں بھنائے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ جوجی صاحب بدر پر چلانے لگے۔ وہ انگریزی میں بکواس کر رہے تھے۔ انہوں نے بدر کو سخت برا بھلا کہا اور پوچھا کہ اس نے اندر کمرے میں تانکا جھانکی کیوں کی؟

وہ بھلا اس انگریزی ڈانٹ ڈپٹ کا کیا جواب دیتی۔ بدر کی خبر لینے کے بعد جوجی صاحب انسپکٹر تابش سے احتجاج کرنے لگے "مسٹر تابش! اس طرح تو ہماری پرائیویسی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اگر ان سب لوگوں نے یہاں ٹھہرنا ہی ہے تو پھر آپ انہیں ایک دو کمروں تک محدود رکھیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ یہ جہاں چاہیں، منہ اٹھا کر چلے آئیں۔"

"آپ فکر نہ کریں جوجی صاحب، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ابھی انتظام کر دیتا ہوں۔"

جوجی صاحب سنکیوں کی طرح سر ہلاتے اوپر چلے گئے۔ انسپکٹر تابش بدر کو مقامی زبان میں سمجھانے بجھانے لگا۔ اس نے ہم سے بھی کہا کہ ہم صرف نچلی منزل تک محدود رہیں بلکہ بہتر ہے کہ برآمدے کی طرف ہی نہ آئیں۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اوپر کیا مسئلہ تھا مگر پھر انسپکٹر تابش کا موڈ دیکھ کر میں نے یہ سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انسپکٹر نے خود بھی یہ موضوع چھیڑنے سے گریز کیا۔

انسپکٹر تابش چلا گیا تو غزالہ نے اشاروں میں بدر سے پوچھا کہ اوپر کیا تھا۔ جواب میں بدر نے اشاروں کنایوں سے جو کچھ بتایا وہ کافی حد تک ہماری سمجھ میں آگیا۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ ہم اشاروں کنایوں کی زبان میں بھی کافی کچھ بدر سے پوچھ سکتے ہیں۔ بدر نے اشاروں میں بتایا کہ اوپر دو مرد ایک عورت سے زبردستی کر رہے تھے۔ وہ اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش میں تھے، وہ چیخنا چاہتی تھی مگر انہوں نے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

ہم سب سوچ میں پڑ گئے۔ یہ کیا چکر چل رہا تھا۔ جس وقت بدر کی خوف زدہ چیخوں کی آواز آئی ہم بھی یہیں موجود تھے۔ اگر بالائی منزل کے کسی کمرے میں کسی عورت کے ساتھ دست درازی ہو رہی تھی تو ہمیں کیوں معلوم نہیں ہوا۔ اکھاڑ پچھاڑ کی آوازیں آنی چاہئیں تھیں، یا پھر ایک آدھ چیخ ہی سنائی دے جاتی۔

صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! کہیں یہ بھی فلم کا ہی کوئی منظر نہ ہو۔"

"میرا اپنا ذہن بھی اُدھر ہی جا رہا ہے۔" میں نے کہا "ممکن ہے کہ یہ لوگ کوئی ریہرسل وغیرہ کر رہے ہوں۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔" صفدر نے کہا۔

بدر کا خوف کم ہو گیا تھا مگر چہرہ ابھی تک متغیر تھا۔ میں نے کہا "اس ہنگامے سے کوئی اور فائدہ چاہے نہ ہوا ہو مگر ایک بات کا پتا ضرور چل گیا ہے۔ ہم بدر سے اشاروں کنایوں میں بات کر سکتے ہیں۔ یہ کافی ذہانت سے جواب دیتی ہے۔"

غزالہ بولی "شاہ جہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں آج کافی دیر اس سے باتیں کرتی رہی ہوں۔ میں نے اس سے اس کے سسر کے بارے میں پوچھا ہے۔"

"یہ سسر کیا ہوتی ہے؟" زریں نے پوچھا۔

"یہ ہوتی نہیں ہوتا ہے۔ غزالہ بوڑھے راراب کی بات کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ زریں نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

غزالہ بولی "میں نے بدر سے پوچھا تھا کہ راراب نے ہم پر کلہاڑی سے حملہ کیوں کیا۔ ہم تو تم لوگوں کی مدد کر رہے تھے۔ بدر کے جوابی اشاروں سے پتا چلا ہے کہ ٹیکسی کار کے اوپر لاؤڈ اسپیکر رکھ کر علاقے میں جو اعلان کیا گیا تھا، اس اعلان کی وجہ سے بوڑھا لالچ میں آگیا تھا۔ اس نے خود جا کر مبارک امین کے ایک ملازم کو بتایا کہ جن کے بارے میں اعلان کیا جا رہا ہے وہ اس کے گھر میں موجود ہیں۔"

"لیکن ہم تو صفدر صاحب کو گھر میں نگران چھوڑ کر گیا تھا، بوڑھا باہر کیسے نکلا۔" زریں گل نے نکتہ اٹھایا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ صفدر بولا "اب مجھے لگ رہا ہے کہ شاید مجھ ہی سے غلطی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جس طرح آپ لوگ راراب کی طرف سے مطمئن تھے، اسی طرح میرے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی تھی، شاید اسی وقت بوڑھے کو کام دکھانے کا موقع مل گیا۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔" غزالہ نے کہا "وہ ٹائم دیکھنا جانتی ہے، اس نے کمرے کے وال کلاک پر باقاعدہ انگلی رکھ کر مجھے سمجھایا ہے۔"

اب یہ بات تقریباً کلیئر ہو گئی تھی کہ داراب کے گھر پر ہم پر جو حملہ ہوا اس کا ذمے دار صرف داراب ہی تھا۔ وہ پیر فرتوت کمزور و ناتواں ہونے کے باوجود چالاک نظر آتا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ بہو تو گھر آہی گئی ہے' اب کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں۔ ہمیں پکڑوانے سے اس کا گھر بھی محفوظ ہو جاتا اور ہماری گرفتاری کا انعام بھی اسے مل جاتا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں کو ہماری موجودگی کی اطلاع دے رہا ہے' ہم انہی سے اس کی بہو کو چھڑا کر لائے ہیں۔ اپنی اس "بے وفائی" کا صلہ بوڑھے کو اپنی موت کی صورت میں ملا تھا۔ راہیِ عدم ہوتے ہوئے اس نے شریکِ حیات کو بھی ہم سفر بنا لیا تھا۔ بد ہماری باتیں نہیں سمجھ رہی تھی مگر وہ جان رہی تھی کہ ہم اس کے سسر کا ہی ذکرِ خیر کر رہے ہیں۔ میں صاف طور پر دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر اپنے سسر مرحوم کے لیے سوگواری کم اور بیزاری زیادہ ہے۔ بلکہ اسے نفرت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

موسم مسلسل ابر آلود تھا۔ گاہے گاہے بوندا باندی شروع ہو جاتی تھی۔ اس عمارت کا رابطہ اردگرد سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ میں اور صفدر بستر پر لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کلثوم نے آکر گلابی اردو میں بتایا کہ تابی نے اپنی انگلی کاٹ لی ہے اور مسلسل رو رہا ہے۔ میں دوسرے کمرے میں تابی اور غزالہ کے پاس پہنچا تو تابی کی ننھی سی انگلی پر مولی سی پٹی نظر آئی اور گول گول آنکھوں میں آنسو دکھائی دیے۔ غزالہ نے اسے گود میں بھینچ رکھا تھا اور پچکار رہی تھی "کیا ہوا چھوٹے صاحب کو؟" میں نے پوچھا۔

"مچھر کے تیل کی شیشی توڑ کر انگلی زخمی کر لی ہے۔" غزالہ نے بتایا۔

مجھے دیکھ کر تابی نے اور بھی زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ غزالہ مسکرائی اور اسے لے کر ٹہلنے لگی۔ کلثوم نے پلاسٹک کا ایک ڈیکوریشن پیس کھلونے کے طور پر تابی کو دیا۔ وہ خوب صورت گڑیا سے بہل گیا۔ گالوں پر آنسو رہے لیکن آنکھوں میں مسکراہٹ بھر گئی۔ کچھ دیر گڑیا کو الٹتا پلٹتا رہا' پھر جیسے اچانک اسے یاد آیا کہ وہ تو رو رہا تھا۔ مگر چند لمحوں کے لیے اس کے ذہن سے نکل گیا کہ کس بات پر رو رہا تھا۔ ان چند لمحوں میں' اس کے چہرے پر جو تاثرات نظر آئے انہوں نے ہمیں بہت محظوظ کیا۔ پھر اسے اپنی زخمی انگلی یاد آگئی اور وہ دوبارہ "ریں ریں" کرنے لگا۔ اس کی اس معصومانہ ادا پر غزالہ نے بے ساختہ اس کا گال چوم لیا۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تابی چپ ہو گیا۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ مجھے اپنی زخمی انگلی دکھانے میں مصروف ہو گیا۔ غزالہ نے کہا "اسی انگلی سے انکل کی آنکھ چبھوتے تھے نا... اللہ میاں نے تمہیں سزا دی ہے۔"

وہ منہ کھول کر غزالہ کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ان لمحوں میں وہ دونوں بالکل "ماں بچے" کی طرح نظر آ رہے تھے۔ غزالہ بڑے پیار سے تابی کو دیکھ رہی تھی۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے تابی کا گال چوم لیا' اسی جگہ سے جہاں سے ابھی غزالہ نے چوما تھا۔ غزالہ نے میری اس "رومانٹک کارروائی" کو نوٹ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر رنگ سا بکھر گیا۔ یہ حیا آلود رنگ اب میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا' پچھلے چند دنوں میں' میں نے کئی بار اس رنگ کی جھلک دیکھی تھی۔ یہ رنگ اس بہار کی نشان دہی کرتا تھا جو میرے مردہ تن میں نئی زندگی دوڑا رہی تھی۔

"آپ نے کچھ سوچا ہے؟" غزالہ نے مجھے محویت سے چونکا دیا۔

"کس بارے میں؟"

"پاکستانی سفارت خانے پہنچنے کے بارے میں۔ آپ نے کہا تھا کہ سفارت خانہ ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس دنیا میں دو بندے ایسے ہیں' جو میرے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے کچھ بھی سوچنا نہیں پڑتا۔ سب کچھ آپوں آپ ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ بغیر سوچے ہی راستے نکلنے لگتے ہیں۔ اب تم سوچ رہی ہوگی کہ وہ کون ہیں؟ ان میں سے ایک تم ہو اور دوسرا صفدر ہے' تم دونوں میرے ساتھ ہو' اب جو بھی ہوگا وہ ٹھیک ہی ہوگا۔"

"مجھ میں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ منہ پھیر کر بولی۔

"ماؤنٹ ایورسٹ کو خود اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ کتنی اونچی ہے' نہ ہی بحرالکاہل کو پتا ہے کہ وہ کتنا وسیع ہے۔"

اس سے پہلے کہ غزالہ کوئی جواب دیتی' دھما چوکڑی کی آوازیں سنائی دیں' پھر زریں گل کی چنگھاڑ گونجی' واضح طور پر وہ کسی سے برسرِپیکار تھا "ارے خنزیر کا بچہ! ام تمہارا خانہ خراب کرے گا۔" وہ دبی دبی آواز میں غرایا۔

میں باہر برآمدے میں پہنچا تو زریں کو ایک افریقی سے دست و گریباں پایا۔ زریں نے میرے سامنے اچھل اچھل کر دو ٹکریں افریقی کی ٹھوڑی پر رسید کیں۔ پھر دراز قد مدِمقابل

کے پیٹ میں ٹانگ مارنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو افراد دونوں کو چھڑانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ان میں سے ایک حبشی تھا اور دوسرا کوئی انڈین لگتا تھا۔ زریں پر برسائے جانے والے دو تین وار سہنے کے بعد انڈین نے اپنی گردن پر کھائے اور زریں گل کو دھکیل کر اس کے سیاہ فام مدِمقابل سے دور لے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر افریقی کو سنبھال لیا اور اسے دھکیل کر برآمدے کے وسط میں کھڑا کر دیا۔ رات کافی ہو چکی تھی' لگتا تھا کہ قلمی یونٹ کے اکثر افراد سونے کے لیے لیٹ چکے ہیں' ورنہ اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو جاتا۔ پھر بھی چند ایک ملازم تو جمع ہو ہی گئے۔ بیچ بچاؤ کروانے والے انڈین نے مقامی زبان میں ملازمین کو مخاطب کیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔ یہ درمیانے قد کا انڈین اسمارٹ سا نوجوان تھا۔ اس نے نیکر بوشرٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں سونے کا لاکٹ تھا اور پاؤں میں جوگرز۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ قلمی یونٹ کے ارکان میں سے ہے۔

تماشائیوں کو روانہ کرنے کے بعد انڈین نوجوان نے زریں گل کے مدِمقابل کو مقامی زبان میں سمجھانا بجھانا شروع کیا اور ایک دو منٹ کے اندر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ زریں گل کی طرف آیا اور بولا "خان صاحب! مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں بالکل نئے نئے آئے ہو۔"

"کیوں امارے چہرے پر تم کو سفر کا تھکاوٹ نظر آرہا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔ دراصل تمہیں یہاں کی بول چال کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔"

"ام کو پتا کرنے کا ضرورت بھی نہیں۔ خوام کو مالوم ہو گیا ہے کہ یہاں کا لوگ پیار کا نہیں کیے کا زبان سمجھتا ہے اور یہ زبان ام بہت اچھی طرح سے فرفر جانتا ہے۔"

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟" میں نے انڈین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ بولا "آپ اس کے ساتھی ہیں نا....؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انڈین نے کہا "خان صاحب نے ابھی اس حبشی ملازم کے سامنے ایک لمبی باریک سی آواز نکالی تھی۔ یہ آواز چھوٹے مرغے کی بانگ سے ملتی جلتی ہے۔ کیا آپ نے پہلے کبھی سنی ہے؟"

"شاید سنی ہو۔ تم آگے بتاؤ۔" میں نے کہا۔

انڈین بولا "یہ آواز یہاں عام طور پر نوجوان شرارت کے طور پر نکالتے ہیں۔ اس شرارت پر اکثر لڑائیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ آواز دراصل شروع شروع میں یہاں کی ایک مزاحیہ فلم میں نکالی گئی تھی' بعد میں یہ مشہور ہوتے ہوتے عام ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے... "کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہے جو میرے "کام" آسکے۔"

زریں گل کا منہ کھلا رہ گیا' میں بھی حیران رہ گیا تھا۔ زریں گل کئی موقعوں پر خوش اخلاقی میں یہ آواز نکال چکا تھا۔ ایک مرتبہ بوڑھے داراب کے سامنے بھی اس نے دو تین مرتبہ یہ آواز نکالی تھی۔ داراب کی جوان بیٹی بھی موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ زریں گل کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا ہے۔ غالباً اسے وہ سارے مواقع یاد آ رہے تھے جب اس نے یہ صدا نکال کر "اپنی طرف سے" "خوش مزاجی کا ثبوت دیا تھا۔

اب یہ بات بھی اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ حبشی ملازم اور زریں آپس میں ٹکرم ٹکری کیوں ہوئے ہیں۔ یقیناً زریں نے اس بھلے مانس سے بھی یہی پوچھا تھا۔ "تمہاری نظر میں کوئی ایسی لڑکی ہے جو اس سہانے موسم میں میرے کام آسکے۔" اس کے بعد اگر حبشی نے زریں کو دو ہتھڑ مارے تھے تو یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں تھی۔

زریں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بلراج نامی یہ انڈین درست کہہ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے زریں کو یقین آیا۔ اس کے بعد وہ اصرار کرنے لگا کہ وہ "متاثرہ" شخص سے معافی مانگے گا۔ انڈین بلراج نے کہا "خان صاحب! معافی کیسے مانگو گے' نہ تم اس کی بات سمجھتے ہو نہ وہ تمہاری۔"

زریں پر اخلاقیات کا بھوت سوار تھا' کہنے لگا "نہیں۔ ام اشاروں کنایوں میں اسے اپنی بات سمجھائے گا۔"

زریں کے کہنے پر بلراج اسے حبشی ملازم کی طرف لے گیا۔ بلراج تو فوراً واپس آگیا' زریں کی واپسی دو چار منٹ بعد ہوئی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں کسی کمرے کے اندر سے حبشی ملازم کی غصیلی آواز بلند ہو رہی تھی۔ زریں پھنکار کر بولا "عجیب واہیات شخص ہے یہ۔ پیار محبت کا بات سمجھتا ہی نہیں ہے۔ ام معذرت فرما رہا ہے وہ ام پر چیخ چلا رہا ہے۔ ام لعنت بھیجتا ہے ایسی معافی پر۔ بس ٹھیک ہے' جو ہو گیا سو ہو گیا' ام کو اس پر بالکل شرمندگی نہیں ہے۔"

"مگر ہوا کیا ہے؟" انڈین بلراج نے پوچھا۔

"وہ بہت بددماغ شخص ہے۔ ام سے فوراً لڑنے لگ پڑا ہے۔"

بلراج نے پوچھا "تم نے کیا کہا تھا؟"

"ام نے کیا کہنا تھا' بس معافی مانگا تھا۔"

"کیسے مانگا تھا؟"

تحقیق پر معلوم ہوا کہ زریں نے ہاتھ جوڑے تھے تاکہ حبشی کو معلوم ہوجائے کہ وہ معافی مانگ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اردو میں بھی معذرت طلب کی تھی۔

انڈین بلراج کے چہرے پر پھر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "خان صاحب! اسی لیے تو آپ سے کہا تھا کہ آپ نہ جائیں۔ آپ اپنی بات اسے سمجھا نہیں سکیں گے۔"

"سمجھانے کا کیا بات ہے۔ ام نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔" زریں نے دوبارہ پانچ سے ہاتھ جوڑ کر دکھا دیے۔

بلراج ہنستے ہوئے بولا "یہی تو مصیبت ہے۔ ہمارے ہاں ہاتھ جوڑنے کا مطلب معافی ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ "تم نے میرے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔ میں یہاں اپنا بدلہ نہیں لے سکا مگر وعدہ کرتا ہوں کہ قیامت کے روز تمہارے سینے پر چڑھ کر اپنا حساب چکاؤں گا۔"

"آ۔۔۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہا؟"

"میں سولہ آنے سچ کہہ رہا ہوں۔" بلراج نے جواب دیا۔

زریں کا چہرہ ایک بار پھر فق ہوگیا۔

بلراج نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "چلو۔۔۔ تراش ہونے کی بات نہیں ہے۔ میں خود تم دونوں کی صلح کرا دیتا ہوں۔" وہ زریں کو لے کر حبشی ملازم کی طرف چلا گیا۔

وہ رات سکون سے ہی گزری۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا مگر بوندا باندی رات بھر جاری رہی۔ ہم کل ساری رات کے جاگے ہوئے تھے مگر چوکس رہنا بھی ضروری تھا۔ پہلے پہر صفدر سو گیا۔ آخری پہر میں سو گیا اور صفدر نگرانی کرتا رہا۔ میں نو دس بجے کے قریب جاگا۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ کے باوجود ہوا میں خنکی موجود تھی۔ عمارت سے باہر پانی کی سطح کچھ نیچی ہوگئی تھی مگر خشک ہونے میں ابھی اسے کئی دن لگنے تھے۔ زریں گل سامنے برآمدے میں بیٹھا چاکلیٹ کھا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صفدر باتھ روم تک گیا ہے۔ میں نے پوچھا "چاکلیٹ کہاں سے لیے ہیں؟"

وہ بولا "اس ہندوستانی نے زبردستی دیا ہے۔ وہ ام سے کافی بے تکلف ہوگیا ہے۔"

"بے تکلف نہیں بے تکلف۔" میں نے تصحیح کی۔

زریں بولا "ہندو ہونے کے باوجود اچھا آدمی لگتا ہے۔ ویسے بھی بس نام کا ہندو ہے کام اس کے شریفانہ ہی ہیں۔"

"حبشی سے تمہاری صلح ہوگئی ہے؟"

"ہاں بلراج نے ہم دونوں کا جپھی ڈلوا دیا۔"

"رات کیسی گزری؟"

"کچھ نہ پوچھیں جی۔ غزالہ بی بی نے امارا ستیاناس کر دیا ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"کلثوم اچھا بھلا امارے ساتھ کمرے میں سونے لگا تھا۔ مگر غزالہ بی بی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں وہ دونوں باتیں کرنے لگا۔ ان کا باتیں اتنا لمبا ہوا اتنا لمبا ہوا کہ ام سو کر کانٹا ہوگیا۔ جتنا بھی مشہور مشہور غمگین گانا ہے سب ام نے دل میں گنگنا لیا مگر وہ نہیں آیا۔ آخر پتا نہیں کس وقت امارا آنکھ لگ گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلا تو باہر درختوں پر چڑیاں چہچہا رہا تھا اور کلثوم ساتھ والے پلنگ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔" زریں گل نے آہ بھری اور غم غلط کرنے کے لیے چاکلیٹ کا ایک اور پیکٹ پھاڑ لیا۔

اسی دوران میں صفدر بھی نہا کر آگیا۔ وہ بہت نکھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ خوب صورت بال، روشن آنکھیں، چوڑا سینہ اور مضبوط بازو جن پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایسا جاں نثار دوست تھا جس پر جتنا بھی ناز کیا جاتا کم تھا۔ صفدر نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی "اینا رکول کا ذرم (انسپکٹر تابش) کچھ پریشان نظر آرہا ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"کہیں مبارک امین سے اس کا رابطہ نہ ہوگیا ہو۔"

"بظاہر تو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی۔" میں نے کہا "ٹیلی فون تو یہاں ہے نہیں۔ نہ کوئی باہر سے یہاں آیا ہے نہ یہاں سے باہر گیا ہے۔"

"واکی ٹاکی یا وائرلیس وغیرہ بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"تم دور دراز کے اندیشوں کی بات کر رہے ہو۔ تابش اگر پریشان ہے تو اس کی ایک ہزار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی پریشانی ایسے بے راہ رو لوگوں کا نصیب ہوتی ہے۔"

ہم دونوں دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے اور آئندہ کا لائحہ عمل بناتے رہے۔ اسی دوران میں ہم نے ناشتا بھی کیا۔ زریں، غزالہ اور کلثوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہاں بدر ناشتے میں شریک نہیں تھی۔ وہ بہت خاموش اور گم صم تھی۔ ظاہر ہے بچوں سے بچھڑنے کا غم تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے مستقبل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ تو غزالہ اور کلثوم کی دو

سے اس کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی، ورنہ وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتی۔ اس کا پاؤں غیر متوقع تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا۔

دوپہر کے قریب زریں گل ایک انکشاف انگیز خبر لے کر آیا۔ یہ خبر اس تک اپنے انڈین دوست بلراج کے ذریعے پہنچی تھی۔ ہمارے اندازے کے مطابق بلراج اسی فلمی یونٹ کا حصہ تھا جو انسپکٹر تابش کے گھر بالائی منزل پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ زریں گل نے بڑے دل گرفتہ لہجے میں بتایا کہ یہ لوگ بے ہودہ فلموں کا کام کرتے ہیں۔ ان دنوں بھی یہ لوگ ایک عریاں فلم بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس فلم کی کچھ شوٹنگ انہوں نے ساحلی علاقے میں بھی کی ہے اور تین چار مقامی لڑکیاں بھی اس فلم میں کام کر رہی ہیں۔

نجانے کیا بات تھی کہ زریں کی بات سنتے ہی مجھے یقین آگیا۔ شاید میرے ذہن میں پہلے سے ہی ان لوگوں کے بارے میں کوئی اچھا تاثر موجود نہیں تھا۔ یہ مادر پدر آزاد قسم کے لوگ تھے اور ان کی ہر حرکت سے فحاشی ٹپکتی تھی۔ فلمی لوگوں میں بھی بہت سلجھے ہوئے اور شائستہ قسم کے لوگ نظر آجاتے ہیں لیکن "رنگ باز لوگ" تخلیق کاروں سے بالکل علیحدہ پہچانے جاتے ہیں اور یہ لوگ مجھے تخلیق کار نہیں رنگ باز نظر آئے تھے۔

زریں گل بولا "امارا تو یہ سوچ سوچ کر دماغ خراب ہو رہا ہے کہ بدر جیسی گھریلو عورت کو ایسے منحوس کام کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ ان بدبختوں کو کچھ اور نظر نہیں آیا تھا۔"

"شیطان عقل پر پردہ ڈالتا ہے تو پھر ایسے ہی کام ہوا کرتے ہیں۔"

زریں بولا "ام نے اس انڈین (بلراج) کو کہا ہے کہ تم ایسے منحوس کام کے لیے ایک بال بچے دار گھریلو عورت کو لے آیا ہے، آخر تم نے بھی مرنا ہے۔ کیا منہ دکھائے گا خدا کو۔ وہ حرامی آگے سے ہنسنے لگا۔ بولا "یہ تو اس عورت کا خوش قسمتی ہے کہ اسے فلم کے لیے چنا گیا ہے۔ آٹھ دس روز میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا اور ایک مہینے میں تو وہ اتنا خوش ہو جائے گا کہ جوجی صاحب اسے واپس بھی بھیجنا چاہے گا تو وہ نہیں جائے گا۔" وہ کہتا ہے کہ ام کوئی پہلی دفعہ یہاں نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی ام نے دو تین فلمیں یہاں بنایا ہے۔"

"کافی خرانٹ لوگ لگتے ہیں یہ۔" میں نے کہا۔

زریں گل بولا "استاد صیب! ام کس قدر گندے ماحول میں ہے۔ خدا کی قسم امارا تو دم گھٹنے لگا ہے یہاں۔۔۔ اس چار بچوں کی ماں کو دیکھ دیکھ کر اتنا ترس آرہا ہے کہ ام لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں ام کو بدر سمیت جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

اسی دوران میں صفدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے زریں گل کی اطلاع سے آگاہ کیا اس کے چہرے پر بھی تشویش اور تلخی کے آثار نمودار ہوگئے۔ میری اور صفدر کی گفتگو کے دوران میں زریں گل اٹھ کر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے "اوغ اوغ" کی آوازیں آئیں۔ زریں گل قے کر رہا تھا۔ میں اور صفدر باتھ روم میں پہنچے۔ زریں گل نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں حلق میں گھسیڑی ہوئی تھیں اور واش بیسن پر جھکا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس نے جان بوجھ کر قے کی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ منہ دھو کر تولیے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ وہ پہلی بار اتنا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ "یہ کیا ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ عجیب لہجے میں بولا "امارے سینے میں آگ سا لگا ہوا تھا استاد صیب! ام نے اس بدکار انڈین کے ہاتھ سے لے کر چاکلیٹ کھایا تھا۔ وہ چاکلیٹ امارے جسم میں رہ جاتا تو ام کو اپنے آپ سے نفرت ہو جاتا۔ ام سچ کہہ رہا ہے۔ امارا دم گھٹ رہا ہے اس بدبودار ماحول میں۔ ام کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

زریں گل اپنے حساب سے ٹھیک کہہ رہا تھا مگر اتنی جلدی یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ کھیت کھلیان اور راستے، سب کچھ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی پھر اندھیرا سا چھا گیا۔ گہرے بادل امڈ آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بار پھر تیز بارش شروع ہوگئی۔ قریباً ویسا ہی منظر تھا جیسا کل صبح سویرے دکھائی دیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ فلمی یونٹ آج پھر ہلا گلا کرے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، کوئی سفید فام نظر آیا اور نہ سیاہ فام۔ ایک دو خوب رو چہرے بالکونی میں نظر آئے لیکن وہ بھی لٹکے لٹکے تھے۔ اسی اثنا میں میری نگاہ انسپکٹر تابش پر پڑی۔ وہ ایک کمرے سے نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بالائی منزل پر چلا گیا۔ صفدر نے درست ہی کہا تھا، وہ خاصا پریشان بلکہ الجھا ہوا نظر آتا تھا۔

"کوئی گڑبڑ ہے یہاں۔" صفدر نے کہا۔

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" میں نے کہا "انسپکٹر تابش تو چپ ہے ہی، دوسرے لوگ بھی کچھ خوش نہیں ہیں۔ کل بارش دیکھ کر وہ جس طرح چیخے چلائے تھے آج اس کے برعکس کر رہے ہیں۔"

"آپ پوچھ کر دیکھیں انسپکٹر تابش سے۔" صفدر نے

مشورہ دیا۔

"مگر وہ تو ہمارے پاس ہی نہیں پھٹک رہا۔" میں نے کہا۔

اوپر کی منزل میں ہلچل نظر آرہی تھی۔ دروازے کھل رہے تھے بند ہو رہے تھے فرش سے چھت تک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ہم کن انکھیوں سے اس کارروائی کو دیکھتے رہے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پریشانی کے عالم میں کچھ تلاش کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ تلاش بالائی منزل سے نچلی منزل پر آ گئی۔ ہمارے کمروں کو بھی کھنگالا گیا۔ ہر کونے کھدرے میں جھانکا گیا۔ میں نے انسپکٹر تابش سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک قیمتی کیمرا نہیں مل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے معذرت بھی کی کہ انھوں نے ہمارے کمروں کی تلاشی بھی لی ہے۔ وہ بولا "ہم سوچ رہے تھے کہ شاید کسی ملازم نے یہ حرکت کی ہو اور کیمرا کسی ایسی جگہ چھپا دیا ہو جہاں ہمارا دھیان ہی نہ جائے۔"

"کب گم ہوا ہے کیمرا؟" صفدر نے پوچھا۔

"کل شام تک تو تھا۔" تابش نے گول مول جواب دیا۔ "کل شام سے تو کوئی یہاں سے گیا ہے اور نہ آیا ہے۔"

"یہی بات تو پریشان کن ہے۔" تابش نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دیکھ رہے تھے کہ تابش اور جوجی سمیت سات افراد گھٹنے گھٹنے پانی میں چلتے عمارت سے باہر جا رہے ہیں۔ تابش سمیت کم از کم چار افراد مسلح تھے۔ کچھ آگے جا کر پانی مزید گہرا ہو گیا اور ان کی کمر تک پہنچ گیا' تاہم جلد ہی وہ نسبتاً بلند راستے پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک جیپ موجود تھی۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور وہ سب اس میں بیٹھ گئے۔ جیپ پانی میں بڑی بڑی لہریں پیدا کرتی جنوب کی طرف روانہ ہو گئی۔ کئی بار یوں لگا کہ زیادہ پانی کی وجہ سے جیپ کا انجن بند ہو جائے گا لیکن... ڈرائیور اور جیپ دونوں ذہین نکلے۔ جیپ جیسے جیسے آگے بڑھتی رہی اور درختوں کے جھنڈ کے عقب میں اوجھل ہو گئی۔

"معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔" صفدر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بندہ تو نہیں گم ہو گیا ان کا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جنگلوں میں جنگل کا قانون ہی چلتا ہے۔"

"لیکن اب ایک بات اور بھی ہے پیارے۔" میں نے کہا "صورتِ حال ہمارے لیے بھی خطرناک ہو گئی ہے۔ ابھی تک تو انسپکٹر گھر میں پھنسا ہوا تھا' اب باہر نکلا ہے' معلوم نہیں کس کس سے ملے گا۔"

"ہاں یہ خطرہ تو اب چمکتی تلوار بن گیا ہے۔" صفدر نے تائید کی "مبارک امین یا اس کا کوئی کارندہ کسی بھی وقت ہمارا بھانڈا پھوڑ سکتا ہے۔"

"پھر کیا خیال ہے' کوچ کرنے کے لیے تیاری پکڑلی جائے۔"

"پانی میں اترنے کی تیاری تو یہی ہوتی ہے کہ لنگر لنگوٹ کس لیا جائے' ہم تو یہ تیاری پکڑلیں گے' عورتوں کا مسئلہ ہے۔" صفدر نے کہا۔

"ایک مسئلہ اور بھی ہے۔" میں نے کہا "ہمیں تو یہ لوگ شاید جانے دیں لیکن بدر کو ہرگز نہیں جانے دیں گے۔ وہ تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ بدر کی قیمت چکا کر اسے یہاں لایا گیا ہے۔"

"پھر کیا ہونا چاہیے؟"

ابھی ہم صلاح مشورہ ہی کر رہے تھے کہ گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہی جیپ واپس آ رہی تھی جس پر آدھ پون گھنٹا پہلے انسپکٹر تابش اور دوسرے لوگ یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا' کہیں انسپکٹر تابش پر ہماری حقیقت تو ظاہر نہیں ہو گئی تھی۔ پانی میں بڑی بڑی لہریں پیدا کرتی جیپ واپس عمارت کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔ تمام افراد اس میں سے نکل آئے۔ انسپکٹر تابش اور جوجی سب سے آگے تھے۔ جوجی کے پیچھے آنے والے ایک امریکی کے ہاتھ میں کوئی خون آلود جانور تھا۔ دور سے تو ہمیں یہی لگا کہ شاید وہ لوگ کوئی شکار کر کے لائے ہیں۔ جب وہ پانی سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ایل سیشن کتے کی لاش ہے۔ چھوٹا سا سفید کتا خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ غالباً اسے کسی تیز دھار آلے سے ہلاک کیا گیا تھا۔ جوجی اور اس کے ساتھیوں کے چہرے بھی ستے ہوئے تھے۔

چند منٹ بعد بالائی منزل سے کسی عورت کے رونے اور بلند آواز سے بولنے کی صدا آنے لگی۔ اس کے جواب میں گاہے گاہے ایک بھاری مردانہ آواز بھی سنائی دے جاتی تھی' یقینی طور پر یہ آواز فلمی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر جوجی صاحب کی تھی۔ یہ شور شرابا بہتر طور پر سننے کے لیے میں سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ آوازیں اب نسبتاً صاف سنائی دے رہی تھیں۔

ان آوازوں کو سننے سے انکشاف ہوا کہ ہمارا اندازہ

درست تھا۔ بات صرف کیمرے کی گمشدگی کی نہیں تھی۔ کیمرے کے ساتھ ساتھ یونٹ کی ایک لڑکی بھی گم ہو گئی تھی۔ ابھی جو کتا مردہ حالت میں جنگل سے لایا گیا تھا وہ اسی لڑکی کا تھا۔ مزید تھوڑی دیر بعد انکشاف ہوا کہ چیخنے چلانے والی عورت جوجی کی گرل فرینڈ نما بیوی تھی اور جو لڑکی گم ہوئی تھی وہ اس کی بہن یعنی جوجی کی سالی تھی۔ حیرانی کی بات تھی۔ یہ لوگ کسی نیک مقصد کے تحت یہاں موجود نہیں تھے۔ یہ شیطان کے "دستِ راست" یہاں عریاں فلم بنا رہے تھے۔ ایسا منحوس کام کرنے والا شخص اپنی مبینہ بیوی اور سالی کو بھی ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ شاید اس کا کوئی بچہ ہوتا تو وہ اسے بھی ساتھ لانے سے نہ چوکتا۔ انسان ماحول کا حصہ بن جاتا ہے اور برے بھلے کے معیار بہت جلد اس کے لیے بدل جاتے ہیں۔ یہ لوگ فلم میکر تھے۔ ان کا روزگار یہی تھا۔ غالباً یہ لوگ اس بدبودار دھندے کو بھی معمول کا کاروبار ہی سمجھتے تھے جیسے جنرل اسٹور چلایا جاتا ہے' کتابیں چھاپی جاتی ہیں' یا کوئی فیکٹری لگائی جاتی ہے۔ انھیں اس کام میں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی اور اگر آتی بھی تھی تو وہ اسے جدت' ماڈرن ازم اور "عین فطرت" کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے تھے۔ اگر جوجی اسے شرمناک کام سمجھتا تو اس کے ساتھ اس کی بیوی اور سالی یہاں کیوں ہوتی۔

اس کی بیوی یا گرل فرینڈ جو بھی تھی چلا رہی تھی "تم جھوٹ بولتے ہو' میں نے تمھیں پچاس بار کہا تھا کہ کرسٹی کو ساتھ نہ لاؤ۔ مگر... مگر تم ہٹ دھرم ہو' جو بات منہ سے نکل جائے نکل جاتی ہے۔"

"میں اسے باندھ کر تو یہاں نہیں لایا تھا۔" جوجی جواباً چیخا "وہ نہ آنا چاہتی یا تم اسے نہ لانا چاہتیں تو وہ کیوں آتی۔ وہ برباد کرنے کے خیال میں تھی اور اندر سے تم بھی یہی چاہتی تھیں۔ تمھارے سامنے میں نے اسے بار بار سمجھایا تھا' کل پرسوں یہاں بیٹھ کر میں نے اس سے کیا کہا تھا؟" جوجی نے ذرا توقف کیا اور بولا "میں نے اسے کہا تھا کہ اسے کیلی بونیا نہ سمجھے' یہ پس ماندہ علاقہ ہے۔ یہاں کا ماحول بالکل اور ہے' اچھے لوگ نہیں ہیں' دن دہاڑے جرم ہوتے ہیں۔ اسے باہر نکلنا ہی ہو تو ساتھ کسی کو لے کر جائے۔ وہ بھی ضدی ہے تمھاری طرح۔ کسی کو ساتھ لے جانا دور کی بات گھروزہ فول کسی کو بتا کر بھی نہیں گئی۔"

"جوجی! دیکھو مجھے یہ تقریر نہیں چاہیے۔" عورت دہائی آواز میں بولی "مجھے کرسٹی لا کر دو۔ جہاں سے مرضی لا دو۔ ورنہ باقی گاڑ میں بھی شوٹ کر لوں گی خود کو... تمھارے سامنے اسی جگہ کھڑے ہو کر گولی ماروں گی اپنے سر میں۔" وہ چیخنے لگی۔

یہ عجیب و غریب صورتِ حال تھی۔ کل سویرے اچانک زوردار بارش ہو گئی تھی۔ اس وقت یہاں کے سارے مکین بہت خوش اور مست تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی اس وقت تک غائب نہیں ہوئی تھی۔ بارش کے بعد چاروں طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ اس عمارت میں آمد و رفت ناممکن ہو گئی تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک لڑکی اپنے کتے اور کیمرے کے ساتھ یہاں سے نکل جاتی۔ نہ صرف نکل جاتی بلکہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔

میرے کانوں میں بار بار وہ الفاظ گونج رہے تھے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے جوجی صاحب نے بولے تھے۔ اس نے کہا تھا "یہ پس ماندہ علاقہ ہے' یہاں کا ماحول بالکل اور ہے۔ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ دن دہاڑے جرم ہوتے ہیں۔"

اس کے منہ سے یہ الفاظ کتنے بھونڈے اور مضحکہ خیز محسوس ہوئے تھے۔ وہ خود علی الاعلان ذلت کے گڑھے میں گرا ہوا تھا اور اس گڑھے کے اندر سے دوسروں کو کریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر رہا تھا۔ یہ الفاظ گند پھیلانے والے کو ہی سب سے زیادہ بدبودار آ رہی تھی۔ یہ اچھائی برائی کے معیار بدلنے کی ایک واضح ترین مثال تھی۔

میں نے صفدر اور زریں گل کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی معاملے کی سنجیدگی کو شدت سے محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جوان لڑکی کا جنگل میں نکل جانا واقعی ایک فاش غلطی تھی۔ اب اس کا کتا مردہ حالت میں ملا تھا' خود اس کے ساتھ نجانے کیا ہوا تھا۔

پانچ دس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ انسپکٹر تابش کے ملازمین گیراج میں کھڑی ہوئی دو گاڑیاں باہر نکال رہے تھے۔ ایک گاڑی پہلے ہی باہر موجود تھی۔ وہ سب لوگ ایک بار پھر جنگل میں تلاش کے لیے نکل رہے تھے۔ اس مرتبہ جوجی کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ درمیانی عمر کی ایک بے کشش سی عورت نظر آتی تھی۔ چہرے پر جھائیاں سائے اور آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ جانے سے پہلے انسپکٹر تابش میرے پاس آیا۔ گمبیر لہجے میں بولا "ہمیں ایک مسئلہ پیش آ گیا ہے۔ یونٹ کی ایک لڑکی نہیں مل رہی ہے۔ اس کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے ملازم شالے سے کہہ دینا۔ وہ انگلش سمجھ لیتا ہے۔"

میں نے تاسف کا اظہار کیا اور کہا کہ کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ تابش نے کہا "بس تم لوگ چاہو

دیواری کے اندر ہی رہو۔ کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو میں بتاؤں گا۔"

وہ لوگ افراتفری میں وہاں سے چلے گئے۔ تینوں گاڑیاں تین مختلف اطراف میں روانہ ہوئی تھیں۔ اندین بلراج ساتھ نہیں گیا تھا۔ اس کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سوجی ہوئی تھیں۔ لڑکی کی گمشدگی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ سب اس پر تبصرہ کر رہے تھے۔

میں نے بلراج سے کہا "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی' کل جب بارش میں سب لوگوں نے ہلا گلا کیا' لڑکی یہیں پر تھی۔ اس کے بعد چاروں طرف پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ ہم نے یہاں کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ کب یہاں سے نکل گئی۔"

بلراج بولا "وہ بدبخت بہت سیلانی ہے۔ نشہ وغیرہ بھی کرتی ہے۔ کل جس وقت سب لوگ بارش میں نہا رہے تھے' وہ یہاں سے جا چکی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سب نے یہی خیال کیا کہ وہ کمرے میں سوئی پڑی ہوگی۔ کافی دروازہ کھٹکھٹایا گیا مگر وہ نہیں کھلا۔ آج نو دس بجے تک بھی وہ کمرے سے نہیں نکلی تو اس کی بہن یعنی جوتی صاحب کی بیوی کا ماتھا ٹھنکا۔ پہلے وہ دروازہ کوٹتی رہیں پھر کمرے کی عقبی جانب گئیں۔ یہاں کھڑکی اندر سے بند نہیں تھی۔ کھڑکی کھلی تو کمرا خالی تھا۔ کرسٹی کا کتا کہیں نظر آ رہا تھا اور نہ دس ہزار ڈالر کا قیمتی کیمرا۔ بس اسی وقت سے بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہے۔ بھگوان کرپا کرے "آثار کچھ اچھے نہیں دکھتے۔"

"کیمرے کے غائب ہونے کا کیا مطلب ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہ تو کرسٹی لے کر گئی ہوگی۔ اس پر جنگل میں گھومنے اور مووی بنانے کا خبط سوار ہو رہا تھا۔ یہی لگتا تھا کہ جنگل میں کہیں آگے نکل گئی ہے اور اوباشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔"

ہم بھی کوئی ایسے نیکوکار اور صالح حضرات نہیں تھے۔ کوشش کے باوجود بے شمار کوتاہیاں ہم سے سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔ اس فلمی یونٹ کے ارکان کے منہ سے دوسروں کے لیے برائی' جرم اور بدمعاشی جیسے الفاظ سن کر بہت عجیب لگتا تھا۔

اس وقت صورتِ حال ہمارے لیے کچھ سازگار تھی۔ ہم چاہتے تو بدر سمیت یہاں سے نکلنے کی ایک کامیاب کوشش کر سکتے تھے۔ انسپکٹر تابش اور فلم ڈائریکٹر جو سمیت بیشتر افراد یہاں موجود نہیں تھے۔ اندین بلراج کو ملا کل تین چار مرد ہوں گے۔ باقی لڑکیاں تھیں' جس جیپ گاڑی پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ بھی گیراج میں موجود تھی۔ میرے اور زریں گل کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا بھی میرے لباس کے نیچے موجود تھا۔

میری ہدایت پر زریں گل نے عمارت کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس نے رپورٹ دی کہ یہاں کل پانچ عورتیں موجود ہیں اور پانچوں بالائی منزل پر ہیں۔ ان میں ایک درمیانی عمر کی نیگرس ہے' چار سفید فام ہیں۔ مردوں کی تعداد چار تھی۔ ان میں عمارت کے گیٹ پر موجود مسلح سنتری بھی شامل تھا۔

پوری پلاننگ کے بعد میں اور صفدر ٹہلتے ہوئے بالائی منزل پر گئے۔ اتفاقاً پانچوں عورتیں کچن میں موجود تھیں۔ نیگرو برتن دھو رہی تھی' باقی چاروں کوکنگ میں مصروف تھیں۔ یقیناً وہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہوں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو یقیناً کوکنگ کے ساتھ ساتھ میوزک سن رہی ہوتیں اور کچن میں ان کے مست قہقہے گونج رہے ہوتے مگر اپنی ایک ساتھی کی گمشدگی نے انہیں افسردہ کر رکھا تھا اور وہ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھیں۔ میں دبے قدموں آگے کیا اور بڑی آہستگی سے کچن کا دروازہ باہر سے بند کر دیا' صفدر نے نیچے کمرے سے ایک پرانا تالا ڈھونڈ لیا تھا' یہ تالا اس نے دروازے میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم مرد حضرات کی طرف متوجہ ہوئے۔ صرف سنتری کے پاس رائفل تھی' باقی سب غیر مسلح تھے' کم از کم فی الوقت تو ان کے پاس ہتھیار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ کون شخص کہاں موجود ہے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ ہمیں ان تک پہنچنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ لڑکیوں میں سے کسی نے کچن کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر انہوں نے دھڑ دھڑ دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ جب پھر بھی دروازہ نہیں کھلا تو ایک ساتھ دو تین لڑکیاں چیخنے لگیں۔ دراصل وہ پہلے ہی خوف زدہ تھیں' اب مختصر کچن میں بند ہو کر مزید ڈر گئی تھیں۔ ان کی چیخ پکار سن کر نیچے سے دو افراد بھاگے ہوئے پہنچے۔ میں اور صفدر ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔ پہنچنے والوں میں ایک تو اندین بلراج تھا دوسرا طوطے کی ناک والا ایک دبلا پتلا امریکی۔ انہوں نے کچن کا دروازہ کھولا مگر وہاں بھاری بھرکم تالا لگا تھا "یہ تالا کس نے لگا

عشق کا عین

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

خوبصورت گرد و پیش اور عمدہ طباعت کیساتھ

قیمت ۱۳۵/ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ :

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰- عزیز مارکیٹ اُردو بازار ، لاہور ۔ فون : ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ : علی بک سٹال

نسبت روڈ ، چوک میو ہسپتال ، لاہور۔

طوطے کی ناک والا امریکی چیخا۔

اسی اثناء میں باقی دونوں افراد بھی پہنچ گئے۔ دونوں سیاہ فام تھے ایک سنتری تھا اور دوسرا گھریلو ملازم۔ چاروں افراد ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تو انہیں ہینڈز اپ کرانا ہمارے لیے چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ صفدر رائفل بدست دروازے کی اوٹ سے نکلا اور کڑک کر انہیں ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر آرام سے رائفل سنتری کے کندھے سے اتار لی۔ یہ منظر دیکھ کر اندر بند لڑکیاں ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔ وہ سب کی سب کھڑکی کی گرل سے چمٹ گئی تھیں اور باہر نکالنے کے لیے ہماری منت سماجت کر رہی تھیں۔ جو ڈش وہ بنا رہی تھیں وہ جل گئی تھی اور اس کی بو تیزی سے پھیل رہی تھی مگر انہیں کچھ خبر نہیں تھی۔

ہم نے چاروں مرد حضرات کو پہلے تلاشی کے مرحلے سے گزارا پھر ایک محفوظ باتھ روم میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب کسی قسم کا ذرا خطرہ نہیں تھا۔ ہم اطمینان سے نیچے آئے۔ انسپکٹر تابش کے کمرے سے کچھ کرنسی حاصل کی۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ایک کمرا "جوجی صاحب" کے آفس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں دیواروں پر عریاں تصویریں لگی تھیں۔ زریں گل نے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر میز پر ڈھیر لگا دیا۔ وہ تو اس ڈھیر کو آگ دکھانے کے چکر میں تھا لیکن ہم نے اسے سمجھایا' یہ خطرناک کام تھا' آگ بھڑک سکتی تھی۔ اور بالائی منزل پر ہم آٹھ نو افراد کو مقفل چھوڑ آئے تھے۔ جوجی کے کمرے سے ہمیں ایک واکی ٹاکی سیٹ بھی مل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ ویگن نما جیپ میں سوار اس عمارت سے باہر نکل رہے تھے۔ بدر اور اس کا بچہ ہمارے ساتھ تھے۔ عمارت سے باہر جمع ہونے والا بارش کا پانی اب کافی حد تک اتر گیا تھا۔ ہماری گاڑی کسی خاص مشکل کے بغیر وہاں سے گزر گئی۔ میں اور صفدر طے کر چکے تھے کہ اب مقامی پولیس سے رابطہ نہیں کریں گے۔ ہمیں اب کسی نہ کسی طور قریبی قصبے دارگورو میں پہنچنا تھا۔ یہاں سے ہمیں "ارنگا" جانے والی بس مل سکتی تھی۔ ایک دفعہ ہم "ارنگا" پہنچ جاتے تو پھر نہ صرف ہمارے بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی بلکہ سفارت کاروں سے بھی ہمارا رابطہ ہو سکتا تھا۔ اصل مسئلہ "ارنگا" تک پہنچنے کا تھا۔ جس گاڑی میں ہم سفر کر رہے تھے یہ بری طرح مشکوک ہو چکی تھی۔ ہم جتنی جلدی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتے اتنا ہی اچھا تھا۔ ہمارے اردگرد قریباً جنگل ہی تھا۔ کچے راستے پر چار پانچ کلومیٹر سفر کرنے کے بعد ہم نے مبارک امین کی گاڑی گھنے درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپا دی۔ اس کے بعد دشوار گزار راستے پر ہمارا سفر پیادہ شروع ہوا۔ شام کی دھندلاہٹ اب رات کے گہرے اندھیرے میں بدل گئی تھی۔ یہ اندھیرا سفر کو مشکل تو بنا رہا تھا مگر سفر کے رسک کو کم کر رہا تھا۔ میں اور زریں گل بدستور مقامی لباس میں تھے۔ جب تک اندھیرے میں ہمیں قریب سے نہ دیکھا جاتا' یقیناً مقامی ہی سمجھا جاتا۔ غزالہ کلثوم اور بدر سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ صرف صفدر غیر مقامی لباس میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر راستے میں ہمیں کوئی مل بھی تو ہم پر خصوصی توجہ نہیں دے گا۔ بدر کا پاؤں بھی اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ہم ایک چھوٹے سے قصبے کے پاس سے گزرے۔ یہاں زیادہ تر گھر کچے تھے۔ چند گول جھونپڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ گھروں سے باہر بکریاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ہم قصبے سے کنی کتراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں سب سے آگے اور صفدر سب سے پیچھے تھا۔ راستہ دیکھنے کے لیے میں گاہے گاہے ایک دو سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کر لیتا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ دیر پہلے اس راستے پر سے کوئی جیپ وغیرہ گزر کر گئی ہے۔ ٹائروں کے نشانات میں نے صفدر کو بھی دکھائے۔ ابھی ہم قصبے سے دو تین فرلانگ ہی آگے گئے تھے کہ گھنے درختوں میں کئی روشنیاں چمکتی نظر آئیں۔ یوں لگا کہ یہاں کافی لوگ جمع ہیں۔

"یہ کیا چکر ہے۔" صفدر نے کہا "جنگل میں منگل نظر آ رہا ہے۔"

"ابھی جو قصبہ دیکھا تھا' شاید یہ اسی کے لوگ ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

ہم محتاط ہو گئے۔ میں نے صفدر اور زریں گل سے بھی کہہ دیا کہ وہ اب ٹارچ نہ جلائیں۔ ہم ڈیڑھ سو گز آگے گئے تو روشنیاں مزید واضح دکھائی دینے لگیں۔ یہ لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنیاں تھیں۔ ٹارچیں وغیرہ بھی گردش کر رہی تھیں۔ روشنیوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ قصبے کی طرف سے کچھ اور لوگ آ کر بھی ہجوم میں شامل ہو رہے ہیں۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا "صفدر! کہیں یہ گمشدہ لڑکی والا معاملہ ہی تو نہیں؟"

"میں بھی بالکل یہی بات سوچ رہا تھا۔" صفدر نے کہا۔

"کیا خیال ہے؟ دیکھنا چاہیے؟" میں نے کہا۔

صفدر کے بجائے غزالہ بولی "رہنے دیں۔ ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا

چاہیے۔"

اسی دوران میں ہوا کے دوش پر تیر کر ایک آواز آئی۔ یہ کسی کے رونے کی آواز تھی۔ میں نے دیکھا کہ میری طرح صفدر بھی متجسس نظر آ رہا ہے۔ میں نے صفدر کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ ان لوگوں کو لے کر یہیں رکے' میں دیکھ کر آتا ہوں۔

میری مدھم آواز بھی غزالہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ پھر اصرار کرنے لگی کہ ہمیں چلتے رہنا چاہیے۔ میں نے کہا "لیکن چلنے کے لیے راستہ ضروری ہوتا ہے۔ جس راستے پر ہم جا رہے ہیں قریباً اسی راستے پر یہ ہجوم موجود ہے۔ دیکھنا تو چاہیے کہ مسئلہ کیا ہے۔ اس دوران میں تم لوگ تھوڑا سا ستا بھی لو۔ یہ گھنے درخت ستانے کے لیے بالکل محفوظ ہیں۔"

بدر بھی شاید کچھ تھک گئی تھی۔ وہ وہیں ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر دم لینے کے لیے بیٹھ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر غزالہ اور کلثوم بھی بیٹھ گئیں۔ میں نے صفدر اور زریں کو چوکس رہنے کا کہا اور درختوں میں چلتا ہوا روشنیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ رائفل میں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے چغے میں چھپالی تھی' سر اور چہرہ عمامہ ٹائپ کے کپڑے میں لپیٹ لیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں موقع پر پہنچ گیا۔ یہاں سو ڈیڑھ سو افراد جمع ہو چکے تھے۔ گہری تاریکی اور ہجوم میں ایک دوسرے کو پہچاننا خاصا دشوار کام تھا۔ مجمع کی توجہ اپنے مرکز کی طرف تھی۔ لوگوں کے درمیان گھس کر میں بھی ذرا آگے آیا۔ گیس لیمپس کی روشنی میں مجھے ایک لاش نظر آئی۔ یہ امریکن لڑکی کی لاش تھی۔ اس کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سفید چادر پر خون کے چھوٹے بڑے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ان دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ چادر کے نیچے بدنصیب لڑکی کا جسم برہنہ ہے۔ اپنے چہرے مہرے سے بمشکل اٹھارہ بیس سال کی نظر آتی تھی۔ اس کے سنہری بال بھی کیچڑ اور خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر نیل اور خراشیں تھیں۔ لاش کے قریب ہی مجھے لمبے سفید بالوں والا جوجی اور اس کے دو رفقائے کار نظر آئے۔ ان کے چہرے برف کی طرح سفید ہو رہے تھے۔

پھر میری نگاہ جوجی کی بیوی پر پڑی۔ وہ زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ننگ دھڑنگ افریقی جس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹی اور چہرے پر نقش و نگار تھے' جوجی کی بے ہوش بیوی کے قریب اکڑوں بیٹھا تھا اور اس پر کوئی جنتر منتر پڑھ رہا تھا۔ یہ کوئی مقامی معالج تھا۔ معالج کا نوجوان اسسٹنٹ گاہے گاہے ایک رقیق دوا لکڑی کے چمچ کے ذریعے بے ہوش عورت کے منہ میں ٹپکا دیتا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی میں امریکن عورت کی پلکیں لرزاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہوش میں آ رہی ہے۔ پھر دو ہٹے کٹے افریقی لمبی لاٹھیاں لے کر وہاں آ گئے وہ بلند آواز میں بول بول کر ہجوم کو منتشر کرنے لگے۔ لوگ منتشر تو نہیں ہوئے مگر انہوں نے اپنا دائرہ وسیع کر دیا۔ میں بھی چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک بار پھر رونے دھونے کی کربناک آواز بلند ہونے لگی۔ یہ جوجی کی بیوی ہی کی آواز تھی۔ وہ اب ہوش میں آ گئی تھی اور اپنی جواں سال بہن کا ماتم کر رہی تھی۔ اس کی چیخ کرلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "ہائے' وحشیوں نے میری پھول سی بہن کو مسل کچل دیا۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی اس کی ماں کو۔ ہائے میں کیا کروں گی۔"

پھر جوجی کی آواز سنائی دی "حوصلہ کرو ہنی۔ ہمت سے کام لو۔ ہم.... ہم بدلہ لیں گے کرسٹی کا۔ جن بدمعاشوں نے اس کی جان لی ہے ان کی بوٹیاں ہم اپنے کتوں کو ڈالیں گے۔" اس کے ساتھ ہی جوجی تماشائیوں سے مخاطب ہو کر دہاڑا "یہاں تمہاری ماں ناچ نہیں رہی ہے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

وہ انگریزی میں دہاڑا تھا مگر اس کا غصہ تو لوگ دیکھ ہی رہے تھے' وہ دائیں بائیں منتشر ہونے لگے۔ جوجی کو دیکھ کر اس کا ایک ساتھی بھی رائفل لہرا کر دہاڑنے لگا۔ اب میرا یہاں رکنا ممکن نہیں تھا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ ہی پیچھے ہٹ آیا اور پھر گھنے درختوں میں داخل ہو گیا۔

میری سوچوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مکافاتِ عمل کی ایک جیتی جاگتی مثال میں نے ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اور یہ ایسی مثال تھی جس سے جتنی بھی عبرت پکڑی جاتی کم تھی۔ ابھی جوجی چیخ چیخ کر کچھ نامعلوم لوگوں کو بدمعاش کہہ رہا تھا' چند سیکنڈ پہلے اس کی بیوی نے بھی روتے ہوئے ان "لوگوں" کو وحشیوں کا خطاب دیا تھا۔ وہ بدمعاش اور وحشی کون تھے جنہوں نے ایک جوان لڑکی کو جنگل میں گھیرا تھا اور نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا تھا۔ وہ بدمعاش اور وحشی جو کوئی بھی تھے وہ ماں کے پیٹ سے ایسے برآمد نہیں ہوئے تھے' انہیں اس معاشرے نے برباد کیا تھا' ان کے قرب و جوار نے برباد کیا تھا۔ جوجی جیسے لوگوں نے ان کے ماحول میں جو گند بھرا تھا اسی کی بدبو سے ان کے دماغ ماؤف ہوئے تھے۔ کیا پتا کہ ان لوگوں کو بدمعاش اور وحشی بنانے

میں جوجی کی تخلیق کی ہوئی "شاہکار" نظموں کا ہی عمل دخل ہو۔ اگر ایسا تھا تو پھر کرسٹی کی موت پر حیران ہونے اور اس کے قاتلوں کا کھوج لگانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو بس ایک برائی تھی جو اس جنگل میں چکر کاٹ کر اپنے خالقوں کی طرف لوٹ آئی تھی۔ کسی کی موت پر رونے والوں پر ہمیشہ ترس آتا ہے مگر پتہ نہیں کیا بات تھی مجھے جوجی کی روتی چلاتی بیوی پر بالکل ترس نہیں آیا تھا۔

میں واپس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ میں انہیں کرسٹی کی موت کا بتا کر خوف زدہ کرنا نہیں چاہتا تھا' خاص طور سے خواتین پر تو یہ اطلاع بہت منفی اثر کر سکتی تھی میں نے انہیں صرف یہ بتایا کہ جوجی کی سالی زخمی حالت میں مل گئی ہے۔ ایک مقامی معالج دیسی طریقے سے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا' اب وہ ہوش میں آگئی ہے اور اس کی مرہم پٹی کی جا رہی ہے۔

ہم فوراً وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ راستے میں' میں نے سرگوشی میں صفدر کو بتا دیا کہ جوجی کی سالی زخمی حالت میں نہیں مردہ حالت میں ملی ہے۔ اسے تشدد کے بعد جان سے مار دیا گیا ہے۔

اس واقعے سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ جنگل میں دو ڈھائی گھنٹے مزید سفر کرنے کے بعد کسی مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈالیں گے اور آرام کریں گے۔ مگر اب صاف نظر آ رہا تھا کہ رکنا خطرناک ہے۔ لوسی کے قتل کے بعد یہ جنگل بہت مخدوش ہو گیا تھا۔ ہم تقریباً ساری رات چلتے رہے' سب تھک کر چور تھے' حتیٰ کہ بدر بھی نڈھال نظر آ رہی تھی مگر کلثوم تو پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ وہ تو جیسے تھکنا جانتی ہی نہیں تھی۔ اسی طرح چوکس نظر آ رہی تھی جیسے انسپکٹر تابش کے گھر سے روانہ ہوتے وقت تھی۔ کبھی وہ تابی کو اٹھا لیتی' کبھی بدر کو آرام دینے کے لیے اس کے بچے کو اٹھا لیتی۔ ساتھ ساتھ وہ زریں گل سے باتیں بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ دونوں "پشتو" زبان بولتے تھے تو کوئی بات بھی ہمارے پلے نہیں پڑتی تھی۔ میں نے زریں گل سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

وہ بولا "یہ ام کو پاگل کر کے چھوڑے گا استاد! ایسی ایسی باتیں کرتی ہے کہ امارا دماغ لٹو کی مافق چکرا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے اس پر اماری خدمت کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اب بار بار ام سے پوچھ رہی ہے کہ کہیں ام تھک تو نہیں گیا۔ امارا خیال ہے کہ اگر ام نے ایک بار بھی کہہ دیا کہ ہاں ام تھک گیا ہے تو وہ فوراً فرمائش کرے گا کہ وہ ام کو اپنے کندھوں پر بٹھانا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایسی خدمت گزار بیوی ملی ہے۔ آج کل کی بیویاں کہاں شوہروں کو سر آنکھوں پر بٹھاتی ہیں۔ وہ تو خود سوار رہتی ہیں۔"

"یہ خدائے تعالیٰ کا نظام ہے استاد صیب! اور یہ بے وقوف اسے بگاڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ ام کو لگتا ہے کہ یہ ام کو بالکل ہڈ حرام کر کے رکھ دے گا۔ اس کا تو دل چاہتا ہے کہ جب ام بیت الخلا سے نکلے تو یہ امارا نالا بھی خود باندھے۔ اور کل سچ مچ اس چرخی نے ایسا ہی کیا تھا۔ امارا انگی تھوڑا سا زخمی تھا اس نے فوراً امارا نالا باندھنا شروع کر دیا۔ نالا سمجھتا ہے ناں آپ؟ آزار بند۔"

"ہاں ہاں سمجھتا ہوں' لیکن اس میں برائی ہی کیا ہے وہ تمہاری بیوی ہے۔"

"نالا باندھنے میں تو کوئی برائی نہیں تھا مگر جب تھوڑی دیر بعد ام کو تیز پیشاب آیا اور ام باتھ روم میں گیا تو ام کو نانی یاد آگیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"اس الو کا پھرتی نے اپنے علاقے کا اسپیشل گرہ لگایا ہوا تھا۔ ام نے گرہ کھولنے کا کوشش کیا تو وہ اور پکا ہو گیا۔ کچھ نہ پوچھیں جی کہ امارا کیا حشر ہوا۔ وہ کیا گاتا ہے میڈم نور جہاں کہ اظہار بھی مشکل ہے' کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

گھنی جھاڑیوں اور تاڑ کے خود رو درختوں کے درمیان ہمارا سفر جاری رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ ہم تھکن سے چور تھے' ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے سستانے کی خواہش کو شدید تر کر دیا۔ اسی دوران میں ایک موزوں جگہ بھی نظر آ گئی۔ جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان یہ تھوڑی سی صاف اور ہموار زمین تھی۔ صفدر نگرانی کے لیے رضاکارانہ طور پر تیار تھا۔ وہ ایک چودہ پندرہ فٹ اونچے تاڑ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ رائفل اس کے پاس تھی۔ ہم نے ہموار جگہ پر دو چادریں بچھا دیں اور بیٹھ گئے۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ حشرات الارض موجود تھے' بے فکر ہو کر سو جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب سستانے کے لیے لیٹے تو سب ہی کو نیند آ گئی۔ پانچ دس منٹ کے لیے میری بھی آنکھ لگ گئی مگر پھر میں جاگ گیا اور گاہے گاہے ٹارچ روشن کر کے ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہوئی اور پھر دھیرے دھیرے سب کچھ روشن ہو گیا۔ زریں اور کلثوم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سو رہے تھے۔ وہ ایک خطرناک جنگل میں تھے اور ان گنت خطروں میں گھرے ہوئے تھے' مگر نیند کی مہربان دیوی نے

انہیں اپنے گرد و پیش سے قطعی بے نیاز کر دیا تھا۔ ان کے دلوں کی طرح ان کے چہروں پر بھی معصومیت کا عکس تھا۔ پھر میری نگاہ بدر پر پڑی۔ وہ اپنے بچے کو اپنے سینے پر لٹائے نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ بچہ بھی سو رہا تھا۔ نو بجے کے قریب میں نے سب کو جگایا۔ تھوڑا بہت کھانا اور پانی ہم تابش کے گھر سے ہی ساتھ لے آئے تھے۔ یہ سامان خورد و نوش ہمارے بہت کام آیا۔ رات بھر کے سفر نے ہمارے معدے یکسر خالی کر رکھے تھے۔ صفدر بھی نیچے آگیا اور تناول ماحضر میں شریک ہو گیا۔ اس نے بتایا "قریباً سو گز دور سے ایک پگڈنڈی سی گزر رہی ہے۔ لگتا ہے کہ آس پاس کوئی آبادی موجود ہے۔"

زریں بولا "ہاں ابھی ام کو کچھ دور سے کسی بکری کے ممیانے کا آواز بھی آیا تھا۔"

"بکری کے ممیانے کا آواز تھا یا کوئی بندہ بکری جیسی آواز نکال رہا تھا۔" صفدر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" زریں گل بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب ہمیں آوازوں کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرنی چاہیے' اس سے پہلے کوئی لوفر مرغے جیسی آواز نکال کر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر چکا ہے۔"

زریں گل کھسیانے انداز میں ہنسنے لگا۔ واقعی اس سے زبردست غلطی ہوئی تھی۔ میں نے صفدر کو آنکھ کے اشارے سے سمجھایا کہ وہ زریں کو مزید شرمندہ نہ کرے کیونکہ وہ پہلے ہی خاصا شرمندہ ہے۔

اچانک ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ ایک دور افتادہ آواز ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ آواز میرے اور زریں گل کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ جلال کے ڈیرے پر ہم پہلے بھی یہ آواز سن چکے تھے۔ یہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے کیا جانے والا وہی اعلان تھا جس میں ہمارا "ذکر خیر" کیا گیا تھا اور ہمیں پکڑوانے والے کے لیے انعام کی پیشکش تھی۔ آواز ڈیڑھ دو فرلانگ کی دوری سے سنائی دے رہی تھی۔ پھر وہ کچھ نزدیک آگئی۔۔۔ اندازہ ہوا کہ اعلان کرنے والی گاڑی قریباً ایک فرلانگ کی دوری سے آگے نکل گئی ہے۔ آواز بتدریج مدھم ہوئی اور پھر معدوم ہو گئی۔

"یہ لوگ تو ہمارے عشق میں مسلسل تڑپ رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"یہ کوئی ٹین ایجز والا عشق نہیں' پکی عمر کا عشق ہے جو خاصا خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بات اب واضح ہو گئی ہے کہ ہم کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔"

"تم پناہ کی بات کر رہے ہو' جس قدر بھوک ہے یہاں' مجھے تو یہ ڈر ہے کہ انعام کے لالچ میں لوگ ڈنڈے سوٹے لے کر ہمیں ڈھونڈنے نہ نکل کھڑے ہوں۔"

"امارے خیال میں تو بہتر یہی ہے کہ ام رات کے وقت سفر کرے۔ دن میں امارا رنگ دور ہی سے پہچانا جائے گا اور ام پکڑا جائے گا۔"

"تم تو ضرور پہچانے جاؤ گے۔ کیونکہ تم سب سے زیادہ گورے چٹے ہو۔" صفدر نے کہا۔

ویسے زریں گل کی بات میں وزن تھا۔ دن میں سفر جاری رکھنا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اب ہمارے لیے تین جانب سے خطرہ موجود تھا۔ پہلا خطرہ تو مبارک امین کی طرف سے تھا۔ یقینی بات تھی کہ مائیکل یہاں سے جاتے جاتے مبارک امین کی سخت ڈیوٹی لگا گیا ہے کہ وہ ہر صورت ہمیں ڈھونڈے گا۔ اب ہماری تلاش مبارک امین کا ذاتی مسئلہ بھی بن چکی تھی کیونکہ بوڑھے واراپ کے گھر ہونے والی لڑائی میں مبارک کے کم از کم دو کارندے ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ دوسری جانب اب ہمیں انسپکٹر تابش کی طرف سے بھی شدید خطرہ تھا۔ ہم اس کی زر خرید کنیز بدر کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے تھے اور تابش کا گھر چھوڑنے سے پہلے ہم اس کے کارندوں کو غیر مسلح کر کے باتھ روم میں بند کر آئے تھے۔ تیسرا خطرہ اب جوجی اینڈ کمپنی کی طرف سے تھا۔ یونٹ کی لڑکی نامعلوم افراد کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہ لوگ اس جنگل میں دیوانہ وار قاتلوں کا کھوج لگاتے پھر رہے ہوں گے۔ ہمارے ساتھ جوجی وغیرہ کی براہ راست دشمنی نہیں تھی مگر ہم اتفاقاً ان کی زد میں آ سکتے تھے۔ ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بہتر یہی تھا کہ ہم جیسے تیسے ان درختوں میں ہی دن کاٹیں اور سفر رات کو شروع کریں۔

وہ سارا دن خاصی "ٹینشن" میں گزرا لیکن خواتین نسبتاً ریلیکس رہیں۔ خاص طور سے کلثوم پر تو ان حالات کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ اگر اسے کوئی شے پریشان کر رہی تھی تو وہ صرف گرمی تھی' وہ گلگت کے برف زاروں میں پلی بڑھی تھی' اب اسے افریقہ کی تپش اور گرمی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ پھر بھی اس کی ہمت کی داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ وہ ادھ موئی ہو رہی تھی پھر بھی چہک رہی تھی۔ غزالہ بار بار مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ لیتی تھی اور چپکے چپکے ہدایات بھی دے

دیتی تھی۔ کلثوم جن ایام سے گزر رہی تھی ان میں اسے غزالہ کی ہدایات کی شدید ضرورت بھی تھی۔

شام چار بجے کے لگ بھگ ہمیں کسی جیپ یا کار کے انجن کی آواز سنائی دی' ہم چوکس ہوگئے۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ بدر کا بچہ رو رہا تھا اور اس سے خطرہ مزید بڑھ گیا تھا۔ بدر بچے کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ کسی طور چپ ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اسے دودھ پلانے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ شاید اس کو کوئی تکلیف تھی۔ اب تو ایک ہی صورت رہ جاتی تھی۔ بچے کا منہ زبردستی بند کردیا جاتا مگر اتنی سختی کون کرسکتا تھا۔ گاڑی نزدیک تر آرہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اتنے فاصلے پر پہنچنے والی تھی کہ بچے کی چیخ و پکار گاڑی سواروں تک پہنچ جاتی۔ بہت کٹھن صورتِ حال تھی۔ پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ ایک معصوم بچہ اپنی معصومیت کے سبب کسی سنگین موقع کو کتنا سنگین تر بنا سکتا ہے۔ بدر سٹپٹا گئی تھی' آخری کوشش کے طور پر اس نے بچے کا منہ اپنی ہتھیلی سے بند کردیا۔ بچہ بے قراری سے دائیں بائیں سرہلانے لگا' اس کی سانس رکنے لگی تھی اور سینے کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بدر کا ہاتھ بچے کے منہ پر سے کھینچ لیا۔ گاڑی والوں کے خوف سے ہم بچے کا دم گھونٹ دیتے تو یہ ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس معصوم کے آنسو خشک کرنے کے لیے تو ہم واراب کی چار دیواری سے نکلے تھے اور اس چکر میں الجھے تھے۔

گاڑی اب بالکل نزدیک آچکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا اور جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ گاڑی رک چکی تھی۔ یہ ایک چھوٹی جیپ تھی۔ وہ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس پر دو مسلح افراد سوار تھے' تیسرا ڈرائیور تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جیپ انہی گاڑیوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ہمیں بوڑھے واراب کے مکان میں گھیرا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بالآخر مبارک امین کے آدمی ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ جیپ کا انجن بند ہوگیا تھا۔ جھاڑیوں میں سے بچے کے رونے کی آواز مسلسل بلند ہورہی تھی۔ اب اس امر میں شک کرنا کہ گاڑی والوں نے بچے کی آواز سن لی ہے' خود کو دھوکا دینا تھا۔ وہ آواز سن چکے تھے اور اسی لیے رکے تھے' پھر ایک گرانڈیل سیاہ فام جیپ میں سے اترا' اس کے ہاتھ میں لانگ رینج خودکار رائفل تھی۔ رائفل پر ٹیلی اسکوپ بھی نظر آرہی تھی۔ وہ شخص بڑے چوکس انداز میں جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ اس نے مقامی زبان میں پکار کر کچھ کہا' یقیناً یہی کہا ہوگا... "یہاں کون ہے؟"

ہم سب خاموش تھے لیکن بدر کا بچہ معصومیت کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ یہاں میں ہوں اور میں اکیلا نہیں ہوں۔ رائفل بدست شخص کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ صفدر غیر محسوس طور پر دائیں طرف رینگ گیا تھا۔ وہ اب نووارد کے پہلو میں تھا اور نووارد سے اس کا فاصلہ لحہ بہ لحہ کم ہورہا تھا۔ رائفل بردار نووارد اب جھاڑیوں میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا۔ صفدر اچانک کسی شکاری جانور کی طرح جست کرکے جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ نووارد کی رائفل پر آیا اور دوسرا اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ اگلے ہی لمحے صفدر اپنے "شکار" سمیت واپس جھاڑیوں میں گم ہوچکا تھا۔ میں نے جیپ میں بیٹھے شخص پر فائر کیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ گولی نشانے پر لگی' مگر دوسرا فائر جو میں نے جیپ کے ٹائر پر کیا تھا' رائیگاں گیا۔ جیپ ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور ریورس گیئر میں دور تک بھاگتی چلی گئی۔ بھاگتے بھاگتے جیپ میں بیٹھے شخص نے جوابی فائر کیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے واکی ٹاکی کی جھلک بھی دیکھی' یہ واکی ٹاکی ڈرائیور نے اپنے منہ سے لگا رکھا تھا۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کو ہماری موجودگی سے آگاہ کررہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں جیپ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اب یہاں ایک لمحہ بھی رکنا ہمارے لیے خطرناک تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' صفدر نے جس حبشی کو دبوچا تھا اس نے زبردست مزاحمت کی تھی' جواب میں صفدر نے اسی کی رائفل سے اس کے نرخرے میں گولی مار کر اسے ٹھنڈا کردیا تھا۔ اس کی گہری سیاہ گردن گہرے سرخ لہو سے لتھڑتی چلی جارہی تھی۔ غزالہ اور بدر خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ تابی کی نگاہ کو اس منظر سے محفوظ رکھنے کے لیے غزالہ نے اسے اپنی اوڑھنی میں چھپالیا تھا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ فوراً!" میں نے کہا۔

ہم نے سامانِ خورد و نوش اور دیگر اشیاء وہیں چھوڑیں اور جھاڑیوں سے نکل کر مخالف سمت میں بڑھے۔ یہی وقت تھا جب ہمیں دور اپنے عقب میں جیپوں کی آواز اور کتوں کا منحوس شور سنائی دینے لگا۔ اب اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہمارے پیچھے آنے والے مبارک امین کے لوگ ہی ہیں۔ یہ وہی کتے تھے جو پرل فارم سے ہمارے پیچھے لگے تھے آج پانچ چھ دن گزرنے کے باوجود یہ ہمارے پیچھے ہی تھے۔ ہم تیزی سے جھاڑیوں میں بڑھتے چلے گئے۔ چند منٹ بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارا رخ آبادی کی

طرف ہے۔ دور سے سفید رنگ کے کچے پکے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ موجودہ حالت میں جنگل کی طرف جانے کے بجائے آبادی کی طرف جانا محفوظ نظر آرہا تھا۔ ہم آبادی کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ آبادی کے ننگ دھڑنگ افراد حیرت سے ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ اس آبادی میں چند ایک بڑے مکانات بھی تھے۔ ایک عمارت دو منزلہ تھی اور عبادت گاہ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چھت مخروطی اور کھڑکیاں رنگین شیشوں کی تھیں۔ عمارت کی پیشانی پر مقامی زبان میں بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ اور بورڈ کے بالائی حصے پر انگریزی کے چند الفاظ بھی لکھے تھے۔ اس عمارت کے اردگرد بھی کافی تعداد میں مقامی لوگ نظر آئے' انہوں نے لمبے چغے پہن رکھے تھے' کئی ایک کے سروں پر پگڑیاں بھی تھیں۔ آبادی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہم نے اپنی رائفلیں اپنے لبادوں میں چھپالی تھیں۔

دو افراد تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔ یقیناً انہیں ہماری خستہ حالی نے متوجہ کیا تھا اور اس پریشانی نے متوجہ کیا تھا جو ہمارے چہروں سے عیاں تھی۔ انہوں نے ہم سے کچھ پوچھا۔ ہم میں سے بدر کے علاوہ اور کون جواب دے سکتا تھا۔ بدر نے اپنے ہم زبانوں کو روتے ہوئے اپنی بپتا سنائی۔ ان لوگوں کے چہروں پر ہمدردی نظر آنے لگی۔ ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے کتوں کے بھونکنے کی دور افتادہ آوازیں بھی سن لی ہوں۔ اسی دوران میں پتلون قمیص والا ایک دراز قد نوجوان وہاں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ انگریزی بھی سمجھ لیتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ بدمعاش ہمارے پیچھے ہیں' اور ہم سے بھی زیادہ وہ بدر نامی اس لڑکی کے دشمن ہیں جو ہمارے ساتھ ہے۔

پتلون قمیص والے اس نوجوان کے چہرے پر بھی ہمدردی نظر آنے لگی۔ وہ خاصا جوشیلا اور لیڈر قسم کا شخص لگتا تھا۔ اس نے کہا "ابھی ہم کو جنگل میں سے چند فائر سنائی دیے تھے۔ وہ تم لوگوں پر ہی تو نہیں کیے گئے تھے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا "وہ فائرنگ ہم پر ہی کی گئی تھی۔ جواب میں ہم نے بھی ایک دو فائر کیے تھے۔ اس وقت دو لوگ بھاگ گئے تھے اب پھر آگئے ہیں۔"

نوجوان کا چہرہ باعزم نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک نظر... تھرتھر کانپتی بدر پر ڈالی پھر غزالہ اور کلثوم کو دیکھا اور جرات مند لہجے میں بولا "آپ لوگ آئیں میرے ساتھ۔"

وہ ہمیں لے کر مخروطی چھت والی عمارت میں داخل ہوگیا۔ یہاں بہت سے مرد و زن جمع تھے۔ سب نے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عمارت کا مرکزی ہال دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے میں صرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں' دوسرے حصے میں کرسیوں کے علاوہ میزیں بھی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں چائے وغیرہ کا انتظام ہے۔ کئی میزوں پر موسمی پھل بھی نظر آرہے تھے' اس کے علاوہ بیکنگ کا سامان تھا' تاہم ہال کا یہ حصہ ابھی خالی پڑا تھا' صرف اکا دکا ملازم حضرات گھوم پھر رہے تھے۔ ہال کا دوسرا حصہ بارونق تھا' یہاں ایک چبوترہ نما اسٹیج پر ساز وغیرہ بجائے جارہے تھے اور کچھ خواتین جو سرتاپا زرق برق لباس میں ڈھکی ہوئی تھیں' گارہی تھیں۔

ہم اپنے مددگار کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو گانا بجانا ختم کیا اور سب لوگ پوری طرح ہماری جانب متوجہ ہوگئے۔ ہمارے مددگار نے مقامی زبان اور پرجوش لہجے میں حاضرین کو ہماری مشکل کے بارے میں بتایا۔ اس کا انداز کم و بیش تقریر کرنے والا ہی تھا۔ چہروں کے تاثرات سے ہمیں اندازہ ہوا کہ "رائے عامہ" ہمارے حق میں ہے اور لوگ ہمیں پناہ دینے پر آمادہ نظر آرہے ہیں۔

قریباً یہی وقت تھا جب اس گرجا نما عمارت کے باہر گاڑیوں کا شور اور کتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے مددگار نے کہا "میرا نام اسماعیل ہے اور میرا خیال ہے کہ "تمہارے دوست" یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔ اگر تم لوگ مجرم نہیں ہو تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں نے دیکھا کہ کچھ افراد تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے عمارت کے وہ دو تین بغلی دروازے بند کردیے جو اس سے پہلے کھلے ہوئے تھے۔ دو نوجوان جو اسماعیل کے قریبی دوست نظر آتے تھے' انہوں نے ہم سب کو لیا اور اسٹیج کے عقب میں واقع ایک کمرے میں پہنچادیا۔ اسماعیل نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اپنی رائفلیں اس کے حوالے کردیں۔ میں نے کہا "آپ ایک رائفل ہمارے پاس رہنے دیں' باقی لے لیں۔"

اسماعیل نے یہ بات مان لی۔ سرگوشی میں مجھ سے بولا "لیکن یہ رائفل آپ لباس کے اندر ہی رکھیں' سردار رائفل کا آپ کے پاس ہونا پسند نہیں کرے گا۔"

ایک رائفل جو نسبتاً چھوٹی تھی زریم گل کے لبادے کے اندر ہی رہنے دی گئی' باقی دونوں رائفلیں مع ایمونیشن ہم نے اسماعیل کے حوالے کردیں۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"اب کیا ہوگا؟" غزالہ تشویش ناک انداز میں منمنائی۔

"تمہیں کل کی سرا بندی ہوگی۔ کلثوم پھر سے دلہن بنے گی' سائیں عالی ہندوستان سے آ کر یہاں آئے گا اور نکاح خواں کا کردار ادا کرے گا۔ یوں ان دونوں کی شادی دوبارہ دھوم دھام سے ہوگی اور اس کی باقاعدہ مووی بھی بنائی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"یہ بھلا کون سا مذاق کا موقع ہے؟" غزالہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں غالباً ابھی تک حبشی کا لہولہان نرخرا گھوم رہا تھا۔

میں نے کہا "اس دور میں اگر بندہ مذاق کے لیے مناسب موقع ڈھونڈتا رہے تو مہینوں میں ایک بات بھی مذاق کی نہ کر سکے۔"

"گویا آپ کا خیال ہے کہ آپ نے مذاق کی بات کی ہے۔"

"بھئی کوشش تو کی ہے نا۔۔۔ اور آج کے دور میں ایسی کوشش بھی جہاد ہے۔"

اسی دوران میں ہمارا مددگار اسماعیل ہمارے پاس واپس آگیا۔ اتنے ہجوم میں صرف وہی پتلون قمیص میں تھا اور کچھ پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ باقی سب دیہاتی طور اطوار لیے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ ایک مختصر کمرے میں چلا آیا۔ ہال کے کمرے میں لوگوں کا شور ایک بھنبھناہٹ کی صورت اس کمرے میں پہنچ رہا تھا۔ اسماعیل کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ بولا "گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آپ کے پیچھے تو مبارک امین کے بندے لگے ہوئے ہیں' اور مبارک امین اس پورے علاقے میں خطرناک ترین شخص شمار ہوتا ہے۔ مبارک کے بندے آپ لوگوں پر نہایت سنگین قسم کے الزامات لگا رہے ہیں۔"

"کیا کہا ہے انہوں نے؟"

"ان کا کہنا ہے کہ آپ ان کے کاٹن فارم کے مفرور ملازمین ہیں۔ آپ نے پورنامی عورت کو اغوا کرنے کے لیے اس کے ساس سسر کو قتل کیا اور بعد میں مزید تین افراد کی جان لے لی۔ آخری قتل آپ کے ہاتھوں ابھی دس پندرہ منٹ پہلے ہی ہوا ہے۔"

اسماعیل مجھے ایک سمجھدار اور نیک خو نوجوان نظر آ رہا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ چھپایا نہ جائے۔ میں نے کہا "اسماعیل! تم نے ابھی مبارک امین کو ایک خطرناک شخص قرار دیا ہے۔ تمہارے لب و لہجے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم اسے ایک جرائم پیشہ شخص سمجھتے ہو۔ ایک ایسا شخص جو ڈکیتی' اغوا' قتل جیسے جرائم کو معمول کی کارروائی سمجھتا ہے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"آپ بجا' سو فی صد درست ہیں۔" اسماعیل نے کہا۔

"ممکن ہے کہ مبارک امین کی ایک اور انفرادیت تمہاری نظر سے اوجھل ہو۔"

"کیسی انفرادیت؟"

میں نے کہا "مبارک امین ایک بہت بڑے بردہ فروش کا قریبی ساتھی اور دوست بھی ہے۔" اسماعیل کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ یہ اطلاع اس کے لیے نئی ہے "۔۔۔ اور میں یہ بات پوری ذمے داری سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ فارم کے ان ملازمین میں شامل تھے جنہیں "پکے ملازم" کہا جاتا ہے اور جو کہیں آ جا نہیں سکتے۔"

"یقیناً' پل فارم میں ایسے ملازم بھی موجود ہیں' لیکن ہمارا تعلق مبارک امین سے نہیں اور نہ ہم اس کے ملازم ہیں۔"

"تو پھر کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"پاکستان کا نام سنا ہے تم نے؟"

"کیوں نہیں۔ پاکستان ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ ہم کئی حوالوں سے پاکستان کو جانتے ہیں۔ کیا آپ۔۔۔ پاکستانی ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "آپ۔۔۔ یہاں کیسے پہنچے اور آپ نے بردہ فروشی کا ذکر کیوں کیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ لوگ۔۔۔ کسی طویل مشکل کا شکار رہے ہیں۔"

"طویل اور صبر آزما مشکل۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اسماعیل کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ آدم خور مائیکل کے ہاتھوں ہماری گرفتاری' طویل اور ہنگامہ خیز سمندری سفر' پھر تنزانیہ کے ساحل پر ہمارا اترنا اور یہاں بے کس و مجبور بدر کی وجہ سے ایک نئے ہنگامے کا شروع ہونا' میں نے مکمل روداد کا قریباً اسی فی صد حصہ اسماعیل کے گوش گزار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ دل سے نکلنے والی بات دل پر اثر کرتی ہے' اور میں دیکھ رہا تھا کہ میری سچی سیدھی باتیں اسماعیل پر اثر کر رہی تھیں۔ خصوصاً وہ اس بات سے متاثر نظر آ رہا تھا کہ ہم نے خود مصیبت میں ہونے کے باوجود مصیبت زدہ بدر کی وجہ سے خود کو مزید مصائب کے سامنے سینہ سپر کر دیا اور اب بھی ہمیں اپنے نئے بزرگ بدر اور اس کے بچے کی فکر تھی۔

وہ بولا "مسٹر شاہ جہاں! آپ کا ٹکراؤ ایک ایسے شخص سے ہے جسے یہاں کے لوگ عفریت سمجھتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہے' اب ہم نے آپ کو پناہ دی ہے' ہم ہر ممکن طریقے سے آپ کا دفاع کریں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے مسٹر شاہ جہاں کہ آپ حق پر ہیں' اور حق بجانب لوگوں کی خدا بھی مدد کرتا ہے۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

اسماعیل واپس ہال نما کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں اپنے ساتھیوں میں واپس آگیا۔ صفدر نے ایک کونے میں واقع سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہم یہ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آ گئے۔ یہ ایک خالی کمرا تھا۔ ایک محرابی کھڑکی میں مختلف رنگوں کے شیشے لگے تھے۔ ایک ٹوٹے ہوئے شیشے کے سوراخ میں سے ہم نے نیچے جھانکا۔ منظر سنسنی خیز تھا۔ کم و بیش آٹھ گاڑیاں اور لمبی چوڑی جیپیں عمارت کے مین دروازے کے سامنے نظر آ رہی تھیں۔ ان گاڑیوں کے آگے آٹھ دس کتوں کی قطار تھی۔ کتوں کی زنجیریں مسلح افراد کے ہاتھوں میں تھیں اور بری طرح تنی ہوئی تھیں۔ کتوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ عمارت سے باہر نکلنے والے چند معززین کے ساتھ کتا برداروں کی تند و تیز بحث ہو رہی ہے۔ غالباً معززین اصرار کر رہے تھے کہ مبارک کے کارندے کتوں کو عمارت کی حدود سے پیچھے لے جائیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس عمارت کی کوئی مذہبی حیثیت بھی ہے۔ خاصی تو تکرار کے بعد مسلح افراد کتوں کو گاڑیوں کے عقب میں لے گئے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور شاندار دانسن جیپ بھی موقع پر پہنچ گئی۔ اس جیپ میں سے تنے ہوئے جسم کا کوتاہ قامت مبارک امین برآمد ہوا۔ اس کا سیاہ رنگ ڈوبتے سورج کی روشنی میں چمکیلی سیاہ دھات کے مانند دمک رہا تھا۔ انگوٹھیوں' ہاروں' بٹنوں وغیرہ کی صورت میں بہت سا خالص سونا اس کے جسم پر موجود تھا۔ اس کے آتے ہی اس کے چھ سات درجن کارندوں میں نیا جوش و خروش نظر آنے لگا۔ وہ نہایت تنومند گارڈ رائفلیں لیے مبارک کے عقب میں موجود تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ آدم خور مائیکل اب یہاں موجود نہیں ہے۔ پھر بھی اس کی تلاش میں ہم نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی' وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔

کامدار ریشمی چغے اور رنگین ٹوپی والا ایک بلند قامت شخص عمارت سے باہر نکلا۔ اس نے مبارک امین سے ہاتھ ملایا۔ مبارک امین کے انداز میں نخوت اور بیزاری تھی۔ صفدر نے بتایا کہ رنگین ٹوپی والا یہی دبلا پتلا شخص بستی کا سردار ہے۔ بستی کا سردار اور مبارک امین باتیں کرتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

ہم واپس نیچے والے کمرے میں آ گئے۔ ہال میں مسلسل شور ہو رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر اب واضح طور پر خوف و ہراس نظر آنے لگا تھا۔ ہمیں پناہ دیتے وقت جو جذبہ و جوش ان میں محسوس ہوا تھا وہ اب ناپید تھا۔ یقیناً یہ تبدیلی اس انکشاف کے بعد ہوئی تھی کہ ہمارا تعاقب کرنے والا مبارک امین ہے۔

اسی دوران میں تھوڑی دیر کے لیے اسماعیل ہمارے پاس آیا۔ اس کا چہرہ الجھن زدہ تھا۔ بظاہر اس نے ہمیں تسلی تشفی دینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ بات چیت چل رہی ہے۔

میں نے پوچھا "کیا پولیس کے کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ بولا "ابھی تو یہ ناممکن ہے۔ مبارک امین کی طرف سے مہلت مل جائے تو کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ مہلت دینے کو تیار نہیں۔ اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے' آپ لوگوں کو حوالے کیا جائے۔ ہم نے تمام دروازے اندر سے مقفل کر دیے ہیں۔"

صفدر نے پوچھا "کیا یہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی؟"

اسماعیل نے جواب دیا "ہاں۔۔۔ سردار کے گھر لڑکیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا' اسی کی خوشی منائی جا رہی تھی۔" پھر وہ خود ہی بولا "یہ عمارت ایک طرح سے ہمارے قصبے کا کمیونٹی ہال ہے۔ عرصہ پہلے سینٹ جارج نامی ایک مذہبی شخص نے اسے تعمیر کرایا تھا اور قصبے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ اب بھی سینٹ جارج کے نام سے ہی منسوب ہے اور جارج ہال کہلاتا ہے۔ یہاں شادیاں بھی کی جاتی ہیں' آخری رسومات بھی ادا ہوتی ہیں' غرض ہر قسم کی تقریبات کے لیے یہ جگہ مخصوص ہے۔"

"تم اسی قصبے کے رہنے والے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"رہنے والا تو اسی قصبے کا ہوں۔" اسماعیل نے کہا "لیکن آج کل شہر میں ملازمت کرتا ہوں۔ درحقیقت میں اس قصبے کا واحد بندہ ہوں جس نے تھوڑا بہت پڑھا ہے اور قصبے سے نکل کر ملازمت کی ہے۔ میرے مالک IRINGA شہر کے بااثر ترین لوگ ہیں۔ اور ایک خاص بات اور بھی ہے۔ وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے اسماعیل کے لہجے میں پھر جوش آ گیا تھا۔

وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ زریں گل قریبی کمرے میں چلا گیا تھا اور وہاں ایک کھڑکی میں سے ہال کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ رائفل بدستور اس کے لبادے کے نیچے تھی۔ سو واپس آ کر کہنے لگا "استاد صیب! ام کو تو لگتا ہے کہ معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ اس ہال نما کمرے میں موجود لوگ تو بہت ڈرا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ خدائی خوار مبارک امین ان لوگوں کے لیے بہت بڑا ہوّا ہے۔ اس کا نام سن کر سب کا دم نکل گیا ہے۔ عورتیں رو رہا ہے، مرد رونے والا ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے آدم خور شیروں کا گروہ دیکھ لیا ہو۔ انہوں نے دروازوں کو اندر سے تالے لگا دیے ہیں اور بڑے دروازے کے سامنے وزنی چیزیں ڈھیر کر دیا ہے۔ امارا خیال ہے کہ ان لوگوں کو پہلے بھی مبارک امین سے سخت نقصان پہنچ چکا ہے۔"

مبارک امین کی سفاکی پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کے درندہ صفت ہونے کے لیے یہی دلیل کافی تھی کہ وہ آدم خور مائیکل کا دوست تھا۔ اب اس قصبے کے مکینوں کی دہشت زدہ صورتیں دیکھ کر "مزید تصدیق" ہو گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ تکلیف دہ انتظار میں گزرے پھر سیون ایم ایم رائفل کا برسٹ چلنے کی آواز آئی۔ اس زوردار آواز نے ماحول میں سراسیمگی کی تازہ لہر دوڑا دی۔ ہال نما کمرے کے اندر موجود عورتیں بلند آواز سے رونے لگی تھیں۔ مرد بھی دہشت سے پھٹی پھٹی آوازوں میں بول رہے تھے پھر ایک دم شور سا بلند ہوا۔ اس شور میں عورتوں کے رونے کی آواز نمایاں تھی۔ شاید انہوں نے کوئی پریشان کن منظر دیکھا تھا۔ ہم کمرے میں بند تھے اور ارد گرد جو ہو رہا تھا وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے شاہ جہاں۔" غزالہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاید ان لوگوں نے ہوائی فائرنگ کی ہے۔"

"مگر عورتیں تو رو رہی ہیں۔"

"وہ ضرورت سے زیادہ خوف زدہ لگتی ہیں۔"

تابی سہما ہوا سا غزالہ کے کندھے سے لگا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ بڑوں کی ذہنی کیفیت کا اثر نا سمجھ بچوں پر بھی ہوتا ہے۔

صفدر نے زریں سے کہا "جاؤ، ذرا ہال نما کمرے میں ایک نظر ڈال کر آؤ۔"

زریں نے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے قدم اٹھایا مگر عین اسی وقت اسماعیل گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اسماعیل ہی کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اسماعیل نے کہا "ان حرام زادوں نے سردار کے ایک گارڈ کو گولی مار دی ہے۔ سردار حشام کو غشی کا دورہ پڑا ہے۔ انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

اسماعیل کا جسم غم و غصے کی زیادتی سے لرز رہا تھا۔ اب اس کے کندھے پر ایک ہولسٹر بھی نظر آ رہا تھا، ہولسٹر میں ریوالور موجود تھا۔

میں نے کہا "اسماعیل! ہماری وجہ سے تم سب لوگ مصیبت میں پڑ گئے ہو، تم ہمیں جانے دو۔ اب جو بھی ہو گا ہم "فیس" کر لیں گے۔"

اسماعیل نے ترت جواب دیا "آپ بھی تو کسی کی وجہ سے مصیبت میں پڑے ہیں، آپ نے بدر کی مشکل کو اپنی مشکل بنایا ہے۔ ہم آپ کی لڑائی نہیں لڑ رہے، اپنی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اپنی ایک ہم قوم کی مدد کر رہے ہیں۔ آپ اپنے ذہن پر خوامخواہ بوجھ مت لیں۔"

"لیکن یہاں لوگوں میں سخت خوف و ہراس پیدا ہو گیا ہے۔ عورتیں رو رہی ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"ہم... میں دیکھتا ہوں ان لوگوں کو... ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسماعیل نے پریشانی چھپانے کی کوشش کی مگر وہ لہجے سے عیاں ہو رہی تھی۔

اسماعیل اور اس کے ساتھی نے ہال نما کمرے کی طرف قدم بڑھائے مگر ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ کئی افراد اندر گھس آئے۔ یہ سب قصبے ہی کے افراد تھے، ان کے رنگ برنگے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ یہاں ہونے والی تقریب کے شرکاء ہیں۔ انہوں نے اندر آتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ان کے چہرے خوف اور غصے کی زیادتی سے بگڑے ہوئے تھے۔ ان کی انگلیاں بار بار ہماری طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ ہم ان کی بات نہیں سمجھ رہے تھے مگر مفہوم ہم پر واضح ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی اور وہ اب ہمیں اس عمارت سے باہر نکالنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اسماعیل اور اس کا ساتھی نوجوان ہمارے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ اسماعیل چیخ رہا تھا اور مطالبہ کرنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر مطالبہ کرنے والے بڑھتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی مطالبے کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں عمارت کے اندر ہر طرف ایک ہی آواز گونجنے لگی۔ لوگ ہمیں باہر نکالنا چاہ رہے تھے۔ اسماعیل اور اس کے چند ہمنوا اس شور کی مزاحمت کر رہے تھے لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی

آواز تھی۔ عمارت کے اندر بے پناہ شور برپا ہو گیا تھا۔ اب ہمیں اس علاقے میں مبارک امین کی اصل قوت اور دہشت کا پتا چل رہا تھا۔ ان شریف لوگوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں پناہ دینے کا عزم کیا تھا مگر اب ان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ہم مزید کچھ دیر ان کے درمیان رہے تو ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی بے موت مارے جائیں گے وہ اب ہمیں اٹھا کر باہر پھینکنا چاہتے تھے اور مبارک امین سے گلو خلاصی کرانا چاہتے تھے۔ ہمارے لیے یہ بڑی پُر کوفت صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

اسماعیل ایک کرسی پر چڑھ گیا اور بلند آواز میں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا، پھر وہ غصے میں بھرا ہوا ہماری طرف آیا۔ میرے کان میں چیخ کر بولا "آپ لوگ یہاں ڈٹے رہیں کوئی مائی کا لال آپ کو یہاں سے نہیں نکال سکتا۔"

"مگر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟" میں نے بھی چیخ کر کہا "وہ لوگ دروازے توڑ کر اندر گھس آئیں گے۔ آپ سب لوگوں کا بھی نقصان ہو گا۔"

اس نے جوش میں گالی دے دی "آپ گھبرائیں مت... ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ میں نے... مبارک کے کارندوں کو دیکھتے ہی قریبی قصبے "پاتالا" کی طرف بندہ دوڑا دیا تھا۔ وہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ اس نے میرے مالکوں کو فون کر دیا ہو گا۔ وہ بس تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

"کیا کریں گے وہ؟"

"میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا نا... کہ میرے مالکوں کے بارے میں ایک خاص بات ہے... وہ بات یہی ہے کہ میرے مالکوں اور مبارک امین میں پرانی دشمنی ہے۔ مبارک امین اگر کسی سے دبتا ہے تو وہ میرے مالک ہی ہیں۔ آج کل وہ ہر جگہ مبارک امین کی سیاہ کاری کا بھانڈا پھوڑ رہے ہیں۔ ایسا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں کہ اسے بھاگنے کا موقع نہیں مل رہا۔ آپ دعا کریں کہ وہ جلد یہاں پہنچ جائیں، پھر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔" اسماعیل کے لہجے میں دبی دبی آگ تھی۔

"لیکن ہم تو خون خرابا نہیں چاہتے ہیں۔ آپ لوگ اس معاملے کو خوامخواہ طول مت دیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی خون خرابا نہیں ہو گا۔" اسماعیل نے کہا "آپ دیکھتے جائیں کہ مبارک کے ان کتوں اور گیدڑوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، کیسے دُم دبا کر بھاگتے ہیں۔"

"مگر... میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کوئی تمہاری بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو یہ لوگ ہمیں اٹھا کر باہر پھینکنے کی فکر میں ہیں۔"

"یہ پاگل کے بچے، عقل سے کام نہیں لے رہے ہیں... انہیں سمجھاتا ہوں۔" اسماعیل نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر ہال نما کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ تناؤ بڑھتا جا رہا تھا پھر اچانک باہر والوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ فائرنگ صرف دہشت زدہ کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ کئی روشن دانوں اور کھڑکیوں کے رنگین شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر فرش پر گرے۔ ایک دم کہرام سا مچ گیا۔ ہال نما کمرے کے دہشت زدہ حاضرین ایک بار پھر احتجاجی لہجوں میں بولنے لگے تھے۔ کسی وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان میں سے کچھ لوگ دفعتاً ہم پر جھپٹ پڑیں گے اور کھینچتے ہوئے باہر لے جائیں گے اور مبارک امین کے سامنے پھینک دیں گے۔

وہ نوجوان جو اسماعیل کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا، قریب ہی کھڑا تھا۔ اس باریش نوجوان کے کندھے سے بھی ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ حالات کی سنگینی نے اس کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔ وہ انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "سردار کا کیا حال ہے؟"

"وہ مسلسل بے ہوش ہے۔"

"اور جس گارڈ کو گولیاں لگی تھیں؟"

"وہ تو اسی جگہ مر گیا تھا۔"

"تمہارا دوست اسماعیل جس کمک کی بات کر رہا تھا، وہ تو ابھی تک نہیں آئی۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہی یہ پتا ہے کہ وہ لوگ کچھ کر بھی سکیں گے یا نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ مبارک امین بہت زہریلا شخص ہے۔ انسان کو مارنا اس کے لیے مکھی مارنے کی طرح ہے۔ اسماعیل بھی اس کو اتنا نہیں جانتا جتنا میں جانتا ہوں۔"

صفدر بولا "اسماعیل تو کہہ رہا ہے کہ یہ لوگ اس کے مالکوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکیں گے۔"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ویسے بھی ان کے آنے تک پتا نہیں کیا کچھ ہو جائے۔"

اس نوجوان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی عام لوگوں کا ہمنوا ہو گیا ہے اور دل ہی دل میں ہماری موجودگی کو ناپسند کر رہا ہے۔ میں نے ایک نظر صفدر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی کیفیت نظر آ رہی تھی جو میرے دل میں موجود تھی۔ ہم آگے بڑھ کر خطرات کو گلے لگانے والے لوگ

تھے' مصلحت اور پسپائی ہماری فطرت میں شامل ہی نہیں تھی۔ یہ تو عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا ورنہ ہم اس پناہ گاہ سے کب کے باہر آ چکے ہوتے۔ بہرحال اب پانی سر سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہماری وجہ سے ہمیں پناہ دینے والوں کو شدید نقصان پہنچ جائے۔

"کیا خیال ہے برادر؟" میں نے ڈرامائی لہجے میں صفدر سے پوچھا۔

"جو بڑے برادر کا خیال ہے۔" اس نے برابر کے جوش سے جواب دیا۔

"مبارک امین تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی گردن پر ہماری رائفل آ جائے تو بات بن سکتی ہے۔"

"چلو دیکھتے ہیں' جو اللہ کو منظور ہو۔"

صفدر کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر میرے اندر بھی حوصلے کا پہاڑ کھڑا ہو گیا تھا' غزالہ ہمارے تاثرات دیکھ کر جلدی سے قریب آ گئی "کیا کرنے لگے ہیں آپ؟"

"ہمارا خیال ہے کہ ہم باہر نکل کر مبارک امین سے بات کرتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن' اس کے سر پر تو خون سوار ہو رہا ہے۔" غزالہ منمنائی۔

"ہم یہ خون اُتارنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"مم ۔۔۔ مگر۔"

"مگر کچھ نہیں۔" میں نے کہا "تم تسلی رکھو۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم یہاں مع اہل و عیال موجود ہیں۔ ہم معاملے کو سنبھالنے کی کوشش ہی کریں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں GIVE AND TAKE۔"

"لیکن ۔۔۔ جب آپ کے ساتھ صفدر ہوتا ہے تو پھر آپ دونوں ٹھنڈے دماغ سے نہیں سوچتے۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"محترمہ' ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کا تعلق صفدر سے نہیں حالات سے ہے۔ تم دعا کرو کہ حالات ٹھیک رہیں۔"

وہ صفدر کی طرف دیکھ کر بولی "صفدر پلیز! کوئی ۔۔۔ خطرناک کام نہ ہو جائے۔"

صفدر نے تسلی بخش انداز میں غزالہ کی طرف دیکھا۔ اسی اثنا میں اسماعیل بھی ہمارے پاس چلا آیا۔ میں نے اس سے کہا "اسماعیل! ہم خود مبارک امین سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ بہت خطرناک ہوگا۔" وہ گڑبڑایا۔

"معاف کرنا دوست اس بارے میں ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم صرف اتنا کرو کہ ہمیں ہماری دونوں رائفلیں لا دو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ بے حد پریشان ہو گیا "یہ تو خودکشی والی بات ہوگی۔"

"دیکھو اسماعیل! ہم لڑنے کے لیے نہیں جا رہے۔ رائفلیں صرف اس لیے مانگ رہے ہیں کہ ہمیں احساس رہے کہ ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔"

"آپ بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔" اسماعیل نے احتجاج کیا "مجھے یقین ہے کہ میرے مالک بس یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ اسماعیل سے بحث فضول ہے۔ وہ رائفلیں ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں عمارت کے مین دروازے کی طرف بڑھے۔ اسماعیل اور اس کے دو جواں سال ساتھی ہمیں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے تحکمانہ لب و لہجہ اختیار کیا اور اسماعیل سے کہا کہ وہ ہمیں باہر نکل کر مبارک امین سے بات کرنے کا موقع دے' ورنہ معاملہ قابو سے باہر ہو جائے گا۔ میں نے جب زیادہ اصرار کیا تو اسماعیل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس پر وہاں موجود دوسرے لوگوں کا دباؤ بھی تھا۔ اس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور اس نے مقفل دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی باہر سے کتوں کے بھونکنے کی منحوس آوازیں آنے لگیں۔ مبارک امین کے مسلح غنڈے ایک طویل قطار میں کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ نے گاڑیوں کے عقب میں پناہ لے رکھی تھی۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے اچانک اسماعیل کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے ریوالور جینز کے نیچے اپنے سینے میں لگایا اور باہر نکل آیا۔ ہمیں دیکھ کر بوگیر کتوں نے زور و شور سے غرانا شروع کر دیا۔

"مبارک امین کہاں ہے؟" میں نے بلند آواز سے کہا۔

"تم اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ' اور آگے آ جاؤ۔" دوسری طرف سے حکم جاری کیا گیا۔

یہی وقت تھا' جب مجھے اپنے عقب میں اسماعیل کی ہولی پُرجوش آواز سنائی دی "آپ اندر آ جائیں مسٹر! جہاں ۔۔۔ آپ اندر آ جائیں۔"

اگلے ہی لمحے مجھے اسماعیل کے جوش و خروش کی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے سامنے دیکھا اور دور فاصلے پر مجھے

بڑی جیپیں نظر آئیں۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھیں یقیناً ان کے پیچھے بھی گاڑیاں موجود تھیں کیونکہ گرد و غبار کافی اوپر تک جا رہا تھا۔ میں اور صفدر بڑی تیزی سے واپس دروازے میں داخل ہو گئے۔ اسماعیل اور اس کے ساتھیوں نے بھاری بھرکم دروازہ پُرشور آواز سے بند کر دیا۔

اسماعیل کا سینہ جوش سے ایک بالشت اور چوڑا ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں آگ سی دہکنے لگی تھی۔ وہ بولا "میں نہ کہتا تھا کہ یہ لوگ ضرور آئیں گے۔ اب یہ سب کچھ خود ہی سنبھال لیں گے۔ مبارک امین دُم دبا کر بھاگے گا یا مار کھائے گا۔"

پھر وہ دوبارہ کرسی پر کھڑا ہو گیا اور حاضرین کے سامنے جوشیلے انداز میں بولنے لگا۔ اسے مکمل یقین تھا کہ اب مبارک امین کو بھاگتے ہی بنے گی۔ میں' صفدر اور زریں بالائی منزل پر چلے گئے' کچھ دیر بعد اسماعیل بھی وہاں آ گیا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مبارک امین کی "آٹھ" گاڑیوں کے مقابلے میں پانچ گاڑیاں آئی تھیں۔ ان میں ایک بڑی اسٹیشن ویگن بھی تھی۔ اسٹیشن ویگن کے قریب ہی آٹھ دس افراد جمع تھے۔ ان میں مبارک امین صاف پہچانا جا رہا تھا۔ وہ جن افراد سے مذاکرات کر رہا تھا وہ بھی سیاہ فام تھے تاہم وہ سوٹڈ بوٹڈ تھے۔ یہ لوگ ہم سے کافی فاصلے پر تھے' اس کے باوجود ہاتھوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ نہایت ہی تلخ قسم کی گفتگو ہو رہی ہے' پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اچانک صورتِ حال دھماکا خیز ہو گئی۔ بہت سے افراد ایک دم ایک دوسرے پر پل پڑے۔ گھونسوں لاتوں اور اینٹوں وغیرہ کا آزادانہ استعمال ہونے لگا۔ پھر پہلے فائر کی آواز گونجی۔ یہ آواز اس امر کا اشارہ تھی کہ تصادم سنگین ہو گیا ہے۔ آناً فاناً دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے اور فائرنگ ہونے لگی۔ دونوں گروہوں کے مسلح افراد نے گاڑیوں اور درختوں کے پیچھے پناہ لی تھی۔ ہم بلندی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ قریباً دو منٹ تک شدید فائرنگ ہوئی' پھر ایک کئی گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں اور حرکت میں آ گئیں۔ یہ سب مبارک اور اس کے ساتھیوں کی گاڑیاں تھیں۔ وہ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اسماعیل کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی ۔۔۔ ہماری نظر مبارک امین پر پڑی' شاید اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی' وہ ایک کارندے کا سہارا لیتے ہوئے اُچھل اُچھل کر چل رہا تھا پھر وہ غڑاپ سے ایک بھاری جیپ کے اندر گھس گیا۔ ہم اسے بالکل صاف دیکھ رہے تھے۔ اسماعیل کے ایک ساتھی نے

جوش کے عالم میں اپنی دور مار رائفل کی نال کھڑکی میں سے نکال دی۔ وہ مبارک کو نشانہ بنانے جا رہا تھا۔

"اسماعیل! یہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے چیخ کر اسماعیل کو متوجہ کیا۔

اسماعیل نے لپک کر رائفل کا رخ تبدیل کر دیا۔ یوں اس دور مار رائفل سے ایک جان لیوا برسٹ چلتے چلتے رہ گیا۔ اسماعیل نے اپنے ساتھی کو مقامی زبان میں ڈانٹا۔ وہ اپنے ساتھی کو سرزنش کر رہا تھا کہ اس نے اس لڑائی میں حصے دار بننے کی کوشش کیوں کی ۔۔۔ اس حوالے سے اسماعیل کا ردعمل بالکل درست تھا۔ اگر جارج ہال کے اندر سے "مبارک امین اینڈ کمپنی" پر فائرنگ کی جاتی تو صورتِ حال بالکل مختلف ہو جاتی ۔۔۔ اس قصبے کے لوگ براہِ راست اس لڑائی میں ملوث سمجھے جاتے اور بعد ازاں مبارک امین کا گروپ ان کے لیے مزید مشکلات کھڑی کر دیتا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف گرد و غبار کے بادل بلند ہو گئے۔ مبارک اور اس کے ساتھی اپنے اسلحے اور اپنے کتوں سمیت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ دوسرے گروپ کی گاڑیاں حرکت میں نہیں آئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اسماعیل کے مالکان' مبارک امین گروپ کا تعاقب کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عمارت کے اندر گہرا سکوت طاری تھا۔ باہر جو تابڑ توڑ گولیاں چلی تھیں انہوں نے عمارت میں موجود لوگوں کو سہما کر رکھ دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گرد و غبار بیٹھ گیا۔ ہمیں نیچے کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ ایک بے حس و حرکت جسم میدان میں اوندھا پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ مبارک امین کے کارندے کی لاش تھی۔ اسے فائرنگ کے آغاز میں ہی رائفل کا برسٹ لگ گیا تھا۔ اس لڑائی میں کم از کم تین افراد فائرنگ سے زخمی ہوئے تھے اور چار پانچ افراد کو کند آلات کی ضربیں آئی تھیں ۔۔۔ میدان صاف ہو چکا تو قصبے کی اس "سہمی ہوئی عمارت" جارج ہال کا مرکزی دروازہ کھول دیا گیا۔ جن لوگوں نے مبارک اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کیا تھا' ان میں چوڑے شانوں والا ایک دراز قد شخص سب سے نمایاں تھا۔ اس نے قیمتی لباس پہن رکھا تھا' دائیں کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی تھی جس میں قیمتی پتھر چمک رہا تھا۔ بے شک وہ بھی سیاہ فام تھا تاہم اس کی جلد بے حد صاف اور چمکدار تھی۔ اس کے گارڈز اور دیگر ساتھی بھی اچھے لباس میں تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ نظر آ رہا تھا۔ اسماعیل نے آگے بڑھ کر بڑے مؤدب انداز میں اس دراز قد شخص کو

سلام کیا۔ اسماعیل کے دیہاتی ساتھی بھی اس کے اردگرد جمع ہوگئے تھے۔ کچھ دیر وہ لوگ مقامی زبان میں آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ اسماعیل نے جارج ہال کی عمارت پر گولیوں کے نشان دکھائے اور کھڑکیوں کے کرچی کرچی شیشوں کے بارے میں بتایا پھر وہ لوگ ہماری طرف آگئے۔ اسماعیل نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سر! یہ وہ لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ تین خواتین اور دو بچے ہیں۔" پھر وہ بدر کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "سر یہ وہ لڑکی بدر ہے۔ اس پر جو ظلم ہوا ہے وہ آپ اس کی زبانی سن لیں۔"

دراز قد شخص نے بڑے بارعب لہجے میں بدر سے کچھ پوچھا۔ بدر سہمے سہمے انداز میں بولنے لگی۔ جلد ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھی چمکنے لگے۔ موقع پر موجود تمام افراد بڑی توجہ سے یہ سب کچھ سن رہے تھے۔ بدر کی روداد ختم ہوئی تو دراز قد شخص نے بدر سے ایک دو سوالات پوچھے۔ بدر نے اپنے شانے پر سے قمیص ہٹائی اور روتے ہوئے اپنے نیلگوں داغ دکھائے۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر مفہوم واضح تھا' وہ یقیناً اپنے اغوا کا ذکر کر رہی تھی۔ اور اس بدسلوکی کے بارے میں بتا رہی تھی جو مبارک امین اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے اس کے ساتھ کی گئی تھی۔ وہ واضح طور پر جنسی تشدد کے بارے میں بیان دے رہی تھی۔

اس کی پوری روداد سننے کے بعد ڈائمنڈ بالی والے دراز قد شخص نے تسلی آمیز انداز میں بدر کا شانہ تھپکا اور اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اس بے کس عورت کی مدد کر کے آپ نے بڑی جرأت کا کام کیا ہے۔ آپ جیسے لوگوں سے مل کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر میرے علاوہ صفدر اور زریں گل سے ہاتھ ملایا "آپ سے دوبارہ تفصیلی ملاقات ہوگی۔" وہ بولا۔

اسی دوران میں چند پریشان صورتوں والے افراد اندر سے ایک اسٹریچر برآمد کر لائے۔ اس اسٹریچر پر اس قصبے کا سردار بے ہوش پڑا تھا۔ اسے گلوکوز کی ڈرپ لگانے کی کوشش بھی کی گئی تھی مگر پھر ناکام ہو کر ڈرپ اسٹریچر پر ہی رکھ دی گئی تھی۔ وہ گہرے سانس لے رہا تھا۔ اسماعیل کی نگرانی میں سردار کو اسٹیشن وین کے اندر پہنچا دیا گیا۔ چند افراد وین میں بیٹھ گئے اور وہ تیزی سے روانہ ہوگئی۔ یقیناً سردار کو شہر روانہ کیا گیا تھا تاکہ اسے اسپتال میں طبی امداد مل سکے۔ دراز قد شخص قصبے کے دیہاتی معززین کے ساتھ کچھ دیر تسلی آمیز گفتگو کرتا رہا' اسماعیل اور اس کے تین چار ساتھی بھی اس گفتگو میں شریک تھے۔ بعد ازاں دراز قد شخص اپنے گارڈز کے ساتھ واپس چلا گیا۔ ایک گاڑی بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ باقی دو گاڑیاں قصبے میں ہی رہیں۔ ان گاڑیوں پر سوار ہو کر آنے والے قریباً ایک درجن مسلح افراد بھی قصبے میں ہی رہے۔ قصبے کے سیدھے سادے لوگوں میں شدید ہراس پایا جا رہا تھا تاہم اسماعیل اور اس کے شہری دوستوں کی موجودگی ان کے لیے قدرے تسلی کا باعث بھی تھی۔

اب رات ہو چکی تھی۔ اسماعیل اور اس کے ساتھی ہمیں قصبے کے ہی ایک مکان میں لے آئے۔ یہ مکان قصبے کے دیگر کچے پکے مکانات سے بہتر تھا۔ صحن میں پھلواری تھی' رنگ و روغن بھی کیا گیا تھا۔ اس دیہاتی مکان میں شہری مکانوں کی جھلک پائی جاتی تھی' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ اسماعیل کا مکان تھا' یہاں وہ اپنی انتہائی دین دار والدہ' ایک بہن اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اسماعیل نے ہمیں اپنے گھر کے افراد سے ملایا' پھر ہم گھر کے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ غزالہ' کلثوم اور بدر گھر کے زنان خانے میں چلی گئی تھیں۔

اسماعیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مسز شاہ جہان اور مسٹر صفدر! میں آپ لوگوں کی خواہش سمجھ رہا ہوں' آپ پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچنا چاہتے ہیں یا پھر آپ چاہتے ہیں کہ کسی سفارت کار سے آپ کی ملاقات ہو جائے... فی الوقت یہ دونوں کام ممکن نہیں ہیں۔ آپ ہم پر اعتماد رکھیں' ہم وہی کچھ کریں گے جو انشاء اللہ آپ لوگوں کے لیے بہتر ہوگا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا "سر کی ہدایت کے مطابق ہم آپ لوگوں کو ابھی تھوڑی دیر میں "ارنگا" لے جا رہے ہیں۔ اس وقت آپ لوگوں کے لیے بہترین پناہ گاہ وہی ہو سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"آپ کے لیے کافی مشکلات پیدا ہو چکی ہیں۔ مبارک امین اور اس کے ساتھی آپ کے خلاف پوری شدت سے حرکت میں آچکے ہیں۔ انتظامیہ میں مبارک کے بہت سے ٹاؤٹ موجود ہیں۔ آپ پولیس تک پہنچ کر بھی خود کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے بلکہ عین ممکن ہے کہ آپ اور زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں۔ اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں تو مبارک امین آپ لوگوں کو زندہ پکڑنے میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی آپ کو

جسمانی طور پر ختم کرنے میں رکھتا ہے۔ درحقیقت آپ لوگوں کی حیثیت مبارک امین کے خلاف نہایت معتبر گواہوں کی ہو گئی ہے۔ آپ اسے بردہ فروشوں کا ساتھی ثابت کر سکتے ہیں' اور اگر ایسا ہو گیا تو یہ مبارک کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ثابت ہوگا۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ پولیس کے پاس پہنچ کر آپ اور زیادہ خطرات میں گھر جائیں۔ پولیس لائن میں مبارک کے جو بہت سے ٹاؤٹ ہیں ان میں سے ایک سے تو آپ مل ہی چکے ہیں۔ یعنی انسپکٹر تابش۔ وہ تو ایک چھوٹی سی مثال ہے' ایسے کئی بڑے بڑے لوگ اس بدبخت کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ وہ مبارک کے ایک اشارے پر آپ کی جان کے درپے ہو سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم بے گناہ ہونے کے باوجود خود کو چھپانے پر مجبور رہیں گے۔"

"نہیں! آپ کو زیادہ دیر نہیں چھپنا پڑے گا۔ ایک دو دن میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے' اس کے بعد "سر" آپ کو خود اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کریں گے۔"

ہمارے اور اسماعیل کے درمیان کچھ دیر تبادلہ خیال ہوا۔ اسماعیل کی نیت آئینے کی طرح صاف نظر آتی تھی۔ درحقیقت اس کی پوری شخصیت ہی آئینے کی طرح تھی۔ وہ اپنی بات چیت اور وضع قطع سے ایک اصلاح پسند "طالب علم لیڈر" نظر آتا تھا۔ اس بات پر اس کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا کہ اس نے پورے قصبے کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے ہماری مدد کی ہے... اور یہ بات فخر کے قابل بھی تھی۔ جس وقت سب لوگ خوف سے کانپ رہے تھے وہ اس وقت بھی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے بلاوے پر اس کے مالکان ضرور پہنچیں گے اور مبارک امین کو ناکوں چنے چبوائیں گے۔

میں نے اسماعیل سے کہا "تمہارا کیا خیال ہے' مبارک کا جو ایک بندہ اس لڑائی میں مارا گیا ہے اور جو دو تین بندے اس سے پہلے ہمارے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں' ان کی رپورٹ وہ پولیس میں درج نہیں کرائے گا؟"

"وہ خود کو اس علاقے کا بے تاج بادشاہ سمجھتا ہے۔ اپنے کسی جھگڑے میں پولیس کو ملوث کرنا وہ اپنی توہین قرار دیتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ اس نے اپنے کسی دشمن کو خود ہی سزا دی ہے۔ خود قتل کیا ہے یا پولیس کے ہاتھوں قتل کروایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس مرتبہ بھی باقاعدہ طور پر پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تم لوگوں تک پہنچنے میں قطعی ناکام رہے تو پھر پولیس کو بھی تمہاری تلاش میں شریک کر لے۔"

"لیکن ایک بندہ تمہارے مالکوں کے ہاتھوں بھی تو مارا گیا ہے۔"

اسماعیل مسکرایا "ہمارا کھاتا تو اس کے ساتھ چل ہی رہا ہے۔ اس نئے واقعے سے اسکور میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ایک بندہ ہمارے ہاتھوں مارا گیا ہے' تو ایک بندہ اس نے بھی مارا ہے۔ سردار کے گارڈ کی لاش ابھی بھی قصبے میں پڑی ہے۔"

○☆○

رات قریباً دس بجے ہم ایک کھٹارا سے ٹرک پر سوار ہو کر قصبے سے قریبی شہر ارنگا کی طرف جا رہے تھے۔ اس ٹرک پر ایک ایسے شخص کے گھر کا سامان لدا ہوا تھا جو خشک سالی اور بے روزگاری کے سبب شہر کا رخ کر رہا تھا۔ اس سامان میں چارپائیاں' بستر' چھوٹی بڑی ٹوکریاں' ٹرنک اور برتن وغیرہ تھے۔ اس سامان کے اندر ہی گھس گھسا کر ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر سے آنے والے دو مسلح افراد بھی حفاظت کی غرض سے اس ٹرک میں ہمارے ساتھ سوار تھے۔ اس کے علاوہ ہم تینوں بھی رائفلوں سے مسلح تھے۔

کچے پکے راستوں پر سفر کرتا ہوا ہمارا ٹرک رات قریباً دو بجے ایک شہر کی پختہ سڑکوں پر پہنچ گیا۔ یہاں زیرو نمبر پلیٹ والی ایک نئی نکور اسٹیشن وین ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے مسلح محافظ نے بتایا کہ اس وین میں اپنے ہی آدمی ہیں۔ شہر کی روشنیاں ہمارے اردگرد جگمگا رہی تھیں۔ یقیناً یہ ایک بارونق شہر تھا کیونکہ رات کے اس پہر بھی سڑکوں پر ٹریفک نظر آ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم ایک عالی شان عمارت کے مین گیٹ میں داخل ہوگئے۔ پھولوں سے گھرے طویل "ڈرائیو وے" پر چلتے ہوئے ٹرک ایک بلند چھت والے پورچ کے نیچے رک گیا۔ سرخ اسٹیشن وین بھی ہمارے پیچھے ہی پیچھے اندر آگئی تھی۔ اس میں واقعی مسلح افراد موجود تھے۔ وین کی سائیڈ پر انگریزی میں چند حروف لکھے تھے۔ ان حروف کو دیکھ کر میں کچھ چونک سا گیا۔ میں نے صفدر کو بھی یہ حروف دکھائے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اس کے چہرے پر بھی تعجب دکھائی دیا۔

ہمیں ٹرک سے نیچے اتارا گیا۔ یہ ایک شاندار محل نما کوٹھی تھی۔ اس میں کسی حد تک عربی طرزِ تعمیر کی جھلک بھی پائی جاتی تھی۔ ہم کوٹھی کے مہمان خانے کے پورچ میں آئے تھے۔ مہمان خانے کے پہلو میں سوئمنگ پول نظر آ رہا تھا۔

روشنیوں میں جگمگاتا ہوا نیلگوں پانی اور کنارے آرام کرسیوں پر نیم دراز حسین انگریز لڑکیوں کو دیکھ کر گمان ہوا کہ ہم افریقہ کے بجائے کسی یورپی ملک میں ہیں۔ یہ عمارت باہر سے بے شک تنزانیہ میں کھڑی تھی مگر اندر سے یورپ کا حصہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہر شے سے شان و شوکت اور امارت ٹپکی پڑ رہی تھی۔ ہم اس آن بان کو ملاحظہ کرتے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہو گئے۔ آبنوس کے بلند دروازوں کے نیچے سے گزرتے ہی احساس ہو گیا کہ عمارت مرکزی طور پر ائر کنڈیشنڈ ہے۔ زریں گل نے بڑے اسٹائل سے ٹھنڈی سانس لی اور بولا "ام ستار صیب! اگر ام کو دفینے میں سے اپنا حصہ مل گیا تو ام لندن میں ایک ایسا عمارت ضرور بنوائے گا۔ وہاں کا سارا ملازم فرنگی لوگ ہوگا۔ اگر کوئی فرنگن امارے سامنے بیٹھ کر فرش پر ٹاکی مارے گا تو امارا ایک بہت بڑا خواہش پورا ہو جائے گا۔"

"مگر فرنگی تو ٹاکی نہیں مارتے۔ وہ تو مشین سے صفائی کرتے ہیں۔" میں نے نکتہ اٹھایا۔

"پیسے کے زور پر سب کچھ ہو سکتا ہے استاد صیب..... اور ام سب کچھ کرے گا۔ ام لندن میں اپنے گھر کے اندر دستی نلکا لگوائے گا اور فرنگیوں سے بالٹیاں بھروائے گا۔ کچن کے اندر ام گیلی لکڑیوں سے چولہا جلوائے گا۔ کسی موٹے سے انگریز کے ہاتھ میں ڈول دے گا اور سخت سردی میں صبح تڑکے اس سے دہی منگوائے گا۔ ہمارے گھر میں کوئی واشنگ مشین نہیں ہوگا۔ ملازموں کو سارا کپڑا ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر دھونا پڑے گا۔"

"لیکن لندن میں تو کوئی چیز ڈنڈے سے نہیں کوٹی جا سکتی۔ یہاں تک کہ پولیس پر بھی یہ پابندی عائد ہے۔" صفدر نے کہا۔

"خو چے۔ جب جیب میں مال ہوگا تو کوئی پابندی امارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"شاید اسی لیے خدا گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔" صفدر نے زیر لب کہا۔

"آپ کچھ فرما رہا ہے صیدر صیب؟" زریں نے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ تمہاری باتیں سن کر ایمان تازہ ہو گیا ہے۔" صفدر نے بات بدلی "تم واقعی محمد میر اور بدر منیر کے سچے عاشق ہو۔"

ہمیں ایک شاندار لاؤنج میں پہنچایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وردی بردار ملازم آئے اور انہوں نے ہمیں ہمارے کمرے دکھا دیے۔ زریں اور کلثوم کے علاوہ سب کو علیحدہ علیحدہ دیا گیا۔ بدر بے چاری یہ ماحول دیکھ کر بالکل سہم سی گئی تھی۔ وہ جھونپڑے سے اچانک شہر کے محل میں پہنچ گئی تھی۔ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی اور میری طرف دیکھتی تھی۔ میرے کہنے پر اسے اور غزالہ کو ایک ہی کمرا دے دیا گیا۔

میرا کمرا ایک سائیڈ پر تھا۔ کھڑکی سوئمنگ پول کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی پام کے بلند و بالا درخت خوشگوار ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہم سے ہماری رائفلیں وغیرہ لینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایک طرح سے یہ ہم پر مکمل اعتبار کا اظہار تھا۔ اسماعیل ہم سے صبح ملنے کا کہہ کر واپس چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد صفدر بھی میرے پاس چلا آیا۔ رات کا باقی حصہ ہم نے باتیں کرتے اور اونگھتے ہوئے گزار دیا۔

کمرے کی وارڈ روب ہر قسم کے کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے ایک لباس منتخب کیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ آدھ پون گھنٹے بعد نہا دھو کر باہر نکلا تو خود کو بہت فریش محسوس کیا۔ ناشتا ہم نے کامن روم میں اکٹھے ہی کیا۔ زریں گل نے بھی اپنا پسینے میں بھیگا ہوا بدبودار چغہ اتار پھینکا اور اب پتلون قمیض میں نظر آ رہا تھا۔ صفدر اور عز الہ بھی نہا کر لباس تبدیل کیے تھے تاہم کلثوم اور بدر نے صرف نہانے پر اکتفا کیا تھا۔ ناشتے کی میز کے گرد دو تین حسین ملازمائیں تتلیوں کے مانند چکرا رہی تھیں۔ انہوں نے اسکرٹ پہن رکھے تھے۔ گریبان بھی افق تا افق پھیلے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہمیں ناشتا کرانے کا تو صرف بہانہ ہے ورنہ وہ اپنے سرخ و سپید سڈول جسم کی نمائش کے لیے یہاں موجود ہیں۔

انہیں دیکھ کر کلثوم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "بہت ننگا ہے۔ ام کو غصہ لگتا ہے۔ ام ماشاء اللہ بہت شرم والا۔"

"زریں گل تمہارے ساتھ ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔" صفدر نے چوٹ کی۔

زریں نے صفدر کو گھورا اس سے پہلے کہ تکرار شروع ہو جاتی' میں نے کہا "ویسے لڑکیاں ہیں خوب صورت یا کم از کم اس لیے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں کہ ہمارے چاروں طرف سیاہ فام موجود ہیں۔"

"خو ام کو تو یہ بھی سازش لگتا ہے۔" زریں نے بڑے ہلکے انداز میں کہا "یہ لوگ چاہتا ہے کہ ام خدا کی قدرت دیکھتا رہے اور خدا کی نعمت یعنی ناشتے کی طرف زیادہ توجہ نہ دے۔ یوں ان لوگوں کا بچت ہو جاتا ہے۔"

ناشتا بھی اسی ٹھاٹ باٹ کا تھا جس ٹھاٹ باٹ کی یہ عمارت تھی۔ یہ بوفے ٹائپ ناشتا تھا۔ درجن بھر ڈشز تھیں۔ زریں گل کھا کھا کر ہانپ گیا۔ رات بھر ائر کنڈیشنڈ کمرے میں رہنے سے بھوک بھی اسے خوب کھل کر لگی تھی۔

وہ ایک سالم رس گلا بڑی محبت سے اپنے منہ میں رکھتے ہوئے بولا "لگتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس کوئی سونے کا کان وغیرہ ہے۔"

"سونے کی نہیں بلکہ اس سے بھی قیمتی چیز کی۔" صفدر نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"خان صاحب! ان کی ہیروں کی کان ہے۔ اور یہ کوئی افواہ نہیں' باقاعدہ ایک تصدیق شدہ خبر ہے۔ یہ دو بھائی ہیں نسیم اور سالم۔ ان دونوں کا شمار شہر کے امیر ترین افراد میں ہوتا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"رات کو جانے سے پہلے اسماعیل سے تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔" صفدر نے کہا۔

ابھی اس کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ اسماعیل اندر داخل ہو گیا۔ وہ سفاری سوٹ میں تھا۔ اس نے علیک سلیک کے بعد کہا "مسٹر شاہ جہاں! مسٹر صفدر اور مسٹر زریں' آپ ناشتے کے بعد نشست گاہ میں تشریف لے آیئے گا۔ مسٹر سالم آپ سے ملاقات کریں گے۔"

صفدر نے زیر لب مسکراتے ہوئے زریں سے کہا "تم تو اپنی بیماری کی وجہ سے معذرت کر لو۔"

"بیماری..... کیسا بیماری؟"

"بھئی تم نے جس قدر کھایا ہے' کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی ہے۔ کچھ بھی نہ ہو پھر بھی پیٹ میں درد تو ہوگا ہی۔"

زریں غصے سے نتھنے پھلا کر رہ گیا۔ میں نے اسماعیل سے کہا "ٹھیک ہے' ہم تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں۔"

ہم نشست گاہ میں پہنچے تو وہاں دبلی پتلی دراز قد شخصیت موجود تھی۔ وہ شارک اسکن کے شاندار سوٹ میں تھا۔ کان میں ہیرے کی چھوٹی سی خوب صورت بالی دمک رہی تھی۔ صفدر کی اطلاع یقیناً درست ہی تھی۔ یہ لوگ قیمتی پتھروں کا کام کرتے تھے۔ میں نے افریقہ میں سونے اور ہیروں کی کانوں کے بارے میں کئی دفعہ پڑھا تھا۔ آج ایک سیاہ فام جوہری کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ ابھی اسماعیل کی زبانی ہمارے میزبان کا نام مسٹر سالم معلوم ہوا تھا۔ عمر قریباً اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ خاصا پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ کافی اچھے موڈ میں بھی تھا۔ بڑے ریلیکسڈ انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر انگریزی اخبار تھا اور قیمتی برانڈ کے سگریٹ رکھے تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ بے تکلف انداز میں بولا "میرا خیال ہے کہ آپ میرے بارے میں جاننا چاہ رہے ہوں گے' اور یہ جاننا چاہ رہے ہوں گے کہ اتنی دور دیہات میں رہنے والے مبارک امین سے میرا کیا تعلق ہے' میرا اندازہ ہے کہ میرا ابتدائی تعارف تو اسماعیل نے کرا ہی دیا ہوگا۔ ہم "جم اسٹونز" کا کام کرتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔ مگر یہ دنیا ایسی جگہ ہے کہ یہاں کوئی شخص بھی اپنی مرضی کے مطابق جی نہیں سکتا ہے۔ برائی اتنی زیادہ ہے کہ کہیں نہ کہیں اس سے ٹکراؤ ہو ہی جاتا ہے۔ اس برائی کا سامنا کرنے کا ہر شخص کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی دب جاتا ہے' کوئی راستہ بدل لیتا ہے اور کوئی ڈٹ جاتا ہے۔ کچھ عرصے چند سال پہلے ہم نے شوقیہ طور پر میکنڈانی کے ساحلی علاقے میں ایک بڑا زرعی فارم بنانے کا کام شروع کیا تھا۔ ہمارا یہ پراجیکٹ بن تو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا ایک دشمن بھی بن گیا۔ اور اس سخت "نامبارک دیہاتی" کا نام مبارک امین ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک آپ اس "چائے فروش" کو بڑی اچھی طرح جان چکے ہوں گے۔ مگر شاید میں غلط الفاظ استعمال کر گیا ہوں۔ اس شخص کو بڑی اچھی طرح جاننے کے لیے ایک طویل عمر بھی ناکافی ہے۔ بے حد کمینہ اور حد درجہ خطرناک شخص ہے وہ۔ میں اس کے بارے میں تفصیل میں جا کر آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ وہ ایک چلتی پھرتی مجسم لعنت ہے۔ آپ یہاں پہنچتے ہی نادانستگی میں اس سے ٹکرا گئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ خوب ٹکرائے ہیں۔ نادانستگی میں ایسے ہی کام ہوا کرتے ہیں مگر اب آپ کو شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"کس قسم کی احتیاط؟" صفدر نے پوچھا۔

"آپ اعلیٰ حکام کے سامنے پیش ہونا چاہتے ہیں تو ضرور ہوں..... اور آپ کو ہونا بھی چاہیے کیونکہ آپ نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا ہے مگر ابھی فوری طور پر ایسا کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم دو تین روز تک صورت حال کا جائزہ لیں گے پھر قدم اٹھائیں گے۔ آپ لوگ یہاں خود کو بالکل محفوظ تصور کریں۔ اس چار دیواری کے اندر کوئی آپ کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا "جس خاتون کے چکر میں یہ سب کچھ ہوا ہے وہ از حد پریشان ہے۔ اسے ڈر ہے کہ مبارک اور اس کے کارندے اس کے خاوند کو نقصان پہنچائیں گے۔ اس کا خاوند محنت مزدوری کے سلسلے میں اسی شہر میں کہیں مقیم ہے۔"

"اس خاتون کو بالکل فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔" سالم نے اطمینان سے کہا "وہ خاتون اپنے خاوند کا اتا پتا بتائے ہم چند گھنٹے میں اسے تلاش کرکے یہاں پہنچا دیں گے۔" سالم نے ذرا توقف کیا پھر بولا "مگر اس خاتون کے دیگر بچے بھی تو ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"ان کی طرف سے وہ مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے کہ مبارک اس کے بچوں اور نند تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اس کے شوہر کا اتا پتا دریافت کریں۔ میں اسے تلاش کروا لیتا ہوں۔"

دس پندرہ منٹ تک ہمارے درمیان گفتگو ہوئی پھر سالم اپنے آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔

—— وہ سارا دن ہم نے اس محل نما کوٹھی میں آرام کرتے ہوئے گزارا۔ پچھلے دو روز کی بھاگ دوڑ اور ہنگامہ خیزی نے ہمیں سخت تھکا دیا تھا۔ بدر کو ٹھیک سے معلوم تو نہیں تھا کہ اس کا شوہر شہر میں کس جگہ ہے، تاہم ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا ایڈریس اس کے پاس موجود تھا۔ یہاں قریب ہی کہیں وہ ورکشاپ تھی جہاں وہ مزدوری کرتا تھا۔ ہم نے یہ معلومات اسماعیل کو فراہم کر دیں۔ اس نے ہمیں تسلی دی کہ شام تک اس شخص کا پتا چل جائے گا۔ اسماعیل نے ہمیں تازہ اخبارات بھی دکھائے۔ ان اخبارات میں کہیں بھی جارج ہال کی اس خون ریز لڑائی کا ذکر نہیں تھا جس میں دو افراد ہلاک اور کئی شدید زخمی ہوئے تھے۔ نہ ہی کہیں مبارک کے اس گارڈ کی ہلاکت کا ذکر تھا جس کے نرخرے میں صفدر نے گولی ماری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سالم کی بات سچ تھی۔ روایتی "وڈیروں" کی طرح مبارک امین اس سنگین معاملے کو پولیس میں لے کر نہیں گیا تھا اور اپنے طور پر حل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ اپنے زعم میں خود ہی قانون اور خود ہی سزا بنا ہوا تھا۔ تاہم اس اخبار میں ایک اور توجہ طلب خبر موجود تھی۔ اس خبر کا تعلق فلم کمپنی سے تھا۔ فلمی یونٹ کے سربراہ مسٹر جوجی کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ چار کالمی سرخی اس طرح تھی "امریکی فلم کمپنی کے یونٹ کے ساتھ پُراسرار واردات!"

ذیلی سرخیاں اس طرح تھیں "نوجوان امریکی لڑکی کی لاش جنگل میں پائی گئی۔ لڑکی کو زیادتی کے بعد قتل کیا گیا۔ لڑکی کا قیمتی کیمرا غائب۔ پالتو کتے کی لاش بھی مل گئی۔"

میں نے یہ انگلش اخبار چھپا دیا۔ کیونکہ یہ خبر میں نے اور صفدر نے بس اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس خبر میں لڑکی کے قتل پر تاسف کا اظہار کیا گیا تھا۔ بے شک یہ تاسف کی بات تھی مگر ان وجوہ پر کسی کی نظر نہیں تھی جو ایسے جرائم کا اصل سبب ہوتی ہیں۔ یہ وجوہ مقتولہ کے آس پاس ہی تو موجود تھیں بلکہ وہ تو خود ان "وجوہ" کا ایک حصہ تھی۔ ایک ایسے فلمی یونٹ کی رکن تھی جو نجانے کب سے اخلاق سوز فلمیں تیار کرنے میں مصروف تھا۔ دانا کہتے ہیں کہ دنیا گنبد کی آواز ہے۔ ایسی ہی ایک واہیات آواز لوٹ کر اس لڑکی تک پہنچی تھی اور اس کی جان لے گئی تھی۔ یہاں جو بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہاں بے راہ روی بو رہے تھے، سلامتی کیسے کاٹ سکتے تھے۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ یہ واقعہ ایک مکمل کہانی ہے جو راہ چلتے چلتے ہم نے پڑھ ڈالی ہے۔

شام کے بعد میں، صفدر اور غزالہ باہر سوئمنگ پول کے کنارے آن بیٹھے۔ زریں گل کو کلثوم کے ساتھ علیحدہ کر اٹل گیا تھا، وہ تو باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بہرحال دونوں کھانے پینے کے لیے مجبوراً باہر آتے تھے۔

خوشگوار ہوا میں سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھنا بڑا اچھا لگا۔ خوب صورت لائٹس میں نیلگوں پانی چمک رہا تھا۔ پام کے بلند درختوں تلے گھاس کے خوب صورت تختے تھے اس گھاس پر رنگین چھتریوں کے نیچے کرسیاں اور آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ چاروں کونوں میں چار فوارے چھوٹ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد صفدر کا دل نہانے کو مچلنے لگا۔ اس نے کاسٹیوم پہنا اور پول میں اتر گیا۔ میں اور غزالہ بیٹھے رہے۔ تابی گھاس پر اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ غزالہ کے چہرے پر الجھن تھی۔ بولی "یوں تو سالم صاحب کا رویہ ٹھیک ہی لگتا ہے میزبانی بھی کر رہے ہیں۔ مگر......"

"مگر کیا؟"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس چار دیواری میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"یہ بات تمہارے ذہن میں کیوں آئی؟"

وہ پُرسوچ انداز میں بولی "مبارک امین اور سالم کی دشمنی ہے۔ اب ہم نے اتفاقیہ طور پر مبارک کے خلاف اہم گواہوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے بیانات مبارک کو بردہ فروشوں کا ساتھی ثابت کر سکتے ہیں بلکہ بدر کے اغوا اور اس کے ساس سسر کے قتل کا ذمے دار بھی ٹھہرا سکتے ہیں۔"

"یعنی تم کہنا چاہ رہی ہو کہ یہ لوگ ہمیں مبارک امین کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں!"

"یقین تو نہیں بس ایک اندیشہ سا ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولی "صفدر بتا رہا تھا کہ وہ لوگ رائفلیں بھی مانگ رہے تھے۔"

"نہیں مانگی تو نہیں تھیں۔ اسماعیل یہ کہہ رہا تھا کہ انہیں کہیں حفاظت سے رکھ دیا جائے۔"

میں خاموشی سے اورنج جوس کی چسکیاں لیتا رہا۔ وہ بولی "ویسے آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس مرحلے میں ہمیں کسی طرح کی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ باقی تمہارے اندیشے کو مکمل طور پر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی چند لڑکیاں سوئمنگ پول پر پہنچ گئیں۔ وہ سب پیراکی کے لباس میں تھیں اور بڑی بے باکی سے کولہے مٹکا رہی تھیں۔ ان میں ایک گھونگریالے بالوں والی لڑکی خاصی اسمارٹ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ان آزاد منش لڑکیوں کا تعلق مصر یا اردن وغیرہ سے تھا۔ وہ سوئمنگ پول میں نہانے اور اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔ وہ سب کی سب انگلش بول رہی تھیں۔ کسی وقت میں وہ نہاتے ہوئے ہمارے بالکل قریب آجاتیں اور ایک دوسری پر پانی اچھالتیں۔ کبھی کبھی وہ ایک دلچسپ نظر ہم دونوں پر بھی ڈال لیتی تھیں۔ خاص طور سے غزالہ کو وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ غزالہ شلوار قمیص میں تھی۔ دوپٹا مضبوطی سے اس کے سر پر جما ہوا تھا۔ کندھوں پر شال تھی۔ اس کے مقابلے میں لڑکیاں مادر پدر آزاد نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے گھونگریالے بالوں والی لڑکی خاص طور سے بہت شوخ تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے دھیمی آواز میں غزالہ کے بارے میں ایک آدھ فقرہ بھی چست کیا ہے۔

میں نے پتلون قمیص اور ٹائی والے ایک نوجوان ویٹر سے ان لڑکیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے گھونگریالے بالوں والی لڑکی کا نام بڑے احترام سے ماموزہ بتایا۔ ویٹر کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ماموزہ چھوٹے صاحب یعنی سالم کے بھائی وسیم کی قریبی "دوست" ہے، اور دیگر لڑکیاں ماموزہ کی کزن ہیں۔

تھوڑی دیر بعد لڑکیاں پول سے باہر آگئیں اور "ریسٹ بنڈز" پر اوندھی سیدھی لیٹ گئیں۔ اس کے بعد کسی لڑکی نے شرارت کی۔ دوسری چیختی ہوئی اس کے پیچھے بھاگیں، اسے نیچے گرا کر بے تحاشا چٹکیاں کاٹنے لگیں۔ پھر ایک اور لڑکی کے پیچھے سب نے دوڑ لگا دی۔ وہ ہمارے اردگرد موجود تھیں۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ گھونگریالے بالوں والی لڑکی ایک سنگین شرارت کرنے جا رہی ہے۔ وہ ایک لڑکی سے الجھتی ہوئی غزالہ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ سب کچھ دانستہ تھا۔ وہ غزالہ کو پانی میں گرانا چاہ رہی تھی۔ جونہی وہ مصنوعی لڑکھڑاہٹ کے ساتھ غزالہ کی طرف بڑھی میری ٹانگ نے تیزی سے حرکت کی۔ یہ حرکت لڑکی کی "تیز حرکت" سے تیز تر تھی، میرا پاؤں آہستگی کے ساتھ لڑکی کے کولہے سے ٹکرایا۔ وہ غزالہ کو چھوئے بغیر لڑاتی ہوئی پانی میں جا گری۔ ایک ڈبکی کھانے کے بعد وہ سطح آب پر آئی۔ اس کے چہرے پر ولولے کے آثار تھے۔ وہ چند سیکنڈ میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر غرائی "یو...... یو باسٹرڈ۔ تم نے...... تم نے مجھے لات ماری؟"

"میں نے لات نہیں ماری۔ صرف اپنی ساتھی کو تمہارے دھکے سے بچایا ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم نے...... تم نے مجھے لات ماری ہے۔" وہ انگلش میں دہاڑی۔

اس نے سیڑھی پر پاؤں رکھا اور اچھل کر تالاب سے باہر آگئی پھر وہ غضب ناک انداز سے میری طرف بڑھی۔ اس کا نیم عریاں جسم کڑکتی بجلی نظر آرہا تھا۔ غزالہ نے ہمارے

جرمِ وفا

⇐ اگرتلہ لیکس سازش کیس، قتلِ ریاست اور بپھلی ہوئی ایک رومانی داستان۔

⇐ مصنف نے اس ناول میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی مکمل عکاسی اور تجزیہ پیش کیا ہے۔

⇐ سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان مسلم تاریخ کا دوسرا شرمناک سانحہ ہے۔ بغداد، غرناطہ اور متحدہ پاکستان کے آخری ادوار کا جائزہ لیا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ حکمرانوں کی عیاشیاں اور اخلاق، کردار کی کمزوریاں نمایاں نظر آتی ہیں۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر	7247414
اسٹاکسٹ	چوک میو ہسپتال، نسبت روڈ، لاہور ۔ فون: 7223853

درمیان آنے کی کوشش کی مگر لڑکی نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ میں نے لڑکی کو خود سے دور رکھنے کے لیے ایک کرسی اٹھائی اور اس کے پائے لڑکی کی سمت کر دیے "دیکھو! اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" میں نے اسے وارننگ دی۔ میرا پُراعتماد انداز دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی۔ اس نے چیخ کر گارڈز کو آواز دی۔ ایک ہٹا کٹا باکسر ٹائپ حبشی دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ غالباً وہ یہ سب کچھ پہلے سے دیکھ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اس نے میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس دوران میں صفدر پول میں سے باہر آ چکا تھا۔ اس نے گارڈ کی کلائی پکڑ لی اور مروڑ کر ہاتھ پیچھے کر دیا "ذرا ہوش سے گارڈ صاحب!" صفدر نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

غصیلے گارڈ نے اپنی طاقت کے زعم میں گھونسا چلایا۔ بڑا اچانک وار تھا مگر مدمقابل بھی صفدر تھا۔ اس نے سر جھکا کر وار بچایا اور جوابی مکا حبشی کی عین ناک پر رسید کیا۔ حبشی لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا اور گیلے فرش پر آگے تک پھسل گیا۔ لڑکیوں کے حلق سے سُریلی چیخیں نکل گئیں۔ مہمان خانے کی طرف سے دو تین گارڈز ہماری طرف لپکتے دکھائی دیے۔ ایک دم تصادم کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ واقعی تصادم ہو جاتا۔ ایک جانب سے ہمارا میزبان سالم آتا دکھائی دیا۔ اس نے دور ہی سے آواز دے کر مسلح افراد کو منع کر دیا کہ وہ الجھنے کی کوشش نہ کریں۔

غصے سے تھر تھر کانپتی مامونہ نامی وہ حسینہ مجھ سے چند قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ اس کے آب دار سنہری بدن سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر گر رہے تھے۔ ہم لوگ سوئمنگ پول کی جس سائیڈ پر کھڑے تھے وہاں روشنی قدرے کم تھی۔ اگر روشنی زیادہ ہوتی تو شاید تھر تھر کانپتی اس جل پری کے بدن سے پانی ٹپکنے کا منظر اور بھی فتنہ ساماں ہوتا۔ سالم باوقار انداز میں چلتا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ اس کے کان کی جڑاؤ بالی چمک رہی تھی۔ میری طرف دیکھنے کے بجائے اس نے اپنی تمام توجہ مامونہ پر مبذول کر دی۔ مامونہ کسی ناقابل فہم زبان میں تیز تیز بولنے لگی اور سالم کو سخت شکایتی انداز میں صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ اس کی ایک کزن نے ایک بڑا سا تولیا اس کے عریاں کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ صفدر نے بھی ایک تولیا اپنے کندھوں پر ڈال لیا تھا۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے نظر بچا کر اسے آنکھ مار دی۔ اس کا مطلب یہ تھا... "صفدر پیارے! تم نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اس چرچی کے اوباڈی گارڈ کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

ابھی ہماری صفائی پیش کرنے کی باری نہیں آئی تھی۔ ہم خاموش کھڑے تھے اور مامونہ کی تند و تیز چیخ و پکار جاری تھی۔ وہ ہاتھ نچا نچا کر بول رہی تھی' اچانک میری نگاہ مامونہ کے ہاتھ کے دو طلائی کنگنوں پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ ایک برقی لہر سی میرے پورے جسم میں دوڑنے لگی تھی۔ یہ جڑاؤ کنگن میرے لیے جانے پہچانے تھے۔ میرے حافظے کی سلیٹ پر ان کی نہایت واضح تصویر موجود تھی۔ ان قدیم کنگنوں میں ستارہ نما چھوٹے چھوٹے تین یا چار یاقوت لگے تھے۔ یاقوتوں کی سرخی کے درمیان مناسب تناسب سے زمرد کی سبزی موجود تھی۔ یہ زمرد مکون کی شکل میں تراشے گئے تھے۔ اس منفرد ڈیزائن کے کنگنوں کا ہر نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ یہ کنگن ہزاروں میل سے چل کر یہاں کیسے پہنچے تھے اور اس ماڈرن مصری تتلی کی گوری چٹی کلائی کی زینت کیسے بنے تھے؟ یہ سوال کسی نقارے کی طرح میرے پورے ذہن میں گونج رہا تھا۔ چند ہی لمحے میں مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ یہ سنہری کنگن اسی بیش بہا دفینے کا حصہ تھے جو چند سال پہلے جھنگ کے نواح میں پتے پل والی حویلی سے برآمد ہوا تھا اور جس نے انڈیا اور پاکستان میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ان کنگنوں کو دیکھنے کے ساتھ ہی میری نگاہوں میں سرخ اسٹیشن ویگن بھی گھومنے لگی تھی جو اپنی حفاظت میں ہمیں شہر کے مضافات سے اس کوٹھی تک لائی تھی۔ اس ویگن کی سائیڈ پر سفید رنگ میں کچھ حروف ہم نے دیکھے تھے وہ حروف اب تک میرے ذہن سے چپکے ہوئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ صفدر کے ذہن سے بھی چپکے ہوں گے۔ وہ حروف تھے۔۔۔ G. CLARCK AND CO۔۔۔ یعنی جی کلارک اینڈ کمپنی۔ مسٹر جی کلارک کا نام ہمارے لیے اجنبی کیسے ہو سکتا تھا۔ مسٹر جی کلارک ہی تو تھے جو اس وقت دفینے میں ہم سب کے حصے کے امین تھے۔ آج سے چند ماہ پہلے ہم نے اس وعدے پر برآمد شدہ دفینے کا تمام سامان ان کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ اسے فروخت کر کے ہم سب کے لیے قابل استعمال بنائیں گے۔ آج اس دور دراز افریقی شہر میں میں ایک ایسی گاڑی دیکھ رہا تھا جس پر مسٹر جی کلارک کی کسی فرم کا نام تھا اور اس کے ساتھ ہی میں ایک مصری حسینہ کی کلائی میں وہ کنگن دیکھ رہا تھا جن کا تعلق یقیناً۔۔۔ ہمارے دفینے سے تھا۔ سوئمنگ پول کے کنارے صفدر کے پہلو میں کھڑے کھڑے میرے دل نے گواہی دی کہ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔!

ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں دو گھنے درختوں کی وجہ سے روشنی کم تھی۔ سوئمنگ پول کا بھی بس ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ تند و تیز لہجے والی مصری حسینہ بدستور ہاتھ نچا نچا کر بات کر رہی تھی اور میری نگاہیں اس کی کلائی کے کنگنوں سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ اچانک لڑکی نے اپنی بات ختم کر دی۔ سالم تیزی سے صفدر کی طرف گھوما اور اس نے صفدر کو گردن سے پکڑ لیا' صفدر کے کندھوں پر صرف ایک تولیا تھا۔ سالم نے تولیے کو یوں پکڑا جیسے وہ صفدر کی قمیص کا گریبان ہو۔ دو تین زوردار جھٹکے دے کر وہ بولا "گویا سٹرڈ! کون ہو تم؟ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی۔ میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟"

اس نے صفدر کے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی سالم کے محافظوں نے دائیں بائیں سے صفدر کو پکڑ لیا۔ تین چار محافظ ایک دم مجھ سے بھی لپٹ گئے۔ یہ صورت حال میری سمجھ میں نہیں آئی' یقیناً صفدر کی سمجھ میں بھی نہیں آئی ہو گی۔ آج صبح ہی سالم سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں دیر تک ہم سے بات چیت کی تھی۔ اب وہ صفدر سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور اس نے باقاعدہ صفدر کو گھونسا مارا تھا۔ کیا اتنی کمزور یادداشت تھی اس شخص کی؟ یکایک مجھے احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے بجلی روشنی میں ذرا غور سے سالم کا چہرہ دیکھا اور انکشاف ہوا کہ یہ سالم نہیں ہے۔ اس کی شکل و صورت سالم سے بہت ملتی تھی مگر آواز اور پیشانی کی ساخت میں فرق موجود تھا۔ بڑی ڈرامائی صورت حال تھی' بلکہ اسے یہی کہنا چاہیے۔۔۔ جس شخص نے صفدر کو گردن سے پکڑ رکھا تھا' وہ تو سو فی صد سالم تھا۔

اسی دوران میں ایک طرف سے اسماعیل بھی بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے سالم کے ہم شکل کو مخاطب کیا اور مقامی زبان میں وضاحتوں اور دلیلوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اسماعیل "جارج ہال" والے واقعے کی طرح یہاں بھی ہمارا اچھا وکیل ثابت ہوا۔ اس کی بات سننے کے بعد مسٹر سالم کا ہم شکل اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے نہ صرف صفدر کا "گریبان" چھوڑ دیا بلکہ اس کے اشارے پر محافظوں اور ملازموں نے بھی صفدر کو اور مجھے چھوڑ دیا۔

اسماعیل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھے مخاطب کیا اور سالم کے ہم شکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ہمارے بڑے صاحب ہیں۔ مسٹر سالم کے چھوٹے بھائی' محترم وسیم حمید۔"

میں نے اور صفدر نے غور سے دیکھا۔ معمولی سے فرق کے ساتھ یہ شخص مسٹر سالم کی کاربن کاپی ہی تھا۔ وہی قد کاٹھ' وہی رنگت' ملتا جلتا لباس' ایک کان میں ویسی ہی ڈائمنڈ کی بالی۔ پہلی نظر میں کوئی بھی شخص دھوکا کھا سکتا تھا۔

صفدر کے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ اس نے تولیے کے کونے سے خون صاف کیا۔ مسٹر وسیم نے صفدر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ درست ہے کہ تم نے مس مامونہ صاحبہ کو ٹھوکر رسید کی؟"

مامونہ نے فوراً میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ٹھوکر اس نے ماری تھی۔"

میں نے کہا "سر! جو کچھ بھی ہوا' بالکل اتفاقیہ ہوا۔ آپ لڑکھڑا کر میری ساتھی مس غزالہ پر گرنے لگی تھیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے ٹانگ آگے کر دی۔ میرے خیال میں میری جگہ کوئی بھی ہوتا' اس سے یہ حرکت سرزد ہو جاتی۔"

مامونہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی کہ وسیم بولا "یہ جگہ اس بات چیت کے لیے مناسب نہیں۔ آپ لوگ ڈریس تبدیل کر کے اندر آ جائیں۔" اس کا اشارہ ہم دونوں کی طرف تھا۔ (صفدر سوئمنگ کے لباس میں تھا جبکہ میری قمیص محافظوں کی گرفت میں پھٹ گئی تھی)

مامونہ نامی وہ آفت خیز حسینہ بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ وسیم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے تلے قدم اٹھاتا اندرونی حصے میں چلا گیا۔

ہم دس پندرہ منٹ بعد ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچے۔ مسٹر وسیم اور دو ملازم وہاں موجود تھے' یہ دیکھ کر ہمیں قدرے اطمینان ہوا کہ اس "مقدمے" کا استغاثہ یعنی کافر ادا مامونہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ زور و شور سے پیروی کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ شاید جج صاحب یعنی مسٹر وسیم کو خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ استغاثہ کو جو لات رسید ہوئی ہے اس میں اس کا اپنا بھی قصور ہے۔

بہرطور اپنی محبوبۂ دلنواز کے مقابلے میں مسٹر وسیم نے ہم پناہ گزینوں کو نیچا تو دکھانا ہی تھا۔ انہوں نے پہلے اس گھر میں مس مامونہ کی قدر و منزلت بیان کی' ہمیں سمجھایا کہ یہاں مس مامونہ کی شان اور عظمت وہی ہے جو ہندوستان کے فرماں روا شاہ جہاں کے دولت کدے میں ممتاز محل کی تھی اور ہم نے مس مامونہ کی تشریف پر لات مار کر بہت بڑا جرم کیا ہے' لیکن یہ جرم چونکہ ناوانستگی میں ہوا ہے لہٰذا معافی کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے بعد مسٹر وسیم نے ہمیں تھوڑا سا ڈانٹا ڈپٹا اور اپنی طرف سے معاملہ برابر کر دیا۔

— مگر میرے دل و دماغ میں اس معاملے نے ...

رکھی تھی۔ مس ماسوتہ کے جڑاؤ کنگن دیکھ کر یہ اُتھل پیدا ہوتی ہی ہوئی تھی۔ میں اور صفدر رات گئے تک اپنے سامنے ایش ٹرے رکھے بیٹھے رہے "سگریٹ پھونکتے رہے اور اس معاملے پر غور کرتے رہے۔ میں نے کنگنوں کے بارے میں صفدر کو سب کچھ بتا دیا تھا' اب میری طرح اس کا ذہن بھی مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم اس دور دراز افریقی ملک میں یوں اچانک اور بالکل اتفاقیہ طور پر ایک بار پھر خود کو دفینے کے چکر میں پائیں گے۔ اب یہ بات ہم دونوں پر قریباً قریباً واضح ہو چکی تھی کہ سرخ ویگن پر ہم نے جو الفاظ درج دیکھے تھے ان کا تعلق مسٹر جی کلارک ہی سے تھا۔ جیسا کہ ہم دونوں اچھی طرح جانتے تھے مسٹر جی کلارک کا شمار امریکا کے گنے چنے دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ ان کے کاروبار کی سیکڑوں شاخیں تھیں اور یہ شاخیں تقریباً پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ بات قرین قیاس تھی کہ یہاں تنزانیہ میں بھی ان کا کوئی بزنس موجود ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں فوری اور مفصل معلومات درکار تھیں۔ اس حوالے سے فوراً جو بندہ ذہن میں آتا تھا وہ اسماعیل تھا۔ میں نے صفدر کے سامنے اسماعیل کا نام لیا تو وہ بولا "بے شک' وہ خاصا ہوشیار اور باخبر آدمی ہے۔ اسے معلوم ہو گا کہ "جی کلارک اینڈ کمپنی" کے الفاظ کے پیچھے کیا پوشیدہ ہے۔"

"مگر اسماعیل سے ملنے کے لیے صبح آٹھ نو بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میرے پاس اس کا فون نمبر تو ہے۔" صفدر نے کہا۔

"مگر اتنی رات گئے اس سے بات کر کے ہم اسے چونکا دیں گے۔ میرے خیال میں تو اس سے بالکل رسمی انداز میں بات کرنی چاہیے۔ یہ سوچ اس کے ذہن میں نہ آئے کہ ہم کسی طرح کا کھوج لگا رہے ہیں۔"

"مجھے لگ رہا ہے کہ آپ اپنے جڑواں میزبانوں کی طرف سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔"

"یہ اہل ثروت ہیں اور تم جانتے ہی ہو' اہل ثروت پر ہم آسانی سے اعتبار نہیں کیا کرتے۔ ایسے لوگوں کی اکثریت مفاد کے بغیر تھوک بھی ضائع نہیں کرتی۔"

"یہ بات تو ہے۔" صفدر نے تائید کی "کسی وقت مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس میزبانی کے پیچھے کوئی مقصد بھی ہے۔ شاید نزالہ کی بات ہی درست ہو۔ چونکہ ہماری حیثیت مبارک امین کے خلاف معتبر گواہوں کی ہو گئی ہے لہٰذا یہ لوگ ہمیں اپنی تحویل میں رکھنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر ہم یہاں سے جانے پر اصرار کریں تو یہ لوگ ہمیں اجازت دینے سے صاف انکار کر دیں۔"

"اچھا چلو صبح تک اسماعیل کا انتظار کرتے ہیں۔ درمیان میں چار چھ گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں۔"

کنگنوں کے بارے میں اور سرخ اسٹیشن ویگن کے بارے میں سوچتے ہوئے ہم سو گئے' اور ایسے سوئے کہ نو بجے کے قریب جاگے۔ سب سے پہلی صورت جو دیکھی وہ اسماعیل ہی کی تھی۔ وہ رات والے واقعے پر کچھ شرمندہ نظر آ رہا تھا' کہنے لگا "مجھے بہت افسوس ہے مسٹر شاہ جہاں اور مسٹر صفدر! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ شرارت مس ماسوتہ ہی کی ہو گی' ان کی شوخی شرارت کے بارے میں ہم سب ہی جانتے ہیں۔ مگر وہ چونکہ چھوٹے سر کی "بیسٹ فرینڈ" ہیں لہٰذا ان کی شوخیاں سب کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف سے آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "اسماعیل بھائی! اب تم ہمیں شرمندہ کر رہے ہو۔ تم نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے ہم اس کے لیے احسان مند ہیں۔ جارج ہال میں اگر تم ہماری مدد نہ کرتے اور مبارک امین کے غنڈوں کے سامنے دیوار بن کر ہمیں پناہ نہ دیتے تو یقیناً اس وقت ہم سخت مصیبت میں ہوتے۔"

"آپ کے ساتھ خواتین اور بچے تھے۔ ایک مسلمان کے ناتے میرا فرض تھا کہ میں اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق آپ کا ساتھ دوں۔"

میں نے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکا دیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ سرخ اسٹیشن ویگن پورچ میں کھڑی نظر آ رہی تھی' میں نے یونہی رسمی سے لہجے میں کہا "اسماعیل یہ جی کلارک اینڈ کمپنی کیا ہے؟"

اسماعیل نے بھی آگے بڑھ کر کھڑکی میں سے اسٹیشن ویگن کو دیکھا اور بولا "یہ ہماری فرم کا نام ہے۔ جم اسٹونز کے حوالے سے اس فرم کا نام تنزانیہ ہی میں نہیں پورے مشرقی افریقہ میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ قیمتی پتھروں کی کان کنی سے لے کر ان کی پراسیسنگ اور فروخت تک بہت سے کام یہ فرم کرتی ہے۔"

"مگر یہ جی کلارک کون ہے؟"

"مسٹر جی کلارک صاحب ہی اس فرم کے اصل روح رواں ہیں۔ وہ اسٹیٹس کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔ بے شمار کارخانے' فرمیں اور بحری جہاز ان کی ملکیت ہیں۔ تقریباً پوری دنیا میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ وہ کرشماتی شخصیت ہیں۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو سونا ہو جاتی ہے۔"

"مسٹر سالم اور مسٹر وسیم سے ان کا کیا تعلق ہے؟" میں نے دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"پارٹنرشپ کا تعلق ہے۔" اسماعیل نے جواب دیا "چھوٹے سر اور بڑے سر اس فرم میں تیس فی صد حصص کے مالک ہیں' باقی ستر فی صد حصص مسٹر جی کلارک صاحب کے ہی ہیں۔ وہ قریباً پانچ سال پہلے بڑے اور چھوٹے سر کے ساتھ اس کاروبار میں شامل ہوئے تھے۔ اس وقت کے بعد سے اس فرم نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے۔"

"کیا تم مسٹر جی کلارک سے ملے ہو؟" صفدر نے اسماعیل سے پوچھا۔

"ان جیسے بڑے لوگوں کے درشن ہم جیسے معمولی ملازمین کو کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ویسے کوئی ایک ماہ پہلے وہ یہاں تنزانیہ میں تشریف لائے تھے۔ اپنے ذاتی طیارے پر دارالحکومت دارالسلام پہنچے تھے۔ سر سالم نے ان سے وہیں جا کر ملاقات کی تھی۔"

"اب وہ کہاں ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ اب وہ تنزانیہ میں نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ واپس اسٹیٹس ہی پہنچ چکے ہوں۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے غور سے مجھے دیکھا اور بولا "کیا آپ... مسٹر جی کلارک کو جانتے ہیں؟"

"بس ایک دو دفعہ اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ امریکا کی کوئی بہت بڑی کاروباری شخصیت ہیں' ان کے ساتھ غالباً کسی TREASURE وغیرہ کا ذکر بھی آیا تھا۔ پاکستان کے کسی دیہاتی علاقے سے بہت سے ہیرے جواہرات ان لوگوں کے ہاتھ لگے تھے' اور اس کے علاوہ نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تھا۔"

"آپ کی معلومات درست ہیں۔" اسماعیل نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "کچھ اسی طرح کی اطلاعات مجھے بھی ملی تھیں... بلکہ میرا خیال ہے کہ... پچھلے دنوں مسٹر جی کلارک کی تنزانیہ میں آمد کا تعلق بھی نوادرات وغیرہ کے سلسلے میں ہی تھا لیکن یہاں میں ایک بات پر آپ سے اختلاف کروں گا۔ میری معلومات کے مطابق مسٹر جی کلارک کو ملنے والے نوادرات کا تعلق پاکستان سے نہیں انڈیا سے ہے۔"

"شاید تمہاری معلومات ہی درست ہوں۔" میں نے بولیں سے کہا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ ان نوادرات کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے کھودا ہے اور اس دفینے کو اپنے ہاتھوں سے نکالا ہے۔

یقیناً میری طرح صفدر کے ذہن میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ کل رات مصری حسینہ کی نازک کلائیوں میں جو کنگن دمک رہے تھے وہ ہمارے ہی مال و متاع کا حصہ تھے۔

ناشتا کل کی طرح زبردست تھا' یہ ناشتا کھانے کے کمرے میں افق تا افق پھیلا ہوا تھا۔ درجنوں ہی ڈشز ہوں گی۔ چار پانچ طرح کے فروٹ جو سبز بھی شیشے کے جاروں میں چمک رہے تھے۔ سبزی' گوشت' انڈے' مکھن جام' سبھی کچھ اس ناشتے میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس پر طرہ وہ خوب صورت لڑکیاں تھیں جو پھلواری جیسے ناشتے پر تتلیوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ ان کے کشادہ گریبان اور عریاں ٹانگیں دیکھ کر زریں گل لاحول پڑھنا چاہتا تھا مگر کچھ پڑھنے کے لیے منہ کا خالی ہونا ضروری ہوتا ہے' لہٰذا ایک گھنٹے کے ناشتے کے دوران میں زریں ایک مرتبہ بھی لاحول نہیں پڑھ سکا۔

بے شک لنچ اور ڈنر وغیرہ بھی شان دار ہوتا تھا مگر یہاں جو اہتمام ناشتے میں ہوتا تھا وہ سب سے جدا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم سب باہر گراسی لان میں جا بیٹھے۔ ابھی بیٹھے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک طرف سے بدر تیز تیز چلتی آئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا۔ پاؤں کی لنگڑاہٹ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میرے پاس آ کر وہ تیز تیز بولنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے جذبات تھے۔ اس نے باقاعدہ میرے اور صفدر کے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی۔

میں نے دیکھا کہ بدر کے عقب میں ایک دبلا پتلا جوان سال شخص کھڑا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی' لباس اور صورت سے غربت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بدر ہی کی طرح تشکر نظر آ رہا تھا۔ ایک ملازم نے مترجم کے فرائض ادا کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ یہ جوان سال شخص بدر کا شوہر ہے جو محنت مزدوری کے لیے یہاں ارنگا آیا ہوا تھا۔ اسے آج صبح ہی ایک قریبی فیکٹری سے تلاش کیا گیا ہے۔

مترجم کے ذریعے بدر نے بتایا کہ وہ بے حد... بے حد خوش ہے کیونکہ اس کے باقی تینوں بچے بھی اس کے پاس پہنچ گئے ہیں۔

"وہ کیسے پہنچے؟" صفدر نے مترجم کے ذریعے پوچھا۔

وہ بولی "جس کرسچین عورت کے حوالے بچوں کو کیا گیا تھا' اس نے بڑی حفاظت سے انہیں یہاں ارنگا میں پہنچا دیا۔ میڈم جین نامی اس کرسچین عورت کو میرے شوہر کا ٹھکانا معلوم تھا' وہ بچوں کو سیدھا باپ کے پاس لے آئی۔ اب وہ بچے اپنی پھوپی سمیت اس عمارت میں موجود ہیں۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "اب آپ ہمیں یہاں

سے جانے کی اجازت دیں۔ ہم غریب لوگ ہیں' کسی لڑائی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے' نہ ہی پولیس اور عدالت وغیرہ کا سامنا کرنے کی ہم میں ہمت ہے۔ ہمارے پاس اس شہر میں ایک محفوظ ٹھکانا موجود ہے۔ ہم وہاں ایک دو ماہ کے لیے سر چھپا کر بیٹھ جائیں گے' جب حالات ٹھیک ہوں گے تو پھر اپنی زمین اور مکان بیچ کر کہیں اور نکل جائیں گے۔ بس اب آپ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت عنایت کر دیں۔"

میں نے کہا "بی بی! اگر تم جانا چاہتی ہو تو ہماری طرف سے اجازت ہی اجازت ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اصل اجازت یہ لوگ دیں گے جن کے پاس ہم مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر آپ ان سے اجازت لے دیں جی۔" بدر کے خاوند نے گھگھیا کر کہا "ہم یہاں مزید ٹھہرنا نہیں چاہتے ہیں۔"

"کیوں ایسی کیا پریشانی ہے؟" صفدر نے مترجم کی وساطت سے پوچھا۔

بدر کے خاوند نے کہا "بس ہم غریب لوگ ہیں جی' جھونپڑیوں میں رہنے والے اور روکھی سوکھی کھانے والے۔ ایسے محلوں میں تو ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہم اپنے مقام پر ہی اچھے لگتے ہیں صاحب جی۔"

میں نے محسوس کیا کہ بدر کا شوہر "راحد" کچھ گھبرایا ہوا بھی ہے۔ غالباً اسے خطرہ تھا کہ یہ خاطر تواضع اور مہمان نوازی اسے اور اس کے اہل خانہ کو راس نہیں آئے گی۔ وہ ایسے لوگوں کا مہمان بنا ہوا تھا جن کے نوکروں کے نوکر بھی اس سے ہزار درجہ بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ یہ انہونی اس سادہ لوح کے دل میں شک ابھار رہی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی نہایت خوب صورت بیوی اور جوان بہن بھی تھی۔ اگر اس محل کے کسی کمرے میں ان دونوں سے اس آرام و آسائش کا خراج وصول کیا جانے لگتا تو وہ بے چارہ کیا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بچی کچھی آبرو لے کر جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے اس سے کہا "لنچ کے وقت مسٹر سالم یا مسٹر وسیم سے ملاقات ہوگی۔ اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کو یہاں سے جانے کی اجازت مل سکتی ہے یا نہیں۔ مگر ایک بات تمہیں بھی ذہن میں رکھنی چاہیے۔ اگر تمہارے پاس واقعی کوئی محفوظ ٹھکانا ہے تو پھر یہاں سے نکلو ورنہ یہ حماقت مت کرنا۔ مبارک امین تم تک پہنچ گیا تو بہت برا سلوک کرے گا۔"

واحد نے یقین دلاتے ہوئے کہا "آپ کی فکر مندی کا بہت بہت شکریہ جی۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ جہاں ار نگا میں ہم ہر خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

بدر نے مترجم کی وساطت سے تقریباً روتے ہوئے کہا "ہم بہت مسکین لوگ ہیں صاحب! یہاں کی مہمان نوازی ہم کو بہت ہی مہنگی پڑے گی۔ ہمیں جانے کی اجازت لے دیں۔ یہاں میرے شوہر کا ایک بہت پرانا دوست اسے مل گیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ پتا نہیں۔ ہم اس کے گھر میں بالکل محفوظ رہیں گے۔"

دوپہر کو کھانے پر ہمیں مسٹر سالم کا بہت شدت سے انتظار تھا مگر سالم کے بجائے چھوٹے بھائی وسیم کی شکل نظر آئی۔ دونوں میں واقعی چونکا دینے والی مشابہت تھی۔ مسٹر وسیم نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ ایک طرح سے یہ ہماری عزت افزائی تھی اور اس بات کا اظہار بھی تھا کہ "ہم کم حیثیت" ہونے کے باوجود ان برادران کی نگاہوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔

کھانے کے بعد اسماعیل نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ میں جو درخواست مسٹر سالم کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا وہ ان کے چھوٹے بھائی کے سامنے پیش کر دوں۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ وہی کافر ادا حسینہ وسیم کے پہلو میں موجود تھی جس نے غرّاۓ کو بول میں دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں میری ٹانگ کھائی تھی۔ اس کا چہرہ مہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی تک اس غم کو بھولی نہیں ہے۔ بہرحال میں نے دل کڑا کر کے وسیم کو مخاطب کیا اور کہا "ہمارے ساتھ جو مقامی خاتون بدر ہے اس کا شوہر یہاں پہنچ گیا ہے۔ اب وہ دونوں اپنے بچوں سمیت یہاں سے جانا چاہتے ہیں' اگر آپ مناسب سمجھیں۔"

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔" وسیم نے تیزی سے قطع کلامی کی "آپ سب لوگ اس وقت رسک پر ہیں۔ وہ چائے فروش مبارک اور اس کے کتے ہر طرف آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اگر یہ خاتون اور اس کا شوہر یہاں سے نکل کر ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ان کا حشر خراب تو ہوگا ہی' آپ سب لوگوں کے لیے بھی خطرہ سو گنا بڑھ جائے گا۔ مبارک امین کی مار کھا کر یہ میاں بیوی پانچ منٹ میں بک دیں گے کہ آپ سب لوگ اس چار دیواری میں ہیں۔"

میں نے کہا "بدر کے شوہر کا کوئی بہت پرانا دوست اسے یہاں ار نگا میں مل گیا ہے وہ ان لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتا ہے۔ بدر اور راحد کا خیال ہے کہ مبارک امین کے

فرشتے بھی اس چار دیواری تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگر آپ اپنی حفاظت میں رازداری کے ساتھ ان میاں بیوی کو اس گھر تک پہنچا دیں تو ممکن ہے کہ یہ لوگ خود کو چھپانے میں کامیاب رہیں۔"

"مسٹر شاہ جہاں! مجھے تم سے ایسی ہلکی پھلکی بات کی توقع نہیں تھی۔ تم ان دیہاتوں کی باتوں میں آ رہے ہو۔ یہ تو ایک ہی سانس میں تین دفعہ اپنا بیان بدل لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو پتا نہیں اور نہ تم لوگوں کو پتا ہے کہ اس چار دیواری سے باہر کتنے خطرات ہیں آپ سب کے لیے۔ آپ کے ہاتھوں سے قتل ہوئے ہیں اور مقتول بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے علاقے میں خدا بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ انسان کو چیونٹی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔"

وسیم کے پہلو میں بیٹھی ہوئی فتنہ سامان مامونہ نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور بولی "اسماعیل! کیا یہ لوگ واقعی پاکستان سے آئے ہیں؟" اسماعیل نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "کیا کراچی سے آئے ہیں؟"

اسماعیل نے کہا "نہیں لاہور سے' وہ بھی کراچی کی طرح ایک بڑا شہر ہے۔"

مامونہ بولی "اتفاقاً میں بھی پاکستان جا چکی ہوں۔ کافی سیاحت کی تھی میں نے پاکستان میں۔ مجھے تو وہاں کے دیہات میں بھی ایسے سیدھے سادے بندے نظر نہیں آئے جیسے ہمارے یہ مہمان ہیں۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگی "یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ جتنے سیدھے نظر آ رہے ہیں' اتنے ہی ہوشیار اور گھاگ ہوں۔"

صفدر نے اردو میں سرگوشی کی "لگتا ہے کہ اس حرام زادی کو ابھی تک آپ کی لات نہیں بھولی۔"

وسیم نے کہا "آپ لوگ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ موجودہ حالات میں آپ کا اس چار دیواری سے قدم باہر نکالنا کتنا خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہمیں صاف طور پر ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔" صفدر نے پھر سرگوشی کی۔

وسیم نے دیکھ لیا۔ صفدر سے مخاطب ہو کر بولا "مسٹر! تم نے جو کچھ کہنا ہے' بے جھجک کہو اور براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہو۔"

صفدر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "محترم! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بدر نامی یہ خاتون ایک دو دن بھی مزید یہاں رہی تو شاید ذہنی توازن کھو بیٹھے گی۔ آپ اس سے خود بات کر کے دیکھ لیں۔ اس کے لیے یہاں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کچھ روز پہلے تک وہ مبارک امین کی طرف سے کتنی شدید بدسلوکی کا شکار ہوتی رہی ہے۔ اس کا جسم ابھی تک ان زیادتیوں کی گواہی دے رہا ہے اور جسم ہی نے اس کے ذہن پر بھی اثر کیا ہے۔ اس چار دیواری جیسا پُر تکلف ماحول اسے پہلے بھی ڈس چکا ہے۔ اب وہ اس ماحول سے فوراً نکل جانا چاہتی ہے۔"

"آپ کا نام صفدر ہے شاید۔" مامونہ نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"اگر آپ اپنی نفسیات پاس ہی رکھیں تو بہتر ہے۔" وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولی "اور اگر کچھ کہنا ہی ہے تو پھر اصل بات زبان پر لائیں۔ مجھے شک ہے کہ آپ لوگ ہم پر اعتبار نہیں کر پا رہے ہیں۔"

"اور مجھے شک ہے کہ آپ "کل" رات والا رنج بھولی نہیں ہیں۔"

"مسٹر صفدر۔" وسیم نے تلخ لہجے میں کہا "آپ گڑے مردے مت اکھاڑو۔ میرے پاس بحث میں پڑنے کا وقت نہیں ہے۔ جو اصل صورت حال ہے وہ میں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ سمجھنا نہ سمجھنا آپ کا کام ہے۔ باقی اگر آپ لوگ یہاں سے جانا چاہتے ہو تو اس کی اجازت آپ کو سالم صاحب سے ہی لینی ہوگی' وہی آپ کو یہاں لائے ہیں۔"

"اور سالم صاحب سے کیسے ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اب شام کو ہی آئیں گے۔" وسیم نے روکھا سا جواب دیا۔

وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم نے اس سے تکرار کر کے اسے ناراض کیا ہے اور ساتھ ہی اس "مہمان نوازی" کی ناشکری کی ہے جو ہمیں یہاں میسر ہے۔

بدر اور اس کے شوہر کی حالت سچ مچ پتلی ہو رہی تھی۔ وہ جیسے سونے کے پنجرے میں تھے اور پھڑپھڑا کر زخمی ہو رہے تھے۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ وہ نامعلوم اندیشوں میں گھرتے چلے جا رہے تھے۔ سہ پہر کو جب میں' صفدر اور غزالہ کمرے میں چائے پی رہے تھے' زریں گل کی غیر موجودگی ہم سب نے محسوس کی۔ یہاں آنے کے بعد وہ کلثوم کا سچا اور پکا عاشق ثابت ہو رہا تھا۔ میاں بیوی کو رہنے کے لیے علیحدہ کمرا مل گیا تھا اور وہ بس کمرے کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ کسی وقت چندھیائی چندھیائی آنکھوں سے باہر جھانکتے تھے' ذرا نہ رنگا نکلتے تھے اور پھر اندر چلے جاتے تھے۔ کل رات زریں نے بہانہ بنایا تھا کہ اس کی طبیعت گری گری ہے اور ہلکی سی

حرارت بھی ہے۔ صفدر نے فوراً کہا تھا "ہلکی سی حرارت نہیں' کافی تیز حرارت ہے تمہیں۔ بلکہ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے سے بخار تمہاری ہڈیوں میں گھسا ہوا ہے۔ اس کا مکمل علاج کراؤ' ورنہ زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔"

ابھی ہم نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ ایک باوردی ملازم جس کے شولڈر پر سرخ پٹی سی لگی ہوئی تھی دروازے پر نظر آیا۔ یہ سیاہ فام ملازم پڑھا لکھا تھا' اس کا نام یونٹے تھا اور ہیڈ سرونٹ تھا۔ یونٹے کے طور اطوار بڑے مہذبانہ اور قاعدہ اسٹار قسم کے تھے۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم رات کے وقت ذرا محتاط رہیں' اگر دروازے پر دستک ہو تو صرف اس صورت میں دروازہ کھولیں اگر اسماعیل بول رہے ہوں۔

میں نے یونٹے سے پوچھا "یہ ہدایت کس کی طرف سے ہے؟"

وہ بولا "بڑے صاحب (سالم) کی طرف سے۔"

میں چونک گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اسماعیل سے پوچھا تھا کہ سر سالم سے کب ملاقات ہو سکے گی۔ وہ بولا تھا کہ سر سالم شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں' شام سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔ اب یہ ہیڈ سرونٹ بتا رہا تھا کہ سر سالم نے ہمارے لیے پیغام دیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوٹھی میں ہی موجود ہیں لیکن ہم سے ملنا نہیں چاہ رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دوپہر کے کھانے پر بھی وہ کھرائی میں ہوں۔ دال میں کالا اب واضح نظر آنے لگا تھا۔ ابھی جو پیغام مجھے پہنچایا گیا تھا یہ بھی ہمیں خوف زدہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ ہو سکتا تھا۔ بے شک ہمارے لیے مباوک امین کا خطرہ موجود تھا مگر اس خطرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا رہا تھا۔

میں نے یہ سب کچھ غزالہ اور صفدر کو بتایا' وہ بھی متفکر نظر آنے لگے۔ صفدر بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے ہوں۔"

غزالہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ مسٹر سالم رات کے کھانے پر بھی نظر نہیں آئیں گے۔ انہوں نے ہمیں چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ ہمیں یونہی رَخا تا رہے گا اور کوئی ڈھنگ کی بات نہیں بتائے گا۔"

"پھر اب کیا ہونا چاہیے؟" میں نے مشورہ طلب نظروں سے صفدر اور غزالہ کو دیکھا۔

صفدر نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم نے تکلف میں آکر غلطی کر دی ہے۔"

"کون سی غلطی؟" غزالہ نے پوچھا۔

"اپنے ہتھیار دینے والی غلطی۔ اب ہماری تینوں رائفلیں ہمارے میزبانوں کے پاس بطور امانت محفوظ ہیں۔"

"سوائے میرے چھرے کے۔" میں نے اپنی پنڈلی کو ٹٹولا جہاں ڈیڑھ فٹ لمبا چھرا موجود تھا۔

"ہاتھی کے سامنے جو حیثیت غلیل کی ہوتی ہے' وہی اس صورتِ حال میں آپ کے چھرے کی ہے۔" صفدر نے تبصرہ کیا۔

"ویسے مجھے امید ہے کہ توپ و تفنگ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہ معاملہ کسی اچھے طریقے سے ہی سلجھے گا۔ یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے پرانے دوست مسٹر جی کلاوک کا ان جوہری برادران سے گہرا تعلق ہے۔ ممکن ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہم مسٹر جی کلارک سے بالمشافہ گفتگو کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"آپ کو تو ہر جگہ امید کی کرن دکھائی دے جاتی ہے مگر مجھے تو یہاں گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور معاف کیجیے گا' یہ جو آپ مسٹر جی کلارک کی بات کر رہے ہیں' مجھے تو کبھی کبھی اس معاملے میں بھی وسوسے گھیر لیتے ہیں۔ نجانے کیوں یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ مسٹر جی کلارک ابھی ہم سے ملنا نہیں چاہ رہے ہیں' یا پھر وہ کسی ایسے چکر میں پھنس گئے ہیں جس نے انہیں بے بس کر دیا ہے۔"

"خیر اب یہ معاملہ صاف ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔"

ایک دم مجھے خاموش ہونا پڑا۔ مسٹر سالم کا ہٹا کٹا سیکریٹری میری طرف دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میرے پاس آتے ہی وہ بولا "جناب! تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کو اینکسی کے یہ کمرے فوراً خالی کرنا ہوں گے۔"

"کیوں خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے صاحب کے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ بڑے صاحب کے حکم کے مطابق انہیں ان کمروں میں ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ٹھیک چھ بجے وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔ تکلیف کے لیے بڑے صاحب نے بھی معذرت چاہی ہے۔"

"پھر ہم کہاں جائیں گے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"آپ کے لیے اوپری منزل پر کمرے کھلوا دیے ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو آپ کا سامان بھی وہاں شفٹ کر دیا جائے۔"

میں نے کہا "میں اسماعیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اسماعیل صاحب' ابھی مہمانوں کو ریسیو کرنے کے لیے ایئرپورٹ روانہ ہو گئے ہیں۔ بڑے صاحب بھی بس ایئرپورٹ کے لیے نکلنا چاہ رہے ہیں۔"

ہم سے رسمی اجازت لینے کے بعد سیکریٹری چلا گیا۔ پانچ دس منٹ کے اندر ہم اپنے مختصر سامان سمیت بالائی منزل پر شفٹ ہو گئے۔ یہ کمرے بھی اچھے تھے مگر نیچے والے کمروں سے کہیں کم تر تھے۔ پھر جس طرح ہمیں ایک دم یہاں شفٹ کیا گیا تھا' اس میں بھی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ بہرحال ہم تیل اور تیل کی دھار دیکھنے پر مجبور تھے۔ گھر کے ملازمین اور دیگر اسٹاف کی بھاگ دوڑ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اہم لوگ آ رہے ہیں۔ بڑی تیزی سے کمروں کی صفائی کی گئی تھی۔ کارپٹ پر کلینز دوڑایا گیا تھا۔ گملوں میں لگے ہوئے پھول پودوں پر اسپرے کر کے انہیں تر و تازہ اور چمک دار بنا دیا گیا تھا۔

ٹھیک ساڑھے چھ بجے مہمان کاروں کے ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت میں پہنچ گئے۔ ان میں سات آٹھ خواتین' چھ بچے اور پانچ مرد حضرات تھے۔ مرد حضرات میں سنہری بالوں اور نظر کے چشمے والے ایک موٹے امریکی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ شخص میرے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھا' میں پاکستان میں اور پھر انڈیا میں آٹھ دس مرتبہ اس شخص کو دیکھ چکا تھا اور دو چار مرتبہ گفتگو بھی کر چکا تھا۔ یہ شخص مسٹر جی کلاوک کا منیجر تھا اور بین الاقوامی ٹریڈ کے معاملات میں مسٹر کلاوک کی مشاورت کرتا تھا۔ اس شخص کا نام واک ملٹن تھا۔ ملٹن کو دیکھنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جلد یا بدیر مسٹر جی کلاوک کے درشن بھی ہو سکتے ہیں۔ جوہری برادران اور ان کے اہلِ خانہ مسٹر ملٹن کی راہ میں بچھے جا رہے تھے۔ انہیں بے حد عزت و احترام سے مہمان خانے میں پہنچایا گیا اور دونوں جوہری برادران یعنی مسٹر سالم اور مسٹر وسیم ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے مہمان خانے کے اندر ہی سنہری بالوں والے ملٹن سے چپکے رہے۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مسٹر ملٹن اور اس کے ساتھ آنے والے لوگوں کو یہاں وی آئی پی کا درجہ حاصل ہے۔ اگر مسٹر کلاوک کے ایک ملازم کی یہاں اتنی قدر و منزلت تھی تو خود مسٹر جی کلارک کی یہاں کیسی پذیرائی ہوتی ہوگی۔ ان کو تو شاید اکیس توپوں کی سلامی بھی دی جاتی ہو۔

مسٹر کلاوک کی طاقت اور شان و شوکت کا اندازہ تو ہمیں پہلے بھی تھا' اب ان کے ایک ملازم کی یہ آؤ بھگت دیکھ کر کچھ اور بھی اثر پڑ رہا تھا۔ یہ "آؤ بھگت" کرنے والے لوگ ایرے غیرے نہیں تھے' تنزانیہ کے امیر ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ان کے ٹھاٹ باٹ کسی طرح بھی لارڈز اور بیرنز سے کم نہیں تھے۔ معزز مہمانوں کے اعزاز میں شان دار عشائیہ دیا گیا بہرحال ہم نے اپنا ڈنر کھانا بالائی

منزل کے کمروں میں ہی کھایا۔ ایک ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک ہی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی تفریحی دورے پر یہ لوگ مصر آئے ہوئے تھے۔ قاہرہ سے اچانک ان کا پروگرام تنزانیہ میں آنے کا بن گیا۔ یہاں انہیں صرف دو دن رکنا تھا۔

ان معزز مہمانوں کے گلے میں کیمرے اور دوربینیں وغیرہ دیکھ کر ہمیں بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ مسٹر ملٹن اور ان کے اہلِ خانہ کسی تفریحی دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ رات کو میں اور صفدر دیر تک پروگرام بناتے رہے کہ ہمیں ملٹن کو اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں اور اگر کرنا چاہیے تو کس طریقے سے۔

اگلا دن خاصا خوشگوار تھا۔ دھوپ زیادہ شدید نہیں تھی۔ کبھی کسی وقت بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کا تمتمایا ہوا چہرہ ڈھانپ لیتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ یہ کمروں میں گھسے رہنے کا موسم نہیں تھا' مگر ہم گھسے رہنے پر مجبور تھے۔ معزز مہمانوں کی آمد کے بعد ہم پر باقاعدہ کرفیو لگا دیا گیا تھا کہ ہم اپنے کمروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مسٹر سالم نے بنفسِ نفیس ہمیں یہ پیغام دیا تھا کہ ہم اپنے کمروں تک محدود رہیں اور نیچے آنے کی کوشش تو بالکل نہ کریں۔ انہوں نے یہ باور کرایا تھا کہ ایسا ہماری سکیورٹی کے لیے ضروری ہے۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب سوئمنگ پول کے اردگرد چہل پہل نظر آئی' بڑی بڑی رنگین چھتریوں کے نیچے بہت سی کرسیاں رکھی تھیں' اور معزز امریکی مہمانوں کے علاوہ کچھ دیگر خواتین و حضرات بھی ان کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ سوئمنگ کے نہایت مختصر لباس میں کچھ سفید اور سیاہ فام تتلیاں' ہیجان خیز انداز میں اِدھر سے اُدھر منڈلاتی پھر رہی تھیں۔ دو انگریز لڑکیاں جو لڑکپن اور بلوغت کے سنگم پر کھڑی تھیں بڑی بے باکی سے بار بار ڈائیونگ بورڈ پر پہنچتی تھیں اور پانی میں چھلانگ لگا دیتی

تھیں۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ڈائیونگ کی مشق کر رہی ہیں۔ چند مقامی نوجوان کرسیوں پر بیٹھے تھے اور بڑے مہذب لیکن بڑے ہی حریص انداز میں ان لڑکیوں کو تکتے چلے جا رہے تھے۔ لڑکیاں بھی اپنے جسموں پر نگاہوں کی تپش محسوس کر کے زیادہ بے باک ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد مسٹر ملٹن بھی نظر آئے۔ ان کے سنہری بالوں کے درمیان میں سے چندیا صاف چمکتی نظر آ رہی تھی۔ ملٹن کے ساتھ دونوں جوہری برادران بھی تھے۔ دونوں نے قریباً ایک ہی طرح کے لباس پہن رکھے تھے۔ دونوں کے ایک ایک کان میں ڈائمنڈ کی بالی دور ہی سے چمکتی دمکتی نظر آ رہی تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ملٹن کے راستے میں بچھ بچھ جا رہے ہیں۔ چھوٹے جوہری یعنی وسیم کی فتنہ ساماں محبوبہ ماسونہ بھی ہمراہ تھی۔ وہ بتیسی نکال نکال کر ملٹن سے باتیں کر رہی تھی۔ خوش پوش افراد کا یہ گروہ بھی پول کے کنارے کرسیوں پر جا بیٹھا۔ اس کے بعد چنچل لڑکیوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی۔ ان میں زیادہ تر گندمی رنگت والی یا سفید فام تھیں۔ اپنے نہایت مختصر لباس میں یہ، مردوں کے ہوش و خرد پر بجلیاں گراتی ہوئی پول میں اتر گئیں۔ ان کے پیراکی کے لباس دو رنگوں کے تھے۔ بعد ازاں اندازہ ہوا کہ یہ دراصل واٹر پولو کی دو ٹیمیں ہیں۔ کچھ دیر یہ لڑکیاں پانی میں مشق کرتی رہیں' اس کے بعد باقاعدہ میچ شروع ہو گیا۔

صفدر کے علاوہ غزالہ بھی کمرے میں ہی موجود تھی۔ ہم کھڑکی میں سے نیچے سوئمنگ پول کا منظر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد زریں گل بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھوں میں بے خوابی کے آثار تھے۔ اگر غزالہ پاس نہ ہوتی تو صفدر 'زریں گل پر چوٹ کرنے سے باز نہ آتا۔ کم از کم وہ یہ شعر تو ضرور پڑھتا۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت' یہ کھلے کھلے سے گیسو۔

میں نے کہا "زریں گل! تمہیں ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

زریں طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "ام اپنے کمرے میں تھا۔"

"وہ تو ہمیں کئی دن سے معلوم ہے۔" صفدر نے فوراً کہا۔

"اماری پوری بات تو سنیں۔ ام کمرے میں تھا' وہاں کھڑکی سے ام نے تالاب کا منظر دیکھا۔ ام نے سوچا کہ آپ کو بھی بتائے کہ یہاں کیا کیا تماشا ہو رہا ہے۔"

"اور ہم پہلے سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"ام کو تو لگتا ہے کہ ام ایک دم یورپ میں آ گیا ہے۔ غضب خدا کا' ایسا بے شرمی۔ کلیجا منہ کو آتا ہے۔"

زریں گل لعن طعن کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ میچ بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ صفدر نے کہا "تم تقریر بھی کر رہے ہو اور ساتھ ساتھ دیکھتے بھی جا رہے ہو۔"

"جو ام دیکھ رہا ہے' وہ آپ نہیں دیکھ رہا' اور جو آپ دیکھ رہا ہے وہ ام نہیں دیکھ رہا۔"

"میں کیا دیکھ رہا ہوں؟" صفدر نے کہا۔

"آپ کھیلنے والیوں کو دیکھ رہا ہے' ام کھیل دیکھ رہا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بندہ کھیلنے والیوں کو نہ دیکھے صرف کھیل دیکھتا رہے۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا؟ آپ صرف بال پر نظر رکھیں۔ خو آپ کا اللہ بھی خوش رہے گا اور آپ بھی خوش رہیں گے۔"

میں نے کہا "زریں گل ایک کام کرتا ہے۔"

"زہے نصیب" وہ بولا "ام تو خود بھی بے تحاشا بور ہو رہا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے تم جتنا بور ہو رہے ہو' بہرحال اس بات کو چھوڑو' تم یہ بتاؤ' اس سنہری بالوں والے بندے کو جانتے ہو؟" میں نے کھڑکی سے نیچے پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں جانتا جی۔ ام نے تو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یہ کلارک صیب کا دوست ہے ناں۔"

"دوست نہیں' ملازم ہے۔"

"جیسے تم ہو۔" صفدر نے فوراً کہا۔

"ام نے پکا فیصلہ کیا ہے کہ اب آپ کی بات کا برا نہیں مانے گا۔"

"تو پھر کیا کرے گا؟" صفدر نے پوچھا۔

"بس ایک دم آپ سے کشتم کشتا ہو جائے گا۔" زریں نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

میں نے کہا "اچھا مذاق چھوڑو۔ تم اس بندے کو جانتے ہو ناں؟" زریں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ یہ بھی تمہیں جانتا ہو گا۔ بس تم نے کسی طرح اسے اپنی شکل دکھانی ہے۔"

"کیا مطلب؟ اماری شکل میں کوئی نقص وغیرہ ہے؟"

"وہ تو ہے' لیکن اس وقت ہمارا مقصد کچھ اور ہے۔ چاہتے ہیں کہ سنہری بالوں والے اس بندے کو یہاں ہماری موجودگی کا پتا چل جائے۔"

"بس اتنی سی بات ہے۔ لو جی' ام ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

"یہ اتنا آسان کام نہیں۔" میں نے کہا "میزبانوں نے ہمارے کمرے سے نکلنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ وہاں سیڑھیوں پر باقاعدہ دو مسلح گارڈز کھڑے ہیں۔ بظاہر وہ ہماری حفاظت کے لیے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں نیچے نہیں جانے دیں گے۔"

زریں گل چند لمحے سوچتا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر صفدر بولا "تم ایسے کرو کہ انگلش فلم "حسن کے چور" والی ترکیب استعمال کرو۔ اس میں ہیروئن مسلح محافظوں کو اپنی باتوں میں لگاتی ہے اور ہیرو نظر بچا کر قید خانے سے باہر نکل جاتا ہے۔"

زریں فوراً بولا "نہیں صفدر صیب! ام پاکستانی فلم ہزار داستان والی ترکیب استعمال کرے گا۔ ام اپنے کمرے کے پچھواڑے والی کھڑکی کھولتا ہے اور پائپ کے سہارے فٹافٹ نیچے اتر جاتا ہے۔ بس آپ دیکھتے جائیں ام کیا کرتا ہے۔"

اور پھر ہمارے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی زریں گل نے وہ سب کچھ کر دکھایا۔ وہ آناً فاناً اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اسے نیچے باغیچے کے پاس دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ بندر ہی کی پھرتی سے نیچے اترا تھا۔ اس نے ایک فتحیابی نگاہ ہم پر ڈالی اور دھیمے قدموں سے سوئمنگ پول کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی کرسیوں کی سب سے پچھلی قطار سے دس پندرہ قدم دور ہی تھا کہ گارڈز نے اسے دیکھ لیا' زریں ان سے لاپروا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسی دوران میں فتنہ ساماں حسینہ ماسونہ کی نگاہ بھی زریں پر پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری دکھائی دی۔ اس نے اشاروں سے گارڈز کو ہدایت کی کہ وہ زریں کو روکیں۔ دو گارڈز نے آگے بڑھ کر زریں کا راستہ روک لیا۔ ہمیں اتنے فاصلے سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا' ہاں ہاتھوں کے اشاروں اور چہروں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زریں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ زریں الٹا ان کو سمجھا بجھا رہا ہے۔ نہ وہ اس کی زبان سمجھ رہے تھے نہ وہ ان کی سمجھ رہا تھا۔ اس اندیشے سے کہ کوئی بدمزگی نہ ہو جائے گارڈز زریں سے سختی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ماسونہ کے چہرے پر سخت برہمی نظر آ رہی تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں بار بار گارڈز کو حکم دے رہی تھی کہ وہ "مداخلت کرنے والے" کو یہاں سے ہٹا لے جائیں۔ وہ یہ سب کچھ معزز مہمانوں کی نگاہ بچا کر کر رہی تھی اور ایسا کرنے سے دلچسپ صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔

جب زریں گل کسی طرح نہیں ٹلا تو ماسونہ اٹھی اور اپنا ریشمی لبادہ سنبھالتی ہوئی زریں کی طرف بڑھی۔ تاہم اس کے پہنچنے سے پہلے ہی زریں گل ایک گارڈ کے ہاتھوں کو جھٹکتا ہوا "ملٹن" کی طرف بڑھ گیا۔ ملٹن نے زریں گل کو دیکھا' اپنے مخصوص انداز اور حلیے کی وجہ سے زریں فوراً ہی ملٹن کی نگاہ میں آ گیا۔ چند سیکنڈ تک تو ملٹن کا چہرہ بے تاثر رہا' پھر اچانک چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ زریں گل قریب پہنچ چکا تھا۔ ملٹن نے حیرت ناک لہجے میں زریں سے کچھ کہا۔ زریں نے بتیسی نکال کر جواب دیا۔ ملٹن نے باقاعدہ کھڑے ہو کر زریں سے مصافحہ کیا۔ ماسونہ انگشت بدنداں کھڑی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت جوہری برادران اور ان کے محافظوں کی تھی۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس محفل میں دخل در معقولات کرنے والے اس بے ڈھنگے شخص کو مہمانِ خصوصی کی طرف سے ایسی پذیرائی ملے گی۔ زریں کی باچھیں کھل کھل جا رہی تھیں۔ دوسری طرف ملٹن کے چہرے پر بھی گرم جوشی نظر آ رہی تھی۔ ملٹن نے اسے اپنے برابر بیٹھنے کے لیے جگہ دے دی تھی۔ ہم بالائی منزل کی کھڑکی میں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اتنے فاصلے سے بھی جوہری برادران اور ماسونہ وغیرہ کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت صاف پڑھی جا رہی تھی۔ غالباً زریں نے اشاروں کنایوں میں ملٹن کو سمجھا دیا تھا کہ ہم سب بھی اس کے ساتھ ہیں۔

ذرا ہی دیر بعد ہم نے سالم کے تنے تنے سیکریٹری اور چند دیگر ملازموں کو سوئمنگ پول سے مہمان خانے کی طرف آتے دیکھا' یقیناً وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ زریں گل وہیں ملٹن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خوش بدن تتلیوں کے درمیان واٹر پولو کا میچ اب بھی ہو رہا تھا مگر اب معزز مہمانوں کی توجہ اس میچ میں بہت کم رہ گئی تھی۔ جلد ہی سیکریٹری اور دو دیگر ملازمین ہمارے کمرے تک پہنچ گئے۔ سیکریٹری نے بڑے خوشامدانہ انداز میں کہا "سر! بڑے صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

"کون سے بڑے صاحب؟" صفدر نے انجان بن کر پوچھا۔

"سر سالم صاحب! انہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو لینے کے لیے بھیجا ہے۔"

"کہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی تمہیں؟ ہمیں تو کمروں سے باہر جھانکنے کی اجازت بھی نہیں۔"

"سر آپ تو مذاق فرما رہے ہیں۔"

"اور میرے خیال میں آپ مذاق فرما رہے ہیں۔" صفدر اسے ستانے پر تلا ہوا تھا "یہ نہ ہو کہ ہم آپ کی باتوں میں آ کر سر سالم کے پاس پہنچیں تو وہ ہمیں تالاب میں دس دس غوطے دینے کا حکم صادر فرما دیں۔"

سیکریٹری کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ کچھ دیر تک صفدر سیکریٹری کو زچ کرتا رہا پھر میں نے مداخلت کی اور سیکریٹری سے کہا کہ ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔

میں اور صفدر سیکریٹری صاحب کی معیت میں سیڑھیاں اترے اور پول پر پہنچ گئے۔ ملٹن پیچ و تاب بھول چکا تھا اور بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کا چہرہ حیرت آمیز خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے پہلے مجھ سے اور پھر صفدر سے معانقہ کیا۔

امریکن اسٹائل میں بولا "اگر اس تالاب میں سے جنگی طیارہ نکل کر فضا میں بلند ہو جاتا تو بھی مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی آپ تینوں کو یہاں دیکھ کر ہوئی ہے۔"

میں نے کہا "ہماری کیفیت بھی اس سے کچھ ملتی جلتی ہی ہے۔"

"کیا آپ کبھی پہلے بھی یہاں آئے ہیں؟" ملٹن نے پوچھا۔

"پہلی دفعہ آئے ہیں۔۔۔ بلکہ آئے کیا ہیں لائے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سوال کا جواب بہت تفصیلی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مسٹر سالم اور روسیم ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ملٹن نے دونوں برادران سے مخاطب ہو کر کہا "آپ کے یہ مہمان' ہمارے بھی بڑے پرانے اور پیارے ساتھی ہیں۔ بہت لمبا ساتھ رہا ہے ہمارا۔۔۔ جناب کلارک صاحب پچھلے دو تین ہفتوں سے بڑی شدت کے ساتھ ان کو تلاش فرما رہے ہیں۔ کم از کم سو فون کالز تو کرائی ہوں گی انہوں نے انڈیا اور پاکستان میں۔۔۔" پھر وہ ایک دم مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "حضور والا' یہ کیوں دوڑیں لگوائی جا رہی ہیں ہماری۔ کیا قصور سرزد ہو گیا ہے ہم سے؟ دو ہفتے پہلے میرا اسسٹنٹ خود آپ لوگوں کی تلاش میں پاکستان پہنچا تھا۔ سات آٹھ روز وہ آپ کے کھوج میں پھرتا رہا ہے اور ناکام ہو کر واپس آیا ہے۔"

"کیا معلوم ہوا تھا اسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ لوگ ایسے غائب تھے جیسے سب کو سلیمانی ٹوپیاں مل گئی ہوں' اور آپ نے پہن بھی لی ہوں۔ آپ کی ساتھی ڈاکٹر غزالہ کا بھی کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ نہ ہی زریں گل اور اس کی نوبیاہتا بیوی کا پتا چل رہا تھا۔ صرف بمبئی میں سائیں عالی صاحب اور ان کی شاگرد مس سروج سے ملاقات ہوئی۔ مس سروج ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل تھی۔ اس پر اب بھی کبھی کبھی "قلگت والا" دورہ پڑتا ہے۔ ویسے وہ بالکل صحت مند ہے بلکہ کسی انڈین فلم میں کام بھی کر رہی ہے۔ شاید کوئی ڈانسر وغیرہ کا رول ہے۔ سروج اور سائیں عالی دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ آپ خواتین و حضرات کہاں اور کس حال میں ہیں۔"

"ڈاکٹر غزالہ کے بارے میں کیا معلوم ہوا آپ کو؟" میں نے دریافت کیا۔

"ڈاکٹر کے بارے میں پتا چلا کہ وہ لاہور میں ذیشان پارک کے علاقے میں مقیم تھی۔ بعد ازاں پولیس نے ایک بردہ فروش ارشاد احمد کو پکڑنے کے لیے غزالہ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کیے رکھا تھا۔ پولیس کو توقع تھی کہ ارشاد احمد' غزالہ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ اس تک پہنچے گا لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔ بعد ازاں غزالہ بھی خاموشی کے ساتھ اس مکان سے چلی گئی تھی۔ باقی تمہارے اور صفدر کے بارے میں رجال ساہی صاحب سے فقط اتنا پتا چل سکا تھا کہ تم ایک عطائی ڈاکٹر پروفیسر اللہ دتا کے کلینک میں آتے جاتے رہے تھے' پھر تم اس کی رہائش گاہ پر بھی جانے لگے تھے۔ وہاں سے تم دونوں کے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی روپوش ہو گیا تھا۔"

واٹر پولو کا پیچ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ ہم ملٹن سے باتیں کرتے ہوئے مہمان خانے کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ ہم شکل جوہری برادران بھی چارو ناچار ہمارے ساتھ تھے۔ ایک دم ہی ہم جان محفل اور مرکز نگاہ بن گئے تھے۔ مس ماہوتہ جواب تک ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی تھی ایک دم ہی ریشہ خطمی نظر آنے لگی تھی۔ وہ آنکھوں آنکھوں میں ہم سے کئی بار معذرت کر چکی تھی۔ کچھ دیر تک جوہری برادران اور اس محل نما عمارت کے دیگر مکین ہمارے ساتھ رہے پھر ہمیں اور ملٹن کو تنہائی فراہم کر دی گئی۔

ہم نے ملٹن کو اپنے بارے میں سبھی کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ بردہ فروش مائیکل سے ہمارا ٹکراؤ' بحری جہاز ہرکولیس میں۔۔ ہمارا طویل سفر اور آخر میں افریقہ آمد' سبھی کچھ ملٹن کے

گوش گزار کر دیا۔ وہ محو حیرت رہا اور سنتا رہا۔ اس کے بعد ملٹن نے ہمیں اپنے اور مسٹر جی کلارک کے متعلق بتایا۔ وہ بولا "آپ لوگوں کے لیے اچھی خبر یہ ہے کہ آپ کا کام ہو گیا ہے۔ دفینے کے سامان میں شامل تمام نوادرات اور قیمتی اشیاء کو ڈسپوز کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ بہترین طریقے سے اور نہایت اچھی قیمت پر ہوا ہے۔ اب ہمارا یہ اثاثہ کیش کی شکل میں موجود ہے اور اب ہم اس ہارڈ کیش کو جہاں چاہے منگوا سکتے ہیں۔"

"بہت خوب۔" صفدر نے کہا۔

"کام ہو جانے کے بعد جناب کلارک صاحب نے فوراً پاکستان میں آپ سے رابطہ کرنا چاہا' مگر اس وقت تک آپ حضرات لاہور کے آسمان سے اوجھل ہو چکے تھے۔ دفینے کے نوادرات تو مسلسل فروخت ہو رہے تھے مگر کلارک صاحب نے آپ کو تازہ ترین صورتِ حال سے جان بوجھ کر بے خبر رکھا۔ وہ آپ کو ایک دم سرپرائز دینے کے خواہش مند تھے۔ آپ نے لاہور سے غائب ہو کر الٹا ان کو سرپرائز دے دیا اور یہ سرپرائز اب تک جاری و ساری ہے۔ جناب کلارک بے حد تحمل مزاج اور ٹھنڈے دل والے ہیں' مگر میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ پچھلے دو تین ہفتے میں وہ کتنے پریشان رہے ہیں۔ ان کو یہ سوچ پریشان کیے ہوئے تھی کہ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے' اب مزید ہو جائے گی اور آپ لوگ ان کے بارے میں پتا نہیں کیا سوچیں گے۔ وہ اوسطاً ہر روز چھ فون کالیں پاکستان اور انڈیا میں کرتے رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ہمیں یقین تھا کہ کلارک صاحب مصروف ہوں گے۔ اور ہمارے ہی کام میں مصروف ہوں گے۔ پریشانی کی بات تو وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی اجنبیت ہو۔"

ملٹن ایک دم اٹھتے ہوئے بولا "میں چاہتا ہوں کہ کلارک صاحب کو آپ کی "برآمدگی" کی فوراً اطلاع دی جائے۔ یہ فون کال ان کے لیے ایک بڑی خوش خبری ہو گی۔"

"لیکن۔۔۔"

"لیکن کچھ نہیں مسٹر شاہ جہاں۔" ملٹن جوش سے بولا "آپ آئیے میرے ساتھ ہم ابھی جناب کلارک سے بات کرتے ہیں۔"

میں صفدر اور ملٹن ایک قریبی کمرے میں چلے گئے۔ یہاں انٹرنیشنل فون کی سہولت موجود تھی۔ ملٹن "مسٹر جی کلارک" سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے کن کھیوں سے صفدر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ وہ اب تک ایک عجیب سے تذبذب کا شکار رہا تھا۔ ایک دو بار اس کی اندرونی کشمکش اس کی زبان پر بھی آئی تھی۔ وہ اس تاخیر کی وجہ سے پریشان تھا جو مسٹر جی کلارک کی طرف سے ہو رہی تھی' اور یہ کوئی اکیلے صفدر کی بات نہیں تھی۔ بہت سے باخبر لوگ اسی انداز میں سوچ رہے تھے۔ پاکستان اور انڈیا کے کئی اخباروں نے اس بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے مسٹر جی کلارک کو دفینے سمیت امریکا رخصت کر کے حماقت کی ہے۔ اب ہم برسوں بھی منہ اٹھا کر دیکھتے رہیں گے تو یہ ASSETS ہمیں واپس نہیں ملیں گے۔ تاہم اس دوران میں میرا یقین چند لمحوں کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔ میں نے مسٹر جی کلارک پر بھروسا کیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ میں نے غلط نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد نیویارک میں مسٹر جی کلارک سے رابطہ ہو گیا۔ ملٹن نے چند رسمی کلمات کے بعد کہا "جناب! ایک بڑی خوش خبری آپ کی منتظر ہے۔"

اس کے بعد ملٹن نے ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

گڈ آفٹر نون سر! میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

دوسری جانب چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کلارک صاحب کی لرزتی ہوئی آواز آئی "او گاڈ! مجھے اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ کیا تم واقعی شاہ جہاں ہو؟"

"اگر آپ فرمائیں تو صفدر اور زریں گل کی گواہی بھی دلا سکتا ہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"بھئی تم نے تو ہمیں گھن چکر بنا کر رکھ دیا تھا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تم لوگوں کو۔۔۔ ہم تمہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے' تم نے الٹا ہمارے طوطے اڑا دیے۔ اب مزید طوطے یوں اڑ رہے ہیں کہ تم پاکستان یا انڈیا کے بجائے تنزانیہ سے بول رہے ہو۔"

"شاید اسی کو پاؤں کا چکر کہتے ہیں جی۔ کبھی موقع ملا تو تفصیل سے ساری کہانی سنائیں گے آپ کو۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟" "کبھی" کا کیا مطلب۔" مسٹر کلارک نے پیار سے ڈانٹا "ہماری ملاقات ابھی ہو رہی ہے۔ میں شاید۔۔۔ آج ہی یہاں سے فلائٹ لے لوں۔۔۔ اور اگر آج نہیں تو کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا یہاں سے۔"

"آپ خود آئیں گے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"بھئی! بڑی بھاری ذمے داری ہے مجھ پر۔ تم لوگوں کی امانت کا بوجھ ہے۔ اسے جلد از جلد تمہارے حوالے کرنا ہے۔"

"مگر فی الحال تو جناب! ہم خود اپنے آپ پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا

ہے۔ اجنبی جگہ ہے اجنبی لوگ۔"

"تم لوگ مسٹر سالم اور وسیم کے ہاں مقیم ہو ناں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ مسٹر کلارک بولے "پھر یہ اجنبی جگہ ہے اور نہ ہی یہ لوگ اجنبی ہیں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ مسٹر سالم اور وسیم کی میزبانی انجوائے کرو اور میری طرف سے زریں گل کو سرمایہ دار بننے کی خوش خبری سناؤ۔" انہوں نے آخری الفاظ کے بعد ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔

میرے بعد صفدر نے مسٹر کلارک سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا۔ اس کے بعد زریں نے گلابی انگلش میں ایک دو مضحکہ خیز جملے کہے۔ آخر میں مسٹر کلارک نے مجھے بتایا کہ وہ ایک دو گھنٹے بعد دوبارہ ہمیں فون کر رہے ہیں۔ اس فون میں وہ اپنی روانگی کے درست وقت سے آگاہ کریں گے۔

زریں گل کی آنکھیں حلقوں میں گول گول گھوم رہی تھیں۔ میں نے کہا "زریں گل! مجھے اب فرنگیوں کی قسمت پر ترس آنے لگا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"بھئی اب تم کروڑ پتی بن رہے ہو۔ اب فرنگیوں اور فرنگنوں کا تو تم نے حشر کر دینا ہے۔ جب انہیں فرش پر ٹاکیاں پھیرنا پڑیں گی اور دستی نلکوں سے پانی بھر کر ڈنڈوں سے کپڑے دھونے پڑیں گے تو نانی یاد آجائے گی انہیں۔"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔ دشمن کو مارنا کوئی کام نہیں ہوتا۔ مزہ تو تب ہے کہ اسے جینے دیا جائے اور نہ مرنے دیا جائے۔"

"مگر دیکھو، مسٹر جی کلارک صاحب بھی تو سفید فام ہیں، وہ ہمارے حق میں کتنے اچھے ہیں، کتنا ساتھ دیا ہے انہوں نے ہمارا؟" صفدر نے کہا۔

"بس ایسے چند لوگوں کی خاطر ہی تو ام نے فرنگیوں پر ہاتھ نرم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ قسم خدا کا ام ان کو الٹا لٹکا کر ان کی گوری چمڑیاں کھینچ لیتا۔" جوش سے زریں گل کے منہ سے تھوک اڑ رہا تھا۔

صفدر نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "اچھا یار! ابھی سے اتنا غصہ نہ کرو، پہلے پیسے تو لینے دو۔"

ملٹن بے قرار ہو رہا تھا، وہ غزالہ سے اور زریں کی دلہن سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں اور صفدر اسے لے کر بالائی منزل کے رہائشی کمروں کی طرف بڑھ گئے۔ ملٹن اوپر پہنچا اور بے حد گرم جوشی کے ساتھ غزالہ اور کلثوم سے ملا۔ اس نے کلثوم کو باقاعدہ نقد سلامی بھی دی۔ اس نے فوراً نوٹ کیا کہ ہم جن کمروں میں رہ رہے ہیں ان کی سہولیات نیچے والے کمروں سے کم ہیں۔ جوہری برادران کا سیاہ فام سیکریٹری باہر ہی کھڑا تھا، مسٹر ملٹن نے اسے ایک طرف لے جا کر کچھ گھسر پھسر کی۔ یقیناً یہی کہا ہوگا کہ ہمیں بہتر کمروں میں شفٹ کر جائے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں پھر سے زیریں منزل پر منتقل کر دیا گیا۔ اس مرتبہ ہمارے لیے کچھ نئے کمرے کھلوائے گئے تھے اور انہیں ہنگامی طور پر فرنش کیا گیا تھا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جوہری برادران نے اپنی ذاتی رہائش گاہ کا سامان یہاں منتقل کر دیا ہے۔ شام سات بجے کے لگ بھگ مسٹر جی کلارک کا فون پھر آیا۔ میں نے ان سے بات کی۔ مسٹر کلارک نے بتایا کہ وہ کل سہ پہر کی فلائٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے فلائٹ نمبر اور دیگر معلومات بھی فراہم کر دیں۔ وہ بہت خوش محسوس ہو رہے تھے۔ انہوں نے اشاراتی زبان میں مجھے بتایا کہ نوادرات کا قریباً ایک تہائی حصہ انہوں نے خود اپنے پاس رکھا ہے اور مارکیٹ کے مطابق اس کی قیمت اپنی جیب سے ادا کی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ نوادرات اور زیورات کھلی مارکیٹ میں بیچے گئے ہیں اور ان کی آکشن کرائی گئی ہے۔ اسی طرح کچھ سامان امریکا سے باہر بھی فروخت کیا گیا ہے۔ ان بیرونی خریداروں میں جوہری برادران بھی شامل ہیں۔

میں نے کہا "میں یہ بات پہلے سے جانتا ہوں جناب۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ سامان کے خریداروں میں مسٹر سالم اور مسٹر وسیم بھی شامل ہیں۔ میں نے مسٹر وسیم کی ایک دوست کلائی میں دفینے کے جانے پہچانے کنگن دیکھے ہیں۔"

"شاید۔ تم اس مصری لڑکی ماموشہ کی بات کر رہے ہو۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ ہنس کر بولے "ہاں اس کی منظور نظر ہے۔ ویسے وہ غیر معمولی ہوشیار اور تیز طرار لڑکی ہے۔ اس کا باپ یونانی ہے، وہ سوئزر لینڈ کے ایک معروف بینک کا ریجنل منیجر ہے۔"

مسٹر کلارک کے ساتھ آٹھ دس منٹ گفتگو ہوئی۔ اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو بدر اور اس کا مسکین صورت شوہر واحد وہاں موجود تھے۔ اس کا شوہر روتے ہوئے میرے قدموں میں گر پڑا۔ اس کے چہرے پر تشکر ہی تشکر تھا۔ بدر بھی شکریے کے آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے صفدر سے پوچھا "یہ لوگ اتنے مشکور کیوں ہو رہے ہیں؟"

وہ بولا "ان کا خیال ہے کہ آپ نے ان کو یہاں سے

جانے کی اجازت لے کر دی ہے۔ اور "یہ اجازت" لینے کے لیے سخت کوشش کی ہے۔"

"کیا مطلب، انہیں اجازت مل گئی ہے؟"

"جی ہاں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مسٹر سالم نے کہا ہے کہ واحد اور اس کے بیوی بچے جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔ سالم نے گاڑی بھی فراہم کر دی ہے۔ یہ گاڑی ان لوگوں کو مطلوبہ مقام تک چھوڑ آئے گی۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہو گئی۔"

تھوڑی ہی دیر بعد بدر، اس کے بچے اور واحد ایک ایسی کار میں سوار ہو رہے تھے جس کے شیشے رنگین تھے۔ یہ گاڑی انہیں لے کر کوٹھی کے عقبی راستے سے نکلی اور رات کی تاریکی میں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

گرمی آج پھر کچھ زیادہ تھی۔ میں اپنے بیڈ روم کے پر آسائش باتھ روم میں نہا کر باہر نکلا تو نشست گاہ کے صوفے پر ایک حسنِ مجسم کو بیٹھے ہوئے پایا۔ یہ ماموشہ تھی۔ چست اسکرٹ اس کے جسمانی نشیب و فراز کو نمایاں کر رہا تھا، پنڈلیاں اوپر تک عریاں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نیلاہٹ تھی جو صرف غور سے دیکھنے پر نظر آتی تھی۔

"ہیلو شاہ جہاں صاحب۔" وہ بڑی ملائمت سے بولی۔

"ہیلو اور خوش آمدید۔" میں نے کہا۔

"اس روز والے واقعے پر آپ سے پھر معذرت چاہتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"میں وہ بات بھول چکا ہوں۔ پلیز آپ بھی بھول جائیے۔ بہتر ہے کہ اب کوئی نئی بات کی جائے۔"

اس نے بال جھٹک کر پیشانی سے ہٹائے "تو نئی بات یہ ہے جناب کہ ہمیں ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے۔"

"بہت نیک خیال ہے۔"

"تو کیا میں ہاتھ بڑھا سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے کہا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کے انداز میں ایک لوچ اور حدت سی تھی۔ یہ تذبذب میں ڈال دینے والا انداز تھا۔ خاص طور سے صنفِ مخالف کے لیے اس انداز میں ایک الجھن سی ہوتی ہے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہا جا رہا ہو کہ دوستی کے اس راستے پر چلتے ہوئے کہیں آگے جا کر کچھ گنجائشیں بھی نکل سکتی ہیں۔

ہم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ مسٹر جی کلارک کی آمد سے باخبر ہو چکی ہے اور اسے کسی حد تک یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیوں آ رہے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے بولی "میرے ڈیڈی سوئس بینک میں ریجنل منیجر ہیں۔ بینکنگ کے شعبے میں کافی نام ہے ان کا۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا "کس بینک سے تعلق رکھتے ہیں؟"

اس نے بڑے فخر سے بینک کا نام بتایا اور اپنے والد کی مختلف پیشہ ورانہ ACHIEVEMENTS کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے والد یونین بینک آف سوئزر لینڈ میں سروس کرتے تھے۔

میں اس کی گفتگو کے رخ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ آخر میں وہ بولی "سنا ہے کہ جو نوادرات اور ASSETS کلارک صاحب نے فروخت کیے ہیں ان میں آپ کا بھی کافی حصہ ہے۔"

"کافی تو نہیں، تھوڑا بہت ضرور ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "میں جانتی ہوں اگر تھوڑا بھی ہوگا تو کروڑوں ڈالر سے تو اوپر ہی ہوگا۔"

"کتنا اوپر ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے کہ دوگنا ہو، یا پھر تین گنا ہو۔"

"آپ نے میرے بارے میں شدید قسم کی غلط فہمیاں پال لی ہیں۔"

"اس فقرے میں مجھے صرف ایک لفظ پر اعتراض ہے۔" وہ بولی۔

"کون سا لفظ؟"

"شدید۔" اس نے اٹھلا کر کہا "تھوڑی بہت غلط فہمی تو ہو سکتی ہے مگر شدید نہیں؟"

"چلیں۔ اگر آپ کی کسی غلط فہمی کے سبب میرا اور میرے ساتھیوں کا اسٹیٹس بلند ہو رہا ہے، تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اس نے خوشامدی قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے دہری سی ہو گئی۔ اس کے کشادہ گریبان سے نظر چراتے ہی بنی۔ چند لمحے بعد اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "ویسے شاہ جہاں صاحب، اگر آپ کے پاس رقم آتی ہے تو آپ اسے کسی سوئس بینک میں ہی ڈپازٹ کریں۔ سرمائے کی حفاظت اور پھلنے پھولنے کی گارنٹی سوئس بینکوں سے زیادہ کہیں بھی نہیں ہوتی۔ اور میرا نہایت مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس اقدام سے پہلے دو تین اچھے بینکرز سے مشورہ

کرلیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سلسلے میں اِیڈی سے بھی آپ کی ملاقات کراسکتی ہوں۔ ان سے اپوائنٹ منٹ لینا یوں تو کافی مشکل ہوتا ہے مگر میرے لیے تو یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا "آپ کی بات میں وزن ہے۔ مگر اس سارے معاملے میں بنیادی حیثیت تو رقم کی ہے' جو سرے سے موجود ہی نہیں۔"

"وہ بھی موجود ہو جائے گی' آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔" وہ لوا سے مسکرائی۔

اس کی باتوں میں ایک کامیاب سیل مین کی سی گرفت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر جی کلارک نے اس کی شخصیت پر جو تبصرہ کیا تھا وہ شاید درست ہی تھا۔ خاصی ہوشیار اور زمانہ شناس لڑکی تھی وہ۔ ہماری یہ نیم کاروباری اور نیم دوستانہ گفتگو دیر تک جاری رہی۔ اچانک دروازہ کھلا اور غزالہ تابی کو انگلی سے لگائے اندر داخل ہوئی۔ مجھے اور ماسونہ کو قریب قریب بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ چہرے پر ناگواری کی ایک مدھم لہر گزر گئی۔ یہ دوسری تیسری بار تھی کہ یہ انداز دیکھ کر میرے دل کو اچھا لگا تھا۔ اس انداز میں اپنائیت تھی' رشتہ تھا اور وہ بو بندہ وابستگی تھی جو ایک بار پھر سے زندہ ہو رہی تھی۔

"اوہ سوری۔ میں نے مداخلت کی۔" وہ بولی۔

"بس یونہی چائے پی رہے تھے ہم۔" میں نے کہا "تو تم بھی پی لو۔"

"شکریہ۔ میں بھی آپ کی طرح اس وقت چائے نہیں پیا کرتی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی کاٹ تھی۔

"ہاں پیتا تو میں بھی نہیں۔ بس مس ماسونہ کی وجہ سے۔۔۔ ویسے مس ماسونہ چائے بہت اچھی بناتی ہیں۔" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"مس ماسونہ ہر لحاظ سے اچھی ہیں۔ میں واقعی ان سے متاثر ہوئی ہوں۔" غزالہ نے کہا۔

تابی کو لے کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

میرا دل مسکرا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں غزالہ کی ایسی پریشانی مجھے ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی۔

"یہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" ماسونہ نے پوچھا۔

"رشتے دار بھی ہیں' دوست بھی اور آج کل ہم سفر بھی۔"

"یہ بچہ۔۔۔؟"

"یہ ان کا اپنا نہیں' لے پالک ہے۔ خاوند سے ان کی علیحدگی ہو چکی ہے۔"

"اوہ۔" ماسونہ نے ہونٹ سکوڑے "شروع میں تو میں نے سمجھا تھا کہ شاید یہ آپ کی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی وائف یا دوست ہیں۔"

"کیوں' ایسا کیوں سمجھا آپ نے؟"

"بس یونہی۔۔۔ پتا نہیں کیوں کچھ لوگوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک پیئر ہوں' ایک جوڑا۔۔۔ ایک موزوں جوڑا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی "کاش آپ یہ بات تھوڑی دیر پہلے کہتیں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" وہ شوخی سے مسکرائی "ویسے اسٹریٹ فارورڈ لوگ مجھے پسند ہیں اور لگتا ہے کہ آپ بھی اسٹریٹ فارورڈ ہیں۔"

وہ رات بے چینی میں ہی گزری۔ صفدر میں اور زریں دیر تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے اور پیش آمدہ حالات پر غور کرتے رہے۔ واقعات تیزی سے رخ بدل رہے تھے۔ ہم بردہ فروشوں کے چکر میں الجھ کر مائیکل سے ٹکرائے تھے اور اس کے شاطر ذہن کی کارستانیوں کے سبب یہاں افریقہ پہنچے تھے۔ ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں پہنچ کر ایک بار پھر دفینے کا مسئلہ زندہ ہو جائے گا۔ اب حالات کی حرکت سے کچھ اس طرح کے اشارے مل رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ چند روز تک ہم تینوں میں سے ہر ایک "بہت بڑا سرمایہ دار" ہوتا۔ جیسے دولت کا نہ ہونا مسئلہ ہوتا ہے' دولت کا ہونا بھی مسئلہ ہوتا ہے' بلکہ دولت کا ہونا زیادہ گمبھیر مسئلہ ہے۔ اکثر اوقات دولت کی موجودگی سے انسان کا سکون چین برباد ہو جاتا ہے۔ ابھی ہمیں دولت ملی نہیں تھی مگر سکون ابھی سے غارت ہو محسوس ہو رہا تھا' اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ ہم الوؤں کی طرح جاگ رہے تھے اور ہماری شانتی اس دولت کے خوف سے بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی جو ابھی ہم سے کوسوں دور تھی۔ ماسونہ نے سوئس بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کی جو بات کی تھی وہ ہمارے لیے ہنسی مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ابھی اس قسم کی باتیں سوچنا ہوا میں قلعے تعمیر کرنے کے مترادف تھا' بہرحال اگر ہمیں دفینے میں سے حصہ مل بھی جاتا تو ہم اس حصے کی رقوم کو بیرون ملک رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں ملکی قانون کی مکمل پاسداری کرنی تھی اور جو بھی TAXES وغیرہ عائد ہوتے ان کی کٹوتی کرانی تھی۔ ایک مرتبہ ہم نے اس سلسلے میں وزارت خزانہ کے ایک مشیر سے طویل گفتگو بھی کی تھی مگر اس گفتگو کے بعد دفینہ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب

ہو گیا تھا۔

اگلے روز میری طبیعت مضمحل سی تھی' تاہم چائے وغیرہ پینے کے بعد اور جوہری برادران کا پُر تکلف اور "رنگین" ناشتا کرنے کے بعد کچھ بہتری پیدا ہوئی۔ صفدر اور زریں اس چار دیواری میں بند رہ رہ کر بری طرح اکتا چکے تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ باہر نکلا جائے' کم از کم اس شہر کا ایک چکر تو لگایا جائے جس میں ہم پچھلے کئی روز سے موجود تھے۔

صفدر نے کہا "دیکھیں جی! یہ ہمارے بے فکری کے آخری دن ہیں۔ امیر کبیر بننے سے پہلے غریب غربا کی طرح تھوڑا سا گھوم پھر کر دیکھ لیں' پھر کہاں یہ آزادیاں نصیب ہوتی ہیں۔"

"لیکن ان آزادیوں میں اگر اس نامبارک امین نے دخل در معقولات کر دیا تو پھر؟ کہیں یہ نہ ہو کہ کل کے اخبارات میں کچھ اس قسم کی خبر چھپی ہو۔ "تین مفلس حضرات جن میں سے ایک تو بہت ہی مفلس تھا' دولت مند بننے سے صرف چند دن قبل پُراسرار طور پر ہلاک" خبر کے ساتھ تین لاشوں کی تصویر ہو اور نیچے کیپشن ہو' حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

زریں کے کان کھڑے ہو گئے' مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "آپ نے بہت ہی مفلس کس کو کہا ہے؟"

"بھئی تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔" صفدر نے فوراً کہا "لاہور میں کلثوم کو یخنی پلانے تک کے پیسے نہیں تھے تمہارے پاس۔"

"دیکھو صفدر بھائی! اگر پیسے نہیں بھی تھے' تو تم سے نہیں مانگے تھے' جو کچھ کیا تھا خود ہی کیا تھا۔"

"اور وہ جو اُدھار لے کر ہماری میزبانی کرتے رہے تھے۔"

"ہم نے کسی سے اُدھار نہیں لیا۔ وہ ہمارا چچا تھا۔ ہمارا اس پر حق تھا۔"

"اور ہم پر کوئی حق نہیں تھا تمہارا۔ تم نے ہم سے بات تک نہیں کی۔" صفدر مزہ لینے کے لیے جان بوجھ کر بات کو طول دے رہا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے پر خوب فقرے چست کیے۔ باقاعدہ جھگڑے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان کی بلند آوازیں سن کر کلثوم اور غزالہ بھی کمرے سے باہر نکل آئیں۔

کلثوم نے خوش ہو کر کہا "یہ ہم سے بھی بڑا لڑتا۔۔۔ ہم مشکل میں گر تا۔ کیونکہ ہم کو جواب نہ آتا۔"

صفدر نے کہا "تم فکر نہ کرو۔ تمہاری طرف سے بھی اسے میں ہی جواب دیا کروں گا۔ اگر تم نے کوئی جواب دینا ہے تو بتاؤ' میں ابھی اس کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔"

"کیا اس کا طبیعت گندا ہو گیا؟"

"بس یہی سمجھ لو۔"

"دیکھ صیدر بھائی! اب تم حد سے بڑھ رہا ہے۔" زریں نے کہا۔

صفدر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ہاں کلثوم! تم بتاؤ' کوئی جواب دینا ہے اسے؟"

"ہاں جواب دینا۔۔۔ مگر یہ بعد میں انشاء اللہ ام کو غصہ ہوئیں گا۔"

"اگر یہ غصہ ہوئیں گا تو ہم انشاء اللہ عدالت میں جائیں گا۔ بلکہ سپریم کورٹ تک جائیں گا۔ ہم تمہارا سگا بھائی ہے' اس مگرمچھ کے منہ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔" صفدر نے کہا۔

"آپ دیکھ رہا ہے استاد صیب۔" زریں بولا "یہ کیسا بھائی ہے جو ام کو مگرمچھ بولتا ہے اور بہن کو اس کے شوہر سے دور کرتا ہے۔"

"اور تم کیسے شوہر ہو جو پہلے لو میرج کرتے ہو پھر تھانے دار بن کر بیوی کو ڈراتے ہو۔"

"ام اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

"تو کلثوم بھی اپنی مرضی کی مالکن ہے۔ ہاں کلثوم' تم بتاؤ' تم نے کیا جواب دینا تھا اسے۔"

وہ بولی "زریں کا غصہ دیکھا۔۔۔ ام کو بھول گیا۔ انشاء اللہ بس اتنا یاد۔۔۔ کہ ام نے اس کو جواب دینا تھا۔"

"چلو اتنا تو یاد ہے ناں کہ جواب دینا تھا؟" کلثوم نے اثبات میں سر ہلایا۔ صفدر بولا "لو پیارے زریں' تمہیں کلثوم کی طرف سے جواب ہے۔"

بحث طول کھینچتی جا رہی تھی' میں نے بیچ بچاؤ کرایا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد زریں کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی مونچھوں کو قرار سا آ گیا تھا۔ غزالہ بولی "کیوں خوامخواہ میں اپنی انرجی ضائع کرتے ہو۔ کیا فائدہ ہوا اس بحث کا؟"

صفدر بولا "یہ فائدہ کیا کم ہے کہ تین دن بعد کلثوم کمرے سے باہر نکل آئی' اور سب نے اس کی صورت دیکھ لی۔"

اس مزے دار چوٹ پر زریں کے سوا سب ہنس دیے۔ کلثوم خوش ہو کر بولی "صیدر بھائی! آپ کی باتوں پر ہنسی آ [تا]

ہے۔ آپ بہت اچھی ہے۔ ماشاء اللہ بہت ہی اچھی ہے۔"

اس بار صفدر کے علاوہ سب ہنس دیے۔ زریں کی ہنسی سب سے بلند تھی۔ صفدر برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

اس دوران میں ماسونہ بھی لٹکتی مٹکتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں بے حد گہرائی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھی۔ گھونگریالے بال شانوں پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ہوئے اپنے پورے جسم کو ہلکورے سے دیتی رہتی تھی۔

"کیا تبادلہ خیال ہو رہا ہے؟" اس نے آتے ساتھ ہی بے تکلفی سے پوچھا۔

"یہ لوگ ارنگا کی سیر کرنا چاہ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک خیال ہے۔" وہ بولی۔

"مگر مسٹر سالم اور مسٹر وسیم کے نزدیک یہ زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ کم آن!" وہ انداز سے بولی "اب ایسا بھی نہیں کہ ہم اپنے ہی گھر میں اس چائے فروش مبارک کے ڈر سے دبک کر بیٹھے رہیں۔ اس کی یہ ہمت نہیں کہ ہمارے گارڈز کی موجودگی میں آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف دیکھ سکے۔ پورے تنزانیہ میں اس سے بہتر گارڈز اور کسی کے پاس نہیں ہوں گے۔"

"مگر شروع میں تو ہمیں اپنے کمروں کے اندر بند رہنے کو کہہ دیا گیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت مسٹر سالم غیر ضروری احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ ضرورت سے زیادہ احتیاط۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم باہر نکل سکتے ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"بالکل نکل سکتے ہیں۔ بلکہ میری تو یہ خواہش ہے کہ میں آپ لوگوں کو اپنے ڈیڈی سے ملواؤں۔ اتفاقاً وہ بھی کل شام سے یہاں ارنگا میں ہی ہیں۔ میں نے ان سے آپ کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ بھی ملنے کے خواہش مند ہیں۔"

"یہ تو اچھا ہے۔ ایک پنتھ دو کاج ہو جائیں گے۔ شہر دیکھ لیں گے اور آپ کے ڈیڈی کو بھی۔" صفدر نے کہا۔

"آپ نے میرے منہ کے الفاظ چھینے ہیں۔" ماسونہ نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب لوگ ایک ائر کنڈیشنڈ منی کوچ میں سوار اس محل نما کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ غزالہ اور نائلہ کے علاوہ کلثوم بھی ہمراہ تھی۔ منی کوچ کی کھڑکیوں پر سفید پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مزید حفاظت کے لیے ایک جیپ بھی کوچ کے عقب میں آ رہی تھی۔ اس میں خود کار رائفلوں سے مسلح چار گارڈز موجود تھے۔ ان گارڈز کو ہم نے کوٹھی میں باوردی دیکھا تھا مگر یہاں وہ سادہ لباس میں تھے۔ ان کی شکلیں گواہی دے رہی تھیں کہ ماسونہ کی بات درست ہے۔ وہ انتہائی تربیت یافتہ اور جاں باز قسم کے محافظ تھے۔ ماسونہ ہم سے بہت گھل مل گئی تھی۔ وہ کافی پر کشش لڑکی تھی اگر وسیم جیسے جواں سال رئیس نے اس سے دوستی پال رکھی تھی تو یقیناً اس میں کچھ دیکھا ہی ہوگا۔ اس کی نیلی آنکھیں واقعی بہت گہری تھیں۔ ایک ایسی گہرائی جس کی پیمائش کرنی ناممکن تھی۔

ہم نے شہر کے مناظر دیکھنے کے لیے کوچ کی کھڑکیوں کے پردے تھوڑے تھوڑے سرکا دیے تھے۔ یہ ایک خوشگوار دن تھا۔ کم از کم ہمارے لیے تو خوشگوار ہی تھا کیونکہ ہم ائر کنڈیشنڈ کوچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر کی سڑکیں کشادہ تھیں کناروں پر کثرت سے پام نظر آ رہے تھے۔ تاہم ٹریفک زیادہ صاف ستھرا نہیں تھا۔ پاکستان سے ملتے جلتے مناظر تھے کہیں کہیں پینچر ٹیکسیاں اور بسیں وغیرہ بھی نظر آ جاتی تھیں۔ عمارتیں درمیانے درجے کی تھیں تاہم کہیں کوئی پرشکوہ بلڈنگ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک نسبتاً شان دار سڑک سے گزرتے ہوئے ماسونہ نے ایک بڑے سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر جی کلارک اینڈ کمپنی اور زائمنڈ کے الفاظ لکھے تھے۔ دیو ہیکل گلاسز سے سجی ہوئی یہ ایک وسیع و عریض اور شان دار دکان تھی۔ ماسونہ نے بتایا "یہ ان آٹھ شاپس میں سے ایک ہے جو یہاں تنزانیہ میں سالم اور وسیم کے کنٹرول میں ہیں۔"

صفدر نے کہا "مس ماسونہ! لگے ہاتھوں ہمیں وہ کان بھی دکھا دیں جہاں سے یہ قیمتی پتھر نکالے جاتے ہیں۔"

وہ مسکرائی "اس کے لیے ہمیں ایک طویل سفر کرنا پڑے گا اور مسٹر جی کلارک کی آمد کا شیڈول ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔" کچھ ہی دیر بعد ہم ارنگا کے ایک نسبتاً خوب صورت علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ٹریفک کم تھی اور ہریالی زیادہ تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ سرسبز ٹیلے بھی نظر آ رہے تھے۔ اب معلوم نہیں تھا کہ یہ مصنوعی ہیں یا قدرتی۔

اچانک ہمارے لحیم شحیم سیاہ فام ڈرائیور نے گاڑی روک دی "کیا ہوا؟" ماسونہ نے چونک کر پوچھا۔

"گارڈز والی گاڑی رک گئی ہے۔" ڈرائیور نے جواب

مشتاق احمد قریشی کے سحر کار قلم سے نیا ناول

پاتال

فطرت کے باغی شخص کا فسانۂ عبرت

قیمت جلد اوّل: ۱۷۵/-
قیمت جلد دوم: ۱۷۵/-

ڈاک خرچ ۳۰ روپے

- ایک جینئس سائنسدان کی انوکھی داستان، وہ انسانی ذات کی پاتال کے راز بے نقاب کرنے چلا تھا۔
- دلکش، منفرد اور اچھوتے موضوع کی حامل، اردگرد کے ماحول سے بیگانہ کر دینے والی تحریر۔
- ہر صفحہ تجسس لئے ہوئے ...... اعصاب شکن سسپنس سے بھرپور ناول۔

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز، ۳۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک اسٹال، نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

دیا۔ وہ عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

ایک نوجوان جو ڈرائیور کا ہیلپر نظر آتا تھا۔ منی کوچ سے اتر کر گارڈز والی گاڑی تک گیا۔ گارڈز نے جیپ کا بونٹ اٹھایا ہوا تھا اور دو افراد انجن کا معائنہ کر رہے تھے۔ دو چار منٹ بعد ڈرائیور کا ہیلپر واپس آگیا۔ اس نے مقامی زبان میں ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے انگریزی میں ماموند کو بتایا "جیپ خراب ہوگئی ہے۔ ٹھیک ہونے میں آدھ پون گھنٹا لگے گا۔"

ماموند نے چند لمحے کے لیے سوچا پھر بولی "ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں۔ گھر اب زیادہ دور نہیں۔ پانچ چھ منٹ کا راستہ ہے۔ گارڈز سے کہو کہ گاڑی ٹھیک کرا کے میرے گھر پہنچ جائیں۔"

ہیلپر نوجوان نے یہ پیغام گارڈز تک پہنچایا اور کوچ میں واپس آگیا۔ چند ہی لمحے بعد کوچ اپنا سفر پھر شروع کر چکی تھی۔ کشادہ سڑک پر کوچ نے ڈھائی تین کلو میٹر کا سفر تیزی سے طے کیا' پھر اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کی ہم نے ہرگز توقع نہیں کی تھی۔ دونوں گارڈز میں سے ایک نے للکارتی ہوئی آواز میں کہا "خبردار' کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔"

ڈرائیور سمیت سب نے مڑ کر عقب میں دیکھا' دونوں گارڈز رائفل بدست کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر دہشت ناچ رہی تھی اور ان کی انگلیاں ٹریگرز پر تھیں۔

"یہ کیا حماقت ہے!" ماموند چیخی۔

گارڈ نے اس کی ڈانٹ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیور کو مقامی زبان میں حکم دیا کہ وہ گاڑی کو کنارے پر روک دے' کیونکہ اسی میں اس کی خیریت پوشیدہ ہے۔

ڈرائیور نے پہلے تو پس و پیش سے کام لیا لیکن جب باغی گارڈ کا لب و لہجہ نہایت خطرناک ہوگیا تو اس نے بریک پیڈل دبایا اور گاڑی سڑک سے اتار کر روک دی۔ ماموند چیختی ہوئی گارڈز کی طرف بڑھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ قریبی گارڈ سے رائفل چھیننا چاہ رہی ہے مگر گارڈ اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا اور مکمل تربیت یافتہ تھا۔ اس نے رائفل کا درمیانی حصہ زور سے ماموند کے سر پر مارا' وہ تیورا کر نشستوں کے درمیانی خلا میں گری اور دردسے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ اس کے سر سے خون کی دھار بہہ کر اس کی پیشانی کو رنگین کرنے لگی تھی۔ اسی دوران میں منی بس کے ڈرائیور نے بھاگنے کی کوشش کی مگر ابھی وہ دروازہ بھی پوری طرح نہ کھول پایا تھا کہ دھماکے سے فائر ہوا اور گولی ہیجم ڈرائیور کے کولہے ... وہ ... چیخ کر اوندھے منہ اسٹیئرنگ پر گر گیا۔

صورت حال اچانک ہی دھماکا خیز ہوگئی تھی۔ دونوں گارڈز کوچ کی سب سے پچھلی نشست پر تھے' ہمارے اور ان کے درمیان کافی گیپ تھا۔ ان تک پہنچنے کی کوئی بھی کوشش ہلاکت خیز ثابت ہوسکتی تھی۔ صرف ایک صورت میں ان گارڈز کی مزاحمت کی جاسکتی تھی' اور وہ صورت یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار ہوتا مگر ایسا نہیں تھا۔ ہم نہتے تھے۔ ایک چھرا میری پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا تھا' لیکن تیز دھار آلہ تو اس وقت کام دیتا ہے جب آپ کے اور مد مقابل کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔

ایک گارڈ نے چیخ کر ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ہمارے اندازے کے مطابق اس نے ڈرائیور کو ادھ کھلا دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا۔ زخمی ڈرائیور نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں نظر آرہی تھیں مگر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کوچ کے اندر کیا ڈراما چل رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہمارے مسلح گارڈز کی گاڑی میں جو خرابی پیدا ہوئی تھی وہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔

غزالہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا اور تابی کو اپنے سینے سے لگالیا۔ کلثوم بھی پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر زریں کا ہاتھ تھام لیا۔ زریں کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور یہ پھولے ہوئے نتھنے اس بات کی نشانی تھے کہ وہ کسی بھی معرکہ "حق و باطل" کے لیے بالکل تیار ہے اور میرے صرف ایک اشارے کی منتظر ہے مگر یہ اشارہ کرنا میرے لیے آسان نہیں تھا' موجودہ صورت حال میں اس اشارے کا یہی مطلب ہوتا کہ میں نے کلثوم کی "بیوگی" قبول کرلی ہے۔

دونوں گارڈز میں سے ایک جواں سال اور دوسرا درمیانی عمر کا تھا۔ درمیانی عمر کا گارڈ کوچ کے ڈرائیور پر مسلسل چیخ رہا تھا۔ اس کا لہجہ خطرناک سے خطرناک ہوتا جارہا تھا۔ ہمیں یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ڈرائیور کو آگے بڑھانے کا حکم دے رہا ہے۔ ڈرائیور کا تکلیف سے برا حال تھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہوگیا تھا اور منہ سے کراہ نکل جاتی تھی۔ آخر گارڈ کی دھمکیوں سے مجبور ہو کر اس نے کوچ آگے بڑھادی۔ دونوں گارڈز بدستور عقب میں کھڑے تھے' ان کی عقابی نگاہیں ہم میں سے ہر ایک کی حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ماموند جہاں گری پڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بار بار کراہ نکل جاتی ...

گارڈز کی ہدایت پر کوچ تھوڑا سا آگے جاکر سڑک سے اتر گئی اور بغلی سڑک پر آگئی' یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ نہایت سرسبز گرد و پیش میں دو تین موڑ مڑنے کے بعد کوچ ایک عمارت کے مین گیٹ میں داخل ہوگئی۔ یہ عمارت خستہ حال نظر آتی تھی۔ رنگ و روغن اڑا ہوا تھا' ڈرائیو وے کے اردگرد لمبی گھاس اگی تھی۔ اس عمارت میں پتلون قمیص والے دو تین مسلح نگہبان نظر آئے۔ کوچ ایک بڑے سے آہنی شٹر کے سامنے جاکر رک گئی۔ یہ شٹر دیکھنے میں کسی گیراج کا لگتا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو افراد نے بلند و بالا شٹر اٹھایا اور گاڑی آگے بڑھی۔

اچانک درمیانی عمر کا گارڈ چیخا "رکو... پہلے لائٹ آن کرو۔"

اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز کھڑکی میں سے گزر کر باہر پہنچی۔ شٹر اٹھانے والے افراد کو بھی غلطی کا احساس ہوگیا۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیراج کی اندرونی لائٹس آن کردیں۔ کوچ رینگتی ہوئی گیراج میں داخل ہوگئی۔

اگر گارڈ کا ذہن اس طرف نہ جاتا اور کوچ تاریک گیراج میں داخل ہوجاتی تو ہمارے لیے یقیناً ایک سنہری موقع پیدا ہوجاتا۔ تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ہم گارڈز پر جھپٹ سکتے تھے' یا اس نوعیت کا کوئی دوسرا قدم اٹھا سکتے تھے۔

ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ کوچ میں سے اتارا گیا اور گیراج کے اندر ہی ایک قطار میں دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا گیا۔ اس سیلن زدہ گیراج کی دیواروں کا پلاستر جگہ جگہ سے جھڑا ہوا تھا' ایک کونے میں چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔ یہ کوئی متروک عمارت نظر آتی تھی۔

کم از کم تین رائفلیں ہماری سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ اگر ان رائفلوں کا نشانہ صرف میں اور صفدر ہوتے تو کبھی یوں ناچار ہو کر دیوار کے ساتھ کھڑے نہ ہوتے۔ اس گیراج میں ایک زبردست ہنگامہ ہوتا اور ایک آدھ لاش گر جاتی۔ ان چار پانچ بندوقچیوں پر قابو پانا ہم دونوں کے لیے کوئی ایسا ناممکن کام نہیں تھا مگر اب صورت حال مختلف تھی۔ ہمارے ساتھ غزالہ اور کلثوم تھیں۔ اس کے علاوہ ایک معصوم بچہ تھا۔ ہم کسی قسم کا رسک لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اس لمبے چوڑے گیراج میں رنگ دار شیشوں والی ایک اسٹیشن ویگن بھی موجود تھی۔ ہمیں فوراً اس ویگن میں منتقل ہونے کا حکم دیا گیا۔ حکم عدولی کی کوئی گنجائش نہیں تھی' ہم ایک ایک کرکے اسٹیشن ویگن میں داخل ہوگئے۔ ویگن کا اندر

کنڈیشنر پہلے سے چل رہا تھا۔ ڈرائیور بھی اپنی نشست پر موجود تھا' منی کوچ والے دونوں باغی گارڈز یہاں بھی ویگن کی عقبی نشست پر براجمان ہوگئے۔ نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ ہمارے اور گارڈز کے درمیان' غزالہ کلثوم اور تابی تھے۔ ایک طرح سے گارڈز کی رائفلیں ان تینوں کے جسموں سے چھو رہی تھیں۔

ماموند کے علاوہ زخمی ڈرائیور اور اس کے جواں سال ہیلپر کو بھی کوچ میں ہی رہنے دیا گیا تھا۔ میں نے ایک مسلح شخص کو دوسرے شخص سے کہتے سنا "ان تینوں کو یہیں کوچ میں چھوڑ دو۔ خود ہی ذبح ہوجائیں گے۔" اس کا اشارہ ماموند' ڈرائیور اور ہیلپر کی طرف تھا۔

ذرا دیر بعد اسٹیشن ویگن گیراج میں سے نکلی اور بدحال عمارت کے مین گیٹ سے گزر کر سڑک پر آگئی۔ ایک سفید سوزوکی کار ہمارے عقب میں چلی آرہی تھی۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ یقیناً میری طرح صفدر کے ذہن میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گمان غالب یہی تھا کہ ہم پھر سے اپنے پرانے دوستوں میں آگئے ہیں۔ ان کے سوا یہاں ہماری میزبانی کا اتنا زیادہ مشتاق اور کون ہوسکتا تھا۔ مبارک امین کی سفاک صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی بے رحم سیاہی' اس کے جسم پر چمکتا ہوا سونا' اس کے کوتاہ قد جسم پر رکھا ہوا پُرغرور سر۔ میں نے اپنے ملک کے با اثر وڈیرے اور جاگیردار تو بہت دیکھے تھے اب تنزانیہ کے ایک وڈیرے سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوگیا تھا۔ اس وڈیرے کی کمینگی دیکھ کر میں کئی مہربانوں کی کمینگیاں بھول گیا تھا۔

"لگتا ہے کہ ہمارے بدترین اندیشے درست ثابت ہوگئے ہیں۔" صفدر نے سرگوشی کی۔

"ہاں... شاید مبارک کی موت ہمارے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔" میں نے صفدر کی تائید کی۔

"ان میں کوئی شناسا چہرہ بھی نظر آیا آپ کو؟"

"نہیں۔ ابھی تک تو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم اپنی بکواس بند رکھو۔" عقب سے درمیانی عمر کے گارڈ نے گرج کر کہا۔

مجھے اور صفدر کو خاموش ہونا پڑا۔

رنگین شیشوں والی یہ ویگن تیزی سے ارنگا کی مختلف سڑکوں پر پھسلتی رہی پھر مضافات میں آگئی۔ اب ہم ایک بار پھر دیہاتی علاقے میں تھے۔ تاہم یہ شناخت مشکل تھی کہ ہم واپس مبارک امین کی کافی اسٹیٹ کی طرف جارہے ہیں یا

ہمارا رخ کسی اور جانب ہے۔ ہمیں سڑک کے اطراف میں چائے اور کافی کے باغات دکھائی دے رہے تھے۔ پام بھی بکثرت تھے۔ جلد ہی ہم ایک شاندار عمارت میں داخل ہوگئے۔ اس عمارت کو مقامی طرز کی حویلی ہی کہنا چاہیے۔

عمارت کے اندر پورچ میں ہمیں ایک بڑا ٹریلر کھڑا نظر آیا۔ اس ٹریلر کو دیکھنے کے بعد اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہم ایک بار پھر مبارک امین کے شکنجے میں ہیں۔ ٹریلر کا تعلق "برل کافی فارمز" سے تھا اور یہ الفاظ ٹریلر پر درج بھی تھے۔ ایک ایسے ہی منحوس ٹریلر میں بھر کر ہمیں ہرکولیس سے برل فارمز میں لایا گیا تھا۔۔۔ اور پھر ایک ایسے ہی دوسرے لوڈر نما ٹریلر میں ہم برل فارمز سے فرار ہوئے تھے۔

صفدر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا "پنجابی کی کہاوت ہم پر صادق آرہی ہے نہنے دی کھوتی' اوتھے آ کھلوتی۔"

میں نے کہا "ابھی تم اس کھوتی کو "کھلوتی" نہیں کہہ سکتے' ابھی یہ چل رہی ہے' نجانے کہاں جاکر کھڑی ہوگی اور کبھی کھڑی بھی ہوگی یا نہیں۔"

صفدر بولا "کچھ اور ثابت ہو یا نہ ہو مگر اتنا ثابت ہوگیا ہے کہ اس چائے فروش مبارک کے ہاتھ بھی کچھ کم لمبے نہیں ہیں۔"

"بے شک اس کے ہاتھ بھی لمبے ہوں گے مگر یہاں لگ رہا ہے کہ جوہری برادران کے اپنے ہی لوگوں نے کوئی سازش کی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....."

صفدر کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ عقب سے گارڈز نے گرج کر کہا "باسٹرڈ! تم دونوں خاموش نہیں رہ سکتے ہو۔"

"تھوڑی تیسری دنیا ظلم برداشت کرکے خاموش رہ سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں رہ سکتے۔" صفدر نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کرلیے۔

ہمیں وین سے اتار کر ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچایا گیا۔ کمرے کی سجاوٹ دیہاتی طرز کی تھی مگر خوب صورت تھی۔ پوری عمارت ائر کنڈیشنڈ تھی لہٰذا افریقہ کا شعلہ بار سورج باہر ہی باہر غرّا رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر دونوں خواتین اور بچے کو ہم سے علیحدہ کردیا گیا۔ تاہم انہیں کمرے سے باہر نہیں نکالا گیا۔ بس اتنا کیا گیا کہ ہم سے دور ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا گیا۔ یہ تشویش ناک صورت حال تھی۔ اب تک جو کچھ سامنے آیا تھا اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ مبارک امین ایک نہایت کینہ اور "موذ کریکٹر" شخص ہے۔ اب ہم اس کے رحم و کرم پر تھے۔ دو مسلح افراد رائفلیں تان کر غزالہ اور کلثوم کے سر پر کھڑے ہوگئے۔ دو افراد نے ہمیں زد میں لے رکھا تھا۔ میرے دل میں آئی کاش اس وقت غزالہ اور کلثوم کا ساتھ نہ ہوتا۔ میرا دل مزاحمت کے لیے مچل رہا تھا' اور مجھے یقین ہے کہ صفدر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ پتا نہیں کہ وہ اپنی امنگ ترنگ کو کس طرح قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر حوادث کو ڈھونڈتا پھرتا تھا' اب حوادث اس کے سامنے تھے لیکن وہ ان سے آنکھ چرانے پر مجبور تھا۔ اس کی بے بسی کچھ میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔

ایک سیاہ فام نے ہمیں حکم دیا کہ ہم دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑے ہوجائیں اور اپنے ہاتھ پشت پر باندھ لیں۔

زریں گل نے اس شخص کو پشتو میں ایک موٹی سی گالی دی۔ صفدر بھی بڑبڑا کر رہ گیا۔ بہرحال حکم کی تعمیل کے سوا ہمارے پاس چارہ نہیں تھا۔ ہماری مزاحمت کا شدید نقصان غزالہ، کلثوم اور تابی کو پہنچ سکتا تھا۔ ہم دیوار کی جانب منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔ ہمارے ہاتھ پشت پر آہنی ہتھکڑیوں سے جکڑ دیے گئے اور تینوں ہتھکڑیوں کو ایک ہی زنجیر سے منسلک کردیا گیا۔ اس کے بعد اچھی طرح ہماری تلاشی لی گئی۔ میری پنڈلی سے میرا چھرا بھی برآمد ہوگیا۔ اس "برآمدگی" کے نتیجے میں مجھے گارڈز کے دو زوردار مکے منہ پر کھانے پڑے۔

چھرے کو دیکھ کر گارڈز مقامی زبان میں باتیں کرنے لگے۔ یقیناً انہوں نے چھرا پہچان لیا تھا۔ یہ وہی چھرا تھا جو میں نے برل کافی فارمز میں ایک نہایت تگڑے گارڈ سے چھینا تھا' بعد ازاں اسی چھرے سے میں نے مبارک امین کے ایک کارندے کا کام تمام کیا تھا۔ اس چھرے کی شناخت کے بعد گارڈز کی آنکھوں میں تڑپتی ہوئی نفرت کچھ اور بھی شدید ہوگئی۔ ایک سینئر گارڈ نے چھرے کو احتیاط سے اخبار میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

غزالہ، کلثوم اور تابی اسی کمرے میں رہے' ہمیں ساتھ والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ صرف فرش پر ایک بوسیدہ سا قالین بچھا تھا اور لیٹنے کے لیے تکیے وغیرہ رکھے تھے۔ اس کمرے میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی میں آہنی گرل لگی تھی۔ گرل میں سے ہم غزالہ اور کلثوم وغیرہ کو دیکھ سکتے تھے۔

"ان تینوں کو اس کمرے میں کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

صفدر نے گارڈز سے پوچھا۔

"ابھی بتاتے ہیں۔" گارڈز نے زہریلے انداز میں جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ صفدر کچھ اور کہتا' ایک دم سات آٹھ تنومند حبشی اندر گھس آئے۔ کوئی سوال جواب کیے بغیر وہ نہایت وحشت کے عالم میں ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ایک دو کے سوا ان سب کے ہاتھ میں لکڑی کے مضبوط ڈنڈے تھے۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' دوسرے حملہ آوروں کی تعداد بھی کہیں زیادہ تھی' ہم مار کھانے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکے۔ اور ان بدبختوں نے بھی مارنے کا حق ادا کردیا۔ کم از کم تین افراد مجھ سے لپٹے ہوئے تھے۔ گھونسوں اور ٹھوکروں کے علاوہ وہ بے دریغ ڈنڈے بھی برسا رہے تھے۔ چند سیکنڈ کے اندر میں گر گیا۔ اس کے بعد تو جیسے ضربات کی بارش ہوگئی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ صفدر اور زریں بھی بری طرح پٹ رہے تھے۔ میری قمیص تار تار ہوچکی تھی' بنیان پھٹ گئی تھی اور جوتے اتر چکے تھے۔ گارڈز کی وحشیانہ غراہٹوں کے درمیان زریں گل کی چیخیں اور گالیاں بھی گونج رہی تھیں۔ غزالہ اور کلثوم کے دہشت زدہ چہرے کھڑکی میں نظر آرہے تھے۔ جو آخری منظر میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ غزالہ ایک گارڈز کی منتیں کررہی تھی "خدا کے لیے چھوڑ دو۔ پلیز اب بس کرو۔"

اس کے بعد میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کی دبیز چادر پھیلتی چلی گئی۔

O☆O

دوبارہ ہوش آیا تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا اور گیلے کپڑے سے میرا چہرہ صاف کررہا تھا۔ یہ غزالہ تھی۔ اس کے سانسوں کی جانی پہچانی مہک میری حسِ شامہ کے بالکل قریب تھی۔ عجیب غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی مجھ پر۔ میں نے نیم باز آنکھوں سے غزالہ کا شیخ چہرہ دیکھا۔ جی چاہا کہ اس کا ہاتھ تھام لوں مگر اچانک پتا چلا کہ ہاتھ تو پشت پر بندھے ہوئے ہیں۔ کہیں بالکل پاس سے صفدر نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا پھر اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی "گڈ ایوننگ۔ بھوک تو نہیں لگی آپ کو؟"

"کیوں' تمہیں لگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آٹھ بندوں نے مل کر مارا ہے' بھوک نہیں لگے گی تو کیا ہوگا؟"

"بڑی نرالی بھوک ہے تمہاری' مار کھانے سے چمکتی ہے۔" میں نے کہا۔

اس گفتگو کے دوران میں غزالہ بڑی نرمی سے میرے ہونٹ صاف کرتی رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کا لمس جاں فزا تھا۔ صفدر میرے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ کلثوم اس کے کندھے پر گرم اینٹ سے ٹکور کررہی تھی۔ صفدر کے چہرے پر بھی چوٹوں کے نشان تھے۔ ہونٹ پر بھی زخم نظر آرہا تھا۔ تاہم میری طرح اسے بھی زیادہ تر اندرونی ضربات ہی آئی تھیں۔ اب یہ بات بڑی اچھی طرح ہماری سمجھ میں آرہی تھی کہ ہمیں زدوکوب کرنے کے لیے لکڑی کے ڈنڈے کیوں استعمال کیے گئے تھے۔ یہ لوگ ہمارے جسموں کو زخمی کیے بغیر ہمیں تکلیف پہنچانا چاہتے تھے۔۔۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم بہرحال "امپورٹ کوالٹی" کے بردے تھے۔ اگر ہماری جلد وغیرہ خراب ہوجاتی یا دانت شانت ٹوٹ جاتے تو ہمارا بھاؤ کہیں سے کہیں آجاتا۔ یوں مائیکل کی ناراضگی کا خطرہ درپیش ہوتا' لہٰذا مبارک کے غنڈوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہمیں پولیس والوں کے اسٹائل میں "چھتر" مار ماری تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو محسوس ہوا کہ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا ہے۔ بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ غزالہ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کردیا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔ کچھ یہی کیفیت کلثوم کی بھی تھی "زریں گل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اپنے سر کی جانب سے آواز آئی "ام یہاں ہے استاد صیب! اور خدا سے اپنے گناہوں کا معافی مانگ رہا ہے۔"

"لگتا ہے کہ تمہارا آخری وقت آگیا ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ ویسے تو ام بالکل ٹھاک ٹھاک ہے۔ ام اپنے پچھلے گناہوں کا نہیں اگلے گناہوں کا معافی مانگ رہا ہے۔"

"اگلے کون سے؟"

"ام سے کم از کم چار پانچ قتل ہونے والا ہے اور انشاء اللہ ہونے والا ہے۔ خو ام ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"کن لوگوں کو؟"

"جنہوں نے آپ سے مارپیٹ فرمایا ہے۔"

"ارے چندو! میرے ساتھ کوئی خاص مارپیٹ تو نہیں فرمایا انہوں نے۔ سبھی کو مارا ہے۔ کیا تمہیں نہیں مارا؟"

"ام کو اپنا پروا نہیں۔ امارا جان بھی رخصت ہوجائے تو امارے لیے امتیاز (اعزاز) ہے۔ مگر آپ۔۔۔"

"اچھا زیادہ قربان علی نہ بنو۔" میں نے اس کی بات کاٹی

"کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔"

زریں کی جگہ کلثوم نے اشک بار لہجے میں کہا "ماشاء اللہ بہت اچھا مارا ہے۔ پورا جسم توڑا ہے۔"

میں نے کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہم اسی کمرے میں تھے جہاں ہمارے سروں پر اچانک قیامت ٹوٹی تھی۔ زریں میرے سرہانے کی طرف لیٹا ہوا تھا۔ اب کلثوم اس کے قریب آن بیٹھی تھی۔ زریں کے سر سے بہت سا خون بہا تھا اور غزالہ نے وہاں پٹی باندھی ہوئی تھی۔ گھٹنوں پر سے زریں کی پتلون بھی پھٹی ہوئی تھی اور قمیص کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ میری طرح زریں کے جسم پر بھی اندرونی ضربات کے نیلگوں نشان تھے۔ اس کے ہاتھ بھی بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کمرے میں ایک الیکٹرک ہیٹر موجود تھا۔ اس پر ایک توا رکھا ہوا تھا۔ کلثوم اس توے پر اینٹ سینک سینک کر زریں اور صفدر کو ٹکور کر رہی تھی۔ غزالہ نے بتایا کہ ہیٹر اور توا انہی لوگوں نے فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ درد کش گولیاں اور چوٹوں پر لگانے کے لیے وکس وغیرہ بھی دی گئی تھی۔

ان لوگوں نے ہمیں جی بھر کر مارا تھا اور اب یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے جسموں پر نشانات وغیرہ نہ پڑیں۔ عجیب سی پچویشن تھی۔ بار بار ہمیں یہ احساس ہوتا تھا کہ جیسے ہم انسان نہیں کسی نایاب نسل کے جانور ہیں جنہیں باحفاظت منڈی مویشیاں تک پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

میں نے غزالہ سے پوچھا "تم لوگ کب سے یہاں ہو؟"

وہ آنسو پیتے ہوئے بولی "آپ کو مارنے کے فوراً بعد ہمیں اس کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔"

"کوئی بدتمیزی تو نہیں کی گئی تمہارے ساتھ؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ ابھی میرے اور صفدر کے درمیان جو ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی تھی۔ اس نے غزالہ کے رنج و غم میں کوئی دراڑ نہیں ڈالی تھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا' تابی ایک گوشے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ ائرکنڈیشنر کی کولنگ بہت زیادہ تھی۔ غزالہ نے تابی کے اوپر ایک موٹی چادر ڈال دی تھی۔

صفدر نے غزالہ سے پوچھا "کوئی نامبارک شکل تو نظر نہیں آئی؟" اس کا اشارہ مبارک امین کی طرف تھا۔

غزالہ نے پھر نفی میں جواب دیا۔

کلثوم بولی "ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ آدی آئی۔ ام کو گندی گندی آنکھوں سے دیکھا۔"

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھلا اور کھانے کی خوشبو ہمارے نتھنوں میں گھسی۔ دو افراد تین ٹرے لیے اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دو مسلح گارڈز بھی تھے۔ ٹرے قالین پر ہیٹر کے قریب رکھ دیے گئے۔ گارڈز ہمیں مضحکہ خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے نظروں نظروں میں پوچھ رہے ہوں "حال کیسا ہے جناب کا۔ جواب دیجئے سوال کا۔"

ایک سینئر گارڈ انگلش میں غزالہ سے مخاطب ہو کر بولا "اپنے گورے گورے ہاتھوں سے اپنے ان یاروں کو لقمے دو۔ کیا خبر کہ پیار محبت کے ایسے مواقع پھر آئیں کہ نہ آئیں۔"

غزالہ کے چہرے پر ناگواری کی شکن ابھری مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

صفدر کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ گارڈز ہمیں تاؤ دلانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے باہر چلے گئے۔ کھانا حسب معمول اچھا تھا۔ گوشت کی یخنی میں پکے ہوئے چاول' سبزی' شوربا' سویٹ ڈش اور ٹھنڈا تربوز بھی تھا۔ تابی کے لیے دودھ علیحدہ سے موجود تھا۔ مجھے بھوک نہیں تھی' غزالہ اور کلثوم کے اصرار پر میں نے چند لقمے لیے۔ صفدر اور زریں نے کراہتے ہوئے تھوڑا بہت کھایا۔ غزالہ اور کلثوم دونوں کو لقمے بنا بنا کر دیتی رہیں۔ دو گارڈز کھڑکی کے قریب ٹہل رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ آپس میں مسکراتی ہوئی سرگوشی بھی کر لیتے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ غزالہ اور کلثوم کے بارے میں نازیبا تبصرے کر رہے ہیں۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں انہیں دیکھ کر زریں گل کا میٹر بالکل ہی نہ گھوم جائے' لہٰذا میں ایسے زاویے سے بیٹھ گیا کہ زریں کی نگاہ براہ راست کھڑکی پر نہ پڑے۔

ہمیں توقع تھی کہ شاید رات سونے سے پیشتر مبارک امین ہمیں اپنی شکل دکھائے گا مگر مبارک امین نہیں آیا۔ ہاں اس کے بجائے ایک ایسی شکل نظر آئی جس کے بارے میں ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یقیناً میری طرح میرے ساتھی بھی توقع نہیں رکھتے تھے کہ وہ صورت ہمیں یہاں دکھائی دے گی۔ یہ قریباً دس بجے رات کا وقت تھا۔ زریں قالین پر اوندھا پڑا کراہ رہا تھا اور کلثوم ہولے ہولے اس کی پیٹھ پر دوا لگا رہی تھی۔ اچانک قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ نسوانی قدموں کی آہٹ تھی۔ میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا اور ایک اسمارٹ سی لڑکی دو گارڈز کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ تاریکی سے روشنی میں آئی تو ہم چونک گئے۔ وہ مامونہ تھی۔ اس کی جھیل سی گہری نیلی آنکھوں میں ایک زہریلا پن چمک رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہی دونوں گارڈز تھے جنہوں نے منی بس اغوا کی تھی اور ہمیں موجودہ "مقام و مرتبے" تک پہنچایا تھا۔

مامونہ ابھی تک پتلون قمیص میں تھی۔ اس کے سر پر پی کیپ تھی۔ غالباً یہ پی کیپ اس چوٹ کو چھپانے کے لیے رکھی گئی تھی جو بس میں اس کے سر پر لگی تھی۔

وہ میرے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ چند لمحے گھورنے کے بعد زہریلے لہجے میں بولی "میں اپنی بے عزتی بھولتی نہیں ہوں۔"

"مجھے یقین آگیا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "سورج طلوع ہونے کے بعد تو اندھا بھی یقین کر لیتا ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ بغیر دیکھے یقین کیا جائے۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"اب صرف پچھتاوا ہو سکتا ہے۔" وہ بولی "جس وقت تم نے مجھے لات ماری تھی اسی وقت اپنی بدقسمتی پر مہر لگالی تھی۔"

"مگر تم جانتی ہو کہ وہ سب کچھ اتفاقیہ تھا۔"

"مگر لات مارنے کے بعد تمہارا غصہ اور تمہاری ہٹ دھرمی تو اتفاقیہ نہیں تھی۔ تم معافی مانگ سکتے تھے۔ تمہاری یہ دلیل معافی مانگ سکتی تھی مگر تم نے اکڑ دکھائی اور اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔"

میں نے کہا "مجھے اس واقعے پر کوئی شرمندگی نہیں تھی نہ اب ہے۔ ہاں اگر کبھی پھر تم سے آزادی کے ماحول میں ملاقات ہوئی تو جو کچھ ہوگا اس پر شاید مجھے شرمندگی ہو۔"

"دھمکی دے رہے ہو؟" وہ غرائی۔

"ایک امکان ظاہر کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ دانت پیس کر بولی "بھول جاؤ اب آزادی کو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہارا مقدر کیا ہے۔"

"کیا یہی بتانے کے لیے آئی ہو؟"

"نہیں' ایک اور کام تھا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

پھر اس نے کھڑے کھڑے دو بار اپنی ٹانگ زور سے گھمائی اور میری پشت پر ٹھوکر رسید کی۔ اس کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہوا تھا۔ زریں گل زخمی شیر کی طرح تڑپ اٹھا۔

"تجوار!" پرے وار دا تغلیں تان کر گرجے۔

غزالہ نے جلدی سے زریں کو روک لیا۔ کلثوم بھی اس سے لپٹ گئی۔ زریں کی دہاڑوں اور گارڈز کی دھمکیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مامونہ نے قالین پر تھوکا اور ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ گارڈز نے پرشور آواز سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اور صفدر اپنی جگہ ساکت بیٹھے تھے۔ زریں بدستور غرا رہا تھا "ام قسم کھاتا ہے' اگر دوبارہ اس کا شکل نظر آیا تو ام اس کا ٹانگیں چیر کر کتوں کے آگے پھینک دے گا۔"

وہ کافی دیر تک اپنے آپ میں کھولتا رہا' پھر ہمارے سمجھانے بجھانے سے قدرے پرسکون ہو گیا۔

صفدر نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ یہ ساری اس کتیا کی کارستانی ہے۔ منی کوچ میں جو کچھ ہوا وہ بس ڈراما ہی تھا۔"

"یقینی بات ہے۔" میں نے تائید کی "دونوں گارڈز مامونہ کے ساتھ ملے ہوئے تھے لیکن ڈرائیور اور اس کے ہیلپر پر ظاہر کرنے کے لیے کہ مامونہ سازش میں شریک نہیں ہے۔ انہوں نے رائفل کی ضرب لگا کر مامونہ کو بھی زخمی کیا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ مصری حسینہ مبارک امین وغیرہ سے ملی ہوئی ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ وہ مبارک کے لیے کام کر رہی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے صرف انتقام کی خاطر ہمیں پکڑوایا ہو۔ بہرحال دونوں صورتوں میں یہ ہمارے حق میں برا ہی ثابت ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی ہمیں ایک لمبا سفر درپیش ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا "ہو سکتا ہے کہ مبارک امین ہمیں مائیکل کے پاس بھیجنا چاہے' اور مائیکل یہاں سے بہت دور ماورا برطانیہ میں پہنچ گیا ہے۔"

"آپ کیا سرگوشیاں کر رہے ہیں۔" غزالہ نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی ذاتی بات تھی۔" میں نے غزالہ کو ٹالا۔

وہ رات ہم نے جیسے تیسے گزار دی۔ زریں قریباً ساری رات جاگتا رہا تھا اور وقفے وقفے سے مامونہ کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا تھا۔ قصیدے تو ہم بھی پڑھ رہے تھے مگر دل ہی دل میں۔۔۔ وہ نہایت کینہ پرور اور خطرناک لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں جو گہرائی پنہاں تھی وہ ہمارے لیے موت کا جال بن گئی تھی۔ میرا ذاتی خیال یہی تھا کہ مامونہ کا مبارک امین سے تعلق نہیں۔ اس حرافہ نے صرف اپنے انتقام کی تسکین کے لیے ہمیں مبارک کے چنگل میں پھنسایا ہے۔ رہ رہ کر مسٹر جی کلارک کا خیال ہمارے ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ آج کسی بھی وقت نیویارک سے تنزانیہ پہنچنے

والے تھے۔ انہیں پہلے تنزانیہ کے دارالحکومت دارالسلام پہنچنا تھا۔ وہاں سے اروشا آنا تھا۔ اس طویل سفر کے اختتام پر انہیں جو خبر ملنے والی تھی وہ یقیناً ان کے لیے سوہانِ روح ثابت ہونا تھی۔ میں... تصور ہی تصور میں ملٹن کی پریشان صورت دیکھ رہا تھا۔ ہماری گمشدگی کے بعد خبر نہیں ان پر کیا گزری ہوگی۔ ایک خطرہ یہ بھی موجود تھا کہ کہیں مبارک امین اور جوہری برادران کے درمیان خون ریز فساد نہ ہوجائے۔ جوہری برادران کے محل میں قیام کے دوران ہم یہ دیکھ چکے تھے کہ دونوں برادران کے ہاتھ بہت لمبے اور ذرائع بے شمار ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت کئی شہروں میں زور و شور سے ہماری تلاش ہو رہی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ آفتِ جاں مامونہ بھی بڑھ چڑھ کر اس تلاش میں حصہ لے رہی ہو۔

صبح دم پہرے داروں نے ہمیں جگا دیا۔ انگلش وال پہرے دار نے غزالہ اور کلثوم کو حکم دیا کہ وہ اپنا منہ ہاتھ دھوئیں اور ہم سب کے منہ ہاتھ بھی دھلائیں۔ ہمارے لیے شیو کا سامان بھی فراہم کیا گیا اور حکم دیا کہ ہم شیو کرلیں۔ ہمارے ہاتھ بدستور پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ مجبوراً غزالہ اور کلثوم نے ہم تینوں کی شیو کی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد ہم نے کنگھی وغیرہ کی۔ غزالہ نے ہم تینوں کی چوٹوں پر مرہم لگایا اور زریں کے سر کی پٹی تبدیل کی۔ ہم تینوں کو بڑی بے دردی لیکن مہارت سے ضربات لگائی گئی تھیں۔ جسم پھوڑا بن گئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے بے ساختہ کراہ نکل جاتی تھی۔ صفدر کی پسلیوں پر بڑے بڑے نیل تھے اور اسے سانس لینے میں بھی دقت ہوتی تھی۔ یہ بھی ہم تینوں ہی کی ہمت تھی کہ اٹھ بیٹھ رہے تھے کوئی اور ہوتا تو شاید دو ہفتے تک بستر سے ہلتا بھی نہیں۔

جلد ہی ناشتا بھی آگیا۔ حسبِ معمول غزالہ اور کلثوم نے پہلے ہمیں کھلایا پھر خود کھایا۔ ننھا تابی یہ صورتِ حال دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شاید ہمیں بچوں کی طرح کھاتے دیکھ کر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ہم کوئی شرارت کر رہے ہیں۔ اسے ہمارے اور اپنے حالات کی سنگینی کا کچھ علم نہیں تھا۔ گاہے گاہے وہ میری گود میں بیٹھ کر غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگتا اور چہرے کی چوٹوں کو اپنی انگلی سے چھیڑنے لگتا تھا۔ غزالہ اسے ڈانٹ کر پیچھے ہٹاتی تھی وہ کچھ دیر بعد پھر آجاتا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ہم ناشتے سے فارغ ہوگئے۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے ہمیں یہاں سے کہیں اور شفٹ کیا جا رہا ہے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہوں گے جب ہمیں تنزانیہ کے نامبارک شخص امین کی شکل نظر آئی۔ وہ حسبِ معمول ایک شان دار ریشمی چغے میں ملبوس تھا۔ اس نے کسی دلہن کی طرح جسم پر سونا سجا رکھا تھا۔ دو مسلح گارڈز بڑے مؤدب انداز میں اس کے پیچھے چلے آرہے تھے۔

مبارک امین کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ صبح سویرے ہی نشے میں چور نظر آتا تھا۔ وہ ہمارے درمیان آکھڑا ہوا۔ بالکل خاموش اور بے حرکت۔ لیکن غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غضب کی بجلی کوند رہی ہے۔ ہم نے مبارک کے فارم سے فرار ہونے کی جرأت کی تھی۔ اب تک ہمارے ہاتھوں مبارک کے کم از کم تین ساتھی قتل ہوچکے تھے۔ اس کے علاوہ جارج ہال میں ہماری وجہ سے اسے جو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی وہ بھی یادگار تھی پھر ایک خاص بات یہ تھی کہ ہم نے مبارک امین سے بدر کو چھینا تھا اور یوں چھینا تھا کہ وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ وہ بدر کا سو اپنے پلیے دوست انسپکٹر تابش سے کرچکا تھا مگر ہم بدر کو اس کے گھر سے مکھن کے بال کی طرح نکال لائے تھے۔ یہ ساری ہزیمتیں چند دن کے اندر اندر مبارک کو برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اب ہم اس کی دسترس میں تھے شاید اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہمیں کچا چبا جائے اور ہماری ہڈیاں اس کے دانتوں کے نیچے یوں کڑکڑائیں کہ اس کے پھڑکتے دل کو سکون آجائے۔

اس نے ڈرامائی انداز میں اپنا کولٹ ریوالور نکالا۔ اس کے چیمبر میں پوری چھ گولیاں بھری تھیں۔ اور ایک لفظ کہے بغیر میرے سر کا نشانہ لے لیا "مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ بچے پہلے تمہاری باری ہے۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا۔

غزالہ اور کلثوم کے چہرے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئے۔ میں اپنی جگہ پُرسکون بیٹھا رہا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر آئی۔ چہرے پر ہیجانی کیفیت نمودار ہوئی۔

"ہمارا قصور کیا ہے؟" صفدر نے ہمت کرکے پوچھا۔

"تمہیں قتل کرنے کے لیے میرے پاس ایک سو جواز ہیں' اور ان میں سے ایک جواز یہ بھی ہے کہ تم نے نام کی اس لڑکی کو میرے گھر سے چرایا ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم' اور اگر معلوم ہوتا تو تمہیں نہ بتاتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر اس نے فائر کردیا۔

غزالہ اور کلثوم کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے پتا چل گیا کہ مبارک امین کے ہاتھوں میری موت نہیں لکھی ہے۔ وہ مجھے قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف اور صرف مجھے اذیت دینا چاہ رہا تھا (بدر کو دوبارہ حاصل کرنے میں بھی اسے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی) وہ بس یہ خواہش رکھتا تھا کہ میں اس کا غضب دیکھ کر ٹوٹ جاؤں اور اس کے سامنے بدحواسی اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کروں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ مبارک نے یکے بعد دیگرے تین فائر مجھ پر مزید کیے یہ گولیاں بھی میرے سر اور چہرے کے آس پاس سے گزریں اور دیواروں میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے بعد مبارک نے ایک ایک گولی زریں اور صفدر پر چلائی۔ یہ دونوں گولیاں بھی نہایت خطرناک انداز میں چلائی گئی تھیں۔ زریں پر چلنے والی گولی تو اس کی گردن کو قریباً چھو کر گزری تھی۔

یہ قیامت کے لمحے تھے جو ہم پر گزر رہے تھے۔ بہرحال ہم میں سے کسی نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مبارک نے ریوالور واپس اپنے لبادے کے نیچے رکھ لیا۔ اس کے انداز میں شرابیوں کی سی لڑکھڑاہٹ موجود تھی۔ یقیناً ہماری خوش بختی ہی تھی کہ ہم اس کی چاند ماری سے جانبر ہوگئے تھے یا پھر یہ بات تھی کہ وہ صفدر کی طرح خاصا ماہر نشانے باز تھا۔

ہم تینوں کے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور یہ تینوں ہتھکڑیاں آپس میں بھی منسلک تھیں۔ اس انتظام کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں رہے تھے کہ کسی طرح کی مزاحمت کا سوچ بھی سکتے۔ اس کے باوجود دونوں گارڈز یوں رائفلیں تھامے کھڑے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ ہم کھڑے کھڑے تحلیل ہوجائیں گے۔ مبارک امین بڑی حریص نظروں سے غزالہ اور کلثوم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خاص طور سے اس کی توجہ غزالہ کی طرف تھی۔ یوں لگا جیسے وہ آنکھوں آنکھوں میں اسے کھا جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ وہ اس کے قریب چلا گیا۔ غزالہ سہم کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ ننھا تابی اس کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا اور حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے گمبھیر آواز میں مبارک امین سے کہا "دیکھو مبارک! اب تک جو کچھ ہوا ہم نے برداشت کیا مگر ان خواتین پر تمہاری میلی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے ورنہ وہ کچھ ہوگا جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔" مبارک نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اس نے غزالہ کا بازو پکڑا پھر اسے ایک دم موڑ کر پشت سے لگا دیا۔ غزالہ کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔ بازو مڑنے کی وجہ سے اس کا چہرہ دیوار کی طرف ہوگیا تھا۔ مبارک نے بے رحمی سے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور جھٹکے سے غزالہ کا چہرہ اپنی طرف موڑ لیا۔ وحشیانہ انداز میں اسے دیکھتا رہا پھر بولا "تمہاری قسمت اچھی ہے' میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہارے اصل مالک پہنچنے والے ہیں' ورنہ۔" اس نے ایک معنی خیز قہقہہ لگایا اور غزالہ کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنا بازو سہلاتی ہوئی مبارک سے دور جا کھڑی ہوئی۔

زریں کا میٹر ایک بار پھر گھوم گیا تھا۔ وہ جست بھر کر اٹھا مگر اس مرتبہ صفدر اس سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر تھا۔ لہٰذا ہتھکڑیوں کی مشترکہ زنجیر تن گئی اور زریں کچھ آگے نہیں بڑھ سکا پھر کلثوم نے بھی اسے تھام لیا۔ وہ پشتو اور اردو میں گالیاں بکنے لگا۔ جواب میں گارڈز بھی ایک بار پھر دھمکی آمیز لہجوں میں دھاڑنے لگے۔ کمرے میں رات کی طرح کہرام سا مچ گیا۔ چند لمحے بعد کمرے کا دروازہ پُرشور آواز میں بند ہوگیا اور مقفل کردیا گیا۔ مبارک امین اپنے گارڈز سمیت باہر جا چکا تھا۔

مبارک امین کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد گارڈز کے ہمراہ تین افراد اندر داخل ہوئے۔ ان تینوں کی شکلیں کچھ جانی پہچانی محسوس ہوتی تھیں' تاہم ان میں سے ایک سفید فام کو تو ہم بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ہرکولیس جہاز کا نائب کپتان آرتھر تھا۔ آرتھر کو ہم نے آخری بار ہرکولیس جہاز میں ہی دیکھا تھا' جب ہم ایک ویران کھاڑی میں اترے تھے اور اتر پردیشی قیدیوں نے ساحلِ سمندر کو دیکھ کر ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ اس روز کے بعد آج ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا۔ حسبِ توقع ہمیں دیکھ کر آرتھر کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "ہیلو' دوستو! کیسے ہو؟" وہ بولا۔

"مزے میں ہیں۔" میں نے اپنی ہتھکڑی جھنجھنائی۔

وہ بولا "دانا سچ کہتے ہیں۔ بچھڑ کر ملنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ کیسی لگی یہ دوری اور اب یہ قربت؟"

"ہر پل تمہاری یاد میں تڑپ تڑپ کر گزارا ہے ہم دونوں نے۔" صفدر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"چلو تمہارے غموں کا مداوا کرتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"تم لوگوں کے سچے عاشق تو باس مائیکل ہی ہیں۔"

"کہاں درشن ہوں گے اس کے۔ اور کب ہوں گے؟"

آرتھر نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور ڈرامائی لہجے میں بولا "تاریطانیہ میں ورثن ہوں گے۔ اور آج رات ایک دو بجے کے لگ بھگ ہوں گے۔" وہ تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

آرتھر سے باتوں کے دوران میں ہی مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے پہلے سے شبہ تھا کہ ہم نے جو ناشتا نوش فرمایا ہے وہ اسپیشل ناشتا ہے اور بڑی "محبت" سے تیار کیا گیا ہے۔ اب یہ محبت اثر دکھانے لگی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کلثوم تو دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سو گئی ہے۔ تابی بھی گہری نیند میں چلا گیا تھا۔ زریں اور صفدر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

میں نے کہا "صفدر پیارے! میرا خیال ہے کہ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونے والے ہیں۔"

"شاید ناشتے میں گڑبڑ تھی۔" صفدر کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"یہ تو غور کریں گے تو پتا چلے گا اور غور اب جاگنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔"

"اور پتا نہیں جاگیں گے تو کس حال میں ہوں گے۔"

صفدر نے زیر لب مبارک امین کو چند منتخب پنجابی گالیاں دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے غنودگی گہری ہو گئی اور سب کچھ تاریکی میں غرق ہوتا چلا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو مجھے لگا کہ میں کسی گاڑی کی نشست پر دراز ہوں۔ "گھوں گھوں" کی مسلسل آواز کانوں میں پڑ رہی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ وہ بدستور میری پشت پر تھے اور جکڑے ہوئے تھے' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے جسم کی بے شمار ہڈیاں چیخ گئیں اور انہوں نے مجھے یاد دلایا کہ ہم مبارک کے کارندوں کے ہاتھوں بے طرح پٹ چکے ہیں۔ میری نظر غزالہ اور کلثوم پر پڑی' وہ دونوں میرے قریب موجود تھیں اور ٹھیک نظر آتی تھیں' تاہم صفدر' زریں اور تابی ابھی تک محو خواب تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس چیز پر سوار ہوں وہ گاڑی نہیں بلکہ ہوائی جہاز ہے۔ اور اس جہاز میں ہم اکیلے بھی نہیں تھے۔ ہم چھ کے علاوہ کم و بیش دو درجن افراد یہاں موجود تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا جہاز تھا۔ دو چار نشستوں کے علاوہ باقی سب نکال دی گئی تھیں۔ مختصر سے خلا میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ بلکہ بھیڑ بکریاں بھی نسبتاً اچھی حالت میں ٹھونسی جاتی ہیں۔ کم از کم وہ اپنے پاؤں پر تو کھڑی ہوتی ہیں۔ یہاں تو مسافر ایک دوجے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ ان مسافروں میں زیادہ تعداد نوجوان و خوب رو لڑکیوں کی تھی۔ ان کے بال منتشر' چہرے بے رونق اور لباس ابتر تھے۔ حسن و شباب کی یہ بے قدری دیدنی تھی۔ ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی دل گواہی دینے لگتا تھا کہ اس جہاز میں ان لڑکیوں کی حیثیت قیدیوں کی سی ہے۔

میں نے غزالہ سے پوچھا "تمہیں بھی نیند آ گئی تھی۔"

"ہاں۔ لیکن میں ذرا جلدی جاگ گئی۔ میں نے بہت تھوڑا ناشتا کیا تھا۔"

"کہاں آنکھ کھلی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک اسکول بس تھی۔ وہ ایک ویران ائر فیلڈ میں کھڑی تھی۔ بس سے چالیس پچاس گز دور یہ جہاز کھڑا تھا۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں' چھوٹا سا ہے۔ باہر سے رنگ سرخ اور سفید ہے۔ جہاز کا عملہ سیاہ فام ہے۔ ہمیں جہاز میں سوار کیا گیا۔ میں پیدل چل کر جہاز میں آئی۔ آپ لوگوں کو اسٹریچر پر لایا گیا۔ جہاز میں پہنچنے کے بعد قریباً ڈیڑھ گھنٹا ہم وہیں کھڑے رہے۔ اس دوران کلثوم کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس کا جی متلا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک اور بس رن وے کے پاس آئی۔ اس میں سے ان دو درجن افراد کو رائفلوں کی زد میں نکالا گیا' اور جہاز میں ٹھونس دیا گیا۔ اب پچھلے ڈھائی گھنٹے سے ہم مسلسل پرواز کر رہے ہیں۔" غزالہ نے مختصر الفاظ میں اب تک کی رپورٹ دے دی۔

میں نے جہاز میں موجود قیدی' نما مسافروں کا جائزہ لیا۔ ان میں قریباً پندرہ لڑکیاں اور نو مرد تھے۔ لڑکیوں میں سے چند فلپائنی یا انڈونیشیائی نظر آتی تھیں۔ دو چار ایرانی یا ترک تھیں۔ ان میں ایک ہندوستانی لڑکی بھی موجود تھی۔ اس کی پہچان ماتھے کا سرخ ٹیکا تھا۔ وہ سب گم صم تھیں۔ مسافروں میں کوئی دوسرے کو مخاطب کرتا تھا اور نہ اس کی طرف دیکھتا تھا۔ ایک دو لڑکیوں کے چہرے پر تشدد کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔

غالباً جہاز کا اے سی ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا' اوپر سے اوور لوڈنگ بھی تھی۔ خاصا حبس محسوس ہو رہا تھا۔ اوورلوڈنگ کا یہ عالم تھا کہ ایک لڑکی کی عریاں ٹانگ میرے سینے پر دھری تھی اور میرے ایک بازو پر ایک انڈونیشیائی نوجوان کا بالائی دھڑ تھا۔ اسی طرح زریں گل ایک "ماہ جبیں" سے قریباً بغل گیر ہو کر لیٹا ہوا تھا۔ لڑکی کے پاس اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ خود کو محو خواب زریں سے دور ہٹا سکتی۔ لڑکی کی یہ مجبوری کلثوم بھی سمجھ رہی تھی ورنہ وہ اب تک خاموش نہ ہوتی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد زریں اور صفدر کی

گہری نیند بھی پہلے ہلکی نیند میں بدلی اور پھر وہ جاگ گئے۔ صفدر سر میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ میرا اپنا سر بھی بھاری بھاری تھا۔ مجموعی طور پر ہم قریباً سات گھنٹے نہایت گہری نیند میں رہے تھے۔ زریں گل کو سخت پیشاب آیا ہوا تھا مگر وہ ساتھی مسافروں کے درمیان یوں پھنسا ہوا تھا کہ ٹوائلٹ کی طرف جانا ناممکن تھا پھر یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ٹوائلٹ کہاں اور کس طرف ہے۔

"اب کیا ہوگا؟" وہ پریشانی سے بولا "ام کو تو وہی وقت یاد آ گیا ہے۔"

"کون سا وقت؟"

"جب کلثوم نے امارے آزار بند کو قبائلی گرہ لگا دیا تھا اور گرہ کھولتے کھولتے امارا حشر خراب ہو گیا تھا۔"

"اللہ کرے اب یہ نوبت نہ آئے۔" میں نے کہا۔

"نوبت تو بس آنے ہی والا ہے جی۔ ام کو تو لگتا ہے کہ کچھ دیر یہی حال رہا تو امارا مثانہ پھٹ جائے گا۔"

"چلو میرا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔" صفدر نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیسا شوق؟"

"میری بڑی خواہش ہے کہ کسی کا مثانہ پھٹتے ہوئے دیکھوں۔"

"دیکھو کلثوم' یہ ایک طرف تو تم کو بہن بولتا ہے' دوسری طرف امارے بارے میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ کون سالا ہوگا جو بلاوجہ بہنوئی کا مثانہ پھٹنے کا دعا فرمائے گا۔ امارے دادا نے ایک دفعہ۔۔۔"

"اپنے دادا کی بات چھوڑو۔" صفدر نے کہا "وہ اور زمانہ تھا۔ آج کل مارکیٹ میں ایسے ہی بہنوئی اور سالے آ رہے ہیں۔"

"آپ لوگ موقع محل دیکھے بغیر چونچ لڑانا شروع کر دیتے ہیں۔" غزالہ نے خفگی سے کہا۔

"ہمارے حالات ایسے ہیں کہ اگر موقع محل کے انتظار میں رہیں تو شاید کبھی چونچ لڑا ہی نہ سکیں۔" صفدر نے کہا۔

"میرے خیال میں چونچ لڑانے سے بہتر ہے کہ آپ لوگ دماغ لڑائیں اور سوچیں کہ ہمیں اس۔۔۔ گورکھ دھندے سے کیسے نکلنا ہے۔"

صفدر بولا "سوچنے کے لیے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا زریں کی تو بات ہی نہیں ہو رہی' جہاں تک میرا تعلق ہے میں سوچنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ شاہ جہاں صاحب خوب سوچتے ہیں اور وہ سوچ بھی رہے ہوں گے۔"

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ مسٹر جی کلارک تنزانیہ پہنچ کر ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

"بس اسی سوچ پر ساری سوچیں ختم ہو جانی چاہئیں؟" صفدر نے کہا "اب ہمارے حالات وہ نہیں ہیں جو ہرکولیس میں تھے اور پرل فارم میں پہنچ کر تھے۔ وہاں ہم قریباً بے یار و مددگار تھے۔ اب ایسا نہیں۔ مسٹر جی کلارک جان چکے ہیں کہ ہم کن لوگوں کے قبضے میں ہیں اور وہ ہمیں کہاں پہنچا سکتے ہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "آپ کا کیا خیال ہے۔ جی کلارک صاحب ہمارا کھوج لگائیں گے۔"

"تم زیادہ جانتے ہو۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا "مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے شاہ جہاں صاحب۔ مسٹر جی کلارک کے بارے میں میرے کچھ اندازے غلط تھے اور آپ کے صحیح تھے۔"

میں نے کہا "ان صحیح اندازوں کی روشنی میں تم اب بھی مسٹر جی کلارک کے ردعمل کے بارے میں جان سکتے ہو۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ ہمارا کھوج لگائیں گے اور ہماری مدد کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

زریں نے ٹھنڈی سانس بھری "ام کو تو لگتا ہے کہ یہ سارا کوشش بے فضول ہے۔ ان کوششوں کا وہی نتیجہ نکلنا ہے جو پہلے نکلا ہے۔ مسٹر کلارک ناکام ہوگا۔"

"کس سلسلے میں ناکام ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ام کو کروڑپتی بنانے کے سلسلے میں۔ ام کو تو کبھی کبھی لگتا ہے کہ اس دفینے کا دولت اماری قسمت میں ہی نہیں ہے۔ ام کئی بار اس دولت کے بالکل پاس پہنچ کر بھٹک گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سائیں عالی نے کوئی جادو ٹونا کر چھوڑا ہو' ام سب کے اوپر۔"

"ہم تو ٹھیک ہیں' تمہارے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" صفدر بولا۔

زریں مسکرایا "دیکھو صفدر بھائی! ام کو بڑا سخت پیشاب آیا ہے اور تم امارے بالکل پاس لیٹا ہوا ہے۔ تم کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ام سے اچھا اچھا باتیں کرو تاکہ امارے ساتھ ساتھ تمہارا کپڑا بھی گیلا ہونے سے بچا رہے۔"

اتنے میں میری نگاہ ایک باوردی شخص پر پڑی۔ یقیناً اس کا تعلق جہاز کے عملے سے تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آواز دی۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور

ایک لفظ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

صفدر نے کہا "زریں پیارے! آج تو تمہارا پیشاب خطا ہو ہی ہوتا ہے۔ یہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا ہے۔"

زریں کا رنگ بگڑتا جا رہا تھا۔

اگلے پانچ چھ گھنٹے تک ہم مسلسل محو پرواز رہے۔ ہمارے دل گواہی دے رہے تھے کہ ہماری منزل ماریطانیہ ہی ہے۔ افریقہ کا مغربی کنارہ جہاں سے ایک طرف بحر اوقیانوس کا پانی نظر آتا تھا اور دوسری طرف صحرائے اعظم۔ ہوائی سفر بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ہم سرزمین افریقہ کے نجانے کن کن علاقوں پر سے گزر رہے تھے۔ کیسے کیسے لوگ اور کیسی کیسی قومیں نیچے آباد تھیں۔ دریا' جنگل' ریگستان' دور دراز قبائلی خطے سب کچھ ہمارے نیچے سے ایک خیال کی طرح گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اس اڑن کھٹولے میں موجود مسافروں میں سے بس ہم ہی باتیں کر رہے تھے' باقی تقریباً خاموش بیٹھے تھے۔ صفدر نے ایک دو افراد کو مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر بات چیت رسمی کلمات سے آگے نہیں بڑھی۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہمارے علاوہ جہاز میں ایک بھی ہتھکڑی والا قیدی نہیں ہے۔ زریں گل کے پیشاب کا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہم سب کی جان میں جان آئی تھی۔ ٹوائلٹ میں پہنچ کر پیشاب تو زریں نے کیا تھا مگر اس سے راحت ہم سب کو نصیب ہوئی تھی۔ خاص طور سے صفدر کو چین آیا تھا کیونکہ اسے زریں کے بالکل پاس جگہ ملی ہوئی تھی۔

شام سے کچھ ہی دیر پہلے ہمیں محسوس ہوا کہ جہاز کی بلندی کم ہونا شروع ہوئی ہے ایسے موقعوں پر بیلٹ باندھنے کی ہدایت کی جاتی ہے مگر یہاں تو اس نامعلوم ائرلائن کے تمام معزز مسافر سامان کی طرح ایک دوسرے پر کشتم پشتم پڑے تھے۔ جہاز مسلسل نیچے آتا رہا پھر اس نے تین چار چکر کاٹے اور رن وے سے اس کے پہیے ٹکرائے۔ ایک صبر آزما سفر ختم ہو گیا تھا مگر یہ کیسی منزل تھی جس کا انتظار بھی تھا اور جس کی آمد پریشان بھی کر رہی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ ہماری ملاقات کن لوگوں سے ہونے والی ہے اور وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ ہمیں ابھی اس منزل پر مائیکل کے درشن ہونے والے تھے اور مائیکل کی موجودگی میں خیر کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ جہاز نے لینڈ کیا اور پانچ دس منٹ تک ٹیکسی کرنے کے بعد ایک ویران مقام پر رک گیا۔ میں نے کوشش کر کے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ رن وے کی روشنیاں بھی نظر سے اوجھل رہیں۔ لگتا تھا کہ ہم کسی ہوائی اڈے کے بجائے لق و دق صحرا میں اتر گئے ہیں۔ حبس بڑھتا چلا جا رہا تھا.... قریباً آدھ گھنٹے بعد جہاز کا دروازہ کھلا اور ہانپتے ہوئے مسافروں نے تازہ ہوا کی آمد محسوس کر کے سکھ کا سانس لیا۔ باہر دو بسیں موجود تھیں۔ ان پر ماریا ٹرسٹ کے الفاظ لکھے تھے۔ بظاہر یہ کوئی رفاہی ادارہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں بڑے نظم و ضبط کے ساتھ مسلح افراد کی زیر نگرانی بسوں کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ بدبخت مبارک امین بھی ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہے۔ میں نے اسے کاک پٹ کے ادھ کھلے دروازے میں سے دیکھا۔ وہ جھکا ہوا تھا اور پائلٹ یا معاون پائلٹ سے کوئی بات کر رہا تھا۔ مبارک کو دیکھ کر مجھے اپنے جسم کا خون سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔ اس نے غزالہ کے ساتھ جو بدتمیزی کی تھی وہ ابھی تک میری آنکھوں میں مرچیں جھونک رہی تھی۔ اگر یہ کمینہ شخص یہاں بھی موجود تھا تو پھر ہمارے مصائب میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

دونوں بسیں ائرکنڈیشنڈ تھیں۔ جونہی سب لوگ سوار ہو گئے' بسیں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میری طرح صفدر نے بھی مبارک امین کی نامبارک جھلک دیکھ لی تھی اس کی آنکھوں میں پریشانی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ بہرحال ہم دونوں میں سے کسی نے مبارک امین کی موجودگی پر تبصرہ نہیں کیا۔ اس سے باقی ساتھی پریشان ہو سکتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد بسیں قدرے بارونق علاقے میں داخل ہو گئیں۔ یہ ایک شہری علاقہ تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک نظر آ رہا تھا اور اس ٹریفک کو دیکھ کر ہمیں لاہور اور کراچی وغیرہ کی یاد آ رہی تھی۔ وہی بے ترتیبی' وہی دھواں' سڑکوں کے کنارے بجلی کے کھمبے اور ہوا میں جھولتے ہوئے تاروں کے سلسلے۔ کہیں کہیں بلند عمارتیں بھی تھیں مگر زیادہ تر تعمیرات یک منزلہ یا دو منزلہ تھیں۔

ایک قدرے کم آباد علاقے میں پہنچ کر دونوں بسیں ایک بڑے گیٹ میں داخل ہو گئیں۔ اس محرابی گیٹ کی پیشانی پر بھی "ماریا ٹرسٹ" کے الفاظ جلی حروف میں لکھے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ملازمین ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑے سائبان کے نیچے بہت سی عورتیں مشینوں پر کپڑے دھونے میں مصروف تھیں۔ ان سب کے لباس ایک ہی طرح کے تھے۔ سفید کھلے لبادے اور سفید اسکارف۔ اس وسیع احاطے میں ہی ایک طرف کیاریوں میں بہت سی سبزی اگی

ہوئی تھی۔ کچھ خواتین و حضرات یہ سبزی توڑنے اور اسے ٹوکریوں کے اندر جمع کرنے میں مصروف تھے۔ افریقہ کے جو علاقے ہم نے دیکھے تھے ان میں "ٹوکری" کی بے حد اہمیت نظر آئی تھی۔ بازاروں میں' کھیتوں اور تفریح گاہوں میں ہر جگہ خواتین ٹوکری سے مزین نظر آتی تھیں۔ مرد بھی حسب موقع ٹوکری کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔

ہماری گاڑیاں ایک بڑے شیڈ تلے رک گئیں۔ اس شیڈ تلے اور بھی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں تین چار اسٹیشن ویگن تھیں۔ کچھ لوڈر قسم کی وہیکلز تھیں۔ ان سب کا رنگ ایک طرح کا تھا یعنی سفید اور سبز۔ ان سب گاڑیوں پر ماریا ٹرسٹ کے الفاظ موجود تھے۔ ہماری دونوں بسوں میں مسلح گارڈز موجود تھے مگر ٹرسٹ کی وسیع و عریض چار دیواری میں پہنچنے کے بعد ان گارڈز نے اپنے ہتھیار اپنے لبادوں کے اندر چھپا لیے تھے۔ ہمیں بسوں سے اتار کر ایک برآمدے میں پہنچایا گیا۔ برآمدے کے پار چند ایمبولینس گاڑیاں بھی ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کو اور یہاں کے ماحول کو دیکھ کر اس خیال کو تقویت ملتی تھی کہ یہ ماریا ٹرسٹ خدمت خلق کا کوئی ادارہ ہے۔ یہاں برآمدے میں داخل ہونے کے بعد ہم تینوں کے ہاتھ کھول دیے گئے۔

برآمدے میں پہنچ کر ہم سب کو دو واضح گروپس میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک میں عورتیں اور ایک میں مرد۔ غزالہ اور کلثوم بھی دوسرے گروپ میں چلی گئیں' تابی بھی ان کے ساتھ تھا۔ غزالہ اور کلثوم دونوں کے چہروں پر فکر کے گہرے آثار تھے۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں غزالہ اور کلثوم کو تسلی دی پھر میں نے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے جوڑ کر انہیں اشارہ دیا کہ وہ اپنا حوصلہ بلند رکھیں۔ پریشانی تو میرے دل و دماغ کو بھی جکڑ رہی تھی مگر میں نے چہرے پر طمانیت اور مسکراہٹ ہی رکھی۔ جب عورتوں کے گروپ کو زنانہ رہائشی حصے کی طرف لے جایا گیا' تو کئی عورتیں شدید ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئیں۔ ان میں سے کچھ ہلکی پھلکی مزاحمت بھی کرنے لگیں۔ تاہم سفید وردیوں میں ملبوس ٹرسٹ کی لیڈی ملازمین نے انہیں پیار محبت سے سمجھایا اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گارڈز کی مدد بھی لے لی گئی اور ان خواتین کو وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ زنانہ حصے کی طرف جاتے ہوئے غزالہ اور کلثوم مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو صاف دکھائی دیتے تھے۔

مردوں کے گروپ کو ہانک کر مردانہ رہائشی حصے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ سادہ مگر صاف ستھرے کمرے تھے۔ ہر کمرے میں تین بیڈ تھے۔ ایک الماری' ایک میز اور کرسی تھی۔ یہاں پہنچ کر صفدر اور زریں بھی مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ گارڈز نے مجھے جس کمرے میں داخل ہونے کا حکم دیا اس میں میرا ایک ساتھی حبشی تھا اور دوسرا سفید فام۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے دروازہ بند کر دیا گیا' تاہم اسے مقفل نہیں کیا گیا۔ ایک گارڈ نے زہریلی سرگوشی کرتے ہوئے کہا "دروازہ لاک نہیں ہے لیکن تم اسے لاک ہی سمجھو۔ یہاں درجنوں آنکھیں ہر وقت تمہیں دیکھ رہی ہیں' کسی بھی غلط حرکت کا نتیجہ تمہاری توقع سے زیادہ خوفناک ہو گا۔"

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس ٹرسٹ کا ماحول جیسا نظر آ رہا ہے ویسا ہے نہیں.... بے شک یہاں ہر کام بڑے نظم و ضبط اور شائستگی کے ساتھ ہو رہا تھا مگر اس کے پیچھے کسی نہ کسی شکل میں جبر اور دباؤ بھی موجود تھا۔ جو گارڈز ہمیں یہاں لے کر آئے تھے ان میں سے کسی کے پاس ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ ہمارے آس پاس ہی موجود تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ اب بھی مسلح ہیں۔

سفید وردی والا ایک شخص ہمارے کمرے کے عین سامنے موجود تھا۔ بہت جلد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی حیثیت ہمارے پہرے دار اور خدمت گار کی ہے۔ وہ سیاہ فام نہیں تھا۔ اس کی گندمی رنگت اور شکل و صورت سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ بھارتی ہے۔ جلد ہی یہ شبہ یقین میں بدل گیا۔ یہ شخص اردو میں بات چیت کر سکتا تھا۔ اس کا نام انیس احمد تھا اور اس کا تعلق مہاراشٹر سے تھا۔ انیس احمد کرخت چہرہ اور کم گو شخص تھا۔ ایک ہم قوم اور ہم زبان سے مل کر بھی اس کے لب و لہجے میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے اگر اس سے دس باتیں کیں تو اس نے فقط ایک کا جواب دیا۔

میری پریشانی کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا "تمہیں اپنی ساتھی عورتوں کے بارے میں فکر مند ہونے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یہاں کا ڈسپلن بڑا سخت ہے۔ زنان خانے کی طرف چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ زنان خانے کا تمام عملہ عورتوں کا ہے۔ پہرے دار بھی عورتیں ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو بھائی' لیکن میری پریشانی کی ایک خاص وجہ ہے۔"

"وہ کیا؟" انیس نے پوچھا۔

"تم نے مبارک امین کا نام سنا ہے؟" انیس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "وہ ایک کوتاہ قد شخص ہے۔ عام طور پر سرخ یا سیاہ ریشمی جبہ پہنتا ہے' اس کی سب سے خاص نشانی

یہ ہے کہ اس کے جسم پر انگوٹھیوں' بٹنوں اور ہاروں وغیرہ کی صورت میں بہت سا سونا نظر آتا ہے۔"

انیس کے چہرے پر رنگ سا نظر آیا۔ یوں لگا جیسے وہ مبارک کو تھوڑا بہت جانتا ہے اور کچھ نہیں تو اس نے مبارک کو دیکھا ہوا ضرور ہے۔ وہ خشک لہجے میں بولا "مجھے نہیں معلوم تم کس کی بات کر رہے ہو۔ بہرحال تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "بھائی! یہ ایک بہت خطرناک اور کمینہ شخص ہے۔ میری پریشانی یہ ہے کہ یہ میری ساتھی خاتون ڈاکٹر غزالہ کو میلی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر غزالہ وہی ہے جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہے۔ مجھے یہ خدشہ ہے کہ مبارک امین بھی ہمارے ساتھ ہی اس چار دیواری میں آگیا ہے' وہ ڈاکٹر غزالہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

انیس نے کہا "شاید تم نے میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس ادارے کا ڈسپلن مثالی ہے۔ فرسٹ انٹری کے بعد جو شخص ادارے کی تحویل میں آجاتا ہے' اس کی حفاظت کی تمام تر ذمے داری ادارے پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس ملک کا سربراہ بھی چاہے تو ادارے کی تحویل میں آئے ہوئے شخص کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "بھائی! جہاں قانون ہوتا ہے' وہاں خلاف ورزی بھی ہوتی ہے' یہ دونوں لفظ لازم و ملزوم ہیں۔ انہیں آج تک کوئی الگ نہیں کر سکا۔ یہ بندہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے بڑے لمبے ہاتھ رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ادارے کا ایک کرتا دھرتا مبارک امین کا گہرا دوست ہے۔"

"تم پہیلیاں مت بجھواؤ۔ کس کی بات کر رہے ہو تم؟"

"مائیکل کی۔" میں نے کھٹاک سے جواب دیا۔

میرے اچانک جواب کی وجہ سے انیس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ میرا اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر عین نشانے پر لگا تھا "تم مائیکل صاحب کو کیسے جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"سمندری سفر میں ہمارا بڑا لمبا ساتھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ انیس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں' آخر وہ بولا' تو تمہارا خیال ہے کہ جس بندے پر تمہیں شبہ ہے وہ باس مائیکل کے ساتھ مل کر تمہاری ساتھی خاتون کو نقصان پہنچائے گا؟"

"ہاں یہی اندیشہ ہے مجھے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اندیشہ بالکل احمقانہ ہے۔" وہ بیزاری سے بولا "اور اگر فرضِ محال یہ صحیح ہے بھی تو بھی ابھی تمہاری ساتھی کو اس بندے سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ... باس مائیکل فی الحال یہاں نہیں ہیں۔ انہیں کم از کم چار روز بعد آنا ہے۔ لہٰذا تمہارے اندیشے کے مطابق بھی چار دن تک تمہاری ساتھی کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔"

میں نے کہا "انیس بھائی! تم نے اپنی باتوں کو خود ہی جھٹلا دیا ہے۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اس ملک کا سربراہ بھی آجائے تو یہاں کے قانون قاعدے نہیں توڑ سکتا' اب تم نے خود ہی ایک ڈھیلی ڈھالی بات کر دی ہے۔"

"بال کی کھال اتارنے سے بہتر ہے کہ تم اپنا تھوبڑا بند رکھو اور وہاں ایک کونے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔" انیس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا لہرایا۔ وہ سخت سٹپٹا گیا تھا۔

میں نے اسے مزید مشتعل کرنے سے بہتر سمجھا کہ کونے میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ابھی مجھے بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کسی قریبی کمرے سے گرجنے برسنے کی آوازیں آئیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے دو افراد آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ یہ جان کر میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی کہ ان میں سے ایک آواز صفدر کی ہے۔ اس سے پہلے تو اکثر اس قسم کی مہم جوئی زریں صاحب ہی کیا کرتے تھے مگر اس مرتبہ صفدر کی رگِ اشتعال پھڑک اٹھی تھی۔ پتا نہیں یہ سب کیسے ہوا تھا۔ دو چار منٹ یہ شور شرابا رہا پھر کسی پہرے دار کی گھن گرج سنائی دی۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

میں ابھی اس جنگ و جدل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی' پھر صفدر کی جھلک نظر آئی۔ وہ تین ڈنڈا بردار پہرے داروں کے ساتھ ہمارے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ ایک پہرے دار نے دروازہ کھولا۔ اس نے میرے روم میٹ حبشی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا تو صفدر کو اندر دھکیل دیا گیا۔ دروازہ پھر باہر سے بند کر دیا گیا۔ صفدر کے گریبان کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی تھی کہ اس نے کسی سے دھینگا مشتی کی ہے۔

"یہ کیا لفڑا ہے بھئی۔" میں نے اس کے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لفڑا نہیں گریبان ہے۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"پھٹے ہوئے گریبان کو لفڑا ہی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

"کسی کی فرمائش پر۔"

"یار کھل کر بات کرو۔"

"ابھی آپ کی پرستار سوزی سے ملاقات ہوئی ہے اس خاکسار کی... اسی کی ہدایت پر یہ لفڑا ہوا ہے۔" صفدر نے بڑے اسٹائل سے کہا۔

سوزی کے نام پر دماغ کے تار جھنجھنا اٹھے۔ یہ وہی پٹاخا حسینہ تھی جو ہرکولیس جہاز پر افسران کی تنہائیوں کو چمکاتی تھی۔ میرے ہاتھوں آدم خور ٹام کی ہلاکت کے بعد وہ میری تعریف کے پل باندھتی رہتی تھی۔ پرل فارمز سے فرار ہو کر جب ہم ایک جوہڑ کے سرکنڈوں میں چھپے ہوئے تھے' سوزی نے ہماری بڑی مدد کی تھی۔ وہ ہمیں تلاش کرنے والوں میں شامل تھی تاہم اس نے ہمیں سرکنڈوں میں دیکھنے کے بعد بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ آج پھر وہی سوزی اس چار دیواری میں ہمارے روبرو آگئی تھی۔ صفدر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ہمارے کمرے کے سامنے سے گزری۔ شاید اتفاقاً ہی اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں میری خیر خیریت پوچھی اور آگے بڑھ گئی اس کے ساتھ دو پہرے دار بھی تھے... تقریباً ایک گھنٹا پہلے وہ دوبارہ نظر آئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ میرے کمرے کے دونوں ساتھی سوئے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی کے قریب چلی آئی۔ اس نے آپ کے بارے میں اور دیگر ساتھیوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں بتا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کسی طرح میرا کمرا تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ میں شاہ جہاں صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ پہلے تو اس نے نفی میں سر ہلایا' جب میں نے اصرار کیا تو وہ بولی' تم اپنے ایک روم میٹ سے جھگڑا کر لو پھر میں کوشش کروں گی۔ میں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

"یعنی جھگڑے کے نتیجے میں اس نے تمہارا کمرا تبدیل کرا کے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے؟" صفدر نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "یار! ویسے یہ لڑکی ہے کام کی چیز۔"

"اس میں کیا شک ہے' مگر آپ یہ بات غزالہ کے سامنے نہ کہیے گا۔"

ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔ ہمارا روم میٹ حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے جعفر رضا بتایا۔ ہماری توقع کے برعکس وہ ایرانی تھا۔ وہ بردہ فروشوں کے ہاتھوں اغوا ہو کر یہاں پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بتانے کو تیار نہیں تھا۔ اسے انگلش بالکل نہیں آتی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا فارسی میں کہا' ہم بمشکل اس کا مطلب سمجھ پائے۔ ابھی ہم جعفر رضا سے باتیں ہی کر رہے تھے کہ سوزی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پتلون اور شرٹ میں تھی۔ اس کا جسم جیسے لباس کی قید سے رہائی پانے کے لیے مچل رہا تھا۔ اب اس نے ہمارے ساتھ کوئی بات نہیں کی' بس کھڑکی سے ہمیں اپنی جھلک دکھا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ایک پہرے دار بھی تھا' تھوڑی دیر بعد وہ پہرے دار سمیت پھر واپس آئی۔ مجھے اور صفدر کو باتیں کرتے دیکھ کر اس نے گھورا۔ سخت لہجے میں بولی "آپ لوگ خاموش رہیں تو بہتر ہے۔ یہاں صرف ضروری بات کی اجازت ہے۔" ہمیں دھمکی آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد پہرے دار انیس سے پتا چلا کہ سوزی اس رہائشی حصے کی انچارج ہے۔ اس کا دفتر اسی رہائشی حصے میں ہے اور وہ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتی ہے۔ زنانہ حصے کی انچارج علیحدہ تھی۔ اسی طرح اس عمارت میں مختلف شعبوں کے انچارج مختلف تھے۔ انیس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں رات کا کھانا شام سات بجے کے قریب ہی کھلایا جاتا ہے۔ یعنی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی یہاں کھانا کھلایا جا چکا تھا۔ ہمیں بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر اب اس بھوک کے مداوے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رات نو بجے کے قریب ہی ٹرسٹ کی چار دیواری میں خاموشی چھانے لگی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں کے باسیوں کے لیے یہ نصف شب ہے اور وہ سونے کے لیے دراز ہو چکے ہیں۔ ہماری آنکھوں سے نیند ابھی بہت دور تھی۔ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ افریقہ کا مشہور و معروف مچھر تھا' جو ہیلی کاپٹر کی طرح گھوں گھوں کرتا ہوا قریب سے گزر جاتا تھا۔

صفدر اور میں بیٹھے رہے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ یہ وہی چار دیواری ہے جہاں مائیکل ہمیں لانا چاہ رہا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی اور اس کے اسرار ابھی ہم پر پوری طرح کھلے نہیں تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ابھی ہم اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ مائیکل اور سوزی کی یہاں موجودگی کا پتا تو ہمیں چل چکا تھا' توقع تھی کہ ہرکولیس کے باقی جانے پہچانے چہرے بھی یہاں موجود ہوں گے اور وہ تمام حالات بھی موجود ہوں گے جو ان چہروں سے وابستہ تھے۔ پروفیسر اللہ رکھا' اس کی خوب رو بیٹی شائستہ' سادہ لوح دیہاتی حسینہ' اتر

پروین کی کم سن ماں کملا اور روشن جان راجن وغیرہ..... ہرکولیس میں پروفیسر اللہ دتا نے کسی کنگ براون کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ ہمیں اس کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ممکن تھا کہ اس چار دیواری کے اندر مستقبل قریب میں اس شخص سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

ہم باتیں کر رہے تھے اور ہمارا پہرے دار انیس ایک ستون سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اچانک نسوانی قدموں کی تیز چاپ سنائی دی' پھر ہم نے سوزی کا غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھا۔ وہ کھڑکی کے سامنے پہنچ کر غرائی "یہ کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو۔ میں نے آپ کو سمجھایا بھی تھا کہ یہاں بات چیت منع ہے۔ آپ پورے وارڈ کو پریشان کر رہے ہیں۔"

سوزی کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر پہرے دار انیس بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ڈرا ہوا تھا کہ شاید انچارج اس کی طبیعت بھی صاف کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ سوزی پہرے دار انیس سے مخاطب ہو کر سخت لہجے میں بولی "اس شخص کو لے کر میرے آفس میں آؤ۔" سوزی کا اشارہ میری طرف تھا۔

وہ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد انیس نے ایک گارڈ کو ساتھ لیا اور ہمارے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ گارڈ نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پہرے دار اور گارڈ کی معیت میں میں سوزی کے دفتر پہنچا۔ رہائشی کمروں کے درمیان ہی ایک کمرا سوزی کا دفتر تھا۔ اسی کمرے میں ایک طرف بیڈ اور فریج وغیرہ بھی رکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا ٹی وی اور وارڈ روب بھی یہاں نظر آ رہی تھی۔ عقبی دیوار پر ایک خوب صورت سا پوسٹر ٹنگا ہوا تھا۔ سوزی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی "دیکھو مسٹر! میں لوگوں پر سختی کرنے کی قائل نہیں ہوں مگر ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے اگر سختی ضروری ہو تو پھر وہ کرنی پڑتی ہے۔ اس ادارے کے کچھ قواعد و ضوابط ہیں۔ تم میری انگلش سمجھ رہے ہو ناں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

سوزی نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ گارڈ اور پہرے دار کمرے سے باہر موجود تھے۔ تاہم کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ سوزی ایک دم لہجہ بدلتے ہوئے بولی "مسٹر شاہ جہاں! میں بڑی دیر سے آپ سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی' آپ کے لیے ایک بری نیوز ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولی "آپ کا ایک دشمن یہاں موجود ہے اور وہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہ رہا ہے۔"

"کہیں اس کا نام مبارک امین تو نہیں؟"

"بالکل یہی ہے۔" سوزی نے قدرے حیرت سے کہا۔

"اگر وہ مبارک امین ہی ہے تو پھر شاید وہ مجھے نہیں ڈاکٹر غزالہ کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مبارک کے حوالے سے اندیشہ پہلے ہی سا تھا۔"

"ہاں میں اس کمینے کو یہاں دیکھ چکا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ غزالہ کو بری نظر سے دیکھ رہا ہے۔"

سوزی نے ایک گہری سانس لی۔ کرسی سے تھوڑا سا بلند ہو کر اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا اور رازداری کے لہجے میں بولی "آج رات نو بجے مبارک امین مجھ سے ملا ہے اور اس نے مجھ سے غزالہ کے بارے میں بات کی ہے۔"

"کیسی بات؟" میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔

"وہ بدبخت ڈاکٹر غزالہ کو گیسٹ ہاؤس میں بلانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے رشوت کی پیشکش کی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

وہ بولی "بظاہر اس ادارے کا نظم و نسق مثالی ہے... مگر حقیقتاً اس ادارے میں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو اس قسم کے بیشتر دوسرے رفاہی اداروں میں ہوتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں سب کچھ اونچی سطح پر ہوتا ہے اور "قیمت" بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ لڑکیاں...؟"

"ہاں جس جگہ ہم موجود ہیں' اسے ہاسٹل کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ہاسٹل ہے کم و بیش تین سو خواتین اور تین سو مرد یہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بے شک ڈسپلن بہت زیادہ ہے مگر وہ لوگ جو انتظامیہ کے بہت قریب ہیں' کسی نہ کسی طرح اپنا الو سیدھا کر ہی لیتے ہیں۔ مبارک امین بھی ان میں سے ایک ہے۔"

"کیا وہ پہلے بھی یہاں آ چکا ہے؟"

"ہاں پچھلے سال بھی دو بار آیا تھا۔ جس طرح شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے' عیاش لوگ بھی اپنے لیے عیاشی کا سامان ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہ مبارک دراصل باس مائیکل کے دوستوں میں سے ہے۔ مائیکل کی مدد سے اس نے دو بار سیکنڈ انٹری سے پہلے لڑکیاں حاصل کی ہیں۔"

"یہ فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری کیا چیز ہے؟"

"یہ بھی یہاں کا ایک چکر ہے۔ کسی وقت تفصیل سے بات کرنے کا موقع ملا تو بتاؤں گی۔ فی الحال آپ اس مسئلے پر غور کریں جو فوری طور پر درپیش ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی "میں نے مبارک امین کو صاف جواب دے دیا ہے لیکن وہ ڈھیٹ ہے۔ چپکا نہیں بیٹھ جائے گا۔ وہ کوئی اور راستہ ڈھونڈے گا۔ اس ہاسٹل کے چار انچارج ہیں اور میں ان میں سے جو

ترین ہوں۔ کیا پتا وہ کسی اور انچارج کو شیشے میں اتار لے اور پھر ہیڈ انچارج بھی تو ہے۔ یہاں ہیڈ انچارج کے سامنے انچارج کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جیل سپرنٹنڈنٹ کے سامنے جیلرز کی ہوتی ہے۔"

"تم کہنا چاہتی ہو کہ مبارک امین کسی اور طرح ڈاکٹر غزالہ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔"

"بالکل۔" سوزی نے اثبات میں سر ہلایا "اگر باس مائیکل یہاں موجود ہوتے تو مبارک کے لیے ڈاکٹر غزالہ تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر باس تین چار روز کے لیے شہر سے باہر ہیں۔ اب اگر ایک دو روز تک آپ لوگ سیکنڈ انٹری میں چلے گئے تو مبارک آپ کو چھو بھی نہیں سکے گا۔ مبارک تو کجا پھر مائیکل بھی آپ کے حوالے سے تقریباً بے بس ہی ہو گا۔ لہٰذا مبارک چاہے گا کہ آج کل میں ہی اپنی مطلب بر آری کر لے۔"

"تمہاری یہ فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر کرسی سے بلند ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور دھیمے لہجے میں بولی "آپ نے کنگ براون کا نام سنا ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولی "بس آپ مختصراً یہ سمجھیں کہ کنگ براون اس سارے سیٹ اپ کے کرتا دھرتا ہیں۔ جو لوگ اس ادارے میں پہنچتے ہیں وہ سیکنڈ انٹری کے بعد کنگ براون کی تحویل میں چلے جاتے ہیں' پھر ان کے متعلق ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا فیصلہ کنگ کی صوابدید سے ہوتا ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا "مس سوزی! ایک بنیادی سوال تو میں اب تک پوچھ ہی نہیں سکا ہوں۔ ہم اس وقت کس ملک میں ہیں؟"

"ماریطانیہ میں۔ اس شہر کا نام NEMA ہے۔" سوزی نے جواب دیا۔

"پروفیسر اللہ دتا اور اس کی بیٹی شائستہ کہاں ہیں؟"

سوزی ذرا سا ہچکچانے کے بعد بولی "وہ دونوں بھی یہیں ہیں۔"

"کیا میں تمہاری بات پر یقین کر لوں۔"

"یقین کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اور دوا تر پرتشی افراد؟"

"وہ بھی یہیں ہیں۔ چند دن پہلے تک انہوں نے زبردست مسئلہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر بھوک ہڑتال پر چلے گئے تھے۔ یہ تا دم مرگ بھوک ہڑتال تھی۔ ان میں سے ایک لڑکی مر بھی گئی تھی۔ اب ان کے بارے میں تازہ ترین صورت حال کا مجھے علم نہیں۔"

"کیا وہ یہاں اس ہاسٹل میں نہیں ہیں؟"

"ہیں بھی اور نہیں بھی۔ اب میں پھر سیکنڈ انٹری کی بات کروں گی اور آپ الجھ جائیں گے لہٰذا اس باب کو ابھی بند ہی رکھیں۔"

لڑکی کی موت کا سن کر میرے ذہن میں کم سن کملا کے بارے میں بھیانک خدشات جاگ اٹھے تھے۔ میں نے سوزی سے پوچھا "ان قیدیوں میں ایک چھوٹی عمر کی ماں تھی۔ اس لڑکی کا نام کملا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا ہے؟"

سوزی نے نفی میں جواب دیا۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہا تھا مگر ایک سیاہ فام لڑکی تیز قدموں سے چلتی آفس کے دروازے پر پہنچی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آئی ہے۔ اس نے دہلیز پر کھڑے ہو کر سوزی سے اندر آنے کی اجازت چاہی' اجازت ملنے پر وہ لپک کر سوزی کے پاس پہنچی۔ رکوع کے انداز میں جھک کر اس نے اپنا منہ سوزی کے کان کے قریب کیا اور پریشان لہجے میں کچھ بتانے لگی۔ میں نے صاف محسوس کیا سوزی کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ اس کے خوب رو چہرے پر شدید پریشانی نمودار ہو گئی تھی۔

جونہی لڑکی آفس سے باہر گئی' سوزی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ وہ بدبخت مبارک اپنا کام کر گزرا ہے۔"

زمین جیسے میرے پاؤں تلے سے نکل گئی "کیا ہوا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"ڈاکٹر غزالہ شدید خطرے میں ہے۔" سوزی بڑبڑائی "اس لڑکی نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر غزالہ کو ہاسٹل کے کمرا نمبر ۸۸ سے نکال کر گیسٹ ہاؤس میں پہنچایا گیا ہے۔ گیسٹ ہاؤس وہ جگہ ہے' جہاں خصوصی مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ عیاش جاگیردار مبارک بھی وہیں پر مقیم ہے۔"

میرے جسم کا سارا لہو جیسے ایک دم میرے سر میں جمع ہو گیا' اور آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک پل بھی مزید اس کرسی پر بیٹھا رہا تو میرا سر دھماکے سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ میں یک لخت کھڑا ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں زور سے بھنچی ہوئی ہیں۔

یکایک سوزی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں ان لمحوں میں آزاد تھا اور سوزی نے ایک ایسی خبر مجھ تک پہنچائی تھی جس نے مجھے جنون کی حد تک مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے ہکلا کر کچھ کہنا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرے اندر وہ

جمانی استاد بیدار ہو چکا تھا جس کی ڈکشنری میں سے موت' خطرہ' ڈر اور مصلحت جیسے الفاظ پندرہ سال پیشتر حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے گئے تھے۔ اب یہ لفظ اور ان لفظوں سے وابستہ تصورات اس کے لیے بے معنی تھے۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ جب بے بسی گھیر لے تو پھر اس بے بسی کو ختم کردو چاہے اس کے ساتھ ساتھ باقی سب کچھ بھی ختم ہوجائے۔

"مسٹر شاہ جہاں! آپ میری بات سنیں۔" سوزی نے میرا بازو پکڑا۔

میں لپک کر اس دیوار کی طرف گیا جہاں خوب صورت سے ہولسٹر میں لیڈی پسٹل آویزاں تھا۔ اس سے پہلے کہ سوزی کچھ سمجھتی یا کرتی پسٹل میرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے پسٹل سوزی کی طرف سیدھا کیا تو وہ اس کے چہرے سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہ گیا "خبردار سوزی۔ میرا دماغ گھوما ہوا ہے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا "اس عقبی دروازے سے باہر نکلو سوزی اور مجھے گیسٹ ہاؤس لے چلو۔ فوراً!"

سوزی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا پھر پسٹل کی طرف دیکھا جو اس کی پیشانی کے عین سامنے موجود تھا۔ تاہم میرے خیال میں پسٹل سے زیادہ اس لہجے نے سوزی پر اثر کیا جس میں میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ عقبی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے سے باہر مکمل سکوت تھا۔ ابھی بمشکل دس بجے ہوں گے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات بیت چکی ہے۔

"کہاں ہے گیسٹ ہاؤس؟" میں نے پوچھا۔ سوزی نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔

احاطے میں یہ ایک علیحدہ عمارت تھی اور اس پر گیسٹ ہاؤس کے الفاظ بھی لکھے نظر آتے تھے۔ ہم درختوں کے نیچے سے گزر رہے تھے' جب اچانک ایک ہٹا کٹا پہرے دار سامنے آگیا۔ وہ حیرت سے کبھی سوزی کی طرف اور کبھی میرے ہاتھ میں موجود پسٹل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ٹانگ سے اس کی رانوں کے درمیان ضرب لگائی' وہ تڑپ کر دوہرا ہوا تو کنپٹی پر لگنے والی پسٹل کی طوفانی ضرب نے اسے لمبا لٹا دیا۔ میں نے احتیاطاً ایک اور ضرب اس کے سر پر لگا دی۔ سوزی پتھر کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ وہ ایک مرتبہ ہرکولیس میں میری مزاحمت کرکے دیکھ چکی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کیمی جیسی پانچ چھ بھی اکٹھی ہوجائیں تو مجھے زیر نہیں کرسکتیں۔

میں نے سوزی کو آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ ہم گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک گارڈ سے مڈبھیڑ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ میں نے سوزی سے پوچھا "کس کمرے میں ہے مبارک؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" اس نے کہا۔

اچانک میرے کانوں میں تابی کے رونے کی مدھم آواز پڑی اور پورے جسم میں جیسے انگارے بھر گئے۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا واش روم تھا۔ میں نے سوزی کو اس واش روم میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کردیا۔ اس کے بعد میں دیوانہ وار تابی کی آواز کی سمت بڑھا۔ ایک گارڈ میرے راستے میں آیا۔ اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ (یہاں موجود تمام گارڈز کے پاس ریوالور وغیرہ تھے جو وہ بہ آسانی اپنے کپڑوں کے نیچے چھپائے رکھتے تھے) اس سے پہلے کہ گارڈ کا ریوالور اس کے ہاتھ میں آتا' میں اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔ گارڈ کے حلق سے بس ہلکی سی آواز ہی نکل سکی۔ میں نے اس کی گردن پر مخصوص دباؤ ڈالا اور وہ بے جان لاشے کے مانند میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے فرش پر لٹایا اور ایک بار پھر آواز کی سمت بڑھا۔ بالکل یوں لگا جیسے تابی رو کر میری رہنمائی کر رہا ہے۔ مجھے بتا رہا ہے کہ وہ اور اس کی "ماں" فلاں جگہ ہیں۔ آواز ایک دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں نے دروازے کو ٹانگ رسید کی تو وہ چوپٹ کھل گیا۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ میں نے دیکھا تابی قالین پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے کئی کھلونے پڑے تھے۔ سفید لباس والی ایک گندمی لڑکی وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ یقیناً چند سیکنڈ پہلے تک وہ تابی کو بہلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پسٹل کی پروا کیے بغیر وہ دیوانہ وار باہر کی طرف بھاگی' میں نے اس کا بازو جکڑ لیا۔

"بچے کی ماں کہاں ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

میری انگلش یقیناً لڑکی کی سمجھ میں آگئی تھی مگر وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ میں نے پھر اسے جھنجھوڑا "کہاں ہے اس بچے کی ماں؟" میری آواز در و دیوار میں گونج گئی۔

لڑکی نے اپنی لرزتی انگلی ایک بغلی دروازے کی طرف اٹھائی۔ اس سے پہلے کہ میں اس دروازے کی طرف بڑھتا' دروازہ خود ہی کھل گیا۔ مجھے اپنے سامنے مبارک امین کی منحوس صورت دکھائی دی۔ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ مبارک امین کے عقب میں مجھے جو منظر نظر آیا وہ کہیں زیادہ سنگین اور اشتعال انگیز تھا۔ میں نے ادھ کھلے دروازے میں سے غزالہ

کو دیکھا۔ وہ اسی لباس میں تھی جس میں جہاز سے اتری تھی اور اس چار دیواری میں پہنچی تھی۔ اس کے ہاتھ سامنے کی طرف ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے' وہ پہلو کے بل ایک بستر پر پڑی تھی۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ غزالہ کو کوئی نشہ آور چیز دی گئی ہے۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ ایک ہی سمت میں دیکھتی چلی جارہی تھی۔ میں نے کوتاہ قد مبارک امین کی گردن پکڑی اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ وہ میز پر گرا۔ میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل دو گلاسز سمیت دیوار سے ٹکرائی اور چکنا چور ہوگئی۔

مبارک امین حلق پھاڑ کر چیخا۔ وہ گارڈز کو آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے دبوچا اور ایک بار پھر دیوار سے دے مارا۔ گریبان پر میری گرفت مضبوط تھی۔ مبارک امین کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ میں نے زہرخند لہجے میں کہا "مبارک! تجھے کہا تھا ناں کہ ان دونوں عورتوں کے ساتھ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ کہا تھا ناں تجھ سے؟" فرطِ وحشت میں مجھے اپنی آواز ہی اجنبی محسوس ہورہی تھی۔

میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کچھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے یا صرف رو رہی ہے۔ پہلی مرتبہ میری نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی۔ وہ بھی بندھے ہوئے تھے۔

میری توجہ ایک لمحے کے لیے غزالہ کی طرف مبذول ہوئی تھی۔ عیار مبارک نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگنا چاہا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن بازو کے آہنی شکنجے میں جکڑ لی اور پسٹل اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے چاروں طرف سے بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ پہرے دار اور گارڈز تھے جو مبارک کی پکار سن کر اس کمرے کی طرف لپکے تھے۔ میں نے مبارک کو گھسیٹا اور ایک گوشے میں ہوگیا۔ اب مبارک ایک زندہ ڈھال کی صورت میرے سامنے تھا۔ اندر آنے والے گارڈز اور پہرے داروں کی تعداد کم و بیش دس تھی۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھ میں ریوالور وغیرہ نظر آرہے تھے۔ وہ سب سیاہ فام تھے۔

"خبردار!" ایک گارڈ دہاڑا "معزز مہمان کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاؤ اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔"

میں نے گارڈ کی دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے مبارک امین کے کان میں سرگوشی کی "چائے فروش مبارک امین! تیرا آخری وقت آگیا ہے۔ اپنے خدا کو یاد کرلے۔"

مبارک کا جسم سرتاپا لرز گیا۔ اس نے مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ ابھی دو چار منٹ زندگی باقی ہے تمہاری۔ میں تمہیں اسی طرح اپنے ساتھ گھسیٹ کر چھت پر لے جاؤں گا۔ وہاں تیرے پیٹ میں گولیاں ماروں گا اور تیسری منزل سے تجھے سر کے بل پختہ فرش پر پھینکوں گا۔ تیری موت تیرے شایانِ شان ہوگی۔"

"خدا کے لیے۔ میری گردن چھوڑ دو۔" مبارک کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

گارڈز نے گھیرا تنگ کردیا تھا۔ دو گارڈز مجھ سے صرف بیس تیس فٹ کی دوری پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "تم معزز مہمان کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم تم پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور "معزز مہمان" کو گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں پر لے آیا۔ اچانک ایک گارڈ دائیں جانب سے نمودار ہوا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ میں نے اسے وارننگ دی "رک جاؤ۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔" میرا اشارہ مبارک کی طرف تھا۔

یہ گارڈ بے حد تربیت یافتہ اور مشاق نظر آتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں چیتے کی سی پھرتی تھی۔ اس نے مجھے چکما دیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری وارننگ اس پر اثر کرگئی ہے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا' پھر بجلی کی طرح تڑپ کر میری طرف آیا۔ میں تو پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ پسٹل کی نال مبارک کی نامبارک کنپٹی پر تھی۔ میں نے ٹریگر دبا دیا۔

میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ پسٹل میں سے "ٹرچ" کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ خالی تھا۔ یہ ایک لمحے کی مہلت "چیتا صفت" گارڈ کے لیے بہت کافی تھی۔ وہ توپ کے گولے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں مبارک سمیت سخت فرش پر گرا ہوں' پسٹل میرے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ ایک دم مسلح گارڈز کالی بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے۔ میرے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش سی ہوگئی تھی' مگر مبارک امین کی ایک ٹانگ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے پوری طاقت سے ٹانگ کو گرفت میں لے لیا۔ مبارک فرش پر اوندھا پڑا تھا اور مچھلی کی طرح بل کھا کھا کر میرے ہاتھوں سے پھسلنے کی کوشش کررہا تھا۔ دوسری طرف میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے چھوڑوں گا نہیں' پہرے دار میری کمر پر اندھا دھند ضربات لگا رہے تھے۔ چند سیکنڈ کے لیے کبڈی کے کھیل کی سی صورت حال پیدا ہوگئی۔ جاپھی کو بھاگنے والے کھلاڑی کو پکڑ لیتا ہے۔ بھاگنے والا کھلاڑی زور لگا کر خود کو گھسیٹتا ہے اور "دھائی" کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مبارک بھی کسی نادیدہ "دھائی" کو ہاتھ لگانے کی کوشش کررہا ہے۔ اچانک مجھے

موقع مل گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے مبارک امین کا نرخرا جکڑے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ایک حواس باختہ گارڈ کے ہولسٹر میں سے ریوالور کھینچ لیا۔ ریوالور کا وزن بتا رہا تھا کہ وہ فل لوڈڈ ہے۔ میں نے اوپر تلے تین گولیاں چلائیں اور تینوں مبارک کے سر سے پار کر دیں۔ کئی ہاتھوں نے میرے ریوالور والے ہاتھ کو جکڑ لیا۔ میری انگلیوں کو وحشیانہ انداز میں موڑ کر ریوالور میرے ہاتھ سے کھینچ لیا گیا۔ پھر کئی ہاتھوں نے میرے بازوؤں کو پشت کی طرف موڑا اور میری کلائیوں کو کسی رسی نما شے سے باندھا جانے لگا۔ کچھ افراد بدحواسی میں مبارک امین کو جھنجھوڑنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک ایسی لاش کو جھنجھوڑ رہے ہیں جس کی کھوپڑی میں تین روشن دان کھل چکے ہیں۔

اچانک سوزی کی شکل میرے سامنے آئی۔ وہ چیخ چیخ کر گارڈز کو ہدایات دے رہی تھی "مت مارو اسے۔ چھوڑ دو۔ اسے قانون کے مطابق سزا ملے گی۔"

مشتعل گارڈز نے سوزی کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرے جسم پر گھونسوں کی بارش تھم گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے، دو تین گارڈز نے مجھے بازوؤں سے جکڑ کر کھڑا کر دیا۔ مبارک امین بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا کھوپڑا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ وہ پرل کانی فارمز کا مالک ہی نہیں اپنے علاقے کا سخت ترین جاگیردار بھی تھا۔ بدر جیسی نجانے کتنی عورتیں اس کی افتادِ طبع کا شکار ہو چکی تھیں۔ آج وہ سونے سے لدا پھندا اپنے غرور و رعونت سمیت مردہ چھپکلی کی طرح فرش پر پڑا تھا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، مبارک نے ہاسٹل کی ایک انچارج ہی کی مدد سے غزالہ کو گیسٹ ہاؤس میں بلایا تھا۔ غزالہ کو کھانے میں خواب آور دوا کھلائی گئی تھی۔ پھر اسے نائی سمیت گیسٹ ہاؤس کے کمرا نمبر ایک میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں مبارک ٹھہرا ہوا تھا۔ خواب گاہ میں مبارک نے غزالہ کو زبردستی شراب پلانے کی ایک ناکام کوشش کی تھی۔ اسی دوران میں وہاں پہنچ گیا تھا، اور مبارک نے عیاشی کی جو بساط بچھا رکھی تھی وہ اس کی موت کی بساط میں بدل گئی تھی۔

گارڈز مجھے کھینچتے ہوئے گیسٹ ہاؤس سے باہر لے آئے۔ سوزی بھی ہمراہ تھی۔ مجھے تقریباً نصف فرلانگ تک ننگے پاؤں چلایا گیا اور ایک دوسری عمارت کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اس عمارت میں قدم رکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ اس جگہ کو یہاں جیل خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ بڑی عمارت نہیں تھی۔ بمشکل ایک کنال رقبہ ہوگا۔ یہاں بیرک کی طرز پر چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کوٹھڑیوں کے دروازے سلاخ دار تھے۔ دو چار کوٹھڑیوں کے سوا باقی خالی ہی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے بھی ایک کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ دروازے کی سلاخیں زنگ آلود تھیں اور فرش گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک وزنی تالا لگا دیا گیا۔

میں فرش پر بیٹھ گیا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ صرف چھتیس گھنٹے پہلے ارنگا میں مبارک کے کارندوں نے مجھے اور رزیں کو بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ ابھی وہ چوٹیں تازہ تھیں کہ یہ مزید چوٹیں لگ گئی تھیں۔ میرے زخمی ہونٹ سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے ایک دھجی علیحدہ کی اور اپنے ہونٹ پونچھے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں میرے ہاتھوں سے کئی قتل ہوئے تھے لیکن جو آج میں نے کیا تھا اس میں کچھ جدا طرح کی طمانیت اور خوشی تھی۔ یہ قتل میں نے اس عزیز ہستی کے لیے کیا تھا جو میری زندگی کا محور تھی۔ وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی میری متاعِ حیات تھی۔ مجھے اس کی خوبیوں یا خامیوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ بس میری محبت تھی۔ میری غزالہ تھی..... اس سے پیچھے نہ سوچنا چاہتا تھا نہ اس سے آگے۔

میں ساری رات دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ کبھی اونگھتا رہا کبھی جاگتا رہا۔ میری سوچ بار بار بھٹک کر غزالہ کی طرف جا رہی تھی۔ میں اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں روتے چھوڑ آیا تھا۔ پتا نہیں اب وہ کیسی تھی، اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا تھا۔ بس ایک تسلی تھی، اور وہ یہ کہ سوزی کا رویہ ابھی تک میرے حوالے سے نرم تھا۔ میں نے اس کے سر پر پستول رکھا تھا اور اسے گیسٹ ہاؤس تک لے کر گیا تھا۔ اس کے باوجود سوزی نے مجھے گارڈز کے وحشیانہ تشدد سے بچایا تھا۔

صبح چار پانچ بجے کے قریب بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ کوئی دو گھنٹے بعد ایک پہرے دار کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ وہ سلاخ دار دروازے کے باہر سے مجھے جگا رہا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ راہداری میں کوئی بھاری بھرکم قدموں سے چلتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ ان قدموں کی چاپ میں عجیب سی ہیجانی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر چلنے والا میرے سامنے آن کھڑا ہوا.....

وہ مائیکل تھا۔ تھری پیس سوٹ میں آدم خور درندہ۔ اس کا چہرہ فرطِ غضب سے تمتما رہا تھا اور آنکھوں کی جگہ دہکتے ہوئے انگارے رکھے تھے۔

مائیکل کا غیظ و غضب سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میرے ہاتھوں اس کا دوست مبارک امین قتل ہوا تھا اور یہ واقعہ صرف آٹھ نو گھنٹے پہلے کا تھا۔ مائیکل کے پیچھے ہی پیچھے دو حبشی گارڈ بھی کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان جلاد نما حبشیوں نے صرف پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ بالائی جسم عریاں تھے۔ میری تمام تر توجہ مائیکل کی طرف تھی۔ میں اس کی انگارہ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک کوٹھڑی کے سلاخ دار دروازے میں سے کوئی شے گزر کر میری طرف آئی۔ ایک دائرہ سا میری آنکھوں کے قریب چمکا۔ دفعتاً مجھے پتا چلا کہ میری گردن میں تانبے کا بنا ہوا وہی مخصوص کڑا ڈال دیا گیا ہے جو میں اس سے پیشتر جہاز ہرکولیس میں دیکھ چکا تھا۔ اس کڑے کا تعلق ایک طویل بانس نما راڈ سے تھا۔ مائیکل کے سخت گیر پہرے دار اس راڈ کو بڑی پھرتی سے قیدیوں کی کوٹھڑی میں داخل کرتے تھے اور تانبے کا حلقہ یا کڑا کسی قیدی کی گردن میں فٹ ہو جاتا تھا، پھر اس قیدی کو کھینچ کر سلاخوں کے قریب لایا جاتا تھا اور بے رحمی سے تشدد کیا جاتا تھا۔ ایک ہی لمحے میں یہ ساری تفصیل میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔

سخت کڑے کی پٹی میری گردن میں دھنستی چلی جا رہی تھی۔ پھر دونوں حبشیوں نے مل کر زور لگایا اور میں کھنچتا ہوا سلاخ دار دروازے سے آ ٹکرایا۔ اب میرا چہرہ آدم خور مائیکل سے فقط چند انچ کی دوری پر تھا۔ اس کی درندے جیسی سانس میرے رخساروں سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ کسی درندے ہی کی طرح غرایا "بھگوڑا کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔ آخر پکڑا جاتا ہے یا مر جاتا ہے اور تم بھی مر جاتے تو تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔" اس کے الفاظ میں خوفناک دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔

"تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کرنا ہے خدا نے کرنا ہے۔"

"خدا نے جو کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔ اس نے تمہارے ہاتھوں مبارک کو قتل کرا دیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ خدا نے اسی ذریعے سے تم پر عذاب نازل کیا ہے۔ ایسا عذاب جو تمہیں جینے دے گا نہ مرنے دے گا۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا "جوزف کہاں ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ مائیکل جلد یا بدیر مجھ سے یہ سوال ضرور پوچھے گا۔ جب ہم پرل فارمز سے فرار ہوئے تھے تو جوزف کو ہم نے راستے میں ایک جوہڑ کے کنارے سے پکڑا تھا۔ بعد ازاں بوڑھے داراب کے گھر ہونے والی فائرنگ میں جوزف کو مبارک ہی کے کسی کارندے کی گولی لگ گئی تھی۔ کئی گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد جوزف نے دم توڑ دیا تھا۔

مائیکل نے میرے بالوں کو شدید جھٹکا دیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا "کہاں ہے جوزف؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" میں نے بمشکل کہا۔ تانبے کا حلقہ میری آواز کو گلے میں گھونٹ رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اور تم بتاؤ گے بھی۔ اور اگر نہیں بتاؤ گے تو پھر تمہاری ڈاکٹر بتائے گی۔ اور اس سے میں جس طرح پوچھوں گا اس کا اندازہ بھی تمہیں ہے۔ وہ میرے ہاتھوں زندہ درگور ہو جائے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم ہی بتا دو۔" مائیکل نے میرے بالوں کو ایک اور زبردست جھٹکا دیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بند رکھے پھر میری آنکھوں کے سامنے منحوس "سی بوکو" لہرایا۔ بید کی وہی لچکیلی چھڑی جو بردوں کی کھالیں ادھیڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ہرکولیس میں اسی چھڑی سے میں نے دو قیدیوں کے چہرے کا بھرتا بنتے دیکھا تھا۔ مائیکل نے وحشیانہ انداز میں "سی بوکو" کو ہوا میں حرکت دی۔ "شائیں" کی باریک آواز دل دہلا دینے والی تھی "کیا خیال ہے جانی! کچھ بتانا ہے یا چہرے پر نقش و نگار بنوانے ہیں۔"

پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی مائیکل نے "سی بوکو" کی ایک شدید ضرب میرے سر پر لگائی۔ واقعی سی بوکو ایک سخت منحوس اور اذیت ناک چیز تھی۔ میں نے اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اس کی ضرب آج پہلی مرتبہ سہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کھوپڑی میں تلوار سی گھس گئی ہو۔ یقیناً دوسری ضرب میرے چہرے کے مزاج پوچھتی اور پھر ہر ضرب کے ساتھ میرے چہرے سے کھال ادھڑنا شروع ہو جاتی۔ اپنی بے بسی کا یہ تماشا میرے تصور میں ناچ رہا تھا اور میں یہ تماشا مائیکل کو ہرگز دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں وہ عام قیدی نہیں تھا جسے یہ بردہ فروش جانوروں کی طرح مارتا تھا اور جانوروں ہی کی طرح چیخنے چلانے اور پاؤں میں لوٹنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دروازے کی سلاخیں پکڑیں، اپنے دونوں پاؤں اچھل کر سلاخوں سے ٹکائے اور بھرپور قوت سے پیچھے کی طرف زور لگایا۔ میری ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ دونوں حبشیوں کے ہاتھوں سے آہنی راڈ چھوٹ گئی تھی۔ میں مزید پیچھے ہٹا اور اس راڈ کو کوٹھڑی کے اندر لے

آیا۔ پلک جھپکتے میں میں نے تانبے کا حلقہ اپنی گردن سے اتار لیا۔ اب آہنی راڈ ایک طویل نیزے کی طرح میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کوٹھڑی سے باہر موجود تینوں افراد بالکل سنبھل نہیں سکے۔ میں نے راڈ نیزے کی طرح ایک حبشی کے سینے میں ماری۔ ضرب کی شدت سے وہ اچھل کر دور جا گرا۔

اسی دوران میں مائیکل پھرتی سے ایک طرف ہو گیا اور اس نے اپنا ریوالور مجھ پر تان لیا "خبردار!" وہ چیخا "گولی مار دوں گا۔"

میں چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر گہری سانس لے کر راڈ ایک طرف پھینک دی۔ میں نے راڈ مائیکل کے ریوالور سے ڈر کر نہیں پھینکی تھی' دراصل تینوں افراد دروازے سے دور ہٹ گئے تھے اور راڈ میرے لیے بیکار ہو گئی تھی۔ جہاں تک مائیکل کی دھمکی کا تعلق تھا وہ صرف گیدڑ بھبکی ہی تھی۔ یہ شخص اتنا ظالم تھا کہ اتنی آسانی سے مجھے مار نہیں سکتا تھا۔ مجھے مارنا اس کے نزدیک اپنے "قلم" کو قتل کرنے کے مترادف تھا' اور یہ قلم اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔

اس سے پہلے کہ آتش فشاں کی طرح ابلتا ہوا مائیکل مجھے کسی دیگر انداز سے سفاکی کا نشانہ بناتا' ایک حبشی تیز قدموں سے وہاں پہنچا۔ اس نے مائیکل کے بالکل قریب کھڑے ہو کر دھیمے لہجے میں کوئی بات کہی۔ اس کے فقرے میں سے صرف "کنگ" کا لفظ میری سمجھ میں آیا۔ حبشی کی بات سننے کے بعد مائیکل کے غضب کا بھرا ہوا دریا جیسے ایک دم اتر گیا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے مجھے گھورا پھر ریوالور جیب میں رکھا اور حبشی پہرے داروں کو مقامی زبان میں ہدایات دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

حبشی پہرے دار رکھوالی کے خوں خوار کتوں کی طرح کوٹھڑی کے سامنے ٹہلنے لگے اور گاہے گاہے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔ بردوں کی گردنیں ناپنے والا مخصوص پھندا اپنی طویل راڈ سمیت کوٹھڑی کے اندر ہی پڑا تھا مگر پہرے دار اسے نکالنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے' یا شاید مائیکل ہی انہیں ہدایت دے گیا تھا کہ "قیدی" خطرناک ہے لہٰذا وہ پھندا باہر نکالنے کی کوشش نہ کریں۔

میں کوٹھڑی کی خستہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جسم کے کئی حصے پھوڑے کی طرح دکھ رہے تھے۔ نچلے ہونٹ اور ایک کنپٹی سے بھی گاہے گاہے خون رسنے لگتا تھا۔ مجھے اس وقت سب سے زیادہ فکر غزالہ کی تھی...... اپنے کمرے میں لے جانے سے پہلے بدبخت مبارک امین نے اسے خواب آور دوا پلائی تھی۔ اس دوا کے زیر اثر غزالہ کی حالت مبارک کی خواب گاہ میں بہت ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ میں غزالہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا مگر ہر طرف سنگلاخ دیواروں اور آہنی سلاخوں نے راستے روک رکھے تھے۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن تھوڑی دیر پہلے نمودار ہوئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جس شخص کا پیغام مائیکل کو پہنچایا گیا تھا وہ کنگ براؤن تھا۔ یہ پیغام سن کر مائیکل کا ساتویں آسمان کو چھوتا ہوا پارا ایک دم نیچے آ گیا تھا۔ اب تک کنگ براؤن کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک نہایت سخت منتظم اور قاعدہ پسند شخص ہے۔ مائیکل کے جو دوست اس ٹرسٹ میں عیاشی کی غرض سے آتے تھے وہ یہ کام کنگ براؤن سے چھپ چھپا کر کرتے تھے۔ نا مبارک امین نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اب وہ میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کنگ براؤن کی ضابطہ پسندی کی وجہ سے میرے لیے بہتری کی کوئی صورت نکل آتی۔

سہ پہر تک میں بھوکا پیاسا اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ پہرے دار بدستور دروازے کے سامنے موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے نہایت چوڑے اور مضبوط جبڑوں کی وجہ یہی ہے کہ وہ دونوں خبائی ہیں اور اس لحاظ سے خطرناک درجے کے آدم خور ہیں۔ ڈھائی تین بجے کا وقت ہو گا جب مجھے سوزی کی شکل نظر آئی۔ اس کی تیوری پر بل تھے اور وہ بالکل خاموش نظر آ رہی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے عین سامنے وہ آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے انگلش میں مجھ سے پوچھا "تمہارا حال کیا ہے؟"

"بہت مزے میں ہوں۔ انگ انگ خوشی سے جھوم رہا ہے۔"

"کھانا وغیرہ کھایا ہے؟"

"کھانا تو نہیں "وغیرہ" کھایا ہے۔ شاید مزید بھی کھاتا لیکن اس دوران میں تمہارے باس مائیکل کو کنگ کا بلاوا آ گیا اور وہ واپس چلا گیا۔"

سوزی کوٹھڑی میں پڑے پھندے اور راڈ کو دیکھ کر بولی "مجھے اس واقعے کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ بہرحال میں تمہیں یہی بتانے آئی ہوں کہ دماغ ٹھنڈا رکھو۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کنگ براؤن تمہارے ساتھ نرمی کا سلوک کریں گے۔"

"میں کسی کی سختی سے خوف زدہ ہوں اور نہ کسی کی نرمی کا امیدوار ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الوقت مجھے صرف اپنے ساتھیوں کی فکر ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی "تمہیں ساتھیوں کی اور خاص طور سے اپنی ڈاکٹر کی فکر ہے۔ ڈاکٹر ہی کے بارے میں بتانے آئی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اسے اپنے ذاتی کمرے میں رکھا ہوا ہے اور ایک ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ خواب آور دوا کا اثر اس کے ذہن سے ختم ہو گیا ہے' ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے دودھ بھی پیا ہے۔"

"اس عنایت کی وجہ؟" میں نے پوچھا "میں تو تمہاری کنپٹی پر پسٹل رکھ کر تمہیں گیسٹ ہاؤس میں لے گیا تھا۔"

"وہ تمہارا فعل تھا یہ میرا فعل ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ویسے سوزی! اگر تم میری بات پر یقین کر سکو تو کہوں گا کہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ پسٹل بھرا ہوا بھی ہوتا تو میں تم پر کبھی گولی نہ چلاتا۔"

اس نے میرے ہی انداز میں کہا "اگر تم بھی میری بات پر یقین کر سکو تو میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"مجھے معلوم تھا کہ میرا پسٹل خالی ہے۔ اس کے باوجود میں تمہارے آگے لگ کر گیسٹ ہاؤس چلی گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک بار پھر پہیلی بوجھ ثابت ہوئی تھی۔ وہ اب تک بالکل سپاٹ لہجے میں بات کرتی رہی تھی' پہرے دار انگلش نہیں سمجھتے تھے۔ نہ ہی وہ سوزی کے تاثرات سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ کیا بات کر رہی ہے۔ غالباً ان کا خیال یہی تھا کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی بازپرس کر رہی ہے۔

"تمہارا ایک اور احسان بھی تو ہے ہم پر؟"

"کون سا احسان؟"

"انجان مت بنو۔ جب ہم پرل فارمز سے فرار ہوئے تو تم لوگوں نے ہمارا تعاقب کیا۔ تم بھی تعاقب کرنے والوں میں شامل تھیں' اور تم نے ہمیں سرکنڈوں میں چھپے ہوئے دیکھا بھی تھا۔"

اس کے چہرے پر گلابی رنگ سا بکھر گیا۔ شاید پہرے دار موجود نہ ہوتے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آتی مگر اب وہ اپنا چہرہ اور لہجہ سپاٹ رکھنے پر مجبور تھی "شاید تم اب شکریہ ادا کر کے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہم بدستور اجنبی ہیں۔"

"ٹھیک ہے' نہیں ادا کرتا شکریہ ـــ اور کوئی خدمت۔"

"بس تمہاری یہی خدمت کافی ہو گی کہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو اور یاس مائیکل کو بھڑکنے کا موقع نہ دو۔ ہاں ایک بات اور یاد آئی۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی "کیا میں امید کروں کہ تم سچ سچ بتاؤ گے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"کیا تمہیں واقعی جوزف کے بارے میں معلوم نہیں؟"

"معلوم تو ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ اس بارے میں مائیکل کو بتانا چاہیے یا نہیں۔"

"کیا معلوم ہے۔ کم از کم مجھے تو بتاؤ۔"

"جوزف ہلاک ہو چکا ہے۔ اور اسی نامبارک امین کی گولی سے ہوا ہے جسے مائیکل اپنا یار دوست بتاتا ہے۔"

میں نے اس سارے واقعے کے بارے میں مختصراً سوزی کو بتایا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ آخر میں بولی "مجھے یقین ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو' لیکن باس کو اس کا یقین دلانا خاصا دشوار کام ہو گا۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ مجھے اپنے حالات سے نمٹنا آتا ہے۔"

وہ بولی "تمہاری ہمت پر شک نہیں لیکن تم نہیں جانتے کہ تم کس چار دیواری میں پہنچ گئے ہو۔ اگر میں نرم سے نرم لفظ بھی استعمال کروں تو یہی کہوں گی کہ تم خود کو اور اپنے ساتھیوں کو بدترین مشکلات کے لیے تیار کر لو۔"

اسی دوران میں بیرونی دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ سوزی نے تسلی آمیز انداز میں دیکھا اور بولی "اچھا میں رات کو پھر آؤں گی۔ تم خود کو بالکل ریلیکس رکھو۔ اگر کنگ براؤن تم تک پہنچیں تو انہیں مبارک کے قتل کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دو۔" وہ پہرے داروں کو چند ہدایات دینے کے بعد باہر نکل گئی۔

رات تک میں کوٹھڑی میں پڑا اینٹھتا رہا۔ زخموں سے خون بھی رس رہا تھا۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ مجھے دو گھونٹ پانی کے لیے ہی پوچھ لیتا۔ میں نے پیاس سے بے تاب ہو کر پہرے داروں کو کئی بار آواز دی تھی مگر وہ جیسے سماعت اور گویائی سے محروم تھے۔ غالباً وہ میرا شمار نہایت خطرناک قیدی کی حیثیت سے کر رہے تھے اور سلاخوں کے قریب جھکنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ کوٹھڑی میں گرمی تھی اور مچھر بھی پایا جاتا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب ایک تیسرا

پہرے دار وہاں پہنچا اور پہلے دونوں پہرے داروں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے سوزی کی شکل نظر آئی۔ وہ نیلی شرٹ اور سفید پتلون میں تھی سنہری بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بیگ تھا۔ اس نے چابی سے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔ خستہ حال کمرا پرفیوم کی خوشبو سے مہک اٹھا

"ہیلو کیسے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ انگ انگ جھوم رہا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تمہارے انگ انگ کے لیے مرہم کا انتظام کیا ہے میں نے۔"

اس نے بڑے اطمینان سے کینوس کا بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک دری نما کپڑا نکالا۔ یہ دری اس نے کمرے کے گرد آلود فرش پر بچھا دی' پھر اس نے بیگ میں سے ربر کا تکیہ نکالا' اس میں ہوا بھری اور دری پر رکھ دیا۔ تب اس نے بیگ کے اندر سے ایک ٹفن کیریئر برآمد کیا اور ایک کونے میں رکھ دیا۔ ٹفن کے اندر سے مسالے دار گوشت کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ تاہم اس نے ٹفن کیریئر کھولنے کے بجائے میری قمیص کے بٹن کھولنے شروع کر دیے "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"بس چپ چاپ دیکھتے جاؤ۔" وہ بولی۔

میری قمیص اتارنے کے بعد اس نے میری پتلون کے پائنچے اوپر تک چڑھا دیے۔ بیگ کے اندر سے ہی اس نے مرہم پٹی کا سامان نکالا اور میرے گھٹنوں اور کہنی کے زخم کو صاف کر کے پٹی کر دی "یہ پین کلر گولیاں ہیں۔" وہ بولی "تمہارا انگ انگ بالکل پُرسکون ہو جائے گا۔"

میں نے گولیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا "نہیں بھئی' خالی پیٹ نہیں۔ پہلے کھانا کھا لو۔" وہ ادا سے بولی۔

اس کے نازو انداز مجھے اندیشے میں مبتلا کر رہے تھے بہرحال میں خاموش رہا۔ اس نے ٹفن کھولا۔ اس میں چاول تھے گوشت کا سالن تھا' ڈبل روٹی کے سلائس تھے اور خاص قسم کا حلوا تھا۔ وہ بولی "یہ مخصوص افریقی حلوا ہے۔ اس میں کئی جڑی بوٹیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ توانائی بحال کرنے کے لیے بے مثال چیز ہے۔"

"کہیں اسے ہی تو حبشی حلوا نہیں کہتے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "نہیں یہ اور چیز ہے۔"

اس کی بلند ہنسی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اب تو بڑے سکون سے بیٹھی ہو۔ وہ پہرے دار نہیں ہیں۔"

"اب پہرے دار' گارڈ' انچارج سب کچھ میں ہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ لاک اپ اس ہوسٹل سے ملحق ہیں جہاں کی میں انچارج ہوں۔ اکثر یہ خالی ہی پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ قیدی یہاں رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان لاک اپ کا اضافی چارج بھی میرے پاس ہے۔ میں نے پہرے داروں کو واپس بھیج دیا ہے۔ جن تین پہرے داروں کی ڈیوٹی تھی انہیں میں نے کال نہیں کیا' لہٰذا اب صبح آٹھ بجے تک یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا' میرے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے۔ سوزی تو یہ شکن جسم اور قیامت خیز اداؤں کی مالک تھی۔ اس کے ناز و انداز دیکھ کر میرے ذہن میں میرونا المعروف الو کی پٹھی کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی ایک شوریدہ سر دریا کی طرح نظر آتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہر شے اپنے ساتھ بہا لے جانے کی آرزو مند ہے۔ مگر پھر بھی سوہج اور سوزی میں ایک فرق نظر آتا تھا۔ کچھ بھی تو سوہج کا تعلق مشرق سے تھا' سوزی مغرب کی بیٹی تھی۔ میں نے سوزی کی حرکات و سکنات دیکھی تھیں اور بات چیت تو تھی۔ وہ محبت' جنس اور جسمانی ملاپ وغیرہ کے بارے میں آزادانہ باتیں کرتی تھی۔ جنسی تقاضے کے بارے میں بیم کرنا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے بھوک اور پیاس وغیرہ کے بارے میں بات کی جائے۔

وہ میرے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں ہی اس نے بیگ میں سے شیمپین کی یخ بستہ بوتل نکال کر دری پر سجا دی پھر بیئر کے ٹن نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ "میں جانتی تھی کہ تم سخت پیاس محسوس کر رہے ہو گے۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیا پانی وغیرہ نہیں مل سکے گا؟"

"اس وقت جو کچھ مل سکتا تھا وہ لے آئی ہوں۔"

"تم یہ سب کچھ میرے لیے کیوں کر رہی ہو؟" میں نے مجبوراً حلق تر کرتے ہوئے کہا۔

"بتا دوں؟"

"ہاں بتاؤ۔"

"آدم خور تام جسے تم نے دوبدو مقابلے میں ہلاک کیا میرے لیے ایک نہایت قابل نفرت شخص تھا۔ وہ میری عزت کا قاتل تھا' میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور بولی "شاید تم

رہے ہو کہ میرے جیسی لڑکی کی بھلا کیا عزت ہو سکتی ہے۔ تم اپنی جگہ ٹھیک ہو لیکن ایک وقت تھا کہ میری بھی عزت تھی۔"

اس نے ایک قیمتی برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میرا اصل تعلق ساؤتھ افریقہ سے ہے۔ میں کیپ ٹاؤن کی رہنے والی ہوں۔ ہمارا گھرانا کٹر کیتھولک تھا اور والدین سخت مذہبی تھے۔ میں چار بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ ہمارے گھرانے میں بیٹی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے اندر بغاوت کے جراثیم موجود تھے۔ میں کچھ کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ کوئی بڑا کام جس کے سبب خاندان میں اور خاندان سے باہر میری عزت ہو۔ جس طرح والدین بھائیوں کو اہمیت دیتے ہیں اسی طرح مجھے بھی اہمیت دیں اور میری صلاحیتوں کے قائل ہوں۔ میں کالج میں تھی جب میری اسی معصوم خواہش نے مجھے بھٹکا دیا۔ میں نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا۔ اشتہاری فلمیں بنانے والے ایک ادارے کو نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ دیگر بہت سی لڑکیوں کی طرح میں بھی اس ادارے کے آفس پہنچی۔ ہم میں سے چھ لڑکیوں اور دو لڑکوں کو منتخب کیا گیا۔ ہمارے کچھ سین بھی شوٹ کیے گئے۔ اس کام کا نہایت معقول معاوضہ بھی ہمیں دیا گیا۔ بعد ازاں ایڈورٹائزنگ والے یہ لوگ ہمیں بہلا پھسلا کر ایک دوسرے شہر پورٹ الزبتھ لے گئے اور ویرانے میں ایک عمارت میں ہمیں بند کر دیا۔ یہ عمارت مضافاتی علاقے میں واقع تھی۔ کئی روز تک کسی ذمے دار شخص نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا پھر ایک روز مجھے عمارت کی ایک نہایت بوڑھی اور قریب المرگ ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ میں بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہوں۔ ان لوگوں کا جال پورے ملک میں اور ملک سے باہر بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس سے پہلے بھی قریبی سکولوں اور دیہات سے بہت سی لڑکیاں اغوا کر کے بیلجئم اور ہالینڈ وغیرہ میں اسمگل کر چکے ہیں۔ اس عورت نے کہا کہ اگر میں اپنے ساتھیوں سمیت کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں تو یہ ہم سب کے لیے بہت اچھا ہو گا۔

"میں نے اپنے ساتھیوں کو تمام صورت حال بتائی مگر وہ یہاں موجود پہرے داروں اور رکھوالی کے کتوں سے سخت خوف زدہ تھے اور کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے اس رات بڑی سوچ بچار کے ساتھ فرار کی منصوبہ بندی کی اور اس منحوس دیہاتی عمارت سے نکل گئی۔ بردہ فروشوں نے

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ——— ایک نوجوان جس کے انداز زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

نئی جلوؤں میں ملی

قیمت 150/-
ڈاک خرچ 20/-

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۔ ۷۲۴۷۴۱۴

گھوڑوں اور کتوں کے ذریعے میرا تعاقب کیا۔ مجھے واپس اسی منحوس عمارت میں لایا گیا۔ مجھے بری طرح مارا گیا' اور پھر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان کرنے کے لیے سب کے سامنے میری عصمت دری کی گئی۔ میری بے بسی کا تماشا دیکھنے والوں میں میرے تمام ساتھی شامل تھے۔ اس بدمعاش ماں کے بیٹے ٹام نے مجھے کئی گھنٹے تک وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنایا۔ اس تمام واقعے کی فلم بندی کی گئی اور بے شمار تصویریں کھینچی گئیں۔

"بعد ازاں یہ شرمناک تصویریں' ایک درجن لفافوں میں بند کی گئیں۔ ان لفافوں پر میرے گھر اور اڑوس پڑوس کے گھروں کے ایڈریس لکھے تھے۔ ایک بردہ فروش نے مجھ سے کہا تھا "تمہارے گھر جانے کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ لفافے پوسٹ کر دیے جائیں گے۔"

"میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے میں ایک نئے رنگ میں ڈھلتی چلی گئی تھی۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بردہ فروشوں کا انچارج رابی میرا مداح تھا' اس نے مجھے اپنی داشتہ کی حیثیت دے دی تھی۔ وہ میری اس منصوبہ بندی سے بے حد متاثر ہوا تھا جو میں نے فرار ہونے کے لیے کی تھی۔ وہ کہتا تھا تمہاری چالاکی بڑے کام کی چیز ہے۔ تم ہمارے ساتھیوں میں شامل ہو جاؤ۔ عیش کی زندگی گزارو' ملک ملک کی سیر کرو اور موجیں اڑاؤ۔ اور پھر ایسا ہی ہوا میں بتدریج ایک اور رنگ میں ڈھلتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ بہت کچھ بدل گیا' لیکن وہ نفرت نہیں بدلی جو ٹام اور اس کے سلوک کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں گھر کر چکی تھی۔ اس پہلے واقعے کے بعد اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا لیکن وہ میرے اردگرد موجود تو ہوتا تھا' اسے دیکھ کر میرے اندر کے زخموں سے لہو بہنے لگتا تھا۔ طاقت اور سخت جانی میں وہ منحوس اپنی مثال آپ تھا۔ کوبرا سانپ کی طرح مدمقابل کو مبہوت کر کے ڈنک مارتا تھا اور دوسرا سانس نہیں لینے دیتا تھا۔ جب تم نے ہرکولیس پر اسے بزور بازو زیر کیا اور اس کے ناک منہ سے خون کی پچکاریاں نکلیں تو خدا گواہ ہے وہ میری زندگی کے پُرمسرت ترین لمحے تھے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اب سوزی گلاس ہاتھ میں لیے شیمپین کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے میں نے بھی گلاس تھام رکھا تھا۔ وہ اس زنداں میں یوں بیٹھی تھی جیسے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہو۔ کسی قسم کا فکر فاقہ نہیں اسے۔ اس نے جو تیز پرفیوم لگا رکھا تھا وہ غالباً مانی پرپوز اس کی وجہ سے صحت مند اور افریقی مچھر ہمارے قریب نہیں پھٹک رہا تھا۔ وہ نیم دراز ہو کر میرے کندھے سے لگی۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانے پر سے گزار کر ہاتھ ہوا میں معلق کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ سوزی مجھے "زرینی ادارے" کے اسرار و رموز کے بارے میں اہم باتیں بتائے گی یہی وجہ تھی کہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی گریز کی وجہ سے بدک جائے۔ وہ جس ماحول میں رہ رہی تھی اس میں یہ سب کچھ ایک کی سی حیثیت رکھتا تھا' جیسے بوریت محسوس کر کے تھوڑی کے لیے تاش کھیل لیا جائے' یا موڈ بہتر کرنے کے لیے وغیرہ سن لیے جائیں۔ کسی مرد سے تھوڑی دیر کے جسمانی تعلق قائم کر لینا سوزی جیسی لڑکی کے لیے ایک ہلکی تفریح کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے دو تین بار اس کے گرم ہونٹوں کا لمس اپنے رخسار پر محسوس کیا اور تصور ہی تصور میں سوچا کہ اگر گل یہاں ہوتا تو کس قیامت کا منظر ہوتا۔ میں نے سوزی کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "یہ ماریا زرسٹ مجھے ایک بہت بڑے گورکھ دھندے کی طرح نظر آ رہا ہے"

"تم اسے جتنا بڑا گورکھ دھندا ابھی سمجھ لو' یہ اس سے بڑا گورکھ دھندا ہی نکلے گا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تم تو یہاں بہت عرصے سے ہو۔ تمہارے لیے گورکھ دھندا نہیں ہو گا؟"

وہ مسکرائی "ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کے بارے میں جتنا جانا جا سکتا ہے' میں شاید اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے نشیلے انداز میں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کے شکن جسم کا قرب کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

"کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"یہی کہ جسے تم ایک فلاحی ادارے کی چھوٹی سی شے سمجھ رہے ہو' یہ ایک بہت عظیم الشان جال ہے۔ جس میں میرے اور تمہارے جیسی ہزاروں چھوٹی بڑی مچھلیاں پھنسی رہی ہیں۔ یا تم یوں سمجھ لو کہ یہ ایک بہت بڑا آکٹوپس ہے اس خونی آکٹوپس کے بازو دنیا کے دور دراز ملکوں تک پھیلے ہو گئے ہیں۔ بہت کچھ جکڑ رکھا ہے اس آکٹوپس نے اور جکڑتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ایسا خبیث عفریت ہے کہ اگر

ایک بازو کاٹا جاتا ہے تو وہاں دس بازو اور نکل آتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم معمولی شخص نہیں ہو' لیکن تم جیسے بہت سے غیر معمولی شخص یہاں آ کر بے بس ہو چکے ہیں۔ اپنی بے بسی کی ایک چھوٹی سی مثال تم دیکھ ہی چکے ہو۔ تم نے پرل فارم سے فرار ہونے کی کامیاب کوشش کی' مگر آخر میں نتیجہ کیا نکلا۔ اس خونی آکٹوپس کے بازو تمہیں باندھ کر پھر دیں لے آئے۔ تم دس بار ایسی کوشش کرو گے تو دس بار یہی نتیجہ نکلے گا۔ لہٰذا۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "لہٰذا مسٹر شا! تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مزاحمت کا رویہ چھوڑ دو۔ خود کو حالات کے دھارے پر بہنے دو۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح تم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے کچھ رعایتیں حاصل کر لو گے۔ تم نے بحری سفر کے دوران میں ایک دو موقعوں پر اپنی شان دار صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً اس بارے میں باس مائیکل اپنی رپورٹ کنگ کو دے چکا ہو گا۔ اگر تم اطاعت مندی کا اظہار کرو گے تو کنگ کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ پیدا ہوتے دیر نہیں لگے گی۔"

"کیا تم مجھے کنگ اور ماریا زرسٹ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی۔" میں نے اس کا سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ میرے بازو سے چمٹ کر بولی "میں نے تمہیں بتایا ہے ناں شا کہ میرے سامنے ایک سمندر ہے اور میں اس بھیدوں بھرے پانی کے کنارے پر کھڑی ہوں۔ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ اس سارے "سیٹ اپ" کا ماسٹر مائینڈ کنگ براؤن ہے۔ وہی یہاں کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیا پتا کہ اس ماسٹر مائینڈ کے اوپر بھی کوئی ماسٹر مائنڈ ہو' یا پھر کنگ براؤن کا ہی کوئی ایسا چہرہ ہو جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو۔ ماریا دراصل کنگ براؤن کی چہیتی بیوی کا نام تھا۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد وہ ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ کنگ نے اس فلاحی ادارے کی بنیاد اس کی موت کے دو سال بعد رکھی تھی اور اسے ماریا زرسٹ کا نام دیا تھا۔"

شیمپین کی ایک چسکی لے کر وہ بولی "کہنے کو تو ماریا زرسٹ صرف دو لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ ظلم و ستم کا ایک سیاہ نظام ہے۔ جس نے شاخ در شاخ دنیا کے ایک بڑے حصے کو لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میں پھر کہوں گی کہ یہ ایک آکٹوپس ہے جس کی جسامت اور خوں خواری پچھلے پندرہ برسوں میں دن رات بڑھی ہے۔ اب اس بلا کی پہنچ دنیا کے دور دراز حصے تک ہے' تم لوگ بھی اسی بلا کے ایک بازو میں جکڑ کر یہاں تک پہنچے ہو۔"

مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ سوزی گول مول بات کر رہی ہے۔ وہ میرے سوالوں کے جواب وضاحت سے دینا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ جسمانی طور پر میرے بہت قریب آ چکی تھی اور ابھی مزید آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا "اچھا مجھے پروفیسر اور اس کی بیٹی شائستہ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"شائستہ باس مائیکل کے ساتھ ہے۔ دو تین ماہ بعد وہ ایک آدم خور کو جنم دے دے گی۔ پروفیسر کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ باس مائیکل کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ جس کے بعد باس نے اسے قید تنہائی کی سزا دی تھی۔ غالباً ساتھ والی کوٹھڑی میں اسے بند کیا گیا۔ وہ تین چار روز بھوکا پیاسا یہاں رہا تھا۔ اس کے بعد اسے یہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ شاید شائستہ نے ہی اس کی رہائی کے لیے کوشش کی ہو گی۔ اب اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"اور وہ تینوں لڑکیاں کہاں ہیں جو بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئی تھیں؟ ان میں سے دو براؤن آنکھوں اور سیاہ بالوں والی تھیں؟"

"وہ تینوں سیکنڈ انٹری میں جا چکی ہیں۔" سوزی نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے ہونٹ بند کر دیے۔ وہ جانتی تھی کہ میں پھر فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری کے بارے میں استفسار شروع کر دوں گا۔ بہرحال اس نے میرے ہونٹ بند کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ سوزی جیسی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ اس نے میرے ہونٹ اپنے ہونٹوں سے بند کیے تھے۔

شیمپین اس کی خوب صورت آنکھوں سے چھلک رہی تھی اور اس کے جسم میں تپش بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھ مجھے بہا لے جانا چاہ رہی تھی۔ وہ مغرب کی بیٹی تھی۔ اس کے لیے یہ سب ایک کھیل تھا۔ ایک ایسی تفریح تھی جس کا تعلق تاش کے پتوں یا سوئمنگ پول وغیرہ سے نہیں تھا بلکہ سیکس سے تھا۔ لیکن میرے لیے یہ کھیل نہیں تھا۔ میں اپنے تمام تر جسمانی تقاضوں کے باوجود اس کوشش میں تھا کہ سوزی کا دل توڑے بغیر اس کی پیش قدمی کو روک سکوں۔ اس نے میرے گریز کو محسوس کرتے ہوئے کہا "کیا تمہیں میری ضرورت محسوس نہیں ہو رہی؟"

"بہت شدت سے ہو رہی ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔"

قدرت نے میری مشکل آسان کر دی۔ کال بیل کی سی ایک مدھم آواز سنائی دی "اوہ! مائی گاڈ۔" سوزی نے کہا۔ اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھی اور پھر فوراً کھڑی ہو گئی۔ اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے ہانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ ابھی تک لال بھبھوکا تھا۔ کال بیل پھر ہوئی۔ وہ اپنے منتشر بال سمیٹ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر غزالہ۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "شاید اسے پتا چل گیا ہے کہ تم اس کی امانت میں شدید قسم کی خیانت کرنے لگے تھے۔" (وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میری طرح اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ دروازے پر کون ہے)

میری طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا یہ روپ میرے لیے نیا تھا۔ دو تین منٹ بعد وہ پھر تیزی سے اندر آئی۔ وہ تھوڑی سی پریشان تھی۔ بولی "ہیڈ انچارج آنے والا ہے۔ اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں یہاں آئی تھی۔"

اس نے جلدی جلدی کھانے پینے کا سامان سمیٹا۔ بس ایک گلاس، ایک پلیٹ ایک چمچ اور ایک کوارٹر پلیٹ وہاں رہنے دی۔ باقی سب کچھ بیگ میں ڈال لیا اور رفوچکر ہو گئی۔

دوبارہ اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ دو گارڈز اور ایک بھیم تیم نیگرو اس کے ساتھ تھا۔ یہی یہاں کا ہیڈ انچارج تھا۔ وہ صورت سے ہی بے حد سخت گیر اور خشک مزاج نظر آتا تھا۔ سوزی اس کے سامنے سہمی سہمی سی تھی۔ ہیڈ انچارج نے سلاخوں کی دوسری جانب سے ہاتھ بڑھایا اور مجھ سے مصافحہ کیا "میرا نام مرقص ہے۔ میں اس ہوسٹل کا ہیڈ انچارج ہوں۔" اس نے انگریزی میں اٹک اٹک کر کہا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میرا نام شاہ جہاں ہے اور میں پچھلے چوبیس گھنٹے سے اس شان دار کوٹھڑی میں رہائش پذیر ہوں۔"

ہیڈ انچارج نے میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کنگ نے تمہیں اس کوٹھڑی سے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چند روز تک وہ تمہیں شرفِ ملاقات بھی بخشیں۔"

"اس عنایت کی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"وضاحت تو کنگ ہی بتا سکتے ہیں مگر کچھ کچھ میں بھی جانتا ہوں۔ کچھ تم سے آفس میں ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

تھوڑی دیر تک مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد ہیڈ انچارج مرقص واپس چلا گیا۔ اس کے نام سے پتا چلتا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔

سوزی نے مجھے کوٹھڑی سے نکلوایا اور واپس اسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں میرے ساتھی موجود تھے۔ یعنی یار رفتار صفدر اور ایرانی جعفر رضا۔ صفدر سخت پریشان تھا۔ اسے مبارک امین کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ کل رات اس قتل کے بعد مائیکل کے مسلح کارندے مجھے زدوکوب کرتے ہوئے کسی نامعلوم مقام پر لے گئے تھے بہرحال اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ہنگامہ کیوں کر ہوا اور ایسا کیا واقعہ پیش آیا کہ مجھے مبارک امین کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے۔

میں نے صفدر کو مختصر الفاظ میں مبارک کی شیطانیت کے بارے میں بتایا۔ اور یہ بتایا کہ اپنی موت سے چند منٹ قبل وہ غزالہ کے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہا تھا۔ صفدر کے چہرے پر جوش سا لہرا گیا۔ بولا "کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔ اس کارِ ثواب میں ایک آدھ گولی کا حصہ میں بھی ڈال دیتا۔"

"گھبراؤ مت۔" میں نے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں تمہیں ایسے بہت سے مواقع فراہم ہونے والے ہیں۔"

"انشاء اللہ... انشاء اللہ۔" صفدر نے بڑے خلوص سے سر ہلایا۔

مبارک امین کی موت کے بعد یقیناً میں اور صفدر خطرناک قیدی شمار ہونے لگے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اب کمرے کے دروازے سے باہر تالا نظر آ رہا تھا اور ایک کے بجائے دو مسلح محافظ ہماری نگرانی کے لیے موجود تھے اور تو اور ہمارا روم میٹ یعنی ایرانی جعفر رضا بھی ہم سے ذرا ذرا نظر آ رہا تھا۔ وہ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ علی الصباح ناشتے کے فوراً بعد مجھے دو محافظوں کی زیرِ نگرانی ہیڈ انچارج مرقص کے آفس میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک کشادہ دفتر تھا، سجاوٹ کے بجائے سادگی نظر آ رہی تھی۔ دیواروں پر بہت سی تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ ماریا ٹرسٹ میں ہونے والی مختلف تقریبات کی تصویریں تھیں۔ معزز قسم کے افراد بچوں، بچیوں اور نوجوانوں کو انعامات وغیرہ دیتے نظر آتے تھے۔ ایسی ایک دو تصویروں میں مجھے لیبیا کے کرنل معمر قذافی اور ماریطانیہ کے مصطفیٰ سالک وغیرہ بھی نظر آئے۔

میں اور مرقص آفس میں تنہا تھے۔ مرقص نے مجھے

بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا "مائیکل کے قریبی دوست مبارک امین کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اگر کنگ نے تمہارے بارے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ مبارک ٹرسٹ کے قانون کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ تمہاری ساتھی ڈاکٹر اس کے بیڈ روم سے برآمد ہوئی ہے اور یہی اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہے لیکن قانون کے مطابق کارروائی تو بہرحال ہوگی اور ممکن ہے کہ تمہیں سزا کا سامنا بھی کرنا پڑے۔" میں خاموشی سے سنتا رہا۔

مرقص نے میری طرف جھکتے ہوئے قدرے دوستانہ لہجے میں کہا "تمہارے لیے سزا سے بچ نکلنے کے امکانات روشن ہیں اور یہ امکانات بھی روشن ہیں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس ٹرسٹ میں کچھ خاص قسم کی رعایتیں مل جائیں۔"

"رعایتوں سے آپ کی مراد؟"

"فی الوقت تمہاری حیثیت یہاں قیدیوں کی سی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ تمہیں کچھ آزادیاں مل جائیں اور کوئی ذمے داری وغیرہ بھی تمہیں سونپ دی جائے۔ بالکل جیسے جہانزیب پر مائیکل نے کیا تھا۔ مگر اس کے لیے تمہیں دو کام کرنے ہوں گے۔ نمبر ایک کنگ کی غیر مشروط اطاعت۔ نمبر دو مائیکل کے ساتھ کسی بھی قسم کی مخاصمت سے گریز۔ مائیکل کو فی الوقت یقیناً تم پر بہت طیش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس کے سخت رویے کا سامنا بھی کرنا پڑے مگر تمہیں برداشت اور حوصلے کا ثبوت دینا ہوگا۔"

"میں اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیف برداشت کر لوں گا لیکن اگر میری ساتھی خواتین پر..."

"ایسا اب نہیں ہوگا۔" مرقص نے جلدی سے میری بات کاٹی "اس سلسلے میں تم بالکل بے فکر رہو۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مرقص نے ریسیور اٹھا کر چند منٹ تک بات کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "ان انڈین لڑکوں کو جانتے ہو جو ہر کولیس میں تمہارے ساتھ ہی یہاں پہنچے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "مائیکل کی طرف سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم ان قیدیوں کی زبان سمجھتے ہو اور وہ تمہاری بات مانتے بھی ہیں؟"

"وہ ہر اس شخص کی بات مان سکتے ہیں جو انہیں انسان سمجھے اور ان کے ساتھ محبت سے بات کرے۔"

"ہم بھی یہ سب کچھ کر رہے ہیں مگر لگتا ہے کہ وہ تم پر زیادہ ہی بھروسا رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ تم ان سے مل لو۔" مرقص نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے؟ کیا وہ پریشان کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔"

کچھ ہی دیر بعد میں مرقص کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اس عمارت کے خدوخال اور اندر کا ماحول مکمل طور پر ایک رفاہی ادارے جیسا تھا۔ یہاں قالین بافی بھی ہو رہی تھی، لڑکیاں کڑھائی سلائی بھی کر رہی تھیں۔ ایک ورکشاپ اور اسکول بھی اس عمارت کے اندر ہی موجود تھا۔ بلا تخصیص مرد اور عورت سب نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں کہیں کہیں نیلی دھاریاں تھیں۔ انتظامیہ کے ارکان کا لباس مختلف تھا۔ اس ادارے کا نظم و ضبط مثالی نظر آ رہا تھا۔ ایک پورچ نما مقام پر پہنچ کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور کانوں میں ایئر ڈاٹس دے دی گئیں۔ ایک رنگ دار شیشوں والی ویگن میں مجھے سوار کیا گیا۔ یہ ائر کنڈیشنڈ ویگن مجھے لے کر روانہ ہوئی اور مختلف سڑکوں پر گھومنے لگی۔ ٹریفک کا بس ہلکا ہلکا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ شاید ہم شہر کے بیچوں بیچ سے گزر رہے تھے۔ آخر کسی مقام پر گاڑی رکی۔ میری آنکھوں اور کانوں کو آزاد کیا گیا۔ یہ ایک شان دار عمارت کا اندرونی حصہ تھا۔

مختلف راہداریوں سے گزر کر ہم ایک ہال نما کمرے میں پہنچے۔ یہاں عام افراد کا داخلہ ممنوع تھا اور ہال تک پہنچنے کے لیے ہمیں سکیورٹی کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ یوں لگا جیسے ہم وائٹ ہاؤس یا ڈاؤننگ اسٹریٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہال نما کمرے میں لفٹ دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ عمارت ایک منزلہ تھی، بس کہیں کہیں دو منزلہ تعمیر نظر آتی تھی۔ اس تھوڑی سی ضرورت کے لیے جدید قسم کی چار لفٹوں کا ہونا حیرت کی بات تھی۔ ان لفٹوں کے سامنے بھی باوردی گارڈز موجود تھے۔ پوری عمارت میں یہ واحد جگہ تھی جہاں میں نے گارڈز کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھا۔ لفٹوں کے سامنے سکیورٹی گارڈز نے ایک مرتبہ پھر میری تلاشی لی۔ اس کے بعد ہیڈ انچارج مرقص نے ایک بڑے رجسٹر پر دستخط کیے۔ رجسٹرار کی طرف سے مرقص کو ایک سکہ دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ایک خاص قسم کا ٹوکن تھا اور اس ٹوکن کے بغیر کوئی شخص ان لفٹوں میں سوار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم لفٹ میں سوار ہوئے۔ مجھے اس وقت حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا جب لفٹ اوپر جانے کے بجائے نیچے کی طرف متحرک ہو گئی۔ ہم پہلے ہی گراؤنڈ فلور پر تھے، اس کا مطلب تھا کہ ہم

زیر زمین جا رہے ہیں۔ اگلے چند سیکنڈ میں میری حیرت میں مزید اضافہ ہوا ہم کم از کم چار منزل نیچے گئے تھے پھر لفٹ رکی، دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک طویل راہداری پائی۔ راہداری کی دیواریں اور فرش چکنے اور چمک دار تھے۔ ٹیوب لائٹس نے سارا منظر روشن کر رکھا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں ٹرسٹ کی عام سی سادہ عمارت سے نکل کر کسی جدید کمپلیکس میں آگیا ہوں۔ یہاں میں نے نیلی وردیوں والے گیگرو دیکھے' ان کے لباس پر سفید نشانات تھے۔ بعد میں معلوم ہوا یہ مقامی زبان "حول" کے الفاظ تھے۔ نیلی وردیوں والے یہ سارے افراد نہایت چوکس اور صحت مند تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور نوجوان عورتیں بھی۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اسلحہ بھی نظر آرہا تھا۔ یہ اسلحہ ریوالور تھا جو ہولسٹر میں بند کر کے کمر سے لٹکایا گیا تھا۔

راہداری میں سے کئی ذیلی راہداریاں بھی نکلتی تھیں۔ ہم لفٹ سے نکل کر آگے بڑھے تو کئی باوردی افراد نے مرقس کو پہچان کر سلام کیا۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو کل رات میں نے پہلے پہرے دار انیس سے اور پھر سوزی سے سنے تھے۔ یعنی فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری۔ شاید لفٹ میں داخل ہونے کے بعد میری سیکنڈ انٹری ہوئی تھی۔ یعنی میں اس "ٹرسٹ" کے خاص الخاص حصے میں داخل ہوگیا تھا۔ راہداری میں ہمیں باوردی افراد کے علاوہ بھی کچھ لوگ ملے۔ ان میں عورتوں اور مردوں کے علاوہ بچے بھی تھے۔ ان سب افراد نے مختلف رنگوں کے چغے پہن رکھے تھے' ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ سب کے سب نہایت صاف ستھرے تھے اور انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان کے حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان میں زبردست قسم کا نظم و ضبط بھی نظر آتا تھا۔

یہ زیرِ زمین دنیا دیکھ کر میں دنگ تھا۔ ابھی میں اس حوالے سے مرقس سے کچھ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ ہم ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ مرقس نے ایک بٹن دبایا تو یہ گیٹ نما دروازہ سلائیڈ کر کے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں اپنی جگہ سن رہ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا لاک اپ تھا۔ یہاں فرش پر بڑی بڑی دریاں بچھی تھیں اور فوم کے بے شمار گدے رکھے تھے۔ اس لاک اپ میں وہ تمام اتر پردیشی قیدی موجود تھے جنہیں میں نے پرل فارمز میں چھوڑا تھا۔ لیکن ان کی حالت۔ خدا کی پناہ وہ سوکھ کر ہڈیوں کے ڈھانچے بنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر فاقہ کش مہاتما بدھ کا نقشہ ذہن میں آجاتا تھا۔ وہ فوم کے گدوں پر الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان میں سے کچھ واضح طور پر بیمار بھی دکھائی دیتے تھے۔ میری نظریں کملا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اب تک اس کے بارے میں بہت فکر مند رہا تھا۔ خاص طور سے جب سے مجھے ایک افسوس ناک خبر ملی تھی' میری فکر مندی کملا کی طرف سے بہت بڑھ گئی تھی۔ سوزی نے مجھے بتایا تھا کہ اتر پردیشی قیدیوں میں سے ایک لڑکی ہلاک بھی ہوچکی ہے۔

چند اتر پردیشی افراد نے مجھے دیکھا اور ایک دم جیسے ان کے مردہ جسموں میں زندگی دوڑنے لگی۔ انہوں نے اپنی ہڈیوں کو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے نیم جاں مرد و زن اٹھ بیٹھے اور میری جانب دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر تحیر کے ساتھ ساتھ مسرت کی چمک بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

مرقس نے کہا "یہ لوگ پچھلے دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہے۔ چند بار بڑی دشواری سے انہیں انجیکشن وغیرہ لگائے گئے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ آٹھ دس روز میں مرنا شروع ہوجائیں گے۔"

اس دوران میں اتر پردیشی افراد لاک اپ کی سلاخوں سے چمٹ گئے تھے اور والہانہ انداز میں میری طرف دیکھنا شروع ہوگئے تھے۔ ان کے خشک لب جذبات سے پھڑک رہے تھے اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ اپنی کمزور اور ناقابلِ فہم آوازوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ مرقس اور دیگر پہرے داروں کو اس منظر نے بہت متاثر کیا۔ مرقس کے اشارے پر ایک پہرے دار نے ایک بٹن دبایا اور آٹومیٹک طریقے سے لاک اپ کے دروازے میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ ایک شخص جھک کر اس میں سے گزر سکے۔ ایک پہرے دار نے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اندر گھسنے کے بعد میرے ساتھ اس قسم کی صورتِ حال پیش آئے گی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ چھ سات درجن افراد مجھ سے لگاؤ رکھتے ہیں لیکن خبر نہیں تھی کہ پچھلے چند ہفتوں میں ان کے جذبات اتنے شدید ہوچکے ہیں اور ان میں ایسا والہانہ پن آچکا ہے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا' انہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بوڑھے سیوک کمار نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوم لیا۔ کچھ مرد و زن میرے پاؤں چھونے لگے' کچھ دور ہی سے اپنے ہاتھوں کو ایسے انداز میں حرکت دینے لگے جیسے میری بلائیں لے رہے ہوں' میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے کوئی ایسا معرکہ انجام نہیں دیا تھا جس کے بدلے یہ لوگ میری ایسی ایسی زبردست عزت افزائی کرتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں تھا۔ کوئی روحانی یا مادی طاقت بھی میرے پاس نہیں تھی' پھر خبر نہیں یہ لوگ کیوں مجھے بانس پر چڑھانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے رونا شروع کر دیا۔ وہی پُراسرار نوحہ جو اس سے پہلے میں ہرکولیس میں بھی سنتا رہا تھا۔ وہ ایک کورس کی شکل میں ہم آہنگ ہو کر روتے تھے اور ان کے رونے میں گا رہے گا ہے کسی چیتے وغیرہ کا ذکر بھی آتا تھا۔ میری نگاہیں بڑی بے قراری سے کمسن کملا اور اس کے بچے کو تلاش کر رہی تھیں' مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے' حالانکہ کملا کو تو سب سے پہلے لپک کر میری طرف آنا چاہیے تھا۔ بڑا خصوصی لگاؤ تھا اسے مجھ سے۔ میں نے ان لوگوں کے درمیان گھس کر بے چینی سے کملا کو تلاش کیا۔ اچانک میری نگاہ کملا کی دبلی پتلی والدہ پر پڑ گئی۔ میں نے اس ناتواں عورت کو شانوں سے تھاما اور اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے پاس لے جا کر زور سے پوچھا "کملا کہاں ہے۔ ہماری بچی؟"

میرے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ میں اپنی بات کر رہا تھا وہ اپنی ہانک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ الٹا مجھ سے کملا کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ اس کا یہ جملہ واضح طور پر میری سمجھ میں آیا۔ "کمار کملا کیسو ہے؟" یعنی میری بیٹی کیسی ہے؟

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ عورت کیا کہہ رہی تھی۔ میں اس کی کملا کے بارے میں بھلا کیا بتا سکتا تھا۔ ایک سرد لہر میری رگ رگ میں دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے ہیں۔ کمسن کملا کے ساتھ ضرور کچھ ہوچکا ہے۔

اسی دوران میں بوڑھا سیوک بھی میرے قریب آ بیٹھا۔ وہ کملا کی ماں کو دلاسا دیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ اس کی بیٹی ٹھیک ہی ہوگی۔ اس کے بعد وہ میرے پاؤں چھو کر کہنے لگا "مہاراج! ہم کو انتظار تھا تمہارا کہ ہم کیا بتاوت۔ تم ان لوگن سے کہو کہ یہ ہم غریبن کو آجاد کر دیں۔ ہم اب اپنے گھر جانا چاہت ہیں۔"

نجانے وہ لوگ کیوں سمجھ رہے تھے کہ ان کے سارے دکھوں دردوں کی دوا میرے پاس ہے اور میں جب چاہوں جادو کی چھڑی ہلا کر انہیں کسی اڑن کھٹولے میں بٹھا سکتا ہوں اور یہ اڑن کھٹولا انہیں پلک جھپکتے میں ان کے گھروں تک پہنچا دے گا۔

میں نے سیوک سے کہا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن آہستہ آہستہ۔ کچھ وقت لگے گا۔ پھر میں نے لاک اپ میں نیم جان پڑے مرد و زن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ کیوں بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ ایسا کر کے صرف تم اپنا نقصان کر رہے ہو۔ تمہاری بھوک پیاس سے کوئی مسئلہ حل ہوسکتا تو میں جہاز میں تمہیں کھانے پر مجبور کیوں کرتا۔"

جواب میں سیوک نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا "جب ہم ان آدم خور حبشیوں کو دیکھتے ہیں تو ہماری بھوک ہی نہیں اڑتی ہماری جان بھی ہوا ہوجاتی ہے۔ پھر کئی ہفتوں سے آپ بھی تو ہم کو نظر نہیں آرہے تھے۔ جب آپ نظر نہیں آتے تو ہم سب کو یہی لگتا ہے کہ ہم بالکل بے آسرا ہو گئے ہیں اور یہ کالی رنگت والے درندے ہمارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے آنکھوں میں آنے والے آنسو قمیص کے میلے دامن سے صاف کیے اور بولا کہ آپ نے تو جہاز میں کہا تھا کہ جہاز سے اتر کر ہمیں کوئی حبشی نظر نہیں آئے گا لیکن یہاں تو جدھر نظر اٹھتی ہے یہی حبشی ہیں۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دیکھو سیوک! کالی رنگت والے ہر شخص سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جہاز میں جن لوگوں کو آدم خوری کرتے دیکھا تھا وہ ایک خاص نسل کے لوگ ہیں اور اس نسل کے بس دو چار بندے ہی یہاں موجود ہوں گے اور شاید اب وہ بھی نہ ہوں۔"

میں سیوک کمار کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک آندھی بھی چل رہی تھی۔ میں کملا کی ماں سے کملا کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا مگر الٹا وہ مجھ سے کملا کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ کملا اپنے بچے سمیت میرے پاس ہے۔ اب اگر میں ایک دم اس بات کی تردید کر دیتا تو یہ نامناسب بلکہ خطرناک تھا۔ ان سب لوگوں کو اور خاص طور سے کملا کی ماں کو زبردست شاک لگتا تھا۔

میں نے کملا کا خیال فی الحال ذہن سے جھٹک دیا اور کوشش کرنے لگا کہ یہ لوگ کچھ کھانے پینے پر آمادہ ہوجائیں۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں سیوک کمار اور دیگر دو تین معمر افراد کو لیموں کا شربت پلانے میں کامیاب ہوگیا تو باقی افراد نے بھی یکے بعد دیگرے ہٹ دھرمی چھوڑ دی۔ ان میں سے کچھ عورتیں تو بے حد کمزور ہوچکی تھیں۔ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا'

ان لوگوں کو میں نے ہیڈ انچارج مرقص کی مدد سے فوراً اسپتال کی طرف روانہ کروایا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ جدید سہولتوں سے آراستہ یہ پچاس بستروں کا اسپتال اس زیر زمین بستی کے اندر ہی واقع تھا۔ اچانک میرا دھیان اپنے دشمن جاں راجن کی طرف چلا گیا۔ کملا کی طرح وہ بھی مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے سیوک کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے آٹھ دس روز پہلے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے ریزر کے ایک ٹکڑے سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی اور زیادہ خون بہہ جانے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ بے ہوشی ہی کی حالت میں اسے پہرے داروں نے لاک اپ سے نکال لیا تھا۔

میں نے سیوک سے پوچھا "کیا یہاں کسی لڑکی کا انتقال بھی ہوا ہے؟"

سیوک نے نفی میں سر ہلایا "ناہیں۔۔۔ ایسو تو کوئے ور گھٹنا ناہیں ہوئی۔"

میرے ذہن میں پلنے والے اندیشے قوی تر ہونے لگے۔ سوزی نے بتایا تھا کہ اترپردیشی قیدیوں میں سے ایک لڑکی ہلاک ہوئی ہے۔ اب سیوک ایسے کسی واقعے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ میری تشویش کملا کے بارے میں اور بڑھ گئی۔

میں قریباً تین گھنٹے اترپردیشی قیدیوں یعنی بردوں کے ساتھ رہا۔ انہیں کھانا وغیرہ کھلایا اور حوصلے تسلی کی باتیں کیں۔ ان باتوں کے دوران میں مجھے دو تین بار ایک سنگین جھوٹ بھی بولنا پڑا۔ مجھے کملا کی ماں کو بتانا پڑا کہ کملا میرے پاس ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے' وہ ایک دو روز تک واپس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں جانتا تھا کہ یہ جھوٹ میرے لیے بہت بڑا مسئلہ بن سکتا ہے لیکن فوری طور پر اس جھوٹ کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اترپردیشی قیدیوں کے لاک اپ سے باہر نکلتے ہی میں نے ہیڈ انچارج مرقص سے پوچھا "مسٹر مرقص! وہ کملا نام کی لڑکی کہاں ہے؟"

مرقص کا بنجر خشک چہرہ اور بھی خشک ہو گیا۔ وہ شانِ بے اعتنائی سے بولا "میں کسی ایسی لڑکی کے بارے میں نہیں جانتا' بردوں کی نقل و حرکت میری ذمے داری نہیں ہے۔"

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے کہا "تم ہیڈ انچارج ہو' تم نہیں جانو گے تو اور کون جانے گا؟"

"بردوں کی گنتی میرا کام نہیں' یہ انچارج کی ذمے داری ہوتی ہے اور ویسے بھی میں تمہارے سوالوں کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر واپس لفٹوں تک پہنچے۔ نجانے کیوں مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ زمین دوز آبادی درحقیقت ماریا ٹرسٹ کی ہی توسیع ہے۔ عین ممکن تھا کہ ان دونوں جگہوں کے درمیان میں نے جو فاصلہ اسٹیشن ویگن میں طے کیا تھا وہ صرف ایک سراب ہو۔ مجھے ماریا ٹرسٹ کے وسیع و عریض احاطے میں ہی گھما پھرا کر اس زمین دوز جگہ پر لے آیا گیا ہو۔ بہرحال لفٹ نے ہمیں اوپر پہنچایا۔ اس کے بعد دوبارہ ہم تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن میں بیٹھے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور کانوں میں ایئرڈاٹس لگا دی گئیں۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ وہ ایک سنسان سڑک سے نسبتاً بڑی اور بارونق سڑک پر آئی پھر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی واپس ٹرسٹ کی عمارت میں پہنچ گئی۔ بلند چھت والے گیراج کے اندر میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی اور سماعت کو بھی آزاد کر دیا گیا۔ مرقص نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا موڈ بتا رہا تھا کہ وہ میری کسی بات کا جواب دینا پسند نہیں کرے گا۔ مرقص کی عمر پینتیس اور چالیس برس کے درمیان تھی۔ وہ کافی دراز قد تھا کندھے تھوڑے سے آگے جھکے ہوئے تھے' میں نے اس کے چہرے پر ایک بار بھی مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی۔ شاید وہ مسکرانا جانتا ہی نہیں تھا۔

مجھے واپس کمرے میں صفدر اور جعفر رضا کے پاس بھیج دیا گیا۔ صفدر نے میرے چہرے کی پریشانی پڑھ لی۔ بولا "کیا بات ہے۔ آپ نے بہت دیر لگا دی؟"

میں نے اسے مختصر الفاظ میں روداد سنائی۔ آخر میں میں نے کہا "صفدر ڈیئر! مجھے لگتا ہے کہ بے چاری کملا کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔"

"بات واقعی سوچنے کی ہے۔" صفدر بھی گہری سوچ میں پڑ گیا "کملا کے بارے میں یہ جھوٹ کس نے بولا کہ وہ آپ کے پاس ہے؟ اور کیوں بولا؟"

"اور تیسرا سوال یہ ہے کہ سوزی نے جس لڑکی کی ہلاکت کی اطلاع دی ہے وہ کون ہے' جبکہ سارے اترپردیشی قیدی کہہ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی کی ہلاکت نہیں ہوئی۔"

"اور یہی بات زیادہ تشویش ناک ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کملا کے ساتھ ہونے والے کسی حادثے کو ان قیدیوں سے چھپایا گیا ہو۔ یہ ساری عورتیں اور بچیاں یہاں بدترین جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے!"

○☆○

سوزی سے ہماری ملاقات رات دس بجے کے قریب

ہو سکی۔ اس وقت تک ٹرسٹ میں گہری خاموشی طاری ہو چکی تھی' یوں محسوس ہوتا تھا کہ رات کے دو بجے ہوئے ہیں۔ سوزی ٹہلنے والے انداز میں ہمارے کمرے کے سامنے پہنچی۔ اس نے باہر موجود نگران کو کسی بہانے وہاں سے ہٹا دیا۔

سوزی نے مجھ سے حال احوال دریافت کیا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "سوزی! میں بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ میں تم سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو یہاں تم لوگوں کی تحویل میں ہلاک ہوئی ہے۔"

"کیوں! ایک دم اتنی پریشانی کیوں لگ گئی ہے تمہیں؟"

"اترپردیشی قیدیوں میں ایک لڑکی اپنے بچے سمیت موجود نہیں۔ اور اس کی خیریت اور سلامتی میرے لیے بہت اہم ہے۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

سوزی کی پیشانی پر سوچ کے بل نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ اس بارے میں ہیڈ انچارج مرقص ہی تمہیں بہتر طور پر بتا سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کچھ روز پہلے مرقص ایک لڑکی کو لاک اپ میں سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا تھا' اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ جو لڑکی بعد میں ہلاک ہوئی یہ وہی تھی یا کوئی اور۔۔۔"

ایک بار پھر مجھے اپنا بدن سلگتا ہوا محسوس ہوا۔ مرقص نے لڑکی کی ہلاکت سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بردوں کو گنتی کرنا یا ان کی نقل و حرکت اس کی ذمے داری نہیں ہے' اب سوزی بتا رہی تھی کہ کچھ روز پہلے وہ ایک لڑکی کو لے کر گیا تھا۔

"یہ مرقص کیسا شخص ہے؟" میں نے سوزی سے پوچھا۔

"جیسے یہاں کے سارے مرد ہیں۔" وہ عجیب بیزاری سے بولی۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ جس لڑکی کو لاک اپ میں سے لے کر گیا تھا اس کے ساتھ اس نے بدسلوکی کی ہو گی؟"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال میں پھر یہی کہوں گی کہ تم اس معاملے میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ پہلے ہی تم مبارک امین کو۔۔۔"

"میرے دماغ پر لعنت بھیجو۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی "میں اپنا دماغ ٹھنڈا ہی رکھنا چاہتا ہوں' لیکن شاید تم لوگ نہیں چاہتے۔ اگر تمہاری خواہش ہے کہ یہاں کوئی نیا ہنگامہ برپا نہ ہو تو مجھے بتاؤ کہ مرقص نے اس لڑکی کو لاک اپ سے کیوں نکالا اور قیدیوں کو یہ کیوں بتایا گیا کہ وہ لڑکی میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتاؤ کہ جس لڑکی کی ہلاکت کی اطلاع تم دے رہی ہو وہ کون ہے؟ اگر تم واقعی اس بارے میں نہیں جانتی ہو تو پھر معلوم کر کے بتاؤ۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ سوزی بہت سنجیدہ ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اسی دوران میں برآمدے کی طرف سے پہرے دار کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ سوزی نے تسلی دینے والے انداز میں ہم دونوں کی طرف دیکھا اور واپس چلی گئی۔

اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں رہا تھا کہ بقول سوزی جس لڑکی کو مرقص نے لاک اپ میں سے نکالا وہ کملا ہی تھی۔ کملا کے لواحقین کو یہ بتایا گیا کہ وہ کملا کو میرے پاس لے جا رہے ہیں۔ اترپردیشی قیدی اب تک یہی سمجھتے تھے کہ میں مائیکل کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک ہوں۔ لہٰذا انہیں اس بیان پر شبہ نہیں ہوا کہ کملا کو میں نے ہی طلب کیا ہے۔ اس کے بعد کملا کے ساتھ کیا ہوا اور اب وہ کہاں تھی؟ یہ سب تاریکی میں تھا۔ اگر کملا کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا تو یہ بہت اندوہناک بات تھی۔ کملا کی معصوم بھولی بھالی صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہ اس عمر میں تھی جب بچیاں جھولے جھولتی ہیں' رسّا پھلانگتی ہیں اور دھوم دھام سے گڑیوں کے بیاہ رچاتی ہیں' لیکن بے رحم بیگی سماج نے اس گڑیا سی بچی کی گود میں ایک بچہ دے دیا تھا۔ عورت کی گود میں بچہ ہو تو وہ مکمل نظر آنے لگتی ہے' لیکن کملا کی گود میں بچہ دیکھ کر انسانیت ہی نامکمل نظر آنے لگتی تھی۔ وہ نچلی ذات کی غریب بے آسرا لڑکی تھی۔ پتا نہیں کس ٹھاکر' برہمن یا معاشے کے دستِ ستم کا شکار ہوئی تھی۔ کسی نامہرباں اندھیرے میں اس کی معصومیت چھین کر اسے ایک ذمے داری سونپ دی گئی تھی۔ وہ اس روتی بلکتی ذمے داری کو سنبھالنے' پچکارنے اور اس کے پوتڑے دھونے پر مجبور تھی۔ بحری سفر کے دوران میں کم سن کملا کو مجھ سے عجیب قسم کا اُنس ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی بہت اردو جانتی تھی جس کی وجہ سے میں اس کی بات سمجھتا تھا اور اکثر اسے ترجمانی کے لیے بھی استعمال کر لیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کملا کی معصوم آنکھوں میں اطمینان اور سلامتی کا احساس کسی چراغ کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔

وہ ساری رات میں نے کانٹوں پر گزاری۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ صفدر میری بے قراری کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ پوری شدت سے سوزی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے سوزی سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی کملا کے بارے میں معلوم کر کے بتائے۔ اب کچھ معلوم

نہیں تھا کہ وہ کیا خبر لائے گی۔ ہم مسلسل انتظار کی پھانسی پر لٹک رہے تھے۔ صفدر نے میرا دھیان بنانے کے لیے غزالہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح سوزی اسے بہانے سے اپنے آفس میں لے گئی تھی۔ آفس کے ساتھ ہی اٹیچ ایک کمرا وہ اپنی رہائش کے لیے استعمال کرتی ہے اور غزالہ اسی کمرے میں موجود ہے۔ صفدر نے بتایا "میں نے اس سے بات کی ہے' وہ بالکل ٹھیک ہے۔ جس وقت مبارک امین اسے اپنے بیڈ روم میں لے کر گیا وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر تھی پھر بھی وہ اس جدوجہد سے واقف ہے جو آپ نے اسے بدبخت مبارک کے چنگل سے نکالنے کے لیے کی۔ بعد میں گارڈز آپ پر پل پڑے تھے اور غزالہ نے اوپر تلے تین فائر بھی سنے تھے۔ اس کے ذہن میں یہ شک بیٹھا ہوا ہے کہ شاید وہ فائر آپ پر کیے گئے تھے۔ وہ آپ کی خیریت کی طرف سے بے حد پریشان ہے۔ میں نے اس کے سامنے قسمیں بھی کھائی ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں' لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی۔ روتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھی۔"

صفدر بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"یہ وعدہ خلافی ہو جائے گی جناب۔" وہ مسکرایا۔ پھر ذرا توقف سے خود ہی کہنے لگا "وہ کہہ رہی تھی کہ میں ایک بار اسے آپ کی صورت دکھا دوں۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی لے رہی تھی کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میرے رگ و پے میں درد کی میٹھی سی لہر جاگ گئی۔

صفدر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "شاہ جہاں صاحب! مجھے بارہا محسوس ہوا ہے کہ غزالہ آپ کی توقع سے زیادہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ اسے بے شمار مجبوریوں نے جکڑ رکھا ہے اس کے باوجود کبھی کبھی اس کی محبت برق کی طرح تڑپ کر اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ اس طویل سفر نے اور رات دن کے ساتھ نے آپ دونوں کو ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اپنے اس تعلق کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"جب اس بارے میں سوچتا ہوں تو دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔"

وہ بولا "دیکھیں شاہ جہاں صاحب! ایک بات تو طے ہے کہ غزالہ اب واپس شیخ عاصم کی طرف نہیں جائے گی۔ وہ خود مجھ سے کہہ چکی ہے کہ یہ دور اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو چکا ہے۔"

"لیکن وہ قانونی اور مذہبی رشتہ تو موجود ہے جسے نکاح کہتے ہیں۔ وہ دستاویز جو عاصم اور غزالہ کو میاں بیوی ثابت کرتی ہے' بے شک غزالہ نے وہ سب کچھ حالتِ مجبوری میں کیا لیکن کیا تو اب ایک ایسی زنجیر اس کے پاؤں میں ہے جسے توڑے بغیر وہ "آزاد" نہیں کہلا سکتی۔ اور یہ بات وہ خود بھی بہت اچھی طرح سمجھتی ہے۔"

"وہ خوفناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے شاہ جہاں صاحب۔ شاید اس کے دل کی گہرائی میں یہ خواہش موجود ہے کہ آپ اسے اس دلدل سے نکالیں۔"

"لیکن دلدل سے نکلنے کے لیے وہ خود بھی تو ہاتھ بڑھائے۔ اگر وہ ہاتھ نہیں بڑھائے گی اور میں اسے کھینچوں گا تو پھر یہ عمل دو معقولات کہلائے گا۔ ایسے میں مجھ پر یہ الزام بھی آسکتا ہے کہ میں نے ایک گھر اُجاڑنے کی کوشش کی ہے۔ تم جانتے ہی ہو' چچی چچا تو مجھے روزِ اول سے غزالہ کا دشمن سمجھتے ہیں۔"

"آپ دنیا کی بات چھوڑیں' اپنے دل کی آواز سنیں۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ غزالہ جہاں پھنسی ہوئی ہے وہ دلدل ہے یا ہنستا بستا گھر ہے۔ باقی جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ غزالہ خود آپ کی طرف ہاتھ کیوں نہیں بڑھا رہی تو پھر ایک اور چیز آپ کو ذہن میں رکھنی ہوگی۔ ممکن ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن کسی وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غزالہ آپ کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ شاید وہ اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ ایک شریکِ حیات کی مساوی حیثیت سے آپ کی زندگی میں آسکے۔ اور اگر یہ بات اس کے ذہن میں ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ جس قسم کے بے رحم حالات سے وہ گزری ہے' اس قسم کی نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی ہی ہے۔ اگر آپ واقعی غزالہ کو اپنانا چاہتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ چاہتے ہیں تو پھر تعلقات کو معمول پر لانے کا اس سے بہترین موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حالات کی گردش ایک محدود مدت کے لیے آپ کو ایک دوجے کے قریب لے آئی ہے۔ آپ اس انتظار میں مت رہیں کہ غزالہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ خود اس کی طرف بڑھیں اور اس کا یہ اندیشہ ختم کر دیں کہ شاید اب آپ دونوں کی حیثیت مساوی نہیں ہے۔"

میں صفدر کا منہ تکنے لگا۔ کبھی کبھی مجھے صفدر کے خیالات جان کر حیرت کا شدید دھچکا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جو کچھ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے وہی فوٹو اسٹیٹ ہو کر صفدر کے ذہن پر نقش ہو رہا ہے۔ اب جو کچھ صفدر نے

کہا تھا یہ ہو بہو وہی سوچ تھی جو میرے ذہن میں پچھلے کئی دنوں سے پیدا ہو رہی تھی۔ من و عن یہی خیالات اور یہی تصورات تھے۔ لفظوں میں شاید کچھ ہیر پھیر ہو مگر مفہوم یہی تھا۔

صفدر نے کملا کی طرف سے میرا دھیان ہٹانے کے لیے غزالہ کا ذکر چھیڑا تھا مگر غزالہ کی باتیں کرتے ہوئے بھی کملا کا درد بدستور میرے سینے میں ٹیس جگا رہا تھا۔ جیسے نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی جسم کی کسی شدید تکلیف کا احساس ذہن کو کچوکے لگاتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رات کے آخری پہر راہداری کی طرف سے سوزی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو میرا دل پسلیوں میں دھڑکنے لگا۔ ممکن تھا کہ سوزی کملا کے بارے میں کوئی اطلاع لے کر آئی ہو۔

سوزی کا چہرہ دیکھ کر میرے سینے میں سو لہریں دوڑ گئیں۔ وہ گم صم تھی "کیا معلوم ہوا؟" میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ گمبھیر لہجے میں بولی "اطلاع اچھی نہیں ہے۔"

"کیا ہوا ہے کملا کو؟" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"ابھی ٹھیک سے کچھ معلوم نہیں۔ صرف یہ بات کنفرم ہوئی ہے کہ کملا نامی اس لڑکی کو لاک اپ سے نکالا گیا تھا۔ اسے نکالنے والا ہیڈ انچارج مرقس ہی تھا۔ اس وقت شیر خوار بچہ بھی کملا کے ساتھ تھا۔"

"کیوں نکالا تھا اس نے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر کہنے لگی "دیکھو مسٹر شاہ! تم نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو گے اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے جس کے سبب یہاں تمہاری اور ہماری مشکلات میں اضافہ ہو۔ اگر تم نے میری بات سن کر وحشیوں کی طرح طیش دکھانا ہے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہونا ہے تو پھر میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

نڈھال سا ہو کر میں فرش پر بیٹھ گیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں میں نے کہا "ٹھیک ہے سوزی! تم بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں میری وجہ سے تمہیں پریشانی نہیں ہوگی۔"

صفدر نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ کہے۔ سوزی بولی "مرقس نے کملا کو یہ کہہ کر لاک اپ سے نکالا تھا کہ اسے تم بلا رہے ہو۔ اس نے کہا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اور تم چاہتے ہو کہ کملا تمہاری دیکھ بھال کے لیے دو چار روز تمہارے پاس رہے۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے دوران کملا کی ماں اور سیوک بار بار میری خیریت کیوں پوچھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں میں بیمار تھا اور کملا میری سیوا میں مصروف تھی۔

"تو کیا مرقس نے کملا کی جان لے لی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جس اتر پردیش لڑکی کی موت کے بارے میں خبر آئی تھی وہ کملا تھی یا کوئی اور۔"

"اور کیسے ہو سکتی ہے۔" صفدر کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی "اتر پردیش قیدیوں میں سے صرف وہی بدنصیب غائب ہے۔"

"مگر یہاں مزید اتر پردیش قیدی بھی تو موجود نہیں۔ تقریباً ساٹھ افراد کا ایک گروپ اور ہے۔ وہ لوگ تین مہینے پہلے یہاں نرسنگ میں پہنچے تھے۔ اب وہ بھی سیکنڈ انٹری میں ہیں۔"

"ان میں بھی لڑکیاں موجود تھیں؟" امید کی ایک کرن میرے ذہن میں نمودار ہوئی۔

"زیادہ تو نہیں تھیں مگر پانچ چھ تو ہوں گی ہی۔" سوزی نے جواب دیا۔

"لڑکی کی موت کی اطلاع تم تک کیسے پہنچی تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا جھجک کر بولی "ہر ماہ پہلے ویک اینڈ کی رات بابس مائیکل میرے ساتھ گزارتا ہے۔ اس رات بھی نو بجے کے قریب اس نے میرے پاس آنا تھا لیکن وہ دس بجے کے قریب آیا۔ جلدی میں تھا' اس نے کہا کہ ایک انڈین (اتر پردیش) لڑکی ہلاک ہو گئی ہے۔ میں کنگ کی طرف جا رہا ہوں۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے' اب کل ہی ملاقات ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ کیسے ہلاک ہوئی' وہ بولا "جیسے یہ لوگ ہوتے ہیں۔ مرنے کی بہت جلدی ہوتی ہے انہیں۔ بس بیٹھے بیٹھے بھی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔۔۔" پھر مجھے اپنی زیرِ نگرانی بردوں کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر وہ چلا گیا۔"

صفدر نے کہا "دیکھو مس سوزی! تم ہماری پریشانی کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو۔ وہ زندہ ہے یا خدانخواستہ مر گئی ہے' جو کچھ بھی ہے ہمیں جلد سے جلد معلوم ہونا چاہیے۔ تمہاری ادھوری اطلاع نے ہمیں سولی پر چڑھا رکھا ہے۔ تم انچارج ہو یہاں کی' اگر تم بھی ہمیں اس کے انجام کے بارے میں نہیں بتا سکتی ہو تو اور کون بتائے گا؟"

سوزی نے کہا "میں اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن میں پھر کہوں گی کہ تم جذبات میں آ کر اب کوئی اور قدم نہیں اٹھانا۔ مائیکل اپنے دوست کی موت پر پہلے ہی بہت بھڑکا ہوا ہے۔ اگر تم سے کوئی مزید غلطی ہوئی تو وہ کنگ کو تمہارے لیے بدترین سزا پر آمادہ کر لے گا۔ اس کے علاوہ" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ پھر جیسے حوصلہ جمع کر کے بولی "اس کے علاوہ یہ بھی کہوں گی کہ آپ لوگ انڈین لڑکی کے حوالے سے خود کو کسی بھی بری خبر کے لیے تیار رکھیں۔ کرانسٹ سے دعا ہے کہ وہ بچ گئی ہو مگر آثار اچھے نظر نہیں آتے۔"

وہ واپس چلی گئی۔ ہم دونوں نے رات کا بچا کھچا حصہ نیم غنودگی اور نیم بیداری میں گزار دیا۔ "راونگا" میں ہم دونوں سے جو شدید مار پیٹ ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی تک جسم پر موجود تھے۔ صفدر دائیں کروٹ پر نہیں لیٹ سکتا تھا' مجھے بھی دائیں کروٹ سے لیٹنا سخت دشوار محسوس ہوتا تھا' لہٰذا ہم چت لیٹے تھے یا اس طرح لیٹتے تھے جیسے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہوں۔

اس روز سوزی کی مہربانی سے ایک اور مثبت تبدیلی آئی۔ ایرانی جعفر رضا کو ہمارے کمرے میں سے شفٹ کر دیا گیا۔ دراصل مبارک امین کے قتل کے بعد سے جعفر رضا ہم دونوں سے بہت سہما سہما رہتا تھا۔ اس نے ایک پہرے دار کے ذریعے سوزی تک یہ شکایت پہنچائی تھی کہ اسے خطرناک قیدیوں کے ساتھ بند کیا گیا ہے' لہٰذا وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ سوزی نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے جعفر رضا کو ہمارے کمرے سے شفٹ کر دیا تھا اور اس کی جگہ شہنشاہِ ظرافت زریں گل کو ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔

زریں گل گرم جوشی سے ملا لیکن وہ خاصے خراب موڈ میں تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "سچ کہتے ہیں استاد صیب کہ بد سے بدنام برا ہوتا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "یہ صیدر صیب بہت اچھا مالش کرتا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو ایک مرتبہ لاہور میں صیدر صیب نے بجتنی کنور صیب کا مالش کیا تھا اور وہ اش اش کر اٹھا تھا۔ لیکن یہاں کوئی صیدر صیب کو مالش کے لیے نہیں کہتا کیونکہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہے۔ ہم چونکہ مالش کے بارے میں بدنام ہو چکا ہے' اس لیے ہم کو ہر کوئی مالش کے لیے بلوا لیتا ہے۔ خو جہاز کی طرح اب ہم کو یہاں بھی مالشیے کا ڈیوٹی مرحمت فرما دیا گیا ہے۔ وہ بدبخت مائیکل اور اس کا یار دوست ہم سے یہاں بھی دن رات مالش کروا رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی دردناک خبر ہے۔" میں نے افسوس کا اظہار کیا "مستقبل کا کروڑپتی خان زادہ اور اسے ایرے غیروں کی مالش کرنا پڑ رہی ہے۔"

صفدر بولا "یہ سب تمہارے بڑے بول کا نتیجہ ہے۔ تم فرنگی عورتوں سے فرش پر ٹاکی پھروانے کی بڑ کیں مارتے تھے' اب تمہیں انہی فرنگیوں کی مٹھی چاپی کرنی پڑ رہی ہے۔"

"یہ سارا بے عزتی ہمارے اندر آگ کے مافق جمع ہو رہا ہے۔ جب یہ آگ پھٹے گا تو آدھا انگلینڈ جل جائے گا۔"

صفدر بولا "تمہاری ذم کوئی بھی مروڑے تمہارا غصہ انگلینڈ پر ہی نکلتا ہے۔"

"کیوں نہ نکلے۔ اس نے ایک سو سال ہم کو غلام بنا کر رکھا ہے۔" زریں تڑخ کر بولا "اب ہر کوئی ہم کو غلام ہی سمجھتا ہے۔"

زریں خاصا بھرا ہوا تھا' دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ اسے بھی مبارک امین کے قتل کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا اور وہ اس خبر پر دل ہی دل میں بہت خوش بھی ہوا تھا' مگر بعد میں مائیکل اور اس کے ساتھیوں نے اس سے مالش کروا کروا کر اس کی ساری خوشی غارت کر دی تھی۔ زریں کی باتوں سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ پرسوں رات اس ہوسٹل کے بیڑا انچارج مرقس کی مالش بھی کرتا رہا ہے۔

ہم نے زریں سے مرقس کے بارے میں تفصیل پوچھی۔ وہ کافی کچھ جانتا تھا۔ اس نے بتایا "مرقس کا رہائش گاہ فوارے کے بالکل سامنے ہے۔ دائیں طرف سے جو راہداری نکلتا ہے وہ تھوڑا سا خم کھا کر سیدھا اس کے مکان تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنی پانچ عورتوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا اپنا عمر چالیس سال سے اوپر ہی ہو گا لیکن اس کے پاس جو عورتیں ہیں وہ سارا کا سارا کم عمر ہے۔ ان میں سے کسی کا عمر بھی بیس سے زیادہ نہیں ہو گا۔ یہ سب عورتیں بردوں میں سے چنا گیا ہے۔ صرف ان میں سے ایک عورت مقامی ہے۔ وہ فارمی مرغی کی طرح بہت موٹا ہے اور ہر وقت بک بک کرتا رہتا ہے۔ صرف اس کا عمر بیس سال سے زیادہ ہو گا۔ وہ باقی لڑکیوں پر حکم چلاتا ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ مرقس چونکہ بہت لمبا دھوش ہے' اس لیے اس کے کمر میں درد رہتا ہے۔ کمر کی مالش کے لیے ہی اس نے ہم کو بلایا تھا۔ خود وہ بدبخت ہمارے سامنے ہی شراب پیتا رہا تھا اور ایک لڑکی سے اٹھکیلیاں بھی فرماتا رہا تھا۔ وہ چہرے سے تو بہت غصیلا اور ڈھنگ نظر آتا ہے لیکن شراب پینے کے بعد ایک دم رنگ رنگیلا ہو جاتا ہے۔ ہم دو مرتبہ اس کا مالش کرنے گیا

ہے' دونوں مرتبہ اس کا یہی معمولات دیکھا ہے۔"

زریں گل جو کچھ بتا رہا تھا وہ ہمارے اندیشوں کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس سے پہلے سوزی نے بھی یہی اشارہ دیا تھا کہ مرقس اپنے چہرے مہرے کے برعکس رنگین طبع شخص ہے اور اس سے کوئی برائی بھی بعید نہیں۔ اب زریں سے یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ ادھیڑ عمر مرقس کم عمر لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ اس بات میں شک شبے کی گنجائش اب کم ہی دکھائی دیتی تھی کہ مرقس نے اپنی عیاشی کے لیے کملا کو لاک اپ میں سے نکالا ہو گا۔

صفدر نے کہا "مگر ایک چیز مجھے شک میں ڈال رہی ہے۔ سوزی کے بیان کے مطابق لڑکی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے مائیکل کنگ براؤن کی طرف گیا تھا۔ اور کنگ براؤن یہاں نہیں رہتا' وہ اسی زیر زمین کمپلیکس میں ہے جہاں کل آپ کو لے جایا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یا تو ہلاک ہونے والی لڑکی کملا نہیں تھی' یا پھر کملا کو مرقس نے ہلاک نہیں کیا۔"

صفدر کی بات واقعی غور طلب تھی۔ ہم دیر تک اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ دل سے بار بار یہی دعا نکل رہی تھی کہ جو لڑکی ہلاک ہوئی ہے وہ کملا نہ ہو۔

صفدر کل رات کا جاگا ہوا تھا اس لیے جلد ہی سو گیا۔ زریں گل بھی خراٹے لینے لگا لیکن نیند میری آنکھوں سے بہت دور تھی۔ میں دیر تک کروٹیں لیتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ ٹرسٹ کی عمارت میں خاموشی کا راج تھا۔ ہمارے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ مسلح پہرے دار دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سو گیا تھا۔ [اس] کا سر کبھی ایک طرف ڈھلکتا تھا' کبھی دوسری طرف۔ میں [بہ]ت دیر تک اس کے سر کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ آخر [اس] کا سر ستون کے ساتھ ٹک گیا۔ وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ زریں گل نے ایک چھوٹا سا کارنامہ انجام دیا تھا' وہ ہمارے کمرے میں آنے سے پہلے کہیں سے ایک پیچ کس چرا لایا تھا۔ آج دوپہر اس نے یہ پیچ کس میرے حوالے کر دیا تھا۔ زریں کا خیال تھا کہ شاید ہم میں سے کوئی کسی وقت اس پیچ کس کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ پیچ کس آج رات ہی استعمال ہو گا اور اسی کام کے لیے استعمال ہو گا جس کام کے لیے بنا ہے' یعنی پیچ کھولنے کے لیے۔

میں سلاخ دار دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ اپنا ایک بازو آہستگی سے سلاخوں سے باہر نکالا' پھر کلائی کو موڑا اور پیچ کس کی مدد سے کنڈی کے چار پیچ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوشش طویل ثابت ہوئی لیکن لاحاصل نہیں رہی۔ قریباً ایک گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد میں دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے سینے میں الاؤ سا دہک رہا تھا اور مرقس کی منحوس صورت بار بار نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ ٹرسٹ میں ہتھیاروں کی نمائش ممنوع تھی لہٰذا پہرے دار کا ریوالور بھی اس کے لباس میں تھا۔ میں یہ ریوالور حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو بنا بنایا کام بگڑ سکتا تھا۔ میں پہرے دار کو اس کے حال پر چھوڑ کر اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے راہداری کی طرف مڑ گیا۔ پیچ کس یعنی اسکریو ڈرائیور میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے چاقو کے طور پر استعمال کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھا۔ آج زریں گل نے مجھے مرقس کی قیام گاہ کے بارے میں اتنی وضاحت سے بتایا تھا کہ میں کہیں بھی رکے بغیر مرقس کے رین بسیرے پر پہنچ گیا۔ یہ کوارٹرز کی طرز کے پانچ چھ مکانات تھے بظاہر سادہ نظر آتے تھے لیکن اندر سے کافی آرام دہ تھے۔ بیرونی چار دیواری پھلانگنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ کسی کمرے سے ائرکنڈیشنر چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ میں ابھی صحن میں کھڑا اسی آواز پر غور کر رہا تھا کہ ایک تاریک گوشے میں کسی سائے نے حرکت کی۔ میں گہری تاریکی میں تھا اور سایہ نیم تاریکی میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی پہرے دار انیس تھا جو پہلے روز ہمارے کمرے پر تعینات تھا' وہ انڈین تھا اور اردو انگریزی' پنجابی سب سمجھتا تھا۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہی پوچھا تھا کہ اس وقت اندھیرے میں کون گشت کر رہا ہے۔

وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ میری پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ انیس مجھے غور سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ شاید اسے شک ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ اور یہاں کوئی موجود نہیں۔ جونہی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم کی دوری پر پہنچا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کی گناہ گار آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا' میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کا دہن چیخنے کے لیے کھلا تھا مگر گردن میرے شکنجے میں آئی تو آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے اسکریو ڈرائیور اس کی شہ رگ پر رکھ دیا "خبردار! آواز نکالی تو یہ گردن میں دھنسا دوں گا۔"

میری آواز پہچان کر اس کے جسم میں تھرتھری سی نمودار ہوئی۔ مبارک امین کے قاتل کی حیثیت سے میری ٹھیک ٹھاک دہشت پھیل چکی تھی۔ نصف درجن گارڈز کی موجودگی

میں نے جس طرح اس کی کھوپڑی توڑی تھی وہ ایک اثر انگیز منظر ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس کے کان میں پھنکارتے ہوئے کہا "میری بات پورے گیان دھیان سے سنو۔ میرے سر پر خون سوار ہے۔ تم نے کسی حرام زاوے کے ساتھ تمک حلالی کی کوشش کی تو ایک سیکنڈ میں اوپر پہنچا دوں گا۔"

میں نے باقاعدہ اس کی گردن اوپر کی۔ اوپر بہت اوپر ماربلانیہ کے تاریک آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ان کے دل بھی جیسے وحشت زدہ انڈین کے دل کی طرح دھڑک اٹھے تھے۔

میں نے بے رحمی سے اسکریو ڈرائیور کی نوک انیس کی گردن میں چبھوئی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ اس نے غالباً مجھ سے بچنے کے لیے کوئی بدبودار تیل چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر مل رکھا تھا۔ تیل کی بو میرے نتھنوں میں گھستی چلی جا رہی تھی۔

اسکریو ڈرائیور کا بے رحم دباؤ محسوس کرکے انڈین انیس کی حالت کچھ اور بھی پتلی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا "اگر مزید جینے کی خواہش ہے تو مجھے سیدھا اپنے باپ مرقص کے کمرے میں لے چلو۔ بولو منظور ہے؟"

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کا رخ مکان کے اندرونی حصے کی طرف کیا۔ وہ مجھے ایک راہداری کے سامنے لے آیا۔ یہاں جالی دار دروازہ لگا تھا۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ مقفل سے مراد یہ ہے کہ اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے انیس کے گلے پر سے بازو کا دباؤ تھوڑا سا کم کیا "یہ دروازہ کھلواؤ۔" میں نے کہا "اور تمہاری زندگی کی ضمانت بس اسی میں ہے کہ تمہارا دماغ کوئی چالاکی نہ دکھائے۔"

انیس چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ میری بات ماننے کو تیار ہے۔ میں نے اس کی گردن پر سے دباؤ مزید کم کر دیا۔ تاہم شہ رگ پر اسکریو ڈرائیور کا بے رحم دباؤ بدستور موجود تھا۔ انیس نے کھنکار کا گلا صاف کیا اور پھر کسی کو مقامی زبان میں آواز دی۔

اس کی دوسری تیسری آواز پر قدموں کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ راہداری میں مدھم روشنی تھی۔ میں نے ایک فربہ اندام ملازمہ کو دیکھا۔ وہ سلیپر گھسیٹتی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ میں پوری طرح چوکس ہو گیا۔ سیاہ فام ملازمہ نے جالی دار دروازے کی کنڈی کھولی۔ نیند سے بیدار کیے جانے پر وہ اتنا تلملائی ہوئی تھی کہ اس نے انیس پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بڑبڑاتی ہوئی اور اپنے چوڑے کولھوں کو ہلکورے دیتی ہوئی وہ واپس چلی گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں انیس سمیت اندر داخل ہوا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اندر نیلگوں بلب کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں دو لڑکیاں آرام دہ بستر پر اوندھی سیدھی پڑی نظر آئیں۔ وہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ فام تھی اور دوسری گندمی رنگت کی۔ یہ نو دمیدہ کلیاں یقیناً مرقص کی پانچ عدد رکھیلوں میں سے تھیں۔ ان پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ پالش شدہ لکڑی کے ایک دروازے کے سامنے جا کر انیس رک گیا "یہی ہے تیرے باپ کا کمرا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا "تو خاموش کیوں ہے لومڑ۔ آواز دے اسے۔"

انیس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ جواب میں انیس نے کچھ کہا۔ چند سیکنڈ بعد کھڑکی میں روشنی ہوئی اور پھر مرقص نے دروازہ کھول دیا۔ مرقص کے سامنے آنے سے پہلے ہی میں انیس کو فرش پر لٹا چکا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اب اس کے سر پر ڈھول بھی بجائے جاتے تو اس کے کان پر جوں رینگنے والی نہیں تھی۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا مخصوص حربہ آزمایا تھا اور دو تین گھنٹے کے لیے اسے ہر فکر تکلیف سے آزاد کر دیا تھا۔

مرقص نے اپنے ائر کنڈیشنڈ بیڈ روم میں سے اپنی گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں تھا۔ دفعتاً اسے شدید خطرے کا احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ واپس کمرے میں گھس کر کسی ہتھیار وغیرہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا میں اس کی لمبی گردن ناپ چکا تھا۔ مرقص کے حلق سے اوغ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ بری طرح تڑپا مگر چند سیکنڈ میں بے بس ہو کر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی جدوجہد کا ایک منظر بڑا دلچسپ تھا۔ وہ بار بار منہ کھول کر اپنے مددگاروں کو آواز دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر آواز اس کے اندر سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ ہر بار ناکام ہونے کے بعد اس کے چہرے کی حیرت آمیز وحشت کچھ اور بڑھ جاتی۔ تم میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی "قیامت تک بھی لگاؤ گے تو بغیر آواز کے ہی چیخو گے۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بار بار منہ کھولنا اور بند کرنا ترک کر دیا۔ اس کے سیاہ بدن پر بغیر بازو کی

تحیر، تجسس، رومان اور ایڈونچر سے بھرپور ناول

ایک نئی سدابہار تخلیق

کھلاڑی

ایم۔اے۔راحت

ایک بلند حوصلہ نوجوان کی داستان جو چٹانی عزم رکھتا تھا

ایک ایسا نوجوان جو چھلاوے سے زیادہ پھرتیلا تھا۔

وہ جو ہواؤں کو تسخیر کر چکا تھا۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرنا جانتا تھا۔ وقت جس کے لیے ٹھہر جاتا تھا۔ ہوائیں اپنا رخ موڑ دیتی تھیں۔

قیمت -/۲۲۵ ڈاک خرچ -/۲۰

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز

تھی اور ایک پاجامہ نما چیز تھی۔ اس کے بستر پر ایک قیامت سوئی پڑی تھی۔ یہ لڑکی گندمی رنگ کی تھی مگر خاصی خوب صورت تھی۔ عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ اس کی چھوٹی سی ناک میں ایک طلائی تتلی تھی جو ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ یہ نیم عریاں لڑکی بہت گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اسے خواب گاہ میں ہونے والی گڑبڑ کا مطلق پتا نہیں چلا۔

میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک بغلی دروازہ بھی موجود ہے۔ میں نے ٹانگ کے دباؤ سے دروازہ کھولا' یہ بھی ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ یہاں حبس تھا کیونکہ اے سی کی ہوا یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کمرے میں صوفے رکھے تھے اور ٹی وی پڑا تھا۔ غالباً یہ کمرا ٹی وی لاؤنج کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں مجھے ایک ریوالور ہولسٹر لٹکا بھی نظر آگیا۔ میں نے مرقص کی گردن چھوڑے بغیر ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا اور اسکریو ڈرائیور پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں آنے کے بعد میرے اعتماد میں اضافہ ہو گیا۔ میں نے اچھی طرح مرقص کی تلاشی لی اس کے بعد اسے فرش پر اوندھا لٹا دیا۔ وہ میری ہدایات پر بلا چوں چرا عمل کر رہا تھا۔ میں نے اسے دھمکایا کہ اگر اس نے کوئی پھرتی دکھائی تو مبارک امین کی طرح کم از کم تین سوراخ اس کی کھوپڑی میں ضرور ہو جائیں گے۔

ویسے بھی امید نہیں تھی کہ مضمحل جسم والا یہ ادھیڑ عمر ارنٹ کوئی پھرتی دکھا سکے گا۔ جب وہ مجھ سے زور آزمائی کر رہا تھا' مجھے اس کے بدن میں واضح طور پر کھوکھلا پن محسوس ہوا تھا۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی سیاہ کاریوں نے اس کے چہرے کی طرح اس کے جسم کو بھی بنجر کر دیا تھا۔ میں نے بغلی کمرے کا دروازہ کھول دیا اور مرقص کو نظر میں رکھتے ہوئے انیس کو بھی خواب گاہ میں گھسیٹ لایا۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد مجھے تسلی ہو گئی۔ اب کسی کے دخل در معقولات کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

خواب گاہ کی لائٹ آف کرنے کے بعد میں اس لمبوترے کمرے میں آگیا جو غالباً ٹی وی لاؤنج تھا۔ میں نے مرقص کو صوفے پر بٹھایا اور خود دس بارہ فٹ دور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ موت کے خوف سے مرقص کا سیاہ چہرہ کچھ اور بھی سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ اس کپکپی کو چھپانے کے لیے بار بار ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیتا تھا۔

"اس کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟" وہ لرزتی آواز میں بولا۔ اس کا اشارہ انیس کی طرف تھا۔

"کچھ دیر کے لیے انڈیا کی سیر کرنے گیا ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے ملے گا۔ گنگا جل پیے گا۔ تمہارے اور کنگ برادرن کے حق میں دعا کرے گا اور واپس آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں۔"

"اور اگر ۔۔۔ یہ ۔۔۔ بے ہوشی میں ہی مر گیا تو؟" مرقص ہکلایا۔

"تو میری ڈبل سینچری مکمل ہو جائے گی۔ ایک سو ننانوے بندے میں پہلے ہی پار کر چکا ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

مرقص اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ خاصا خوف زدہ تھا' اگلے آٹھ دس منٹ میں میں اس کے خوف کو پانچ چھ گنا کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی آنکھیں پیلی پڑ گئیں اور موت اسے اپنے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اس کی ساری "ہیڈ انچارجی" ناک کے رستے بہہ گئی تھی اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا سارا جسم بھی کانپنا شروع ہو گیا تھا۔

"باقی باتیں چھوڑو۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہیے' کملا کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟"

وہ ہکلایا "میں ۔۔۔ یہ بات مانتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو لاک اپ سے لایا تھا۔ مم مگر میں نے صرف کنگ کی ہدایت پر ایسا کیا تھا۔ میں نے اسی رات لڑکی کو بچے سمیت کیمپس میں پہنچا دیا تھا۔"

کیمپس اس زیر زمین علاقے کو کہا جاتا تھا جہاں دو روز پہلے مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا تھا۔

"کنگ کو اس لڑکی سے کیا کام تھا؟"

"اس بارے میں مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں بتانے میں ایک منٹ کی تاخیر نہ کرتا۔" وہ شکستہ لہجے اور شکستہ انگلش میں بولا "اس کی حالت گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ پتلی ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "لگتا ہے کہ تمہارے منہ میں اپنی زبان کے بجائے کتے کی زبان پیوند کی گئی ہے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہو اور اتنے بے غیرت ہو کہ کہیں لڑکھڑاتے بھی نہیں ہو۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم بہت طرح کی قسمیں کھا سکتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی "تم قسم کھا سکتے ہو کہ تم خدا کے عبادت گزار بندے ہو' تم نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں

لگایا۔ تمہیں اس بڑھاپے میں نو عمر لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' تم بڑے قردشی کر کے حق حلال کی روزی کما رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی بہت سی قسمیں تم کھا سکتے ہو۔ لیکن یہ قسمیں تمہاری جان نہیں بچا سکتیں' آج کی رات تمہاری جان صرف سچ بولنے سے بچ سکتی ہے۔ یہ بتانے سے بچ سکتی ہے کہ آدھی رات کو تم کمسن کملا کو لاک اپ سے نکال کر کہاں لے گئے تھے' اور کیا کیا تھا اس کے ساتھ ۔۔۔ اور یہ کہ اب وہ کہاں ہے؟"

مرقص نے تھوک نگلنا چاہا لیکن اس کے منہ میں غالباً تھوک بھی باقی نہیں بچا تھا' اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور کئی سیکنڈ تک حلق سے "کھیں کھیں" کی آواز نکلتی رہی "میری بات کا یقین کرو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہے۔ میری ڈیوٹی بس یہی تھی کہ میں اسے کیمپس میں پہنچا دوں۔ پہنچا کر میں واپس آگیا تھا۔"

میں نے کہا "وہ بے چارہ انڈین لڑکی جو ہلاک ہوئی کون تھی؟"

"مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ صرف باس مائیکل سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ کیمپس میں ایک انڈین لڑکی ہلاک ہو گئی ہے۔"

میں نے ریوالور مرقص کی پیشانی کی طرف سیدھا کیا اور ایک آنکھ بند کر کے نشانہ لے لیا "بڑے بے خبر ہو تم۔ میرا خیال ہے کہ ایسے بے خبر ہیڈ انچارج سے چھٹکارا پا کر کنگ برادرن بہت خوش ہوں گے۔" میں نے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا تو مرقص کی باقاعدہ گھگی بندھ گئی۔ اس کے منہ سے ناقابل فہم آوازیں نکل رہی تھیں۔ "خدا کے لیے گولی مت چلانا۔" اس نے فریاد کی۔

"تو بتاؤ' کملا کو لاک اپ سے کیوں نکالا تھا اور دوسرے قیدیوں کو یہ کیوں بتایا تھا کہ کملا کو میں نے بلایا ہے؟"

"وہ ۔۔۔ وہ صرف اس لیے تھا کہ کملا میرے ساتھ آنے میں پس و پیش نہ کرے۔ مجھے ہرکولیس کے نائب کپتان آرتھر سے معلوم ہوا تھا کہ کملا اور دیگر قیدی تم پر بے پناہ اعتبار رکھتے ہیں اور جہاز میں سفر کے دوران میں تم ہی ان کی دیکھ بھال کرتے رہے ہو۔"

بدبخت مرقص سخت خوف زدہ ہونے کے باوجود چکنا گھڑا ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک ایک بھی ٹھوس بات نہیں بتائی تھی۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا۔ میں ایک دم اٹھا اور پھر سے اس کی لمبوتری گردن دبوچ لی۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔ لیکن تھا ڈھیٹ۔ آخری حد تک خوف زدہ بھی تھا اور اپنے جھوٹ پر اڑا ہوا بھی تھا۔ میں اسے گھسیٹ کر اٹیچ باتھ روم میں لے گیا۔ یہاں باتھ ٹب جھاگ دار پانی سے لبالب بھرا تھا۔ میں نے مرقص کا سر سیدھا ٹب میں گھسیڑ دیا۔ اس کی سانس بند ہونے لگی تو وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ اس کا پاجامہ نما پہناوا کر سے کھسک گیا اور وہ نیم عریاں ہو گیا۔ جب سانس بالکل بند ہونے لگی تو میں نے اس کا سر ٹب سے نکال دیا "ہاں' کہاں ہے کملا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پھر وہی راگنی الاپنے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ اس کا سر پانی میں ڈبو دیا۔ دو چار خوفناک غوطے کھانے کے بعد مرقص کی مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ وہ باتھ روم کے فرش پر گر گیا اور زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس حرکت کا مطلب یہ تھا کہ وہ اگلے غوطے سے بچنا چاہتا ہے اور اس کے بدلے مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کو تیار ہے۔

وہ باتھ روم سے نکلنا چاہتا تھا مگر میں اسے ٹب کے قریب ہی رکھنا چاہتا تھا تاکہ اگلے غوطے کا خوف مرقص کے سر پر سوار رہے اور وہ جھوٹ بکنے سے گریز کرے۔ اس کی حالت اتنی پتلی تھی کہ تین چار منٹ تک اسے اپنی برہنگی کا بھی خیال نہیں آیا اور وہ اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران میں اس نے دو بار قے بھی کی۔ اس کی حالت قدرے سنبھلی تو میں نے ریوالور کی نال ہلاتے ہوئے کہا "ہاں ۔۔۔ بتاؤ کہاں ہے کملا؟"

"میں سچ کہتا ہوں ۔۔۔ مم ۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ وہ ۔۔۔ کنگ کے پاس تھی۔"

"تھی ۔۔۔ کیا مطلب؟" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

"وہ مر چکی ہے۔" مرقص کی آواز میرے کانوں میں بم کے دھماکے کی طرح گونجی۔

میں سکتے کی سی کیفیت میں مرقص کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بولا "وہ مر چکی ہے اور اس کا بچہ اس سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ وہ دونوں کیمپس میں ہی تھے۔"

"کس نے مارا تھا انہیں؟" مجھے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

مرقص کے ہونٹ تھرائے۔ وہ تھوک نگل کر بولا "اس ۔۔۔ اسقف نے اور اس کے دوستوں نے۔"

"یہ اسقف کون ہے؟"

مرقص کے ہونٹ پھر کپکپائے "وہ ۔۔۔ وہ کنگ کا بیٹا

ہے۔"

"کہاں رہتا ہے وہ؟"

"کیمپس میں۔ کنگ کے ساتھ۔"

"کیا کیا ان لوگوں نے کملا کے ساتھ؟" میری آواز دکھ کے بوجھ سے کراہ اٹھی تھی۔

"بس مار دیا۔ کسی کو مار دینا ان کے لیے ایک مشغلہ ہے۔"

"مجھے تفصیل بتاؤ۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"بس... بس وہ ایک دن اس سے کھیلتے رہے' پھر اسے مار ڈالا۔"

"اس پر جنسی تشدد کیا گیا تھا؟"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" وہ فوراً بولا۔

"کیا بکتے ہو۔" میں نے اسے جھانپڑ مارا "درندہ اپنی درندگی سے باز کیسے رہ سکتا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ ہکلایا۔ "تت... تم استقف... کو دیکھو گے تو خود یقین کر لو گے۔" وہ خود کو قریباً گھسیٹتا ہوا باتھ روم کے دروازے کی طرف گیا۔ بیڈ کے ساتھ ہی سائڈ ٹیبل موجود تھی۔ اس نے ٹیبل کی نیچے والی دراز کھولی اور اس میں سے ایک فوٹو البم نکال لیا۔ البم کے شروع میں ہی ایک گروپ فوٹو موجود تھا۔ وہ ایک چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہ ہے استقف۔ اسے عام طور پر ماسٹر استقی کہا جاتا ہے۔ یہ اس کی تازہ تصویر ہے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ موٹی ناک والا ایک سفید فام لڑکا جس کی عمر بمشکل دس گیارہ سال رہی ہوگی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بڑی شان سے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں اور کم عمری میں ہی چہرے سے خشونت اور درشتگی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ بڑا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا' گلے میں سونے کی جڑاؤ زنجیر تھی۔ اس کے دوست بھی حلیے اور تاثرات کے لحاظ سے اس سے ملتے جلتے تھے۔

"اس بچے نے مارا ہے کملا کو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یہی کنگ کا صاحب زادہ ہے۔ باقی لڑکوں میں سے دو اس کے کزن اور دو دوست ہیں۔"

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی دونوں لائٹس اتار لیں۔ اب اگر بستر پر موجود لڑکی جاگ بھی جاتی تو وہ کمرے میں روشنی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ مرقص کی لمبی گردن دبوچی اور اسے پھر سے باتھ روم کے اندر لے گیا۔ میں نے اسے ٹب کے سامنے بٹھا دیا اور خطرناک لہجے میں کہا "دیکھو مرقص! مجھے کنگ اور اس لڑکے کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ورنہ چند منٹ کے اندر اس ٹب میں تمہاری لاش تیرتی نظر آئے گی۔"

میرے لب و لہجے نے خاطر خواہ اثر کیا۔ مرقص ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "یہ کنگ کا بڑا بیٹا ہے اور کنگ کا جانشین بھی۔ کنگ اس کی تربیت اپنے جانشین کے طور پر ہی کروا رہا ہے۔ وہ اسے بے حد دلیر' بے رحم اور پتھر دل دیکھنا چاہتا ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی ماسٹر استقی ہر قسم کے اسلحے کے استعمال سے واقف ہے۔ وہ صرف تفریح کے طور پر کسی راہ جاتے بوڑھے کو گولی مار کر ہلاک کر سکتا ہے۔ ابھی صرف تین چار دن پہلے اس نے ایک نئی آٹو میٹک رائفل ٹیسٹ کرنے کے لیے ایک نائیجیرین بوڑھے کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ کنگ کی ہر توقع پر پورا اتر رہا ہے بلکہ کئی کام ان کی توقع سے بھی بڑھ کر کرتا ہے۔"

البم ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس بچے کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مرقص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ اس بچے کی آنکھوں میں واقعی ایک ایسی خباثت بھری چمک موجود تھی جو اسے دوسروں سے جدا کرتی تھی۔ اس کے اردگرد موجود بچوں کے چہرے بھی معصومیت سے یکسر محروم تھے اور وہ شکل و صورت سے ہی بدمعاش زادے دکھائی دیتے تھے مگر استقی کا رنگ ڈھنگ سب سے جدا نظر آتا تھا۔ مرقص نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ماسٹر استقی اور دیگر لڑکوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی وجہ کے سبب ہی کسی کو قتل کریں۔ وہ عام طور پر صرف تفریح کے لیے ایسا کرتے ہیں اور انہیں اس تفریح کی عادت ڈالنے والے ان کے بڑے ہی ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا ہال ہے۔ اس ہال کے اندر اینٹوں کی مدد سے بھول بھلیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ چھ فٹ اونچی دیواریں ہیں جن کا سلسلہ پورے ہال میں پھیلا ہوا ہے۔ نہتے شکار کو ان بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ماسٹر استقی اور اس کے ساتھی شکار کا پیچھا کرتے ہیں۔ عام طور پر شکار کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ طاقتور ہونے کی صورت میں وہ بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ بس اس شکار کو اذیتیں دے کر مار دیا جاتا ہے۔ اذیت دینے کے بے شمار طریقے ہیں۔ کبھی یہ بچے اسے "کی بوکو" سے پیٹتے ہیں' کبھی چھوٹے چھوٹے خنجروں سے چرکے لگاتے ہیں' جب وہ نڈھال ہو کر گر جاتا ہے تو اس کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے' یا فائرنگ سے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں اکثر اس کی لاش ضیاسیوں کو دے دی جاتی ہے۔"

"یہ ضیاسی کون ہیں؟" میں نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

وہ ذرا سا ہچکچایا۔ گرم پانی سے بھرا ہوا ٹب اس کے سامنے تھا۔ تھوک نگل کر بولا "باس مائیکل اور اس کے قبیلے کے لوگ ضیاسی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ... یہ لوگ..."

"آدم خوری بھی کرتے ہیں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔ مرقص اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"کملا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"اس کے بچے کو... بیچ کر مار دیا تھا بچوں نے۔ بعد میں اسے بھول بھلیوں کے اندر لے گئے۔ دو تین گھنٹے بعد وہ بھی زخمی ہو کر مر گئی تھی۔"

میرے کانوں میں جیسے سیسا انڈیلا جا رہا تھا۔ جو کچھ مرقص بتا رہا تھا اگر سچ تھا تو بڑا ہی خوفناک سچ تھا۔ کملا کی صورت پھر میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ میرے لیے یہ تصور سوہان روح تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کی آس لے کر لاک اپ سے نکلی تھی۔ پتا نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا کیا باتیں تھیں۔ وہ مجھ سے کیا کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اسے بے رحم آفت زادوں کے حوالے کر دیا گیا تھا اور اس کی آخری چیخیں شوخ و شنگ قہقہوں میں ڈوب گئی تھیں۔ میری نگاہ ایک بار پھر یہاں کے سفاک ولی عہد کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔ وہ اپنے ہم جولیوں کے درمیان بڑی شان سے اکڑ کر کھڑا تھا۔ وہ کملا اور اس کے بچے کا قاتل تھا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ ایک بچہ تھا۔ میں چاہتا بھی تو اس سے اتنی نفرت نہیں کر سکتا تھا جتنی ایک درندہ صفت قاتل سے کرنی چاہیے تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے اصل ذمے دار اس کے بڑے تھے۔ اس کا شیطان باپ تھا اور وہ ماحول تھا جس میں اسے پروان چڑھایا جا رہا تھا۔

"ماں بچے کی لاشوں کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں باس مائیکل ہی جانتا ہے۔ غالباً..." مرقص پھر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میں مرقص کے ادھورے فقرے کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ یقیناً وہ لاشیں مائیکل اور اس کے ساتھیوں کے کام آئی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ اس رات کیمپس کے کسی ائرکنڈیشنڈ کمرے میں پانچ چھ ضیاسیوں نے ایک دل پسند کھانا کھایا ہو۔ سوزی نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ اس رات باس مائیکل نے اس کے ساتھ وقت نہیں گزارا تھا اور کیمپس چلا گیا تھا۔ اس قسم کے نجانے کتنے "وزٹ" وہ پہلے بھی کر چکا تھا اور کرتا رہتا تھا۔ ان در و دیوار کے اسرار جتنے کھل رہے تھے اتنے ہی گمبھیر ہو رہے تھے۔

اب مجھے ایک سنہری موقع ملا تھا کہ میں ہیڈ انچارج مرقص سے کچھ پوچھ لوں۔ کم از کم جتنا اسے معلوم تھا وہ تو مجھ تک پہنچ ہی سکتا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں گفتگو کا رخ "ماریا زمنت" کی طرف موڑتا ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ باریک سی نسوانی آواز اس نوخیز لڑکی کی تھی جو بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں دو تین بار یقیناً مرقص ہی کو پکارا تھا' پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک نلکا کھول دیا تھا اور پانی پُرشور آواز سے پلاسٹک کی ایک بالٹی میں گرنے لگا تھا۔ یہ آواز لڑکی کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ مرقص باتھ روم میں ہے۔ میں تین چار منٹ خاموشی سے انتظار کرتا رہا' دوبارہ کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکی دوبارہ سو گئی ہے۔ بہرحال اس کی نیند کچی ہو چکی تھی اور وہ کسی بھی وقت دوبارہ بیدار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے کمرے کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ یوں تو میں دروازہ اچھی طرح بند کر آیا تھا مگر پہرے دار کسی بھی وقت بیدار ہو کر دروازہ چیک کر سکتا تھا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اب زیادہ دیر مجھے یہاں رکنا نہیں چاہیے۔

میں نے پتلون کی جیب میں سے ایک بار پھر اسکریو ڈرائیور نکال لیا۔ یہ اسکریو ڈرائیور مرقص کی گردن کو خاصی اذیت پہنچا چکا تھا' یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں اسکریو ڈرائیور دیکھ کر یرقان زدہ ہو گئیں۔ میں نے پیٹھے جیسے جسم والے مرقص کو باتھ روم کے فرش پر پچھاڑ کر گھٹنا اس کے سینے پر رکھ دیا "مجھے افسوس ہے مرقص! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

خوف سے مرقص کی آنکھیں پھیل گئیں "خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا "میں نے کملا کو قتل نہیں کیا۔ تم جس طرح چاہو میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں۔"

"تم نے قتل نہ بھی کیا ہو' مگر تمہیں زندہ چھوڑ دینا میرے لیے جان لیوا ہے۔"

وہ بلک اٹھا "میں اپنی زبان بند کر لوں گا۔ اپنے ہونٹوں پر تالا لگا لوں گا۔ میں سمجھوں گا۔ میں نے آج کچھ نہیں دیکھا' کچھ نہیں سنا۔ میں کرائسٹ کی قسم کھاتا ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

جاں بخشی کی ہزار ہا اپیلیں ہیڈ انچارج کے چہرے پر درج تھیں اور اس کی حسن پرست آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی اور وہ یہ

کہ مرقص اتنا باہمت اور مضبوط نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا اور جتنا اسے اپنے عہدے کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ آج رات وہ ایک کمزور دل اور ناتواں شخص ثابت ہوا تھا' ایسے لوگ اکثر مہم جوئی سے گریز کرتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ کوئی واردات ہو جائے اور خاموش رہنے میں عزت رہ جاتی ہو اور تحفظ بھی نظر آتا ہو تو وہ خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں' اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ مرقص اپنے ہمکار مائیکل کے سخت خلاف تھا۔ مرقص کی جان بخشی کر کے اسے بعد میں مائیکل کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی مگر دوسری طرف خطرات بھی تھے۔ مرقص اب تو عہد پر عہد کر رہا تھا مگر محفوظ ہونے کے بعد وہ ہر عہد کو ملیامیٹ بھی کر سکتا تھا۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ اسے چھوڑ دوں مگر پھر ذہن نے آخری فیصلہ مرقص کے خلاف ہی دیا۔ میں نے اس کے ہونٹ اپنی ہتھیلی کے ساتھ مضبوطی سے بند کیے۔ "مجھے افسوس ہے مرقص! تمہیں جانا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور آٹھ انچ لمبا اسکریو ڈرائیور دستے تک مرقص کے سینے میں گھس گیا۔ اس کے سیاہ جسم کو شدید جھٹکا لگا اور آنکھیں دہشت آمیز اذیت سے پھٹ گئیں۔ میں نے دوسرا وار چند انچ نیچے کیا۔ دل کے مقام سے خون کا فوارہ چھوٹا اور اس کی بنیان کو بھگونے کے بعد باتھ روم کے فرش کو رنگین کرنے لگا۔ ڈیڑھ دو منٹ میں مرقص ٹھنڈا ہو گیا۔ میں باتھ روم کی کنڈی ہٹا کر بہ آہستگی باہر نکلا۔ نو خیز حسینہ ایک بار پھر گہری نیند میں نظر آئی تھی۔ اس کے جسم پر نہایت مختصر لباس تھا اور مدہوشی کی نیند میں وہ بھی بے ترتیب نظر آ رہا تھا۔ اس کے ریشمی بال پورے تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ باتھ روم کے ادھ کھلے دروازے سے آنے والی روشنی میں انیس کا بے ہوش جسم بھی فرش پر پڑا نظر آ رہا تھا۔ مرقص کی موت کے بعد اب انیس کا "چل چلاؤ" بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا اور اس کی گواہی میرے لیے موت کا پھندا تھی۔ میں اسے قالین پر احتیاط سے گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے آیا۔ قریباً دو منٹ بعد انیس بھی عزت مآب ہیڈ انچارج مرقص کے پاس پہنچ چکا تھا۔

لڑکی معصوم صورت تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ سوئی رہے۔ اس کی نیند ہی اس کی زندگی کی ضمانت تھی۔ وہ جاگ جاتی تو مجھے اس کے نازک جسم میں بھی ایک دوبار اسکریو ڈرائیور اتارنا پڑتا۔ انیس کے خاتمے کے بعد میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ مختلف جگہوں اور چیزوں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ یہاں تک کہ جو ٹیوب لائٹس میں نے اتاری تھیں' انہیں بھی اچھی طرح صاف کرنے کے بعد رومال سے پکڑ کر لگایا۔ ہر طرح اطمینان کرنے کے بعد میں احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ مکان کی بیرونی دیوار پھلانگ کر میں احاطے میں پہنچا۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ٹرسٹ کی عمارت میں سے نکلنے کی کوشش میرے لیے سخت خطرناک ثابت ہوگی۔ میری چھٹی حس کی اطلاع تھی کہ کچھ نادیدہ آنکھیں یہاں ہر وقت نگران ہیں اور فرار کی کوشش ناکام بنانے کے لیے تیار ہیں۔ عین ممکن تھا کہ جس طرح ہرکولیس جہاز پر خفیہ ٹی وی کیمرے نصب تھے' یہاں بھی نازک مقامات پر اس قسم کا انتظام موجود ہو۔

میں مختلف چیزوں کی آڑ لیتا واپس اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ اب میری بچت کا دارومدار اسی پر تھا کہ پہرے دار کے علم میں آئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں پہنچ جاؤں اور نہ صرف کمرے میں پہنچ جاؤں بلکہ کنڈی کو بھی دوبارہ اس کے مقام پر فکس کر سکوں۔ جس طرح کوئی اچھا دن ہوتا ہے وہ ایک اچھی رات تھی' میں نہ صرف سلامتی کے ساتھ واپس کمرے میں گھس گیا بلکہ کنڈی کو دوبارہ فکس کرنے کا موقع بھی مجھے مل گیا۔ پہرے دار مسلسل خوابیدہ تھا۔ بس کبھی کبھی اس کا جسم جھٹکا کھاتا تھا اور وہ دیوار سے پشت ہٹا کر اکڑوں بیٹھ جاتا تھا' لیکن یہ صورتِ حال دو چار منٹ ہی رہتی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر سے باسی مولی کی طرح لٹک کر دیوار سے ٹیک لگا لیتا تھا اور گردن جھکا کر ٹھوڑی سینے پر ٹکا دیتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے کمرے کے باتھ روم میں جا کر ایک مرتبہ پھر اسکریو ڈرائیور اور اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے' اپنے لباس کا جائزہ لے کر میں واپس دروازے کے پاس آ بیٹھا اور کنڈی کو پھر سے کسنے کی کوشش کرنے لگا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ میری غیر موجودگی میں صفدر اور زریں بھی گہری نیند سوئے رہے تھے اور انہیں مطلق معلوم نہیں تھا کہ میں کیا چاند چڑھا کر آیا ہوں۔ دروازے کی سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر باہر سے کنڈی کو اس طرح کسنا کہ آواز بھی پیدا نہ ہو' بڑا جان جوکھم کا کام تھا۔ دانتوں پسینہ لے آنے والے اس کام میں مجھے کم و بیش تین گھنٹے لگے۔ اس دوران میں پہرے دار کے بیدار ہونے کی وجہ سے دو تین بار مجھے کام روکنا بھی پڑا۔ پھر ایک مرتبہ زریں گل بیدار ہو گیا اور باتھ روم میں جا کر دس پندرہ منٹ بیٹھا رہا۔ میں نے زریں پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ

میں جاگ رہا ہوں اور پیچیدہ مکینکی کر رہا ہوں۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا جب میں دروازے کی کنڈی کو دوبارہ اس کی جگہ پر بٹھانے اور لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ میری دونوں کلائیاں اکڑ کر رہ گئی تھیں اور انگلیاں جیسے پھوڑا بن گئی تھیں۔ جس زاویے سے ہاتھوں کو حرکت دے کر میں نے یہ کنڈی لگائی تھی وہ میرے اپنے لیے بھی حیران کن تھا۔ اب مسئلہ آلۂ قتل کو چھپانے کا تھا' اس کے لیے میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے اسکریو ڈرائیور کو روازے... کی سلاخوں میں پھنسا کر تھوڑا سا خم دیا' پھر باتھ روم میں جا کر اس خمیدہ اسکریو ڈرائیور کو فلش میں یوں گھمایا کہ وہ سارا پائپ میں چلا گیا۔ اب فرش اکھاڑے بغیر اس کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

صبح یوں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا تاہم پہرے دار واضح طور پر پریشان نظر آ رہے تھے۔ دس بجے کے قریب جب ہم ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے' ایک پہرے دار ہی کی زبانی ہمیں اطلاع ملی کہ یہاں پاس ہی دو قتل ہو گئے ہیں' اور ان میں سے ایک وہی انیس نامی پہرے دار تھا جو چند روز پہلے یہاں پہرے پر موجود تھا۔ دوسرے مقتول کا نام پہرے دار نے نہیں بتایا۔ شاید وہ ہم سے چھپا رہا تھا یا پھر اس سے بھی چھپایا گیا تھا۔ بہرحال دوپہر تک دوسرے مقتول کا نام بھی قرب و جوار میں گردش کرنے لگا۔ اور یقیناً یہ ایک بڑی خبر تھی۔ ماریا ویلفیئر ٹرسٹ کے ہوسٹل کا ہیڈ انچارج اپنے گارڈ سمیت خواب گاہ میں مردہ پایا گیا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی سے ہی ہمیں پولیس کی آمد و رفت بھی نظر آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کنگ براؤن بھی بنفسِ نفیس ہوسٹل میں موجود ہے۔ بہرحال ہم اس کے "دیدار" سے محروم رہے۔ میں صفدر اور زریں سے کچھ بھی چھپانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا تاہم میرے خیال میں ابھی انہیں بے خبر رکھنا ہی مناسب تھا۔ تاکہ اگر کوئی تفتیشی چکر چلتا بھی تو اپنی کارروائی کا راز داں خود میں ہی ہوتا۔

وہ سارا دن کمرے میں ہی گزرا۔ باہر کے حالات کا ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ رات بھی بغیر کسی اہم واقعے کے گزر گئی۔ ہیڈ انچارج کے قتل کی تفتیش تو یقیناً ہو رہی تھی مگر ہمارے آس پاس اس "تفتیش" کا گزر نہیں تھا۔ اور یہ صورتِ حال میرے لیے تسلی بخش تھی۔ پہرے داروں کی گفت و شنید سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تفتیش کا رخ بڑی سنجیدگی سے کسی اور طرف مڑ گیا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست بھی ثابت ہوا (کچھ دنوں بعد ہمیں پتا چلا تھا کہ مرقص کی ایک لڑکی کے ہی سلسلے میں کسی مقامی سے پرانی رقابت تھی۔ اس قتل کو فوری طور پر اس رقابت کا شاخسانہ قرار دے دیا گیا تھا) قریباً ۴۸ گھنٹے تک میرے ذہن میں خدشات رہے مگر پھر میں پُرسکون ہو گیا۔ کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ایک مقفل کمرے کے اندر سے نکل کر اور پہرے دار کو جُل دے کر ہم میں سے کوئی ایسی کارروائی کر سکتا ہے۔ تیسرے روز رات کو میں نے صفدر اور زریں گل کو سب کچھ بتا دیا' وہ حیرت سے گنگ بیٹھے رہے۔ صفدر کو زیادہ حیرت ہوئی کیونکہ وہ زریں سے زیادہ چوکس اور باخبر شخص تھا۔ وہ حیران تھا کہ میں کمرے سے باہر گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹا باہر رہا اور پھر واپس بھی آیا۔ اس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں نے کملا اور اس کے بچے کی موت کی اطلاع دی تو ان دونوں کے چہرے بھی رنج و غم کی تصویر بن گئے۔ یہ بات شروع میں انہیں بھی ناقابلِ یقین محسوس ہوئی کہ کملا اور اس کے بچے کا قاتل دس گیارہ سالہ ایک بچہ ہے۔ کملا کی موت کا سن کر زریں کی آنکھوں میں تو باقاعدہ آنسو چمکنے لگے۔ کملا کی زندگی کے بارے میں اب تک وہی سب سے زیادہ پُرامید تھا۔ وہ کئی بار کہہ چکا تھا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ام اس لڑکی کو پھر سے ہنستا مسکراتا دیکھے گا۔" اس کے دل کی یہ گواہی غلط ثابت ہوئی تھی۔

اس رات ہم تینوں جاگتے رہے اور واقعات کی اس نئی کروٹ کے بارے میں سوچتے رہے۔ ہم صاف دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک بدترین مقام پر ہیں اور ہمارا واسطہ بدترین لوگوں سے ہے۔ آرم خور مائیکل کا کردار ہی کچھ کم بھیانک نہیں تھا' اب یہ کنگ براؤن اور اس کا توعمرولی عہد سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے زیرِ زمین جرم کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی اور دہشت گردی اور سفاکی کے ریکارڈ قائم کر رہے تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس "ماریا ٹرسٹ" کے دو روپ ہیں۔ دو چہروں والی ایک بھیانک تصویر' جس کا اُجلا چہرہ عام لوگوں کے لیے ہے اور تاریک و گھناؤنا چہرہ خاص الخاص لوگوں کے لیے۔ ابھی ہم نے اس تاریک چہرے کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھی تھی۔ معلوم نہیں کہ پس منظر میں کیا کچھ تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے پھر کمرے سے نکالا گیا۔ پہرے داروں نے بتایا کہ مجھے پھر کیمپس میں لے جایا جا رہا ہے۔ ایک بار پھر ہم اسی راستے سے نکل کر انہی مراحل سے گزرے۔ رنگین شیشوں والی اسٹیشن ویگن' آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں ڈاٹ۔ پندرہ بیس منٹ کے تیز رفتار اور "چکر دار" سفر کے بعد ہم کسی عمارت کے مین گیٹ میں داخل

ہوئے اور پھر ایک طویل راہداری سے گزر کر' جہاں قدموں کی آواز دور تک گونجتی تھی' اس ہال میں پہنچ گئے جہاں چار نہایت جدید لفٹس نصب تھیں۔ یہاں میری بصارت اور سماعت کو آزاد کر دیا گیا۔ پہلے کی طرح رجسٹر میں ہمارا اندراج ہوا۔ پھر ہمیں ٹوکن فراہم کیا گیا اور تلاشی وغیرہ کے مراحل سے گزر کر ہم لفٹ میں داخل ہو گئے۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ خود کو اسی لاک اپ کے سامنے پایا جہاں دو روز پہلے اترپردیشی قیدیوں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی' آج میرے اندر ان لوگوں کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں تھی اور کملا کی ماں کا سامنا کرنے کی طاقت تو بالکل نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کی بیٹی اور شیر خوار نواسہ میرے پاس ہیں۔ میں پرسوں اسے تسلی دے کر گیا تھا کہ اس کی لاڈلی بیٹی بہت جلد اس کے پاس ہو گی۔ یقیناً وہ شدت سے کملا کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس دکھیاری کو بیٹی اور نواسے کی دردناک موت کی خبر سناؤں۔ میں نے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کی اور لاک اپ میں داخل ہو گیا۔ تمام لوگ دیوانہ وار میرے گرد جمع ہو گئے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے تھے۔ وہ مجھ سے اپنا دکھ سکھ بیان کرنے لگے' ان میں لڑکیاں بھی تھیں' عورتیں بھی' مرد اور بچے بھی۔ وہ سب اتنی عقیدت اور ستائش سے مجھے دیکھتے تھے کہ شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ کملا کی ماں نے پوچھا کہ کملا نہیں آئی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔

ایک دم اس کی آنکھوں میں سیکڑوں اندیشے جاگ اٹھے "ہائے رام۔ کا کہوت ہو۔"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا "سیڑھیوں سے گر گئی تھی' سر اور سینے پر چوٹ آئی ہے' اسپتال میں ہے۔ اب پہلے سے کچھ ٹھیک لگتی ہے۔"

وہ ایک دم رونے لگی۔ اس کی آواز نوحے سے مشابہ تھی۔ "ہر کوئے مصیبت ہم غریبن کے واسطے۔ رام ہم جیسو کا ہے کو جگ میں اوتت۔ ہائے میری کملا۔" پھر وہ اپنے نواسے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

میں نے بتایا کہ حادثے کے وقت وہ بھی کملا کی گود میں تھا۔ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں' لیکن زیادہ چوٹ کملا کو لگی ہے۔ میں اس عورت کو ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار کر رہا تھا جو اسے پہنچنے والا تھا۔ وہ واویلا کرنے لگی۔ میرے پاؤں میں سر رکھنے لگی کہ میں اسے اس کی بیٹی کے پاس لے جاؤں۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں۔ اسے تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ وہ کسی صورت چپ نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا رونا دھونا دوسرے افراد کو بھی متاثر کر رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے دیکھ کر جو چہرے کھل اٹھے تھے وہ پژمردہ نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سیوک کمار کو ایک طرف لے جا کر بتایا کہ فی الحال اس کی بیٹی کی حالت ایسی نہیں کہ وہ اس سے مل سکے۔ اسے ذرا اپنی زبان میں سمجھاؤ۔

سیوک کمار میری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "ہماری بیٹی کو کوئے خطرہ تو نا ہیں؟"

میں نے کہا "بس تم پرارتھنا کرو۔ بھگوان اچھا کرے گا۔"

میں اس کو کیسے بتاتا کہ وہ خطرے اور سلامتی کے مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ اسے مار دیا گیا ہے اور اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ زندہ تھی۔ وہ کچھ ایسے لوگوں کے قبضے میں چلی گئی تھی جو صرف تفریح کی خاطر زندگی کو رلا رلا کر موت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس بے اماں چار دیواری کے اندر وہ اس گروپ میں سے پہلی ستم رسیدہ تھی' ابھی نجانے کس کس کو کیسے کیسے انداز میں تختہ مشق بننا تھا۔ آثار کہہ رہے تھے کہ یہ ایک طویل رات کا آغاز ہے' یہ ایک بیکراں کرب کی پہلی ٹیس اور ایک لامحدود نوحے کی پہلی سسکی ہے۔

سیوک کمار نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ سرگوشی میں بولا کہ میں ان پر رحم کروں' کسی طرح سے ان سب کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔

میں نے کہا "سیوک! یہ سب اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دھیرج اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

جواب میں اس نے عجیب اعتقاد کے ساتھ والہانہ انداز میں کہا "پربھو! تم سب کچھ کر سکت ہو۔ تمہارے نجدیک کوئے بھی مسکل ناہیں۔"

یعنی اے ہمارے مالک! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ تمہارے لیے کوئی مشکل بھی مشکل نہیں۔

میں نے کہا "سیوک! بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ مالک تو بس اوپر والا ہے۔ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ اور اگر یہاں تھوڑی بہت میری حقیقت ہے بھی تو مجھ سے بڑی بڑی حقیقت والے بھی یہاں موجود ہیں۔ لہٰذا مجھ سے بہت زیادہ آشائیں مت باندھو' ہاں جو کچھ مجھ سے ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔"

کچھ دیر بعد پہرے دار مجھے لے کر لاک اپ سے باہر نکل آئے۔ میرا خیال تھا کہ اب ہم واپس لفٹوں کی طرف

جائیں گے لیکن پہرے داروں نے مجھے دوسرے رخ پر چلنے کو کہا "اب کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ایک پہرے دار گمبھیر آواز میں بولا "کنگ تمہیں شرفِ ملاقات بخش رہے ہیں۔"

میرے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ ایک عرصے سے میں کنگ کے بارے میں سن رہا تھا آج اس سے ملاقات بھی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سپوت کی جس "اعلیٰ انداز" میں تربیت کر رہا تھا اور اس تربیت کے نتیجے میں سپوت جیسے کارنامے انجام دے رہا تھا... اس کے بارے میں جان کر کنگ کی "قدر و منزلت" میری نگاہ میں اور بڑھ گئی تھی۔ ایک طویل راہداری میں قدم اٹھاتے ہوئے میں کنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ مین کوریڈور سے ہم ایک برانچ کوریڈور میں مڑ گئے۔ راہداریوں کے اس زیرِ زمین سلسلے کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ ساری "تعمیر" کسی کان وغیرہ کا حصہ ہو۔ بعض اوقات کچھ کانوں میں کام ختم کر دیا جاتا ہے لیکن زیرِ زمین سرنگوں کا وہ جال موجود رہتا ہے جو کان کنی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ تھا۔ راستے میں نیلی وردیوں والے مرد و زن ملے۔ ان میں سے اکثریت کے چہروں پر خشونت اور بے رحمی رچی تھی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ اکثر باوردی خواتین نے بھی کمر سے ریوالور وغیرہ لٹکا رکھے تھے۔ بردوں کے سہمے سہمے گروہ بھی مجھے یہاں وہاں نظر آئے پھر ایک دروازے میں لگے ہوئے شیشے میں سے میں نے ایک کلاس روم دیکھا۔ یہاں سات آٹھ سال کے طلبہ و طالبات موجود تھے۔ ان میں مجھے کئی نسلوں اور رنگوں کے بچے نظر آئے۔ لڑکوں کے سر مونڈ دیے گئے تھے۔ ان بچوں کے چہروں سے ہی مظلومیت اور محکومیت چھلکتی تھی۔ ان ہی راہداریوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے کہیں پاس سے تیز چیخیں بھی سنائی دیں۔ یہ چیخیں کسی عورت یا بچے کی تھیں۔ ان چیخوں کے ہمراہ کی بوکو کی شائیں شائیں بھی صاف سنی جا سکتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کی بوکو یعنی مخصوص چھڑی کا استعمال یہاں بلا تردد اور بلا دریغ کیا جاتا ہے۔ یہاں کئی باوردی مرد و زن کو میں نے دیکھا جو کی بوکو لیے آزادانہ پھر رہے تھے' جیسے یہ ایذا رسانی کا آلہ نہ ہو' واکنگ اسٹک یا چھتری وغیرہ ہو۔ میں اس کیمپس کی وسعت اور جدت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ماریا ٹرسٹ کی عمارت اس عمارت کے مقابلے میں ایک استقبالیہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ جلد ہی ہم ایک شاندار آفس نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں مکمل خاموشی تھی۔ فرش پر دبیز قالین' دیواروں پر نمائشی پلیٹیں۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ آرام دہ نشستیں اور ایک بہت بڑی شاندار میز جس کے پیچھے ایک قیمتی کرسی موجود تھی۔ میز کے عقب میں دیوار پر کسی بہت پرانے بوسیدہ انگریز کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ اس تصویر کے طلائی فریم میں نگینے دمک رہے تھے۔ مجھے اس مرعوب کن فضا میں پہنچا کر آفس کا خصوصی گارڈ دروازے سے باہر کھڑا ہو گیا۔ ایسا ہی ایک گارڈ آفس کے اندر موجود سیڑھیوں پر چوکس کھڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کنگ براؤن کو انہی سیڑھیوں سے اتر کر تشریف فرما ہونا تھا۔ میں ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا اور دھڑکتے دل سے کنگ کا انتظار کرنے لگا۔ سیڑھیوں پر موجود پہرے دار بھی ساکت و جامد تھا۔ پہلی نظر میں یہ شک گزرتا تھا کہ شاید وہ پتھر کا مجسمہ ہے۔ اس کی کمر سے چاندی کے دستے والا ایک نہایت قیمتی پسٹل جھول رہا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی جس پر سامنے کی طرف M.T کے الفاظ موجود تھے۔

میں قریباً آدھ گھنٹے تک اکڑوں نشست پر بیٹھا رہا پھر باہر والا گارڈ اندر آیا اور اس نے شستہ انگریزی میں مجھے بتایا کہ کنگ کچھ لیٹ ہیں' میں آرام سے تشریف رکھوں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ مسلسل انتظار کرتے ہوئے آرام سے تشریف کیسے رکھی جا سکتی ہے' بہرحال میں بیٹھا رہا۔ اچانک میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ کوئی شے اڑتی ہوئی آئی اور چٹاخ سے میرے چہرے پر لگی۔ یہ ایک انڈا تھا جو عین میری پیشانی پر ٹوٹا تھا اور زردی و سفیدی میرے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میں بوکھلا کر اٹھا اور جیب سے رومال نکالا۔ اسی دوران میں ایک اور انڈا میرے کان پر لگا اور گردن تک بہہ گیا۔ چاروں طرف دیکھا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ سیڑھیوں پر کھڑا گارڈ اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ اس نے الماری میں سے ایک تولیا نکال کر ادب سے میری طرف بڑھا دیا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کون ہے یہ؟"

گارڈ نے جواب نہیں دیا۔ بس اس کا نچلا ہونٹ مسکانے والے انداز میں تھوڑا سا کھنچ گیا۔ میں نے گردن اور چہرہ صاف کیا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ اب تک جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ کنگ کا بگڑا تگڑا بیٹا ماسٹر اسٹی ایک مجسم آفت ہے۔ ابھی جو شرارت میرے ساتھ ہوئی تھی وہ اسی آفت زادے یا اس کے کسی شکی ساتھی کا کام ہو سکتی تھی "یہ کون حرام زادہ ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

سیڑھیوں پر کھڑے سفید فام گارڈ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ

میرے قریب آیا اور دھیمے لیکن کرخت لہجے میں بولا "ادب ملحوظِ خاطر رہے۔ یہ ماسٹر اسحٰق کے دوست ہیں۔"

ابھی اس کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ سیڑھیوں کے آخری سرے پر واقع ایک کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھلا، اس میں ایک ہاتھ کی حرکت دکھائی دی اور ایک اور انڈا تیرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس مرتبہ شاید پھینکنے والے کا نشانہ تھوڑا سا چوک گیا، انڈا گارڈز کی کنپٹی پر لگا اور اس کا مواد گارڈ کے چہرے پر پھیل گیا۔ گارڈ جوں کا توں کھڑا رہا۔ یہ انڈا سخت بدبودار تھا۔ پورے کمرے میں کراہت آمیز بو پھیل گئی۔ کھڑکی کے عقب سے ایک دبی دبی ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ گارڈ کے چہرے پر سلوٹ تک نہیں آئی۔ اس نے بو ختم کرنے کے لیے ایئرکنڈیشنر کے شٹرز کو اوپن پر سیٹ کر دیا، پھر الماری سے ایئر فریشنر نکال کر تھوڑا سا اسپرے کیا۔ اس کے بعد باتھ روم میں جا کر چہرہ صاف کیا اور واپس اپنی جگہ پر اٹین شین کھڑا ہو گیا۔

میں رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا اور کسی بھی نئی شرارت کے لیے تیار تھا مگر شرارت نہیں ہوئی، اس کے بجائے ایک مجسم شیطان مجھے نظر آ گیا۔ یہ مائیکل تھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف سے ہی نمودار ہوا۔ ہمیشہ کی طرح تھری پیس سوٹ میں ملبوس، سرخ ٹائی لگائے ہوئے وہ بڑا بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ مائیکل سے میری آخری ملاقات کئی روز پیشتر زسٹ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہوئی تھی۔ میں کوٹھڑی کے اندر اور مائیکل باہر تھا۔ اس وقت مبارک امین تازہ تازہ مرحوم ہوا تھا۔ اپنے دوست کے قتل پر مائیکل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ فرطِ طیش میں اس نے کی بو کوسے میری چمڑی ادھیڑنے کی کوشش کی تھی مگر قدرت نے میری مدد کی تھی۔ مائیکل کو کنگ کی طرف سے فوری بلاوا آ گیا تھا اور وہ واپس چلا گیا تھا۔ آج پھر وہ میرے روبرو تھا۔ تاہم آج وہ خاصا پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی مستی آمیز اطمینان تھا جو انتہائی پھرتیلے اور خوں خوار درندوں کی آنکھوں میں پایا جاتا ہے۔

وہ میز کے عقب میں جا کر زرنگار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بالوں بھرے ہاتھ میز کی شفاف سطح پر رکھ دیے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر لیں۔ اس کی کلائی پر ڈائمنڈ راڈو گھڑی جگمگا رہی تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! مجھے افسوس ہے کہ کنگ مصروف ہیں، وہ تم سے مل نہیں سکیں گے۔ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے میرا لہجہ بڑے اطمینان سے برداشت کیا اور بولا "تمہارے لیے کنگ کے کچھ کمپلیمنٹس ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ سمجھو کہ میں کنگ کی جانب سے تم سے مخاطب ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "بحری جہاز ہرکولیس میں اور پھر یہاں کیمپس میں تم نے جس طرح انڈین بردوں کو کنٹرول کیا ہے وہ قابلِ تعریف کام ہے۔ اس سے تمہاری فہم و فراست اور تمہارے اندر چھپی ہوئی انتظامی صلاحیتوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ کنگ ایسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں اور ان سے خصوصی رعایت کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ایسے ہی انڈین بردوں کا ایک اور گروپ بھی موجود ہے۔ ان لوگوں کو کنٹرول کرنا بھی کافی دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ کنگ کو توقع ہے کہ تم اس سلسلے میں تعاون کا ہاتھ بڑھاؤ گے۔"

"میں ہر اس کام میں تعاون کرنے کو تیار ہوں جس سے دکھی لوگوں کے دکھ کم ہو سکتے ہوں، اس حوالے سے میرے ساتھیوں کی خدمات بھی حاضر ہیں۔"

مائیکل نے کہا "یہاں پہنچ کر تم سے ایک سنگین غلطی سرزد ہوئی ہے۔ تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی ہے اور ایک شخص (مبارک امین) تمہارے ہاتھوں قتل بھی ہوا ہے۔ کنگ اس معاملے کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس جرم کے لیے تمہیں تھوڑا بہت ریلیف دے دیا جائے لیکن یہ ریلیف تمہارے اچھے رویے سے مشروط ہوگا۔"

چند لمحے توقف کر کے مائیکل نے اپنے قیمتی لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور بولا "تمہاری نسبت سے ایک مسئلہ جوزف کی گمشدگی کا بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ چنداں مشکل نہیں کہ ہم تم پر یا تمہارے ساتھیوں میں سے کسی ایک پر سختی کر کے جوزف کے بارے میں درست صورتِ حال معلوم کریں مگر ہم اپنے اور تمہارے درمیان اچھی فضا برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ تم بھی ایسا ہی چاہو گے۔ لہٰذا جوزف کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے متعلق سچ بتا کر تم اپنے لیے آسانیاں پیدا کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ سچ مجھے کنگ کو بتانا پڑے گا یا تمہیں؟"

وہ بولا "اس وقت میں تمہارے ساتھ کنگ ہی کی طرف سے مخاطب ہوں نہ۔"

میں نے کہا "جوزف کے بارے میں جو کچھ میں نے سوزی کو بتایا تھا وہی سو فی صد سچ ہے۔ جوزف اب اس دنیا میں نہیں۔ بوڑھے واراب کی رہائش گاہ پر دو طرفہ فائرنگ میں اسے مبارک کے کارندوں کی گولی لگی تھی۔ ہم نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔"

"اس کی لاش کہاں ہے؟"

"مبارک امین کے ایک دوست پولیس انسپکٹر تابش کی رہائش گاہ میں۔ رہائش گاہ کے پچھواڑے واقع احاطے میں اسے دفن کیا گیا تھا۔ اگر تم وہ لاش پا سکو تو وہ خود ہی گواہی دے گی کہ اس کے قاتل مبارک امین کے کارندے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ گولی ابھی تک لاش ہی میں موجود ہے جو جوزف کی ہلاکت کا سبب بنی۔ وہ گولی ان رائفلوں میں سے کسی ایک سے چلائی گئی تھی جو مبارک کے ساتھیوں کے پاس موجود ہیں۔"

مائیکل نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا، اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ میری تاویل کو بری طرح رد کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔ شاید وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ کسی طرح کی تلخی کو ہوا نہیں دے گا۔ ورنہ میرے لیے جس قسم کے "دوستانہ" جذبات اس کے دل میں تھے وہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ آدمیت کا لبادہ اتار کر ابھی آدم خور درندہ بن جاتا اور مجھے اپنے دانتوں اور پنجوں سے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا۔ بہرحال میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مبارک امین کا دکھ بھولے گا نہیں۔ موقع ملتے ہی مجھ پر کوئی کاری وار کرے گا۔ بحری سفر کے دوران میں مجھے مائیکل کی غیر معمولی عیاری اور چال بازی کا اندازہ ہو چکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" مائیکل نے رعونت سے کہا۔

"لیکن میں بھی تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" مائیکل نے جواباً کچھ نہیں کہا بس کڑے تیوروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "میرا ایک مسئلہ ہے اور وہ تم لوگوں کا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ اترپردیشی قیدیوں میں ایک نوعمر لڑکی کملا تھی۔ وہ اپنے بچے سمیت غائب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا کسی درندے کی درندگی کا شکار ہو گئی ہے بہرحال تمہارے لوگوں نے اترپردیشی قیدیوں کو یہ بتایا تھا کہ اس بدنصیب کو میرے حکم پر لاک اپ سے لے جایا جا رہا ہے۔ اب وہ سارے یہی سمجھتے ہیں کہ لڑکی میری حفاظت میں ہے۔ یہ میرے لیے بڑی تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ یا تو اس لڑکی کو اپنے بچے سمیت واپس آنا چاہیے یا پھر ان انڈین قیدیوں کو یہ باور کرایا جانا چاہیے کہ لڑکی اور بچہ میرے پاس نہیں تھے۔"

"تم یہ مسئلہ کنگ کے سامنے بیان کرو تو بہتر ہوگا۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا تھا مگر معلوم نہیں وہ کب شرفِ ملاقات بخشیں گے۔"

"بہرحال میں اس بارے میں رپورٹ مانگتا ہوں اور کنگ کو بھی باخبر کروں گا۔" مائیکل نے گفتگو ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے بڑی مشکل سے برداشت کر رہا ہے۔

"یہ معاملہ تاخیر کرنے والا نہیں ہے۔" میں نے وارننگ کے انداز میں کہا "قیدیوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات ابھر رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ان کی نگاہوں میں، میں اعتبار کھو دوں۔"

میں اٹھا اور گارڈز کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گارڈز مجھے لے کر مین کوریڈور میں آ گئے، ہمارا رخ لفٹوں کی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے واپس لے جایا جا رہا ہے۔ ابھی ہم لفٹوں سے قریباً نصف فرلانگ دور تھے کہ عقب سے دو باوردی سیاہ فام تیز قدموں سے آئے اور انہوں نے میرے ساتھ چلنے والے گارڈز سے کچھ کھسر پھسر کی۔ کھسر پھسر کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑے ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہاں لانے والے دونوں گارڈز عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان نظروں میں استہزائیہ انداز تھا اور اس کے ساتھ ساتھ "رحم" کی جھلک بھی تھی۔ وہ جیسے اچانک ہی میرے انجام کے بارے میں فکرمند ہو گئے تھے۔ "کیا بات ہے؟ ہم رک کیوں گئے ہیں؟" میں نے ایک گارڈ سے پوچھا۔

"بس تمہاری قسمت ہی ایسی ہے۔ لگتا ہے کہ آج کی رات تم کیمپس میں ہی رہو گے۔" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے بولا "کنگ کے آفس میں کیا واقعہ ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے باس مائیکل سے بات چیت ہوئی۔"

"اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا تھا؟"

"کیا مطلب؟"

"تم اپنی زبان کو لگام دے کر رکھتے تو اچھا تھا۔ تم نے ماسٹر اسحٰق صاحب کے ایک دوست کو گالی دی۔ شاید تمہیں

معلوم نہیں ہنگ کے بعد ماسٹر استقی اس کیمپس کے سب سے اہم اور قابلِ احترام فرد ہیں۔ اب ماسٹر نے تمہیں بلایا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ ابھی معلوم نہیں لیکن تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا۔"

انگریزی داں گارڈ نے دوستانہ لہجے میں کہا "دیکھو ماسٹر کے دوست کو گالی دینے کی غلطی تم پہلے ہی کر چکے ہو' اب مزید کوئی غلطی نہ کرنا۔ ماسٹر اگر غصہ دکھائیں' یا کوئی سزا دیں تو خاموشی سے قبول کر لینا۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور سلامتی ہے۔"

اسی دوران میں وہ دونوں گارڈز واپس آ گئے جنہوں نے میرے ساتھ آنے والے گارڈز سے کھسر پھسر کی تھی۔ یہ چاروں گارڈز مجھے لے کر مختلف راہداریوں سے گزرے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا کسی نے مجھے خصوصی توجہ کے قابل نہیں سمجھا' یہاں میں نے ایک بات نوٹ کی۔ ہر قیدی یا بردے کی کلائی میں ایک آہنی رِنگ نظر آ رہا تھا۔ اس رِنگ پر بردے کا نمبر اور دیگر کوائف درج تھے۔ راہداریوں میں آتے جاتے بردوں میں زبردست نظم و ضبط دکھائی دے رہا تھا۔ وہ باوردی گارڈز کے ایک ہلکے سے اشارے پر باجماعت عمل کرتے تھے۔ بالکل جیسے وہ کسی پریڈ میں حصہ لے رہے ہوں۔

ہم ایک لمبوترے کمرے میں پہنچے۔ یہاں ایک طرف کلینک کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی سی میز اور دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ اس حصے کو مشورہ گاہ کی حیثیت دی گئی تھی اور دیوار پر باقاعدہ مشورہ گاہ کا اسٹکر بھی چسپاں کیا گیا تھا۔ اچانک ایک نرس کلینک کے اندرونی حصے سے نکلی۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ عجیب اوٹ پٹانگ سی چیز تھی۔ چھوٹا سا قد تھا' سر پر شاید سرخ بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دس بارہ سالہ لڑکا ہے۔ اس نے اپنے جسم کو بڑی بے حیائی سے نسوانی روپ دے رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ادویات کی ٹرے پکڑے اور اونچی ایڑی پر کھٹ کھٹ چلتا یہ بہروپیا پھر سے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے سفید گاؤنوں میں دو ڈاکٹر صاحبان دیکھے۔ یہ بھی چنچل لڑکے ہی تھے۔ ان کی عمریں پندرہ سال سے کم تھیں۔ انہوں نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتے اندر چلے گئے۔ ان بہروپیے لڑکوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے وہ فوٹو البم یاد آ گیا جو تین روز پہلے میں نے مرقس کے ڈرائنگ روم میں دیکھا تھا۔ اس البم میں ماسٹر استقی اور اس کے چند خرانٹ صورت دوستوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ابھی جو دو "جعلی ڈاکٹر" میں نے دیکھے تھے وہ ان دوستوں میں سے ہی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شیطان زادے ماسٹر استقی سے بھی میری ملاقات ہونے والی ہے۔ ماریا ٹرسٹ میں آنے کے بعد اس شیطان زادے سے ایک دن تو ملاقات ہونا ہی تھی' چلو اچھا تھا کہ جلدی ہو رہی تھی۔

میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کا ولی عہد اور اس کے نوعمر دوست کوئی 'کھیل' کھیل رہے ہیں۔ سامنے شیشے کی ایک دیوار تھی۔ جس کی دوسری جانب پردہ کھنچا ہوا تھا۔ اندر سے "اف۔۔۔ آہ" کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر احتیاط سے پردے کی جھری میں سے جھانکا۔ اندر مجھے تین کم سن ڈاکٹرز اور دو نرسیں نظر آئیں۔ ایک کم سن ڈاکٹر جس نے منہ پر باقاعدہ ماسک چڑھا رکھا تھا' ایک عورت کو انجکشن لگا رہا تھا۔ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی یہ عورت نما لڑکی ڈاکٹر سے عمر میں کم و بیش تین گنا بڑی تھی۔ پتا نہیں کہ کھیل کھیل میں اس بے چاری کو یہ شیطان زادے کتنے انجکشن ٹھونک چکے تھے اور ابھی ٹھونک رہے تھے۔ غالباً وہ "ڈاکٹر مریض" قسم کا کھیل' کھیل رہے تھے۔

قریباً پانچ منٹ بعد اس نوجوان عورت کی جان چھوٹی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا وہ اپنے کولھے سہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ "ڈاکٹر صاحبان" اور نرسیں باہر نکلے اور میری طرف متوجہ ہو گئے۔ جو نوعمر بچہ عورت کو انجکشن ٹھونک رہا تھا اب ماسک میں نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ وہ یہاں کا عزت مآب ولی عہد ماسٹر استقی تھا۔ اس گورے چٹے بچے کی آنکھیں براؤن تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو مجھے کبھی کسی بچے کی آنکھوں میں دکھائی نہیں دی۔ اس کی موٹی ناک اور ذرا ابھری ہوئی پیشانی اسے ایک کرخت اور شریر بچہ ظاہر کر رہی تھیں۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق تیرہ سال کے قریب تھی۔ وہ اپنے پاس کھڑے ایک دراز قد لڑکے سے مخاطب ہو کر صاف انگریزی میں بولا "جم! کیا یہی وہ بندہ ہے جس نے تمہیں گالی دی تھی؟"

جم نامی اس دبلے پتلے لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماسٹر استقی چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اس نے میز سے تھرما میٹر اٹھا کر اپنے ساتھی لڑکے کو دیا اور میری طرف اشارہ کیا۔

لڑکا جس نے بھونڈے انداز میں نرس کا روپ دھار رکھا تھا نسوانی انداز میں چلتا میری طرف آیا اور تھرما میٹر میرے منہ میں رکھنا چاہا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

نرس نما لڑکا بولا "تھرما میٹر کے بغیر ہی پتا چل رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔ کافی تیز حرارت ہے۔"

سب لڑکوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ماسٹر استقی بڑی شان سے بولا "ٹھیک ہے' انجکشن لگا دیتے ہیں' مریض کو اندر لاؤ۔"

نرس لڑکے نے گارڈ کو اشارہ کیا۔ فوراً دو گارڈز اندر آ گئے۔ انہوں نے مجھے شیشے کی دیوار سے دوسری طرف چلنے کو کہا۔ میں دیوار کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں ایک اسٹریچر اور ایک بیڈ تھا' اس کے علاوہ کوک کی دو بوتلیں پڑی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا تھوڑی دیر پہلے نوجوان عورت کو جو انجکشن لگائے جا رہے تھے' ان میں کوک ہی بھری ہوئی تھی۔ بگڑے تگڑے شہزادے مجھے بڑی زہریلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماسٹر استقی کی حیثیت ان میں پروفیسر ڈاکٹر کی سی تھی۔ اس نے کہا "مریض کو بھاری ڈوز کی ضرورت ہے اس کے لیے کم از کم ساٹھ سی سی کا انجکشن تیار کرو۔" جس لڑکے نے نرس کا روپ اختیار کر رکھا تھا اس نے الماری میں سے ساٹھ سی سی کی دیو ہیکل سرنج نکالی اور اس پر ایک موٹی تگڑی سوئی لگا دی' بلکہ اسے سُوا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ سرنج کو کوک کی بوتل میں ڈبویا گیا تو قریباً ایک تہائی بوتل سرنج میں سما گئی۔ نرس نے پھر گارڈز کو اشارہ کیا۔ گارڈ نے سخت لہجے میں مجھ سے کہا "اپنا ٹراؤزر اتارو اور بیڈ پر لیٹ جاؤ۔"

"تاکہ تم یہ سُوا میری پُشت میں گھونپ سکو؟" میں نے کپتان سے کہا۔

"جیسا کہا گیا ہے ویسا کرو۔" گارڈ کا لہجہ کرخت تھا۔

اس نے مجھے بیڈ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ یہ دھکا اس کی توقع سے زیادہ زوردار تھا۔ لڑکھڑاتا ہوا ایک میز پر جا گرا' دوسرا گارڈ آگے بڑھا تو میں نے اسے بھی دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا "ٹھہرو ٹھہرو۔" ماسٹر استقی دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا "تیز بخار کی وجہ سے مریض نیم پاگل ہو رہا ہے۔ اسے دوسرے انتظام کی ضرورت ہے۔"

پھر اس نے سرگوشی کے لہجے میں ایک گارڈ سے کچھ کہا۔ گارڈ باہر گیا اور فوراً ہی ایک دوسرے شخص کے ساتھ واپس آ گیا۔ یہ پہلوان نما شخص کم و بیش سات فٹ اونچا تھا۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ بالائی جسم کا ہر ہر مسل نمایاں تھا۔ ایک بازو پر سامنے کی طرف انگریزی میں "خاموش موت" کے الفاظ لکھے تھے۔ ایسے عظیم الجثہ پہلوان ٹی وی پر دکھائی جانے والی کشتیوں میں عام نظر آتے ہیں' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے صفاحت سروانے اس پہلوان کو میں نے فری اسٹائل کشتیوں میں کہیں دیکھ بھی رکھا ہے۔ ماسٹر استقی نے پہلوان سے کہا "ڈیتھ! یہ مریض ذرا ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اسے بیڈ پر لٹاؤ تاکہ اس کا علاج کیا جا سکے۔"

حکم کی دیر تھی کہ سفید فام پہلوان میری طرف بڑھا۔ اس نے میری گردن اپنے بازو میں دبوچنے کی کوشش کی تھی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میرے کندھے کے اوپر سے قلابازی کھا کر فرش پر گرے گا اور اسے پتا بھی نہ چل سکے گا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ فرش پر گر کر پہلوان چند لمحے تو ساکت پڑا رہا' پھر جیسے اس کے بدن میں بجلی کوندی اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ غصے اور شرم کی سرخی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے خوفناک انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے اور اس مرتبہ احتیاط سے میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھ پر اپنا بایاں مکا چلایا۔ میں نے یہ وار جھک کر بچایا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ پہلوان کھبا ہے۔ باکسنگ میں ایسے باکسر کو ساؤتھ پا کہتے ہیں۔ ساؤتھ پا باکسر کو جھک کر زوردار پنچ لگانا آسان ہوتا ہے۔ میں نے یہی تکنیک استعمال کی' اور پہلوان کی صرف دو ضربوں کے بدلے میں نے اسے سات آٹھ "ضرباتِ کلیم" لگائیں۔ اس کی ناک اور بالائی ہونٹ سے خون جاری ہو گیا۔ جب پہلوان نے خود کو باکسنگ میں ناکام ہوتے دیکھا تو جوڈو اور ریسلنگ پر آ گیا۔ اس میں کافی زور تھا اور جسم بھی ورزشی تھا لیکن نورا کشتیاں لڑ لڑ کر اس میں قوتِ برداشت رہی تھی اور نہ اسٹیمنا۔ میں نے دو چار منٹ میں اس کی ساری پھنے خانی نکال دی۔ ہمارے گرد تماشائیوں کا حلقہ سا بن گیا تھا اور شیطان زادوں سمیت بہت سے افراد دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ گارڈز کے ریوالور وغیرہ اب ان کے ہاتھوں میں نظر آنے لگے تھے لیکن شاید نوعمر ولی عہد نے انہیں اس لڑائی سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ دو تین مواقع مجھے ایسے ملے تھے کہ میں اس خوں خوار پہلوان کی گردن مسل کر اسے لمبا لٹا سکتا تھا لیکن میں خود بھی تھوڑی دیر اس تماشے کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ ہماری زبردست دھینگا مشتی کے دوران میں شیطان زادوں کا مصنوعی کلینک بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ شیشے کی ایک دیوار جو جنوبی سمت میں واقع تھی' ٹوٹ گئی تھی اور اب ہم ساتھ والے کمرے میں لڑ رہے تھے۔ ماسٹر استقی اور اس کے

ساتھی چیخ چیخ کر اپنے پہلوان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر اب اس میں وہ دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ وہ میرے نیچے اوندھا پڑا تھا اور میرا آرم لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں وہی ساٹھ سی سی سرنج تھی۔ یہ میں نے اس کی گردن میں ٹھونک دی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا اور مجھے دور پھینکنے میں کامیاب رہا۔ اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔ سرنج کھینچ کر اس نے گردن میں سے نکالی۔ فرطِ غضب میں اس نے ایک آہنی کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے مجھ پر چلائی۔ میں جھک کر بچ گیا۔ کرسی اڑتی ہوئی ایک کھڑکی سے ٹکرائی اور شیشہ توڑ کر ساتھ والے کمرے میں جا گری۔ کمرے کے اندر سے بھی زوردار چھناکا سنائی دیا۔ یقیناً وہاں بھی کچھ ٹوٹا تھا پھر اچانک ہی ساتھ والے کمرے سے زنانہ اور مردانہ چیخیں سنائی دیں۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے دو باوردی عورتیں چیختی ہوئی برباد شدہ کلینک میں گھس آئیں۔ وہ اپنے عقب میں دیکھ رہی تھیں اور ان کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دائیں جانب کے کمروں سے بھی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ اچانک میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے دو چھپکلے دیکھے۔ ان چھپکلوں LIZARDS کی جسامت کم و بیش ایک عام انسانی بازو کے برابر تھی۔ ان کی ابھری ہوئی آنکھیں خوفناک انداز میں چمک رہی تھیں اور جبڑے کھلے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر فرش پر گرے اور دو نرس لڑکیوں کے پیچھے بھاگے۔ وہ لرزہ خیز چیخیں مارتی ہوئی ایک باتھ روم میں گھس گئیں۔ باتھ روم کے دروازے کے نیچے درز موجود تھی۔ ایک چھپکلے نے اپنا سر درز میں گھسیڑ دیا اور اندر گھسنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اندر دونوں لڑکیاں ہذیانی انداز میں چیختی چلی جا رہی تھیں۔ میں نے سامنے دیکھا اور چونک گیا۔ ایسے ہی مزید تین چار چھپکلے کھڑکی سے کود کر اندر آ گئے تھے اور ادھر ادھر رینگ رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ایسے ہی کچھ چھپکلے دائیں جانب کے کمروں میں بھی کرالنگ کر رہے ہیں۔ وہاں سے چیخ پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چھپکلے ایک بڑے "گلاس کیس" میں بند تھے۔ آہنی کرسی لگنے سے یہ گلاس کیس ٹوٹ گیا تھا اور یہ کریہہ المنظر جانور آزاد ہو گئے تھے۔ "خاموش موت" (پہلوان) کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نہ ہی شیطان صفت شاہ زادوں میں سے کوئی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بھی وہ کمرا چھوڑا اور لڑکیوں کی سمت دوڑتا چلا گیا۔ تھوڑا آگے میں نے ایک سرخ و سفید لڑکی کو دیکھا۔ وہ بہت مختصر لباس میں تھی۔ گرانڈیل چھپکلا اس کے پیٹ پر چڑھا بیٹھا تھا اور وہ فرش پر بری طرح تڑپ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے لڑکی کو چھوڑا اور لپک کر ایک دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لڑکی کے پیٹ کی شفاف جلد لہولہان ہو رہی تھی۔ وہ فرش سے اٹھی اور مخالف سمت میں بھاگتی چلی گئی۔ میں اس لڑکی کی صورت دیکھ کر بے طرح چونک گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی انڈین لڑکی تھی جو "خاصے کی شے" کے طور پر بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئی تھی۔ اس سیدھی سادی لیکن نہایت خوب صورت دیہاتن نے اپنا نام "انّو" بتایا تھا۔ جہاز میں اکثر بڑی بے چارگی کے ساتھ یہی فقرہ دہراتی رہتی تھی "بھگوان کے لیے مجھے میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔" انّو کے ساتھ دو اور حسین و جمیل لڑکیاں بھی جہاز پر سوار ہوئی تھیں۔ ان کے بال گہرے سیاہ اور آنکھیں گہری بادامی تھیں۔ انّو کو دیکھ کر یہ سارا "ڈیٹا" ایک سیکنڈ کے اندر میرے ذہن سے گزر گیا۔ میں نے پکار کر کہا "انّو..... میری بات سنو!"

لیکن وہ اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ اس کے لانبے بال اس کی نیم عریاں کمر پر لہرا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا اس نے مجھے دیکھ لیا ہے، اس کے باوجود وہ میری آواز پر رکی نہیں تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ ارد گرد کے کمروں میں چونکہ خوفناک چھپکلوں کی وجہ سے افراتفری ہوئی تھی لہٰذا کسی باوردی شخص نے مجھے انّو کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا۔ ایک خم دار راہداری میں پہنچ کر میں نے انّو کو آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی۔ بے شک اس کا حلیہ ساحلِ سمندر پر دھوپ سینکنے والی کسی یورپین لڑکی جیسا تھا لیکن وہ تھی انّو ہی۔ ... نہیں کہ وہ مجھ سے اتنی خوف زدہ کیوں تھی۔ یوں لگتا تھا مجھے دیکھ کر وہ اس LIZARD کا خوف بھی بھول گئی ہے جو چند لمحے پہلے اس کے پیٹ پر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھی اور بالائی منزل پر آ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے آیا۔ وہ ایک ایسے کوریڈور میں بھاگتی چلی گئی جس میں قالین بچھا تھا اور دونوں طرف پلائی کے دروازے تھے۔ "انّو رک جاؤ۔" میں نے پھر کہا۔ وہ غڑاپ سے ایک دروازے میں گھس گئی۔

کوریڈور میں موجود ایک ہٹا کٹا پہرے دار تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اسی دوران میں وہ دروازہ بھی کھل گیا جس میں انّو گھسی تھی۔ اندر سے کم و بیش پندرہ لڑکیاں چیخیں مار کر باہر نکل آئیں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ سب کی سب مختصر ترین لباس میں تھیں۔ ایک دو سیاہ فام تھیں باقی سب سفید فام یا گندمی رنگت کی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ا

لڑکیوں کا انتخاب درجنوں خوب صورت اور متناسب الجسم لڑکیوں میں سے کیا گیا ہے۔ وہ بے داغ اور موزوں ترین جسموں کی مالک تھیں اور انّو ان میں سے ایک تھی۔ وہ ڈری سہمی ان لڑکیوں کے درمیان میں ہی کھڑی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کیا۔ اتنے سارے کھلے تھے اور سارے "بھڑکے ہوئے سے" میری جانب دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں طیش، جبینوں پر شکنیں، غالباً یہ لڑکیاں انّو کی ابتر حالت کا ذمے دار مجھے ہی سمجھ رہی تھیں۔ جس دروازے میں سے یہ آفت زادیاں نکلی تھیں اس پر انگلش میں "رقص گاہ" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ شاید یہاں ڈانس وغیرہ کی کلاس ہو رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی خوش شکل عورت آگے بڑھی۔ اس نے جین اور بو شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انسٹرکٹر ہے۔ جتنی کرختگی اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی وہ انسٹرکٹر کے چہرے پر ہی ہو سکتی تھی۔ وہ میری طرف بڑھی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس دوران میں مسلح پہرے دار بھی میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے کالر سے پکڑ لیا اور کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یہاں موجود لوگ ابھی تک اس ہنگامے سے بے خبر تھے جو نچلی منزل پر چھپکلوں کی وجہ سے برپا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے کسی متوقع مار پیٹ سے بچانے کے لیے انّو ہاتھ ہلا ہلا کر ساتھی لڑکیوں سے کچھ کہہ رہی ہے۔ پری پیکر حسینائیں اس کی بات سن کر اپنے پارے کو تھوڑا سا نیچے لے آئی تھیں۔ اسی اثنا میں تین اور مسلح پہرے دار دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک پہرے دار وہی تھا جس کے ساتھ میں تین گھنٹے پہلے اس زمین دوز کیمپس میں آیا تھا۔ ان پہرے داروں نے فوراً مجھے گھیر لیا۔ انگریزی داں پہرے دار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ ہم تمہیں نیچے ڈھونڈ رہے تھے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا کورس کی شکل میں ملی جلی چیخیں سنائی دیں۔ یہ انہی حسیناؤں کی چیخیں تھیں جو تھوڑی دیر پہلے مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ دراصل انہیں ایک پہرے دار نے اپنی زبان میں سمجھایا تھا کہ نیچے کیا واقعہ رونما ہوا ہے۔ چھپکلی سے ڈرنے والی بنات نے گز بھر لیے۔ چھپکلے سے تو ڈرنا ہی تھا۔ وہ چیخ کر واپس اپنی رقص گاہ میں گھس گئی تھیں اور دروازہ مضبوطی کے ساتھ اندر سے بند کر لیا تھا۔ حالانکہ یہاں چھپکلوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اندر گھسنے سے پہلے "انّو" نے آخری بار مڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ اس ایک لمحے میں ان آنکھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی ہیں لیکن کسی نامعلوم وجہ سے خوف زدہ ہیں۔ انّو کا حلیہ بھی مجھے حیران کر رہا تھا۔ جہاز میں وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھی سادی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر زریں گل نے تبصرہ کیا تھا "اس کو دیکھ کر تو ام کو شہنائی فلم کا دیا یاد آگیا ہے۔ اتنا خوب صورت لڑکی کو اتنا سادہ نہیں ہونا چاہیے ورنہ ہر لوفر کے اندر ایک بھیڑیا جاگ اٹھتا ہے۔"

انّو خیر سیدھی سادی تو اب بھی نظر آ رہی تھی مگر اس کا ظاہری حلیہ ان چند دنوں میں ہی بہت بدل گیا تھا۔ بال، چہرہ، لباس، چلنے پھرنے کا انداز، سبھی کچھ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ دو تنومند پہرے داروں نے مجھے دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ ایک گارڈ نے اپنا ہاتھ ریوالور پر رکھا ہوا تھا اور بوقتِ ضرورت ریوالور کو "بے نیام" کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ہم واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ اس دوران میں نچلی منزل سے "ری پیٹر" کے تین چار فائر سنائی دیے۔ اس فائرنگ کی "وجہ" کا علم مین راہداری میں جا کر ہوا۔ میں نے دیواروں اور فرش پر خون کے چھینٹے دیکھے۔ دو جسیم چھپکلے فرش پر مردہ پڑے تھے۔

مجھے سیدھا لفٹوں پر لے جایا گیا۔ یہاں تلاشی اور چیکنگ کے مختلف مراحل سے گزار کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور رنگ دار شیشوں والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

○☆○

قریباً پون گھنٹے بعد میں واپس ہوسٹل میں تھا اور اپنے کمرے میں صفدر اور زریں کے روبرو بیٹھا تھا۔ میں دوپہر بارہ بجے یہاں سے گیا تھا اب قریباً چار بجنے والے تھے۔ پچھلے چار گھنٹوں میں جو کچھ ہوا تھا اس کی کچھ تفصیلات صفدر اور زریں کو بھی معلوم ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ LIZARDS والے واقعے کی خبر بھی ابھی پانچ دس منٹ پہلے ان تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی باخبری نے مجھے حیران کیا۔ صفدر نے بتایا کہ یہ سب کچھ سوزی بتا کر گئی ہے۔ سوزی ابھی دس منٹ پہلے تک یہاں موجود تھی۔

صفدر بولا "وہ بڑے افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔"

"کس بات پر؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سی باتوں پر لیکن خاص طور سے اس بات پر کہ آپ بار بار منع کرنے کے باوجود احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔ وہ کہتی ہے کہ پہلے آپ کے ہاتھوں مبارک امین کا قتل ہوا پھر آپ نے اتر پردیشی لڑکی کی گمشدگی پر برہمی دکھائی اور اب آپ نے جھٹاپٹ ماسٹر اسٹی سے دشمنی مول لے لی ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ آپ نے اسٹی کے کسی دوست کو گالی

دی ہے۔ جس کے بعد ماسٹر استی صاحب برہم ہوگئے ہیں۔"

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "چلو برہم ہی ہوا ہے' قتل تو نہیں ہوا۔ میں اسے نابالغ ہونے کی رعایت دینے پر مجبور ہوں ورنہ اس بدبخت نے جس طرح کملا اور اس کے بچے کی جان لی ہے شاید میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔"

"کملا کی موت کا تو ہم سب کو دکھ ہے۔ مگر کیا کر سکتے ہیں۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اصل میں فردِ جرم کس پر عائد کی جاسکتی ہے۔"

"شاید تم درست کہتے ہو۔" میں نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

خبیث آنکھوں والے ماسٹر استی کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا' اور میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کچھ بھی ہے لیکن وہ ہے تو بچہ ہی۔ اس کے شیطانی کرتوتوں کی تمام تر ذمے داری اس پر کیسے ڈالی جاسکتی ہے۔ عین اسی وقت ذہن سے ایک اور آواز آئی "وہ بچہ نہیں ہے۔ تم نے اس ملعون کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ کیا ایک بچے کی آنکھیں ایسی ہوتی ہیں۔ اس کے اندر کسی سو سالہ "فتنہ پسند" بدبخت روح کا بسیرا ہے۔"

زریں گل کی آواز نے مجھے اپنے خیال سے چونکا دیا۔ وہ بولا "استاد صیب! ام کو ایک بات کا بہت افسوس ہے۔ آپ ہر خطرناک کام کرنے کے لیے خود چلا جاتا ہے اور ام کو بتاتا تک نہیں۔ آخر ام کس مرض کی دوا ہے۔"

"تم خود مرض ہو۔" صفدر نے ہولے سے کہا۔

"صفدر بھائی! کیا کہا تم نے؟" زریں کے کان کھڑے ہوگئے۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ تمہارا جذبہ تعریف کے قابل ہے۔"

"لیکن ام صرف تعریف نہیں چاہتا۔ ام آپ کے شانہ بشانہ ہر خطرناک کام میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ اب دیکھیں استاد صیب! آپ نے مبارک امین کو اکیلے ہی جہنم واصل کیا اور اس کے بعد اکیلے ہی گارڈز کا مار پیٹ بھی برداشت کیا' اگر اس تبرک میں سے تھوڑا بہت حصہ ام کو بھی مل جاتا تو امارا دل ٹھنڈا ہو جاتا۔"

"وئے چند اِتوا سے تبرک کہہ رہا ہے۔ تبرک تو تھوڑا سا ہوتا ہے چکھنے کے لیے۔ یہ دیکھو نیل میری ٹانگوں اور بازوؤں کے۔" میں نے اسے اپنی ٹانگیں دکھائیں "اگر یہ تبرک تھا تو پھر میں نے پوری دیگ کھائی ہے تبرک کی۔"

"ام اسی لیے تو کہہ رہا ہے جناب کہ ام بانٹ کے کھائیں۔"

"بانٹ شانٹ کوئی نہیں۔ بس اب تمہاری باری ہے۔" صفدر نے کہا۔

"خوا ایسے بھی ٹھیک ہے۔" زریں نے اطمینان کہا۔

— غزالہ کو میں نے آخری مرتبہ اس وقت دیکھا جب نامبارک امین میرے ہاتھوں پار ہوا تھا۔ میں ایک غزالہ سے مل کر اس کی خیر خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا ابھی تک سوزی کے پاس اس کے آفس نما اپارٹمنٹ میں تھی۔ سوزی سے درخواست کرکے غزالہ سے ملاقات جاسکتی تھی۔ میں نے پہرے دار کے ہاتھ سوزی کو دو پیغامات بھیجے لیکن وہ نہیں آئی۔ اور جب آئی تو آفت کی طرح آئی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں عجلت پائی جاتی تھی۔ اس نے پہرے دار کو بہانے سے بھیج دیا پھر سلاخ دار دروازے کے قریب چلی آئی۔ ہولی سی آواز میں بولی "مسٹر شا! تم نے اپنے حق میں برا کیا ہے۔ تم نے یہاں آتے ساتھ ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔"

"بھڑوں کے چھتے سے کہیں تمہاری مراد ماسٹر استی اس کے ساتھی تو نہیں؟"

"تو اور کیا۔" اس نے پریشانی سے کہا "تم ماسٹرا عمر پر نہ جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیا بلا ہے اور یہ چار دیواری کے اندر کیا کچھ کر سکتی ہے۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ماسٹر تمہیں فوری طور پر سبق سکھانے کا ارادہ رکھتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں موجود ہو۔"

اطلاع واقعی سنسنی خیز تھی۔ سوزی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ صفدر نے کہا "مس سوزی! تم یہاں انچارج ہو۔ اپنی تحویل میں موجود افراد کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔ اگر ماسٹر اور اس کے ساتھی یہاں آتے ہیں تو تم انہیں ہوسٹل میں داخل ہونے سے روک سکتی ہو۔"

"وہ بچے نہیں ہیں۔" وہ جھلا کر بولی "میں نے کہا ناں کہ وہ بلاؤں سے کم نہیں ہیں' اور انہیں روکنے کی ہمت کنگ براؤن کے علاوہ یہاں کسی میں نہیں ہے۔" وہ پریشان نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اور کنگ براؤن کہاں ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ کنگ اس وقت ایک نہایت اہم

میٹنگ میں ہیں۔ یہ میٹنگ پچھلے چھ گھنٹے سے مسلسل چل رہی ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ کب تک چلے گی۔ کیمپس میں کنگ سے تمہاری ملاقات بھی اسی لیے نہیں ہو سکی تھی۔"

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی "اگر ماسٹر کے روانہ ہونے سے پہلے کنگ کی میٹنگ ختم ہوگئی اور انہوں نے ماسٹر کو روک لیا تو اور بات ہے ورنہ تم اس وقت خود کو شدید قسم کے خطرے میں سمجھو۔"

سوزی کے چہرے پر ہمارے لیے ترس آمیز پریشانی تھی۔ ایسے ہی تاثرات کیمپس میں پہرے داروں کے چہرے پر دکھائی دیے تھے جب ماسٹر نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ سوزی نے کہا "ماسٹر... تم پر بہت برہم ہے۔ تم نے اسے چیلنج کیا ہے' اب وہ اس کا جواب دے کر رہے گا۔ اس کی تربیت ہی اس انداز سے کی گئی ہے۔ ماسٹر کے اضافی غصے کا سبب وہ توڑ پھوڑ بھی ہے جو تمہاری اور پہلوان کی دھینگا مشتی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس توڑ پھوڑ میں وہ دیوار گیر "گلاس کیس" ٹوٹ گیا ہے جس میں ماسٹر کے پالتو چھپکلے تھے۔ یہ آٹھ چھپکلے تھے' ان میں سے دو کو ہلاک کرنا پڑا ہے۔"

"ہم بھی یہاں بہت سے چھپکلے اور چھپکلیاں ہلاک ہوتی ہیں۔" صفدر نے اطمینان سے کہا۔

سوزی صفدر کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "مسٹر شا! یاد ہے کہ تم نے کہا تھا کہ تم میرے احسان مند ہو؟"

"ہاں' تم نے ایک سے زائد مرتبہ ہم پر احسان کیا ہے۔ پرل فارمز سے فرار کے بعد تو تم ہی ہماری زندگی کا وسیلہ بنی تھیں۔"

"تو پھر ان احسانات کے بدلے میری ایک بات مان لو۔" وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔

"ہاں کہو۔"

"جس زندگی کو بچانے کے لیے میں نے خود کو تین بار خطرے میں ڈالا ہے اسے یوں بے دردی سے ضائع نہ کرو۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ اپنا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے بولی "ماسٹر استی سے الجھنے کا مطلب کنگ سے الجھنا ہے اور کنگ کو خفا کرکے تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو دردناک خطرے سے دوچار کردو گے۔ تمہاری بہادری اور سخت جانی میں کلام نہیں لیکن اس "ماریا نرسٹ" کے آہنی پنجرے میں تم بری طرح پھنس چکے ہو۔ یہ لوگ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ساتھ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور یہ کیا کچھ "چاہ" سکتے ہیں اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں..."

"لگتا ہے کہ تم ہمیں خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں شاہ جہاں! میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے ساتھیوں کے لیے تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا ہوگی۔ ماسٹر استی بہت بپھرا ہوا ہے۔ وہ اب تمہیں ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائے بغیر نہیں رہے گا۔ یہ اذیت تمہیں برداشت کرنی ہی پڑے گی۔ رضامندی سے نہیں کرو گے تو زبردستی کرائی جائے گی۔ دانا کہتے ہیں کہ لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پہلے تھوڑا سا پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ اگر تم واقعی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس وقت تمہیں اپنی مرضی اور انا کے خلاف چلنا پڑے گا۔"

صفدر نے کہا "کیا یہاں سے ہمارے فرار کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے؟"

وہ بے دلی سے مسکرائی "سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی تو شاید نکل جائے مگر ماریا نرسٹ سے راہ فرار اختیار کرنا ناممکن ہے۔ بے شمار پوشیدہ آنکھیں ہیں جو یہاں ہر وقت نگران رہتی ہیں۔"

سوزی روہانسی آواز میں دس پندرہ منٹ تک ہمیں قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اب ماسٹر استی کے غیظ و غضب کا سامنا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔ وہ زبان سے تو نہیں کہہ رہی تھی مگر اس کا خیال یہی تھا کہ میرا زندہ بچ نکلنا ہی میری بہت بڑی خوش قسمتی ہوگا۔ اسی دوران میں منی اسکرٹ والی ایک سیاہ فام لڑکی گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ سوزی کی قابلِ اعتماد ماتحت تھی۔ اس نے سرگوشی میں سوزی سے کچھ کہا۔ سوزی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "ماسٹر استی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیمپس سے روانہ ہو چکا ہے' وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے ہیں۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا "دیکھو شا! میں پھر کہتی ہوں۔ ماسٹر سے کسی طرح کی تکرار نہیں کرنی۔ وہ گالی وغیرہ بھی بکے گا مگر تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ ماسٹر کے ساتھ اس کا ایک چچا بھی ہے۔ اس کا نام بین ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں نقص ہے۔ وہ بھی سخت بدزبان شخص ہے۔ تمہارا امتحان یہی ہے کہ تم اپنے آپ پر کنٹرول رکھو۔"

پیشانی سے پسینہ پونچھتی ہوئی سوزی واپس چلی گئی۔ صفدر اور زریں پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ زریں گل...

بڑبڑایا "ایسا زندگی سے ہم موت کو بہتر سمجھتا ہے۔ استاد صیب، ہم آپ کا بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تم اپنی چونچ ذرا بند رکھو۔ کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

صفدر نے کہا "سوزی کو کسی طرح کنگ سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"وہ کوشش کر چکی ہے۔ کنگ کے ماتحت اسے کوئی کال نہیں دے رہے۔ وہ کسی بہت اہم میٹنگ میں ہے۔"

"ہم آپ کو کہیں جانے نہیں دیں گے۔" صفدر نے عزم سے کہا۔

"دیکھو صفدر! کسی بے وقوفی کی گنجائش نہیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "تم خود کو مشکل میں ڈال کر بھی میرا کوئی بھلا نہیں کر سکتے ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ مشکل میں اضافہ ہو جائے۔ اسے میری درخواست سمجھ لو یا میرا حکم۔ تم دونوں اس معاملے سے بالکل الگ رہو گے۔ میں اس چکر سے خود ہی نمٹوں گا۔" پھر میں نے زریں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اور سنو زریں! اب یا آگے چل کر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو پھر تم سب کو صفدر کے مشورے پر چلنا ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟" زریں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک بھی اور سخت شکوہ تھا۔

اگلے تین چار منٹ بڑی ٹینشن میں گزرے۔ سوزی کی شکل دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ وہ اپنے آفس میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ کنگ سے رابطے کی آخری کوشش کر رہی ہو۔ پھر مشکل گھڑی سر پر پہنچ گئی۔ راہداری کی طرف سے کئی قدموں کی چاپ ابھری اور ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں بچوں کی آوازیں بھی تھیں اور ان میں وہ بچہ بھی تھا جس کے اندر کسی بوڑھی خبیث روح کا بسیرا تھا۔ ہمارے کمرے کے سامنے دو پہرے دار بالکل چوکس کھڑے تھے۔ وہ سنگی مجسموں کی طرح ساکت تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جوں جوں قدموں کی چاپ نزدیک آ رہی ہے پہرے داروں کے رنگ پیلے پڑتے جا رہے ہیں۔ کسی وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس ماریا ٹرسٹ کے اندر موجود ہر جاندار و بے جان شے ماسٹر استی کے شر سے پناہ مانگتی ہے اور پھر ماسٹر ہمارے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ وہی چنڈال چوکڑی تھی جس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے کیمپس میں ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ کل سات لڑکے تھے۔ ان میں ایک ذرا لمبے قد کا تھا اور تیرہ چودہ سالہ لگتا تھا۔ باقی ماسٹر سمیت دس اور بارہ تیرہ سال کے درمیان تھے۔ ان کے ساتھ پانچ مسلح حبشی گارڈز تھے اور ایک آنکھ سے معذور وہ نوجوان بھی تھا جس کا نام سوزی نے چین بتایا تھا۔ یہ نوجوان رشتے میں ماسٹر کا چچا تھا۔ خوش صورت نوجوان قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے لمبے بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تو تم ہو شاہ جہاں؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی استی نے کہا "ہاں یہ ہے۔" پھر وہ گارڈز سے مخاطب ہوا "نکالو اس ماں کے شیر کو باہر۔"

ماسٹر استی اپنی عمر سے کہیں بڑی باتیں کرتا تھا اور اس کا انداز بھی بڑوں جیسا تھا۔ دو گارڈز نے اپنے [illegible] تان لیے۔ پھر دروازہ کھولا گیا اور مجھے باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ میں باہر آگیا۔ دروازہ پھر لاک کر دیا گیا۔ سوزی ہوسٹل انچارج کی حیثیت سے ایک طرف کھڑی خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ گارڈز نے بڑی مہارت کے ساتھ مجھے کور کر رکھا تھا۔ ایک شخص عقب سے آیا اور اس نے پھرتی سے کوئی شے میرے گلے میں ڈال دی۔ یہ ایک رسی تھی۔ بالکل جیسے بکرے کے گلے میں رسی ڈالی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسے دو طرف سے کھینچا جا سکتا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ میرے گلے میں دو رسیاں ڈالی گئی تھیں اور انہیں دو افراد مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ میں اپنی مرضی سے کسی جانب حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ماسٹر استی اور اس کے ساتھی مجھے کھینچتے ہوئے راہداری کی طرف بڑھے۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شیشے کا ایک گلاس اڑتا ہوا ماسٹر استی کے سر میں لگا اور فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی زریں گل کی چیخ پکار سنائی دی۔ وہ اردو اور پشتو میں ماسٹر اور اس کے ساتھی لڑکوں کو بے نقط سنا رہا تھا۔ اس کی گالیاں جیسے پورے ہوسٹل میں گونج رہی تھیں۔ ماسٹر استی کے چہرے کا رنگ انگارا ہو گیا۔ یہی کیفیت اس کے چچا کی تھی۔ ماسٹر استی بھنایا ہوا کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچا۔ اس نے سوزی کو حکم دیا کہ زریں کو بھی کمرے سے باہر نکالا جائے۔ میں اپنے آپ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ زریں پر میری نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے پٹھانی خون نے جوش مارا تھا اور وہ مجھے تنہا جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ اسے بھی کمرے سے نکال کر میرے برابر کر دیا جائے اور اس کی تمنا مکمل طور پر پوری ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اسے باہر نکالا گیا بلکہ میری ہی طرح گلے میں دہری رسی

بھی ڈال دی گئی۔ وہ جنگلی شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا اور پوری طاقت سے دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔ جن افراد نے دونوں طرف سے اس کی رسیاں تھام رکھی تھیں انہیں زریں پر قابو رکھنے کے لیے پورا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ میری طرح زریں بھی تین چار ریوالوروں کی زد میں تھا۔

وہ لوگ ہمیں کھینچتے اور مارتے ہوئے اسی بندی خانے میں لے آئے جہاں چند روز قبل مجھے قید رکھا گیا تھا۔ اس خستہ حال قید خانے کی بیشتر کوٹھڑیاں اب بھی خالی پڑی تھیں۔ جو دو چار بندے یہاں قید تھے، وہ حیران پریشان نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔ اس سنسان قید خانے میں یہ ہنگامہ انہیں یقیناً بہت دلچسپ اور سنسنی خیز لگا ہوگا۔ یہاں ایک گوشے میں مجھے تین زنگ آلود ٹکٹکیاں نظر آئیں۔ ان عمودی ٹکٹکیوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ انہیں قیدیوں کو کوڑے وغیرہ مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نجانے کتنے زمانے سے یہ ٹکٹکیاں یہاں موجود تھیں اور کیسے کیسے عذاب ناک مناظر کی شاہد تھیں۔ ان ٹکٹکیوں پر کسے جانے والے بدنصیبوں کی کربناک چیخیں ابھی تک ان کے اردگرد ہی گونج رہی تھیں۔

دو ٹکٹکیوں کو جلدی جلدی تیار حالت میں کیا گیا۔ ایک تنومند حبشی گارڈ جو صورت سے ہی کوڑا زن نظر آتا تھا دو بڑے سائز کے "کی بوکو" لے کر آگیا۔ سارے کام جلدی جلدی کیے جا رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ماسٹر استی اور دیگر لوگوں کو خطرہ تھا کہ کہیں کنگ براؤن کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ پڑ جائے۔ کنگ ابھی تک میٹنگ میں تھا اس کے فارغ ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنا کام کر گزرنا چاہتے تھے۔

ماسٹر کے ہمراہ آنے والے تمام افراد ایک نیم دائرے کی صورت ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ ہوسٹل کے پہرے دار اور سوزی بھی ان افراد میں شامل تھی۔ ایک دو بار میری نظر سوزی سے ملی۔ اس کی نگاہ میں بس یہی التجا تھی کہ جو کچھ ہونے جا رہا ہے اسے ہو جانے دو۔ بندی خانے کے باہر سے بھی کچھ لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اندر آنا چاہ رہے تھے۔ ماسٹر استی کے حکم پر سوزی نے بندی خانے کا ایک زنگ آلود دروازہ کھلوا دیا۔ دروازہ کھلتے ہی کئی مرد و زن اندر آگئے اور تماشائیوں میں شامل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تماشائیوں کی تعداد سو سے تجاوز کر چکی تھی اور ابھی مزید لوگ اندر آ رہے تھے۔

میں نے زریں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل پرسکون تھا اور ہر قسم کی اذیت کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ماسٹر استی کے چچا چین کے اشارے پر سوزی نے ہم دونوں کو ٹکٹکیوں پر باندھنے کا حکم دیا۔ بندی خانے کے چوکس پہرے دار آگے بڑھے۔ مگر بارہ تیرہ سالہ ماسٹر استی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس کی سوئی ناک ضرورت سے زیادہ پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خباثت لشکارے مار رہی تھی۔ وہ پہرے داروں سے بولا "ہم انہیں برہنہ کر کے کوڑے مارے جائیں گے۔"

پہرے داروں نے سر تسلیم خم کیا اور کپڑے اتارنے کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ ماسٹر نے انہیں ایک بار پھر روک دیا "یہ اپنے کپڑے خود اتاریں گے۔" وہ بڑی زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ایک پہرے دار نے زریں گل کی پشت پر "کی بوکو" کی دو زوردار ضربیں لگائیں اور چیخ کر کہا "چل مانٹیے! اپنے کپڑے اتار دے۔"

زریں گل پہرے دار کی بات سمجھ گیا تھا اور اس کا رنگ سرخ انگارا ہو گیا تھا۔ اس نے پہرے دار کی جانب تھوک دیا اور اسے ماں بہن کی غلیظ گالیاں دیں۔ یہ گالیاں چونکہ اردو میں تھیں لہٰذا سننے والوں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ زریں پر کی بوکو کی بارش کر دی گئی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ یہ بڑی جان لیوا ضربیں تھیں۔ ایسی ہی ایک ضرب میں مائیکل کے ہاتھوں چندرن پہلے سہہ چکا تھا۔ "رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا۔

پہرے دار کا ہاتھ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ زریں گل کے گلے کی رسی تنومند پہرے دار دو طرف سے کھینچ رہے تھے اور اس کھچاؤ کے سبب اس کا چہرہ سرخ تر ہو گیا تھا۔

میں نے ماسٹر استی سے کہا "اس کو کیوں مار رہے ہو؟ یہ بے قصور ہے۔ بس وقتی طور پر غصے میں آگیا تھا۔ اپنے کیے کی سزا اسے مل گئی ہے۔"

"بہت خوب، بڑا خیال ہے اپنے ساتھی کا۔" استی کے جواں سال چچا نے کہا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اچانک اس نے اپنے ہولسٹر میں سے ریوالور برآمد کیا اور زریں کو ایک زوردار دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیا۔ تنومند پہرے داروں نے زریں کو قربانی کے جانور کی طرح دبوچ لیا۔ چین نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر نال زریں کے سر سے لگا دی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بے حد سرد لہجے میں بولا "اپنے ساتھی کی جان بے حد پیاری ہے تمہیں۔ اس کی جان بچانا چاہتے ہو تو خود کو بے لباس کر دو۔"

اس کی آواز میں موجود درندگی کا تاثر اتنا گمبیر تھا کہ میں اندر سے ہل گیا۔ ایک لمحے میں مجھے یقین ہو گیا کہ زریں کی زندگی تیز ہوا میں رکھا ہوا چراغ بن گئی ہے۔ جنونی چین کی انگلی کی ایک جنبش زریں کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر سکتی تھی۔ یہ شعلہ پر چڑھے ہوئے لمحے تھے۔

"میں دس تک گنوں گا۔" چین نے سپاٹ آواز میں کہا۔

میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ جدوجہد کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ قید خانے کے کھلے ہوئے گیٹ میں سے باہر ایک باغ کا منظر تھا لیکن یہ گیٹ، اور یہ باغ اور یہ آزادی مجھ سے بہت دور تھے۔ برہنگی ایک تذلیل ہے لیکن یہ کسی فرد واحد کی نہیں، انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس شخص کو برہنہ ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اس سے زیادہ فکر مند انسانیت کو ہونا چاہیے۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا، اس کے بعد اپنے ہاتھ قمیص کے بٹنوں کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ مجھ جیسے لوگ جو جرم و سزا کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں، اپنے اور دوسروں کے متعلق خاصے بے رحم ہو جاتے ہیں۔ بتدریج اور غیر محسوس طور پر ان کا ذہن سخت ترین فیصلوں کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میں قمیص کے بٹن کھول چکا تھا جب اچانک ایک بجلی سی میری نگاہوں کے سامنے لپک گئی۔ قید خانے کی ایک "کھنڈر بالکونی" میں سے ایک سایہ نے چھلانگ لگائی اور دھم سے پختہ فرش پر گرا۔ ماسٹر اسٹی کا ایک ساتھی لڑکا اس سایے کے نیچے دب گیا۔ پھر سایہ سیدھا ہوا، وہ ایک خستہ حال شخص تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال بڑھے ہوئے تھے، چہرے اور ہاتھوں پر بے تحاشا میل کچیل تھا۔ وہ صرف پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس نے گیارہ بارہ سالہ فربہ اندام لڑکے کو عقب سے یوں دبوچ لیا تھا جیسے عقاب چڑیا کو دبوچتا ہے، اس کے دائیں ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالور تھا اور اس کی خوفناک نال مین لڑکے کی کنپٹی پر رکھی تھی۔

میں نے ذرا غور سے نووارد کی شکل دیکھی اور بھونچکا رہ گیا۔ وہ پروفیسر اللہ دتا تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی وہ پروفیسر اللہ دتا ہی تھا۔ اس نے جنونی انداز میں چیخ کر کہا "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ورنہ اس بدبخت کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا تھا۔ پھر جیسے دو گارڈز کو ہوش آیا۔ وہ ریوالور سونت کر چند قدم آگے بڑھے "خبردار!" پروفیسر نے پھنکار کر کہا "گولی مار دوں گا۔"

اور پھر۔ ایک گارڈ کو جھپٹتے دیکھ کر اس نے سچ مچ لڑکے کے سر میں گولی مار دی۔ طاقتور ریوالور نے دھماکے سے شعلہ چھوڑا اور میں نے لڑکے کی پیشانی کی جانب سے سرخ سی پچکاری سی نکلتے دیکھی۔ یہ منظر اتنا وحشت ناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے گارڈز بھی مبہوت رہ گئے۔ جس گارڈ نے پروفیسر پر جھپٹنے کی حماقت کی تھی، وہ بھی ایک لمحے کے لیے پتھر ہو گیا تھا۔ اسی مختصر ترین مہلت میں پروفیسر نے ایک اور لڑکے کی گردن دبوچ لی اور اسے گھسیٹ کر کئی قدم پیچھے لے گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کا قد اسٹی کے دوستوں میں سب سے لمبا تھا۔ اب "قاتل ریوالور" کی نال اس دوسرے لڑکے کی کنپٹی سے چپکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اردگرد موجود افراد پتھرا گئے ہیں "کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اسے بھی مار ڈالوں گا!" پروفیسر نے خوفناک لہجے میں وارننگ دی۔

میں ان لمحوں میں ششدر تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی پروفیسر ہے جو بحری سفر کے دوران میں مائیکل کے سائے سے لرزتا تھا۔ اور ہر جگہ بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

پروفیسر کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ اگر اس کی دھمکی کو نظر انداز کیا گیا تو وہ اس دوسرے لڑکے کو بھی پلک جھپکنے میں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کے چہرے کی طرف دیکھا اور بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ پروفیسر ایک بالکل بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور چہرے پر وحشت ہی وحشت تھی۔ وہ ایک بار پھر پھنکار کر بولا "میں کہتا ہوں چھوڑ دو اس کو۔" پروفیسر کا اشارہ زریں کی طرف تھا۔

ماسٹر اسٹی کا جواں سال چچا چین چند لمحے تک شدید تذبذب میں نظر آیا، پھر اس نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے زریں کو چھوڑ دیا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ زریں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ دھیمی آواز میں گارڈز کو فصیح و بلیغ گالیاں دے رہا ہے۔

"تم دونوں ادھر آ جاؤ۔ میرے پیچھے۔" پروفیسر نے مجھے اور زریں کو ہدایت کی۔

میں نے زریں کو اشارہ کیا اور خود بھی نو عمر لڑکے کی لاش پھلانگ کر پروفیسر کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ لڑکے کے سر کا گاڑھا سرخ خون بہہ کر فرش پر پھیلتا چلا جا رہا تھا اور

خون سے اس کی سرخ بوشرٹ ایک طرف سے بالکل لتھڑی گئی تھی۔ دوسرے لڑکے کو پروفیسر نے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صورت سے ہی ایک خرانٹ اور بے حد کرخت لڑکا نظر آتا تھا مگر اپنے ساتھی کی لاش دیکھ کر گم صم ہو گیا تھا۔ پروفیسر یرغمال لڑکے سمیت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے انداز میں بلا درجے کا اعتماد اور بے خوفی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ پروفیسر اللہ دتا ہی ہے۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی وحشت سے ماسٹر اسٹی، اس کے چچا اور دیگر ساتھیوں کو پتھرا کر کے رکھ دیا تھا، بلکہ شاید ان کے ساتھ ساتھ تماشائی بھی پتھرا گئے تھے۔ وہ سب تتر بتر ہو کر دیواروں کے ساتھ جا لگے تھے اور کچھ اس منظر کی تاب نہ لا کر قید خانے سے باہر بھاگ گئے تھے۔

پروفیسر نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر الٹے پاؤں چلتا باہر باغ میں نکل آیا۔ شام کے سائے طویل تر ہو چکے تھے اور افق کی سرخی جلد ہی گہری سیاہی میں بدلنے والی تھی۔ یہاں درختوں تلے ایک لاری نما گاڑی تھی۔ بالکل ویسی ہی گاڑی جیسی ہمارے پنجاب کے دیہات میں چلتی ہیں۔ ان گاڑیوں کا انجن باہر ہوتا ہے اور چھت پر جنگلے وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ اس لاری کی سائیڈ پر ماریا ٹرسٹ کے الفاظ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ ٹرسٹ کے استعمال کی گاڑی ہے۔ میری اور پروفیسر کی نگاہ ایک ساتھ ہی گاڑی پر پڑی اور ایک ساتھ ہی ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہمیں اس گاڑی میں گھس جانا چاہیے۔ جلد ہی ہم یرغمالی لڑکے سمیت گاڑی کے اندر تھے۔ گاڑی کے فرش پر کیلے اور مونگ پھلی کے بے شمار چھلکے پڑے تھے۔ اندر کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ٹوپی رکھی تھی، یوں لگتا تھا کہ ڈرائیور ابھی ابھی گاڑی سے اتر کر گیا ہے۔

"تم گاڑی ڈرائیو کر لو گے؟" پروفیسر نے ڈرامائی لہجے میں پوچھا۔

"ڈرائیو تو میں کر لوں گا لیکن یہ لوگ ہمیں بہ آسانی یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ان کا باپ بھی نکلنے دے گا۔" پروفیسر عجیب جنونی لہجے میں بولا "اس حرامی کی جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کریں گے۔" اس نے ریوالور کی نال یرغمالی لڑکے کی گردن میں بے رحمی سے گھسیڑ دی۔ لڑکا کراہ کر رہ گیا۔

"کون لڑکا ہے یہ؟" زریں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ لیکن یہ سارے کے سارے حرامی ان لوگوں کی اولاد ہیں جو یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔ ایک سے

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان، ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۰۳

ایک بڑھ کر خبیث زادہ ہے ان میں۔۔۔ اور سب سے بڑا خبیث زادہ وہ چوڑی ناک والا ماسٹر استی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ ہمارے ارد گرد اچل پچ گئی تھی۔ مسلح گارڈز نے چاروں طرف سے لاری کو گھیر لیا تھا۔ بندی خانے کی چھت پر بھی چند افراد نے پوزیشن لے لی تھی۔ یہ سب افراد ریوالور یا پستول وغیرہ سے مسلح تھے۔ ٹرسٹ کی اس عمارت میں میں نے ابھی تک رائفل یا کسی دوسرے بڑے ہتھیار کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ یہاں کے گارڈز ریوالور اور پستول وغیرہ بھی چھپا کر رکھتے تھے لیکن اس وقت چونکہ صورتِ حال سنگین تھی لہٰذا ریوالور گارڈز کے ہاتھوں میں نظر آرہے تھے۔

پروفیسر نے مجھ سے کہا "دیکھو! اگنیشن میں چابی ہے؟"

"مخدوم نے دیکھا ہے۔ چابی نہیں ہے لیکن استاد صیب تار۔۔ جوڑ کر گاڑی اسٹارٹ فرمالے گا۔" زریں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے شاہ جہاں! تم گاڑی اسٹارٹ کرو۔" پروفیسر نے بے خوفی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' کسی قریبی کمرے کی کھڑکی سے اوپر تلے ریوالور کے تین فائر ہوئے اور "سوں" کی تیز آواز آئی۔ لاری کا اگلا بایاں ٹائر برسٹ کردیا گیا تھا۔

"کتے کے بچے۔" پروفیسر نے دانت پیس کر کہا۔

اس کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی۔ چند لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ وہ لڑکے کو شوٹ کردے گا۔ مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ہماری طرح وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت یہ یرغمالی لڑکا ہی ہماری زندگی کی ضمانت ہے۔

میں نے لڑکے کے ہاتھ ایک الیکٹرک تار کی مدد سے اس کی پشت پر باندھ دیے۔ زریں نے اس کے پاؤں باندھے اور اسے ایک طرف لاری کے فرش پر ڈال دیا۔ پروفیسر نے ریوالور مسلسل لڑکے کے سر سے لگا رکھا تھا۔ لاری سے باہر گارڈز میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے ہر طرف سے ہمیں گھیر لیا تھا پھر میگا فون پر گنگ کے کسی کارندے کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی "پروفیسر! خود کو ہمارے حوالے کردو۔ تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

پروفیسر کھڑکی میں سے سر نکال کر چیخا "مجھے بچاؤ کا راستہ نہیں چاہیے۔ مجھے موت چاہیے۔ تم نے حرام زادو! تم نے میری بچی کو مار دیا' اب مجھے بھی مار دو۔"

پروفیسر اللہ دتا کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے اور چہرہ وحشت کا نمونہ تھا۔ میں اور زریں گنگ سنانے میں رہ گئے۔ میری نگاہوں میں پروفیسر کی معصوم صورت بیٹی شائستہ کا چہرہ گھوم گیا۔ مائیکل نے اس کے ساتھ زبردستی شادی رچائی تھی اور اب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں نے شائستہ کو آخری بار پرل کاؤن فارمز میں ہی دیکھا تھا۔ اب پروفیسر کی زبانی ہمیں یہ اندوہناک خبر مل رہی تھی کہ وہ مرچکی ہے۔

پروفیسر اب بھی گلا پھاڑ کر چلا رہا تھا "ہاں۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے زندگی لیکن مرنے سے پہلے میں تم جیسے دس بیس سور ضرور مارنا چاہتا ہوں اور میں ماروں گا بھی۔"

پروفیسر کے ریوالور کی نال لڑکے کی گردن میں دھنسی جارہی تھی اور خوف سے اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ یہ پروفیسر اللہ دتا کا ایک بالکل مختلف روپ تھا۔ دھیمے مزاج کا ایک کمزور شخص کہیں اوجھل ہوگیا تھا اور اس کی جگہ ایک کرخت چہرہ جنونی نے لے لی تھی۔ اپنی لاڈلی بیٹی کی جدائی اس کی آنکھوں میں شعلوں کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے پوچھا "پروفیسر! کیا ہوا شائستہ کو؟"

"وہی ہوا جو ہونا تھا۔" وہ کرب ناک آواز میں بولا "اس درندے نے اسے مار ڈالا۔ اس بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔" پروفیسر کا اشارہ واضح طور پر مائیکل کی طرف تھا۔

"کب ہوا یہ سب کچھ؟"

"میرے زخم مت کریدو۔" پروفیسر جھلا کر بولا "بس وہ مرگئی' ختم ہوگئی۔ اب مجھے بھی مرنا ہے۔ اس کے پاس پہنچنا ہے۔ اپنی شائستہ کے پاس پہنچنا ہے۔" پروفیسر گرد و پیش سے بیگانہ نظر آرہا تھا۔

وقفے وقفے سے میگا فون پر دوبارہ پھر اعلان کیا گیا کہ ہم خود کو گارڈز کے حوالے کردیں ورنہ ہم پر حملہ کرکے ہمیں شوٹ کردیا جائے گا۔ اعلان کرنے والے کا لہجہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ لہجے میں ایک طرح کی جھلاہٹ بھی تھی۔ یہ جھلاہٹ اس امر کی نشان دہی کرتی تھی کہ یہ یرغمالی لڑکے کی جان انتظامیہ کے لیے قیمتی ہے۔

پروفیسر پر ان اعلانات کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شاہ جہاں! تم تار۔۔ جوڑ کر انجن اسٹارٹ کرو۔"

"مگر ٹائر برسٹ ہے ہم یہاں سے نکل نہیں سکیں گے اور اگر نکل بھی گئے تو یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔"

پروفیسر نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا "یہ آج تم کس زبان میں بول رہے ہو شاہ جہاں! تم تو مجھے دلیری اور بہادری کا سبق پڑھاتے تھے۔"

"بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرے لیے کوئی فرق نہیں۔ میرا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہے میرے پاس کھونے کو۔"

"مگر ہمارے پاس تو ہے۔" زریں نے کہا "صیدر صیب ہے' اغزالہ بی بی ہے' کلثوم ہے۔"

"تو پھر جاؤ' دفع ہو جاؤ تم۔ ادھر ننگے ہو کر کوڑے کھاؤ اور جانوروں کی طرح چلاؤ۔" پروفیسر وحشت ناک آواز میں گرجا۔

اسی دوران میں انجن کا شور بلند ہوا اور ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو گاڑیاں نمودار ہوئیں اور ہمارے سامنے اور عقب میں آڑی کھڑی ہو گئیں۔ ان میں سے ایک لاری اور دوسری لوڈر نما گاڑی تھی۔ ان گاڑیوں کے کھڑے ہونے سے دونوں طرف راستہ بند ہو گیا اور یہ امکان بالکل ختم ہو گیا کہ ہم لاری کو اسٹارٹ کرکے یہاں سے نکل سکیں گے۔

پروفیسر نے غضب ناک ہو کر یرغمالی لڑکے کے سر پر ریوالور کے آہنی دستے سے زوردار ضربیں لگائیں اور اس کا چہرہ لہولہان کردیا پھر وہ خوف زدہ لڑکے کو گھسیٹتا ہوا لاری کی ایک کھڑکی میں لے گیا۔ لڑکے کا اگلا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال کر اس نے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھا اور چلا کر کہا "ہمیں یہاں سے جانے کے لیے راستہ دو' ورنہ میں اس حرامی کو ختم کررہا ہوں۔"

گارڈز میں واضح طور پر کھلبلی کے آثار نظر آنے لگے۔ زریں گنگ بولا "استاد صیب! ام کو تو لگتا ہے کہ یہ لوگ ام پر حملہ فرمادے گا۔ وہ دیکھیں اس لوڈر کے پیچھے بھی دو کالے بندروں نے پوزیشن لے لیا ہے۔" زریں نے انگلی سے اس لوڈر کی طرف اشارہ کیا جس نے عقب سے ہمارا راستہ مسدود کیا تھا۔

پروفیسر ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا' دوسری طرف گنگ کے کارندے بھی ہرگز ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ صورتِ حال دم بہ دم کشیدہ ہوتی چلی جارہی تھی۔ میری سمجھ میں ابھی تک یہی نہیں آیا تھا کہ پروفیسر اچانک نمودار کیسے ہو گیا۔ وہ بڑے ڈرامائی انداز میں ظاہر ہوا تھا اور ایک نازک موقع پر اس نے صورتِ حال ہمارے حق میں پلٹ دی تھی۔ شروع میں پروفیسر کا یہ بدلا ہوا روپ بالکل ہماری سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اب ہم پر یہ دردناک انکشاف ہوا تھا کہ پروفیسر کی بیٹی قتل کردی گئی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو پھر ایک غم زدہ باپ کی وحشت اور دیوانگی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پروفیسر گارڈز کو جھکا دے کر نکل گیا تھا اور اب تک ٹرسٹ کی عمارت میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بڑھے ہوئے بال اور خستہ حالت اسی امر کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ میں پروفیسر سے

پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں چھپا ہوا تھا اور شائستہ کی موت کی بات جو وہ کررہا ہے اس میں کہاں تک حقیقت ہے مگر پروفیسر پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ اور اس کی تمام تر توجہ یرغمالی لڑکے اور نیم تاریکی میں چھپے ہوئے دشمنوں کی طرف تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری بات سن کر بھی نہیں سنے گا۔

کم و بیش ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ ایک دراز قد حبشی میگا فون پر بار بار مختلف دھمکیاں دیتا رہا۔ وہ شکستہ انگریزی بول رہا تھا پھر اس نے میگا فون ایک طرف رکھ دیا اور پروفیسر سے براہِ راست بات چیت کرنے کے لیے لاری کے پاس چلا آیا۔ اسے قریب آتے دیکھ کر پروفیسر ایک دم بھڑک گیا اور اس نے دراز قد حبشی کے پاؤں میں دو فائر کیے۔ وہ بوکھلا کر واپس پلٹ گیا۔ سچویشن لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جارہی تھی۔ میں نے پروفیسر کو سمجھایا کہ جب وہ انتظامیہ کے کسی بندے کو قریب ہی نہیں آنے دے گا تو مطلب کی بات کیسے کی جاسکے گی۔ میرے سمجھانے بجھانے سے پروفیسر کا رویہ کچھ نرم ہوا۔ میں نے لاری کی کھڑکی سے منہ نکال کر دراز قد حبشی کو آواز دی اور اسے کہا کہ وہ بات کرنے کے لیے ہمارے قریب آئے مگر ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ اسے غیر مسلح ہونا چاہیے۔

کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد دراز قد حبشی ایک نوجوان کے ساتھ ہماری طرف بڑھا۔ ان کے قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ نوجوان "ماسٹر استی" کا چپڑا چین تھا۔ چین کو دیکھ کر پروفیسر کا غصہ بڑھ گیا۔ اس نے یرغمالی لڑکے کا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھتے ہوئے پھنکارا "اس لڑکے کی زندگی صرف ایک ہی صورت میں بچ سکتی ہے۔ شاہ جہاں کے چاروں ساتھیوں کو رہا کرکے اس لاری میں بھیج دو۔ اور ناکارہ ٹائر بدل کر ہمیں یہاں سے نکل جانے کا راستہ دو۔"

دراز قد حبشی نے کہا "تمہارے یہ مطالبات ماننا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہاں اگر تم جرم کو چھوڑ دو تو ایک قتل کے باوجود تمہارے ساتھ رعایت کا سلوک کیا جاسکتا ہے۔"

"آفرین ہے تمہاری رحم دلی پر۔" پروفیسر نے زہرخند لہجے میں کہا "تمہیں تو محبت اور خدا ترسی کا نوبل انعام ملنا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی نفرت سے دراز قد حبشی کی طرف تھوک دیا۔

"تم اپنی مصیبت میں اضافہ کررہے ہو۔" ایک آنکھ والا چین غرایا۔

"میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت جھیل چکا ہوں۔ میری شائستہ کو مروا کر مار دیا تم لوگوں نے اب اس

سے بڑی قیامت مجھ پر کیا ٹوٹے گی۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

میں نے پروفیسر کا کندھا دبا کر اسے تحمل کی ہدایت کی پھر دراز قد شخص سے مخاطب ہو کر میں نے کہا "ہم تمہیں نہیں جانتے اور نہ تمہارے ساتھی کو۔ ہم صرف مائیکل سے بات کریں گے یا کنگ براؤن سے۔"

"باس مائیکل اور کنگ میں سے کوئی بھی اس وقت یہاں نہیں آسکتا۔"

"تو پھر تم بھی جاؤ یہاں سے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

دراز قد حبشی اور چینی کچھ دیر تک خشمگیں نظروں سے ہمیں گھورتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ ان کے جاتے کے بعد مجھے اور زرین کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں جھلا کر یہ لوگ اچانک دھاوا نہ بول دیں۔ اگر اس دھاوے کے نتیجے میں ایک اور لڑکا قتل ہو جاتا اور ہم پھر سے پکڑے جاتے تو یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی۔ ان لوگوں نے ہم سب کو بدترین سلوک کا مستحق ٹھہرانا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ کچھ رعایت لے کر پسپائی اختیار کر لی جاتی۔ ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور بچ نکلنے کے امکانات تقریباً صفر تھے۔

اچانک گارڈز میں کھلبلی سی نظر آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی اہم شخص یہاں پہنچا ہے اور اس کی آمد نے تمام گارڈز اور دیگر عملے کو الرٹ کر دیا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد دراز قد حبشی ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے دور ہی سے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر ہمیں اس بات کا اشارہ دیا کہ وہ غیر مسلح ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیاہ ڈبیا نظر آرہی تھی۔ حبشی قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک واکی ٹاکی ہے۔ کھڑکی سے چند قدم دور دراز قد حبشی ٹھہر گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ کنگ یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ تم سے واکی ٹاکی پر بات کرنا چاہتے ہیں۔"

حبشی نے واکی ٹاکی کھڑکی میں سے میری طرف اچھال دیا۔

میں نے واکی ٹاکی آن کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک بارعب لیکن پرسکون آواز واکی ٹاکی پر ابھری "ہیلو مسٹر شاہ! میں کنگ براؤن تم سے مخاطب ہوں۔ تمہارے ساتھ ہمارا غائبانہ تعارف ہے۔ مائیکل نے تمہاری تعریف کی تھی' یہی وجہ تھی کہ ہم نے آج دوپہر تمہیں ملاقات کے لیے بلایا تھا۔"

"لیکن آپ کے بجائے میری ملاقات آپ کے فرزند سے ہوئی اور بہت خوب ہوئی۔"

مجھے تعجب ہوا کہ جواب میں کنگ نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔ بولا "ہمیں افسوس ہے کہ ایک اہم میٹنگ میں ہونے کی وجہ سے ہم تم سے مل نہ سکے۔ اس کے علاوہ وہاں تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر بھی ہمیں افسوس ہے۔ استھی بچہ ہے۔ بچوں سے ایسی نادانیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ خاص طور سے ایسے بچے جو زیادہ لاڈلے ہوتے ہیں۔ بہرحال جو ہو چکا اس میں سر کھپانے سے فائدہ نہیں' جو ہو رہا ہے اسے سنبھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک نہایت قیمتی جان ضائع ہو چکی ہے اور دوسری شدید خطرے میں ہے۔ ہم اس معاملے کو نرمی سے سلجھانا چاہتے ہیں۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ تمہارے ساتھی ہماری تحویل میں ہیں۔ ہم جوابی کارروائی کے طور پر ان کی گردنوں پر بھی اسلحہ رکھ سکتے ہیں۔"

کنگ کا لہجہ قائل کرنے والا تھا اور اس کی دلیل میں وزن بھی تھا۔ دوسری طرف پروفیسر ہر شے سے بیگانہ نظر آرہا تھا۔ اس پر بس ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اپنے طور پر پروفیسر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم بری طرح گھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں افہام و تفہیم سے کام لینا چاہیے۔ میرے سمجھانے بجھانے سے پروفیسر قدرے نرم پڑ گیا۔

میرے اور کنگ کے درمیان واکی ٹاکی پر کم و بیش آدھ گھنٹا بات چیت ہوئی۔ اس بات چیت کے نتیجے میں طے پایا کہ ہم یرغمالی لڑکے جوائم کو چھوڑ دیں گے اور غیر مسلح ہو کر خود کو گارڈز کے حوالے کر دیں گے۔ پروفیسر کو گرفتار کر لیا جائے گا' مگر ایک فوری ردعمل کے تحت پروفیسر کے ہاتھوں سے جو گولی چلی ہے اور جس کے نتیجے میں ایک جان گئی ہے' اسے ایک اتفاقی واقعہ ہی سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں جب کنگ نے مکمل یقین دہانی کرا دی تو ہم نے یرغمالی لڑکے کے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور اسے لے کر لاری سے باہر نکل آئے۔ گارڈز نے فوراً پروفیسر کے ہاتھوں سے ریوالور لے لیا اور اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ ہمیں اسلحے کی چھاؤں میں کنگ براؤن کے روبرو لے جایا گیا۔ کنگ براؤن ایک گول کمرے میں بڑی تمکنت کے ساتھ صوفے پر براجمان تھا۔ سامنے شیشے کی ٹیبل پر واکی ٹاکی' سگریٹ کیس' لائٹر اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ میری توقعات کے برعکس کنگ براؤن کسی لحیم شحیم شخص کا نام نہیں تھا۔ وہ درمیانے قد اور اکہرے جسم کا شخص تھا۔ جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی شخصیت عام سی ہونے کے باوجود عام نہیں تھی۔ اس کی شخصیت دو چیزوں کی وجہ سے خاص بن جاتی تھی۔ ایک اس کی آنکھیں اور ایک اس کا پالتو جانور۔ اس کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں اور ان بظاہر پرسکون آنکھوں کو

دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان میں دنیا جہان کا قہر و غضب سمٹا ہوا ہے اور ان کی گہرائی اور پُراسراریت اتھاہ ہے۔ دوسری چیز کنگ کا پالتو جانور تھا۔ دولت مند شوقینوں کو اپنے ساتھ کتے بلیاں اور طوطے وغیرہ رکھتے تو دیکھا تھا مگر کنگ کی گود میں جو شے پالتو جانور کے طور پر موجود تھی وہ ایک LIZARD تھا۔ مخصوص نسل کا یہ افریقی چھپکلا قریباً انسانی بازو کے برابر تھا۔ چھپکلے کی زردی مائل آنکھیں بالکل بے حرکت نظر آتی تھیں مگر وہ جس چیز پر جمتی تھیں جم کر رہ جاتی تھیں۔ اس کے منہ کو ایک جالی دار تھیلی سے بند کیا گیا تھا' اس کے باوجود اس کی حرکات دیکھ کر جھرجھری سی آتی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے چوڑے پنجوں کو حرکت دے کر تیزی سے اوپر گیا اور کنگ براؤن کے کندھے پر مقیم ہو گیا۔ کنگ براؤن کی برمے کی طرح چھیدتی ہوئی نگاہیں میرے سر میں گھس رہی تھیں۔ وہ بھاری آواز میں بولا "ہم نے ہرگز نہیں چاہا تھا کہ ہماری ملاقات اس انداز میں ہو' بہرحال ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہمیں بہت ارجنٹ بات چیت کے لیے کانفرنس روم میں رکنا پڑ گیا۔"

"جو کچھ ہوا اس پر مجھے خود بھی شرمندگی اور افسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

زرین نے بھی کچھ سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کنگ نے سر کے اشارے سے پروفیسر کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ کنگ کے عقب میں چوکس کھڑے گارڈز میں سے دو آگے بڑھے اور انہوں نے پروفیسر کو ہتھکڑی ڈال دی۔ چونکہ شرائط پہلے سے طے ہو چکی تھیں لہٰذا پروفیسر نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ تاہم اس کا چہرہ دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی ہوتا تھا کہ وہ اپنے اندر طوفان سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کنگ براؤن کے علاوہ ماسٹر استھی' اس کا چچا چین' چند خبیث صورت لڑکے اور گارڈز وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔ ان سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ وجہ یقیناً اس لڑکے کا اچانک قتل ہی تھا جو اچانک پروفیسر کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ ان لوگوں کے بس میں ہوتا تو یقیناً پروفیسر کے ساتھ ساتھ ہماری بھی تکا بوٹی کر ڈالتے مگر کنگ کی موجودگی میں وہ خاموش اور باادب تھے۔ کنگ نے مجھے اور زرین کو چند گارڈز کے ساتھ واپس ہمارے کمرے میں روانہ کر دیا۔ گارڈز کے علاوہ ہوسٹل انچارج سوزی کو بھی ہماری حفاظت کی خصوصی ہدایت کر دی گئی۔

O☆O

اگلے تین چار روز خاموشی سے گزر گئے۔ پروفیسر کی بیٹی شائستہ کے بارے میں جان کر صفدر کو بھی دکھ ہوا تھا۔ بہرحال میری طرح صفدر کے دل میں بھی یہ امید موجود تھی کہ شاید پروفیسر کی معلومات ناقص ہوں۔ ویسے بھی اس کی ذہنی حالت ابتر نظر آتی تھی۔ اس کی بات پر سو فی صد یقین کر لینا نادانی تھی۔ نجانے کیوں مجھے امید تھی کہ شائستہ کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملے گی۔ وقت آگے کو سرک رہا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ سوزی بھی اب کافی محتاط ہو گئی تھی۔ ہمارے کمرے کے سامنے ہر وقت دو یا تین گارڈز موجود رہتے تھے۔ ان میں سے کم از کم ایک گارڈ کا تعلق اس ماریا ٹرسٹ کے خاص الخاص پورشن "کیمپس" سے محسوس ہوتا تھا۔ کیمپس کے گارڈز کی نشانی وہی نیلگوں وردی تھی۔ غالباً اسی گارڈ کی وجہ سے سوزی ہم سے نگاہ چرائے رکھتی تھی۔ ایک روز موقع دیکھ کر اس نے غزالہ اور کلثوم کی خیر خیریت سے آگاہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ غزالہ کو اس نے واپس کمرے میں بھیج دیا ہے اور اس کی حفاظت کا خاص انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سوزی ہی کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ شاید ایک آدھ دن میں کنگ مجھے دوبارہ ملاقات کے لیے کیمپس میں طلب کرے۔

سوزی کی پیشگی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ ایک روز شام سے ذرا پہلے ہمارے کمرے کے سلاخ دار دروازے پر پرکشش جسم والی سوزی نمودار ہوئی اور اس نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم لباس بدل کر تیار ہو جائیں ہمیں کیمپس میں لے جایا جا رہا ہے۔ ہم سے سوزی کی مراد صفدر اور مجھ سے تھی۔ ہمیں حکم دے کر وہ بڑی بانکی چال چلتی ہوئی واپس چلی گئی۔ وہ اکثر چست پتلون پہنے رکھتی تھی۔ اس کا لباس اس کی چال کو اور بھی قیامت خیز کر دیتا تھا۔ زرین گل ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ صفدر بولا "ایسی ٹھنڈی سانسیں بھرنے سے بہتر ہے کہ کوئی سفارش وغیرہ لڑا کر کلثوم کی تبدیلی اس کمرے میں کروا لو۔ ہم باتھ روم کے اندر ٹھنڈے فرش پر سو جایا کریں گے۔"

صفدر کی چوٹ پر زرین گل تلملا گیا "صفدر بھائی! تم اماری ٹھنڈی سانس کا غلط مطلب لے رہے ہو۔ ام کو تو اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ یہ لوگ ام کو اہمیت کیوں نہیں دے رہا۔ اگر آپ دونوں کے ساتھ کنگ ام کو بھی بلا لیتا تو اس کا کیا نقصان ہو جاتا۔"

"اس میں کنگ کا کوئی قصور نہیں۔ تم نے پیشہ ہی ایسا چن لیا ہے کہ ایک خاص حد تک ہی تمہاری عزت کی جا سکتی ہے۔ تم سے کون کہتا تھا کہ جہاز میں اور یہاں خود کو مالشیے کے طور پر اسٹیبلش کرو۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ام بقلم خود اپنی مرضی سے

ماشیا بنا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کرو صفدر بھائی کیوں اپنا ایمان خراب کر رہے ہو۔"

صفدر ہولے سے بولا "ایمان تو تم خراب کر رہے ہو۔ ٹھنڈی سانسیں کسی اور وجہ سے بھر رہے ہو اور بتا کوئی اور وجہ رہے ہو۔ سوزی جب بھی آئی ہے میں نے تمہیں ایسے ہی ہوا چھوڑتے دیکھا ہے۔"

زریں کے کسی تند و تیز جواب سے بچنے کے لیے صفدر جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور صفدر دو گارڈز کی معیت میں کیمپس کی طرف جا رہے تھے۔ یہ گارڈز نیلگوں وردیوں والے تھے اور کیمپس سے ہمیں لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ ہم اس مخصوص مقام پر پہنچے جس سے آگے کچھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔ یعنی ہماری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور سماعت کے راستے بھی بلاک کیے گئے' اس کے بعد رنگین شیشوں والی ویں میں بٹھا کر ہمیں روانہ کر دیا گیا۔ تمام سابقہ مراحل سے گزر کر ہم شام سات بجے کے لگ بھگ کنگ براؤن کی خدمت میں پہنچ گئے۔ کنگ سے ہماری ملاقات اسی آفس نما کمرے میں ہوئی جس میں پہلے بھی میں ایک گھنٹا بیٹھ کر اس کا انتظار کر چکا تھا۔ اسی آفس نما کمرے میں ماسٹر اسمتھی کے کزن جوم نے مجھ پر انڈوں کے ذریعے چاند ماری کی تھی۔ کنگ نے اپنی وسیع و عریض میز کے عقب سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ LIZARD حسب سابق اس کی گود میں تھا۔ کنگ گاہے گاہے اپنی انگلیوں سے اس کی چتک دار کھال کو سہلاتا تھا۔ ایک چوکس گارڈ دفتر کی اندرونی سیڑھیوں کے قریب ہی موجود تھا۔ میں نے بے اختیار سیڑھیوں کے بالائی سرے کی طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے ابھی چپکے سے کوئی کھڑکی کھلے گی اور ایک انڈا ہوا میں تیرتا ہوا میری پیشانی پر پھوٹے گا۔ مگر اس مرتبہ مجھے ادھ کھلی کھڑکی کے بجائے پوری کھلی ہوئی کھڑکی نظر آئی۔ اس میں ماسٹر اسمتھی کھڑا تھا۔ وہ بڑی کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اسی دوران میں کنگ براؤن نے رخ پھیر کر اوپر اسمتھی کی طرف دیکھا اور آواز دے کر اسے نیچے بلا لیا۔ اسمتھی بڑی مردانہ چال چلتا نیچے آیا اور بدتمیزی سے پھیل کر کرسی پر بیٹھ گیا "گڈ ایوننگ ماسٹر اسمتھی۔" میں نے کہا۔

اسمتھی نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ اس کا جبڑا مسلسل حرکت میں تھا' وہ چیونگم چبا رہا تھا "جو کچھ پہلے ہوا اسے بھول جاؤ اسمتھی۔" کنگ نے بارعب آواز میں کہا "یہ آج سے تمہارے دوست ہیں۔"

"اوکے۔" اسمتھی نے مختصر جواب دیا۔

"چلو اٹھ کر ہاتھ ملاؤ۔" کنگ نے کہا۔

چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد اسمتھی ہماری طرف آیا۔ ہم دونوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسمتھی نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور پھر باپ سے اجازت لے کر واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کنگ بولا "بے شک ماسٹر اسمتھی ایک مشکل بچہ ہے' لیکن جو اسے سمجھ جائے اس کے لیے بہت دلچسپ دوست اور جاں نثار ساتھی بھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ماسٹر کی طرف سے تمہیں کوئی غیر معمولی شکایت نہیں ہوگی۔ اگر چھوٹی موٹی شکایت تم نے برداشت کر لی' بہت جلد تم اسے اپنا دوست پاؤ گے۔"

میں نے اور صفدر نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

کچھ دیر ہم سے مصروف گفتگو رہنے کے بعد کنگ نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم کنگ کے عقب میں چلتے آفس کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک قالین پوش راہداری میں آ گئے۔ در و دیوار اپنے اندر بلا کی نفاست اور سجاوٹ سمیٹے ہوئے تھے۔ یہاں مکمل خاموشی تھی اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باوردی ملازم مجسموں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ جب کنگ سامنے سے گزرتا تو وہ احتراماً اپنی کمروں میں خم پیدا کر لیتے۔ طویل راہداری طے کر کے ہم جیسے ایک بند گلی کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ تاہم جونہی آگے بڑھے ایک دروازہ خودکار طور پر کھل گیا' دروازہ کھلتے ہی جیسے ہم کسی اور دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ ایک ایسی شان دار نشست گاہ تھی جس کا ہم نے کبھی نظارہ کیا تھا اور نہ تصور۔ بالکل یوں لگا جیسے اچانک ہمارے سامنے کوئی حسین و جمیل منظر کھل گیا ہے۔ کنگ کے عقب میں صفدر اور میں جھجکتے ہوئے سے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک بالکل گول کمرا تھا۔ اس گولائی کی مناسبت سے یہاں کا تمام فرنیچر بھی اپنے اندر مختلف گولائیاں رکھتا تھا۔ ایک نیم گول بہت بڑے گلاس بکس میں دنیا کی مہنگی ترین مچھلیاں اور جیلی فش تیر رہی تھیں۔ کمرے کی ایک دیوار پر نہایت خوب صورت لے آؤٹ میں ٹی وی کی چھوٹی چھوٹی چودہ پندرہ اسکرینز تھیں۔ یہ اسکرینز اس کمرے کی آرائش کا حصہ ہی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نشست گاہ میں کئی نادر پینٹنگز اور نوادرات سجاوٹ کے طور پر موجود تھے اور جو چیز بھی تھی وہ قیمت اور خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ ہم آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کنگ براؤن بولا "اس نشست گاہ میں ہمارے خاص ساتھی اور دوست ہی پہنچتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنی نشست کے ساتھ ایک کنٹرول پینل کی طرف ہاتھ بڑھایا' ایک بٹن کے دبتے ہی سامنے دیوار میں

ایک نیم گول خلا پیدا ہوا اور ایک شان دار بار روم ہمارے سامنے آ گیا۔ اس میں دنیا کی مہنگی ترین شرابیں مع لوازمات کے موجود تھیں۔ ایک بغلی دروازہ خودکار طریقے پر بے آواز کھلا اور ایک پانچ ساڑھے پانچ فٹ کی جیتی جاگتی قیامت اندر آ گئی۔ اس لڑکی کے جسم پر لباس کے نام پر کپڑے کے صرف دو مختصر ٹکڑے تھے۔ وہ سفید فام تھی اور اس کے سنہری بالوں نے اس کے کندھے ڈھانپ رکھے تھے۔ کمر میں خم دے کر اس نے کنگ کو تعظیم پیش کی اور شراب خانہ خراب کی طرف بڑھی۔ میں نے اور صفدر نے معذرت کے ساتھ انکار کر دیا۔ ہمارے سامنے قیامت خیز حسینہ نے سوفٹ ڈرنکس سرو کیے' کنگ کی خدمت میں سفید شراب "جن" کا جام پیش کیا گیا۔ فرانس کے بنے ہوئے اس جام کے پیندے میں ہیرے جگمگا رہے تھے۔ خوشبودار ساقی سے جام وصول کرنے کے بعد کنگ نے اپنے بازو پر بیٹھے ہوئے چھپکلے کو ساقی کی طرف اچھال دیا' پالتو چھپکلا جست لگا کر لڑکی کے سینے سے چمٹ گیا۔ لڑکی نے چھپکلے کو تھپتھپایا اور سینے سے لگائے لگائے باہر لے گئی۔ میں حیران ہوا۔ بات تھی بھی حیران ہونے کی۔ چھپکلی چوہے وغیرہ سے ڈرنا عورت ذات کی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ نوجوان لڑکی اتنے بڑے کریہہ چھپکلے کو سینے سے لپٹا کر باہر لے گئی تھی۔ یقیناً یہ مسلسل تربیت اور ایک کڑے ماحول کا نتیجہ تھا۔ اس لڑکی اور چھپکلے کو ایک ساتھ دیکھ کر مجھے کچھ ویسا ہی احساس ہوا جیسے سرکس میں شیر کو آہنی کڑے میں سے گزرتے دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہ دونوں مناظر جبلت پر بے پناہ جبر کے اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔

شاندار نشست پر جگمگاتا جام ہاتھوں میں لیے کنگ واقعی کوئی کنگ نظر آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پناہ شان و شوکت تھی۔ اس کے علاوہ وہ خوب صورت بھی تھا۔ اس کا رنگ سفید سے زیادہ گندمی محسوس ہوتا تھا' عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ ہاں کسی وقت غور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے میں بیماری اور نقاہت کی جھلک ہو۔ خاص طور سے اس کی آنکھیں کسی وقت نمایاں طور پر خوابیدہ اور بیمار نظر آنے لگتی تھیں۔ کثرت سے شراب نوشی کرنے والے اور عیش و عشرت کے دلدادہ لوگوں پر میں نے ایسی بیماری پرچھائیں اکثر دیکھی ہے۔ شاید یہ بھی مکافات عمل ہی کا کوئی روپ ہوتا ہے۔

شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کنگ براؤن نے کہا "ہم ہمیشہ سے دلیر اور ذہین ساتھیوں کی قدر کرتے ہیں۔ جو ایک بار ہمارا دوست بن جاتا ہے پھر وہ ہمیشہ کا دوست اور جاں نثار ہوتا ہے۔ ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ تم دونوں سے بھی ہمارے اسی طرح کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔"

"یہ صرف آپ کا حسنِ نظر ہے ورنہ ہم کس قابل ہیں۔" میں نے کہا۔

کنگ بولا "ہمیں پتا چلا ہے کہ جہاز ہرکولیس میں جب لڑائی کے دوران میں آگ بھڑک اٹھی تو تم نے بروقت پانی کی لیکیج کو درست کیا جس کے سبب آگ بجھ گئی اور ہرکولیس بڑی تباہی سے بچ گیا۔ اس کے علاوہ ٹام جیسے خوں خوار سے دوبدو مقابلہ کرنے اور اسے ہرانے کا کریڈٹ بھی تمہیں جاتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ بندہ پروری سے کام لے رہے ہیں ورنہ میں ذاتی طور پر اسے کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتا۔"

کنگ نے صفدر کی طرف اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا "لگتا ہے کہ تم بھی کام کے آدمی ہو۔ مائیکل کی مطلوبہ لڑکیاں بمبئی سے جہاز پر لانے میں تم نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد حزانیہ میں ایک کانی نارم سے فرار ہوتے وقت بھی تم نے خوب تباہی مچائی۔ ہم غلط تو نہیں کہہ رہے؟"

"آپ بالکل بجا ارشاد فرما رہے ہیں لیکن میری جگہ کوئی بھی شاہ جہاں صاحب کا ہم سفر ہوتا' اسے کم از کم اتنی جدوجہد تو کرنا ہی پڑتی۔"

"ہاں بھئی! بات تو ساری ہم سفری کی ہوتی ہے' تم شاہ کے ساتھی ہو تو آخر اس کی کوئی وجہ ہوگی۔"

پھر اس نے ہماری طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر کنٹرول پینل سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی۔ دیوار پر موجود ٹی وی اسکرینز میں سے ایک روشن ہو گئی۔ ایک دل فریب منظر ہمارے سامنے آیا۔ یہ ایک ان ڈور سوئمنگ پول کا منظر تھا۔ چار پانچ افراد تیراکی کے لباس میں نظر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ چار پانچ حسین تتلیاں بھی تھیں۔ ان خوب صورت لڑکیوں کو کسی بھی انٹرنیشنل لیول کے کمرشل میں بہ آسانی ماڈل لیا جا سکتا تھا۔ یہ مختصر لباس والی لڑکیاں سوئمنگ میں مردوں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ایک جوڑا تالاب کے اندر ہی ربر کی کشتی میں پی پلا کر خوش فعلیاں کرنے میں مصروف تھا۔ تالاب کے کنارے ڈنر کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ایک نہایت خوب رو لڑکی جھالر دار میزوں کے درمیان آرکسٹرا کی دھن پر ہولے ہولے رقص فرما تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میں ایک بار پھر چونک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھتا' کنگ نے شاہانہ انداز میں کہا "جو ہمارا ساتھ دیتے ہیں ہم ان کے لیے اسی طرح ہر جگہ خوشیاں بکھیر دیتے ہیں۔ یہ سب ہمارے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو شاید تم پہچان بھی سکتے ہو۔" اس نے کنٹرول پینل پر

ایک "بی" کو بہ آہستگی سرکایا۔ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کیمرا زوم ان کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سوئمنگ پول کا ایک گوشہ ٹی وی اسکرین پر واضح ہو گیا۔ میں ہرکولیس جہاز کے کپتان جم کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ بلانوش سوئمنگ پول کے کنارے ایک ریسٹ بیڈ پر اوندھا لیٹا تھا' ایک ادھ کھلی کلی جیسی نوخیز ہندوستانی لڑکی اس کی پیٹھ کی مالش کر رہی تھی۔ جم کی آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ سوجی ہوئی تھیں اور اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس نے اپنے مٹکے سی توند میں کئی بوتلیں انڈیل رکھی ہیں۔ یہ سب لوگ خود کو کسی زمینی جنت میں محسوس کر رہے تھے اور سرشار تھے۔ کنگ نے کنٹرول پینل پر "بی" کو سرکایا۔ کیمرا پین کرتا ہوا مچھیروں کی طرف چلا گیا۔ میں نے رقص کناں لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس انڈین رقاصہ کا نام اوتو ہے جناب! یہ ہرکولیس پر ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ ممم... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

کنگ بڑی شان سے مسکرایا "یہ رقاصہ کیا چیز ہے' یہاں ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو اس زیرِ زمین بستی سے باہر نکلیں تو سورج کی روشنی ماند پڑ جائے۔"

پھر کنگ نے بٹن دبایا اور ایک مزید اسکرین روشن ہو گئی۔ یہ بھی ایک شاندار کمرا تھا' یہاں دیوار پر ایک قطار میں چودہ پندرہ وال کلاک لگے ہوئے تھے' ہر کلاک کسی ملک کے دارالحکومت کا مقامی وقت بتا رہا تھا۔ نیچے کرسیوں پر وائرلیس اور ٹیلی فون آپریٹر موجود تھے۔ ان کے کانوں پر ہیڈ فونز چڑھے ہوئے تھے۔ یہ قریباً ڈیڑھ درجن آپریٹر سخت مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کنگ نے کہا "یہاں رہتے ہوئے بھی ہم پوری دنیا کے حالات سے چوبیس گھنٹے باخبر رہتے ہیں۔ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بی بی سی اور وائس آف امریکا سے بھی پہلے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔"

پھر ایک اور اسکرین چند لمحے کے لیے روشن ہوئی۔ ایک شاہانہ خواب گاہ جو کہ انٹیریئر ڈیکوریشن کا نادر نمونہ تھی' اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کنگ جان بوجھ کر ہمیں اپنی شان و شوکت اور جاہ و حشمت کی جھلکیاں دکھا رہا ہے۔ وہ جیسے کسی منظر کو تلاش کرنے کے لیے مختلف بٹن دبا رہا تھا۔ کبھی کوئی اسکرین روشن ہو جاتی تھی' کبھی کوئی۔ اچانک ایک اسکرین پر ایک لرزہ خیز منظر ابھرا۔ کسی عقوبت گاہ میں ایک حبشی نوجوان مادر زاد برہنہ الٹا لٹکا ہوا تھا۔ تین عریاں حبشی اس سے لپٹے ہوئے تھے اور اپنے دانتوں سے اس کا گوشت ادھیڑ رہے تھے۔ ان کے منہ خون سے تھڑے ہوئے تھے اور فرش پر بھی خون تھا۔ یہ مختصر سی جھلک بس ایک دو سیکنڈ کے لیے نظر آئی۔ ہم یہ بھی نہ جان سکے کہ الٹا جھولتا ہوا بدنصیب شخص زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ اس خونی منظر کے فوراً بعد اسکرین پر ایک دھواں دھار قمار خانے کا منظر ابھر آیا۔ یہاں جوئے کی میزوں پر لاکھوں بلکہ شاید کروڑوں ڈالر موجود تھے۔ یہ سب کچھ LIVE نظر آ رہا تھا۔

کنگ کی اندرونی خباثت آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ دو دروازوں والی کہانی تھی۔ ایک دروازے کے عقب میں حسینہ اور دوسرے کے پیچھے شیر تھا۔ کہانی میں تو قیدی کو معلوم نہیں تھا کہ کس دروازے کے پیچھے کیا ہے' لیکن ہمیں بتایا جا رہا تھا کہ کون سا دروازہ کھولو گے تو زندگی برآمد ہوگی اور کس دروازے کی طرف بڑھو گے تو موت سے دست پنجہ ہوگا۔

یہ تو ہم بہت پہلے جان گئے تھے کہ ہرکولیس جہاز کی طرح اس "ماریا زسٹ" میں بھی بہت سی جگہوں پر خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں لیکن اس نشست گاہ میں پہنچنے سے پہلے ہمیں معلوم نہیں تھا کہ نگرانی کا یہ نظام اتنا مربوط اور وسیع ہے۔ کمرا ایک میجک آئی کی طرح تھا' جو ہر جگہ ہر زاویے سے دیکھ سکتی تھی۔ دفعتاً ایک منظر دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ صنوبر بھی بری طرح چونک پڑا تھا۔ میں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ ایک اسکرین پر میں خود دکھائی دے رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ تصویر زیادہ صاف نہیں تھی مگر میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسکریو ڈرائیور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اچانک مقتول پہرے دار انیس منظر میں داخل ہوا۔ میں نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور اسکریو ڈرائیور اس کی شہ رگ پر رکھ کر "خبردار لومڑ! آواز نکالی تو یہ گردن میں دھنسا دوں گا۔" میری بہت مدھم آواز ابھری۔ انیس بے حد ڈرا ہوا دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر بعد پھر میری مدھم اور قدرے ناصاف آواز سنائی دی "میری بات پورے گیان دھیان سے سنو۔ میرے سر پر خون سوار ہے۔ تم نے کسی حرام زادے کے ساتھ نمک حرامی کی کوشش کی تو ایک سیکنڈ میں اوپر پہنچا دوں گا۔"

کچھ ہی دیر بعد میں انیس کو دبوچے ہوئے مکان کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں کچھ دیر کے لیے کٹ ہوا' پھر ایک اندرونی راہداری کا کیمرا کام کرنے لگا۔ راہداری کے سامنے جالی دار دروازہ لگا ہوا تھا "یہ دروازہ کھلواؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "اور تمہاری زندگی کی ضمانت بس اسی میں ہے کہ تمہارا دماغ کوئی چالاکی

کر جائے۔" اس مرتبہ میری آواز کافی صاف تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ مائیکرو فون میرے کہیں بہت قریب نصب ہے۔ کچھ دیر بعد چوڑے کولہوں والی فربہ اندام ملازمہ نے دروازہ کھولا اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو میں انیس سمیت اندر داخل ہوا۔ تصویر اب کافی صاف ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور مقتول پہرے دار ہیڈ انچارج مُرقس کی خواب گاہ کے دروازے پر نظر آ رہے تھے "یہی ہے تیرے باپ کا کمرا؟" میں نے انیس سے پوچھا۔ آواز ایک بار پھر مدھم تھی۔ انیس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے دروازہ کھلوایا اور دروازہ کھلنے سے چند لمحے پہلے انیس کی گردن مروڑ کر اسے ایک طرف ڈال دیا پھر دروازہ کھلا اور مقتول مُرقس کی خوابیدہ صورت نظر آئی۔ اس نے اپنی اونٹ نما گردن نکال کر باہر دیکھا ہی تھا کہ میں نے اسے دبوچا اور خواب گاہ میں لے گیا۔ یہاں یہ طویل منظر ختم ہو گیا۔ غالباً خواب گاہ میں کیمرے نہیں تھے۔ اس کے بعد ایک ادھورا سا منظر نظر آیا جب میں انیس کا بے ہوش جسم گھسیٹ کر خواب گاہ میں لے گیا تھا۔ اس کے بعد آخری منظر دکھائی دیا۔ یہ دوہرے قتل کے بعد کا منظر تھا۔ میں آلۂ قتل یعنی اسکریو ڈرائیور ہاتھ میں لیے صحن میں آیا' بعد میں مجھے مکان کی بیرونی دیوار پھلانگتے ہوئے بھی دکھایا گیا۔

کنگ کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ ابھری' اس نے بٹن دبا کر اسکرین تاریک کر دی۔ میں اور صنوبر گم صم تھے۔ وہ بولا "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ریکارڈ شدہ فلم میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ ہیڈ انچارج مرقس اچھا شخص تھا' لیکن اب وہ اچھا نہیں رہا تھا۔ پانچ عورتوں نے اس کی صلاحیتوں کو پانچ گنا کم کر دیا تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہمارے ساتھیوں کی صلاحیتیں کم ہو جاتی ہیں تو وہ ہمارے نزدیک غیر اہم ہو جاتے ہیں۔ مرقس کا گناہ کچھ اور تھا۔" کنگ چند لمحے خاموش رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ ہمیں مرقس کے گناہ کے بارے میں بتائے یا نہیں' پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدلے اور اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمک گئے۔ بولا "ایسے ہمیں یقین ہے کہ تم قسمت کے دھنی ہو۔ تم نے ماریا زسٹ میں داخل ہوتے ہی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ ماریا زسٹ میں کوئی ہماری اجازت کے بغیر مکھی مچھر مارنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے دو جیتے جاگتے بندے قتل کیے (وہ پہرے دار انیس کو گنتی میں نہیں لا رہا تھا) اور دونوں کا شمار ہمارے ساتھیوں میں ہوتا تھا' مگر اس کے باوجود ہم تمہارے خلاف کسی قسم کا غصہ یا عناد محسوس نہیں کرتے۔ شاید تم ہمارا شکریہ ادا کرنے کا ارادہ کر رہے ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس میں شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ دونوں بندے جو تمہارے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں' ہمیں مقتول ہی درکار تھے' کیونکہ وہ سنگین خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔"

"میں اپنے طور پر شرمندہ ہوں کیونکہ......"

"رسمی کلمات کی ضرورت نہیں۔" کنگ نے شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھایا "جو تم کہنا چاہ رہے ہو وہ ہمیں معلوم ہے۔" اس نے کچھ دیر توقف کیا۔ اس کی نگاہوں کا برما جیسے ہم دونوں کے سر میں گھس رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم کچھ بھی ان نگاہوں سے چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔ اس نے ایک بٹن دبایا۔ نہایت مختصر لباس والی حسینہ خوفناک چھپکلا سینے سے لگائے اندر داخل ہوئی۔ کنگ نے چھپکلا اس سے لے لیا اور پُرسوچ انداز میں دھیرے دھیرے اس پر ہاتھ پھیرنے لگا "اب تم جاؤ۔" اس نے گمبھیر آواز میں کہا "کل مائیکل تم سے ملے گا اور ایک اہم کام تمہارے سپرد کرے گا۔"

"بہت شکریہ جناب۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا کہنے لگا "شاید تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو۔"

میں اس کی تیز نگاہی کا قائل ہو گیا۔ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے میں نے کہا "جناب! اگر یہ کام اُتر پردیشی قیدیوں کے حوالے سے ہے' تو میں ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ کام اُتر پردیشی قیدیوں کے حوالے سے نہیں۔ بہرحال تم کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"گزارش یہ ہے کہ اتر پردیشی قیدیوں میں سے ایک لڑکی کملا اپنے نومولود بچے سمیت قتل کر دی گئی ہے۔ ہیڈ انچارج مرقس نے اتر پردیشی قیدیوں کے سامنے یہ غلط بیانی کی تھی کہ وہ لڑکی کو میرے پاس لے جا رہا ہے۔ اب وہ قیدی یہی سمجھ رہے ہیں کہ لڑکی بخیر و عافیت میری تحویل میں ہے' جبکہ اس کو مرے ہوئے بھی اب کئی روز ہو چکے ہیں۔ اتر پردیشی مجھ پر جو اندھا اعتماد کرتے ہیں وہ شدید خطرے میں ہے۔"

"ٹھیک ہے شاہ! میں اس سلسلے میں مائیکل کو ہدایات دیتا ہوں۔"

"میں نے خود بھی مائیکل سے درخواست کی تھی' لیکن شاید انہیں یاد نہیں رہا یا پھر انہوں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔"

"ٹھیک ہے میں اسے خاص تاکید کر دوں گا۔"

ہم نے حسب رواج الٹے پاؤں چل کر کنگ کو خم دیا اور کنگ براؤن کو تعظیم پیش کی۔ خوفناک افریقی چھپکلا اس وقت کنگ کے کندھے پر سوار تھا اور اپنی زردی مائل آنکھوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ بالکل جیسے وہ ہمیں پہچانتا ہو۔ ہمارے ناموں سے اور ہمارے حسب نسب سے واقف ہو۔ ہم دروازے سے نکلنے کے لیے گھومے تو کنگ کی آواز نے ہمارے پاؤں جکڑ لیے "ہمیں افسوس ہے کہ تمہاری ڈاکٹر دوست کے ساتھ مائیکل کے ایک دوست نے دست درازی کی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال یہ امر تسلی بخش ہے کہ دست درازی کرنے والا کیفر کردار کو پہنچ گیا ہے۔"

"آپ کے احساسات جان کر ہمارے دلوں میں آپ کی عقیدت بڑھ گئی ہے۔" صفدر نے گردن کو خم دے کر کہا۔

ایک بار پھر تعظیم پیش کر کے ہم اس حیرت انگیز نشست گاہ سے باہر نکل آئے۔ وہ گارڈز جو ہمیں یہاں تک لے کر آئے تھے باہر کھڑے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ان کے انداز بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا رویہ تحکمانہ تو پہلے بھی نہیں تھا، اب وہ واضح طور پر خوش اخلاق اور مؤدب نظر آ رہے تھے۔ غالباً یہ تبدیلی ہماری موجودہ ملاقات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ہم نے کنگ براؤن کے ساتھ اس کی خصوصی نشست گاہ میں وقت گزارا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، گارڈز کو ہمارے حوالے سے نئی ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ ان ہدایات کا پتا اس وقت چلا جب ہم مختلف صاف شفاف راہداریوں سے گزرتے ہوئے اور اس زیر زمین بستی کا نظارہ کرتے ہوئے تفتیش تک پہنچے۔ تعجب ہوا کہ تفتیش سے ہمیں اتارنے کے بعد اور تلاشی وغیرہ کے مراحل سے گزارنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور نہ کانوں میں ایئر ڈاٹس لگائی گئیں۔ ہمیں تاریک شیشوں والی ویگن میں بٹھایا گیا اور ویگن خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے تقریباً ایک درجن مرتبہ اس راستے پر سفر کیا تھا لیکن آج پہلی بار راستے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس راستے کے بارے میں اب تک جتنا تجسس میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا وہ سارا ایک دم سے آنکھوں میں سمٹ آیا۔ یہ جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ہم کسی چار دیواری سے نکل کر شہر کی کسی سڑک پر پہنچنے کے بجائے زمین کے نیچے ہی نیچے ایک طویل سرنگ میں سفر کرنے لگے۔ اس سرنگ کے اندر شاندار سڑک بچھی ہوئی تھی اور دو طرفہ ٹریفک بہ آسانی چل سکتی تھی۔ اس سڑک پر مجھے زیر زمین بستی کے رہائشی اور کارکن رواں دواں نظر آئے۔ کاروں اور گاڑیوں کے علاوہ چند ایک موٹر سائیکل بھی یہاں رواں دکھائی دیے۔ روشنیوں نے اس راستے کو جگمگا رکھا تھا۔

صفدر نے ہمت کر کے ایک گارڈ سے پوچھا "یہ سرنگ کسی کان کا حصہ ہے؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" گارڈ نے خوش خلقی سے جواب دیا۔ یہ سینئر گارڈ تھا۔

"اگر یہ واقعی کان ہے تو پھر یقیناً یہ لوہے کی کان ہو گی کیونکہ میری معلومات کے مطابق ماریطانیہ لوہے کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی بات درست ہے لیکن فقرہ غلط ہے۔" گارڈ مسکرایا۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "یہ لوہے کی کان" ہے "نہیں۔ لوہے کی کان تھی" کسی زمانے میں یہاں سے لوہا نکلتا تھا پھر یہ بند ہو گئی اور برسوں بند رہی۔ بعد ازاں ہمارے کنگ کی نظر اس پر پڑی اور یہ آباد ہو گئی۔"

میرا اور صفدر کا یہ قیافہ درست ثابت ہوا تھا کہ ہاسٹل اور کیمپس دو جگہوں کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک ہی "ٹرسٹ" کے دو حصے ہیں جنہیں ایک طویل زمین دوز سرنگ نے باہم ملا رکھا ہے۔ اس زمین دوز راستے کو طے کر کے ہم ہاسٹل میں پہنچ گئے لیکن اس مرتبہ ہمیں سلاخ دار دروازوں والے کمرے میں نہیں پہنچایا گیا بلکہ اس رہائشی حصے میں لے جایا گیا جہاں ہیڈ انچارج مرقس اور دیگر اعلیٰ عہدے داروں کے مکانات تھے۔ ایک مکان جو باہر سے سادہ اور اندر سے خاصا جائے آسائش تھا ہمارا منتظر تھا۔ اس شاندار رہائش کی خوب صورتی کو چار چاند لگانے کے لیے غزالہ یہاں موجود تھی اور یہاں کی رونق کو دوبالا کرنے کے لیے زرد کلثوم بھی یہیں پائے جاتے تھے۔ غزالہ بہت نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ غالباً وہ ابھی ابھی نہائی تھی اس کے بال کنگھی کے ڈھیلی سی چوٹی کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ ماں اس کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر غزالہ کی آنکھیں چمک گئیں۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی اور بالکل غیر ارادی طور پر میرے بازو سے لگ کر سسکنے لگی۔ میں نے اس کا سر سہلایا۔ مجھے صفدر اور سوزی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ مبارک امین کے قتل کے بعد غزالہ میرے لیے از حد پریشان رہی ہے۔ اسے یہ شبہ تھا کہ مبارک امین سے

تاوان ☆ 141 ☆ بارھواں حصہ

عشق کا عین

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

خوبصورت گرد وپیش اور عمدہ طباعت کیساتھ

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

قیمت ۱۳۵ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ :

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار ، لاہور۔ فون :- ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ : علی بک سٹال

نسبت روڈ ، چوک میو ہسپتال ، لاہور۔ فون :- ۷۲۲۳۸۵۳

باری کے دوران میں جو تین فائر ہوئے تھے' وہ مجھ پر کیے گئے تھے۔ صفدر اور سوزی نے اسے بار بار تسلی دی تھی کہ میں صحیح سلامت ہوں' لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت میں غزالہ کا جو بے اختیار ری ایکشن دیکھ رہا تھا وہ اسی مسلسل بے چینی کا نتیجہ تھا جو وہ میرے حوالے سے محسوس کرتی رہی تھی۔ پھر جیسے ایک دم اپنے جذباتی پن پر اسے خود ہی عجیب سا لگا اور وہ مجھ سے الگ ہو گئی "آپ نے بہت پریشان کیا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں شکوے اور محبت کا امتزاج اتنا حسین تھا کہ لفظ ہیچ محسوس ہوتے ہیں۔ اس لمحے وہ مجھے اتنی پیاری لگی کہ جی چاہا ہر طرف سے بے خبر ہو کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں اور اتنی دور اڑا لے جاؤں کہ کسی غم کا تصور بھی ہمیں چھو نہ سکے۔

"شکر ہے کہ تم نے تسلیم تو کیا کہ پریشان رہی ہو۔ اس سے پہلے تو یہی اطلاع ملتی تھی کہ تابی میرے لیے پریشان رہا ہے۔"

"وہ بھی تو تھا استاد حبیب۔" زریں نے کہا "دیکھیے' کس طرح منہ اٹھا کر آپ کو تکا جا رہا ہے۔"

میں نے بے اختیار تابی کو اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگا اور خوش ہو کر میرے چہرے پر اپنا ملائم ہاتھ پھیرنے لگا۔ صفدر نے تابی سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ زریں گل بے حد مسرور نظر آ رہا تھا کیونکہ اسے کلثوم کے ساتھ علیحدہ پورشن مل گیا تھا۔ اس کی نظریں بار بار غزالہ کو خاموش سلام کر رہی تھیں جس سے میں نے اور صفدر نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ زریں کے لیے اس خلوت کا انتظام غزالہ نے ہی کیا ہے۔ ابھی رات کے صرف نو بجے تھے' لیکن زریں ابھی سے جماہیاں لے لے کر دکھا رہا تھا۔ نوخیز کلثوم کی آنکھیں بھی گاہے گاہے شراب سی چھلکانے لگتی تھیں۔ وہ اتنی سادہ اور بے تکلف تھی کہ اپنا کسی قسم کا احساس بھی چھپا نہیں سکتی تھی۔ وہ جب خوش ہوتی تھی تو اس کا انگ انگ خوشی سے جھومتا تھا' جب دکھی ہوتی تھی تو ایک معصوم بچی کی طرح روتی بسورتی نظر آتی تھی۔ صفدر نے اس سے پوچھا "کلثوم! تم چپ چپ کیوں ہو؟"

"ام کو بھی ماشاءاللہ بہت تیز نیند آتا۔" اس نے اردو کی ٹانگ توڑی۔

"یہ نیند ہے یا بارش ہے جو اتنا تیز آتا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"ہاں ام کو بارش میں بھی بہت تیز اور غصے کا نیند آتا۔"

"چلو۔ اب یہ غصہ درمیان میں کہاں سے آ گیا۔" صفدر سٹپٹایا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "سچ کہتا ہوں جان' ان میاں بیوی کا ساتھ رہا تو میری اردو کا جنازہ نکل جائے گا۔"

"ٹھیک ہی کہتے ہو۔" میں نے تائید کی "بڑے میاں بڑے میاں چھوٹی بی سبحان اللہ۔ بلکہ اگر چھوٹی بی کا موازنہ بڑے میاں سے کیا جائے تو بڑے میاں بھی ٹھیک ٹھاک علامہ نظر آنے لگتے ہیں۔"

"ہاں جی علامہ کے درجے پر نظر آتے ہیں۔" صفدر نے منہ بنا کر کہا۔

غزالہ نے مجھ سے پوچھا "آپ کہاں سوئیں گے؟ ساتھ والا کمرا بھی ہے' ایک کمرا اوپر کی منزل پر ہے۔"

"ہاں بھئی صفدر! کہاں سونا ہے؟"

صفدر زیر لب مسکرایا "چند دن پہلے رات کو زریں نے ایک گانا سنایا تھا۔ جس کا مطلب ہے نہ ہمدم ہے نہ کوئی ہمدم ہی دم ہے۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں... تو تنہا اعلیٰ میں تو جا رہا ہوں اوپر کی منزل پر۔"

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بڑی باریک بینی سے مکان کا جائزہ لیا اور اپنا یہ شک رفع کیا کہ کہیں اس رہائش گاہ میں بھی کیمرے اور ڈکٹا فون وغیرہ پوشیدہ نہ ہوں۔ اس کے بعد میں بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا' افریقہ کے تاریک ترین آسمان پر روشن تر چاند چمک رہا تھا اور اس کے ارد گرد ستارے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ تھمی ہوئی ہوا میں کھجور اور تاڑ کے طویل قامت درخت خاموش کھڑے تھے۔ میں دیر تک اس منظر کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن غزالہ نے آ کر کھڑکی بند کر دی اور اس نے ٹھیک ہی کیا۔ اے سی کی ٹھنڈک کو تپش کا عفریت تیزی سے نگل رہا تھا۔ غزالہ کے رویے میں ایک عجیب سی لگاوٹ اور محبت کی جھلک ملتی تھی۔ یہ جھلک مجھے ایک طویل... طویل عرصے بعد نظر آئی تھی۔ شاید کئی برسوں کے بعد۔ مبارک والے واقعے نے غزالہ کو بہت اندر تک متاثر کیا تھا۔ مبارک کے قتل سے چند لمحے پہلے غزالہ نے مجھے گارڈز کے نرغے میں دیکھا تھا۔ ان میں سے کئی گارڈز کے ہاتھ میں ریوالور تھے پھر اس نے فائرنگ سنی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے شوٹ کر دیا گیا ہے۔ نیم غنودگی میں وہ روتی اور مجھے پکارتی رہی تھی۔ بعد کے دنوں میں بھی غزالہ کے دل و دماغ پر میرا تصور پوری شدت سے سوار رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ آج جبکہ کئی روز کے بعد اس نے مجھے صحیح سالم اپنے سامنے دیکھا تھا' اپنے اندرونی جذبات اس سے چھپائے نہیں چھپ رہے تھے۔ وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی مگر اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ کرے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے' کسی صدمے کی بے پناہ حدت سے انسان کے اندر کی برف پگھل جاتی ہے' منجمد جذبوں کو روانی ملتی ہے اور وہ زمین بھی سیراب ہو کر زندہ ہو جاتی ہے' جس کی حیات نو کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کہنے کو تو یہ حادثے اور صدمے ہوتے ہیں مگر ان میں زندگی کا حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔

غزالہ اور تابی کو ساتھ والے کمرے میں سونا تھا' کچھ دیر تک وہ دونوں میرے ساتھ موجود رہے' میں اور غزالہ تابی کی معصوم حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر تابی ہلورے لینے والے کاٹھ کے گھوڑے پر اوندھا لیٹا لیٹا سو گیا۔ غزالہ نے کہا "اچھا میں چلتی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی فکر مندی رہی۔"

"لیکن سارا کیا دھرا تو میرا ہی تھا۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی "مجھے بچانے کے لیے آپ کو اپنا آپ خطرے میں ڈالنا پڑا۔"

"اب تم میرا شکریہ بھی ادا کرو تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ ہم واقعی ایک دوسرے کے لیے بیگانے ہیں۔" میں نے خفگی سے کہا۔

"نہیں شاہ جہاں۔" اس نے بے قرار ہو کر کہا "مجھے غلط مت سمجھا کریں۔ آپ نہیں جانتے آپ... آپ میرے لیے کیا ہیں۔ یہ کچھ مجھے ہی معلوم ہے کہ پچھلے دس پندرہ روز سامنے کیسے گزارے ہیں۔"

"تم دس پندرہ روز کی بات کر رہی ہو۔ میں نجانے کب سے ایسے ہی گزار رہا ہوں۔" غزالہ کی پلکیں جھک گئیں اور لب تھرتھرا کر رہ گئے۔

چند لمحے کی گمبھیر خاموشی کے بعد وہ بولی "میں اب جاؤں؟"

"تم بھی جانتی ہو۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف اثبات میں دے سکتا ہوں۔"

اس نے چہرے پر ڈھلک آنے والی ریشمی لٹوں کو سنبھالا اور میری طرف دیکھے بغیر بولی "آپ اپنا خیال رکھا کریں۔"

تب اس نے گھٹنوں میں خم دے کر تابی کو گھوڑے کی پیٹھ پر سے اٹھایا اور سینے سے لگائے لگائے باہر لے گئی۔

"شب بخیر" دروازے پر رک کر اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"شب بخیر۔" میں نے جواب دیا۔

نصف شب کا وقت ہو گا۔ میں پیشاب کرنے کے لیے باتھ روم میں گیا۔ اچانک باہر کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی' پھر کوئی جلدی سے کمرے میں آ گیا۔ مجھے چاپ سے اندازہ ہوا کہ یہ غزالہ ہے۔ چند سیکنڈ کے بعد غزالہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "شاہ جہاں... شاہ جہاں کہاں ہیں آپ؟" وہ جیسے پورے کمرے میں چکرا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے باتھ روم میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا' وہ تیزی سے باہر نکل گئی' پھر میں نے اس کی آواز برآمدے میں سنی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ میں جلدی سے باہر نکلا "غزالہ! میں یہاں ہوں..." میں نے کھڑکی کھول کر آواز دی۔

وہ تیزی سے واپس کمرے میں آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرے بازو سے لگ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا اور نرمی سے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس نے کسی قسم کا گریز ظاہر نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد میں اسے آہستگی کے ساتھ چلاتا ہوا صوفے پر لے آیا۔ کیا ہوا غزالہ— میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ ایک بار پھر میرے کندھے سے لپٹ گئی۔ اس مرتبہ وہ قدرے بلند آواز سے رو رہی تھی۔ روتے روتے بولی "شاہ جہاں! پتا نہیں' مجھے کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت آپ کے بارے میں ہی سوچتی رہتی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی کچھ اور نہیں سوچ سکتی... آپ... آپ مجھ سے وعدہ کریں شاہ جہاں! مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ نہ مجھے بتائے بغیر کہیں جائیں گے۔"

میں نے اسے تھپتھپا کر حوصلہ دیا "پاگل! میں تجھے چھوڑ کر جا سکتا ہوں کہیں۔ یہ تو میرے بس میں ہی نہیں ہے۔"

اس نے اپنا سر میرے شانے پر ڈھلکا دیا اور بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ اس کے نیم گرم آنسوؤں کی نمی میں اپنے کندھے پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسی طرح میرے بازو سے لپٹ کر بیٹھی رہی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سختی سے میرے بازو پر جمی ہوئی تھیں۔ ان انگلیوں کی پوروں میں جیسے انجانے اندیشے لرز رہے تھے۔ یہ انگلیاں بھی مجھ سے وہی بات کہہ رہی تھیں جو ابھی غزالہ نے خود مجھ سے کہی تھی۔

"یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا تھا۔" میں نے پوچھا "میں تو دو منٹ تمہارے لیے باتھ روم میں گیا تھا۔"

وہ میرے شانے سے لگے لگے بولی "چھت پر کسی کے بھاگنے کی تیز آواز آئی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ دھیان سیدھا آپ کی طرف چلا گیا۔ یہاں آکر دیکھا تو آپ بستر پر موجود نہیں تھے۔"

اس کے آنسوؤں کی نمی، اس کے بدن کی خوشبو، اس کے قرب کی لطافت، سب کچھ اتنا دل نشیں تھا کہ میں ایک سنہری دھند سے میں کھو گیا۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "معلوم ہے ایک دن صفدر کیا کہہ رہا تھا؟"

"کیا کہہ رہا تھا؟" وہ ناک میں بولی۔ چہرہ ہنوز میرے کندھے میں گڑا ہوا تھا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ....." میں خاموش ہو گیا۔

"بولیں نا.....؟" اس نے میرے بازو کو انگلیوں سے دبایا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ..... مجھے خود تمہاری طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ اپنی اور تمہاری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے خود کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ صفدر ٹھیک کہہ رہا تھا؟"

اس کے بدن میں جھرجھری سی نمودار ہوئی "مجھے نہیں معلوم۔" وہ نزلہ زدہ آواز میں بولی۔

"تو پھر کسے معلوم ہے؟"

"یہ بھی نہیں معلوم۔"

"تو تمہیں معلوم کیا ہے؟"

"مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔" اس نے کچھ ایسی ادا سے کہا کہ میں نے بے اختیار اپنے ہونٹ اس کے ریشمی بالوں پر رکھ دیے۔

کچھ دیر بعد غزالہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں بستر پر دراز ہو گیا اور سوچنے لگا۔ حالات کتنی آہستگی سے لیکن بتدریج تبدیل ہوئے تھے۔ تاریک براعظم افریقہ کے اس سفر میں اجالے میرے ہم قدم ہونے لگے تھے۔ غزالہ اور میں ایک طویل جدائی..... کے بعد پھر غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے۔ میں نے گزر جانے والے چند ہفتوں پر نظر دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ میرے اور غزالہ کے تعلق کا جمود ہرکولیس کے سفر میں ٹوٹا تھا۔ "محبت کے جزیرے" پر گزری ہوئی وہ رات یادگار تھی۔ کبھی کبھی ایک دشمن کی دشمنی وہ کام کر جاتی ہے، جو مخلص ترین دوستوں کی دوستی بھی نہیں کر سکتی۔ مائیکل سے بڑا میرا دشمن اور کون تھا، اور اسی مائیکل نے محبت کے اس "دل نما جزیرے" پر میرے لیے ایک عجیب و غریب حکم جاری کیا تھا۔ اس کا بدمستی میں جاری کیا ہوا یہ حکم مجھے اور غزالہ کو ایک دوجے کے قریب لے آیا تھا، اور وہ حکم یہ تھا کہ وہ رات مجھے اور غزالہ کو ایک ساتھ گزارنی تھی۔ بہ الفاظ دیگر گن پوائنٹ پر ہمیں باہم ملایا گیا تھا۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے ساحلی ریت کی آغوش میں غزالہ کے ہونٹوں کا وہ لمس ناقابل فراموش تھا۔ اس لمس نے ایک دیرینہ "بیریئر" توڑ دیا، اور اس کے بعد ہم تیزی سے قریب آئے تھے یا یہ کہنا چاہیے کہ ہمارے درمیانی فاصلے تیزی سے کم ہوئے تھے۔

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب ایک ملازم نے اطلاع دی کہ مجھے کیمپس لے جایا جائے گا، لہٰذا میں تیار ہو جاؤں۔ کل کنگ براؤن نے بتا دیا تھا کہ ایک اہم کام میرے سپرد کیا جائے گا۔ غزالہ بھی اٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ رات کا باقی حصہ اس نے جاگتے ہی گزارا ہے۔ اس نے مجھے تیار ہوتے دیکھا تو ایک بار پھر اس کا ماتھا ٹھنک گیا "اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"اگر تم نے ایک بار اور اس انداز میں کہا تو یہ فدوی یہیں تڑپ کر مر جائے گا۔ یہ لہجہ سن کر تو مجھے والد گرامی یاد آ گئے۔ جو وہ باہر جانے لگتے تھے تو امی ان سے....."

"اچھا اچھا زیادہ باتونی بننے کی کوشش نہ کریں۔" اس نے میری بات کاٹی۔ شرم سے اس کا چہرہ گل رنگ ہو گیا تھا۔

اوپر سیڑھیوں سے صفدر نے ہانک لگائی "ارے بھئی زریں! یہ ذرا دیکھنا غزالہ کس بات پر شرما دی ہیں۔"

زریں واش بیسن پر کھڑا غرارے کر رہا تھا۔ فوراً بولا "غزالہ بی بی اور استاد شیب کے شرمانے کا ایک سو ایک وجوہات ہے۔ خدا وند تعالیٰ کا رحمت ہے ان پر۔ ان کا جوڑا اسٹیبلش ہو رہا ہے۔ خو تمہاری طرح بے کار اور اجڑا ہوا نہیں ہے ان کا زندگی۔"

"میں تیرا سر توڑ دوں گا زریں! تو دن بدن بے لگام ہو رہا ہے۔" صفدر نے سیڑھیوں سے دھمکایا۔

"صفدر بھائی! تم نے ہمارا کون سا بے لگامی دیکھا ہے۔"

"دیکھا نہیں لیکن پتا تو ہے نا..... رات تو بچے بیڈ روم میں جا کر صبح دس بجے تک بستر میں گھسا رہتا ہے، یہ بے لگامی نہیں تو کیا ہے۔"

صفدر اور زریں کو نوک جھونک کرتا چھوڑ کر میں ناشتے کی ٹیبل پر چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں کیمپس کے "نیلی" وردی

والے اسپیشل گارڈز مجھے لینے پہنچ گئے۔ میں نے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا۔ غزالہ اس دوران میں مجھ سے کم از کم چھ سات بار یہ فقرہ کہہ چکی تھی "اپنا دھیان رکھیے گا۔" ہر بار اس کے فقرے نے میرے کانوں میں رس گھولا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی فکر مندی پر مجھے "فکر مندی" بھی ہوئی تھی۔ وہ میری غیر موجودگی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگی تھی۔

سفر کے تمام مراحل طے کر کے میں ایک بار پھر کیمپس پہنچا۔ کیمپس میں وہی گہما گہمی تھی جو میں اس سے پہلے دیکھ چکا تھا۔ بردوں کے گروہ یہاں سے وہاں ہانکے جا رہے تھے۔ ان میں ہر نسل اور رنگ کے لوگ تھے۔ عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ ہر بردے کی شناخت کلائی کا آہنی RING تھا، جس پر نمبر اور ریوڈر زبان کے الفاظ کندہ تھے۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ بردوں کی تربیت گاہ ہے۔ یہاں انہیں آداب غلامی سکھائے جاتے تھے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ بڑے بڑے لارڈز، ڈیوکس اور روسا کے محلات میں انہیں کس طور طریقے سے رہنا ہے۔ ان کے اندر کے آزاد انسان کو بتدریج مار کر ایک غلام کی تخلیق کی جاتی تھی۔ اس اندھیر نگری کے کئی شعبے تھے۔ خوب صورت لڑکیوں کو رقص کی تربیت دی جاتی تھی۔ انہیں اپنی حرکات و سکنات میں دلکشی پیدا کرنے کے گر سکھائے جاتے تھے، نوجوان مردوں میں جفاکشی اور سخت جانی کے ساتھ ساتھ غیر مشروط اطاعت گزاری پیدا کی جاتی تھی تاکہ وہ اچھے غلام ثابت ہو سکیں۔ بچوں کو جسم فروشی سکھائی جاتی تھی۔ اس اندھیر نگری کا ایک اور گھناؤنا شعبہ ایسا تھا جہاں ہیجڑے غلام تیار کیے جاتے تھے۔ میری معلومات ابھی ادھوری تھیں، مجھے معلوم تھا کہ اس کالی بستی کی اور بہت سی سیاہیاں ابھی میری نظروں سے اوجھل ہیں۔

مختلف صاف شفاف راہداریوں سے گزر کر میں ایک کمرے میں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ کنگ کے بیان کے مطابق میری ملاقات وہاں مائیکل آدم خور سے ہوگی، لیکن مائیکل کے بجائے وہاں میری ملاقات ہرکولیس جہاز کے فربہ اندام شرابی کپتان جم سے ہوئی۔ جم کی حیثیت مائیکل کے دوست کی بھی تھی بلکہ ان دونوں خبیثوں کو ایک دوسرے کا راز داں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جم پھیل کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھے خوش آمدید کہا اور بولا "آؤ میرے ساتھ، میں پہلے تمہیں باس مائیکل کا مسئلہ بتاؤں۔"

"اچھا تو یہ باس مائیکل کا اپنا مسئلہ ہے؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں۔" جم نے جواب دیا "مائیکل اس مسئلے کے سلسلے میں تم سے مدد لینے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ سمجھو کہ اب بھی اس کی بے خبری میں ہی میں تمہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں۔"

"جس کا مسئلہ ہے اگر وہی رضامند نہیں تو پھر مجھے خوا مخواہ کیوں گھسیٹا جا رہا ہے۔"

"یہ کنگ کا حکم ہے۔ اور ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت یہاں کسی میں نہیں۔ ویسے میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو۔ اس سے پہلے تم نے بگڑے ہوئے انڈین بردوں کو سنبھالنے میں جس قسم کا کردار ادا کیا تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تم میں قائل کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور پھر سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہوتا ہے۔ ایک "ہم زبان" کی بات جلدی سمجھ میں آتی ہے اور دل و دماغ پر اثر بھی کرتی ہے۔"

کپتان جم کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ ایک بار پھر میرے ذمے ویسا ہی کام لگایا جا رہا ہے جیسا اتر پردیش کے قیدیوں کے سلسلے میں لگایا گیا تھا۔ یعنی "کونسلنگ ایشن"۔ کسی ایسے فرد یا افراد کو سمجھانے بجھانے کی ضرورت تھی جن کا تعلق انڈیا یا پاکستان سے تھا اور جو کسی طور ان لوگوں کے قابو نہیں آ رہے تھے، یا نہیں آ رہا تھا۔

جم نے اپنی جیب میں سے وہسکی کی کوارٹر بوتل نکالی اور ایک ہی گھونٹ میں آدھی خالی کرتے ہوئے بولا "یقیناً تمہارے ذہن میں اب سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ جس شخص کو تم نے قائل کرنا ہے وہ کون ہے اور باس مائیکل سے اس کا کیا تعلق ہے..... تو ڈیئر! وہ مائیکل کی بیوی شاستے (شائستہ) ہے۔ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ حیرت کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی خوشی کا احساس بھی دل و دماغ میں پھیل گیا۔ کم از کم یہ تو ثابت ہوا تھا کہ شائستہ زندہ ہے۔ اس سے پہلے بدحال پروفیسر سے مل کر تو نجانے کیسے کیسے وسوسے دماغ میں آتے رہے تھے۔

"لیکن اسے ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا "وہ تو گائے بکری جیسی لڑکی تھی۔ مائیکل کے اشارے پر چلتی تھی۔"

"جو لوگ بہت اطاعت گزار ہوتے ہیں، وہی کبھی کبھی سخت نافرمان بھی ثابت ہوتے ہیں۔" جم نے مخمور لہجے میں کہا۔

"لیکن....."

"باقی باتیں میں تمہیں مائیکل کی رہائش گاہ پر چل کر بتاتا

ہوں۔" جم نے میری بات کاٹی۔

ہم اٹھے اور تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے اس زیر زمین کیمپس کے ایک اور حصے میں جا پہنچے۔ مائیکل کی رہائش گاہ اس کے شایان شان تھی۔ تین چار بیڈ روم کا یہ گھر آرائش و زیبائش کا مثالی نمونہ تھا۔ بیشتر دوسری جگہوں کی طرح اس رہائش گاہ کے دروازے بھی خودکار تھے۔ ہر جدید الیکٹرانکس سہولت یہاں موجود تھی۔ مائیکل گھر میں موجود نہیں تھا۔ گھر میں موجود خدام نے جم کو خوش آمدید کہا اور تعظیم پیش کی۔ جم نے ایک بند کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ وہ کمرا ہے جہاں شائستہ نے پچھلے اٹھارہ روز سے خود کو بند کر رکھا ہے۔ اس کے پاس مائیکل ہی کا ایک ریوالور ہے اور اس نے دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر دروازہ توڑنے یا اسے زبردستی نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنی جان لے لے گی۔"

"اسے کھانا وغیرہ کہاں سے پہنچایا جاتا ہے؟"

"کہیں سے بھی نہیں۔ کمرے کے اندر ہی ایک ریفریجریٹر موجود ہے۔ اس میں کھانے پینے کی اشیاء ہیں۔ اسی میں سے تھوڑا بہت نکال کر کھا لیتی ہوگی۔" جم دھیمی آواز میں بول رہا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کی آواز شائستہ تک نہ پہنچ جائے۔

"لیکن مسئلہ کیا ہے۔ کیا میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟ یا پھر ہو سکتا ہے کہ مائیکل نے اس پر سختی کی ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں مائیکل کا رویہ اس لڑکی سے نرمی اور محبت کا ہی رہا ہے۔ وہ بہت گرم مزاج ہے، لیکن اس گرمی کی آنچ کبھی اس لڑکی تک نہیں پہنچی۔"

"لڑکی تک نہیں پہنچی مگر اس کے باپ تک تو پہنچی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جہاز میں پروفیسر کو مائیکل کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتے دیکھا ہے۔"

"یہ بہت پرانی بات ہے اور میرا خیال ہے کہ موجودہ صورت حال سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"تو پھر کس سے تعلق ہے؟"

وہسکی کی باقی بوتل حلق میں انڈیل کر جم بولا "میری زندگی کا تجربہ ہے کہ جو عورتیں مجبوری کے تحت کسی کو اپنا شوہر تسلیم کرتی ہیں، وہ اپنے دل میں ایک گرہ باندھ کر رکھتی ہیں اور نفرت کی یہ گرہ کبھی کھلتی نہیں، چاہے زندگی بھر ان سے کتنا بھی اچھا سلوک کیا جائے۔"

نشے میں جم بہکنے کے بجائے اور بھی ہوش مند نظر آنے لگا تھا اور بڑی دور دور کی کوڑی لا رہا تھا۔ گھنی سفید بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھوں میں جہاں گرد و کلر کے سارے تجربات سمٹ آئے تھے۔ تاہم یہ شرابی بڈھا مجھے کسی بھی حالت میں اچھا نہیں لگتا تھا۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "کمرے کا دروازہ بند ہے، کوئی کھڑکی بھی نہیں پھر لڑکی سے بات کیسے کی جا سکتی ہے؟"

وہ بولا "اسی ہول کے پاس بیٹھ جاؤ۔ وہاں سے بہ آسانی مکالمہ ہو سکتا ہے لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ بڑی احتیاط سے۔ وہ پاگل پن کی حد تک ضد اور طیش کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کمرے میں بند ہونے سے پہلے اس نے بڑی مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں۔ چوبیس گھنٹے بے ہوش رہی تھی، بڑی مشکل سے جان بچی، صرف دو دن بعد اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔"

مجھے یاد آیا کہ ہرکولیس جہاز پر بھی شائستہ نے ایسا ہی ارادہ کیا تھا اور جہاز کی ڈسپنسری سے خواب آور گولیاں اٹھا لے گئی تھی۔

میں کپتان جم کو دوسرے کمرے میں لے آیا۔ میں نے کہا "دیکھیں کپتان صاحب، جب تک مجھے تمام صورت حال کا علم نہیں ہوگا، میں شائستہ سے کیا بات کروں گا اور اسے کیسے قائل کر پاؤں گا۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ شائستہ کا مطالبہ ہے؟ دوسرے نمبر پر یہ کہ پروفیسر کا کیا چکر ہے۔ وہ تم لوگوں کی حراست سے کیسے فرار ہوا اور اب تک کہاں تھا؟ اور یہ کہ شائستہ کے بچہ ہونے والا تھا۔ اس کا کیا بنا؟"

جم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اس بچے کی پیدائش کے موقع پر ہی تو سارا بکھیڑا کھڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکی زچگی کے سلسلے میں اسپتال میں تھی اور پروفیسر اس سے ملنے کی رٹ لگا رہا تھا۔ ان دنوں باس مائیکل اس سے بہت الرجک تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا یہ بڈھا شائستہ کی جان نہیں چھوڑتا۔ اس نے ایک دو بار پروفیسر کو میرے سامنے نرمی سے سمجھایا کہ اس کی بیٹی بھلی چنگی ہے لیکن ابھی وہ اس سے مل نہیں سکتا۔ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔ جب پروفیسر کسی صورت نہیں مانا تو باس سے اس کی جھڑپ ہوگئی۔ دونوں میں سخت تلخ کلامی کا تبادلہ ہوا اور باس مائیکل نے پروفیسر کو دھکے دے کر اسپتال سے نکلوا دیا۔ یہ اسپتال ماریا ٹرسٹ کی بیرونی عمارت میں واقع ہے۔ اس سے اگلی رات شائستہ نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ مائیکل اس واقعے پر دکھی تھا۔ دوسری طرف پروفیسر شائستہ سے ملنے پر اصرار کر رہا تھا۔ بیٹی کے لیے اس کی محبت کبھی کبھی پاگل پن کی حد تک پہنچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس دن مائیکل بہت بھنا گیا۔ اس نے سینئر ڈاکٹر کی زبانی پروفیسر کو یہ کہلوا دیا، اس کی بیٹی زچگی کے دوران میں مرچکی ہے۔ اس کا قصہ تمام ہو گیا ہے۔

"پروفیسر پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے ایک گارڈ سے ماؤزر چھینا اور فائرنگ کر کے دو افراد کو زخمی کر دیا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ٹرسٹ کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا۔ قریباً ایک ماہ تک اس کی گمشدگی ابھی تک ایک معما ہے۔ ٹرسٹ کی عمارت کے اندر کسی کا یوں چھپ جانا اپنی مثال آپ ہے۔"

"کیا شائستہ کو ان واقعات کا علم ہے؟"

"نہیں ابھی تک کچھ معلوم نہیں اسے۔ نہ ہی اسے یہ خبر ہے کہ چند روز پہلے پروفیسر کے ہاتھوں ایک قتل بھی ہو چکا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا... کہ شائستہ نے جو ضد پکڑ رکھی ہے اس کا تعلق اس کے باپ کے حالات سے نہیں۔ بس وہ ایک دم مائیکل سے الرجک ہو گئی ہے۔ اس سے کہتی ہے کہ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ پیار محبت سے ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ چکا ہے۔ لیکن وہ اس کی آواز سن کر ہی بدک جاتی ہے۔ اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور ہے، اور جس طرح وہ ہیجان کا شکار ہے، کچھ خبر نہیں کہ طیش میں آ کر اپنی دھمکی کو واقعی عملی جامہ پہنا دے...."

میں کپتان جم کے ساتھ قریباً آدھ گھنٹا تبادلہ خیال کرتا رہا۔ کپتان نے بتایا کہ شائستہ پچھلے دنوں میں چار پانچ بار مطالبہ کر چکی ہے کہ اسے اس کے والد سے ملایا جائے۔ مائیکل شاید یہ مطالبہ پورا کر ہی دیتا لیکن تم جانتے ہی ہو کہ پروفیسر ہمارے پاس موجود نہیں تھا سو نہ جانے کہاں سمایا ہوا تھا۔"

اب پوری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ جو گمشدہ کڑی تھی وہ بس یہی تھی کہ شائستہ جو اپنے مبینہ شوہر مائیکل کے اشاروں پر چلتی تھی "ایکا ایکی" ایسی نافرمان کیوں ہو گئی۔ جم کے بیان کے مطابق وہ اس کی آواز سننے کی روادار بھی نہیں تھی۔ بچہ ضائع ہونے یا مردہ پیدا ہونے کی وجہ سے بعض خواتین نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ ہو۔ میں نے خدا کا نام لیا اور اس دروازے کے سامنے پہنچ گیا جہاں شائستہ نے پچھلے 18 روز سے خود کو قید کر رکھا تھا۔ میری دستک پر اندر سے ایک ڈوبی ڈوبی آواز آئی "کون ہے؟"

"شائستہ! یہ میں ہوں شاہ جہاں!" میں نے نرم آواز میں کہا۔

شائستہ کا رد عمل میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ ایک دم اس کے رونے کی آواز آنے لگی۔ بڑا کرب تھا اس کے رونے میں۔ جیسے کسی ویران کھنڈر سے کوئی نوحہ برآمد ہو رہا ہو۔ میں اندر سے کانپ گیا۔ اس کی ہچکیاں دروازے کے پاس سنائی دے رہی تھیں۔ درمیان میں دروازہ نہ ہوتا تو میں اسے تسلی تشفی دیتا، اس کے آنسو پونچھتا۔ میں نے کہا "مجھے بڑا افسوس ہے شائستہ کہ تمہارے بچے کو زندگی نہ مل سکی۔ بہرطور یہ خدا کے کام ہیں۔ ہمیں راضی بہ رضا رہنا چاہیے۔"

"کاش میں یہاں آنے سے پہلے ہی مر جاتی۔" کمرے کے اندر سے اس کی کرب ناک آواز ابھری۔

"شائستہ! پلیز میرے لیے ہی دروازہ کھول دو۔ میں بڑے مان سے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"مجھے اب کسی سے نہیں ملنا۔ پلیز مجھے مجبور نہیں کرنا۔ اگر کر سکتے ہیں تو اتنا کر دیں کہ بس ایک بار میرے پاپا سے مجھے ملا دیں۔"

"شائستہ تمہارے ڈیڈی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم کہتی ہو تو میں ان کو بھی یہاں لے آؤں گا، لیکن تم دروازہ تو کھولو۔ اگر تم مائیکل کے سامنے نہیں آنا چاہتی ہو تو نہ آؤ۔ مائیکل یہاں نہیں ہے۔"

"خدا کے لیے چلے جائیں۔ خدا کے لیے چلے جائیں یہاں سے۔" وہ ایک دم چیخنے لگی۔

یوں لگا کہ مائیکل کی شکل تو در کنار، وہ اس کے نام سے ہی دہشت زدہ ہو جاتی ہے۔ اس پر جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ مجھے کپتان جم کی بات یاد آئی کہ شائستہ کے پاس لوڈڈ ریوالور ہے اور وہ کسی بھی وقت اسے استعمال کر سکتی ہے۔ میں نے اسے مزید مشتعل کرنے سے بہتر سمجھا کہ فی الوقت باہر چلا جاؤں۔

میں دوسرے کمرے میں آیا تو کپتان جم بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا "کچھ بات بنی؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"بات بگڑتے دیر نہیں لگتی لیکن بنتے دیر لگتی ہے۔" میں نے کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں وہ لڑکی دل و جان سے مائیکل کو اپنی زندگی کا مالک بنا چکی تھی۔ مائیکل کو اپنے جسم اور دماغ پر پورا پورا اختیار دے رکھا تھا اس نے۔ آخر کوئی

بات تو مائیکل کی طرف سے ہوئی ہو گی کہ وہ اتنی متنفر ہو گئی۔"

اتنے میں تیز نسوانی قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پتلون شرٹ میں ملبوس سوزی اندر داخل ہوئی۔ اس نے کپتان جم کو بتایا کہ باس مائیکل اوپر "ہوسٹل" میں اسے فوراً بلا رہے ہیں۔ انہیں بندرگاہ پر جانا ہے وہاں کوئی مسئلہ پیش آیا ہے۔

اس اطلاع کے ملنے کے بعد جم فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سوزی اپنی بو شرٹ کے بالائی بٹن کھول کر بڑی شان سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے ایسے انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا رکھی تھی کہ جسم نمایاں تر ہو گیا تھا۔ بولی "مبارک ہو۔ اب تو تمہیں کنگ کی نظروں میں جگہ مل گئی ہے۔ سنا ہے کہ کنگ کے ساتھ ان کے خصوصی کمرے میں بیٹھ کر تم نے چائے بھی پی ہے؟"

"چائے تو نہیں کچھ اور چیز تھی جو ہم نے نہیں پی۔"

وہ مجھے مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "لگتا ہے کہ تم کنگ کے ساتھ کلک کر گئے ہو۔ کافی اوپر جاؤ گے لیکن دیکھو بھولنا نہیں مجھے۔"

"تم بھی کوئی بھولنے والی شے ہو۔" میں نے اس کے آوارہ گریبان پر نظر ڈالی اور پھر چھت کو گھورنے لگا۔

اس کمرے کی چھت سپاٹ تھی۔ کئی کمروں کی چھتیں ڈیزائن دار تھیں۔ بلکہ اس کیمپس میں مجھے اکثر کمروں کی چھتیں ڈیزائن دار ہی نظر آئی تھیں۔ ہر چھت پر لکڑی کی مدد سے چھوٹے چھوٹے منقش خانے بنائے گئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اسی چوبی ڈیزائن میں ننھے منے کیمرے فٹ کیے گئے تھے اور ساؤنڈ ریکارڈ کرنے کے آلات تھے۔ لکڑی کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ کوشش کے باوجود کیمروں کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ تاہم اس وقت ہم باس مائیکل کی رہائش گاہ میں تھے۔ یہاں کیمروں وغیرہ کا وجود نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوزی کھل کر بات کر رہی تھی۔

پوچھنے لگی "کیا بنا شائستہ سے تمہاری ملاقات کا؟"

میں نے کہا "ابھی تو کچھ نہیں بنا۔ ابھی تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ میاں بیوی میں ناراضگی کس بات کی ہے۔"

"میں بتاؤں؟" وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔

"ہاں بتاؤ۔" میں آگے کو جھک آیا۔

وہ بولی "تمہاری گرل فرینڈ اکنزغزالہ ہے نا...؟"

"چلو ایسے ہی سمجھ لو۔"

"سمجھ کیوں لوں۔ یہ سو فی صد حقیقت ہے۔ اب تم ذرا تصور کرو۔ تم کہیں سے آئے ہو۔ بہت دنوں بعد غزالہ سے ملے ہو۔ اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہے ہو۔ ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے ہو پھر تنہائی ملتی ہے۔ تم اس کے پاس آتے ہو' لیکن وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی ہے تمہیں اور نہ تمہارے جذبات کو۔ دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ مقفل کر لیتی ہے اور یہی عمل بار بار دہرایا جاتا ہے' تو کیا ہو گا۔" وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی' پھر شوخی سے بولی "وہی ہو گا جو یہاں ہوا ہے۔ باس مائیکل اور ان کی چہیتی بیوی کے درمیان زبردست فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"باس کی گھریلو ملازمہ اروسا کی زبانی۔ وہ چوبیس گھنٹے اسی گھر میں گزارتی ہے اور اتنی ہوشیار ہے کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے' پھر اسے یہ کیسے پتا نہ چلتا کہ میاں بیوی کے مابین گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے بتایا ہے اور ویسے بھی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی ہے باس مائیکل کے دل میں مسز شائستہ کے لیے جگہ ہے۔ وہ اسے خود سے دور کرنا نہیں چاہتے لیکن دوسری طرف شائستہ پر ہٹ دھرمی کا دورہ پڑ گیا ہے۔" اس نے مجھے گھورا اور ایک لمحہ توقف کرکے بولی "ویسے تم مشرقی ہوتے بڑے عجیب ہو۔ تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس وقت کیا کر جاؤ۔ اب خود ہی کو دیکھو۔ کتنی سنگ دلی سے تم نے دل توڑا ہے میرا۔ اس رات تمہارے بغیر میرا وہی حال تھا جو کچھ باس مائیکل کا شائستہ صاحبہ کے بغیر ہوتا ہو گا۔ تم مشرقی لوگ اپنے ارد گرد والوں کے بارے میں نہیں صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو۔ خود کو اس طرح خود ساختہ پابندیوں میں جکڑتے ہو کہ خدا کی پناہ۔" اس نے اپنا کندھا کچھ اس طرح اٹھایا کہ گریبان وسیع تر ہو گیا۔

"تم کس رات کی بات کر رہی ہو؟"

"او گاڈ' ایسی بے پروائی۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا "میں اس رات کی بات کر رہی ہوں جب تم کال کوٹھڑی میں بھوک سے 'الامان' پکار رہے تھے' میں نے تمہارے لیے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔" اس نے "پینے" پر معنی خیز انداز میں زور دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم نے ایک غیر متعلقہ موضوع چھیڑ لیا ہے۔" میں نے کہا "فی الوقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ شائستہ کو کمرے سے باہر کیسے نکالا جائے۔ وہ مائیکل کے نام سے بھی بدک رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ کیا سلوک ہوا ہے اس کے ساتھ۔ آخر کوئی تو وجہ ہو گی کہ وہ اسے اپنے پاس نہیں آنے دیتی۔"

"وجہ تمہیں بتائی تو ہے۔ وہی تم لوگوں کی پراسرار مشرقیت۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کب کیا دھن دماغ میں سما جائے۔"

میں نے کہا "ایک کام ہو سکتا ہے۔ اب تو پروفیسر لاپتا نہیں ہے۔ اگر پروفیسر کو یہاں لایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ دروازہ کھول دے گی۔"

"یہی تو تمہیں معلوم نہیں۔" وہ بال جھٹک کر بولی "باس مائیکل کسی صورت پروفیسر کو یہاں نہیں لائیں گے۔ وہ اس قدر بیزار ہیں پروفیسر سے کہ تم گمان نہیں کر سکتے۔"

"مگر اب تو شائستہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرے۔"

"تم کوشش کرکے دیکھ لو ویسے مجھے امید نہیں۔"

"کیا اس وقت مائیکل سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"اگر تو وہ ڈسٹ کے اندر ہی ہوئے تو رابطہ ہو جائے گا۔" سوزی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ایک واکی ٹاکی قسم کا آلہ لے آئی۔ اس نے چند بٹن پش کیے' چند لمحے بعد آلے پر سرخ لائٹ روشن ہوئی اور مائیکل کی آواز ابھری "ہیلو مائیکل اسپیکنگ!"

"یس باس! میں سوزی بول رہی ہوں۔ آپ کی رہائش گاہ سے۔ مسٹر شا آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

سوزی نے آلہ مجھے تھما دیا "مائیکل! میں شاہجہاں بول رہا ہوں۔ جناب کنگ کی ہدایت پر میں نے ابھی تمہاری وائف شائستہ سے بات کی ہے۔ وہ کسی صورت دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اگر شائستہ کے والد پروفیسر اللہ دتا کو..."

"شٹ اپ!" مائیکل ایک دم بھڑک کر بولا۔ اس نے پروفیسر کو ایک گندی گالی دی اور کہا "میں اب اس بڈھے کا سایہ بھی شائستہ کے قریب برداشت نہیں کر سکتا۔ سمجھو کہ میں نے یہ ورق ہی پھاڑ دیا ہے۔ وہ اس بڈھے کے لیے مر چکی ہے اور اسے مرا ہی رہنا چاہیے۔ اپنی زبان میں شائستہ کو سمجھاؤ کہ وہ اب شادی شدہ ہے اس کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس کے خاوند کی ہونی چاہیے۔"

"مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ وہ اس کا باپ ہے۔ اس کے ساتھ شائستہ کا تعلق بیس بائیس سال پرانا ہے جبکہ تمہارے ساتھ اس کے تعلق کی عمر فقط ایک ڈیڑھ سال ہے۔ خونی رشتے اتنی جلدی ختم نہیں ہوا کرتے اور نئے تعلق مضبوط ہوتے بھی کچھ وقت لگتا ہے۔"

"تم مجھے رشتے داریوں پر لیکچر مت دو۔ یہ نفسیات اور عمرانیات میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے یہ حتمی ہے اور فی الحال یہ کوئی ایشو بھی نہیں ہے۔ شائستہ یہ بات تسلیم کر چکی ہے کہ وہ میری مرضی اور رضامندی کے بغیر پروفیسر سے نہیں ملے گی اور نہ ہی اس کا مطالبہ کرے گی۔ فی الوقت ایشو یہ ہے کہ اسے کمرے سے باہر آنا چاہیے۔ وہ کیوں خود کو اور مجھے تماشا بنا رہی ہے؟" پھر فوراً ہی "وینس آل" کہہ کر مائیکل نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سوزی بولی "میں نے کیا کہا تھا۔ شائستہ کے ساتھ پروفیسر کا حد سے زیادہ لاڈ پیار باس مائیکل کے لیے شدید الجھن بن چکا ہے۔"

"خاندانی رشتوں کی اہمیت تم مغربی لوگ نہیں سمجھ سکتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ ایک باپ جس نے بیٹی کو ماں بن کر بھی پالا ہو' بیٹی سے کس قدر اٹیچ ہوتا ہے۔ یہ شائستہ ہی ہے جس کی خاطر پروفیسر ہزاروں میل دور سے مائیکل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ ذلت' تکلیف اور غریب الوطنی برداشت کر رہا ہے۔ تم نے ان جانوروں کا ذکر تو سنا ہی ہو گا جن کے بچوں کو شکاری پکڑ کر لے جاتے ہیں اور وہ مصیبت کے مارے جانور سیکڑوں میل تک شکاریوں کے پیچھے جاتے ہیں۔ پروفیسر کو دیکھ کر بھی مجھے کچھ ایسا ہی خیال آتا ہے۔ تمہیں تو شاید یہ یاد نہ ہو لیکن میں وہ منظر بھول نہیں سکتا جب پروفیسر جیسا باکمال معالج جہاز پر معمولی نوکروں کی طرح کچن کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے سامنے اپنی لاڈلی بیٹی کو ایک دیو زاد کی قید میں دیکھتا رہا ہے اور دل پر صبر اور برداشت کا پتھر رکھے رہا ہے۔ اس سے بڑی قیامت اس پر اور کیا گزر سکتی تھی کہ مائیکل نے اسے اس کی بیٹی کی موت کی جھوٹی خبر دی۔ اس خبر نے اسے نیم دیوانہ کر چھوڑا ہے' لیکن مائیکل اور اس کے حواریوں کو اب بھی اس بدنصیب پر ترس نہیں آتا۔"

بات کرتے کرتے مجھے ایک دم خاموش ہونا پڑا۔ شائستہ والے کمرے سے تاحال رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے سوزی کو وہیں چھوڑا اور ایک بار پھر کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا "شائستہ کیا بات ہے۔ کیوں رو رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے نوحے جیسی آواز میں کہا پھر ایک دم وہ کچھ ہو گیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ دروازے کی دوسری جانب کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور خود کار دروازہ سلائیڈ کرتے ہوئے کھل گیا۔ مجھے شائستہ دکھائی دی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ

زرد اور بیمار نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس کے باوجود اس کی دلکشی برقرار تھی۔ کچھ عجیب سے خدوخال تھے اس کے۔ نقاہت، کمزوری اور زردی اس کے چہرے کو گہنانے کے بجائے کچھ اور جاذب بنا رہی تھی ــ کم از کم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی جاذبیت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے اور آنکھوں میں وحشت کے جگنو ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ جیسے چیخ کر ایک ستون سے لپٹ گئی "پلیز شاہ جہاں! میرے پاپا کو مجھ سے ملا دو۔ بس ایک آخری بار۔"

میں نے جلدی سے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ ریوالور سامنے ہی تپائی پر نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ریوالور قبضے میں لیا۔ اس کے بعد شائستہ کے پاس آ گیا۔ اسے تسلی تشفی کی ضرورت تھی۔ میں نے بڑے خلوص سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے پچکارتا ہوا سا اندر لے آیا۔ میں نے باریک بینی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بظاہر وہاں مجھے کوئی کیمرا یا ڈکٹا فون وغیرہ نظر نہیں آیا۔ میں نے سوزی سے کہا کہ وہ چائے کا انتظام کرے۔ میں جانتا تھا کہ شائستہ گرین ٹی بڑے شوق سے پیتی ہے۔ جب تک چائے آئی شائستہ نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا۔ چائے نے اسے کچھ اور سنبھالا دیا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اسے بولنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ کہنے لگی "شاہ جہاں! اس شخص کے ساتھ میں اب مزید نہیں رہ سکتی۔ ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے اندر بہتری کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔"

"لیکن بات کیا ہوئی ہے۔ آخر انسان..."

"وہ انسان ہے ہی نہیں۔" شائستہ نے تیزی سے میری بات کاٹی "وحشی ہے، درندہ ہے۔ اسے کسی جنگل میں ہونا چاہیے جانوروں کے ساتھ۔" اس کا لہجہ کرب کی شدت سے لرز رہا تھا۔

"کیا اس نے تمہارے ساتھ غیر مہذب برتاؤ کیا ہے؟"

وہ رو دی "غیر مہذب بہت معمولی لفظ ہے مسٹر شاہ جہاں۔ پلیز میرے زخم کریدنے کی کوشش نہ کرو۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "دیکھو شائستہ! تم یقین کرو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے کچھ بتاؤ۔ مائیکل بہت بااثر ہے لیکن اس سے اوپر بھی ایک بااثر شخص یہاں موجود ہے۔ وہ تمہاری مدد کر سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کرے گا۔ مگر مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں کس حوالے سے مدد طلب کرنی ہے۔"

"بس میں اس شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی، یہ اتنا گھناؤنا ہے کہ..." ایک دم شائستہ کا گلا رندھ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں سکی۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے ایک دم ہسٹریا کا دورہ پڑ جائے گا۔ اس کے ہاتھ تھر تھر کانپنے لگے تھے اور ہونٹ بالکل سفید پڑ گئے تھے۔

میں نے جلدی سے اسے پانی دیا، اور فیصلہ کیا کہ فی الحال یہ موضوع نہیں چھیڑوں گا۔ وہ کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، پھر بولی "شاہ جہاں! سچ بتاؤ میرے ڈیڈی کہاں ہیں، مسٹر... میرا دل کہتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بہت جلد وہ تم سے ملنے یہاں آئیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"وہ بچے کی پیدائش کے موقع پر کیوں نہیں آئے تھے میں رات دن ان کا انتظار کرتی رہی۔"

"اس وقت... سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مائیکل نے انہیں آنے نہیں دیا تھا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اب وہ آمادہ ہو جائے گا۔"

وہ خاموش ہو گئی، لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میری بات پر یقین نہیں کر پا رہی۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے میں اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ میری باتیں سن رہی تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ اس کی سوچیں شاید اب بھی اسے مائیکل کے تصور سے ڈرا رہی تھیں۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی "شاہ جہاں! میں ایک پل یہاں نہیں رہ سکتی۔ اگر میرے سچے دوست ہو تو مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے اس منحوس شخص کے سائے سے دور لے جاؤ۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ ہائی گاڈ مر جاؤں گی۔"

میں نے اسے شانوں سے تھاما اور دباؤ ڈال کر واپس نشست پر بٹھا دیا "پاگل مت ہو شائستہ۔ تم جہاں ہو وہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ سیکڑوں پہرے دار ہیں یہاں۔ خفیہ کیمرے، ڈکٹا فون اور نجانے کیا کچھ ہے۔ اگر تم زیادہ خطرہ محسوس کرتی ہو تو اپنی پہلے والی پوزیشن برقرار رکھو۔ واپس کمرے میں چلی جاؤ۔ میں ریوالور تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ لیکن خبردار کوئی غلط قسم کا خیال اپنے دماغ میں مت رہنے دینا۔ میں پھر تم سے وہی بات کہوں گا جو جہاز پر کہی تھی۔ تمہاری زندگی دو وجہ سے بے حد قیمتی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ زندگی ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ تمہارے

پاپا کی بھی زندگی ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوا تو تمہارے پاپا بھی نہیں بچیں گے۔"

وہ لرز کر رہ گئی۔ میں کچھ دیر اسے سمجھاتا رہا۔ اس نے فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی ضد ترک کر دی اور ریوالور سمیت واپس کمرے میں چلی گئی۔ میں نے سوزی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ شائستہ کو ریوالور میں نے از خود واپس کیا ہے۔ شائستہ کے واپس کمرے میں جانے کے بعد میں اور سوزی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ شائستہ اور مائیکل کے درمیان ایک دم سے اتنا فاصلہ پیدا ہوا تھا، شائستہ وہ وجہ زبان پر نہیں لا رہی تھی۔

اتنے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اپنے سامنے اس دنیائے جرم کے کم عمر شیطان کو پایا۔ وہ ماسٹر استقی تھا۔ جینز جوگر اور ہاف سلیو شرٹ پہنے وہ کسی غنڈے کے سے انداز میں دروازے میں ٹانگیں چوڑی کیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ یہ کسی بوکو کی طرح تھی تاہم اس سے بہت چھوٹی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور پکی عمر جیسے لڑکوں کی طرح بولا "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہو۔"

سوزی ماسٹر استقی کو دیکھتے ہی مؤدب کھڑی ہو گئی تھی۔ ماسٹر استقی نے بے پروائی سے اپنی چھڑی سوزی کے جسم کے نازک حصے پر ماری اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "لیکن یہ تمہارا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ تمہارا مسئلہ میں حل کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ انکل مائیکل اور اس کی بیوی میں کیا جھگڑا ہے۔"

وہ اپنی عمر سے کہیں بڑی باتیں کرتا تھا، اور انداز بھی بڑا پختہ تھا "کیا بتا سکتے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

اس نے چھڑی کے ذریعے تحکمانہ انداز میں اشارہ کیا اور سوزی کان لپیٹ کر باہر نکل گئی۔ ماسٹر استقی نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے دو کوریڈورز سے گزرے۔ ماسٹر استقی جدھر سے گزرتا تھا، وردی پوش مرد و زن کی سلامی وصول کرتا تھا۔ دیگر غلام اور بردے اسے دیکھ کر سہم جاتے تھے۔ مجھے مرقس کی بتائی ہوئی وہ بات یاد آ گئی کہ بعض اوقات ماسٹر کوئی نئی قسم کا اسلحہ ٹیسٹ کرنے کے لیے بھی کسی بردے کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

قدم قدم پر اپنی وحشت کا احساس دلاتا ہوا ماسٹر استقی مجھے ایک کشادہ کمرے میں لے آیا "ادھر بیٹھ جا لمبے۔" اس نے بدتمیزی سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسلسل چیونگم چبا رہا تھا۔

میں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ٹانگ صوفے کے ہتھے پر رکھی اور رعونت بھرے لہجے میں بولا "وہ لونڈیا تجھے کیا بتا سکتی ہے۔ اسے کچھ آتا پتا نہیں ہے۔"

"تم کیا بتا سکتے ہو؟"

"سب کچھ۔ مجھے بچہ مت سمجھنا لمبے۔" اس نے انگلی سے میری ٹھوڑی کو چھوا۔

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میرے خلاف غصے سے بھرا ہوا ہے، اگر زیادہ بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کر رہا تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس کے باپ نے میرے سامنے اسے احتیاط سے رہنے کی تنبیہہ کی تھی۔ وہ جس کمرے میں مجھے لایا تھا، وہاں کچھ ویڈیو گیمز رکھی تھیں۔ ایک بڑا سا کمپیوٹر تھا۔ ایک ٹی وی سیٹ تھا اور ایک الماری ویڈیو کیسٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس الماری کے قریب ہی ایک بیش قیمت اسٹریو ڈیک بھی پڑا تھا۔ فرش پر قالین تھا اور کشن وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ کمرا ماسٹر استقی ٹی وی لاؤنج کے طور پر استعمال کرتا ہے، تاہم وہاں دیگر تفریحات بھی موجود ہیں تاکہ "ولی عہد" کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ ماسٹر نے کیبنٹس والی الماری کھولی اور کوئی کیسٹ تلاش کرنے لگا۔ اسی دوران میں تین چار لڑکے اندر آ گئے۔ مجھے دیکھ کر پہلے ان کے ماتھے ٹھنکے پھر انہوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔ آہستہ آہستہ ان سب کی تیوریاں چڑھتی جا رہی تھیں، مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ کوئی سنگین قسم کی شرارت نہ کر بیٹھیں۔ بہرحال خیریت گزری۔ ماسٹر استقی نے لڑکوں کو باہر بھیج دیا اور ایک کیسٹ منتخب کر کے وی سی آر میں لگا دی۔ اس کے بعد وہ میرے قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹی وی آن کر کے بولا "ذرا غور سے دیکھ لمبے! تجھے پتا چل جائے گا کہ وہاں کیا جھگڑا چل رہا ہے۔" میری رگوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں کسی اہم معاملے سے باخبر ہونے جا رہا ہوں۔ شائستہ کا وحشت زدہ چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا اور ذہن میں اس سوال کا ہتھوڑا چل رہا تھا کہ وہ کون سی بھیانک بات ہے جس کا بوجھ شائستہ کی زبان نہیں اٹھا پا رہی۔ ٹی وی اسکرین پر کچھ دیر تک لہریں آتی رہیں، پھر ایک فلم چلنے لگی۔ یہ ڈاکومنٹری ٹائپ فلم تھی۔ افریقہ کا ایک گھنا جنگل دکھایا گیا تھا۔ یہاں ننگ دھڑنگ حبشی گھوم رہے تھے۔ عورتوں کے بالائی جسم عریاں تھے۔ مادر زاد برہنہ بچے اور بچیاں دلدلی زمین

رکھیل کود رہے تھے۔ پس منظر میں ایک مردانہ آواز کمنٹری کرنے والے انداز میں ابھر رہی تھی۔ آواز صاف نہیں تھی۔ تاہم بغور سن کر اسے سمجھا جا سکتا تھا۔ کمنٹری کرنے والا کہہ رہا تھا "یہ افریقہ کا قلب ہے۔ یہ وہ گھنے جنگلات ہیں جن میں سے سورج کی روشنی کا گزر بھی نہیں ہوتا۔ یہاں وہ وحشی قبائل آباد ہیں جو تاریکی کے مانند پُراسرار اور آسیب کی طرح خوفناک ہیں۔ یہ جگہ جو ہم دیکھ رہے ہیں یہاں ضیاعی قبیلے کی ایک شاخ آباد ہے۔ یہ گھاس پھوس کی بنی ہوئی گول جھونپڑیاں ان کا مسکن ہیں۔ ضیاعی آدم خوری میں مشہور ہیں اور اس فلم میں آپ ان کی آدم خوری کے کئی مناظر دیکھ چکے ہیں لیکن اب جو منظر آپ دیکھنے والے ہیں وہ یقیناً آپ کے لیے بے حد سنسنی خیز ثابت ہوگا۔"

یہاں پر آواز دب گئی اور کئی فقرے سمجھ میں نہیں آئے۔ اس دوران میں کیمرا پین کرتا ہوا ایک گول جھونپڑی پر رک گیا تھا۔ جھونپڑی سے باہر ایک سیاہ فام عامل گلے میں ہڈیوں کی مالا ڈالے الاؤ کے سامنے اناپ شناپ پڑھ رہا تھا۔ دو تنگ دھڑنگ حبشی ڈھول پیٹ رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ نیم دائرے کی صورت میں بہت سے لوگ الاؤ کے گرد کھڑے تھے۔ ان میں سے اکثر نے گینڈے کی کھال پہن رکھی تھی۔ کمنٹری والے کی آواز پھر نمایاں ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "اس گول جھونپڑی کے اندر سے آپ مدھم چیخیں سن رہے ہوں گے۔ یہ اس عورت کی آواز ہے جو ابھی اپنا پہلا بچہ جنم دینے والی ہے۔ سردار کے پہلو میں دائیں طرف جو شخص کھڑا ہے وہ اس ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ اس کا نام لوگام ہے۔ لوگام جس عقیدے کا پیروکار ہے اس کا مظاہرہ آپ ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اگر آپ نے ان جانوروں کی عادات کے بارے میں پڑھا ہو جو بلی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بلی کے خاندان میں نر جانور اپنے نومولود بچوں کا دشمن ہوتا ہے۔ خاص طور سے وہ نر بچوں کو نشانہ بناتا ہے۔ ان ضیاعی لوگوں میں بھی اس سے ملتی جلتی ایک عادت پائی جاتی ہے۔ ہم اسے ایک لرزہ خیز رسم سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس رسم کے مطابق اگر ضیاعی کا پہلوٹھی کا بچہ لڑکا ہو تو ضیاعی اسے پیدائش کے فوراً بعد کھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح کسی شخص کی روحانی و جسمانی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی باقی اولاد پر سے بلائیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ ان وحشی لوگوں میں اگر ـــ"

یہاں ایک دم کمنٹری والے کو رکنا پڑا۔ ایک عورت اندر سے ایک روتی بلکتی زندگی کو اٹھا لائی تھی۔ یہ ایک سیاہ فام نومولود بچہ تھا۔ غالباً اسے ٹھیک سے صاف بھی نہیں کیا گیا۔ اس کی نیلگوں ناف پیٹ پر لٹک رہی تھی۔ بچے کو دیکھ کر ڈھول بجانے والوں کا رقص تیز ہو گیا۔ عامل نما شخص بھی جھوم جھوم کر آگ پر کسی لکڑی کا برادہ پھینکنے لگا۔ عورت نے بچہ اس کے باپ کے حوالے کر دیا۔ باپ کا چہرہ ایک روحانی جوش سے تمتما رہا تھا۔ اس نے اپنے کمر کس میں سے ایک چھرا برآمد کیا اور بچے کو عامل کے سامنے زمین پر لٹا کر ذبح کر دیا۔ اس کے بعد کا منظر دیکھنے کے لیے لوہے کا دل درکار تھا۔ وہ وحشی اپنے نیم جان بچے کا گوشت دانتوں سے ادھیڑ ادھیڑ کر کھا رہا تھا اور اس کا چہرہ معصوم کے خون سے لتھڑا چلا جا رہا تھا۔

"بند کرو اسے۔" میں نے چلا کر کہا۔

استی نے ایک بلند قہقہہ لگایا "اندر سے کافی کمزور دل ہو لیے۔"

اس نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور اسکرین تاریک ہو گئی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ ماسٹر استی نے مجھے جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اگر وہ واقعی درست تھا تو پھر شائستہ کی دہشت اور اس کی جنونی کیفیت سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ جیسے جیسے میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ میں نے ماسٹر استی کو دیکھا وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ وہ کسی انداز سے بھی بچہ نہیں لگتا تھا اس کے باوجود بچہ ہی تھا۔ کسی وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی پکی عمر کے بونے کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ بولا "میں نے تمہیں وہ بات بتا دی ہے جو وہ لونڈیا مر کر بھی نہیں بتا سکتی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مائیکل کا بچہ مردہ پیدا نہیں ہوا تھا؟"

"مگر میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہوتا تو میں تمہیں ضرور بتاتا۔ یہ بڑے راز کی بات ہے لیے! اب ہم یار دوست ہیں، پروگرام بھی بنا رہے ہیں۔ ہمارا کلینک تو تم نے دیکھا ہی ہوا ہے۔ ڈیڈی سے اجازت مل گئی تو اس میں کسی دن کسی عورت کو۔" اس نے معنی خیز انداز میں آنکھیں نچا کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس نو عمر عفریت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"کیا میں جا سکتا ہوں۔" میں نے استی سے پوچھا۔

"جی تو نہیں چاہتا تمہیں بھیجنے کو۔ لیکن ڈیڈی سے ہم ڈر لگتا ہے۔ خیر پھر کبھی سہی۔" اس نے بڑے فلمی انداز سے کہا۔ اس کا جبڑا مسلسل چیونگم چبا رہا تھا۔

میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔ قدم فرش پر پڑ رہے تھے لیکن ذہن کہیں فضاؤں میں اڑ رہا تھا۔ یہ تصور بڑا لرزہ خیز تھا کہ مائیکل اپنے نومولود بچے کو کھا گیا ہے۔ وہ پڑھا لکھا تہذیب یافتہ حیوان تھا اور میں اس کے منہ پر بھی یہ بات کہتا تھا لیکن ایسی حیوانیت کا تصور تو ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اب جیسے کڑی سے کڑی جڑتی جا رہی تھی۔ غالباً شائستہ کی بدنصیب آنکھوں نے مائیکل کی "اولاد خوری" کا یہ منظر دیکھا تھا اور وہ نیم پاگل ہو گئی تھی۔ اسے مائیکل کے نام سے ہی خوف آنے لگا تھا۔ اس کا وجود تو درکنار اس کا سایہ بھی اسے ڈرا دیتا تھا۔ سوزی نے مجھے بتایا کہ شائستہ اور مائیکل کے جھگڑے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ مائیکل کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے رہی۔ وہ کیسے جواب دیتی اسے محبت سے کیوں اپنے جسم پر اس کا ہاتھ لگنے دیتی؟ کیا اس لیے کہ وہ ایک اور زندگی کو اپنے جسم میں پالے نو ماہ تک دکھ جھیلے، تکلیفیں سہے اور پھر ایک اور شکار مائیکل کے حوالے کر دے۔ (شائستہ کو ابھی اس گھناؤنے عقیدے کے بارے میں پوری تفصیل معلوم نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کی ہر اولاد کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوگا) بہرحال جو کچھ بھی تھا انتہائی دردناک تھا۔

میں واپس مائیکل کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ چند ملازمین کے سوا اور یہاں کوئی نہیں تھا۔ کنگ کی قیام گاہ کی طرح یہ بھی بہت جدید قسم کی قیام گاہ تھی۔ دروازے خودکار تھے۔ لائٹس کا ماخذ نظر نہیں آتا تھا۔ جدید ترین فرنیچر اور آرائش نے اس جگہ کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا تھا۔ میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچا جہاں شائستہ نے خود کو محصور کر رکھا تھا۔ میری درخواست پر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ادھر مائیکل موجود نہیں ہے، باہر آ گئی۔ وہ مہینوں کی بیمار نظر آتی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر میں نے کہا "شائستہ! تمہارا بچہ مردہ پیدا نہیں ہوا تھا، اسے مارا گیا تھا نا...؟"

اس کی آنکھیں ایک دم خوف اور دکھ سے پھیل گئیں۔ پھر موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ اچانک وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر زار و قطار رونے لگی۔ وہ کربناک انداز میں کئی منٹ تک روتی رہی۔ دل و دماغ پر چھائے ہوئے غم کے بادل کچھ چھٹے ہوئے تو میں نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا اور برابر کو ریڈور میں لے آیا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا بچہ مرا ہوا نہیں تھا؟"

"بس معلوم ہو گیا کسی طرح اور اس وحشی رسم کے بارے میں بھی پتا چل گیا جس نے تمہارے بچے کی جان لی۔"

"کس نے بتایا۔ کیسے معلوم ہوا؟ میرے سوا کسی کو پتا نہیں تھا۔" ایک بار پھر اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔

"یہ پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ فی الحال ایک نہایت ضروری بات تم سے کہنے کے لیے واپس آیا ہوں۔" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا "تم خود کو حوصلے میں رکھو۔ جذبات میں آ کر کوئی قدم نہیں اٹھانا۔ اس سارے کاروبار کا کرتا دھرتا کنگ براؤن نامی شخص ہے۔ اسی کی ہدایت پر میں تمہاری طرف آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مائیکل اور تمہارے درمیان اختلاف ختم ہو جائے، شاید یہ بات ٹھیک ہے اسے بھی معلوم نہیں تھی کہ اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ میں آج ہی کنگ سے دوبارہ ملاقات کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔"

شائستہ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "خدا کے لیے کوئی ایسا انتظام کرو کہ میں دوبارہ اس درندے کی صورت نہ دیکھ سکوں۔ میں جانتی ہوں کہ خودکشی حرام ہے لیکن میں خودکشی پر مجبور ہو جاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں ایک وحشت ناک منظر مجسم نظر آ رہا تھا۔

میں ..... اسے تسلی تشفی دے کر واپس کمرے میں چھوڑ آیا۔ ریوالور بدستور شائستہ کے پاس تھا۔

دوبارہ کنگ سے ملاقات کرنے سے پہلے میں صفدر اور غزال سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ گارڈز مجھے واپس ہوسٹل میں لے آئے۔ اب آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں پلگز کا چکر ختم ہو چکا تھا، طویل سرنگ کے تمام نشیب و فراز مجھے ازبر ہو گئے تھے۔

○☆○

اگلے روز کنگ سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے میں ایک بار پھر سرنگ میں تھا۔ آخر تلاشی کے مختلف مراحل سے گزر کر میں لفٹ میں بیٹھا اور کیمپس کی تحیر خیز دنیا میں داخل ہو گیا۔ دو گارڈز وردیوں میں ملبوس میرے ہمراہ تھے۔ میں نے ازخود صفدر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ اچانک چیخوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس دردناک نوحے کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ لمبوں کی صورت کبھی بلند اور کبھی دھیمی ہوتی ہوئی یہ کرب ناک آواز اکثر پردگی قیدیوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اکثر وہ کورس کی صورت میں روتے

تھے لیکن اس وقت یہ ایک ہی عورت کی آواز تھی۔ تھکی ہوئی اور غم سے نڈھال۔ میں نے شناخت کر لیا' یہ کملا کی بدنصیب ماں کی آواز تھی۔ یقیناً اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کی بچی اپنے بچے سمیت راہی عدم ہو چکی ہے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی کیونکہ اس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے عورت کے نوحے کا دکھ اور کرب محسوس کر کے میرے سینے میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ کئی دن تک پل پل اپنی بیٹی اور نواسے کا انتظار کرتی رہی تھی' اور اس جاں گسل انتظار کا صلہ اسے ایک جگرپاش خبر کی صورت میں ملا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس لاک اپ کی طرف جاؤں جہاں سے ایک دکھیاری ماں کا نوحہ بلند ہو رہا ہے۔ ایک بار اسے گلے سے لگا کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھوں لیکن پھر ہمت نہیں ہوئی۔ جن ہونٹوں سے میں اس کی امید بندھاتا رہا تھا ان ہونٹوں سے بیٹی کا پرسہ کیسے دیتا۔ اس کی شکوہ کناں نگاہوں کا سامنا کیسے کرتا؟ میں سیدھا چلتا چلا گیا۔ گارڈز بدستور میرے ساتھ تھے۔ ہم اس اسپتال کے سامنے سے گزرے جو اس کیمپس کے اندر ہی واقع تھا۔ یکایک ایک چنگھاڑ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو صفدر ایک حملہ آور کا وار اپنے بازو پر روک رکھا تھا۔ یہ وار کسی تیز دھار آلے کا تھا۔ آلے کی چمک لالٹین میں خوفناک لگ رہی تھی۔ حملہ آور راجن تھا۔ آتر پردیشی قیدیوں میں سے وہی خطرناک شخص جو مجھ سے خدا واسطے کا بیر رکھتا تھا۔ میری آخری اطلاعات کے مطابق یہ شخص ناکام خودکشی کی کوشش میں بازو زخمی کرنے کے بعد اسپتال میں تھا۔ میں نے غور سے دیکھا' اس کے ہاتھ میں ایک بڑا نشتر تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر چیخ رہا تھا "قاتل۔۔۔ ہتھیارا۔ ہم تمہار کو زندہ نہیں چھوڑت!" اس کی آنکھوں میں دیوانگی تھی اور چہرہ غضب سے بگڑا ہوا تھا۔ صفدر کو ایک طرف دھکیل کر وہ میری طرف بڑھا' لیکن صفدر بھی اتنی جلدی کہاں ہار ماننے والا تھا۔ اس نے راجن کی ٹانگ دبوچ لی۔ دونوں آگے پیچھے فرش پر گرے۔ راجن کے جسم میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ اپنے کلائی کے زخم کی پروا نہ کرتے ہوئے' اس نے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر صفدر کے چہرے پر رسید کر دیں۔ اس کی ٹانگ صفدر کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ راجن اٹھ کر مجھ پر جھپٹا' اس کے ہاتھ میں تیز دھار آلہ تھا۔ میں نے اسے دور ہی سے ٹانگ رسید کی۔ ٹانگ اس کے سینے پر لگی اور وہ جتنی تیزی سے آگے آیا تھا' اتنی ہی تیزی سے پیچھے گیا۔ صفدر نے اس کی پشت پر ٹانگ ماری وہ چکنے فرش پر فٹ بال کی طرح دور تک لڑھک گیا۔ وہ اتنی شدت کے ساتھ ایک دروازے سے ٹکرایا کہ دروازہ ٹوٹ گیا اور راجن ایک کمرے میں جا گرا۔ صفدر اس کی طرف لپکا لیکن یہاں ایک اپ سیٹ ہو گیا۔ کمرے کا ایک بغلی دروازہ کھلا اور حیران صورت والی ایک خوب صورت لڑکی نے دروازے میں سے جھانکا۔ راجن نے لپک کر لڑکی کی گردن میں اپنا بازو ڈال دیا اور تیز نشتر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ اس کی اپنی پشت دیوار کی طرف تھی۔ اس نے گرج کر دھمکی دی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن یقیناً اس نے یہی کہا تھا کہ کوئی اس کے قریب نہ آئے۔ گارڈز اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ایک دم ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ لڑکی یہاں کوئی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اردگرد موجود تمام مرد و زن کے چہرے سخت ہراساں نظر آنے لگے تھے' خاص طور سے ریوالور بردار گارڈز بہت گھبرا گئے تھے۔ لڑکی کی عمر بائیس سال کے قریب تھی۔ اس نے ڈاکٹروں اور سائنس دانوں جیسا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں پر سفید دستانے تھے۔ اس نے بال بھی جوڑے کی شکل میں باندھ کر سفید ٹوپی میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور راجن کی آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہی تھی۔ اس کا سرخ و سفید رنگ کورے لٹھے جیسا ہو گیا تھا۔ راجن میری طرف خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ نگاہوں نگاہوں میں مجھے کھا جاتا۔ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا بغلی دروازے تک لے گیا۔ اس دروازے کے اوپر چھوٹا سا سرخ بلب روشن تھا اور نمایاں الفاظ میں لکھا تھا "داخلہ ممنوع ہے۔" راجن لڑکی کو لے کر اندر چلا گیا۔ شیشے کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے اس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی تیزی تھی۔ میرا شروع سے یہی خیال تھا کہ راجن ٹھیک ٹھاک قسم کا غنڈا رہا ہے اور لڑائی بھڑائی کے سارے گر جانتا ہے۔ سینئر گارڈ کے منہ سے بے ساختہ "اف خدایا" کے الفاظ نکل گئے۔

وہ دوڑتا ہوا باہر راہداری میں گم ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے کئی سینئر قسم کے افراد کو اپنے اردگرد دیکھا۔ بھورے بالوں والا ویبن اور کپتان جم بھی ان میں آکر شامل ہو گئے۔ ان سب کے چہرے خوف کی تصویر تھے۔ جم نے گارڈز کو وارننگ دی "خبردار! کوئی گولی نہیں چلائے گا۔ یہاں سب آتش گیر مادہ ہے۔"

گارڈز اس حکم سے پہلے ہی اس بات کو سمجھ رہے تھے۔ اسی لیے ان کے چہرے فق کر تاف تک پہنچ گئے تھے کپتان

شہرۂ آفاق سلسلہ وار کہانی

شہ زور

تحریر
ایم اے راحت

دو حصوں میں مکمل

ایک ایسی خاتون رپورٹر کی داستان
جو قانون پرست، رحم دل، دلیر
اور انسانیت کی قدر دان تھی

قیمت مکمل سیٹ -/100 ڈاک خرچ -/25

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز

جم اور چین نے ہم سب کو بھی پیچھے ہٹا دیا۔ راجن لڑکی کو لے کر جس مستطیل کمرے میں گھسا تھا' وہ لیبارٹری نما تھا' یہاں فرش سے چھت تک الماریاں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ میزوں پر سائنسی تجربات کے آلات رکھے تھے۔ ایک طرف چھوٹی سی موٹر چل رہی تھی جس کے ذریعے لیو ترے سیلنڈروں میں کوئی گیس بھری جا رہی تھی۔ یہ نہایت حساس قسم کی لیبارٹری تھی اور جگہ جگہ DANGER کے الفاظ لکھے نظر آرہے تھے۔

راجن سائنس داں لڑکی سمیت ایک الماری کے پیچھے چھپ گیا تھا اور وہیں سے چیخ پکار کر رہا تھا۔ اس کی بکواس سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ انتظامیہ کے افراد نے دیگر افراد کی طرح مجھے اور صفدر کو بھی باہر کوریڈور میں نکال دیا۔ قرب وجوار میں زبردست قسم کی افراتفری نظر آنے لگی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ایک مخصوص الارم بجنا شروع ہو گیا' یہ خطرے کا الارم تھا۔ اس الارم کے بجتے ہی نیلی وردیوں والے محافظ لوگوں کو خطرناک ایریا سے دور ہٹانے لگے۔ ہمیں بھی مزید پیچھے دھکیل دیا گیا۔

قریباً دس منٹ تک وہاں زبردست سرگرمی جاری رہی۔ پریشان چہروں والے افسران تیز قدموں سے لیبارٹری کی طرف آتے اور جاتے رہے پھر دو افراد دکھائی دیے۔ انہوں نے وہی وردی پہن رکھی تھی جو بم ڈسپوزل یونٹ کے ارکان پہنتے ہیں۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے جن کے آگے بڑے بڑے شیشے تھے۔ یہ دونوں افراد دس پندرہ منٹ اندر رہے پھر واپس چلے گئے۔ ان کی جگہ تین چار مزید کمانڈو ٹائپ افراد متاثرہ پورشن کی طرف چلے گئے۔ اسی دوران میں مائیکل بھی نظر آگیا۔ وہ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر چشمہ لگائے بڑے ہیجانی قدموں سے متاثرہ حصے کی طرف آیا۔ اس نے ایک نظر مجھے اور صفدر کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی واپسی بھی چار پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی نظر آرہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا "قسمت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس لڑکی کی جان بہت قیمتی ہے۔ یہ کنگ کی بھتیجی ہے۔ کنگ بڑا پیار کرتے ہیں اس سے۔ وہ حرامی اسے لے کر لیبارٹری میں گھس گیا ہے۔ وہاں ہر طرف آتش گیر مادہ ہے' ہم اس پر گولی بھی نہیں چلا سکتے' نہ کوئی اور خطرہ مول لیا جا سکتا ہے۔"

اتنے میں ایک اٹالین دوڑا ہوا آیا۔ اس نے انگلش میں مائیکل سے کہا "سر سیلنڈر کی گنجائش زیادہ سے زیادہ چار سو پاؤنڈ ہے۔ اس میں چار سو ساٹھ پاؤنڈ گیس بھری جا چکی ہے' وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔"

"موٹر باہر سے بند کر دو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے سر۔ موٹر UPS کے ذریعے چل رہی ہے۔ اسے اندر سے ہی بند کیا جا سکے گا۔"

"حرام زادہ۔ سؤر۔" مائیکل نے دانت پیسے۔

وہ تیز قدموں سے دوبارہ تو شیبر کی طرف گیا۔ میں اور صفدر بھی اس کے ساتھ ہو لیے' اس نے اعتراض نہیں کیا۔ ہم چھوٹے کوریڈور سے گزر کر لیبارٹری کے سامنے پہنچ گئے۔ اندر سے راجن کے بولنے کی آواز آرہی تھی لیکن پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ مائیکل سے اجازت لے کر میں دروازے کے قریب گیا اور راجن سے بات چیت کی کوشش کی۔ اس کا دماغ گھوما ہوا تھا اور وہ گالیاں بکنے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ بس ایک دو لفظ سمجھ میں آئے جن سے پتا چلا کہ وہ سب کو مارنے اور قتل کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

جس سیلنڈر میں خودکار طریقے سے گیس بھری جا رہی تھی وہ کھڑکی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ سیلنڈر کے اوپر ہوا پیومیٹر اپنی سوئی کے ذریعے خطرے کے نشان کو ظاہر کر رہا تھا۔ راجن ایک الماری کے عقب میں تھا۔ اس کا سر اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ الماری کے عقب سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو یہاں سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا لیکن نشانہ خطا ہونے کی صورت میں گولی کہیں اور جا لگتی اور اس لیبارٹری سمیت اردگرد کے کئی کمرے دھماکے کی زد میں آجاتے۔ وقت دو دھاری تلوار کے مانند گزر رہا تھا۔ ایک طرف لڑکی کی جان بچانے کی ضرورت تھی اور دوسری طرف سیلنڈر کو بند کرنا بھی ضروری تھا۔ ایک گارڈ نے بتایا کہ ابھی دو منٹ پہلے ایک گارڈ نے اندر جا کر موٹر بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اغوا کنندہ نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اس نے اس صاحبہ کا سر زور زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا اور نشتر مار دینے کی دھمکی دی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ صفدر کا نشانہ ہمیشہ سے بے عیب رہا تھا۔ وہ رائفل اور ریوالور وغیرہ کے ذریعے بڑے اعتماد سے نشانہ لیتا تھا۔ میں مائیکل کو لے کر ذرا پرے کوریڈور میں آگیا۔ میں نے کہا "مائیکل! رسک تو اب لینا ہی پڑے گا۔ وہ جانگلی ہماری بات بالکل نہیں سمجھ رہا۔ اگر سیلنڈر پھٹ گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔"

"کیسا رسک لو گے تم؟" مائیکل نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"شوٹ کرنے کا رسک۔ اس اُتر پردیشی کو شوٹ کیا

جا سکتا ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے' وہ الماری کے عقب میں چھپا ہوا ہے۔"

"لیکن اس کے سر کا کچھ حصہ نظر آرہا ہے۔" صفدر نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اسے گولی مار سکتا ہوں۔"

"لیکن اگر تمہارا نشانہ خطا ہو گیا تو سب کچھ دھماکے سے اُڑ جائے گا اور تمہارے بھی ٹکڑے نہیں ملیں گے۔"

"اس کے باوجود میں یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔"

"لیکن ہم نہیں لے سکتے۔ ریرا کی جان بہت قیمتی ہے سر۔"

"اور ویسے بھی تو وہ مر رہی ہے۔" صفدر نے مائیکل کی بات اُچکی "آپ خود دیکھ سکتے ہیں سیلنڈر کے میٹر کی سوئی کہاں پہنچ گئی ہے۔"

مائیکل نے آنکھیں سکوڑ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ پیومیٹر واقعی خطرناک صورتِ حال پیش کر رہا تھا۔ ائر کنڈیشنڈ ماحول کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ اس نے بڑی تیزی سے سوچا اور تیزی سے فیصلہ کر لیا۔ ایک نظر بغور صفدر کو دیکھنے کے بعد وہ بولا "ٹھیک ہے! اگر تم خود کو اس قابل سمجھتے ہو تو یہ رسک لے لو۔"

"مجھے اعشاریہ دو پانچ کا ایک کولٹ پسٹل فراہم کریں۔" صفدر نے کہا۔

ایک منٹ کے اندر اندر ایک گارڈ سے کولٹ پسٹل لے کر صفدر کو دے دیا گیا۔ لمبے بالوں والے چین کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ ریرا نامی جو لڑکی اندر پھنسی ہوئی تھی وہ رشتے میں چین کی بھی بھتیجی تھی۔ چین نے رندھے لہجے میں مجھ سے پوچھا "کیا یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر بھی پائے گا؟"

میں نے کہا "یہ تو اللہ ہی جانتا ہے' لیکن میرا خیال ہے اس وقت اس سے بہتر شخص یہاں اور کوئی نہیں ہو گا۔"

صفدر نے کہا "میری درخواست ہے کہ آپ سب لوگ چلے جائیں۔"

"مگر۔"

"آپ وقت ضائع نہ کریں۔" صفدر نے چین کی بات کاٹی۔

مائیکل نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ پلک جھپکتے میں سب باہر نکل گئے۔ مائیکل' چین اور کپتان جم رخنو بھی باہر نکل گئے۔ صرف میں رہ گیا۔

صفدر بولا "آپ بھی جائیے شاہ جہاں صاحب۔"

"نہیں صفدر! میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب۔ پلیز آپ جذباتی بات نہ کریں۔ ہم دونوں کو رسک پر نہیں ہونا چاہیے' جبکہ اس دُہرے رسک کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔"

"مجھے یہ گوارا نہیں ہے صفدر۔"

"بات آپ کو گوارا ہونے کی نہیں ہے۔ اگر اللہ نہ کرے۔ ہم دونوں کو کچھ ہو گیا تو باقی ساتھیوں کا کیا بنے گا۔ پلیز آپ جائیے۔" اس نے مجھے قریباً دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

"صفدر احتیاط سے۔" میں نے لیبارٹری کا بیرونی دروازہ بند ہونے سے پہلے کہا۔

گارڈز مجھے قریباً سو میٹر دور ایک چوکور کمرے میں لے گئے۔ یہاں ایک ٹی وی اسکرین پر لیبارٹری کا اندرونی منظر نظر آرہا تھا۔ مائیکل' چین' جم وغیرہ سب یہیں موجود تھے اور بڑے انہماک سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ راجن بدستور آہنی الماری کے عقب میں تھا وہ گاہے گاہے ہذیان بکنے لگتا تھا مگر اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کبھی کبھی لڑکی کی گھٹی ہوئی چیخ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ کیمرا جس زاویے پر تھا وہاں سے راجن یا لڑکی کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا مگر صفدر کو یقیناً راجن کے سر کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ صفدر بڑی توجہ سے راجن کا نشانہ لینے میں مصروف تھا۔ وہ لیبارٹری کی کھڑکی میں سے راجن کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں پسٹل تھام کر اس نے بازو سیدھے کر لیے تھے اور دیوار کا سہارا لے لیا تھا' اس کا پورا جسم ساکت تھا اور بازو تو جیسے پتھر کے تھے۔ یہ زندگی اور موت کا نشانہ تھا' یہ ایک ایسا فائر تھا جس پر تین زندگیوں کا انحصار تھا اور اس میں خود فائر کرنے والے کی زندگی بھی شامل تھی۔ اور اس فائر کے لیے وقت محدود تھا۔ نجانے کیوں صفدر کا اعتماد دیکھ کر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ایک کامیاب فائر کرے گا۔ پھر آتش گیر مادے سے لدی ہوئی اس لیبارٹری میں دھماکے کی آواز گونجی۔ یہ پسٹل کا دھماکا تھا۔ کسی کے زمین پر گرنے کی آواز آئی اور ریرا نامی لڑکی چیختی ہوئی الماری کے پیچھے سے نکلی اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کا سفید کوٹ پھٹا ہوا تھا اور بال کھل چکے تھے۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر صفدر کو دیکھا اس نے ایک بار پھر دلیری کا مظاہرہ کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ لڑکی کے ساتھ ہی بھاگ کر باہر آجاتا' وہ اندر کی طرف دوڑا۔ لیبارٹری کے

دوسرے کونے میں جاکر اس نے وہ پریشر پمپ بند کردیا جو سیلنڈر میں مسلسل گیس بھرتا چلا جارہا تھا۔ کمرے میں موجود سب افراد کے چہرے بے اختیار کھل اٹھے۔ سب اٹھ کر لیبارٹری کی طرف دوڑے۔ ویرا نامی وہ خوب رو لڑکی تو نجانے کہاں غائب ہوگئی تھی' ایسی بھاگی کہ کہیں نظر ہی نہیں آئی۔ ہم لیبارٹری میں پہنچے۔ میں نے منور کو بے اختیار گلے لگایا۔ مائیکل اور چین وغیرہ نے بھی اس کے لیے تعریفی کلمات کہے۔ ہم نے الماری کے عقب میں پہنچ کر دیکھا۔ اتر پردیشی راجن وہاں مردہ پڑا تھا۔ گولی اس کے بائیں ابرو کے اوپر سے کھوپڑی میں داخل ہوئی تھی اور گاڑھا خون قالین پر زیادہ پھیلنے نہیں پایا تھا بلکہ تھوڑے سے حصے میں ہی جذب ہوگیا تھا۔ نشتر اس کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس کی لاش کو گارڈز نے گھسیٹ کر الماری کے پیچھے سے نکالا تو قالین پر خون کی سرخ لکیر سی کھنچ گئی۔ یہی وہ خون تھا جو اس گرم مزاج شخص کے اندر ہر وقت اچھالے مارتا رہتا تھا۔ اس خون نے اس سے نجانے کیسے کیسے کام کرائے تھے اور اس نے کہاں کہاں اپنی کہانیاں چھوڑی تھیں' لیکن یہ ساری کہانیاں بہت دور انڈیا میں کہیں بکھری ہوئی تھیں' اتر پردیش کے کسی نہ کسی علاقے میں یقیناً ان کہانیوں کا وجود ہوگا لیکن آج ان گلی کوچوں سے ہزاروں میل دور اس لیبارٹری میں راجن کی آخری کہانی وائنڈ اپ ہوگئی تھی۔ ایک باکمال نشانہ باز کی چلائی ہوئی ایک گولی نے اس جسیم شخص کو ٹھنڈا ٹھار کردیا تھا۔

اس واقعے نے کیمپس کے طول و عرض میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ ہمیں کیمپس ہی کے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا اور انتظار کرنے کو کہا گیا۔ چند روز کے اندر یہ کیمپس میں ایک ہی طرح کی واردات کا دوسرا واقعہ تھا۔ پہلے واقعے میں پروفیسر نے ایک لڑکے کو قتل کرکے دوسرے کو یرغمال بنا لیا تھا' آج اس دوسرے واقعے میں راجن نے ایک نوجوان سائنس داں کی گردن پر نشتر رکھ دیا تھا۔ پہلے واقعے میں اغوا کنندہ اپنے مقصد میں جزوی طور پر کامیاب رہا تھا' آج اس دوسرے واقعے میں اغوا کنندہ ہلاک ہوا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہمیں کنگ کی طرف سے بلاوا آیا اور مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہم کنگ کی خدمت میں پیش ہوگئے۔ وہ آج بھی اسی طلسمی نشست گاہ میں تھا جہاں اس سے پرسوں ملاقات ہوئی تھی۔ زرد آنکھوں والا چھپکلا اس کے کندھے پر بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ سامنے والی دیوار پر موجود ٹی وی اسکرینز میں سے چند ایک کے سوا باقی تاریک تھیں۔ کنگ نے اپنے پاؤں نیم گرم پانی کے برتن میں ڈبو رکھے تھے اور نیم عریاں لباس والی حسین و جمیل لڑکی اس کے پاؤں کو غسل دینے میں مصروف تھی۔ ہماری آمد پر کنگ نے لڑکی کو اشارہ کیا اور وہ پانی کے برتن سمیت اٹھ کر باہر چلی گئی۔ کنگ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس کی تعریفی نظریں منور پر لگی تھیں۔ یقیناً اس کو دو گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعے کی رپورٹ مل چکی تھی۔

"ویل ڈن جنٹلمین!" اس نے ہولے سے تالی بجائی "ہمیں پہلے سے یقین تھا کہ شا کی طرح تم بھی ہمارے بہت کارآمد ثابت ہوگے۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے۔" منور نے کہا۔

"شا کی بھی تعریف کرنا پڑتی ہے کیونکہ اس نے بروقت فیصلہ کیا اور مجرم کو شوٹ کرنے کی ذمے داری تمہیں سونپنے کا مشورہ دیا۔"

"شکریہ سر۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ خاموش ہو شا۔" کنگ نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔"

"ہماری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی۔ کچھ نہ کچھ تو ہے۔ کیا بات ہے؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا "جناب! آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ یہ سارا معاملہ اس وقت شروع ہوا جب اتر پردیشی راجن نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا۔ اور اس کے حملے کی وجہ تھی کہ وہ مجھے کملا کا قاتل سمجھ رہا تھا۔ اس نے پکار پکار کر مجھے قاتل اور آبرو کا لٹیرا کہا۔ مجھے بہت دکھ ہوا جناب۔ کملا میرے لیے بچی کی طرح تھی۔ شاید بیٹی کی طرح۔"

"اوہ!" کنگ نے ہونٹ سکوڑے "ہمیں افسوس ہے۔ ہم نے کپتان جم کو ہدایت کی تھی کہ وہ اتر پردیشی بردوں کو کملا کی موت سے آگاہ کردے اور ساتھ ہی ان بردوں کو یہ باور کرا دے کہ اس واقعے میں تمہارا ہاتھ قطعاً نہیں ہے۔ شاید جم یہ کام ٹھیک طور پر نہیں کرسکا۔" اس کے ساتھ کنگ نے کنٹرول پینل پر ایک بٹن دبایا۔ ایک اسکرین روشن ہوگئی۔ فربہ اندام کپتان جم کھانے کی میز پر نظر آیا۔ وہ سور کی روسٹ ران سے نبرد آزما تھا "ہیلو کپتان جم" کنگ نے کہا۔

"یس سر۔" جم نے چونک کر کیمرے کی طرف دیکھا۔ کھڑا ہوگیا۔

"کھانا کھا کر ہمارے روم میں آؤ۔"

"میں کھانا کھا چکا ہوں سر۔ بس میں پہنچ رہا ہوں۔"

نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد جم ہمارے سامنے موجود تھا۔ کنگ نے کہا "ہمیں یقین ہے کہ تم جہاز چلانے کے علاوہ بھی کچھ کام اچھے طریقے سے کرسکتے ہو' یہی وجہ ہے کہ فرصت کے اوقات میں ہم تمہیں کچھ ذمے داریاں سونپتے رہتے ہیں۔"

"یہ آپ کی کرم فرمائی ہے کنگ۔۔۔ ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" کپتان جم دیو ہیکل ہونے کے باوجود کنگ کے سامنے ناچیز نظر آرہا تھا۔

"ہم نے تم سے کہا تھا کہ انڈین بردوں کے نئے گروپ کے سامنے شا کی پوزیشن صاف ہونی چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو ہنگامہ ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ اس گروپ کے سامنے شا کی پوزیشن صاف نہیں ہوئی۔ وہ شخص جو مارا گیا ہے شا کو انڈین لڑکی کا قاتل قرار دے رہا تھا۔"

جم نے کہا "جناب! میں نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ دو ترجمانوں کی مدد حاصل کی گئی تھی۔" چند لمحے توقف کرکے اس نے کہا "اور جہاں تک میرا خیال ہے جناب! وہ لوگ کافی حد تک قائل بھی ہوگئے تھے۔ وہ مسٹر شا کی کافی عزت کرتے ہیں۔ بھروسا رکھتے ہیں مسٹر شا پر۔۔۔ جہاں تک حملہ آور کا تعلق ہے وہ اس گروپ میں شامل نہیں تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ زخمی ہو کر اسپتال میں داخل تھا۔ وہیں اسپتال میں اسے انڈین لڑکی کی موت کی خبر ملی اور وہیں سے نکل کر اس نے شا پر حملہ کیا۔"

جم کی دلیل میں وزن تھا۔ راجن اس لاک اپ میں موجود نہیں تھا جہاں دیگر اتر پردیشیوں کو رکھا گیا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو وہ سمجھانے بجھانے سے قائل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ ملاقات کا نہیں مُکّا لات کا آدمی تھا اور میرے ساتھ اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ بہرحال جم کی غلطی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کنگ نے ایک بار پھر اسے ہدایت کردی کہ انڈین بردوں کے ذہن میں میرے بارے میں کسی بھی طرح کی غلط فہمی باقی نہ رہنے دی جائے۔

کپتان جم کے جانے کے بعد کنگ نے ایک بار پھر منور کے لیے توصیفی کلمات کہے۔ کچھ دیر کنگ کے ساتھ ادھر ادھر کی بات ہوئی پھر کنگ اصل موضوع پر آگیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مائیکل اور اس کی بیوی والے مسئلے کا کیا ہوا؟

میں نے کہا "جناب! کل میں نے مسز شائستہ سے بات کی ہے' وہ تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر بھی آئیں لیکن پھر واپس چلی گئیں۔ وہ ذہنی طور پر از حد اپ سیٹ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کچھ عرصے کے لیے وہ مسٹر مائیکل سے دور رہیں تو یہ ان کے اور مسٹر مائیکل دونوں کے لیے بہت مفید رہے گا۔"

"لیکن ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ وہ مائیکل کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس شادی میں اس لڑکی کی مکمل رضامندی شامل نہ ہو مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے' مائیکل کا رویہ اس کے ساتھ محبت اور سلیقے کا رہا ہے۔"

"گستاخی معاف جناب! مسٹر مائیکل کا رویہ اپنی مسز سے بے شک شائستگی کا رہا ہے لیکن اپنے فادر ان لاء سے ان کا رویہ کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ شائستہ کو اپنے والد سے بے حد محبت ہے' ان کی مسلسل تکلیف اور پریشانی دیکھ کر اس کا دکھی ہونا لازمی تھا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ مسٹر اور مسز مائیکل میں فوری اختلاف اور دوری کی وجہ مسز کا والد نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا وجہ ہے؟"

"اس کی وجہ مسٹر اور مسز مائیکل کا وہ بچہ ہے جو ڈیڑھ ماہ قبل پیدا ہوا تھا۔"

"ہم وضاحت چاہتے ہیں۔" مائیکل نے چھپکلے کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے جواب دیا "جناب! میں نہیں جانتا کہ مجھے یہ بات کرنا چاہیے یا نہیں لیکن چونکہ آپ نے حقیقتاً دریافت کی ہے اس لیے میں کچھ بھی چھپانا غلط سمجھتا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق مسٹر مائیکل کا تعلق ایک آدم خور قبیلے سے ہے۔"

"ٹھیرو ٹھیرو۔" کنگ نے ہاتھ اٹھایا "شاید تم یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ مائیکل نے اپنے نومولود بچے کو کھایا ہے۔"

"یس۔۔۔ جی سر" میں نے کہا۔

مجھے بے حد حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ کنگ کے چہرے پر کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ چند لمحے بعد اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ اس نے چھپکلے کو صوفے کے ہتھے پر رکھا' وہ رینگ کر صوفے کی پشت پر چڑھ گیا۔ کنگ نے کہا "شا! تم اس وقت افریقہ میں ہو۔ تمہیں یہاں کے ماحول کے مطابق ہی سوچنا اور عمل کرنا ہوگا۔ جیسا کہ تم بخوبی جانتے ہو مائیکل کا تعلق قبائلی قبیلے سے ہے' ان خاص لوگوں کے خاص رسم و رواج ہیں۔ جو کچھ تم ہمیں بتانا چاہ رہے ہو وہ تم لوگوں کے لیے شاید غیر معمولی اور انوکھا ہو لیکن ان لوگوں کے لیے یہ بالکل عام بلکہ غیر اہم ہے۔ وہ لڑکی

جو مائیکل کی بیوی ہے' اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ بالکل مختلف لوگوں میں داخل ہو رہی ہے' اسے ان لوگوں کو تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت قبول کرنا ہوگا۔"

میں کنگ کو کیسے بتاتا کہ وہ سیدھی سادی لڑکی اپنے وحشی شوہر کو اس کی تمام برائیوں سمیت قبول کر چکی تھی مگر یہ "برائی" تو نہیں تھی' یہ تو ایک قیامت تھی۔ ایک حشر تھا جو پروفیسر کی بیٹی کے لیے برپا ہوا تھا۔ اس کا لختِ جگر دنیا میں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اپنے وحشی باپ کے خوں خوار جبڑوں تلے کچلا گیا تھا اور اس کے شکم میں پہنچ گیا تھا۔ وہ ہمکتی ہوئی معصوم زندگی جو نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں رہی تھی' آناً فاناً موت میں بدل گئی تھی اور باپ کے پیٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اب اس زمین دوز دنیا کا یہ بے تاج بادشاہ کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اور جب وہ اسے عام کہہ رہا تھا تو پھر خاص کون کہہ سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ کنگ شاید میری دل جوئی کے لیے بولا "ہاں' کسی حد تک شاید مائیکل سے بھی غلطی ہوئی ہے' اسے اپنی بیوی کو اس صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار کر لینا چاہیے تھا۔ بہرحال اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس کا اتنا طویل سوگ منانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اس لڑکی سے ایک دو ملاقاتیں اور کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ اسے ایک نہایت طاقت ور اور بااختیار شخص کی بیوی بننے کا موقع ملا ہے' وہ کیوں اپنا گھر خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ تھوڑی سی برداشت کے ساتھ کام لے۔ جو باتیں آج اسے عجیب اور بری لگ رہی ہیں' کل اس کے لیے قطعی عام ہو جائیں گی' انسان کے ذہن میں قدرت نے تبدیلی کی بہت گنجائش رکھی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب' جیسا آپ کہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گا۔" میں نے کہا۔

"باقی اگر تم کہتے ہو تو ہم مائیکل سے بات کریں گے' اسے کہیں گے کہ وہ اپنے فادر ان لاء سے بہتر سلوک کرے۔"

"میرا ذاتی خیال یہ ہے جناب کہ اگر باپ بیٹی کی ملاقات کرا دی جائے تو صورتِ حال پر اچھا اثر پڑے گا۔ مسز شائستہ کی ذہنی پریشانی کا دور مختصر ہو جائے گا۔"

"ہمارے خیال میں یہ کام تو ذرا مشکل ہوگا۔ مائیکل نے ہمیں بتایا تھا کہ بیوی سے اس کے بگاڑ کی وجہ یہی ہے کہ وہ شخص اپنی بیٹی کی جان نہیں چھوڑتا۔ وہ کسی نہ کسی طور ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتا ہے اور اسے اپنے لاڈ پیار کے گھیرے سے نکلنے نہیں دیتا۔"

"میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا جناب کہ مسٹر مائیکل کا تجزیہ درست نہیں ہے۔ نجانے کیوں وہ باپ بیٹی کی محبت سے الرجک ہو گئے ہیں' حالانکہ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ پروفیسر کی بیٹی اس کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"وہ زندہ تو ہے۔ حالانکہ مائیکل اسے باور کرا چکا ہے کہ اس کی بیٹی زچگی کے دوران میں ختم ہو چکی ہے۔"

"گستاخی معاف کنگ! آپ اسے زندگی نہیں کہہ سکتے۔" میں نے کہا "دو تین روز میں نے پروفیسر کو بہت قریب سے دیکھا ہے' وہ نیم پاگل ہو چکا ہے جناب! وہ کسی بھی وقت اپنی یا کسی اور کی جان لے سکتا ہے۔ اس سیدھے سادے کمزور بندے میں ایسی تبدیلیاں آئی ہیں' جنہیں محسوس کر کے میں کانپ اٹھا ہوں۔ پروفیسر کی بیٹی اپنے بچے کی ہولناک موت کے صدمے سے تو شاید سنبھل جائے لیکن اگر اس کے باپ کو کچھ ہوا تو شاید وہ بھی زندہ نہ رہ سکے گی۔ میں نے باپ بیٹی کی اس غیر معمولی محبت کو محسوس کیا ہے' اور اگر آپ کو ملاحظہ کرنے کا موقع ملے تو مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ضرور محسوس فرمائیں گے۔ ان دونوں کو جدا رکھ کر ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے جناب۔"

کنگ کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں' وہ بولا "اچھا' ہم اس بارے میں مائیکل سے بات کریں گے۔"

اتنے میں مختصر لباس والی نوخیز ملازمہ اندر آئی۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر کنگ کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ کنگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بغلی دروازہ کھلا اور ایک خوب رو لڑکی اندر آ گئی۔ یہ وہی مہ جبیں تھی جو قریباً تین گھنٹے پیشتر ایک سخت ترین مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ یہ وہی لیبارٹری والی لڑکی ویرا تھی جسے راجن نے دبوچ لیا تھا۔ اس سنگین واقعے کے نتیجے میں نشتر کا ایک کٹ لڑکی کی صراحی دار و شفاف گردن میں لگا تھا۔ اب وہاں چھوٹی سی چند ٹیپ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ایک رخسار پر بھی چند خراشیں موجود تھیں۔ کنگ نے کہا "ویرا ذاتی طور پر آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ خاص طور سے مسٹر صفدر کا۔" لڑکی پہلے ذرا سا شرمائی' پھر اس نے بڑی آہستگی سے صفدر کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی اور اپنی بہادری کا شاندار ثبوت پیش کیا۔ اس نے اپنے بارے میں انکشاف کیا کہ وہ "ریسرچ سائنس داں" ہے' اور آج کل اپنے استادِ محترم کے ساتھ ایک کیمیکل گیس کے تجربات کر رہی ہے۔ اس کی کوالی فیکیشن

اس کی "تابی" عمر کی نسبت سے خاصی حیران کن تھی۔ کنگ نے اس سے کہا "جاؤ ویرا! اپنے ان نئے دوستوں کو آس پاس کی سیر کراؤ۔"

"آیئے حضرات!" اس نے دلکش ادا سے کہا۔

یہ آفر قبول کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم ویرا نامی اس لڑکی کے ساتھ چل دیے۔ وہ ہمیں لے کر چند راہداریوں سے گزری اور ایک ہال نما کمرے میں آ گئی یہاں بھی وڈیو ٹیلی فون کی دو بڑی بڑی اسکرینز موجود تھیں اور دو افراد ان اسکرینز کے سامنے کھڑے گفتگو میں مصروف تھے۔ کیمپس کے اندر وڈیو فونز' برقی سیڑھیوں اور خودکار دروازوں کی سہولت کثرت سے موجود تھی۔ ہال نما کمرے میں پہنچ کر ویرا نے سرخ رنگ کی ایک خوب صورت جیکٹ پہن لی۔ ایسی ہی دو جیکٹس اس نے ہمیں بھی پہنا دیں۔ ایسی جیکٹس میں نے یورپین لارڈز' ڈیوکس اور وزرا کو پہنے دیکھا تھا۔ ویرا مسکرا کر بولی "جہاں ہم جا رہے ہیں' وہاں اس جیکٹ کا ہونا لازمی ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ دو روز پہلے ہم نے کنگ کی خصوصی نشست گاہ میں وڈیو اسکرین پر جو شان دار کیسینو دیکھا تھا وہاں موجود اکثر افراد نے بھی ایسی ہی سرخ جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ہم ایک بڑے خودکار دروازے کے سامنے پہنچے۔ اس دروازے کی پیشانی پر جگمگاتے حروف میں لکھا تھا "اے کلب"۔ خودکار دروازے میں سے گزر کر ہم ایک شان دار "باغ نما" جگہ پر آ گئے۔ زمین دوز بستی میں باغ؟ یہ انوکھی تھی۔ فوراً ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ جسے ہم باغ سمجھ رہے ہیں' یہ ویسا ہی باغ ہے جیسا فلمی اسٹوڈیوز میں ماہر مصور تخلیق کرتے ہیں۔ بلند و بالا چھت والے اس وسیع و عریض ہال کی دیواروں کو یوں پینٹ کیا گیا تھا کہ ایک خوب صورت لینڈ اسکیپ کا گماں ہوتا تھا۔ یہ افریقہ کے کسی سرسبز علاقے کا لینڈ اسکیپ تھا۔ یہاں پام کے بلند و بالا درخت بھی تھے' سبز نرم گھاس بچھی تھی اور پھول پودے بھی۔ ایک چٹانی آبشار قریباً پچیس فٹ کی بلندی سے گرتا تھا اور اس کا پانی سیاہ چٹانوں سے ٹکرا کر دلنشیں آواز پیدا کر رہا تھا۔ یہاں ان دو پھلنے پھولنے والے پودے اور پھول بھی موجود تھے۔ اتنا سحر انگیز منظر تھا کہ آنکھ چند لمحے کے لیے ساکت ہو کر رہ جاتی تھی۔ یہاں چند خوب صورت لڑکیاں تتلیوں کے مانند گھومتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ اس مقام سے آگے بڑھ کر ہم ایک شان دار سوئمنگ پول پر پہنچ گئے۔ یہ وہی سوئمنگ پول تھا جو پرسوں ہم نے کنگ کے کمرے میں اسکرین پر دیکھا تھا۔ آج بھی یہاں چند معزز افراد نہانے اور تیرنے میں مصروف تھے۔ ان میں مجھے ہرکولیس کا نائب کپتان آذر بھی نظر آیا۔ ایک حسین ملائی لڑکی اس کی بغل میں تھی۔ مجھے دیکھ کر آذر کے چہرے پر شناسائی کے آثار نظر آئے لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں بہت سے سوئمنگ پول دیکھے تھے' لیکن اس پول کی شان اور دبدبہ ہی کچھ اور تھا۔ تیلگوں اور سفید روشنیوں کا ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ حسین گرد و پیش حسین تر نظر آنے لگتے تھے۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے دو پری پیکر حسیناؤں نے میرے اور صفدر کے قدم لیے اور ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ بالکل جیسے ہم انسان نہیں دو سیارے تھے اور جونہی ہم خلا کے ایک خاص حصے میں پہنچے تھے دو چاند ہمارے گرد گردش کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں پیراکی کے لباس میں تھیں۔ ایک نے اپنی حسین ادائیں مجھ پر لٹاتے ہوئے کہا "کیا آپ نہانا پسند فرمائیں گے؟"

"شکریہ۔ ابھی نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ دونوں سفید فام پریاں ذرا بھی بدمزہ نہیں ہوئیں اور بدستور لپک لپک کر ہمارے ساتھ چلتی رہیں' یہاں تک کہ ہم "جنتِ ارضی" کے اس گوشے سے گزر کر ایک شان دار کیسینو میں داخل ہو گئے۔ اس قمار خانے میں بھی کچھ نہایت معزز صورت خواتین و حضرات "حرام تفریح" میں مصروف تھے۔ دھواں دھواں فضا میں میزوں پر لاکھوں کا جوا چل رہا تھا۔ لمحوں میں لوگوں کی قسمتیں بگڑ اور سنور رہی تھیں۔ یہ قمار خانہ بھی ہم اس سے پہلے کیمرے کی وساطت سے دیکھ چکے تھے۔ اس قمار خانے کے پہلو میں بھی دو تین چھوٹے ہال تھے یہاں اسنوکر' کارڈز اور چیس وغیرہ کھیلنے کا انتظام تھا۔ ان کے عقب میں ایک شان دار رقص گاہ نظر آ رہی تھی۔ ایک نہایت سجا سجایا بلوری شراب خانہ بھی اس رقص گاہ کے اندر ہی تھا۔ یہ جگہ واقعی "اے کلب" کہلانے کی مستحق تھی۔ صفدر نے رقص گاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ لاکھوں ڈالر تو ڈانسنگ فلور پر ہی خرچ ہو گئے ہوں گے۔"

"حساب لگانے بیٹھو گے تو دماغ چکرا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"کاش دفینے کی رقم مل جائے۔" صفدر نے ٹھنڈی سانس بھری "ہم بھی چند روز اس جنتِ ارضی میں گزار کر دیکھ لیں۔"

"جنتِ ارضی نہیں' عشرت کدہ کہو۔" میں نے سرگوشی

کی "ورونیکا! ذرا آہستہ بولو یہاں ویڈیو کیمروں کے علاوہ صوتی آلات بھی لگے ہوئے ہیں۔ تم پرسوں خود بھی دیکھ چکے ہو۔" صفدر نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا "مس ویرا! وہ اوپر بار کے اوپر کمرے کیسے ہیں؟"

ویرا کے حسین چہرے پر رنگ سا لہرایا "یہ آرام کرنے کے لیے ہیں۔ آپ چاہیں تو یہاں رات بھر کے لیے بھی ٹھہر سکتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے فائیو اسٹار سے بہت اوپر کی چیز ہے۔" صفدر میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر رہ گیا۔ ویرا بولی "کیا آپ یہ سوئٹس دیکھنا چاہیں گے؟"

"نہیں مس۔" صفدر نے کہا "ہم تو تھرڈ کلاس اسٹاف بھی افورڈ نہیں کر سکتے۔ ان سوئٹس کو کیا افورڈ کریں گے۔"

وہ ادا سے مسکرائی "یہ سب کچھ آپ کے لیے فری ہے۔ بلکہ اگر آپ کیسینو جانا چاہیں تو آپ کو فوری طور پر رقم بھی مہیا کی جا سکتی ہے۔ اس کلب میں داخلے کا اعزاز صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو کنگ کے قریبی ساتھی ہوتے ہیں یا قریبی ساتھی بننے والے ہوتے ہیں۔"

اب ہمارے لیے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ کنگ ہمیں اس زمین دوز دنیا کی حیرت ناک آسائشوں اور رنگینیوں سے مرعوب کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ ہمیں بتانا چاہ رہا ہے کہ اگر ہم اس کے بے دام کے غلام بن جائیں تو ہمارے لیے دنیاوی راحت اور آسائش کے کیسے کیسے دروازے کھل سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے چہرے پر وہی تاثرات پیدا کر لیے جو کنگ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ رقص گاہ سے واپس آتے ہوئے جب ہم کیسینو کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نیم عریاں لڑکیاں جوئے کی میزوں کے درمیان تھرکتی نظر آئیں۔ چھت سے پھوٹنے والی روشنیوں میں ان کے بدن اور مختصر لباس آئینے کی طرح دمک رہے تھے۔ آرکسٹرا ان رقاصاؤں کو مسلسل دھیمی دھیمی دھن فراہم کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی میری جانی پہچانی تھی اور اس سے پہلے بھی وہ کئی بار مجھے ان در و دیوار میں نظر آ چکی تھی۔ یہ انورادھا عرف انو تھی۔ وہی سیدھی سادی دیہاتن جو ایک چڑیا کی طرح اس خوفناک جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا تھا، اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ غالباً اتنی خوف زدہ تھی کہ مجھ سے نگاہ ہی نہیں ملاتی تھی۔ اس مرتبہ بھی میں اور صفدر صرف اسی کے لیے کیسینو کے اندر گئے۔ وہ رقص کرتی ہوئی ایک بار ہمارے قریب سے بھی گزری مگر وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے ہمیں دیکھا ہی نہیں۔

کچھ دیر بعد ہم اس طلسماتی کلب سے باہر نکلے اور کیمپس سے باہر جانے کے لیے لفٹوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ویرا گاہے گاہے صفدر کو لگاوٹ کی نظروں سے دیکھ لیتی تھی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ صفدر میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ ایک بھرپور لڑکی تھی اور بہت تعلیم یافتہ بھی۔ کوئی بھی نوجوان اس کی رفاقت پر رشک کر سکتا تھا مگر صفدر عجب آزاد مرد تھا۔ وہ ویرا کی نگاہ کے زاویوں سے قطعی بے پروا نظر آ رہا تھا۔ رات نو بجے کے قریب ہم اپنی رہائش گاہ واقع ہوسٹل میں واپس پہنچ گئے۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے زورین گر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے قراری سے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ "استاد صیب! آپ کہاں رہ گئے تھے؟" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"اوئے اس طرح تو بیویاں بولتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ مذاق مت فرمائیں استاد صیب! خوامخواہ پریشان تھا۔ ادھر کچھ وہی صورتِ حال بنا ہوا تھا جو فلم بازار میں نشو صاحب نے بنایا تھا اور گایا تھا "ابھی جاؤ صنم تم کو میری قسم۔"

صفدر نے تصحیح کی۔ اس نے کہا تھا "مت ابھی جاؤ صنم تم کو میری قسم۔"

"صفدر بھائی! تم بیچ میں اپنا ٹانگ ضرور اڑائے گا۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "استاد صیب! آپ بتا کر جانا چاہیے تھا کہ اتنا دیر لگے گا۔ آپ جانتا ہی ہے غزالہ بی بی آج کل آپ کے حوالے سے پریشان رہتا ہے۔ آپ دو گھنٹا لیٹ ہوا ہے اور انہوں نے کوئی دو دو جن مرتبہ اس سے آپ کے بارے میں پوچھا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تو کو لگ رہا تھا کہ وہ رو دے گا۔"

صفدر نے ہولے سے کہا "لگتا ہے کہ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی ہے۔"

"کہاں لگا ہے آگ۔" زورین ایک دم پریشان ہو گیا۔

"تیرے بھیجے میں۔" صفدر نے جواب دیا۔

"غزالہ کہاں ہے؟" میں نے زورین سے پوچھا۔

"ادھر اپنے کمرے میں گیا ہے۔"

میں نے اس کمرے کے دروازے پر دستک دی جو غزالہ، تابی کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ دوسری تیسری دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور روئی روئی لگتی تھیں "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"کک... کچھ نہیں، وہ ذرا کچن میں تھی، پیاز کاٹ

رہی تھی۔" اس نے پلکیں جھکا کر کہا۔

"ذرا میری طرف دیکھ کر کہو۔"

اس نے گڑبڑا کر پلکیں اٹھائیں، پھر ایک دم بولی "میرا خیال ہے کہ تابی رو رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے واپس کمرے کی طرف مڑ گئی۔

اس نے کھسکنے کا بہانہ تلاش کیا تھا۔ چند سیکنڈ توقف کرنے کے بعد میں اس کے پیچھے کمرے میں گیا۔ وہ بڑے انہماک سے تابی کے کپڑے بدلنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "کچھ پریشان لگ رہی ہو۔"

"آپ شاید یہی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں، میں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔"

"آپ تو کچھ نہیں کرتے۔ میں ہی ہمیشہ سے غلط سمجھتی ہوں۔" وہ عجیب لہجے میں بولی۔

"لگتا ہے کہ ناراض ہو۔"

"نہیں۔" اس نے میری طرف پشت کیے کیے انکار میں سر ہلایا۔

"اس "نہیں" میں سیکڑوں "ہاں" پوشیدہ ہیں۔ کیوں تابی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......"

تابی کچھ سمجھے بغیر ہنسنے لگا۔ ابھی اس نے نیکر نہیں پہنی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے ایک دم میری ناک میں انگوٹھا پھنسایا اور بے ڈھنگے طریقے سے کھینچنے لگا "اوئے کیا کرتے ہو؟" غزالہ نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر چپت لگائی۔

اس نے ناک سے انگوٹھا نکالتے ہی میرے سر کے بال پکڑ لیے۔ میں نے کہا "تابی! لگتا ہے کہ تم بھی مجھ سے ناراض ہو۔ لیکن بات کیا ہے یار؟"

زورین نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ آپ دیر سے آیا ہے۔"

"یار ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔" میں نے وال کلاک دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں صبح کے نو بجتے تو پھر دیر ہوتی۔" غزالہ نے ہولے سے کہا اور بغلی دروازے میں اوجھل ہو گئی۔ میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے غزالہ کا بہت انتظار کیا تھا، بہت بے قراری محسوس کی تھی۔ اب وہ بھی انتظار اور بے قراری محسوس کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ ناپسندیدہ ہونے کے باوجود مجھے اچھا سا لگ رہا تھا۔

عجیب گورکھ دھندا ہے انسان کا ذہن بھی۔ جس سے محبت کرتا ہے جس کو سکھ دینا چاہتا ہے اسی کو اپنے لیے دکھی

جناب ایم اے راحت
کا ناقابلِ فراموش ناول

احساس

حساس دل رکھنے والوں کیلئے حساس کہانی
مصنف نے اس ناول میں معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا ہے۔

قیمت: ۸۰/ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: ۷۲۴۷۳۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۳

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ محبوب کی بے قراری اس کے اپنے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ محبوب کے آنسو اس کے اپنے آنسوؤں کا مداوا کرتے ہیں۔

کھانا ابھی کسی نے نہیں کھایا تھا۔ ہم نے کھانے کے کمرے میں اکٹھے ہی ڈنر کیا۔ کھانے میں دال ماش اور گوشت کی ڈش بھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ غزالہ نے تیار کی ہوگی۔ اسے ان دو تین ڈشز کا پتا تھا جو مجھے پسند تھیں۔ پہلا نوالہ لیتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ ڈش غزالہ نے خود تیار کی ہے "پتا نہیں آج بھوک زیادہ ہے یا یہ کھانا ہی زیادہ مزے دار ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے۔" صندر نے بے دھیانی سے کہا۔

میں نے دیکھا کہ غزالہ کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں بھنچ گئے ہیں۔ اس نے اپنی "تعریف" نوٹ کرلی تھی۔

کھانے کے بعد میں اور صندر کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے آج کے واقعات پر تبصرہ کرتے رہے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچتے رہے۔ جو کچھ آج ہم نے کیمپس میں دیکھا تھا وہ سب خواب کی طرح لگ رہا تھا' ایک حسین طلسماتی خواب۔ رات قریباً گیارہ بجے میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تابی ابھی تک جاگ رہا تھا لہٰذا غزالہ بھی جاگ رہی تھی۔ کسی وقت ان کے کمرے سے مجھے تابی یا غزالہ کے بولنے کی آواز آجاتی تھی پھر یہ آوازیں مدھم پڑیں اور ختم ہوگئیں۔ شاید وہ دونوں سوگئے تھے۔ میں اپنی جگہ چت لیٹا رہا۔ نجانے کب میں نے اونگھنا شروع کیا اور کب یہ اونگھ نیند میں بدل گئی۔ دوبارہ میری آنکھ ایک مدھم شور سے کھلی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اپنے کان آواز کی سمت میں لگائے۔ یہ سائرن کی آواز تھی۔ خطرے کا وہی سائرن جو آج سہ پہر کیمپس میں بجایا گیا تھا' جب واجن لیبارٹری میں گھس گیا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی سائرن کیمپس کے بجائے ہوسٹل میں گونج رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈوری کھینچ کر میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ دور قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے سرخ روشنی نظر آئی' یہ روشنی آگ کی علامت تھی پھر مجھے چند شعلوں کی جھلک بھی نظر آئی جو دو منزلہ مکانوں کے عقب سے اٹھ رہے تھے۔

ابھی میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دائیں جانب والی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی دھماکے سے کھلی اور کوئی لپک کر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل نظر آرہی تھی۔

وہ ایک پرچھائیں کی طرح میری طرف بڑھا' پھر اس کی وحشت ناک آواز کمرے میں گونجی "ہینڈز اپ۔ گولی ماردوں گا۔"

میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ اللہ دتا کی آواز تھی۔ پروفیسر اللہ دتا کی۔ سوئچ بورڈ میرے قریب ہی تھا۔ میں نے لائٹ جلائی۔ پروفیسر کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس کے ہاتھ اور چہرے پر تازہ زخم تھے۔ ٹھوڑی سے گوشت لٹک رہا تھا اور ہڈی تک نظر آرہی تھی۔ اس کے کپڑے لہولہان تھے اور آنکھوں میں دیوانگی چمک رہی تھی۔ "ہینڈز اپ!" اس نے پھر گرج کر کہا اور رائفل کا رخ میرے سینے کی طرف کردیا۔

اگر مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ بتی روشن ہونے کے بعد پروفیسر اپنی رائفل جھکالے گا تو یہ فوراً ہی دور ہوگئی۔ پروفیسر کے لب و لہجے میں مطلق لچک نظر نہیں آئی تھی "ادھر بیٹھ جاؤ صوفے پر۔ اور اپنے ہاتھ سر سے اونچے رکھو۔" وہ اجنبی لہجے میں غرایا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرا ریوالور قریبی دراز میں موجود تھا لیکن میں دراز کی طرف ہاتھ بڑھانے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ پروفیسر کو یہاں دیکھ کر ذہن میں تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ وہ گرفتار تھا اور اسے سخت پہرے میں رکھا گیا تھا' معلوم نہیں وہ کیسے آزاد ہوا تھا اور کیسے میرے کمرے تک پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک دم میرا ذہن آگ اور خطرے کے سائرن کی طرف چلا گیا۔ سائرن مسلسل بجتا چلا جارہا تھا تاہم اس کی آواز مدھم تھی اور کافی دور سے آرہی تھی۔ میرے ذہن نے گواہی دی کہ اس آگ اور پروفیسر کی یہاں موجودگی میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ "پروفیسر! تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کررہے ہو؟" میں نے اس کی رائفل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ غرایا "میں بالکل ہوش میں ہوں' مجھے بتاؤ کہ وہ کتیا کی اولاد مائیکل کہاں ملے گا؟"

"مجھے مائیکل کا کیا پتا؟ اس کی رہائش تو نیچے کیمپس میں کہیں ہے۔"

"تم سب جانتے ہو۔ سب جانتے ہو تم۔"

"پروفیسر! مجھ سے بیگانوں کے لہجے میں بات مت کرو۔ میں نے تو۔۔۔"

"خبردار۔" پروفیسر گرجا (میرے ہاتھ سر سے ذرا نیچے آئے تھے اور اس کی انگلی ٹریگر پر بے قرار ہوگئی تھی)

"پروفیسر' میری بات تو سنو۔"

"خاموش!" اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم بہت

پھرتیلے ہو مگر میں تمہیں گولی مارنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا۔ میں سچ کہتا ہوں شاہ جہاں۔ مجھ سے بچ جاؤ' میرے سر پر خون سوار ہے' ابھی کم از کم چار بندے میرے ہاتھوں مرے ہیں۔ مجھے صرف اپنی بیٹی کے قاتل کا پتا چاہیے۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں۔ تم بس مجھے مائیکل تک لے چلو۔"

اچانک طاقت ور پسٹل کا فائر ہوا' ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور گولی پروفیسر کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی چینی کے ایک گلدان کو چکنا چور کرگئی۔ پروفیسر نے پہلے سر نیچے جھکایا پھر گھوم کر کھڑکی کے رخ پر دو تین فائر کیے' اس کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا' جب وہ سیڑھیوں پر تھا' ایک بار پھر ریوالور اور پسٹل کے چند فائر ہوئے' لیکن میرا اندازہ تھا کہ پروفیسر محفوظ رہا ہے۔ اس دوران میں' میں بھی دراز سے اپنا ریوالور برآمد کرچکا تھا۔

دو تربیت یافتہ گارڈز کھڑکی سے کود کر اندر آگئے۔ انہوں نے اسی صوفے کے پیچھے پوزیشن لے لی جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بلا تکان سیڑھیوں کے بالائی سرے کی طرف فائرنگ کرنے لگے' پروفیسر وہیں گیلری میں چھپا تھا۔ دھماکوں سے صندر' ذریں' غزالہ' کلثوم سب جاگ اٹھے تھے۔ اچانک گیلری کی طرف سے دو تین مرتبہ ٹرچ ٹرچ کی آواز آئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پروفیسر کی رائفل خالی ہوگئی ہے یا پھر اس میں گولی وغیرہ پھنس گئی ہے پہلی بات کا امکان زیادہ تھا۔ پروفیسر کی رائفل سے نکلنے والی یہ آواز یقیناً تربیت یافتہ گارڈز نے بھی سن لی تھی۔ ان کے حوصلے سوا ہوگئے۔ وہ صوفے کے عقب سے نکلے اور مجھ سے چند گز آگے جاکر انہوں نے سیڑھیوں کے قریب پوزیشن لے لی۔ یہاں سے وہ زیادہ آسانی کے ساتھ پروفیسر کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ بے شک ابھی تھوڑی دیر پہلے تک پروفیسر نے میرے سینے پر رائفل رکھی ہوئی تھی' مگر میری ساری ہمدردیاں اب بھی پروفیسر کے ساتھ ہی تھیں۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اپنا ریوالور والا ہاتھ پیچھے رکھے رکھے تین مرتبہ ٹریگر دبایا اور دونوں گارڈز کو عقب سے گولی ماردی۔ ایک کے سر میں سوراخ ہوگیا اور دوسرے کی پشت میں دل کے آس پاس دو گولیاں اتر گئیں۔ صندر اور ذریں قریبی کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

گارڈز کے ہلاک ہوتے ہی میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گیلری میں پہنچا۔ پروفیسر گیلری کے اندر ہی موجود تھا اور اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح پکڑلیا تھا۔ غالباً وہ مجھ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے معلوم نہیں ہوا تھا کہ گارڈز سے اس کی جان چھڑانے کے لیے میں نے کتنا بڑا رسک لیا ہے۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے کہا "پروفیسر! تم بڑی غلطی کررہے ہو۔ خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو تم جس جال میں ہم تم پھنسے ہیں اسے توڑنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میں تو۔۔۔ خود موت ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔" پروفیسر نے عجیب دیوانے لہجے میں کہا "میں مرنے سے پہلے اس درندے کی بوٹیاں کرنا چاہتا ہوں میں۔"

اس کا اشارہ یقیناً مائیکل کی طرف تھا۔

"میرے ارادے تم سے مختلف نہیں ہیں لیکن۔۔۔"

"تمہارے پاس وقت ہوگا' میرے پاس نہیں ہے۔" پروفیسر نے میری بات کاٹی "مجھے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔"

اسی دوران میں مجھے نیچے لان کی طرف سے گارڈز کی آوازیں آنے لگی تھیں' وہ گھر کے مختلف حصوں میں پوزیشنیں لے رہے تھے اور ایک دوسرے کو بلند آوازوں میں بلا رہے تھے۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا' پھر اپنا ریوالور پروفیسر کو تھما دیا۔ پروفیسر کا خون آلود ہاتھ پکڑ کر میں اسے عقبی دروازے کی طرف لے آیا' یہاں سے ایک تنگ زینہ پچھواڑے کے باغیچے کی طرف جاتا تھا "لو پروفیسر! آگے تمہاری قسمت' نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ۔"

"مجھے کوئی نہیں مار سکتا' ابھی میری بیٹی کا قاتل زندہ ہے۔" پروفیسر نے مہیب آواز میں کہا۔

چند ہی سیکنڈ بعد میں اس کا ہیولا ظلمتوں میں اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سنگین حالات میں بہت سے افراد کی یک دم کایا پلٹ ہوتے دیکھی تھی لیکن پروفیسر اللہ دتا کی کایا پلٹنے کا انداز بالکل انوکھا اور ناقابل فراموش تھا۔ مذہبی ذہن رکھنے والے ایک مسیحا صفت معالج کے اندر سے اتنا قاتل ہی ایک جنگجو شخص برآمد ہوا تھا اور اس نے اپنے قرب و جوار میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہوش و خرد کی منزل سے گزر چکا ہے اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو ملیامیٹ کروا لے گا۔ اسے اس کی بیٹی کی موت کی خبر دی گئی تھی اور یہ خبر اسے زندگی سے بہت دور اور موت سے بہت قریب لے آئی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ یہ جھوٹی خبر تھی۔ جلد ہی گارڈز اپنے ہتھیاروں سمیت پورے گھر میں دندنانے لگے۔ میں نے گارڈز کی ایک ٹولی کو یہ باور کرایا کہ میں نے ایک ہیولا چھت کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ جلد ہی

چھت بھی گارڈز کے بھاری بھرکم بوٹوں تلے لرزنے لگی۔

قریباً ایک منٹ بعد ہم نے اپنے گھر کے شمال میں ان بیرک نما کمروں کی طرف سے فائرنگ کی آواز سنی جو مارپا ٹرسٹ کے مین گیٹ سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ یہ رائفل اور ریوالور وغیرہ کی فائرنگ تھی۔ دل سے بے ساختہ پروفیسر کی خیریت کی دعا نکلی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہوسٹل کی خوب رو انچارج سوزی' ہوسٹل کا نیا ہیڈ انچارج ڈوجون اور کچھ دیگر بااختیار افراد بھی گارڈز کے ہمراہ ہمارے مکان پر پہنچ گئے۔ پورے مکان کی لائٹس روشن کردی گئیں اور ہر جگہ کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ جس وقت پروفیسر نے کھڑکی کے راستے اندر گھس کر مجھے ہینڈز اپ کرایا تھا' ایک غیر مسلح چوکیدار نے کھڑکی میں سے یہ صورت حال دیکھ لی تھی۔ بعد ازاں وہ ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے اپنے کوارٹر کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اس چوکیدار کے بیان کے بعد اور موقع کی شہادتوں کی موجودگی میں مجھے کسی طرح کی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے جو اسٹیٹ منٹ دی وہ یہی تھی کہ جس وقت پروفیسر میرے کمرے میں گھسا میں گہری نیند سو رہا تھا۔ پروفیسر نے پہلے مجھے ہینڈز اپ کرایا پھر میری دراز میں سے بھرا ہوا ریوالور بھی حاصل کرلیا۔ اسی دوران میں دونوں مقتول گارڈز بھی اندر گھس آئے۔ ان سے بچنے کے لیے پروفیسر سیڑھیوں کی طرف دوڑا اور اوپر گیلری میں چھپ گیا۔ گارڈز عقبی زینوں سے گیلری میں جانے کے لیے برآمدے کی طرف واپس دوڑے' اسی دوران میں پروفیسر نے فائرنگ کرکے انہیں ہلاک کر ڈالا۔ بعد ازاں میں پروفیسر پر ہاتھ ڈالنے کے لیے گیلری کی طرف بڑھا' تاہم اسی دوران میں وہ نکل بھاگا۔

میری کہانی میں ایک دو چھوٹے چھوٹے سقم موجود تھے لیکن مجھے امید تھی کہ انتظامیہ کی نظر اس طرف نہیں جائے گی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے جنوب کی طرف آگ کی جو سرخی دکھائی دے رہی تھی وہ اب کافی حد تک ماند پڑ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ آگ پر قابو پالیا گیا ہے۔ خطرے کا سائرن بھی اب خاموش ہوگیا تھا' مگر قرب وجوار میں رات کے اس پہر جو تھرتھلی سی مچی تھی وہ کم نہیں ہوئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ پروفیسر نے واقعی نزیل لو رائفل سے اندھا دھند گولیاں چلائی ہیں اور کم از کم چار افراد کو قتل کرکے ہر طرف دہشت پھیلا دی ہے۔ پروفیسر نے چوتھا قتل ہماری قیام گاہ سے صرف دس پندرہ گز کی دوری پر کیا تھا۔ ایک مسلح گارڈ نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی اور اس نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ گھما مار کر اسے نیچے گرا دیا تھا اور پھر کندے کی پے درپے

ضربوں سے اس کی کھوپڑی چٹکا ری تھی۔ باقی تین افراد بندی خانے میں ہلاک ہوئے تھے۔ یہ وہی بندی خانہ (جیل) تو جہاں اس سے پہلے میں بھی گرفتارِ ابتلا رہ چکا تھا۔ اسی بندی خانے کی ایک کوٹھڑی میں ایک رات انچارج سوزی نے مجھ پر اپنی "نوازشوں" کی بارش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب بندی خانہ کوئلے اور گرم راکھ میں بدل چکا تھا۔ سوزی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ بندی خانے کو آگ لگانے والا پروفیسر ہی تھا۔

میں سوزی سے اس واقعے کی تفصیل پوچھنا چاہتا تھا مگر سوزی اس قدر پریشان تھی کہ میں نے ارادہ ترک کردیا۔ دراصل وہ جس علاقے کی ذمے دار تھی' بندی خانہ بھی اسی علاقے میں آتا تھا' اب پروفیسر کے فرار اور بندی خانے کی تباہی کے حوالے سے جواب دہی کی تمام ذمے داری سوزی پر آگئی تھی۔ ہیڈ انچارج ڈوجون سخت مضطرب اور غضب ناک نظر آتا تھا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے سوزی کو گھورا اور بولا "انچارج سوزی! تم اپنے آپ کو زیر حراست سمجھو۔"

سوزی کانپ گئی "لیکن جناب!"

"شٹ اپ!" ہیڈ انچارج ڈوجون نے اس کی بات کاٹ "تمہیں قیدی کے بارے میں باس مائیکل کی طرف سے خصوصی ہدایات دی گئی تھیں۔ ہم سب جانتے تھے کہ وہ انتہائی خطرناک قیدی ہے اور کچھ بھی کرسکتا ہے' پھر اسے کوٹھڑی سے باہر کیوں نکالا گیا۔"

"جناب وہ درد سے تڑپ رہا تھا' اس کی ناک سے خون جاری ہوگیا تھا۔ آپ کی طرف سے اس کی حفاظت کی سخت ترین ہدایت تھی' اور اس میں اس کی زندگی کی حفاظت بھی شامل تھی۔ ہمیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ کوٹھڑی کے اندر ہی ختم نہ ہوجائے۔"

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ تمہیں بندی خانے کا انچارج کس نے بنایا تھا۔ کس کے ساتھ رات گزاری تھی تم نے کہ یہ اعزاز تمہیں سونپ دیا گیا۔" ڈوجون زہر خند لہجے میں بولا۔

"سر! میں معافی چاہتی ہوں لیکن۔۔۔"

"خاموش۔" ایک بار پھر ہیڈ انچارج نے اسے سب کے سامنے جھاڑا "ایک جیل انچارج کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قیدی ایسے ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔ خطرناک قیدی کوٹھڑی سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنے پیٹ تک پھاڑ لیتے ہیں۔"

شاید ہیڈ انچارج اپنی ماتحت پر اور بھی گرجتا برستا مگر اسی

دوران میں دو افراد تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ وہ وردی میں نہیں تھے لیکن ان کی صورتیں دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان کا تعلق گارڈز یا کمانڈوز وغیرہ سے ہے۔ وہ ریوالور سے مسلح تھے۔ ان سیاہ فام افراد نے سفید فام ڈوجون کو انگلش میں بتایا کہ مجرم کا کہیں کھوج نہیں مل رہا۔ ڈوجون پہلے ہی مشتعل تھا اب اس کا پارا باقاعدہ ساتویں آسمان کو چھو گیا وہ چنگھاڑا "وہ انسان کے بجائے بھوت ہے یا تم سب کے سب پیدائشی اندھے ہو۔ اس چار دیواری کے اندر وہ کہاں چھپ سکتا ہے۔ مجھے بتاؤ یہاں کون سی ایسی جگہ ہے جہاں وہ سؤر خود کو چھپا سکتا ہے؟"

"سب کو حیرت ہے جناب! لیکن ابھی تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔"

دوسرے مسلح شخص نے ڈرتے ڈرتے کہا "اس سے پہلے بھی وہ اسی طرح غائب ہوا تھا جناب۔"

"اس سے پہلے تمہاری ماں نے۔" ہیڈ انچارج نے مسلح شخص کو ماں کی گندی گالی دی۔ وہ سخت بھنایا ہوا تھا "آؤ میرے ساتھ۔" اس نے گارڈز سے کہا اور تیز قدموں سے مین گیٹ کی جانب چل دیا۔ یہ نیا ہیڈ انچارج اس پرانے ہیڈ انچارج مرحوم کے مقابلے میں خاصا توانا اور چست تھا جو کچھ روز پہلے میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ پروفیسر کا کھوج کھرا ان بیرک نما کمروں کے آس پاس گم ہوا تھا جو مین گیٹ سے قریباً ڈیڑھ سو گز کی دوری پر واقع تھے۔ اس جگہ کو گارڈز نے گھیرے میں لینے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ یہاں بہت سے افراد جمع ہوچکے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں بھی بہت سے ہراساں اور متجسس چہرے نظر آرہے تھے۔ ایک سنسنی سی تھی جس نے قرب وجوار کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بالکل جیسے کوئی خون آشام جانور اپنا پنجرہ توڑ کر بھری پری بستی میں نکل آیا ہو اور بستی کے باسی سہم کر رہ گئے ہوں۔ اس واقعے میں کل چھ افراد قتل ہوئے تھے اور پروفیسر کی بے دریغ فائرنگ سے زخمی اور شدید زخمی ہونے والوں کی تعداد ڈیڑھ درجن سے اوپر تھی۔ ہوسٹل کے طول وعرض سے گاہے گاہے آہ وبکا کی آوازیں آنے لگتی تھیں' ان آوازوں کا تعلق یقیناً ان افراد کے لواحقین سے تھا جو اس سنگین واقعے میں ہلاک یا زخمی ہوئے تھے۔

یہی وہ خطرہ تھا جس کا احساس میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں کنگ کو دلانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس دُکھی بلپ کی نگاہوں میں ایک ایسی جنونی چمک نظر آئی تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے اسی وقت پختہ یقین ہوگیا تھا کہ پروفیسر کو جب بھی موقع ملا وہ اس چار دیواری میں تہلکہ مچادے گا اور آج رات وہ ایسا کر گزرا تھا۔

خوف وہراس کے علاوہ ہر چہرے پر ایک شدید قسم کی حیرانی بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس حیرانی کی وجہ میرے لیے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ پروفیسر کا غائب ہوجانا' سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں خود کو چھپانے والا تادیر نگاہوں سے اوجھل رہ سکتا۔ پروفیسر نہ صرف اوجھل تھا بلکہ اس سے پہلے بھی ایک مہینہ اوجھل رہ چکا تھا۔ دونوں مرتبہ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا!

جب اس قسم کا واقعہ ہوجائے تو ایک قسم کی پُراسراریت وجود میں آنے لگتی ہے۔ ایک سوال سے بے شمار سوال پھوٹتے ہیں اور انسانی ذہن کو جکڑنے لگتے ہیں۔

صفدر نے کہا "یقیناً پروفیسر کے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں چھپا جاسکتا ہے اور تادیر محفوظ بھی رہا جاسکتا ہے۔"

"لیکن سوال تو یہی ہے کہ وہ جگہ ہے کہاں؟ پچھلی مرتبہ گٹر اور سیوریج کے پائپ تک تو دیکھے تھے ان لوگوں نے۔"

"چلو کہیں بھی ہے' خدا کرے وہ محفوظ رہے۔ اگر اب وہ پکڑا جاتا ہے تو بڑی تکلیف دے کر ماریں گے اسے۔" صفدر نے کہا۔

میں اور صفدر ان مسلح گارڈز کو دیکھتے رہے جو بڑی باریک بینی سے بیرک نما کمروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہ ہر کمرے میں سے قیدیوں (بردوں) کو باہر نکالتے اور کمرے کا ایک ایک کونا چھان مارتے۔ سرچ لائٹس کے ذریعے انہوں نے ہوسٹل کے اس حصے کو یوں روشن کر رکھا تھا کہ چیونٹی بھی نظر آسکتی تھی۔ اگر نظر نہیں آرہا تھا تو پروفیسر نہیں آرہا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ صفدر میرے پہلو میں نہیں ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ صفدر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھا تھا "کیا ہوا صفدر؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ چند لمحے تک کچھ نہیں بولا' پھر کہنے لگا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جناب۔۔۔ شاید میرا سر چکرا رہا ہے۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟ کیا دیکھا ہے تم نے؟" مجھے اس کے لہجے نے ہراساں کردیا تھا۔

"پتا نہیں کہ میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے' یا پھر میں نے صحیح دیکھا ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی "میں نے ابھی' یہاں سائیں عالی کو دیکھا ہے۔"

میں اپنی جگہ مبہوت کھڑا رہ گیا۔

پھر جیسے مجھے ہوش آیا۔ میں نے تیزی سے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ گارڈز نیدیوں کو بیرکوں سے نکال نکال کر قطاروں میں کھڑے کررہے تھے اور تندہی سے تلاشی میں مصروف تھے۔ سرچ لائٹس کی روشنیوں میں بہت سے تماشائی بھی یہاں وہاں کھڑے نظر آرہے تھے لیکن سائیں عالی مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ یہاں ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ انڈیا اور پاکستان سے ہزاروں میل دور 'مغربی' افریقہ کے اس دور دراز شہر میں ایک ایسی چار دیواری کے اندر جہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی... سائیں عالی کیسے نظر آسکتا تھا۔ یقیناً صفدر کو دھوکا ہی ہوا تھا۔ جس وقت میں یہ بات سوچ رہا تھا' عین اسی وقت میرے اندر سے کہیں آواز آئی کہ شاہ جہاں ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ کیا تم سائیں عالی سے واقف نہیں ہو؟ اس عجوبہ شخص کی پُراسراریت نے کہاں کہاں تمہیں حیران نہیں کیا۔ کیسے کیسے مواقع تھے جب یہ بھوت نما بندہ زمین میں سے اُگا یا آسمان پر سے ٹپکا۔ یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ کسی طور یہاں بھی آپہنچا ہو۔

اس دوران میں زریں گل بھی وہاں پہنچ گیا "کیا ہوا استاد صیب؟" اس نے مجھے اور صفدر کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"ام تو گھبرا گیا تھا۔" وہ بولا "ام نے سمجھا شاید پروفیسر صیب پکڑا گیا ہے۔"

صفدر الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک شدید گومگو کی کیفیت میں تھا۔ اس کی نگاہ بار بار بیرکوں کے مغربی حصے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ یقیناً اسے جو شناسا جھلک دکھائی دی تھی وہ یہیں سے دکھائی دی تھی۔ وہ انگلش میں بولا "شاہ جہاں صاحب! دیکھیں اس جگہ پر خاصی روشنی ہے۔ جو بندے وہاں کھڑے ہیں ان کے چہرے کافی حد تک واضح دکھائی دے رہے ہیں۔ قریباً تین چار سیکنڈ تک میری نگاہ اس پر رہی ہے یا تو وہ سائیں عالی تھا' یا اس سے بہت ملتا جلتا شخص تھا۔"

اس فقرے میں سے سائیں عالی کا لفظ زریں کی سمجھ میں آگیا۔ وہ اپنی ٹانگ اڑاتے ہوئے بولا "آپ سائیں عالی کا ذکر کیوں فرما رہا ہے اور وہ بھی انگریزی میں۔"

"سائیں عالی کا ذکر اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ ابھی یہاں نظر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خبیث قسم کا جن ہے' جو ایک پٹھان کو چیتنے کا خواہش مند ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

زریں سمجھ گیا کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو ہم دونوں اس سے چھپا رہے ہیں۔ وہ گھبرایا ہوا گارڈز کی سرگرمیاں دیکھنے لگا۔ میں اور صفدر لوگوں کے درمیان گھومنے لگے۔ ممکن تھا کہ مجھے یا صفدر کو وہ جھلک پھر نظر آتی۔ لیکن ہماری یہ کوشش بے سود رہی۔ دوسری طرف گارڈز کی کوششیں بھی بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔ انہیں پروفیسر کا سراغ کہیں نہیں ملا تھا۔ گرد و پیش میں عجیب قسم کا خوف لہریں لے رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی درندہ اچانک کشت و خون کرنے کے بعد جنگل میں روپوش ہو گیا ہو۔ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہوں اور اس کے اچانک نمودار ہونے سے خوفزدہ بھی ہوں۔ میں اور صفدر بندی خانے کی طرف چلے گئے۔ یہاں دو لاشیں اسٹریچرز پر رکھی تھیں۔ ان کے چہروں پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ یہ دونوں پروفیسر کے مقتولین میں شامل تھے بندی خانہ ابھی تک سلگ رہا تھا۔ بس لوہے کے دروازے اور جنگلے سلامت تھے' باقی سب کوئلہ ہو گیا تھا۔ گارڈز کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک لاش بندی خانے کے اندر ہی جل گئی ہے۔ ہوسٹل کا ہیڈ انچارج زرجون جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا وہ اپنے ماتحتوں پر چیخ رہا تھا۔ انہیں ننگی گالیاں دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف ہدایات بھی جاری کر رہا تھا۔ انچارج سوزی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے غفلتِ مجرمانہ کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ہیڈ انچارج زرجون نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ ایک خطرناک مجرم (پروفیسر) کی ٹھیک طرح حفاظت نہیں کر سکی۔ جس کی بنا پر مجرم نے بندی خانے سے نکل کر چھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دو بندوں کو گھائل کیا۔

اگلے چوبیس گھنٹے تک ہوسٹل کے طول و عرض میں سراسیمگی کی کیفیت رہی۔ گاہے گاہے آہ و بکا کی آوازیں بھی ہمارے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ پروفیسر کے بندی خانے سے نکلنے اور اندھا دھند فائرنگ کرنے کی کچھ اور تفصیلات بھی سامنے آئی تھیں۔ پروفیسر نے اپنی ناک کو اندر سے زخمی کر لیا تھا جس کے بعد اس کے نتھنوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس نے کوٹھڑی میں خود کو شدید بیمار اور قریب المرگ ظاہر کیا۔ سوزی کوئی خاک جیلر نہیں تھی۔ وہ پروفیسر کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ پروفیسر کو طبی امداد کے لیے باہر لایا گیا تو اس نے ایک گارڈ سے خودکار رائفل چھینی اور اپنے سامنے آنے والے ہر بندے پر گولی چلا دی۔ اس کی وحشت نے گارڈز کو تتر بتر کر دیا اور کچھ موقع سے بھاگ گئے۔ بعد ازاں پروفیسر ہماری قیام گاہ تک پہنچ گیا تھا اور مجھ پر رائفل تان کر مجھ سے مائیکل کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پروفیسر کا سرخ آنکھوں والا وحشت زدہ چہرہ بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ ہر شے سے بیگانہ نظر آرہا تھا' اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس نے مجھ کو بھی گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس چار دیواری میں ہم سے بڑھ کر اس کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے پروفیسر کی آنکھوں میں صرف ایک ہی چیز نظر آئی

تھی' مائیکل کے خون کی پیاس۔ مجھے یقین تھا کہ جس گھڑی' جس لمحے پروفیسر اور مائیکل کا آمنا سامنا ہوا ان دونوں میں سے ایک قتل ہو جائے گا۔ ویسے امید نہیں تھی کہ عیار مائیکل ایسی غفلت کا مظاہرہ کرے گا۔ یقینی بات تھی کہ اس نئے واقعے کے بعد وہ پروفیسر کی طرف سے بے حد محتاط ہو جائے گا۔ (خصوصاً اس اطلاع کے بعد کہ پروفیسر کے قبضے میں رائفل اور پستول بھی ہے)

صفدر اور میں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کچن سے چکن کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کچن اور چکن کتنے ملتے جلتے لفظ ہیں اور ان کا باہمی تعلق اکثر خوشگوار "نتیجے" پیدا کرتا ہے۔ ایسے "نتائج" خاص طور سے زریں کو بہت پسند تھے۔ وہ بے قراری سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا اور ڈنر کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوک تو مجھے اور صفدر کو بھی لگی تھی مگر ہمارا سارا دھیان کل رات والے نہایت ناخوشگوار واقعے کی طرف تھا۔ میں نے صفدر کو بتا دیا تھا کہ دونوں گارڈز جو اس چار دیواری میں ہلاک ہوئے' میری فائرنگ سے ہوئے تھے۔ اپنا ریوالور پروفیسر کو دینے کے حوالے سے بھی میں نے صفدر کو آگاہ کر دیا تھا۔

صفدر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا "اگر پروفیسر کو معلوم ہو جائے کہ شائستہ زندہ ہے تو شاید وہ اپنے لیے اتنے زیادہ خطرات پیدا نہ کرے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی۔" میں نے کہا "جب میں نے پروفیسر کو عقبی سیڑھیوں سے اتارا تو میں نے سوچا کہ اسے شائستہ کے بارے میں بتا دوں' لیکن پھر ہمت نہیں پڑی۔"

"کیا مطلب؟" صفدر نے پوچھا۔

"شائستہ مائیکل کے قبضے میں ہے اور مسلسل خودکشی کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ آئندہ چند دنوں میں اس کے ساتھ کیا ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ واقعی شائستہ کے ساتھ کچھ ہو گیا تو یہ پروفیسر کے لیے دُہری اذیت ہوگی۔ زندگی کا بدترین صدمہ اسے دو مرتبہ سہنا پڑے گا۔"

صفدر نے چونک کر مجھے دیکھا "لگتا ہے کہ آپ شائستہ کے حوالے سے خاصے مایوس ہیں۔"

"بات تو کچھ مایوسی والی ہی ہے۔" میں نے کہا۔

دفعتاً ایک چیخ سنائی دی۔ صفدر اور میں اچھل کر رہ گئے۔ کلثوم بھاگتی ہوئی ہمارے کمرے میں گھسی اور وحشی ہرنی کی طرح صفدر کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے زریں بھی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ زریں کو دیکھ کر کلثوم اس کے بازو سے چمٹ گئی اور ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے بولنے لگی۔ وہ پشتو... زبان بول رہی تھی' ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا' بس اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ سخت خوف زدہ ہے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے برآمدے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ زردی مائل تھا۔

کچھ دیر بعد کلثوم کی زبان ذرا سُست پڑی تو زریں نے بولنا شروع کر دیا۔ اب زریں کے اپنے چہرے پر بھی تحیر اور سنسنی کے آثار نظر آرہے تھے۔ کچھ لمحے تک زریں اور کلثوم دونوں اندھا دھند بولتے رہے' پھر زریں ہماری طرف متوجہ ہوا اور اس نے لرزاں آواز میں کہا "استاد صیب! کلثوم ایک بڑا گڑبڑ والا خبر سنا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے برآمدے میں ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا فقیر دیکھا ہے۔ کلثوم کا خیال ہے کہ وہ سائیں عالی ہے۔"

صفدر اور میں ایک ساتھ چونکے۔ میں نے کمرے کی چوڑائی تیزی سے طے کی اور صفدر کے ساتھ باہر برآمدے میں آگیا۔ صحن نیم تاریک تھا لیکن برآمدے کا بڑا حصہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دو ملازم باہر لان میں گھوم رہے تھے۔ ننھا تابی گھاس پر بیٹھا کھلونا کار سے کھیل رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے پوچھنے پر کلثوم نے برآمدے کے کونے کی طرف اشارہ کیا اور بولی

کوری آنکھیں

(دو جلدیں)

ایک نوجوان کی داستانِ الم جس نے خواب دیکھے اور انہیں اپنی کوری آنکھوں میں سمو لیا۔

ایثار اور بے لوث محبت کی ایسی داستان جو آپ کی جذباتی دنیا میں ہلچل مچا دے گی۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

7223853

7247414

"ہم نے وہاں دیکھا۔ وہ فقیر وہاں کھڑی تھی۔ ہم ماشاءاللہ سچا سچا کہتا۔"

"پھر وہ فقیر کہاں گئی؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہ ایک دم گم شدہ ہوتی۔ ہم بالکل بکواس نہیں کرتا۔ ہم ساری قسمیں کھاتا۔"

"مت کھایا کرو قسمیں۔" زریں نے اسے جھاڑا۔ وہ خود بھی ہکا بکا نظر آرہا تھا۔

اس نئے واقعے کے بعد مجھے اور صفدر کو ایک دم پختہ یقین ہوگیا تھا کہ سائیں عالی یا ہو بہو اس کے حلیے کا کوئی بندہ اس چار دیواری میں موجود ہے۔ جب میں سائیں عالی کے سابقہ ریکارڈ پر نظر دوڑاتا تھا تو مجھے یقین ہونے لگتا تھا کہ ایک بار پھر غیر متوقع طور پر اس چار دیواری میں سائیں عالی سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ہم چاروں نے بڑی تیزی سے اپنی رہائش گاہ کا جائزہ لیا۔ زریں نے دوسری منزل کی تلاشی لی' صفدر چھت اور برساتی کے اوپر تک سے ہو آیا مگر کلثوم کے بیان کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ اس دوران میں غزالہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ ہم سب کامن روم میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ساوڑ خیال کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ موضوع "بگو بڑ روزگار' فتنۂ خوابیدہ' آفت بدست سائیں عالی ہی تھا۔ سائیں عالی یا اس کے حلیے کا کوئی شخص یہاں ہمارے بالکل آس پاس موجود تھا۔

صفدر کا خیال تھا کہ اس بارے میں گارڈز سے ٹوہ لی جائے۔ سائیں کا حلیہ بتا کر ان سے دریافت کیا جائے کہ کیا اس شباہت کا کوئی بندہ اس چار دیواری میں موجود ہے۔ لیکن میرا خیال ذرا مختلف تھا۔ اس معاملے میں گارڈز کو شامل کرنے سے الجھن پیدا ہوسکتی تھی۔ ممکن تھا کہ سائیں عالی کے لیے بھی کسی قسم کا خطرہ پیدا ہو جاتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک جاگتے رہے۔ کلثوم ذرا ڈری ہوئی تھی۔ ہم سب کلثوم اور زریں کے کمرے میں ہی جمع تھے۔ کلثوم بار بار ہونٹوں میں کچھ بڑبڑانے لگتی تھی۔ غالباً کوئی قدیم قبائلی جنتر منتر پڑھ رہی ہوگی۔ زریں کو کل سے شدید زکام نے گھیر رکھا تھا اور اس کا گلا خراب تھا۔ وہ کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں کھڑا نمکین گرم پانی کے غرارے کر رہا تھا۔ اتفاقاً میری نظر زریں پر ہی تھی۔ دوسرا غرارہ کرنے کے لیے اس نے اسٹیل کا گلاس اٹھایا۔ گلاس کی حرارت سے بچنے کے لیے اس نے گلاس کے گرد رومال لپیٹ رکھا تھا۔ گرم پانی کا گھونٹ لے کر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور منہ کھول کر حلق سے گھرر گھرر کی آواز نکالی۔ اس کی نظر باتھ روم کی چھت کی طرف تھی۔ اچانک مجھے لگا کہ زریں گل کے چہرے کے تاثرات کچھ بدل گئے ہیں۔ گھرر گھرر کی آواز بھی طویل ہوتی چلی جارہی تھی۔ یہ آواز کچھ بدل بھی گئی تھی۔ زریں کی نظریں چھت پر تھیں اور ساکت ہوکر رہ گئی تھیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ زریں نے چھت کی نچلی سطح پر کچھ دیکھا ہے۔ میں لپک کر باتھ روم کی طرف گیا۔ دروازے میں سر گھسیڑ کر میں نے اوپر دیکھا اور زریں کی طرح میں بھی مبہوت رہ گیا۔ اگر میں غرارہ کر رہا ہوتا تو میری حالت بھی زریں جیسی ہی ہوتی۔ اوپر چھوٹے سے پنکھے کے ساتھ کوئی شخص چمٹ کر بیٹھا ہوا تھا... اور یہ شخص... بلاشبہ سائیں عالی تھا۔ زریں گل ذری ذری آوازیں نکالتا ہوا باتھ روم سے باہر آگیا۔ ہم سب باتھ روم کے دروازے میں جمع ہوکر سائیں عالی کو دیکھنے لگے۔ حیرت اور تجسس نے ہم سب کو گنگ کر رکھا تھا پھر ایک دم مجھے ہوش آیا' میں نے غزالہ سے کہا کہ وہ کمرے کا دروازہ بند کردے۔ غزالہ نے روز کردہ دروازہ اندر سے بند کردیا۔ اب سائیں ہمارے کسی ملازم کی نظر میں آنے سے محفوظ ہوگیا تھا۔ سائیں پنکھے پر چڑھا بیٹھا تھا اور مضحکہ خیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔

"حیران کیوں ہو رہے ہو۔ پرستان ائرلائنز سے افریقہ کا سفر ایسے ہی ہے جیسے لاہور سے گوجرانوالہ۔ اگر کہو تو میں تم سب کو ابھی دس منٹ میں دہلی کے سیخ کباب یا لاہور لکشمی چوک کے مرغ چھولے کھلا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "ہمیں یقین ہے کہ تم ایسا کرسکتے ہو' لیکن براہ مہربانی اب ذرا اس پنکھے سے نیچے اتر آؤ۔ کسی بھی وقت کوئی ملازم دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔"

"کوئی نہیں آئے گا۔ تمہارے تینوں ملازموں پر میں نے ایک ایک جن چھوڑ رکھا ہے۔ وہ وہی کریں گے جو جنات کہیں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے جو مرغ مسلّم کھایا ہے' اس میں میرے ہی کہنے پر ان جنات نے تھوڑا سا زہر ملوا دیا ہے۔ ابھی دس پندرہ منٹ تک تمہارے سینوں میں درد شروع ہوجائے گا اور تھوڑی دیر بعد تم سارے کے سارے وفات پاجاؤ گے انشاءاللہ۔" سائیں عالی نے ایک جنونی قہقہہ لگایا اور نعرہ بلند کیا "دل دھڑکا بڑل کا ہادل دھڑکا۔ دل دھڑکا ہاہادل دھڑکا۔"

ہم سب کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔ "یہ کیا بک رہے ہو؟" میں نے جھلا کر کہا۔

سائیں نے پھر ایک قہقہہ بلند کیا "بس۔ ڈر گئے ناں۔ ایک طرف کہتے ہو کہ میں ڈراما کرتا ہوں۔ میرے پاس کوئی مؤکل نہیں ہے' کوئی شکتی نہیں ہے' دوسری طرف زہر کا سن کر رنگ بھی پیلے پڑ گئے۔ میں تمہیں کیوں ماروں' تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ تم تو اتنے بھلے مانس ہو کہ تمہیں دوست دشمن کی پہچان بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم تمہارے جنات سے نہیں تم سے ڈرتے ہیں۔ اور تم سے بھی زیادہ اس شے سے ڈرتے ہیں جو تمہاری کھوپڑی میں ہے اور نت نئے گل کھلاتی ہے۔"

سائیں عالی پنکھے سے جھول کر نیچے آگیا۔ وہ حسب معمول سیاہ گدڑی میں تھا۔ گلے میں مالاؤں اور گھنٹیوں کا شور تھا۔ سر ننگا' بال جٹاؤں کی طرح الجھے ہوئے اور پاؤں غلیظ تھے لیکن اس کی آنکھیں۔ بیٹے کی طرح اسرار بھری اور سمندروں کی گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ وہ کمرے کے عین درمیان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور شان بے نیازی سے آنکھیں بند کرلیں۔ ہم سب خالی ذہنوں کے ساتھ اس کے ارد گرد کھڑے تھے اور اپنی اپنی جگہ اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ پیر فرتوت اب کیا کرنے والا ہے۔ سائیں عالی قریباً ایک منٹ تک آگے پیچھے جھولتا رہا اور اپنی انگلیاں مروڑتا رہا' پھر اچانک ایک نامعلوم نعرہ بلند کرکے اس نے کوئی شے مجھ پر بڑی قوت سے پھینکی۔ مجھے اپنے سینے پر بائیں طرف تیز چبھن سی محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی کانٹا سا چبھ جائے۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ اسی دوران میں سائیں عالی ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا۔ اس نے اپنا چولا سمیٹ کر پنڈلیاں ننگی کیں اور ادھ کھلی کھڑکی میں سے پھلانگ کر غائب ہوگیا۔ کلثوم اور غزالہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ میں آوازیں دیتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا' صفدر اور زریں بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دروازہ کھول کر برآمدے میں پہنچے اور پھر صحن میں آئے۔ صحن میں اور صحن سے آگے تاریکی تھی' سائیں عالی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ ایک چھلاوے ہی کی طرح ناپید ہوچکا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں مین دروازے سے باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن اسی اثنا میں دو مسلح گارڈز بھاگتے ہوئے اندر آگئے۔ ہم نے سائیں عالی کو روکنے کے لیے جو آوازیں دی تھیں انہوں نے گارڈز کو چونکا کردیا تھا۔

"کیا ہوا صاحب! کیا بات ہے؟" ایک گارڈ نے انگریزی میں پوچھا۔

جی چاہا کہ اسے ایک جھانپڑ دوں۔ اس کی پہرے داری میں سائیں یہاں داخل ہوا تھا اور نکل بھی گیا تھا اور وہ ہم سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ شبہ سا ہوا تھا کہ کوئی بندہ یہاں سے نکل کر گیا ہے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہو صاحب۔ یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ ہم بالکل چوکس ہوکر پہرا دے رہے ہیں۔" گارڈ نے اپنا ہولسٹر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں اور صفدر کچھ دیر تک صحن میں اور صحن سے باہر سائیں عالی کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتے رہے۔ چار دیواری سے باہر کا باغیچہ اور لان کے پودے وغیرہ بھی ہم نے دیکھے۔ زریں گل اندرونی حصے میں سائیں کو کھوج رہا تھا۔ پانچ دس منٹ بعد ہم سب ناکام ہوکر پھر سے زریں کے کمرے میں جمع ہوگئے۔

"سائیں نے آپ کو کیا مارا تھا؟" غزالہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ سینے کی جلد پر بائیں طرف شدید جلن ہو رہی ہے۔ میں نے گریبان کے بٹن کھول کر سینے کا متاثرہ حصہ ننگا کیا۔ یہاں سوئی چبھنے کا باریک سا سرخ نشان تھا۔ نشان کے آس پاس ایک دائرے کی صورت میں جلد سرخ ہوگئی تھی اور ذرا سوج بھی گئی تھی۔ سب میری طرف جھک آئے اور معائنہ کرنے لگے۔ غزالہ نے متاثرہ حصے کو انگلیوں سے دبا کر دیکھا' ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ بہتر تبصرہ کرسکتی تھی مگر اس نے فوری طور پر کسی طرح کا تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے قمیص کو پینٹ میں سے نکال کر اچھی طرح جھاڑا تو ایک لمبی اور ذرا موٹی سوئی قمیص میں سے نکل کر قالین پر گر گئی۔ صفدر نے احتیاط سے اسے اٹھا لیا اور روشنی کی سمت کرکے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ سوئی کی ٹپ (نوک) پر ہلکا نارنجی رنگ نظر آرہا تھا۔ صفدر نے تشویش سے کہا "کہیں یہ کوئی زہریلا کیمیکل نہ ہو۔"

"یہ معلوم کرنے کا طریقہ تو بہت آسان ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا۔" زریں نے پوچھا۔

"بھئی' اگر تو میں ایک آدھ گھنٹے تک وفات پا گیا تو یہ زہریلا کیمیکل ہوگا ورنہ نہیں ہے۔"

"یہ تاں سیریس معاملہ نہیں ہے۔" غزالہ خفگی سے بولی "آپ کو فوراً معائنہ کرانا چاہیے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ مجھے وصیت نامہ لکھ کر فوراً آسٹریا روانہ ہوجانا چاہیے کیونکہ وہاں کے ڈاکٹرز اور سرجن دنیا میں ماہر ترین ہیں۔" میں نے کہا' اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس دوران میں زریں گل کہیں سے ایک ہتھوڑی ڈھونڈ لایا۔ اس نے ہتھوڑی کا لوہا میرے سینے پر گھسنا شروع کردیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "خو یہ بہت پرانا ٹوٹکا ہے لیکن ایک دم کارآمد ہے۔ لوہا ہر قسم کا زہر چوس لیتا ہے۔"

میرے سینے پر ہتھوڑی رگڑنے کے بعد زریں گل تو مطمئن ہوگیا مگر باقی ساتھیوں میں سے کوئی مطمئن نہیں ہوا۔ بہرحال سوزش زیادہ نہیں بڑھی اور کچھ دیر بعد جلن بھی کم ہوگئی۔ ہم سب کامن روم میں آبیٹھے اور اس بلائے ناگہانی

پر تبصرہ کرنے لگے جو ایکا ایکی سائیں عالی کی صورت میں ہم پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا نظر آنا جتنا حیرت ناک تھا' غائب ہونا بھی اتنا ہی تعجب خیز تھا اور غائب ہونے سے پہلے اس نے جو کچھ کیا تھا وہ بھی سمجھنے کی بات تھی اور نہ سمجھانے کی۔ مجھ پر اچانک سوئی چلا کر وہ بھگنٹ بھاگ گیا تھا اور کسی بل میں جا گھسا تھا۔ صفدر اور زریں کا مشترکہ خیال تھا کہ اگر سائیں یہاں موجود ہے تو وہ اکیلا نہیں ہے' سموج عرف آلو کی بچی بھی اس کے ساتھ یہاں تشریف فرما ہوگی۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ سائیں یہاں کیسے پہنچا اور کس حیثیت سے یہاں موجود ہے۔ اس کی آمد کا مقصد یا مقاصد بھی فی الحال ہماری کوتاہ نظروں سے اوجھل تھے۔ بہت دیر تک اس فتنہ ساماں عجوبے کے بارے میں سر کھپانے کے بعد زریں اور صفدر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

غزالہ تابی کو سلا کر ایک بار پھر میرے پاس کمرے میں آگئی۔ وہ میری جلد کی سوزش کے بارے میں فکر مند تھی۔ اس نے میری قمیص اتروائی اور ٹیبل لیمپ کی مدد سے دیر تک متاثرہ حصے کا معائنہ کرتی رہی۔ میرے انکار کے باوجود اس نے مجھے ایک انجکشن لگایا اور جلد پر لگانے کے لیے آئنٹ مینٹ دی۔ میں اس کی تشویش کو مسلسل ہنسی میں اڑا رہا تھا "بھئی! ابھی میرے بہت سے کام ادھورے ہیں' میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں۔" میں نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کی سنجیدہ آنکھوں میں اچانک نمی تیر گئی "آپ ایسی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں' ان باتوں سے کسی کو دکھ پہنچتا ہے۔"

"جس کو دکھ پہنچتا ہے میں اس سے بہت شرمندہ ہوں' مگر وہ ذات شریف ہے کون؟"

"بس ہے ایک پاگل۔ ایک مدت سے ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ ننگے سر اور ننگے پاؤں۔"

"کتنی مدت سے بھاگ رہی ہے؟" میں نے اس کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ چند لمحے کے توقف سے بولی "شاید اس وقت سے جب اس کے لیے زندگی صرف گڑیوں کا کھیل تھی۔"

"وہ سائے کے پیچھے کیوں بھاگ رہی ہے' جبکہ جس شخص کا یہ سایہ ہے وہ بھی اس کے آس پاس موجود ہے۔"

"کہا ہے ناں کہ پاگل ہے۔" غزالہ نے عجیب سے درد کے ساتھ کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ساری رات سائیں عالی کی شبیہ مجھے ڈراتی رہی اور اپنے پیچھے بھگاتی رہی۔ وہ روپ بدل بدل کر میرے سامنے آتا رہا' میں رات آخری پہر سویا تھا' صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی پھر آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر چت لیٹا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں سے باہر آسمان صاف تھا اور دن کی روشنی آہستہ آہستہ اندھیرے کو پسپا کر کے ایک مغربی غار میں دھکیل رہی تھی جہاں سے اس اندھیرے کو کل شام پھر برآمد ہو جانا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ ہماری اس قیام گاہ سے باہر زمین کچی اور بھر بھری تھی۔ ایسی جگہوں پر قدموں کے نشانات بہت واضح نظر آتے ہیں اور دیر تک محفوظ رہتے ہیں۔ سائیں عالی بھی اسی زمین پر چل کر ہماری قیام گاہ میں گھسا تھا اور واپس گیا تھا۔ اس کے قدموں کے نشان ڈھونڈنا چنداں مشکل نہیں تھا' سائیں ہمیشہ ننگے پاؤں رہتا تھا۔

میں نے جلدی سے بستر چھوڑا اور جوتے پہن کر باہر نکل آیا۔ سائیں کے نقوش پا ڈھونڈنے کے لیے یہ وقت بہترین تھا۔ ابھی ماریا ٹرسٹ کے مکینوں کی آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی اور رات کے نشانات بہ آسانی ڈھونڈے جاسکتے تھے۔ میں جب لان سے باہر نکلا اندھیرا کافی حد تک چھٹ چکا تھا۔ معمولی سی کوشش کے بعد مجھے کامیابی حاصل ہوگئی' بیرونی دیوار کے بالکل قریب مجھے سائیں کے پاؤں کے نشانات مل گئے۔ یہ کوٹھی کی عقبی سمت تھی' سائیں نے پانچ فٹ اونچی باؤنڈری وال کود کر پار کی تھی اور جہاں اس نے لینڈ کیا تھا وہاں سرخی مائل مٹی واضح طور پر دبی ہوئی تھی۔ اس سے آگے بھی معمولی کوشش کے ساتھ نشانات دیکھے جاسکتے تھے۔ یہ کام میری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہو رہا تھا۔ میں ننگے پاؤں کے ان نشانات پر چلتا ہوا اپنی قیام گاہ سے تقریباً دو سو گز دور نکل آیا۔ نشانات کہیں واضح اور کہیں ہلکے تھے مگر غائب کہیں نہیں ہوئے تھے' میں ان نشانات کو کھوجتا ہوا جا رہا تھا' مگر میرا انداز کھوجیوں والا نہیں تھا۔ میں سیدھا چل رہا تھا اور دیکھنے والوں کو یہ شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کسی قسم کی تفتیش میں مصروف ہوں۔ میں نے ان نشانات کے سہارے ہوسٹل کے اندر تقریباً ڈیڑھ فرلانگ فاصلہ طے کیا اور آخر گھوم کر پھر انہی بنگلا نما مکانات کی طرف آگیا جن میں سے ایک مکان ہمارا بھی تھا۔ اس کالونی میں ان لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں جو یہاں کی انتظامیہ میں اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ ہوسٹل کے تین انچارج اور ہیڈ انچارج بھی اسی کالونی کے رہائشی تھے۔ ایک مختصر بلاک کے سامنے پہنچ کر سائیں کے پاؤں کے نشانات گم ہوگئے۔ نشانات گم ہونے کی معقول وجہ تھی۔ یہاں پختہ فرش تھا۔ یہ رہائشی بلاک کل پانچ مکانات پر مشتمل تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ کل رات مجھ پر "ہوا سرار" سوئی سے "حملہ آور" ہونے کے بعد سائیں عالی انہیں مکانات میں پہنچا تھا اور اگر میری قسمت اچھی تھی تو وہ اب تک وہیں تھا۔

کچھ دیر تک ان مکانات کا جائزہ لینے کے بعد میں واپس اپنی قیام گاہ پر آگیا۔ اس روز ناشتے کے بعد میں نے صفدر کو اپنی "تفتیش" سے آگاہ کیا اور صفدر کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ ان پانچ مکانات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ صفدر نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس نے بعد از دوپہر مجھے جو رپورٹ دی اس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ عدد رہائشی مکانات میں سے دو تو بند پڑے ہیں اور ان میں کوئی رہتا نہیں۔ باقی تین میں سے دو مکانات ٹرسٹ کے انتظامی عہدے داروں کے پاس ہیں' جبکہ تیسرا مکان ایک جانی پہچانی شخصیت کے زیر استعمال ہے۔ صفدر نے اس شخصیت کا نام آرتھر بتایا۔ ہرکولیس کا نائب کپتان آرتھر آج کل ہمیں اسی ٹرسٹ میں گھومتا پھرتا نظر آرہا تھا۔ غالباً ہرکولیس کہیں لنگر انداز تھا اور اس کا عملہ ایک انسانی کھیپ کو کامیابی سے منزل تک پہنچانے کے بعد اب آرام اور تفریح میں مصروف تھا۔

میں نے صفدر سے کہا "کیا خیال ہے' سائیں کی تلاش آرتھر کے گھر سے ہی شروع نہ کی جائے؟"

"بالکل نیک خیال ہے۔ اگر آپ کا ارشاد ہو تو میں کوشش کروں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب تھوڑی سی کوشش مجھے کرنے دو۔"

اسی شام میں آرتھر سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ صفدر نے مجھے جو انفارمیشن دی تھی اس کے مطابق' آرتھر شام آٹھ بجے تک گھر میں ہی پایا جاتا تھا۔ وہ اپنی گرل فرینڈ اور تین ملازموں کے ساتھ وہاں مقیم تھا۔ میں نے آرتھر کے گھر کی کال بیل دی تو ایک چوکیدار باہر نکلا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مسٹر آرتھر سے ملنا چاہتا ہوں۔ میری قسمت اچھی تھی کہ عین اسی وقت آرتھر نے بھی ایک کمرے کے اندر سے باہر جھانکا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار نمودار ہوئے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی بیزاری نے بھی جھلک دکھائی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں یوں آرتھر کو راہ راست نہ دیکھ لیتا تو شاید وہ ملازموں کے ذریعے مجھے دروازے سے ہی ٹالنے کی کوشش کرتا۔ بہ امر مجبوری چہرے پر خوش خلقی سجا کر وہ باہر نکلا اور مجھے خوش آمدید کہا۔

کنگ براؤن کے ساتھ اس کی خاص نشست گاہ میں بیٹھنے کے بعد ہماری حیثیت اور رتبے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ جہاں ہمیں بہتر مراعات ملی تھیں وہاں ہمیں کنگ کے ساتھیوں میں اہمیت بھی حاصل ہوئی تھی۔ یہی اہمیت تھی کہ جس کی بنا پر آرتھر مجھے خوش آمدید کہنے اور اپنے کمرے کے اندر لے جانے پر آمادہ ہوا "کیسے آئے ہو مسٹر شا؟" اس نے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیئر کی بوتل کھولتے ہوئے پوچھا۔

"بس یونہی ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ جہاز پر ہم نے اچھا وقت گزارا ہے۔"

"اچھا بھی اور برا بھی۔" آرتھر مسکرایا "مجھ سے یقیناً کہیں کہیں زیادتی ہوئی ہوگی اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ مگر تم جانتے ہو کہ اس وقت تمہاری حیثیت ایک بردے کی تھی اور بردوں کو دوران سفر کنٹرول میں رکھنے کے لیے باس نے کچھ اصول وضع کر رکھے ہیں۔"

"میں تو اب بھی خود کو ایک بردہ ہی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھی کو کنگ کی نظر میں اہم مقام حاصل ہو چکا ہے' اور ابھی تمہاری اہمیت اور بڑھے گی۔ لو بیئر پیو۔"

"نہیں شکریہ۔ میں نے ابھی بلیک کافی لی ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم ڈرنکس سے بچنے بچانے کی کوشش کرتے ہو۔" وہ مسکرایا۔ پھر بولا۔

"مسٹر شا' اب تم اس کلب کے ممبر بننے والے ہو۔ یہاں پر لوگ اسے "زمینی جنت" کا نام دیتے ہیں۔ اس زمینی جنت میں داخل ہونے کے بعد بھی وہاں کی آسائشوں سے لطف نہ اٹھاؤ گے تو پھر کیا پاؤ گے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے' لیکن بندہ لطف تو اس وقت حاصل کر سکتا ہے جب ذہنی طور پر پرسکون ہو۔ ذہن پریشان ہو تو پھر کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

وہ کچھ دیر تک بغور مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "کہیں تم پروفیسر والے واقعے کی وجہ سے تو ڈسٹرب نہیں ہو؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ پروفیسر کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ پاگل پن میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ جس طرح اس نے مجھے گن پوائنٹ پر لیا تھا' اسی طرح میرے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو لے سکتا ہے۔ اس کا پکڑا جانا از حد ضروری ہے۔"

"یہ تو ایسا معاملہ ہے جس نے سب کے ذہن کو گھن چکر بنا رکھا ہے۔ ۴۸ گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک اس کا کھوج نہیں ملا۔ اب تو یوں لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی اندر کا بندہ ہی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے اور اسے پناہ دے رہا ہے۔"

"یہی بات میرے ذہن میں بھی آتی ہے۔" میں نے کہا "آخر وہ انسان ہے' بھاپ بن کر تو نہیں اڑ سکتا۔"

آرتھر نے سگریٹ کا کش لیا' اس کی چوڑی پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ اسی دوران میں کسی قریبی کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ آرتھر فون سننے کے لیے اٹھ گیا۔ یہ موقع

میرے لیے غنیمت تھا۔ میں نے ساتھ والے کمروں میں جھانکا' ایک کمرے کی کھڑکی میں سے مجھے جو منظر دکھائی دیا اس نے میری رگوں میں خون کی گردش تیز کردی۔ میری تلاش کامیاب رہی تھی۔ اس کمرے میں سائیں عالی موجود تھا۔ وہ حسب عادت فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور چائے میں کیلا ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔ اس کے جبڑے تیزی سے چل رہے تھے اور چپڑ چپڑ کی آواز میرے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ ایک ملازم سائیں عالی کے سرہانے مؤدب کھڑا تھا۔

اچانک آرتھر کی آواز نے مجھے چونکا دیا "کیا دیکھ رہے ہو مسٹر شاہ؟"

میں گڑبڑا گیا' تاہم جلد ہی سنبھل بھی گیا۔ میں نے سائیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بندہ کون ہے اور یہاں کیسے پہنچا؟"

"اس کی حیثیت یہاں بردے کی ہے۔" آرتھر نے جواب دیا۔

"مگر اس وقت تو یہ کسی آقا کی طرح بیٹھا ہے۔"

"کیا تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے جواب دیا "یہ کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہے' بمبئی اس کے مداحوں اور عقیدت مندوں سے بھرا ہوا ہے' خاص طور سے فلم انڈسٹری کے لوگ اس کو بہت مانتے ہیں۔ میں نے اسے سب سے پہلے بمبئی میں ہی دیکھا تھا۔"

"یہ شخص واقعی کرشماتی شخصیت کا مالک ہے۔" آرتھر نے شستہ انگلش میں کہا "میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

"لیکن یہ تمہارے پاس کیسے پہنچا؟"

"ہرکولیس کے ہر سفر کے بعد ہم لوگوں کو کچھ مراعات دی جاتی ہیں۔ اس میں نقد رقم کے علاوہ تین چار ہفتوں کی چھٹی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم بردوں میں سے ایک دو بردے اپنی خدمت کے لیے بھی منتخب کرسکتے ہیں۔ میں نے اس شخص میں کچھ ایسی خصوصیات دیکھیں کہ اسے اپنے لیے منتخب کرلیا۔ اب یہ پچھلے ایک ماہ سے میرے پاس ہی ہے۔ اب تم نے مجھے یہ بتا کر حیران کردیا ہے کہ یہ شخص بمبئی میں بہت جانا پہچانا جاتا ہے۔"

میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا "کیا یہ شخص بھی ہرکولیس میں ہی یہاں پہنچا ہے؟"

"نہیں۔ یہ ہرکولیس میں نہیں تھا۔"

"تو پھر؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں' بس یہ مجھے انڈین SLAVES میں نظر آیا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں مجھے ایک ایسی روحانی بلا ہوں کہ لوکہ بزرگی نظر آئی کہ میں متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔"

"اس نے اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ نہ ہی مجھے پوچھنے کی ہمت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ بہت غصیلی طبیعت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پرسوں اس نے میری گرل فرینڈ مازیان کو اپنی ٹانگیں دبانے کے لیے کہا۔ اس نے نہیں دبائیں تو یہ بہت غصے میں آگیا۔ انگریزی میں اسے دھمکیاں اور بددعائیں دینے لگا۔ کل رات مازیان کو شدید بخار ہوگیا اور وہ ساری رات سردی سے کانپتی رہی۔ یقیناً یہ ایک اتفاق ہی تھا لیکن اس کا مازیان پر بہت اثر ہوا ہے' وہ بہت سہمی ہوئی ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

وہ متذبذب لہجے میں بولا "اگر وہ مشتعل ہوگیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔"

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ معمولی پس و پیش کے بعد آرتھر مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں سائیں عالی اب کھانے کے بعد استراحت فرما رہا تھا۔ وہ فرش پر ہی لیٹا تھا' آنکھیں بند تھیں "ہیلو سائیں عالی۔" میں نے اس کے سر پر پہنچ کر کہا۔

وہ بدک کر اٹھا' چند لمحے آنکھیں پٹ پٹا کر مجھے دیکھتا رہا پھر کھڑا ہوگیا "تم یہاں کیسے شفیع محمد۔" اس نے حسب عادت مجھے شفیع محمد کے نام سے مخاطب کرکے پوچھا۔

"اگر تم اچانک وارد ہوکر مجھے حیران کرسکتے ہو تو مجھے بھی ایسا کرنے کا حق ہے۔"

"میں نے اپنے جنات سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجھے کوئی ٹیلی فون کال نہ دیں۔ سو رنہ جس وقت تم نے اس چاردیواری میں قدم رکھا تھا' مجھے اسی وقت تمہارے بارے میں علم ہوجاتا۔"

پھر وہ ہوا میں اشارے کرنے لگا اور غیر مرئی اشیاء کو مخاطب کرکے اوٹ پٹانگ فقرے بولنے لگا۔ ان فقروں کا لب لباب یہ تھا کہ کوئی چھ عدد نہایت خبیث قسم کے جن اس کمرے میں موجود ہیں' وہ اس بات پر سخت خفا ہیں کہ میں نے

سائیں عالی کے آرام میں خلل ڈالا ہے اور اس کی استراحت میں دخل در معقولات کیا ہے' اب وہ جن مجھے چپیڑیں لگانے کے موڈ میں ہیں۔ سائیں عالی نے انہیں جھڑکیاں شڑکیاں دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس نے مجھ پر احسان عظیم کیا ہو۔

میں نے کہا "سائیں! ایک بات پوچھوں؟ ٹالنے کی کوشش تو نہیں کرو گے؟"

"ہاں ہاں پوچھو۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"تم انڈیا سے یہاں آئے ہو' تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"اوئے چرسئے! میں آیا کہاں ہوں' لایا گیا ہوں۔ یہ بدبخت گورے اور کالے مجھے قیدی بنا کر یہاں لائے ہیں۔"

"میں مر کر بھی یہ بات نہیں مان سکتا۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی تمہیں کہیں نہیں لے جاسکتا۔ اگر ایسا ہوگا تو پھر اس دن سورج مغرب سے نکلے گا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور داڑھی کھجاتا رہا' پھر قہقہہ مار کر ہنس دیا "تو بڑا خرانٹ ہوگیا ہے شفیع محمد۔ اچھا چل تجھے اصل بات ہی بتا دیتا ہوں۔"

آرتھر سائیں کے سامنے ذرا مؤدب انداز میں کھڑا تھا اور خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہماری اردو اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ سائیں نے قلندرانہ انداز میں کہا "دراصل ہمیں تمہارا بہت خیال ہے شفیع محمد! تیرا دکھ ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تو اس لیڈی ڈاکٹر سے بہت پیار کرتا ہے' لہٰذا جب ہمیں پتا چلا کہ مرغوب نامی جن لیڈی ڈاکٹر پر عاشق ہوگیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے کوہ قاف سے افریقہ پہنچ گیا ہے تو ہم نے یہاں آنا ضروری سمجھا۔ تم جانتے ہو ناں اس غنڈے مرغوب کو؟"

"میں یہ نام تمہاری زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں۔" میں نے بیزاری سے کہا "اس قسم کی بہت سی کہانیاں گھڑ کر تم پہلے بھی سناتے رہے ہو۔"

"یہ کہانی نہیں سو فی صد حقیقت ہے۔ مرغوب جن واقعی موجود ہے' اس کے ارادے کا علم ہونے کے بعد میں نے اسے کوہ قاف میں ہی روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی ایک کائیاں ہے۔ کوہ قاف کے اپوزیشن لیڈر یا شاید ڈپٹی اپوزیشن لیڈر کا بیٹا ہے۔ خود بھی سیاست میں حصہ لیتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو' ایک تو سیاست داں اوپر سے جن۔ وہ جتنی بھی آفت اٹھائے کم ہے۔ بگڑے تگڑے رئیس زادوں کی ساری خرابیاں اس جن میں ہیں۔ اب دیکھو کوہ قاف کی

اینٹی کنٹرول لسٹ میں بھی اس کا نام موجود ہے' اس کے باوجود وہ نکل بھاگا۔"

میں سمجھ گیا کہ سائیں عالی کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا لہٰذا بے پر کی اڑا رہا ہے۔ وہ اس قسم کی بے معنی گفتگو گھنٹوں جاری رکھ سکتا تھا۔ اس گفتگو میں بعض اوقات خاص قسم کے اشارے بھی ہوتے تھے۔ لیکن ان اشاروں کو ڈھونڈنا اور اس سے معنی اخذ کرنا زبردست قسم کی ذہنی ورزش کے زمرے میں آتا تھا۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز گھر کے بالائی پورشن سے آئی تھی۔ کوئی کرب ناک انداز میں چیخا تھا' پھر اس نے دھما دھم دیوار پر مکے برسائے تھے۔ یہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دم میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ آواز یہاں کیسے سنائی دے رہی تھی۔ میری طرح آرتھر بھی بری طرح چونک گیا تھا۔ وہ پریشان سا ہوکر تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد میں نے سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آواز سنی۔ سائیں عالی کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر میں تیزی سے سیڑھیوں کی طرف گیا۔ وہاں ایک گارڈ نے احترام سے مجھے روک لیا۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ مطلب یقیناً یہی تھا کہ میں گھر کے بالائی پورشن میں نہیں جاسکتا۔ میرے شبہات تیزی سے پھل پھول رہے تھے۔ یقیناً آرتھر ہی گارڈز سے کہہ گیا تھا کہ مجھے بالائی منزل پر نہ آنے دیا جائے۔ آواز دوبارہ سنائی نہیں دی تھی' تاہم چھت پر سے آہٹیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ دفعتاً میری نگاہ گارڈ کے ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور پر پڑی اور میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اس ریوالور کو پہچاننا میرے لیے قطعی مشکل نہیں تھا۔

میں چند سیکنڈ تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر ایک طویل سانس لی اور ایڑیوں پر گھوم کر واپس نشست گاہ میں آگیا۔ صوفے پر بیٹھ کر میں آرتھر کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی واپسی چار پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے بال بکھرے بکھرے تھے اور سانس بھی کچھ چڑھی ہوئی تھی۔ تاہم وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک عمر رسیدہ ملازم ہے۔ نشے میں شور کرنے لگتا ہے۔" آرتھر نے مختصر جواب دیا۔

وہ بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر سے بکھرا بکھرا ہے۔ اس نے اعصابی انداز میں سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا "سائیں عالی کمال کا بندہ ہے۔" اس نے پھر سائیں عالی کا موضوع چھیڑنا چاہا "رات

رات بھر اکڑوں بیٹھا رہتا ہے اور بیٹھے بیٹھے ہی سو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اندھیرے میں اس کی آنکھیں کبھی کبھی ہیرے کی طرح چمکتی ہیں۔ سائیں کا ہر کام انوکھا ہے۔ سالن میں چینی ڈال کر کھاتا ہے' شربت میں مرچیں ڈال لیتا ہے' دودھ میں پیاز نچوڑ کر پیتا ہے اور چائے میں کیلا ڈبو کر کھاتا ہے۔ کمال کا بندہ ہے۔"

"یہ سب کچھ کرنے سے کوئی کمال کا بندہ تو نہیں ہو جاتا۔ کمال کا بندہ بننے کے لیے تو کمال کے کام کرنے پڑتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم خود سے پوچھو۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا مسٹر شا۔"

"میں پروفیسر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ک۔۔۔ کیا مطلب؟" آرتھر کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"میں جانتا ہوں آرتھر! پروفیسر اللہ دتا تمہارے گھر میں موجود ہے۔"

چند ہی لمحے میں آرتھر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک گئے "تم کیا۔۔۔ کہہ رہے ہو۔۔۔ مسٹر شا؟"

"میں جو کہہ رہا ہوں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے خود پروفیسر کی آواز سنی ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر آرتھر میں نے تمہارے گارڈ کے ہولسٹر میں اپنا ریوالور بھی پہچان لیا ہے' یہ وہی ریوالور ہے جو دو دن پہلے پروفیسر نے میرے بیڈ روم سے حاصل کیا تھا۔"

میرے فیصلہ کن لہجے نے آرتھر کو چپ لگا دی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا۔ کہنے لگا "مسٹر شا! میں تم سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوراً ایسا کرنا پڑا' میں سخت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔"

میں نے نوٹ کیا کہ آرتھر کافی بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ اس میں ایک طرح کا دھیما پن اور کسی حد تک انکسار بھی موجود تھا۔ اور یہ بات میں نے آج نوٹ نہیں کی تھی بلکہ پچھلے آٹھ دس روز سے کر رہا تھا۔ اب بھی اس نے شرمندگی کا اظہار کیا تھا تو یہ اس کے انکسار ہی کی علامت تھی۔

میں نے کہا "آرتھر! تم ہرکولیس کے نائب کپتان ہو۔ میری حیثیت تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر تم خود کو میرے جواب دہ سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری مہربانی ہی ہے۔ بہرحال تم اپنی مرضی سے مجھے پروفیسر کے بارے میں جو کچھ بتاؤ گے وہ صرف اور صرف میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔"

آرتھر چند لمحے تک خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا "میں مانتا ہوں مسٹر شا! کہ پروفیسر میرے ہی گھر میں موجود ہے لیکن یہ سب کچھ میری مرضی سے زیادہ سائیں عالی کی مرضی سے ہوا ہے۔"

"کیا تم تفصیل بتانا پسند کرو گے؟ میں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ تم بتاؤ گے وہ ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔ بشرطیکہ یہاں کوئی خفیہ کیمرا یا مائیکروفون وغیرہ نہیں ہے۔"

"نہیں یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔" آرتھر نے مری مری آواز میں کہا۔

ویسے میں اپنے طور پر بھی اچھی طرح درودیوار کا جائزہ لے چکا تھا۔ مجھے یہاں الیکٹرانک آلات کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' آرتھر کی رہائش گاہ ان چند رہائش گاہوں میں سے تھی جہاں ابھی یہ آلات نصب نہیں ہوئے تھے۔

آرتھر نے لرزاں ہاتھوں سے نیا سگریٹ سلگایا۔ وہ ایک دم انڈر پریشر اور پشیمان محسوس ہونے لگا تھا۔ بات تھی بھی حیران کن۔ آرتھر ایک نہایت ذمے دار شخص تھا۔ اس کا شمار کنگ کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ کئی دوسرے ذمے دار لوگوں کی طرح وہ بھی تندہی سے پروفیسر کو تلاش کرتا رہا تھا اور اب انکشاف یہ ہوا تھا کہ پروفیسر اسی کے پاس چھپا ہوا ہے۔ آرتھر نے سگریٹ کا کش لے کر کہا "شا! میں عیسائی ہوں۔ خود کو روشن خیال سمجھتا ہوں اور پڑھا لکھا بھی ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی غیر حقیقی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ میں کچھ روز پہلے تک اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں روحانیت پر یقین کرنے لگوں گا اور ایک بدحال فقیر کا عقیدت مند بن جاؤں گا۔ تم سمجھ ہی گئے ہو میرا اشارہ مسٹر سائیں عالی کی طرف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں سائیں صاحب سے بے حد متاثر ہو چکا ہوں اور ان کے ساتھ وہی تعلق محسوس کرتا ہوں جو ایک پیروکار کا اپنے گرو کے ساتھ ہوتا ہے۔"

آرتھر نے میرا ہاتھ تھاما اور ایک کوریڈور میں سے گزار کر مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ ایک بیڈ روم تھا۔ یہاں قیمتی فرنیچر موجود تھا۔ ائرکنڈیشنر لگا ہوا تھا اور آرام دہ بیڈ پر ایک حسینہ ایک سیاہ فام نوجوان لڑکی کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ دونوں گہری نیند میں تھیں۔ دروازے کو بے آواز طریقے سے بند کر کے آرتھر میرے ساتھ واپس کمرے میں آ گیا۔ اس

کے چہرے پر غم ناک سنجیدگی تھی "یہ انگلش لڑکی میری گرل فرینڈ مازیان ہے۔ دیکھنے میں تمہیں بالکل صحت مند نظر آئی ہوگی لیکن یہ صحت مند نہیں ہے۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے شدید ذہنی دباؤ میں ہے۔ اس کی بیماری عجیب ہے۔ اسے ڈر آتا ہے۔ اور خوف کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک عجیب سا احساس اس کے ذہن میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ ڈرنے لگتی ہے۔ اس وقت مازیان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ تنہا نہ ہو۔ کوئی اس کے پاس ہو۔ تنہائی اسے شدید طور پر ڈراوتی ہے' یہاں تک کہ اگر وہ باتھ روم میں ہو تو بھاگ کر باہر نکل آتی ہے۔ اگر کمرے میں ہو تو صحن میں آجاتی ہے' اگر صحن میں کوئی نہ ملے تو باہر گلی میں بھی پہنچ سکتی ہے۔ بس اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی انسان اس کے آس پاس ہو۔ پچھلے تین چار ماہ سے یہ ذہنی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ ہرکولیس میں' بحری سفر کے دوران میں بھی مازیان اس اذیت کا شکار رہی ہے۔ تم نے ہرکولیس میں مجھے کم گھومتے پھرتے دیکھا ہوگا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی تھی کہ مجھے ہر وقت مازیان کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں ایک یا دو ملازمائیں اس کے پاس رہتی تھیں۔ اب بھی تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک ملازمہ اس کے ساتھ سو رہی ہے۔ اگر یہ ملازمہ اٹھ کر چلی جائے اور اس کی غیر موجودگی میں مازیان کی آنکھ کھل جائے تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوگی کہ پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دے گی۔ قریباً ایک ماہ پہلے تک میں مازیان کی وجہ سے ازحد پریشان تھا' انہی دنوں میری ملاقات اتفاقاً سائیں عالی سے ہوئی۔ سائیں صاحب انڈین بردوں میں تھے۔ میں ان کا حلیہ دیکھ کر ان کے پاس ٹھہر گیا تھا۔ مجھ سے انگریزی میں کہنے لگے "تیری پریشانی کا نام کیا ہے؟" پھر خود ہی کہنے لگے "تیری پریشانی کا نام M سے شروع ہوتا ہے' اس کی عمر چوبیس سال ہے اور وہ انگلینڈ کی رہنے والی ہے۔"

میں نے مسٹر سائیں صاحب کی باتوں پر غور کیا مسٹر شا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ غیب دانی یا علم نجوم کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں نے کچھ دیر تک سائیں سے بات چیت کی اور پھر انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ یہاں میری رہائش گاہ پر آ کر سائیں صاحب کی مزید صلاحیتیں سامنے آئیں۔ ان کی برکت سے ہماری گمشدہ بلی چند گھنٹے کے اندر گھر واپس آ گئی۔ سائیں صاحب کے روحانی عمل سے میری کمر کا پرانا درد چند روز کے اندر ختم ہو گیا۔ مازیان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی بیماری بتدریج کم ہونے لگی۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت حد تک نارمل ہو چکی ہے۔ سائیں صاحب کسی وقت بہت اوٹ پٹانگ حرکتیں بھی کرتے ہیں لیکن میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ وہ یہ چیزیں تحمل سے برداشت کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اب ان کی کوئی بات بھی بری نہیں لگتی۔ یہ دو روز پہلے کی بات ہے جب پروفیسر جیل توڑ کر فرار ہوا اور اس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے چھ افراد جان سے مار ڈالے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو بعد میں پروفیسر بھاگ گیا تھا۔ میں اس وقت گھر ہی میں تھا۔ مازیان پر خوف کا دورہ پڑا ہوا تھا اور وہ مجھے گھر سے باہر نکلنے نہیں دے رہی تھی۔ سائیں عالی بھی گھر میں نہیں تھا۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے اور مازیان کو تسلی تشفی دے۔ وہ اکثر اسے پھونکیں وغیرہ بھی مارتا ہے جس کے بعد وہ بالکل پُرسکون ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سائیں عالی آیا' مگر وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ وہ قاتل بھی تھا جس نے پورے نرسٹ میں دہشت پھیلا دی تھی۔ پروفیسر کے لباس پر خون کے چھینٹے تھے اور ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کا چہرہ ہیجان کی وجہ سے بھیانک ہو رہا تھا۔ مازیان پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ بری طرح چیخیں مارنے لگی۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ سائیں صاحب نے کہا کہ پروفیسر کو پناہ دینی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بہت ہی مشکل فیصلہ تھا۔ پروفیسر نہ صرف جیل سے فرار ہوا تھا بلکہ چھ افراد کی جان بھی لے چکا تھا۔ یہ کنگ کی شدید ترین ناراضگی مول لینے والی بات تھی۔ مگر سائیں عالی کی عقیدت نے مجھے بالآخر مجبور کر دیا کہ میں پروفیسر کو گھر کے اندر چھپا لوں۔ یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا' اب بھی سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ فیصلہ کیسے اور کیونکر کر سکا۔ شاید۔۔۔ یہ بھی سائیں کی روحانیت کا ہی کرشمہ ہے۔"

آرتھر نے اپنے ہاتھ سے سینے پر کراس بنایا اور خالی نظروں سے فرش کو گھورنے لگا۔

اب یہ بات بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ بندی خانے سے فرار ہونے کے بعد پروفیسر بے نام و نشان کیسے ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں ہوٹل کا چپا چپا چھانا گیا تھا اور خود آرتھر بھی تلاش کرنے والوں میں شامل تھا' جبکہ پروفیسر' آرتھر ہی کے گھر میں روپوش تھا۔ یہ چراغ تلے اندھیرے والی بات تھی۔ آرتھر کے گھر کی طرف بھلا کس کا دھیان جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ پروفیسر اسی طرح غائب ہو گیا تھا' ممکن تھا کہ اس وقت بھی سائیں کے کسی ایسے ہی عقیدت مند نے اسے پناہ دے دی ہو۔

"مگر سوچنے کی بات یہ ہے مسٹر آرتھر کہ سائیں نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ بات میں بھی پچھلے دو روز سے سوچ رہا ہوں۔ سائیں بند کمرے میں صرف ایک بار پروفیسر سے ملے ہیں۔ اس کے سوا انہوں نے مجھے پروفیسر کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی۔ صرف اتنا کہا ہے کہ میں پروفیسر سے نہیں ملوں گا۔ اور نہ اس سے بات کروں گا۔ میں سائیں کی ہدایت پر پورا عمل کر رہا ہوں۔"

"پروفیسر کا کیا حال ہے؟"

"بہت برا۔" آرتھر نے تاسف سے کہا "سائیں کی ہدایت پر میں نے پروفیسر کو کمرے میں مقفل کر رکھا ہے۔ صرف شام کو تھوڑی دیر کے لیے اسے بالائی منزل پر ہی گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکالا جاتا ہے۔ حبشی ملازم اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ میں نے ملازمین سے کہہ رکھا ہے کہ پروفیسر کی رسائی کسی ہتھیار تک نہ ہونے پائے' اس کے علاوہ پروفیسر کو نچلی منزل پر بھی نہ آنے دیا جائے۔ ملازمین انگریزی نہیں جانتے' پروفیسر ان سے بار بار مائیکل کے بارے میں پوچھتا ہے' اور اس امر کا صاف اعلان کرتا ہے کہ وہ اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اپنی بیٹی کے بارے میں پروفیسر کا کیا خیال ہے؟"

"وہ اسے مردہ سمجھتا ہے اور ہاس مائیکل کو اس کا قاتل قرار دیتا ہے۔ ایک دو بار میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ میں اسے بتاؤں کہ اس کی بیٹی حیات ہے مگر سائیں عالی کی طرف سے ہم سب پر پروفیسر سے بات کرنے کی پابندی ہے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے پروفیسر کی آواز سنی تھی' لگتا تھا کہ وہ بڑی تکلیف کی حالت میں بولا ہے۔"

"بس کسی وقت بیٹھے بیٹھے بے چین ہو جاتا ہے۔ در و دیوار پر مکے برسانے لگتا ہے۔ بلند آواز سے روتا ہے اور بیٹی کو پکارتا ہے۔ ایسے میں مجھے اور ملازمان کو بڑا ترس آتا ہے لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"کیا میں پروفیسر سے مل سکتا ہوں۔"

آرتھر کے چہرے پر تذبذب نظر آیا' وہ بولا "میں اس معاملے کو سائیں عالی کا معاملہ سمجھ رہا ہوں اور کوئی مداخلت کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم ملنا چاہتے ہو تو اس بارے میں سائیں عالی سے پوچھنا پڑے گا۔"

ابھی بمشکل آرتھر کا فقرہ ہی پورا ہوا تھا کہ سائیں چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اپنے مخصوص لہجے میں بولا "وے چریئے! تجھے کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔ کیوں ملنا ہے تجھے پروفیسر سے۔ وہ پکی عمر کا بندہ ہے کوئی چھیل چھبیلی لونڈیا نہیں۔ جس سے مل کر تیرا دل خوش ہوگا اور آنکھوں میں تراوٹ آئے گی۔ ویسے بھی وہ بہت غصے میں ہے۔ اور غصے میں کیوں نہ ہو۔ اس کی پھول سی بچی کو وہ حرامی آدم خور جن چمٹا ہوا ہے' باپ بیٹی کی زندگی حرام کر رکھی ہے اس کالے آدم خور نے۔ اللہ کسی کو ایسی مصیبت میں نہ ڈالے۔ میرے اور میرے جنات کی ساری ہمدردیاں پروفیسر کے ساتھ ہیں' اور اس کی بچی کے ساتھ ہیں۔"

میں نے کہا "سائیں! میں بھی ان کا دشمن نہیں ہوں۔ ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے تو ملنا چاہتا ہوں پروفیسر سے۔ تم جانتے ہو کہ اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ بیٹی کے صدمے نے اسے ادھ موا کر رکھا ہے۔"

"تم شاید اس کا صدمہ دور کرنا چاہتے ہو۔ اسے بتانا چاہتے ہو کہ اس کی بیٹی مری نہیں' زندہ ہے؟"

"میری شدید خواہش ہے کہ میں اسے یہ خوش خبری دے سکوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ شائستہ بدستور شدید خطرے میں ہے۔ وہ کسی بھی وقت مائیکل کے چنگل میں خودکشی کر سکتی ہے' یا مائیکل اس کی جان لے سکتا ہے۔ میں پروفیسر کو خوشی کا بول سنا کر پھر سے بدترین صدمے سے دوچار کرنا نہیں چاہتا۔"

"ویری گڈ گونگلو۔ ویری گڈ گونگلو۔" سائیں نے اثبات میں سر ہلایا "میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔ اب تم اچھے بچے بنتے جا رہے ہو شفیع محمد۔ جی چاہتا ہے کہ ہاتھی کی لید سے تمہاری نظر اتاری جائے اور تمہارے بازو پر گینڈے کی کھال کا تعویذ باندھا جائے۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر کسی نامعلوم خیال میں کھویا رہا پھر بولا "جب تم پروفیسر کو بتاؤ گے کہ اس کی بیٹی مری نہیں بلکہ زندہ ہے تو وہ سب سے پہلے اس سے ملنے کی ضد کرے گا' اور جب تم اسے بیٹی سے ملا نہیں سکو گے تو اس کا جنون اور بڑھ جائے گا۔ اس لیے سب سے پہلے تو یہ انتظام کرو کہ اس لڑکی کو آدم خور جن کی قید سے رہائی ملے اور اس کے جیون پر سے موت کے سائے چھٹ جائیں۔ اور جب ایسا ہو جائے تو پھر بے شک پروفیسر کو یہ خوش خبری سنا دینا۔"

"میں نے پرسوں یہاں کے بگ باس کنگ سے بات کی تھی۔ مجھے امید ہے کہ وہ مائیکل سے سفارش کرے گا اور مائیکل' شائستہ کو کچھ رعایتیں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ میں شائستہ کو اپنے ساتھ ہوسٹل میں

لانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اور ایک بار وہ یہاں آ گئی تو پھر باپ بیٹی کی ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔"

"یہ بہت ضروری ہے میرے تخت گونگلو۔" سائیں نے مجھے ایک نئے نام سے پکارتے ہوئے کہا "اگر تم نے پروفیسر کو بتایا کہ اس کی بچی زندہ ہے' لیکن پھر بیٹی سے اس کی ملاقات بھی نہ کروا سکے تو وہ یہی سمجھے گا کہ تم اسے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایسے میں وہ اور بھی زیادہ جنونی ہو جائے گا۔"

سائیں کا لہجہ بے شک اوٹ پٹانگ تھا لیکن اس کی بات میں وزن تھا۔ تھوڑی دیر بعد سائیں عالی واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آرتھر اس دوران میں مؤدب کھڑا رہا تھا۔ سائیں کے جانے کے بعد اس نے اشتیاق آمیز انداز میں پوچھا کہ میرے اور سائیں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی ہے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے آگاہ کیا۔ آرتھر کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ غم زدہ پروفیسر کو اس عذاب ناک غلط فہمی میں سے نکالا جائے جس نے اس کے ہر پل کو عذاب بنا رکھا ہے۔ اسے شائستہ کی زندگی کی نوید سنائی جائے۔ خاص طور سے آرتھر کی گرل فرینڈ تو پروفیسر کی حالت سے بہت دکھی تھی۔ (وہ بھی شائستہ ہی کی طرح اپنے باپ سے بچھڑی ہوئی لڑکی تھی)

کچھ دیر بعد میں آرتھر کی قیام گاہ سے رخصت ہو گیا۔ جس وقت میں اندرونی دروازے میں سے نکل رہا تھا' مجھے ایک بار پھر پروفیسر کی گرج سنائی دی۔ بند کمرے سے ابھرتی ہوئی یہ آواز بالائی منزل سے آ رہی تھی "نہیں چھوڑوں گا۔ خدا کی قسم نہیں چھوڑوں گا۔" پروفیسر کی آواز کا کرب گونج بن کر در و دیوار میں سرایت کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آرتھر کا ایک ملازم پریشانی کے عالم میں سیڑھیوں کا دروازہ بند کر رہا ہے۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ پروفیسر کی آواز زیریں منزل تک پہنچے۔

اگلے روز میں نے ہوسٹل کے نئے ہیڈ انچارج ڈوجون کو بتایا کہ میں کیمپس جا کر مسز مائیکل سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ ڈوجون نے مواصلاتی سسٹم کے ذریعے ناگا کنگ سے رابطہ قائم کیا اور دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ مجھے کیمپس جانے کی اجازت مل گئی۔ طویل سرنگ کا سفر طے کر کے میں کیمپس کی پُراسرار اور حیرت انگیز دنیا میں داخل ہو گیا۔ حسب معمول دو گارڈز بھی میرے ہمراہ تھے۔ میں کنگ سے ملنا چاہتا تھا اور اس سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ شائستہ کی بہتری کے لیے اسے مائیکل سے چند روز کی آزادی دلا دے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں کنگ سے یہ وعدہ کر لوں کہ میں شائستہ کو پروفیسر کے تازہ ترین حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا تو وہ چند شرطیں عائد کرنے کے بعد شائستہ کو میرے ساتھ روانہ کر دے گا۔ میرا اندازہ تھا کہ کنگ بھی شائستہ کی بہتری اسی میں سمجھ رہا ہے کہ وہ کچھ عرصہ مائیکل سے دور رہے۔ مگر جب میں زیر زمین کیمپس میں پہنچا تو صورتِ حال بالکل مختلف پائی۔ کنگ اپنے آفس میں بے حد مصروف تھا لہٰذا اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ میری ملاقات مائیکل کے دوست اور ہرکولیس کے کپتان جم سے ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں اپنے پہاڑ جیسے جسم کو ایک کرسی میں ٹھونس کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شائستہ کے سلسلے میں بڑی... گڑبڑ ہو گئی ہے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر پوچھا "وہ ٹھیک تو ہے؟"

"ٹھیک ہونے سے اگر تمہارا مطلب زندہ ہونا ہے تو وہ زندہ ہی ہے لیکن سخت مصیبت میں ہے۔ اس بے وقوف لڑکی نے اپنی جان کو جان بوجھ کر عذاب میں ڈالا ہے۔ مائیکل اپنی طبیعت کے برخلاف اس سے بہت نرمی کا سلوک کرتا رہا ہے۔ لیکن کچھ بھی ہے آخر وہ مرد ہے۔ اپنی عورت سے کب تک دبا رہتا۔ اس کی برداشت جواب دے گئی ہے۔ کل کسی طرح وہ اس کمرے میں گھس گیا تھا جہاں شائستہ نے خود کو بند کر رکھا تھا۔ اس نے اس سے ریوالور چھین لیا اور طمانچے وغیرہ مارے۔ اب وہ ایک دوسرے کمرے میں بند ہے۔"

"تو گویا وہ اپنی اصلیت پر آ گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب بھی معاملہ بگڑنے سے بچ سکتا ہے۔ اگر وہ لڑکی بغاوت کا رویہ ترک کر دے اور مائیکل سے معافی مانگ لے تو وہ برے انجام سے بچ سکتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مائیکل کے دل میں اب بھی اس کے لیے گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ کام صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ تم اس کے ہم وطن اور ہم زبان ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ مائیکل کو راضی رکھ کر ہی وہ اپنی اور اپنے باپ کی مشکلات کم کر سکتی ہے۔ مائیکل کی زندگی میں نجانے کتنی لڑکیاں آئیں اور گئیں مگر شائستہ کو ایک اہم مقام ملا ہے' وہ مائیکل کی بیوی کہلاتی ہے اور کنگ کے بعد مائیکل اس زیرِ زمین بستی کا سب سے بااختیار شخص ہے۔ شائستہ ذرا سمجھ داری سے کام لے تو وہ اپنی زندگی کو شاندار بنا سکتی ہے۔"

"کیا میں ابھی اس سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں؟"

"تو ٹھیک ہے مجھے لے چلو اس کے پاس۔" میں نے اندرونی اضطراب کو دباتے ہوئے کہا۔

"ایک بات تمھیں یاد رکھنی ہوگی۔" جم نے وارننگ دی "پروفیسر کے بارے میں شائستہ کے سامنے اپنی زبان بند رکھنی ہوگی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم مائیکل کی شان دار رہائش گاہ پر اس کمرے میں موجود تھے جہاں شائستہ کو رکھا گیا تھا۔ میں لرز گیا۔ شائستہ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے ایک بیڈ کے ساتھ نائیلون کی رسیوں سے جکڑا گیا تھا۔ وہ سر اور پاؤں سے ننگی تھی۔ رخساروں پر طمانچوں کے نشان صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ خوب صورت ہونٹ زخمی تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر بھی نیلگوں نشانات نظر آ رہے تھے۔ جم نے بتایا تھا کہ مائیکل نے شائستہ سے ریوالور چھیننے کے بعد اسے طمانچے وغیرہ مارے ہیں۔ اس نے غلط بیانی کی تھی۔ اس پھول سی نازک لڑکی کو بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔ جسم کے جو حصے بھی نظر آ رہے تھے وہاں ضربات کے نشان موجود تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کراہتے کراہتے سو گئی ہے۔ آنسوؤں کی نمی ابھی تک اس کی پلکوں پر موجود تھی۔

جم مجھے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ کمرے کی چھت ویرائن دار تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں کیمرا اور ڈکٹا فون وغیرہ موجود ہوں گے۔ میں شائستہ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا پھر آہستگی سے اسے آواز دی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی' پھر بے آواز رونے لگی۔ میں نے نرمی سے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ کراہی "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس موت چاہیے۔ مجھے مار دو شاہ جہاں۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں' میرا گلا گھونٹ دو۔"

"شائستہ تم بڑی ہمت والی لڑکی ہو۔"

"لیکن تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ وہ مجھے تھوڑا تھوڑا کر کے مار رہا ہے۔ وہ مجھے اور میرے پاپا کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترساتا رہا ہے' اب وہ مجھے موت کے لیے ترسا رہا ہے۔"

"میں حیران ہوں شائستہ' جب تم مرنے کی بات کرتی ہو تو تمہیں اپنے پاپا کا خیال کیوں نہیں آتا۔ تم جانتی ہو۔ ان کی جان ہے تمہارے اندر۔"

"یہی تو چاہتی ہوں کہ ان کی جان کو تکلیف نہ ہو۔ انہیں ایک ہی بار رو کر صبر آ جائے۔ میرے ساتھ وہ بھی ہر روز جیتے اور مرتے ہیں۔ میں ان کو اپنے نہ ختم ہونے والے دکھوں سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں۔ وہ کچھ عرصہ آنسو بہائیں گے' پھر سب کچھ بھول جائیں گے۔ بیٹیوں کو آخر تو بھولنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں نے کنگ سے بات کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مائیکل سے کہیں گے اور وہ تمہیں کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ بھیج دے گا۔ غزالہ اور کلثوم بے قراری سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم چند دن ان کے ساتھ رہو گی تو بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔"

"وہ مجھے کہیں نہیں بھیجے گا۔ وہ تو..."

"نہیں شائستہ ایسا نہیں کہتے۔ ہمیں اچھی توقع رکھنی چاہیے۔ مائیکل کیسا بھی ہے لیکن اس کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔"

میں جان بوجھ کر کنگ اور مائیکل کا ذکر اچھے الفاظ میں کر رہا تھا۔ اگر ہماری یہ بات چیت کسی ٹی وی اسکرین پر دیکھی جا رہی تھی تو پھر ہمیں اچھا ہی تاثر قائم کرنا چاہیے تھا۔

شائستہ کے ہونٹ زخمی تھے۔ بولنے سے اس کے زخموں سے پھر خون رسنے لگا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور بڑی نرمی سے اس کے ہونٹ صاف کیے۔ اس کی گردن پر اور گردن سے نیچے بھی خراشیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ مائیکل وحشت میں اسے نوچتا کھسوٹتا رہا ہے۔ میں بڑی ملائمت سے شائستہ کو سمجھانے لگا۔ اسے بتانے لگا کہ موجودہ حالات میں اسے کس طرح اپنے آپ کو سنبھالا دینا چاہیے۔ وہ عجیب بے حسی کے عالم میں سنتی رہی۔ اس دوران میں اس نے مجھ سے کئی بار پروفیسر کے بارے میں پوچھا لیکن اپنی کمٹ منٹ کے مطابق میں نے پروفیسر کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اچانک مائیکل از خود وہاں پہنچ گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر شائستہ کا رنگ ہلدی ہو گیا اور بیند ہاتھوں کی انگلیاں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔ بلی کو دیکھ لینے والے کبوتر کی طرح اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مائیکل کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور چوڑے جبڑے کچھ اور بھی پھیلے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ بغیر علیک سلیک کے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "کیا مسئلہ ہے تمہارا؟ کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے کہا "کنگ کی خواہش پر آیا ہوں۔"

"کنگ نے کہا تھا کہ اس بے وقوف کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اسے بھڑکانے کی کوشش کرو۔"

"میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

محی الدین نواب کے قلم سے ایک شاہکار ناول

پتھر

(دو جلدیں)

قیمت فی جلد -/150 ڈاک خرچ -/20

- دوسروں کے حق میں کانٹے بو کر خود کو پھولوں کا حقدار سمجھنے والوں کی کہانی۔
- محبت کی مہکتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

علی میاں پبلی کیشنز
20 عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
فون: 7247414

علمی بک سٹال
چوک میو ہسپتال نسبت روڈ لاہور
فون: 7223853

"تم اسے یہ پٹی پڑھا رہے ہو کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ اور پھر اس کے بدبخت باپ سے ملاؤ گے۔" مائیکل کے لہجے میں انگارے دہک رہے تھے۔

"میں نے اسے یہاں سے لے جانے کی بات ضرور کی تھی کیونکہ اس کی ذہنی حالت سنبھالنے کے لیے اس کا یہاں سے باہر نکلنا ضروری ہے۔ یہ اس زیرِ زمین جگہ سے نکل کر ہوسٹل میں پہنچے گی' کھلا آسمان دیکھے گی' اپنے ہم سفروں سے ملے گی تو اس کی طبیعت بہلے گی۔ لیکن جو دوسری بات تم کہہ رہے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ میں نے ہرگز نہیں کہا کہ میں اسے اس کے باپ سے ملواؤں گا اور تم جانتے ہو کہ میں ملوا بھی نہیں سکتا۔" (مائیکل اور دوسرے لوگوں کے نزدیک پروفیسر ابھی تک گم شدہ تھا)

مائیکل ایک دم پھٹ پڑا "تم کون ہوتے ہو میری بیوی کو یہاں سے لے کر جانے والے۔ تمہیں کس نے حق دیا ہے ایسا سوچنے کا۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے' میں اسے خود سلجھاؤں گا۔ یہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گی' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"لیکن......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" مائیکل نے بڑے طیش سے میری بات کاٹی "اس کا جینا مرنا اسی جگہ پر ہوگا۔ کان کھول کر سن لو۔ تم نے ایک بار یہ بات کہہ دی ہے' آئندہ نہیں کہنا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ شائستہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور شدتِ غم سے اس کا جکڑا ہوا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے مائیکل کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بھی یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ کوئی تلخ سی بات میرے ہونٹوں پر آنا چاہ رہی تھی مگر شائستہ کی خاطر میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اس بے چاری کی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ میں اسے مزید ابتر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مائیکل کی پُر غرور آتشیں نگاہیں دروازے تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔ میں جانتا تھا کہ اس موقع پر اگر ایک لفظ بھی میری زبان سے نکل گیا تو یہ مازرن آدم خور کپڑوں سے باہر ہو جائے گا اور یہ صورتِ حال میرے ساتھ ساتھ شائستہ کے لیے بھی نقصان دہ ہوگی۔

...... میں واپس ہوسٹل پہنچ گیا۔ غزال اور کلثوم کو امید تھی کہ میں پروفیسر کی پریشان حال بیٹی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ شام کو میں نائب کپتان آرتھر کی طرف چلا گیا۔ سائیں عالی مجھے دیکھتے ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیا "آ گئے ہو اپنے منہ کو سفید منہ بنا کر۔ میں نے تو کہا تھا کہ وہ جن کے قبضے میں ہے اور جن اپنا قبضہ آسانی سے نہیں چھوڑتے۔"

میں نے آرتھر اور سائیں عالی کو بتایا کہ مائیکل ابھی بہت طیش میں ہے اور شائستہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دے رہا۔

"وہ دے گا بھی نہیں۔ وہ لاتوں کا جن ہے' باتوں سے نہیں مانے گا۔ جس طرح انسانوں میں انسانیت ہوتی ہے' اسی طرح بھوتوں میں بھوتیت اور چڑیلوں میں چڑیلیت ہوتی ہے' لیکن جنوں میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جو جن غلط راستے پر چل نکلتا ہے وہ بس پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے۔" سائیں نے اپنا فلسفہ بگھارا۔

"پروفیسر کا پتا نہیں کیا بنے گا؟" آرتھر نے انگلش میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسے اس مسلسل عذاب سے نکال لیا جائے۔ اسے شائستہ کے بارے میں بتا دیا جائے۔ اگر وہ یقین کر پایا تو اس کا جنون کم ہوگا اور اس میں زندہ رہنے کی خواہش بھی پیدا ہوگی۔ ورنہ جس قسم کی کیفیت سے وہ گزر رہا ہے وہ اس کے اپنے لیے خطرناک ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ تمہارا کیا خیال ہے آرتھر؟"

آرتھر نے گہری سانس لی "مسٹر شا! تم نے میرا خیال دریافت کرنے میں کافی دیر لگا دی ہے۔ کم از کم بیس گھنٹے لیٹ ہو تم۔"

"کیا مطلب؟"

"تقریباً بیس گھنٹے پہلے پروفیسر یہاں سے جا چکا ہے۔"

"کہاں؟" میرا منہ کھلا رہ گیا۔

"ماریا ٹرسٹ سے باہر۔ اسے باہر نکالنے کا رسک مجھے ہی لینا پڑا ہے۔ یہ مسٹر سائیں کا حکم تھا کہ پروفیسر کو ٹرسٹ سے باہر پہنچانا ہے۔"

میں نے تعجب سے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ کسی پہاڑی بکرے کی طرح جگالی کر رہا تھا۔ وہ ایک دم ہم دونوں سے لاتعلق نظر آنے لگا تھا۔

میں نے آرتھر سے پوچھا کہ یہ سب ہوا کیسے؟

"مسٹر سائیں نے کل رات دس بجے کے لگ بھگ اچانک مجھے اپنے پاس بلایا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر جلالی کیفیت طاری تھی۔ فرمانے لگے کہ وہ میرے ذمے ایک نہایت اہم کام سونپنا چاہتے ہیں اور وہ کام یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے مجھے پروفیسر کو اس چار دیواری سے باہر نکالنا ہے۔ میں نے سائیں صاحب سے کہا کہ یہ بہت

مشکل کام ہے۔ یہاں باؤنڈری وال پر ہر طرف کیمرے لگے ہیں اور سخت ترین نگرانی کا خود کار نظام ہے مگر سائیں صاحب اپنی بات پر اصرار کرتے رہے۔ ان کی بے قراری دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے اور مازیان کو خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے باس مائیکل سے ہنگامی طور پر ٹرسٹ سے باہر جانے کی اجازت طلب کی۔ اس اجازت کے لیے کسی مضبوط جواز کی ضرورت تھی۔ میں نے باس مائیکل کو بتایا کہ مازیان کا ڈپریشن خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے اور اسے شدید دورے پڑ رہے ہیں' لہٰذا میں اسے کسی نفسیاتی معالج کے پاس لے جانا چاہتا ہوں۔ ٹرسٹ سے باہر جانے کی اجازت مل گئی تو میں نے پروفیسر کو اپنی کار کی ڈکی میں چھپایا اور مازیان سمیت ٹرسٹ سے باہر چلا گیا۔ اعلیٰ عہدے داروں کی گاڑیوں سمیت یہاں ہر آنے جانے والی گاڑی کی تلاشی اور کلیرنس ہوتی ہے' ہماری گاڑی کی چیکنگ بھی ہوئی لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پروفیسر نظر میں نہیں آیا۔"

اس واقعے کا آرتھر پر اتنا دباؤ تھا کہ بات کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

میں اپنی جگہ گم صم کھڑا تھا۔ سائیں نے یہ بالکل غیر متوقع کارروائی کی تھی۔ اس کے مضمرات وہی بہتر سمجھ سکتا تھا۔ مجھے تو یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ پروفیسر کے "عذاب" کو طول دینے کے بجائے اسے شائستہ کی زندگی کی نوید سنا دی جائے' مگر اس نوید سے پہلے ہی سائیں نے پروفیسر کو اس کی وحشت سمیت باہر بھیج دیا تھا۔ اب اس غم زدہ باپ کی تڑپ نجانے کیا روپ اختیار کرنے والی تھی۔

میں نے سائیں سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے اچھا نہیں کیا۔ پروفیسر نیم پاگل ہو رہا تھا۔ اب خبر نہیں' وہ کیا کر بیٹھے۔"

"میں نے جو کچھ کیا ہے' اپنے ذہین ترین جنوں سے مشورے کے بعد کیا ہے۔"

"کم از کم ہم اسے شائستہ کے بارے میں ہی کچھ بتا دیتے۔"

"میں نے کہا ہے ناں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل درست ہے۔" سائیں کا لہجہ اٹل اور الہامی قسم کا تھا۔

اس کے لہجے نے میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ کہیں سائیں کی بات کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ شائستہ کو اب زندگی کی طرف نہیں لوٹنا تھا' لہٰذا سائیں نے پروفیسر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار سائیں کے بے معنی اقدامات اور اشاروں کے پیچھے گہری رمزیں موجود پائی گئی تھیں۔ فوراً ہی شائستہ کی حالتِ زار کا تصور میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ بدترین مشکلات میں گھر گئی تھی۔ مائیکل اپنے وحشیانہ کردار سمیت اب کھل کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

چند لمحے بعد سائیں اپنی مستی میں جھومتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی گھنٹیوں اور مالاؤں کا شور اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد آرتھر نے تاسف کے لہجے میں کہا "ویسے وہ لڑکی کافی بے وقوف ثابت ہوئی ہے۔ مائیکل نے اس کے ساتھ مہذب رویہ اپنا رکھا تھا۔ مائیکل کو اپنے خلاف بھڑکا کر اس نے اپنے حق میں برا کیا ہے۔"

"لیکن آرتھر! تم لوگ یہ بھی تو سوچو کہ وہ ایک ماں ہے۔ اس کے لختِ جگر کی جان اس کے آدم خور باپ نے لی ہے۔ یہ سب کچھ اتنا گھناؤنا ہے کہ کوئی بھی عورت اپنا ذہنی توازن کھو سکتی تھی۔ شائستہ تو پھر بھی ہمت اور برداشت کا ثبوت دے رہی ہے۔"

"کچھ بھی ہے شا! میں اب اس لڑکی کے مستقبل سے بالکل مایوس ہوں۔ اس نے صرف مائیکل کی نرمی دیکھی ہے' اس کا طیش نہیں دیکھا۔ وہ اسے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' میں اس سلسلے میں کنگ سے دوبارہ بات کر کے دیکھوں؟"

"میرا اندازہ ہے کہ کنگ' باس مائیکل کے نجی معاملے میں ایک حد تک ہی مداخلت کریں گے۔"

"چلو ایک حد تک ہی کریں' مگر مائیکل سے اس کی جان تو بچائیں۔"

جب میں آرتھر کے گھر سے رخصت ہو رہا تھا تو سائیں عالی کسی کونے کھدرے سے نکلا اور لپک کر میری طرف آیا۔ اس نے میرے سینے پر سے قمیص ہٹائی اور غور سے اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں دو روز پہلے اس نے پُراسرار سوئی چبھوئی تھی۔ وہ جگہ ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی' ہلکی سی سرخی اور سوجن وہاں موجود تھی۔ اس نے انگلی سے اس مقام کو چھوا اور مطمئن انداز میں سر ہلا کر واپس لوٹ گیا۔ اسی رات میں ایک بار پھر ٹرسٹ کی حیرت ناک زیرِ زمین دنیا میں جا پہنچا۔ میں نے کنگ سے ملاقات کا وقت مانگا تھا اور اس نے رات دس بجے کے بعد کا وقت عنایت کر دیا تھا۔

کنگ نے مجھ سے اسی جادوئی کمرے میں ملاقات کی جسے

مقامی زبان میں روم کہا جاتا تھا۔ دنیا کی بہترین آسائشوں اور الیکٹرانک سہولتوں سے آراستہ اس گول کمرے کو "میجک آئی" بھی کہا جاسکتا تھا۔ ایک دیوار پر بڑی خوب صورتی سے بہت سی وڈیو اسکرینیں نصب کی گئی تھیں۔ کنگ آرام دہ صوفے پر بیٹھا بیٹھا ایک کنٹرول پینل کے ذریعے اس زیرِ زمین اور بالائے زمین دنیا کے بے شمار گوشوں میں جھانک سکتا تھا۔ میں اس بے مثال نیلگوں کمرے میں پہنچا تو کنگ پھیل کر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ نیم عریاں خادمہ دست بستہ اس کے عقب میں موجود تھی۔ زردی مائل آنکھوں والا چھپکلا قالین پر تھا۔ آج اس کے منہ پر جالی دار تھیلی نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک پلیٹ یا ٹرے اس کے سامنے تھی اور وہ بڑی رغبت سے اس میں سے کوئی گوشت نما چیز کھا رہا تھا۔ کنگ نے سر کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کی ہدایت کی اور میرے سلام کا جواب بھی دیا۔ وہ وڈیو اسکرین کے ذریعے اپنے کسی ماتحت سے انتظامی امور پر بات چیت کررہا تھا۔ چند منٹ بعد بات چیت ختم ہوئی اور کنگ نے بٹن دبا کر وڈیو اسکرین تاریک کردی۔ یہ بات چیت ٹرسٹ میں نگرانی کے خودکار نظام کے سلسلے میں تھی۔ کنگ نے اپنے ماتحت کے ساتھ بڑا سخت رویہ اختیار کیا تھا اور اس سے ان وڈیو کیمروں اور مائیکروفونز کے متعلق مفصل رپورٹ مانگی تھی جو درست کام نہیں کررہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ پروفیسر کے جیل سے فرار ہونے اور پھر گمشدہ ہونے نے کنگ کو خاصا دھچکا پہنچایا ہے' اور وہ اس معاملے کو اپنے لیے ایک چیلنج کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔ گفتگو ختم کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا "ہمیں افسوس ہے مسٹر شاکہ تمہیں اپنے ٹاسک میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس میں تمہارا ابھی کیا قصور ہے۔ عورت کی ترپاہٹ ہر رنگ و نسل میں مشہور ہے اور مشرقی عورت تو اس حوالے سے خصوصی شہرت رکھتی ہے۔"

"لیکن جناب! میں نے تو ابھی مسز مائیکل سے صرف ایک ہی بھرپور ملاقات کی تھی۔ میں خاصا پرامید تھا مگر پھر پتا چلا کہ مسٹر مائیکل کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا ہے اور انہوں نے مسز سے ریوالور چھین کر انہیں بری طرح زدوکوب کیا ہے اور بیڈ کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ یہ تو لبِ بام کمند ٹوٹنے والی بات ہے۔ معاملہ سنبھلتے سنبھلتے بگڑ گیا ہے۔"

کنگ نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید بولنے سے روکا اور بولا "سنو! بات یہ ہے کہ کچھ عورتیں صرف سختی کی زبان سمجھتی ہیں۔ ان کا مزاج سرکش گھوڑے کی طرح ہوتا ہے' ان پر قابو پانے کے لیے ذرا درشت رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی یہ مائیکل کا نجی معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس معاملے کو ہم سے کہیں بہتر سمجھتا ہے اور حل بھی کرسکتا ہے۔"

"لیکن جناب..."

"ہم جانتے ہیں کہ وہ لڑکی تمہاری ہم وطن ہے اور اس حوالے سے تمہیں اس کی فکر بھی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" کنگ نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اسے کچھ ہو نہ جائے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ مائیکل کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ اسے زندہ دیکھنا چاہے گا۔" کنگ نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ کنٹرول پینل کی طرف بڑھ گیا۔

چند سیکنڈ بعد ایک اسکرین روشن ہوئی' پہلے اس پر چند نامانوس مناظر ابھرے پھر میں شائستہ کے کمرے کا منظر دیکھ کر چونک گیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بے سُدھ لیٹی تھی۔ وہ بدستور رسیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مائیکل سوٹ بوٹ پہنے اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ اس پر جھکا ہوا تھا اور تند لہجے میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مائیکل کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی' تاہم یہ بات صاف محسوس کی جاسکتی تھی کہ وہ حاکمانہ لب و لہجے میں شائستہ کو سمجھانے کی کوشش کررہا ہے۔ کنگ نے بٹن دبا کر منظر بدل دیا "اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں پائی جاتی ہے اور صحیح سلامت ہے۔" کنگ نے کہا۔

"میں مائیکل صاحب کی آتش مزاجی سے ڈرتا ہوں' کہیں وہ ایک دم بھڑک نہ اٹھیں۔"

"اگر وہ اسے بھڑکائے گی نہیں تو وہ نہیں بھڑکے گا۔ بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ لڑکی سے تمہاری ایک اور ملاقات ہوجائے۔ تم اسے سمجھاؤ کہ مائیکل کی اطاعت کے سوا اس کے پاس چارہ نہیں۔"

"اگر آپ موقع دیں گے تو میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

"اپنے قریبی ساتھیوں کا گھریلو سکون اور ان کی ذہنی یکسوئی ہمیں بے حد عزیز ہے۔ وہ اس ٹرسٹ میں ہمارے لیے اہم ترین فرائض انجام دے رہے ہیں' اگر وہ منتشر ذہن کے ساتھ کام کریں گے تو یہ ہمارے لیے پُرخطر ہوگا۔ ہم مائیکل کو

بھی مطمئن اور پُرسکون دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جناب۔" میں نے کہا۔

چھپکلا رینگتا ہوا آیا اور بے تکلفی سے کنگ کی گود میں بیٹھ گیا۔ کنگ کا بایاں ہاتھ آہستہ آہستہ چھپکلے کی پشت کو سہلانے لگا پھر وہ آہستگی سے پھسلا اور کنگ کے چمک دار بوٹوں پر لوٹ لگانے لگا۔ نیم عریاں حسینہ کسی بلی کی طرح اپنے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل کنگ کے قدموں میں جھک گئی۔ اس نے خوب صورت جالی دار تھیلی بڑے سلیقے سے چھپکلے کے منہ پر چڑھا دی۔ حسینہ کا بلوری جسم سحر انگیز روشنیوں میں دل فریب منظر پیش کررہا تھا۔ ان در و دیوار میں موجود تمام جان دار اور بے جان اشیاء کی طرح یہ پُرشباب حسینہ بھی اپنی مثال آپ تھی اور نایاب تھی۔ وہ کنگ اور اس کے مہمانوں کے لیے ساقی گری کے فرائض انجام دیتی تھی اور خود بھی سراپا نشہ تھی۔ بہ الفاظِ دیگر وہ ساقی بھی تھی اور ساغر و مینا بھی۔

کنگ نے کنٹرول پینل پر ہاتھ کو تھوڑی سی حرکت دی' ایک اسکرین روشن ہوئی۔ چند لمحے تک لہریں دکھائی دیتی رہیں پھر ایک منظر اسکرین پر ابھرا اس نے مجھے اچھلنے پر مجبور کردیا۔ یہ ایک مستطیل کمرے کا منظر تھا' یہاں ایذا رسانی کے کئی آلات دیواروں پر سجے ہوئے تھے۔ تین افراد یہاں الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو نیگرو تھے اور ایک سیاہ فام۔ تینوں مادر زاد برہنہ تھے۔ ان کے ہاتھ فرش کی طرف جھول رہے تھے۔ دو بھٹے کٹے افراد جن کے ہاتھ میں کی بوکو تھے بڑے "جلادانہ" انداز میں فرش پر ٹہل رہے تھے۔ یہ دونوں سیاہ فام تھے پھر کی بوکو والا ایک اور "حبشی" ایک لڑکی کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں سناٹے میں رہ گیا' یہ لڑکی "انچارج سوزی" تھی۔ وہ رحم طلب لہجے میں حبشی سے کچھ کہہ رہی تھی مگر وہ اسے مسلسل دھکے دیتا ہوا کمرے کے وسط میں لے آیا۔ یقیناً سوزی کو بھی الٹا لٹکایا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف اتنی رعایت تھی کہ اس کے جسم پر مختصر سا لباس رہنے دیا گیا تھا۔ لباس کیا تھا کپڑے کی دو دھجیاں تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تنومند حبشیوں نے سوزی کو بھی چھت سے جھولتی ہوئی زنجیروں کے ذریعے الٹا لٹکا دیا۔ اس کے بال فرش سے چھونے لگے۔ وہ بے بسی کی تصویر نظر آرہی تھی۔ چند دن پہلے تک وہ ہوسٹل کی ایک ونگ کی انچارج تھی اور اس کا حکم چلتا تھا۔ آج وہ جھولا گارڈز کے رحم و کرم پر تھی اور وہ اس کی چمڑی ادھیڑنے کی تیاری کررہے تھے۔

کنگ نے مجھ سے مخاطب ہوکر گمبھیر لہجے میں کہا "تمہیں شاید اہم افراد کو اس "سزا خانے" میں دیکھ کر تعجب ہوا ہو' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم ماریا ٹرسٹ کے اندر کسی بھی قسم کی غفلت اور بے پروائی برداشت نہیں کرتے۔ یہ غفلت اور بے پروائی کسی سے بھی سرزد ہو' اسے سزا ملتی ہے اور بہر صورت ملتی ہے۔"

"کیا اس سزا کا تعلق پروفیسر کے جیل توڑنے سے ہے؟"

کنگ نے اثبات میں سر ہلایا "یہ ایک بہت سنگین غلطی تھی۔ اس غلطی کے نتیجے میں نہ صرف ٹرسٹ کا اہم مجرم فرار ہوا بلکہ کئی قیمتی جانوں کا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مفرور ابھی تک پکڑا نہیں جاسکا۔ اس کی روپوشی ہمارے حفاظتی انتظامات میں شدید قسم کی خامیوں کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں پورے سسٹم کو ری چیک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور وسیع تبدیلیاں کررہے ہیں۔"

وہ گفتگو کے ساتھ ساتھ کسی مشروب کی چسکیاں بھی لیتا جارہا تھا۔ ایک ایسا ہی جوس ٹائپ مشروب میرے سامنے بھی رکھا تھا۔ مشکوک ہونے کے باوجود میں اس کی چسکیاں لینے پر مجبور تھا۔ عقوبت خانے کا منظر اسکرین پر نظر آرہا تھا اور یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ جلاد نما حبشی گارڈ برہنہ افراد کو بے دردی سے کی بوکو کی ضربیں لگا رہے تھے۔ سوزی معتوبین میں شامل تھی۔ کی بوکو کی ہر ضرب پر اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ مرد حضرات پہلے تو خاموشی سے ضربیں سہتے رہے لیکن پھر انہوں نے کراہنا شروع کردیا اور بتدریج یہ کراہیں چیخوں میں بدل گئیں۔ عقوبت خانے کی چھت میں لگے ہوئے مائیکروفون بڑی خوبی اور وضاحت سے یہ چیخیں ہم تک پہنچا رہے تھے' کی بوکو کی شائیں شائیں بھی ہم تک پہنچ رہی تھی۔ بدنصیب افراد میں سے کبھی کبھی کوئی رحم طلب لہجے میں بولنے لگتا تھا مگر یہ الفاظ واضح سنائی نہیں دیتے تھے۔

اسی دوران میں ایک اور منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ عقوبت خانے کا ایک دروازہ کھلا اور کم عمر شیطان ماسٹر استقی اپنے چند دوستوں سمیت اندر داخل ہوا۔ یہ "لوفر پارٹی" بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھنے لگی۔ یہ کل پانچ لڑکے تھے۔ چست پتلونیں' لمبے بال' گلے میں لاکٹس اور بڑے بڑے جوگرز۔ وہ مستقبل کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے' اور ان کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جارہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کنگ نے کنٹرول پینل پر ایک بٹن پش کیا۔ ماسٹر استقی اور اس کے ساتھی چونک کر سامنے کیمرے کی طرف دیکھنے

لگے۔ یقیناً وہاں انہیں اسکرین پر کنگ کی شکل نظر آنے لگی تھی۔

"ہیلو اسمتی۔" کنگ نے کہا۔

"ہیلو باپ۔" اسمتی نے جواب دیا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟"

"ونڈر فل پاپ۔ میں انجوائے کر رہا ہوں۔" اسمتی چیونگم چباتے ہوئے بولا۔

"تمہارے دوست نائی کی موت کے یہ لوگ بھی برابر کے ذمے دار ہیں۔" کنگ نے کہا' اور بٹن دبا کر سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

معتوب افراد کا اب برا حال تھا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ ان کا گوشت کئی جگہ سے اُدھڑ گیا تھا اور فرش پر کئی جگہ خون کے سرخ قطرے ٹپک رہے تھے۔ ضربوں کے دوران میں بڑی سفاکی سے تھوڑا تھوڑا وقفہ بھی دیا جا رہا تھا' مقصد غالباً یہی تھا کہ مار کھانے والے بے ہوش نہ ہو جائیں۔ بے ہوشی ناقابلِ برداشت اذیت کے خاتمے کا اعلان ہوتی ہے اور مارنے والے اذیت کا خاتمہ نہیں تسلسل چاہتے تھے۔ چند لمحے بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ چنڈال چوکڑی میں سے سب سے بڑے لڑکے نے بڑے اسٹائل سے سگریٹ برآمد کیا اور اسے لائٹر دکھا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اس لڑکے کی عمر بھی چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی' ہاں قد تھوڑا سا لمبا تھا۔ اس نے چند کش ہی لیے تھے کہ ماسٹر اسمتی نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے لیا اور بڑے مشاق انداز میں کش لینے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے کنگ کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکن کا دور دور پتا نہیں تھا' اس کے برعکس ایک مطمئن سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔ یہ منظر میں نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ آئندہ دیکھنے کی توقع تھی۔ ایک باپ اپنے کم سن بیٹے کو سگریٹ نوشی کرتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کل کلاں وہ اپنے بچے کو شراب نوشی کرتے دیکھ کر بھی شاید ایسے ہی مسکرائے گا۔

(اور میرا یہ خیال چند روز بعد بالکل درست ثابت ہوا)

اسمتی کا اعتماد دیدنی تھا' اسے اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ کنگ اپنے "روم" میں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے' مگر وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا تھا اور لمبے سُوٹے لگا رہا تھا اور وہ ایسا کیوں نہ کرتا۔ جنہوں نے اسے روکنا ٹوکنا تھا وہی اس کو گوارا کر رہے تھے۔ میں نے بڑی حیرانی سے سوچا کہ وہ کیسی ماں ہوگی جو اپنے لختِ جگر کی تربیت اعلانیہ ایک گناہ گار اور بدقماش کے طور پر کر رہی ہے۔ اور وہ کیسا باپ ہے جو اپنے بیٹے کو ڈاکٹر یا انجینئر وغیرہ بنانے کے بجائے' ایک سفاک اور بے حس بردہ فروش کا روپ دے رہا ہے۔

عقوبت خانے میں الٹے لٹکے ہوئے دو افراد تو جلد ہی بے ہوش ہو گئے۔ ان کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح فرش کی طرف جھول گئے' اور کوڑے کی بے رحم ضربیں ان پر بالکل بے اثر ثابت ہونے لگیں۔ تاہم تیسرا شخص جو نسبتاً جوان تھا ابھی تک ہوش میں تھا اور اپنے ناکردہ یا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ سوزی بھی ابھی تک بے ہوشی کی نعمت سے محروم تھی۔ کی بوکو کی ہر ضرب پر اس کا چکیلا بدن مچھلی کی طرح تڑپتا تھا اور اس کے حلق سے ایک چیخ آزاد ہو جاتی تھی۔ ماسٹر اسمتی اور اس کے ساتھی اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے پھر ماسٹر اسمتی کے ذہن میں نجانے کیا آئی۔ اس کی آنکھوں میں سراسر شیطانی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں اپنے ساتھی جوئم سے کچھ کہا پھر وہ اٹھا اور اس نے اپنی انگلیوں میں دبا ہوا جلتا سگریٹ بڑی بے دردی سے سوزی کے شفاف رخسار پر بجھا دیا۔ اس مرتبہ سوزی کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔ یہ طویل چیخ دو تین حصوں میں تھی۔ اس کا پورا جسم تھرایا اور پھر اس کے ہاتھ بھی ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح فرش کی طرف جھول گئے۔ وہ بھی بے ہوش ہو گئی تھی۔ کم سن شیطان نے دوبارہ سگریٹ سلگائی۔ دو بڑے بڑے کش لیے اور سگریٹ ایک بار پھر سوزی کے عریاں کندھے پر بجھا دی۔ اس مرتبہ وہ بدنصیب مچھلی کی طرح تڑپی اور نہ ہی اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ یہ کم سن شیطان ابھی سفاکی میں ناتجربہ کار تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سوئے ہوئے شخص کو تو اذیت سے جگایا جا سکتا ہے لیکن بے ہوش ہو جانے والے کو مزید اذیت نہیں دی جا سکتی۔ کندھے پر سگریٹ بجھائے جانے کے باوجود وہ بے حس و حرکت لٹکی رہی۔ اب فقط ایک شخص ہوش میں تھا اور حبشی گارڈ اسے پیٹنے میں مصروف تھے۔ اسمتی اپنے ساتھیوں سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں ابھی تک خباثت آمیز مسکراہٹ تھی۔ یہ لڑکے گاہے گاہے سوزی کے بے ہوش جسم کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔ شاید ان کے سفاک ذہنوں میں کوئی نئی شرارت پروان چڑھ رہی تھی۔

کنگ نے چینل بدل دیا۔ خدمت گار حسینہ نے نیا جام بنا کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے محتاط لہجے میں کنگ سے پوچھا "ان لوگوں کو کب چھوڑا جائے گا؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "شاید تمہیں ترس آنا شروع ہو گیا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ فی الحال ان کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ چند روز تک مرہم پٹی کر کے انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ سزا کو ہم وارننگ کہتے ہیں۔ ہاں اگر ان میں سے آئندہ کوئی ایسی غلطی کرے گا تو اس کی کم از کم سزا موت ہوگی اور ہمارے ہاں سزا پر فوراً عمل درآمد ہوتا ہے۔"

کنگ بِرھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہا لیکن میرا دھیان اسی مقصد کی طرف رہا جس کی خاطر میں یہاں کیمپس آیا تھا۔ جونہی باتوں کے دوران میں مجھے ذرا سی گنجائش نظر آئی میں نے کنگ کی توجہ ایک بار پھر شائستہ والے معاملے کی طرف دلانے کی کوشش کی۔ کنگ اچھے موڈ میں تھا' میری کوشش پر وہ خفا نہیں ہوا۔ دھیمے لہجے میں بولا "یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے' تم اسے اپنے ذہن پر زیادہ سوار مت کرو۔ میں نے کہا ہے ناں کہ ہم اس لڑکی سے تمہاری ایک اور ملاقات کرانے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ملاقات سے پہلے ہی سب ٹھیک ہو جائے۔"

"جیسے آپ کا حکم جناب۔" میں نے اطاعت مندی سے کہا۔

وہ سرزنش کے لہجے میں بولا "غیر اہم معاملات میں ذہن مت الجھاؤ شاہ۔ ہم تم سے بہت اہم کام لینے والے ہیں۔ ایسا کام جو تمہاری صلاحیتوں کے مطابق ہوگا اور تمہاری قسمت کو نکھارے گا بھی۔"

"یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

کنگ نے ایک آٹومیٹک دراز کھولی اور اس میں سے دو ٹکٹ نما کارڈز نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ یہ دیکھنے میں کسی میوزیم یا ZOO وغیرہ کے ٹکٹ لگتے تھے مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ ان ٹکٹوں پر ایک انسانی ڈھانچے کی شبیہ تھی جسے ایک خوفناک اژدہے نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ٹکٹوں پر کچھ لکھا بھی ہوا تھا لیکن یہ سب کسی نامعلوم زبان میں تھا۔ صرف تاریخ مجھ سے پڑھی گئی۔ یہ چار روز بعد کی تھی۔ کنگ نے کہا "تمہیں یہاں جانا ہے۔ یہ دوسرا ٹکٹ تمہارے جیسٹ آف کے لیے ہے۔ اگر کوئی بیسٹ ہاف نہیں ہے تو پھر تم یہاں سے کوئی بھی اپنی پسند کی خاتون اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ لیکن خاتون کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔" میں کنگ سے کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اس دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کنگ فون کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

○☆○

اگلے روز ہوسٹل کے ہیڈ انچارج کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ میں کیمپس میں جا کر مسز مائیکل سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ مجھے فوراً کنگ کا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا کہ میں ایک دو روز میں تمہاری ملاقات مسز مائیکل سے کرواؤں گا۔ میں رات نو بجے کے لگ بھگ کیمپس میں پہنچا اور پھر مختلف صاف شفاف راہداریوں سے گزرنے کے بعد مائیکل کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے کل شائستہ کو وڈیو اسکرین پر دیکھا تھا۔ وہ رسیوں میں جکڑی ہوئی بیڈ پر پڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج بھی شائستہ سے میری ملاقات اسی کمرے میں اور اسی حال میں ہوگی' لیکن یہ اندیشہ بالکل باطل ثابت ہوا۔ شائستہ سے میری ملاقات گھر کے ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ وہ ایک پھولدار بنارسی ساڑی میں تھی۔ بال بڑے سلیقے سے جُوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں بلوری چُوڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی سرخی اور کانوں میں آویزے جچ رہے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میاں بیوی میں صلح ہو چکی ہے۔ کم از کم کسی قسم کی مفاہمت ضرور ہو چکی ہے۔

شائستہ کی آنکھیں تاحال سُوجی ہوئی تھیں' لیکن حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی ہے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور ملازم سے کہہ کر اپنے سامنے سے گرین ٹی کے خالی برتن اٹھوا دیے "شکر ہے کہ آج تمہیں بہتر حالت میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ بہتر حالت ہے تو پھر پتا نہیں کہ بدتر حالت کسے کہتے ہیں۔ میں اندر سے ٹوٹ چکی ہوں شاہ جہاں۔ اس شخص نے مجھے توڑ پھوڑ کر کچرا بنا دیا ہے۔ تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے' یہ صرف میری مجبوری ہے۔ شاید عورت مجبوری ہی کا دوسرا نام ہے۔"

"مجبوری کا تعلق عورت سے نہیں' انسان سے ہے۔ اس میں مرد عورت کی تخصیص ہو ہی نہیں سکتی۔ تم اپنا دل چھوٹا مت کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک گئے "یہ طفل تسلیاں مجھے مت دو۔" وہ بولی' شاید وہ رنج کے عالم میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہو گئی۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اس کمرے میں خفیہ کیمرا اور ڈکٹافون وغیرہ موجود ہے۔

وہ کچھ دیر تک سیدھی سیدھی باتیں کرتی رہی۔ اس کا مدعا سمجھ کر میں بھی گفتگو میں محتاط ہی رہا۔ کچھ دیر بعد ہم کامن روم میں آ بیٹھے۔ یہاں پہنچ کر شائستہ ایک بار پھر آنسو پونچھنے لگی۔ اس نے روتے ہوئے کہا "میں بہت بزدل ہوں

شاہ جہاں۔ کاش میں خود کو گولی مار سکتی' اس روز روز کے جینے اور مرنے سے تو بچ جاتی۔"

"تم بہت بہادر ہو شائستہ۔ بزدل وہ نہیں ہوتا جو خود کشی نہ کر سکے' بزدل وہ ہوتا ہے جو زندہ نہ رہ سکے۔"

"نہیں شاہ جہاں' میں بزدل ہوں۔" اس نے اور زور سے نفی میں سر ہلایا "میں محبت کرتی ہوں اور محبت نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ اپنے پاپا کی محبت نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ یہ محبت میرے اندر سے مرنے کا حوصلہ چھین کر... لے گئی ہے۔ میرے پاپا ان درندوں کے چنگل میں ہیں۔ ان کے بوڑھے جسم کو شدید اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان کو اس حالت میں چھوڑ کر تو میں مر بھی نہیں سکتی ہوں۔"

"تم کو اپنے پاپا کے بارے میں کس سے معلوم ہوا ہے؟"

"مجھے کس سے معلوم ہوتا؟ میں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہو گئے "وہ اس چار دیواری میں کہیں بند کیے گئے ہیں۔"

میری معلومات کے مطابق پروفیسر اللہ دتا اس ٹرسٹ کی ناقابلِ عبور چار دیواری سے باہر جا چکا تھا۔ مگر اب شائستہ ایک بالکل مختلف صورتِ حال بیان کر رہی تھی۔ اس کے دو ہی مطلب تھے۔ پروفیسر پھر پکڑا جا چکا تھا یا پھر... آرتھر نے ہی غلط بیانی کی تھی۔ پروفیسر کو ٹرسٹ میں سے باہر نکالا ہی نہیں گیا تھا۔

"تم نے کہاں دیکھا تھا پروفیسر صاحب کو؟" میں نے شائستہ سے پوچھا۔

وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھی اور ایک وڈیو اسکرین کے سامنے جا بیٹھی۔ اس وڈیو اسکرین کی حیثیت وڈیو فون کی سی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر ریکارڈنگ بھی ہوتی تھی۔ یعنی کسی بھی LIVE گفتگو یا منظر کو ری وائنڈ کر کے دوبارہ دیکھا جا سکتا تھا۔ شائستہ نے وی سی پی آن کیا اور ٹیپ کو ری وائنڈ کر کے ایک منظر اسکرین پر لے آئی۔ یہ منظر ٹرسٹ کے بیرونی حصے یعنی ہوسٹل کے بندی خانے کا تھا۔ ایک سیل میں پروفیسر اللہ دتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جسم پر صرف ایک پاجامہ نما کپڑا تھا۔ دونوں ہاتھ اطراف میں دو زنجیروں کے ساتھ باندھ دیے گئے تھے۔ پروفیسر کے جسم پر تشدد کے واضح نشانات تھے۔ وہ نیم بے ہوش تھا اور اس کی ٹھوڑی سینے سے لگی ہوئی تھی۔ ایک نیگرو گارڈ کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے افریقی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بہیمانہ تشدد کی علامت کی بوکو موجود تھا۔ درا صل وہ وڈیو فون پر مائیکل کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

اسکرین پر مجھے یہ منظر دکھاتے ہوئے شائستہ کے چہرے پر کرب اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنے ڈیڈی کی حالت اس کے لیے یقیناً ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے شائستہ سے پوچھا "یہ منظر تم نے کب دیکھا تھا؟"

"کل... مائیکل نے دکھایا تھا۔"

"کیا یہ LIVE تھا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا کہ شائستہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے مائیکل نے سفید جھوٹ بولا ہے۔ اس نے اپنے آخری حربے کے طور پر شائستہ کو اس کے ڈیڈی کی حالتِ زار دکھائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اگر وہ خود پر آمادہ نہ ہوئی تو اس کے باپ کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ حالانکہ شائستہ کا باپ مائیکل کے پاس تھا ہی نہیں۔ جو مناظر LIVE کہہ کر شائستہ کو دکھائے گئے تھے وہ ریکارڈ شدہ اور کئی دن پرانے تھے۔ اس میں ہوسٹل کا بندی خانہ نظر آ رہا تھا جو قریباً ایک ہفتہ پہلے پروفیسر ہی کے ہاتھوں جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ ان مناظر کے ریکارڈ شدہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال مائیکل کی اس عیارانہ چال نے صورتِ حال کو بہتر بنانے میں معاونت کی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی لیکن شائستہ کچھ سنبھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ شائستہ کو پروفیسر کے حالات سے آگاہ نہیں کروں گا۔

وڈیو بند کرنے کے بعد شائستہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "پلیز شاہ جہاں! پاپا کے لیے کچھ کریں۔ اگر میری جان کی ضرورت ہے تو ابھی لے لیں مگر میرے ڈیڈی پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔"

میں نے شائستہ سے کہا "تمہاری جان کی ضرورت ہے اور نہ تمہارے پاپا کو کچھ ہونے والا ہے۔ سمجھو کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تمہارے پاپا اب مکمل سکون میں ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" اس کی آنکھوں میں امید کے دیپ جل اٹھے۔

"میں نے کہہ دیا ہے ناں۔ میری بات پر مکمل یقین رکھو۔" میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں ان سے مل سکتی ہوں؟" اس کے لہجے میں جہان کی بے چارگی و بے بسی سمٹ آئی۔

"ابھی تھوڑا سا صبر اور کرنا ہوگا۔ لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ یہ صبر اور انتظار انشاءاللہ رائیگاں نہیں ہوگا۔"

"یا خدا! میرا اور امتحان نہ لے۔ ایک بیٹی سے اپنے باپ کا اور انتظار نہیں ہوتا۔" وہ دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔

پھر وہ کرید کرید کر مجھ سے پروفیسر کے بارے میں سوال کرنے لگی۔ وہ کیسے ہیں؟ میں نے انہیں کہاں دیکھا ہے؟ انہیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ کس کے حکم پر کیا گیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنی طرف سے ان سوالات کے تسلی بخش جواب دیتا رہا۔ بیچ بیچ میں میں خود بھی سوالات کرتا رہا۔ ان سوالوں کا تعلق مائیکل اور شائستہ سے تھا۔ میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مائیکل اور شائستہ کے تعلق میں یہ تھوڑی سی تبدیلی کس حوالے سے آئی ہے۔ میرے اندازے کے عین مطابق جہاں دیدہ مائیکل نے شائستہ کے ذہن سے یہ اندیشہ نکالنے کی کامیاب کوشش کی تھی کہ مائیکل اس کے اگلے دنوں میں بھی اسی بہیمانہ سلوک کا نشانہ بنائے گا جس کا نشانہ پہلا بنایا تھا۔ اس نے شائستہ کو بتایا تھا کہ یہ کمند قبائلی رسم صرف پہلی رات یا پہلے بچے تک ہی محدود رہتی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر کی ایک پرانی وڈیو کو مائیکل نے LIVE کہہ کر دکھایا تھا اور شائستہ کو باور کرایا تھا کہ اس کا باپ قانون کی حراست میں ہے۔ اس صورتِ حال نے بھی شائستہ کو جارحانہ رویہ ترک کرنے پر مجبور کیا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک عارضی مفاہمت ہو گئی تھی۔ مائیکل نے شائستہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس سلسلے میں سفارش کرے گا اور جلد ہی پروفیسر کو ٹرسٹ کی حراست سے رہا کرا لے گا۔ مائیکل نے شائستہ کو تفصیل تو نہیں بتائی تھی تاہم اتنا ضرور سمجھا دیا تھا کہ اس کے باپ پر اندھا دھند فائرنگ اور قتل کرنے کا سنگین الزام ہے۔ اس جرم کی لازمی سزا موت ہے مگر وہ اس سزا کے آڑے آئے گا اور اس کے لیے زندگی کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔

شائستہ مجھ سے کرید کرید کر جو سوال پوچھ رہی تھی ان میں اہم ترین سوال یہی تھا کہ اس کے ڈیڈی پر فائرنگ اور قتل کے الزامات کی کیا حقیقت ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم تھا مگر کنگ کی طرف سے مجھے مکمل طور پر پابند کر دیا گیا تھا۔ میں شائستہ کے سامنے پروفیسر کے حوالے سے بالکل زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ مائیکل کے آنے کا وقت ہو گیا' لہٰذا میں شائستہ کے پاس سے اٹھ آیا۔

ہوسٹل واپس آتے ہوئے میں مسلسل شائستہ' مائیکل اور پروفیسر کے متعلق سوچتا رہا۔ یہ رشتوں کی ایک عجیب سی کہانی بن گئی تھی اور اس کی پیچیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ کل کنگ نے مجھ سے کہا تھا کہ شائستہ کے سلسلے میں مجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' یہ میاں بیوی کا گھریلو جھگڑا ہے اور مائیکل اسے جلد ہی نمٹا لے گا۔ آج کنگ نے شاید اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے ہی مجھے شائستہ سے ملایا تھا۔ شائستہ نہ صرف خود کشی کی دھمکی سے دستبردار ہو گئی تھی' بلکہ آج وہ مائیکل کے لیے بنی سنوری بھی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر کی عورت اور بیٹی میں زبردست جنگ ہو رہی ہے۔

میں رات کو قریباً گیارہ بجے واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچا۔ دیگر ساتھیوں کے علاوہ غزالہ بھی بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر جب صفدر اور زریں وغیرہ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ غزالہ میرے پیچھے ہی پیچھے کمرے میں آئی تھی۔ تابی بھی اس کے ساتھ تھا "یہ آج کل کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہیں آپ؟" اس نے ذرا شوخ لہجے میں پوچھا۔

"آوارہ گردی تو کہیں نہیں۔ بس کیمپس گیا تھا' ابھی ساری رپورٹ تو دی ہے تم لوگوں کو۔"

"دیکھا تابی! اب "ہم اور تم" لوگ ہو گئے ہیں۔" غزالہ نے کہا۔

"زبان پکڑنے کی عادت تمہاری بہت پرانی ہے۔ پتا ہے کتنی پرانی ہے؟"

"ہاں پتا ہے۔ اب آپ رہنے دیں اس موضوع کو۔" اس نے ہوشیاری سے دامن بچایا پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا "ارے۔ آپ نے تو میرے ذہن سے ہی نکال دیا۔ کیا حال ہے آپ کے نشان کا؟" اس کی مراد چھاتی پر سوئی کے نشان سے تھی۔

میں نے قمیص کے دو بٹن کھولے۔ وہ آگے جھک کر غور سے میری جلد دیکھنے لگی۔ اس کی انگلی کی پور بڑی نرمی سے متاثرہ حصے پر گردش کرتی رہی۔ مطمئن انداز میں سر ہلا کر اس نے قمیص کے بٹن بند کر دیے۔

اسی دوران میں میرا دھیان جیب میں پڑے ان ٹکٹ کی طرف چلا گیا جو کل کنگ کی طرف سے مجھے عنایت ہوئے تھے۔ میں نے جیب سے وہ ٹکٹ نکالے اور غزالہ کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ٹکٹ ہیں۔ کنگ نے دیے ہیں۔ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ کس چیز کے ہیں۔ بس اندازہ سا ہے کہ کوئی شو وغیرہ ہے۔"

"لیکن یہ دو ہیں۔"

"یہ بات میرے لیے بھی پریشانی کی ہے کہ یہ دو ہیں۔ کیونکہ میں تو اکیلا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"بھئی یہ دوسرا ٹکٹ بیوی کے لیے' یا منگیتر کے لیے' یا کسی ایسی دوست کے لیے ہے جو بیوی یا منگیتر وغیرہ بننے والی ہو۔"

میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے تانبے کے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی "کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا سوچ سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں لاچاری تھی۔

"تمہارے سوچنے پر کوئی پابندی نہیں' اگر کوئی ہے تو وہ تم نے خود لگائی ہوگی۔"

"آپ... ہمیشہ مجھے ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں' مجھے ہی الزام دیتے ہیں۔"

"تم نے کبھی اس الزام کو غلط بھی تو ثابت نہیں کیا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کیا تم میری ساتھی کی حیثیت سے میرے ساتھ اس ٹور پر چلو گی؟"

غزالہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اس کی پلکیں لرزیں۔ میں نے اپنا سوال دہرایا "کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

چند لمحے تک اس کی حسین پیشانی پر الجھن کی لکیریں بنتی اور مٹتی رہیں۔ پھر وہ بولی "میں کیسے جا سکتی ہوں شاہ جہاں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ... آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ مناسب نہیں ہے۔ صفدر' زرین اور کلثوم وغیرہ کیا سوچیں گے۔"

"ہاں واقعی' وہ کیا سوچیں گے۔ وہ تو ہماری اس بے راہ روی پر شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"دیکھیں آپ..."

"مجھے لیکچر دینے کی ضرورت نہیں غزالہ!" میں نے اس کی بات کاٹی "میں معافی چاہتا ہوں کہ میری زبان سے ایسی واہیات بات نکل گئی۔"

میں اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ میرا سینہ آگ کی طرح پھنک رہا تھا۔ میں نے پانی پیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ دیر بعد باہر آ گیا۔ میری توقع کے مطابق غزالہ اپنے کمرے میں واپس جا چکی تھی۔

شائستہ اور پروفیسر کے حالات کی وجہ سے دل پریشان تھا۔ غزالہ کے مبہم رویے نے اس پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ اگلے کئی گھنٹے میں نے تقریباً کمرے میں بند ہو کر گزارے۔ اگلے روز رات کو صفدر گھر کے کا میں مجھ سے ملا۔ ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔ سنجیدہ لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ تو ہم کو واسطے ہیں' پھر آپ کو سمجھانے کی ضرورت کیوں پیش ہے؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں کہ غزالہ آپ کے سلسلے میں ہے پھر آپ اس کے ساتھ غیر محتاط رویہ کیوں اپنانے"

"کیوں' میں نے کیا کر دیا ہے؟"

"یہ تو آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ بہرحال اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کل رات سے اسے شا ہے اور اس کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ وہ مسلسل رہی ہے۔"

مجھے یہ اطلاع سن کر دھچکا سا لگا' تاہم میں تاثرات کو قابو میں رکھا۔ میں نے کہا "اس کے رونے سے میرا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

صفدر بولا "گستاخی معاف۔ میں آپ سے بحث چاہتا مگر آپ کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ آپ بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر غزالہ ساتھ یہاں پردیس میں ہے اور مصیبتیں اٹھا رہی صرف ہماری وجہ سے ہی ہے۔ ہم ذمے دار ہیں' موجودہ حالات کے۔ امارات کے شہزادے کا خون ہاتھوں سے نہیں ہوا تھا' شیخ عاصم بھی غزالہ کا دشمن تھا۔ اس کے بعد بھی غزالہ کو جو حالات پیش اس کے ذمے دار آپ اور ہم ہیں۔ ہمیں اس اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے' معافی چاہتا ہوں' میرے الفاظ سخت ہوں' لیکن حقیقت یہی ہے شاہ صاحب کہ اس غریب الوطنی میں اگر ہماری وجہ سے دل دکھے گا تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔"

صفدر کی باتیں وزن سے خالی نہیں تھیں۔ میں سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے' مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ آپ کا معاملہ ہے' میں آپ کو کیا بتا میری تو بس یہ خواہش ہے کہ غزالہ کو کم از کم آپ سے دکھ نہ ملے۔"

اپنے کمرے میں آ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ مجھے

ہوا کہ کل رات میرا رویہ ضرورت سے زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے میرا حال دریافت کرنے آئی تھی اور سخت رنجیدہ ہو کر واپس گئی تھی۔ میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا' آخر میں نے فیصلہ کیا کہ غزالہ کے پاس جا کر اس کی طبیعت پوچھوں اور کل کے رویے پر معذرت کروں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ کھڑکیوں پر درختوں کے سائے جھوم رہے تھے۔ دو تین حبس زدہ راتوں کے بعد آج یہاں ہلکی بارش ہوئی تھی اور تیز ہوا ابھی چل رہی تھی۔ یہ ریسٹ کا بالائی حصہ یعنی ہوسٹل تھا' یہاں موسم کی اس خوشگوار کروٹ کو محسوس کیا جا سکتا تھا ورنہ زیر زمین کیمپس میں تو دن رات اور سردی گرمی برابر تھے۔ ابھی میں غزالہ کی طرف جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میرے اندر سے آواز آئی کہ یہ غزالہ کی دستک ہے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہی کھڑی تھی۔ اس کے پس منظر میں تاڑ کے طویل درخت تھے اور افریقہ کے ہر دم پُرسکون نظر آنے والے آسمان پر بادلوں کی گرج چمک تھی۔ غزالہ کے بال تیز ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ اپنی اوڑھنی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اندر آ کر وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی۔ نیلگوں بلب کی روشنی میں اس کا سفید لباس بھی ہلکا نیلگوں نظر آنے لگا تھا "بیٹھ جاؤ غزالہ۔" میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" وہ نم ناک آواز میں بولی۔

"کچھ پریشان ہو؟"

"میں بہت شرمندہ ہوں شاہ جہاں۔ میری وجہ سے آپ کو بار بار دکھ پہنچا ہے۔"

"یہی بات تم سے کہنے کے لیے میں تمہارے کمرے میں جا رہا تھا۔ اور میرے خیال میں میری بات زیادہ درست ہے۔ میں نے پچھلے پندرہ سولہ برس میں ہر ہر قدم پر تمہیں آنسو دیے ہیں۔"

"یہ تو میری قسمت ہے۔ میں شاید ہوں ہی ایسی بدنصیب۔ بہرحال کل والی بات پر آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"میرے خیال میں غلطی میری ہے۔ مجھے ایسا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔"

"کاش میں آپ کو اپنا دل کھول کر دکھا سکتی۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

میں نے بے اختیار ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے لرزاں جسم میں ایک دم جوار بھاٹا نمودار ہوا۔ سینے میں ہلچل ہوئی اور وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ایک عجیب سی جذباتی کیفیت تھی۔ میں نے اسے دور ہٹایا اور نہ وہ خود ہٹی۔ کھڑکیوں سے باہر دیوانی ہوا سر پٹخ رہی تھی۔ گاہے گاہے بجلی کی چمک روزن میں پھلجھڑیاں سی چھوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد غزالہ کے آنسو تھم گئے' تاہم اس کے گرد میرے بازوؤں کا حصار قائم رہا۔ ایک خواب ناک سی آواز میرے ہونٹوں سے نکلی "کتنا اچھا ہو غزالہ۔ مجھے اسی جگہ تمہارے ساتھ کھڑے کھڑے موت آ جائے۔ اس ملاپ کے بعد کوئی جدائی نہ ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خود کو مجھ سے دور ہٹانے کی معمولی سی کوشش کی پھر میرے بازوؤں کے حصار کو محسوس کر کے میرے ساتھ لگی رہی۔ اس کے بدن کی مسحور کن مہک میرے حواس کو مختل کر رہی تھی۔ اس کے بالوں کا ریشم میرے چہرے کو ڈھانپ رہا تھا۔ وہ جادوئی لمحے تھے "غزالہ پیار کرتی ہو ناں؟" میں نے خواب ناک لہجے میں پوچھا۔

"ہوں۔" اس نے میرے سینے میں چہرہ دھنسائے دھنسائے جواب دیا۔

"پیار کرتی رہو گی ناں؟"

"ہوں۔" اس کا جواب پھر اثبات میں تھا۔

"ہمارا جینا مرنا اکٹھے ہوگا ناں؟"

"ہوں۔"

ایک چنگاری سی شعلہ بن کر اردگرد کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ میرے بازو اس سے لپٹ سے گئے۔ میرے ہونٹ اس کے بالوں کو' اس کے گالوں کو چھونے لگے۔ وہ جادوئی لمحے تھے۔ ان لمحوں نے بحیرۂ عرب کے "جزیرۂ محبت" میں گزاری ہوئی رات کی یاد تازہ کر دی تھی' بلکہ یہ لمحے' ان لمحوں سے بھی کہیں زیادہ حسین اور دل نشیں تھے۔ "جزیرۂ محبت" کے لمحے مجبوری کے خمیر سے اٹھے تھے' لیکن یہ لمحے ایک جاں فزا آمادگی اور خود سپردگی کا تحفہ تھے۔ یہ لمحے ان ہزارہا بے قرار راتوں کا صلہ تھے جو میں نے انتظار کے کانٹوں بھرے بستر پر گزاری تھیں' ان بے شمار بے مہر رتوں کا انعام تھے جن کا پل پل جدائی کا خنجر بن کر میرے سینے میں اترا تھا۔ میرے ہونٹ ایک پیاسا صحرا بن گئے اور غزالہ کا سراپا ساغر نما ہو گیا۔ بے ہوشی اور سرشاری کی ایک لہر رگ جاں سے اٹھی اور کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنے دوش پر اڑاتی اور اٹھاتی چلی گئی۔ ہم یک جان دو قالب کی طرح تھے اور محبت کی سرگوشی' گرم سانسوں کا لباس پہن کر ہماری سماعت میں اتر رہی تھی۔ وہ بس دو منٹ ہی ہوں گے' مگر زندگی کا

حاصل تھے۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے تانی کی روتی بسورتی مدھم آواز سنائی دی۔ غزالہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی شرگیں نگاہ ایک ساعت کے لیے میری نگاہ سے ٹکرائی۔ اپنی اوڑھنی سر پر درست کرتی ہوئی وہ تیزی سے دروازے کی طرف چلی گئی۔ وہ چلی گئی لیکن رات کا باقی حصہ میں نے جاگتے گزار دیا۔ اس کے لباس اور جسم کی خوشبو مجھ سے لپٹی رہی اور خواہشوں و ارمانوں کے گھوڑے سوچ اور خیال کے جنگلوں میں سرپٹ دوڑتے رہے مگر پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ ایک سنجیدگی اور اُداسی سی ذہن پر طاری ہونے لگی۔ اس اُداسی نے دھیرے دھیرے ایک طرح کی ندامت کا روپ دھار لیا۔ میں کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا۔ میری حیثیت، میرا مزاج اور مرتبہ مجھ سے زیادہ سنجیدہ رویے کا طلب گار تھا۔ کچھ بھی تھا، قانونی طور پر غزالہ ابھی تک شیخ عاصم سے وابستہ تھی۔ اس وابستگی کی موجودگی میں میں غزالہ کے قریب جانے پر کیوں تلا ہوا تھا۔ کیوں اس کے گریز کے باوجود اسے اپنے ساتھ بہالے جانے پر مُصر تھا؟ شاید یہ اس محرومی اور طویل دوری کا نتیجہ تھا جو اب تک مجھے غزالہ کے حوالے سے ملی تھی۔ اپنی محبت کا وجود تسلیم کرانے کے لیے میں غزالہ کی مزاحمت کو توڑنا اور اس کے قریب جانا چاہتا تھا۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب تھا لیکن یہ محبت کے آداب تو نہیں تھے۔ میں نے اپنا ناصح بن کر خود کو سمجھانا شروع کیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا لیکن اب مجھے خود کو سنبھال لینا چاہیے۔ معاشرے کے وجود کو تسلیم کرنا چاہیے اور اس کی اقدار کی اہمیت کو بھی ماننا چاہیے۔ محبت کی منزل کی طرف ایک طویل سفر طے ہو چکا ہے اب شاید تھوڑا باقی رہ گیا ہے۔ اس آخری مرحلے میں بے صبری سے کام نہیں لینا چاہیے۔

صبح ناشتے پر میں نے محسوس کیا کہ غزالہ خاموش اور خجل سی نظر آرہی ہے۔ اس نے مجھ سے بھی نگاہ نہیں ملائی۔ ناشتے کے بعد صفدر اور زریں باغیچے میں جا بیٹھے اور کلثوم سوگئی۔ غزالہ اپنے کمرے میں تانی کو نہلانے دھلانے میں مصروف ہوگئی۔ کچھ دیر بعد میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ تانی کو تھپک تھپک کر سلانے میں مصروف تھی۔ میں نے دیکھا کہ تانی سوچکا ہے لیکن وہ بے خیالی میں اسے تھپکتی چلی جارہی تھی۔

میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی گردن جھکی رہی اور چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلک آئی۔ میں نے کہا "غزالہ! میں تم سے ایک خاص بات کہنے آیا ہوں۔"

"جی۔" وہ ہولے سے بولی۔

"تم پریشان ہو ناں؟"

"نن۔۔۔ نہیں تو۔" وہ گڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"رات والے واقعے نے تمہیں الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری الجھن بجا ہے۔ بے شک ہم بہت محبت کرتے ہیں لیکن موجودہ حالات میں ہمارا ایک دوسرے کے قریب آنا مناسب نہیں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کے دل کی بات کہہ رہا تھا مگر وہ اقرار کرتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ شاید میں ناراض نہ ہو جاؤں۔ میں نے اپنا سوال ذرا مختلف الفاظ میں دہرایا تو وہ گہری سانس لے کر بولی "شاہ جہاں۔۔۔ میرے بس میں ہو تو۔۔۔ ایک پل بھی۔۔۔ آپ سے دور نہ رہوں لیکن آپ جانتے ہیں کہ۔۔۔" اس کے ہونٹ تھرا کر خاموش ہوگئے۔

"میں جانتا ہوں غزالہ! اسی لیے تو تم سے بات کر رہا ہوں۔"

میرے انداز نے اسے ذرا حوصلہ دیا۔ وہ بولی "آپ دیکھیں۔ اگر رات صفدر یا زریں میں سے کوئی ہمیں دیکھ لیتا تو ہمارے بارے میں کتنا غلط تصور پیدا ہوتا ان کے ذہن میں، اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کے علاوہ بھی میں سب جانتا ہوں غزالہ۔ اسی لیے تو چاہتا ہوں کہ ہم دونوں باہمی رضامندی سے ایک فیصلہ کرلیں۔ یا یوں کہہ لو کہ ایک معاہدہ کرلیں۔ کیا میں سگریٹ سلگا سکتا ہوں۔"

اس نے حسب معمول سر ہلا کر اجازت دی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور دو تین ہلکے کش لینے کے بعد کہا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاؤں میں شیخ عاصم کے کاغذی رشتے کی زنجیر ہے۔ جب تک یہ زنجیر موجود ہے تم میرے حوالے سے اپنے ذہن پر بوجھ محسوس کرتی رہو گی۔ چلو آؤ آج ہم طے کرلیتے ہیں کہ جب تک یہ زنجیر موجود ہے ہم اس زنجیر کے وجود کو تسلیم کریں گے۔ ایسا رویہ اپنائیں گے کہ ہمیں اپنے بارے میں کسی سے کچھ چھپانا نہ پڑے۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں تم؟"

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں روشنی سی نمودار ہوگئی تھی جیسے کسی نے بے زباں لمحوں میں کسی کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ میں نے کہا "ہم کہیں بھی جائیں، کہیں بھی رہیں، پوری سچائی کے ساتھ اس فیصلے پر عمل کریں گے۔ میں اپنی طرف سے تمہیں یقین

دلاتا ہوں کہ کسی بھی قسم کے حالات میں اپنے اس فیصلے پر قائم رہوں گا۔ اگر تمہارے دل میں کوئی شبہ ہو تو میں ہر طرح تمہیں یقین دلا سکتا ہوں۔"

"میری زندگی میں وہ دن نہیں آئے گا جس دن میں آپ پر شبہ کروں۔"

"اور میری زندگی میں بھی نہیں آسکتا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

ہم کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ کمرے میں سکوت کا راج تھا۔ اس سکوت میں محبت تھی، آس تھی اور ہلکا سا دکھ بھی تھا۔ شاید یہ اس نئے فاصلے کا دکھ تھا جو کچھ عرصے کے لیے ہمارے درمیان پیدا ہو رہا تھا۔ غزالہ نے اس گمبھیر خاموشی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ توڑا "آپ کا سگریٹ ختم ہو چکا ہے۔" اس نے میری انگلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

واقعی فلٹر جلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے ٹکڑا ایش ٹرے میں مسل دیا۔ غزالہ نے اپنی خوب صورت آنکھوں میں جمع ہوجانے والے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور ذرا مسکرا کر بولی "ہاں تو کب چلنا ہے ہمیں شو میں؟"

"تم دل سے تیار ہو یا میرے مجبور کرنے پر جارہی ہو؟"

"دل سے تیار ہوں۔" اس نے عجیب محبوبانہ انداز میں کہا۔

اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں پھسل کر اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

O☆O

دوسرے روز کیمپس کے خاص الخاص حصے میں کنگ سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ اپنے اسپیشل کمرے "ردم" میں موجود تھا۔ کئی وڈیو اسکرینیں روشن تھیں اور ان پر کیمپس اور ہوسٹل کے مختلف مناظر نظر آرہے تھے۔ غالباً ابھی ابھی کنگ کے پاس سے کوئی خوب رو مہمان اٹھ کر گیا تھا۔ کمرے میں پرفیوم کی بھینی سی مہک تھی اور میز پر رکھے جام کے کنارے پر لپ اسٹک کی سرخی نظر آرہی تھی۔ کنگ کا بھتیجا آج دور ایک گوشے میں نظر آرہا تھا۔ کنگ وڈیو فون پر مصروف تھا اور کسی نامعلوم زبان میں اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ گفتگو سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں بھئی! کل تمہاری ملاقات ہو گئی مسز ہائیکل سے؟" کنگ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ صورتِ حال اب کچھ بہتر نظر آتی ہے۔"

"ہم نے پہلے ہی تم سے کہا تھا، ہائیکل اس معاملے کو ہینڈل کرے گا۔ وہ بہت ذہین اور ہوشیار بندہ ہے۔ اپنے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتا ہے۔ دیکھنا وہ لڑکی اس کے اشاروں پر چلے گی اور یہ سب کچھ وہ تشدد سے نہیں بلکہ اپنی حکمتِ عملی سے کرے گا۔"

میرا دھیان ان ٹکٹوں کی طرف چلا گیا جو ہفتے کو کنگ نے مجھے دیے تھے۔ میں کنگ سے جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ کس قسم کی تقریب ہے اور مجھے وہاں کس لیے بھیجا جارہا ہے۔ جس اہتمام سے کنگ مجھے وہاں بھیج رہا تھا، یوں لگتا تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ میں کنگ سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر تذبذب میں تھا۔ کنگ کی تیز نگاہوں نے از خود میرے دل کی بات جان لی۔ وہ بولا "تین دن پہلے ہم نے تمہیں دو ٹکٹ دیے تھے۔ یہ دراصل ایک شو ہے۔ اس شو کا تعلق روحانیت سے ہے۔ افریقہ کی سرزمین پر روحانیت ایک اہم موضوع ہے۔ اس شو میں ٹرسٹ کے چند گنے چنے افراد کو ہی مدعو کیا گیا ہے جن میں تم بھی شامل ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا، پھر ذرا توقف سے اس نے شیمپین کا ایک طویل گھونٹ لیا اور بولا "یہ شو دو چار دن کے لیے ملتوی کردیا گیا ہے۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے کنگ کے چہرے پر فکر کی پرچھائیں لہرا گئی۔

"جسارت کی معافی چاہتا ہوں جناب۔ کیا اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں مسئلہ تو نہیں ہے۔ بس یونہی پروگرام تبدیل کیا ہے۔" کنگ نے مختصر جواب دیا۔

اسی دوران میں لہراتی لچکتی اور مستانی چال چلتی ویرا اندر داخل ہوئی۔ وہ آج ایک قیامت خیز لباس میں تھی۔ "گڈ ایوننگ انکل۔" اس نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کنگ کو سلام کیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوگئی "ہیلو مسٹر شا! آپ کیسے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس نے دائیں بائیں دیکھا "آج آپ اکیلے نظر آرہے ہیں۔"

"ہاں آج میرا ساتھی صفدر نہیں ہے۔"

"وہ بہت ونڈر فل شخص ہے۔" ویرا نے کہا اور میں نے اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی محسوس کی۔

کنگ اپنے کنٹرول پینل پر مصروف تھا۔ وڈیو اسکرینوں پر مختلف مناظر ابھر ابھر کر اوجھل ہو رہے تھے۔ کسی بہت بڑے کچن میں ڈیگر باورچی کھانا پکا رہے تھے، کہیں کسی کیسینو میں جوا چل رہا تھا، ایک ہال میں نیم برہنہ ایشیائی لڑکیاں رقص

کررہی تھیں۔ ایک کتے کو انجکشن لگایا جارہا تھا۔ دو مکینک طویل سرنگ میں واقع سڑک پر ایک گاڑی کا پہیا بدل رہے تھے' غلاموں کے ایک گروہ کو کئی بوکوں کی مدد سے لاک اپ میں ہانکا جارہا تھا۔ کسی جمنازیم میں مسلح گارڈز ورزش کررہے تھے۔ غرض مختلف قسم کے بے شمار مناظر تھے جو اس زیر زمین دنیا کے ماحول کی عکاسی کرتے تھے۔

ویرا نے کنگ سے مخاطب ہو کر کہا "انکل کنگ! میں مسٹر شا کو اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں؟"

"ضرور ضرور۔" کنگ نے کہا "اسے کلب میں لے جاؤ۔ اچھی طرح گھماؤ پھراؤ' یہ عن قریب ہمارا بہت اچھا رفیق ثابت ہونے والا ہے۔"

"اور ران کا ساتھی؟" ویرا نے پوچھا۔

"وہ بھی... وہ بھی۔" کنگ نے تائید کی "وہ بندہ غضب کا نشانے باز ہے۔"

ویرا کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کیمپس کی اس ارضی جنت میں داخل ہوگئی جسے یہاں "اے کلب" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ پھول پتے' درخت' چشمے' آبشار' سبھی کچھ اس زیر زمین جگہ پر موجود تھا۔ نامعلوم مقامات سے جادوئی روشنیاں پھوٹتی تھیں اور ہر جاندار و بے جان شے کو حسین تر بنادیتی تھیں۔ یہاں کے ریستوران' کیسینو اور سوئمنگ پول دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ پیرس کی حسین شام راستہ بھٹک کر ادھر نکل آئی ہے۔ "اے کلب" میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے حسب معمول سمعی جیکٹس پہن لی تھیں۔ ویرا دل نشیں انداز میں باتیں کررہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا "مسٹر صفدر آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"دوست ہے اور بھائی بھی۔ ہم ایک دوسرے کو بہت انڈراسٹینڈ کرتے ہیں۔"

"آپ ان کو ساتھ کیوں نہیں لاتے۔ وہ دلچسپ آدمی ہیں۔"

"میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" میرے انداز نے اسے مسکرانے پر مجبور کردیا۔

اچانک ایک منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ سوئمنگ پول کے ساتھ ہی ان ڈور پودوں کا باغیچہ تھا۔ ایک خوب صورت آبشار جس کے پانی کو روشنیاں ہفت رنگ بنارہی تھیں اس باغیچے کے بیچوں بیچ گرتا تھا۔ یہاں مور اور کسی خاص نسل کی رنگین مرغیاں گھومتی نظر آرہی تھیں۔ میں نے یہاں ماسٹر اسمتھی اور اس کے دوست جوم کو دیکھا۔ جوم کی عمر چودہ برس کے قریب تھی۔ ویسے بھی وہ دراز قد تھا' اپنی قامت اور خرانٹ پن کی وجہ سے وہ پندرہ سولہ سال کا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کم سن لڑکی تھی۔ لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال رہی ہوگی۔ اس کا تعلق تھائی لینڈ یا برما وغیرہ سے تھا' بہرحال وہ کافی خوب صورت تھی۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی' پاؤں میں جوگرز تھے' بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ جوم لڑکی کو ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار کرانے کی کوشش کررہا تھا' لیکن لڑکی سواری کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ تھی "جوم کے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"

"اس کی گرل فرینڈ ہے۔" ویرا نے جواب دیا۔

"کیا اس بچے کی عمر اتنی ہے کہ وہ گرل فرینڈ رکھ سکے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے' یہ لڑکی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ شاید ایک نوعمر شہزادے کے لیے کنیزوں میں سے ایک لڑکی منتخب کی گئی ہے۔ تاکہ وہ شہزادے کے لیے تفریح طبع کا سامان بن سکے۔"

"اس جگہ کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں مسٹر شا! آپ کو حیران ہونے کی آزادی ہے لیکن زیادہ کرید کرید کر سوال پوچھیں گے تو یہ آپ کے لیے پریشانی کا باعث ہوگا۔"

"میں نے کافی دنیا دیکھی ہے' لیکن جیسے بچے میں یہاں دیکھ رہا ہوں' میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ خاص طور سے یہ ماسٹر اسمتھی تو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کے بزرگ بڑی محنت سے اسے ایک برا انسان بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اس کے لیے بدترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے مسٹر شا۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرانی ہو کہ کنگ نے ماسٹر اسمتھی کی والدہ یعنی ماریا سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ اسمتھی بغیر شادی کے پیدا ہونے والا بچہ ہے۔ کنگ کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ گناہ کی زندگی گزارنا انسان کے اختیار میں ہے اور اس کا حق بھی ہے۔ ان کے نزدیک کوئی انسان بھی نیک نہیں ہوتا اور نہ گناہ گار ہوتا ہے' بس ہر انسان کا اپنا لائف اسٹائل ہوتا ہے۔ انہوں نے اسمتھی کو نوعمری میں ہی ہر طرح کی چھوٹ دے رکھی ہے۔"

"کیا تم اپنے انکل کے خیالات سے اتفاق کرتی ہو؟"

وہ مسکرائی "کچھ باتوں سے اتفاق کرتی ہوں اور کچھ سے نہیں۔ مجموعی طور پر وہ مجھے پسند ہیں۔"

"کیا یہ بردہ فروشی بھی تمہیں پسند ہے؟"

"ہمارے نزدیک یہ بردہ فروشی نہیں۔ اسے ہم ڈیمانڈ اور سپلائی کے معاشی اصول کے پس منظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو ایک جگہ بیکار اور مصیبت زدہ ہیں انہیں اس جگہ پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے اور دوسروں کے لیے بے حد کارآمد ہوجاتے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی بدل جاتی ہیں۔"

میں نے باغیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بچی جسے یہاں کا نوعمر رئیس زادہ گھوڑے پر بٹھانے کی کوشش کررہا ہے' اپنی زندگی کو کہاں تک بدلا ہوا پاتی ہے۔ تم نے ایک پھول کو شاخ سے نوچا ہے۔ اس بچی کو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے چھین کر یہاں پہنچایا ہے۔ کیا کیا قیامتیں نہیں ٹوٹی ہوں گی جدا ہونے والوں کے دلوں پر۔ اب یہ بچی نجانے ہوس اور گناہ کے کتنے خارزاروں سے گزرے گی۔"

"آپ صرف ایک مفروضے پر بات کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تھائی لڑکی اب تک تھائی لینڈ کے کسی گاؤں میں فاقوں کا شکار ہو کر مرچکی ہوتی یا پھر عصمت فروشی کے کسی اڈے پر دو دو ٹکے میں بک رہی ہوتی۔ اب یہاں اسے نکھارا جائے گا' سنوارا جائے گا' اکنامکس کی زبان میں اس کی مارکیٹ ویلیو اور سودے بازی کی قوت کو بہتر بنایا جائے گا' پھر یہ یورپ امریکا یا مڈل ایسٹ میں پہنچے گی' ایک پُرآسائش زندگی میں داخل ہوگی اور کیا پتا کہ اس کے لیے ایک خوش حال مستقبل کے دروازے کھل جائیں۔"

شاید ویرا کچھ اور بھی کہتی مگر تھائی لڑکی کی چیخوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ جوم نے اسے زبردستی گھوڑے پر سوار کرادیا تھا' اب گھوڑا ذرا مچلا تھا تو نوعمر لڑکی کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ اس کا رنگ بالکل سفید نظر آنے لگا تھا۔ جوم نے گھوڑے کی گردن تھپتھپا کر اسے پُرسکون کیا۔ پھر خود بھی کود کر گھوڑے پر لڑکی کے عقب میں سوار ہوگیا۔ ماسٹر اسمتھی بڑے خوشگوار موڈ میں تھا' وہ ایک جدید وڈیو کیمرے کے ذریعے ان دونوں کی فلم بندی کررہا تھا اور ساتھ ساتھ چیونگم چبا رہا تھا۔ کسی وقت وہ کسی بات پر ہنسی سے لوٹ پوٹ بھی ہوجاتا تھا۔ جوم نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور باغیچے کے اندر ہی اسے تھوڑا سا چلایا۔ اسمتھی گھوڑے کے آگے آگے الٹے قدموں چلتا رہا اور فلم بناتا رہا۔ پھر اسمتھی کے ذہن میں نجانے کیا آیا۔ وہ وڈیو کیمرا گھاس پر رکھ کر دوڑتا ہوا سوئمنگ پول کی طرف آیا۔ یہاں ایک مور پنکھ کے پودے کے نیچے چھوٹا سا پنجرہ رکھا تھا۔ اس میں ایک چھپکلا موجود تھا۔ اسمتھی چھپکلا نکال کر لے گیا اور جوم کو تھما دیا۔ جوم نے یہ چھپکلا تھائی لڑکی کو پکڑانا چاہا۔ اس مرتبہ وہ بالکل روہانسی ہوگئی۔ وہ ہم سے دور تھے ان کی گفتگو تو سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر لڑکی کے ہاتھوں کے اشاروں اور جسم کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد خوف زدہ ہے اور چھپکلے کو چھونا تک نہیں چاہتی۔ وہ یقیناً جوم کی منت سماجت کررہی تھی کہ وہ چھپکلا اس سے دور لے جائے' لڑکی کا گریز دیکھ کر جوم کو تاؤ آرہا تھا۔ اس نے زبردستی چھپکلا کم سن لڑکی کی گود میں گھسیڑنا چاہا' وہ خوف زدگی کے عالم میں گھوڑے سے نیچے گرگئی۔ اس کی پیشانی پر چوٹ آئی تھی۔ جوم عقاب کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے پیٹنے لگا۔ اسمتھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور مسلسل فلم بندی کررہا تھا۔ لڑکی ادھ موئی ہوگئی تھی تو جوم گھاس پر رینگتا ہوا چھپکلا پھر پکڑ لایا۔ شاید وہ اسے دوبارہ لڑکی کے ہاتھوں میں دینا چاہتا تھا۔ تاہم اسی دوران میں کھچڑی بالوں والا ایک سفید فام شخص وہاں پہنچ گیا۔ اس نے جوم کو کچھ سمجھایا اور لڑکی کو جس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا' مرہم پٹی کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ سارا واقعہ ڈیڑھ دو منٹ میں رونما ہوا۔ میں اور ویرا سوئمنگ پول کے کنارے سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

"بہت خوب۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "واقعی ان بچوں اور بچیوں کو ان کے گھروں سے اغوا کرکے اور اس دور دراز خطے میں پہنچا کر تم نے ان کی زندگیوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ ویل ڈن مس ویرا اینڈ یور انکل۔"

"آپ کسی صرف ایک واقعے کی وجہ سے' یہاں کی مجموعی صورت حال کے بارے میں رائے قائم نہیں کرسکتے۔" ویرا بولی "آیئے میں آپ کو یہاں کے کچھ اچھے مناظر بھی دکھاؤں۔ آپ دیکھیں کہ یہاں بے ہنر اور معمولی لوگوں کو کس طرح گراں قدر اور کارآمد بنایا جاتا ہے۔" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور غالباً کسی ایسے کمرے کی طرف لے چلی جہاں وڈیو اسکرینیں وغیرہ موجود تھیں۔ مگر ابھی ہم دس پندرہ قدم ہی گئے تھے کہ ایک مسلح سفید فام گارڈ نے ہمیں روک لیا "ایکسکیوز می لیڈی!" اس نے بڑے احترام سے ویرا کو مخاطب کیا "آپ یہاں سے آگے نہیں جاسکتیں' اوپر سے حکم ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" ویرا نے خوش خلقی سے کہا اور میرے ساتھ واپس کیسینو کی طرف آگئی۔

"کیا بات ہے' ادھر راستہ بند کیوں کیا گیا ہے؟" میں نے ویرا سے پوچھا۔

"شاید کوئی انتظامی مسئلہ ہوگا۔" ویرا نے بظاہر بے

پروائی سے کہا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ آج کلب اور کلب سے باہر بھی حفاظتی انتظامات معمول سے کچھ سخت ہیں۔ کئی ایسی جگہوں پر بھی مسلح گارڈز نظر آ رہے تھے جہاں اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس سے پہلے کنگ نے مجھے بتایا تھا کہ میجک اور روحانیت کے متعلق کوئی شو ملتوی کر دیا گیا ہے۔ شو کے ملتوی ہونے کی وجہ کنگ نے بھی نہیں بتائی تھی۔ نجانے کیوں مجھے حالات میں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ چند روز پہلے کنگ کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ یہاں کے انتظامی معاملوں سے مطمئن نہیں ہے۔ خاص طور سے وہ نگرانی کا نظام مکمل طور پر فول پروف چاہتا تھا۔ میں نے قیافہ لگایا کہ شاید اسی سلسلے میں کچھ ردوبدل کیا جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے "نین شین" پائی جاتی ہے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ کلب کے طول و عرض میں رنگ روشنی اور خوشبو کا بسیرا تھا دوسری جگہوں کی طرح بار میں بھی خوب رونق تھی اور ہر طرف سرخ جیکٹس نظر آ رہی تھیں۔ ماریا ٹرسٹ کے معززین یہاں داد عیش دے رہے تھے۔ کلب کے عالی شان ریسٹوران میں کھانوں اور الکحل کی ملی جلی خوشبو تھی۔ یہاں اسٹیج پر ایک میڈونا ٹائپ گلوکارہ عجیب و غریب لباس میں گانا گا رہی تھی۔ اس انگلش گانے کے بول کچھ یوں تھے "ہم سب محبوب ہیں' ہم سب عاشق ہیں' ہم سب انسان ہیں۔"

گانے کے آخری الفاظ پر مجھے شدید اعتراض تھا۔ کم از کم اس ظلمت کدے میں تو یہ الفاظ بالکل بے معنی تھے۔ سفید فام گلوکارہ کہہ رہی تھی "ہم سب انسان ہیں" مگر میں جانتا تھا یہاں بہت سے لوگ انسان نہیں ہیں۔ وہ تنگ وعز تنگ لوگ کہاں انسان تھے جنہیں کی بو کو کی مدد سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ہانکا جاتا تھا' وہ ملزم کہاں انسان تھے جنہیں بھول بھلیوں میں بھگا بھگا کر مار دیا جاتا تھا' وہ بے گناہ افراد بھی انسان نہیں تھے جنہیں ماسٹر استقی صرف اپنی نئی رائفل ٹیسٹ کرنے کے لیے گولیوں سے بھون دیتا تھا اور وہ تیرہ چودہ سالہ تھائی بچی بھی انسان نہیں تھی جو گرل فرینڈ کے طور پر ایک مقامی شہزادے کے ساتھ تھی۔ اور کملا بھی کہاں انسان تھی۔ وہ کم سن ماں جسے اس کے شیر خوار بچے سمیت تفریحاً مار دیا گیا تھا۔ کملا کا خیال آیا تو ذہن میں انگارے دہک اٹھے۔ وہ غریب صورت معصوم لڑکی۔ وہ ہندوؤں کی ایک مسلی کچلی ہوئی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک پوری لاچار نسل نظر آتی تھی۔

اسے میرا حوالہ دے کر لاک اپ میں سے نکالا گیا تھا اور پھر زندگی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کی سوالیہ آنکھیں اکثر راتوں کو میری نیند حرام کر دیتی تھیں۔ یہ آنکھیں مجھ سے پوچھتی تھیں "میرا کیا دوش ہے۔ میں تو خود ایک ننھی سی زندگی تھی اور میری گود میں ایک زندگی دے دی گئی۔ پھر یہ زندگی' میری اپنی زندگی سمیت مجھ سے چھین لی گئی۔ میرے آغاز کو ہی میرا انجام کیوں بنا دیا گیا؟"

اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ ریسٹوران کی ایک میز پر مجھے مائیکل اور شائستہ نظر آ گئے۔ ان کے سامنے کھانے کے برتن تھے۔ مائیکل بڑی رغبت سے کھا رہا تھا اور ساتھ چیز چیز باتیں بھی کر رہا تھا' شائستہ بڑی آہستگی سے کھا رہی تھی اور ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ شائستہ بھی بے بسی کی ان بے شمار تصاویر میں سے ایک تصویر ہے جو اس زیست کی سنگلاخ دیواروں پر جابجا آویزاں ہیں۔ وہ مرنا چاہتی تھی لیکن مائیکل اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا اور اپنی شرطوں پر زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے رویے میں تھوڑی بہت لچک پیدا کی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ یہ عارضی لچک ہے' اور حکمت عملی کے تحت اختیار کی گئی ہے۔ میں مائیکل کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہا تھا' میں اور ویرا ان ہال نما کمروں کی طرف چلے گئے جہاں مختلف گیمز وغیرہ ہو رہے تھے۔ پورا کیمپس ائرکنڈیشنڈ تھا اور کہیں بھی گرمی کا احساس نہیں ہوتا تھا' حالانکہ اس زیر زمین دنیا سے باہر افریقہ کی ایک حبس زدہ رات' اپنے تمام تکلیف دہ لوازمات کے ساتھ موجود تھی۔ ہم ان جنت نظیر در و دیوار میں پھرتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ویرا واضح طور پر صفدر میں دلچسپی لے رہی تھی اور مجھ سے اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ مجھے یہ معاملہ دلچسپ محسوس ہوا اور میں نے بھی بڑھا چڑھا کر صفدر کی تعریفیں شروع کر دیں۔ ہم نے ایک جگہ سے سوفٹ ڈرنکس لیے اور آئس کریم کھائی۔ اس کے بعد ہم واپس بڑے ریسٹوران کی طرف آ گئے۔ یہاں کھلی جگہ پر ایک آٹھ فٹ ضرب چھ فٹ کی دیوہیکل ٹی وی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ اس اسکرین پر برازیل میں ہونے والا کوئی دھواں دھار فٹ بال میچ دکھایا جا رہا تھا۔ ہم دونوں بھی ایک طرف رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کھیل دیکھنے لگے۔ نیم عریاں لباس والی ایک شعلہ بدن سفید فام لڑکی ہمارے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی' اس نے جھک کر ہم سے اسنیکس وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے انکار میں سر ہلا دیا۔ یہی وقت تھا' جب ریسٹوران کی طرف سے شور سنائی دیا۔ میں نے اور ویرا

نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا' ایک حیرت ناک منظر نظر آیا' ایک شخص کا پیٹ پھٹا ہوا تھا' اس کی سرمئی مائل انتڑیاں باہر لٹک رہی تھیں اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے عقب میں دیکھتا ہوا ہماری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ ویرا کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ یکایک عقب سے خودکار رائفل کی فائرنگ سنائی دی۔ بھاگتا ہوا شخص اچھل کر ہم سے دس گز کی دوری پر گرا اور بے حرکت ہو گیا۔ ریسٹوران کے بڑے بڑے شیشوں میں سے اندر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک سات آٹھ مسلح افراد اندر داخل ہوئے' ان میں سے کم از کم چار افراد کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ تھا۔ اندر گھستے ہی انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ریسٹوران میں موجود جوڑے چیختے چلاتے باہر کی طرف دوڑے' ان میں سے کئی کو گولیاں لگیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے بے اختیار مائیکل اور شائستہ کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ اسی دوران میں سوئمنگ پول کی طرف سے بھی مسلح افراد کی ایک ٹولی برآمد ہوئی۔ ان میں سے بیشتر انڈین اور سری لنکن تھے ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ خوفناک آوازوں میں چلا رہے تھے اور آس پاس نظر آنے والے ہر نیگرو اور سفید فام پر فائر کر رہے تھے۔ میں نے ویرا کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ ویرا کا پاؤں کسی شے سے ٹکرایا اور وہ ایک بار پھر چلا اٹھی۔ اس کے پاؤں میں اسی شعلہ بدن لڑکی کی لاش پڑی تھی جس نے صرف چند سیکنڈ پہلے ہم سے اسنیکس کے بارے میں پوچھا تھا۔ دو گولیاں اس کے نازک رخسار پر لگی تھیں اور اسے راہی عدم کر گئی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔ او خدا' یہ کیا ہو گیا ہے؟"

ویرا کے منہ سے خدا کا لفظ سن کر اس سنگین صورت حال میں بھی مجھے تعجب کا احساس ہوا۔ اب دو طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ حملہ آوروں کی جو ٹولی ریسٹوران میں گھسی تھی' وہ بہت زیادہ مشتعل تھی اور ان کے پاس اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کر کے انہوں نے پلک جھپکنے میں ریسٹوران کے دیوہیکل شیشوں کو چکنا چور کر دیا اور ہر آرائشی شے کا جنازہ نکال دیا۔ خودکار رائفل کا ایک برسٹ وسیع و عریض ٹی وی کے اسکرین پر لگا' اس میں سے شعلے نکلے اور پچھلے حصے نے آگ پکڑ لی۔ یوں لگتا تھا کہ غلاموں کا کوئی سرکش گروہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے اور "تخت یا تختہ" کے مصداق اپنے رستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ملیامیٹ کر رہا ہے۔ یہ فائرنگ یقیناً گارڈز کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ تڑتڑ کی بھیانک آوازوں اور لوگوں کی چیخ و پکار نے اس عشرت کدے کو ایک دو منٹ کے اندر ہی جہنم کدہ بنا دیا۔

اچانک ویرا کی چیخ سنائی دی' اس نے پکار کر کہا "استقی۔۔۔!"

میں نے ویرا کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ میری نظر ماسٹر استقی پر پڑی۔ وہ باغیچے کی طرف سے نکلا تھا اور پوری رفتار سے بھاگتا ہوا مین گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ یقیناً وہ گارڈز کے پاس پہنچنا چاہتا تھا مگر تیس چالیس میٹر کا یہ فاصلہ بہت کٹھن تھا۔ ایک انڈین سکھ استقی کے تعاقب میں تھا۔ دونوں تیز رفتاری سے آگے پیچھے بھاگتے میرے سامنے سے گزرے۔ انڈین نے بھاگتے بھاگتے رائفل کا دستہ بڑے زور سے استقی کے سر میں مارا۔ وہ فٹ بال کی طرح اچھل کر دور جا گرا۔ سکھ سردار پھر اس پر جھپٹا مگر اس سے پہلے ہی سردار کے پہلو میں گولیاں لگیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سوئمنگ پول میں جا گرا۔ استقی کے سر میں یقیناً بہت شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ جہاں کا تہاں بے حرکت پڑا تھا اور گولیاں اس کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ویرا رونے لگی "اسے گولی لگ جائے گی' خدا کے لیے اسے بچائیں۔"

اس اندھا دھند فائرنگ میں اوٹ سے نکلنا موت کو دعوت دینا تھا پھر میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ باغی گروپ کا پلہ بھاری ہو رہا ہے۔ انہوں نے چار پانچ گارڈز کو بھون کر رکھ دیا تھا اور باقی کلب کے مین گیٹ سے باہر پسپا ہو گئے تھے۔ میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے نکلا اور جھک کر بھاگتا ہوا استقی کی طرف گیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا اور خون اس کے بالوں میں چمک رہا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا اور اس طرح اپنے کولہے سے لگا لیا کہ اس کے پاؤں فرش پر ہی گھسٹ رہے تھے۔ جو سکھ سردار گولی کھا کر تالاب میں گرا تھا اس کی رائفل کنارے پر ہی پڑی تھی۔ میں نے وہ رائفل اٹھائی اور استقی سمیت ایک قریبی کمرے میں گھس گیا۔ اس دوران میں کئی گولیاں میرے آس پاس سے سنسناتی ہوئی گزری تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر زخمی "ماسٹر استقی" نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر میں نے اسے فرش پر ہی لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس اندھا دھند فائرنگ میں سیدھا کھڑا ہونا شدید خطرے کا باعث تھا۔

وہی ہوا جس کا پہلے سے اندازہ تھا۔ باغی گروپ نے

گارڈز کو کلب میں سے پسپا کردیا۔ باغیوں کی مزید کئی ٹولیاں بھی موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ ان میں زیادہ تر انڈین تھے امریکن اور تھائی بھی نظر آرہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا دو تین پاکستانی بھی تھے۔ ان میں سے ایک تہائی افراد کے پاس آتشیں اسلحہ تھا۔ باقی چاقوؤں' آہنی ڈنڈوں اور زنجیروں وغیرہ سے مسلح تھے۔ ان کے چہرے جوش سے دہک رہے تھے...... اور آنکھوں میں بغاوت کے شعلے تھے۔ وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے اور اپنی آزادی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو پامال کردینا چاہتے تھے۔ وہی فطری خواہش جو روزِ آفرینش سے قدرت نے انسان کے ذہن میں نصب کر رکھی ہے۔ وہی دیوانہ جذبہ' جو کسی زنجیر' کسی ہتھکڑی' کسی دیوار کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ جذبہ انسان کو بتاتا ہے کہ وہ آزاد پیدا ہوا تھا اور اسے آزاد رہنا ہے۔ تمام دنیا کے ارشاد احمد' مائیکل اور گنگ مل کر بھی ایک ناتواں شخص کے اندر سے آزادی کی خواہش ختم نہیں کرسکتے۔ میں ان باغیوں کے تمتمائے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔ میں ان کے انجام کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھا پھر بھی ان کی دلیرانہ کوشش دل و دماغ کو متاثر کررہی تھی اور مجھے اپنے سراپا۔ میں بھی جوش اور سنسنی کی ایک لہر محسوس ہورہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ اسٹی یہاں محفوظ نہیں ہے۔ باغی ٹولا کسی بھی وقت اس کمرے میں داخل ہوسکتا تھا۔ یہ کمرا دراصل سوئمنگ پول کا "کاسٹیوم روم" تھا۔ یہاں کپڑے وغیرہ رکھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی الماریاں بنی ہوئی تھیں' اس کے علاوہ لباس بدلنے کے لیے بھی چھوٹے چھوٹے کیبن تھے۔ میں اسٹی کو ایک ایسے ہی کیبن میں لے گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ فی الوقت اسے چھپ جانا چاہیے ورنہ اس کے لیے شدید خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔ کیبن کے اوپر واقع ایک چوکور خانے میں' میں نے اسے گھسیڑ دیا اور ہدایت کی کہ جب تک میں نہ کہوں وہ یہاں چپ چاپ دبکا رہے۔ چوکور خانے کا دروازہ میں نے باہر سے مقفل کردیا۔

جونہی میں کمرے میں واپس پہنچا چار پانچ افراد دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے' ایک آسٹریلین رائفل سے مسلح تھا "کون ہو تم؟" ایک شخص نے اردو میں مجھ سے پوچھا۔

"تم میں سے ہی ہوں۔" میں نے کہا "پکڑ کر لایا گیا ہوں۔"

"رائفل کہاں سے لی ہے؟"

"ابھی باہر پڑی ہوئی ملی ہے۔"

میں نے رائفل اس شخص کی طرف بڑھادی۔ اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا پھر ہونٹ چبا کر بولا "ٹھیک ہے اسے پاس رکھو۔ کوئی بھی گورا یا ٹیگرو حملہ کرے' بے در بھون ڈالو۔"

ایک دوسرا شخص بولا "گھبرانے کی بات نہیں جگر! ٹ... پاس میں اپنا قبضہ ہوگیا ہے' ایک آدھ گھنٹے میں یہ سارا گ... خانہ صاف ستھرا کردیں گے۔" اس کے منہ سے یہاں ... کرتا دھرتا لوگوں کے لیے گالیوں کی بوچھاڑ نکل گئی۔

ریستوران کی بالائی منزل سے بہت شور سنائی دے ... تھا' پھر ایک گونج دار نعرے کی آواز آئی۔ یقیناً بہت سے لوگوں نے مل کر ایک دروازے کو دھکا دیا تھا اور اسے توڑ کر اندر گھس گئے تھے۔ دروازہ ٹوٹنے کے چند ہی سیکنڈ بعد ... نسوانی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ... لڑکیاں تھیں جو حرام کاری کے لیے مخصوص کمروں میں رکھی گئی تھیں۔ یہ کمرے...دوسری منزل پر واقع تھے۔ ... مجھے اور صفدر کو ان کمروں کے بارے میں بڑی بے باکی سے بتایا تھا۔ جونہی چیخوں کی آوازیں آئیں' کمرے میں گھس آنے والے افراد باہر چلے گئے' میں ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔ رائفل بدستور میرے پاس تھی۔ سوئمنگ پول کے آس پاس اور ریستوران کے سامنے کم از کم پانچ لاشیں بکھری پڑی تھیں' ایک سکھ فائرنگ کا شکار ہوکر میرے سامنے تالاب میں گرا تھا۔ ایک گھوڑا بدکا بدکا سا باغیچے میں پھر رہا تھا۔ اس کی ٹانگ میں کارتوس کے چھرے لگے تھے اور خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ یہ وہی چتکبرا گھوڑا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے "جوئم" نے تھائی لڑکی کو زبردستی سوار کیا تھا۔ اب سواری کا پتا تھا اور نہ سوار کرانے والے کا۔ باغی قیدیوں کی ٹولیاں ہر طرف دندناتی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک گورے کے کپڑے پھاڑ ڈالے تھے۔ اسے بالکل ننگا کرکے آہنی ڈنڈوں اور جوتوں سے مار رہے تھے' وہ ادھ موا ہوگیا تو اسے کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے "کیسینو" کی جانب لے گئے۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا قطعی غیر متوقع اور ناقابلِ گمان تھا۔ بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ بردوں کی ایک جمعیت نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بغاوت کی ہے اور انتظامیہ کو روند کر رکھ دیا ہے۔ اردگرد ان کا مکمل کنٹرول نظر آرہا تھا اور انہوں نے ابھی ابھی دعویٰ کیا تھا کہ کلب سے باہر بھی انہوں نے بردہ فروشوں کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ میری دلی تمنا تھی کہ ایسا ہی ہوا ہو۔ کوئی انہونی

ہوگئی ہو اور ماریا ٹرسٹ کی انتظامیہ مفلوج ہوکر رہ گئی ہو۔ تاہم حقائق سے نگاہ چرانا بھی دانش مندی نہیں تھی۔ اور یہ ٹھوس حقیقت تھی کہ یہاں کی انتظامیہ غیر معمولی طور پر طاقت ور اور جدید ترین سہولتوں سے لیس تھی۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ وہ کسی باغی گروپ کے سامنے اتنی جلدی گھٹنے ٹیک دے گی۔ خدشہ تھا کہ وہ بہت جلد طاقت کے ساتھ حرکت میں آئے گی اور یہاں خاصا خون خرابا ہوگا۔

میرے لیے یہ بڑے تذبذب کے لمحے تھے۔ میں اندازہ نہیں کرپا رہا تھا کہ ٹرسٹ میں ہونے والی یہ بغاوت کس پیمانے پر ہوئی ہے اور اس کی کیا شدت ہے۔ اگر یہ ایک زور دار کوشش تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کوشش کا ساتھ نہ دے کر کہیں میں غلطی تو نہیں کررہا اور اگر یہ صرف بچاس ساٹھ افراد کی کارروائی تھی تو پھر بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان لوگوں کو خون خرابے سے کیسے بچایا جاسکتا ہے۔ وقتی طور پر تو یہی نظر آرہا تھا کہ باغی گروپ قرب وجوار پر چھا گیا ہے اور سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو تہس نہس کررہا ہے۔ ان لوگوں کا ساتھ دینا آسان اور فائدہ بخش محسوس ہورہا تھا لیکن میرے اندر کی آواز مجھے اس اقدام سے روک رہی تھی۔

کلب کی حدود کے اندر اب فائرنگ نہیں ہورہی تھی مگر باہر سے مسلسل ایسی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی اکا دکا فائر ہوتا تھا' کبھی ایک دم برسٹ چل جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد سات آٹھ افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان میں چھوٹی چھوٹی داڑھی والا ایک ہندوستانی نوجوان سب سے آگے تھا۔ اس کے ماتھے پر سیاہی کا ہلکا سا نشان گواہی دے رہا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا "وہ حرامی لڑکا کہاں ہے؟"

"کون سا لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے خود تمہیں اس لڑکے کے ساتھ کمرے کی طرف آتے دیکھا ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

میں سمجھ گیا کہ نوجوان کا اشارہ اسٹی کی طرف ہے۔ نوجوان اور اس کے دیگر ساتھی بے حد مشتعل نظر آتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اسٹی کو دیکھتے ہی جان سے مار ڈالیں گے۔ اسٹی کے بارے میں میرے تجربات اور خیالات بھی زیادہ اچھے نہیں تھے لیکن کچھ بھی تھا وہ ایک بچہ تھا۔ میں اسے بچانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے کہا "شاید تم ماسٹر اسٹی کی بات کررہے ہو جس کے سر پر رائفل کا بٹ لگا تھا۔"

"ہمیں اس حرامی کا نام معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ وہ بدمعاش ہے اور قتل کے لائق ہے۔ تم نے اسے کہاں چھپایا ہے؟"

"میں کہاں چھپاؤں گا۔ وہ میرے ساتھ کمرے تک پہنچا ہی نہیں۔ اسے ہوش آگیا تھا۔ دروازے ہی میں وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر مین گیٹ کی طرف نکل گیا۔"

مسلمان نوجوان نے ایک دم میرا گریبان تھام لیا "تم بکواس کرتے ہو۔ تم نے اس لڑکے کو پناہ دی ہے۔ تم ان بردہ فروشوں کے ساتھی ہو۔"

ایک دوسرے شخص نے تیزی سے میری کلائی تھام کر جھٹکا دیا۔ اس نے میری کلائی اپنے ساتھیوں کے سامنے کی اور وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے۔ یکایک بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس ٹرسٹ میں موجود ہر بردے کی کلائی میں ایک RING موجود تھا۔ اس RING پر اس کا شناختی نمبر اور دیگر کوائف درج ہوتے تھے۔ میری کلائی میں یہ رِنگ نہیں تھا "تم جھوٹ بولتے ہو۔" ایک سکھ چیخا "تم ہمارے میں سے نہیں ہو۔"

اس نے باقاعدہ میری رائفل پر ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن اسی دوران میں آسٹریلین قیدی آگے آگیا۔ وہ اپنی زبان میں ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ میں جو کوئی بھی ہوں بہرحال ان کا ہمدرد ہوں۔ (یہ آسٹریلین اسی گروپ میں شامل تھا جو ہرکولیس پر یہاں پہنچا تھا) وہ پنج ذات کا شخص تھا اس کی بات پر کسی نے دھیان دیتا تھا۔ ویسے بھی اس کی زبان سمجھنی کافی مشکل تھی۔ داڑھی والے نوجوان نے چلا کر ساتھیوں سے کہا کہ وہ اس ساری جگہ کی تلاشی لیں۔ باغی گروپ کے ارکان کمرے میں اور ان چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں دندنانے لگے جو کپڑے بدلنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ رائفل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے تہیہ کررکھا تھا کہ اگر اسٹی کو جانی نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی تو میں بھرپور مزاحمت کروں گا۔ یہ ایک اصولی فیصلہ تھا اور مجھے اس کے بارے میں کسی قسم کا تذبذب نہیں تھا۔ باغی افراد کا جو گروپ اب اندر گھسا تھا ان میں سے صرف دو افراد کے پاس اسلحہ تھا۔ ایک رائفل تھی اور ایک ریوالور۔ میں ان کی "قرار واقعی" مزاحمت کرسکتا تھا۔ تاہم اس کی نوبت نہیں آئی۔ اچانک وہ سب کچھ ہوگیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ کلب کا مین گیٹ ٹوٹنے کی آواز آئی' اس کے ساتھ ہی ریستوران کی جانب دو زوردار دھماکے سنائی دیے۔ یہ چند

گرینیڈ کے دھماکے تھے۔ چاروں طرف دھواں اور بارود کی بُو پھیل گئی۔ ایک دم بہت سے مسلح گارڈز دھاوا بول کر اندر گھس آئے۔ ان کے سروں پر سیفٹی ہیلمٹ تھے اور انہوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ وہ سب کے سب جدید خود کار رائفلوں سے مسلح تھے۔ غیر معمولی پھرتی سے انہوں نے کلب کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا۔ انہیں دیکھ کر باغی گروپ کے ارکان نے بھی بھاگ بھاگ کر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ وہ سات آٹھ افراد جو میرے آس پاس موجود تھے وہ بھی افراتفری کے عالم میں باہر نکل گئے۔ داڑھی والے نوجوان کی ہدایت پر انہوں نے تباہ شدہ ٹی وی سیٹ اور سوئمنگ پول کی ایک دیوار کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ ان سب کا رخ کلب کے مین گیٹ اور ریسٹوران کی طرف تھا۔

میرے دل میں باغی گروپ کے لیے ہمدردی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ ان کا انجام ٹھیک ہونے والا نہیں۔ انہوں نے جوش میں آکر ایک ایسا کام کر ڈالا تھا جو ان کی طاقت اور ہمت سے بڑھ کر تھا۔ اب وہ سب شدید خطرے میں تھے۔ قرب و جوار میں پہلے ہی پانچ چھ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اب ان لاشوں میں خاطر خواہ اضافہ ہونے والا تھا۔ لوڈڈ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں کمرے کی دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور کھڑکی سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اچانک بغیر کسی وارننگ یا اعلان کے گارڈز نے باغی گروپ پر ہلہ بول دیا۔ شدید دو طرفہ فائرنگ سے در و دیوار لرز اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آنسو گیس کی نہایت تیز بُو محسوس ہوئی۔ میرے گلے میں پھندا سا لگ گیا اور کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ آنکھوں میں جیسے لال مرچیں ڈال دی گئی تھیں۔ مجھے استقی کا خیال آیا۔ وہ چوبی خانے میں بند تھا اور دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ مختصر جگہ میں اس کا دم گھٹ سکتا تھا۔ میں دوڑ کر گیا اور چوبی خانے کا دروازہ کھول کر استقی کو باہر کھینچ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں تک نہیں۔ میں نے اپنا رومال گیلا کر کے اس کے منہ پر لپیٹا اور اسے فرش پر لٹا دیا۔ اشک آور گیس کا اثر بڑھتا جا رہا تھا اور کھڑکی سے باہر کا منظر لرزہ خیز تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کم از کم چار افراد کو گولی لگی اور میں نے انہیں فرش پر گرتے دیکھا۔ یہ کسی ہارر فلم کا سین لگتا تھا یا ڈراؤنے خواب کا منظر۔ ریسٹوران کی طرف دستی بموں کے دو دھماکے مزید سنائی دیے۔ یہ نہایت زوردار دھماکے تھے۔ کسی عورت کا دھواں دیتا ہوا سینڈل اڑتا ہوا آیا اور کھڑکی سے چند فٹ کی دوری پر گرا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ سینڈل والی کا کیا حال ہوا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ تباہ ہونے والے ویوجیکل ٹی وی سیٹ کے قریب ایک پاکستانی لڑکے کے پیٹ میں رائفل کا برسٹ لگا۔ وہ دوڑتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا۔ اس کا رنگ پلک جھپکنے میں ہلدی ہو گیا تھا "مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔" وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے چیخا۔ خون اس کی انگلیوں کے اندر سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا پھر وہ فرش پر گرا اور جاں کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔

میرے ہاتھ رائفل کے دستے پر بے قراری سے حرکت کر رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر باہر نکلوں اور مزاحمت کرنے والوں میں شامل ہو کر ظلم کے پہرے داروں سے بھڑ جاؤں۔ مگر یہ دل کی آواز تھی۔ دماغ کی آواز مختلف تھی۔ ذہن کا مطالبہ تھا کہ دل پر جبر کر کے یہ سب کچھ جھیل لیا جائے۔ کسی غیر معمولی موقع کے لیے ایک معمولی موقع کو ضائع کر دیا جائے۔ باغی گروپ کے بے پناہ جوش و خروش کے باوجود یہ ایک معمولی موقع ہی تھا۔

تقریباً تین چار منٹ تک دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی پھر باغی گروپ کے پاس ایمونیشن ختم ہو گیا۔ وہ بس اکا دکا فائر کرنے لگے۔ بلٹ پروف جیکٹس والے گارڈز دو اطراف سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اس آخری حملے میں کم و بیش دس افراد کو ہلاک اور تین کو پکڑ لیا گیا۔ پکڑے جانے والوں میں سے کئی افراد ابھی تک جوش میں تھے۔ وہ اپنے عبرت ناک انجام سے باخبر ہونے کے باوجود زوردار نعرے لگا رہے تھے اور گارڈز کے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا مسلمان نوجوان بھی ان میں شامل تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی اور آنسو گیس کی شدت سے اس کی آنکھیں تر بتر ہو رہی تھیں۔ تمام قیدیوں کو مار مار کر فرش پر اوندھا لٹا دیا گیا اور مختلف چیزوں سے ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ قرب و جوار میں باغی بردوں کی کم و بیش پندرہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ انہیں ٹانگوں اور بازوؤں سے گھسیٹ کر ایک جگہ جمع کیا گیا اور ان میں سے ہر ایک کا اسلحہ اس کی لاش پر رکھ دیا گیا اس اثنا میں ماسٹر استقی کا چچا ہین بھی مجھے وہاں نظر آیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ تیزی سے چاروں طرف گردش کر رہی تھی اور وہ گارڈز کو چیخ چیخ کر احکامات دے رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گارڈز کو ماسٹر استقی کی تلاش کے سلسلے میں کہہ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں استقی سے کچھ کہتا وہ خود ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ استقی کو صحیح سلامت دیکھ کر ہین اور

گارڈز کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ گارڈز نے نو عمر ولی عہد کو گھیرے میں لے لیا اور مرہم پٹی کے لیے باہر لے گئے۔ میں بھی اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آیا۔ گارڈز نے رائفل مجھ سے لے لی۔ ہین نے میری خیر خیریت دریافت کی۔ استقی کے حوالے سے کچھ اس نے پوچھا نہ ہی میں نے جتایا۔ یہ لوگ بے خبر تھے کہ استقی کی حفاظت کے لیے میں نے کتنا شدید خطرہ مول لیا تھا۔

میں نے ہین سے پوچھا "یہ سب کیا ہوا ہے۔ کون لوگ تھے یہ؟"

"بس یوں سمجھو کہ بے وقوف مہم جوؤں کا ایک گروہ تھا۔ ایک غدار شخص کے بہکانے میں آگیا۔" ہین نے افسردگی سے کہا۔

"کنگ تو خیریت سے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن کچھ اہم افراد مارے گئے ہیں۔ ان میں ہرکولیس کا کپتان جم بھی شامل ہے۔"

کپتان جم کا نام سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ وہ فربہ اندام شرابی مائیکل کے رازداں دوستوں میں سے تھا۔ ابھی کل میں نے اسے کیمپس کے اندرونی حصے کی طرف آتے ہوئے ایک راہداری میں دیکھا تھا۔ اب میں اس کے مرنے کی خبر سن رہا تھا۔ ابھی میں اور ہین باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک اسٹریچر ہمارے سامنے سے گزرا۔ اسٹریچر پر ایک فربہ اندام جسم تھا جو چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسٹریچر قریب پہنچا تو ہین نے لاش کے چہرے سے خون آلود چادر ہٹائی۔ اندیشے کے مطابق یہ کپتان جم ہی تھا۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا اور چہرے پر لپ اسٹک کے داغ نظر آ رہے تھے۔ یہ علامتیں مرنے والے کے آخری لمحات کی کہانی سنا رہی تھیں جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کپتان جم حملے کے وقت کلب کے شاندار ریسٹوران کی بالائی منزل پر پایا گیا تھا۔ وہاں عیاشی کی غرض سے جو کمرے اور سوئٹس بنائے گئے تھے وہ ان میں سے ایک میں موجود تھا۔ حملہ آور دروازہ توڑ کر اندر گھسے تھے۔ جم کے پیٹ میں چاقو کے سات آٹھ زخم آئے تھے اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا تھا۔ تیس برس تک سمندر کی لہروں سے لڑنے والا ایک پُرسکون رات کی آغوش میں جان ہار گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مائیکل اور سیڈ انچارج ڈوجون بھی موقع پر پہنچ گئے۔ مائیکل کا پسٹل اس کے ہاتھ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی حبشی گارڈز کو چیخ چیخ کر ہدایات دیں اور ان سے کہا کہ وہ کونے کھدروں کی اچھی طرح تلاشی لیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی بچا کھچا حملہ آور ابھی یہاں موجود نہ

آسیب

آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۷۵ روپے

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰- عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

اپنے قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

هو۔ چین کے پوچھنے پر مائیکل نے بتایا کہ کوریڈور نمبر ۳ کی پہلی اور دوسری لین میں بھی فائرنگ ہوئی ہے۔ یہ قریباً پندرہ حملہ آور تھے جنہوں نے اسلحے کے اسٹور کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ گارڈز نے ان کا مقابلہ کیا۔ اس جھڑپ میں تین گارڈز سمیت آٹھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ مائیکل نے بتایا کہ صورت حال اب مکمل قابو میں ہے اور چند افراد جو یہاں وہاں چھپ گئے ہیں انہیں ڈھونڈا جا رہا ہے۔

مائیکل اور چین کے درمیان ہونے والے گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ چار پانچ افراد کی ایک ٹولی نے کیمپس کے نکاسی کے راستے پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش جزوی طور پر کامیاب بھی ہوگئی تھی مگر پھر گارڈز کو مزید کمک پہنچ گئی اور لفٹوں کے قریب ہونے والی جھڑپ میں دو افراد کو ہلاک اور دو زخمیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان اطلاعات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ کوئی اتفاقیہ ہنگامہ نہیں تھا بلکہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چین نے اشارہ دیا تھا کہ ان کے اپنے لوگوں میں سے ہی کسی نے غداری بھی کی ہے۔ اب معلوم نہیں تھا کہ غدار کون ہے اور اس کی غداری کی نوعیت کیا ہے۔ کلب کی حدود میں گارڈز کی زبردست سرگرمی دکھائی دے رہی تھی' تاہم جب ہم کلب کی حدود سے باہر نکلے تو وہاں بھی ہر طرف نیلی وردیاں نظر آئیں۔ تنے ہوئے چہروں والے گارڈز ہر گوشے اور ہر موڑ پر چوکس کھڑے تھے۔ خاص طور سے کنگ کی قیام گاہ کی طرف جانے والے راستے پر زبردست نگرانی تھی۔ یہاں مجھے بہت سے چکنا چور شیشے دکھائی دیے اور دروازوں پر گولیوں کے نشان بھی نظر آئے۔ کئی گارڈز رکوع کے بل جھکے ہوئے تھے اور گولیوں کے خول جمع کر رہے تھے۔ ایک جگہ فرش خون سے سرخ تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زخمی یا "ہلاک شدہ" کو فرش پر گھسیٹا گیا ہے۔ ہر چہرہ خوف و ہراس اور پریشانی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ اسفی کی خبر گیری کے لیے مائیکل اسپتال کی طرف چل دیا۔ میں اور چین بھی اس کے عقب میں تھے۔ اسپتال پہنچ کر پتا چلا کہ "مسٹل ماسٹر" کو مرہم پٹی کے بعد فارغ کردیا گیا ہے اور وہ اب اپنے والد کے پاس ہے۔

مائیکل نے مجھے واپس ہوسٹل میں پہنچنے کی ہدایت کی اور اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ یہاں ہونے والے ہنگامے کے بارے میں میں کسی سے بات نہیں کروں گا حتیٰ کہ اپنے ساتھیوں سے بھی نہیں۔ اس کے بعد مائیکل اور چین انتظامی امور کی نگرانی کے لیے کلب کی طرف چلے گئے' میں لفٹوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک ذیلی راہداری میں سے گزرتے

ہوئے' مجھے زبردست چیخ و پکار سنائی دی۔ کئی افراد بیک زبان دہائی دے رہے تھے۔ ان کی لرزہ خیز آوازیں قرب و جوار میں شدت سے گونج رہی تھیں۔ میں ان آوازوں کا ماخذ ڈھونڈنے کے لیے آگے بڑھا۔ دو محافظ مجھے روکنے کے لیے آگے آئے مگر پھر مجھے پہچاننے کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ میں ایک نیم تاریک راہداری سے گزر کر ایک لاک اپ کے سامنے پہنچا' یہاں کا منظر دیکھنے کے لیے بہت سے افراد دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں نیلی وردیوں والے پہرے دار بھی تھے اور دیگر افراد بھی۔ لاک اپ میں کم و بیش نیم افراد برہنہ حالت میں الٹے لٹکے ہوئے تھے۔ دو درجن "جلاد صورت" حبشی ان بدنصیب افراد کو کی بوکو سے ضربیں لگا رہے تھے۔ یہ بڑا دل سوز منظر تھا۔ بید کی منحوس چھڑی انسانی گوشت سے ٹکراتی تھی اور اذیت کی ایسی ہولناک لہر پیدا کرتی تھی کہ معضوب کا چہرہ بگڑ جاتا تھا۔ ہر معضوب اپنی اذیت کے گھیرے میں تھا۔ اپنا دکھ جھیل رہا تھا اور بس اپنے چھٹکارے کا سوچ رہا تھا۔ یہ سب وہی افراد تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے کلب کی حدود سے پکڑے گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مار کھانے والوں میں سے کئی افراد بے ہوش ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا بھی تھا' وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور بے ہوشی ہی کی حالت میں اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ غالباً اسے کسی قسم کا دورہ پڑ گیا تھا۔ ایک اور شخص کے منہ سے بے ہوشی کی حالت میں مسلسل رال بہہ رہی تھی۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ انہوں نے اپنے قفس کو توڑنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی۔ اس ناکام کوشش کی سزا میں انہیں اذیت کے خوفناک شکنجے میں جکڑ دیا گیا تھا۔ مزید دکھ کی بات یہ تھی کہ اذیت کے خوفناک دریا سے گزرنے کے بعد بھی ان کے نصیب میں کنارہ نہیں تھا۔ ان کی موت یقینی تھی۔ معافی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ان لوگوں کی حالت زار دیکھ کر دل پر عجیب سا بوجھ پڑ گیا۔ ان میں زیادہ تر انڈین تھے۔ کچھ سری لنکن نامل تھے۔ چند تھائی اور دو تین پاکستانی بھی ان بدنصیبوں میں شامل تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چار مزید افراد کو اذیت کے جال میں جکڑنے کے لیے اس عقوبت خانے میں پہنچا دیا گیا۔ میں وہاں سے ہٹ آیا اور بوجھل قدموں سے لفٹوں کی طرف چل دیا۔ قریباً تیس مربع فٹ کے ایک لاک اپ میں تیس پینتیس قیدی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ایرانی اور ترک وغیرہ تھے۔ ان میں پانچ چھ عورتیں بھی تھیں اور دو بچے بھی۔ یہ سب لوگ گردنیں اس طرح جھکا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی ٹھوڑیاں

سینے سے جا لگی تھیں۔ ایک مسلح گارڈ لاک اپ کی آہنی سلاخوں کے سامنے زخمی چیتے کی طرح چکرا رہا تھا۔ غالباً اس کے حکم پر قیدیوں نے اس طرح گردنیں جھکا رکھی تھیں۔ اس قسم کا توہین آمیز سلوک عموماً پاکستان اور انڈیا کی جیلوں میں بھی قیدیوں سے کیا جاتا ہے۔ کسی بھی اعلیٰ افسر کی آمد پر انہیں اس طرح سر جھکا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یکایک ایک طرف سے شور بلند ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لفٹوں کی طرف سے گارڈز کسی شخص کو مارتے پیٹتے اندرونی حصے کی طرف لا رہے تھے۔ وہ ذرا قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک ایرانی تھا اور یہ ایرانی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کا نام جعفر رضا تھا۔ ناریا ٹرسٹ میں ہمارے ابتدائی دنوں میں یہ جواں سال شخص میرا اور صفدر کا روم میٹ رہا تھا۔ بعد ازاں جب مائیکل کا خبیث دوست مبارک امین میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا تو جعفر رضا مجھ سے خوف زدہ سا ہوگیا تھا۔ اس نے نجاہج سوزی سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کا کمرا بدل دے کیونکہ وہ ایک خطرناک قاتل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔ ایک "خطرناک قاتل" سے ڈرنے والا آج خطرناک بن قاتل کے نرغے میں تھا۔ دراصل وہ بھی اس باغی گروہ میں شامل تھا۔ جس نے کوئی دو گھنٹے پہلے کیمپس میں "ٹیک اوور" کرنے کی خون ریز کوشش کی تھی۔ گارڈز کی جوابی کارروائی کے بعد باغی گروپ کے کچھ افراد تتر بتر ہو کر چھپ گئے تھے۔ اب ان افراد کو ڈھونڈ کر ان کی پناہ گاہوں سے نکالا جا رہا تھا اور ایک جگہ جمع کیا جا رہا تھا۔ میں نے ایرانی جعفر رضا کی صرف ایک جھلک دیکھی پھر وہ گارڈز کے نرغے میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ جعفر کی آخری جھلک ہے۔ اس کے بعد میں اسے شاید ہی دیکھ سکوں۔ میں نے ایک اور بات نوٹ کی اور سخت حیران ہوا۔ راہداری میں شدید شور شرابا ہونے کے باوجود لاک اپ میں بیٹھے افراد نے گردنیں اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح ارد گرد سے لاتعلق بیٹھے رہے تھے۔ یہ بے بسی محسوس کر کے دل پر پڑا ہوا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ لفٹوں کے قریب بھی ہنگامے کے آثار واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اب یہاں مکمل سکوت تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے جو تہلکہ یہاں مچا تھا اس کی نشانیاں جا بجا نظر آ رہی تھیں۔ فرش پر چکنا چور ہونے والے شیشوں کے ٹکڑے تھے۔ اور جگہ جگہ گولیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔

لفٹوں سے کچھ فاصلے پر صاف شفاف دیوار کے ساتھ ٹیلی ویژن نصب تھا۔ ایسے ہی رنگین ٹیلی ویژن کیمپس کی سینکڑوں درجنوں جگہ نصب کیے گئے تھے۔ یہ ٹیلی ویژن ماریطانیہ کی نشریات کے علاوہ کیمپس کے اندر سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام بھی دکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ اہم اعلانات بھی نشر کیے جاتے تھے۔ اس وقت بھی ایک اہم اعلان ہی نشر ہو رہا تھا۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر کنگ براؤن کو دیکھا۔ وہ اپنے "روم" نامی کمرے میں ہی موجود تھا۔ چھپکلا اس کی گود میں تھا' تاہم عقب میں نیم عریاں حسیناؤں کے بجائے دو مسلح گارڈز نظر آ رہے تھے۔ ان گارڈز کے چہرے ساکت تھے اور آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ ٹی وی کے سامنے ڈھائی تین درجن افراد جمع تھے اور انہماک سے کنگ کی بات سن رہے تھے۔ وہ انگلش میں کہہ رہا تھا "جاں نثار ساتھیو! اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ حالات مکمل طور پر ہمارے کنٹرول میں ہیں۔ تمام سرکردہ افراد کو پکڑ لیا گیا ہے اور خدا نے چاہا تو وہ قانون کے مطابق سزا پائیں گے۔ یہ دراصل مٹھی بھر لوگ تھے جنہوں نے تھوڑے سے ذاتی مفاد کے لیے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ ہم مکمل تحقیقات کر رہے ہیں اور پس پردہ یا پیش پردہ کسی شخص کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ میں ان بہادر جوانوں کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا فرض بے مثال طریقے سے ادا کیا ہے۔ اور اب بھی کر رہے ہیں۔ میں آخر میں اپنے جاں نثار ساتھیوں سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ باغی گروپ کے کچھ افراد اب بھی کیمپس کے اندر پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ہماری فورس تندہی سے ان فسادیوں کو تلاش کر رہی ہے' آپ لوگ بھی اس سلسلے میں فورس کی مدد کریں۔ اپنے دفاتر اور رہائش گاہوں کی

چراغ

(دو جلدیں)

+ ایک کشمیری مجاہد کی داستان شجاعت۔
+ وادی کشمیر کے باسی اس کے فرزندوں کا پیام
ہم لے کے رہیں گے آزادی۔
+ کشمیر کی آزادی کے لئے مجاہدین کی جدوجہد مسلسل۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

خود بھی تلاشی لیں تاکہ کوئی ایسا مجرم قانون کی نظر سے چھپا نہ رہ سکے۔ شکریہ' خدا حافظ۔"

سنگ براؤن کی شکل ٹی وی اسکرین سے فیڈ آؤٹ ہوگئی۔ چند لمحے بعد ایک اناؤنسر کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس خوب صورت خاتون اناؤنسر نے پہلے انگلش اور پھر افریقی زبان میں اعلان کیا کہ اب ناظرین ماسٹر استقی سے ملیں گے جن کے بارے میں عام لوگوں میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ اناؤنسر نے کہا "ہز ہائی نس ماسٹر استقی اس واقعے میں زخمی ہوگئے تھے' انہیں آرام کی ضرورت تھی مگر وہ ناظرین کی خواہش پر ان کے سامنے تشریف لا رہے ہیں۔"

مختصر سے وقفے کے بعد اسکرین پر استقی کی تصویر ابھری۔ اس کے سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ بھی کچھ متورم تھی۔ ایک سفید فام کمپیئر بڑے ادب سے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ کمپیئر نے استقی سے چند رسمی باتیں کیں' اس کے بعد بڑے احترام سے پوچھا "ماسٹر استقی! قدرت نے آپ کو نئی زندگی دی ہے۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔ آپ کلب کے اندر پیش آنے والے واقعے کے چشم دید گواہ ہیں۔ کیا آپ اس واقعے کی کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے؟"

استقی نے شاہانہ انداز میں صوفے سے ٹیک لگائی اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بولا "میں اور جوم گھڑ سواری کی مشق کر رہے تھے۔ اتنے میں بیس تیس افراد کلب میں زبردستی گھس آئے اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ میں خود کو بچانے کے لیے مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ اسی دوران میں ایک حملہ آور نے میرے سر پر پیچھے سے رائفل کے دستے کی زوردار چوٹ لگائی۔ تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہوگیا پھر میں خود کو سنبھال کر اٹھا اور دوڑ کر ڈریسنگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس وقت چاروں طرف زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں ایک کیبن میں چلا گیا اور خود کو کیبن کے بالائی خانے میں چھپا لیا۔ حملہ آور دوبارہ میری تلاش میں ڈریسنگ روم کے اندر آئے مگر مجھے ڈھونڈ نہیں سکے۔ انہوں نے شاید مجھے دوڑ کر اندر گھستے دیکھا تھا۔ وہ حیران تھے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ اتنے میں ڈریسنگ روم سے باہر گارڈز اور حملہ آوروں میں سخت لڑائی شروع ہوگئی۔ کمرے میں گھس آنے والے لوگ بھی لڑائی میں حصہ لینے کے لیے باہر چلے گئے۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں لکڑی کے خانے میں سے نکل آیا اور لٹک کر فرش پر پہنچ گیا۔"

"اس وقت تو آنسو گیس بھی پھیلی ہوئی تھی۔" کمپیئر نے جملہ شامل کیا۔

"ہاں' جب میں کیبن سے باہر نکلا تو آنکھوں میں مرچیں لگ گئیں۔ ادھر کرسی پر ایک رومال پڑا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اسے پانی میں بھگویا اور منہ پر لپیٹ لیا۔"

"اس کے بعد آپ کتنی دیر ڈریسنگ روم میں رہے؟" کمپیئر نے پوچھا۔

"قریباً پانچ منٹ۔ کمرے کے فرش پر ایک گارڈ بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے' اسے پانی پلایا اور اس کے ہوش میں آنے کے بعد باہر نکلا۔"

استقی کی ایک اور خصلت سامنے آئی تھی' اور وہ یہ کہ وہ سفید جھوٹ بولتا تھا اور بڑی ڈھٹائی سے بولتا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا اس میں سچ صرف چار پانچ فیصد ہی تھا۔ اس سارے واقعے میں اس نے کہیں میرا ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مجھے امید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ میرے بارے میں ضرور کہے گا۔ وہ میرا تذکرہ بالکل ہی گول کر گیا تھا اور ایسا اتفاقاً نہیں ہوا تھا' وہ میری توقع سے زیادہ خرانٹ اور کینہ پرور ثابت ہو رہا تھا۔ میں وہاں کھڑا رہا اور اس عجیب و غریب نادر روزگار "بچے" کے بارے میں سوچتا رہا۔ جیسے ہم عمر بچے بیٹھ کر کہانیاں گھڑتے ہیں' وہ بھی بڑے اعتماد سے ٹی وی اسکرین پر باتیں گھڑ رہا تھا۔ سننے والے اس کی باتوں پر کہاں تک یقین کر رہے تھے' یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

اچانک کوئی میرے عقب میں میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا' میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اپنی کمر پر ریوالور کی نال کا مخصوص دباؤ محسوس ہوا تھا۔

میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میرے عقب میں ابن افلاطون سائیں عالی موجود تھا۔ اپنے مخصوص چلتے اور پیوند لگے لباس میں وہ سب سے الگ پہچانا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیچ کا ریوالور تھا اور آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی "چلو میرے آگے لگ کر ورنہ میں خون بھی قتل کر سکتا ہوں۔" اس نے پُراسرار انداز میں کہا۔ آواز سرسراتی ہوئی سرگوشی جیسی تھی۔

میرے عقب میں کوئی انٹرنیشنل قاتل بھی ہوتا تو میں اس کی دھمکی کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیتا جتنی سنجیدگی سے سائیں عالی کی دھمکی کو لینا پڑا۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی جذبے کے تحت کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ایسے شخص سے ڈرنا عین دانش مندی ہوتا ہے۔ سائیں عالی نے مجھے ریوالور کی نال سے ٹہوکا دیا۔

ایک لفظ کہے بغیر میں اس کے ساتھ چل دیا۔ ☆☆☆

ہاپل مچی ہوئی تھی۔ اس زیرِ زمین کیمپس میں ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں تھی۔ انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کی اجازت اور سفارش کے بغیر کوئی یہاں پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے قیاس لگایا کہ سائیں عالی کو یہاں لانے والا اس کا عقیدت مند نائب کپتان آرتھر ہوگا۔ بعد ازاں میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا۔ سائیں عالی نے ریوالور اپنی گدڑی میں چھپا رکھا تھا' گدڑی کے ایک سوراخ سے صرف اس کی نال باہر نکلی ہوئی تھی۔ ارد گرد موجود افراد اور گارڈز میں سے کسی کو شبہ تک نہیں ہوا کہ یہ عجیب و غریب حلیے والا شخص مسلح ہے اور مجھے ہانک کر لے جا رہا ہے "اس کمرے میں گھس جاؤ۔" سائیں نے حکم دیا۔

سامنے ایک کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دروازے کے شیشے میں گولیوں کے سوراخ نظر آرہے تھے۔ یہ کمرا شاید کسی کچن کا حصہ تھا' بارود کے ساتھ ساتھ کچے پیاز اور لہسن وغیرہ کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے اندر گھستے ہی سائیں بھی اندر گھس آیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" وہ پھنکارا۔

میں نے اس کی تسلی کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اس نے ریوالور کو اپنی بائیں ہتھیلی پر یوں گردش دی جیسے وہ ریوالور نہ ہو استرا ہو اور وہ میرے ہاتھ اوپر اٹھوا کر میری بغلیں صاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پانچ دس سیکنڈ تک مجھے گھورنے کے بعد وہ بولا "چلو اب اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ۔"

"وہ کس لیے؟"

"سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔" وہ ریوالور کو حرکت دے کر غرایا "چلو ٹانگ اوپر اٹھاؤ۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ٹانگ اوپر اٹھا دی۔

"شاباش' اب دوسری بھی اٹھاؤ۔" سائیں نے کہا۔

میں نے پہلی نیچے رکھ کر دوسری اٹھا دی۔ "ایسے نہیں۔" وہ پھر گرجا "پہلی بھی اوپر رکھو اور دوسری بھی اٹھاؤ۔"

"انہونی بات مت کرو۔ ایسا کوئی نہیں کر سکتا اور نہ کسی نے کیا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا ایسا۔" سائیں نے اعتراض کیا "یہ دیکھو میں کرتا ہوں۔"

اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے' پھر اپنے پاؤں پر اچھلا اور دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے موڑ لیں' فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر بولا "بتاؤ میں نے دونوں پاؤں اٹھائے ہیں یا نہیں؟"

"تم نے پاؤں نہیں اٹھائے' خود کو اٹھایا ہے۔ خود کو اٹھائے بغیر پاؤں اٹھانا اور بات ہے۔"

"تم اپنی بک بک بند کرتے ہو یا میں گولی چلاؤں۔" سائیں نے ریوالور میری طرف سیدھا کیا۔

اچانک ایک ساعت شکن دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں' کھڑکیوں کے کئی شیشے ٹوٹ کر اندر آگرے۔ کمرے سے باہر ایک دم چیخ و پکار مچ گئی۔ میں بے ساختہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں اٹھا۔ دھماکے کے ساتھ ہی کمرے میں اور کمرے سے باہر تاریکی پھیل گئی تھی۔ میں ٹٹولتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ کسی متبادل نظام کے تحت' بجلی کی سپلائی بحال ہوگئی اور در و دیوار پھر روشن ہوگئے۔ میں نے لفٹوں کے پاس کوریڈور میں لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ٹیلی ویژن کے عین سامنے پختہ فرش میں قریباً آٹھ فٹ قطر کا دو فٹ گہرا گڑھا نظر آرہا تھا۔ اس گڑھے کے ارد گرد بہت سی لاشیں اور انسانی جسم کے اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں اور چھت کے سامنے گوشت کے خون آلود لوتھڑے چپکے نظر آتے تھے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں صرف دو منٹ پہلے میں بھی موجود تھا اور ٹیلی ویژن پر ماسٹر استقی کا انٹرویو دیکھ رہا تھا۔ میں نے سائیں عالی کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف دھواں تھا اور بارود کی نہایت تیز بو پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ یہ سائیں عالی نجانے کیا شے تھا؟ اس کی پُراسراریت گزرنے والے ہر روز کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ مجھے ریوالور کے زور پر کوریڈور سے کمرے میں لے کر آیا تھا اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد بم کا زبردست دھماکا ہوگیا تھا۔ کیا یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا تھا۔ اگر اتفاقیہ نہیں ہوا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ سائیں عالی کو اس دھماکے کا پیشگی علم تھا۔ وہ جنات کی بات کرتا تھا مگر اس کی یہ بات میں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لی۔ ہاں اتنا میں جانتا تھا کہ سائیں ایک روحانی شخص ہے اور اس میں کچھ مافوق الفطرت صلاحیتیں موجود ہیں۔ ان خون ریز لمحوں میں ایک بار پھر بڑی شدت سے سائیں کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

دھواں ارد گرد کے سارے کمروں میں بھر گیا تھا۔ خطرے کے الارم ایک بار پھر بڑی شدت سے بج اٹھے تھے۔ چاروں طرف اسٹریچر گردش کر رہے تھے۔ گارڈز شور مچا رہے تھے اور زخمیوں کو اٹھا کر نامعلوم سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔ اب دہشت ہر طرف آسیب کی طرح رقصاں رہی تھی۔ اس دہشت کو کچھ وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کے آس پاس اس طرح کا جان لیوا دھماکا ہوا ہو۔ سماعت مفلوج ہو جاتی ہے' نظر دھندلا جاتی ہے اور دل کو ہر گھڑی میں یہ دھڑکا لگا ہوتا ہے کہ آس پاس مزید دھماکا خیز مواد بھی موجود

ہوگا جو کسی بھی لمحے پھٹ جائے گا۔ دھواں دھواں فضا میں سائیں عالی کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ موقع سے ہٹ جاؤں۔

○☆○

اگلے تین روز میں نے ہوسٹل میں اپنی قیام گاہ کے اندر گزارے۔ زریں، صفدر، غزالہ اور کلثوم بھی میرے ساتھ تھے۔ ہیڈ انچارج زوجون نے ہمیں ہدایت کردی تھی کہ ہم چار دیواری سے باہر قدم نہ نکالیں۔ اندر رہتے ہوئے ہمیں باہر کے حالات کا کچھ علم نہیں ہو رہا تھا۔ ٹیلی ویژن موجود تھا لیکن نرسٹ کے اندر سے جو پروگرام نشر کیے جاتے تھے وہ بند کردیے گئے تھے۔ ہماری رہائش گاہ کے ٹیلی فون بھی خاموش تھے۔ رہائش گاہ سے باہر پہرے داروں کی تعداد دوگنا کردی گئی تھی۔ پہلے دن تو کئی رات کے بعد وقفے وقفے سے دوبار فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی اور ایک بار خطرے کے الارم بجائے گئے۔ تاہم اس کے بعد مکمل خاموشی رہی۔ ہم نے اپنی خدمت پر مامور ملازموں سے سن گن لینے کی کوشش کی مگر بیرونی حالات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ خاص طور سے زیرِ زمین "کیمپس" کے حالات تو ہماری نگاہوں سے بالکل اوجھل تھے۔

دوسرے دن شام کو ٹیلی ویژن پر اندرونی نشریات کے چینل سے خبروں کا ایک مختصر بلیٹن نشر کیا گیا۔ اس بلیٹن میں بتایا گیا کہ کچھ فسادی لوگوں کی طرف سے نرسٹ میں ہنگامے اور خون ریزی کی جو کوشش کی گئی تھی، اسے سختی سے کچل دیا گیا ہے۔ شرپسند عناصر کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور نرسٹ میں مکمل امن اور سکون ہے۔ اگلے روز دوپہر کو ہمارے فون بھی ٹھیک ہوگئے۔ جو سب سے پہلا فون ہمیں آیا وہ چونکا دینے والا تھا۔ یہ فون میرے لیے تھا اور ماسٹر اسمتھی کی طرف سے آیا تھا۔ میری آواز پہچاننے کے بعد ماسٹر اسمتھی نے بڑے بارعب لہجے میں کہا "دیکھو مسٹر لمبے۔۔۔ مجھے بچہ مت سمجھنا۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ میری بات کو پورے دھیان سے سنو۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

"کس بات کا پتا؟"

"یہی کہ تم مجھے اٹھا کر ڈریسنگ روم میں لے کر گئے تھے اور تم نے مجھے الماری کے خانے میں بند کیا تھا۔"

"لیکن یہ سچ بولنے سے تم گھبرا کیوں رہے ہو؟"

"میں کسی سے نہیں گھبراتا لیکن۔۔۔ لیکن جو میں نے کہہ دیا بس وہ کہہ دیا۔ تم اس کو غلط نہیں کہو گے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو۔۔۔"

"تو کیا ہوگا؟"

"تم اسمتھی کو جانتے نہیں ہو لمبے! میں پھر کہتا ہوں، مجھے بچہ نہ سمجھنا۔ مجھے جس پر غصہ آجائے میں اس سے برا پیش آتا ہوں۔" اس کی آواز غصے سے لرز گئی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "جیسے تم کہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

"کوئی ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے۔ اس میں میری بے عزتی ہے۔" اس نے اپنی طرف سے بڑی دانائی کی بات کی۔

"اوکے۔۔۔ جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔"

اسمتھی نے فون بند کردیا۔ کتنا بھی خبیث سہی لیکن تھا تو وہ بچہ ہی۔ وہ ایک بے معنی بات کو اہمیت دے رہا تھا اور اس پر اڑ گیا تھا۔

اسی روز شام کو ہیڈ انچارج زوجون نے مجھے اطلاع دی کہ کل کیمپس میں ایک تقریب ہے اور وہاں مجھے صفدر سمیت آنا ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا "کنگ" برائن نے نرسٹ کے چیدہ چیدہ افراد کو کیمپس میں بلایا تھا۔ یہ ایک طرح سے اطمینان اور خوشی کے اظہار کی تقریب تھی کہ نرسٹ میں ہونے والی بغاوت کو کامیابی سے کچل دیا گیا ہے اور مجرم کیفرِ کردار کو پہنچے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تقریب کا سن کر ہمارے دل پر بھاری بوجھ سا پڑا تھا۔ یہ ایک طرح سے جبر کی کامرانی کی تقریب تھی۔ بہرطور اگلے روز شام کے وقت میں اور صفدر نیلگوں وردیوں والے دو گارڈز کے ہمراہ ہوسٹل سے کیمپس کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوسٹل اور زیرِ زمین کیمپس میں اب حالات معمول پر نظر آرہے تھے۔ کسی قسم کی ابتری نہیں تھی۔ ہر شخص اپنے حال میں مگن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تین چار روز قبل یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لفٹس کے قریب جس مقام پر بم دھماکا ہوا تھا، وہاں سب کچھ مرمت کردیا گیا تھا اور اب ہولڈر میں ٹی وی سیٹ نصب کیا جارہا تھا۔ دیواروں پر سے گولیوں کے نشانات بڑی حد تک ختم ہوگئے تھے اور متاثرہ شیشے وغیرہ بدل دیے گئے تھے۔ ہم کیمپس کی صاف شفاف راہداری میں چلتے ہوئے اسپتال کے قریب سے گزرے۔ ویرا کو دیکھ کر میں اور صفدر چونک گئے۔ وہ ایک وہیل چیئر پر تھی۔ دو نرسیں بڑی احتیاط سے اسے کیمپس کے اندرونی حصے کی طرف لے جارہی تھیں۔

ویرا کی نظر ہم پر پڑی۔ وہ چونک سی گئی۔ صفدر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رنگ بکھر گیا تھا۔ اس کے ایک گھٹنے اور پر چوٹ آئی تھی وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سر کے پچھلے حصے پر بھی بینڈیج نظر آرہی تھی۔ یقیناً یہ چار روز پہلے والے ہنگامے کی ہی چوٹیں تھیں۔ بہرحال اب وہ کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ اس نے باقاعدہ ہم دونوں سے مصافحہ کیا "آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔" وہ بولی۔

"اور تمہیں زخمی دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔" میں نے کہا۔

"نہیں، اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ چل سکتی ہوں بلکہ ضرورت پڑے تو شاید دوڑ بھی سکتی ہوں، لیکن ڈاکٹر صاحب مجھے زمین پر پاؤں اتارنے نہیں دیتے۔"

"یہ سب ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے دیوار کی اوٹ میں چھوڑ گئے تھے۔ جب فائرنگ بہت شدید ہوگئی تو مجھے وہاں سے نکل کر بھاگنا پڑا۔ چند قدم آگے مجھے ٹھوکر لگی اور میں ڈھلوان فرش پر دور تک لڑھکتی گئی۔ میرا سر سوئمنگ پول کی آہنی سیڑھی سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ پورے دو روز میں خواب آور دوا کے زیرِ اثر سوئی رہی ہوں۔ آج معلوم ہوا کہ "اے کلب" کے بڑے ہال میں فنکشن ہے۔ سوچا لیٹے لیٹے تھک گئی ہوں۔ چلو تھوڑی دیر ذرا رونق دیکھ لوں۔ ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں، سہارے سے چل بھی لیتی ہوں۔"

اس نے ازخود وہیل چیئر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ صفدر نے جلدی سے اسے سہارا دیا۔ اس نے دو چار قدم چل کر دکھایا، پھر نرسوں کی پُرزور درخواست پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ "کیوں جی، لنگڑی تو نہیں ہوگئی ہوں ناں؟" اس نے تحسین طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"پھر بھی ہے آپ کو ڈاکٹرز کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"آپ بھی ڈاکٹروں کے طرف دار بن گئے۔" وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس کی چالاکی نے مجھے دل ہی دل میں مسکرانے پر مجبور کیا۔ وہ جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر وہیل چیئر سے کھڑی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ صفدر اس کے قریب کھڑا ہے وہی اسے سہارا دے گا۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت جب کچھ چاہتی ہے تو اس کے لیے سو حیلے ڈھونڈ لیتی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم بلند و بالا چھت والے ایک شاندار ہال میں پہنچے۔ یہاں چار پانچ سو کے قریب نشستیں موجود تھیں مگر اس وقت ہال کی بہت سی نشستیں خالی تھیں۔ دراصل اس تقریب میں گنے چنے افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ نرسٹ کے پانچوں اہم ارکان زوجون، پین او اور تھی وغیرہ بھی یہاں وہاں بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر دیگر معززین کے لیے نشستیں موجود تھیں۔ کنگ براؤن کی آمد کا انتظار تھا۔ ویرا اپنی وہیل چیئر پر میرے اور صفدر کے درمیان بیٹھی

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کرنے والی داستان۔ اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۳۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول۔ دل میں اترنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر ۲ جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرمِ وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف جاپ۔ ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔
ڈاک خرچ فی کتاب ۳۰ روپے

علی میاں پبلی کیشنز
PH: 7247414 ... 20

تھی۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھی اور مسلسل بول رہی تھی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اس نے نہ صرف یہ کہ مجھے استقی کو اٹھا کر کمرے میں لے جاتے دیکھا تھا بلکہ بعد کے پورے حالات سے بھی وہ پوری طرح آگاہ تھی۔ وہ بولی "وہاں کمرے میں روشنی تھی اور شیشوں میں سے مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ آپ نے استقی کو ایک کیبن میں چھپا رہا تھا اس کے بعد آپ واپس کمرے میں آ گئے تھے۔ پہلے چند حملہ آور اندر آئے اور آپ سے بات چیت کر کے چلے گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ آ گئے۔ انہوں نے آپ کو دھمکانے کی کوشش کی اور آپ سے استقی کا پتا پوچھا مگر آپ ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ وہ تلاشی لینے لگے اسی دوران میں گارڈز تیار ہو کر آ گئے اور انہوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ شروع کر دیا۔"

"یعنی تم سارے واقعے کی چشم دید گواہ ہو۔"

"بالکل۔۔۔ اور یہی بات یہ ہے مسٹر شا! کہ میں آپ کی کوشش سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ زندگی موت تو قدرت کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن آپ اگر اس وقت استقی کے سامنے دیوار نہ بنتے تو وہ یقیناً باغی افراد کے ہاتھوں مارا جاتا۔"

"کیا تم نے یہ بات کنگ وغیرہ کو بھی بتائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تک تو کنگ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناں کہ دو روز تو میں خواب آور دوا کے زیر اثر رہی ہوں۔ کل صرف اپنی والدہ سے تھوڑی دیر کے لیے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے صرف اپنی چوٹوں کے بارے میں ہی بات ہوتی رہی۔"

میں زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اسٹیج کے ارد گرد ہلچل کے آثار نظر آئے۔ گارڈز اور پہرے دار پوری طرح چوکس ہو گئے پھر کنگ اپنے ذاتی محافظوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا اور اسٹیج پر اپنی نشست سنبھال لی۔ اس کے ارد گرد اس کے خاندان کے افراد اور مصاحبین کی نشستیں تھیں۔ فنکشن کا آغاز ہوا۔ ان افراد کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا جنہوں نے چند روز پہلے برپا ہونے والی بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنی جانوں کا "نذرانہ" پیش کیا اور کنگ کی نظروں میں سرخ رو ہو کر دنیا و آخرت کی "فلاح" پائی۔ ایک میوزیکل گروپ نے منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ پھر نوخیز دوشیزاؤں کے ایک گروپ نے ٹیبلو قسم کی چیز پیش کی۔ اس میں "عظیم کنگ" کو اپنا فرماں روا تسلیم کیا گیا۔ کنگ کو اس بات پر خراجِ عقیدت پیش کیا گیا کہ وہ ٹرسٹ کے زیر زمین نظام کو انتہائی خوبی سے چلا رہا ہے۔ اور دنیا کے بے نوا مسلے چلے

لوگوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے لیے زندگی کی نئی راہیں کھول رہا ہے۔ نیلہ میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ عظیم کنگ کے لیے یہاں کے لوگ اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے ہیں اور رہیں گے۔

اس کے بعد کچھ ایسے افراد کو سامعین کے سامنے لایا گیا جنہوں نے بغاوت کچلنے کی کارروائی میں دلیری سے حصہ لیا تھا اور نمایاں کارکردگی دکھائی تھی۔ ان میں نوجوان کارکی اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ آخر میں ماسٹر استقی کو اسٹیج پر دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹی موجود تھی تاہم وہ خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر فخریہ انداز میں اپنی روداد سنائی کہ شدید ترین فائرنگ کی زد میں آنے کے باوجود وہ اپنی "ہوشیاری اور دیانت" سے بچ نکلا تھا اور یہ قابلیت سب کے لیے متاثر کن تھی۔ ویرا ابھی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب بڑھ رہا تھا اور وہ بار بار تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ بولی "مسٹر شا! میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے استقی کو آپ نے فائرنگ میں سے نکالا تھا۔ بعد میں بھی صرف آپ ہی کی وجہ سے محفوظ رہا لیکن اس نے آپ کا ذکر تک نہیں کیا۔"

"اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑے گا؟"

"سچ بولنے سے اس کی صحت پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ کیوں جھوٹ بول رہا ہے؟"

"اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے بہرحال میں کنگ سے کوئی دکٹوریا کراس حاصل نہیں کرنا ہے۔ اگر اس کی خوشی جھوٹ بولنے سے پوری ہو رہی ہے تو مجھے اس پر اعتراض نہیں۔"

"لیکن مجھے ہے۔۔۔ میں ابھی کنگ سے بات کرتی ہوں۔"

"پلیز ویرا۔ اس بات کو یہیں رہنے دو۔" میں نے کہا "میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ کرنی دو یا نہ کرو۔"

"مگر میرے نزدیک اس بات کی بہت اہمیت ہے۔" وہ زور دے کر بولی "آپ نے۔۔۔ مسٹر شا! کوئی معمولی کام نہیں کیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے قاتل باغیوں سے کنگ کے عہد کی جان بچائی ہے اور اس کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ آپ کا یہ ایثار کنگ کے اور دیگر لوگوں کے علم میں آنا چاہیے۔ کم از کم کنگ کو تو یہ سب پتہ ہونا چاہیے اور ایسا ہونا بہت ضروری بھی ہے۔ کنگ کی نظر میں آپ کو مقام حاصل ہو گا تو اس میں آپ کی اور آپ

ساتھیوں کی بہتری ہے۔ آپ کی کئی مشکلات دور ہوں گی۔" مجھے خاموش پا کر وہ صفدر سے مخاطب ہوئی "آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں مسٹر صفدر؟"

"آپ بڑی شستہ انگریزی بولتی ہیں اس میں نہ سمجھنے والی کوئی بات ہی نہیں۔ باقی جو بات آپ شاہ جہاں صاحب کو سمجھا رہی ہیں اس کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ شاہ جہاں صاحب پردہ پوشی سے کام لینا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے ماسٹر استقی نے ہی انہیں کہا ہے۔ ماسٹر استقی نہیں چاہتا کہ اب اس کی بات کی تردید ہو اور اسے دوسروں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ جو اس کے منہ سے نکل گیا ہے اب وہ اس پر قائم رہنا چاہتا ہے۔"

"کیا واقعی ایسا ہوا ہے مسٹر شا؟"

"ہاں ویرا۔۔۔ کل فون پر استقی سے میری طویل بات ہوئی تھی۔ وہ اس معاملے میں بالکل جذباتی ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کے خبط کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔"

"مگر مسٹر شا۔۔۔"

"پلیز ویرا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "میں چاہتا ہوں کہ میں نے استقی کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے اسے نبھاؤں۔"

"وہ تو بچہ ہے مسٹر شاہ۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ وہ بچہ ہے اور ہمیں بچے کے ساتھ بچہ نہیں بن جانا چاہیے۔"

وہ بولی "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح آپ استقی کی ہمدردی اور دوستی پا سکیں گے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ وہ شاید دنیا کا مشکل ترین بچہ ہے۔"

"اگر وہ مشکل ترین بچہ ہے تو ہم بھی مشکل ترین کام پسند کرتے ہیں۔ کیوں بھئی صفدر۔" صفدر نے اثبات میں سر ہلایا۔

ویرا بہت جز بز نظر آ رہی تھی مگر وہ میری مرضی کے خلاف بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ اسی دوران میں کنگ براؤن کا خطاب شروع ہو گیا اور ہم خاموش ہو کر ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ یہ ایک طویل خطاب تھا اس میں کنگ نے باغی گروپ کے بارے میں تفصیلات بھی بتائیں۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اس ہنگامے کی اصل ابتدا پروفیسر اللہ دتا کا ٹرسٹ سے غائب ہو جانا تھا۔ پروفیسر کی گمشدگی کے بعد کنگ براؤن کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ نگرانی کے نظام کی خامیاں دور کی جائیں اور غیر ذمے دار افراد پر ہاتھ ڈالا جائے۔ اسی کارروائی کے دوران میں انتظامیہ کے چند لوگ سے دار تفتیش کی زد میں آئے اور در پردہ کنگ کے مخالف

ہو گئے۔ انہوں نے منصوبہ بندی کے تحت انڈین اور تھائی قیدیوں کو سرکشی پر ابھارا۔ انہیں کچھ ہتھیار فراہم کیے اور مقررہ وقت پر انہیں لاک اپس سے نکلنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ ایکشن کا وقت ایسا تھا کہ کنگ اور اس کے دو اہم ترین ساتھی "روم" نامی جگہ پر موجود تھے اور انہیں نشانہ بنایا جا سکتا تھا مگر خوش قسمتی سے باغی قیدی بر وقت "روم" تک نہ پہنچ سکے اور وہ لفٹوں پر قبضہ کرنے میں بھی ناکام ہوئے۔ اپنی تقریر کے آخر میں کنگ نے ان سزاؤں کا ذکر کیا جو "قانون شکن" افراد کو دی گئی تھیں اور نگرانی کے نظام میں جو تبدیلیاں کی گئی تھیں ان پر بھی روشنی ڈالی۔

بعد ازاں یہ تقریب برخاست ہوئی۔ بہت سے لوگ ہال نما کمرے سے اٹھنے کے بعد ایک گیلری نما جگہ کی طرف جا رہے تھے اور بڑی دلچسپی سے کوئی چیز ملاحظہ کر رہے تھے۔ صفدر اور میں یہی سمجھے کہ یہ کوئی فوٹو گیلری ہے اور لوگ تصویریں وغیرہ دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آگے بڑھے اور اس فوٹو گیلری میں جھانکا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ دل جیسے ایک دم مٹھی میں جکڑا گیا تھا۔ اس گیلری میں درندگی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ کم از کم دو درجن افراد کے کٹے ہوئے سر یہاں موجود تھے۔ ان سروں میں لوہے کی میخیں ٹھونک کر انہیں چھت کے ساتھ تار کی مدد سے لٹکا دیا گیا تھا۔ اب یہ خون آلود فانوسوں کی طرح ہوا میں جھول رہے تھے۔ یہ سب وہ بدنصیب ہوئے تھے جنہوں نے چند روز پہلے اس ظلم کدے سے نجات پانے کی ایک باغیانہ کوشش کی تھی۔ ان میں سے کئی ایک کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں جان کنی کی اذیت منجمد نظر آ رہی تھی۔ ان میں ایک دو پاکستانی تھے۔ کچھ انڈین، تھائی اور سری لنکن تھے۔ ان میں مجھے ایرانی جعفر رضا کا سرخ و سپید چہرہ بھی نظر آیا۔ مجھے وہ سکھ بھی دکھائی دیا جس نے میری کلائی میں RINO موجود نہ پا کر غراہٹ بلند کی تھی اور چلا کر کہا تھا "تم جھوٹ بولتے ہو تم ہم میں سے نہیں ہو۔" سیاہ چہرے والا وہ غریب افریقی بھی موجود تھا جس نے سکھ سردار جی کے سامنے میری صفائی پیش کرنے کی اچھی سی کوشش کی تھی۔ یہ مختلف قوموں کے مختلف خدوخال والے لوگ تھے مگر اس ٹرسٹ میں ان کا درد مشترک تھا۔ وہ اس پنجرے کی تیلیاں بکھیر کر یہاں سے اڑ جانا چاہتے تھے۔ اپنے اپنے گلی کوچوں اور گھروں میں جانا چاہتے تھے اپنے پیاروں کے چہرے دیکھ کر اپنی بنجر آنکھوں کو سیراب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کھلا آسمان دیکھنے کی حسرت دل میں لیے وہ اس زمین دوز ظلمت کدے کی تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ ایک بردہ فروش نے ان کے سروں کو ان کے زخمی جسموں سے علیحدہ کر کے عبرت نگاہ بنایا تھا اور اس گیلری میں

لٹکا دیا تھا۔ لوگ بڑے بڑے دیوار گیر شیشوں کے ساتھ منہ لگا کر اس گیلری میں جھانک رہے تھے اور مدھم آوازوں میں تبصرے کر رہے تھے۔ یہ دلدوز منظر تھا۔ چھت سے لٹکے ہوئے سر از خود ہی آہستہ آہستہ گھومتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی چہرہ سامنے آجاتا تھا' کبھی سر کا پچھلا حصہ۔ ان کے دھڑ بریدہ چہروں پر تشدد کے نشانات منظر کو اور بھی ہولناک بنا رہے تھے۔

ویرا تو یہ منظر دیکھ کر ہی پیچھے ہٹ گئی تھی' میں اور صفدر بھی زیادہ دیر نگاہوں کا یہ عذاب نہیں سہہ سکے اور پیچھے ہٹ آئے۔

"ان سروں پر یقیناً کیمیکل وغیرہ لگائے گئے ہوں گے' ورنہ ان میں سے بُو آنا شروع ہو جاتی۔" صفدر نے تبصرہ کیا۔

"ہو سکتا ہے کہ ایسا کیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں تازہ تازہ ہی قتل کیا گیا ہو۔ ویسے بھی یہ گیلری ائرٹائٹ ہے' بُو وغیرہ باہر نہیں آسکتی۔"

اس دلدوز منظر پر دبی جیسی آواز میں تبصرہ کرتے ہوئے ہم ہال نما کمرے سے باہر آگئے۔ یہ منظر دیکھ کر ویرا کی طبیعت بھی مکدر ہو گئی تھی۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی بیٹھی گم صم ہو گئی تھی۔ نرسیں اس کی چیئر کو دھکیلتی ہوئی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہال نما کمرے کے ارد گرد حفاظت کے انتظامات بڑے سخت تھے۔ مسلح گارڈز ہر شخص کو کڑی نظر سے گھور رہے تھے۔ ابھی ہم مین کوریڈور میں نہیں پہنچے تھے کہ ایک انتظامی افسر نے عقب سے آکر ہمیں روک لیا۔

اس نے سلیوٹ کے انداز میں ہمیں سلام کیا پھر بتایا کہ مجھے اور صفدر کو کنگ اپنے خصوصی چیمبر "روم" میں یاد فرما رہے ہیں۔

یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی' بہرحال ہم "روم" میں پہنچے۔ ہمیں ایک ملحقہ کمرے میں انتظار کے لیے بٹھایا گیا۔ قریباً دس پندرہ منٹ بعد کنگ نے ہمیں اپنے خصوصی چیمبر یعنی "روم" میں طلب فرما لیا۔ وہ حسب معمول شاہانہ انداز میں اپنی شاہانہ نشست پر براجمان تھا۔ افریقی LIZARD اس کی گود میں رینگ رہا تھا' اس کی قریباً ڈیڑھ فٹ لمبی دُم کنگ کے ہاتھ کی پشت پر دھری تھی اور دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھی۔ اس گول کمرے کی گول دیوار پر اسکرینیں روشن تھیں اور ٹرسٹ کے مختلف مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ کنگ آج قدرے خوشگوار موڈ میں تھا۔ مختصر لباس والی حسینہ تتلی کی طرح اس کے ارد گرد چکرا رہی تھی۔ کنگ کے خوشگوار موڈ کا اثر حسینہ پر بھی تھا اور وہ بھی گاہے گاہے مسکرا دیتی تھی۔ کنگ نے LIZARD حسینہ کو تھما دیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے باہر لے گئی۔ کنگ سفید شراب "جن" کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی ہدایت پر ایک دوسری نیم عریاں دوشیزہ اندر داخل ہوئی اور ہمارے سامنے سافٹ ڈرنکس رکھ دیے۔ کنگ نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا "اپنے دوست کے ساتھ تمہاری جوڑی بہت اچھی لگتی ہے۔ میرا قیافہ ہے کہ تم دونوں اکٹھے کام کر کے خوش بھی بہت ہوتے ہو۔"

"آپ اکثر بہت درست تجزیہ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کنگ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "پہلی ملاقات میں ہم نے تم سے جو توقعات قائم کی تھیں وہ بہت حد تک پوری ہوئی تھیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم تمہیں کوئی اہم ذمے داری سونپ سکتے ہیں۔"

"یہ آپ کی عنایت ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" میں نے گھسا پٹا فقرہ کہا۔

"تم اس قابل ہو۔ اور ہم یہ بات دلیل کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں جناب۔"

کنگ نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہا "جس وقت کلب میں حملہ ہوا اور استی کو چوٹ لگی تم کہاں تھے؟"

"میں بھی اس وقت کلب میں ہی تھا۔ مس ویرا میرے ساتھ تھیں۔"

"تم نے استی کو زخمی ہو کر گرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس یونہی پوچھ رہے تھے۔" وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے سامنے مختلف اسکرینوں کے مناظر دیکھتا رہا اور گلاس کے کنارے پر بے خیالی میں انگلی پھیرتا رہا' تب ایک گہری سانس لے کر بولا "پچھلے آٹھ دس روز میں ہم نے اپنے "نگرانی کے نظام" کو کافی بہتر بنایا ہے۔ ایسی جگہوں کو بھی ویڈیو کیمروں کے نیٹ میں لایا گیا ہے جہاں پہلے ویڈیو کیمرے نہیں تھے۔ مثلاً "اے کلب" کی یہ جگہ دیکھو یہاں پہلے کیمرے اور مائیکروفون نہیں تھے۔"

اس نے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے اور ایک "کی" کو افقی حرکت دی۔ ایک اسکرین روشن ہوئی اور میرے ساتھ ساتھ صفدر بھی بری طرح چونک گیا۔ اسکرین پر چار روز پہلے کا وہ ہنگامہ خیز منظر نظر آرہا تھا' جب "اے کلب" پر اچانک باغی بدوؤں نے ہلہ بول دیا تھا۔ یہ ریستوران کے سامنے کا منظر تھا۔ دیو ہیکل ٹی وی سیٹ تباہ ہو چکا تھا اور ہر طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ فائرنگ کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی پھر میں نے خود کو اسکرین پر دیکھا۔ میں رکوع کے انداز میں جھک کر دوڑتا ہوا ایک نیم تاریک گوشے سے نکلا۔ پھر

مزید جھک کر میں نے فرش سے کچھ اٹھایا۔ یہ استی کا نیم بے ہوش جسم ہی تھا۔ میں نے اس کا بالائی دھڑ کو مجھ سے لگا رکھا تھا اور اس کی ٹانگیں فرش پر گھسٹ رہی تھیں۔ اچانک میری نگاہ تالاب کے کنارے گری ہوئی رائفل پر پڑی۔ میں نے رائفل بھی اٹھائی اور گولیوں کی بوچھار میں جھک کر دوڑتا ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ یہاں کیمرا کٹ ہوا اور ایک دوسرا کیمرا منظر دکھانے لگا۔ میں ڈریسنگ روم کے اندر حملہ آور افراد کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ آواز نہیں آرہی تھی مگر چہروں پر تناؤ کی کیفیت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ داڑھی والا نوجوان مسلمان مجھ سے جھگڑا کر رہا تھا اور اس کا ہاتھ میرے چہرے کے سامنے بڑے غصیلے انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ دراصل یہ اس وقت کی ریکارڈنگ تھی جب میں استی کو الماری کے خانے میں چھپا چکا تھا اور حملہ آور مجھ سے استی کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔ اس منظر کے بعد گارڈز کے بھرپور جوابی حملے کے مناظر اسکرین پر دکھائی دیے۔ آنسو گیس کی شدت سے ہر شخص کا برا حال تھا پھر اس منظر کی جھلک نظر آئی جب میں گیلا رومال استی کے چہرے پر لپیٹ رہا تھا۔ پھر استی فرش پر لیٹ گیا اور کیمرے کی رینج سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد کنگ نے بٹن دبا کر ٹی وی کی اسکرین کو تاریک کر دیا اور خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اور صفدر بھی خاموش رہے۔ خاموشی جب طویل ہوئی تو میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "میں معذرت چاہتا ہوں جناب! اگر میں نے اس سلسلے میں آپ کو بے خبر رکھا' دراصل یہ ماسٹر استی کی خواہش تھی کہ میں اس سلسلے میں خاموش رہوں۔"

"ایسی باتوں کے بارے میں خاموش رہنا ہی تو بڑے ظرف کی نشانی ہوتا ہے۔" کنگ نے کہا۔

"آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی نوازش ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دراصل ان مقامات پر پہلے کیمرے موجود نہیں تھے۔ دیگر کئی افراد کی طرح استی بھی بے خبر تھا کہ یہاں کیمرے "انسٹال" ہو چکے ہیں۔ ہم پرسوں ہنگامے کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھ رہے تھے کہ یہ مناظر ہماری نگاہ میں آگئے۔ ہم نے انہیں علیحدہ سے محفوظ کر لیا۔"

"ماسٹر استی صاحب کو خبر ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ابھی بے خبر ہے۔"

"میری آپ سے ایک درخواست ہے' آپ استی صاحب کو اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ وہ اگر اسی طرح خوشی محسوس کر رہے ہیں تو ہمیں ان کو خوش ہی رہنے دینا چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ استی کو کم از کم ہم سے تو غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔"

"میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتا کہ آپ کو مشورہ دے سکوں مگر اس درخواست کی جسارت ضرور کروں گا کہ آپ ابھی کچھ روز تک ماسٹر سے اس ویڈیو کا تذکرہ نہ فرمائیں۔"

کنگ کے چہرے پر نیم رضامندی کے آثار نظر آرہے تھے۔ چھپکلا رینگتا ہوا اندر آگیا تھا اور بڑی بے تکلفی سے صفدر کے پاؤں پر چڑھ بیٹھا تھا۔ صفدر بالکل بے حرکت بیٹھا رہا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ یقیناً اس مکروہ جانور کو پاؤں کی حرکت سے دور پھینک دیتا مگر یہ شہنشاہ اعظم کا پالتو تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بدتمیزی کیونکر کی جا سکتی تھی' بلکہ وہ تو اگر گردن پر چڑھ کر منہ بھی چومنے لگتا تو ہمیں ہلنے کی مجال نہیں تھی۔

کنگ اپنی جگہ سے اٹھا' ہم بھی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بڑی شاہانہ چال چلتا دوسرے کمرے میں اوجھل ہو گیا۔ چھپکلا بدستور صفدر کی ٹانگ پر رینگ رہا تھا۔ صفدر نے اسے ہٹانے کے لیے اپنی دوسری ٹانگ کو حرکت دی مگر پھر فوراً ارادہ تبدیل کر دیا۔ اس کے ذہن میں آگیا تھا کہ اس کمرے میں بھی کیمرے لگے ہوئے ہوں گے اور چھپکلے کے ساتھ گستاخی کرنے کی حرکت بھی کہیں نہ کہیں ریکارڈ ہو جائے گی' اور پھر کسی دن محترم کنگ یہ سین بھی ہمیں پلے بیک کے ذریعے دکھا دیں گے۔ دو چار منٹ بعد کنگ کمرے میں واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی۔ اس پر نیلا مخمل چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ڈبیا کھولی۔ ایک نہایت قیمتی دستی گھڑی اس میں موجود تھی۔ ڈائل میں چھوٹے چھوٹے نیلم چمک رہے تھے۔ کنگ نے گھڑی کی پشت دکھائی۔ اس پر ایک مہر کندہ تھی۔ کنگ براؤن کی چھوٹی سی شبیہہ بنی ہوئی تھی اور کنگ براؤن کے الفاظ بھی کھدے ہوئے تھے۔ کنگ نے کہا "یہ گھڑی یہاں اہم ترین لوگوں کے پاس ہے۔"

اس نے مجھے ہاتھ آگے کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ کنگ نے گھڑی خود میرے ہاتھ پر باندھ دی۔

"یہ میرے لیے بے حد اعزاز و عزت کی بات ہے۔" میں نے کمر کو خم دے کر کہا۔ اپنے چہرے پر میں نے بے تحاشا عقیدت سجالی تھی۔

"ہم نے کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تمہاری اس دلیرانہ کوشش کا اعتراف ہے جو تم نے اس زیر زمین بستی کے

اکلوتے وارث کو بچانے کے لیے کی ہے۔ یہ ہمارے ولی کی گواہی تھی کہ تمہیں ہماری نظر میں اہم مقام ملنے والا ہے مگر یہ توقع نہیں تھی کہ یہ مقام اتنی جلدی مل جائے گا' اور اتنا اہم بھی ہوگا۔ ہم واقعی تم پر فخر محسوس کر رہے ہیں۔" کنگ نے باقاعدہ میرا کندھا تھپتھپایا۔

ان لمحوں میں وہ صرف اور صرف استی کا باپ نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی' میں دل ہی دل میں حیران بھی ہوا۔ والدین سے ان کے جگر گوشے چھین کر ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل کر دینے والا اور انسانوں کو کھیوں کی طرح مار دینے والا سفاک شخص کچھ معاملوں میں کتنا حساس تھا۔

کنگ نے ہمیں پھر سے نشستوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قیامت خیز چال والی حسینہ میز پر مزید مشروب سجا کر باہر چلی گئی۔ کنگ نے خالی خالی نظروں سے وڈیو اسکرینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ ٹکٹس تمہارے پاس ہیں جو ہفتے کو ہم نے تمہیں دیے تھے؟" میں نے فوراً اثبات میں جواب دیا۔ کنگ بولا "وہ شو اب منگل کے روز ہوگا۔ تم اس میں ضرور شرکت کرنا۔ تم اس شو کو ایک لحاظ سے ون مین شو بھی کہہ سکتے ہو۔ کیا تم جادو پر یقین رکھتے ہو؟" اس نے آخر میں اچانک پوچھا۔

میں گڑبڑا کر رہ گیا مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر کہا "جادو کی بھی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ اب یہ تو دیکھ کر ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ کون سا جادو ہے۔"

وہ مسکرایا "تو ٹھیک ہے۔ منگل کو تم ایک خاص قسم کا جادو دیکھنا۔ بعد میں ہمیں بتانا کہ یہ کون سی قسم تھی۔ اور اس شخص کے بارے میں بھی بتانا جو یہ جادو کرتا ہے۔"

"گستاخی معاف۔ میری معلومات اس بارے میں بہت محدود ہیں جناب۔"

"بالکل غلط۔ تمہاری معلومات اس بارے میں محدود نہیں ہیں۔ ہمیں بہت کچھ بتا دیا گیا ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا جناب؟"

ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری "وقت آنے پر سب معلوم ہو جائے گا۔ اب اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔" ہم کنگ کے پاس سے واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں' میں نے کئی بار اپنی گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

صفدر کو خدشہ تھا کہ اس گھڑی میں کوئی ٹرانسمٹر وغیرہ نصب نہ ہو۔ اس گھڑی کو دیکھ کر میرے ذہن میں بھی شیخ عاصم والی منحوس گھڑی کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ اس گھڑی نے ایک عرصہ میری زندگی حرام کیے رکھی تھی۔

منگل کے روز حسب پروگرام میں اور غزالہ کیسپر پہنچے اور اسی عالیشان ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے جہاں چار روز پہلے "بغاوت کچلنے کی خوشی میں" تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کے برعکس آج کے شو میں ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامعین میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ صرف مرد اور عورت تھے۔ اور سب جوڑوں کی شکل میں آئے تھے۔ خواتین نے دیدہ زیب لباس پہن رکھے تھے' مرد بھی خوش لباس دکھائی دیتے تھے۔ ہمیں درمیانی نشستوں میں جگہ ملی۔ ہمارے ٹکٹس پر ہی سیٹ نمبر لکھے ہوئے تھے۔ غزالہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ یہ سادگی کی دلکشی تھی۔ اس نے بالکل بناؤ سنگھار نہیں کیا تھا۔ ہمیں بیٹھے دس پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ہال میں کنگ براؤن کی تشریف آوری بھی ہو گئی۔ اس کے ساتھ معززین کا ایک ٹولا بھی تھا۔ اس ٹولے میں ایک بار پھر مجھے وہ شخص نظر آیا جس کا تعلق مسٹر جی کلارک سے تھا۔ اگر یہ شخص یہاں موجود تھا تو اس کا مطلب تھا کہ مسٹر جی کلارک نہ صرف اس مقام پر ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکے ہیں بلکہ عنقریب وہ اس سلسلے میں کوئی کوشش بھی کرنے والے ہیں۔ اب یہ کوشش کیا تھی' یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

کنگ کو ہال میں داخل ہوئے بمشکل تین چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسٹیج پر سے پردہ اٹھ گیا۔ ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ اسٹیج پر ایک "سیٹ" سا لگا ہوا تھا۔ اس سیٹ میں چاروں طرف کالی چٹانیں دکھائی گئی تھیں۔ زمین بھی کالی تھی۔ کالے بادلوں کی اوٹ سے کالا سورج طلوع ہو رہا تھا یا شاید وہ چاند تھا پھر کہیں سے ایک نقطے کی طرح روشنی نمودار ہوئی اور پھیلتے پھیلتے پورے اسٹیج پر پھیل گئی۔ اس روشنی کے اندر سے ہی سیاہ لبادے میں ملبوس ایک طویل قامت شخص برآمد ہوا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس نے جو لبادہ پہن رکھا تھا وہ برساتی ٹائپ تھا یعنی سر پر بھی ٹوپی تھی۔ اس ٹوپی کے نیچے سے اس کی سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ مائیک پر آ کر بولا "خواتین و حضرات! طلسم اور سائنس دو بالکل مختلف چیزیں ہیں لیکن میں انہیں یکجا سمجھتا ہوں میں نے اسے طلسمی سائنس کا نام دیا ہے۔ میں اس طلسم کو آپ سب خواتین و حضرات کے سامنے ثابت کر سکتا ہوں کیونکہ یہ طلسم سائنس بھی ہے۔"

اس نے ایک لمحہ توقف کر کے کنگ براؤن کی طرف

مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولا "میں لمبی چوڑی تمہید باندھ کر آپ خواتین و حضرات کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں آپ کے سامنے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے حاضرین میں سے چند ایسے جوڑے درکار ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کی وفاداری غیر متزلزل ہے۔"

شروع میں کوئی کھڑا نہیں ہوا۔ سیاہ لبادے والے نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے برادری کی بسائی ہوئی اس بستی کے اندر لوگوں کے ظاہر اور باطن میں اتنا فرق ہے۔"

اس کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے کچھ لوگ مسکراتے ہوئے اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ یہ کوئی دس پندرہ جوڑے تھے۔ خواتین شرمائی شرمائی محسوس ہوتی تھیں۔ سیاہ لبادے والے عامل نے ان سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی جگہوں پر بیٹھیں' وہ ان سے دوبارہ بات کرے گا۔ جوڑے اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

عامل نے اشارہ کیا۔ سیاہ چٹانوں کی اوٹ سے "چند سیاہ فام" سیاہ لباسوں میں اسٹیج پر آ گئے۔ ان سیاہ فاموں کے پاس تین بڑے پنجرے تھے۔ ہر پنجرے کو دو افراد نے اٹھا رکھا تھا۔ ان پنجروں کو حاضرین کے عین سامنے رکھ دیا گیا۔ ہر پنجرہ کوئی پانچ فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تھا۔ ہر پنجرے کو ایک درمیانی جالی کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے پنجرے کے ایک حصے میں موٹی تازی بلی اور دوسرے حصے میں ایک کبوتر بند تھا۔ دوسرے پنجرے کے ایک حصے میں گرے ہاؤنڈ کتا اور دوسرے میں جنگلی خرگوش تھا۔ تیسرے پنجرے کے ایک حصے میں افریقی عقاب اور دوسرے حصے میں ایک چڑیا بند تھی۔

غزالہ نے سرگوشی میں پوچھا "یہ کیا چکر ہے؟"

"میں دیکھ رہا ہوں' تم بھی دیکھو۔" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

پُراسرار حلیے والے عامل نے گمبھیر لہجے میں کہا "جاندار کی جبلت کو بدلنا آسان کام نہیں ہوتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان تین پنجروں میں تین شکاری اور تین شکار بند ہیں۔ آپ شکاری کی بے تابی بھی دیکھ رہے ہیں اور شکار کی بے چینی اور گھبراہٹ بھی۔ کبوتر گھبرایا ہوا ہے' خرگوش لرز رہا ہے اور چڑیا پھڑپھڑا رہی ہے۔ آپ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں ناں۔" اس نے حاضرین سے سوال کیا۔ بہت سے سر اثبات میں ہلے۔

وہ بولا "ان جانوروں کی جبلت کو بدلنا یا اس پر پہرے بٹھانا آسان نہیں۔ کوئی ایسا کرنا چاہے تو اس کے لیے مہینوں کی محنتِ شاقہ درکار ہوتی ہے مگر یہاں آپ ابھی تھوڑی ہی دیر میں بالکل مختلف صورتِ حال دیکھیں گے۔"

عامل کے اشارے پر سیاہ فام معاون تینوں پنجروں کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ شکاری کتا بار بار جنگلی خرگوش کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ عقاب کا انداز بھی جارحانہ تھا۔

اسٹیج خالی ہوا ہی تھا کہ عامل کے اشارے پر ایک اور پنجرہ اندر لایا گیا۔ اس میں ایک کتیا اور بکرا بند تھے۔ بکرا گھاس پر منہ چلا رہا تھا۔ جبکہ سینٹ برنارڈ نسل کی کتیا جیسی خود کو چاٹنے میں مصروف تھی۔ پنجرے کے دوسرے حصے میں ایک بندر اور لومڑی تھی۔ یہ پنجرہ حاضرین کو دکھایا گیا اور اسے بھی بیک اسٹیج پر بھیج دیا گیا۔

اس کے بعد عامل نے ان جوڑوں سے دوبارہ کھڑے ہونے کی درخواست کی جو کچھ دیر پہلے سامنے آئے تھے۔ جوڑے دوبارہ کھڑے ہوئے تو عامل نے ان میں سے دو جوڑے منتخب کیے اور انہیں اسٹیج پر بلا لیا۔ یہ دونوں جوڑے سفید فام تھے۔ ان کا تعلق ٹرسٹ کی انتظامیہ سے تھا۔ ایک جوڑا جوان تھا اور دوسرا عمر رسیدہ۔ عامل نے نوجوان جوڑے کی خاتون کا نام پوچھا۔

"اگاتھا۔" نوجوان خاتون نے جواب دیا۔

"آپ کے ساتھی آپ کے شوہر ہیں؟" نوجوان خاتون کا جواب پھر اثبات میں تھا "آپ کو ان پر مکمل بھروسا ہے کہ یہ آپ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔"

"بے شک!" خاتون نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ میرے کہنے پر یہ کسی لڑکی کو چوم لیں گے تو آپ یقین کریں گی؟"

"ہرگز نہیں۔ یہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔" خاتون نے یقین سے کہا۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" پھر وہ ہنسی "میں تو یہ بھی کہوں گی کہ آپ ان کے سر پر پستول بھی رکھ دیں تو یہ ایسا نہیں کریں گے۔"

شوہر بھی تائیدی انداز میں سر ہلا رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مسز اگاتھا۔ ہم آپ کے شوہر کو آدھ گھنٹے کے لیے آپ سے جدا کرتے ہیں' اس کے بعد نتیجہ ملاحظہ کرتے ہیں۔"

اس کے بعد عامل عمر رسیدہ جوڑے کی طرف متوجہ

ہوا۔ خاتون نے اپنا نام بتایا اور عمر ۴۵ سال بتائی۔ شوہر نے اپنی عمر ستر سال بتائی۔ دونوں کو اپنی دیرینہ رفاقت اور وفاداری پر بھرپور یقین تھا۔ عامل نے ان سے بھی دو چار سوال پوچھے اور پھر بڑے میاں کو بڑی بی سے علیحدہ کر دیا۔ دونوں خواتین واپس نشستوں پر جا بیٹھیں۔ کچھ دیر کے لیے سیاہ پوش عامل بھی منظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس دوران میں دو تین مسخرے اسٹیج پر آ گئے۔ یہ سیاہ فام مسخرے نہایت مختصر لنگوٹیاں پہنے ہوئے تھے۔ وہ الٹی سیدھی حرکتوں سے حاضرین کو ہنساتے رہے۔ گاہے گاہے غزالہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نظر آئی۔ قریباً نصف گھنٹے بعد عامل کی واپسی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ چھڑی تھی۔ چھڑی کے اشارے سے اس نے اپنے معاونوں کو کوئی حکم دیا۔ چند لمحے بعد معاون تینوں پنجرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تینوں پنجروں میں وہی جانور موجود تھے جو ہم نے پہلے دیکھے تھے' فرق صرف اتنا تھا کہ ہر پنجرے کی درمیانی جالی نکال دی گئی تھی اور پارٹیشن ختم ہو گئی تھی۔ پارٹیشن کے خاتمے کا نتیجہ خون ریزی تھا' لیکن خون ریزی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ حیران کن طور پر تمام جانور نہ صرف پُرسکون تھے بلکہ شیر و شکر نظر آ رہے تھے۔ کبوتر بے خوف و خطر بلی کے عین سامنے بیٹھا تھا بھوکا شکاری کتا جو کچھ دیر پہلے خرگوش کو پھاڑنے کے لیے بے قرار تھا' بڑے سکون سے خرگوش کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھ رہا تھا' کچھ ایسی ہی کیفیت عقاب اور چڑیا کی بھی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید جانور بدل دیے گئے ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ کچھ نشانیاں میرے ذہن میں تھیں اور یہ نشانیاں بتا رہی تھیں کہ یہ سو فی صد وہی جانور ہیں۔ یہ شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پانی پلانے والا معاملہ تھا اور یہ سب کچھ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوا تھا۔

غزالہ نے اپنے حیران ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کہ... پہلے یہ جانور بھوکے ہوں' اب انہیں کھانا وغیرہ کھلا دیا گیا ہو؟"

میں نے کہا "بلی کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن شکاری کتے اور پالتو عقاب کی خصلت کو میں جانتا ہوں۔ ان کا پوٹا چاہے لبالب بھرا ہوا ہو مگر یہ شکار پر جھپٹنے سے باز نہیں آتے۔"

"کہیں کوئی "ٹرنکولائزر" وغیرہ تو نہیں دی گئی انہیں؟" غزالہ نے ڈاکٹری حیثیت سے اندازہ قائم کیا۔

"مجھے تو یہ سارے جانور ہشاش بشاش ہی نظر آ رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہے' کیا کوئی شعبدے بازی ہے؟" وہ الجھن سے بولی۔

اسی دوران میں عامل اپنے معاونوں کو پنجرے اٹھانے کا حکم دے چکا تھا۔ تینوں پنجرے اٹھا لیے گئے۔ مجھ سمیت غالباً ہر شخص کا ذہن یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ یہ سب ہوا کیسے ہے۔ پنجروں کے واپس جاتے ہی اسٹیج نے گھومنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ ریوالونگ اسٹیج ہے۔ اسٹیج گھوما تو سامنے کا منظر بھی بدل گیا۔ اب حاضرین کو ایک بیڈ روم کا سین دکھائی دے رہا تھا۔ اس افریقی طرز کے بیڈ روم میں جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ چونکا دینے والا تھا۔ وہی سفید فام نوجوان جس نے کچھ دیر پہلے اپنی اہلیہ سے غیر متزلزل وفاداری کا دعویٰ کیا تھا ایک لڑکی سے ہم آغوش نظر آ رہا تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ معمولی صورت کی بھدی سی لڑکی اس کی بانہوں میں تھی اور وہ اس میں کھویا ہوا تھا۔ پس منظر سے پُراسرار عامل کی آواز ابھری "یہ وہی نوجوان ہے جو کسی غیر عورت کو چھونے کا روادار نہیں تھا' اب یہ ایک ایسی لڑکی کی زلفوں کے سائے میں ہے جو اس کی بیوی سے کہیں کم تر ہے۔ اور یہ کسی دباؤ یا میڈیکیشن وغیرہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کر رہا ہے اپنی منشا سے کر رہا ہے۔ اگر ہم اسے کچھ اور ڈھیل دیں تو یہ تھوڑی ہی دیر میں "مرد اور عورت کے تعلق" کی ساری منزلیں طے کر لے گا مگر ہم ایسا کر کے اس خاتون کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنا شوہر بڑے یقین سے ہمارے حوالے کیا تھا۔" پھر وہ ہال میں بیٹھی خاتون سے مخاطب ہو کر بولا "میں معافی چاہتا ہوں خاتون! آپ کے شوہر اب بھی پوری طرح آپ کے وفادار ہیں۔ یہ جو کچھ آپ کو نظر آیا ہے یہ ایک طلسم ہے جو ابھی تھوڑی دیر میں ٹوٹ جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اسٹیج نے ایک بار پھر محوری حرکت کی۔ ایک اور منظر حاضرین کے سامنے آ گیا۔ یہ بھی ایک خواب گاہ کا منظر تھا۔ یہاں بڑے میاں راجا اندر بنے بیٹھے تھے۔ وہ ہیجان خیز لباس والی کوئی نصف درجن لڑکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ایک ان کے پاؤں دبا رہی تھی' ایک کھوپڑی کی مالش کر رہی تھی۔ دو پہلوؤں سے چپکی بیٹھی تھیں۔ ایک چینی خدوخال والی انہیں کوئی مشروب پلا رہی تھی۔ بڑے میاں بڑے خوش اور سرشار نظر آ رہے تھے پھر وہ بالکل ہی پھیل کر لیٹ گئے اور اپنا سر ایک لڑکی کی آغوش میں رکھ دیا۔ عامل کی آواز پس منظر سے ابھری۔ وہ ہال میں بیٹھی بڑی بی سے مخاطب ہو کر بولا "محترم خاتون! میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ دل میں یہ وسوسہ مت لائیں کہ

شاید آپ کے شوہر نامدار کو نشہ وغیرہ پلایا گیا ہے' یہ سادہ بیئر پی رہے ہیں۔ خدانہ کرے ان کا ذہنی توازن بھی گڑبڑ نہیں ہے۔ یہ ایک جادوئی اثر ہے جو میں جب چاہوں ختم کر دوں گا اور یہ میں ابھی ختم کر رہا ہوں۔ آپ نے ازدواجی زندگی کی بڑی لمبی اور خوب صورت اننگ کھیلی ہے۔ اننگ کے اس مرحلے میں' میں آپ کو رن آؤٹ کرنا نہیں چاہتا۔"

ہال میں کچھ لوگوں کی دبی دبی حیرت زدہ ہنسی سنائی دی۔ اس کے بعد ریوالونگ اسٹیج نے حرکت کی اور راجا اندر کی سبھا کا منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب سیاہ لبادے والا پُراسرار عامل ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی جنگلی کبوتر کی سی سرخ آنکھیں حاضرین پر مرکوز تھیں۔ اس کا انداز چھا جانے والا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "پیارے ساتھیو! آپ نے دیکھا کہ ماورائی قوتیں کس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہ جب ان قوتوں کے زیر اثر آتے ہیں تو اپنی جبلت' فطرت خصلت سب کچھ فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب میں آپ کو ایسا ہی ایک اور منظر دکھاتا ہوں۔" اس کے بعد وہ پنجرہ سامنے لایا گیا جو شروع میں دکھایا گیا تھا۔ اس میں بکرا اور کتیا بند تھے۔ پنجرے کے دوسرے حصے میں بندر اور لومڑی تھی۔ یہ دونوں جوڑے سراسر بے جوڑ تھے مگر اس وقت یہ بے جوڑ نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ حیرت انگیز طور پر اٹکھیلیوں میں مصروف تھے اور ان کی حرکات و سکنات وہی تھیں جو "جوڑوں" کی ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ قطعی ناقابلِ یقین تھا۔

حاضرین کی اکثریت آزاد خیال اور بے فکرے مرد و زن مشتمل تھی مگر سب ہی تو ایسے نہیں تھے۔ مثلاً غزالہ... وہ پہلے ہی بے حد خجل نظر آ رہی تھی اب اور بھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ جلد از جلد اس واہیات ماحول سے نکل جانا چاہتی تھی انگریزوں بھرے بڑے ہال میں سے اٹھ کھڑے ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ سخت بے سکونی کی حالت میں بیٹھی رہی۔

ریوالونگ اسٹیج ایک بار پھر حرکت کر گیا۔ اب ایک بار پھر وہی سیٹ سامنے تھا جو پردہ اٹھتے وقت نظر آیا تھا۔ سیاہ چٹانیں' سیاہ زمین اور چٹانوں کے عقب سے ابھرتا ہوا سیاہ سورج یا چاند۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب ایک بہت بڑا سیاہ سانپ بھی اسٹیج پر نظر آ رہا تھا۔ یہ اصلی سانپ نہیں تھا بلکہ لکڑی یا گتے وغیرہ کا بنا ہوا تھا۔ اس کی اونچائی کم و بیش چھ فٹ تھی۔ یہ اس کے پھن کی اونچائی تھی' کنڈلی اس کے علاوہ تھی۔ اس کے اردگرد سیاہ لباسوں والے حبشی مرد و زن دو زانو بیٹھے تھے۔ جیسے یہ سیاہ ناگ ایک دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے۔ ناگ کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے اور لگتا تھا کہ وہاں جیتی جاگتی آنکھیں موجود ہیں۔ اچانک اسٹیج کی روشنیاں گل ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک پُراسرار نیلگوں روشنی در و دیوار سے پھوٹنے لگی۔ سیاہ چٹانیں' زمین' چاند سب کے سب ایک نئے زاویے سے دمک اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک لرزہ خیز موسیقی کی صدا بلند ہونے لگی۔ عجیب آہنگ تھا اس موسیقی کا۔ اس میں انسانی چیخیں بھی تھیں' آہیں بھی اور کسی قدیم وحشی قبیلے کی نعرہ زنی بھی۔ موسیقی شروع ہوتے ہی ناگ کے مؤدب پجاریوں نے اپنے سر زمین کی طرف جھکائے تھے اور سجدے میں گر گئے تھے۔ موسیقی بلند تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ہمیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ میں نے غزالہ کے ہاتھ کی گرفت اپنے بازو پر محسوس کی۔ اچانک سیاہ ناگ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلنا شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ناگ کا ہیولا بے آواز حرکت کرتا ہوا' عین تماشائیوں کے سامنے آ گیا۔ پہلی قطاروں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا خوف یقیناً بڑھ گیا ہو گا لیکن شاید ان میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ کسی ردعمل کا اظہار کر سکتے۔ ایک سحر سا تھا جس نے ہر نفس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ پس منظر سے عامل کی گونجتی ہوئی آواز ابھری "پیارے دوستو! آپ سب سانپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کیا نظر آ رہا ہے۔ آپ غور کریں' آپ کو کیا نظر آ رہا ہے۔"

سانپ کی آنکھوں کے گرد بھی ہلکی ہلکی سبز روشنی نمودار ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آگ بھی کچھ بڑھ گئی۔ موسیقی کا شور قیامت خیز ہو گیا۔ ہال کی تمام روشنیاں ایک دم گل ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد سیاہ پوش عامل سامنے آ گیا۔ اس نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا "میں برادر محترم کنگ براؤن سے درخواست کروں گا کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں اور حاضرین سے بات کریں۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے کنگ براؤن کی طرف بڑھایا "آیئے برادر محترم۔"

کنگ شاید ہچکچاہٹ سے کام لے رہا تھا۔ سیاہ پوش عامل نے اپنی درخواست دوبارہ دہرائی۔ آخر کنگ کا ہیولا نظر آیا۔ وہ شاہانہ انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچ گیا۔ کنگ اور عامل مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ہنگامہ خیز موسیقی کے شور میں ان کی آواز دبی ہوئی تھی۔ اچانک یوں لگا جیسے ان میں تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تلخ کلامی سنگین

صورت اختیار کر گئی۔ دونوں کی آواز اور خاص طور سے کنگ براؤن کی آواز بلند ہوتی چلی گئی لیکن چونکہ اب موسیقی کا شور بھی بہت بڑھ گیا تھا لہٰذا دونوں کی لڑائی کی آواز اب بھی سامعین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اچانک کنگ براؤن نے سیاہ پوش عامل کو ہاتھ سے دھکا دے دیا۔ عامل جو اکھرے بدن کا تھا لڑکھڑا گیا۔ اسے لڑکھڑاتے دیکھ کر عامل کا ایک تنومند حبشی چیلا اضطراری طور پر آگے بڑھا۔ وہ غالباً عامل اور کنگ براؤن کے درمیان آنا چاہتا تھا۔ کنگ کو اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گزری کہ اس نے ایک دم چیلے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ موسیقی یک لخت تھم گئی۔ حاضرین ہکا بکا رہ گئے۔ اپنے چیلے کو پٹتے دیکھ کر سیاہ پوش عامل نے کنگ براؤن کا ہاتھ روکنا چاہا۔ یہ کنگ کی شان میں سخت ترین گستاخی تھی۔ جو شخص اپنے سامنے کسی کا اٹھا ہوا سر برداشت نہیں کرتا تھا وہ اٹھا ہوا ہاتھ کیسے برداشت کرتا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اسٹیج پر جیسے برق سی کوند گئی۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ سب سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئے۔ کنگ نے ایک حبشی چیلے کی کمر سے بندھی ہوئی تین فٹ لمبی تلوار دفعتاً کھینچ لی۔ ایک سیکنڈ کے مختصر ترین وقفے میں یہ تلوار عامل کے پیٹ میں تین مرتبہ داخل ہو کر باہر آ چکی تھی۔ ہال چیخوں سے گونج اٹھا۔ بہت سے مرد و زن اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ جو بالکل اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ آئے تھے یا EXIT کی طرف دوڑ گئے تھے۔ عامل کے پیٹ سے خون فواروں کی صورت پھوٹ نکلا تھا' اس کا سیاہ لبادہ خون سے رنگین ہو گیا تھا اور اب سیاہ زمین پر خون پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ عامل گر کر جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔ تلوار کنگ براؤن کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کا غیظ و غضب ہوا ہو گیا تھا اور وہ پلک جھپکتے میں وحشت اور دکھ کے بھنور میں گھر گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے زخمی عامل کو اٹھا کر اسٹیج سے باہر لے جانے کی کوشش کی مگر اس کی خراب حالت دیکھ کر واپس وہیں رکھ دیا۔ جونہی عامل نے آخری ہچکی لی کنگ بے بس ہو کر گھٹنوں کے بل اس کی لاش کے پاس گر گیا۔ وہ چند لمحے کانپتا رہا' تب اس نے لاش کو شانے سے جھنجوڑا اور کرب ناک آواز میں پکارا "کارلو۔ کارلو۔ میرے بھائی۔"

یہی وقت تھا جب پردے نے تیزی سے حرکت کر کے اسٹیج کو ڈھانپ لیا' اور سب کچھ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بالکل ڈرامے کا سا منظر تھا۔ لوگ انگشت بدنداں کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک پردہ پھر سے کھل گیا۔ اسٹیج اپنی جگہ سے گھوم چکا تھا۔ اب ایک صاف ستھرے کمرے کا منظر سامنے تھا۔ سیاہ پوش عامل بھلا چنگا ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے جسم یا لباس پر خون کا نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلائے اور داد طلب انداز میں حاضرین کے سامنے جھک گیا پھر اپنی پاٹ دار آواز میں اس نے کہا "خدا ہم سب پر ہمارے کنگ براؤن کا سایہ سلامت رکھے' ابھی آپ نے جو منظر دیکھا اس کا تعلق حقیقت سے نہیں تھا۔ وہ ڈراما بھی نہیں تھا تو پھر وہ کیا تھا۔" اس نے چند لمحے تک اپنی اثر انگیز نگاہیں حاضرین پر جمائے رکھیں' تب سلسلہ' کلام جوڑتے ہوئے کہا "آپ نے نظر بندی اور سجیشن وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ یہ بھی اسی طرز کا سلسلہ تھا۔ آپ نے ابھی محترم برادر کنگ براؤن کو اسٹیج پر دیکھا جبکہ وہ حقیقت میں اسٹیج پر آئے ہی نہیں۔ وہ جب سے آئے ہیں اپنی نشست پر تشریف فرما ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے انہیں دیکھا ان کی آواز سنی اور۔۔۔"

بات کرتے کرتے عامل کو خاموش ہو جانا پڑا کیونکہ کنگ براؤن جو اس ہنگامے کے دوران میں اپنی نشست پر ہی موجود رہا تھا' ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھتے ہی اس کے اردگرد بیٹھے معززین بھی کھڑے ہو گئے۔ یہ سب لوگ کنگ کے ساتھ تیزی سے EXIT کی طرف بڑھے اور ہال سے باہر نکل گئے۔

کنگ کے انداز سے واضح طور پر ناراضگی کا اظہار ہوا تھا۔ سیاہ پوش عامل چند لمحے تک اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا "شاید ہمارے کنگ کو کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ جب چراغِ محفل ہی نہیں تو پھر محفل سجائے رکھنے سے کیا حاصل۔ لہٰذا اب ہم یہ شو ختم کرتے ہیں۔"

اس نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا۔ مجھے اور غزالہ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کچھ لوگوں نے تالیاں بھی بجائیں۔ عامل نے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا اور ایک سائیڈ دروازے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی پردہ گرنا شروع ہو گیا۔

دوسرے لوگوں کی طرح میں اور غزالہ بھی یہ طلسمی تماشا دیکھ کر ہال سے باہر آ گئے۔ مجھے ایک بار پھر گلگت کی نواحی وادی کے شب و روز یاد آ گئے تھے۔ وہاں ہمارا واسطہ سانوس نامی اس ساحر سے پڑا تھا جس کی آنکھوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ وہ ہپناٹزم کا یکتا ماہر تھا۔ آج ایک عرصے بعد میں نے پھر وہی کیفیت محسوس کی تھی جو سانوس سے ملنے کے

بعد کی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ سب کچھ جو پچھلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسٹیج پر دیکھا ہے کسی نہ کسی حوالے سے ہپناٹزم اور تنویمی نیند سے ہی متعلق تھا۔ اس تماشے کے اندر آخر میں کچھ شعبدے بازی بھی داخل ہو گئی تھی۔ ہم نے یعنی سب حاضرین نے کنگ براؤن کو بنفسِ نفیس اسٹیج پر دیکھا تھا مگر ابھی تھوڑی دیر پہلے عامل نے انکشاف کیا تھا کہ کنگ براؤن اسٹیج پر آئے ہی نہیں۔۔۔ اور جو کچھ ہم نے دیکھا وہ نظر بندی وغیرہ کا نتیجہ تھا۔ عامل کی اس بات پر یقین کرنا مشکل نظر آ رہا تھا مگر فی الوقت وثوق سے کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ غزالہ کا خیال یہی تھا کہ خواب ناک روشنیوں اور تیز موسیقی کے ذریعے پہلے حاضرین کے ذہنوں کو ماؤف کیا گیا اور پھر کنگ براؤن سے ملتا جلتا کوئی ایکٹر اسٹیج پر لایا گیا' جس نے عامل کو بہانہ طریقے سے قتل کرنے کا ڈراما کیا۔

ہوسٹل میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر میں نے صفدر اور زریں کو تمام "کارگزاری" سے آگاہ کیا۔ یہ تعجب خیز شو دیر تک موضوعِ بحث بنا رہا۔ اس حوالے سے مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ سیاہ پوش عامل کا نام کارلو معلوم ہوا تھا۔ اسٹیج پر کنگ براؤن کی مشابہت رکھنے والے شخص نے عامل کو قتل کیا تھا تو بعد میں اسے "کارلو! میرے بھائی" کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے پہلے عامل کارلو بھی کنگ کو "برادرِ محترم" کہہ کے پکارتا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کنگ اور کارلو کے درمیان کوئی خونی رشتہ موجود ہے۔ کارلو نے اپنے شو کے آخر میں اسٹیج پر جو تماشا دکھایا تھا اس نے کنگ کو خاصا ناراض کیا تھا اور وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا تھا۔ یہ کافی گمبھیر معاملہ لگتا تھا۔ اس سے پہلے ایک موقع پر کنگ نے بغاوت کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے اندر سے ہی کچھ لوگ غداری کر رہے ہیں' نجانے کیوں کارلو سے ملنے کے بعد میرا ذہن بار بار کنگ کے مندرجہ بالا فقرے کی طرف جا رہا تھا۔

زریں گل بولا "استاد عجیب ہو سکتا ہے کہ یہ کارلو صاحب کنگ کا کوئی بچھڑا ہوا بھائی ہو اور اب ان دونوں کے درمیان ایرانی مرا پرانی کا جھگڑا ہو۔ ام نے وحید مراد اور غلام محی الدین صاحب کا ایک فلم دیکھا تھا اس میں۔۔۔"

"ہاں ہاں وہ فلم میں نے بھی دیکھی تھی۔" صفدر نے اس کی بات کاٹی "اس فلم میں دونوں بھائیوں کے گلے میں بچپن میں ایک ہی جیسے تعویذ ڈال دیئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کنگ اور کارلو کے گلے میں بھی ایسے تعویذ ضرور ہوں گے۔ اگر زریں کوشش کرے تو ان تعویذوں کا سراغ لگ سکتا ہے۔"

زریں نے کھا جانے والی نظروں سے صفدر کو گھورا مگر میرے چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ کر بولا کچھ نہیں۔ صفدر نے بھی سنجیدگی سے سگریٹ کا کش لیا اور بولا "ویسے اتنی بات تو مجھے بھی معلوم ہوئی تھی کہ کنگ براؤن کا ایک چھوٹا بھائی موجود ہے۔ وہ پہلے کنگ کے ساتھ اس کے کاروبار میں شریک تھا لیکن پھر علیحدہ ہو گیا یا ویسے ہی کنارہ کش ہو گیا۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"سوزی نے بتایا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی کچھ اور بھی جانتا ہو۔ ام کو اس سے رابطہ فرمانا چاہیے۔" زریں بولا۔

"وہ بے چاری تو زیرِ عتاب ہے۔" میں نے کہا "پتا نہیں کہاں ہوگی۔"

"میں نے اتوار کو اسے کیمپس کے ہاسپٹل میں دیکھا تھا۔ اس کے ایک رخسار پر بڑی سی پٹی چپکی ہوئی تھی۔" صفدر نے بتایا۔

غزالہ کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ سوزی پر کیا گزری ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ پروفیسر اللہ دتا کے فرار اور روپوشی کے سبب سوزی پر کتنی بڑی آفت آئی ہے۔ عقوبت خانے میں اس کو نیم برہنہ حالت میں بے دردی سے پیٹا گیا تھا اور یہاں کم سن شیطان ماسٹر اسٹی نے اس کے رخسار پر اپنا سگریٹ بجھایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سوزی اب تک داغ دار چہرے کی مالک ہے۔ سوزی کی مصیبت کا سن کر غزالہ اور کلثوم رنجیدہ نظر آنے لگیں۔ ہم اپنی رہائش گاہ کے کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ ہماری اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ کمرا اس مکان میں سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ ہم نے اس کمرے کو بہت ہی اچھی طرح کھنگالا تھا اور پورا یقین کر لیا تھا کہ یہاں کوئی بصری یا صوتی آلہ نصب نہیں۔

زریں گل بولا "اماری ناقص سمجھ میں ایک اور بات آتا ہے۔ کیوں نہ ام جہاز کے نائب کپتان آرتھر سے رابطہ کرے۔ وہ کنگ براؤن کے بھی قریب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ حالات پر روشنی ڈال سکے۔"

زریں گل کی بات میں وزن تھا۔ صفدر نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ فیصلہ ہوا کہ میں علی الصباح آرتھر سے ملوں۔ ابھی ہم آرتھر کے بارے میں بات ہی کر رہے تھے کہ وہ وہاں آموجود ہوا۔ زریں نے آہستہ سے کہا "اس کو کہتے ہیں لمبا عمر۔"

آرتھر نے اب چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ لی تھی اور اس کی چال ڈھال میں بھی ایک طرح کی متانت اور سنجیدگی نے

جگہ پائی تھی۔ یقیناً یہ تبدیلی سائیں عالی کی صحبت اور عقیدت کا نتیجہ تھی۔ سائیں پتا نہیں اس گورے کو کیا الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہا تھا۔ میں نے آرتھر سے سب سے پہلے سائیں عالی کے بارے میں ہی پوچھا۔ میں نے کہا ”آرتھر! بروز ہفتہ میں نے تمہارے پیرو مرشد کو ایک ایسی جگہ پر دیکھا تھا جہاں چیختے ہوئے سارے بردوں اور شیطانوں کے پر جلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ سائیں عالی چار روز پہلے کیمپس میں نظر آیا تھا۔“

”ہاں' سائیں صاحب کو میں ہی وہاں لے کر گیا تھا۔“ آرتھر نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا ”دراصل' سائیں صاحب پچھلے کئی دنوں سے کنگ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ میں نے اس سلسلے میں کنگ سے بات کی۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ جس روز کیمپس میں بردوں اور گارڈز میں خون ریز لڑائی ہوئی' سائیں عالی کیمپس میں ہی تھے۔ غالباً وہ ہفتے کا ہی دن تھا۔“

میں نے کہا ”جس وقت لفٹس کے پاس بم دھماکا ہوا اس وقت سائیں کہاں تھا۔“

”میں اس وقت سائیں صاحب کے بارے میں سخت پریشان تھا۔ ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ افراتفری میں وہ کہیں فساد زدہ علاقے کی طرف نہ چلے گئے ہوں۔“

میں نے کہا ”تمہارا خدشہ درست تھا آرتھر! وہ اس وقت فساد زدہ علاقے میں ہی تھا۔ بم کا دھماکا ہونے سے صرف دو منٹ پہلے وہ میرے ہمراہ عین دھماکے والی جگہ پر موجود تھا۔“

آرتھر کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے سب کو اس واقعے کی تفصیل بتائی۔ وہ سب کچھ واقعی حیران کن تھا۔ سائیں اپنے اوٹ پٹانگ انداز میں مجھے ریوالور دکھا کر ٹیلی ویژن کے پاس سے ہٹا لے گیا تھا اور اس کے فوراً بعد وہ خوفناک دھماکا ہو گیا تھا' جس میں پانچ افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ اس بم دھماکے کی ذمے داری باغی افراد میں سے ہی کچھ لوگ قبول کر چکے تھے۔ کچھ دیر تک سائیں کی پُراسراریت اور اس کی ناقابلِ فہم شخصیت پر تبصرہ ہوتا رہا' پھر گفتگو کا رخ اس میجک شو یعنی طلسمی مظاہرے کی طرف مڑ گیا جو کوئی گھنٹے پہلے کشیدہ فضا میں ختم ہوا تھا۔ کارلو نامی عامل نے شو کے آخر میں اسٹیج پر ایک ایسا ناٹک رچایا تھا جس نے کنگ کو برہم کر دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر آرتھر نے انکشاف کیا کہ کنگ اور کارلو واقعی سگے بھائی ہیں۔ کنگ بڑا اور کارلو چھوٹا ہے۔ دو سال پہلے تک بردہ فروشی کے اس کاروبار میں دونوں کا اشتراک تھا۔ یہ زیرِ زمین دنیا بسانے اور اسے بنانے سنوارنے میں دونوں بھائیوں نے بھرپور کردار ادا کیا' مگر قریباً دو سال پہلے چھوٹا بھائی کارلو اچانک منظر سے غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں مختلف افواہیں گردش کرتی رہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ ماریطانیہ کی پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ انٹرپول کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کنگ نے کسی خصوصی مشن پر اسے یورپ بھیج رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بعض افراد کا خیال تھا کہ کنگ اور کارلو کے درمیان کوئی کاروباری جھگڑا ہوا ہے اور کارلو ناراض ہو کر از خود کہیں چلا گیا ہے۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے کارلو اچانک پھر منظرِ عام پر آ گیا تھا۔ وہ کنگ کے مقابلے میں پہلے ہی کچھ ہلکے جسم کا تھا اب وہ اور بھی کمزور نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے بال بڑھا لیے تھے اور اس کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں نظر آتی تھیں۔ وہ بتاتا تھا کہ اس نے دو برس تک جنگلوں اور بیابانوں میں رہ کر روحانی طاقت حاصل کی ہے اور اس کے اندر بہت کچھ بدلنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ شروع میں اکثر لوگوں نے اس کی باتوں کو مذاق سمجھا مگر پھر اوپر تلے کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ لوگوں نے اس کی باتوں کو سنجیدگی سے سنا۔

آرتھر صاف طور پر نہیں بتا رہا تھا تاہم اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں بھائیوں میں کسی قسم کا تنازع پایا جاتا ہے۔ اس تنازعے میں جہاں کچھ معززین کنگ کی حمایت کرتے ہیں' وہاں کچھ کارلو کے حمایتی بھی ہیں۔

میں نے آرتھر سے پوچھا ”تم نے آج کا شو دیکھا ہے۔“

وہ بولا ”میں مدعو تھا لیکن بیوی کی خراب طبیعت کے باعث دیر سے پہنچا۔ اس وقت تک شو ختم ہو گیا تھا۔“

”شو کا اختتام کچھ عجیب تھا۔“ میں نے کہا ”کارلو نے ایک ناٹک کے ذریعے خود کو مظلوم ظاہر کیا۔ اس نے دکھایا کہ کنگ نے طیش میں آکر اسے قتل کر دیا۔ بعد ازاں کنگ کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔“ میں نے پورا سین تفصیل سے اس کو بتایا۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا ”خدا نہ کرے یہاں تک نوبت پہنچے۔ مگر حالات کچھ اچھے نظر نہیں آتے۔“

میں نے محسوس کیا کہ میرے اور غزالہ کے یہاں آنے کے بعد بھی وہاں کوئی بات ہوئی ہے اور آرتھر اس بارے میں جانتا ہے۔ اس بات کا تعلق یقیناً کنگ اور کارلو کی چپقلش سے ہی تھا۔ میں نے اور صفدر نے آرتھر کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ زریں اور کلثوم چونکہ آرتھر کی الجھن

سمجھ چکے تھے لہٰذا وہ اٹھ کر باہر جا چکے تھے۔ تابی کے رونے کی آواز سن کر غزالہ بھی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اب میں اور صفدر ہی آرتھر کے پاس موجود تھے۔ آرتھر نے کچھ زیادہ تو نہیں بتایا تھا بہرحال یہ بات اس کے منہ سے نکل ہی گئی کہ شو ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کنگ برادرز اور کارلو میں خاصی تلخ کلامی ہوئی ہے۔ اس نے کہا ”میں کنگ سے ملنے ”روم“ میں گیا تھا۔ وہاں ایک کمرے میں کنگ اور کارلو پہلے سے موجود تھے۔ ایک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور کارلو کا غصے سے بھرا ہوا چہرہ نظر آیا۔ عقب سے کنگ کی آواز آئی 'ہم حکم دیتے ہیں کہ دروازہ بند کرو اور ہماری بات سنو' دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا مگر دو ہی منٹ بعد پھر جھٹکے سے کھلا اور کارلو صاحب تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کی طرف چلے گئے۔“

آرتھر یہ باتیں کرتے ہوئے خاصا متفکر نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا ”نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ٹرسٹ کا سارا نظم و نسق خطرے میں ہے۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بردوں کی بغاوت جیسے اور واقعے بھی ہو سکتے ہیں۔“

”بالکل' جب اپنے اندر ہی دراڑیں پڑنے لگیں تو پھر باہر سے خیر کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔“

صفدر نے آرتھر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”کہیں آپ یہ تو کہنا نہیں چاہ رہے کہ ہفتے کے روز ہونے والا واقعہ بھی دونوں بھائیوں کے اختلاف کا شاخسانہ تھا۔“

”یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔ ہم اس پر رائے دینے کے اہل نہیں' اور نہ ہی ہمیں دینی چاہیے۔“ آرتھر نے محتاط لہجے میں کہا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ آرتھر کے جانے کے بعد ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ابھی مجھے لیٹے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ ایک دستک نے مجھے جگا دیا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید غزالہ کی دستک ہے۔ وہ ان دنوں ہمہ وقت میرے لیے فکر مند رہتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ وہم گھر کیے ہوئے تھا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ تاہم جب میں نے دستک پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ غزالہ کی نرم و نازک دستک نہیں ہے۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے وہی دونوں گارڈز کھڑے تھے جو مجھے اکثر کیمپس لے کر جایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ”آپ کو کنگ نے یاد فرمایا ہے' فوراً۔“

میں نے رسٹ واچ دیکھی' رات کے دو بج رہے تھے۔

یہ بلاوا تعجب خیز تھا مگر یہاں تو ہر چیز ہی تعجب خیز تھی۔ کسی وقت کچھ بھی حکم دیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوال جواب میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ صفدر بھی سیڑھیاں اتر کر آ رہا ہے۔ پتا چلا کہ وہ بھی میرے ساتھ کیمپس جا رہا ہے۔ نیکروں وردیوں والے گارڈز ہمیں لے کر اس مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے ہمیں سرنگ میں داخل ہونے کے لیے گاڑی میں بٹھایا جاتا تھا۔ رات کے اس پہر ہوسٹل میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ افریقہ کے شفاف تاریک آسمان پر چاند دور مغرب میں جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں شک سا ابھرا۔ کنگ نے اس پہر ہمیں یاد کیوں کیا تھا' کہیں یہ کوئی فریب تو نہیں تھا۔ ٹرسٹ میں جس قسم کے حالات پائے جاتے تھے' ان میں ایسی سوچ کا ذہن میں آنا قدرتی بات تھی۔ بہرحال جلد ہی میں نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ہم اس طویل کوریڈور میں داخل ہو گئے تھے جو پورچ میں پہنچتا تھا۔ اچانک اطراف سے کم ریش آٹھ افراد نکلے اور ہم پر ٹوٹ پڑے۔ میرے سر کے عقب میں کسی وزنی شے سے ضرب لگائی گئی تھی۔ میں اس ضرب سے سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کم از کم دو افراد میرے سینے پر چڑھ بیٹھے مجھے اپنے چہرے پر چند زوردار مکے سہنے پڑے۔ میں نے ٹانگوں کو حرکت دینا چاہی مگر نچلا دھڑ بھی حملہ آوروں کی گرفت میں تھا۔ میں نے پوری قوت سے کروٹ بدلی اور چھاتی پر چڑھے ہوئے دو افراد کو فرش بوس کرنے میں کامیاب ہوا۔ ایک حملہ آور کے لمبے بال میرے ہاتھ میں آئے میں نے اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا۔ وہ ڈکراتا ہوا زمین بوس ہوا۔ اسی ہلچل میں میری داہنی ٹانگ آزاد ہو گئی تھی' وہ میں نے ایک شخص کے سینے پر دے ماری۔ مجھے کھڑے ہونے کا موقع مل گیا۔ اور یہ حملہ آوروں کے حق میں بہت برا ہوا۔ میرے سر کی زوردار ٹکر نے ایک مقابل کی ناک کی ہڈی توڑ دی اور اگلے چند سیکنڈ میں دوسرا اپنی کلائی تڑوا بیٹھا۔ دوسری طرف صفدر بھی اولین دھچکے سے سنبھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک حملہ آور کو صفدر کے سر کے اوپر سے ہو کر فرش پر گرتے دیکھا۔ ایک اور شخص صفدر کے سامنے سر بسجود تھا اور لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ یقیناً چند لمحے پہلے صفدر اسے کوئی تسلی بخش ضرب لگا چکا تھا۔ شاید ہم دونوں صورتِ حال کو قابو میں کر لیتے مگر اچانک سب کچھ ہمارے اختیار سے باہر ہو گیا۔ آہنی مکوں سے مسلح تین چار افراد مزید اندر گھس آئے اور انہوں نے ہمیں بے بس

کردیا۔ میرے سر اور سینے پر چند شدید چوٹیں آئیں اور میں بھی صفدر کی طرح گر گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمارے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے جاچکے تھے۔ حملہ آور ہمیں کھینچ کر ایک طویل کمرے میں لے گئے۔ یہاں ایک شخص کرسی پر بیٹھا اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہ مائیکل تھا۔

''ہاں۔۔۔ مسٹر شا! مزاج کیسا ہے۔'' اس نے گاورلا نے والے لہجے میں کہا۔

''اگر تم پر دس بارہ مسلح غنڈے چھوڑ دیے جائیں تو تمہارا بھی یہی دل چاہے گا کہ مزاج پوچھنے والے کے منہ پر گوبر باندھ دوں۔''

''رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ چلو ابھی کچھ دیر میں وہ بھی نکل جائے گا۔'' مائیکل نے کہا۔ اس نے اپنے تنومند حبشی کارندوں کو اشارہ کیا۔

ان کارندوں نے میرے اور صفدر کے منہ پر ایک چوڑا ٹیپ چپکا دیا۔ یہ ٹیپ اتنا سخت تھا کہ چند ہی لمحے میں میرے خون آلود ہونٹ سن ہو کر رہ گئے۔ صفدر کی قمیص پھٹ چکی تھی اور اس کا بالوں بھرا سینہ اور پیٹ نظر آرہا تھا۔ میری ایک آستین بھی اُدھڑ گئی تھی اور نیچے سے خون آلود بازو جھانک رہا تھا۔ مائیکل کے اشارے پر ہمیں کمرے سے باہر نکالا گیا اور پورچ میں لے جاکر ایک بند گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اس کوچ نما گاڑی میں سترہ اٹھارہ نشستیں تھیں۔ ائرکنڈیشنر پہلے سے چل رہا تھا۔ مائیکل اور اس کے حبشی کارندے بھی ہمارے ساتھ ہی سوار ہوگئے۔ ان کارندوں کی تعداد چودہ کے قریب تھی اور ان میں سے کم از کم نصف نیاہی یعنی آدم خور تھے۔ ان کے غیر معمولی چوڑے جبڑے اور ان کی خوں خوار نگاہیں انہیں اپنے ساتھیوں سے ممتاز کرتی تھیں۔

گاڑی پورچ سے نکلی اور روانہ ہوگئی۔ اس سے پہلے ہم جب بھی گاڑی میں بیٹھے تھے اس طویل سرنگ میں داخل ہوئے تھے جس کا ایک سرا ہوسٹل اور دوسرا زیرِ زمین کیمپس سے ملا ہوا تھا لیکن آج ہمارا رخ کیمپس کی طرف نہیں تھا۔ آج ہم ٹرسٹ کے بیرونی گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ گاڑی کی کھڑکیوں پر دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے اس کے باوجود ہم نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ اب ہم ماریا ٹرسٹ کی منحوس چار دیواری سے باہر آچکے ہیں۔ ہم اب بھی مکمل طور پر قیدی تھے اس کے باوجود مجھے ایک طرح کی راحت کا احساس ہوا' اور یہ راحت ٹرسٹ کی چار دیواری سے نکلنے کی راحت تھی۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس خطرناک ترین ترم خو مائیکل مجھ سے صرف چند فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کی جلتی ہوئی نگاہ گاہے گاہے میری نگاہ سے ملتی تھی اور میرے رگ و پے میں چنگاریاں سی بھر جاتی تھیں۔ یہ بات مجھے بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ مائیکل کے دل و دماغ میں میرے لیے بہت سا کینہ جمع ہے اور جونہی مائیکل کو کوئی اچھا موقع ملا وہ اپنی پوشیدہ دشمنی کو ظاہر کرنے سے باز نہیں رہے گا۔ شاید آج مائیکل کو کوئی اچھا موقع مل گیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ وہ مجھے اور صفدر کو کہاں لے جارہا ہے اور ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر وہ جو کچھ بھی کرنے جارہا تھا وہ بدترین ہوسکتا تھا۔ ٹرسٹ میں آنے کے بعد مائیکل کا ایک عزیز دوست مبارک امین میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔ اس دکھ کے علاوہ بھی مائیکل کو میرے ہاتھوں کئی ''دکھ'' اٹھانے پڑے تھے۔ شاید آج وہ ان سارے دکھوں کا حساب ایک بار ہم سے لے لینا چاہتا تھا۔

ہم نے ایک نیم گرم رات میں تقریباً ایک گھنٹے تک تیز رفتار سفر کیا اور ٹرسٹ کی چار دیواری سے کم و بیش ساٹھ کلومیٹر دور آگئے۔ ایک مقام پر گاڑی رک گئی۔۔۔ دروازہ کھول کر مجھے اور صفدر کو باہر نکالا گیا۔ یہ بالکل سنسان علاقہ تھا۔ زمین ریتلی تھی اور جگہ جگہ جھاڑیاں اور صحرائی پودے نظر آرہے تھے۔ چاند مغربی افق پر بہت نیچے تک جھک آیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی جس کے سبب خوشگوار خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اور صفدر نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی' دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی صدا سنائی دے رہی تھی۔ بس گاڑی کے انجن کی گھرر گھرر تھی اور اس کی ہیڈلائٹس تھیں' جو ریتلی زمین اور اس پر حشرات الارض کی کھینچی ہوئی لکیروں کو نمایاں کررہی تھیں۔

''کیا ہمیں مار کر یہاں دفن کیا جارہا ہے؟'' میرے ذہن میں یہ سوال ایک چیخ کی طرح ابھرا۔

اگر واقعی ایسا ہو رہا تھا تو پھر یقیناً یہ بڑی بے بسی کی موت تھی۔ ایک مسلح نیاہی نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کے ہونٹوں پر سے ٹیپ ہٹا دیا۔ ہونٹوں اور اردگرد کی جگہ پر جیسے کسی نے مرچیں لگا رکھی تھیں۔ میں نے مائیکل سے کہا ''دیکھو بھئی مائیکل! میں تمہیں ایک بہادر دشمن سمجھتا ہوں۔ بہادر دشمن سے جو توقع کی جاتی ہے وہ تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہوگی۔''

وہ بڑی ملائمت سے مسکرایا ''تم کیا سمجھتے ہو۔ میں یہاں تم دونوں کو قتل کرنے کے لیے لایا ہوں؟ نہیں نہیں۔ یہ

نہیں ہے۔ میں تو تمہیں آزاد کردینا چاہتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تمہاری ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے۔'' اس نے ایک پل توقف کرکے مجھے گھورا اور بولا ''شاید تمہیں میری بات پر یقین نہیں آرہا۔ چلو میں تمہیں ثبوت فراہم کردیتا ہوں۔''

اس نے خوں خوار صورت کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے میرے اور صفدر کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو آپس میں ملایا اور ایک تیسری ہتھکڑی سے ہماری ایک ایک کلائی آپس میں باندھ دی پھر پہلے والی دونوں ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اب ہتھکڑی کے ایک حلقے میں میری کلائی تھی اور دوسرے میں صفدر کی' ہمارا ایک ایک بازو آزاد ہوچکا تھا۔ مائیکل نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو اب بھاگ جاؤ۔ خدا کرے تمہاری قسمت تمہارا ساتھ دے۔''

میرے ذہن میں ان جعلی پولیس مقابلوں کا نقشہ آگیا جو پاکستان میں آئے دن منظرِ عام پر آتے رہتے تھے۔ ایسے مقابلوں میں گرفتار شدہ ملزموں کو پہلے از خود بھاگنے کا موقع دیا جاتا ہے' اور جب وہ بھاگ اٹھتے ہیں تو پولیس انہیں شوٹ کردیتی ہے اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مفرور ملزموں کو ٹھکانے لگا دیا۔ شاید ہمارے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی ناٹک رچایا جارہا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ یہ سب کچھ کنگ براؤن کو مطمئن کرنے کے لیے کیا جارہا ہو' یا پھر ہماری موت کو ڈرامائی اور دردناک بنانے کے لیے یہ کھیل کھیلا جارہا ہو۔

مائیکل کے کم و بیش چودہ کارندے ہمارے اردگرد موجود تھے۔ ان میں سے آٹھ خودکار رائفلوں سے مسلح تھے' باقیوں کے پاس بھی یقیناً چھوٹے ہتھیار موجود تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس طاقت درنا وجثہ اور درندگی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے چہروں کی سفاکی اور بے رحمی گواہی دے رہی تھی کہ وہ کریں گے جو ان کا باس مائیکل ان سے کہہ دے گا۔

''چلو بھاگ جاؤ اب۔'' مائیکل نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''حرام زادے' تم سیدھی طرح ہمیں گولی کیوں نہیں مار دیتے۔'' صفدر پھنکارا۔

مائیکل کا ایک کارندہ طیش میں صفدر کی طرف بڑھا لیکن مائیکل نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولا ''تم دونوں خواہ مخواہ خود کو مصیبت میں مت ڈالو۔ میں سچے دل سے کہہ رہا ہوں کہ بھاگ جاؤ' تو بھاگ جاؤ۔ اس میں تمہاری بہتری ہے۔''

''شاید تم ہمیں پیٹھ پر گولی مارنا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوگا۔''

''تو پھر کیا ہوگا؟ ہمارے دور چلے جانے کے بعد ہمیں تلاش کرو گے۔ تاکہ جنگل میں شکار کھیلنے کا مزہ لے سکو؟''

''تم خود ہی سوال کررہے ہو شا' اور خود ہی جواب دے رہے ہو۔ تم صرف اپنا اور ہمارا وقت ضائع کررہے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم یہاں سے راہِ فرار اختیار کرلو۔''

میں نے صفدر کی طرف دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں ہمارے درمیان آنکھوں میں اچانک کچھ طے ہوگیا۔ اگر مائیکل ہمیں موت اور زندگی کی آنکھ مچولی کا چیلنج کررہا تھا تو یہ چیلنج ہمیں قبول تھا۔ ہم اس قسم کے کھیلوں سے ڈرنے والے نہیں تھے۔ ہم تو خود قریہ قریہ ایسے خطرناک اور حوادث کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ یہ سنسنی خیزی ہماری غذا تھی اور موت کا ساتھ ہمیں کبھی کبھی آکسیجن کی طرح ضروری محسوس ہوتا تھا۔ پھر ایک بات اور بھی تھی۔ ممکن تھا کہ مائیکل واقعی سچ ہی کہہ رہا ہو۔ کسی نامعلوم وجہ سے یہ لوگ ہمیں آزاد کردینا چاہتے ہوں۔

بہرحال میں نے اور صفدر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور الٹے پاؤں چلتے ہوئے دس پندرہ گز کی دوری پر چلے گئے۔ مائیکل اور اس کے ساتھی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں پہنچتے ہی ہم نے رخ پھیرا اور ایک نشیب میں دوڑتے چلے گئے۔ یہاں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا اور تعاقب میں آنے والے کسی بھی شخص کو جل دینے کے وافر مواقع موجود تھے۔ ہمارے ہاتھ ایک ہی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے لہٰذا بھاگنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ایک دو بار ہم گرے بھی مگر جلد ہی ہماری آنکھیں اندھیرے میں زیادہ اچھی طرح دیکھنے لگیں اور ہم جھاڑ جھنکاڑ سے بچ کر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی مائیکل کے بارے میں ہماری وہ خوش فہمی دور ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ مائیکل اور اس کے مسلح کارندے ہمارا تعاقب کررہے تھے۔ ان کی ٹارچوں کی چمکتی ہوئی روشنیاں بتا رہی تھیں کہ وہ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے نشیب میں اتر رہے ہیں ''حرام زادے۔۔۔ سالے۔'' صفدر بھاگتے ہوئے بولا ''یہ تو مرزا جٹ کے سالے لگتے ہیں۔ امید ہے کہ ہمیں تیروں سے چھلنی کرکے ہی چھوڑیں گے۔''

''اگر مرزا کے سالے ہیں تو کم از کم ہمارے لیے صاحباں کا انتظام تو کرتے۔'' میں نے کہا۔

اچانک عقب سے سیون ایم ایم رائفل کی لرزہ خیز

آواز سنائی دی۔ صفدر دوڑتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ انہوں نے آپ کی بات سن لی ہے۔"

ٹارچوں کی روشنی دائیں اور بائیں جانب سے ہماری سمت بڑھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی دکھائی دے جاتی تھیں۔ میں نے کہا "لگتا ہے کہ ان بدبختوں نے اپنی دشمنی کا سلسلہ وہیں سے جوڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم پرل کانی فارم سے اسی طرح بھاگے تھے اور اسی طرح مائیکل اور مبارک امین نے ہمیں پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شاید آج مائیکل اس ناکامی کو کامیابی میں بدلنا چاہتا ہے۔"

صفدر نے دوڑتے دوڑتے اپنے آزاد ہاتھ سے دائیں جانب اشارہ کیا۔ وہاں نیم تاریکی میں کچھ اونچے نیچے ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ کسی کھلے میدان میں بھاگنے کے بجائے یہ ٹیلے ہمارے لیے زیادہ موزوں تھے۔ ہم نے اپنا رخ ان ٹیلوں کی طرف پھیر دیا لیکن جب ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ جنہیں ہم ٹیلے سمجھ رہے تھے' وہ اسکریپ اور کوڑا کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ کوڑا کرکٹ کہاں سے اکٹھا کرکے اور کب سے اس ویرانے میں پھینکا جا رہا تھا۔ ہم ان ڈھیروں میں پہنچے اور نشیب و فراز کی بھول بھلیوں میں دوڑنے لگے۔ تعاقب کرنے والے بدستور ہمارے پیچھے تھے اور قریب تر پہنچ رہے تھے۔ اب ضروری محسوس ہونے لگا تھا کہ ہم خود کو کہیں چھپا لیں' دوسری صورت میں مائیکل کے کارندے کسی بھی وقت ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ ایک جگہ تباہ حال موٹر سائیکلوں کے ڈھانچوں کا بہت بڑا ڈھیر نظر آیا۔ ہم اس اسکریپ کے اندر گھس کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد تعاقب کرنے والوں کی ایک ٹولی وہاں پہنچ گئی اور ہمیں اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگی۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ ایک دو افراد اس مقام کی طرف بھی نکل آتے جہاں ہم نے گھات لگا رکھی تھی۔ اس صورت میں ہم اچانک حملہ کرکے رائفل وغیرہ چھین سکتے تھے۔ تاہم بہت جلد ہی ہماری یہ امید بھی دم توڑ گئی۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ مائیکل اور اس کے کارندے اسکریپ کے ڈھیر میں ہماری موجودگی سے باخبر ہو چکے ہیں' اور وہ تاریکی میں ہمارے قریب آنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ان لوگوں نے ہماری پناہ گاہ کے اردگرد پوزیشنیں سنبھال لیں اور ہماری طرف سے کسی غلطی کا انتظار کرنے لگے لیکن جس غلطی کا انہیں انتظار تھا وہ ہم ہرگز کرنے والے نہیں تھے۔

غالباً وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے محاصرے سے گھبرا کر بھاگیں اور وہ ہم پر فائر کھول دیں۔ ہم اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھے رہے' بالکل جیسے ہم بھی اس ٹیڑھے میڑھے زنگ آلود اسکریپ کا حصہ ہوں۔ ریتلی زمین پر رینگنے والے حشرات الارض میرے جوتوں میں سرسرا رہے تھے اور آستینوں میں گھس رہے تھے' مگر ہم اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہنے پر مجبور تھے۔ پھر مائیکل کی منحوس آواز ویرانے میں گونجی اور پھیلتی چلی گئی "تم ہار گئے ہو شا' بہتر ہے کہ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔"

جواب میں صفدر اور میں خاموش رہے۔ مائیکل نے وقفے وقفے سے دو بار اپنا مطالبہ دہرایا۔ پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے اور صفدر کو یہ خاموشی کسی زلزلے کا پیش خیمہ محسوس ہوئی۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کی جا سکتی تھی' اچانک ہماری پناہ گاہ کی طرف رش کیا جا سکتا تھا' بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہماری "خدمت" میں کوئی دستی بم ہی پیش کر دیا جاتا۔ کنگ براؤن کا خیال رہ رہ کر ذہن میں آ رہا تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ یہ ساری کارروائی مائیکل نے از خود کی ہے اور کنگ براؤن سے چھپا کر کی ہے۔ اگر یہ لوگ ہمیں جان سے مارنے میں کامیاب ہو جاتے تو بعد ازاں آسانی سے ہمارے فرار کا ڈراما رچایا جا سکتا تھا۔ کنگ کو بتایا جا سکتا تھا کہ ہم دونوں اپنی مذموم کوشش کے دوران نائٹ گارڈز کی فائرنگ کا شکار ہوئے ہیں۔ اس "کارنامے" کے صلے میں کنگ براؤن سے انعام و اکرام یا چھوٹا موٹا ایوارڈ بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ انعام و اکرام کا خیال ذہن میں آتے ہی میرا دھیان فوراً اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف چلا گیا۔ ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں ... کے چمک دار ڈائل کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پچھلے آدھ ... گھنٹے میں ہم دونوں نے مائیکل اینڈ کمپنی کو چکما دینے کی کوشش کی تھی۔ کئی صحرائی جھاڑیوں میں کئی بار اپنا ... تھا اور آخر کاٹھ کباڑ کے اس ڈھیر میں آ چھپے تھے۔ ... تاریکی کے باوجود مائیکل اینڈ کمپنی نے ایک پل کے لیے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے ساتھ چپکے رہے تھے۔ کہیں یہ گھڑی ہی تو کمال نہیں دکھا رہی تھی؟ اس سوال نے جھنجھوڑنے کی حد تک ذہن پر ضرب لگائی۔ میری پیروی میں صفدر نے بھی اپنا دھیان میری گھڑی پر مرکوز کر دی تھی۔ اس سے پہلے بھی ہم ... اس رسٹ واچ کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر چکے تھے۔ میں نے گھڑی کھول کر ہاتھ میں لے لی ...

"پیچھا پالیا جائے اس سے؟" میں نے سرگوشی میں صفدر سے پوچھا۔

"ٹھیک خیال ہے۔" صفدر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا پھر اس نے گھڑی میرے ہاتھ سے لے لی۔

تھوڑی دیر تک وہ اسے ہاتھ میں تولتا رہا۔ گھڑی کا ڈائل اور گولڈن چین' مدھم روشنی میں بھی نظر آ رہے تھے۔ صفدر ایک گھٹنا ریتلی زمین پر ٹیک کر آدھا کھڑا ہو گیا پھر اس نے کرکٹ کے تھرو پھینکنے والے انداز میں گھڑی پورے زور سے اس نشیب کی طرف اچھال دی جو ہماری دائیں جانب موجود تھا۔ گھڑی کافی دور جا گری تھی۔ ہم دم سادھے "نتیجے" کا انتظار کرتے رہے۔ چند سیکنڈ تک تو کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ پھر جو رد عمل ظاہر ہوا وہ ہماری خواہش اور توقع کے عین مطابق تھا۔ ہمارے گرد موجود ہمارے مسلح "دوستوں" میں اچانک ہلچل پیدا ہوئی اور ہم نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کچھ افراد دائیں طرف اسی نشیب کی طرف سرک رہے ہیں جدھر گھڑی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارے خدشات غلط نہیں تھے۔ جس طرح اسٹیج پر ایکٹر کو فوراً تماشائیوں کا رد عمل مل جاتا ہے ہمیں بھی فوراً اپنی کارروائی کا نتیجہ مل گیا تھا۔ گھڑی ریتلی زمین پر گرنے سے بالکل آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مائیکل کے کارندوں کا نشیب کی طرف جانا اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ وہ لوگ ہمارے نہیں بلکہ گھڑی کے پیچھے ہیں۔ یقیناً گھڑی میں کوئی مختصر ٹرانسمیٹر موجود تھا جو تعاقب میں آنے والوں کو سگنل فراہم کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے پاس اس قسم کے آلات اور سسٹم کا ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مائیکل اینڈ کمپنی کی توجہ نشیب پر مرکوز ہو جانے کے سبب ہمارے عقب میں راستہ صاف ہو گیا تھا۔ یہ بڑے اہم لمحات تھے۔ کچھ ہی دیر بعد شب کی تاریکی دن کی روشنی میں بدلنے والی تھی' پھر ہمارے لیے بھاگنے اور چھپنے کے مواقع بہت محدود ہو جاتے تھے۔ بہتر تھا کہ راہ فرار اختیار کرنے کے اس آخری اور سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بوقت ضرورت ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے صفدر نے کاٹھ کباڑ میں سے ایک آہنی راڈ پہلے ہی اٹھا لی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ کسی ٹریل موٹر سائیکل کا شاک آبزوربر تھا۔ میرے ہاتھ میں بھی ایک سریا نما چیز آ گئی تھی۔ ہم اپنی پناہ گاہ میں سے نکلے۔ چالیس پچاس گز تک اسکریپ کی اوٹ میں رکوع کے بل چلتے رہے' پھر گھاس اور جھاڑیوں میں گھستے چلے گئے۔ ہمارا رخ نشیب کی مخالف سمت میں تھا۔ بھاگتے ہوئے میرا ایک جوتا اتر گیا۔

میں نے دوسرا بھی اتار پھینکا اور صفدر کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑنے لگا۔ ننگے پاؤں دوڑنا زیادہ مشکل ثابت ہوا لیکن چونکہ ہمارا ایک ایک ہاتھ مشترکہ ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک کے لیے اپنی رفتار کم کرنا ممکن نہیں تھا۔ ریتلی زمین میں جگہ جگہ کانٹے تھے' جو بڑی اچھی طرح تلووں کا مزاج پوچھ رہے تھے' بہرحال میں نے صفدر پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ صفدر کا اپنا جوتا جوگر ٹائپ کا تھا' اس لیے اترنے سے محفوظ رہا۔ صفدر کا عام جوتا چونکہ دو روز پہلے کم ہو گیا تھا لہٰذا یہ مقامی طرز کا ہوا دار جوگر اُس نے انچارج ڈاجون نے فراہم کیا تھا۔ عقب سے ایک بار پھر چار پانچ فائر سنائی دیے' فائرنگ کی آواز سے بہت سے پرندے درختوں سے اڑے اور کہیں دور درختوں میں آوارہ کتوں کا کوئی گروہ زور و شور سے بھونکنے لگا۔ ایک جگہ درختوں میں ایک گڑھا سا تھا۔ چھپنے اور کچھ دیر سانس لینے کے لیے ہمیں یہ ایک مناسب جگہ نظر آئی۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ ہم یہاں گھات لگا کر مائیکل کے کارندوں سے کوئی ہتھیار وغیرہ چھیننے میں کامیاب ہو جاتے۔ گڑھے میں پانی تھا جو ہماری پنڈلیوں تک پہنچ رہا تھا۔ میرے ننگے پاؤں بدبو دار کیچڑ میں دھنسے ہوئے تھے۔ قریباً چار پانچ منٹ بعد ہمیں اپنے قریب ٹارچوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ تاہم اس مرتبہ یہ روشنیاں دائیں جانب قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھیں اور وہ منتشر اور بھٹکی ہوئی سی تھیں۔ یہ منظر ہمارے لیے کافی اطمینان کا باعث تھا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو رہی تھی کہ اس سے پہلے ہمارے دوست جو گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے تعاقب میں آ رہے تھے تو اس کا سہرا اسی گھڑی کے سر تھا جو ہم کاٹھ کباڑ میں پھینک آئے تھے۔

اب دن کا اُجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اردگرد کے مناظر بتدریج نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک منظر دیکھ کر میں اور صفدر دونوں ہی چونک گئے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر درختوں کے درمیان ایک ریسٹ ہاؤس طرز کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ یہ عمارت زیادہ تر لکڑی کی ہی بنی ہوئی تھی۔ سامنے گراسی لان تھا لیکن جس چیز نے مجھے اور صفدر کو چونکنے پر مجبور کیا وہ ایک نئے ماڈل کی سفید جیگوار کار تھی۔ اس کا نمبر 555 سے شروع ہوتا تھا۔ یہ کار ہم نے دو تین بار ہوٹل کے ایک گیراج میں کھڑی دیکھی تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ یہ کنگ براؤن کے ذاتی استعمال کی کار ہے۔ آج ہم اس کار کو اس شاندار ریسٹ ہاؤس کے باہر دیکھ رہے تھے۔ دو افراد ہمیں کار کے نزدیک دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک تو باوردی ڈرائیور

تھا۔ دوسرا غالباً گھریلو ملازم تھا۔ دونوں متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ہمیں ان کے واضح تاثرات تو دکھائی نہیں دیے تاہم اتنا اندازہ ہو گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے عقب میں جو فائر کیے گئے تھے انہوں نے ہی ان دونوں سیاہ فام حضرات کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے پھر ایک اور شخص ان دونوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کی ٹیلی اسکوپ تھی۔ وہ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے اطراف کے درختوں کا جائزہ لینے لگا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگر یہ لوگ یہاں موجود ہیں تو کنگ براؤن یا اس کا کوئی معتمد ساتھی بھی یہاں موجود ہوگا۔ کنگ براؤن کی یہاں موجودگی کی کیا وجہ تھی؟ اس کے بارے میں سوچنے کی ہمیں مہلت تھی اور نہ فوری ضرورت تھی۔ فوری ضرورت تو بس یہ تھی کہ ہم مائیکل اور اس کے کارندوں کی زد سے نکل جائیں۔ ہم دونوں نے بزبانِ خاموشی طے کیا اور ایک ساتھ جھرمٹ سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف دوڑ پڑے۔ تاریکیں ابھی کافی فاصلے پر تھیں' وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے اور اگر دیکھ بھی لیتے تو کوئی خاص مضائقہ نہیں تھا۔ تمیں چالیس سیکنڈ کے اندر اندر ہم جیکوار گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی کے قریب کھڑے افراد ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ہمارے حلیے ہی ایسے ہو رہے تھے۔

میں نے دوربین والے شخص سے پوچھا "کنگ براؤن یہاں موجود ہیں؟"

ابھی میرے الفاظ منہ ہی میں تھے کہ ریسٹ ہاؤس کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور میں نے نیم عریاں لباس والی اس حسین ملازمہ کو دیکھا جو اکثر کنگ کے آس پاس نظر آتی تھی۔ ملازمہ کو دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ کنگ بنفسِ نفیس یہاں پایا جاتا ہے۔ لڑکی نے ٹیلی اسکوپ والے شخص کو اپنے قریب بلایا اور اس سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد وہ توبہ شکن چال چلتی واپس چلی گئی۔ ٹیلی اسکوپ والا شخص میرے پاس آیا اور بولا "آپ کا نام مسٹر شا اور مسٹر صفدر ہے؟" ہم دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا "محترم کنگ آپ کو دیکھ چکے ہیں۔ انہوں نے آپ کو فوری طور پر اندر بلایا ہے۔"

اس وقت مجھے حیرانی ہوئی کہ کنگ نے اتنی جلدی ہمیں کیسے دیکھ لیا اور پہچان لیا لیکن اس بات کا انکشاف بعد میں ہوا کہ اس ریسٹ ہاؤس میں بھی ویڈیو کیمروں کی سہولت موجود تھی۔ ایک ایسا ہی نگران کیمرا ریسٹ ہاؤس کی چھت پر بھی موجود تھا۔

ہم ایک مسلح گارڈ کے ساتھ چلتے ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ریسٹ ہاؤس باہر سے جتنا خوب صورت نظر آتا تھا' اندر سے کہیں زیادہ تھا۔ یہاں ائیر کنڈیشنر کی ٹھنڈک تھی' فرشوں پر دبیز قالین تھے۔ ہمارے حلق پیاس سے کانٹا ہو رہے تھے۔ ٹھنڈک میں پہنچ کر فرحت کا احساس ہوا۔ دبیز قالین پر چڑھنے سے پہلے میں اور صفدر ٹھٹک گئے۔ ہمارے پاؤں کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ گارڈ نے کہا "کوئی بات نہیں سر۔ آپ تشریف لائیں۔"

ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچے۔ یہاں کنگ براؤن ایک صوفے پر براجمان تھا۔ اس کا "الوٹ انگ" ازرق چھبکلا بھی اس کے ساتھ تھا۔ کنگ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں اور صفدر بری طرح چونک گئے۔ وہ مائیکل تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تاؤ دلانے والی مسکراہٹ تھی۔

"اوہ۔۔۔ آؤ شا' ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔" کنگ نے عجیب لہجے میں کہا۔

"میں۔۔۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا جناب۔" میں نے واقعی حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تمہیں سمجھانے کے لیے ہی تو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اندر آجاؤ۔" کنگ نے کہا۔

"اگر اجازت ہو تو ہم ذرا واش روم میں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" کنگ بولا "سب کچھ ایسے ہی رہنے دو۔ اسی کیچڑ اور خستہ حالی کے لیے تمہیں یہ ساری بھاگ دوڑ کرنا پڑی ہے۔ ورنہ مائیکل کے کارندے تمہارے حق میں اتنے بھی برے نہیں ہیں۔"

"گستاخی معاف' ہم کچھ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔" ۔۔۔ نے کہا۔

کنگ نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسیاں چھ فٹ کے فاصلے پر تھیں اور ہمارا ایک ایک بازو آپس میں بندھا تھا لہٰذا ایک ملازم نے دونوں کرسیوں کا درمیانی فاصلہ ختم کر دیا۔ ہم پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ کنگ نے مائیکل کے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا پھر وہ پُرسوچ انداز میں بولا "یہ سب کچھ ایک پلاننگ کا حصہ ہے۔ مائیکل نے جو کچھ کیا ہماری ہدایت کے تحت تھا۔"

میں اور صفدر خاموشی سے کنگ کی طرف دیکھتے رہے۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا "کارلو ہمارا ساتھی ہے۔ ہم اس سے پیار بھی کرتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے سے کارلو کی مصروفیات ایسی ہیں کہ ہمیں اس سے شدید اختلاف کرنا پڑ رہا ہے۔ دراصل اس کی دماغی صحت کچھ عجب

رہی ہے۔ دو سال پہلے تک وہ بھرپور طریقے سے ہمارے ساتھ کاروبار میں شریک تھا مگر پھر ایک روز ایکا ایکی وہ بغیر کسی کو بتائے منظر سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے اسے تلاش کرانے کی بہت کوشش کی مگر پورے دو سال تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ یوں لگتا تھا کہ ہم کسی دن تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے لیکن ایک روز اچانک کارلو کہیں سے وارد ہو گیا۔ یہ قریباً دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ کارلو کا حلیہ بدل چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک کلین شیو اور خوش لباس شخص تھا مگر اب وہ جو کچھ ہے تم نے دیکھا ہی ہے۔ وہ اکثر رات کے وقت گلے میں ایک مالا بھی پہنتا ہے جس میں انسانی انگلیوں کی ہڈیاں پروئی ہوتی ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ماورائی طاقتوں کا مالک بن گیا ہے اور اپنی روحانی شکتی سے بہت سی چیزوں کو الٹ پلٹ کر سکتا ہے۔ وہ لوگوں کا علاج کرنے کا دعویٰ بھی کرتا ہے' اس کے علاوہ گمشدہ اشیاء کے بارے میں بھی قیاسے لگاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب چکر اور شعبدہ بازی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس پر یقین بھی کر رہے ہیں۔ نہار عزا نے بھی اس کا کل رات والا شو دیکھا تھا۔ تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا' اس شو میں کچھ باتیں واقعی حیرت ناک تھیں۔ بہرحال جناب میں خود کو اس بارے میں تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"شاید تم ضرورت سے زیادہ انکساری دکھا رہے ہو۔" کنگ نے کہا "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم اس فیلڈ میں کافی تجربہ رکھتے ہو۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا جناب۔"

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ماورائی علوم کے بارے میں تم نے کافی کچھ پڑھ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات' روحانیات' ہپناٹزم اور مسمریزم جیسے موضوعات پر بھی تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ غالباً ہپناٹزم کا تم عملی تجربہ بھی رکھتے ہو۔ ہم غلط تو نہیں کہہ رہے۔"

"میں آپ کی بات رد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ آپ تک درست معلومات پہنچائی نہیں گئی ہیں۔"

کنگ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "دیکھو شا! جہاں تک ہماری اپنی ذات کا تعلق ہے ہمیں ان باتوں پر کچھ زیادہ یقین نہیں۔ ہاں ہپناٹزم اور مسمریزم وغیرہ کے بارے میں بہت عالم فاضل لوگ بھی سنجیدگی سے بات کرتے ہیں۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص میں قدرتی صلاحیت موجود ہو اور وہ سخت ریاضت کرے تو ہپناٹزم اور مراقبے وغیرہ سے حیرت انگیز نتائج برآمد کر سکتا ہے۔"

"ایسا ہوتا ہوگا جناب' بلکہ ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس فیلڈ کا بندہ نہیں ہوں اور نہ ہی۔۔۔"

"مسٹر شا' ہم اس سلسلے میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس کچھ بہت ٹھوس معلومات موجود ہیں' ہم کسی اور بات پر یقین نہ بھی کریں مگر اتنی بات پر ضرور کرتے ہیں کہ ماورائی علوم اور نفسیات وغیرہ کے بارے میں تمہارا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ہم اس سلسلے میں تمہیں پاکستان' گلگت اور سانوس کا اشارہ دیتے ہیں۔ شاید تمہارے ذہن میں کوئی بات آجائے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ اب میرا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ پیر فرتوت' فتنہ ساماں سامیں عالی کنگ سے بالمشافہ ملاقات کر چکا ہے اور اس کے کانوں میں خبر نہیں کون کون سی الٹی سیدھی باتیں ڈال چکا ہے۔ گلگت کی وادی موت میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات ابھی بہت پرانے نہیں ہوئے تھے۔ ان کی تلخ یادیں اور ناقابلِ فہم یادیں ابھی ہمارے ذہنوں میں تازہ تھیں۔ آنکھوں کے ماہر طلسم کار سانوس کا تصور ابھی بھی گاہے گاہے ہم سب کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ہم اس کے بارے میں اور اس کی پھیلائی ہوئی جادو نگری کے بارے میں سوچتے تھے۔ وادیِ موت میں سفید محل کے اسرار' جاتیوں یعنی مذہبی رہنماؤں کی ریشہ دوانیاں' تخت نامی مقام کے ہنگامے کچھ بھی ہمیں بھولا نہیں تھا۔۔۔ اور پھر اس وادی کے سارے جانے پہچانے کردار بھی سوچ کے دروازے پر دستک دیتے رہتے تھے۔ وادی کا من موجی ڈاکٹر ہنری' شعلہ صفت لڑکی ناشا' معصوم بچی زر خونہ' حسین ساپینا اور کوکی دادا سمیت بے شمار لوگوں کے چہرے حافظے کی تختی پر نقش تھے۔ سفید محل میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات ایک فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر دوڑ گئے۔ کنگ نے ان واقعات کا حوالہ دیا تھا تو کیوں دیا تھا' اور وہ آئندہ مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس وادی سے ملتے جلتے حالات یہاں بھی پیش آنے والے ہوں۔

میں نے کہا "محترم کنگ! گستاخی کی دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔ میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ آپ نے پاکستان اور گلگت کا ذکر یہاں کیوں فرمایا ہے۔"

"صرف اس لیے تاکہ تم جان سکو کہ ہم تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہماری یہی جان کاری ہمیں

مجبور کر رہی ہے کہ ہم تم سے کچھ کام لیں۔"

"جناب! میں ہر اس کام کے لیے حاضر ہوں جو میں کر سکتا ہوں اور ہر اس کام کے لیے بھی جو میں نہیں کر سکتا۔ آپ فرمائیے میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"بہت خوب۔ ہمیں تم سے ایسا ہی جواب درکار تھا۔ بہرحال تمہیں کام بتانے سے پہلے ہم یہ وضاحت کردیں کہ تمہارے بارے میں یہ جانکاری ہم کافی دنوں سے رکھتے ہیں اور یہ جانکاری ہمیں اس سائمیں نامی شخص سے حاصل ہوئی ہے جو نائب کپتان آرتھر کے پاس موجود ہے۔"

"میرا اپنا بھی یہی اندازہ تھا۔ ایسی باتیں وہی شخص کر سکتا ہے۔"

کنگ کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھری "تمہارے منہ سے یہ تکرار ہمیں اچھی نہیں لگ رہی۔"

"میں معافی چاہتا ہوں جناب آئندہ احتیاط کروں گا۔" میں نے فوراً غیر مشروط معذرت کردی۔

کنگ کی پیشانی پر کچھ دیر تک ناگواری کی شکن برقرار رہی۔ تب اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا "ہم تمہیں اور تمہارے دوست کو کارلو کی طرف بھیج رہے ہیں۔ تم نرسٹ کے دو مفرور مکینوں کی حیثیت سے وہاں جاؤ گے۔ یہاں سے ہیں پچیس میل دور شمال کی طرف جنگل میں زار نامی جھیل کے پاس وہ جگہ ہے جہاں اس وقت کارلو موجود ہے۔ زار جھیل کے کنارے جنگل میں ایک مقامی قبیلہ آباد ہے اسے لارس کہا جاتا ہے۔ قبیلے کے لوگوں کو لارسی بھی کہتے ہیں اس قبیلے کی یہاں ماریطانیہ میں کئی ایک شاخیں ہیں۔ لارسی کسی حد تک پُراسرار اور الگ تھلگ رہنے والے لوگ ہیں۔ یہ آگ کی پوجا کرتے ہیں۔ اس قبیلے کا سردار نہ صرف سیاست داں ہوتا ہے بلکہ طبیب' کاہن اور جادوگر بھی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں' ان کے مطابق زار جھیل کے کنارے رہنے والے لارسیوں کا سردار کافی بوڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر سو سال سے زائد ہے مگر وہ اب بھی اچھی خوراک کھاتا ہے اور اپنی عورت کے ساتھ سوتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے جس کی عمر صرف اٹھارہ برس ہے۔ وہ اپنے ہم شکل بیٹے کو اپنی بے مثال صحت کے ثبوت کے طور پر ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس سردار کا نام اس کے کریکٹر ہی کی طرح عجیب و غریب ہے۔ اسے سردار بوغات کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان کے اس لفظ کا مطلب تم نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے.... ہماری معلومات کے مطابق یہ سردار ہی دراصل کارلو میں پیدا ہونے والے سارے بگاڑ کا ذمے دار ہے۔ پچھلے دو سال کارلو اسی سردار بوغات کے پاس رہا ہے۔ سردار بوغات نے اسے بتدریج اپنے رنگ میں رنگا ہے اور اس کا دماغ جو پہلے ہی خراب تھا' بالکل خراب کرکے رکھ دیا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو' کل رات والے شو کے فوراً بعد کارلو نے ہمارے چیمبر میں آکر ہم سے جھگڑا کیا اور پھر خود ہی غصہ کھا کر وہاں سے چلا آیا۔ اب وہ اسی سردار بوغات کے پاس گیا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس نے یقیناً ہمارے خلاف کوئی کھچڑی پکائی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ اس کھچڑی میں سردار بوغات کے علاوہ لارس قبیلے کے سرکردہ افراد بھی شامل ہیں۔ ہم تمہیں نرسٹ کے باغی اور مفرور مکینوں کی حیثیت سے لارس قبیلے میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد یقیناً تمہاری سمجھ میں آہی گیا ہوگا۔ ہمیں معلومات درکار ہیں کہ لارسیوں میں رہ کر کارلو کیا کر رہا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ کارلو کا گرو سردار بوغات دراصل کیا شے ہے اور اس کی روحانیت اور عملیات کی حقیقت کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں اس کام کے لیے تم سے بہتر کوئی شخص نہیں۔ تمہارا دوست صفدر تمہارا بہترین معاون ثابت ہو سکتا ہے۔"

صفدر نے کہا "محترم کنگ' ہمیں زبان کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ ہم انگلش اور اردو کے سوا کچھ نہیں جانتے۔"

"ہمارے خیال میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب تم لوگ وہاں پہنچو گے تو لارسی تمہیں مترجم فراہم کریں گے۔ اس بات کا پتہ ہم لگا چکے ہیں کہ ان کے پاس مترجم موجود ہیں۔ پھر سردار بوغات خود بھی انگریزی بہت اچھی طرح جانتا ہے۔"

"اس دور دراز علاقے میں رہتے ہوئے بھی انگریزی داں ہونا تعجب کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

کنگ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا "ہم نے پچھلے دو ماہ میں لارسیوں کے متعلق کافی معلومات جمع کرلی ہیں اور یہ معلومات ہم تمہیں منتقل کرسکتے ہیں لیکن ہم ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ اس سے ہمارے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ پھیکا پڑ سکتا ہے۔ تم دونوں وہاں مفرور افراد کی حیثیت سے پہنچو گے اور تمہارے لیے وہ لوگ یکسر اجنبی ہوں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"آپ بالکل بجا ارشاد فرما رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ تک کنگ مجھے اور صفدر کو بغور دیکھتا رہا پھر اس نے ایک کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی۔ ایک حبشی

نوجوان مؤدب انداز میں اندر داخل ہوا۔ کنگ نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے نوجوان سے کہا "ان کی چیزیں ان کے حوالے کردو۔"

نوجوان واپس گیا۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک لیڈی ہینڈل تھا۔ تھوڑی سی کرنسی تھی اور کسی گاڑی کی چابی تھی۔ کنگ نے آدھی آدھی کرنسی ہمارے حوالے کی اور کہا کہ ہم اسے جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد لیڈیز ہینڈل اس نے میرے حوالے کردیا اور گاڑی کی چابی صفدر کو دے دی۔ ہینڈل کو دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ یہ انچارج سوزی کا ذاتی ہینڈل تھا۔ یہ ہینڈل اس سے پہلے بھی ایک دفعہ میرے ہاتھ میں آچکا تھا لیکن اس دن کے برعکس آج یہ خالی نہیں تھا۔ اس کے بعد حبشی نوجوان نے اپنے لباس میں سے دو دھاتی کڑے برآمد کیے' ان میں سے ایک میری کلائی اور دوسرا صفدر کی کلائی میں ڈال دیا گیا۔ ان کڑوں پر ہم دونوں کے کوائف کندہ تھے۔ ایسے کڑے ماریا نرسٹ میں موجود ہر بردے کے ہاتھ میں نظر آتے تھے۔

کنگ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ باقی کی تمام ہدایات تمہیں مائیکل سے مل جائیں گی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تم دونوں خود کو اس ذمے داری کا اہل ثابت کرو گے جو ہم نے تم پر ڈالی ہے۔ وِش یو گُڈ لک۔"

کنگ نے اپنے سگار کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا اور کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ بظاہر دبلا پتلا تھا مگر اس کی بے پناہ اندرونی مضبوطی اور طاقت کو ظاہر کرتا تھا۔ ہمیں کسی سوال کا موقع دیے بغیر وہ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مائیکل آ وارد ہوا۔ وہ بولا "شاہ جہاں! ہماری اب تک کی اطلاعات کے مطابق سردار بوغات ایک نہایت ہی جہاں دیدہ اور ہوشیار شخص کا نام ہے۔ وہ اس عمر میں بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ہر معاملے میں بال کی کھال اتار سکے۔ جو پتا تنگ ہم نے کی ہے اس کی کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے کہ ہر کام بالکل درست ہو اور اس میں کسی طرح کا سقم تلاش نہ کیا جاسکے۔ اور بات صرف سردار ہی کی نہیں ہے "خدا کے فضل" سے ہمارے اپنے اندر بھی بہت سے مہربان ایسے ہیں جو ہمارا بھانڈا پھوڑ سکتے ہیں' لہٰذا جو اسٹوری ہم بنا رہے ہیں یہ ہر لحاظ سے مکمل ہونی چاہیے۔"

"اسٹوری کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"اسٹوری یہ ہے کہ شاہ جہاں کے ساتھ انچارج سوزی کے خفیہ تعلقات تھے اور یہ تعلقات ہرکولیس جہاز میں ہی شروع ہوگئے تھے۔ نرسٹ کے اندر بھی سوزی اور شاہ جہاں اکثر میل ملاپ کرتے رہتے تھے۔ بعد ازاں جب پروفیسر اللہ وتا کے سلسلے میں سوزی نے غفلت برتی اور سزا کے طور پر اس کے ساتھ مارپیٹ کی گئی اور اس کے رخسار کو سگریٹ سے داغا گیا تو وہ در پردہ کنگ سے دشمنی پر اتر آئی۔ اسی نے اپنے اور تم دونوں کے فرار کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے پر نجانے کب عمل ہوتا لیکن اسی دوران میں تم لوگوں کو اتفاقاً ایک زبردست موقع فراہم ہوگیا۔ کل رات ڈھائی بجے اچانک نرسٹ میں الیکٹرک پاور کا بریک ڈاؤن ہوگیا اور پورے دو گھنٹے تک نگرانی کا نظام درہم برہم رہا۔ انچارج سوزی اپنی گاڑی میں تم دونوں کو نرسٹ سے نکالنے میں کامیاب ہوگئی مگر جلد ہی نگرانی پر مامور عملے کو تم تینوں کے فرار کا علم ہوگیا اور انہوں نے تمہارا پیچھا شروع کردیا۔ یہ ایک طویل تعاقب ثابت ہوا۔ اس تعاقب کے دوران میں فائرنگ بھی ہوئی۔ سوزی کو گولی لگی اور وہ ہلاک ہوگئی۔ تم لوگوں نے اس کی لاش چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دی۔ تاہم اس کا ہینڈل اپنے قبضے میں لے لیا۔ سوزی کے بعد گاڑی صفدر نے ڈرائیو کی۔ سوزی کی ہلاکت کے دس پندرہ منٹ بعد ہی گاڑی کا ایندھن ختم ہوگیا اور اسے چھوڑ کر تم دونوں کو بھاگنا پڑا۔ بے آباد علاقے میں ایک طویل تعاقب کے بعد آخر تم دونوں بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور گرتے پڑتے زار جھیل تک جا پہنچے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟" میں اور صفدر خاموش رہے "کیا بات ہے۔ چپ کیوں ہوگئے ہو؟"

"کیا سوزی کو واقعی مار دیا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ سوال تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تم نے خود ہی کہا ہے ناں کہ اس کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس میں کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑی گئی ہے۔"

"فی الحال میں تمہیں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا اور میرا خیال ہے کہ ہمارے اصل موضوع سے اس سوال کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور ہمیں جو کچھ کرنا ہے ذرا جلدی کرنا ہے۔" اس نے ہمیں دکھانے کے لیے بے قراری سے اپنی رسٹ واچ دیکھی پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا "تمہاری گھڑی کہاں ہے شاہ جہاں؟"

"وہیں جہاں تم نے اتروائی تھی۔" میں نے بھی معنی خیز انداز میں کہا۔

"یعنی اسکریپ کے ڈھیر میں؟" اس نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نظروں میں مجھے ایک بار پھر حسد اور کینہ کا گدلا پن نظر آیا۔ وہ ایک دم موضوع بدلتے ہوئے بولا "کنگ کو تم دونوں کی ہوشیاری اور ذہانت پر بھروسا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہیں ایک اہم ترین کام سونپا جا رہا ہے لیکن کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ ہوشیاری بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ قبیلہ لارس میں جاکر تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا جیسے کنگ کی ہدایات ہیں۔ تم ان لوگوں میں رہ کر اور ان کے ہم خیال بن کر ان کی پلاننگ جاننے کی کوشش کرو، لیکن یہ کام دھیمے پن اور نارمل انداز سے ہونا چاہیے۔"

"ہمارے اور تمہارے درمیان رابطے کا کیا ذریعہ ہوگا؟" صفدر نے پوچھا۔

"رابطے کا ذریعہ تو تم اپنے ساتھ لیے پھرتے ہو۔" مائیکل نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

مائیکل نے صفدر کے کیچڑ آلود جوتے کی طرف اشارہ کیا اور اسے جوتا اتارنے کی ہدایت کی۔ یہ مقامی ٹائپ کا جوگر کافی بڑا تھا۔ صفدر نے ایک جوتا اتارا۔ مائیکل نے اسے الٹ کر ایڑی کو حرکت دی اور وہ کسی ڈھکنے کی طرح ایک طرف ہٹ گئی۔ اندر ایک مختصر اور نہایت حساس ٹرانسمیٹر کے تار و پود نظر آ رہے تھے۔ جاسوسی کے ایسے آلات پہلے پہل صرف کہانیوں میں ہوتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے عملی شکل اختیار کی ہے۔ اس وقت بھی ہم جوتے کے تلوے میں ایک جیتا جاگتا ٹرانسمیٹر اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ ماریا ٹرسٹ میں ہمیں جو جدید ترین الیکٹرانکس سہولیات نظر آتی تھیں یہ ٹرانسمیٹر ان میں ایک اضافہ تھا۔ مائیکل نے ہماری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹرانسمیٹر سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی۔ ایک ننھا سا سرخ بلب اسپارک کرنے لگا۔ ایک کونے سے دُبلا پتلا حساس انٹینا بھی مائیکل نے کھینچ لیا۔ وہ ہمیں بڑی تفصیل سے اس ڈوائس کے فنکشن اور ان کا استعمال سمجھانے لگا۔ اس نے ایک ایک بات کی وضاحت کی اور تقریباً ایک گھنٹا صرف کر دیا۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر مزید حیران کیا کہ ایک ایسا ہی لانگ رینج ڈوائس دوسرے جوتے کی ایڑی میں بھی موجود ہے۔ دونوں کی ساخت اور فنکشن بالکل ایک تھے، اگر کسی وجہ سے ایک ڈوائس خراب ہو جائے تو ہم دوسرا استعمال کر سکتے تھے۔ ڈوائس کو جوتے میں سے نکالنے کا آسان طریقہ بھی مائیکل نے ہمیں بتایا۔

ہم دونوں مائیکل کی یہ طویل ہدایات سمجھ تو رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بور بھی ہو رہے تھے۔ مائیکل نے یہ بیزاری ہمارے چہروں سے پڑھ لی۔

"کیا بات ہے۔" اس نے کہا "بہت اکتائے ہوئے لگتے ہو؟"

"اکتائے ہوئے تو نہیں، ہاں تم پریشان کہہ سکتے ہو۔" میں نے جواب دیا "کنگ ہم سے ایک ایسا کام لینا چاہ رہے ہیں، جس کو ہم سے بہت بہتر طریقے سے کرنے والے لوگ بھی محترم کنگ کے پاس موجود ہوں گے۔"

"تو تم کنگ کی نظرِ انتخاب پر شک کر رہے ہو؟"

"ایسی گستاخی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی اوقات جتنی میں جانتا ہوں اتنی کوئی اور نہیں جان سکتا اور پھر۔۔۔"

"شاید تم ضرورت سے زیادہ انکساری دکھانے کے مرض میں مبتلا ہو۔ ورنہ تم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے کھوجنے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا "کوئی نہ کوئی شعبدے بازی تو ہے تمہارے اندر، ورنہ اب تک تمہاری لاش کو چاٹنے والے کیڑے بھی جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہوتے۔"

"کیا آج تم نے پہیلیاں بجھوانے کی قسم کھا رکھی ہے؟"

وہ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے رہا پھر کہنے لگا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں زہر دیا گیا تھا۔ ماسٹر اسٹی کے دو دوستوں جوم اور داس نے رات کو تمہارے دودھ میں زہر ملا دیا تھا۔ یہ ایک بہت تیز اثر زہر ہے۔ پانچ منٹ کے اندر انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ کب کی بات ہے یہ؟"

"اس واقعے کو سات آٹھ روز ہو چکے ہیں۔ دراصل تمہاری رہائش گاہ کی بڑی راہداری میں ایک نگران کیمرا موجود ہے۔ پچھلے اتوار کی شب اسی کیمرے نے یہ منظر ریکارڈ کیا تھا۔ دونوں لڑکوں کو تمہارے بیڈ روم کی طرف سے راہداری میں داخل ہوتے دیکھا گیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ انہوں نے کوئی سنگین شرارت کی ہے۔ چین نے لڑکوں کو فوری طور پر اپنے پاس طلب کیا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔ لڑکوں کے پاس سے ایک وائل برآمد ہوا جس میں زہریلا محلول تھا۔ مزید تفتیش پر لڑکوں نے بتایا کہ انہوں نے تمہارے دودھ میں زہر ملا دیا ہے۔ ایسا انہوں نے اپنے مرنے والے دوست کے انتقام میں کیا تھا۔ یہ خبر کنگ تک

پہنچی۔ وہ بھی پریشان ہوئے اور فوری کارروائی کا حکم دیا۔ تم اس وقت تک سونے کے لیے لیٹ چکے تھے اور دودھ پیے ہوئے تمہیں تو دو گھنٹا گزر چکا تھا۔ ہمارا پہلا خیال یہی تھا کہ تم دارِ فانی سے کوچ کر چکے ہو، مگر جب فون کی گھنٹی کے ذریعے تمہیں جگایا گیا تو تم بھلے چنگے اٹھ بیٹھے اور تم نے کنگ سے دو تین منٹ تک بات کی۔ یہ ایک حیرت انگیز صورتِ حال تھی۔ اتفاق سے اس وقت وہ درویش بھی آرتھر کے ہمراہ کیمپس میں موجود تھا جسے تم لوگ سائیں کے نام سے پکارتے ہو۔ اسے محترم کنگ سے ملاقات کے لیے لایا گیا تھا۔ اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے اور پاکستان و انڈیا میں کافی وقت تمہارے ساتھ گزار چکا ہے۔ اس نے ماورائی علوم میں تمہاری بے پناہ دلچسپی کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ تم ایک ماہر ہپناٹسٹ سمجھے جاتے ہو۔ اس نے مزید انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ تم نے سیلف سجیشن (خود ترغیبی) کے ذریعے اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر رکھی ہے کہ کسی بھی قسم کا حیوانی، نباتاتی یا کیمیائی زہر تم پر اثر نہیں کرتا۔ درویش کی باتوں کو شروع میں زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ ہمارا اوّلین خیال یہی تھا کہ شاید تم نے دودھ استعمال ہی نہیں کیا۔ ایک دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ شاید ڈی ایکس نامی اس زہریلے محلول میں وہ خاصیت ہی نہیں جس کے لیے وہ مشہور ہے۔ ہم نے وائل میں موجود محلول کے چند قطرے ایک بندر پر تجربہ کیا۔ وہ دو تین منٹ کے اندر تڑپ کر مر گیا۔ اس کے بعد تمہاری بے خبری میں تمہاری خواب گاہ سے دودھ کا خالی گلاس اٹھوایا گیا۔ کنگ کی بھتیجی مس ویرا نے لیبارٹری میں خود اس گلاس کا تجزیہ کیا۔ اس میں ڈی ایکس زہر موجود تھا۔ تم تو اس رات مزے سے سوئے رہے اور ہم شدید الجھن میں گھرے جاگتے رہے۔ درویش کی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ اگر ہمیں اب بھی کسی قسم کا شک ہے تو ہم اس تجربے کو تم پر دہرا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اسے اپنی بات پر پختہ یقین تھا۔"

میں اور صفدر حیرت کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے اور مائیکل کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ لطف اندوز ہو رہا تھا، مگر شاید اس کے پاس وقت کم تھا لہٰذا وہ زیادہ تفصیل میں نہیں جا رہا تھا۔ بولا "اگلے روز صبح تم نے ناشتے میں جو اورنج جوس پیا وہ بھی موت کا جام تھا۔ جتنے زہر نے بندر کی جان لی تھی اس سے ڈیڑھ گنا زہر اورنج جوس میں موجود تھا مگر تم وہ جوس پی کر ڈکار گئے اور بھلے چنگے گھومتے پھرتے رہے۔ درویش سائیں نے اس روز محترم کنگ کو تمہارے بارے میں کئی باتیں بتائیں اور انکشاف کیے۔ اب معلوم نہیں کہ ان میں سے کتنے درست تھے اور کتنے غلط۔ بہرحال کوئی نہ کوئی شعبدے بازی تو ہے جس کے سبب تم اب تک زندہ سلامت پھر رہے ہو۔"

مائیکل کی باتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی اور پھر ویسے بھی ڈکٹا فونز اور وڈیو کیمروں کا سایہ یہاں ہر جگہ موجود تھا۔ میری ذات کے ساتھ کچھ ایسے کمالات منسوب کیے جا رہے تھے جن کا علم مجھے بھی نہیں تھا۔ یعنی مجھے بتایا جا رہا تھا کہ میں خود اپنے لیے بھی چھپا رستم ہی ہوں۔ عجیب بات تھی۔ مجھے دو بار خطرناک زہر دیا گیا تھا۔ میں اس سے بے خبر رہا تھا اور میرا جسم بھی اس سے بے خبر رہا تھا۔ یہ صلاحیت مجھ میں کب پیدا ہوئی تھی یا کب سے موجود تھی، میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی۔ میں ٹھوس حقائق پر یقین رکھنے والا شخص تھا، اور یقیناً صفدر کا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ مائیکل کی بات کسی طور ہماری بدھی میں سما ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ کوئی گورکھ دھندا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ سائیں عالی کا بھی اس میں کوئی کردار ہے۔ وہ مجھے یہاں پُراسرار بنانے پر تلا ہوا تھا اور یقیناً اس کے پیچھے اس کا کوئی مقصد تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی گلگت وغیرہ کے بارے میں کنگ کو مرچ مسالا لگا کر داستانیں سنانے کی۔

بھوک اور پیاس سے ہم دونوں کا برا حال تھا لیکن مائیکل نے کھانے پینے والی کوئی شے ہمارے قریب نہیں آنے دی۔ وہ ہماری خستہ حالی و نیم جانی برقرار رکھنا چاہتا تھا، تاکہ جب ہم گرتے پڑتے لارسیوں کے علاقے میں داخل ہوں تو ہماری اداکاری گریگری پیک اور کلارک گیبل کو بھی مات کر دے۔

○☆○

وہ ایک طویل سفر تھا، گرمی، حبس اور پریشانی کا سفر۔ افریقہ کا بے رحم سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت بہتا رہا تھا، مگر اب بہہ بہہ کر خشک ہو گیا تھا۔ بس جسم کے عریاں حصوں پر سوئیاں سی چبھتی تھیں اور بے حال کر دیتی تھیں۔ ہمیں مسلسل پیدل چلتے ہوئے اب تقریباً چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ کسی وقت میں اور صفدر کسی سایہ دار درخت کے نیچے رک جاتے اور اپنے سامنے دور تک پھیلی ہوئی لمبی زرد گھاس اور کٹی پھٹی زمین کو دیکھتے، کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ اس بے اماں دوپہر میں چرند پرند بھی کہیں کونے کھدروں میں جا چھپے تھے۔ بس افریقہ

کی موٹی کھیاں تھیں جو سایہ دار جگہوں پر بھنبھناتی نظر آتی تھیں یا ایک گلہری نما خاکستری جانور تھا جو کسی وقت تیزی سے ہمارا راستہ کاٹتا ہوا گزرتا تھا اور جھاڑ جھنکاڑ میں گم ہو جاتا تھا۔

جوں جوں ہم شمال کی سمت آگے بڑھ رہے تھے زمین کا ریتلا پن کم ہو رہا تھا اور جھاڑ جھنکاڑ بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم پانی ابھی بھی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ پیاس سے ہمارا یہ حال تھا کہ کہیں کائی جما جوہڑ بھی نظر آتا تو ہم اسے "منرل واٹر" کا سا احترام دیتے "شاہ جہاں صاحب! آپ میرے جوتے پہن لیں۔" صفدر نے میرے زخمی پاؤں کو دیکھتے ہوئے تیسری بار پیشکش کی۔

"یار! میرے تو زخمی ہو ہی چکے ہیں اب تیرے بھی زخمی ہوں گے، فائدہ کیا؟ ویسے بھی تمہارے جوتے پہن کر مجھے یہی لگے گا کہ کار کی ڈگی میں ہیروئن کی کھیپ رکھ کر اسلام آباد میں گھوم رہا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ تمہارے جوتوں میں ٹرانسمیٹر نصب ہیں۔ قبائلیوں کے لیے یہ ایک معقول جواز ہوگا کہ تمہیں دیگ میں زندہ اُبال کر کھا جائیں۔"

اچانک صفدر بری طرح ڈگمگا گیا۔ اس کا پاؤں پنڈلی تک نرم زمین میں دھنس گیا تھا "اوہ خدایا!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

یہ دلدلی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ افریقی جنگلوں میں واقع آدم خور دلدلوں کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہ ویسی دلدل تو نہیں تھی، پھر بھی رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرح کی خوشی کا احساس ہوا۔ نرم زمین اس امر کی گواہ تھی کہ کہیں آگے پانی کی شکل بھی نظر آئے گی۔ ہم لمبی گھاس میں احتیاط سے قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ صفدر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "ہم کاربٹ کی کہانیاں یاد آ رہی ہیں۔ ایک ایسے ہی ماحول میں اس نے ایک افریقی تیندوے کا ذکر کیا تھا۔"

"یار ہوش سے کام لو۔" میں نے کہا "تیندوے کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے، اور جن چیزوں کی عمر لمبی ہوتی ہے وہ یاد کرنے پر حاضر ہو جاتی ہیں اور ہمارے پاس صرف ایک لیڈیز پستول ہے۔"

صفدر کی حاضر جوابی اسے یقیناً جواب دینے پر آمادہ کر رہی تھی مگر گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے، بولنے کے بجائے چپ رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے یہاں تک خشک لمبی گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ میں ہم نے بتیرہ کے سفر کیا تھا اور مسلسل ان حالات کے بارے میں سوچا تھا جو ہمیں آئندہ پیش آنے والے تھے یا پیش آ سکتے تھے۔ یہ سب کچھ ایک خواب جیسا لگ رہا تھا۔ آدھی رات کے بعد ماریا ٹرسٹ سے ہمارا نکلنا، مائیکل اینڈ کمپنی کا ویران علاقے میں ہمارا تعاقب کرنا پھر ریسٹ ہاؤس میں کنگ براؤن سے ہماری چونکا دینے والی ملاقات، اور پھر اس منصوبے کا انکشاف جو نجانے کتنے دنوں سے ترتیب دیا جا رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں مائیکل نے جو گفتگو کی تھی وہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ خاص طور سے گفتگو کے وہ حصے جن کا تعلق سائیں عالی اور اسٹی کے دوستوں سے تھا۔ مائیکل کا دعویٰ تھا کہ مجھے خطرناک زہر دیا گیا تھا اور یہ زہر مجھ پر بے اثر رہا تھا۔ سائیں عالی نے اس حوالے سے جو بیانات دیے تھے وہ قابلِ غور تھے۔ میری طرح صفدر کو بھی یقین نہیں تھا کہ خطرناک زہر میرے معدے میں پہنچنے کے باوجود بے اثر رہا ہے۔ وہ اسے بھی کسی گہری چال سے تعبیر کر رہا تھا۔ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا اور دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر پہنچ گیا۔ مجھے وہ سوئی یاد آ گئی تھی جو کئی روز پہلے سائیں نے پُراسرار طور پر مجھے چبھوئی تھی اور بھاگ گیا تھا۔ اس جگہ پر مجھے کئی روز جلن رہتی تھی اور ہلکا سا بخار بھی ہوا تھا۔ نجانے کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ اس سوئی اور اس زہر خورانی میں گہرا تعلق ہے جس کا ذکر چند گھنٹے پہلے مائیکل نے کیا ہے۔

صفدر کی نگاہ میرے چہرے پر تھی۔ وہ شاید میرے تاثرات سے میری سوچ کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا ہم دونوں کو چونکنا پڑا۔ ہمیں ایک جگہ بکری جیسی کی بہت سی مینگنیاں نظر آئیں۔ یہ مینگنیاں ایک طرح سے آبادی اور رہائش کی علامت تھیں۔ کچھ آگے ہمیں چند درختوں کے کٹے ہوئے تنے دکھائی دیے، پھر ایک پگڈنڈی نما راستہ نظر آیا۔ اس راستے کے گرد کہیں کہیں جانوروں کا فضلہ وغیرہ بھی تھا۔ یقیناً ہم کسی آبادی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ یہ وہ آبادی ہو سکتی تھی جو ہماری منزل تھی اور اس کے علاوہ بھی کوئی گاؤں یا دیہہ ہو سکتا تھا پھر دور سے ایک انسانی آواز ہمارے کانوں میں پڑی اور ہم اس جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ کھجور کے ایک بلند و بالا درخت پر ایک ننگ دھڑنگ سیاہ وجود نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تھا اور اب اپنی لمبی باریک آواز میں کسی کو پکار رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایسی ہی

دو تین اور آوازیں سنائی دیں۔ یہ بھی کھجوروں کے بلند درختوں سے آئی تھیں۔

ہم اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئے۔ پیچھے ہٹنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا اور آگے بڑھنے میں بھی اندیشہ تھا۔ یقیناً ہمارا واسطہ خالصتاً اجڈ اور دور افتادہ حبشیوں سے پڑا تھا۔ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ ہم آگے بڑھیں تو شائیں سے دو تین تیر آئیں اور ہمارے سینوں کو رنگین کر دیں۔ قریباً دو منٹ اسی کشمکش میں گزرے۔ تب ہمیں اپنے اطراف کی جھاڑیوں اور لمبی خودرو گھاس میں ہلچل محسوس ہوئی۔ کچھ لوگ ہمارے بالکل قریب موجود تھے لیکن ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے اور ان دیکھی چیز سے ہمیشہ زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ بڑے کٹھن لمحے تھے۔ ہمارے ساتھ کوئی بھی "مناسب سی" ٹریجڈی ہو سکتی تھی۔ دفعتاً خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ زمین نے جیسے ایک دم بہت سے لمبے تڑنگے مسلح حبشیوں کو اگل دیا۔ ان کی تعداد دس سے کم نہیں تھی۔ جسم پر صرف کھال کی چھوٹی چھوٹی لنگوٹیاں تھیں۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنے سروں پر پرندوں کے پر سجا رکھے تھے اور ماتھے پر سرخ و سفید دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ بے شک وہ قبائلی تھے لیکن ان کے پاس ہتھیار جدید تھے۔ کم از کم چار افراد کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ ایک نے اپنی عریاں کمر سے ریوالور کا ہولسٹر باندھ رکھا تھا۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں بھالا بھی نظر آ رہا تھا۔

فربہ اندام شخص اپنی مٹکے جیسی توند کو ہلاتا ہوا آگے آیا اور اس نے ہم پر افریقی زبان کی بوچھار کر دی۔ اس کا انداز جارحانہ تھا۔ ہم بھلا کیا جواب دیتے، خاموش کھڑے رہے۔ اسی دوران میں ایک اور شخص آگے بڑھا اور میرے ہاتھ میں موجود دھاتی کڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک ان لوگوں نے آپس میں کھسر پھسر کی پھر ہم دونوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ دو رائفلوں نے ہمیں نشانے پر لے رکھا تھا۔ فربہ اندام شخص نے آگے بڑھ کر اچھی طرح ہماری تلاشی لی۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل تھیں اور اپنے نیم عریاں بدن پر اس نے کوئی خوشبو مل رکھی تھی۔ تلاشی میں ہماری جیبوں سے کرنسی نکال لی گئی۔ صفدر کی جیب سے گاڑی کی چابی اور میری جیب سے لیڈیز پسٹل برآمد کر لیا گیا۔ مطمئن ہونے کے بعد ان لوگوں نے ہمیں آگے لگا لیا اور بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ نصف فرلانگ تک ہم نے نہایت گھنے درختوں میں سفر کیا۔ یہاں ایک دو جگہ ہمیں رائفل بردار ننگ دھڑنگ افراد یام کے بلند درختوں پر چڑھے نظر آئے۔ انہوں نے وہاں چھوٹی چھوٹی مچانیں بنا رکھی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان لوگوں کی حیثیت پہرے داروں کی تھی۔ نہایت گنجان درختوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہاں ہمیں مکئی اور جو وغیرہ کے کھیت نظر آئے اور چلچلاتی دھوپ میں مرد و زن کام کرتے دکھائی دیے۔ ہم ان کے پاس سے گزرتے تو وہ ہماری طرف متوجہ ہو جاتے اور دیر تک دیکھتے اور چہ میگوئیاں کرتے رہتے۔ ایک راستے پر کچھ لوگ دکھائی دیے۔ انہوں نے پشت سے ٹوکریاں باندھ رکھی تھیں اور وہ بڑے سروالے مقامی گدھوں کو ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں سے گزرنے کے بعد ایک نہایت خوب صورت منظر ہماری نگاہوں کے سامنے کھل گیا۔ یہ صاف پانی کی ایک چھوٹی جھیل تھی اور جھیل کے کنارے کچے پکے جھونپڑوں کی ایک وسیع و عریض بستی نظر آ رہی تھی۔ بستی کے اندر جس شے پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی تھی وہ ایک بلند و بالا عمارت تھی۔ گویا عمارت لکڑی اور گھاس پھونس وغیرہ کے ذریعے جھونپڑوں ہی کی طرز پر تعمیر کی گئی تھی مگر اس کے حجم کی وجہ سے اسے جھونپڑا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس عمارت کے بلند ترین مقام پر ایک سیاہ اور سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جھیل میں چند رنگے تیر رہے تھے اور سفید براق پروں والی بطخیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے جھیل کے کنارے کنارے چلتے نیم دائرے کی شکل میں سفر کیا اور بستی کے قریب پہنچ گئے۔ جھیل کو دیکھنے کے بعد اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہم اپنی منزل یعنی لارس قبیلے میں جا پہنچے ہیں۔ جلد ہی ہم بستی کے اندر تھے۔ بستی کے سیاہ فام مکین رک رک کر ہماری طرف متوجہ ہو رہے تھے اور ان کی نگاہیں بڑی دلچسپی سے ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہمارا ایک ایک ہاتھ بدستور آہنی ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا اور یہ چیز تماشائیوں کے لیے اضافی دلچسپی کا باعث تھی۔ ہم اس بلند و بالا عمارت کے سامنے پہنچے جو جھیل کے عین کنارے پر موجود تھی۔ قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس عمارت کو جھونپڑا کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ یہ مکمل طور پر درختوں کی شاخوں، گھاس پھونس اور لکڑی سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا ڈیزائن بھی ایک وسیع و عریض گول جھونپڑے کا سا تھا۔ اس کے مختلف حصوں پر گارے کا لیپ بھی کیا جا رہا تھا۔ پاس سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ عمارت ابھی ابھی تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے کچھ حصوں پر ابھی بھی تھوڑا بہت کام باقی تھا۔ توانا جسموں والے ننگ دھڑنگ مزدور تیزی سے یہ بچا کھچا کام مکمل کرنے میں مصروف تھے۔

عمارت کے پہلو میں حیران آنکھوں والے بہت سے بچے کھڑے ہمیں گھور رہے تھے' وہ بالکل عریاں تھے۔ ہمیں بستی کے ایک چھوٹے سے بازار سے گزارا گیا' یہاں مختلف قسم کی سبزی' تربوز اور کیلے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ بازار کے عقب میں ایک بڑے گول جھونپڑے کے اندر ہمیں پہنچایا گیا اور چٹائیوں پر بٹھا دیا گیا۔ اس جھونپڑے کے دو حصے تھے' جس حصے میں ہم بیٹھے تھے وہاں مٹی کے چھوٹے بڑے برتن رکھے تھے' دیواریں گارے سے پوتی گئی تھیں اور ان پر چند بھالے آویزاں تھے۔ لکڑی کی ایک بلی پر شکار کیے ہوئے گوشت کے چند انچ چوڑے اور دو تین فٹ لمبے ٹکڑے سوکھنے کے لیے لٹکا دیے گئے تھے۔ ہم پانچ دس منٹ تک خاموشی سے چٹائی پر بیٹھے رہے' دو رائفل بردار افراد ہمارے قریب موجود تھے۔

آخر درمیانی عمر کا ایک صحت مند شخص اندر داخل ہوا۔ وہ لنگوٹی کے بجائے ایک لمبے چولے میں تھا' یہ چولا بھی ایک پتلی سی کھال کا بنا ہوا تھا۔ اس شخص کے ساتھ ایک قبول صورت سفید فام لڑکی تھی۔ وہ آدھے بازو کی بنیان اور گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی نیکر میں تھی۔ وہ مترجم کے فرائض انجام دینے کے لیے مقامی شخص کے ساتھ آئی تھی۔ اس مترجم کی وساطت سے مقامی شخص نے اپنا نام لارو نابے بتایا اور کہا کہ وہ قبیلے کے محترم سردار یوغات کا نائب ہے۔ وہ ہم سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ ہم یہاں کیونکر اور کس مقصد سے پہنچے ہیں۔

اس سوال کا جواب مائیکل نے ہمیں بڑی خوبی اور وضاحت سے سمجھا دیا تھا بلکہ ازبر بھی کرا دیا تھا۔ میں نے شروع سے آخر تک سارا "افسانہ" لارو نابے کے گوش گزار کر دیا۔ ٹرسٹ سے فرار' سوزی کی موت' جنگل میں ہماری اور گارڈز کی آنکھ مچولی اور آخر میں ہمارا بچ نکلنا' سب کچھ لارو نابے کو بتا دیا۔ وہ محویت سے سنتا رہا اور گاہے گاہے ہم سے کراس سوالات بھی کرتا رہا۔ وہ یوغات نہیں تھا' یوغات کا نائب تھا اس کے باوجود اس نے بال کی کھال اتار کر رکھ دی اور ایک ایک واقعے کی وضاحت کئی پہلوؤں سے طلب کی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں سے کڑے اتروا لیے گئے اور روزن سے آنے والی سورج کی روشنی میں انہیں بغور دیکھا گیا۔ بعد ازاں لارو نابے نے کڑے اپنے پاس ہی رکھ لیے۔

اتنی لمبی چوڑی تفتیش کے باوجود یہ شخص ہم سے کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سرخی مائل آنکھوں میں شک و شبہے کے بادل بدستور موجود تھے اس نے ہمارے ہاتھوں کی ہتھکڑی کو بغور دیکھا۔ تالی بجا کر اپنے ایک کارندے کو اندر بلایا اور اسے ہتھکڑی کے بارے میں کچھ ہدایات دیں۔ اس کے بعد مسلح افراد ہم دونوں کو جھونپڑے میں سے نکال کر ایک اور مقام پر لے آئے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ اس کی دیواریں موٹی تھیں اور انہیں اچھی طرح گارے سے لیپا گیا تھا۔ فرش پر کسی درخت کی خشک چھال بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں مٹکا اور پیالہ رکھا تھا۔ کوٹھڑی میں ڈھائی تین فٹ کی بلندی پر صرف ایک گول روزن تھا۔ ڈیڑھ فٹ قطر کے اس روزن سے دیواروں کی غیر معمولی موٹائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ روزن میں آہنی سلاخیں تھیں اور سہ پہر کے سورج کی ترچھی روشنی اس روزن میں سے اندر آ رہی تھی۔

گھڑا اور پیالہ دیکھ کر ہماری آنکھوں میں روشنی جاگ گئی۔ خشک ہونٹوں نے ٹھنڈے پانی کا لمس محسوس کیا تو یوں لگا کہ زندگی اور زندگی کی تمام تر مسرتیں اس ایک لمحے میں سمٹ آئی ہیں۔ کتنا بے حس اور ناچیز ہے انسان اپنے جسمانی تقاضوں کے سامنے۔ ابھی ہم پانی پی کر بیٹھے ہی تھے کہ دو افراد نیم تاریک کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ ایک شخص کے پاس ہتھکڑی توڑنے کے آلات تھے۔ قریباً ایک گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد وہ شخص ہماری کلائیوں کو ہتھکڑی کی بندش سے آزاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس ایک گھنٹے میں سفید فام مترجم کی صورت دو تین مرتبہ روزن میں نظر آئی تھی۔ وہ جب جھک کر روزن میں دیکھتی تھی تو اس کا کشادہ گریبان اس کے پُرشباب جسم کو دور تک عیاں کر دیتا تھا۔ پسینے کی نمی سے چمکتا ہوا یہ جسم جیسے بہ زبانِ خاموشی دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ پتا نہیں کہ اس لڑکی کے جسم میں زیادہ کشش تھی یا سیاہ فاموں میں گھری ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ پُرکشش اور چمک دار نظر آتی تھی۔ لڑکی نے اپنا نام صوفیہ بتایا۔ صفدر کے اندازے کے مطابق یہ اٹالین نام تھا۔ لڑکی نے صفدر کے اندازے کی تصدیق کی۔ اس نے کہا "آپ لوگ یہاں اطمینان سے رہیں اور آرام کریں۔ نائب سردار کا رویہ آپ کے لیے لچک دار ہے مگر یہ لچک اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے' اگر آپ نے جھوٹ نہیں بولا۔ وہ اور سردار یوغات صرف سچ سننا پسند کریں گے۔ لہٰذا اگر کوئی بات آپ نے چھپائی ہے تو وہ زبان پر لے آئیں۔ اس میں آپ کی بہتری ہوگی۔"

"اور اگر ہم بہتری نہ چاہیں تو؟"

وہ مسکرائی "تو پھر جھوٹ بولیں اور اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کریں۔ کیونکہ لاری سردار کے سامنے جھوٹ بولنے کی کم از کم سزا موت ہے۔"

اگلے دو روز ہم نے اسی کوٹھڑی میں بند رہ کر گزارے۔ یہ کوٹھڑی حیرت انگیز طور پر چلچلاتی دھوپ میں بھی زیادہ گرم نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں تین وقت کھانا مہیا کیا جا رہا تھا۔ یہ کھانا دودھ' مکئی کی نمکین یا میٹھی روٹی' چاول' گائے کے گوشت اور ترکاری پر مشتمل ہوتا تھا۔ گوشت ہم نہیں کھاتے تھے' کیونکہ اسے دیکھتے ہی کئی قسم کے خدشات ہمارے ذہن میں پروان چڑھنے لگتے تھے۔ پانی کا ذائقہ کچھ بدلا بدلا تھا مگر اس بے اماں گرمی میں پانی کا ملنا ہی غنیمت تھا۔ ہماری ہتھکڑی کھول دی گئی تھی اور کھانا لانے والوں کا رویہ بھی نرم تھا مگر کوٹھڑی سے باہر ایک دو مسلح پہرے دار چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ رات کو حیوانی چربی کا چراغ کوٹھڑی میں جلایا جاتا تھا' سخت بو محسوس ہوتی تھی۔ چراغ بجھانے کے بعد سکون محسوس ہوتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی مچھر بھنبھنانا شروع کر دیتا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسری طرح کی بو کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ بو اس تیل کی ہوتی تھی جو مچھر سے بچنے کے لیے جسم کے کھلے حصوں پر لگاتے تھے۔ فرصت کے ان لمحات میں غزال کی یاد بھی بڑی شدت سے آتی اور ستاتی تھی۔ میں کوٹھڑی سے باہر پھیلی ہوئی چاندنی کو دیر تک تکتا رہتا اور اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ آج کل میرے بارے میں بے تحاشا فکر مند رہتی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے بھی اوجھل ہوتا تھا تو وہ کمروں میں بے قرار پھرتی تھی۔ میرے اور صفدر کے اچانک غائب ہو جانے سے خبر نہیں اس پر کیا بیتی تھی۔ ویسے وہ جنگل کی راتیں بڑی سنسنی خیز تھیں۔ رات گئے جنگلی جانوروں کی دور افتادہ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ ان میں ایک تیز باریک چیخ جیسی آواز بھی شامل ہوتی تھی جس کے بارے میں مجھے اور صفدر کو شک تھا کہ یہ چیتے یا تیندوے وغیرہ کی آواز ہے۔ ہمیں صبح کے وقت ایک مرتبہ گھمانے پھرانے کے لیے لے جایا گیا۔ اس دوران تین مسلح افراد مسلسل ہمارے ساتھ رہے۔ لاری قبیلے کی یہ بستی ایک درمیانی سائز کے قصبے سے چھوٹی نہیں تھی۔ اس کو دو طرف سے جھیل کے پانی نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ باقی دو جانب بڑی محنت سے کانٹے دار جھاڑیوں کے انبار سے فصیل سی بنا دی گئی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر اس باڑ کے اندر گارے اور مٹی کی چھ سات فٹ اونچی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس حصار سے باہر جانے کے لیے دو جگہ گیٹ موجود تھے۔

میرا اور صفدر کا مشترکہ خیال تھا کہ ہمارے بارے میں حتمی فیصلہ ہونے تک ہمیں عالمِ برزخ میں رکھا گیا ہے۔ غالباً ہمیں کوٹھڑی میں بند رکھ کر ہمارے بیانات کی صحت جانچی جا رہی تھی۔ یہ معلوم کیا جا رہا تھا کہ کیا واقعی ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوا ہے جس کا ہم نے دعویٰ کیا ہے یا پھر یہ کوئی چال ہے۔ کنگ اور مائیکل کا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا تھا کہ ماریا ٹرسٹ کے اندر بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ہمدردیاں کنگ کے بھائی کارلو اور اس کے پشت پناہوں کے ساتھ ہیں۔ غالباً یہی لوگ قبیلے والوں کے لیے معلومات کا ذریعہ تھے۔ تیسرے روز علی الصبح صفدر نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔

"کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے صبح صبح؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"ٹوٹی تو قیامت ہی ہے لیکن یہ صبح صبح نہیں ہے۔ گھڑیال دس بجا رہا ہے۔" صفدر نے کہا' اور روزن کی طرف اشارہ کیا۔

روزن میں سے قیامت کا شور ہماری آرام گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ ڈھول پیٹے جانے کا شور تھا' اور یہ کوئی تنہا ڈھول نہیں تھا' درجنوں ڈھول تھے جو ایک ساتھ پوری طاقت سے بجائے جا رہے تھے۔ شاید یہ لوگ اپنے مرے ہوئے بزرگوں کو قبروں سے برآمد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے' یا پھر یہ کانوں کے پردے پھاڑنے کا کوئی مقابلہ تھا۔ ڈھولوں کی گونج سے زمین دہل رہی تھی اور کوٹھڑی کی دیواریں لرزتی محسوس ہوتی تھیں۔

صفدر بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ سردار اور اس کے مصاحب ہمارے ساتھ لنچ کرنا چاہتے ہیں' اس لیے ہمیں جگانے کے لیے ڈھول بجا رہے ہیں۔"

"یہ ہمارے ساتھ لنچ کرنا کیوں چاہیں گے؟"

"ہو سکتا ہے کہ ہمارے بیانات کی تصدیق نہ ہو سکی ہو' لہٰذا وہ ہمارے "ساتھ" لنچ کرنا چاہتے ہوں۔ یعنی ہمیں بھون کر کھانا چاہتے ہوں۔" صفدر نے وضاحت کی۔

"بڑی اچھی اچھی باتیں کر رہے ہو آج کل۔" میں نے تعریف کی۔

"زندگی کی شام نظر آنے لگے تو اچھی اچھی باتیں ہی کرنی چاہئیں۔"

میں نے رکوع کے انداز میں جھک کر روزن سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک درمیانے سائز کے سیاہ ہاتھی پر بے شمار رنگ پھینک کر اسے ٹیکنی کلر کر دیا گیا تھا۔ ایک حبشی جو خود بھی رنگوں میں لتھڑا ہوا تھا اس ہاتھی پر کھڑا تھا اور بے ڈھنگا سا رقص کر رہا تھا۔

ہاتھی کے اردگرد مرد و زن نے گھیرا بنا رکھا تھا اور ڈھول کی سماعت شکن تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ جلد ہی یہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی دوران میں ہماری کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قد حبشی لڑکی خوشبو میں بسی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے بالوں میں ایک بڑا سا جنگلی پھول سجا تھا اور گلے میں مالا تھی۔ ایک مختصر چرمی لباس اس کے بالائی جسم پر تھا' یہ اسے ڈھانپ کم اور دکھا زیادہ رہا تھا' وہ چرمی لنگوٹی جو اس کے زیریں جسم پر تھی گھٹنوں سے ایک فٹ اوپر ہی کہیں اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ لڑکی نے سفید دانتوں کی نمائش کی اور دو لباس ہماری خدمت میں پیش کر دیئے۔ یقیناً وہ یہی چاہتی تھی کہ ہم اپنے خستہ حال پھٹے پرانے لباس اتار کر یہ خلعتِ فاخرہ پہن لیں۔

لڑکی کے جانے کے بعد ہم کافی دیر تذبذب میں رہے' آخر صوفیہ روزن میں نمودار ہوئی اور اس نے زور دے کر ہم سے کہا کہ ہم یہ لباس تبدیل کر لیں' کیونکہ ہمیں عزت مآب سردار کی خدمت میں پیش ہونا ہے۔ صوفیہ کی آواز ڈھولوں کی دھمک میں بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

صفدر نے پوچھا "یہ باہر کیا شور شرابا ہے؟"

"یہ بُوما مکمل ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ یہ جشن آج رات بھر جاری رہے گا۔"

"یہ بُوما کیا بلا ہے؟"

"اوہ سوری!" وہ بولی "بوما در اصل افریقی زبان میں رہائش گاہ کو کہتے ہیں۔ لیکن جس بوما کا میں ذکر کر رہی ہوں' وہ عبادت گاہ ہے۔ تم نے جھیل کے کنارے وہ بلند و بالا عمارت دیکھی ہو گی جس پر جھنڈا لہرا رہا ہے' وہی بوما ہے۔ قبیلے کے لوگوں نے آٹھ ماہ کی شب و روز محنت کے بعد اسے تیار کیا ہے۔ آج سے اس میں عبادت شروع کی جا رہی ہے۔"

صوفیہ کے جانے کے بعد ہم نے لباس تبدیل کیا۔ یہ ایک ہی اسکرٹ نما چیز تھی۔ یہ جسم کو گھٹنوں سے لے کر کندھوں تک ڈھانپتی تھی۔ تاہم ایک کندھا عریاں رہتا تھا۔ یہ کسی جانور کی کمائی ہوئی نرم کھال تھی جس پر رنگ سے دھبے ڈالے گئے تھے۔

صفدر نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ آپ اب تک جو لباس پہنتے رہے ہیں' وہ آپ کے لیے نہیں تھا' آپ کا اصل لباس تو یہی ہے۔ کاش میرے پاس کیمرا ہوتا اور میں آپ کی تصویر اتار سکتا۔"

"کاش تمہارے پاس کیمرا ہوتا اور میں اسے توڑ کر تمہاری بات کا صحیح جواب پیش کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں شاہ جہاں صاحب' غزالہ آپ کو اس لباس میں دیکھے تو باغ باغ ہو جائے بلکہ پاکستان میں بھی شمشا' رجال سائی صاحب' حمزہ' انجم سب آپ کی بلائیں لانے پر مجبور ہو جائیں۔" سینے سے ایک آہ سی نکل گئی۔ صفدر نے روانی میں کیسا فقرہ بول دیا تھا۔ اس ایک ہی جملے نے ذہن کے پردے پر کئی من موہنے چہرے اُجاگر کر دیئے تھے۔ وہ سب ہمارے پیارے تھے۔ ہمارے دکھ درد کے ساتھی تھے' ہمارے اندر ان کی جان تھی اور ہماری جان ان کے اندر تھی۔ ہم بیٹھے بٹھائے اچانک ان سب لوگوں سے دور ہو گئے تھے' نہ نام نہ پیام نہ کوئی اطلاع' ان سب کو سوچوں اور اندیشوں کی سولی پر چڑھا کر ہم سیکڑوں ہزاروں میل دور آ بیٹھے تھے اور یہ کوئی دو چار روز کی بات نہیں تھی۔ اب مہینوں گزر چکے تھے۔ چند روز پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ کیمپ میں جا کر کنگ براؤن سے درخواست کروں گا۔ اس سے کہوں گا کہ وہ پاکستان میں میرا ٹیلی فونک رابطہ کرا دے۔ میں صرف اپنی اور ساتھیوں کی خیر خیریت کی اطلاع کسی عزیز تک پہنچا دوں لیکن اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی مجھے اور صفدر کو اکا ایکی نرسٹ سے نکلنا پڑ گیا تھا اور اب ہم دونوں گھنے جنگلات میں گھری ہوئی اس جھیل کے کنارے موجود تھے۔ یہ مقام نرسٹ سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر نہیں تھا' پھر بھی جدید سہولتوں سے آراستہ "نرسٹ" کے مقابلے میں یہ جگہ پتھر کے زمانے کی بستی لگتی تھی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور صوفیہ کے علاوہ دو مسلح قبائلیوں کی صورت نظر آئی۔ درانتیاں ان کے کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ انہوں نے ہماری طرف دوستانہ انداز میں دیکھا اور صوفیہ نے بتایا کہ "عبادت گاہ بُوما" میں عبادت شروع ہونے سے پہلے ایک تقریب ہو رہی ہے۔ ہمیں بھی اس تقریب میں شامل ہونا ہے۔ ہم صوفیہ کے ساتھ عظیم الشان بُوما کے سامنے پہنچے۔ بُوما کا بچا کھچا کام آج مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے عین سامنے جھیل کے کنارے ایک بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا' یہاں رنگ دار لباس پہنے سیکڑوں مرد و زن جمع تھے۔ بُوما کی دہلیز سفید پتھر کی تین سیڑھیوں سے منسلک تھی۔ ان سیڑھیوں کے ایک سرے پر مٹی کا بڑا سا پیالہ رکھا تھا۔ اس پیالے کا قطر دو فٹ کے لگ بھگ تھا۔ اس میں ایک سفید محلول چمک رہا تھا' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ بھینس کا دودھ تھا۔

ہم دونوں کو بھی تماشائیوں کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ بُوما

کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس کے گرد تقریباً تین درجن ڈھولچی جمع تھے اور بڑے بڑے نقاروں کو جوش و خروش سے بجا رہے تھے۔ اس شور کے سبب کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ چبوترے پر دس پندرہ سیاہ فام دوشیزائیں کوئی مذہبی رقص پیش کر رہی تھیں' ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا اور وہ والہانہ رقص کے دوران میں اس خنجر کو بڑی وحشت سے حرکت دیتی تھیں۔ ان کے بالائی جسم بالکل عریاں تھے' صرف زرد پھولوں کے ہار ان کے گلے میں تھے جو ان کے جسموں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے' رقص کے وحشیانہ انداز دیکھتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا کہ کہیں یہ دوشیزائیں خود کو زخمی ہی نہ کر لیں اور پھر یہی ہوا' ڈھولوں کی سماعت شکن گونج کو چیرتی ہوئی ایک چیخ سنائی دی۔ ایک لڑکی نے خنجر اپنی چھاتی پر کندھے کے نزدیک اتار لیا تھا۔ پھر اس نے خنجر گوشت میں سے کھینچا اور لڑکھڑاتی ہوئی اس مٹی کے پیالے کے پاس دو زانو بیٹھ گئی جو سیڑھیوں پر موجود تھا' وہ ایک ہاتھ سے اپنے عریاں زخمی کندھے کو تھامے ہوئے پیالے پر جھک گئی۔ سرخ خون پیالے کے اندر ٹپکنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد وہ سیدھی ہوئی اور اپنا زخمی کندھا دبائے ہوئے ایک طرف نشیب میں اوجھل ہو گئی۔ اس کے بے تاب چہرے پر تکلیف اور گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔ باقی کی دوشیزائیں بدستور محو رقص تھیں۔ تب ڈھول کی دھما دھم میں ایک اور مدھم چیخ ابھری' ایک اور دوشیزہ نے خنجر اپنی چھاتی پر کندھے کے قریب پیوست کر لیا تھا۔ اس نے خنجر کھینچا اور اُڑی ہوئی رنگت کے ساتھ لڑکھڑاتی ہوئی پیالے کے قریب پہنچ گئی۔ یہی عمل یکے بعد دیگرے تیرہ لڑکیوں نے دہرایا اور پیالہ نصف کے قریب جوان تازہ لہو سے بھر دیا۔ رقص ختم ہو چکا تھا' مگر ڈھولچی اسی جوش و خروش سے بجائے جا رہے تھے۔

اس کے بعد ایک فربہ اندام شخص چبوترے پر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا' تمام مرد حضرات اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے شخص نے بڑے غور سے ہجوم کو دیکھا۔ جو افراد "مرد" ہونے کے باوجود ابھی تک زمین پر بیٹھے تھے انہیں بھی کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ ان میں صفدر اور میں بھی شامل تھے۔ فربہ اندام شخص چبوترے سے نیچے آیا اور اس نے بڑی احتیاط سے تمام افراد کا جائزہ لیا۔ ہجوم میں سب سے لمبے دس افراد کا چناؤ کیا گیا۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ فربہ اندام شخص نے ہم سب کو باہر آنے کا اشارہ کیا' لہٰذا ہم چبوترے کے سامنے پہنچ گئے۔ بوما ہمارے بائیں جانب تھا' چبوترہ عقب میں تھا اور ہمارے سامنے نشستوں کی ایک قطار تھی جس میں قبیلے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں معزز ترین فرد ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کی سفید گھنی داڑھی اس کے سینے تک پہنچ رہی تھی۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور قبیلے کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح گہری سرخ تھیں۔ سردار کا لباس اس کے پورے بدن کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اس کے سر پہ نایاب پرندوں کے پروں کا تاج تھا۔ سردار کی شخصیت پُراسرار اور بارعب تھی۔ اس کے پہلو میں مضبوط جسم والا ایک نوجوان لڑکا موجود تھا۔ مجھے فوراً مائیکل کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ ضعیف العمری کے باوجود سردار ربوغات کا ایک نوعمر بیٹا بھی ہے جسے وہ اپنی صحت اور تندرستی کے ثبوت کے طور پر ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس بات میں اب کوئی شبہ نہیں تھا کہ باوقار لبادے میں لپٹا ہوا جو شخص میرے سامنے بیٹھا ہے وہی سردار ربوغات ہے۔

سردار ربوغات کے اطراف میں تین خواتین موجود تھیں اور وہ تینوں سرتاپا سیاہ ریشمی لبادوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ تو کجا ان کے ہاتھ پاؤں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ پتھریلے مجسموں کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھیں اور سردار ہی کی طرح پُراسرار نظر آ رہی تھیں۔

فربہ اندام شخص نے تمام دس افراد کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور اپنے دائیں ہاتھ آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ معززین کی پہلی قطار میں سے ایک کیکڑے جیسا تنگ و ترنگ سال خوردہ بابا اٹھا اور اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں کو حرکت دیتا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس کی سفید بھنویں اس کی آنکھوں پر سایہ فگن تھیں۔

وہ بڑی توجہ سے ایک ایک کے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ ایک نوجوان معاون بھی اس کے ساتھ آن کھڑا ہوا تھا' دھیمی آواز میں معاون کے ساتھ تبصرے بھی کرتا جا رہا تھا۔ ہاتھوں کی لکیروں پر طویل غور و خوض کے بعد اس نے پہلے ایک حبشی کے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ حبشی کے چہرے پر میں نے خوشی کی ایک جھلک سی محسوس کی یا پھر ایک رنگ تھا جو اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ نائب سردار لارو ناہے آگے بڑھا اور اس نے ہم دونوں کی شان میں چند الفاظ بڑے متبرک انداز میں کہے۔ مجھے شک گزرا کہ شاید ہم دونوں کو زور آزمائی وغیرہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ تاہم چند لمحے بعد یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور جو بات سامنے آئی وہ خاصی

خوفناک تھی۔

مترجم صوفیہ نے میرے قریب آکر کہا "مبارک ہو مسٹر شاہ!"

"کس بات کی مبارک اور تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"تمہارے تمام کوائف اس RING پر کندہ ہیں جو پرسوں تمہاری کلائی سے اتارا گیا تھا' اور مبارک باد اس بات کی ہے کہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"بات تو مکمل کرو۔" میں نے کہا۔ ڈھول کی دھما دھم میں ہم دونوں چیخ کر بول رہے تھے۔

وہ بولی "تمہیں مقدس قربانی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔"

میں سنانے میں رہ گیا "کیسی قربانی؟" آخر میں نے چلا کر پوچھا۔

"ہوما کے سامنے۔۔۔ عبادت شروع ہونے سے پہلے دو قربانیاں دی جائیں گی' یہ دونوں انسانی قربانیاں ہوں گی۔ ان میں سے۔۔۔ ایک تم ہو گے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ یہ کیا بکواس کر رہی تھی۔ یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔ کوٹھڑی سے ہمیں یہ کہہ کر یہاں لایا گیا تھا کہ سردار بوعات نے ہمیں ہوما کی افتتاحی تقریب میں بلایا ہے مگر یہاں یہ نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں واپس صفدر کے پاس زمین پر جا بیٹھا "کیا ہوا ہے شاہ جہاں صاحب؟" صفدر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

ان سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' صوفیہ پھر میرے پاس پہنچ گئی اور ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بڑے دل ربا انداز سے بیٹھ گئی۔ اس کا دوسرا گھٹنا خمیدہ تھا اور اس کی تنی ہوئی سفید جلد دن کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ وہ بولی "آپ مقدس قربانی کے لیے تیار ہیں؟"

میں نے کہا "میں لعنت بھیجتا ہوں اس ساری بکواس پر۔"

"شاید آپ ٹھیک سے بات سمجھ نہیں پائے ہیں۔" اس نے ڈھول کی دھما دھم میں چیختے ہوئے کہا "قربانی دو بوب لڑکیوں کی ہو گی۔ ان میں سے ایک لڑکی کی قربانی آپ اپنے ہاتھ سے دیں گے۔ آپ اسے تیز دھار آلے سے قربان کریں گے۔"

"یہ تو اور بھی ناقابلِ قبول بات ہے۔" میں نے غصے میں تپ کر کہا "میں ایسی کسی درندگی میں حصے دار بننے والا نہیں ہوں۔"

"لیکن۔۔۔ یہ تو اب آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔" وہ میرے کان میں چیخی "اگر آپ اس مقدس کام سے انکار کریں سردار ناراض ہو جائے گا۔ یہاں سردار کی ناراضگی سے آفت اور کوئی نہیں ہے۔"

ڈھول کی آواز ایک دم مزید بلند ہو گئی تھی۔ وہ تھو دیر میرے کان میں چیختی رہی' پھر میں نے سننے سے انکار کر وہ صفدر کی طرف چلی گئی اور اس کا سر کھانے لگی۔ صفدر اس کا حل یہ نکالا کہ صوفیہ کو لے کر ڈھولچیوں سے دور کے کنارے چلا گیا۔۔۔ وہاں سے اس کی واپسی تقریباً پندرہ بعد ہوئی۔ اس دوران میں چبوترے پر مختلف کھیل تما ہوتے رہے تھے۔ ان سب تماشوں میں مذہبی رنگ نما تھا۔ واپس آتے ہی صفدر نے مجھے بازو سے تھاما اور کے کنارے لے گیا۔ شور تو یہاں بھی تھا مگر ہم ایک دو کی بات سمجھ سکتے تھے۔

صفدر نے کہا "میرا خیال ہے شاہ جہاں کہ آپ چکے ہیں۔ جو کچھ صوفیہ نے کہا ہے وہ آپ کو کرنا ہی پڑ گا۔"

"کیا کرنا پڑے گا؟"

"ایک بوب لڑکی کی اپنے ہاتھ سے قربانی؟"

"یہ بوب لڑکی کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صوفیہ نے جو کچھ بتایا ہے اس کے مطابق 'بو لڑکیاں' وہ اصیل لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں صرف مقد قربانیوں کی غرض سے ہی پیدا کیا جاتا ہے اور پالا جاتا ہے سب سے الگ تھلگ رکھی جاتی ہیں۔ باہر کی دنیا کا خوف' کوئی خوشی اور غم ان تک نہیں پہنچتا۔ وہ بول سکتی اور نہ کسی کی بات سمجھ سکتی ہیں۔ ان کا کسی سے کوئی ر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی خواہش ان کے دل میں پلتی ہے دوسرے لفظوں میں زندگی ان کے لیے صرف کھانے سونے کا نام ہوتی ہے۔"

"لیکن کچھ بھی ہے' وہ انسان تو ہوتی ہیں؟"

"شاہ جہاں صاحب! یہ ان فلسفوں میں پڑنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے ہاتھ سے اس لڑکی کے گلے پر چھری نہیں چلائیں گے تو کوئی اور چلا دے گا۔ آپ کے چھری چلانے سے یہ رسم بدل نہیں جائے گی اور نہ وہ ساری انسانی رسوم ختم ہو جائیں گی جو یہاں پائی جاتی ہیں۔ ہاں ضرور ہو گا کہ "مقدس قربانی" کی توہین پر یہ لوگ ابھی مشتعل ہو کر ہمیں اس دارِ فانی سے رخصت کر دیں گے۔"

"گستاخی معاف' آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ صوفیہ کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ "مقدس قربانی" کے لیے منتخب ہونا لوگ بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اس اعزاز کو ٹھکرائے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسی حرکت ان لوگوں کو بے حد مشتعل کرے گی اور وہ فوری طور پر ہماری جان کے درپے ہو جائیں گے۔"

پانچ دس منٹ تک میرے اور صفدر کے درمیان مکالمہ ہوا صفدر کی دلیلوں میں وزن تھا اور اس کا پلڑا خود مجھے بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد صوفیہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ میرے انکار پر حواس باختہ نظر آتی تھی۔ صفدر اور صوفیہ نے مل کر مجھے اس نہایت ناپسندیدہ فعل کے لیے نیم آمادہ کر لیا۔ اسی دوران میں چبوترے کی طرف ہلچل محسوس ہوئی۔ ہم نے ایک سفید فام دراز قد لڑکی کو دیکھا۔ اس کے سنہری بال بکھرے ہوئے تھے اور جانور کی طرح اس کے گلے میں رسی نظر آ رہی تھی۔ لڑکی خاصی صحت مند اور سرخی مائل تھی۔ یقیناً اس کی خوراک وغیرہ کا خصوصی دھیان رکھا گیا تھا۔ تاہم لڑکی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ کسی بے حس شخص کی طرح وہ خالی خالی نگاہوں سے ہجوم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے گلے کی رسی نکال دی گئی' تب دو لمبی تڑنگی حبشی عورتیں آگے بڑھیں۔ ان میں سے ایک کے شانے بہت چوڑے تھے۔ پیشانی پر کسی تیز دھار آلے کا پرانا زخم تھا۔ اس نے بڑی محبت سے لڑکی کے سر پر پیار دیا' پھر اس کے گریبان میں ڈالا اور ایک ہی جھٹکے سے لڑکی کا اسکرٹ نما لبادہ سامنے پھاڑ دیا۔ اسی دوران میں دوسری عورت نے بھی خوف زدہ لڑکی کو دبوچ لیا اور لباس کی بچی کھچی دھجیاں اس کے جسم نوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنے جبلی تقاضے کے تحت مزاحمت پر اتر آئی۔ بے شک وہ صحت مند تھی مگر حبشی عورتوں کے سامنے اس کی پیش کہاں تک تھی' انہوں نے پلک جھپکتے میں اس لڑکی کو چبوترے فرش پر گرا دیا اور اس کے جسم سے کپڑے کا ہر تار نوچ وہ اب برہنہ تھی۔ میں نے تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ کسی نگاہ میں دلچسپی یا شوقِ نظارہ کا عنصر دکھائی نہیں دیا۔ ایک مذہبی عقیدت تھی جو ہر چہرے پر سایہ فگن تھی' مناجات کے انداز میں بدبدا رہے تھے۔ دونوں عورتیں نوجوان لڑکی کو دبوچ کر عین قربان گاہ پر گئیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے' یہ قربان گاہ دراصل وہ سفید سیڑھیاں تھیں جو عبادت گاہ کی دہلیز سے ملتی لڑکی کو دبوچ کر سیڑھیوں پر لٹا دیا گیا۔ وہ حبشی جو میرے ساتھ ہی مقدس قربانی کے لیے منتخب ہوا تھا' ایک تیز دھار چھری لیے نمودار ہوا اور لڑکی کی شہ رگ کے قریب دو زانو بیٹھ گیا۔ لڑکی ایک بار پھر پورے زور سے مچلی اور اس کی ٹانگیں گرانڈیل عورت کی گرفت سے نکل گئیں۔ یہ دیکھ کر ایک اور موٹی تازی عورت دوڑ کر مدد کو پہنچ گئی اور لڑکی کو پوری طرح دبوچ لیا گیا۔ اسی دوران میں لڑکی نے اپنے حلق سے ایک چیخ جیسی نامانوس آواز بلند کی۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ ڈھولوں کے قیامت خیز شور کو چیر کر ہم تک پہنچی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی کے قریب دو زانو بیٹھے حبشی نے لڑکی کی شہ رگ کاٹ دی ہے' ہم نے گرانڈیل ہاتھوں میں لڑکی کا مچلتا ہوا بدن دیکھا اور اس کی شہ رگ سے چھلکنے والا خون مٹی کے پیالے میں گرتے دیکھا۔ ہجوم نے اپنے حلق سے ایک ساتھ ایک عجیب آواز نکالی یہ ایک طرح سے اس قربانی پر اپنے اچھے جذبات کا اظہار تھا۔ ڈھول بجانے والوں کے پاس ہی رنگ دار ہاتھی آن کھڑا ہوا تھا اور اس کے اردگرد مجذوب دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ دو تین منٹ کے اندر لڑکی کی شہ رگ سے چھلکنے والا سارا لہو مٹی کے پُراسرار پیالے میں گر گیا۔ تینوں گرانڈیل عورتوں نے لڑکی کی لاش کو بڑے احترام سے اٹھایا اور "ہوما" کے اندر لے گئیں۔ لڑکی کے خوب صورت بازو حسرت آمیز انداز میں زمین کی طرف لٹکے ہوئے تھے اور اس کے سنہری بال خون میں لتھڑے نظر آتے تھے۔ اس کا حسن اور جوبن کسی خوابوں کے شہزادے کا دل فتح کر سکتا تھا۔ اس کی حسین آنکھوں سے زندگی کی جوت جل سکتی تھی۔ ایک گھر آباد ہو سکتا تھا۔ اس میں معصوم ہنسی کے پھول کھل سکتے تھے۔ ایک دنیا تخلیق ہو سکتی تھی لیکن صحرا میں کھلنے والے حسین پھول کی طرح وہ اپنی لطافت کی داد پائے بغیر اس جہان سے کوچ کر گئی تھی۔

اور پھر دوسری لڑکی چبوترے پر پہنچا دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فربہ اندام شخص نے چبوترے پر پہنچ کر میرا نام پکارا۔ بس اس کے ہونٹوں کے ہلنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرا نام پکار رہا ہے۔ مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے صوفیہ میرے پاس آئی اور مجھ سے چبوترے پر آنے کی درخواست کی۔

"پلیز شاہ جہاں صاحب۔" صفدر نے مجھے ٹہوکا دیا۔

"اٹھ جائیے۔" صوفیہ نے بھی التجا آمیز لہجے میں کہا۔

میں صوفیہ کے ساتھ مرے مرے قدموں سے چلتا چبوترے پر پہنچ گیا۔ ایک تیز دھار چھری میرے ہاتھ میں تھما دی گئی پھر اس کی دھار کو کسی متبرک پانی سے دھو دیا گیا۔۔۔

دوسری طرف چبوترے پر گرانڈیل عورتوں اور سفید فام دوشیزہ کے درمیان جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ صرف چند سیکنڈ پہلے بدنصیب لڑکی کے ساتھ گرانڈیل عورتوں کا رویہ بڑی شفقت اور مہربانی کا تھا لیکن اب وہ بڑی بے رحمی کے ساتھ اس کے کنوارے جسم سے کپڑے نوچ رہی تھیں اور اسے اٹھا کر پٹخنے کی فکر میں تھیں۔ یہ لڑکی پہلی لڑکی سے زیادہ مزاحم ثابت ہوئی۔ شاید اس نے مقدس پیالے میں بھرے ہوئے خون کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھ میں چھری بھی دیکھ لی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔ وہ اتنے زور سے مچلی کہ ایک بار تو گرانڈیل عورتوں کی گرفت سے نکل ہی گئی۔ وہ نیم عریاں حالت میں تماشائیوں کی مخالف سمت میں بھاگی۔ اس موقع پر تیسری عورت بھی چبوترے پر چڑھ آئی۔ تینوں عورتوں نے گھیر کر آخر بدنصیب لڑکی کو گرا ہی لیا۔ شاید چبوترے پر ہونے والی جدوجہد بھی اس منحوس قربانی کا حصہ ہی سمجھی جاتی تھی' ورنہ لڑکی کو باندھ کر بھی چبوترے پر لادیا جاسکتا تھا۔ یہ بات کئی روز بعد ایک مقامی شخص نے ہمیں بتائی کہ قربانی کے لیے پیش کیا جانے والا شخص جب چبوترے پر جدوجہد کرتا ہے تو اس سے دیوتاؤں پر اور تماشائیوں پر ثابت ہوتا ہے کہ "قربانی" نہ صرف تندرست اور صحت مند ہے بلکہ طاقت ور بھی ہے۔

بہرحال سفید فام لڑکی کو بے بس کرنے کے بعد اس کے جسم سے رہا سہا لباس نوچا گیا اور اسے ڈنڈا ڈولی کر کے بوما کی درمیانی سیڑھی پر لٹا دیا گیا۔ لڑکی کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ دہشت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن لارس میلے کی اس قربان گاہ پر میں نے وحشت کا رنگ بھی دیکھا۔ یہ وہ زرد رنگ تھا جو لڑکی کی ناک اور ہونٹوں کے اردگرد دکھائی دے رہا تھا۔ ان حصوں سے جیسے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ چکا تھا۔ میں نے زندگی میں جو ناقابل فراموش چہرے دیکھے ہیں ان میں سے ایک چہرہ اس نامعلوم لڑکی کا بھی تھا جو چند سیکنڈ کے بعد میرے ہاتھوں ہلاک ہونے والی تھی اور پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آلۂ قتل میرے ہاتھ میں تھا مگر میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کاش کوئی انہونی ہو جائے' کوئی کرشمہ اپنی جھلک دکھا جائے' اور یہ نورسیدہ پھول جیسی لڑکی میرے ہاتھوں جان ہارنے سے بچ جائے۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور پورے زور سے مچلی۔ مجھے اس کے کھلے ہوئے منہ سے اس کے حلق کا کوا تک نظر آیا مگر یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ دبوچنے والی عورتوں نے اس پر اپنا پورا وزن ڈال رکھا تھا۔ اب وہ تینوں پریشان سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں کہ میں چھری چلانے میں تاخیر کیوں کر رہا ہوں۔ ڈھول کی تیز ہوتی ہوئی لے' حاضرین کے بدبداتے ہوئے ہونٹ' اگلی قطار میں معززین کے چہرے' سب مجھ سے یہی سوال پوچھ رہے تھے۔ میں نے چھری لڑکی کی شفاف گردن پر رکھی' دل کڑا کیا اور ہاتھ کو حرکت دے دی۔ وہ بدنصیب صابن کی طرح کٹ گئی۔ گرم خون ابل کر میرے ہاتھ پر پڑا اور اس کے ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ سماعت سے ٹکرائی۔ چھری ہڈی تک پہنچ چکی تھی۔ میں اس تیرہ بخت کی طرف دیکھے بغیر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ آیا۔ میرا ہاتھ غیر محسوس طور پر کانپتا چلا جا رہا تھا۔

اگر میں یہ سمجھتا تھا کہ قربانی کے بعد میری جان چھوٹ گئی ہے تو یہ غلط تھا۔ ابھی اس حوالے سے ایک اور کٹھن مرحلہ آنے والا تھا۔ قربانی کی طرح اس مرحلے سے دامن بچانا بھی ممکن نہیں تھا۔ دودھ اور خون والا پیالہ نما برتن اب تقریباً بھر چکا تھا۔ شاہ بلوط کی ایک مقدس لکڑی کے ذریعے ایک پجاری نے اس محلول کو MIX کیا۔ تب دو پجاریوں نے اس پیالے کو دو طرف سے بڑی احتیاط کے ساتھ پکڑا اور عمر رسیدہ سردار بوغات کے سامنے لے گئے۔ سردار بوغات نے پیالے کو ہاتھ لگائے بغیر اپنے آپ کو تھوڑا سا جھکایا اور ہونٹ دیتے سے محلول کے چار گھونٹ بھرے۔ اس کے ہونٹ سرخ ہو گئے اور سفید داڑھی پر لہو کے قطرے چمکنے لگے۔

اسی دوران میں وہ حبشی نوجوان' جس نے میرے ساتھ ہی قربانی کے عمل میں حصہ لیا تھا' قربان گاہ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ صوفیہ کی ہدایت پر میں بھی اس کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ سردار بوغات کو محلول پلانے کے بعد دونوں پجاری مڑے تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دودھ اور خون کے آمیزے کا پیالہ ہماری طرف لایا جا رہا تھا۔ دل چاہا کہ آگے بڑھ کر یہ پیالہ الٹ دوں اور قربان گاہ میں پڑی ہوئی خون آلود چھری اٹھا کر سامنے آنے والے ہر شخص کا پیٹ چاک کر دوں مگر یہ صرف خیال تھا' ان سارے باغیانہ خیالات کی طرح جو اس سے پہلے بھی میرے ذہن میں آتے رہے تھے اور اس لیے عملی جامہ نہیں پہن سکے تھے کہ میں یہاں تنہا نہیں تھا۔ میرے قول و فعل کے ساتھ میرے تمام ساتھیوں کی زندگی اور سلامتی بھی وابستہ تھی۔ پہلے میرے ساتھی حبشی نوجوان نے پیالے کو ہاتھ لگائے بغیر اس میں سے دو گھونٹ لیے پھر پیالہ میرے سامنے آ گیا۔ دودھ کی وجہ سے

خون کا رنگ قدرے مختلف ہو گیا تھا مگر تھا تو وہ خون ہی۔ انسانی خون جو ابھی تک گرم تھا اور اس میں بے شمار ننھے بلبلے تھے۔ میرا معدہ الٹنے لگا۔ اسی وقت میری نگاہ صوفیہ پر پڑی۔ وہ چند گز دور گرانڈیل عورتوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے بڑی التجا سے اشارہ کیا کہ میں یہ محلول حلق سے اتار لوں۔ مجھے وہی ہرکولیس جہاز والا منظر یاد آ گیا' جب میں نے ان حبشی قیدیوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر سر کے بالوں کی یخنی پی تھی۔ آج اس سے بھی ایک کڑی آزمائش میرے سامنے تھی۔ میرے کام و دہن کے لیے یہ سب کچھ ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ دوسری طرف صوفیہ بہ زبانِ خاموشی مجھے یہ وارننگ دے رہی تھی کہ اگر میں نے اس مقدس رسم کی توہین کی تو کوئی بہت بڑا طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا جب اپنے ہاتھ سے ایک بے گناہ لڑکی کا گلا کاٹ دیا تو پھر اپنی ذات پر اتنا جبر بھی کر ہی لینا چاہیے۔ پیالے سے ہونٹ لگا کر میں نے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیے' خون کا نیم گرم نمکین ذائقہ ہونٹوں سے لے کر حلق تک تلوار کی طرح میرے جسم کو چیر گیا۔ میرے اندر کی جمالیاتی حس پر یہ ایک کاری وار تھا۔ میں نے انسانی خون پیا تھا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے ایک عجیب سی وحشت کا احساس مجھے ہوا۔ مجھے لگا کہ جیسے میں سچ مچ تاریک جنگل میں رہنے والا ایک قبائلی ہوں اور مرنا یا مار دینا میری زندگی کا مقصد ہے۔

اپنی ابکائی مشکل سے روکتا ہوا میں اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ڈھول بجانے والوں کے ساتھ اب کچھ تاشے بجانے والے بھی شامل ہو گئے تھے۔ موسیقی کا آہنگ کچھ اور تیز ہو گیا تھا۔ خون اور دودھ بھرا ہوا پیالہ باری باری اگلی قطار کے معززین کو پلایا جا رہا تھا۔ اگلی قطار ختم ہوتے ہوتے یہ پیالہ بھی ختم ہو گیا۔ تمام پینے والوں نے تین تین گھونٹ بھرے تھے یعنی ہر بار سے ایک گھونٹ کم۔ اس کے بعد معززین کی قطار سردار بوغات کے عقب میں چلتی ہوئی "بوما" کے اندر داخل ہو گئی۔ یہ لوگ بوما میں پوجا پاٹ کا افتتاح کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کے اندر داخل ہو جانے کے بعد پنڈال میں موجود مرد و زن ذرا آزادی اور بے تکلفی محسوس کرنے لگے۔ ان میں سے بہت سے اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور نمدار ہاتھی کے گرد محو رقص ہو گئے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ بہت سی خواتین کے بالائی جسم پر کوئی لباس نہیں تھا' بس گیندے کے بڑے بڑے زرد پھولوں کا ایک ہار تھا جو کبھی ان کے جسموں کو چھپا لیتا تھا اور کبھی ظاہر کر دیتا تھا۔

ڈھول تاشوں کی تھاپ پر وہ سب لوگ دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال تک موجود نہیں تھا کہ پندرہ بیس منٹ پہلے یہاں دو انسانی زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ رقص کرنے والے جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ مرد و زن ایک دوسرے کی باہوں میں جھوم رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد میرے اور منصور سمیت صرف پانچ چھ افراد ہی پنڈال کے فرش پر بیٹھے رہ گئے۔ وقفے وقفے سے چار پانچ سیاہ فام لڑکیاں آئیں اور انہوں نے بڑی ادا سے شاخ کی طرح لچک لچک کر ہم سے کچھ کہا۔ یقیناً وہ ہمیں اپنے ساتھ رقص میں شریک کرنا چاہ رہی تھیں۔ خاص طور سے وہ مجھے دعوت دے رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' چونکہ مجھے قربانی دینے کا اعزاز حاصل ہوا تھا لہٰذا بستی کی خوب صورت لڑکیاں میرا قرب حاصل کرنا چاہ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد صوفیہ ہم دونوں کے پاس چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخی تھی' بولی "تم نے قصبے کی کئی خوب صورت لڑکیوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ یہ کفرانِ نعمت اچھی بات نہیں ہے۔"

"جہاں اتنا کچھ برا ہوا ہے' وہاں ایک اور اچھی بات نہ ہو گی تو کیا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"چلو جہاں طبیعت پر اتنا جبر کیا ہے' وہاں تھوڑا سا اور کر لو۔ آج کے دن بغیر جوڑے کے نظر آنا بدشگونی ہے۔ تم دونوں فوراً نظر میں آ جاؤ گے۔"

"تم بھی تو بے جوڑ ہی پھر رہی ہو۔" منصور نے کہا۔

"میری بات اور ہے۔ سمجھو کہ میں ان سب میں سے نہیں ہوں۔" صوفیہ نے کہا۔

"مجھے قائل کرنا چاہتی ہو تو دلیل سے بات کرو۔" منصور نے کہا۔

"چلو آؤ' تمہیں دلیل دوں۔" اس نے منصور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

منصور اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ان دونوں کو "ناچتے گاتے ہجوم" میں گم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ میں تاڑ کے ایک درخت سے ٹیک لگا کر اکیلا پنڈال میں بیٹھا رہا۔ رقصاں جوڑوں کے درمیان اب کھجور کی شراب کے پیالے گردش کرنے لگے تھے۔ شراب کی بو چاروں طرف پھیل رہی تھی اور اس جنگلی خوشبو پر غالب آ رہی تھی جو قبیلے کے اکثر افراد نے جسموں پر مل رکھی تھی۔ شراب کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی رنگین ٹوکریاں بھی ہجوم میں گردش کر رہی

تھیں۔ رقصاں افراد ان ٹوکریوں میں سے کچھ نکال نکال کر بڑی رغبت سے کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے ہیں۔ یہ مچھلی اسی جھیل سے حاصل کی جاتی تھی جس کے کنارے یہ عظیم الشان بستی آباد تھی۔ سورج اب ڈھل رہا تھا اور سہ پہر کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ عبادت کے لیے بوما میں داخل ہونے والے لوگ کسی دوسرے دروازے کے ذریعے باہر جا چکے تھے۔

آدھ پون گھنٹے بعد مجھے "صفدر اور صوفیہ" ایک بار پھر ہجوم میں دکھائی دیے۔ وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھوم رہے تھے۔ اچانک پنڈال کے ایک گوشے میں بہت سے مرد وزن دائرے کی شکل میں اکٹھے ہو گئے۔ وہ بڑی دلچسپی سے کوئی منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ حبشی گرانڈیل عورتیں ایک دوجی سے برسرپیکار تھیں۔ وہ دو ماہر پہلوانوں کی طرح گتھم گتھا تھیں اور برتری حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت کی پیشانی پر برا سا زخم تھا اور یہ وہی تھی جس نے بھینٹ چڑھائی جانے والی لڑکیوں کو ایک دوسری عورت کے ساتھ مل کر قابو کیا تھا۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں دوسری عورت کو اڑنگا لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کوشش میں وہ خود گر گئی اور دوسری عورت اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی۔ دونوں عورتوں کی ٹانگیں اور بازو لباس سے بے نیاز تھے۔ پہلوانوں جیسے رگ پٹھے زور آزمائی سے نمایاں ہو گئے تھے اور دھوپ میں چمک رہے تھے۔ زخمی ماتھے والی عورت نے تڑپ کر اپنی ٹانگیں اٹھائیں اور سینے پر بیٹھی عورت کو اپنی پنڈلیوں میں جکڑ کر نیچے پٹخ دیا۔ دونوں خوفناک چنگھاڑوں کے ساتھ ایک دوسرے پر مکے برسانے لگیں۔

میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو صوفیہ تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تشویش تھی بولی "تمہیں کہا تھا ناں کہ اکیلے مت بیٹھو۔" وہ اب آپ سے تم پر اتر آئی تھی۔

"اکیلے بیٹھنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"عورت اکیلی ہو تو کوئی جن چمٹ جاتا ہے اور مرد اکیلا ہو تو کوئی جننی چمٹ جاتی ہے۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟"

"یہ دنگل دیکھ رہے ہو تم؟" اس نے گرانڈیل عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اسٹائل سے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ دنگل تمہارے لیے ہو رہا ہے۔"

"میرے لیے کیوں؟"

"تمہیں ان دونوں میں سے ایک جننی چمٹے گی۔ اس دنگل کے بعد فیصلہ ہوگا کہ کون سی چمٹے گی۔ اگر تم میری بات مان لیتے اور تمہارے ساتھ بھی کوئی عورت ہوتی تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ آج کے دن پچیس سال سے زائد عمر کا کوئی مرد اور بیس سال سے زائد عمر کی کوئی عورت تنہا نہیں رہ سکتی۔ انہیں جوڑوں کی شکل میں ہی نظر آنا چاہیے۔ سمجھو کہ یہ رسم بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی بوب لڑکی کی قربانی کی رسم۔"

"میں تمہاری ساری رسموں پر ایک سو ایک بار لعنت ارسال کرتا ہوں۔"

"یہ میری رسمیں نہیں ہیں' اس قبیلے کی رسمیں ہیں' اور تمہارے لعنت ارسال کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ سو بار کرو یا ایک سو کروڑ بار۔ اب ان دونوں میں سے ایک عورت تو تمہارے ساتھ جائے گی ہی۔"

"کہاں جائے گی؟"

"اپنے گھر۔" اس نے قدرے شوخی سے کہا۔

ایک دم فلک شگاف شور سنائی دیا۔ یہ شور ان تماشائیوں نے بلند کیا تھا جو گرانڈیل عورتوں کو گھیرے کھڑے تھے۔ ایک عورت نے دوسری کو چاروں شانے چت کر دیا تھا اور اس کے اوپر نوے درجے کا زاویہ بنا کر یوں لیٹی ہوئی تھی کہ نیچے والی عورت حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں اٹھی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کسی بہت بڑے سیاہ ریچھ کی طرح اچھلنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور چٹ چٹ میرے رخساروں کے بوسے لے رہی تھی۔ اس کا قد مجھ سے شاید ہی ایک آدھ انچ کم ہو۔ اس کے پسینے کی بدبو اور سانسوں کی ناگوار حرارت سے میرا دم گھٹنے لگا۔ وہ افریقی زبان میں بڑی ملائمت سے بولتی چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے جدا ہوئی اور بڑی ادا سے میرا بازو پکڑ کر مجھے ان لوگوں کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی جو ہاتھی کے گرد رقص کر رہے تھے اور DATE VINE کے نشے میں چُور تھے۔ میں نے مزاحمت کا ارادہ کیا لیکن اسی دوران میں میری نگاہ عورت کے عقب میں چلی گئی۔ وہاں چالاک آنکھوں والی خوب رو صوفیہ کھڑی تھی۔ اس نے مجھے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری اور پکار کر بولی "اس وقت کوئی ٹراؤ نہ کرو اور آجاؤ۔ میں سب سنبھال لوں گی۔"

وہاں انگریزی سمجھنے والا اور کون تھا؟ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ صوفیہ نے مجھ سے کیا وعدہ کیا ہے۔

گرانڈیل عورت نے بڑی محبت سے میرے گلے میں بازو ڈال دیا اور مجھے ان لوگوں کی طرف کھینچنے لگی جو ہاتھی کے گرد جوش و خروش سے ناچ رہے تھے۔ ڈھولوں کی تھاپ اور تاشوں کی چھنا چھن میں یہ رقص عجیب و غریب تھا۔ اس میں ایک طرح کی وحشت جھلکتی تھی۔ مرد تو ایک طرف رہے جوان عورتوں کو بھی اپنے آپ کا ہوش نہیں تھا۔ ان عورتوں کے بالائی جسم پر فقط بڑے بڑے زرد پھولوں کی مالائیں تھیں۔ ان کی اچھل کود میں یہ مالائیں بھی شریک تھیں لہٰذا ان کے جسموں کو چھپانے سے قاصر تھیں۔ پسینے کی بو' بدمست چیخیں' تھرکتا ہوا سیاہ گوشت' یہ سب کچھ میرے ارد گرد تھا۔ گرانڈیل عورت نے مجھے بھی اس اچھل کود میں شریک کرنا چاہا مگر میری مزاحمت دیکھ کر اس نے ارادہ ترک کر دیا اور ہم صرف تماشائی کی حیثیت سے ان لوگوں میں شامل رہے۔

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی بوما کے ارد گرد اور جھیل کے کنارے کنارے دور تک مشعلوں کی روشنی نظر آنے لگی۔ جشن کا سا سماں تھا۔ کچھ دیر بعد گرانڈیل عورت مجھے اپنے گھر لے آئی۔ اس کا گھر ایک بڑے گول جھونپڑے کی شکل میں تھا۔ جھونپڑے کے اوپر ایک چھوٹا سا نیلا جھنڈا بھی لگا ہوا تھا۔ اس جھنڈے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ عورت کو اس بستی میں کوئی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

اندر سے جھونپڑا خوب صاف ستھرا تھا اور دو تین حصوں میں تقسیم تھا۔ یہاں دیواروں پر مختلف قسم کے اوزار لگے ہوئے نظر آئے۔ ان میں کلہاڑے' خنجر اور تو ڑے دار بندوقیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک جگہ جدید رائفل کی گولیوں کو بڑے ہار کی شکل میں پرو کر دیوار پر آویزاں کیا گیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس عورت کے شوق عسکری قسم کے ہیں۔ ایک خادمہ قسم کی مسکین سی لڑکی جھونپڑے میں موجود تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے اور عورت کے دستے ہاروں سے علیحدہ کیے۔ پھر وہ ایک پیالے میں کوئی مرہم نما چیز لے آئی۔ گرانڈیل عورت کو زور آزمائی کے مقابلے میں جو خراشیں وغیرہ آئی تھیں ان پر خادمہ لڑکی نے مرہم لگایا اور خاموشی سے دوسرے حصے میں چلی گئی۔

گرانڈیل عورت نے بڑی مشکل اور کوشش سے مجھے اپنے نام کا تلفظ یاد کرایا۔ اس کا نام بانے جوری تھا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھایا کہ میں اسے جوری کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں (اس کا ذیل ذول اور مسل وغیرہ دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ جوری کے بجائے اسے شاہ جوری یا

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ——— ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

تین حصوں میں مکمل

قیمت -/150

ڈاک خرچ -/20

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون ۔ 7247414

شاہ نوری کہہ کر مخاطب کروں) جوری اپنی موٹی کمر کو لچکانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی اندر گئی اور شیشے کی ایک رکابی لے آئی۔ اسے کڑھائی دار رومال سے ڈھانپا گیا تھا۔ رکابی میں سے کسی چٹ پٹے کھانے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جوری نے رومال ہٹایا۔ اندر تلی ہوئی مچھلی کے ٹکڑے اور چاول تھے جس میں گھی اور مسالے وغیرہ ڈالے گئے تھے۔ سجاوٹ کے لیے لیموں کے ٹکڑے اور سرخ مرچ چاولوں پر رکھی گئی تھی۔ بھوک تو مجھے کافی لگی تھی' اوپر سے کھانا بھی اچھا لگ رہا تھا مگر ایک کراہیت سی میرے دل میں موجود تھی۔ قربان گاہ پر دو صحت مند لڑکیوں کی قربانی کا منظر ابھی تک نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور خون کا نمکین ذائقہ ابھی تک زبان پر تھا۔ بہرطور میں نے دل کڑا کر کے کھانا شروع کیا۔ جوری اپنے لوہے جیسے "نرم و نازک" ہاتھوں سے لقمے بنا بنا کر میرے منہ میں رکھنے لگی۔ وہ ہر گھڑی میرے قریب کھسکتی آرہی تھی حالانکہ اس کا سٹنا بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑی گیند سی میرے پہلو سے آلگی ہے۔

کھانے کے دوران میں اس نے مجھے ایک سرخ مشروب بھی پلایا۔ جوس جیسا یہ مشروب میں نے بے ضرر سمجھ کر پی لیا مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ اس میں کوئی گڑبڑ موجود تھی۔ میرا سر بھاری ہونے لگا اور ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ قریباً اسی قسم کی صورت حال تھی جو شراب کے نشے میں ہوتی ہے۔ بہرطور قوت ارادی سے کام لے کر میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ کھانے کے بعد اس آفت جاں نے جھک کر پہلے تو میرے تابڑ توڑ بوسے لیے پھر رقص کی کوشش شروع کر دی۔ یوں لگا کہ جھونپڑے میں بھونچال سا آگیا ہے۔ بچپن میں ہم نے ایک سیاہ بھینسے کو دیکھا تھا جسے شہد کی مکھیوں نے کاٹ لیا تھا' اس نے بھی کچھ اسی قسم کی حرکات کی تھیں۔ گرانڈیل عورت سب سے زیادہ ظلم اپنی "نازک" کمر پر کر رہی تھی۔ وہ کمر کو بل دینے کی کوشش میں دو تین مرتبہ فرش پر لڑھکی مگر کمر کو بل نہ دے سکی۔ زریں گل ہوتا تو اس عورت کے مرض کی تشخیص "مرگی" کرتا اور اسے جوتی سنگھانے کا صائب مشورہ بھی دیتا۔ کچھ دیر بعد اس فتنہ ساماں پہلوان نے اچانک بانہیں کھول کر مجھے قریب کر لیا اور ایک بڑے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ رقص کی مشقت نے اسے پسینہ پسینہ کر رکھا تھا اور سانس دھونکنی بلکہ دھونکنے کی طرح چل رہی تھی۔ جھونپڑے کے باہر اب خاموشی تھی۔ جھیل کے کنارے سارا دن جاری رہنے والا ہلا گلا اب یقیناً جھونپڑوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ جوری مخمور آواز میں مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں پھر بھی وہ بولتی چلی جا رہی تھی پھر زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ غالباً وہ اپنے حسن اور جوانی کے "نایاب خزانے" مجھ پر لٹا دینا چاہتی تھی۔ میں نے پریشانی سے اردگرد دیکھا۔ مجھے اپنی مددگار کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس مشکل صورت حال سے نکال لے گی گویا اس سے بھی زیادہ مشکل صورت حال ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ـــ مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ـــ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔

اچانک میری نگاہ دیوار کے ایک روزن پر پڑی۔ وہاں مجھے صوفیہ کی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ اس نے مجھے اشاروں کنایوں سے بتایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو شربت ابھی تھوڑی دیر پہلے جوری نے غٹاغٹ پیا ہے وہ اسے تھوڑی ہی دیر میں انٹا غفیل کر دے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ دیر تک ہوا میں ہاتھ چلانے اور بھاؤ بتانے کے بعد وہ ملکۂ کوہسار اپنی تمام تر بلیک ہول کے ساتھ میرے پہلو میں ڈھیر ہو گئی اور لمبے خراٹے لینے لگی۔ ایک دو منٹ بعد حسین صوفیہ مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ اس نے ملکۂ کوہسار کے کوہسار سے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔ قریب ہی جلتی ہوئی دونوں شمعیں پھونک مار کر گل کر دیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس وسیع جھونپڑے کے دوسرے پورشن میں لے آئی۔ یہاں ایک شان دار مسہری موجود تھی۔ مسہری کے چاروں پایوں کے نیچے پانی سے بھرے ہوئے پیالے رکھے تھے۔ یقیناً یہ اہتمام حشرات الارض سے بچاؤ کے لیے کیا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر جوری ہوش میں رہتی تو وہ میرے ساتھ غالباً اسی دیوہیکل مسہری پر پہنچتی مگر اب وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ساتھ والے پورشن میں دری پر پڑی تھی اور اس کی خوش بدن چلبلی ماتحت صوفیہ میرے ساتھ اس مسہری پر موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا اور وہ سراپا قیامت نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی سرخ و سپید بانہیں میرے گلے میں حمائل کیں تو میں نے کہا "ابھی دو گھنٹے پہلے تک تو تم میرے دوست صفدر کے ساتھ گھوم پھر رہی تھیں' اب مجھ سے آ چپکی بیٹھی ہو؟"

"تو تم کیا چاہتے ہو۔ میں اس کے پاس واپس چلی جاؤں؟"

"ہونا تو یہی چاہیے۔ ہم دونوں تو قریباً اجنبی ہیں۔"

"یہاں کوئی اجنبی نہیں اور سب اجنبی ہیں۔" صوفیہ

نے کھوئے کھوئے لہجے میں فلسفہ بگھارا "اس دنیا میں مرد و زن کا اصل رشتہ بس جسم کا رشتہ ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے' فریب ہے۔"

"تم کسی مطلب پرست کی ڈسی ہوئی لگتی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے گہری سانس لی اور مجھ سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی "میرا کیس بڑا عجیب ہے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ کھیل گئی "تم سنو گے تو ہنسو گے اور شاید مجھے پاگل سمجھنے لگو۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"میں کسی مطلب پرست کی نہیں بلکہ اپنے آپ کی ڈسی ہوئی ہوں۔ میں کسی سے بہت پیار کرتی ہوں۔ اتنا پیار کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن جسے پیار کرتی ہوں' اسے بھول چکی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مطلب پرست تو تم خود ہو۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج سے چار سال پہلے میں پیرس کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ ایک روز ہماری کلاس میں نیلی آنکھوں والا ایک نوجواں سال ٹیچر آیا۔ اس کا نام ڈیگال تھا۔ تم نے پہلی نظر کی محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ میری اور ڈیگال کی محبت پہلی نظر کی محبت ہی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اس کے بعد سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بڑی شدید محبت تھی' انسان کو بنیادوں تک ہلا دینے والی لیکن یہ طوفانی نہیں تھی۔ طوفانی ہوتی تو چند ہفتوں یا مہینوں میں یہ طوفان گزر جاتا۔ یہ محبت تو ہماری رگ جاں میں اتری ہوئی تھی اور ہمارے خون میں شامل ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ محبت جتنی شدید ہوتی ہے اتنی ہی خطرناک بھی ہوتی ہے۔ اس کے برباد ہونے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ ہماری محبت کو بھی زمانے کی نظر لگ گئی۔ ڈیگال کی والدہ ہماری محبت کی راہ میں آگئی۔ وہ بیٹے کا رشتہ اپنی فیملی میں ایک لڑکی سے کرنا چاہتی تھی اور ہر صورت کرنا چاہتی تھی۔ اسی اثنا میں وہ بہت بیمار پڑ گئی۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ اس حالت میں ڈیگال کی والدہ نے ڈیگال کے سامنے اپنی آخری خواہش بیان کی اور کہا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کر لے جسے وہ اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ ڈیگال نے انکار کیا لیکن والدہ کے ساتھ ساتھ خاندان کے دیگر افراد نے بھی اس پر بے پناہ دباؤ ڈال دیا۔ ڈیگال اس دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکا اور چار سال پہلے دسمبر کی ایک سرد شام میں اس نے میری اور اپنی بے گناہ محبت کے گلے پر چھری چلا دی۔ اس نے شادی کر لی۔ اس نے یہ سب کچھ اپنی والدہ کی زندگی کے لیے کیا تھا مگر وہ جانبر نہ ہو سکی اور شادی کے دوسرے ہی روز ختم ہو گئی۔ ڈیگال کی شادی نے میرے دل و دماغ پر بے حد اثر کیا۔ میں کئی ماہ شراب اور حشیش کے نشے میں دھت رہی پھر میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی اور ہپیوں کے ایک گروپ میں شامل ہو کر اسپین چلی گئی۔ میرے بے پروا باپ اور سوتیلی ماں نے مجھے تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی اور میں اپنے بہاؤ میں بہتی چلی گئی۔ ہپی ازم سے میرا رجحان روحانیت کی طرف ہو گیا۔ میں نے روحانیت کے بارے میں کئی کتابیں پڑھیں اور کئی ماہرین روحانیات سے ملی۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ماریطانیہ میں لارس نام کا ایک قبیلہ پایا جاتا ہے۔ اس قبیلے کی شہرت ایک الگ تھلگ اور پراسرار قبیلے کے طور پر ہے۔ معلوم ہوا کہ اس قبیلے کے اکثر لوگ پیدائشی طور پر کرشماتی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں اور ان میں ایک خاص قسم کی روحانی قوت پائی جاتی ہے۔ میں اپنے ہپی ساتھیوں کے ایک گروپ کے ساتھ ماریطانیہ پہنچ گئی اور اس قبیلے کا کھوج لگانے میں مصروف ہو گئی۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس قبیلے کی ایک شاخ وسطی ماریطانیہ کے نواحی جنگلات میں کہیں آباد ہے۔ میں ان جنگلات تک کیسے پہنچی یہ ایک لمبی داستان ہے' بہرحال اس قبیلے میں پہنچ کر اور عالی مرتبت سردار بوغات سے مل کر مجھے قلبی سکون حاصل ہوا اور میری اندرونی بے قراریاں کچھ ماند پڑ گئیں۔ یوں تو اس قبیلے کے لوگ کئی قسم کے جادوئی عمل کرتے ہیں مگر ان میں ایک عمل "ہابارو" کہلاتا ہے۔ مقامی زبان کے اس لفظ کا مطلب ہے "آنکھوں کا جادو" یہ وہی غیر مرئی طاقت ہے جسے ہم ہپناٹزم کا نام دیتے ہیں اور جسے باقاعدہ ایک سائنس سمجھا جاتا ہے۔ ہپناٹزم کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے ہمارے ہاں ریاضت کی جاتی ہے اور مخصوص مشقوں وغیرہ سے مدد لی جاتی ہے پھر بھی کچھ لوگوں کو جزوی کامیابی ملتی ہے اور کچھ بالکل ہی کورے رہتے ہیں مگر اس قبیلے کے لوگوں میں یہ صلاحیت فطری طور پر موجود ہے' کسی میں کم ہے اور کسی میں زیادہ لیکن کوئی بھی اس صلاحیت سے یکسر محروم نہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ یہاں کے ہر شخص کی آنکھیں سرخی مائل ہیں' کچھ ایسے بھی ہیں جن کی آنکھیں زیادہ سرخ ہیں۔ سردار بوغات کی آنکھیں تم نے دیکھی ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی "سردار بوعات اپنی مثال آپ ہے۔ جو شخص بھی اس سے ایک بار ملتا ہے ہمیشہ کے لیے اسی سے متاثر ہو جاتا ہے۔ میں قریباً تین برس پہلے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے سردار بوعات کو بتایا کہ میں اس قبیلے میں رہنا چاہتی ہوں اور اس قبیلے ہی کا مذہب اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ شروع میں تو سردار بوعات رضامند نہیں ہوا پھر قبیلے کے ایک معزز شخص نے مجھ سے جسمانی تعلق استوار کرلیا۔ میرے ساتھ یہ سب کچھ زبردستی ہوا تھا لہٰذا اس معزز شخص کو قبیلے کے رواج کے مطابق سزا دی گئی جبکہ مجھے میری خواہش کے مطابق قبیلے میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

"میں بڑی محنت سے مقامی زبان سیکھنے لگی' کچھ دن بعد میں نے قبیلے کا مذہب بھی اختیار کرلیا۔ اس میں آگ کی پوجا کی جاتی ہے اور ہاتھی کی شکل کے ایک دیوتا کو عبادت گاہوں میں سجایا جاتا ہے۔ اس دیوتا کا نام "بوبو" ہے۔ بوبو کا لفظی مطلب آگ سے بنا ہوا ہاتھی ہے۔ قبیلے کے محترم سردار کے نام میں بھی بوبو کا لفظ جزوی طور پر شامل ہے یعنی بوعات۔۔۔ اسی طرح پجاری حضرات بھی اپنے نام میں دیوتا کے نام کو لازماً شامل کرتے ہیں' جیسے بوشام' مالی بو وغیرہ۔"

"کیا تم نے بھی آنکھوں کا جادو سیکھا؟" میں نے صوفیہ سے سوال کیا۔

"اس قبیلے میں پہنچنے اور یہاں رہائش اختیار کرنے سے میرا اصل مقصد یہی تھا۔ میں روحانی علوم سیکھنا چاہتی تھی۔ "ہاباردکی" بھی ان میں سے ایک تھا۔ سچی بات تو یہ ہے مسٹر شاہ جہاں کہ میں ابھی تک ڈیگال کو بھول نہیں پائی تھی۔ میں ڈیگال سے اور اس کی دنیا سے ہزاروں میل دور بھاگ آئی تھی لیکن وہ اب بھی ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی صورت' اس کی یادیں ہر وقت میرے دل کو اپنے گھیرے میں لیے رہتی تھیں۔ میں خود کو مشغول رکھنا چاہتی تھی۔ کسی ایسے دھندلکے میں گم ہو جانا چاہتی تھی جہاں ڈیگال کی یادیں میرا پیچھا نہ کریں۔" وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟ کیا تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی؟"

"نہیں مسٹر شاہ جہاں' مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ میں روحانی علوم پر کوئی خاص دسترس حاصل کرسکی اور نہ ڈیگال کے خیال سے ہی میرا پیچھا چھوٹا۔ جو شخص مجھے روحانی علوم کی تعلیم دے رہا تھا اس کا نام "مالی بو" تھا۔ بو کے لفظ سے تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ قبیلے کے پجاریوں میں شامل تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے مقصد میں اس لیے کامیاب نہیں ہو پا رہی کہ میرے دل میں دیوتاؤں کے بجائے کسی اور کی محبت ہے اور اس مادی محبت نے میرے دل میں روحانیت کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اس نے کہا میری کامیابی کی ایک ہی صورت ہے' میں اس مادی اور سفلی محبت کو اپنے دل سے نکال دوں۔ میں نے کہا "اے محترم استاد' میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ میں ہزاروں بار یہ کوشش کرکے دیکھ چکی ہوں۔" محترم استاد نے کہا' پھر روحانیت کا بھوت اپنے سر سے اتار دو اور عملیات کے چکر میں پڑنے کے بجائے ویسی ہی سیدھی زندگی گزارو جو تمہاری دنیا کے لوگ گزارتے ہیں۔

"میں نے اپنے استاد کی بات مان لی اور واپس اپنے وطن فرانس چلی گئی۔ نجانے کیوں میرے دل میں یہ بات جم چکی تھی کہ جس طرح میں ڈیگال کو بھلا نہیں پائی' وہ بھی مجھے بھلا نہیں سکا۔ وہ بھی دن رات مجھے سوچتا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں بھی ایک آس شب و روز پروان چڑھتی ہے۔ واپس پیرس پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ ڈیگال کی اپنی امیر کبیر بیوی کے ساتھ بنتی نہیں ہے اور دونوں اکثر لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دونوں کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ مجھے ایک دو مشترکہ دوستوں کی زبانی یہ پتا بھی چلا کہ ڈیگال مجھے بڑی شدت سے مس کرتا ہے۔ وہ بیمار بھی رہتا تھا۔ کچھ دوستوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر پھر سے میری طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ ان دوستوں نے دعویٰ کیا کہ وہ عنقریب مجھ سے رابطہ قائم کرے گا۔

"میں نہیں چاہتی تھی کہ ڈیگال کا گھر خراب ہو مگر دوسری طرف میرے دل کی گہرائی میں یہ خواہش بھی تھی کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی دن رات اس کا انتظار کررہی تھی لیکن دوسری طرف وہ اس انتظار میں تھا کہ میں اس سے رابطہ کروں۔ انا کی ایک دیوار ہمارے درمیان حائل ہونے لگی۔ دوبارہ ملنے سے پہلے ہی ہم ایک بار پھر بچھڑنے لگے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے منتظر تھے اور ایک دوسرے کو انتظار بھی کروا رہے تھے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ بس یوں سمجھو کہ پورے دو برس میں نے اذیت کی سولی پر گزار دیے۔ آخر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے آس اور انتظار کی روشنیاں بجھنے لگیں۔ انسان آخر کہاں تک دیوار سے سر پٹخ سکتا ہے۔ بے آس اور بغیر امید کے کب تک تڑپا جاسکتا ہے۔ رفتہ رفتہ میری ہمت دم توڑنے لگی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس بے وفا سے اور اس کے بے وفا شہر سے کہیں دور نکل

جاؤں۔ میں اسپین چلی گئی۔ وہاں میرا ایک دیرینہ کلاس فیلو نیل رابرٹ رہتا تھا۔ ایک دور میں وہ میرا دیوانہ رہا تھا۔ میرے قریب آنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ میں میڈرڈ میں رابرٹ سے ملی اور اس کی دیرینہ خواہش پوری کردی۔ درحقیقت میں اب شعوری طور پر ڈیگال کو بھلانا چاہتی تھی اور اس کا طریقہ میری سمجھ میں یہی آیا تھا کہ خود کو زندگی کی رنگینی میں گم کردوں۔ خود کو ان خوشیوں سے دور نہ رکھوں جو میں نے ڈیگال کی خاطر خود پر حرام کر رکھی ہیں۔ اسپین میں' میں کوئی چھ ماہ رہی ہوں۔ وہاں میں نے نائٹ لائف کو انجوائے کیا۔ بہت سے دوستوں سے ملی' ان میں سے کچھ کے ساتھ وقت بھی گزارا۔ آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ڈیگال کے غم میں وہ شدت نہیں رہی۔ وقت نے مجھے بہلانا شروع کردیا تھا پھر مجھے اپنے روحانی استاد مالی بو کی بات یاد آگئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب میرے دل سے ایک مادی شخص کی مادی محبت نکل جائے گی۔ پھر میرے اندر روحانیت کو جگہ مل سکے گی۔ ویسے بھی مجھے ماریطانیہ کے جنگلات اور اس قبیلے کے لوگوں کی یاد بڑی شدت سے آرہی تھی۔ قریباً چار ماہ پہلے میں اپنی ایک دوست کے ساتھ یہاں واپس پہنچ گئی۔ میں اس قبیلے کی نہایت مشکل زبان سمجھتی تھی۔ محترم سردار بوعات نے مجھے ایک مترجم کی حیثیت سے قبول کرلیا اور مجھے اس شرط کے ساتھ پھر سے بستی میں رہنے کی اجازت مل گئی کہ میں کم از کم چھ ماہ تک ہر قسم کی روحانی تعلیم سے دور رہوں گی۔ آج کل میں سالار کے ساتھ اس کی ماتحت کے طور پر رہ رہی ہوں اور مقامی انداز کی لڑائی کی تربیت بھی حاصل کررہی ہوں۔"

"سالار سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سالار جوری۔" صوفیہ نے جلدی سے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں۔ قبیلے کی فوج میں ایک دستہ عورتوں کا بھی ہے۔ اس دستے کی سالار جوری ہے۔ سالار جوری دست بدست لڑائی' برچھا زنی اور رائفل سے نشانہ بازی میں ماہر ترین عورت ہے۔"

میں کچھ دیر گہری نظروں سے صوفیہ کو دیکھتا رہا۔ اس کی رنگت بھرپور شباب کی تھی۔ رنگ سرخ و سپید' جسم متناسب' اس جنگل میں رہ کر بھی وہ پیرس میں رہنے والی کسی لڑکی کی طرح شفاف اور تر و تازہ نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بڑھ کر خوب صورت تھیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "تو تم اس طرح مختلف مردوں کے ساتھ جسمانی کھیل کھیل کر اور خود کو ارزاں کرکے اپنے محبوب کو بھلانے کی کوشش کررہی ہو؟"

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ تاہم وہ جلد ہی سنبھل کر بولی "میں کوشش نہیں کررہی ہوں۔ میں تقریباً بھلا چکی ہوں اسے۔"

"لیکن میرا خیال کچھ مختلف ہے۔ میں نے کہیں سنا تھا کہ عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔"

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔"

"مگر میں صرف کتابی باتیں نہیں کررہا۔ تمہاری آنکھیں میرے سامنے ہیں اور میں ان مسکراتی آنکھوں سے بہت پیچھے ایک آگ دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ ڈیگال اب بھی تمہارے دل کے کسی گوشے میں بستا ہے۔"

"تم بالکل بے معنی بات کررہے ہو۔ ایسا کچھ نہیں ہے اب۔" وہ قدرے جھلا کر بولی۔

"تم مانو یا نہ مانو لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہارا محترم استاد "مالی بو" اس مرتبہ بھی تم سے مایوس ہوگا۔ وہ تمہیں کچھ سکھا پائے گا اور نہ تم سیکھ سکو گی۔"

اپنے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لیے وہ ایک دم مسکرا دی۔ اٹھلا کر بولی "تم بھی کیا بے کار کی بحث لے کر بیٹھ گئے ہو۔ اتنی خوب صورت رات ضائع کررہے ہو۔"

"یہ تم نہیں بول رہی ہو۔ وہ روپ بول رہا ہے جو تم نے اپنا رکھا ہے۔"

وہ پھر مسکرائی "اگر تم ایسی ہی باتیں کرو گے تو میں تمہاری اصل حق دار سالار جوری کو جگا دوں گی۔ پھر وہ جانے اور تم جانو۔"

"تم چاہتی کیا ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بڑی ادا سے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا "مجھے پیار کرو۔" وہ مخمور لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سراپا خود سپردگی نظر آرہی تھی۔

مجھے اس پر ترس آیا۔ مجھے وہ ایک ایسے بچے کی طرح دکھائی دی جس کا محبوب ترین کھلونا گم ہوگیا ہو۔ وہ اس کے لیے رو رو کر ہلکان ہوچکا ہو اور اب لالی پاپ سے دل بہلانے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے جھونپڑے کی دیوار میں واقع روزن پر سے پردہ ہٹایا۔ باہر اب ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ تاہم بستی کے اندر کسی جگہ سے ہلکی ہلکی موسیقی اب بھی بلند ہورہی تھی۔ خیموں کے اندر گونجنے والے قہقہے ایک جاگتی ہوئی رات کا تصور اجاگر کرتے تھے۔ دور جھیل کے کنارے کچھ مشعلیں روشن تھیں اور ان کے شعلے پانی میں منعکس

ہو رہے تھے "مجھے پیار کیوں نہیں کرتے ہو؟" صوفیہ نے آنکھیں بند کیے کیے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا "دراصل میرا ایک مسئلہ ہے۔ میں اسی لڑکی کو پیار کرتا ہوں جسے میں نے بزور بازو حاصل کیا ہو۔ اغوا کیا ہو یا کسی سے چھینا ہو۔"

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اور غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے بدستور سنجیدہ صورت بنائے رکھی۔ وہ بولی "نہیں تم مذاق کر رہے ہو۔ تم صورت سے ایسے نظر نہیں آتے ہو۔"

"میں سو فیصد سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوں۔"

وہ مسکرائی اور اس نے میری کلائی تھام لی "غالباً تمہیں اپنی طاقت اور مردانگی وغیرہ پر ضرورت سے زیادہ بھروسا ہے۔"

"اور شاید تم بھی خود کو کوئی بم قسم کی چیز سمجھتی ہو؟"

"وہ تو میں ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا "تم مردوں کی دنیا میں اس کے بغیر گزارا ہی نہیں۔"

بالکل اچانک حرکت کرکے اس نے میرا بازو موڑا اور اپنی دونوں ٹانگوں کی قینچی میری گردن میں ڈال دی۔ کافی پھرتی دکھائی تھی اس نے۔ یہ جوڈو کی طرز کی تکنیک تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے مجھے "نیک لاک" لگا دیا تھا۔ میں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ اس کی ٹانگوں کی گرفت ذرا کمزور ہوئی تو میں نے اپنی گردن چھڑالی۔ میری گردن چھڑانے کے دوران میں ہی وہ مسہری پر اوندھی ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تو اسے یوں دبوچتا کہ وہ پھڑپھڑا بھی نہ سکتی مگر میں نے اسے ڈھیل دی۔ اس نے ٹانگ رسید کی جو میرے سینے پر لگی اور میں جہازی سائز کی مسہری کے کنارے سے جا لگا۔ وہ چیتی اور بلی کی طرح غرا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے دیوار سے لگا کر اس نے میرے سر اور چہرے پر کئی مکے رسید کیے۔ تب اچانک ایک بار پھر اس نے اپنی ٹانگوں کی قینچی سے میری گردن جکڑی۔ وہ بھول چکی تھی کہ ایک بار پھر اس کا سر میری ٹھوکر کی زد میں ہے۔ بہرحال میں نے اس کی یہ غلطی بھی نظرانداز کی۔ وہ اٹھی اور قریباً میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر اس کی برتری کا اعتراف کیا۔ وہ چند سیکنڈ تک ہانپتی ہوئی مجھے دیکھتی رہی پھر میری گردن آزاد کرکے سینے سے اتر آئی۔ فاتحانہ انداز میں ہاتھ بڑھا کر اس نے مجھے اٹھایا اور اپنے بکھرے بال سمیٹنے میں مصروف ہو گئی۔

"تم میری توقع سے زیادہ تیز ہو۔" میں نے اسے مزید خوش کرتے ہوئے کہا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے جو گرما گرم رومانی موڈ اس پر سوار تھا وہ اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر ساتھ والے پورشن کی کن سن لی۔ اسے بجا طور پر اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ مسہری پر ہونے والی دھینگا مشتی کی آواز سے سالار جوری کی نیند میں خلل پیدا نہ ہو گیا ہو۔ بہرحال ایسا کچھ نہیں تھا۔ جوری بدستور خراٹے لے رہی تھی۔ صوفیہ دوبارہ میرے پاس آ بیٹھی۔ نصیحت کے لہجے میں بولی "ہر وہ چیز جو کمزور نظر آتی ہے کمزور نہیں ہوتی۔"

میں نے دوستانہ انداز میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا "اگر برا نہ مانو تو ایک نصیحت میں بھی تمہیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"مجھے تم سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم ایسے راستے پر چلو جو تمہیں خوشی کی منزل کی طرف لے جائے۔"

"تم کس حوالے سے بات کر رہے ہو؟"

"میں تمہارے اور ڈیگال کے تعلق کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ تمہیں جس قسم کے حالات کا سامنا ہے کچھ اسی قسم کے حالات کا سامنا مجھے بھی رہا ہے۔ تم نے جسے چاہا تھا اس نے شادی کر لی۔ میں نے جسے چاہا تھا اس نے بھی شادی کر لی۔ جس طرح ڈیگال کی شادی ناکام تھی اسی طرح وہ شادی بھی ناکام تھی۔ جس طرح ڈیگال ناکام شادی کے باوجود اپنی بیوی کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر پا رہا' اسی طرح جس لڑکی سے میں پیار کرتا تھا وہ بھی اپنے نام نہاد شوہر کو چھوڑنے کی جرات نہیں کر پا رہی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے مس صوفیہ کہ تمہاری طرح میں نے بھی کئی برس کا عرصہ کانٹوں پر لوٹتے ہوئے اور انگاروں پر چلتے ہوئے گزارا ہے۔ اذیت کے اس سارے سفر میں میں نے ایک ہی سبق سیکھا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اگر جذبہ سچا ہو اور عزم پختہ ہو تو طویل جدائیاں بھی دو پیار کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتیں۔ بے شک اس کانٹوں بھرے سفر میں کچھ مقام ایسے آتے ہیں کہ ہمتیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور یقین چکنا چور ہونے لگتے ہیں لیکن اگر ان مقامات پر سے بھی بندہ ثابت قدمی کے ساتھ گزر جائے تو منزل کا سراغ ضرور ملتا ہے۔"

"تمہیں سراغ ملا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے بے تکلفی سے کہا "مجھے سراغ ملا ہے۔ میں نے بڑی گہری تاریکی میں سے روشنی کی کرن پھوٹتے دیکھی ہے۔"

وہ بڑے انہماک سے میری باتیں سن رہی تھی۔ گہری سانس لے کر بولی "تم نے گہری تاریکی کی بات کی ہے تو مجھے کیٹس کا ایک شعر یاد آ گیا ہے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ 'جب حبس بہت بڑھ جائے تو پھر امید پیدا ہوتی ہے کہ اب تیز ہوا چلے گی اور ابر کرم برسے گا۔' اسی طرح جب رات کی تاریکی بہت گہری ہو جاتی ہے تو صبح ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔"

"تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔ یہی کچھ میں تم سے کہنا چاہ رہا تھا۔ محبت کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہمت نہ ہارنا ہی دراصل محبت کی جیت ہے۔ ہمت نہ ہارنے سے مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی آرزو کو کبھی نہ مرنے دے اور اس آرزو کی خاطر جو بھی قربانی اور کوشش ضروری ہو اس سے پہلوتہی نہ کرے جیسے کہ تم کر رہی ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم ٹوٹی ہوئی ہمت اور ہارے ہوئے حوصلے کی ایک دردناک مثال ہو۔ معاف کرنا مس صوفیہ شاید میرے الفاظ کچھ سخت ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے محبت کے مشکل رستے سے منہ موڑ کر تن آسانیوں اور رنگینیوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے اور یوں محبت کے نام کو بٹا لگایا ہے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے۔" وہ تلخی سے بولی "میں اپنے آپ میں گھل گھل کر مر جاؤں۔ اور وہ بے حس۔ وہ ظالم شخص۔ اپنی بیوی کے ساتھ۔۔۔"

آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ نجانے کیوں یہ لڑکی مجھے بہت اپنی اپنی سی لگی تھی' وہ ہم قوم نہیں تھی' ہم زبان نہیں تھی پھر بھی کوئی ایسی بات تھی اس میں کہ دل و دماغ میں اس کے لیے شناسائی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے اور غزالہ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ کئی ایسے واقعات بھی میں نے اسے بتائے جو پہلے کسی کو نہیں بتائے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی پھر میں نے اپنی اور غزالہ کی محبت کے اس تاریک ترین دور کا ذکر کیا جب غزالہ ایک نام نہاد شادی کے بندھن میں بندھ کر شیخ عاصم کی دسترس میں تھی۔ میری محبت میری نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہی تھی اور میں یہ نظارہ دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ان دنوں میرے ذہن میں بھی کچھ ایسے خیالات پیدا ہوئے تھے جنہوں نے اب صوفیہ کے دل میں جگہ بنا رکھی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں غزالہ کی آرزو کو دل سے مٹا کیوں نہیں دیتا۔ کیوں ایک دیوار سے سر پھوڑتا چلا جا رہا ہوں۔ جس کوشش کا حاصل ناکامی ہو اس کوشش سے کیا فائدہ؟ کیوں نہ میں زندگی کو انجوائے کروں۔ ان غم کی زنجیروں کو توڑ دوں جو مجھے ہر مسرت سے دور رکھے ہوئے ہیں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا تھا' اور اس مرحلے کے ساتھ ساتھ کئی اور دشوار مرحلوں سے بھی گزر گیا تھا۔۔۔ اور آج صورتِ حال وہ نہیں رہی تھی۔ میں نے صوفیہ کو اپنی زندگی کی خوشگوار کروٹ کے بارے میں بتایا اور اپنی طرف غزالہ کی واپسی کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اس سے صوفیہ متاثر ہوئی۔

رات ڈھل چکی تھی اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ جھونپڑے میں چربی کا چراغ جل رہا تھا اور دور جنگل سے شب بیدار جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں' بڑے خواب ناک اور رومانوی مزاج کی رات تھی یہ۔ صوفیہ بولی "تمہاری باتیں سننے کے بعد اس لڑکی سے ملنے کا زبردست اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ کہاں ہے؟"

"اسی نام نہاد زرست میں جہاں دنیا جہان کی خباثت جمع ہے اور تجارت کے لیے انسانوں کے ریوڑ جمع کیے گئے ہیں۔"

صوفیہ بولی "اس بدنام جگہ کے بارے میں' میں نے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ دل میں خواہش ہے کہ وہ جگہ دیکھی جائے۔"

"خدا سے توبہ کرو۔ وہ جگہ ایسی نہیں کہ اسے دیکھنے کی خواہش کی جائے۔"

"چلو مجھے زبانی کلامی ہی وہاں کے بارے میں بتاؤ۔ کم از کم اتنا تو بتاؤ جتنا جانتے ہو۔"

"چلو میں بتاتا ہوں لیکن پہلے تم بھی ایک بات بتاؤ۔"

"وہ کیا؟"

"کارلو کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"ان کا نام تمہیں تمیز سے لینا چاہیے۔ انہیں ہم یہاں بوکارلو کہتے ہیں۔ انہیں یہاں سردار بونات کے قریبی ساتھی کی حیثیت حاصل ہے اور ان کا رتبہ کسی طرح بھی ایک پجاری سے کم نہیں۔"

"سوری' میں انہیں کارلو کے بجائے اب بوکارلو کہوں گا لیکن کیا یہ بات درست ہے کہ بوکارلو میں بھی کسی طرح کی روحانی طاقت پائی جاتی ہے اور وہ آنکھوں کے جادو کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"میرے علم کے مطابق یہ بات بالکل درست ہے اور

محترم بوکارلو نے اس سلسلے میں سخت ترین ریاضت بھی کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنے آپ کو منا کر کیا ہے۔ انہوں نے بہت کڑی جسمانی اور ذہنی مشقتیں کی ہیں۔ اپنے جسم کو سخت گرمی اور سردی کا عادی بنانا، مسلسل فاقہ کشی، مراقبہ، خود خوری اور معلوم نہیں کیا کچھ۔ بعض دفعہ تو ہمیں بھی انہیں دیکھ کر ترس آتا تھا۔ اب وہ ایسے مرتبے پر ہیں کہ محترم سردار بوغات کے بعد ان کا نام چند اہم ترین افراد میں لیا جاتا ہے۔"

"کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ محترم کارلو۔۔۔ سوری میرا مطلب ہے کہ بوکارلو اب کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں پر ہیں۔ وہ چند ہفتوں کے لیے شہر گئے تھے۔ اب واپس آگئے ہیں۔"

"شہر سے کہیں تمہاری مراد یہ تو نہیں کہ وہ ماریا زسٹ گئے تھے۔"

"ہاں وہ قریباً دو ماہ زسٹ میں رہ کر واپس آئے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ زسٹ میں اپنے بھائی سے ان کا جھگڑا ہوا ہے اور وہ واپس آگئے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ان کے بھائی کو کنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور وہی شخص ماریا زسٹ کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔"

میں نے کہا "ماریا زسٹ میں سفید کا کیا کام، وہاں سب سیاہ ہی سیاہ ہے اور اس ساری سیاہی کا ٹھیکے دار کنگ ہی ہے۔"

"یہاں قبیلے میں مشہور ہے کہ زسٹ میں ہزاروں کی تعداد میں غلام موجود ہیں۔ وہاں مردوں کو ان کی صفات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور عورتوں پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ وہاں انسانوں کے بڑے بڑے تاجر آتے ہیں اور تھوک کے حساب سے اپنی پسند کا مال لے جاتے ہیں۔"

"جو کچھ تم نے سنا ہے اس میں سچائی موجود ہے۔" میں نے کہا۔

وہ کنگ کی زیر زمین دنیا کے بارے میں بے پناہ تجسس رکھتی تھی۔ کئی پُراسرار کہانیاں اور سوالات اس کے ذہن میں زسٹ کے حوالے سے کلبلا رہے تھے۔ میں نے اسے زسٹ کے بارے میں اپنے کچھ مشاہدات سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے وہاں کتنی اذیت اور مصیبت کے دن گزارے ہیں۔ وہ زسٹ سے میرے "دلیرانہ" فرار کی کہانی میری زبانی سننا چاہتی تھی۔ میں نے وہ سب کچھ اس کے گوش گزار کیا جو اس سے پہلے سردار کے نائب لاوڈ نابے کے گوش گزار کیا تھا۔ اب رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔ ساتھ والے حصے سے جوری کے کسمانے اور بڑبڑانے کی آواز آنے لگی تھی۔ صوفیہ ذرا ذرا فکر آنے لگی۔ اس نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا کہ میں جاؤں اور جوری کے پاس جا کر لیٹ جاؤں۔ صوفیہ کی پریشانی دیکھتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے پورشن میں جانے سے پہلے میں نے کہا "ایک آخری بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں جلدی پوچھو۔" وہ بے تابی سے ہاتھوں کو حرکت دے کر بولی۔

"تم نے ابھی بتایا ہے کہ کارلو۔ سوری میرا مطلب ہے کہ بوکارلو اس بستی میں ہی ہے لیکن وہ کل کے جشن میں نظر نہیں آیا، نہ ہی میں نے کہیں اور اسے دیکھا ہے۔"

"ان کی طبیعت خراب ہے۔ اس بارے میں، میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گی۔ اب تم بس نکل جاؤ۔"

میں دوسرے کمرے یا پورشن میں جوری کے پاس آگیا۔ وہ اب پھر گونج دار خراٹے لے رہی تھی۔ ایک سیاہ پہاڑ سا تھا جس کے اندر لاوا گڑگڑا رہا تھا۔

علی الصباح دو مسلح افراد سالار جوری کے جھونپڑے پر پہنچ گئے۔ مترجم صوفیہ نے مجھے بتایا کہ محترم بوکارلو نے مجھے یاد فرمایا ہے۔

یہ میری خواہش کے عین مطابق ہوا تھا۔ میں خود بھی بوکارلو سے ملنا چاہ رہا تھا۔ وہ دونوں مسلح حبشی مجھے ساتھ لے کر بوکارلو کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوگئے۔ بستی کے مختلف گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ مختصر لباسوں والے مرد و زن روز مرہ کی مصروفیات میں مشغول تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے جھیل کے کنارے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ان کی چیخیں پرندوں کی چہچہاہٹ کا ایک حصہ ہی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے عظیم الشان بُوما کے پاس ہی واقع ایک آرام دہ اور کشادہ جھونپڑے میں پہنچایا گیا۔ یہاں کارلو یا بوکارلو ایک آرام دہ مسہری پر موجود تھا۔ میں نے کارلو کو فقط ایک بار "میجک شو" میں دیکھا تھا۔ جہاں اس نے مختلف جانوروں کی جبلت پر اپنی آنکھوں کا جادو چلایا تھا اور انہیں قطعی غیر متوقع ردعمل پر مجبور کر دیا تھا۔ وہی بڑی بڑی سرخ آنکھیں، سرخ و سپید لمبوترا چہرہ، چھریرا اور دراز جسم۔ اس کے سراپا میں کوئی مقناطیسی کشش تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ صفدر یہاں پہلے سے موجود ہے۔ بوکارلو کا ایک ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا، انگلیاں سوجی سوجی نظر آتی تھیں۔ اس کا چہرہ بھی کچھ تمتمایا ہوا تھا۔ شاید ہاتھ کی تکلیف کے سبب اسے بخار وغیرہ ہو گیا تھا۔ اس کے گلے میں انسانی انگلیوں کی ہڈیوں کی مالا تھی۔

"اندر آجاؤ شریف آدمی۔" بوکارلو نے شستہ انگلش میں کہا۔

میں جھونپڑے کے دروازے میں سے جھک کر اندر داخل ہوگیا۔ یہ جھونپڑا واقعی کسی روحانی عامل کا مسکن نظر آتا تھا۔ جھونپڑے کی دیواروں پر کچھ پوسٹر آویزاں تھے جن پر جانوروں اور انسانوں کی شبیہیں تھیں۔ کچھ انسانی ہڈیاں بھی دیواروں پر آویزاں نظر آتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک انسانی کھوپڑی تھی جس پر سرخ اور نیلے مارکر سے لکیریں کھینچی گئی تھیں اور نمبر وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ جھونپڑے کے ایک گوشے میں ویسے ہی دو پنجرے پڑے تھے جیسے ہم نے اس سے پہلے زسٹ کے "میجک شو" میں دیکھے تھے۔ ہر پنجرہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ جھونپڑے میں پڑا ہوا ایک پنجرہ تو خالی تھا تاہم دوسرے کے منظر نے مجھے حیران کر دیا۔ اس پنجرے میں کچھ کالی بھڑیں بند تھیں۔ پنجرے کی سلاخیں قریباً دو انچ کے فاصلے پر تھیں، بھڑیں پرواز کرتی ہوئی بہ آسانی پنجرے میں سے نکل سکتی تھیں لیکن وہ حیرت انگیز طور پر پنجرے کے اندر ہی چکرا رہی تھیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر غور سے پنجرے کو دیکھا کہ شاید کسی باریک جالی نے پنجرے کو ڈھانپ رکھا ہے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔

ایک عجیب سی پُراسراریت نے جھونپڑے کی فضا میں گھر کیا ہوا تھا۔ میں صفدر کے قریب ہی ایک کشن پر بیٹھ گیا۔ بوکارلو نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "مجھے تم دونوں دوستوں کے بارے میں دو تین روز پہلے ہی پتا چل گیا تھا مگر میری طبیعت خراب تھی اس لیے تم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تم دونوں کی جرأت اور کوشش نے مجھے متاثر کیا ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہاری یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ زسٹ کے سخت ترین انتظامات کو ناکام کر کے وہاں سے بھاگنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر ہمیں مس سوزی کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید ہم یہ مشکل گھاٹی سر نہ کر سکتے۔ افسوس وہ ہمارے ساتھ آزاد فضا میں سانس نہ لے سکیں اور راستے میں ہی زندگی ہار گئیں۔"

"انسان کو آزادی کے لیے ہمیشہ قیمت چکانا پڑتی ہے۔" بوکارلو نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "اور وہ یہ قیمت چکاتا ہے۔ اس لیے کہ آزادی کی خواہش اس کی رگوں میں لہو کے ساتھ دوڑتی ہے۔ اگر اسے قید کر بھی لیا جائے تو اس کی تائید نہیں ہوتی۔"

"آپ کے خیالات بہت اچھے لگے۔" میں نے کہا۔

"اگر تمہیں یہ خیالات اچھے لگے ہیں تو یہاں کے ہر شخص کے خیالات تمہیں اچھے لگیں گے کیونکہ یہاں کے ہر شخص کے دل میں جسمانی اور ذہنی آزادی کا احترام ہے۔ یہاں کسی بھی فرد کو حبس بے جا میں رکھنا یا کسی بھی حوالے سے محکوم بنانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ تم دونوں کو اگر یہاں چند روز تنہائی میں بند رکھا گیا تو یہ بھی اشد ضرورت کے تحت تھا۔ جونہی یہ ضرورت ختم ہوئی ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر تمہیں رہا کر دیا گیا۔"

اس کے بعد بوکارلو نے بھی ہمارے "فرار" کی کہانی میری زبانی سنی، بیچ بیچ میں وہ مختلف سوالات بھی کرتا رہا۔ یقیناً اس سے پہلے صفدر سے بھی وہ یہ سارے واقعات سن چکا تھا۔ اب وہ مجھ سے ان واقعات کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ مجھے ہر سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دینا پڑ رہا تھا۔ کوئی بھی تضاد بوکارلو کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ دروازے پر ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ یہ دلکش آواز کسی نوجوان لڑکی ہی کی لگتی تھی۔ بوکارلو نے لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ سیاہ فام تھی مگر اپنی آواز کے عین مطابق خاصی دلکش تھی۔ جلد صاف اور چمکیلی، جسم انتہائی متناسب، نقش بھی مقامی شکل و صورت کے مطابق اچھے تھے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیاہ رنگت کا شخص بھی جاذب نظر اور دلکش ہو سکتا ہے وہ شاید اسی قسم کے چہروں کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ لڑکی بڑی شائستگی سے بوکارلو کے قریب پہنچ کر جھکی اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ بوکارلو کا چہرہ ایک دم متغیر نظر آنے لگا۔

بوکارلو نے لڑکی سے مقامی زبان میں چند سوالات کیے جن کا اس نے مؤدب انداز میں جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ بوکارلو مسہری سے اٹھ بیٹھا اور بے قراری سے جھونپڑے کے اندر ٹہلنے لگا۔ ہم سے کچھ کہے سنے بغیر وہ جھونپڑے سے باہر چلا گیا اور دو تین منٹ بعد واپس آگیا۔ اس کی بے قراری بدستور موجود تھی بلکہ پہلے سے شاید کچھ بڑھی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "کیا تم گاڑی چلا سکتے ہو؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بوکارلو نے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔"

میں اٹھ کر بوکارلو کے عقب میں چل دیا۔ وہ تیز قدموں سے بستی کے اندر سے گزرا، لوگوں نے جلدی سے اس کے لیے راستہ چھوڑا اور جھک جھک کر تعظیم پیش کی۔ بوکارلو جھیل کے کنارے چلتا گھنے درختوں میں داخل ہو گیا۔ کئی جگہ

درخت اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی بھی زمین تک نہیں پہنچ پا رہی تھی اس کے باوجود زمین پر جھاڑ جھنکاڑ موجود تھا۔ ہمیں راستہ بنانے کے لیے شاخوں کو ہاتھ سے دائیں بائیں کرنا پڑتا تھا۔ جلد ہی ہم ایک قدرے کشادہ جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک جھونپڑا موجود تھا جس میں لوہے کے چند ڈرم رکھے تھے' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان ڈرموں میں پیٹرول تھا۔ جھونپڑے کے قریب ہی ایک ترپال کے نیچے ٹویوٹا کی ایک کھلی جیپ موجود تھی۔ جیپ کو شاید عام لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لیے اس پر درختوں کی کٹی ہوئی شاخیں اور چھال وغیرہ ڈال دی گئی تھی۔ جھونپڑے کے اندر سے ایک تنگ رھڑنگ برچھا بردار حبشی نمودار ہوا اور تعظیم کے طور پر بوکارلو کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ بوکارلو نے افریقی زبان میں اس سے کچھ کہا' اس نے برچھا ایک طرف رکھا اور جلدی جلدی جیپ کے اوپر سے جھاڑ جھنکاڑ ہٹا دیا۔ بوکارلو نے اپنا تندرست ہاتھ اپنی جیب میں گھسایا اور جیپ کی چابی نکال کر میرے حوالے کی "چلو ڈرائیو کرو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اونچے نیچے راستے پر سفر کرتے جنوب کی سمت جا رہے تھے۔ بوکارلو نے اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ یقیناً یہ زخمی ہاتھ ہی تھا جس کی وجہ سے وہ مجھے ڈرائیور کے طور پر اپنے ساتھ لانے پر مجبور ہوا تھا۔ تقریباً پانچ میل تک ہم نے دشوار گزار راستے پر حتی الامکان رفتار سے سفر کیا۔ بوکارلو بار بار کہہ رہا تھا "تیز چلو۔ ذرا تیز چلو۔"

درخت تو اس علاقے میں بھی تھے مگر زیادہ گھنے نہیں تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں دور سے گرد نظر آئی۔ بوکارلو بے تاب ہو گیا۔ تین چار منٹ مزید گزرے تو ہمیں کچھ گھڑسوار دکھائی دیے' ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈیڑھ سو سے کم نہیں تھی۔ مشرق سے ابھرنے کے بعد سورج اب کافی اوپر آچکا تھا۔ اس کی روشنی میں گھڑسواروں کے عریاں سیاہ پنڈے چمک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور برچھیاں وغیرہ بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یقیناً اب ان لوگوں نے بھی جیپ کی آواز سن لی تھی' وہ اپنی جگہ رک گئے تھے اور اب گھوم کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جیپ ان لوگوں کے عین سامنے پہنچ گئی۔ بوکارلو اس کھلی جیپ میں میرے کندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور تقریر کرنے والے انداز میں جوش خروش سے بولنا شروع کر دیا۔ گھڑسوار بڑی توجہ اور احترام سے سن رہے تھے تاہم ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ بوکارلو کی باتوں سے اتفاق نہیں کر رہے۔ بوکارلو کا انداز سمجھانے والا تھا لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔

بوکارلو کی تقریر میں چند لمحے کا وقفہ آیا تو ایک گھڑسوار جو گھوڑے سے اتر چکا تھا' آگے آیا۔ اس نے بوکارلو کو بڑی عقیدت سے سجدہ کیا اور دبے دبے لہجے میں چند فقرے بولے۔

بوکارلو کا پارا ایک دم چڑھ گیا' وہ تند و تیز آواز میں بولنے لگا۔ اس کے اشتعال بھرے تقریری انداز سے پوری جیپ ہلنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس مسلح گھڑسوار دستے کو ان کے سفر سے روکنا چاہتا ہے اور واپس بستی میں لے جانا چاہتا ہے۔ آٹھ دس منٹ کی کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ گھڑسوار دستے میں سے اکثر افراد نے اپنے سر جھکا دیے اور ان کے تنے ہوئے چہرے کچھ نرم پڑ گئے۔ وہ اب واپس جانے پر نیم رضامند نظر آتے تھے۔ بوکارلو نے مجھے جیپ موڑنے کا حکم دیا۔ میں نے یوٹرن لے کر اپنا رخ واپس بستی کی طرف کر دیا۔ بوکارلو نے گھڑسواروں کو اپنے آگے آگے چلنے کا حکم دیا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ گھڑسواروں کی نیت بدل نہ جائے۔ اچانک ایک گھڑسوار تیر کی طرح دستے میں سے نکلا اور اس نے اپنا گھوڑا اسی سمت میں دوڑا دیا جس سمت میں وہ کچھ دیر پہلے جا رہا تھا۔

"رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔" بوکارلو انگلش میں چیخا۔

لیکن گھڑسوار برق رفتاری سے دور ہوتا چلا گیا۔ "جیپ موڑو۔" بوکارلو مجھ پر چلایا۔

میں نے جیپ کو ایک بار پھر یوٹرن دیا۔ جیپ کا اگلا پہیا ایک گڑھے میں چلا گیا۔ یہ دلدلی سا گڑھا تھا۔ میں نے جیپ کو فور پر کیا اور پورا زور لگوایا۔ جیپ بمشکل گڑھے میں سے نکل سکی۔ تاہم اس دوران میں گھڑسوار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے جیپ کو اس کے تعاقب میں دوڑانا چاہا مگر بوکارلو نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ کافی جھلایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ آخر اس نے جیپ کا رخ پھر موڑنے کا حکم دیا اور گھڑسوار دستے کے ساتھ واپس بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔

گھڑسوار دستے میں سے نیلی آنکھوں والا ایک خوب رو سفید فام ہماری جیپ میں آ بیٹھا تھا' اس کے پاس طاقتور وائلڈ اے کے 47 موجود تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور جسم کسرتی تھا۔ اس شخص کے ساتھ بوکارلو کی جو گفتگو ہوئی وہ میں ڈرائیونگ کے دوران میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس گفتگو سے مجھے اپنے کئی سوالوں کا جواب مل گیا۔ مسلح سیاہ فاموں کا یہ گھڑسوار دستہ جو اب ہمارے آگے آگے واپس بستی کی طرف جا رہا تھا' دراصل بوکارلو کے پرجوش پرستاروں پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک بوکارلو کی حیثیت ایک پیر و مرشد یا اوتار کی سی تھی۔ ان لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ بوکارلو نے ٹرسٹ میں اپنے بھائی کنگ براؤن کے پاس گزارے ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کنگ نے بوکارلو کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور اسے توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنے کے بعد ٹرسٹ کو چھوڑنا پڑا ہے اور واپس لاوسی قبیلے میں آنا پڑا ہے۔ اس گفتگو سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میجک شو کی رات کنگ براؤن اور بوکارلو میں ٹھیک ٹھاک جھگڑا ہوا تھا۔ کنگ براؤن کو رنج تھا کہ بوکارلو نے شو میں اپنے قتل کا ناٹک رچایا اور لوگوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ بڑا بھائی اس پر ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے اور مزید توڑنے والا ہے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی تلخ کلامی کا نقطہ عروج یہ تھا کہ بوکارلو کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ یہ ہاتھ کیونکر اور کیسے زخمی ہوا؟ اس پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑ سکی۔

لارسیوں کی بستی میں موجود بوکارلو کے پرستاروں میں اس واقعے پر خاصا غم و غصہ پایا جاتا تھا اور یہ کوئی جذباتی یا عارضی کیفیت نہیں تھی۔ ٹرسٹ سے لاوسیوں کی دشمنی بہت پرانی تھی اور یہ دشمنی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ ماریا ٹرسٹ بردہ فروشی کا بین الاقوامی گڑھ تھا اور لارسی اس گڑھ کے نواح میں بستے تھے۔ انہیں بجا طور پر یہ خوف لاحق تھا کہ ایک روز ماریا ٹرسٹ ان کی آزادی پر حملہ آور ہو گا اور ان کو کسی نہ کسی طور غلام بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ بوکارلو کے ساتھ ہونے والی زیادتی نے اہل قبیلہ کے غم و غصے کو ایک دم بھڑکا دیا تھا۔ قبیلے کی فوج میں سے قریباً ڈیڑھ سو نہایت خطرناک جنگ جو بوکارلو کی توہین کا بدلہ لینے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بڑی رازداری سے روانہ ہوئے تھے اور ان کی منزل ٹرسٹ تھی۔ خبر نہیں کہ وہ وہاں پہنچ کر کیا کرنا چاہتے تھے اور ٹرسٹ کے انتہائی جدید حفاظتی انتظام کو ناکام کرنے کا ان کے پاس کیا منصوبہ تھا' بہرحال وہ بڑے پختہ ارادے سے نکلے تھے۔ خوب رو سیاہ فام لڑکی کے ذریعے بوکارلو کو بروقت اس کارروائی کا علم ہو گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ جیپ لے کر بستی سے گھڑسوار دستے کے تعاقب میں نکلا تھا اور اسے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ امن پسندی کا قائل تھا اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے تشدد کو گناہ سمجھتا تھا۔ اس لحاظ سے اس کا مزاج اپنے بھائی کنگ سے بالکل مختلف سمجھا جاتا تھا۔

ہم قریباً ایک گھنٹے میں بستی واپس پہنچ گئے۔ جیپ انہی گھنے درختوں میں چھپا دی گئی جہاں سے نکالی گئی تھی۔ میں ناشتے کے بغیر ہی بستی سے روانہ ہو گیا تھا۔ اب دوپہر ہونے کو آئی تھی' مجھے شدید بھوک پیاس محسوس ہو رہی تھی مگر پتا نہیں جونہی میں کھانے پینے کے بارے میں سوچتا تھا میری آنکھوں کے سامنے انسانی خون سے بھرا ہوا پیالہ آجاتا تھا اور خون کا نمکین گرم ذائقہ ہونٹوں سے لے کر حلق تک خنجر سا چلا رہا تھا۔

صفدر بڑی بے قراری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ رات بھر دو سیاہ فام دوشیزائیں اس کے ساتھ جھونپڑے میں مقیم رہی تھیں اور اس کی شرافت اور پاک دامنی کا کڑا امتحان لیتی رہی تھیں۔ صفدر نے بس ان سے اتنا کام لیا تھا کہ ایک اسے وقفے وقفے سے پنکھا جھلتی رہی تھی اور دوسری نے اس کے سر اور جسم کی مالش اپنے نازک ہاتھوں سے کی تھی۔ صبح دم صفدر نے جھیل میں غسل کیا تھا اور اب کافی تازہ دم اور نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا۔

میرے بغیر اس نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور بھوک اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ ہم دونوں اس نئے جھونپڑے میں آ گئے جو ہمارے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہ جھونپڑا صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ رات والی دونوں لڑکیاں اب بھی خدمت گار کے طور پر جھونپڑے میں موجود تھیں۔ صفدر نے اشاروں کنایوں میں انہیں سمجھایا کہ ہم کھانا کھانا چاہ رہے ہیں۔ دس منٹ کے اندر اندر دسترخوان ہمارے سامنے تھا۔ سبزی گوشت چاول روٹی اور شراب سب کچھ ہمارے سامنے موجود تھا۔ صفدر نے دونوں لڑکیوں کو باہر جانے کی ہدایت کی تاکہ ہم اطمینان سے پیٹ پوجا کر سکیں۔

ابھی ہم جوتے اتار کر دسترخوان پر بیٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ میں نے صفدر کو چونکتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ وہ اپنے جوتے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر جھونپڑے کا دروازہ بند کر دیا پھر اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑا اور جوتے پر رکھ دیا۔ اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ جوتے میں عجیب طرح کا ارتعاش موجود تھا۔ جیسے لوہے کے کسی پائپ میں سے ہوا کی

کرنٹ پاس ہو رہا ہو۔

"شاید نرسٹ کی طرف سے کوئی کال ہے۔" میں نے کہا۔

صفدر نے جوتا اُتارا اور مخصوص انداز میں اس کی ایڑی گھما دی۔ ٹرانس میٹر ہمارے سامنے تھا۔ اس میں سے کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی تھی مگر دو بلب باری باری جل بجھ رہے تھے۔ مائیکل کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہم نے ٹرانس میٹر (TRANSMITTER) آن کیا۔ فوراً ہی دوسری طرف سے مائیکل کی منحوس آواز ابھری "ہیلو مائیکل اسپیکنگ! ہیلو۔" آواز باریک لیکن حیرت انگیز طور پر صاف تھی۔

"یس صفدر اسپیکنگ۔" صفدر نے دبے لہجے میں جواب دیا۔

"تھینکس گاڈ۔ تمہاری آواز تو سنائی دی۔ میں کل رات بھی دو مرتبہ تمہیں کال کر چکا ہوں۔"

"میں نے محسوس کیا تھا مگر اس وقت میں اکیلا نہیں تھا۔" صفدر نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ تو گیم کا حصہ ہے۔ اب بتاؤ کیا صورتِ حال ہے؟"

"سب اچھا ہے۔ دو تین دن ہمیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا ہے لیکن اب ہم ایک دوسرے جھونپڑے میں آگئے ہیں اور گھومنے پھرنے کی آزادی بھی مل گئی ہے۔"

"ان لوگوں نے تمہارے بیانات کی چھان بین کی ہے' اس کے بعد ہی ان کا رویہ تبدیل ہوا ہے۔ بہرحال اب بھی تمہیں محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیا تمہیں کوئی خدمت گار دیا گیا ہے؟"

"ہاں دو سیاہ فام لڑکیاں ہیں۔"

"پھر تو اور بھی ہوشیار رہو۔ وہ لڑکیاں مخبر بھی ہو سکتی ہیں۔ خاص طور سے تمہیں نائب سردار لا رو ناب سے بے حد ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس قبیلے میں اسے خطرناک ترین شخص کہا جانے تو بے جا نہ ہوگا۔ دراصل یہاں اہم ترین فیصلے وہی شخص کرتا ہے۔"

"ہم یہاں ہر شخص سے محتاط ہیں۔" صفدر نے خشک لہجے میں کہا۔

"یہاں کے حالات کیا ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ بوکارلو کیا کر رہا ہے۔"

"اب تک تو آرام ہی کر رہا تھا۔ آج صبح وہ جیپ لے کر نکلا تھا۔" صفدر کی جگہ میں نے جواب دیا۔

مائیکل ایک دم چوکنا ہو گیا "کہاں گیا تھا وہ۔؟ اس کے ساتھ کون تھا؟"

"اس کے ساتھ میں تھا۔ قبیلے کے گھڑ سواروں کا ایک دستہ شاید "شہر" کی طرف آنا چاہ رہا تھا۔"

"کیوں آنا چاہ رہا تھا؟" مائیکل کی آواز میں تجسس مزید بڑھ گیا۔

"وہ لوگ بہت مشتعل تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مسٹر بوکارلو کی توہین کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ مسٹر بوکارلو نے جیپ پر ان لوگوں کا تعاقب کیا اور راستے سے ہی انہیں واپس موڑ لیا۔ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بستی میں واپس پہنچے ہیں۔"

"یہ بہت اہم خبر ہے۔" مائیکل نے تیزی سے کہا "مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

میں نے شروع تا آخر سب کچھ مائیکل کے گوش گزار کر دیا۔ مائیکل کافی حد تک متفکر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے میری اور صفدر کی تعریف کی اور کہا کہ ہم اسی طرح اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔ آخر میں اس نے بتایا کہ وہ کل رات کو نو اور دس بجے کے درمیان ہم سے پھر رابطہ کرے گا۔

میں نے مائیکل سے اپنے ساتھیوں کی خیر خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ انہیں ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا گیا ہے اور اب وہ بالکل مطمئن ہیں۔

"کیا ہم ان سے بات کر سکتے ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ کل کی ملاقات میں تمہارے ساتھیوں سے بھی تمہاری بات ہو جائے۔"

مائیکل سے بات چیت ختم کرنے کے بعد صفدر نے جوتے کو اپنی اصلی حالت میں کیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اس میلے کچیلے جوگر نما جوتے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں ایک نہایت حساس ٹرانس میٹر نصب ہے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں سیاہ فام دوشیزائیں پھر سے ہمارے سر پر سوار ہو گئیں۔ وہ جھونپڑے میں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی تھیں۔ وہ بار بار اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتی تھیں اور ہمیں یہ جتانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ ہماری خدمت گزاری اور مہمان نوازی میں بہت آگے تک جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ گاہے گاہے وہ آپس میں بھی کوئی بات کرتی تھیں اور ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگتی تھیں۔ میں اور صفدر پہلے تو یہ کوشش کرتے رہے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو اور وہ جھونپڑے سے رخصت بھی ہو جائیں لیکن جب ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو

صفدر نے ایک لڑکی کو بازوؤں میں اٹھایا اور جھونپڑے سے باہر رکھ آیا' دوسری کو میں نے دھکیل کر باہر پہنچا دیا۔ ایک لڑکی جو کافی خوش شکل تھی' حیران نظر آنے لگی۔ شاید اسے ہم دونوں سے ایسی بے رخی اور ناقدری کی توقع نہیں تھی۔

لڑکیوں کو جھونپڑا بدر کیے ہوئے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ نائب سردار لا رو ناب بنفسِ نفیس ہمارے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔ اس نے پہلے تو ہماری خیر خیریت دریافت کی پھر اس نے ہمیں بڑی نرمی سے سمجھایا کہ ہماری حیثیت اس لاوسی بستی میں مہمانوں کی سی ہے اور یہ اس قبیلے کی پرانی روایات میں سے ایک ہے کہ مہمان کو رات میں اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔ مہمان اگر مرد ہے اور اس کے ساتھ کوئی خاتون نہیں ہے تو قبیلے کی کوئی عورت اس کے ساتھ' جھونپڑے میں رہتی ہے۔ اس عورت کی وجہ سے شیطانی ارواح اور آسیب وغیرہ سے مہمان محفوظ رہتا ہے۔

"لیکن ہم تو شیطانی ارواح کو نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک تو یہ دونوں خواتین ہی سب سے بڑی بلائیں ہیں۔ اگر ہم ان کے چمٹنے سے محفوظ رہے تو پھر ہمیں کوئی اور شے نہیں چمٹ سکے گی۔"

"دیکھو' اگر تم لوگ ان دونوں لڑکیوں کی مہمان نوازی کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ہو تو نہ اٹھاؤ مگر انہیں جھونپڑے سے مت نکالو۔ یہ ہمارے اور تمہارے لیے بڑی بدشگونی کی بات ہوگی۔ یہ تمہاری نیند میں مخل ہوئے بغیر بس ایک طرف پڑی رہیں گی۔"

یوں لگا جیسے مائیکل کا شبہ درست ہی تھا۔ یہ لڑکیاں ہماری ٹوہ رکھنے کے لیے ہمارے سر پر مسلط کی جا رہی تھیں۔ میں اور صفدر اڑ گئے۔ میں نے کہا "محترم ناب! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن جس طرح آپ لوگوں کی رسم ہے' اس طرح ہمارے بھی کچھ رسم و رواج ہیں۔ ہمارے لیے کسی غیر عورت کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رات گزارنا بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوگا۔"

کچھ دیر تک ہمارے اور ناب کے درمیان تکرار ہوئی۔ آخر ناب اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گیا۔ اس نے ایک بڑھے عامل کو بلایا۔ اس ننگ دھڑنگ لنگوٹی پوش عامل کے پاس چیکل کا ایک منقش پیالہ تھا۔ اس نے پیالے میں سے کئی "مقدس پانی" کے چلو بھرے اور انہیں ہمارے جھونپڑے کے ارد گرد چھڑکاؤ کی صورت بکھیر دیا۔ اپنی دانست میں انہوں نے ہمیں اور ہمارے جھونپڑے کو شیطانی ارواح کی یلغار سے محفوظ کر دیا تھا اور اب ہم ان دو آفت زادیوں کے بغیر بھی کل صبح صحیح اور سلامت بیدار ہو سکتے تھے۔

وہ رات ہم دونوں نے قریباً جاگتے ہوئے ہی گزار دی۔ دن بھر کی شدید گرمی اور حبس کے بعد رات ذرا خوشگوار ہو گئی تھی۔ ہم نے مچھر اور دیگر حشرات سے بچنے کے لیے جسم پر تیل مل رکھا تھا' چربی کے چراغ کی بو اس تیل کی بو کے ساتھ شامل ہو کر جھونپڑے میں چکرا رہی تھی مگر اب ہم اس کے عادی ہو چلے تھے۔ جھونپڑے سے باہر آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ تھے اور ہوا اپنے سینے میں بے شمار اسرار چھپائے دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اچانک جھونپڑے سے باہر ایک شور سا ابھرا۔ بہت سے قبائلی ایک ساتھ بول رہے تھے' پھر چند گھوڑوں کی تیز رفتار ٹاپیں سنائی دیں۔ ابھی ہم نے باہر جھانکنے کے لیے جھونپڑے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ خوابیدہ صوفیہ کی صورت نظر آئی۔ اس نے پریشان لہجے میں کہا "مسٹر شاہ جہاں! تمہیں محترم بوکارلو نے بلایا ہے۔ فوراً!"

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید تمہیں ان کے ساتھ جیپ پر کہیں جانا ہے۔ زخمی ہاتھ کی وجہ سے وہ جیپ نہیں چلا سکتے۔ اس قبیلے میں صرف ایک بندہ اور ہے جسے ڈرائیونگ کرنا آتی ہے اور وہ بستی میں موجود نہیں ہے۔"

"کیا میں صفدر کو اپنے ساتھ لا سکتا ہوں؟"

"بوکارلو نے تو مجھے صرف تمہیں لانے کے لیے کہا تھا۔ باقی تم صفدر کو لے جا سکتے ہو۔ شاید وہ اجازت دے دیں۔"

میں اور صفدر صوفیہ کے ساتھ ہو لیے۔ وہ گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی نیکر اور میلی سی بنیان میں ملبوس تھی۔ اس کے سراپا میں دلکشی اور چال میں زبردست لوچ تھا۔ کوئی بھی جوان دل رکھنے والا شخص اس پر فدا ہو سکتا تھا۔ مجھے ڈیگال نامی اس نوجوان کی بدقسمتی کا خیال آ رہا تھا جس نے صوفیہ کو پا کر کھو دیا تھا۔

"آخر مسئلہ کیا ہے؟" میں نے صوفیہ کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی "کل محترم بوکارلو جس گھڑ سوار دستے کو سمجھا بجھا کر بستی میں واپس لائے تھے ان میں سے ایک گھڑ سوار واپس نہیں آیا تھا۔ یہ شخص مخلوط نسل کا ہے۔ اس کا والد مقامی اور والدہ انگلش تھی۔ اس کا نام رابرٹ عرف رابی ہے اور وہ محترم بوکارلو کے عزیز ترین دوستوں میں سے ایک ہے۔ اسے محترم بوکارلو کی توہین اور محترم بوکارلو کے ساتھ کنگ کی ناانصافی کا سخت رنج ہے۔ اب معلوم نہیں کہ رابی نے کیا کیا

ہے؟ بوکارلو ایک دم بہت پریشان ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کچھ گھڑسواروں کو فوری طور پر بستی سے باہر بھیجا ہے' اب خود بھی جانا چاہ رہے ہیں۔ وہ ٹرسٹ کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا نہیں چاہتے اور خون خرابے کے تو وہ ازحد خلاف ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس ہلچل کا تعلق گھڑسوار رابی سے ہی ہے۔"

"میں نے خود بوکارلو کے منہ سے رابی کا نام سنا ہے۔ اس نے شاید ٹرسٹ کے ایک بندے کو قتل کردیا ہے اور کچھ کو اٹھا لایا ہے۔"

ہم باتیں کرتے بوکارلو کے جھونپڑے پر پہنچ گئے۔ وہ پہلے ہی جانے کے لیے تیار نظر آرہا تھا۔ اس کے ارد گرد چار پانچ مسلح مشعل بردار موجود تھے۔ یہ سب کے سب سیاہ فام تھے۔ ہم تیز رفتاری سے اس کل والے مقام پر پہنچے جہاں جیپ گھنے درختوں میں کیموفلاج کی گئی تھی۔ جیپ میں سوار ہوکر ہم تیزی سے اس راستے پر چل پڑے جو بستی سے باہر جاتا تھا۔ صفدر بھی ہمارے ساتھ ہی سوار ہوگیا تھا۔ بوکارلو نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

تاریک جنگل میں اونچے نیچے راستے پر سفر کرکے ہم تقریباً پون گھنٹے میں ایک کھنڈر تک پہنچ گئے۔ ویران علاقے میں یہ کھنڈر کسی قدیم فوجی چوکی کا حصہ نظر آتا تھا۔ اس کی شکل و صورت کسی قلعے کی باقیات جیسی تھی۔ بے چھت کی دیواروں کے اندر کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کچھ برجیاں زمین پر پڑی تھیں اور ریت میں دب چکی تھیں۔ ایک منہدم فصیل کا ٹکڑا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کھنڈر میں تقریباً بیس گھڑسوار جمع تھے اور ان کی مشعلوں کی روشنی ماحول کو مزید پُراسرار بنا رہی تھی۔ پندرہ بیس فٹ کی بلندی پر واقع ایک آہنی دروازہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ یہ دروازہ درحقیقت ایک شکستہ مینار کا داخلی دروازہ تھا۔ کوئی ساٹھ ستر فٹ اونچے اس مینار کا بالائی حصہ منہدم ہوچکا تھا۔

جونہی جیپ کی ہیڈلائٹس نے اس ویران کھنڈر کو روشن کیا تمام افراد جو موقع پر موجود تھے' جیپ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بوکارلو بڑی متانت کے ساتھ جیپ سے اترا اور موقع پر پہلے سے موجود گھڑسواروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ میں اور صفدر بھی ان لوگوں کے پاس جا کھڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی گفتگو کا ایک لفظ ہمارے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ تاہم صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہمیں ہورہا تھا۔ اس شکستہ مینار کے اندر سے گاہے گاہے لرزہ خیز نسوانی چیخیں بلند ہورہی تھیں۔ کوئی نوجوان عورت اندر موجود تھی اور یا ہر کے لوگوں سے مدد طلب کررہی تھی مگر مدد کے لیے پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ڈھونڈنے والے نے بڑی زبردست جگہ ڈھونڈی تھی۔ رابطے کا واحد راستہ شکستہ مینار کا آہنی دروازہ تھا۔ اور یہ اندر سے مقفل کردیا گیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں مجھے ایک جگہ ریت پر گولیوں کے کچھ خول پڑے ہوئے نظر آئے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فائرنگ وغیرہ بھی ہوچکی ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ فائرنگ آہنی دروازے پر کی گئی تھی اور یہ قطعی بے اثر رہی تھی۔

گھڑسواروں سے طویل مشورہ کرنے کے بعد بوکارلو مینار کے قریب چلا گیا۔ نسوانی چیخیں مینار کے درمیان سے بلند ہورہی تھیں۔ ان کی بلندی زیریں دروازے سے کوئی تیس فٹ رہی ہوگی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہاں مینار کے اندر ہی ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا جو کسی وقت مورچے کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ بوکارلو اس کمرے کی طرف منہ کرکے بلند آواز میں بولا "رابی! یہ سب کیا ہورہا ہے۔ ایک طرف میری دوستی کا دم بھرتے ہو' دوسری طرف وہ سب کچھ کررہے ہو جس سے مجھے شدید نفرت ہے۔"

بلندی سے آواز آئی "بوکارلو! اب ہم اور ذلت برداشت نہیں کرسکتے۔ ایسے جینے سے مرنا بہتر ہے اور میں مرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ لیکن مرتے مرتے میں ٹرسٹ والوں کی زندگی حرام ضرور کرجاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"لیکن یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے رابی۔ ہم نے ظلم کا بدلہ ظلم سے نہیں دینا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہمارے اور ان کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا۔"

"معاف کرنا بوکارلو! یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ تم ٹرسٹ والوں کو زبانی کلامی ظلم سے باز رکھ سکو گے۔ کئی برس ہوچکے ہیں۔ اب ہمیں اس نتیجے پر پہنچ جانا چاہیے کہ یہ لوگ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ کسی قسم کی تبلیغ یا روحانی عمل سے راہ راست پر آنے والے لوگ نہیں' انہیں راہ راست پر لانے کے لیے میٹھے بولوں کی نہیں' دلیری اور مردانگی کی ضرورت ہے۔"

"تو یہ کون سی مردانگی ہے کہ تم ان کی لڑکیاں اٹھا لائے ہو؟"

"مردانگی نہ سہی' یہ ادلے کا بدلہ تو ہے۔ قبیلے کی لڑکیاں بھی تو غائب ہوتی رہی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے بوکارلو' ہماری ان بہنوں بیٹیوں کو ٹرسٹ والوں نے عزت کا ہما

پہنایا ہوگا؟ ان کی عزتوں کو بھی پامال کیا گیا ہوگا۔ وہ بھی ایسے ہی مدد کے لیے چیخیں پکارتی رہی ہوں گی۔"

"لیکن ہمیں ان جیسا نہیں بننا رابی۔" بوکارلو نے پکار کر کہا۔

"برداشت کی ایک حد ہوتی ہے میرے دوست۔" بلندی سے رابی کی آواز آئی "اور اب یہ حد گزر گئی ہے۔ اور تو اور' اب کنگ کے اپنے ساتھی ہی اس کے خلاف زہر سے بھر گئے ہیں۔ وہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھا رہے ہیں' اگر ہم اب بھی کنگ کے لیے ہاتھوں میں پھول رکھیں گے تو پھر یہ ہماری بزدلی ہوگی۔"

"میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنے دوں گا رابی۔" بوکارلو چیخ کر بولا "عزت سب کی ایک جیسی ہوتی ہے' تمہیں ان دونوں لڑکیوں کو چھوڑنا ہوگا اور ابھی چھوڑنا ہوگا۔"

"یہ نہیں ہوگا بوکارلو۔ تمہاری دوستی کی قیمت پر بھی نہیں ہوگا۔ میں... میں دیوتاؤں کی قسم کھا چکا ہوں۔ میں ان ذکا زادیوں سے وہی سلوک کروں گا جو ہماری غلام زادیوں سے ہوتا رہا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنی قسم جان دے کر بھی نبھانا جانتا ہوں۔"

بوکارلو نے کہا "اگر یہ سب کچھ ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتا تو اور بات تھی۔ اب ہم اپنے سامنے یہ سب کچھ ہونے نہیں دے سکتے۔ ہمیں ہر صورت تمہیں روکنا پڑے گا۔"

رابی بڑے طیش میں کچھ بڑبڑایا پھر بلند آواز میں بولا "تم کچھ نہیں کرسکتے بوکارلو ڈیئر! صرف اس لوہے کے دروازے سے سر پٹخ سکتے ہو۔"

چند ہی لمحے بعد مینار میں بند ایک لڑکی پھر زور زور سے چیخنے لگی۔ یقیناً رابی نام کا وہ شخص اس سے دست درازی کررہا تھا۔ رابی کی طرح لڑکی بھی انگریزی داں تھی۔ وہ پکار رہی تھی "خدا کے لیے میری مدد کرو۔ خدا کے لیے بچاؤ!" گاہے گاہے وہ رابی کی منت سماجت بھی کرنے لگتی تھی۔ اس کے لب و لہجے سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ سفید فام ہے۔

بوکارلو کی کشادہ پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ وہ پہلے تو سب کے سامنے بڑی بے قراری سے ٹہلتا رہا' پھر اس نے چند مسلح افراد کو اپنے پاس بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ چند فٹ کی دوری سے آہنی دروازے پر زبردست فائرنگ کریں۔

بوکارلو کے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ دروازے پر رکھے رکھے سے قریباً دو سو راؤنڈ فائر کیے گئے مگر وہ قدیم زمانے میں ہاتھ داری سے بنا ہوا بھاری بھرکم اور ٹھوس دروازہ تھا۔ مزید مضبوطی کے لیے اس پر لوہے کی پٹیوں سے جال سا بنایا گیا تھا۔ خود کار رائفل کی گولی دروازے سے ٹکراتی تھی تو یوں آواز دیتی تھی جیسے کسی لیڈیز پسٹل سے فوجی ٹینک کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ فائرنگ کو بے اثر دیکھ کر بوکارلو نے اپنے رائفل برداروں کو پیچھے ہٹالیا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ رابی کو گفت و شنید سے قائل کیا جاسکے مگر اس مرتبہ رابی نے بوکارلو کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ مینار کی بلندی سے لڑکی کی چیخیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ یہ بڑی دردناک صورت حال تھی۔ لڑکی مدد کے لیے چیخ رہی تھی۔ اس کی آواز ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی مگر ہم لاچار تھے پھر بدنصیب لڑکی کی چیخیں آہ و زاری میں بدل گئیں۔ اس آہ و زاری میں بے بسی اور لاچاری اپنے عروج پر محسوس ہوتی تھی۔ بوکارلو نے آگے جاکر از خود زور زور سے دروازہ پیٹا اور رابی کو پکارا مگر یہ سب کوششیں لاحاصل رہیں۔ آخر لڑکی کی آواز آنا بند ہوگئی' وہ ایک بھیانک مرحلے سے گزر چکی تھی۔

بوکارلو کو میں نے پہلی بار غصے کی حالت میں دیکھا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر ٹہل رہا تھا۔ اس کا اضطراب دیکھ کر باقی افراد بھی مضطرب نظر آنے لگے تھے۔ میں نے بوکارلو کے قریب پہنچ کر کہا "کیا ہم آپ کی کچھ مدد کرسکتے ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ پریشانی سے بولا "مجھے اس شخص سے اتنی برائی کی توقع نہیں تھی۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا۔"

"جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوچکا محترم۔ اب ہمیں دوسری لڑکی کی فکر کرنی چاہیے۔" یہ بات اس سفید فام نے کہی جس نے کل ہمارے ساتھ جیپ میں سفر کیا تھا۔

اس سفید فام شخص اور بوکارلو کے درمیان انگلش میں جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ رابی آج شام سے اس مینار میں گھسا بیٹھا تھا۔ اس کی موجودگی کا علم اتفاقاً ہی ایک راہ گیر کو ہوا تھا اور اس نے جاکر بستی میں اطلاع کردی تھی۔ ابھی ہمارے آنے سے تھوڑی دیر قبل رابی نے بلندی سے شراب کی دو خالی بوتلیں پھینکی تھیں جس سے ایک شخص شدید زخمی ہوگیا تھا' اس کے بعد فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔

صورت حال بڑی عجیب تھی۔ ایک بھڑکا ہوا جنونی شخص ایک ایسی پناہ گاہ میں گھسا بیٹھا تھا جہاں سے اسے نکالنا یا اس پر قابو پانا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ وہ ہم سب کی موجودگی میں ڈنکے کی چوٹ پر ایک لڑکی کو پامال کرچکا تھا اور ہم کچھ نہیں کرسکے تھے۔ اس کی پناہ گاہ پر اندھا دھند فائرنگ بھی

نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس سے لڑکیوں کی زندگی جاسکتی تھی۔ کچھ دیر تک سٹپٹانے اور چکرانے کے بعد بوکارلو ایک بار پھر مینار کے قریب چلا گیا۔ وہ رابی نامی اس جنونی سے مکالمہ کر رہا تھا اور اسے لڑکیوں سمیت نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ کوشش بے سود ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جنونی واضح الفاظ میں دو تین بار کہہ چکا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کو تاراج کرنے کی قسم دیوتاؤں کے سامنے کھا چکا ہے۔ وہ یہ کارروائی ان عورتوں کے انتقام میں کر رہا تھا جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً لارسیوں کی بستی سے غائب ہوتی رہی تھیں اور جن کے بارے میں رابی کا خیال تھا کہ انہیں ٹرسٹ والوں نے پکڑا ہے۔

میں اور صفدر ایک طرف نیم تاریکی میں کھڑے تھے' صفدر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کھجور کے وہ دو درخت دیکھ رہے ہیں آپ؟ کتنے لمبے ہیں۔ ان میں سے ایک کی شاخیں مینار سے قریباً چھو رہی ہیں۔"

"جناب والا! وہ کھجور کے نہیں تاڑ کے درخت ہیں۔ کیا تمہارا ارادہ ان پر چڑھنے کا ہے؟"

"یہ ایسی کوئی نہ ہونے والی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس درخت پر چڑھ کر مینار کے اندر چھلانگ لگا سکتا ہوں۔" اس نے بائیں جانب والے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید تم بھول رہے ہو کہ وہ شخص مسلح ہے۔ وہ بھی دیکھ چکا ہوگا کہ اس درخت کی شاخیں مینار سے چھو رہی ہیں۔ اس کی رائفل کا رخ یقیناً اسی درخت کی طرف ہوگا۔"

"ایک بات آپ بھی بھول رہے ہیں۔" صفدر نے اطمینان سے کہا "یہاں جو تین درجن مشعلیں بھڑک رہی ہیں ان کی وجہ سے یہاں روشنی ہے اور درخت بھی روشن نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ مشعل بردار دوسری طرف چلے جائیں یا پیچھے ہٹ جائیں تو اس درخت سمیت آس پاس کا سب کچھ تاریکی میں ڈوب جائے گا۔"

بات تو صفدر کی درست تھی۔ مینار کا ایک پہلو اور تاڑ کے بلند و بالا درخت صرف مشعلوں کی وجہ سے اور جیپ کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے روشن نظر آ رہے تھے۔ اگر ادھر روشنی نہ ہوتی تو یہ سب کچھ تاریک تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ بہت سی مشعلیں تیل ختم ہونے کی وجہ سے بجھ گئیں۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی بجھا دی گئی تھیں کیونکہ بیٹری ڈاؤن ہونے کا خطرہ تھا۔ صرف چند مشعلیں روشن تھیں اور وہ کچھ فاصلے پر درختوں میں چلی گئی تھیں

جہاں بوکارلو اپنے ساتھیوں کے ساتھ صلاح مشورے میں مصروف تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ صفدر میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے اسے دو چار آوازیں دیں مگر وہ آس پاس کہیں نہیں تھا۔ پلک جھپکتے میں میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کدھر گیا ہے۔ میری نگاہ بے اختیار تاڑ کے جھنڈ کی طرف اٹھ گئی۔ خطرے سے کھیلنا صفدر کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ خطرہ جتنا شدید ہوتا تھا اس کا سامنا کرنے میں اسے اتنا ہی مزہ آتا تھا۔ شاید میری اپنی کیفیت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہمیں بدترین حالات کا سامنا کرنے کا چسکا سا پڑ گیا تھا۔ جس طرح اکثر لوگ تحفظ اور سلامتی کی تلاش میں رہتے ہیں' ہم حوادث اور مشکلات کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ ان مشکلات سے آنکھیں چار کرکے اور پھر ان سے عہدہ برآ ہو کر ہمیں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا تھا۔

تاڑ کے درخت مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن انہیں دیکھے بغیر ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرا سرپھرا یار ان درختوں میں پہنچ چکا ہے اور مینار پر اترنے کے لیے کارروائی کا آغاز کر چکا ہے۔ اب ان درختوں کی طرف جانا نہ صرف میرے لیے بلکہ صفدر کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموشی سے کھڑا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

قریباً بیس منٹ سخت تجسس اور انتظار میں گزرے۔ شکستہ مینار کے اندر اب مکمل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی وہاں موجود ہی نہیں ہے' نہ کوئی آہٹ تھی' نہ روشنی۔ میں گھور گھور کر درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا مگر درختوں کے ہیولوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شاید یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی اور پھر ایک دم قرب و جوار لرز اٹھے۔ مینار کی نصف بلندی سے رائفل کی خوفناک تڑتڑاہٹ سنائی دی تھی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا' صفدر نہتا تھا۔ مد مقابل نہ صرف مسلح تھا بلکہ جنونی کیفیت میں بھی تھا۔ تب اچانک زوردار نسوانی چیخیں سنائی دیں' یہ دو لڑکیوں کی چیخیں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مینار میں قریباً چالیس فٹ کی بلندی پر شعلے بھڑک اٹھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں چند لمحے کے لیے دو افراد گتھم گتھا نظر آئے۔ یقیناً ان میں سے ایک خدائی فوجدار صفدر تھا۔ مینار کے ارد گرد موجود قبائلی بوکارلو سمیت حیرت زدہ تھے' ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بوکارلو کا سفید فام ساتھی میرے قریب ہی کھڑا تھا' وہ اس اچانک ہلچل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے

کہ یہ بدبخت اکیلا نہیں تھا۔ کوئی ساتھی بھی اس کے ہمراہ ہے۔ اب شاید دونوں جھگڑ پڑے ہیں۔"

بوکارلو کے مسلح ساتھی مینار کے ارد گرد بوکھلائے بوکھلائے پھر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ قریباً پانچ منٹ بعد لڑکیوں کی چیخ و پکار قدرے کم بلندی سے سنائی دینے لگی۔ اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کی طرف آ رہی ہیں۔ مینار میں بھڑکنے والے شعلے اب کافی پھیل گئے تھے۔ گاڑھے دھوئیں کا بادل آسمان کو تاریک کر رہا تھا پھر بھاری بھرکم آہنی دروازے پر کھٹ پٹ سنائی دی۔ اس کا اندرونی کھٹکا ہٹایا جا رہا تھا۔ بوکارلو کے کچھ ساتھیوں نے جیپ کی اوٹ میں پوزیشن لے لیں اور رائفلیں دروازے کی طرف سیدھی کر لیں۔ آخر دروازہ کھلا۔ پہلے دو لڑکیاں چیختی ہوئی باہر نکلیں اور درختوں کی طرف لپک گئیں۔ بوکارلو کے ساتھیوں نے لڑکیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کے بعد مجھے صفدر کی صورت نظر آئی۔ وہ ایک زخمی شخص کو رائفل کے کندے سے دھکیلتا ہوا باہر لا رہا تھا۔ زخمی کے دونوں بازوؤں پر گولیاں لگی تھیں اور خون دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے مضروب کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ شاید وہ تکلیف میں نہ ہوتا تو بھی اس کا چہرہ کچھ اتنا معقول نہ ہوتا۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر لمبا تھا اور جسمانی لحاظ سے بھی وہ شخص خاصا لمبا تڑنگا تھا۔ اس کا رنگ نہ سیاہ تھا اور نہ سفید۔ مترجم صوفیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا' یہ شخص سیاہ باپ اور سفید ماں کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔ کھلی جگہ پر پہنچ کر صفدر نے اسے دھکا دیا اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ بوکارلو کے حبشی ساتھیوں نے لپک کر اس کی مشکیں کس دیں۔ صفدر کو دیکھ کر بوکارلو سمیت ہر شخص کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔ صفدر خود بھی زخمی ہوا تھا۔ اس کے کندھے سے خون رس رہا تھا۔

"یہ تو۔۔۔ تمہارا ساتھی ہے۔" بوکارلو نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ لیکن اس نے جو کچھ کیا ہے' اپنی صوابدید پر اور اپنے رسک پر کیا ہے۔"

"لیکن یہ وہاں پہنچا کیسے؟"

"یہ تو آپ اسی سے پوچھئے۔" میں نے کہا۔

بوکارلو کی نگاہ بے اختیار تاڑ کے درختوں پر جم گئی۔ وہ بڑبڑاتے لہجے میں بولا "اگر یہ وہاں سے گیا ہے تو پھر اس نے انوکھا کمال کیا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ وہیں سے گیا ہے۔" میں نے کہا۔

بوکارلو کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ دو افراد نے جلدی سے صفدر کا زخمی کندھا دیکھا۔ یہ گولی کے بجائے تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ لمبائی چھ انچ اور گہرائی ڈیڑھ انچ کے لگ بھگ تھی۔ خون روکنے کے لیے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی گئی۔ صفدر کے بعد رابی کی مرہم پٹی بھی کی گئی۔ تاہم یہ عارضی انتظام تھا۔ رابی کے دونوں بازوؤں میں ایک ایک گولی موجود تھی۔ مینار سے برآمد ہونے والی دونوں سفید فام لڑکیوں کو لمبی چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا لباس پھٹ چکا تھا اور جسم پر ان گنت خراشیں تھیں۔ یہ وہی بدنصیب لڑکی تھی جو مینار کے اندر رابرٹ عرف رابی کی آتش مزاجی کا "شکار" ہوئی تھی۔ میں اس کا چہرہ قریب سے نہیں دیکھ پایا' بہرحال اس کے سر پر ہچکولے کھاتی ہوئی چادر سے عیاں تھا کہ وہ مسلسل ہچکیوں سے رو رہی ہے۔

مینار کے اندر بھڑکنے والی آگ خود ہی بجھ گئی تھی۔ دراصل یہ آگ اسی کوٹھڑی نما کمرے میں بھڑکی تھی جہاں رابی نے لڑکیوں کو محبوس کیا تھا۔ کمرے میں جو شے بھی لکڑی کی تھی یا جلنے کے قابل تھی وہ جل گئی تھی۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ آگ نے بجھنا ہی تھا۔ رابی کی رائفل اب صفدر کے ہاتھ میں تھی۔ اس رائفل سے ۲۰ گولیوں کا میگزین ملحق ہوتا تھا۔ چار پانچ گولیاں اب بھی میگزین میں موجود تھیں۔ یہ رائفل بوکارلو کے کارندوں نے اپنی تحویل میں لے لی۔ بوکارلو کی ہدایت پر چند افراد نے اوپر جاکر آتش زدگی کا شکار ہونے والا کمرا دیکھا اور کچھ شواہد اکٹھے کیے۔ اس کے بعد دو تین افراد کو کھنڈر میں چھوڑ کر باقی سب لوگ واپس بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ صفدر کے علاوہ شدید زخمی رابی کو بھی جیپ میں سوار کر لیا گیا' اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی لہٰذا بوکارلو نے مجھے ہدایت کی کہ میں جیپ کی رفتار ممکنہ حد تک تیز رکھوں۔ جلد ہی ہم بستی واپس پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد بوکارلو کے گھڑ سوار بھی آ گئے۔ دونوں لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ وہ سرتاپا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں' انہیں ایک ہی گھوڑے پر بٹھایا گیا تھا۔ بوکارلو نے خود آگے بڑھ کر بڑے احترام سے دونوں لڑکیوں کو گھوڑے سے اتارا۔ وہ انہیں لے کر اپنے جھونپڑے کی طرف بڑھا۔ مشعل بردار افراد اس کے دائیں بائیں تھے۔ پہلے بوکارلو جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کے بعد دونوں لڑکیوں نے اندر قدم رکھا۔ دونوں جھجک رہی تھیں۔ اگلی لڑکی اندر داخل ہو چکی تھی' پچھلی آدھی اندر اور آدھی باہر تھی۔ اچانک بجلی سی لپک گئی۔

ایک شخص نے کود کر لڑکی پر حملہ کیا اور اسے دبوچ لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی جو اس نے لڑکی کی کنپٹی پر رکھ دی، اس کے ساتھ ہی وہ وحشیانہ انداز میں چیخنے لگا "پیچھے ہٹ جاؤ۔ سب پیچھے ہٹ جاؤ۔ ورنہ ختم کر دوں گا اسے۔"

مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ روشن مشعلیں جو دو سیدھی قطاروں کی صورت میں تھیں، چاروں طرف بکھر گئیں۔ بوکارلو بھی پلٹ کر باہر نکل آیا۔ دوسری لڑکی بھی نکلنا چاہتی تھی مگر بوکارلو نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے واپس اندر دھکیل دیا۔ لمبا تڑنگا شخص لڑکی کو چڑیا کی طرح دبوچے ہوئے دس پندرہ قدم پیچھے چلا گیا اور ایک جھونپڑے کی دیوار سے پشت لگا لی۔ مشعلوں کی روشنی اب براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ شروع میں تو مجھے اور صفدر کو یہی لگا کہ وہ رابرٹ عرف رابی ہے۔ اس کا قد کاٹھ اور کسی حد تک شکل بھی رابی سے ملتی تھی مگر وہ رابی نہیں تھا، اس کا بھائی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے بولا "یہ لڑکیاں میرے بھائی کے ساتھ آئی ہیں اور اسی کے ساتھ رہیں گی۔ میرے بھائی نے دیوتاؤں کی قسم کھائی ہے۔ میں یہ قسم ٹوٹنے نہیں دوں گا۔"

بوکارلو غرا کر بولا "پاگل مت بنو۔ لڑکی کو چھوڑ دو۔ ورنہ رابی کی طرح۔۔۔"

"جناب! میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔" رائفل بردار بوکارلو سے مخاطب ہو کر چیخا "مگر ان لڑکیوں کے بارے میں میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ یہ لڑکیاں میرے بھائی کی ملکیت ہیں۔"

"تمہارے بھائی نے انہیں اغوا کیا ہے۔"

"ہمارے قبیلے سے بھی تو لڑکیاں اغوا ہوئی ہیں۔ میری بیوی کی پندرہ سالہ بہن اغوا ہوئی ہے۔ ٹرسٹ والے اسے تو واپس چھوڑ کر نہیں گئے، پھر ہم ان کے سروں پر چادریں دے کر انہیں کیوں واپس کریں۔"

اس نے وحشت کے عالم میں لڑکی کے جسم پر سے چادر نوچ پھینکی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو کچھ دیر پہلے رابی کی وحشت کا شکار ہو چکی تھی۔ لڑکی کے جوان جسم پر بس لباس نام کی چند دھجیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ سراپا حیرانی اور خوف تھی۔ ابھی وہ بمشکل ایک سانحے سے گزری تھی کہ یہ دوسری قیامت اس کے سر پر ٹوٹ پڑی تھی۔ رائفل بردار نے جب یہ دیکھا کہ اس کی دھمکی کارگر ہے اور کوئی بھی اس کے قریب آنے کی جرات نہیں کر رہا تو وہ لڑکی کو لے کر آہستہ آہستہ جھیل کی طرف بڑھنے لگا۔ جھیل کا کنارہ دس پندرہ گز کی دوری پر تھا، وہاں ایک ڈونگا لہروں پر ہلکورے کھا رہا تھا۔ رائفل بردار لڑکی کو لے کر ڈونگے میں سوار ہو جاتا تو پھر اس پر قابو پایا جانا کافی مشکل کام تھا۔ بوکارلو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ماہر نشانہ باز کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیاہ فام شخص خاموشی کے ساتھ تاریکی میں رینگ گیا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوا کہ یہ چاق و چوبند نشانہ باز کس طرف گیا ہے اور اس نے کہاں پوزیشن لی ہے، ہم نے بس تاریکی میں دھماکے کے ساتھ شعلہ لپکتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی لڑکی کو یرغمال بنانے والا شخص جو جھیل کے عین کنارے پر پہنچ چکا تھا، لڑکھڑا کر گر گیا۔ چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے گئے اور انہوں نے گرنے والے کو قابو کر لیا۔ میں اور صفدر بھی موقع پر پہنچے۔ رائفل کی گولی اس شخص کے سینے میں دل کے مقام پر لگی تھی اور وہ گرتے ساتھ ہی راہیِ عدم ہو گیا تھا۔ قبائلی نشانہ باز واقعی بہت اچھا تھا۔ لڑکی ہذیانی انداز میں چیختی چلی جا رہی تھی۔ اس کو ایک مرتبہ پھر چادر سے ڈھانپ دیا گیا اور بوکارلو کے کشادہ جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا جس کے دروازے پر ایک مسلح حبشی پہرے پر کھڑا تھا۔

بوکارلو کے چہرے پر تاسف کے آثار تھے۔ وہ غم زدہ نظروں سے ہلاک ہونے والے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ فام بوڑھا روتا چلاتا ہوا آیا اور ہلاک ہونے والے کے خون آلود جسم سے چمٹ گیا۔ اس بوڑھے کے جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور گھونگریالے بال بالکل سفید تھے۔ وہ بیٹے پر دوہتڑ مار مار کر چیخ رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا۔ گاہے گاہے دکھ بھرے انداز میں بوکارلو کی طرف بھی اشارہ کرتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بوڑھا مقتول کا باپ ہے اور وہ اپنے بیٹے کی موت پر بوکارلو سے شکوہ کناں ہے۔ پھر اچانک بوڑھے کو نجانے کیا ہوا، وہ خاک اڑاتا ہوا اٹھا اور بستی کی طرف دوڑا۔ وہ میرے بالکل قریب سے ہو کر گزرا تھا۔ بوکارلو نے اس کی طرف ہاتھ اٹھائے اور مجھ سے چیخ کر کہا "اس کو پکڑو۔" بوکارلو کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں پلٹ کر بوڑھے کے پیچھے بھاگا۔ چند اور مسلح افراد بھی میرے عقب میں آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں بوڑھے کو پکڑتا، وہ ایک نیم پختہ جھونپڑے میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر گھسا۔ یہاں چربی کے دو تین چراغ روشن تھے۔ اس روشنی میں مجھے کسی دھات کی بنی ہوئی ایک صراحی نظر آئی۔ اس صراحی کے منہ میں سے شیشے کی دو نلکیاں نکل کر ایک ... نے سے جار میں جا رہی تھیں۔ یہ جار پانی سے بھرے

ہوئے ایک ٹب میں رکھا تھا۔ صراحی کے نیچے آگ جل رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کچھ تجرباتی نوعیت کے آلات نظر آ رہے تھے۔ بوڑھا جھونپڑے میں پہنچتے ہی دیوانوں کی طرح ہاتھ چلانے لگا۔ آگ پر رکھی صراحی الٹ کر دور جا گری۔ شیشے کی نلکیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ ہمارے پکڑتے پکڑتے بوڑھا جھونپڑے میں موجود اکثر اشیا کو توڑ پھوڑ چکا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہذیانی انداز میں چلا بھی رہا تھا۔ بوڑھے کو بمشکل قابو میں کیا گیا۔ غم و غصے کی زیادتی سے بوڑھے پر اچانک غشی طاری ہو گئی اور وہ ہمارے ہاتھوں میں جھول گیا۔ جھونپڑے کے اندر ایک سیاہی مائل سیال پھیل گیا تھا۔ اس میں سے نہایت تیز اور کریہہ بو اٹھ رہی تھی۔ ہم بوڑھے کو ہاتھوں پر اٹھا کر جھونپڑے سے باہر لے آئے۔

بوکارلو بڑے مایوس انداز سے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اشیا پر ایک پریشان نگاہ ڈالی اور ایک گہری سانس لے کر باہر آ گیا۔

میں اور صفدر جس وقت اپنے جھونپڑے میں واپس پہنچے صبح ہونے والی تھی۔ جنگل کی یہ خنک صبح بڑی سہانی اور دل فریب تھی۔ مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ بستی میں مرغ بہ آواز بلند اذانیں دے رہے تھے اور درختوں پر پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔ میں اور صفدر جھونپڑے کا دروازہ اور کھڑکی کھول کر بیٹھ گئے۔ ہوا جھونپڑے میں سے گزرنے لگی اور رات بھر کی گرمی اور حبس کا مداوا ہو گیا۔ ہمارے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کب تک کلبلاتے رہتے لیکن پھر ہمیں صوفیہ کی صورت نظر آ گئی اور ہم نے اپنے سوالات اس کے سامنے رکھ دیے۔ ان میں سے سب سے اہم سوال یہی تھا کہ یہ بوڑھا کون تھا اور اس نے جھونپڑے میں گھس کر جو توڑ پھوڑ کی تھی، اس کا کیا مقصد تھا؟

اس سوال کے جواب میں صوفیہ نے کہا "مرنے والے کا نام فرانسس ہے۔ یہ رابرٹ عرف رابی کا سگا بھائی ہے، جس بوڑھے کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ان کا باپ ہے۔ اس کی بیوی ایک سفید فام عورت تھی اور یہ دونوں بھائی اسی کے بطن سے ہیں۔"

"اس نے جھونپڑے میں توڑ پھوڑ کس لیے کی؟" صفدر نے پوچھا۔

صوفیہ بولی "تم نے محترم بوکارلو کے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھی ہے۔" ہم نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ کہنے لگی "تم جانتے ہو یہ ہاتھ کیسے مجروح ہوا؟"

اس مرتبہ ہمارا جواب نفی میں تھا۔

صوفیہ نے کہا "تم نے ٹرسٹ میں کبھی گنگ کو دیکھا ہے؟ اس کے پاس اکثر ایک خاص قسم کا چھپکلا ہوتا ہے۔"

"ہاں وہ چھپکلا میں نے دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"محترم بوکارلو کو اسی منحوس چھپکلے نے کاٹا ہے۔ اس کے لگائے ہوئے زخم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔" صوفیہ کے لہجے میں دکھ کی لہر تھی۔

میں اور صفدر حیران رہ گئے۔ صفدر نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ زخم کیسا بھی ہو اگر وہ کرانک نہیں تو اس کا علاج ممکن ہے۔"

"میں تمہیں کوئی کتابی بات نہیں بتا رہی۔ یہ یہاں کے لوگوں کا صدیوں پرانا تجربہ ہے۔ یہ بہت نایاب نسل کا LIZARD ہے اور اس کی جو خصوصیت میں نے تمہیں بتائی ہے وہ تسلیم شدہ ہے۔"

میری اور صفدر کی حیرانی بجا تھی۔ وہ منحوس چھپکلا اکثر ہمارے ارد گرد موجود رہا تھا۔ ایک بار تو وہ صفدر کے پاؤں پر بھی چڑھ گیا تھا اور اس کی پنڈلی پر منہ مارتا رہا تھا۔ گنگ براؤن کی موجودگی میں صفدر اسے پاؤں سے جھٹک بھی نہیں سکا تھا۔ اس وقت میرے یا صفدر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ بظاہر سست الوجود جانور اس قدر موذی ہے۔

صوفیہ بولی "یہ بوڑھا جس نے ابھی جھونپڑے میں توڑ پھوڑ کی ہے اس قبیلے میں جڑی بوٹیوں اور ادویات کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نام موسو ہے۔ موسو کے پاس ایک نہایت کمیاب مقامی بوٹی "بازی" کی چند خشک پتیاں موجود تھیں یا شاید وہ کہیں سے لے کر آیا تھا۔ اس بوٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہر قسم کے زخم کو ٹھیک کر سکتی ہے، حتیٰ کہ اس ضدی زخم کے لیے بھی مفید ہے جو محترم بوکارلو کو آیا ہے۔ اس بوٹی کو کشید کر کے اس کا عرق نکالا جاتا ہے پھر اس کے عرق کا عرق اور پھر اس کے عرق کا عرق نکالا جاتا ہے، یہ سلسلہ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ آٹھ سے دس مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ موسو اپنے جھونپڑے میں اسی عمل میں مصروف تھا۔ وہ دو دن سے سخت محنت کر رہا تھا۔"

اب ساری بات میری اور صفدر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ صوفیہ نہ بھی بتاتی تو ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ بوکارلو کے حکم پر معالج موسو کے بیٹے کو گولی مارے جانے کا واقعہ موسو پر ستم کے پہاڑ توڑ گیا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے وہ سارا "سیٹ اپ" درہم برہم کر دیا تھا جس کا تعلق بوکارلو کے علاج سے تھا۔ جھونپڑے میں ٹوٹی پھوٹی اشیا دیکھ کر بوکارلو کے چہرے پر

مایوسی کی جو لہر آئی تھی اس کی نوعیت اب اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی۔

میں نے صوفیہ سے پوچھا "مگر یہ سب ہوا کیوں کر۔ کیا کنگ کی طرف سے محترم بوکارلو کو یہ زخم جان بوجھ کر لگایا گیا ہے؟"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ کنگ یوں تو دھیمے مزاج کا شخص ہے لیکن جب وہ مشتعل ہوتا ہے تو ایک بالکل بدلا ہوا شخص بن جاتا ہے۔ اس کا غضب دیوانگی کی حد کو چھونے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے موقع پر اس کا خفیف سا اشارہ بھی اس منحوس LIZARD کو حرکت میں لے آتا ہے اور وہ بجلی کی سی سرعت سے سامنے بیٹھے شخص پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔"

"کیا محترم بوکارلو کو بھی یہ بات معلوم تھی؟"

"یقیناً معلوم ہوگی لیکن کہا جاتا ہے نا کہ جو تکلیف انسان کی قسمت میں لکھی ہو وہ مل کر رہتی ہے۔"

صوفیہ کی باتیں سننے کے بعد میرے دل میں بوکارلو کے لیے ہمدردی کا گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آتش مزاج بھائی کے مقابلے میں دھیما اور قدرے امن پسند شخص نظر آتا تھا۔ اب تک اس کا جو رویہ سامنے آیا تھا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے برعکس اپنے جیسے انسانوں کو غلام نہیں بلکہ آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچ کا یہی اختلاف دونوں بھائیوں کے درمیان نزاع کی وجہ تھا۔

صفدر نے پوچھا "اب کیا ہوگا۔ اگر موسو نے بوکارلو کا علاج نہ کیا تو کیا کوئی اور شخص ہے جو ایسا کر سکے؟"

صوفیہ مسکرائی "محترم بوکارلو سے تادیر اختلاف کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ تم دیکھنا ایک دو روز تک موسو بھی بالکل ٹھیک ہو جائے گا' وہ نہ صرف محترم بوکارلو کے لیے دوا تیار کرے گا بلکہ شاید اپنے رویے پر ان سے معافی بھی مانگے۔"

"یہ کیونکر ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"محترم کی روحانی قوت۔" صوفیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا "یہ کوئی تصوراتی بات نہیں ہے۔ اگر تم یہاں رہے تو خود ہی محترم بوکارلو اور سردا دیوغات کی پُراسرار طاقت کے ناقابل تردید ثبوت ملاحظہ کر لو گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ آنکھوں کا جادو؟"

"اور یہ جادو کوئی واہمہ نہیں ہے' یہ وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔" صوفیہ نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر بوکارلو صاحب اپنے بھائی کنگ براؤن کو رام کیوں نہیں کر لیتے؟" میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور بہت جلد ہونے والا ہے۔" صوفیہ نے بڑے یقین سے کہا۔

صوفیہ نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق اگلے ہی روز ہو گئی۔ موسو کے بیٹے فرانسس کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ نو تعمیر شدہ مذہبی عمارت "بوٗما" کے سامنے فرانسس کی لاش ایک تختے پر رکھی تھی۔ چہرے کے سوا اس کا سارا جسم کسی جانور کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ سوگوار ارد گرد جمع تھے۔ ان میں بوکارلو کے علاوہ مرنے والے کا باپ موسو اور بھائی رابی بھی نظر آ رہا تھا۔ رابی کے دونوں بازو سفید پٹیوں میں جکڑے تھے۔ وہ گاہے گاہے کینہ توز نظروں سے صفدر کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ بوما کے اندر سے گھنٹیاں بجائی گئیں تو سفید چولے میں ملبوس بوکارلو بڑے وقار سے آگے بڑھا۔ ایک برتن میں مقدس پانی تھا۔ اس پانی کی مدد سے بوکارلو نے اپنے ہاتھ سے فرانسس کا چہرہ اور سر دھویا۔ چہرے اور سر سے گرنے والا پانی ایک بڑے برتن میں جمع ہو رہا تھا۔ بعد ازاں بوکارلو نے یہی پانی چلو بھر بھر کر چند مرد و زن کے سر میں ڈالا۔ ان میں معالج موسو اور اس کا زخمی بیٹا رابی بھی شامل تھے۔ بوکارلو نے موسو کے سر پر پانی ڈالا تو وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ پھر ایک دم بوکارلو کے سینے سے لگ گیا۔ بوکارلو نے محبت سے اس کا شانہ تھپکا اور تسلی آمیز انداز میں چند فقرے کہے۔ موسو مسلسل اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ بعد ازاں فرانسس کی لاش ایک جلوس کی شکل میں جنگل کی طرف لے جائی گئی۔ اس جلوس میں صرف مرد شامل تھے' وہ ہم آہنگ ہو کر کوئی مناجات وغیرہ بھی پڑھ رہے تھے۔ میں اور صفدر بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے تھے۔ جنگل میں ایک جگہ بہت بڑا الاؤ روشن تھا۔ یقیناً فرانسس کی لاش کو آگ کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ آگ ان لوگوں کا دیوتا تھی یعنی فرانسس کو دیوتاؤں کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ جس تختے پر مرنے والے کو لٹایا گیا تھا اس کے نیچے پہیے موجود تھے۔ یہ پہیے بھی لکڑی کے ہی تھے۔ الاؤ کے قریب پہنچ کر چند رسوم ادا کی گئیں اور تختے کو ایک ہموار سطح پر رکھ کر آگ کی طرف دھکیل دیا گیا۔

اس کارروائی کے بعد بوکارلو ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے تقریر کرنے والے انداز میں چند جملے کہے۔ ان جملوں کا مطلب بوکارلو کے انگریزی داں دوست میڈا سے کی زبانی ہمیں معلوم ہوا۔ بوکارلو نے اپنے عقیدت مندوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا "ہم عدم تشدد کے علم بردار ہیں۔ عدم تشدد کی راہ پر چلنا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ اس کے لیے کبھی کبھی اپنے پیاروں اور اپنے قریبی ساتھیوں کی قربانی بھی

دینا پڑتی ہے' جیسے کل ہم نے اپنے عزیز دوست موسو کے پیارے بیٹے فرانسس کی قربانی دی ہے۔ اس پر گولی چلانے کا حکم دیتے وقت میرے دل پر جو کچھ گزری تھی وہ مجھے ہی معلوم ہے' تاہم دیوتاؤں کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب رہا ہوں۔ میں موسو کے دکھ درد کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ موسو نے اس موقع پر جس حوصلے کا ثبوت دیا ہے' دیوتا اس کا صلہ ضرور دیں گے۔"

اس رات صفدر اور میں دیر تک اپنے جھونپڑے میں جاگتے رہے اور صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ بوکارلو کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا اور اس کی اکثر باتوں میں سچائی بھی نظر آتی تھی۔ کل اس نے یرغمالی لڑکی کو بچانے کے لیے واقعی ایک کٹھن فیصلہ کیا تھا۔ اس نے موسو کے بیٹے کی قربانی دے دی تھی مگر اصول پر سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا بھی تھا کہ جو زخم وہ اپنے بھائی سے لے کر آیا ہے اس کا علاج بس موسو کے پاس ہی ہے۔ میں نے صفدر سے وہ حالات بھی سنے جو کھنڈر کے مینار کے اندر پیش آئے تھے۔ صفدر نے بتایا کہ وہ شاخ سے کود کر مینار کے اندر پہنچا تھا۔ رابی اس وقت نشے کے زیرِ اثر نیم خوابیدہ تھا۔ ایک لڑکی کو اس نے اپنے سامنے بٹھایا ہوا تھا اور اس کو گن پوائنٹ پر رکھ کر اس سے بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں گہری تاریکی میں تھے۔ صفدر ان سے کنی کترا کر سیڑھیوں کی طرح چلا گیا۔ وہاں دوسری لڑکی موجود تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور وہ ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ صفدر واپس آیا اور اچانک نیم خوابیدہ رابی پر جا پڑا۔ چند لمحے کی کشمکش کے بعد رابی کی رائفل صفدر کے قبضے میں آ گئی۔ اس شدید کشمکش میں رابی کے دونوں بازوؤں میں گولیاں لگیں اور صفدر کا شانہ بھی زخمی ہوا۔ جو لڑکی تاریکی میں رابی کے روبرو بیٹھی تھی وہ ہوشیاری سے سیڑھیوں کی طرف چلی گئی اور اپنی ساتھی لڑکی کی بندشیں کھول کر اس کے ساتھ نیچے بھاگ گئی۔ بعد ازاں صفدر بھی زخمی رابی کو آگے لگا کر نیچے لے آیا۔ اس دوران میں ایک بم کے گرنے سے مینار کے ایک کمرے میں آگ بھی بھڑک اٹھی تھی اور مینار کے اندر دھواں بھرتا جا رہا تھا' صفدر کا خیال تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر بھی مینار کے اندر مزید رہتے تو ان سب کا دم گھٹ جاتا۔

صفدر نے حقیقی معنوں میں ایک دلیرانہ کام کیا تھا۔ اس امر کی وجہ سے بستی کے عوام اور خواص میں اس کی عزت افزائی ہوئی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ رابی جیسے شخص کی عداوت بھی اس کے حصے میں آئی تھی۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ جھونپڑے کا دروازہ اور کھڑکی دونوں کھلے تھے اس کے باوجود حبس محسوس ہوتا تھا۔ مچھروں کے الیہ گانے بھی مسلسل کانوں میں گونج رہے تھے۔ وسیع و عریض بستی کی چیخ در چیخ گلیوں میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے اور بلیاں غرا رہی تھیں۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن میں ماضی کی فلم سی چل رہی تھی۔ سائیں عالی کا بھوت جیسے ہر وقت میرے ارد گرد چکراتا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ اپنا کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سینے میں جو پُراسرار سوئی چبھوئی تھی اس کا نشان ابھی تک میرے سینے پر موجود تھا۔ سائیں کے بعد کم سن شیطان اسفی کا چہرہ میرے تصور میں چکرانے لگا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد بھی نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ اچانک مجھے کھٹ پٹ محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ صفدر بہ آہستگی جھونپڑے میں سے نکل رہا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے جوتے پہنے اور تاریکی میں گم ہو گیا۔ صفدر کا انداز چونکا دینے والا تھا۔ وہ تو مجھ سے کچھ بھی چھپاتا نہیں تھا۔ اس کا انداز مجھے خاصا پُراسرار محسوس ہوا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں بستر سے اٹھ بیٹھا اور باہر تاریکی میں جھانکنے کی ناکام کوشش کرنے لگا پھر میں نے صفدر کے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا۔ جوتے پہن کر اور ایک چادر لپیٹ کر میں بھی باہر نکل آیا۔ میں اور صفدر ابھی تک اسی قبائلی لباس میں تھے جو بوما کے افتتاح کے موقع پر ہمیں پہنایا گیا تھا۔ شروع میں یہ لباس ہمیں بڑا مضحکہ خیز محسوس ہوا تھا مگر اب جیسے ہمارے جسم کا حصہ ہی بنتا جا رہا تھا۔ میں چالیس پچاس گز ہی آگے گیا تھا کہ مجھے صفدر نظر آ گیا۔ وہ دیواروں کے سائے میں چلتا جھیل کے اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں بوکارلو کا شان دار جھونپڑا واقع تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ صفدر یوں رازداری سے کہاں جا رہا ہے۔ ویسے یہ ایک حقیقت تھی کہ پچھلے ایک روز سے وہ مجھے کچھ اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔ بہت زیادہ بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ نجانے کیوں میرا خیال تھا کہ صفدر بوکارلو کے جھونپڑے کی طرف جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ صفدر دائیں جانب درختوں کے اس جھنڈ کی طرف مڑ گیا جو بوکارلو کی رہائش گاہ کے عقب میں واقع تھا۔ میں بھی چند لمحے کا وقفہ دے کر بڑی احتیاط سے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ میں صفدر کی تیز نگاہی اور زود حسی سے اچھی طرح آگاہ تھا' لہٰذا میں نے درختوں میں داخل ہوتے ہوئے نہایت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھے۔

اچانک مجھے بری طرح ٹھٹکنا پڑا۔ مجھے اپنے بالکل قریب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صفدر نے ہولے سے کھانسی کی تھی۔ نسوانی آواز سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ خوب رو ویرا کی آواز تھی۔ وہی جوان سائنس داں جسے کنگ براؤن کی بھتیجی ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ نرسٹ میں صفدر نے ایک "شان دار رنگا رنگ" کے عوض ویرا کی زندگی بچائی تھی۔ میں نے آخری مرتبہ اسے نرسٹ کے خاص الخاص علاقے کیمپس میں ہی دیکھا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس تاریک رات میں اسے درختوں کے اس جھنڈ میں صفدر کے ساتھ دیکھوں گا۔ میں نے اپنی سانس تک روک لی۔ صفدر اور ویرا کا فاصلہ مجھ سے بمشکل پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ میری پیدا کی ہوئی ایک ہلکی سی آہٹ بھی ان دونوں کو چوکنا کر سکتی تھی۔ اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے خود کو تھوڑا سا مزید آگے کھسکایا۔ جلد ہی میں صفدر اور ویرا کے ہیولے دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ ایک درخت کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ یوں اپنے پیارے دوست کی جاسوسی کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر اس جادو نگری میں ہر قسم کے حالات سے باخبر رہنا بھی ضروری تھا۔ یہاں ہر طرف اسرار کے سائے تھے اور حقیقت پسندی اپنا چہرہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نسوانی ہیولا صفدر کے ہیولے سے لپٹ گیا۔ صفدر اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا پھر منہ چومنے کی آوازیں آئیں اور ویرا کی ہانپتی ہوئی سی سرگوشی سنائی دی۔ اس نے صفدر کا نام لے کر کچھ کہا تھا۔ میرا اور ان دونوں کا فاصلہ خطرناک حد تک کم تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے پیچھے کی طرف سرکنا شروع کیا اور درختوں کے جھنڈ سے باہر آ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں آوارہ کتوں سے بچتا بچاتا اپنے جھونپڑے میں واپس پہنچ چکا تھا۔

ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ صفدر ایک نہایت قابل اعتماد دوست اور دیرینہ ساتھی تھا۔ اس کا کردار بھی قابل رشک حد تک مضبوط تھا مگر جو کچھ میں نے ابھی دیکھا تھا وہ اس کے برعکس تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد صفدر بھی خاموشی سے جھونپڑے میں واپس پہنچ گیا۔ اس نے ایک محتاط نگاہ مجھ پر ڈالی اور میرے قریب ہی لیٹ گیا۔ صبح ہم نے اکٹھے ہی ناشتا کیا۔ صفدر اور میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میرے دل میں یہ شدید خواہش موجود تھی کہ صفدر مجھے خود ہی ویرا کے بارے میں کچھ بتائے۔ میری یہ خواہش تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ پوری ہو گئی۔ ہم جھونپڑے سے دور جھیل زار کے کنارے بیٹھے تنگ و عریض جیسی کشتی رانوں کو دیکھ رہے تھے، صفدر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ وہ بولا "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کنگ براؤن اور بوکارلو کی بھتیجی ویرا یہاں موجود ہے۔"

"ویرا یہاں کیسے پہنچی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

وہ بولا "جن دو لڑکیوں کو راہبی نے اتوار کے روز یرغمال بنایا تھا ان میں سے ایک ویرا بھی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" میں واقعی حیران رہ گیا۔

"جی ہاں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی شکل میں مینار کے اندر نہیں دیکھ سکا۔ جب وہ مینار میں سے نکل آئی تو قبا کیوں نے اسے چادر میں چھپا دیا۔ غالباً آپ نے بھی اس کی صورت نہیں دیکھی ہوگی۔ وہ ویرا تھی۔ پرسوں رات آخری پہر جب ہم دونوں جھونپڑے میں سو رہے تھے ویرا ہمارے پاس آئی۔ اس نے مجھے جگایا اور اپنے ساتھ باہر لے گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شہر کے ایک شاپنگ پلازا سے اپنی دوست سمیت کیسے اغوا ہوئی اور کیسے اس کھنڈر میں پہنچی۔ ویرا اور اس کی دوست کے ساتھ وقوعہ کے وقت ایک ڈرائیور بھی تھا۔ یہ ڈرائیور گارڈ کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ راہبی نے اس 'گارڈ ڈرائیور' کو جان سے مار ڈالا اور دونوں لڑکیوں کو اغوا کر کے شہر سے قریباً ساٹھ کلومیٹر دور اس کھنڈر میں لے گیا۔ یہاں اس نے درجنوں افراد کی موجودگی میں ویرا کی اطالین سہیلی کو پامال کیا۔ اس کے بعد یقیناً ویرا کی باری آنا تھی۔

"ویرا نے وہ ساری کارروائی دیکھی تھی جو میں نے دونوں سہیلیوں کو ہونی راہبی کے پنجے سے چھڑانے کے لیے کی تھی۔ ویرا میری کوشش سے بڑی متاثر نظر آتی تھی اور بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ چند روز کے اندر میں نے دوسری بار اس کی زندگی بچائی ہے۔" (اور واقعی یہ ایک زبردست اتفاق ہی تھا کہ صفدر نے ایک شدید خطرے سے دوسری مرتبہ ویرا کی حفاظت کی تھی اور یہ دونوں واقعات صرف چند روز کے وقفے سے ہوئے تھے)

صفدر نے اپنے پیکٹ سے دو سگریٹ نکالے۔ ایک مجھے دیا اور دوسرا خود سلگا لیا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "آج رات میری اور ویرا کی ملاقات پھر ہوئی ہے۔ میں پہلے روز ہی آپ کو اس بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر ویرا آپ سے بہت کتراتی ہے۔ اس نے درخواست کی تھی کہ میں آپ کو

اپنی اور اس کی ملاقات کے متعلق نہ بتاؤں۔ بہرحال آج کی ملاقات میں میں نے اس پر واضح کر دیا کہ میں کچھ بھی آپ سے چھپا نہیں سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "تمہاری اطلاعات حیرت انگیز ہیں پیارے۔ مجھے نرسٹ میں ہی شبہ ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی تمہارے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہے۔ اس تازہ اتفاق کے بعد تو یہ گوشہ یقیناً اور بھی وسیع ہو گیا ہوگا۔"

"میرے بھی سان گمان میں نہیں تھا کہ ویرا سے لارسیوں کی اس بستی میں ملاقات ہوگی اور اس انداز سے ہوگی۔"

میں نے ویرا کے حوالے سے صفدر کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ موضوع بدلتے ہوئے میں نے کہا "ویرا کے خیالات کیا ہیں۔ وہ اپنے چچا بوکارلو کو کس نظر سے دیکھ رہی ہے؟"

"میرے خیال میں وہ بوکارلو کو پہلے بھی برا نہیں سمجھتی تھی۔ اب اس کی نظر میں بوکارلو کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بوکارلو نے اس کی سہیلی کی جان اور عزت بچانے کے لیے اپنے ایک قریبی دوست کے بیٹے کو گولی مروائی ہے اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے نواحی جنگلات سے لارسیوں کے کئی مرد و زن اغوا ہوئے ہیں اور شاید ہی ان میں سے کوئی واپس آیا ہو۔ نہ صرف یہ کہ بوکارلو نے لڑکی کی عزت بچائی ہے بلکہ اب وہ دونوں لڑکیوں کو واپس نرسٹ کے حوالے کرنے پر بھی آمادہ ہے۔ اس نے کنگ براؤن کو پیغام بھیجا ہے کہ دونوں لڑکیاں قبیلے کی بستی میں ہیں اور کنگ اپنے آدمی بھیج کر انہیں غیر مشروط طور پر منگوا سکتا ہے۔"

"کنگ براؤن کی طرف سے کیا جواب آیا ہے؟"

"ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ سردار بوعات اور بوکارلو شدت سے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں یہ خطرہ بھی ہے کہ کہیں یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ لڑکیوں کے اغوا کے علاوہ کنگ کا ایک کارندہ قتل بھی ہوا ہے۔"

"مگر کنگ یہ بھی تو دیکھے گا کہ دونوں لڑکیوں کی جان بچانے کے لیے بوکارلو نے اپنے ایک بندے کو ہلاک اور دوسرے کو شدید زخمی کر دیا ہے۔"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" صفدر نے کہا۔

اس رات صفدر پھر ویرا سے ملاقات کرنے کے لیے گیا۔ ویرا اور اس کی سہیلی کا جھونپڑا درختوں کے جھنڈ کے قریب ہی واقع تھا۔ حفاظت کی غرض سے ایک مسلح پہرے دار جھونپڑے سے باہر موجود رہتا تھا، اس کے علاوہ ایک فوجی عورت جھونپڑے کے اندر بھی سوتی تھی پھر بھی ویرا کو مقررہ وقت پر جھونپڑے کی عقبی کھڑکی سے نکلنے اور درختوں کے جھنڈ میں پہنچنے کا موقع مل جاتا تھا۔ صفدر آج سارا دن ہی کچھ کھویا کھویا رہا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ویرا اپنی کشش اور غیر معمولی ذہانت کے ساتھ اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ کچھ بھی تھا، آخر وہ گوشت و پوست کا انسان تھا۔ ایک انتہائی خوب صورت لڑکی اپنی محبت کی تمام تر گرمی اور جوش کے ساتھ اس کی زندگی میں گھس آئی تھی۔ اس کی مزاحمت کرتے ہوئے صفدر کو واقعی پسینہ آ رہا تھا۔ صفدر کی پہلی محبت تو انجم تھی۔ وہ لاہور میں تھی اور ساہی صاحب نے شفقت کے ساتھ ساتھ انجم کی حفاظت کا بھی فول پروف انتظام کر رکھا تھا۔ صفدر کی زندگی میں انجم کی محبت دھیمی دھیمی برسنے والی شبنم کی طرح تھی جو ہر موسم میں ہر رات برستی ہے اور برستی ہی رہتی ہے لیکن اس لڑکی ویرا کی محبت شاید ایک طوفانی بارش جیسی تھی، جو تھوڑی دیر کے لیے برستی ہے لیکن شور مچاتی ہے، چنگھاڑتی ہے اور ہر طرف جل تھل کر دیتی ہے۔ صفدر کی واپسی رات قریباً ڈیڑھ بجے ہوئی۔ وہ ایک گھنٹا جھونپڑے سے باہر رہا تھا "ہاں بھئی مہینوال۔۔۔ سوہنی ملی کہ نہیں؟" میں نے شرارت سے کہا۔

"ملی جی۔۔۔ وہ تو کوئی ایک گھنٹا پہلے ہی سے وہاں انتظار کر رہی تھی۔ بڑی پاگل لڑکی ہے جی۔ بالکل خبطی ہے۔ میرے تو گھٹنوں کوڑوں میں بیٹھ جائے گی۔" صفدر نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سچ پوچھتے ہیں تو اس کی محبت سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ اس کی مت تو ماری ہی ہوئی ہے، میری بھی مار دے گی۔ اب پتا ہے کیا کہہ رہی ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہے؟"

"کہہ رہی ہے کہ واپس نرسٹ جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا۔ وہ یہیں ہمارے ساتھ رہنے کا سوچ رہی ہے۔"

"تو کیا اس کے بڑے چچا کنگ صاحب اسے یہاں رہنے دیں گے؟"

"یہ تو اس کے سوچنے کی بات ہے۔ میں نے تو اس سے یہی کہا ہے کہ وہ کوئی ایسا منصوبہ مت بنائے جس سے اختلافات میں اضافہ ہو۔"

"کیا ویرا کو معلوم ہے کہ ہم یہاں کیسے اور کس مقصد

کے تحت پہنچے ہیں؟"

"نہیں وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ ہمارے حوالے سے ڈرامائی فرار کی اسی کہانی پر یقین رکھتی ہے جو ہم نے بوکارلو وغیرہ کو سنائی ہے۔"

اچانک میں نے صفدر کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ میں نے صفدر کی نگاہ کا تعاقب کیا تو نگاہ سیدھی ویرا پر جا پڑی۔ وہ اپنے جھونپڑے کی کھڑکی کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا رخ جھیل ہی کی طرف تھا اور وہ یقیناً صفدر کو ہی تک رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں عجیب والہانہ پن تھا۔ ہم دونوں جھیل کے کنارے بیٹھے تھے۔ سورج اب کافی اوپر آگیا تھا' لہٰذا شمال کی طرف سے چلنے والی ہوا میں جنگلی نباتات کی بھینی بھینی سی خوشبو شامل ہوگئی تھی۔ یہ سوچا جاسکتا تھا کہ شاید ویرا نے بھی اسی ہوا سے لطف اندوز ہونے کے لیے کھڑکی کھولی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ کافی فاصلے سے بھی یہ بات صاف محسوس ہو رہی تھی کہ ویرا کی نگاہیں صفدر کے چہرے کا طواف کر رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ ویرا ہمیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جس میں وہ چار پانچ روز پہلے اغوا ہوئی تھی۔ یہ آدھے بازو کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر کچھ میلے سے ہوگئے تھے لیکن اس سے ویرا کی عمومی کشش پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے بال ہمیشہ کھلے رکھنے کی عادی تھی اور یہ خوب صورت چمکیلے بال اس قابل بھی تھے کہ انہیں کھلا رکھا جائے۔ ہماری طرف بڑھتے ہوئے ہوا اس کے لباس کو اس کے جسم سے پیوست کر رہی تھی اور اس کے دلکش نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ ایک مسلح گارڈ حفاظت کی غرض سے اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ ویرا ہمارے پاس ہی آکر بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ اس جنگل میں یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ کچھ دیر رسمی باتیں ہوتی رہیں' پھر ویرا اپنی سہیلی کا ذکر کرنے لگی۔ وہ اغوا ہونے کے بعد جنسی تشدد کا نشانہ بنی تھی اور ابھی تک اس صدمے سے باہر نہیں آسکی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ویرا نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ جھونپڑے سے باہر لائے اور گھمائے پھرائے تاکہ اس کا دھیان کچھ بٹے مگر ویرا کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ویرا نے بوکارلو کا ذکر بھی کیا۔ وہ اس کے لیے "چھوٹے چچا" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ کہنے لگی "چھوٹے چچا اس واقعے پر اتنے شرمندہ ہیں کہ اب ان کی شرمندگی کو دیکھ کر مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ اس واقعے پر خود جینا

(ویرا کی سہیلی) سے معافی مانگ چکے ہیں۔ کل رات وہ اس کمینے (راہل) کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس نے بھی جینا کے پاؤں میں گر کر اس سے معافی مانگی ہے۔ اس سے جینا کا صدمہ کچھ کم ہوا ہے' ورنہ کل رات تک تو وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔"

ویرا کچھ دیر تک ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر اس نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ صفدر کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "جینا ان سے ملنا چاہتی ہے۔ کئی بار ان کا نام لے چکی ہے۔ انہوں نے کھنڈر میں ہمیں بچانے کے لیے جس طرح خود کو شدید خطرے میں ڈالا وہ اس سے بہت متاثر ہوئی ہے۔"

"اور بھی بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ویرا سمجھ گئی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ صفدر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کیا مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اب تمہیں بار بار اجازت لینی پڑے گی' لہٰذا میں تمہیں ایک ہی دفعہ "الٹی پل" اجازت دے رہا ہوں۔"

وہ مسکرایا اور ویرا کے ساتھ اس کے جھونپڑے کی طرف چلا گیا۔ ویرا کا رویہ صفدر کے لیے واقعی بے حد شدید اور بے ساختہ تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش سے یوں لگتا تھا کہ وہ برسوں سے صفدر کو جانتی ہے اور اسے چاہتی ہے۔ یہ واقعی ایک طوفانی محبت لگتی تھی۔ ویرا کی آنکھوں میں صفدر کے لیے پسندیدگی کی چمک میں نے پہلی مرتبہ اس وقت بھی دیکھی تھی جب نرسٹ میں راجن والا سنگین واقعہ پیش آیا تھا۔ از پرسٹی راجن نے اچانک اسپتال سے نکل کر مجھ پر حملہ کیا تھا اور پھر لیبارٹری میں گھس کر ویرا کو یرغمال بنا لیا تھا۔ لیبارٹری میں دھماکا خیز مواد موجود تھا اور وہاں موجود ایک سلنڈر کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ ان خطرناک لمحات میں صفدر نے بڑی جرات سے ایک یادگار نشانہ لیا تھا اور کولٹ پسٹل کے صرف ایک ہی فائر سے راجن کو ڈھیر کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد صفدر اور ویرا کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ہر ملاقات میں' میں نے ویرا کو صفدر کے کچھ اور قریب محسوس کیا تھا۔ مگر اب جو صورت حال نظر آرہی تھی وہ بالکل مختلف تھی۔ ویرا کی آنکھوں میں محبت کی دبی دبی چمک اب

روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی۔

صفدر مجھ سے صرف پندرہ بیس منٹ کی اجازت لے کر گیا تھا مگر اس کی واپسی دوپہر کے کھانے پر ہوئی۔ میں نے کہا "بھئی کھانا بھی ادھر ہی اپنے پرستاروں میں کھا لیتے' خواہ مخواہ زحمت کی تم نے۔"

"بس وہ پکڑ کر ہی بیٹھ گئی تھی۔ کہنے لگی جینا کو کمپنی کی ضرورت ہے اور وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ جینا واقعی۔۔۔"

"بس بس بس۔ زیادہ صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ شیر کس حال میں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ لوہے کے جال میں ہے۔"

صفدر نے مسکرانے کے بجائے گہری سانس لی اور بولا "شاہ جہاں صاحب! میں واقعی پریشان ہوں۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بات چھپائی نہیں۔ شاید چھپا ہی نہیں سکتا ہوں۔ یہ لڑکی۔۔۔ مم میرا مطلب ہے' ویرا تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کا قد لمبا ہوتا جارہا ہے۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں لیکن میں سنجیدہ ہوں۔"

"ہاں بھئی' جب لڑکی اتنی حسین اور تعلیم یافتہ ہو تو سمجھ دار بندے کو سنجیدہ ہونا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بائی دی وے۔۔۔ پچھلے ایک ہفتے میں وہ کتنا "بڑھ" چکی ہے۔"

وہ مسکرایا "آپ ہفتوں کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ دنوں اور گھنٹوں کے حساب سے بڑھ رہی ہے' اسی لیے تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے اس کے رویے سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"زریں گل یہاں ہوتا تو ضرور کہتا' جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ خو چھپ چھپ کے آہیں بھرنا کیا۔"

شام کے وقت ویرا پھر صفدر کو لینے آگئی۔ وہ اس کے ساتھ ڈونگے میں جھیل کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مسٹر شا! آپ بھی چلئے ہمارے ساتھ۔"

"نہیں میں یہاں بہت ٹھیک ہوں۔ آپ بس اتنا کیجئے گا کہ رات ہونے سے پہلے لوٹ آیئے گا۔ یہ جنگل ہے اور ہم جنگلیوں میں ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم کنارے کے پاس نہیں جائیں گے۔" ویرا نے کہا۔

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اب باقی کی ساری زندگی تم دونوں اس جھیل میں ہی گزارو گے؟"

"کیا مطلب مسٹر شا؟"

"بھئی اگر تم لوگ کنارے کے پاس نہیں آؤ گے تو واپس کیسے لوٹو گے؟"

ویرا کھلکھلا کر ہنس دی۔ ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

وہ صفدر کو لے کر چلی گئی۔ دونوں ایک ڈونگے میں بیٹھے۔ صفدر نے چپو سنبھال لیے' جھیل کے ساکت پانی میں لہریں پیدا کرتے اور سفید براق بطخوں کے درمیان سے راستہ بناتے وہ دور نکل گئے۔ حسب توقع ان کی واپسی رات گئے ہی ہوئی تھی۔ صفدر کچھ جھینپا جھینپا اور خاموش نظر آتا تھا۔ میں نے اسے ستانے کے لیے کہا "لڑکی کے چچا حضور عزت مآب بوکارلو تشریف لائے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی۔ انہیں تمہارے اور ویرا کے چکر کا پتا چل گیا ہے۔ انہوں نے مجھے وہی پیشکش کی جو بے شمار رومانی فلموں میں امیر ہیروئن کے بزرگوں کی طرف سے غریب ہیرو کے والدین کو کی جاچکی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!" صفدر نے کہا۔

"ویرا کے چچا بوکارلو نے چار گابھن بھینسیں مجھے تحفے میں دی ہیں اور کہا ہے کہ میں اپنے لونڈے کو لے کر ویرا کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں۔ لونڈے سے مراد تم ہو۔"

"مجھے نہیں یقین کہ آپ چار سو گابھن بھینسوں کے بدلے بھی میری کسی چھوٹی سی خوشی کا خون کر سکتے ہیں۔"

"تو اسی لیے تم چوڑے ہوتے چلے جارہے ہو۔"

"چوڑا میں نہیں ہو رہا ہوں جی۔ زبردستی مجھے چوڑا کیا جارہا ہے۔ اگر آپ میرے دین ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں تو فوراً مجھے یہاں سے لے کر چلے جائیں۔" وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"اب نئی پیش رفت کیا ہوئی ہے؟"

"پیش رفت نہیں جی' پیش رفتائیں۔ یہ لڑکی جتنی سوبر اور شائستہ نظر آرہی تھی' اتنی ہی بگولا ثابت ہو رہی ہے۔ میں آپ سے جو کہنے جارہا ہوں شاید آپ اس پر یقین نہ کر سکیں۔"

"تم بتاؤ' میں کر لوں گا یقین۔ مجھے قرب قیامت کی ساری نشانیاں نظر آگئی ہیں۔ اب قیامت بھی آجائے گی تو حیرت نہیں ہوگی۔"

صفدر نے بستر پر گرتے ہوئے کہا "محترمہ نے شادی کی بات چھیڑ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں اور یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

"کیوں' شادیوں پر کوئی پابندی لگ رہی ہے یا پھر محترمہ نے کہیں اور بھی شادی کا ٹائم دے رکھا ہے؟"

صفدر نے میرے طنز کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ میرے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں ان خرافات میں پڑنے والا نہیں ہوں لیکن ویرا کے رویے میں کوئی ایسی بات ہے کہ میں کوشش کے باوجود اسے نظرانداز نہیں کر پارہا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔ وہ والدین اور بہن بھائیوں کے پیار سے محروم لڑکی ہے۔ اس نے کبھی کوئی دوست بھی نہیں بنایا۔ ایسے الگ تھلگ رہنے والے کم آمیز لوگوں میں بعض اوقات محبت کے لیے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے پھر جب وہ کسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بے پناہ شدت سے ہوتے ہیں۔"

صفدر کی سنجیدگی نے مجھے بھی سنجیدہ کردیا۔ میں نے اپنا آخری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تمہاری بات ٹھیک ہے صفدر! لیکن یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے کہ تم اس معاملے کو طول نہیں دے سکتے ہو۔ اس سے پہلے کہ یہ لڑکی مزید آگے نکل جائے' تمہیں اس کی پیش قدمی روک دینی چاہیے۔ یہ کام جتنی تاخیر سے ہوگا اتنی ہی اس بے چاری کو اذیت زیادہ ہوگی۔"

"ایک بار پھر جیسے اور آپ کے خیالات ہو بہو مل رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک خط لکھ کر اسے اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کردیتا ہوں۔"

"یہاں قلم اور کاغذ کا حصول کافی مشکل ہوگا۔ ویسے بھی تمہیں کوئی تحریری ثبوت مہیا نہیں کرنا چاہیے۔ میرا مشورہ ہے کہ دل کڑا کرکے تم خود ہی اس سے بات کرلو۔"

صفدر نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور پُرسوچ انداز میں جھونپڑے کی منقش دیوار کو گھورنے لگا۔ میرے مشورے پر اس نے نیم رضامندی ظاہر کردی تھی۔

اگلے روز دوپہر تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ قبیلے کے نائب سردار لاروناہے نے ہمارے جھونپڑے کا چکر لگایا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک کاٹیاں اور جہاں دیدہ شخص نظر آتا تھا بلکہ مجھے یہ بات حقیقت کے قریب محسوس ہوئی کہ قبیلے کے تمام انتظامی امور ناہے ہی چلا رہا تھا۔ سردار بوناٹ کی حیثیت "آئینی سربراہ" اور مذہبی رہنما کی سی تھی۔ لاروناہے کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ قبیلے کے بزرگ عزیز معالج موسو نے اس دوا کی تیاری پھر سے شروع کردی ہے جو محترم بوکارلو کے موذی زخم کو مندمل کرنے میں مدد دے گی۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ٹرسٹ والوں کو اس بات سے آگاہ کردیا گیا ہے کہ ان کی دو لڑکیاں ہمارے پاس حفاظت سے موجود ہیں اور وہ جب چاہیں انہیں لے جاسکتے ہیں۔ "تاہم ابھی تک ٹرسٹ کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ میرے ایک سوال کے جواب میں ناہے نے ہمیں اس بات کی اجازت دی کہ ہم بستی کی حدود میں آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔

دوپہر کے وقت ویرا پھر ہمارے غریب خانے پر آدھمکی۔ آج وہ نئے لباس میں نظر آرہی تھی۔ یہ ایک پھنسا پھنسا سا اسکرٹ تھا۔ ویرا کی پنڈلیاں اور سرخ و سپید بازو عریاں تھے۔ بال ہمیشہ کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اپنی دلکشی کو چار چاند لگانے کے لیے اس نے گلے میں جنگلی پھولوں کی مالا بھی پہن لی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک طشتری تھی جسے رومال سے ڈھانپا گیا تھا۔ اس نے طشتری صفدر کی ناک کے عین سامنے کی اور شوخی سے بولی "بوجھو بھلا کیا ہے؟"

"کوئی حلوا قسم کی چیز لگتی ہے۔" صفدر نے کہا۔

"تمہارے سونگھنے کی حس اتنی اچھی نہیں ہے۔" وہ چہکی اور خوان پوش ہٹا دیا۔ پتھر کی خوب صورت رکابی میں کھیر تھی۔ اس کھیر کو اسٹابری جیسے کسی جنگلی پھل سے سجایا گیا تھا۔

صفدر نے رکابی تھامنا چاہی تو اس نے جلدی سے پیچھے ہٹالی "نہیں جی نہیں۔ یہ تمہارے لیے نہیں۔ یہ تو میں مسٹر شاہ کے لیے لائی ہوں۔"

وہ بے تکلفی سے ہمارے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی "یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہے۔" وہ بولی اور دو پلیٹوں میں ہمارے لیے کھیر نکالنے لگی۔ اپنی کاوش کے سلسلے میں وہ خاصی پُرامید نظر آتی تھی۔

میں نے اور صفدر نے غور سے کھیر کا معائنہ کیا۔ دراصل یہاں کا ہر کھانا ہمیں "خورد بین" لگا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ صفدر بولا "کہیں اس میں بھی تو ہتھنی وغیرہ کا دودھ نہیں؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" ویرا نے برا سا منہ بنایا "میں تمہیں ہتھنی کے دودھ کی کھیر کھلاؤں گی۔ میں یہاں تم سے زیادہ محتاط ہوں۔ اگر کوئی شک ہے تو لو میں پہلے کھاتی ہوں۔" اس نے ایک چمچ لے کر بڑی نزاکت سے منہ میں رکھا۔

میں نے اور صفدر نے بھی ایک ایک چمچ لیا۔ کھیر اچھی تھی نہ بری' بس کھیر تھی' ہاں اس پر لگا ہوا جنگلی پھل خوب مزے دار تھا۔

"کیسی ہے؟" ویرا نے بے حد اشتیاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "کھیر بنانا مجھے والدہ نے سکھایا تھا۔ والدہ کی بنائی ہوئی کھیر (پڈنگ) کی خوشبو مجھے اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں بھی ویسی ہی کھیر بنانا چاہتی تھی لیکن پھر والدہ رہیں' نہ ان کی بنائی ہوئی کھیر اور نہ اس کی خوشبو۔ اس خوشبو کی جگہ لیبارٹری میں کیمیکلز کی ناگوار بوؤں نے لے لی۔ میں شب و روز اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ پچھلے چار پانچ سال میں نے پورے کے پورے لیبارٹری کے اندر سفید کوٹ پہن کر گزارے ہیں۔ زندگی کی یہ رنگینیاں جو اس وقت ہمارے اردگرد نظر آرہی ہیں' مجھ سے کوسوں دور رہی ہیں۔"

اس کی نگاہ جھونپڑے کی کھڑکی سے باہر دور جھیل پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی اور اس کے حسین چہرے پر وہی چمک نظر آتی تھی جو کئی گھنٹے اپنے کلاس روم میں بند رہنے والی معصوم بچی کے چہرے پر چھٹی کے وقت نظر آتی ہے۔

"تمہارے والد کب فوت ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"والدہ کی وفات کے صرف ایک سال بعد۔ والدہ کی جدائی کا غم بھلانے کے لیے وہ دن رات کام میں مصروف رہتے تھے۔ وہ بھی سائنس داں تھے۔ میری طرح لیبارٹری ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ایک رات لیبارٹری میں آگ بھڑک اٹھی۔ ڈیڈی کے جسم کا تین چوتھائی حصہ آگ سے متاثر ہوا۔ اس حادثے کے ایک ہفتے بعد وہ انتقال کرگئے۔"

ویرا کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں لیکن اسی دوران میں اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر جھیل کے ایک منظر میں کھوگئی۔ میں اور صفدر بھی بے ساختہ یہ منظر دیکھنے پر مجبور ہوگئے۔ رنگ برنگ پھولوں سے لدی ہوئی ایک کشتی دھیرے دھیرے جھیل کے وسط سے کنارے کی طرف آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کشتی کی شکل کا ایک بہت بڑا گلدستہ ہے جو جھیل کی شفاف سطح پر بہتا چلا آرہا ہے۔ اس کشتی کو تین سیاہ فام لڑکیاں چپوؤں سے چلا رہی تھیں۔ ان کے چپو بڑے آہنگ کے ساتھ یکبارگی حرکت میں آتے تھے' اٹھتے تھے اور گرتے تھے۔ جیسے کوئی بچہ روتے روتے کسی کھلونے میں گم ہوجائے' ویرا بھی ایک دم خوش ہوگئی تھی۔ اس نے صفدر کا ہاتھ تھام لیا "آؤ دیکھیں۔" وہ اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔ تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ صفدر اٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں جھیل کے کنارے کھڑے پھولوں سے لدی ہوئی اس طویل کشتی کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل جھیل کے پار کئی پھلواریاں تھیں جہاں سے یہ پھول توڑ کر بستی کے بازار میں لائے جاتے تھے۔ اس بازار سے فروخت ہو کر یہ پھول بستی کی کنواریوں اور سہاگنوں کے بالوں اور جسموں پر سجتے تھے۔

جھیل کے کنارے صفدر سنجیدہ نظر آرہا تھا مگر ویرا مسلسل چہک رہی تھی۔ اس کے بال خنک ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ خوشی کے عالم میں بار بار انہیں چہرے سے ہٹاتی تھی۔ کشتی کنارے پر پھول اتارتی رہی۔ جب وہ واپس جانے لگی تو صفدر اور ویرا اسی عطر بیز کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکل گئے۔ ویرا کی حفاظت پر مقرر حبشی گارڈ بھی کشتی میں سوار ہونا چاہتا تھا مگر ویرا نے اسے منع کردیا۔ یہ سوچ کر میرا دل افسردہ ہوا کہ صفدر کو اپنے دل پر جبر کرکے ویرا کے ساتھ ایک ناپسندیدہ گفتگو کرنا پڑے گی۔ دھیرے دھیرے جھیل پر' جنگل پر اور لارسیوں کی اس وسیع و عریض بستی پر شام کے سائے پھیلنے لگے۔ دھوپ کی شدت بتدریج کم ہوگئی اور بستی کے گول جھونپڑوں کے اندر سے دھوئیں کی لکیریں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ دن بھر جنگل میں چرنے والے پالتو جانوروں کے ریوڑ بستی میں واپس آنا شروع ہوگئے اور کھیتوں میں اور کھجوروں کے باغات میں کام کرنے والے محنت کش اپنی دن بھر کی کمائی کا حساب جوڑتے ہوئے بستی میں لوٹ آئے۔ میں' صفدر اور ویرا کا انتظار کررہا تھا مگر ان کا دور دور پتا نہیں تھا۔ ذہن میں انجانے خدشے سر اٹھانے لگے۔ ویرا اور اس کی دوست کی وجہ سے بستی میں ایک قتل ہوچکا تھا اور دوسرا شخص شدید زخمی ہوچکا تھا۔ اس واقعے کے نتائج خطرناک بھی ہوسکتے تھے۔ میرے خیال کے مطابق ویرا اور صفدر کو یوں اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے اس طویل قامت حبشی کو دیکھا جو گارڈ کے طور پر ہر وقت ویرا کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ بھی بے قراری سے جھیل کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ گارڈ بھی یقیناً اس رنگین تعلق سے آگاہ ہوچکا تھا جو آناً فاناً صفدر اور ویرا میں پیدا ہوا تھا۔ اور بات صرف گارڈ ہی کی نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق بستی میں بھی لوگ اس حوالے سے چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ خدا خدا کرکے وہ کشتی نظر آئی جس پر صفدر اور ویرا سیر کے لیے نکلے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد صفدر میرے ساتھ جھونپڑے میں موجود تھا۔ وہ کچھ خاموش نظر آرہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس

نے ویرا سے کھل کر بات کرلی ہے اور غالباً انہیں واپسی میں دیر بھی اسی لیے ہوئی ہے لیکن جب صفدر سے بات ہوئی تو میرا اندازہ غلط نکلا۔ صفدر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "آپ کو یقیناً مجھ پر غصہ آئے گا شاہ جہاں صاحب۔ لیکن پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں کوشش کے باوجود آج اس سے بات نہیں کرسکا ہوں۔ وہ اتنی خوش، اتنی پُرامید نظر آرہی تھی کہ میری ہمت ہی نہیں پڑسکی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے وہی رستہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے خط؟" صفدر نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "یار! میں تو تمہیں کافی مضبوط شخص سمجھتا تھا لیکن آج کل تم ٹین ایجرز والی باتیں کررہے ہو۔"

صفدر نے سنجیدہ لہجے میں کہا "یہ میرا آپ سے وعدہ ہے شاہ جہاں صاحب! کل تک یہ معاملہ بالکل ختم ہوجائے گا۔"

وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ ایک طرف ویرا کی طوفانی محبت تھی، دوسری طرف صفدر کا اپنا ماضی تھا۔ انجم بھی، اس سے کیے ہوئے عہدوپیمان تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ میں نے اس موضوع پر مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سب کچھ صفدر صوابدید پر چھوڑ دیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی نائب سردار لاروناپے ہمارے جھونپڑے میں آموجود ہوا۔ وہ حسبِ معمول کھال کے چغہ نما لبادے میں تھا۔ آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ سرخ نظر آرہی تھیں۔ مترجم کے طور پر صوفیہ اس کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے دو محافظوں کو جھونپڑے سے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ لاروناپے نے اندر آتے ہی صفدر کو خشمگیں نظروں سے گھورنا شروع کردیا۔ اس نے مترجم صوفیہ کے ذریعے صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ تم یہاں کوئی چکر چلا رہے ہو۔ تم نے ہماری میزبانی سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک ایسا کام کیا ہے جو تمہاری اوقات کے مطابق نہیں ہے۔ تمہاری حیثیت ایک مفرور غلام کی سی ہے اور تم نے محترم بوکارلو کی بھتیجی کو ورغلانے کی کوشش کی ہے۔"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" صفدر نے اعتماد سے کہا "اور اگر کچھ ہوا بھی ہے تو وہ محترم بوکارلو کی بھتیجی کی طرف سے ہی ہوا ہے لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آپ کو اس حوالے سے کیا پریشانی لاحق ہے؟"

حسبِ توقع لاروناپے کا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ وہ صوفیہ کی وساطت سے بولا "مجھے پریشانی اس لیے لاحق ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہورہا ہے۔ اگر اسے حل نہ کیا گیا تو خون خرابے کی نوبت آسکتی ہے۔ میں تو اس وقت کو پچھتا رہا ہوں جب سردار نے تمہیں یہاں پناہ دینے کا فیصلہ کیا۔"

"لیکن ہوا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

لاروناپے نے کہا "کل رات ٹرسٹ سے تین افراد یہاں پہنچے ہیں۔ ان میں محترم بوکارلو کا ایک قریبی عزیز بھی شامل ہے۔ یہ لوگ دونوں مغویہ لڑکیوں کو یہاں سے واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں مگر محترم بوکارلو کی بھتیجی صاحبہ نے ٹرسٹ واپس جانے سے صاف انکار کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے چچا بوکارلو کے پاس رہنا چاہتی ہیں اور ابھی واپس جانے کی خواہش مند نہیں۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اپنا قصور تم بہت اچھی طرح سمجھتے ہو۔ وہ لڑکی صرف تمہاری وجہ سے واپس جانے سے انکاری ہے۔ اور اگر لڑکی تمہاری وجہ سے واپس نہ گئی اور کسی قسم کا مسئلہ کھڑا ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری تم پر عائد ہوگی۔"

میں نے کہا "محترم ناپے! میرا خیال ہے کہ آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں، ہم اس سلسلے میں بھلا کیا کرسکتے ہیں۔"

"تمہارا یہ ساتھی سب کچھ کرسکتا ہے۔" لاروناپے نے صفدر کی طرف اشارہ کیا "لڑکی کے ذہن کو فتور کا شکار کرنے والا یہی ہے۔ یہی اسے سمجھا سکتا ہے کہ وہ یہاں سے واپس چلی جائے اور خواہ مخواہ ہم کو کسی بڑے امتحان میں نہ ڈالے۔"

چند تلخ ترش باتیں کرنے کے بعد لاروناپے پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ خاصا مضطرب نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ ویرا کی وجہ سے معاملہ کافی بگڑا ہوا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد بوکارلو بنفسِ نفیس ہمارے جھونپڑے پر پہنچ گیا۔ میں اور صفدر اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اس کی پرکشش آنکھیں سوچ سوچ تھیں۔ لگتا تھا کہ لاروناپے کی طرح وہ بھی رات بھر جاگتا رہا ہے۔ ہم نے اسے بیٹھنے کے لیے اونچی جگہ فراہم کی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "ویرا بہت جذباتی لڑکی ہے۔ اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ بچپن سے ہی یہ ایسی تھی۔ اگر کسی بات پر اڑ جاتی تھی تو اسے منانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ کل رات بھی اس نے کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ ٹرسٹ سے کچھ لوگ اسے واپس لے جانے کے لیے آئے تھے۔ اس نے کہہ دیا کہ ابھی وہ چند دن میرے پاس رہنا چاہتی ہے۔ جو لوگ لینے آئے تھے ان میں چین بھی شامل تھا۔ وہ ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ وہ غصے کا بھی تیز

ہے۔ اس کے منہ سے نکل گیا کہ وہ اسے ہر صورت لے کر جائے گا۔ بس اسی بات پر دونوں میں تلخ کلامی ہوگئی۔ بات زیادہ بڑھی تو ویرا نے واپس ٹرسٹ جانے سے صاف انکار کردیا۔ اب وہ اپنی بات پر بضد ہے اور کسی صورت واپس جانا نہیں چاہ رہی۔"

"یہ صورتِ حال ہمارے لیے بھی تشویش ناک ہے جناب۔" میں نے کہا۔

بوکارلو نے گہری سانس لیتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "پچھلے دنوں ایک دوست کی حیثیت سے ویرا تم دونوں کے بہت قریب رہی ہے۔ اگر تم دونوں اسے سمجھانے کی کوشش کرو تو شاید صورتِ حال میں کوئی بہتری پیدا ہو۔"

"ہم دل و جان سے حاضر ہیں جی۔" صفدر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اگر ہماری درخواست پر مس ویرا اپنے ارادے میں تبدیلی لے آتی ہیں تو یہ ہمارے لیے بڑی خوشی بلکہ اعزاز کی بات ہوگی۔"

"ٹھیک ہے" میں ابھی تھوڑی دیر میں صوفیہ کو تمہاری طرف بھیجتا ہوں۔ تم دونوں کو وہ ویرا تک پہنچادے گی۔ اسے بتانے کی کوشش کرو کہ اس کے اس اچانک فیصلے سے قبیلے اور ٹرسٹ کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ جائے گی اور ایسا ہوگیا تو یہ کسی کے لیے بھی بہتر نہیں ہوگا۔ وہ فی الحال چین انکو کے ساتھ ٹرسٹ واپس چلی جائے۔ برادر کنگ کے ساتھ تعلقات کچھ بہتر ہوجائیں تو پھر وہ واپس اس بستی میں بھی آسکتی ہے یا ہوسکتا ہے کہ ہم سب ہی وہاں چلے جائیں۔" بوکارلو نے آخری فقرہ کچھ عجیب سے انداز سے کہا تھا۔

بوکارلو نے جیسے کہا تھا، تھوڑی ہی دیر بعد صوفیہ آئی اور ہم دونوں کو لے کر اس جھونپڑے میں پہنچ گئی جہاں ویرا اپنی بہت کے ساتھ موجود تھی۔ باہر نکلتے وقت صوفیہ نے ہم دونوں کو دو بڑے رومال دیے تھے اور کہا تھا کہ یہ رومال ہم ڈھاٹے کی طرح منہ سر پر لپیٹ لیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم کسی ٹرسٹ سے آنے والوں کی نگاہ میں نہ آجائیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم ٹرسٹ والوں کے ہی بھیجے ہوئے ہیں۔ جھونپڑے میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے دیکھا کہ ایک نشان دار جیپ لونا کے قریب موجود ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ویرا کا سب سے چھوٹا چچا اور دیگر دو افراد اسی جیپ پر یہاں پہنچے تھے، اب وہ ویرا کو اپنے ساتھ لے جانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ ہم جھونپڑے میں پہنچے تو ایک طرف خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی اطالین دوست وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے بوکارلو ہی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم تنہائی میں ویرا کے ساتھ آزادی سے بات کرسکیں۔

میں نے کہا "ویرا! تم نے اپنے چھوٹے چچا کے ساتھ ٹرسٹ واپس جانے سے انکار کردیا ہے۔ کیوں؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے گردن جھکائے جھکائے کہا "میں آپ دونوں سے گزارش کروں گی کہ آپ اس میں دخل نہ دیں۔"

"لیکن ویرا! تمہارے اس ذاتی معاملے سے بے شمار لوگوں کا تعلق ہے۔ اگر تم نے ٹرسٹ واپس جانے سے انکار کیا تو لڑائی ہوسکتی ہے اور بہت سے لوگوں کی جان جاسکتی ہے۔ تم جانتی ہو پہلے ہی دونوں طرف بڑی ٹینشن پائی جاتی ہے۔" صفدر نے نرم لہجے میں کہا۔

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا "آخر میرا جانا یا نہ جانا اتنا اہم کیوں ہوگیا ہے۔ کیا میں ایک عاقل بالغ لڑکی کی حیثیت سے اپنی مرضی کا فیصلہ نہیں کرسکتی۔ مجھ پر وہ شخص کیوں اپنے فیصلے ٹھونسنا چاہتا ہے، کیا میں اس کی زر خرید ہوں۔"

صفدر اور میں سمجھ رہے تھے کہ ویرا کا اشارہ اپنے چھوٹے چچا چین کی طرف ہے۔ وہ اس سے خاصی الرجک بلکہ متنفر نظر آتی تھی۔ ان دونوں میں جو تازہ تازہ تلخ کلامی ہوئی تھی اس کا اثر بھی ویرا پر تھا لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی آنکھوں میں ایک چیز صاف پڑھی جاتی تھی، اور وہ تھی صفدر کی منہ زور محبت۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی صفدر پر پڑی تھی، میں نے اس جذبے کی چمک صاف محسوس کی تھی۔

صفدر اور میں کافی دیر اسے سمجھانے میں لگے رہے لیکن اسے قائل کرنے میں ناکام رہے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی "میں کسی اجنبی جگہ پر نہیں ہوں اور نہ ہی کسی اجنبی کے ہاں مقیم ہوں۔ بوکارلو میرے سگے چچا ہیں اور بیٹی کی طرح مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ میرا جب تک جی چاہے گا، میں ان کے پاس رہوں گی۔ کوئی مجھے زبردستی ان کے پاس سے نہیں لے جاسکتا۔"

"لیکن وہ تو خود بھی چاہتے ہیں کہ تم فی الوقت یہاں سے چلی جاؤ۔" صفدر نے کہا۔

"تم انہیں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے ہو۔ میں جانتی ہوں وہ کس دل سے کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے تم سے کہا ہے کہ تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔"

صفدر کو ویرا کا لہجہ برا لگا۔ اس نے ایک دو تلخ باتیں کیں جس کے بعد ویرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ تیزی سے اٹھ کر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ میں اسے روکنے کی کوشش ہی کرتا رہ گیا۔ ہم وہاں سے ناکام واپس آگئے۔ جھونپڑے سے باہر نکلتے ہوئے ہم نے اپنے چہرے ایک بار پھر منڈاسوں میں چھپا لیے تھے۔ ہماری صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

اس روز دوپہر کو جھونپڑے میں بیٹھ کر صفدر نے ویرا کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس خط میں اس نے واضح الفاظ میں ویرا کو بتا دیا کہ وہ جو کچھ سوچ رہی ہے اس کا عملی شکل میں آنا ممکن نہیں۔ اس نے ویرا کو لکھا کہ وہ اس کے حوالے سے کوئی ایسی تمنا دل میں نہ پالے جس کے ناکام ہونے پر اسے صدمہ ہو۔ اس نے ویرا پر واضح کیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور جس لڑکی سے اس کی شادی ہونے والی ہے وہ پاکستان میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پند و نصائح سے بھرا ہوا یہ خط اس نے صوفیہ ہی کے ذریعے ویرا تک پہنچا دیا۔

میرا اور صفدر کا مشترکہ خیال تھا کہ اس دو ٹوک خط کو پانے کے بعد ویرا کے رویے میں تبدیلی آئے گی اور صفدر کے حوالے سے اس نے اپنے دل میں جو خوش فہمیاں پال لی ہیں' اس کا تدارک ہو جائے گا۔ اس طرح عین ممکن ہے کہ وہ اپنے وارثوں کے ساتھ ٹرسٹ واپس جانے کا فیصلہ کر لے مگر ہمارا یہ اندازہ اس وقت بالکل غلط ہو گیا جب اگلے روز صبح سویرے ہمیں پتا چلا کہ ٹرسٹ سے آنے والے تینوں افراد فقط ویرا کی سہیلی کو لے کر واپس جا رہے ہیں۔ یہ کشیدہ صورت حال کی طرف اشارہ تھا۔ میں نے جھونپڑے کی کھڑکی سے نائب سردار لادو تابے کو دیکھا۔ وہ بستی کے تین چار معززین کے ساتھ باتیں کرتا جھونپڑے کے سامنے سے گزرا' ان سب کے چہروں پر تناؤ کی کیفیت تھی۔

سارا دن گومگو کی کیفیت میں گزرا۔ ویرا کی صورت نظر آئی اور نہ صوفیہ سے ہی بات ہو سکی۔ سہ پہر کے وقت جب ہم جھونپڑے میں اکیلے تھے' صفدر کو اپنے جوتے میں سنسناہٹ کا احساس ہوا۔ یہ سنسناہٹ درحقیقت کال سگنل تھی۔ صفدر نے جوتا اتار کر کال وصول کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کال نامعلوم وجہ سے ڈراپ ہو گئی۔ اسی رات ڈیڑھ دو بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے صفدر کو ایک بار پھر بستر سے غائب پایا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ گلیوں میں آوارہ کتوں کی آوازوں کے سوا مکمل سکوت تھا۔ ہمارے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔ صفدر اور میں مقامی طور پر تیار کیے گئے بیڑی کی شکل کے سگریٹ ہی پی رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ صفدر کے بستر کے پاس سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں کا ڈھیر تھا۔ یہ ٹکڑے اس کے ذہنی انتشار کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اب وہ نجانے کہاں غائب تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں صفدر جیسے مضبوط شخص کو منتشر دیکھ رہا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ رات کے سناٹے میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یہ آہٹ جھونپڑے کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ صفدر تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ صفدر اندر داخل ہوا۔ چراغ کی روشنی میں اس کا طویل سایہ جھونپڑے کے اندر لرزا۔ میں نے آنکھوں میں تھوڑی سی جھری بنا کر دیکھا۔ صفدر کا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے جوتے اتارے' قمیص اتار کر ایک طرف پھینکی اور بستر پر لیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اس نے مجھے کچھ بتایا تھا اور نہ میں نے پوچھا تھا' اس کے باوجود مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ رات کی تاریکی میں ویرا سے مل کر آیا ہے' نہ صرف مل کر آیا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی وغیرہ بھی ہوئی ہے۔ میں نے اس خراب موڈ میں اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے لیٹا رہا۔ صفدر نے اوپر تلے کئی سگریٹ پھونکے پھر اٹھ کر جھونپڑے کے اندر ہی ٹہلنے لگا۔ چند منٹ ٹہلنے کے بعد وہ لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا' اس کے بعد اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ رات پچھلے پہر مجھے نیند آگئی لیکن میرے اندازے کے مطابق صفدر صبح تک جاگتا ہی رہا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ دسمبر 2001ء کو شائع ہوگا

شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل
13

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۲۰۰۲ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— مغل کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ——— ۴۰ روپے

ISBN 969-517-064-1

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور

تاوان

زندگی کے پُرپیچ اور انوکھے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک ہنگامہ خیز سرگزشت

علی الصباح میری آنکھ ایک تیز چیختی ہوئی سی آواز سے کھلی۔ یہ صوفیہ کی آواز تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ صفدر کو کوئی اطلاع دے رہی تھی۔ میں نے اس اطلاع پر کان دھرے تو میں بھی ٹھٹک گیا۔ یہ اطلاع ویرا کے بارے میں تھی۔ صوفیہ گلوگیر آواز میں بتا رہی تھی کہ ویرا نے زہریلی دوا کھالی ہے اور وہ بے ہوش ہے۔ میں اور صفدر صوفیہ کے ساتھ بھاگم بھاگ اس کی قیام گاہ پر پہنچے۔ وہاں لارو تابے، جوری اور معالج موسو سمیت کئی افراد جمع تھے۔ بوڑھا معالج موسو، ویرا پر جھکا ہوا تھا اور اس کی پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھ رہا تھا۔ موسو کا دوسرا ہاتھ ویرا کی نبض پر تھا۔ وہ مکمل بے ہوش تھی اور اس کا حسین چہرہ سرسوں کا پھول نظر آرہا تھا۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے بوڑھے معالج نے ویرا کو کوئی دوا پلائی تھی۔ دوا کا سبز رنگ ویرا کے ہونٹوں پر دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دوران میں ویرا کا چچا بوکارلو بھی گھبرایا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ویرا پر جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا پھر قبائلی معالج موسو سے مقامی زبان میں بات کرنے لگا۔ موسو کے تاثرات سے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ بوکارلو کو تسلی دے رہا ہے اور اسے بتا رہا ہے کہ مریضہ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ موسو کے تاثرات دیکھنے کے بعد مجھے اور صفدر کو بھی اطمینان کا احساس ہوا۔ بعد ازاں موسو نے بوکارلو کو شیشے کی ایک چھوٹی بوتل دکھائی۔ اس بوتل میں مچھروں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو تلف کرنے والا محلول تھا۔ ایسی ہی ایک بوتل ہمارے جھونپڑے میں بھی موجود تھی۔ یہ تیل جیسا محلول یہاں مقامی طور پر تیار کیا جاتا تھا اور کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ ویرا نے رات پچھلے پہر اس محلول کی تین چوتھائی بوتل اپنے معدے میں انڈیل لی تھی۔

تھوڑی دیر بعد معالج موسو نے دو عورتوں کے سوا باقی افراد کو جھونپڑے سے باہر چلے جانے کو کہا۔ میں اور صفدر بھی اپنے جھونپڑے کی طرف چل دیے۔ گرما کا شعلے برساتا سورج دھیرے دھیرے آسمان پر بلند ہو رہا تھا۔ میں اور صفدر جھیل کے کنارے درختوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا "بوکارلو کی بات درست نکلی ہے۔ اس کی بھتیجی بے حد جذباتی ثابت ہو رہی ہے۔"

"خطرناک حد تک جذباتی ہے۔" صفدر نے سر جھکائے کہا۔

"تمہارے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے اس کی؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

صفدر نے ایک گہری سانس لی اور بولا "جی ہاں۔ آج رات بات ہوئی تھی۔ وہ خود ہمارے جھونپڑے کی طرف آئی تھی۔ آپ اس وقت سوئے ہوئے تھے۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جو خط میں نے اسے بھیجا تھا وہ اسی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔"

"ہم نے تو سنا تھا کہ سائنس داں بڑے حقیقت پسند اور سرد مزاج کے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ تو بالکل برعکس ثابت ہوئی ہے۔"

"اس کے اندر گھٹن اور محرومی بہت ہے شاہ جہاں صاحب۔ سب سے الگ تھلگ رہ کر اس نے کئی برس بہ لیبارٹری میں ہی گھس کر گزارے ہیں۔ شاید اسی ایب نار

زندگی کا ردعمل ہے جو وہ اچانک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہے۔"

"رات تو تمہارے ساتھ کیا بات ہوئی؟"

وہ ذرا توقف سے بولا "میں نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے نزدیک ایک اچھی انسان اور اچھی دوست ہے لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر میرے کسی عمل یا بات کی وجہ سے اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کے علاوہ اگر آئندہ ہم نہ ملیں تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

"اس کا ردعمل کیا تھا؟"

"بس روتی رہی تھی.... اور.... بغیر کچھ کہے چلی گئی تھی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھالے گی۔"

"اس قسم کے جذباتی لوگوں سے ہر قسم کی توقع رکھنی چاہیے۔ یہ تو شکر ہے کہ بروقت طبی امداد مل گئی ہے ورنہ جو دوا اس نے پی ہے صوفیہ کے بقول اس کی تھوڑی سی مقدار بھی بندے کو لمبا لٹا دیتی ہے۔"

ہم وہاں بیٹھے اسی سنگین موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں تو اٹھ کر جھونپڑے میں آگیا تاہم صفدر نہانے کے لیے چلا گیا۔ میں جھونپڑے میں پہنچا تو تھوڑی ہی دیر بعد صوفیہ بھی وہاں آگئی۔ اس نے بتایا کہ ویرا ابھی تک ہوش میں نہیں آئی اور موسو کے علاوہ بستی کے دو اور معالج بھی مسلسل اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ وہ بولی "ویسے تم مشرقی لوگ ہوتے بڑے عجیب ہو۔ وہ کرتے ہو جو تمہاری سوچ نہیں ہوتی اور جو تمہاری سوچ ہوتی ہے وہ کرتے نہیں ہو۔ تمہارے مزاج میں الجھاؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اب بندہ پوچھے کہ جس راہ پر چلنا ہی نہ ہو اس پر قدم رکھنے سے فائدہ؟ تمہارا دوست پہلے مس ویرا کے ساتھ ہنستا بولتا رہا ہے گھومتا پھرتا رہا ہے اب ایک دم پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ شاید آپ کو برا لگے لیکن میں یہ کہنے سے نہیں رہ سکتی کہ مس ویرا کی موجودہ حالت کا ذمے دار وہ ہے۔"

"اگر اپنی جان خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچانا کسی کے جذبات کا احترام کرنا اور کسی کی باتوں کا جواب خندہ پیشانی سے دینا گناہوں میں شمار ہوتا ہے تو پھر صفدر نے بھی یہ گناہ کیے ہیں بلکہ ایک سے زائد مرتبہ کیے ہیں۔"

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی مسٹر شاہ جہاں مگر حقیقت یہی ہے کہ مس ویرا بڑی شدت سے آپ کے دوست میں INVOLVE ہو چکی ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں وہ بے ہوشی کے عالم میں بھی آپ کے دوست کا نام بڑبڑاتی رہی ہیں اور اس کو بلاتی رہی ہیں۔ موسو مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیا کہہ رہی ہے لیکن میں نے بات گول کر دی۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے دوست کو سمجھائیں۔ کسی کا دل توڑنا سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے اور وہ یہ کر رہا ہے۔ اگر وہ مس ویرا سے دامن چھڑانا ہی چاہتا ہے تو یہ کام اس طرح آہستگی سے ہونا چاہیے کہ مس ویرا کو کم سے کم صدمہ ہو....."

شاید وہ کچھ اور بھی کہتی مگر اسی دوران میں دو سیاہ فام خادمائیں میرے اور صفدر کے لیے کھانا لے کر پہنچ گئیں۔ صوفیہ نے پھر آنے کا کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی اپنی زندگی سے بھی ایک رومانی کہانی منسلک تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ویرا کے حوالے سے بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔

اگلے چار پانچ روز بڑی بے یقینی کی کیفیت میں گزرے۔ ٹرسٹ سے آنے والے تینوں افراد صرف ایک لڑکی کو لے کر واپس چلے گئے تھے۔ یقیناً وہ یہاں سے خوش نہیں گئے تھے اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ ان کا ردعمل سخت ہوگا لیکن ابھی تک یہ ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ ویرا دو تین روز شدید بخار میں رہنے کے بعد اب کچھ ٹھیک تھی۔ معالج موسو ذاتی توجہ کے ساتھ اس کا علاج کر رہا تھا۔ صفدر کے کندھے کا زخم بھی اب اچھا تھا اور وہ بہ آسانی بازو کو حرکت دے سکتا تھا۔ ان پانچ دنوں میں دو مرتبہ مائیکل نے بھی ٹرانس میٹر کے ذریعے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ حسب وعدہ اس نے غزالہ، زریں اور کلثوم سے بھی ہماری بات کرائی تھی۔ غزالہ میرے حوالے سے سخت پریشان تھی۔ تاہم مجھ سے بات کر کے اور خیر خیریت دریافت کر کے اسے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ زریں گل کو شکوہ تھا کہ ہم ایک بار پھر اسے بتائے بغیر "مہم" پر نکل گئے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہم نکلے نہیں ہیں بلکہ نکالے گئے ہیں۔ وہ اب تک کے تمام حالات تفصیل سے سننا چاہتا تھا مگر ٹرانس میٹر پر یہ ممکن نہیں تھا۔

بوکارلو کا ہاتھ بدستور پٹیوں میں جکڑا نظر آتا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق موسو نے اس کے زخم کا علاج شروع کر دیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود یہ معلوم نہ کر سکا کہ بوکارلو کے زخم پر اس علاج معالجے کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ بہرحال بوکارلو کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ بہتر ہے۔ بستی کے عام لوگوں میں بوکارلو کے زخم کے حوالے سے کافی غم و غصہ

پایا جاتا تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو ٹرسٹ والوں کی زیادتیوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے اور اب انہیں منہ توڑ جواب دینے کے آرزو مند تھے۔ اسی طبقے میں سے کچھ زیادہ جذباتی لوگوں نے چند روز پہلے ٹرسٹ پر باقاعدہ بلہ بولنے کی کوشش کی تھی مگر بوکارلو تحمل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں راستے سے لوٹا لایا تھا۔ یہ پانچویں یا چھٹے روز کی بات ہے، رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک بار پھر صفدر کو بستر پر غیر موجود پایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جھونپڑے کے دروازے سے باہر جھانکا، بستی میں ویرانی کا راج تھا۔ دور تک کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی کھڑکی کھولی۔ یہ عقبی جانب کھلتی تھی۔ مجھے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں دو سائے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک سایہ واضح طور پر عورت کا تھا۔ دوسرا سایہ قد کاٹھ اور لباس سے صفدر کا نظر آتا تھا۔ میرے دل سے آواز آئی کہ ہو نہ ہو، یہ صفدر اور ویرا ہیں۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستگی کے ساتھ جھونپڑے سے نکلا اور ایک طویل چکر کاٹ کر ان درختوں کے قریب پہنچ گیا جہاں وہ دونوں سائے موجود تھے۔ جب اس مقام پر پہنچا تو سائے وہاں موجود نہیں تھے۔ اب وہ قریباً سو گز دور جھیل کے قریب نظر آ رہے تھے۔ ان کا رخ گھنے درختوں کی طرف تھا۔ میں نے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے ان کا تعاقب کیا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکی کی چال سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ویرا نہیں بلکہ صوفیہ ہے۔ اس کے ساتھ یقیناً صفدر ہی تھا۔ صفدر جیسے چوکس شخص کا تعاقب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں اس کی تیز حسیات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے مجھے دانتوں پسینہ آ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں نے صفدر اور صوفیہ کو انہی گھنے درختوں میں پایا جہاں چند روز پہلے صفدر اور ویرا میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ملاقات اتفاقاً ہی میری نگاہوں میں آگئی تھی لیکن آج صفدر کے ساتھ صوفیہ نظر آ رہی تھی۔ بہرحال تھوڑی ہی دیر بعد میرا یہ کنفیوژن دور ہو گیا۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ کر صوفیہ رک گئی اور صفدر درختوں کے اندر داخل ہو گیا۔ اب یہ بات سمجھنا مشکل نہیں تھی کہ صوفیہ صرف اس لیے صفدر کے ساتھ نظر آ رہی تھی کہ وہ اسے یہاں لے کر آئی تھی۔ اس بات کا سو فی صد امکان تھا کہ جھنڈ کے اندر ویرا موجود ہو اور صفدر کا انتظار کر رہی ہو۔ صفدر درختوں کے اندر داخل ہو گیا تو صوفیہ واپس چلی گئی۔ میں اپنی جگہ دبکا کھڑا رہا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنا بڑھ جائے گا۔ خوب رو ویرا کسی آسیب ہی کی طرح صفدر سے چمٹ گئی تھی۔

صفدر دس پندرہ منٹ جھنڈ کے اندر رہا، پھر چاند کی مدھم روشنی میں، میں نے اسے جھنڈ سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک نسوانی سایہ بھی تھا۔ سایہ بستی کے جنوبی حصے کی طرف چل دیا جبکہ صفدر نے اپنا رخ جنوب مشرق کی طرف رکھا مگر وہ ابھی دس پندرہ قدم ہی چلا تھا کہ سایہ واپس پلٹا اور صفدر سے لپٹ گیا۔ یہ نسوانی سایہ یا ہیولا یقیناً ویرا ہی کا تھا۔ چاند بدلیوں سے نکل آیا تھا اور اس کی روشنی کچھ تیز ہو گئی تھی۔ میں صفدر کا چمکیلا افریقی لباس اور ویرا کے ہوا میں لہراتے ہوئے بال دیکھ سکتا تھا۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں صفدر کی بانہوں میں سمائی ہوئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ پھر جدا ہوئے اور اپنے اپنے رخ پر چل دیے۔ صفدر کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں بھی واپس جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

اگلے روز میں نے صفدر کو گم صم دیکھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پا رہا۔ اس کے چہرے کی الجھن صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ اس نے ناشتا بے پروائی سے کیا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں لیٹ گیا۔ دوپہر کے بعد جب گرمی ذرا کم ہو گئی تو میں اسے زبردستی گھمانے پھرانے کے لیے لے گیا۔ راستے میں صوفیہ بھی مل گئی۔ ہم جھیل کے کنارے اس مقام پر پہنچے جہاں عظیم الشان عبادت گاہ بوما واقع تھی اور وہ قربان گاہ تھی جہاں چند روز پہلے دو صحت مند جوان لڑکیوں کو بھینٹ چڑھایا گیا تھا۔ بوما کے قریب ہی بوکارلو کا وسیع و عریض جھونپڑا بھی تھا۔ ابھی ہم اس جھونپڑے کے قریب ہی پہنچے تھے کہ گھوڑے کی تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ یہ نائب سردار لارو تابے تھا۔ وہ بوما کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور بوما کی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ تاہم اسی اثنا میں اس کی نگاہ ہم دونوں پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔ اس نے بڑے تیز لہجے میں صوفیہ سے کچھ کہا اور دو تین بار بوکارلو کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ صوفیہ کے چہرے پر بھی پریشانی نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے بوکارلو کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا "ٹرسٹ سے کچھ لوگ یہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم دونوں جلدی سے محترم بوکارلو کے جھونپڑے میں گھس جاؤ۔ اگر ٹرسٹ والوں کی نظر تم پر پڑ گئی تو نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

ابھی بمشکل صوفیہ کی بات ہی ختم ہوئی تھی کہ گاڑیوں کی

آواز سنائی دی اور درختوں کے عقب سے گردو غبار بلند ہوا۔ صوفیہ نے ہم دونوں کو تقریباً دھکیلتے ہوئے بوکارلو کے جھونپڑے میں گھسا دیا۔ درحقیقت یہ جھونپڑا ہی اس وقت ہمارے قریب ترین تھا۔ جھونپڑا خالی تھا۔ بوکارلو شاید کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس جھونپڑے میں 'میں اور صفدر پہلے بھی قدم رنجہ فرما چکے تھے۔ یہاں عملیات کا سامان تھا۔ انسانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس کے علاوہ جانوروں کے پنجرے تھے اور وہ پنجرہ بھی تھا جس میں شہد کی مکھیاں ان دیکھی حدود میں مقید تھیں۔ بڑا پُراسرار ماحول تھا۔ تاہم اس وقت ہماری ساری توجہ اس پُراسرار ماحول کے بجائے باہر کے ماحول پر تھی۔ ہمارے اندر گھستے ہی کم و بیش چار بھاری بھرکم جیپیں اور دو اسٹیشن ویگن شور مچاتی ہوئی بوما کے سامنے پہنچ گئیں۔ ان تمام گاڑیوں میں نرسٹ کے مسلح افراد موجود تھے اور ایک فرد ایسا بھی تھا جس کے تعارف کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ وہی شخص تھا جسے ہم "تھری پیس سوٹ میں آدم خور" کہتے تھے۔ میری مراد بدبخت مائیکل سے ہے۔ وہ ایک مجسم آفت تھا اور یہ آفت سب سے اگلی جیپ میں بنفسِ نفیس موجود تھی۔ مائیکل کو دیکھ کر مجھے ابکائی سی آنے لگی۔ اس درندے کی "بچہ خوری" پوری تفصیل کے ساتھ ذہن میں آگئی تھی۔

گاڑیوں کے نرسٹ میں پہنچتے ہی ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے لگا کر گھروں کی طرف دوڑ گئی تھیں۔ مردوں کے چہروں پر بھی کشیدگی تھی۔ ایک سنسنی سی تھی جو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بوما کے اندر سے بوکارلو برآمد ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مسلح حبشی محافظ موجود تھے اور ان کے چہرے پتھر کی طرح سخت نظر آرہے تھے۔ بوکارلو کے ہمراہ نائب سردار تابے تھا اور اس کے عقب میں فوجی دستے کی گرانڈیل سالار جوری بڑی مردانہ شان سے چلی آرہی تھی۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور لگا رکھا تھا اور ایک ہاتھ میں برچھی بھی تھی' یعنی جدید اور قدیم کا ملک امتزاج۔ بوکارلو کو دیکھ کر مائیکل بڑی شان سے گاڑی میں سے نکل آیا۔ اس کے نکلتے ہی نرسٹ کے کئی مسلح افراد جن میں چین بھی شامل تھا' باہر نکل آئے۔ مائیکل کی نکھری ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ بوکارلو سے کہہ رہا تھا "کارلو صاحب! میں کنگ کے حکم پر مس ویرا کو لینے آیا ہوں۔"

بوکارلو نے کہا "اگر صرف ویرا کو لینے آئے ہو تو اتنے بندے ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم ویرا کو زبردستی لینے آئے ہو۔"

"فی الوقت تو ہمارا یا محترم کنگ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" مائیکل نے کہا۔

اس کی بظاہر دھیمی بات میں ایک طرح کی دھمکی بھی پوشیدہ تھی۔

بوکارلو چند سیکنڈ تک مائیکل کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہ میں کچھ ایسی تپش تھی کہ مائیکل جیسا شخص بھی اس سے تادیر آنکھیں نہیں ملا سکا۔ بوکارلو نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "تم اندر بوما میں آجاؤ۔ ویرا کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔ اگر وہ بخوشی تمہارے ساتھ جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"بات مس ویرا کی خوشی کی نہیں۔ بات اب کنگ کے حکم کی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کنگ کے حکم میں مس ویرا کی بہتری ہی پوشیدہ ہوگی۔ کنگ ہم سب کے بگ باس ہی نہیں' مس ویرا کے بزرگ اور سرپرست بھی ہیں۔ وہ اس کا برا ہرگز نہیں سوچیں گے۔"

"میں بھی اس کا بزرگ اور سرپرست کہلا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مت بھولو کہ ویرا ایک عاقل بالغ لڑکی ہے۔"

"وہ عاقل بالغ ہو سکتی ہے لیکن تجربہ کار یا جہاں دیدہ نہیں۔ انہیں ورغلایا جا سکتا ہے۔ اب اس سے زیادہ حیران کن بات اور کیا ہوگی کہ جن لوگوں نے انہیں زبردستی اغوا کیا ہے۔ ان کے سامنے ان کی عزیز سہیلی کو برباد کیا ہے' وہ انہی لوگوں میں رہنا چاہ رہی ہیں۔"

"وہ ایک شخص کا ذاتی فعل تھا اور اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ ایک شخص کی وجہ سے پورے قبیلے کو مجرم نہیں گردانا جا سکتا اور پورا قبیلہ مجرم ہے بھی نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ویرا اس قبیلے میں ہے اور خوش ہے۔"

"میں ویرا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" ویرا کے چچا چین نے بگڑے تگڑے لہجے میں کہا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں غضب کی چنگاریاں تھیں۔

"میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ آپ اس سے بات کریں بلکہ اسے قائل کریں کہ وہ آپ کے ساتھ چلی جائے لیکن ایک بات آپ سب لوگ یاد رکھیں۔ اگر وہ خود یہاں سے جانا نہیں چاہے گی تو دنیا کی کوئی طاقت اسے لے جا نہیں سکتی۔"

"اسے جانا ہوگا۔" چین ترخ کر بولا "ہم اس کی ضد کے

سامنے جھکنے والے نہیں ہیں۔"

"پہلے بھی یہ کام تمہاری وجہ سے بگڑا ہے۔" بوکارلو نے ترکی بہ ترکی کہا "تم تھانے دار نہ بنتے تو شاید اس کا رویہ بھی اتنا سخت نہ ہوتا۔ اب تم پھر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے ہو اور اس معاملے کو مزید بگاڑنا چاہتے ہو۔"

اس سے پہلے کہ بوکارلو کے جواب میں چین مزید سخت لہجہ اختیار کرتا' عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر سردار بوعات کی صورت نظر آئی۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم لہجے میں کچھ کہا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سردار بوعات نے بات کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے بوما کی طرف بھی اشارہ کیا۔ وہ مقامی زبان میں حاضرین سے کہہ رہا تھا کہ وہ بیچ بازار کے بحث مباحثہ کرنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ اندر بیٹھ کر بات کریں۔ حاضرین پر اس کے لب و لہجے کا اثر ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دیکھ رہے تھے کہ تمام لوگ سیڑھیاں چڑھ کر بوما میں داخل ہو رہے تھے۔ جب جیپوں کے پاس بس اِکا دُکا افراد ہی رہ گئے تو میں اور صفدر احتیاط کے ساتھ بوکارلو کے طلسمی جھونپڑے سے نکلے اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

عبادت گاہ بوما کے اندر جو گفتگو شروع ہوئی تھی' وہ طویل ہوتی چلی گئی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے اردگرد کچھ اور تبدیلیاں بھی دیکھیں۔ قبیلے کے بہت سے مرد مسلح نظر آرہے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا جب کہ اکثر برچھیوں اور بھالوں وغیرہ سے مسلح تھے۔ یہ لوگ یہاں وہاں گروہوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ کچھ اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ میں نے پہلی بار قبیلے میں مسلح عورتیں بھی دیکھیں۔ یہ سب کی سب درمیانی عمر کی جسیم عورتیں تھیں۔ انہوں نے کھال کے لبادے پہن رکھے تھے اور یہ مردوں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتی تھیں۔ ان کے لبادے ایک ہی طرح کے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ تربیت یافتہ اور منظم ہیں۔ مردوں کی طرح ان عورتوں کے چہروں پر بھی تناؤ اور کشیدگی موجود تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا تو سائے طویل ہو گئے اور ایک طویل گرم سہ پہر اپنے اختتام کو پہنچتی محسوس ہوئی۔ شام ہونے سے تھوڑی دیر پہلے صوفیہ ہمارے جھونپڑے میں آئی۔ اس نے کہا "حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ بوما کے اندر سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ لگتا ہے کہ خاصی گرما گرمی ہے۔"

"کیا ویرا رضامند نہیں ہوئی؟"

صوفیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اس نے سب کے سامنے دو ٹوک کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے منہ بولے چچا بوکارلو کے پاس رہے گی اور نرسٹ نہیں جائے گی۔"

"مائیکل اور چین کا کیا ردعمل ہے؟"

"وہی جو ہونا چاہیے۔ وہ بہت پیچ و تاب کھا رہے ہیں اور دھمکیاں دے رہے ہیں۔ وہ مس ویرا کو لے جانا چاہتے ہیں لیکن محترم بوکارلو نے صاف کہا ہے کہ ویرا ان کی پناہ میں ہے اور وہ اسے کسی صورت ان کے حوالے نہیں کریں گے۔"

ابھی ہم صوفیہ سے بات ہی کر رہے تھے کہ ایک ساتھ بہت سی گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ صوفیہ جھونپڑے سے باہر نکلی اور اس نے کچھ آگے جا کر بوما کی جانب دیکھا۔ دو چار منٹ بعد وہ تیز قدموں سے چلتی واپس آگئی۔ اس نے بتایا کہ نرسٹ سے آنے والے لوگ واپس جا رہے ہیں۔ وہ سخت غصے میں دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد جھیل کے پار جاتی ہوئی گاڑیاں ہمیں جھونپڑے کی کھڑکی سے بھی نظر آگئیں۔ وہ ناہموار راستے پر اچھلتی کودتی دھول اُڑاتی بستی سے نکل رہی تھیں۔

یہ سب کچھ ایک طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا تھا کہ اس طوفان کی اصل اور بنیادی وجہ صفدر اور ویرا کا تعلق ہے۔ واپسی سے ویرا کے انکار کی بڑی وجہ صفدر ہی تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے بھی سخت تناؤ کی کیفیت میں گزرے۔ قبیلے کے افراد گلیوں میں ٹولیوں کی صورت میں موجود رہے اور صورتِ حال پر تبصرے کرتے رہے۔ بوما کے اندر نائب سردار لارو تابے کی رہنمائی میں صلاح و مشورے ہوتے رہے۔ شام کے وقت ہم نے ایک چھکڑا بھی دیکھا جس میں بہت سی برچھیاں لاد کر بوما کے اندر لے جائی گئی تھیں۔ بوما یوں تو ایک عبادت گاہ تھی تاہم یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے بوقتِ ضرورت عسکری مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ رات تقریباً نو بجے کا وقت ہوگا جب ایک نامانوس شور سنائی دیا۔ بستی میں ہلچل کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں اور صفدر جھونپڑے سے نکل آئے۔ جنوب کی سمت دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ آسمان پر سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور اس روشنی میں دھول کے بادل تھے۔ یوں لگتا تھا کہ بہت سے لوگ لاریوں کی اس بستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین دہلنے لگی۔ صورتِ حال اس امر کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ نرسٹ کے جو لوگ آج شام غصے میں بھرے ہوئے واپس گئے تھے وہ اپنے مزید

ساتھیوں کے ہمراہ واپس آ گئے ہیں۔

اسی دوران میں صوفیہ بھی نظر آئی۔ اس کی چلی سی نائی سرٹ گرمی کے سبب پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور اس کے پُر شباب جسم کو چھپانے میں ناکام نظر آ رہی تھی "یہ کیا ہو رہا ہے؟" صفدر نے اس سے پوچھا۔

"میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا۔" وہ بولی "اگر یہ ٹرسٹ والے ہیں تو پھر گاڑیوں کی آواز کیوں نہیں آ رہی۔"

چار پانچ منٹ کے اندر اندر ہمارا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ آنے والوں کا تعلق ماریا ٹرسٹ سے ہے۔ یہ گھڑ سوار مقامی افراد تھے۔ ان کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ ان کے ننگ دھڑنگ سیاہ جسم پسینے سے چمک رہے تھے ان کے ہاتھوں میں برچھیاں، کلہاڑے اور بھالے تھے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے بستی میں داخل ہوئے اور گلیوں بازاروں میں پھیل گئے۔

"ان لوگوں کا رویہ تو دوستانہ لگتا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بھی لارسی ہیں۔" صوفیہ نے خیال ظاہر کیا۔

"کیا مطلب، یہاں لارسیوں کی کوئی اور بستی بھی ہے۔"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں مگر سنا ہے کہ انہی جنگلوں میں لارسیوں کی ایک دو اور بستیاں بھی ہیں۔"

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آنے والوں نے بوما کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ ان کی سرخ روشنی میں اردگرد کی ہر شے سرخ نظر آنے لگی تھی اور جھیل کے ساکت پانی میں سیکڑوں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ پھر بوما کا بڑا دروازہ کھلا اور لمبے چوغے میں ملبوس سردار بوعات سیڑھیوں پر نظر آیا۔ اس کو دیکھتے ہی ہجوم میں ہلچل پیدا ہوئی۔ تمام لوگ چند سیکنڈ کے اندر اندر اپنے گھوڑوں سے اتر آئے۔ گھڑ سواروں میں سے چند سرکردہ افراد آگے بڑھے۔ ان کے سروں پر مختلف پرندوں کے پر سجے ہوئے تھے اور گلے میں چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کی مالائیں تھیں۔ یہ کل سات آٹھ افراد تھے۔ سردار بوعات کے عین سامنے پہنچ کر یہ لوگ اچانک سجدہ ریز ہو گئے۔ جونہی وہ سجدے میں گرے، ان کے ساتھ آنے والے سیکڑوں افراد نے بھی اپنی پیشانیاں زمین سے ٹیک دیں۔ وہ قریباً ایک منٹ تک سجدے میں گرے رہے، پھر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب انہوں نے ایک ساتھ اپنے ہتھیار فضا میں بلند کیے اور زور و شور سے نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کے نعروں میں عسکری جوش و خروش تھا اور سردار بوعات کے لیے بے پناہ عقیدت کی جھلک تھی۔

سردار بوعات معززین کو اپنے ساتھ بوما کے اندر لے گیا۔ باقی افراد مقامی لوگوں سے گھل مل گئے اور دوستانہ انداز میں بات چیت کرنے لگے۔ ان لوگوں کو وہیں کھڑے کھڑے ٹھنڈے مشروب پیش کیے گئے اور کھانے کے لیے پھل دیے گئے۔ ہم بھی اس ہجوم میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ صوفیہ نے ہمیں بتایا "یہ لوگ لارسی ہی ہیں۔ سردار بوعات اور محترم بوکارلو سے یہ لوگ بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ ٹرسٹ میں محترم بوکارلو کے ساتھ ان کے بھائی کنگ کی طرف سے توہین آمیز سلوک ہوا ہے وہ بے حد پریشان ہیں۔ آج وہ ایک طرح سے اظہار یکجہتی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے علی الاعلان کہا ہے کہ سردار بوعات اور بوکارلو کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"کیا ویرا کے معاملے کا بھی انہیں علم ہے؟"

"ہاں اس معاملے کی بھی انہیں بھنک ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کنگ براؤن۔۔۔ محترم بوکارلو کی ایک بھتیجی کو زبردستی ٹرسٹ میں لے جانا چاہ رہا ہے۔"

بوما کے اندر جانے والے معززین قریباً ایک گھنٹے بعد باہر نکلے۔ سردار بوعات اور بوکارلو وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ مہمان لارسیوں نے ایک بار پھر پُرجوش نعرے لگائے۔ سردار بوعات کی ہدایت پر نائب سردار لاورتا سے نے جھیل کے کنارے ہی ایک زبردست محفل کا انتظام کر دیا۔ گرمی کے موسم میں جھیل کے کنارے بیٹھنا اور آرام کرنا ایک خوشگوار عمل تھا۔ گھڑ سوار جو یقیناً ایک طویل سفر طے کر کے آئے تھے، جھیل کے کنارے گھاس کے تختوں پر بیٹھ گئے اور نیم دراز ہو گئے۔ سیکڑوں مشعلیں جھیل کے کنارے اور گھاس کے قطعوں پر گاڑ دی گئی تھیں۔ بستی کے وسطی حصے میں بڑے بڑے دیوہیکل دیگچوں کے اندر کھانا تیار ہونے لگا۔ مہمانوں کے دل بہلاوے کے لیے خوب صورت جسموں والی سیاہ فام لڑکیاں جھیل کے کنارے ایک چبوترے پر رقص فرما ہو گئیں۔ ان لڑکیوں کے بیچ میں ہی کچھ بازیگر کرتب دکھانے میں بھی مصروف تھے۔ رات گیارہ بجے کے قریب ان لوگوں کو کھانا کھلایا گیا۔ بھات کے بڑے بڑے تھالوں میں جھیل کی تلی ہوئی مچھلی اور گائے کا بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ چاول اور شراب وغیرہ بھی تھی۔ ساری رات

قریباً جاگتے ہوئے ہی گزر گئی۔ ہم بھی ان پُرجوش لشکریوں کے درمیان گھومتے رہے اور ان کی باتیں سنتے رہے۔ یہ باتیں چونکہ مقامی زبان میں تھیں لہٰذا ایک لفظ بھی ہمارے پلے نہیں پڑتا تھا۔ ہاں ہماری مترجم صوفیہ کسی کسی بات کا انگلش میں ترجمہ کر کے ہمیں بتا دیتی تھی۔ ایک گروہ کے درمیان ایک تنومند شخص بیٹھا بڑے جوش سے بول رہا تھا۔ صوفیہ نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ شخص دستہ سالار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ٹرسٹ والوں کی زیادتیاں ہر آنے والے دن میں بڑھتی جا رہی ہیں۔ کنگ براؤن کی بے لگامی اور من مانی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اس کی اپنی صفوں میں ہی لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بے حد سختی سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ چند روز پہلے ٹرسٹ میں چار درجن افراد کے سر قلم کر دیے گئے ہیں۔ ان سب لوگوں کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں جبکہ کنگ کے نزدیک وہ غلام ہیں اور تجارت کے مال کا حصہ ہیں۔"

گھڑ سواروں کا ایک دستہ بوما کی طرف سے آ رہا تھا۔ اس دستے کا تعلق بھی مہمان لارسیوں سے تھا۔ گھڑ سواروں کے ہاتھوں میں نیزے چمک رہے تھے، چند افراد رائفلوں سے بھی مسلح تھے۔ سب سے آگے دستہ سالار تھا۔ دستہ سالار کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ چند لمحے کے لیے تو اپنی آنکھوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا پھر میں، صفدر اور صوفیہ کو وہیں چھوڑ کر گھڑ سواروں کے پیچھے لپکا۔ یہاں رش زیادہ تھا، گھڑ سوار بھی آہستہ ہو گئے تھے۔ جلد ہی میں ان تک پہنچ گیا۔ میں نے ایک بار پھر دھیان سے دستہ سالار کو دیکھا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔۔۔ وہ پروفیسر تھا۔ پروفیسر اللہ دتا۔ وہی شخص جو کچھ عرصہ پہلے تک ایک کلینک چلاتا تھا۔ اس کا مخصوص طریقۂ علاج تھا اور اس کے ہاتھ میں پہنچ کر مٹی بھی ایک تیر بہ ہدف دوا بن جاتی تھی۔ آج اس مسیحا صفت پروفیسر کی کایا ہی پلٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر کھال کا لباس تھا۔ چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور اس کے ہاتھ میں رائفل نظر آ رہی تھی۔ دس عدد قبائلی سوار اس کی رکاب میں تھے۔

میں پروفیسر کے عین سامنے پہنچ گیا تاکہ وہ مجھے اور میں اسے اچھی طرح دیکھ سکوں۔ پروفیسر کی نگاہ مجھ پر پڑی اور کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی پھر اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ چھلانگ لگا کر گھوڑے سے اترا اور

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواز کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا "مجھے اپنی آنکھوں پہ۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا۔" وہ بولا۔

"یہ ہی حال میرا بھی ہے۔" میں نے کہا۔

اب صفدر اور صوفیہ بھی ہمارے پاس پہنچ گئے تھے۔ پروفیسر صفدر سے بھی بغل گیر ہوا اور اس کی پیشانی چومی۔ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ شاید شائستہ کی یاد آگئی تھی۔

میں نے شانہ تھپک کر پروفیسر کو تسلی دی۔ ہم پروفیسر کو اپنے جھونپڑے میں لے آئے۔ چراغوں کی روشنی میں غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ پہلے سے کچھ دبلا نظر آرہا تھا' اس کے رخسار پر زخم کا نشان بھی تھا۔ پروفیسر کو اچانک یہاں دیکھ کر ہمیں جو حیرت ہوئی تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔

پروفیسر جانتا تھا اور ہمیں بھی معلوم تھا کہ وقت بہت کم ہے۔ اب صبح ہونے والی تھی اور مہمان لارسیوں کو کسی بھی وقت یہاں سے واپس روانہ ہوجانا تھا۔ میں اور صفدر چاہتے تھے کہ اس مختصر وقت میں ہی پروفیسر کی روداد سن لی جائے۔ پروفیسر نے ہمارے سوالوں کے مختصر لیکن جامع جواب دیے۔ اس کی شخصیت کے ساتھ ہی اس کا لب ولہجہ اور بول چال بھی تبدیل ہوچکی تھی۔ وہ ایک مہربان معالج کے بجائے سراپا ایک "اینگری اولڈ مین" نظر آتا تھا۔ ایک ایسا ادھیڑ عمر شخص جس کی لاڈلی بیٹی اس سے چھین لی گئی تھی اور اب وہ دن رات اس کی جدائی میں تڑپ رہا تھا۔ یاد رہے کہ پروفیسر کی دانست میں شائستہ مائیکل کے ہاتھوں قتل ہوچکی تھی۔ اپنی پیاری شائستہ کی ابدی جدائی کے تصور نے پروفیسر کو ایک سر پھرے شخص کا روپ دے دیا تھا اور وہ اپنی زندگی سے تقریباً لاتعلق ہوچکا تھا۔ پروفیسر سے میری آخری ملاقات ٹرسٹ میں آرتھر کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس وقت میری دلی خواہش تھی کہ میں پروفیسر کو اس کی زندگی کی سب سے اچھی خبر سناروں' اسے بتاؤں کہ شائستہ ابھی حیات ہے اور دلیری سے زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے' مگر اس سے پہلے کہ میں یہ خبر پروفیسر تک پہنچاتا' اچانک پروفیسر ٹرسٹ سے ارجھل ہوگیا تھا۔ اس دن کے بعد میں اس غم زدہ باپ کی صورت آج دیکھ رہا تھا۔ اب میں دل ہی دل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ پروفیسر کو یہ خوش خبری سناکر ہی رہوں گا۔

اچانک جھونپڑے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو باہر صوفیہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر ہورہا تھا۔ وہ مجھے اشارے سے کچھ دور لے گئی۔ جھیل کے کنارے اور بستی کی گلیوں میں مہمان قبائلیوں کا ہجوم تھا۔ وہ کھا پی رہے تھے۔ خصوصاً مجور اور چاول کی شراب پی رہے تھے۔ ابھی سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا تھا تاہم بادِ صبا چلنا شروع ہوگئی تھی اور اس کے جھونکوں سے مشعلیں ہولے ہولے پھڑپھڑا رہی تھیں "کیا بات ہے صوفیہ؟" میں نے مجور کے درختوں تلے کھڑے ہوکر پوچھا۔

وہ روہانسی آواز میں بولی "آپ کا دوست ایسا کیوں کررہا ہے۔ کیوں اس کی جان لینا چاہتا ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتی تو یہ غلط ہے' وہ کچھ کرکے دکھا دے گی' وہ پھر کچھ کھالے گی۔"

"تم کس کی بات کررہی ہو؟"

"ویرا کی۔" صوفیہ نے گلوگیر لہجے میں کہا "آپ کے دوست نے آج رات اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ویرا تقریباً ساری رات درختوں میں مقررہ جگہ پر اس کا انتظار کرتی رہی ہے' وہ نہیں گیا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جھونپڑے میں واپس لوٹی ہے۔ اوس میں بھیگنے کی وجہ سے اسے لرزے کے ساتھ بخار چڑھ گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کہہ رہی تھی کہ موسو نے اس کی زندگی بچاکر اچھا نہیں کیا۔ بہتر تھا کہ یہ لوگ اسے مرجانے دیتے۔ وہ سخت مایوس نظر آرہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس سے کوئی الٹا سیدھا کام نہ ہوجائے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم خواہ مخواہ اپنی پریشانی مت بڑھاؤ۔" میں نے کہا۔

"آپ مس ویرا کو جانتے نہیں اس لیے ایسی بات کہہ رہے ہیں۔ وہ ارادے کی اتنی پکی ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ مجھے ننانوے فی صد یقین ہے کہ اگر حالات اسی طرح کے رہے تو وہ پھر کوئی ویسا ہی قدم اٹھالے گی جیسا پہلے اٹھایا تھا۔ وہ اپنے عشق میں بڑی تیزی سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس کا خون آپ کے دوست کی گردن پر آجائے۔"

اچانک میں نے ایک سیاہ فام عورت کو دیکھا۔ وہ ہجوم کو چیرتی ہوئی تیزی سے ہماری طرف آرہی تھی۔ وہ ویرا کے ساتھ ملازمہ کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ کوئی اہم خبر لارہی ہے۔ ایک ایسی اہم خبر جو شاید بُری بھی تھی۔

سیاہ فام عورت ہمارے قریب پہنچی اور صوفیہ سے مخاطب ہوکر انگریزی میں بولی "میڈم جلدی چلو۔ وہ بے ہوش ہوگئی ہے۔"

صوفیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مجھے فراموش کرکے وہ تیزی سے اس جھونپڑے کی طرف بڑھی جہاں ویرا مقیم تھی۔ میں بھی دونوں عورتوں کے پیچھے ہی پیچھے جھونپڑے کی طرف لپکا۔ جھونپڑے کے اندر ویرا واقعی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے خوب صورت بال جو ہمیشہ کھلے رہتے تھے اس کے شانوں اور سینے پر بکھرے تھے۔ اس کا رنگ ہلدی ہورہا تھا اور ہونٹ خشک تھے۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر بھی زردی سی کھنڈی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ صفدر کے لیے اس کی محبت کے جذبے نے ایک خون آشام بلا کا روپ دھار لیا ہے اور اس کے جسم کا خون نچوڑنا شروع کردیا ہے۔

گرمی کے باوجود ویرا کے جسم پر ایک کمبل نما کپڑا پڑا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ سخت سردی محسوس کررہی تھی۔ میں نے کمبل اس کے جسم سے ہٹانا چاہا تو سیاہ فام ملازمہ نے جلدی سے منع کردیا۔ اس نے بتایا کہ معالج موسو کی ہدایت ہے کہ اس کے جسم کو گرم رکھا جائے۔ صوفیہ نے جلدی سے ایک چھوٹی شیشی کا ڈھکن کھولا اور اسے ویرا کے نتھنوں کے سامنے لے گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ موسو کی ہدایت کے مطابق ایسا کررہی ہے۔ اسی دوران میں صفدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ ملازمہ جو ہمیں یہاں لے کر آئی تھی اب معالج موسو کو بلانے کے لیے دوڑ گئی تھی۔ صوفیہ دیر تک شیشی کو ویرا کی ناک کے سامنے حرکت دیتی رہی۔ کسی جنگلی بوٹی سے تیار کردہ دوا کی خوشبو پورے جھونپڑے میں پھیل گئی تھی۔ یہ عجیب قسم کی بو تھی دماغ میں سرسراہٹ محسوس ہونے لگی تھی' تاہم ویرا پر ابھی تک اس دوا کا کوئی اثر نہیں تھا' وہ مکمل بے ہوش پڑی تھی۔

صوفیہ نے تیز نظروں سے صفدر کو دیکھا اور روتے ہوئے بولی "تم کیوں اس کی جان لینا چاہتے ہو' کیوں بہلاتے رہے ہو اسے جھوٹے وعدوں سے؟"

"میں نے کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔" صفدر بھنا کر بولا "یہ خود ہی غلط فہمیوں کا شکار ہوئی ہوگی۔۔۔ اور میرے خیال میں تو اب کوئی غلط فہمی بھی نہیں تھی۔ میں نے سب کچھ بتادیا تھا اسے۔۔۔ اور یہ مطمئن بھی ہوگئی تھی۔"

"بالکل غلط ہے۔ یہ کوئی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اگر مطمئن ہوتی تو کل ساری رات تمہارے انتظار میں کیوں گزارتی؟ تم نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اس کے باوجود نہیں آئے۔"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں نے تو۔۔۔"

"تم غلط کہہ رہے ہو۔" صوفیہ نے صفدر کی بات کاٹی "مس ویرا نے خود مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ انہوں نے تم سے صاف کہہ دیا تھا کہ اب ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے' اور اگر۔۔۔ تم نے انہیں واپسی پر مجبور کیا تو وہ پھر وہی کچھ کریں گی جو پہلے کیا تھا۔"

"یعنی زہر کھالیں گی؟" صفدر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو' یہ دوبارہ ایسا نہیں کرسکتیں۔ یہ کرسکتی ہیں ایسا۔" وہ زور دے کر بولی "میرا خیال ہے کہ میں مس ویرا کو تم سے زیادہ سمجھنے لگی ہوں۔ اگر تم انہیں آزمانے کی کوشش کروگے تو یہ بہت خطرناک ہوگا۔"

"اچھا تم اس کے سرہانے کھڑی ہوکر ایسی باتیں مت کرو۔" صفدر نے بیزاری سے کہا اور باہر چلا گیا۔

صوفیہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی۔ وہ ویرا کی زندگی کی طرف سے بڑی فکرمند نظر آتی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "اپنا جی ہلکا مت کرو صوفیہ۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پہلا جھٹکا زیادہ شدید ہوتا ہے اور وہ جھٹکا ویرا کو لگ چکا ہے۔ دیکھنا' اب یہ آہستہ آہستہ خود کو سنبھال لے گی۔ اللہ نے چاہا تو اب وہ کچھ نہیں ہوگا جو تم سوچ رہی ہو۔"

"یہ خود کو نہیں سنبھالیں گی۔ مجھے پتا ہے یہ خود کو نہیں سنبھال سکیں گی۔" صوفیہ کی آنکھوں میں بدستور آنسو موجود تھے۔

ایک دم مجھے ٹھٹکنا پڑا۔ میری نگاہ ویرا کے بستر سے نیچے گئی تھی۔ اس کے بستر میں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک کر فرش پر گر رہا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ویرا کا بستر نیچے سے خون آلود تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا کمبل ہٹایا۔ صوفیہ اور حبشی ملازمہ کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ ویرا کا ایک پہلو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بازو اٹھایا۔ اس کی کلائی کی نرم ونازک رگیں کٹی ہوئی تھیں اور خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ شاید ہمیں دو چار منٹ مزید پتا نہ چلتا تو اس کے خون کا آخری قطرہ تک بھی اس کے جسم سے رخصت ہوجاتا۔ میں نے ایک رومال پھاڑا اور اس کی مدد سے کٹی ہوئی رگوں کو کس کر باندھ دیا۔ کانچ کا ایک کنگن ویرا کے پہلو میں ٹوٹا پڑا تھا۔ یہ ویرا ہی کا کنگن تھا۔ اس کی مدد سے ویرا نے اپنی رگیں کاٹی تھیں۔ یہ خودکشی کی کوشش تھی اور وہ اپنی اس کوشش میں قریباً قریباً کامیاب ہوچکی تھی۔

اس دوران میں مقامی معالج موسو بھی ہانپتا کانپتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ جسم کا بیشتر خون ضائع ہو جانے کے سبب ویرا پر گہری غشی طاری ہو چکی تھی۔ ایک دم چیخ و پکار سی مچ گئی۔ بہت سے مرد و زن جھونپڑے کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ ان کے چہرے غم کی تصویر تھے اور وہ دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر مناجات وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ویرا کا چچا بوکارلو اور نائب سردار لارو تابے بھی وہاں آگیا۔ بوکارلو کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور تابے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تابے کا خیال تھا کہ یہاں پر جو بھی ہلچل اور افراتفری نظر آرہی ہے اس کا سبب میں اور میرا دوست یعنی صفدر ہیں۔ اس کی رائے تھی کہ ہم دونوں کو یہاں پناہ ہی نہیں دی جانی چاہیے تھی۔ موسو اور دوسرے لوگ ویرا کو ہوش میں لانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے مگر سانس کی ہلکی سی جنبش کے سوا اس کے جسم میں کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک جاذب نظر لباس میں تھی۔ بالوں کو سلیقے سے کنگھی کیا گیا تھا۔ ایک دو مرجھائے ہوئے پھول بھی بالوں میں نظر آرہے تھے۔ ایسے ہی کچھ نیم مردہ پھول اس کی کلائیوں میں گجروں کی صورت موجود تھے۔ غالباً یہ سب اس ملاقات کی تیاری تھی جو آج گزر جانے والی رات میں اس نے صفدر سے کرنا تھی۔ مجھے پہلی بار پوری شدت سے اس معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ یہ لڑکی واقعی حد سے گزر جانے والی تھی۔ چند دن کے مختصر وقفے میں اس نے دو مرتبہ اپنی جان لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کی تھی۔ اس کی پہلی کوشش تو ناکام ہوئی تھی مگر دوسری کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ویرا کوئی رومان پسند لڑکی نظر نہیں آتی تھی۔ نہ ہی رویے کے اعتبار سے وہ جذباتی محسوس ہوتی تھی۔ ویسے بھی سانتھشٹ خواتین و حضرات کے بارے میں یہی تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ زندگی کو ٹھوس حقائق کے آئینے میں دیکھتے ہیں لیکن اس لڑکی نے یہ سارے نظریات غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ صفدر پر فدا ہوئی تھی اور یوں ہوئی تھی کہ دیکھنے اور سننے والوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ویرا کی حالت کسی طور سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ موسو نے اپنے چند معاونوں کے سوا باقی سب افراد کو جھونپڑے سے نکل جانے کی ہدایت کی۔ میں بھی باہر آگیا۔ یہاں مجھے صفدر بھی کھڑا نظر آیا۔ وہ گم صم تھا اور اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں وہ لشکری بھی شامل ہو گئے تھے جو آج رات سردار بوقات کے ساتھ اظہار یک جہتی کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ جھونپڑے کے چاروں جانب ایک شور برپا تھا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد موسو کی دو معاون عورتیں جھونپڑے سے باہر نکلیں۔ بالکل یوں لگا جیسے ایک نہایت خطرناک آپریشن کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا ہو اور ڈاکٹروں میں سے کسی کی صورت نظر آئی ہو۔ کئی افراد دونوں عورتوں کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ بوکارلو کی بھتیجی ہوش میں آگئی ہے یا کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو صفدر موجود نہیں تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اسے ہجوم میں ڈھونڈتا رہا پھر اپنے جھونپڑے کی طرف آگیا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ میں جھونپڑے میں داخل ہو کر لیٹ گیا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ ویرا والا معاملہ جتنی تیزی سے شروع ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے ایک گمبھیر مسئلہ بن گیا تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک میرا دھیان پروفیسر اللہ دتا کی طرف چلا گیا۔ ویرا کے سنگین چکر میں پروفیسر کا خیال کچھ دیر کے لیے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور پروفیسر کی تلاش میں نکلا۔ اب دن کے نو دس بج چکے تھے۔ بہت سے مہمان لاری بستی سے رخصت ہو چکے تھے اور باقی ہو رہے تھے۔ صوفیہ کے ہمراہ قریباً ایک گھنٹے تک میں نے دیوانہ وار پروفیسر کو تلاش کیا۔ آخر معلوم ہوا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر علی الصباح ہی بستی سے روانہ ہو گیا تھا۔ میں پروفیسر کی تلاش میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر صوفیہ نے مجھے بتایا کہ میں اور صفدر اس بستی سے باہر نہیں جا سکتے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا اور تھکا ہارا جھونپڑے میں لوٹ آیا۔

شام کے وقت میں جھونپڑے سے نکلا تو کئی چہ میگوئیاں سنائی دیں۔ کچھ چہ میگوئیاں ویرا کی صحت کے بارے میں تھیں، کچھ چہ میگوئیوں کا تعلق ان وجوہات سے تھا جن کے سبب ویرا نے خودکشی کی ایک اور کوشش کی تھی۔ کچھ لوگ میں کنگ براؤن اور ٹرسٹ والوں کے خلاف بھی غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ویرا کی پریشانیوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ ٹرسٹ والے اسے یہاں سے واپس لے جانا چاہتے ہیں اور اسے اپنی نافرمانی کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ بہرحال ایسے لوگ بھی تھے جو حقیقت کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان کی رائے میں ویرا اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی تھی اور اپنی خواہش کی ناکامی اسے موت کی طرف لے جا رہی تھی۔

صفدر ابھی تک جھونپڑے میں واپس نہیں آیا تھا۔ میں اسے تلاش کرنے نکلا۔ وہ مجھے بستی کے بازار میں نظر

آیا۔ ایک طویل جھونپڑے کو شراب خانے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں زمین پر چٹائیاں بچھی تھیں اور بہت سے سیاہ فام بالوں میں جو اور کھجور کی شراب پی رہے تھے۔ کئی نشے میں دھت ہو کر یہاں وہاں لڑھکے ہوئے تھے۔ مجھے ایک جانب صفدر نظر آیا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک گیا۔ میں اس کے پاس ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ صفدر بھی نشے میں ہے۔ اس کی یہ کیفیت اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے چینی اور اندرونی ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی کرتی تھی۔

میں نے ایک نظر اس کی بڑھی ہوئی شیو اور الجھے ہوئے بالوں پر ڈالی "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے صفدر۔"

وہ ایک گہرا کش لے کر بولا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا شاہ جہاں صاحب! یہ لڑکی میرے لیے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا... کہ مجھے یہاں سے لے جائیں لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی۔"

"تم اپنے ذہن پر اتنا بوجھ کیوں لے رہے ہو۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "اب مجھے لگ رہا ہے کہ میرا قصور ہے' یقیناً مجھ سے بھی کہیں نہ کہیں غلطی ہوئی ہے۔"

"تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ایک بات ہمیں بھی ٹھنڈے دل سے سوچنی چاہیے۔ کوئی یونہی تو اپنی جان نہیں لیتا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے صفدر کی تائید کی۔

"مجھے ڈر ہے کہ وہ بچ گئی تو پھر وہی کرے گی' جو دو مرتبہ پہلے کیا ہے اس نے' اور اگر وہ مر گئی تو اس کا خون میں ساری زندگی اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں گا۔" صفدر کی آواز میں نقاہت اور بے بسی تھی۔

وہ مجھے بہت حد تک بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ویرا کی سرکش اور منہ زور محبت نے صفدر جیسے شخص کی ذہنیت میں بھی دراڑیں ڈال دی ہیں۔ وہ اس محبت کی لرزاں ضربوں کو دل کی گہرائی سے محسوس کر رہا تھا اور گزرنے والا ہر گھڑی کے ساتھ بے حال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی تھا بے رحم یا سفاک نہیں تھا اور اس میں آنے والی تبدیلی اس کی اسی خاصیت کو ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے صفدر کو بھی بتایا کہ پروفیسر ہم سے ملے بغیر بستی سے چلا گیا ہے۔ میری طرح صفدر کو بھی پروفیسر کے اچانک چلے جانے کا افسوس ہوا۔ ایک بار پھر ہمارے ہونٹوں کی بات ہونٹوں میں ہی رہ گئی تھی۔ ہم آبلیا پروفیسر کو اس کی لاڈلی بیٹی کے بارے میں ایک نہایت خوش کن اور یادگار اطلاع نہیں دے سکے تھے۔ یہ ایک ڈرامائی اتفاق تھا' مگر حقیقی زندگی بھی ایسے ڈرامائی اتفاقات سے مبرا نہیں ہوا کرتی۔ اب ہمیں دوبارہ سے پروفیسر کے ملنے کا انتظار کرنا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹے کافی پریشانی میں گزرے۔ صفدر بالکل گم صم تھا۔ میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ میری دس باتوں کے جواب میں بس ایک بات کرتا تھا اور وہ بھی بجھے دل سے۔ ایک دو بار اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بستی سے بلکہ اس علاقے سے ہی نکل جانا چاہتا ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں۔ ہم کنگ براؤن کے قیدی تھے اور اس کے قیدیوں کے لیے چھٹکارا ایسا سہل نہیں تھا۔ جو کنگ کی سلطنت کی ناقابل عبور حدوں کو عبور کرنے کی کوشش کرتے تھے انہیں کیمپس کی خوفناک بھول بھلیوں میں بھگا بھگا کر مار دیا جاتا تھا۔ ولی عہد ماسٹر اسٹی اور اس کے دوستوں کے لیے ایسی سزاؤں پر عمل درآمد سے ایک دلچسپ تفریح کا سامان مہیا ہوتا تھا۔ کم سن ماں "کملا" اور اس کے شیر خوار بچے کی موت کی دردناک مثال ہمارے سامنے تھی۔ ویرا کا علاج مسلسل ہو رہا تھا۔ اس کے جھونپڑے کے گرد کڑا پہرا رہتا تھا' معالج موسو نے جھونپڑے میں مستقل ڈیرا لگا رکھا تھا' میں نے متعدد بار بوکارلو کو بھی جھونپڑے میں آتے جاتے دیکھا۔

اگلے روز شام کو مجھے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ میں ذرا ہوا خوری کے لیے صفدر کو جھیل کے کنارے لے آیا تھا۔ دن کی تمازت شام کی پرچھائیوں کے ساتھ ہی ڈھل گئی تھی۔ کسرتی جسموں والے سیاہ فام مرد چھوٹی بڑی کشتیاں کھیتے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ جھیل کے شفاف پانی میں ڈوبتے سورج کا عکس تھا۔ اچانک صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب! آپ مجھے کیسا انسان سمجھتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے نزدیک میرا کردار کیا ہے؟ کیا میں ایک مضبوط شخص نہیں ہوں؟ کیا میری سوچ سطحی ہے؟ کیا میں اپنے فیصلے جذبات میں کرتا ہوں؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہارے ان تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔"

وہ بولا "شاہ جہاں صاحب' چند ہفتے پہلے تک میں رومانیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا میرے نزدیک پیار محبت کا

نمبر بہت سی دیگر انسانی ضروریات کے بعد آتا تھا۔"

"لیکن اب کیا ہے؟"

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں جناب۔" صفدر نے عجیب غیرمانوس لہجے میں کہا۔

"کس کے ساتھ؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ویرا کے ساتھ۔" صفدر نے کہا۔

میں نے چند لمحے سکتے کی کیفیت میں رہنے کے بعد کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو صفدر؟ تم جانتے ہو کہ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تمہاری محبت انجم ہے' اور وہ سادہ دل لڑکی پاکستان میں تمہارا انتظار کررہی ہے۔ تم نے بھی اس سے عہد وپیمان باندھ رکھے ہیں۔ کیا تم وہ سب کچھ بھول جاؤ گے۔"

"میں نے ہر پہلو پر بہت گہرائی میں جاکر سوچا ہے جناب۔ آخر اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں ویرا جیسی لڑکی کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔ وہ میری وجہ سے دو دفعہ موت کے منہ میں گئی ہے' اگر اس نے پھر وہی کچھ کیا جو پہلے کرتی رہی ہے اور اس کی جان چلی گئی تو میں خود کو زندگی کی آخری سانس تک معاف نہیں کرسکوں گا۔"

"صفدر' میرے خیال میں یہ بے حد اہم فیصلہ ہے۔ اس نوعیت کے فیصلے کرنے سے پہلے ہمیں بہت سوچ بچار کرنی چاہیے۔"

"میں نے بہت سوچ بچار کی ہے جناب! اب میں تھک گیا ہوں۔"

صفدر کے لہجے میں واقعی صدیوں کی تھکن اتری ہوئی تھی۔ اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے صفدر کے سینے میں بھی وہی ناقابل برداشت آگ بھڑک چکی تھی جو ویرا کے سینے میں بھڑکی ہوئی ہے اور اسے زندگی اور موت سے بیگانہ کررہی ہے۔ اس حسین لڑکی کا جذبہ اتنا شدید اور سرکش تھا کہ اس کی جان خود بخود اس کی ہتھیلی پر آگئی تھی اور جب کسی فرد کی جان اس کی ہتھیلی پر آجاتی ہے تو اس کے اندر انہونی کو ہونی میں بدلنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے' اور اس کی ذات میں ایک ایسا طلسم جاگتا ہے جو اسم اعظم کی خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ اسم اعظم ہی تو تھا جو صفدر جیسے آہنی شخص کو توڑ رہا تھا اور اس کی زبان سے ایسے الفاظ کہلوا رہا تھا جن کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ مجھے صفدر کی ذہنی حالت ابتر نظر آرہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس موضوع پر فی الحال اس سے مزید بات نہ کی جائے۔

اگلا دن میرے لیے ایک اور ذہنی دھچکا لے کر آیا۔ میں صبح سویرے اٹھ گیا تھا اور جھیل پر نہا کر واپس آیا تھا' میرے بعد صفدر نہانے کے لیے چلا گیا۔ صفدر کے جانے کے چند منٹ بعد بوکارلو وہاں آدھمکا۔ اس کا زخمی ہاتھ بدستور پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں نے اس سے ویرا کی خیر خیریت دریافت کی' اس نے اظہار اطمینان کے بعد کہا "میرا خیال ہے ویرا کی حالت کے سنبھلنے میں صفدر کا بھی کردار ہے۔ [illegible] سے شادی پر رضامندی ظاہر کرکے اس نے ویرا کے جسم میں نئی زندگی پھونک دی ہے۔ شاید کوئی قیمتی سے قیمتی دوا بھی اثر نہ کرتی جو صفدر کے دو بولوں نے کیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ صفدر سے حتمی مشورہ کیے بغیر یوں اس بات کو آگے بڑھا دے' میری طرح شاید بوکارلو کو بھی توقع نہیں تھی کہ صفدر بات میرے علم میں لائے بغیر آگے چلائی ہوگی۔ وہ اس سے بات کررہا تھا جیسے میں اس صورت حال سے پوری باخبر ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے صفدر کے رویے پر سے دکھ کا احساس ہوا۔ ایک دیرینہ دوست اور غم خوا حیثیت سے اس نے مجھے وہ اہمیت نہیں دی تھی جس کا حق دار تھا۔ تاہم جلد ہی دکھ اور تاسف کی یہ لہر گزر گئی۔ صفدر کی پریشانی اور اس کی ابتر ذہنی کیفیت کا خیال آیا بری طرح اپ سیٹ تھا۔ شاید اس کی یہی ابتر کیفیت تھی کے بہاؤ میں بہہ کر اس نے تن تنہا یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ بو خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔

"کیا بات ہے' تم سوچ میں پڑ گئے ہو؟" بوکارلو بولا۔

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر صفدر پہلے رضامندی ظاہر کردیتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ مطلب ہے کہ مس ویرا کو دو مرتبہ موت کے منہ میں پڑتا۔" میں نے بات بنائی۔

بوکارلو نے اپنی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھیں میرے پر جمائیں۔ کچھ دیر تک اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیر پھر گہری سانس لے کر بولا "شاہ جہاں! تم جس قدر صفدر قریب ہو اتنا کوئی اور نہیں ہے۔ میں تم سے وہ بات کر ہوں جو ابھی تک صفدر سے بھی نہیں کی۔"

بوکارلو کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ بوکارلو اور میں پہلے بھی براہ راست گفتگو ہوچکی ہے۔ میں نے لہجے میں کہا "میں ہمہ تن گوش ہوں جناب۔"

جھونپڑے کی کھڑکی میں سے سورج کی روشنی ایک ستون کی طرح داخل ہورہی تھی۔ بوکارلو اس ستو روشنی میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے سر میں سے پھوٹ رہی ہے۔ اس کی سرخ آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ

اور گمبھیر نظر آرہی تھیں۔ گلے میں انسانی انگلیوں کی ہڈیاں مالا کی شکل میں آویزاں تھیں۔ وہ بولا "ویرا اور تمہارے دوست کی شادی مقامی رسم ورواج کے مطابق بوبودیوتا کے سامنے ہوگی۔ بس یہی ایک طریقہ ہے' جس سے اس شادی کو قبیلے کا تحفظ حاصل ہوسکتا ہے' اور قبیلے کی طاقت اس رشتے کی پشت پناہ بن سکتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا...؟"

میں نے اقرار میں سرہلایا۔ بوکارلو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم جانتے ہی ہو ٹرسٹ والے ہر صورت ویرا کو واپس لے جانا چاہتے ہیں' جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نہ صرف ویرا کو قبیلے میں روکے ہوئے ہیں بلکہ اپنی مرضی سے اس کی شادی بھی کردی گئی ہے تو وہ لوگ مزید سیخ پا ہوں گے۔ ممکن ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم ہوجائے کہ یہ شادی ٹرسٹ کے ایک مفرور بردے سے کی گئی ہے' ایسی صورت میں وہ جتنا بھی چیخیں چلائیں وہ کم ہے۔ ان حالات میں لارسی قبیلے کی طاقت ہی ہے جو ٹرسٹ والوں کو کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھ سکتی ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہی ہو ان جنگلات میں لارسیوں کی پانچ چھوٹی بڑی بستیاں موجود ہیں۔ ان بستیوں کے لشکریوں کی مجموعی تعداد ہزاروں میں ہے۔ اگر کسی ایک "ایشو" کے سبب یہ سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوجائیں تو بہت بڑی قوت بن سکتے ہیں۔ کنگ کے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا کہ وہ کسی ایسی قوت کو للکارنے کی جرأت کرسکے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرے گا کہ اپنے خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہے۔" بوکارلو نے ایک بار پھر مجھے گہری' استفساری نظروں سے دیکھا۔

میں نے پھر اثبات میں سرہلایا۔ بوکارلو نے گہری سانس لیتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا "لارسیوں میں ایک رسم مدت سے چلی آرہی ہے۔ اگر قبیلے کی کسی دوشیزہ کے ساتھ کوئی ایسا شخص شادی کرنا چاہے جو قبیلے میں سے نہیں تو اسے اپنی دلیری اور مردانگی کا ایک امتحان دینا ہوتا ہے۔ اس امتحان کے مطابق اسے کم از کم دو بوب لڑکیوں سے جسمانی تعلق قائم کرنا پڑتا ہے۔ بوب لڑکیوں کے بارے میں شاید تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی پرورش سب سے الگ تھلگ کی جاتی ہے۔ ان کی کوئی زبان نہیں ہوتی' نہ ان کا کوئی نام ہوتا ہے اور نہ کسی سے ان کا کوئی تعلق یا رشتہ ہوتا ہے۔ ان سفید فام لڑکیوں کی پرورش صرف مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے کی جاتی ہے۔ شاید تمہارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب یہ قبیلہ اور اس کا مذہب انسان کی آزادی اور مکمل خود مختاری کا علم بردار ہے تو پھر یہاں جیتی جاگتی دوشیزاؤں کو مذہبی رسوم کی بھینٹ کیوں چڑھایا جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مذہبی رسوم میں صرف بوب لڑکیاں ہی استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بالکل الگ تھلگ زندگی گزارنے کے سبب ہر قسم کے انسانی احساسات اور خواہشات سے مبرا ہوتی ہیں۔ ان کا کام صرف کھانا اور آرام کرنا ہوتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا پیکر بے شک انسانی ہوتا ہے لیکن ان کی فطرت ان جانداروں کی سی ہوتی ہے جنہیں ہم مختلف مقاصد کے لیے اپنے گھروں میں پالتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" اس نے حسب عادت کہا۔

میں نے ایک بار پھر اقرار میں سرہلایا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھیل کی طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا "ہاں تو میں ذکر کررہا تھا بوب لڑکیوں سے جسمانی تعلق کا۔ شادی سے دس راتیں پہلے کسی چاندنی رات میں یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کے مطابق شام سے کچھ دیر بعد پانچ بوب لڑکیاں قریبی جنگل میں چھوڑ دی جاتی ہیں۔ دولہا کو ایک گھوڑا دیا جاتا ہے اور اس کے چہرے پر ایک ماسک چڑھایا جاتا ہے۔ یہ مقامی طور پر چمڑے سے تیار کردہ ایک ایسے جانور کی شکل کا ماسک ہوتا ہے جس کے لمبے سینگ ہوتے ہیں اور نہایت کشادہ دہن ہوتا ہے۔ یہ ماسک پہن کر وہ شخص جنگل میں لڑکیوں کا تعاقب کرتا ہے۔ اس کے پاس "سن" کی ایک رسی کے سوا کوئی چیز ہوتی ہے اور نہ کوئی ہتھیار ہوتا ہے۔ اسے خالی ہاتھ دو بوب لڑکیوں پر قابو پانا ہوتا ہے اور ان سے جسمانی تعلق قائم کرنا ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ شخص سورج طلوع ہونے سے پہلے ان دونوں لڑکیوں کو لے کر بوما (عبادت گاہ) کے سامنے پہنچتا ہے۔ یہاں وہ دونوں لڑکیاں سردار بوبنات کی سب سے پہلی بیوی کانگے کے حوالے کردی جاتی ہیں۔ بعد ازاں کانگے ہی اس شخص کی کامیابی یا ناکامی کا اعلان کرتی ہے جو لارسی دوشیزہ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔"

بوکارلو بڑی لرزہ خیز حکایتیں سنا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ میں پتھر کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں' یا اس دور کی کوئی وحشت ناک کہانی پردہ سیمیں پر دیکھ رہا ہوں۔ "بوب لڑکیوں" کے حوالے سے ایک لرزہ خیز منظر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لڑکیوں کو بھینٹ چڑھائے جانے کا منظر تھا' اب میں اس نسبت سے ایک اور انسانیت سوز بلکہ شرمناک رسم کے بارے میں سن رہا تھا۔ ان قبائل میں ایسی بہت سی رسموں کے بارے میں کہا اور سنا جاتا ہے' آج میں سب کچھ بغیر

نفیس ملاحظہ کر رہا تھا۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر بوکارلو نے کہا "تم متفکر لگ رہے ہو۔ یہ آزمائش اتنی کڑی نہیں ہے۔ بوب لڑکیوں کو پکڑنا اکثر آسان ثابت ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں طاقت ور تو ہوتی ہیں لیکن زیادہ ہوشیار نہیں ہوتیں۔ نہ ہی ان میں اتنا شعور ہوتا ہے کہ وہ باہم مل کر کسی طرح کی مزاحمت کر سکیں۔ چاندنی رات میں وہ جلد ہی پکڑی جاتی ہیں۔ پہلی لڑکی کو پکڑ کر اسے سن کی رسّی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے' پھر دوسری لڑکی پکڑ لی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر دس افراد کو اس آزمائش میں سے گزارا جائے تو ان میں سے آٹھ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ پچھلے دو سال میں اس قسم کی سات آٹھ آزمائشیں ہو چکی ہیں' ان میں سے صرف ایک نوجوان ناکام رہا تھا۔ ایک بوب لڑکی نے اس پر درخت کی شاخ سے حملہ کیا تھا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی۔"

میں نے کہا "محترم بوکارلو! میں ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں کہو۔"

"آپ نے ابھی فرمایا ہے کہ اس آزمائش سے صرف اس شخص کو گزرنا پڑتا ہے جو قبیلے کی کسی لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے' لیکن گستاخی معاف۔ مس ویرا تو قبیلے میں سے نہیں ہیں۔"

بوکارلو کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ ابھری "نہیں میرے دوست" وہ نرمی سے بولا "ویرا اب قبیلے ہی کی فرد ہے۔ چونکہ میں اس قبیلے کا فرد بن چکا ہوں اور ویرا کی نسبت مجھ سے ہے۔ وہ میری بھتیجی ہے اور میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ لہٰذا وہ قبیلے کی فرد بن کر میرے ساتھ رہے گی۔ ویرا کے سلسلے میں اب ہمیں انہی اصولوں کی پابندی کرنا ہوگی جو دیگر لارسی دوشیزاؤں پر لاگو ہوتے ہیں۔" بوکارلو نے چند لمحے توقف کیا' سورج کی روشنی اب اس کے سینے پر مرکوز تھی اور انسانی ہڈیوں کی مالا کو چمکا رہی تھی۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا "میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے دوست کو اس صورت حال سے آگاہ کر دو۔ آج چاند کی چھ تاریخ ہے' دو چار روز تک چاندنی راتیں شروع ہو جائیں گی۔ ہم کسی بھی رات کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ رسم کی ادائیگی کے بعد دس روز ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ دیوتاؤں نے چاہا تو اس دوران میں ویرا بھی مکمل صحت یاب ہو جائے گی۔ اس کے بعد ان دونوں کو بندھن کے مقدس بندھن میں باندھا جا سکتا ہے۔"

دو چار منٹ تک بوکارلو مزید میرے پاس بیٹھا' پھر اپنے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان آخری دو چار منٹوں میں بوکارلو نے مجھ سے جو بات کی اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نرسٹ والے ویرا کو واپس لے جانے کے لیے اس لیے بھی بے چین ہیں کہ ویرا کا چھوٹا چچا چین ویرا کی شادی اپنے ایک خالہ زاد سے کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ بوکارلو کے جانے کے بعد میں صفدر کا انتظار کرنے لگا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ بوکارلو ابھی جو کچھ بتا کر گیا تھا وہ میری طرح صفدر کے لیے بھی حیرت ناک ثابت ہونے والا تھا۔ میں صفدر کے مزاج اور ذہن کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صفدر کے لیے یہ سب کچھ قابل قبول نہیں ہوگا۔ بے شک ویرا کے مجنونانہ اور انتہائی جذباتی رویے نے صفدر کو بھی جذباتی طور پر توڑ پھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی اس نے ابھی مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے تھے۔ وہ ایک ایسی قبائلی رسم کی ادائیگی میں حصے دار کیسے بن سکتا تھا جو شروع سے آخر تک وحشیانہ تھی۔ وہ تو پھولوں سے پیار کرنے والا اور کتابوں سے دل بہلانے والا شخص تھا' وہ ایک لڑکی کی خاطر خود اپنی نظروں سے ہمیشہ کے لیے گرنے کا سامان کیوں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نئی صورت حال کے بارے میں سننے کے بعد صفدر کی سوچ میں تبدیلی آئے گی اور اس کے خیالات وہ نہیں رہ جائیں گے جو کل شام تک تھے۔ اور حقیقت یہ تھی کہ میں خود بھی کچھ ایسا ہی چاہتا تھا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ صفدر ویرا کے معاملے میں اتنی دور چلا جائے کہ واپسی ممکن نہ رہے۔ بے شک ویرا ایک حسین لڑکی تھی۔ وہ صفدر سے ٹوٹ کر پیار بھی کرنے لگی تھی' ان دونوں کی جوڑی لاکھوں میں ایک کہلا سکتی تھی' مگر کچھ بھی تھا صفدر کا ایک ماضی تھا۔ اس کے رشتے ناتے تھے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی منگیتر انجم تھی۔ یہ سب کچھ سوچ کر مجھے یوں لگتا تھا جیسے صفدر کو اس ماضی سے اور مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔

بوکارلو کے جانے کے چند ہی منٹ بعد صفدر بھی واپس آ گیا۔ نہا دھو کر وہ خاصا نکھرا ہوا تھا۔ پانی کے قطرے اس کے سیاہ چمکدار بالوں اور کشادہ پیشانی پر چمک رہے تھے۔

"بوکارلو صاحب آئے تھے؟" صفدر میرے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے انہیں جھونپڑے کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بوکارلو کے رابطہ

جاتے ہی صفدر کیسے آ دھمکا تھا۔ دراصل وہ یہاں بوکارلو کی موجودگی سے آگاہ تھا۔ وہ ادھر ادھر گھوم کر انتظار کرتا رہا تھا کہ بوکارلو مجھ سے اپنی بات ختم کر کے واپس جائے۔

میں نے بیڑی کی طرز کا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "جانتے ہو' بوکارلو کیوں آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ کچھ جانتا ہوں۔"

"مثلاً؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"غالباً اس نے کسی رسم وغیرہ کی بات کی ہے۔" صفدر نے میری حیرانی میں اضافہ کر دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس تھوڑی سی بھنک مجھے بھی پڑ گئی تھی۔ صوفیہ نے بات کی تھی۔"

"کیا کہا تھا؟"

"وہی رسم کے بارے میں بتایا تھا۔ قبیلے سے باہر کا کوئی شخص اگر قبیلے کی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہے اور وہ لڑکی بھی رضامند ہو تو پھر اس شخص کو ایک آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے جنگل میں بھاگ دوڑ کر کے دو غلام لڑکیوں کو پکڑنا پڑتا ہے اور انہیں سردار بوعنات کی بیوی کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔"

صفدر عام سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے اس "عام لہجے" نے جہاں میری حیرت میں اضافہ کیا' وہاں مجھے ہلکے سے دکھ کا احساس بھی ہوا۔ بہرطور میں نے کسی طرح کے تاثرات اپنے چہرے پر نہیں آنے دیے اور سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود ہی اپنی بات کو آگے بڑھائے گا' لیکن جب وہ خاموش رہا تو مجھے خاموشی کو توڑنا پڑا۔ میں نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"جی جی۔۔۔ فرمائیں۔"

"تم نے بوکارلو سے اپنی اور ویرا کی شادی کی بات کی تھی؟"

"جی ہاں' سرسری سی بات ہوئی تھی لیکن یہ بات مسٹر بوکارلو نے ہی چھیڑی تھی۔"

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"میں آپ سے بات کرنا ہی چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے بوکارلو نے خود آپ سے بات کر لی۔ یقیناً آپ کو برا لگا ہوگا کہ میں نے آپ سے حتمی اجازت لیے بغیر بوکارلو سے اس موضوع پر گفتگو کی۔ مگر میں نے آپ کو بتایا ہے نا۔ کہ یہ بات بوکارلو نے خود ہی چھیڑ دی تھی۔"

صفدر کی وضاحت ناکافی تھی تاہم میں نے اس موقع پر مزید سوال جواب مناسب نہیں سمجھے۔ میں نے بیڑی کا ایک کش لیا اور موضوع بدلتے ہوئے کہا "اچھا اس رسم کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے' جس کا ذکر بوکارلو نے کیا ہے؟"

"بڑی عجیب سی رسم ہے۔"

"صرف عجیب سی؟"

"کیا مطلب؟"

"بھئی میرے خیال میں تو یہ ایک وحشیانہ رسم ہے۔ جنگل میں چھوڑی گئی سیدھی سادی لڑکیوں کو پکڑنا' پھر ان کی مشکیں کسنا اور ان سے بدسلوکی کرنا' یہ وحشیانہ نہیں تو اور کیا ہے۔"

"بدسلوکی کا آپ سے کس نے کہا ہے؟"

"خود بوکارلو نے بتایا ہے مجھے۔"

"میرا خیال ہے کہ بوکارلو۔۔۔ آپ کو ٹھیک سے بتا نہیں پایا۔ صوفیہ نے مجھ سے کافی تفصیلی بات کی تھی۔ اس نے تو کہیں بدسلوکی کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا اس نے کہ لڑکیوں کو پکڑنا ہے اور انہیں باندھ کر بستی میں واپس لانا ہے۔" صفدر بڑے یقین کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

"میرا خیال تم سے مختلف ہے صفدر۔ صوفیہ بہرحال لڑکی ہے۔ شاید وہ تم سے کھل کر بات نہیں کر سکی۔ بوکارلو نے مجھ سے وضاحت کے ساتھ بات کی ہے۔ جن لڑکیوں کو تم "غلام لڑکیاں" کہہ رہے ہو' وہ دراصل وہی سیدھی سادی بے زبان لڑکیاں ہیں جنہیں یہاں "بوب دوشیزائیں" کہا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں صرف مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے پالی جاتی ہیں۔ بوما کے سامنے ایسی ہی دو لڑکیوں کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔ بوکارلو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے مطابق تم دو بوب لڑکیوں کی عزت لوٹو گے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے انہیں بستی میں پیش کر دو گے۔"

صفدر کی آنکھوں میں بے چینی اور کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا "گستاخی معاف جناب۔۔۔ مجھے لگتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ شرط صرف لڑکیوں کو پکڑنے کی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ وہ حرکت بھی کر گزرتے ہوں جو آپ نے بتائی ہے لیکن ایسا کرنا شرط نہیں ہوگا۔"

"مجھے اپنی بات دہرانی پڑ رہی ہے صفدر۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ صوفیہ تم سے کھل کر بات نہیں کر سکی ہے۔ اصل بات وہی ہے جو تمہیں میں بتا رہا ہوں۔ اگر تم غور کرو تو تمہیں فوراً ہی سمجھ آ جائے گی۔ آخر لڑکیوں کو پکڑنے کے بعد سردار کی بیوی کے سامنے پیش کرنے کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔"

میں کافی دیر تک صفدر کو اس گفتگو کی تفصیل بتاتا رہا جو کچھ دیر پہلے میرے اور بوکارلو کے درمیان ہوئی تھی۔ صفدر کچھ خاموش خاموش نظر آنے لگا۔

اگلے روز علی الصباح بوکارلو ہمارے جھونپڑے پر پہنچا۔ اس کے ساتھ دو حبشی گھڑ سوار تھے۔ ایک خالی گھوڑا ان گھڑ سواروں کے عقب میں کھڑا تھا۔ بوکارلو نے صفدر سے کہا کہ اسے ان گھڑ سواروں کے ساتھ جانا ہے۔

"گستاخی معاف' مجھے کہاں جانا ہوگا؟" صفدر نے پوچھا۔

"بس تھوڑی سی سیر و تفریح کرانی ہے تمہیں۔ جھیل کے شمال میں جو جنگل ہے وہاں کچھ دیر گھوم پھر کر واپس آجاؤ گے۔ اس تفریح کا مستقبل قریب میں بہت فائدہ ہوگا تمہیں۔" بوکارلو کا لہجہ معنی خیز تھا۔

اب بوکارلو کی بات صفدر کے ساتھ ساتھ میری سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ بوکارلو کی بات کا تعلق اسی گھناؤنی روایت سے تھا جس کا "ذکر خیر" کل بوکارلو نے کیا تھا۔ صفدر کو وہ لوکیشن دکھائی جا رہی تھی جہاں اس نے چاندنی رات میں بوب لڑکیوں کا پیچھا کرنا تھا اور انہیں پکڑنا تھا۔ صفدر عجیب کشمکش میں نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بہت کچھ جاننے کے باوجود کچھ بھی کہہ نہیں پا رہا۔ اس نے ایک دو بار الجھن آمیز نظروں سے میری طرف بھی دیکھا۔ بوکارلو نے صفدر کو گھڑ سواروں کے ہمراہ رخصت کر دیا اور مجھے یہ بتا کر کہ صفدر شام سے پہلے واپس آجائے گا بوما (عبادت گاہ) کی طرف چلا گیا۔ اس کا ہاتھ مسلسل پٹی میں جکڑا رہتا تھا اور اس میں سے تیز دوا کی بو اٹھتی رہتی تھی۔ بوکارلو کے زخم کے بارے میں ہم نے جو کچھ سنا تھا' وہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ بہترین علاج معالجے کے باوجود زخم جوں کا توں موجود تھا۔

صفدر کے جانے کے بعد میں جھونپڑے میں اکیلا رہ گیا۔ تاہم میری تنہائی ایک نسوانی وجود نے جلد ہی ختم کر دی۔ یہ وجود ویرا کا تھا۔ وہ سفید لباس میں تھی' بال بیشہ کی طرح شانوں پر بکھرے تھے۔ چند روز پہلے جو زردی اور غیر معمولی نقاہت میں نے اس کے چہرے پر دیکھی تھی وہ خاصی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اس کی کلائی پر ایک چھوٹی سی پٹی موجود تھی۔ یہ پٹی اس زخم کی نشانی تھی جو چند روز پیشتر ویرا نے خود اپنی کلائی پر لگایا تھا اور جس نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ کر اسے قریب المرگ کر دیا تھا۔ وہ بہت شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔

میں جانتی ہوں کہ میری وجہ سے آپ دونوں کو اور خاص طور سے آپ کو بہت تکلیف پہنچی ہے۔ میرا رویہ آپ کے لیے مسلسل غم و غصے کا سبب بن رہا ہے۔"

"غم و غصے کا تو نہیں۔۔۔ ہاں تم "غم" کا کہہ سکتی ہو۔" میں نے کہا "یہ زندگی ہمارے پاس قدرت کی امانت ہے۔ اسے یوں بددل ہو کر گنوانے کی کوشش کرنا کسی طور بھی دانش مندی نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی کتنی بھی تلخ کیوں نہ ہو اور کتنی بھی کٹھن ہو بہرحال قدرت کا انعام ہوتی ہے۔"

وہ بدستور سر جھکائے جھکائے بولی "میں نے کہا ہے نا۔۔ کہ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

میں نے اس کے لب و لہجے پر غور کیا۔ یہ اس بچے کا سا لہجہ تھا' جو اپنی غلطی تسلیم تو کر رہا ہو مگر آئندہ غلطی سے اجتناب کرنے کا وعدہ نہ کر رہا ہو۔ یعنی اسے خود بھی یقین نہ ہو کہ وہ آئندہ اس غلطی سے پرہیز کر سکے گا۔ یہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور محض بن جانے والے ایک شخص کا لہجہ تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ اس کی باتوں میں مٹھاس بھی اور محبت کی خوشبو بھی۔ وہ محبت جو صفدر کے لیے تھی اور جو کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح اچانک ویرا کے اندر جاگ کر اس کی پوری ہستی پر چھا گئی تھی۔ وہ اپنی خوش اخلاقی اور شیریں بیانی سے مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی' یقیناً اس کی وجہ یہ تھی کہ میں صفدر کا دوست تھا' میری نظروں میں اپنا مقام بنا کر وہ درحقیقت صفدر کی نظروں میں ہی مقام بنا رہی تھی۔ گفتگو کے دوران میں ہی اس نے ایک ناقدانہ نگاہ جھونپڑے کے طول و عرض پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے ویرا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں کی حالت کتنی ابتر ہو رہی ہے۔ کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہیں ہے۔ میں ذرا چیزوں کو سنبھال دوں۔"

"ارے رے کیا کر رہی ہو۔" میں نے اٹھ کر اسے روکا "بھئی' تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔ کنگ براؤن' بوکارلو اور رچین جیسے محترم لوگوں کی بھتیجی ہو۔ ہم بے حیثیت لوگ تم سے خدمت کروانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیوں ہمارا تماشا بنانے کا ارادہ کر رہی ہو۔"

"اگر آپ بھی ایسی باتیں کریں گے تو پھر آپ میں اور ٹرسٹ والوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ وہ بھی انسانوں کو طبقوں میں بانٹتے ہیں آپ بھی طبقوں میں بانٹ رہے ہیں۔"

میں نے بڑی مشکل سے ویرا کو سمجھایا اور اس ارادے

سے باز رکھا جسے وہ عملی جامہ پہنانے جا رہی تھی۔ اسی دوران میں صوفیہ جھونپڑے میں پہنچ گئی اور ویرا کو اپنے ساتھ لے گئی۔ میں بھی باہر نکل کر جھیل پر پہنچ گیا اور کنارے کنارے چلتا شمال کی جانب بڑھنے لگا۔ جھیل کے اندر چند منچلے افراد ڈونگوں کی ریس لگا رہے تھے۔ ہر ڈونگے میں دو افراد تھے اور انتہائی تیزی سے چپو چلا رہے تھے' ڈونگوں کی تعداد آٹھ کے قریب تھی۔ کنارے پر کھڑی خواتین اپنے مردوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کا طریقہ عجیب و غریب تھا۔ وہ ایک ایک ٹانگ پر اچھل رہی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں کھجور کی بڑی بڑی شاخیں تھیں جنہیں وہ لہرا رہی تھیں۔

میں اس منظر کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کچھ آگے درختوں کے درمیان مجھے گھڑ سواروں کی سرگرمی نظر آئی۔ میں نے کئی تنگ دھڑنگ گھڑ سواروں کے ہاتھ میں نیزے دیکھے' لیکن حیرت کی بات تھی کہ ان نیزوں کے پھل لوہے کے بجائے لکڑی کے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی "فوجی مشق" قسم کی کارروائی ہو رہی ہے۔ میں نے آگے جانا چاہا مگر مسلح گھڑ سواروں نے مؤدب انداز میں مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ میں وہیں جھیل کے قریب بیٹھ گیا اور جو کچھ دکھائی دے رہا تھا اسی پر اکتفا کرنے لگا۔ درختوں کے اندر سے گاہے گاہے نعروں کی صدا آتی تھی۔ کسی وقت کوئی گھڑ سوار ٹولی برق رفتاری سے نمودار ہوتی اور دوبارہ درختوں میں اوجھل ہو جاتی۔ اس جنگی مشق کے دوران میں مجھے چند گھڑ سوار بچے بھی نیزے لہراتے نظر آئے۔ ان بچوں کو دیکھ کر نجانے کیوں میرا ذہن خواہ مخواہ ماسٹر استی کی طرف چلا گیا۔ شیطان ابن شیطان کے حیرت انگیز روز و شب میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ دیگر برائیوں کے علاوہ اسے نوعمری میں ہی جنسی کھیل کھیلنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ اس نے بلوغت کی سرحد پر پہنچ کر کیا کیا گل کھلانے ہیں۔ میں سوچتا رہا اور عسکری تماشا دیکھتا رہا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ اس عسکری سرگرمی کی بنیادی وجہ وہی تناؤ ہے جو ٹرسٹ کے ساتھ کشمکش کی وجہ سے بستی میں پایا جاتا ہے۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ ٹرسٹ والے جلد یا بدیر قبیلے والوں کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر آمادہ کر رہے تھے۔ میں دوپہر کے بعد تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب گرمی زیادہ ہو گئی اور درختوں کے سائے سمٹ سمٹا کر ناچیز بن گئے تو میں واپس جھونپڑے میں آگیا۔ جھونپڑے میں داخل ہوتے ہی مجھے

انوار علیگی کے قلم سے ایک وحشت ناک ناول
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
● سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی نمرہا کی داستان حیرت۔
● سانپوں کا شہزادہ رنسارد ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
● عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
● سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنسارد کا طلسم توڑ دیا۔
● سیّد بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔
قیمت [illegible] روپے | محصول ڈاک 30 روپے
بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 7247414
اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال۔ لاہور

اندازہ ہوگیا کہ ویرا اپنی مرضی کر کے رہی ہے۔ جھونپڑا آئینہ بنا ہوا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ میرے اور صفدر کے استعمال کی اشیا بڑے قرینے سے رکھی گئی تھیں۔ ہمارے کچھ کپڑے وہ دھلانے کے لیے ساتھ لے گئی تھی۔ ایک طرف تپائی پر طشت میں کچھ رکھا تھا جسے خوان پوش سے ڈھانپا گیا تھا۔ میں نے خوان پوش اٹھایا۔ یہ ویسی ہی کھیر تھی جیسی کچھ دن پیشتر صوفیہ نے خود پکا کر ہمیں کھلائی تھی۔ اس مرتبہ کھیر پہلے سے بہتر اور خوش نما نظر آ رہی تھی۔

صفدر کی واپسی شام سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج اس سے ویرا کے متعلق کھل کر بات کروں۔ ویرا کے ارادے تو اب کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ وہ صفدر کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ تھی (اور دو مرتبہ بازی لگا بھی چکی تھی) دوسری طرف صفدر بھی اب ڈانواں ڈول نظر آ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ماحول کا اسیر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ویرا اور بوکارلو اس سے نہایت ہی ناقابل قبول رسموں کی ادائیگی چاہ رہے ہیں' وہ اس شادی پر رضامند نظر آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے صفدر سے پوچھا "آج کہاں گھومتے رہے؟"

وہ بولا "وہی پروگرام تھا جس کا ذکر صبح بوکارلو صاحب نے کیا تھا۔ جھیل کے شمال کی طرف کافی گھنا جنگل تھا۔ تیس چالیس ایکڑ رقبہ تو ہوگا۔ بس اسی جنگل میں گھومتے پھرتے رہے۔ جنگل کے اندر سے ایک نالا بھی گزرتا ہے۔ اس پر لکڑی کے دو عارضی سے پل بنے ہوئے ہیں۔"

میں نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا "رسم کے بارے میں کیا پتا چلا۔ کیا لڑکیوں سے بدسلوکی کی شرط موجود ہے؟"

"میں کنفرم نہیں کرسکا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات ہے نہیں۔"

میں جھنجلا گیا "یار! تم کیا بات کر رہے ہو۔ ایک نہایت سنگین مسئلہ تمہارے سامنے ہے' اور تم ابھی تک اس مسئلے کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کرسکے۔"

صفدر کے چہرے پر شرمندگی کی لہری آ کر گزر گئی "آئی ایم سوری شاہ جہاں صاحب۔" اس نے کہا۔

نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ صفدر دیکھتے ہی دیکھتے بہت زیادہ تبدیل ہوگیا ہے۔ کوئی چیز اچانک اس کے مزاج میں شامل ہوگئی ہے یا نکل گئی ہے۔ میں نے کہا "صفدر' اگر ویرا سے شادی کے لیے تمہیں واقعی اس رسم کا سامنا کرنا پڑا تو پھر؟"

وہ کچھ نہیں بولا "کیا بات ہے خاموش کیوں ہوگئے ہو؟"

میں نے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے بیڑی کا دھواں فضا میں چھوڑا اور دکھ بھرے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! یہ بات تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کنگ براؤن کے پنجے سے نکلنا ہمارے لیے آسان نہیں۔ بے شک ہم ٹرسٹ سے باہر ہیں لیکن یہ انہونی کنگ کی مہربانی سے ہوئی ہے۔ ہم اپنی مرضی سے مدت تک بھی سر پٹختے رہتے تو اس قید خانے سے باہر نہ نکل سکتے۔ اب ہمارا باہر ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے کیونکہ ہمارے ساتھی کنگ کے قبضے میں ہیں۔ خود کو اس نہایت خوفناک جال سے نکالنے کے لیے ہمیں ابھی پتا نہیں کہ کتنے ناپسندیدہ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ جس رسم کی آپ بات کر رہے ہیں اس کو ادا کرنا بھی میرے لیے ایک ناپسندیدہ فیصلہ ہے اگر آپ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اگر تمہیں بوب لڑکیوں کے ساتھ زبردستی کرنی پڑی تو تم کرو گے؟"

وہ ذرا توقف سے بولا "آپ نے بتایا تھا کہ رسم کے بعد ان لڑکیوں کو آزاد کردیا جاتا ہے کیونکہ اپنی دوشیزگی کھونے کے بعد وہ دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے کے قابل نہیں رہتیں۔ اگر۔۔۔ اگر اس پہلو سے سوچا جائے تو پھر اس "بد رسم" سے خیر کی ایک شکل بھی نکلتی ہے۔ ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے جناب کہ اگر لڑکیوں سے بدسلوکی والی بات درست بھی ہے تو ان بے زبان لڑکیوں کے لیے اس میں زندگی کا پیغام چھپا ہوا ہے۔ ویسے میں نے۔۔۔"

"بس ٹھیک ہے۔ جو تم کہہ رہے ہو وہی ٹھیک ہوگا۔"

میں نے اس کی بات کاٹی اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

میرا دماغ ہانڈی کے مانند کھول رہا تھا۔ یہ وہ صفدر نہیں تھا جسے میں برسوں سے جانتا تھا۔ وہ عزتیں برباد کرنے والا صفدر نہیں تھا' وہ تو کسی بہن بیٹی کو میلی نگاہ سے بچانے کے لیے جان قربان کرسکتا تھا۔ اس کے منہ سے ایسی بات کیسے نکل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں دو تین دن سے جو شک پروان چڑھ رہا تھا وہ ایک دم ہی نہایت توانا ہو کر یقین کا روپ دھارنے لگا تھا۔ صفدر کے ساتھ یقیناً کچھ ہوچکا تھا۔ ہم ایک ایسے قبیلے میں تھے جو اپنی پراسراریت کی وجہ سے ماریطانیہ میں مشہور تھا۔ یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ اس قبیلے کا ہر فرد اپنے اندر ایک جدا قسم کی روحانی قوت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس روحانی قوت کے چند حیران کن مظاہرے ہم ٹرسٹ کے اندر بوکارلو کی وساطت سے دیکھ چکے تھے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے سامنے کچھ انسانوں اور جانوروں کے مزاج اور

رویے کو یوں تبدیل کیا تھا کہ ہم سناٹے میں رہ گئے تھے۔ کہیں میرے یا صفدر کے ساتھ بھی تو کوئی ایسی ہی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔

عام حالات میں شاید اس قسم کا اندیشہ میرے ذہن میں نہ آتا اور اگر آتا بھی تو میں اسے فوراً رد کردیتا مگر ٹرسٹ میں بوکارلو کا حیران کن مظاہرہ دیکھنے کے بعد ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ اس مظاہرے کا ہر ہر منظر میرے ذہن پر نقش تھا۔ اپنے مظاہرے کے دوران میں بوکارلو صرف بیس تیس منٹ کے لیے "بیک اسٹیج" پر گیا تھا' اسی دوران میں اس نے اپنے تمام معمول (جانور اور انسان) ٹرانس میں لے لیے تھے اور پھر جب وہ دوبارہ اسٹیج پر آئے تھے تو انہوں نے قطعی مختلف ردعمل دکھایا تھا۔ کہیں صفدر کا یہ حیران کن حد تک بدلا ہوا رویہ بھی بوکارلو یا اس جیسے کسی اور شخص کے عملیات کا کرشمہ تو نہیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا اور گونج بن کر پورے جسم میں پھیل گیا۔

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ صفدر کا سامنا کروں۔ ذہن عجیب سی الجھن میں گھرا ہوا تھا۔ صبح سویرے ہی میں جھونپڑے سے نکل گیا۔ سارا دن جھیل کے کنارے جنگل میں گھومتا رہا' پھر اس دیوار سے باہر چلا گیا جو بستی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ اس فصیل نما دیوار میں آمدورفت کے لیے دو راستے موجود تھے۔ یہاں سے مکمل شناخت اور تلاشی وغیرہ کے بعد ہی گزرا جاسکتا تھا۔ کچھ دن پہلے مجھے اور صفدر کو اس فصیل سے باہر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یہاں مویشیوں کے گلے کڑی دھوپ میں گھوم پھر رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیت بھی نظر آتے تھے۔ کھیتوں سے آگے جنگلات کا سلسلہ تھا۔ اس جانب سے بستی پر حملہ آور ہونا آسان نہیں تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی قریباً دس فٹ اونچی باڑ تھی۔ اس کے بعد گارے مٹی سے بنائی گئی مضبوط دیوار تھی۔ یہ دونوں رکاوٹیں' بیرونی دشمن کے علاوہ جنگلی جانوروں وغیرہ سے بھی بستی کی حفاظت کرتی تھیں۔۔۔ شام کے وقت میں بستی میں واپس آگیا۔ بستی میں تناؤ اور خطرے کی فضا بدستور موجود تھی۔ اس تناؤ اور خطرے کا تعلق کنگ براؤن اور اس کے ممکنہ حملے سے تھا۔

بستی میں آکر بھی میرا جھونپڑے میں جانے کو دل نہیں چاہا۔ میں جھیل کے کنارے بیٹھ گیا اور شفق رنگ شام کو شب کے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد صفدر بھی وہاں آگیا۔

اسے میری دلی کیفیت کا کچھ کچھ اندازہ ہوچکا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن کل رات والے موضوع پر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی اس تکلیف دہ تذکرے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک بات نوٹ کی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے صفدر نے دو تین بار گھڑی دیکھی۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ مضطرب بھی ہے "کیا کہیں جانا ہے؟" میں نے ذرا معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کیوں' آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"بس یونہی۔ مجھے لگا تھا جیسے تم کہیں جانا چاہ رہے ہو۔"

"بس جھونپڑے میں جانا چاہ رہا تھا۔ یہاں مچھر بہت بھنبھنانے لگا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں ابھی آجاتا ہوں۔"

"آپ صبح سے نکلے ہوئے ہیں۔ اب پھر مجھے جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کچھ ناراض ہیں۔"

"تم جاؤ میں ابھی آجاتا ہوں۔ وہاں حبس ہوگا۔ مجھے یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔"

مجبوراً صفدر کو بھی بیٹھنا پڑا۔ تاہم میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا دھیان جھونپڑے کی طرف ہی ہے۔

میں نے سوچا شاید صوفیہ کے ہاتھ ویرا کا کوئی پیغام وغیرہ آنے والا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں جھونپڑے میں واپس آگئے۔ کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد بیڑی وغیرہ پینے لگے۔ صفدر ڈائریکٹ تو بات نہیں کر رہا تھا تاہم باتوں باتوں میں مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' دو وجوہات کے سبب کر رہا ہے۔ ایک تو وہ ویرا کی زندگی بچانا چاہتا ہے۔ دوسرے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس راستے پر چل کر وہ ہم سب کے لیے کچھ آسانیاں تلاش کرسکے گا۔ میں صفدر سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیونکہ فی الوقت مجھے اس کی کچھ بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

نیند کا بہانہ کر کے میں بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک چیخ و پکار کی آواز آئی۔ اس کے بعد یکایک فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے لپک کر کھڑکی میں سے دیکھا' جھیل کے کنارے عین اس جگہ پر شعلے سے تڑپ رہے تھے جہاں کھانے سے پیشتر میں اور صفدر بیٹھے تھے۔ یہ دو طرفہ فائرنگ کے شعلے تھے۔ بھٹکی ہوئی کوئی گولی ہماری خیر خیریت بھی دریافت کرسکتی تھی۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ صفدر بستر سے اٹھ گیا تھا اور اب میری ہی طرح گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ ایک دو چیخیں سنائی دیں اور فائرنگ رک گئی۔ میں اور صفدر جھونپڑے سے نکل

آ گئے۔ بہت سے لوگ جھونپڑوں سے نکل نکل کر جھیل کے کنارے جمع ہو رہے تھے۔ یہاں مشعلوں کی روشنی میں میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ تین افراد غوطہ خوری کے مخصوص لباس میں یہاں موجود تھے۔ ایک شخص زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس کے پیٹ اور گردن پر گولی لگی تھی اور پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ غوطہ خور بحرِ اجل میں ابدی غوطہ لگا چکا ہے۔ ایک مقامی عورت بھی خون میں لت پت ریت پر پڑی تھی۔ یہ عورت انہی جنگ جو خواتین میں سے تھی' جو اس قبیلے کی فوج کا اہم حصہ تھیں اور جوری نامی گرانڈیل عورت جن کی سالار تھی۔ جنگ جو عورت کے سر میں گولی لگی تھی اور اس کے سر سے بہنے والا خون ریت پر ایک بڑے دھبے کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ غوطہ خوری کے لباس میں ملبوس افراد کی صورتیں دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ ان کا تعلق ماربا ٹرسٹ سے ہے۔ ان میں سے دو سفید فام تھے اور دو نیگرو۔ ہلاک ہونے والا نیگروز میں سے ایک تھا۔ مجھے زمین پر ایک M4 رائفل بھی پڑی دکھائی دی۔ چھوٹی نال کی نیلی اسکوپ کندے والی ایسی رائفلیں میں نے ٹرسٹ میں اکثر دیکھی تھیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کئی مقامی افراد غوطہ خوروں پر پل پڑے۔ وہ انہیں گھونسوں ٹھوکروں اور رائفل کے کندوں سے مارنے لگے۔ پلک جھپکتے میں غوطہ خوروں کے لباس پھٹ گئے۔ ان کی مخصوص عینکیں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ ایک غوطہ خور کی پشت پر موجود آکسیجن کا سلنڈر پشت سے علیحدہ ہوا اور ریت پر دور تک لڑھک گیا۔ مارنے والے بڑے غضب میں تھے' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان میں سے زیادہ تر افراد کا تعلق ہلاک ہونے والی عورت سے تھا۔ جلد ہی مار کھانے والے چیخنے لگے۔ ان کی چیخوں سے معلوم ہوا کہ ان میں ایک عورت ہے۔ اپنے ساتھیوں کی طرح وہ بھی ریت پر تڑپ رہی تھی اور جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ یہ نازک صورت حال تھی۔ اخلاق کا تقاضا تھا کہ ہم پٹنے والوں کو ہجوم کے غضب سے بچانے کی کوشش کریں مگر ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہماری اس کاوش کا رد عمل کتنا مثبت یا کتنا منفی ہو گا۔ عین ممکن تھا کہ سیاہ فام قبائلیوں کے غیظ و غضب کا رخ ہماری ہی طرف مڑ جاتا۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ایک بارعب آواز نے مشتعل لوگوں کو چونکا دیا۔ یہ آواز بوکارلو کی تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے کی طرف سے بڑی تیزی کے ساتھ موقع کی طرف آیا تھا۔ اس کا کھلا لبادہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور ہاتھ میں ایک عصا نما لاٹھی تھی۔ اس نے بڑے تند و تیز لہجے میں ہجوم سے کچھ کہا اور لوگ کائی کی طرح پھٹنے لگے۔ بوکارلو کے عقب میں بستی کا بڑا معالج موموبھی تھا۔ بوکارلو اور موموان افراد کی طرف بڑھے جنہیں ہجوم نے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ بہت سے مسلح افراد نے جن کا تعلق قبیلے کی فوج سے تھا زخمیوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ مشعلوں کی روشنی زخمیوں پر مرکوز ہو گئی تھی۔ واقعی انہیں بہت بری طرح پیٹا گیا تھا۔ ان میں سے ایک سفید فام کی پیشانی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے بہتا ہوا خون دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا آخری دموں پر ہے۔ لڑکی کا نہ صرف غوطہ خوری کا لباس پھٹ گیا تھا بلکہ اس کا اصل لباس بھی تار تار ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے گرد چیتھڑے لپیٹے ہوئے ہیں۔ اس کا بالائی جسم بالکل عریاں ہو گیا تھا اور وہ اپنے بازوؤں سے اپنی عریانی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر جب وہ دو قدم چلی تو اس کا زیریں جسم بھی عریاں ہونے لگا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ زیریں جسم کو چھپانے کے لیے بالائی جسم سے ہٹا لیا۔ یوں وہ بے بسی کی تصویر نظر آنے لگی۔ بوکارلو جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے اپنے لبادے کا بالائی حصہ لڑکی کو ستر پوشی کے لیے دے دیا۔ زندہ بچ جانے والے مرد اور عورت کو بوکارلو اپنی نگرانی میں ٹوما کی طرف لے گیا۔ ان لوگوں کے پیچھے ہی پیچھے دیگر معززین بھی ٹوما کی طرف چلے گئے۔ زبردست مارپیٹ کے دوران میں جس شخص کی پیشانی کی ہڈی ٹوٹی تھی' وہ بھی بس ایک دو منٹ میں چل بسا۔ مسلح قبائلی ان تینوں لاشوں کو وہاں سے ہٹانے میں لگ گئے۔

اسی اثنا میں میں نے صوفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی غوطہ خوری کا ایک لباس نظر آ رہا تھا۔ ساتھ میں ماسک اور چھوٹا سا سلنڈر بھی تھا' وہ یہ اشیا لے کر ٹوما (عبادت گاہ) کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ کیا سلسلہ ہے؟"

اس نے اشارے سے کہا کہ ابھی واپس آ کر بتاتی ہوں۔

وہ چند منٹ بعد لوٹ آئی۔ میں نے صوفیہ سے اس خوفناک ہنگامے کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا "یہ ٹرسٹ کے لوگ ہیں۔ بڑی سازش کے ساتھ یہ لوگ بستی کے اندر پہنچے ہیں۔ ان کو پتا تھا کہ جھیل پر رات کے وقت بھی نگرانی کا انتظام ہے۔ یہ لوگ "ڈائیونگ سوٹس" پہن کر پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے ارادے

یقینی طور پر خطرناک تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انتہائی تربیت یافتہ ہیں اور ان کا مقصد مس ویرا کو یہاں سے لے جانا تھا۔ یہ پانچواں "ڈائیونگ سوٹ" جو ابھی آپ نے میرے ہاتھ میں دیکھا ہے انہی لوگوں کے سامان میں موجود تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوٹ مس ویرا کو پہنایا جانا تھا۔"

"اگر یہ واقعی ٹرسٹ کے لوگ ہیں تو پھر لازماً صورت حال اور کشیدہ ہو جائے گی۔ ان میں سے دو بندے مر بھی گئے ہیں۔"

"ایک عورت قبیلے کی بھی مری ہے۔" صوفیہ نے کہا "اسے واٹر پروف ٹائپ M4 رائفل کی گولی لگی ہے۔ ایسی رائفلیں ان چاروں افراد کے پاس موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سے دو واکی ٹاکی بھی ملے ہیں۔ ایک واکی ٹاکی تو خاصی طاقت ور رینج کا ہے' میں نے خود دیکھا ہے۔ ایک شخص کے پاس سے کلوروفارم کا اسپرے بھی برآمد ہوا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ اسپرے مس ویرا پر استعمال ہونا ہو۔"

"گویا یہ لوگ کافی منصوبہ بندی کے ساتھ پہنچے تھے۔"

"یہ تو صاف ظاہر ہے۔"

"اس کے باوجود پکڑے گئے۔" میں نے کہا۔

"یوں لگتا ہے کہ یہ مخبری وغیرہ کا شکار ہوئے ہیں۔" صوفیہ نے پر سوچ لہجے میں کہا "ہو سکتا ہے کہ اس شان دار منصوبے کی بھنک کسی طور سردار بوغات یا نائب سردار لارو ناپے تک پہنچ گئی ہو۔"

"تم یہ بات کیوں کہہ رہی ہو؟"

"میں نے کوئی ایک گھنٹا پہلے نائب سردار کے جھونپڑے میں مسلح افراد کی سرگرمی دیکھی تھی۔ نائب سردار لارو ناپے ان افراد کو بڑی رازداری کے ساتھ کچھ سمجھا رہا تھا اور انہیں ایمونیشن وغیرہ فراہم کر رہا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ٹرسٹ والوں کی طرف سے ایسی خطرناک حرکت ہونے والی ہے اور جھیل میں سے غوطہ خور برآمد ہونے والے ہیں۔"

بالکل اچانک میرے دماغ میں ایک بات آئی اور میں سر تا پا ہل گیا۔ میں نے صفدر کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ صوفیہ کو خدا حافظ کہہ کر میں جھونپڑے میں آ گیا' صفدر وہاں بھی نہیں تھا۔ میرے اندر عجیب سی بے قراری بھر گئی تھی۔ میں پشت پر ہاتھ باندھ کر جھونپڑے کے اندر ہی ٹہلنے لگا۔ دماغ میں جیسے ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں اور صفدر جھیل کے کنارے بیٹھے تھے۔ اس دوران میں صفدر مجھے سخت مضطرب نظر آیا تھا۔ اس نے کئی بار گھڑی پر نگاہ دوڑائی تھی۔ وہ مجھے کنارے سے اٹھا کر جھونپڑے میں لانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم جھونپڑے میں آ گئے تھے۔ بعد ازاں عین اسی جگہ پر جہاں ہم بیٹھے رہے تھے خون ریز فائرنگ ہوئی تھی۔ اس فائرنگ میں اور دست بدست لڑائی میں تین افراد ہلاک اور تین چار زخمی ہوئے تھے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں شک ابھر رہا تھا کہ صفدر اس خون ریز واقعے کے بارے میں پیشگی آگاہی رکھتا تھا۔

اگر ایسا ہوا تھا تو کیسے ہوا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ صفدر کے ساتھ ٹرسٹ والوں نے رابطہ قائم کیا ہو اور صفدر نے مجھے اس رابطے سے بے خبر رکھا ہو۔ میں نے اس معاملے پر تھوڑا سا غور و فکر کیا تو اس حوالے سے میرا شک پختہ ہونے لگا۔ ہو سکتا تھا کہ مائیکل نے ٹرانس میٹر (TRANSMITTER) پر صفدر کو غوطہ خوروں کی کارروائی کے بارے میں پیشگی اطلاع دے دی ہو اور اس سلسلے میں صفدر سے کسی طرح کا تعاون بھی چاہا ہو۔ صفدر نے مجھے نہ صرف اس سارے معاملے سے بے خبر رکھا ہو بلکہ ویرا کو یا بوکارلو کو اس کارروائی کی خبر کر دی ہو۔ وہ ان دنوں جس طرح ویرا اور بوکارلو وغیرہ کی طرف جھکا ہوا تھا اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ صفدر زندگی میں کسی موقع پر اس قسم کا رویہ بھی اپنائے گا۔ جب میں ذرا گہرائی میں جا کر سوچتا تھا' تو میرے دماغ میں یہ بات آتی تھی کہ صفدر کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پچھلے چند دنوں میں نفسیاتی طور پر زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہے' اور اپنے رویے پر اس کا اختیار نہیں ہے۔ وہ ان دنوں کثرت سے شراب نوشی بھی کر رہا تھا۔

پوری بستی میں ہلچل نظر آ رہی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن ہو گئی تھیں اور لوگ ان کی روشنی میں کھڑے ڈری ڈری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کہیں دور سے رونے پیٹنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' ان آوازوں کا تعلق' اس عورت کی موت سے تھا جو حملہ آوروں کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔ تھوڑی دیر بعد صفدر بھی جھونپڑے میں پہنچ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟" میں نے پوچھا۔

"ٹوما کی طرف گیا تھا۔ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ بوکارلو صاحب پکڑے جانے والوں سے کیا سلوک کرتے ہیں' لیکن ٹوما کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا ہے۔"

اچانک میری نگاہ صفدر کے پاؤں کی طرف گئی۔ وہاں جوگرز کے بجائے سیاہ رنگ کی قبائلی جوتی نظر آرہی تھی۔ اس کی شکل چپل سے ملتی جلتی تھی "تمہارے بوٹ کہاں ہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

صفدر کے چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ ایک گہری سانس لے کر وہ میرے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ذرا توقف سے بولا "میں خود بھی آپ سے یہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ دراصل۔۔۔ دراصل وہ جوگرز۔۔۔ میں نے۔۔۔ نائب سردار لاروناب کے حوالے کر دیے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا "یہ کیا بات کر رہے ہو صفدر؟"

"جی ہاں۔" اس نے ایک اور گہری سانس لی اور نڈھال سا ہو کر دیوار سے ٹیک لگائی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ بکھرے بالوں' بڑھی ہوئی شیو اور متورم آنکھوں کے ساتھ وہ ایک دم آزردہ بیزار نظر آرہا تھا۔ اس کی سانسوں میں الکحل کی بو بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

"یار! تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آرہی۔" میں نے جھلا کر کہا۔

وہ بولا "میں آپ کی پریشانی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب! میں واقعی آپ کو پریشان کر رہا ہوں۔ دراصل یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے فوری طور پر فیصلہ کرنا پڑا میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا لیکن آپ علی الصباح ہی کہیں نکل گئے تھے۔ میں نے سہ پہر تک آپ کا انتظار کیا' اس کے بعد مجھے مجبوراً قدم اٹھانا پڑا۔ شام کو جب آپ واپس آئے تو میں نے آپ کو بتانا چاہا مگر کوشش کے باوجود مجھے ہمت نہیں ہو سکی۔"

"کیا بتانا چاہتے تھے تم۔ کیا نہیں بتایا تم نے؟"

صفدر نے اٹھ کر جھونپڑے کا دروازہ بند کیا اور ذرا دھیمی آواز میں بولا "آج صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ جوگر کے ٹرانس ہمٹر پر مجھے مائیکل کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ٹرسٹ میں ویرا کو یہاں سے واپس لے جانے کی منصوبہ بندی ہوئی ہے۔ اس نے ساری منصوبہ بندی سے مجھے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ چار کمانڈوز کو بستی تک پہنچانے کے لیے جھیل کا راستہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ کمانڈوز جن میں ایک لڑکی بھی تھی' غوطہ خوری کے مکمل لباس میں جھیل کے اندر تیرتے ہوئے بستی میں پہنچنے والے تھے۔ مائیکل نے ہم دونوں کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ ہم ان کمانڈوز کو اس جھونپڑے تک پہنچائیں گے جہاں ویرا مقیم ہے۔ اس کے بعد کی ساری کارروائی ان چاروں کمانڈوز نے خود ہی کرنا تھی۔ یہ کال موصول کرنے کے بعد میں دو تین گھنٹے سخت بے چینی میں رہا' میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ دوسری طرف آپ کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں آپ کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا اور شام تک ڈھونڈتا رہا۔ آخر میں نے شام کے وقت ساری صورت حال سے محترم بوکارلو کو آگاہ کر دیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت میں ڈوب کر پوچھا "کیا بتایا تم نے؟"

"تقریباً سب کچھ۔" صفدر نے مجھ سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔

"یعنی ٹرانس ہمٹر اور ٹرسٹ سے رابطے کے بارے میں بھی؟"

"جی ہاں' اس بارے میں بھی۔ وہ جوگرز میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نائب سردار لاروناب کے حوالے کیے ہیں۔ جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے مجھے معلوم تھا کہ آپ مجھ سے جوگرز کے بارے میں پوچھیں گے اور مجھے سب کچھ آپ کو بتانا پڑے گا۔"

"اوہ صفدر۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو' کیا واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تمہیں پتا ہے۔۔۔ تمہیں پتا ہے کہ تمہاری اس حماقت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ یہ تم نے کیا کر دیا ہے صفدر۔۔۔ تمہیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟ بتاؤ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا؟" میں نے بڑے دکھ کے عالم میں صفدر کو باقاعدہ جھنجوڑ دیا۔

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اب ایک سو دس فی صد یقین ہو گیا تھا کہ صفدر کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا کسی ذہنی رو میں بہک کر کر رہا تھا اگر خود اسے اپنی اس کیفیت کا علم نہیں تھا۔ اب یہ بات بھی بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ غوطہ خور بستی میں پہنچتے ہی لارسیوں کی گرفت میں کیوں آگئے تھے۔ صفدر بیڑی کو پاؤں تلے مسل کر بولا "شاہ جہاں صاحب! پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ویرا کی زندگی کو فوری خطرہ لاحق تھا۔ اس لیے مجھے جلدی میں فیصلہ کرنا پڑا' ورنہ میں آپ سے مشورے کے بغیر یہ قدم اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔ باقی میں نے یہ قدم بڑی احتیاط سے اٹھایا ہے۔ بوکارلو صاحب کے ساتھ میں نے بڑی رازداری سے بات کی ہے' انہوں نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ سردار بوعات کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو پائے گی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ ہم ٹرسٹ سے فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ ہمیں

بھیجا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں رابطے کے لیے ٹرانس ہمٹر فراہم کیا گیا تھا' اور یہ ٹرانس ہمٹر ہم استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔"

"سردار بوعات اور بوکارلو یہ سب کچھ اپنے تک بھی رکھیں تو بھی ٹرسٹ والوں کو ہم پر شبہ تو ہو ہی جائے گا۔" میں نے سٹپٹا کر کہا۔

"کیسا شبہ؟"

"یہی کہ ان کا مشن ہماری وجہ سے ناکام ہوا ہے۔"

"گستاخی معاف' آپ ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہیں۔ مشن ناکام ہونے کی ایک سو ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔ موقع پڑنے پر ہم اپنی صفائی میں کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کل جس وقت ٹرانس ہمٹر پر مائیکل کی کال آئی' دو رائفل بردار میرے سر پر کھڑے تھے اور میں نے مائیکل سے جو بات بھی کی ان کی موجودگی میں کی۔"

"لیکن یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت کیا تھی صفدر؟ ویرا کو اس حملے سے محفوظ رکھنے کے اور بھی کئی طریقے ہو سکتے تھے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارا مستقبل اب ٹرسٹ سے نہیں اس قبیلے سے وابستہ ہے۔"

"یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں اور ان کے بارے میں آپ بھی تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ ٹرسٹ کے خلاف لارسی قبیلے کی تمام شاخوں میں زبردست اتفاق پایا جا رہا ہے۔ پھر ان لوگوں کو بوکارلو جیسا قائد بھی مل گیا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ بوکارلو کسی عام شخص کا نام نہیں۔ وہ کنگ براؤن کا سگا بھائی ہے' اور ٹرسٹ کے معاملات پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کنگ براؤن کا۔ اب ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ٹرسٹ کے اندر بھی کنگ کے خلاف بغاوت کے آثار پائے جا رہے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے شواہد ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹرسٹ کا زوال قریب ہے۔ اس وقت ہم اگر بوعات اور بوکارلو وغیرہ کا اعتماد حاصل کر لیں تو ہمارے حق میں بہت اچھا ثابت ہوگا۔"

"کچھ بھی ہے۔ میرے خیال میں تم نے ایک بہت بڑا رسک لیا ہے۔ لارسی تعداد میں بے شک زیادہ ہیں اور جنگجو بھی ہیں مگر ان کے پاس ٹرسٹ والوں کی طرح جدید ہتھیار اور دیگر سہولتیں موجود نہیں۔ ویسے بھی ٹرسٹ "جرائم کے کسی اڈے" کا نام نہیں۔ یہ ایک نیٹ ورک ہے جو دنیا کے بیشتر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ لارسیوں میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ اسے ختم کر سکیں۔ اگر فرض محال وہ ٹرسٹ کو اور ہوسٹل اور کیمپس وغیرہ کو تاراج بھی کر دیں تو یہ گھناؤنا کھیل ختم نہیں ہوگا۔"

اسی دوران میں بوکارلو کے جھونپڑے کی طرف شور برپا ہو گیا۔ میں اور صفدر بھی وہاں پہنچ گئے۔ بہت سے مشتعل قبائلی بوکارلو کے جھونپڑے کے گرد جمع تھے۔ ان میں اس عورت کے پس ماندگان بھی تھے جو کچھ دیر پہلے فائرنگ میں ہلاک ہوئی تھی۔ اپنی مترجم صوفیہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ زندہ پکڑے جانے والے دونوں افراد سے انتقام لینا چاہ رہے ہیں۔ قبیلے کے قانون کے مطابق وہ انہیں موت کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ محترم بوکارلو اس کی مخالفت کر رہے ہیں' کچھ ہی دیر بعد بوکارلو تقریر کرنے والے انداز میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ صوفیہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لوگوں کو صلہ رحمی اور معافی کا درس دے رہا ہے۔ انہیں سمجھا رہا ہے کہ ہمیں ٹرسٹ کی برائی کا جواب برائی سے نہیں دینا۔ ان لوگوں کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ یہ اپنے دو ساتھی مروا کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ صوفیہ نے بتایا کہ بوکارلو زندہ بچ جانے والی لڑکی اور اس کے ساتھی کو چھوڑنا چاہتا ہے۔

کچھ دیر بعد مجمع چھٹ گیا۔ بوکارلو بھی اپنے جھونپڑے میں واپس چلا گیا۔ صوفیہ نے بتایا کہ اس معاملے کا فیصلہ کل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ فیصلے کا اعلان سردار بوعات خود کریں گے۔ ہماری باتوں کے دوران میں ہی ویرا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ اس سارے ہنگامے پر حیران نظر آرہی تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس ہنگامے کا اصل سبب وہ خود ہی ہے۔

وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ یہ لوگ کیا چاہتے تھے۔

"یہی جاننے کے لیے تو ہم یہاں کھڑے ہیں۔" میں نے بات بنائی۔

وہ بولی "لگتا ہے کہ صورت حال دن بہ روز خراب ہو رہی ہے۔ شاید سب کچھ میری وجہ سے ہی ہو رہا ہے۔"

بات تو ویرا کی درست تھی مگر ہم اس کی تائید کر کے اسے مزید دکھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ صفدر نے کہا "تم خواہ مخواہ ذہن پر بوجھ مت لو ویرا۔ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمہارے آنے سے بہت پہلے ہی تمہارے چچا واں کنگ اور بوکارلو میں جھگڑا ہو چکا تھا۔ بوکارلو کے ہاتھ کا زخم اسی جھگڑے کی نشانی ہے۔"

"پھر بھی میری وجہ سے یہ کشیدگی بڑھی ہے۔" ویرا

بولی

"تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ آزادی ہر شخص کا حق ہے۔" صفدر نے کہا۔

"لیکن۔"

"لیکن کچھ نہیں۔" صفدر پیار بھرے غصے سے بولا "جاؤ تم اپنے جھونپڑے میں آرام کرو۔ صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے صفدر کو دیکھا اور واپس چلی گئی۔ وہ سراپا صفدر کے عشق میں غلطاں نظر آتی تھی۔ دوسری طرف صفدر بھی جیسے اپنے اردگرد سے بے خبر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس شدت سے چاہا گیا تھا کہ بوکھلا سا گیا تھا۔ ویرا جھونپڑے میں چلی گئی تو صفدر مضطرب نظر آنے لگا۔ درحقیقت ویرا نے دو مرتبہ خودکشی کی نہایت سنجیدہ کوشش کر کے ہر شخص کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ اب جب بھی وہ ذرا مغموم نظر آتی تھی اس کی طرف سے فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ صفدر نے صوفیہ سے کہا "جاؤ.... اس کے پاس چلی جاؤ۔ اس سے ذرا بات وات کیا کرو۔"

صوفیہ تفہیمی انداز میں سرہلاتی ہوئی ویرا کے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ بوکارلو کا خادم خاص آیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ محترم بوکارلو ہمیں اپنے جھونپڑے میں بلا رہے ہیں۔ میں اور صفدر، بوکارلو کے طلسماتی جھونپڑے میں پہنچے۔ شہد کی پراسرار مکھیوں والا پنجرہ بدستور وہاں موجود تھا۔ کسی جالی کے بغیر مکھیاں پنجرے میں مقید تھیں۔ اس پنجرے کی "ہیئت" جھونپڑے میں داخل ہونے والے کو فوراً جیسے سحر میں جکڑ لیتی تھی۔ جہاں دیکھنے والے کے دل میں خوف جاگتا تھا وہاں بوکارلو کے لیے ایک طرح کا احترام بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ اس پنجرے کے علاوہ بھی کئی پنجرے یہاں موجود تھے۔ کچھ میں جانور موجود تھے کچھ خالی تھے۔ موم بتیوں کی روشنی میں بوکارلو بڑی تمکنت کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ملازم نے جھونپڑے کا چوبی دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔

بوکارلو چند سیکنڈ تک اپنی سرخ پُراسرار آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مسٹر شا! مجھے تمہارے دوست صفدر نے اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ تم دونوں نے اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور حق سچ کا ہاتھ تھام کر جرم اور گناہ کے جال سے نکلے ہو۔ مجھے احساس ہے کہ یہ کام تمہارے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ تمہارے چار ساتھی جن میں ایک معصوم بچہ بھی ہے ابھی تک ٹرسٹ کی قید میں ہیں۔ تم نے ان کی آزادی اور زندگی کا رسک لیا ہے اور تمہاری اس قربانی کو میں تہ دل سے محسوس کرتا ہوں۔ بہرحال تمہیں کسی طرح فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انشاءاللہ ٹرسٹ کا نقشہ بہت جلد بدلنے والا ہے۔ تاریکی کا یہ کھیل زیادہ دیر جاری نہیں رہ سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ انسان کی فطرت کو ناروا پابندیوں میں جکڑنا تاریکی ہے اور اسے آزاد کرنا روشنی۔ ہم اسی روشنی کے علم بردار ہیں۔۔۔ دیوتاؤں نے چاہا تو فتح ہماری ہی ہوگی۔"

"کیا ٹرسٹ والوں کے ساتھ لڑائی کا امکان ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"امکان کو تو رد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ہماری خواہش ہے کہ یہ تبدیلی پرامن طریقے سے آئے اور اسی لیے اس کام میں اتنی دیر بھی ہو رہی ہے۔ ہمارا شیوہ خون ریزی نہیں محبت ہے۔ ہم جسم نہیں' دل فتح کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان افراد کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو کل رات ہونے والی خون ریزی کے ذمہ دار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کل سردار ربوعنات کی طرف سے حتمی اجازت مل جائے گی اور ہم ان دونوں افراد کو ٹرسٹ واپس بھجوا سکیں گے۔"

صفدر نے کہا "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں جناب! ابھی تک تو ٹرسٹ والوں پر ہر مہربانی بے اثر ہی ثابت ہوئی۔ بلکہ شاید وہ اسے قبیلے کی کمزوری سمجھتے ہیں۔ میں اس بارے میں رائے دینے کا اہل نہیں ہوں لیکن اتنی عرض ضرور کروں گا کہ اگر دونوں حملہ آوروں کو واپس کیا گیا تو ٹرسٹ والے مس ویرا کی واپسی کا مطالبہ مزید شدت سے کرنے لگیں گے۔"

"ویرا واپس نہیں جائے گی۔ چاہے اس کے لیے ہمیں کتنی بھی بڑی قربانی دینی پڑے۔ یہ صرف ویرا کا معاملہ نہیں یہ ہمارے نظریے کی سچائی کا معاملہ ہے۔ اس زمین پر بسنے والے ہر انسان کی طرح ویرا بھی آزاد ہے اور قدرت نے چاہا تو آزاد ہی رہے گی۔"

کچھ دیر بعد میں اور صفدر جھونپڑے میں لوٹ آئے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ صفدر بھی جاگ رہا تھا۔ وہ کروٹیں بدلتا جا رہا تھا۔ کسی وقت اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ دو بار اس نے صراحی سے پانی پیا۔ مجھے اس کی ذہنی حالت نظر آ رہی تھی۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر اس کے نہ ماننے سے سچ جھوٹ میں نہیں بدل سکتا تھا۔ میرا اور اس کا بچپن کا ساتھ تھا۔ میں اسے نہ جانتا تو اور کون جانتا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ صفدر کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو چکا ہے۔ کوئی طلسم تھا جو اس کے حواس کو جکڑتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی مجھے لگتا تھا کہ یہ ویرا کے حسن اور عشق کا طلسم ہے مگر کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس طلسم کا تعلق اس جادو نگری کے ساحر اعظم بوکارلو کی آنکھوں سے' اس کی روحانی قوت سے ہے۔

یہ تیسرے روز شام کا واقعہ ہے' صفدر سو رہا تھا۔ میں گھومنے کے لیے باہر نکل گیا' میں عبادت گاہ کے عقب سے گزرا تو ایک مستطیل کوٹھڑی نظر آئی۔ جھونپڑوں کی طرح اس لمبی چوڑی کوٹھڑی کی چھت بھی گھاس پھونس کی تھی۔ اندر حیوانی چربی کے چراغ روشن تھے۔ کھڑکی میں سے مجھے ایک ہوش ربا منظر نظر آیا۔ میں نے چند سفید فام لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ کوٹھڑی کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان کے چکیلے جوان جسموں پر صرف پتوں کا مختصر لباس تھا۔ کسی سبز پودے کے چند چوڑے پتے بالائی جسم پر اور چند زیریں جسم پر تھے۔ لڑکیاں گم صم کھڑی تھیں اور خالی خالی نظروں سے صوفیہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ صوفیہ ایک لڑکی کے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھ رہی تھی۔

میں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ گم صم دوشیزائیں...... یقیناً بوب دوشیزائیں تھیں۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ میں نے لڑکیوں کو شمار کیا۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ کانوں میں بوکارلو کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے صفدر کو جس آزمائش سے گزرنا ہے اس میں اسے جنگل میں پانچ بوب دوشیزاؤں کا تعاقب کرنا ہے۔ تو کیا یہ اسی آزمائش کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں تاریکی میں تھا لہٰذا کوٹھڑی کا اندرونی منظر دیکھنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ پانچوں لڑکیوں کی پنڈلیاں عریاں تھیں۔ تاہم ان کے پاؤں میں جوتے نظر آ رہے تھے۔ مقامی طرز کے یہ جوتے ان کی نصف پنڈلیوں کو ڈھانپ رہے تھے۔ کوٹھڑی میں صوفیہ کے علاوہ دو مسلح محافظ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی اور دوسرا قبائلی ہتھیار یعنی برچھی سے مسلح تھا۔ یہ دونوں سیاہ فام افراد گاہے گاہے للچائی ہوئی چور نظروں سے لڑکیوں کو دیکھ لیتے تھے۔ ابھی میں اپنے ردعمل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ صوفیہ اتفاقاً کسی کام سے باہر نکلی۔ وہ اپنے آپ میں مگن الھڑ چال چلتی ہوئی جنگلی پھولوں کی ایک جھاڑی تک پہنچی اور وہاں سے پھول توڑنے لگی۔ غالباً وہ بوب لڑکیوں کے لیے کوئی گجرا قسم کی شے بنانا چاہ رہی تھی۔ میں نے تاریکی سے نکل کر اس کا بازو تھام لیا۔ وہ بدک کر رہ گئی' بہرحال میری صورت دیکھ کر اس نے چیخنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اسے ایک طرف درختوں میں لے گیا "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

"آپ کو معلوم نہیں؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا؟"

"آپ کے دوست صفدر نے نہیں بتایا؟"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں صوفیہ کو کیسے بتاتا کہ میرا دوست آج کل مجھ سے بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "نہیں ابھی تک تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔"

اس کی آنکھوں میں حیرت چمکی۔ وہ بولی "آج رات رسم ادا ہو رہی ہے۔ مقامی زبان میں اس رسم کو "ہاتو" کہا جاتا ہے۔ کوٹھڑی میں جو پانچ بوب لڑکیاں ہیں انہیں آج رات جنگل میں چھوڑ دیا جائے گا۔ آپ کے دوست صفدر کو ان میں سے دو لڑکیوں کو پکڑنا ہوگا اور۔۔۔"

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ غالباً شرم آڑے آ گئی تھی۔ وہ موضوع بدل کر بولی "میرا خیال تھا کہ آپ کے دوست صفدر نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔"

میں نے پوچھا "لڑکیوں کو کتنے بجے چھوڑا جائے گا؟"

وہ بولی "بس ہم لڑکیوں کو تیار ہی کر رہے ہیں۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں یہ رسم کے لیے بالکل تیار ہوں گی۔ بہرحال رسم چاندنی چٹکنے سے پہلے شروع نہیں ہوگی اور چاندنی چٹکنے میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی ہیں۔" میں خاموش تھا۔ وہ ذرا توقف سے بولی "آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں۔ آپ کے دوست کو جنگل میں بہت زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ بناؤ سنگار کرنے کے بعد ان لڑکیوں کو ایک خاص قسم کی خوشبو بھی لگائی جائے گی۔ یہ خوشبو لڑکیوں کو تلاش کرنے والے کے لیے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔"

اتنے میں کہیں پاس سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ کوٹھڑی سے چند گز کی دوری پر کھجور کے نیچے ایک سفید گھوڑا موجود تھا۔ گھوڑا گھاس پر منہ مارتا ہوا آہستہ آہستہ ہماری طرف آ گیا۔ اس صحت مند گھوڑے پر زین کسی ہوئی تھی۔ زین کے ساتھ سن کی طویل رسی موجود تھی۔ رسی کو گول گول لپیٹ کر زین کے ساتھ ہی باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا خول سا بھی نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ ذبح ڈراؤنا ماسک تھا جسے پہن کر صفدر کو لڑکیوں کی تلاش میں نکلنا تھا۔ صوفیہ بولی "یہ وہ گھوڑا ہے جس پر

سوار ہو کر تمہارے دوست کو لڑکیوں کے تعاقب میں جانا ہے۔"

یہ تو پوری تیاری مکمل نظر آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ صفدر کی برین واشنگ ہو چکی ہے اور اس کے دماغ میں ایک نیا ذہن تخلیق ہو چکا ہے۔ وہ ہر حد سے گزرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ وہ مجھ کو ہر مشورے میں شریک کرنے کا دعویٰ بھی کر رہا تھا' اور دوسری طرف مجھ سے ہر بات چھپا بھی رہا تھا۔ میرے دل کی گواہی تھی کہ اس کا ذہن کسی پراسرار جال میں جکڑا جا چکا ہے' اور اب کچھ بھی اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرا یار آنکھیں بند کر کے کسی خوفناک گڑھے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ نہ لیا تو وہ ہمیشہ کے لیے میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اب پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ اب بھی خاموش رہنا دانشمندی نہیں تھی۔ میں نے واپس جھونپڑے کی طرف جاتے ہوئے ایک نہایت اہم فیصلہ کر لیا۔ راستے میں بو کارلو کا جھونپڑا بھی پڑتا تھا۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے بو کارلو کو عبادت گاہ میں دیکھ کر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بو کارلو کے جھونپڑے میں داخل ہونے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ جھونپڑے کے دروازے پر کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا۔ یہ بات میں دو دن پہلے ہی نوٹ کر چکا تھا کہ رات نو دس بجے سے پہلے جھونپڑے کے دروازے پر پہرا نہیں ہوتا۔ میں نے درختوں کی اوٹ سے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک حبشی نظر آیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ دو زانو بیٹھا تھا اور اپنے "خدا" یعنی آگ کی پوجا کر رہا تھا۔ یہ آگ جھونپڑے کے وسط میں ایک چھوٹی سی انگیاری میں روشن تھی۔ میرے قدموں کی ہلکی سی چاپ اس شخص کے کانوں تک پہنچ گئی۔ اس نے تیزی سے مڑ کر میری طرف دیکھا مگر اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اس کی گردن سے لپٹ چکا تھا۔ میں نے مخصوص انداز میں بازو کو جھٹکا دیا۔ وہ کسمسا کر میری بانہوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر ایک گوشے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد میں غوطہ خوری کے لباس کی طرف بڑھا۔ غوطہ خوری کے یہ پانچ لباس یعنی (WET SUITS) جھونپڑے کے اندر چند کھونٹیوں سے لٹک رہے تھے۔ قریب ہی سلنڈر اور ماسک وغیرہ بھی موجود تھے۔ یہ سارا سامان انہی ناکام کمانڈوز کا تھا جو دو تین دن پیشتر جھیل میں تیر کر بستی تک پہنچے تھے۔ ان میں سے دو راہیِ عدم ہوئے تھے اور دو پیشانی پر ناکامی کا داغ سجا کر

زبست واپس چلے گئے تھے۔ میں نے دو لباس سلنڈروں اور ماسک سمیت وہاں سے اٹھا لیے۔ باہر نکلنے سے پہلے اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں مڑا اور ایک صندوق کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ جلد ہی گوہر مقصود میرے ہاتھ آگیا۔ یہ وہی کلوروفارم اسپرے تھا' جو کمانڈوز کے پاس سے ملا تھا۔ میں اس اسپرے سمیت جھونپڑے سے نکلا اور تاریک درختوں کے درمیان چلتا ہوا اپنے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔ پیراکی کے دونوں لباس میں نے اپنے جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر درختوں میں رکھ دیے اور جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ حسب توقع صفدر ابھی تک سویا پڑا تھا۔ شاید ایک پرہنگام رات گزارنے سے پہلے وہ سو کر اپنی توانائیاں بحال کر رہا تھا۔ حالت نیند میں اس کے چہرے پر نیکی کا اجالا موجود تھا مگر یہ نیند کی حالت تھی۔ میں جانتا تھا بیدار ہو کر وہ وہی کچھ کرے گا جس کا تقاضا اس کی ذہنی حالت کرے گی۔ اور اس کا ذہن کسی پراسرار جال میں الجھا ہوا تھا۔ میں چند لمحے تک بغور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ میرا ہم دم تھا' میرا جگری یار تھا' میرا دایاں بازو تھا' میرا جاں نثار ساتھی تھا' لیکن آج وہ کسی نامعلوم ذہنی کج روی کا شکار ہو کر ایک بالکل مختلف شخص بن گیا تھا۔ میں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا پھر بھی پہچان نہیں پا رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور دل کڑا کر کے اسپرے کا رخ صفدر کے چہرے کی طرف کر دیا۔ یہ بڑا زود اثر اسپرے تھا۔ صفدر کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ جیسے اس نے کسمسا کر اٹھنے کی کوشش کی ہو پھر اس کے سینے کا زیروبم یکسر بدل گیا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا تھا۔ جھونپڑے میں ایک ناگوار بو پھیل گئی تھی۔ میں نے اپنی سانس مکمل طور پر روکی ہوئی تھی۔

صفدر کی بے ہوشی "مستحکم" ہونے کے بعد میں جھونپڑے سے نکل کر واپس درختوں میں پہنچ گیا۔ دونوں ڈائیونگ سوٹس اور دیگر لوازمات لے کر میں جھونپڑے میں آگیا جھونپڑے کا دروازہ اور کھڑکی اندر سے بند کیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ آج گرمی معمول سے زیادہ تھی۔ جھونپڑا بند ہونے سے حبس مزید بڑھ گیا تھا۔ پانچ دس منٹ میں ہی میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ بہرحال میں ڈائیونگ سوٹ اپنے جسم پر چڑھانے میں کامیاب رہا۔ سلنڈر میں نے اپنی پشت پر فکس کر لیا تھا۔ پہلے میں صفدر کو بھی سوٹ پہنانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ میں نے صفدر کو صرف ماسک چڑھانے پر اکتفا کیا۔ آکسیجن کا سلنڈر میں نے اس کی پشت پر پہلے ہی باندھ دیا تھا۔

اب ہم جھونپڑے سے نکلنے اور جھیل میں اترنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

اس امر کا اندازہ مجھے دو تین روز پیشتر ہی ہو چکا تھا کہ اس بستی کی حدود سے نکلنے کا واحد راستہ جھیل ہی ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ جھیل کی طرف نگرانی کا انتظام نہیں تھا تاہم اس نگرانی کو ناکام بنایا جا سکتا تھا۔ خشکی کی طرف سے ایسا کوئی امکان موجود نہیں تھا۔ وہاں سے نکلنے کے فقط دو راستے تھے اور ان راستوں پر چوبیس گھنٹے مسلح سیاہ فام موجود رہتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں بے ہوش صفدر کو اپنے کندھے پر لاد کر یا کسی چھکڑے وغیرہ پر رکھ کر ان راستوں سے گزرتا اور پہرے دار مجھے گزر جانے دیتے۔ پوری طرح تیار ہونے کے بعد میں نے جھونپڑے کی کھڑکی کھول لی اور جھیل کا جائزہ لیا۔ جھیل کا کنارہ جھونپڑے سے تقریباً سو گز کی دوری پر تھا۔ اس راستے میں صرف دو تین جھونپڑے اور تھے۔ یہ جھونپڑے اور ان کا قرب و جوار تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چاند درختوں کے عقب سے جھلک دکھانے لگا تھا مگر ابھی اس کی روشنی نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ ایک شخص دو بیلوں کو ہانکتا ہوا جھیل سے بستی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے اس کے گزر جانے کا انتظار کیا۔ اس کے بعد میں نے صفدر کا بے ہوش جسم اپنے کندھے پر لادا اور آہستگی کے ساتھ کھڑکی میں سے نکل آیا۔ غوطہ خوری کے لیے پاؤں پر چڑھائے جانے والے چپو جنہیں "FINS" کہا جاتا ہے میرے پاس موجود تھے۔ تاہم میں نے انہیں پاؤں پر نہیں چڑھایا تھا۔ وہ میری بغل میں دبے ہوئے تھے۔ ہاں ماسک اور دیگر لوازمات میں نے پہن لیے تھے۔ ہتھیار کے طور پر میرے گریبان میں ایک تیز دھار چھرا موجود تھا۔ میں نے سینے پر موجود زپ یوں کھول رکھی تھی کہ چھرے کا دستہ مجھے دکھائی دیتا تھا۔ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر یہ چھرا میرے ہاتھ میں پہنچ سکتا تھا۔ یہ چھرا میں نے دو روز پیشتر بستی کے بازار میں ایک قصاب کی دکان سے پار کیا تھا۔ کنارے پر پہنچ کر میں نے دائیں جانب چلنا شروع کر دیا۔ تقریباً سو گز آگے جھیل کا وہ حصہ شروع ہوتا تھا جہاں سے جھیل کو پار کیا جا سکتا تھا۔ یہاں سے جھیل کی چوڑائی بمشکل ستر اسی گز رہی ہوگی۔ جھیل کا یہ حصہ کسی حسینہ کی نہایت پتلی کمر جیسا تھا۔ ایک ایسی حسینہ جس کا باقی جسم کافی گداز اور بھرا بھرا تھا۔ تاریکی میں سفر کر کے میں دو چار منٹ کے اندر جھیل کی "نازک کمر" تک پہنچ گیا۔ یہاں میں نے صفدر کا بے ہوش جسم بڑے آرام سے زمین پر اس طرح رکھ دیا کہ پشت پر موجود سلنڈر پر دباؤ نہ پڑے۔ اس کے بعد میں نے اپنے پاؤں پر "FINS" چڑھائے' گیس ماسک کو درست کر کے اپنے اور صفدر کے لیے آکسیجن گیس کھولی پھر دھیرے سے صفدر سمیت پانی میں اتر گیا۔ پانی کا لمس فرحت بخش تھا۔ صفدر سمیت میں تقریباً پانچ فٹ کی گہرائی میں چلا گیا اور آہستہ آہستہ مشرقی کنارے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ میرا ایک بازو صفدر کے چوڑے چکلے سینے کے گرد لپٹا ہوا تھا دوسرے بازو سے میں تیر رہا تھا۔ صفدر کا چہرہ اوپر کی طرف تھا۔ اس کے سینے کا زیروبم میں اپنے بازو سے محسوس کر رہا تھا۔ یہ زیروبم صفدر کے سانسوں کی روانی کی نشان دہی کر رہا تھا پھر بھی گاہے گاہے میں ہاتھ لگا کر صفدر کے گیس ماسک کو چیک کر لیتا تھا۔ ڈائیونگ سوٹ میں تیرنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ ہوا تھا۔ سنگاپور میں شیطان ابن شیطان شنکر شکرا سے میری ایک خون ریز جھڑپ ہوئی تھی۔ شنکر کے ایک ساتھی نے کچھ اسلحہ واٹر پروف تھیلوں میں بند کر کے ساحلی علاقے میں غرقاب کر دیا تھا۔ اسی اسلحے کی تلاش کے سلسلے میں مجھے چند ماہر غوطہ خوروں کی ماتحتی میں یہ مہم جوئی کرنی پڑی تھی' بہرحال یہ ایک علیحدہ واقعہ ہے۔ میں بتا رہا تھا کہ زیر آب پیراکی کا تجربہ چونکہ مجھے نہیں تھا لہٰذا جھیل کے پانی میں تیرنا میرے لیے دشوار ثابت ہو رہا تھا پھر صفدر کا وزن بھی تھا۔ میری سانس پھولنے لگی۔ تاہم میں جلد از جلد کنارے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جھیل کے اس حصے کے عین وسط میں تین ڈونگے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان ڈونگوں کا درمیانی فاصلہ تیس میٹر کے قریب ہوتا تھا۔ ہر ڈونگے میں دو سے تین پہرے دار موجود رہتے تھے۔ یہ ساری معلومات مجھے چند روز قبل صفدر نے ہی فراہم کی تھیں۔ اس وقت صفدر کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ معلومات ایسے وقت میرے کام آئیں گی جب میں اسے بے ہوشی کی حالت میں بستی سے نکال رہا ہوں گا۔ اچانک مجھے رکنا پڑا۔ سطح آب کے نیچے میرا سر کسی شے سے الجھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور جسم لرز کر رہ گیا۔ میری انگلیاں ایک جال میں الجھی تھیں۔ میں پیچھے ہٹ آیا۔ تھوڑا سا رخ تبدیل کر کے میں دس پندرہ گز دائیں جانب چلا گیا۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ پانی میں مچھلیوں کے لیے کسی نے جال وغیرہ پھینک رکھا ہے۔ میں اس جال سے بچ کر گزرنا چاہ رہا تھا مگر میرے ہاتھ ایک بار پھر جال سے چھو گئے۔ یہ کافی بڑا جال معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دائیں رخ پر تیرنا شروع کر دیا اور اپنے اندازے کے مطابق جال سے چالیس پچاس گز دور ہٹ گیا۔ اب میں نے ایک بار پھر آگے بڑھنا چاہا۔ سانس

بری طرح پھول چکی تھی اور ہاتھ پاؤں منوں وزنی ہو گئے تھے۔ یہ جان کر میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ جال یہاں بھی موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جھیل کے اس سارے حصے میں سطح آب کے نیچے جال لگا دیا گیا ہے۔ یہ جال یقیناً دو تین روز پیشتر پیش آنے والے واقعے کے بعد لگایا گیا تھا۔ زرسٹ کے چار چھاپا ماروں کا جھیل کے راستے بستی میں گھس آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس واقعے کے سدباب کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جال لگانے کی یہ کارروائی رات کے اندھیرے میں کی گئی ہے۔ دن کے وقت کم از کم میں نے تو جھیل پر کوئی سرگرمی نہیں دیکھی تھی۔ یہ بڑی مایوس کن صورت حال تھی۔ بلکہ اسے خطرناک کہنا چاہیے۔ واپس جانے میں میرے اور صفدر کے لیے بے شمار خطرات پوشیدہ تھے۔ عین ممکن تھا کہ اب تک وہ عدد وائیونگ سوٹس کی گمشدگی کا راز کھل چکا ہو اور ان میں سے ایک سوٹ ہمارے جھونپڑے سے برآمد بھی ہو چکا ہو۔ میں نے سخت پریشانی کے عالم میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

بڑی آہستگی کے ساتھ میں نے جال کو ایک بار پھر چھوا۔ یہ جال ڈوری وغیرہ کا نہیں تھا بلکہ پلاسٹک جیسے کسی بڑے سخت ریشے سے بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنے سینے کی زپ کو تھوڑا سا مزید کھولا اور چھرا نکال لیا۔ چھرے کی مدد سے میں نے احتیاط کے ساتھ جال کاٹنے کی کوشش کی مگر تقریباً ناکامی ہوئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے صفدر کو تھام رکھا تھا' دوسرے ہاتھ سے مجھے تیرنا تھا اور جال بھی کاٹنا تھا۔ یہ کام جوئے شیر لانے سے زیادہ دشوار تھا۔ میں چھرے والے ہاتھ کو زیادہ تیزی سے حرکت بھی نہیں دے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ جال میں پیدا ہونے والی جنبش کو سطح آب پر محسوس کیا جا سکتا ہو' ایسے میں ڈونگوں میں بیٹھے ہوئے افراد ریڈ الرٹ ہو سکتے تھے۔ چار پانچ منٹ کی کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ موجودہ صورت حال میں جال کاٹنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اگر میں جال کاٹنے کے لیے صفدر کو ہاتھ سے چھوڑ دیتا تو وہ جھیل کی تہ میں بیٹھ جاتا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جھیل کی گہرائی کتنی ہے پھر اس تاریک پانی میں صفدر کو ڈھونڈنا اتنا ہی دشوار ثابت ہوتا جتنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا۔ میں یہ رسک کسی طور نہیں لے سکتا تھا۔ ہماری آکسیجن بہت تیزی سے خرچ ہو رہی تھی۔ یوں تو ان سلنڈروں میں ایک گھنٹے کے لیے آکسیجن موجود تھی مگر نصف کے قریب ان کمانڈوز نے خرچ کر دی تھی جو زیر آب تیر کر بستی میں وارد ہوئے تھے۔ یہ میرے لیے بڑے کٹھن لمحے تھے۔ مجھے آگے جانا تھا اور آگے جانے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

آخر میں نے اپنا رخ نیچے کی طرف کر دیا۔ پاؤں میں لگے ہوئے FINS کے باعث نیچے کی طرف جانا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ ویسے بھی صفدر کی وجہ سے میں خاطر خواہ وزنی ہو گیا تھا۔ شاید میں ہاتھ پاؤں نہ بھی چلاتا تو بھی میں اترتا چلا جاتا۔ تاریک پانی میں اندازاً سات آٹھ فٹ نیچے جانے کے بعد میرے پاؤں تہ سے جا لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر جال کو چھونا چاہا۔ اور یہ جان کر دل ڈوب سا گیا کہ جال جھیل کی تہ تک موجود ہے۔ پہلے تو یوں لگا جیسے اسے میخوں وغیرہ سے ٹھونک دیا گیا ہے مگر پھر اچانک میرا ہاتھ ایک گول پتھر سے ٹکرایا' جال کا زیریں کنارہ اس پتھر سے لپٹا ہوا تھا۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ایسے کئی پتھر جال کے کنارے میں لپیٹے گئے ہیں یا شاید جال کے اندر ہی سی دیے گئے ہیں۔ ان پتھروں کے سبب جال پانی میں تنا ہوا تھا۔ پتھر کافی بڑے تھے مگر پانی میں ہونے کے سبب ان کا وزن ان کے حجم سے کم تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں پتھر کو اٹھانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے کوشش کی لیکن پتھر ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں اور صفدر اب جھیل کی تہ میں بیٹھ چکے تھے۔ اب میرے لیے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے صفدر کو چھوڑ کر اپنا بایاں ہاتھ بھی آزاد کرا لوں۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اپنا ہاتھ صفدر کے جسم سے جدا کر دیا۔ صفدر مجھے نظر نہیں آ رہا تھا' لہٰذا یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ میرے پاس ہی پانی میں موجود ہے میں نے اپنی بائیں ٹانگ بڑی احتیاط سے اس کے سینے پر چڑھا دی۔ میرے دونوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ میں نے تیز دھار چھرا برآمد کیا اور اس کی مدد سے جال کو کاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ جال کا ریشہ کافی زیادہ سخت تھا۔ تاہم جلد ہی مجھے پہلی کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں سخت ریشے کے ایک اسٹریپ کو کاٹنے میں کامیاب رہا تھا۔ میرا ہاتھ تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس تیزی میں احتیاط بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ جال میں حرکت پیدا نہ ہو۔ چار پانچ منٹ کی محنت شاقہ سے میرا دایاں بازو شل ہو گیا لیکن اس کے ساتھ جال کو بھی خاطر خواہ نقصان پہنچ گیا۔ میں صفدر سمیت بڑی احتیاط کے ساتھ جال کے نیچے سے گزر گیا۔ صفدر کے بے ہوش جسم کو ایک بار پھر سہارا دے کر میں نے پانی کے اندر ہی اندر کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ میری سانس بری طرح پھول چکی تھی اور ہاتھ پاؤں بے دم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میرے سلنڈر کی آکسیجن ختم ہو گئی ہے۔ چند سانسیں میں نے کھینچ کھینچ کر لیں پھر ایک دم ہوا آنا بند ہو گئی۔

میں نے رہی سہی قوت جمع کر کے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیے۔ میرا دم سینے میں گھٹ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی بے قرار کر رہا تھا کہ شاید صفدر کی آکسیجن بھی ختم ہو چکی ہے۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ صفدر کے سینے کا زیر و بم محسوس کر سکوں یا نبض ٹٹول سکوں۔ اب تو مجھے بس تیرنا تھا اور جلد از جلد پانی سے باہر نکلنا تھا۔ اس تاریک پانی کے نیچے گزرنے والی ہر ساعت ہم دونوں کو زندگی سے دور اور موت سے قریب کر رہی تھی۔ خاص طور سے میں تو اپنی "سانسیں" ختم کر چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے وہ آخری دو منٹ کس طرح گزارے۔ بس یہی لگتا تھا کہ میرے ہونٹ کسی بھی وقت آپوں آپ کھل جائیں گے اور میں صفدر سمیت جھیل کی تہ میں بیٹھتا چلا جاؤں گا۔ ایک تاریکی سی تھی جو دل و دماغ کو گھیر رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کنارہ کتنی دور ہے' اب میں فقط پانی سے باہر نکلنا چاہتا تھا' چاہے جس جگہ سے میں نکلوں وہ جگہ نگران ڈونگوں کے عین سامنے ہی واقع ہو اور پھر اچانک میری نگاہ ایک جھلملاتی روشنی پر پڑی۔ یہ چاند تھا۔ مجھے پانی کے اندر سے اس کی جھلک دکھائی دی تھی۔ یہ زندگی کی جھلک تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کو چند آخری حرکات دیں اور پانی سے باہر نکل آیا۔ اکھڑی ہوئی سانس دیوانہ وار سینے میں گھسی۔ میں نے چند لمبی سانسیں لیں اور پورا زور لگا کر صفدر کا سر بھی پانی میں سے باہر نکال دیا۔ اضطراب کے عالم میں صفدر کا ماسک میں نے اس کے منہ سے کھینچ دیا اور اسے شانوں سے تھام کر جھنجھوڑنے لگا لیکن یہ صرف اضطراری حرکت تھی۔ صفدر تو پہلے سے بے ہوش تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کے ہونٹوں کے سامنے رکھی۔ میرے کپکپاتے ہاتھ کو اس کی سانسوں کا لمس محسوس نہیں ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے جسم کے ہر حصے میں سے جان کشید ہو گئی ہے۔ دل کسی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر پوری طاقت سے صفدر کو جھنجھوڑا "صفدر... صفدر آنکھیں کھولو۔" میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ صفدر کی گردن کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف ڈھلک جاتی تھی۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ جھیل کا کنارہ مجھ سے قریباً بیس گز کی دوری پر تھا۔ نگرانی کرنے والے ڈونگے میرے عقب میں تھے نگران کے ہیولے بہت مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ان سے کافی فاصلے پر آ گیا ہوں۔ ایک ہاتھ اور دونوں پیروں کو حرکت میں لا کر میں حتی الامکان تیزی سے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے جسم کی جان جیسے سمٹ کر میرے ان رگ پٹھوں میں آ گئی تھی جو مجھے تیز سے تیز تیرنے میں مدد دے رہے تھے۔ ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا میں جلد از جلد کنارے پر پہنچوں اور صفدر کو ابتدائی طبی امداد دوں۔

ابھی کنارہ مجھ سے دس پندرہ فٹ دور تھا کہ ایک اور افتاد آن پڑی۔ میں نے جھاڑیوں میں سے ایک ہیولے کو حرکت کر کے کنارے کی طرف آتے دیکھا۔ اس انسانی ہیولے کے ہاتھ میں رائفل مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ شخص جو پہرے دار تھا پانی میں تیرنے کی آواز سن کر کنارے کی طرف آیا تھا۔ وہ مقامی زبان میں پکارا۔ وہ یہی پوچھ رہا تھا کہ "میں کون ہوں؟"

میں نے جواب دینے سے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ صرف اندھادھند کھانس کر میں نے اسے یہ باور کرایا کہ میں بری طرح ہانپا ہوا ہوں اور غوطے کھا رہا ہوں۔ جب میں صفدر کو لیے ہوئے عین کنارے پر پہنچا تو پہرے دار نے بھانپ لیا کہ گڑبڑ ہے۔ چاندنی میں اس نے صفدر کی صورت دیکھ لی تھی یا اور میرے چہرے پر چڑھا ہوا ماسک اور عینک وغیرہ بھی اسے نظر آ گئی تھی۔ اس نے رائفل ہم دونوں کی طرف سیدھی کر لی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ساتھ ساتھ وہ بلند آواز میں بولتا جا رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی اردگرد درختوں میں موجود ہیں اور وہ انہیں آوازیں دے رہا ہے۔

میرے اندر دہشت اتری ہوئی تھی۔ صفدر کی نازک حالت نے مجھے ہر خوف اور اندیشے سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ اکیلا پہرے دار تھا' مجھے یقین ہے کہ وہ چار پانچ بھی ہوتے تو اس وقت میرے لیے کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر سکتے۔ میں صفدر کو ریت پر لٹانے کے لیے جھکا۔ سیدھا ہوتے ہوتے میں نے پہرے دار پر چھلانگ لگا دی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی رائفل پر آیا' دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے سر کے بال پکڑے اور اسے لیتا ہوا ٹھنڈی ریت پر گرا۔ وہ جیسے سکتے میں رہ گیا تھا' نہ چیخا اور نہ اس سے گولی چل سکی۔ بالکل اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ جس رائفل بردار کے سینے پر میں چڑھا بیٹھا ہوں' وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ اس کے جسم کا نسوانی گداز اور رخساروں کا ملائم پن گواہی دے رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ تاہم اس کی آواز مردوں ہی کی طرح بھاری تھی اور قبیلے کی جنگجو عورتوں کی طرح جسم بھی لمبا چوڑا تھا۔

اس کے منہ سے شراب کی بو بھی اٹھ رہی تھی۔ میں نے اس مرد نما عورت پر مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کرچکا تھا' دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی رائفل چھین کر اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ وہ اب بھی بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کے جسم میں جنگلی گھوڑی کی سی طاقت تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے بے تحاشا شراب پی رکھی ہے اور اس کی طاقت میں شراب کی عارضی طاقت بھی شامل ہے۔ جونہی میرا بازو اس کی گردن میں حمائل ہوا' میں نے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور اس کا جسم میرے بوجھ تلے تھرا کر ساکت ہوگیا۔ سب کچھ دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔

میں دیوانہ وار صفدر کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا کرتہ پھاڑ کر اس کا سینہ عریاں کردیا اور دونوں ہاتھوں سے بار بار اس کے سینے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ پانی صفدر کے اندر نہیں گیا' اس کا جو بھی مسئلہ تھا آکسیجن کی کمی یا کلوروفارم کی زیادتی کی وجہ سے تھا۔ چند سیکنڈ بعد دل کڑا کرکے میں نے اس کی نبض دیکھی تو مجھے اپنے بے جان جسم میں بھی زندگی کی حرارت محسوس ہونے لگی۔ نبض بہت ہلکی تھی مگر محسوس کی جاسکتی تھی۔ صفدر کا تنفس بحال کرنے کے لیے میں نے اس کے منہ سے منہ ملایا اور اپنے سانس کی آمدورفت صفدر کے سینے میں منتقل کرنے کی سعی کرنے لگا۔ گاہے گاہے میں اس کے سینے پر بھی دباؤ ڈال رہا تھا۔ دو چار منٹ بعد جب صفدر کی نبض نمایاں ہوئی اور سانس بحال ہوا تو میں نے بے اختیار اس کے بے ہوش بدن کو گلے سے لگالیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں میں نمی ہے۔

ان دو چار منٹوں میں میں اپنے گردوپیش سے قطعی بے خبر رہا تھا۔ بہ الفاظ دیگر اپنے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں تھا مجھے۔ اب میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے چاروں طرف صرف سناٹا تھا۔ چاندنی میں جھاڑ جھنکاڑ تھا اور پام کے بلند درختوں کے ہیولے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے حکمران عورت نے جو چیخ و پکار کی تھی وہ بے سود رہی تھی۔ اس کا کوئی ساتھی موقع پر نہیں پہنچا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بے ہوش ہونے والی عورت کی طرح اس کے ساتھیوں نے بھی بے نوشی کی ہو اور درختوں کے اندر چاندنی میں الٹے سیدھے پڑے ہوں۔ بہرحال میرے لیے یہ سب کچھ غیر متعلق تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے FINS اتارے' اپنا اور صفدر کا گیس سلنڈر جسم سے علیحدہ کیا اور یہ سب لوازمات جھاڑیوں میں چھپا دیے۔ اس کے بعد بے ہوش عورت کو بھی بازوؤں میں اٹھایا اور درختوں میں ڈال دیا۔ عورت کی کمر کے ساتھ ایک چرمی بیلٹ تھی۔ اس بیلٹ کے اندر چھوٹے چھوٹے خانے تھے اور ان میں رائفل کے پچاس کے قریب راؤنڈ موجود تھے۔ میں نے یہ بیلٹ کھول کر اپنی کمر سے باندھ لی۔ اسی وقت کہیں پاس ہی گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں آواز کی سمت گیا۔ ایک کیت گھوڑا درخت سے بندھا تھا' اس پر زین کسی ہوئی تھی اور خرجین بھی موجود تھی۔ میں نے قیاس لگایا کہ یہ اسی گرانڈیل عورت کا گھوڑا ہے جو درختوں میں بے سدھ لیٹی ٹھنڈی ہوا کے مزے لوٹ رہی ہے۔

میں نے گھوڑے کو کھولا' اس کا "چال چلن" ملاحظہ کیا اور پھر کود کر سوار ہوگیا۔ گھوڑے نے برائے نام مزاحمت کی پھر میری تابعداری پر آمادہ ہوگیا۔ میں نے بے ہوش صفدر کو گھوڑے پر اس طرح سوار کیا کہ وہ میرے آگے بیٹھا ہوا تھا اور میں نے ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد ڈال رکھا تھا۔ سب سے مشکل کام صفدر کی گردن کو ایک مقام پر رکھنا تھا' اس کا سر کبھی ایک طرف ڈھلکتا تھا کبھی دوسری طرف۔ اس کی ٹانگیں بڑے پریشان کن انداز میں گھوڑے کی دونوں جانب جھول رہی تھیں۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ بڑے اعتماد سے اونچے نیچے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ لوڈڈ رائفل میں نے خرجین (تھیلے) میں یوں اڑس رکھی تھی کہ موقع پڑنے پر فوراً میرے ہاتھ میں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی اس وقت ہماری تصویر کھینچے تو وہ کتنی مضحکہ خیز ہو۔ صفدر بچہ نہیں تھا ایک چوڑا چکلا جوان مرد تھا مگر وہ کسی بچے ہی کی طرح میرے آگے گھوڑے پر بیٹھا تھا اور جیسے بچہ سو جاتا ہے وہ بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر میرے بازو میں جھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کلوروفارم کا ڈوز کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا مگر صفدر کے ہوش میں آنے کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ میرا اور صفدر کا رشتہ ایسا تھا جسے پیار محبت کے عام لفظوں سے بیان کرنا شاید ممکن ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی ہم دونوں خود کو دو قالب یک جان محسوس کرتے تھے۔ کئی لمحے ایسے بھی آتے تھے جب ہمارے ذہن میں ایک ہی سوچ پیدا ہوتی تھی' ہمارا جسم ایک ہی انداز میں حرکت کرتا تھا اور ہم کسی چھوٹے یا بڑے مسئلے کا ہو بہو ایک ہی حل پیش کرتے تھے۔ ذہنی ہم آہنگی کی ایسی لاتعداد مثالیں میرے ذہن پر نقش تھیں اور یقیناً صفدر کے ذہن پر بھی تھیں۔ یہ ساری مثالیں اور یادیں ہمارا مشترکہ ورثہ تھا۔ کسی وقت تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے صفدر میرے جسم کا ہی ایک حصہ ہے اور اگر خدانخواستہ خدانخواستہ وہ

کسی وقت مجھ سے جدا ہوگیا تو میں اکیلا ایک عضو معطل بن کر رہ جاؤں گا۔ ایک بیکار اور بے حیثیت انسان۔ پھر وہ شاہ جہاں جو نامی گرامی مجرموں کے لیے بھی ڈراؤنا خواب ثابت ہوتا ہے' کسی روز کسی عام سے غنڈے کے ہاتھوں مات کھا جائے گا' یوں صفدر کے بے ہوش جسم کو اپنے آگے سنبھال کر سفر کرتے ہوئے' نجانے کیوں مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔ اس میں ایک جاں نثار ساتھی کا پیار بھی تھا۔ ایک دوست کا پیار بھی اور ایک بھائی کا پیار بھی۔ میں نے صفدر کی پیشانی پر جھولتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں پیچھے ہٹایا۔ اس کا بے ہوش جسم دائیں جانب جھکنے لگا۔ میں نے کوشش کرکے اسے پھر سے سنبھال لیا۔ اسے ایک ہاتھ سے یوں گھوڑے پر سنبھال کر رکھنا میرے لیے ازحد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

ہر گھڑی دل کو یہی دھڑکا تھا کہ کسی مسلح لارسی سے ہماری ملاقات ہوجائے گی اور اس ویرانے میں تڑاتڑ گولیاں چلنا شروع ہوجائیں گی' یا پھر سنسناتے تیر ہوا میں پرواز کرنے لگیں گے' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹا ہم مسلسل چلتے رہے۔ گھوڑا میری توقع سے زیادہ تعاون کررہا تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا' ہر لحظہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ گھوڑے کا پاؤں کسی گڑھے میں جائے گا اور وہ پشت پر زیادہ وزن کے باعث اپنی ہڈی تڑوا بیٹھے گا۔ بہرطور اس حوالے سے بھی خیریت ہی رہی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس آدھے گھنٹے میں ہم نے کتنا سفر کیا ہے اور جھیل سے کتنی دور آئے ہیں۔ آخر گھنے درختوں کے درمیان کوئی چار پانچ کلومیٹر مزید سفر کرنے کے بعد میں نے رکنے کا فیصلہ کیا۔ صفدر کی مسلسل بے ہوشی میرے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ میں اسے جلد از جلد ہوش میں دیکھنا چاہ رہا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ہوش میں آکر اس کا ردعمل کیا ہوگا' وہ خاموش رہے گا' غصہ دکھائے گا' یا پھر اپنی بھٹکی ہوئی ذہنی رو کے سبب قبیلے میں واپس جانے پر اصرار کرے گا' میں بس اسے اپنے ہوش و حواس میں دیکھنا چاہتا تھا۔

درختوں اور جھاڑیوں میں گھری ہوئی ایک ہموار جگہ پر میں نے ہانپتا ہوا گھوڑا روک لیا۔ صفدر کو نیچے اتارا اور ریتلی زمین پر لٹا دیا۔ شدید گرمی اب خوشگوار ٹھنڈک میں بدل چکی تھی۔ میں نے گھوڑے سے لٹکے ہوئے تھیلے کو ٹٹولا تو اس میں سے پانی کی بھری ہوئی بوتل نکل آئی' افریقہ کے جھلتے ہوئے شب و روز میں پانی ایک بہت بڑی نعمت تھا۔ میں نے بوتل میں سے کچھ پانی چلوؤں میں بھر بھر کر صفدر کے چہرے پر چھینٹے دیے۔ اس کے ہاتھ گیلے کیے' پاؤں کے تلوے گیلے کیے۔ تھوڑا پانی میں نے کوشش کرکے اس کے منہ میں بھی ٹپکا دیا۔ صفدر کی سانس اب ہموار ہوگئی تھی اور کسی وقت ہونٹوں میں جنبش بھی محسوس ہوتی تھی' مگر وہ ہوش میں بہرحال نہیں آرہا تھا۔

میں صفدر کے پہلو میں لیٹ گیا' صاف آسمان پر چاند ستارے روشن تر نظر آرہے تھے' ناریل اور کھجور کے بلند و بالا درخت اس آسمان کے پس منظر میں پراسرار متحرک ہیولوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ گھوڑا میرے پاس ہی گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ میں نے اس کی رسی دراز کرکے ایک درخت سے باندھ دی تھی۔ نجانے کیسے پروفیسر اللہ دتا کا خیال ذہن میں آگیا۔ وہ میرے قریب آکر ایک بار پھر دور چلا گیا تھا۔ مجھے صرف اتنا پتا چل سکا تھا کہ وہ "دورابا" نامی بستی کے لارسیوں کے ساتھ جھیل زار کی بستی میں آیا تھا۔ یہ بات مجھے صوفیہ نے معلوم کرکے بتائی تھی۔ اس کے علاوہ صوفیہ مجھے کچھ نہیں بتاسکی تھی اور نہ میں پوچھ سکا تھا۔

ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں خیالوں کے گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے نجانے کس وقت مجھے جھپکی سی آگئی۔ آنکھ کھلی تو چاند کا رخ دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ میں جسے مختصر جھپکی سمجھ رہا ہوں وہ ڈیڑھ دو گھنٹے پر مشتمل تھی۔ میں نے دیکھا کہ صفدر میرے پہلو سے غائب ہے۔ گھوڑے کی طرف نگاہ دوڑائی تو وہ بھی درخت کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ چاند کی روشنی اب کافی نمایاں ہوگئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا صفدر یا گھوڑا کہیں نظر نہیں آئے پھر اچانک میرا خیال رائفل کی طرف گیا۔ میں دوڑ کر وہاں واپس آیا جہاں لیٹا تھا۔ حسب اندیشہ رائفل بھی غائب تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ صفدر کو کوئی لے کر نہیں گیا بلکہ وہ خود یہاں سے گیا ہے۔ اگر اسے لے جایا جاتا تو پھر مجھے بھی یہاں سوتا ہوا نہ چھوڑا جاتا۔ اچانک میری نگاہ درختوں میں ایک چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا' یہ سگریٹ کا سلگتا ہوا ٹکڑا تھا۔ یہ اسی برانڈ کا سگریٹ تھا جو آج کل ہم پی رہے تھے۔ ان بیڑی نما سگریٹوں کا ایک پیکٹ میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے چونکہ غوطہ خوری کا لباس پہن رکھا تھا' یہ سگریٹ گیلے ہونے سے محفوظ رہے تھے۔ ان میں سے دو سگریٹ میں نے یہاں درختوں میں پہنچ کر پیے تھے۔ اس کے بعد کل پانچ سگریٹ میرے پیکٹ میں بچے تھے۔ میں نے سگریٹ گنے وہ چار تھے۔ پانچواں سگریٹ یقیناً صفدر نے پیا تھا۔ سلگتے ہوئے سگریٹ کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ابھی

زیادہ دور نہیں گیا۔ میں نے تیزی سے اس کا پیچھا شروع کردیا۔ میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ صفدر کی بے ہوشی کے بارے میں مجھے پہلے ہی کچھ شبہ سا ہو رہا تھا۔ خاص طور سے ان درختوں میں پہنچنے کے بعد صفدر کی مسلسل بے ہوشی نے مجھے الجھن زدہ کردیا تھا۔ اب میرے ذہن سے آواز آرہی تھی کہ کہیں صفدر کی بے ہوشی آخر میں ایک چال تو نہیں بن گئی تھی۔

صفدر کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا۔ اس کی ذہانت اور مستعدی کے بارے میں جتنا میں جانتا تھا شاید اتنا اور کوئی نہیں جانتا ہو۔ یہ عین ممکن تھا کہ دوران سفر وہ بتدریج ہوش میں آگیا ہو مگر اس نے مجھ پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا ہو۔ میرے بارے میں شکوک و شبہات تو اس کے ذہن میں پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے' اب جب اس نے اس چاندنی رات میں خود کو بستی سے دور میرے ساتھ اس ویرانے میں پایا ہوگا تو اس کے ذہن رسا نے آناً فاناً اسے بہت کچھ سمجھا دیا ہوگا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں شادی کی رسومات کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اسے قبیلے کی بستی سے اٹھالایا ہوں اور اب واپس نرسٹ لے جارہا ہوں۔

نیم روشن جنگل میں نہایت تیزی سے دوڑتے ہوئے مجھے جلد ہی صفدر اور گھوڑا نظر آگئے۔ میں نے دور سے صفدر کو اس کے کپڑوں سے شناخت کیا۔ وہ کیت گھوڑے کو درمیانی رفتار سے چلاتا جارہا تھا "صفدر رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا۔

اس نے ٹھٹک کر عقب میں دیکھا اور گھوڑا روک لیا۔

میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ صفدر اب مکمل ہوش میں تھا۔ رائفل اس کے بائیں ہاتھ میں تھی اور وہ یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر وہی قمیص تھی جو ابھی میرے ہاتھوں سے پھٹی تھی۔ اس کے بال منتشر شیو بڑھی ہوئی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ "صفدر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"یہی سوال میں آپ سے بھی کرسکتا ہوں۔" وہ عجیب بدلے بدلے سے لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں بستی سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں' اور یہ تمہاری بہتری کے لیے تھا۔ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ اگر ہے تو بتاؤ۔"

"اور میرے مفاد کے لیے ہی آپ نے مجھے بے ہوش کیا ہے؟"

"یہ ضروری ہوگیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔"

"شاید آپ کا اندیشہ درست ہی تھا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں بستی واپس جارہا ہوں شاہ جہاں صاحب۔ یہ ایک زندگی کا سوال ہے' آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری غیر موجودگی میں ویرا کچھ بھی کرسکتی ہے۔ میں اس کا خون اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتا جناب۔"

"اس کے لیے تم اپنے ساتھیوں کا خون گردن پر لے سکتے ہو؟۔۔ زریں گل' کلثوم' غزالہ' نانی کی زندگیوں پر تمہارے اس اقدام کا کیا اثر پڑے گا' یہ سوچا ہے تم نے؟"

صفدر گھوڑے سے اتر آیا۔ اس نے گھوڑا ایک درخت سے باندھا اور میرے ساتھ ہی گھاس پر بیٹھ گیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب' شاید آپ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میرے ذہن پر کسی طرح کا اثر ہے' یا کسی نے مجھے بری طرح بہکا رکھا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں شاہ جہاں صاحب ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ ویرا مجھ سے محبت کرتی ہے اور اس کی محبت اتنی شدید ہے کہ اب میں بھی اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا کہ اسے ٹھکرا سکوں۔ مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا شاہ جہاں صاحب۔ باقی جہاں تک آپ کا یہ اندیشہ ہے کہ ویرا کے ساتھ میری شادی سے خدانخواستہ زریں اور غزالہ وغیرہ پر کوئی مصیبت آئے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اندیشہ درست نہیں۔ آپ یقین رکھیں یہ شادی ہمارے اور ہمارے ساتھیوں کے لیے مشکل کشا ثابت ہوگی۔"

صفدر اپنی صفائی میں دلائل دے رہا تھا' اس کی گفتگو میں کوئی جھول بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ یقین کرنا انتہائی دشوار تھا کہ صفدر کی ذہنی حالت نارمل ہے اور وہ اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق بات کر رہا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف تھا میں کیسے یقین کرلیتا کہ وہ اتنے مختصر وقت میں اس قدر تبدیل ہوگیا ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ویرا کی محبت دس گنا بھی شدید ہوتی تو شاید صفدر کو یوں توڑ پھوڑ نہ سکتی۔

میں نے کہا "صفدر! میں یہ فیصلہ کرچکا ہوں کہ تمہیں اس گورکھ دھندے میں نہیں پھنسنے دوں گا۔ میں تمہیں واپس لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

"میں ایک بار پھر وہی بات کہوں گا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کہی ہے۔" صفدر اعتماد سے بولا "آپ یہ گمان

کر رہے ہیں کہ میری ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ بوکارلو' سردار بوہمات یا کسی اور نے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہے' ایسا کچھ نہیں ہے شاہ جہاں! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں بالکل نارمل ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا' تمہارے ایب نارمل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ تم میری بات نہیں مان رہے ہو۔ ویسے تو ایک فاترالعقل شخص بھی یہی کہتا ہے کہ وہ بھلا چنگا ہے اور اس جیسا عقل مند چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ میں نے کہا "صفدر۔۔ اگر تم واقعی نارمل ہو تو میری ایک بات ضرور مانو گے۔ تم فی الوقت ویرا کو بھول کر میرے ساتھ واپس نرسٹ چلو۔"

"یہ نہیں ہوسکتا!" صفدر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"جو تم کہہ رہے ہو' وہ بھی نہیں ہوسکتا۔ میں تمہیں واپس بستی جانے اور کسی وحشیانہ رسم میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

صفدر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے رائفل کندھے سے لٹکائی۔ گھوڑا کھولا اور خاموشی سے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ جونہی اس نے ایڑ لگائی' میں نے گھوڑے کی باگیں تھام لیں "شاہ جہاں صاحب! پیچھے ہٹ جائیے۔" وہ بے حد محتاط انداز میں بولا "میں آپ کی بے حد عزت کرتا ہوں۔"

"مجھے اپنی عزت کی طرح تمہاری سلامتی اور خیریت بھی عزیز ہے۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔"

صفدر نے ایک بار پھر زور سے ایڑ لگائی اور باگوں کو جھٹکا دیا۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ میں نے باگیں کھینچ کر روکنا چاہا تو گھوڑا لڑکھڑا گیا پھر وہ کچھ ہوا جس کی میں نے کبھی توقع بھی نہیں کی تھی۔ صفدر نے مجھے دھکا دیا' میں ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ چند لمحے کے لیے تو میں بالکل سکتے میں رہا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ سب صفدر نے کیا ہے اور میرے ساتھ ہوا ہے۔ صفدر گھوڑے کو سنبھال کر پھر اپنے راستے پر گامزن ہوگیا تھا۔ مجھے اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا۔ وہ میرا ایسا دوست تھا جو بھائیوں سے بڑھ کر عزیز تھا۔ ابھی اس نے مجھے دھکا دے کر ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں اس کی سوچیں کسی آسیبی جال میں جکڑی جاچکی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی جان دینا قبول کرلیتا مگر مجھے یوں جھٹک کر آگے نہ بڑھتا۔ یہ وہ صفدر نہیں تھا جسے میں جانتا تھا یہ کسی اسرار میں گرفتار کوئی اور شخص تھا۔ میں پوری قوت سے اس کے پیچھے دوڑا۔

صرف بیس پچیس گز دور جاکر میں نے اسے جالیا۔ میرا ہاتھ صفدر کی کمر پر آیا اور میں نے اسے کھینچ کر گھوڑے سے اتار لیا۔ وہ میرے اس "ایکشن" کے لیے جیسے پہلے سے تیار تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ یوں اٹھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں اور حواس مختل نظر آرہے تھے۔ ہاں واقعی یہ وہ صفدر نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔ اس نے دیوانہ وار ہاتھ گھمایا۔ اس کا طوفانی مکا میرے جبڑے پر پڑا اور آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ میں لڑکھڑایا۔ اسی دوران میں وہ دوسرا مکا تان چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ مکا میرے جبڑے پر لگ گیا تو شاید میں قدموں پر کھڑا نہ رہ سکوں۔ یہ میرے یار کا مکا تھا۔ اس کی طاقت اور ہلاکت میں بارہا اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرچکا تھا۔ میں نے تیزی سے سر جھکا کر صفدر کا یہ وار بچایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا۔ ہم دونوں گھوڑے کے پاؤں میں گرے تھے۔ وہ ہنہناتا اور اچھلتا ہوا دور جا کھڑا ہوا۔ صفدر کے سر کی ضرب میرے رخسار پر لگی اور میرے سر میں جیسے انگارے سے بھر گئے۔ وہ وار کر رہا تھا اور اس کا جواب دینا اب ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں اوپر تلے گھٹنے کی دو ضربیں لگائیں جونہی اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی۔ میں نے ٹانگوں کے زور سے اسے اچھال کر دور پھینک دیا۔ ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ یہ ایک خوفناک تصادم تھا۔ صفدر بے دریغ وار کر رہا تھا۔ طیش کے عالم میں اس کے حلق سے غرائیں برآمد ہو رہی تھیں۔ صفدر کی جسمانی قوت سے میں بخوبی آگاہ تھا' اب جنون کے عالم میں یہ قوت اور بڑھ گئی تھی۔ میرے دانتوں سے خون بہنے لگا تھا۔ سر اور پسلیوں پر بھی کئی زوردار چوٹیں آئی تھیں۔ میں صفدر پر جوابی وار تو کر رہا تھا مگر پھر بھی میری پوری کوشش تھی کہ اسے کوئی سنگین چوٹ نہ لگ جائے۔

میں نے دو تین بار اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے اس وار کی طرف سے بے حد محتاط تھا وہ ہر مرتبہ اپنی گردن صاف بچا گیا۔ لڑتے لڑتے اچانک صفدر کے ہاتھ میں کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی توانا شاخ آگئی۔ مجھے صفدر کے پاس اس شاخ کی موجودگی کا علم اس وقت ہوسکا جب و اوندھے منہ درختوں میں گرنے کے بعد سیدھا ہوا۔ اس وقت تک میرے لیے بہت دیر ہوچکی تھی۔ یہ لٹھ نما شاخ بڑی تیزی سے میرے سر کی طرف بڑھ رہی تھی' میں نے جھک کر وار بچانے کی کوشش کی۔ شاخ میرے سر کے پچھلے حصے اور

کان نہ گی۔ گوبادار ٹھکانے پر نہیں لگا تھا پھر بھی اس کی سنگینی قابل ذکر تھی۔ میرا سر جیسے ایک دم سن سا ہو گیا تھا۔ میں... لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ صفدر جست کر کے مجھ پر سوار ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ میری گردن پر آئے اور وہ پوری قوت سے میرا گلا دبانے لگا۔ لاٹھی نما شاخ کی چوٹ سہنے کے بعد میری آنکھوں میں پہلے ہی اندھیرا چھا رہا تھا' رہی سہی کسر گردن پر دو مضبوط ہاتھوں کے بے پناہ دباؤ نے پوری کر دی۔ کچھ وہی اذیت محسوس ہوئی جو رات کے پہلے پہر جھیل زار میں تیرتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔ ہوا ایک بار پھر میرے پھیپھڑوں سے بچھڑ گئی تھی۔ چند ہی لمحوں میں ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے صفدر کے نیچے سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی تاہم وہ کسی ماہر پہلوان کی طرح مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے دباؤ میں ایسی بے رحمی تھی کہ مجھے فرشتہ اجل کی پھڑپھڑاہٹ اپنے کانوں میں سنائی دینے لگی۔ آخری کوشش کے طور پر میرا ہاتھ اپنی پنڈلی کی طرف بڑھا' یہاں وہی چھرا موجود تھا جس سے میں نے جھیل میں موجود جال کو کاٹا تھا اور خود کو صفدر سمیت ان قاتل پانیوں سے نکالا تھا۔ میں نے چھرا پنڈلی سے کھینچ لیا مگر اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں صفدر پر ایک زوردار وار کر سکوں۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان انتہائی نازک لمحوں میں بھی یہی محسوس ہوا کہ میں صفدر پر وار کروں گا تو چھرے کا پھل صفدر کے گوشت میں نہیں میرے گوشت میں اترے گا۔ چھرا اپنے ہاتھ میں ہونے کے باوجود میں نے جو چند لمحوں کی تاخیر کی اس نے مجھے سخت نقصان پہنچایا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر سی تن گئی اور سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نہ کوئی منظر میرے روبرو رہا' نہ کسی تکلیف کا احساس باقی رہا' اور نہ یہ فکر کہ مجھے اپنے دفاع میں کیا کرنا ہے؟ ایک آسیب زدہ جنونی سے خود کو کیسے بچانا ہے؟

میرے حواس دوبارہ کتنی دیر بعد بحال ہوئے مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں۔ کم از کم ایک دو گھنٹے تو گزر ہی گئے ہوں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کھجور کے ان گھنے درختوں میں نہیں جہاں میرے اور صفدر کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ یہ ایک کھوہ قسم کی جگہ تھی۔ کھوہ کے دہانے سے چاندنی کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ چاند اب مغرب کی جانب جھکا ہوا محسوس ہو تا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اٹھنا چاہا اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ پاؤں نہایت مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔ بندشیں اتنی سخت تھیں کہ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ اٹھنے کی کوشش میں میں نے زور لگایا تو سر کے پچھلے حصے میں ٹیسیں اٹھیں۔ مجھے شاخ کی وہ ظالم ضرب یاد آئی جو صفدر کے ہاتھوں مجھے لگی تھی۔

"صفدر کہاں ہے؟" یہ سوال بڑی شدت سے میرے ذہن میں ابھرا۔

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کروں اور کھوہ میں سے نکل کر دیکھوں یا پھر صفدر کو آواز وغیرہ دوں۔ میں نے کروٹ بدل کر ڈھلوان کی طرف لڑھکنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ نہ صرف میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں بلکہ میں خود بھی کسی شے سے بندھا ہوا ہوں۔ میں گہری تاریکی میں تھا' خود کو ٹٹول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے پتا چل گیا کہ مجھے کھجور کے کٹے ہوئے وزنی تنے سے باندھا گیا ہے۔ میں زور لگا کر اس تنے کو معمولی جنبش تو دے سکتا تھا مگر اس کی جگہ نہیں بدل سکتا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ مجھے باندھنے والا میرا یار صفدر ہی ہے' لہٰذا اس نے باندھنے میں کسی طرح کی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میری پشت سخت کھردرے تنے سے پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ صفدر کو آواز دوں مگر پھر یکایک مجھے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ مجھے کہیں اپنے بالکل پاس مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ کھوہ کے دہانے میں سے چاند کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ روشنی کھوہ کے قریباً چالیس مربع فٹ ٹکڑے کو روشن کر رہی تھی۔ میری نگاہ اس روشن حصے پر جم گئی۔ آہٹ اس روشنی کے آس پاس ہی محسوس ہوئی تھی۔ پھر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے ایک حسین و جمیل سفید فام لڑکی کو دیکھا۔ اس کے نیم عریاں بدن کو بس چند پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ ڈری سہمی کھوہ میں داخل ہوئی اور سمٹ سمٹا کر ایک گوشے میں بیٹھ گئی۔ وہ ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ اس کا آدھا جسم تاریکی اور آدھا اجالے میں تھا۔ اس کے بھرے بھرے کولہے اور سنگ مرمری پنڈلیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں' بالائی دھڑ کھوہ کی تاریکی میں تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے مجھے جو آہٹ سنائی دی تھی وہ لڑکی کے کنگن وغیرہ کی تھی۔

یہ کون لڑکی تھی اور رات کے اس پہر اس ویران کھوہ میں کیا کرنے آئی تھی؟ یہ سوالات بڑے تجسس آمیز تھے۔ لڑکی کے اندر داخل ہوتے ہی میرے نتھنوں میں بھینی بھینی سی ایک نامعلوم خوشبو بھرنے لگی تھی۔ اس بو کا رنگ ڈھنگ خود رو جنگلی پھولوں جیسا تھا۔ میرے ذہن نے گواہی دی کہ ہو

نہ ہو' یہ لڑکی انہی بوب دوشیزاؤں میں سے ایک ہے جنہیں آج رات کے آغاز میں سر شام میں نے بستی میں دیکھا تھا۔ صوفیہ نے مجھے بتایا تھا کہ ان لڑکیوں کو رسم کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس نے اس خوشبو کے بارے میں بھی بتایا تھا جو لڑکیوں کے جسموں پر ملی جاتی ہے' تاکہ انہیں تلاش کرنے والے کو ان تک پہنچنے میں آسانی رہے۔

مگر یہ بوب لڑکی اس جگہ اس کھوہ میں کیوں گھس آئی تھی۔ وہ کسی ڈرے ہوئے خرگوش کی طرح دم سادھے بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ میں اس سے صرف پندرہ بیس فٹ کی دوری پر تھا لیکن چونکہ مکمل تاریکی میں تھا لہٰذا وہ میری موجودگی سے بے خبر تھی۔ پھر ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ صفدر مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر اسی جنگل میں لے آیا ہو جو بستی کے نواح میں واقع تھا' اور جہاں آج رات اسے بوب دوشیزاؤں کا تعاقب کرنا تھا۔ میں نے تھوڑا سا غور کیا تو یہ بات مجھے درست معلوم ہوئی۔ میں نے دو چار روز پہلے اس علاقے میں گھوم پھر کر دیکھا تھا' یہاں کچھ مقامات پر مجھے کھوہ نما جگہیں بھی نظر آئی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ انہی جگہوں میں سے ایک ہو۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کھوہ کے باہر سے گھوڑے کی مدھم ہنہناہٹ سنائی دی پھر دو افراد باتیں کرتے ہوئے کھوہ کی طرف چلے آئے۔ جلد ہی میں ان میں سے ایک کی آواز پہچان گیا' وہ صفدر تھا۔ وہ دونوں حیران کن طور پر انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ اس دوسرے شخص کی آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ صفدر اسے بے تکلفی سے رم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ اس علاقے میں اس کا کوئی نیا دوست ہے۔ شاید صفدر نے جہاں مجھ سے اور کئی باتیں چھپائی تھیں وہاں اس دوستی کے بارے میں بھی چھپایا تھا۔ رم بھی صفدر کو بے تکلفی سے نام لے کر بلا رہا تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے کہیں پاس ہی بیٹھ گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کھوہ کے اور حصے بھی ہیں' جیسے بڑے بڑے غاروں میں ایک سے زائد چیمبرز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے وسیع و عریض غار ہم نے گلگت سے آگے وادی موت میں دیکھے تھے۔ بہرحال یہ تو ایک چھوٹی سی کھوہ تھی۔ جو حصہ چاندنی میں دکھائی دے رہا تھا اس سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ کھوہ کسی چٹان کے اندر نہیں بلکہ بھربھری مٹی میں ہے۔

صفدر اور اس کے ساتھی کی آوازیں سننے کے بعد نیم عریاں لڑکی کچھ اور بھی دبک گئی تھی۔ اب اس کے جسم کا صرف ایک تہائی حصہ روشنی میں رہ گیا تھا۔ اب میں نے اس کے بازوں میں فل بوٹ کی طرز کے مقامی جوتے بھی دیکھ لیے تھے۔ ان جوتوں کو دیکھنے کے بعد مجھے سو فی صد یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی انہی بوب دوشیزاؤں میں سے ایک ہے جو سر شام میں نے دیکھی تھیں۔

میں نے اپنے کان اس گفتگو پر لگا دیے' جو صفدر اور اس کے نامعلوم ساتھی رم کے درمیان ہو رہی تھی۔ رم کی آواز قدرے پتلی تھی' وہ برطانوی لہجے میں بول رہا تھا۔

اس نے کہا "ان کی بے ہوشی خطرناک تو نہیں؟"

"نہیں ۔۔۔ نہیں۔" صفدر نے جواب دیا "جلد ہی ہوش میں آ جائیں گے۔ دراصل سر پر لگنے والی چوٹ سے انہیں کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ وہ آکسیجن کی کمی کے باعث بے ہوش ہوئے ہیں۔"

"اب پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟" رم نے پوچھا۔

"یہی مشورہ کرنے کے لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔" صفدر بولا۔

"میں تو پھر یہی کہوں گا کہ تم اپنے دوست سمیت فوراً بستی میں واپس پہنچ جاؤ۔ محترم بوکارلو کے نزدیک تمہاری بہت اہمیت ہے۔ تم درخواست کرو گے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔"

"اور اگر انہوں نے نہ کیا تو؟ ممکن ہے کہ کوئی قبائلی قانون آڑے آ جائے۔"

"میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہو گا۔ تمہارے دوست کا جرم فقط یہ ہے کہ اس نے تمہیں لے کر بستی سے فرار ہونے کی کوشش کی اور یہ کوئی بہت سنگین جرم نہیں ہے۔ جہاں تک محافظ عورت کا تعلق ہے اس کے ہلاک ہونے میں اس کی جسمانی چوٹ سے زیادہ اس کی شراب نوشی کا ہاتھ ہے۔ اس نے ضرورت سے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ لہٰذا بے ہوشی ابدی بے ہوشی میں بدل گئی۔"

صفدر اور اس کے دوست کی باتوں سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ جھیل کے کنارے جس گرانڈیل عورت سے میری مڈبھیڑ ہوئی تھی اور جسے میں جھاڑیوں میں بے ہوش پھینک آیا تھا' وہ "زیو تاؤں" کو پیاری ہو گئی ہے۔ (ان دونوں کی گفتگو مجھے حیرت انگیز طور پر صاف سنائی دے رہی تھی)

صفدر نے کہا "دیکھو رم' کچھ بھی ہے مسٹر شا میرے دوست ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ اختلافات ہیں مگر مسٹر شا کی زندگی مجھے اب بھی بے حد عزیز ہے۔ اگر محترم بوکارلو اور سردار بوغات نے عورت کی موت کو مسئلہ بنا لیا تو بہت گڑبڑ

ہو جائے گی۔ ویرا کی خاطر میں نے بہت قربانی دی ہے مگر پھر ایک ایسی حد آجائے گی جس کے بعد میں قربانی نہیں دے سکوں گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ...."

"جو تم چاہتے ہو میں اچھی طرح جانتا ہوں پیارے۔" رم نے صفدر کی بات کاٹی "مجھے یقین ہے کہ محافظ کی ہلاکت تمہارے دوست کے لیے سنگین مسئلہ نہیں بنے گی۔ ڈیوٹی کے دوران میں نشہ کرنا لاری قانون کے مطابق سختی سے ممنوع ہے' اور مرنے والا اور اس کے ساتھی اسی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" صفدر نے کہا۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ یہ نشے کی... لڑکھڑاہٹ تھی۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' پچھلے کچھ دن سے صفدر نے ٹھیک ٹھاک شراب نوشی شروع کر رکھی تھی۔ وہ کبھی چھپ کر اور کبھی میرے سامنے بھی اس شغل سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کا یہ شغل اس کی ابتر ذہنی کیفیت کی نشان دہی کرتا تھا۔ صفدر اور رم کی گفتگو کے درمیان وقفہ تھا' مجھے بوتل کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ صفدر یا پھر وہ دونوں "پی" رہے ہیں۔ دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد رم کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس نے کہا "شاید تمہیں ایک اور بات کا پتا نہیں صفدر؟"

"کون سی بات؟" صفدر نے پوچھا۔

"تم نے آج کی رات کھو دی تو پھر ویرا سے شادی کے لیے تمہیں کم از کم ایک مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ابھی رات کا کم از کم ڈیڑھ پہر باقی ہے۔ تم اب بھی بوب لڑکیوں کو تلاش کر کے "ہاتو" کی رسم پوری کر سکتے ہو۔ آج یہ رسم پوری ہو گئی تو صرف دس دن بعد تم ویرا کے ساتھ شب عروسی منا سکو گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بوب لڑکیوں کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے؟"

"ہاں مقامی رواج کے مطابق انہیں مقررہ وقت پر ہر صورت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر مستقبل کا دلہا موجود نہ ہو' یا وہ کسی وجہ سے لڑکیوں کے تعاقب میں روانہ نہ ہو سکے تو بھی لڑکیوں کو مقررہ وقت پر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ان کا نہ چھوڑنا بد شگونی سمجھا جاتا ہے۔ یہ لڑکیاں رات بھر جنگل میں گھومتی پھرتی ہیں' صبح سردار ریوجات کے محافظ ان لڑکیوں کو جنگل میں سے اکٹھا کر لیتے ہیں اور واپس "کانگے" کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ "کانگے" کا تمہیں پتا ہی ہو گا' وہ سردار کی سب سے بڑی بیوی ہے۔ اسے بوب دوشیزاؤں کی پیدائش' پرورش اور نگہداشت کا انچارج بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہونے والا دلہا' سردار یا نائب سردار کو اپنی غیر حاضری کا معقول ہرجانہ ادا کر دے تو اس کے لیے آزمائش کا اہتمام اگلے ماہ دوبارہ کیا جاتا ہے' ورنہ پھر اس معاملے کو ختم سمجھا جاتا ہے۔ اکثر ہرجانے کی رقم اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کسی پردیسی کے لیے اس کی ادائیگی بہت دشوار ثابت ہوتی ہے۔"

صفدر کی لڑکھڑاتی آواز میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ بولا "تمہارا مطلب ہے کہ جنگل میں پانچوں لڑکیاں چھوڑ دی گئی ہیں اور وہ اب بھی ہمارے آس پاس موجود ہوں گی؟"

"بے شک!" رم نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید صفدر اور رم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچنے میں مصروف تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات اب اچھی طرح آ گئی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے جو شعلہ صفت جنگلی لڑکی اس کھوہ میں گھسی ہے اور اب دبکی سہمی بیٹھی ہے' کون ہے؟ اور کیونکر یہاں پہنچی ہے؟ صفدر اور رم اس کی موجودگی سے بے خبر تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب بے خبر ہی رہیں۔ اسی شرمناک قبیح رسم سے صفدر کو بچانے کے لیے میں نے آج رات تگ و دو کی تھی اور خطرات مول لیے تھے' لیکن وہ رسم اپنے تمام تر گھناؤنے پن کے ساتھ پھر میرے سامنے کھڑی تھی۔

چند سیکنڈ کے بعد میں نے صفدر اور رم کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ مجھے دیکھنے کے لیے کھوہ کے اس حصے کی جانب آرہے تھے مگر دبکی ہوئی لڑکی نے سمجھا کہ شاید کوئی اسے نقصان پہنچانے اس کی طرف آرہا ہے۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری مدھم آواز نکلی اور وہ کھوہ میں آگے کو سرکتی ہوئی مکمل طور پر تاریکی میں اوجھل ہو گئی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کھوہ کچھ آگے تک بھی گئی ہوئی ہے۔ چند لمحے بعد صفدر اور اس کا ساتھی کھوہ میں داخل ہو گئے۔ صفدر کے ساتھی کے ہاتھ میں ایک روغنی مشعل تھی مگر اس کی روشنی اس ٹارچ جیسی تھی جس کے بیٹری سیل بس ختم ہونے کے قریب ہوں۔ میں صفدر کے سفید فام ساتھی کی صورت بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا۔ میں نے صفدر اور رم کو قریب پا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ صفدر نے جھک کر میری نبض دیکھی تو اس کے منہ سے اٹھنے والے الکحل کے بھبکے میرے نتھنوں سے ٹکرائے۔ اس نے پلکیں اٹھا کر میری پتلیاں بھی دیکھیں' اور

پھر مطمئن انداز میں اپنے ساتھی کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ ان دونوں کو کھوہ میں لڑکی کی موجودگی کا پتا نہیں چلا تھا۔ ممکن ہے کہ لڑکی کے جسم سے اڑنے والی جنگلی پھولوں کی خوشبو ان کی حس شامہ تک بھی پہنچی ہو مگر وہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکے۔ وہ دونوں باہر چلے گئے۔

چند لمحے بعد مجھے صفدر کی آواز سنائی دی' وہ رم سے مخاطب تھا "تم بھی چلو میرے ساتھ۔"

"نہیں۔" رم کا جواب فیصلہ کن تھا "یہ سب کچھ تمہیں اپنے طور پر کرنا ہے۔ یہی قبائلی قانون ہے اور ہاں وہ چھرا بھی یہیں رکھ جاؤ۔ اگر کسی بھی مرحلے میں کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ "ہاتو" کے دوران میں تمہارے پاس کوئی ہتھیار موجود تھا' تو نہ صرف تم آزمائش میں ناکام قرار پاؤ گے بلکہ اگر تمہاری شادی ہو چکی ہے تو وہ بھی کالعدم ہو جائے گی۔"

"لیکن...."

"لیکن کچھ نہیں۔ وہ چھرا مجھے دے دو۔" رم نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی چھرے کی بات ہو رہی ہے۔ جو دو ڈھائی گھنٹے پہلے تک میرے پاس موجود تھا۔ میں نے یہ چھرا اپنے دفاع میں صفدر پر چلانے کا سوچا تھا لیکن اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا' نتیجے میں بے ہوش ہوا تھا اور صفدر نے مجھے باندھ کر اس کھوہ کی زینت بنا دیا تھا۔ اب یہ چھرا صفدر کے پاس تھا اور رم اس سے واپس مانگ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں گھوڑے کی دور جاتی ہوئی تیز ٹاپیں سن رہا تھا۔

چاند اب کچھ اور مغرب کی سمت جھک گیا تھا' اس کی روشنی کھوہ میں مزید اندر تک آنے لگی تھی۔ تاہم کھوہ کا زیادہ تر حصہ اب بھی مکمل تیرگی میں تھا۔ رات کے اس پچھلے پہر اب ہلکی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی اور کھوہ کے اندر حبس میں قدرے کمی واقع ہو گئی تھی۔ کھوہ کے آس پاس اب مکمل خاموشی تھی۔ بس کسی وقت کسی شب بیدار جانور کی آواز سنائی دیتی تھی' یا پھر جھینگر کی تیز اور مسلسل پکار تھی جو خاموشی ہی کا حصہ بن گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سہمی ہوئی لڑکی کو کسی طرح اس کھوہ میں سے نکال دوں۔ کیونکہ وہ اس جنگل میں ایسی جگہ پناہ گزیں ہوئی تھی جو آج کی رات اس کے لیے سب سے خطرناک تھی۔ یعنی شکار خود ہی چل کر کچھار میں آگیا تھا لیکن اگر میں لڑکی کو آواز دے کر یہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا تو اس میں دو بڑے خطرات پوشیدہ تھے۔ ایک تو یہ کہ عین ممکن تھا' صفدر کا دوست رم کھوہ کے پاس ہی موجود ہو۔ میری آواز سن کر جب بوب لڑکی مجھ تک پہنچے یا یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے تو رم بھی یہاں پہنچ جائے اور لڑکی کو پکڑ لے۔ وہ خود بھی نشے میں تھا اور اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا کہ کیا کر گزرے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ ہو سکتا ہے' بوب لڑکی ہی میرے لیے خطرناک ثابت ہو جائے۔ میں آواز نکال کر اسے اپنی طرف متوجہ کروں تو وہ کھوہ سے بھاگنے کے بجائے خوف کے عالم میں مجھ پر ہی حملہ کر دے۔ میں مجبور محض ہو کر یہاں بندھا پڑا تھا۔ اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں دہشت زدہ لڑکی کسی پتھر یا اینٹ وغیرہ سے میرے سر اور چہرے کا بڑا اچھا بھرتا بنا سکتی تھی۔ سوچ بچار کے بعد میں نے خاموش لیٹے رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

کچھ دیر اسی طرح گزری پھر مجھے کافی فاصلے سے چیخ و پکار سنائی دی۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ نسوانی چیخیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ صفدر ایک بوب لڑکی کو پکڑنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایک دو منٹ کے اندر اندر یہ چیخیں قریب آگئیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوبار گھوڑے کی مخصوص آواز بھی ہوا کے دوش پر تیر کر میرے کانوں تک پہنچی۔ لڑکی کی چیخوں میں داد فریاد کے بجائے ایک وحشیانہ سا آہنگ تھا۔ وہ یوں چیخ رہی تھی جیسے کوئی حیوان خود کو خطرے میں پا کر چیختا ہے پھر لڑکی کا منہ کسی چیز سے بند کر دیا گیا۔ اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ صفدر لڑکی سمیت کھوہ کے اندر ہی کسی گوشے میں گھس گیا ہے۔ لڑکی کی چیخوں نے اس دوسری لڑکی کو بھی بری طرح مضطرب کر دیا تھا جو کھوہ کے اندر مجھ سے صرف چند قدم کی دوری پر موجود تھی۔ جنگلی لڑکی کے اضطراب کا ثبوت یہ تھا کہ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے کنگن بار بار بج اٹھتے تھے۔ بالکل وہی کیفیت تھی جو کسی خوں خوار درندے کی بو پا کر کسی چرندے کی ہو سکتی ہے۔ وہ کھوہ کی تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتی ہوئی میرے بالکل قریب آگئی۔ اب میں اس کے ہانپتے ہوئے سانسوں کی سرگوشی سن سکتا تھا۔ میرے بالکل قریب پہنچ کر بھی وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ میں کھجور کے تنے سے پیوست تھا اور شاید تنے کا ہی حصہ نظر آتا تھا۔ اچانک لرزتی کانپتی لڑکی نے بیٹھنے کی کوشش کی اور میرے سینے پر تشریف فرما ہو گئی۔ دفعتاً اسے اپنے نیچے کسی زندہ جسم کا احساس ہوا۔ وہ تڑپ کر اٹھی' اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ دہانے کی طرف لپکی۔ اسے کسی شے کی ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گر گئی۔ گر کر اٹھنے اور سنبھل کر پھر بھاگنے

میں اسے دو چار سیکنڈ لگ گئے۔ اسی دوران میں مجھے وہانے کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ بھاری قدم صفدر کے تھے۔ کھوہ سے باہر آٹھ دس فٹ کی دوری پر میں نے صفدر اور بوب لڑکی کو گتھم گتھا ہوتے دیکھا۔ بوب لڑکی کے حلق سے زوردار چیخیں نکلیں۔ مجھے چاندنی میں جو چند جھلکیاں نظر آئیں ان سے یہی معلوم ہوا کہ بوب لڑکی اپنی وحشیانہ طاقت استعمال کرکے صفدر کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہے اور غالباً اسے کاٹ بھی رہی ہے۔ بہرحال وہ بھی صفدر تھا' اس نے لڑکی کی مزاحمت کو زیادہ طول نہیں پکڑنے دیا۔ چند زوردار تھپڑ رسید کرکے اس نے لڑکی کو نیم جان کردیا اور پھر اسے کندھے پر اٹھا کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ اس دوسری لڑکی کو بھی اسی جگہ پر لے گیا تھا جہاں سے پہلی بوب لڑکی کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ نشے میں بہکا ہوا اور پراسرار ذہنی کیفیت میں الجھا ہوا صفدر اب ایک ایسا کام کرنے جارہا ہے' جو زندگی بھر اس کے لیے پشیمانی کا داغ بنا رہے گا۔ جب وہ اپنی پراسرار ذہنی کیفیت سے نکلے گا تو جرم کا ایک شدید احساس اس کے دامن گیر ہوگا اور ہمیشہ دامن گیر رہے گا۔

"صفدر... صفدر!" میں نے سینے کی پوری قوت سے اسے پکارا۔

صفدر کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا "صفدر میری بات سنو!" میں نے پھر چلا کر کہا۔

میری یہ چیخ وپکار بالکل بے سود ثابت ہوئی۔ صفدر میری آواز سنتے ہوئے بھی نہیں سن رہا تھا "صفدر! یہ تم ٹھیک نہیں کررہے ہو۔ کسی کی عزت خراب مت کرو... ان مظلوم لڑکیوں کی بددعا سے بچو... صفدر... صفدر..."

میں نے کئی بار اسے پکارا لیکن یہ سب بے سود رہا۔ میری بندشیں اتنی مضبوط تھیں کہ انہوں نے مجھے بے بس کرکے رکھ دیا تھا۔ اس رات میں صفدر کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہ کرسکا اور صفدر وہ سب کچھ کرگزرا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ سب کچھ ایک خوفناک خواب کی طرح تھا۔ اس خواب کو دہرانا بھی میرے لیے اذیت اور شرم کا باعث ہے۔

اس روز سورج طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے صفدر مجھے بندھی ہوئی حالت میں بستی واپس لے آیا تھا۔ ان واقعات کے ٹھیک دس روز بعد صفدر کی شادی ہونا قرار پائی۔ اس کی شادی لارسیوں کے "عظیم محترم بوکارلو" اور برائی کے "نیٹ ورک" "زرسٹ کے روح رواں کنگ کی بھتیجی ویرا سے ہو رہی تھی۔ یہ دس روز میں نے ایک طرح قید تنہائی میں گزارے تھے۔ میں بوما کے عقب میں واقع ایک تنہا کوٹھڑی میں تھا اور وہاں ہر وقت دو مسلح پہرے دار موجود رہتے تھے مجھے کھانا وغیرہ پہنچانے کے ذمے دار بھی وہی پہرے دار تھے وہ صرف مقامی زبان بولتے تھے' لہٰذا مجھے اردگرد کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو ابھی یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ میں اس کوٹھڑی میں ایک قاتل کی حیثیت سے قید ہوں یا پہلے کی طرح ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا ہوں۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ ابھی تک صفدر نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ان دس دنوں میں سیکڑوں بار میں قدموں کی آہٹ پر چونکا تھا' اور میرے دل میں یہ امید جاگی تھی کہ شاید یہ صفدر کے قدموں کی آواز ہو مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

یہ دسویں روز کی بات ہے۔ میں گم صم سا کوٹھڑی میں بیٹھا تھا' غزالہ اور زریں گل وغیرہ کی صورتیں نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔ ان لوگوں سے جدا ہوئے اب ہمیں قریباً پانچ ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ مجھے غزالہ کی طرف سے زیادہ فکرمندی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ بھی ان دنوں میری طرف سے ضرورت سے زیادہ فکرمند رہتی تھی۔ جب میں نرسٹ میں تھا تو بعض اوقات مجھ سے چند گھنٹوں کی دوری بھی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ عجیب عجیب سے وہم اسے گھیرنے لگتے تھے۔ اب میری مستقل دوری اور گمشدگی کو وہ نجانے کیسے جھیل رہی تھی۔ غزالہ کے بعد سائیں عالی کا خیال ذہن میں آ دھمکا۔ میں نے کئی دنوں سے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن ایک آسیب کی طرح وہ ہر وقت میرے آس پاس رہتا تھا۔ میں اسے سوچتا تھا اور پھر سوچتا چلا جاتا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ صوفیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دس دنوں میں پہلی مرتبہ مجھے اپنے کسی شناسا کی صورت نظر آئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر ان گنت سوال مچل گئے۔ صوفیہ میری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح بھانپ گئی تھی۔ بولی "مسٹر شاہ! مجھے آپ سے ملاقات کے لیے تھوڑا سا وقت دیا گیا ہے' لہٰذا میں لمبی بات نہیں کرسکتی۔ میں صرف اتنا عرض کروں گی کہ قبیلے کے زنانہ فوجی دستے کی ایک رکن آپ کے ہاتھوں شدید زخمی ہونے کے بعد ہلاک ہوگئی ہے۔ یہ ایک خاصا سنگین جرم تھا۔ مگر صفدر کی گزارش اور سفارش پر آپ پر فرد جرم عائد نہیں کی گئی۔ اس کے علاوہ اس معاملے میں محترم بوکارلو کی طرف سے بھی آپ کے ساتھ نہایت صلہ رحمی کا سلوک کیا گیا ہے۔"

"لیکن مجھے مسلسل قید تنہائی میں رکھا جارہا ہے؟"

"یہ تو آپ ہی کی بہتری کے لیے ہے۔ یوں سمجھیں کہ آپ کو حفاظتی تحویل میں رکھا گیا ہے۔ کل تک آپ پر لگائی جانے والی پابندیاں مزید نرم کردی جائیں گی۔ آپ کو صفدر صاحب کی شادی میں شریک ہونا ہے۔ کل ان کی شادی مس ویرا کے ساتھ انجام پارہی ہے۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا' تاہم ایسے گھونسوں کے لیے میں ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے اچھا نہیں ہورہا لیکن میں یہ سب کچھ دیکھنے اور برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ شادی سے ایک رات پہلے بستی کے وسط میں ایک بڑا الاؤ روشن کیا گیا۔ اس الاؤ کے گرد ناچ گانے کا پروگرام تھا۔ نوجوان قبائلی لڑکیاں اور لڑکے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکال رہے تھے اور ڈھول کی تھاپ پر دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ مجھے بھی دو محافظوں کی نگرانی میں اس تقریب میں شرکت کے لیے لایا گیا۔ میں صفدر کی صورت دیکھنے کو ترسا ہوا تھا مگر صفدر مجھے یہاں کہیں نظر نہیں آیا۔ ہاں پُرجمال ویرا کی صورت ضرور دکھائی دی۔ وہ ایک بالکل سفید لباس میں ملبوس کوئی حور پری ہی لگتی تھی۔ اس کے ریشمی بال ہمیشہ کی طرح اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔ سر پر سفید اور پیلے جنگلی پھولوں سے بنایا گیا ایک تاج تھا۔ اس سادہ سے تاج نے اس کی خوب صورتی کو چار بلکہ آٹھ دس چاند لگا دیے تھے۔ وہ واقعی ایک مسحور کن شخصیت کی مالک تھی۔ سائنسی لیبارٹری کی بدبودار تاریکیوں نے اس کے حسن کو ڈھانپ رکھا تھا' اب وہ اس مکینیکل زندگی سے نکل کر کھلی فضاؤں میں حسنِ فطرت کے نزدیک آئی تھی تو پھولوں ہی کی طرح کھل اٹھی تھی۔ اور یہ کھلے ہوئے سارے پھول کسی کی جھولی میں گرنے کے لیے بے تاب ہوگئے تھے۔ ویرا کی دلکش شخصیت کسی بھی مرد کو اپنا دیوانہ بنا سکتی تھی... اور اسی نے میرے یار کو دیوانہ بنایا تھا' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ چچا بھتیجی نے مل کر اسے دیوانہ بنایا تھا۔ وہ جو میرے پسینے پر خون گرانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا اور میرا نام لے لے کر جیتا تھا' اس نے چچا بھتیجی کی خاطر میرے ساتھ باقاعدہ ٹکر لی تھی اور دو بدو مقابلہ کیا تھا۔ اس مقابلے میں وہ کامیاب رہا تھا اور میں کامیابی کے قریب پہنچ کر بھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ منظر اب بھی میرے ذہن میں تازہ تھا' جب تیز دھار چھرا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں صفدر کے پہلو میں ایک کاری ضرب لگا کر خود کو اس کی بے رحم گرفت سے نکال سکتا تھا مگر مجھ سے یہ نہیں ہوسکا تھا' یہاں تک کہ میرا ذہن اچانک تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔

بھڑکتے ہوئے سرخ الاؤ کے گرد جشن کا سا منظر تھا۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ چمکتے سیاہ چہروں والی مقامی لڑکیاں ویرا سے شوخ سرگوشیاں کررہی تھیں۔ وہ کسی دلہن ہی کی طرح شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ اسی دوران میں بوکارلو کی صورت نظر آئی۔ وہ حسب معمول ایک کھلے لبادے میں ملبوس تھا۔ اپنے گلے کی مالا اور چہرے و سر کے بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے وہ کوئی پیر فقیر قسم کی شے ہی نظر آتا تھا۔ اس کے عقب میں حبشی ملازمین دو شاندار سفید بھیڑیں لے کر آرہے تھے۔ یہ بھیڑیں دلہن کے قدموں میں ذبح کی گئیں اور بوما کے سب سے بڑے پجاری نے ویرا کے گرد گھوم کر اناپ شناپ پڑھا۔

صوفیہ میرے پاس سے گزری تو میں نے پوچھا "کیا میں صفدر سے مل سکتا ہوں؟"

وہ مسکرائی "بالکل نہیں۔ اس وقت آپ کا دوست سخت مصیبت میں ہے۔ مقامی رواج کے مطابق' آج کی رات دلہن کی سات سہیلیاں اس کی مہمان ہیں۔ رسم کے مطابق وہ سب رات بھر اس کو اپنی شرارتوں کا نشانہ بنائیں گی۔ آپ کے دوست سے ناچ اور گانے وغیرہ کی فرمائش کی جائے گی' اور انکار پر اسے نقدی کی صورت میں بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ آپ کا دوست اپنی ساتوں مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلائے گا۔ اور یہ کام اسے ہر صورت کرنا پڑے گا۔

الاؤ کے گرد جوش و خروش دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا تھا۔ چاول اور کھجور کی شراب کے پیالے گردش کرنے لگے تھے اور راگ رنگ کے شور میں اضافہ ہوگیا تھا۔ کچھ لڑکیاں ایک بڑے تھال میں بیضوی شکل کا ایک بڑا تربوز لے کر آئیں اور ادب سے بوکارلو کے سامنے کھڑی ہوگئیں۔ ایک طرف سے سردار بوعات کی تین عدد پردہ پوش بیویاں برآمد ہوئیں' ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی کپڑے سے باہر نہیں تھا۔ انہوں نے تربوز والا تھال ایک ایک ہاتھ سے تھام لیا اور اجازت طلب نظروں سے بوکارلو کی طرف دیکھنے لگیں۔ بوکارلو نے سر کے اشارے سے انہیں اجازت دی۔ بوکارلو کچھ پژمردہ نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خوشی کی اس تقریب میں خوشی سے شریک ہے مگر اس کے باوجود خوش نہیں ہے۔ ایک کرب اور ایک بیزاری سی اس کے چہرے پر محسوس کی جاسکتی تھی۔

سرتاپا لبادے میں چھپی ہوئی تینوں "خواتین اول" تربوز لے کر دلہن کے قریب پہنچ گئیں۔ اب بوکالو گھٹنوں پر

زوروے کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سست قدموں سے چلتا ہوا دلہن کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے احترام سے ایک چھری تھما دی گئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ یہ قبیلے کے کسی مقدس کھیت میں اگا ہوا مقدس تربوز تھا' اور بوکارلو کا کام یہ تھا کہ وہ تربوز کو کاٹ کر اس کا سرخ گودا دلہن کے چہرے پر ملے۔ بوکارلو چھری بدست تربوز کی طرف بڑھا مگر ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اچانک اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ تربوز والے تھال سے ٹکراتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔ تربوز زمین پر گرا اور لڑھک کر دور چلا گیا۔ پردہ پوش عورتیں بھی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ بوکارلو کے گرتے ہی کئی نسوانی چیخیں فضا میں بلند ہوئیں۔ کئی محافظ بوکارلو کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ ایک دم چاروں طرف ہلچل مچ گئی تھی۔ ناچ گانا ختم کیا تھا اور سازندے خاموش ہو گئے تھے۔ مجھے ہجوم میں بوکارلو دکھائی نہیں دیا' تاہم صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گر کر بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گیا ہے۔ چند لمحے بعد مقامی طرز کی ایک چارپائی بھی وہاں پہنچ گئی۔ دو تین منٹ بعد میں نے دیکھا کہ بوکارلو کو چارپائی پر لٹا کر اس کے جھونپڑے کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ معالج موسو بھی گھبراہٹ کے عالم میں چارپائی کے ساتھ ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔ ساری تقریب درہم برہم ہو گئی تھی۔ الاؤ بجھا دیا گیا اور ناچنے گانے والے کونے کھدروں میں او جھل ہو گئے۔ بس سردار کی پردہ پوش بیویوں نے ویرا کے قریب کھڑے ہو کر چند مختصر رسمیں ادا کیں اور قبائلی لڑکیاں ویرا کو لے کر بستی کے وسط کی طرف چلی گئیں۔ محافظ مجھے میری نیم پختہ کوٹھڑی میں واپس لے آئے۔

اگلے دو گھنٹے میں نے اضطراب کے عالم میں گزارے۔ بوکارلو کے زخمی ہاتھ پر ابھی تک پٹی نظر آتی تھی' اب یہ کوئی دوسری تکلیف اسے لاحق ہو گئی تھی۔ اچانک صوفیہ کی صورت نظر آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سب خیریت ہے' محترم بوکارلو کی حالت اب بہتر ہے۔

"مگر انہیں ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا افسردگی سے بولی "ان کا وہی ہاتھ والا مسئلہ ہے۔ وہی ہوا ہے جس کا ڈر تھا' ہر ممکن علاج کے باوجود ان کے ہاتھ کا زخم اچھا نہیں ہو سکا۔ زخم بری طرح خراب ہے اور اسی وجہ سے محترم بوکارلو کو پچھلے دو روز سے شدید بخار بھی ہے۔ مس ویرا کی خوشی میں شرکت کے لیے وہ خود پر جبر کر کے تقریب میں آ تو گئے مگر تیز بخار اور کمزوری کے باعث چکرا کر گر گئے۔"

میں نے کہا "ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ یہ جدید دور ہے' اگر اس دور میں بھی ہم خام جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے اپنی تکلیفوں کا علاج کریں گے تو اسے عقل مندی نہیں کہا جائے گا۔"

"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ مقامی معالج موسو کے علاوہ ایک تجربہ کار اسکن اسپیشلسٹ بھی محترم بوکارلو کے زخم کو دیکھتا رہا ہے اور ٹریٹ منٹ دیتا رہا ہے مگر اب وہ بھی مایوس نظر آ رہا ہے۔ اور ....."

"اور کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ افسردگی سے بولی "اب اسی ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ محترم بوکارلو کا ہاتھ کہنی پر سے کاٹا جانا ضروری ہو گیا ہے' ورنہ زخم کا زہر ان کے پورے جسم میں پھیل سکتا ہے۔"

"عجیب بات ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا.... کہ جس LIZARD نے محترم بوکارلو کو کاٹا ہے اس کا زخم ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی کئی ایسی مثالیں موجود ہیں۔"

چند لمحے خاموشی رہی' پھر میں نے پوچھا "اب کیا ہو گا؟"

"محترم بوکارلو کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ کام کل صبح ہی کر دیا جا سکے۔"

"ویرا اور صفدر کی شادی کا کیا بنے گا۔"

"یہ شادی اب دو چار روز لیٹ ہو جائے گی۔" صوفیہ نے کہا۔

دوسرے روز دوپہر کو صوفیہ نے مجھے یہ خبر دی کہ دو ماہر ڈاکٹروں نے محترم بوکارلو کا ہاتھ کہنی کے اوپر سے کاٹ ڈالا ہے۔ اور وہ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چند روز دیکھا جائے گا اگر زخم میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہوئے تو پھر مزید سرجری کرنا پڑے گی۔

صوفیہ کے لیے یہ ایک غم ناک خبر تھی۔ میں اور صوفیہ کچھ دیر تک اس صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ بوکارلو کو یہاں پراسرار روحانی قوتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا اور واقعی اس میں کچھ حیرت انگیز صلاحیتیں موجود بھی تھیں مگر اپنے جسمانی عارضے کے سامنے وہ بھی بے بس ہو گیا تھا۔ بوکارلو کا ہاتھ کاٹا جانا غیر اہم واقعہ نہیں تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ میں نے قبیلے کے اکثر ایسے افراد کے چہروں پر پژمردگی دیکھی جو مجھے اپنی کال کوٹھڑی میں سے نظر آئے۔

اس شام ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ بے شمار گھوڑوں اور اونٹوں کی ٹاپوں سے بستی کے در و دیوار لرزنے لگے۔ ہر طرف مشعلیں بھڑ بھڑاتی نظر آئیں اور مجھے پھر اسی قسم کے

نعرے اور للکارے سنائی دیے جو چند روز پہلے مہمان لارسیوں کی آمد پر سنائی دیے تھے۔ اس مرتبہ ان نعروں میں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔ لشکریوں کی تعداد بھی کہیں زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ کئی سمتوں سے بستی میں اڈے چلے آ رہے تھے' میرے دل نے گواہی دی کہ بستی میں ان لشکریوں کی دوبارہ آمد کا تعلق اس واقعے سے ہے جو آج بستی میں رونما ہوا ہے۔ بوکارلو کا ہاتھ کاٹا جانا کسی طرح بھی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' بوکارلو کی خواہش تھی کہ ہاتھ کاٹے جانے کے واقعے کی تشہیر نہ ہو تاکہ مزید کشیدگی سے بچا جا سکے۔ بوکارلو کو اندیشہ تھا کہ اگر اس واقعے کا علم دیگر بستیوں کے لارسیوں کو ہو گیا تو وہ جو کنگ کے خلاف پہلے ہی مشتعل ہیں' مزید مشتعل ہو جائیں گے۔ اور یہی کچھ ہوا تھا۔ ہاتھ کاٹے جانے کی خبر راز نہیں رہ سکی تھی اور اس واقعے کے صرف دس بارہ گھنٹے بعد بپھرے ہوئے لارسیوں کا ایک جم غفیر یہاں پہنچ گیا تھا۔

بستی میں ایک بار پھر زبردست ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ افراتفری کا سماں تھا۔ میری کوٹھڑی کے سامنے موجود رہنے والے دونوں مسلح پہرے دار بھی اس ہنگامے میں کہیں کھو گئے تھے۔ میں کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ میری خواہش تھی کہ پروفیسر سے آج پھر کہیں ملاقات ہو جائے۔ جو بات میں اس سے کہنا چاہتا تھا وہ ہر پل' ہر گھڑی میرے ہونٹوں پر مچلتی رہتی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ ان کہی باتوں کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اب میں اس ان کہی کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا جس کا تعلق پروفیسر کی لاڈلی بیٹی شائستہ سے تھا' اب میں ہر صورت یہ بات اس تک پہنچا دینا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی زندہ سلامت اسی دنیا میں موجود ہے۔

میں کوٹھڑی سے نکلا تو گلیوں میں ہر طرف لشکریوں کے گھوڑے نظر آئے۔ وہ تند بگولوں کی طرح چاروں طرف چکرا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مشعلیں' برچھیاں اور رائفلیں تھیں۔ ان میں سے کم از کم چار پانچ سو افراد عبادت گاہ بوما کے گرد جمع تھے اور پرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ ان پرغضب نعروں کا نشانہ یقیناً ٹرسٹ اور کنگ براؤن ہی تھے۔ میں پروفیسر اللہ دتا کو تلاش کرتا رہا اور ان لوگوں میں گھومتا رہا۔ پروفیسر مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا' اب ان میں بہت سے مقامی لارسی بھی شامل ہو گئے تھے اور جوشیلے نعرے لگا رہے تھے۔ گاہے گاہے ان کے ہتھیار بھی فضا میں بلند ہوتے تھے۔ ان ہتھیاروں میں آتشیں اسلحے کے علاوہ جو ہتھیار سب سے زیادہ نظر آتا تھا وہ برچھی تھی۔ پھر کچھ لوگوں نے جوش کے عالم میں ہوائی فائرنگ بھی شروع کر دی۔ اسی دوران میں میں نے بوکارلو کو دیکھا۔ وہ اپنے جھونپڑے سے نکلا اور چند قدم چل کر ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے شانوں پر چادر ڈال رکھی تھی اس کے باوجود فوراً اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ کہنی سے اوپر تک موجود نہیں۔ بوکارلو کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس کی ہمیشہ سرخ نظر آنے والی بڑی بڑی آنکھیں اپنے اندر نقاہت کا رنگ لیے ہوئے تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہجوم قدرے پرسکون ہوا تو بوکارلو نے بڑے مدبرانہ لہجے میں لوگوں کو سمجھانا بجھانا شروع کر دیا۔ وہ مقامی زبان میں بات کر رہا تھا۔ میرے پلے ایک لفظ نہیں پڑ رہا تھا مگر لب و لہجے سے مفہوم کافی حد تک واضح ہو رہا تھا۔ اتنے میں صوفیہ میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس نے مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھے بتایا "لوگ بہت غصے میں ہیں۔ وہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق تھوڑی ہی دیر میں ڈیڑھ دو ہزار تک پہنچ جائے گی۔ اگر ان لوگوں نے ٹرسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تو خون ریز ہنگامہ ہو گا اور محترم بوکارلو کسی صورت خون ریزی نہیں چاہتے وہ ان لوگوں کے جذبات ٹھنڈے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بھی دیکھ رہے ہیں' میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا ہے۔ وہ بڑے عرصے سے بھڑک رہے ہیں اور محترم بوکارلو بڑے عرصے سے ان پر پانی کے چھینٹے ڈال رہے ہیں۔"

بوکارلو مسلسل تقریری انداز میں بول رہا تھا' اس کا اکلوتا ہاتھ بار بار فضا میں اٹھتا تھا اور لہجہ بلند ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی طرح اس کے لہجے میں بھی ایک پراسرار توانائی تھی۔ یہ توانائی سننے والے کے اندر سرایت کر جاتی تھی۔ ہجوم میں سے کچھ افراد نکل کر آگے آئے اور تیز لہجے میں بوکارلو کے سامنے بولنے لگے۔ یقیناً وہ بوکارلو کے سامنے اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے پھر ایک ادھیڑ عمر قبائلی آگے بڑھا۔ اس نے برچھی فضا میں بلند کی۔ برچھی کی نوک پر ایک کٹا پھٹا زنانہ لباس لہرا رہا تھا۔ لباس پر بڑے بڑے سیاہ دھبے بھی تھے۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ خون کے پرانے دھبے ہیں۔ ادھیڑ عمر قبائلی غم و غصے کے عالم میں برچھی کو بار بار حرکت دے رہا تھا اور بلند آواز میں بول رہا تھا۔

اس کی گردن پسینے میں شرابور تھی اور رگیں پھولی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے صوفیہ سے پوچھا۔

وہ بولی "تین چار مہینے پہلے اس شخص کی بیٹی کو نواحی جنگل سے نرسٹ کے لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے پہلے راستے میں ہی اس کی آبرو ریزی کی' پھر لے کر نرسٹ کی طرف روانہ ہوئے' ایک جگہ لڑکی کو موقع مل گیا' وہ چلتی ہوئی تیز رفتار جیپ سے ایک کھائی میں کود گئی اور ہلاک ہو گئی۔ یہ شخص اسی بدنصیب لڑکی کا لباس محترم بوکارلو کے سامنے لہرا رہا ہے۔"

لباس کو برچھی کی نوک پر لہراتے دیکھ کر ہجوم میں ایک بار پھر جوش و خروش کی لہریں ابھرنے لگی تھیں۔ ہتھیار فضا میں بار بار بلند ہو رہے تھے اور نعرے گونج رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے بوکارلو کی آواز ہجوم کے شور میں دب کر رہ گئی۔

بوکارلو کے محافظوں نے چیخ چیخ کر بمشکل لوگوں کو چپ کرایا۔ ایک بار پھر بوکارلو نے اپنے سحر انگیز لب و لہجے سے حاضرین کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ لوگ پہلے کھڑے تھے پھر آہستہ آہستہ بیٹھنے لگے۔ جو نہیں بیٹھ رہے تھے انہیں محافظوں نے بٹھانا شروع کر دیا۔ لوگ بوکارلو کی تقریر سننے پر مجبور ہونے لگے تھے۔ بوکارلو نے برچھی کی نوک پر لہراتا ہوا خستہ حال لباس اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے مٹھی میں بھینچ کر جذباتی لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ غالباً وہ لوگوں کو یقین دلا رہا تھا کہ اس بدنصیب لڑکی اور ایسے ہی دوسرے بدنصیب لوگوں کو انصاف ضرور ملے گا۔ ان کا خون رنگ لائے گا اور "سچی آزادی" کی شمع روشن ہوگی۔

بوکارلو تقریباً آدھے گھنٹے تک مسلسل بولتا رہا۔ مشتعل ہجوم قدرے پرسکون نظر آنے لگا۔ اچانک ایک طرف شور بلند ہوا۔ بہت سے افراد اٹھ کر ایک گھڑ سوار کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میں اور صوفیہ بھی اس جانب گئے۔ گھوڑا اور گھڑ سوار دونوں پسینے میں شرابور تھے۔ چند افراد سفید فام گھڑ سوار کو سہارا دے کر گھوڑے سے اتار رہے تھے۔ گھڑ سوار زخمی تھا اور اس کے ایک کندھے سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ یہ واضح طور پر گولی کا زخم تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ بوکارلو کا وہی ساتھی تھا جو چند روز پہلے بوکارلو کی جیپ پر کھنڈر سے واپس آیا تھا۔ لوگ اسے سہارا دے کر کچھ آگے لائے۔ اس دوران میں بوکارلو بھی لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا زخمی تک پہنچ گیا "یہ کیا ہوا؟" بوکارلو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

زخمی نے چند گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کیے اور بولا "نرسٹ کے لوگ مس ویرا کی شادی سے باخبر ہو چکے ہیں۔ وہ مس ویرا کو زبردستی یہاں سے لے جانے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ مس ویرا کی شادی نرسٹ میں ہی کسی سے کرنا چاہتے ہیں اور اس کی پوری تیاری کر چکے ہیں۔ میں جنگل کے راستے سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ وہ لوگ بس یہاں پہنچا ہی چاہتے ہیں۔"

"کتنے لوگ ہیں؟" بوکارلو نے پوچھا۔

"وہ تین جیپوں میں ہیں۔ پچیس تیس تو ہوں گے لیکن وہ اکیلے نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ان تین جیپوں کے پیچھے مسلح کمانڈوز سے بھرے ہوئے کم از کم ایک درجن ٹرک ہیں۔ یہ لوگ بڑے خطرناک ارادے سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ وہ کسی بھی قیمت پر مس ویرا کو یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں گولی کیسے لگی؟"

"مسٹر چین نے ایک جیپ میں میرا پیچھا کیا اور مجھ پر گولی چلائی۔" زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"چین بھی ان کے ساتھ آ رہا ہے؟" بوکارلو نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اس کے علاوہ مسٹر مائیکل اور کنگ براؤن بھی ہمراہ ہیں۔" زخمی نے انکشاف کیا (اس کی آنکھیں نیلی تھیں' اور اسی وجہ سے مجھے زخمی کی صورت یاد رہی تھی)

میں نے دیکھا کہ بوکارلو کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ غالباً ایسا کنگ براؤن کی آمد کی اطلاع سن کر ہوا تھا! کنگ اپنے چھوٹے بھائی بوکارلو سے بالکل مختلف طبیعت کا تھا۔ اس کی آتش مزاجی' تند خوئی اور سفاکیت اسے بوکارلو سے بالکل مختلف شخص ظاہر کرتی تھی۔ اور میں نے محسوس کیا تھا کہ بوکارلو بہت حد تک اپنے بڑے بھائی سے ڈرتا تھا۔ بوکارلو کا کٹا ہوا بازو اسی سفاکیت کا نتیجہ تھا جو کنگ کے مزاج کا لازمی جزو تھی اور اب یہ سفاک شخص پورے لاؤ لشکر کے ساتھ لارسیوں کی اس بستی میں قدم رنجہ فرما رہا تھا۔

بوکارلو اور زخمی کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہوئی تھی' میرا خیال تھا کہ شاید عام لارسی اس گفتگو کی سنگینی سے بے خبر ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کیسے دو تین منٹ کے اندر اندر یہ خبر لارسیوں میں پھیل گئی۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے بوکارلو کی تقریر کے زیر اثر پرسکون ہو چلے تھے' ایک بار پھر ہیجان کا شکار ہونے لگے۔ غیظ و غضب اور جوش کی ایک تند و تیز لہر تھی جو ہجوم کے اس کنارے سے اس

کنارے تک پھیلتی اور لپکتی چلی گئی پھر ہجوم کے اگلے حصے سے کسی لارسی نے ایک پرجوش نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کے جواب میں سیکڑوں ہتھیار فضا میں بلند ہوئے اور ایک زمین ہلا دینے والا نعرہ تاریک فضاؤں میں گونج گیا۔ یہ نعرہ جیسے بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ ایکا ایکی پرجوش جنگلی نعرے لوگوں کا جوش و خروش انتہا کو پہنچانے لگے۔ لوگ ہتھیار لہرا رہے تھے' اچھل رہے تھے اور ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم نے ایک تند و تیز سیلابی ریلے جیسی شکل اختیار کر لی۔ ایسا ریلا جو صرف آگے بڑھنا چاہتا ہے اور اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے۔ اب شاید بوکارلو بھی ان لوگوں کو نہیں روک سکتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اب وہ روکنا چاہتا بھی نہ ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو اطلاع زخمی گھڑ سوار کے ذریعے یہاں تک پہنچی تھی وہ سنگین حالات کی نشان دہی کر رہی تھی۔

میں نے کئی خون ریز ہنگامے دیکھے تھے۔ ایسے ہنگاموں سے قبل فضا میں ایک سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر بندہ اپنی توجہ مرکوز کرے تو وہ ایسے ہنگاموں سے قبل فضا میں خون اور بارود کی بو سونگھ سکتا ہے۔ شاید میدان جنگ میں موجود فوجی بھی اس قسم کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ زار جھیل کے کنارے اس وسیع و عریض بستی میں سیاہ رات جیسے سیاہ فام لارسیوں کا جوش و خروش دیکھ کر مجھے کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں نائب سردار لاروتابے ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چائنیز C.Q رائفل نظر آ رہی تھی' رائفل ہوا میں لہرا کر وہ چیخ چیخ کر کچھ بولنے لگا۔ اس کے بولنے کی دیر تھی کہ ڈھولچیوں نے ڈھول پر تھاپ دینی شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے یہ تھاپ تیز ہونے لگی اور تھاپ کے ساتھ ہی لارسیوں کا ولولہ بھی بڑھتا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد زنانہ فوج کا دستہ بھی میدان میں آ گیا۔ ان جنگجو عورتوں کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ بستی کی عام لڑکیوں اور عورتوں کے برعکس یہ تیم شحیم کرانڈیل عورتیں تھیں۔ وہ نیزوں اور رائفلوں سے مسلح تھیں۔ چند عورتوں کے پاس مجھے کلہاڑیاں بھی نظر آئیں۔

میں نے دیکھا کہ لاروتابے سپہ سالار کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کی ہدایت پر لشکری مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور تین اطراف میں حرکت کرنے لگے۔ بھڑکتی ہوئی شعلوں کے ساتھ ان کی حرکت سے اسٹیڈیم میں نیو منو کا سا منظر پیدا ہو گیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ لارسیوں نے فی

الحال بستی میں محصور رہ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اس حد بندی کے ساتھ ساتھ پھیل رہے تھے جو بستی کے گرد و اطراف میں موجود تھی۔ یہ حد بندی گارے کی دیوار اور کانٹے دار جھاڑیوں کے دوہرے دفاع کی شکل میں تھی۔ مگر پھر کچھ ایسا ہوا جس کی لارسیوں کو توقع نہیں تھی۔ ابھی وہ اپنی پوزیشنوں تک نہیں پہنچے تھے کہ ایک نامانوس شور بستی کے مشرقی دروازوں کی طرف سے بلند ہوا۔ کنگ براؤن اور اس کے ساتھی لارسیوں کی توقع سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئے تھے۔ بستی کے دونوں دروازوں کی طرف اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس فائرنگ کا شور اتنا خوفناک تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ یہ بھاری خود کار رائفلوں اور مشین گنوں کی فائرنگ تھی۔ پھر زبردست چمک کے ساتھ دستی بموں کے دھماکے سنائی دیے۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی فصیل کے ایک حصے میں اور محافظوں کے جھونپڑوں میں شدید آگ بھڑک اٹھی۔ ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔

میں نے بلند و بالا شعلوں کی روشنی میں کئی جیپوں اور گاڑیوں کو بستی کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ لوگ بستی کے دفاع کو روند کر اندر پہنچے تھے۔ ان کا حملہ بے حد شدید تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس حملے کے لیے انہوں نے زبردست پلاننگ اور بہت سا ہوم ورک کیا ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی پھرتی کے ساتھ اور بلا جھجک تین اطراف میں پھیل گئے۔ پرجوش لارسی ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ ان پر جدید ترین ہتھیاروں کی تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ گاہے گاہے دستی بموں کے لرزہ خیز دھماکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک بیل کو اندھا دھند بھاگتے دیکھا اس کی پشت پر موجود کوہان نما چربی بھڑک کر جل رہی تھی۔ دو اونٹ بلبلاتے ہوئے میرے سامنے سے گزرے اور چند مرغیوں اور ایک بچی کو روندتے ہوئے گزر گئے۔ چار پانچ سالہ بچی کا سر اونٹ کے پاؤں تلے آ کر ناریل کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ دستی بموں کے دھماکوں سے کئی جھونپڑے جلنے لگے اور ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔

اس قیامت صغریٰ میں میرا دھیان صفدر کی طرف چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ صفدر وہیں ہو گا جہاں ویرا ہو گی' اور ویرا اس وقت یقیناً شدید خطرے میں تھی۔ یہ قیامت صغریٰ اسی کی وجہ سے تو برپا ہوئی تھی۔ ویرا کے طوفانی رومانس نے حالات کو یوں مہمیز کیا تھا کہ وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی طرح سرپٹ بھاگ اٹھے تھے۔ اور اس طوفانی رومانس میں میرا جان سے

پیارا دوست صفدر بھی گردن تک پھنسا ہوا تھا۔ یوں وہ اس خونی ہنگامے کا اہم ترین کردار بن گیا تھا۔ میں اندھا دھند دیرا کے جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ یہ جھونپڑا بوکارلو کے جھونپڑے کے قریب ہی واقع تھا۔ اس طرف زبردست لڑائی ہو رہی تھی۔ میں جھک کر دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نیم مردہ لارسی کے پاس سے میں نے C.Q رائفل اٹھائی' اور ایک ہوائی فائر کر کے اسے چیک کیا۔ جھیل کی طرف سے ہو کر میں دیرا کے جھونپڑے کے سامنے پہنچا تو میں نے ایک ریتلے گڑھے کے اندر ایک عجیب منظر دیکھا۔ نرسٹ سے آنے والا ایک آدم خور "ضیاعی" شکاری کتے کی طرح ایک لارسی سے گتھم گتھا تھا اور اس کی گردن کا گوشت اپنے دانتوں سے ادھیڑ رہا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں اس منظر کی جھلک کچھ اور بھی خوفناک لگ رہی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ انسان نما حیوان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی ضیاعی کا بھیجا چیر کر نکل گئی۔

میں دیرا کے جھونپڑے کے عین سامنے پہنچا تو میں نے صفدر کو دیکھا۔ وہ اس حال میں تھا کہ اسے دیکھ کر میرا خون آتش فشاں کے لاوے کے مانند کھول گیا۔ جوش کی ایک لہر میرے رگ و پے سے اٹھی اور میرے جسم میں آگ بھڑکا گئی۔ صفدر تن تنہا چار افراد سے برسرپیکار تھا۔ میں نے عقب سے ایک حملہ آور کو دبوچ لیا۔ اتفاق تھا کہ یہ بدبخت بھی مائیکل کا خونی رشتے دار نکلا۔ بالکل کسی خون آشام جانور ہی کی طرح وہ ضیاعی اپنے پاؤں پر اچھل کر میری شہ رگ کی طرف آیا۔ اس نے اپنے سفید دانت نکوس رکھے تھے اور چہرے پر جانوروں کی سی درندگی تھی۔ مجھے اپنا بچاؤ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو شاید وہ دانتوں سے میری شہ رگ جھنجوڑ ڈالتا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور مکا ضیاعی کے چوڑے جبڑے پر پڑا۔ یہ مکا ایسا باموقع اور پُرزور تھا کہ میں نے ضیاعی کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز صاف سنی' وہ لڑکھڑا کر ایک دو قدم پیچھے ہٹا' میں نے رائفل سیدھی کر کے بے دریغ اس کے سینے پر فائر کیا۔ وہ تڑپ کر ایک طرف جا گرا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ صفدر سے لڑنے والا ایک شخص بجلی کی طرح میری طرف لپک رہا ہے۔ اس بدبخت کے پاس فوجی طرز کی رائفل تھی اور اس پر باقاعدہ سنگین چڑھی تھی۔ یقیناً اس کی رائفل کا میگزین خالی ہو چکا تھا' ورنہ وہ مجھ پر گولی چلاتا۔ اس نے دوڑ کر مجھے سنگین میں پرونا چاہا' میں نے اپنا پہلو بچایا' سنگین

میرے لباس کو چھوتی ہوئی گزر گئی' میں نے بلا جھجک دوسری مرتبہ C.Q رائفل کا ٹریگر دبایا' گولی حبشی کے سر کے پچھلے حصے میں کہیں لگی اور وہ کسی بڑی چمگادڑ کے مانند پھڑپھڑا کر زمیں بوس ہو گیا۔ اس وقت تک صفدر اپنے دو مدمقابل افراد کو ڈھیر کر چکا تھا۔ وہ تیزی سے جھونپڑے میں گھسا اور کسی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں نے ہوا میں لہراتے ہوئے لمبے بالوں اور سفید براق لباس سے پہچان لیا۔ وہ خوب رو دیرا ہی تھی۔ صفدر اس کو لے کر میری طرف آیا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ میں نے صفدر سے کہا "جھیل کی طرف چلو!"

ہم جھیل کی طرف بڑھے۔ ایک سیاہ فام پہلو سے ہم پر جھپٹا' میں نے اس کے منہ پر رائفل کا کندا رسید کیا' وہ دور جا گرا' پتلون قمیص والا ایک اور حبشی سامنے سے آیا۔ اس نے صفدر پر فائر کیا۔ نشانہ خطا گیا' اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتا' میں نے عین اس کی پیشانی پر گولی داغ کر اسے راہیِ عدم کر دیا۔ اس کی لاش کو پھلانگتے ہوئے ہم آگے بڑھے' ابھی ہم کنارے کی جانب پندرہ بیس گز ہی گئے ہوں گے کہ ایک طویل قامت شخص ہمارے سامنے آگیا۔ شعلوں کی روشنی میں میں نے دیکھا۔ اس کی سرخ ٹائی ہوا میں لہرا رہی تھی اور تھری پیس سوٹ کی آب و تاب نمایاں نظر آتی تھی۔ وہ مہذب لباس میں چھپا ہوا آدم خور درندہ "مائیکل" تھا۔ وہ عیار ترین بردہ فروش جس کی سفاکی اب تک بے مثال رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی اور وہ اچانک ایک دیوار کی طرح ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ شاید میں اس اچانک افتاد سے ایک لمحے کے لیے بھی مرعوب یا خوف زدہ ہوتا تو ہم تینوں میں سے کسی ایک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا' مائیکل کی رونمائی اتنی اچانک ہوئی تھی کہ میرے پاس رائفل سیدھی کرنے کا وقت بھی نہیں بچا تھا۔ وہ صرف چھ سات فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں رائفل سمیت اس پر جا پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور میں اسے لیتا ہوا نشیب میں جا گرا "صفدر تم نکل جاؤ!" میں مائیکل کو اپنے نیچے سنبھالتے ہوئے چلایا۔

مجھے مائیکل سے گتھم گتھا دیکھ کر دیرا کی چیخ نکل گئی تھی۔ شاید اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی نرسٹ کے اس "خون آشام منتظم" کی شان میں یوں گستاخی فرمائے گا اور اس کی درندگی کو خاطر میں لائے بغیر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے گا۔

میں نے ایک بار پھر چیخ کر کہا "صفدر جاؤ!"

صفدر نے دیرا کو لیا اور دوڑتا ہوا بوما کی طرف گیا۔ یہاں ایک چھکڑا الٹا پڑا تھا۔ صفدر نے چھکڑے کی آڑ میں رک کر اطراف کا جائزہ لیا' تب ایک بار پھر دیرا کا بازو پکڑا اور جھک کر دوڑتا ہوا دھوئیں کے مرغولوں میں گم ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک دو سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ اس دوران میں میرے اور مائیکل کے درمیان شدید زور آزمائی جاری رہی تھی۔ خوش قسمتی سے مائیکل کی سرخ ٹائی میرے ہاتھ میں آگئی تھی' میں نے اس ٹائی سے اس کی تومند گردن بھینچ رکھی تھی اور یوں اس کے خونی جبڑے کی ہولناکی سے محفوظ ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرا ہاتھ اس کی ٹائی پر نہ پڑتا تو وہ خوش لباس درندہ اپنے دانتوں سے میری گردن ادھیڑنے میں ذرا تردد نہ کرتا۔ جو ٹائی وہ اپنی درندگی کو چھپانے کے لیے استعمال کرتا تھا' وہی ٹائی اب اس کی درندگی کو ناکام بھی بنا رہی تھی۔ ان لمحوں مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے وہ سچ مچ ایک جنگلی جانور ہے اور میں نے خود کو اس کے جبڑوں سے بچانے کے لیے اسے گردن کی رسی سے پکڑ رکھا ہے۔ اچانک مائیکل کا داؤ چل گیا۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی اور اس نے اپنا ہاتھ میری گردن کے نیچے سے نکال کر اپنی دو انگلیاں میرے نتھنوں میں ڈال دیں' تب ایک بے رحم جھٹکے سے وہ مجھے اپنے اوپر سے کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب میں مائیکل کے نیچے تھا۔ میرے نتھنے جیسے چرتے چرتے رہ گئے تھے۔ یہ ایک اوچھا وار تھا لیکن مائیکل جیسے مادر پدر آزاد جانور سے عام زندگی میں بھی کسی اصول ضابطے کی توقع نہیں کی جا سکتی یہ تو پھر لڑائی تھی۔ غنیمت تھا کہ مائیکل کی ٹائی ابھی تک میری گرفت میں تھی۔ ٹائی کو بھینچنے کے لیے اور ٹھیک سے بھینچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دونوں ہاتھ آزاد ہوں۔ میرے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور یہ ہاتھ مائیکل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں رائفل استعمال کر سکتا تھا اور نہ مائیکل کی گردن بھینچ سکتا تھا۔ ہاں وہ بدبخت اس پوزیشن میں تھا کہ اپنا خونی جبڑا میرے چہرے یا گردن تک پہنچا دیتا اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شعلوں کا عکس نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ بالکل بھیڑیے کے سے انداز میں پھیل گئے۔ چمکتے ہوئے دانت سو فی صد درندے کے دانت تھے۔ جونہی اس کا چہرہ مجھ پر جھکا میں نے سر کی بھرپور ٹکر اس کی ناک پر رسید کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس ضرب نے انسان نما درندے کو تیورا ڈالا اور یہیں پر مائیکل سے ایک

فاش غلطی ہو گئی۔ ایک ایسی غلطی جس کا خمیازہ بہت گراں تھا۔ وہ یہ بھول گیا کہ میں اس کی گردن کو مخصوص طریقے سے مسل سکتا ہوں یا پھر اس نے اب تک میرے اس ہنر کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ چند ساعت کا وقت ہی میرے لیے بہت تھا۔ میں نے اس کی منحوس گردن اپنے بازو میں جکڑی اور ایک مسنک جھٹکا دیا۔ میرے دل میں اس آدم خور وحشی کے لیے رحم کی رمق نہیں تھی۔ میں اسے بے ہوش کرنا نہیں چاہتا تھا اس کی گردن توڑ کر اسے راہیِ عدم کر دینا چاہتا تھا۔ تاہم اس کے جسم کی فولادی سختی میرے راستے میں حائل ہوئی۔ زوردار جھٹکے کے باوجود میں نے اس کی منحوس ہڈی ٹوٹنے کی آواز نہیں سنی۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ یہ

اندھیر نگری
محی الدین نواب
چار حصے
آپ کی ۔۔۔ 150 روپے

سنہری جونک
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس عہد
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس نشان
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

راکھشس
ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سید
قیمت 125 روپے

راکھ
ایک خوفناک ناول
وجیہہ سحر
قیمت 100 روپے

جھٹکا فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ستم گر، فریبی، بردہ فروش کی گردن ٹوٹ گئی۔ ایک لمحے کے اندر وہ وجود سے عدم میں چلا گیا۔ اب اس کی ساری شان و شوکت تمام طاقت اور عیاری 'مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال کر ایک طرف پھینک دیا۔ اسی دوران میں دو حبشی تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ان میں سے ایک یقیناً نیاہی تھا۔ اس نے اپنے دانت میرے بازو میں گاڑے اور درد کی لہر سراپا پھیل گئی۔ دوسرے حبشی نے ریوالور کا دستہ میری پیشانی پر مارا تھا۔ درد سے بلبلا کر میں نے نیاہی کی پسلیوں میں گھٹنا رسید کیا۔ اس اثنا میں ایک اور حبشی مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے انداز میں بلا کی وحشت تھی۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے چند گرے ہاؤنڈ کتے کسی اکیلے وکیلے چرندے سے لپٹ گئے ہوں۔ چند لمحوں کے لیے مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ وہ ڈھاٹا جسے میں نے بڑی مضبوطی سے اپنے منہ سر پر لپیٹ رکھا ہے کھل جائے گا۔ ایک خوفناک کشمکش تھی اور اس کشمکش کے ارد گرد بھی خوفناک کشمکش موجود تھی۔ جھونپڑے دھڑا دھڑ جل رہے تھے' چیخیں گونج رہی تھیں اور دھماکوں کے ساتھ پگھلا ہوا سیسہ زندگی کو موت میں بدلنے کے لیے سیکڑوں اہداف کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ بالکل میدان جنگ کا سا منظر تھا۔ مائیکل کا مردہ جسم اوندھا پڑا تھا اور اب کسی رائفل کی آوارہ گولی بھی اس کی پشت میں پیوست ہو چکی تھی۔ یکایک ایک غضب ناک غراہٹ میرے کانوں میں گونجی۔ ایک حبشی رائفل کی سنگین کو خنجر کی طرح استعمال کرتے ہوئے مجھ پر حملہ آور تھا۔ اس کا نشانہ میرا چہرہ تھا۔ میں نے پوری کوشش کر کے چہرہ بچایا۔ سنگین میرے کان کو زخمی کرتی ہوئی ریت میں گھس گئی۔ حبشی نے سنگین کھینچی۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ دوسرا وار کرنے والا تھا اور اس مرتبہ میرے لیے چہرہ بچانا ممکن نہیں تھا۔ میرا ڈھاٹا (نقاب) کھل چکا تھا اور میری ٹھوڑی ایک حملہ آور کی توانا گرفت میں تھی۔ اچانک سنگین بردار حبشی کے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور وہ میرے اوپر ہی گر گیا۔ اس کے سینے سے ابلنے والے گرم خون کا لمس میں نے اپنے چہرے اور گردن پر محسوس کیا۔

ایک دم میرے جسم پر حملہ آوروں کی مضبوط گرفت ختم ہو گئی۔ میں نے پروفیسر اللہ دتا کو دیکھا۔ وہ دو حبشیوں سے گتھم گتھا تھا۔ میں نے بھی تڑپ کر ایک حملہ آور کو رائفل کا کندہ رسید کیا' وہ چوٹ کھا کر پیچھے ہٹا تو میں نے ٹریگر دبا دیا' کم از کم چار گولیاں اس کے سینے میں پہنچ گئیں۔ پروفیسر اللہ دتا کی اچانک دید نے میرے اندر نیا جوش و خروش بھر دیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پروفیسر سے ایسے ڈرامائی موقع پر ملاقات ہو گی۔ حبشیوں میں بری طرح گھرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال تو ضرور آیا تھا کہ شاید صفدر مجھے اس مصیبت میں دیکھ لے اور واپس پلٹ آئے مگر پروفیسر کا خیال ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی نہیں تھا۔

حملہ آور ذرا تتر بتر ہوئے تو میں نے بھاگ کر ایک جھونپڑے کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ پروفیسر نے بھی میری تقلید کی' وہ میرے پہلو میں ہی اوندھا لیٹ گیا اور رائفل کندھے سے لگا لی۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اس کا ہر انداز سپاہیانہ تھا' صاف پتا چلتا تھا کہ پروفیسر نے یونہی رائفل پکڑ کر "میدان جنگ" کا رخ نہیں کر لیا۔ اس نے باقاعدہ ٹریننگ کی ہے اور "مبارزت" کے رموز و اسرار کو سمجھا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر کی آگ نے اس کی تربیت کے ساتھ مل کر اس کی حربی صلاحیت کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

جس جھونپڑے کے عقب میں ہم چھپے تھے وہ اچانک شدید فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ جھونپڑے کی چھت کا گھاس پھونس دھنکی ہوئی روئی کی طرح فضا میں بکھرنے لگا اور کچی دیواروں کے پرخچے اڑنے لگے' پھر یکایک جھونپڑے نے آگ پکڑ لی۔ میں نے پروفیسر کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا پیچھے لے آیا۔ پروفیسر کی C.Q رائفل سے گولی کے بجائے دو تین بار کھٹ کھٹ کی آوازیں سن چکا تھا۔ میں اس قسم کی رائفل کے میکنزم کو اچھی طرح سمجھتا تھا' مجھے معلوم تھا کہ زمین پر لیٹ کر رائفل چلانے کی وجہ سے اس میں ریت مٹی پھنس چکی ہے۔ اب یہ رائفل پروفیسر کے لیے صرف لاٹھی کا کام دے سکتی تھی۔ دوسری طرف میری رائفل میں بھی دو چار گولیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان گولیوں کو یونہی ضائع نہ کروں۔ ان کا استعمال میں نازک ترین وقت میں کرنے کا خواہش مند تھا۔ دوسری طرف بستی میں لڑائی اپنے عروج پر تھی اور ہولناک مارا ماری ہو رہی تھی۔ ٹرسٹ والوں کا پلہ واضح طور پر بھاری تھا۔ لارسی دبے ہوئے تھے اور مزید دب رہے تھے۔ وہ چاروں طرف سے سمٹ کر اپنی عبادت گاہ بوما کے گرد جمع ہو گئے تھے اور تین اطراف سے ٹرسٹ والوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ پرجوش لارسیوں کی طرف سے بار بار نعرہ بلند ہوتا تھا اور وہ ہلہ مار کر آگے بڑھتے تھے' مگر انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز اور جدید ہتھیاروں کے سامنے ان کی مطلق پیش نہیں جاتی تھی۔ ان لمحوں میں مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ اکثر بڑے توانا اور تنومند جذبے بھی تکنیک اور طاقت کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ لارسیوں کی دلیری اور سرفروشی میں کوئی شبہ نہیں تھا'

اپنے قابل صد احترام رہنما بوکارلو کے ساتھ ہونے والی زیادتی نے انہیں شعلہ جوالہ بنا رکھا تھا' وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے مگر دستی بموں کی ہلاکت خیزی اور جدید رائفلوں کی آتش بازی کے سامنے ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ یقیناً ان کی نگاہوں کے سامنے بوکارلو کا کٹا ہوا ہاتھ تھا' اپنی عورتوں کی لٹی ہوئی عصمتیں تھیں' وہ سارا رنج و غم جو انہیں وقتاً فوقتاً کنگ براؤن کی طرف سے بطور سوغات ملتا رہا تھا۔ وہ کنگ براؤن اور اس کے حواریوں سے انتقام لینا چاہتے تھے' لیکن آگے بڑھنے کے بجائے انہیں مسلسل پیچھے ہٹنا پڑ رہا تھا۔ دو چار منٹ کے اندر اندر وہ بوما کے آس پاس محصور ہو کر رہ گئے۔ اس مرحلے میں ایسا لگا کہ بوما کوئی فوجی قلعہ ہے اور ٹرسٹ والوں کی طرف سے اسے محاصرے میں لے لیا گیا ہے۔ کنگ براؤن کے ہرکارے ہر صورت بوما کے اندر گھسنا چاہ رہے تھے مگر لارسی جنگ جو ان کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن گئے تھے۔ وہ بار بار ایک قبائلی نعرہ بلند کرتے تھے۔ ان کے نیم عریاں سیاہ جسم شعلوں کی روشنی میں چمکتے تھے' ایک تند ریلے کی طرح وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے' تاکہ ٹرسٹ کے محافظوں کا گھیرا توڑ سکیں۔ مگر ہر بار انہیں ناکامی ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اور غالباً پروفیسر کو بھی حیرانی ہوئی کہ بوما کے دلیرانہ دفاع میں قبیلے کی جنگ جو عورتیں مرکزی کردار ادا کر رہی تھیں۔ وہ نہ صرف رائفل سے فائرنگ کر رہی تھیں بلکہ کلہاڑے اور نیزے بھی چلا رہی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک کے بالائی جسم بالکل عریاں تھے اور آگ کی روشنی میں ان کے کسرتی سینے چمک رہے تھے۔ ان نہایت دلیر اور زور آور عورتوں میں مجھے بانے جوری بھی نظر آئی۔ وہی بدمست گرانڈیل عورت جو ایک رات مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گئی تھی اور میرے سامنے ایک ایسا مضحکہ خیز رقص کیا تھا جس کا تصور مجھے اب بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ رقص کر رہی تھی' تاہم یہ موت کا رقص تھا۔ وہ بوما کے بڑے دروازے کے عین سامنے موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک وزنی کلہاڑا تھا' میں نے اسے گولیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک وردی پوش گارڈ پر جھپٹتے دیکھا۔ محافظ کی نیلی وردی' مجھے ایک لمحے کے لیے جوری کے سامنے نظر آئی' پھر اس وردی کو میں نے اچھل کر آگ میں گرتے دیکھا۔ یقیناً محافظ بھی وردی کے اندر ہی موجود تھا۔ جوری کے اس جرات مندانہ اقدام کو دیکھ کر دیگر عورتوں میں بھی تازہ جوش کی لہر دوڑ گئی۔ دس پندرہ جنگ جو عورتوں کی ایک ٹولی چنگھاڑتی ہوئی ٹرسٹ کے گارڈز پر حملہ آور ہوئی۔ یہ گارڈز نہ صرف رائفلوں اور دستی بموں سے مسلح تھے بلکہ بلٹ پروف جیکٹس بھی پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے قبائلی عورتوں کو بے دریغ گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا۔ میں نے کئی عورتوں کو گولی کھا کر جھیل کے عین کنارے پر گرتے دیکھا۔ باقی عورتیں جان بچانے کے لیے واپس پلٹ گئیں۔ ابھی وہ بوما کے مین دروازے سے کچھ دور ہی تھیں کہ دستی بم کا ایک طاقت ور دھماکا قربان گاہ کے عین سامنے ہوا۔ ایک جنگ جو عورت زد میں آ کر ہوا میں اڑتی نظر آئی۔ یہی وقت تھا جب اچانک بوما کے ایک حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ آگ کا بھڑکنا تھا کہ بوما کا دفاع کرنے والے لارسیوں میں افراتفری کے آثار نمودار ہو گئے۔ ان کا جوش و خروش' خوف و ہراس میں بدل رہا تھا۔ اچانک بستی کے اندر آنے والے راستے پر مزید گاڑیاں نظر آئیں۔ ان تازہ دم حملہ آوروں کا تعلق بھی ٹرسٹ سے ہی تھا۔ ان لوگوں کے آنے سے گارڈز کے حوصلے مزید بلند ہو گئے' وہ خوف زدہ لارسیوں کو تہس نہس کرتے ہوئے بوما کے دروازے کے عین سامنے پہنچ گئے۔ اسی دوران میں ٹرسٹ کی ایک جیپ ہمارے عقب میں نمودار ہوئی۔ میں اور پروفیسر ہیڈ لائٹس کی زد میں آ گئے۔ اس سے پہلے کہ میں اس جیپ کے سلسلے میں کچھ کرتا' جیپ بری طرح لہرائی اور ہماری طرف آنے کے بجائے اچانک دائیں طرف مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ خاصی رفتار کے ساتھ ایک جھونپڑے کی نیم پختہ دیوار سے ٹکرائی اور اندر دھنس گئی۔ یہ حادثہ ہم سے صرف آٹھ دس گز کی دوری پر ہوا۔ میں اور پروفیسر دوڑ کر جیپ تک پہنچے۔ اس کی ایک لائٹ ابھی تک جل رہی تھی اور انجن اسٹارٹ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے سفید فام شخص کی گردن میں ایک تیر ترازو نظر آیا۔ وزنی تیر اس کی شہ رگ کو چیرتا ہوا سر کے پچھلے حصے سے نکل گیا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا رائفل بردار بھی تصادم کے سبب بری طرح زخمی ہوا تھا' وہ جیپ کے فرش پر پڑا تھا اور اس کا چہرہ اپنے ہی لہو سے رنگین ہو رہا تھا۔ میں نے بلا تردد اس کی کنپٹی پر رائفل کے دستے سے ایک جچی تلی ضرب لگائی اور اٹھا کر اسے نیچے پھینک دیا۔ اتنی دیر میں پروفیسر بھی مردہ یا نیم مردہ ڈرائیور کو اس کی نشست سے لڑھکا چکا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ڈرائیور کی نیلگوں پی کیپ پہن لی۔ پروفیسر نے میرے ساتھ کی نشست سنبھال لی۔ ریورس گیئر لگا کر میں نے جیپ کا زور لگوایا اور اسے جھونپڑے کے اندر سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت یہاں سے فرار ہو جانا ہی بڑی کامیابی تھی۔ کنگ براؤن کے ساتھی لارسیوں پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ وہ لارسیوں سے ہتھیار چھین رہے تھے'

مزاحمت کرنے والوں کی ٹانگوں میں گولیاں مار مار کر انہیں زخمی کر رہے تھے۔ بہت سے گھڑ سوار لارسی فائرنگ کرتے ہوئے جنگل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے' ٹرسٹ کے گارڈز نے اپنی تیز رفتار جیپوں پر ان کا پیچھا شروع کر دیا۔

ہمارے لیے یہ اچھا موقع تھا' ہم نے بھی جیپ ان تعاقب جیپوں میں شامل کر دی۔ یوبا کا ایک تہائی حصہ اب جل رہا تھا۔ یہ وہی مقدس عمارت تھی جسے کئی ماہ کی محنت کے بعد لارسیوں نے چند دن قبل ہی مکمل کیا تھا۔ اب یہ عمارت ان کی بے بس نگاہوں کے سامنے راکھ ہو رہی تھی۔ پروفیسر میرے پہلو میں بیٹھا تھا اور رائفل کے دستے پر اس کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے جمے تھے۔ وہ عجیب آسیب زدہ لہجے میں بولا "شاہ جہاں! وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کی لعنتی صورت نظر نہیں آ رہی۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی درندے کی۔ جس نے میری شائستہ کی جان لی ہے۔"

"اس وقت اسے ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر مجھے اتار دو۔" پروفیسر کی آواز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔

"پروفیسر ہوش کی بات کرو۔ مائیکل اس وقت ہمیں نہیں مل سکتا۔ اور ویسے بھی میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا بتانا چاہتے ہو؟"

"مائیکل اور شائستہ کے بارے میں۔ مائیکل قاتل نہیں ہے۔"

"تو پھر کون قاتل ہے؟"

"پروفیسر! تمہارے لیے میرے پاس ایک بڑی اچھی خبر ہے' مگر اس خبر کے لیے تمہیں میرے ساتھ اس جیپ میں رہنا ہو گا اور تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"پلیز پروفیسر! میرے ساتھ رہو اور مجھے صرف چند منٹ دے دو۔" میں نے جیپ کو تیزی سے دائیں طرف نیم پختہ راستے پر موڑتے ہوئے کہا۔

اب ہم بستی کی حدود سے باہر تھے۔ لارسی گھڑ سواروں کا تعاقب کرنے والی جیپیں مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں' اس تاریکی میں کسی کو شک ہو سکتا تھا کہ ٹرسٹ کی اس گاڑی میں کنگ کے دوست نہیں دشمن ہیں؟ چند تیر ہمارے سروں کے اوپر سے سنسناتے ہوئے گزرے اور اتھاہ تاریکی میں گم ہو گئے۔ بستی کا وسیع و عریض یوبا اب ایک بہت بڑے الاؤ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس الاؤ کے اندر دستی بموں کے دھماکے ہو رہے تھے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ بھی۔ یوبا سے اٹھنے والے شعلے اتنے بلند تھے کہ ان کا عکس پام کے درختوں کی بلند ترین شاخوں پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ زن زر اور زمین کا جھگڑا ازل سے انسان کے ساتھ رہا ہے۔ اس بستی میں ہونے والے اس خون ریز جھگڑے کے پس منظر میں یوں تو کئی وجوہات تھیں لیکن فی الفور اس جھگڑے کی شروعات زن کی وجہ سے ہی ہوئی تھی' ویرا کے سبب لارسیوں اور ٹرسٹیوں کی کشیدگی کو ہوا ملی تھی اور ویرا کو یہاں سے زبردستی لے جانے کے لیے کنگ براؤن اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ قبیلے پر حملہ آور ہو گیا تھا۔

میں جیپ چلا رہا تھا اور میری نگاہیں صفدر اور ویرا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ ہماری طرح وہ بھی بستی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں اور اب انہی جھاڑیوں اور درختوں میں کہیں بھٹک رہے ہوں۔ میں کتنی ہی دیر تک درختوں میں ادھر ادھر جیپ گھماتا رہا مگر اس قسم کی مہم جوئی زیادہ دیر جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی' یہ سخت خطرناک تھا' ویسے بھی جیپ کے اگلے حصے سے مسلسل کھٹ پٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں' یہ آوازیں ڈھکے چھپے انداز میں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ یہ جیپ کسی بھی وقت بریک ڈاؤن ہو کر ہمیں بھی بریک ڈاؤن کر سکتی ہے۔ میں نے صفدر اور ویرا کے بارے میں اچھی توقعات رکھتے ہوئے جیپ کو شعلہ فشاں بستی سے دور جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ یہ کھلی جیپ خاصی طاقت ور تھی۔

گھنی جھاڑیوں اور لمبی جنگلی گھاس کے درمیان جیپ اچھلتی کودتی اور ہچکولے کھاتی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پر جمے تھے اور پروفیسر نے اتنی ہی مضبوطی سے چھت پر موجود راڈ کو تھام رکھا تھا۔ دم بدم بستی ہم سے دور ہو رہی تھی اور جتنا دور ہو رہی تھی اتنا ہی تحفظ کا احساس ہم میں بڑھ رہا تھا۔ فائرنگ کی دور افتادہ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر اب ان آوازوں میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔

"شکریہ پروفیسر۔" میں نے ڈرائیونگ کرتے کرتے کہا۔

"کس بات کا؟" پروفیسر نے اپنے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"بڑے نازک وقت میں میری مدد کرنے کا۔ اگر تم بر وقت نہ آتے تو کنگ کے پالتو کتے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیتے۔"

"اس میں میرا کوئی خاص کمال نہیں' میری نظر اچانک تم پر پڑ گئی تھی۔ میں اس حرامی مائیکل کی جیپ کو دیکھ کر اس طرف آیا تھا۔ میں نے تمہیں حبشیوں سے الجھے ہوئے دیکھا

اور گولی چلا دی۔"

میں نے پروفیسر کو نہیں بتایا کہ حبشیوں کے ساتھ الجھنے سے چند لمحے پہلے میں مائیکل سے الجھ رہا تھا اور نہ ہی یہ بتایا کہ میں اس کی لعنتی گردن کا کڑاکا نکال چکا ہوں۔ کیونکہ اگر میں یہ بتا دیتا تو عین ممکن تھا کہ مائیکل کے خون کے لیے پروفیسر کی دیوانی پیاس پھر بھڑک اٹھتی اور وہ چلتی جیپ سے کود کر واپس بستی کی طرف روانہ ہو جاتا۔

دانا کہتے ہیں کہ دنیا گنبد کی آواز ہے' یہاں ہم جو بھی عمل کرتے ہیں وہ اکثر ہماری طرف لوٹ آتا ہے۔ نیکی برائی' نفرت محبت سب کچھ ہماری طرف پلٹتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بستی میں میں نے اپنے جگری دوست اور یار غار صفدر سے "محبت" کی تھی۔ گھمسان کی لڑائی میں ویرا کے جھونپڑے کے سامنے میں نے اسے مسلح حبشیوں کے نرغے میں دیکھا تھا اور اس کی جان بچانے کے لیے خود کو شدید خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس واقعے کے دو چار ہی منٹ بعد پروفیسر نے مجھ سے "محبت" کی تھی۔ اس نے غضب ناک حبشیوں کو مجھ سے لپٹے دیکھا تھا اور میری جان بچانے کے لیے خود کو شدید خطرے میں ڈال لیا تھا۔ ہم دونوں قریباً تین کلومیٹر تک بالکل سیدھے چلتے چلے گئے پھر میں نے جیپ کو ایک ذیلی راستے پر ڈال دیا۔ نجانے کیوں میرے اندر ایک بے تابی سی پیدا ہو رہی تھی۔ اس بے تابی کا تعلق پروفیسر اور اس کی بیٹی شائستہ سے تھا۔ میں پروفیسر کو جلد از جلد وہ خوش خبری سنا دینا چاہتا تھا جو بہت دنوں سے میرے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے مزید تاخیر کی تو پروفیسر پھر کہیں اوجھل ہو جائے گا اور یہ خوش خبری پھر میرے ہونٹوں میں رہ جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ پرانی سوچ بھی ذہن میں آ رہی تھی جو اس سے پہلے بھی مجھے تذبذب میں مبتلا کرتی رہی تھی۔ شائستہ زندہ تو تھی مگر برے حالات میں تھی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں ہے' زندہ بھی ہے یا نہیں' اور اگر زندہ ہے تو کس حد تک محفوظ ہے۔ میں پروفیسر کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری سنانا تو چاہ رہا تھا لیکن اس انداز سے کہ اس کے اندر بدترین حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی موجود رہے۔

کچھ آگے جا کر میں نے جیپ گھنی جھاڑیوں کے اندر روک دی اور انجن بند کر کے اس کی اکلوتی ہیڈ لائٹ آف کر دی۔ "رک کیوں گئے ہو؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"اپنی ٹوٹ پھوٹ تو دیکھ لیں۔" میں نے اندرونی بتی جلاتے ہوئے کہا۔

میرے بازو کے بالائی حصے پر آدم خور حبشی نے اپنے دانت گاڑے تھے۔ یہاں سے قمیص سرخ ہو رہی تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا' وہ حبشی بوٹی نکالنے میں تو کامیاب نہیں ہوا تھا تاہم دانت کافی گہرائی تک گئے تھے۔ عقب نما آئینے میں جھانکا تو پیشانی پر نیلگوں ابھار بھی صاف نظر آیا' یہاں ایک حملہ آور نے ریوالور کا دستہ رسید کیا تھا۔ نتھنوں کی جلن محسوس کر کے مجھے بدبخت مائیکل کا وہ اوچھا ہتھکنڈا یاد آ گیا جو اس نے مجھے اپنی چھاتی سے اتارنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ میرے نتھنوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے میری ناک کو چیر ڈالنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ واقعی ایک درندہ تھا اور درندوں کی طرح کسی اصول یا ضابطے کے بغیر لڑتا تھا۔ پروفیسر کی خستہ حال رائفل تو جام ہو کر بیکار ہو چکی تھی' لیکن میری رائفل ٹھیک تھی اور اس میں دو تین گولیاں بھی باقی تھیں۔ میں نے جیپ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور اچانک آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ جیپ کے فرش پر نشستوں کے نیچے کم از کم چھ خودکار رائفلیں موجود تھیں اور ان کا وافر ایمونیشن بھی نظر آ رہا تھا۔ پروفیسر نے بھی یہ بیش قیمت اسلحہ دیکھ لیا اور اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

میں نے اندرونی روشنی بجھا دی۔ آس پاس کے نیم تاریک مناظر دھیرے دھیرے واضح ہونے لگے۔ کھجور اور تاڑ کے بلند و بالا درخت' خود رو جنگلی جھاڑیاں اور لمبی زرد گھاس' جو ہوا کی زد میں آ کر کسی دریا کی طرح لہریں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ چاند گہری بدلیوں کی اوٹ میں تھا اور کسی ایسے ستم گر محبوب کے مانند نظر آتا تھا جو چلمن کی اوٹ سے ہلکی سی جھلک دکھانے پر اکتفا کر رہا ہو۔ اب رات کے قریباً دس بج چکے تھے اور گرمی دھیرے دھیرے خنک ہوا میں گھلتی چلی جا رہی تھی۔ کسی رومانی جوڑے کے لیے اس "افریقی رات" کا طلسم یقیناً بڑا دلکش ہوتا مگر ہم جس قسم کے خون ریز حالات سے گزر رہے تھے' زمان و مکان کی ہر خوب صورتی دکھ کا سیاہ لباس پہنے نظر آتی تھی۔

میں نے اپنی جیب سے ایک مڑی تڑی بیڑی نکالی اور اسے سلگاتے ہوئے پروفیسر سے کہا "پروفیسر! مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ تم نے کن حالات میں اور کیوں ٹرسٹ کو چھوڑا لیکن ایک اندازہ سا ہے کہ تمہیں شائستہ کے حوالے سے ایک نہایت ناخوشگوار اطلاع دی گئی تھی' اس اطلاع کے بعد تمہیں اپنے غیظ و غضب پر قابو نہ رہا' تم نے

نرسنگ ہوم میں اندھا دھند فائرنگ کرکے پورے چھ افراد کو قتل کردیا اور بعد ازاں ہرکولیس کے نائب کپتان آرتھر کی رہائش گاہ میں جا چھپے۔ بعد ازاں آرتھر نے ہی تمہاری مدد کی اور تمہیں نرسنگ ہوم سے نکال دیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"اگر تم ٹھیک بھی کہہ رہے ہو تو یہ باتیں کرنے کا یہ کون سا موقع ہے؟" پروفیسر نے جھنجلاہٹ آمیز حیرانی سے کہا۔

"بے شک یہ مناسب موقع نہیں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ہم جس قسم کے غیر یقینی حالات میں سے گزر رہے ہیں' تم کہیں پھر مجھ سے جدا نہ ہوجاؤ' اور جو بات میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں' وہ پھر ان کہی نہ رہ جائے۔"

"میں کچھ بھی سمجھ نہیں پارہا ہوں۔"

میں نے بیڑی کا ایک گہرا کش لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "پروفیسر! شائستہ کے حوالے سے میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر ہے' اور مجھے امید ہے کہ یہ خبر تمہارے لیے بالآخر اچھی ہی ثابت ہوگی۔" میں نے ایک لمحہ توقف کرکے پروفیسر کے خشونت زدہ چہرے کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے نرسنگ ہوم کے ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ شائستہ کی موت کی اطلاع کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔ بے شک بچے کی ولادت کے بعد شائستہ سخت بیمار تھی اور اس کے بچنے کا امکان کم رہ گیا تھا مگر ان واقعات کے دو تین ہفتے بعد بھی اسے زندہ سلامت دیکھا گیا ہے۔"

پروفیسر کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے بڑی غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھا' پھر اس کے ہونٹوں سے تھرائی ہوئی آواز نکلی "شاید تم بھی مجھے پاگل سمجھ رہے ہو' اس لیے الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ جو مرچکی ہے۔۔۔ وہ مرچکی ہے' اب وہ تمہارے کہنے سے دوبارہ دنیا میں نہیں آجائے گی۔"

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ مرچکی ہے' کیا تم نے خود اسے دیکھا ہے' یا پھر سنی سنائی بات پر ہی بھروسا کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اور۔۔۔ اور تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ کیا تم نے خود اسے دیکھا ہے۔ تم بھی تو ایک سنی سنائی بات دہرا رہے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تم کسی کو کتنا دکھ پہنچا رہے ہو۔ تمہیں کیا پتا کہ میرے کتنے زخم ہرے کردیے ہیں تمہاری اس بات نے۔"

میں نے کہا "پروفیسر! تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تمہیں شائستہ کے بارے میں کوئی جھوٹی اطلاع دے کر مجھے بھلا کیا فائدہ پہنچے گا۔ میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کررہا۔ تمہیں وہی کچھ بتا رہا ہوں جو مجھے معلوم ہوا ہے' اور یہ بھی اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے اس میں تمہاری بھلائی نظر آتی ہے۔ تم اپنی زندگی کی طرف سے دیوانگی کی حد تک بے پروا ہو رہے ہو اور یہ تمہارے لیے کسی طور مناسب نہیں ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ شائستہ کی زندگی کا امکان ابھی باقی ہے۔"

پروفیسر سکتے کی سی حالت میں تھا اور منہ کھولے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پروفیسر کی طرف رخ پھیر کر اس کے دونوں شانے تھام لیے اور بڑی نرمی سے' محبت سے اسے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ مائیکل نے سازش کے تحت اسے شائستہ کی طرف سے یوں مایوس کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک محبت کرنے والے باپ کی حیثیت سے وہ شائستہ کی زندگی میں دخل انداز رہے اور شائستہ ایک بیوی سے زیادہ ایک لاڈلی بیٹی کی زندگی گزارتی رہے۔

پروفیسر بولا "لیکن۔۔۔ مجھے تو۔۔۔ ان ڈاکٹروں نے بھی کہا بتایا تھا جنہوں نے زچگی سے پہلے شائستہ کا علاج کیا تھا۔ انہوں نے۔۔۔ انہوں نے۔"

"انہوں نے بھی جھوٹ بولا تھا۔ تمہیں شائستہ کی بیماری کے بجائے اس کی موت کی اطلاع دی تھی اور یہ سب اس بدبخت مائیکل ہی کی سازش تھی۔"

میں پروفیسر کو بڑے دھیمے لہجے میں اور بتدریج سمجھاتا رہا کہ شائستہ کی زندگی کے بارے میں امکانات موجود ہیں' آخر میں میں نے پروفیسر کو یہ بھی بتا دیا کہ شائستہ کی موت کی خبر کے بعد میں ایک بار اسے نرسنگ ہوم کے اندرونی حصے میں دیکھ بھی چکا ہوں۔

پروفیسر کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ اس کی سانس بڑی تیزی سے آجا رہی تھی۔ اس نے ایک دم مجھ پر سوالات کی بارش کردی۔ کب دیکھا تھا؟ کہاں دیکھا تھا' وہ کیسی تھی؟ کہیں مجھے کوئی دھوکا تو نہیں ہوا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے محتاط انداز میں اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ میں پروفیسر کو زیادہ جذباتی کرنا نہیں چاہتا تھا' نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ وہ میری باتوں کو بے وزن سمجھنے لگے۔ میں نے جان بوجھ کر پروفیسر کو مائیکل کی موت کی دھماکا خیز خبر بھی نہیں دی۔ میں بس اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ وہ سنتا رہا اور پھر اچانک وہ کچھ ہوا جس کی میں نے ہرگز توقع نہیں کی تھی۔ پروفیسر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور گردن نیچے کی طرف جھکا دی پھر اچانک اس نے سر اٹھایا اور کچھ

بڑبڑانے لگا۔ پہلے تو مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی' پھر دھیان سے سنا تو اتنا فقرہ سمجھ میں آیا "میں۔۔۔ واپس جاؤں گا۔ میں اس کے پاس جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے پروفیسر اٹھا' اس نے رائفل پکڑی اور چھلانگ لگا کر جیپ سے اتر گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اسے بڑی تیزی سے اندھیرے میں لپکتے دیکھ رہا تھا۔

"پروفیسر!" میں نے چلا کر کہا۔

مگر اس پر تو جیسے دیوانگی طاری تھی۔ میں نے جیپ سے اتر کر اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ ساتھ ساتھ میں اسے رکنے کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ جب پروفیسر نے محسوس کیا کہ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا ہوں تو اچانک رخ پھیرا اور رائفل مجھ پر تان لی "خبردار!" وہ گرجا "مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا شاہ جہاں۔ مجھے جانے دو۔"

وہ بھول گیا تھا کہ اس کی رائفل جام ہوچکی ہے اور اب ایک لاٹھی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھے دھمکانے کے بعد پروفیسر نے ایک بار پھر دوڑ لگادی۔ ابھی وہ چند قدم ہی بھاگا تھا کہ تاریکی میں اسے کسی درخت کے کٹے ہوئے تنے سے ٹھوکر لگی اور وہ بڑے زور سے اوندھے منہ گرا' اس کا سر ایک کھجور سے ٹکرایا تھا۔ میں نے لپک کر پروفیسر کو سنبھالا۔ چوٹ شدید تھی۔ پروفیسر نیم جان سا ہوگیا تھا۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ گرنے سے اس کی کنپٹی سے ذرا اوپر چوٹ لگی تھی۔ یہاں سے خون بہہ نکلا تھا اور اس کی جھاڑ جھنکار داڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی پروفیسر خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اسے رائفل سمیت بازوؤں میں اٹھایا اور واپس جیپ میں لے آیا' خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کرنے کے بعد پروفیسر نڈھال ہوگیا اور اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کے بجائے مجھے کوسنے اور گالیاں دینا شروع کردیں۔ اس کی ذہنی حالت ابتر تھی۔ وہ بار بار شائستہ کا نام لے رہا تھا اور کبھی میرے ساتھ ساتھ مائیکل اور کنگ براؤن کو بھی گالیاں دینے لگتا تھا۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی پروفیسر اللہ دتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد پروفیسر نے رونا شروع کردیا۔ وہ بلند آواز سے بالکل بچوں کی طرح رونے لگا۔ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے اندر ایک بچہ موجود ہوتا ہے' کبھی خوشی اور کبھی غم کی شدت اس بچے کو انسان کے اندر سے ابھار کر سامنے لے آتی ہے۔ پروفیسر کے یوں رونے سے میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ بیٹی کی محبت نے ایک دکھیارے باپ کو کیا سے کیا بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پروفیسر ایک بار پھر شدید مزاحمت پر اتر آئے گا اور خود کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ میں نے جیپ کے اندر سے ہی بجلی کا ایک بل دار تار ڈھونڈ لیا تھا' دل پر جبر کرکے میں نے اس تار سے پروفیسر کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ میری اس کارروائی کے دوران میں پروفیسر بری طرح مچلتا رہا اور مجھے گالیاں اور بددعائیں دیتا رہا وہ بھی مجبور تھا اور میں بھی مجبور۔۔۔ میری مجبوری اس لحاظ سے بھی روا تھی کہ اس میں پروفیسر کی بہتری کا خیال بھی شامل تھا۔ اچھی طرح باندھنے کے بعد میں نے پروفیسر کو اگلی اور پچھلی نشست کے درمیانی خلا میں ڈال دیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے سے پہلے میں نے احتیاطاً ایک بار پھر پروفیسر کی بندشیں اچھی طرح چیک کیں۔ جنون کی حالت میں انسان کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہوجاتا ہے اور پروفیسر کوئی ایسا ویسا جنونی نہیں تھا۔ وہ نرسنگ ہوم میں کئی افراد کو قتل کرکے تہلکہ مچا چکا تھا۔ پروفیسر کی دشنام طرازی سے مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا لیکن اس سے دیگر مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔ اس کی آواز کسی کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی تھی۔ میں نے کوشش کرکے پروفیسر کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ سب کچھ کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس وقت کی مجبوری تھی۔

ابھی میں نے جیپ پھر سے اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ کچھ آوازوں نے مجھے بے طرح چونکا دیا' یہ لوگوں کا ایک گروہ تھا جو ان جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کی تیز آوازیں جن میں عورتوں کی آوازیں بھی شامل تھیں ہوا کے دوش پر تیر کر مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت صاف محسوس کی جاسکتی تھی بلکہ ان آوازوں کو شاید' چیخیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے جیپ گھنی جھاڑیوں میں روک رکھی تھی۔ یہ مقام قدرے نشیب میں تھا' اطراف میں لمبی جنگلی گھاس سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ یہ لوگ مجھے فوراً دیکھ سکیں گے پھر بھی میں پیش آمدہ حالات کے لیے تیار ہوگیا۔ جیپ کے فرش پر موجود رائفلوں میں سے ایک رائفل اٹھا کر میں نے اس کا میگزین وغیرہ چیک کیا اور چوکس ہوکر بیٹھ گیا۔

پانچ دس منٹ کے اندر آوازیں بالکل قریب پہنچ گئیں۔ اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ یہ لاریسیوں کا ایک گروہ ہے جو بستی سے جان بچا کر بھاگا ہے۔ اب وہ لوگ جلد از جلد خطرناک حدود سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وہ جس رخ سے آرہے تھے' انہیں جیپ سے

تیس چالیس گز دور ہی سے گزر جاتا تھا۔ اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ان بھاگنے والوں کا غیر معمولی اضطراب اور خوف بے معنی نہیں تھا۔ وہ واقعی شدید خطرے میں تھے۔ میں نے جیپوں کی آواز سنی تھی۔ یہ آواز لارسیوں کے عقب سے بلند ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے جھاڑیوں کی دوسری جانب لارسیوں کے ہیولے دیکھے۔ یہ پندرہ بیس افراد کا ایک گروہ تھا، آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں عورتیں بھی ہیں۔ ان لوگوں کے اوپر اٹھے ہوئے نیزے صاف دیکھے جا سکتے تھے، یہ سب لوگ تقریباً دوڑنے والے انداز میں چل رہے تھے۔ دوڑ شاید اس لیے نہیں رہے تھے کہ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں اور عورتوں کی کمر پر بچے بھی بندھے ہوئے تھے۔ چاند کا کچھ حصہ بدلیوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تھا اور اس کی مدھم روشنی ہی تھی جس کی وجہ سے میں کافی فاصلے سے بھی لارسیوں کو دیکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ یکایک لارسی مجھے صاف نظر آنے لگے۔ ان کے نیزے، ان کی سیاہ ننگی ٹانگیں، ان کے تیزی سے حرکت کرتے ہوئے سر۔ لارسیوں کے یوں دکھائی دینے کی وجہ یہ تھی کہ ان پر کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس پڑ رہی تھی، اور یہ گاڑی ان گاڑیوں میں سے ہی تھی جو تعاقب میں آ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے سائز کی تین جیپوں نے لارسیوں کے اس ڈرے سہمے گروہ کو گھیر لیا۔ عورتوں کی چیخیں دلدوز ہو گئی تھیں۔ پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ہوا میں ایک جال اچھلا اور چیختے چلاتے لارسیوں پر جا پڑا۔ آٹھ دس لارسی مرد و زن اس جال میں الجھ گئے اور بری طرح مچلنے لگے۔ تین چار لارسی عورتیں چیختی ہوئی بھاگ رہی تھیں اور ان کا رخ عین میری جیپ ہی کی طرف تھا۔ ایک تیز رفتار گاڑی ان کے عقب میں بھی تھی۔ لیکن ابھی وہ عورتیں جیپ سے پندرہ بیس گز دور ہی تھیں کہ ایک جال ان پر بھی گرا اور انھیں لپیٹ میں لے لیا۔ یہ بڑا روح فرسا منظر تھا۔ جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح افراد (جو کنگ براؤن کے ہرکارے تھے) انسانوں کو جانوروں ہی کی طرح پکڑ پکڑ کر گاڑیوں میں ٹھونس رہے تھے۔ چند افراد جو جال کی زد سے بچ نکلے تھے۔ انھیں ٹرسٹ کے محافظوں نے دوڑ کر پکڑ لیا اور زمین پر اوندھا گرا کر ان کے ہاتھ پشت پر مخصوص ہتھکڑیوں سے جکڑ دیے۔ ایسی منحوس ہتھکڑیاں میں نے ٹرسٹ میں لاتعداد دیکھی تھیں۔ اسی دوران میں ایک ٹرک نما گاڑی بھی ہچکولے کھاتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ گاڑی کی باڈی کی ایک جانب گولیوں کے کئی سوراخ موجود تھے۔ یہ سوراخ یقیناً اسی خون ریز ہنگامے کی نشانی تھے جو ابھی کچھ دیر پہلے بستی میں برپا ہوا تھا۔ کچھ لارسیوں کو جالوں میں سے نکال لیا گیا، کچھ کو جالوں سمیت ہی اٹھا اٹھا کر ٹرک نما گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ چیخ رہے تھے اور آہ و بکا کر رہے تھے پھر میں نے ایک اور منحوس آواز سنی۔ یہ "کی بو کو" کی آواز تھی۔ وہی بے رحم بجلی کی لچک دار چھڑی جو ٹرسٹ میں بردوں کو جانوروں کی طرح ہانکتی تھی، میں ایک بار خود بھی اس سفاک چھڑی کا مزہ چکھ چکا تھا۔ یہ چھڑی انسان کے جذبۂ آقائیت کے ساتھ ہی صدیوں کا سفر کرتی ہوئی اس جدید دور میں بھی پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے کنگ براؤن کے جابر ہاتھ میں دیکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی یہ نجانے کہاں کہاں موجود تھی۔ یہ چھڑی اشرف المخلوقات کو سدھائے ہوئے جانوروں کی سی حرکات کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس نیم تاریک رات میں اس ویران مقام پر بھی یہ چھڑی اپنا جادو جگا رہی تھی۔ مرد و زن سہمی ہوئی مرغیوں کی طرح اپنی اپنی جگہوں پر دبک گئے تھے۔

میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔ ٹرسٹ والوں کی اس ظالمانہ کارروائی کے دوران میں ایک دو بار میرے جی میں آئی کہ ان لوگوں کو بچانے کی کوشش کروں، مگر یہ سوچ صرف سوچ ہی رہی۔ ٹرسٹ والے فی الوقت صورت حال پر پوری طرح حاوی تھے، ان کی چار گاڑیاں اور کم و بیش ڈیڑھ درجن تربیت یافتہ گارڈ یہاں موجود تھے کیا معلوم کہ میں ان لوگوں کے خلاف محاذ کھولتا تو کتنے اور ڈشکرے یہاں پہنچ جاتے اور پھر ان لوگوں کی مدد کی کوشش میں میں اپنے ساتھ پروفیسر کو بھی شدید خطرے میں ڈال دیتا۔ ویسے بھی مسئلہ صرف ان چند مرد و زن کا ہی نہیں تھا، پتا نہیں کتنے لارسی اس وقت اسی قسم کی صورت حال سے دوچار تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ بستی سے بھاگنے والوں کی پکڑ دھکڑ پورے علاقے میں جاری ہے۔ ان لوگوں کی آزادی کو زنجیر کیا جا رہا تھا اور انھیں باندھ کر اس منحوس چار دیواری میں لے جایا جانے والا تھا، جسے بردہ فروشی کے ایک بین الاقوامی مرکز کا درجہ حاصل تھا، وہ زمین دوز دنیا جہاں جیتے جاگتے آزاد انسان کو جسمانی و روحانی طور پر ایک مکمل غلام میں ڈھالا جاتا تھا، پھر اسے تربیت کے تمام تر مراحل سے گزار کر اور بنا سنوار کر مہنگے داموں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ اس انسانیت سوز حرکت کے لیے ٹرسٹ کے کرتا دھرتا ایک معاشی اصطلاح استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کچھ نہیں کرتے، صرف "خدمات" کو وہاں تک پہنچاتے ہیں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ٹرسٹ کے ہرکارے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرک میں بھر کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں بڑی خاموشی سے اپنی جگہ دبکا رہا۔ اتفاقاً میں بڑی محفوظ جگہ پر تھا۔ میں نے سوچا کہ ابھی کچھ دیر مزید مجھے یہیں رکنا چاہیے۔ قریباً آدھ گھنٹا میں نے وہیں رک کر انتظار کیا۔ اب قرب و جوار میں مکمل خاموشی تھی۔ چاند ایک بار پھر گہری بدلیوں میں چھپ چکا تھا اور ہر طرف تاریکی کا راج ہو گیا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اکلوتی ہیڈ لائٹ کے سہارے بہت کم رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ نشیب سے نکل کر میں قدرے بلندی پر آیا تو دور عقب میں مجھے افق پر ہلکی سرخی نظر آئی۔ یقیناً بستی میں ابھی تک آگ بھڑک رہی تھی۔

قریباً دو گھنٹے کے انتہائی دشوار گزار سفر کے بعد مجھے ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ میں نے جیپ بستی سے کافی فاصلے پر درختوں میں روک دی اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح زیادہ دور نہیں تھی، کچھ ہی دیر بعد مشرقی افق پر وہ روشنی نمودار ہو گئی جسے صبح کاذب کا نام دیا جاتا ہے۔ آسمان اب صاف ہو چکا تھا اور دور دور تک ٹمٹماتے ستاروں کے چراغ روشن تھے۔ پروفیسر بہت دیر تک مچلتا رہا تھا، اب نڈھال ہو گیا تھا اور بس کبھی کبھار اس کے حلق سے غوں غاں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ صبح کے انتظار میں فضول بیٹھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس دوران میں میں نے ایک اہم کام کیا۔ میں نے سوچا کہ قیمتی رائفلوں کو کہیں چھپا دینا چاہیے۔ خوش قسمتی سے مجھے جیپ کے اندر ہی ایک شاندار خفیہ خانہ مل گیا۔ یہ خانہ جیپ کے فرش میں واقع تھا اور اتنی صفائی سے بنایا گیا تھا کہ دروازے کا جوڑ تلاش کرنا قریباً ناممکن تھا۔ اس کے دروازے کو کھولنے کے لیے نمبروں والا ایک تالا درمیانی نشست کے پیچھے نصب کیا گیا تھا۔ میں نے اس خفیہ خانے کو کھولا اور چاروں رائفلیں مع ایمونیشن یہاں چھپا دیں۔ بعد ازاں تالے کو مخصوص نمبر پر سیٹ کر دیا۔ صبح صادق کے بعد روشنی پھیلنی شروع ہوئی۔ یہ ایک خون آشام و پرہنگام رات کی صبح تھی۔ بتدریج "قرب و جوار" دن کے اجلے لباس میں دکھائی دینے لگے۔ دو تین فرلانگ کی دوری پر قدرے نشیب میں جو بستی مجھے نظر آ رہی تھی، وہ لارسیوں کی عظیم الشان بستی کا عشر عشیر بھی نہیں تھی، تاہم بستی کا رنگ ڈھنگ اور جھونپڑوں کی ساخت اور جھونپڑوں پر لہراتے ہوئے جھنڈے، یہ سب کچھ لارسیوں کی بستی سے ملتا جلتا تھا۔ بستی میں سو کے قریب جھونپڑے ہوں گے، اس کے علاوہ کھجور کے تنوں اور گھاس پھونس سے بنے ہوئے چھپر بھی تھے۔ ان میں سے کچھ چھپروں کے نیچے نحیف و نزار جانور بندھے ہوئے تھے، دور ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ غریب غربا کی بستی ہے۔

میں نے پروفیسر کو تو جیپ سمیت وہیں رہنے دیا۔ خود میں درختوں کی آڑ لے کر چلتا ہوا اس صحرائی گاؤں کی طرف بڑھا۔ میرے جسم پر ابھی تک لارسی قبیلے والا لباس تھا۔ یہ لباس خوش نما ہونے کے باوجود مضحکہ خیز سا لگتا تھا۔ ایک لمبا چولا سا تھا اور نیچے کڑھائی دار پاجامے کی شکل والا لباس تھا، جس کے پائنچے کافی کھلے تھے۔ ایک فل لوڈڈ خودکار رائفل "C.Q" میرے پاس تھی، اس رائفل کی نال چونکہ کافی چھوٹی ہوتی ہے لہٰذا میں نے اسے بہ آسانی اپنے لبادے میں چھپا لیا تھا۔ بھوک پیاس سے میرا برا حال تھا۔ میں جانتا تھا کہ پروفیسر کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہوگا۔ پروفیسر کو تو ویسے بھی پیاس بہت زیادہ لگتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ کہیں سے اتنا پانی مل جائے کہ کم از کم ہم اپنے ہونٹ ہی تر کر لیں۔ اس کے علاوہ گاڑی کے ریڈی ایٹر کے لیے بھی پانی کی شدید ضرورت تھی۔ سورج ابھی افق سے بلند نہیں ہوا تھا، پھر بھی آثار بتا رہے تھے کہ گرمی اور تپش کے لحاظ سے یہ ایک نہایت خوفناک دن ثابت ہوگا۔ ابھی میں بستی سے دور ہی تھا کہ ایک جگہ درختوں میں گھمبیر سی آوازیں آئیں۔ میں

مشہور ترین مصنف ایم اے راحت کے قلم سے
عقل و سوچ سے ماورا سسپنس مہم جوئی اور پراسرار واقعات پر مبنی دلچسپ کہانیاں
قیمت 90 روپے
مقدس عہد
قیمت 90 روپے
مقدس نشان
قیمت 90 روپے
اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
7247414

نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ یہاں پانچ چھ عمر رسیدہ افریقی موجود تھے۔ یہ سوکھے سڑے جسموں والے سیاہ فام ایک بڑی سی کڑاہی کے گرد جمع تھے' کڑاہی کے نیچے سرکنڈوں کی آگ روشن تھی۔ میں نے دیکھا کہ چولہے کے پاس ہی ایک گیدڑ کا سر اور کٹے ہوئے پاؤں پڑے ہیں۔ کڑاہی سے جو باس اٹھ رہی تھی اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ جانور کا گوشت ابالا جارہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بوڑھوں کی آنکھیں خوف اور تحیر سے پھیل گئیں۔ وہ جہاں کے تہاں رک گئے تھے پھر ان میں سے صرف ایک کے سوا باقی سب بدکے ہوئے جانوروں کی طرح جھاڑیوں میں او جھل ہوگئے۔ جو بیٹھا رہ گیا تھا وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح ہڈیوں کا ڈھانچا ہی تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹ تھا' پیشانی پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کسی دھات کا بنا ہوا ایک طویل چمچہ تھا۔ میری آمد سے قبل وہ اس چمچے کو بڑے انہماک سے کڑاہی کے اندر چلا رہا تھا' لیکن اب اس چمچ کی حیثیت اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی ہوتی تھی۔ وہ ایک سہمی ہوئی لاغر بلی کی طرح ایک ٹک میری آنکھوں میں دیکھتا چلا جارہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد موقع سے بھاگنے والے افراد واپس آگئے' اب ان کے ساتھ نصف درجن اور لوگ بھی تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں بھالے نظر آرہے تھے۔ میرے پاس جدید رائفل تھی۔ میں چند سیکنڈ میں ان افراد کو زیر کر سکتا تھا مگر نجانے کیوں مجھے ان مسکین صورت افراد سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ جیسے میرے اندر کے وجدان نے مجھ سے کہا کہ یہ دشمن نہیں دوست ہیں۔ میں نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور انہیں بتایا کہ میرا ارادہ کسی بھی طرح جارحانہ نہیں' پھر میں نے اشاروں کنایوں میں انہیں سمجھایا کہ میں ایک مصیبت زدہ ہوں' طویل مسافت کے سبب بھوک پیاس کا شکار ہوں اور ان سے مدد چاہتا ہوں۔

ایک بوڑھا درختوں میں گیا اور تھوڑی دیر بعد مٹی کے پیالے میں سرد پانی لے آیا۔ پانی پی کر میں نے سر جھکایا اور مقامی انداز میں شکریہ ادا کیا۔ وہ لوگ ابھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے وہ شخص جو نسبتاً دلیر تھا اور مجھے دیکھ کر بھی کڑاہی کے قریب بیٹھا رہا تھا' آگے بڑھا اور مقامی زبان میں مجھ سے مختلف سوالات پوچھنے لگا۔ غالباً وہ میرے لبادے کے نیچے رائفل کی موجودگی سے بھی آگاہ ہوچکا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے رائفل نکالی اور سامنے فرش پر رکھ دی۔ جونہی میں نے رائفل فرش پر رکھی' بھالا بردار افراد تیزی سے آگے آئے اور انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ ایک بھالے کی نوک باقاعدہ میری کمر سے چھونے لگی تھی۔ سوالات پوچھنے والے شخص نے آگے بڑھ کر اچھی طرح میری جامہ تلاشی لی۔ میری کلائیاں دیکھیں' پیشانی کا نیگوں ابھار دیکھا۔ میرے بازو کا وہ حصہ دیکھا جہاں رات کو آدم خور ضیاعی نے دانت گاڑے تھے۔ یہ زخم دیکھنے کے بعد دفعتاً میرے میزبانوں کا رویہ نرم محسوس ہونے لگا۔ میرے بازو کو عریاں کرنے کے بعد وہ بوڑھے بڑے دھیان سے میرا زخم ملاحظہ کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ بار بار اثبات میں سر ہلانے لگے۔ مجھے لے کر وہ گھنے درختوں میں آگئے۔ میری رائفل ایک تومند شخص نے اٹھالی تھی۔ اس کے رائفل اٹھانے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا استعمال نہیں جانتا۔

مجھے تقریباً ایک فرلانگ دور بستی کی حدود میں لایا گیا۔ یہاں ہم گھاس پھونس کی بنی ہوئی ایک کوٹھڑی میں داخل ہوگئے۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ کوٹھڑی کے فرش میں سے ایک زینہ نیچے اترتا تھا۔ ہم اس تاریک زینے میں داخل ہوگئے۔ میرے ساتھ آنے والے بیشتر افراد باہر ہی رہ گئے تھے' اب صرف تین افراد میرے ساتھ تھے ان میں سے ایک وہ تھا جس نے میری رائفل اٹھا رکھی تھی۔ اس نے سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی اور وہ شکل و صورت سے مسلمان نظر آتا تھا' اور صرف اسی کی بات نہیں تھی' بستی کے اکثر افراد مجھے مسلمان ہی لگ رہے تھے۔ زینے اترنے کے بعد میری حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ یہاں ایک کافی بڑا خلا تھا۔ در و دیوار کچے تھے اور کچے فرش پر درختوں کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ میرے میزبانوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ٹھنڈے پانی سے میری تواضع کی گئی۔ ایک شخص کہیں سے مرہم نما دوا اٹھالایا۔ اس نے یہ دوا میری پیشانی پر اور بازو کے زخم پر لگائی۔ وہ سراپا ہمدرد نظر آرہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈرے ہوئے بھی تھے۔ یہ بات اب اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ اس نامعلوم بستی کے لوگ اپنے اردگرد کے حالات سے کافی حد تک باخبر ہیں۔ یقیناً انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کل رات جھیل زار کے کنارے لارسیوں کی بستی میں کیا طوفان برپا ہوا ہے۔ میرا مخصوص لباس اس بات کا گواہ تھا کہ میں لارسیوں کی بستی میں سے آرہا ہوں' اس کے بعد میرے جسم کی چوٹیں اور خاص طور سے میرے بازو پر دانتوں کا زخم دیکھ کر انہیں یقین ہوگیا تھا کہ میں لارسیوں کے ساتھ مل کر باہر کے حملہ آوروں سے برسرپیکار رہا ہوں۔ انہوں نے میرے لیے ہمدردی محسوس کی تھی اور

خوف زدہ ہونے کے باوجود مجھے پناہ دے دی تھی۔

میں نے اشاروں کنایوں میں انہیں بتایا کہ میرا ایک ساتھی بھی ہے اور وہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی میں بندھا پڑا ہے۔ میری بات سمجھ میں آنے کے بعد دو افراد فوراً باہر نکل گئے اور تقریباً پون گھنٹے کے بعد پروفیسر سمیت اس زمین دوز پناہ گاہ میں واپس آگئے۔ وہ پروفیسر کو بندھی ہوئی حالت میں ہی لائے تھے' اور تو اور اس کے منہ سے کپڑا نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ وہ لوگ پروفیسر کو میرا کوئی دشمن سمجھ رہے تھے' اور ان کی سوچ منطقی تھی۔ میں پروفیسر کو بندھی ہوئی حالت میں لیے پھر رہا تھا۔

میں نے اشاروں کنایوں میں اپنے میزبانوں کو سمجھایا کہ وہ پروفیسر کی طرف سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ میرا دوست ہے' میں اسے سمجھا بجھا کر ٹھیک کرلوں گا۔ میزبانوں نے اس پناہ گاہ میں تازہ پانی کے علاوہ تھوڑا سا دودھ اور زردی مائل مکھن بھی پہنچا دیا۔ مکھن کے ساتھ موٹے سے آٹے کی روٹی تھی۔ ایک شخص نے اشاروں میں مجھ سے اس گاڑی کے متعلق پوچھا جس میں ہم یہاں پہنچے تھے۔

میں نے اس شخص کو بتایا کہ یہ گاڑی ہم نے حملہ آوروں سے چھینی ہے۔ میری اس اطلاع پر سوال کرنے والے کی آنکھوں میں خوشی کی موہوم سی چمک نظر آئی۔ کھانے کی اشیاء فرش پر رکھنے کے بعد وہ لوگ باہر چلے گئے۔ طاق دان میں دو چراغ روشن تھے۔ ان چراغوں کے سبب زینوں والا دروازہ بند ہونے کے بعد بھی اس پناہ گاہ میں روشنی موجود رہی۔

پروفیسر اب قدرے پرسکون نظر آرہا تھا۔ شائستہ کے بارے میں میری اطلاع سننے کے بعد اس پر جو جنونی کیفیت طاری ہوئی تھی اب وہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو پروفیسر! شائستہ کے بارے میں ہم بھی کچھ کم فکرمند نہیں ہیں' لیکن جو انداز تم اپنا رہے ہو وہ کسی طور پر بھی درست نہیں۔ رات کو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تمہیں زبردستی روک لوں۔ میری دلی دعا ہے کہ شائستہ صحیح سلامت ہو۔ اور اگر وہ صحیح سلامت ہے تو پھر تمہاری جلدبازی اسے سخت نقصان پہنچا سکتی ہے۔ نقصان اسے براہ راست پہنچ سکتا ہے اور تمہاری وجہ سے بھی پہنچ سکتا ہے۔ اگر ٹرسٹ کے گارڈز کی طرف سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو یہ بھی شائستہ کا نقصان ہی ہوگا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہارے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔"

میں دیر تک پروفیسر کو سمجھاتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو بہہ نکلے اور اس کا چہرہ ہیجان کے بجائے ایک غم آمیز سکون کا مظہر نظر آنے لگا۔ میں نے بڑی آہستگی کے ساتھ اس کا منہ کھول دیا پھر اس کے ہاتھ پاؤں بھی بندشوں سے آزاد کردیے۔ پروفیسر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے نجانے کیا ہوا کہ وہ مجھ سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"مجھے میری بچی کی صورت دکھا دو۔ مجھے میری شائستہ کے پاس لے چلو۔" وہ بلک کر بولا۔

"اللہ نے چاہا تو تم اس کی صورت دیکھو گے' اس کو پیار کرو گے۔" میں نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

"وہ زندہ ہے ناں۔ تم نے اسے دیکھا ہے ناں۔ تمہیں۔۔۔ تمہیں کوئی دھوکا تو نہیں ہوا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے وہ جان دول کی گہرائی سے لرز گیا۔

"میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے سچ بتایا ہے۔ مجھے موجودہ حالات کا تو علم نہیں' لیکن میرے دل کی گواہی ہے کہ تمہارا پیار اتنی آسانی سے شائستہ کو زندگی ہارنے نہیں دے گا۔"

پروفیسر نے چہرہ بازوؤں میں چھپالیا اور روتے ہوئے بولا "ہاں وہ نہیں مرے گی' وہ اپنے باپ کو اتنا بڑا دکھ نہیں دے گی۔ وہ کیسے دے سکتی ہے اتنا بڑا دکھ؟"

○☆○

اگلے چار پانچ روز ہم نے اسی پناہ گاہ میں بند رہ کر گزارے۔ ہمارے میزبان غربت کے مارے ہوئے تھے اس کے علاوہ وہ خوف زدہ بھی بہت تھے' اس کے باوجود وہ اپنی طرف سے ہماری خدمت اور حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ ان کے جسموں اور چہروں سے ظاہر تھا کہ انہیں دو وقت کی روکھی سوکھی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے' مگر ہمارے لیے وہ کسی نہ کسی طرح تین وقت کھانے کا انتظام کردیتے تھے۔ اگر ہم کھانے سے انکار کرتے تھے یا ہاتھ کھینچ کر رکھتے تھے تو وہ اصرار کرکے کھلاتے تھے۔ چونکہ ہم ایک دوسرے کی زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اردگرد کے حالات کا علم ہمیں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ علم نہیں تھا کہ ہمارے آنے کے بعد جھیل زار کے کنارے کیا کچھ ہوا۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ جھیل زار کے کنارے لارسیوں کی عظیم الشان بستی اب موجود بھی ہے کہ نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر منور اور ویرا کی تھی۔ جس وقت بستی میں ہنگامہ شباب پر تھا وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بستی کی حد بندی کی طرف گئے تھے' ان کے سامنے آگ اور بارود کی دیوار تھی۔ خبر نہیں کہ وہ دونوں اس دیوار کو عبور کرنے میں

کامیاب ہو سکتے تھے یا نہیں۔۔۔ میں کسی وقت ان دونوں کے متعلق اتنا سوچتا تھا کہ دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

جس جگہ ہم قیام پذیر تھے وہ ایک سرنگ نما قیام گاہ تھی۔ چھت بمشکل چھ فٹ اونچی ہوگی۔ زینوں کے قریب کا حصہ نسبتاً کشادہ تھا لیکن آگے جا کر یہ سرنگ نما پناہ گاہ قدرے تنگ ہو گئی تھی۔ سرنگ کے اس حصے کو ایک سرخ پردے کے ذریعے دوسرے حصے سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ اس دوسرے حصے سے ہم نے اکثر دھواں اٹھتے دیکھا تھا۔ ہمارے میزبانوں میں سے کوئی اگر اس حصے کی طرف جاتا تھا تو ننگے پاؤں اور بے حد عزت و احترام کے ساتھ جاتا تھا۔ دبے پاؤں جانے والے دبے پاؤں ہی واپس آتے تھے اور جب وہ آتے تھے تو اکثر زیر لب کچھ پڑھ رہے ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس حصے میں کوئی برگزیدہ مذہبی ہستی رہائش پذیر ہے۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ شاید وہ اس بستی کا مکھیا ہو۔

ایک روز ہم نے ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھا۔ اس سیاہ فام دوشیزہ کو کسی دماغی دورے کی شکایت تھی۔ وہ چیخ رہی تھی اور اس نے اپنا لباس پھاڑ کر دھجیوں میں بکھیر دیا تھا۔ تین چار افراد نے اسے تھام رکھا تھا اور زبردستی کر کے اس سرخ مخملی پردے کی طرف لے جا رہے تھے جس کی دوسری طرف کوئی پراسرار شخص موجود تھا۔ دوشیزہ کی برہنگی چھپانے کے لیے اس کے ورثا نے اس کے جسم پر ایک موٹی چادر ڈال رکھی تھی۔ وہ اس چادر کو کھینچ کھینچ کر اپنے جسم سے جدا کر رہی تھی۔ بار بار اس کے جسم کے مختلف حصے عریاں ہو جاتے تھے۔ جب ایک طرف سے ڈھانپا جاتا تھا تو وہ دوسری طرف سے چادر اتار پھینکتی تھی۔ اس چیختی چلاتی لڑکی کو سرخ پردے کے عقب میں لے جایا گیا۔ دو چار منٹ تک اس کی آوازیں آتی رہیں، پھر بتدریج ختم ہو گئیں۔۔۔ آدھ پون گھنٹے بعد لڑکی باہر نکلی تو مکمل لباس میں تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، بال اوڑھنی سے ڈھکے ہوئے تھے اور وہ مکمل طور پر پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اسی قسم کے ایک دو اور واقعات بھی ان دو دنوں میں ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرے تھے۔

سرخ پردے کے عقب میں کیا ہے؟ اس حوالے سے ہمارا تجسس بہت بڑھ چکا تھا۔

ایک صبح میں سو رہا تھا کہ پروفیسر نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا "کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے اور شاید تمہاری بھی ٹھیک ہونے والی ہے۔" پروفیسر نے نارمل لہجے میں کہا۔ وہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"تمہارا تجسس دور ہونے والا ہے۔ ابھی ایک حبشی آیا تھا۔ وہ اشاروں کنایوں میں مجھے سمجھا گیا ہے کہ ہم دونوں کو سرخ پردے کے اس پار جانا ہے اور کسی سے ملنا ہے۔ حبشی اشاروں میں سمجھا گیا ہے کہ ہم نہا کر پاک صاف ہو جائیں اور دھلے ہوئے کپڑے پہن لیں۔"

ایک طرف لکڑی کی تپائی پر میرے اور پروفیسر کے لیے لباس بھی موجود تھا۔ ہم دونوں کے نہانے کا انتظام اس پناہ گاہ کے اندر ہی کیا گیا تھا۔ نہا کر ہم نے لباس تبدیل کر لیا تو دو عمر رسیدہ افراد آئے اور ہمیں پردے کی دوسری جانب لے گئے۔ یہاں دیواروں پر رنگ و روغن سے مختلف جانوروں اور دیوی دیوتاؤں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک دو مقامات پر کسی عبادت گاہ کی تصویر بھی تھی۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ بستی کے سبھی لوگ مسلمان نہیں ہیں بلکہ یہ ملی جلی آبادی ہے۔ پناہ گاہ کا یہ تنگ حصہ تقریباً پندرہ گز طویل تھا۔ یہاں چھت بھی نسبتاً نیچی تھی۔ تاہم یہاں خوشگوار ٹھنڈک موجود تھی۔ ہم ایک ادھیڑ عمر شخص کے پاس پہنچے۔ وہ ایک چوبی تختے پر بڑی تمکنت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک مالا گردش کر رہی تھی۔ میں اس شخص کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ سردار بوغات تھا۔ اس نے ایک بڑی چادر سر پر ڈال کر گھونگھٹ سا نکال رکھا تھا، اس کے باوجود اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی سفید نوکیلی داڑھی اس کے سینے تک پہنچ رہی تھی۔ آنکھیں چھوٹی تھیں اور قبیلے کے اکثر افراد کی طرح گہری سرخ تھیں۔ سردار اچھے لباس میں تھا لیکن یہ لباس میلا کچیلا سا ہو گیا تھا۔ نایاب پرندوں کے پروں کا تاج بھی آج سردار کے سر پر نظر نہیں آتا تھا۔ سردار بوغات کا ایک بازو کلائی سے لے کر کندھے تک پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ چوٹ اسی خون ریز ہنگامے کی نشانی ہے جو سات دن پہلے جمیل زار کے کنارے برپا ہوا تھا، اس کے علاوہ سردار کے ایک رخسار پر بھی چوٹ کا نشان موجود تھا۔ میں سردار کو دیکھ کر حیران ہوا لیکن سردار کے چہرے پر تحیر کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں ہماری موجودگی سے پہلے ہی آگاہ ہے۔ سردار نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ اشاروں کی زبان میں ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ایک طاقت ور مقناطیس ہے اور

ہم لوہے کے حقیر ذرّوں کے مانند اس کی طرف کھنچتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی سمندر ہو اور وہ ہمیں اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہو یا کوئی سحر انگیز ہوا ہو جو ہمیں اپنے ساتھ اڑا لے جانا چاہتی ہو یا پھر میٹھی میٹھی غنودگی کا ایک جھونکا ہو جو ہم سے ہمارے ہوش و حواس چھیننا چاہتا ہو۔ ان سحر انگیز سرخی مائل آنکھوں کو دیکھ کر نجانے کیوں ایک بار پھر مجھے وادی موت کا پراسرار انسان سانوس یاد آ گیا۔ وہ بھی تو ایسی ہی غیر مرئی قوت کا مالک تھا اور وہ کوئی خیالی قوت نہیں تھی ایک ٹھوس شے کی طرح اس کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کا اثر ملاحظہ کیا جا سکتا تھا۔

سردار بوغات کی نگاہیں گواہ تھیں کہ وہ مجھے بڑی اچھی طرح پہچان چکا ہے۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو قریب بلایا اور ہمارے لباسوں پر کوئی خوشبو لگائی۔ اس کے بعد ہماری ایک کلائی پر ایک سرخ دھاگا باندھ دیا۔ اس سرخ دھاگے میں دو دو سفید جنگلی پھول بھی پروئے گئے تھے۔

اس سرخ دھاگے اور سفید پھولوں کو دیکھ کر میں ذرا چونکا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ سرخ دھاگا اور سفید پھول میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ جب شروع شروع میں میں اور صفدر لارسیوں کی بستی میں پہنچے تھے اور دو پرشباب مقامی لڑکیاں ہم دونوں کی خلوت کو رنگین کرنے کے لیے ہمارے جھونپڑے میں وارد ہوئی تھیں تو ان دونوں نے بھی میری اور صفدر کی کلائی پر اسی طرح کے پھول باندھنے کی کوشش کی تھی۔ بعد ازاں صوفیہ نے شرم سے سرخ ہوتے ہوئے اور ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ یہ پھول بہت خوشی کے موقع پر باندھے جاتے ہیں، خاص طور سے ایسی خوشی جس کا تعلق جوان مرد اور جوان عورت کے باہمی تعلق سے ہو۔ اس نے بتایا تھا کہ شادی بیاہ کے موقع پر بھی ایسے پھول دلہا اور دلہن کے عزیز ایک دوسرے کو باندھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ارسیوں کے سردار بوغات نے اس وقت یہ پھول ہم دونوں کو کیوں باندھے ہیں۔ یہاں کوئی شادی بیاہ کا سلسلہ تھا اور نہ ہی کوئی دوشیزہ ہماری خدمت گزاری کے لیے کمربستہ نظر آتی تھی۔ سردار بوغات ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کچھ بھی ہمارے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ سردار کسی محفل یا تقریب وغیرہ کا ذکر کر رہا ہے، کوئی ایسی تقریب جس میں ہمیں کھانا وغیرہ بھی پیش کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ رقص کا انتظام بھی ہو۔

کچھ دیر تک سردار بوغات نے ہم سے گفتگو کی۔ اس گفتگو کا کوئی لفظ ہمارے پلے نہیں پڑا۔ بس یہ سمجھ میں آیا کہ سردار خوش ہے اور اس خوشی کے موقع پر ہمیں بھی اہمیت دے رہا ہے (خاص طور سے مجھے) بستی میں ہونے والے خون ریز ہنگامے کے بعد اور کنگ برازن کے ہاتھوں ایک واضح شکست کے بعد سردار کا یوں خوش نظر آنا حیرانی کی بات تھی۔ چاہے یہ کوئی وقتی خوشی تھی لیکن خوشی تو تھی۔ کچھ دیر بعد ہم سرخ پردے کی دوسری جانب اپنی قیام گاہ میں واپس آ گئے۔

پروفیسر بولا "لارسی سردار کو یہاں دیکھ کر پرانے قصے کہانیاں یاد آ گئے ہیں۔ بادشاہ دشمن فوج کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایسے ہی ہمسایہ ملکوں میں پناہ لے لیا کرتے تھے۔"

"مثال تو تمہاری صحیح ہے۔" میں نے کہا "مگر سردار علی الاعلان پناہ گزیں نہیں ہوا۔ یہ خفیہ پناہ ہے۔ اگر زست والوں کو بھنک بھی پڑ گئی کہ سردار یہاں ہے تو وہ سردار سمیت اس غریب بستی کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ لوگ قبائلی نظام کے تحت رہتے ہیں۔ اس بستی کے لوگوں کا تعلق بھی کسی قبیلے سے ہوگا۔ اس بستی کے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب پورے قبیلے سے ٹکر لینا ہوگا۔"

"وہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" میں نے کہا "باہر سے مدد پہنچنے تک اس بستی کا صفایا تو یقیناً ہو جائے گا، اور ممکن ہے کہ ساتھ میں ہمارا بھی ہو جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم تھوڑا سا اصرار کرتے تو یہ لوگ رائفل ہمیں دینے پر آمادہ ہو جاتے۔"

"میرا خیال تم سے مختلف ہے۔" میں نے کہا۔

اچانک پروفیسر کے ذہن میں کوئی خیال آیا، وہ بولا "تم نے بتایا تھا کہ جیپ میں کچھ رائفلیں موجود ہیں، کیا اب بھی وہ جیپ کے اندر ہی ہوں گی؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اگر ان لوگوں نے بہت اچھی طرح تلاشی نہیں لی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی جیپ میں ہی ہوں۔"

"کیوں نہ ان رائفلوں کے بارے میں ان لوگوں کو بتا دیا جائے یا پھر سردار بوغات کو ہی بتا دیا جائے۔"

میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اس اسلحے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ تم نے دیکھا ہی تھا کہ یہ لوگ میری رائفل کو کتنی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ آتشیں اسلحہ کبھی کبھار ہی ان کی نگاہوں سے گزرتا ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہماری طرح اور سردار بوغات کی طرح، کچھ اور لوگ بھی جھیل زار سے بھاگ کر اس گاؤں میں پہنچے ہوں اور یہاں وہاں چھپے ہوئے ہوں۔ وہ لوگ یہ اسلحہ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ان چند رائفلوں کی وجہ سے یہ لوگ کنگ براؤن کی دست برد سے بچ سکتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہی تھا، بستی میں لارسیوں کی کتنی بڑی تعداد کو ٹرسٹ والوں نے روند کر رکھ دیا تھا۔"

پروفیسر بڑبڑا کر رہ گیا۔ اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا، پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائے اور کسی طور ٹرسٹ پہنچے۔ اب اپنی آزادی سے ٹرسٹ کی غلامی اسے ہزار درجہ بہتر محسوس ہوتی تھی۔ وہ غلامی اسے اس کی بیٹی کے قریب پہنچا سکتی تھی۔ ان چند دنوں کے اندر پروفیسر کے اندر کافی تبدیلی آئی تھی۔ اس کا جنون بڑی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اب وہ محتاط بات کرنے لگا تھا اور محتاط انداز میں سوچنے لگا تھا۔ شاید اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے پاس کھونے کے لیے بہت کچھ باقی ہے۔

سہ پہر کے کچھ دیر بعد ہماری زمین دوز پناہ گاہ میں کچھ عورتیں داخل ہوئیں۔ یہ عورتیں مقامی رواج کے مطابق سروں پر اسکارف باندھے ہوئے تھیں، انہوں نے رنگ برنگے لباس پہن رکھے تھے اور پاؤں میں جھانجریں وغیرہ تھیں۔ ان عورتوں کے بعد اِکا دُکا مرد و زن اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے رہے اور شام ہوتے ہوتے کوئی تین درجن افراد وہاں جمع ہو گئے۔ یہ سب مقامی سیاہ فام تھے۔ ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں پر میں نے وہی سرخ دھاگا اور اس میں پروئے ہوئے دو سفید پھول دیکھے۔ وہ لوگ آپس میں ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے اور ہم ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ فرش پر درخت کی چھال بچھی تھی اور سب لوگ اس پر بیٹھے تھے۔ تاہم ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک غالیچہ بھی بچھا دیا گیا تھا۔ اس غالیچے پر دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ایک گاؤ تکیہ قریباً پانچ فٹ لمبا تھا، دوسرا دو ڈھائی فٹ تھا لیکن یہ ریشمی اور کافی خوب صورت تھا۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے مجھے اٹھایا اور غالیچے کے بالکل سامنے لا بٹھایا۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ چند مقامی لڑکیوں کے ہمراہ دو افراد زینوں کی طرف سے اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر میرے تو چودہ طبق روشن ہوئے ہی تھے یقیناً پروفیسر بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ صفدر اور ویرا تھے۔ دونوں رنگ دار لباس میں تھے۔ ویرا کے سر پر ایک سرخ کامدار اسکارف تھا اور وہ بنی سنوری ہوئی تھی۔ جونہی صفدر سے میری نظریں چار ہوئیں، میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صفدر کے چہرے پر بھی خوشی اور شناسائی کے تاثرات نظر آئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ یہاں میری موجودگی سے آگاہ ہے۔ میں صفدر کے قریب پہنچا تو وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے پوچھا "مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر مندی تھی۔"

''اور مجھے بھی۔'' صفدر نے کہا۔

"میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم سے یہاں اس طرح ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ یہاں ہیں، میں آپ سے ملنا بھی چاہ رہا تھا، مگر کچھ مجبوری تھی جس کی وجہ سے آ نہ سکا۔''

''ویرا! تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ شرمیلے انداز میں بولی ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اس کے انداز میں شکریے کی جھلک بھی تھی۔ غالباً شکریہ اس کوشش کے لیے تھا جو میں نے اسے اور صفدر کو ہنگامے کی رات مائیکل کے چنگل سے نکالنے کے لیے کی تھی۔

ابھی صفدر اور ویرا سے میری اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی کہ خوشبو میں بسی ہوئی مقامی لڑکیاں ہمارے درمیان آ گئیں۔ انہوں نے صفدر اور ویرا کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور چند قدم آگے جا کر انہیں غالیچے پر بٹھا دیا۔ انہیں لمبوترے گاؤ تکیے کے سہارے بٹھایا گیا تھا۔ لڑکیاں ان دونوں کو شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ صورت حال کو سمجھنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ کچھ ہونے جا رہا ہے جس کی شروعات بہت دن پہلے جھیل زار کے کنارے ہو چکی ہے۔ صفدر اور ویرا کو ایک بندھن میں باندھا جا رہا تھا اور یہ بندھن ازدواجی رشتے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ گم صم بیٹھا رہ گیا۔

قرائن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ صفدر اور ویرا بھی ہماری طرح پناہ کی تلاش میں اس صحرائی گاؤں تک پہنچے ہیں اور سات روز سے یہیں قیام پذیر ہیں۔ عین ممکن تھا کہ سردار بوغات کی طرح اور بھی کئی لارسی اس بستی میں موجود ہوں اور انہوں نے اس ادھوری کارروائی کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا ہو جس کا تعلق صفدر اور ویرا کے ازدواجی بندھن سے تھا۔ اچانک مجھے اپنے تیز رفتار خیالات سے چونکنا پڑا۔ پناہ

گاہ میں واقع سرخ پردہ متحرک ہوا اور اس کے عقب سے سردار بوغات کا سراپا برآمد ہوا۔ اس کا لباس اسے سرتاپا ڈھانپے رکھتا تھا اور اس پر پشت کی طرف چمک دار دھاگے کے ذریعے ہاتھی کی شبیہ بھی کاڑھی گئی تھی۔

سردار کے ہمراہ بستی کے دو معمر افراد تھے۔ عقب میں دو دبلی پتلی لڑکیاں بڑے ادب سے چلی آ رہی تھیں۔ سردار بوغات بڑی تمکنت سے غالیچے پر فروکش ہو گیا اور قیمتی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا لی۔ اس کا بازو بدستور پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بازو کو لٹکنے سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے ایک ڈوری کے ذریعے سردار کی گردن سے لٹکا دیا گیا تھا جیسا کہ بعد ازاں معلوم ہوا، سردار کے بازو کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

سردار نے ویرا سے چند جملوں کا تبادلہ کیا۔ صفدر چونکہ یہ زبان نہیں سمجھتا تھا اس لیے وہ اس گفتگو کے دوران میں میری ہی طرح لاتعلق بیٹھا رہا۔ آج میں نے اسے پورے سات روز بعد دیکھا تھا اور آج بھی اس کی آنکھیں شراب کے نشے سے بوجھل تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ذہنی سکون کی خاطر ان دنوں شراب میں ڈوبا رہتا ہے۔ کوئی آسیبی قوت تھی جس نے اس کی فطرت اور اس کے مزاج میں ناقابل فہم دراڑیں ڈال دی تھیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تین عورتیں ایک تھال لے کر نمودار ہوئیں۔ اس میں کٹا ہوا تربوز موجود تھا۔ سردار بوغات اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تو صفدر اور ویرا بھی کھڑے ہو گئے۔ سردار نے تربوز کا تھوڑا سا گودا لیا اور ویرا کی پیشانی پر ملا۔ غالباً یہ وہی رسم ادا کی گئی تھی جو بستی میں ادھوری رہ گئی تھی۔ چند منٹ بعد ایک چھناکا سا ہوا اور ایک نیم تاریک گوشے میں کئی ساز بج اٹھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑکیاں ایک ساتھ کھڑی ہو گئیں جو سب سے پہلے جھانجریں پہنے اس پناہ گاہ میں داخل ہوئی تھیں۔ اس مفلوک الحال بستی کی طرح یہ لڑکیاں بھی مفلوک الحال تھیں۔ رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور دبلے پتلے جسم۔ بہرحال ان کے رقص کا آغاز ہوا تو پتا چلا کہ وہ اچھا رقص کر لیتی ہیں۔ رقص کرتے ہوئے بھی اسکارف ان کے سروں پر ہی تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔ اب وہ میرے پاس آ بیٹھا تھا۔

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔"

"تمہارے دوست کی شادی ہو رہی ہے اور تمہیں علم نہیں؟"

"یہاں سب کچھ ہی انوکھا ہو رہا ہے۔"

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ لڑکی جو دلہن بنی بیٹھی ہے کنگ براؤن کی بھتیجی ہے۔"

''تم کنگ براؤن کی بھتیجی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''وہی جو جھیل زار کے لارسی جانتے ہیں اور دوسری تمام بستیوں کے لارسی جانتے ہیں۔ کنگ براؤن کی بھتیجی ویرا نے ٹرسٹ سے بھاگتے ہوئے ایک غلام کے ساتھ عشق کیا ہے اور اس کے عشق کی خاطر ہر آرام آسائش ٹھکرا دی ہے، یہاں تک کہ دو مرتبہ اپنی جان لینے کی کوشش بھی کی ہے۔ اب مجھ پر یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ...." پروفیسر کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"کیا انکشاف ہو رہا ہے؟"

"یہی کہ ٹرسٹ کا وہ مفرور غلام تمہارا دوست صفدر ہے۔"

پروفیسر کے لہجے میں ہلکا سا طنز آمیز شکوہ بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کس بات کا شکوہ ہے۔ پروفیسر پچھلے سات دنوں سے میرے ساتھ تھا، مگر میں نے اسے ویرا اور صفدر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی پروفیسر نے خود اس بارے میں کوئی بات کی تھی۔

لڑکیوں کا رقص ختم ہوا تو غالیچے کے سامنے لوہے کی ایک انگیاری میں آگ روشن کر دی گئی۔ ایک بوڑھا اٹھا اور اس نے جھک کر صفدر اور ویرا کے کانوں میں کچھ کہا۔ ویرا صفدر سمیت اٹھی اور آگ کے سامنے پہنچ گئی۔ دونوں نے رکوع کے بل جھک کر ''آگ'' کو تعظیم پیش کی۔ صفدر کا یوں ''اگنی دیوتا'' کے سامنے سرنگوں ہونا میرے لیے ''ناقابل ہضم'' تھا لیکن بہت سی خرافات کی طرح یہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اگنی دیوتا کو تعظیم پیش کرنے کے بعد صفدر اور ویرا سردار بوغات کے سامنے دو زانو بیٹھ گئے۔ سردار بوغات نے ان دونوں پر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ساتھ وہ آگ کی طرف بھی پھونکیں مار رہا تھا۔ آخر اس نے صفدر اور ویرا کے ہاتھ میں سفید پھولوں کا ایک ایک ہار تھما دیا۔ ویرا نے مسکرا کر ہار صفدر کے گلے میں ڈال دیا، جواب میں صفدر نے بھی ہار ویرا کی صراحی دار گردن کی زینت بنا دیا۔ حاضرین میں ایک شور سا بلند ہوا اور انہوں نے مقامی انداز میں ایک ایک ٹانگ اٹھا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس طرح ایک ٹانگ اٹھا کر آوازہ بلند کرنے کو غالباً تالیاں بجانے کا متبادل سمجھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے جھیل زار کے کنارے کشتیوں کی ریس کے موقع پر بھی میں تماشائیوں کا یہی انداز دیکھ چکا تھا۔

اس کے بعد ایک عجیب منظر سامنے آیا۔ ویرا شرماتی

لجاتی ہوئی حنا لیچے پر لیٹ گئی' صفدر اس کے اوپر جھکا اور اس نے ویرا کے ہونٹوں کا ایک طویل بوسہ لیا۔ حاضرین نے ایک بار پھر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ بعد ازاں دولہا دلہن کھڑے ہوگئے اور ان پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ ایک شخص نے پتیوں والی تھالی میرے ہاتھ میں بھی تھما دی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر صفدر پر پھول نچھاور کروں یا اس کے ساتھ افسوس کا اظہار کروں۔ وہ ایک انجانے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک ایسا راستہ جو اس کی پہلی تمام تر مسافت کو رائگاں کر رہا تھا۔ یہ ایک خوابیدہ راستہ تھا جو بہکے ہوئے قدموں سے طے کیا جا رہا تھا۔ میرے ذہن کے پردے پر بار بار انجم کی تصویر ابھرتی تھی۔ وہی انجم جو ایک موقع پر صفدر کی دلہن بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پاکستان میں اب بھی صفدر کی راہ دیکھ رہی ہوگی اور اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

یہاں صفدر خوب ویرا کی محبت کے نشے میں سرشار نظر آرہا تھا۔ ویرا کے ہونٹوں کو چھونے کے بعد اس کی آنکھوں میں نشہ سا تیرنے لگا تھا۔ دونوں قریب قریب کھڑے تھے۔ ایک عمر رسیدہ عورت آگے بڑھی اور اس نے صفدر کے ہاتھ میں ویرا کا ہاتھ تھما دیا۔ دونوں نے ایک بار پھر آگ کو تعظیم پیش کی اور حاضرین کے درمیان سے گزرتے ہوئے سرخ پردے کی دوسری طرف چلے گئے۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ ان دونوں کی رہائش کا انتظام اسی پناہ گاہ میں کیا گیا ہے۔ یہاں کسی قریبی کمرے میں کھانے کا انتظام بھی تھا مگر دل اتنا بجھا ہوا تھا کہ میں کھانے کے لیے نہیں گیا۔

میں صفدر سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کب اور کیسے یہاں پہنچا اور اب تک کہاں تھا' اس کے علاوہ بھی ان گنت سوال میرے ذہن میں مچل رہے تھے لیکن صفدر مجھ سے بہت دور تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کئی رکاوٹیں حائل ہو چکی تھیں۔ وہ میرا عزیز ترین دوست اور ساتھی تھا۔ اس کی شادی خانہ آبادی کے حوالے سے میں نے نجانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ یہ بات کبھی میرے تصور میں بھی نہ آئی تھی کہ میرے یار کی شادی ہوگی' وہ میرے سامنے دولہا بنا بیٹھا ہوگا اور میں اس سے کھل کر بات بھی نہ کر سکوں گا۔ نہ ہی وہ مجھ سے بے تکلفی کی کوئی بات کرنا چاہے گا۔ وہ اپنی دلہن کے ساتھ حجلہ عروسی میں جا چکا تھا اور میں پروفیسر کے پہلو میں خاموش کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہاں کوئی ہم خیال تھا اور نہ ہم زبان۔ سوال ہی سوال تھے' جواب کوئی نہیں تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد میں دیوار کے سہارے گم صم بیٹھا تھا کہ سرخ پردے میں حرکت ہوئی اور مجھے ویرا کا جگمگاتا سراپا نظر آیا۔ وہ اپنے حجلہ عروسی سے نکل کر یہاں آپہنچی تھی۔ ریشمی کپڑے اس کے بدن پر سرسرا رہے تھے اور کامدار اسکارف سر پر چمک رہا تھا۔ اس کے ہمیشہ کھلے رہنے والے بال آج بڑے سلیقے سے چوٹی کی شکل میں گوندھے گئے تھے "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا؟" وہ دلنشیں لہجے میں بولی۔

"بس دل نہیں چاہ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کھائیں گے تو دل چاہے گا۔" وہ دل ربائی سے بولی۔

میں نے دیکھا کہ دو ملازم کھانے کے خوان ہاتھوں میں اٹھائے آرہے ہیں۔ میرے اور پروفیسر کے منع کرنے کے باوجود ویرا ہمارے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور ہمیں اپنے سامنے بٹھا کر کھانے پر اصرار کرنے لگی۔ میں نے کہا "ویرا! کھانا ہمارے لیے اتنا ضروری نہیں جتنا ان سوالوں کا جواب ضروری ہے جو ہنگامے کے بعد سے ہمارے ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔"

"ان سب سوالوں کا جواب بھی میں آپ کو دوں گی مگر پلیز... پلیز آپ پہلے کھانا کھائیں۔" وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔

وہ دلہن کے لباس میں ہونے کے باوجود دلہنوں جیسا تکلف نہیں کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں اپنے سامنے کھانا کھلایا پھر وہ ہمیں یہ بتانے میں مصروف ہوگئی کہ وہ اور صفدر جمیل زار سے اس صحرائی گارن تک کیسے اور کیونکر پہنچے۔ اس کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کا لب لباب یہ ہے:

"جب آپ نے لڑائی میں مائیکل کو دبوچ لیا اور صفدر کہ وہ مجھے لے کر بھاگ جائے تو ہم دونوں ایک چھکڑے میں گھس گئے۔ اس چھکڑے کے آگے دو گھوڑے موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ایک ہینڈ گرنیڈ اس چھکڑے سے کچھ فاصلے پر پھٹا۔ شدید دھماکے سے گھوڑے بدک گئے اور چھکڑا اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ بستی کی حدود سے باہر نکل کر چھکڑا جھاڑیوں میں گھس گیا اور رک گیا۔ اسی دوران میں فائرنگ سے خوف زدہ ہو کر بھاگنے والے کچھ لاری دیہاتی گئے۔ انہوں نے زور آزمائی کرکے چھکڑے کو گھنی جھاڑیوں میں سے نکالا اور خود بھی اس میں سوار ہو گئے۔ وہ خوف زدہ تھے۔ ان میں سے ایک عورت کے پیٹ میں گولی لگی ہوئی تھی' یہ عورت تھوڑی دیر بعد چھکڑے کے اندر

ٹوٹ گئی۔ لاریوں نے بتایا کہ اس وقت بہترین پناہ گاہ مالے کا گارن ہے۔ انہیں یقین تھا کہ گارن والے اس مشکل وقت میں انہیں پناہ دے سکتے ہیں۔ یہ گارن عام راستے سے کافی ہٹ کر تھا۔ تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد یہ لوگ ہم دونوں سمیت اس مالے نامی گارن کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب ہم بھٹکتے ہوئے اس گارن تک پہنچے تو یہ رات کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہماری بری حالت دیکھ کر یہاں کے مکھیا نے ہمیں پناہ دی اور جس چھکڑے پر ہم یہاں پہنچے تھے وہ چھپا دیا۔ اگلے روز ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے علاوہ بھی دس پندرہ لاری جان بچا کر اس صحرائی گارن تک پہنچے ہیں اور ان میں جمیل زار کی بستی کا سردار یوحنات بھی شامل ہے۔ سردار یوحنات کی طرح ہمیں بھی ایک خفیہ پناہ گاہ میں رکھا گیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے ایک ڈیڑھ برس میں اس طرح کی پناہ گاہیں آس پاس کے کئی دیہات میں بنائی گئی ہیں۔ ان پناہ گاہوں کا اصل سبب "ٹرسٹ" کا خوف ہی ہے۔ تیسرے روز میری اور صفدر کی ملاقات سردار یوحنات سے کرائی گئی تھی۔ سردار یوحنات نے اسی دن میری اور صفدر کی شادی کا فیصلہ کر دیا تھا۔ سردار کا کہنا تھا کہ شادی کی ابتدائی رسومات بستی میں ادا ہو گئی تھیں' اب دیوتاؤں کی خوشی اسی میں ہے کہ ہماری شادی انجام پا جائے۔"

اپنی روداد سناتے ہوئے ویرا کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کا سا منظر تھا۔ اپنی شادی کی اسے خوشی بھی تھی لیکن اس کے ساتھ اس تباہی کا رنج و غم بھی تھا۔ جس نے چند روز پہلے جمیل زار کی بستی میں تہلکہ مچایا تھا۔ وہ اور صفدر چونکہ ہم سے بھی پہلے بستی سے نکل آئے تھے اس لیے انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ بعد میں وہاں کیا کچھ ہوا ہے۔ ہاں بعد میں یہاں پہنچنے والے ایک لاری کی زبانی ویرا کو بس اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس کا چچا بوکارڈو اور چند دیگر سرکردہ افراد ٹرسٹ کے گارڈز کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے' عبادت گاہ یوما کی تباہی کا منظر بھی اس لاری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ بستی میں دو ڈھائی سو افراد ہلاک ہوئے ہیں اور سیکڑوں افراد کو زندہ پکڑ کر ٹرسٹ میں لے جایا گیا ہے۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ ویرا بدستور آلتی پالتی مارے ہمارے پاس بیٹھی تھی اور باتیں کر رہی تھی۔ گارن کی لڑکیاں دو تین بار ادھر آ کر اسے دیکھ چکی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں شوخی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔ حیرت یقیناً اسی بات کی تھی کہ ویرا اپنے حجلہ عروسی میں ہونے کے بجائے ہمارے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا دولہا یقیناً بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی دوران میں سردار یوحنات بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ویرا کو پیار بھری نظروں سے دیکھا' پھر مقامی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ یقیناً یہی کہا ہوگا کہ وہ اب اپنے دولہا کے پاس جائے۔

اگلے روز ویرا اور صفدر سے ملاقات نہیں ہو سکی' تاہم اس سے اگلے روز ویرا نے دوپہر کے کھانے پر مجھے اور پروفیسر کو بلا لیا۔ تہ خانہ نما ہونے کی وجہ سے یہ پناہ گاہ قدرے ٹھنڈی تھی ورنہ گرمی ہر طرف قیامت ڈھا رہی تھی۔ بار بار پیاس لگتی تھی اور مقامی طرز کے پنکھے ہر شخص کے ہاتھ میں نظر آتے تھے۔ اس پناہ گاہ میں صفدر اور ویرا کو جو کمرا دیا گیا تھا' وہ خاصا کشادہ تھا۔ اس میں باہر سے روشنی اور ہوا کی آمد بھی ہوتی تھی۔ مسہری کے بجائے فرش پر دری چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف صراحی اور مٹی کے پیالے رکھے تھے۔ ویرا کا عروسی جوڑا ایک طرف کھونٹی سے لٹک رہا تھا اور اب وہ عام سے لباس میں نظر آتی تھی۔ تیل سے آلودہ طاق دان میں مٹی کے دو چراغ رکھے تھے اور یہیں پر ایک طرف اناج پیسنے والی پتھر کی چکی بھی موجود تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک ویرا یا اس کی ملازمہ اس چکی پر آٹا پیستی رہی ہے۔ ویرا نے شاید کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ اس کی شادی ایسے حالات میں ہوگی اور شادی کے بعد اسے ایک مختصر سے کچے کمرے میں ہنی مون منانا ہوگا۔ وہ ٹرسٹ کے جدید ترین اور انتہائی پر آسائش ماحول سے نکل اور چند ہی دنوں میں ایک ایسے ماحول میں آ پہنچی تھی جس کی نسبت پتھر کے دور سے تھی مگر وہ اس ماحول میں بھی خوش نظر آتی تھی اور یہ خوشی اس لیے تھی کہ اس کا محبوب اس کے ساتھ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ محبت انسان کے لیے خوشی اور غم' راحت و تکلیف کے معیار بدل کر رکھ دیتی ہے۔ محبوب میسر نہ ہو تو ریشم و کمخواب کا بستر کانٹوں کا بستر بن جاتا ہے اور محبوب پاس ہو تو کانٹے بھی ریشم و کمخواب کی سی راحت دیتے ہیں۔

ویرا بہت اجلی اور نکھری سی نظر آتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں وہی سرشاری تھی جس کا تعلق انسان کی روحانی طمانیت اور اندرونی راحت سے ہوتا ہے۔ اس نے یہاں دستیاب اشیاء سے ایک مزے دار ڈش تیار کی تھی۔ اس میں کھجوریں' جو' کاریا اور پنیر وغیرہ استعمال ہوا تھا۔ ساتھ میں بکری کا گوشت تھا اور ٹھنڈا دودھ تھا جس میں بتاشے وغیرہ گھولے گئے تھے۔ صفدر نے بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بظاہر تو وہ بھی خوش ہی نظر آتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی ندامت میں محسوس کر سکتا تھا۔

اس ندامت کی وجہ میں جانتا تھا اور صندر بھی بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اچانک شادی جن حالات میں ہوئی تھی وہ ہم دونوں کے لیے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ نرم سے نرم الفاظ بھی استعمال کیے جاتے تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ اس شادی نے ہم دونوں دوستوں کے درمیان ایک خلیج سی حائل کر دی تھی۔ صندر اس خلیج سے آگاہ تھا اور کسی حد تک ویرا بھی۔ غالباً اسے بھی یہ احساس دامن گیر تھا کہ اس کی وجہ سے جہاں اور بہت کچھ ہوا ہے وہاں دو گہرے دوستوں کے درمیان دوری بھی پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ اپنی دانست میں اسی دوری کو اپنے اخلاق اور محبت سے پاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کھانے کے بعد پروفیسر تو واپس چلا گیا' ہم تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ صندر کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ اس نے کئی بار پہلو بدلا اور اپنے دل کی بات کو ہونٹوں تک لانے کی کوشش کی۔ آخر ویرا نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ آپ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔" اس کا اشارہ صندر کی طرف تھا۔

"ہاں ہاں کہو صندر! کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "میں اپنے رویے پر بہت شرمندہ ہوں شاہ جہاں صاحب! میں نے آپ کی مزاحمت کی' آپ پر ہاتھ اٹھایا۔ اس کے لیے شاید میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں۔"

صندر کا اشارہ اسی دلدوز واقعے کی طرف تھا۔ جب میں نے اسے نرسٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کی تھی اور وہ واپس لارسیوں کی بستی جانے پر اڑ گیا تھا۔ آخر ہم دونوں کے درمیان باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی اور صندر نے وحشت کے عالم میں اس طرح میرا گلا دبایا تھا کہ میں مرحوم ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اب صندر اس واقعے پر معذرت کر رہا تھا۔ اس غمناک واقعے کے مقابلے میں صندر کی معذرت بہت معمولی تھی۔ لیکن۔۔۔ چلو اس نے معذرت تو کی تھی۔

میں نے کہا "پرانی باتوں کو چھوڑو صندر۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تو ہمیں آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

صندر خاموش رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب بھی ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے۔ اگر وہ نارمل ہوتا تو اتنے بڑے واقعے کے لیے ایسے معمولی انداز میں معذرت نہ کرتا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس وقت بھی نشے میں ہے۔

ویرا اٹھ کر دوسرے حصے میں چلی گئی۔ شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی موجودگی میں ہم دونوں کھل کر بات نہیں کر پا رہے۔ اس کے جانے کے بعد صندر بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ جانتے ہی ہیں' جو کچھ ہوا اتنی جلدی ہوا کہ میں خود بھی چکرا کر رہ گیا۔ جب ویرا نے دوسری مرتبہ خودکشی کی کوشش کی تو وہ تقریباً کامیاب ہی ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ میں اس کا قاتل بننے والا ہوں اور اس کی موت ساری عمر کے لیے میرے دل کا بوجھ بننے والی ہے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے صندر۔ مگر ویرا کی زندگی کا سوچتے ہوئے تمہیں اپنے ساتھیوں کی زندگی کا بھی سوچنا چاہیے تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ اگر ہم لارسیوں سے امیدیں وابستہ کر لیں گے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ کنگ کے جدید ترین ہتھیاروں اور تربیت یافتہ کمانڈوز کے سامنے ان قبائلیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

صندر کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ پر تفکر لہجے میں بولا "اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"اب تو صرف یہ دعا کر سکتے ہیں کہ جو غلطی تم سے ہوئی ہے' وہ پوری طرح کنگ براؤن کے علم میں نہ آئی ہو۔ وہ لوگ کسی نہ کسی طور اب بھی ہمیں اپنا وفادار ہی سمجھ رہے ہوں۔"

"کنگ۔۔۔ کیا ایسا ممکن ہے؟"

"ممکن تو ہے۔ لڑائی کے دوران میں دو تین بندے ہم سے لپٹے ہوئے تھے' وہ تینوں فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے۔"

"لیکن مائیکل' اس نے بھی تو ہمیں دیکھا تھا۔"

"تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔ بلکہ اسے خوش خبری ہی کہنا چاہیے۔ مائیکل اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" صندر کا منہ کھلا رہ گیا۔

"ہاں' وہ اسی جگہ ہلاک ہو گیا تھا۔"

"کیا اسے گولی لگی تھی؟"

"گولی بھی لگی تھی' مگر اس سے پہلے ہی میں اس کی گردن مروڑ چکا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر ذرا توقف سے میں نے کہا "میں نے تو اپنا منہ سر کپڑے میں چھپا رکھا تھا' اگر تمہیں بھی کسی اور شخص نے نہیں دیکھا تو ہمارا بھرم قائم رہ سکتا ہے۔"

صندر بولا "تاریکی تھی اور لڑائی بھی گھمسان کی ہو رہی تھی۔ مجھے امید ہے کہ کسی اور نے مجھے شناخت نہیں کیا ہوگا۔"

"ایسی صورت میں نرسٹ والے گمان کر سکتے ہیں کہ بستی سے فرار ہونے والے لارسی ہم دونوں کو بھی کہیں اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں۔"

میں اور صندر کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ فی الوقت صورت حال سخت غیر یقینی تھی۔ ان حالات میں بہتر یہی تھا کہ پوشیدہ رہ کر تیل اور تیل کی دھار دیکھی جائے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ ہم جہاں پوشیدہ ہیں وہ جگہ ہمارے لیے کہاں تک محفوظ ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ کنگ براؤن ویرا کو تلاش کرنے کی سرتوڑ کوشش کرے گا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے اور ذرائع بے شمار تھے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس وقت کنگ کے ہرکارے اس صحرائی گاؤں میں بھی آ دھمکیں۔ مجھے یقین تھا کہ اپنے دست راست مائیکل کی موت نے کنگ کے اشتعال میں بہت اضافہ کر رکھا ہوگا۔ اس کا یہ اشتعال اسے ضرورت سے زیادہ فعال کر سکتا تھا۔

۔۔۔ اگلے تین چار روز ہم نے اسی پناہ گاہ میں بند رہ کر گزارے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نرسٹ کی طرف سے کسی ناگہانی چھاپے کا خطرہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ شاید ویرا اور سردار بوحات وغیرہ کی تلاش کرنے والوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کو نظرانداز ہی کر دیا تھا۔ ہمارے خیال میں اگر انہوں نے ایسا کر دیا تھا تو یہ ہمارے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی۔ اگر وہ ویرا کی تلاش میں اس گاؤں پر چھاپہ مارتے تو بہت مشکل تھا کہ یہ عام سی پناہ گاہ ہمیں تحفظ فراہم کر سکتی۔ گاؤں کے کئی افراد کو یہ معلوم تھا کہ ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ کنگ کے ہرکارے ان پر تشدد کرتے تو ان بے چاروں کے لیے زبان بند رکھنا ناممکن ہو جاتا۔

ان چار پانچ دنوں میں بھی صندر کی بلا نوشی جاری رہی تھی۔ وہ ہر وقت نشے میں ڈوبا نظر آتا تھا' اب تو یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا تھا۔ یعنی شراب کے ساتھ ویرا کا شباب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہر وقت ایک دوسرے میں کھوئے نظر آتے تھے۔ صندر سے ویرا کا عشق اتنا واشگاف تھا کہ ہر جگہ چمکتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ عشق ویرا کی آنکھوں سے جھانکتا تھا۔ اس کے کنگنوں میں کھنکتا تھا اور اس کی پازیبوں کے ساتھ ناچتا تھا۔ یقیناً وہ نہیں جانتی تھی کہ جب وہ صندر کی طرف دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے محبت کا ایک پرشور دریا بہنے لگتا ہے۔ جو پلک جھپکنے میں ہر کس و ناکس کو نظر آ جاتا ہے۔ میں ٹھیک سے نہیں جانتا تھا کہ صندر کی بلا نوشی کے حوالے سے ویرا کے خیالات کیا ہیں لیکن اتنا اندازہ مجھے تھا کہ وہ بھی اس بے اعتدالی کو پسند نہیں کرتی' اور ممکن ہے کہ نرم الفاظ میں صندر کو ٹوکتی بھی ہو۔ اس پناہ گاہ سے باہر کے حالات کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا تھا۔ بس ایک دن ویرا سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ حملے کی رات جمیل زار کی بستی پوری طرح تباہ ہو گئی تھی اور اب اس بستی پر مکمل طور پر نرسٹ کا قبضہ ہے۔ مقامی پولیس بھی نرسٹ والوں کی پوری مدد کر رہی تھی اور لارسیوں کو شرپسند عناصر قرار دے کر دبانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ ایک روز ویرا میرے پاس آئی۔ اس کا موڈ خوشگوار تھا۔ بولی "میں تو اس قبر نما پناہ گاہ میں مرنے کی حد تک بور ہو گئی تھی۔"

"اب کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟"

"جب تک ہمیں افریقی زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا' ہمیں بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کام میں دس پندرہ سال تو لگ ہی جائیں گے۔"

وہ میرے مزاح کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی "سردار بوحات نے ہماری نئی نئی شادی پر ترس کھاتے ہوئے ہم پر پابندی تھوڑی سی نرم کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"سردار نے کہا ہے کہ آج چاندنی رات ہے۔ ہم کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے پناہ گاہ سے باہر گھوم پھر سکتے ہیں۔"

"ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"یعنی ہم تینوں۔ آپ میں اور صندر۔"

"تو پروفیسر نے کون سا گناہ کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے' میں پروفیسر کے بارے میں سردار سے پوچھ لیتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اجازت دے دیں گے۔"

اس پناہ گاہ کا مختصر سا خلا اب واقعی ہمارے لیے سوہان روح بن گیا تھا۔ رات دن ایک ہی طرح کے در و دیوار دیکھ کر اور ایک ہی جیسی آوازیں سن سن کر دم گھٹنے لگا تھا۔ پناہ گاہ سے باہر نکلنے کا تصور خوش آئند تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہم تین مقامی نیزہ بازوں کی حفاظت میں پناہ گاہ سے باہر نکلے۔ دن بھر کی تمازت ایک خوشگوار خنکی میں ڈھل چکی تھی۔ گاؤں کے گھروں میں چراغ جل رہے تھے اور اکا دکا افراد بھی نظر آتے تھے۔ گاؤں پر مفلسی کے سائے صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ انسانوں کی طرح اکثر جانوروں کی بھی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ چارا خشک اور کمزور تھا۔ چند عورتیں ٹوکریوں میں بیکار سے آلو بھر کر جھونپڑیوں کی طرف جا رہی تھیں۔

سفید فام خوب رو ویرا کو مرد و زن بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ویرا کون ہے' اس کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں ویرا کے لیے ایک طرح کا احترام تھا۔ شاید اسے ہی رعب حسن کہا جاتا ہے۔ ویرا نے گلی میں کھڑے سال ڈیڑھ سال کے ایک بچے کو گود میں اٹھالیا۔ میلا کچیلا بچہ ویرا کی گود میں آکر کچھ اور بھی میلا کچیلا لگنے لگا تھا۔ ویرا نے اس کے گالوں پر بوسہ دیا۔ وہ شرما کر ہنسنے لگا اور اپنی شہادت کی انگلی ویرا کے سفید چکنے گالوں پر پھیرنے لگا۔ اس کی یہ ادا اتنی معصوم تھی کہ ہم مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ بچے کی سیاہ فام ماں بھی خوشی سے کھل اٹھی۔ ویرا کے جی میں نجانے کیا آئی کہ اس نے اپنی انگلی سے ایک RING اتار کر بچے کی مٹھی میں دے دیا۔ بچہ اس RING کی قدر نہیں جانتا تھا لو نہ اس کی ماں جانتی تھی۔ ویرا نے جھک کر بچے کی ماں کے کان میں کچھ کہا۔ یقیناً اس رِنگ کی قدر و قیمت سے ہی آگاہ کیا ہوگا۔ بچے کی ماں نے جلدی سے بیٹھ کر ویرا کے پاؤں کو ہاتھ لگا دیے اور سراپا شکر نظر آنے لگی۔

"چلو اب نکلیں یہاں سے۔" صفدر نے کہا "ورنہ مزید لوگ اکٹھے ہوجائیں گے۔"

ہم آگے بڑھ گئے۔ گاؤں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر ہمیں اپنے میزبانوں پر ترس آنے لگا۔ خبر نہیں کہ وہ کس طرح پیٹ کاٹ کاٹ کر ہماری خاطرمدارات کرتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر ہمیں پناہ دے رکھی تھی۔ ہم گاؤں سے باہر نکل آئے۔ دور تک کھجوروں کے باغ نظر آرہے تھے' مگر ان پر کچھ رونق نہیں تھی۔ کھجوروں کی اوٹ سے گاہے گاہے چاند اپنی جھلک دکھاتا تھا' ہم نے دیکھا کہ کچھ کھیتوں کے اندر لوگ اس تاریکی میں بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ اپنی مفلسی اور فاقہ کشی سے لڑنے کا ایک انداز تھا۔ ویرا کی زبانی معلوم ہوا کہ اس گاؤں میں نصف سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے اور ان کی حالت زیادہ پتلی ہے۔ انہیں دوسرے لوگوں سے زیادہ فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف حلال گوشت کھاتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ بھوک سے مجبور ہو کر ہر قسم کا شکار کھانے لگتے ہیں۔ ویرا نے بتایا کہ یہ حالت صرف اسی گاؤں کی نہیں۔ اردگرد کے جتنے بھی دیہات ہیں وہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ گیدڑ لومڑی اور کتے بلی تک' جو شکار بھی ملتا ہے لوگ کھانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

ویرا کی بات سن کر مجھے وہ منظر یاد آگیا جب میں اور پروفیسر اس بستی میں وارد ہوئے تھے اور ہمیں درختوں میں کچھ بوڑھے "گیدڑ" کا گوشت پکاتے نظر آئے تھے۔

تینوں نیزہ بردار محافظ بستی سے ہی ہمارے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ آتشیں ہتھیاروں کے سامنے ان نیزوں کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے بڑی شان اور اعتماد سے نیزے اٹھا رکھے تھے۔ ان افراد کی موجودگی میں بات چیت کرتے ہوئے ہم الجھن محسوس کر رہے تھے۔ میں نے ویرا کو اشارہ کیا اور اس نے کہہ سن کر ان محافظوں کو واپس بھیج دیا۔

محافظوں کے جانے کے بعد ہم ایک پگڈنڈی پر آگے بڑھنے لگے "اس وقت ہم نرسٹ سے کتنی دور ہوں گے؟" صفدر نے ویرا سے پوچھا۔

"کافی فاصلہ ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم نرسٹ سے شمال جنوب کی طرف قریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر کی دوری پر موجود ہیں۔ یہ سارا علاقہ خاصا دشوار گزار ہے۔ اس علاقے میں گاؤں اور بستیاں موجود ہیں لیکن ان کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اجتماعی خطرے کے خلاف یہ لوگ مل کر نہیں لڑ سکتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ جدید ہتھیاروں کے استعمال سے بھی واقف نہیں۔"

"ماریطانیہ کی حکومت اور انتظامیہ ان کی مدد نہیں کرتی؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"مجھے اس بارے میں ٹھیک سے معلوم تو نہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ انتظامیہ کی گرفت یہاں بہت کمزور ہے۔ شاید کہیں کہیں پولیس چوکیاں موجود ہوں لیکن ان چوکیوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان چوکیوں پر موجود پولیس اہلکار دراصل مقامی وڈیروں کے زیر اثر ہوتے ہیں اور ان کے گماشتوں کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔"

ویرا شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ کنگ براؤن بھی تو ایک بہت بڑے انٹرنیشنل وڈیرے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے بھی مقامی پولیس کو زر خرید لونڈی بنا رکھا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم تک ایسی اطلاع کیوں پہنچی کہ پولیس جمیل زار کے تباہ حال باسیوں کو ہی مجرم قرار دے رہی ہے۔ درحقیقت یہ نام نہاد پولیس تھی اور اس کا مقصد صرف بااثر لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلنا تھا۔ ایک جگہ اچانک پروفیسر کو گاڑی کے ٹائروں کے نشان نظر آئے چاندنی میں ریت پر نظر آنے والے یہ نشان جھاڑیوں کے اندر سے ہوتے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ صفدر کے چہرے پر پریشانی کے گمبھیر سائے لہرانے لگے۔ ان نشانات کا نظر آنا واقعی شدید خطرے کی نشانی تھا۔ تاہم کم از کم میری حد تک یہ پریشانی جلد ہی دور ہوگئی۔ میں

نے پہچان لیا یہ اسی جیپ کے نشانات تھے جس پر ہم جمیل زار سے اس بستی تک پہنچے تھے اور اس کی نشانی یہ تھی کہ جیپ کا اگلا ٹائر لہرا رہا تھا۔ میں نے صفدر اور ویرا کو بتایا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ ہم نشانات کے ساتھ ساتھ چلتے آگے بڑھنے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ بستی والوں نے حفاظت کی غرض سے جیپ کو نسبتاً زیادہ محفوظ جگہ پر چھپا دیا ہے۔ کچھ آگے جاکر ٹائروں کے نشان معدوم ہوگئے لیکن غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ انہیں معدوم کیا گیا ہے۔ ریت پر ان نشانات کو مٹانے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ کافی کامیاب کوشش تھی۔ ٹائروں کے نشانات کھو گئے تو میں اور پروفیسر تھکے تھکے سے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ صفدر اور غزالہ باتیں کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ وہ جیسے ہر لحظہ ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ میں اور پروفیسر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہ افریقہ کا ویرانہ تھا اور افریقہ کے ویرانے خوں خوار جانوروں کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ابھی تک ہم نے کوئی درندہ نہیں دیکھا تھا' صرف انسان نما درندے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

صفدر اور ویرا کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ وہ تیز قدموں سے ہمارے پاس پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جیپ ڈھونڈ لی ہے۔ صفدر کے پاس ایک نہایت طاقتور ٹارچ بھی تھی۔ یہ ٹارچ اس نے یقیناً جیپ کے اندر سے ہی ڈھونڈی تھی۔ صفدر اور ویرا ہمیں لے کر جیپ تک پہنچے۔ جیپ کو دھکیل کر گھنی جھاڑیوں میں گھسیڑ دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اس پر مٹی ڈالی گئی تھی اور چاروں جانب سے شاخوں اور پتوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ صفدر نے جیپ کے اندر سے شراب کی تین بوتلیں بھی برآمد کر رکھی تھیں۔ نہ صرف برآمد کر رکھی تھیں بلکہ ایک بوتل میں سے اس نے ایک چوتھائی پی بھی لی تھی۔ وہ بلا نوشی کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کوئی نادیدہ قوت تھی جو اسے ہمہ وقت مدہوش رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ ہم کچھ دیر گھوم پھر کر جیپ کا جائزہ لیتے رہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قیمتی اسلحہ اپنی جگہ موجود ہے یا نہیں۔ مگر صفدر اور ویرا کی موجودگی میں میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کتنے ستم کی بات تھی کہ وہ صفدر جو میرے ہر راز میں شریک رہتا تھا اب ناقابل اعتبار محسوس ہونے لگا تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے صفدر کے نشے کو تیز کر دیا تھا۔ اب وہ بار بار للچائی ہوئی نظروں سے بوتلوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید پینا چاہتا تھا لیکن میری موجودگی میں ایسا کرتے ہوئے شاید اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اسے موقع دیا کہ وہ ویرا اور بوتل سمیت دائیں بائیں ہوجائے۔ وہ چلا گیا تو میں نے ٹارچ جلائی اور بڑی احتیاط سے جیپ کے چور خانے کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ لاک بدستور اپنی جگہ پر موجود ہے۔ نمبر مجھے یاد تھا۔ نمبر ملا کر میں نے لاک کھولا اور اندر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ چمکتی دمکتی رائفلیں مع ایمونیشن موجود تھیں۔ میں نے چور خانہ پھر لاک کر دیا۔ ابھی بمشکل میں نے لاک سے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ صفدر میرے سامنے تھا وہ بری طرح ہانپا ہوا تھا۔

"ویرا کہاں ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ویرا یہیں ہے۔" صفدر بولا "ابھی مجھے سائیں عالی کی آواز آئی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"آپ مجھے نشے میں نہ سمجھیں' میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ سائیں ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے۔"

اسی دوران میں ویرا بھی ہانپی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "میں نے بھی اس بوڑھے کی آواز سنی ہے۔ وہ ان چھوٹی کھجوروں کے پیچھے کہیں چھپا ہوا ہے۔"

میں اور پروفیسر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ صفدر اور ویرا کے عقب میں چلتے ہم کوتاہ قد کھجوروں کے جھنڈ میں پہنچ گئے "سائیں عالی۔ سائیں عالی کہاں ہو؟" صفدر نے پکار کر کہا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور صفدر کے ہمراہ کھجوروں کے جھنڈ میں گھسا۔ یہاں کوئی متنفس نہیں تھا۔

صفدر نے سائیں کو کئی بار پکارا۔ ایک دو بار میں نے بھی آواز دی لیکن جواب ندارد۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم ناکام واپس آگئے۔ صفدر کا یقین بھی اب شک میں بدلنے لگا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے حواس پر واقعی شراب اجارہ داری ہے۔ ہم واپس پہنچے تو ویرا اور پروفیسر پریشان نظر آئے۔ ویرا نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک سایہ درخت سے کودا ہے اور ان کے سامنے جھاڑیوں میں غائب ہوا ہے۔ ویرا اور پروفیسر نے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی آواز بھی سنی تھی۔

میری ٹارچ کا روشن دائرہ درختوں میں گردش کر رہا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ دس پندرہ گز کی دوری پر مجھے سائیں عالی نظر آیا۔ ہاں وہ سائیں عالی ہی تھا۔ اس کے عقب میں ایک سرخ سپید نوجوان کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ میں ان دونوں کے قریب پہنچا۔ سائیں کے حلیے نے مجھے مزید حیران کیا۔ اس

گلے میں نوٹوں کا ایک ہار ڈال رکھا تھا اور اس ہار میں ایک ایک نوٹ نہیں پرویا گیا تھا بلکہ نوٹوں کی چھوٹی چھوٹی گڈیاں تھیں' اور یہ کوئی معمولی نوٹ بھی نہیں تھے۔ یہ دنیا کی اہم ترین کرنسی امریکن ڈالر تھی۔ سائیں کے گلے میں جو گڈیاں ہار کی صورت میں آویزاں تھیں' وہ سو اور پچاس ڈالر کے نوٹوں کی تھیں۔ اس کے علاوہ سائیں نے اپنے سر پر بھی نوٹوں کا ایک تاج سا بنا کر رکھا ہوا تھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچے سائیں؟" میں نے پوچھا۔

"اوئے گھامڑ! کبھی تو نے ہوا سے یا دھوپ سے پوچھا ہے کہ وہ یہاں کیسے پہنچی؟"

"یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

"یہ بھی تمہاری طرح اللہ کا بندہ ہے۔ نروان کی تلاش میں ہے۔ در اصل یہ ایک جن ہے۔ نروان حاصل کرنے سے پہلے انسانی شکل میں دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ میں پرسوں اسے پرستان سے ساتھ لایا تھا۔ اس کی امی بہت پریشان ہوں گی کیونکہ یہ بتا کر نہیں آیا۔"

سائیں نے الٹی سیدھی ہانکنا شروع کر دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب اسے جلدی بریک نہیں لگے گا۔ میں نے عقب میں کھڑے انگریز نوجوان سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

جواب میں وہ بالکل خاموش رہا۔ سائیں عالی بولا "یہ میری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لیتا' بولنا تو دور کی بات ہے۔"

پھر سائیں نے بڑی شان سے اپنے گلے میں لٹکے ہوئے نوٹوں میں سے ایک ۵۰ ڈالر کا نوٹ علیحدہ کیا۔ ایک طرف جھک کر ناک سے "سوں سوں" کی زوردار آواز نکالی اور نوٹ سے ناک صاف کر کے نوٹ ایک طرف پھینک دیا۔

صفدر' ڈیرا اور پروفیسر اللہ دتا بھی اب سائیں کے گرد جمع ہو گئے تھے اور بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خاص طور سے ڈیرا بہت حیران تھی۔ اس نے ایسا عجوبہ پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔

"یہ۔۔ یہ کون ہے؟" اس نے سرگوشی میں صفدر سے پوچھا۔

"یہ ایک ہندوستانی سینٹ ہے۔ تمہارے ہائی جیکنگ کے ٹری جہاز میں بردوں کے ساتھ لد کر یہاں پہنچا ہے۔"

"کیا اس کے گلے میں لٹکے ہوئے نوٹ اصلی ہیں؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا نوٹوں کے بارے میں اور نہ خود سائیں کے بارے میں۔"

"کیا کہہ رہی ہے یہ چھوکری!" سائیں نے ڈیرا کو گھورا۔

"کچھ نہیں۔ ہماری کوئی اپنی بات تھی۔"

سائیں مزید بھڑک گیا "اوئے بدذاتو! ہماری موجودگی میں "اپنی بات۔" تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ہماری موجودگی میں اپنی بات کرو۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ پوری پوری سزا ملے گی' اور وہ سزا یہ ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"لیکن۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں' چلو تم چاروں' ابھی میرے ساتھ چلو۔" سائیں نے صفدر کو باقاعدہ بازو سے پکڑ لیا۔

صفدر نے آہستگی سے اپنا بازو چھڑایا اور بولا "تمہارا کھانا بھی ضرور کھائیں گے لیکن اس وقت ہمیں واپس جانے کی جلدی ہے۔"

"کیا کہا۔۔ جلدی ہے؟" سائیں عالی اور بھڑک گیا "یعنی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے کام مجھ سے زیادہ ضروری ہیں۔ یہ سراسر میری توہین ہے۔ اب تو تمہیں میرے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔"

"سائیں فضول مت ہانکو۔" میں نے بیزاری سے کہا "اگر تم اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہ رہے ہو تو مت بتاؤ۔"

سائیں نے اپنا رخ تھوڑا سا پھیرا اور مخصوص انداز میں تالی بجائی۔ ہم ششدر رہ گئے۔ ایک ڈرامائی منظر ہمارے سامنے آیا تھا۔ قریبی جھاڑیوں سے کم و بیش پانچ مسلح افراد نکل آئے۔ ان میں سے دو سفید فام اور باقی سیاہ فام تھے۔ ان کی جھلک دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ انتہائی تربیت یافتہ گارڈز ہیں۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز' رائفلیں پکڑنے اور ہماری طرف دیکھنے کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ معمولی افراد نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک سفید فام گارڈ کو دیکھ کر مجھے یہ شک بھی گزرا کہ میں اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔

"چلو میرے ساتھ۔" اس مرتبہ سائیں کا انداز زیادہ تحکمانہ تھا۔

ڈیرا اور پروفیسر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ صفدر بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ یقیناً میری طرح صفدر کو بھی افسوس ہوا تھا کہ ہم اپنے سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر موجود مسلح افراد کا نوٹس کیوں نہ لے سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلے چند منٹ سے سائیں نے ہمیں اپنے اندر ہی الجھا رکھا تھا۔ یوں تو جب بھی اس عجیب کردار سے ملاقات ہوتی تھی ہمیں کسی نہ کسی انہونی کی توقع لگ جاتی تھی مگر اس

مرتبہ تو کچھ زیادہ ہی انوکھا کام ہو گیا تھا' کسی زمیندار و وڈیرے کی طرح اس کے دبدبے میں اضافہ فرمانے کے لیے کرائے کے بہادر بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ یہ کرائے کے بہادر سائیں کو کس نے فراہم کیے تھے اور اصلی یا نقلی نوٹوں کی یہ گڈیاں سائیں کے پاس کہاں سے آئی تھیں اور سائیں ہمیں اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا' یہ سارے سوال "جواب طلب" تھے۔

"سائیں یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "یہ کون لوگ ہیں' اور ہم پر رائفلیں کیوں تان رہے ہیں۔"

میری گہری سنجیدگی دیکھتے ہوئے سائیں نے ہاتھ کا اشارہ کیا' اور رائفل بردار رائفلیں جھکا کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔ وہ آنکھیں نچا کر بولا "میں مرغا بنا کر تمہاری چھترول نہیں کر رہا ہوں' تمہیں صرف اپنے ساتھ کھانا کھلا رہا ہوں' پھر اتنا بدک کیوں رہے ہو تم۔۔؟"

سائیں کی ذہنی رو بہکی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ فی الوقت اس کے ساتھ الجھنا مناسب نہیں۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تمہاری سزا ہمیں منظور ہے۔ ہم تمہارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ لیکن ابھی ہمیں جلدی ہے۔ یہ کھانا ادھار رہا۔"

"ٹھیک ہے۔" سائیں رعایت پر آمادہ ہو گیا "کب کھاؤ گے؟"

"ایک دو دن تک۔" صفدر نے کہا۔

"او کے۔"

"او کے!" صفدر نے کہا۔

ایک دم سائیں نے پھر بھڑک کر صفدر کا بازو پکڑ لیا "تمہارا جھوٹ ابھی پکڑا گیا ہے چرغے۔ تم نے اگر آنا ہوتا تو یہ ضرور پوچھتے کہ کہاں آنا ہے۔ کس وقت آنا ہے۔ تم مجھے الو سمجھ رہے ہو اور مزید الو بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ چلو ابھی اور اسی وقت چلو' تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہی پڑے گا۔"

سائیں کے حوالے سے میرے ذہن میں ابھی کئی سوال ابھر رہے تھے۔ اس کے ساتھ یہ رائفل بردار نجانے کون تھے۔ ان میں سے ایک دو بندوں کی صورتیں مجھے جانی پہچانی کیوں لگی تھیں' اور یہ سائیں عالی کہاں ٹھہرا ہوا تھا' اس ویرانے میں؟ ہم اپنی پناہ گاہ سے یونہی گھومنے پھرنے کے لیے نکلے تھے۔ ابھی ہمیں نکلے کچھ زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا' میں نے فیصلہ کیا کہ سائیں کے ساتھ چلنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس ویرانے میں رائفل برداروں کے ساتھ وہ کیا کرتب دکھا رہا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں اور اول فول باتوں کے اندر سے کوئی کام کی بات بھی نکل آتی۔ ماضی میں دو چار بار ایسا ہو بھی چکا تھا۔

میں نے صفدر کو آنکھ سے اشارہ کیا' اور ہم نے سائیں کے ساتھ چلنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ ڈیرا خاصی پریشان نظر آ رہی تھی لیکن میرا اور صفدر کا اطمینان دیکھ کر اس کی پریشانی بھی قدرے کم ہو گئی۔

سائیں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ہمیں زیادہ دور نہیں لے جائے گا۔ اپنا عصا تھام کر وہ واپس مڑا اور ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ذرا توقف سے ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ سرخ و سپید نوجوان بھی سائیں عالی کے عقب میں تھا۔ تاہم غیر متوقع طور پر وہ رائفل بردار گارڈز دوبارہ نظر نہیں آئے جو سائیں کے تالی بجانے پر ایک دم زمین سے اگ آئے تھے۔ بہرحال یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ ہمارے آس پاس موجود ہوں گے۔

قریباً تین چار فرلانگ چلانے کے بعد سائیں عالی ہمیں ایک کھنڈر نما مقام پر لے آیا۔ یہ در اصل چند جھونپڑوں اور کچے پکے مکانات کا مجموعہ تھا۔ غالباً ایک ڈیڑھ سال پہلے تک یہاں آبادی موجود ہوگی۔ قحط سالی کے سبب یا کسی اور وجہ سے یہ لوگ یہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے' اب بغیر چھتوں کے کچی پکی دیواریں رہ گئی تھیں۔ اگر کوئی چھت نظر بھی آتی تھی تو وہ قابل استعمال نہیں تھی۔ یہیں پر ایک طرف ہموار ریت پر چار پانچ چھولداریاں موجود تھیں۔ ایک طرف آگ جل رہی تھی۔ روزمرہ استعمال کا دیگر سامان بھی ریت پر بکھرا نظر آتا تھا۔ یہاں میں نے ایک خوبرو سفید فام لڑکی کو بھی دیکھا۔ وہ منی اسکرٹ میں تھی اور کچھ کھانے پکانے میں مصروف تھی۔ سائیں عالی کو دیکھتے ہی وہ مؤدب کھڑی ہو گئی۔

سائیں عالی نے لڑکی کے قریب جا کر اسے کچھ ہدایات دیں۔ لڑکی بار بار اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ وہ سائیں کی رام لونڈی نظر آتی تھی۔ لڑکی کو ہدایات دینے کے بعد سائیں نے بڑی شان سے اپنی سیاہ گدڑی میں سے ایک بیڑی نکال کر ہونٹوں میں دبائی' پھر گلے میں آویزاں نوٹوں میں سے ایک نوٹ علیحدہ کیا۔ نوٹ کو رول کر کے ایک سرے سے پکڑا اور چولہے کے قریب جھک کر نوٹ کو آگ دکھا دی۔ اس جلتے نوٹ سے سائیں نے اپنی بیڑی سلگائی اور دھواں چھوڑتا ہوا ہمارے پاس واپس آگیا۔ اس کا یہ نیا بہروپ میرے اور صفدر کے لیے چونکا دینے والا تھا۔ یوں تو سائیں اوٹ پٹانگ

حرکتیں کرتا ہی رہتا تھا' اور کبھی کبھی اپنا رعب اور دبدبہ بھی دکھاتا تھا مگر اس طرح کی خرمستی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

ہم سب وہیں ٹھنڈی ریت پر سائیں کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں ایک کالا کتا بھی چھولداریوں کے عقب سے برآمد ہوا اور سائیں کے قریب آکر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ سائیں نے اسے پچکارا تو وہ اپنا سر سائیں کے پاؤں پر رگڑنے لگا اور تیزی سے دم ہلانے لگا۔ بظاہر یہ کوئی آوارہ کتا ہی لگتا تھا جسے سائیں عالی نے راہ چلتے اپنے ساتھ نتھی کرلیا تھا۔ کتے کو پچکارتے ہوئے سائیں بولا "ارے بادشاہ! تو نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ نہیں کھایا۔" اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا پھر اس کے منہ کو سہلاتے ہوئے بولا "اچھا پہلے اپنی پیٹ پوجا کرلیں۔ پھر تجھے بھی کراتے ہیں۔"

پیٹ پوجا کے ذکر پر صفدر نے برا سا منہ بنایا۔ صفدر کی بیزاری کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ سائیں ہمیں اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر رہا تھا اور ہم بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ سائیں کیا کھاتا ہے۔ اس کا کھانا اس کی حرکتوں سے کہیں بڑھ کر اوٹ پٹانگ ہوتا تھا۔ اس امر کا قوی امکان موجود تھا کہ وہ ہمیں بھی وہی کچھ کھلائے گا جو خود تناول کرے گا۔ میں اور صفدر خود کو ذہنی طور پر کسی واہیات ڈش کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اور پھر وہی کچھ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد خوب رو لڑکی اور خوب رو نوجوان ہمارے سامنے دستر خوان پر کھانا چننے لگے۔ یہ دونوں انگریز تھے۔ کھانا یقیناً بہت شان دار پکا ہوا تھا۔ مرغی کی خوشبو' حلوے کا رنگ' چاولوں سے اٹھنے والی دل آویز بھاپ اور فرنی لیکن ستم یہ تھا کہ حسب توقع سائیں عالی نے ان سب اشیاء کو ایک دوسرے میں مکس کرا دیا تھا۔ شوربے میں حلوا تیر رہا تھا اور مرغی کی بوٹیاں فرنی میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ دودھ کی میٹھی لسی بھی تھی لیکن اس میں پودینے کی چٹنی ملا دی گئی تھی۔

سائیں عالی نے فرنی ملی ہوئی مرغی کی ڈش بڑے اہتمام سے ویرا کے آگے رکھی اور صاف ستھری انگریزی میں بولا "[illegible] رانی! یہ خاص طور سے تمہارے لیے ہے۔ کھاؤ اباٹریب۔ تمہاری شادی کی دعوت ہے اور ایسی دعوتوں میں [illegible] نہیں کھانا چاہیے۔"

ویرا نے تھوڑا سا چکھا' اسے ابکائی آگئی۔ سائیں عالی [illegible] گھور کر اسے دیکھا۔ صفدر نے ہولے سے ویرا کو ٹھوکا [illegible]۔ اس نے دل کڑا کر کے تھوڑی سی مرغی کھائی۔ سائیں [illegible] نظر آنے لگا۔ میں نے تھوڑا سا سالن سائیں کی نظر سے بچا کر ریت میں پھینک دیا۔ غالباً صفدر نے بھی کوئی ایسی ہی حرکت کی تھی۔ اسی دوران میں وہ مسلح گارڈز بھی نمودار ہو گئے جنہوں نے ہم پر رائفلیں تانی تھیں۔ وہ چھولداریوں کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تھے۔ یقیناً یہ سارا کھانا ان گارڈز وغیرہ کے لیے ہی تیار کیا گیا تھا۔ جسے MIX کرکے سائیں نے ہماری ضیافت کر ڈالی تھی۔ یہ چھولداریاں بھی یقیناً ان گارڈز وغیرہ کے لیے ہی تھیں ورنہ سائیں عالی تو کڑاکے کی سردی میں بھی کھلے آسمان تلے رہ سکتا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سائیں عالی اس وقت یہاں کس چکر میں موجود ہے۔ اس حوالے سے میں نے ایک دو سوال پوچھے لیکن وہ ہمیشہ کی طرح چکنا گھڑا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے گلے میں جو بے تحاشا نوٹ آویزاں تھے ان کے بارے میں بھی اس نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ میں نے [illegible] ڈال کر ان نوٹوں کو قریب سے دیکھ لیا تھا' میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ اصلی نوٹ ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں کے ارد گرد جو خدمت گار اور گارڈز موجود ہیں وہ ان ہی نوٹوں سے خریدے گئے ہیں۔

اچانک پروفیسر نے کھڑے ہو کر اپنی انگلی سے بائیں جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس جانب آسمان پر سرخی سی نظر آ رہی ہے۔ یہ سرخی آگ کی نشان دہی کر رہی تھی۔ سرخی کا پھیلاؤ زیادہ نہیں تھا تاہم گہری تاریکی کے سبب وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ یہ سرخی بستی ہی کی طرف سے نمودار ہوئی تھی۔ میں نے صفدر سے کہا "یوں لگتا ہے کہ بستی میں کچھ ہو گیا ہے۔"

"دل دھڑکا بستی کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔۔۔" سائیں نے مخصوص انداز میں نعرہ بلند کیا' اور پھر ہاتھ بلند کر کے دھمال ڈالنا شروع کر دیا۔

پروفیسر بے چینی سے بولا "میرا خیال ہے کہ ہمیں دیکھنا چاہیے۔"

ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ سائیں اور اس کے خدمت گاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں سب سے آگے تھا اور ٹارچ بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ صفدر اور ویرا میرے پیچھے تھے' پروفیسر آخر میں تھا۔ ہم تقریباً پون گھنٹے میں بستی کے قریب پہنچ گئے۔ آگ اب بجھ چکی تھی لیکن فضا میں دھواں موجود تھا۔ اس دھوئیں کے ساتھ ایک نہایت منحوس بو بھی ہمارے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ یہ انسانی یا حیوانی گوشت کے جلنے کی بو تھی۔

پروفیسر نے بے حد مایوسی سے سر ہلایا "کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔" وہ بولا۔

"ہو سکتا ہے کہ فائرنگ بھی ہوئی ہو' ہوا کا رخ دوسری طرف تھا اسی لیے آواز ہم تک نہ پہنچی ہو۔"

"اب کیا کرنا چاہیے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"اگر ہمارا اندیشہ درست ہے اور کنگ کے آدمی واقعی بستی میں پہنچے ہیں تو پھر ہمیں اگلا قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ آگ کسی حادثے کی وجہ سے لگی ہو۔" صفدر نے خیال ظاہر کیا۔

"اور ہو سکتا ہے کہ یہ حادثہ نہ ہو۔" میں نے کہا "ہم پہلے ہی اپنے ساتھیوں کے لیے کافی مشکلات پیدا کر چکے ہیں' اب ان کے لیے اور اپنے لیے مزید مشکلات مول لینے سے بچنا چاہیے۔" میرا روئے سخن غزالہ' زریں اور کلثوم وغیرہ کی طرف تھا۔

پروفیسر نے اشارے سے مجھے ایک طرف بلایا اور سرگوشی میں بولا "اگر ہم جیپ میں موجود رائفلیں نکال لیں تو شاید اس وقت وہ ہمارے کچھ کام آسکیں۔"

میں نے کہا "اگر واقعی زسٹ کے لوگوں نے بستی پر ہلہ بولا ہے تو پھر ہماری دو چار رائفلیں ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔"

ہم جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے' بستی ہم سے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ بستی میں کیا ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ ویرا بہت ڈری ہوئی تھی۔ صفدر بار بار اس کا شانہ تھپک کر اسے تسلی دے رہا تھا۔ ہم تقریباً پندرہ بیس منٹ تک جھاڑیوں میں دبکے رہے۔ بستی کی طرف کسی ہلچل کے آثار نہیں تھے۔ نہ ہی کوئی آواز یا شور سنائی دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر دھوئیں میں گوشت کی بو کیسی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم جھاڑیوں سے برآمد ہوئے اور محتاط انداز میں بستی کی طرف بڑھے۔ بستی کے قریب ہمیں دو گھوڑے جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں' آوارہ گھومتے نظر آئے۔ پھر ریت پر دو بے حس و حرکت پڑے جسم ملے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا اور تھرا کر رہ گیا۔ دونوں مردہ تھے۔ یہ کمزور جسموں والے مقامی افراد تھے۔ دونوں کے عریاں سینوں پر گہرے زخم موجود تھے۔ ویرا کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی تھی۔ ان دو لاشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم بستی کی ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئے۔ یہاں صورت حال اور بھی بھیانک تھی۔ میں نے کم از کم بیس مرد و زن کو دیکھا جنہیں گولیوں سے بھون دیا گیا تھا اور جیپوں تلے روند دیا گیا تھا۔ جہاں جہاں ٹارچ کا روشن دائرہ پڑتا تھا وہاں وہاں تازہ لہو کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جو جیپ تلے کچل کر چیتھڑوں کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ان ہی لاشوں میں مجھے وہ معصوم بچہ بھی نظر آیا جس نے دو ڈھائی گھنٹے پہلے بڑی محبت بھری نظروں سے ویرا کو دیکھا تھا اور ویرا نے اسے گود میں اٹھا کر اس کی مٹھی میں اپنا قیمتی رنگ دیا تھا۔ اب وہ بچہ خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کا ننھا سا سر گولیوں کی بوچھاڑ سے پاش پاش ہو چکا تھا اور جسم چھلنی تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی شکاری نے چڑیا کو شکار کرنے کے لیے اس پر پوری رائفل خالی کر دی ہو۔ ویرا اب وحشت کے عالم میں مسلسل چیخ رہی تھی۔ صفدر نے اسے بانہوں میں لے لیا تھا۔

میری ٹارچ کا روشن دائرہ ایک عورت پر پڑا' وہ بچے کے قریب ہی اوندھی گری ہوئی تھی۔ پروفیسر نے اسے سیدھا کیا۔ یہ اسی بچے کی بدنصیب ماں تھی جس کی لاش ہمارے سامنے پڑی تھی۔ عورت کے سینے اور گردن میں گولیاں لگی تھیں۔ اس کی شہ رگ کٹ چکی تھی اور وہ بالکل آخری سانسیں لے رہی تھی "یہ کیا ہو گیا ہے شاہ جہاں؟" پروفیسر نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد زسٹ کے کتے یہاں حملہ آور ہو گئے تھے۔"

گلی کے آخری جھونپڑے سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ ہم بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے جھونپڑے سے باہر ایک بڑھیا زمین پر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کے ارد گرد اس کے بیٹوں اور پوتے پوتیوں کی تقریباً ایک درجن لاشیں پڑی تھیں۔ بڑھیا کے ایک نوجوان بیٹے کے ہاتھ مرنے کے بعد بھی نیزے کے چوبی دستے پر جمے ہوئے تھے۔ بڑھیا زمین سے ریت اور خاک اٹھا اٹھا کر سر میں ڈال رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ ویرا نے روتے ہوئے بتایا کہ یہ بڑھیا حملہ آوروں کو بددعائیں دے رہی ہے اور اپنے مرنے کی دعائیں کر رہی ہے۔ یہ بتا رہی ہے کہ وہ مردوں کو مار گئے ہیں اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

اچانک میرے ذہن میں سردار بوغات کا خیال آیا۔ اگر یہ سب کچھ زسٹ کے غنڈوں نے کیا تھا تو پھر یقیناً سردار بوغات بھی خیر سے نہیں تھا۔ میں نے پروفیسر کو ساتھ لیا اور دوڑتا ہوا اس پناہ گاہ کی طرف بڑھا جہاں ہم پچھلے کئی دن سے

مقیم تھے۔ راستے میں مجھے دل دوز مناظر دیکھنے کو ملے۔ جھونپڑے کے دروازے گولیوں سے چھلنی تھے۔ کچھ جھونپڑوں کو آگ لگائی گئی تھی اور وہ جل رہے تھے یا سلگ رہے تھے۔ اس بستی میں انسان یوں مرے پڑے تھے جیسے کسی تیز اثر دوا کے چھڑکاؤ سے مکھیاں مرتی ہیں۔ کہیں کہیں کسی زخمی یا جاں بلب شخص کی کربناک آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ایک جگہ مجھے ایک لاش کے نیچے رائفل دبی نظر آئی۔ یہ "چائنیز" ٹائپ کی وہی خود کار رائفل تھی جو ٹرسٹ میں ہم نے عام دیکھی تھی۔ یہ پہلا ثبوت تھا جو ہمیں کنگ براؤن اور اس کے حواریوں کے خلاف ملا تھا۔

میں نے رائفل کو چیک کیا۔ وہ لوڈڈ تھی اور ابھی اس کا نصف میگزین بھرا ہوا تھا۔ اپنی پناہ گاہ کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا۔ وہاں دو جھونپڑوں میں ابھی تک آگ لگی ہوئی تھی۔ آگ کی روشنی میں پناہ گاہ کے اردگرد کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی ریت پر کئی لاشیں موجود تھیں۔ مرنے والے بیشتر افراد کو گولیاں لگی تھیں' تاہم کسی کسی شخص کے جسم پر سنگین یا تیز دھار آلے کا زخم بھی دکھائی دے رہا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ سب مرنے والے مقامی تھے۔ ان میں ایک بھی حملہ آور نہیں تھا۔ غالباً یہ لڑائی یک طرفہ ہی ثابت ہوئی تھی۔ اب چاندنی میں ان کی خونچکاں لاشیں اور لٹے پٹے جھونپڑے حسرت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے صفدر' ویرا اور پروفیسر کو کوتاہ قد کھجوروں کے جھنڈ میں بھیج دیا اور خود بڑی احتیاط سے پناہ گاہ کی طرف بڑھا۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ اس مقام پر زوردار مقابلہ ہوا ہے۔ ہر طرف گولیوں کے خول بکھرے تھے اور در و دیوار چھلنی تھے۔ شاید قبائلیوں نے اپنے مہمان کا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ وہ مہمان جو ان کے نزدیک پراسرار قوتوں کا مالک تھا اور نہایت قابل احترام اور مقدس بھی تھا۔ سیڑھیوں پر بھی لاشیں گری ہوئی تھیں۔ میں کئی مردہ جسموں کو پھلانگ کر تہ خانے میں اترا۔ یہاں کٹے پھٹے لباس والی ایک چودہ پندرہ سالہ سیاہ فام لڑکی مردہ پڑی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ٹرسٹ کے وحشیوں نے اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہے اور ناکام ہو کر گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ اس کے سینے پر اتنی وحشت سے گولیاں چلائی گئی تھیں کہ جسم کا قیمہ بن کر رہ گیا تھا۔ کچھ ایسی ہی وحشیانہ فائرنگ در و دیوار پر بھی کی گئی تھی۔ کچی دیواروں میں اور نیم پختہ چھت پر گولیوں کے ان گنت سوراخ نظر آ رہے تھے۔ در و دیوار کے پرخچے اڑ گئے تھے اور لاشیں مٹی سے اٹی ہوئی تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس وحشیانہ کارروائی کے پیچھے مائیکل کی موت کا غضب بھی شامل ہے۔ مائیکل کی موت نے یقیناً کنگ براؤن کے غم و غصے کو انتہا تک پہنچا دیا تھا اور اسی انتہا کا نتیجہ تھا کہ یہاں اچانک حملہ کر کے آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔

سرنگ نما پناہ گاہ میں' جہاں ہم مقیم تھے وہاں بھی ایک ادھیڑ عمر دیہاتی کی لاش موجود تھی۔ دیہاتی کی بیوی جو خود بھی زخمی تھی اس کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی۔ پوری بستی میں یہ دوسری عورت تھی جو ہمیں زندہ نظر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی زبان میں آہ و بکا کرنے لگی۔ اس دوران میں صفدر' ویرا اور پروفیسر بھی محتاط قدموں سے اندر آ گئے۔ صفدر کے ہاتھ میں ہتھیار کے طور پر ایک چمک دار نیزہ موجود تھا۔ ادھیڑ عمر عورت کا واویلا ویرا کی سمجھ میں آ رہا تھا اس نے عورت کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا "یہ کہہ رہی ہے کہ ان پر نیلی وردیوں والوں نے حملہ کیا ہے۔ انہوں نے کسی کی منت سماجت نہیں سنی' سب کو قتل کر دیا ہے یا ان کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

میرے کہنے پر ویرا نے عورت سے پوچھا کہ سردار بوعنات کہاں ہیں۔

وہ بڑے یقین سے بولی "وہ تو دیوتاؤں کے اوتار ہیں۔ انہیں بھلا کیا ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" ویرا نے پوچھا۔

عورت بولی "نیلی وردیوں والے سردار بوعنات کو تلاش کرتے ہوئے سرخ پردے کے پار چلے گئے تھے۔ وہاں وہ سردار کے حجرے میں گھس گئے مگر سردار انہیں نظر نہیں آئے۔ وہ گالیاں بکتے اور چیختے چلاتے ہوئے واپس چلے گئے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ سردار زندہ ہیں؟"

"وہ زندہ ہیں' دیوتاؤں کی روشنی بھلا کیسے مر سکتی ہے۔" عورت لرز کر بولی "وہ اپنے حجرے میں موجود ہیں۔"

عورت کی بات ہم سب کے لیے ناقابل یقین تھی۔ ہم سردار بوعنات کے حجرہ نما مسکن کی طرف بڑھے۔ چونکہ میرے ہاتھ میں رائفل تھی اس لیے میں سب سے آگے تھا۔ ہم حجرے میں داخل ہوئے تو ہم نے سردار کو ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے دیکھا۔ وہ بہت اداس نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دور کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس نے اپنی جگہ سے ہلنے یا کوئی بات کہنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دیکھ کر ہماری حیرت میں بے پناہ اضافہ ہوا کہ اس

کمرے کی تمام دیواروں پر بھی گولیوں کے نشان موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کمرے کا چپا چپا گولیوں سے چھلنی ہے۔ ہاں جہاں سردار بوعنات بیٹھا تھا وہ جگہ اور اس کے دائیں بائیں چند فٹ جگہ گولیوں سے بچی ہوئی تھی۔

کمرے کا منظر دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ دوڑ گئی۔ کچھ وہی پراسرار سا احساس ہوا جو سردار بوعنات کے شاگرد ارجمند بوکارلو کے جھونپڑے میں جا کر ہوتا تھا۔ جب ہم وہاں شہد کی پراسرار مکھیوں کو پنجرے میں بند دیکھتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ وہ باہر نکل سکنے کے باوجود باہر نہیں نکلتیں تو حواس پر ایک بے نام سی ہیبت سوار ہو جاتی تھی۔ کچھ ایسی ہی دہشت یا ہیبت کا سامنا ہمیں یہاں بھی تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ پورا کمرا خود کار رائفلوں کی مار سے تباہ حال ہے لیکن یہاں بیٹھا ہوا سردار بوعنات اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور بالکل محفوظ تھا۔ مقامی عورت گواہ تھی کہ جس وقت حملہ آور کمرے میں گھسے' سردار کمرے کے اندر ہی تھا۔ تو کیا وہ حملہ آوروں کو نظر نہیں آیا تھا۔ ماورائی علوم میں جو نظر بندی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے' کیا وہ یہاں کارفرما رہی تھی' یا پھر یہ کوئی اور ماجرا تھا۔ سردار بوعنات کی آنکھیں نہایت پراسرار تھیں اور اس کی آنکھوں کا جادو جیسے یہاں بار بار کی کہا جاتا تھا' سر چڑھ کر بولتا تھا لیکن یہ سوچنا کسی طور بھی درست نہیں تھا کہ سردار نے آناً فاناً حملہ آوروں کو بے اثر کر دیا ہوگا اور وہ دیواروں پر گولیاں برسا کر چلے گئے ہوں گے۔ بہرحال اس کمرے میں ہمیں جو کچھ بھی دکھائی دیا تھا وہ ناقابل فہم تھا۔ گولیوں کے ان گنت خولوں اور دیواروں کے اڑے ہوئے خاکستری پرخچوں کے درمیان لاوسی سردار زندہ سلامت موجود تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ اسے خراش تک نہیں آئی۔ ویرا نے سردار سے بات کرنے کی کوشش کی' سردار صرف ہوں ہاں میں جواب دے کر رہ گیا۔ وہ بات کہنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں اور ان میں دیکھنے سے جھرجھری محسوس ہوتی تھی۔

ایک مقامی بوڑھا بہت گھبرایا ہوا پناہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے واویلا کرنے والے انداز میں کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر ویرا کا رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ اس نے بتایا "شاید ٹرسٹ کے کچھ لوگ ابھی بستی میں موجود ہیں۔ یہ بوڑھا بتا رہا ہے کہ ایک مکان کے اندر سے اجنبی آوازیں آ رہی ہیں۔"

ویرا کی بات سن کر میری گرفت رائفل پر خود بخود مضبوط ہو گئی۔ میں پروفیسر کے ساتھ پناہ گاہ سے باہر نکلا۔ چاند کی روشنی اب زیادہ ہو گئی تھی۔ خوف زدہ بوڑھا ہمیں اپنے پیچھے لگا کر تیس چالیس گز دور لایا' پھر اس نے ایک نیم پختہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مکان گاؤں کے مکھیا کے بھائی کا تھا۔ مکان کا ایک حصہ جل گیا تھا اور سامنے کی کچی دیوار بھی کسی جیپ کی ٹکر سے گر گئی تھی' تاہم ایک تہائی مکان اب بھی محفوظ تھا۔ مکان کے اندر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں اور گاہے گاہے ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ یہ گھٹی اور سہمی ہوئی چیخ تھی۔

صفدر بھی ہم دونوں کے پیچھے ہی پیچھے موقع پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے علاوہ دو چار بوڑھے مرد و زن بھی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری بستی میں بس یہی چند دہشت زدہ متنفس باقی رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ بھی ہماری طرح پریشان نگاہوں سے تباہ حال مکان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر نے کہا "میرا خیال ہے کہ ان درندوں میں سے ایک دو اندر موجود ہیں۔"

لڑکی کی دبی دبی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور مکان کی طرف بڑھا۔ ویرا نے ڈری ڈری آواز میں مجھے روکنا چاہا لیکن میں سنی ان سنی کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ ٹارچ میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔ ٹارچ کا روشن دائرہ اپنے بالکل سامنے رکھتے ہوئے میں نے ایک دیوار کی اوٹ سے اندرونی کمرے کا جائزہ لیا اور دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ دو افراد ایک نیم برہنہ مقامی لڑکی سے جانوروں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نے اسے دبوچ رکھا تھا اور دوسرا پاگل کتے کی طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ یہ دونوں افراد سفید فام تھے اور انہیں دیکھتے ہی میرے دل نے گواہی دے دی کہ ان کا تعلق ٹرسٹ کے گارڈز سے ہے۔ یہ دونوں نشے میں اس قدر دھت تھے کہ اپنے اردگرد سے بے خبر ہو کر رہ گئے تھے۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ اپنے نیم برہنہ جسموں پر محسوس کر کے بھی انہوں نے کسی خاص ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے اس خیال سے ٹارچ کی روشنی پورے کمرے میں گھمائی کہ کہیں کوئی تیسرا بدبخت بھی موجود نہ ہو' لیکن وہ صرف دو ہی تھے۔ میں کمرے میں گھسا' ایک کی گردن پر میں نے رائفل کا کندہ رسید کیا' وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ دوسرے نے لڑکی کو چھوڑا اور بالکل کسی جانور ہی کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ بالکل آخری لمحے میں مجھے پتا چلا کہ اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل کا خطرناک چاقو ہے۔ یہی چاقو لڑکی کی گردن پر رکھ کر اس شرابی نے لڑکی کو بے بس کر رکھا تھا۔ میں نے خود کو چاقو کے اس خطرناک اور غیر متوقع وار سے بمشکل

بچایا۔ حملہ آور کا چاقو والا ہاتھ میرے ٹارچ والے ہاتھ سے ٹکرایا، ٹارچ ہاتھ سے نکل گئی اور کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ چاقو ابھی تک حملہ آور کے ہاتھ میں موجود تھا اور وہ مجھے بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اندھیرے میں اندھا دھند فائر بھی نہیں کرسکتا تھا، لڑکی بھی ابھی تک کمرے میں ہی موجود تھی۔ میں نے رائفل کو اس کی مختصر نالی کی طرف سے لاٹھی کی طرح پکڑا اور اندازے سے چاقو بردار کے سر کا نشانہ لیا۔ رائفل کا مضبوط چوبی دستہ کسی ٹھوس شے سے ٹکرایا اور بڑی تسلی بخش آواز پیدا ہوئی۔ یہ "آواز" اس امر کا اعلان تھی کہ دستہ حملہ آور کی عین کھوپڑی پر لگا ہے۔ ایک سیکنڈ بعد میں نے اس کے زمیں بوس ہونے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی دہشت زدہ لڑکی بری طرح چیخی۔ مضروب حملہ آور غالباً لڑکی کے اوپر ہی گرا تھا۔ وہ اٹھی اور چیختی ہوئی ایک گوشے میں دبک گئی۔

اسی دوران میں پروفیسر بھی ایک ٹارچ لے کر کمرے میں نمودار ہوگیا۔ جس شخص کی گردن پر میں نے شروع میں ضرب لگائی تھی، وہ فرش پر ہی لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دفاع کے قابل نہیں تھا، بس نشے کی زیادتی میں مغلظات بکتا چلا جارہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر دو زوردار ٹھوکریں رسید کیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا فرش پر لم لیٹ ہوگیا۔ اس کے قریب ہی شراب کی ایک خالی بوتل بھی لڑھکی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے اپنے کندھوں سے چادر اتار کر لڑکی کا جسم ڈھکا۔ اس نے اب بلند آواز سے رونا شروع کردیا تھا۔

دونوں گارڈز اس قدر ٹن ہورہے تھے کہ اب اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک گارڈ غنودگی کے عالم میں خبر نہیں کیا بڑبڑا رہا تھا، پھر اس نے باقاعدہ گانے کی کوشش شروع کردی۔ اس کوشش میں جب ناکام ہوا تو بھوں بھوں کرکے رونے لگا۔ اس کا انداز بے حد مضحکہ خیز تھا۔ گاؤں کے بوڑھے افراد گالیاں دیتے ہوئے ان دونوں گارڈز کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے، مگر اتنی ہمت ان میں بہرحال نہیں تھی کہ گارڈز پر ہاتھ اٹھا سکتے۔ ان لاچار بوڑھوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اور ان کی دلی خواہش کا احترام کرتے ہوئے، میں نے دونوں گارڈز کو تابڑ توڑ تھپڑ رسید کیے اور انہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ وہ مضحکہ خیز حرکتیں کرتے رہے۔ وہ شراب کی اتنی زیادہ مقدار حلق سے اتار چکے تھے کہ انہیں کچھ شدھ بدھ ہی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو وہ لوٹ مار کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوگئے ہوتے۔

میں، صفدر اور پروفیسر دونوں گارڈز کو گھسیٹتے ہوئے ایک جھونپڑے میں لے آئے۔ ان پر پانی پھینکا گیا اور نشہ اتارنے کی دوسری ترکیبیں آزمائی گئیں۔ آدھ پون گھنٹے میں ان کے حواس کچھ بحال ہونے لگے۔ اس دوران میں صفدر اور پروفیسر گاؤں کا جائزہ لینے چلے گئے تھے۔ میری طرح انہیں بھی اندیشہ تھا کہ شاید گاؤں میں ابھی کچھ اور حملہ آور بھی موجود ہوں۔ بہرحال یہ اندیشہ غلط نکلا اور وہ تھوڑی دیر بعد لوٹ آئے۔

"یہ سب کیا ہوگیا ہے۔" ویرا نے روتے ہوئے کہا "اس سارے خون خرابے کی میں ہی ذمے دار ہوں۔"

"تم اپنے سر پر دنیا جہان کا بوجھ مت ڈالو۔" صفدر نے ناراضگی سے کہا "یہاں کے حالات مدتوں سے خراب ہیں۔ نسل در نسل یہ سلسلہ چل رہا ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہیے۔"

"تو کہاں جائیں گے؟" صفدر نے پوچھا۔

"کہیں بھی لیکن یہاں سے نکل چلیں۔" میں نے کہا "یقینی بات ہے کہ ٹرسٹ کے لوگ اس بات سے آگاہ ہوچکے ہیں کہ تم اور ویرا اس گاؤں میں قیام پذیر رہے ہو اور تمہاری شادی کی رسم بھی یہاں ادا ہوئی ہے۔ اب وہ تمہیں اس گاؤں کے اندر اور گاؤں کے آس پاس ہی تلاش کریں گے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ آوروں کا کوئی گروہ اس وقت بھی ہماری تلاش میں گاؤں کے اردگرد گھوم رہا ہو۔"

"تو ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں یہاں سے۔" ویرا نے بڑی دہشت بھری آواز میں کہا۔

وہ خود کو کسی قبرستان میں محسوس کررہی تھی۔ ایک ایسا قبرستان جس میں لاشیں قبروں کے اندر نہیں باہر پڑی تھیں۔

پروفیسر نے پوچھا "کیا سردار بوغات بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟"

"یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

ویرا اور صفدر زمین دوز پناہ گاہ میں گئے تاکہ سردار بوغات سے اس کا عندیہ لے سکیں۔ دو چار منٹ بعد وہ پریشان سے واپس آگئے۔ صفدر نے بتایا کہ سردار بوغات وہاں موجود نہیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ ہم نے یا مقامی لوگوں میں سے کسی نے سردار کو پناہ گاہ سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کس وقت یہاں سے رفوچکر ہوگیا تھا۔

ارے لیے اس کی پراسراریت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ مزید لی کے لیے میں اور پروفیسر بھی دو تین حسرت ناک لاشوں کو ہلا کر پناہ گاہ میں اترے اور کونے کھدروں میں دیکھا مگر ات کہیں نہیں تھا۔ ہم پناہ گاہ سے باہر نکلے تو ویرا صفدر سے چمٹی ہوئی خوف کے عالم میں روتی چلی جارہی تھی۔ صفدر ں کے شانوں کو تھپک تھپک کر اسے تسلی دے رہا تھا۔

رحقیقت یہ گاؤں ایک خونچکاں مقتل کی شکل اختیار کرگیا ا۔ ایک ایسا مقتل جس میں ڈھائی تین گھنٹے پہلے درندگی نے ننگا رقص کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہاں ہونے والے قتل ام کی خبر جلد یا بدیر پورے علاقے میں پھیلنے والی ہے۔ پھر یہاں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں، خبر رساں ایجنسیوں اور جانے کون کون سی ایجنسیوں نے چڑھ دوڑنا تھا۔ بے شک یہ لاقہ دور افتادہ تھا اور یہاں تک پہنچنا کار دشوار تھا، مگر جس م کا قتل عام یہاں ہوا تھا، وہ بہت جلد لوگوں کو اپنی جانب کھینچنے والا تھا اور غالباً ایسا ہی کوئی خدشہ تھا جس کے سبب ٹ کے حملہ آور جلد سے جلد یہاں سے نکل گئے تھے۔

گاؤں میں جو چند بوڑھے مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ پنے بچوں اور پوتے پوتیوں کی لاشوں پر نوحہ خواں تھے۔ نہیں بے گور و کفن چھوڑ کر وہ کہاں جاسکتے تھے پھر بھی ہماری خواہش تھی کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ ویرا کے ذریعے میں نے ان سے بات کی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ ہمارے ساتھ کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ حسب اندیشہ انہوں نے اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

وہ لڑکی جسے ہم نے کچھ دیر قبل دو وحشی اور نشے میں دھت ہوئے گارڈز سے چھڑایا تھا جھونپڑے کے ایک گوشے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے برہنہ جسم کو چھپانے کے لیے پروفیسر کی چادر بکل کی صورت لپیٹ رکھی تھی۔ اچانک وہ بری طرح چیخی اور اٹھ کر جھونپڑے کے دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کوشش میں اس کی ٹانگیں عریاں ہوگئیں اور وہ دروازے کے قریب گرتے گرتے بچی۔ ہم نے یہی سمجھا کہ شاید اس پر کوئی دماغی دورہ پڑ گیا ہے یا وہ ہسٹریا کا شکار ہوگئی ہے مگر جب دو ہی سیکنڈ بعد ویرا کی بھی چیخیں نکل گئیں تو ہم سب بری طرح چونکے۔ میں نے طاقت ور ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں ایک خوفناک سیاہ سانپ نظر آیا۔ اس کے جسم پر چھوٹے چھوٹے داغ تھے اور سرخی مائل زبان تیزی سے حرکت کررہی تھی۔ ابھی میں نے اپنے ردعمل کا تعین نہیں کیا تھا کہ صفدر بھی اپنے پاؤں پر اچھل کر دروازے کی طرف گیا۔ میں نے ٹارچ کو حرکت دی، مگر وہ رنگت والا ایک اور سانپ دروازے کے عین سامنے نمودار ہورہا تھا۔ اس دوران میں جھونپڑے کے باہر سے بھی چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ جس سانپ کی کھال پر چھوٹے چھوٹے داغ تھے، وہ اب دروازے کے بالکل سامنے آگیا تھا۔ سانپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے میں نے رائفل سیدھی کی اور اس کے سر کا نشانہ لے لیا۔ اس سے پہلے کہ میں ٹریگر دباتا، سانپ کے سر کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ پٹ سے زمین پر گر کر ساکت ہوگیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کے دھڑ سے اس کا سر غائب نظر آیا۔ یہ نشانہ باکمال نشانے باز کے سوا بھلا اور کون لگا سکتا تھا۔ میں نے تصدیق کے لیے دیکھا۔ صفدر کے ہاتھ میں ریوالور نظر آرہا تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ ریوالور کب سے اس کے پاس تھا، بہرحال اس کا علم مجھے ابھی ہوا تھا۔ صفدر نے پچھلے کچھ دنوں میں مجھ سے اتنی باتیں چھپائی تھیں کہ اب کسی بھی بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔

میں اور ویرا تیزی سے باہر نکلے اور ہمارا یوں باہر نکلنا صفدر کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوا۔ میرے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی روشنی بھی صفدر کے عقب میں گئی۔ یہاں ایک چھوٹے قد کی کھجور موجود تھی۔ کھجور کی ایک زیریں شاخ سے نہایت پتلے جسم کے دو سانپ رسیوں کے مانند لٹک رہے تھے، وہ صفدر کے سر کے بالکل پاس جھول رہے تھے۔ شاید مجھے دو لمحوں کی تاخیر ہوتی تو ان میں سے کوئی سانپ صفدر پر حملہ آور ہوجاتا۔ میرے پاس نشانہ لینے کی مہلت تھی اور نہ یہ یقین تھا کہ نشانہ کامیاب رہے گا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا اور اس سانپ کو نشانہ بنایا جو صفدر کے عین سر پر تھا۔ رائفل کی ضرب نے سانپ کو شاخ سے جدا کرکے دور پھینک دیا۔ صفدر نے پلٹ کر دوسرے سانپ کا نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ معلوم نہیں کہ یہ دوسرا سانپ نشانہ بن سکا یا نہیں۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ اب ان دو چار بوڑھے افراد کی طرف تھا جو دہشت کے عالم میں مخالف سمت میں بھاگے چلے جارہے تھے۔ بغیر تصدیق کے یہ بات ہمارے علم میں آرہی تھی کہ ان لوگوں کی دہشت کی وجہ بھی وہی ہے جو ہماری ہے۔ یہ بہت سے سانپ تھے جو اچانک نجانے کہاں سے نکل آئے تھے اور چاروں طرف پھیل گئے تھے۔

یہ بڑی سنسنی خیز صورت حال تھی۔ ایک نہایت خوفناک قتل عام کی بازگشت ابھی فضا میں موجود تھی کہ یہ دوسری افتاد آن پڑی تھی۔ اگلے ایک منٹ کے دوران میں میری ٹارچ کا روشن دائرہ جدھر جدھر گیا، وہاں مجھے ایک آدھ

سانپ دکھائی دے گیا۔ یہ سانپ بستی کی شمالی جانب سے آرہے تھے۔ یہاں چند جھونپڑے جلے تھے اور خشک جنگلی گھاس کو بھی آگ لگی تھی۔ ہماری سمجھ میں فوری طور پر یہی آیا کہ یہ اسی آگ کا نتیجہ ہے لیکن سوچنے کی بات تھی کہ اگر اتنی زیادہ تعداد میں سانپ گھاس میں موجود تھے تو کیا وہ اس سے پہلے بستی والوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ بہرحال یہ زیادہ تفصیل سے سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ سانپ ہر طرف نظر آرہے تھے اور تاریکی میں کوئی حادثہ بھی رونما ہو سکتا تھا۔

اچانک ایک اور دلدوز چیخ سنائی دی۔ یہ ان دونوں گارڈز میں سے ایک تھا جسے ہم نے ہاتھ پاؤں باندھ کر کھلی جگہ پر ڈال دیا تھا۔ میں اور صفدر لپک کر وہاں پہنچے۔ گارڈ زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی زہریلے سانپ کا شکار ہوا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گارڈ کا سرخ و سپید رنگ نیلا پڑ گیا اور میں نے اس کی ناک سے خون کی پتلی لکیر نکلتے دیکھی۔

"یہ تو گیا۔" صفدر نے سرگوشی کی۔

"کیا ہوا؟" ویرا بھی گھبرائی ہوئی ہمارے قریب چلی آئی۔

میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ فوراً جاں بلب گارڈ پر سے ہٹا لیا۔ اس بدبخت کے گلے سے اب "خر خر" کی خوفناک آواز نکلنا شروع ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" ویرا نے اپنا سوال دہرایا۔

"کچھ نہیں۔" صفدر اسے کھینچ کر دوسری طرف لے گیا۔

دوسرا گارڈ اپنے ساتھی کے انجام سے باخبر ہو گیا تھا۔ اس نے ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ دہائی دے رہا تھا "جونی مر رہا ہے۔ اسے سانپ نے کاٹا ہے' وہ مر رہا ہے۔" اگر اس کے پاؤں کھلے ہوتے تو وہ اٹھ کر بھاگ گیا ہوتا۔

اب بہتر یہی تھا کہ میں اس دوسرے گارڈ کو کندھے پر اٹھاؤں اور ہم سب یہاں سے نکل بھاگیں پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ وزنی گارڈ کو کندھے پر لادا اور ٹارچ کے اشارے سے صفدر اور پروفیسر کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے اس جگہ سے نکلے۔ ویرا کو اندھیرے میں ایک لاش سے ٹھوکر لگی اور وہ اوندھے منہ گری۔ صفدر نے اسے بمشکل سنبھالا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے درجنوں سانپ ہمارے عقب میں لپک رہے ہیں' بستی سے نکلتے ہی ایک کھیت کے کنارے ٹارچ کا روشن دائرہ ایک ایسی لڑکی کی نیم برہنہ لاش پر پڑا جس کے سینے پر ایک سانپ رینگ رہا تھا۔ ویرا کے ہونٹوں سے ایک مرتبہ پھر چیخیں نکل گئیں۔ سرزمین افریقہ ہر قسم کے جنگلی جانوروں اور موذی درندوں کے لیے جانی پہچانی ہے' ہمیں اس علاقے میں اب کافی دن گزر چکے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ابھی تک ہمیں اس قسم کے حالات سے سامنا نہیں پڑا تھا جو شکار وغیرہ کی کہانیوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ بہرطور آج ہمیں ان کہانیوں کی ایک جیتی جاگتی جھلک یہ نظر آگئی تھی۔

ہم گرتے پڑتے تقریباً دس منٹ میں اس جیپ تک پہنچے جو درختوں میں یوں چھپی ہوئی تھی کہ جھاڑ جھنکاڑ کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ دراصل اس جیپ تک بحفاظت پہنچنے میں جس شے نے ہماری سب سے زیادہ مدد کی وہ ٹارچ تھی جس کی روشنی کسی گاڑی کی ہیڈلائٹ سے مشابہ تھی۔ اس جیپ کی چابی ابھی تک میرے پاس موجود تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور وہ یوں اسٹارٹ ہو گئی جیسے میں نے ابھی دو منٹ پہلے اسے بند کیا ہو۔ جونہی میں نے جیپ کی اگلی لائٹ روشن کی میرے ساتھ ساتھ دیگر افراد کو بھی چونکنا پڑا۔ سامنے سے سردار بوعنات چلا آرہا تھا۔ اس کا لباس وہی چولا تھا جس کی پشت پر کڑھائی سے ہاتھی کی شبیہہ بنائی گئی تھی۔ اس کا ٹوٹا ہوا ہاتھ پٹیوں میں جکڑا تھا اور اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ سردار کو اچانک یہاں دیکھ کر ہم سب کو زبردست حیرت ہوئی۔

صفدر کے اشارے پر ویرا نے آگے بڑھ کر سردار بوعنات سے چند باتیں کیں۔ اس کے بعد ویرا نے ہمیں بتایا کہ محترم سردار ہمارے ساتھ جانا پسند کریں گے۔

"موسٹ ویلکم۔ آپ جیپ میں تشریف لے آیئے۔" میں نے انگلش میں کہا اور اس کے ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے سردار کو جیپ میں سوار ہونے کی دعوت دی۔ سردار جیپ میں چلا آیا۔ صفدر نے بندھے ہوئے گارڈ کو جیپ کے فرش پر پٹخ دیا' پھر صفدر کے علاوہ ویرا اور پروفیسر بھی سوار ہو گئے۔ میں نے جیپ آگے بڑھائی اور وہ لہراتی لنگڑاتی ہوئی ناہموار راستے پر چلنے لگی۔ ریوالور صفدر کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا تھا۔ صفدر کا نشہ اب بہت حد تک اتر چکا تھا اور کسی شکاری جانور کی طرح اس کی تمام حسیں پوری طرح بیدار ہو رہی تھیں۔ میں نے ڈرائیونگ کے دوران میں اپنی رائفل گود میں رکھی ہوئی تھی اور ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ درحقیقت ہم شدید خطرے سے گزر رہے تھے۔ اس امر کے قوی امکانات موجود تھے کہ ٹرسٹ کے لوگ آس پاس

کہیں موجود ہوں اور کسی موڑ پر اچانک ان سے مڈبھیڑ ہو جائے۔

"کدھر جانا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"فی الحال تو یہی ارادہ ہے کہ بستی سے دور نکل جائیں۔"

"گاڑی میں ایندھن زیادہ نہیں ہے۔" صفدر نے اطلاع دی۔

"چلو جہاں تک بھی چلے۔"

چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی سی پھیل گئی تھی۔ یہ رات کا درمیانی پہر تھا اور ہوا کی خنکی بہت خوشگوار تھی۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے بائیں پاؤں پر کسی نے انگارا رکھ دیا ہے' میں نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اپنے پاؤں تک پہنچایا' مجھے معلوم ہوا کہ کوئی زندہ جسم میرے پاؤں پر رینگ رہا ہے' بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا ہاتھ ایک سانپ کے زندہ جسم سے ٹکرایا۔ میں نے اس موذی کو کھینچ کر اوپر اٹھایا اور ایک اضطراری حرکت کے تحت اسے چلتی جیپ سے باہر پھینک دیا۔ یہ تقریباً دو ڈھائی فٹ لمبا سانپ تھا۔ اس کا سیاہ خم دار جسم ایک لمحے کے لیے جیپ کی ہیڈلائٹ میں چمکا' پھر وہ زمین پر گرا۔ میرا تو سو فی صد خیال یہی تھا کہ جیپ کا پہیہ اس موذی کے اوپر سے گزر گیا ہے۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ جیپ میرے ہاتھوں میں لہرائی اور راستے کے کنارے پر رک گئی۔

"کیا ہوا؟" ویرا نے چیخ کر پوچھا۔

"سانپ نے کاٹا ہے۔" صفدر کی وحشت زدہ آواز ابھری۔

پروفیسر نے آگے آکر ٹارچ کی روشنی میرے پاؤں پر ڈالی۔ ٹخنے سے ذرا اوپر سانپ کے دانتوں کا منحوس نشان صاف نظر آرہا تھا۔ سردار بوعنات نے تیز تیز لہجے میں ویرا سے چند باتیں کہیں۔ میں نے کن انکھیوں سے ویرا کا چہرہ دیکھا' وہ یکایک وحشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس دوران میں صفدر نے اپنا رومال بڑی مضبوطی سے میری پنڈلی کے زیریں حصے پر باندھ دیا تھا۔ ویرا نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

"تم تو چپ کرو ویرا۔" صفدر نے ذرا سختی سے کہا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سردار بوعنات نے ویرا کو سانپ کے متعلق کچھ بتایا ہے اور ویرا اسی وجہ سے پریشان ہوئی ہے۔ غالباً یہ کوئی بہت زہریلا سانپ تھا۔ شاید اسی نسل کا جس نے کچھ دیر قبل بستی میں سفید فام گارڈ کی جان لی تھی۔ یہ خیال ذہن میں جاگا تو دل و دماغ میں نقاہت سی اتر گئی۔ صفدر مرے مرے لہجے میں مجھے تسلی دے رہا تھا۔ ویرا کو روتے دیکھ کر اس کے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ گاڑی میں مجھے صفدر کے ہاتھ میں ایک نیزہ نظر آیا تھا۔ اس نیزے کا پھل اتار کر صفدر نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب وہ اس تیز دھار آلے کی نوک سے میرے ٹخنے کے زخم کے قریب کٹ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ابھی وہ کٹ لگانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اچانک ویرا ایک مرتبہ پھر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ اس مرتبہ اس کی چیخیں کہیں زیادہ وحشت ناک تھیں۔ صفدر نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے پلٹ کر ٹارچ کی روشنی ویرا پر ڈالی۔ منظر خون منجمد کر دینے والا تھا۔ ایک ویسا ہی سیاہ سانپ ویرا کی گود میں موجود تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے ڈنک مارا تھا لیکن یہ سانپ پہلے سانپ سے تقریباً دوگنا بڑا تھا۔ ویرا کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ سانپ کی وحشت سے سکتہ طاری ہونے کے بارے میں میں نے کئی بار پڑھا اور سنا تھا' مگر آج میں اپنی آنکھوں سے یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ ویرا' سانپ کے اس قدر نزدیک تھی کہ بالکل دم بخود ہو کر رہ گئی تھی۔ سانپ بڑی شان سے اپنا پھن پھیلائے ہوئے تھا' اور یہ موت کا پھن تھا۔ کسی بھی لمحے وہ برق کی رفتار سے ویرا کے کومل جسم پر ڈنک مار سکتا تھا۔ یہ سانپ بلائے ناگہانی ثابت ہوئے تھے۔ بے شک ہم بستی سے دور آچکے تھے لیکن بستی میں پائے جانے والے سانپ اس جیپ کے ذریعے ہمارے ساتھ یہاں تک بھی پہنچ گئے تھے۔ میری نگاہ سردار بوعنات پر پڑی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ خدا کی پناہ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن تھیں۔ وہ درمیانی نشست پر ویرا کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ وہ براہ راست سانپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ بڑی پر اعتماد سرگوشی میں ویرا سے کچھ کہہ رہا تھا' ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی تسلی دینے والے انداز میں اوپر نیچے ہل رہا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا جو اس چاندنی رات میں ہم نے اس خواب ناک ویرانے میں دیکھا۔ جیپ کے اندر سردار بوعنات بے حرکت بیٹھا تھا۔ وہ بغیر پلک جھپکائے سانپ کو دیکھ رہا تھا' اور ناقابل فہم الفاظ مناجات کی صورت اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ دیکھا جاتا تو اس سنسنی خیز ڈرامے کے تینوں کرداروں پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ یعنی ویرا' سانپ اور سردار تینوں ہی پتھر کی طرح ساکت تھے۔ ویرا کو تو بے پناہ وحشت نے مبہوت کر رکھا تھا۔ سردار اور سانپ کی کیفیت ہماری سمجھ سے بالاتر تھی۔ یہ صورت حال کم و

بیش تین منٹ برقرار رہی۔ سانپ کا پھن بدستور پھیلا ہوا تھا مگر اس نے ویرا کو ڈنک نہیں مارا۔ ویرا ہانپی ہوئی تھی اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا پھر اچانک سردار بوغات نے اپنا تندرست ہاتھ آگے بڑھایا اور بڑے آرام سے سانپ کو پھن کے نیچے سے پکڑ کر جیب سے باہر سرکنڈوں میں پھینک دیا۔ ویرا تڑپ کر اٹھی اور جیپ کے پچھلے حصے میں چلی گئی۔ وہ بلند آواز سے رو رہی تھی۔ سردار بوغات نے صفدر کے ہاتھ سے ٹارچ لے کر اس کا روشن دائرہ پوری جیپ میں گھمایا اور تصدیق کی کہ جیپ میں کوئی اور موذی کیڑا تو موجود نہیں پھر سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں میرے پاؤں کا زخم دیکھا گیا۔ جلد اب زخم کے اردگرد سے نیلی ہو گئی تھی اور زخم سے بہنے والا خون گاڑھا ہو کر سیاہی مائل شکل اختیار کر گیا تھا۔ سردار بوغات کی ہدایت پر میری پنڈلی پر ایک اور پٹی کس کر باندھ دی گئی تاکہ زہر اوپر کی طرف تیزی سے سفر نہ کر سکے۔ صفدر نے زخم کے پاس چیرا بھی دے دیا تاکہ زہریلا خون بہہ نکلے۔ خون گاڑی کے فرش پر ٹپکنے لگا۔ سردار بوغات نے ویرا سے کوئی بات کہی۔ ویرا سخت ہراساں لہجے میں بولی۔

"سردار صاحب کا کہنا ہے کہ یہ زخم بے حد زہریلے سانپ کے دانتوں سے آیا ہے۔ اگلے چند منٹوں میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد کسی بستی میں پہنچنا چاہیے۔"

"بستی میں پہنچ کر کیا ہو گا؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" ویرا نے کہا "ان قبائلیوں کے پاس علاج کے اپنے طریقے ہوتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔"

"تو چلو سائیں عالی کی طرف چلو۔ اس نے یہاں پاس ہی ڈیرا لگا رکھا ہے۔"

صفدر نے مجھے اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چند ہی منٹ بعد ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ جہاں سائیں عالی اپنے گارڈز اور ملازمین وغیرہ کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ جگہ بھی ایک چھوٹی سی بستی کی شکل ہی اختیار کیے ہوئے تھی۔

ہم سائیں کے ڈیرے پر پہنچے تو سائیں کے گارڈز رائفلیں تھام کر بالکل چوکس ہو گئے۔ آگ کے الاؤ کے پاس سائیں تو موجود نہیں تھا مگر اس کا پالتو کتا بڑی شان سے ایک پلیٹ میں منہ مار رہا تھا۔ پلیٹ میں سیخ کباب تھے۔ ایک دوسری پلیٹ میں کوئی کھیر یا گجریلا قسم کی شے نظر آ رہی تھی۔ ایک پیالے میں اُبلے ہوئے انڈے تھے۔

"سائیں صاحب کہاں ہیں؟" میں نے ایک اگریزا سے پوچھا۔

بلڈ ٹائپ کے اس ملازم نے بڑے ادب سے بتایا سائیں صاحب ذرا سیر کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔

"رات کے اس پہر سیر؟" صفدر نے تعجب سے پوچھا

"چاندنی رات میں وہ اسی وقت سیر فرماتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جاتے ہیں۔"

اور واقعی تھوڑی دیر بعد سائیں کا ہیولا نظر آیا۔ واپس آ رہا تھا لیکن وہ پیدل نہیں تھا۔ کسی چھکڑا نما چھوٹا گاڑی پر سوار تھا۔ اس چھکڑے کو دو جانور کھینچ رہے تھے جانور قریب آئے تو دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ جانور تھا جسے ابن آدم بھی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان میں ایک ابن آدم تھا جبکہ دوسری بنت حوا تھی۔ یہ وہی خوب انگریز جوڑا تھا جو اس سے پہلے بھی ہم نے سائیں عالی ساتھ دیکھا تھا۔ ان دونوں کی حیثیت سائیں کے ملازموں سی تھی۔ سائیں عالی نے ان دونوں کو چھکڑے میں جوت تھا' اور باقاعدہ ایک چابک سے دونوں کو ہانک رہا تھا ہمارے سامنے لڑکے اور لڑکی کی ٹانگوں پر کئی بار اس کا چابک لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منہ سے باقاعدہ ٹخ ٹخ کی آواز بھی نکال رہا تھا۔

"رک جاؤ لاہور کا لاری اڈا آ گیا ہے۔" سائیں نے اور ہمارے پاس آ کر چھکڑا روک لیا۔

انگریز جوڑے نے نیکریں پہن رکھی تھیں۔ نوجوان بالائی جسم عریاں تھا جبکہ لڑکی نے شرٹ نما بنیان زیب تن رکھی تھی۔ دونوں کے لباس پسینے سے شرابور تھے اور وہ طرح ہانپے ہوئے تھے۔ سائیں ہماری طرف دیکھے بغیر اوا بے نیازی سے کھنڈر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے سر پر ڈالر کا تاج موجود تھا اور گلے میں بھی ڈالروں اور پاؤنڈوں کی گڈیاں لٹک رہی تھیں۔ صفدر نے آگے بڑھ کر کہا "سا شاہ جہاں صاحب کے پاؤں پر زہریلے سانپ نے کاٹا ہے۔"

سائیں نے یہ اہم خبر یوں سنی جیسے سنی ہی نہ ہو۔ صفدر نے اپنی اطلاع دہرائی تو وہ بولا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے میں پرستان ٹی وی اسٹیشن سے ایک نیوز ریڈر کی زبانی خبریں سن رہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ آج رات کوئی بھلا مانس شخص سانپ کے کاٹنے سے نہیں مر سکتا۔ یہ خصوصی رعایت آج رات نو بجے سے صبح

سات بجے تک ہے۔ لہٰذا آپ سب کو بھی مشورہ ہے کہ اس خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھائیں اور خود کو سانپ ڈسوانے کا تجربہ کر لیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ بھلے مانس آدمی ہوں۔"

"سائیں' بات کو مذاق میں مت ٹالو۔" صفدر نے کہا "میں بہت سنجیدہ ہوں' شاہ جہاں صاحب کو واقعی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ اسے واقعی سانپ نے کاٹا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے کچھ نہیں ہو گا اگر پھر بھی تم لوگوں کو خطرہ ہے تو میں پرستان سے "زہر چوسنی" کو بلا لیتا ہوں۔"

"یہ زہر چوسنی کون ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"یہ ایک پری ہے۔ بڑی کافر ادا ہے۔ زہریلے سے زہریلے جن یا انسان کے ساتھ سو جائے تو اس کا سارا زہر چوس کر اسے بھلا چنگا کر دیتی ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ اس کے ساتھ سونا پڑتا ہے۔"

"مگر۔۔۔"

"مگر کچھ نہیں۔" سائیں نے صفدر کی بات کاٹی "شاید تمہارا خیال ہو گا کہ وہ کوئی بدصورت پری ہے۔ پریاں بھی بے شک بدصورت ہوتی ہیں لیکن یہ ایسی پری نہیں۔۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم خود دیکھ لو۔" سائیں نے فوراً سے پہلے تالی بجائی۔ ایک دیوار کی اوٹ سے ایک حسین لڑکی ہیجان خیز لباس میں نمودار ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں نے اپنے اس ڈیرے پر..... ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لڑکی اور نوجوان جمع کر رکھے ہیں۔ یہاں ہر چہرا اپنی مثال آپ نظر آتا تھا' یہاں تک کہ راتفل بردار گارڈز بھی نک سک سے بالکل درست تھے۔

سائیں نے لڑکی کے ہیجان خیز سراپا۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ پری جس کا نام زہر چوسنی ہے۔ شاید تم لوگ حیران ہو رہے ہو کہ یہ تو پری زاد نہیں بلکہ آدم زاد ہے۔ تو بات یہ ہے دوستو کہ یہاں تمہیں جتنے بھی لوگ نظر آ رہے ہیں وہ آدم زادوں کی شکل میں ہیں لیکن آدم زاد نہیں۔ ہو ہو ہا ہا۔"

سائیں عالی بے پر کی اُڑا رہا تھا اور ہم اب اس کی باتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو سائیں کی مزید باتیں بھی سنی جا سکتی تھیں' لیکن یہ نازک وقت تھا۔ مجھے جلد از جلد ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ سائیں کو نظرانداز کرتے ہوئے میں الاؤ کے پاس چلا گیا۔ یہاں مجھے اور صفدر وغیرہ کو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک غریب صورت سیاہ فام

ایک ہاور نما دری پر نیم دراز تھا۔ اس نے کھنڈر کی ایک دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سیاہ فام کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ۔۔۔ سخت مشقت کر کے پیٹ پالنے والا شخص ہے' لیکن اس وقت اس شخص کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ایک خوب صورت انگلش لڑکی اس شخص کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کام کسی مجبوری یا جبر کے تحت نہیں کر رہی بلکہ خوشی سے کر رہی ہے۔ لڑکی کی عمر بائیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ اس نے گرمیوں کا مختصر لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بالکل سنہری بال جو کافی لمبے تھے' حبشی کے پیٹ اور ٹانگوں سے چھو رہے تھے۔ ہمیں آگ کی طرف آتے دیکھ کر حبشی اور اس کی ساتھی لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور کچھ دور ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

سردار بوغات نے مجھے لیٹنے کی ہدایت کی۔ میری زخمی ٹانگ گھٹنے پر سے موڑ کر اوپر اٹھا دی گئی۔ سردار بوغات نے ایک تیز دھار چھری آگ میں تپانے کا حکم دیا۔ کپڑے کی ایک بڑی سی پٹی منگوائی گئی اور ایک حبشی نے زخم پر لگانے کے لیے کسی سفوف کی ایک پوٹلی بھی فراہم کر دی۔ لگتا تھا کہ سردار بوغات زیادہ چیر پھاڑ کرنے والا ہے۔ غالباً وہ ٹخنے سے اوپر پنڈلی پر آٹھ دس انچ لمبا کٹ لگانا چاہتا تھا۔

سائیں عالی بھی کچھ فاصلے پر کھڑا طائرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ اچانک اس نے حلق سے "حق ہو" کا زوردار نعرہ بلند کیا اور اپنی مالائیں اور گھنٹیاں کھڑکھڑاتا ہوا میری طرف آ گیا۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔" وہ دونوں ہاتھ ہلا کر بولا "اس جگہ پر خون مت گراؤ۔ یہ بڑی خاص جگہ ہے۔ یہاں شاہ جنات کی خالہ کے بیٹے کا پھوپھا چلہ کاٹا کرتا ہے' وہ ایک ہی بار میں تمہاری سات نسلوں کو چاٹ جائے گا۔۔۔ اور میرا بھی خانہ خراب کرے گا۔ ٹھہرو۔۔۔ اگر تمہیں زیادہ ہی پریشانی ہے تو میں اسے دوا دے دیتا ہوں۔ اگر اس کے اندر سانپ کا تھوڑا بہت زہر موجود بھی ہے تو وہ بالکل صاف ہو جائے گا' بلکہ صفا چٹ ہو جائے گا۔"

پروفیسر نے کہا "سائیں صاحب! تھوڑی بہت طب میں بھی جانتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے۔ زخم کی رنگت بتا رہی ہے کہ سانپ کا زہر خطرناک اور تیز اثر ہے۔ اگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" سائیں عالی تڑخ کر بولا "میں

تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔ شفیع محمد کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"یہ شفیع محمد کون ہے؟" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سائیں' شاہ جہاں صاحب کو ہی شفیع محمد کہتا ہے۔" صفدر نے سرگوشی میں پروفیسر کو بتایا۔

سائیں عالی بے حد پر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی سیاہ گودڑی کے اندر کہیں ہاتھ ڈالا اور چند سیکنڈ بعد ایک چھوٹی سی شیشی برآمد کرلی۔ اس نے چند بار شیشی کو ہلایا پھر آلتی پالتی مار کر میرے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا میلا کچیلا ہاتھ بڑی نرمی سے میرے زخم کے ارد گرد پھیرا اور مجھے تسلی دی۔

پروفیسر نے کہا "اس شیشی میں کیا ہے سائیں جی؟"

"دنیا کا بہترین تریاق۔ تم اسے آب حیات بھی کہہ سکتے ہو۔ کوہ قاف میں یہ عام ملتا ہے۔ وہاں کسی کو اس کی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ جنوں کی عمریں تو ویسے ہی پانچ پانچ چھ چھ ہزار سال ہوتی ہیں۔ کئی جن تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دودھ کے دانت ہی سو سال بعد نکلتے ہیں' دو ڈھائی سو برس میں وہ بیٹھنا شروع کرتے ہیں اور پاؤں پاؤں چلنے میں انہیں تین چار سو سال لگ جاتے ہیں۔" سائیں پھر بے پر کی اڑانے لگا تھا۔

صفدر نے کہا "اگر تمہارے اس تریاق نے اثر نہ کیا تو؟"

سائیں نے فوراً ایک بڑی قسم کھائی اور بولا "میں اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنا سر کٹوا دوں گا۔"

اس نے بڑے اعتماد سے شیشی کا ڈھکن کھولا۔ چند قطرے بڑی احتیاط سے ایک پیالے میں ڈالے۔ اس میں چند گھونٹ پانی ملایا اور مجھ سے کہا "پی جاؤ پیارے شفیع محمد۔"

میں ذرا جھجکا۔ سائیں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کیا پلا دیتا مگر اس کا اعتماد دیکھتے ہوئے کچھ ذہن بن بھی رہا تھا۔ ذرا سا پانی میں نے چکھا۔ وہ بے ذائقہ اور بے ضرر ہی محسوس ہو رہا تھا۔ حوصلہ کر کے میں نے وہ چند گھونٹ پی لیے۔

سائیں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "بس اتنی سی بات تھی شہزادے! اب تم بھلے چنگے ہو۔ جاؤ' موج اڑاؤ' کھیلو کودو۔"

میں سائیں کے مشورے کو نظر انداز کر کے وہاں لیٹا رہا۔ صفدر' ویرا اور پروفیسر کے چہروں پر شعلوں کا رنگ منعکس ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی میرے لیے پریشان نظر آتے تھے میرے سر پر صاف آسمان تھا' چاند میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور ہزاروں لاکھوں ٹمٹماتے ستارے سارے کے سارے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ بھی میرا اور سائیں عالی کی دوا کی تاثیر دیکھنا چاہتے ہوں۔ سائیں ایک عجوبہ تھا اور اس سے انہونیاں سرزد ہوتی رہتی تھیں' کیا خبر تھی کہ وہ پھر کوئی مشکل کام کر گزرتا۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا کب دھیرے دھیرے ویرا' صفدر اور پروفیسر وغیرہ کے چہرے میری نگاہوں میں دھندلا گئے اور میں اپنے ماحول کے ساتھ ساتھ ارد گرد کی ہر شے سے بے خبر ہوگیا۔

آنکھ کھلی تو ارد گرد کی ہر شے روشن تھی۔ سورج افق پر بلند ہو چکا تھا۔ پروفیسر نے مجھے اٹھایا تاکہ میں دھوپ سے اٹھ کر سایہ دار جگہ پر چلا جاؤں۔ میرے ٹخنے پر پٹی بندھی ہوئی تھی' ارد گرد کی جلد سرخ تھی تاہم زیادہ تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود پروفیسر نے مجھے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ چلا کر ایک سایہ دار جگہ پر لے آیا۔ میں نے یہاں کئی سفید فام اور سیاہ فام مرد و زن دیکھے۔ ایک منظر دیکھ کر ایک بار پھر حیرت کا شدید احساس ہوا۔ بہت سے سفید فام جنہوں نے صرف نیکریں اور ہیٹ پہن رکھے تھے ایک جگہ تعمیر کے کام میں معروف تھے۔ وہ ایک کھنڈر کو دوبارہ سے ایک مکان کی شکل دے رہے تھے۔ میں نے ایک عمر رسیدہ سیاہ فام کو بھی دیکھا جو انگریز ورکروں کی نگرانی کر رہا تھا۔ "یہ سب کیا ہے؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"اسے گورکھ دھندا ہی کہنا چاہیے کیونکہ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔"

"سائیں عالی کہاں ہے؟"

"ابھی گلے میں نوٹوں کی گڈیاں لٹکائے یہاں گھوم رہا تھا۔ اب پتا نہیں کدھر ہے۔"

"اور صفدر' ویرا؟"

"وہ دونوں سو رہے ہیں۔ سائیں نے انہیں رات کا باقی حصہ گزارنے کے لیے کھنڈر کے اندر جگہ دی تھی۔ سردار بوغات بھی ان کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں ہے۔"

ایک جگہ تھوڑا سا خون بکھرا ہوا تھا اور ایک ٹوٹے ہوئے شکستہ ستون کے ساتھ رسی لپٹی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس ستون کے ساتھ ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کو باندھا گیا تھا۔ میں نے پروفیسر سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولا "وہ خبیث گارڈ اتنا ڈھیٹ شخص نکلا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

میں سمجھ گیا کہ پروفیسر اس گارڈ کی بات کر رہا ہے جسے ہم بستی سے پکڑ کر اپنے ساتھ لائے ہیں۔ "کیوں کیا ہوا؟" میں نے

پروفیسر سے پوچھا۔

پروفیسر نے بتایا "ایک لارسی کمان دار بھی اس جگہ موجود ہے۔ وہ اس گارڈ سے کنگ کے ارادوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن گارڈ نے جانوروں کی طرح مار کھانے کے باوجود ایک لفظ بول کر نہیں دیا۔ اس کے علاوہ دلیری دیکھو کہ اس نے دو مرتبہ کمان دار کے منہ پر تھوکا اور اسے رذیل غلام قرار دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کمان دار نے اسے اس ستون کے ساتھ باندھوا کر بری طرح مارا ہے لیکن اسے بے ہوش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔"

"ہو سکتا ہے کہ ٹرسٹ میں ان لوگوں کو اس قسم کے حالات سے گزرنے کی خاص ٹریننگ دی جاتی ہو۔ اس سے پہلے بھی ایک ایسے ہی ڈھیٹ گارڈ سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگتا ہے کہ لوہے کے بنے ہوئے لوگ ہیں۔" پروفیسر نے تبصرہ کیا۔

"اب وہ کہاں ہے؟"

"اسے سردار بوغات نے اپنے پاس بلوایا ہے۔ شاید وہ اپنے انداز میں کچھ پوچھے گا۔"

ابھی پروفیسر کی بات منہ ہی میں تھی کہ وہی گارڈ نظر آیا۔ اسے دو حبشی سہارا دیے کر لا رہے تھے۔ اس کا منہ سر سوجا ہوا تھا اور نچلا ہونٹ کٹ کر اونٹ کے ہونٹ کی طرح لٹک گیا تھا۔ یقیناً یہ سب اس تشدد کا نتیجہ تھا جو اس گارڈ کی دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی کے جواب میں کیا گیا تھا۔ دونوں افراد زخمی گارڈ کو سہارا دے کر کھنڈر کے عقبی حصے کی طرف لے گئے۔ غالباً اس سے مزید پوچھ گچھ کی جانے والی تھی۔

دو چار منٹ بعد صفدر اور ویرا اپنی عارضی قیام گاہ کی طرف سے برآمد ہوئے۔ وہ میرے حوالے سے تشویش میں مبتلا تھے۔ خاص طور سے ویرا بہت فکر مند نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور اپنے انداز میں خدا کا شکر ادا کیا۔ صفدر نے بھی میرا حال چال پوچھا۔ صفدر کی آنکھیں ہر وقت سوجی سوجی رہتی تھیں' یہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی کا نتیجہ تھا۔

میں نے صفدر سے پوچھا کہ ٹرسٹ سے پکڑے جانے والے گارڈ کو ابھی کھنڈر کے عقبی حصے کی طرف لے جایا گیا ہے۔ کیا اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے؟

صفدر نے کہا "ہاں جی۔ پوچھ گچھ ہو رہی ہے' اور وہ کم بخت یوں بول رہا تھا جیسے ٹیپ ریکارڈر بولتا ہے۔ کمان دار کی ہر بات کا جواب فر فر دے رہا ہے۔" پھر صفدر نے ذرا توقف کیا اور بولا "ویسے شاہ جہاں صاحب! سردار بوغات کی عجیب و غریب شخصیت کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہے اس کے اندر جو انسان اور جانور کے ذہن کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ اس کا یہ کرشمہ جیپ میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے سانپ کو نظروں نظروں سے مفلوج کر دیا تھا۔ شاید اب کچھ ایسا ہی اس ڈھیٹ گارڈ کے ساتھ ہوا ہے۔"

سردار بوغات کی آنکھوں کی پراسرار قوت پر بحث مباحثہ کرنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ میں اس قوت سے انکاری نہیں تھا اور اس قوت کے کئی مظاہر میں اپنی آنکھوں سے گلگت کی وادی موت میں ملاحظہ کر چکا تھا۔ بہر طور میں نے صفدر سے پوچھا کہ گارڈ نے کیا کچھ بتایا ہے۔ صفدر بولا "سب کچھ تو میں بھی نہیں سن سکا۔ جو کچھ سنا ہے اس سے بس یہی پتا چلا ہے کہ مائیکل والے واقعے کے بعد ٹرسٹ والوں نے آس پاس کی بستیوں میں خوب تباہی مچائی ہے۔ ایک بستی میں تو درجنوں لوگ مارے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو پکڑ کر ٹرسٹ والے اپنے ساتھ لے گئے ہیں ان کا شمار ہی نہیں۔ مقامی پولیس بھی ٹرسٹ والوں کے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہے اور ان بستیوں کے بے آسرا لوگوں کو فسادی قرار دے رہی ہے۔ خاص طور سے لارسیوں پر زیادہ الزام لگائے جا رہے ہیں۔"

"لارسیوں پر کیوں؟"

"اس کی وجہ ویرا ہے۔ ٹرسٹ والے بلا جھجک اعلان کر رہے ہیں کہ ویرا کو لارسیوں نے اغوا کیا ہے اور اسے جبس بے جا میں رکھا گیا ہے۔ پولیس بھی اس بات پر یقین کر رہی ہے۔ اب ٹرسٹ والوں کی منصوبہ بندی ہے کہ ویرا کی تلاش کا کام دو چار دن کے لیے بالکل روک دیا جائے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم پر خوف کم ہو اور ہم اپنی پناہ گاہ چھوڑ کر اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں۔"

صفدر کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ٹرسٹ کا گارڈ واقعی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہا ہے۔ میرے ذہن میں آئی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ سوال کئی دنوں سے ہمارے ذہنوں میں گردش کر رہا تھا کہ ٹرسٹ والے مجھے اور صفدر کو اب بھی وفادار سمجھ رہے ہیں یا نہیں؟ میری سمجھ میں تو یہی بات آئی تھی کہ اگر کسی نے مجھے مائیکل کے ساتھ جنگ و جدل کرتے نہیں دیکھا تو پھر اس بات کا امکان موجود ہے کہ ہمیں اب بھی کنگ براؤن کا وفادار ہی سمجھا جا رہا ہو۔ بہر حال ٹرسٹ کے گرفتار شدہ گارڈ سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی

تھی۔

میں نے ویرا کو ساتھ لیا اور اس کوٹھڑی میں پہنچ گیا جہاں لارسی کمان دار زخمی گارڈ سے سوال جواب کر رہا تھا۔ گارڈ زمین پر بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں خوابیدہ تھیں۔ یقین یہی لگتا تھا کہ اسے نشہ وغیرہ پلایا گیا ہے۔ یہ کمان دار کسی حد تک مجھے اور صفدر کو جانتا تھا۔ اب چونکہ ویرا میرے دوست کی بیوی بھی بن چکی تھی لہٰذا لارسیوں پر میرا احترام واجب ہو چکا تھا۔ لارسی کمان دار اپنی جگہ سے باقاعدہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے جھک کر ویرا کو تعظیم پیش کی۔ ویرا جو نہ صرف حسین کی ملکہ تھی بلکہ اس لحاظ سے لارسیوں کے لیے بھی ملکہ تھی کہ وہ بوکارلو کی بھتیجی تھی۔ یہ حسین و فطین لڑکی صفدر کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی اور ٹرسٹ کے عشرت کدے سے نکل کر صحراؤں کی خاک چھان رہی تھی۔ زخمی گارڈ بھی ویرا سے بے حد مرعوب نظر آ رہا تھا۔ میں نے ویرا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ خود گارڈ کا انٹرویو لے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ کنگ براؤن اور اس کے حواری میرے اور صفدر کے بارے میں کس انداز سے سوچ رہے ہیں۔

ویرا نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ اس نے گارڈ سے جو سوالات کیے ان سے اس کی خداداد ذہانت اور قابلیت کا پتہ چلتا تھا۔ قریباً دس منٹ کے اندر اس نے گارڈ سے تمام مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں۔ یہ کافی زیادہ معلومات تھیں تاہم ان میں ہمارے مطلب کی جو چند باتیں تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

"میرے اور صفدر کے بارے میں ٹرسٹ کے کرتا دھرتا ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ ہم نے ٹرسٹ سے غداری نہیں کی اور نہ ہی ہم کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے چار ساتھی ابھی تک ٹرسٹ کی تحویل میں ہیں اور ان کی حیثیت یرغمالیوں کی سی ہے۔ یہی سمجھا جا رہا تھا کہ ہماری کسی غلطی کے سبب لارسیوں کی بستی میں ہمارا راز کھل گیا ہے اور وہ ٹرانس میٹر لارسیوں کے قبضے میں آ گیا ہے جسے جوتے میں چھپایا گیا تھا۔ صفدر کے ساتھ ویرا کی شادی میں بھی صفدر کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا رہا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ یہ سب ویرا کے دماغ کا فتور تھا جسے بوکارلو کے سبب بڑھاوا ملا اور بوکارلو نے ویرا کی شادی ایک کم تر شخص سے کر کے اپنے بڑے بھائی کنگ سے بدلا لینا چاہا۔"

جو کچھ یہ گارڈ بتا رہا تھا اس لحاظ سے تو صورت حال اب بھی ہمارے حق میں تھی۔ دوسرے الفاظ میں صفدر نے ٹرسٹ سے جو سنگین بغاوت کی تھی وہ ابھی تک طشت از بام نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہ امید بھی کی جا سکتی تھی کہ ٹرسٹ میں موجود ہمارے ساتھیوں کی مشکلات میں مزید اضافہ نہیں ہوا ہو گا۔ ابھی میں اور ویرا گارڈ سے مزید معلومات چاہ رہے تھے لیکن اچانک ہم چونک گئے۔ کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بڑی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سائیں عالی کا پرجوش نعرہ "حق ہُو، حق ہُو" سنائی دیا۔ میں اور ویرا باہر نکل آئے۔ ایک شان دار قسم کا لوڈر کھڑا تھا اور سائیں عالی اس کے ارد گرد دھمال ڈال رہا تھا۔ سائیں کی اچھل کود کے ساتھ وہ ہزاروں ڈالر کے نوٹوں کی گڈیاں بھی اچھل رہی تھیں جو اس نے گلے میں ڈال رکھی تھیں۔ چند لمحے بعد لوڈر کا دروازہ کھلا اور موٹر اسرار سائیں عالی کا جنونانہ رقص بھی تھم گیا۔ اندر سے قریباً ایک درجن خوب رو انگریز لڑکیاں اور نوجوان مرد برآمد ہوئے۔ وہ حیران حیران نظروں سے ارد گرد دیکھ رہے تھے خاص طور سے سائیں عالی کا حلیہ انہیں الجھن میں ڈال رہا تھا۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص بھی لوڈر سے برآمد ہوا۔ اس کا گنجا سر انڈے کی طرح صاف شفاف تھا۔ حلیے سے یہ شخص انڈین لگتا تھا۔ اس شخص نے بڑے ادب سے جھک کر سائیں کو تعظیم پیش کی اور شستہ اردو میں بولا "لوگ حاضر ہیں جناب! دو کے سوا ان سب کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔ دو امریکن ہیں۔"

"ان کو ملازمت کی شرائط بتا دی گئی ہیں؟" سائیں نے شان بے نیازی سے پوچھا۔

"جی سر۔" انڈین نے احترام سے دوہرا ہوتے ہوئے کہا۔

"کسی کو کسی طرح کا کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"بالکل نہیں سر۔ معاہدے پر دستخط کرا لیے گئے ہیں۔"

"ویری گڈ گو نگلو۔ ویری گڈ۔" سائیں نے اپنا گرد سے اٹا ہوا سر اوپر نیچے ہلایا اور اپنے ہار میں سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی علیحدہ کر کے گنجے کی طرف اچھال دی جسے اس نے چابک دستی سے کیچ کر لیا۔ نوٹ لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا سر بے حد احترام سے سائیں کے حضور جھکایا۔ اس کی شفاف کھوپڑی سورج کی روشنی میں چمکنے لگی۔

نئے آنے والے تمام افراد ایک قطار میں کھڑے تھے۔ سائیں نے ناقدانہ نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ نہایت سرخ ہونٹوں والی ایک خوب صورت انگریز لڑکی کے قریب جا کر وہ چند سیکنڈ تک بغور اسے دیکھتا رہا، اپنے میلے کچیلے ہاتھ سے اس کا بالائی ہونٹ اوپر اٹھایا اور اس کے دانت دیکھے، اس کی خوب صورت ناک اٹھا کر اس کے نتھنے ملاحظہ کیے، اس

کے کان دیکھے، بالکل جیسے کوئی جانور خریدتے ہوئے اس کا معائنہ کیا جاتا ہے، پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد دو نوجوانوں کا بھی سائیں نے ایسے ہی انداز میں معائنہ کیا۔ اس معائنے کے بعد وہ شان بے نیازی سے آگے بڑھ گیا اور ٹہلتا ہوا اس قطعۂ اراضی کی طرف نکل گیا جہاں سفید فام حضرات ٹکریں اور ہیٹ پہنے تعمیر کے کام میں مصروف تھے۔ وہ قریباً ایک کینال کے رقبے میں ایک عام سی عمارت بنانے میں مصروف تھے۔ ویرا نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس عام سی تعمیر کے لیے سائیں عالی نے نہایت مہنگے انگریز انجینئروں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں اور انہیں سیکڑوں ڈالر روزانہ کے حساب سے معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ بات تو ناقابل یقین تھی مگر سائیں عالی کے حوالے سے کچھ بھی ناقابل یقین نہیں تھا۔ یہ سارا گورکھ دھندا ہی پر اسرار تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جو کچھ ہمارے ارد گرد ہو رہا تھا، اس میں بے شمار پر اسرار پہلو موجود تھے، ہم نے کل رات گاؤں میں ایک خوفناک قتل عام دیکھا تھا، اس قتل عام میں لارسی سردار بالکل محفوظ رہا تھا، حالانکہ جس حجرے میں وہ موجود تھا، وہاں دیواروں پر گولیوں کے بیسیوں سوراخ موجود تھے۔ وہ منظر انتہائی حیرت انگیز ہونے کے باوجود ایک ٹھوس حقیقت تھا۔ اس کے بعد ہم نے جیپ میں سردار بوغات کے .... حوالے سے ایک اور تعجب خیز واقعہ ملاحظہ کیا تھا، یہ واقعہ بھی ذہن پر نقش ہو جانے والا تھا۔ ایک بے حد زہریلا سانپ ویرا کی گود میں آ بیٹھا تھا، سردار بوغات نے اپنے پر اسرار عمل سے اس سانپ کو بے ضرر بنا ڈالا تھا اور پھر جیپ سے باہر پھینک دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے ٹرسٹ کے ایک نہایت سخت جان اور وحشت گارڈ کو فرفر بولتے دیکھا تھا، اسے بھی سردار کی کرامات قرار دیا جا سکتا تھا۔ سردار بوغات کے علاوہ سائیں عالی کے حوالے سے بھی ہمیں ناقابل فہم حالات کا تجربہ ہو رہا تھا۔ سائیں عالی نے یہاں کئی یورپین مرد و زن کو اپنے ڈالروں کے زور سے اکٹھا کر رکھا تھا اور انہیں عجیب و غریب کاموں پر لگانے کا تجربہ کر رہا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ یہ ڈالر اس کے پاس کہاں سے آئے ہیں اور وہ ان ڈالروں کو یوں کیوں خرچ کر رہا ہے۔

ویرا کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بولی "کل رات کے سانپوں کا معما حل ہو گیا ہے شاہ جہاں صاحب۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ سانپ جنگل سے نہیں بلکہ گاؤں کے اندر سے ہی آئے تھے۔" ویرا نے کہا پھر اپنے پاس کھڑے ایک مدقوق بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "یہ بندہ ان چند خوش نصیبوں میں شامل ہے، جو کل رات جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ علاقے کا ایک نہایت تجربہ کار اور جانا پہچانا سپیرا ہے۔ وہ سیکڑوں سانپ اسی کی ملکیت تھے۔"

غم زدہ صورت والے بوڑھے نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کی۔

ویرا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی "جب کل رات جھونپڑوں کو آگ لگی تو ان تین کوٹھڑیوں تک بھی پہنچ گئی جہاں اس شخص نے سانپ رکھے ہوئے تھے۔ اس خوف سے کہ سانپ اندر ہی جل کر راکھ نہ ہو جائیں یہ شخص گاؤں سے بھاگتے وقت ان کوٹھڑیوں کو کھول گیا تھا۔ جوں جوں سانپوں کو حرارت پہنچی اور دھوئیں سے ان کا دم گھٹنا شروع ہوا، وہ اپنی جگہوں سے نکلے اور رینگتے ہوئے گاؤں میں اور ارد گرد کی جھاڑیوں میں پھیلنے لگے۔ ایسے ہی دو سانپ بعد ازاں ہماری جیپ تک بھی پہنچ گئے تھے۔"

میں نے اپنے پاؤں سے پٹی ہٹا کر بوڑھے سپیرے کو اپنا زخم دکھایا اور ویرا سے کہا "اس سے پوچھو کہ یہ کس قسم کے سانپ کا زخم ہے۔"

وہ بولی "آپ کے کہنے سے پہلے ہی میں نے اس سے پوچھ لیا ہے، یہ سخت حیرت زدہ ہے اور بار بار کہہ رہا ہے کہ گول جسم والے سیاہ سانپ کا ڈنک کھا کر جاں بر ہو جانا کسی انہونی سے کم نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ صرف دیوتاؤں کی کرم نوازی ہے۔"

بوڑھے کی بات پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، اسے ضرورت بھی کیا تھی اس معاملے کی سنگینی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی۔ پھر کل رات میں نے خود ٹرسٹ کے گارڈ کو چند سیکنڈ کے اندر تڑپ کر جاں بلب ہوتے دیکھا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ ہٹ گیا۔ بالکل اچانک مجھے وہ پر اسرار سوئی یاد آ گئی تھی جو سائیں عالی کے "دست حیرت ناک" نے ایک روز میرے سینے میں چبھوئی تھی اور موقع سے بھاگ نکلا تھا۔ اس سوئی کے بارے میں سائیں عالی نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مجھے زہر کے اثر سے بچا سکتی ہے۔ اس دعوے کا ایک ثبوت مجھے چند ہفتے پہلے ٹرسٹ میں مل چکا تھا۔ کنگ براؤن کے بگڑے ہوئے خطرناک بیٹے اسٹی نے میرے دودھ میں زہر ملا دیا تھا، میں حیرت انگیز طور پر اس زہر کے اثر سے بچ گیا تھا۔ اب پھر اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہوا تھا۔ مجھے کل رات کا منظر یاد آیا۔ مجھے پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے

سب پریشان تھے مگر سائیں عالی بالکل بے فکر نظر آتا تھا۔ پھر جب اس نے دیکھا تھا کہ سردار یونانت میری پنڈلی پر چیرا لگانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ بیچ میں کود پڑا تھا اور اس نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ وہ مجھے چیرے وغیرہ کے بغیر ہی ٹھیک کرلے گا۔ اور اس کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔ یہ ساری باتیں بس ایک لمحے کے اندر میرے ذہن سے گزر گئیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" ویرا نے پوچھا۔

"بس ایک بات یاد آگئی تھی۔" میں نے ویرا کو ٹال دیا۔

بوڑھے سپیرے نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ویرا نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "یہ کہہ رہا ہے کہ آپ کو اپنی جان بچ جانے پر دیوتاؤں کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہیے اور ہر روز کم از کم دو بڑے مٹکے پانی پینا چاہیے تاکہ زہر کا جو تھوڑا بہت اثر رہ گیا ہو وہ بھی ختم ہوجائے۔"

میں نے اثبات میں سرہلا کر بوڑھے کو بتایا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔

اگلے روز موسم قدرے خوشگوار تھا' رات بھی ٹھنڈی ہی تھی۔ میں بہت دیر تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو دوپہر ہونے والی تھی لیکن نیند پھر بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر میں پھر سو گیا۔ شاید پچھلے کئی دن کی تھکن اتر رہی تھی یا پھر یہ اس زہر کی تاثیر تھی جو میرے جسم پر اثر کرتے کرتے رہ گیا تھا۔ شام کو اٹھا تو آس پاس قدرے رونق کے آثار نظر آئے۔ ایک جنریٹر چل رہا تھا جس کے سبب کھنڈرات روشنی سے جگمگا اٹھے تھے۔ ایک بڑے لوڈر سے کچھ سامان اتارا جارہا تھا۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ چند ریفریجریٹر تھے' دو بڑے ائرکنڈیشنر تھے' اس کے علاوہ صوفے' ٹیوب لائٹس' اوون' ٹیلی وژن اور نجانے کیا کچھ شامل تھا۔ اس ویرانے میں یہ لوازمات دیکھ کر جنگل میں منگل والا محاورہ آنوں آپ یاد آجاتا تھا۔ یہ سب سائیں ہی کے کرشمات تھے۔ پتا نہیں وہ یہاں کیا کرنے جارہا تھا۔ کھنڈرات کے وسط میں کل رات والی جگہ پر الاؤ پھر روشن ہوچکا تھا۔ دن بھر تو گرمی رہتی تھی مگر رات کو خنکی محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ آگ نہ صرف حرارت فراہم کرتی تھی بلکہ جنگلی جانوروں کے خطرے سے بھی محفوظ رکھتی تھی۔ اس آگ سے کھنڈرات کو ایک خواب ناک سا ماحول مل جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہاں سائیں عالی ایک دیوار کے سہارے بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد اور لوگ بھی موجود تھے۔ سائیں عالی کل رات والے حلیے میں ہی نظر آرہا تھا۔ میں الاؤ کی طرف بڑھا تو راستے میں ایک چبوترے پر سائیں عالی کا کتا نظر آیا۔ یہ عام سا آوارہ کتا تھا مگر اس وقت کتے کے بہت ٹھاٹ تھے۔ ایک گورا نوجوان بڑی محبت سے اس کے جسم پر تولیا پھیر رہا تھا۔ غالباً کچھ دیر پہلے اس نے کتے کو نہلایا تھا' اب اس کا جسم خشک کررہا تھا۔

میں الاؤ کے قریب پہنچا تو سائیں عالی کے آس پاس کئی حبشی مرد وزن نظر آئے۔ ان غریب صورت لوگوں کو سائیں نے اپنے برابر میں جگہ دے رکھی تھی۔ یہاں چند گورے افراد بھی موجود تھے۔ ویرا پہلے سے یہاں موجود تھی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بتایا کہ سائیں صاحب ایک لڑکی اور نوجوان کی شادی کررہے ہیں۔

"کون ہے لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دیکھیں۔۔۔ سائیں کے بائیں جانب جو تھی لڑکی۔" ویرا نے بتایا۔

"یہ خوب صورت گہرے سرخ ہونٹوں والی وہی انگریز لڑکی تھی جو کل صبح لوڈر سے اتری تھی اور سائیں نے اسے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اب وہ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔

"کس سے ہورہی ہے شادی؟"

ویرا نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا اور میں ششدر رہ گیا۔ میں بڑے غور سے اس شخص کی صورت دیکھتا چلا گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہورہا تھا۔ یہ ایک مسکین صورت اترپردیشی بردا تھا۔ اس کے سانولے سلونے چہرے پر منحوس چھڑی کی بوکو کے پرانے نشانات تھے۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ نرسٹ کا بے نوا قیدی تھا لیکن اب ایک رس بھرے سرخ سیب جیسی دلہن کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

یہ دلہن ہر لحاظ سے اپنے دلہا سے بہتر تھی۔ میں نے بڑی اچھی طرح شناخت کرلیا تھا اس کا دلہا اترپردیش وشوا تھا۔ یہی وہ نوجوان تھا جس نے ہرکولیس جہاز میں اسلم نامی پاکستانی کی دردناک موت دیکھ کر شور مچایا تھا اور حبشی گارڈز نے اس کی گردن ہینڈل کے شکنجے میں کس کر اس کا چہرہ بید کی چھڑی "بی بوکو" سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ آج وہی وشوا دلہا تھا اور ایک نئے روپ میں سامنے کھڑا تھا۔ دلہا نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو عام طور پر ہندوستانی دلہا پہنتا ہے۔ ایک ریشمی تہبند تھا اس کے اوپر کڑھائی دار کرتہ سا تھا۔ اوپر پگڑی تھی۔ دلہن سفید فام تھی مگر اس نے انڈین لباس ساڑی زیب تن کررکھی تھی۔ اس لباس میں وہ بیک وقت عجیب اور خوب صورت نظر آرہی تھی۔ یہ سب کچھ بہت عجیب تھا۔ پتا نہیں کہ وشوا نامی یہ شخص نرسٹ کی ناقابل عبور دیواروں سے نکل کر یہاں تک کیسے پہنچا تھا۔ اس حسین لڑکی سے اس کی

شادی بھی تعجب خیز تھی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک مسکین صورت حبشی کو ایک سفید فام دوشیزہ کے پہلو میں دیکھ چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سائیں عالی نے یہاں انوکھے سے انوکھا کام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ شاید وہ اس طبقاتی فرق کو بیلنس کرنا چاہ رہا تھا جو کنگ براؤن نے یہاں روا رکھا ہوا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سائیں عالی نے نرسٹ سے کچھ بردے خرید لیے ہوں۔۔۔ اگر ایسا تھا تو پھر تقریب کا دلہا بھی نرسٹ سے خرید کر ہی لایا گیا تھا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت مزید بڑھ گئی کہ سائیں عالی نے دلہا اور دلہن کو ازدواجی بندھن میں باندھنے کے لیے باقاعدہ ایک پنڈت نما شخص کا انتظام کیا ہوا ہے۔ لنگوٹی باندھے ہوئے یہ تنگ دھڑنگ شخص شکل وصورت سے ہندو ہی نظر آتا تھا۔ اس کے ماتھے پر سفید قشقہ تھا اور بالوں کی وہ لمبی لٹ بھی اس کے سر پر موجود تھی جسے بودی کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے مسکین شکل والے اچھوت دلہا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا' پھر اسے اور دلہن کو کھڑا کیا۔ دلہا کی چادر کے ساتھ دلہن کی اوڑھنی کو گرہ دی اور آگ کے گرد ان کو پھیرے لینے کے لیے کہا۔ دلہا دلہن آگے پیچھے آگ کے گرد چکرانے لگے۔ پنڈت نما شخص بلند آواز سے اشلوک پڑھنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ آگ پر کچھ پھینکتا بھی جارہا تھا۔ دلہا کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی بہت تھی۔ یقیناً یہ بات کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آئی ہوگی کہ وہ بھی ایک خوب صورت دلہن کا دلہا بنے گا۔ حسین وجمیل انگریز لڑکی تو کیا وہ کسی درمیانی ذات کی ہندو دلہن کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی تقدیر پر ازل سے ذلت اور پشیمانی کے گہرے سائے تھے۔ اپنے سے اونچی ذات کے ہم مذہبوں کی جوتیوں میں بیٹھنا' ان کی گالیاں سننا اور ماریں کھانا اس کا نصیب تھا لیکن آج قسمت اسے ایک ایسے موڑ پر لائی تھی کہ وہ حقیقت حال کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس پر یقین نہیں کرپارہا تھا۔

سات پھیرے پورے ہوئے اور دیگر رسومات ادا کرنے کے بعد اترپردیشی قیدی انگریز لڑکی کا دلہا بن گیا۔ پنڈت نے اترپردیشی کو ہدایت کی کہ وہ مقامی رواج کے مطابق اپنی دلہن کا بوسہ لے۔ دلہن دراز ہوگئی۔ اترپردیشی کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا دوسرا جاتا تھا۔ جو کچھ اسے ملا تھا وہ اس کی توقع سے بہت۔۔۔ بہت زیادہ تھا۔ وہ اسے اپنانے کا حوصلہ نہیں کرپارہا تھا۔ دلہن کے

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

فی جلد 150 روپے | ڈاک خرچ 40 روپے

◉ ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا

◉ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال

◉ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان

◉ پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

ناشر

الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور

اسٹاکسٹ

علی میاں پبلیکیشنز

پتہ: ۲۰ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414

ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے دلہا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دلہا بھی اس کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خوف اتنا زیادہ تھا کہ شوق کہیں دب کر رہ گیا تھا۔ صورت حال دیکھ کر سائیں عالی نے دلہا صاحب کو زوردار ڈانٹ پلائی "اوئے لومڑ کے! لگتا ہے کہ تجھے عزت راس نہیں ہے۔ اپنی چنی کی چھپی لیتا ہے یا ماروں جوتا تیرے سر پر؟"

اترپردیش تیدی بوکھلا کر رہ گیا۔ اس کا رنگ بالکل ہی اڑ گیا تھا۔ اس کی بے چارگی دیکھ کر سائیں کا لب ولہجہ ایک دم نرم ہو گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور پچکار کر بولا "میرے بچو گڑے! میرے بالز بچے! یہ رسم ہے یہاں کی۔ جب تک یہ رسم ادا نہیں کرے گا اپنی دلہن کے ساتھ اپنے "رین بسیرے" میں نہیں جاسکے گا۔"

اس نے اپنے گلے میں آویزاں نوٹوں کی ایک گڈی میں سے ایک نوٹ اتار کر اترپردیشی کی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور اس کی پیٹھ تھپکی۔ لرزتے کانپتے اترپردیشی نے جھک کر اپنی دلہن کا بوسہ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دلہن کا بوسہ لینے کے بعد اترپردیش کی غیر معمولی جھجک اور گھبراہٹ کم ہو گئی تھی۔ اس نے جیسے اپنی تقدیر کو چھو کر دیکھ لیا تھا۔ اسے وشواس ہو گیا تھا کہ دلہن کے لباس میں یہ خوب صورت جوان جسم اس کی پتنی کا ہے' اچھوت ہونے کے باوجود وہ' اسے چھو سکتا ہے' اسے اپنے ہونٹوں سے چوم سکتا ہے۔ اس احساس نے جیسے اس کے اندر مرے ہوئے حوصلے کو زندہ کر دیا تھا' اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں اب خوف دبنے اور شوق ابھرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب چند منٹ بعد پنڈت نے اترپردیشی سے کہا کہ وہ اپنی دلہن کو اٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے جائے تو اس نے زیادہ تردد نہیں کیا۔ جھک کر دلہن کو گود میں اٹھایا اور کھنڈر کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد محفل بتدریج برخاست ہونا شروع ہو گئی۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں صفدر اور ویرا بھی وہاں آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ غالباً یہ شادی دیکھ کر انہیں اپنی شادی یاد آ گئی تھی' جو چند روز پہلے انجام پائی تھی۔ میری طرح صفدر بھی حیرت سے کھنڈر میں جگمگاتے ہوئے برقی قمقمے دیکھ رہا تھا۔ لوازمات جو الیکٹرانکس کا سامان اتارا گیا تھا وہ بھی صفدر اور ویرا کی حیرت کا موجب تھا۔ فریج' ائرکنڈیشنرز' ٹی وی' اس لق ودق ویرانے میں یہ لوازمات جنگل میں منگل کی بالکل صحیح تفسیر پیش کر رہے تھے "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" ویرا اپنی چھوٹی سی ناک چڑھا کر حیرت سے بولی۔

"لگتا ہے کہ سائیں یہاں اپنا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرانا چاہ رہا ہے۔" صفدر بولا "مرنے سے پہلے اکثر لوگوں نے اپنے مقبرے تعمیر کروائے ہیں۔"

میں نے کہا "سائیں نے سن لیا تو وہ تمہاری نئی نئی شادی کی پروا کیے بغیر تمہیں کوہ قاف کی پولیس کے حوالے کر دے گا۔ اب ذرا سوچو' ایک تو پولیس والا ہوا اوپر سے جن ہو' وہ تمہارا کیا حشر نہ کر دے گا۔"

میری ایسی بات پر صفدر اکثر مسکرا دیا کرتا تھا لیکن وہ نہیں مسکرایا۔ ایک اجنبی سی سنجیدگی اس کے چہرے پر طاری رہی۔ ان دنوں اس کی ہر ادا نرالی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ صفدر ہے ہی نہیں۔ اس کے بھیس میں کوئی اور غیر مانوس بندہ ہے۔

میرے پاؤں کا زخم اب بہتر تھا۔ میں نے پٹی بھی اتار پھینکی تھی۔ ویرا بڑے دھیان سے میرے زخم کو دیکھ رہی تھی جب ایک مقامی حبشی وہاں آن کھڑا ہوا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ مجھے اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن ویرا کے لیے یہ زبان اجنبی نہیں تھی۔ وہ اس مقامی شخص سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے ویرا سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟

وہ بولی "اس کا نام صالح ہے۔ یہ اس شخص کا ملازم ہے جسے تم سائیں عالی کہتے ہو۔"

"یہ کیا کرتا ہے یہاں؟"

"یہ برتن وغیرہ دھوتا ہے۔ سائیں عالی کی طرف سے اس کام کے لیے اسے مقامی کرنسی میں جو ہفتہ وار تنخواہ ملتی ہے وہ ۵۰۰ امریکن ڈالر کے برابر ہے۔ یہ کہتا ہے کہ سائیں عالی یہاں موجود تمام ملازموں کو اسی طرح موٹی موٹی رقمیں دے رہا ہے۔ سب لوگ اس سے بہت خوش ہیں بلکہ بہت سے تو حیران بھی ہیں۔ شروع میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید سائیں کھسکا ہوا ہے مگر ایسی بات بھی نہیں پھر کچھ لوگوں نے سوچا کہ شاید یہ نوٹ جعلی ہیں مگر یہ اصلی نوٹ ہیں۔ اب سائیں نے اپنی اور اپنے ڈالروں کی حفاظت کے لیے بہت سے گارڈ بھی رکھ لیے ہیں۔ وہ ہر طرح ایک چاق و چوبند شخص نظر آتا ہے۔"

"مگر وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟" میں نے ویرا کے ذریعے صالح سے پوچھا۔

"یہ تو خود ہمیں بھی معلوم نہیں۔ ہم قریباً تین ہفتوں سے یہاں سائیں صاحب کے ساتھ ہیں۔ سائیں صاحب

یہاں کھنڈروں کی مرمت کروا رہے ہیں اور بہت سی مہنگی مہنگی چیزیں منگوا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ وہ یہاں لمبے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ اردگرد کے لوگوں میں بڑی تیزی سے مشہور ہو رہے ہیں۔ کچھ تو انہیں کوئی بہت پہنچا ہوا روحانی پیشوا سمجھنے لگے ہیں' بلکہ اب تو مجھے خود بھی یہی لگ رہا ہے کہ سائیں صاحب کرامات والے شخص ہیں۔"

"تم نے کیا کرامت دیکھی ہے سائیں میں؟" میں نے پوچھا۔

اس شخص نے بلا توقف میرے پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور بولا "میں نے یہ کرامت دیکھی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اس دن سائیں عالی نے آپ کو ایک دوا پلائی تھی اور کہا تھا کہ یہ تریاق آپ کے اندر سے سانپ کا زہر ختم کر دے گا۔ وہ تریاق نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ کیا تھا؟"

ویرا نے نفی میں جواب دیا۔

صالح انکشاف انگیز لہجے میں بولا "وہ بالکل سادہ پانی تھا۔ وہ پانی صرف دو تین منٹ پہلے میں نے سائیں کو دیا تھا تاکہ وہ اس پر کچھ پڑھ کر پھونک دے۔ مجھے کئی روز سے ملیریا کی شکایت تھی۔ سائیں نے ابھی اس پر کچھ بھی پھونکا نہیں تھا' وہ سادہ پانی تھا جو اس نے آپ کو پلایا اور آپ بھلے چنگے ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب کیا نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ویرا کے توسط سے بولا "یہ واقعی بہت زہریلے سانپ کا ڈنک تھا۔ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کے اندر بندہ ختم ہو جاتا ہے۔"

صالح نامی اس شخص کی باتیں سننے کے بعد میرا دھیان ایک بار پھر اپنے سینے کی سوئی کی طرف چلا گیا۔ اس سوئی میں یقیناً کوئی کرامات موجود تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو پھر دو مرتبہ مجھ پر خطرناک زہر بے اثر کیوں رہا تھا۔

اتنے میں پروفیسر اللہ دتا بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی کھنڈر میں جگمگاتے قمقموں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ کھنڈروں کی مرمت وغیرہ کا کام بجلی کی روشنی میں بھی جاری تھا۔ بہت سی دیواریں مکمل کرلی گئی تھیں اور اب ان پر چھت ڈالی جا رہی تھی۔ یہ سب کام سفید فام افراد کر رہے تھے اور وہ اچھے خاصے ٹیکنیکل لوگ لگتے تھے۔ ان سے کوئی پلازہ وغیرہ تعمیر کرایا جاتا یا کوئی جدید کالونی ڈیزائن کرائی جاتی تو بھی بات تھی۔ یہاں سائیں عالی نے انہیں خستہ حال دیواروں اور چھتوں کی مرمت پر لگایا ہوا تھا۔ شاید ان لوگوں کو اس طرح سخت گرمی میں اپنے لیے کام کرتے دیکھ کر سائیں عالی کی انا کو تسکین مل رہی تھی یا پھر شاید وہ یہ سب کچھ سیاہ فاموں کو خوش کرنے کے لیے کرا رہا تھا۔ سیاہ فام جو گوری چمڑی سے از حد خوف زدہ رہتے تھے' اب گوری چمڑی والوں کو اپنے لیے پسینہ بہاتے اور بوجھ اٹھاتے دیکھ رہے تھے۔ ان کی چند عورتیں بے حیثیت مقامی افراد کی بیویاں بنائی گئی تھیں اور ان کی خدمت کر رہی تھیں۔ اور یہ سارے کام بخوشی ہو رہے تھے۔ سائیں عالی کے پاس جو بے تحاشا نوٹ نظر آ رہے تھے یہ سب اسی کی کرامات تھیں۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ سائیں عالی اس طرح کیا حاصل کرنا چاہتا ہے یا کیا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ہاں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے افلاطونی ذہن میں کوئی گہرا منصوبہ ہے۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ اس روز میں نے ایک اہم کام کیا اور وہ یہ کہ رات کے اندھیرے میں اپنی "زخمی" جیپ تک پہنچا اور اس میں سے تین عدد رائفلیں مع ایمونیشن کے نکال لایا۔ بعد ازاں رائفلیں میں نے اپنی قیام گاہ کے قریب ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیں۔

اگلے روز دوپہر سے تھوڑی دیر قبل ایک بڑا ٹریلر بھی وہاں پہنچ گیا۔ سائیں عالی نے ہمیں بتایا کہ یہ ٹریلر ہمارے لیے ہے "ہمارے لیے کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب کے بچے' بس یہ تمہارے لیے ہے۔" سائیں پھنکار کر بولا۔

"کیا ہم اس کے اندر سوئیں گے؟"

"نہیں نہیں' سونا نہیں۔ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے' ہم یہاں کام کرنے کے لیے آئے ہیں سونے کے لیے نہیں۔" سائیں نے کہا۔

"کیا کام کرنے کے لیے؟"

"ہم یہاں ایک بہت بڑی لانڈری کھولیں گے جس میں جنات کے کپڑے ڈرائی کلین ہوں گے۔" سائیں پٹڑی سے اتر گیا "جنات بڑے بھلکڑ ہوتے ہیں' سیٹھوں کی طرح وہ اکثر اپنے کپڑوں میں بڑی قیمتی چیزیں بھول جاتے ہیں پھر میری طرح تم سب کے گلے میں نوٹوں کی ایسی ہی گڈیاں نظر آئیں گی' انشاء اللہ۔"

سائیں کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے صفدر نے ٹریلر کا دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ یہ ٹریلر اندر سے ایک چھوٹا موٹا اسپتال نظر آتا تھا۔ بہت سی ادویات اور ڈاکٹری آلات وغیرہ یہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ دواؤں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ایک بڑا ریفریجریٹر بھی تھا۔ سائیں عالی کی بے شمار دوسری کارروائیوں کی طرح یہ کارروائی بھی ہماری

سمجھ سے بالاتر تھی۔ ظاہر ہے کہ سائیں کے سارے کام تو بامعنی نہیں ہوتے تھے' بے شمار کام ایسے بھی تھے جو بظاہر رانگ پلاننگ تھے اور حقیقت میں بھی اوٹ پٹانگ ہی ثابت ہوتے تھے۔

کھنڈر میں آج ہمارا چوتھا دن تھا۔ یہ خطرہ بدستور موجود تھا کہ کنگ کے ہرکارے صفدر اور ویرا کو تلاش کرتے ہوئے کسی وقت یہاں پہنچ جائیں اور ان دونوں کے ساتھ پروفیسر اور میں بھی دھر لیے جائیں۔ صحرائی گاؤں میں تو پھر بھی زمین دوز پناہ گاہیں موجود تھیں' ہم یہاں کھلے عام پڑے تھے اور فورا ٹرسٹ کے گارڈز کی نگاہ میں آسکتے تھے۔

ہم اپنے اردگرد کے ماحول سے اب اچھی طرح روشناس ہوتے چلے جارہے تھے۔ یہاں سائیں عالی کے اسپیشل گارڈز اور ملازمین وغیرہ کی تعداد سو کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ سب لوگ سفید فام تھے' کچھ امریکن اور برٹش تھے' کچھ کا تعلق دیگر یورپی ممالک سے تھا۔ کم از کم چھ خوب صورت سفید فام خواتین کی شادیاں مقامی سیاہ فاموں سے کی گئی تھیں۔ ان سیاہ فاموں میں دو تو ٹرسٹ کے سابقہ قیدی تھے' باقی آس پاس کی بستیوں کے مفلوک الحال لوگ تھے۔ ایک جواں سال حبشی عورت کی شادی نیلی آنکھوں والے ایک خوب رو انگریز لڑکے سے بھی کی گئی تھی۔ سائیں عالی سفید فام کاریگروں کو گراں معاوضہ دے کر یہاں ان سے محنت مزدوری بھی کروا رہا تھا۔ زیادہ تر تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں یہاں ایک کالونی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ سب سے حیران کن سوال یہ تھا کہ سائیں کے پاس ایک دم اتنے ڈھیر سارے ڈالر اور پاؤنڈ وغیرہ کہاں سے آگئے ہیں۔ وہ اس پڑاؤ میں بڑے بھونڈے طریقے سے ان نوٹوں کی نمائش کرتا پھر رہا تھا۔ میں نے یہاں تک سنا تھا کہ اس نے ایک تھیلی میں بہت سے نوٹ بھرے ہوئے ہیں اور اس تھیلی کو سوتے وقت تکیے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ سب کچھ بہت خطرناک بھی تھا۔ اس کے اردگرد کے لوگ بھی اس کے دشمن ہوسکتے تھے۔ شاید اسے مسلح گارڈز پہ بھروسا تھا لیکن اگر مسلح گارڈز ہی کسی رات چپکے سے اس کی گردن کاٹ ڈالتے تو کیا ہوتا؟

سردار ربوغات کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا علاج یہاں بڑے اچھے طریقے سے ہونے لگا تھا۔ جو ٹریلر یہاں پہنچا تھا اس میں بہت سی دواؤں کے علاوہ دو ڈاکٹرز اور تین نرسیں بھی یہاں آئی تھیں۔ سردار ربوغات کے بازو پر باقاعدہ پلاسٹر چڑھایا گیا تھا اور اینٹی بائیوٹکس دوا بھی دی جارہی تھی۔ پروفیسر اللہ دتا نے بھی خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ میری مسلسل کوشش سے دو باتیں اس کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی بیٹی شائستہ واقعی زندہ سلامت ٹرسٹ میں موجود تھی اور دوسری یہ کہ ابھی وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر ابھی اسے یہ جدائی برداشت کرنا تھی۔ کھنڈرات میں پہلے تین کمرے تیار ہوئے تو سائیں عالی نے صفدر اور ویرا کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے ویرا کے گال پر ہاتھ پھیرا اور بولا "چل بہو رانی! تیرا گھونسلا تیار ہوگیا۔ تیری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تجھے زیادہ دیر تیرے میاں سے دور نہیں رکھنا چاہیے۔"

ویرا کے حسین چہرے پر لال گلابی رنگ بکھر گئے۔

پھر سائیں عالی نے اتر پردیش والا اور اس کی بنگالی دلہن کو پاس بلایا "چلو بھئی تم دونوں بھی اپنے گھونسلے میں تشریف لے جاؤ۔ تمہاری بھی نئی نئی شادی ہوئی ہے اور خبردار شرماتا رہنا بالکل نہیں۔" اس نے اتر پردیش کا کان مروڑتے ہوئے کہا "یہ گوری میم اب تمہاری پتنی ہے۔ بڑی محبت سے پتی پتنی کی طرح رہو۔ اگر کوئی شکایت ہو تو مجھے بتاؤ۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟"

اتر پردیش نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا "چلو میرے سامنے ہاتھ پکڑو اپنی پتنی کا۔" سائیں نے حکم صادر کیا۔

اتر پردیش نے ذرا سا جھجکنے کے بعد اپنے سیاہ کھردرے ہاتھ میں اپنی دلہن کا گلابی پھول جیسا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور بار بار اپنی بنارسی ساڑی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تیسرا کمرا سائیں نے اپنے لیے رکھا اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کیا۔ بولا "تیسرا کمرا میں خود رکھوں گا' کیونکہ کوہ قاف سے مہمان آتے ہیں تو انہیں بٹھانے میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ وہ دیکھو اس وقت بھی تین جن اس سامنے والی کھجور پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔" سائیں نے بڑے حقیقی انداز میں ایک کھجور کی طرف اشارہ کیا۔

ہم سب غیر ارادی طور پر کھجور کے درخت کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں بھلا کیا نظر آتا تھا۔

اچانک گاڑیوں کی آواز سنائی دی اور ہم سب بری طرح چونک گئے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ آخر وہی ہوا ہے جس کا اندیشہ تھا۔ یہ انہی جیپوں کی آواز تھی جو اس سے پہلے جھیل زار کی وسیع و عریض بستی میں اور پھر صحرائی گاؤں میں تباہی مچا چکی تھیں۔ اب یہ جیپیں سائیں عالی کے اس ڈیرے کے رخ پر آرہی تھیں۔ ہماری طرح بیشتر سیاہ فاموں کے چہروں پر بھی ہراس نظر آنے لگا تھا مگر سائیں عالی اپنی جگہ با اطمینان کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اور صفدر کو مخاطب کر کے کہا

"اوئے گھامڑو! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ یہ ٹریلر جو آیا ہے' تمہارے لیے ہے۔ تم چاروں اس میں گھس جاؤ' بلکہ اس حبشی سردار کو بھی بلالو۔" حبشی سردار سے سائیں کی مراد یقینا سردار ربوغات سے تھی۔ چاروں سے اس کی مراد میں' صفدر' ویرا اور پروفیسر تھے۔

جیپوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی' دور افق پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ یہ اچھلتی کودتی روشنیاں تباہی اور بربادی کی روشنیاں تھیں۔ ان روشنیوں کے ساتھ موت کے ہرکارے بھی ان کھنڈرات کی طرف آرہے تھے۔ سائیں نے ایک بار پھر ہمیں گھور کر دیکھا اور بولا "جاؤ اس ٹرالے میں گھس جاؤ۔"

سائیں کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔ ویسے بھی ہمارے پاس خود کو چھپانے کی اور کون سی جگہ تھی۔ میں نے پروفیسر اور صفدر کو اشارہ کیا اور ہم اس ٹریلر کی طرف بڑھے جسے یہاں سب لوگ موبائل کلینک کہنے لگے تھے۔ ویرا ابھی ہمارے ساتھ تھی۔ ٹریلر میں گھسنے سے پہلے میرے ذہن میں آیا کہ وہ تین رائفلیں ہمارے پاس ہونی چاہئیں جو میں نے کل جیپ سے نکالی تھیں۔ میں نے صفدر کو اپنے ساتھ لیا اور وہ تینوں رائفلیں مع ایمونیشن اٹھالایا۔ ہم ٹریلر یعنی موبائل کلینک میں گھسے تو ایک انگریز ڈاکٹر سامنے ہی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ انگریز نرس اس کی گود میں تھی اور وہ بوس و کنار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ جلدی سے علیحدہ ہوگئے۔

"کیا ہوا' خیریت تو ہے؟" ڈاکٹر نے شرمندہ ہوئے بغیر پوچھا۔

"خیریت ہوتی تو ہمیں یوں اچانک اندر نہ گھسنا پڑتا اور آپ کو یوں ایک دم اپنی ڈاکٹری ادھوری نہ چھوڑنی پڑتی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ بن بلائے مہمان یہاں آرہے ہیں۔" میں نے کہا "وہ نام بعد میں پوچھتے ہیں گولی پہلے مارتے ہیں۔ خاص طور سے وہ ہم چاروں سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ سائیں صاحب نے ہمیں ان کی محبت سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔"

"حالانکہ یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔" ویرا نے اضطراب میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر تیزی سے بولا "چھپنے کی جگہ کیوں نہیں۔ چھپنے کی جگہ ہے اور خاص طور سے آپ کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔"

"کون سی جگہ؟"

ڈاکٹر نے پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک چابی نکالی اور جہازی سائز کے ریفریجریٹر کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے دو ریکس میں بہت سی دوائیں نظر آرہی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک ریک دواؤں سمیت باہر نکال لیا۔ ہم دنگ رہ گئے۔ عقب میں ایک خلا موجود تھا۔ ہم رکوع کے بل جھک کر اس خلا میں داخل ہوسکتے تھے۔ ڈاکٹر نے اسٹائلش انگلش میں کہا "براہ مہربانی آپ اس خلا میں داخل ہوجائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہاں ہر بلا سے محفوظ رہیں گے۔"

"لیکن؟"

"گھبرائیں مت جناب' یہ سارا انتظام سائیں صاحب کے حکم پر ہی کیا گیا ہے۔ ان کا فرمان تھا کہ جلد یا بدیر آپ لوگوں کو اس پناہ گاہ کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

صورت حال اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی تھی۔ سائیں کی وہ بات میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ اس نے پرسوں روپہر کہا تھا کہ یہ ٹریلر ہمارے لیے ہے۔ یقینا اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ ٹریلر ہمیں پناہ دینے کے لیے ہے۔ سب سے پہلے میں خلا میں گیا۔ عقب میں ریفریجریٹر کی مشینری موجود تھی مگر وہ ریفریجریٹر کے ساتھ اٹیچ ہونے کے بجائے ایک طرف لوہے کی دیوار پر لگی ہوئی تھی' ٹریلر کی باہر والی دیوار کے ساتھ اتنی جگہ موجود تھی کہ ہم چاروں بہ آسانی وہاں کھڑے ہوسکتے تھے۔ میرے پیچھے صفدر' ویرا اور پروفیسر بھی اندر آگئے۔ رائفلیں ہم تینوں کے پاس موجود تھیں۔ ڈاکٹر نے دواؤں والا ریک واپس رکھا تو خلا میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ویرا کی ذری ذری سرگوشی سنائی دی مگر پھر فوراً یہ تاریک خلا ایک چھوٹے سے بلب کی روشنی سے منور ہوگیا۔ جیپوں کی آواز اب کھنڈرات میں پہنچ گئی تھی۔ میرے اور صفدر کے اندازے کے مطابق یہ تین چار جیپیں تھیں اور یہ تعداد ہمارے اندیشے سے خاصی کم تھی۔ جیپیں رک گئیں اور پھر ان کے انجن یکے بعد دیگرے خاموش ہوگئے۔

ہم اپنی جگہ دم سادھے کھڑے تھے۔ کوشش یہی تھی کہ ہماری طرف سے کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔ یہ خلا بمشکل ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا۔ اس میں ہم سیدھے کھڑے تو ہوسکتے تھے لیکن بیٹھنا ناممکن تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ سردار ربوغات ابھی تک اس پناہ گاہ میں نہیں آیا تھا۔ باہر سے مدھم آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک تو دیوہیکل جنریٹر کی آواز تھی جو ان کھنڈرات کو بجلی فراہم کر رہا تھا۔ دوسری آواز گفتگو کی

تھی۔ اس گفتگو میں کبھی کبھی سائیں عالی کا نعرۂ مستانہ "حق ہو" بھی سنائی دے جاتا تھا۔ اس نعرے کے سوا باقی کچھ بھی ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔

مجھے اپنے سر کے عین اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ دکھائی دیا۔ اس سوراخ کو ربر کی ایک ٹکیہ سے بند کردیا گیا تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو استعمال کیا اور بڑی آہستگی اور خاموشی کے ساتھ ربر کی اس ٹکیہ کو سوراخ میں سے نکال لیا۔ آوازیں اب ہمارے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ تھوڑی سی کوشش کرکے ہم اس گفتگو کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ گفتگو جیپ سواروں اور پیر فرتوت سائیں عالی کے مابین ہورہی تھی۔ ذریعہ گفتگو انگریزی تھا۔ سائیں عالی کسی انگلینڈ پلٹ کی طرح فرفر بول رہا تھا۔

اس گفتگو میں اس منیجر کی آواز بھی شامل تھی جو سائیں عالی کے لیے ملازم وغیرہ لے کر آتا تھا۔ اس انڈین منیجر کا نام اشوکا تھا۔ وہ غالباً ٹرسٹ والوں کو کچھ کاغذات دکھا رہا تھا۔ ان کاغذات کے مطابق یہاں موجود اتر پردیشی اور چند حبشی افراد کو ٹرسٹ سے باقاعدہ خرید لیا گیا تھا۔

ٹرسٹ کے گارڈز نے ان کاغذات کے حوالے سے کچھ سوالات کیے' جن کے اشوکا نے مناسب جواب دیے۔ اس سوال و جواب کے بعد گارڈز مطمئن ہوگئے۔ اس کے بعد بھاری آواز والے ایک شخص نے جو یقیناً گارڈز کا انچارج تھا یہاں موجود دو سفید فام لڑکیوں سے بات چیت کی۔ ان میں سے ایک وہی خوب رو دلہن تھی جو پانچ چھ روز قبل مسکین اتر پردیشی سے بہ رضا و رغبت بیاہی گئی تھی۔ گارڈز نے لڑکیوں سے پوچھا "کیا آپ لوگ یہاں اپنی مرضی سے موجود ہیں۔"

"بالکل' ہم باقاعدہ ایگریمنٹ کے ساتھ آئے ہیں' اور اپنی خوشی سے یہاں رہ رہے ہیں۔" ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"کیا آپ کی حیثیت یہاں ملازم کی ہے؟"

"جی ہاں۔" وشوا کی دلہن نے جواب دیا۔

"آپ کا کیا کام ہے؟"

"ہم سائیں صاحب کی خدمت کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہمارے ذمے کچن وغیرہ کا کام بھی ہے۔"

"اس سے پہلے آپ کیا کرتی تھیں۔" گارڈ نے دلہن سے پوچھا۔

"میں اٹلی میں تھی اور "روم" کے ایک شاپنگ سینٹر میں سیلز گرل تھی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر انچارج گارڈ نے کہا "آپ کی صورت ایک امریکن ماڈل گرل سے بہت ملتی ہے۔"

"بہت شکریہ۔" لڑکی نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

انچارج گارڈ بولا "سویٹ گرل! کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ روم کا آرام و آسائش چھوڑ کر آپ اس ویرانے میں کیوں چلی آئیں؟"

"پرکشش معاوضہ۔" لڑکی نے غالباً مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"ویسے آپ کے جسم پر یہ ہندوستانی لباس اچھا لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس لباس کا نام بھی کوئی اچھا سا ہوگا۔"

"جی ہاں اسے ہندوستان میں ساڑی کہتے ہیں۔"

"سا۔ ڑ۔ ی۔" گارڈ نے دہرایا۔

پھر اس کی نگاہ غالباً ٹریلر پر پڑگئی تھی۔ اس نے پوچھا "اس گاڑی میں کیا ہے؟"

"سائیں صاحب کا موبائل کلینک ہے۔" اشوکا نے جواب دیا "آس پاس کے دیہاتیوں کو علاج کی سہولت دینے کے لیے یہ یہاں موجود ہے۔"

گارڈ نے اس موبائل کلینک کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ٹریلر کا دروازہ کھلا اور بھاری قدموں کی دھمک سے فرش لرزنے لگا۔ یہ بڑے کٹھن لمحے تھے۔ رائفل کے دستے پر میری گرفت خود بخود مضبوط ہوگئی۔ ہم نے اپنے سانس تک روک رکھے تھے۔ ایک دو منٹ تک ٹریلر کے اندر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر سب لوگ باہر چلے گئے۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ گارڈز اشوکا سے گفتگو کرتے ہوئے ٹریلر سے دور چلے گئے تھے' لہٰذا ان کی آوازیں مدھم پڑگئیں اور پھر معدوم ہوگئیں۔ مجھے صرف ایک بات کا اندیشہ تھا' سردار بوغات ابھی تک باہر تھا۔ اس پر گارڈز کی نظر پڑجاتی تو سب کچھ چوپٹ ہوجاتا۔ اصولی طور پر اسے بھی اس ٹریلر کے اندر موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہم دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ جیپوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئے اور مصیبت ٹلنے کا اعلان ہو۔ آخر یہ انتظار ختم ہوا۔ جیپوں کے بھاری بھرکم دروازے کھلے' بند ہوئے پھر ان کے انجن یکے بعد دیگرے اسٹارٹ ہوئے اور وہ آہستہ آہستہ کھنڈر سے دور ہٹتی گئیں۔

تقریباً دس منٹ بعد فریج کے دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے

کہ یہ دوست کی آمد ہے یا دشمن کی۔ رائفل کے دستے پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ نکاسی کا راستہ کھلا اور حسب توقع ہمیں انگریز ڈاکٹر صاحب کا چہرہ دکھائی دیا جس پر ابھی تک لپ اسٹک کا ایک آدھ نشان موجود تھا۔ ہم باہر نکلے تو سائیں عالی' اشوکا اور دیگر افراد ٹریلر کے سامنے ہی موجود تھے۔ اشوکا کے صفاچٹ سر پر پسینہ تھا اور وہ سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے ہماری جانب غور سے دیکھا اور پوچھا "سردار بوغات کہاں ہے؟"

"وہ تو اندر نہیں تھا۔" صفدر نے جواب دیا۔

"ایں' تو پھر کہاں گیا؟" اشوکا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

دیگر افراد کے چہروں پر بھی حیرت نظر آنے لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ سردار بوغات اپنی قیام گاہ پر موجود نہیں۔ سب لوگوں نے یہی سمجھا تھا کہ سردار ہمارے ساتھ ہی ٹریلر میں داخل ہوا ہے۔

سردار کی تلاش شروع ہوئی۔ نو تعمیر شدہ کمروں کے علاوہ اردگرد کے کھنڈروں میں بھی دیکھا گیا مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ اسی دوران میں وہ درختوں کی طرف سے آتا دکھائی دیا وہ بڑی تمکنت سے چلا آرہا تھا۔ خبر نہیں کہ وہ کس وقت ان کھنڈرات سے نکل گیا تھا۔ وہ کوئی باقیود جسد اور پھرتیلا شخص نہیں تھا' آہستگی سے چلتا تھا' بڑے آرام سے اٹھتا بیٹھتا تھا پھر بھی وہ جب کبھی موقع سے اوجھل ہوتا تھا یوں لگتا تھا کہ اسے کوئی چڑیک دم اٹھا کرلے گئی ہے۔ اس کی شخصیت میں جو چیز سب سے غیر معمولی تھی وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کا جادو بوکارلو کی آنکھوں کی طرح سرچڑھ کر بولتا تھا اور ہر کس و ناکس کو گرویدہ کرلیتا تھا۔ بوکارلو نے جو کچھ حاصل کیا تھا سردار بوغات سے ہی کیا تھا اور بوغات کو اس کا مرشد بھی کہا جاتا تھا۔ ہم نے بوکارلو کے کچھ کرشمے دیکھے تھے یقیناً بوغات اس سے بڑھ چڑھ کر ہی تھا۔

اگلے تین چار روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا' سوائے اس کے کہ سائیں عالی نے کھنڈر میں تعمیر کا کام بڑی تیزی سے جاری رکھوایا۔ سفید فام کاریگر گراں معاوضہ لے کر سائیں عالی کے لیے خون پسینہ ایک کررہے تھے اور شاید یہ عمل سائیں عالی کو سکون پہنچاتا تھا۔ وہ یورپین لڑکیاں جن کی شادی مقامی لوگوں سے کی گئی تھی خوش و خرم تھیں اور یہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ انہیں وافر رقم مل رہی تھی۔ یہ رقم سائیں ان خواتین کو ان کے شوہروں کے ذریعے ہی دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لڑکیاں اپنے سے کہیں کمتر مردوں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ نہ صرف رہ رہی تھیں بلکہ ان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں۔ اپنے شوہروں کی منھی چاپی کرتی تھیں' انہیں چھاؤں میں لٹا کر ان کی مالش کرتی تھیں' ان کے کپڑے دھوتی تھیں بلکہ ان میں سے بعض اپنے ہاتھ سے ان کے لیے کھانا بھی پکاتی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت سے تقریباً ہر شے خریدی جاسکتی ہے اور شاید محبت بھی۔ جب دو افراد عرصہ دراز تک شب و روز ایک دوجے کے ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ محبت بھی تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔ زریں گل اگر اس موقع پر یہاں ہوتا تو یقیناً اسے بے حد خوشی ہوتی' بلکہ وہ خوشی سے نہال ہوجاتا وہ بھی "فرنگیوں" کے بہت خلاف تھا اور اپنی صد سالہ غلامی کا بدلہ اس انداز میں ان سے لینا چاہتا تھا۔

سائیں نوٹوں کی گڈیاں گلے میں ڈالے ہر وقت کھنڈرات میں گھومتا نظر آتا تھا۔ ایک دو گارڈز ہمہ وقت اس کے آس پاس ہوتے تھے۔ سائیں کی حرکات مضحکہ خیز ہوتی تھیں لیکن پھر بھی ہر کوئی اس کی تعظیم پر مجبور تھا اور اس امر پر مجبور تھا کہ سائیں کو اہمیت دی جائے اور یہ مجبوری بے تحاشا دولت کی مجبوری تھی' وہی دولت جو سائیں عالی سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ اردگرد کے لوگ اس مرد عجیب کی شہرت سن کر کھنڈرات میں آنا شروع ہوگئے تھے۔ یہ سب سادہ لوح قبائل تھے۔ یہ سائیں کو کوئی پہنچا ہوا مجذوب سمجھتے تھے' ایسا درویش مرد جس کے پاس غیب کے ذریعے سے ڈالر اور پاؤنڈ آتے تھے اور وہ انہیں مستی کی کیفیت میں لٹاتا رہتا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا۔ کھنڈرات سے باہر ایک جگہ مجمع لگا ہوا تھا۔ بہت سے سیاہ فام ایک کھجور کے گرد جمع تھے۔ ان میں خوبرو خوش اندام وریا بھی تھی۔ یہ سب لوگ لپک لپک کر کسی شے کو پکڑ رہے تھے۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو پتہ چلا کہ سائیں عالی بلند و بالا کھجور کے اوپر تشریف فرما ہیں۔ وہ دس دس ڈالر کے نوٹوں کے جہاز بنا کر فضا میں اڑا رہا تھا اور نیچے موجود لوگ لپک لپک کر انہیں پکڑ رہے تھے۔ وریا بھی اس دلچسپ شغل میں شامل ہوگئی تھی۔ اس کے لمبے بال حسب معمول شانوں پر بکھرے تھے' وہ بالکل ایک شوخ و شنگ بچے کی طرح نظر آنے لگی تھی ان لمحوں میں۔ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر' ان حالات سے قطعی لاپروا جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک سنجیدہ مزاج سائنسٹ ہے۔ وہ کھلی فضاؤں اور کھیتوں کھلیانوں میں پروان چڑھنے والی ایک دیہاتی دوشیزہ کے مانند تھی۔ وہ دوشیزہ جو اپنے پیا سے ملنے کے بعد نشے اور ترنگ

میں ڈول جاتی ہے۔ وہ خستہ حال اور پسینے میں شرابور قبائلیوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھی اور لپک لپک کر ڈالر لوٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ میرے سامنے اس نے دس دس کے دو نوٹ لوٹے۔ یہ دونوں نوٹ اس نے دو ایسے کمزور لڑکوں کو دے دیے جو اس چھینا جھپٹی میں ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکے تھے۔

سائیں عالی کچھ دیر تک تو نوٹ لٹاتا رہا پھر اس کا جی شاید اس تماشے سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور لوگوں پر نوٹ پھینکنے کے بجائے انہیں پتھر مارنے شروع کردیے۔ یہ پتھر اس کے جھولے کے اندر ہی موجود تھے۔ سادہ لوح قبائلی پتھر کھا کر بھی بدمزہ نہیں ہورہے تھے اور اسے بھی سائیں عالی کی نوازشات میں شمار کررہے تھے۔ وہ کچھ دور دور تو ہٹ گئے مگر کھجور کے نیچے سے گئے نہیں۔ بہرحال دیرا پتھروں کے خطرے کو محسوس کرکے پلٹ آئی۔

اس کے گال لال شہابی ہورہے تھے۔ مشقت کی وجہ سے صراحی دار گردن بھی پسینے سے تر تھی۔ وہ اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے سے گزارتے ہوئے بولی "یہ سائیں صاحب جتنے عجیب و غریب ہیں، اتنے ہی دلچسپ بھی ہیں۔"

"اور تم بھی کچھ کم عجیب و غریب نہیں ہو۔" میں نے کہا "ان قبائلیوں کے ساتھ مل کر اس طرح ادودھم مچا رہی ہو۔ تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو بھئی۔ کنگ براؤن اور محترم بوکار لو جیسے زبردست چچاؤں کی بھتیجی ہو۔ تمہیں اپنے اور ان لوگوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھنا چاہیے۔"

"میں انسانوں سے نہیں درندوں سے فاصلہ رکھنے کی قائل ہوں۔"

"انسانوں میں ہی درندے اور حیوان بھی تو ہوتے ہیں۔"

"وہ حیوان نہیں ہوتے صرف بگڑے ہوئے انسان ہوتے ہیں۔" دیرا نے فلسفہ جھاڑا۔

"اگر تمہاری بات کو درست بھی مان لیا جائے تو بھی اس وقت تمہیں کھلے آسمان تلے ہونے کے بجائے اپنی پناہ گاہ میں ہونا چاہیے تھا۔ بگڑا ہوا انسان اگر ٹرسٹ کا خوں خوار گارڈ بھی ہو تو اس کی خطرناکی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جھیل پر اور پھر گاؤں میں انسولیانے کس طرح قتل عام کیا ہے۔"

قتل عام کے ذکر پر دیرا ایک دم پھر سے اُداس ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی خوشی جیسے کہیں بہت دور غم کے بادلوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ "شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، مجھے اس طرح خوش ہونے کا اور اچھلنے کودنے کا کوئی حق نہیں۔ آئی ایم سوری۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری شاہ جہاں صاحب۔"

مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ دیرا کا دل دکھانے والی بات کہہ دی۔ پچھلے دنوں وہ بے حد افسردہ رہی تھی۔ اب شاید صفدر کے بار بار مجبور کرنے سے وہ اس افسردگی سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہی کھلے ماحول میں آئی تھی۔ میری بات نے اسے پھر سے دکھ اور پچھتاوے کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ بہرحال اب کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

پچھلے چند دنوں میں، میں نے غور سے دیرا کے مزاج کا جائزہ لیا تھا۔ وہ خاصی مختلف لڑکی تھی۔ اگر مختلف نہ ہوتی تو دوسری دفعہ صفدر کے لیے جان دینے کی انتہائی سنجیدہ کوشش کیوں کرتی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے جذبوں میں حد سے گزر جانے والے ہوتے ہیں۔ جو کام بھی شروع کرتے ہیں اتنی توجہ اور لگن سے کرتے ہیں کہ پھر باقی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں اپنے مقصد سے وفاداری انتہا پہنچی ہوتی ہے۔ دیرا کا مقصد جب تعلیم تھا اس نے تعلیم میں اپنا تن من لگا دیا تھا۔ جب وہ لیبارٹری میں پہنچی تو تحقیق میں خود کو فنا کردیا اور چھوٹی سی عمر میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ وہ عرصہ دراز تک لیبارٹری کے گھٹے ہوئے ماحول میں رہی سائنسی آلات اور کیمیکلز نے اس کا گھیراؤ کیے رکھا۔ اپنے اردگرد کی سنجیدگی اور کثافت میں گم ہوکر رہ گئی، پھر ایک روز اسے صفدر ملا اور اس ملاقات کے ساتھ ہی رومانیت اور لطافت کا ایک جہاں دیرا کی نظروں کے سامنے آباد ہوگیا۔ لیبارٹری کے سفید کوٹ کے اندر سے نکلی اور رنگ بن کر فضاؤں میں بکھرنے لگی۔ اس کا وجود ہوا کی طرح سبک ہو کر صحراؤں میں اڑا اور صفدر کا ہاتھ تھام کر اس نے دنیا کے آخری کنارے تک جانے کی تمنا اپنے دل میں پالی۔ یہ منفرد اور یکتا لڑکی اب صفدر کی زندگی کا ہتھیار بن چکی تھی۔

اسی دوران میں سائیں کا دیدار کرنے کے لیے ایک اور ٹولی موقع پر پہنچ گئی۔ یہ کوئی پندرہ بیس مرد و زن تھے۔ یہ مقامی تھے۔ کچھ نے اپنے سروں پر پرندوں کے پر بھی سجا رکھے تھے مردوں کے بالائی دھڑ بالکل عریاں تھے۔ یہ لوگ غالباً قریبی بستی سے آئے تھے۔ انہوں نے سائیں کو کھجور پر چڑھے دیکھا تو بڑی عقیدت سے کھجور کے نیچے ہی بیٹھ گئے۔ سائیں کو شاید ان کے انداز پر ترس آگیا تھا۔ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی سے بیس تیس نوٹ علیحدہ کیے اور نیچے پھینک

دیے۔ قبائلیوں میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے لپک لپک کر یہ نوٹ جمع کرلیے۔ لوٹ کا مال جمع کرنے میں جو بھگدڑ مچی تھی اس نے گرد کا بادل فضا میں بلند کردیا۔ سائیں عالی بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد سائیں کا پالتو کتا وہاں سے گزرا۔ ایک انگریز نے بڑی محبت سے اس کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ میں یہ خوب صورت زنجیر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ سونے کی معلوم ہوتی تھی۔ کئی سادہ لوح قبائلی سائیں کے کتے کو دیکھ کر اس کی بلائیں لینے لگے۔ چند باہمت افراد نے کتے کو ہاتھ لگانے کی کوشش بھی کی۔

اچانک سائیں زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ مجھے مخاطب کرکے کچھ کہہ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ بائیں طرف دیکھ رہا تھا "شفیع محمد! جاؤ گھس جاؤ اپنے بل میں۔ جنات آرہے ہیں۔ خبیث جنات آرہے ہیں۔"

میں سائیں کا کوڈ ورڈ سمجھ گیا۔ اس نے کھجور کی بلندی سے شاید کسی مشکوک گاڑی کو کھنڈر کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ دہائی دے رہا تھا کہ ہم سب زیلر کے خفیہ خلا میں گھس جائیں۔ اس زیلر یعنی موبائل کلینک میں چھپنے کے دو تجربے ہمیں ہوچکے تھے، تیسری مرتبہ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک منٹ کے اندر ہم سب زیلر کے خفیہ خلا کے اندر تھے۔

کسی جیپ وغیرہ کی آواز نہیں آئی پھر بھی ہم ایک گھنٹا خلا میں رہے۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑ گئیں۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے ہمیں باہر نکالا اور اپنی محبوبہ نرس کے ہمراہ باہر بھیج دیا۔ نرس ہمیں سیدھا سائیں عالی کے حجرے میں لے آئی۔ یہاں بیٹھے افراد کو دیکھ کر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ یہ ہرکولیس جہاز کا نائب کپتان آرتھر اور اس کی بیوی نما گرل فرینڈ ماریان تھی۔ یہ وہی عورت تھی جسے کبھی کبھی بلا وجہ بلا سبب خوف آنا شروع ہوجاتا تھا۔ اس وقت دونوں کے لباس گرد آلود تھے اور دشوار گزار رستے نے ان کے پاؤں زخمی کر رکھے تھے۔ آرتھر نے مجھے دیکھا اور اٹھ کر لپٹ گیا۔

وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ جہاز ہرکولیس کے نائب کپتان کی حیثیت سے میں نے اسے بہت دلیر اور جفاکش پایا تھا لیکن اس وقت وہ سسک اٹھا تھا۔ خبر نہیں کن مشکلات سے گزر کر وہ اور اس کی بیوی یہاں تک پہنچے تھے۔

آرتھر نے سب سے پہلے مجھے میرے ساتھیوں یعنی زریں غزالہ اور کلثوم کی خیریت سے آگاہ کیا پھر اس نے بتایا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ ہم سب کو یہاں دیکھے گا۔ آرتھر ہمارے لیے بہت گراں قدر تھا، ہمیں اس سے ٹرسٹ کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوسکتی تھیں لیکن فی الوقت اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے سوال و جواب کیے جاتے۔ اسے بہت آرام اور دوا وغیرہ کی ضرورت تھی۔ میں نے صفدر سے کہا کہ وہ فوراً موبائل کلینک میں جائے اور ڈاکٹر صاحب کو لے آئے۔ خاص طور سے آرتھر کی بیوی کو فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ صحرا کے سفر نے اس کی جلد خشک کردی تھی اور کئی جگہ چھالے بھی پڑے ہوئے تھے۔ وہ واضح طور پر ڈی ہائیڈریشن کا شکار نظر آتی تھی۔ صفدر پانچ منٹ بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ رنگین مزاج ڈاکٹر بوس ابھی فارغ نہیں ہے۔

"کیا پھر اپنی نرس کو ڈاکٹری پڑھا رہا ہے؟"

"نہیں لوگوں کے کندھوں پر سواری کررہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

صفدر بولا "ایک قریبی گاؤں زرخارے میں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ سائیں کی ہدایت پر دونوں ڈاکٹر حضرات اپنے موبائل کلینک سمیت وہاں پہنچے اور انہوں نے لوگوں کو انجکشن لگائے۔ ایک دو دن کی دوا بھی تقسیم کی گئی۔ اب یہ پورا گاؤں بھلا چنگا ہوگیا ہے۔ یہ سب لوگ سائیں کو دیوتاؤں کا اوتار سمجھ رہے ہیں اور ڈاکٹروں کو سائیں کی طرف سے بھیجا ہوا رحمت کا فرشتہ سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے گاؤں میں سائیں کے نام پر ایک بالکل نوخیز بچھڑے کی قربانی دی ہے اور اب عقیدت کے مزید اظہار کے لیے یہاں چلے آئے ہیں۔ انہوں نے دونوں ڈاکٹروں کو کندھوں پر اٹھا رکھا ہے اور باقاعدہ ان کا جلوس نکالا ہوا ہے۔"

میں نے غور سے سنا تو موبائل کلینک کی جانب سے واقعی نعروں وغیرہ کی آوازیں آرہی تھیں۔ گاہے گاہے ان آوازوں کے درمیان سائیں کا نعرۂ مستانہ بھی سنائی دے جاتا تھا۔ پتہ نہیں کہ یہ شخص کیا کرتا پھر رہا تھا۔

اسی دوران میں بلند آواز سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں اس جانب سے آرہی تھیں جہاں سوار بونغات رہائش پذیر تھا۔ میں اور صفدر وہاں پہنچے۔ دیکھا تو سائیں عالی کا ایک حبشی گارڈ سر جھکائے کھڑا تھا اور سوار بونغات طیش کے عالم میں مقامی زبان بول رہا تھا۔ سائیں عالی کے تین مزید گارڈز بھی اس کمرے میں موجود تھے۔

میں نے ایک سفید فام گارڈ سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے؟

اس نے بتایا "جناب! ہماری جان تو دو طرف سے

مصیبت میں ہے۔ سائیں صاحب کا حکم ہے کہ ہمیں آپ پانچوں افراد کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم پر یہ ذمے داری ہے کہ آپ کو یہاں پر کوئی نقصان نہ پہنچے۔ موبائل کلینک کے اندر آپ پانچوں کے لیے خطرے کے وقت چھپنے کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ ہم نے ہی کیا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ انتظام ہر لحاظ سے کار آمد رہا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ سردار بوغات ایک مرتبہ بھی اس پناہ گاہ میں نہیں گئے۔ خوش قسمتی سے یہ اب تک بچے رہے ہیں لیکن آئندہ کے لیے کوئی گارنٹی تو نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے انچارج نے سردار صاحب سے اسی حوالے سے گزارش کی تھی۔ سردار صاحب ایک دم غصے میں آ گئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہی کہ مجھے تم لوگوں کی پہرے داری کی ضرورت نہیں۔ میری حفاظت اب تک دیوتاؤں نے کی ہے' آئندہ بھی وہی کریں گے۔"

میں نے سوچا کہ اگر جھیل زار کے کنارے دیوتا اپنے معبد "بوہا" کے دفاع میں ناکام رہے تو یہاں بھی ان سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ بات سردار بوغات کے سامنے کہنا آسان کام نہیں تھا۔ انسان اکثر اپنے عقائد کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ وہ عموماً اپنے غلط سلط نظریات کے حق میں بھی ایسے ایسے دلائل ڈھونڈ لیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سردار بوغات شدید خطرے کے وقت بھی موبائل کلینک میں نہ جا کر غلطی کر رہا تھا۔ اور یہ ایسی غلطی تھی کہ ہم سب سر توڑ کوشش کرنے کے باوجود سردار سے یہ غلطی تسلیم نہیں کرا سکتے تھے' لہٰذا بہتر یہی تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ ویسے بھی وہ دکھی اور پریشان تھا۔ اس کی بستی اُجڑ گئی تھی۔ اس کے وفادار تہ تیغ ہوئے تھے اور وہ خود اپنے خون کے پیاسوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے حبشی گارڈ کو منع کر دیا کہ وہ سردار کی بات کا کوئی جواب نہ دے اور بہتر ہے کہ یہاں سے کھسک جائے۔ زیبن گارڈ نے میری اس ہدایت کو فالو کیا اور موقع ملتے ہی اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے نکل گیا۔

سردار بوغات بڑبڑاتا ہوا کمرے میں چکرانے لگا پھر اس نے گوشے میں رکھی ہوئی ایک بلوری صراحی اٹھائی۔ اس میں ریڈ وائن یعنی "کھجور کی بیٹی" موجود تھی۔ اس شراب میں اکثر ایک مقدس چشمے کا پانی ملایا جاتا تھا۔ سردار نے اس مشروب کے دو پیالے غٹاغٹ چڑھائے اور بے دم سا ہو کر مسہری پر جا بیٹھا۔ اس موقع پر سردار سے کوئی مکالمہ کرنا مناسب نہیں تھا' بہتر تھا کہ اس کے دماغ کو ٹھنڈا ہونے کا موقع دیا جائے۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔

میں اور پروفیسر اپنے نو تعمیر شدہ کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ رات کسی پہر صفدر نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "سردار بوغات اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ میں ابھی اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ سردار کے کمرے میں لائٹ جل رہی ہے' پنکھا بھی چل رہا ہے' پر وہ غائب ہے۔"

"وہ تو اسی طرح غائب ہو جایا کرتا ہے۔" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"میں آس پاس ہر جگہ دیکھ کر آیا ہوں۔" صفدر نے کہا۔

میں نے دل میں سوچا کہ صفدر نے کہیں آج پھر زیادہ نہ چڑھا لی ہو۔ میں نے غور سے اس کی آنکھیں دیکھیں' ان میں شراب کے نتیجے میں رہ جانے والا خمار تو موجود تھا لیکن نشہ نہیں تھا۔ لب و لہجہ بھی نارمل تھا۔

میں صفدر کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گیا۔ رات کے قریباً دو بج چکے تھے۔ ان کھنڈرات میں بس ضروری روشنیاں ہی جل رہی تھیں۔ دور کہیں سائیں عالی کا لاڈلا کتا بلند آواز میں اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس کتے کے علاوہ بس جنریٹر کی گھوں گھوں ہی سنائی دیتی تھی۔ صفدر کا کمرا یعنی صفدر اور دیرا کا کمرا سردار بوغات کے حجرہ نما کمرے کے قریب ہی واقع تھا۔ صفدر کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ میں نے صفدر سے یہ نہیں پوچھا کہ رات کے اس پہر وہ جاگ کیوں رہا تھا (اس کی نئی نئی شادی کے پس منظر میں یہ سوال بے معنی تھا) ہاں یہ ضرور پوچھا کہ وہ باہر کیا لینے نکلا تھا۔ صفدر نے کہا "سائیں عالی کا کتا مسلسل شور مچا رہا تھا' میں نے سوچا کہ اسے دیکھنا چاہیے۔ باہر نکلا تو یہ ماجرا سامنے آیا۔"

ہم دونوں نے سردار بوغات کے کمرے کا معائنہ کیا۔ کہیں جدوجہد کے آثار تو نظر نہیں آئے جن سے شبہ ہوتا کہ سردار کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے' ہاں پنکھا اور لائٹ آن تھے' شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ سردار کو یہ دونوں چیزیں بند کرنا ہی نہیں آتی تھیں۔ نایاب پرندوں کے پروں کا تاج جو سردار بوغات عموماً اپنے سر پر رکھتا تھا' نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بنفسِ اس نے یہاں سے جانے کی ٹھانی' اپنا تاج اٹھا کر سر پر رکھا' اپنی مخصوص جوتی پہنی اور اٹھ کر روانہ ہو گیا۔

وہ شدید خطرے میں تھا اور اگر وہ کہیں زیادہ دور نکل گیا تھا تو پھر اس کا پکڑے جانا یقینی تھا۔ اس صحرا میں ہر طرف زمت کے گارڈز دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کا پہلا ٹارگٹ صفدر اور دیرا تھے جبکہ دوسرا ٹارگٹ سردار بوغات اور اس کے قریبی ساتھی تھے۔ وہ دیرا کی گمشدگی کو اغوا قرار دے رہے تھے اور اس اغوا کے جرم میں وہ سردار بوغات کو بوکارلو کے ساتھ برابر کا شریک سمجھ رہے تھے۔ صفدر نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ سردار یہ کھنڈر چھوڑ جانے کے ارادے کے ساتھ یہاں سے نکلا ہے۔ وہ اس ماحول سے بہت الرجک ہو چکا تھا' ایک ملازمہ نے بتایا ہے کہ وہ پنکھے' ٹیوب لائٹس اور ریڈیو وغیرہ کو شیطانی چیزیں قرار دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ چیزیں اس کی صحت اور اس کے اندر کی طاقت کو تباہ کر دیں گی۔ کھنڈرات میں چمکتی ہوئی بجلی کی روشنیوں کو بھی وہ بڑی اندیش نظروں سے دیکھتا تھا۔ میرے خیال میں اس پر یہ وہم بھی سوار ہو چکا تھا کہ جو انگریزی دوائیں اسے دی گئی ہیں وہ اس کے اندرونی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گی۔"

"شاید اسی لیے وہ موبائل کلینک میں بھی نہیں گھستا تھا۔" میں نے کہا۔

"بالکل یہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح چھپنے کو اپنی سرداری اور اپنی روحانی طاقت کی توہین سمجھتا ہو۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں' لیکن میرا خیال ہے کہ رات کو گارڈز کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی نے بھی سردار بوغات کو متاثر کیا ہے۔"

صفدر نے پر سوچ لہجے میں کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں سردار بوغات کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنی چاہیے' وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔"

"جائیں گے کیسے؟"

"جیپ پر..... چابی تو آپ کے پاس موجود ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ سائیں کے گارڈز نہیں روکیں گے؟"

"ان سے کہیں گے کہ سردار صاحب کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں' جو تمہاری وجہ سے ناراض ہو کر گئے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر چلو۔ لیکن دیرا کو بتا آؤ۔ وہ پریشان نہ ہو۔"

صفدر دوڑ کر گیا اور ایک منٹ بعد لوٹ آیا۔ ریوالور اس کی جیب میں تھا جس کا پتہ اس کی بھاری جیب سے چلتا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے مضحکہ خیز افریقی لباسوں سے نجات حاصل کر لی تھی۔ موبائل کلینک کے ڈاکٹر بوس نے ہم دونوں کے لیے دو پتلون شرٹ مہیا کر دی تھیں۔ صفدر کے حصے میں ہاف سلیو شرٹ آئی تھی اور اس گرم موسم میں وہ اپنی اس شرٹ سے بہت خوش تھا۔ صفدر کے واپس آنے سے پہلے ہی میں بھی اپنے کمرے سے بھاری خودکار دائفل اٹھا لایا تھا' بہر طور میں نے پروفیسر کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ پروفیسر کو میرے بارے میں تشویش ہوئی تو دیرا یہ تشویش دور کر دے گی۔

ہم دوڑتے ہوئے آئے اور جیپ میں گھس گئے۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ کتے نے اور زور و شور کے ساتھ شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ ابھی جیپ حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک طرف سے سائیں عالی ہاتھ میں عصا لیے نمودار ہوا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔ غالباً یہ کتے کا ایک بلند ہونے والا شور ہی تھا جس نے سائیں کو الرٹ کیا تھا اور ہماری طرف بھیج دیا تھا۔ سائیں کے عقب میں کچھ فاصلے پر دو مسلح گارڈز بھی نظر آ رہے تھے۔ سائیں نے ہمارے قریب پہنچ کر ایک زوردار ڈنڈا جیپ کے پچھلے حصے پر رسید کیا اور نعرہ لگا کر بولا۔

"بھاگ..... بھاگ..... دُم اٹھا کر بھاگ۔ بھاگ دُم اٹھا کر بھاگ....."

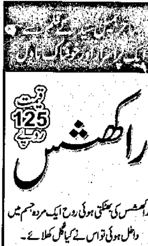

وہ ڈنڈے رسید کرتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ جیپ کو دُم اٹھا کر بھاگنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ میں نے گیئر لگا کر ایکسلی ریٹر چھوڑا اور جیپ تیزی سے آگے بڑھی۔ سائیں نے جاتے جاتے بھی ایک ڈنڈا جیپ کو رسید کر ہی دیا۔

ایک طرح سے یہ سائیں کی طرف سے ہمارے لیے رمزیہ اجازت تھی کہ ہم سردار بوغات کے پیچھے چلے جائیں۔ جب سائیں کی طرف سے اجازت تھی تو پھر اس کے گارڈز کو کیا ضرورت تھی ہمیں روکنے کی۔ جیپ کو ٹرن دے کر میں کھنڈرات کی حدود سے نکلا اور جھیل زار کی سمت پر روانہ ہو گیا۔ حسب معمول اس زخمی جیپ کی اکلوتی لائٹ روشن تھی اور ایک اگلا پہیہ بھی نشے میں جھوم رہا تھا۔ صحرائی جھاڑیوں اور کھجور کے درختوں کے درمیان اونچے نیچے راستے پر سفر کرتے ہم درمیانی رفتار سے آگے بڑھتے رہے۔ گاہے گاہے کوئی بلی نیولا یا خارپشت ہمارا راستہ کاٹ جاتا تھا۔ سفر کے دوران میں میری اور صفدر کی نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ سردار بوغات کا ملنا کارِ دشوار معلوم ہوتا تھا' پھر ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمیں مل جانے کی صورت میں سردار واپس جانے پر بھی آمادہ ہو گا یا نہیں۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ہم نے قریباً دس کلو میٹر کا سفر کیا۔ اچانک جیپ کے انجن کی مدھم آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ میں نے اپنی گود میں رائفل کی موجودگی کا اندازہ کیا' دوسری طرف صفدر کی گرفت بھی ریوالور پر یقیناً مضبوط ہو چکی تھی۔ ہم نے اکلوتی ہیڈ لائٹ بھی آف کر دی اور آواز کی سمت بڑھے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انجن کی آواز آنا بند ہو گئی۔ بہرحال ہم آواز کے رخ پر بڑھتے رہے۔ جلد ہی ہمیں ایک جیپ کا ہیولا نظر آ گیا۔ ہم نے اپنی جیپ جھاڑیوں میں روک دی اور نیچے اتر کر محتاط قدموں سے آگے بڑھے۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے مجھے ایک شخص ریت پر اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ وہ کسی پر جھکا ہوا تھا اور مصیبت زدہ آواز میں پکار رہا تھا "آنکھیں کھولو۔۔۔ میں کہتا ہوں آنکھیں کھولو۔"

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا ایک ساتھی ریت پر چت لیٹا ہے اور وہ اس کے سینے پر بار بار دباؤ ڈال کر اس کی سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ارد گرد کوئی اور شخص موجود نہیں اور یہ شخص اکیلا ہی اس صورت حال سے دوچار ہے' ہم جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئے۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی جبکہ صفدر نے اپنا ریوالور نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہم اس شخص کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جب اسے ہماری موجودگی کا علم ہوا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تھا "کون ہے؟" اس کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف بڑھا تھا۔ یہ رائفل اس کے پہلو میں ریت پر رکھی تھی۔

"خبردار!" میں نے انگلش میں اسے دھمکایا "اپنا ہاتھ رائفل سے دور رکھو۔"

وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اب ہم اچھی طرح اس کے خدوخال اور اس کا لباس دیکھ سکتے تھے۔ اس کے جسم پر وہی منحوس نیلگوں وردی تھی جو ٹرسٹ کے پالتو کتوں کا امتیازی نشان سمجھی جاتی تھی۔ وہ سفید فام تھا۔ ریت پر اس کا جو ساتھی بے ہوش پڑا تھا وہ بھی نیلی وردی میں تھا۔ صفدر نے ٹارچ روشن کی اور زمین پر بے ہوش پڑے شخص کا چہرہ صاف نظر آنے لگا اس کی آنکھیں الٹی ہوئی تھیں اور گردن تشنج کے سبب عجیب انداز سے مڑی تھی۔ اس کی ایک باچھ سے سفید سفید جھاگ بھی نکل رہا تھا۔

صفدر نے آگے بڑھ کر گارڈ کے پاس سے اس کی رائفل اٹھائی اور تحکم سے پوچھا "تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں پاس ہی جھاڑیوں میں موجود ہیں۔"

"جھوٹ بول رہا ہے یہ کتا۔" میں نے ٹارچ کی روشنی ریت پر پھینکتے ہوئے کہا "اس جیپ سے صرف دو بندے نیچے اترے ہیں' اور جیپ خالی ہے۔"

ریت پر دو افراد کے قدموں کے نشان صاف پہچانے جاتے تھے۔ صفدر نے گارڈ کے سر پر ریوالور کا دستہ مارا تو وہ کراہ کر رہ گیا "کیا ہوا ہے تیرے اس ساتھی کو؟" صفدر نے پوچھا۔

"اس کو کوئی دورہ وغیرہ پڑا ہے۔" گارڈ نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

متاثر شخص کے ہاتھ پاؤں اینٹھتے جا رہے تھے اور جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو گیا "کہاں سے آ رہے ہو تم لوگ؟" میں نے رائفل کی نال سے گارڈ کی کھوپڑی کو ٹھوکا دیا۔

وہ دہشت زدہ لہجے میں بولا "میں تمہیں سب بتاتا ہوں' پہلے میرے اس ساتھی کا کچھ کرو۔ کہیں یہ۔۔۔ مر ہی نہ جائے۔"

"پر ہوا کیا ہے اسے؟"

"بس جیپ چلاتے چلاتے کچھ ہو گیا ہے۔ ایک دم ہاتھ پاؤں مڑ گئے ہیں۔"

ہم گارڈ کو گن پوائنٹ پر اپنی زخمی جیپ میں لے آئے۔ بعد ازاں صفدر گارڈ کے بے ہوش ساتھی کو بھی جیپ میں اٹھا لایا۔ دوسری جیپ کی تلاشی احتیاط سے لی گئی۔ یہ درمیانی حالت کی ایک ٹویوٹا جیپ تھی۔ جیپ میں ایک واکی ٹاکی بھی موجود تھا۔ فرش پر تازہ پھلوں کے چھلکے تھے۔ جیپ کا ریڈیو بھی ابھی تک مدھم آواز میں آن تھا۔ قریباً دو سو مربع گز علاقے میں ریت پر ٹائروں کے جو نشانات نظر آ رہے تھے انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جیپ کو یہاں دیر تک گول گول گھمایا گیا ہے۔ جیپ کی تلاشی لینے کے بعد میں نے اسے جھاڑیوں میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد میں اپنی جیپ میں آ گیا۔ اس دوران میں صفدر گارڈ کی زبان کھلوانے میں کامیاب رہا تھا۔ گارڈ کے چہرے پر ایک دو چوٹوں کے نشانات ظاہر ہو چکے تھے اور وہ صفدر کے سوالوں کے جواب بڑی روانی سے دے رہا تھا۔

اس سوال و جواب کے نتیجے میں بالآخر جو صورت حال ہمارے سامنے آئی' وہ کافی تعجب خیز بلکہ پُراسرار تھی۔ گارڈ نے اپنا اور اپنے ساتھی کا نام بتایا۔ اس کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ ٹرسٹ کا ملازم ہے اور ٹرسٹ کی انتظامیہ کے حکم پر اس علاقے میں ویرا اور صفدر کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ اس نے کہا "یہ ایک اتفاق ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہمارے ایک ساتھی نے واکی ٹاکی پر اطلاع دی کہ اس نے قریبی علاقے میں جھیل زار کے مفرور سردار بوغات کا سراغ لگا لیا ہے۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم جلد از جلد "گِدھوں والی کھائی" پر پہنچیں اور سردار بوغات پر قابو پانے میں مدد دیں۔" (دراصل گارڈ کا وہ ساتھی اکیلا تھا' اسے اندیشہ تھا کہ سردار بوغات اپنی سرداری کے زعم میں اس کو خاطر میں نہیں لائے گا اور اسے اپنے ساتھ لانا ایک نہایت دشوار عمل ثابت ہو گا) یہ دونوں لوکیشن پر پہنچنے کے لیے نکلے' مگر یہاں پہنچ کر گاڑی چلاتے چلاتے اچانک ڈرائیور کو اعصاب زدگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے دماغی دورہ سا پڑ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح سخت ہو گئے' پتلیاں الٹ گئیں اور اس نے گاڑی کو گول گول گھمانا شروع کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے گارڈ جیکب نے گاڑی روکی اور ساتھی کو جیپ سے اتار کر ریت پر لٹا دیا۔

گارڈ جیکب پر عجیب طرح کی دہشت سوار تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے ساتھی کو اس سے پہلے کبھی اس قسم کا دورہ نہیں پڑا۔ بے شک وہ حشیش وغیرہ پیتا ہے لیکن پوری طرح صحت مند ہے۔ جیکب نے لاریسوں کے سردار بوغات کے بارے میں بہت سی پُراسرار کہانیاں سن رکھی تھیں' اس کے ڈرے ہوئے ذہن میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اس کے ساتھی گارڈ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دونوں سردار بوغات کا پیچھا کر رہے تھے۔

اس قسم کے خیالات کسی دقیانوسی افریقی کے ہوتے تو بات اتنی انوکھی نہیں تھی۔ مگر یہ بات ایک پڑھا لکھا سفید فام گارڈ کر رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے بے ہوش ساتھی کے چہرے پر گیلا کپڑا پھیرنے لگتا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن چیک کرتا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ خوف کی وجہ سے اس پر خود بھی کوئی دورہ شورہ پڑ جائے گا۔ ارد گرد کی ریت پر جیپ کے گول گول گھومنے کے نشانات ہم بھی دیکھ چکے تھے اور یہ نشانات گارڈ کے بیان کی تصدیق کر رہے تھے۔ صفدر سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اس جیکب نامی گارڈ کے ہاتھ اس کے بوٹوں کے لمبے تسموں کے ذریعے بڑی مضبوطی کے ساتھ اس کی پشت پر باندھ دیے۔ اس کے بعد میں اسے رائفل سے دھکیلتا ہوا اس کی اپنی جیپ میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا بے ہوش گارڈ بھی جیپ میں پہنچ گیا' اسے صفدر کندھے پر لاد کر لایا تھا۔ گارڈ جیکب حیران تھا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے اس کی حیرانی دور کرتے ہوئے کہا "چلو بھئی اب اس "گِدھوں والی کھائی" کی طرف۔"

گارڈ کی آنکھیں خوف کی تازہ لہر سے مزید پھیل گئیں "نہیں' میں اب اس طرف نہیں جاؤں گا۔ مم۔۔۔ مجھے خوف آ رہا ہے۔" وہ اپنے بے ہوش ساتھی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے رائفل کی نال اس کی گردن سے لگا دی "تمہارے لیے موت سے بڑھ کر اور کسی شے کا خوف ہو سکتا ہے' اور اگر تم اڑیل ٹٹو بنو گے تو میں تمہیں گولی مارنے میں دیر نہیں کروں گا۔"

دو تین منٹ شدید شش و پنج میں گزارنے کے بعد جیکب ہماری رہنمائی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ہم نے بے ہوش گارڈ کو اس جیپ کے پچھلے حصے میں نشستوں کے درمیان چھپا دیا تھا' صفدر بھی اپنے ریوالور سمیت یہیں پر چھپ گیا تھا تاکہ اگر گارڈ ہوش میں آ کر حرکت میں برکت ڈالنے کی کوشش کرے تو صفدر اس کا سدباب کر سکے۔ جیکب کو میں نے اگلی نشست پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور خود اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اس ٹویوٹا جیپ کی اندرونی حالت کافی اچھی تھی۔ یہ ہماری جیپ کی طرح بغیر چھت کے نہیں تھی تاہم

اس کی چھت میں چوکور روزن موجود تھا جس کی وجہ سے کھلی جیپ جیسی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی۔ جیپ کے ریڈیو پر کسی افریقی زبان میں کورس گایا جا رہا تھا۔ اس کورس کو سن کر نجانے کیوں میرے ذہن میں قبل از تاریخ کے کسی قدیم غار کا تصور ابھر رہا تھا' جہاں اچھا شکار ملنے کی خوشی میں الاؤ بھڑکائے جاتے تھے اور الاؤ کے گرد مادر زاد برہنہ قبائلی ناچتے اور گاتے تھے۔ رات تاریک اور بھید بھری تھی۔ تاروں بھرا نیلگوں آسمان ایک اوندھے پیالے کی طرح صحرا کو ڈھانپے ہوئے تھا اور ہماری محو سفر جیپ کے عقب میں وہ گارڈ موجود تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے پراسرار طور پر بے ہوش ہوا تھا۔ اس کی بے ہوشی کے حوالے سے کئی سوالات ہمارے ذہن میں ابھر رہے تھے مگر ابھی ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم نے جیکب کی رہنمائی میں قریباً دو کلو میٹر سفر کیا۔ یہ سفر ہمیں کھنڈرات سے مزید دور لے کر نہیں گیا بلکہ ہم کھنڈرات سے جنوب کی طرف چلے گئے۔ کھنڈرات سے ہمارا فاصلہ اب بھی کم و بیش دس کلو میٹر رہا ہو گا۔ میں نے جیکب کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ موقع پر پہنچ کر اس نے کیا کرنا ہے اور یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اگر اس نے ان ہدایات پر عمل نہ کیا تو عقب میں چھپا ہوا مسلح صفدر اس کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔

جس جگہ کو "بھیدوں والی گھاٹی" کہا جاتا تھا وہ ایک گھاٹی نما جگہ ہی تھی۔ اس ریتلی گھاٹی پر صحرائی جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ ہم گھاٹی کے قریب پہنچے تو ایک طرف سے ایک سایہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔ میرا ہاتھ خود بخود رائفل تک پہنچ گیا۔ سایہ قریب پہنچا۔ اس کی نیلی وردی اس کی سب سے بڑی شناخت تھی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں جیکب سے مخاطب ہوا "جیکی! میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔ اس کا خون بڑی تیزی سے نکل رہا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" جیکب نے پوچھا۔

نووارد نے گھاٹی کے دامن کی طرف اشارہ کیا اور بولا "اگر اسے زندہ رکھنا ہے تو پھر ابھی اسپتال پہنچانا پڑے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔"

میری ہدایت کے مطابق جیکب عرف جیکی نے اپنی ٹانگ دباتے ہوئے کہا "ابھی راستے میں جیپ کھائی میں چلی گئی تھی' میرے گھٹنے پر سخت چوٹ آئی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "جاز' تم ہٹلر کے ساتھ' سردار کو جیپ میں اٹھا لاؤ۔"

میں جیپ سے اترا اور نیلی وردی والے کے ساتھ چل دیا۔ "ہٹلر" کے نام پر مجھے کچھ یاد آ رہا تھا' یہ نام شاید میں نے زسٹ میں بھی سنا تھا۔ دوسری طرف یہ ہٹلر نامی شخص بھی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا' پھر اس نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور چونک کر بولا "اوہ' آپ تو مسٹر شاہین' مجھے پہلے ہی آپ کی آواز پر شک ہو رہا تھا۔ لل لیکن آپ جیکی کے ساتھ کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ... آپ کو تو ہم لوگ کئی دن سے ڈھونڈ رہے تھے۔"

"یہ لمبی کہانی ہے' بعد میں سناؤں گا۔" میں نے تیزی سے گھاٹی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مم... مسٹر صفدر بھی آپ کے ساتھ ہیں؟"

ہٹلر نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا' لیکن میری مختصری ہوں نے اسے مزید سوالات کا حوصلہ نہیں دیا۔ گھاٹی کے دامن میں جنتر کی طرز کا ایک خودرو پودا کثرت سے اگا ہوا تھا۔ انہی پودوں میں میں نے لارسیوں کے "عظیم المرتبت" سردار بوتانات کو دیکھا وہ ریتلی زمین پر چت لیٹا تھا' ایک تیر اس کے دائیں پہلو میں بغل سے ذرا نیچے پیوست تھا۔ سردار کا خون رس رس کر اس کے کرتے کو بھگو رہا تھا اور ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ یہ تیر ہٹلر نامی گارڈ نے ہی چلایا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ ہٹلر کے ہاتھ میں ایک ایرو گن نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' ہٹلر نامی یہ گارڈ اس گھاٹی کے ارد گرد پیادہ گشت پر تھا' اس نے تیر چلا کر سردار بوتانات کو زخمی کیا تھا اور اس کے بعد ہی واکی ٹاکی پر جیکب کو جیپ پر آنے کے لیے کہا تھا۔

تیر سردار کی پسلیوں میں یوں پیوست تھا کہ اسے نکالنا سرجن ہی کا کام لگتا تھا۔ ہم نے احتیاط سے سردار بوتانات کو اٹھایا اور جیپ کی طرف بڑھے' سردار مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ہم دونوں نے یوں اٹھا رکھا تھا کہ اگلا دھڑ ہٹلر کے بازوؤں میں تھا جبکہ نچلے دھڑ کا بوجھ میرے ہاتھوں پر تھا۔ جیپ کی طرف جاتے جاتے مجھے یاد آ گیا کہ جس طرح ہٹلر مجھے جانتا ہے اسی طرح میں بھی تھوڑا بہت اسے جانتا ہوں۔ جن دنوں ہم پر کنگ کی مہربانیوں کا آغاز ہوا تھا اور ہمیں ہاسٹل میں نائب کپتان آرتھر کے قریب ہی رہائش گاہ عنایت کی گئی تھی ہم نے کئی بار اس ہٹلر نامی گارڈ کو دیکھا تھا۔ یہ شخص ایک اچھا اتھلیٹ تھا اور صبح سویرے ورزش کے طور پر دوڑ لگایا کرتا تھا۔

ہم نے سردار کو لا کر جیپ میں ڈال دیا۔ جس وقت ہم اسے جیپ میں رکھ رہے تھے' ہٹلر کی نگاہ پچھلی نشستوں کے درمیانی خلا میں پڑ گئی۔ وہاں دو افراد کی موجودگی کو محسوس

کر کے وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا تو اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ میرے ہاتھ میں موجود رائفل کا رخ اس کی طرف ہو چکا تھا "یہ... یہ کیا ہے مسٹر شاہ؟"

"اسے رائفل کہتے ہیں اور اس کی موجودگی میں تمہیں اپنی ایرو گن ہاتھ سے گرا دینی چاہیے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مگر آپ تو... میرا مطلب ہے آپ تو ہمارے ساتھی ہیں۔" وہ ہکلایا۔

"بے شک ساتھی ہوں' اسی لیے تو تمہاری خیریت چاہ رہا ہوں۔ چلو شاباش' چھوڑ دو ایرو گن۔"

ایرو گن درخت سے جدا ہونے والے پھل کی طرح ریت پر جا گری۔ صفدر نے ہٹلر کو گریبان سے گھسیٹ کر جیپ میں سوار کر لیا۔ ہٹلر ہکا بکا سا کبھی جیکی کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے اس تیسرے ساتھی کو جو جیپ کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔

"صفدر! اب ان تینوں پالتو کتوں پر نگاہ رکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔" میں نے کہا۔

صفدر نے یہ ذمے داری بخوشی قبول کر لی۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ سردار بوتانات کے چہرے پر ڈالا۔ اس کی سیاہ رنگت میں عجیب سی زردی گھل گئی تھی۔ اس زردی کا سبب وہ خون تھا جو اس کے پہلو سے بہا تھا اور جس نے اس کا لباس اور بازو کی پٹی تقریباً بھگو دی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ بوڑھے سردار کی حالت بہت نازک ہو چکی ہے' اس کے حلق سے خر خر کی آواز نکلنا شروع ہو گئی تھی اور سانس ناہموار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی' اگر اسے بیس پچیس منٹ کے اندر موبائل کلینک تک پہنچا دیا جاتا تو اس کی زندگی بچنے کے روشن امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بیس پچیس منٹ کے اندر کھنڈرات تک پہنچنے کے لیے مشکل راستے پر نہایت تیز ڈرائیونگ کی ضرورت ہے۔

میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے گھوڑے دوڑاتے ہوئے برق رفتاری سے کھنڈر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند منٹ بعد صفدر نے اطلاع دی کہ جھٹکے لگنے کے سبب جیکب کا تیسرا ساتھی بھی ہوش میں آ گیا ہے۔ صفدر نے مہارت سے اسے بھی گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اچانک جیپ کے نیچے سے کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ دراصل یہ کسی جھاڑی کا ٹوٹا ہوا دو شاخہ تھا جو جیپ کے نیچے پھنس گیا تھا اور ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔

ایک جگہ میں نے جیپ روک دی اور نیچے اتر کر دو شاخہ نکالنے کی کوشش کی۔ یہ کافی مضبوط لکڑی تھی اور بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ صفدر بھی اتر آیا۔ اس نے ریوالور مجھے تھما دیا اور خود جیپ کے نیچے گھس کر شاخیں نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دھیان ایک لمحے کے لیے صفدر کی طرف گیا تھا' اچانک چھپاکا سا ہوا' وہ گارڈ جسے ہٹلر کہا جاتا تھا جیپ سے چھلانگ لگا کر بھاگ نکلا۔ میں نے مڑ کر اس پر دو فائر کیے۔ اس کی خوش قسمتی کہ دونوں گولیاں خطا گئیں' وہ تیزی سے کنارے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ دھماکوں کے ساتھ ہی صفدر بھی تڑپ کر جیپ کے نیچے سے نکل آیا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف پھینکی "صفدر ان دونوں کا دھیان رکھو۔" میں نے چیخ کر کہا اور مفرور ہٹلر کے پیچھے بھاگا۔

تیزی سے بھاگتے ہوئے میں جلد ہی جھاڑیوں سے پار نکل گیا۔ ذرا بلندی پر مجھے دور ہٹلر کا ہیولا نظر آیا۔ اس کی لمبی ٹانگیں بڑی رفتار سے اسے مجھ سے دور لیے جا رہی تھیں۔ میں نے بھی ٹانگوں کی پوری طاقت صرف کر دی۔ دفعتاً میں رک گیا۔ میں جیپ سے قریباً نصف کلو میٹر دور نکل آیا تھا' جیپ میں سردار بوتانات جاں بلب تھا' اس کی زندگی کے لیے ایک ایک سیکنڈ قیمتی تھا اور جیپ کی چابیاں میری جیب میں موجود تھیں۔ اگر نہ بھی ہوتیں تو صفدر کے لیے یہ آسان نہیں تھا کہ وہ دونوں گارڈز کو سنبھالتا اور جیپ چلا کر سردار کو موبائل کلینک تک بھی پہنچاتا۔ دوسری طرف ہٹلر تھا جو بڑی تیزی سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جی میں آئی کہ اس کم بخت کو جانے دوں اور سردار بوتانات کی جان بچانے کی کوشش کروں مگر یہ کام بھی آسان نہیں تھا' ہٹلر اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا جو زسٹ والوں کے لیے ابھی تک راز کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ اب ہم زسٹ کے وفادار نہیں ہیں۔ اس کی یہ باخبری ہمارے لیے اور خاص طور سے ہمارے ساتھیوں کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ غزالہ' زریں اور کلثوم شدید ترین مصائب کا شکار ہو سکتے تھے' وہ تینوں کوڑا بردار جلادوں کے قبضے میں تھے اور وہ لوگ زندہ انسانوں کی کھال کھینچنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک ساعت کے لیے میری آنکھوں کے سامنے' تیرگی زار ماسٹر اسٹی کا چہرہ گھوما' وہ کم سن شیطان' انسان کو تفریحاً تڑپا تڑپا کر مار ڈالتا تھا۔ زسٹ کی وہ قاتل بھول بھلیاں جہاں غریب کملا کو بھگا بھگا کر مار دیا گیا تھا' وہاں غزالہ یا کلثوم... میں اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکا۔ سردار بوتانات کی نازک حالت کو فراموش کر کے میں پوری رفتار سے ہٹلر کے

پیچھے دوڑا۔ وہ مجھ سے اپنا فاصلہ مسلسل بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ ایک ایتھلیٹ ہے اور باقاعدہ دوڑوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ اسے پکڑنا میرے لیے آسان کام نہیں تھا مگر میں نے کوشش جاری رکھی۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک سہولت حاصل تھی۔ میرے پاس ٹارچ تھی' جہاں کہیں مجھے راستے کے بارے میں شک ہوتا تھا میں اپنی رفتار دھیمی کرلیتا تھا اور ٹارچ روشن کردیتا تھا۔ تین چار بار میں گڑھوں میں گرتے گرتے یا کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنستے پھنستے بچا۔ آخر میرا اور ہٹلر کا فاصلہ خاطر خواہ کم ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اب کچھ فاصلے پر گھنی جھاڑیوں کی ایک اور چوڑی پٹی شروع ہوجائے گی' اگر ہٹلر ان جھاڑیوں میں گھس جاتا تو اسے ڈھونڈنا دشوار ہوجاتا۔ بہتر تھا کہ اس سے پہلے ہی اسے فائر مارا جائے۔ جو ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اس میں دو گولیاں موجود تھیں۔ میں نے سوچا کہ بھاگتے بھاگتے ہی فائر کرنے کا رسک لینا چاہیے۔۔۔ میں نے ہٹلر کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر دو فائر کیے۔ ایک گولی اس کی پنڈلی میں لگی اور وہ چیخ کر گر گیا۔ میں اس کے سر پر پہنچا تو وہ تکلیف کی شدت سے رو رہا تھا۔ اس نے اپنی دائیں ٹانگ دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور ٹھنڈی ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

"مجھے مت مارنا' مجھے مت مارنا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے بھی تو سردار بوعنات کو مارا ہے۔" میں نے کہا۔

"خدا گواہ ہے' مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ سردار بوعنات ہے۔ میں نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا' وہ رکا نہیں اور مجھ سے الجھنا شروع کردیا۔ اس ہاتھا پائی میں اچانک میری اریو گن چل گئی۔ میں قسم کھاتا ہوں مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ سردار ہے' میں تو اسے کوئی عام قبائلی سمجھا تھا۔ بعد میں جب میں نے اس کے پاس پرندوں کے پروں والا تاج دیکھا اور گلے میں خاص مالا دیکھی تو مجھے معلوم پڑا کہ زخمی ہونے والا سردار بوعنات ہے۔"

"تمہاری دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ تم سردار بوعنات کو تلاش کرنے نکلے ہوئے تھے اور تمہیں سردار کا حلیہ بھی معلوم نہیں تھا؟"

"ہمیں حلیہ بتایا گیا تھا لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں سردار کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اگر میں اس کو پہچان جاتا تو شاید اس پر وار ہی نہ کرسکتا' میرا مطلب ہے کہ ہاتھا پائی ہی نہ کرسکتا۔ سردار کی بہت دہشت سوار ہے ہم سب پر۔۔۔ اسے خفیہ طاقت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ۔۔۔" اس سے آگے تکلیف کے سبب ہٹلر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ کہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مجھ میں سردار سے الجھنے کی ہمت نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا۔"

میں نے کہا "سردار سے تمہارا خوف کھانا بالکل بجا تھا۔ سردار کو زخمی کرکے تم ایک بہت بڑی آفت کا شکار ہوگئے۔ یہ آفت تمہاری جان لے کر رہے گی۔"

"کک۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" ہٹلر کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اس ہانپتے کانپتے شخص پر ترس آیا لیکن اسے زندہ چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ مجھے اور صفدر کو بڑی اچھی طرح شناخت کرچکا تھا۔ اسے مرنا تھا۔۔۔ ہاں میں یہ کرسکتا تھا کہ اس کی موت کو نسبتاً آسان کردوں۔ وہ ریت پر بیٹھا تھا' اس کے دونوں ہاتھ اپنی زخمی پنڈلی پر تھے۔ میں پنڈلی دیکھنے کے بہانے اس پر جھک گیا "خدا کے لیے' مجھے مارنا مت۔ میں زندہ رہنا۔۔۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے اس کی گردن بازو میں دبوچ لی اور ایک ہی زوردار جھٹکے سے اس کا منکا توڑ ڈالا۔ وہ لرز کر میرے ہاتھوں میں ساکت ہوگیا۔ اپنی زخمی ٹانگ پر سے اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے پھسل گئے۔ وہ ایک جوان اور توانا شخص تھا نجانے کیوں مجھے اس کی موت پر افسوس ہوا۔ اس کی تلاشی لے کر میں نے اس کی اشیاء اپنی جیبوں میں ٹھونسیں' اس کی لاش کو گھسیٹ کر لمبی جنگلی گھاس میں چھپا دیا۔ یہ جگہ "گدھوں والی گھاٹی" کے قریب ہی واقع تھی۔ جیکب نے بتایا تھا کہ دن کی روشنی میں گدھوں والی گھاٹی پر اکثر بڑے بڑے گدھ جمع رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو کل ان گدھوں کو اچھی خوراک ملنے والی تھی۔

میں دوڑتا ہوا واپس جیپ کی طرف روانہ ہوا۔ سردار بوعنات کی نازک حالت کا تصور بار بار ذہن میں آجاتا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ صفدر سردار کے لیے کچھ کر بھی سکا ہے یا نہیں۔ بری طرح ہانپتا ہوا جب میں قریباً بیس منٹ بعد جیپ تک پہنچا تو سردار بوعنات کو دم توڑے ہوئے کئی منٹ ہوچکے تھے۔ میری غیر حاضری میں صفدر نے جیکب کے ساتھی کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ دیے تھے۔ اس کے بعد وہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا لیکن اسی دوران میں سردار بوعنات کے سانس پورے ہوگئے تھے۔ قبیل زار کے

لارسیوں کا باکمال سردار' اپنی تمام پُراسرار قوتوں سمیت' ایک بے خبر شخص کے وار کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ بڑھاپے میں بھی تین بیویوں کا خوش و خرم شوہر تھا اور اس کی آنکھوں کا خداداد جادو ہر کس و ناکس کے سر چڑھ کر بولتا تھا' اس تاریک رات میں وہ جیپ کی خون آلود نشست پر مردہ پڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں قوت کے بے نام سرچشمے سوکھ چکے تھے۔

○☆○

ہم سردار بوعنات کی لاش کھنڈرات میں لے آئے۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ آسمان روشن تر ہو رہا تھا اور ستارے یکے بعد دیگرے تیزی سے اوجھل ہو رہے تھے۔ کھنڈرات میں جو چند ایک لارسی موجود تھے وہ سردار بوعنات کی لاش دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ سائیں عالی نے سردار کی لاش کے گرد کئی چکر لگائے' پھر ہوا میں ہاتھ نچا نچا کر کسی ان دیکھی مخلوق سے باتیں کرنے لگا۔ اس گفتگو کے بعد وہ ہم سے مخاطب ہوا اور بولا "جنات کہتے ہیں کہ اس شخص کی آخری رسومات یہاں ادا نہیں ہونی چاہئیں۔ ورنہ بہت سے لوگوں پر نحوست آئے گی' اس کو بڑی عزت کے ساتھ یہاں سے لے جاؤ۔"

"کہاں لے جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی لے جاؤ لیکن یہاں نہیں۔۔۔ دراصل اس علاقے میں ہفتے کی شب کوہ قاف کی چڑیلیں رفع حاجت کے لیے آتی ہیں' اگر ان کی موجودگی میں سردار کی آخری رسمیں ادا کی گئیں تو سردار کی روح ناپاک ہوجائے گی۔ بہتر ہے کہ سردار کی لاش کو کسی اونچی اور پاک جگہ پر جلایا جائے۔"

"اونچی اور پاک جگہ کا پتہ بھی تم ہی بتا دو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

سائیں عالی کا مصاحب معتمد اشوکا آگے آیا۔ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا "میرا وچار ہے کہ میں سائیں صاحب کا اشارہ سمجھ گیا ہوں۔ سائیں صاحب نے اونچی پاک جگہ کا کہا ہے۔ یہاں سے دس پندرہ کلو میٹر دور "موگاسا" کی بستی ہے۔ موگاسا مقامی زبان میں اونچی پاک جگہ کو ہی کہا جاتا ہے۔"

"یہاں کون لوگ رہتے ہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"یہ بھی لارسیوں ہی کی بستی ہے۔ وہ نہ صرف سردار کی آخری رسومات کو مناسب طریقے سے ادا کریں گے بلکہ کسی لارسی کو یہ شکوہ بھی نہیں رہے گا کہ ان کے سردار کی لاش کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔"

ہم نے کچھ دیر تک صلاح مشورہ کیا پھر اشوکا نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی کہ وہ سردار کی لاش کو موگاسا بستی پہنچائے گا اور یوں پہنچائے گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں رازداری بہت ضروری بھی تھی۔ اگر ٹرسٹ والوں کو اس امر کی بھنک بھی پڑجاتی کہ قتل ہونے سے پہلے سردار بوعنات ان کھنڈرات میں پناہ گزیں تھا تو اس جگہ کی یقیناً اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی۔ دوسرے کچھ دیر پہلے اشوکا نے سردار بوعنات کی لاش موبائل کلینک کے اندر رکھوائی اور ایک ڈاکٹر اور ڈرائیور کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

جن دو گارڈز کو ہم پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے تھے ان میں سے ایک کا نام تو جیکب تھا' دوسرے کا نام ہنری معلوم ہوا۔ جیکب اور ہنری دونوں بے حد خوف زدہ تھے۔ اس خوف کا سبب وہ پُراسرار دماغی دورہ ہی تھا جو ہنری کو سردار کے تعاقب کے دوران میں پڑا تھا۔ تاریک رات میں کسی نامعلوم ہیجانی کیفیت کا شکار ہوکر اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے تھے اور جیپ گول گول گھومنا شروع ہوگئی تھی' بعد ازاں ہنری مکمل طور پر بے ہوش ہوگیا تھا۔ وہ اب ہوش میں تھا لیکن بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ جیکب کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ سردار بوعنات کی لاش دیکھنے کے بعد ایک عجیب طرح کی دہشت اس پر سوار ہوگئی تھی۔ شاید وہ خود کو بھی بالواسطہ طور پر اس قتل میں ملوث سمجھ رہا تھا یا اس عمل میں ملوث سمجھ رہا تھا جس کا اختتام سردار کے قتل پر ہوا تھا۔

کھنڈرات میں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ سائیں عالی کے نادر شاہی حکم پر کمروں کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ دیو ہیکل جنریٹر کو مسلسل چالو رکھنے کے لیے ڈیزل کے درجنوں ڈرم ایک لوڈر کے ذریعے یہاں پہنچ گئے تھے۔ سائیں کے حکم پر مختلف کمروں میں پنکھے لگائے جا رہے تھے اور رلا ملس کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ خوب صورت یورپین لڑکیاں گرمیوں کے مختصر لباس میں یہاں وہاں منڈلاتی پھرتی تھیں۔ ان کی موجودگی سے کھنڈر بارونق لگنے لگا تھا۔ چوبیس گھنٹے آرام کرنے کے بعد نائب کپتان آرتھر کافی بہتر ہوگیا تھا۔ رات کو جب صحن پُرسکون تھا اور جنریٹر کی گھوں گھوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' میں آرتھر اور پروفیسر اللہ رکھا ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ صفدر کو بھی آنا تھا مگر پھر شاید اس نے ارادہ تبدیل کردیا تھا۔ ظاہر ہے اس کی نئی نئی شادی تھی اور دلہن بھی ایسی تھی جس کے بغیر سارا دن کاٹنا اسے پہاڑ کاٹنے کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ صفدر

ہر لمحہ ویرا کی پاس رہتی ہے۔

یہ کمرا جس میں ہم بیٹھے تھے کھنڈر کے وسطی حصے میں واقع تھا۔ دیواریں جو کافی موٹی تھیں' سفید مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ گرمی سے بچنے کے لیے چھت اونچائی پر ڈالی گئی تھی۔ ہوا کی آمدورفت کے لیے روزن بھی موجود تھے۔ سائیں عالی نے چند دوسرے کمروں کی طرح یہاں بھی پنکھا لگوا دیا تھا' اس کے علاوہ ایک واٹر کولر بھی کمرے میں موجود تھا۔ یہ کمرا میرے اور پروفیسر کے استعمال میں تھا' دو چارپائیاں موجود تھیں جن کے پایوں کے نیچے پانی سے بھرے ہوئے پیالے رکھے تھے۔ اس علاقے میں حشرات الارض کی بہتات تھی جس کی وجہ سے عموماً یہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ آرتھر سائیں کا کمرا عقیدت مند ہے۔ آرتھر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "سائیں صاحب اس ویران بنجر علاقے پر اتنا پیسہ خرچ کیوں کررہے ہیں' یہاں سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔"

"وہ کوئی کام فائدے کے لیے نہیں کرتا ہے' پھر بھی اس کے اکثر کاموں سے فائدہ ہوجاتا ہے۔"

"سائیں صاحب جیسا عجیب وغریب شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے تمام دنیاوی لذتیں خود پر حرام کر رکھی ہیں' اس کے باوجود وہ بے انتہا خوش و خرم ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ان کے ایک اشارے پر سب کچھ قربان کرسکتے ہیں۔"

"اور میرا خیال ہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تمہاری اور تمہاری بیوی کی یہاں موجودگی کا سبب بھی سائیں عالی ہی ہے۔"

آرتھر چند لمحے خاموش رہا' پھر اس نے آہستہ سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا "آپ کی سوچ صحیح رخ پر گئی ہے۔ میری یہ مائیگریشن سائیں عالی ہی کی ہدایت پر ہوئی ہے' سائیں صاحب نہیں چاہتے تھے کہ میں ٹرسٹ میں رہوں اور اس ناانصافی اور ظلم کا حصہ بنا رہوں جو کنگ کی طرف سے روا رکھا جارہا ہے۔ یہ کوئی تین دن پہلے کی بات ہے جب میں ماریان سمیت ٹرسٹ سے نکل آیا۔ میری بدقسمتی کہ کنگ کو میرے رویے پر شک ہوگیا' اس نے سادہ لباس میں اپنے گارڈز میرے پیچھے لگا دیے۔ میں بڑی مشکل سے بچتا بچاتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس سفر میں کئی ایسے مرحلے بھی آئے ہیں جب میں اور ماریان اپنی زندگی سے بالکل ناامید ہوگئے تھے۔ دراصل باس مائیکل کی موت کے بعد کنگ براؤن اور اس کے ساتھیوں کا رویہ بے حد سخت ہوگیا ہے۔ وہ ہر مشکوک شخص کو پکڑ رہے ہیں اور پکڑے جانے والوں کو انسانیت سوز سزائیں دی جارہی ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو کھولتے ہوئے پانی میں زندہ اُبال دیا گیا ہے اور بعد میں ان کا گوشت ان کے ساتھیوں کو ہی کھانے پر مجبور کیا گیا ہے۔"

یہ باتیں ناقابل یقین لگ رہی تھیں مگر ٹرسٹ کے اندر کچھ بھی ناقابل یقین نہیں تھا' میں نے آرتھر سے پوچھا "مائیکل کو ہوا کیا تھا؟"

"وہ جھیل زار کے کنارے ہونے والی دو دوا لڑائی میں مارا گیا۔ اس کی لاش رات گئے کئی دوسری لاشوں کے درمیان ملی تھی۔" آرتھر نے جواب دیا۔

اس کا جواب میرے نقطہ نظر سے کافی تسلی بخش تھا۔ اس جواب سے گارڈ ہنٹر کے بیان کی بھی تصدیق ہوئی تھی۔ کل رات ہنٹر نے بتایا تھا کہ ہمیں ابھی تک ٹرسٹ کا وفادار ہی سمجھا جارہا ہے' کم از کم ہمیں باغی قرار نہیں دیا جارہا تھا۔ میرا یہ اندازہ بھی درست قرار پایا تھا کہ میرے ہاتھوں مائیکل کا دھڑن تختہ ابھی تک راز ہی ہے۔ آرتھر نے جو دیگر باتیں کیں ان سے یہی معلوم ہوا کہ جھیل زار کی لڑائی سے پہلے مائیکل اور کنگ وغیرہ ہم سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے ہیں' آخر وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ ہمارا ٹرانسمیٹر پکڑا گیا ہے۔ صفدر کے ساتھ ویرا کی شادی کو بھی ابھی تک صرف اور صرف بوکارلو کی کارستانی ہی قرار دیا جارہا تھا۔ یہ سب باتیں ہمارے حق میں جاتی تھیں۔ یہ باتیں جاننے کے بعد مجھے لگا کہ کل رات ٹرسٹ کے گارڈ ہنٹر کی گردن توڑ کر میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ وہ یہاں سے بچ کر نکل جاتا تو اس تاش کے کھیل کے بہت سے اہم پتے ہمارے ہاتھ سے نکل جاتے۔

کھنڈرات کے پیچ و خم میں اگلے دو تین روز ہم نے غیر یقینی کی کیفیت میں ہی گزارے میں نے اپنے طور پر کوشش کی تھی اور ویرا کے ذہن سے یہ بات نکالنے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا کہ اس علاقے میں ٹرسٹ اور لارسیوں کے ٹکراؤ سے جو خون خرابہ ہوا ہے اس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمے داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ میں نے اپنے موقف کے حق میں کئی دلیلیں دی تھیں' جن میں سے اکثر نے اسے متاثر کیا تھا۔ درحقیقت اس مرحلے میں میں ذہنی طور پر صفدر اور ویرا کی شادی کو تسلیم کرنے لگا تھا۔ کچھ بھی تھا بہرحال اب وہ میاں بیوی تھے' یہ کم ظرفی کی نشانی ہوتی اگر میں اب بھی ویرا سے عناد رکھتا یا صفدر کے خلاف دل میں غصہ پالتا۔ یہ سب

کچھ عجیب وغریب حالات میں ہوا تھا' بہرحال یہ ہوچکا تھا اور اسے تسلیم کرنا ہی دانش مندی تھی۔ پھر ویرا ابھی مجموعی طور پر ہم سب کو اچھی ہی لگی تھی۔ بے شک وہ حد درجہ جذباتی تھی لیکن اس میں خوش اخلاقی' ملنساری اور محبت جیسے اوصاف بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ دوستی کے حوالے سے میرے دل میں صفدر سے شکوہ موجود تھا۔ وہ منظر اکثر میرے دل ودماغ کو جھنجوڑ ڈالتا تھا جب صفدر نے باقاعدہ مجھ سے جنگ کی تھی۔ مجھ پر بے رحمانہ وار کیے تھے اور میرا گلا گھونٹا تھا۔ اس کے بعد بڑی ڈھٹائی کے ساتھ بوب لڑکیوں کو قابو کرکے ان سے جسمانی تعلق قائم کیا تھا۔ بے شک صفدر نے مجھ سے معذرت کی تھی مگر یہ معذرت ان واقعات کے مقابلے میں بالکل معمولی تھی۔ کئی بار میں تنہائی میں سوچتا تھا تو دل غم سے لبریز ہوجاتا تھا۔ بہرحال اب میں نے طے کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں مکمل خاموشی اختیار کروں گا۔ صفدر کا رویہ قدرے بہتر ہوا تھا۔ شراب نوشی میں بھی تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی۔ میں دل میں یہ امید پال رہا تھا کہ شاید حالات بہتر ہوجائیں۔

میں اور پروفیسر چونکہ صفدر کے ساتھی اور دوست تھے اس لیے ویرا کی خصوصی توجہ کا مرکز تھے۔ وہ ہمارے لیے ہر روز کچھ نہ کچھ پکا کرلے آتی تھی۔ اس کی عمر لیبارٹری میں گزری تھی' وہ بہت اچھا تو نہیں پکاتی تھی لیکن ہم دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ کسی وقت وہ ہمارے ساتھ اتنا بے تکلف ہوجاتی تھی کہ بالکل دوستوں کی طرح لگنے لگتی تھی۔ صفدر کی شکایتیں وہ مجھ سے کرتی تھی اور بڑی دھوم دھام سے کرتی تھی۔ یہ پیار بھری شکایتیں ہوتی تھیں اور اس کے نتیجے میں جو لڑائیاں ہوتی تھیں وہ بھی پیار بھری ہوتی تھیں۔

ایک دن وہ دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس آئی۔

پروفیسر نے پوچھا "کیا بات ہے بیٹی؟"

وہ گردن جھکاتے ہوئے بولی "مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے صفدر ناراض ہوگئے ہیں۔"

"کیسی غلطی؟" میں نے پوچھا۔

"میں کہتی تھی کہ صبح جلدی اٹھا کریں۔ سیر وغیرہ کیا کریں۔ ویسے بھی صحرا میں سورج نکلنے کا منظر دیکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ یہ بات مانتے ہی نہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ مان جائے گا۔ میں بھی اس سے کہوں گا۔" پروفیسر نے تسلی دی۔

"کہنے سننے کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔ اب دیکھیں بارہ بج چکے ہیں لیکن وہ ابھی تک پڑے سو رہے ہیں۔ ناشتا تک نہیں کیا۔"

"تو تم نے ضرور کوئی سخت بات کہہ دی ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"کوئی سخت بات نہیں کی۔"

"پھر کیا کیا ہے؟"

"بس ٹھنڈے پانی کی بالٹی پھینکی تھی ان پر۔" وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر بولی۔

"اوہ گاڈ۔" پروفیسر نے ہونٹ سکوڑے۔

میں نے کہا "صبح سویرے ٹھنڈے پانی سے تو وہ الرجک ہے۔ تم نے کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا' اب تو وہ کل کا ناشتا بھی نہ کرے تو حق بجانب ہے۔"

"پلیز شاہ جہاں صاحب! مجھے ڈرانے والی باتیں نہ کریں' میں دل کی بہت کمزور ہوں۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی "اس وقت مجھے آپ کی پرخلوص مدد کی ضرورت ہے۔"

"اور ہمیں تمہاری پرخلوص چائے کی۔ اگر دو کپ بہترین چائے ہمیں دستیاب ہوجائے تو تمہاری مشکل آسان کرنے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"اور اگر ایک آدھ پیکٹ بسکٹوں کا بھی ساتھ ہوجائے تو مزید تعاون کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ بھاگی بھاگی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک سفید فام ملازمہ کے ساتھ اندر داخل ہوگئی' ملازمہ کے ہاتھ میں ٹرے تھی' جس میں چائے لوازمات سمیت موجود تھی۔ چائے پی کر میں اور پروفیسر صفدر کے کمرے میں پہنچے۔ یہ کمرا اس کمرے کے ساتھ ہی واقع تھا جہاں چند روز پہلے تک لارسیوں کا پراسرار سردار بوناٹ قیام پذیر تھا۔ سردار کی ناگہانی موت کے بعد کمرا خالی پڑا تھا اور اسے دیکھ کر اداسی اور غم کا عجیب سا تاثر ذہن میں ابھرتا تھا۔ اندر صفدر اپنے کمرے میں چارپائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ شراب کی خالی بوتل فرش پر لڑھکی ہوئی تھی۔ صفدر کے کپڑوں اور بستر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج سویرے واقعی اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا گیا ہے۔ میں نے صفدر کو جگایا۔ معمولی کوشش سے وہ اٹھ بیٹھا اور لال لال آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ زیرک شخص تھا' ایک ہی لمحے میں ساری بات بھانپ گیا تھا۔ پھر بھی رسماً اس نے پوچھا "آپ دونوں یہاں؟"

"ہم کسی کی سفارش لے کر آئے ہیں بھئی۔" میں نے کہا۔

"وہ خود کہاں ہے؟" صفدر نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی آواز میں نشے کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔

ویرا صفدر کے عین پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے کھنکار کر صفدر کو متوجہ کیا۔ وہ ایک دم پلٹا۔ ویرا کی آنکھوں میں شرارت ناچتی رہی بہرحال اس نے جڑے اسٹاکل سے ہاتھ جوڑ دیے۔ صفدر کا تین چوتھائی غصہ تو اس کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ جو شاید ویرا پر جھپٹنے کا ارادہ رکھتا تھا ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے نشست پیش کی اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ویرا بدستور جڑے اسٹاکل سے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی "بندی کے لیے کیا حکم ہے؟" ویرا نے دریافت کیا۔

"بندی دو بالٹی پانی میں برف توڑ کر لائے اور میرے سر پر انڈیل دے' تاکہ میری آنکھ بہت اچھی طرح کھل جائے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شاہ جہاں صاحب! میں آپ کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ آپ غزالہ سے شادی کر لیں' میں پچھتا رہا ہوں کہ میں آپ کو کس قدر گمراہ کر رہا تھا۔ خدارا میری حالت سے عبرت پکڑیں' اگر آپ غزالہ سے واقعی بہت پیار کرتے ہیں تو پھر اس سے شادی ہرگز نہ کریں۔"

"لیکن یار مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے باقاعدہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا "اب یہی مسئلہ لے لیں۔ یہ مجھ سے کہتی ہے بلکہ حکم صادر کرتی ہے کہ میں صبح سویرے اٹھوں۔ کیونکہ میرے پر دادا کو دل کا دورہ پڑا تھا لہٰذا اس امر کے روشن امکانات ہیں کہ مجھے بھی آج کل میں یہ صورت حال پیش آ جائے' لہٰذا اگر میں اپنی شادی کی پہلی سالگرہ دیکھنے کا خواہش مند ہوں تو میرے لیے اشد ضروری ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر ایک ڈیڑھ گھنٹا سیرسپاٹے میں گزاروں۔"

"تو بھئی اس میں برائی ہی کیا ہے۔" پروفیسر نے کہا "ایک معالج کی حیثیت سے میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ صبح سویرے اٹھو اور صحرا کی صاف ستھری خوب صورت صبح کا مزہ لو۔"

"میں یہ مزہ لینے کو تیار ہوں جی۔ لیکن اس کے لیے اس کو بھی اپنے ایک دو مزے چھوڑنے ہوں گے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ میں رات بارہ ایک بجے تک اس کے پاس بیٹھ کر گپیں ہانکوں یا برج کھیلوں۔"

ویرا فوراً بولی "میرے پاپا بھی رات بارہ ایک بجے تک برج کھیلا کرتے تھے مگر صبح سویرے اٹھ کر ممی کے ساتھ تین میل کی دوڑ لگاتے تھے۔"

"وہ ممی کے ساتھ نہیں' ممی کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوں گے کیونکہ غالب امکان ہے' وہ بھی تمہاری طرح ان پر ٹھنڈا پانی پھینکتی ہوں گی۔"

میں اور پروفیسر بے اختیار مسکرا دیے۔ صفدر نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا "دیکھیں جی' اگر آپ میری ذہنی صحت کی سلامتی چاہتے ہیں تو اس کا بس ایک ہی طریقہ بچا ہے۔ آپ دونوں حضرات مجھے اپنی پناہوں بلکہ اپنی بانہوں میں لے لیں۔ میں آج رات سے آپ کے کمرے میں سویا کروں گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ پناہ دینا اخلاقی فرض ہے لیکن ایک بات میں تمہیں ابھی سے بتا دینا چاہتا ہوں۔ صبح دیر تک سونے کی تمہاری خواہش وہاں بھی پوری نہیں ہو سکے گی۔ ہم دونوں نے بھی علی الصباح اٹھنے اور صحرا کی صبح دیکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر ہمارے ساتھ ہی اٹھو گے تو ٹھیک ہے ورنہ گردن سے پکڑ کر اٹھائے جاؤ گے اور کھینچ کھینچ کر کمرے سے باہر لائے جاؤ گے۔"

"یہ تو زیادتی ہے۔" صفدر نے کراہ کر کہا۔

"زیادتی ہے بلکہ زیادتی کے اوپر زیادتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب۔" صفدر نے پوچھا۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی "رات بارہ ایک بجے تک "برج" بھی نہیں کھیل سکو گے اور صبح سویرے اٹھنا بھی پڑ جائے گا۔ یہاں کم از کم برج "وغیرہ" تو انجوائے کرتے ہی ہو۔"

ویرا نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اپنے دوست کے کان میں کوئی بے تکلف سرگوشی کر رہا ہوں اس کے چہرے پر سرخ رنگ سا لہرا گیا تھا۔ اتنے میں کمرے سے باہر تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی' پھر کسی نے دروازے پر بے تاب دستک دی۔ صفدر نے دروازہ کھولا' سامنے اشوکا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا یہاں تک کہ شفاف سر کی رگیں بھی ابھری ہوئی تھیں۔

"ایک اہم خبر ہے۔" وہ اندر آتے ہی بغیر تمہید کے بولا۔

میں نے بھانپ لیا کہ خبر اہم ہونے کے ساتھ شاید ناخوشگوار بھی ہے۔ میں اب ویرا کی طبع سے کافی حد تک آشنا ہو چکا تھا۔ اس کا مزاج ایک خوش رنگ پھول سے مشابہ تھا' جو کھلتا ہے تو ہر طرف رنگ بکھیر دیتا ہے لیکن ذرا سی دھوپ سے مرجھا کر سیاہ بھی ہو جاتا ہے۔ بہتر تھا کہ یہ خبر ویرا کی موجودگی میں نہ سنائی جاتی۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے ویرا کو باہر لے گیا۔ اشوکا نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے اور سر کا پسینہ پونچھا اور بولا

"سردار یوغات کے قتل کو لارسیوں نے برداشت نہیں کیا ہے۔"

"کیا موگاسا سے کوئی خبر آئی ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ سردار یوغات کی آخری رسومات ابھی تک ادا نہیں کی گئیں۔ لارسیوں نے اس کی لاش کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے اس پر کچھ مسالے وغیرہ لگا رکھے ہیں اور تین دن سے اسے موگاسا بستی کے معبد میں رکھا ہوا ہے۔ جن جن لارسیوں کو سردار کے قتل کی خبر مل رہی ہے وہ چھپ چھپا کر موگاسا بستی میں پہنچ رہے ہیں۔ یہ سب لوگ بے حد غصے میں ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ جوش میں آ کر کوئی خطرناک کام کر گزریں۔"

"خطرناک کام سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹرسٹ کے خلاف کوئی بھی کارروائی۔۔۔ یہ بہت جوشیلے اور ارادے کے پکے لوگ ہیں۔ بے شک جھیل زار پر ہونے والے ٹکراؤ میں انہیں شکست ہوئی ہے اور فی الوقت وہ بکھرے ہوئے ہیں مگر سردار یوغات کی موت بھی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ وہ اس قتل کا بدلہ لینے کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ بستی کے معبد یعنی بوما میں اسلحہ وغیرہ جمع کیا جا رہا ہے اور خفیہ صلاح مشورے ہو رہے ہیں' دوسری طرف سردار یوغات کی لاش کے گرد ماتم کرنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے اور ایک مقامی شخص نے سردار کی موت کے غم میں خود کو زندہ جلا ڈالا ہے۔"

اپنی اپنی جگہ ہم سب سوچ میں گم ہو گئے۔ یہ ایک نئے ہنگامے کی شروعات محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ابھی پہلے ہنگامے کے زخموں سے ہی خون رس رہا تھا۔ میں نے اشوکا سے پوچھا "کیا تمہارے خیال میں لارسیوں کے اندر اتنا دم خم ہے کہ وہ فوری طور پر ٹرسٹ کے خلاف کوئی نئی مہم جوئی کر سکیں۔"

وہ پرسوچ لہجے میں بولا "میرا اندازہ ہے اور مجھے کچھ شواہد بھی ملے ہیں کہ ہو سکتا ہے لارسی براہ راست کنگ براؤن کے ساتھ ٹکرا لیں۔ وہ کوئی زبردست قسم کی چھاپہ مار کارروائی بھی کر سکتے ہیں۔ شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں اس قسم کی کارروائیوں کے لیے یہ جنگجو قبائلی بہت مشہور ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا' کچھ دن پہلے ٹرسٹ میں کنگ براؤن نے اپنے برادر بوکارلو کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ بوکارلو کے ہاتھ پر LIZARD کے کاٹنے سے زخم بھی آیا تھا' اس وقت بھی لارسی بے حد بھڑک گئے تھے' انہوں نے کنگ کے خلاف ایک زبردست چھاپہ مار کارروائی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت تو بوکارلو صاحب نے چھاپہ ماروں کا تعاقب کر کے از خود انہیں روک لیا تھا' اب معلوم نہیں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے ابھی شواہد کی بات کی ہے۔ وہ کیا شواہد ہیں جو چھاپہ مار کارروائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟"

اشوکا نے ایک بار پھر اپنے گنجے سر سے پسینہ پونچھا اور بولا "ان لوگوں کی چھاپہ مار کارروائی بڑی خون ریز قسم کی ہوتی ہے۔ اس کارروائی میں حصہ لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حصہ لینے والے نے اپنی جان بوبو دیوتا کے نام پر قربان کر دی ہے۔ زندہ واپس آنے پر اسے یقیناً خوشی ہوتی ہوگی لیکن حملے میں مر جانے کو یہ لوگ بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ ایسے شخص کے جھونپڑے پر سرخ اور سیاہ رنگ کا پھریرا ہمیشہ کے لیے لہرا دیا جاتا ہے اور اس کے لواحقین کو خصوصی عزت دی جاتی ہے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے' لیکن تم شواہد کی بات کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "جو لوگ اپنی جان دیوتا پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں' انہیں مقامی زبان میں جام کہا جاتا ہے' اس کا مطلب جانباز یا سرفروش کا ہے۔ یہ جانباز اپنی جان لیوا مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے دیوتا یعنی آگ کے سامنے رسم ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنا ایک ہاتھ بار بار تیزی کے ساتھ آگ کے اندر سے گزارتے ہیں اور اپنے مذہبی پیشوا کے روبرو کچھ کلمات ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں ایک بہت پرانی مقدس شراب کی ایک بوتل دی جاتی ہے۔ مجھے جو اطلاع ملی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل رات بستی کے بوما کے سامنے اس قسم کی رسم ادا کی گئی ہے۔ چند جنگجو عورتوں اور بہت سے مردوں نے اس رسم میں حصہ لیا ہے۔"

"کیا میں تم سے تمہاری اطلاع کا ذریعہ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"میں آپ کو وقت آنے پر بتا دوں گا۔" اشوکا نے جواب دیا۔

"اب بتانے میں کوئی حرج ہے؟"

"حرج تو نہیں لیکن الجھن پیش آ سکتی ہے۔"

"تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"یہی سوال لے کر تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ لوگ سائیں صاحب کے کافی قریب ہیں اور ان کے مزاج کو سمجھتے ہیں' میرا خیال تھا کہ شاید آپ کوئی مشورہ دے

سکیں۔"

"تم نے سائیں عالی سے بات کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اشوکا نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے سب کچھ ان کے گوش گزار کردیا ہے' لیکن۔ ان کی طرف سے کوئی خاص۔ ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔"

"ردعمل سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے کہ سائیں صاحب اکثر اشاروں کنایوں میں یا پھر براہ راست کوئی ہدایت جاری کردیا کرتے ہیں' لیکن اس مرتبہ ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"کیا ہم خود موگا سا بستی جاسکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔ ویسے بھی یہ کافی مشکل کام ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کرکے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "میرا ایک آدمی بستی میں اب بھی موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ آج رات تک وہ تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی بات کی جاسکتی ہے۔"

اتنے میں دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا' سامنے سائیں عالی اس حالت میں موجود تھا کہ اس نے ایک ہاتھ میں ویرا کی صراحی دار گردن دبوچ رکھی تھی اور دوسرا ہاتھ منصور کے کالر میں تھا' اس کے عقب میں چار مسلح گارڈز موجود تھے۔ سائیں نے منصور اور ویرا کو کمرے میں دھکیل دیا اور پروفیسر سمیت ہم چاروں کو گھورنے لگا۔ سائیں کے عقب میں دو سفید فام موجود تھے۔ ایک درمیانی عمر کی خاتون تھی۔ دوسرا کوئی ساٹھ پینسٹھ برس کا پروفیسر نما شخص تھا۔ اس کی آنکھوں پر نہایت نفیس عینک موجود تھی۔ یہ دونوں شکل و شباہت سے امریکن لگتے تھے' ان کے ہاتھوں میں بڑے سائز کے بریف کیس موجود تھے۔ سائیں عالی ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولا "ان چاروں کو پکڑلو اور ایسے ہاتھ دکھاؤ کہ ان کے حلیے بگڑ جائیں۔"

"چاروں" سے سائیں کی مراد میں' منصور' ویرا اور پروفیسر تھے۔

سائیں کا حکم سن کر امریکن جوڑا اندر آگیا۔ بریف کیس رکھ کر بوڑھے نے آستینیں چڑھانی شروع کردی تھیں' وہ واقعی کچھ کرگزرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ منصور حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری طرح غالباً اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا کہ یہ جوڑا ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ اس بوڑھے جیسے درجن بھر افراد بھی ہوتے تو اکیلے منصور کو قابو نہیں کرسکتے تھے۔ امکان یہی تھا کہ ان لوگوں کے بریف کیس کوئی پنڈورا باکس قسم کی شے ہیں اور وہ دونوں ان میں سے کوئی انوکھی چیز نکالنے والے ہیں۔

"یہ کیا ہورہا ہے سائیں عالی؟" منصور نے پوچھا۔

"تمہیں سوالوں کا ہیضہ کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے۔ میں تمہیں ایسی دوا پلاؤں گا کہ یہ ہیضہ۔۔۔ کم ہیضے میں بدل جائے گا۔ تمہارا پیٹ پھٹ جائے گا۔ خبردار! اب اگر کوئی اور سوال کیا تو۔ بھورانی کے سامنے تمہاری بے عزتی خراب ہوجائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی سائیں نے اشوکا کو اشارہ کیا' وہ کمرے سے باہر نکل گیا سائیں نے دروازہ باہر سے بند کردیا۔ اب ہم چاروں کے علاوہ صرف امریکن جوڑا کمرے میں رہ گیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے بڑی ملائمت سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا "میرا نام ڈاکٹر اسٹیفن ہے میرا تعلق "کاسمیٹک سرجری" کے شعبے سے ہے' یہ میری ساتھی ڈاکٹر روزی ہیں۔ یہ بھی بیوٹی اور کاسمیٹکس سرجری سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ایک معروف امریکی ٹی وی چینل کے لیے بطور "میک اپ ماہر" کام کررہی ہیں۔ ہم دونوں یہاں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ کچھ جرائم پیشہ عناصر سے آپ چاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے آپ کی شکل و شباہت میں مناسب تبدیلی کی ضرورت ہے۔"

بات اچھی طرح ہماری سمجھ میں آرہی تھی اور یہ بات بہت مناسب بھی تھی' بشرطیکہ یہ لوگ واقعی اپنا کام اچھے طریقے سے انجام دیتے۔ خاتون نے اپنے بریف کیس سے دو آئینے نکالے اور سامنے دیوار کے ساتھ رکھ دیے۔ اس کے بعد دونوں بریف کیسوں سے شیشے کی بوتلوں اور چھوٹے چھوٹے ڈبوں کا ایک انبار نکل آیا۔ کچھ برش تھے' رنگ تھے' نوشتر تھے اور پتہ نہیں کیا کچھ تھا۔ اس کے بعد ادھیڑ عمر شخص نے بڑی نفاست کے ساتھ اپنے بریف کیس میں سے چند چیتھڑے برآمد کیے۔ دیکھنے میں یہ بالکل انسانی کھال لگتی تھی۔ یہ درحقیقت انسانی چہروں کی کھال کے چند مصنوعی ٹکڑے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ انہیں حیوانی کیمیائی ریشوں اور SILICONE PLASTIC وغیرہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اب ان ٹکڑوں کو ماہرانہ چابک دستی سے ہمارے چہروں کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر روزی نے ویرا کو اور ڈاکٹر اسٹیفن نے منصور کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ اس کے بعد ہم نے اگلے ایک گھنٹے میں پلاسٹک سرجری کا ایک ایسا LIVE تماشہ دیکھا جس نے عقل کو دنگ کردیا۔ منصور گھونگھریالے بالوں

والے ایک سندھی یا گجراتی شخص میں تبدیل ہوگیا تھا' بلکہ ویرا اطالوی یا فلسطینی لڑکی لگتی تھی۔ یہ یقیناً شاہکار کام تھا اور نہایت گراں معاوضے پر کیا گیا تھا۔ ویرا اور منصور کے بعد میری اور پروفیسر کی باری آئی۔ اگلے ایک گھنٹے میں ہم دونوں کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو منصور اور ویرا کے ساتھ ہوا تھا۔ ہماری صورتیں حیرت انگیز طور پر تبدیل ہوگئیں۔ ہم دونوں پاکستان کے شمالی علاقوں یا افغانستان کے باشندے نظر آرہے تھے اور یہ سب کچھ بے حد حقیقی تھا۔

وہ رات ہم نے اپنے کمرے میں ہی گزاری۔ صبح سویرے اٹھ کر پروفیسر نے سب سے پہلے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ اس بدلی ہوئی شکل کے ساتھ بہت الجھن محسوس کررہا تھا۔ الجھن تو مجھے بھی تھی لیکن چونکہ میں دو تین بار پہلے بھی میک اپ کے تجربے سے گزر چکا تھا لہٰذا زیادہ پریشان نہیں تھا۔ صبح سویرے جو دو ملازمائیں ہمارا ناشتا لے کر آئیں۔ انہوں نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا' بس "گڈمارننگ" پر ہی اکتفا کیا۔ یقیناً انہیں بتادیا گیا تھا کہ اس کمرے کے مکین تبدیل ہوچکے ہیں۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اشوکا آدھمکا۔ وہ ہمارے چہروں کے ساتھ ہونے والی کارروائی سے آگاہ تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ حیرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا۔ "ونڈر فل!" اس کے منہ سے نکلا "بہت کمال کا کام ہے' لگتا ہے کہ ماہر کاریگروں کے ہاتھ لگے ہیں۔"

"کیا خبر ہے؟" میں نے اس کے توصیفی کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"خبر اچھی نہیں ہے۔ بھگوان خیر کرے۔ موگا سا بستی کے لارسیوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ باہر کے کچھ لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی ہے مگر انہوں نے سردار کی لاش بھی نذر آتش نہیں کی۔ آئندہ چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ ممکن ہے کہ اس دوران میں لارسی کوئی انتقامی کارروائی کرگزریں۔"

"تمہارے اندازے کے مطابق یہ کارروائی کیا ہوسکتی ہے؟"

اشوکا نے اپنی پتلون کی جیب میں سے تین چھوٹی چھوٹی پڑیاں نکالیں۔ کپڑے کی ان پوٹلیوں میں سے ایک کے اندر فاسفورس تھی' دوسری میں سلفر اور تیسری میں بھی کوئی ایسا ہی کیمیائی مادہ تھا۔ وہ بولا "ان لارسیوں نے ان اشیا سے بارود تیار کررکھا ہے اور اس کا استعمال بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس بارود کو مٹی کے ہنڈولوں میں بھر کر دستی بم کی طرح استعمال کرتے ہیں اور غلیل نما آلے کے ذریعے دور تک پھینکتے ہیں۔ زہر میں بجھے ہوئے نیزوں اور تیروں کا استعمال بھی ان کے ہاں عام ہے۔ لارسیوں کے موجودہ پروگرام کے حوالے سے مجھے جو اطلاع ملی ہے وہ خاصی خوفناک ہے۔ ان لوگوں نے ایک خودکش دستہ تیار کیا ہے۔ اس دستے میں دس سے بارہ تک افراد ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے جسموں کے ساتھ خانہ ساز بارود کی بہت سی تھیلیاں باندھیں گے اور دیوانہ وار ٹرسٹ کے مین گیٹ میں گھس جائیں گے۔ انہوں نے تہیہ کیا ہے کہ وہ اپنی جانوں پر کھیل کر ٹرسٹ کا بیرونی دفاع تہس نہس کردیں گے۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ خودکشی کرنے والے اس اسکواڈ میں دو تین عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس خودکش حملے کے بعد لارسیوں کے قریباً پچاس جنگجو درانتیوں اور زہریلے تیروں سے مسلح ٹرسٹ میں گھس جائیں گے اور جتنا زیادہ سے زیادہ نقصان ٹرسٹ کو پہنچا سکیں گے پہنچائیں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ زندہ ٹرسٹیوں کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

"بہت بڑی بے وقوفی کررہے ہیں یہ لوگ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "ان کی اس جوشیلی کارروائی سے سردار بانات تو واپس نہیں آسکتا اور نہ ہی ٹرسٹ کی بنیادیں ہل سکتی ہیں۔ بس ان لوگوں کی جان جاسکتی ہے اور کئی اور گھروں میں صف ماتم بچھ سکتی ہے۔"

"اس کے بعد جو ہوگا وہ بھی تو نگاہ میں رکھو۔" پروفیسر نے کہا "کنگ براؤن مزید غصے میں آئے گا۔ قانون اس کے ہاتھ میں ہے' پولیس اور انتظامیہ اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ لارسیوں کے ساتھ کیا کچھ نہ کرگزرے گا۔"

"میری رائے میں تو اس کارروائی کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔

ایک دم کمرے کا دروازہ کھلا اور سائیں عالی بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ نوٹوں کی گڈیاں اس کے گلے میں آویزاں تھیں اور اچھل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں جو عصا تھا آج اس پر بھی گوند کے ذریعے نوٹ چپکے ہوئے تھے۔ اس نے عصا زور سے زمین پر مارا اور چنگھاڑ کر بولا "بھاگو بھاگو دُم اٹھا کر بھاگو۔ بھاگو بھاگو موگا سا کو بھاگو۔ بھاگو بھاگو بھاگو۔"

وہ پورے کمرے میں چکراتا پھرتا تھا۔ اس کی آواز بلند سے بلند ہوتی جارہی تھی۔ اس کا جوش دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ وہ ہم پر عصا برسانا شروع کردے گا۔ شور و غل سن کر منصور اور ویرا بھی وہاں پہنچ گئے۔ منصور کے رخسار میک اپ کے

بعد بہت چمکیلے اور سرخ نظر آنے لگے تھے۔ ویرا کا حسن قدرے ماند پڑا تھا اور شاید اس کی وجہ یہ تھی۔ یا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے لمبے بال جو ہمیشہ شانوں پر لہراتے تھے ذرا کھوکھرپالے کردیے گئے تھے۔ سائیں نے نڑانڑوں کا ایک ہار اپنے گلے سے اتارا۔ اس میں صرف دو استعمال شدہ گڈیاں تھیں۔ یہ ہار اس نے صفدر کے گلے میں ڈال دیا۔ ایسا ہی ایک ہار جس میں صرف ایک گڈی تھی سائیں نے میرے گلے میں ڈالا اور عصا زمین پر ٹھونک ٹھونک کر چیخا۔ "بھاگو بھاگو، قدم اٹھا کر بھاگو، زور لگا کر بھاگو، موگاسا کو بھاگو۔"

سائیں کے یہ اشارے بہت واضح تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے دروازے کے پیچھے سے ہماری باتیں سنی ہیں اور ہمارے اس ارادے سے بھی آگاہ ہوا ہے کہ ہم موگاسا کی کشیدہ صورت حال کے متعلق پریشان ہیں اور کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک سائیں نے اشوکا کے گنجے سر پر زوردار چپت ماری اور بولا "اوئے تو کھڑا کیا دیکھ رہا ہے؟ کیا تیری ویدی کی برات آنے والی ہے۔ جا تو بھی ان کے ساتھ۔"

اشوکا نے گھبرا کر زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ سائیں نے پانچ پانچ سو ڈالر کے دو نوٹوں سے اشوکا کے سر کا پسینہ پونچھا اور یہ نوٹ اشوکا کی جیب میں ڈال دیے۔ اشوکا عجز و انکسار کی تصویر نظر آنے لگا پھر سائیں نے اپنی گودڑی کے نیچے سے مٹھائی کا ایک چھوٹا ڈبا نکالا اور صفدر کی طرف بڑھایا "یہ لے منہ میٹھا کراوے اپنے ساتھیوں کا۔ تیری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ بالکل تازہ مٹھائی ہے ابھی دس منٹ ہی ہوئے ہیں کہ نکلی ہے۔ دیکھ ڈبے کے اوپر لوہاری گیٹ لاہور کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ اتنی جلدی اتنی گرما گرم مٹھائی کوئی لا سکتا ہے لاہور سے؟ صرف سائیں عالی لا سکتا ہے کیونکہ وہ جنات سے کام لیتا ہے۔"

پھر سائیں نے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں کسی کو شاباش دی اور یوں ظاہر کیا کہ وہ اتنی جلدی لوہاری گیٹ سے یہاں پہنچنے والے جن کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ اس "مقی با" جن سے خیالی گفتگو کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد اشوکا نے ہیجانی لہجے میں کہا "سائیں صاحب کا حکم بہت واضح ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ اور صفدر صاحب سائیں صاحب کے نمائندے بن کر موگاسا جائیں اور وہی کردار ادا کریں جو جھیل زار پر محترم بوکارلو نے کیا تھا۔ آپ مشتعل لارسیوں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔"

"مگر عزت مآب نے تمہارے سر پر بھی تو چپت رسید کی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

جہاں سائیں کا ہاتھ پڑا تھا وہاں چندیا پر پانچ انگلیوں کے سرخ نشان صاف نظر آرہا تھا۔ اشوکا نے سر سہلاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے بھی مترجم کی حیثیت سے آپ کے ساتھ جانے کی ہدایت ملی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے بھی تمہیں اسی طرح ہدایات ملتی رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"جج... جی ہاں... جی نہیں۔" اشوکا بوکھلا گیا۔

"کہیں ایسی ہدایات کی وجہ سے ہی تو تمہارے سر کے بال ختم نہیں ہوئے؟" صفدر نے خیال ظاہر کیا۔

طنز کو محسوس کر کے اشوکا کا رنگ سرخ ہوگیا۔ ممکن ہے کہ وہ صفدر کی بات کا کوئی تیکھا سا جواب دیتا مگر وہ سائیں کی نوازشات کے بوجھ تلے اتنا دب گیا تھا کہ کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اپنے غصے پر اس کا قابو دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ ایک گہرا شخص ہے لوہے کے مانند ٹھنڈا اور نہایت ٹھوس۔

اسی دوران میں اپنے فن کا ماہر امریکن جوڑا بھی بریف کیسز وہاں پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے کل ہی ہمیں بتایا تھا کہ وہ کل میک اپ کے "جوڑ" دیکھنے کے لیے آئیں گے۔ جوڑوں سے ان کی مراد وہ جگہیں تھیں جہاں جہاں مصنوعی جلد کو اصلی جلد کے ساتھ چسپاں کیا گیا تھا۔ ان جوڑوں کا قطعی طور پر نظر نہ آنا ہی میک اپ کی اصل کامیابی تھی۔ میک اپ دیکھ کر دونوں مطمئن ہوئے پھر بھی ہمیں آئینے کے سامنے باری باری بٹھا کر یہ لوگ قریباً ڈیڑھ گھنٹا مصروف رہے۔ ہمارے میک اپ کو لوشنز اور حرارت رساں آلات وغیرہ کے ذریعے ٹیسٹ کیا گیا۔ اس دوران میں میں، صفدر، اشوکا موگاسا بستی جانے کے لیے اپنا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ میک اپ چاروں پر اس لیے کیا گیا تھا کہ ہم یہاں کھنڈرات میں ٹرسٹ کے گارڈز کی نظروں سے محفوظ رہیں اور ہمیں بار بار کلینک کے خلا میں چوہوں اور خرگوشوں کی طرح گھمایا جائے لیکن اب صورت حال ایسی بنی تھی کہ اس میک اپ کی بدولت ہم موگاسا بستی پہنچے اور وہاں کی بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کے قابل ہوگئے تھے یا کم از کم ایسی کوشش کرنے کے قابل ہوگئے تھے۔ یہ واقعی ایک بے مثال "IMPROVEMENT" تھی۔

O☆O

اسی رات آٹھ نو بجے کے قریب ہم موگاسا بستی پہنچ گئے۔ اس بستی کا ناک نقشہ علاقے کی دوسری بستیوں جیسا

تھا۔ قطار اندر قطار گول جھونپڑے جن کی مخروطی چھتیں گھاس پھونس سے بنائی گئی تھیں، کہیں کہیں مٹی اور گارے کی چار دیواریاں بھی نظر آرہی تھیں یہ دراصل مویشیوں کے باڑے تھے۔ گھروں میں تیل اور چربی وغیرہ کے چراغ جل رہے تھے اور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس بستی میں مجھے صرف دو چیزیں مختلف نظر آئیں۔ ایک تو یہاں سبزہ بہتر دکھائی دے رہا تھا اور بستی کی شمال کی جانب درخت بھی تھے۔ یوں دکھتا تھا کہ موگاسا بستی صحرائی علاقے اور جنگل کے سنگم پر واقع ہے۔ دوسری چیز جو مختلف نظر آئی وہ کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑیں تھیں۔ یہ باڑیں اکثر گھروں کے باہر موجود تھیں۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا یہاں جنگلی جانوروں کا شدید خطرہ رہتا تھا اور یہ باڑیں ان سے حفاظت کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ ایک نسبتاً بڑی باڑ بستی کے گرد بھی موجود تھی۔

میں، صفدر اور اشوکا جیپ پر سوار تھے۔ ہم سیدھا سردار کے جھونپڑے پر پہنچے۔ یہ جھونپڑا بوما کے قریب ہی واقع تھا اور اس کی پہچان یہ تھی کہ یہ سب سے بڑا تھا اور اس پر کئی رنگوں کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ سردار کا نام رانفے تھا۔ وہ ایک نہایت تنومند شخص تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ سردار بوغات کی طرح سردار رانفے کے سر پر بھی نایاب پرندوں کے پروں کا تاج نظر آرہا تھا۔ سردار کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی لہٰذا اس نے جھونپڑے سے نکل کر ہمارا استقبال کیا۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ کی تصویر تھا اور یہ غم و اندوہ صرف سردار کے چہرے پر نہیں بستی کے ہر فرد کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ یہ سردار بوغات کی اچانک موت کا غم تھا۔ جھیل زار کی بستی لارسیوں کی بستیوں میں سب سے بڑی تھی، اس لحاظ سے سردار بوغات کا رتبہ بھی زیادہ تھا۔ بوغات کے قتل کا دکھ ہماری توقع سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ بوما یعنی عبادت گاہ کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم ہے اور ماتمی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ ایک یاس انگیز نوحہ تھا جو بہت سی نسوانی آوازوں کے باہم ملنے سے وجود میں آیا تھا۔

ہماری آمد کے ساتھ ہی بہت سے لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہوگئے۔ سیاہ فام مردوں کے بالائی جسم بالکل عریاں تھے اور سرخی مائل آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ رلا رہی ہیں۔ ان کے نیزوں کی انیاں چمک رہی تھیں اور چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ میرے اور صفدر کے گلے میں نوٹوں کی گڈیاں بدستور موجود تھیں۔ یہ گڈیاں ایک طرح سے اس بات کی علامت تھیں کہ ہم سائیں عالی کے نمائندے ہیں اور سائیں عالی کی ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں ہی سائیں کی شہرت کھنڈرات سے نکل کر قرب و جوار میں پھیل گئی تھی۔ بہت سے لوگ اس کی "زیارت" کر کے عقیدت مندوں میں شامل ہو چکے تھے اور بہت سے "زیارت" کرنے کی حسرت رکھتے تھے۔ جب انہوں نے ہمیں سائیں کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنے درمیان دیکھا تو ان کے چہروں پر عقیدت اور محبت کی برسات ہونے لگی۔ بہت سے مرد و زن نے مقامی انداز میں جھک کر ہمیں تعظیم پیش کی اور کچھ لوگ حیرت اور عقیدت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہماری جیپ کو چھونے لگے۔ ہجوم کے درمیان سے راستہ بنا کر سردار رانفے ہمیں اپنے وسیع جھونپڑے میں لے گیا۔ ہمیں ایک منقش چٹائی پر بٹھایا گیا اور مشروبات اور پھل پیش کیے گئے۔ جھونپڑے کے اندرونی حصے میں ہتھیاروں، جانوروں کے حنوط شدہ سروں اور تصویروں وغیرہ سے آرائش کی گئی تھی۔ ایک تصویر نے خصوصی طور پر میری اور صفدر کی توجہ حاصل کی۔ یہ مذہبی نوعیت کی تصویر تھی۔ قربان گاہ پر ایک خوب صورت بوب لڑکی برہنہ لیٹی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں تنومند عورتوں نے جکڑ رکھے تھے، ایک مقامی شخص لڑکی کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ یہ تصویر دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں جھیل زار کے کنارے دو بوب لڑکیوں کی ہولناک قربانی کا منظر تازہ ہوگیا۔ ایک تصویر میں بوبوریوتا یعنی آتشیں ہاتھی کو جنسی اختلاط کی حالت میں دکھایا گیا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ رسوم معمول کی حیثیت رکھتی تھیں۔ نسل در نسل یہ سلسلہ چلا آرہا تھا لہٰذا ان خرافات میں چھپی ہوئی سفاکی اور بے ہودگی ان لوگوں کے لیے غیر اہم ہو چکی تھی۔ مجموعی طور پر یہ لوگ برے نہیں تھے۔ کم از کم ٹرسٹ کے بردہ فروشوں سے تو ہزار درجہ بہتر تھے۔

ہمارے اور قبائلی سردار کے درمیان قریباً ایک گھنٹا گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو میں اشوکا نے بڑی خوبی سے مترجم کا کردار ادا کیا۔ ہم نے سردار رانفے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم ٹرسٹ کو اندر اور باہر سے بڑی اچھی طرح دیکھ چکے ہیں، اس حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹرسٹ پر جانبازوں کے حملے سے کوئی بہت زیادہ فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ میں نے سردار کو بتایا "ٹرسٹ کی اصل عمارت اور آبادی زمین دوز ہے۔ اور یہ آبادی ایک طویل سرنگ کے ذریعے ٹرسٹ کے بیرونی حصے سے ملی ہوئی ہے۔ تمہارے جانباز اپنی جانوں پر کھیل کر بس اتنا کر سکیں گے کہ ٹرسٹ کے بیرونی حصے کو جے

ہاسل کیا جاتا ہے معمولی نقصان پہنچا پائیں۔ ٹرسٹ کی اصل طاقت اور اس طاقت کے اصل مالک زمین دوز ہیں جسے یہ لوگ چھو بھی نہیں پائیں گے۔"

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔" سردار رانفے نے کہا "لیکن کیا ناکامی کے خوف سے ہم اپنا فرض ادا نہ کریں۔ کیا اب بھی ہمارا چپ چاپ بیٹھے رہنا ذلت کی انتہا نہیں ہے۔ ہماری بہو بیٹیوں کو ہمارے کھیتوں کھلیانوں سے اٹھایا گیا اور اپنے عشرت خانوں میں سجایا گیا' ہمیں بھوک ننگ دینے کے لیے ہماری فصلوں کو روند آگیا' ہمارے محترم اور پیارے ساتھی ہوکارلو کی توہین کی گئی اور انہیں ٹرسٹ میں وہ زخم دیا گیا جو پالا خران کو ایک ہاتھ سے ہی محروم کر گیا۔ جھیل زار کے کنارے ہمارے نو تعمیر شدہ معبد کو جلا کر راکھ کیا گیا اور وہاں کے رہائشیوں پر ظلم و ستم کی انتہا کی گئی۔ میرے معزز مہمانو۔۔! ہم نے یہ سب کچھ برداشت کیا لیکن اب ہم میں حوصلہ نہیں ہے۔ جی ہاں' ہم میں حوصلہ نہیں ہے کہ ہم اپنے سردار کے قتل کے بعد بھی خاموش بیٹھے رہیں۔ اس زندگی پر ہم عزت کی موت کو ترجیح دیں گے۔ ہمارا بچہ بچہ کٹ مرے گا لیکن ٹرسٹ کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے سے باز نہیں آئے گا۔"

سردار رانفے کا انداز نہایت جوشیلا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ میں بڑی کوشش کر کے اس کے ٹمپریچر کو ذرا نیچے لایا اور باقی کی گفتگو اگلی نشست کے لیے چھوڑ دی۔

سردار کے ساتھ اس کے تین چار معتمد ساتھی بھی موجود تھے' ان میں سے ایک نوجوان حبشی کا نام شازل تھا۔ وہ شکل سے ہی ایک دلیر اور جنگ جو لڑکا نظر آتا تھا۔ اس کے جبڑے پر ایک پرانے زخم کا نشان تھا جس نے اس کی معمولی شکل کو مزید معمولی کر دیا تھا۔ بہرحال اس کا جسم مضبوط تھا اور کسی شکاری جانور کی طرح چھریرا بھی تھا۔ سردار رانفے نے اس شازل نامی نوجوان سے کہا کہ وہ ہمیں اپنے گھر ٹھہرا لے۔ شازل نے خوش دلی سے یہ دعوت قبول کر لی۔ وہ ہم تینوں کو اپنے ساتھ اپنے جھونپڑے میں لے آیا۔ یہ بھی ایک کشادہ جھونپڑا تھا۔ گھاس پھونس کی مضبوط دیوار نے جھونپڑے کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دونوں حصوں میں چٹائی بچھی تھی اور ضروریات کا دیگر سامان رکھا تھا۔

ہم نے محسوس کیا کہ یہ قبائلی نوجوان کافی خاموش طبع ہے' اس کے لب و لہجے میں عجیب سی گمبھیرتا تھی۔ بات کرتے کرتے اچانک کہیں کھو جاتا تھا۔ ہماری انفکر میں یہی لگتا تھا کہ اس وسیع جھونپڑے میں وہ اکیلا رہتا ہے۔ اس نے اپنی اس رہائش گاہ کا ایک حصہ مکمل طور پر ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ جگہ چونکہ بوما سے کافی دور تھی' لہٰذا ہمیں ایک زبردست "سہولت" حاصل ہو گئی تھی۔ بوما کے اندر سے ماتمی آوازیں ایک یاس انگیز نوحے کی صورت مسلسل ہو رہی تھیں وہ یہاں تک کم کم ہی پہنچتی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم رات کو بہ آسانی سو سکیں گے لیکن سوچنے کی بات تھی کہ ہمیں سونا بھی چاہیے یا نہیں۔ بستی کی صورت حال کسی طور بھی اطمینان بخش نہیں تھی۔ جوشیلے لاری کسی بھی وقت کوئی سنگین قدم اٹھا سکتے تھے۔

بہرحال رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اس رات ہمیں ایک نیا تجربہ ہوا۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلی قریبی جنگل سے جنگلی جانوروں کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ آوازیں تو دور سے سنائی دیتی تھیں لیکن کچھ اتنے پاس سے آتی تھیں جیسے بستی کے اندر سے ہی بلند ہوئی ہوں۔ ان آوازوں میں ایک آواز بہت نہایت باریک اور تیز آواز بھی تھی۔ صبح ہمیں معلوم ہوا کہ یہ چیتے کی آواز تھی۔

صبح ہمیں ناشتا جھونپڑے کے اندر ہی کرایا گیا۔ ناشتے میں بکری کا تازہ دودھ' انڈے اور جوار کی گرم روٹی تھی جس پر شہد لگایا گیا تھا۔ ایک تو ناشتا مزے دار تھا دوسرے سرو کرنے والے ہاتھ اتنے خوب صورت تھے کہ مزہ دوبالا ہو گیا۔ یہ ایک خوب صورت مقامی لڑکی تھی۔ بے شک اس کا رنگ سیاہ تھا' مگر سیاہ رنگ میں بھی حسین خدوخال والے کو لبھا سکتے ہیں' لڑکی کی عمر بمشکل بیس بائیس برس ہوگی' آنکھیں نہایت روشن اور دانت خوب سفید تھے۔ کوئی شاعر اس کے بدن کو رس بھرے سیاہ انگور سے تشبیہ دیتا تو یہ ایک نہایت "مناسب کام" ہوتا۔ اس لڑکی کو رات ہم نے جھونپڑے کے آس پاس ہی دیکھا تھا۔ غالب گمان تھا کہ اس نے رات بھی نوجوان حبشی شازل کے ساتھ گزاری ہے۔ یہ ایک پرتجسس صورت حال تھی۔ رات اس جھونپڑے کی طرف آتے ہوئے ہمارے میزبان نے اشوکا کو مختصراً بتایا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے' جھونپڑے میں اکیلا ہی رہتا ہے۔ اگر وہ اکیلا رہتا تھا تو "سیاہ انگور" کہاں سے آن ٹپکا تھا۔

ناشتے کے بعد بھی ہم غیر ارادی طور پر اس لڑکی کو دیکھتے رہے۔ وہ بڑی تندہی سے شازل کے کام کر رہی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے شازل کو ناشتا دیا' پھر اس کے گھوڑے کو دانہ ڈالا۔ ایک پنجرے میں ایک نہایت خوب صورت افریقی پرندہ

بند تھا' اس کے پروں میں قوس قزح کے رنگ تھے۔ لڑکی نے ہم سب کی طرح اسے بھی ناشتا کرایا۔ تب وہ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی لے کر بستی کے شمالی حصے کی طرف چلی گئی۔ اس طرف پانی کے آثار نظر آتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کپڑے دھونے کے لیے گئی ہے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دھلے ہوئے کپڑوں کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے یہ کپڑے جھونپڑے سے باہر الگنی پر پھیلائے تو پتہ چلا کہ یہ شازل ہی کے کپڑے ہیں۔

اسی دوران میں بستی کا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی ہمارے پاس آ بیٹھا۔ ہم آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے جبکہ وہ پاؤں کے بل بیٹھا تھا اور بڑی عقیدت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ منصور نے اپنے گلے میں آویزاں نوٹوں میں سے دس ڈالر کا ایک نوٹ علیحدہ کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نوٹ کو تبرک کی طرح چوما' آنکھوں سے لگایا اور بڑی عقیدت سے اپنی پگڑی میں رکھ لیا' اشوکا اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اشوکا سے کہا کہ وہ اس شخص سے میزبان شازل کے بارے میں پوچھے۔ اشوکا نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد اشوکا نے بتایا کہ یہ ایک دلچسپ صورت حال ہے۔ وہ کہنے لگا "شازل ان افراد میں شامل ہے جنہوں نے "خودکش اسکواڈ" میں شمولیت اختیار کی ہے۔ یہ کل بارہ کے قریب افراد ہیں اور انہوں نے دیوتا کی ناموس پر اپنی جان نچھاور کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان تمام بارہ جانبازوں میں شازل واحد جنگ جو ہے جو غیر شادی شدہ ہے۔ لاریوں میں رواج ہے کہ جو افراد اس طرح دیوتا کی ناموس پر قربان ہونے کے لیے کسی مہم پر جانے کا اعلان کرتے ہیں وہ روانگی سے پہلے دو تین روز اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا یہ وقت صرف اور صرف اہل خانہ کے لیے ہوتا ہے۔ شازل نہ صرف غیر شادی شدہ ہے بلکہ اس کے والدین بھی حیات نہیں۔ کل رات گئے جوزبی نامی اس لڑکی کے ساتھ ہنگامی طور پر شازل کی شادی ہوئی ہے۔ ہم اسے عارضی شادی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کل رات جس وقت شازل نے ہمیں بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے' اس وقت وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور واقعی غیر شادی شدہ تھا۔"

"یہ لڑکی کون ہے؟" منصور نے پوچھا۔

"شاید آپ کا خیال ہو کہ یہ شازل کی محبوبہ یا منگیتر وغیرہ ہے' ایسا بالکل نہیں۔ شادی سے پہلے اس لڑکی کا شازل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ ویسے بھی آپ دیکھ ہی رہے ہیں' شازل بالکل معمولی شکل و صورت کا ہے جبکہ جوزبی مقامی لحاظ سے کافی خوب صورت کہی جا سکتی ہے۔ دونوں کا کوئی جوڑ نہیں۔ اس کے باوجود یہ شادی جوزبی کی خواہش سے ہوئی ہے۔ ایک طرح سے اس نے اپنا آپ ایک ایسے نوجوان پر نچھاور کیا ہے' جو خود کو دیوتا کی ناموس پر نچھاور کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ درحقیقت جوزبی نے اس شادی کی خواہش دو دن پہلے اسی وقت ظاہر کر دی تھی جب آگ کے الاؤ کے سامنے شازل نے خود کو جانبازوں کے گروہ میں شامل کیا تھا مگر شازل اس شادی پر آمادہ نہیں تھا۔ دوسری طرف جوزبی اپنے مطالبے پر اڑی رہی۔ آخر کل رات گئے اس کے پرزور اصرار پر یہ شادی نہایت خاموشی سے ہو گئی۔"

"بڑی عجیب شادی ہے۔" منصور نے گمبھیر لہجے میں کہا "اسے تو شادی مرگ کہنا چاہیے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی شازل آنکھیں ملتا ہوا جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ ہمیں باہر بیٹھے دیکھ کر اس نے تعظیم پیش کی اور سنجیدہ لہجے میں چند رسمی کلمات کہے۔ جو ظاہر ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے پھر وہ خاموشی سے اپنے گھوڑے کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر تک کھوئے کھوئے انداز میں اس کی گردن سہلاتا رہا پھر شاید نہانے کے لیے چشمے کی طرف چلا گیا۔ یہ چشمہ بستی کے شمالی کنارے پر واقع تھا اور سرسبز درختوں کے درمیان سے یوں پھوٹتا تھا جیسے کسی سرسبز کھیت کے اندر سے سفید بکریوں کی قطار نمودار ہو جائے۔

منصور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "یہاں ہر بات نرالی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم اپنی خوش قسمتی کے سبب یہاں سے زندہ سلامت واپس لوٹنے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے ساہی صاحب' عالم قریشی اور شفتا وغیرہ کو یہاں کے حالات بتائے تو کیا وہ ہمیں فاترالعقل تو قرار نہیں دے دیں گے۔"

"یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔"

"پتہ نہیں کہ وقت کب آئے گا۔" منصور نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "لگتا ہے کہ ایک زمانہ گزر گیا ہے' مہذب دنیا سے دور ہوئے۔ کراچی کا ساحل یاد آ رہا ہے' اسلام آباد کی رونقیں اور لاہور کے گلی کوچے یاد آ رہے ہیں۔۔۔ شاہراہ قائداعظم' لارنس گارڈن' کشمی چوک اور میکلوڈ روڈ۔" اس نے کھجور کی چند خشک گٹھلیوں کو ہاتھ میں ملتے ہوئے کہا "یقین کریں اس وقت شاہراہ قائداعظم کے کسی ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر چائے کا ایک گرما گرم کپ پینا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ تو چائے کا گرما گرم کپ۔۔۔ لگتا ہے

ایک مدت ہو گئی ہے' چائے کی خوشبو سونگھے ہوئے۔"

ایک دم مجھے یاد آیا کہ سائیں عالی نے وقت رخصت ہمیں مٹھائی کا ایک ڈبا دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ لوہاری گیٹ لاہور کی مٹھائی ہے جو اس نے بذریعہ جنات ہمارے لیے منگوائی ہے۔ صفدر نے وہ ڈبا سائیں عالی سے وصول کر کے بے پروائی سے جیب میں رکھ دیا تھا اور وہ ابھی تک جیب میں ہی تھا۔ میں نے صفدر سے کہا "تمہاری گرما گرم چائے والی خواہش تو شاید اس وقت پوری نہ ہو سکے مگر لاہور کی ایک سوغات تمہیں ضرور مل سکتی ہے۔"

"ارے ہاں' مجھے یاد آیا۔ وہ مٹھائی تو جیب میں ہی پڑی ہے جو سائیں نے دی تھی۔"

صفدر تیز قدموں سے جیب کی طرف گیا اور وہ ڈبا نکال لایا۔ اس نے بے تابی سے ڈبا کھولا مگر دل کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ ڈبے میں مٹھائی کی جگہ اونٹ کی سوکھی ہوئی مینگنیاں تھیں۔ ان مینگنیوں کے درمیان ایک جدید قسم کا واکی ٹاکی رکھا تھا۔ اس ہلکے پھلکے طاقت ور واکی ٹاکی پر "میڈ ان یو ایس اے" لکھا ہوا تھا۔ میں اور صفدر اس آلے کو جھونپڑے میں لے آئے۔ شازل کی ساتھی جوزبی اس وقت جھونپڑے میں نہیں تھی۔ وہ جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور شاید کسی طرح کا راز و نیاز کر رہی تھی۔ لڑکیوں کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ کی جھلک تھی' یقیناً وہ جوزبی سے اس کی "سہاگ رات" کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔ وہ سہاگ رات جس پر خوشیوں بھری زندگی کا نہیں ایک دکھ بھری موت کا سایہ تھا۔

میں نے ایک بٹن دبا کر واکی ٹاکی کو آن کیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب تھوڑی ہی دیر بعد دوسری جانب سے سائیں عالی کی نہایت واضح آواز سنائی دی۔

"ہیلو سائیں عالی آف بمبئی اسپیکنگ!" اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

"ہیلو۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تمہارا یار صفدر کہاں ہے؟"

"ہیلو سائیں عالی! میں صفدر بول رہا ہوں۔" صفدر نے واکی ٹاکی پر جھک کر کہا۔

"تمہاری آواز پر مردنی چھائی ہوئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے وہی کیا ہے جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ تم نے مٹھائی کا ڈبا کھولنے میں غیر ضروری تاخیر کی ہے اور اس میں موجود مٹھائی "اونٹ کی مینگنیوں" میں بدل گئی ہے۔ وہ جادو کی مٹھائی تھی' ایسا تو ہونا ہی تھا' بہرحال واکی ٹاکی تو تمہیں مل ہی چکا ہے۔ اسے تم دونوں بہت سنبھال کر رکھو' تمہارے کام آئے گا۔"

"یہاں حالات بہت خراب ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں حالات ٹھیک کرنے کے لیے ہی تو بھیجا ہے۔ ورنہ کس مرض کی دوا ہو تم؟ ان لوگوں کو سمجھاؤ کہ وہ غصے میں آ کر کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اٹھائیں۔ یہی شاہ جنات کی مرضی ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ لارسیوں اور نرسیلوں کا مسئلہ آج شاہ جنات نے جنوں کی اقوام متحدہ میں بھی اٹھایا ہے اور جنوں کی اقوام متحدہ کسی سپر پاور کی لونڈی نہیں وہ واقعی بااختیار ہے۔"

سائیں عالی کچھ دیر تک ادھر ادھر کی ہانکتا رہا پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

یہ بات بالکل واضح تھی کہ لارسیوں نے ابھی تک سردار بوعات کی آخری رسوم ادا نہیں کی ہیں۔ بوما کے اندر سے بدستور نوحے کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ یہ صدا جہاں تک جاتی تھی وہاں تک لارسیوں میں غم و غصے کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور وہ آپس میں پراسرار سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یقیناً یہ سرگوشیاں سردار کے قتل کے بارے میں تھیں اور اس انتقامی کارروائی کے بارے میں تھیں جو عنقریب نرسٹ کے خلاف ہونے والی تھی۔ اسی دوران میں ہم نے نوجوان شازل کو دیکھا۔ وہ ایک رات کا دولہا تھا اور اس کی سہاگ رات گزر چکی تھی۔ اب وہ اپنے عقیدے کے مطابق ایک اعلیٰ ترین مقصد کے لیے اپنی جان قربان کرنے جا رہا تھا۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ بستی میں اور کئی افراد بھی اسی طرح موت کو گلے سے لگانے کے لیے تیار تھے۔ وہ بھی شازل ہی کی طرح آج اس بستی میں اپنا آخری دن گزار رہے تھے۔ وہ جانتے تھے اس جنم بھومی کے گلی کوچوں میں' اپنے پیاروں کے درمیان اپنے بال بچوں کے ساتھ' ان کا آج آخری دن ہے۔

شازل آہستہ آہستہ چلتا ہم پر خاص توجہ دیے بغیر ہمارے قریب سے گزر گیا۔ اس نے ایک پیار بھری نظر اپنے گھوڑے پر ڈالی۔ اس منظر میں حسرت کی جھلک بھی شامل تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھوئے کھوئے انداز میں گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس پنجرے کی طرف چلا گیا جس میں رنگین پروں والا طوطا بند تھا۔ شازل کو اپنے قریب دیکھتے ہی طوطا بے قراری سے پھڑپھڑانے لگا۔ شازل نے اپنے ہاتھوں سے اسے کچھ کھلایا' اپنی انگلی سے اس کے خوب صورت پروں کو سہلایا۔ طوطا باتیں کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ مقامی

لوگوں کی طرح مقامی طوطے کی باتیں بھی ہماری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اسی موقع پر جوزبی بھی شازل کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ شازل اور طوطے کی گفتگو پر مسکرا رہی تھی' تاہم اس کی مسکراہٹ میں حزن و ملال کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ دیر تک طوطے کے ساتھ محو رہنے کے بعد شازل نے یاس انگیز انداز میں پنجرے کا دروازہ کھولا اور طوطے کو اڑا دیا۔ وہ اڑ کر تازی کی ایک بلند شاخ پر جا بیٹھا اور اس کے خوب صورت پر سورج کی روشنی میں دمکنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اڑا اور دور نکل گیا۔

میں نے صفدر سے کہا "اگر ہم نے کچھ دیر مزید سردار رانفے سے ملاقات نہ کی تو پھر ہمارے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ ان لوگوں نے جو کرنا ہے وہ کر گزریں گے۔"

صفدر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ سردار سے ملاقات کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ قبائلی اپنے ارادوں کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ سردار بوعات کا انتقام لینے سے پہلے اس کی آخری رسمیں ادا نہیں کریں گے۔"

"پھر بھی ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بہت سی انسانی جانوں کا معاملہ ہے۔" اشوکا نے کہا۔

میں' صفدر اور اشوکا ایک بار پھر سردار رانفے کے جھونپڑے کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں بوما کے قریب ہم نے چند افراد کو دیکھا' وہ نیزے ہوا میں لہرا لہرا کر پرجوش نعرے لگا رہے تھے ان کے چہرے جوش اور غضب سے تمتمائے ہوئے تھے۔ ان افراد کے گرد بستی کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ گاہے گاہے یہ ہجوم بھی نیزہ برداروں کے نعروں کا جواب دیتا تھا۔ اشوکا نے معلوم کر کے بتایا کہ یہ نیزہ بردار بھی "جانبازوں" میں شامل ہیں' یہ اپنے اس عزم کا اعادہ کر رہے ہیں کہ اگر وہ سردار کے قاتلوں کو ملیامیٹ نہ کر سکے تو خود بھی زندہ واپس نہیں آئیں گے۔

اس پرجوش ہجوم کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم سردار رانفے کے وسیع اور بلند جھونپڑے پر پہنچ گئے۔ جھونپڑے کے دروازے پر نیزہ بردار چوکس کھڑے تھے۔ عقب میں بھی دو پہرے دار موجود تھے۔ ہمیں کل یہ انتظام نظر نہیں آیا تھا۔ سردار کو ہماری آمد کی اطلاع ملی تو وہ فوراً باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ جھونپڑے میں چند اور خوش مند حبشی بھی موجود تھے' غالباً ہماری آمد سے قبل کوئی صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ یہ سب لمبے تڑنگے لوگ تھے اور ان کے چہروں اور ہاتھوں پر زخموں کے پرانے نشان گواہی دے رہے تھے کہ ان کا پیشہ سپہ گری ہے۔ ان میں ایک جنگجو عورت بھی تھی۔ ہماری آمد کے بعد سردار نے ان تمام افراد کو جھونپڑے سے رخصت کر دیا اور ہمہ تن ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے انداز میں عقیدت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آج جھونپڑے کی ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی کئی پیلیاں چنی ہوئی تھیں۔ دیکھنے میں یہ فروٹ کی پیٹیوں جیسی تھیں۔ اندرونی حصے میں گھاس پھونس رکھ کر ان پیٹیوں کو نرم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ ان پیٹیوں میں مٹی کے ہنڈولے ہیں اور ان میں مقامی طور پر تیار کردہ بارود رکھا گیا ہے۔ جھونپڑے سے باہر جو حفاظتی انتظام نظر آ رہا تھا وہ اس بارود کے سلسلے میں ہی تھا۔ یہ بات کسی کے بتائے بغیر ہی ہماری سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ وہی بارود ہے جو جانبازوں کے "خودکش" حملے میں استعمال ہوتا ہے۔

ہم نے سردار رانفے سے بات چیت کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے کل ٹوٹا تھا۔ اشوکا مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہم نے سردار کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس موقع پر جلد بازی کسی صورت ٹھیک نہیں۔ تھوڑے تھوڑے افراد کو موت کے منہ میں جھونکنے سے بہتر ہے کہ خود کو منظم کیا جائے اور پلاننگ کے ساتھ کنگ براؤن پر ایک کاری وار کیا جائے۔ ایسا وار جو فیصلہ کن بھی ثابت ہو۔

سردار جانتا تھا کہ ہماری حیثیت سائیں عالی کے نمائندوں کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سے متفق نہ ہونے کے باوجود وہ ہماری بات غور سے سن رہا تھا۔ اچانک میری جیب میں رکھے واکی ٹاکی سے سگنل کی مخصوص آواز آنے لگی۔ سردار چونک کر رہ گیا۔ میں نے واکی ٹاکی نکال کر آن کیا دوسری طرف فتنہ ساماں سائیں عالی خود تھا "ہاں شفیع محمد! کیا صورت حال ہے۔" سائیں نے مجھے اپنے پسندیدہ نام سے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک تو ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے کہا "سردار رانفے ہماری بات سن تو رہا ہے لیکن مان نہیں رہا۔"

سائیں نے فوراً اسے ایک گالی نکالی اور بولا "مانے گا کیوں نہیں۔ اس کے بڑے بڑے مانیں گے۔ دو اس کو یہ واکی ٹاکی۔"

"لیکن وہ تو افریقی سمجھتا ہے۔" میں نے سائیں کو بتایا۔

"اس کا باپ بھی میری اردو سمجھے گا' بلکہ میں پنجابی یا گجراتی بولوں گا تو وہ بھی سمجھے گا۔ دو اس کو واکی ٹاکی۔"

میں نے سیاہ رنگ کا واکی ٹاکی سردار رانفے کی طرف

بڑھایا۔ اشوکا نے سردار کو بتایا کہ سائیں صاحب اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سردار رانے سخت خوف زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ غالباً ٹرانسمیٹر یا واکی ٹاکی قسم کی چیزوں سے وہ قطعی ناآشنا تھا۔ وہ واکی ٹاکی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ڈر رہا تھا' جیسے اسے اندیشہ ہو کہ یہ کوئی بچھو قسم کی شے ہے جو اچانک اسے ڈس لے گی۔ آخر اشوکا کے بار بار کہنے پر اس نے واکی ٹاکی پکڑا اور ڈرتے ڈرتے اسے کان سے لگایا۔ چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ وہ غور سے کچھ سن رہا ہے۔ پندرہ بیس سیکنڈ اسی طرح گزرے' پھر اچانک سردار کے سیاہ چہرے پر پیلاہٹ نظر آنے لگی۔ اس کے موٹے ہونٹ بھی تھرانے لگے تھے۔ اس کی یہ کیفیت بیس تیس سیکنڈ تک برقرار رہی' پھر اس نے دو تین بار اثبات میں سر ہلایا اور کانپتے ہاتھوں سے واکی ٹاکی ہماری طرف بڑھا دیا۔

کتنی ہی دیر وہ بالکل گم صم رہا پھر اس نے اشوکا کی وساطت سے کہا "اے میرے معزز مہمانو! میں آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

میں نے اشوکا کی وساطت سے کہا "ہمارے ہمدردانہ مشورے سے آپ بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں' ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ٹرسٹ کے خلاف فوری طور پر کی جانے والی کارروائی رکوا دیں۔ اس کے بعد ہم آئندہ لائحہ عمل باہمی مشورے سے طے کرلیں گے۔"

سردار نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میرے معزز دوستو! میں اپنے قریبی ساتھیوں کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے عام لوگوں کے سامنے بھی اپنے اس فیصلے کا اعلان کرنا ہوگا۔"

"بہت شکریہ محترم سردار۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ جو بظاہر آپ کے لیے ناپسندیدہ ہے' بہت اچھے اثرات ظاہر کرے گا۔"

ہم جھونپڑے سے باہر نکل آئے۔ یہاں ابھی تک جانبازوں کا گروپ موجود تھا۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ یہ لوگ کچھ پی رہے تھے۔ اس مشروب نے ان کے چہروں کو کچھ اور تمتما دیا تھا۔ اشوکا نے آگے بڑھ کر معلوم کیا۔ پتہ چلا کہ یہ وہی مقدس شراب ہے جو دیوتا پر جان نچھاور کرنے کا عہد کرنے والوں کو دی جاتی ہے۔ یہ شراب انہیں ہر خطرے سے بے نیاز کرتی ہے اور جان پر کھیل جانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اس پرجوش گروہ کو معلوم نہیں تھا کہ صورت حال بدل چکی ہے اور سردار نے بے شک عارضی طور پر سہی مگر اپنا جارحانہ رویہ ترک کر دیا ہے۔

ہم اپنے جھونپڑے میں پہنچے تو نوجوان شانزل اور جوزفی جھونپڑے کے اندر ہی تھے۔ وہ اپنے علیحدہ پورشن میں تھے۔ اس پورشن کا دروازہ بند تھا اور اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ اپنی دانست میں اپنی انتہائی مختصر ازدواجی زندگی کو تھوڑا سا طول دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک "تھوڑی سی مہلت" سے خوشی کشید کرنے کا عمل تھا۔ زندگی انسان کو کیسے کیسے انوکھے روپ دکھاتی ہے۔ کبھی یہ زندگی بے انتہا سنگ دل اور تکلیف دہ بن جاتی ہے' پھر بھی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی خواہش رکھے' اس کے ناز اٹھائے۔ بدتر سے بدتر ہونے کے باوجود یہ زندگی انسان پر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کرتی ہے اور اکثر کامیاب رہتی ہے۔

صفدر' اشوکا اور میں جھونپڑے سے باہر ہی ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور تازہ صورت حال پر بات کرنے لگے۔ ہمارے میک اپ بڑے کامیاب جا رہے تھے۔ بدلی ہوئی شکل و صورت میں ہمیں تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ ہمیں پختہ یقین تھا کہ ٹرسٹ کے لوگ ہمیں شناخت نہیں کر سکتے۔ اشوکا اس بستی کے محل وقوع کے متعلق اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہ قدرے بلندی پر واقع تھی۔ یہاں سے گرد و نواح بخوبی نظر آرہا تھا۔ موگاسا بستی کو دو طرف سے گھنے جنگل نے گھیر رکھا تھا۔ رات بھر اس جنگل سے ہمیں درندوں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ اشوکا نے بتایا کہ ان گھنے درختوں میں کئی چھوٹی بڑی دلدلیں بھی ہیں' یہ انسان اور جانور کو زندہ نگل جاتی ہیں' لہٰذا ان درختوں میں وہی لوگ گھستے ہیں جو راستوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اشوکا نے بتایا کہ پچھلے برس ایک زخمی شیرنی نے بستی کے جانوروں اور انسانوں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ اس شیرنی کو ہلاک کرنے کے لیے ماہر نیزہ بازوں کا ایک گروہ جنگل میں داخل ہوا۔ انہوں نے شیرنی کو تو ہلاک کر ڈالا مگر اس کارروائی کے دوران میں تین افراد ایک خونی دلدل کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اشوکا نے بتایا کہ اس بستی میں آتشیں اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہے' پوری بستی میں صرف سردار رانے اور اس کے ایک بھائی کو را تفل چلانا آتی ہے۔ وہ بھی نہایت مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرتے ہیں ورنہ نیزہ ہی ان کا محبوب ہتھیار ہے۔ اشوکا نے بتایا کہ جو ایک دو رائفلیں بستی میں موجود ہیں مدت ہوئی ان کا ایمونیشن ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ فقط لاٹھی کے کام آسکتی ہیں۔ بستی میں ماہر جنگ جو افراد کی تعداد اشوکا نے سات سو کے قریب بتائی ان میں پچیس فی صد عورتیں تھیں۔

ہم دیر تک مختلف موضوعات پر بات کرتے رہے۔ سائیں عالی کی گفتگو سے سردار رانے کا ایک دم رام ہو جانا ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ خبر نہیں کہ اس نے سردار کو کیا گیدڑ بھبکی سونگھائی تھی۔ سائیں افریقی زبان نہیں جانتا تھا اور رانے افریقی کے سوا کچھ سمجھتا نہیں تھا' پھر خبر نہیں ان کے درمیان کیسے الہام و تفہیم ہوا تھا؟ بہرحال کچھ بھی تھا' اب سردار رانے غیر مشروط طور پر ہماری بات مان رہا تھا۔ ضروری تھا کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور سردار کو اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ مقتول سردار بوناٹ کی آخری رسومات ادا کروا دے۔ آخری رسومات ادا ہو جائیں تو یہ معاملہ کافی حد تک ٹھنڈا پڑ جاتا۔

اب دوپہر ہونے والی تھی۔ سورج نصف نہار پر تھا اور اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ بستی کے وسطی حصے سے مسلسل ڈھول پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ تین چار ڈھول بیک وقت پیٹے جاتے تھے اور ان کی صدا فضا میں اور جسم میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ اشوکا نے بتایا کہ یہ ڈھول ایک طرح سے جلسہ عام کا اعلان ہے' لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ معبد کے سامنے جمع ہو جائیں' وہاں سرداران کے سامنے کوئی اعلان وغیرہ کریں گے۔ ہم نے پسینے میں شرابور کئی مرد و زن کو بستی کے وسطی حصے کی طرف جاتے دیکھا۔

اچانک واکی ٹاکی پر سگنل سنائی دیا۔ میں نے واکی ٹاکی آن کیا۔ حسب توقع دوسری طرف مجموعہ عجائب سائیں عالی ہی تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا "شفیع محمد! شرارتی جنوں کا ایک گروہ اس بستی پر حملہ کرنے والا ہے۔ تم لوگ بالکل چوکس ہو جاؤ۔ وہ گروہ پرستان سے اڑ گیا ہے' راستے میں وہ صرف کوہ قاف میں پیٹرول لینے کے لیے ایک گھنٹا رکے گا پھر سیدھا یہاں پہنچ جائے گا۔ میں جنوں کی سلامتی کونسل میں احتجاج کے لیے جا رہا ہوں' میرے بعد پروفیسر امذہ دونا میرا قائم مقام ہوگا۔ کوئی مشورہ کرنا ہو تو اس سے کر لینا۔"

"یہ کیا ہانک رہے ہو۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔" میں نے بھنا کر کہا۔

"میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تو تمہارے کیا پڑے گا۔" سائیں نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن..."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سائیں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں بھونچکا بیٹھا رہ گیا "کیا کہہ رہا تھا؟" صفدر نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا واہی تباہی بول رہا تھا۔ پروفیسر کو امذہ دونا کا خطاب دے رہا تھا۔"

اشوکا حیرت سے ہم دونوں کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ اچانک واکی ٹاکی پر دوبارہ سگنل سنائی دیا اور سرخ بلب اسپارک کرنے لگا۔ میں نے سیٹ آن کیا۔ دوسری طرف پروفیسر اللہ دتا تھا۔ اس نے میری آواز پہچاننے کے بعد گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "شاہ جہاں! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ٹرسٹ والے باخبر ہو گئے ہیں کہ سردار بوناٹ کی لاش موگاسا بستی میں موجود ہے اور وہاں سے ٹرسٹ کے خلاف کوئی خون ریز کارروائی ہونے والی ہے۔ انہوں نے اس کارروائی سے پہلے ہی بستی پر بلّہ بولنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ سب کچھ تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ سائیں عالی نے خود بتایا ہے۔"

"سائیں کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں کچھ دیر پہلے سائیں عالی کو کسی نے واکی ٹاکی پر ہی اطلاع دی ہے۔ میں سائیں کے کمرے کے پاس سے گزرا تھا' اندر وہ اکیلا تھا مگر باتوں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنی ترنگ میں ہے اور دیواروں سے باتیں کر رہا ہے لیکن اب ذہن میں آرہا ہے کہ وہ واکی ٹاکی پر بول رہا تھا' کیونکہ اس کے فوراً بعد ہی وہ کمرے سے نکل آیا اور شور مچا دیا۔"

"عجیب گھن چکر بندہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کس بات پر یقین کریں اور کس کو مذاق سمجھیں۔"

"میری رائے میں اس بات پر تو یقین کر ہی لینا چاہیے' آثار یہی بتا رہے ہیں کہ ٹرسٹ کے حرامیوں کو موگاسا میں ہونے والی پلاننگ کا پتہ چل گیا ہے اور وہ طیش میں آگئے ہیں۔ موگاسا والوں کے حق میں بس ایک ہی بات جاتی ہے کہ تم دونوں وہاں موجود ہو۔ تم ان لوگوں کے بچاؤ کا کچھ سوچو۔ ابھی کچھ وقت ہے۔ راستہ دشوار ہے۔ ٹرسٹ والوں کو یہاں پہنچتے پہنچتے دو ڈھائی گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ہم... کیا کر سکتے ہیں؟"

"کچھ بھی کرو۔ تم موقع پر موجود ہو اور جو موقع پر موجود ہو' بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تو اگر بستی کے لوگ بستی چھوڑ کر ادھر ادھر بکھر جائیں تو یہ بھی ان کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ کم از کم جانی نقصان سے تو بچ جائیں گے۔"

اسی دوران میں اچانک کسی وجہ سے ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے اور صفدر نے کوشش کی مگر رابطہ بحال نہیں

ہو سکا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا' صورت حال واقعی مخدوش تھی۔ میں نے صفدر اور اشوکا کو ساتھ لیا اور تیزی سے اس مقام کی طرف بڑھا جہاں سردار رانفے نے بستی کے لوگوں کو اکٹھا کیا تھا۔ ڈھول بجنا اب بند ہو گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ جلسہ شروع ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ ہم بھاگم بھاگ موقع پر پہنچے تو بوما کے سامنے لوگوں کا جم غفیر نظر آیا۔ سردار رانفے اپنے لوگوں سے خطاب کے لیے چبوترے پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے راستے میں ہی اشوکا کو سمجھا دیا تھا کہ اسے سردار سے کیا کہنا ہے۔ اس نے فوراً چبوترے پر چڑھ کر سردار کے کان میں سرگوشی کی "سردار! اپنا اعلان روک لیں۔ صورت حال بدل گئی ہے۔"

رانفے ٹھٹک کر اشوکا کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں صفدر اور میں بھی چبوترے پر پہنچ گئے "معزز مہمانو! یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" رانفے نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں نے اشوکا کی وساطت سے جواب دیا "ہاں محترم سردار! وہ لوگ بڑی تیزی سے بستی کی طرف آ رہے ہیں۔ اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ بستی کا دفاع کریں یا پھر عارضی طور پر بستی سے نکل جائیں۔"

"یعنی آپ چاہ رہے ہیں کہ ہم اپنی عبادت گاہیں اور اپنے گھربار ان کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا معزز مہمانو... ہم کٹ مریں گے لیکن پیچھے نہیں ہٹیں گے۔"

سردار کی سرخ آنکھوں میں بجلیاں سی چمکنے لگی تھیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ سردار وہی کرے گا جو کہہ رہا ہے اور اگر وہ کسی وجہ سے یہ سب نہ کر سکا تو پھر ایسی کے قبیلے والے کریں گے۔ ویسے بھی یہ بات مشکوک تھی کہ بستی والے صحرا میں تتر بتر ہو کر جانی نقصان سے بچ جائیں گے۔ عین ممکن تھا کہ اس طرح وہ مزید بے بسی کا شکار ہو جاتے۔ زرست کی جیپیں چھوٹے چھوٹے گروہوں کا تعاقب کرتیں اور نیلی وردیوں والے گارڈز ان گروہوں کو یہ تیغ کر ڈالتے یا جال پھینک کر پکڑ لیتے۔ ایسے انسانیت سوز مناظر ہم اس سے پہلے جھیل زار کی لڑائی میں دیکھ چکے تھے۔ میں نے سردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے سردار! تم اپنے لوگوں کو بتا دو کہ زرستی حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں' اور اپنے دفاع کے لیے تیار ہو جائیں۔"

سردار رانفے نے اثبات میں سر ہلایا پھر اپنے قریبی ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چبوترے کے اوپر ہی سردار رانفے نے اپنے معتمدین کے ساتھ صلاح مشورہ کیا اس کے بعد تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ لوگوں کے روبرو آ گیا۔ اس نے اپنا نیزہ ہوا میں لہرایا اور بڑے جوش کے ساتھ بولنے لگا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں اور آواز بلند تر ہو رہی تھی۔ ہم صرف تاثرات کی زبان سمجھ رہے تھے اور تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ سردار رانفے کا جوش و جذبہ بڑی تیزی سے سیکڑوں سامعین میں منتقل ہو رہا ہے۔

سردار نے تقریر کرتے کرتے ایک پرجوش نعرہ بلند کیا۔ اس نعرے کے جواب میں سیکڑوں ہاتھ ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئے اور عسکری للکارے سے قرب و جوار گونج اٹھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ جلسہ برخاست ہو گیا' لوگ ہیجانی کیفیت میں مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ بہت سے لوگ بوما کے سامنے جمع ہو گئے اور زور و شور سے مناجات پڑھنے لگے۔ جس چبوترے پر ہم چڑھے ہوئے تھے وہاں سے پوری بستی اور قرب و جوار واضح نظر آ رہے تھے۔ بستی کو چاروں طرف سے کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ یہ باڑ جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لیے تھی اور اتنی اونچی اور گھنی نہیں تھی کہ کسی بیرونی حملے سے بستی کو محفوظ رکھ سکے۔ میں نے اشوکا سے کہا "ہمارے پاس ڈھائی تین گھنٹے ہیں اگر اس دوران میں اس باڑ کو مشرق اور جنوب کی طرف سے اونچا اور مضبوط کر دیا جائے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔"

"لیکن ان دو سمتوں میں ہی کیوں؟"

"بس... مجھے لگتا ہے کہ بستی کو اس طرف سے زیادہ خطرہ ہے۔"

"باڑ تو اونچی ہو سکتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہو۔" صفدر نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ بالکل خشک باڑ ہوگی۔ یوں سمجھیں کہ یہ ایندھن کا ذخیرہ ہوگا۔ زرست والوں نے اسے آگ دکھا دی تو یہ آدھ پون گھنٹے میں جل کر راکھ ہو جائے گی۔ آپ نے جھیل پر دیکھا ہی تھا۔" صفدر کی دلیل میں وزن تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ جن خاردار جھاڑیوں سے یہ باڑ بنائی گئی تھی وہ بستی کے اردگرد اور جنگل کے کنارے سبز حالت میں بھی موجود تھی' اگر ان سبز جھاڑیوں کو کاٹ کاٹ کر باڑ میں تبدیل کر دیا جاتا تو یہ باڑ آگ سے سو فی صد محفوظ رہتی۔ ان جنگلی جھاڑیوں کے کانٹے نہایت سخت اور کم و بیش تین تین انچ لمبے تھے۔ درحقیقت یہ

ایک قدرتی حفاظتی جنگلا تھا جس کو پار کرنا آسان کام نہیں تھا۔ خامی بس یہی تھی کہ اسے جلا کر بھسم کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اشوکا کے ذریعے سردار رانفے اور اس کے مشیروں تک یہ بات پہنچائی۔ یہ تجویز ان کے دل کو لگی۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد اس تجویز پر فوراً عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سردار نے حکم جاری کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں لارسی مرد و زن ہاتھوں میں تیز دھار آلات لے کر جھونپڑوں سے نکل آئے۔ یہ لوگ بستی سے نکلے اور یاجوج ماجوج کی طرح ان ہیولہ نما سبز جھاڑیوں پر پل پڑے۔ لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے میں' صفدر اور اشوکا بھی اس کام میں شریک ہو گئے' چھوٹی کلہاڑیوں کی مدد سے ہم نے ان جھاڑیوں سے کئی دو شاخے اور سہ شاخے علیحدہ کیے' پرجوش لوگ ان شاخوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر باڑ تک لے گئے۔ خاص طور سے مجھے اور صفدر کو اپنے درمیان پا کر ان کے حوصلے بڑھے تھے۔ ہمارے گلے میں آویزاں نوٹوں کی گڈیوں کی وجہ سے وہ ہمیں سائیں عالی کا نمائندہ سمجھتے تھے اور سائیں کے حوالے سے تھوڑے ہی عرصے میں ان کے دلوں میں بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔

جھاڑیوں کو کاٹنے اور انہیں ایک بلند و بالا باڑ میں تبدیل کرنے کا کام ہماری توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا۔ لوگوں نے پوری پوری جھاڑیاں جڑوں سے کاٹ دیں اور انہیں چیونٹیوں کی سی ہم آہنگی سے گھسیٹ کر باڑ پر پہنچا دیا۔ یہ باڑ قریباً ایک فرلانگ لمبی تھی' دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اونچائی چودہ پندرہ فٹ تک پہنچ گئی۔ یہ بات قبیلے والے بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ بستی کو اسی سمت سے زیادہ خطرہ لاحق ہے۔ باقی دو اطراف میں جنگل تھا اور جنگل کی طرف سے بستی میں گھسنا خطرات سے خالی نہیں تھا۔ بلکہ میرے خیال میں اہل قبیلہ کو اس بات کی خواہش کرنی چاہیے تھی کہ زرستی جنگل کی طرف سے بستی میں گھسنے کی کوشش کریں۔ وہ اس علاقے سے قطعی ناآشنا تھے اور وہاں ان کے لیے موت کا جال بچھا ہوا تھا۔

دو گھنٹے کے اندر اندر خشک باڑ کی جگہ ایک بلند اور گھنی سبز باڑ نے لے لی۔ اب یہ موقع تھا ان چھ عدد نہایت جدید ترین اور طاقت ور رائفلوں کو استعمال کرنے کا جو ہماری زخمی جیپ کے چور خانے میں پڑی تھیں۔ یہ رائفلیں مع ایمونیشن ہمارے ساتھ ہی جیپ میں یہاں پہنچی تھیں۔ میں صفدر اور اشوکا کے ساتھ گیا اور جیپ میں سے رائفلیں نکال لایا۔ ایمونیشن کے باکس مقامی لوگوں نے اٹھا لیے تھے۔

سردار رانفے اور دیگر لوگ یہ جدید اسلحہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اگلے آدھ گھنٹے کے اندر صفدر اور میں نے تیزی سے کارروائی کی اور ان چھ عدد رائفلوں کو... چھ نہایت مناسب جگہوں پر ماؤنٹ کر دیا۔ ہر رائفل کے ساتھ ایمونیشن بھی رکھ دیا گیا تھا۔ ٹیسٹ کے طور پر صفدر نے ایک رائفل چلا کر دیکھی۔ اس نے دور کھیتوں میں گھومتے ہوئے ایک ریوہیکل آوارہ کتے کو نشانہ بنایا' رائفل کی مار بے مثال تھی' پھر صفدر کا نشانہ بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ تڑتڑ کی ہیبت ناک آواز کے ساتھ یہ "سگ آوارہ" ہوا میں اچھلا اور چھلنی ہو کر کھیت میں گم ہو گیا۔ قبائلیوں کی آنکھیں حیرت سے مزید کشادہ ہو گئی تھیں۔ اتنے میں ایک بار پھر واکی ٹاکی جاگ اٹھا۔ اس آلے کی رینج کافی دور تک تھی اور سگنل بھی بے مثال تھے۔ میں نے ڈوائس کو آن کیا۔ دوسری طرف پروفیسر اللہ دتا تھا۔ وہ بولا "سائیں عالی یہ پوچھ رہا ہے کہ حالات کیا ہیں؟"

"وہ خود کیوں بات نہیں کر رہا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے۔ بس آسن جمائے گم صم بیٹھا ہے۔ کہتا ہے' یہ میں نہیں ہوں میرا ہمزاد ہے' میں خود جنات کی سلامتی کونسل میں گیا ہوا ہوں۔ اس شخص نے تو میرا دماغ بھی الٹا کر رکھ دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہاں ہم سے جو تیاری ہو سکتی تھی ہم نے کر لی ہے' اگر کنگ براؤن نے حملہ کیا تو اس دفعہ لارسی اس کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوں گے... آگے جو اللہ کو منظور۔"

پروفیسر اللہ دتا پُرتپش لہجے میں بولا "کاش میں بھی وہاں تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ کنگ براؤن کا نام سن کر میرا بھی خون کھول اٹھتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں' نائیکل اور کنگ براؤن کے ہرکاروں سے لڑتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

پروفیسر کے لہجے میں اسی جنگجو شخص کا جوش تھا جسے کچھ روز قبل میں نے جھیل زار کے کنارے لارسیوں کے شانہ بشانہ زرست والوں سے برسرپیکار دیکھا تھا۔ یہ پروفیسر اللہ دتا سے بالکل مختلف ایک شخص تھا' اور اس کو "بالکل مختلف شخص" بنانے میں کچھ نہ کچھ کردار میرا بھی تھا۔ میں نے ہی ایک روز کھلے سمندر میں سفر کرتے ہوئے ہرکولیس جہاز کے عرشے پر پروفیسر کو سر جھکانے کے بجائے سر اٹھانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنی پیاری بچی کے لیے مائیکل جیسے فرعونوں کے پاؤں میں سر رگڑتا رہا تو اسے

ذلت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اسے حوصلے اور جرأت سے جینا ہوگا تاکہ اس کی نئی میں بھی حوصلہ پیدا ہو سکے اور پھر پروفیسر نے واقعی خود کو بدل ڈالا تھا۔ ایک حساس اور مہربان معالج کے اندر سے ایک ایسا شخص برآمد ہوا تھا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ مجھے بھی نہیں تھی۔

پروفیسر سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے صفدر اور سردار رانفے کے ساتھ مل کر ایک بار پھر دفاعی انتظامات کا جائزہ لیا' سردار رانفے ان انتظامات سے پوری طرح متفق تھا۔ یہ بات بڑی اچھی طرح رانفے کی سمجھ میں آ رہی تھی۔۔۔ بلکہ پوری بستی کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اگر ٹرسٹ کے گارڈز کو جنوب اور مشرق کی سمت سے بستی میں آنے سے روک دیا گیا تو وہ لازمی طور پر جنگل کی طرف سے آنے کی کوشش کریں گے اور یہ کوشش انہیں جتنی مہنگی پڑ سکتی تھی ہمیں اچھی طرح معلوم تھا۔ سردار رانفے سردار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا اچھا کمان دار بھی نظر آتا تھا۔ اس نے تمام رائفلز کی پوزیشن دیکھنے کے بعد اپنے نیزہ بازوں اور تیر اندازوں کو تین مختلف جگہوں پر بڑی خوش اسلوبی سے تعینات کر دیا۔ مجھے اس امر کے تقریباً ۸۰ فی صد امکانات نظر آ رہے تھے کہ ان دفاعی انتظامات اور خاردار باڑ کے سبب ٹرسٹ کے گارڈز کی پیش قدمی روک دی جائے گی۔ اس صورت میں انہیں جنگل کی طرف سے آنا تھا۔۔۔ اور جنگ کے میدان میں ایسی غلطیاں بہت مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ یہ غلطیاں اکثر بااعتماد لوگوں سے ہی سرزد ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسا ہوتا ہے' یا پے در پے ملنے والی کامیابیوں نے ان کو خود پسند بنا رکھا ہوتا ہے۔ چند دن پہلے ایسی ہی ایک "کوتاہ اندیشی" ٹرسٹ کے سب سے بڑے خود پسند سے بھی تو سرزد ہوئی تھی۔ میرا مطلب مائیکل سے ہے۔ وہ آسانی سے زیر ہونے والا شخص نہیں تھا لیکن لڑائی کے دوران میں اس نے میری اس صلاحیت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ میں اس کی گردن کو اپنے مہلک شکنجے میں جکڑ سکتا ہوں۔۔۔ اور میں ایسا کر گزرا تھا۔ وہ انتہائی سخت مدمقابل ہونے کے باوجود لمحوں میں گردن تڑوا بیٹھا تھا اور مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا۔

ہم پوری طرح تیار تھے اور اپنے بن بلائے "مہمانوں" کا انتظار کر رہے تھے۔ وہی مہمان جنہیں جیپوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچنا تھا اور حسب معمول آگ اور بارود کے ذریعے موت کا بازار گرم کرنا تھا۔ لوگوں کو مارنا تھا' کاٹنا تھا' جھلنی کرنا تھا اور جو بچ جاتے انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح باندھ کر اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال تھا۔ کیا وہ درندہ صفت گارڈز اس مرتبہ بھی ایسا کر گزریں گے؟ اس سوال کا جواب تو ابھی کوئی نہیں دے سکتا تھا مگر مقامی لوگوں کی یک جہتی' ہمت اور ان کا بے پناہ جوش و خروش دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ اس مرتبہ کنگ کے نمک خواروں کا کام اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک اہم وجہ تو سردار بوتات کی لاش تھی جو ابھی تک یوما میں پڑی تھی اور جسے لارسی بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دوسری وجہ ہم خود تھے۔ سائمن کے نمائندوں کی حیثیت سے ہم ان لوگوں کے شانہ بشانہ موجود تھے اور اس چیز نے لارسیوں کو بہت حوصلہ بخشا تھا۔ سائمن نے یہاں جس طرح اپنا امیج بنایا تھا وہ لارسیوں کے لیے بے حد پسندیدہ تھا۔ سائمن نے گراں معاوضوں پر گوروں اور گوریوں کو ملازم رکھا تھا اور غریب مسکین حبشیوں کا خدمت گار بنا دیا تھا۔ کئی گوریوں کو باقاعدہ بے حیثیت حبشیوں کی بیویاں بنا دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ بے حد انقلابی نوعیت کا تھا۔ مقامی لوگوں میں یہ تاثر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ سائمن کسی دیوتا کا اوتار ہے جو کل کلاں ان کے لیے نجات دہندہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

انتظار مشکل ہوتا ہے۔۔۔ اور اگر یہ انتظار کسی جری حملہ آور کا ہو تو اس کی دشواری کا کیا ہی کہنا۔ ڈھائی تین گھنٹے گزرے' پھر چار گھنٹے گزرے اور پھر دن بھر کی تیز دھوپ طویل سایوں میں چھپنے لگی۔ یہ ایک پرتپش دن کی شام کے آثار تھے۔ چھ رائفلوں میں سے تین رائفلیں میرے' صفدر اور اشوکا کے پاس تھیں' ایک رائفل پر ہم نے سردار رانفے کے بھائی کو بٹھا دیا تھا اور ایک پر رانفے کو بیٹھنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ دونوں رائفل چلا سکتے تھے اور ری لوڈ بھی کر لیتے تھے' پھر بھی صفدر نے پانچ دس منٹ لگا کر انہیں مذکورہ رائفل کی تکنیک سمجھائی تھی اور اب وہ خاصے پر اعتماد دکھائی دیتے تھے۔ بستی سے ہی ہمیں ایک اور رائفل مین بھی مل گیا تھا بلکہ اسے رائفل وومین کہنا چاہیے۔ یہ ایک جنگ جو عورت تھی اور اس خودکش اسکواڈ میں شامل تھی جس نے ٹرسٹ پر حملے کا پروگرام بنایا تھا۔۔۔

میں نے اور صفدر نے ایک جھونپڑے میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس جھونپڑے کی دیواریں مٹی کی تھیں اور خاصی موٹی تھیں۔ ہماری پوزیشن اس دفاعی لائن کی اہم ترین پوزیشن تھی۔ یہ عین اس جگہ پر تھی جہاں کانٹے دار باڑ ختم ہوتی تھی اگر ہم یہاں بھرپور کارروائی کر سکتے تو گارڈز کے

دانت کھٹے ہو سکتے تھے۔

شام ہوئی اور پھر شب کی تاریکی پھیلنے لگی۔ حملہ آوروں کا ابھی کہیں پتہ نہیں تھا۔ یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی محسوس ہوتی تھی۔ ایک ہیجان خیز سنسناہٹ سی تھی جو بستی کے اس کنارے سے اس کنارے تک دوڑ رہی تھی۔ میں نے اور صفدر نے جھونپڑے میں جان بوجھ کر چراغ روشن نہیں کیا تھا اور دوسرے رائفل مینوں کی طرح تاریکی میں بیٹھے تھے۔

اچانک صفدر کی کھوئی ہوئی اور سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "شاہ جہاں صاحب! کبھی کبھی تو میں اپنے آپ سے ہی الجھنے لگتا ہوں' مجھے ابھی ہی سمجھ نہیں آئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کہیں۔۔۔ کہیں سچ مچ تو میرے دماغ پر کوئی اثر نہیں ہے۔ بے شک ویرا بہت خوب صورت ہے' بہت دلکش ہے' لیکن۔۔۔ کیا کوئی کسی کے دماغ میں یوں بھی سما تا ہے جیسے وہ میرے دماغ میں سمائی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے۔۔۔ ہاں ایک لمحے کے لیے بھی میری آنکھوں اور میرے ذہن سے جدا نہیں ہوتی ہے۔"

میں نے تاریکی میں مسکراتے ہوئے کہا "ہم نے تو سنا تھا کہ جب عورت کو حاصل کر لیا جاتا ہے اور اس کا حسن دستیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ تڑپ باقی نہیں رہتی۔"

صفدر بڑے عجیب انداز میں ہنسا' پھر ایک سرد آہ اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ اس آہ میں الکحل کی ہلکی سی بو شامل تھی۔ آج پھر اس نے تھوڑی بہت پی رکھی تھی۔ کتنی ہی دیر جھونپڑے کی تاریکی میں گمبھیر خاموشی شامل رہی۔ تب صفدر نے آہستہ سے کہا "ہم ایک طرح سے لڑائی کے میدان میں ہیں۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج آپ کو ایک بات بتانا چاہ رہا ہوں۔" چند لمحے توقف کر کے اس نے کہا "شاید آپ کو میری بات پر یقین نہ آئے کیونکہ میں نے پچھلے دنوں میں کئی طرح سے اپنا اعتماد کھویا ہے لیکن جو بات میں اب آپ کو بتا رہا ہوں وہ عجیب ہونے کے باوجود حرف بحرف صحیح ہے۔" اس نے تاریکی میں ایک گہری سانس لی اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "آپ کو یاد ہوگا' صحرائی گاؤں میں اپنی شب عروسی کے وقت ویرا میرے پاس سے اٹھ کر آپ اور پروفیسر کے پاس آ بیٹھی تھی۔ بہت دیر تک بیٹھی رہی تھی' اور میرے بہت اصرار پر میرے ساتھ واپس گئی تھی۔ آپ کو یاد ہے ناں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

صفدر بدستور گمشدہ لہجے میں بولا "شاہ جہاں صاحب! یہ ایک حقیقت ہے کہ ویرا کو پانے کے باوجود میں اب بھی اس سے اتنا ہی دور ہوں جتنا شادی سے پہلے تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن سچ یہی ہے۔ ہم اکٹھے رہتے ہیں' ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں' پیار بھی کرتے ہیں لیکن وہ جسمانی قرب نہیں ہے جو ازدواجی رشتے کی اصل پہچان ہوتا ہے۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "مگر کیوں ہے ایسا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت عجیب لڑکی ہے شاہ جہاں صاحب! بہت اچھی' بہت خوشبودار' لیکن ایک نیلی کی طرح ناقابل فہم۔۔۔ وہ کہتی ہے۔۔۔ وہ کہتی ہے کہ پچھلے کچھ دنوں کے اندر علاقے میں جو خون خرابا ہوا ہے اس کی ذمے داری کسی نہ کسی طور اس پر بھی آتی ہے۔ اس کے دل پر بہت بوجھ ہے۔ اسی حوالے

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش' بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۸۰ روپے

ہے۔ وہ اکثر تنہائی میں روتی رہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ اپنے بہتے خون پر اپنی خوشیوں کی بنیاد نہیں رکھ سکتی۔ میں اسے بہت سمجھاتا ہوں۔ وہ اکثر خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کرتی ہے مگر جلد ہی اپنی اصلی حالت میں لوٹ آتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ آپ کی طرف سے بھی بہت فکرمند ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی سے آگاہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں نے اس کی خاطر آپ سے اپنی برسوں پرانی دوستی میں دراڑ ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر آپ سے دست و گریباں بھی ہوا ہوں۔ وہ سب جانتی ہے۔" صفدر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کے جاننے سے کیا ہوتا ہے؟"

"وہ چاہتی ہے شاہ جہاں صاحب! کہ میں آپ سے اپنے تعلقات درست کروں۔ وہ مجھے اور آپ کو پھر سے بہت اچھے دوستوں کی طرح دیکھنا چاہتی ہے۔ اور جب تک ایسا نہیں ہوگا وہ اپنے دل و دماغ پر بوجھ محسوس کرتی رہے گی۔"

ایک دم میرے سینے میں درد کی ٹیس سی اٹھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کچھ دنوں سے صفدر کے رویے میں جو اچھی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ صفدر نہیں ویرا ہے۔ وہ ویرا کی دل جوئی کی خاطر مجھ سے تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ روانی میں ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جس کی وجہ سے میری نظروں میں ویرا کی قدر کچھ اور بڑھ گئی تھی اور صفدر کی کم ہو گئی تھی مگر پھر یکایک ذہن میں ایک اور بات آئی اور میں صفدر کے بارے میں بالکل مختلف رخ سے سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ میرا یار ہمیشہ سے ایسا کب تھا؟ وہ تو میرے پسینے پر خون گرانے والا اور میرے اشارے پر جان نچھاور کرنے والا تھا' وہ جو کچھ کر رہا تھا اور جو کچھ سوچ رہا تھا وہ اس کا ذاتی فعل تو نہیں تھا۔ یہ تو کوئی آسیبی قوت تھی جس نے میرے یار کے ذہن کو جکڑ رکھا تھا' اس کے خوب صورت سینے سے میری محبت نوچ کر وہاں سیاہ دھواں بھر رکھا تھا۔ وہ دھواں جس نے میرے "جگری" کو مجبور شخص بنا دیا تھا۔ وہ مریض تھا' اسے نفرت اور گریز کی نہیں محبت اور توجہ کی ضرورت تھی۔ میرا دل صفدر کی محبت سے بھر کر لبریز ہو گیا۔

وہ دکھی آواز میں بولا "شاہ جہاں صاحب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا کسی عورت کی محبت اتنی شدید بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر کچھ عرصہ مزید دوری رہی تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔"

"پاگل ہو تم۔ تم کچھ نہیں کرو گے۔ ورنہ میں تمہیں کرنے دوں گا۔ مار مار کر تمہارا حشر خراب کر دوں گا۔" میں نے اس کے سر کے بالوں سے پکڑ کر اسے جھنجوڑ دیا۔ مجھے لگا کہ میری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ہے۔

میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ صفدر' ویرا کو حاصل کر چکا ہے' لیکن یہاں تو ایک اور ہی بات سامنے آئی تھی۔ یہ بات صفدر اور ویرا کی طوفانی محبت ہی کی طرح انوکھی اور عجیب تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں کچھ اور پوچھتا۔ اچانک میری چھٹی حس نے شدید خطرے کا احساس دلایا۔ میں نے اپنے سامنے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ خاردار باڑ کی دوسری جانب مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا' اور یہ کوئی ایک دو افراد نہیں تھے' درجنوں تھے۔ بڑی ہی خاموشی اور رازداری کے ساتھ یہ لوگ باڑ کے بالکل قریب آن پہنچے تھے پھر ایک ساتھ کئی چکاچوند کر دینے والے دھماکے ہوئے' اور میں نے دو جھونپڑوں کی چھتیں تنکوں کی طرح فضا میں بکھرتے دیکھیں۔ یہ دستی بموں کے دھماکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی روشنی کا ایک گولا فضا میں پھٹا۔ چند لمحوں کے لیے سیاہ رات میں چمکیلی دوپہر کا سا اجالا ہو گیا۔ اتنی روشنی تھی کہ زمین پر رینگتے ہوئے حشرات بھی نظر آ سکتے تھے۔ میں قریباً نصف فرلانگ کے فاصلے پر جیپوں کی ایک لمبی قطار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان گاڑیوں کے انجن بند کر دیے گئے تھے اور انہیں دھکیل کر یہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ ٹرسٹ کے حیوان صفت گارڈز نے جیپوں کے عقب میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ دو جیپیں باڑ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھیں اور دستی بم یہیں سے اچھالے گئے تھے۔ ان میں سے ایک جیپ ویرا کے ایک آنکھ والے شیطان صفت چچا چین کی تھی۔ وہی چین جو ویرا اور صفدر کو زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے رائفل کا چوبی دستہ کندھے سے ٹکایا اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ اسی دوران میں خاردار باڑ پر دو دستی بم اور پھینکے گئے۔ باڑ پر بم پھینکنے کا مقصد یہی تھا کہ جمیل زار کی طرح یہاں بھی خاطفی باڑ کو آگ لگ جائے اور جیپیں دندناتی ہوئی اندر داخل ہو جائیں لیکن اس مرتبہ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔

میں نے اپنی رائفل سے پہلا برسٹ مارا اور اس کے ساتھ ہی باقی پانچ کی پانچ رائفلیں بھی ایکشن میں آگئیں۔ براہ راست لڑائی کا وہ عمل شروع ہو گیا تھا جسے روکنے کی ہم خواہش رکھتے تھے اور جس کے لیے پوری کوشش بھی کی تھی۔

دونوں اطراف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ تاریکی میں ان گنت روشن لکیروں کا جال سا کھنچ گیا تھا' یہ موت کی لکیریں تھیں۔ ٹرسٹ والوں کا حملہ جتنا اچانک تھا اتنا ہی بھرپور تھا۔ وہ جمیل زار والا خونی واقعہ دہرانا چاہتے تھے' پوری طاقت استعمال کر کے اندر گھسنا چاہتے تھے اور سامنے آنے والی ہر شے کو تاراج کر دینا چاہتے تھے لیکن اس مرتبہ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے بستی کے دفاع کی منصوبہ بندی کی تھی۔ خاص طور سے کانٹوں کی باڑ کا سرسبز ہونا' دفاعی نقطہ نظر سے بے حد مفید تھا۔ باڑ کو آگ نہیں لگ سکتی تھی۔ جن دو جیپوں نے تیز رفتاری سے باڑ کو پار کرنے کی کوشش کی وہ باڑ کے اندر الجھ کر رہ گئیں۔ ایک جیپ تو جیسے تیسے ریورس ہو گئی مگر دوسری وہیں پھنس گئی۔ صفدر نے اپنے شان دار نشانے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو برسٹ مارے اور جیپ نے ایک دھماکے سے آگ پکڑ لی۔ ایک گارڈ آگ میں لپٹا ہوا جیپ سے کودا اور میری گولی کا نشانہ بن کر باڑ کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ صفدر کا برسٹ جیپ کے ایندھن کی ٹنکی میں لگا تھا اور وہ آناً فاناً آگ کا گولا بن گئی تھی۔

اسی دوران میں بڑے سائز کی ایک لینڈ روور جیپ انتہائی رفتار سے خاردار باڑ کی طرف بڑھی۔ لینڈ روور جیپ نہایت سخت جان گاڑی سمجھی جاتی ہے۔ مضبوط چادر "بکتر بند گاڑی" جیسی ہوتی ہے' انجن نہایت طاقت ور اور فور ویل پر ہو تو ٹینک کی طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ جیپ باڑ سے ٹکرائی اور اسے تقریباً روند کر رکھ دیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ بستی کی حدود میں داخل ہو جاتی' صفدر ایک بار پھر اچھا نشانہ لگانے میں کامیاب رہا۔ اس نے جیپ کا اگلا ٹائر برسٹ کر دیا اور وہ ریتلی زمین میں گھوم کر رہ گئی۔ آگے بڑھنے میں ناکام ہونے کے بعد جیپ نے ریورس ہونے کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ اندھا دھند فائرنگ میں پہلی جیپ کا انجام گارڈز نے ملاحظہ کر لیا تھا لہٰذا اس مرتبہ انہوں نے جیپ کے اندر رہنے کی غلطی نہیں کی۔ میں نے دو سایوں کو جیپ کے اطراف میں رینگتے دیکھا۔

صفدر نے تیز سرگوشی کی "شاہ جہاں صاحب! یہ چین کی جیپ ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اندر ہو۔"

صفدر کا خیال بڑا متاثر کن تھا۔ یہ لینڈ روور جیپ ہم سے صرف بیس تیس گز کی دوری پر موجود تھی۔ اگر اس میں ویرا کا "ایک چشم" چچا چین موجود تھا تو یہ بڑی اہم صورت حال تھی۔ اتنے میں فضا کے اندر روشنی کا ایک اور گولا پھٹا۔ چند لمحے کے لیے تاریک رات چمکتی دوپہر میں بدل گئی۔ میں نے لمبے بالوں والے چین کو دیکھا۔ اس کا لباس خاردار جھاڑیوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا اور وہ بڑی جھلاہٹ میں اپنے ساتھیوں کو پکار رہا تھا۔ میری انگلی خود بخود ٹریگر پر دب گئی۔ میں نے چین کے زیریں جسم کو نشانہ بنایا تھا۔ اپنے نشانے کا نتیجہ میں نہیں دیکھ سکا کیونکہ روشنی ایک دم سے پھر تاریکی میں بدل گئی تھی۔ بہرحال مجھے قوی امید تھی کہ چین زخمی ہو گیا ہے۔

ٹرسٹ والوں کو یقیناً ایسی بھرپور مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے صرف نیزوں اور تیروں وغیرہ کے بارے میں سوچا تھا لیکن یہاں ان کا سامنا ان روایتی ہتھیاروں کے علاوہ چھ عدد جدید ترین رائفلوں سے ہوا تھا اور ان رائفلوں کو اتنی خوبی سے پوزیشن کیا گیا تھا کہ حملہ آوروں کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ جلد ہی جیپوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ ٹرسٹ والوں کی پسپائی دیکھ کر اہل بستی کی مزید حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر آگے بڑھ آئے اور گارڈز پر تیروں کی بارش کر دی۔ ان میں آتشیں تیر بھی شامل تھے۔ یہ تیر واضح روشن لکیریں چھوڑتے ہوئے اپنے نشانوں پر گر رہے تھے۔ اچانک مجھے چین کا خیال آیا۔ وہ جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ زخمی بھی ہوا ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ ابھی تک وہیں پھنسا ہوگا۔ میں جھونپڑے سے نکلا اور کرالنگ کرتا ہوا اس مقام کی طرف بڑھا جہاں میں نے آخری مرتبہ چین کو دیکھا تھا۔ میں باڑ کے نزدیک پہنچا تو مجھے دبی دبی کراہیں سنائی دیں۔ یہ چین ہی کی آواز تھی۔ وہ اپنے نام کی تفسیر بنا ہوا تھا اور سخت چین (درد) میں تھا۔ وہ اپنے پسپا ہو جانے والے ساتھیوں کو کوس رہا تھا اور ران پر فرا رہا تھا "کتے کے بچو! مجھے یہاں چھوڑ گئے ہو۔ ہیجڑو! میں دیکھ لوں گا ایک ایک کو... اوئے کوئی ہے یہاں؟ ہے کوئی؟"

میں نے دیکھ لیا تھا' چین کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں بائیں طرف سے آگے بڑھا۔ اس طرف سے چین کا ایک چراغ گل تھا' یعنی اسے نظر نہیں آتا تھا۔ گولیوں کی گونج میں وہ ایک بار پھر کراہا "کوئی ہے یہاں؟"

"ہاں میں ہوں؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے بے دریغ رائفل کا کندہ اس کے تھوبڑے پر رسید کیا۔ وہ بغیر آواز نکالے شاخوں کے اوپر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اتنی دیر میں صفدر بھی وہاں پہنچ گیا' ہم نے کھینچ تان کر بے ہوش چین کو جھاڑیوں میں سے نکالا اور ڈنڈا ڈولی کر کے جھونپڑے میں لے آئے۔

فائرنگ کا زور اب ٹوٹ گیا تھا۔ سردار رانے ایک بلند جگہ پر کھڑا ہوگیا اور بازو لہرا لہرا کر اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ جیپوں کی آوازوں اور روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گارڈز قلادا کاٹ کر اب جنگل کی طرف جارہے ہیں۔ یہ صورت حال ہماری حکمت عملی کے عین مطابق تھی۔ اگر یہ لوگ جنگل کی طرف سے بستی پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے تو سخت ترین مشکل کا شکار ہوسکتے تھے۔

ہم سب ایک قدرے بلند جگہ پر کھڑے ہوگئے اور بڑے دھیان سے گارڈز کی نقل و حرکت دیکھنے لگے۔ ہماری حیثیت ایسے شکاریوں کی تھی جو اپنے شکار کو اپنے لگائے ہوئے پھندے کی طرف بڑھتے دیکھتے ہیں مگر پھر یہ ہوا کہ جنگل کے عین کنارے پر پہنچ کر گارڈز کی گاڑیاں رک گئیں۔ وہ جیسے تذبذب کا شکار ہوگئے تھے میں نے سردار رانے سے کہا کہ گارڈز کو جنگل میں گھسانے کے لیے ضروری ہے کہ اس موقع پر ان پر کچھ دباؤ ڈالا جائے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ گاڑیاں جنگل سے دور ہٹنا شروع ہوگئیں۔ شاید وہ لوگ بستی پر مزید حملے کا ارادہ ترک کرکے واپس جارہے تھے۔ گارڈز کے نقطہ نظر سے یہ اُن کی عقل مندی تھی جبکہ ہمارے زاویہ نگاہ سے بڑی مایوس کن صورت حال تھی۔ زرسٹ کے گارڈز ایک جال میں پھنستے پھنستے بچ گئے تھے۔ ان کی واپسی سے پہلے فضا میں روشنی کے چند گولے پھٹے تھے۔ یقیناً یہی روشنی ان کے کام آئی تھی اور انہوں نے جنگل کی مخدوش صورت حال اور دلدلی زمین دیکھ کر واپسی کا ارادہ کرلیا تھا۔

ایسا کرتے ہوئے انہیں اپنے دل پر بے شک بہت جبر کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے گنگ براؤن کے سگے بھائی چین کے بغیر واپس جارہے تھے' اس کے علاوہ بھی ان کے کم و بیش پندرہ افراد ہلاک ہوئے تھے' زخمیوں کی تعداد بھی کافی رہی ہوگی۔

زرسٹی جب چوٹ کھا کر واپس لوٹ گئے تو پوری بستی میں روشنیاں جل اٹھیں اور جراغاں کا سا منظر ہوگیا۔ لوگ جوش کے عالم میں اچھلنے کودنے لگے اور اپنے ہتھیار ہوا میں لہرانے لگے۔ خوش قسمتی سے اس لڑائی میں بستی کا کوئی فرد ہلاک نہیں ہوا تھا' بس تین افراد کو گولیوں اور دستی بم کے ٹکڑوں وغیرہ سے زخم آئے تھے۔ لوگوں کو گارڈز کی پسپائی سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ گنگ براؤن کا سفاک بھائی چین زندہ پکڑلیا گیا تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں ساری باڑ کا معائنہ کیا گیا۔ یہاں درجنوں جگہ پر خون کے دھبے موجود تھے لیکن لاش یا زخمی ایک بھی موجود نہیں تھا۔ وہ لوگ پسپا ہونے سے پہلے اپنے کشتگان کو بڑی احتیاط سے اٹھا لے گئے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہمارے مترجم اشوکا نے صرف ایک لاش دریافت کی۔ یہ باڑ سے سو ڈیڑھ سو گز دور ایک گڑھے میں پڑی تھی۔ ایک تیر اس سیاہ فام گارڈ کی آنکھ میں پیوست ہوا تھا اور دماغ میں جا گھسا تھا۔ وہ کچھ دور تک دوڑا تھا اور پھر گڑھے میں گر گیا تھا۔ سردار رانے نے پرجوش ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"دیوتاؤں نے ہمیں کامیابی دی ہے لیکن ابھی مطمئن ہونے کا وقت نہیں ہے۔ زرسٹ کے وحشی زیادہ قوت کے ساتھ پھر پلٹ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے دفاع کو اور مضبوط بنانا چاہیے۔ معزز مہمان نے سبز باڑ کی جو تجویز دی تھی وہ توقع سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔ میری رائے ہے کہ ہم صبح تک اس باڑ کو اور مضبوط بنا دیں۔" سردار رانے کے اس اعلان کے تھوڑی ہی دیر بعد قبیلے کے مرد و زن ایک بار پھر کلہاڑیاں اور درانتیاں وغیرہ لے کر ان جھاڑیوں پر ٹوٹ پڑے جو خار دار باڑ بنانے کے لیے استعمال ہورہی تھیں۔ دو ڈھائی گھنٹے کے اندر خار دار باڑ مزید اونچی اور مضبوط کردی گئی۔ اس کے علاوہ زمین میں کچھ گڑھے کھودے گئے جنہیں تیر اندازی کے لیے مورچوں کی شکل دے دی گئی۔

اس دوران میں چین بھی ہوش میں آچکا تھا۔ میری گولی اس کی ران کے نچلے حصے کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا' ہاں خون کافی بہہ گیا تھا۔ اگر ہم خاردار شاخوں میں پھنسے ہوئے چین کو وہاں سے نکال نہ لاتے تو شاید مسلسل خون بہنے سے وہ وہیں انکا انکا آنجہانی ہوجاتا۔ میری ہدایت پر بستی کے مقامی معالج نے چین کے زخم کو پہلے اسپرٹ سے دھویا پھر مرہم وغیرہ لگا کر پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں چین نیم عریاں حالت میں ہمارے سامنے پڑا رہا۔ وہ مجھے اور صفدر کو پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا' یہ اس شاندار میک اپ کی کامیابی تھی جو کھنڈرات میں پلاسٹک سرجری کے امریکی ماہر اور "ماہرو" نے ہم پر کیا تھا۔ اس میک اپ کے بعد ہم دونوں نے اپنی آواز بھی تھوڑی سی تبدیل کرلی تھی' ہم چین کے سامنے آپس میں اور اشوکا کے ساتھ بات چیت کرتے رہے لیکن چین کے فرشتوں کو بھی ہم پر شک نہیں گزرا۔

چین کی اکلوتی آنکھ میں عجیب خباثت بھری ہوئی تھی۔ اس کا قد کاٹھ اچھا تھا' جسم بھی مضبوط تھا۔ اس کی دونوں رانوں پر سرخ رنگ کی ان مٹ روشنائی سے دو عریاں عورتوں کے خاکے بنے ہوئے تھے۔ یہ خاکے چین کی عیاش

طبع کی چغلی کھا رہے تھے۔ وہ غلاموں کی انٹرنیشنل منڈی "زرسٹ" کا رہائشی تھا اور گنگ کے بھائی کی حیثیت سے لا محدود اختیار اور طاقت کا مالک تھا۔ چین کو نوجوانی میں ایسا ماحول مل گیا تھا اور فطرت بھی کمینی تھی' میں تصور کرسکتا تھا کہ اس نے کیا کیا گل کھلائے ہوں گے۔ جس جھونپڑے میں چین کو رکھا گیا تھا۔ اس کے باہر بھی ایسے بہت سے مشتعل مقامی افراد موجود تھے جو چین کی بوٹیاں نوچ لینا چاہتے تھے۔ ان کے نعروں کی گونج جھونپڑے کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ چین کو ان لوگوں کے غضب سے محفوظ رکھنے کے لیے سردار نے جھونپڑے سے باہر چند نیزہ بردار محافظوں کو مقرر کردیا تھا۔ اشوکا کی زبانی معلوم ہوا کہ مقامی لوگوں میں چین کی شہرت بہت بری ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے اس کا نام استعمال کرتی ہیں۔ اسے ایک آنکھ کے شیطان کا نام دیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ خون آشام جانور کی طرح اسے جوان عورت کے جسم کی خوشبو میلوں دور سے آجاتی ہے۔

سردار رانے کی ہدایت پر اشوکا نے چین سے سوال جواب کیے۔ پہلے تو وہ بریات پر غراتا رہا اور لارسی سردار کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا' پھر وہ قدرے نرم پڑا اور اس نے دارننگ کے انداز میں لارسی سردار سے کہا "زرسٹ پر حملہ کرنے کی سازش کرکے تم لوگوں نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ اپنی نیت ٹھیک کرلو۔ ورنہ بہت خون خرابا ہوگا۔"

رانے نے اشوکا کی وساطت سے کہا "خون خرابے کا خیال تمہیں اس وقت کیوں نہ آیا جب معزز سردار ربوتات کو قتل کیا گیا؟"

"سردار ربوتات کی موت ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ اسے اتنا بڑا مسئلہ مت بناؤ۔"

"تم ہمیں بے غیرتی سکھانا چاہتے ہو۔ اس میں تمہیں ناکامی ہوگی۔" سردار رانے فرمایا۔

"غیرت کی بات کرتے ہو تو پھر تمہیں دوسروں کی غیرت کا خیال بھی رکھنا چاہیے تھا۔" چین تنک کر بولا "تم لوگوں نے دیرا کو اغوا کیا ہے' اسے حبس بے جا میں رکھا ہے اور اب زبردستی اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کی گئی ہے جس کی حیثیت یہاں بردے کی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" سردار دھاڑا "وہ لڑکی اپنی مرضی کی مالک ہے اور وہ کسی صورت واپس تم لوگوں میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی شادی اس کی خوشی سے ہوئی ہے اور یہ شادی لارسیوں نے نہیں کرائی' اس کے محترم چچا بوکارلو نے کرائی ہے۔"

چین کی اکلوتی آنکھ غضب سے دہک اٹھی۔ وہ چیخا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم اس بات سے کیسے انکار کرسکتے ہو کہ دیرا اور اس کی سہیلی کو رابرٹ نام کے غنڈے نے شہر سے اغوا کیا تھا اور سیکڑوں لارسیوں کی موجودگی میں دیرا کی سہیلی کی عزت لوٹی تھی۔"

سردار رانے نے مشتعل ہوکر نیزے کا دستہ چین کے سر پر مارا اور چیخا "تمہیں اس ایک لڑکی کی عزت یاد رہی مگر ان بے شمار لارسی عورتوں کی عزت اور جان کا حساب کون دے گا جن کو ہمارے کھیتوں کھلیانوں سے اٹھایا جاتا ہے اور زرسٹ کے زمین دوز دوزخ میں پہنچایا جاتا ہے۔ پتا نہیں کہ اب تک کتنے لارسی بچے اور جوان تمہارے ہاتھوں اپنے گھر بار سے اور اپنے وطن سے دور ہوئے ہیں۔"

سردار رانے کا پارا چڑھتا جارہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اشتعال میں چین کو مزید زخمی کردیتا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ وہ رک تو گیا مگر زور دار لہجے میں کچھ بولتا رہا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ میرے پوچھنے پر مترجم اشوکا نے بتایا کہ سردار قسم کھا رہا ہے کہ سردار ربوتات کی آخری رسمیں اس وقت تک ادا نہیں کی جائیں گی جب تک ان کے قتل کا بدلہ نہیں لے لیا جاتا۔

سردار رانے کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوگیا تو میں اور صفدر بستی کے دفاعی انتظام کا جائزہ لیتے ہوئے جھونپڑے میں واپس آگئے۔ یہ وہی جھونپڑا تھا جس میں بیٹھ کر ہم نے گارڈز کی یلغار کا مقابلہ کیا تھا۔ جھونپڑے میں ہر طرف گولیوں کے خول اور خالی میگزین بکھرے ہوئے تھے۔ جھونپڑے کی کھڑکی خاردار باڑ کے رخ پر تھی اور بالکل کسی مورچے کے روزن کی طرح نظر آتی تھی۔ اگر یہ جھونپڑا مورچے کی مثال تھا تو ہم دونوں ان دو فوجیوں کی طرح تھے جو رات بھر مورچے میں بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور جب صبح دم کچھ دیر کے لیے فائر بند ہوتا ہے تو مورچے کی دیواروں سے ٹیک لگا کر ستانے لگتے ہیں۔

صفدر نے بیڑی نما سگریٹ سلگالیا۔ اس کے خشک ہونٹوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شراب کی شدید طلب محسوس کررہا ہے۔ اس کے پاس مقامی شراب کی ایک صراحی نما بوتل موجود تھی تاہم میرے سامنے پیتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے اٹھ کر چلا جاؤں۔ میں بہانے سے نکل گیا اور ادھر ادھر گھومنے لگا۔ مجھے نوجوان

جانباز شازل نظر آیا۔ وہ جھونپڑے سے باہر اپنی خوب رو دلہن جوزبی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کل رات ہونے والی لڑائی میں شازل کے کندھے پر دستی بم کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے تھے۔ جوزبی اپنے ہاتھ سے شازل کے کندھے پر پٹی باندھ رہی تھی۔ پرسوں رات شازل اور جوزبی ایک رات کے دلہا دلہن بنے تھے لیکن اب قدرت ان پر تھوڑی سی مہربان ہوگئی تھی اور ان کی ازدواجی زندگی اب تک برقرار تھی اور ایسا صرف اس وجہ سے ہوسکا تھا کہ ہم نے ٹرسٹ پر لارسیوں کے فدائی حملے کا پروگرام رکوا دیا تھا۔ اچانک میری جیب میں موجود واکی ٹاکی پر سگنل کی آواز سنائی دی۔ میں نے واکی ٹاکی آن کیا۔ دوسری طرف مجموعۂ عجائب سائیں عالی تھا۔ اس نے پہلے تو میری آواز سن کر ایک "حق حق ہو" بلند کیا پھر بولا "تیری آواز سن کر بڑی خوشی ہوئی شفیع محمد۔"

میں نے کہا "یہ میرے بچ جانے کی خوشی ہوگی کیونکہ جہاں تم نے ہمیں بھیجا ہے وہاں لقمہ اجل بننے کے امکانات کافی روشن ہیں۔"

"مایوسی کی باتیں مت کرو۔" وہ بولا "تم ایک نیک کام کررہے ہو۔ خبیث جنات کے ساتھ مقابلے میں کمزور لوگوں کی مدد کرکے تم نے جنت میں اپنے درجات بلند کرلیے ہیں۔ بہرحال ابھی یہ درجات مزید بلند ہوں گے کیونکہ خبیث جنات نے ابھی اپنی خباثت چھوڑی نہیں ہے۔"

خبیث جنات سے سائیں کی مراد یقیناً ٹرسٹ کے گارڈز سے تھی اور خباثت نہ چھوڑنے سے مطلب یہ تھا کہ وہ مزید حملہ کرسکتے ہیں۔ میں نے سائیں سے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ تم سیدھی سیدھی بات کیا کرو۔ ان اوٹ پٹانگ حرکتوں کی وجہ سے تمہاری وزنی بات بھی ہلکی محسوس ہونے لگتی ہے۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" سائیں بولا "جو وزنی کو ہلکا سمجھیں گے وہ خود ہلکے ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور یاد رکھو۔ دولت سے زیادہ وزن کسی شے کا نہیں۔ میرے گلے میں نوٹوں کی جو گڈیاں ہیں انہوں نے میرا وزن اتنا بڑھا دیا ہے کہ میں سفید ہاتھی پر اپنی داڑھی کا بال رکھ دوں تو اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں گی۔"

سفید ہاتھی سے خبر نہیں اس کی کیا مراد تھی۔ وہ اکثر ذو معنی الفاظ استعمال کرتا تھا۔ شاید وہ سفید فاموں کو ہی سفید ہاتھی کہہ رہا تھا جو دولت کی وجہ سے سائیں کے لیے بیچ سے بیچ کام کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد سائیں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں واپس اس جھونپڑے میں لوٹ آیا جسے ہم مورچے کے طور پر استعمال کررہے تھے۔ یہاں صفدر اپنے "کام" سے فارغ ہوچکا تھا۔ جھونپڑے میں الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی اور صفدر کی آنکھوں میں اداس سا نشہ تیر رہا تھا۔ اس نے ایک بیڑی نکر میری طرف بڑھا دی۔ دوسری بیڑی سے طویل کش لیتے ہوئے بولا "شاہ جہاں صاحب! ہم واپس کب جائیں گے؟"

"تم اپنی مرضی کے خود مالک ہو۔ چاہو تو ابھی جاسکتے ہو۔"

اس نے میرے طنز کو قطعی نظر انداز کردیا' بدمزہ کھوئے لہجے میں بولا "اپنے دل پر میرا بس نہیں رہا جناب۔ ویرا کی یاد ایک پل کے لیے میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس خواہش کے سامنے میں خود کو بالکل بے بس اور کمزور محسوس کرتا ہوں۔"

"تم چاہو تو واپس جاسکتے ہو۔" میں نے پھر کہا۔

"میں یہ بھی نہیں چاہتا۔ مشکل حالات میں آپ لوگوں کو یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا تو شاید اپنی نظروں میں ہی گر جاؤں گا۔"

"پھر کیا ہوسکتا ہے؟"

"اگر... کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں کچھ دیر کے لیے خاموشی سے چلا جاؤں۔ ویرا کو دیکھ کر سر پھر تک واپس آجاؤں۔"

ویرا کی طلب صفدر کی آنکھوں میں تمتماہٹ سی رکھا رہی تھی اور یہ طلب صرف اس کی آنکھوں میں ہی نہیں تھی اس کے جسم کا ہر عضو جیسے ویرا کی محبت میں غرق تھا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ ویرا اس کے بہت قریب آکر بھی اس سے بہت دور رہی تھی۔ جب غیر معمولی قربت میں بھی غیر معمولی دوری برقرار رہے تو ایک جوان سال مرد کے اندر جو شدید ٹوٹ پھوٹ ہوسکتی ہے وہ صفدر میں بھی ہوئی تھی۔ ویرا کی محبت کی آگ پہلے ہی ایک الاؤ کی طرح اس کے سینے میں روشن تھی' اب یہ آگ اس کے پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ اس کے بدن کے ایک ایک ریشے کو جلا رہی تھی۔ میں اور صفدر ویرا کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ ظاہری اور باطنی طور پر ایک بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس میں ان گنت خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ٹرسٹ کے ماحول میں رہ کر بھی وہاں کے غیر انسانی رنگ میں رنگی نہیں گئی تھی لیکن ایک بات سے صفدر بھی انکار نہیں کرسکتا تھا' وہ دیوانگی کی حد تک جذباتی لڑکی تھی۔ اس کے اندر کے چیختے چنگھاڑتے جذبات نے اسے توڑ کر ہی رکھا تھا' اب اس نے صفدر کو بھی توڑ پھوڑ دیا

تھا۔ وہ اسے چھوڑ رہی تھی اور نہ حاصل کررہی تھی۔ خود بھی تڑپ رہی تھی اور اسے بھی تڑپا رہی تھی۔ نجانے یہ محبت کرنے کا کون سا ڈھنگ تھا۔

یکایک مجھے اور صفدر کو چونکنا پڑا۔ ہمیں اپنے سامنے باڑ کی دوسری جانب گرد کا بادل سا دکھائی دیا تھا۔ یقیناً بہت سے افراد تھے جو بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے جھونپڑے سے باہر دیکھا' لارسیوں میں بھی ہلچل نظر آرہی تھی۔ تیر اندازوں نے دوڑ دوڑ کر اپنی جگہوں پر پوزیشنز سنبھال لی تھیں۔ جن افراد کو رائفلوں پر تعینات کیا گیا تھا وہ بھی چوکس نظر آنے لگے تھے لیکن پھر یوں ہوا کہ ایک دم یہ ہلچل ختم ہوگئی بلکہ اس کی جگہ ایک طرح کی خوشی اور طمانیت لوگوں میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی' آنے والے یقیناً دشمن نہیں' دوست تھے۔ اس کا ثبوت وہ کورس کی شکل کی آوازیں تھیں جو ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ایسی آوازیں ہم جھیل زار پر بھی سن چکے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد لارسیوں کا ایک بڑا گروہ جنگل کی طرف سے نمودار ہوا۔ ان کے نیزے اور کلہاڑے وغیرہ سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ پانچ دس منٹ میں یہ لوگ بستی کے اندر تھے۔ ان سیاہ فاموں میں سے بیشتر کی صورتیں جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کا تعلق جھیل زار کی بستی سے ہے' پھر ہمیں دو صورتیں ایسی نظر آئیں جن کو دیکھنے کے بعد اس امر میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی کہ یہ لوگ جھیل زار سے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک صورت جنگ جو عورت جوری کی تھی اور دوسری نائب سردار لارونابے کی۔ ان سب کے لباس اور حلیے وغیرہ سے ظاہر تھا کہ جھیل زار پر شکست کھانے کے بعد یہ ادھر ادھر بھٹکتے رہے ہیں اور ٹرسٹ کے گارڈز سے چھپتے پھرے ہیں۔ اب انہیں اس بستی میں گارڈز کی پسپائی کی خبر ملی تھی۔ اس خبر نے ان کے مسمار حوصلوں کو پھر سے کھڑا کیا تھا اور وہ یہاں پہنچ گئے تھے۔

سردار رافے اور اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھ بڑھ کر ان خستہ حال لوگوں کو گلے سے لگایا۔ سردار رافے نے اشوکا کے ذریعے لارونابے سے ہمارا تعارف کرایا اور بولا "معزز مہمانو! ان سے ملو۔ ان کا نام لارونابے ہے۔ جھیل زار میں یہ شہید ہونے والے سردار بوعنات کے نائب تھے۔" پھر وہ ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اور یہ دونوں حضرات' صحرائی درویش کے خاص مرید ہیں اور ہمارے مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

ہم نے لارونابے سے مقامی انداز میں ہاتھ ملائے۔ لارونابے ہمیں پہچاننے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ اس تعارف سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ سائیں عالی کے لیے یہ لوگ صحرائی درویش کا لقب استعمال کررہے ہیں۔

نئے آنے والوں میں سے بہت سے لوگ سسکیاں لے رہے تھے اور آہیں بھر رہے تھے۔ ان کا یہ غم و اندوہ اپنے مقتول سردار بوعنات کے لیے تھا۔ یہ لوگ گروہ در گروہ عبادت گاہ کے اندر داخل ہوگئے اور سردار کے جسد خاکی کا دیدار کرنے لگے۔ میں اور صفدر بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی اندر چلے گئے۔ عبادت گاہ یعنی یوما میں داخلے کا ہمارا یہ پہلا موقع تھا۔ اندر سے یوما بے حد صاف ستھرا تھا۔ یہاں خوشبوئیں سلگائی گئی تھیں اور مٹی گارے کے در و دیوار پر عجیب و غریب نقش بنے ہوئے تھے۔ ان میں سرخ ہاتھی کی پوجا کے مناظر اور رقص وغیرہ کے مناظر بھی شامل تھے۔ پتھر کی ایک بہت بڑی انگیاری میں آگ روشن تھی اور یہاں بہت سے مرد و زن پوجا کرنے کے انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔ سردار کی میت لکڑی کے ایک بڑے پلیٹ فارم پر رکھی تھی۔ اس پلیٹ فارم کے نیچے لکڑی کے ہی پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس منقش پلیٹ فارم پر خوب صورت گدیلے بچھا کر سردار کو لٹایا گیا تھا۔ سردار بوعنات کو قتل ہوئے آج کئی روز ہوچکے تھے' پھر بھی اس کے جسم سے بو اٹھ رہی تھی اور نہ جلد خراب ہوئی تھی۔ ہاں چہرے کا سیاہ رنگ ذرا خاکستری نظر آتا تھا۔ یہ ان مسالا جات کی وجہ سے ہوگا جو اسے لگائے گئے تھے۔

سردار بوعنات کے گرد بیٹھی چادر پوش خواتین ہم آہنگ ہوکر ایک نوحہ بلند کررہی تھیں۔ اس نوحے کی آواز کبھی بلند ہوجاتی تھی' کبھی بالکل دھیمی پڑجاتی تھی۔ اس زیر و بم میں جو تاثر تھا اسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ نیا آنے والا ہجوم بھی اس نوحے میں شامل ہوگیا۔

صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ معاملہ بڑا طول کھینچے گا۔"

"ہاں اگر یہ لاش اسی طرح بے گور و کفن پڑی رہی پھر تو واقعی بڑا طول کھینچے گا۔"

"وہ دیکھیں' جوری کیا کررہی ہے۔" صفدر نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک پتھر پر بڑا سا پیالہ رکھا ہے۔ یہ خون سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ گرانڈیل جوری نے اس خون میں سے چلو بھر خون لے کر ہونٹوں سے لگایا اور ایک چسکی۔

لی۔ ہاتی کا خون اس نے چہرے پر مل لیا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی طرح اور بھی بہت سے سوگوار دھاڑیں مار رہے تھے۔

جس طرح کے چوبی پلیٹ فارم پر سردار بوغات لمبا لیٹا ہوا تھا ویسا پلیٹ فارم ہم ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکے تھے' جمیل زار کی بستی میں جب فرانسس نامی شخص کو مرنے کے بعد نذر آتش کیا گیا تھا تو وہ بھی ایسے ہی پلیٹ فارم کے ذریعے آگ کے الاؤ میں پہنچایا گیا تھا۔ اچانک ہوا کے باہر سے شدید شور و غل سنائی دینے لگا۔ بہت سے دیگر افراد کے ساتھ ہم بھی باہر پہنچے' اس جھونپڑے کے ارد گرد ہمیں شدید ہلچل نظر آئی' جہاں چین کو رکھا گیا تھا۔ سردار رانے بھی اس ہلچل کے مرکز میں نظر آرہا تھا۔

"مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔" صفدر غبار آلود آواز میں بولا "یہ لوگ چین کو چھوڑیں گے نہیں۔"

"اگر نہیں چھوڑیں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے۔" میں نے کہا۔

"وہ دیکھیں۔ وہی جمیل زار والا بوڑھا۔" صفدر نے انگلی سے اشارہ کیا۔

میں نے صفدر کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ مجھے وہی شخص نظر آیا جس نے ایک روز جمیل زار کی بستی میں ایک خون آلود لباس ہوا میں لہرا لہرا کر دہائی دی تھی۔ یہ لباس اس لڑکی کا تھا جسے ٹرسٹ کے غنڈوں نے بستی کے نواح سے اٹھایا تھا اور اذیت دے کر مار ڈالا تھا۔ اپنی بچی کے وہ تار تار کپڑے اس شخص نے ایک پرچم کی طرح لہرائے تھے اور سیکڑوں لارسیوں کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ وہ سنسنی خیز منظر آج بھی میری نگاہوں میں تازہ تھا اور پرجوش بوڑھے کی روتی ہوئی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ ہاں یہ اسی بوڑھے کی آواز تھی۔ آج پھر وہ چیخ چیخ کر یہی اعلان کر رہا تھا کہ اسے اپنی بچی کے خون کا حساب چاہیے۔ اشوکا نے ہمیں بتایا' یہ شخص پرزور طریقے سے دعویٰ کر رہا ہے کہ جن کارندوں نے اس کی بچی کو اغوا کیا تھا ان کے ساتھ یہ ایک آنکھ والا شیطان بھی تھا۔ بعد ازاں لڑکی کو بے آبرو کرنے والا بھی یہی لعین تھا۔ ہم نے دیکھا کہ بہت سے لوگ بوڑھے کے ہم نوا نظر آرہے ہیں۔ وہ سب شدومد سے اصرار کر رہے تھے کہ درندہ صفت مجرم کو ابھی اور اسی جگہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ سردار رانے بھی اب کسی حد تک اس حق میں ہے کہ مجرم کو اس کے جرائم کی قرار واقعی سزا دی جائے۔ دراصل رانے کے خیالات میں تبدیلی کی وجہ نائب سردار لاروتابے تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' جمیل زار کی عظیم الشان بستی کا اصل حاکم اور کرتا دھرتا یہی شخص تھا۔ چالاکی اور فہم و فراست اس شخص کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ اب لاروتابے نے ہی سردار رانے کو نیم آمادہ کیا تھا کہ چین کو فی الفور سزا دی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کارروائی سے ایک تو ٹرسٹیوں میں دہشت پھیلے گی' دوسرے وہ تمام لارسی بھی کسی حد تک مطمئن ہو جائیں گے جو اپنے پیارے سردار کی موت پر غم و غصے سے بھرے ہوئے ہیں اور "انتقام انتقام" پکار رہے ہیں۔

اشوکا سن گن لینے کے لیے آگے گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمارے پاس واپس آیا۔ اس نے کہا "گڑبڑ ہو گئی ہے' رانے اپنے لوگوں کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا ہے کہ چین کو کھجور کے خشک درخت سے باندھ کر زندہ جلا دیا جائے۔"

"ہا سنز!" صفدر دانت پیس کر بولا۔

"اگر آپ لوگوں نے کچھ کرنا ہے تو ابھی کریں۔ ورنہ یہ لوگ اپنا کام کر گزریں گے۔"

میں نے فوری طور پر سردار رانے کو ایک علیحدہ جھونپڑے میں بلایا۔ رانے نے تصدیق کی کہ چین کو درخت سے باندھ کر زندہ جلایا جا رہا ہے۔

میں نے اشوکا کی وساطت سے کہا "سردار! میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ حماقت ہو گی۔ کنگ کے بھائی کو زندہ جلانے سے پہلے ان سیکڑوں لارسیوں کا سوچو جو پچھلے چند دنوں میں پکڑے گئے ہیں اور اب ٹرسٹ کے قبضے میں ہیں۔ چین کو زندہ جلائے جانے کے بعد ان لوگوں پر کیا نہیں بیت جائے گی۔ مردہ چین کے بجائے زندہ چین ہمارے لیے کہیں زیادہ کارآمد ہے۔ سردار بوغات تو مر چکا ہے' وہ واپس نہیں آسکتا مگر محترم بوکارلو ابھی زندہ سلامت ہیں۔ تم لوگ ان کو بھی اتنا ہی مکرم سمجھتے ہو جتنا سردار بوغات کو سمجھتے رہے ہو۔ ہم چین کے بدلے میں محترم بوکارلو کو کنگ راؤن سے مانگ سکتے ہیں۔"

میری آخری بات رانے کے دل کو لگی تھی۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔ میری مدد کرتے ہوئے صفدر اور اشوکا نے بھی کچھ دلائل دیے۔ سردار سوچتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔ دوسری طرف غضب ناک لارسی "یک چشم" چین کو جھونپڑے سے باہر گھسیٹ لائے تھے۔ وہ اسے گھونسوں' ٹھوکروں اور لکڑیوں سے بری طرح پیٹ رہے تھے۔ یہ منظر عبرت ناک تھا۔ یہ وہی چین تھا جو ٹرسٹ میں وی

آئی پی کی حیثیت سے دندناتا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر سیکڑوں لوگوں کی زندگی موت میں اور موت زندگی میں بدل سکتی تھی۔ غلام اور کنیزیں' مویشیوں کے ریوڑوں کی طرح اس کے حکم پر حرکت کرتے تھے اور اس کی اکلوتی آنکھ کی بجلی بڑے سے بڑے سورما کو چشم زدن میں جلا کر راکھ کر سکتی تھی لیکن اب وہ معمولی اور بے نوا لوگوں کی ٹھوکروں میں تھا اور وہ اسے قتل گاہ کی طرف ہانک رہے تھے۔ اس کے جسم پر صرف ایک پھٹی ہوئی پتلون باقی رہ گئی تھی اور اس کے حلق سے غضب ناک غراہٹوں کے بجائے اب ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں۔

اسے کھجور کے ایک خشک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ مضبوط رسے کے مضبوط بل تھے جس نے چین کو گردن سے لے کر ٹخنوں تک درخت کے ساتھ پیوست کر دیا۔ غضب ناک لارسی اس کے گرد ایندھن چننے لگے۔ سردار نے اشوکا کے ذریعے مجھ سے پوچھا "کیا میں ان لوگوں کو روک دوں؟"

میں نے بیزاری سلگاتے ہوئے کہا "نہیں۔ ابھی اس کام کو تھوڑا سا اور آگے بڑھنے دو۔ یہ موت نہیں دیکھے گا لیکن موت کی آمد دیکھ لے گا۔"

ہم دور سے دیکھ سکتے تھے۔ چین کی اکلوتی آنکھ وحشت سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مضبوط رسی کے بل نہیں کھول سکتا' خود کو حرکت دینے کی اور چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ زندہ رہنے کی فطری خواہش کا عکس تھا۔ میں لوگوں کے درمیان سے گزر کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی زخمی ران پر بندھی ہوئی رسی' کھینچا تانی کے سبب خون سے رنگ دار ہو گئی تھی۔ قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مسلسل چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ گئی ہے اور اس کے حلق سے مینڈک کی سی ٹرائی ہوئی آواز نکل رہی ہے۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ لارسیوں کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چین کے کان کے بالکل قریب بولتے ہوئے میں نے کہا "دیکھا مسٹر چین! موت کتنی خوفناک ہوتی ہے' یہ لوگ تمہیں ہر صورت موت کا مزہ چکھانا چاہتے ہیں اور ابھی تھوڑی دیر میں تم چکھ بھی لو گے۔ تمہارے گرد چنی ہوئی ان ساری خشک لکڑیوں کو آگ لگا دی جائے گی۔ دھوئیں سے تمہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑے گا' پھر تم آگ کی لپٹیں اپنے جسم پر محسوس کرو گے۔ تمہارے کانوں میں لارسیوں کے پرغضب نعرے گونجیں گے اور تم اپنے جلتے ہوئے گوشت کی بو سونگھو گے۔"

"میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔" چین نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں تمہیں ہر بات ماننے کے لیے نہیں کہوں گا۔"

"پھر کیا کہو گے۔ جلدی بتاؤ کیا کہو گے۔ میں ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔"

"دیکھو! میں تمہیں بچانے کی کوشش کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ تم اگر زندہ بچ گئے تو ٹرسٹ اور لارسیوں کے درمیان ہونے والی اس لاحاصل جنگ کو روکنے کی کوشش کرو گے اور اس جنگ کی اصل بنیاد تمہاری بھتیجی ویرا ہے۔ ویرا نے ٹرسٹ سے بھاگے ہوئے ایک قیدی سے محبت کی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عشق کیا ہے۔ یہ ایسا عشق تھا کہ وہ دو مرتبہ اپنی زندگی ہارتے ہارتے بچی ہے۔ لارسیوں نے اور تمہارے بھائی بوکارلو نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ ویرا کی زندگی بچانے کے لیے اس کی شادی صفدر نامی اس نوجوان سے کرا دی ہے بلکہ اس سلسلے میں لارسیوں کو ملوث کرنا بھی غلط ہے۔ جو کچھ کیا وہ تمہارے بھائی بوکارلو نے کیا۔ میں ان میں سے کئی واقعات کا خود چشم دید گواہ ہوں۔"

"ہم... مجھے منظور ہے۔" چین نے راستے میں ہی میری بات کاٹ دی "تم جیسا کہتے ہو میں ویسا کروں گا۔ میں... کنگ سے کہوں گا کہ وہ ویرا کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں انہیں... مجبور کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ یہ سارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

"میں نے سنا ہے کہ جو لوگ اتنی جلدی کوئی وعدہ کر لیتے ہیں' وہ وعدے پر قائم نہیں رہتے۔ کیا گارنٹی ہے کہ اگر تم بچ گئے تو پھر ہاتھ دھو کر اس جوڑے کے پیچھے نہیں پڑ جاؤ گے؟"

وہ گھگھیایا "جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے اسے سننے کے بعد میرا ذہن بہت بدل گیا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں وہی کروں گا جو اپنی زبان سے کہہ رہا ہوں۔"

"اگر تمہاری نیت ٹھیک ہے تو ہو سکتا ہے کہ میری کوشش بھی کامیاب ہو جائے۔" میں نے کہا اور چین کو لرزتا کانپتا چھوڑ کر سردار رانے کی طرف واپس آگیا۔

سردار رانے کے کارندوں کے ہاتھوں میں روغن نفت کے ہانڈے نظر آرہے تھے۔ وہ یہ ہانڈے ایندھن پر انڈیل کر اسے آگ دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔ میں نے سردار سے کہا کہ وہ ان لوگوں کو روک دے۔ سردار اس چبوترے پر چڑھ گیا جہاں سے وہ اپنے لوگوں سے خطاب کرتا تھا۔ خطاب کرنے سے پہلے اس نے نایاب پروں والا تاج اپنے سر پر رکھا

اور اپنا نیزہ ہوا میں لہرا لہرا کر چار پانچ منٹ تک بولتا رہا۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے چین کو زندہ جلانے کا پروگرام ختم کر دیا۔ انہوں نے بجھے دل کے ساتھ اس کے اردگرد سے ایندھن ہٹا دیا اور اس کی بندشیں کھول کر اسے واپس جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا۔

○☆○

موگاسا بستی میں شدید قسم کی کشیدگی اگلے روز بھی موجود رہی۔ یہ سب جانتے تھے کہ ٹرسٹ والے اب چپکے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ کئی افراد کو ہلاک کرانے اور چین کو ہاتھ سے گنوانے کے بعد وہ شدید اور زیادہ خوفناک کارروائی کا پروگرام بنا رہے ہوں گے۔ ہاں ایک بات قدرے حوصلہ افزا تھی اور وہ یہ کہ چین ہمارے پاس اس بستی میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں بستی پر کسی اچانک بے رحمانہ حملے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ میں نے اشوکا کو ترجمان بنا کر سردار رانفے سے صلاح مشورہ کیا۔ میں نے رانفے کو رائے دی کہ ٹرسٹ والوں کے ساتھ بات چیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر بات کرنے سے ہو سکتا ہے کہ بہتری کی شکل نکل آئے۔ رانفے تذبذب میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس معاملے کا انجام ہر صورت میں خون ریزی پر ہوتا ہے' ٹرسٹ والے کسی صورت ہم سے بات چیت نہیں کریں گے کیونکہ وہ اسے بہت بڑی توہین سمجھیں گے۔

میرے اور رانفے کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ واکی ٹاکی ایک بار پھر جاگ اٹھا۔ حسب توقع دوسری جانب سائیں عالی ہی تھا۔ پہلے تو اس نے واکی ٹاکی کے موجد کو کئی تیکھی گالیاں دیں کیونکہ اس کا واکی ٹاکی ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا پھر اس نے مجھ سے موگاسا بستی کی تازہ ترین صورت حال پوچھی۔ میں نے بتایا "تازہ خبر یہ ہے کہ گنگ پراؤن کے سب سے چھوٹے بھائی چین کی جان بچ گئی ہے۔ لاری اسے زندہ جلانے لگے تھے۔"

"یقیناً اس معاملے میں بھی تم نے ٹانگ اڑائی ہو گی۔ جگہ جگہ ٹانگ مت اڑاؤ ورنہ لنگڑے ہو جاؤ گے۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ چین کو زندہ جلنے دیتا؟"

"نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ تم ٹانگ نہ اڑاتے' اپنا بازو وغیرہ اڑا دیتے۔ باقی چین کا جلنا تو ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے بجائے یہ پاگل لوگ اپنے مردہ سردار کو جلا کیں تو زیادہ اچھا ہے۔ کیا تم نے اس بارے میں کوشش نہیں کی۔"

"بہت کی ہے لیکن وہ اڑے ہوئے ہیں۔ ویسے تو انہوں نے بوماتی کی لاش کو لکڑی کے پلیٹ فارم پر رکھا ہوا ہے لیکن اس کو آگ لگانے کا ابھی کوئی پروگرام نظر نہیں آتا۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔" سائیں نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا "ہسپتال والی گاڑی تمہارے پاس پہنچ گئی ہے؟"

"کیا مطلب ہے؟ کیا تم موبائل کلینک کی بات کر رہے ہو؟"

"اور نہیں تو گنگا رام ہسپتال کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی تین گھنٹے پہلے وہ لوگ یہاں سے نکل گئے تھے۔"

"لیکن یہاں تو ابھی تک کوئی نہیں آیا۔"

"کہیں شرارتی جنات نے تو کوئی شرارت نہیں کی؟" سائیں کی آواز میں پریشانی تھی۔

"تم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے ہو۔ موبائل کلینک کو کیوں بھیجا تھا یہاں؟"

سائیں نے تمام زرشیوں سے نئے نئے غیر شریفانہ رشتے جوڑنے کے بعد کہا "ہسپتال کی گاڑی میں لاریسیوں کے لیے طاقت کی دوائیاں تھیں' آسٹریا سے منگوائے ہوئے بہترین سیرپ تھے اور گولیاں تھیں۔ یہ دوائیاں ان جنات کے ہاتھ لگ گئیں تو وہ تو بالکل ہی جن ہو جائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی سائیں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ تین چار منٹ بعد پروفیسر اللہ دتا کی کال آ گئی۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا "شاہ جہاں! کیا موبائل کلینک ابھی تک وہاں نہیں پہنچا؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔

پروفیسر بولا "یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ سائیں کے حکم پر موبائل کلینک میں نے ہی موگاسا کی طرف بھیجا تھا۔ زبلر کے اس خفیہ خانے میں جہاں تم چھپتے رہے ہو' اس وقت تیس چالیس آٹومیٹک رائفلیں اور ان کا ایمونیشن موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ضروری چیزیں موجود ہیں۔ سائیں صاحب کا خیال ہے کہ ٹرسٹ کی طرف سے بستی پر ایک بڑا حملہ ہو سکتا ہے۔ یہ اسلحہ اسی حملے کی پیش بندی کے لیے زبلر میں چھپا کر بھیجا گیا ہے۔ اگر زبلر ابھی تک نہیں پہنچا تو پھر ہو سکتا ہے کہ اسے ٹرسٹ والوں نے کہیں روک لیا ہو۔"

اب سائیں کا اشارہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ طاقت کی دواؤں سے اس کی مراد اسلحے کی کھیپ تھی۔ اب پتا نہیں کہ یہ اسلحہ یہاں تک کیوں نہیں پہنچا تھا۔

پروفیسر کی آواز پھر آئی "پریشانی کی ایک بات اور بھی ہے۔ ویرا ابھی اس زبلر میں موگاسا بستی آ رہی تھی۔"

"یہ کیا حماقت ہے؟" میں پیچ بیچ جھنجلا گیا۔

"یہ حماقت ہے یا نہیں ہے اس کا علم بھی سائیں کو ہی

ہو گا۔ انہوں نے ہی اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ فرما رہے تھے کہ بہو رانی بڑی اداس ہو گئی ہے' اسے بھی رائفلوں کے ساتھ موگاسا بستی بھیج دو۔"

"اداس کیا ہو گئی تھی؟"

"اس نے صفدر کی دوری کو بری طرح محسوس کیا ہے۔ کچھ کھاتی پیتی نہیں تھی' میرا خیال ہے کہ پچھلے چند دن میں کئی بار روئی بھی ہے۔ سائیں نے کہا کہ اسے بھی نرس کے طور پر دیگر نرسوں کے ساتھ بھیج دو۔"

میری اور صفدر کی طرح ویرا ابھی میک اپ میں تھی۔ اس کے پہچانے جانے کا خطرہ تو نہیں تھا پھر بھی موجودہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ کھنڈرات سے موگاسا بستی تک کا سفر بمشکل دو گھنٹے کا تھا مگر زبلر اب تک یہاں نہیں پہنچا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس میں کوئی خرابی واقع ہو گئی ہو یا پھر وہ کہیں ریت وغیرہ میں دھنس گیا ہو۔ تاہم غالب خیال یہی تھا کہ علاقے میں گشت کرنے والے گارڈز یا پولیس اہلکاروں نے اسے کہیں روک لیا ہے۔

میں نے اس سلسلے میں صفدر' اشوکا اور سردار رانفے سے مشورہ کیا۔ زبلر میں اسلحے کے علاوہ ویرا کی موجودگی کا سن کر صفدر کو اضافی پریشانی لاحق ہو گئی۔ وہ پہلے ہی ویرا کے لیے از حد پریشان تھا' بہ الفاظ دیگر دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی' اب اس نئی خبر نے اسے اور بھی فکر مند کر دیا تھا۔ جب میں نے کہا کہ ہمیں زبلر کو تلاش کرنا چاہیے تو صفدر فوراً اس کام کے لیے رضا مند ہو گیا۔

وہ بولا "میں اس کام کے لیے اپنی خدمت پیش کرتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ صرف ایک مقامی شخص کو رہنما کے طور پر بھیج دیں۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر آپ کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔"

"جاؤ گے کس پر؟" میں نے پوچھا۔

"میری رائے میں اس کے لیے گھوڑے کی سواری مناسب رہے گی۔ آپ دو گھوڑوں کا انتظام کرا دیں۔"

"تو پھر دو کا نہیں تین گھوڑوں کا انتظام ہو گا۔ میں بھی ساتھ جاؤں گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

سردار رانفے اور رلا رونا بے نے بھی اپنی خدمات پیش کیں تاہم اشوکا نے اپنی زبان میں انہیں سمجھایا کہ ان کا بستی میں رہنا ضروری ہے۔

قریباً دس منٹ بعد میں' صفدر اور جانباز نوجوان شازل گھوڑوں پر سوار بستی سے نکل رہے تھے۔ بستی کو دو اطراف سے خار دار باڑ نے گھیر رکھا تھا لہٰذا ہمیں بھی جنگل کی طرف سے ہو کر نکلنا تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار' درختوں سے گھرے ہوئے اور سبزے سے ڈھکے ہوئے راستوں پر سے گزرے تو ہمیں معلوم ہوا کہ مقامی لوگ اس جنگل سے خوف کیوں کھاتے ہیں۔ یہاں نہ صرف جنگلی جانوروں کی موجودگی کی شہادتیں موجود ہیں بلکہ دلدلیں بھی نظر آتی تھیں۔ ان میں سے کچھ دلدلیں رنجے پتوں اور شاخوں وغیرہ سے ڈھکے ہوئے تھے اور کسی بھی جاندار کے لیے موت کا پھندا ثابت ہو سکتے تھے۔ کچھ دلدل نما جوہڑوں کے اوپر سے گرم بخارات اٹھ رہے تھے اور ان کی ناگوار بو حواس کو مختل کر رہی تھی' یہاں مچھر اور دیگر حشرات بھی کثرت سے تھے۔ شازل بڑی چابک دستی کے ساتھ ہمیں محفوظ راستوں پر چلا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا آگے تھا۔ ایک جگہ اس نے خشک فضلے کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ یہ یہاں خطرناک تیندوے کی موجودگی کی نشان دہی کرتا ہے۔

میرے اور صفدر کے پاس رائفلیں تھیں' جبکہ شازل نیزے سے مسلح تھا۔ اس پرخطر جنگل سے گزرتے ہوئے جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑتی رہی۔ جنگل سے گزرنے کے بعد ایک بار پھر نیم ریتلا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں ایک دو جگہوں پر ہمیں جیپوں کے ٹائروں کے منحوس نشانات بھی نظر آئے۔ یہ عین دوپہر کا وقت تھا اور یہ کوئی عام دوپہر نہیں تھی' چلچلاتی کڑکتی ہوئی افریقی دوپہر تھی۔ سورج ہماری پشت کی طرف تھا اور ہمارے نہایت مختصر سائے ہمارے آگے آگے نشیب و فراز پر اچھل کود رہے تھے۔ اچانک شازل چونکنے انداز میں رک گیا۔ اس نے اپنا سیاہ عریاں بازو اٹھا کر انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

اس کی انگلی کا تعاقب کرنے پر مجھے بھی شیشے کی چمک نظر آئی۔ یقیناً خشک جھاڑیوں کے عقب میں یہ کسی گاڑی کی ونڈ اسکرین تھی۔ یہ گمشدہ موبائل کلینک بھی ہو سکتا تھا' ٹرسٹ کی کوئی جیپ بھی ہو سکتی تھی اور کوئی غیر متعلقہ گاڑی بھی۔ ہم نے کندھوں سے چھاگلیں اتار کر دو دو گھونٹ پانی پیا' اپنی رائفلیں چیک کیں اور کچھ دیر جائزہ لینے کے بعد محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ہماری اعصابی کشیدگی ایک دم کم ہو گئی۔ جھاڑیوں کے عقب میں جو گاڑی موجود تھی وہ "موبائل کلینک" ہی تھا۔ اس کی نیلی چھت ہم صاف دیکھ سکتے تھے۔ اردگرد کسی اور گاڑی کی موجودگی بھی ثابت نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ذرا تیزی سے زبلر کی طرف بڑھنے لگے۔

پانچ منٹ بعد ہم زبلر کے سامنے کھڑے تھے۔ زبلر کے

قریب پہنچ کر ہمارے ذہن میں دب جانے والے اندیشے ایک بار پھر سر اٹھانے لگے۔ کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ زیلر کے اندر اور باہر مکمل خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہاں کوئی ذی نفس ہے ہی نہیں۔ عقبی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ زیلر کے ارد گرد ریت پر کچھ عجیب سے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یہ کسی جانور کے پاؤں کے نشانات تھے اور بے شمار تھے لیکن ہم شناخت نہیں کر سکے کہ یہ کون سا جانور ہے۔

"آپ نے کچھ محسوس کیا؟" صفدر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا؟"

"شازل کچھ گھبرا گیا ہے۔"

"مجھے بھی لگ رہا ہے۔ شاید یہاں کوئی جنگلی جانور موجود ہے۔"

"وہ دیکھیے۔" اچانک صفدر نے زیلر کی پچھلی جانب اشارہ کیا۔

زیلر کی دائیں جانب کے پچھلے دو ٹائرز پنکچر تھے۔ قریب ہی جیک، جالی اور بیلچہ لئے کار ریگر سامان رکھا تھا۔ یہ امر اب بالکل واضح ہو گیا تھا کہ دو ٹائر پنکچر ہو جانے کے سبب زیلر کو یہاں قدرے سایہ دار جگہ پر روکا گیا تھا۔

ہماری طرح شازل بھی گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکنا اور تیار نظر آ رہا تھا۔ اپنا نیزہ دائیں ہاتھ میں سونت کر وہ زیلر کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ ہم نے بھی انگلیاں رائفلوں کے ٹریگرز پر رکھ لی تھیں۔ شازل کے پیچھے جھک کر چلتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔

"او مائی گاڈ!" صفدر کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

زیلر کے پنکچر پہیوں کے قریب اوزاروں کے درمیان خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہاں کوئی سنگین حادثہ پیش آ چکا تھا۔ صفدر ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر دیوانہ وار زیلر کی طرف بڑھا۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ وہ نہیں رکا تو میں بھی اس کے پیچھے زیلر میں گھسا۔ یہاں ایک خوفناک منظر ہمارے روبرو تھا۔ موبائل کلینک کی خوش باش نرس ریتا کی کٹی پھٹی لاش زیلر کے فرش پر پڑی تھی بلکہ شاید اسے لاش کہنا بھی درست نہیں تھا۔ یہ بچے بچائے ناقابل شناخت گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ تھا، ہم نے فقط چھلی ہوئی اور نوچی کھسوٹی ہوئی کھوپڑی سے پہچانا کہ یہ باقیات نرس ریتا کی ہیں۔ اس کا خوش نما لباس دھجیوں کی صورت یہاں وہاں پڑا تھا۔

شازل وحشت زدہ آواز میں ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہم کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ جو سوال بے پناہ شدت سے ہمارے ذہنوں میں گونج رہا تھا وہ یہ تھا کہ ویرا کہاں ہے؟ اور موبائل کلینک کا دیگر عملہ کہاں ہے؟ کیا وہ سب اس خوفناک ویرانے میں کچھ خونی درندوں کا شکار ہو گئے تھے؟

"ویرا... ویرا!" صفدر اپنے سینے کی پوری طاقت سے چیخا اور اسے دیوانہ وار ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔

میں اور شازل دوڑتے ہوئے زیلر سے باہر نکلے۔ شازل ایک بار پھر ریت پر پنجوں کے نشانات کی طرف اشارے کرنے لگا اور تیزی سے کچھ بولنے لگا۔ ان نشانات سے اس کے سوا کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کوئی اکیلا دکیلا جانور نہیں تھا بلکہ جانوروں کا ایک گروہ تھا۔ شازل کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور وہ جیسے ہوا میں دور دور کی بو سونگھ رہا تھا۔ وہ نیزہ سونت کر متلاشی انداز میں ایک طرف بڑھنے لگا۔ میں اور صفدر بھی رائفل بدست اس کے عقب میں تھے۔ سو ڈیڑھ سو گز دور خشک جھاڑیوں میں کپڑے کی کچھ دھجیاں اٹکی ہوئی نظر آئیں، اس کے ساتھ ہی اندازہ ہوا کہ یہاں بھی کوئی کٹا پھٹا جسم موجود ہے۔ بدن میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اگر... خدانخواستہ یہ جسم ویرا کا تھا تو... اس سے آگے میرے لیے سوچنا بھی محال تھا۔ صفدر کی ذہنی حالت پہلے ہی اچھی نہیں تھی، اگر کوئی ایسا حادثہ ہو گیا تھا تو پھر اس کا پاگل ہونا یقینی تھا۔

ہم دھڑکتے دلوں اور کانپتے قدموں کے ساتھ موقع پر پہنچے، یہاں ایک انسانی پنجر موجود تھا۔ کسی ہڈی پر شاید ہی کوئی تھوڑا بہت گوشت باقی رہ گیا ہو۔ اور تو اور، چہرے اور سر سے کھال تک نوچ لی گئی تھی۔ اور یہ سب کچھ ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ریت پر اور ارد گرد کی خشک ٹہنیوں پر خون کے دھبے چلچلاتی دھوپ میں بالکل تر و تازہ نظر آتے تھے۔ کھوپڑی اور چہرے سے پتا چلا کہ یہ نوچی کھسوٹی ہوئی لاش ڈاکٹر بوس کے ساتھی ڈاکٹر رائٹ کی ہے۔ میں نے اب تک کسی درندے کی کھائی ہوئی لاش نہیں دیکھی تھی، پھر بھی ایک اندازہ سا تھا کہ شیر چیتا اور تیندوا وغیرہ اپنے شکار کو اس انداز سے ہرگز نہیں کھاتے ہیں۔ یہ کچھ نہایت حریص اور کمینی فطرت کے جانوروں کا کام تھا۔ اچانک ڈاکٹر رائٹ کی باقیات کے پاس مجھے ایک چمکتی ہوئی شے نظر آئی۔ یہ کولٹ پسٹل کا آہنی دستہ تھا۔ باقی کا پسٹل زرد پتوں کے نیچے چھپ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر احتیاط سے پسٹل

اٹھایا۔ پسٹل میں چار گولیاں موجود تھیں۔

"لگتا ہے کہ ڈاکٹر نے اپنے دفاع میں دو تین گولیاں چلائی ہیں۔" صفدر نے خیال ظاہر کیا۔

میں نے پسٹل کی نال سونگھی اور صفدر کے خیال کی تائید کی۔

صفدر نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر وہ تیزی سے دائیں جانب گیا۔ چند لمحے بعد جھاڑیوں کے عقب سے اس کی چیختی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں صاحب! یہاں آئیے۔"

ویرا کے خیال سے ایک بار پھر دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ میں اور شازل جھاڑیوں کو پھلانگتے ہوئے صفدر تک پہنچے تو صفدر گھٹنوں کے بل ایک لاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ لاش کسی انسان کی نہیں، جانور کی تھی۔ دیکھنے میں یہ ایک بد صورت سا ہاؤنڈ کتا نظر آتا تھا، تاہم اس کے جسم پر بڑے بڑے زرد دھبے تھے۔ چہرہ سیاہ، آنکھیں خونی اور دانت بے حد نکیلے تھے۔ اس کتے کے سینے میں کولٹ پسٹل کی گولی لگی تھی اور دائیں جانب کی پسلیاں توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

صفدر لرزاں آواز میں بولا "یقیناً یہ ان جنگلی کتوں کا ہی کام ہے۔"

شازل بھی اپنے نیزے کی نوک کتے کے جسم پر چبھو چبھو کر اس بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس علاقے کے بارے میں ہمیں بریفنگ دیتے ہوئے کنگ براؤن نے ان خوں خوار کتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس نے انہیں AFRICAN HUNTING DOGS کا نام دیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ بد شکل کتے گروہ در گروہ جنگل میں پھرتے ہیں اور بھوک کی حالت میں کسی بھی شے پر حملہ کر دیتے ہیں۔

ویرا کے خیال سے صفدر کا رنگ زرد تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے موبائل کلینک کے اس خفیہ خانے کا خیال آیا جہاں ہم کھنڈرات میں قیام کے دوران میں پناہ لیتے رہے تھے۔ صفدر کو وہیں سکتے کی سی کیفیت میں چھوڑ کر میں دوڑتا ہوا واپس زیلر میں پہنچا۔ زیلر دھوپ کے سبب اندر سے جہنم بنا ہوا تھا۔ نرس ریتا کی مسخ شدہ لاش سے نگاہیں چراتا ہوا میں سیدھا جہازی سائز کے ریفریجریٹر تک پہنچا۔ ریفریجریٹر کے دروازے کے عین سامنے بدنصیب نرس کے ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی پڑی تھیں اور ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے جھٹکے سے ریفریجریٹر کا دروازہ کھولا۔ دو بڑے شیلف کھینچ کر پیچھے ہٹائے اور لائٹ آن کرتے ہوئے خلا میں گھس گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خلا کے فرش پر ویرا بے سدھ پڑی تھی۔ وہ نرسنگ کے سفید اور نیلے لباس میں تھی۔ وہ اسی میک اپ میں تھی جو ڈاکٹر اسٹیفن اور ڈاکٹر روزی نے اس کے چہرے پر کیا تھا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اسے بے طرح جھنجھوڑ دیا "ویرا... ویرا آنکھیں کھولو۔"

وہ بے ہوش تھی۔ پسینے سے اس کا لباس بھیگا ہوا تھا۔ زیلر کا ائیر کنڈیشنر بند ہو چکا تھا اور ائیر کنڈیشنگ کے بغیر اس قبر نما خلا میں رک کر بیٹھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ بے پناہ خوف، گرمی اور حبس کے سبب وہ بے ہوش ہوئی ہے۔ میں نے کندھے سے چھاگل اتار کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے، کچھ پانی اس کے ہونٹوں پر ٹپکایا۔ ساتھ ساتھ میں صفدر اور شازل کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد صفدر بھی ہانپتا کانپتا زیلر کے اندر اور پھر خفیہ پناہ گاہ کے اندر پہنچ گیا۔ اس کی ڈری ڈری نظریں پہلے ویرا پر پڑیں اور پھر میرے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "صرف بے ہوش ہے، ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

صفدر نے رائفل ایک طرف پھینک کر ویرا کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ میں نے پناہ گاہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور مجھے حیرت کا دوسرا شدید دھچکا لگا۔ یہ پناہ گاہ اسلحے سے بھری ہوئی تھی۔ سیون ایم ایم اور ایم سولہ (M-16) جیسی زبردست رائفلیں تھیں۔ کچھ ہینڈ گرینیڈ تھے، چند بلٹ پروف جیکٹس بھی تھیں اور اس کے علاوہ بہت سا ایمونیشن تھا۔ خالی میگزین ایک علیحدہ ڈبے میں بند کیے گئے تھے۔ میں نے چند رائفلوں کو چیک کیا اور انہیں بالکل درست حالت میں پایا۔

اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس پناہ گاہ کو فوراً بند کر دیا جائے تاکہ اگر گارڈز کی کوئی بھولی بھٹکی ٹولی اس جانب آ نکلے تو وہ اس اسلحے سے آگاہ نہ ہو جائے۔ میں نے صفدر کے ساتھ مل کر بے ہوش ویرا کو خفیہ خانے میں سے باہر نکالا۔ ریفریجریٹر کے اندر شیلف برابر کیے، خفیہ خانے کی لائٹ آف کی اور ریفریجریٹر کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ اب کوئی ماہر سراغ رساں بھی آسانی سے اس پناہ گاہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ویرا خفیہ بند گلر کے بے پناہ حبس سے باہر نکل کر قدرے بہتر نظر آنے لگی تھی۔ شازل نے اپنی چھاگل کا سارا پانی ویرا کے جسم پر انڈیل دیا تھا اور گتے کے ایک بڑے ٹکڑے سے اسے ہوا دینے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں

رائفل بدست باہر نکل آیا اور ٹریلر کے پنکچر ٹائروں کا جائزہ لینے لگا۔ اس ٹریلر کو فوری طور پر حرکت میں لانے کی اور موگاسا بستی پہنچائے جانے کی ضرورت تھی لیکن اس کے ساتھ دہرا خطرہ بھی موجود تھا۔ پہلا خطرہ تو انہی جنگلی کتوں کا تھا جنہوں نے کچھ دیر پہلے یہاں تہلکہ مچایا تھا اور کم از کم دو افراد کو ہلاک کردیا تھا۔ دوسرا خطرہ دو ٹانگوں والے کتوں سے تھا۔ یعنی ٹرسٹ کے گارڈز' جو کتوں کے غولوں ہی کی طرح یہاں چکراتے پھر رہے تھے۔ میک اپ میں ہونے کی وجہ سے اور سائیں عالی سے تعلق کی بنیاد پر شاید ہم تو ان کے شدید عتاب کا شکار نہ ہوتے لیکن شازل کے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی تھی۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ صورت حال اب خاصی واضح ہوگئی تھی۔ ٹریلر کے ٹائرز پنکچر ہوئے تھے۔ جس وقت یہ لوگ نیچے اتر کر ٹائرز تبدیل کرنے میں مصروف تھے اچانک خوں خوار افریقی کتوں کے غول بیابان نے ان لوگوں پر ہلا بول دیا تھا۔ نرس ریٹا ٹریلر کے اندر ہی ہلاک ہوگئی تھی جبکہ ویرا ریفریجریٹر کے اندر داخل ہونے اور پناہ گاہ میں گھسنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ باقی افراد باہر بھاگ گئے تھے۔ ان میں سے ڈاکٹر رائٹ تو فوراً ہی خوں خوار جانوروں کے قابو میں آگیا تھا۔ اس نے اپنے پسٹل سے اپنے دفاع کی آخری کوشش بھی کی تھی اور کتوں کے غول پر دو فائر کیے تھے مگر نتیجہ وہی نکلا تھا جو فائر نہ کرنے کی صورت میں نکلتا۔ وحشی کتوں نے اسے چیرپھاڑ ڈالا تھا اور شاید دس پندرہ منٹ کے اندر اس کا سارا گوشت نوچ کر کھا گئے تھے۔ رومانی جوڑے ڈاکٹر بوس اور نرس ایمی کا ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔ اسی طرح ٹریلر ڈرائیور کا انجام بھی ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔

سخت ترین گرمی میں قریباً ایک گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے بعد میں شازل کی مدد سے ٹریلر کے ٹائرز بدلنے میں کامیاب رہا۔ اس دوران میں ویرا کو بھی ہوش آچکا تھا۔ تاہم وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کررہی تھی۔ صفدر نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا "ویرا! پلیز کچھ تو بولو۔ ڈاکٹر بوس اور ایمی کے بارے میں ہی کچھ بتاؤ۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" وہ سسک کر بولی "میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے بس بہت سے کتوں کی آوازیں سنیں۔ اس کے بعد کچھ کتے ٹریلر کے اندر آگئے۔ انہوں نے انہوں نے ریٹا کو نیچے گرالیا اور اسے کاٹنے لگے۔ میں نے فریج کا دروازہ کھولا اور پچھلی جگہ میں چھپ گئی۔" اس نے اتنا کہہ کر آنکھیں بند کرلیں۔ دو آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک گئے۔ اس کا سارا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

ٹریلر کے اگنیشن میں چابی موجود تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور گیئر وغیرہ لگا کر دیکھے۔ اچانک وہ ہوگیا جس کا خطرہ میں شدت سے محسوس کررہا تھا۔ مجھے دور فاصلے پر دھول اڑتی نظر آئی' پھر شیشوں کی چمک دکھائی دی۔ بلاشبہ یہ گاڑیاں تھیں۔ جلد ہی انجنوں کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

"یہ تو ٹرسٹ کی جیپیں ہیں۔" صفدر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"کتنی تعداد ہے؟"

"دو ہی نظر آرہی ہیں۔"

"نہیں! تین ہیں۔" میں نے کہا۔

جلد ہی میری بات درست ثابت ہوگئی۔ یہ تین جیپیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم کم و بیش ڈیڑھ درجن گارڈز کے نرغے میں آنے والے ہیں۔ مزاحمت فضول تھی اور خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے اپنی رائفل ٹریلر کے اندر پھینک دی۔ صفدر نے بھی میری تقلید کی۔ واکی ٹاکی میں نے نشست کے پیچھے چھپا دیا۔

اگر ہم اکیلے ہوتے تو شاید گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلتے لیکن ہمارے ساتھ نیم جان ویرا بھی تھی۔ اس کے علاوہ نہایت بیش قیمت اسلحہ ہم اس ٹریلر میں چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ گارڈز کے ساتھ ہم نے جو مکالمہ کرنا تھا وہ ہم پہلے ہی سوچ چکے تھے۔ جلد ہی جیپیں دھول اڑاتی اور شور مچاتی ہمارے سروں پر پہنچ گئیں۔ اس وقت میں نے شازل کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی' وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ہم پر انکشاف ہوا کہ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل گیا ہے۔ اس نے ذہانت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ ایک لحاظ سے اس کا نکل جانا ہمارے حق میں بھی اچھا تھا۔

یہ کل تین جیپیں تھیں۔ ان میں سے ایک خراب تھی اور اسے رسے کی مدد سے دوسری جیپ کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ ان جیپوں پر قریباً پندرہ مسلح گارڈز سوار تھے۔ ان کے چہرے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے اور صحرائی گرم ہوا کی وجہ سے ان کے نقوش جھلسے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہوسٹل کا چاق چوبند انچارج ڈوجون تھا۔

عام حالات میں یہ شخص ایک لمحے کے اندر مجھے اور صفدر کو پہچان لیتا لیکن اپنی بدلی ہوئی شکلوں میں ہم اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ گارڈز بڑے چوکنے انداز میں ہماری طرف دیکھ رہے تھے تاہم ان میں سے ایک دو کے سوا کسی نے اپنی رائفل ہاتھ میں نہیں کی تھی۔ ڈوجون اگلی جیپ میں سوار تھا۔ وہ نیچے اترا' اس نے احتیاط سے ہمارا اور ٹریلر کا جائزہ لیا پھر اس کی نگاہ ریت پر موجود خون کے دھبوں پر پڑی۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا "میرا خیال ہے کہ کچھ دیر پہلے یہاں کوئی تکلیف دہ حادثہ ہوچکا ہے۔"

میں نے بدلی ہوئی آواز اور غم زدہ لہجے میں کہا "جی ہاں جناب! جنگلی کتوں کے غول نے اس کلینک پر حملہ کیا ہے' دو افراد کو مار ڈالا ہے اور تین افراد لاپتا ہیں۔"

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ ٹریلر اس شخص کا ہے جو خود کو سائیں عالی کہتا ہے۔" ڈوجون نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"آپ درست فرما رہے ہیں۔" میں نے بھی شائستگی سے جواب دیا۔

"کیا تم دونوں کا تعلق بھی سائیں عالی سے ہے؟"

"جی جناب! ہم سائیں صاحب کی ملازمت میں ہیں۔ ٹریلر میں ایک لڑکی بھی ہے۔ اس کا نام ونگ ہے اور وہ اس موبائل کلینک کے عملے میں شامل ہے۔ معجزانہ طور پر وہ جنگلی کتوں کے حملے میں محفوظ رہی۔ پتا نہیں کون سی نیکی اس کے کام آئی ہے۔"

"یہ دونوں گھوڑے کس کے ہیں؟" ڈوجون نے میرے اور صفدر کے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم ان گھوڑوں پر موگاسا بستی سے یہاں آئے ہیں۔ دراصل سائیں صاحب نے واکی ٹاکی پر ہمیں بتایا تھا کہ انہوں نے انسانی ہمدردی کے طور پر موبائل کلینک موگاسا روانہ کیا ہے۔ کافی انتظار کے باوجود جب موبائل کلینک بستی میں نہیں پہنچا تو ہم اس کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر دیکھا تو ٹریلر کھڑا تھا اور اندر باہر تباہی پھیلی ہوئی تھی۔" میں نے پورا واقعہ تفصیل سے ڈوجون کے گوش گزار کردیا۔

ساری روداد سننے کے بعد ڈوجون بولا "یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم دونوں موگاسا بستی کس سلسلے میں گئے تھے؟"

"اسی سلسلے میں جس سلسلے میں یہ موبائل کلینک وہاں جارہا تھا۔" میں نے جواب دیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا "سائیں جی کی کسی سے دشمنی نہیں۔ وہ سب ہی کا بھلا چاہتے ہیں اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ سائیں صاحب کو معلوم ہوا تھا کہ علاقے میں ہیضے اور ملیریا کی وبا پھیل رہی ہے۔ انہوں نے علاقے کی کئی بستیوں میں موبائل کلینک بھیجے ہیں۔ وہ موگاسا کی صورت حال بھی جاننا چاہتے تھے اور اسی غرض سے ہم دونوں کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ یہاں بستی میں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ بیماری کے آثار تو یہاں نہیں ہیں مگر ٹرسٹ کے ساتھ لڑائی کی وجہ سے صورت حال کافی کشیدہ ہے' پھر ہماری موجودگی میں ہی ٹرسٹ کے گارڈز اور بستی والوں میں شدید لڑائی بھی ہوگئی۔ اس لڑائی میں کئی افراد زخمی بھی ہوگئے تھے' ہم نے واکی ٹاکی پر سائیں صاحب کو اطلاع دی کہ یہاں کچھ لوگ زخمی ہیں اور ملیریا کے چند کیس بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ سائیں صاحب نے دوائیں اور دیگر سامان موبائل کلینک کے ذریعے روانہ کردیا۔"

"بڑی شہرت سنی ہے تمہارے اس موبائل کلینک کی۔ آؤ ذرا دیکھیں۔" ڈوجون نے ٹریلر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ تین مسلح گارڈز بھی اس کے ہمراہ تھے۔

یقیناً میری طرح صفدر کا دل بھی اچھل کر رہ گیا ہوگا۔ یہ لوگ کلینک کا معائنہ کرنے جارہے تھے۔ اگر یہ ریفریجریٹر کے پیچھے خفیہ خانے کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاتے اور وہاں سے اسلحہ وغیرہ برآمد ہوجاتا تو سائیں عالی کا سارا اسٹیج برباد ہوجاتا اور یقینی طور پر ہم بھی دھر لیے جاتے۔ ڈوجون نے ٹریلر میں گھس کر معائنہ شروع کیا۔ وہ ہر شے کو ٹھونک بجا کر دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کسی بم کا شک تھا۔ نرس ریٹا کی لاش ہم ٹریلر میں سے ہٹا چکے تھے۔ اس کی باقیات کو باہر ایک درخت کی چھاؤں میں رکھ کر اوپر چادر ڈال دی گئی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر رائٹ کی لاش کو بھی جھاڑیوں کے اندر ہی چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ ڈوجون اور اس کے ساتھی ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ہیضے کی دوائیاں' گلوکوز کے بیگ' ملیریا کے انجکشن' ہر شے کا انہوں نے تفصیلی معائنہ کیا' پھر وہ ریفریجریٹر تک پہنچے۔ اتفاقاً ریفریجریٹر کا دروازہ ٹھیک طرح لاک ہونے سے رہ گیا تھا۔ ایک گارڈ نے دروازہ کھولا اور اپنا نصف دھڑ اندر رکھ کر معائنہ کرنے لگا۔ اس نے شیلفوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ میری اور صفدر کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے ملیں۔ ہم نے بہ زبان خاموشی فیصلہ کرلیا کہ اگر گارڈ نے شیلفوں کو ان کی جگہ سے حرکت دی تو ہم "ری ایکٹ" کریں گے۔ ایک گارڈ میرے بالکل قریب تھا۔ اس نے بڑے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں رائفل تھام رکھی تھی۔ جیسے رائفل تھام کر وہ خود بھی بھول گیا ہو۔ اس سے رائفل چھیننا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ صفدر بھی اس قسم کی کامیاب کوشش کرسکتا تھا' اس کے بعد جو بھی ہوتا دیکھا جاتا۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر اس انداز سے سوچا تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا اور پھر جو کچھ ہوا تھا وہ ہم نے بڑی کامیابی سے "دیکھا" تھا۔

گارڈ نے شیلفوں کو ایک دو مرتبہ ان کی جگہ سے ہلانے کی معمولی کوشش کی' پھر ارادہ بدل دیا اور ریکر اشیا کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ریفریجریٹر کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ اسی دوران میں ایک اور گارڈ کی نگاہ ان دو رائفلوں پر پڑ گئی جو میں نے اور صفدر نے جیپوں کی آوازیں سن کر ٹریلر میں پھینک دی تھیں۔

ذوجون ہم سے ان رائفلوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ ہم نے ان رائفلوں کے حوالے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا "ڈاکٹر حضرات کے پاس ایسی خطرناک رائفلوں کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟" ذوجون نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

صفدر بولا "گستاخی معاف' میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب آپ کے آس پاس ہی موجود ہے۔ یہ سارا علاقہ خطرناک ہے۔ سائیں صاحب نے یہ رائفلیں ڈاکٹر صاحبان کو اپنی حفاظت کے لیے دی ہوں گی۔"

"لیکن سخت خطرے کے باوجود ان رائفلوں کو استعمال نہیں کیا گیا۔" ذوجون نے نقطہ اٹھایا "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ رائفلیں اس حادثے کے بعد یہاں پہنچی ہوں؟"

ذوجون شاطر دماغ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے حقیقت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال کرتا' ہم سب بری طرح چونک گئے۔ ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ منحوس آوازیں ہم تک پہنچی تھیں۔ یہ آوازیں کئی فرلانگ دور سے آ رہی تھیں لیکن پہچانی جا سکتی تھیں' یہ جنگلی کتوں کی آوازیں تھیں' ہم سب تیزی سے باہر نکل آئے۔ جیپوں میں موجود گارڈز کے چہروں پر بھی ہیجانی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار لی تھیں اور پریشانی کے عالم میں تر آوزوں کی سمت دیکھنے لگے تھے۔ ذوجون نے ایک گارڈ کے ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ لے کر آنکھوں سے لگائی اور آواز کے رخ پر دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ ویرا تھی۔ وہ خوف زدہ انداز میں ہماری طرف دوڑی آ رہی تھی۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ صفدر نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں لے لیا اور دلاسا دینے لگا۔ ویرا کو خوف کی جس تازہ لہر نے گھیرا تھا اس کا سبب کتوں کی آوازیں ہی تھیں۔

ویرا جیسے صفدر کے سینے میں گھستی چلی جا رہی تھی۔ صفدر اسے سہارا دیتا ہوا ٹریلر کے اندر لے گیا۔ اگلے چار پانچ منٹ سخت کشیدگی میں گزرے پھر یہ کشیدگی بتدریج ختم ہو گئی۔ جنگلی کتوں کا غول بیابانی کچھ فاصلے سے گزر گیا تھا۔

دوپہر آہستہ آہستہ سہ پہر میں ڈھل چکی تھی۔ درختوں کے سائے قدرے طویل ہو گئے تھے اور لو کی شدت بھی کم تھی۔ ذوجون کے کہنے پر میں نے ٹریلر کا طاقتور انجن اسٹارٹ کرنے کے بعد ائرکنڈیشنر آن کر دیا۔ ذوجون میرے اور صفدر کے ساتھ ٹریلر کے اندر آ بیٹھا۔ ویرا عرف ٹونگ بھی وہیں تھی۔ دو چار گارڈز کو بھی ذوجون نے ٹریلر کے اندر خوشگوار خنکی میں بلا لیا۔ باقی گارڈز کو اس نے حکم دیا کہ وہ علاقے میں پھیل جائیں اور ٹریلر ڈرائیور' ڈاکٹرز اور نرس کو تلاش کریں۔ ہمارے گھوڑوں کو سائے میں باندھنے اور انہیں چارا وغیرہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا۔

ذوجون کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیں اتنی جلدی چھوڑنے والا نہیں ہے۔ ہم موگاسا بستی سے آئے تھے اور اس وقت موگاسا' ٹرسٹ والوں کا ٹارگٹ تھی۔ قدرتی طور پر یہ بات ذہن میں آتی تھی کہ ٹرسٹ والے موگاسا کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہے ہوں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ذوجون نے ہم سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھنے لگا۔ سردار بوعنات کی لاش کہاں رکھی گئی ہے؟ بستی میں جدید رائفلیں کہاں سے آئی ہیں اور ان کی تعداد کیا ہے؟ بستی میں لڑنے والے افراد کتنے ہیں؟ لڑنے کے لیے ان کی حکمت عملی کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے ان سوالات کے جواب اس طریقے سے دیے کہ ذوجون پر موگاسا والوں کا رعب قائم ہو اور وہ انہیں آسان ٹارگٹ نہ سمجھے۔ بہرحال ہم نے یہ سارے جوابات غیر جانبدارانہ انداز میں دیے۔ اس کے باوجود ذوجون نے ہمارے ساتھ شک والا رویہ برقرار رکھا۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ شبہ موجود تھا کہ ہم نے بھی اس لڑائی میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور سے رائفلوں کے حوالے سے وہ شک کر رہا تھا۔ موگاسا بستی کے بعد اس نے سائیں عالی کے حوالے سے بھی کرید کرید کر سوال پوچھے۔ سائیں عالی نے یہاں قلیل عرصے میں خاطر خواہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا' اس کے عجیب و غریب کردار کا راز پانا چاہتا تھا۔ دولت کی خیرہ کن چمک نے سائیں کے اول جلول کریکٹر کو یوں "ہائی لائٹ" کیا تھا کہ اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے لگی تھی۔ اگر اسے "سائیں فوبیا" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ذوجون بھی اسی "سائیں فوبیا" کا شکار نظر آتا تھا۔

اس نے پوچھا "آخر تمہارے سائیں کے پاس اتنی دولت آئی کہاں سے ہے؟"

صفدر بولا "اس سوال کے جواب سے ہم بھی اتنے ہی دور ہیں جتنے آپ ہیں۔"

"لیکن تم لوگوں کو کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا۔ تم شب و روز اس کے ساتھ رہتے ہو۔ اس کی ہر ہر ادا سے واقف ہو۔ یہ بات تو کسی صورت تسلیم کی جانے والی نہیں کہ سائیں یہ سب کچھ بے مقصد کر رہا ہے۔ اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی پلاننگ ہے۔"

"گستاخی معاف ہمیں آپ سے اختلاف کرنا پڑے گا۔" صفدر نے کہا "کم از کم اب تک ہمیں تو یہی محسوس ہوا ہے کہ سائیں صاحب کے ہر کام کے پیچھے بس ان کی افتاد طبع کارفرما ہے۔ ایک سیلانی اور من موجی شخص کی طرح جو کچھ ان کے ذہن میں آتا ہے' کر گزرتے ہیں۔ علاقے کے لوگوں کی غربت' بیماری اور فاقہ کشی دیکھ کر ان کے ذہن میں سمائی ہے کہ ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔ بس وہ اپنے ڈھنگ سے شروع ہو گئے ہیں۔ غریب لوگوں کو جمع کر کے ان میں ڈالرز' پاؤنڈ بانٹ رہے ہیں۔ ان کو نوکریاں دے رہے ہیں۔ دو تین ٹریلرز میں انہوں نے موبائل کلینک بنائے ہیں اور ان ٹریلرز کو متاثرہ علاقوں میں بھیج رہے ہیں۔"

"تم تصویر کا صرف ایک رخ دکھا رہے ہو۔" ذوجون نے صفدر کو ٹوکا "تمہارے سائیں کے بارے میں تو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اپنی حسن پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ دور دراز سے حسین "سفید فام لڑکیوں" اور ماڈلز وغیرہ کو جمع کر رہا ہے۔ کھنڈرات میں ان لڑکیوں کے ذریعے رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ بعد ازاں سائیں' ان حسین لڑکیوں کو عیاشی کے لیے اپنے قریبی ساتھیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔"

"آپ کی معلومات غلط نہیں ہیں لیکن یہ غلط انداز میں پہنچائی گئی ہیں۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "سائیں صاحب ایک خاص طبیعت کے مالک ہیں اور ان کی ہر حرکت کو ہمیں اسی پس منظر میں رکھنا ہوگا۔ بے شک وہ خوب صورت لڑکیاں یہاں کھنڈرات میں لے کر آئے ہیں لیکن اس میں کسی بھی طرح کا جبر شامل نہیں۔ یہ لڑکیاں بھاری معاوضہ پا کر اپنی خوشی سے یہاں آئی ہیں۔ کم از کم ہم نے تو وہاں رقص و سرود کی کوئی محفل نہیں دیکھی ہے۔ آپ کو یہ اطلاع بھی درست نہیں دی گئی کہ سائیں عالی صاحب ان لڑکیوں کو اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سائیں صاحب کا کوئی ساتھی ہے ہی نہیں۔ انہوں نے کچھ لڑکیوں کی شادیاں مقامی لوگوں سے کروائی ہیں' اسی طرح کچھ سیاہ فام عورتوں کی شادیاں سفید فام مردوں سے بھی کرائی گئی ہیں اور یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوا ہے۔"

"لیکن وہ ایسا اوٹ پٹانگ کام کیوں کر رہا ہے۔ کیا وہ اس طرح سفید فاموں کو نیچا دکھانا چاہ رہا ہے؟" ذوجون نے تنک کر کہا۔

"میں نے آپ سے گزارش کی ہے ناکہ یہ سب سائیں کی ذہنی رو کا کرشمہ ہے۔ بس جو بات بھی ان کے ذہن میں آ جائے۔ جہاں تک سفید فاموں سے کسی طرح کی پرخاش کا تعلق ہے ایسی بات بھی ہرگز نہیں ہے۔ سائیں صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے لیے سب ایک جیسے ہیں۔ جب انہیں موگاسا میں لڑائی کی خبر ملی تو وہ کہنے لگے کہ وہ ایک موبائل کلینک ٹرسٹ کے لیے بھی بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں نے ہی انہیں سمجھایا تھا کہ ٹرسٹ میں ہر قسم کی طبی سہولتیں موجود ہوں گی لہٰذا آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

سائیں کے حوالے سے کچھ دیر تک بات ہوتی رہی' پھر ذوجون ہمیں ٹریلر میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ ایک طویل گرم دن کی شام ہو چکی تھی۔ مغربی افق سرخ نظر آ رہا تھا۔ ٹریلر کے اندر ائرکنڈیشنر کی وجہ سے خوشگوار خنکی موجود تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا "تین مسلح گارڈز چوکس حالت میں ٹریلر سے باہر موجود تھے۔ میرے اور صفدر کے لیے یہ سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ ہماری حیثیت یہاں قیدیوں کی سی ہے۔

ویرا کی حالت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ وہ اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے ایک قبول صورت تھائی یا ملائشین لڑکی لگتی تھی لیکن کچھ بھی تھا اس کی آنکھیں تو میک اپ سے تبدیل نہیں ہوئی تھیں اور اس کی آنکھیں بلا کی حسین تھیں۔ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں اپنی ان آنکھوں اور لمبے بالوں کی وجہ سے ویرا پہچانی نہ جائے۔ بس ایک بے وکیل ہو ہم سا تھا۔

صفدر ایک گجراتی نوجوان کے روپ میں تھا' ڈاکٹر اسٹیفن نے اس کے بال تھوڑے سے گھونگھریالے کر دیے تھے اور رنگ بھی سانولا کر دیا تھا۔ صفدر نے ویرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور ہولے ہولے سہلا رہا تھا۔ ویرا بولی "پلیز کچھ کریں۔ مجھے یہاں سے نکالیں۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اس ٹریلر میں میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"ویرا تھوڑا سا حوصلہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر ہم تمہارے ساتھ ہیں نا۔ تمہیں پریشان ہونے کی کیا

ضرورت ہے۔" صفدر نے ملائمت سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ان لوگوں کو ہم پر کوئی شک ہو گیا ہے۔ اگر شک نہیں تو پھر ہمیں کیوں روکا ہوا ہے یہاں؟" ویرا نے کہا۔

"کس قسم کا شک؟" صفدر نے پوچھا۔

"کہیں... ان لوگوں نے ہمارا میک اپ پہچان نہ لیا ہو۔ ڈوجون کی نگاہ بڑی تیز ہے' میں اس شخص کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"خود کو بیکار میں پریشان مت کرو۔" صفدر نے اسے پیار سے ڈانٹا۔

ویرا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ دن کا اجالا اب رات کے اندھیرے میں بدلنے والا تھا اور اس مہلک ویرانے میں رات بسر کرنے کے تصور ہی سے ویرا کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ ایک شہری لڑکی تھی اور اس نے چند گھنٹے پہلے خوں خوار کتوں کے غول کو انسانی جسموں کی چیر پھاڑ کرتے دیکھا تھا۔ یہ چیر پھاڑ چونکہ ٹریلر کے اندر بھی ہوتی تھی لہٰذا ویرا کو ٹریلر سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ باہر نکلنا چاہتی تھی حالانکہ منطقی طور پر وہ کھلی جگہ کی نسبت ٹریلر کے اندر زیادہ محفوظ تھی۔ اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے میں نے ڈوجون سے اجازت طلب کی اور اس نے ہمیں کچھ دیر کے لیے ٹریلر سے اتر کر گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

ہم دونوں ویرا سمیت ٹریلر سے اتر آئے۔ ٹریلر کا انجن اور راستے ہی اب بند کر دیا گیا تھا۔ ٹھنڈی خوشگوار ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس تیز ہوا نے ویرا کے ہلکے پھلکے پیراہن کو اس کے جسم کے ساتھ چپکا دیا تھا۔ اردگرد موجود گارڈز دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہوں سے رال سی ٹپکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ جس پر رال ٹپکا رہے ہیں وہ ان کے محترم کنگ براؤن کی بھتیجی ہے۔ عام حالات میں شاید وہ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کرتے مگر اب وہ اسے بے باکی سے گھور رہے تھے۔ بہرحال اب بھی وہ رعایت ہی کر رہے تھے۔ ان کی معلومات کے مطابق ہم تینوں یعنی میں' صفدر اور ویرا صحرائی درویش سائیں عالی کے مریدین تھے اور سائیں عالی اپنی دولت کی وجہ سے بہت باحیثیت شخص قرار دیا جا رہا تھا۔ اگر ہم کوئی عام قیدی ہوتے تو شاید طاقت کے نشے میں چور گارڈز ویرا کے ساتھ دست درازی سے بھی باز نہ آتے۔ ان کی خصلت اور فطرت کو میں اب بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔ عورت اور باندی ان کے لیے ہم معنی لفظ تھے۔ ان کے ذہن عورت کے ساتھ جسمانی رشتے کے سوا اور کسی رشتے کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ٹرسٹ کے بڑے تو دور کی بات ہے ان کے نابالغ بچے بھی عورت کو ایک جنسی کھلونا سمجھتے تھے۔ میری نگاہ میں کم سن شیطان ماسٹر اسٹی کا چہرہ گھوم گیا' وہ بچہ تھا لیکن اس کے اندر ایک پختہ کار ہوس پرست ابھی سے اودھم مچا رہا تھا۔

صفدر' ویرا اور میں ٹہلتے ہوئے ذرا دور نکل گئے تو گارڈز کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک گارڈ نے بلند آواز میں ہمیں وارننگ دی کہ ہم زیادہ آگے نہ جائیں کیونکہ کتوں کا خطرہ بدستور موجود ہے۔ ہم وہیں رک گئے۔ ویرا ایک بار پھر ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ صفدر نے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں کے اوپر سے گزار کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میرا خیال نوجوان حبشی شاؤل کی طرف چلا گیا۔ وہ یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ہمارے لیے کمک لے کر پہنچ جاتا۔ درست ہی کہتے ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

میں نے دیکھا' ڈوجون اپنی جیپ میں موجود ہے اور وائرلیس سیٹ پر کسی سے گفتگو میں مصروف ہے۔ اس کا لب و لہجہ بے حد مودب تھا۔ ہمیں شک گزرا کہ وہ اپنے بگ باس کنگ براؤن سے صلاح مشورہ کر رہا ہے۔ بہرحال ہمارا یہ شک' شک ہی رہا کیونکہ اس کی کسی طرح تصدیق نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ لوگ کیا پلاننگ کر رہے ہیں۔ صرف ایک بات واضح تھی اور وہ یہ کہ یہ لوگ موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

رات آٹھ نو بجے ٹریلر کے اندر ہی ہمیں کھانا دیا گیا۔ ویرا کے حلق سے کچھ بھی نیچے نہیں اترا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس ٹریلر کے اندر چیر پھاڑ کے مناظر دیکھ چکی تھی' دوسری وجہ وہ وحشت ناک آوازیں تھیں جو قریبی جنگل سے بلند ہو رہی تھیں۔ ان میں ہر قسم کی آوازیں شامل تھیں۔

ڈاکٹر' نرس اور ٹریلر ڈرائیور کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک ٹرک نما گاڑی موقع پر پہنچی۔ ہم نے پہچان لیا۔ یہ ٹرسٹ ہی کی گاڑی تھی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور مسلح جوان چھلانگیں لگا لگا کر نیچے کودنے لگے۔ یہ سب مسلح تھے۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور انہوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ ان میں زیادہ تر تو گارڈز کی نیلی وردی میں تھے' تاہم کچھ جوان پولیس کی یونیفارم میں تھے۔ ہم نے گنا۔ ان کی تعداد انتالیس تھی۔

صفدر نے کہا "وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ یہ لوگ کوئی چکر چلا رہے ہیں' شاید موگاسا بستی میں گھسنے کے لیے اس ٹریلر کو استعمال کیا جائے۔"

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔" میں نے تائید کی۔

"یہ سب زبردست تربیت یافتہ لوگ لگتے ہیں۔ پوری طرح اسلحے سے لیس بھی ہیں۔ اندر گھس گئے تو قیامت ہو جائے گی۔"

میں نے صفدر کو اشارے سے منع کیا کہ وہ ویرا کی موجودگی میں یہ موضوع نہ چھیڑے۔ ہم دونوں ٹریلر سے اتر آئے۔ ہمیں ٹریلر سے اترتے دیکھ کر ڈوجون ہمارے قریب چلا آیا۔ میں نے ذرا لجاجت سے کہا "نرس (ویرا) بہت خوف زدہ ہے۔ پلیز آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔ ہمیں آپ کی اور قبائلیوں کی لڑائی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم واپس سائیں صاحب کی طرف چلے جاتے ہیں۔"

"کیوں چلے جاتے ہیں بھئی؟" ڈوجون نے طنزیہ لہجے میں کہا "آپ کوئی جرم تو نہیں کر رہے' صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر موگاسا والوں کو ہیضے کی دوائیاں اور ملیریا کے ٹیکے دینے جا رہے ہیں۔ اس نیک کام سے تمہیں روک کر ہم گناہگار ہونا نہیں چاہتے۔ تم جاؤ' بلکہ ضرور جاؤ۔ لڑائی کے بعد وہاں کئی زخمی بھی ہو چکے ہوں گے۔ ان کو مرہم پٹی کی ضرورت ہو گی۔"

"آپ... یہ سب کچھ شاید ناراضگی میں کہہ رہے ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"ناراضگی کس بات کی' تم تو یہاں اصلاحی اور سماجی کاموں میں مصروف ہو۔ انڈیا سے اٹھ کر اور سو مصیبتیں جھیل کر یہاں پہنچے ہو تاکہ یہاں کی دکھی انسانیت کے دکھ ہلکے کر سکو۔ تمہیں تو آنکھوں پر بٹھایا جانا چاہیے..."

"شکریہ... لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں!" ڈوجون نے میری بات کاٹی "ہم آپ سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ بیان نہیں کر سکتے۔ ہم نے ٹرسٹ سے کچھ نوجوان بلوائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں ان نوجوانوں کو اپنے ساتھ ہی موگاسا لے جائیں۔ یہ لوگ کچھ دن آپ لوگوں کی نیک صحبت میں رہیں گے تو ان میں بھی خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو گا۔ یہ بھی دکھیوں کے سکھ چین کے لیے اپنی نیندیں حرام کریں گے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔" ڈوجون نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ٹرسٹ کے گارڈز اور پولیس کے کمانڈوز ٹریلر میں چڑھنا شروع ہو گئے۔ وہ سب کے سب صورتوں سے ہی نہایت خطرناک افراد نظر آتے تھے۔ میں نے التجا کے لہجے میں کہا۔

"جناب! ہم بالکل بے ضرر قسم کے لوگ ہیں۔ پاپی پیٹ کی خاطر سائیں صاحب کی نوکری کر رہے ہیں۔ ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم پر رحم کریں' ہمیں اس خطرناک چکر میں نہ الجھائیں۔"

"یہ کوئی خطرناک چکر نہیں۔" ڈوجون نے سختی سے کہا "تم لوگ ٹریلر کو چلا کر موگاسا بستی لے جاؤ گے اور یہ لوگ تمہارے ساتھ جائیں گے اور خبردار کسی طرح کی ہوشیاری نہیں چلے گی۔ تم دونوں آگے ڈرائیونگ کیبن میں رہو گے لیکن یہ نرس پیچھے گارڈز کے قبضے میں رہے گی۔ اگر تم لوگ طے شدہ پروگرام کے مطابق چلو گے تو تم پر اور لڑکی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اور میری دلی خواہش ہے کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے سائیں عالی کی بے شمار غلطیوں کے باوجود ہمارے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔"

صفدر نے کہا "اگر واقعی نرم گوشہ موجود ہے تو پھر آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ہم سیدھے سادے ملازمت پیشہ لوگ ہیں' ہمیں اس خون ریزی میں مت الجھائیں۔"

ڈوجون بولا "ابھی تم لوگوں نے کہا تھا کہ تم خدمت خلق کے لیے نکلے ہو۔ یہ کام جو تم کر رہے ہو یہ بھی خدمت خلق ہے۔ تم حق سچ کا ساتھ دے رہے ہو۔ لارسیوں نے محترم کنگ کی جواں سال بھتیجی کو اس کی سہیلی سمیت گن پوائنٹ پر اغوا کیا ہے پھر اس کی شادی ٹرسٹ سے بھاگے ہوئے دو قیدیوں میں سے ایک کے ساتھ زبردستی کرائی گئی ہے۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ محترم کنگ براؤن کے عالی مرتبت خاندان کو ایک غلام کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے۔ یہ کوئی عشق محبت کا معاملہ نہیں تھا۔ یہ سیدھی سادی عداوت تھی۔ اس ساری کارروائی کا ماسٹر مائنڈ محترم کنگ کا نافرمان بھائی بوکارلو ہے۔"

میں نے دبے دبے لہجے میں کہا "محترم! ہم نے تو ایک اور بات بھی سنی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ٹرسٹ کے جن دو قیدیوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے' وہ ٹرسٹ سے فرار نہیں ہوئے تھے

بلکہ انہیں فرار کرایا گیا تھا۔ منصوبے کے تحت ان دونوں افراد کو لارسیوں میں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ بوکارلو اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔"

"تمہیں یہ کس نے بتایا؟" ذوجون کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا تھا۔

"یہ بات کئی لوگوں میں گردش کر رہی ہے۔"

ذوجون نے سگریٹ کا طویل کش لیا' کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ہمارے چہروں کو دیکھتا رہا پھر بولا "اگر یہ بات بھی ہے تو بھی مس ویرا کی شادی ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے بلکہ اسے شادی کہنا ہی نہیں چاہیے' یہ تو سیدھا سادہ اغوا اور آبرو ریزی کا کیس ہے۔ بوکارلو نے صرف انتقاماً مس ویرا کی شادی اپنے سے کہیں کم تر شخص کے ساتھ محترم کنگ کو نیچا دکھانے کے لیے کرائی ہے۔ اب بوکارلو تو ٹرسٹ کے قبضے میں ہے اور خدا نے چاہا تو وہ اپنے کیے کی عبرت ناک سزا بھگتے گا لیکن مس ویرا کا بازیاب ہونا بھی بہت ضروری ہے اور یہ کام ہر صورت میں ہو کر رہتا ہے' چاہے اس کے لیے لارسیوں کے خون سے اس ریت کو سرخ کیوں نہ کرنا پڑے۔ اب یہ محترم کنگ کے ساتھ ساتھ پورے ٹرسٹ کی آبرو کا معاملہ ہے۔"

"مگر موگاسا بستی پر شب خون مارنے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ مس ویرا اور وہ قیدی وہاں موجود ہوں گے؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں ہوں اور اگر نہیں بھی ہیں تو بھی موگاسا والوں کا قلع قمع ضروری ہے۔ ان لوگوں نے دیدہ دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے ٹرسٹ کے خلاف گولا بارود جمع کیا ہے' خاردار باڑیں بنائی ہیں اور ایسے دستے تیار کیے ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر ٹرسٹ کو تہس نہس کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہم سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں مگر ٹرسٹ کے لیے خطرہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

کچھ دیر بعد ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ ذوجون نے مجھے اور صفدر کو ڈرائیونگ کیبن میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ ویرا ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ اسے گارڈز نے ٹریلر کے پچھلے حصے میں اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ ڈرائیونگ کیبن اور پچھلے حصے کے درمیان ایک چھوٹا سا روزن تھا۔ اس روزن میں سے ایک گارڈ نے مجھے اور صفدر کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ ذوجون نے مجھے ڈرائیونگ کرنے کا حکم دیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا "تم اس ٹریلر کو موگاسا بستی کے اندر لے جانے کے ذمے دار ہو۔ اگر ہوشیاری دکھاؤ گے تو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"لیکن وہاں تو ان لوگوں نے باڑ لگا رکھی ہے۔ جنگل کی طرف جو راستہ ہے وہ اس قابل نہیں کہ وہاں سے یہ ٹریلر گزارا جائے۔"

"یہ ٹریلر اظہار خیر سگالی کے لیے موگاسا بستی میں جا رہا ہے۔ اس میں موگاسا والوں کے لیے طبی امداد کا سامان ہے۔ اس ٹریلر کو راستہ کیوں نہیں ملے گا؟ اور اگر فرض محال کوئی رکاوٹ ہو بھی تو اسے دور کرنا تمہارا کام ہے۔"

صفدر سخت بے چین نظر آ رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی ہنگامے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو پریشان ہونے کے بجائے شاید اس صورت حال کو انجوائے کرتا مگر اب ویرا اس کے ساتھ تھی۔ نہ صرف ساتھ تھی بلکہ یرغمال کے طور پر گارڈز کے قبضے میں تھی۔ اس ہنگامے میں ویرا کو نقصان پہنچ جانے کا تصور صفدر کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ بار بار ڈرائیونگ کیبن کے روزن میں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رائفل بردار گارڈ نے سختی سے اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی توجہ سامنے کی طرف رکھے۔

نیم ریتلی زمین پر ہمارا سفر موگاسا بستی کی طرف شروع ہوا۔ ہمارے دونوں گھوڑے ایک گارڈ کی تحویل میں تھے۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا اور دوسرے کو ساتھ بھگا رہا تھا۔ ڈاکٹر دانتے اور نرس ریٹا کی مسخ شدہ لاشیں بھی چادروں میں لپیٹ کر ٹریلر کے سامان والے حصے میں رکھ لی گئی تھیں۔ اتنی بڑی گاڑی چلانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا' کچھ راستہ بھی ایسا کہ میرے لیے ڈرائیونگ اور دشوار ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں یا ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک مرتبہ یہ ٹریلر موگاسا بستی میں گھس جاتا تو اس میں موجود نہایت تربیت یافتہ افراد ٹریلر سے نکل کر تہلکہ مچا سکتے تھے۔ وہ بلٹ پروف جیکٹس پہنے ہوئے تھے اور ان کا اسلحہ بھی جدید ترین تھا۔ ہمیں کسی بھی صورت اس ٹریلر کو بستی کے اندر پہنچنے سے روکنا تھا۔ جوں جوں بستی نزدیک آ رہی تھی' ہمارے دلوں کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ ویرا کی وجہ سے ہم بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کا خطرہ کسی صورت مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ عجیب صورت حال تھی۔ کنگ براؤن اور اس کے ہرکارے ویرا کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ اس پورے علاقے کی ریت انہوں نے چھان ڈالی تھی اور کئی بستیوں کو کچل ڈالا تھا۔ اپنے باس کی چہیتی بھتیجی کو ڈھونڈنے کے لیے نجانے اب تک کتنے بے گناہوں کی کھال کی بوکو سے ادھیڑی گئی

اور کتنے لوگوں کو زندہ درگور کیا گیا تھا۔ کنگ براؤن کی وہ بھتیجی اب ان کے درمیان موجود تھی لیکن وہ اس کی موجودگی سے لاعلم تھے۔ یعنی وہ جسے ڈھونڈنے کے لیے جا رہے تھے اسی کو گن پوائنٹ پر رکھے ہوئے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ ویرا کی زندگی ہمارے لیے جتنی اہم تھی اتنی ہی اہم ذوجون اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں ویرا کو ہلاک کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے تھے۔ اگر ان کے ہاتھوں ویرا ہلاک ہو جاتی تو کنگ براؤن زندہ ان کی کھال اتار لیتا۔

دور افق پر ہمیں ایک نیم روشن دھبا نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ موگاسا بستی تھی۔ وہی بستی جہاں کئی روز سے سردار بوغات کی لاش پڑی تھی اور جہاں گلیوں میں پرجوش لادی اپنے نیزے لہرا رہے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ کسی بھی بیرونی حملے کے حوالے سے پوری طرح چوکس ہیں لیکن انہیں دھوکا دیا جا رہا تھا اور یقیناً یہ ایک کامیاب دھوکا ثابت ہونے والا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ میرا دھیان ایک بار پھر لارسی نوجوان شازل کی طرف چلا گیا تھا۔ گارڈز کی آمد سے تھوڑی دیر قبل شازل اچانک موقع سے غائب ہو گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ سیدھا موگاسا بستی پہنچا ہوگا۔ اس نے بتا دیا ہوگا کہ ٹریلر خطرے میں ہے۔

لیکن یہاں فوراً ہی ایک اور سوال پیدا ہو جاتا تھا۔ اگر شازل موقع سے بھاگ کر بستی میں پہنچ گیا تھا اور اس نے سردار رافے کو ہماری مصیبت کے بارے میں بتا دیا تھا تو پھر رافے نے ہماری مدد کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ ہم تو ڈیڑھ گھنٹے سے گارڈز کی تحویل میں تھے۔ اس دوران میں بہ آسانی بستی سے ہمارے لیے کمک آ سکتی تھی۔ ہمارے مسلسل انتظار کے باوجود یہ کمک نہیں آئی تھی۔ کیا لارسیوں نے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا یا وہ اتنے ڈر چکے تھے کہ ہماری مصیبت کی اطلاع پا کر بھی انہوں نے خاردار باڑ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر شازل ان تک پہنچ ہی نہیں سکا تھا۔ پہلے دونوں امکانات تو دل کو نہیں لگ رہے تھے۔ سردار رافے ایسا کم حوصلہ نہیں تھا' ہاں آخری امکان درست ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ نوجوان شازل بستی تک پہنچ ہی نہ سکا ہو۔ اسے راستے میں گارڈز کے کسی گشتی دستے نے پکڑ لیا ہو یا پھر جنگلی کتوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی ہو۔

دھیرے دھیرے افق پر نظر آنے والے روشن نقطے واضح ہوتے گئے۔ بستی کے جھونپڑوں میں کہیں کہیں جو مشعلیں روشن تھیں یہ ان کے آثار تھے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا تھا ورنہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا۔ میرے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر جمے ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے اپنا ایک ہاتھ غیر محسوس طور پر نیچے سرکایا اور ڈیش بورڈ کے نیچے گھسا دیا۔ اگنیشن میں جانے والے دو تار میں پہلے ہی تاڑ چکا تھا۔ میں نے یہ دونوں تار زور سے کھینچے اور توڑ دیے۔ اس کے بعد چابی گھما کر میں نے انجن بند کر دیا۔ دو تین جھٹکے کھا کر ٹریلر رک گیا۔

"کیا مصیبت ہے؟" ذوجون روزن میں سے منہ نکال کر غرایا۔

"پتا نہیں' انجن بند ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اندر کی لائٹ جلاؤ۔" وہ پھر غرایا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی "چلو اسٹارٹ کرو۔" اس نے دوسرا حکم دیا۔

میں نے تین چار بار سیلف مارا' انجن اسٹارٹ نہیں ہوا "سن آف اے بچ۔" ذوجون نے دانت پیس کر گالی دی۔

ٹریلر کا عقبی دروازہ کھل گیا اور تین چار افراد ٹارچیں لے کر باہر نکل آئے۔ ان میں ذوجون بھی تھا۔ ایک گارڈ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرا چوکس نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کی یہ احتیاط بالکل ناکافی تھی۔ اس جیسے تین چار اور بھی ہوتے تو میں اور صفدر ان کو بھی کا ناچ نچا سکتے تھے۔ ذوجون آگے بڑھ کر اگنیشن میں چابی گھمانے لگا۔ نیچے سے تار ٹوٹے ہوئے تھے' انجن کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

یکایک میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ذوجون کو دبوچ لیا۔ صفدر نے کھڑے کھڑے ٹانگ چلائی اور گارڈ کی رائفل کو ہوا میں اڑا دیا۔ میں نے ذوجون کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا "ٹھہرو! کوئی حرکت نہ کرے' نہیں تو اس کا بھیجا پھاڑ دوں گا۔"

گارڈز کے ہاتھ اپنے کندھوں سے لٹکی ہوئی رائفلوں کی طرف بڑھ رہے تھے' وہیں کے وہیں رک گئے۔ تاریکی میں صاف دکھائی تو نہیں دے رہا تھا لیکن یقینی بات تھی کہ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی ہیں' یقیناً ان کو ہم سے ایسے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح تھی کہ وہ ذوجون جیسی اہم عہدے دار کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

کتنی ہی دیر تک ان میں سے کوئی کچھ نہ بول سکا' پھر ذوجون کی غراتی ہوئی آواز ابھری "تم بڑی بے وقوفی کر رہے ہو۔ تم بچ کر نہیں نکل سکتے اور تمہاری ساتھی اندر گارڈز کے

قبضے میں ہے' وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔"

"اپنا برا بھلا ہم خوب سمجھتے ہیں۔ تم اپنے چچوں کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہو۔"

اچانک ہمیں ویرا نظر آئی۔ ایک تومند گارڈ نے اس کے لمبے بالوں کو بل دے کر اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور رائفل کی نال اس کی نازک گردن سے لگا رکھی تھی۔ یہ گارڈ پھنکار کر بولا "میں صرف چار تک گنوں گا' اگر تم نے انچارج صاحب کو نہیں چھوڑا تو میں اس لڑکی پر گولی چلا دوں گا۔"

"تمہاری یہ دھمکی کارگر نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا "تم بڑی خوشی سے گولی چلا سکتے ہو۔ یہ لڑکی تمہاری اور تمہارے بگ باس ہی کی کچھ لگتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" رائفل بردار بولا۔

"یہ کنگ کی بھتیجی ویرا ہے۔ یہ میک اپ میں ہے۔ تم چاہو تو اس کی آواز سے اسے پہچان سکتے ہو۔"

ویرا نے حیرت سے میری طرف دیکھا' پھر اس کا تیز ذہن بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا چاہ رہا ہوں۔ ایک گارڈ نے ٹارچ کی روشنی میں بڑے دھیان سے ویرا کا چہرہ دیکھا۔ چند لمحے بعد اس نے ویرا سے پوچھا "آپ کون ہیں۔ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ آپ کے بارے میں؟"

ویرا نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ ایک طرح سے وہ میری بات کی تائید کر رہی تھی۔ ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر غور سے اور قریب سے ویرا کو دیکھا۔ تب وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ یہ بندہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے ان کی آواز پر پہلے بھی شبہ ہو رہا تھا۔ اب ان کے چہرے پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ میک اپ میں ہیں۔ کسی کاسمیٹک سرجن نے SILICONE PLASTIC وغیرہ سے ان کے چہرے کے نقوش کو تبدیل کیا ہے پھر بھی ان کی آنکھیں اور ناک کے ارد گرد کا حصہ صاف پہچانا جا رہا ہے۔"

"تت۔۔۔ تم لوگ کون ہو؟" ایک گارڈ نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہم خدائی فوجدار ہیں۔ سائیں صاحب کے حکم پر خدمت خلق کر رہے ہیں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔" ذوجون نے میری سخت گرفت میں مچلتے ہوئے کہا "اگر یہ ویرا صاحبہ ہیں تو پھر تم میں سے ایک کا نام صفدر ہے اور دوسرے کا شاہ جہاں۔"

"چلو اگر تم پہچان ہی گئے ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔" میں نے اپنی اصل آواز میں بولتے ہوئے کہا "اب کیا ارادے ہیں تمہارے۔ اپنے ساتھیوں سے ہتھیار پھنکواتے ہو یا میں اڑا دوں تمہارا کھوپڑا۔"

"دیکھو تم اپنے ساتھ مس ویرا کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال رہے ہو۔"

صفدر نے پھنکار کر کہا "ہمیں صرف اپنی فکر ہے' اس لڑکی کی فکر تمہیں کرنی چاہیے۔"

"کیا یہ تمہاری بیوی نہیں ہیں؟" گارڈ نے پوچھا۔

"چند راتوں کے لیے بیوی تھی۔ بس چند رات کا مزا تھا۔ رات گئی' بات گئی۔" صفدر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

میں نے ذوجون کے کان میں گرم سرگوشی کرتے ہوئے کہا "دیکھو ذوجون! جان بڑی قیمتی چیز ہے' ایک بار چلی جائے تو پھر کنگ براؤن اسے واپس نہیں لوٹا سکتا۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور تمہارے خلاف گزر رہا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں۔"

"نہیں تو کیا ہوگا۔ کیا تم بچ سکو گے۔ جونہی تم نے مجھے مارا' تم دونوں بھی گولیوں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔"

"ہمارا مت سوچو' اپنا سوچو۔ کیونکہ تمہیں بہرحال پہلے مرنا ہے۔"

میرے لہجے کی وحشت نے ذوجون کو یقین دلا دیا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں کر گزروں گا۔ وہ اس سے پہلے ہوسٹل یا ہو پھر کیمپس میں بھی میری مار دھاڑ دیکھ چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی چند سیکنڈ پہلے میرا تعارف ہونے کے بعد اس کے بدن نے ہولے ہولے لرزنا شروع کر دیا تھا۔

"ہتھیار پھنکواؤ ذوجون!" میں نے ان کی کنپٹی پر ریوالور کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس بے رحم دباؤ نے ذوجون کا رہا سہا حوصلہ بھی توڑ دیا۔ اس نے اپنے گارڈز سے کہا "تم لوگ اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکا لو اور تھوڑی قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"نہیں ذوجون!" میں نے فیصلہ کن لہجہ اختیار کیا "ان لوگوں کو ہتھیار زمین پر پھینکنا ہوں گے اور ہینڈز اپ ہونا ہوگا۔ میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو مخصوص انداز سے موڑنا شروع کر دیا۔ تکلیف کے سبب ذوجون کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی اور اس نے اپنے ماتحتوں کو ہتھیار پھینکنے کی ہدایت کی۔

جونہی انہوں نے ہتھیار پھینک دیے۔ میں نے ویرا کو اشارہ کیا' وہ لپک کر ہماری طرف آگئی۔ "ان کو پیچھے ہٹنے کی

ہدایت کرو۔" میں نے ذوجون کی گردن موڑتے ہوئے کہا۔

ذوجون نے اشارہ کیا اور اس کے ماتحت بے چارگی کے عالم میں گری ہوئی رائفلوں سے دور ہٹ گئے "اور پیچھے ہٹو۔" میں نے انہیں دھمکایا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ان میں سے دو چار ایسے ضرور تھے جو تصور ہی تصور میں مجھے اور صفدر کو پچھلے چند منٹوں میں کئی بار قتل کر چکے تھے۔ وہ برے برے منہ بناتے ہوئے مزید پیچھے ہٹ گئے۔ اتنی زیادہ تعداد میں مسلح افراد پر قابو پالینا آسان کام نہیں تھا اگر ہم اس میں کامیاب ہوئے تھے تو اس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ ایک تو ویرا کی اصلیت ظاہر کر کے اور اس کی طرف سے بے پروائی دکھا کر ہم نے گارڈز کو چکرا دیا تھا' دوسرے یہ تمام گارڈز میری اور صفدر کی "صلاحیت" سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ ٹرسٹ میں ہونے والے ہنگاموں کی یادیں ان کے ذہن میں تازہ تھیں اور وہ جانتے تھے کہ ہمیں اتنی جلدی کنگ براؤن کا قرب کیوں حاصل ہوا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ نفسیاتی طور پر ہم سے مرعوب تھے۔

صفدر نے آگے بڑھ کر رائفلیں سمیٹ لیں۔ جب وہ رائفلیں سمیٹ رہا تھا' ایک دو گارڈز کی حرکتوں سے ہمیں خطرہ محسوس ہوا۔ بجائے اس کے کہ میں انہیں خبردار کرتا' ذوجون نے خود ان کو وارننگ دینا شروع کر دی۔ اس کی جان شکنجے میں آئی ہوئی تھی۔ شاید اس کی نگاہوں میں مبارک امین کی موت کا نقشہ گھوم گیا تھا۔ غزال پر حریص نگاہیں ڈالنے کی پاداش میں مبارک بھی اسی طرح میری گرفت میں آیا تھا اور تین گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اس وقت بھی کئی گارڈز میرے ارد گرد موجود تھے اور وہ مبارک کی کوئی مدد نہیں کر سکے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً اپنے پیش رو انچارج رقص کا انجام بھی ذوجون کے سامنے تھا۔

صفدر نے رائفلیں سمیٹ کر ٹریلر کے ڈرائیونگ کیبن میں ڈال دیں۔ کچھ رائفلیں خالی کر کے ٹول باکس کے ساتھ بنے ہوئے فالتو خانے میں رکھ دیں۔ میں نے گارڈز کو اشارہ کیا کہ وہ ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ وہ بے حد خوف زدہ نظر آنے لگے تھے' شاید انہیں ڈر تھا کہ ہم انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے صفدر کو اشارہ کیا کہ وہ ٹریلر میں ٹرنک کا دروازہ اچھی طرح چیک کر لے۔ صفدر میرا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ہم ان گارڈز کو ٹریلر میں بند کر کے اپنے ساتھ موگا سا بستی لے جا رہے تھے لیکن ٹریلر میں وہ شاندار اسلحہ بھی خفیہ خانے کے اندر موجود تھا جو سائیں

نے موگا سا بستی والوں کو ارسال کیا تھا۔ اگر گارڈز اسلحے تک پہنچ جاتے تو کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ صفدر نے باہر آکر مطمئن انداز میں سر ہلایا تو میں نے گارڈز کو دوبارہ ٹریلر میں سوار ہونے کا حکم دیا۔ وہ اندر گھس گئے تو دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا۔ ذوجون کو ہم اپنے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں لے آئے۔ اسے اب صفدر نے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ ویرا صفدر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ روزن جو "ڈرائیونگ کیبن" کو ٹریلر کے پچھلے حصے کے ساتھ ملاتا تھا' ہم نے ایک چوبی تختے کے ذریعے بند کر دیا تاکہ گارڈز کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ ڈیش بورڈ کے نیچے ٹوٹے ہوئے تار پھر سے جوڑ کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور ایک بار پھر ہم موگا سا بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ فرق یہ تھا کہ ذوجون ہم کو نہیں لے جا رہا تھا' ہم ذوجون کو لے جا رہے تھے۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے سائیڈ کے شیشے میں سے ویرا کو دیکھا' ویرا اور صفدر دونوں کے چہرے کیبن کی اندرونی روشنی میں نظر آ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے قرب نے انہیں مسرور سا کر رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ ان سخت غیر یقینی حالات میں بھی وہ دونوں ایک دوجے کا لمس محسوس کر کے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ وہ ایک مطمئن شادی شدہ جوڑا نظر آتا تھا' شاید کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ قریب آنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ اگر صفدر درست کہہ رہا تھا تو پھر یہ سب کچھ بہت عجیب بلکہ پراسرار تھا۔ ویرا ایسا کیوں کر رہی تھی۔ اس نے اتنی نرالی منطق کیوں اپنائی تھی؟ کہیں وہ کسی دوسرے کا کھیل تو نہیں کھیل رہی تھی؟ صفدر کی ذہنی حالت پہلے ہی نارمل نہیں تھی۔ یہ جذباتی الجھن اسے مزید اتھل پتھل کا شکار کر سکتی تھی۔

ہم موگا سا بستی پہنچے تو بوما کے قریب نقارہ پیٹے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی گھونگروؤں کی چھن چھن بھی سنائی دے رہی تھی۔ سوار راف نے خاردار باڑ کو ہٹا کر ٹریلر کے لیے راستہ بنانے کا حکم دیا۔ چند منٹ میں راستہ بن گیا اور ہم بستی میں داخل ہو گئے۔

سوار راف ہم سے پریشانی کے عالم میں مختلف سوالات پوچھ رہا تھا۔ ہماری سمجھ میں بھلا کیا آتا تھا۔ اسی دوران میں ہمارا مترجم اشوکا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سوار کی ترجمانی کرتے ہوئے ہم سے پوچھا کہ اب تک ہم کہاں تھے؟

میں نے کہا "ہمیں کچھ گارڈز نے گھیر لیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" رافے نے پوچھا۔

"ہم نے گارڈز کو گھیر لیا' اب وہ اس ٹریلر میں بند ہیں۔ یہ کوئی اٹھائیس کے قریب افراد ہیں۔"

رافے اور دیگر افراد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اشوکا نے ژاجوان کی طرف اشارہ کیا اور اپنی طرف سے پوچھا۔

"یہ کون ہے۔ اس کی شکل کچھ پہچانی سی لگتی ہے۔"

"یہ کنگ براؤن کے پالتو افراد میں سے ایک ہے' اس کا نام ژاجوان ہے۔ یہ ان تربیت یافتہ اور نہایت "دلیر" گارڈز کا انچارج ہے جو اس وقت ٹریلر کے چوبی دان میں بند ہیں۔"

"اور یہ لڑکی؟" رافے نے دیرا کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا تعارف بڑا سنسنی خیز ہے۔ بعد میں کراؤں گا۔" میں نے کہا۔

"شازل کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" رافے نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں اسے کیا ہوا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" رافے نے کہا۔

"ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ جب گارڈز ٹریلر کی طرف آرہے تھے تو وہ موقع تاڑ کر وہاں سے نکل گیا تھا۔"

"اچھا ابھی تمہیں اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔ آؤ پہلے سردار بوغات کا آخری سفر دیکھ لو۔" رافے نے کہا۔

"آخری سفر؟" صفدر نے حیرت سے پوچھا "کیا سردار کی آخری رسمیں ادا کی جارہی ہیں؟"

رافے نے اثبات میں سرہلا دیا اور ہمیں ساتھ لے کر بوبا کی طرف آگیا۔ یہ ایکا ایکی سردار بوغات کے کریا کرم کا مسئلہ حل ہوجانا ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوچکا تھا۔ پرندے جاگ گئے تھے اور موگاسا بستی کے رہائشی تو شاید آج ساری رات ہی جاگتے رہے تھے۔ وہ نیزے اور بھالے لہراتے ہوئے بستی کی گلیوں میں چکرا رہے تھے۔ بوبا کے سامنے آگ کا ایک بڑا الاؤ روشن کردیا گیا تھا۔ اس الاؤ سے تیس چالیس فٹ کی دوری پر لکڑی کا پلیٹ فارم رکھا تھا اور پلیٹ فارم کے اوپر سردار بوغات کی لاش دھری تھی' سیکڑوں سوگوار مرد و زن اس لاش کے گرد موجود تھے۔ نقارے کی آواز اور گھونگھروؤں کی چھنا چھن سے زمین دہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ایک منظر

ہے۔ لکڑی کے تین مزید پلیٹ فارم موقع پر لائے گئے۔ ان کے نیچے بھی پہیے موجود تھے۔ اگر ان پلیٹ فارمز کو اسپتال میں استعمال ہونے والے اسٹریچرز سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان پلیٹ فارمز پر تین بوب لڑکیاں اس حالت میں موجود تھیں کہ ان کے دونوں ہاتھ اور پاؤں کسی دھات کے کڑوں کے ذریعے اسٹریچر نما پلیٹ فارم سے باندھ دیے گئے تھے۔ تینوں لڑکیاں سرخ و سپید اور خوش شکل تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھ رہی تھیں۔ غالباً ہلکی سی حیرت بھی ان کی آنکھوں میں موجود تھی۔ وہ ایسے جانوروں کی طرح نظر آرہی تھیں جنہیں کسی پنجرے سے نکال کر اچانک سیکڑوں تماشائیوں کے روبرو لایا گیا ہو۔ لڑکیوں کے جسموں پر سفید ریشم کے مہین لبادے تھے۔ ان لبادوں میں سے ان کے پُرشباب اور صحت مند جسموں کے خدوخال نمایاں نظر آرہے تھے۔ ہر لڑکی کے پہلو میں لوہے کا ایک د فٹ لمبا موسل رکھا تھا۔ یہ وزنی موسل پیچھے سے پتلا او آگے سے موٹا تھا۔

میرے دل نے گواہی دی کہ یہاں کوئی وحشیانہ تما ہونے جارہا ہے۔ دیرا اس تماشے سے پہلے ہی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی تھی۔ اس نے مضبوطی سے صف کا بازو تھام رکھا تھا اور اس کی انگلیوں کی کیفیت بتاتی تھی صفدر کے بازو پر اس کی گرفت مضبوط تر ہوتی جارہی میں نے صفدر سے کہا "تم ٹریلر کے پاس جاؤ۔ اشوکا کو ساتھ لے جاؤ۔ رافے کے محافظوں کو بتادو کہ ٹریلر ٹرسٹ کے مسلح افراد موجود ہیں اور ان کی نگرانی کی ضرو ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ٹریلر بستی میں آجا کے بعد ٹرسٹ کے گارڈز باہر سے بھی کوئی کارروائی کریں۔"

صفدر نے اثبات میں سرہلایا اور دیرا سمیت وہاں چلا گیا۔ اس دوران میں چار بالکل جوان اور چار بہت بو قبائلی عورتیں موقع پر پہنچ گئیں۔ وہ آٹھوں عورتیں انداز میں رقص کررہی تھیں۔ ان کے پاؤں میں گھو بندھے ہوئے تھے۔ نقارے کی آواز کے ساتھ چھنا چھن زوردار صدا بلند ہورہی تھی وہ ان گھونگھروؤں ہی کی آٹھوں عورتیں ناچ ناچ کر ہلکان ہورہی تھیں' پسینہ ان سیاہ جسموں سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ خاص بے جوان عورتوں کی حرکات میں تو اتنی تیزی تھی نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس رقص کو ماتمی رقص کہا جانے ہوگا۔ رقص کے دوران میں ہی یہ عورتیں بین کررہی تھیں اور رانیں بھی پیٹ رہی تھیں۔

گھونگھروؤں کی چھن چھن تھی جبکہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ عجیب سا انتشار تھا۔

رقص اور موسیقی کی لے تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ انتہا پر پہنچ گئی۔ عالم جوش میں چاروں جوان اور چاروں بوڑھی عورتوں نے اپنے لباس نوچ کر پھینک دیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھیں اور ناچ رہی تھیں۔ ایک طرف بوڑھی عورتوں کے جھریوں بھرے بے ڈول بدن تھے' دوسری جانب جوان عورتوں کے چھریرے پیکر تھے۔ جونہی یہ عورتیں بے لباس ہوئیں' تین افراد بوب لڑکیوں کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں قینچیاں تھیں۔ انہوں نے بوب لڑکیوں کے سفید ریشمی لبادے ان قینچیوں سے کاٹ ڈالے' پھر ان کٹے ہوئے لبادوں کو لڑکیوں کے جسم کے نیچے سے کھینچ لیا گیا۔ اب یہ لڑکیاں بھی بے لباس ہوگئیں۔ ان کے سرخ و سپید چہرے حیرت کی آماجگاہ بن گئے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ڈرے ہوئے جانوروں کی طرح گاہے گاہے خود کو چھڑانے کی ناتواں سی کوشش بھی کرلیتی تھیں۔ اسی دوران میں سیاہ فام عورتیں ناچتے ناچتے بوب لڑکیوں کے گرد جمع ہوگئیں۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں جنگلی جھاڑیوں کا ایک ایک لمبا کانٹا تھا۔ ان سخت کانٹوں کے ذریعے سیاہ فام عورتوں نے بوب لڑکیوں کے سرخ و سپید جسموں پر خراشیں ڈالنا شروع کردیں۔ بوب لڑکیاں چیخنے لگیں اور تکلیف کی وجہ سے ان کے جسم لرزنے لگے۔ چند سیکنڈ کے اندر ان لڑکیوں کے جسموں پر بے شمار سرخ لکیریں دکھائی دینے لگیں۔ تاہم یہ تماشا جلد ہی ختم ہوگیا' جن تین افراد نے بوب لڑکیوں کے لبادے کاٹے تھے وہ آگے بڑھے اور لڑکیوں کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔ لوہے کے تین موسل' تین افراد نے اٹھالیے۔ اس کے بعد انہوں نے بڑے نپے تلے انداز میں ایک ایک زوردار ضرب بوب دوشیزاؤں کے تالو میں لگائی۔ یہ بڑی ناپی تولی ہوئی ضرب تھی۔ لڑکیاں بے ہوش ہوگئیں۔ دو کے جسم تو بالکل ساکت ہوگئے تاہم ایک کے ہاتھ پاؤں ہولے ہولے اینٹھتے رہے۔ سردار رافے سے مشورے کے بعد موسل بردار نے اس لڑکی کو ایک اور ضرب لگائی اور اسے بھی ساکت کردیا۔

اس کے ساتھ ہی ماتمی صداؤں سے قرب و جوار گونجنے لگے۔ لارسی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور عورتیں بین کررہی تھیں۔ لکڑی کے چاروں پلیٹ فارم آگ کے بلند الاؤ کے قریب لائے گئے اور ایک ساتھ الاؤ میں دھکیل دیے گئے۔ یہ پلیٹ فارم لکڑی کے پہیوں پر چلتے ہوئے آگ کے الاؤ میں پہنچ گئے۔ سیکڑوں لارسیوں نے اپنے سروں میں خاک ڈالی اور سینہ کوبی کرتے ہوئے الاؤ کے گرد جمع ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر میں گوشت کے جلنے کی بو گاڑھے دھوئیں کے ساتھ اطراف میں پھیلنے لگی۔ اسی دوران میں بہت سے کپڑے' برتن' ننھے منے جوتے' بچوں کے پالنے اور دودھ کی بوتلیں وغیرہ بھی الاؤ میں پھینک دی گئیں۔ اس رسم کے رموز اگلے دن ہم پر واضح ہوئے۔

سردار بوغات کی آخری رسوم ادا ہونے کے بعد بہت سے لارسی بوبا میں جمع ہوگئے اور مناجات وغیرہ پڑھنے لگے۔ ہم ٹریلر کی طرف چلے گئے۔ ٹرسٹ کے گرفتار شدہ کمانڈوز کو ایک ایک کرکے ٹریلر میں سے نکالا گیا اور ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ وہ سب بے بسی کی تصویر نظر آرہے تھے۔ اپنے مشن کا یہ انجام شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ان افراد کو باہر نکالنے کے بعد وہ جدید ترین اسلحہ ٹریلر کے خفیہ خانے میں سے نکالا گیا جو سائیں عالی نے بطور کمک یہاں بھیجا تھا۔ اس اسلحے اور گولا بارود کو دیکھ کر لارسیوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ڈاکٹر رائٹ اور نرس ریٹا کی چادروں میں لپٹی ہوئی لاشیں ٹریلر میں سے نکال کر زمین پر بچھی چٹائیوں پر رکھ دی گئیں۔ اب سورج کافی اوپر آچکا تھا اور در و دیوار کے سائے مختصر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اچانک مجھے صفدر اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ بڑی تیزی سے آرہا تھا اور اس کی صورت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کوئی خاص خبر لایا ہے۔

اس نے میرے قریب آکر سرگوشی کی "شاہ جہاں صاحب' غضب ہوگیا۔"

"کیا بات ہے؟"

"آئیے میرے ساتھ۔" وہ مجھے لے کر ایک طرف چل دیا۔

ہم الاؤ کی بائیں جانب سے ہوکر کھجور کے درختوں کی طرف آگئے۔ ایک منظر دیکھ کر میں سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ مجھے اپنے سامنے کھجور کا وہی خشک درخت نظر آرہا تھا جس کے ساتھ برسوں چین کو باندھ کر جلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ درخت جل چکا تھا اور اس کے ساتھ لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا شخص بھی جل چکا تھا' اب فقط اس کا پنجر ہی درخت کے کوئلہ تنے سے پیوست تھا۔

"یہ کون ہے؟" میرے ہونٹوں سے لرزتی آواز نکلی۔

"چین۔"

صفدر کے جواب نے میرا بدترین خدشہ درست ثابت

کر دیا۔

"اوہ خدایا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے کہا "ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

صفدر نے افسردگی سے کہا "جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو پھر نہ کوئی ظالم رہتا ہے اور نہ مظلوم۔ دونوں طرف سے جارحانہ کارروائیاں ہوتی ہیں۔ اشوکا نے بتایا ہے کہ ایک پرجوش لارسی نے غصے سے بے قابو ہو کر چین کے سینے میں زہر آلود نیزہ گھونپ دیا تھا۔ وہ وہیں تڑپ کر ہلاک ہو گیا۔ بعد میں اپنا غصہ نکالنے کے لیے لارسیوں نے اس کی لاش یہاں باندھ کر جلا ڈالی۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ سردار ربوغات کی آخری رسوم ادا کرنے کا مسئلہ اچانک کیسے حل ہو گیا۔ لارسیوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ سردار کے قتل کا بدلہ لیے بغیر اس کی آخری رسوم ادا نہیں کی جائیں گی۔ انہوں نے کنگ براؤن کے سگے بھائی کو ہلاک کر کے اپنی قسم پوری کر لی تھی اور اس کے بعد سردار ربوغات کی لاش کو مقامی رواج کے مطابق جلا دیا گیا تھا۔

"اس طرح تو صورت حال اور خراب ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کنگ براؤن اور لارسیوں کے درمیان بہت سنگین تصادم ہو گا۔ شاید لارسیوں سے یہ بے وقوفی ہو گئی ہے۔" صفدر بولا۔

"ہاں بظاہر تو بے وقوفی ہی ہے۔" میں نے تائید کی۔

"لیکن اس "بے وقوفی" میں بھی ٹرسٹ والوں کا عمل دخل ہے۔" صفدر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"حبشی شازل ٹریلر پر ہمارے ساتھ موجود تھا۔ گارڈز کی گاڑیوں کی آواز سن کر وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے اب وہ کہاں ہے؟"

میں سوالیہ نظروں سے صفدر کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا "وہ گارڈز کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔ اس کی لاش کل شام سے تھوڑی دیر پہلے جنگل کے اندر سے ملی ہے۔ مرنے سے پہلے وہ گارڈز کے وحشیانہ تشدد کا شکار ہوا ہے۔ اس کے جسم کے نازک حصوں کو جیپ کے "سگریٹ لائٹر" سے داغا گیا ہے اور خنجر سے لاتعداد چرکے لگائے گئے ہیں۔ شازل کی لاش دیکھنے کے بعد ہی بستی کے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے کہ ان میں سے ایک شخص نے چین کو جان سے مار ڈالا۔"

"لیکن۔۔۔ شازل کے ساتھ یہ سب کیوں ہوا۔ کیسے پکڑا گیا وہ؟"

میرا سوال مکمل ہونے تک اشوکا بھی وہاں پہنچ گیا۔ صفدر نے اشوکا سے کہا کہ وہ مجھے تفصیل سے بتائے۔ اشوکا نے جیب سے سرخ رومال نکال کر اپنے گنجے سر سے پسینہ پونچھا اور فکر مند لہجے میں بولا "سہ پہر کے وقت سردار رانے کے ایک محافظ نے اطلاع دی کہ جنگل کی شمالی جانب سے دھماکے کی آواز آئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بارود وغیرہ پھٹا ہے۔ سردار رانے نے چند گھڑ سواروں کو بھیجا۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ ہم جنگل میں اس مقام تک پہنچے تو ایک دل خراش منظر نظر آیا۔ وہاں درختوں کے درمیان ایک طویل قدرتی کھائی ہے۔ کہیں کہیں اس کھائی کی گہرائی ڈیڑھ دو سو فٹ تک ہے۔ کھائی میں ایک جیپ الٹی پڑی تھی اور دھماکے کے بعد اس میں آگ لگ گئی تھی۔ جیپ میں نوجوان شازل سمیت چھ افراد سوار تھے اور ان میں سے صرف ایک زندہ بچا تھا۔ یہ ایک گارڈ ہی تھا' اس کا نام پیٹر ہے۔ تین افراد تو جیپ کے اندر ہی جل کر ہلاک ہو گئے تھے جبکہ دو افراد نے جیپ سے باہر نکلنے کے بعد دم توڑا تھا۔ ان میں سے ایک شازل تھا۔ شازل کے چہرے پر کند آلے سے شدید ضربات لگائی گئی تھیں اور اس کے باقی جسم پر بھی وحشیانہ تشدد کے آثار تھے۔ زندہ بچ جانے والے گارڈ پیٹر نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا ہے کہ شازل کو گارڈز کے اس گشتی دستے نے کھائی سے تقریباً دو تین میل پیچھے راستے سے گرفتار کیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تیز رفتاری سے جا رہا تھا' اسے رکنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی ٹانگ پر گولی مار کر اسے پکڑا گیا۔ گارڈز اسے جیپ میں لے آئے۔ اس سے پوچھ گچھ کی گئی کہ وہ کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا ہے مگر اس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا یہاں تک کہ وہ نیم بے ہوش ہو گیا۔ گارڈز اسے مزید پوچھ گچھ کے لیے اپنے کیمپ کی طرف لے جا رہے تھے۔ جب جیپ اس کھائی کے پاس سے گزر رہی تھی' شازل نے اچانک اسٹیئرنگ پر جھپٹا مارا اور پوری طاقت سے اس کا رخ کھائی کی طرف موڑ دیا۔ وہ بھی جاں بحق ہوا اور اپنے ساتھ چار گارڈز کو بھی لے مرا۔"

اشوکا کے اس بیان کے بعد صورت حال ہماری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ شازل نے اپنے قبیلے سے جاں بازی کا جو وعدہ کیا تھا' وہ اس نے نبھایا تھا۔ وہ خودکشی نہیں کر سکتا تھا' وہ کسی کی جان نہیں لے سکتا تھا مگر اس نے گارڈز سمیت موت کو گلے لگا

اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا تھا۔ آزادی اس کا نصب العین تھا اور اپنے نصب العین سے سچی اور انوٹ "وابستگی" اس نے جان دے کر ثابت کی تھی۔ اشوکا نے بتایا "جب کل شام شازل کی لاش بستی میں پہنچی تو اس کے بدن پر وحشیانہ تشدد کے نشان دیکھ کر لارسی آپے سے باہر ہو گئے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی نعرے بلند کرتی ہوئی اس جھونپڑے میں گھس گئی جہاں چین کو رکھا گیا تھا اور نیزہ مار کر اسے ہلاک کر ڈالا۔"

"سردار رانے نے لوگوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس وقت شازل کی لاش کے پاس تھا۔ اسے تب اطلاع ملی جب چین آخری سانس لے رہا تھا۔ بہرحال سردار رانے نے چین کی لاش جلانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ شاید وہ خود بھی چاہتا تھا کہ لوگوں کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔"

"جیپ کے حادثے میں زندہ بچنے والا گارڈ کہاں ہے؟"

"وہ بھی شدید زخمی ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ بستی کے معالج اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

واقعات سنگین رخ پر جا رہے تھے اور سب سے بڑا سنگین واقعہ یہ تھا کہ چین ہلاک ہو گیا تھا۔ ابھی مائیکل کی موت ہی کو ٹرسٹ والے بھول نہیں پائے تھے کہ کنگ کا سگا بھائی بھی جہنم واصل ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو چین کو جانتے تھے اسے یک چشم شیطان کا نام دیتے تھے اور اس کی موت پر یقیناً ان کے ذہنوں میں شادیانے بج گئے تھے مگر اس شیطان کی موت دوسرے فریق کے لیے بے حد سوہان روح ثابت ہونی تھی۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جو کچھ بھی ہونا تھا اس پر مہر لگ چکی تھی۔ چین کی موت سے ایک اور نقصان بھی ہوا تھا۔ پرسوں جب اسے آگ میں زندہ جلایا جانے لگا تھا' میں نے اس سے پختہ عہد لیا تھا کہ بچ جانے کی صورت میں وہ مصالحتی کردار ادا کرے گا۔ اب یہ عہد اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

اس بستی میں لاشوں کو محفوظ رکھنے کا بھلا کیا انتظام ہونا تھا۔ سخت گرمی کے سبب ڈاکٹر رانٹ اور نرس ریتا کی بچی ہوئی لاشوں نے بارہ گھنٹے بعد ہی بو دینا شروع کر دی تھی۔ انہیں صبح سویرے ہی سپرد خاک کر دیا گیا تھا۔ جو واقعات دیکھے تھے اس کے بعد کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سہ پہر تک میں بس بیڑی نما سگریٹ ہی پھونکتا رہا۔ جس جھونپڑے میں میرا اور صفدر کا قیام تھا وہ بھی اکیلا اکیلا اور اداس ہو چکا تھا۔ یہ جانباز شازل کا جھونپڑا تھا' صرف چار دن پہلے اس نے قبیلے کی خوب رو لڑکی جوزبی کے ساتھ اس جھونپڑے کے ایک حصے میں اپنی سہاگ رات منائی تھی۔ اس جھونپڑے کی دیواروں میں ان کے سانسوں کی کھنک اتری تھی اور ان کی سرگوشیاں گونجی تھیں۔ ہزاروں سال سے محو گردش دو ستاروں کی طرح وہ ایک رات کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے اور پھر لامتناہی فاصلوں پر چلے گئے تھے۔ اب یہاں کچھ نہیں تھا' شازل کی موت کے بعد جوزبی نے بھی یہ جھونپڑا چھوڑ دیا تھا۔ اسے میں نے آج چشمے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا' وہ ایک ہی رات میں مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ رس سے بھرا ہوا "سیاہ انگور" سوکھا ہوا لگتا تھا۔ اس کے بال بیواؤں کی طرح کھلے تھے اور متورم آنکھوں میں ویرانی کے ڈیرے تھے۔ ہونی ہو کر رہی تھی۔ شازل اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

جھونپڑے کا وہ حصہ جو اس سے پہلے شازل اور جوزبی کے استعمال میں تھا' میں نے صفدر اور ویرا کو دے دیا تھا۔ خود میں اس حصے میں تھا جہاں اس سے پہلے صفدر اور میں قیام پذیر تھے۔ صفدر اور ویرا کہیں باہر گھومنے گئے ہوئے تھے' میں اکیلا بیٹھا اپنی سوچوں میں گم رہا۔ آج صبح سویرے نظر کے سامنے آنے والے خونی مناظر بار بار ذہن کے پردے پر ابھر رہے تھے اور چیخ چنگھاڑ رہے تھے۔ سردار ربوغات کی لاش کے ساتھ تین کنواری خوب رو لڑکیوں کا آگ میں جلائے جانا بڑا اندوہناک تھا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب بھاری موسل کی ضرب سے ان تینوں لڑکیوں کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ سنگدلی کے زمرے میں آتا تھا اور اس حوالے سے کسی طرح بھی لارسیوں کی تائید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن یہاں ایک بات ضرور ذہن میں آتی تھی۔ لارسی مسلسل سفید فاموں کے ظلم و ستم برداشت کر رہے تھے' انہیں مارا کاٹا جاتا تھا' غلام بنایا جاتا تھا اور اپنوں سے جدا کر کے دنیا کے دور دراز ممالک میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ میں نے ٹرسٹ میں ایسی بے شمار کم سن لڑکیاں دیکھی تھیں جن کی عمریں نو سے بارہ تیرہ سال کے درمیان تھیں۔ یہ بچیاں اسی عمر میں عورتیں بنا دی گئی تھیں۔ انہیں ٹرسٹ میں غلامی کے آداب سکھائے جاتے تھے اور یورپ و امریکا کے ہوس پرست امرا کے معیار پر پورا اترنے کے قابل بنایا جاتا تھا۔ ان معصوم بچیوں اور بچوں میں سے نہ جانے کتنے بدنصیبوں کا تعلق انہی سادہ لوح قبائل سے تھا۔ اس سارے ظلم و ستم کا ردعمل کسی نہ کسی طور تو ظاہر ہونا تھا اور یہ خوب رو لڑکیوں کی قربانی کی صورت میں

ظاہر ہوا تھا۔ خطے میں کالوں پر گوروں کے دیرینہ ظلم و ستم کے جواب میں بوب لڑکیوں کی رسم نے فروغ پایا تھا۔ ان قبائل میں بوب دوشیزاؤں کو مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے پروان چڑھایا جاتا تھا پھر انہیں کسی نہ کسی طریقے سے قربان کردیا جاتا تھا یا ان سے مزید بوب لڑکیوں کی پیدائش کا کام لیا جاتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ افزائش نسل کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ بوب لڑکیوں کی قربانی بے شک سفاکانہ کارروائی تھی لیکن یہ ان سفاک ترین کارروائیوں کا رد عمل تھا جو سفید فام یہاں برسوں سے کررہے تھے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا جب صفدر اور ویرا واپس آگئے۔ ویرا اب نارمل نظر آتی تھی' اگر صفدر نے مجھے حقیقت حال نہ بتائی ہوتی تو میں انہیں ایک خوش و خرم اور مسرور جوڑا سمجھتا۔ وہ دونوں میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ صفدر مسلسل ہنسی مذاق کی باتیں کررہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ویرا کے ذہن سے کل اور پرسوں کے نہایت ناخوشگوار واقعات کا اثر کم کرنا چاہ رہا ہے۔ ویرا اس کی باتوں پر مثبت رد عمل ظاہر کررہی تھی تاہم اس کی نہایت حساس آنکھوں میں گہرائی کے اندر اب بھی درد و کرب کا سمندر کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جو بھی اندوہناک منظر یہ لڑکی ایک بار دیکھ لیتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں میں جم کر رہ جاتا ہے۔ اتنے حساس لوگوں کے لیے اس دنیا میں زندہ رہنا کار دشوار ہوجاتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے حال میں مگن ہو کر کہیں گوشہ نشین ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔ ویرا ابھی ٹرسٹ کے اندر اپنی لیبارٹری کی دنیا میں گم رہتی تو شاید اس کے لیے بہتر ہوتا۔ اب وہ روز بہ روز ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ صفدر سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود کسی وقت چند لمحوں کے لیے صفدر سے بھی دور چلی جاتی ہے۔ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی بے پناہ غربت' بیماری اور اذیت کو دیکھ کر اس کا موم سا جسم پگھلنے لگا تھا۔

میری آنکھوں میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور وہ بولی "آپ کیسے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

صفدر نے فوراً ٹانگ اڑائی "میں جانتا ہوں یہ بالکل ٹھیک نہیں ہیں' یہ بھی تمہاری طرح سردار یوتات کی آخری رسموں کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور غم زدہ ہو رہے ہیں۔"

"ہاں وہ سب کچھ دل دکھانے والا تھا۔ شکر ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا۔" ویرا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

صفدر بولا "اشوکا سے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ نے دیکھا ہوگا آج صبح جب سردار کی لاش الاؤ میں جلائی گئی تو بوب لڑکیوں کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ساتھ ہی جلا دی گئیں۔ ننھے منے کپڑے' جوتے اور کھلونے وغیرہ۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

صفدر بولا "ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بوب لڑکیاں سردار کی خدمت مدارات کے لیے سردار کے ساتھ اگلے جہان کا سفر اختیار کرتی ہیں۔ جب انہیں سردار کے ساتھ الاؤ میں پھینکا جاتا ہے تو بوبو دیوتا یعنی "آگ کا ہاتھی" بھی آگ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ بوب لڑکیوں کی آمد کے بعد آگ کا ہاتھی' انسانی شکل اختیار کرلیتا ہے اور بوب دوشیزاؤں کو اپنا قرب بخشتا ہے۔ اس "قرب" کا نتیجہ صحت مند و توانا بچوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ کھلونے اور لباس جو آگ میں پھینکے گئے تھے انہی بچوں کے لیے تھے۔ تاکیور کا عقیدہ ہے کہ یہ بچے بھی بڑے ہو کر سردار کے مستقل خدمت گاروں کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔"

ہم کچھ دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے صفدر بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا میں صاف محسوس کررہا تھا کہ وہ شراب کی طلب محسوس کررہا ہے۔ ایسے موقع پر ایک عجیب سی بے چینی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک اجنبی شخص محسوس ہونے لگتا تھا' وہی اجنبی جس نے ایک روز مجھ پر غرا کر حملہ کیا تھا اور وحشت کے عالم میں میرا گلا دبایا تھا۔ میں اس واقعے کی بے پناہ شدت کو بھول کر بھی بھول نہیں پایا تھا۔

بستی میں ٹرسٹ کے شدید حملے کا خطرہ محسوس کیا جارہا تھا۔ ہم نے رات ہونے تک بستی میں موجود تمام اسلحہ لوڈ کرلیا اور کم و بیش چالیس رائفلوں کو پوزیشن کردیا۔ ان میں پندرہ وہ رائفلیں بھی تھیں جو ہم نے گارڈز سے چھینی تھیں۔ ہم نے بستی میں سے پچاس کے قریب ایسے افراد ڈھونڈے جو رائفل کے سامنے بیٹھ کر کم از کم اس کی لبلبی تو دبا ہی سکتے تھے۔ ان کا کام بس موقع پڑنے پر لبلبی دبانا ہی تھا۔

وہ رات کافی بے آرام تھی۔ بستی میں بہت سے لوگ ساری رات جاگتے رہے اور جو سوئے تھے' یقیناً وہ بھی گہری نیند میں نہیں ہوں گے۔ میں بھی ساری رات سوئی جاگی کیفیت میں رہا' ماضی قریب کے واقعات ایک فلم کی طرح

آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے۔ لاہور سے ہمارا آدم خور مائیکل کے ہاتھوں اغوا ہونا' ہرکولیس میں پہنچنا' افریقہ کے مشرقی ساحل پر تنزانیہ پہنچنا اور مبارک امین کے حوالے سے خون ریز واقعات کا شکار ہونا۔ پھر افریقہ کے مغربی ساحل پر ٹرسٹ کی حیرت ناک دنیا اور وہاں کے ناقابل فراموش روز و شب' میرے ہاتھوں مبارک امین کا قتل اور بوکارلو کی آنکھوں کی جادوئی قوت کے جیتے جاگتے کرشمے۔ کمرن شیطان اسمتی کے لرزہ خیز کارنامے اور ٹرسٹ میں زندہ درگور ہونے والے غلاموں کی بغاوت' پھر آدم خور مائیکل کا میرے ہاتھوں بالکل غیر متوقع طور پر اچانک قتل ہوجانا اور اس کے قتل کے نتیجے میں ٹرسٹیوں کا غضب سے پاگل ہوجانا۔ یہ عمل اور رد عمل کا ایک ایسا سلسلہ تھا جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑتا چلا جارہا تھا۔

رات کسی پہر نیند کے مختصر وقفے کے بعد میری آنکھ کھلی تو دھیان خود بخود جھونپڑے کے ساتھ والے پورشن کی طرف چلا گیا۔ اس پورشن میں صفدر اور ویرا سو رہے تھے۔ وہاں مکمل خاموشی تھی' کوئی آواز کوئی سرگوشی نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ میاں بیوی تھے' جوان اور خوب صورت تھے' ایک دوسرے کی محبت میں غرق تھے' پھر بھی ایک دوسرے سے دور تھے' انوکھے کردار کی ویرا نے ایک اور انوکھا کام کیا تھا۔ سب کچھ میسر ہونے ہوئے بھی جدائی کی سولی پر لٹک گئی تھی اور اپنے محبوب کو بھی لٹکا دیا تھا۔ محبت ایک پہیلی ہے اور اس کے ہزار رنگ ہیں' یہ بھی ایک نیارا رنگ تھا۔ نہ یہ وصال تھا نہ فراق تھا' نہ ملن تھا' نہ جدائی تھی' نہ گریز تھا نہ خود سپردگی تھی۔ ایک طرف تو ویرا' صفدر کو حاصل کرنے کے لیے اتنی بے تاب تھی کہ اس نے دو مرتبہ خود کو قریباً ختم کرلیا تھا' اب جبکہ ان کے رستے کی ہر رکاوٹ دور ہوگئی تھی' وہ خود بھی ایک خود ساختہ سولی پر لٹک گئی تھی اور صفدر کو بھی لٹکا دیا تھا۔

اچانک مجھے شک گزرا کہ صفدر جھونپڑے میں نہیں ہے۔ جھونپڑے کے دروازے پر ہمارے جوتے پڑے تھے' ان میں صفدر کا جوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں بہ آہستگی اٹھا اور جوتا پہن کر جھونپڑے سے نکل آیا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ گرمی حد سے زیادہ تھی اور حبس بھی بہت تھا۔ کہیں کسی درخت کا پتا تک نہیں ہل رہا تھا' شاید یہ کسی طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ جن لارسیوں کی ڈیوٹی رات کے دوسرے پہر کے بعد شروع ہوتی تھی وہ چوکسی سے پہرا دے رہے تھے۔ کمین گاہوں میں تیر انداز اور جھونپڑوں کے اندر رائفل بردار بھی ہوشیار تھے۔ صفدر کو ڈھونڈتا ہوا میں چشمے کی طرف چلا گیا۔ مجھے وہ جگہ معلوم تھی جہاں وہ اکثر بیٹھتا تھا' میں بڑی احتیاط سے درختوں میں داخل ہوا تو مجھے رات کے سناٹے میں کسی کے رونے کی واضح آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یہ صفدر کی آواز تھی۔ وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ یہ میرے جان سے پیارے دوست کی آواز تھی۔ وہ جو فولاد کی طرح مضبوط اور ہمالیہ کی طرح بلند حوصلہ تھا' پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں بے اختیار اس کے پاس پہنچ گیا "صفدر۔ کیا ہوا ہے صفدر؟" میں نے اسے شانوں سے تھام لیا۔

اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ چند لمحے ساکت بیٹھا رہا پھر اس نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ شاید سمجھ رہا تھا کہ اس کے منہ پھیرنے سے اس کی حالت میری نگاہ سے چھپ جائے گی۔ میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف گھمایا "صفدر! میرے یار! میرے بھائی! تجھے کیا ہوگیا ہے۔ تو ایسا تو نہیں تھا۔ یار! کیوں چھپا رہا ہے تو مجھ سے اپنے دل کی باتیں؟ بتاتا کیوں نہیں مجھے؟"

"کچھ نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" وہ بولا۔

اس کے منہ سے الکحل کی بو آرہی تھی۔ لہجے سے بھی پتا چلتا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

میں اس کے پاس ہی درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا "صفدر! مجھے کچھ بتاؤ۔ میں تمہارے لیے سب کچھ کرسکتا ہوں۔ ہر انتہا تک جاسکتا ہوں۔"

"آپ کچھ نہیں کرسکتے۔ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

"تم نہ بتاؤ لیکن میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کررہی ہے۔"

"وہ کچھ نہیں کررہی۔ نہ ہی اس کا کوئی قصور ہے۔ اور... نہ ہی میری پریشانی کی وجہ وہ ہے۔"

وہ چھپانے کی کوشش کررہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ جھنجلایا ہوا بھی تھا۔ شاید اسے خود پر ہی غصہ آرہا تھا کہ میرا اور اس کا سامنا ایسی حالت میں کیوں ہوا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اس سے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے ساتھ لے کر واپس جھونپڑے میں آگیا۔ راستے میں چند مسلح لارسیوں نے ہمیں دیکھا اور تعظیم پیش کی' بہرحال کسی نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔

جھونپڑے میں داخل ہونے سے پہلے صفدر نے کہا "میری آپ سے درخواست ہے شاہ جہاں صاحب' آپ اس بارے میں ویرا سے کوئی بات نہیں کریں گے۔"

میں نے اس کا شانہ تھپک کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

صفدر جھونپڑے کے دوسرے حصے میں ویرا کے پاس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے گلاس اور بوتل کے ٹکرانے کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ پھر پی رہا تھا۔

علی الصباح مجھے ویرا سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ صفدر شاید رات کے آخری حصے میں سویا تھا۔ وہ نشے میں بھی تھا لہٰذا اتنی جلدی جاگنے والا نہیں تھا۔ ویرا ابھی منہ ہاتھ دھو کر آئی تھی اور بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے بال حسب عادت شانوں پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ تاہم اس کی آنکھوں میں ابھی سرخی موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ روتی رہی ہے اور شاید سکون سے سو بھی نہیں سکی۔ یعنی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی تو میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ویرا! میں تم سے آج ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"جی کہیے۔" وہ نگاہیں جھکائے جھکائے بولی۔

"تم جانتی ہی ہو کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو پانے کے لیے کتنی مشکل جھیلی ہے۔ تم نے قربانیاں دی ہیں اور صفدر بھی تم سے پیچھے نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اس نے تمہارے حصول کے لیے مجھ سے بھی ٹکر لینا گوارا کر لیا۔ یہ بات میں کسی شکوے شکایت کے طور پر نہیں کہہ رہا بلکہ اس جذبے کی طاقت بتانا چاہ رہا ہوں جس نے بالآخر تم دونوں کو ایک کیا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتی رہی۔

میں نے کہا "اتنا کچھ جھیلنے کے بعد اور منزل پانے کے بعد انسان خوشی اور سکون کا طالب ہوتا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ سب کچھ حاصل کرنے کے باوجود تم دونوں محروم ہی نظر آتے ہو۔ تمہارے چہروں کی مصنوعی مسکراہٹ کے پیچھے میں تمہاری بے چینی اور اذیت صاف محسوس کر سکتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے ویرا؟"

وہ سر جھکائے جھکائے بولی "پتا نہیں کہ آپ یہ سب کچھ کیوں محسوس کر رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے..."

"دیکھو ویرا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "صفدر کہنے کو تو میرا دوست ہے لیکن وہ میرے لیے قریب ترین رشتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن بتانا پڑ رہا ہے۔ میں نے کل رات اسے روتے ہوئے دیکھا ہے اور تب سے میرا اپنا دل بھی رو رہا ہے۔ اتنے مضبوط اعصاب کا بلند حوصلہ شخص جو کبھی آہ بھی نہیں کرتا' اگر زار و قطار رویا ہے تو اس پر کوئی قیامت تو بیتی ہوگی۔ آخر کیا ہوا ہے اس کے ساتھ... بلکہ تم دونوں کے ساتھ؟ تم دونوں لاکھ چھپاؤ مگر اندر کی بات آسانی سے چھپتی نہیں ہے۔"

ایک دم ویرا کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے۔ اس نے چہرہ ایک طرف پھیر لیا اور اپنے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ویرا! تمہاری جو بھی پریشانی ہے' مجھے بتاؤ۔ میں تم دونوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ پلیز ویرا۔ مجھے اپنے مسائل سے دور مت رکھو۔"

وہ باقاعدہ رونے لگی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی "آپ سے بڑا حوصلہ کس کا ہوگا۔ میں نے جہاں اور بہت سے لوگوں کو دکھی کیا ہے وہاں آپ کو بھی کیا ہے۔ آپ سے آپ کا بہت پیارا دوست چھیننے کی کوشش کی۔ آپ کو اور آپ کے جاں نثار دوست کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میں جانتی ہوں میری وجہ سے آپ پر کیا گزری ہے' پھر بھی آپ سب کچھ بھلا کر ہم دونوں کی خوشی کا سوچ رہے ہیں' ہمارے غم میں خود کو ہلکان کر رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو میں آپ سے آنکھیں ملانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"ویرا! جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے اس کے بارے میں سوچو۔ تم جانتی ہی ہو صفدر ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے۔ وہ بہت زیادہ الکحل بھی لے رہا ہے۔ اگر وہ مزید پریشان ہوا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم اس کی بیوی ہو۔ تم بہتر سمجھ سکتی ہو کہ اس کا دکھ کیا ہے۔ اپنی شادی کے اولین دنوں میں ہی وہ اس قدر دکھی ہو گیا ہے اور تم بھی گم صم نظر آتی ہو۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "کیا کروں شاہ جہاں صاحب! اپنی خوشی پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں... میں آپ سے اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ میں خوش رہنا چاہتی ہوں' میں صفدر کو بھی بہت خوش دیکھنا چاہتی ہوں لیکن وہ ساری تباہی اور بربادی میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے جو صرف اور صرف میری وجہ سے جھیلی ہے۔ وہ سارے معصوم بچے' عورتیں اور مرد جو صرف میری وجہ سے قتل ہوئے اور پکڑے گئے۔ وہ جھونپڑے اور مویشی جو میری وجہ سے جل کر راکھ ہو گئے۔ شاہ جہاں صاحب! میں... اپنے لیے خوشی کا سوچتی ہوں... تو میرے کانوں میں بے شمار لوگوں کے بین اور ان کی

چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو... میرے دل میں آتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جاؤں۔ کسی گرجے کی راہبہ یا کسی اسپتال کی نرس بن کر زندگی گزار دوں۔" اس کی حسین آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

میں نے کہا "ویرا! تم اپنے جذباتی پن کے لیے خواہ مخواہ جواز ڈھونڈ رہی ہو۔ کوئی بے عقل ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ لارسیوں اور ٹرسٹ والوں کے درمیان جو کچھ ہوا ہے اس کی وجہ تم ہو یا تمہارا کوئی فعل ہے۔ یہ تو بیس تیس برس پرانی چپقلش ہے۔ کم از کم تین سال سے ٹرسٹ کے خلاف قبائلیوں کے دلوں میں لاوا ایک رہا تھا۔ یہ طوفان کسی بہانے کا منتظر تھا اور یہ بہانہ تم نے فراہم نہیں کیا ہے۔ تمہیں تو خود اغوا کر کے لارسیوں کے درمیان لایا گیا تھا۔ اگر سچ پوچھتی ہو تو اس ساری کشیدگی اور خون ریزی کا فوری سبب کنگ برادن کا جارحانہ فعل بنا ہے۔ اس نے اپنے زہریلے LIZARD کے ذریعے محترم ہو کارلو کو زخم لگایا ہے جس کی وجہ سے ان کو اپنے ہاتھ سے ہی محروم ہونا پڑ گیا۔ اس واقعے نے ایک زنجیر کھینچی کہ واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

"لیکن میں نے بھی تو..."

"لیکن کچھ نہیں!" میں نے ذرا تحکم سے اس کی بات کاٹی "تم نے کچھ نہیں کیا سوائے اس کے کہ اپنے دل کی سچائی پر کان دھرے اور اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ تم نے کسی کو دل کی گہرائی سے اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن اب جو کچھ تم کر رہی ہو یہ کسی طور بھی دانش مندانہ نہیں ہے۔ تم کہتی ہو کہ تم نے بہت سے لوگوں میں دکھ تقسیم کیے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو دکھ دے کر بھی اگر تم ایک شخص کو خوش نہ کر سکو تو پھر یہ سلسلہ واقعی دردناک ہو جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو تمہاری وجہ سے دکھ ملا بھی تھا تو وہ جھیل چکے ہیں۔ اب تم دکھوں کا ایک نیا سلسلہ کیوں شروع کر رہی ہو؟"

وہ روہانسی ہو کر بولی "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے ہاتھوں پر خون لگا ہے۔"

"تمہارے ہاتھ بالکل صاف شفاف ہیں لیکن اگر تم نے اپنا رویہ برقرار رکھا تو پھر ان ہاتھوں پر واقعی خون لگ سکتا ہے اور ویرا! تمہیں پتا ہے یہ خون کس کا ہوگا؟"

ویرا نے تڑپ کر میرے ہونٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے وہ مجھے بولنے سے روک دینا چاہتی ہو۔ سسک کر بولی "میں صفدر کی ایک زندگی پر اپنی دس زندگیاں قربان کر سکتی ہوں... مم... میرا بس چلے تو اپنے جسم کی کھال اس کے قدموں میں بچھا دوں لیکن میں اپنے اس پاگل دل کا کیا کروں... مجھے کچھ مہلت چاہیے۔ اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے' اپنی سوچوں کو سنبھالنے کے لیے۔"

شاید وہ اور بھی کچھ کہتی مگر جھونپڑے کے ساتھ والے حصے میں صفدر نے گہری نیند میں کروٹ لی اور کچھ بڑبڑا کر پھر سو گیا۔ باہر بوما کے سامنے پرجوش لارسی فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ ٹرسٹ کے گارڈز کو ایک بار پسپا کرنے کے بعد ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ یہ لوگ ناقابل شکست نہیں ہیں۔ ویسے بھی پچھلے دو دن میں لارسیوں کی قوت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا' جھیل زار کی لڑائی میں بچ جانے والے اور جنگل میں بھٹکنے والے چھپ چھپا کر موگاسا میں پہنچ گئے تھے اور اب وہ مار دو یا مر جاؤ کے نظریے پر عمل پیرا نظر آتے تھے۔

میں نے کہا "ویرا! تم مہلت کی بات کر رہی ہو۔ ہم سب کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جگہ ہے اور ہم ایک دوسرے کو جتنی چاہے مہلت دے سکتے ہیں مگر جو وقت ہم پر گزر رہا ہے وہ کسی کو مہلت دینے کے لیے تیار نہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھی نہیں!"

میں نے کہا "میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اس وقت ایک خوفناک لڑائی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ٹرسٹ والوں نے مقامی پولیس کے ساتھ مل کر ہمارا گھیراؤ کر رکھا ہے' مجھے یقین ہے کہ اگر جین کی موت کی خبر افشا ہو چکی ہے تو پھر یہ گھیراؤ اور بھی سخت ہو چکا ہوگا۔ اب ایک ہی راستہ ہے کہ لڑائی ہوگی' ہم اس بستی کا دفاع نہ کر سکے تو کیا کچھ نہیں ہو جائے گا۔ کل کی کسی کو خبر نہیں مگر آج پر تو تمہارا اختیار ہے۔ آج تم دونوں اکٹھے ہو۔ اس آج کو "آنسو" نہ بننے دو۔ اس کو مسکراہٹ بناؤ۔"

وہ سنتی رہی اور اس کے چہرے پر رنگ آ کر گزرتے رہے۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "ویرا! جانتی ہو جھونپڑے کے جس دوسرے حصے میں تم اور صفدر مقیم ہو' پانچ چھ دن پہلے وہاں کون تھا؟ یہاں قبیلے کی سب سے خوب صورت لڑکی جوزبی اور حبشی نوجوان شازل مقیم تھے۔ انہوں نے اپنی سہاگ رات وہاں گزاری تھی۔ اب شازل یہاں نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ وقت جو ہاتھ سے پھسل جاتا ہے وہ دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔ اللہ نہ کرے کہ وقت تمہارے ہاتھ سے بھی پھسلے لیکن وقت کی قدر تو ہمیں کرنی چاہیے۔"

شاید میں کچھ اور بھی کہتا' شاید وہ کچھ اور بھی سنتی مگر اس دوران میں خار دار باڑ کی طرف سے ہلچل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کسی گاڑی کے انجن کی آواز بھی آ رہی تھی پھر کوئی میگا فون کے ذریعے بلند آواز میں بولنے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" زریا ہراساں لہجے میں بولی۔

"تم یہیں رہو' میں دیکھ کر آتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں باہر آیا تو اشوکا سامنے سے آتا دکھائی دے گیا۔ وہ میری آنکھوں میں سوالیہ نشان دیکھ کر بولا "پولیس کی دو گاڑیاں آئی ہیں۔ ایک جیپ بھی ہے۔ یہ لوگ میگا فون کے ذریعے بستی والوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ملکی قانون کو اپنے ہاتھ میں مت لیں اور پولیس افسروں کو اندر آنے دیں۔ پولیس افسر بستی کے معززین سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"یہ بات تو طے ہے کہ پولیس ہنگ براؤن کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔" میں نے کہا "یقیناً وہ کسی چال کے تحت ہی یہاں آئی ہوگی۔"

ہم سردار رانفے کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت تک تین پولیس افسروں کو بستی میں داخل ہونے کی اجازت دے چکا تھا۔ شرط صرف یہ تھی کہ یہ لوگ مسلح نہیں ہوں گے۔

تین سیاہ فام پولیس افسروں میں سے دو خاصے بنے ٹھنے تھے۔ ان کے بشرے سے عیاری اور جارحیت کے علاوہ اختیار کا نشہ بھی ٹپکا پڑتا تھا۔ وہ اردگرد کی ہر شے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے اور ذرا بھی پریشان نہیں تھے۔

سردار رانفے ان لوگوں کو اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ وہاں چند معززین موجود تھے۔ سردار رانفے نے مجھے اور صفدر کو بھی بڑے اہتمام سے اپنے درمیان بٹھایا اور میرا اور صفدر کا تعارف صحرائی درویش کے معتقدین کے طور پر کرایا۔ پولیس افسروں میں سے بڑے رینک کے آفیسر کا کمال یہ تھا کہ اسے لارسیوں کی زبان بھی آتی تھی۔ اس نے تیکھا لب ولہجہ اختیار کیا اور سردار رانفے کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ قانون سے ٹکرانے کی کوشش نہ کریں ورنہ پشیمانی اور ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس نے سردار کو یہ بھی بتایا کہ اگر فوری طور پر چین اور کل پکڑے جانے والے انجائیس گارڈز کو رہا نہ کیا گیا تو لارسیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائی ہو سکتی ہے۔

پولیس آفیسر کی بات سے یہ واضح ہوا کہ یہ لوگ ابھی چین کی ہلاکت سے باخبر نہیں ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اصل طوفان کی شروعات ابھی نہیں ہوئی ہے۔ دھیرے دھیرے پولیس آفیسر کا لہجہ تند ہوتا گیا۔ اس نے سردار رانفے کو باقاعدہ وارننگ دی کہ قبیلے والے مغویوں کو چھوڑ کر اپنے ہتھیار اور مقامی طور پر تیار کیا گیا گولا بارود فوراً پولیس کے حوالے کر دیں ورنہ سخت کارروائی کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس موقع پر مجھے بولنا پڑا۔ میں نے کہا "آفیسر! گستاخی معاف' چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر جانب دار شخص ہوں' مجھے اس معاملے میں بولنا تو نہیں چاہیے لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ لوگوں نے ہمیشہ کی طرح غلط وقت پر قانون اور انصاف کا جھنڈا بلند کیا ہے۔ اس وقت آپ لوگ کہاں رہے ہیں جب ٹرسٹ والوں کی طرف سے ان قبائلیوں پر بے تحاشا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ اب تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق یہ لوگ ٹھونک کر میدان میں آئے ہیں تو آپ ٹرسٹ والوں کے خیر خواہ بن کر گفت وشنید کے لیے یہاں پہنچ گئے ہیں ... اور ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ہمارا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" مار بطانیہ پولیس افسر غرایا "ہم صرف قانون کا نفاذ کرتے ہیں۔"

"کاش ایسا ہوا ہوتا۔" میں نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو ٹرسٹ کی آڑ میں انسانوں کی تجارت کا وسیع وعریض دھندا ہو رہا ہوتا۔ اردگرد کے علاقے کے لوگوں کی زندگیاں اجیرن نہ ہوئی ہوتیں اور نہ ہی یہ خون ریزی شروع ہوتی جس کے ڈر سے آپ بھاگے بھاگے یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"تم شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بننے کی کوشش نہ کرو۔" ایک پولیس آفیسر انگریزی میں گرجا۔

رانفے نے مداخلت کی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے پولیس افسر کو سمجھایا کہ ہم دونوں صحرائی درویش (سائیں عالی) کے بھیجے ہوئے ہیں اور قبیلے کے معزز مہمانوں کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ہمارے بارے میں کوئی نامناسب بات نہ کہی جائے۔

یہ بات چیت صرف پندرہ بیس منٹ ہی جاری رہ سکی۔ پولیس والوں کا رویہ تند سے تند تر ہوتا جا رہا تھا۔ سردار رانفے نے علیحدگی میں مجھ سے اور صفدر سے مشورہ کیا۔ اشوکا نے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ میں نے رانفے کو مشورہ دیا کہ فی الحال پولیس والوں کو کوئی حتمی جواب نہ دیا جائے۔ ان سے کہا جائے کہ ہم اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد کچھ بتا سکیں گے۔

سردار نے ایسا ہی کیا اور پولیس والے بھناتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مجھے سائیں عالی کی کال کا شدت سے انتظار تھا۔ سائیں عالی نے ہی ہمیں یہاں بھیجا تھا۔ اب یہاں کی صورت حال سنگین ہو گئی تھی اور سائیں گدھے کے سر سے

سینگوں کی طرح غائب تھا۔ کوشش کے باوجود اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پولیس والوں کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک بار پھر وائی تائی پر کوشش کرنی چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ پہلی بار ہی سائیں عالی کی "فتنہ پرور" آواز سنائی دے گئی۔

"ہمیں پھنسا کر کہاں غائب ہو گئے ہو تم؟" میں نے دانت پیس کر کہا۔

وہ بولا "دراصل میں تھوڑا سا مصروف ہو گیا تھا شفیع بھائی۔ نئی فرانسیسی لڑکیاں آئی تھیں۔ ان کی شادی کرانی تھی۔ بے چاریوں کے لیے مناسب رشتے ڈھونڈنے تھے۔ مناسب رشتے آج کل ملتے کہاں ہیں۔ اب ذرا دیکھو' ان میں سے ایک لڑکی مشہور فرانسیسی ماڈل گرل کرسٹینا کی چھوٹی بہن ہے۔ لڑکا یوسف ثانی نہ ہو مگر اس کا ناک نقشہ تو اچھا ہونا چاہیے۔ مقامی لوگوں میں اچھا ناک نقشہ ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے۔ کوشش کر کے قریبی بستی سے ایک بندہ تو میں نے ڈھونڈ لیا لیکن اس کی عمر تھوڑی سی زیادہ تھی۔ ویسے بھی رنڈوا تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچوں کو خبیث جن (ٹرسٹ والے) اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب وہ رنڈوا ہی ہوا نا۔ خبیث جنات عورتوں کو چھوڑتے تھوڑا ہی ہیں۔ میں نے اس کی شادی ماڈل گرل کی بہن سے کرا دی۔ باقی دو لڑکیاں بھی جیسے تیسے ٹھکانے لگا دیں۔"

بظاہر تو سائیں کی باتیں اوٹ پٹانگ لگ رہی تھیں لیکن مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ اس نے یقیناً کچھ اور سفید فام لڑکیوں کو اپنی "روحانیت" کی ڈور سے کھینچ کر کھنڈرات میں پہنچایا ہوگا اور مقامی مردوں سے ان کی شادیاں کرائی ہوں گی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے شغل کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

میں نے بھنا کر کہا "یہاں ہم سب توپ کے منہ سے بندھے ہوئے ہیں اور وہاں تم شادیاں رچانے کے چکر میں پڑے ہو۔ کچھ خبر ہے تمہیں' یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے سب خبر ہے پیارے! اور جہاں تک شادیوں کی بات ہے' یہ کوئی لمبا چوڑا پروگرام نہیں تھا۔ رات کو ڈیڑھ دو گھنٹوں میں سارا کام ختم کیا تھا' دراصل دیر اس وجہ سے ہوئی کہ مجھے پاس کھڑے ہو کر سارا کام کرانا پڑا۔ اپنے سامنے ٹائلیں اور ٹونٹیاں وغیرہ لگوانی پڑیں۔"

"ٹائلیں اور ٹونٹیاں؟ میں سمجھا نہیں؟"

"اوہو۔ میں شاید بتانا بھول گیا۔ یہاں لڑکیوں کے لیے دو سو لگژری باتھ روم ٹوائلٹ بنوانے پڑے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے' یہ گوری چمڑی والے تمہاری کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہاں ریگستان میں تالاب کہاں سے آئے گا۔ میں نے یہاں گہرائی میں بور کروا کے پانچ بڑے ٹیوب ویل لگوائے ہیں۔ ایک ٹیوب ویل صرف تالابوں کے لیے ہے۔ بڑے شاندار تالاب بنیں گے' تم آکر دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ یوں لگے گا کہ بالی ووڈ میں گھوم پھر رہے ہو۔"

تمہارا ستیاناس ہو سائیں عالی۔ میں نے دل ہی دل میں سائیں کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ خدا جانے وہ کیا کرتا پھر رہا تھا۔ ابھی اس نے فرانسیسی ماڈل گرل کی چھوٹی بہن کا ذکر کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی کسی جانی پہچانی ماڈل گرل کا ذکر ہوا تھا۔ وہ غالباً امریکی ماڈل گرل تھی۔ ٹرسٹ سے جو گارڈز تفتیش کے لیے کھنڈرات میں آئے تھے انہوں نے ایک میلے کچیلے اتر پردیشی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہوئی خوب رو سفید فام لڑکی کو بڑے دھیان سے دیکھا تھا۔ "انچارج گارڈ" نے لڑکی سے کہا تھا کہ تمہاری صورت ایک مشہور امریکی ماڈل گرل سے بہت ملتی ہے۔ لڑکی نے فوراً تردید کی تھی اور بتایا تھا کہ وہ نوروم کے ایک شاپنگ سینٹر میں معمولی سیل گرل ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس نے بھی جھوٹ بولا ہو۔ شوبز کی اکثر لڑکیاں پیسے کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہیں اور سائیں عالی کے پاس پیسہ یوں آیا تھا جیسے چھپر پھٹنے کے بجائے آسمان ہی پھٹ گیا ہو اور سائیں پر ڈالروں اور پاؤنڈز کی موسلا دھار بارش ہو گئی ہو۔

سوچ کی اس لہر کے ساتھ ہی اچانک ایک اور لہر میرے ذہن سے ٹکرائی اور رگ وپے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ نجانے کیوں میرا دھیان مسٹر جی کلارک صاحب کی طرف چلا گیا تھا۔ جس وقت ہمیں تنزانیہ کے شہر ارنگا (IRINGA) میں پرل کافی فارم کے "کمینہ پرور" مالک مبارک امین کے ستم کا نشانہ بننا پڑا اس وقت ایک طویل جدائی کے بعد مسٹر کلارک سے ہماری ملاقات ہونے والی تھی۔ وہ بالکل "نونی کہاں کمند" والا معاملہ ہوا تھا۔ ہم مسٹر کلارک سے نہیں مل سکے تھے اور بالآخر ٹرسٹ میں پہنچا دیے گئے تھے پھر ایک روز ٹرسٹ میں ہمیں مسٹر کلارک کا خصوصی نمائندہ نظر آیا تھا۔ اس شخص کی موجودگی سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ مسٹر کلارک نے ہمیں فراموش نہیں کیا اور ہمیں کھوجنے اور اس جال سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں ہم پھنس گئے ہیں۔ آج سائیں سے بات کرتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں پھر مسٹر جی کلارک آ گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ سائیں کے گلے میں جھولتے ہوئے لاکھوں ڈالروں اور پاؤنڈز کا تعلق مسٹر جی کلارک سے ہی ہو۔ اور یہ جی مسٹر جی کلارک ہی پس پردہ رہ کر

سائیں کی اہانت کررہے ہوں۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح مسٹر جی کلارک بھی سائیں عالی کا بہت احترام کرتے تھے اور اسے غیر معمولی شخص قرار دیا کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں دو تین لمحوں کے اندر میرے ذہن سے گزر گئیں۔

"کہاں کھو گئے شفیع محمد۔" دوسری طرف سے سائیں عالی کی کراری آواز نے مجھے چونکا دیا "اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم واپس لوٹو گے تو تمہیں بھی تالاب میں گوریوں کے ساتھ نہانے کا پورا موقع ملے گا۔"

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "سائیں! ایک بات بتاؤ۔"

"ہاں پوچھو۔"

"یہ اتنے سارے ڈالر اور پاؤنڈ وغیرہ تمہارے پاس کہاں سے آتے ہیں؟"

"شفیع محمد! پتا نہیں کہ اس بارے میں اتنی پریشانی کیوں ہے تمہیں؟ بھئی دراصل بات یہ ہے کہ پرستان میں بھی لاٹری وغیرہ کا رواج ہوتا ہے' ایک دن ایسا ہوا...."

"سائیں عالی!" میں نے اسے ٹوکا "نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ لیکن فضول وقت ضائع نہ کرو' ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اس وقت۔ تمہیں کچھ پتا نہیں کہ بستی میں کیا کچھ ہوگیا ہے۔ ایک بڑا اہم بندہ ضائع ہوگیا ہے یہاں۔"

"مجھے سب پتا ہے' تم زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو اور پریشان ہونے کی بھی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ خبیث جنات تمہارا اور بستی والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ کچھ بھی نہیں۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ وہ سب کچھ کرسکتے ہیں۔ انہیں کسی کا ڈر نہیں۔ تمہارے بھیجے ہوئے موبائل کلینک پر پہلے جنگلی کتوں نے حملہ کیا' پھر ٹرسٹ والوں نے ہلا بول دیا۔"

"وہ سب جنات اور بھوتوں کا کرشمہ تھا۔ جنگلی کتوں کے بھیس میں بھی وہ دراصل خبیث جنات ہی تھے۔ ان کا سدباب میں نے ہی کیا تھا ورنہ تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔"

"بس تم بیٹھ کر باتیں بناتے رہنا اور شادیاں کراتے رہنا' یہاں ٹرسٹ والے مقامی پولیس سے مل کر ان سیدھے سادے قبائلیوں کو تہس نہس کردیں گے۔ اگر کچھ کرسکتے ہو تو کرو ورنہ بڑی تباہی ہوگی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ایک بہت اہم بندہ بھی یہاں قتل ہوگیا ہے۔"

"مجھے الف ب مت پڑھاؤ' میں سب جانتا ہوں۔ میرے نزدیک سوئمنگ پول میں لاشیں وغیرہ گلوانا اس وقت زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ تم بے شک گھوڑے بیچ کر سوجاؤ' یہاں کچھ نہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر بوس اور نرس کہاں ہیں؟"

"وہ خبیث جنات سے بچ کر ڈرائیور سمیت یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ان کی طرح تم بھی صحیح سلامت یہ پہنچو گے۔"

پھر واکی ٹاکی سے "سڑپ سڑپ" کی آوازیں آنے لگیں۔ سائیں عالی کچھ پی رہا تھا۔ میرے پوچھنے سے پہلے کہنے لگا "یہ میں کافی پی رہا ہوں۔ ایک گوری میم نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ کافی میں تھوڑا سا وسکی اور چھوٹی مکھی کا شہد ملا لیا جائے تو اس کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ تم بھی یہ تجربہ کرکے دیکھنا۔" اس کے ساتھ ہی واکی ٹاکی بند ہوگیا۔

میں جھونپڑے میں واپس آگیا۔ صفدر نے آج پھر شام ہی پینا شروع کردی۔ بظاہر وہ ہنس بول رہا تھا مگر اندر سے خاموش تھا' کچھ یہی کیفیت ویرا کی بھی تھی۔ صفدر جلد سوگیا۔ ویرا میرے پاس آبیٹھی۔ رات گرم اور تاریک تھی۔ قریبی جنگل کی گہرائی سے جنگلی جانوروں کی آوازیں ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔ رات کے پہلے حصے میں پہرا دینے والے لوگ ابھی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ چکے تھے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں اور ان کی وجہ سے گرمی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ویرا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "صفدر نے آپ پر حملہ کیا تھا نا۔ آپ کا گلا دبانے کی کوشش کی تھی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی "اور پھر صفدر نے مجھ سے شادی کی شرط پوری کرنے کے لیے بوپ لڑکیوں کو بھی پکڑا تھا؟" میں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کہنے لگی "کبھی آپ نے سوچا کہ صفدر اس قدر کیوں بدل گئے؟"

"ہاں ذہن میں اکثر یہ سوال آتا تو ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی "آپ کی طرح میں بھی روشن خیال اور حقیقت پسند ہوں۔ لارسیوں کے بارے میں جو باتیں کہی اور سنی جاتی ہیں ان پر مجھے بہت کم یقین رہا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں جھٹلانا ممکن نہیں۔ کم از کم میں تو ان پر یقین کرنے پر مجبور ہوں۔" اس نے ذرا توقف کیا اور بولی "آپ نے دیکھا ہوگا کہ لارسیوں میں سے زیادہ تر کی آنکھیں ہلکی سرخ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر لارسی اپنی آنکھوں میں ایک پراسرار قوت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ سردار بوغات بھی اس قوت کا مالک تھا۔ اس کی یہ قوت اعلیٰ ترین درجے کی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی آنکھوں کی طاقت سے گیلی لکڑی میں آگ جگا سکتا ہے اور پتھر کو پگھلا

میں بدل سکتا ہے۔ میرے چچا بوکارلو نے بھی طویل عرصے تک سردار بوغات سے کسب فیض کیا تھا۔ قبیلے کے لوگ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ سردار بوغات نے اپنی بہت سی صلاحیتیں چچا بوکارلو میں منتقل کردی تھیں۔ اب سردار بوغات کی طرح وہ بھی بابا روکی (آنکھوں کا جادو) کے ماہر ترین فرد سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ میں آپ کو چچا بوکارلو اور صفدر کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے کہا۔

ویرا نے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری بات پر یقین کریں گے یا نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ صفدر کے بدلے ہوئے طور اطوار کی اصل وجہ چچا بوکارلو ہیں.... صفدر دراصل.... چچا بوکارلو کی بے پناہ ذہنی قوت کے اثر میں ہیں یا آپ یوں کہہ لیں کہ چچا بوکارلو کی وجہ سے وہ ہپناٹائزڈ ہیں۔ جھیل زار کی بستی میں آخری دنوں کے اندر صفدر جو کچھ بھی کرتے رہے ہیں وہ اسی ذہنی قوت کے اثر میں کرتے رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال آپ پر صفدر کا حملہ بھی ہے۔ شاید نارمل حالت میں صفدر اس بارے میں سوچ بھی نہ سکتے لیکن انہوں نے یہ کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا شاہ جہاں صاحب! کہ میری طرف صفدر کے راغب ہونے کی ایک وجہ یہ ذہنی اثر بھی تھا۔" وہ ایک گہری طویل سانس لے کر رہ گئی۔

میں نے کہا "تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے لیے صفدر کی چاہت اور دیوانگی ایک مصنوعی بات ہے؟"

"یہ میں نے آپ سے کب کہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ صفدر کے دل میں میرے لیے پسندیدگی اور ہمدردی کے جذبات ہیں۔ خاص طور سے جب میں نے شدید مایوسی کے عالم میں اپنی کلائی کی نسیں کاٹ لیں تو صفدر نے اس کا بے حد اثر لیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ میری محبت کا جواب محبت سے دیں گے۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ صفدر کی محبت کو شدید تر کرنے میں کچھ حصہ اس ترغیب "سجیشن" کا بھی ہے جو چچا بوکارلو کی طرف سے صفدر کو ملی ہے اور یہ ذہنی اثر صفدر کے ہر قول و فعل میں موجود ہے۔"

"میں کچھ دیر کے لیے تمہاری بات درست مان لیتا ہوں۔ کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ صفدر پر یہ ذہنی دباؤ کب تک موجود رہے گا اور اس کے ختم ہونے کا امکان بھی ہے یا نہیں؟"

"یہ دباؤ وقت کے ساتھ بتدریج ختم ہورہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا۔ اس کی شدت کم ہورہی ہے۔ آہستہ آہستہ صفدر اس ٹرانس سے نکل رہے ہیں۔ وہ اپنے رویے پر ایک دفعہ آپ سے معذرت بھی کرچکے ہیں۔ میرے خیال میں چند دن کے اندر ہی وہ وقت آجائے گا جب انہیں اپنی غلطیوں کی شدت کا ٹھیک ٹھیک احساس ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس وقت وہ باقاعدہ آنسو بہا کر آپ سے معافی مانگیں۔"

"اوہ!" میں نے بے اختیار اپنے ہونٹ سکوڑے "اس کا مطلب ہے کہ تم بھی صفدر کی چاہت کا درست اندازہ لگانے کے لیے اس وقت کا انتظار کررہی ہو۔"

"ہاں شاید' یہ بات بھی میرے ذہن میں ہے۔"

میں نے کہا "میں نے کبھی کوئی پیش گوئی نہیں کی لیکن تمہارے لیے میں ابھی سے ایک پیش گوئی کردیتا ہوں۔ صفدر واقعی تم سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔ اس محبت کو بڑھاوا دینے میں اور شعلہ بنانے میں شاید کسی سجیشن وغیرہ کا اثر ہو لیکن اب یہ محبت ہر قسم کے اثر سے آزاد ہوچکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اگر محترم بوکارلو بھی اسے ختم کرنا چاہیں تو نہ کرسکیں گے۔ تم اسے بہت دور لے گئی ہو ویرا۔"

ویرا کی آنکھوں میں اندرونی مسرت کا بڑا پیارا سا رنگ لہراگیا۔

نجانے میرے منہ سے یہ بات کیسے نکل گئی "ویرا! کسی وقت کا انتظار مت کرو۔ صفدر کو وہ محبت دو جس کا وہ حقدار ہے۔ میں اپنے یار کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تمہیں.... ضمانت دیتا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے تمہارا ہے۔"

ویرا کی آنکھوں میں بڑی سہانی سی چمک ابھری۔ اس کے اندر کچھ پگھل رہا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس کے چہرے پر اس اداسی نے ڈیرے ڈال لیے جو گاہے گاہے اس کے پورے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی تھی۔ وہ ایک آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

"کیا بات ہے' کچھ یاد آگیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "پتا نہیں کیا بات ہے۔ جب بھی اپنے لیے.... اور صفدر کے لیے کسی خوشی کا سوچتی ہوں' کانوں میں چیخیں گونجنے لگتی ہیں۔ وہ ساری بربادی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے جو ہم سب دیکھ چکے ہیں۔"

"وہ سب کچھ بھولنا ہوگا ویرا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "اگر نہیں بھولو گی تو خدا نہ کرے اس سے بھی بڑی پریشانیاں مل سکتی ہیں۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور پاؤں کے انگوٹھے سے جھونپڑے کے کچے فرش کو کھرچتی رہی۔ اسی دوران میں جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر لوگوں کا شور سنائی دینے لگا۔ میں

نے دروازے میں سے دیکھا' بہت سی مشعلیں اچھل کود رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں لارسیوں کے سیاہ فولادی چہرے چمک رہے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے' عورتیں بھی اور بوڑھے بھی۔ انہوں نے چہروں پر رنگین نقش و نگار بنا رکھے تھے اور بڑے خوش دکھائی دیتے تھے۔ چند بچے ایسے تھے جنہوں نے مقامی رواج کے مطابق اپنے سروں پر درختوں کی لمبی لمبی شاخیں باندھ رکھی تھیں۔ یہ بچے ڈھول کی تھاپ پر خوب صورت رقص کر رہے تھے۔ ویرا کھو سی گئی۔ ان سیدھے سادے لوگوں کی کسی بھی خوشی میں شریک ہونا اور ان میں مکمل مل جانا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ جیسے ان ہی کا حصہ بن جاتی تھی۔

"آئیں ان کو دیکھیں۔" اس نے پر شوق لہجے میں کہا۔

"چلو تو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی "صفدر کو جگا کر دیکھ لیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں دیکھ لو۔"

وہ جھونپڑے کے دوسرے حصے میں گئی۔ اس نے دو تین بار بڑی نرمی سے صفدر کو آواز دی۔ ایک دو بار اس کا شانہ بھی ہلایا لیکن وہ گہرے نشے کے زیر اثر سویا تھا۔ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کے سینے تک چادر کھینچنے کے بعد وہ میرے ساتھ باہر آ گئی۔ ہجوم میں سے کچھ لوگوں کے ہاتھ میں لمبی لمبی مہتابیاں تھیں۔ ان مہتابیوں کے بالائی سرے سے بڑی تیز نارنجی روشنی پھوٹتی تھی اور دھواں نکلتا تھا۔ یہ آتش بازی یقیناً مقامی طور پر فاسفورس اور سلفر وغیرہ سے تیار کی گئی تھی۔ ان مسالا جات کا استعمال یہ قبائلی اچھی طرح جانتے تھے۔ میں اور ویرا اس ہجوم کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریب سے ان لوگوں کا جوش و خروش اور بھی واضح نظر آتا تھا پھر ویرا سے رہا نہیں گیا' وہ اس ہجوم میں داخل ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے معصوم خوشی پھوٹنے لگی تھی۔ وہ ہر چیز کو جیسے بہت قریب سے دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس نے باری باری دو تین بچوں کو اٹھایا' ان کے گال چومے۔ ان کے ہاتھوں سے مہتابیاں لے کر ہوا میں گھمائیں۔ لارسی ویرا کو اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ میں کچھ فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اشوکا بھی میرے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ گرمی کی وجہ سے اس کا سر اور چہرہ پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ اس بوڑھے پر پڑی جو بدنصیب لارسی لڑکی کا خون آلود لباس جمیل زار کی بستی میں سیکڑوں لوگوں کے سامنے لہرا رہا تھا اور رو رو کر فریاد کرتا رہا تھا۔ آج وہ نئے رنگ دار کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں چمک تھی اور مدقوق چہرے پر وجدانی سا رنگ تھا۔

اشوکا نے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ یہ خوشی کس بات کی منائی جا رہی ہے؟"

"کس بات کی؟"

"چین کی ہلاکت کی۔ اسے عزتوں کا لٹیرا سمجھا جاتا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ چین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے جوان عورت کے جسم کی خوشبو میلوں دور سے آ جاتی ہے۔ یہ لوگ اس کے خاتمے پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔"

کچھ دیر ہجوم کے ساتھ رہنے کے بعد ویرا ابھی ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی۔ تاہم اس کی نگاہیں اب بھی ہجوم پر تھیں۔ وہ قبائلیوں کی اچھل کود کو انجوائے کر رہی تھی۔ ہم سب کو ہلکی ہلکی کھانسی ہونے لگی تھی۔ یہ گندھک کے بخارات تھے جو مہتابیوں سے نکل کر فضا میں پھیل رہے تھے۔ اچانک ایک آواز نے سب کو سہما دیا۔ یہ سردار رانے کی آواز تھی' اس نے ناچنے گانے والوں کو گرج کر ڈانٹ پلائی تھی۔ ساز خاموش ہو گئے اور ہجوم بھی ساکت ہو گیا۔

سردار رانے تقریر کرنے والے انداز میں بولنے لگا۔ اس کے انداز میں غصہ تھا۔ اشوکا نے بتایا "سردار لوگوں کو اچھل کود سے منع کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چین کی موت پر اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سائیں عالی کے بارے میں بھی لوگوں کو بتا رہا ہے۔"

"کیا بتا رہا ہے؟"

"یہی کہ سائیں صاحب نے اپنے نمائندوں کے ذریعے ہمیں ہدایت کی تھی کہ ہم چین کی جان نہ لیں لیکن شازل کی موت کے بعد ہم نے جوش میں آ کر چین کی جان لے لی۔ ایک طرح سے یہ سائیں صاحب کی حکم عدولی ہے اور اس پر ہمیں اتنا خوش نہیں ہونا چاہیے۔"

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ چین کی موت پر سردار رانے خوش نہیں تھا۔ وہ یہ بات سمجھ رہا تھا کہ اس واقعے کے بعد حالات انتہائی کشیدہ ہونے والے ہیں۔ سردار رانے کی ڈانٹ کے بعد لوگوں نے مہتابیاں اور پھلجھڑیاں وغیرہ ریت میں دھنسا کر بجھا دیں اور تتر بتر ہو گئے۔ بہرحال خاردار باڑ کی طرف سے عسکری نعروں کا شور پھر بھی سنائی دیتا رہا۔

میں اور ویرا ابھی واپس جھونپڑے کی طرف آ گئے۔ چاند نکل آیا تھا مگر افریقہ کی یہ گرم رات چاندنی سے ٹھنڈی ہونے والی نہیں تھی۔ عورتوں کے ہاتھوں میں کھجور اور پام وغیرہ سے بنے ہوئے پنکھے نظر آ رہے تھے۔ رات کے اس پہر بھی چشمے کی طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ یقیناً وہاں لوگ نہا رہے تھے اور پانی وغیرہ بھر رہے تھے۔ ویرا دو چھوٹے بچوں کو

اپنے ساتھ ہی جھونپڑے میں لے آئی تھی۔ اس نے انہیں بسکٹ اور چاکلیٹ وغیرہ دیے۔ یہ اشیا موبائل کلینک کے ساتھ ہی یہاں آئی تھیں۔ دبلے پتلے مدقوق بچے خوش نظر آنے لگے۔ ایک ڈھائی تین سالہ بچی ویرا کی گود میں گھس کر بیٹھ گئی۔ جھونپڑے میں چربی کے تیل کا چراغ بہت مدھم ہو گیا تھا۔ میں نے اس میں مزید تیل ڈال کر اس کی لو اونچی کی۔ جھونپڑے کی نیم تاریکی روشنی میں بدل گئی۔

ویرا بسکٹ کا پیکٹ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے قریب کھڑے پانچ چھ سالہ بچے نے اچانک چیخ ماری اور چاکلیٹ پھینک کر باہر کو دوڑا۔ میں نے پہلے بچے کی طرف دیکھا پھر ویرا کی طرف۔ ویرا کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی کھلی رہ گئیں۔ خوف کی ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی۔ ویرا کا چہرہ بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کے ایک رخسار کی کھال ادھڑ کر لٹک رہی تھی۔ پیشانی پر بھی ایک بدنما ابھار نظر آ رہا تھا بلکہ اسے گومڑ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"ویرا!" میرے منہ سے نکلا۔

"کیا ہوا؟" وہ خوف زدہ انداز میں چیخی۔

پھر اس کا ہاتھ خود بخود اپنے چہرے پر آیا اور اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ تاہم اس دوران میں میری ہیجانی کیفیت ایک دم ختم ہو گئی۔ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی اور اس کے چند ہی لمحے بعد ویرا کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا ویرا کے چہرے کے ساتھ نہیں ہوا تھا' اس میک اپ کے ساتھ ہوا تھا جو ڈاکٹر روزی نے اس کے چہرے پر کیا تھا۔

"یہ... کیا ہو گیا شاہ جہاں صاحب؟" وہ اپنی ادھڑی ہوئی جلد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کا چہرہ چراغ کی طرف کر کے غور سے دیکھا۔ پلاسٹک اور حیوانی لحمیات کے ریشے اپنی جگہ چھوڑ گئے تھے... اور میرے خیال میں ایسا کیمیکل ری ایکشن کی وجہ سے ہوا تھا۔ ویرا ابھی کچھ دیر پہلے پر جوش لارسیوں کے ہجوم میں گھسی تھی' وہاں فاسفورس اور سلفر وغیرہ کے بخارات پھیلے ہوئے تھے۔ انہی بخارات نے اثر انداز ہو کر ویرا کے میک اپ کو نقصان پہنچایا تھا۔ جھونپڑے میں واپس آ کر جب ویرا نے چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھنے کے لیے کپڑا استعمال کیا تھا تو میک اپ کی بالائی سطح اکھڑ گئی تھی۔ بظاہر یہ سب کچھ معمولی تھا مگر دیکھنے میں اتنا خوفناک لگتا تھا کہ دل دہل جاتا تھا۔

"اب کیا ہوگا؟" ویرا پریشانی سے بولی۔

"اب تو تمہیں اصلی چہرہ سامنے لانا ہوگا۔" میں نے اکھڑے ہوئے ٹشوز اس کے رخسار اور پیشانی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو' اچھا ہی ہوا۔ میں خود تنگ آ گئی تھی اس بہروپ سے۔"

"بہروپ والی بات تو ٹھیک ہے لیکن جو کچھ ہوا اسے اچھا کہنا ٹھیک نہیں۔"

"مجھے پروا نہیں۔" وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ چپکے سے جائے اور صفدر کے سرہانے سے وہسکی کی بوتل اٹھا لائے۔ ویرا نے ایسا ہی کیا۔ میں نے الکحل اور کپڑے کی مدد سے آہستہ آہستہ ویرا کا رہا سہا میک اپ بھی اتار دیا۔ آخر میں خالص اسپرٹ سے بھی مدد لینا پڑی۔ کچھ دیر بعد جب ویرا نے صابن سے منہ دھونے کے بعد اچھی طرح صاف کیا تو یوں لگا کہ آسمان کی طرح ایک چاند جھونپڑے کے اندر بھی طلوع ہو گیا ہے۔ تھائی لڑکی کے اندر سے ایک دلکش حسینہ برآمد ہو گئی تھی۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ صفدر جیسے فولاد کو اپنے حسن کی تپش سے موم کر سکے۔ اس کی وارفتگی اور اس کے جذباتی پن نے اس کے حسن کو ایک اور ہی طرح کی ہیجانی کیفیت بخش دی تھی۔ شاید اس کے ہر وقت کھلے رہنے والے دلکش بال بھی اس کی اسی پر ہیجان اور آزار شخصیت کی عکاسی کرتے تھے۔

ایک دم صفدر کی کراہ سنائی دی۔ وہ گہری نیند میں کچھ بڑبڑایا تھا اور پھر کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ اس کے الفاظ کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آئے تھے مگر اس کے لہجے میں درد اور کرب کی کیفیت رہی تھی جو جاگتے میں اس کی آنکھوں اور اس کے لہجے میں نظر آتی تھی۔ وہ جیسے سوتے میں بھی اپنی جذباتی الجھنوں سے لڑتا تھا۔ میں نے کہا "ویرا! تمہارا کہنا ہے کہ تم نے صفدر کو میرے مقابل کھڑا کیا اور مجھے بہت بڑا دکھ دیا۔ پتا نہیں' وہ دکھ تم نے دیا تھا یا نہیں... اور وہ دکھ تھا یا کچھ اور تھا؟ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا میں اسے جھیل چکا ہوں لیکن یہ جو نیا دکھ تم دونوں مجھے دے رہے ہو یہ بہت ناقابل برداشت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں' یہ مجھے بہت تکلیف دے گا۔"

ویرا کی پلکیں ایک بار پھر جھک گئیں۔ حسین چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ یوں لگ رہا تھا' وہ ایک بہت بڑے امتحان سے گزر رہی ہے۔ اس کے اندر صفدر کی بے پناہ محبت اور اپنی شوریدہ سری کے درمیان ایک جنگ جاری تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پلکیں اٹھائے لیکن وہ نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس کا سینہ بھی اس بھیدوں بھری رات کی طرح اتھاہ اور بیکراں تھا۔

"کچھ بولو ویرا! تمہاری خاموشی مجھے شدید الجھن میں ڈال رہی ہے۔"

"کیا بولوں۔" وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

"تم دونوں ایک دوسرے کو اذیت دے رہے ہو۔ تم نے کیوں اپنے اور صفدر کے درمیان دیوار کھڑی کرلی ہے۔ اس دیوار کو گرا دو ویرا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عمر بھر پچھتانا پڑے۔ ہم سب اس وقت زسٹ کے گھیرے میں ہیں اور بڑی غیر یقینی صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ کچھ خبر نہیں آنے والی گھڑیوں میں کس کے ساتھ کیا ہوجائے۔"

ویرا کے ہونٹ لرزے۔ اس نے ایک بار پلکیں اٹھا کر اپنی نہایت خوب صورت آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر آہستگی سے بولی "ہم۔۔۔ میں کوشش کروں گی۔"

اگلے روز بھی صورت حال جوں کی توں رہی۔ یوں لگتا تھا کہ کنگ براؤن ابھی تک اس سنگین ترین واقعے سے بے خبر ہے جو یہاں موگا سا بستی میں رونما ہوچکا ہے۔ کنگ کے سگے بھائی کو قتل کرکے اس کی لاش جلائی جاچکی تھی اور پرسوں رات بھر اس کی کھوپڑی بستی کی ایک گلی میں نیزے پر ٹنگی رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہ دھماکا خیز خبر جس وقت بھی زسٹ تک پہنچے گی ایک طوفان برپا ہوجائے گا۔ اگر موگا سا بستی پر اب تک کوئی خونچکاں حملہ نہیں ہوا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کنگ براؤن کی دانست میں چین موگا سا بستی میں تھا اور حملے کی وجہ سے اسے نقصان پہنچ سکتا تھا۔

سائیں عالی کی منطق بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنی زبان میں بار بار کہہ رہا تھا کہ کنگ براؤن سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں اور وہ موگا سا والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہمارا حوصلہ بلند رکھنا چاہتا ہے اور مصیبت سے پہلے ہی مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے روز صبح آٹھ نو بجے کے لگ بھگ میں نے سردار رانے کو دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف آرہا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے مقامی انداز میں سلام دعا کی پھر جلدی جلدی کچھ بولنے لگا۔

اشوکا میرے پاس ہی موجود تھا۔ اس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "سردار پوچھ رہا ہے کہ وہ نئی لڑکی کون ہے اور کب یہاں پہنچی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ویرا کی بات کررہا ہے۔ اس نے اسے میک اپ کے بغیر دیکھا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ پلاسٹک سرجری اور میک اپ وغیرہ کی بات سردار رانے کی سمجھ میں نہیں آسکتی لہٰذا میں نے اشوکا کے ذریعے رانے کو بتایا "یہ لڑکی رات کو سائیں صاحب نے بھیجی ہے۔ پہلے والی لڑکی انہوں نے واپس بلالی ہے۔"

"لیکن یہ لڑکی کب آئی اور پہلے والی واپس کب گئی۔" رانے نے حیران ہوکر پوچھا۔

"کیوں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

رانے گڑبڑا کر بولا "پہرے داروں نے تو لڑکیوں کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔"

"یہ رات پچھلے پہر کی بات ہے۔ اس وقت اکثر پہرے داروں کو اونگھ آجاتی ہے۔ ویسے پہرے دار جاگ بھی رہے ہوں تو سائیں صاحب کسی چیز کو ان کی آنکھوں سے اوجھل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ کیا تم ان کی روحانی صلاحیتوں کو نہیں مانتے؟"

سردار رانے نے توبہ کرنے والے انداز میں اپنے کانوں اور رخساروں کو ہاتھ لگایا "ایسی بات تو ہم ذہن میں بھی نہیں لاسکتے۔" وہ بولا "صحرائی درویش کو ناراض کرنا میرے نزدیک دیوتاؤں کو ناراض کرنا ہے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا "ویسے وہ لڑکی طبیعت کی بڑی اچھی ہے۔ اس نے بستی کے بہت سے بچوں میں کھانے پینے کی چیزیں بانٹی ہیں۔ اب وہ گاڑی (موبائل کلینک) کے اندر سے بہت سی دوائیں لے کر آگئی ہے۔ جو لوگ بستی میں بیمار ہیں ان کو دوائیں دے رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں اسے خود دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ ایک جوان کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ اس شخص کو لڑائی میں بازو پر گولی لگی تھی۔ زخم میں پیپ پڑی ہوئی ہے۔ وہ اس کا گندا غلیظ بازو اپنے ہاتھ سے صاف کررہی تھی۔۔۔ بہت ہمدرد لڑکی ہے وہ!"

کچھ ہی دیر بعد ویرا بھی ہمارے پاس پہنچ گئی۔ اس نے نرس کا لباس اتار دیا تھا اب وہ ایک سادہ سی پتلون اور شرٹ میں تھی۔ شرٹ آدھی آستین کی تھی اور ویرا پر خوب جچ رہی تھی۔ وہ تھکی تھکی سی ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں گہری اداسی کروٹیں لے رہی تھی۔ سردار رانے بڑی محویت سے اس کی طرف دیکھا چلا جارہا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر لگتا ہے کہ یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے اور یہ کوئی اکیلی اس بستی کی بات نہیں ہے۔ یہ پورا علاقہ ہی آفت زدہ لگتا ہے۔" وہ بولی۔

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"یہاں کے لوگوں کی غربت اور بے چارگی دیکھی نہیں جاتی۔" وہ افسردگی سے بولی "میں تو سمجھتی تھی کہ اس علاقے میں زسٹ ہی ایک بڑا قید خانہ ہے مگر اب لگتا ہے کہ یہ پورا علاقہ ہی ایک وسیع قید خانہ ہے۔ یہاں لوگ مفلسی کے غلام ہیں اور ان کے بھوکے ننگے جسموں پر فاقے اور بیماری کے کوڑے پڑتے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے اور وہ آہ کھینچتے ہوئے بولی "میں نے یہاں ایسی مائیں دیکھی ہیں جو کوڑے کرکٹ میں سے چیزیں تلاش کرکے کھاتی ہیں تاکہ اپنے بچوں کو دودھ پلاسکیں۔ مجھے ابھی چند بچے ملے تھے انہیں پتا ہی نہیں کہ کھلونا کیا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایک لقمے کو ترستے ہیں اور پیٹ بھر کر کھانا تو شاید انہیں کبھی زندگی میں نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ بھوک اور ناقص پانی کی وجہ سے بچوں کی موتیں یہاں عام ہیں۔ آج شام تک ایک دو بچے شاید یہاں اور مرجائیں گے لیکن ان کی موت کو معمول سمجھا جائے گا۔ ماں باپ چند آنسو بہائیں گے اور ان کی لاشوں کو آگ میں جلا کر فارغ ہوکر بیٹھ جائیں گے۔ یہ کیسی زندگی ہے؟"

ایک بار پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ لڑکی زسٹ میں ہی رہتی تو بہتر تھا۔ لیبارٹری اس کے لیے گوشۂ عافیت تھی۔ وہاں کا آرام وہ ماحول ایک ڈھال کی طرح تھا جس نے اس کے حساس ذہن کو بے شمار کچوکوں سے بچا رکھا تھا۔ وہ باہر آئی تھی اس نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی مفلس زندگی کو دیکھا تھا اور اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

میں نے کہا "ویرا! تمہیں یوں بتائے بغیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں میں یوں گھل مل جانا مناسب نہیں۔ اب تم اپنی اصل صورت میں ہو اگر یہاں زسٹ کا کوئی مخبر موجود ہے تو پھر یہ بہت خطرناک بات ہوگی۔"

وہ بولی "میں آپ کے خیال سے اتفاق نہیں کرتی اگر یہاں کوئی مخبر موجود ہوتا تو اب تک چچا چین کی موت کی خبر زسٹ تک پہنچ چکی ہوتی۔ یہ خبر نہیں پہنچی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں مخبر نہیں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں باہر نکلتے ہوئے نقاب استعمال کررہی ہوں۔"

"پھر بھی یہ لوگ ہمارے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ ہمیں احتیاط کی ضرورت ہے۔" اشوکا نے نرم لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے لوگوں کی پہچان ہے۔ میں ان لوگوں میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی ہوں۔ بہرحال آپ کی فکرمندی کا شکریہ۔"

ابھی اور ان میں جھونپڑے کی طرف سے صفدر کی بلند آواز سنائی دی۔ جھونپڑا ہم سے چند رہ بیس قدم کی دوری پر تھا۔ ابھی میں نے ایک حبشی لڑکی کو شیشے کا ایک صراحی نما برتن جھونپڑے کی طرف لے جاتے دیکھا تھا۔ یہ دراصل مقامی طور پر کھجور سے تیار کی گئی تیز از شراب تھی۔ یہ صفدر کے لیے تھی کیونکہ دوران بھر میں نصف صراحی تو چڑھا ہی جاتا تھا۔ ابھی لڑکی کو جھونپڑے میں گھسے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ صفدر کی غراہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں اور ویرا لپک کر جھونپڑے میں پہنچے۔ صفدر نے شراب کی صراحی فرش پر پٹخ کر توڑ دی تھی اور خدمت گار لڑکی کو دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ اب وہ بڑے غصے کے عالم میں اپنے بستر کے نیچے سے کچھ نکال رہا تھا۔ یہ بھی شراب کی دو بوتلیں تھیں ان میں تھوڑی تھوڑی شراب باقی تھی۔ صفدر نے یہ بوتلیں بھی چکنا چور کردیں۔

"مجھے نہیں چاہیے یہ سب کچھ۔ مجھے نہیں چاہیے۔" وہ چیخ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر صفدر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "مجھے چھوڑ دیں شاہ جہاں صاحب۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ میرے لیے پریشان ہوں۔ میں ایک بیچ اور گرا ہوا انسان ہوں۔"

بوتل کو فرش پر مار کر توڑتے ہوئے اس کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا اور انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ "اِدھر دکھائیں۔ آپ کے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے۔" ویرا نے بے چین ہوکر اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔

صفدر نے اسے بھی جھٹک دیا "اس گندے خون کو نکل ہی جانے دو۔ اس میں خون کم اور شراب زیادہ ہے۔ مجھے نہیں چاہیے یہ خون۔"

صفدر کو تھامنے کی کوشش میں میرے اور ویرا کے ہاتھ بھی رنگین ہوگئے تھے۔ صفدر کی آنکھیں سرخ تھیں اور منہ سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

"پلیز صفدر۔ مجھے اپنا ہاتھ دیکھنے دو۔" ویرا نے روہانسی ہوکر کہا۔

"نہیں ویرا۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے۔" صفدر نے ذرا نرمی سے ویرا کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹا دیا۔

ویرا پیچھے ہٹ گئی۔ صفدر کی نگاہ بچا کر اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر اسے سنبھالوں۔ میں نے صفدر کو بانہوں میں لے لیا اور سمجھا بجھا کر جھونپڑے کے پچھلے حصے

میں لے گیا۔ ویرا خاموشی سے باہر چلی گئی تھی۔ وہ صورت حال کی نزاکت سمجھ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس موقع پر میں صفدر کو اچھے طریقے سے سنبھال سکتا ہوں۔

میں نے صفدر کا خون آلود ہاتھ دھویا پھر کٹی ہوئی جگہ پر راکھ ڈال کر خون بند کیا اور پٹی باندھ دی۔ اسے مزید پرسکون کرنے کے لیے میں نے دو بیڑیاں جلائیں اور ایک اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔ وہ کچھ دیر تک کش لیتا رہا پھر بولا "شاہ جہاں صاحب! مجھے اپنی غلطیوں کا بڑی شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ میں شراب کے نشے میں غرق ہو کر معلوم نہیں کیا کچھ کرتا رہا ہوں۔ ان واقعات کا تصور ذہن میں آتا ہے تو دل رونے لگتا ہے۔"

میں تسلی دینے والے انداز میں اس کی کمر سہلاتا رہا۔ وہ کہنے لگا "یہ شراب واقعی گھناؤنی چیز ہے۔ اس نے مجھ سے کیا کچھ نہیں کرایا۔ اپنے ان بدبخت ہاتھوں سے میں نے آپ کا گریبان پکڑا۔ آپ سے مار ماری کی۔ آپ کو باندھ کر غار میں ڈالا اور دو بے بس لڑکیوں کو پکڑ کر ان سے وحشیانہ برتاؤ کیا۔ میں اس رات کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے ہی پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا ہوں۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا مجھ سے؟"

وہ اپنے ان افعال کے لیے شراب کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا۔ بے شک اس میں شراب کا بھی عمل دخل تھا مگر سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ وہ ایک اچھے بھلے نارمل انسان کے بجائے ایک زبردست شرابی میں کیوں تبدیل ہو گیا؟ یہ وہی پراسرار نفسیاتی دباؤ تھا جو کسی نامعلوم سمت سے صفدر کے ذہن پر پڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ دباؤ سردار بوغات یا بوکارلو کی طرف سے تھا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے صفدر کو اپنی آنکھوں کی طلسمی قوت کا شکار بنایا تھا اور اسے ایک مخصوص انداز سے سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صفدر اس پراسرار اثر سے نکل رہا تھا۔ وہ اب غیر جانب داری سے اپنے ماضی قریب کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت پشیمانی محسوس کر رہا تھا۔ غالباً ویرا نے درست ہی کہا تھا کہ وہ بہت جلد اپنے آپ میں واپس آنے والا ہے۔

"میں بہت ہیچ انسان ہوں شاہ جہاں صاحب۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اس کا کفارہ کیسے ادا کروں گا۔"

"تم نے کچھ نہیں کیا صفدر۔ وہ سب ایک ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سردار بوغات اور بوکارلو کسی بھی شخص کو اپنی اندرونی قوت کے ذریعے معمول بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی۔"

"میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جناب۔ میں اپنی غلط کاریوں اور اپنے گناہوں کے لیے کسی دوسرے کو ذمے دار کیوں ٹھہراؤں؟ میں نے سب کچھ اپنی مرضی سے اور اپنے ہوش و حواس میں کیا ہے۔ میں خود کو یہ دھوکا کیوں دوں کہ مجھ سے یہ سب کچھ کرایا گیا ہے۔ یہ سب۔۔۔ بیکار کی باتیں ہیں۔"

"یہ بیکار کی باتیں نہیں ہیں صفدر۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور میں بھی۔ گلگت کے واقعات کو پیش آئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہاں ہم نے جو کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا وہ جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ بھلایا جا سکتا ہے۔ سانوس کی کرشماتی شخصیت اور اس کی پراسرار دنیا کے روز و شب اب بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ وہ تو اس سے بھی آگے کی باتیں تھیں۔ اگر وہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ تم حقیقت کا ادراک نہیں کر پا رہے ہو۔"

اتنے میں ویرا نے کھنکار کر ہمیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ موبائل کلینک میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک حبشی ملازمہ بھی تھی۔ ویرا کی ہدایت پر ملازمہ نے جھونپڑے کے فرش پر پھیلی ہوئی شراب صاف کی اور شیشے کی ساری کرچیاں چن لیں۔ ویرا نے بڑی ملائمت سے صفدر کے ہاتھ کی پٹی کھولی اور اسپرٹ سے زخم صاف کر کے مناسب ٹریٹ منٹ دی۔ اس دوران میں دونوں خاموش ہی رہے تھے۔

اس روز سہ پہر کے وقت اچانک میرا دل کھل اٹھا تھا۔ میں نے صفدر اور ویرا کو چشمے کی طرف آتے دیکھا تھا اور انہیں دیکھ کر میرے دل نے فوراً گواہی دی تھی کہ دونوں کا درمیانی کھچاؤ ختم ہو گیا ہے' یا دوسرے لفظوں میں دونوں میں صلح ہو گئی ہے۔ وہ تناؤ اور بیگانگی کا رنگ جو کئی دنوں سے دونوں کے چہروں پر موجود تھا اور کھلی مسکراہٹوں کے پیچھے سے اپنی جھلک دکھاتا تھا اب نظر نہیں آتا تھا۔ ویرا جھونپڑے سے نکلتے وقت ایک نقاب پہن لیتی تھی۔ اس نقاب میں سے اس کی آنکھیں اور پیشانی کا بس تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا۔ اس وقت ویرا نے یہ نقاب چند لمحوں کے لیے کھسکایا تھا۔ میں نے دیکھا۔ کسی بات پر ویرا مسکرا رہی تھی اور صفدر بھی نارمل دکھائی دیتا تھا۔ آج موسم قدرے کم گرم تھا۔ جنگلی نباتات کی مہک فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہوا کے ساتھ یہ مہک لہروں کی طرح سفر کرتی تھی۔ مغرب میں جھکے ہوئے

سورج کی روشنی ویرا کے رخساروں کو کچھ اور بھی شہابی بنا رہی تھی۔ اس کے بال بہت چمکیلے تھے اور اس کی پتلون کی بیلٹ سے نیچے تک جا رہے تھے۔ ہوا گاہے گاہے بالوں کی آوارہ لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ وہ چند دن پہلے کی اس لڑکی سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی جو جنگلی کتوں کے خوف سے ٹریلر میں بے ہوش پڑی تھی اور جس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔

جنگلی پھولوں کے ایک پودے کے پاس پہنچ کر دونوں رک گئے۔ نقاب پھر سے ویرا کے چہرے پر تھا۔ ویرا جھک کر بڑے غور سے اور پیار سے ان عجیب و غریب پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ غالباً دونوں ان پھولوں کی شباہت پر تبصرہ بھی کر رہے تھے۔ ان پھولوں کی شباہت حیرت انگیز طور پر تیر کی نوک سے ملتی تھی اور مقامی لوگ اس توہم کا شکار تھے کہ جو عورت ان پھولوں سے چھو جاتی ہے اس کی کوکھ ہری نہیں ہوتی۔ ویرا غالباً ان پھولوں کو چھونے ہی جا رہی تھی جب ایک طرف سے سردار رانفے تیزی سے برآمد ہوا۔ اس نے بڑے جارحانہ انداز میں ویرا کو پودے سے پیچھے ہٹا دیا۔

ویرا ہنسنے لگی۔ صفدر بھی مسکرا دیا۔ دونوں تھوڑی دیر تک اشاروں کنایوں میں سردار رانفے سے باتیں کرتے رہے پھر درختوں کی طرف چلے گئے۔ رات کا کھانا ہم تینوں نے اکٹھے ہی کھایا۔ کھانا سردار رانفے کی طرف سے آتا تھا اور بڑے اہتمام سے پکایا جاتا تھا۔ تاہم آج کا کھانا کچھ اور بھی پر تکلف تھا۔ اس میں ویرا نے اپنی بنائی ہوئی ایک ڈش بھی شامل کی تھی۔ یہ آلو کی بھجیا جیسی کوئی چیز تھی اور خاصی مزے دار بھی۔ "یہ اس نے خاص طور سے آپ کے لیے بنائی ہے اور آپ کھا ہی نہیں رہے۔" صفدر نے کہا۔

"کھا تو رہا ہوں بھئی۔" میں نے لقمہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کھا تو رہے ہیں لیکن رک رک کے۔" ویرا نے اضافہ کیا۔

"دراصل میں بھوک رکھ کر کھا رہا ہوں۔ اشوکا دو تین دن سے کہہ رہا ہے کہ میں رات کا کھانا اس کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں کھاؤں۔ میں نے آج وعدہ کر رکھا ہے۔"

"اس کے ساتھ وعدہ نبھانا کیا بہت ضروری ہے؟" ویرا نے کہا۔

"بھئی وہ یہاں ہمارے لیے بہت اہم شخص ہے۔ اس کے بغیر ہم گونگے اور بہرے ہیں' بلکہ پرلے درجے کے احمق بھی۔ اگر وہ ہماری باتوں کا غلط سلط ترجمہ کر دے تو ہم احمق ہی ٹھہرے نا۔"

تھوڑا سا کھانا کھانے کے بعد میں نے صفدر اور ویرا سے رخصت لی اور اشوکا کے جھونپڑے میں چلا گیا۔ دعوت وغیرہ کی بات تو میں نے صرف بہانے کے طور پر صفدر سے کی تھی۔ اشوکا کھانا کھا کر فارغ ہو چکا تھا اور اب فرش پر چت لیٹا بیڑی کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ ہم دونوں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے پھر اشوکا بولا "کارڈز کھیلیں گے؟"

میں نے کہا "ہیں تو کھیل لیں گے لیکن پہلے ایک کام کرو۔"

"جی فرمائیے۔"

"کسی کے ہاتھ صفدر کو پیغام بھیج دو کہ میں آج رات تمہارے جھونپڑے میں ہی سو رہوں گا۔"

"یہ تو خوشی کی بات ہے' لیکن صفدر صاحب سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔"

"نہیں۔۔۔ دراصل میں ان دونوں کو کچھ تنہائی دینا چاہتا ہوں۔ شادی شدہ ہو کر بھی وہ ایک دوسرے سے دور دور ہیں۔"

"ہاں یہ تو کھیلنے کھانے کے دن ہوتے ہیں۔" اشوکا بھی مسکرایا۔

اس نے ایک خدمت گار کو بلایا اور مقامی زبان میں صفدر اور ویرا کے لیے پیغام بھجوا دیا۔ ویرا لاری زبان اچھی طرح سمجھتی تھی۔

ہم چراغ کی روشنی میں دیر تک کارڈز کھیلتے رہے پھر قریبی جنگل سے شب بیدار جانوروں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ آوازیں ماحول کو عجیب سا سحر بخش دیتی تھیں۔ سونے سے پہلے میں نے اشوکا کے ساتھ مل کر حفاظتی باڑ کا ایک چکر لگایا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ شروع رات کے پہرے دار اپنی اپنی جگہوں پر چوکس تھے۔ کم از کم چار سو نیزہ باز اور رائفل بردار ایسے تھے جو ایک لمحے کے نوٹس پر بستی کے دفاع کے لیے حرکت میں آ سکتے تھے۔ سردار رانفے خود بھی دن میں سوتا تھا اور رات آخری پہر تک جاگتا تھا۔ اس نے اپنی تقریروں سے لاروسیوں میں ایسا جوش بھر دیا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ ویسے بھی ہین کی موت کے بعد اب لڑنے مرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ کوئی مجبور ہو جاتا تو یہ اور بات تھی۔

حفاظتی باڑ کا ایک راؤنڈ لگا کر میں اور اشوکا جھونپڑے میں واپس آ گئے۔ اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی قرب و جوار کو منور کر رہی تھی۔ اشوکا نے حسب عادت سونے سے پہلے تھوڑی سی شراب پی اور سو گیا۔ میں چت لیٹا رہا اور جاگتا رہا۔ ایک عجیب سی خوشی نے دل میں گھر کر رکھا

تھا۔ اس خوشی کا تعلق صفدر کی خوشی سے تھا۔ اسے اپنا پیار مل گیا تھا... یا پھر ملنے والا تھا۔ یہ رات اس کے لیے ہزاروں کے پھولوں سے آراستہ ہو کر آئی تھی۔ میرے دل میں شادیانے سے بج رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت میں اپنے وطن میں ہوتا' اپنے شہر لاہور میں ہوتا تو کیا کرتا؟ شاید میں کوئی بہت بڑی تقریب برپا کرتا اور ہزاروں لاکھوں لٹا دیتا' یا پھر اپنی ساری جمع پونجی لے کر کسی سڑک پر نکل آتا اور ہر آتے جاتے پر نوٹ نچھاور کرنے لگتا یا پھر شہر بھر کے پھول اکٹھے کر کے صفدر اور ویرا کے راستے میں بچھا دیتا یا پھر پتا نہیں کیا کرتا۔ آج مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں صفدر سے کتنی محبت کرتا ہوں اور اس کی خوشی پر خود بھی خوش ہونے کے لیے میرا دل کس کس طرح مچلتا ہے۔ صفدر اور میری محبت کے بیچ میں ایک دراز ضرور آئی تھی' لیکن یہ عارضی دراڑ تھی اور میں اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ دراڑیں اپنا نشان چھوڑ جاتی ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ دراز جب مٹ گئی تو اس کا نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ رات میں نے قریباً آنکھوں میں ہی کاٹ دی تھی۔ علی الصباح ٹھنڈی ہوا کے سبب کچھ دیر کے لیے نیند آ گئی۔ جاگا تو مشرق سے خون رنگ سورج برآمد ہو چکا تھا۔ ابھی یہ سورج بہت "شریف النفس" نظر آتا تھا مگر اس کی شرافت دیر برقرار رہنے والی نہیں تھی۔ میں اٹھا' منہ ہاتھ دھویا اور سیدھا اپنے جھونپڑے کا رخ کیا۔ دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ جھونپڑے میں پہنچا تو صفدر کو بے حس و حرکت لیٹے ہوئے پایا۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون اور راحت کی ایک ایسی کیفیت تھی جس کو لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے۔ آسودہ ہونٹ اگر ذرا سی بھی جنبش کرتے تو شاید مسکرا دیتے۔ اچانک آہٹ ہوئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ویرا کی صورت نظر آئی۔ اس کے حسین چہرے پر بھی صفدر کے چہرے کی طرح ایک سکون بخش اجالا سا تھا۔ بال جو ہمیشہ کھلے رہتے تھے آج بڑے سلیقے سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک رنگیلے ڈھالے مقامی لبادے میں تھی۔ یہ لبادہ یقیناً اس نے یہاں سے ہی حاصل کیا تھا "صبح بخیر۔" اس نے مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ کر کہا اور پلکیں جھکا لیں۔

"صبح بخیر۔" میں نے جواب دیا۔

ویرا کے چہرے پر بڑا خوب صورت شرمگیں سا تاثر تھا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ اس گلدان پر مرکوز کر دی جس میں وہ پھول سجانے کی کوشش کر رہی تھی "آپ ناشتا کریں گے؟" اس نے پھول سجاتے سجاتے کہا۔

"ضرور کروں گا۔ بڑی زوردار بھوک لگی ہے بلکہ اگر ناشتے کے ساتھ لنچ بھی ابھی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔"

اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی "مجھے لگتا ہے کہ آپ نے رات کو کوئی دعوت وغیرہ نہیں کھائی۔ بس دعوت کا بہانہ بنا کر یہاں سے چلے گئے تھے۔"

میں اس کی زود فہمی کا قائل ہو گیا۔ مگر دلی تاثرات چہرے پر نہیں آنے دیے "ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "رات کو واقعی بڑی زوردار دعوت تھی۔"

"وہ تو آپ کی صورت سے ہی لگ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ حلق تک کھانا ٹھونسا ہوا ہے۔" وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

پھر وہ میرے اور صفدر کے لیے ناشتے کا انتظام کرنے میں مصروف ہو گئی۔

حالات بدستور کشیدہ تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر زسیوں کو بھنک بھی پڑ گئی کہ چین کو قتل کیا جا چکا ہے تو وہ پوری قوت کے ساتھ موگاسا پر حملہ کر دیں گے اور ایک خون ریز لڑائی ہو جائے گی۔ دوپہر سے تھوڑی دیر قبل تین پولیس افسروں کی ٹیم پھر بستی پہنچ گئی۔ ان میں بڑے رینک کا وہ پولیس افسر بھی تھا جسے لارسی زبان روانی سے آتی تھی۔ اس مرتبہ پولیس والوں کا رویہ قدرے نرم اور مصالحانہ تھا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کنگ برازن براہِ راست تصادم سے بچنا چاہتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر صورت اپنے یک چشم بھائی کی جان بچانا چاہتا ہے۔ (حالانکہ بھائی صاحب مقتول ہو کر اپنے خدا کے حضور پہنچ چکے تھے)

جس وقت بستی کے معززین اور پولیس افسروں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی' میں اور صفدر بھی وہیں موجود تھے۔ میں نے اشوکا کے ذریعے سردار رافے کو سمجھا دیا تھا کہ چین کی موت کے بارے میں پولیس والوں کو بھنک تک نہیں پڑنی چاہیے۔

باتوں کے دوران میں ایک پولیس آفیسر مینارڈ نے کہا "اگر تم لوگ کنگ کے محترم بھائی مسٹر چین اور بعد میں پکڑے جانے والے اٹھائیس گارڈز کو رہا کر دو تو ہم مل بیٹھ کر مصالحت کی بات چیت کر سکتے ہیں۔ میں مقامی انتظامیہ کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے ساتھ جتنی بھی رعایت کی جا سکی کی جائے گی۔"

سردار رافے نے کہا "آپ یہاں رعایت وغیرہ کی بات

نہ کریں اور نہ ہی قانون اور انتظامیہ وغیرہ کا نام لیں۔ یہ تو کنگ کے تنخواہ دار ملازموں اور قبائل کے درمیان کھلی جنگ ہے۔ آپ اب ہم سے اسی طرح بات کریں جس طرح میدانِ جنگ میں کی جاتی ہے۔"

"تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟"

"ہم چین اور دیگر اٹھائیس لوگوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں' لیکن اس کے بدلے ہمیں کیا ملے گا۔"

"تم پر سے اور تمہارے قبیلے پر سے تباہی و بربادی ٹل جائے گی اور تمہیں کیا چاہیے۔"

"ہمیں تباہی یا امن دینے والے تم کون ہوتے ہو۔ ان چیزوں پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے' تم ان چیزوں کی بات کرو جن پر تمہارا اختیار ہے۔" رافے تنک کر بولا۔ ہماری ہدایات کے مطابق وہ بالکل ٹھیک جا رہا تھا۔

"تم ہم سے کیا لینا چاہتے ہو؟" سینئر پولیس آفیسر بولا۔

سردار رافے نے اپنے ہاتھ میں زمرد کی بیش قیمت انگوٹھی گھمائی اور بولا "چین اور دوسرے قیدیوں کی رہائی کے بدلے کنگ کو فوری طور پر ہماری دو باتیں ماننا پڑیں گی۔ ان سب لوگوں کو چھوڑنا ہو گا جو جھیل زار کی حالیہ لڑائی میں پکڑے گئے ہیں۔ ان میں ہمارے پیارے ساتھی اور محبوب رہنما محترم بوکارلو بھی شامل ہیں۔ دوسری بات یہ کہ لارسیوں کی تین بستیوں کے اردگرد کم از کم پانچ میل چوڑی محفوظ پٹی رہنی ہو گی۔ پولیس یا ٹرسٹ کا کوئی کارندہ کسی بہانے سے اس پٹی میں داخل نہیں ہو گا۔"

پولیس افسر عیاری سے بولا "یہ دراصل چار مطالبے ہیں۔ نمبر ایک محترم بوکارلو کو تمہارے حوالے کرنا' نمبر دو لڑائی میں گرفتار ہونے والے لارسیوں کو رہا کرنا' نمبر تین لارسیوں پر سے پولیس مقابلے اور قتل وغیرہ کے مقدمات خارج کرنا' نمبر چار لارسی بستیوں کے اردگرد ایک وسیع علاقے کو جو گورنمنٹ ماریطانیہ کی ملکیت ہے لارسیوں کے حوالے کرنا۔ میرے خیال میں یہ کافی سخت مطالبات ہیں اور اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تم لوگوں نے قانون کو ہاتھ میں لینے کا تہیہ کر رکھا ہے۔"

"تم جو کچھ بھی سمجھو' ہم اپنے ان مطالبات سے ایک انگل پیچھے ہٹنے کے لیے بھی تیار نہیں۔" رافے نے تنک کر کہا۔

خون کے دباؤ سے آفیسر مینارڈ کا چہرہ کچھ اور بھی سیاہ ہو گیا۔ شاید وہ کچھ تلخ ترش بولتا مگر سینئر آفیسر نے تھاما اس کا بازو دبا کر اسے روک لیا۔ سینئر آفیسر قدرے نرم لہجے میں بولا "تمہارے مطالبات قریباً ناقابلِ قبول ہیں سردار۔ بہرحال ہم اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں۔ شاید کوئی بہتری کی شکل نکل آئے لیکن ایک بات میں تم لوگوں کو پھر بتا دینا چاہتا ہوں۔ بہتری کی کوئی صورت تب ہی نکلے گی جب مسٹر چین یہاں ہر طرح محفوظ رہیں گے اور انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

سردار رافے نے اثبات میں سر ہلایا۔

پولیس افسران چین اور دیگر قیدیوں سے ملنا چاہتے تھے مگر رافے کے لیے یہ ممکن نہیں تھا' بلکہ "راہیِ عدم" ہوئے بغیر کسی کے لیے بھی چین سے ملنا ممکن نہیں تھا۔ میرے اشارے پر سردار رافے نے پولیس والوں کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ دو پولیس افسروں نے اس پر خاصی ناک بھوں چڑھائی مگر سینئر افسر انہیں سمجھا بجھا کر لے گیا۔

سردار رافے نے پولیس افسران کے جانے کے بعد کہا "اگر واقعی کوئی معاہدہ ہو گیا تو ہم ٹرسٹ والوں کو چین کے بارے میں کیا بتائیں گے۔"

میں نے کہا "یہ سوال مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنے جوشیلے لوگوں سے پوچھو تو بہتر ہے۔" میرا طنز محسوس کرتے سردار رافے کی گردن ذرا سا خم کھا گئی۔

صفدر نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "ویسے سردار رافے! یہ ہوئی غلطی ہے اور غلطی بھی چھوٹی موٹی نہیں ہے۔ ویرا کے اغوا اور مائیکل کے قتل کے بعد کنگ پہلے ہی بے حد غضب ناک تھا' چین کی خبر ملنے کے بعد تو اس کے قہر کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔"

"میں اس واقعے پر شرمندہ ہوں۔" سردار رافے نے کہا "اور زیادہ شرمندگی اس بات کی ہے کہ ہم سے صحرائی درویش کی بھی حکم عدولی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہمیں خاص طور سے چین کے قتل سے منع فرمایا تھا۔ دیوتا ہم پر رحم فرمائیں۔ اب آپ لوگ ہی اس کا کوئی حل سوچیں۔ آپ کی حیثیت یہاں صحرائی درویش کے نمائندوں کی ہے۔ اب آپ جو کہیں گے وہ میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اب کرنے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

اتنے میں ویرا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ حسبِ معمول نقاب میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک عینک تھی۔ میں اس عینک کو پہچانتا تھا' اسی لیے عینک دیکھ کر دل افسردہ ہو گیا۔ یہ پانچ روز پہلے جنگلی کتوں کے چنگل میں پھنس کر ہلاک ہونے والے

ڈاکٹر رائٹ کی عینک تھی۔ نظر کی یہ عینک ویرا سردار رانفے کے لیے لائی تھی۔ اس نے رانفے سے مخاطب ہو کر چند باتیں کیں پھر بڑی اپنائیت سے عینک رانفے کو پہنا دی۔ سردار عینک پہنتے ہوئے بہت جھجک رہا تھا تاہم عینک پہن کر اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اور خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ اس کی نظر کمزور تھی اور عینک لگانے کے بعد اسے بہت کچھ صاف دکھائی دینے لگا ہے۔ وہ کچھ بول رہا تھا، اشوکا نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا "سردار کا خیال ہے کہ یہ کوئی جادو کا کرشمہ ہے۔"

عینک پہننے کے بعد حبشی سردار بڑے والہانہ انداز میں ویرا کی سمت دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ ویرا کو دیکھتے ہوئے رانفے کی نگاہ میں بے ساختہ شوق کی کیفیت نمودار ہو جاتی ہے اور یہ صرف رانفے کی بات ہی نہیں تھی، قبیلے کے ہر چھوٹے بڑے مرد کو ویرا کی بے پناہ دلکشی نے متاثر کیا تھا۔ وہ ان میں گھل مل جاتی تھی اور اپنے بے باک انداز سے ان کے دل موہ لیتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کرتی تھی تاہم اس کا اثر بہت نمایاں ہوتا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر ہر آنکھ کا تارا بن گئی تھی اور شاید ان میں سردار رانفے بھی شامل تھا۔ ان میلے کچیلے مرد و زن اور میلے کچیلے ماحول کے درمیان ویرا یوں نمایاں نظر آتی تھی جیسے کنکروں کے درمیان ہیرا ہوتا ہے۔ اس کی بے ساختہ اداؤں سے کوئی آنکھ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی، اور تو اور بچے بھی اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے تھے۔

رات تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ ٹرسٹ کی طرف سے کوئی جواب آیا اور نہ کوئی ردعمل ظاہر ہوا۔ سردار رانفے نے بستی والوں کو نہایت سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی شخص کسی بھی حالت میں بستی سے باہر نہیں جائے گا۔ اگر باہر سے کوئی شخص بستی میں آنا چاہے گا تو اس سے کسی قسم کی بات چیت نہیں کی جائے گی اور اس کی فوری اطلاع سردار یا بستی کے کسی ذمے دار شخص کو دی جائے گی۔ اس کے علاوہ سردار کی جانب سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ اگر بستی میں باہر سے کوئی فرد آئے گا تو اس کے سامنے کسی قسم کا نعرہ وغیرہ بلند نہیں کیا جائے گا۔ ان تمام ہدایات کا مقصد صرف یہ تھا کہ یک چشم جین کی موت کی خبر بستی سے باہر نہ نکلنے پائے۔ ٹرسٹ کے گرفتار ہونے والے گارڈز کو دوجون سمیت ایک پختہ کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا اور اس کوٹھڑی میں حفاظت کا سخت انتظام کروایا گیا تھا۔ ان گارڈز کی طرف سے ہمیں زیادہ فکر نہیں تھی۔

شام ہوتے ہی صفدر کے چہرے پر خوب صورت رنگ نظر آنے لگے تھے۔ آج اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے، کئی روز بعد شیو کرائی تھی اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ اسے خوش دیکھ کر میرے نیم مردہ دل میں بھی زندگی دوڑی ہوئی تھی۔ صفدر کے چہرے کی یہی آسودگی تھی جسے میں پچھلے کئی دنوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ سب کچھ پا کر بھی محروم نظر کیوں آتا ہے۔ آج اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کوئی اشارہ و کنایہ نہیں دیا تھا، اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ کل گزر جانے والی رات میرے یار کے لیے زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ اسے اپنا پیار ملا تھا اور اس کے ترسے ہوئے قدموں نے اپنی منزل پائی تھی۔ اب شام ہوتے ہی ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آشاؤں کے دیے جل اٹھے تھے۔ کوئی اور چاہے نہ دیکھ سکتا لیکن میں یہ دیے دیکھ سکتا تھا۔ مجھ سے زیادہ اس گجراتی شہزادے کو اور کون جانتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے دل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا میں نے صفدر اور ویرا کے ساتھ ہی کھایا۔ اس میں بھیڑ کا گوشت تھا جسے چربی میں تلا گیا تھا، مکھن میں چپڑے ہوئے نمکین چاول تھے۔ کھجور اور میدے سے بنا ہوا حلوا تھا۔ سلاد تھی اور تازہ دودھ تھا۔

کھانے کے بعد ویرا مجھ سے اور صفدر سے اجازت لے کر بستی میں چلی گئی۔ لڑائی میں جو دو چار افراد زخمی ہوئے تھے وہ ان کے زخموں کا علاج بڑی تندہی سے کر رہی تھی۔ خاص طور سے زخمی پاؤں والے شخص کو وہ دن میں دو مرتبہ دیکھنے جاتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ صرف انسانی ہمدردی کے تحت کر رہی تھی۔ وہ چلی گئی تو میں اور صفدر جھونپڑے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کل کی شدید گرمی کے بعد آج موسم قدرے خوشگوار تھا۔ ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ صفدر کی نگاہ بار بار گھڑی کی طرف جاتی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ویرا آدھ پون گھنٹے کا کہہ کر گئی تھی مگر ابھی تک نہیں آئی تھی۔ بظاہر وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا دل کہاں اٹکا ہوا ہے۔ اس کی کیفیت کچھ اسی قسم کی ہو رہی تھی جو چند دن پہلے شراب کے بغیر ہوتی تھی۔ اب اسے ویرا کی محبت کی شراب درکار تھی۔ اس شراب نے کل رات اسے مدہوش کیا تھا اور آج اس کی طلب شاید وہ کل سے بھی زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ اور یہ یک طرفہ نہیں دو طرفہ طلب تھی۔ میں نے ویرا کی آنکھوں میں بھی سرِ شام محبت کا ایک سمندر کروٹیں لیتے

دیکھا تھا۔ جیسے وہ بھی بے قراری سے خلوت کے محبوب لمحوں کا انتظار کر رہی ہو مگر اب وہ نجانے کہاں رہ گئی تھی۔

صفدر نے نیا سگریٹ سلگایا تو میں اٹھ کھڑا ہوا "کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ویرا کو دیکھ کر آتا ہوں۔ وہ ابھی تک نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، آ جائے گی۔" اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرنا چاہا۔

"نہیں پھر بھی دیکھنا چاہیے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے اوپر ہو گیا ہے۔"

میں جھونپڑے سے نکلا۔ آج سردار کے حکم پر تیس چالیس بھیڑیں ذبح کی گئی تھیں۔ فضا میں بھنے ہوئے گوشت اور شراب کی بو باس تھی۔ میں وسطی حصے کی طرف گیا۔ زخمی پاؤں والے شخص سے ملا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ویرا اسے پٹی کر کے گئی ہے۔ میں بوما کی طرف گیا۔ راستے میں ایک خیمے سے رونے کی آواز آئی۔ کوئی بھاری بھرکم آواز والی عورت ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ یہ گرانڈیل عورت جوری تھی۔ وہی جنگ جو حبشن جو پناہ گزینوں کے ساتھ چند روز قبل یہاں موگا سا بستی میں پہنچی تھی۔ ویرا ابھی اسی خیمے میں موجود تھی۔ اس نے بڑی محبت سے جوری کا بھاری بھرکم ہاتھ اپنے نازک ہاتھ میں لے کر گود میں رکھا ہوا تھا اور جوری کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بس ذرا جذباتی ہو گئی ہے۔" ویرا نے بھی انگلش میں جواب دیا۔

"کیا کہتی ہے؟"

"سردار بوغات کی موت پر غمزدہ ہے۔ یہ بڑی عقیدت رکھتی تھی سردار بوغات اور چچا بوکا رلو سے۔"

میں نے کہا "اسے سمجھاؤ کہ رونے دھونے سے اب کچھ حاصل نہیں۔ ہم سب کو آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ورنہ سردار بوغات کی موت جیسے کئی اور المیے ہمارے راستے میں آ سکتے ہیں۔"

"یہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کوشش خاصی طویل ہو چکی ہے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "وہاں بڑی شدت سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

ویرا کے چہرے پر شفق سی لہرا گئی "بس آپ چلیے۔ میں آ رہی ہوں۔"

"کہتے ہیں کہ جس کا جا کر انتظار کرنا پڑے، اسے ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔"

"اچھا جی تو چلیں۔" وہ پسپا ہوتے ہوئے بولی۔

جوری کو میں نے سردار کی لاش پر بھی بلک بلک کر روتے دیکھا تھا۔ اس واقعے نے یقیناً اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ ایک نہایت طاقت ور اور جنگ جو سپاہیہ تھی۔ جھیل زار کی بستی میں وہ جنگ جو عورتوں کے دستے کی سالار رہی تھی۔ اب بھی اس بستی میں بیسیوں عورتیں ایسی تھیں جو جوری کے ایک اشارے پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ سکتی تھیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جوری کے اندر بھڑکتے ہوئے جوالا مکھی سے کوئی اہم کام لیا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے جنگی نقطۂ نظر سے وہ اہم کردار ادا کر سکتی تھی۔ اگر خدانخواستہ واقعی ٹرسٹ سے جنگ ہو جاتی تو میدانِ جنگ میں جوری کو کوئی اہم ذمے داری سونپی جا سکتی تھی۔

ویرا جھونپڑے کی طرف چلی گئی تو میں جان بوجھ کر چشمے کی طرف نکل گیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں چہل قدمی کرنا چاہ رہا تھا۔ میں ابھی راستے میں ہی تھا کہ دا کی تا کی پر شکل نمودار ہو گیا۔ دوسری طرف حسبِ توقع "عجیب مرد" سائیں عالی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں رسمی کلمات ادا کیے۔ ساتھ ساتھ وہ غٹا غٹ کچھ چڑھا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا پی رہے ہو؟"

بولا "بڑا شاندار ورڈ رنک ہے۔ بکرے کی اوجڑی کا ملک شیک ہے۔"

"اوجڑی کا ملک شیک۔" میں نے کراہت دباتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں یہ بڑا شاندار ورڈ رنک ہے۔ بمبئی میں جب دھرمیندر اور ہیما مالنی کی شادی کا لفڑا تھا اور دھرمیندر، ہیما کو اس کے وارثوں سے چھیننے کے لیے ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہا تھا تو میں نے اسے یہی ملک شیک پینے کا مشورہ دیا تھا۔ دھرمیندر میں جناتی قوت آ گئی تھی۔ ارے ہاں جناتی قوت سے مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔"

"کوئی کام کی بات یاد آئی ہے یا اپنا اور میرا وقت ضائع کرو گے؟"

"بڑے کام کی بات ہے۔ ایک جن نے مجھے خبر دی ہے کہ ایک آدھ شرارتی جن اس بستی میں بھی موجود ہے۔ وہ

کوئی بھی پریشان کرنے والی کارروائی کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ سوار رانے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے تاکہ لارسی بد دل ہو جائیں۔ وہ ٹرسٹ کے پکڑے جانے والے کمانڈرز کو رہا کرانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ تمہیں یا تمہارے دوست صفدر کو نقصان پہنچائے۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"جن فائدے کے لیے کچھ نہیں کرتے لیکن اکثر ان کو فائدہ ہو جاتا ہے۔"

"اگر تمہیں اتنا کچھ معلوم ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ جن کون ہے۔ اپنے فرماں بردار اور نیک جنات سے اس بدبخت کا خاتمہ کیوں نہیں کرا دیتے۔"

"تمہارے لفظوں میں سے مذاق کی بو آتی ہے شفیع محمد۔ جب کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں بے شک اوجڑی کا ملک نیک ہے لیکن یہ رزق ہے اور میں رزق ہاتھ میں لے کر غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ تمہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سائیں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ جنات وغیرہ کی باتیں تو وہ اکثر بس یونہی شغل میں کرتا تھا، اس کا اصل مقصد کچھ بتانا ہوتا تھا۔ غالباً سائیں کے کسی عقیدت مند یا خیر خواہ نے اسے اطلاع دی تھی کہ ٹرسٹ کا کوئی ایجنٹ بستی میں موجود ہے اور وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یقیناً سائیں کو اطلاع دینے والے کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ایجنٹ کون ہے، ورنہ وہ فوراً سائیں کو بتاتا اور سائیں اس بارے میں مجھے اطلاع کر دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ادھوری خبر تھی۔ بہرحال اس ادھوری خبر کی بھی اپنی اہمیت تھی۔

جس طرح شکر خورے کو کسی نہ کسی طرح شکر مل ہی جاتی ہے، سائیں عالی کو بھی ہر جگہ اور ہر ماحول سے اپنے عقیدت مند مل جاتے تھے۔ وہ ہر قسم کے بدقماش ترین افراد میں سے بھی وہ کوئی نہ کوئی خوش عقیدہ بندہ ڈھونڈ لیتا تھا۔ اب نجانے یہ کون سا شخص تھا جس نے سائیں کو بستی میں "کالی بھیڑ" کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سائیں عالی کی اطلاع کا نتیجہ اتنی جلدی نکلے گا اور اتنا سنگین ہوگا۔ قریباً نو بجے گھمنا چشمے پر رہنے کے بعد میں سونے کے لیے اشوکا کے جھونپڑے میں آ گیا۔ میں نے صفدر کو علی الصباح ہی بتا دیا تھا کہ میں اشوکا کے جھونپڑے میں رات گزارا کروں گا۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد صفدر نیم رضامند ہو گیا تھا۔ دراصل میں صفدر اور ویرا کی تنہائی میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اشوکا کے پاس بیٹھ کر میں نے تھوڑی دیر کاروز کھیلے پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات کسی پہر اچانک میری آنکھ کھلی۔ جھونپڑے کے اندر گھپ اندھیرا تھا حالانکہ ہم ایک چراغ جلتا چھوڑ کر سوئے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میری آنکھ ایک بلند آہٹ اور ایک کراہ کی وجہ سے کھلی تھی۔ شاید اشوکا کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا۔

"اشوکا۔" میں نے زور سے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ تاریکی میں میں نے ماچس ٹٹولی، چراغ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا "اشوکا۔" میں نے ایک بار پھر اپنے "روم میٹ" کو پکارا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ گہری تاریکی میں کوئی تاریک جسم میرے بالکل پاس موجود ہے۔ میں نے تیزی سے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی، کوئی مجھ سے ٹکرایا اور میں فرش پر چت گر گیا۔ یہ بڑا شدید دھکا تھا، یوں لگا جیسے چھت میرے اوپر آن گری ہو۔ میں نے مدمقابل کو اپنے اوپر سے اچھالنا چاہا لیکن قطعی ناکامی ہوئی، وہ کسی بھاری بھرکم جونک ہی کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ تکیے کی طرف بڑھانا چاہا۔ میری کلائی پر شدید ضرب لگی۔ محسوس ہوا جیسے بے رحمی سے ہتھوڑا رسید کیا گیا ہو۔ کندھے تک میرا بازو سن ہو کر رہ گیا۔ بھنا کر میں نے مدمقابل کے چہرے پر سر کی ٹکر رسید کی۔ اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو میں نے پلٹ کر اسے اپنے نیچے لے لیا۔ میری یہ برتری دو تین سیکنڈ سے زیادہ برقرار نہیں رہی۔ میرے جسم سے پھر ایک ہتھوڑا ٹکرایا اس مرتبہ ضرب میرے جبڑے پر لگی تھی۔ جبڑا ٹوٹنے میں بس تھوڑی بہت کسر ہی باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ میں نے مدمقابل کے اوپر خود کو سنبھالنے کی کوشش مگر ناکام ہوا۔ اس کے جسم میں جنگلی بھینسے کی سی طاقت تھی۔ اس نے مجھے اچھالا تو میں مٹی کے مٹکے کے اوپر گرا۔ مٹکا ٹوٹ گیا اور پانی بہہ نکلا۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، مدمقابل کا ہیولا پھر مجھ پر حملہ آور تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں واقعی کوئی ہتھوڑی نما شے تھی۔ اس مرتبہ میں نے پھرتی سے جھک کر اپنے سر کو ٹوٹنے سے بچایا، مدمقابل کی دونوں ٹانگوں کے بیچ سر دے کر اسے اٹھایا اور چند قدم بھاگ کر جھونپڑے کی نیم پختہ دیوار سے دے مارا۔ اس کی کمر پر یقیناً شدید چوٹ آئی تھی۔ تاہم اس کی "سخت جانی" تھی کہ اس کے ہونٹوں سے کراہ تک نہیں نکلی۔ اس نہایت شدید تصادم کے سبب جھونپڑے کی دیوار

ہل گئی اور میں حریف سمیت جھونپڑے سے باہر جا گرا۔ گرتے گرتے اس نے ایک بار پھر میرے سر پر گند آلے کی ضرب لگانا چاہی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پہرے دار قریباً پچاس گز کے فاصلے پر موجود تھے۔ شور سن کر وہ تیزی سے ہماری طرف لپکے۔ مدمقابل بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بے انتہا پھرتیلا تھا۔ اس نے مچھلی کی طرح تڑپ کر خود کو میری گرفت سے آزاد کرانا چاہا۔ میرا دایاں ہاتھ چوٹ کی وجہ سے ابھی تک شل تھا۔ کوشش کے باوجود میں پورا زور نہ لگا سکا اور وہ نکل گیا۔

پہرے دار چیخ و پکار کرتے ہوئے دوڑے آ رہے تھے۔ مدمقابل نے فرار ہونے کے لیے بائیں طرف تاریکی میں غوطہ لگایا۔ میں اس کے پیچھے لپکا مگر دیر ہو چکی تھی۔ وہ جھونپڑیوں کے عقب سے گزرا اور خودرو جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔ اب میرے اردگرد چند مشعلیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے ایک لارسی کے ہاتھ سے مشعل جھپٹی اور دوسرے ہاتھ سے رائفل لے کر جھاڑیوں میں گھسا مگر پھر فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس تاریکی میں خطرناک حملہ آور کی تلاش کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ لڑائی بھڑائی کے فن میں خاصا ماہر تھا اور زور آور بھی تھا۔ وہ یہاں گھات لگا کر کسی کو بھی شدید نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ پہرے دار گھنی جھاڑیوں کے اردگرد اور جھونپڑیوں کی بھول بھلیوں میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ امید نہیں تھی کہ ان کی بھاگ دوڑ سود مند ثابت ہوگی۔ میرا دھیان فوراً اشوکا کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کی کراہ سنی تھی اور اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ میں دوڑتا ہوا جھونپڑے میں واپس پہنچا۔ جھونپڑا اب کئی مشعلوں کی زد میں تھا۔ جھونپڑے کے فرش پر ٹوٹے ہوئے گھڑے کے پاس اشوکا بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے شفاف سر کا پچھلا حصہ خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں اشوکا ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اسی دوران میں باہر سے بھی شور کی آواز آئی۔ ہم جھونپڑے سے نکلے۔ معلوم ہوا کہ حملہ آور فرار ہوتے وقت ایک شخص کو جان سے مار گیا ہے۔ یہ بدقسمت شخص اس بستی میں اشوکا کا پڑوسی تھا۔ اس نے حملہ آور کے راستے میں آنے کی کوشش کی تھی۔ حملہ آور نے اس کی پیشانی پر ایسی شدید ضرب لگائی تھی کہ ایک ہی کافی ثابت ہوئی تھی۔ پیشانی کی ہڈی ٹوٹ کر دماغ میں دھنس گئی تھی۔

مقتول حبشی کے پاس ہی وہ آلہ بھی پڑا تھا جس سے اشوکا کے علاوہ مجھے اور مقتول کو بھی ضربیں لگائی گئی تھیں۔ یہ وہی آہنی موسل تھا جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ چند روز پہلے ایسے ہی تین موسلوں کے ذریعے تین خوب رو بوب لڑکیوں کے سر میں ضربیں لگا کر انہیں موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ آج اسی موسل نے مجھ سے زندگی چھیننے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میرے گرنے کے بعد جو وار حملہ آور نے میرے سر پر کیا تھا وہ نشانے پر لگ جاتا تو نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ غالباً میری پیشانی یا سر کا وہی حشر ہوتا جو اشوکا کے پڑوسی کا ہوا تھا۔ حملہ آور موقع سے بھاگتے ہوئے یہ موسل پھینک گیا تھا یا اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ قریباً دو فٹ لمبا یہ وزنی موسل اب ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگر ہم کسی شہر میں ہوتے تو اس موسل پر سے فنگر پرنٹس لے کر حملہ آور کا کھوج لگایا جا سکتا تھا لیکن اس دور افتادہ غیر مہذب علاقے میں ایسا سوچنا بھی مضحکہ خیز تھا۔ اب جھونپڑے کے اردگرد کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر میں صفدر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا "میں تو بہت ڈر گیا تھا۔" وہ بولا "ایک پہرے دار نے ویرا کو آ کر بتایا کہ آپ پر سوتے میں حملہ ہوا ہے اور حملہ آوروں نے جھونپڑے کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔"

"اس سے ثابت ہوا کہ خبروں کو مرچ مسالا دنیا کے ہر کونے میں لگایا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" صفدر نے مجھے ٹٹولا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہوں، اور تمہاری خیریت "نیک مطلوب" چاہتا ہوں۔ تم جاؤ اپنے جھونپڑے میں ویرا اکیلی پریشان ہو رہی ہوگی۔"

"پریشان؟ وہ تو باقاعدہ رو رہی تھی جی۔ بہت باکا دل ہے اس کا۔"

"چلو پھر بھاگو۔ نئے نویلے دلہے ویسے بھی اتنی رات گئے باہر نہیں نکلتے۔"

مجھے سلامت دیکھ کر صفدر کی آنکھوں میں اطمینان کروٹیں لینے لگا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا بچھڑا ہوا صفدر مجھے آہستہ آہستہ بتدریج واپس مل رہا ہے۔

بستی میں حملہ آور کی تلاش سرگرمی سے جاری تھی۔ میرے ذہن میں سائیں عالی کے وہ فقرے گونج رہے تھے جو میں نے آج سرِ شام واکی ٹاکی پر سنے تھے۔ سائیں عالی نے بستی میں موجود کسی خبیث جن کا ذکر کیا تھا۔ یہ جو کوئی بھی تھا واقعی خبیث جن ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے ٹھکانے لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ایک بات غور کرنے

والی تھی۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لارسیوں کا روایتی ہتھیار موسل استعمال کیا تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو عین ممکن تھا کہ اس قتل کا الزام کسی لارسی کے سر آجاتا۔ ایسے میں یہ سوچا جا سکتا تھا کہ نامعلوم حملہ آور نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کرکے لارسیوں اور سائیں عالی میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری حیثیت یہاں سائیں کے نمائندوں کی تھی اور ہم یہاں بظاہر انسانی ہمدردی کے تحت موجود تھے۔ ہم میں سے کسی ایک کے قتل سے سائیں عالی کا لارسیوں سے بدظن ہو جانا منطقی بات تھی۔۔۔ مگر یہاں سب کچھ ناکام ہوا تھا۔ سائیں کو حملے سے پہلے ہی حملے کی خبر ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر کوئی سازش ہوئی ہے تو وہ اس سازش کے آغاز سے ہی باخبر تھا۔

اشوکا جلد ہی ہوش آگیا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اسے سوتے میں نشانہ بنایا گیا تھا۔ اگر اس کی کراہ سن کر میں جاگ نہ جاتا تو شاید مجھ پر بھی سوتے میں ہی حملہ کیا جاتا اور مرحوم کر دیا جاتا۔

اگلے روز بھی حملہ آور کی تلاش جاری رہی۔ لارسیوں کی تفتیش اس تفتیش سے ملتی جلتی تھی جو پاکستانی دیہات میں کی جاتی ہے۔ پاؤں کے نشانات سے مجرم تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں بھی کچھ نشانات ملے تھے اور کھوجی جستجو میں لگے ہوئے تھے مگر کچھ حاصل نہیں ہوا حملہ آور خاصا جسیم تھا اور لڑائی بھڑائی میں طاق نظر آتا تھا۔ ان نشانیوں کی مدد سے میں نے اور صفدر نے اپنے طور پر حملہ آور کو کھوجنے کی کوشش کی۔ اشوکا بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ ہم سارا دن بستی میں گھومتے رہے۔ قبائلیوں میں مجھے کم از کم دس ایسے افراد نظر آئے جو اپنے قد کاٹھ کے اعتبار سے حملہ آور سے ملتے جلتے تھے۔ ان میں سے ایک لوہار تھا اور برچھیاں نیزے وغیرہ بناتا تھا۔ دو بھائی تھے جو مویشی وغیرہ چراتے تھے۔ ان تینوں افراد کا لڑائی بھڑائی سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر باقی سات افراد کسی نہ کسی طور فن حرب سے منسلک تھے۔ یہ موگاسا کے حفاظتی دستے میں بھی شامل تھے۔ ان ساتوں گرانڈیل افراد کا میں نے بغور جائزہ لیا۔ اشوکا کی مدد سے دو تین کے انٹرویوز بھی کیے مگر کوئی خاص کلیو نہیں مل سکا۔

سوار را نے ہمیں جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق بستی میں بس یہی دس بارہ افراد جسیم شحیم یا گرانڈیل کہے جا سکتے تھے۔ رات جو شخص موسل کی جان لیوا ضرب سے ہلاک ہوا تھا اس کے لواحقین سارا دن بین کرتے رہے تھے۔ وہ بستی کا ہر دل عزیز شخص تھا اور آگ کے گرد بیٹھ کر قدیم افریقہ کی منظوم کہانیاں سنانے والے لوگوں میں شامل تھا۔ مرنے والے کے لیے مقامی زبان میں جو لقب استعمال کیا جاتا تھا اس کا ترجمہ اشوکا نے "پیارا داستان گو" کیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں صفدر اور ویرا جھونپڑے میں ہی لیٹ گئے۔ باہر نشیب و فراز پر چلچلاتی دھوپ برس رہی تھی اور چار سو ہو کا عالم تھا۔ آخر خدا خدا کرکے یہ طویل دوپہر ختم ہوئی اور درختوں کے سائے طویل ہو کر جھونپڑوں کو ڈھانپنے لگے۔ گرمی سے کملائے ہوئے چہرے جھونپڑوں سے برآمد ہوئے اور مرنے والے شخص کے جھونپڑے کے سامنے جمع ہونے لگے۔ شام ہوتے ہی اسے آگ میں جلائے جانے کی رسم ادا ہونا تھی۔ ہمیں اب اس رسم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ویرا نے کہا "آیئے شاہ جہاں صاحب! ذرا جوری کی طرف چلیں۔"

"کیوں؟"

"کل وہ بے چاری بڑی پریشان تھی۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ اسے ذرا تسلی تشفی دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "چلو آؤ۔"

ہم دونوں جوری کے جھونپڑے میں پہنچے تو وہ ابھی سو رہی تھی۔ میں واپس لوٹنا چاہتا تھا مگر ویرا نے اسے جگا دیا۔ وہ اس کے لیے نن پیک اور نج جوس لے کر آئی تھی۔ جوری کا چہرہ دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اس کا بایاں رخسار زخمی تھا اور بالائی ہونٹ پر بھی پٹی تھی۔

"ارے یہ کیا ہوا؟" ویرا نے مقامی زبان میں پوچھا۔

جوری نے جو کچھ بتایا ویرا غور سے سنتی رہی' پھر اس نے انگلش میں مجھے بتایا "بے چاری کل رات سردار بوتات کے لیے مناجات وغیرہ پڑھنے کے لیے پوہا گئی تھی' واپسی پر پوہا کی سیڑھیوں سے پھسل گئی۔"

میں نے بھی دیکھا تھا' پوہا کی پتھریلی سیڑھیاں کافی اونچی اور خطرناک قسم کی تھیں۔

مگر پھر اچانک میرا دھیان ایک اور سمت میں گیا اور ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے ایک اور زاویے سے سوچا تھا اور جسم سنسنا اٹھا تھا۔ میں نے جوری کے سراپا پر نگاہ دوڑائی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ ایک گرانڈیل مرد کی طرح لمبی تڑنگی اور زور آور تھی۔۔۔ کہیں۔۔۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ رات۔۔۔ مجھ سے کشت و خون کرنے والی یہی عورت ہو۔ مجھے وہ دھواں دھار ٹکریاد آئی جو میں نے حملہ آور کے چہرے پر رسید کی تھی۔ وہ ضرب

یقیناً اپنا نشان چھوڑ جانے والی ضرب تھی اور قریباً اسی مقام پر لگی تھی جہاں اب جوری کے چہرے پر زخم نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنے اندرونی تاثرات کو چہرے پر آنے سے بمشکل روکا۔ ویرا بڑی اپنائیت سے جوری کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے نازک ہاتھوں میں لے لیا اور اس سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگی۔

میرے ذہن میں اور ہی طرح کی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ کیا جوری واقعی "کالی بھیڑ" تھی۔ وہ تو اپنے لوگوں پر جان فدا کرتی تھی اور سردار کی موت پر اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے رکھا تھا' لیکن اب ایک بالکل مختلف صورت حال سامنے آرہی تھی۔ میں اور ویرا قریباً آدھا گھنٹا جوری کے پاس بیٹھے' تاہم اس دوران میں میں ذہنی طور پر بالکل غیر حاضر رہا۔ اپنے جھونپڑے میں واپس پہنچتے ہی میں صفدر کو لے کر باہر نکل گیا۔

"تمہارے لیے ایک انکشاف ہے صفدر۔" میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"اچھا انکشاف ہے نا۔" وہ بولا۔

"اس کا پتا تو بعد میں چلے گا۔ پہلے انکشاف سن لو۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں نے رات والے حملہ آور کو پہچان لیا ہے۔"

"و۔۔۔ واقعی!"

"ہاں۔۔۔ مجھے نوے فی صد یقین ہے کہ رات کو ہم پر جوری نے حملہ کیا تھا۔"

صفدر سناٹے میں رہ گیا "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہے ہو۔ جوری ٹرسٹ والوں سے ملی ہوئی ہے یہی وہ کالی بھیڑ ہے جس کے بارے میں سائیں نے بھی اندیشہ ظاہر کیا تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" صفدر ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

میں نے اسے ساری تفصیل بتائی۔ وہ تعجب سے سنتا رہا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ بھی میرا ہم خیال نظر آنے لگا تھا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" اس نے بیڑی سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"جوری بڑی سخت جان عورت ہے۔ اس سے بزور بازو پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ ایک طویل کوشش ثابت ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ سخت ترین عذاب جھیل کر بھی زبان نہ کھولے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلے میں حکمت سے کام لیا جائے۔"

"مثلاً؟" صفدر نے پوچھا۔

"اسے اعتماد میں لے لیا جائے۔ اسے بتا دیا جائے کہ ہمارے میک اپ کے پیچھے اصل چہرے کون سے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"پوری بات تو سنو۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد اسے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا جائے کہ ہم ٹرسٹ سے بھاگے ہوئے قیدی نہیں ہیں بلکہ ٹرسٹ والوں نے پلاننگ کے تحت ہمیں لارسیوں میں بھیجا تھا۔ اس طرح ہم اور وہ (جوری) ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

"کیا وہ ہماری بات پر اتنی آسانی سے یقین کر لے گی۔"

"اسے یقین کرنا پڑے گا۔ عین ممکن ہے کہ ٹرسٹ والوں نے ہماری طرح جوری کو بھی رابطے کے لیے ٹرانس میٹر وغیرہ فراہم کیا ہو۔ وہ ہمارے آنے کے بعد تنہائی میں اس ٹرانس میٹر پر ٹرسٹ سے رابطہ قائم کر سکتی ہے اور ہماری بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے بارے میں پہلے ہی کافی کچھ جانتی ہو۔"

ہم نے قریباً آدھ گھنٹے میں ایک لائحہ عمل تیار کیا اور اشوکا کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ اشوکا کی مدد اس لیے ضروری تھی کہ جوری صرف لارسی زبان جانتی تھی (بہرحال بعد میں ہمارا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہو گیا) رات آٹھ بجے کے قریب میں اور اشوکا خاموشی سے جوری کے جھونپڑے میں پہنچے۔ وہ شراب پی رہی تھی اور اس کی آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ میں نے اشوکا کی وساطت سے کہا "ویرا! تمہارے بارے میں بڑی فکر مند رہتی ہے۔ اس نے بھیجا تھا کہ میں تمہاری خیر خیریت دریافت کر آؤں۔"

"بہت شکریہ لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ ہمہ وقت یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ سردار بوتات کی موت کے غم نے اسے ہلکان کر رکھا ہے۔

میں نے کہا "تمہارے چہرے کی چوٹ کا بہت افسوس ہوا۔ لگتا ہے کہ پھسلنے کے بعد سب سے پہلے تمہارا چہرہ ہی زمین سے لگا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ بہت بری طرح گری تھی۔"

"کہیں اور چوٹ تو نہیں آئی؟"

"ن۔۔۔ نہیں۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری گردن پر کچھ خراشیں سی تھیں' میں نے سمجھا شاید یہ بھی گرنے کی وجہ سے آئی ہیں۔"

اس کا رنگ متغیر ہوا۔ گردن پر ہاتھ پھیر کر بولی "نہیں، یہ پہلے کی ہیں۔"

میں نے دو بیڑیاں سلگائیں، اور ایک اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ بیڑی پیتی تھی مگر اس وقت اس نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ میں نے دوسری بیڑی اشوکا کو دے دی۔

دو گہرے کش لیتے ہوئے میں نے کہا "جوری! تم سے ایک بندے کے بارے میں پوچھنا تھا۔"

"کون بندہ؟" اس کے لہجے میں بدستور کڑواہٹ تھی۔

"اس کا نام شاہ جہاں تھا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ٹرسٹ سے بھاگ کر جھیل زار کی بستی میں پہنچا تھا اور کئی دن وہاں رہا تھا۔"

"ہاں وہ بندے ٹرسٹ سے بھاگ کر یہاں آئے تو تھے لیکن تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم ابھی صرف یہ بتاؤ کہ وہ دونوں بندے کیسے تھے۔ خاص طور سے شاہ جہاں نام کا وہ بندہ۔ یہ تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ شاہ جہاں نام کے اس شخص کو تم نے کشتی کے ایک زوردار مقابلے کے بعد ایک رات کے لیے جیتا تھا اور اس کے ساتھ رات بھی گزاری تھی۔"

جوری کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ بہرحال میری "رات گزارنے والی بات" کا اس نے برا نہیں منایا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس تذکرے نے اس کے چہرے سے کشیدگی اور بیزاری کم کر دی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ میری باتوں میں قدرے دلچسپی لیتے ہوئے بولی "تم تو صحرائی درویش کے ساتھ رہتے ہو، تمہیں جھیل زار کی باتیں کیسے معلوم ہیں؟"

"صحرائی درویش کو بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور جب انہیں معلوم ہو جاتی ہیں تو پھر ہمارے علم میں کچھ نہ کچھ آ ہی جاتا ہے۔"

"تم نے ابھی بتایا ہے کہ شاہ جہاں کے ساتھ تمہارا گہرا تعلق ہے۔ وہ کیا لگتا ہے تمہارا؟"

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ شاہ جہاں نامی وہ شخص تمہیں کیسا لگا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس رات تم اسے حاصل کرنے کے باوجود حاصل نہیں کر سکی تھیں، زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے تم گہری نیند سو گئی تھیں اور وہ تمہارے پاس رہ کر بھی بہت دور رہا تھا۔"

جوری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اس کا سارا نشہ ہرن ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے ساغر و مینا ایک طرف سرکا دیے اور بولی "تم تو۔۔۔ تم تو۔۔۔" پھر اپنی زبان کو بریک لگا کر بولی "لیکن تم ہو کون۔ شاہ جہاں کیا لگتا ہے تمہارا؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اس شخص کے بارے میں تمہارے خیالات کیا ہیں۔ اگر وہ دوبارہ تمہیں ملے تو تمہارا رویہ کیا ہوگا۔"

"اچھا ہی ہوگا۔ اس نے میرا کوئی برا نہیں کیا اور نہ میں نے اس کا کیا ہے۔"

"یعنی تم اس سے ملنا چاہتی ہو؟"

"ہاں بالکل۔ میں نے آخری بار اسے جھیل زار کی لڑائی میں دیکھا تھا۔ لڑائی بھڑائی کے معاملے میں وہ دونوں دوست خاصے ماہر ہیں۔ میں ان دونوں سے دوبارہ ملنا چاہوں گی۔"

"دونوں سے تو نہیں لیکن ایک سے تم اسی وقت بھی مل سکتی ہو۔۔۔ وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔" میں نے اپنی اصل آواز میں کہا (میک اپ کے بعد سے میں نے اپنی آواز بدل لی تھی)

میری بدلی ہوئی آواز نے جوری کو چونکایا لیکن وہ سمجھی پھر بھی نہیں۔ میں نے اس کی حیرت میں گوناگوں اضافہ کرتے ہوئے کہا "میں ہی شاہ جہاں ہوں۔ میں نے ایک خاص طریقے سے اپنا چہرہ بدل رکھا ہے، سمجھو کہ چہرے پر خول چڑھا رکھا ہے، تم میرے قد کاٹھ اور آواز وغیرہ سے مجھے پہچان سکتی ہو۔"

جوری کے لیے یہ سب کچھ بے حد تہلکہ خیز تھا۔ جوری کی گردن نہایت موٹی تھی اور ایسے لوگ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں، لیکن میرے انکشاف نے جوری کے اعصاب کو کشیدہ کر دیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی تھی۔

میں نے اسے بٹھایا اور اشوکا کی وساطت سے سمجھایا کہ میری صورت کیونکر بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

وہ کانپتے ہوئے لہجے میں بولی "یہ میرے لیے ایک بہت بڑا انکشاف ہے۔"

میں نے کہا "ڈیئر جوری! آج تمہارے لیے انکشافات کا دن ہے۔ اب تم ایک اور بڑے انکشاف سے دو چار ہونے جا رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

میں اس کے بالکل قریب چلا گیا اور آہستگی سے کہا "جوری، مجھے معلوم ہے کہ تمہیں چہرے کی یہ چوٹ بوا کی سیڑھیوں سے گر کر نہیں آئی۔ تم نے کل رات مجھ پر حملہ کیا

تھا اور یہ چوٹ اسی کارروائی کا نتیجہ ہے۔"

جوری کا منہ کھلا رہ گیا۔ میں نے کہا "اور اب تیسرا انکشاف۔۔۔ تم لارسی ہو اور اس ناتے سے تمہارا سردار وہی ہے جو سب لارسیوں کا سردار ہے۔ یعنی سردار رانفے۔ لیکن یہ غلط ہے، تمہارا اصل سردار کنگ براؤن ہے۔ تم کنگ براؤن کے لیے کام کر رہی ہو، کل رات تم نے مجھ پر جو قاتلانہ حملہ کیا تھا، وہ کنگ براؤن کے کارندے کی حیثیت سے کیا تھا۔ اپنی دانست میں تم نے سائیں عالی کے ایک مرید پر حملہ کیا تھا۔ یہ "مرید" قتل ہو جاتا تو سائیں عالی اور لارسیوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

جوری نے خشک گلے کو تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔ میں نے کہا "پریشانی کی بات نہیں ہے جوری ڈیئر۔ اس حملے کے سلسلے میں مجھے تم سے کوئی شکوا نہیں۔ تم نے یہ حملہ بے خبری میں کیا۔ تمہیں معلوم تو نہیں تھا نا کہ میں شاہ جہاں ہوں۔ تم نے بس کنگ براؤن کی ہدایت پر عمل کیا۔۔۔ اور کنگ براؤن کی ہدایت پر عمل کرنے والے سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔"

حسب توقع میرے آخری فقرے نے ایک بار پھر جوری کو بے طرح چونکا دیا "تت۔۔۔ تم۔۔۔ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"میں آخر میں ایک آخری انکشاف کرنا چاہ رہا ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ اس انکشاف کے بعد تمہاری ہر قسم کی پریشانی بالکل دور ہو جائے گی۔ کنگ براؤن کی ہدایات پر عمل کرنے والے سے میں اس لیے ناراض نہیں ہو سکتا کہ میں خود بھی کنگ کی ہدایتوں پر عمل کرتا ہوں۔"

جوری اپنی جگہ سے جیسے اچھل پڑی۔ میرے پے در پے انکشافات نے اسے واقعی چکرا کر رکھ دیا تھا "ہاں جوری!" میں نے نرمی سے کہا "میں اور میرا دوست کنگ براؤن کے لیے ہی کام کر رہے ہیں۔ ہم ٹرسٹ سے فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ ہمارے فرار کا ڈراما رچایا گیا تھا۔۔۔"

میں نے پوری تفصیل سے جوری کو آگاہ کیا۔ جوری قائل نظر آنے لگی لیکن وہ یہ بات ماننے سے اب بھی انکاری تھی کہ وہ ٹرسٹ کے لیے کام کر رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا اعتراف تھا اور یہ اعتراف کرنے سے پہلے شاید وہ ہر پہلو سے پرکھنا چاہتی تھی۔ یہ پرکھنا چاہتی تھی کہ میری باتوں میں جھوٹ کتنا ہے اور سچ کتنا۔ میں نے کہا "جوری ڈیئر! ہم خود کو شک میں ڈال کر وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے اور تم جانتی ہی ہو کہ یہ وقت کتنا قیمتی ہے۔ تم میری ایک بات مانو۔"

"کیسی بات؟"

"جب ہمیں ٹرسٹ سے روانہ کیا گیا تو ہمیں ایک ٹرانس میٹر دیا گیا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا۔۔۔ کہ یہ ٹرانس میٹر میرے دوست صفدر کے جوتے میں نصب کیا گیا تھا۔ بعد میں رابطے کا یہ آلہ ہم سے چھن گیا۔ مجھے یقین ہے کہ رابطے کا کوئی ایسا ہی آلہ، تمہارے پاس یا تمہارے کسی ساتھی کے پاس بھی موجود ہوگا۔ تم اس آلے کے ذریعے ٹرسٹ کے کسی ذمے دار فرد سے رابطہ کر کے میری بات کی تصدیق کر سکتی ہو۔"

جوری کا چہرہ بالکل سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اتنی آسان عورت نہیں تھی جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ اچانک میرا دھیان ایک اور طرف چلا گیا۔ جوری کے بڑے بڑے چرمی جوتے جھونپڑے کے ایک گوشے میں پڑے تھے۔ یہ "فل بوٹ" سے ملتی جلتی چیز تھی اور گھڑ سواری اور جھاڑ جھنکاڑ میں سفر کرنے کے لیے ان کا استعمال بہت مفید تھا۔ ویسے میں نے جوری یا کسی دوسری عورت کو یہ جوتے کم ہی استعمال کرتے دیکھا تھا۔ جوتے دیکھ کر میرے ذہن میں یکایک یہ خیال آیا تھا کہ کہیں وہ مواصلاتی آلہ ان جوتوں میں ہی نصب نہ ہو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر جوتا اٹھایا تو جوری کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ خون آشام بلا کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے گی اور اس جھونپڑے میں ایک بار پھر وہی سنگین جدوجہد شروع ہو جائے گی جو کل رات اشوکا کے خیمہ نما جھونپڑے میں ہوئی تھی۔ میں نے ایک ساعت ضائع کیے بغیر پھرتی سے ریوالور نکال لیا اور جوری، جو مجھ سے جوتا چھیننے کے لیے حرکت میں آ چکی تھی ٹھٹک کر رہ گئی۔

"نہیں جوری ڈیئر۔" میں نے ریوالور اس کے سر کی طرف سیدھا کر لیا۔

اب شک کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ جوتوں میں کچھ نہ کچھ موجود تھا اور اگر موجود تھا تو پھر جوری کا ٹرسٹ سے تعلق سو فی صد یقینی تھا۔ میں نے دوسرا جوتا بھی اٹھا لیا، دونوں جوتوں کی ایڑی کو باری باری گھمایا۔ ایک ایڑی گھوم گئی۔ اس میں "ٹرانس میٹر" موجود تھا۔ جوری پتھر کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اشوکا بھی ششدر تھا۔ میں نے بڑے

اطمینان سے ریوالور دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور ٹرانس میٹر والا جوتا جوری کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر میری جانب دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا "جوری ڈیئر! کنگ براؤن سے یا جس سے بھی چاہے رابطہ کرو۔ میری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔"

میرے لہجے کے اعتماد نے اسے متاثر کیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ جھونپڑے کا در کھول کر اس نے باہر جھانکا اور اچھی طرح اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد اپنے لمبے تڑنگے وجود کو حرکت دیتی پھر میرے اور اشوکا کے پاس آبیٹھی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تمہارا کہنا ہے کہ تم کنگ کے مفاد میں کام کر رہے ہو مگر واقعات اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے یہاں بستی والوں کے کندھے سے کندھا ملا کر گارڈز کے خلاف لڑائی کی تھی۔"

"یہ سب کچھ تو تم بھی کر رہی ہو اور ہمیں تو ایسا کرنے کی تم سے زیادہ ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم لارسی نہیں ہیں۔ بستی والوں پر اپنا اعتماد بٹھانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا ضروری تھا۔ بلکہ اب بھی ضروری ہے۔"

"جنگل والے واقعے کے بارے میں تم کیا کہو گے۔ تم اٹھائیس کمانڈوز کو انچارج سمیت پکڑ کر بستی میں لے آئے تھے۔"

"وہ سب کچھ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ لارسی گھڑ سواروں نے نیلر کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ گھڑ سوار قریبی درختوں میں موجود ہیں اور ہماری ہر حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں اگر ہم کمانڈوز کے ساتھ رو رعایت کرتے تو فوراً مشکوک قرار پا جاتے۔"

"اگر تمہاری یہ بات درست مان بھی لی جائے تو بھی اٹھائیس کمانڈوز کے گرفتار ہو جانے سے ٹرسٹ کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ٹرسٹ ان افراد سے محروم ہوا ہے بلکہ نہایت قیمتی اسلحہ بھی سردار رانے کے ہاتھ آگیا ہے۔"

"تمہاری بات درست ہے لیکن ہم اس کا بھی سدباب کر سکتے ہیں۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ بیپ۔۔۔ بیپ۔۔۔ بیپ کی باریک آواز سنائی دی۔ یہ ٹرانس میٹر کی آواز تھی۔ جوری چونک کر اپنے جوتوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں ایڑی کو گھما کر ٹرانس میٹر آن کیا۔

میرے اعصاب تن گئے۔ ایک عرصے کے بعد شاید میں کنگ براؤن یا اس کے کسی مشیر سے ہم کلام ہونے جا رہا تھا۔ ٹرانس میٹر پر شور ابھرا۔ رابطہ صاف نہیں تھا۔ بیٹری بھی خاصی ڈاؤن لگتی تھی۔ کسی کی بہت مدھم اور ناقابلِ فہم آواز سنائی دی پھر وہ بھی دم توڑ گئی۔ جوری اپنے طور پر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ٹرانس میٹر استعمال کرنے میں اسے زیادہ مہارت حاصل نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ ٹرانس میٹر استعمال کرتی ہوئی خاصی مضحکہ خیز لگتی تھی۔ عجیب سا تصور ذہن میں ابھرتا تھا، جیسے کوئی بھینس موٹر سائیکل چلانے کی کوشش کر رہی ہو یا کوئی کوری ان پڑھ دیہاتن جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھی الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہو۔

اس نے فریکوئنسی کلیئر کرنے والی ناب کو بے تکے پن سے دو تین بار گھمایا۔ پھر انٹینا سے کھینچا تانی کرنے لگی۔ غالباً وہ از خود ٹرسٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ناکام ہوئی تو میں نے ٹرانس میٹر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اشوکا کی وساطت سے اسے بتایا کہ میں خود رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ نیم رضامند نظر آنے لگی۔

میں نے کوشش کی اور کمزور بیٹری کے باوجود رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے جو آواز ابھری وہ میرے جسم میں دوڑتی ہوئی سنسناہٹ میں بے تحاشا اضافہ کر گئی۔ وہ کنگ براؤن کی آواز تھی۔ ٹرسٹ کی زیرِ زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ بنفسِ نفیس لائن پر تھا "ہیلو۔ اسٹار اسپیکنگ!" جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اسٹار کنگ براؤن کا کوڈ نیم تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "گستاخی معاف جناب! میں بول رہا ہوں شاہ جہاں۔۔۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے میری آواز شناخت کر لی ہو گی۔"

دوسری جانب چند لمحے سناٹا رہا پھر کنگ براؤن کی حیرت زدہ آواز آئی "او شاہ جہاں کہاں تھے تم؟ ہم نے کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کروایا ہے۔ کہاں سے بول رہے ہو تم۔ اور جس کا یہ ٹرانس میٹر ہے وہ کہاں ہے؟"

"وہ میرے پاس ہی کھڑی ہے جناب۔" میں نے جوری کو اشارہ کیا۔

اس نے اپنا منہ ٹرانس میٹر سے قریب کیا اور نہایت مودب لہجے میں بولی "جناب! میں ونڈر عرض کر رہی ہوں۔"

"ونڈر" جوری کا کوڈ نیم تھا۔ جوری نے یہ فقرہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔

میں اور اشوکا دنگ رہ گئے۔ آج پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ یہ گرانڈیل جنگ جو عورت انگریزی سے بھی آشنا ہے۔ وہ

ابھی تھوڑی دیر پہلے تک بھی اشوکا کو مترجم بنا کر مجھ سے بات کر رہی تھی۔

صرف دو تین کلمات ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ادا کرنے کے بعد جوری نے ٹرانس میٹر پھر میری طرف بڑھا دیا "ہیلو شاہ جہاں!" کنگ نے کہا "ہم تم سے تمہارے حالات تفصیل سے سننا چاہتے ہیں اور بہت سے سوالات ہمارے ذہن میں کلبلا رہے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس مواصلاتی رابطے پر یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ تم ہمیں مختصراً بتا دو کہ تم اور تمہارا ساتھی مندر اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟"

"جناب! آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ مس ویرا کی شادی محترم بوکارلو نے زبردستی مندر کے ساتھ کرائی ہے۔ مندر بہت خوف زدہ ہے۔ آپ کی ناراضگی کا ڈر اسے ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔ وہ بالکل مجبور ہو گیا تھا جناب۔"

"ہمیں کچھ کچھ اندازہ تھا۔ بہرحال اس بارے میں تفصیل سے بات پھر ہو گی۔ ویرا اس وقت کہاں ہے؟"

"ویرا صاحبہ اس بستی میں نہیں ہیں جناب۔ ویسے وہ بالکل محفوظ ہیں۔ میں اس بارے میں آپ کو بالمشافہ بتاؤں گا۔"

"او کے۔ تم اس بستی میں کیونکر پہنچے ہو؟"

"جمیل زارے جو لارسی بھاگے تھے ان کے ساتھ ہی ہم بھی بستی سے نکل آئے تھے۔" میں نے گول مول جواب دیا "ٹرانس میٹر چھن جانے کے سبب ہم آپ سے رابطہ نہ کر سکے۔ آپ سے اس دوری نے ہمیں از حد پریشان رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔" کنگ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا "تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ بدبخت رانے اور اس کے گماشتوں نے ہمارے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔"

"جی۔۔۔ جی ہاں۔ ہم۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔ میری بدقسمت آنکھوں کو بہت کچھ دیکھنا پڑا ہے۔" میں نے اپنے لہجے کو سوگوار بنا لیا۔ یہ جان کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی تھی کہ کنگ براؤن اپنے بھائی کے قتل سے آگاہ ہو چکا ہے۔

"رانے اور اس کے ساتھیوں کو اب یادگار سبق سکھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔" کنگ کی گمبھیر آواز ابھری "اور یہ سبق آج ہی رات سکھایا جا رہا ہے۔ بلکہ ابھی چند گھنٹے میں۔ تمہیں ونڈر (جوری) نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے؟"

"جی۔۔۔ جی نہیں۔ ابھی نہیں۔" کنگ کے انکشافات نے مجھے چکرا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے 'ونڈر' سب کچھ جانتی ہے۔ وہ تمہیں ساری تفصیل بتا دیتی ہے۔ تم اور مندر صرف یہ کرو کہ کسی طرح۔۔۔"

اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر آواز بے حد مدھم ہو گئی، چند سیکنڈ بعد شور بڑھ گیا اور آواز بالکل ختم ہو گئی۔ کنگ براؤن کے ساتھ میری گفتگو ادھوری رہ گئی تھی اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ میں کنگ کے کئی مشکل سوالات کے جواب دینے سے بچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ جوری کے ساتھ کنگ کی دوبارہ بات نہیں ہو سکی تھی۔ عین ممکن تھا کہ دوبارہ بات ہوتی تو جوری اٹھائیس کمانڈوز کی گرفتاری یا ہماری بدلی ہوئی شکل و صورت کے حوالے سے کوئی بات کنگ کو بتاتی اور الجھن پیدا ہوتی۔

جوری کے ذہن میں اب اس حوالے سے کوئی شک شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں اور مندر ٹرسٹ کے لیے کام کر رہے ہیں۔

میں نے نئی بیڑی سلگائی تو میری آفر کے بغیر ہی جوری نے میرے ہاتھ سے لے لی۔ گہرا کش لے کر بولی "تم دونوں نے یہاں کچھ مشکوک کام کیے ہیں۔ اس کے باوجود میں اب یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ تم دونوں محترم کنگ کے لیے ہی کام کر رہے ہو۔"

"محترم کنگ کی گواہی کے بعد بھی اگر تم شک کر رہی ہو تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو۔" اس نے موضوع بدلا "تمہارا ساتھی تو یقیناً اس نقاب پوش لڑکی کے ساتھ لپٹ کر سو رہا ہو گا۔ ان دونوں میں پکا یارانہ ہے۔" (جوری کا اشارہ ریرا کی طرف تھا۔ وہ نقاب کے بغیر جھونپڑے سے نہیں نکلتی تھی)

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے جوری کی بات کا جواب دیا۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تم دونوں سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں اگر ممکن ہے تو اسے بھی یہاں بلا لو۔"

میں نے اشوکا کو اشارہ کیا۔ وہ مندر کو لینے چلا گیا۔ جوری کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ کوئی اہم انکشاف کرنے والی ہے۔ میری چھٹی حس مجھے آگاہ کرنے لگی کہ یقیناً آج ہی رات حملہ ہونے والا ہے۔ جوری نے سرخ شراب کا ایک جام بھر کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے شکریے کے ساتھ

انکار کردیا۔ ورغشاغٹ جام خالی کرگئی۔ میں نے پوچھا۔

"تم اکیلی ہو یا کوئی ساتھی بھی ہے؟"

"تم دونوں مل گئے ہو اب اکیلی کہاں ہوں۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

وہ بولی "چندرن پہلے اتنی سی بھنک تو مجھے بھی پڑی تھی کہ ٹرسٹ سے دو افراد بھیس بدل کر لارسیوں میں آئے ہیں' لیکن یہ خیال ذہن میں نہیں آیا کہ وہ تم دونوں ہی ہوگے۔"

"مگر تمہارے ذہن میں نہیں آیا تو پھر اور کسی کے ذہن میں کہاں آیا ہوگا۔"

جوری نے مجھ سے میرے اور صفدر کے بارے میں چند مزید سوالات پوچھے۔ اس کے علاوہ اس نے کنگ بارون بائیکل اور اسقی رغیرہ کے بارے میں کئی باتیں دریافت کیں۔ اگر ہم واقعی کنگ کی طرف سے یہاں نہ آئے ہوتے تو جوری کے سوالوں کے جواب دینا کافی مشکل تھا۔ یہ بظاہر اجڈ اور پہلوان نما عورت اندر سے خاصی جہاں دیدہ بھی تھی۔ زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ٹھیٹ لارسی ہونے کے باوجود بری بھلی انگریزی جانتی تھی۔ میں نے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔

"تم صوفیہ کو جانتے ہو؟"

"تھوڑا بہت۔"

"تھوڑا بہت نہیں' تم اس کے بارے میں زیادہ جانتے ہو۔ اس رات جب میں تھکاوٹ کی وجہ سے سوگئی تھی تو وہ شیلوگڑی جھونپڑے میں تمہارے ساتھ جاگتی رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے ساتھ لیٹی بھی ہو۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں تمہیں پوری سچائی سے بتا رہا ہوں۔"

ورنوبی پھوٹی انگلش میں بولی "خیر چھوڑو اس بات کو.... مجھے یہ جو تھوڑی بہت انگریزی آتی ہے' یہ صوفیہ کی وجہ سے ہے۔ ور ایک طویل عرصے میرے ساتھ رہی ہے۔ ور لڑاکی بھڑائی سیکھنے کی شوقین تھی' میں انگریزی کے ضروری لفظ سیکھنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی ضرورت پوری کی۔"

"ہاں اس کی لڑائی مارکٹائی کا تو میں بھی قائل ہوں۔ اس رات تمہارے جھونپڑے میں اس نے میری گردن توڑنے کی بڑی مخلصانہ کوشش کی تھی۔"

اسی دوران میں صفدر اور اشوکا پہنچ گئے۔ اشوکا سمجھ گیا تھا کہ اب یہاں اس کی ضرورت باقی نہیں۔ وہ خود ہی صفدر کو چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ جوری نے صفدر سے بھی چند سوال جواب کیے اور مطمئن ہوگئی۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "آج رات ٹھیک تین بجے بستی پر زبردست حملہ ہو رہا ہے۔ اس حملے میں پولیس کی بھاری جمیعت بھی شامل ہوگی۔"

میں اور صفدر سناٹے میں رہ گئے۔ تاہم اپنے چہروں کو ہم نے حتی الامکان اپنے دلی جذبات سے علیحدہ ہی رکھا۔ میں نے اپنے لہجے میں جوش سمیٹتے ہوئے کہا "بہت خوب۔ یہ ایک مناسب موقع پر بہت اچھا قدم ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن...." صفدر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" جوری نے پوچھا۔

"بستی کے گرد یہ کانٹے دار باڑ پھر سے رکاوٹ بنے گی۔"

"اس دفعہ نہیں بنے گی۔ ٹرسٹ والے اس باڑ کا انتظام کرکے ہی آرہے ہیں۔"

"کیسا انتظام؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ کوئی زبردست انتظام ہوگیا ہے۔" جوری کا لہجہ اندرونی جذبات سے لرزیدہ تھا۔

"پھر بھی یہ لوگ گارواز کو باڑ کی دوسری طرف روکنے کی سخت کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"سخت کوشش کے لیے زبردست سازو سامان ہونا ضروری ہے۔ خالی ہاتھ سخت کوشش نہیں ہوا کرتی۔"

"کیا مطلب؟ رانے اور اس کے ساتھیوں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ سب کچھ تو ہے ان کے پاس۔ انہوں نے ڈھیروں کے حساب سے مقامی طور پر گولا بارود تیار کر رکھا ہے اور اب تو بلٹ پروف جیکٹس اور جدید رائفلیں بھی آگئی ہیں ان کے پاس۔"

"سمجھو کہ وہ سب کچھ برباد ہوچکا ہے۔" جوری نے ڈرامائی انکشاف کیا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "بے شک بستی میں بہت سی رائفلیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جمیل زار سے بھاگ کر آنے والے بہت سے رائفل مین بھی یہاں موجود ہیں' لیکن یہ سب کچھ گولیوں (ایمونیشن) کے بغیر بیکار ہے اور ان لوگوں کا نوے فی صد ایمونیشن برباد ہوچکا ہے۔"

"برباد ہوچکا ہے؟ کیا مطلب؟"

اس کی موٹی گردن فخریہ انداز میں تن گئی "اسلحے کی ان ساری پیٹیوں پر "جولاک" ڈال دیا گیا ہے۔ جولاک کا نام

تمہارے لیے نیا ہوگا۔ یہ ایک نہایت تیز اثر تیزاب ہے اور یہ تیزاب مقامی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس تیزاب میں چھریا لوہے کی ڈلی پھینک دی جائے تو ور بھی چند گھنٹوں میں حل ہوجاتی ہے۔"

پھر اس نے جھونپڑے کے گوشے میں سے مٹی کا ایک برتن اٹھایا۔ نیچے دری بچھی ہوئی تھی اس نے دری اٹھائی تو ایک گڑھا نظر آیا۔ گڑھے میں ہاتھ ڈال کر اس نے جی تھری گن کی چند گولیاں نکالیں۔ ان گولیوں کا بیرونی خول تباہ ہوچکا تھا' یوں لگتا تھا جیسے مضبوط دھاتی چادر کو دیمک کھا گئی ہے اور سوراخ نظر آرہے ہیں۔ وہ اسرار بھرے انداز میں مسکرائی "وہاں جتنا بھی اسلحہ ہے' اس کا یہی حال ہوچکا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ اسلحہ سلامت بھی نظر آئے لیکن ور چلنے کے قابل نہیں ہے۔" وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔

میں اور صفدر سناٹے میں رہ گئے۔ کل بھی ایک رائفل مین نے شکایت کی تھی کہ اسے جو ایمونیشن فراہم کیا گیا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے اور گولیوں کے کئی اسٹیپ بالکل خراب ہیں۔... اس کا مطلب تھا کہ بستی کے محافظ بظاہر مسلح نظر آنے کے باوجود تقریباً نہتے تھے "کیا یہ سب تم نے کیا ہے؟" میں نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے فخریہ طریقے سے اثبات میں سر ہلایا اور بولی "اس کے علاوہ گرفتار شدہ کمانڈوز کو بھی تقریباً رہا ہی سمجھو۔"

"وہ کیسے؟"

"کمانڈوز کی نگرانی پر مامور دونوں پہرے دار میری مٹھی میں ہیں۔ انہوں نے کمانڈوز کے ہاتھوں کی بندشیں کھول دی ہیں' صرف دکھاوے کے لیے ان کے ہاتھوں پر رسیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ میرا اشارہ ملتے ہی پہرے دار کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیں گے اور کمانڈوز کو اسلحہ بھی فراہم کردیں گے۔"

"ونڈر فل۔" میں نے "خوش" ہوتے ہوئے کہا "تم نے تو لڑائی سے پہلے ہی آدھی سے زیادہ لڑائی جیت لی ہے۔"

"تعریف کا شکریہ۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"

"مثلاً کیا۔" میں نے چہرے پر خوشی کا تاثر برقرار رکھ کر پوچھا۔

"میں تمہارے ذمے دو تین چھوٹے چھوٹے کام لگاتی ہوں۔ تم وہ کردو' باقی باتیں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" اس نے توقف کرکے شراب کا ایک جام غٹاغٹ چڑھایا اور بولی "پہلا کام تو یہ ہے کہ سردار یوتمات کے نائب لارو ناب کا کام تمام کردو اور اسے مارنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ور جھونپڑے میں پڑا سورہا ہوگا۔ وہاں کوئی پہرے دار وغیرہ نہیں ہے۔ تم میں سے کوئی اندر گھس جائے اور خنجر وغیرہ سے اس کا قصہ پاک کردے۔ جھونپڑے میں لارو ناب کی بہن بھی ہوتی ہے' اگر وہ جاگ جائے تو بے شک اس کو بھی مار ڈالو۔ یہ کام بس دس پندرہ منٹ کے اندر ہوجانا چاہیے۔"

"ہوجائے گا۔" میں نے سینہ تان کر کہا "لیکن لارو ناب پر یہ خاص مہربانی کیوں ہورہی ہے؟"

"یہ شخص لڑائی کے میدان میں ہمارے لیے سخت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کی زبان بہت تیز ہے' اپنے نعروں اور للکاروں سے یہ شخص لشکریوں کے جسم میں آگ بھر دیتا ہے۔ جمیل زار میں بھی یہ شخص نہ ہوتا تو لارسی کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتے۔ سچ پوچھتے ہو تو یہ شخص لارسیوں کا دماغ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ کام ہوجائے گا' دوسرا کام کیا ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"کمانڈوز کی کوٹھڑی کے سامنے تین پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو کو تو میں نے اعتماد میں لے لیا ہے' مگر تیسرے کا مسئلہ ہے۔ وہ کسی طور قابو میں نہیں آرہا۔ اس کی بس ایک کمزوری کا پتا چلا ہے' وہ عورتوں کا شیدائی ہے۔ اس کے لیے ایک اچھی شکل کی نوجوان لڑکی کا انتظام کرنا ہے۔ کوئی رقم لے کر مان جائے' ویسے رضامند ہوجائے' یا زبردستی اٹھانی پڑے۔ یہ کام بھی ایک گھنٹے کے اندر اندر ہونا چاہیے۔ لڑکی کا انتظام ہوجائے تو تم میں سے کوئی ایک یہاں آکر مجھے اطلاع دے دے' باقی میں خود سنبھال لوں گی۔"

"تیسرا کام؟" صفدر نے پوچھا۔

"سرخ رنگ کے تھوڑے سے کپڑے کا انتظام کرنا ہے۔ اتنا کپڑا ہو کہ اس کی چار پانچ پگڑیاں بن سکیں۔ ایک پگڑی میں باندھوں گی۔ ایک ایک تم دونوں باندھنا۔ دو پگڑیاں مزید چاہئیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے دو ساتھی مزید اس بستی میں موجود ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"تم زود فہم ہو۔ واقعی ہمارے دو ساتھی اور یہاں موجود ہیں۔ لڑائی میں یہ پگڑیاں ہماری شناخت ہوں گی اور ہماری زندگی کی ضمانت بھی۔"

"لیکن سرخ کپڑا کہاں سے ملے گا۔"

"معبد میں جو پردے لٹکائے جاتے ہیں وہ سرخ ہوتے ہیں۔ بہت سے پرانے پردے بوما میں موجود ہوں گے' تم سردار رانے سے کہہ کر کوئی پرانا پردہ تبرک کے طور پر

حاصل کر سکتے ہو۔ لیکن یہ کام بھی ابھی ایک دو گھنٹے کے اندر ہو جانا چاہیے۔ ورنہ گھمسان کی لڑائی میں ہماری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ قسمت سے بچ گئے تو بچ گئے ورنہ سب کے ساتھ ہی لپیٹ جائیں گے۔"

"بہت خطرناک ارادے لگتے ہیں۔" میں نے جوری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"رانفے اور اس کے ساتھیوں نے خوفناک حماقت کی ہے۔ ابھی باس مائیکل کی موت کا غم تازہ تھا کہ انہوں نے مسٹر چین کو بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔ اب ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے وہ کم ہے۔"

"میرے خیال میں تو ایک ایک کو بھون ڈالنا چاہیے تاکہ دوسروں کے لیے مثال ہو۔" صفدر نے مخلصانہ تجویز پیش کی۔

جوری کے موٹے سیاہ ہونٹوں پر ایک انتہائی زہرناک مسکراہٹ ابھری اور غائب ہو گئی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر مہیب لہجے میں بولی "یہاں جو کچھ ہوگا وہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ ہے۔"

ہم دونوں سوالیہ نظروں سے اس کا درشت چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بولی "مجھے یقین ہے کہ بستی میں موجود کسی ایک مرد کو بھی کل صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ بستی کے ہر مرد کو قرار واقعی سزا دینے کے لیے موقع پر ہی قتل کر دیا جائے گا' جو ہتھیار پھینک دیں گے اور گرفتار ہوں گے ان کی موت زیادہ اذیت ناک ہوگی۔ انہیں درختوں سے باندھ کر زندہ جلا دیا جائے گا۔ جس طرح چین کو جلایا گیا۔ یہ بات مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلی ہے۔"

"یہ لوگ واقعی اس قابل ہیں۔" میں نے تائید کی۔

"لیکن میرے دماغ میں بار بار بات آ رہی ہے۔ کہیں یہ پھر رکاوٹ نہ بن جائے۔" صفدر نے کہا۔

"میں نے کہا ہے ناکہ اس کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔" جوری نے کہا "جہاں تک میرا اندازہ ہے' پولیس نے بلڈوزروں کا انتظام کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بلڈوزر پہلے سے بستی کے آس پاس پہنچ چکے ہوں۔"

جوری کے انکشافات لرزہ خیز تھے۔ اب تک بستی میں جو خاموشی نظر آ رہی تھی وہ واقعی طوفان سے پہلے کی خاموشی ثابت ہو رہی تھی۔ چین کی موت کا رد عمل اتنا ہی شدید ہوا تھا جتنا ہمیں اندیشہ تھا' بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

جوری نے گوشے سے دری نما چٹائی اٹھا کر گڑھے نے ایک رسٹ واچ نکالی اور وقت دیکھا' پھر بیڑی کا ایک گہرا کش لے کر بولی "میری رائے ہے کہ سب سے پہلے تم لڑکی کا انتظام ہی کرو۔ لڑکی پہرے دار کے جھونپڑے میں پہنچے گی تو وہ کمانڈوز کی کوٹھڑی کے سامنے سے ٹلے گا۔ اس کے بعد ہی ہم کچھ کر سکیں گے۔"

"مگر لڑکی ملے گی کہاں سے؟ وہ بھی ایسی جو فوری طور پر ایک اجنبی کے ساتھ شب بسری کو تیار ہو جائے۔"

"تمہاری حیثیت رانفے کے معزز مہمانوں کی سی ہے۔ تم اشارے سے بھی کہہ دو تو وہ فوراً تمہارے لیے انتظام کر دے گا۔"

"مگر ایسی پیشکش سے ہم بہت پہلے ہی انکار کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ جو نقاب پوش لڑکی رہ رہی ہے' وہ کس مزاج کی ہے؟" جوری نے پوچھا۔

صفدر کے جبڑے بھینچ گئے۔ جوری نے دیرا کی بات کی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو صفدر شاید اسے تھپڑ دے مارتا مگر اب ضبط کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے جوری سے کہا "وہ لڑکی صفدر کے ساتھ رہ رہی ہے اور اس مزاج کی نہیں ہے۔"

ایک دم جیسے جوری کے ذہن میں کوئی بات آ گئی۔ اس کی خوں خوار ریچھ جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بولی "ہمارے پاس وقت کم ہے' کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں۔ لاروناب کا قصہ تو تمام کرنا ہی ہے۔ اس کی بہن کو جھونپڑے کے اندر ہی باندھ کر ڈال دو۔ وہ کافی خوب صورت چھوکری ہے' میرا خیال ہے کہ پہرے دار جوام کی رال اس پر ضرور ٹپکے گی۔"

"مگر پہرے دار کو لڑکی تک پہنچائے گا کون؟"

"میں نے کہا ہے ناکہ یہ سب کام مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس کارروائی ڈال دو۔"

جوری سے ضروری "ہدایات" لے کر ہم جھونپڑے سے باہر آ گئے۔ یہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ایک نیم گرم صحرائی رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ مشعلوں کی روشنی میں لوگ خاموشی سے آ جا رہے تھے۔ گول جھونپڑوں سے باہر بچے گھوم رہے تھے۔ چولہے جل رہے تھے اور مرد و زن کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ چین کی موت کو اب سات آٹھ دن گزر چکے تھے اور شروع شروع میں لوگوں کے اعصاب پر جو تناؤ کی کیفیت تھی وہ اب بہت کم رہ گئی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مشرقی افق سے کیسی آندھی نمودار ہونے والی

ہے۔

"اب کیا ہوگا شاہ جہاں صاحب؟" صفدر نے چلتے چلتے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔"

"کنگ سے رحم کی توقع بیکار ہے۔ وہ صبح تک اس بستی کو یقیناً قبرستان بنا دے گا۔"

صفدر کی آواز میں اندیشوں کی لرزش تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ صفدر دلیروں کا کھلاڑی ہے۔ بے رحم موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا اس کے لیے کرکٹ یا ہاکی کھیلنے کی طرح دلچسپ تھا پھر آج اس کے لہجے میں اندیشے کیوں بولے تھے؟ اس کی وجہ بڑی جمال دیرا تھی۔ وہ صفدر کی محبت تھی' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے موت کے سایوں کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بستی کے سیکڑوں بے گناہ افراد کی دردناک موت کا تصور بھی اس کے دل کو دہلا رہا تھا۔ جوری کے جھونپڑے سے پچاس ساٹھ گز آگے ہمیں اشوکا مل گیا ہم نے اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔

ہم بوما کے قریب واقع اس طویل کوٹھڑی کے پاس سے گزرے جہاں کمانڈوز کو قید رکھا گیا تھا۔ زہریلی برچھیاں لیے دو پہرے دار بڑی چوکسی سے نگرانی کر رہے تھے۔ گھنی مونچھوں اور لمبے قد کا ایک جواں سال حبشی کچھ دور کھلے آسمان تلے چٹائی پر بیٹھا قہوہ پی رہا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ جوری نے اسی شخص کو عورتوں کا بھوکا قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ خوب صورت عورت کے لالچ کے سوا اس شخص پر کوئی اور دباؤ یا لالچ قطعاً کام نہیں کرتا۔ ہم تیزی سے سردار رانفے کے وسیع و عریض جھونپڑے پر پہنچے۔ دروازے پر دو مسلح پہرے دار موجود تھے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتے تھے پھر بھی مقامی ضابطے کے مطابق ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیں روک کر "آنے کا مقصد" وغیرہ پوچھیں۔ ہمارے پاس ان سوال و جواب کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ دونوں پہرے داروں کو تقریباً دھکیلتے ہوئے ہم جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔

اندر سردار رانفے اپنی ایک جواں سال بیوی کو آغوش میں لیے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر سیاہ فام لڑکی تڑپ کر اٹھی اور ہمیں نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہوئی جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ سردار رانفے بھی جلدی سے کھڑا ہو گیا اس کے ہاتھوں سے سرخ شراب کا جام گرتے گرتے بچا تھا۔ رانفے غالباً اس بات کا جشن منانے میں مصروف تھا کہ اس نے اور اس کے قبیلے نے کنگ کے بھائی کو ہلاک کر کے سردار بوماٹ کے قتل کا انتقام لے لیا ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس انتقام کے بعد کا امن و سکون عارضی ہے۔

"کیا بات ہے معزز مہمانو! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" رانفے نے کہا۔

میں نے اشوکا کی وساطت سے جواب دیا "ہم "کچھ" نہیں بہت زیادہ پریشان ہیں۔"

"کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟" اشوکا کے ذریعے رانفے نے پوچھا۔

"پرانی بات کیا کم ہے' جو نئی کی توقع کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"سردار رانفے تم نے کنگ براؤن کے بھائی کو قتل کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کا خمیازہ تمہارے علاوہ پورے قبیلے کو بھگتنا پڑے گا۔ آج رات کسی بھی وقت کنگ براؤن مقامی انتظامیہ کے ساتھ مل کر اس بستی پر خوفناک حملہ کرنے والا ہے۔ وہ لوگ یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں' دیوتاؤں کی مدد اور آپ لوگوں کے تعاون سے ہم ایک بار پھر انہیں مار بھگائیں گے۔"

"دشمن کو مار بھگانے کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ طاقت دو طرح سے آتی ہے' ایک تو لڑنے والے کا حوصلہ اور دوسرے ہتھیار۔ حوصلہ تو بے شک تمہاری تقریروں نے لوگوں میں بھر رکھا ہے اور وہ کٹ مرنے کو تیار ہیں مگر ہتھیار ان کے پاس نہیں ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بستی میں کنگ براؤن کے کم از کم تین ایجنٹ موجود ہیں۔ ان لوگوں نے یہاں موجود رائفلوں کا زیادہ تر ایمونیشن تباہ کر دیا ہے۔ اب یہ رائفلیں لاٹھیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کے علاوہ تمہارا مقامی طور پر تیار کیا گیا گولا بارود بھی برباد ہو چکا ہے۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سردار رانفے بوکھلاہٹ میں ایمونیشن کے گودام کی طرف لپکا۔

میں نے بازو سے پکڑ کر اسے روک لیا "سردار! میں تم سے کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں اگر تم چاہو تو کسی ذمے دار کارندے کو بھیج کر میری بات کی تصدیق کرا سکتے ہو۔ بہرحال تم اس وقت ہمارے ساتھ یہاں موجود رہو کیونکہ یہ ایک ایک سیکنڈ قیمتی ہے۔"

سردار رانفے کا نشہ ہرن ہو گیا تھا اور رنگ پھیکا پڑ گیا

تھا۔ اس نے حلق سے عجیب سی آواز نکال کر ایک پہرے دار کو اندر بلایا اور مقامی زبان میں اسے کچھ ہدایات دیں۔ یقیناً یہی کہا تھا کہ وہ ایمونیشن کی صورتِ حال دیکھ کر آئے۔

میں نے اشوکا کے ذریعے رافے کو بتایا کہ آج رات کسی وقت بستی پر بھرپور حملہ ہونے والا ہے اور اس حملے کے سامنے ہماری باڑ کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوگی کیونکہ وہ لوگ باڑ اور بستی کو تہس نہس کرنے کے لیے کئی بلڈوزرز ساتھ لا رہے ہیں۔

"بچاؤ کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" رافے نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"بچاؤ کی صورت تو تم نے خود ختم کی ہے اگر اس وقت سگ کا بھائی زندہ ہوتا تو سگ کی مجال نہیں تھی کہ وہ بستی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ اسی وقت کے لیے صحرائی درویش (سائیں عالی) نے تمہیں چین کو قتل کرنے سے منع کیا تھا۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی وہ پہرے دار واپس آگیا جسے تھوڑی دیر پہلے سردار رافے نے میری اطلاع کی تصدیق کے لیے بھیجا تھا۔ پہرے دار کے ساتھ بستی کے دو سفید ریش افراد بھی تھے۔ پہرے دار کی طرح ان کے رنگ بھی اڑے ہوئے تھے۔ ایک سفید ریش کے ہاتھ میں خودکار رائفل کی چند گولیاں تھیں۔ ان گولیوں کا بھی وہی حشر تھا جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ ان کے اندر سے "ٹی این ٹی" ریت کی طرح گر رہا تھا۔

سردار رافے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اشوکا کے ذریعے مجھ سے پوچھا "کس نے کی ہے یہ غداری؟ اور آپ کو کیسے معلوم ہوا اس کے بارے میں؟"

"میں نے اس کے بارے میں بتا دیا تو تمہارے لوگوں سے جوش میں پھر کوئی حماقت ہو جائے گی۔ ابھی اس بارے میں خاموش رہیں تو بہتر ہے۔"

"اب خاموش رہنے سے کیا فائدہ ہوگا؟" رافے نے پوچھا۔

"کم از کم ایک فائدہ تو ہوگا۔ بستی میں کم از کم دو کالی بھیڑیں اور موجود ہیں۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور ہمیں کتنا مزید نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان کا پتا چلنے تک ہمیں سخت محتاط رہنا ہوگا۔"

سردار رافے نے مہوب لہجے میں کہا "آپ لوگوں نے جو کالی بھیڑ پکڑی ہے اس سے کیوں نہیں اگلوا لیتے۔ نائب سردار لارو نامہ ایسے معاملوں میں ماہر ہے۔ وہ ڈھیٹ سے ڈھیٹ بندے کی زبان کھلوا سکتا ہے۔"

"جس طرح تشدد کی حد نہیں ہوتی اس طرح امید کی بھی حد نہیں ہوتی۔ ہمیں ابھی یہ رسک نہیں لینا چاہیے۔" میں نے کہا "فی الحال تم تین کام کرو۔ دو گز سرخ کپڑا ہمیں مہیا کرو۔ ایک لڑکی کا انتظام کرو جو مجھ کے لیے تمہارے ایک پہرے دار کا دل بہلانے پر آمادہ ہو اور تیسرا کام سب سے اہم ہے۔ نائب سردار لارو نامہ کو کچھ دیر کے لیے روپوش کرنا ہوگا۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ کیا آپ تفصیل بتانا پسند کریں گے؟" رافے نے کہا۔

میں نے اسے تمام تفصیل بتا دی۔ وہ تفہیمی انداز میں ہلاتا رہا۔ زیادہ تر باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ یہ جان کر سردار کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا تھا کہ ٹرسٹ کے ایجنٹ نے اپنے گرفتار شدہ کمانڈوز کی رہائی کا انتظام کر لیا ہے۔

لڑکی والی فرمائش بھی سردار رافے کو الجھن میں ڈال رہی تھی۔ جب میں نے اسے پہرے دار کی نشان دہی کی جس کے لیے لڑکی کی ضرورت تھی تو رافے کی الجھن قدرے کم ہوئی۔ اس نے مجھ سے چند مزید سوال و جواب کیے۔ آخر رافے نے کہا "ٹھیک ہے میں جوزام کے لیے لڑکی کا انتظام کرتا ہوں۔"

"جوزام کون ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"وہی پہرے دار جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔ جوزام اس شخص کا نام نہیں بلکہ ذات ہے۔ جوزام دراصل لارسیوں ہی کی ایک نسل ہے۔ جوزام لوگوں کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ دراصل سانپ ہیں جو انسانی روپ میں جنم لیتے ہیں۔ جوزام نسل کے مرد کی شادی جوزام عورت سے ہی ہو سکتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں لڑکیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور جو ہوتی ہیں ان میں سے بھی اکثر کچھ فرسودہ اور بے ہودہ رسموں کی وجہ سے دودھ کی عمر میں ہی مر جاتی ہیں۔ جوزام مرد اکثر غیر شادی شدہ رہتے ہیں اور عورت کی کمی محسوس کرتے رہتے ہیں۔ وہ عورتیں جو "جوزام" نہیں ہوتیں جوزام مردوں سے جسمانی تعلق قائم کرتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ عورتوں میں یہ وہم پایا جاتا ہے کہ جوزام مرد کیونکہ اصل میں سانپ ہوتے ہیں لہٰذا وہ جس عورت سے تعلق قائم کرتے ہیں وہ مر جاتی ہے۔"

جوزام کے بارے میں سردار نے مختصراً جو کچھ بتایا اس سے صورتِ حال واضح ہو گئی تھی اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ جوری کے لیے انچارج پہرے دار کے واسطے لڑکی ڈھونڈنا اتنا مشکل کیوں ہو رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور صفدر بڑی احتیاط سے واپس جوری کے پاس پہنچے۔ جوری نے جھونپڑے کا دروازہ کافی تاخیر سے کھولا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ٹرانس منزڈ ٹرسٹ سے رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کے دیوہیکل سیاہ چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ میں نے جوری کو ڈرامائی لہجے میں بتایا کہ اس کے تینوں کام ہو گئے ہیں اور سرخ کپڑا ایک تھیلے میں سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"لارو نامہ ختم ہو گیا؟" جوری نے پوچھا۔

"ہاں اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہے اور لاش جھونپڑے کے اندر ہی صندوق میں بند کر دی ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔"

"اور اس کی بہن؟" جوری نے پوچھا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"اسے بھی خبر نہیں ہوئی۔ وہ جھونپڑے کے دوسرے حصے میں بے سُدھ پڑی ہوئی ہے۔"

"کیا لڑکی کا انتظام ہو گیا؟"

"لڑکی کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں نے سردار رافے سے کہا تھا اس نے ایک لڑکی فراہم کر دی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے جھونپڑے میں موجود ہے۔ وہ ہمارے ہر حکم کی تعمیل کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہمارے پاس وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ تم اس کپڑے کو پانچ پگڑیوں کی صورت میں پھاڑ لو۔ میں تمہیں تمہارے باقی دو ساتھیوں سے ملاتی ہوں۔"

اس نے ہمیں جھونپڑے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کی ہدایت کی اور خود باہر نکل گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ جھیل زار سے تعلق رکھنے والے دو بڑے کٹے لارسی تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہم نے تحمل سے کام لیا ہے اور کالی بھیڑوں کی صورت دیکھ لی ہے۔ دوسری صورت میں یہ کالی بھیڑیں سخت نقصان کر سکتی تھیں۔ ان دونوں کو اشوکا نے بہترین رائفلیں مہیا کی ہوئی تھیں اور صفدر نے انہیں اہم ترین دفاعی پوزیشنوں پر متعین کیا ہوا تھا۔ گھمسان کی لڑائی میں یہ بکے ہوئے لارسی اپنے ہی بھائی بندوں کا زبردست نقصان کر سکتے تھے۔

یہ دونوں افراد مجھے اور صفدر کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ ہم نے بھی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں نے بیک وقت اپنے ریوالور نکال کر جوری اور اس کے دونوں ساتھیوں کو نشانے پر لے لیا۔ جوری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دونوں رائفل بردار بھی سکتے میں تھے پھر اچانک جوری نے اپنی جگہ سے اچھل کر مجھے دبوچنا چاہا۔ بھاری بھرکم ہونے کے باوجود وہ پھرتیلی تھی مگر اتنی بھی نہیں تھی کہ میں اپنا بچاؤ نہ کر سکتا۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور وہ مجھے بس ہلکا سا چھو کر اوندھے منہ زمین پر گر گئی۔ یوں لگا جیسے کسی مکان کی چھت زمین بوس ہو گئی ہو۔ میں نے اس کی ٹانگ پر فائر کیا اور وہ چیخ کر وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ صفدر میرا سونی صد درست پارٹنر تھا۔ اس نے اس ہنگامے کو یکسر نظرانداز کیا تھا اور اپنی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی دونوں رائفل برداروں سے نہیں ہٹائی تھی۔

فائر کی آواز نے جھونپڑے سے باہر ہلچل مچا دی تھی۔ چند ہی لمحے بعد تین پہرے دار اندر گھس آئے۔ اس کے فوراً بعد اشوکا اور سردار رافے وغیرہ بھی اندر چلے آئے۔ رافے کو دیکھ کر دونوں رائفل بردار لارسیوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے تھے۔ میں نے اشوکا کے ذریعے رافے کو بتایا کہ یہی وہ دو غدار ہیں جن کی تلاش تھی۔

رافے نے کھا جانے والی نظروں سے دونوں رائفل برداروں کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہ دوبارہ جوری پر جم گئی۔

"جوری کو کس نے زخمی کیا؟" رافے نے پوچھا۔

"میں نے کیا ہے۔" میں نے ریوالور کی نال میں پھونک مارتے ہوئے کہا "یہ ٹرسٹ کی تیسری ایجنٹ ہے۔ بلکہ اسے پہلا کہنا چاہیے۔ کیونکہ یہی سرغنہ ہے۔"

"جوری.... یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" رافے نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے جوری کو مخاطب کیا۔

وہ فرش پر پڑی جی بک بک کرنے لگی۔ غالباً اپنی صفائی پیش کرنے کی بھونڈی کوشش کر رہی تھی۔ صفدر نے اس کا چرمی جوتا اٹھایا اور ایڑی گھما کر ٹرانس منزڈ رافے کے سامنے کر دیا پھر گوشے سے چٹائی ہٹا کر گڑھے میں ہاتھ ڈالا اور بے جلد شدہ گولیاں اور دیگر سامان سردار کے سامنے رکھ دیا۔ سردار رافے کے اشارے پر اس کے چوکس پہرے داروں نے ٹرسٹ کے دونوں ایجنٹوں سے رائفلیں چھین لیں۔ سردار رافے کا پارا آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے نفرت سے جوری پر تھوکا اور پھر دونوں رائفل بردار لارسیوں پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ میں نے آگے بڑھ کر سردار رافے کا ہاتھ روکا۔ میرے اشارے پر سردار کے مسلح محافظ آگے بڑھے اور انہوں نے جوری سمیت تینوں افراد کی مشکیں اچھی طرح کس کے انہیں اوندھے منہ جھونپڑے کے فرش پر ڈال دیا۔ جوری خاموش تھی لیکن باقی دونوں افراد چیخ و پکار کر رہے

تھے۔ ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سردار رانے سے رحم کی درخواستیں کر رہے ہیں۔

ان تینوں کو سردار کے ذاتی محافظوں کی نگرانی میں دینے کے بعد ہم اس طویل کوٹھڑی پر پہنچے جہاں ٹرسٹ کے انتہائی اہم عدد نہایت خطرناک کمانڈوز بند تھے۔ کوٹھڑی کے آہنی دروازے پر دیوہیکل قفل پڑا ہوا تھا اور باہر زہریلے نیزوں سے مسلح تین پہرے دار موجود تھے لیکن یہ تینوں تھکے ہوئے تھے۔ ان تینوں کو خاموشی سے گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں جوذام بھی شامل تھا۔ اس کے پاس زہریلے نیزے کے علاوہ چھوٹی نال کی خودکار رائفل بھی موجود تھی۔ جوذام نے تھوڑی سی مزاحمت کی مگر اس کے جبڑے پر پڑنے والے صفدر کے ایک ہی زوردار مکے نے اس کا دم ختم کر دیا۔

سردار رانے نے کوٹھڑی سے باہر موجود پہرے داروں کی تعداد تین گنا کر دی۔ ان پہرے داروں میں تین رائفل بردار شامل تھے۔ پہرے داروں کو بتا دیا گیا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کسی صورت میں نہ کھولا جائے اور اگر قیدیوں کی طرف سے کوئی گڑبڑ ہو تو بغیر رعایت کے گولی چلا دی جائے۔

اسی دوران میں دو گھڑ سوار موقع پر پہنچے۔ مشعلوں کی روشنی میں گھوڑے اور گھڑ سوار پسینے میں تر نظر آ رہے تھے۔ دونوں گھڑ سواروں نے نیچے اتر کر پہلے سردار رانے کو تعظیم پیش کی، پھر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگے۔

گفتگو سے فارغ ہو کر سردار ہماری طرف آیا۔ اس نے بتایا کہ ہماری اطلاع بالکل درست ہے۔ موگاسا سے تقریباً تین میل دور گھنے درختوں میں چار عدد بڑے بلڈوزرز اور پولیس کی تین جیپیں موجود ہیں۔ گھڑ سواروں نے اس کے علاوہ بھی گاڑیوں کی آمد و رفت نوٹ کی تھی۔ سردار رانے نے فوری طور پر قبیلے کے معززین کو مشورے کے لیے طلب کر لیا۔ یہ مشورہ بوما میں ہونا تھا۔ سردار بوما کی طرف چلا گیا تو ہم اپنے جھونپڑے میں آ گئے۔

اب رات کے بارہ بجنے والے تھے، ویرا جھونپڑے میں موجود تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ بستی کے باہر لوگوں میں کیا ہلچل مچی ہوئی ہے۔ فائر کی آواز تو اس نے بھی سنی تھی مگر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے ہوائی فائر کیا ہے۔ اس نے بڑی خوب صورت پھول دار قمیص پہن رکھی تھی۔ بال بڑے سلیقے سے کنگھی کیے گئے تھے۔ کانوں میں نقرئی بندے دمک رہے تھے۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا پھر بھی دو نوبیاہتا ہی نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بے چینی سے صفدر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ آج کی رات پچھلی راتوں سے بہت مختلف ہے۔ اس رات محبوب کے ہونٹوں کے نہیں موت کے سائے تھے۔ یہ رات ایک بدقسمت پرندے کی طرح صحرا کی ٹہنی پر بیٹھی تھی اور اجل کا سانپ اسے نگلنے کے لیے خاموشی سے سرک رہا تھا۔

"کیا کوئی پریشانی ہے؟" وہ میرا اور صفدر کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں حملے کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔" صفدر نے کہا۔

ویرا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں اور صفدر باتیں کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے ویرا کو بھی سب کچھ معلوم ہو گیا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں تفکر صاف بڑھتا جا رہا تھا۔ تفکر اپنے لیے نہیں بستی اور علاقے کے مفلوک الحال لوگوں کے لیے تھا۔ ان کے دکھوں نے رات ویرا کو پریشان رکھے تھے اور وہ جانتی تھی کہ بدامنی سو دکھوں کا ایک دکھ ہے۔

اچانک ویرا کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ وہ ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے بولی "آپ کا خیال ہے کہ اگر چچا چین کی جان نہ لی جاتی تو اس وقت ٹرسٹ کے گارڈز کو بستی پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو انہیں روکا جا سکتا تھا۔ آپ کا یہ خیال بہت حد تک درست ہے اور اسی خیال کی وجہ سے میرے ذہن میں بھی ایک خیال آ رہا ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور بولی "بستی والوں کو جو فائدہ چچا چین کی وجہ سے پہنچ سکتا تھا میرا خیال ہے کہ وہی میری وجہ سے بھی پہنچ سکتا ہے۔ چچا براؤن کو معلوم نہیں کہ میں اس وقت بستی میں موجود ہوں۔ اگر اس بات کا اعلان کر دیا جائے اور چچا براؤن کو ثبوت بھی دے دیا جائے کہ میں بستی میں ہوں تو مجھے یقین ہے کہ بستی پر فوری حملے کا خطرہ ٹل جائے گا۔"

میں اور صفدر چونک کر ایک دوجے کو دیکھنے لگے۔ ویرا کی بات میں وزن تھا۔ افراتفری میں اس پہلو کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ویرا سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی اور صفدر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بیزاری سلگاتے ہوئے کہا "ویرا! تمہارا تجزیہ تو درست ہے، لیکن یہ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے کہ ہم تمہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کریں۔ اگر تم......"

"پلیز شاہ جہاں صاحب۔" ویرا نے میری بات قطع کی "آپ پریکٹیکل آدمی ہیں، پریکٹیکل انداز میں سوچیں۔ اس وقت ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ بستی پر فوری اور تباہ کن حملے کا خطرہ ٹل جائے۔ اس وقت اس کے سوا اور کوئی راستہ

نہیں کہ آپ بستی میں میری موجودگی کا اعلان کر دیں۔ بلکہ آپ کو یہ کرنا پڑے گا اگر آپ... نہیں کریں گے تو میں اپنے طور پر کوئی قدم اٹھاؤں گی۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے ویرا کا لہجہ دو ٹوک ہو گیا تھا۔

ویرا سو فی صد درست بات کہہ رہی تھی۔ میں اور صفدر جھونپڑے سے باہر آ گئے اور مشورہ کرنے لگے۔ خوفناک حملے کو فوری طور پر روکنے کا یہ ایک بہت مناسب سا راستہ تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹرانس میٹر پر کنگ براؤن سے میری بات ہوئی تھی تو اس نے بستی میں ویرا کی موجودگی کے بارے میں بہت کرید کرید کر پوچھا تھا۔ یقیناً ویرا کی سلامتی اور واپسی اسے اب بھی عزیز تھی اگر کسی طرح کنگ براؤن تک یہ اطلاع پہنچ جاتی کہ ویرا بستی میں موجود ہے اور لارسیوں کی دسترس میں ہے تو کنگ براؤن بے رحمانہ حملے سے باز رہ سکتا تھا..... مگر کنگ تک یہ اطلاع پہنچتی کس طرح؟ جوری کے پاس جو ٹرانس میٹر تھا وہ بیٹری ڈاؤن ہونے سے تقریباً بیکار ہو چکا تھا اگر کوئی شخص خود یہ اطلاع لے کر ٹرسٹ پہنچتا تو اس میں بہت تاخیر ہو جاتی۔ گزرنے والے وقت کا ہر ہر لمحہ قیمتی تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ جوری کے علاوہ بھی تو ٹرسٹ کے دو ایجنٹ ہم نے پکڑے تھے، ممکن تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس رابطے کا ذریعہ موجود ہو۔ عین اسی وقت صفدر کے ذہن میں بھی یہی بات آئی۔ شاید اسی کو ٹیلی پیتھی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! جوری والا ٹرانس میٹر تو اب بیکار ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ ایک آدھ اور ٹرانس میٹر بھی یہاں موجود ہو گا۔"

ہم دونوں اس جھونپڑے میں پہنچے جہاں جوری اور باقی دو افراد کو مشکیں کس کر ڈالا گیا تھا۔ اس وقت جھونپڑا عقوبت خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سردار رانے کا سگا بھائی اولام خود یہاں موجود تھا اور اس کی نگرانی میں جوری اور اس کے ساتھیوں کی زبان کھلوانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دونوں لمبے تڑنگے حبشی تشدد کے نتیجے میں بچوں کی طرح رو رہے تھے اور دہائی دے رہے تھے کہ انہوں نے جو کچھ بتا دیا ہے اس کے سوا انہیں کچھ معلوم نہیں۔ وہ دونوں نیم عریاں تھے اور انہیں سخت چمڑے کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے ذریعے مارا گیا تھا۔ کئی جگہ سے ان کی کھال ادھڑ چکی تھی اور وہ واقعی اسی قابل تھے۔ انہوں نے اپنے مظلوم بھائی بندوں کے بجائے جابر کنگ براؤن کا ساتھ دیا تھا اور ان لوگوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا جو قبیلے کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری چلائی ہوئی گولی جوری کی ران کے نچلے حصے میں لگی تھی اور وہاں سے خون بہہ بہہ کر اس کی پوری ٹانگ کو بھگو رہا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اولام اسی زخم کو استعمال کر رہا تھا۔ اس کے اشارے پر ایک محافظ نے تیر کی انی جوری کے زخم میں چبھوئی تو جوری کے حلق سے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی۔ محافظ نے تیر کی انی کا دباؤ برقرار رکھا۔ جوری بری طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کا جسم گوشت کا پہاڑ تھا اور یہ پہاڑ زلزلے کی زد میں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کچھ عرصے پہلے کا وہ منظر آ گیا جب جھیل زار کی بستی میں جوری نے شہ زوری کا مظاہرہ کر کے مجھے ایک مقابلے میں جیتا تھا اور پھر مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گئی تھی۔ وہاں اس نے نشے میں بدمست ہو کر ایک وحشیانہ رقص کیا تھا۔ اس کے پہاڑ سے جسم نے جھونپڑے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کافی دن گزر جانے کے باوجود مجھے وہ رقص یاد تھا۔ آج اس رقص کے سارے بھاؤ تاؤ میرے ذہن میں تازہ ہو گئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بدمستی کا رقص تھا اور یہ رقص بسمل تھا۔

بری طرح تڑپنے پھڑکنے کے باوجود جوری نے زبان سے ایک لفظ بول کر نہیں دیا۔ اس کے حوالے سے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ وہ ایک نہایت ڈھیٹ اور غیر معمولی حد تک سخت جان عورت ہے۔ شاید اس کا کوڈ نیم "ونڈر" اسی حوالے سے رکھا گیا تھا۔ میں نے اشوکا کے ذریعے اولام سے پوچھا کہ جوری کے علاوہ کسی کے پاس ٹرانس میٹر وغیرہ ہے۔

اولام کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے کہا "میں نے پوری تفتیش کی ہے۔ رابطے کا آلہ صرف جوری کے پاس تھا اور وہ بھی اب کام کا نہیں رہا ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

اولام نے اشارہ کیا اور ایک محافظ جوری کا بھاری بھرکم جوتا اٹھا لایا۔

میں اور صفدر ساتھ والے جھونپڑے میں چلے گئے اور ٹرانس میٹر کو استعمال میں لانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ بستی ہی کا کوئی شخص فوری طور پر ایلچی کی حیثیت سے ان بلڈوزروں تک پہنچے جو ٹرسٹ والوں نے بستی کے نواح میں کھڑے کیے تھے۔ وہاں پہنچ کر وہ شخص کسی ذمے دار بندے کو ویرا کی موجودگی کی اطلاع دے۔

صفدر نے کہا "کیوں نہ اس سلسلے میں جوری کے ساتھیوں میں سے ہی کسی کو بھیجا جائے۔"

"تمہاری تجویز تو ٹھیک ہے لیکن ان پاگلوں نے جوش میں آکر دونوں کو بری طرح مارا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ جا بھی سکیں گے یا نہیں۔"

ہم نے دوسرے جھونپڑے میں پہنچ کر جوری کے ساتھیوں کی حالتِ زار دیکھی۔ وہ قریباً نیم بے ہوش پڑے تھے پھر انہیں بھیجنے میں ایک اور خطرہ بھی تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ وہ ہماری اطلاع ٹرسٹ والوں تک پہنچائیں گے۔ کیا پتا کہ وہ راستے میں ہی کہیں سسک جاتے۔

میں نے باہر آکر صفدر سے مشورہ کیا۔ اس مشورے کے نتیجے میں یہ فیصلہ ہوا کہ معاملے کی بے پناہ نزاکت کے پیش نظر میں یہ اطلاع خود لے کر گارڈز کے کیمپ کی طرف جاؤں گا۔ گارڈز کے کیمپ سے میری مراد وہ جگہ تھی جہاں بلڈوزر وغیرہ دیکھے گئے تھے۔ میں نے سردار رانفے اس کے بھائی اولام، لارڈ نابے اور دیگر معززین سے بات کرنے کے لیے بُوما (عبادت گاہ) کا رخ کیا۔ وہاں ہنگامی میٹنگ عروج پر تھی۔ معززین کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سب چہرے حالات کی سنگینی کے پیش نظر تمتمائے ہوئے تھے۔ میرے دخل در معقولات پر سب چونک گئے۔

میں نے اشوکا کے ذریعے سردار رانفے سے کہا "میں آپ سے ایک اہم اور فوری نوعیت کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ میری دخل اندازی کو نظرانداز کیا جائے گا۔"

سردار رانفے نے کہا "کیا آپ کی بات مجھے علیحدگی میں سننا ہوگی۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں یہ بات سب کے سامنے بھی کرلی جائے تو کوئی حرج نہیں۔"

"ہم ہمہ تن گوش ہیں۔" رانفے نے مجھے اپنے قریب جگہ دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "قبیلے کے محترم بزرگو! میں وقت کی نزاکت کو سمجھتا ہوں۔ ہم سب اس وقت ایک سنگین خطرے سے دوچار ہیں اور بچاؤ کے لیے صلاح مشورہ کررہے ہیں۔ چین کو قتل کرکے دراصل ہم نے اپنا ایک بہت اہم مُہرا ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ لیکن اب میرے پاس آپ کے لیے ایک اچھی خبر موجود ہے۔" میں نے ایک لمحے توقف کرکے حاضرین کے متجسس چہروں کا جائزہ لیا اور کہا "کنگ براؤن کی بھتیجی دیرا اس وقت ہمارے درمیان یہاں موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی موجودگی کا اعلان کرکے ہم ٹرسٹ کے گارڈز اور پولیس کو بستی پر حملہ کرنے سے روک سکتے ہیں۔"

میرے اس اعلان نے مایوس اور پریشان چہروں پر زندگی کی رمق دوڑا دی۔ سردار رانفے نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ پورے یقین سے کہہ رہے ہیں کہ کنگ کی بھتیجی یہاں موجود ہیں؟"

"اگر مجھے سو فی صد یقین نہ ہوتا تو آپ سب کے سامنے یہ اعلان نہ کرتا۔ دیرا پچھلے کئی دن سے ہمارے ساتھ جھونپڑے میں موجود ہیں۔ میں نے ایک بہن کی حیثیت سے انہیں اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"وہ نقاب پوش لڑکی جو ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ دراصل دیرا ہے۔ اور اب دیرا کا تقاضا ہے کہ "ٹرسٹ" کو اس کی یہاں موجودگی کی اطلاع دی جائے اور بستی پر حملے سے روکا جائے۔"

حاضرین پر سناٹا چھا گیا پھر دھیمی آواز میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ رانفے اور لارڈ نابے کی جانب سے مجھ سے چند سوال پوچھے گئے جن کے میں نے مختصر لیکن جامع جواب دیے اور آخر میں یہ بھی بتایا کہ ایلچی کی حیثیت سے میں خود "ٹرسٹ والوں" کی طرف جارہا ہوں۔

قریباً دس پندرہ منٹ کے اندر اندر یہ سارا معاملہ طے ہوگیا۔ معززین نے متفقہ طور پر کہہ دیا کہ "صحراتی درویش" کا نمائندہ ہمارے ایلچی کی حیثیت سے ٹرسٹیوں کی طرف چلا جائے۔

میں نے اپنے ساتھ صرف ایک لارسی کو لیا۔ یہ ان گھڑ سواروں میں سے ایک تھا جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے بستی کے نواح میں بلڈوزر اور جیپیں وغیرہ دیکھی تھیں۔ یہ لارسی یوں تو کافی صحت مند تھا مگر زبان سے معذور تھا۔ اس کا نام اوبے تھا۔ سفید کپڑا دنیا کے تقریباً ہر خطے میں امن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس سفید کپڑے کے دو جھنڈے بنائے' دو تازہ دم گھوڑے لیے اور جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ دیرا کی جوتی اور ایک انگوٹھی ہم نے نشانی کے طور پر ساتھ لے لی۔

اب رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ فضا میں طوفان سے پہلے کا حبس موجود تھا لیکن رات بہت زیادہ گرم نہیں تھی۔ ہم خاردار باڑ میں بنائے گئے ایک چھوٹے سے رستے میں سے باہر نکلے اور مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔ چاندنی پھیکی سی روشنی کھجور اور تاڑ کے بلند و بالا درختوں کو روشن کررہی تھی۔ شمال کی جانب جو جنگل واقع تھا وہاں سے جنگلی

جانوروں کی آوازیں حسبِ معمول بلند ہورہی تھیں۔ ہم ایلچی کی حیثیت سے اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لانا نہیں چاہتے تھے لیکن پُرخطر علاقے کی وجہ سے رائفلیں لانا پڑی تھیں۔ قریباً تین میل فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں گھنے درختوں کے اندر روشنی ٹمٹماتی نظر آئی۔ لارسی اوبے نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ یہی ٹرسٹیوں کا کیمپ ہے۔ یہاں ریت پر گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات بھی نظر آرہے تھے۔ ہم نے سفید جھنڈے کھولے اور انہیں ہاتھ میں لے کر ٹرسٹیوں کے پڑاؤ میں پہنچ گئے۔

بڑے بڑے دو تین بلڈوزر ہمیں دور ہی سے نظر آگئے تھے۔ بلڈوزرز کے عقب میں کچھ چھولداریاں بھی موجود تھیں۔ ہمیں دیکھ کر تین چار رائفل بردار گارڈز ہمارے گھوڑوں کے سامنے آگئے۔ ہم گھوڑوں سے اتر آئے۔ ایک گارڈ نے تند لہجے میں پوچھا "کون ہو تم؟"

"ہم موگاسا سے آئے ہیں۔ سردار رانفے کی طرف سے تمہارے کسی افسر سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

انچارج گارڈ نے ہمیں سرتاپا گھورا' اپنے ساتھیوں سے کچھ کھسر پھسر کی پھر ہم سے رائفلیں حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے یہ مطالبہ فوراً پورا کردیا۔ انچارج نے آگے بڑھ کر باری باری ہم دونوں کی اچھی طرح تلاشی لی پھر رائفلوں کے سائے میں ہم چھولداریوں کی طرف بڑھے۔ کم از کم چھ خیمے اور چھولداریاں یہاں موجود تھیں۔ دو جدید خیموں میں باقاعدہ ائرکنڈیشنر لگایا گیا تھا۔ جنریٹر کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ خیموں کے عقب میں تین چار شاندار لینڈ کروزر اور لینڈ روور جیپیں موجود تھیں۔ ایک جیپ پر جالیاں وغیرہ لگا کر اسے بالکل بکتربند گاڑی کی شکل دے دی گئی تھی۔ گارڈ ہم دونوں کو لے کر ایک کشادہ چھولداری میں داخل ہوا۔ یہاں عارضی طور پر فٹ کیا گیا ائرکنڈیشنر چل رہا تھا اور ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ میں نے ماسٹر اسقی اور اس کے تین چار دوستوں کو دیکھا۔ لمبے قد کا جوٹم بھی ان میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ جوٹم کی دوست لڑکی بھی تھی جو یقیناً تھائی ہی تھی۔ اکثر لڑکوں کی طرح لڑکی نے بھی نیکر اور ہلکی پھلکی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ماسٹر اسقی کے ہاتھ میں ایک نہایت جدید اور قیمتی ویڈیو کیمرا تھا۔ وہ کیمرے پر سرچ لائٹ قسم کی روشنی نصب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ایسا ہی ایک اور کیمرا سامنے میز پر پڑا تھا اس پر روشنی وغیرہ نصب ہوچکی تھی۔ نیچے فرش پر چھوٹے سائز کی چند بیٹریاں بھی پڑی تھیں۔

اسقی اور اس کے دوستوں نے ہم دونوں پر بس ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ میں میک اپ میں تھا۔ ان لڑکوں میں سے کسی کے لیے مجھے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ ہم دونوں کو ایک طرف پڑی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ انچارج بولا "دو چار منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ ابھی تمہاری بات چیف صاحب سے کرواتے ہیں۔"

یہ چیف صاحب پتا نہیں کون تھے۔ صرف ایک یا دو گارڈ باہر دروازے پر موجود رہے۔ باقی کسی جانب چلے گئے۔ کیمرا درست کرنے کے بعد کم سن شیطان ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ حسبِ معمول وہ چیونگم کی جگالی میں مصروف تھا۔ مجھے سرتاپا گھور کر انگریزی میں بولا "کسی سے ملنے آئے ہو؟"

میں نے وہی جواب دیا جو تھوڑی دیر پہلے انچارج گارڈ کو دیا تھا۔ اسقی نے پوچھا "کیا کوئی بہت خاص پیغام ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بولا "میرا خیال ہے کہ ہمارے ڈر کی وجہ سے سردار رانفے کی کسی بیوی نے بچہ دے دیا ہے' اب یہ درخواست کرنے آئے ہیں کہ بچے کے بڑا ہونے تک حملہ نہ کیا جائے۔"

سب لڑکوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ جوٹم نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "نہیں بھئی! یہ بات ٹھیک نہیں۔ ان دونوں بندوں کی حیثیت یہاں ایلچی کی ہے اور ایلچی سے کوئی مذاق وغیرہ نہیں کیا جاتا۔"

"ایلچی کو خوش تو کیا جاسکتا ہے نا۔" اسقی کے ایک دوست داس نے بڑی ادا سے پوچھا۔

"ہاں خوش تو کیا جاسکتا ہے۔" جوٹم کے بجائے اسقی نے جواب دیا۔

اسقی کے دوست نے بیگ میں سے ٹن کا ایک ڈبا نکالا۔ یہ ٹافیوں کا ڈبا تھا۔ چند لمحے وہ شرارتی نظروں سے اوبے کی طرف دیکھتا رہا' پھر اس نے ڈھکن اتار کر ڈبا میرے ساتھی اوبے کی گود میں الٹ دیا۔ ڈبے میں سے تین بڑے بڑے زرد صحرائی بچھو نکلے اور اپنے خوفناک ڈنک اٹھا کر اوبے کے چہرے کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اٹھا تو کرسی الٹتے الٹتے بچی۔ چونکہ وہ گونگا تھا اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل کر رہ گئی۔ دو بچھو اس نے کھینچ کر پیچھے پھینک دیے تیسرا خود ہی گر پڑا۔ بچھوؤں کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی اس سے پتا چلا کہ وہ گوشت و پوست کے نہیں بلکہ دھات وغیرہ کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کھلونا بچھو تھے اور حیرت انگیز طور پر "نقل بمطابق اصل" بنائے گئے تھے۔ اسقی اور اس کے دوستوں

کے قہقہوں سے ایک بار پھر گردو پیش گونج گئے۔

یہ جان کر کہ بچھو نقلی ہیں اوبے کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی تھی۔

اسقی کے دوست نے اوبے کو مخاطب کرکے مزاحیہ لہجے میں کہا "دیکھو! تمہیں یہ جان کر خوشی ہوئی ہے ناکہ بچھو نقلی تھے' ہمارا مقصد بس تم کو خوش کرنا ہی تھا۔"

"ہم لوگ عام طور پر اسی طرح لوگوں میں خوشیاں بانٹتے ہیں۔" اسقی نے لقمہ دیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ نو عمر تھائی لڑکی بھی لڑکوں کے ساتھ ہنس رہی تھی۔ شاید اب وہ بھی ان میں گھل مل گئی تھی۔ اپنی رضا سے یا مجبوری کے تحت اس کم سن نے خود کو اپنے آقاؤں کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ آخری بار میں نے اس تھائی لڑکی کو کیمپس کے خاص الخاص حصے اے کلب میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک ڈری سہمی مصیبت زدہ مخلوق نظر آتی تھی۔ اسقی اور جوم اس بے چاری کو زبردستی ایک بچھلا تھمانے کی کوشش کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس منظر کی فلم بندی بھی کر رہے تھے' آقا زادے اور مجبور لڑکی کی وہ کشمکش ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھی۔ شاید اسقی اور اس کی چنڈال چوکڑی ہمارے ساتھ کوئی اور شرارت بھی کرتی مگر اس دوران چیف صاحب بھی تشریف لے آئے۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی کہ چیف ایک نوجوان تھا' چوبیس پچیس سال عمر رہی ہوگی۔ اس کے جسم پر گارڈز کی وہی منحوس بٹنوں وردی تھی۔ تاہم کندھے پر لگے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا رتبہ عام گارڈز سے اونچا ہے۔ وہ مجھے اور اوبے کو ایک دوسرے خیمے میں لے آیا۔ ہم نشستوں پر بیٹھ گئے۔

نوجوان نے کہا "میرا نام اینڈریو ہے۔ میں یہاں موجود گارڈز کا انچارج ہوں۔ تم دونوں موگاسا والوں کی طرف سے جو پیغام دینا چاہو مجھے دے سکتے ہو لیکن اس سے پہلے میں تم دونوں سے تعارف حاصل کرنا چاہوں گا۔"

میں نے کہا "میرا نام کریم ہے۔ میرا تعلق سائیں عالی سے ہے' جنہیں یہاں صحرائی درویش بھی کہا جارہا ہے۔ میں اور میرا ایک ساتھی بینے اور ملیریا وغیرہ کی دوائیں لے کر موگاسا آئے تھے اور لڑائی کی وجہ سے یہیں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت میں ایک غیر جانبدار ایلچی کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اپنے ساتھ میں اس اوبے نامی لاری کو معاون کے طور پر لایا ہوں۔ میرے پاس آپ لوگوں کے لیے ایک نہایت اہم پیغام ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ پیغام جلد از جلد محترم کنگ براؤن تک پہنچا دیں۔"

"میں وہ پیغام سننا چاہوں گا۔" چیف نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "سردار رانفے نے اطلاع دی ہے کہ محترم کنگ براؤن کی بھتیجی صاحبہ جن کا نام مس ویرا ہے' اس وقت موگاسا بستی میں ہیں اور سردار رانفے کی تحویل میں ہیں۔ اگر کنگ براؤن مس ویرا کی واپسی چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں سردار رانفے سے بذات خود یا اپنے کسی نمائندے کے ذریعے بات کرلیں۔"

نوجوان چیف کے چہرے پر حیرت آمیز دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ اس نے مجھے بغور دیکھا اور بولا "تمہارے پاس اپنی بات کا کوئی ثبوت۔ کیا تم نے خود بھی مس ویرا کو بستی میں دیکھا ہے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "جی ہاں جناب! میں بستی میں مس ویرا کی موجودگی کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس کے علاوہ آپ نے ثبوت کی بات کی ہے تو سردار رانفے نے مس ویرا کی دو نشانیاں بھی ارسال کی ہیں۔"

میں نے اوبے کو اشارہ کیا۔ اس نے جیب میں سے ویرا کی انگوٹھی اور تھیلے میں سے جوتی نکال کر نوجوان چیف کے سامنے رکھ دی۔

نوجوان چیف نے کہا "یہ کوئی ثبوت نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی شہادت؟"

"آپ اپنا کوئی نمائندہ بھیج کر تصدیق کرسکتے ہیں یا پھر آپ سردار رانفے کو کوئی وائرلیس فراہم کریں تو وہ اس پر آپ سے مس ویرا کی بات کرا سکتا ہے لیکن میں ایک گزارش کروں گا۔ آپ یہ تصدیق کرنے سے پہلے محترم کنگ براؤن سے رابطہ کرلیں۔"

"کیوں؟ تم رابطے پر کیوں زور دے رہے ہو؟"

"ایک غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے مجھے موجودہ حالات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہیے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ موگاسا والوں کے خلاف جلد ہی کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔ شاید ایک دو گھنٹے کے اندر اندر۔ اگر کوئی ایسی کارروائی ہوئی تو جہاں دونوں طرف سے شدید جانی نقصان ہوگا' وہاں ٹرسٹ کے گرفتار شدہ افغانیس کمانڈوز اور محترمہ ویرا صاحبہ کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔"

"یہ وارننگ تمہاری طرف سے ہے یا سردار رانفے کی طرف سے؟"

"میں صرف اور صرف وہی عرض کر رہا ہوں جو سردار

رانفے نے کہا ہے۔"

نوجوان چیف نے بڑے اسٹائل سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے تمہارے سردار نے؟"

"جوری اور اس کے دونوں ساتھی گرفتار ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

اینڈریو ذرا سا چونکا لیکن پھر سنبھل گیا۔

"خیر یہ تو کوئی اہم خبر نہیں ہے' لیکن مس ویرا کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا ہے وہ قابل غور ہے اگر تم دونوں مجھے چار پانچ منٹ کی اجازت دو تو میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"جی ضرور..... ہم یہاں بیٹھے ہیں۔"

نوجوان چیف ہمیں گہری نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی جیپ میں موجود ٹرانس میٹر کے ذریعے ٹرسٹ سے رابطہ کرنے گیا ہے۔ چیف کے جانے کے بعد میں نے چھولداری کے اس حصے کا جائزہ لیا' یہاں بھی ائر کنڈیشنر کی خنکی موجود تھی۔ اس کے علاوہ ایک سفری بستر بھی یہاں موجود تھا۔ بستر کے پاس ہی شراب اور بیئر کی تین چار بوتلیں اور سگریٹ کے پیکٹ وغیرہ موجود تھے۔ یہاں مجھے ایک زنانہ جوتی اور پرس بھی نظر آیا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک نوجوان چیف یہاں کسی حسینہ کے ساتھ داد عیش دیتا رہا ہے۔ ٹرسٹ کے خدائی فوجداروں کے لیے شراب اور عورت کے بغیر رہنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا عام شخص کے لیے ہوا اور پانی کے بغیر رہنا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جس عورت کے ساتھ اینڈریو داد عیش دیتا رہا ہے وہ اس کی کوئی ہم قوم نہ ہو بلکہ ان ہزاروں پکڑی دھکڑی عورتوں میں سے کوئی ایک ہو جو ٹرسٹ کی چار دیواری میں مجبوری و بے کسی کی زندگی جی رہی تھی۔

پھر میرا دھیان کم سن شیطان اسقی اور اس کے دوستوں کی طرف چلا گیا۔ اس کیمپ میں ان کی موجودگی حیران کن تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ موگاسا پر ہونے والے خوفناک حملے کو "انجوائے" کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ جس طرح ویڈیو کیمرے اور لائٹس وغیرہ تیار کر رہے تھے' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس خونی ہنگامے کی کوریج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

قریبی چھولداری سے ماسٹر اسقی اور اس کے دوستوں کی مدھم آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں انہوں نے ٹیپ ریکارڈر پر ایلوس پریسلے کا ایک گانا لگا لیا تھا اور غالباً اس گانے پر رقص وغیرہ کر رہے تھے۔ گاہے گاہے ان کے قہقہے بھی جو گیدڑ کی چیخوں سے مشابہ تھے مجھ تک پہنچ رہے تھے۔

چیف اینڈریو کی واپسی میں جوں جوں تاخیر ہو رہی تھی' میری بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے تک گیا۔ باہر جھانکا تو نظر سیدھی اینڈریو پر ہی پڑی۔ وہ ایک جیپ کے پاس کھڑا ماسٹر اسقی سے باتیں کر رہا تھا۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میں یہاں ایک ایک سیکنڈ گن رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ٹرانس میٹر پر کنگ براؤن سے ہر قسم کی گفتگو میں مصروف ہے جبکہ وہ یہاں اپنے نوعمر ولی عہد سے گپ شپ کر رہا تھا۔

دو تین منٹ بعد یہ گفتگو ختم ہوئی اور اینڈریو مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے واپس نشست پر جا بیٹھا۔ اینڈریو اندر داخل ہوا' اس کے ساتھ دو مسلح گارڈز بھی تھے۔ اینڈریو نے مجھ سے کہا "بڑی مشکل سے رابطہ ہو سکا ہے' میں نے محترم کنگ کو نئی صورت حال سے آگاہ کردیا ہے۔"

"انہوں نے کیا فرمایا ہے؟"

"وہ بھی اس بات کا ثبوت چاہ رہے ہیں کہ مس ویرا واقعی لارسیوں کے پاس موجود ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرکے ابھی چار پانچ منٹ میں دوبارہ کال کرتے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہی ایک گارڈ میرے اور اوبے کے عقب میں چلا گیا تھا۔ بظاہر یہی لگا تھا کہ وہ واٹر کولر میں سے ٹھنڈا پانی لینے کے لیے گیا ہے۔ اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ رائفل کے مضبوط کندے کی یہ نہایت بے رحمانہ ضرب میری گردن پر لگی تھی اور آنکھوں کے سامنے کہکشائیں ناچ گئی تھیں۔ دوسری ضرب سر کے پچھلے حصے پر لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں آگے کی طرف گر رہا ہوں اور گرتے ہوئے میری ٹھوڑی اینڈریو کے گھٹنے سے ٹکرائی ہے۔ اس کے بعد آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ چادر سی پھیل گئی۔

دوبارہ میرے حواس قریباً تیس منٹ بعد بحال ہوئے تھے۔ تاہم ان تیس چالیس منٹوں میں کافی کچھ بدل چکا تھا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں بڑی مضبوطی کے ساتھ نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ کچھ یہی کیفیت اوبے کی بھی تھی۔ اوبے ابھی تک بے ہوش تھا' اس کے سر سے بہنے والا خون اس کی ٹھوڑی اور گردن کو بھگو رہا تھا۔ یقیناً میری طرح اس کے سر کو بھی تختہ مشق بنایا گیا تھا۔ بہرحال میرے سر سے خون وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ ہاں گردن اور ایک کنپٹی بھوتی بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اسی خیمے میں زمین پر پڑے تھے جہاں

ہمیں تختۂ مشق بنایا گیا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں او بے کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا' تاہم میرا منہ آزاد تھا۔ شاید ان لوگوں کو مجھ سے یہ ٹیک توقع تھی کہ میں شور وغیرہ نہیں مچاؤں گا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے "میک اپ" کی طرف سے تھی اگر میرا میک اپ پکڑا جاتا تو پھر بے حد گڑبڑ ہونا تھی۔ زریں' کلثوم' غزالہ اور نائی کی سلامتی اسی میں تھی کہ میں اور صفدر اپنا بہروپ قائم رکھنے میں کامیاب رہیں۔

میں نے اپنے سر کو دو تین بار زور سے جھٹکا اور اپنے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ایک کھنکتی ہوئی نسوانی ہنسی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے سامنے دیکھا اور لاحول پڑھنے کو دل چاہا۔ ایک انگریز حسینہ نہایت ہی مختصر لباس میں میرے سامنے نیم دراز تھی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر جھول رہے تھے اور اس کے ہاتھوں میں برانڈی سے نصف بھرا ہوا نفیس سا گلاس تھا۔ خیمے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔

انگریز حسینہ بڑی ادا سے بولی "تمہیں سر جھٹکتے دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی کتا نہانے کے بعد اپنے بالوں سے پانی جھٹک رہا ہو۔"

میرے ذہن میں حواس کھونے سے پہلے کی تمام صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ میں نے بے قراری سے پوچھا "چیف اینڈریو کہاں ہے اور تم کون ہو؟"

"اینڈریو یہاں نہیں ہے اور میں اس کی گرل فرینڈ ہوں۔ کوئی اعتراض ہے تمہیں؟"

میں نے زمین پر بچھے بستر کی طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ بستر کے قریب نظر آنے والی جوتی اور پرس رغبو کا تعلق اسی آفت زادی سے ہے۔

"میں پوچھتا ہوں کہ اینڈریو کہاں ہے؟" میں نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو جا چکا ہے۔"

"کہاں؟"

"جہاں اسے جانا چاہیے تھا۔ بلکہ سب لوگ جا چکے ہیں۔ جنگ میں مرد گھر نہیں بیٹھا کرتے یہاں کیمپ میں تو اب صرف چند عورتیں اور بچے وغیرہ موجود ہیں۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا "تم کس جنگ کی بات کر رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "وہی جنگ جسے رکوانے کے لیے تم یہاں آئے تھے۔"

میرے ہاتھ پشت کی طرف نہیں سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاؤں میں زنجیر ہے۔ یہ زنجیر خیمے کی دو نہایت مضبوط میخوں کے ساتھ منسلک تھی۔ اس کا دوسرا سرا میرے ٹخنے سے ذرا اوپر لپٹا ہوا تھا اور اس میں تالا لگا دیا گیا تھا۔ ایسی منحوس زنجیریں میں نے نرسٹ میں بہت دیکھی تھیں۔ ایسی ہی ایک زنجیر میرے ساتھی او بے کے پاؤں میں بھی تھے۔ میں سپٹا کر رہ گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں دل کی رفتار سہ گنا ہو گئی تھی۔

میں نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ نرسٹ کے گارڈز موگاسا پر حملے کے لیے جا چکے ہیں؟" لڑکی نے بڑے اطمینان سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں چیخا "لیکن میں نے تمہارے چیف کو بتایا تھا کہ مس ویرا سردار رانے کے قبضے میں ہیں۔ حملے کی صورت میں مس ویرا کی زندگی شدید خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"تم نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔"

"میں نے بتائی ہے۔ تمہارے بوائے فرینڈ اینڈریو کو بتائی ہے۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟" وہ ہسکی لیتے ہوئے بولی۔

"ثبوت؟ ثبوت میں خود ہوں۔ میرا یہ ساتھی ثبوت ہے۔"

"لیکن تم دونوں تو مر چکے ہو۔ وفات پا چکے ہو۔ تمہاری لاشیں جنگلی جانور کھا چکے ہیں یا وہ کسی دلدل میں ڈوب چکی ہیں۔"

"کیا بکتی ہو۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ میں پوچھتا ہوں اینڈریو کہاں ہے؟"

"میں نے بتایا ہے نا... کہ وہ سب لوگ جا چکے ہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب خواہ مخواہ ٹینشن لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی اور گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھ دیا۔ کچھ دیر تک بے پروائی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "چھوڑو ان باتوں کو۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹی وی پر ایک مزے دار پروگرام آنے والا ہے۔ لائیو اور بہت سنسنی خیز۔ وہ دیکھتے ہیں۔"

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ ان گنت وسوسے ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔

میں نے کہا "میں یہ بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ کنگ براؤن نے یہ جان کر بھی کہ ویرا موگاسا میں موجود

ہے موگاسا پر حملے کا ارادہ کیا ہے۔"

"نہیں یہ بات ماننے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ کنگ براؤن کو واقعی یہ معلوم نہیں کہ ویرا بستی میں موجود ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے بوائے فرینڈ نے یہ اہم ترین اطلاع کنگ تک نہیں پہنچائی؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

میں نے دانت پیس کر کہا "تو پھر جتنے بھی لوگ مرنے والے ہیں' جتنی بھی تباہی پھیلنے والی ہے اس کا ذمے دار تمہارا وہ حرامی بوائے فرینڈ ہے۔"

میری گالی پر بھی انگریز لڑکی کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بولی "اس کا ذمے دار اینڈریو نہیں ہے۔ اس کا ذمے دار ماسٹر اسقی ہے۔ ماسٹر نے ہی اینڈریو کو یہ خبر نرسٹ تک پہنچانے سے منع کیا تھا۔"

"کیوں؟ کیوں کیا اس نے ایسا؟" میں نے پاؤں کی زنجیر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب تو تمہیں ماسٹر اسقی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ماسٹر اسقی نہیں چاہتے تھے کہ عین موقع پر آکر سارا شو خراب ہو جائے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اس شو کو انجوائے کرنے کا لمبا چوڑا انتظام کر رکھا ہے۔ اور یہ کوئی ماسٹر اسقی ہی کی بات نہیں ہے۔ نرسٹ کے زیادہ تر کرتا دھرتا لوگوں کی دلی خواہش اس وقت یہی ہو گی کہ جو ہونے جا رہا ہے وہ ہو ہی جائے۔ لارسی اب نرسٹ کے لیے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں اور انہیں ختم کرنے کا یہ سنہری موقع کسی ایک لڑکی کے لیے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن یہ ایک لڑکی تمہارے کنگ براؤن کی چہیتی بھتیجی ہے۔ جس کی زندگی اس کے لیے بے حد اہم ہے۔"

"چلو ہو گی اہم' لیکن تم اس فکر میں خود کو دبلا کیوں کر رہے ہو۔ جو تھوڑی بہت زندگی تمہاری باقی ہے اس کو انجوائے کر لو۔"

وہ توبہ شکن انداز میں اٹھی اور خیمے کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے پورٹ ایبل ٹی وی کو اپنی لمبی لمبی نازک انگلیوں سے آن کر دیا۔ ٹی وی کی اسکرین ابھی صاف تھی۔ جو پروگرام وہ دیکھنا چاہ رہی تھی ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ وہ لوچ دار چال چلتی ہوئی زمین پر بچھے بستر کے اوپر سے گزری اور واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ چھوٹے سائز کے ٹی وی کا چھوٹا سا ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ

اس ٹی وی پر کون سا منحوس پروگرام دیکھا جانے والا ہے غالباً کسی شارٹ سرکٹ ٹیلی وژن پر موگاسا پر حملے کی کارروائی یہاں براہ راست دکھائی جانے والی تھی۔ لڑکی نے ہولڈر میں سگریٹ لگایا اور بڑے ناز سے کش لیتی ہوئی مجھے گھورنے لگی۔ وہ مجھ سے قریباً آٹھ فٹ کے فاصلے پر بیٹھی تھی' اور یہ بڑا محفوظ فاصلہ تھا اگر میں اوندھے منہ زمین پر لیٹ کر لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو زنجیر کی وجہ سے قریباً تین فٹ ادھر ہی میرے ہاتھوں کی پہنچ ختم ہو جاتی۔ میں یہ سارا حساب کتاب بہت اچھی طرح لگا چکا تھا۔ میں اپنے دانتوں وغیرہ سے ہاتھوں کی بندش کھولنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا مگر یہ بھی اسی وقت ممکن تھا جب لڑکی اس خیمے سے باہر جاتی' اور اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وہ نشے کی ترنگ میں بولی "مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ تم جوان ہو' صحت مند ہو' تمہیں کیا ضرورت تھی اس پھڈے میں پڑنے کی اور اگر پڑ ہی گئے تھے تو پھر بستی تک ہی رہتے' ایلچی بن کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

اس نے اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر بڑے توبہ شکن انداز میں اپنی دوسری ٹانگ پر رکھی اور کش لے کر بولی "اگر تم موگاسا بستی میں ہی رہتے تو تمہارے لیے قدرے بہتر ہوتا۔ تم لارسی نہیں ہو اس لیے شاید قتل ہونے سے بچ جاتے' اور ان دو چار خوش نصیب مردوں میں شامل ہو جاتے جو آج موگاسا میں زندہ رہیں گے۔ پھر تمہیں بردا بنا کر نرسٹ لے جایا جاتا۔ بے شک وہ غلام کی زندگی ہوتی مگر زندگی تو ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں ہیجڑا ہی بنا دیا جاتا' مگر ہیجڑا بھی تو انسان ہوتا ہے۔ اب تم نے موگاسا والوں کا سفیر بن کر اور ویرا کے بارے میں اطلاع دے کر اپنی زندگی پر موت کی مہر لگوا لی ہے۔ اینڈریو اور ماسٹر اسقی کبھی نہیں چاہیں گے کہ تم دونوں میں سے کوئی زندہ رہے اور ویرا کے حوالے سے ان کا راز فاش کرے۔"

"میں تمہاری بات کی وضاحت چاہوں گا۔"

"بات واضح ہے۔ جو اطلاع تم محترم کنگ کے لیے لے کر آئے تھے وہ ان تک نہیں پہنچائی گئی اور اس کے ذمے دار اسقی اور اینڈریو ہیں۔ اب اگر ویرا مرتی ہے تو اس کے ذمے دار بھی وہ دونوں ہیں۔ اس ذمے داری سے بچنے کے لیے وہ تمہیں قتل کر رہے ہیں۔"

لڑکی ہمیں قتل کرنے کی بات اتنے یقین سے کہہ رہی تھی جیسے ہم چڑیا کی طرح اس کی مٹھی میں ہیں اور وہ جب

جاہے مٹھی بھینچ کر ہمارا دم نکال سکتی ہے۔ وہ میرے میک اپ سے دھوکا کھا رہی تھی ورنہ بے شمار دوسرے ٹرسٹیوں کی طرح وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ ٹرسٹ کے اندر ہونے والے ہنگاموں نے میری اور صفدر کی ٹھیک ٹھاک دھاک بٹھا رکھی تھی' بلکہ پروفیسر اللہ دتا بھی اس میں شامل تھا اگر اس لڑکی کو میری اصلیت معلوم ہوتی تو وہ اتنی بے پروائی سے مجھے چیونٹی کی طرح مسلنے کی بات نہ کرتی۔

میں نے آنکھوں میں خوف اجاگر کرتے ہوئے کہا "کیا ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔"

"بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتی' اگر کوئی معجزہ ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ فی الحال تم دونوں خود کو مردہ ہی سمجھو تو بہتر ہے۔"

"کیا۔ تم ہماری کوئی سفارش کر سکتی ہو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"اینڈریو مانے گا نہیں۔ ویسے بھی مجھے اس میں کیا فائدہ ہوگا۔"

"میں... ساری زندگی... تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

اس نے سر پیچھے کی طرف لے جا کر اپنے بال جھٹکے اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولی "واہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ ایک جوان غلام مرد... جو ہر وقت میرے پاؤں چاٹنے اور ناز اٹھانے کے لیے تیار رہے۔ مجھے تمہارے اس آئیڈیا نے متاثر کیا ہے۔ شاید... ہر عورت کے اندر گہرائی میں اس سے ملتی جلتی کوئی خواہش چھپی رہتی ہے۔ وہ ایک مرد کے گلے میں زنجیر ڈال کر اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرنا چاہتی ہے۔ اس کی مختارِ کل بننا چاہتی ہے اور میرا خیال ہے کہ آج کی بہت سی عورتیں اس مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں' یہ اور بات ہے کہ ان کی ڈالی ہوئی زنجیر نظر نہیں آتی۔" وہ فلسفہ بگھار رہی تھی اور میری سوچ کے تمام گھوڑے موگاسا کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جہاں ٹرسٹ کے خدائی فوجدار قہر بن کر ٹوٹنے والے تھے۔

"مجھے تم پر ترس آرہا ہے لیکن افسوس کہ میں تمہارے لیے کچھ کر نہیں سکتی۔" اس نے غالباً تیسری بار یہ فقرہ ادا کیا۔

"تم کر سکتی ہو۔ اینڈریو تمہارا بوائے فرینڈ ہے۔ تمہارے سب سے زیادہ قریب ہے۔"

"اینڈریو میرا بوائے فرینڈ ہے۔ غلام نہیں ہے اور ان دونوں چیزوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں اینڈریو کی نظرِ کرم کی طالب ہوتی ہوں' وہ میری نظرِ کرم کا طالب نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت حاکم کی ہے' وہ میرے ساتھ کھانا کھاتا ہے' پیار کرتا ہے' سوتا ہے لیکن ہر کام میں اس کی حاکمیت موجود رہتی ہے۔ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق میرے غلام بن سکو تو پھر بات اور ہوگی۔ بلکہ بالکل برعکس ہوگی اور یہ فرق بہت بڑا فرق ہے۔ شاید میں بھی اس فرق کو پسند کرتی ہوں' جو مجھے تمہارا آئیڈیا پسند آیا ہے لیکن یہ پسندیدگی صرف سوچ تک ہی رہے گی۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی ہوں۔ میں نے کہا ہے ناکہ تم دونوں کی موت پر مہر لگ چکی ہے۔"

اسی دوران میں ایک قبول صورت لارسی لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے وہ تیزی سے انگریز لڑکی کے قریب دو زانو بیٹھ گئی اور بڑے التجائیہ لہجے میں اس سے کچھ کہنے لگی۔ اتنے میں خیمے سے باہر بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ دو "سفید فام" جن کا تعلق لازمی طور پر ٹرسٹ سے تھا خیمے میں آگھسے۔ ان کے چہرے نشے میں تمتمائے ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریز لڑکی سے کہا "ایکسکیوز... میڈم! آپ کو ڈسٹرب کیا۔ یہ چھوکری ضرورت سے زیادہ تیزی دکھا رہی ہے۔"

ان میں سے ایک نے انگریز لڑکی کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے لارسی لڑکی کو دو تین تھپڑ مارے اور بالوں سے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

انگریز لڑکی اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی اور لارسی لڑکی کی دور جاتی ہوئی چیخیں سنتی رہی۔ جب چیخیں معدوم ہو گئیں تو وہ عجیب انداز سے مسکرائی' ہولڈر میں لگے سگریٹ کا ایک اور کش لیا اور بولی "یہ ہوتا ہے آزادی اور غلامی کا فرق۔ شاید اس لڑکی کے دماغ میں بھی خوابوں کا کوئی خوب صورت شہزادہ ہوگا' خوابوں خیالوں میں اس نے شہزادے کو اپنی زلف کی زنجیر کا اسیر بنایا ہوگا۔ ایسا اسیر جو اس کے اشاروں پر چلے اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے لیکن اب یہ بے چاری ٹرسٹ کی اسیر ہو کر شرابی مردوں تلے روندی جا رہی ہے۔"

"کون لوگ تھے یہ؟"

"ٹرسٹ کی انتظامیہ میں سے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے فتح سے پہلے ہی جشن منانا شروع کر دیا ہے۔"

اس نے بے قراری سے اپنی رسٹ واچ دیکھی اور ایک بار پھر اٹھ کر ٹی وی کی طرف بڑھی۔ اس نے ٹی وی کی طرف جاتے ہوئے ایک بار پھر بستر پر پاؤں رکھا تھا۔ میں اس کی یہ حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ اس نے رکوع کے انداز میں

جھک کر ٹی وی کے ساتھ تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی' اچانک اسکرین پر ایک منظر نمودار ہو گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر لڑکی نے "یاہو" کا نعرہ بلند کیا اور خوشی سے تقریباً اچھل پڑی۔ وہ جست لگاتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آبیٹھی۔ اسکرین پر نظر آنے والا منظر دیکھ کر میرا دل اچھل گیا۔ یہ موگاسا کا منظر تھا اور وہی منظر تھا جس کا خوف مجھے اب تک دہلا رہا تھا۔ کسی جیپ کی کھڑکی میں فٹ کیا جانے والا کیمرا دو عدد دیوہیکل بلڈوزرز کو دکھا رہا تھا۔ یہ بلڈوزرز دھیرے دھیرے موگاسا کی حفاظتی باڑ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ گاڑیاں بھی دھیرے دھیرے موگاسا کی اس حفاظتی باڑ کی طرف بڑھ رہی تھیں جو چند روز پہلے میری تجویز پر لگائی گئی تھی۔ یہ موگاسا پر حملے کا "لائیو" منظر تھا۔ میں بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ جی چاہا کوئی غیر مرئی قوت میرے اندر آجائے اور میں یہ زنجیریں توڑ کر یہاں سے نکل جاؤں۔

باڑ سے قریباً پندرہ بیس گز کی دوری پر پہنچ کر بلڈوزر رک گئے پھر روشنی کے دو گولے فضا میں پھٹے اور موگاسا بستی کے جھونپڑوں اور بلند و بالا بوما کی جھلک نظر آکر اسکرین سے اوجھل ہو گئی۔ موگاسا کے اندر کسی طرح کی نقل و حرکت نظر نہیں آئی تھی لیکن یقینی بات تھی کہ بستی کے لارسی محافظوں کے پاس جو بھی بچا کھچا اسلحہ ہے اس کے ساتھ وہ اپنی پوزیشنوں پر چوکس بیٹھے ہوں گے۔ بستی والوں کی بے بسی پر بے تحاشا ترس آرہا تھا۔ وہ پہلے ہی بے سرو سامان تھے' اب جوری کی سازش کے بعد اور بھی بے سرو سامان ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے اور اوبے کو ٹرسٹ کی طرف بھیجا تھا تاکہ ہم ویراوالا کارڈ استعمال کر کے ٹرسٹ کا حملہ رکوا سکیں مگر یہاں اینڈریو اور اسقی کی ملی بھگت نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا تھا۔

دیوہیکل بلڈوزر چند لمحے رکے رہے پھر ان میں سے ایک کسی بدمست ہاتھی کی طرح زمین کو لرزاتا ہوا باڑ کی طرف بڑھا۔ وہ باڑ سے ٹکرایا اور اسے روندتا ہوا بستی میں گھس گیا۔ باڑ کو مضبوط کرنے کے لیے درختوں کے تنے اور دیگر کاٹھ کباڑ استعمال کیا گیا تھا' یہ سب کچھ بلڈوزر نے تنکوں کی طرح اڑا دیا تھا۔ بلڈوزر پر بارود سے بھرے ہوئے مٹی کے کچھ ہانڈے پھینکے گئے۔ اس سے دھماکے ہوئے اور آگ کے کچھ شعلے بھی نظر آئے مگر اس سے بلڈوزر کی پیش رفت رکی نہیں۔ بلڈوزر کے بنائے ہوئے راستے سے گزر کر چند لینڈ روور جیپیں بھی بستی کے اندر گھس گئیں۔ جیپوں میں موجود گارڈز خودکار رائفلوں سے اندھادھند فائرنگ کر رہے تھے اور اس کا ثبوت اسکرین پر یہ نظر آرہا تھا کہ جیپوں کے گرد تاریکی میں روشن لکیریں لپک رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر انگریز حسینہ نے زور سے تالی بجائی۔ اس کے ساتھ ہی کسی قریبی خیمے سے بھی کورس کی شکل میں نعرہ تحسین بلند ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ آوازیں ماسٹر اسقی اور اس کے ساتھیوں کی تھیں۔ وہ یقیناً اپنی ائر کنڈیشنڈ چھولداری میں موجود تھے اور انگریز حسینہ کی طرح ٹی وی پر لائیو حملے کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کر لوں یا کوئی چیز پھینک کر ٹی وی اسکرین توڑ دوں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے خار دار باڑ کو تین جگہ سے بلڈوزروں نے روند کر برابر کر دیا اور ٹرسٹ کے بپھرے ہوئے گارڈز جیپوں اور گاڑیوں پر تیزی سے بستی میں داخل ہونے لگے۔ گارڈز کے علاوہ ماریطانیہ کی پولیس بھی اس حملے میں ملوث تھی۔ پولیس کی دو تین جیپیں اسکرین پر بھی صاف نظر آئیں۔ تاریکی کی وجہ سے حملے کی کوریج زیادہ واضح نہیں تھی۔ آوازیں بھی صاف نہیں آ رہی تھیں' پھر بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ بستی پر ایک خوفناک حملے کا آغاز ہو گیا ہے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ' دستی بموں کے دھماکے' تاریکی میں دوڑتے لپکتے ہوئے سائے اور انسانی چیخیں سب کچھ ٹی وی کے ذریعے اس خیمے تک پہنچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے کئی جھونپڑوں نے آگ پکڑ لی اور ارد گرد کے مناظر شعلوں کی وجہ سے نیم روشن ہو گئے۔ ایک نیزہ بردار لارسی رائفل کا برسٹ کھا کر اوندھے منہ باڑ کے قریب گرا اور ٹرسٹ کے گارڈز اس کو پاؤں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ یہ منظر ٹی وی اسکرین پر بالکل صاف نظر آیا پھر ایک دوسرے کیمرے نے گھمسان کی لڑائی کا ایک اور منظر ٹی وی اسکرین تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ ٹرسٹ کے چار گارڈز جنہوں نے بلٹ پروف جیکٹس اور ہیلمٹ وغیرہ پہن رکھے تھے' دو فاقہ زدہ منحنی دھڑنگ لارسی نیزہ بازوں کو گولیوں سے چھلنی کر رہے تھے۔ اس منظر کے پس منظر میں بوما کی سیڑھیاں بھی نظر آئیں۔ لارسیوں کو موت کے گھاٹ اتارے جانے کا لائیو منظر دیکھ کر انگریز حسینہ نے ایک بار پھر تالی بجائی' اس کے ساتھ ہی اسقی اینڈ کمپنی کے خیمے سے پرجوش آوازوں کا شور سنائی دیا۔

اسی دوران میں ایک اور وڈیو کیمرے نے ایک بھاگتی ہوئی لارسی عورت کو CAPTURE کرنے کی کوشش کی۔ عورت کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی مگر کیمرا چند سیکنڈ

سے زیادہ اس بدنصیب عورت کا پیچھا نہ کر سکا اور وہ خیموں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ کیمرے نے پین کیا اور چند لاری میدو زن کو دکھانے لگا جنہوں نے گارڈز کی رائفلوں کے سامنے خود کو ہینڈز اَپ کر رکھا تھا۔ ان کے چہروں پر وحشت جلی حروف میں درج تھی۔ گارڈز ان لوگوں کو رائفلوں کے کندوں سے جانوروں کی طرح مار رہے تھے اور زمین پر اوندھا لیٹ جانے کا حکم دے رہے تھے پھر یہ منظر بھی اسکرین سے اوجھل ہو گیا۔ اسی دوران میں بستی کی مشرقی جانب سے لارسیوں نے جوابی حملہ کیا اور یوں لگا کہ ٹرسٹی جو کافی آگے چلے گئے تھے تھوڑا سا پیچھے آ گئے ہیں۔

انگریز لڑکی بے حد دلچسپی سے۔ سانس کو تقریباً روکے ہوئے یہ مناظر دیکھ رہی تھی۔ یہ خونچکاں مناظر کسی فلم کا حصہ نہیں تھے' یہ جیتی جاگتی زندگی کی جھلکیاں تھیں۔ تصویر زیادہ صاف نہیں آ رہی تھی۔ غالباً تصویر صاف کرنے کے لیے ہی لڑکی ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹی وی کی طرف بڑھی۔ اس کی پوری توجہ ٹی وی کی طرف تھی۔ ٹی وی کی طرف جاتے ہوئے اس کا پاؤں ایک بار پھر زمین پر بچھے بستر پر آیا۔ میں کسی ایسے ہی لمحے کا منتظر تھا۔ میں لڑکی تک تو نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن اس بستر تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے خود کو اوندھے منہ گرا کر بستر تک پہنچایا اور بستر کا کنارا تھام کر زور سے اپنی طرف کھینچا۔ لڑکی کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ وہ پھسلی اور بستر کے ساتھ ہی کھنچ کر میری طرف آ گئی۔ تین فٹ کا وہ محفوظ فاصلہ ختم ہو چکا تھا جو وہ اب تک میرے اور اپنے درمیان برقرار رکھے ہوئے تھی۔ میں نے اس کی پنڈلی پکڑ لی اور کھینچ کر اپنے پاس کر لیا۔ وہ دو چیخیں تو مار چکی تھی میری سے پہلے ہی میں نے سختی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ وہ چکنے جسم والی مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل جانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس کی دو چیخوں کے جواب میں کوئی مسلح شخص اندر داخل نہ ہو جائے' لیکن اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔ شاید اس کی ان چیخوں کو بھی "انجوائے منٹ" کی کلکاریاں سمجھ لیا گیا تھا۔ میں نے اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ لڑکی کی گردن پر رکھ دیے اور اس زور سے دبایا کہ اس کی نیلی آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں اور منہ پورا کھل گیا۔ تاہم اس پورے کھلے ہوئے منہ کے باوجود وہ حلق سے کراہ تک نہیں نکال سکتی تھی "میری زنجیر کی چابی کہاں ہے؟" میں نے اس کے کان میں سفاک سرگوشی کی۔

وہ سراپا لرز کر رہ گئی۔ اپنی آواز کا وحشیانہ پن خود میں نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس وحشت کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں تھی' بلکہ یہ "وجہ" میرے سامنے ٹی وی اسکرین پر خونچکاں منظروں کی صورت میں کیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ لڑکی نے کچھ کہنا چاہا۔ میں نے اس کی گردن پر گرفت ذرا ڈھیلی کی' اس کے ہونٹ لرزے مگر خوف و وحشت کے سبب وہ بول نہیں سکی پھر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ میں نے غور کیا تو اس کے سینے کے مختصر لباس میں سے چابی کا ابھار صاف محسوس ہوا۔ یہ اس تالے کی چابی تھی جس نے زنجیر کو میرے ٹخنے سے منسلک کر رکھا تھا۔

لڑکی پوری طرح میرے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ اگر اس نے آواز نکالنے کی غلطی کی تو میں ابھی اسی جگہ اس کی زندگی کا خاتمہ بالجبر کر دوں گا۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور اس کے لباس میں ہاتھ ڈال کر چابی برآمد کر لی۔ چابی دیکھنے کے بعد اور یہ یقین کرنے کے بعد کہ یہی میری زنجیر کے تالے کو لگے گی' میں نے لڑکی سے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہاتھ دوبارہ اس کی گردن پر رکھ دیے وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک ٹی وی دیکھ رہی تھی اور تالیاں پیٹ رہی تھی اب برف کی طرح سفید تھی۔ غلام مردوں اور آزاد مردوں کے بارے میں اس کا سارا فلسفہ ناک کے راستے بہہ گیا تھا۔ میں نے اس کی گردن مسل کر اسے چند گھنٹوں کے لیے ہر فکر سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد میں نے زنجیر کا تالا کھولا اور پھر اپنے پاؤں کو بھی رسّی کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ اب ہاتھوں کا مسئلہ باقی رہ جاتا تھا۔ یہ کام دانتوں کی مدد سے ہی کیا جا سکتا تھا لیکن اس سے پہلے میں نے خیمے کی تلاشی لے کر ایک چھوٹا سا پسٹل برآمد کر لیا۔ جو چابی میری زنجیر کے تالے کو لگی وہی اوب کے تالے کو بھی لگ گئی لیکن اوب ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ اسے اپنے ساتھ یہاں سے نکالنا آسان نہیں تھا اور نہ ہی اس کا وقت تھا۔ جس وقت میں نے انگریز لڑکی کو بستر کھینچ کر نیچے گرایا تھا' اس کا سر ٹی وی ٹرالی سے ٹکرایا تھا اور غالباً تار وغیرہ کھنچ جانے سے ٹی وی بند ہو گیا تھا۔ مجھے یہ جرأت نہیں ہوئی کہ ٹی وی کو دوبارہ آن کروں۔ میں نے دانتوں سے جھنبوڑ کر ہاتھوں کی رسّی کھولی۔ خیمے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور احتیاط سے باہر نکل آیا۔

ایک جوالا مکھی تھا جو میرے ذہن میں دہک رہا تھا۔ میرے کانوں میں لاتعداد لارسیوں کی آخری چیخیں اور التجائیں گونج رہی تھیں۔ گارڈز کے وحشت سے تمتمائے

ہوئے چہرے آنکھوں کے سامنے تھے۔ جب سے میں نے افریقی سرزمین پر قدم رکھا تھا یہ پہلا اور بالکل پہلا موقع تھا جب میں کسی معاملے میں خود کو مکمل طور پر INVOLVE محسوس کر رہا تھا۔ خیمے سے باہر نیم تاریکی تھی۔ بس دو تین گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں اور گاڑیوں کے عقب میں جنریٹر اپنی مخصوص آواز سے سناٹے کو مجروح کر رہا تھا۔ پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور میں جانتا تھا کہ اس وقت جو بھی میرے راستے میں آیا وہ مارا جائے گا۔ میں نے دائیں جانب دیکھا اور مجھے وہ وسیع چھولداری نظر آئی جہاں ماسٹر اسمتھی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ محفل جما رکھی تھی۔ چھولداری کے اندر سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی اور گاہے گاہے آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ میں گاڑیوں کی سمت چلا گیا۔ یہ کل تین گاڑیاں تھیں۔ ایک گاڑی میں ایک شخص سو رہا تھا' ٹویوٹا جیپ تھی۔ دوسری دو گاڑیاں بھی جیپیں ہی تھیں۔ ایک مسلح گارڈ جیپوں کے پاس موجود تھا اور پہرا دینے والے انداز میں چکرا رہا تھا۔ میں گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ جونہی وہ میرے پاس سے گزرا میں نے اسے دبوچ لیا اور ایک ہی سیکنڈ میں اس کی گردن مسل کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس شخص کی جامہ تلاشی میں رائفل کے دو بھرے ہوئے میگزین اور ٹارچ نکلی۔ میں نے یہ اشیا اپنی جیبوں میں منتقل کر لیں۔ گارڈ کی رائفل فوجی طرز کی تھی اور اس پر باقاعدہ سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل اپنے قبضے میں کر لی اور تنومند گارڈ کا نیم جان جسم گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔

میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں اچھی طرح سوچ چکا تھا۔ جس گاڑی میں بندہ سو رہا تھا وہ تو میں نے چھوڑ دی' باقی دونوں گاڑیوں میں گھس کر ان کے اگنیشن میں سے تار وغیرہ کھینچ دیے۔ مجھے یقین تھا کہ اب یہ گاڑیاں دس پندرہ منٹ سے پہلے اسٹارٹ نہیں ہو سکیں گی۔ اس کام سے فارغ ہونے میں مجھے دو منٹ سے زائد نہیں لگے۔ پسٹل میں نے جیب میں ڈالا اور سنگین سے لیس رائفل تھام کر اسمتھی اور اس کے دوستوں کی محفل کی طرف بڑھا۔ ابھی میں خیمے سے پندرہ بیس قدم دور ہی تھا کہ ایک سایہ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ یہ مسلح گارڈ تھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا جب میری ٹانگ اس کے سینے پر پڑی اور وہ اچھل کر ایک درخت سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے ایک طوفانی مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا' وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح میرے پاؤں میں گرا۔ میں جھک کر اس کی پوزیشن دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کوئی عقب سے مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے سر کے عقبی حصے سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔ اس کے ساتھ ہی میری کہنی نے اس کی پسلیوں کو نشانہ بنایا' مگر بندہ ڈھیٹ تھا اس نے مجھے چھوڑا نہیں اور پورے زور سے اٹھا کر گرانا چاہا' میں نے اس کی کوشش کو کامیاب ہونے دیا۔ جب اس نے مجھے گرا لیا اور دبوچنے کی کوشش کی تو رائفل کی سنگین اس کے سینے میں دل کے مقام پر یوں اتری جیسے چھری صابن میں اترتی ہے۔ وہ ایک بلند کراہ کے ساتھ پھڑکنے لگا۔ میں نے سنگین کھینچی اور دوسرا وار اس کی شہ رگ پر کیا۔ وہ خون میں لت پت ہو کر گر گیا۔ اس کے حلق سے جو کراہ نکلی تھی وہ کسی دوسرے گارڈ کو اس مقام کی طرف کھینچ سکتی تھی۔ میں نے جنریٹر کی اوٹ میں رک کر چند لمحے کسی ردعمل کا انتظار کیا پھر اسمتھی اور اس کے دوستوں کے خیمے کی طرف آ گیا۔

غیر متوقع طور پر یہاں کوئی گارڈ نظر نہیں آیا۔ میں اس چھولداری نما خیمے کی چاروں جانب گھوما۔ جہاں ایئر کنڈیشنر لگایا گیا تھا وہاں چھولداری میں کچھ درزیں موجود تھیں۔ میں نے ایک درز سے آنکھ لگائی۔ اندر کا منظر صاف نظر آیا۔ اسمتھی اور اس کے دوست ایک نیم دائرے کی شکل میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ کئی ایک کے ہاتھ میں پاپ کارن کے لفافے نظر آ رہے تھے لمبے قد کا "جوم" ٹی وی کے سامنے اوندھا لیٹا تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ کوئی دلچسپ کارٹون فلم دیکھ رہے ہیں لیکن یہ کارٹون فلم نہیں تھی' موگاسا کی تباہی و بربادی کی ہولناک عکاسی تھی۔ مجھے ٹی وی اسکرین دکھائی نہیں دے رہی تھی' تاہم تماشائیوں کے چہرے گواہی دے رہے تھے کہ ان کی دلچسپی عروج پر ہے۔ جن دو گارڈز کو غالباً خیمے سے باہر پہرا دینا تھا وہ بھی اس انتہائی سنسنی خیز LIVE فلم کو دیکھنے کے لیے خیمے کے اندر آ گئے تھے اور ایک گوشے میں مؤدب کھڑے تھے۔ اسمتھی کے دوستوں کے علاوہ چند بڑی عمر کے سفید فام نوجوان بھی خیمے میں موجود تھے۔ ان نوجوانوں کا تعلق بھی یقیناً کنگ براؤن کے خانوادے سے ہی تھا۔

میں نے ایک بات نوٹ کی اور مجھے لگا کہ میرا کام قدرے آسان ہو گیا ہے۔ ماسٹر اسمتھی خیمے کی دیوار سے تقریباً ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جس جگہ اس نے ٹیک لگا رکھی تھی وہاں سے خیمے کا کینوس تھوڑا سا باہر کو آ گیا تھا۔ میں اس مقام پر پہنچا۔ میں نے گھٹنے سے اسمتھی کی کمر کو ہلکا سا ٹھوکا دیا کینوس کا ابھار اوجھل ہو گیا۔ یقیناً اندر اسمتھی چونک کر

سیدھا ہو گیا تھا۔ ایک ساعت ضائع کیے بغیر میں نے سنگین کی مدد سے خیمے کے کینوس کو تقریباً چار فٹ تک چاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا داہنا ہاتھ اندر ڈالا اور اسقی کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ یہ سارا واقعہ پانچ چھ سیکنڈ سے بھی کم وقت میں رونما ہوا تھا۔ اسقی جو ذرا دیر پہلے خیمے کی فرحت بخش ٹھنڈک میں ٹی وی سے لطف اندوز ہو رہا تھا' اب میری گرفت میں تھا اور تاریکی میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا اور کسی خوں خوار بلی کی طرح خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اسے لے کر ٹویوٹا جیپ کی طرف دوڑا۔ اس کے منہ سے غلیظ ترین گالیوں کا سیلاب امڈ آیا۔ جب اس نے میری کلائی میں اپنے دانت گاڑے تو میں نے اس کے سر کو رائفل کے دستے سے نشانہ بنایا۔ اس نے بوکھلا کر میری کلائی کو دانتوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

بے شک وہ بچہ تھا لیکن میرے دل میں اس کے لیے رحم کی رتی تک نہیں تھی۔ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں کہ وہ بچہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بچہ تھا ہی نہیں۔ اس کے نوعمر سراپا میں کسی بڈھے کھوسٹ شیطان کی روح بسی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ ماں کے پیٹ سے ہی افلاطون بن کر آمد ہوا تھا اور اب بھی وہ لڑکا نہیں بلکہ ایک ادھیڑ عمر بونا ہے۔ اپنی کلائی کو اس کے دانتوں کی زد سے بچانے کے لیے میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے' لیکن اس کے ہاتھ پاؤں اب بھی مشین کی طرح چل رہے تھے۔ میں اسے لے کر ٹویوٹا جیپ میں پہنچا تو وہاں سویا ہوا شخص ہڑبڑا کر اٹھ چکا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کے پاس نشست پر پڑی ٹویوٹا جیپ کی چابی دیکھ لی تھی اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شخص جیپ ڈرائیو کرے گا۔ میں نے رائفل کی نال اس حبشی کی کنپٹی سے لگا دی اور اسے فوراً جیپ اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر حبشی ڈرائیور نے میری بات نہیں مانی تو میں اس کے بھیجے میں گولی ٹھونکوں گا اور اسقی کو بے ہوش کر کے پچھلی نشست پر ڈال دوں گا۔ اس کے بعد میرے لیے از خود جیپ ڈرائیو کرنا مشکل نہیں ہوگا لیکن یہ سب کچھ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے لب و لہجے میں شاید میرے اندرونی فیصلے کی جھلک موجود تھی۔ ڈرے ہوئے حبشی ڈرائیور نے غور سے میری طرف دیکھا اور بلا چون و چرا گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اسی دوران میں دھماکے ہوئے اور دو تین گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے دائیں بائیں سے گزریں۔ میں نے تاریکی میں گارڈز کے ہیولے دیکھے۔ وہ عفریتوں کی طرح جیپ کی طرف لپک رہے تھے۔ میں نے خود کار رائفل کا رخ ان ہیولوں کی طرف کیا اور بلا جھجک ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی بوچھار نکلی اور میں نے ایک دو چیخوں کی آواز سنی۔ نیچے جھک کر میں نے خود کو جوابی حملے سے محفوظ کیا اور رائفل کی نال ایک بار پھر ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ دی۔ اسقی ایک کوتاہ قد بلا کی طرح تھا۔ اس کی مزاحمت میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے اور زبان سے مغلظات نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کے بال عقب سے مٹھی میں جکڑ لیے تھے ورنہ وہ میری کلائی دانتوں سے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔

عقب میں جیپوں کی روشنیاں چمکیں مگر میں جانتا تھا کہ یہ جیپیں ہمارے تعاقب میں نہ آسکیں گی۔ تقریباً ایک میل تک ہماری جیپ ریتلے راستے پر چلتی رہی پھر درختوں میں گھس گئی۔ اس دوران میں اسقی نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ہاتھ پاؤں روکے تھے اور نہ زبان۔ اس کی دائیں ایڑی سیکڑوں مرتبہ میری پنڈلی سے ٹکرائی تھی اور اسے چھیل کر رکھ دیا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کی ہدایت کی پھر اسقی کے منہ پر چند زوردار تھپڑ مارے' وہ نیم بے ہوش ہو کر جیپ کے فرش پر گر گیا۔ یہ وہی اسقی تھا جس کی طرف کوئی نظر بھر کر دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"نکالو گالی۔" میں نے کہا۔

اس نے پھر گالی دی۔ میں نے ایک بار پھر اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اچانک وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور جیپ سے اتر کر نکل بھاگا۔ اس سے پیشتر کہ میں اس کے عقب میں دوڑتا' تاریکی سے ایک سایہ نمودار ہوا اور اسقی کو دبوچ کر ریت پر گرا دیا۔ اگر یہ سایہ میرا مددگار تھا تو بڑے ٹھیک وقت پر مدد کے لیے آیا تھا۔ ان نازک لمحات میں اگر میں اسقی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو حبشی ڈرائیور کوئی ہوشیاری دکھا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ جیپ بھگا کر لے جاتا یا عقب سے مجھ پر کوئی وار کر گزرتا۔ تاریک ہیولے نے اسقی کو دبوچ کر میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اب وہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں اس کی آواز سن کر حیران رہ گیا۔ وہ فتنہ سامان سائیں عالی تھا۔ میں نے سائیں کی آواز سن کر حیرت کا شدید دھچکا محسوس کیا۔ وہ کھنڈر سے میں پچیس میل دور اس ویرانے میں نجانے کیا کر رہا تھا۔ سائیں کی طرف جانے سے پہلے میں نے حبشی ڈرائیور کی اچھی طرح تلاشی لی پھر اسے ٹھنڈی ریت پر اوندھا لیٹنے کا حکم دیا۔ اس نے تعمیل کی۔

میں سائیں عالی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں نابغہ اسقی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹک رہا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ میرے ذہن میں اندیشہ ابھرا کہ سائیں نے اسے مار ڈالا ہے لیکن پھر فوراً ہی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ کلوروفارم کی تیز بو میرے نتھنوں میں گھسی۔ سائیں عالی کے ہاتھ میں ایک چیتھڑا سا نظر آ رہا تھا۔ غالباً اس نے یہی اسقی کے منہ پر رکھ کر اسے بے ہوش کیا تھا۔

"سائیں تم یہاں کیسے؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"ایک حبشی کی ناک کا لونگ کھو گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اس کی چال دیکھتا آ رہا تھا اور ساتھ ساتھ لونگ ڈھونڈ رہا تھا۔" سائیں نے بے پر کی اڑائی۔

"تمہیں معلوم ہے موگا سائیں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"مجھے سب معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔ تمہارا ذہن کافی کمزور ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم عورت سے بہت دور ہو۔ عورت کا قرب بندے کے دماغ کو تازگی بخشتا ہے۔ فی الحال تم یہ کرو کہ دماغی قوت کے لیے ریتی بم کھایا کرو۔"

"ریتی بم؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

سائیں نے گلے کے ہار میں سے چند ننھے ڈالر نوچ کر ان کا پنکھا سا بنایا اور خود کو ہوا دیتے ہوئے بولا "رات کو دس بارہ ریتی بم پانی میں بھگو کر رکھ دیا کرو۔ صبح نہار منہ ان کے خول اتار کر کھایا کرو۔ اس جیپ کی سیٹوں کے نیچے اور ٹول بکس میں بھی بہت سے ریتی بم موجود ہیں' تم ان کو بھی استعمال کر سکتے ہو۔ بلکہ اس چھوکرے اسقی کو بھی استعمال کراؤ۔ اگر یہ نہیں کھاتا تو آٹھ دس بم اس کے پیٹ سے باندھ دو۔ انشا اللہ بہت فائدہ ہوگا تمہیں۔ ویسے تم بہت اچھے جا رہے ہو شفیع محمد! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور بددعائیں کنگ براؤن کے ساتھ۔"

سائیں عالی ایک بار پھر رمزیہ گفتگو کر رہا تھا۔ میں اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ سائیں عالی نے میری طرف سر جھکایا اور میرے کان میں پر اسرار سرگوشی کرتے ہوئے بولا "اور یہ جو حرامی ڈرائیور ہے نا' یہ اصل میں ایک جن ہے۔ بڑا خبیث جن ہے۔ اس کو قتل کر دو ورنہ یہ تمہارا اور میرا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ اس بدبخت کا کردار وہی ہے جو انڈین فلموں میں پران کا ہوتا ہے۔"

سائیں کا یہ اشارہ بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آ گیا۔ ڈرائیور نے سائیں کو اسقی پر جھپٹتے دیکھ لیا تھا اور مجھ سے گفتگو کرتے بھی سن لیا تھا۔ سائیں عالی نے گفتگو میں میرے لیے شفیع محمد کا لقب استعمال کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ زست میں کچھ لوگوں کو پتا ہو کہ سائیں یہ لقب کس کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یوں سائیں کے ساتھ میرا کردار بھی زسٹیوں کی نگاہ میں مشکوک ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے ریت پر اوندھے لیٹے ڈرائیور کی طرف دیکھا تھا۔ پلٹ کر واپس دیکھا تو سائیں عالی غائب تھا۔ وہ پھرتی سے جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے اسے دو تین آوازیں دیں مگر وہ آوازوں سے کب لوٹنے والا تھا۔ وہ تو ایک چھلاوا تھا۔ حیران کر کے جاتا تھا اور حیران کرنے کے لیے آتا تھا۔ یہ ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں بے ہوش اسقی کو وہیں ریت پر چھوڑ کر جیپ کی طرف لپکا۔ جیپ پر لگے بڑے بڑے اینٹینے دیکھ کر میں بہت پہلے جان چکا تھا کہ اس میں ٹرانس میٹر موجود ہے۔ میں نے ڈرائیور کو گن پوائنٹ پر رکھ کر ٹرانس میٹر کے سامنے بٹھایا اور اسے حکم دیا کہ وہ کنگ براؤن سے میرا رابطہ کرائے۔ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ میں کنفرم نہیں تھا کہ کنگ براؤن رابطے میں ہوگا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ بنفس نفیس موگا سا پر

ایم اے راحت کے قلم سے ایک نیا اور انوکھا شاہکار

فرعون

قیمت فی جلد روپے

پروفیسر زاخ کون تھا؟ کوئی انسان یا بدروح؟
ایک ایسی دوشیزہ کا قصہ جو لمحوں کی قیدی تھی۔
وہ بے بدن تھا۔ اسکا بدن تاریخ کا قیدی تھا۔

ناشر

اسٹاکسٹ

ہونے والے حملے میں شریک ہے۔ ڈرائیور کے مشاق ہاتھوں نے تھوڑی دیر ٹرانس میٹر کے کنٹرول پینل سے چھیڑ چھاڑ کی اور پھر ٹرسٹ کے کرتا دھرتا کی آواز اسپیکر پر ابھری "یس کنگ اسپیکنگ!"

اس کی بارعب آواز کے پس منظر میں گولیوں کی تڑتڑ گونج رہی تھی اور یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ کنگ "میدانِ جنگ" میں موجود ہے۔ اس نے ذرا گرج کر اپنا سوال دہرایا "ہم پوچھ رہے ہیں کہ کون بول رہا ہے؟"

"میں تمہاری ماں کا خصم بول رہا ہوں۔ والدِ محترم ہوں تمہارا۔" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"یہ کون ہے۔ کون بک بک کر رہا ہے؟"

"خبردار رابطہ منقطع مت کرنا ورنہ بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔" میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا "تمہارا اکلوتا بچہ۔ شیطان جونیئر ماسٹر اسٹی اس وقت میرے قبضے میں ہے اور میرا میٹر پوری طرح گھوما ہوا ہے۔ میں ایک پل کے اندر اپنی اور اس کی جان لینے کا فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

"یہ کون پاگل ہے' یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔" کنگ کی... بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ کسی ساتھی سے ہم کلام تھا۔ شاید اس کے تصور میں ہی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی اسٹی پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔

ایک سیکنڈ بعد ایک اور بارعب آواز ابھری "کون ہو تم؟"

"میں نے تمہارے حرامی کنگ کو بتایا ہے' میں اس کا اصلی باپ ہوں' اور کنگ کا بیٹا شیطان جونیئر اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ کنگ سے کہہ دو۔ موگاسا پر حملہ دو منٹ کے اندر اندر روک دیا جائے' ورنہ میں اس بچے کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا۔"

اپنی آواز کی وحشت نے خود مجھے بھی چونکا دیا۔ میں جو کہہ رہا تھا واقعی کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ٹرانس میٹر پر مجھے گولیوں کی تڑتڑاہٹ نہایت واضح سنائی دے رہی تھی۔ اگر میری دھمکی کے نتیجے میں یہ اندھا دھند فائرنگ رک نہ جاتی تو میں واقعی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتا۔ میں نے کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ میں کسی گروہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کسی بچے کو اغوا کروں گا اور پوری سفاکی سے اسے قتل کر ڈالنے کی دھمکیاں دوں گا' لیکن یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور بقائمی ہوش و حواس ہو رہا تھا۔ میں نے زمیلوں کی درندگی کے ایسے مناظر دیکھے تھے کہ اب اس بچے کے حوالے سے میرے دل میں رحم کی رمق نہیں رہی تھی۔ اور یہ بچہ تھا بھی کہاں؟ یہ تو بچے کے روپ میں ایک نہایت بگڑی ہوئی بدروح تھا۔

کنگ کی آواز دوبارہ ابھری "تم جو کوئی بھی ہو اپنے لیے اذیت ناک موت کا سامان کر رہے ہو۔ یہ مذاق تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔"

"یہ مذاق نہیں ہے میرے لختِ جگر۔ تیری خرمستیوں اور لن ترانیوں کا یومِ حساب آنے والا ہے۔"

میں نے رائفل کے ٹہوکے سے حبشی ڈرائیور کو ٹرانس میٹر کی طرف دھکیلا اور بولنے کا اشارہ کیا۔

وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بولا "میں کنگ کا حقیر غلام روگال عرض کر رہا ہوں۔ میری ڈیوٹی چیف اینڈریو کے ساتھ تھی۔"

اس کے بعد روگال نامی اس شخص نے رو رو کر کنگ کو بتایا کہ "چھوٹے شہزادے" کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ میں نے کس طرح اسے جھپٹا ہے اور کس طرح بے ہوش کر کے ٹھنڈی ریت پر پھینکا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ شاید اس ناقابلِ یقین خبر پر یقین کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے نہایت سرد لہجے میں کہا "برخوردار کنگ' میں نے تمہیں تمہارے اصلی باپ کی آواز سنا کر تم پر حد درجہ احسان کیا ہے۔ اب ذرا اپنی گھڑی کی طرف نگاہ دوڑا لو۔ میں نے تمہیں دو منٹ کا وقت عنایت فرمایا تھا۔ اس میں سے ایک منٹ پانچ سیکنڈ گزر چکے ہیں۔ اگر پچپن سیکنڈ تک فائرنگ کی آواز آنا بند نہیں ہوئی تو میں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دوں گا۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم۔۔ تم۔۔ تم!" کنگ براؤن ہکلا کر رہ گیا۔

"اور میری ایک بات اور کان کھول کر سن لو بچے۔ جس بستی کو تم تہس نہس کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اسی بستی میں تمہاری بھتیجی ویرا بھی موجود ہے۔ اور وہ میرے چھوٹے بھائی سوار رانے صاحب عزت مآب کے قبضے میں ہے۔ اگر بستی پر یہ حملہ روکا نہ گیا تو میرے نورِ نظر! تیری تو۔۔" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں جانتا تھا کنگ اس ادھورے فقرے کے آگے من پسند گالیاں خود ہی کر لے گا۔

"تم پاگل ہو۔۔۔ پاگل ہو!" کنگ چیخا۔

"اور یہ پاگل تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ تمیں سیکنڈ رہ گئے ہیں' حملہ روک دو' ورنہ پہلے شیطان جونیئر کی جان جائے گی اور پھر بعد میں ویرا کی۔۔۔؟"

میری دھمکی ٹرانس میٹر کے ذریعے کنگ براؤن تک پہنچ گئی تھی اور اب مجھے نتیجے کا انتظار تھا۔ میں نے زمیلوں کو بستی پر حملہ روکنے کے لیے صرف تمیں سیکنڈ کی مہلت دی تھی اور یہ مہلت بڑی تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ میں جیپ کی اگلی نشست پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور میری رائفل کی نال حبشی ڈرائیور کی گردن سے لگی ہوئی تھی۔ ماسٹر اسٹی جیپ سے قریباً بیس گز دور کلورو فارم کے زیرِ اثر ریت پر بے سدھ پڑا تھا۔

تمیں سیکنڈ گزرنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میری دھمکی کارگر رہی ہے اور کنگ براؤن نے بستی پر حملہ روک دیا ہے۔ ٹرانس میٹر پر فائرنگ کی جو اندھا دھند آواز آ رہی تھی وہ بڑی تیزی سے کم ہوئی تھی اور اب صرف اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کنگ براؤن کے اسسٹنٹ کی آواز سنائی دی "بستی پر حملہ روک دیا گیا ہے۔ کنگ چاہتے ہیں کہ ماسٹر اسٹی سے ان کی بات کرائی جائے۔"

"یعنی کنگ اس بات کا ثبوت چاہتا ہے کہ شیطان جونیئر واقعی میرے قبضے میں ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" دوسری طرف سے جواب آیا۔

"کیا ابھی اپنے پالتو کتے روگال کی بکواس سن کر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟"

"اگر ماسٹر واقعی تمہارے پاس ہیں تو پھر تم ان سے بات کرانے میں یوں پس و پیش کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں کتے کے بچے۔۔ میرا مطلب ہے کہ شیطان جونیئر کو لے کر خود تمہاری خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں' بس آدھ گھنٹے کے اندر اندر۔ اگر اس دوران میں تم لوگوں کی طرف سے موگاسا بستی پر ایک گولی بھی چلائی گئی تو اس کی سزا شیطان جونیئر کو بھگتنا پڑے گی۔" اس کے ساتھ ہی میں نے روگال کو اشارہ کیا کہ وہ ٹرانس میٹر بند کر دے۔

سائمن عالی مجھے اشاروں کنایوں میں کہہ گیا تھا کہ روگال کو زندہ رکھنا اب ٹھیک نہیں اور اگر سائمن نہ بھی کہتا تو میں روگال کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں نے پہلے روگال کو حکم دیا کہ وہ بے ہوش ماسٹر اسٹی کو اٹھا کر جیپ میں لائے۔ جب وہ لے آیا تو میں نے رائفل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس کا جسم تھرا اٹھا۔ وہ بڑی تیزی سے کچھ بولنے لگا۔ یقیناً جاں بخشی کی درخواستیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی چمکنے لگے تھے۔ میں نے اس کی اذیت کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور ٹریگر دبا دیا۔ طاقتور رائفل کی گولی نے اس کا بھیجا یوں اُڑایا کہ سر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح ریت پر گرا اور اس کا خون ایک سیاہ دھبے کی شکل میں ریت پر پھیلنے لگا۔

میں نے جیپ کی نشستوں کے نیچے تلاش کیا تو فوراً ہی مجھے دستی بموں کے دو چھوٹے ڈبے مل گئے۔ ان دھاتی ڈبوں میں کم و بیش بیس دستی بم موجود تھے۔ ایسے ہی دو ڈبے جیپ کے ٹول بکس سے بھی ملے۔ اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ جب میں ماسٹر اسٹی کو خیمے سے پکڑ کر جیپ میں لایا اور جیپ روانہ ہوئی تو محافظوں نے جیپ پر صرف چند فائر کرنے پر اکتفا کیا۔ درحقیقت وہ جانتے تھے کہ جیپ میں چالیس کے لگ بھگ ہینڈ گرینیڈز موجود ہیں۔ اگر کوئی ایک ہینڈ گرینیڈ بھی پھٹتا تو ہمارے ساتھ ولی عہد اسٹی کے بھی ہزاروں ٹکڑے ہو جاتے۔

میں نے سارے ہینڈ گرینیڈ ڈبوں سے نکالے۔ جیپ کے اندر سے ہی مجھے بجلی کا ایک بڑا سا تار بھی مل گیا۔ میں نے قریباً بارہ ہینڈ گرینیڈ اس تار کے ذریعے ایک ہار کی شکل میں پروئے اور یہ ہار ایک طرف رکھ دیا' پھر ایسا ہی ایک دوسرا ہار میں نے بنایا' اس میں بھی آٹھ کے لگ بھگ ہینڈ گرینیڈ تھے۔ اسٹی کسی بھی وقت ہوش میں آسکتا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد اس نے جس قسم کا تہلکہ مچانا تھا اس کی چھوٹی سی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ ہینڈ گرینیڈ کا چھوٹا ہار میں نے اس کے گلے میں ڈالا اور بڑا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اسٹی کو میں نے نشست پر بٹھا کر حفاظتی بیلٹ کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کا سر آگے کی طرف جھک گیا تھا' بہرحال وہ نشست پر بیٹھا ہی نظر آتا تھا۔ میں نے ٹرانس میٹر کا میکنزم اچھی طرح دیکھنے کے بعد جیپ کو اسٹارٹ کیا اور موگاسا بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرانس میٹر پر بار بار سگنل موصول ہو رہا تھا لیکن میں نے بالکل توجہ نہیں دی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سگنل کنگ براؤن کی طرف سے ہوگا۔ ایک پریشان باپ اپنے بیٹے کی خیریت جاننے کے لیے مجھ سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں ابھی اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد میں موگاسا کے نواح میں پہنچ گیا۔ مجھے اکا دکا فائر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ فائرنگ موگاسا والوں کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ کنگ براؤن کو اب اتنی جرأت نہیں رہی تھی کہ وہ گولی چلوا سکتا۔ تاریک افق پر سرخ روشنی نظر آنے لگی تھی۔ یہ اس آگ کی روشنی تھی جو بستی کے کچھ جھونپڑوں میں لگی ہوئی تھی۔ اگر میری دھمکی کے نتیجے میں کنگ حملہ رکوا نہ چکا ہوتا تو یقیناً اس وقت آگ کے شعلے

آسمان سے باتیں کر رہے ہوتے اور چند جھونپڑے نہیں' پوری بستی جل رہی ہوتی۔

بستی سے تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر میں رک گیا۔ میں نے ٹرانس میٹر آن کیا۔ دوسری طرف سے گنگ کے اسسٹنٹ راجر کی آواز سنائی دی "تم جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟"

"میں تمہارے بالکل قریب پہنچ چکا ہوں۔ ولی عہد شیطان جونیئر میرے پاس ہے۔ میں نے اپنے اور اس کے گلے میں ایک بڑا خوب صورت ہار ڈال دیا ہے۔"

"تمہاری کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو' سامنے آؤ اور اگر تمہارا کوئی مطالبہ ہے تو پیش کرو۔"

اسسٹنٹ راجر کی آواز میں وہ پہلے والا رعب محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کا لہجہ بھی مصالحانہ تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پچھلے پندرہ بیس منٹ کے دوران میں گنگ اور اس کے حواریوں کا رابطہ اپنے کیمپ سے ہو گیا ہے اور وہاں سے تصدیق ہو گئی ہے کہ موگا سا کے ایلچی نے خیمہ پھاڑ کر ماسٹر دستفی کو اغوا کر لیا ہے اور جیپ پر فرار ہو گیا ہے۔

میں نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا "یہ میرا مطالبہ نہیں بلکہ اطلاع ہے کہ میں تمہارے شیطان جونیئر سمیت تمہارے درمیان سے گزر کر موگا سا بستی میں جا رہا ہوں۔ اگر تم میں سے کسی نے میری جیپ پر ایک گولی بھی چلائی تو میرے اور جیپ سمیت شیطان جونیئر کے بھی بے شمار ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

"تم ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن....."

"میں کسی طاعون زدہ چوہے کو ڈرانے کی کوشش نہیں کر رہا۔" میں نے راجر کی بات کاٹی "اس وقت تمہارے شیطان جونیئر کے جسم کے ساتھ اور میرے جسم کے ساتھ درجنوں دستی بم بندھے ہوئے ہیں۔ اگر تم اس بات کا ثبوت چاہتے ہو تو اپنے کسی اکیلے چوہے کو تصدیق کے لیے بھیج سکتے ہو لیکن اس چوہے کو یہ سمجھا کر بھیجنا کہ اپنی دم پر کھڑا ہونے کی حماقت بھول کر بھی نہ کرے۔ اس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کا نتیجہ یہی ہو گا کہ یہ جیپ استفی سمیت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ میں اس وقت بستی کی مشرقی جانب تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر موجود ہوں۔ میں نے اپنی گاڑی کی روشنیاں بجھا رکھی ہیں' اگر تم کہو تو میں روشنیوں کے ذریعے تمہیں سگنل دیتا ہوں!"

"ہاں دو سگنل۔" راجر کی آواز آئی۔

میں نے ڈپر کے ذریعے تین چار بار اشارہ دیا۔ فوراً ہی ٹرانس میٹر پر راجر کی ہیجانی آواز ابھری "ٹھیک ہے ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ ہم دو منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔"

"ہم نہیں۔" میں نے فوراً اس کی بات کاٹی "صرف ایک شخص آئے گا۔ چاہے تم خود آ جاؤ اور آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں۔ میں اور ماسٹر استفی اس وقت بارود کے ڈھیر پر بیٹھے ہیں۔"

"ٹھ.... ٹھیک ہے۔" راجر نے کہا "صرف ایک شخص آئے گا۔ تم اپنی گاڑی کی پارکنگ لائٹس روشن رکھو۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور لائٹس جلا دیں۔

کچھ ہی دیر بعد ایک جیپ مجھ سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر رکی۔ اس میں سے ایک شخص نکلا اور محتاط قدموں سے میری جانب بڑھا۔ میں نے چال ہی سے پہچان لیا۔ وہ راجر خود تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں' وہ روشنی میں نہا گیا۔ اس کے ہولسٹر میں ریوالور موجود تھا۔ میں نے کہا "ریوالور وہیں ریت پر ڈال دو۔ کوئی دوسرا ہتھیار ہے تو وہ بھی وہیں رکھ دو اور میرے پاس آ جاؤ۔"

راجر نے ہدایات پر عمل کیا اور میرے قریب آ گیا۔ میں نے گاڑی کی اندرونی روشنی جلا دی۔ اب استفی اور میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ جیپ میں ہر طرف دستی بم تھے اور ان میں سے دو تین کی سیفٹی پن بھی میں نے کھینچ رکھی تھی۔ راجر پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی "ماسٹر کو کیا ہوا ہے؟"

"مرا نہیں ہے صرف بے ہوش ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" راجر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"فی الوقت بس یہ چاہتا ہوں کہ مجھے بستی میں جانے کا محفوظ راستہ دیا جائے۔ باقی گپ شپ بستی میں پہنچ کر ہو گی۔"

"کیا تم اس طرح بستی میں جاؤ گے؟" راجر نے دہشت زدہ آواز میں پوچھا۔

"کیوں میرے اس طرح جانے سے تمہارے گنگ کا باؤں بھاری ہو جائے گا؟"

"لل.... لیکن اگر کہیں سے کوئی گولی چل گئی۔ مم.... میرا مطلب ہے کہ اگر لارسیوں کی طرف سے ہی کوئی فائر آ گیا تو؟"

"اس خطرے کا بندوبست بھی تم ہی کرو گے۔" میں نے

بڑے اطمینان سے کہا "تمہیں واپس جا کر بستی کے کسی معزز شخص کو میری طرف بھیجنا ہو گا تاکہ میں اسے اس گاڑی کی صورت حال سے آگاہ کر سکوں۔"

"دیکھو.... تت.... تم بہت خطرناک کھیل' کھیل رہے ہو۔ ہمارے لیے اور تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم ماسٹر کو بستی میں لے جانے کی ضد نہ کرو۔ جو بھی معاملہ ہے وہ یہیں طے کر لو۔"

میں نے رائفل کی نال اس کی ٹانگوں کی طرف سیدھی کر دی "زیادہ دیر ہو گئی تو شرم گاہ کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔ میں تمہیں صرف پندرہ سیکنڈ دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں جیپ کے اندر نظر آنا چاہیے اور جیپ کا رخ بستی کی طرف ہونا چاہیے۔"

"تت.... تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں...."

"پانچ سیکنڈ گزر گئے ہیں اور یہ بات تم لوگ مجھے بتا ہی چکے ہو کہ پیغام لانے والے ایلچی کو بھی دردناک موت کا مزہ چکھایا جا سکتا ہے۔"

میرے اندر کا بے رحم استاد جمالی مدت بعد آج پھر بیدار ہو گیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر راجر جیسے خرانٹ شخص کی بھی گھگی سی بندھ گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن چند سیکنڈ کے تبادلہ خیال سے ہی اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر الٹے قدموں پیچھے ہٹا' پھر مڑ کر بھاگا' بھاگتے بھاگتے ہی اس نے ریت سے اپنا ریوالور اٹھایا اور جیپ میں پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی جیپ نے تیزی سے یو ٹرن لیا اور بستی کی طرف روانہ ہو گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد پھر وہی جیپ مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس مرتبہ جیپ میں راجر کے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔ جیپ مجھ سے کافی فاصلے پر رک گئی۔ جو شخص جیپ سے اتر کر میری طرف بڑھا' وہ سردار رانے کا بھائی اولام تھا۔ اس کے ساتھ مترجم کے طور پر سائیں کا پراسرار کارندہ اشوکا بھی تھا۔ وہ دونوں میرے قریب آ کر رک گئے "یہ کون ہے؟" اشوکا نے بے ہوش استفی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نرسٹ کا ولی عہد.... گنگ براؤن کا نطفہ ماسٹر استفی۔ اس وقت میرے اور اس کے جسم کے ساتھ بم بندھے ہوئے ہیں۔ جیپ میں بھی ہر طرف بم موجود ہیں۔ اگر نرسٹ کی طرف سے یا بستی والوں کی طرف سے جیپ پر ایک بھی فائر کیا گیا تو ہم دونوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ میں نے اسی لیے تم دونوں کو یہاں بلایا ہے۔ میں استفی سمیت بستی میں داخل ہو رہا ہوں۔ اس جیپ کو اچھی طرح پہچان لو۔ یہ نہ ہو کہ بستی میں سے کوئی ہم پر فائرنگ کر دے۔"

اشوکا کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے تھے۔ اس نے جب میری بات کا ترجمہ کر کے اولام کو بتایا تو اس نے جوش میں آ کر اپنا مکا لہرایا اور وہیں کھڑے کھڑے نعرے بازی شروع کر دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ماسٹر استفی کی شکل میں ان کے سب سے بڑے دشمن کی شہ رگ ان کے قبضے میں آ گئی ہے۔

میں نے اسے نعرے بازی سے روکا۔ وہ گردن کی رگیں پھلا کر بڑے تند و تیز لہجے میں کچھ بولنے لگا۔ اس کی ترجمانی کرتے ہوئے اشوکا نے بتایا "نرسٹیوں نے پولیس والوں کے ساتھ مل کر بستی کی حفاظتی باڑ روند ڈالی ہے اور بستی کے شمالی حصے پر قبضہ جما لیا ہے۔ وہاں انہوں نے درجنوں لوگوں کو قتل کر دیا ہے اور کئی جھونپڑے جلا ڈالے ہیں۔ ان کے ارادے بہت خطرناک ہیں اور وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"اب وہ کچھ نہیں کریں گے۔" میں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "تم لوگ اب واپس جاؤ اور میرا انتظار کرو۔"

صفدر' ڈیرا اور سردار رانے وغیرہ کی خیر خیریت پوچھ کر میں نے ان دونوں کو واپس بھیج دیا۔ اولام بے حد پرجوش نظر آ رہا تھا۔ جیپ میں گھس کر بھی وہ مکا لہرا تا رہا اور نعرے بلند کرتا رہا۔ "محاذ جنگ" پر اب مکمل خاموشی تھی۔ دونوں طرف سے ایک گولی بھی فائر نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے تقریباً آدھا گھنٹا مزید انتظار کیا۔ اس دوران میں استفی ایک دو بار کسمسایا ضرور تھا مگر ہوش میں نہیں آیا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور استفی کو لے کر بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ گنگ براؤن کے کئی سو مسلح محافظوں اور پولیس والوں کے درمیان سے گزر کر میں بستی میں داخل ہو گیا۔ سردار رانے نے عبادت گاہ (پوما) کی سیڑھیوں پر میرا استقبال کیا۔ سیکڑوں پرجوش لارسی یہاں جمع تھے اور فلک شگاف نعرے بلند کر رہے تھے۔ ان نعروں میں غم و غصے کا تاثر اتنا نمایاں تھا کہ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ یہ احمق لوگ کہیں چیر پھاڑ کی طرح شیطان جونیئر پر بھی نہ جھپٹ پڑیں۔ میں نے دستی بموں کو احتیاط کے ساتھ اپنے اور استفی کے جسم سے جدا کیا اور استفی کو لے کر سردار رانے کے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں کئی اہم واقعات ہوئے۔ نرسٹ کے ولی عہد استفی کا میرے قبضے میں آ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ تو نرسٹ کے زمین دوز حفاظتی حصار میں سیکڑوں محافظوں کے درمیان رہتا تھا۔ اس تک بھلا کس کی رسائی ہو سکتی تھی۔ اگر وہ موگا سا پر حملے کے براہ راست

مناظر دیکھنے کے لیے یہاں اس جنگل میں موجود نہ ہوتا تو میں اسے کسی بھی طور قابو نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹی کے میرے قبضے میں آجانے سے زرسٹ کے خوں خوار حملہ آوروں پر وہی اثر ہوا تھا جو کسی بہت بڑے جانور پر اس وقت ہوتا ہے جب اس کی ناک میں نکیل ڈال دی جاتی ہے۔ اس بظاہر معمولی سی رسی کے ذریعے نہایت طاقت ور جانور کو اپنی مرضی سے جس طرف چاہے بہ آسانی موڑا جا سکتا ہے۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر کنگ براؤن نے بستی کے مغربی حصے سے اپنے مسلح آدمیوں کو نکال لیا تھا اور بلڈوزر وغیرہ بھی بستی کی حدود سے باہر چلے گئے تھے۔ اگلے آدھ گھنٹے میں تازہ لڑائی میں جن تمیں کے قریب عورتوں اور بچوں کو بستی سے پکڑا گیا تھا انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ زرسٹ کے جنگ جو بستی سے مزید ایک سو گز پیچھے ہٹ گئے۔ کنگ براؤن اور اس کے حواری ہر صورت میں اسٹی اور ویرا کی واپسی چاہتے تھے۔ خاص طور سے اسٹی کو واپس لیے بغیر تو وہ یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بستی کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ صبح دم پولیس کی مزید نفری بھی اس دور دراز بستی کے ارد گرد پہنچ گئی۔

صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ میری توقع کے عین مطابق مجھے سائیں عالی کی صورت نظر آگئی۔ سائیں عالی چار شان دار حبشیوں کے جلو میں بڑے کروفر کے ساتھ بستی میں پہنچا تھا۔ سائیں کے ساتھ اس کے اپنے کارندوں کے علاوہ کنگ براؤن کے نمائندے بھی تھے۔ ان میں راجر کو میں صاف پہچان سکتا تھا۔ یہ سب لوگ مصالحت کی گفتگو کے لیے آئے تھے۔ سائیں عالی کو دو وجوہات کے سبب ساتھ لایا گیا تھا۔ ایک تو لارسی اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کی بات مانتے تھے۔ دوسرے میرے اور صفدر کے متعلق یہاں یہی بات مشہور تھی کہ ہم سائیں کے آدمی ہیں۔ ہمارے ساتھ اشوکا کی موجودگی سے بھی یہی بات ثابت ہوتی تھی کہ ہم سائیں کے بھیجے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

سردار رانے کے شان دار جھونپڑے میں میرے اور سائیں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔

سائیں نے مجھے میرے فرضی نام عبداللہ سے پکارا اور کہا "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں عبداللہ۔ میں نے تمہیں یہاں طلبیا اور بیٹنے کی دوائیں دے کر بھیجا تھا' بندوق اٹھانے اور مار دھاڑ کرنے کے لیے نہیں کہا تھا اور نہ ہی یہ ہمارا راستہ ہے۔ ہمارے لیے سب ایک جیسے ہیں۔ ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔ ہمارا کام صرف دکھی لوگوں کے دکھ بانٹنا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ بچے کو فوراً رہا کر دو۔"

"میں تمہارا حکم ماننے سے صاف انکار کرتا ہوں۔" میں نے بڑی ڈھٹائی سے سائیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

سائیں کی آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ اس نے اپنا عصا سیدھا کیا اور چنگھاڑا "میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی وہ وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹا۔

میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور نکال لیا۔ لارسی محافظ لپک کر میرے اور سائیں کے بیچ میں آگئے۔ سائیں فرط غضب میں گرج رہا تھا "تم کل تک میرے جوتے چاٹ رہے تھے۔ آج تمہاری یہ جرأت کہ میرا حکم ماننے سے انکار کرو۔ میں بھسم کر دوں گا' تمہیں اسی جگہ راکھ کا ڈھیر بنا دوں گا۔"

محافظوں کا گھیرا توڑ کر وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا اور ریوالور سائیں کی پیشانی کی طرف سیدھا کر لیا "خبردار میرے قریب کوئی نہ آئے" میں نے چیخ کر وارننگ دی "ورنہ ماسٹر اسٹی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

"کہاں ہے ماسٹر؟" راجر نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"وہ ساتھ والے جھونپڑے میں ہے۔ میرا مسلح ساتھی اس کی نگرانی پر مامور ہے' اگر یہاں غلطی سے بھی گولی چل گئی تو وہ بچے کو شوٹ کر دے گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی جان چلی جائے گی۔"

میری دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ لارسیوں سے زیادہ کنگ کے آدمی متفکر نظر آنے لگے کہ سائیں کو اودھم مچانے سے کیسے روکا جائے۔ سائیں تو جیسے سچ مچ پاگل ہو گیا تھا' وہ زمین سے دو فٹ اچھل رہا تھا اور مجھے بے نقط سنا رہا تھا "تمہاری یہ جرأت۔ تمہاری یہ جرأت۔" وہ بار بار یہی فقرہ دہراتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہر بار جب وہ اچھلتا تھا تو اس کے گلے میں موجود لاکھوں ولاتوس اور پاؤنڈ بھی اچھل جاتے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ سائیں عالی ڈراما کر رہا ہے لیکن اس کی اوریجنل ایکٹنگ دیکھ کر مجھے شک گزرنے لگا کہ کہیں سچ مچ ہی تو اس کا دماغ نہیں الٹ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر وہ کسی طرح میرے قریب آگیا تو خالی ہاتھوں سے ہی میری بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔

کنگ کے کارندوں نے اسے بڑی مشکل کے ساتھ سنبھالا اور قریباً ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے گئے۔ وہ خود بھی

چکرائے ہوئے نظر آتے تھے۔ جس شخص کو وہ مصالحتی کردار ادا کرنے کے لیے یہاں لائے تھے وہ معاملے کو سلجھانے کے بجائے خود ہی کپڑوں سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ چیخ دھاڑ مچا رہی تھی کہ جھونپڑوں میں لارسیوں کے بچے ڈر کر رونے لگے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا جھونپڑے سے باہر نکل کر سائیں عالی نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور سر میں راکھ ڈال لی تھی۔ وہ کبھی انگریزی اور کبھی اردو میں بس ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہا تھا "اوئے تمہاری یہ جرأت۔ تمہاری یہ جرأت!" اس کے بعد اس نے بوما کے عین سامنے سر کے بل کھڑے ہو کر مجھے بے تحاشا بددعائیں دی تھیں اور میرے عبرت ناک انجام کی پیش گوئیاں "براڈ کاسٹ" کی تھیں۔ بعد ازاں وہ بوما کے بڑے دروازے کے قریب زمین پر اوندھا لیٹ گیا تھا اور "بھوں بھوں" کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔

بہرحال ان باتوں کا پتا تو مجھے بعد میں چلا اس سے پہلے میرے اور کنگ براؤن کے نمائندوں کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے۔ میں نے ان لوگوں کو صاف بتا دیا کہ اسٹی کے سلسلے میں میں فی الحال کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ سائیں عالی اور کنگ تو کیا' برطانیہ کا حکمران بھی آجائے تو شیطان جونیئر کو مجھ سے زندہ واپس نہیں لے سکتا۔ قریباً آدھ گھنٹے کی سخت تلخ کلامی کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ان کی بے بسی قابل دید تھی اور میں یہ سوچ کر قدرت کا شکر گزار ہو رہا تھا کہ اگر میک اپ نے میری اور صفدر کی اصلیت ان لوگوں سے چھپا نہ رکھی ہوتی تو ہم پر کیا کیا آفات نہ ٹوٹ پڑتیں۔ ہمارے ساتھی زرسٹ کی قید میں تھے۔ ان کی اذیت ناک موت کا تصور ہمیں کنگ کے پاؤں پر سر رکھنے پر مجبور کر سکتا تھا پھر اسٹی کو یرغمال بنانا تو دور کی بات ہے' ہم کنگ کے کسی کارندے کی طرف بھی میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں لرز گیا۔ میرا اور صفدر کا بہروپ یہاں ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل تھا لیکن ایک فرد ایسا تھا جو اس بہروپ کے بارے میں جانتا تھا۔ اور وہ جوری تھی۔ حملے سے قبل میں نے اور صفدر نے جوری کو اپنے بارے میں بتا دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں جوری ہمارے اہم ترین راز سے آگاہ تھی' اسے فوری طور پر خاموش کرنا ضروری ہو گیا تھا اور پائیدار خاموشی یہی تھی کہ اسے ختم کر دیا جاتا۔

میں دوسرے جھونپڑے میں پہنچا۔ یہاں صفدر اپنی ڈیوٹی بڑی ہوشیاری سے انجام دے رہا تھا۔ وہ ایم سولہ رائفل کے ساتھ اسٹی کے قریب چوکس بیٹھا تھا۔ میں نے اسے واضح لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اسٹی کو چھیننے کی کوشش کی جائے تو وہ اسے شوٹ کر ڈالے اور میں جانتا تھا کہ صفدر کا نشانہ چوکنے والا نہیں۔ اسٹی جھونپڑے کے کچے فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود حرکت کر رہے تھے لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ بول کیوں نہیں رہا؟" میں نے صفدر سے پوچھا۔

وہ بولا "یہ جس قسم کی غلیظ گالیاں بکتا ہے' بہتر تو یہ تھا کہ اس کی زبان کاٹ دی جاتی لیکن میں نے صرف اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے پر اکتفا کیا ہے۔"

"چلو اچھا کیا۔ جوری اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

صفدر حیرانی سے بولا "آپ کو نہیں معلوم؟"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے بھی حیرانی سے پوچھا۔

وہ بولا "وہ بڑی سخت جان نکلی ہے۔ جس وقت زرسٹیوں نے بستی پر حملہ کیا اور بلڈوزر اندر گھس آئے تو ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ اس بدبخت نے اپنے قریب موجود ایک محافظ کے سینے میں برچھی اتاری اور نیم عریاں حالت میں ہی بھاگ نکلی۔ سردار رانے پوری بستی میں اسے تلاش کروا رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ صفدر کی آنکھیں بھی پریشانی سے زرد ہو رہی تھیں۔ میری طرح وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جوری کا یہاں سے فرار ہو جانا ہمارے لیے کتنا خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے اگر وہ فرار ہو کر زرسٹیوں میں پہنچ چکی تھی تو پھر ہمارے لیے قیامت صغریٰ برپا ہونے والی تھی۔ جونہی جوری کی زبانی کنگ براؤن کے حواریوں کو یہ پتا چلتا کہ ہم دونوں کی اصلیت کیا ہے' وہ زرسٹ میں موجود ہمارے ساتھیوں غزالہ' کلثوم اور زریں کو موت اور زندگی کے درمیان لٹکا دیتے اور ان پر رحم کرنے کے عوض ہمیں اسٹی اور ویرا سمیت اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیتے اور ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا یہ حربہ کتنا تیر بہدف ثابت ہوتا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

صفدر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "اگر تو وہ بستی کے اندر ہی کہیں ہے تو پھر زیادہ دیر چھپ نہیں سکے گی۔"

"لیکن اگر وہ نکل گئی ہے تو پھر؟"

"میرا خیال ہے کہ رانے کو تازہ ترین صورت حال

معلوم ہوگی۔"

میں صفدر کو وہیں استقی کے پاس چھوڑ کر سردار رانے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے جھونپڑے میں نہیں تھا۔ لاروناب نے بتایا کہ وہ شفا خانے کی طرف گیا ہے۔ شفا خانہ بستی کے وسط میں واقع تھا۔ یہ تین چار بڑے بڑے جھونپڑے تھے جن میں مقامی معالج مریضوں کا علاج جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے کرتے تھے مگر اب سائیں عالی کا موبائل اسپتال پہنچنے سے ان جھونپڑوں نے چھوٹے موٹے اسپتال کی شکل اختیار کرلی تھی۔ یہاں جڑی بوٹیوں کے علاوہ انگریزی دواؤں اور انجکشنوں وغیرہ سے بھی علاج کیا جا رہا تھا۔ اس سارے کام کو ویرا نے سنبھال رکھا تھا۔ کسی وقت صفدر اور اشوکا بھی اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

میں شفا خانے کے بڑے جھونپڑے میں داخل ہوا تو زخمیوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو تازہ لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔ زیادہ تر افراد کو گولیاں لگی تھیں۔ چند مرد و زن جھلسے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان کی دونوں ٹانگوں کے اوپر سے بلڈوزر کا پہیا گزر گیا تھا اور وہ اس جاں بہ لب کے سرہانے اس کی دکھیا ماں بیٹھی واویلا کر رہی تھی۔ ایک بچی دستی بم کے ٹکڑے سے ہلاک ہوئی تھی۔ اس کا باپ بار بار اسے چوم رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ رہا تھا۔ سردار رانے اسے تسلی دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے یہاں ویرا کو بھی دیکھا۔ وہ بولائی کی طرح ادھر سے ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ کسی کو دوا کھلاتی تھی اور کسی کو انجکشن لگاتی تھی۔ اس نے اپنا برا حال کرلیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ اس کے نازک اعصاب چیخ اٹھیں گے اور وہ بھی کچھ دیر بعد ان مریضوں کے درمیان ہی نظر آئے گی۔

اس نے مجھ سے صفدر کے بارے میں پوچھا "صفدر یہاں ہیں۔ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے اور تمہاری خیریت کی طرف سے فکر مند ہے۔"

"سنا ہے میں نے سنا ہے۔ آپ استقی کو پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے ویرا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت یہ بستی جل کر راکھ ہو چکی ہوتی۔ بستی کے تمام مردوں کو چین کے بدلے میں درختوں سے باندھ کر جلا دیا گیا ہوتا۔ سیکڑوں عورتوں اور معصوم بچوں کو موت سے بچانے کے لیے میں نے استقی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم اس کے لیے مجھے معاف کرو گی۔ اس کے علاوہ تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ اگر ٹرسٹ والوں نے کوئی سازش نہ کی تو استقی بالکل محفوظ رہے گا۔"

ویرا کی حسین آنکھوں میں ایک دم بہت سے آنسو امڈ آئے۔ اس نے میرا بازو تھام لیا۔ سسک کر بولی "خدا کے لیے بس کریں۔ ختم کریں اب یہ آگ اور خون کا کھیل۔ اس طوفان کو اب اور کتنا بڑھائیں گے۔"

میں نے کہا "ویرا! ظالم اور مظلوم کا فرق تم بھی سمجھ رہی ہو۔ تم بھی جانتی ہو کہ کون جارح ہے اور کون دفاع کر رہا ہے۔"

وہ روتے ہوئے بولی "مجھے تو لگتا ہے کہ اس وقت سب ایک جیسے ہوگئے ہیں۔ سب ظلم برداشت کر رہے ہیں اور سب ہی ظلم کر رہے ہیں۔ آپ سوچتے کیوں نہیں۔ جو بھی زخمی ہو رہا ہے' جو بھی مر رہا ہے وہ صرف انسان ہے۔ یقین کریں میری ساری ہمدردیاں ان بے کس لارمیوں کے ساتھ ہیں لیکن بائی گاڈ ان کی بہتری بھی اسی میں ہے کہ کسی طرح یہ جنگ وجدل رک جائے۔"

"ٹھیک ہو جائے گا ویرا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور سردار رانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں سردار رانے کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے اشوکا کے ذریعے رانے سے پوچھا "جوری کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" رانے نے نفی میں سر ہلایا "لیکن مجھے امید ہے کہ وہ اسی بستی میں کہیں چھپی ہے اور جلد ہی پکڑی جائے گی۔"

میں بھنا گیا۔ سردار رانے اس معاملے کو اتنی اہمیت نہیں دے رہا تھا جتنی دی جانی چاہیے تھی اور شاید اس میں سردار کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ اصل بات سے بے خبر تھا۔ میں نے سردار رانے کا شانہ تھامتے ہوئے کہا "سردار! ان زخمیوں کی دیکھ بھال تمہارے بغیر بھی ہو جائے گی لیکن جوری کے غائب ہو جانے سے جو نقصان ہوگا وہ آسانی سے پورا نہیں ہو سکے گا۔ تم ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر جوری کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کرو۔"

میرے لہجے نے سردار رانے کو نوٹس لینے پر مجبور کردیا۔ وہ میرے ساتھ تیز قدموں سے چلتا اپنے جھونپڑے میں پہنچا اور اپنے سرکردہ محافظوں کو جوری کی تلاش کے سلسلے میں اہم ہدایات دینے لگا۔ بعد ازاں اس نے گھڑسوار دستے کو بھی کچھ ہدایات دیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جوری کو بستی سے باہر بھی تلاش کروا رہا ہے۔ یعنی اس بات کا امکان تھا کہ وہ بستی سے باہر چلی گئی ہو۔ اسی امکان کے بارے میں سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔

جس دوران میں سردار اپنے لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا' بہت سے افراد میرے ارد گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر نعرے لگا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے تعریف اور پسندیدگی کے جذبات صاف نظر آتے تھے۔ یہ صورت حال میرے لیے تھوڑی سی غیر متوقع تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سائیں عالی مجھے بے نقط سنا کر گیا تھا اور سائیں کے لیے یہ لوگ بڑی عقیدت رکھتے تھے لہٰذا امکان اس بات کا تھا کہ لوگوں میں میری مقبولیت فوری طور پر کچھ کم ہو جائے گی مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں اشوکا سے پوچھا تو وہ بولا "سائیں صاحب کی ہوشیاری شک سے بالا ہے۔ ایک طرف تو وہ آپ سے جھگڑ کر ٹرسٹ والوں کی نظر میں سرخرو ہوگئے ہیں' دوسری طرف یہاں سے جاتے جاتے وہ لارمیوں کے سامنے آپ کا دفاع بھی کر گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگا "سائیں صاحب جھونپڑے سے نکل کر پہلے تو آپ کو بددعائیں دیتے رہے پھر بوما کے بڑے دروازے کے سامنے ازندھالیت کرزار و قطار رونا شروع کردیا۔ رونے کے ساتھ ساتھ وہ مناجات بھی پڑھ رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے بستی کے معززین کو بتایا کہ انہوں نے عبداللہ کے لیے (میرے لیے) رو رو کر خدا سے معافی مانگی ہے اور دعا کی ہے کہ عبداللہ کی نافرمانیوں کو بخش دیا جائے۔ بعد ازاں انہوں نے بستی والوں کو رمزیہ انداز میں بتایا کہ عبداللہ دراصل ایک پری کے زیر اثر ہے' وہی کر رہا ہے جو پری اس سے کہہ رہی ہے۔ فی الحال سلامتی اسی میں ہے کہ عبداللہ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کیا جائے' ورنہ وہ پری عبداللہ کے ذریعے بچے کو ہلاک کردے گی۔"

مجھے سائیں عالی کی خرمستیوں پر تاؤ آرہا تھا۔ میں نے اشوکا سے پوچھا "اب وہ الو کی دم کہاں ہے؟"

اشوکا میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا "سائیں صاحب' کنگ براؤن کے لوگوں کے ساتھ ہی جیپ میں واپس چلے گئے تھے۔"

میں نے دل میں سائیں عالی کو جی بھر کر کوسا اور اس کے پرستان اور کوہ قاف پر بھی بے شمار لعنتیں بھیجیں۔ میرے ارد گرد موجود لوگ بدستور پرشوق نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے چند خواتین آگے بڑھیں اور کچھ پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگیں۔ اس کے علاوہ وہ چٹکیاں بھر بھر کر راکھ بھی مجھ پر ڈال رہی تھیں۔ ان کا انداز ایسا محبت بھرا تھا کہ میں انہیں سختی سے منع نہیں کرسکا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ عورتیں مجھ پر جھاڑ پھونک کر رہی ہیں تاکہ مجھ پر سے وہ اثر ختم ہو جائے جس کا ذکر سائیں نے کیا ہے۔

میں نے اس بارے میں اشوکا سے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔ بولا "یہ بڑی دلچسپ صورت حال ہے جناب! یہ سادہ لوح عورتیں آپ پر جھاڑ پھونک اس لیے نہیں کر رہیں کہ آپ پر سے پری کا اثر ختم ہو جائے بلکہ اس لیے کر رہی ہیں کہ کہیں وہ پری آپ کو چھوڑ کر چلی نہ جائے اور آپ بھلے چنگے نہ ہو جائیں۔"

"یہ بھلا کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو بات ہے۔" اشوکا مسکرایا "آپ پر جو ٹونا کیا جا رہا ہے اس کی راکھ بڑی عجیب وغریب چیز سے بنی ہے۔ نوجوان عورتوں کے بت سے زیر جامہ اکٹھے کرکے انہیں بھینس کے لہو اور پرانی شراب میں بھگویا جاتا ہے' پھر انہیں آگ لگا دی جاتی ہے۔ جو راکھ بنتی ہے وہ جادو ٹونے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اکثر اس کا استعمال برے مقاصد کے لیے ہی ہوتا ہے۔ جیسے اب ہو رہا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ جس ہوائی چیز کے اثر میں ہیں وہ آپ پر اپنا تسلط برقرار رکھے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"سائیں عالی سے بہت عقیدت رکھنے کے باوجود یہ لوگ آپ کی کارروائی سے بہت خوش ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماسٹر استقی کو پکڑ کر اور یہاں لاکر آپ نے زبردست کام کیا ہے۔ اگر آپ نے یہ کام کسی پری کے زیر اثر کیا ہے تو پھر اس پری کا آپ کے پاس سے رخصت ہو جانا کوئی اچھا شگون نہیں ہوگا لہٰذا یہ لوگ اپنی دانست کے مطابق پری صاحبہ سے آپ کا رشتہ مضبوط اور مستحکم کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔"

میں نے نامعقول اشیا کی راکھ اپنے سر اور کندھوں پر سے جھاڑی اور دعا گو عورتوں سے کچھ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا لیکن ان میں سے ایک دراز قد لڑکی لمبے لمبے ڈگ بھر کر پھر میرے قریب چلی آئی۔ وہ لارمی تھی اور مختصر لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا قد مجھ سے بس ایک دو انچ ہی چھوٹا ہوگا اس کے باوجود وہ جاذب نظر ہی لگتی تھی۔ اس کے گلے میں انسانی دانتوں کی ایک مالا تھی اور چہرے پر رنگ سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز آواز میں کچھ بولنے لگی۔ اشوکا

نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے بتایا "یہ کہہ رہی ہے' مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ جوری کی گمشدگی سے سخت پریشان ہیں۔ میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "میں آج رات چلہ کاٹوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ صبح تک مجھے جوری کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "تم کل صبح کی بات کر رہی ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ بس ایک آدھ گھنٹے میں اس عورت کا پتا چل جائے۔ وہ بہت کچھ جانتی ہے اور ہم سب کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں ابھی چلے میں بیٹھ جاتی ہوں۔ میں کوشش کروں گی کہ جلد از جلد آپ کو جوری کے متعلق کچھ بتا سکوں۔ آپ نے ہماری بستی کو حملہ آوروں سے بچا کر ہم پر بڑا احسان کیا ہے' میں چاہتی ہوں کہ آپ کے کچھ کام آؤں۔"

اس نے جھک کر مجھے سلام کیا اور الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ اشوکا نے کہا "اس لڑکی کی باتوں کو مذاق میں نہ لیں۔ لارسی قوم کے لوگ عجیب و غریب صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں' یہ لڑکی بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس کا نام موتاب ہے اور یہ مستقبل بینی اور قیافہ شناسی کی ماہر سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کالے جادو پر بھی دسترس حاصل ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ایسا سمجھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعی کوئی مدد کر سکے۔"

سردار رانفے نے گھڑ سوار ٹولیوں کو قریبی جنگل کی طرف روانہ کر دیا تھا' دیگر محافظوں کو اس نے بستی کے اندر ہی مختلف اطراف میں پھیلا دیا۔ سردار رانفے کے علاوہ بستی کے دیگر معززین کا خیال بھی یہی تھا کہ مفرور جوری بستی کے اندر ہی کہیں چھپی ہوئی ہے۔ وہ بے حد سفاک اور خطرناک عورت تھی' یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی اس کی جلد از جلد گرفتاری کا خواہش مند تھا۔

بستی میں اسقی کی موجودگی نے تحفظ کا زبردست احساس پیدا کر دیا تھا۔ مرد و زن کی ڈری سہمی آنکھوں میں اب اطمینان اور فتح مندی کی چمک نظر آئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک کنگ براؤن کا بیٹا یہاں موجود ہے' بستی کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ان کی تمام کمزوریاں لاچاریاں صرف ایک کامیابی کی وجہ سے طاقت اور اختیار میں بدل گئی تھیں۔ چند گھنٹے پہلے انہیں اپنی جان اور آزادی کے لالے پڑے ہوئے تھے' اب وہ باعتماد اور پرسکون تھے۔ زرسٹ ایک بہت بڑا وحشی جن تھا' اس جن کی جان اسقی کی صورت میں اب ہمارے قبضے میں آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ دیرا بھی ہمارے ساتھ بستی میں موجود تھی۔ کنگ نے اب تک جو طوفان بھی کھڑے کیے تھے ان کے پیچھے یہ جذبہ کار فرما تھا کہ وہ دیرا کو واپس حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً اب کنگ کو اسقی کے علاوہ دیرا کا خیال بھی تھا' اور وہ ان دونوں کی خاطر موگاسا کو تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ ملتوی کرنے پر مجبور تھا۔

یہی وجہ تھی کہ بستی میں کئی اموات ہو جانے کے باوجود خوشی کی لہر دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ لوگوں کو خوش دیکھ کر میرا دل ہول رہا تھا۔ کچھ یہی حال صفدر کا بھی تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ بولا "اگر جوری واقعی زرسٹیوں کے پاس پہنچ گئی ہے تو پھر سب کچھ گڑبڑ ہو جائے گا۔ ہمیں فوراً سے پہلے کنگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔"

"اور اسقی اور دیرا کو کنگ کے حوالے کرنا پڑے گا۔" میں نے صفدر کا جملہ مکمل کر دیا۔

"بے شک' اس کے سوا تو کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ لیکن اس کے بعد بستی کا کیا ہو گا۔ بہت اذیت سے مریں گے یہ لوگ۔" صفدر نے کہا۔

"ان لوگوں میں ہم بھی شامل ہیں' اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو۔"

صفدر نے گہری سانس لی "شاہ جہاں صاحب' سچ کہتا ہوں اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے اپنی کوئی خاص پروا نہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھے رہنے والا مزاج میں نے آپ ہی سے پایا ہے لیکن دیرا کا سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہمارے اندیشے درست نکل آئے تو اس کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو گا۔ وہ بہت خاص لڑکی ہے جناب۔ آپ اس کے اندر کی خوب صورتی دیکھیں تو باہر کی خوب صورتی آپ کو ہیچ نظر آنے لگے گی۔ وہ بہت سخت جان ہونے کے باوجود اتنی نازک اور حساس ہے کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ ڈپریشن کے عالم میں اس کا کیا حال ہوتا ہے' وہ دو مرتبہ پہلے بھی خودکشی کی نہایت سنجیدہ کوشش کر چکی ہے۔ اب بھی اگر اسے مرضی کے خلاف چلنے پر مجبور کیا گیا تو وہ اپنی زندگی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کر جائے گی۔ مم۔۔۔ مجھے بہت دھڑکا ہے اس کی طرف سے۔"

میں نے بیڑی سلگا کر اپنا اور صفدر کا تناؤ کم کرنے کی کوشش کی اور مسکرا کر کہا "ہم کچھ زیادہ ہی پریشان نہیں

ہو گئے یار! اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ جوری کو تلاش کیا جائے اور اگر وہ بستی کے اندر یا نواح میں کہیں چھپی ہوئی ہے تو پھر ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ زرسٹیوں تک نہ پہنچ سکے۔"

"میرے خیال میں تو وہ بستی کے اندر موجود نہیں ہے۔" صفدر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کیونکہ جتنی تلاش یہاں ہو چکی ہے' اسے اب تک مل جانا چاہیے تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ حملے کے دوران میں زرسٹیوں سے جا ملی ہے یا پھر بستی سے نکل گئی ہے۔"

"چلو جو بھی ہے' شام تک صورت حال واضح ہو جائے گی۔"

صفدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا "شاہ جہاں صاحب' آپ کا کیا خیال ہے' ہم لارسیوں کی خاطر غزالہ' بیگم' اور زریں وغیرہ کی قربانی دے سکتے ہیں؟"

"تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ اگر میرے بدن کا ریشہ ریشہ جدا کر کے مجھے قتل کرنے کی سزا دی جائے تو مجھے بسر و چشم قبول ہے لیکن کسی بھی مقصد کی خاطر اپنے ساتھیوں کی قربانی دینا کم از کم میرے بس میں تو نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آیا کہ مجھے لارسیوں اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں۔۔۔ اپنے ساتھیوں کو نظر انداز نہیں کر سکوں گا۔"

"خدا نہ کرے کہ ہم کسی ایسے امتحان میں پڑیں مگر یہ بات تم بھی جانتے ہو صفدر کہ بعض اوقات انسان کو انتہائی ناپسندیدہ کام اپنے ہاتھوں سے کرنے پڑتے ہیں' جن معصوموں کے تصور پر وہ موت کو ترجیح دیتا ہے' وہی مشکلات وہ جیتے جی جھیلتا ہے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اشوکا اندر آ گیا۔ اب دوپہر ہونے والی تھی۔ گرمی کی شدت میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔ کڑکتی دھوپ میں ہر ذی نفس جھلستا چلا جا رہا تھا۔ چرند پرند سایہ درختوں اور پانی کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ اشوکا کے گنجے سر پر پسینے کے قطرے بھی گواہی دے رہے تھے کہ گرمی بہت زیادہ ہے۔ جوری نے چند روز پہلے جو زخم اس کے سر پر لگایا تھا' وہ اب مندمل ہو رہا تھا۔ اندر آ کر اشوکا نے پانی پیا اور بولا "جوری اور اس کے ساتھیوں نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ قریباً اسی فی صد ایمونیشن ضائع ہو چکا ہے۔ اگر آپ بروقت کارروائی کر کے حملہ نہ رکواتے تو یہاں کچھ بھی باقی نہ بچتا۔"

"مگر اب بھی بہت زیادہ مطمئن ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "یہ درست ہے کہ اسقی کی شکل میں ٹرمپ کا پتا ہمارے ہاتھ آ گیا ہے مگر ہتھیاروں کی ضرورت اب بھی اتنی ہی شدت سے موجود ہے۔ پہلے تو سائیں عالی کی چالاکی سے کچھ ہتھیار پہنچ گئے تھے مگر اب وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

اشوکا نے کہا "سردار رانفے اس سلسلے میں کوشش کر رہا ہے۔ جمیل زار سے جو لارسی بھاگے تھے' ان میں سے بہت سوں کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ خیال ہے کہ یہ ہتھیار انہوں نے صحرا میں ہی کہیں ایک جگہ چھپا رکھے ہیں۔ سردار رانفے نے ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بندے روانہ کیے ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں کچھ کرنے گئے ہیں۔"

صفدر نے کہا "شاہ جہاں صاحب' شاید آپ کو یاد ہو کہ پچھلی مرتبہ پولیس والے جب بات چیت کے لیے آئے تھے تو انہوں نے ایک تجویز پیش کی تھی۔ اپنے انہا میں کمانڈوز کی رہائی کے بدلے انہوں نے رائفلیں اور ایمونیشن دینے کی پیشکش کی تھی۔"

"میرے خیال میں اب وہ اپنی پیشکش پر قائم نہیں رہیں گے۔" میں نے کہا "جوری ٹرانس میٹر پر کنگ براؤن کو بتا چکی ہے کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ یعنی کنگ اب جانتا ہے کہ ہم ایمونیشن کی شدید کمی کا شکار ہیں۔۔۔ اور صرف ایمونیشن ہی کی بات نہیں' میرا خیال ہے کہ کنگ براؤن موگاسا کے تمام حالات کی مکمل خبر رکھتا ہے۔ اس کی انٹیلی جنس ہماری توقع سے زیادہ تیز ہے۔"

"آپ کی اس بات سے مجھے ایک اور بات یاد آئی ہے۔" اشوکا نے کہا "آج صبح محترمہ ربا مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ آپ اور صفدر صاحب ایک دوسرے کے نام لینے میں ذرا احتیاط سے کام لیں اور کوشش کریں کہ دوسروں کی موجودگی میں ایک دوجے کو فرضی ناموں سے ہی پکاریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" میں نے تائید کی "اس نے یقیناً کوئی بات نوٹ کی ہو گی۔ یہ بات تو طے ہے کہ بستی میں مخبر موجود ہیں۔"

صفدر خاموش بیٹھا تھا۔ اشوکا کچھ دیر تک صفدر کو دیکھتا رہا' پھر ذرا دبے لہجے میں بولا "آپ دونوں بے پروائی برت رہے ہیں۔ اگر دیرا صاحبہ کو خود اپنا خیال نہیں تو آپ کو تو کرنا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ضرور بیمار ہو کر بستر پر گر جائیں گی۔ انہوں نے کل شام کا کھانا کھایا ہوا ہے۔ صبح سویرے سے وہ اندھا دھند مریضوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی

ہیں۔ میں نے دو تین مرتبہ کہا ہے کہ کچھ دیر آرام کرلیں لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔"

میں نے صفدر سے کہا "جاؤ بھئی! اسے لے آؤ۔ اسے بتاؤ کہ وہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئی نویلی دلہن بھی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میرا جانا بیکار ہے۔ وہ وہی کچھ کرے گی جو اس کی مرضی ہے۔" صفدر نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے کوئی لڑائی شڑائی تو نہیں ہوئی؟" میں نے صفدر کو بغور دیکھ کر پوچھا۔

"لڑائی ہونے کے لیے دو افراد کا اکٹھے ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔ تم دونوں اکٹھے نہیں ہوتے؟"

"آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کتنا اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسے اپنے سوشل ورک سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اگر وہ کبھی پاس ہوتی ہے تو ذہنی طور پر پاس نہیں ہوتی۔"

میں کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ صفدر کے لہجے میں اداسی سمٹ رہی ہے اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ویرا اپنے حال میں مست رہنے لگی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اسے صفدر کے ساتھ محبت نہیں رہی تھی۔ صفدر تو اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اور بہت سی محبتیں' ہمدردیاں اور خدا ترسیاں اس کے ذہن میں جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ اگر چاہتی بھی تو ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتی تھی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا میں خود لے کر آتا ہوں اسے۔"

میں شفا خانے میں پہنچا تو وہ بدستور جتی ہوئی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھی۔ قمیص کی بانہیں اوپر تک اڑسی ہوئی تھیں۔ بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت باندھ رکھے تھے۔ وہ ایک بچے کو انجکشن دے رہی تھی۔ بالوں کی جو لٹیں اس کے چہرے پر جھک آئی تھیں وہ انہیں بار بار اپنی کہنی سے پیچھے ہٹاتی تھی۔ وہ خوب صورت تو پہلے سے تھی لیکن اب صفدر کی قربت نے اسے اور بھی نکھار دیا تھا۔ اس میلے کچیلے ماحول میں وہ ایک ستارے کی طرح دکھتی تھی۔ متناسب بدن کی ایک حسین لڑکی جو اپنی دلکشی سے خود بھی پوری طرح آگاہ نہیں تھی۔۔۔ اس کا نڈھال چہرہ اور سوکھے ہوئے ہونٹ دیکھ کر مجھے بھی اس پر ترس آگیا۔

وہ انجکشن لگا چکی تو میں نے کہا "چلو ویرا! اب کچھ کھا پی لو اور تھوڑا سا آرام کرلو۔"

"پلیز مجھے یہاں رہنے دیجئے۔" وہ ملتجی ہوئی "آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہاں میری کتنی ضرورت ہے۔"

"میں بھی انجکشن وغیرہ لگا لیتا ہوں۔ تم مجھے اور اشوکا کو بتا جاؤ کہ کیا کرنا ہے' ہم تمہاری جگہ یہاں ڈیوٹی دیتے ہیں۔"

"نہیں عبداللہ صاحب۔" اس نے مجھے فرضی نام سے مخاطب کرکے التجا کی "جو میں کر رہی ہوں شاید آپ نہ کرسکیں۔ میں اب ان مریضوں کو زیادہ اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ مجھے ان میں رہنے دیں۔ پلیز مجھے ان لوگوں میں رہنے دیں۔۔۔ اور آپ۔۔۔ آپ کوشش کریں کہ یہاں اور مریض نہ پہنچیں۔۔۔ اور لائیں نہ آئیں' خدا کے لیے عبداللہ صاحب۔ اس لڑائی کو روک دیں۔ کسی بھی طرح یہ خون ریزی ختم کردیں۔ ان لوگوں کے دکھ پہلے ہی کم نہیں ہیں۔ انہیں اور مت توڑیں پھوڑیں۔"

اس کی کشادہ آنکھوں میں باقاعدہ آنسو چمکنے لگے تھے۔

اسی دوران میں ایک زخمی لارسی بوڑھا آگے آیا' اس نے گھٹنوں کے بل گر کر ویرا کے پاؤں چومنے کی کوشش کی' پھر جلدی جلدی کچھ بولنے لگا۔ اس کے لہجے میں رقت تھی۔ اشوکا بھی میرے پیچھے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "یہ شخص ویرا صاحبہ کو دیوی کا درجہ دے رہا ہے۔ ان سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اسے اور دوسرے زخمیوں کو چھوڑ کر یہاں سے نہ جائیں۔"

اسی دوران میں ایک اور لارسی عورت بھی وہاں پہنچ گئی اور رو رو کر ویرا سے کچھ کہنے لگی۔ اشوکا نے بتایا' اس عورت کے تین بچے تھے۔ ان میں سے دو ملیریا سے ہلاک ہوچکے ہیں۔ تیسرا بچہ کل رات کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا۔ ویرا کی کوشش سے اس بچے کی جان بچ سکی ہے۔ یہ عورت ویرا سے بے حد عقیدت کا اظہار کر رہی ہے اور ویرا سے کہہ رہی ہے کہ وہ اسے اپنے پاؤں چومنے کی اجازت دے۔

ویرا نے اس عورت کو بلا جھجک گلے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھ کر واپس بھیج دیا۔ اس دوران میں چودہ پندرہ سالہ ایک لڑکا نیم بے ہوشی سے بیدار ہوگیا اور درد کی وجہ سے چیخنے چلانے لگا۔ ویرا اور اس کی دو معاون عورتیں لڑکے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر ناکام واپس لوٹ آیا۔ ویرا پر زیادہ دباؤ ڈالنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس کی حساسیت اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ خصوصاً وہ اپنے اردگرد جس قسم کے حالات دیکھ رہی تھی انہوں نے اسے بے حد زود رنج بنا دیا تھا۔

میں واپس پہنچا تو صفدر بدستور راستی کے سرہانے چوکس بیٹھا تھا۔ اس نے پچھلے تین چار گھنٹے میں شاید ایک لمحے کے لیے بھی اپنی انگلی ایم اے کے ٹریگر سے نہیں ہٹائی تھی۔ راستی کی مشکیں اب کھول دی گئی تھیں اور اسے چٹائی پر لٹا کر اس پر چادر نما کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ میری ہدایت پر صفدر نے اس شیطان زادے کو انجکشن کے ذریعے "ٹرنکولائزر" دے دیا تھا' اس کی وجہ سے وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔

مجھے شفا خانے سے تنہا واپس آتے دیکھ کر صفدر نے ایک گہری سانس لی اور اس کے ہونٹوں پر ایک کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے معلوم تھا وہ نہیں آئے گی۔" وہ بولا۔

"وہ تو شاید آنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے مریض اسے نہیں چھوڑ رہے تھے۔" میں نے ویرا کا دفاع کیا۔

"مجھے پتا ہے وہ بہت ضدی ہے۔ خیر چھوڑیں اس بات کو۔ مجھے بتائیں کہ اس سن آف اے بچ کا کیا کرنا ہے۔ میری تو انگلی ٹریگر پر پتھرا گئی ہے۔"

"اس وقت ہماری سلامتی کا سارا دارومدار اسی سن آف اے بچ پر ہے۔ اس پر چوبیس گھنٹے نظر رکھنا پڑے گی اور میرے خیال میں یہ کام باری باری ہم دونوں کو ہی کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں ان لارسیوں میں سے کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی؟"

"بے شک۔۔۔ لیکن۔۔۔ ہاں' لاروتا بے سمجھ دار آدمی ہے۔ اس ڈیوٹی میں اسے شریک کیا جاسکتا ہے پھر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی تو زیادہ مشکل نہیں ہوگی؟"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" صفدر نے کہا۔

شام کے وقت کنگ براؤن کی طرف سے ایک قاصد بستی میں پہنچ گیا۔ یہ ان تین پولیس افسران میں سے ایک تھا جو اس سے پہلے بھی پیام بر کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ امبوز نامی یہ شخص قدرے نرم لب و لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے کنگ کی طرف سے ہمیں ایک لانگ رینج ٹرانس میٹر فراہم کیا اور بتایا کہ ہم کنگ براؤن سے اس ذریعے کے ذریعے رابطہ کرسکتے ہیں۔

میں نے بے رخی سے کہا "فی الحال ہم ایسا کوئی رابطہ ضروری نہیں سمجھتے۔ وقت آنے پر رابطہ بھی کرلیا جائے گا۔"

امبوز نے بڑے نرم اور محتاط لہجے میں درخواست کی کہ استی کی ہر طرح حفاظت کی جائے۔ اس نے کہا "بستی میں مسٹر چین کے ناگہانی قتل کے بعد محترم کنگ اپنے بیٹے اور بھتیجی ویرا کی طرف سے ازحد پریشان ہیں۔"

میں نے کہا "ماسٹر استی کی سلامتی کا دارومدار تم لوگوں کے رویے پر ہے۔ جونہی تم لوگوں کی طرف سے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی گئی' استی کا خاتمہ ہوجائے گا۔"

میرے لہجے کی وحشت نے پولیس آفیسر کو لرزا دیا تھا۔ وہ بولا "ایسی کوئی کوشش نہیں کی جائے گی۔"

"ایسی کوشش کی جا رہی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "بستی میں مخبر موجود ہیں اور وہ یقیناً اپنے کام میں لگے ہوئے ہوں گے۔ میری بات یاد رکھنا' ان کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کا نتیجہ استی کی موت کی شکل میں نکلے گا۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا مگر امبوز کے چہرے پر گزرنے والے رنگ بتا رہے تھے کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے۔ وہ ہکلا کر بولا "بستی میں کنگ کا کوئی مخبر موجود نہیں ہے اور اگر فرض محال کوئی ہے بھی تو میں کنگ کی طرف سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس سارے معاملے سے لاتعلق رہے گا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ کنگ اس سلسلے میں کتنے محتاط ہیں۔"

"ایک نصیحت اور کرنا چاہتا ہوں۔ جو لارسی موگا سامنے تمہارے قبضے میں آئے ہیں ان پر تشدد نہ کرنا' ورنہ میرے پاس بھی کنگ کو خون رلانے کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔"

میں نے یہ ساری گفتگو تنہا ہی امبوز سے کی تھی۔ اس دوران میں صفدر اور راستی جھونپڑے کے ساتھ والے حصے میں موجود رہے تھے۔ جانے سے پہلے امبوز نے نرم لہجے میں کہا "میں ایک بار ماسٹر استی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کدھر ہیں؟"

"وہ تمہارے بہت قریب موجود ہے' تم اسے دیکھ سکتے ہو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا' جو شخص اس کی نگرانی پر مامور ہے اس کا نشانہ بے داغ ہے۔"

میں نے آفیسر امبوز کو جھونپڑے کے دوسرے حصے میں بھیج دیا۔ وہ خوابیدہ استی کو دیکھ کر واپس آگیا۔ امبوز سے ٹرانس میٹر کا میکنزم سمجھنے کے بعد میں نے اسے واپس بھیج دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی صفدر کے پاس جھونپڑے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ صفدر بولا "اس ایلچی کی آمد سے تھوڑا سا حوصلہ ملا ہے۔ اس کی آمد ظاہر کرتی ہے کہ جوری ابھی ٹرسٹ والوں تک نہیں پہنچی۔"

"ہاں یہ امید کی جاسکتی ہے مگر یقین سے اب بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

ویرا شام کے کھانے پر بھی نہیں لوٹی تھی۔ اس نے اشوکا کے ہاتھ صفدر کو معذرت کا پیغام بھیجا تھا اور کہا تھا کہ وہ مصروفیت کے سبب کھانا ادھر ہی کھالے گی۔

صفدر نے بھنا کر کہا تھا "بہتر ہے کہ وہ اپنا بستر اور باقی سامان بھی وہاں ہی لے جائے۔"

رات نو بجے کے لگ بھگ وہ لوٹ آئی۔ وہ سیدھی اشوکا کے جھونپڑے میں پہنچی جہاں ہم دونوں موجود تھے۔ غالباً اشوکا نے اسے بتا دیا تھا کہ صفدر اس سے ناراض ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور میری موجودگی کی پروا کیے بغیر بے تکلفی سے صفدر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "پلیز ڈارلنگ! غصہ تھوک دو۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہاں ان لوگوں کی دیکھ بھال کے لیے اور کوئی نہیں۔"

"اگر کوئی نہیں تو اب کیوں آئی ہو؟"

"بڑی مشکل سے دو بندوں کا انتظام کیا ہے اور انہیں کہا ہے کہ وہ اشوکا کے ساتھ مل کر کام کریں۔"

"یہی انتظام تم دوپہر کے وقت بھی کر سکتیں تھیں۔"

"بھئی کہا ہے نا غصہ تھوک دو۔" وہ اسے سر کے بالوں سے جھنجوڑتے ہوئے بولی "چلو آؤ اپنے ولا میں چلتے ہیں۔" وہ جھونپڑے کو مذاق میں ولا کہتی تھی۔

صفدر واقعی بجھا ہوا سا تھا اور ویرا کے ساتھ جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن میری آنکھ کے اشارے پر وہ اٹھ گیا۔ دراصل ماسٹر اسٹی بھی اسی جھونپڑے میں نیم بے ہوش پڑا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ویرا زیادہ دیر اس جھونپڑے میں رکے اور اسٹی کے بارے میں سوالات شروع کردے۔

جاتے جاتے وہ رک گئی اور پوچھنے لگی "اسٹی کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

میں نے کہا "وہ یہیں ہے اور آرام سے سو رہا ہے۔"

"کیا۔۔۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

"ہاں دیکھ لو مگر جگانا نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ دوسرے حصے میں گئی اور ایک دو منٹ بعد آنکھوں میں آنسو لیے واپس آ گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی "ایک بات یاد رکھیے گا شاہ جہاں صاحب! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اسٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"تمہیں کہا ہے نا کہ اس بارے میں بے فکر رہو۔" میں نے کہا۔

"پلیز شاہ جہاں صاحب!" اس نے میرا شانہ تھام لیا "اس لڑائی کو اب سمیٹ لیں۔"

پھر لبوں تک آنے والی سسکی کو روک کر وہ صفدر کے ساتھ اپنے جھونپڑے کی طرف چلی گئی۔ میں بیٹھا سوچتا رہا' کبھی اچھے کھرے لوگوں کو بھی حالات کی ستم ظریفی کے تحت جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ہمیں بھی اسٹی کے حوالے سے ویرا کے ساتھ جھوٹ ہی بولنا پڑ رہا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ اسٹی کو کچھ نہیں ہوگا دوسری طرف میرا عزم تھا کہ ٹرسٹ نے ذرا سی بھی چالاکی دکھائی تو اسٹی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اشوکا کا خیمہ نما جھونپڑا ذرا بلندی پر واقع تھا۔ وہاں سے قریباً سو گز دور ہمارے جھونپڑے کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر صفدر اور ویرا کو دیکھا۔ وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے کھلی ہوا میں بیٹھے تھے اور باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ خوشبودار مقامی قہوہ پی رہے تھے۔ بڑی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ میں نے دور سے دیکھا' ویرا کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ مشعل کی روشنی میں اس کا گورا بازو بار بار ہوا میں اٹھتا تھا اور بالوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا۔ کسی وقت وہ ایک الھڑ اور معصوم سی لڑکی نظر آنے لگتی تھی' جسے اپنی اداؤں سے اپنے پیا کو لبھانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ اس وقت وہ نہ ایک سائنس داں رہتی تھی' نہ سماجی کارکن اور نہ گنگ کی بھتیجی۔ وہ سرتاپا پیار اور شباب کے حسین رنگوں میں رنگی جاتی تھی۔ اب بھی اس پر کچھ ایسا ہی موڈ طاری تھا۔ اس کے انگ انگ سے اچانک ہی دلکشی کے سوتے پھوٹے تھے اور صفدر کو اپنے ساتھ بہا لے گئے تھے۔ صفدر کا کچھ دیر پہلے والا خشک موڈ اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں جھونپڑے میں چلے گئے اور جلد ہی ان کے جھونپڑے کی روشنی بجھ گئی۔ محبت کے مسافر حوادث کے صحرا میں ایک اور نخلستانی شب ڈھونڈنے میں کامیاب رہے تھے۔

یہاں ایک دلچسپ اور انوکھی بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ سردار رانفے اور دیگر بستی والے جانتے تھے کہ ویرا کی شادی صفدر نام کے کسی شخص سے ہو چکی ہے بلکہ بستی میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کی آنکھوں کے سامنے یہ شادی سردار بونمات نے کروائی تھی۔ اب یہ لوگ ویرا کو صفدر کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھتے تھے جبکہ صفدر میک اپ میں تھا۔ منطقی طور پر تو انہیں پریشان ہونا چاہیے تھا کہ ویرا ایک غیر مرد کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس

کی وجہ بستی والوں کا پختہ عقیدہ تھا۔ اشوکا نے بتایا کہ جس وقت صفدر کے ساتھ ویرا کی شادی صحرائی بستی میں انجام پائی' سردار بونمات نے ویرا کو ایک تحفہ دیا تھا۔ یہ کوئی مادی چیز نہیں تھی بلکہ روحانی تحفہ تھا۔ سردار بونمات نے کہا تھا یہ لڑکی جو آج دلہن بنی ہے' پاک دامن ہے اور یہ ہمیشہ پاک دامن رہے گی۔ اس کے شوہر کے سوا کوئی اس کو چھو نہیں سکے گا۔ یہ مردوں کی محفلوں میں بیٹھ سکتی ہے' ان کے ساتھ تنہا سفر کرسکتی ہے' جنگلوں میں ان کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اسے کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ اسے کسی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یہ ازلی پاک دامن ہے۔

اب معلوم نہیں سردار بونمات نے یہ بات کسی کشف کے تحت کہی تھی یا یونہی کسی کیفیت میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا مگر یہ بات اب ویرا کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی تھی۔ اسے ہر جگہ گھومنے پھرنے کی آزادی تھی اور اس کے حوالے سے کسی کے ذہن میں کوئی غلط بات آتی ہی نہیں تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ ویرا میری بہن کی حیثیت سے ہمارے جھونپڑے کے علیحدہ پورشن میں میرے اور صفدر کے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں رات کو بڑی خاموشی کے ساتھ اشوکا کے جھونپڑے میں چلا آتا تھا اور صبح سویرے واپس آجاتا تھا۔ ابھی تک بستی میں کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں رات بھر جھونپڑے سے باہر رہتا ہوں۔

میں اور اشوکا کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ رات کو موسم کچھ خنک ہو جاتا تھا اور جھونپڑے میں نیم دراز ہو کر باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اشوکا نے بتایا کہ جو دو افراد سردار رانفے کی ہدایت پر ایمونیشن حاصل کرنے گئے تھے وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے اور سردار ان کے بارے میں بہت پریشان ہے۔ اشوکا نے یہ بھی بتایا کہ علاقے میں ٹرسٹ کے گارڈز کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں' وہ ہر طرف دندناتے پھرتے ہیں۔ کھجوروں کے ایک باغ میں کچھ غیر شادی شدہ لڑکیوں کو گینگ ریپ کا نشانہ بنایا گیا تھا اور بدمست گارڈز لڑکیوں کے منہ بند کرنے کے لیے ان کی عریاں تصویریں بنا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ لڑکیاں تو خاموش رہی تھیں مگر ایک نو عمر چرواہے نے یہ منظر دیکھا تھا اور اس کی وجہ سے یہ خبر دوسروں تک پہنچی تھی۔ دیر تک اردگرد کے حالات کی باتیں کرنے کے بعد اشوکا سونے کی تیاری کر رہا تھا جب اچانک وہی لمبی تڑنگی لارسی لڑکی نمودار ہوئی جس نے آج صبح کہا تھا کہ وہ اپنی غیر مرئی قوت کے ذریعے چوری کا سراغ لگالے گی۔ نیم برہنہ لڑکی کے گلے میں بدستور انسانی دانتوں کی مالا لہرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھجور کی ایک لمبی شاخ تھی۔ وہ رکوع کے انداز میں جھک کر چل رہی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چلنے کے ساتھ ساتھ وہ شاخ کے ذریعے زمین پر ایک لکیر بھی کھینچتی جارہی تھی۔ چند سیاہ فام مرد و زن بڑی عقیدت سے لمبی لڑکی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لڑکی لکیر کھینچتی ہوئی ہم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے سے گزر گئی اور پھر ایک جگہ جا کر ٹھہر گئی۔ لارونا بے کو شیطان جونیئر پر نگران مقرر کرکے میں اور اشوکا اس مقام پر پہنچے۔ موتابہ نامی اس لڑکی نے اب اپنی سرخ آنکھیں کھول دی تھیں اور اپنی زبان میں کچھ روحانی کلمات پڑھنے میں مصروف تھی۔

لکیر کے ذریعے موتابہ نے دراصل ایک وسیع دائرہ مکمل کیا تھا۔ اس دائرے میں قریباً نصف ایکڑ رقبہ آتا تھا۔ اس رقبے میں پچیس تیس جھونپڑے تھے' بستی کا شفا خانہ اور اصطبل بھی اسی رقبے میں آتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر وجدانی انداز میں بولی "وہ بدمعاش عورت جو ری اسی بستی میں چھپی ہوئی ہے اور اس دائرے کے اندر ہے جو میں نے کھینچا ہے۔ میں نے اپنا کام کردیا۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس بڑے سروالی بھینس کو ڈھونڈ نکالو۔"

"لیکن اس سارے علاقے کی تلاشی تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔" میں نے اشوکا کے ذریعے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا علم جو کہتا ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔"

"کیا یہ دائرہ کچھ اور چھوٹا نہیں ہو سکتا؟" اشوکا نے پوچھا۔

"جو میرے بس میں تھا' وہ میں نے کردیا ہے۔ اب تھوڑی سی محنت تم بھی کرلو۔"

میں نے اندھیرے میں پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ ایک چھوٹی سی کالی بلی موتابہ کے کندھوں پر سوار تھی اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے ہمیں گھور رہی تھی۔ اچانک بلی چھلانگ لگا کر موتابہ کے کندھوں سے اتری اور جھونپڑوں میں گم ہو گئی۔ موتابہ بلی کا ناقابل فہم نام پکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپک گئی۔

میں اور اشوکا طویل قامت لڑکی کے اس نئے انکشاف پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے جھونپڑے میں واپس آگئے۔ اس نصف ایکڑ رقبے کی دوبارہ تلاشی لینا کوئی بہت مشکل کام تو نہیں تھا مگر ہمیں ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا کہ موتابہ کی بات کو کتنی اہمیت دینی چاہیے۔ لارسی اس پر اعتقاد رکھتے تھے مگر ہم لارسیوں کی سمجھ بوجھ کو تو پیمانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ ہم نے اس معاملے کو صبح دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی سردار رانفے

موجود نہیں تھا۔ وہ جوری کی تلاش میں بستی سے باہر تھا۔ نیند اڑ گئی تھی۔ ساری رات میں نے اسٹی کے سرہانے اکڑوں بیٹھ کر گزاری۔ اس کی نیم بے ہوشی اب گہری نیند میں بدل چکی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ صبح سویرے اسے ناشتا کرانے کے بعد دوبارہ نشہ آور انجکشن لگا دیا جائے۔ اسے ہوش میں رکھنا خواہ مخواہ کی پریشانی اور خطرے کو دعوت دینا تھا۔ ابھی پو پھٹی تھی کہ سردار رانفے تین چار افراد کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا ''محترم مہمان! ہمیں جوری کے بارے میں ایک اہم کھوج ملا ہے۔ اب توقع پیدا ہوگئی ہے کہ جوری اس بستی کے اندر ہی موجود ہے۔''

میں رات بھر کسی ایسی ہی خبر کا منتظر رہا تھا۔ میں نے کہا ''سردار! کیا تم اس کھوج کے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟''

سردار نے اپنے دو ادھیڑ عمر ساتھیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا ''یہ ہمارے قبیلے کے تجربہ کار ترین کھوجی ہیں۔ انہوں نے جوری کا ایک روز پرانا کھرا اٹھایا ہے۔''

میں نے ایک بار پھر لارونا بے کو اسٹی پر نگران مقرر کیا اور کھرا دیکھنے کے لیے سردار رانفے کے ساتھ چل دیا۔ لارونا بے کڑوا کسیلا ہونے کے باوجود بے حد ذہین اور چوکس شخص تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں، میں اس پر خاطر خواہ اعتبار کرنے لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اسٹی کی نگرانی کے لیے میں نے اسے اپنے اور صفدر کے ساتھ شریک کیا تھا۔ میں رانفے کے ساتھ ایک جگہ پہنچا۔ کھوجیوں نے ریتلی زمین پر ننگے پاؤں کا ایک چوڑا چکلا نشان دکھا دیا۔ یہ نشان دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ یہ جوری کا پاؤں ہو سکتا ہے۔ دونوں کھوجی بڑے ماہرانہ انداز میں قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نشانات ہمارے جھونپڑے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یعنی اس جھونپڑے کی طرف جہاں میرا، صفدر اور ویرا کا قیام رہا تھا۔ آج کل میں رات کو اشوکا کے جھونپڑے میں چلا جاتا تھا تاکہ نوبیاہتا جوڑے کو تنہائی میسر آسکے۔ نشان جھونپڑے کے عین دروازے پر پہنچ کر ختم ہوگئے۔

سردار رانفے اور کھوجی حضرات معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ سردار رانفے بولا ''کھوجیوں کا کہنا ہے کہ کل رات آخری پہر یا لڑائی کے فوراً بعد جوری اس جھونپڑے میں داخل ہوئی ہے۔ کچھ دیر یہاں رہی ہے اور پھر چلی گئی ہے۔ اس کی واپسی کے نشانات یہ ہیں۔'' رانفے نے کچھ دیگر نشانات کی طرف اشارہ کیا۔

یہ نشانات واقعی واپسی کے تھے لیکن پندرہ بیس گز آگے جا کر ان کا رخ تبدیل ہوگیا تھا۔ اس جانب چونکہ زمین کھوری تھی اور کہیں کہیں گھاس بھی تھی لہٰذا نشانات تلاش نہیں کیے جا سکے تھے۔

سردار رانفے نے گمبھیر لہجے میں کہا ''معزز مہمان! ان نشانات کے آس پاس کچھ اور نشانات بھی ہیں۔ مثلاً یہ ہلکا سا نشان دیکھیں۔ جوری جب جھونپڑے سے واپس گئی ہے تو یہ نشان اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جھونپڑے سے نکلنے کے بعد اس نے کوئی بھاری چادر، کمبل وغیرہ اوڑھ لیا تھا۔ یہ کمبل اس نے خود کو چھپانے کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ کمبل کا پلو زمین پر گھسٹنے کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ جوری جب جھونپڑے میں آئی ہے تو اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کئی جگہ خون کے قطرے بھی گرے ہیں لیکن واپسی میں یہ قطرے کہیں نظر نہیں آتے۔ اس سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ جھونپڑے میں اس کے زخم پر پٹی باندھی گئی ہے یا اس نے خود باندھ لی ہے۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ بھی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔''

سردار رانفے مجھے یہ سب کچھ بتانے کے بعد اپنے کھوجیوں کے ساتھ واپس چلا گیا اور مجھ پر ایک بھاری ذمے داری ڈال گیا۔ ذمے داری یہی تھی کہ میں سوچوں کہ جوری جھونپڑے میں کیوں آئی، کس سے ملی اور پھر واپس کہاں گئی؟ اگر سردار رانفے اور کھوجیوں کا اندازہ درست تھا اور حملے کے دوران میں یا اس کے فوراً بعد جوری ہمارے جھونپڑے کی طرف آئی تھی تو پھر اس کی ملاقات دو افراد سے ہوسکتی تھی۔ نمبر ایک صفدر، نمبر دو ویرا اور ان دونوں میں سے ابھی تک کسی نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ اس نے جوری کے درشن کیے تھے۔

ناشتے کے فوراً بعد میں نے ایک بار پھر وہ مقام دیکھنے کا فیصلہ کیا جہاں سے جوری فرار ہوئی تھی۔ یہ جوری ہی کا جھونپڑا تھا۔ یہاں جوری اور اس کے دیگر دو ساتھیوں سے رانفے کے بھائی اولام نے پوچھ گچھ کی تھی۔ جوری کی زخمی ران میں نیزہ گھسیڑا گیا تھا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخی چلائی تھی لیکن اس نے بتایا کچھ نہیں تھا۔ مجھے تین روز پہلے کے وہ سارے مناظر اچھی طرح یاد تھے۔ پوچھ گچھ کے بعد بھی جوری کی مشکیں کسی رہی تھیں۔ حملے کی رات پچھلے پہر جب بلندزور دندناتے ہوئے سوگیاسا میں گھسے تو ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ جوری اور اس کے ساتھیوں کی نگرانی پر موجود محافظ بھی گھبراہٹ میں تتر بتر ہوگئے۔ جنگ جو اور سخت جان

جوری کو موقع مل گیا۔ صرف ایک پہرے دار اس کی نگرانی پر موجود تھا۔ جوری نے پہلے ہوشیاری سے اپنے ہاتھ کھولے پھر پہرے دار کا بھالا چھین کر اسی کے سینے میں گھونپ دیا اور اپنے ساتھیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ بھاگنے کے بعد وہ کہاں گئی، یہی سوال معما بنا ہوا تھا۔ میں نے موقع کا بغور جائزہ لیا اور پھر ان نقوش پا پر چلنا شروع کردیا جو کھوجیوں نے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ذریعے محفوظ کر رکھے تھے اور جو عام لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔

اچانک مجھے بستی کے شفا خانے کی طرف سے چیخ و پکار کی آواز آئی۔ بالکل یوں لگا کہ دو عورتیں آپس میں لڑ پڑی ہیں۔ میں اپنی تفتیش چھوڑ کر بھاگم بھاگ شفا خانے میں پہنچا تو عجب منظر نظر آیا۔ مریضوں کے عین درمیان میں نے دو لڑکیوں کو گتھم گتھا دیکھا۔ ان میں ایک ویرا تھی اور دوسری وہی دراز قد موتابہ جو پراسرار علوم کی ماہر سمجھی جاتی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بال پکڑ رکھے تھے۔ ویرا کے بال موتابہ کے گھونگریالے بالوں کے مقابلے میں کہیں لمبے تھے لہٰذا وہ بری طرح گرفت میں تھی۔ دونوں کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے اور مختصر لباس والی موتابہ تو تقریباً عریاں ہی ہوگئی تھی۔ مریض ہراساں ہوکر اپنے اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور کچھ مریض جن کے ہاتھ پاؤں سلامت تھے، دونوں کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں لپک کر گیا اور بمشکل دونوں کو علیحدہ کیا۔ موتابہ گلا پھاڑ کر چلا رہی تھی اور ہاتھ نچا نچا کر ویرا کی طرف اشارے کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ نشے میں ہے۔ اشوکا بھی وہاں آپہنچا تھا۔ اس نے بھی موتابہ اور ویرا کی تکرار سنی۔ موتابہ بار بار موبائل کلینک کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ موبائل کلینک یعنی ٹریلر، شفا خانے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ ٹریلر کا عقبی دروازہ شفا خانے کے مین دروازے سے صرف سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

اشوکا نے ویرا اور موتابہ کی تکرار کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ''موتابہ کا کہنا ہے کہ سردار رانفے نے اسے مفرور جوری کی تلاش کا کام سونپا ہوا ہے اور اسی کام کے سلسلے میں وہ ٹریلر کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہے جبکہ میڈم ویرا نے اسے ٹریلر اندر سے دکھانے سے انکار کیا ہے۔ اسی بات پر موتابہ مشتعل ہوگئی ہے۔ اس لڑکی کے دماغ کے کئی اسکرو ڈھیلے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ اس نے میڈم ویرا سے جھگڑا شروع کردیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میڈم ویرا کی یہاں کیا حیثیت ہے۔''

اسی دوران میں کئی مرد و زن نے موتابہ کو ڈانٹنا شروع کردیا تھا۔ اس کے ساتھ لوگوں کا یہ سلوک غیر متوقع نہیں تھا۔ اس نے ویرا پر ہاتھ اٹھایا تھا جو نہ صرف محترم بوکارلو کی بھتیجی تھی بلکہ لاریسیوں میں ہر دل عزیز بھی تھی۔ لوگوں نے اس کے رہے سہے کپڑے بھی پھاڑ دیے۔ اس کے گلے میں آویزاں انسانی دانتوں کی مالا ٹوٹ گئی تھی اور چہرے کے رنگین نقش و نگار آپس میں گڈمڈ ہوگئے تھے مگر اس کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی اور چیخ چیخ کر ٹریلر کے دروازے کی طرف اشارہ کررہی تھی کہ جوری اس میں موجود ہے۔

میرے ذہن میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ آج صبح سویرے سردار رانفے نے مجھے جوری کے قدموں کے نشان دکھائے تھے اور یہ نشان اس جھونپڑے تک گئے تھے جہاں روزانہ کی طرح کل رات بھی صفدر اور ویرا کا قیام تھا۔ اب یہ بڑی بڑی پراسرار آنکھوں والی لڑکی چیخ چیخ کر انکشاف کررہی تھی کہ اس ٹریلر کا دروازہ کھلوایا جائے کیونکہ اس میں جوری موجود ہے۔

میں نے دیکھا۔۔۔ ویرا کا چہرہ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ وہ موتابہ کی باتوں کا جواب تو دے رہی تھی لیکن اس کے لہجے میں دم خم نہیں تھا۔

میں نے کہا ''ویرا! یہ سب کیا ہے۔ اگر یہ لڑکی جھوٹ بک رہی ہے تو تم دروازہ کھول کر دکھا کیوں نہیں دیتیں؟''

''مجھے چابی نہیں مل رہی ہے۔۔۔ اور اگر چابی ہوتی بھی تو میں اس کے لیے دروازہ نہ کھولتی۔ یہ ہوتی کون ہے مجھ پر حکم چلانے والی۔ اس نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے۔''

میں نے نرمی سے کہا ''ویرا! ٹریلر کے دروازے کی دوسری چابی میرے پاس موجود ہے۔ اگر تم کہو تو میں دروازہ کھول کر ان سب لوگوں کا شک رفع کرسکتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم کہو گی نہیں۔'' میں نے آخری الفاظ کہتے ہوئے عجیب سی نظروں سے اسے گھورا۔

میری نظروں کا انداز محسوس کرکے وہ گڑبڑا گئی۔ کچھ دیر تک بے چینی سے اپنے نازک ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی رہی پھر بولی ''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔''

میں اس کے ساتھ شفا خانے کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ یہاں ایک حجرہ نما جگہ تھی جہاں جڑی بوٹیاں اور دیسی دواؤں کا اسٹاک تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ شمع کی روشنی میں چند لمحے دھیان سے میری جانب دیکھتی رہی، پھر

ذرا رسائی لہجے میں بولی "شاہ جہاں صاحب! جوری زیلہ میں ہی ہے' میں اقرار کرتی ہوں لیکن مجھے قصوروار ٹھہرانے سے پہلے آپ کو میری پوری بات سننا ہوگی۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"یہاں نہیں۔ آپ اس پچھلے دروازے سے اپنے جھونپڑے میں پہنچیں' میں بھی آرہی ہوں' صفدر کے سامنے ہی سب کچھ بتاؤں گی۔"

میں نے کہا "تمہیں اب موناہ سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ ہی چلو۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ میں آرہی ہوں' میں کسی سے نہیں الجھوں گی۔"

دس پندرہ منٹ بعد میں' صفدر اور ویرا اپنے جھونپڑے میں موجود تھے۔ لاروناب' شیطان جونیئر کی نگرانی کر رہا تھا۔ ویرا نے گمبھیر لہجے میں کہا "پہلے تو میں آپ دونوں سے اور خاص طور سے صفدر سے معذرت چاہتی ہوں کہ میں نے کل صبح سے یہ بات چھپائے رکھی۔"

"اس تمہید کی ضرورت نہیں' تم اصل بات بتاؤ۔" صفدر نرم لہجے میں بولا۔

ویرا نے کہا "کل رات آخری پہر جب لڑائی شروع ہوئی اور ہر طرف شور مچ گیا تو میری طرح صفدر بھی جاگ گئے اور دوڑ کر جھونپڑے سے باہر نکل گئے۔ یہ جاتے جاتے مجھے کہہ گئے تھے کہ میں جھونپڑے میں ہی رہوں۔ ابھی انہیں گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ جوری جھونپڑے کے اندر گھس آئی۔ اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی اور جسم کے کئی حصوں سے خون نکل رہا تھا۔ اسے اتنی بے رحمی سے مارا گیا ہے کہ اس کی کھال کئی جگہ سے ادھڑ کر لٹک گئی ہے۔ وہ نیم جان ہو کر جھونپڑے کے فرش پر گر گئی اور اس نے مجھ سے پانی مانگا۔ پانی پینے کے فوراً بعد اسے خون کی الٹی آگئی اور ریانی کے ساتھ بہت سا خون بھی باہر نکل گیا۔ وہ قریب المرگ نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اس کی جان بچاؤں۔ اس کی ران میں گولی لگی تھی اور وہاں تشدد کے دوران میں نیزہ بھی داخل کیا گیا تھا۔ یہ زخمی ران خون اگل رہی تھی۔ میں نے اس کے زخم پر روئی رکھ کر پٹی باندھی اور اسے ایک بڑی چادر میں لپیٹ کر جھونپڑے سے باہر لے آئی۔ اس وقت بندوز ر بستی کے اندر داخل ہو چکے تھے اور ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی' کسی نے ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دی اور میں جوری کو موبائل کلینک تک لے آئی۔ جوری کل رات سے وہیں پر چھپی ہوئی ہے۔ میں نے دو مرتبہ اس کی مرہم پٹی کی ہے اور دوائیں وغیرہ بھی دیتی رہی ہوں۔ اس کی حالت تھوڑا سا سنبھلی ہے۔ اب بھی وہ خواب آور دوا کے زیر اثر گہری نیند میں ہے۔ کچھ دیر پہلے میں دوا دینے کے بہانے زیلہ میں گئی تھی۔ جوری نیند میں بڑبڑانے لگی اور مجھ سے کہنے لگی کہ میں اسے بچالوں ورنہ یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔"

ویرا کے بیان کے بعد ساری صورت حال واضح ہو گئی تھی۔ جوری کل سارا دن اور آج ساری رات زیلہ کے اندر بنی ہوئی پناہ گاہ میں موجود رہی تھی۔ زیلہ چونکہ چھاؤں میں کھڑا تھا لہٰذا دن کے وقت بھی گزارا ہو گیا تھا' ورنہ زیلہ کے اندر تپش بہت زیادہ ہو سکتی تھی' اس تپش اور گھٹن کی وجہ سے چند دن پہلے ویرا بے ہوش بھی ہو چکی تھی۔

میں اور صفدر دونوں متفکر نظروں سے ویرا کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے عجیب قدم اٹھایا تھا۔ ہم ہر طرف پاگلوں کی طرح جوری کو تلاش کرتے پھر رہے تھے اور وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی خاموش رہی تھی۔ بظاہر تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت اور دردمندی کی وجہ سے اس نے یہ قدم اٹھایا ہے لیکن فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اپنی ناقابل فہم ذات کی طرح وہ کبھی کبھی ناقابل فہم کام بھی کرتی تھی۔

صفدر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "ویرا! تمہاری خدا ترسی اور انسان دوستی اپنی جگہ بجا ہے لیکن ہم بھی تو انسان ہیں اور تمہارے بہت قریب بھی ہیں' تمہیں ہم پر ترس آیا اور نہ تمہاری ہمدردی جاگی؟"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "میں آپ دونوں سے معافی چاہتی ہوں۔ میں جوری کے کردار سے ناواقف نہیں ہوں لیکن اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ وہ اذیت سے تڑپ رہی تھی۔ میں کیا کرتی؟ میں اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

میں نے کہا "ویرا! اگر تم اس عورت کے کردار سے واقف ہو تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کتنی سنگدل اور خطرناک ہے۔ وہ موقع دیکھ کر تمہاری جان بھی لے سکتی تھی اور اگر وہ تمہاری مدد سے یا تمہاری وجہ سے موگاسا سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی تو تمہیں پتا ہے ہمیں اس کا کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ وہ بدبخت اس راز سے آگاہ ہے کہ ہمارے چہروں کے پیچھے اصل چہرے کس کے ہیں۔ وہ یہ راز کھول کر آشکار کرتی تو ہم پر کیا قیامت نہ ٹوٹ جاتی۔ جذباتی ہونا بری بات نہیں ویرا لیکن جذبات میں خطرات کو فراموش کر دینا

بہت نقصان دہ ہے۔"

ویرا خاموش رہی۔ ہم دونوں بھی خاموش رہے پھر صفدر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "لیکن اس لارسی لڑکی (موناہ) کو کیسے پتا چلا کہ جوری زیلہ میں ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" ویرا بولی "وہ صبح سویرے سے شفاخانے کے آس پاس گھوم رہی تھی۔ کسی کتیا کی طرح ہر شے کو سونگھتی پھرتی تھی۔ کبھی آنکھیں بند کر کے منہ اوپر اٹھا لیتی تھی اور عجیب عجیب ناٹک کرتی تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اس نے کل رات جوری کو زیلہ میں گھستے دیکھ لیا تھا۔"

"ویسے ہے وہ عجیب لڑکی۔" میں نے تائید کی "اس کی آنکھیں ہر وقت نشے میں ڈوبی رہتی ہیں۔ موگاسا والوں کا خیال ہے کہ وہ خفیہ طاقتوں کی مالک ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قسم کی خرافات اس سے منسوب ہیں۔"

صفدر نے کہا "اب جوری کا کیا کرنا ہے۔ اسے زندہ رکھنا تو سخت خطرناک ہوگا۔"

"پلیز صفدر۔" ویرا گھبرا کر بولی "اسے جان سے مت ماریں۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر کہیں بند کر دیں اسے۔ دو تین ماہ کے لیے کسی ایسی جگہ پھینک دیں کہ وہاں سے نکل نہ سکے۔"

صفدر نے سترش لہجے میں کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ اس موقع پر ویرا سے بحث ٹھیک نہیں تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم جوری کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے لیکن ویرا نے اس کی جان بچائی تھی' اس کی دیکھ بھال کی تھی' اس کے دل میں جوری کے لیے نرم گوشہ تھا۔ اس گوشے کو ہم آناً فاناً ختم نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے صفدر سے اس قسم کی باتیں کیں جن سے ویرا کو اندازہ ہو کہ ہم بھی جوری کو قتل کرنے کے حق میں نہیں لیکن اس بات سے پریشان ہیں کہ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم ویرا کے ہمراہ موبائل کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اشوکا ملا' اس نے بتایا کہ موناہ کی جان مصیبت میں آئی ہوئی ہے' اس نے مستی کی حالت میں میڈم ویرا پر ہاتھ اٹھایا تھا' لوگ اس سے سخت خفا ہیں اور اس کو کفارہ ادا کرنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں' کم سے کم کفارہ یہ ہے کہ اسے آج شام سے پہلے پہلے پندرہ بھیڑوں کی قربانی دینا ہوگی۔ یہاں پندرہ بھیڑیں تو چند خوش حال لوگوں کے پاس ہی ہوں گی۔ وہ پندرہ بھیڑوں کی قربانی نہیں دے سکے گی لہٰذا بوما کے بڑے پجاری کی طرف سے سخت سزا پائے گی۔

زیلہ کی طرف جاتے ہوئے صفدر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے رائے دی کہ ہمیں فوری طور پر جوری کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے بتایا کہ وہ یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ میں اسے اچھی طرح انجام دے لوں گا۔

راستے میں ویرا نے التجا کے لہجے میں یہ بات پھر دہرائی کہ ہم جوری کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچائیں۔ اس نے پچھلے ۲۴ گھنٹے میں بہت تکلیف سہی ہے اور بڑی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹی ہے۔

ویرا جتنی ہمدردی سے جوری کے لیے درخواست کر رہی تھی' دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جائے لیکن اس کی زبان کھلنے سے پہلے اسے مار دینا ہماری اٹل مجبوری بن چکا تھا۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ کل عقوبت خانے سے فرار ہونے کے بعد جوری اپنے کسی ساتھی (ٹرسٹ کے کسی مخبر) کے پاس نہیں چلی گئی تھی ورنہ اب تک سب چوپٹ ہو چکا ہوتا۔

ہم بوما کے سامنے سے گزرے تو وہاں سیڑھیوں کے قریب بہت سے لوگ جمع تھے۔ سیڑھیوں پر بوما کا بڑا پجاری بولوس براجمان تھا۔ اس کے سامنے دراز قد موناہ مجرم کی حیثیت سے موجود تھی۔ اس کے ہاتھ رسی سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ اس کی عریانی کو ڈھانپنے کے لیے ایک بڑی چادر اس کے جسم پر یوں باندھ دی گئی تھی کہ وہ اس کی بغلوں کے نیچے سے نکل کر اس کے سینے اور باقی جسم کو ڈھانپ رہی تھی۔ سردار رانے کا بھائی اولام بھی یہیں موجود تھا۔ ہم نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ موناہ کے خلاف ابھی کسی طرح کی کارروائی نہ کی جائے۔

"لیکن کارروائی تو ہو چکی ہے۔" اولام نے کرخت لہجے میں کہا "یہ پندرہ بھیڑوں کی قربانی آج شام سے پہلے پہلے دے گی یا اتنی ہی قیمت بوما کو پیش کرے گی۔ وجہ کوئی بھی ہو لیکن اس لڑکی کا جرم نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس نے ہمارے محترم ترین بوکارلو کی محترم ترین بھتیجی پر ہاتھ اٹھانے کی جسارت کی ہے۔"

صفدر نے ذرا سخت لہجے میں کہا "مدعی تو ہم ہیں' اور ہم ہی کہہ رہے ہیں کہ ابھی کچھ دیر تک اس معاملے کو روکا جائے۔ دراصل ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ موناہ کی کچھ باتیں درست تھیں۔"

اولام نے چونک کر صفدر کی طرف دیکھا اور اشوکا کی وساطت سے کہا "کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ جوری کے بارے میں اس لڑکی کی اطلاع درست تھی؟"

"ابھی ہم کچھ بھی کہنا نہیں چاہ رہے۔" صفدر نے چہک کر کہا "بس تم یہ کرو کہ ابھی لڑکی کے خلاف ہونے والی کارروائی کو روکو۔"

اولام نے نیم رضامندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ ہمیں ٹریلر یعنی موبائل کلینک کی طرف جاتے دیکھ کر بہت سے لوگ ہمارے پیچھے ہو لیے تھے۔ یقیناً ان کے اندر بھی صورت حال کے بارے میں تجسس موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی چابی سے ٹریلر کا عقبی دروازہ کھولا۔ میں' صفدر اور ویرا ٹریلر میں داخل ہوئے اور جہازی سائز ریفریجریٹر کے سامنے پہنچ گئے۔ ٹریلر کی خفیہ پناہ گاہ اس ریفریجریٹر کے عقب میں موجود تھی اور ہماری توقع کے عین مطابق جوری اسی پناہ گاہ میں تھی۔ پناہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے ریفریجریٹر کے شیلف اس کی جگہ سے ہٹائے اور خفیہ خانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں جوری ایک فوم پر لیٹی تھی۔ اس نے مختصر لباس پہن رکھا تھا' اس کی ران' پیشانی اور بازو پر پٹیاں بندھی تھیں۔ چونکہ اس کی کمر کی کھال بید کی ضربوں سے بری طرح ادھڑی ہوئی تھی اس لیے وہ فوم پر اوندھی لیٹی تھی۔ ہمیں دیکھ کر جوری کی آنکھوں میں فوراً کمینگی کا گدلا پن ابھر آیا۔ ایک ایسی کمینگی جو صرف شکم پرست اور خوں خوار جنگلی درندوں کی آنکھوں میں ہی نظر آتی ہے۔ بے شک وہ زخمی تھی لیکن جنگلی درندے زخمی ہو کر اور بھی خطرناک ہو جاتے ہیں۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ ویرا تھا اس ٹریلر میں آ کر غلطی کرتی رہی ہے۔ ویرا جس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھی وہ خوں خوار عورت کسی بھی وقت فرار ہونے کی کوشش میں ویرا کی جان لے سکتی تھی۔ وہ اتنی گرانڈیل اور طاقت ور تھی کہ زخمی ہونے کے باوجود ویرا جیسی دو تین لڑکیوں کی ہڈیوں کا چورا بنا سکتی تھی۔

میرے ذہن میں جوری سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک اور منصوبہ تھا لیکن جوری کو دیکھ کر اور اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت کی کوندتی ہوئی بجلیوں کو دیکھ کر فوراً ایک اور خیال ذہن میں آ گیا۔ یہ نیا طریقہ اس لحاظ سے بھی بہتر محسوس ہوا کہ اس سے ویرا کے ذہن پر جوری کے قتل کا اثر کم سے کم ہو سکتا تھا۔ میں نے بڑی اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور یقیناً صفدر نے بھی دیکھ لیا تھا کہ جوری اپنی تمام مصیبت کا ذمے دار ہمیں سمجھتی ہے اور اگر اسے ہم دونوں کو ہلاک کرنے کا موقع مل جائے تو شاید وہ ایک لمحے کی دیر بھی نہ لگائے۔

میں نے جو چھوٹی سی پلاننگ کی اس کی بنیاد یہی مشاہدہ تھا۔ جوری کے زخموں کو دیکھنے کے لیے میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس دوران میں ویرا نے بھی جوری سے اس کی طبیعت کے بارے میں چند سوالات مقامی زبان میں کیے۔ جس کے جواب جوری نے نہایت مختصر لفظوں میں دیے۔

میں نے کہا "جوری! انگک نے تمہارا کوڈ نیم "ونڈر" سوچ سمجھ کر ہی رکھا تھا۔ تم واقعی ونڈر فل ہو۔ اتنی مار تو کسی پہاڑی خچر کو بھی پڑتی تو وہ کئی دفعہ جاں بحق ہو گیا ہوتا۔"

جوری نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ میری بات سمجھ ہی نہیں پائی' حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ انگریزی سمجھ سکتی ہے۔

"کیا بات ہے ونڈر۔ تمہاری بولتی بند کیوں ہو گئی ہے۔ تمہاری زبان پر تو بنٹر نہیں پڑے ہیں!"

وہ ویرا کی طرف دیکھ کر مقامی زبان میں بڑبڑائی۔ غالباً اس نے ویرا سے یہی کہا تھا کہ وہ ہم دونوں کو یہاں سے ہٹا دے۔ ویرا نے ذرا ناصحانہ نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں ایک بیمار کے سرہانے بیٹھ کر اس طرح کی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔

اس دوران میں' میں اپنا کام کر چکا تھا۔ میری پتلون کی جیب میں ایک چھوٹا لیڈیز پسٹل موجود تھا۔ ایک ریوالور میری کمر سے بندھے ہوئے ہولسٹر میں بھی لگا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب میں موجود لیڈیز پسٹل بیٹھے بیٹھے اس طرح فوم پر گرایا کہ صفدر اور ویرا میں سے کسی کو پتا نہیں چلا۔ ہاں یہ پسٹل جوری کے بھاری بھرکم کندھے سے ٹکرایا تھا اور اسے پتا چل گیا تھا کہ کوئی ٹھوس شے میری جیب میں سے فوم پر گری ہے۔

پسٹل گرانے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہیں کھڑے کھڑے ویرا' میں اور صفدر زخمی جوری کی موجودہ حالت کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ویرا نے کہا "اس کی کمر کے زخم تو کچھ بہتر ہیں لیکن ران میں پیپ پڑنے کا اندیشہ ہے جس کی وجہ سے اسے تیز بخار ہے اور مسلسل متلی بھی ہو رہی ہے۔ میں اسے اینٹی بایوٹک دے رہی ہوں مگر اس پر اثر نہیں ہو رہا۔"

"یہ موٹی کھال کی عورت ہے' اسے ہچھوں اور بھینسوں والی اینٹی بایوٹک کی ضرورت ہو گی۔" میں نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

ویرا نے ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے مجھے دیکھا اور موضوع بدلنے کے لیے ہمیں جوری کے بازو کے خطرناک زخم کے بارے میں بتانے لگی۔ اس گفتگو کے دوران میں میری نگاہ مسلسل پناہ گاہ کی ایک دیوار پر لگی رہی تھی۔ اس دیوار کی

دھاتی سطح چمک دار تھی' اور اس میں مجھے فوم پر لیٹی گرانڈیل جوری کا مدھم عکس نظر آ رہا تھا۔ مجھے جوری سے ایک خاص عمل کی توقع تھی۔۔۔ اور پھر اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میری توقع پوری ہو رہی ہے۔ میرے اعصاب جو قدرے ڈھیلے ہونا شروع ہو گئے تھے' ایک دم تن گئے۔ ہم تینوں کا رخ جوری کی طرف نہیں تھا۔ ویرا تو جوری کی طرف تقریباً پشت کیے کھڑی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جوری کے ہاتھ میں پسٹل ہے اور اس کے ہاتھ کا رخ ہماری طرف ہو رہا ہے۔ یہی حرکت میں آنے کا لمحہ تھا۔ وہ لمحہ جس کے لیے میں خود کو پچھلے تین چار منٹ سے مسلسل تیار کر رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ جوری کے ہاتھ کا رخ مکمل طور پر میری طرف ہوتا' میں تیزی سے پلٹا۔ پلٹنے کے مختصر ترین وقت میں' میں اپنا ۳۸ بور نہایت پاور فل ریوالور اپنے ہاتھ میں لا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ جوری ٹریگر دباتی' میرے ریوالور نے زوردار دھماکوں سے تین گولیاں اگلیں اور جوری کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دی۔ وہ اوندھے منہ پٹ سے ٹریلر کے فرش پر گری اور اس کی شکستہ کھوپڑی سے خون نکل کر فوم کو بھگونے لگا۔

ویرا نے یہ منظر دیکھ کر دو تین زوردار چیخیں ماری تھیں اور اب ایک کونے میں وحشت زدہ سی کھڑی تھی۔ صفدر نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔ وہ پھر بھی سکتے کی سی حالت میں رہی۔ فائرنگ کی آواز سے باہر ہلچل مچ گئی تھی مگر ہم چونکہ ٹریلر کا دروازہ اندر سے لاک کر کے آئے تھے لہٰذا کوئی اندر نہیں آ سکا۔ میں نے صفدر کے ساتھ مل کر جوری کی بھاری بھرکم لاش کو اٹھایا اور کھینچ تان کر خفیہ پناہ گاہ سے باہر نکال لیا۔ اس کے بعد ہم نے ٹریلر کا دروازہ کھول دیا اور جوری کی خونچکاں لاش کو باہر لے آئے۔ لوگ اس لارسی غدار کی صورت دیکھنے کے لیے امڈ پڑے۔ وہ اس بات پر حیرت زدہ تھے کہ موناپ کے بیان کے مطابق جوری ٹریلر کے اندر سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر اکثر لارسیوں کی نگاہ میں نفرت کے آثار امڈ آئے تھے۔ کئی جوشیلے نوجوانوں نے اس کی لاش کو ٹھوکر ماری اور کچھ نے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے اس پر تھوک دیا۔

اسی دوران میں بکھرے بکھرے بالوں والی ایک عورت ہجوم کو چیرتی ہوئی تیزی سے آگے آئی۔ اس نے جوری کے سرہانے کھڑے ہو کر چیختا ہوا سا قہقہہ لگایا' پھر جوری کی لاش کو ٹھوکریں رسید کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا موسل موجود تھا۔ نیچے جھک کر اس نے جوری کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی پر دو تین ضربیں لگا کر اسے مزید توڑ دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس وحشی عورت کو روکنا چاہا تاہم اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ اردگرد کھڑے لوگ عورت کے اس عمل کو پسند کر رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک عورت کی حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے۔ عورت وحشیانہ انداز میں ٹوٹی ہوئی کھوپڑی کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور پھر اس نے ایک خوفناک حرکت کی۔ وہ جوری کا کچا مغز کھانے لگی۔

یہ منظر دیکھنے کے قابل نہیں تھا' میں واپس مڑا اور اسی وقت مجھے ایک بلکی سی چیخ سنائی دی۔ یہ ویرا کی آواز تھی۔ میں نے دیکھا وہ بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔ صفدر نے لپک کر اسے بانہوں میں لیا اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ دراصل جو کچھ ہوا' اتنا اچانک تھا کہ صفدر ویرا کو موقع سے ہٹا ہی نہیں سکا۔ ویرا کی نظر لارسی عورت کے وحشیانہ عمل پر پڑی تھی اور وہ ہوش میں نہیں رہ سکی تھی۔

ویرا کو ایک قریبی جھونپڑے میں پہنچایا گیا اور بمشکل ہوش میں لایا گیا۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں اشوکا کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ جوری کا مغز کھانے والی لارسی عورت اسی پہرے دار کی بیوی تھی جو کل علی الصباح جوری کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

جوری کی لاش کے اردگرد موجود افراد الجھن کا شکار تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ان کی محترم و مکرم ہستی یعنی ویرا نے جوری جیسی عورت کو پناہ دینے کی کوشش کیوں کی؟ میں نے اشوکا سے کہا کہ وہ اس حوالے سے لوگوں کے سامنے ویرا کی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کرے۔

"میں کیا کہوں جناب! میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" اشوکا نے اپنے گنجے سر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی کہہ دو۔ کوئی بہانہ بنا دو۔۔۔ یا پھر صاف صاف ہی کہہ دو۔ لوگوں کو بتا دو کہ ویرا نے صرف انسانی ہمدردی کی وجہ سے ایک معالج کے طور پر جوری کو عارضی پناہ دی تھی۔ جونہی اس کی حالت سنبھلتی' وہ اسے بستی کے معززین کے سامنے پیش کر دیتی۔"

اسی دوران میں اشوکا کی نگاہ سردار رانے پر پڑ گئی۔ وہ بولا "کیا یہ مناسب نہیں کہ یہ بات براہ راست لوگوں سے کہنے کے بجائے سردار رانے سے کہہ دی جائے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے تائید کی۔

سردار رانے آیا تو میں نے اشوکا کے ذریعے اسے سمجھا بجھا دیا۔ وہ جہاں دیدہ شخص تھا' بات کی تہ تک پہنچ گیا ہو گا' بہرحال اس حوالے سے اس نے مکمل تعاون کیا۔ ہم مضمحل

نڈھال ویرا کو اپنے جھونپڑے میں لے آئے۔ اس نے رسٹ کی چار دیواری سے نکل کر پے در پے صدمے اور حادثے دیکھے تھے کہ سراپا غم بن گئی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ صفدر اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا حالانکہ ویرا نے دیکھ لیا تھا کہ جوری نے ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی اور اگر میں فائر نہ کرتا تو وہ ہم پر فائر کر دیتی' اس کے باوجود وہ سوگوار نظر آ رہی تھی۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے سردار رانفے کا چھوٹا بھائی اولام میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ عامل لڑکی موناب بدستور مجرم کی حیثیت سے بوما میں موجود ہے۔ بڑے پجاری بولوس پوچھ رہے ہیں کہ اس کا کیا کرنا ہے۔

میں نے کہا "کیا کرنا ہے؟ اسے چھوڑ دیں۔ یہ بات تو اب ثابت ہو گئی ہے کہ موناب کی اطلاع درست تھی۔"

"وہ سب ٹھیک ہے لیکن اس لڑکی نے ہمارے محترم بوکارلو کی محترم بھتیجی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ یہ جرم قابل معافی نہیں ہے۔ اس کی سزا تو موناب کو ضرور ملنی چاہیے۔ اگر نہیں ملے گی تو ہم پر بوبوریوتا کا قہر نازل ہو گا۔"

"اگر ویرا صاحبہ اس لڑکی کو خود معاف کر دیں تو پھر؟"

"اس بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا جواب تو پجاری ہی دے سکتے ہیں۔" اولام نے کہا۔

"چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔

لاروناب کو استقی کا پہرا دیتے ہوئے اب آٹھ گھنٹے ہو چلے تھے۔ لازمی تھا کہ اب لاروناب کی ڈیوٹی تبدیل کی جائے۔ میں نے صفدر کو ضروری ہدایات دے کر استقی کی طرف بھیج دیا اور خود اولام کے ساتھ بوما کی طرف چل دیا۔ اشوکا بھی ہمارے ساتھ تھا۔

سورج اب سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ ماریطانیہ کے اس دور افتادہ ویرانے کی چلچلاتی دوپہر ہر شے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ پرسوں رات کے حملے میں جو لوگ مر گئے تھے ان کی راکھ فضاؤں میں اڑ چکی تھی مگر ان کی موت کا غم اب بھی بستی کو سوگوار کیے ہوئے تھا۔ یہ سوگواری یوں اور بھی گمبھیر ہو گئی تھی کہ اس میں مستقبل کے خطرات بھی شامل تھے۔ آنے والی گھڑیوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ہم بوما پہنچے تو صحن میں ایک عدالت کا سا منظر نظر آیا۔ بڑا پجاری بولوس دو چھوٹے پجاریوں کے ساتھ لکڑی کی نشستوں پر براجمان تھا۔ اس کی دونوں اطراف مردان اور محافظ دست بستہ کھڑے تھے۔ دراز قامت موناب کو مجرم کی حیثیت سے دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا۔ اس کا سیاہ جسم پسینے کی شورش سے چمک رہا تھا۔ ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے۔

بڑے پجاری بولوس نے بھی وہی باتیں کیں جو تھوڑی دیر پہلے اولام نے کی تھیں۔ اس نے کہا "موناب نامی اس لڑکی کا جرم انتہائی سنگین ہے۔ وجہ کچھ بھی ہوتی' اسے بوکارلو خانوادے کی ایک محترم خاتون پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ ہاتھ اٹھانا تو بہت دور کی بات ہے' یہ اس خاتون سے بلند آواز میں بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ حالت مستی میں کیا ہے اس لیے ہم اسے کم سزا دے رہے ہیں' ورنہ یہ موت کی حق دار تھی۔ اب اسے کم از کم پندرہ بھیڑیں قربان کرنا ہوں گی یا اس کے برابر قیمت ادا کرنا ہو گی۔"

"میں کہہ چکی ہوں۔ میرے پاس بھیڑیں ہیں' نہ اتنی مالیت ہے جو دے سکوں۔ صرف دو گھوڑے ہیں جو میرے بوڑھے والدین اور دو چھوٹی بہنوں کا "روزگار" ہیں۔ ہم ان پر سواری کرتے ہیں اور ان ہی کے ذریعے کھیت میں ہل چلاتے ہیں۔"

"اگر نہیں تو پھر تمہیں تیسری تجویز پر عمل کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر دیوتاؤں کی ناراضگی کو ٹالا نہیں جا سکتا۔"

"اس تجویز پر عمل کرنا بھی میرے بس میں نہیں۔" موناب نے سر جھکا کر کہا۔

یہ ساری گفتگو مقامی زبان میں ہو رہی تھی۔ اشوکا میرے لیے اس گفتگو کا ترجمہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں اشوکا سے پوچھا کہ یہ تیسری تجویز کیا ہے۔

اس کا علم اشوکا کو بھی نہیں تھا۔ اس نے لنگوٹی والے ایک پجاری نما شخص سے پوچھا۔ وہ اشوکا کو احترام سے ایک طرف لے گیا اور تھوڑی دیر کھسر پھسر کرتا رہا۔ واپس آ کر اشوکا نے مجھے بتایا۔ "تیسری تجویز یہ ہے کہ موناب نامی یہ لڑکی اپنے جسم کے عوض جرمانے کی رقم حاصل کرے۔ ایسا کرنا یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے بھینٹ چڑھانے کے لیے اس طرح رقم یا اشیا حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا تھا' لارسیوں میں جوذام ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ جوذام ذات کے مردوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سانپ کی خصوصیات رکھتے ہیں اور انہیں صرف جوذام ذات کی عورتوں سے ہی جسمانی تعلق قائم کرنا چاہیے' اگر وہ کسی دوسری عورت کے ساتھ ایسا رشتہ استوار کریں گے تو اس کے مر جانے کا اندیشہ ہو گا۔ بدقسمتی سے کچھ قبیح رسموں کے سبب جوذام ذات کے لوگوں میں لڑکیاں بہت کم بلوغت کی عمر تک پہنچتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جوذام مرد اکثر عورت کی بھوک کا شکار رہتے ہیں۔ وہ جوذام مرد جو خوش حال ہوتے ہیں'

کسی عورت کو بیوی بنانے یا اس سے جسمانی رشتہ استوار کرنے کے لیے بھاری رقم پیش کر سکتے ہیں۔ ایک جوذام مرد موناب کو بھی دستیاب ہے اور اسے معقول رقم پیش کر رہا ہے۔ وہ اس رقم سے بھینٹ چڑھا سکتی ہے لیکن موناب کو یہ تجویز قبول نہیں۔"

اشوکا جو کچھ بتا رہا تھا وہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان قبائل میں اس قسم کی عجیب و غریب رسوم کی بھرمار تھی بلکہ لارسی شاید اس معاملے میں کچھ پیچھے ہی تھے۔ میں نے اشوکا کے ذریعے بڑے پجاری بولوس سے مخاطب ہو کر کہا "محترم اس مقدمے کی اصل مدعی محترمہ ویرا ہیں۔ اگر وہ خود اپنی رضا سے اس لڑکی کو معاف کر دیں تو کیا بوما کی طرف سے اس کی سزا معاف ہو سکتی ہے؟"

تینوں پجاریوں کے چہروں پر سوچ کر لکیریں ابھریں۔ وہ تینوں لنگوٹی پوش تھے اور انہوں نے چہروں پر نقش و نگار بنا رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد بڑا پجاری بولا "ہمیں نہیں امید کہ محترمہ اس نہایت سنگین بدتمیزی کے لیے مجرمہ کو مرضی سے معاف کر دیں گی۔۔۔ لیکن۔۔۔ اگر واقعی ایسا ہو تو پھر اس بدبخت کے لیے رعایت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ محترمہ ویرا خود یہاں آپ کے سامنے حاضر ہو جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" بڑا پجاری بولوس بوکھلا کر بولا "میں ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔ میں خود محترمہ کے حضور پیش ہونے کو سعادت سمجھوں گا۔"

قریباً ایک گھنٹے کے اندر یہ معاملہ صاف ہو گیا۔ بڑا پجاری بولوس مع اپنے معاون کے میرے ساتھ جھونپڑے میں پہنچا اور ویرا سے ملاقات کی۔ موناب بھی ساتھ تھی۔ موناب نے گھٹنوں کے بل جھک کر ویرا سے معافی مانگی۔ ویرا نے میری ہدایت پر عمل کیا اور موناب کو معاف کر دیا۔ موناب کی سزا صرف ایک بھیڑ کی قربانی تک محدود کر دی گئی۔ قربانی کی یہ بھیڑ بھی سردار رانفے نے فراہم کر دی۔

شام تک ویرا بالکل گم صم رہی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور چہرہ کملایا ہوا نظر آتا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو صفدر کو مشورہ دیتا کہ وہ اس لڑکی کو لے کر ان ہنگاموں اور حادثوں سے کہیں بہت دور چلا جائے۔ کسی پرسکون خطہ زمین پر جہاں چشمے گنگناتے ہوں' ہریالی لہلہاتی ہو اور پہاڑی ڈھلوانوں پر ویرا کے رخساروں جیسے نرم و نازک پھول مہکتے ہوں مگر فی الوقت یہ میرے بس میں نہیں تھا اور شاید صفدر کے بس میں بھی نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب دو چار روز تک ویرا غم کے اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکے گی مگر رات تک اس نے خود کو قدرے سنبھال لیا۔ وہ کپڑے بدل کر شفا خانے گئی اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ ایک سائنس داں کی حیثیت سے وہ میڈی کیشن کے بارے میں کافی کچھ جانتی تھی۔ رات دس بجے کے قریب وہ واپس آ گئی۔ شب بسری کے لیے میں اشوکا کے خیمہ نما جھونپڑے میں چلا آیا۔ یہ ایسی شب بسری تھی جس میں سو نہیں سکتا تھا۔ مجھے شیطان جونیئر کی نگرانی کرنی تھی۔ میں جھونپڑے میں پہنچا تو مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ شیطان جونیئر ہوش میں ہونے کے باوجود خاموش بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا' جب اس نے چہرہ میری طرف گھمایا تو میں چونک گیا۔ اس کے چہرے پر کئی جگہ نیلگوں گومڑ تھے اور نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں ایک میلا کپڑا ٹھونس کر اوپر سے رومال باندھ دیا گیا تھا۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ استقی کی یہ خاطر مدارات لاروناب نے کی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد استقی نے اسے نہایت غلیظ گالیاں دی تھیں۔ اس کے منہ پر تھوکا تھا اور بار بار اسے ننگا ہو کر دکھایا تھا۔ آخر جب اس نے لاروناب کے چہرے پر ٹانگ رسید کر دی تو لاروناب کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے استقی کو بے طرح پیٹ ڈالا اور دو تین دفعہ اٹھا کر زمین پر پٹخا۔ اس کے بعد اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ استقی کے ساتھ یہ سلوک ہو کر رہنا ہے' میں نہ کروں گا تو کوئی اور کرے گا۔ اس کی ہٹ دھرمی اور مزاج کی تیزی انتہا سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اسے تھوڑا سا ڈرایا دھمکایا اور سمجھایا کہ اس کی خیریت چپ چاپ بیٹھے رہنے میں ہے۔ وہ بھی شاید چیخ چیخ کر اور ہاتھ پاؤں چلا چلا کر تھک چکا تھا' مجھے لال لال آنکھوں سے گھورنے کے سوا اس نے اور کچھ نہیں کیا۔ وہ کھانا وغیرہ کھا چکا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں جھونپڑے سے باہر چلا آیا۔ یہاں سے مجھے اپنا جھونپڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ صفدر اور ویرا جھونپڑے میں موجود تھے۔ جھونپڑے کی روشنی آج پھر بہت جلدی گل ہو گئی تھی۔ اس تاریکی میں محبت کا اجالا تھا۔

صبح سویرے جب میں خوابیدہ استقی کے قریب ٹیک لگائے بیٹھا تھا' اچانک جھونپڑے سے باہر تیز قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے گود میں رکھا ہوا ۳۸ بور ریوالور ہاتھ میں لیا اور الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے

والا صفدر تھا۔ اس نے پریشان لہجے میں پوچھا "ویرا تو ادھر نہیں آئی؟"

"نہیں۔"

"وہ جھونپڑے میں نہیں ہے۔ چشمے پر بھی نہیں ہے۔ شفا خانے اور موبائل کلینک۔۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔"

"کہاں جا سکتی ہے؟ بستی سے باہر تو نہیں نکل سکتی' پوری بستی محافظوں کے گھیرے میں ہے۔"

"میں تو کئی محافظوں سے بھی پوچھ چکا ہوں۔" صفدر کا لہجہ گمبھیر تھا۔

میں نے کہا "اچھا لارو نابے کو بلاؤ" اسے اسٹی کے پاس چھوڑ کر میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

صفدر گیا اور لارونابے کو لے آیا۔ ہم دونوں ویرا کی تلاش میں نکلے۔ میرے پاس ٹریلر کی چابی موجود تھی' ہم دروازہ کھول کر اندر گھس گئے' پناہ گاہ بھی دیکھی' پھر شفا خانے کے کونے کھدروں میں جھانکا' اس دوران میں سردار رافے اور اولام وغیرہ بھی پہنچ گئے۔ سردار رافے نے فوراً انچارج محافظ کو طلب کیا اور حکم دیا کہ "محترمہ" کو تلاش کیا جائے۔ ذہن میں کئی انجانے خدشات سر اٹھانے لگے تھے۔ کل عالل لڑکی موناب نے ویرا سے ہاتھا پائی کی تھی اور بعد ازاں اسے معافی مانگنا پڑی تھی' کہیں یہ اسی جھگڑے کا شاخسانہ تو نہیں تھا لیکن پھر ذہن نے فوراً ہی اس اندیشے کو رد کردیا۔ موناب کوئی ایسی جرأت نہیں کرسکتی تھی۔ میں اور صفدر جھونپڑے میں پہنچے۔ صفدر اور ویرا کا مشترک بستر جوں کا توں تھا۔ رات کو صفدر نے ویرا کی کلائی میں چنبیلی کے پھولوں کا گجرا پہنایا تھا۔ اس گجرے کی پتیاں تکیے پر بکھری تھیں اور گزر جانے والی ایک خوب صورت رات کا پتا دے رہی تھیں۔ کل رات ویرا نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ کھونٹی پر ٹنگا تھا' اس کا مطلب تھا کہ وہ جہاں بھی گئی ہے شب خوابی کے لباس میں گئی ہے۔ اچانک صفدر کو تکیے کے نیچے کوئی چیز نظر آئی' اس نے تکیہ اٹھایا۔ سفید کاغذ پر لکھا ہوا ایک خط صفدر کا اور میرا منتظر تھا۔ خط کے ساتھ ہی چاندی کی ایک چوڑی بھی پڑی تھی۔ یہ چوڑی صفدر نے شادی کے موقع پر بطور رسم ویرا کو پہنائی تھی۔

صفدر نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ خوب صورت انگلش میں لکھا گیا یہ خط کچھ اس قدر حیران کن تھا کہ ہم دونوں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑے رہ گئے۔ اس نے صفدر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میرے محبوب!

میرے لیے تم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز عزیز نہیں اسی لیے میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ میں تمہارے پاس رہی تو شاید تم سے بھی محبت نہ کرسکوں۔ ہاں صفدر! ڈیر! بہت سی ایسی چیزیں' جو چند ماہ پہلے تک مجھے بہت محبوب تھیں اب میرے لیے محبوب نہیں رہی ہیں۔ ٹرسٹ کی چار دیواری سے نکل کر میں ایک ایسے عذاب میں گرفتار ہوئی ہوں جس کی اذیت ناقابل برداشت ہے۔ یہ ایک ایسا عذاب ہے جسے میں صرف محسوس کرسکتی ہوں' بتا نہیں سکتی۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ آگاہی کا عذاب ہے۔ مجھے انسانیت کے دکھوں سے آگاہی ہوئی ہے۔ میں نے بھوک' بیماری' غربت اور مجبوری دیکھی ہے اور یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ ہے کہ میرا دل ہر شے سے اچاٹ ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ میں کبھی کبھی اپنے وجود سے نفرت محسوس کرنے لگتی ہوں۔ میں کہاں جانا چاہتی ہوں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کیا کرنا چاہتی ہوں' مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی ایسا کام۔۔۔ جو بے شک مجھے جلا کر راکھ بنا دے' مجھے فنا کردے لیکن جس سے انسانیت کے دکھوں میں تھوڑی سی۔۔۔ بس تھوڑی سی کمی واقع ہوجائے۔

"میں جانتی ہوں صفدر! میں تمہیں بہت دکھ دے کر جا رہی ہوں' میری جدائی تمہیں بہت شاق گزرے گی' میرے پاس وہ الفاظ نہیں صفدر کہ جن میں' میں تم سے معافی مانگ سکوں بس۔۔۔ ہاتھ باندھ کر ایک آخری التجا ہے۔ میری خاطر۔۔۔ ہاں میری جان! میری خاطر خود کو سنبھال لینا۔ میری مجبوریوں کو بخش کر مجھ بدنصیب کو بھول جانا۔ لوگ مر بھی تو جاتے ہیں' سمجھ لینا کل رات میں مر گئی تھی۔ مجھے تلاش مت کرنا کیونکہ میں ملوں گی نہیں اور اگر فرض محال کہیں مل بھی گئی تو وہ ویرا نہیں ہوں گی جو آج تم سے بچھڑ گئی ہے۔

"بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اور خون ہوتے ہوئے دل کے ساتھ تمہارے سرہانے بیٹھی ہوں۔ تم سو رہے ہو' تمہاری پیشانی کو آخری بوسہ دے رہی ہوں۔ خدا حافظ۔۔۔ میری جان' خدا حافظ۔"

خط ختم ہوگیا لیکن ہم پتھر کے بت بنے کھڑے رہے۔ اپنی نگاہوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں "یہ۔۔۔ یہ کیا ہے شاہ جہاں صاحب؟" صفدر نے کانپتی آواز میں پوچھا' اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

میں نے خط صفدر کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا "کہیں۔۔۔ یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے شاہ جہاں صاحب؟" صفدر کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔

"کچھ بھی ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ ایسا نہیں کرسکتی۔" میں نے کہا اور پھر صفدر کو اس کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا لیکن میرے اندر سے کوئی گواہی دے رہا تھا کہ ایسا ہوچکا ہے۔ ایسا ہوچکا ہے کیونکہ ایک دن ایسا ہی ہونا تھا۔ اس عجیب لڑکی سے ایک دن کوئی ایسی ہی انہونی سرزد ہونا تھی۔ میرے اندر سے طیش کی ایک بلند لہر اٹھی۔ میرا دل چاہا کہ میرے ہاتھ حد نگاہ تک طویل ہوجائیں۔ میری انگلیاں اس سارے جنگل اور ان سارے ویرانوں کا احاطہ کرلیں۔ ویرا جہاں کہیں بھی ہو' میں اسے ڈھونڈ نکالوں اور کھینچ کر واپس صفدر کے پاس لے آؤں۔ اصطبل کی طرف اندھادھند دوڑتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں کہا "ویرا! اپنے یار کی زندگی سے کھیل کر میں تمہیں یوں جانے نہیں دوں گا۔ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

اصطبل کے سامنے میری ملاقات اشوکا سے ہوئی۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

"کیا ہوا جناب' کچھ پتا چلا؟"

میں نے اسے ہاتھ سے ایک طرف دھکیلا اور دوڑتا ہوا اصطبل میں چلا گیا۔ اشوکا بھی میرے پیچھے ہی پیچھے آیا۔ اس نے بھی میری طرح ایک گھوڑے پر زین ڈالی اور میرے ساتھ ہولیا۔ بستی کی حدود پر محافظوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی لیکن میں ان کی پروا کیے بغیر انہیں دائیں بائیں ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے میرے یا اشوکا کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں اس بستی میں ہماری حیثیت معلوم تھی۔ بستی سے نکل کر ہم مشرقی رخ پر بڑھنے لگے۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ویرا اسی رخ پر گئی ہوگی۔ اس کی تحریر سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیچھے جھیل زارا یا ٹرسٹ کی طرف نہیں بلکہ آگے جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کسی گھنے جنگل میں' کسی نامعلوم قبیلے میں۔ اس کے انداز تحریر میں بازیابی کی نہیں' فرار اور روپوشی کی جھلک ملتی تھی۔

ہم دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے کئی میل آگے نکل گئے' راستے میں ہمیں کہیں کہیں کسان اور لکڑ ہارے وغیرہ ملے' ہم نے ان سے ویرا کے متعلق پوچھا پھر ہم ایک چھوٹی سی صحرائی بستی سے گزرے۔ وہاں کھجوروں کا ایک بہت بڑا باغ تھا۔ ہم نے باغ بانوں سے ویرا کے متعلق دریافت کیا۔ اس دوران میں بستی کے کئی ننگ دھڑنگ مرد و زن بھی وہاں جمع ہوگئے۔ ان میں سے کسی نے کسی سفید فام لڑکی کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔

سورج کافی اوپر آگیا تھا۔ ہم پسینے سے شرابور تھے۔ بستی کے ایک گوالے سے صرف اتنا پتا چلا کہ اس نے صبح منہ اندھیرے دو گھڑ سواروں کو بڑی تیزی سے پگڈنڈی سے گزرتے دیکھا تھا۔ دور سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ دونوں عورتیں ہوں۔ ہم گوالے کے بتائے ہوئے رخ پر چل نکلے۔ ابھی ڈیڑھ میل دور ہی گئے ہوں گے کہ ٹرسٹ کی ایک جیپ سے آمنا سامنا ہوگیا۔ اس میں تین افراد سوار تھے' نیلگوں وردیوں کے علاوہ ایک رائفل کی جھلک ہمیں دور ہی سے نظر آگئی۔ حسب توقع ان خدائی فوجداروں نے ہمارا راستہ روک لیا اور مقامی زبان میں پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ اشوکا نے عذر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تلخ کلامی پر اتر آئے۔ ان میں سے ایک نے رائفل سیدھی کرلی اور ہمیں گھوڑوں سے اترنے کا حکم دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنا خطرناک کام کر رہا ہے۔ میرے اندر آتش فشاں دہکا ہوا تھا۔ میں اس وقت بلاوجہ بھی قتل کرسکتا تھا۔ اس شخص نے تو اپنے قتل کی بڑی معقول وجہ پیش کردی تھی۔ میں نے ریوالور نکالا اور رائفل بردار کو ایک لمحے کی مہلت دیے بغیر اس کی پیشانی میں ۳۸ بور کا سوراخ کردیا۔ دوسرا فائر میں نے ڈرائیور پر کیا۔ ایک گولی اس کی گردن کو چیرتی ہوئی گزر گئی اور دوسری اس کے رخسار پر لگی۔ دھماکوں سے قرب و جوار لرز گئے تھے۔ تیسرا شخص دہشت کے عالم میں منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ریوالور کی نال اس کے کھلے منہ میں گھسیڑ دی۔ میں بدستور گھوڑے پر بیٹھا تھا تاہم اشوکا نیچے اتر آیا تھا۔ اشوکا نے اس زندہ بچ جانے والے سے ویرا کے متعلق پوچھا۔

وہ تھر تھر کانپنے لگا اور دہائی دینے لگا کہ اسے کسی سفید فام لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی خواہش اتنی شدید تھی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ایک ساتھی ہلاک ہوچکا تھا اور دوسرا جیپ کے فرش پر جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ میرا چہرہ دیکھنے کے بعد اسے اپنا انجام بھی صاف نظر آنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہاتھ پاؤں جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگنے لگا مگر اسے زندہ چھوڑنا اب ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہم نے اس سے ایک سفید فام لڑکی کے بارے میں سوالات پوچھے

تھے اور سفید فام لڑکی کے حوالے سے دھیان فوراً ویرا کی طرف ہی جاتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ شخص ویرا کے فرار سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے چوتھی بار ٹریگر دبایا اور اسے بھی ختم کر دیا۔ گولی اس کے تالو میں لگ کر کھوپڑی کے عقب سے نکل گئی۔ وہ اپنے مردہ ساتھی کے اوپر گر کر ساکت ہو گیا۔

ایک سرخ چادر سی میری آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی۔ شاید اسی کو سر پر خون سوار ہو جانا کہتے ہیں۔ قریباً ایک گھنٹا ویرانے میں مزید بھٹکنے کے بعد ہم بستی میں واپس آ گئے۔ ٹرسٹ کے جو تین گارڈز میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے ان میں سے دو کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ یہ دونوں رائفلیں مع ایمونیشن ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ جیپ کے ٹائر ناکارہ کر کے ہم نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

جس وقت ہم بستی میں داخل ہوئے' یہ آس دل میں موجود تھی کہ شاید ہماری غیر موجودگی میں ویرا کا کوئی کھوج مل گیا ہو لیکن بستی میں داخل ہوتے ہی سردار رانفے کے مایوس چہرے پر ہماری نگاہ پڑی اور اس کے تاثرات نے ہمیں بتا دیا کہ ویرا بدستور عدم پتا ہے "صفدر کہاں ہے؟" میں نے اشوکا سے پوچھا۔

اشوکا نے سردار رانفے سے معلوم کر کے بتایا کہ وہ جھونپڑے میں لیٹا ہوا ہے۔ ہم جھونپڑے میں پہنچے۔ صفدر نے اپنا بازو موڑ کر آنکھوں میں رکھا ہوا تھا اور بالکل خاموش تھا۔

"کچھ پتا چلا؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ چل جائے گا۔ یہ کوئی ایسا گنجان شہر نہیں۔ وہ بستی سے نکل بھی گئی ہے تو زیادہ دیر چھپ نہیں سکے گی۔"

"یہ تو اب خدا ہی جانتا ہے۔" صفدر نے عجیب ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں سردار رانفے' اولام اور بولوس وغیرہ بھی جھونپڑے میں آ گئے۔ یہ سب لوگ ویرا کی گمشدگی سے آگاہ ہو چکے تھے۔ سردار رانفے نے انکشاف کیا کہ وہ دو عورتیں بھی لاپتا ہیں۔ جو محترمہ ویرا کے ساتھ شفا خانے میں مسلسل کام کرتی رہی ہیں۔ میرے پوچھنے پر رانفے نے بتایا کہ وہ عورتیں لارسی نہیں تھیں۔ اس نے ان کے قبیلے کا کوئی اور نام بتایا اور کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں کسی پرانی دشمنی کے خوف سے موگاتا میں پناہ کے لیے آئی ہوئی ہیں۔

میں نے رانفے سے پوچھا "کیا اصطبل سے کوئی گھوڑا یا اونٹ غائب ہے؟"

سردار نے اس کا جواب نفی میں دیا۔

دو غیر لارسی عورتوں کا بستی سے غائب ہونا ایک اہم سراغ تھا۔ میں نے سردار رانفے سے کہا کہ وہ عورتوں کا کھوج لگائے اور اگر وہ واقعی بستی میں موجود نہیں تو پھر ان کے آبائی قبیلے تک پہنچا جائے۔ سردار نے میری رائے سے مکمل اتفاق کیا۔ میں نے سردار رانفے کو یہ بھی بتایا کہ نزدیکی صحرائی بستی کے گوالے نے علی الصباح دو گھڑ سوار عورتوں کو بستی کے قریب سے گزرتے دیکھا ہے۔ رانفے نہ صرف اس بستی کے بارے میں جانتا تھا بلکہ اسے اس گوالے کے کوائف بھی معلوم تھے۔ اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتا ہے۔

وہ سارا دن شدید پریشانی اور بھاگ دوڑ میں گزرا۔ بستی کا کونا کونا چھان مارا گیا' ویرا کا سراغ ملا اور نہ دونوں عورتوں کا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تینوں بستی میں نہیں۔۔۔ اور اگر وہ بستی میں نہیں تو پھر اس سلسلے میں کچھ محافظ بھی ملوث تھے۔ محافظوں کی مدد یا چشم پوشی کے بغیر وہ بستی سے نکل نہیں سکتی تھیں۔ سردار رانفے کی ہدایت پر کم و بیش سو محافظوں کو پوچھ گچھ کے لیے تحویل میں لے لیا گیا' بوما کے عقب میں واقع احاطے میں ان لوگوں سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ میں اور اشوکا' صفدر کو مسلسل سمجھا بجھا رہے تھے اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ صفدر کے لب و لہجے میں انتہا مایوسی اتری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ویرا آئندہ چوبیس گھنٹوں میں مل گئی تو مل گئی ورنہ نہیں ملے گی۔ وہ ویرا کی انتہا درجے کی جذباتیت سے بھی خوف زدہ تھا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ویرا نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کل شام ہی کو کر لیا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اس نے جوری کی موت کے صدمے پر بہت جلد قابو پا لیا ہے اور نارمل ہو گئی ہے لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ ایک شدید ترین جذباتی کشمکش سے گزرنے کے بعد ایک فیصلے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے نارمل انداز میں میرے اور صفدر کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ باتیں کی تھیں پھر وہ صفدر کے ساتھ جھونپڑے میں چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک محبت بھری الوداعی ملاقات کے لیے۔ ایک ایسی قربت جس کا اختتام جدائی تھا۔ علی الصباح جب بادِ صبا کے جھونکوں میں بستی نیند کے ہلکورے لے رہی تھی' وہ کسی طرح اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ بستی سے نکل گئی تھی۔ یہ کہنا تو غلط تھا کہ اس نے یہ اقدام جوری کی موت کی وجہ سے اٹھایا تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا تھا کہ جوری کی اچانک موت ویرا کے پوشیدہ ارادوں کو مہمیز کرنے کا

سبب بنی تھی۔ کئی دنوں سے ویرا جس شدید جذباتیت کا شکار تھی وہ اس واقعے سے انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اس نے یہ قدم اٹھا لیا تھا۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں گئی ہے اور کس مقصد سے گئی ہے؟ یہ دونوں سوال بہت سے دیگر سوالوں کی طرح سربستہ راز کی حیثیت رکھتے تھے۔

میں اور صفدر اس رات اپنے ہی جھونپڑے میں سوئے۔ جس کی خاطر میں اشوکا کے جھونپڑے میں سوتا تھا' اب وہی نہیں رہی تھی تو علیحدہ کیا سوتا تھا۔ صبح سویرے ایک اور صدمہ میرا منتظر تھا۔ میں ذرا دیر سے ہی اٹھا تھا۔ آٹھ بجنے والے تھے' دھوپ جھونپڑوں کی خاکستری کنوپیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے دیکھا' صفدر بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ چشمے کی طرف چلا گیا ہو گا۔ میں باہر نکل آیا اور اشوکا کے جھونپڑے میں پہنچا تاکہ ماسٹر اسمتھی کی خبر گیری کر سکوں۔ رات کو لارو ناب کے دو نہایت قابل اعتماد ساتھیوں نے اسمتھی کا پہرا دیا تھا۔ اسمتھی کا ہاتھیانہ پن اور شور شرابا قدرے دھیما پڑ گیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اس کے باوا جی کی حکومت نہیں جہاں اس کی ابرو کے اشارے پر لوگوں کے سر تن سے جدا کر دیے جاتے تھے' یہاں اس کی چیخ و پکار بے اثر رہے گی اور اگر وہ حد سے گزرے گا تو اسے مارا پیٹا بھی جائے گا۔ بچے گھر سے جدا ہو کر ماں باپ کو یاد کرتے ہیں لیکن وہ ایسا سخت دل تھا کہ ایک بار بھی اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی تھی۔ وہ جب بھی بولا تھا' اس نے مغلظات ہی بکی تھیں۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں ہی ایسی ایسی گالیاں تخلیق کر لی تھیں کہ کان سنسنا اٹھتے تھے اور دماغ چکرا جاتا تھا۔ یقیناً یہ "بہترین" ماحول اور "فرض شناس" اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ رات کو اسمتھی کے بارے میں کنگ براؤننا سے ٹرانس میٹر پر تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ کنگ کی آواز میں کوئی خاص دم خم نہیں تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بار بار یہ فقرہ دہراتا رہا تھا "اسمتھی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" شاید ان لوگوں کی نگاہوں میں بار بار چین کا انجام گھوم رہا تھا جسے اسی طرح بستی میں یرغمال بنایا گیا تھا اور پھر اس کی لاش بھی دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ کنگ نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنا مطالبہ پیش کروں۔ میں نے واضح الفاظ میں جواب دیا تھا کہ یہ مطالبہ نہیں "مطالبات" ہوں گے اور مناسب وقت آنے پر سامنے لاؤں گا۔ بہرحال یہ تسلی میں نے اسے دی تھی کہ اگر ٹرسٹ کی طرف سے کوئی نئی چالاکی نہ دکھائی گئی تو اسمتھی کی جان بالکل محفوظ رہے گی۔ میں نے کنگ کا یہ مطالبہ بھی بڑے تحمل سے رد کر دیا تھا کہ اسمتھی سے اس کی بات کرائی جائے۔

لارو ناب ابھی اسمتھی کے پاس ہی موجود تھا۔ میں نے اسے اسمتھی کے کھانے اور دیگر حاجات وغیرہ کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور صفدر کو دیکھنے چشمے کی طرف چلا گیا۔ یہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ صفدر چشمے پر بھی موجود نہیں۔ میں دوبارہ اپنی قیام گاہ پر آیا۔ وہ واپس نہیں پہنچا تھا۔ پہرے داروں سے پوچھا۔ انہیں بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی۔ میرا سینہ دھڑک اٹھا۔ میں نے صفدر کو بستی میں تلاش کرنا شروع کیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے پسینے چھوٹ گئے' صفدر بستی کی حدود میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی دوران میں دو محافظوں نے مجھے صفدر کے بارے میں اطلاع دی۔ میرا فرضی نام یہاں عبداللہ اور صفدر کا علی احمد تھا۔ محافظوں نے مجھے بتایا کہ احمد صاحب صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر بستی سے نکلے ہیں۔ وہ جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ ہم نے انہیں روکنا چاہا تھا اور کہا تھا کہ ابھی تاریکی ہے' وہ جنگل کی طرف نہ نکلیں مگر وہ نہیں مانے تھے۔

اشوکا نے کہا "یہ تو بہت برا ہوا۔ انہیں اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"وہ ویرا کی تلاش میں گیا ہے۔ ہمیں فوراً اس کے پیچھے جانا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن ہم اکیلے نہیں جا سکتے۔ آپ جانتے ہیں یہ علاقہ بہت خطرناک ہے۔ ہمیں ایک دو گائیڈ ساتھ لے جانے ہوں گے۔"

"تو لے لو میں نے تمہیں روکا ہے۔" میں نے کہا۔

دس منٹ بعد اشوکا تین مقامی گھڑ سواروں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ ان میں سے ایک سردار رانفے کا بھائی اولام بھی تھا۔ ایک خالی گھوڑا میرے لیے تھا۔ ہم بستی سے نکلے اور صفدر کی تلاش میں جنگل میں داخل ہو گئے۔ اولام کے علاوہ جو دو افراد ہمارے ساتھ آئے تھے وہ ماہر شکاری بھی تھے۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی وہ شکاری درندوں کی طرح حساس اور چوکس ہو گئے تھے۔ انہوں نے نیزے اپنے ہاتھوں میں تول رکھے تھے اور ہر قدم جیسے پھونک کر رکھ رہے تھے۔ اولام کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میں بھی رائفل سے مسلح تھا۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ شاید سو دفعہ بھی آتا تو ان خطرناک راستوں کی بھول بھلیوں سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکتا۔ یہاں آدم خور دلدلیں منہ کھولے کھڑی تھیں اور ہر جھاڑی کے عقب میں کسی درندے کی

موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے' جنگل گھنا اور راستہ خطرناک ہوتا گیا۔ سورج ابھی بہت زیادہ اوپر نہیں آیا تھا مگر دلدلی رقبوں سے زہریلے بخارات اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ یہاں حشرات الارض کی کثرت تھی اور مچھروں کی بھنبھناہٹ شور کی طرح سنائی دیتی تھی۔ ہم گاہے گاہے رک کر صفدر کو "علی احمد" کے نام سے آوازیں بھی دے رہے تھے۔ اشوکا اس جنگل میں پہلی مرتبہ داخل ہوا تھا۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا "عبداللہ صاحب' پرارتھنا کریں کہ احمد صاحب اس طرف نہ آئے ہوں۔ کسی انجان بندے کے لیے یہاں دلدل میں ڈوب جانے کا زبردست خطرہ موجود ہے۔"

"لیکن محافظوں کا کہنا ہے کہ اس کا رخ اسی جانب تھا۔"

"وہ تاریکی میں نکلے ہیں۔ اس وقت تو جنگلی جانوروں سے بھی خطرہ تھا۔"

اچانک ایک مقامی شخص تند و تیز لہجے میں بولنے لگا اور ہیجانی انداز میں زمین کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ یہاں پتوں سے ڈھکی ہوئی کچی زمین پر گھوڑوں کے سموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ اشوکا نے مقامی شخص کی بات کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا "یہ کہہ رہا ہے کہ سموں کے یہ نشانات پرانے نہیں ہیں اور عین ممکن ہے کہ احمد صاحب کے گھوڑے کے ہوں۔"

ہم نے ان نشانات پر چلنا شروع کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا ہے اور جسم پسینے سے شرابور ہے۔ صفدر کی صورت بار بار نظروں کے سامنے گھوم جاتی تھی۔ ایک دو جگہ ہمیں سانپوں کی اتاری ہوئی کینچلیاں نظر آئیں۔ بھیڑیے اور چیتے کے پنجوں کے نشانات بھی ہمیں اولام نے دکھائے۔ گھنی جھاڑیوں میں ایک جگہ کسی درندے کا مارا ہوا شکار پڑا تھا اور کوّے اس کے پنجر پر بیٹھے تھے' یہاں ہمیں بدبودار جانور لکڑ بگھے کی جھلک بھی نظر آئی۔ یکایک اشوکا نے چیخ کر اشارہ کیا۔ ہمارے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ انگلیاں فوراً ٹریگر پر پہنچ گئیں مگر کسی اجنبی جانور کے بجائے ہمیں گھوڑا نظر آیا۔

یہ نازی گھوڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی یقین ہو گیا کہ یہ گھوڑا صفدر کا ہے۔ گھوڑے کی زین خالی تھی اور لگام زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ تو پھر صفدر کہاں تھا؟ دل کے نہاں خانوں سے ایک چیخ اٹھی۔ دور دور کسی متنفس کا نشان نہیں تھا۔ میں نے صفدر کے فرضی نام سے اسے آوازیں دیں۔ اشوکا نے بھی میرا ساتھ دیا۔ ہم تین اطراف میں پھیل گئے اور صفدر کو تلاش کرنے لگے۔ اچانک میری نظر صفدر پر پڑ گئی۔ میں نے اسے ڈبی دار سرخ قمیص سے پہچانا۔ یہ قمیص کانٹے دار جھاڑیوں کے اندر سے اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ یہ خار مغیلاں ٹائپ کی وہی جھاڑیاں تھیں جن سے ہم نے موگارا کی حفاظتی باڑ بنائی تھی۔ صفدر ان جھاڑیوں میں بے حرکت پڑا تھا اور اس کے اردگرد خون کے دھبے تھے۔ میں تڑپ کر اس کے پاس پہنچا' نجانے کتنے خار میرے جسم میں اترے ہوں گے لیکن مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہوا "صفدر۔ صفدر۔" میں نے اس کا سر گود میں لے کر اسے جھنجوڑ دیا۔

مجھے احساس تھا کہ میں اولام وغیرہ کی موجودگی میں صفدر کو اصل نام سے پکار گیا ہوں مگر غم کی شدت میں ایسی احتیاطیں کب یاد رہتی ہیں۔

صفدر بے ہوش تو نہیں تھا مگر اسے ہوش میں بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کی گہری سرخ آنکھیں نیم وا تھیں اور سانس بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کے بازو اور پنڈلیاں پھٹے لباس سے جھانک رہے تھے اور دانتوں سے کاٹے جانے کے زخم نظر آ رہے تھے۔ اولام نے پانی کی چھاگل میری طرف اچھال دی۔

میں نے صفدر کو بمشکل ایک گھونٹ پانی پلایا۔ وہ نیم بے ہوشی میں کراہ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بڑی مشکل سے کھولی تھیں اور مجھے پہچان لیا تھا "میں۔ ٹھیک۔۔۔۔ ہوں۔" اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے ابھری۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔

ایک ٹارچ اور رائفل اس کے پاس ہی پڑی تھی پھر فوراً ہی مجھے گولیوں کے چند خول بھی نظر آ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ صفدر نے خود کو کسی موذی جانور سے بچانے کے لیے فائرنگ کی ہے۔ اشوکا میری تقلید کرتے ہوئے خاردار جھاڑی میں گھسنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں تو کانٹوں کی وجہ سے زخمی ہو چکا تھا اب اسے بھی زخمی کر لینا ٹھیک نہیں تھا۔ میں خود ہی کوشش کر کے صفدر کو کانٹوں کے حصار سے باہر لے آیا۔ چھاؤں میں ایک چٹائی بچھا کر صفدر کو اس پر لٹا دیا گیا۔ زخم گہرے نہیں تھے لیکن خون مسلسل رستا رہا تھا اور اب بھی رس رہا تھا۔ میں اسے ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ صفدر کی جیب میں ویرا کی چھوڑی ہوئی پونی دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اسی دوران میں اولام نے مجھے اشارے سے پاس بلایا اور کچی زمین پر کئی جگہ پنجوں کے نشانات دکھائے۔ یہ واضح طور پر دو جانوروں کے نشانات تھے۔

اولام نے اشوکا کے ذریعے بتایا "یہ نر اور مادہ بھیڑیے کے نشانات ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اسی جوڑے نے احمد صاحب پر حملہ کیا ہے۔"

پھر اولام ہمیں جھاڑیوں کی دوسری طرف لے گیا۔ یہاں دو تین جگہ خون کے دھبے تھے اور موٹی افریقی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اولام نے بتایا "یہ نر بھیڑیے کا خون ہے۔ نشانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ احمد صاحب کی فائرنگ سے زخمی ہوا اور اپنی مادہ سمیت بھاگ نکلا۔ یہ درندہ اکثر غول کی صورت میں حرکت کرتا ہے تاہم کبھی کبھی "نر مادہ" اکیلے بھی چلتے ہیں۔"

یہاں پیش آنے والا واقعہ یقیناً سنگین تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی صفدر کی گرفت اپنی رائفل پر تھی۔ جو کچھ سامنے آیا تھا اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ صفدر ویرا کی جدائی سے نڈھال ہو کر اسے تلاش کرنے کے لیے نکل آیا تھا۔ وہ یہاں مارا مارا پھر رہا تھا کہ بھیڑیوں کے نرغے میں آ گیا۔ اس نے گھنی خاردار جھاڑیوں کے جھنڈ میں کود کر اور مسلسل فائر کر کے اپنی جان بچائی تھی۔ اگر ہم کچھ دیر مزید یہاں نہ پہنچتے تو شاید وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو جاتا اور اگر اس کا گھوڑا بھی کسی طرف نکل جاتا تو پھر صفدر کا ملنا محال تھا۔

میرے جسم پر کانٹوں سے خراشیں ہی خراشیں آئی تھیں اور جلن کے ساتھ خون رس رہا تھا مگر صفدر کی خراشیں اور اس کے جسم میں ٹوٹے ہوئے کانٹے دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔ صفدر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے گھوڑے پر بٹھا کر واپس لے جایا جاتا۔ اولام نے اسی وقت ایک گھڑ سوار کو بستی کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہ چارپائی کے علاوہ چند افراد بھی ساتھ لے آئے۔ ہم نے تقریباً ایک گھنٹا انتظار کی سولی پر ٹنگ کر گزارا۔ اس دوران میں ایک اور اہم واقعہ بھی رونما ہوا۔ چارپائی پہنچنے سے تقریباً آدھ گھنٹا پہلے اچانک ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ بھیانک آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں۔ گو یہ معمولی آوازیں تھیں مگر میں ان سے آشنا تھا لہٰذا سراپا کانپ گیا۔ یہ آوازیں آج سے چند دن پہلے میں نے ڈاکٹر رائٹ اور نرس ریٹا کی لاشوں کے قریب سنی تھیں۔ یہ جنگلی کتوں کی آوازیں تھیں۔ غول کی شکل میں چیختے چنگھاڑتے کتوں کی آوازیں۔

اولام بڑبڑایا اور اس کے سیاہ چہرے کی سیاہی کچھ اور گہری ہو گئی۔ اشوکا نے بتایا "محترم اولام کا خیال ہے کہ یہ کتے ہماری طرف آ رہے ہیں۔ ان کا ایک گروہ آج کل ترم خوری پر اترا ہوا ہے۔ اپنے شکار کے خون کی بو یہ بہت دور سے سونگھ لیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ صفدر کے زخموں کی خوشبو؟"

اشوکا نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے لپک کر گھوڑے کے تھیلے میں سے اپنی رائفل کے تین بھرے ہوئے میگزین نکال لیے۔ اولام نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اشوکا کے پاس میرے والا ۳۸ بور ریوالور موجود تھا۔ اولام کے ساتھ آنے والے دونوں شکاری گھڑ سواروں نے اپنے گھوڑے درختوں سے باندھے اور بندر کی سی پھرتی سے درختوں پر چڑھ گئے۔ ان دونوں تنگ دھڑنگ افراد کے پاس تیر کمان موجود تھے۔ اولام نے اشوکا کو بھی ایک درخت پر چڑھا دیا۔ میں نے اور اولام نے صفدر کے دائیں بائیں دو درختوں کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ اولام کی پیش گوئی کے عین مطابق کتے تیزی سے ہمارے قریب آ رہے تھے۔ یہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن میں سنسناہٹ تو دوڑ رہی ہے مگر خوف کا شائبہ تک نہیں۔ اس کے برعکس ایک آگ سی جسم میں بھرتی تھی یا یوں کہہ لیں "ایک خون سا سر پہ سوار تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے منحوس صورت جانوروں کو اپنے روبرو پایا۔ ان کے جسم پر دھبے تھے اور نکیلے دانت چمک رہے تھے" وہ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں درختوں سے نمودار ہوئے اور ان کی کریہہ آوازوں سے جنگل گونجنے لگا پھر ان میں سے دو تین قد آور کتے چیختے ہوئے اور تھوڑا تھوڑا ٹھٹکتے ہوئے ہمارے قریب چلے آئے۔ وہ نشانے پر تھے' میں نے ٹریگر دبا دیا۔ سیون ایم ایم سے گولیوں کی بوچھاڑ نکلی' دو کتے چھلنی ہو کر جھاڑیوں میں گرے۔ ایک رخ پھیر کر واپس بھاگا۔ اسی دوران میں بائیں طرف سے بھی ایک ٹولی نمودار ہو گئی۔ درختوں پر چڑھے دونوں لارسی شکاریوں نے ان پر تیر چلائے اور ساتھ ہی اولام نے بھی اپنی آٹومیٹک رائفل کا دہانہ کھول دیا۔ کم از کم تین کتے تڑپ کر وہیں گر گئے جبکہ باقی جھاڑیوں کے عقب میں چلے گئے۔

اب ایک عجیب تماشا شروع ہوا۔ کتے ہماری تین اطراف میں موجود تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شکار اتنا آسان نہیں۔ اب وہ ڈر بھی رہے تھے مگر پیچھے بھی نہیں ہٹ رہے تھے۔ اپنی کریہہ آوازوں میں چلاتے ہوئے وہ ہمارے قریب آتے لیکن جب فائر ہوتا تو الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگتے۔ اسی دوران میں اچانک آٹھ دس کتوں کی ایک دلیر ٹولی اس درخت کے بالکل قریب پہنچ گئی جس پر لارسی شکاری چڑھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت رائفل کا میگزین بدل رہا تھا۔

اولام اپنا رخ نہیں بدل سکتا تھا کیونکہ اسے اپنے سامنے والی "وحست" کو سنبھالنا تھا۔ صفدر کو اب خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ وہ کھلی جگہ پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اسی دوران میں درخت پر سے ایک لارسی کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے کتوں کے قریب گرا۔ یہ ایک دل خراش منظر تھا۔ کوئی نصف درجن کتے لارسی پر پل پڑے۔ اس بے چارے کا نیزہ ہوا میں ہی اٹھا رہ گیا۔ میری کھوپڑی میں چنگاریاں سی چھوٹ گئی تھیں۔ میں نے رائفل کا رخ کتوں کی طرف کیا اور درخت کی اوٹ سے نکل کر ٹریگر دباتا چلا گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لارسی تو پہلے ہی مر رہا تھا۔ میری اندھا دھند فائرنگ نے کئی کتے وہیں ڈھیر کر دیے۔ باقی چیختے ہوئے مختلف اطراف میں بھاگے۔ خوش قسمتی سے میری کوئی گولی لارسی کو نہیں لگی تھی۔ لیکن اس کا کیا فائدہ تھا۔ اس کی آنتیں زمین پر بکھری ہوئی تھیں اور چند سیکنڈ کے اندر جسم کے چیتھڑے لٹکنے لگے تھے۔

ہمارے اس ناقابل تلافی نقصان کے بعد کتوں نے اچانک پسپائی اختیار کی اور وحشی تاتاریوں کی طرح چیختے چلاتے شور مچاتے درختوں میں اوجھل ہونے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کا شور دور افتادہ آوازوں میں بدل گیا اور پھر معدوم ہو گیا۔

بدقسمت لارسی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دم توڑ گیا۔ اس کی لاش کو قریب سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اگر کتوں کا غول اس پر حملہ آور نہ ہوتا تو شاید وہ پھر بھی بچ نہ پاتا۔ وہ بلندی سے پشت کے بل گرا تھا اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس واقعے کے دوران میں صفدر کی نیم بے ہوشی میں وقفہ آیا تھا۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے کتوں سے لڑائی کے مناظر دیکھتا رہا تھا۔

اس واقعے کے پندرہ بیس منٹ بعد چارپائی اور چارپائی اٹھانے والے لارسی موقع پر پہنچ گئے۔ لارسی کی خونچکاں لاش کو دو چادروں میں اچھی طرح لپیٹ کر ایک گھوڑے کی پشت پر ڈال دیا گیا۔ صفدر پر شدید نقاہت کے باعث ایک بار پھر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ چارپائی چار افراد نے اٹھائی اور ہم تیزی سے موگا ساکی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ اشوکا خوف زدہ لہجے میں بولا "اگر اب کوئی مصیبت آگئی تو کیا ہوگا' ہمارے پاس تو زیادہ گولیاں بھی نہیں بچیں۔"

"یہ خطرہ تو اب مول لینا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ لوگ تیز کیوں نہیں چل رہے؟"

"تیزی میں کچھ اور طرح کا خطرہ پوشیدہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ خطرہ جانوروں کے خطرے سے بڑھ کر ہے۔"

"شاید آپ کا مطلب دلدلوں سے ہے؟"

"بالکل۔۔۔ یہ لوگ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں پھر بھی ہر قدم پھونک کر اٹھا رہے ہیں۔"

یہاں حبس بہت زیادہ تھا' پسینہ دھاروں کی صورت ہمارے جسموں سے نکل رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس پر خطر جنگل سے نکل جائیں۔ راستے میں دو تین جگہ لارسی شکاریوں نے سانپوں کو کلہاڑیوں اور نیزوں وغیرہ سے ہلاک کیا۔ خدا خدا کر کے ہم نباتات کے اس جال سے نکلے اور بستی میں پہنچے۔ صفدر کو سیدھا شفا خانے پہنچایا گیا۔ وہ کے بعد شفا خانہ بھی یتیم سا ہو گیا تھا۔ مریض مایوس نظروں سے آنے جانے والوں کو تک رہے تھے۔ میں نے موبائل کلینک میں گھس کر ضروری ادویات حاصل کیں اور صفدر کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اس کے جسم میں کئی کانٹے ٹوٹے ہوئے تھے اور بخار بھی تھا۔ میں نے اشوکا کے ساتھ مل کر اس کے کانٹے وغیرہ نکالے۔ زخموں کو اچھی طرح دھو کر بینڈیج کی اور اینٹی بایوٹک انجکشن دیے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا میں نے کر دیا۔

ہماری غیر موجودگی میں اس ٹرانس میٹر پر مسلسل سگنل موصول ہوتا رہا تھا جو ٹرسٹ کی طرف سے مجھے رابطے کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ میں سردار رافے کو بتا گیا تھا کہ ٹرانس میٹر پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رابطے کے لیے یہ سوئر یقیناً کنگ براؤن کے پیٹ میں ہی اٹھ رہے تھے۔ ہم سے بہتر اس کی تکلیف بھلا اور کون سمجھ سکتا تھا۔ ہزاروں والدین سے ان کی اولادیں چھیننے والا کنگ آج اپنی اولاد سے دو دن دور رہ کر بے قرار ہو گیا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو ایک ہزار سال تک بھی اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیتا۔

لارو ناب' استی کی نگرانی میری توقع سے بھی بڑھ کر اچھے طریقے سے کر رہا تھا۔ جس جھونپڑے میں استی کو رکھا گیا تھا اس کے گرد پچاس گز تک چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ لارو ناب نے اپنے ساتھیوں میں سے دو بے حد چوکس اور قابل اعتماد نگران بھی ڈھونڈ نکالے تھے جو نگرانی میں لارو ناب کا ساتھ دے رہے تھے۔ لارو ناب سے معلوم ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے استی نے ایک نگران کے منہ پر طمانچہ دے مارا تھا جس کے جواب میں اس کی تھوڑی سی پٹائی کی گئی

ہے۔ اس پٹائی سے استی کی طبیعت ذرا سی بحال ہوئی تھی اور وہ جو اس سے پہلے کچھ بھی کھانے سے انکار کر رہا تھا اب کھانا کھانے لگا تھا۔ استی نے مجھے بے حد زہرناک نظروں سے گھورا لیکن کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

سہ پہر تک صفدر کا بخار بہت تیز ہو گیا۔ اس کا سارا جسم آگ کی طرح پھنک رہا تھا۔ اشوکا اس کی پیشانی پر مسلسل ٹھنڈی پٹیاں رکھوا رہا تھا لیکن ٹمپریچر کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی وقت صفدر غنودگی کے عالم میں ہی بڑبڑانے لگتا تھا۔ وہ ویرا کو یاد کر رہا تھا "ویرا! میں تمہیں اپنا شہر دکھاؤں گا۔۔۔ لاہور۔۔۔ وہ ہزاروں میں ایک ہے۔ تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ وہاں تمہاری ایک اور خواہش بھی پوری ہوگی۔ میں تمہیں اپنی والدہ سے ملواؤں گا۔۔۔" پھر اس نے کراہ کر سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور اذیت بھری آواز میں بڑبڑایا "مجھے پانی پلاؤ ویرا۔۔۔ مجھے بڑی پیاس لگی ہے۔ میرا سانس رک رہا ہے۔ نہیں' مجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤ۔۔۔" پھر وہ کوئی اور بات کرنے لگا۔ اس کی آواز مدھم ہو گئی تھی' سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہوا میں ہاتھ لہرانے لگا جیسے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی بڑبڑاہٹ بے ربط تھی۔

اشوکا نے پرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "احمد صاحب کا ٹمپریچر نیچے آنا چاہیے ورنہ یہ خطرناک ہوگا۔" پھر اس کی نظر میرے بازو پر پڑی۔ ابھی کئی کانٹے میرے جسم میں بھی ٹوٹے ہوئے تھے اور خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ اس نے کہا "آپ تھوڑا سا خیال اپنا بھی کر لیں۔ سنا ہے کہ ان کانٹوں کی چبھن سے بھی بخار ہو جاتا ہے۔ بھگوان نہ کرے آپ بھی بیمار ہو گئے تو احمد صاحب کو کون سنبھالے گا۔"

کچھ اسی قسم کی بات اولام نے بھی مجھ سے کہی۔ میں ان کے مجبور کرنے پر کشتی شفا خانے میں چلا گیا اور اپنے آپ کو خود ہی کچھ ٹریٹ منٹ دی۔ اتنے میں سردار رافے بھی وہاں آگیا تھا۔ وہ بڑے غور سے میرے جسم میں چبھے ہوئے کانٹوں کو اور خراشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں جو کچھ کہا اس سے معلوم ہوا کہ یہ کانٹے جسم میں چبھتے ہی سوزش اور شدید سرخی پیدا کر دیتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر میرے جسم پر ایسی کوئی علامت ابھی تک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ (رافے کی اس بات پر میرا دھیان فوراً کچھ پرانے واقعات کی طرف چلا گیا۔ اس سے پہلے بھی دو دفعہ کچھ زہریلی اشیا میرے جسم پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہی تھیں اور ایسا اس واقعے کے بعد سے تھا جب سائیں نے ٹرسٹ میں ایک پراسرار سوئی میرے سینے میں چبھوئی تھی)

اشوکا کو میں نے مستقل طور پر صفدر کے پاس رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ عام لوگوں کو صفدر کے پاس نہ آنے دیں۔ میں واپس صفدر کے پاس پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ صفدر کی حالت جوں کی توں تھی۔ دوا کی وجہ سے بخار میں عارضی افاقہ ہونے کے بعد ٹمپریچر پھر بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ صفدر کا کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ غالباً اسے خون کی بھی ضرورت تھی لیکن کسی ڈاکٹر کے بغیر ہم انتقال خون کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اشوکا نے بتایا کہ بے ہوشی کے عالم میں صفدر کئی بار بڑبڑایا ہے اور اس نے ہر بار ویرا کا نام لیا ہے۔ یہ سب کچھ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ صفدر کی بڑبڑاہٹ کہیں رافے اور اولام وغیرہ کے کانوں میں نہ پہنچ جائے۔ وہ اگر صفدر کی بڑبڑاہٹ میں بار بار ویرا کا نام سن لیتے تو ان کے ذہن میں بے شمار سوالات پیدا ہو سکتے تھے' یہی وجہ تھی کہ میں نے اشوکا کو ہر دم صفدر کے قریب رہنے کی ہدایت کی تھی۔

ابھی تک ویرا کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ سردار رافے کے دو ہوشیار کارندے ٹرسٹ کے گارڈز سے بچتے بچاتے قریباً ساٹھ میل دور گھنے جنگل میں پہنچے تھے اور اس قبیلے کی بستی میں گئے تھے جہاں کی دو عورتیں ویرا کے ساتھ ہی بستی سے غائب ہوئی تھیں۔ وہ دونوں کارندے اپنے ساتھ سردار رافے کا تحریری پیغام بھی قبیلے کے سربراہ کے لیے لے کر گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس پیغام میں قبیلے کے سربراہ سے تعاون کی درخواست کی گئی تھی۔ سردار رافے کے ان دونوں کارندوں کا مشن ناکام رہا تھا اور انہیں ویرا یا دونوں روپوش عورتوں کا کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ امکانات نہ ہونے کے باوجود بستی کے اندر اور اردگرد ویرا کی تلاش جاری تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی نے اتنا بڑا قدم اتنی سنگدلی سے کس طرح اٹھا لیا ہے۔ یہ بات ذہن میں سماتی نہیں تھی کہ وہ جو اتنی حساس اور گداز دل تھی' صفدر کی زندگی سے کھلونے کی طرح کھیل کر چلی گئی تھی۔ کس طرح کیا؟ کس طرح کیا اس نے اتنا بڑا فیصلہ؟ صفدر کی کون سی ایسی غلطی تھی جس کی اتنی ظالمانہ سزا دے دی اس نے؟ اس معاملے میں شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس امر کا گواہ تھا کہ یہ قاتلانہ فیصلہ اس نے خود کیا ہے' اور یہ بہت سوچا سمجھا ہوا فیصلہ ہے۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ادلام کھڑا تھا۔ اس نے اشوکا کی وساطت سے بتایا کہ میرے لیے ایک خوش آئند خبر ہے۔

"کیسی خبر؟ کیا دیرا کا کوئی پتا چلا ہے؟"

"نہیں جناب! پتا تو نہیں چلا لیکن پتا چلانے کی ایک بہت اہم کوشش ضرور کی جا رہی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ادلام بولا "آپ نے عامل لڑکی موناپ کو سزا سے بچا کر اس پر احسان کیا تھا۔ اب وہ بھی آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ موناپ کی قیافہ شناسی اور مستقبل بینی کو دور دور تک مانا جاتا ہے۔ آج وہ بوبا کے سامنے خود کو ایک مشکل عمل سے گزار رہی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس عمل سے گزرنے کے بعد وہ محترمہ دیرا کے بارے میں ٹھیک ٹھیک قیافہ لگا سکے گی۔"

ادلام مجھے اپنے ساتھ بوبا کے سامنے لے آیا۔ یہاں ایک اور تکلیف دہ منظر میرے سامنے تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور بوبا کے سامنے دائرے کی شکل میں بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ اس روشن دائرے کو ایک ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہجوم نے راستہ دیا۔ ہم روشن دائرے میں پہنچے تو پتھر کی ایک بڑی سل پر ایک نیم برہنہ بوب لڑکی نظر آئی۔ لڑکی کی عمر بمشکل چودہ پندرہ برس رہی ہوگی۔ اس کے گلے پر چھری پھیر دی گئی تھی اور خون کی ایک موٹی دھار لڑکی کی شہ رگ سے نکل کر تانبے کے گول برتن میں جمع ہو رہی تھی۔ لڑکی کو تین جنگجو عورتوں نے دبوچ رکھا تھا تاکہ اس کا جسم تڑپنے پھڑکنے سے محفوظ رہے اور خون کی دھار سیدھی برتن میں ہی جاتی رہے۔ یہ منظر دیکھ کر دل متلانے لگا۔ لڑکی کا جسم دو تین بار زور سے پھڑکا، اس کے گلے سے "خر خر" کی آوازیں نکلیں اور پھر چند جھرجھریاں لے کر وہ ساکت ہو گئی۔ اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے گئے اور دو عورتیں اسے آسانی سے اٹھا کر دائرے سے باہر لے گئیں۔

دراز قد موناپ مختصر لباس میں تانبے کے برتن کے پاس ہی موجود تھی۔ برتن کے پاس ہی ایک قبر نما گڑھا کھدا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بوب لڑکی کی لاش کو اس قبر میں دفن کیا جائے گا لیکن لاش تو یہاں سے لے جائی جا چکی تھی۔ موناپ نے اپنے گلے میں موجود انسانی دانتوں کے ہار کو چوما اور پھر تانبے کے برتن میں موجود خون ایک ڈونگے کے ذریعے اپنے جسم پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ وہ کسی کراہت کے بغیر اس تازہ انسانی خون سے نہا رہی تھی۔ اس کے بال چہرہ اور مختصر لباس سب خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ خون اس کے جسم کو تر کرنے کے بعد قبر کی نرم مٹی پر گر رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا۔ وہ نہا چکی تو اس نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا اور قبر میں گھس کر لیٹ گئی۔ چند لاری نوجوانوں نے اس کے اوپر لکڑی کے تختے رکھے اور پھر مٹی ڈالنا شروع کر دی۔ دو چار منٹ کے اندر موناپ قبر میں دفن تھی۔

یہ سب کچھ نہایت حیرت ناک تھا۔ اس شدید گرمی اور حبس میں جھونپڑے کے اندر بھی دم گھٹتا تھا کہاں یہ نیم پاگل لڑکی چند کیوبک فٹ کے خلا میں زندہ دفن ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں یقین تھا کہ وہ پانچ دس منٹ سے زیادہ زندہ رہ سکے گی۔ اس کے دفن ہوتے ہی اس کے چند نوجوان پیروکاروں نے قبر کے گرد مذہبی رقص شروع کر دیا تھا۔ اس رقص کو تال فراہم کرنے کے لیے ڈھول بجائے جا رہے تھے۔ رقص کرنے والوں میں دو تین لڑکیاں بھی تھیں۔ رقاصوں کے چہرے خوفناک حد تک سنجیدہ تھے اور ان کے سیاہ جسم پسینے میں نہاتے چلے جا رہے تھے۔ دس منٹ گزرے، پندرہ منٹ اور پھر بیس منٹ۔ مجھے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ اب موناپ زندہ برآمد نہیں ہو سکے گی۔ میں نے اس سلسلے میں احتجاج کرنا چاہا تو ادلام نے بڑی نرمی سے لیکن فیصلہ کن انداز میں مجھے منع کر دیا۔ اس نے اشاروں کی زبان میں مجھے سمجھایا کہ موناپ بہت پہنچی ہوئی لڑکی ہے، وہ اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں۔ اس کے علاوہ وہ اس سے پہلے بھی کئی خطرناک کام کر چکی ہے۔

ادلام نے سچ ہی کہا تھا۔ حیرت ناک طور پر تقریباً ایک گھنٹے بعد موناپ کو زمین میں سے زندہ سلامت نکال لیا گیا۔ وہ پسینے میں تقریباً نہائی ہوئی تھی۔ سر کے بال خون اور پسینے میں لتھڑ کر اس کے چہرے سے چپکے ہوئے تھے اور ان بالوں کے اندر سے اس کی سرخ آنکھیں خوفناک لگ رہی تھیں۔ وہ عجیب جذب کی سی کیفیت میں تھی۔ اسے اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا گیا اور بڑے بڑے دستی پنکھوں کی مدد سے اسے ہوا دی جانے لگی۔ وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی اور ایک ہی گھنٹے میں ہفتوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اشارے سے چھوٹے سردار ادلام کو اپنے پاس بلایا اور اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔ ادلام اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ موناپ کی پوری بات سننے کے بعد ادلام نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور واپس شفا خانے میں پہنچ گیا۔

شفا خانے میں اشوکا بدستور صفدر کے پاس موجود تھا

اس نے بتایا کہ صفدر کو کئی بار قے ہوئی ہے اور اس کا بخار بھی بڑھ گیا ہے۔ چار پانچ جگہ ٹوٹے ہوئے کانٹے اس کے جسم میں موجود تھے، وہاں سے اس کی جلد سرخ ہو گئی تھی اور ہیٹ کے مانند تپ رہی تھی۔ ان کانٹوں کو نکالنا ماہر سرجن ہی کا کام تھا۔ میرا دھیان غزالہ کی طرف چلا گیا۔ کاش وہ یہاں ہوتی اور صفدر پر اپنی پُر خلوص توجہ اور مہارت کا سایہ کر دیتی۔

موناپ کی بات ادلام نے اشوکا تک پہنچائی اور اشوکا نے ترجمہ کر کے مجھ تک پہنچا دی۔ موناپ نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ اس نے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا تھا کہ دیرا اس بستی کے اردگرد اور دور دور تک کہیں موجود نہیں۔ تاہم اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے اور یہ معلومات ایک مرد درویش سے حاصل ہو سکتی تھیں اور یہ مرد درویش کوئی اجنبی نہیں، وہی صحرائی سائیں عالی ہے جس کے پیچھے ہوئے ہم یہاں آئے ہیں۔

مجھے یہ سب کچھ موناپ کی خیال آرائی لگتا تھا۔ شاید ایک وجدانی کیفیت میں اس کے ذہن کے اندر یہ قیافہ آیا تھا۔ میں نے ادلام سے پوچھا "اس حوالے سے تمہاری رائے کیا ہے؟"

وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے سر پر پرندوں کے پروں کا تاج سہلاتا رہا پھر پُر سوچ لہجے میں بولا "جہاں تک میرا علم ہے، اس لڑکی کی قیاس آرائیاں اکثر سچ ثابت ہوتی ہیں۔ خاص طور سے جب وہ کسی مشکل عمل کے بعد قیافہ لگاتی ہے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے کسی نادیدہ کھڑکی سے مستقبل میں جھانک لیا ہے۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس کی رائے کو ضرور اہمیت دیں۔"

○☆○

کہتے ہیں کہ مشکل یا مشکلات شدید ہوں تو انسان توہم پرست بن جاتا ہے۔ میں نے سوچا شاید میں بھی اسی کیفیت کا شکار ہو رہا ہوں۔ سردار رانفے اور ادلام بھی بار بار مجبور کر رہے تھے کہ میں سائیں عالی سے رابطہ کروں۔ میں نے واکی ٹاکی پر سائیں سے CONTECT کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح گدھے کے سینگوں کے مانند غائب تھا۔ درجنوں بار سگنل بھیجے مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پتا نہیں کہ اس نے واکی ٹاکی کو کسی گڑھے میں دبا دیا تھا۔

رابطے میں مسلسل ناکام ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خود سائیں کی طرف جانا چاہیے۔ بے شک یہ ایک رسکی کام تھا مگر رسک تو اب یہاں ہر طرف موجود تھا۔ ایسا ہی ایک رسک میرے پیارے دوست کی صورت میں میرے سامنے بستر پر بھی موجود تھا۔ موناپ کی قیافہ آرائی سے پہلے بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ سائیں سے ملاقات ہو لیکن وہ تو جب اوجھل ہوتا تھا، زمین کی ساتویں تہ میں سما جاتا تھا۔

رات گیارہ بجے تک میں صفدر کی طبیعت سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا، پھر مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اشوکا سے کہا کہ وہ ایک گھوڑے کا انتظام کرے۔

سائیں عالی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے لاروناپ اور اشوکا کو ماسٹر اسٹی کے بارے میں ضروری ہدایات دے دیں۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، میرے دل میں کنگ براؤن اور اس کے خانوادے کے لیے رحم کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ میں ایک بچے کے سلسلے میں کچھ سفاک ہو گیا تھا تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ میں نے لاروناپ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسٹی کے سلسلے میں بے حد چوکس رہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ زینی اپنے ولی عہد کے سلسلے میں ہمت ہار کر بیٹھ گئے ہوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایک طرف تو ہم سے بات چیت کر رہے ہیں، دوسری طرف کسی کارروائی کی پلاننگ بھی کر رہے ہوں گے۔ بے شک اسٹی کے حوالے سے کنگ براؤن میری توقع سے کہیں زیادہ محتاط تھا پھر بھی اس کی فطرت ایسی نہیں تھی کہ وہ خود کو بالکل ہی میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔

میں نے لاروناپ سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اسٹی کو چھڑانے کے لیے کوئی کارروائی ہو تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔ لاروناپ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میں رات بارہ بجے کے لگ بھگ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار ہو گا ساسے نکل گیا۔

کئی گھنٹے کا نہایت کٹھن اور پُر خطر سفر کرنے کے بعد میں بالآخر ان کھنڈرات کے نواح میں پہنچا جہاں سائیں عالی نے اپنی انوکھی دنیا بسا رکھی تھی۔ یہ بالکل جنگل میں منگل والی بات تھی۔ لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی جدید بستی کے خدوخال نمایاں ہو رہے تھے۔ میں بستی سے قریباً ایک میل دور تھا۔ اس فاصلے کے باوجود بستی کی برقی روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور "جنریٹرز" کی مدھم آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ میں نے یہاں اپنا سیاہی مائل گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا اور پاپیادہ آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ سیون ایم ایم رائفل کے علاوہ ایک ریوالور اور شکاری چاقو بھی میرے پاس موجود تھا۔

میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں نرسٹ کے سفاک گارڈز سے مڈھ بھیڑ ہونے کا امکان نہ ہو۔ میں بالآخر بستی کے قریب پہنچ گیا۔ سائیں عالی کے تیز رفتار کاریگروں نے درجنوں کھنڈرات کو مرمت کرکے انہیں عمارتوں کی شکل دے دی تھی۔ جگہ جگہ درخت اور پودے بھی نظر آرہے تھے۔ درختوں کو یقیناً تیار حالت میں ہی یہاں لاکر پلانٹ کیا گیا تھا۔ ایک سڑک بھی تعمیر کی جارہی تھی جو بل کھاتی ہوئی کھنڈرات کے اندر تک جاتی تھی۔ کئی گھروں کے سامنے جیپیں اور کاریں وغیرہ بھی کھڑی تھیں۔ ویرانے میں یہ ایک جادو نگری کا منظر تھا۔ اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے نرسٹ کی تین جیپیں نظر آئیں۔ ان کے قریب ڈرائیور اور نیلی وردیوں والے چار پانچ گارڈز بھی موجود تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ ابھی ابھی ان جیپوں سے اتر کر کہیں گئے ہیں۔

میری حسیات بیدار ہوگئیں اور ریوالور میں نے ہاتھ میں لے لیا۔ یقیناً یہاں کوئی "گڑبڑ" موجود تھی۔ شاید نرسٹ سے کچھ لوگ سائیں عالی کے ساتھ "تبادلہ خیال" کے لیے آئے تھے۔ یوں تو سائیں نے ہم دونوں سے لاتعلق ہونے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں جانتا تھا اور شاید سائیں بھی جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ موگاسا میں سائیں مجھ پر چیخا چلایا تھا اور ڈنڈا لے کر مجھ پر چڑھ دوڑا تھا مگر اس کارروائی سے سائیں کی پوزیشن کا مکمل طور پر صاف ہوجانا بعید از قیاس تھا۔ میں مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا اس کھنڈر تک پہنچا جسے سائیں نے اپنی رہائش کے لیے چنا تھا۔ ایک نرسٹی گارڈ اس کھنڈر کے سامنے بھی موجود تھا۔ میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ نرسٹ سے آنے والے افراد سائیں کے پاس ہی موجود ہیں۔ میں گارڈ کی نگاہ بچا کر سائیں کی رہائش گاہ کے عقب میں پہنچا۔ یہاں ایک موبائل کلینک موجود تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ میں موبائل کلینک کی چھت پر پہنچا اور وہاں سے سائیں کی رہائش گاہ کی چھت پر چلا گیا۔ رہائش گاہ کی چھت پر سے بستی کے دو شاندار سوئمنگ پول اور پلے گراؤنڈ وغیرہ صاف نظر آرہے تھے۔ میں چھت پر اوندھا لیٹ کر آگے کو سرکتا ہوا منڈیر تک پہنچ گیا۔ اس طرف مکمل تاریکی تھی اور ایک درخت کی شاخوں نے منڈیر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ منڈیر سے دو تین فٹ نیچے ایک روشن دان موجود تھا۔ میں نے چھت پر اوندھا لیٹے لیٹے خود کو نیچے کی طرف لٹکایا اور اپنا چہرہ روشن دان تک پہنچا دیا۔

کمرے میں سے آوازیں آرہی تھیں اور ٹیوب لائٹس نے ماحول کو روشن کر رکھا تھا۔ کمرے میں نظر آنے والے منظر نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہوگی۔ کمرے میں نرسٹ کے چار مسلح گارڈز کے علاوہ کنگ براؤن کا اسسٹنٹ راجر اور ذاتی محافظ مارشل آرٹ کا خطرناک ماہر رچی بینو عرف ڈاگ بھی تھا۔ یہ ڈاگ اسی پہلوان نام کا بھائی تھا جو میرے ہاتھوں بحری جہاز ہرکولیس میں ہلاک ہوا تھا۔ ڈاگ نامی اس انسانی غلیظ اور بدبودار غنڈے سے نرسٹ میں بھی میری ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ سائیں عالی بھی کمرے میں موجود تھا اور آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ پاؤنڈوں اور ڈالروں کے ہار اتار کر اس نے قریب ہی فرش پر رکھے تھے۔ راجر بڑے غصے کے عالم میں سائیں سے کہہ رہا تھا "دیکھو سائیں جی۔۔۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں' یہ حد گزرنے والی ہے۔ آپ جان بوجھ کر میری ہر بات کا جواب مذاق میں دے رہے ہیں۔"

"جواب۔۔۔ کیسا جواب!" سائیں نے آنکھیں نچائیں "الو کے۔۔۔ تم نے مجھ سے پوچھا ہی کیا ہے؟"

"میں نے ایک درجن مرتبہ آپ سے کہا ہے' مجھے ان دونوں کتوں کے کوائف چاہئیں جو آپ کے بقول پیسے کے ٹیکے لگانے موگاسا میں گئے تھے اور سردار رانے کے ساتھ مل گئے ہیں۔"

"بچے! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ان کے کوائف حاصل کرکے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" سائیں حسب سابق اطمینان سے بولا "میں تمہیں تمہاری ڈیمانڈ کے مطابق ان کے والدین کا پتا دے دیتا ہوں۔ ان کے بہن بھائیوں' بال بچوں' سب کے بارے میں بتا دیتا ہوں مگر اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ تم کوہ قاف جاسکتے ہو' نہ کسی جن سے ملاقات کرسکتے ہو۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں' وہ دونوں پری زاد ہیں جو انسانی بھیس میں میرے پاس ملازم تھے۔"

راجر نے خطرناک لہجے میں کہا "سائیں جی! میں آخری بار آپ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس عبداللہ نام کے کارندے کا پتا ٹھکانا بتادیں۔ اگر نہیں بتائیں گے تو پھر وہ سب کچھ جو آپ کے اور ہمارے بیچ میں ہے' ختم ہوجائے گا۔"

سائیں نے منہ سے "چچ چچ" کی آواز نکالی "پتا نہیں تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے ہو۔ عبداللہ پر تو پری کا سایہ ہوچکا ہے۔ تم نے دیکھا ہی تھا بستی میں وہ کس طرح دیوانوں

کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ تو اب کسی کے کام کا ہی نہیں رہا ہے۔ نہ کسی کی بے مگا نہ سمجھے گا۔ اس کے کوائف حاصل کرنا تو بالکل ہی بیکار ہے۔ اگر تم نے گڑبڑ کرو گے تو وہ بچے کو ہلاک کردے گا۔ میں تو کہتا ہوں۔۔۔"

"میں کہتا ہوں خاموش ہوجاؤ۔" راجر حلق کے بل دہاڑا "تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔" وہ نہ صرف آپ سے تم پر اتر آیا تھا بلکہ اس کا لب ولہجہ بھی ایک دم بے حد جارحانہ ہوگیا تھا۔

"اصلیت پر آگئے ہو؟" سائیں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں آگیا ہوں اصلیت پر۔" راجر اور بھی بپھر گیا۔ اس نے جیسے غصے سے دیوانہ ہوکر اپنا پستل نکالا اور سائیں کی طرف سیدھا کردیا۔

کمرے میں موجود سائیں کے دو ملازم اپنی جگہ سے حرکت میں آئے تو نرسٹ کے خوں خوار گارڈز نے اپنی رائفلیں ان کی طرف سیدھی کردیں "خبردار کوئی جنبش نہ کرے۔" ایک گارڈ نے کڑک کر انگریزی میں کہا۔ کمرے کا ماحول ایک دم دھماکا خیز ہوگیا تھا۔

صورت حال بالکل واضح تھی۔ کنگ کے ہرکارے میرے اور حمنہ کے متعلق معلومات جمع کر رہے تھے تاکہ ہم سے نمٹنے کا راستہ ڈھونڈا جاسکے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ وہ ہمارے بارے میں سبھی کچھ جانتے ہیں' بس ہمارے نئے چہروں سے واقف نہیں۔ کمرے میں ماحول کشیدہ تر ہوتا جارہا تھا' سائیں عالی نے کہا "جو کچھ تم کر رہے ہو' کیا اس کے لیے کنگ براؤن سے پوچھ لیا ہے؟"

"میں پورے اختیار کے ساتھ یہاں موجود ہوں اور اگر آپ تعاون نہیں کرو گے تو میں آخری حد تک چلا جاؤں گا۔"

"بچے! اس کا نتیجہ شاید تم جانتے نہیں ہو؟" سائیں نے حیرت انگیز طور پر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اب بات چل ہی نکلی ہے تو پھر نتیجے کی کوئی پروا نہیں۔" راجر نے بدستور آتشیں لہجے میں کہا۔ اس کے پستل کا رخ بھی سائیں کی جانب تھا۔

"شاید تمہیں اپنے الفاظ پر پچھتانا پڑے۔" سائیں بولا۔

"جب ایسا موقع آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ فی الحال تم اپنے دونوں کارندوں کے بارے میں ہمارے سوالات کا جواب دو۔ ایک بات۔۔۔ ہاں ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں سائیں عالی! ہم تمہیں اس سارے معاملے سے بری الذمہ نہیں سمجھتے۔ اگر اس بچے کا بال بھی بیکا ہوا تو وہ حشر برپا ہوگا کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ لگتا ہے کہ راستے میں لگنے والے جھٹکوں کی وجہ سے تمہارے دماغ کا ایک آدھ پیچ جیب میں ہی گر گیا ہے۔" سائیں ایک بار پھر جلے بھنے موڈ میں آگیا۔

"سائیں! میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہاری مزید عزت نہیں کرسکوں گا۔"

"عزت کرانے کے لیے میں تمہاری مرضی کا محتاج نہیں بچے۔ یہاں ایسے جن موجود ہیں جو تمہیں میری عزت پر مجبور کرسکتے ہیں۔"

"ان سب جنوں کے نام پتے ہمارے پاس ہیں اور ان سے نمٹنے کا بڑا اچھا سا انتظام بھی ہم نے کرلیا ہے۔" راجر نے زہرخند سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ایک گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور چند سیکنڈ بعد ایک بڑا سفری بیگ لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ پیراشوٹ کے اس بیگ میں کوئی بھاری بھرکم شے تھی۔ کمرے کے درمیان میں رکھ کر گارڈ نے بیگ کی زپ کھولی۔ اندر سے جو کچھ برآمد ہوا وہ تعجب خیز تھا۔ یہ ایک حسین سفید فام لڑکی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ان لڑکیوں میں سے ایک تھی جن کی شادیاں یہاں سائیں عالی نے غریب سیاہ فام مردوں سے کروائی تھیں۔ سوینی نامی اس لڑکی کے بارے میں نرسٹ کے ایک انچارج گارڈ نے ریمارکس دیے تھے کہ اس کی صورت ایک مشہور امریکی ماڈل گرل سے ملتی ہے۔ سوینی نامی یہ لڑکی جب پیراشوٹ کے بیگ سے باہر نکلی تو اس کی حالت قابل رحم نظر آئی۔ وہ پیرا کی کے لباس میں تھی اور اس کے بال بھی نیم مرطوب تھے۔ یقیناً وہ سوئمنگ پول سے گارڈز کے ہتھے چڑھی تھی۔ اس کے رخساروں' ہونٹوں اور بازوؤں پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے منہ میں ایک پرانے کپڑے کا گولا یوں ٹھونسا گیا تھا کہ منہ پورے کا پورا کھل گیا تھا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی اور اپنی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کو مڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب سفری بیگ لاکر کمرے میں رکھا گیا تھا تو اس کے اندر بالکل حرکت نہیں تھی۔ ورنہ ایک زندہ جسم کی موجودگی میں کچھ ہلچل تو بیگ میں نظر آتی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' سوینی نامی اس لڑکی کو بری طرح ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ بیگ کے اندر دم بخود پڑی رہے ورنہ چھلنی کردی جائے گی۔ اپنے خوب صورت بدن کو چھلنی ہونے سے بچانے کے لیے وہ سکتے کے عالم میں

پڑی رہی تھی اور اب بھی سکتے کی حالت میں کھڑی تھی۔

راجر نے کہا "اس لڑکی کا اصل نام جینی فر ہے اور یہ مشہور امریکی ماڈل گرل ہے جسے تم نے صرف اپنی دولت کے زور سے اپنے اس جنسی کھنڈر میں سجایا ہے اور اس جیسی اور کئی لڑکیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ تم ایک نفسیاتی مریض کی طرح یہاں ان کی بے بسی اور ذلت کا تماشا دیکھتے ہو۔ ان کو لالچ کے گرداب میں پھنسا کر ان سے بیچ ترین کام کروا رہے ہو۔ انہیں ایسے مردوں کے ساتھ سونے پر مجبور کر رہے ہو جو ان کے کتے نہلانے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ تم نے اپنی ناجائز دولت سے یہاں انجینئر اور ہنر مند اکٹھے کیے ہیں اور ان سے معمولی مزدوروں اور معماروں کے کام لے رہے ہو۔ اپنے پاگل پن کو تم اچھے بھلے سمجھ دار لوگوں میں تقسیم کر رہے ہو اور دیوانوں کی ایک فوج تیار کرنا چاہتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو' تمہاری یہ ساری کارستانیاں اور خرمستیاں ٹرسٹ کی نظروں سے اوجھل ہیں' تم ابھی ہمارے لیے پیدا بھی نہیں ہوئے ہو بہروپیے۔" راجر کا لہجہ تلخ سے تلخ اور زہرناک ہوتا چلا جا رہا تھا۔

سائیں نے زور شور سے اپنا سر کھجا کر کہا "کبھی تم مجھے ناجائز دولت والا کہتے ہو' کبھی بہروپیا اور کبھی دیوانہ۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو الو کے۔۔۔"

"میں نے تمہیں دیوانہ نہیں کہا۔ نفسیاتی مریض کہا ہے۔ نفسیاتی مریض دیوانے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور ویسے بھی تمہارے اس نفسیاتی مرض کے ساتھ ساتھ سازش کے تانے بانے بھی چل رہے ہیں۔ تم اتنے بھی مریض نہیں جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔"

"تو پھر کتنا مریض ہوں؟" سائیں نے ناک میں انگلی گھماتے ہوئے پوچھا۔

"آج ہی تمہیں پتا چل جائے گا۔ پوری پوری گہرائی ناپ لیں گے تمہاری۔"

"اور اس لڑکی کو مار پیٹ کر یہاں کیوں لائے ہو؟" سائیں نے جینی فر کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بتانے کے لیے کہ کسی طرح کی ہوشیاری نہیں چلے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لڑکی خفیہ طور پر تمہاری اسسٹنٹ بھی ہے۔ یہ ان کھنڈرات میں بسنے والوں کے ساتھ گھل مل کر رہتی ہے اور ان کے بارے میں پل پل کی خبریں بھی تمہیں پہنچاتی ہے۔ جن کرائے کے جنات پر تم اترا رہے ہو' ان کے بارے میں ساری معلومات اس چھوکری نے ہمیں فراہم کر دی ہیں۔ صرف پانچ منٹ کے اندر وہ جنات معمولی انسانوں بلکہ بکریوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

"تمہاری بکواس میرے پلے نہیں پڑ رہی۔" سائیں نے ایک لمبی ڈکار لے کر کہا۔

"ان کھنڈرات کے گرد تمہارے چوکیداروں کی تین پوسٹیں ہیں اور وہ تینوں پوسٹیں اس وقت ہمارے گھیرے میں ہیں۔"

سائیں نے "حق ہو" کا نعرہ لگایا پھر آنکھیں اوپر چڑھا کر بولا "کوئی کسی کے گھیرے میں نہیں۔ ہم سب اس اوپر والے کے گھیرے میں ہیں۔"

میں نے راجر کے چہرے کے تاثرات بالکل صاف دیکھے۔ اندازہ ہوا کہ اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے۔ پسٹل کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نے ایک پہلوان نما گارڈ کو اشارہ کیا اور ایک واکی ٹاکی اس کی طرف اچھال دیا۔

تنومند گارڈ اس واکی ٹاکی پر کسی سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ابھی راجر نے سائیں کو دھمکاتے ہوئے کہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر اس کے تمام چوکیدار ٹرسٹ کے گارڈز کے قبضے میں ہوں گے۔ غالباً پانچ منٹ کی بات راجر کی زبان سے روانی اور بے دھیانی میں نکل گئی تھی۔ ایک طرف تو وہ یہ کہہ رہا تھا کہ سائیں کی قائم کردہ تینوں پوسٹیں اس کے گھیرے میں ہیں' دوسری طرف اس نے پانچ منٹ کی بات کہہ دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ٹرسٹ کے باقی گارڈز یہاں سے دو چار میل کے فاصلے پر ہیں۔ اب راجر نے اپنے ساتھی کی طرف واکی ٹاکی پھینکا تھا تو اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ واکی ٹاکی پر اپنے دیگر ساتھیوں کو بتایا جائے کہ سائیں کے خلاف ایکشن شروع ہو گیا ہے اور وہ لوگ بھی دندناتے ہوئے کھنڈرات میں پہنچ جائیں۔

میرے خیال میں یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ اب بھی میں اگر خاموش تماشائی بنا رہتا تو پھر بہت کچھ ہاتھ سے نکل جاتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ابھی دو تین منٹ بعد مجھے یہاں سائیں عالی اور اس کے دونوں کارندوں کی لاشیں نظر آتیں یا پھر میں سائیں عالی کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھتا یا پھر کوئی بھی ایسا منظر نظر آ سکتا تھا جسے دیکھنا میرے لیے محال ہوتا۔ میں پچھلے تقریباً دس منٹ سے عجیب و غریب پوزیشن میں تھا۔ میرا زیریں جسم چھت پر تھا جبکہ بالائی دھڑ نیچے لٹکا ہوا تھا اور میں ریوالور ہاتھ میں لیے روشن دان سے سائیں عالی کے کمرے میں جھانک رہا تھا۔

میری نگاہ اس پہلوان نما گارڈ پر تھی جو واکی ٹاکی پر مصروف تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ موت کے بے رحم ہرکاروں سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا' میں نے واکی ٹاکی کا نشانہ لے لیا۔ ۳۸ بور سے نہایت طاقت ور ریوالور کی پہلی گولی واکی ٹاکی پر ہی لگی۔ واکی ٹاکی کو توڑ کر یہ گولی پہلوان نما گارڈ کے سینے میں گھس گئی۔ وہ تڑپ کر گرا۔ باقی تینوں گارڈز نے حواس باختہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ ان میں سے کسی کی نگاہ روشن دان کی طرف نہیں اٹھی تھی۔ میں نے نہایت سرعت سے تین فائر مزید کیے اور دو گارڈز کی پیشانیوں پر موت کی بندیا لگا دی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں ہی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ چوتھا فائر میں نے خطرناک غنڈے ڈاگ کے بازو پر کیا تھا' اس نے روشن دان میں میری موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور اب اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ گولی بھی تقریباً نشانے پر لگی اور ڈاگ اپنا بازو پکڑ کر ایک طرف جھک گیا۔

"خبردار!" میں نے چلا کر کہا "کوئی حرکت نہیں کرے گا۔۔۔ کوئی نہیں۔"

اب کمرے میں موجود ہر فرد کی توجہ روشن دان کی طرف ہو گئی تھی۔ صرف سائیں عالی تھا جو اپنے حال میں مست نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ایک دم اپنے اردگرد سے لاتعلق ہو کر دور چلا گیا ہے۔ اس پر یہ کیفیت اکثر طاری ہوتی تھی۔ راجر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اپنے کارندوں کی لاشوں کو دیکھتا تھا اور کبھی روزن کو۔ ماڈل گرل جینی فر چیختی ہوئی ایک کونے میں سمٹ گئی تھی' پھر اس نے دروازہ کھول کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی تھی۔ دروازہ لاک کیا گیا تھا۔

میں نے ریوالور کی چند زوردار ضربوں سے روشن دان کا شیشہ توڑ دیا۔ سائیں کے کئی ایک مسلح کارندے فائرنگ کی آواز سن کر سائیں کے کمرے کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سائیں کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جائیں۔ دوسری طرف میں نے راجر' زخمی ڈاگ اور ان کے ایک ساتھی کو مسلسل نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ میرا نشانہ دیکھ چکے تھے اور میرا ارادہ بھی بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ دم بخود کھڑے رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ سائیں کے کارندے نہایت چوکس اور تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ انہوں نے پل بھر میں فائرنگ کر کے دروازے کا لاک توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔

اندر کی صورت حال سائیں کے کمانڈوز نے سنبھال لی تو میں چھت سے کود کر ان افراد کی طرف بڑھا جو جیپوں کے پاس موجود تھے۔ سائیں کے کمانڈوز میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے تھے۔ صورت حال کی گڑبڑ کو محسوس کرتے ہی انہوں نے جیپوں کے قریب موجود افراد کو بھی نرغے میں لے لیا تھا۔ میں نے ان کمانڈوز کو پوری طرح چوکس رہنے کی ہدایت کی اور دوڑتا ہوا واپس سائیں عالی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں فرش پر ان افراد کی خونچکاں لاشیں موجود تھیں جو ابھی میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ کمانڈوز نے ایک گارڈ سمیت راجر اور ڈاگ کو فرش پر اوندھا لیٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ پشت پر باندھے جا رہے تھے۔ یہ کمانڈوز اپنے کام میں بہت ماہر دکھائی دیتے تھے۔ ان کی کارروائی دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ اتنے میں کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' یہ پروفیسر اللہ دتا تھا۔ ہم بے اختیار بغل گیر ہو گئے۔ پروفیسر کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی روسی رائفل نظر آ رہی تھی اور وہ پرعزم دکھائی دیتا تھا۔

میں پروفیسر کو ایک طرف لے گیا۔ میں نے کہا "باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے چوکیدار کمانڈوز کو ہوشیار کر دو۔"

"کیا مطلب؟"

"بستی کے گرد نگران پوسٹیں موجود ہیں؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"ہاں تین پوسٹیں ہیں۔ جو مشرق کی طرف ہے وہ تو بستی کی حدود کے اندر ہی ہے۔ باقی دونوں ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ہیں۔"

"ان تینوں پوسٹوں پر اطلاع کر دو کہ وہاں موجود لوگ ٹرسٹ کے گارڈز کی طرف سے پوری طرح چوکس رہیں۔"

"کیا جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان کے علاوہ بھی کچھ یہاں موجود ہیں؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے راجر کی زبانی خود اپنے کانوں سے سنا ہے بلکہ گارڈز کی اصل تعداد پیچھے ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کافی زیادہ ہوں۔ اگر ان لوگوں کو یہاں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع ہو گئی تو وہ یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔"

اچانک سائیں کا ایک مسلح کارندہ آگے بڑھا۔ اس نے پروفیسر کو کوئی چیز پیش کی۔ میں چونک کر رہ گیا۔ یہ وہی واکی ٹاکی تھا جسے میں نے ریوالور سے نشانہ بنایا تھا۔ یہ واکی ٹاکی سگریٹ کی ڈبیا سے کچھ ہی بڑا تھا۔ گولی واکی ٹاکی میں سوراخ کر کے گزر گئی تھی لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ چل رہا

تھا۔ میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ٹوٹنے پھوٹنے واکی ٹاکی میں سے کسی کی آواز آرہی تھی۔ کوئی بڑی پریشانی کے عالم میں بار بار کہہ رہا تھا "ہیلو ڈاگ! تم بول کیوں نہیں رہے۔ ہیلو یہاں کیا ہوا ہے۔ ہیلو جواب دو۔"

اس کا مطلب تھا کہ ابھی چند منٹ پہلے جب میں نے پہلی گولی چلائی تو مرنے والا پہلوان نما گارڈ واکی ٹاکی آن کر چکا تھا۔ اب شومیٔ قسمت واکی ٹاکی ابھی تک آن تھا اور یہاں ہونے والے سارے ہنگامے کی خبر ہوا کی لہروں کے ذریعے ان خوں خوار گارڈز تک پہنچ چکی تھی جو ان کھنڈرات کے آس پاس کہیں موجود تھے اور راجر کی طرف سے کسی دوسرے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ راجر ان لوگوں کو یقیناً ٹیڑھی انگلیوں کے ساتھ گھی نکالنے کے لیے ہی یہاں لایا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "راجر کے ساتھ آنے والے گارڈز کو ہنگامے کی خبر ہو گئی ہے۔"

"لیکن اگر۔۔۔" پروفیسر نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ اسے خاموش ہونا پڑا۔ کہیں تھوڑے ہی فاصلے پر لائٹ مشین گن کا خوفناک برسٹ چلا تھا۔

ابھی برسٹ کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ کئی چھوٹے بڑے ہتھیار ایک ساتھ فائرنگ کرنے لگے۔ سائیں نے دھمال ڈالنے والے انداز میں ناچنا شروع کر دیا۔ وہ پکار رہا تھا "شب برات پناخے۔۔۔ پناخے۔"

میں اور پروفیسر دوڑتے ہوئے باہر آگئے۔ دو ڈھائی فرلانگ دور تاریکی میں چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ نگران کمانڈوز کی دونوں پوسٹیں اسی جانب تھیں "لو کام شروع ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اب کیا ہو گا؟" پروفیسر بولا۔

"سائیں سے کہو اپنے مسلح آدمیوں کو پوزیشن لینے کا حکم دے۔ ٹرسٹ کے گارڈز کھنڈر میں گھس آئے تو سب کو کھنڈر بنا دیں گے۔"

پروفیسر دوڑ کر ایک دروازے میں داخل ہوا' وہ باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک میگافون تھا۔ وہ ایک جیپ کی چھت پر چڑھ گیا اور اعلان کرنے لگا کہ ٹرسٹ کے گارڈز خطرناک ارادے سے بستی کی طرف آرہے ہیں۔ انہیں بستی میں گھسنے نہیں دیا جائے۔

درحقیقت پروفیسر کے اس اعلان سے پہلے ہی سائیں کے کمانڈوز صورت حال سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ آج تک جس کام کے لیے "صحرائی درویش" سے بھاری تنخواہیں وصول کرتے رہے تھے' وہ کام کرنے کا وقت آیا تھا۔ وہ تعداد میں بے شک تھوڑے تھے لیکن کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتے تھے۔ انہوں نے ہتھیار تیار کر لیے اور دوڑ دوڑ کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ ایک بجیم شحیم شخص ان کمانڈوز کو چیخ چیخ کر گائیڈ کر رہا تھا۔ پوری بستی ہی جاگ اٹھی تھی۔ گورے' کالے' نوجوان' بوڑھے' مرد و زن سب گھروں سے نکل آئے تھے۔ گاہے گاہے عورتوں کی تُرکی چیخیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ میں نے قریب صورت سیاہ فام نوجوانوں میں زبردست جوش و خروش دیکھا۔ وہ لوگ سائیں کی حیرت انگیز مہربانیوں سے فیض یاب ہوئے تھے اور اسے اوتار کا درجہ دینے لگے تھے۔ اس اوتار کے دشمن کو وہ اپنا دشمن سمجھ رہے تھے اور اس دشمن کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو جانا چاہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اپنے روایتی ہتھیار نیزے' بھالے اور کلہاڑے وغیرہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے پھر رہے تھے کہ انہیں سائیں جی کی خاطر کیا کرنا ہے۔ سائیں نے ایک عقل مندی کی تھی' بستی کی چاروں جانب لوہے کی کانٹے دار باڑ لگوا دی تھی۔ موگاسا کی زبردست باڑ کے مقابلے میں یہ باڑ کچھ بھی نہیں تھی پھر بھی کچھ دیر تک تو حملہ آوروں کو روک ہی سکتی تھی۔ میں حالات کی نیرنگی اور تیز رفتاری پر حیران ہو رہا تھا۔ میں یہاں سائیں عالی کے پاس صفدر کی وجہ سے آیا تھا۔ صفدر موگاسا کے شفا خانے میں نیم بے ہوش پڑا تھا اور اس کے ذہن میں صرف ویرا کا غم تھا۔ ایسا غم جو اندرونی طور پر اسے تیزی سے توڑ پھوڑ رہا تھا۔ عالی لڑکی موتابے کے بقول' سائیں عالی ویرا کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا مگر یہاں آکر سائیں سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ ایک اور ہی طرح کا چکر یہاں چلا ہوا تھا۔

بہرحال ایک تسلی مجھے تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ٹرسٹ کے گارڈز ان کھنڈرات میں اندھا دھند نہیں گھس آئیں گے۔ اگر وہ لوگ سائیں عالی کو بھی ماسٹر اسفی کے اغوا میں ملوث سمجھ رہے تھے تو پھر انہیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے تھے جس سے براہ راست یا بالواسطہ اسفی کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

میں نے پروفیسر سے کہا "اب سائیں کو اور اس بستی کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ میں کنگ براؤن سے ٹرانس میٹر پر رابطہ کروں اور اسے بتا دوں کہ میں بھی کھنڈر میں موجود ہوں اور اگر سائیں پر یا کھنڈر پر حملہ کیا گیا تو یہ مجھ پر حملہ

تصور ہو گا۔"

"کنگ سے رابطہ کس طرح ہو گا؟"

"میرے پاس ٹرانس میٹر موجود ہے۔"

میں نے اپنے لباس کے نیچے سے وہ چھوٹا ٹرانس میٹر نکال لیا جو اسفی کے یرغمال بننے کے بعد کنگ کی طرف سے مجھے رابطے کے لیے دیا گیا تھا۔ پچھلے ۲۴ گھنٹے میں اس ٹرانس میٹر پر اکثر سگنل موصول ہوتا رہا تھا مگر میں نے کنگ سے کم ہی بات کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جونہی میں سگنل بھیجوں گا' دوسری طرف سے کنگ براؤن کی آواز سنائی دے جائے گی۔ وقت بہت کم تھا۔ ٹرسٹ کے گارڈز کسی بھی وقت اس کھنڈر (کھنڈرات) کو گھیرے میں لے سکتے تھے۔ میں نے ٹرانس میٹر آن کیا تو اس میں سے روٹین کی ٹون کے بجائے عجیب سی شائیں شائیں سنائی دی جیسے ریڈیو کسی اسٹیشن پر ٹیون نہ ہو تو ایک بے ہنگم شور ابھرنے لگتا ہے۔ میں نے سوچا شاید فریکوئنسی منتخب کرنے والی ناب گھوم گئی ہے۔ میں نے اس چھوٹی سی ناب کو دائیں بائیں حرکت دی لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔

"زیادہ رینج کا کوئی اور ٹرانس میٹر موجود ہے؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"ہاں آرتھر کے پاس ایک ہے۔ وہ ٹرسٹ سے ہی لایا تھا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

میں نے اسے ٹرانس میٹر لانے کو کہا۔ دو منٹ بعد پروفیسر واپس آگیا۔ ٹرانس میٹر اس کے پاس تھا۔ میں نے اس ٹرانس میٹر کو آن کیا تو ایک مایوس کن انکشاف ہوا۔ ایسا ہی شور اس ڈیوائس پر بھی سنائی دے رہا تھا۔ میں فریکوئنسی کی ناب کو بار بار گھماتا رہا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی شے ان "لانگ رینج" کے ٹرانس میٹرز کی لہروں کو "ڈسٹرب" کر رہی ہے۔

جس وقت میں ٹرانس میٹر سے الجھ رہا تھا' پروفیسر ایک واکی ٹاکی سیٹ لے آیا۔ یہ وہی واکی ٹاکی تھا جس پر میرا اور سائیں عالی کا رابطہ ہوتا تھا۔

پروفیسر پریشان لہجے میں بولا "یہ واکی ٹاکی بھی کام نہیں کر رہا۔ لگتا ہے کہ ان لوگوں نے کسی طرح تمام ٹرانس میشن جام کر دی ہے۔"

میں نے پروفیسر سے واکی ٹاکی جھپٹ کر دیکھا۔ یہ بھی "آؤٹ آف ورک" تھا اور مسلسل شائیں شائیں کر رہا تھا "او مائی گاڈ!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لگتا تھا کہ ٹرسٹ والے پوری تیاری کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ پہلے راجر اور ڈاگ خود سائیں کے پاس پہنچے تھے تاکہ اس سے بات کریں اور اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتا ہے تو نکال لیں' اس کے بعد سیدھے سیدھے کھنڈر پر "ریڈ" کرنے کا پروگرام تھا اور یہ بڑا تفصیلی پروگرام تھا' اس کے لیے پہلے سے تمام اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے تھے اور محتاط تیاری کی گئی تھی۔ اس تیاری ہی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ اس وقت یہاں موجود کوئی مواصلاتی آلہ کام نہیں کر رہا تھا۔ ٹرسٹ میں جدید ترین ٹیکنالوجی موجود تھی اور ان کے کسی انجینئر کے لیے ایسا کر گزرنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ یہ لوگ سائیں عالی پر بڑی خاموشی سے ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہوتے نظر آرہے تھے۔۔۔ اگر یہ لوگ یہاں اس کھنڈر میں مجھے اور سائیں عالی کو پکڑ لیتے تو سب دھرے کا دھرا رہ جاتا' ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری اصل طاقت تو ہمارا یرغمال شیطان جونیئر تھا اور وہ موگاسا میں تھا بلکہ موگاسا سے ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ کسی طرح واکی ٹاکی یا ٹرانس میٹر پر موگاسا میں لارو تابے سے رابطہ ہو جائے مگر حسب توقع کچھ حاصل نہیں ہوا۔

"اب کیا ہو گا؟" پروفیسر کی پرتشویش آواز ابھری۔ "تمہاری کیا رائے ہے؟"

"فائرنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ گارڈز کی تعداد کافی زیادہ ہے اور وہ تین اطراف سے کھنڈر کو گھیر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے زبردستی اندر آنا چاہا تو ہمارے کمانڈوز شاید پانچ منٹ بھی ان کو روک نہیں سکیں گے۔"

"اس صورت میں ہمارا یہاں سے نکل جانا بے حد ضروری ہے۔ کوئی اچھی سی جیپ لے لو اور سائیں عالی کو بھی لے آؤ۔"

"جیپ تو میں لے آتا ہوں۔" پروفیسر نے کہا "مگر سائیں عالی تب ہی آئے گا جب اس کی اپنی مرضی ہو گی۔"

"لیکن اسے آنا ہے۔ ورنہ وہ سخت ترین عذاب میں پھنس جائے گا۔ اگر وہ نہیں آتا تو اسے اٹھا کر لے آؤ۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تم خود بھی آؤ۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ وہ لاٹھیاں مار مار کر میرا سر نرم کر دے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے" آؤ میرے ساتھ لیکن پہلے جیپ لے لیں۔"

پلے گراؤنڈ کے پاس ہی دو جیپیں کھڑی تھیں۔ ان میں

سے ایک لینڈ روور جیپ کی چابی پروفیسر کے پاس موجود تھی۔ پروفیسر نے دروازہ کھولا، ہم دونوں جیپ میں گھس گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے خود سنبھال لی تھی۔

"سائیں اپنے کمرے میں ہی ہوگا؟" میں نے پروفیسر سے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تمہارے پیچھے گاڑی کے فرش پر بیٹھا ہوگا۔" یہ پروفیسر کی نہیں سائیں عالی کی آواز تھی۔ میں اچھل پڑا۔

گھوم کر دیکھا تو فتنہ ساماں "آفت بردار" سائیں عالی سچ مچ آلتی پالتی مارے جیپ کے فرش پر موجود تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک نشست کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔ عصا نما لاٹھی اس کے کندھے سے ٹکی ہوئی تھی "تم۔۔۔ تم اس بند گاڑی میں کیسے پہنچے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جیسے تم پہنچے ویسے میں پہنچ گیا اور یہ دیکھو' یہ ایک رائفل بھی میرے ساتھ ہی اپنی ٹانگوں پر چل کر یہاں پہنچ گئی۔" سائیں نے اپنی گود کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی گود میں واقعی ایک آٹومیٹک رائفل موجود تھی۔ اس پر سنگین بھی چڑھی ہوئی تھی۔ سائیں کی باتوں پر حیران ہونا میں نے اب چھوڑ دیا تھا۔

ایک ہی سلف پر جیپ کا نہایت دبنگ انجن جاگ اٹھا۔ اب ہم یہاں سے جانے کے لیے تیار تھے لیکن اس سے پہلے ایک کام ہمیں نپٹانا تھا۔ اگر یہ کام نہ ہوتا تو کئی کھنڈر میں کئی جانیں ضائع ہو جاتیں۔ ہم جیپ چلا کر خاردار باڑ کے قریب پہنچے۔ یہاں لمبا تڑنگا کمانڈو اپنے ساتھیوں کو مختلف پوزیشنوں پر تعینات کر رہا تھا۔ مقامی لوگ بھی پروفیسر کے اعلان کے بعد نیزے کلہاڑے لہراتے ہوئے باڑ کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ سائیں کے لیے مرنے مارنے پر تیار تھے۔ ان لوگوں کے قریب پہنچ کر میں نے جیپ روک دی۔ پروفیسر نے کمانڈوز کے انچارج کو مطلع کیا کہ سائیں صاحب کھنڈر سے جا رہے ہیں۔

انچارج کمانڈو خم ٹھونک کر انگریزی میں بولا "جناب! اگر یہ کوئی پلاننگ ہے تو اور بات ہے' ورنہ سائیں صاحب کو یہاں سے جانے کی کوئی ضرورت نہیں' ہم اپنی جانیں دے کر بھی ٹرسٹ والوں کو سائیں صاحب سے دور رکھیں گے۔"

پروفیسر نے انچارج کا شانہ تھپکا اور کہا "تمہارا جذبہ قابلِ تعریف ہے لیکن ہمارا یہاں سے جانا ایک پلاننگ کا حصہ ہے۔ اس پلاننگ کے مطابق تم لوگ ٹرسٹیوں پر کوئی گولی نہیں چلاؤ گے اور نہ ہی مقامی لوگوں کو کوئی کارروائی کرنے دو گے۔ نگران پوسٹوں پر موجود ساتھیوں کو بھی بتا دو کہ وہ گارڈز کا مقابلہ نہ کریں۔ گارڈز کو بستی میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے صرف زبانی کلامی کوشش کرنا۔ اگر وہ نہ مانیں اور اندر گھس آئیں تو آنے دینا۔"

پروفیسر نے سب کچھ تفصیل سے انچارج کو سمجھا دیا۔ اس کے بعد اس نے مقامی لوگوں کے سامنے بھی سائیں عالی کی طرف سے اعلان کر دیا کہ ٹرسٹیوں کی مزاحمت نہ کی جائے۔ پروفیسر نے اب مقامی زبان کے کئی الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔ وہ اب کئی ماہ سے لارسیوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔

ہم نے جیپ کو یوٹرن دیا اور دوبارہ کھنڈر کے وسط کی طرف بڑھے۔ اچانک مجھے نائب کپتان آرتھر اور اس کی بیمار بیوی نما دوست کا خیال آیا۔ وہ لوگ ٹرسٹ کے مفرور تھے اور ٹرسٹ سے بھاگ کر اس کھنڈر میں سائیں کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے۔ انہیں ان حالات میں یہاں چھوڑ جانا مناسب نہیں تھا۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا "آرتھر اور اس کی دوست کہاں ہیں؟ انہیں یہاں چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

"تم ان کے مامے لگتے ہو؟" سائیں نے چمک کر کہا "کیا ہمیں ان کی فکر نہیں؟"

"اگر فکر ہے تو ساتھ کیوں نہیں لے لیتے ان کو؟"

"وہ یہاں نہیں ہیں۔ وہ پیڑوں والی کشتی بیچنے کے لیے لاہور گئے ہوئے ہیں۔"

"وہ واقعی یہاں نہیں ہیں۔" پروفیسر نے سنجیدگی سے تصدیق کی "ویسے وہ خیریت سے ہیں' میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

ہم نے جیپ کو یوٹرن دیا اور شمالی جانب بڑھے۔ بستی یعنی کھنڈر سے باہر نکلنے کے لیے یہ سب سے مشکل راستہ تھا مگر ہمیں یہی راستہ استعمال کرنا تھا یا یوں کہہ لیں کہ ہم یہ راستہ استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ یہاں جھاڑ جھنکار کثرت سے تھا اور زمین بری طرح کٹی پھٹی تھی۔ کئی جگہ تو اتنے بڑے گڑھے تھے کہ ہلکے جھٹکے میں گاڑی کا سر نیچے' ٹانگیں اوپر ہو سکتی تھیں۔ رات کے وقت اس راستے پر سفر کرنا موت کو دعوت دینا تھا مگر موت کو تو ہر طرف سے "دعوتِ عام" تھی لہٰذا میں نے گاڑی اس پل صراط جیسے راستے پر ڈال دی۔ اس جانب گارڈز سے مڈھ بھیڑ ہونے کا امکان کم سے کم تھا۔

اس وقت جیپ میں تین ہتھیار موجود تھے۔ ایک سائیں عالی کی سنگین چڑھی رائفل' دو ہتھیار میرے پاس تھے یعنی ریوالور اور رائفل۔ رائفل کے دو فالتو میگزین

میرے پاس موجود تھے' باقی ایمونیشن گھوڑے کے ساتھ ہی تھیلے میں بندھا رہ گیا تھا۔ جیپ جونہی پل صراط جیسے راستے پر پہنچی' ہمارے سر اچھل اچھل کر چھت سے ٹکرانے لگے۔ تاہم سائیں عالی کا سر محفوظ رہا کیونکہ وہ حسبِ عادت فرش پر بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں اطراف سے نشستوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ ہر جھٹکے پر سائیں کے ساتھ ہی اس کے گلے میں تو پڑے ہوئے ڈالروں اور پاؤنڈوں کے ہار اوپر تک اچھلتے تھے اور گھنگھرو اور مالا میں چھن چھنا جاتی تھیں۔ اس کے چہرے پر کسی طرح کی پریشانی نہیں تھی حالانکہ کھنڈر اور اس میں موجود لاکھوں ڈالر کی قیمتی اشیا اور مشینیں وغیرہ وہ چھوڑ آیا تھا۔ (کم از کم وقتی طور پر تو چھوڑ ہی آیا تھا)

پروفیسر نے میری رائفل چیک کر کے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس کا انداز ماہرانہ تھا اور یہ انداز گواہی دے رہا تھا کہ اگر راستے میں کوئی مشکل پڑی تو وہ میرا بھرپور ساتھ دے گا۔ کچھ آگے جا کر ہم نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی بجھا دیں اور صرف چاند تاروں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔ یوں سفر اب مزید خطرناک ہو گیا تھا۔ یہ میری زندگی کی ایک خطرناک ڈرائیونگ تھی۔ مجھے نہ صرف کم روشنی میں خود کو گڑھوں سے بچانا تھا بلکہ رفتار بھی برقرار رکھنا تھی۔ اس پر مستزاد دشمن سے مڈھ بھیڑ کا خطرہ۔ یہ واقعی پل صراط کا سفر تھا۔ ہمیں گاہے گاہے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ یہ آواز دائیں جانب کھنڈر کی طرف سے آ رہی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے' راستہ دشوار ہو رہا تھا۔ کئی جگہ ریتلی زمین میں جیپ کا پہیا گھوم کر رہ گیا۔ کہیں ایسے گڑھے بھی آئے کہ ہمارے ساتھ سائیں عالی کو بھی ہوا میں معلق ہونا پڑا۔ یہ نہایت سخت جان جیپ تھی مگر جب راستہ ہی نہ ہو تو جیپ کی سخت جانی کہاں تک کام دے۔ ایک عمیق گڑھے کے کنارے سے گزرتے ہوئے ایک دو شاخے نے ہمارا راستہ روک لیا۔

میں نے ہیڈ لائٹس روشن کر کے دیکھا' جیپ کو دو شاخے کے اوپر سے گزارنا ممکن نہیں تھا۔ دائیں بائیں بھی کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں انجن اسٹارٹ چھوڑ کر نیچے اترا تاکہ دو شاخے کو توڑ کر راستہ بنا سکوں۔ جب میں دو شاخے کو توڑ رہا تھا' مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اچانک ہی چھٹی حس نے اعلان کیا کہ مصیبت سر پر ہے۔ یہ مصیبت نزدیک آتے ہوئے دشمن کی صورت میں تھی۔ لیکن یہ دشمن وہ نہیں تھے جن کی ہم توقع کر رہے تھے۔ یہ ٹرسٹ کے گارڈز نہیں تھے۔ یہ خون خوار جنگلی کتے تھے جو اس علاقے میں غولوں کی صورت میں تباہی مچا رہے تھے۔ ان کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ بجلی کی رفتار سے ہماری طرف آ رہے ہیں۔

کتوں کی خوفناک آوازیں سننے کے بعد میں نے مزید تیزی سے دو شاخے کو توڑنے کی کوشش کی۔ دو شاخے کی نچلی شاخ کافی موٹی تھی اور اس میں لچک بھی تھی۔ اسے توڑنا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ قیمتی تھا۔ اب کسی بھی وقت نکیلے دانتوں اور تیز پنجوں والے موت کے سفاک ہرکارے ہمارے سروں پر پہنچنے والے تھے۔

پروفیسر کی گھبرائی ہوئی آواز جیپ کے اندر سے آئی "شاہ جہاں' اندر آ جاؤ۔ کتے بالکل پاس آ گئے ہیں۔" اس نے جیپ کے سارے شیشے چڑھا لیے تھے۔

پروفیسر بالکل درست مشورہ دے رہا تھا۔ اب واپس جیپ میں گھسنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں دو شاخے کا خیال چھوڑ کر واپس جیپ میں گھس گیا۔ کتوں کا شور ہم سے قریباً سو گز دور شمال کی جانب سنائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو یوں لگا کہ یہ غول بیابانی ہمارے قریب سے ہو کر آگے نکل جائے گا لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ ہمارے بدترین اندیشے کے عین مطابق تھا۔ HUNTING AFRICAN DOGS ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ تھی۔ وہ درختوں کے عقب سے ٹولیوں کی شکل میں برآمد ہوئے اور ہر سمت سے جیپ کو گھیر لیا۔ ان کی منحوس بو سے حواس مختل ہونے لگے اور کریہہ شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ تاریکی میں ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ایسے لگتا تھا کہ جنگل میں بھٹکتی ہوئی بے شمار بدروحوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری جیپ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ان کے جسم جیپ سے ٹکرا رہے تھے اور چمک دار آنکھیں ہر طرف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے جسموں کی بو پا کر وہ جیسے دیوانے ہو گئے تھے۔ سردار رانے کے بھائی اولام نے شاید ٹھیک ہی بتایا تھا۔ ان جنگلی کتوں کے کچھ گروہ ایسے تھے جن کے منہ کو انسانی خون لگ گیا تھا اور وہ آدم خور بن چکے تھے۔ اب یہی آدم خور تھے جنہوں نے اس خطرناک جنگل میں ٹڈی دل کی طرح ہمیں گھیر لیا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا اس انتہائی مخدوش صورتِ حال میں بھی سائیں عالی اپنے حال میں مست نظر آ رہا تھا۔ فرش پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس نے آنکھیں بند کر لی

تھیں اور وجد کے عالم میں دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اسی اثنا میں کچھ کتے جیپ کے بونٹ پر چڑھ گئے۔ ہیڈ لائٹس ابھی تک روشن تھیں۔ یہ روشنی ان کتوں پر بھی منعکس ہو رہی تھی۔ بونٹ پر چڑھے ہوئے کتوں کی خوفناک تھوتھنیاں ونڈ اسکرین سے ٹکرا رہی تھیں۔ یہ جان لیوا تھوتھنیاں ہم سے بس چند انچ کے فاصلے پر تھیں۔ بیچ میں یہ ونڈ اسکرین نہ ہوتی تو ہمارے نرخرے کب کے ادھڑ چکے ہوتے۔ اسی دوران میں ایک دو کتے اتنی زور سے جیپ کے ساتھ ٹکرائے کہ ساری جیپ جھنجھنا گئی۔ ہم نے شیشے چڑھانے کے بعد دروازے اچھی طرح لاک کر دیے تھے۔

پروفیسر نے مری مری آواز میں کہا "شاہ جہاں! یہ تو شیشے توڑ دیں گے۔ میرا خیال ہے ہمیں ... فائر کرنا چاہیے۔"

"نہیں پروفیسر۔" میں نے اس کی رائفل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "فائر ہوگا تو نزست کے گارڈز اس طرف کو بھاگے آئیں گے۔"

"تو پھر اسی طرح بیٹھے رہیں اور ان کو اپنا آپ چیر پھاڑ لینے دیں؟" پروفیسر نے جل کر کہا۔

"ہو سکتا ہے ... مایوس ہو کر یہ آگے بڑھ جائیں۔" میں نے امید کا دامن تھامنے کی کوشش کی۔

ابھی بمشکل میرا جملہ مکمل ہوا تھا کہ ایک بار پھر کسی وزنی کتے کا زوردار تصادم جیپ کی کھڑکی سے ہوا۔ واضح یوں لگا کہ شیشہ ٹوٹنے میں انیس بیس کی کسر رہ گئی ہے۔ پوری جیپ ایک خوفناک بھونچال کی زد میں تھی۔ ایک بار بمبئی میں ایک سیاسی شخصیت کو ٹنگر شکرا کے بھیجے ہوئے کرائے کے قاتل سے بچانے کے لیے میں نے اس سیاسی شخصیت کے ساتھ چند دن گزارے تھے۔ ایک روز اس سیاست داں کی جیپ ایک مشتعل ہجوم کے نرغے میں آ گئی تھی۔ سیاست داں کے مخالفوں نے اس کی جیپ پر بے تحاشا ڈنڈے اور پتھر برسائے۔ میں بھی اس وقت گاڑی میں تھا۔ ہم بمشکل وہاں سے نکل سکے تھے۔ آج بالکل وہی منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ آج ہماری گاڑی مشتعل لوگوں کے نرغے میں نہیں آدم خور کتوں کے گھیرے میں تھی۔

پروفیسر نے کہا "ایسی ایک اور ٹکر کھڑکی کو لگی تو شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ ہم فائرنگ کے بغیر نہیں بچ سکتے۔"

"کتنی گولیاں ہیں تمہارے پاس؟ ابھی انہیں بچا کر رکھو۔" میں نے کہا اور ایک کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا کھول دیا۔

شیشہ کھلتے ہی حیوانی بو کا بھبکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی تین تھوتھنیاں اندر داخل ہو گئیں۔ میں نے وہ رائفل پکڑی جو سائیں عالی اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس رائفل پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے اس رائفل کو نیزے کی طرح استعمال کیا اور بے رحمی سے کئی کتوں کی تھوتھنیاں زخمی کر دیں۔ جو کتے زخمی ہو کر پیچھے ہٹے ان کی جگہ فوراً دوسرے کتوں نے لے لی۔ میں نے پھر سنگین استعمال کی۔ تیز دھار آلہ زندہ حیوانی گوشت میں گھستا تھا تو ہاتھوں میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ جاتی تھی۔ شاید یہ وہی سنسناہٹ تھی جس کا ذکر تیمور لنگ نے بھی اپنی خود نوشت میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب میدان جنگ میں تلوار مخالف کے گوشت میں گھستی ہے تو تلوار بردار کے ہاتھ بازو اور پورے جسم کو ایک لذت آفریں سنسناہٹ سے آشنا کرتی ہے۔ میں اپنے ہاتھوں میں دوڑنے والی سنسناہٹ کو لذت آفریں تو نہیں کہہ سکتا تھا ہاں یہ کسی حد تک اطمینان بخش ضرور تھی۔

مجھے دیکھ کر پروفیسر نے بھی اپنی جانب کی کھڑکی چار پانچ انچ تک کھول لی اور سر اندر گھسانے والے آدم خود کتوں کو رائفل کے وزنی کندے سے ضربیں لگانے لگا۔ یہ خوفناک کشمکش دو تین منٹ جاری رہی پھر ایک خوفناک چھناکا ہوا اور جیپ کی ایک کھڑکی کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر میرے اوپر آ گرا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جسے ڈیڑھ دو منٹ پہلے کسی وزنی کتے کی شدید ضربیں سہنی پڑی تھیں۔ اب غالباً دو تین جانور اکٹھے ہی کھڑکی سے ٹکرائے تھے۔ ان کے نہایت مضبوط جبڑے اس قابل تھے کہ کھڑکی کو توڑ سکیں۔ یہ ایسی سنگین ترین صورت حال تھی جس کے بارے میں چند منٹ پہلے تک ہم میں سے کسی نے سوچا نہیں تھا۔

کھڑکی ٹوٹتے ہی پروفیسر نے رائفل سیدھی کر لی تھی۔ مگر فائر کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایک قد آور کتے کا نصف دھڑ جیپ کے اندر آ چکا تھا اور اس کے دونوں اگلے پنجے میرے شانوں میں گڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس بدبودار کتے کی گردن دبوچ لی تھی اور اس کی مہلک تھوتھنی کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا دوسرا ہاتھ سنگین چڑھی رائفل پر تھا۔

"سنگین مارو۔ سنگین مارو۔" پروفیسر چیخا۔

رائفل کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں فوری طور پر سنگین استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اسی دوران میں ایک اور کتا پہلے کتے کے اوپر سے اندر گھسنا شروع ہو گیا۔ اگر ہم ان دونوں کو ہلاک بھی کر دیتے تو درجنوں کتے اور تھے جو اس ٹوٹی ہوئی

کھڑکی میں سے اندر گھسنے اور ہمیں پارہ پارہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ زندگی میں کئی بار موت مجھے چھو کر گزری تھی۔ پر کبھی بھی موت کا لمس لیے ہوئے تھے پہلے اندر داخل ہونے والا کتا بجلی کی سی اپنی پچھلی ٹانگوں کی پوری قوت سے اندر گھستا چلا آ رہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کی گردن پر تھا۔ بلاشبہ یقین جنگلی کتوں کے جسم پر بال برائے نام ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کتے کی پسینے میں بھیگی ہوئی گردن میرے ہاتھ سے پھسلی جا رہی تھی اور اس کی بدبودار تھوتھنی میرے چہرے سے قریب تر ہو رہی تھی۔ اب اس کتے کی بائیں جانب سے بھی ایک کتے کا سر اندر گھس آیا تھا۔ میں نے پوری جسمانی قوت صرف کر کے نشستوں کے درمیان پھنسی ہوئی رائفل کو سیدھا کیا اور سنگین کتے کی پسلیوں میں اتار دی ایک کریہہ چیخ کے ساتھ کتے نے پلٹ کر سنگین پر جھپٹا مارا جیسے اپنے دانتوں سے پکڑ کر سنگین کو جسم سے واپس کھینچنا چاہتا ہو۔ ناکام ہو کر وہ بری طرح تڑپا اور کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر گرتے ہی کئی آنکھیں کھڑکی میں چمکیں ... اب فائرنگ کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے نشست پر پیچھے کی طرف گرتے ہوئے لبلبی دبائی اور پھر دباتا چلا گیا۔ میں نے کم و بیش پندرہ فائر کیے۔

کھڑکی خالی ہو گئی۔ بھڑکے ہوئے خوں خوار کتے پسپا ہو کر چند گز دور چلے گئے۔ جیپ کے بونٹ پر چڑھے ہوئے کتے بھی اس فائرنگ کے بعد اتر گئے تھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سمیت جھاڑیوں کے عقب میں پناہ لی تھی مگر یہ صرف عارضی پسپائی تھی۔ کتوں نے ہمارا گھیرا نہیں توڑا تھا اور دوبارہ دھاوا بولنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان خوں خوار جانوروں کا مظاہرہ میں دوبارہ پہلے بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ فائرنگ کے باوجود وہ آسانی سے شکار کی جان چھوڑتے نہیں تھے۔

"اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا؟" سائیں عالی نے دائیں بائیں جھولتے ہوئے قلندرانہ لہجے میں کہا۔

"اب تمہارا سر ہوگا۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اگر تم واکی ٹاکی پر مجھ سے بات کر لیتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ مجھے یہاں آنا پڑتا نہ یہ بلا ہمارے سر آتی۔"

"نہ نہ شفیق محمد۔" سائیں نے بڑی ادا سے کہا "ایسی بات نہیں کرتے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب آگے کا سوچو۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔"

"نہیں ٹھہر سکتے تو جاؤ۔ ان کتوں سے اپنا تعارف کراؤ اور انہیں بتاؤ کہ تمہیں جانے کی جلدی ہے۔ وہ تمہارا ... تو گرانٹ لینے کے لیے پھر کسی وقت آ جائیں۔" میں نے جل کر کہا۔

"او نے تو تو بڑا بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بدتمیز بچے مجھے پسند نہیں ہیں۔ اچھے بچے بن جاؤ ورنہ میں کسی جن زادے سے تمہیں نیا کھلوا دوں گا اور جن کا ٹیکا تمہیں پتا ہے کتنا بڑا ہوتا ہے۔"

"ایسا کوئی ٹیکا ذرا اپنے دماغ میں لگوا لو تو زیادہ اچھا ہے۔" میں نے جل بھن کر کہا۔

ایسے سنگین لمحوں میں ہم میں سے کوئی سائیں کے مزاح سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔

مندرجہ بالا مختصر گفتگو کے دوران میں بھی مجھے ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے دو تین فائر کرنے پڑے تھے۔ ایمونیشن بہت کم تھا اور یہ بات میرے علاوہ پروفیسر بھی جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ابھی تک ایک فائر بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی آخری پانچ چھ گولیاں اس وقت چلائی تھیں جب کتے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے بالکل قریب آ گئے تھے۔

پروفیسر نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے دوستوں کی آمد کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے۔"

پروفیسر کا اشارہ نزست کے گارڈز کی طرف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں ہونے والی فائرنگ گارڈز کو اس مقام کی طرف کھینچ لائے گی۔ بہ الفاظ دیگر اب ہم دہرے خطرے کا شکار تھے۔ ایک خطرہ چار ٹانگوں والے کتوں سے اور دوسرا دو ٹانگوں والے کتوں سے تھا۔ دونوں ہمارے جانی دشمن تھے اور اس تاریک و اجنبی جنگل میں انہیں ہر طرح ہم پر برتری حاصل تھی۔

اچانک میں اور پروفیسر بری طرح چونک گئے۔ کسی کتے کی مدھم غراہٹ کھڑکی کے بالکل پاس سنائی دی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کس وقت ہمارے اتنا نزدیک آ گیا تھا یا شاید وہ جیپ کے نیچے موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس غراہٹ کا کھوج لگانے کے لیے اپنا سر ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر نکالتا ایک پرچھائیں سی لپکتی نظر آئی۔ تازی کتے جیسے چست اور چھریرے جسم والا ایک کتا جست بھرتا ہوا جیپ کے اندر آ گیا۔ اس کی جست میں اتنی قوت تھی کہ وہ میری ٹانگوں کے اوپر سے ہوتا ہوا پروفیسر اللہ وتا پر جا گرا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے پروفیسر کو کتے کے ساتھ گتھم گتھا دیکھا پھر میں نے گولی چلا دی لیکن یہ گولی میں نے اس خونخوار کتے پر نہیں چلائی تھی جو اپنے ایک ساتھی کو جیپ کے اندر دیکھ کر تیز رفتاری سے کھڑکی کی طرف بھاگا آ رہا تھا۔ میں نے دو فائر کیے جن میں سے ایک موذی جانور کو لگا اور وہ کھڑکی سے دو چار گز دور گر کر جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔ اس دوران میں پروفیسر اپنی رائفل کے وزنی کندے سے اپنے "مدمقابل" کو کئی بھرپور ضربیں لگا

دکا تھا۔ غالباً اس کی کھوپڑی پر بھی کوئی کاری ضرب آئی تھی۔ اس کے حلق سے اذیت ناک آواز نکل رہی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ پروفیسر کیا کر رہا ہے۔ میری پوری توجہ کھڑکی کی طرف تھی اور میں اس "تازہ حملے" کو روکنے کے لیے گاہے گاہے فائر کر رہا تھا۔

جب یہ حملہ پسپا ہوا تو میں نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن سے گوشت کا ایک لوتھڑا علیحدہ ہو کر لٹک رہا تھا۔ قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ پروفیسر نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک سیکنڈ کے لیے جیپ کا اگلا دروازہ کھولا تھا اور اپنے مد مقابل نیم جان کتے کو باہر پھینک دیا تھا۔ اب جیپ کے پہلو سے اس کتے کی نزعی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنا رومال پروفیسر کی زخمی گردن پر باندھ دیا۔ میرے اپنے کندھوں پر بھی گہری خراشیں تھیں اور یہاں سے قمیص تر محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے پروفیسر سے کہا "میرے والی رائفل خالی ہو گئی ہے۔ اب تمہاری رائفل ہے اور میرے ریوالور کی چھ گولیاں ہیں۔ کل ملا کر چھتیس پچاس راؤنڈ سے زیادہ ہم نہیں چلا سکتے۔"

"اس کا مطلب ہے بری طرح پھنس گئے ہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

میں نے کہا "میں جیپ کو آگے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں شاید بات بن جائے۔"

میں ایک بار پھر اگلی نشست پر چلا گیا۔ چابی گھما کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ریورس گیئر لگایا۔ میں چاہتا تھا کہ جیپ کو دو شاخے کے اوپر سے گزارنے کے لیے پہلے جیپ کو تھوڑا ریورس کروں۔ دو تین میٹر پیچھے جا کر میں نے جیپ کو فور پر کیا اور تیزی کے ساتھ دو شاخے کے اوپر سے گزارنا چاہا۔ زبردست جھٹکا لگا لیکن ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کا ایک اور نقصان بھی ہوا۔ جیپ کو ریورس کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اب ہم ریورس بھی نہیں ہو سکتے۔ دو شاخے کا کچھ حصہ جیپ کے نیچے پھنس گیا تھا۔ ویسے بھی پیچھے جانا تو اب ہمارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم نہایت خطرناک گڑھوں سے بچتے بچاتے یہاں پہنچے تھے۔ اگر گاڑی کو تاریکی میں ریورس لے جاتے تو شاید دس پندرہ میٹر بھی نہ جا سکتے اور کسی گڑھے میں گر جاتے۔ گاڑی کو واپس موڑنے کا آپشن بھی نہیں تھا کیونکہ راستہ نہایت تنگ تھا۔ آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

سائیں عالی ان حالات سے یکسر بے نیاز تھا۔ اس نے ایک بار پھر حق ہو کا نعرہ بلند کیا اور بولا "یہاں سے نکلو بھئی!

میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ رات کو ٹھیک چار بجے مجھے اوجڑی کا ملک ٹیک بنانا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ان حالات میں تو تم اپنی اوجڑی کی فکر کرو۔"

"تم پھر بدتمیزی کر رہے ہو بچے! میں نے تمہیں بتایا بھی ہے کہ جن کا کیا بہت بڑا ہوتا ہے۔"

"وہ دیکھو۔" پروفیسر نے گھبرا کر عقب میں اشارہ کیا۔ بھیڑیوں کے متحد گروہ کی طرح کوئی ایک درجن کتے پھر ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کی بائیں جانب بھی دو ٹولیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی پیش قدمی کا انداز عجیب تھا۔ وہ منہ پھاڑ کر چیختے تھے۔ آٹھ دس قدم آگے آتے تھے پھر چار پانچ قدم پیچھے چلے جاتے تھے پھر آٹھ دس قدم آگے پھر چار پانچ قدم پیچھے۔ کوئی مقناطیسی کشش تھی جو انہیں ہر طرف سے ہماری جانب کھینچ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہمارے زخموں سے رسنے والے خون کی بو نے ان کے معدوں میں ناچتی ہوئی اشتہا کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا انداز پہلے سے بھی جارحانہ نظر آتا تھا۔

جب جیپ سے ان کا فاصلہ پانچ چھ میٹر رہ گیا تو میں نے پروفیسر کو اشارہ کیا کہ وہ کفایت شعاری سے چند گولیاں چلا دے۔ پروفیسر نے اپنی جانب والی کھڑکی تھوڑی سی کھول کر رائفل کی نال باہر نکالی۔ رائفل کا دستہ کندھے سے لگایا اور نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے گولی کسی کتے کو لگنے کے بجائے خود ہمیں لگ گئی ہے۔ اس شاک کی وجہ یہ تھی کہ گولی چلی نہیں تھی۔ پروفیسر نے پھرتی سے رائفل کو چیک کر کے پھر لبلبی دبائی۔ گولی اس مرتبہ بھی نہیں چلی۔ اس نے دیوانہ وار رائفل کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ میں نے اپنا آخری سہارا۔۔۔ یعنی ریوالور نکالا اور پروفیسر کی طرف اچھال دیا۔ خود میں نے پروفیسر والی رائفل جھپٹ لی اور جیپ کی اندرونی روشنی میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یکایک بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ رائفل کے میگزین اور چیمبر کے درمیان موجود لائن منٹ ختم ہو چکی تھی۔ میگزین کی ساکٹ ٹیڑھی ہو جانے کی وجہ سے گولی آگے نہیں جا رہی تھی اور یہ اس وقت ہوا تھا جب پروفیسر نے رائفل کی مدد سے حملہ آور کتے کو ضربیں لگائی تھیں۔ یہ نقص معمولی ہونے کے باوجود فی الوقت ناقابل اصلاح تھا۔

پروفیسر نے ریوالور سے فائرنگ کرتے ہوئے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ لیے تھے "کیا ہوا شاہ جہاں؟" اس نے پوچھا۔

"لگتا ہے کہ آج سارے تارے گردش میں ہیں۔ یہ رائفل بیکار ہو گئی ہے۔"

"او خدایا!" پروفیسر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"میرا خیال ہے کہ اب گولی مت چلاؤ۔ دو چار گولیاں بدترین وقت کے لیے رکھ لو۔"

پروفیسر نے بے حد مایوسی کے عالم میں ریوالور کھڑکی سے ہٹا لیا۔

میں نے ایک بار پھر جیپ اسٹارٹ کی اور اسے "منحوس مقام" سے آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا جو پہلے تھا۔ بس پہیے گھوم کر رہ گئے اور ہمارا رخ تھوڑا سا تبدیل ہو گیا۔ جیپ کی اگلی اور پچھلی نشست پر خون بکھرا ہوا تھا۔ یہ ان زخموں سے بہنے والا لہو تھا جو تھوڑی دیر پہلے میری سنگین نے حملہ آور افریقن ڈاگز کو لگائے تھے۔ کرچی کرچی ہو جانے والا شیشہ بھی اس خون میں لتھڑا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گولیوں کے درجنوں خول اور کتوں کے بال بھی نشستوں پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اندرونی روشنی بجھا دی۔ کیونکہ اس روشنی کے سبب باہر کا منظر وضاحت سے نظر نہیں آتا تھا۔

ہماری طرف سے فائرنگ رک جانے کے بعد آدم خور کتوں کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ وہ جھاڑیوں سے نکل نکل کر ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پچھلے دو چار منٹ میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ شاید پیچھے رہ جانے والی کوئی اور ٹولی بھی یہاں آن پہنچی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سائیں عالی والی رائفل کو نیزے کی طرح تھام لیا۔ اب ریوالور کی چار گولیوں اور اس سنگین کے سوا ہمارے پاس دفاع کو کچھ نہیں رہا تھا۔ یہ بہت ناکافی تھا۔ پروفیسر کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں تاریک سائے رینگنے لگے تھے۔ شاید ان جاں گسل لمحات میں اسے نائلہ یاد آئی تھی۔ اپنی لخت جگر اپنی بچی۔ جس کو زندہ دیکھنے کی آس میں وہ زندہ تھا۔ ایک بار اس کو گلے سے لگانے اور اس کی پیشانی چومنے کی خاطر وہ اپنے تن من پر لاکھوں مصیبتیں جھیل رہا تھا۔ مصیبتیں جھیلتے جھیلتے وہ یہاں تک پہنچا تھا اور آج اس تاریک پر خطر جنگل میں اس کی زندگی کا چراغ اچانک باد اجل کی زد میں آ گیا تھا۔ میرے اپنے ذہن کے اندر بھی چند سیکنڈ کے اندر کئی بھولے بسرے منظر گھوم گئے۔ اٹک جیل سے لے کر دفینے تک اور دفینے سے لے کر نبست کی غلامی تک بے شمار باتیں یاد آئیں۔ بے شمار چہرے تصور میں چمکے۔ اچانک ایک آواز نے ہمارے کان کھڑے کر دیے۔ یہ جیپوں کی آواز تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ نبست کے گارڈز آ رہے ہیں۔ افریقن کتوں کے جنگل میں پھنسنے سے پہلے یہ آواز ہمیں سنائی دیتی تو یقیناً ہماری روحیں فنا ہو جاتیں لیکن اس وقت یہ آوازیں کچھ ایسی خوفناک نہیں لگیں۔ نبستیوں کے قبضے میں چلے جانا اگر بھیانک تھا تو کتوں کی چیر پھاڑ کا شکار ہو جانا بھی کچھ کم بھیانک نہیں تھا اور یہ فوری موت تھی جس میں بچ نکلنے کا کوئی چانس نظر نہیں آتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے تنوں پر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ یہ اچھلتی کودتی ہیڈ لائٹس تیزی سے قریب آ رہی تھیں پھر ان میں سے ایک لائٹ ہماری جیپ پر بھی پڑی۔ گاڑیوں کا رخ سیدھا ہماری طرف ہو گیا۔ سب سے پہلے دو جیپیں ہم تک پہنچیں۔ ان میں سے اچھل اچھل کر مسلح گارڈز اترے۔ وہ اپنے اردگرد کتوں کی موجودگی سے آگاہ تھے لیکن شاید وہ اس خطرے کو اتنی شدت سے محسوس نہیں کر رہے تھے جتنی شدت سے انہیں محسوس کرنا چاہیے تھا۔ گارڈز نے کتوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ ہوائی فائرنگ کی پھر وہ ہماری جیپ کو گھیرنے کے لیے تیزی سے ہماری طرف آئے۔ ان کی رائفلوں کا رخ ہماری طرف تھا اور یہ غلط رخ تھا۔ وہ بڑے اور فوری خطرے کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ یہ "فوری خطرہ" خوں خوار کتوں کی صورت ان کے سامنے آیا۔ دائیں جانب کی جھاڑیوں سے درجنوں کتے نکل کر اچانک گارڈز پر جھپٹے۔ یہ کسی فلم کا سا منظر تھا۔ ایک دل دہلا دینے والی فلم۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں ہم نے دیکھا کہ کتے مشتعل بھڑوں کی طرح چار گارڈز سے چمٹ گئے۔ دو گارڈز تو فائرنگ کرتے ہوئے جان بچانے میں کامیاب ہوئے لیکن دو قابو آ گئے۔ ان کی آخری چیخیں لرزہ خیز تھیں۔ ان کے ساتھیوں کے سامنے درجن بھر کتوں نے پلک جھپکتے میں انہیں چیر پھاڑ ڈالا۔

زندہ بچ جانے والے گارڈز واپس جیپوں کی طرف دوڑے اور جیپوں کے اندر پوزیشن لے کر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ اسی دوران میں تین چار مزید جیپیں بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ پہلے سے موجود گارڈز نے نئے آنے والے ساتھیوں کو چیخ چیخ کر صورت حال سے آگاہ کیا۔ غالباً یہ بھی بتایا ہوگا کہ وہ جیپوں سے اترنے کی حماقت نہ کریں۔

جس وقت زخمی گارڈز اور "افریقن جنگلی کتوں" میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا میں نے موقع غنیمت جانا اور دروازہ کھول کر جیپ سے اتر آیا۔ رکوع کے انداز میں جھک کر میں جیپ کے سامنے پہنچا اور پوری جسمانی طاقت صرف کر کے دو شاخے کا ایک حصہ توڑ دیا۔ اب یہ امید پیدا ہو گئی کہ جیپ آگے نہیں تو پیچھے ضرور جا سکے گی۔

جیپ اسٹارٹ کر کے میں نے ریورس گیئر لگایا۔ دو تین

بار زور لگوایا تو جیپ دو شاخے کے چنگل سے نکل آئی۔ اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ گڑھوں میں گرنے کا شدید خطرہ مول لیتے ہوئے میں جیپ کو ریورس کرتا چلا جاؤں' دوسرا راستہ یہ تھا کہ جیپ کو کچھ پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر رکاوٹ کے اوپر سے گزارنے کی کوشش کروں۔ میں نے دوسرا راستہ چنا اور جیپ کو پیچھے ہٹا کر پوری قوت سے رکاوٹ کی طرف بڑھا۔ اس مرتبہ کامیابی ہوئی اور جیپ گزر گئی۔ سائیں نے حق ہُو کا نعرہ بلند کیا اور اٹھ کر جیپ کے اندر ہی دھمال ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔

میں جیپ کو حتی الامکان تیزی سے چلانے لگا۔ اصولی طور پر مجھے ہیڈ لائٹس نہیں جلانا چاہئیں تھیں' ہیڈ لائٹس کی وجہ سے گارڈز کو فوراً ہمارے فرار کا علم ہو جاتا تھا مگر اس خطرناک راستے پر ہیڈ لائٹس کے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ میری زندگی کی ایک یادگار اور خطرناک ڈرائیونگ تھی۔ جیپ کئی کئی فٹ اچھل رہی تھی' کسی وقت اتنا شارپ موڑ مڑنا پڑتا تھا کہ ایک طرف کے پہیے فضا میں بلند ہو جاتے تھے۔

پروفیسر نے تاریک درختوں کے درمیان سے افق کی طرف اشارہ کیا جہاں بار بار چمک نمودار ہو رہی تھی "یہ کیا ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"لگتا ہے کہ بجلی چمک رہی ہے۔"

"لو بارش بھی ہونے لگی۔" پروفیسر نے ونڈ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں ننھی ننھی بوندیں موجود تھیں۔

رات کی بارش ایسے ہی ہوا کرتی ہے۔ کسی وقت چپکے سے بادلوں کے پرے آسمان کو ڈھانپ لیتے ہیں اور پتا اس وقت چلتا ہے جب بوندیں گرنے لگتی ہیں۔ جنگل اور بارش۔ یہ بڑا دل نشیں تصور تھا' خاص طور سے اس قحط زدہ علاقے میں بارش خوشی کا جنتر منتر تھی' مگر ہم جس صورت حال سے گزر رہے تھے اس میں لطف اندوز ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے بارش کے چھینٹے اندر آئے تو سائیں عالی کو بھی موسم کی کروٹ کا علم ہو گیا۔ کئی دن کے شدید حبس کے بعد یہ بارش یقیناً اسے اچھی لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر حق ہُو کا نعرہ بلند کیا اور اٹھ کر دھمال ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔

اپنے عقب میں ہمیں فائرنگ کی تابڑ توڑ آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ وہ فائرنگ تھی جو ٹرسٹ گارڈز جنگلی کتوں کا حصار توڑنے کے لیے کر رہے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ گارڈز ہمارے پیچھے آ رہے ہیں یا نہیں..... یا انہیں ہمارے نکل آنے کا علم ہوا ہے یا نہیں۔ میری پوری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی اور میں جلد از جلد اس مقام سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ درخت گھنے ہو رہے تھے اور ڈرائیونگ مشکل تر ہو رہی تھی۔ کئی مقامات پر راستہ مسدود ملتا تھا' مجھے جیپ کو ریورس کر کے دوسرے راستے سے آگے بڑھانا پڑتا تھا۔ بارش بھی اب تیز ہو گئی تھی۔ موجب سائیں عالی کے دماغ میں اچانک نجانے کیا بات آئی کہ اس نے اپنے نوٹوں کے ہار اتار اتار کر نشست کے نیچے رکھ دیے اور پھر اپنی مالائیں اور گھنگھیاں وغیرہ اتارنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہو سائیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بارش میں نہاؤں گا۔" اس نے لہک کر کہا۔

"اس وقت کسی پاگل پن کی گنجائش نہیں۔ بس چپ بیٹھے رہو۔" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

"اوئے گھامڑ تم بارش میں نہانے کو پاگل پن کہتے ہو مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارا اپنا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تمہیں بتا دوں تو تم رات کو تھوڑی سی سبز پانی میں بھگو دیا کرو' صبح بادام کے خول اتار کر کھایا کرو' دماغ تیز ہو جائے گا' نہیں اورک بھون کر اس میں تھوڑا سا روح افزا شربت ملا کر پھر آئس کریم کو پیاز کا تڑکا لگا کر اورک میں ملا دیا کرو۔ یہ ایسا زبردست سالن تیار ہو گا کہ چار دن کھانے سے تمہارا دماغ لکشمی چوک کی طرح روشن ہو جائے گا۔"

اول فول بکنے کے دوران میں سائیں نے اپنی سبز گدڑی بھی اتار دی تھی۔ اب اس کے میلے کچیلے بدن پر ایک نیکر نما جانگیا تھا۔ سائیں کے رویے کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ واقعی دروازہ کھول کر چلتی جیپ سے چھلانگ لگا دے۔ شکر تھا کہ جیپ میں ایسا سسٹم موجود تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ سے ہی چاروں دروازے لاک کیے جا سکتے تھے۔ میں نے دروازے لاک کر دیے اور پروفیسر کو اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے سامنے رہے تاکہ سائیں اسی کھڑکی میں سے کودنے کی کوشش نہ کرے۔

بہرحال سائیں کے کودنے یا نہ کودنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ بارش کی وجہ سے زمین پر پھسلن ہو چکی تھی۔ اس پھسلن نے ڈرائیونگ کو مشکل تر کر دیا تھا۔ ایک گڑھے کے کنارے سے گزرتے ہوئے میں راستے کی ڈھلوان پر ٹائروں کی گرفت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکا۔ میرا خیال تھا کہ

کنارے سے ایک ڈیڑھ فٹ ادھر ہی گاڑی کو موڑ لوں گا۔ مگر عین موقع پر گاڑی پھسلی اور ہم سر کے بل آٹھ دس فٹ گہرے گڑھے میں جا گرے۔

چند لمحوں کے لیے تو کچھ پتا نہیں چلا کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے۔ بس یہی لگا کہ ایک دو سیکنڈ ہوا میں معلق رہنے کے بعد ہم دھماکے سے کہیں گرے ہیں۔ حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے سائیں کو اپنے کندھوں پر سوار پایا۔ پروفیسر اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی۔ کسی وجہ سے ایکسی لریٹر دب گیا تھا اور انجن احتجاجی انداز میں چیختا چلا جا رہا تھا۔ ننگ دھڑنگ سائیں عالی نے اپنے دونوں بازو میری گردن میں حائل کر دیے تھے اور بیر تسمہ پا ہی کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔

میں نے بمشکل اگنیشن تلاش کر کے انجن بند کیا اور لائٹس وغیرہ آف کیں۔ اب مسئلہ جیپ سے باہر نکلنے کا تھا۔ جیپ ناک کی سیدھ میں گرنے کے بعد پہلو کے بل الٹ گئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے گڑھے کی کیچڑ اندر داخل ہو رہی تھی۔ بائیں طرف کا دروازہ کھول کر پہلے پروفیسر باہر نکلا۔ اس کے بعد کہہ سن کر میں نے سائیں عالی کو اپنے کندھوں پر سے اتارا اور باہر نکلنے میں سائیں کی مدد کی۔ خود باہر آنے سے پہلے میں نے ایک ٹارچ اور دونوں رائفلیں باہر پھینک دیں۔ اس کے بعد مجھے سائیں کے نوٹوں اور مالاؤں وغیرہ کا خیال آیا۔ اس حادثے سے تھوڑی دیر قبل سائیں نے یہ سب کچھ اتار کر جیپ کی نشست کے نیچے رکھ دیا تھا۔ کوشش کر کے میں نے یہ اشیا بھی نکال لیں۔

ابھی میں بمشکل جیپ سے نکلا ہی تھا کہ دور کہیں عقب میں انجنوں کا منحوس شور سنائی دیا۔ یقیناً یہ ٹرسٹ کی گاڑیاں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ انہوں نے گیلی زمین پر ہمارا ٹریک ڈھونڈ لیا ہو اور اب اس پر چلتے اسی گڑھے کی طرف آ رہے ہوں۔ ضروری تھا کہ ہم جلد از جلد اس مقام سے دور ہٹ جائیں۔

دونوں رائفلیں تو بیکار ہو چکی تھیں۔ ہمارا اکلوتا ہتھیار اس وقت وہی ۳۸ بور کا ریوالور تھا جس میں چار گولیاں باقی تھیں۔ اس ریوالور کو موسلا دھار بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے پروفیسر کی پھٹی ہوئی قمیص استعمال کی۔ ریوالور کو اچھی طرح لپیٹ کر میں نے اپنی قمیص کے اندر رکھ لیا۔ اس کے بعد انجان راستے پر ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور رخ کدھر ہے۔ ہر طرف شائیں شائیں کرتی بارش تھی اور تاریک جنگل تھا۔ میں نے سنگین چڑھی رائفل کو نیزے کی طرح تھام رکھا تھا اور کسی بھی ممکنہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ یہ ممکنہ خطرہ گارڈز کی طرف سے ہو سکتا تھا' اس کے علاوہ جنگل کے باسیوں یعنی جانوروں کی طرف سے بھی ہو سکتا تھا۔

دس پندرہ منٹ تک مسلسل چلنے کے بعد ہمیں کچھ اطمینان ہوا۔ گڑھے کے قریب جیپوں کی جو آواز ہم نے سنی تھی وہ اب کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ شاید جس طرح ہماری جیپ بریک ڈاؤن ہوئی تھی اسی طرح ٹرسٹ کی جیپوں نے بھی اس موسلا دھار بارش اور دشوار راستے پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا یا پھر وہ لوگ کسی اور سمت نکل گئے تھے۔ ہم ایک ہی رخ پر قریباً ایک گھنٹا چلتے رہے لیکن اگر ہمارا خیال تھا کہ ہم اس جنگل سے باہر نکل آئیں گے تو یہ غلط ثابت ہوا۔ اس کے برعکس ہم گھنے اور گنجان درختوں میں چلے گئے تھے۔ جنگل کی ساخت اور گرد و پیش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جنگل اسی جنگل کا حصہ ہے جو موگا سا بستی کے نواح سے شروع ہوتا ہے۔ اس جنگل کی خصوصیت خطرناک دلدلی گڑھے اور چوڑے پتوں کے درخت تھے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے اس جنگل میں بھی دلدلی گڑھوں کا سراغ ملنا شروع ہو گیا تھا۔ میں سب سے آگے جا رہا تھا۔ میرے عقب میں ننگ دھڑنگ سائیں عالی اور اس کے عقب میں پروفیسر تھا۔ دلدلی گڑھوں کے ڈر سے میں نے ٹارچ جلائی تھی اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم قیامت تک اسی طرح چلتے رہیں گے اور یہ جنگل ختم نہیں ہو گا۔ پروفیسر کے طور اطوار سے تھکن کا اظہار ہونے لگا تھا۔ اس کی گردن زخمی تھی اور باقی جسم پر بھی خراشیں تھیں۔ سائیں عالی کا "بارش میں نہانے کا شوق" بھی جی بھر کر پورا ہوا تھا اور اب شاید وہ بھی اس سفر کا اختتام چاہتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ مسلسل بارش کے سبب ہم سردی محسوس کرنے لگے تھے اور کسی وقت تو باقاعدہ کانپ جاتے تھے۔

اچانک بارش کے شور میں ایک اور مدھم شور شامل ہوا اور ہم چونک گئے۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے' وہیں ساکت کھڑے رہ گئے۔ یوں لگا تھا جیسے کہیں قریب ہی کچھ لوگ موجود ہوں اور دگا رہے ہوں۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ شاید یہ سمعی واہمہ تھا۔ میں نے پروفیسر کو وہیں سائیں کے پاس کھڑا رہنے کا اشارہ دیا اور خود محتاط قدموں سے آواز کی طرف بڑھا۔ سنگین چڑھی رائفل میں نے دونوں ہاتھوں میں

تھام رکھی تھی۔ ایک مقام پر پہنچ کر میں چکرا گیا۔ آواز بالکل قریب سے آرہی تھی مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا پھر میری نگاہ چند میٹر دور ایک درخت پر پڑی۔ یہ ایک تناور درخت کا پرانا تنا تھا۔ قریباً چھ فٹ قطر کا یہ تنا جڑوں سے کٹا ہوا تھا اور نجانے کتنے زمانوں سے یہیں جنگل کی نرم زمین میں دھنسا پڑا تھا۔ میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ آواز اسی تنے میں سے آرہی ہے۔ تنے کی لکڑی اندر سے گل سڑ چکی تھی اور یہ کھوکھلا ہو گیا تھا۔ یقیناً کچھ لوگ اس کے اندر سمٹ سمٹا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ (تنا افقی رخ سے زمین پر پڑا تھا)

میں واپس پروفیسر اور سائیں عالی کے پاس آیا۔ اس وقت ہمیں پناہ اور رہنمائی کی شدید ضرورت تھی۔ عقل مندی یہی تھی کہ اس پرخطر جنگل میں گارڈز کے خوف سے ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے کہیں پناہ لی جائے اور موسم ٹھیک ہونے تک رکا جائے۔ پروفیسر نے میری رائے کی تائید کی۔ سائیں عالی کے لاکھوں ڈالر اور پاؤنڈ ابھی تک میرے پاس تھے۔ میں نے نوٹوں کے ہاروں اور مالاؤں وغیرہ کو فلالین کے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ یہ کپڑا میں نے جیپ کے اندر سے ہی حاصل کیا تھا۔ ان نوٹوں کو ساتھ رکھنے کے بجائے میں نے وہیں چھپا دینا مناسب سمجھا۔ ایک گھنے درخت کے نیچے کسی جانور نے چھوٹا سا گڑھا کھود رکھا تھا، میں نے فلالین کا کپڑا اس کے اندر رکھ کر اوپر سے گیلی مٹی ڈال دی۔

اس کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں کچھ مقامی لوگ ایک انوکھی پناہ گاہ میں موجود تھے۔ دیوہیکل تنے کے اندر گھسنے کے راستے کو گھاس پھونس سے بند کیا گیا تھا لیکن جب اسی دوران میں بجلی چمکی تو معلوم ہوا کہ گھاس پھونس تو یونہی تنے کے قریب موجود تھی، اصل رکاوٹ لکڑی کا تختہ تھا جو اس تنے کے مکینوں کے لیے دروازے کا کام دے رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس "دروازے" پر دستک دی۔ تاہم اس سے پہلے میں ریوالور اپنے ساتھی پروفیسر اللہ دتا کے حوالے کر چکا تھا اور اسے ہدایت کر دی تھی کہ موقع پڑنے پر وہ گولی چلانے سے دریغ نہ کرے۔

دستک ہوتے ہی گانے بجانے کی آوازیں یکسر تھم گئیں۔ میں نے دوبارہ اور سہ بارہ دستک دی۔ پروفیسر اس انداز سے کھڑا تھا کہ ریوالور سائیں عالی کے عقب میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ تیسری دستک کے بعد کھٹ پٹ ہوئی اور وہ تختہ ہٹ گیا جس نے تنے کے خلا کو بند کر رکھا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ ایک عمر رسیدہ حبشی دہرا ہو کر تنے کے خلا سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ایک جوان اور تنومند حبشی تھا، اس کے ہاتھ میں اس علاقے کا روایتی ہتھیار نیزہ نظر آرہا تھا۔ تنے سے باہر آنے والے دونوں افراد گھبرائے ہوئے تھے اور ان کے انداز میں جارحیت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہمارے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑ گئے۔

پروفیسر تھوڑے بہت مقامی الفاظ بول لیتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر عمر رسیدہ شخص سے کہا کہ ہم اس جنگل میں راستہ بھٹکے ہوئے ہیں اور رہنمائی چاہتے ہیں۔ جواب میں عمر رسیدہ شخص نے بھی کچھ کہا۔ چند جملوں کے تبادلے کے بعد یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ عمر رسیدہ شخص ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتا ہے۔ وہ ہم کو اندر لے آیا۔ یہاں ایک چھوٹے سے لیمپ کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں ہمیں ایک اور سیاہ فام نظر آیا۔ یہ بھی داخلی راستے کے بالکل قریب موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی توڑے دار بندوق تھی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ جب دونوں سیاہ فام ہم سے بات چیت کے لیے باہر نکلے تھے تو یہ شخص توڑے دار بندوق کے ساتھ ہمیں نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی بندوق بردار نے تنے کا داخلی راستہ تختے کے ساتھ بڑی احتیاط سے بند کر دیا۔ تختے کے اردگرد سے درزیں بند کرنے کے لیے اس نے ایک پرانا کپڑا وہاں ٹھونس دیا۔

تنے کا یہ عجیب و غریب خلا اندر سے قریباً بیس فٹ لمبا اور چار پانچ فٹ قطر کا تھا۔ آگے جا کر یہ خلا تنگ ہو گیا تھا اور پھر برائے نام رہ گیا تھا۔ اس خلا میں تین مردوں کے علاوہ دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ان میں ایک درمیانی عمر کی تھی جبکہ دوسری کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ دونوں شکل و صورت کی اچھی تھیں۔ درمیانی عمر کی سیاہ فام تھی جبکہ چھوٹی عمر کی مصر یا لیبیا وغیرہ کی لگتی تھی۔ انہوں نے مقامی طرز کے لمبے چوغے پہن رکھے تھے۔

ہم اندر آگئے تو بوڑھے نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا "آپ لوگ بھیگے ہوئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ہم لیمپ بجھا دیتے ہیں، آپ اپنے کپڑے اتار کر نچوڑ لیں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں اندر آکر سردی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا لباس بتا رہا ہے کہ آپ بہت دیر سے بھٹک رہے ہیں۔ آپ کو بھوک وغیرہ لگی ہوگی۔"

"آپ نے پناہ دے دی یہی بہت ہے، آپ مزید تکلف نہ کریں۔" میں نے جواب دیا۔

عمر رسیدہ شخص نے درمیانی عمر کی عورت کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھی اور ہمارے لیے کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈنے لگی۔

عورت کا جسم فربہ تھا، جیسا بچے کی پیدائش سے قبل ماؤں کا ہوتا ہے۔ اسے مختصر خلا میں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اور وہ کافی مشکل میں نظر آتی تھی۔

عمر رسیدہ شخص نے کہا "میرا نام واماں ہے۔ یہاں سے ڈیڑھ دن کی مسافت پر ایک 'بستی' "سی بی لی" ہے۔ میں وہاں کا رہنے والا ہوں۔ میرے یہ دونوں ساتھی بھی وہیں کے ہیں۔ اور... اور یہ دونوں عورتیں بھی۔" اس نے آخری فقرہ یوں ادا کیا جیسے اپنی کوئی غلطی درست کر رہا ہو۔

بات ختم کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا جیسے توقع کر رہا ہو کہ اب میں اپنا تعارف کرواؤں گا لیکن جب میں خاموش رہا تو اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "ہم ایک ضروری کام سے بڑے قصبے تک گئے تھے۔ واپس جا رہے تھے کہ یہاں شدید بارش نے آلیا۔ ہم نے اس درخت میں پناہ لے لی۔ دراصل اس جنگل میں اکثر بجلی بھی گرتی ہے اور بارش میں سفر جاری رکھنا خطرناک ہے۔"

مجھے اور پروفیسر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ بوڑھا بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ جواب میں ہم نے بھی ایک فرضی سا تعارف کرا دیا۔ میں نے کہا "ہم انڈین ہیں اور گوبالے شہر میں موجود ایک انڈین کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ ہمیں دو ہفتے کی چھٹی ملی تھی۔ سیر اور شکار کے لیے اس علاقے میں نکل آئے۔ ہمارا کیمپ یہاں سے کافی دور ہے۔ آج رات ڈیڑھ دو بجے کے لگ بھگ جنگلی کتوں کے ایک گروہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بھاگتے ہوئے ہماری جیپ گڑھے میں گر گئی اور ہم مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچ سکے۔"

بوڑھے واماں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا "اس علاقے میں جنگلی کتوں نے آج کل واقعی بڑا اودھم مچا رکھا ہے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ بچ نکلے، ورنہ یہ تو بیس میل تک اپنے شکار کا پیچھا کرتے ہیں، ابھی کچھ دن پہلے ایک انگریز ڈاکٹر اور نرس ان کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔"

بوڑھا واماں یقیناً ڈاکٹر رائٹ اور نرس ریٹا کا ذکر کر رہا تھا۔

بوڑھے نے لیمپ کی روشنی میں دھیان سے میرے اور پروفیسر کے زخموں کو دیکھا اور ہدایت کی کہ ہم ان زخموں کے حوالے سے بے پروائی ہرگز نہ برتیں۔

یہ جاننے کے بعد کہ ہم انڈین ہیں، بوڑھے کی دلچسپی ہم میں بڑھ گئی تھی۔ اس نے جنگلی کتوں کے ساتھ ہماری مڈبھیڑ کا ذکر تفصیل سے سنا اور گاہے گاہے سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کے دوران میں بوڑھے کے باقی دونوں ساتھی یکسر خاموش رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا وہ صرف مقامی زبان بولتے تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے بوڑھے کی نگاہ گاہے گاہے سائیں پر بھی پڑتی تھی۔ سائیں کے جسم پر فقط ایک جانگیا تھا اور وہ اپنے بھیگے ہوئے لمبے بالوں اور داڑھی کے ساتھ عجیب الخلقت نظر آتا تھا۔ واماں نے پوچھا "آپ کے ساتھ یہ جو بھائی صاحب ہیں یہ تو شاید بات ہی نہیں کرتے ہیں۔"

"بس یہ ذرا خاموش طبع ہیں۔ جیسے آپ کے یہ دونوں ساتھی خاموش طبع ہیں۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

اسی دوران میں درمیانی عمر کی عورت ہمارے لیے کچھ کھجوریں اور زیتون کے تیل میں بھنے ہوئے چنے لے آئی۔ منہ کے ذائقے کے لیے میٹھا پنیر بھی ساتھ تھا۔ بارش میں طویل بھاگ دوڑ کے سبب ہماری بھوک چمکی ہوئی تھی۔ جو کچھ بھی پیش کیا گیا تھا ہم نے تناول فرما لیا۔ پیٹ میں کچھ رونق ہوئی تو سردی بھی کم ہو گئی۔ اسی دوران میں چھوٹی عمر کی لڑکی کسی کام سے اٹھی تو میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ بھی حاملہ ہے۔ اس کا چہرہ دبلا پتلا تھا لیکن جسم مخصوص انداز میں بھاری تھا۔ پتا نہیں کہ یہ کوئی اتفاق تھا یا اس میں بھی کوئی راز تھا کہ یہاں موجود دونوں عورتیں امید سے تھیں۔ میں نے دھیان سے لڑکی کا چہرہ دیکھا، وہ غمگین اور مصیبت زدہ نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر سیاہی مائل داغ بھی نظر آئے۔ یہ داغ مار پیٹ اور تشدد کا نتیجہ ہو سکتے تھے۔ نجانے کیوں ان دونوں عورتوں کو دیکھ کر مجھے نرسٹ میں موجود ان سیکڑوں ہزاروں مرد و زن کی یاد آئی جو ان سنگلاخ دیواروں میں قید تھے اور ایسے ہی مصیبت زدہ دکھائی دیتے تھے۔ ان عورتوں کی طرح ان کے چہروں پر بھی محکومیت کی کہنہ چھاپ دور ہی سے نظر آتی تھی۔ اچانک میری نگاہ ایک چیز پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ چھوٹی عمر کی لڑکی نے لیمپ کے قریب بیٹھنے کے لیے اپنا چوغہ تھوڑا سا اٹھایا تو اس کے ٹخنے سے اوپر کا حصہ ننگا ہو گیا۔ مجھے اس حصے پر ایک منحوس داغ نظر آیا۔ یہ آہنی بیڑی کا داغ تھا۔ وہی بیڑیاں جو نرسٹ میں سرکش غلاموں کو آداب غلامی سکھانے کے لیے پہنائی جاتی تھیں۔ اس داغ میں انسانیت کی تذلیل... بے حرمتی کی ان گنت کہانیاں چھپی رہتی تھیں۔ یہ ایک ایسی بیماری کا داغ تھا جو با اثر لوگوں کو لاحق ہوتی ہے لیکن اس کے اثرات لاچار اور محکوم طبقوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ٹخنے پر یہ نشان دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ ان دونوں

عورتوں کا تعلق زسٹ سے ہے۔ بوڑھے داماں اور اس کے ساتھیوں کے حوالے سے جو خوشگوار تاثر ذہن نے قبول کیا تھا وہ معدوم ہوتا محسوس ہوا۔

نجانے بوڑھے داماں کو اس بات میں کیوں دلچسپی تھی کہ ہم انڈین ہیں۔ اس کی گفتگو ہمارے انڈین ہونے کے اردگرد ہی گھوم رہی تھی۔ آخر تھوڑی دیر بعد یہ عقدہ کھلتا ہوا محسوس ہوا۔ بوڑھے نے لیمپ کی روشنی میں دھیان سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی گھنی سفید بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھوں میں عمر کا تجربہ نظر آتا تھا۔ وہ بولا "کیا تم نے کسی ایسے شخص کا نام سنا ہے جسے علاقے میں صحرائی درویش کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"میں... آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

وہ گہری سانس لے کر بولا "اس کا مطلب ہے کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

میں نے کہا "آپ کچھ وضاحت کریں تو شاید میں بتا سکوں۔"

وہ بے خیالی میں لیمپ کے شعلے کو گھورتے ہوئے بولا "صحرائی درویش کا لقب اس علاقے میں ایک عجیب شخص کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ انڈین شخص حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس کے پاس بے پناہ دولت بھی ہے' اور اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی غریب پروری ہے۔ جو لوگ اس سے ملتے ہیں' اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور دل و جان سے اس کے عقیدت مند بن جاتے ہیں۔ چونکہ تم بھی انڈین ہو لہٰذا میرا خیال تھا کہ شاید تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہو؟"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا "... آپ کا اندازہ کچھ ایسا غلط نہیں ہے بزرگوار۔ ہم صحرائی درویش سائیں عالی صاحب کو جانتے ہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور وہ سراپا تجسس بن گیا "کیا تم ہمیں ان کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے۔" اس نے کہا۔

"مجھے جو کچھ معلوم ہے میں ضرور بتاؤں گا' لیکن چاہوں گا کہ پہلے آپ کو جو کچھ معلوم ہے وہ بتائیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

داماں بولا "میں نے تمہیں بتایا ہے نا... کہ ہماری بستی یہاں سے ڈیڑھ دو دن کی مسافت پر ہے۔ یہ علاقہ سفر کے لیے دشوار ترین ہے۔ ایک پیدل شخص کو ہماری بستی سے نزدیکی بستی مرگاسا تک پہنچنے کے لیے ڈھائی دن لگتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ شخص راستوں کا شناور ہو۔ کہنا یہ ہے کہ ہماری بستی اردگرد سے کٹی ہوئی ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں دس پندرہ افراد ہی بستی سے باہر گئے ہوں گے اور شاید اتنے ہی آئے ہوں گے۔ بس انہی لوگوں کی زبانی صحرائی درویش کے بارے میں کچھ معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ لوگ صحرائی درویش کے بارے میں بڑی خوش آئند باتیں کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ قتل ہونے والے عظیم لاوی سردار بوغات کی روح صحرائی درویش کے جسم میں منتقل ہو گئی ہے' اور علاقے کے بے کس لوگوں کے لیے صحرائی درویش کے دل میں جو محبت ہے وہ دراصل سردار بوغات ہی کی محبت کا سایہ ہے۔ اس کے علاوہ..." بوڑھا داماں کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"ہاں ہاں بتائیں۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

وہ بولا "کچھ لوگ تو صحرائی درویش کو دیوتا کا روپ بھی قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک دیوتا کا نام زورے ہے۔ زورے دیوتا کو آزادی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ زورے کا کام انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور محکومی سے آزاد کرانا ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحرائی درویش اگر اتنی دور سے اٹھ کر اس دور دراز علاقے میں پہنچا ہے تو اس میں زورے دیوتا کی ہی کرامات ہے۔"

"کیا تمہاری بستی میں سے کسی نے صحرائی درویش کو دیکھا بھی ہے؟"

"نہیں خود تو نہیں دیکھا لیکن سنا ضرور ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ مالے بستی کے قریب پرانے کھنڈرات میں رہتا ہے۔ اس کے گلے میں نوٹوں کے ہار اور مالائیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی کرامات سے کھنڈر کو بھی خوب صورت شہر کی طرح سجا دیا ہے اور سفید چمڑی والی حسین ترین لڑکیاں اس کی خدمت کے لیے موجود رہتی ہیں۔"

"آپ کی معلومات کافی حد تک درست ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ... تم... ان سے ملے ہو؟"

میں نے کہا "بالکل مل چکا ہوں... بلکہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم اس وقت بھی ان ہی سے ملنے جا رہے ہیں..." داماں حیرت زدہ رہ گیا۔

"اور وہ جو شکار کی بات..." اس نے ذرا توقف سے پوچھا۔

"وہ بھی صحیح تھی۔ شکار کے فوراً بعد ہمارا پروگرام صحرائی درویش یعنی سائیں عالی کی طرف روانہ ہونے کا تھا

ہماری شدید خواہش تھی کہ ان کے لیے شکار کیا ہوا ہرن لے کر جائیں۔"

بوڑھے داماں کے چہرے پر دبے دبے جوش کے علاوہ عجیب سی ڈرامائی کیفیت بھی نظر آنے لگی۔ جیسے بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا "عجیب بات ہے کہ ہماری منزل ایک ہی ہے۔ ہم بھی سائیں صاحب ہی کی طرف جا رہے تھے۔"

یہ بات کہنے کے بعد داماں خاموش سا ہو گیا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول گیا ہے۔ اچانک اس کے ذہن میں کوئی نئی بات آئی اور وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ آپ پورے بھروسے کے ساتھ ہم سے بات کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

داماں پرسوچ انداز میں بولا "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ ہم مشرق کی طرف جا رہے ہیں اور آپ مشرق سے مغرب کی طرف اور ہم سارے ایک ہی شخص کی طرف جا رہے ہیں۔"

"اس کی وضاحت بھی میں کر دیتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سائیں صاحب وہاں نہیں ہیں جہاں آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ مالے کے نواحی کھنڈرات کی طرف جا رہے ہیں لیکن سائیں صاحب اب آپ کو کہیں اور ملیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ سائیں صاحب کہیں اور چلے گئے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کہاں؟" بوڑھے داماں نے بے قراری سے پوچھا۔

میں نے تنے کی اندرونی سطح سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "بزرگوار! میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا' بلکہ ہم آپ کو اپنے ساتھ سائیں صاحب کے پاس لے کر جائیں گے لیکن اس سے پہلے مجھے تھوڑی سی وضاحت درکار ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' سائیں عالی جو اب تک آنکھیں بند کیے لیٹا تھا نعرہ بلند کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس کے انداز نے دونوں عورتوں کو ڈرا دیا اور وہ اپنے گوشے میں کچھ اور سمٹ گئیں۔ سائیں مجھ سے مخاطب ہوا اور پھنکار کر بولا "اوئے شفیع محمد! یہ کیا چکر چلا رہا ہے تو؟ بس اپنی ہی بکواس کرتا جا رہا ہے۔ کیا میں نہیں ہوں یہاں؟ میری بھی کوئی حیثیت ہے' میری بھی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرا تعارف کراؤ ان لوگوں سے۔ انہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ میں کون ہوں۔"

پھر سائیں بوڑھے داماں سے براہ راست مخاطب ہوا۔ انگریزی میں بولا "ان لوگوں نے ٹھیک سے میرا تعارف نہیں کرایا ہے۔ ان سے پوچھو کہ میں کون ہوں۔"

داماں سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ سائیں خواہ مخواہ معاملہ خراب کر رہا تھا۔ ہم نہایت غیر یقینی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ اس بارش زدہ جنگل میں زسٹ کے گارڈز ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے' آئندہ نجانے کیا پیش آنا تھا۔ سائیں کی شناخت چھپی رہتی تو زیادہ بہتر تھا۔ میں نے داماں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہا "یہ ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی شکار پر نکلے ہوئے ہیں۔ بالکل بے ضرر شخص ہیں۔ بس ذرا غصیلے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ فی الحال ان کا اتنا تعارف ہی کافی ہے۔"

"فی الحال کا کیا مطلب ہے؟" سائیں پھنکارا "اور تم ایسے فیصلے کرنے والے ہوتے کون ہو۔ میرا ٹھیک تعارف کرواؤ' ورنہ میں خود کراتا ہوں۔"

"اچھا کروا دو' اپنا پورا شجرہ نسب بیان کرو۔" میں نے بھنا کر کہا۔

سائیں نے حق ہُو کا نعرہ لگایا' پھر اشارے سے بوڑھے داماں کو اپنے پاس بلایا اور بولا "اوئے مردود! تو سائیں عالی کے لیے تڑپ رہا ہے اور اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہا ہے لیکن تجھے پتا نہیں کہ سائیں کا سایہ تیرے بالکل پاس موجود ہے۔"

"شک... کیا مطلب جی؟" داماں نے شکستہ انگریزی بولا۔

"تو جاننا ہے کہ میں کون ہوں؟"

"ن... نہیں؟"

"میں سائیں جی کا خاص الخاص مرید ہوں۔ تم مجھے ان کا نائب بھی سمجھ سکتے ہو۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے اگر اس وقت مجھے اوجڑی کا ملک شیک مل جائے اور میری طبیعت بحال ہو جائے تو میں تمہیں ابھی ایک آدھ کرامت دکھا سکتا ہوں۔"

"آ... آپ سائیں جی کے ساتھی ہیں۔" داماں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

"بالکل اصلی۔ خالص دیسی گھی کی طرح۔"

میری طرح یقیناً پروفیسر نے بھی اطمینان کی سانس لی ہوگی۔ سائیں نے پہلے ہمیں چکما دیا تھا پھر داماں کو چکما دے

گیا تھا۔ راماں نے وضاحت طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ درست کہہ رہے ہیں؟"

پروفیسر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ہاں بزرگوار! یہ درست ہی فرما رہے ہیں۔ دراصل ابھی ہم ان کی شناخت چھپانا چاہ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کچھ مسائل ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ فی الحال سائیں جی یا ان کے کسی قریبی ساتھی کے بارے میں عام لوگوں کو پتا چلے۔"

بوڑھے واماں نے مجھے گہری نظروں سے دیکھ کر کہا "کہیں آپ ٹرسٹ والوں کے ڈر سے تو ایسا نہیں کر رہے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں صاحب اور ٹرسٹ والوں کے درمیان کچھ ان بن ہے۔ شاید سائیں جی کے دو مرید لارسیوں کی مدد کر رہے ہیں جس کے سبب ٹرسٹ والوں کو پریشانی ہے۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات سمجھیں۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

بوڑھے راماں کے چہرے پر ہمارے لیے اور سائیں عالی کے لیے بے تحاشا عقیدت برسنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں اپنے ساتھیوں سے بھی چند باتیں کیں۔ یقیناً یہی انکشاف کیا ہوگا کہ عظیم المرتبت صحرائی درویش سائیں جی کے ایک مرید خاص اس کھوکھلے تنے کے اندر ہمارے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔

یہ اطلاع پا کر واماں کے ساتھیوں کے چہروں پر بھی ہیجانی کیفیت نمودار ہو گئی۔ وہ سائیں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ آٹھواں عجوبہ ہو پھر یکایک راماں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ سائیں کے میلے کچیلے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ سائیں ادائے بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ واماں کے بعد اس کے دونوں ساتھی باری باری اٹھے اور بڑی عقیدت سے جھک کر سائیں کے پاؤں پر سر رکھا۔ فرطِ جذبات سے وہ دونوں لرز رہے تھے۔

اس کے بعد واماں نے دونوں عورتوں کو اشارہ کیا۔ وہ واماں کے پاس آ گئیں۔ واماں نے ان سے چند باتیں کہیں۔ اس کے بعد دونوں عورتوں نے بھی باری باری جھک کر سائیں کی قدم بوسی کی اور جھک کر چلتی ہوئی الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئیں۔ تنے کے تنگ خلا میں ان عورتوں کے لیے کمان کی طرح دوہرا ہو کر چلنا بڑا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ ان کی جسمانی حالت ہی ایسی تھی کہ جھک کر چلنا ان کے لیے دشوار تھا۔

اس انکشاف کے بعد کہ ہمارے ساتھ سائیں عالی کا ایک "مرید خاص" بھی سفر کر رہا ہے، واماں اور اس کے ساتھی ریشہ خطمی ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں کے علاوہ ان کی حرکات و سکنات سے بھی ہمارے لیے غیر مشروط عقیدت کا اظہار ہونے لگا تھا۔ تنے سے باہر بارش کا شور کچھ دیر کے لیے مدھم ہونے کے بعد پھر تیز ہو گیا تھا۔ گاہے گاہے بجلی بھی کڑکتی تھی۔ گھنے جنگل کے عین بیچ یہ بڑی انوکھی پناہ گاہ تھی اور یہ بڑی طلسمی رات تھی۔

واماں نے مجھ سے مخاطب ہو کر بڑی ملائمت سے کہا "آپ نے ابھی مجھ سے کوئی وضاحت مانگنا چاہی تھی؟"

"ہاں۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے ذہن کو مجتمع کیا "میں آپ سے ان دونوں عورتوں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ان میں سے ایک کے ٹخنے پر ابھی ایک خاص نشان دیکھا ہے۔"

"کیسا نشان؟" واماں نے پوچھا۔

"آہنی بیڑی کا نشان۔ میری معلومات کے مطابق ایسے نشانات ان لوگوں کے پاؤں پر ملتے ہیں جن کو ماریا ٹرسٹ کے زیرِ زمین قید خانے کی تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔"

واماں کے جھریوں بھرے چہرے پر لرزش سی آ کر گزر گئی۔ وہ ذرا توقف کے بعد بولا "آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ یہ عورتیں ٹرسٹ سے ہی لائی گئی ہیں۔ ٹرسٹ کے ایک ذمے دار شخص نے یہ عورتیں ہمیں انعام میں بخشی ہیں۔"

"کیسا انعام؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"ہماری کارکردگی کا انعام۔ دراصل ہم تینوں نے ٹرسٹ والوں کے لیے کچھ کام کیا تھا۔"

"کیا آپ اس کام کے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گے؟" میں نے کہا۔

راماں نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے اس نے ہم سے کچھ بھی نہ چھپانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ بولا "میری حیثیت اس علاقے کے سب سے پرانے اور تجربہ کار فراش کی ہے۔ فراش کا لفظ آپ کے لیے اجنبی ہوگا۔ مقامی زبان کے اس لفظ کا مطلب گائیڈ یا راہبر ہے۔ یہ علاقے جن میں ہم اور آپ سفر کر رہے ہیں خطرناک دلدلوں اور جان لیوا بھول بھلیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جوں جوں ہم مغرب اور شمال کی طرف جائیں راستے مزید خطرناک ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے علاقوں میں ماہر فراش یعنی گائیڈ کے بغیر سفر کرنا موت کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہ میرے دونوں ساتھی میرے شاگرد بھی ہیں اور اب یہ بھی علاقے کے ماہر ترین گائیڈ شمار ہوتے ہیں۔ چند روز پہلے ہماری خدمات ٹرسٹ کے ایک اہم شخص

نے حاصل کی تھیں۔ اس کے ساتھی اسے جانسن کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ شخص چند گھڑ سواروں کے ساتھ طویل مسافت طے کر کے ہماری بستی میں داخل ہوا تھا۔ یہ لوگ کسی کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ جس کا تعاقب کیا جا رہا تھا وہ ٹرسٹ کے گھڑ سواروں کو جل دے کر جنگل میں غائب ہو گیا تھا۔ ٹرسٹ کے گھڑ سواروں کے لیے اس شخص کو پکڑنا بے حد ضروری تھا۔ اسی کام کے لیے انہیں میری اور میرے ساتھیوں کی مدد درکار تھی۔ میں آپ کو اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔ ٹرسٹ والوں سے ہمیں براہ راست کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان سے بہت فاصلے پر ہیں، بہرحال دلی طور پر ہم ان لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہماری بستی میں ٹرسٹ اور ٹرسٹ والوں کے بارے میں بہت سی کہانیاں بھی مشہور ہیں۔ اس وقت ان کہانیوں کا تذکرہ فضول ہے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ ٹرسٹ والوں کو برا سمجھنے کے باوجود ہم موقع پڑنے پر ان کی حکم عدولی کا خیال دل میں نہیں لا سکتے۔ جانسن اور اس کے ساتھیوں نے جب مجھ سے یہ کہا کہ ایک بندے کی تلاش کے لیے میری مدد کی ضرورت ہے تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ ہم نے جانسن اور اس کے تین ساتھیوں کے ساتھ مسلسل دو دن جنگل میں گزارے اور آخر ٹرسٹ کے مفرور کو پکڑنے میں کامیاب رہے۔"

"کیا آپ اس مفرور کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"وہ ٹرسٹ کا ہی کوئی ملازم ہے۔ شاید گارڈز کا کوئی انچارج ہے۔"

"کوئی جرم ہوا تھا اس سے؟"

"ٹرسٹ والوں کی نظر میں وہ جرم ہی تھا۔" بوڑھے واماں نے چند لمحے توقف کیا اور بولا "شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ ٹرسٹ کا بادشاہ جسے براؤن کہا جاتا ہے ان دنوں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس کا بچہ اغوا ہو گیا ہے۔ کچھ اس قسم کی افواہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ وہ بچہ صحرائی درویش کے ان دو ساتھیوں نے اغوا کیا ہے جو لارسیوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے ملتی جلتی اطلاع ہمیں بھی ملی ہے۔ وہ بچہ غالباً موگاسا میں ہے۔ جہاں لارسیوں اور ٹرسٹ کے گارڈز میں چند خون ریز جھڑپیں بھی ہو چکی ہیں۔"

"جی ہاں۔" واماں نے تائید کی، پھر اپنی گھونگریالی داڑھی کھجا کر بولا "جو بات ہمارے علم میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ بچہ اغوا کرنے والوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر بچے کو چھڑانے کی کوشش کی گئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی چچا زاد بہن جو ایک جوان لڑکی ہے وہ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ ٹرسٹ کے گارڈز نے موگاسا بستی کو گھیرے میں لے رکھا ہے تاہم وہ بستی سے چند سو قدم کے فاصلے پر ہیں۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے کیونکہ اغوا کرنے والوں نے دھمکی دے رکھی ہے کہ گارڈز اس سے آگے آئیں گے تو بچے اور لڑکی کا نقصان ہو جائے گا۔"

پروفیسر نے کہا "ان میں سے کچھ باتیں تو ہمیں معلوم ہیں۔ آپ اس مفرور کا ذکر کر رہے تھے جسے آپ نے پکڑا۔"

"ہاں میں اسی طرف آ رہا تھا۔" راماں نے سر ہلایا "دراصل وہ شخص کنگ صاحب کی بات نہ ماننے کے لیے مجرم ٹھہرا ہے۔ ٹرسٹ کے گارڈز نے اپنے اور بستی کے درمیان چند سو گز کا فاصلہ برقرار رکھا ہوا ہے۔ اوپر سے بھی ہدایت ہے کہ اس حکم پر سختی سے عمل کیا جائے۔ اینڈریو نام کے اس نوجوان گارڈ نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور رات کے اندھیرے میں بستی کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ دو ساتھی بھی اس کے ہمراہ تھے۔ شاید یہ لوگ اپنے طور پر کوئی کارنامہ انجام دے کر کنگ صاحب سے انعام و اکرام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بستی میں گھسنے سے پہلے ہی یہ لوگ ایک بڑے افسر کی نظر میں آ گئے۔ ٹرسٹ کے اس افسر نے ان لوگوں کو پکڑ کر کنگ صاحب کو اطلاع کر دی۔ کنگ صاحب کو اینڈریو نام کے اس نوجوان پر شدید غصہ آیا۔ انہوں نے اسی وقت اسے شوٹ کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ بادشاہ ہیں اور آپ کو پتا ہے بادشاہوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"ظالم بادشاہوں کے کام!" میں نے تصحیح کی۔

"بالکل جی۔" بوڑھے واماں نے اثبات میں سر ہلایا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "کسی طرح اینڈریو کو پتا چل گیا کہ اسے گولی مارنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کے افسر اسے مار کر عبرت کا سامان بنا دیتے وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ میرا خیال ہے کہ اب پوری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی۔"

میرے ذہن میں اینڈریو کا نام کھنک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یاد آیا کہ اینڈریو اس نوجوان انچارج گارڈ کا نام تھا جس نے اصغی کے مشورے پر مجھے اور میرے مقامی ساتھی ادبے کو اپنے کیمپ میں بند کر دیا تھا۔ بعد ازاں میں اینڈریو کی گرل فرینڈ کا ٹینٹوا دبا کر کیمپ سے نکل بھاگا تھا اور بھاگتے بھاگتے کنگ براؤن کی متاعِ عزیز کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میری مراد شیطان جونیئر سے ہے۔ عین ممکن تھا کہ واماں نے

جس نوجوان ایڈریو کا ذکر کیا ہے یہ وہی ہو۔ راماں کے بیان سے ایک اور بات بھی مزید کھل کر سامنے آگئی تھی اور وہ یہ کہ کنگ براؤن اور اس کے حواری کسی بھی صورت اسمتھ کو کھونا نہیں چاہتے تھے اور اس سلسلے میں غیر معمولی طور پر محتاط تھے۔

پروفیسر اللہ دتا نے راماں سے پوچھا "نوجوان گارڈ کا کیا بنا؟"

"خیال تو یہی ہے کہ اسے شوٹ کردیا گیا ہوگا۔"

"یہ دونوں عورتیں تمہارے سپرد کیسے کی گئیں؟"

"دراصل جنگل میں مفرور کی تلاش کے دوران میں گھڑ سوار افسر جانسن ہماری کارکردگی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ اس نے راستے میں سیکڑوں مرتبہ مجھے شاباش دی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو اپنے ساتھ ہی جیپ پر بڑے شہر گوبالے لے گیا۔ وہاں ہماری خاطر مدارات کی گئی پھر ہمیں ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ میرے دونوں ساتھیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے لیے ایک ایک عورت چن لیں۔ ان دونوں نے یہ عورتیں چن لیں۔ مجھے انعام کے طور پر سونے کی ایک ڈلی دی گئی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو میں دکھا دیتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "لیکن۔۔۔"

"آپ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔" راماں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا "یہ دونوں عورتیں امید سے ہیں۔ کیا وہاں ایسی ہی عورتیں تھیں؟"

"نہیں۔۔۔ کئی زیادہ خوب صورت اور چست عورتیں بھی تھیں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"تو پھر آپ کا یہ انتخاب؟"

"کھامڑ ہو۔۔۔ تم بالکل کھامڑ ہو۔" سائیں جو دیر سے چپ بیٹھا تھا چیخ کر بولا "دماغ پر زور ڈالنا سیکھو۔۔۔ اگر دماغ ہے تو؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بالکل صاف ہے اگر یہ لوگ صرف دو عورتیں چنتے تو صرف دو غلام انسانوں کو آزادی ملتی۔ اب انہوں نے دو سے زیادہ انسانوں کو آزادی دلائی ہے۔ کم از کم ایک ایک زندگی تو ان دونوں عورتوں کے اندر بھی موجود ہے۔"

سائیں کی بات درست تھی۔ میں نے اور پروفیسر نے بوڑھے راماں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تائید تاثرات تھے۔ وہ سائیں کے تجزیے کو ٹھیک قرار دے رہا تھا۔

میں نے راماں سے کہا "آپ نے دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔"

وہ افسردگی سے بولا "ہم دور اندیش ہوتے تو صدیوں سے غلام کیوں بنائے جا رہے ہوتے۔ ویسے بھی جناب دو چار لوگوں کو آزاد کرا کے اس خطے کا مقدر تو نہیں بدلا جا سکتا۔ کیا ایسے بدلا جا سکتا ہے مقدر؟"

اس سوال کا فوری جواب تو ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم خاموش رہے۔۔۔ مگر سائیں عالی اپنے مخصوص انداز میں بول اٹھا "مقدر بدلے گا ضرور بدلے گا۔ خبیث جنات کی قوم ملیامیٹ کرنے کے لیے اچھے جنات کی فوج ظفر موج اس علاقے میں اترنے والی ہے۔ مقدر بدلے گا۔ کیوں نہیں بدلے گا؟ لیکن اس کے لیے اچھے جنات کے ساتھ مل کر تم لوگوں کو بھی کچھ قربانیاں دینا ہوں گی۔ اگر قربانیاں نہیں دو گے تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ قربانی کے بغیر تو خرابی بھی نہیں مل سکتی آزادی کیسے مل سکتی ہے۔"

اچانک کھٹ پٹ کی کچھ آوازوں نے ہمیں بری طرح چونکا دیا۔ یہ آوازیں بالکل قریب سے آئی تھیں۔ اس کھوکھلے تنے کے آس پاس کوئی انسان یا جانور موجود تھا پھر جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ جانور نہیں۔ بارش کے شور میں ڈوبتی ابھرتی ایک بھاری انسانی آواز سنائی دی۔ راماں کے ساتھی کی گرفت اپنی توڑے دار بندوق پر مضبوط ہو گئی۔ میں نے بھی اپنا ریوالور برآمد کر لیا۔ توڑے دار بندوق کے علاوہ اس وقت یہ ریوالور ہی ہمارا واحد آتشیں ہتھیار تھا۔ میں گھٹنوں کو خم دے کر اور بہت جھک کر چلتا ہوا تنے کے دہانے تک پہنچا۔ یکایک اس تختے میں جنبش پیدا ہوئی جس سے دہانے کو بند کیا گیا تھا۔

میں نے راماں کو اشارے سے بتایا کہ وہ لیمپ بجھا دے۔ راماں نے ہدایت پر عمل کیا اور ہماری پناہ گاہ میں گہری تاریکی چھا گئی۔ چند لمحے بعد دہانے کو ڈھانپنے والے تختے پر کسی وزنی شے سے ضربیں لگائی جانے لگیں۔ باہر ایک سے زیادہ افراد موجود تھے اور تختے کو ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس مرحلے میں یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ٹرسٹ کے گارڈز ہی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ راماں اور اس کے ساتھیوں کی طرح راہ گیر ہوں۔ وہ اس قدرتی پناہ گاہ سے واقف ہوں اور اس طوفانی موسم میں یہاں پناہ لینے پہنچ گئے ہوں۔ وہ ہمیں

آواز وغیرہ نہیں دے رہے تھے اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس تنے کے اندر ہماری موجودگی سے آگاہ نہیں۔ ہم بالکل خاموش رہے۔ باہر موجود افراد کچھ دیر تک تختے سے زور آزمائی کرتے رہے آخر اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے تختہ ہٹا دیا تھا۔

بارش کے کچھ چھینٹے اندر آئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار زور سے بجلی چمکی، میں نے خود سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر ایک زخمی گارڈ کا چہرہ دیکھا۔ تختہ ہٹانے کے بعد اس نے اپنی گردن تنے کے خلا میں داخل کر دی تھی۔ میں نے ریوالور کی بھرپور ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی۔ یہ ضرب میری توقع سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوئی اور نیلی وردی والا گارڈ مردہ چھپکلی کی طرح یوں گرا کہ اس کا آدھا دھڑ تنے کے اندر اور آدھا باہر تھا۔۔۔ اس گارڈ کے عقب میں مجھے صرف ایک گارڈ اور نظر آیا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نے اپنی رائفل ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھکا رکھی ہے۔ میں نے تنے کے اندر سے جست لگائی اور سیدھا اس کے اوپر گرا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کی رائفل پر آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شخص فائر کرنے میں کامیاب ہو۔ گولی کی آواز اس کے ساتھیوں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ یہی خطرہ اس کی چیخ سے بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی توانا گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لینے کی کوشش کی لیکن یہ داؤ چل نہیں سکا۔ یہ شخص کافی پھرتیلا تھا، اس نے میری ٹانگوں کے درمیان گھٹنا رسید کر کے مجھے دور پھینک دیا۔ وہ رائفل سیدھی کر چکا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس نے سیفٹی کیچ نہیں ہٹا رکھا تھا۔ جو ایک سیکنڈ اسے سیفٹی کیچ ہٹانے میں لگا وہ مجھے زندگی دے گیا اور گارڈ کو موت۔ گرتے ہوئے میرے ہاتھ میں ایک پتھر آ گیا تھا۔ میں اس پتھر سے رائفل بردار کو ضرب لگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ تنے کے اندر سے پروفیسر اللہ دتا برآمد ہوا اور اس نے رائفل کی سنگین گارڈ کی پشت میں یوں گھسائی کہ آر پار کر دی۔ ایک کراہ کے ساتھ گارڈ گھٹنوں کے بل کیچڑ میں گرا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"اسے اندر کھینچو جلدی سے۔" میں نے پروفیسر سے کہا۔

ہم نے جاں کنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے گارڈ کو کھینچ کر تنے کے اندر کر دیا۔ بارش جاری تھی۔ میں نے مقتول گارڈ کی رائفل چیک کی اور دہانے کے قریب بالکل چوکس بیٹھ گیا۔ ہمیں یہ دیکھنا تھا کہ ان دونوں افراد کے ساتھی تو آس پاس موجود نہیں۔ قریباً پانچ منٹ کے جائزے کے بعد نتیجہ نکلا کہ اردگرد کسی متنفس کے آثار موجود نہیں۔ ان پانچ منٹ کے دوران میں جاں کنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے گارڈ کے حلق سے مسلسل خر خر کی آواز نکلتی رہی تھی پھر یہ آواز دم توڑ گئی وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون تنے کے اندر اور باہر موجود تھا۔ اس خون کو فوری طور پر صاف کیا جانا ضروری تھا۔

میں ٹارچ روشن کر کے باہر نکل آیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ بارش نے ہر شے کو الٹ پلٹ کر رکھا تھا، زمین پر کہیں کہیں گارڈز کے مخصوص بوٹوں کے نشانات موجود تھے۔ ان نشانات کو بھی بارش تیزی سے صاف کرتی چلی جا رہی تھی۔ بہرحال مجھے بھی جہاں کہیں نشانات دکھائی دیے میں نے انہیں صاف کر دیا۔ خشک تنے سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے شراب کی ایک بوتل پڑی تھی۔ بوتل تین چوتھائی خالی ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ پولیتھین میں لپٹا ہوا ایک واکی ٹاکی بھی تھا۔ ان دونوں اشیا کا تعلق یقیناً گارڈز سے تھا۔ میں ان دونوں چیزوں کو اٹھا کر تنے میں لے آیا۔ اس دوران میں پروفیسر نے راماں کے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر دہانے کے سامنے سے ہلاک ہونے والے گارڈ کا خون صاف کر دیا تھا۔ جو تھوڑی بہت آلائش رہ گئی تھی وہ بارش میں تیزی سے صاف ہوتی جا رہی تھی۔

ہم ایک بار پھر تنے میں بند ہو گئے۔ تختے کو بڑی احتیاط کے ساتھ دوبارہ داخلی راستے یعنی دہانے پر رکھ دیا گیا۔ درزوں کو پرانے کپڑے کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ میری ہدایت پر راماں نے لیمپ پھر سے روشن کرا دیا۔ ایک بے ہوش اور ایک مرا ہوا گارڈ اب ہمارے ساتھ اس پناہ گاہ میں موجود تھے۔ بے ہوش گارڈ کی کنپٹی پر گہرا زخم آیا تھا اور خون اس کے رخسار کو بھگو رہا تھا۔ اس کی رشین رائفل بھی اب ہمارے قبضے میں تھی۔

راماں اور اس کے ساتھیوں کے چہروں پر حیرت نظر آ رہی تھی۔ اس نے دبے دبے لہجے میں کہا "آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے کچھ مسائل کا ذکر فرمایا تھا۔ کہیں آپ کا مطلب ان گارڈز وغیرہ سے تو نہیں تھا۔"

"آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا۔۔۔ مطلب ہے کہ پھر شاید وہ بات بھی درست ہو جو ہم نے سنی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ کنگ کے بیٹے کو سائیں جی کے مریدوں نے پکڑ کر موگا سائیں رکھا ہوا ہے اور اس میں کسی نہ کسی حد تک

سائیں صاحب کی منشا بھی شامل ہے۔"

"یہ اندازہ آپ نے کیونکر لگایا؟"

بوڑھے واماں نے سائیں عالی کی طرف اشارہ کیا "سائیں جی کے یہ مرید خاص آپ کے ساتھ سفر فرما رہے ہیں اور آپ کا پیچھا ٹرسٹ کے گارڈز کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سائیں صاحب کے ان محترم مرید کے لیے ہی آپ کا پیچھا کر رہے ہوں۔"

"آپ کافی حد تک حقیقت کے قریب ہیں۔" میں نے تائید کی۔

پروفیسر نے اٹھ کر دونوں گارڈز کی جامہ تلاشی لینا شروع کر دی تھی۔ میں بھی اس میں شریک ہو گیا۔ دونوں رائفلوں کے راؤنڈ فالتو میگزین برآمد ہوئے۔ اس کے علاوہ گارڈز کے شناختی کاغذات اور کرنسی وغیرہ تھی۔ ایک گارڈ کی جیب سے اس کی گرل فرینڈ کی تصویر برآمد ہوئی جس کے پیچھے کچھ لکھا بھی تھا جو بارش میں بھیگ کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ وہی سفید فام گارڈ تھا جو پروفیسر کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ ہلاک ہونے والوں کے لباس سے جب اس قسم کی نجی اشیا ملتی ہیں تو دل افسردہ ہو جاتا ہے مگر اس گارڈ کے حوالے سے ہمارے دل میں کوئی ملال نہیں آیا۔ یہ ایسے کردار کے لوگ تھے کہ ان کے لیے "نفرت" کے سوا کچھ اور محسوس ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹرسٹ کی زیر زمین دنیا میں یہی گارڈز فرعون، چنگیز اور ہلاکو کا جدید ایڈیشن تھے۔ لاچار لوگوں کو اذیت دینا ان کی تفریح تھی۔ درد سے لبریز انسانی چیخیں ان کی سماعت کے لیے موسیقی کا کام دیتی تھیں۔ کم از کم ہم تو ان نیلی وردی والوں کے لیے کسی طرح کی ہمدردی محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے برآمد ہونے والے واکی ٹاکی کو آن کیا۔ حسب توقع اس کے اندر سے بس شائیں شائیں کی آواز بلند ہو کر رہ گئی۔ یہ آلہ اور اس جیسے دوسرے سارے آلات آج کی رات بیکار تھے۔ ٹرسٹ والوں نے ہر قسم کے مواصلاتی رابطے کو جام کر رکھا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ آج رات جو کچھ سائیں عالی کے ساتھ ہوا ہے یا ہونے والا ہے اس کی بھنک بھی موگاسا بستی تک پہنچے۔ موگاسا بستی جہاں کنگ براؤن کا لخت جگر موجود تھا اور جس کے سر پر لارو تابے کی شکل میں ایک ننگی تلوار لٹک رہی تھی۔ میں نے واکی ٹاکی کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔ بوڑھا واماں اور اس کے ساتھی یہ سارا منظر بڑی خاموشی سے دیکھتے رہے تھے۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ سفر کرنے والا باریش شخص صحرائی درویش کا مرید خاص ہے، وہ حد درجہ متورب نظر آنے

لگے تھے۔ ادب کے اظہار میں گاہے گاہے ان کے ہاتھ خود بخود ناف پر بندھ جاتے تھے۔

بوڑھے واماں نے ورزیدہ نگاہ سے سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے قرب و جوار سے قطعی لاتعلق تھا۔ کچھ دیر تک ہوا میں ناقابل فہم اشارے کرنے کے بعد وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ واماں نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا "محترم! میں نے ابھی کچھ دیر پہلے آپ کو بتایا تھا نا... کہ ٹرسٹ والوں کو برا سمجھنے کے باوجود، ہم ان کی حکم عدولی یا ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن آج صورت حال مختلف ہے میرے محترم بھائی۔ آپ کو اور سائیں حضور کے مرید خاص کو اپنے درمیان پا کر ہم سب خود کو بہت بدلا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ ٹرسٹ والوں کی ناراضی کی پروا کیے بغیر میں کچھ کروں اور یقیناً میرے ساتھی بھی ایسا سوچ رہے ہیں۔ اگر ہم آپ کے اور آپ کے ذریعے بڑے سائیں صاحب کے کچھ کام آ سکے تو یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہوگی۔"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "آپ کی پیشکش کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس وقت ہمیں واقعی آپ کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس خطرناک جنگل سے نکلنے کے لیے آپ سے بہتر ہماری رہنمائی کوئی اور نہیں کر سکتا۔ شاید قدرت نے ہماری مدد کرنے کے لیے ہی ہمارا رخ آپ لوگوں کی طرف کیا تھا۔"

بوڑھے واماں کی جھکی ہوئی کمر جوانوں کی طرح تن گئی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "میں اور میرے ساتھی زندگی بھر اپنی قسمت پر ناز کریں گے کہ ہم نے سائیں صاحب کے محترم ساتھیوں کو اپنے تعاون سے منزل تک پہنچایا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے میں اور میرے ساتھی ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

بوڑھا واماں مقامی لہجے میں رک رک کر انگریزی بولتا تھا۔ ہمیں سمجھانے کے لیے کئی کئی جملے اسے دو تین بار دہرانا پڑتے تھے۔ اس کے باوجود سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی کیونکہ وہ گفتگو میں مقامی زبان کے کئی لفظ بھی گھسیڑ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واماں کے ساتھ ہماری مختصر گفتگو بھی کافی وقت لیتی تھی۔ واماں نے پوچھنے پر بتایا تھا کہ پندرہ بیس برس پہلے ٹیلی ویژن کے لیے فلم بنانے والی ایک کمپنی ان دور دراز جنگلات میں پہنچی تھی۔ ان لوگوں نے چھ چھ ماہ یہاں رہ کر تین مرتبہ شوٹنگ کی تھی۔ واماں نے اس دشوار ترین علاقے

میں اس انگلش کمپنی کے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دیے تھے۔ اسی تعلق کے باعث وہ گزارے لائق انگریزی بولنے کے قابل ہوا تھا۔

آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ بارش اب قدرے دھیمی پڑ گئی ہے۔ بوڑھے واماں نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد مجھ سے پوچھا "آپ یہاں سے کب نکلنا پسند فرمائیں گے؟"

میں نے کہا "یہ فیصلہ بھی ہم آپ پر چھوڑتے ہیں، بس یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ ٹرسٹ کے گارڈ اس جنگل میں موجود ہیں اور ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔"

واماں کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔ ان لکیروں میں سالہا سال کا تجربہ اور اعتبار بھرا ہوا تھا۔ وہ بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"وہیں جہاں آپ لوگ جا رہے ہیں۔"

"کیا... مطلب؟"

"ہماری اور آپ کی منزل ایک ہی ہے۔ ہم موگاسا جا رہے ہیں۔"

واماں چند لمحے تک ہیجانی انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "کیا آپ... آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ محترم سائیں صاحب بھی اس وقت موگاسا میں ہی ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "سائیں صاحب سے آپ لوگوں کی ملاقات وہیں پر ہوگی۔"

واماں نے لرزتی آواز میں کہا "یہ تو پھر ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس جگہ پر آپ سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی کر رہے ہیں، ہم آپ کی رہنمائی نہیں کر رہے۔"

واماں نے چار پانچ منٹ تک اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کیا۔ اس کے بعد مجھ سے اور پروفیسر سے مخاطب ہو کر بولا "میرا خیال ہے کہ بارش اور تاریکی میں ہمارا یہاں سے نکلنا ہمارے لیے زیادہ مناسب ثابت ہوگا۔ دیوتاؤں کی مہربانی سے ہم اس جنگل کے پیچ و خم کو اپنے ہاتھوں کی لکیروں کی طرح جانتے ہیں۔ ٹرسٹ کے گارڈز کے لیے ان حالات میں سفر کرنا ہماری نسبت کہیں زیادہ دشوار ثابت ہوگا۔ دیوتاؤں نے چاہا تو ہم انہیں بہ آسانی جل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

میں خود بھی جلد از جلد اس مصیبت سے نکل کر موگاسا میں صفدر کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ میں اسے موگاسا کے شفا خانے میں مخدوش حالت میں چھوڑ آیا تھا۔ پچھلے چند گھنٹے میں ایک لمحے کے لیے بھی صفدر کا خیال میرے ذہن سے نکلا نہیں تھا۔

سائیں عالی مجھ سے صرف تین فٹ کی دوری پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے ہی گہری نیند سو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا اسے اردگرد کے حالات سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں ہے۔ میرا دل چاہا کہ اسے جھنجوڑ کر جگاؤں اور پوچھوں کہ وہ صفدر کی گمشدہ دیرا کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ کہاں ملے گی وہ سیلانی لڑکی جس نے صفدر کو اپنی محبت کا میٹھا زہر پلایا تھا اور پھر اسے تڑپتا چھوڑ کر اسرار کے پردے میں گم ہو گئی تھی۔ اس طوفانی رات کا پہلا پہر میں نے موگاسا بستی میں ہی گزارا تھا۔ وہاں طویل قامت عامل لڑکی موتابہ نے ایک اذیت ناک چلے کے بعد انکشاف کیا تھا کہ دیرا آس پاس کہیں "نظر" نہیں آ رہی۔ وہ کہیں آس پاس موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جب اپنے روحانی علم کے مطابق دیرا کا تصور کرتی ہے اور ذہن پر زور دیتی ہے تو صحرائی درویش کا خاکہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنی اس کیفیت سے موتابہ نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اگر اس وقت ہمیں کوئی دیرا کے بارے میں کچھ بتا سکتا ہے تو وہ صحرائی درویش ہے۔ موتابہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے سردار رانفے وغیرہ نے مشورہ دیا تھا کہ میں سائیں عالی سے رابطے کی کوشش کروں۔ سائیں سے رابطے کی ہر کوشش ناکام ہوئی تھی جس کے بعد مجھے از خود سائیں کے پاس کھنڈرات میں جانا پڑا تھا۔ کھنڈرات میں جو کچھ سامنے آیا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ٹرسٹ والوں نے ماسٹر اسقی کے بدلے میں، بڑی رازداری کے ساتھ سائیں عالی پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اگر میں بروقت موقع پر نہ پہنچتا تو ممکن تھا کہ سائیں عالی اب تک کنگ براؤن کا "مہمان" بن چکا ہوتا۔

ایک دم میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ سائیں نیند کی حالت میں زور سے کھانسا، پھر اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی، لیکن وہ بیٹھا ہوا تھا کروٹ کیسے لیتا، ڈگمگا کر رہ گیا۔ میں نے کہا "سائیں! اٹھ جاؤ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"واقعی؟" اس نے آنکھیں پوری کھول دیں۔

"واقعی۔ تم جلدی سے اپنی گدڑی پہن لو۔" میں نے میلی کچیلی گدڑی اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ سائیں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گدڑی پہن لی۔ دونوں گارڈز بے حس و حرکت پڑے تھے۔ بے ہوش گارڈ کے منہ سے ابھی تک شراب کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں اسے بھی ختم

کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر یہ کام دونوں عورتوں کے سامنے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہماری طرح داماں اور اس کے ساتھیوں نے بھی سامان سمیٹ لیا۔ اس کے بعد ہم ایک ایک کر کے احتیاط کے ساتھ باہر نکل آئے بارش اب ہلکی ہو گئی تھی اور پھوار کی شکل میں برس رہی تھی۔ یہ رات کا آخری حصہ تھا۔ داماں کا کہنا تھا کہ دن کی روشنی پھوٹنے سے پہلے پہلے ہمیں دور نکل جانا چاہیے۔

سب لوگ باہر نکل آئے تو میں دوبارہ کھوکھلے تنے کی پناہ گاہ میں گھسا اور سنگین چڑھی رائفل سے دوسرے گارڈ کا کام بھی تمام کر دیا۔ میں نے سنگین عین اس کے دل کے مقام پر گھونپ دی تھی۔ اس کا جسم صرف دو تین سیکنڈ کے لیے پھڑکا اور ساکت ہو گیا۔ یہ سب کچھ گہری تاریکی میں ہوا تھا۔ خون آلود سنگین کو پرانے کپڑے سے صاف کر کے میں باہر نکل آیا۔

بوڑھے داماں نے کہا "آپ نے دوسرے گارڈ کو بھی ختم کر دیا؟"

"آپ بھی جانتے ہیں کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔"

داماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے گہری تاریکی میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ یوں لگتا تھا کہ داماں اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کچھ دیر بعد داماں نے رخ کا تعین کر لیا اور ہم آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ سائیں عالی کے نوٹ بالٹیں اور گھنٹیاں وغیرہ قریب ہی ایک گڑھے میں دفن تھیں۔ ہم نے انہیں مدفون ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس ویرانے میں ہم کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی وہ اشیا موجودہ جگہ پر زیادہ محفوظ تھیں۔ شاید سائیں بھی اس بات کو سمجھتا تھا۔ اس نے کوئی تقاضا نہیں کیا اور خاموشی سے ہمارے ساتھ چل دیا۔

سب سے آگے داماں کا ایک ساتھی تھا۔ واٹے نامی اس نوجوان کے ہاتھ میں طویل نیزہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک لمبی کٹار نما شے تھی۔ اس کے عقب میں داماں خود تھا۔ داماں کے عقب میں میں اور پروفیسر تھے۔ اس سے پیچھے دونوں عورتیں تھیں۔ آخر میں سائیں عالی اور پھر داماں کا دوسرا ساتھی تھا۔ وہ توڑے دار بندوق سے مسلح تھا۔ داماں کے ہاتھ میں بھی طویل نیزے جیسی ایک لمبی چھڑی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اس چھڑی کو دائیں بائیں اوپر نیچے ہر جانب حرکت دیتا تھا۔ داماں اور اس کے ساتھیوں نے اپنا سامان مختصر گٹھڑیوں کی صورت میں کمر پر باندھ رکھا تھا۔ دونوں عورتوں کی پشت پر بھی اس طرح کی گٹھڑیاں موجود تھیں۔ یہ سفری سامان تھا۔ بچھونے، خشک راشن، پانی وغیرہ۔ اس سارے سامان میں سب سے دلچسپ شے ایک سانپ تھا بلکہ اسے چھوٹا موٹا اژدہا ہی کہنا چاہیے یہ سانپ ایک گٹھڑی کی صورت واٹے کی پشت سے بندھا ہوا تھا۔

میرے پوچھنے پر داماں نے بتایا کہ یہ سانپ کل شام انہیں راستے میں ملا تھا۔ انہوں نے اسے مار ڈالا۔ زہر والا حصہ سانپ کے جسم سے علیحدہ کر دیا گیا اب یہ ان کے لیے لذیذ خوراک کی حیثیت رکھتا تھا۔ سانپ کا پیٹ صاف کر کے اس پر نمک اور کوئی مسالا وغیرہ لگایا گیا تھا اب یہ گوشت دو تین دن کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔ داماں نے بتایا کہ اس نسل کے سانپ کا گوشت لذت اور فائدے میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ اس نے "گولڈن ایگل" کے متعلق بتایا جو اس سانپ کے شکار کے لیے ہفتوں اس کے بل کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔

بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ ہم مزید گنجان جنگل میں گھس آئے تھے بھیگے ہوئے جنگل میں تاریکی کا یہ سفر اپنی مثال آپ تھا۔ ہمارے پاؤں کیچڑ میں دھنس رہے تھے اور شاخیں ہر طرف سے راستہ روکے ہوئے تھیں۔ واٹے کے ہاتھ میں جو کٹار نما شے تھی اس کا استعمال اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ گنجان درختوں میں راستہ بنانے کے لیے واٹے کو بار بار شاخیں کاٹنا پڑ رہی تھیں۔ وہ حلق سے "ہا" کی زوردار آواز نکالتا تھا اس کے ساتھ شائیں شائیں کی صدا آتی اور شاخیں کٹ کر ہمیں راستہ فراہم کر دیتیں۔ کئی مقامات پر ہم خوفناک دلدلی گڑھوں کے کنارے سے گزرے۔ ایسے مقامات پر داماں نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم واٹے کے پیچھے بالکل ایک سیدھی لائن کی شکل میں آئیں ایک قدم بھی ادھر ادھر نہ جائیں۔ تاریکی میں ہمیں تو ساری کیچڑ ایک ہی جیسی لگتی تھی مگر بوڑھے داماں اور اس کے ساتھیوں کی تجربہ کار نگاہیں جانتی تھیں کہ کون سی کیچڑ پاؤں چھوڑ دیتی ہے اور کون سی کیچڑ پاؤں پکڑنے کے بعد پورے جسم کو نگل جاتی ہے۔ اب ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ داماں اور اس کے ساتھی تاریکی میں دیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس انتہائی خطرناک مسافت کے دوران میں ہم نے صرف چند موقعوں پر ٹارچ روشن کی ورنہ یہ سفر اتھاہ تاریکی میں ہی جاری رہا۔

ایک جگہ کسی درخت کی لچک دار ٹہنی زناٹے کی آواز سے پروفیسر کی زخمی گردن پر لگی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ تکلیف کو ضبط کرتے ہوئے بولا "سفر دشوار ہوتا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "ہر دشواری کے پیچھے کوئی آسانی بھی تو ہوتی ہے۔ میں تو اس دشواری سے خوش ہو رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"جوں جوں راستہ مشکل ہو رہا ہے ہمارے لیے گارڈز کا خطرہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ ہماری تلاش میں وہ بے خطرناک علاقے میں گھس سکتے ہیں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" پروفیسر نے تائید کی۔ "یقیناً داماں ہمیں جان بوجھ کر اس راستے پر لایا ہے۔ ب طرح سے اس نے گارڈز کو چیلنج دیا ہے کہ وہ اگر اس استے پر ہمارے پیچھے آ سکتے ہیں تو آ جائیں۔"

ایک لمحے کے لیے بجلی تڑپی تو ہر طرف جنگل اور بارش ا نظر آئے نہایت خطرناک ہونے کے باوجود ان مناظر میں ب طرح کا جوش اور سنسنی خیزی موجود تھی۔ داماں نے کہا ایسے موسم میں ہم لوگ گانے لگتے ہیں۔ ہمارے اندر سے ود بخود سُر پھوٹتے ہیں۔ بارش کے موقع کے لیے یہ ایک دل مذہبی گیت ہے۔ اس گیت میں آسمان دیوتا سے خواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی محبوبہ یعنی زمین کو اپنے زوؤں پر کس کر رکھے۔ اپنے سینے کی پوری طاقت اور محبت ے ساتھ وہ اس پر اتنا برسے کہ وہ جل تھل ہو جائے۔ اس کا ِ انگ سیراب ہو اور اس کے بطن میں خوش حالی کا بیج جائے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ جب ہم آپ کے پاس دگاہ میں پہنچے تو اس وقت بھی آپ یہی کچھ گا رہے تھے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" داماں نے تائید کی۔

"شاید یہی گیت ہمارے اور آپ کے ملاپ کا سبب بنا۔" میں نے کہا۔

"یہ بڑا مبارک گیت ہے جناب۔"

اچانک ایک لرزہ خیز چیخ ابھری۔ یہ چیخ سب سے پیچھے نے والے شخص کی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی وزنی ن شے دھم سے اس سیاہ فام پر گری ہے اور وہ اس کے ے دب گیا ہے۔ بے اختیار میرے ہاتھ نے ٹارچ روشن دی۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں جو کچھ نظر آیا وہ توقع دیکھ خلاف تھا۔ وہ ایک تیندوا (LEOPARD) تھا۔ اس ے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے سیاہ داغ تھے۔ وہ بڑے جانہ انداز میں سیاہ فام نوجوان کو گرا کر اس پر سوار ہو چکا ۔ اس کے حلق سے نکلنے والی غراہٹیں اس آواز سے مشابہ ں جو بلیاں آپس میں لڑتے ہوئے نکالتی ہیں۔ ٹارچ کی

روشنی میں میں نے دیکھا کہ جنگلی درندے کا ایک پنجہ نوجوان کے کندھے سے گوشت کو ادھیڑ چکا تھا اور وہاں سے تازہ خون کی سرخی جھلک دکھا رہی تھی۔ پروفیسر نے فائر کرنے کے ارادے سے رائفل سیدھی کی تاہم میں نے لپک کر رائفل کی نال جھکا دی۔ میں نے واٹے کو دیکھ لیا تھا، وہ نیزہ سونت کر برق رفتاری سے جانور پر جھپٹ رہا تھا۔ اس نے بڑی دلیری سے تیندوے کی پسلیوں پر وار کیا۔ تیندوے کی تیز حرکت کی وجہ سے یہ وار اس کی پسلیوں کے بجائے پچھلی ٹانگ پر لگا۔ نیزے کی انی کئی انچ تک حیوانی گوشت میں گھسی۔ تیندوا تڑپ کر مڑا اور واٹے پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔ دونوں عورتیں واٹے کے پاس ہی کھڑی تھیں، ان کی چیخیں نکل گئیں اور وہ پلٹ کر دوڑیں۔ واٹے نے پھرتی سے نیزہ کھینچ کر دوسرا وار درندے کی گردن پر کیا، یہ وار بھی اوچھا پڑا تاہم اسے زخم دے گیا۔ یہ دوسرا زخم کھانے کے بعد درندے نے تیزی سے پسپائی اختیار کی اور چیختا ہوا جنگل میں گم ہو گیا۔ اس مختصر معرکے کے دوران میں، میں نے ماہر کیمرا مین کی طرح ٹارچ کا روشن دائرہ مسلسل درندے پر مرکوز رکھا تھا اور اس روشن دائرے کے سبب ہی واٹے اتنی جلدی اسے پسپا کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

درندے پر ہمارا گولی نہ چلانا ہر لحاظ سے بہتر ثابت ہوا تھا۔ نہ صرف سیاہ فام نوجوان مزید زخمی ہونے سے بچ گیا تھا بلکہ فائر کی آواز سے ہمارے لیے جو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا وہ بھی معدوم ہو گیا تھا۔ ہم نے لپک کر مضروب نوجوان کو اٹھایا، وہ کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا۔ اس کی توڑے دار بندوق بھی کچھ فاصلے پر موجود تھی اور بری طرح لت پت تھی۔ اچانک دونوں عورتوں میں سے ایک پھر لرزہ خیز انداز میں چیخنے لگی۔ ہم دوڑ کر وہاں پہنچے تو ایک اور دہشت ناک منظر ہمارا منتظر تھا۔ اس منظر میں کوئی درندہ موجود نہیں تھا لیکن منظر کی خوفناکی پہلے منظر سے بھی بڑھ کر تھی۔ تیندوے سے ڈرنے کے بعد ایک عورت دلدلی گڑھے میں جا گری تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے کمر تک اس میں دھنس گئی تھی۔ ہم نے افریقہ کی خوفناک دلدلوں کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا۔ ان دلدلوں کے بارے میں ایک عجیب سا تجسس تھا۔ تاہم یہاں آ کر ہم نے بہت سی دلدلیں دیکھی تھیں اور ان سے مانوس سے ہو گئے تھے۔ جیسے کسی خطرناک جانور کو بار بار قریب سے دیکھا جائے۔ اس کو چھوا جائے اور اس کا خوف بتدریج دور ہو جائے۔ ان دلدلوں کے حوالے سے ہمارا خوف بھی شاید بتدریج کم ہو چکا تھا لیکن آج اس موسلادھار رات میں جب

میری ٹارچ کا روشن دائرہ پتوں سے ڈھکی ہوئی اس دلدل پر پڑا تو وہ مجھے کسی بھی درندے سے بڑھ کر خوفناک نظر آئی۔ یہ درندہ عورت کو نصف سے زیادہ نگل چکا تھا اور مسلسل نگل رہا تھا۔ بالکل کسی اژدہے کی طرح' چھوٹے چھوٹے جھٹکوں کے ساتھ وہ اپنے شکار کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ درمیانی عمر کی عورت تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھیں یرقان زدہ نظر آئیں۔ اس کا منہ دہشت کے سبب کھلا تھا۔ کبھی کبھی اس کے حلق سے ایک ناقابل فہم چیخ نکل جاتی تھی۔ وہ خود کو دلدل کے چنگل سے نکالنے کے لیے زور لگاتی تھی اور تھوڑا سا مزید اندر دھنس جاتی تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ جو اس کے پیٹ میں تھا' وہ ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا' اس نے سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی' اس نے بارش نہیں دیکھی تھی' اس نے جنگل نہیں دیکھا تھا' لیکن اس روشنی' اس بارش اور اس جنگل کے "التعاون" سے جو آدم خور دلدل وجود میں آئی تھی وہ اس میں غرق ہو رہا تھا۔ داماں چیخ رہا تھا' وانے چیخ رہا تھا اور کنارے پر کھڑی مصری لڑکی چیخ رہی تھی۔

بدنصیب عورت کنارے سے کئی فٹ آگے پھنسی ہوئی تھی۔ داماں نے بالکل کنارے پر سے اپنی طویل لاٹھی نما لکڑی عورت کی طرف بڑھائی۔ عورت نے کوشش کرکے اس لکڑی کا ایک سرا تھام لیا۔ داماں اور وانے مقامی زبان میں چیخ چیخ کر عورت کو ہدایات دے رہے تھے... لیکن جب وہ تھوڑا سا زور لگاتے تھے لکڑی عورت کے گیلے ہاتھوں سے پھسل جاتی تھی۔ شاید اس بے چاری کے ہاتھوں میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ لکڑی کو تھام سکے۔ اسی دوران میں پھر تیندوے کی چیختی ہوئی کریہہ آواز قریبی درختوں سے سنائی دینے لگی۔ درندہ آس پاس ہی موجود تھا۔ اب وہ زخمی بھی تھا اور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

وانے نے عورت کا خیال چھوڑ کر پھر سے نیزہ سنبھالا اور اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے بوڑھے داماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اس کوشش میں میرا ایک پاؤں تھوڑا سا آگے گیا تو داماں نے چیخ چیخ کر مجھے منع کیا "کیا کر رہے ہیں آپ! پیچھے رہیں۔"

"لیکن یہ عورت تو ختم ہو رہی ہے۔ اس کا کچھ کرو۔" میں نے کہا۔ بارش کے شور کے سبب ہمیں بلند آواز میں بولنا پڑ رہا تھا۔

"ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں جو کر رہے ہیں۔" بوڑھے داماں کے لہجے میں کرب تھا۔

عورت کے حلق سے اب گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ٹارچ پروفیسر کے ہاتھ میں تھی مگر اب شاید اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ ٹارچ کی روشنی عورت کے چہرے پر ڈالے۔ وہاں موت کی دہشت نے یوں اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے کہ دیکھنا محال تھا۔ اچانک میری نظر دس پندرہ فٹ دور ایک جھاڑی پر پڑی۔ ٹارچ کی روشنی میں جھاڑی دلدل کے اوپر جھکی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی شاخیں اتنی مضبوط ضرور تھیں کہ میرا بوجھ سہار لیتیں۔ داماں کو بتائے بغیر میں اس مضبوط جھاڑی پر چڑھ گیا اور پھر نسبتاً پتلی شاخوں پر آ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی مناسب شاخ پر لیٹ کر یا لٹک کر اپنا ہاتھ عورت کی طرف بڑھا دوں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں عورت کے عین اوپر پہنچ گیا مگر جب پروفیسر نے ٹارچ کا روشن دائرہ عورت پر مرکوز کیا تو عورت کی زندگی کے حوالے سے ہر امید دم توڑ گئی۔ پچھلے دو چار منٹ میں بدقسمت عورت تیزی سے نیچے گئی تھی۔ اب وہ اپنی ٹھوڑی تک دلدل میں تھی۔ اب اس کے حلق سے آواز نکلنا بھی بند ہو گئی تھی اور سر ایک طرف کو جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ دراصل وہ بے ہوش ہو چکی تھی پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ دلدل میں گیا اور اس کے بالوں کی سیاہی بھی دلدل کی سطح سے اوجھل ہو گئی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ افریقہ کے جنگلوں میں گھات لگا کر بیٹھنے والا یہ مٹی کا اژدہا اپنے شکار کو اس کے بچے سمیت نگل چکا تھا۔

آخری لمحوں میں داماں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ نو عمر لڑکی کو موقع سے ہٹا لے گیا تھا' ورنہ پتا نہیں کہ اس پر کیا گزر جاتی۔ تومندوانے ہمارے عقب میں نیزہ لیے چوکس کھڑا رہا تھا۔ درحقیقت اس نے ہمارے عقب سے تیندوے کے خطرے کا دفاع کیا تھا۔

تیندوے کی آواز آنا اب بند ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ کسی اور سمت میں نکل گیا تھا۔ ہم کچھ دیر تک قاتل دلدل کے کنارے خاموش اور غمزدہ کھڑے رہے اور تو اور ساسین عالی بھی اس موقع پر خاموش نظر آ رہا تھا۔ داماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہم نے تو اپنی طرف سے چار لوگوں کو آزاد کرایا تھا لیکن دیوتاؤں کو شاید دو ہی کی آزادی منظور تھی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انسان کی عقل مندی اپنی جگہ لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والے کو منظور ہوتا ہے۔ زخمی نوجوان اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ داماں نے اپنی پوٹلی میں سے کوئی دوا نکال کر ایک چوڑے سبز پتے پر لگائی اور یہ پتا نوجوان کے زخم پر چپکا کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ بدقسمت عورت کے سامان کی

گٹھڑی بھاگتے ہوئے اس کے کندھے پر سے گر گئی تھی۔ میں نے یہ گٹھڑی اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکائی۔ بارش سے بچتے ہوئے پرخطر جنگل میں ہمارا سفر پھر سے شروع ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے تک ہم نے مزید سفر کیا۔ اس نہایت کٹھن سفر کا اختتام موگاسا بستی کے عین نواح میں ہوا۔ یہ وہی جنگلی پٹی تھی جو موگاسا کے نواح سے شروع ہو کر جنوب مغرب میں دور تک چلی گئی تھی۔ ایک دو کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد ہم موگاسا میں داخل ہوئے تو صبح ہونے والی تھی لیکن گہرے بادلوں اور بوندا باندی کے سبب ابھی تک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ موگاسا میں وہی ہنگامی حالت کی کیفیت تھی۔ ہر چہرے پر تناؤ اور ہر آنکھ میں مستقبل کے اندیشے تھے۔ لوگ مقامی ہتھیاروں سے مسلح ٹولیوں کی شکل میں آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ میں سب سے پہلے صفدر کو دیکھنے کے لیے شفا خانے میں پہنچا۔

صفدر نے رات بھی نیم بے ہوشی کے عالم میں ہی گزاری تھی۔ وہ اب بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا اور بخار میں پھنک رہا تھا۔ تیز بارش سے شفاخانے کی چھت ٹپکنے لگی تھی اور مریضوں کے بستر ادھر سے ادھر کرنا پڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر کئی مریضوں کے چہروں پر آس و امید کے دیے روشن ہو گئے۔ میں ان کی آس امید کی وجہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ میں ان کی محبوب معالج دیرا کی تلاش میں نکلا ہوں۔ میرے ساتھ ساسین اور پروفیسر کے جیسی چہرے دیکھ کر ان کے ذہن میں یہی آیا تھا کہ شاید میری تلاش کامیاب رہی ہے۔ وہ ہر گھڑی دیرا کی راہ تک رہے تھے۔ اپنے آخری چند دنوں میں دیرا نے انہیں محبت ہی اتنی دی تھی کہ وہ اسے بھول نہیں سکتے تھے۔ شاید ناقابل فراموش بننے کے لیے ہی دیرا نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ یہاں سے اچانک چلے جانے کے بعد وہ بہت سے لوگوں کے لیے ناقابل فراموش ہو گئی تھی اور صفدر بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ صفدر کے دکھ کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو اس کے قریب رہا تھا۔ اس کی رگ جاں سے بھی نزدیک۔ یک جان دو قالب کی طرح۔ اس کی رنگین تنہائیوں کا ساتھی۔ اس ہر دل عزیز کی عزیز ترین اداؤں کا شاہد۔ اس کے دل کے گھاؤ بے حد گہرے تھے۔ اس کی بے کلی ہر حد سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو چند حسین ریشمی راتیں دیرا کے ساتھ گزاری تھیں۔ ان کا صلہ اسے جاں گسل جدائی اور بدن کو توڑتے ہوئے ان گنت کانٹوں کی شکل میں ملا تھا۔

اشوکا مسلسل صفدر کے سرہانے موجود تھا اور ہر ممکنہ طریقے سے اسے آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اشوکا نے مجھے ایک طرف لے جا کر بے تابی سے کہا "دیرا صاحبہ کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"صفدر صاحب کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تکلیف کا شکار ہیں۔ اگر دیرا صاحبہ نہیں ملتیں تو ہمیں جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ انہیں کسی شہر میں کسی اچھے اسپتال تک پہنچانا ہوگا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے بس چند گنی چنی دوائیں ہیں۔ وہ بھی ختم ہو رہی ہیں۔ گلوکوز کی صرف ایک بوتل باقی رہ گئی ہے۔ اینٹی بائیوٹک انجکشن بھی صرف آج کا دن ہی لگ سکیں گے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

صفدر کو دیکھنے کے بعد میں اس جھونپڑے میں پہنچا جہاں ان سارے مسائل کی اصل "چابی" موجود تھی۔ یعنی ماسٹر اسٹی۔ اشوکا بھی میرے ساتھ تھا۔ لاروتابے نے اسٹی کی حفاظت اور نگرانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ دو چار دنوں میں ہی میں اس کی صلاحیتوں کا قائل ہو گیا تھا۔ درمیانی عمر کا خاموش طبع لاروتابے ایک کامیاب اور سخت منتظم کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اس نے اپنے سمیت چھ افراد کی ایک ٹیم تیار کی تھی جو بڑی ترتیب کے ساتھ چوبیس گھنٹے ماسٹر اسٹی کی نگرانی کر رہی تھی۔ یہ سب کے سب بے حد چوکس اور بہترین نشانے باز لوگ تھے۔ لاروتابے کی فراست اور سخت گیری نے کسی حد تک ماسٹر اسٹی کی سرکشی کو کم کیا تھا۔ میں جب جھونپڑے میں پہنچا تو اسٹی ایک کونے میں بیٹھا اکیلا ہی تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح خشونت برس رہی تھی۔ ایک بچے کے بجائے وہ ایک آدم بیزار بڈھا نظر آتا تھا۔ لاروتابے اور اس کا ایک ساتھی پہرے پر موجود تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں موجود تھیں۔ یہ رائفلیں جرمن ساخت تھیں اور میں نے اس سے پہلے بستی میں نہیں دیکھی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا سردار راسفے کی کوششوں سے تھوڑا بہت اسلحہ بستی میں پہنچ گیا تھا اور اب اس حوالے سے لاری یکسر تہی دامن نہیں رہے تھے۔

میں اسٹی کے قریب پہنچا تو وہ جلتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "کیا کر رہے ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ ایک دم چیخ کر بولا "کیا کر رہا ہوں؟ کیا کر رہا ہوں؟ جو آتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ کیا کر رہا ہوں۔ تم اندھے ہو سارے' تمہیں نظر نہیں آتا۔"

"ذرا تمیز سے۔" میں نے کہا۔

"میں... میں تم سب کا حشر کرا دوں گا۔ کتوں سے برا سلوک کراؤں گا۔ میں... میں۔"

اس سے آگے گالیوں کی ایک طویل فہرست تھی۔

لاردناب بلا تردد اٹھا اور اس نے استی کو بالوں سے پکڑ کر کئی زوردار طمانچے اس کے منہ پر رسید کیے۔ ان طمانچوں سے استی کا سرخ چہرہ کچھ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تاہم اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کے منہ سے مغلظات نکلنا بند ہو گئیں۔ اب وہ صرف چیخ رہا تھا۔ ان چیخوں میں رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ بس سرکشی تھی اور احتجاج تھا۔ یوں لگتا تھا کہ شیطان جونیئر اتنی زور سے چیخنا چاہتا ہے کہ اس کی آواز بغیر کسی ذریعے کے براہ راست یہاں سے ٹرسٹ تک پہنچ جائے۔

جب اس کی ہیسٹریائی چیخ و پکار رکنے میں نہیں آئی تو لاردناب نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک چٹائی کے نیچے سے ایک لکڑی نکال لی۔ معمولی ہونے کے باوجود یہ لکڑی نہایت غیر معمولی تھی۔ یہ وہی کی بوکو تھا جس کے لازوال اور ناقابل فراموش کارنامے میں ٹرسٹ میں دیکھ چکا تھا۔ بید کی یہ معمولی چھڑی اذیت کی طاقت سے انسانیت کو یوں ہانکتی تھی کہ دیکھنے والی آنکھ کانپ اٹھتی تھی۔ یہ چھڑی انسانوں کی کھال کھاتی تھی اور ان کا لہو چاٹتی تھی۔ ٹرسٹ کے آقا اس چھڑی کے ذریعے لوگوں کی چیخیں نکلواتے تھے اور اپنی آقائی کی شان بلند کرتے تھے۔ لیکن آج یہی چھڑی ایک آقازادے کی طرف اٹھی تھی۔ سیاہ فام کے ہاتھ میں کی بوکو دیکھ کر ایک دم استی کی احتجاجی چیخوں کو بریک لگ گئے۔ اس کے چہرے کی سرخی ایک دم ماند پڑ گئی تھی اور کہیں کہیں سے پیلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ سرکس کے شیر کی طرح وہ حلق کے اندر ہی غرایا اور جھونپڑے کے گوشے میں جا بیٹھا۔

لگتا تھا کہ پچھلے ایک دو روز میں اس چھڑی کے ساتھ ماسٹر استی کا خاصا رابطہ رہا ہے۔

میں نے چھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لاردناب سے کہا "یہ تو کافی کام کی چیز لگتی ہے۔"

لاردناب نے کہا "اسے کی بوکو کہا جاتا ہے۔ یہ ٹرسٹ والوں کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔"

"میں اس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ شاید یہ قدیم زمانے میں غلاموں کو قابو میں رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔"

لاردناب نے اثبات میں سر ہلایا اور اشوکا کی وساطت سے بولا "کنگ براؤن کا کارنامہ ہے کہ اس نے موجودہ دور میں بھی کی بوکو کو اتنا ہی دہشت ناک اور کارآمد ثابت کر کے رکھا دیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس نے ایک خون آشام بلا کو نئی زندگی دی ہے۔"

"تم نے ماسٹر استی کو بھی اس آلے سے متعارف کرایا ہے؟" میں نے سخت تیز لہجے میں پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ لاردناب مسکرائے گا لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا "یہ حرامی اس آلے کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔ بے شمار دفعہ اسے استعمال کر کے لطف بھی لے چکا ہوگا۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس حرامی کو اس آلے کے دوسرے سرے سے متعارف کرایا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اشوکا کے ذریعے پوچھا۔

وہ بولا "پہلے یہ کی بوکو کے موٹے سرے سے واقف تھا جو مارنے والے کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اب یہ پتلے سرے سے متعارف ہوا ہے جو جسم کی کھال ادھیڑتا ہے لیکن ہم نے اس حرامی کی کھال نہیں ادھیڑی، بس ایک دو بار ہلکی ہلکی ضربیں ہی لگائی ہیں۔"

اشوکا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "دراصل کل شام اس نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ چرنے کو سگریٹ مانگ رہا تھا۔ جب سگریٹ نہیں دیا گیا تو اس نے لاردناب کے ساتھی پر تھوکا اور ننگا ہو کر دکھایا۔ ساتھ ساتھ حسب دستور گندی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ لاردناب نے کی بوکو کی مدد سے اس کی تھوڑی سی ٹھکائی کر دی۔"

"بہت خوب، پھر تو بہت اچھا کیا ان لوگوں نے۔" میں نے تائید کی "بلکہ بہتر تھا کہ جس وقت یہ ننگا ہوا تھا اسی وقت پٹائی کی جاتی۔"

"میرا خیال ہے کہ آئندہ ایسا ہی ہوگا۔" اشوکا نے پر امید انداز میں سر ہلایا۔

استی کے قریب ہی چاکلیٹ کا ایک ڈبا پڑا تھا اور ایک بڑا شاندار قسم کا فولڈنگ بستر بھی تھا۔ میں نے اشوکا سے پوچھا کہ یہ اشیا یہاں کیسے آئی ہیں؟

اس نے بتایا "رات کو ٹرسٹ کی مذاکراتی پارٹی پھر یہاں پہنچی تھی پولیس آفیسر بھی ان میں شامل تھا۔ وہی لوگ استی کے لیے کچھ چیزیں لے کر آئے تھے۔ بیٹری سے چلنے والا ویڈیو گیمز اور ٹن پیک فوڈ بھی ان چیزوں میں شامل ہے۔"

"بہت خیال ہے کنگ کو اپنے لخت جگر کا۔" میں نے کہا۔

"ان کا رویہ بھی قدرے نرم لگتا تھا۔ اب یہ بات واضح ہے کہ وہ استی کے لیے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔"

"میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟"

"اس کا جواب میں تمہیں رافے سے بات کرنے کے بعد دوں گا۔"

کچھ دیر بعد میں، اشوکا اور پروفیسر اللہ دتا، سردار رافے کے جھونپڑے میں موجود تھے۔ سردار رافے نے ہمیں اس ساری بات چیت سے آگاہ کیا جو آج نصف شب کو ٹرسٹ کی مذاکراتی ٹیم اور موگاسا والوں کے درمیان ہوئی تھی۔ سردار رافے نے بتایا کہ مذاکراتی ٹیم کا رویہ نرم لگتا تھا۔ انہوں نے اشارہ دیا ہے کہ ٹرسٹ لاریبوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لیے تیار ہے۔ اس بات چیت کے لیے کسی جگہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے اور تمام سابقہ رنجشوں کو بھلا کر ایک نئے تعلق کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

میں نے رافے سے پوچھا "تم نے اس پیشکش کا کیا جواب دیا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ میں ساتھیوں سے مشورے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ گھوڑے اور گھاس کے درمیان کبھی صلح نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی صلح نامہ وجود میں آئے بھی تو اس کی حیثیت عارضی ہوتی ہے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے سردار رافے۔" میں نے تائید کی "بری طرح پھنس جانے کے باوجود کنگ براؤن اتنی آسانی سے ہتھیار پھینکنے والا نہیں۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ ایک سے زائد راستوں پر چل رہے ہیں۔ ایک طرف یہاں موگاسا میں بات چیت کے لیے نمائندوں کو بھیج رہے ہیں دوسری طرف ہماری کمزوریاں پکڑنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔"

پھر میں نے کھنڈرات میں پیش آنے والی ساری صورت حال سے سردار رافے اور اس کے قریبی ساتھیوں کو آگاہ کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب میں سائیں عالی کے ہاں پہنچا تو وہاں کنگ کے گماشتے پہلے سے موجود تھے اور سائیں پر دباؤ ڈال کر اس سے میرے اور علی احمد (صفدر) کے کوائف جاننے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ہمارے کسی قریبی کو اغوا کر کے ہم پر استی کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالا جا سکے۔ سائیں پر دباؤ ڈالنے میں ناکام ہو کر وہ اصلیت پر اتر آئے اور انہوں نے سائیں عالی پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے بعد کے ضروری واقعات بھی میں نے سردار رافے کے گوش گزار کر دیے۔

تازہ صورت حال پر سردار رافے کے ساتھ دیر تک گفتگو ہوئی۔ میں نے رافے کو بتایا کہ ٹرسٹ والوں نے کس طرح وائرلیس اور ٹرانس میٹرز کو جام کر دیا تھا تاکہ کھنڈر میں ہونے والی کسی کارروائی کا علم موگاسا میں نہ ہو سکے۔

سردار رافے نے کہا "میں بھی بہت پریشان تھا۔ میں نے ٹرسٹ والوں کی یہاں آمد کے بعد دو تین مرتبہ آپ سے رابطہ کرنا چاہا مگر ناکامی ہوئی۔ لاردناب بھی میری طرح ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ ویسے کیا اب بھی ٹرانس میٹر کام نہیں کر رہا ہے؟"

میرے بجائے رافے کی بات کا جواب خود ٹرانس میٹر نے دیا۔ میری جیب میں پڑا ہوا ٹرانس میٹر کئی گھنٹے کے بعد سگنل دینے لگا۔ میں نے ٹرانس میٹر آن کیا، دوسری طرف حسب توقع کنگ براؤن ہی تھا "کون بول رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہی جسے تمہارے کتوں نے جنگل میں گھیر کر مارنے کی کوشش کی۔"

"عبداللہ... تم کہاں تھے۔ ہم نے کئی بار..."

"تم سے رابطے کی کوشش کی۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا "یہ تمہارا ایک اور بڑا جھوٹ ہے کنگ براؤن۔ تم نے مجھ سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ رابطہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے خود ہی تو مواصلاتی رابطے کو جام کیا تھا۔"

"خیر نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہرحال ہم تم سے یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ..."

"بہرحال تم مجھ سے یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہاری ناجائز اولاد کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔

"دیکھو عبداللہ! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔"

"تم مجھے حد سے بڑھنے پر مجبور کر رہے ہو۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کے لیے موت کا گڑھا کھود رہے ہو۔ بلکہ یہ گڑھا تم قریباً کھود ہی چکے ہو۔"

کنگ نے کہا "دیکھو عبداللہ یا جو بھی تمہارا نام ہے، ہماری بات غور سے سنو۔ کھنڈر میں جو کچھ ہوا اس سے ہمارا

کوئی تعلق نہیں۔ وہ راجر کا ذاتی فعل تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔ اگر کوئی صورت حال بن بھی گئی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ وہ ہم سے رابطہ کرتا۔۔۔ اور۔۔۔ اور اس نے رابطے کی کوشش بھی کی تھی لیکن چونکہ کوئی لاسلکی آلہ کام نہیں کر رہا تھا لہٰذا اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بہرحال پھر بھی اتنا بڑا فیصلہ خود کرنے کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ اپنی غلطی کی اسے پوری سزا ملے گی۔"

"بالکل انسان کو اس کی غلطی کی پوری سزا ملنی چاہیے۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"دیکھو عبداللہ! ہم اس معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ تم بگاڑ پیدا کر رہے ہو۔ اگر یہ معاملہ بگڑ گیا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بات کہاں تک پہنچے گی۔"

"بہت خوب، دھمکیوں اور درخواستوں کو ساتھ ساتھ چلا رہے ہو۔ ایک کشتی میں پاؤں رکھو تو زیادہ اچھا ہے۔"

"ہم دونوں ہی ایک کشتی میں پاؤں رکھیں تو بہتر ہے لیکن تم تو فی الحال کسی کشتی میں ہی نہیں ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نے تین دن گزر جانے کے باوجود ابھی تک اپنا مطالبہ پیش نہیں کیا ہے' اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم سرے سے بات چیت چاہتے ہی نہیں ہو۔ تم جانتے نہیں ہو کہ وقت تیزی سے سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ تم بارود کے ڈھیر پر بیٹھ کر دیر تک اطمینان سے سگریٹ نہیں پی سکتے ہو۔"

"کل شام تک یہ بارود کا ڈھیر نہیں تھا لیکن اب بن چکا ہے۔ تم نے اور تمہارے اسسٹنٹ راجر نے اپنی چالبازی سے اسے بارود کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ اب ایک زوردار دھماکا سننے کے لیے اپنے کانوں کو تیار کر لو۔ گڈ بائے!" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ٹرانس میٹر پر ایک بار پھر سگنل ملنا شروع ہو گئے۔ یقیناً یہ کنگ براؤن ہی تھا۔ وہی کنگ براؤن جس کے پاس کسی سے بات کرنے کے لیے چند سیکنڈ بھی نہیں ہوتے تھے اب مستقل طور پر ٹرانس میٹر سے لگا بیٹھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دھمکی آمیز الفاظ نے اس کی بے چینی کو کئی گنا بڑھا دیا ہے اور میں چاہتا تھا کہ اس کی بے چینی ابھی مزید بڑھے۔ اس کی بے تابیاں مجھے مزہ دے رہی تھیں اور بات تھی بھی مزے والی۔ ایک بہت بڑا بردہ فروش آج اپنے بچے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے کی سہولت کے لیے ٹن پیک خوراک بھیج رہا تھا اور لگژری بستر بھیج رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے یقیناً اس کے دماغ میں ان سیکڑوں ہزاروں معصوم پھولوں کا خیال نہیں آیا ہو گا جنہیں اس نے سرسبز گلشنوں سے نوچا تھا اور کی بوکو کی مارکیٹ میں بیچ کر کے بکھیر دیا تھا۔ میرے دل و دماغ میں ان باپ بیٹوں کے لیے عجیب سی سنگ دلی بھر گئی تھی۔

میں نے سردار رانفے سے کہا "سردار! ماسٹر اسقی کے لیے ٹرسٹ سے جو بھی چیزیں آئی ہیں' انہیں اچھی طرح چیک کراؤ۔ خاص طور سے بیٹری سے چلنے والی گیمز وغیرہ' ان میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ساری اشیا تم اپنے قبضے میں رکھو۔ کنگ کے بچے کو بھی اس بستی میں وہی سہولتیں میسر ہوں گی جو عام لاری بچوں کو ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

سردار رانفے نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ پروفیسر کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس تکلیف کا تعلق پروفیسر کی گردن کے زخم سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ہمیں حفاظتی انجکشن کی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے جسموں پر خوں خوار جانوروں کے کاٹے جانے کے زخم تھے۔ موبائل کلینک میں اس قسم کے انجکشن موجود تھے۔ میں اور پروفیسر کلینک میں چلے گئے اور خود کو انجکشن لگائے۔ یہ مکمل علاج تو نہیں تھا لیکن کچھ تسلی ہو گئی۔

جب سے میری ملاقات بوڑھے قبائلی داماں سے ہوئی تھی' میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ بوڑھے داماں نے مجھ سے اینڈریو کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ اینڈریو کو اس کی معمولی سی بے احتیاطی کی کتنی کڑی سزا دی گئی ہے۔ اس سے یہ بے احتیاطی اسقی کے حوالے سے سرزد ہوئی تھی۔ وہ اپنے طور پر کوئی کمانڈو کارروائی کرنے کے شوق میں موگاسا بستی کے قریب آ گیا تھا۔ اس واقعے سے اس بے پناہ احتیاط کا پتا چلتا تھا جو کنگ براؤن اسقی کے سلسلے میں کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسقی کے یرغمال بن جانے کے واقعے نے کنگ کو دیوانہ سا کر ڈالا ہے۔ وہ پچھلے ۴۸ گھنٹے میں مجھے ٹرانس میٹر پر سیکڑوں ہی مرتبہ کال کر چکا تھا۔ دیکھے دیکھنے سے مذاکراتی ٹیم بھی موگاسا بستی میں پہنچ رہی تھی۔ اسقی کی جان کے لالے پڑے تھے تو کنگ اور اس کے ساتھیوں کے لیے دیرا بھی ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

میرے ذہن میں اب یہ خیال پختہ تر ہوتا جا رہا تھا کہ اسقی کے لیے کنگ براؤن بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جائے گا۔ دراصل اسقی کی شکل میں ٹرسٹ کی شہ رگ

ہمارے قبضے میں آ گئی تھی۔ یہ ہمارے لیے ایک نہایت سود مند اور ٹرسٹ کے لیے ایک نہایت خوفناک اتفاق ہوا تھا۔ سات پردوں میں محفوظ شیطان زادہ کچھ مناظر کا لائیو مزہ لینے کے لیے کھلے جنگل میں نکلا تھا اور میرے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کنگ اس وقت کو سیکڑوں بار کوس چکا ہو گا جب اس نے اسقی کو ٹرسٹ کی زمین دوز دنیا سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس حوالے سے جو افراد بھی غفلت یا بے پروائی کے مرتکب ہوئے ہوں گے ان کو کنگ کی طرف سے یادگار سزا ملے گی (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ انچارج گارڈز اینڈریو نے بھی کسی ایسی ہی لرزہ خیز سزا سے بچنے کے لیے "دلیری" دکھائی تھی اور اپنی صوابدید پر اسقی کو چھڑانے موگاسا کی جانب گیا تھا۔ جیسا کہ کئی دن بعد معلوم ہوا اینڈریو کی اس دلیری کا نتیجہ اس کی لرزہ خیز موت کی صورت میں نکلا تھا۔ اسے جلاد نما حبشی عورتوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ انہوں نے اینڈریو کے نازک اعضا کو کرنٹ لگا لگا کر اسے جان سے مار ڈالا تھا۔ وہ پورا ایک ہفتہ تڑپتا رہا تھا اور موت کی بھیک مانگتا رہا تھا۔ اینڈریو کے دو ساتھیوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی تھی اور الٹا لٹکا کر کوڑوں کی مدد سے ان کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ ان میں سے ایک فرد زخموں کی تاب نہ لا کر کنگ کے سیکڑوں ہزاروں کشتگان میں شامل ہو گیا تھا)

میرے ذہن میں جو خیال جڑ پکڑ رہا تھا اس کی بنیاد اسی تجزیے پر بھی تھی کہ کنگ اپنے اکلوتے لخت جگر کے لیے اپنے تکبر اور اپنی ہٹ دھرمی کی قربانی دے گا۔ وہ اسقی کی رہائی کے بدلے میں کوئی ایسا مطالبہ رد نہیں کرے گا جسے ماننا اس کے بس میں ہو گا۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اسقی کے بدلے میں ہم جو مطالبات پیش کریں کیوں نہ ان میں اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ شامل کر لیا جائے۔ کنگ براؤن کو اپنے اور صفدر کے بہروپ کے بارے میں بتا دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ ہم ٹرسٹ سے غزالہ' تابی' ریں اور کلثوم کی رہائی چاہتے ہیں۔ بے شک اس مطالبے میں ایک خوفناک رسک بھی پوشیدہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ الٹا لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہ جاننے کے بعد کہ ہمارے میک اپ کے پیچھے اصل چہرے کس کے ہیں' کنگ ہمارے ساتھیوں کو اذیت کی سولی پر لٹکا دیتا یا پھر "گڈوِل ایکشن" کے طور پر ان میں سے ایک دو کو چھوڑنے اور ایک دو کو اپنے پاس رکھنے پر اصرار کرتا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ جوان خواتین یعنی غزالہ اور کلثوم بھی ان کے قبضے میں تھیں اور اگر ان میں پروفیسر کی بیٹی شائستہ کو بھی شامل کر لیا جاتا تو یہ تعداد تین ہو جاتی تھی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر یرغمالی جوان لڑکی ہو تو پھر مخالف فریق پر دباؤ ڈالنے کے ان گنت طریقے سوجھ جاتے ہیں۔ ہمارے سارے ساتھی پہلے ہی دکھوں کے مارے تھے اور ٹرسٹ کی ناقابل عبور دیواروں کے اندر سسک سسک کر جی رہے تھے۔ ان پر مصیبتوں کے نئے پہاڑ ٹوٹتے تو پتا نہیں ان پر کیا بیت جاتی۔

میرے تصور میں غزالہ اور تابی کے چہرے آئے۔ میں نے تخیل کی نگاہ سے دیکھا کہ غزالہ کسی کمرے میں گم صم لیٹی ہے۔ ننھا تابی اپنی معصوم اداؤں سے اسے ہنسانے کی کوشش کر رہا ہے مگر ناکام ہو رہا ہے۔ غزالہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں میرے انتظار کی آگ روشن ہے۔ اس کی اشک بار نگاہ مجھ سے پوچھ رہی ہے "کیا آپ مجھے اور ہم سب کو اس چار دیواری میں بھول گئے ہیں شاد جہاں۔ آپ کن ہنگاموں میں کھو گئے ہیں؟ کس بستی میں جا بسے ہیں؟"

پھر میری نگاہوں کے روبرو یار پُر بہار زریں گل کا چہرہ آیا۔ اس کی تصوراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "خو استاد صیب! آپ نے یہ امارے ساتھ کیا کیا۔ ام کو ہمیشہ کی طرح عورت سمجھ کر پیچھے چھوڑ دیا اور خود مردوں کی طرح لڑنے مرنے کے لیے نکل گیا۔ آپ کو اپنے اردگرد صیدر کے سوا تو شاید کوئی مرد نظر ہی نہیں آتا۔ ام بہت دکھی ہے استاد صیب۔ امارے ہونٹوں پر ہر وقت دردناک پاکستانی فلموں کے دردناک گانے رہتے ہیں۔ ام کسی دن بہت دکھی ہو گیا تو ان نیلی وردی والے منحوس گارڈز سے ٹکرا جائے گا۔ ان کو مار کاٹ کر یہاں سے نکل جائے گا یا پھر اپنا نام شہیدوں میں لکھوا لے گا۔"

اسی طرح کلثوم' تابی' شائستہ سب کے چہرے میری نگاہوں میں آئے اور میں نے ان کو سراپا انتظار و غم میں محسوس کیا۔

اپنے ساتھیوں کی رہائی کو اپنے مطالبات میں شامل کرنے کا فیصلہ بے حد اہم تھا۔ میں اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا' لیکن جس یار غار سے مشورہ کرنا چاہتا تھا وہ شدید بخار میں مبتلا ہو کر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اپنی بیوی کی جدائی کے زخم اس کے دل پر تھے اور اس کے جسم پر بھی۔ وہ مجھے مشورہ کیا دیتا وہ تو اپنے آپ سے بیگانہ تھا پھر میرا خیال پروفیسر اللہ وتا اور اشوکا کی طرف گیا۔ میں نے ان سے مشورے کا فیصلہ کیا۔ اشوکا مسلسل صفدر کے سرہانے ڈیوٹی دے رہا تھا۔

میں نے کچھ دیر کے لیے لارو ناہے کے ایک ساتھی کو صفدر کی دیکھ بھال پر مامور کیا اور خود اشوکا اور پروفیسر کے ساتھ صلاح مشورے میں مصروف ہوگیا۔ ہم ان "مطالبات" پر تبادلہ خیال کرنے لگے جو ہمیں اسٹی کی رہائی کے بدلے ٹرسٹ کو پیش کرنے تھے۔

چار مطالبات تو طے شدہ تھے۔ یعنی حالیہ جھڑپوں میں پکڑے جانے والے تمام قیدیوں کی رہائی۔ نمبر دو لارسیوں کی تمام بستیوں کے اردگرد ایک ایسا علاقہ جو ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے پاک ہو' نمبر تین ان سارے مقدمات کا خاتمہ جو ٹرسٹ کی کٹھ پتلی پولیس کی طرف سے لارسی سرداروں پر بنائے گئے ہیں۔ نمبر چار ٹرسٹ کی طرف سے اس امر کی یقین دہانی کہ آئندہ وہ لارسیوں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہے گا۔ ان مطالبات میں ہم پانچواں مطالبہ یہ شامل کرنا چاہتے تھے کہ ہمارے ان پانچ ساتھیوں کو جو ٹرسٹ میں قید ہیں۔ رہا کردیا جائے گا۔

پروفیسر اور اشوکا کے ذہن میں بھی وہی خدشات آئے جو میرے ذہن میں تھے۔ جس طرح ہم اسٹی اور رویرا کے ناموں کو ٹرسٹ پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کررہے تھے' ٹرسٹ والے بھی ہمارے ساتھیوں کو ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔

اشوکا نے کہا "کیا کچھ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے تعلق ظاہر کیے بغیر ان کی رہائی کا مطالبہ کریں۔"

"میرے خیال میں یہ ممکن نہیں۔" میں نے کہا "کنگ اور اس کے ساتھی بڑی جلدی بات کی گہرائی تک پہنچ جائیں گے۔ پلاسٹک میک اپ کے ذریعے چہرہ تبدیل کرلینے کی بات ان کے لیے نئی تو نہیں ہوگی پھر سائیں عالی کے ساتھ گہرا تعلق بھی ان کے شبے کو تقویت دے گا اور وہ بہت جلد اصلیت جان جائیں گے۔"

پروفیسر نے میرے خیال کی تائید کی۔

اشوکا نے کہا "ویسے ایک بات آپ لوگوں کے حق میں بھی جاتی ہے۔ آپ جن لوگوں کی رہائی کا مطالبہ کریں گے ان سے آپ کا اور صفدر صاحب کا بظاہر کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسا خونی یا قریبی رشتہ ظاہر نہیں ہوتا۔ بس وہ آپ کے ساتھی ہیں۔ دوسری طرف ماسٹر اسٹی کنگ کا اکلوتا بیٹا ہے اور اس کی بیوی کی آخری یادگار ہے۔"

یہ بات میرے اپنے ذہن میں بھی آئی تھی اور اس میں وزن بھی تھا۔ بہرحال اس سارے معاملے میں رسک کی موجودگی سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔

ہم تینوں کے درمیان کافی دیر بحث مباحثہ ہوا۔ آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ اسٹی کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ایک زبردست کارڈ موجود ہے۔ یہ کارڈ ہمیں پورے اعتماد کے ساتھ کھیلنا چاہیے اور کنگ کے سامنے مکمل کرا کے ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کردینا چاہیے۔ یوں تو اس فیصلے میں اشوکا اور پروفیسر بھی شریک تھے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو تمام ذمے داری اور رسک کا سارا بوجھ میرے کندھوں پر تھا۔ آخری فیصلہ میں نے ہی کیا تھا اور اب اس کے عواقب سے میں کسی طور بری الذمہ نہیں ہوسکتا تھا۔

مطالبات پیش کرنے سے پہلے میں نے سردار رانے کو اعتماد میں لینا بھی ضروری سمجھا۔ مطالبات کے سلسلے میں سردار سے حتمی مشورہ کیا جانا ضروری تھا' اس کے علاوہ ایک اور اہم بات بھی تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ سردار رانے کو۔ کم از کم سردار رانے کو اس حقیقت سے آگاہ کردیا جاتا جو ہم اب تک چھپائے ہوئے تھے۔ یعنی اسے بتا دیا جاتا کہ ہمارے چہرے جنہیں وہ کئی ہفتوں سے دیکھ رہا ہے اصلی نہیں ہیں' اور نہ ہی وہ نام اصلی ہیں جن سے وہ ہمیں پکار رہا ہے۔

میں نے جب یہی بات اشوکا کے ذریعے سردار رانے کو بتائی تو اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنی پیشانی پر مخصوص انداز میں انگلی پھیر کر بوویوتا کو یاد کیا۔ بالکل جیسے حیرت کے عالم میں سینے پر صلیب کا نشان بنا کر خدا کو یاد کیا جاتا ہے پھر وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولا "اگر آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آرہے ہیں تو پھر آپ کیا ہیں؟"

میں نے کہا "آپ نے ان دو قیدیوں کے بارے میں سنا ہوگا جو کچھ عرصے پہلے ٹرسٹ سے فرار ہو کر جھیل زار کی بستی میں پہنچے تھے۔ وہ وہیں بستی میں رہنے لگے تھے اور پھر ان میں سے ایک کے ساتھ محترم بوکارلو کی بھتیجی ویرا محبت کرنے لگی تھی۔ ان کے رومانس کا بہت چرچا ہوا تھا۔"

"ہاں میں نے سن رکھا ہے' بڑی اچھی طرح سن رکھا ہے۔" رانے نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا "ان میں سے ایک کا نام صفدر ہے۔ ہمارے محترم سردار بوکارلو نے اپنی موت سے چند روز قبل صفدر اور محترمہ ویرا کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا تھا۔"

"اب وہ دونوں افراد آپ کی اسی بستی میں موجود ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن میں تو۔۔۔ ان سے نہیں ملا۔"

"آپ مجھ سے اور علی احمد سے نہیں ملے؟"

سردار رانے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھتا چلا جارہا تھا پھر اس کے منہ سے لرزاں آواز نکلی "کیا آپ۔۔۔ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ۔۔۔ آپ میرا مطلب ہے کہ آپ۔۔۔!" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"ہاں سردار رانے! ہم ہی ٹرسٹ کے وہ مفرور قیدی ہیں جن کا ذکر خیر تم کررہے ہو۔"

سردار رانے کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کچھ ڈرا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ شاید یہ بات اس کے دماغ میں سما نہیں رہی تھی کہ کسی مصنوعی طریقے سے انسان کی شکل بھی بدلی جاسکتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی پیشانی پر انگلی پھیر کر اپنے دیوتاؤں کو یاد کیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنا شروع ہوگئی تھیں۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ جزبز ہو کر بولا۔

"جدید دنیا میں سب کچھ ممکن ہے سردار۔۔۔ تم لوگ تیر کمان سے دشمن کا مقابلہ کرتے ہو لیکن اب تم شعلے اگلنے والی بندوقیں دیکھ رہے ہو۔ یہ ایسے جنگی ہتھیار ہیں جو ایک ہی وار میں گولیوں کی بوچھاڑ کرکے درجنوں لوگوں کو ہلاک کردیتے ہیں۔ تم نے واکی ٹاکی دیکھے ہیں جن کے ذریعے ہم دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بہ آسانی بات کرلیتے ہیں۔ تمہارے چہرے پر نظر آنے والی عینک ویرا نے تمہیں لگائی تھی یہ بھی تو ایک حیران کن چیز ہے۔ اب تم چیزوں کو واضح اور صاف دیکھ سکتے ہو۔ ان جنگلوں سے دور جدید دنیا میں اس سے بھی بڑے بڑے کرشمے موجود ہیں۔ شکل کی تبدیلی بھی ان میں سے ایک کرشمہ ہے۔ تمہیں ابھی یقین نہیں آرہا لیکن بہت جلد تم یقین کرلو گے۔"

رانے نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور مری مری آواز میں بولا "کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ۔۔۔ محترمہ ویرا آپ کی بیوی ہیں؟"

"نہیں میرا نام شاہ جہاں ہے۔ وہ صفدر کی بیوی ہے۔ میرے لیے اس کی حیثیت چھوٹی بہن کی سی ہے۔"

سردار رانے کے چہرے پر الجھن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کی الجھن اتنی جلدی دور نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہرحال سردار نے ہمارے ان مطالبات کی تفصیل سن لی تھی جو ہم ٹرسٹ کو پیش کرنے والے تھے۔ اس نے ان مطالبات کو مناسب قرار دیا تھا۔ اس نے صرف ایک نکتہ اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ مطالبات میں محترم بوکارلو کی واپسی کا مطالبہ شامل نہیں۔

میں نے وضاحت کی کہ ہمارے سب سے پہلے مطالبے میں محترم بوکارلو کا ذکر بھی موجود ہے۔ ہمارا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ حالیہ جھڑپوں میں پکڑے جانے والے تمام قیدی رہا کیے جائیں' چاہے ان کا تعلق ٹرسٹ سے ہو' یا لارسیوں سے۔ (اس سے پہلے ہم کنگ کے سامنے وضاحت بھی کرچکے تھے کہ ان قیدیوں میں محترم بوکارلو بھی شامل ہیں)

دن نو بجے کے قریب میں نے ٹرانسمیٹر سیٹ چیک کیا۔ اور پھر کنگ براؤن کو سگنل ارسال کردیا۔ کنگ براؤن تو جیسے ٹرانس میٹر کے بٹن پر انگلی رکھے بیٹھا تھا۔ ایک لمحے میں اس سے رابطہ ہوگیا "کون بول رہا ہے؟" کنگ نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"اسٹار اسپیکنگ!" کنگ نے اپنا کوڈ نیم بتایا۔

"میں آپ کا خادم شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف یقیناً کنگ براؤن اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی پرتحیر آواز ابھری' اس آواز میں طیش کی جھلک بھی تھی۔ وہ بولا "تم دونوں کہاں تھے باسٹرڈ! ہم پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے رہے ہیں۔"

"ہم بستی میں ہی تھے جناب۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔ ہمارے آدمیوں نے ہر جگہ تمہیں ڈھونڈا ہے۔" کنگ کی آواز سے غضب کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

کنگ کی بات سے اس امر کی سو فی صد تصدیق ہوگئی تھی کہ ابھی بستی میں ٹرسٹ کے مزید مخبر بھی موجود ہیں "بولتے کیوں نہیں ہو۔ کہاں تھے تم؟" کنگ پھر ٹرانس میٹر پر چنگھاڑا۔

"ہم یہیں تھے جناب! لیکن آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں مل رہا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ بستی میں کیا ہوا ہے؟"

"جی ہاں جناب! ہماری بدقسمت نگاہوں کو محترم چینو کی موت کے بعد یہ منظر بھی دیکھنا تھا۔ ہم یہاں ماسٹر اسٹی صاحب کو سائیں عالی کے لعنتی چیلوں کے قبضے میں دیکھ چکے ہیں۔"

"شاید تم واقعی بدبخت ہو۔" کنگ کے منہ سے بے ساختہ نکلا "ہم نے جب سے تمہیں یہاں بھیجا ہے ہمارے لیے بری سے بری خبر ہی آئی ہے۔ وہاں تمہاری موجودگی میں چینو قتل ہوا۔ وینڈر (جوری) کو بیدردی سے مارا گیا' اور اب اسٹی لارسیوں کے چنگل میں ہے۔ تم۔۔۔ تم آخر کیا کرتے پھر رہے ہو۔ ہم تمہیں ایک بات بتا دیں' ہمارے نزدیک

جھوٹ۔ غداری کے مترادف ہے اور غداری کی سزا تم جانتے نہیں ہو۔"

"ہم نے کون سا جھوٹ بولا ہے جناب؟"

"تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ تم اور تمہارا ساتھی موگاسا میں موجود نہیں ہو۔"

کنگ کا لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ہمارے حوالے سے شک میں مبتلا ہو چکا ہے اور گزرنے والے وقت کے ساتھ یہ شک پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں جناب کہ ہم موگاسا میں ہی ہیں۔"

چند لمحے کے توقف کے بعد کنگ براؤن نے کہا "اچھا، ہم کچھ دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ تم موگاسا میں ہی ہو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم موجودہ حالات میں ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"ہم دونوں نے بھی اس بارے میں بہت سوچا ہے جناب! لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میری تو رائے ہے کہ آپ اسقی کو اغوا کرنے والوں کی بات مان ہی لیں۔ وہ لوگ آپ کی توقع سے زیادہ خطرناک ہیں۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کے تیور یہی بتاتے ہیں کہ اگر یہ مسئلہ ان کی مرضی کے مطابق حل نہ ہوا تو وہ خدانخواستہ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہم نے تم سے صورت حال پر تبصرہ کرنے کی درخواست نہیں کی۔" کنگ ٹرانس میٹر پر چنگھاڑا "تم سے یہ پوچھا ہے کہ ان حالات میں تم ہمارے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"پچھلے دو تین روز سے ہم یہی تو سوچ رہے ہیں جناب۔"

"ہمارا خیال ہے کہ تم صرف بک بک کر رہے ہو۔" کنگ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا "ہمیں تمہارے لہجے سے غداری کی بو آ رہی ہے۔ سچ بتاؤ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے اور اب کہاں سے بول رہے ہو۔" پھر ایک دم کنگ کے ذہن میں سب سے اہم نکتہ آیا۔ یہ نکتہ اس کے ذہن میں فوراً آ جانا چاہیے تھا مگر یوں لگتا تھا کہ وہ بہت پراگندہ ذہن ہے۔ اس نے کہا "تم جس ٹرانس میٹر پر بات کر رہے ہو، یہ تو ہم نے سائیں عالی کے مرید عبداللہ کو فراہم کیا تھا کہ وہ ہم سے رابطہ کر سکے۔ یہ تمہارے استعمال میں کیسے آیا ہے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "اصل بات یہ ہے جناب عالی کہ عبداللہ کو یہاں بیٹھے بیٹھے کی شکایت ہو گئی تھی۔ سائیں عالی صاحب نے اپنے علم کے زور سے عبداللہ کی روح اس کے جسم سے میرے جسم میں منتقل کر دی ہے۔ اب عارضی طور پر میں عبداللہ کی ڈیوٹی بھی انجام دے رہا ہوں۔ یہ دیکھیں اب میری آواز کتنی بدل گئی ہے، آپ نے جان لیا ہوگا کہ یہ عبداللہ کی آواز ہے۔" میں نے آخری الفاظ عبداللہ کی آواز میں کہے تھے۔

ٹرانس میٹر پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ دوسری جانب کنگ براؤن پر سکتہ طاری ہو گیا ہے "ہیلو! ہیلو جناب، کہیں آپ فوت تو نہیں ہو گئے ہیں۔" میں نے دریافت کیا۔

اس خطے کے "عظیم" بردہ فروش سے اس لہجے میں بات کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

دوسری طرف سے کنگ کی جو آواز سنائی دی، وہ بے حد گمبھیر اور جنون آمیز تھی۔ اس آواز کی لرزش میں طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "تم دونوں کی موت کو ہم عبرت ناک مثال بنا دیں گے شاہ جہاں۔ تم دونوں نے ہمیں بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ ہم تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"اس اطلاع کا شکریہ پیارے کنگ۔ اب ایک گزارش ہماری طرف سے بھی سن لو۔" میں نے اطمینان سے کہا "اسقی ہمارے قبضے میں ہے۔ سمجھو کہ تمہاری یہ ناجائز اولاد چوبیس گھنٹے گن پوائنٹ پر ہے۔ جن لارسیوں کے معصوم بچے تمہارے ہاتھوں ہلاک ہوئے یا ہمیشہ کے لیے اپنے والدین کی نظروں سے اوجھل ہوئے، وہ سرتاپا قہر بن چکے ہیں۔ تمہارا کیا دھرا آج تمہارے بچے کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ لوگ چین ہی کی طرح اسقی کی بھی تکا بوٹی کر دینا چاہتے ہیں۔ تمہیں ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم لارسیوں اور اسقی کے درمیان دیوار بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت ہم درمیان سے ہٹے تمہیں، اپنے بیٹے کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ میں اپنے الفاظ دہراتا ہوں پیارے کنگ۔ ان کو یاد رکھنا۔ جس وقت ہم درمیان سے ہٹے مشتعل لارسی تمہارے بیٹے کا نام و نشان مٹا دیں گے، یہی وہ دھماکا ہے جس کا ذکر میں نے کچھ دیر پہلے کیا تھا۔"

میری آواز جذبات کے بوجھ سے مہیب ہو گئی تھی۔ آواز کی اس کیفیت کو اور الفاظ کی شدت کو اور حالات کی سنگینی کو کنگ نے بھی محسوس کیا اور اس کے شعلوں پر جیسے پانی سا پڑ گیا۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "اب جبکہ تم کھل کر سامنے آ گئے ہو شاہ جہاں! مجھے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں کوئی ایسی چیز نہیں چاہتا کنگ، جو تمہارے بس میں نہ ہو۔ پھر سمجھ لو کہ میں نے تمہیں وہ سب کچھ دے دیا۔ یہ الفاظ میرے بھی یاد رکھنا شاہ جہاں۔ اس دنیا میں [illegible] اسقی سے بڑھ کر عزیز مجھے اور کچھ نہیں۔ خدا نہ کرے [illegible]سقی کو کچھ ہوا تو میں تمہارا اور تم سے وابستہ افراد کا وہ [illegible]حال کروں گا کہ لوگ صدیوں تک یاد رکھیں گے۔ تمہاری [illegible]طرح میں بھی اپنے الفاظ دہراتا ہوں۔ خدا نہ کرے اگر [illegible] کو کچھ ہوا تو میں تم لوگوں پر قیامت قائم کر دوں گا۔"

"تم پھر دو کشتیوں میں پاؤں رکھ رہے ہو کنگ۔ [illegible]یاں بھی دے رہے ہو اور ڈر بھی رہے ہو۔"

"میں صرف ڈر رہا ہوں۔ صرف ڈر رہا ہوں میں۔" [illegible] نے جنونی انداز میں کہا "میں اپنے آپ سے ڈر رہا [illegible] اپنے اندر کی وحشت سے خوف زدہ ہوں۔" اس نے [illegible] توقف کیا اور بولا "میں جانتا ہوں شاہ جہاں! تم [illegible] بہت خطرناک لوگ ہو۔ تمہارا نام جرائم کی دنیا کے چند [illegible]چے افراد میں سے ہے، تمہاری پوری ہسٹری شیٹ اس [illegible] میرے سامنے اسکرین پر نظر آ رہی ہے۔ یہ سب کچھ [illegible]ے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن اس وقت تک جب [illegible] خدانخواستہ اسقی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر اسے [illegible]ان پہنچ گیا تو پھر یہ سب کچھ۔۔۔ ہاں سب کچھ بے معنی [illegible]ے گا، میں یسوع کی قسم کھاتا ہوں میں تم دونوں کو دس [illegible]روں کے اندر سے مردہ کتوں کی طرح گھسیٹ کر لے آؤں [illegible]ر ایک باوقار موت کے حوالے کروں گا۔"

میں ایک بات نوٹ کر رہا تھا۔ کنگ براؤن ہمیشہ اپنے [illegible] "ہم" کا صیغہ استعمال کرتا تھا لیکن اس موقع پر وہ اتنا [illegible]نی ہو رہا تھا کہ اپنے لیے "میں" کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ [illegible]ل جیسے اچانک آ جانے والی شدید تکلیف کے وقت ہر [illegible]ں کی زبان سے اپنی مادری زبان میں "ہائے" نکلتا ہے۔

"اسقی کی سلامتی کا انحصار اب تمہارے رویے پر ہے [illegible]ب۔" میں نے جملے کے ہر لفظ پر زور دیا۔

"تمہارا مطالبہ کیا ہے؟" کنگ نے پوچھا۔

"کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں، بس چند چھوٹے چھوٹے مطالبات ہیں۔"

"بولو۔"

"کل پانچ مطالبات ہیں۔ نمبر ایک، حالیہ جھڑپوں میں [illegible]ڑے جانے والے تمام قیدیوں کی رہائی۔ ان قیدیوں میں [illegible]رم بوکارلو بھی شامل ہیں، نمبر دو لارسیوں کی تمام بستیوں [illegible]کے گرد ایک ایسے علاقے یا حفاظتی پٹی کا قیام جو ہر قسم کی

بیرونی مداخلت سے پاک ہو، نمبر تین، ان سارے مقدمات کا خاتمہ جو مقامی پولیس کی طرف سے لارسی سرداروں پر بنائے گئے ہیں۔ نمبر چار، ٹرسٹ کی طرف سے اس امر کی یقین دہانی کہ آئندہ ٹرسٹ اور لارسی آپس میں امن و آشتی کے ساتھ رہیں گے۔ نمبر پانچ میرے اور صفدر کے ساتھیوں کی رہائی، ان میں مائیکل کی بیوی شائستہ بھی شامل ہے۔"

"یہ مطالبات کی پوری فہرست ہے۔" کنگ کا لہجہ خشک تھا۔

"جو کچھ بھی ہے، تمہارے سامنے ہے۔ اس کے بدلے لارسی ان تمام قیدیوں کو رہا کریں گے جو حالیہ جھڑپوں میں پکڑے گئے ہیں، ان میں تمہارے افغا ئیں کمانڈز بھی شامل ہیں۔ اسقی کو رہا کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ لارسی سرداروں کی طرف سے یہ عہد ہوگا کہ وہ ٹرسٹ کے ساتھ تصادم کے بجائے مفاہمت کی راہ اختیار کریں گے۔"

"اور تم ہماری خاطر یہ سب کچھ کرواؤ گے۔" کنگ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

"بے شک ہم کروائیں گے۔ کیونکہ ہم یہاں امن دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اس امن ہی کی خاطر تم نے ہمارے کیمپ پر حملہ کر کے ماسٹر اسقی کو اغوا کیا۔" کنگ نے طنز کا ایک اور زہریلا تیر چھوڑا۔

"بے شک امن ہی کی خاطر میں نے تمہارے کیمپ سے ماسٹر اسقی کو اغوا کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس رات اسقی میرے قبضے میں نہ آتا تو تم موگاسا کی گلیوں کو لارسی مردوں کے خون سے رنگین کر دیتے اور ان کی ہر عورت تمہارے بستروں پر پامال ہو جاتی۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ تم نے۔۔۔" کنگ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ غالباً اس نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر خود پر ضبط کیا تھا۔

اپنے آتشیں لہجے پر اس نے خود ہی پانی کے چھینٹے ڈالے اور قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا "تم نے اسقی کا ذکر کیا ہے لیکن ویرا کا نہیں کیا۔ ہم اس کی وجہ پوچھ سکتے ہیں۔"

"جیسا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو، ویرا کی شادی اس کی اپنی خواہش اور کوشش سے صفدر کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا ہے، وہ ایک عاقل بالغ لڑکی ہے، وہ اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہے گی جا سکے گی۔"

"ویرا اس وقت کہاں ہے؟" کنگ نے اچانک سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ ممکن ہے کہ تمہارے مخبروں کو معلوم ہو۔"

"ایک بات ذہن میں رکھنا شاہ جہاں۔ ریرا کو اگر کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کی ذمے داری بھی تم پر اور صرف تم پر آئے گی۔"

"میں کوئی ذمے داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ہم اسے تلاش کر رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی کر رہے ہو گے۔ فی الوقت تو ریرا کے لیے یہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ ایک باریک سی حیوانی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ آواز یقیناً اس منحوس چھپکلے کی تھی جو ہر وقت کنگ کے قریب موجود رہتا تھا۔ اس چھپکلے کا خیال آتے ہی وہ سارا "ویڈیو سیٹ" میری نگاہ میں گھوم گیا جس کا تعلق کنگ براؤن کی عظیم الشان نشست گاہ سے تھا۔ اس خاص الخاص دائرہ نما کمرے میں دنیا کا جدید ترین مواصلاتی نظام موجود تھا۔ ایک وسیع چینل پر درجنوں ریڈیو اسکرینیں تھیں جن پر زرسٹ کے ہر ہر گوشے کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ کنگ کے گرد حسین و جمیل نیم عریاں خادماؤں کا جمگھٹا رہتا تھا اور شراب ناب کے جام گردش کرتے تھے۔

کئی سیکنڈ کے وقفے کے بعد کنگ کی گمبھیر آواز سنائی دی "ہم تھوڑی دیر بعد تم سے رابطہ کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

میں جانتا تھا کہ مطالبات سخت ہیں اور کنگ کی حالت ان مطالبات کے بعد اس کیچوے کی سی ہو چکی ہے جسے بل میں سے کھینچ کر اس پر نمک چھڑک دیا گیا ہو۔ تاہم استقی کی صورت میں جو مہرا ہمارے ہاتھ میں تھا وہ بھی معمولی نہیں تھا۔ یہ ترپ کا پتا تھا، اسمِ اعظم تھا اور جادو کا چراغ تھا۔ یہ تائید ایزدی بن کر ہمارے ہاتھ میں آیا تھا اور اس نے کنگ کو عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔

میں نے سردار رانے کے علاوہ پروفیسر اللہ دتا اور اشوکا وغیرہ کو کنگ کے ساتھ اپنی بات چیت سے آگاہ کیا۔ اسی دوران میں لاروناب بھی وہیں پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا "لاروناب! یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بستی میں جوری کے علاوہ بھی زرسٹ کے مخبر موجود ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ شیطان جونیئر کی نگرانی مزید سخت کر دی جائے اور بہتر ہے کہ تم خود بھی زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارو۔ اب ہم فیصلہ کن مرحلے میں ہیں اور ہمیں غیر معمولی طور پر چوکس رہنا چاہیے۔" لاروناب نے اثبات میں سر ہلایا اور فوراً [illegible] کے پاس واپس چلا گیا۔

اتنے میں ایک جواں سال لارسی ہانپتا کانپتا ہوا مرے پہنچ گیا۔ اس نے اشوکا کو بتایا کہ صفدر کی حالت خراب ہے۔ اشوکا نے یہ اطلاع ہم تک پہنچائی۔ اس نے لارسی کی [illegible] کرتے ہوئے کہا "صفدر صاحب کی ناک سے خون [illegible] ہے۔"

میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ تیز بخار کی حالت میں ناک سے خون آنا خوفناک علامت تھی۔ میرے ذہن میں دماغ کی شریان پھٹنے کا خیال آیا اور اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں پایا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر میں اشوکا اور ہونو کے ساتھ شفا خانے کی طرف لپکا۔ اب دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ رات بھر کی تیز بارش اب ہلکی بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں اس جھونپڑے کے پاس سے گزرا جہاں استقی کو رکھا گیا تھا۔ وہاں سے چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ شاید ماسٹر استقی کو پھر چیخنے چنگھاڑنے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ لاروناب کے پاس اس دورے کا علاج کی بوکو کی صورت میں موجود ہے۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک نہایت بلند و بالا درخت تھا۔ اس درخت کی بلند ترین شاخوں پر لاروناب کے دو سیاہ فام ساتھیوں نے مچان بنا رکھی تھی۔ ان کے پاس ایک ٹیلی اسکوپ بھی تھی جس کے ذریعے وہ ارد گرد پر نگاہ رکھتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ موگاسا کی نسبت جھیل زار کے لارسی زیادہ عقل مند اور زیادہ فہم ہیں۔

ہم شفا خانے پہنچے تو صفدر کی حالت واقعی خون رلانے والی تھی۔ اس کے ایک نتھنے سے بہنے والا خون اس کے رخسار تک پہنچا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کچھ خون پونچھا بھی جا چکا تھا۔ صفدر مسلسل نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کا چہرہ بخار کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ جہاں جہاں جنگلی کانٹے اس کے جسم میں ٹوٹے تھے وہاں نمایاں سوزش موجود تھی اور جلد بالکل سرخ نظر آ رہی تھی۔ مائنر سرجری کے ذریعے ان کانٹوں کا نکالا جانا اشد ضروری تھا لیکن سرجن اور آپریشن تھیٹر یہاں سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر بھی موجود نہیں تھا۔

بے تاب ہو کر میں نے صفدر کا سر اپنی گود میں لے لیا اور آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگا "آنکھیں کھولو صفدر۔ پلیز میری طرف دیکھو۔"

اس کی پلکوں میں معمولی سی لرزش پیدا ہوئی لیکن آنکھیں کھلی نہیں۔ پلکوں کی لرزش سے مجھے یہ اشارہ ملا تھا

صفدر مکمل بے ہوشی میں نہیں، وہ میری آواز سن رہا ہے کم از کم اسے یہ احساس ضرور ہے کہ میں اسے پکار رہا ہوں۔ خدانخواستہ اگر اس کے دماغ کی نس کے ساتھ کچھ ہوا ہوتا تو اس کی بے ہوشی اس طرح کی نہ ہوتی۔ خون کے اس اخراج کو نکسیر وغیرہ سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ میں بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اشوکا نے بتایا کہ بے ہوشی میں وہ جب بڑبڑاتا ہے اس کے ہونٹوں پر ویرا کا نام ہوتا ہے۔

سردار رانے مجھے اور اشوکا کو صفدر کے پاس سے ہٹا کر ایک طرف لے گیا اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگا۔ یہ بات اس کے دماغ میں سما ہی نہیں رہی تھی کہ میرے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ بھی ہے۔ وہ جب بھی مجھے دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں ایک خوف ابھر آتا تھا۔ بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ اسے تھوڑا بہت یقین بھی آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا "اس سے پہلے میں حیران تھا کہ علی احمد نے ویرا صاحبہ کی تلاش میں اتنی سرگرمی کیوں دکھائی اور کیوں سب خطروں کو ایک طرف رکھ کر اکیلے جنگل میں گھس گئے۔ اب وہ ساری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ علی احمد نہیں ہے بلکہ صفدر صاحب ہیں اور صفدر صاحب کی شادی محترمہ ویرا سے ہو چکی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ صفدر صاحب کی موجودہ حالت کی اصل وجہ بھی ویرا صاحبہ کی جدائی ہی ہے۔ اگر ہم ان کی حالت بہتر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں جلد از جلد ویرا بی بی کو ان کے سرہانے لانا ہوگا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ ریرا کو اس کے سرہانے تک کیسے لایا جائے۔ وہ تو کہیں نشان تک چھوڑ کر نہیں گئی ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

اچانک میرے ذہن میں سائیں عالی کا خیال آیا۔ بستی میں پہنچ کر کچھ دیر کے لیے سائیں کا خیال میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا۔ یہ سائیں عالی ہی تھا جس سے بات کرنے کے لیے میں کھنڈرات میں پہنچا تھا اور وہاں سے ایک نیا ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ سائیں سے بات کرنے کی رائے مونابہ نامی ایک لڑکی نے دی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ سائیں ویرا کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتا ہے۔

میں بھاگم بھاگ سائیں عالی کے پاس پہنچا۔ وہ سردار کے جھونپڑے میں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی اور لالام کی خوب رو بیوی اپنے کولھے سہلا رہی تھی۔ یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ سائیں نے اسے نشانہ رسید کی ہیں۔ وہ موڈ میں ہوتا تھا تو بلا ترد میزبانوں کو بھی پیٹ ڈالتا تھا۔ سائیں کے سامنے چار پانچ پیالے رکھے تھے، کسی میں دودھ تھا، کسی میں شربت، کسی میں سادہ پانی یا لسی۔ غالباً یہ مشروبات سائیں عالی کو پیش کیے گئے تھے لیکن وہ ان میں سے کسی سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا۔ اب اس کے میزبان بھی اس سے بیزار سے نظر آنے لگے تھے۔

میں نے کہا "سائیں یہ کیا تماشا ہے؟ کیوں تنگ کر رہے ہو؟"

"میں کہاں تنگ کر رہا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تھا کیا پیو گے۔ میں نے کہا کانجی پیوں گا۔ بس ان کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آ رہی۔ لفظوں سے سمجھایا ہے، اشاروں کنایوں سے بتایا ہے مگر ان کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ سارے کے سارے کوڑھ مغز ہیں۔"

میں نے کہا "تم ان پر رحم کرو اور کوئی آسان سا مشروب بتا دو جو یہ مہیا کر سکیں۔"

"آسان ہی تو بتا رہا ہوں، ورنہ تمہیں تو پتا ہے کہ میں کانجی میں چھوٹی مکھی کا شہد ملا کر پیتا ہوں۔" اس نے ایک اور چھڑی چٹاخ سے لالام کی زوجہ کے کولھوں پر رسید کر دی، وہ برے برے منہ بناتی باہر چلی گئی۔

سائیں بولا "دیکھا۔ دیکھا کیسے بڑبڑاتی ہوئی باہر گئی ہے، تحمل تو ان لوگوں میں ہے ہی نہیں۔ ایک وہ بھلی مانس سروج ہے۔ جوتے کھا کر بھی مسکراتی رہتی ہے۔ بس ایسے لوگ ہی صلہ پاتے ہیں۔"

"بہت اچھا صلہ پایا ہے اس نے۔ نیم پاگل ہو کر رہ گئی ہے۔ بمبئی کے کسی نفسیاتی اسپتال میں علاج کرا رہی ہوگی۔ تم اتنے ہی پہنچے ہوئے ہو تو اسے کیوں ٹھیک نہیں کرتے؟"

سائیں ایک دم مشتعل ہو گیا "خبردار۔۔۔۔ خبردار۔" وہ چیخا "یہ کتاب بند ہی رکھو تو اچھا ہے، ورنہ بڑی لمبی چوڑی بحث ہو گی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں بھی بحث کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے۔ میں تم سے ایک بہت ضروری بات پوچھنے آیا ہوں۔ میں ویرا کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔"

"ویرا؟ کون ویرا؟" سائیں صاف مکر گیا۔

"دیکھو سائیں۔" میں نے ذرا عاجزی سے کہا "صفدر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے کسی سے معلوم ہوا ہے کہ تم ویرا کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔ پلیز! اگر تمہیں واقعی کچھ معلوم ہے تو مجھ سے چھپاؤ مت۔"

سائیں نے انگلی سے اپنی پیشانی ٹھوکی پھر اچانک جیسے

اسے کچھ یاد آیا وہ قہقہہ لگا کر بولا "اچھا تو تم بھورانی کی بات کر رہے ہو۔"

"ہاں وہی جسے تم بھورانی کہتے ہو۔"

ہنستے ہنستے سائیں نے اپنا سر عجیب انداز سے جھٹکا اور پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد گمبھیر آواز میں بولا "شفیع محمد! وہ تو اب نہیں آئے گی۔ وہ بہت دور چلی گئی ہے۔ اتنی دور کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے' وہ جنات کے قبضے میں ہے اور جنات بھی ایسے ہیں جنہیں آج تک کسی نے دیکھا ہے اور نہ جانا ہے۔ اسے تو اب بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ اپنے یار سے بھی کہو کہ اسے بھول جائے۔ وہ اب ایک خواب ہے اور خواب دن کی روشنی میں کبھی حاصل نہیں کیے جا سکتے۔"

"سائیں! ہماری پریشانیوں میں اضافہ مت کرو۔ اگر تمہیں واقعی اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو بتا دو' ورنہ خاموش رہو۔"

"مجھے معلوم ہے شفیع محمد اور میں نے بتا بھی دیا ہے۔" سائیں بدستور سنجیدگی سے بولا "بھورانی ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے۔ اسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ جو واپس نہ آ سکے' پھر سے مل نہ سکے اس کا انتظار کرنا اس کے غم میں گھلنا بیکار ہے۔ اسے بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"لیکن وہ اسے نہیں بھول سکتا سائیں عالی۔ وہ میرا دوست ہے۔ مجھ سے بہتر اسے کوئی نہیں جانتا۔ وہ اپنی جان دے دے گا۔"

"بہت سے صدمے ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں انسان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ انہیں جھیل نہیں سکتا لیکن جب وہ صدمے آتے ہیں تو انہیں کسی نہ کسی طور جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ انسان بڑا سخت جان ہے شفیع محمد! تمہارا دوست بھی ٹوٹ پھوٹ کر ٹھیک ہو جائے گا۔ جلدی نہ ہوا تو دیر سے ہو جائے گا۔ مہینوں میں نہ ہوا تو سالوں میں ہو جائے گا۔ اور اگر....." سائیں کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"اگر کیا؟"

"اگر مر بھی گیا تو کیا ہے۔ ہر زندہ نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ کیا تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے' کیا میں نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے؟"

"خاموش رہو۔" میں چیخ کر بولا "ایسی باتیں مت کہو اپنی زبان سے۔ تم۔ تم میرا کلیجا چیر دو گے۔"

نجانے کیا بات تھی کہ سائیں کو اہمیت نہ دینے کے باوجود میں اس کی باتوں کو اہمیت دے رہا تھا۔ یہ باتیں سیدھی میرے دل میں اترتی جا رہی تھیں۔ شاید یہ اس ماحول کا اثر تھا یا پھر ان لمحات میں ہی کوئی ایسا فسوں تھا کہ میں سرا پا ... گیا تھا۔

سائیں کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ ا... عجیب سی خواب ناک کیفیت اس کے چہرے کا احاطہ ... ہوئے تھی۔ ان لمحوں میں وہ واقعی عام انسانوں سے مختلف کوئی چیز نظر آتا تھا۔

میں نے اپنے اضطراب پر حتی الامکان قابو پاتے ہوئے کہا "سائیں تم اپنی باتوں سے مجھے مایوس کر رہے ہو۔ تمہارے خیال میں امید کی کوئی کرن نہیں؟"

"نہیں۔" سائیں نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

"کیوں نہیں؟" میں نے سائیں کو شانوں سے پکڑ ... باقاعدہ جھنجوڑ دیا۔

"اس لیے کہ تمہارا یار مر چکا ہے۔ وہ زندگی سے دور جا چکا ہے۔ پہلے اسے زندہ کرو۔ اس میں پھر سے جینے کا حوصلہ پیدا کرو۔ اس لیے کہ امید اور نا امیدی کی باتیں ... لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے بظاہر تو دور دور تک تاریکی ... آ رہی ہے' کہیں امید کی ہلکی سی کرن بھی نہیں لیکن ... انسان ہوں' مجھ سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہو سکتا ہے کہ مستقبل کے پردے میں کوئی ... تمہارے یار کے لیے بھی چھپا ہو لیکن ایک بات یاد رکھنا ... اپنے یار کو بھی سمجھا دینا' اگر وہ سمجھ سکا تو..... کسی ... معجزے کی توقع ایک ہزار میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ ... اگر وہ زندہ رہتا ہے تو اس کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ سب بھول جانے کی کوشش کرے۔"

"لیکن۔۔۔ اس عامل لڑکی موتابہ نے کیوں کہا تھا ... دیرا کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتے ہو؟"

"میں بتا تو رہا ہوں۔ ایک کہانی سمجھ کر اس لڑکی کو ... جاؤ۔ سمجھ لو کہ وہ ایک خواب تھا جو تم سب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔"

"مگر ایسا کیوں ہوا ہے۔ وہ تو اتنی حساس' اتنی نرم ... تھی۔ وہ کیوں صنوبر کو موت کے پنجے میں دے کر ... ہو گئی؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔ تم کچھ نہیں سمجھو گے۔ ... طرح میری باتوں کو بکواس کہو گے۔ تم بس یوں جان لو کہ ... لڑکی پر ایک بوجھ تھا۔ ایک وعدے کا بوجھ۔ ایک ... پرانے وعدے کا بوجھ۔ وہ بوجھ اسے اپنے ساتھ لے گیا ..."

میرا جی چاہا کہ اپنے ہر خوف کو بالائے طاق ...

سائیں کا منہ نوچ لوں۔ وہ کیوں ایسی بری باتیں زبان سے نکال رہا تھا۔ اگر اسے پیش گوئیاں ہی کرنا تھیں تو کیوں کوئی اچھی پیش گوئی نہیں کر رہا تھا۔

اچانک سائیں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے' اپنی انگلیاں آسمان کی طرف کھڑی کیں اور دھمال ڈالنا شروع کر دی۔ "دل دھڑکا گورے کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔ دل دھڑکا گورے کا ہا ہا دل دھڑکا۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا "تم بھی ناچو شفیع محمد! یہ خوشی کا موقع ہے۔"

"میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "یہ خوشی کا موقع ہے؟"

"میں اور بات کر رہا ہوں تم ابھی تک وہیں پر اٹکے ہوئے ہو۔ وہ دیکھو' وہ کون آیا ہے۔"

سائیں نے جھونپڑے سے باہر اشارہ کیا۔ اشوکا بڑے تیز قدموں سے جھونپڑے کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ٹرانس میٹر تھا جس کے ذریعے میں کنگ براؤن سے رابطہ کرتا رہا تھا۔ اشوکا اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور اس نے ٹرانس میٹر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کنگ براؤن بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"ہیلو۔ میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کنگ کی بھرائی ہوئی آواز آئی "شاہ جہاں! ہمیں تمہارے سارے مطالبات منظور ہیں۔" اس کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ جیسے کوئی زخمی سانپ دھوپ میں بل کھا رہا ہو۔ چند سیکنڈ کے توقف سے وہ دوبارہ گویا ہوا "ہم نے تمہیں یہی بتانے کے لیے کال کیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم استی کو کس وقت اور کہاں ہمارے حوالے کر رہے ہو؟"

"تم ہمارے ساتھیوں کو اور دیگر قیدیوں کو کہاں ہمارے حوالے کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"جو جگہ بھی تم مناسب سمجھو۔ ہمارے نائب نے ہمیں بتایا ہے کہ موگاسا کے کچھ فاصلے پر ایک گھاٹی ہے اسے گدھوں والی گھاٹی بھی کہا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ "افراد" کے تبادلے کے لیے وہ جگہ مناسب رہے گی۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔" میں نے بلا تردد کہا "ہماری حیثیت یہاں کمزور فریق کی ہے۔ موگاسا سے باہر نکل کر کسی طرح کا معاملہ کرنا ہمارے حق میں بہتر نہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے' بہرحال تم کیا چاہتے ہو؟"

"قیدیوں کا تبادلہ' موگاسا میں کیا جائے۔ ہم بستی سے باہر نکل آئیں گے تم بھی ہمارے قیدی لے کر بستی کے سامنے پہنچ جاؤ۔"

"ہمیں منظور ہے۔" کنگ نے طویل سانس لے کر کہا۔

"میری رائے ہے کہ تبادلہ دو مرحلوں میں ہو۔ پہلے مرحلے میں تم ہمارے ساتھیوں کو لے آؤ۔ ہم ہوسٹل کے بیف انچارج مسٹر ڈوجون سمیت تمہارے چودہ کمانڈوز کو رہا کر دیں گے۔ دوسرے مرحلے میں تم محترم بوکارلو اور دیگر قیدیوں کو لے آنا' ہم ماسٹر استی اور دیگر قیدیوں کو چھوڑ دیں گے۔"

ٹرانس میٹر پر چند لمحے خاموشی رہی پھر کنگ براؤن نے کہا "ہمیں تمہاری تجویز منظور ہے لیکن پہلے مرحلے میں تم ڈوجون سمیت تمام اٹھائیس کمانڈوز کو رہا کر دو۔"

"ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے لیکن دوسرے مرحلے سے پہلے معاہدے کی شرائط وغیرہ لکھ لی جائیں تو بہتر ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شاید تم بھروسا نہیں کر پا رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ استی کی رہائی کے بعد ہم طے شدہ باتوں سے منحرف ہو جائیں گے۔ چلو ٹھیک ہے' اگر تمہاری تسلی ایسے ہی ہوتی ہے تو دوسرے مرحلے سے پہلے ہم معاہدہ لکھ لیتے ہیں۔"

کنگ نے کئی باتیں بہ آسانی مان لی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن میں شک پرورش پا رہا تھا۔ اندیشہ محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں رویے کی اس تبدیلی کے پیچھے کوئی گہری سازش نہ ہو۔ دوسری طرف اس صورت حال کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ عین ممکن تھا کہ استی کی جدائی کا صدمہ سہنے کے بعد اور اس کی بازیابی میں ناکام ہونے کے بعد کنگ کے غرور اور گھمنڈ میں تھوڑی بہت کمی واقع ہوئی ہو۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہو کہ وہ ظلم کی انتہا کرے گا تو پھر مزاحمت بھی وجود میں آئے گی اور جس طرح فرعون کے لیے اس کے گھر میں ہی موسیٰ نے پرورش پائی تھی اسی طرح اس کے گھر میں ہی مزاحمت جنم لے لے گی۔ جو بغاوت پچھلے دنوں ٹرسٹ کے اندر ہوئی تھی وہ کنگ کی حد سے بڑھی ہوئی من مانیوں ہی کا نتیجہ تھی۔ اس بغاوت کے بعد قدرت نے اس بدنام زمانہ بردہ فروش کو اوپر تلے دو تین جھٹکے اور دیے تھے۔ پہلے اس کا دست راست مائیکل جھیل زاد کی لڑائی میں ناگہانی طور پر میرے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا پھر اس کی بھتیجی ویرا نے کھلم کھلا بغاوت کی تھی اور اپنا تن من ٹرسٹ کے ایک غلام کے حوالے کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد ایک شدید ترین جھٹکا اسے استی کے اغوا کی صورت میں لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس اغوا نے اندر سے کنگ کی

چولیس ہلا دی ہوں اور اسے احساس ہوا ہو کہ وہ بے پناہ طاقت ور ہونے کے باوجود ناقابلِ مزاحمت نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ بھی خود کو بے بس محسوس کرنے لگے۔ بہرحال ابھی تو سب کچھ اسرار میں چھپا ہوا تھا۔ اگلے چند گھنٹے بے حد اہم تھے اور انہی گھنٹوں میں اس سارے معاملے کو کسی نتیجے تک پہنچنا تھا۔

کنگ براؤن سے دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کیا اور انہیں تازہ ترین صورت حال بتائی۔ سب کے چہروں پر رونق نظر آنے لگی تھی۔ سائیں جھونپڑے سے باہر دستور ناچ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "دل دھڑکا گورے کا۔ ہارل دھڑکا۔" گورے کا خطاب وہ کنگ براؤن کے لیے استعمال کرتا تھا۔ غالباً یہ سائیں عالی کی پراسرار چھٹی حس ہی تھی۔ جس نے بیٹھے بٹھائے اسے بتا دیا تھا کہ ٹرانس میٹر پر کوئی اچھی خبر موصول ہونے والی ہے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حالات نے ایک ایسی کروٹ لی کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یقیناً پروفیسر اللہ رتا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہمیں امید تو تھی کہ کچھ بہتر ہونے والا ہے لیکن یقین نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا اور اتنی جلدی ہوگا۔ ہم بستی کی حدود پر کھڑے تھے اور دفاعی انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ سردار رانے، سردار اولام اور اشوکا وغیرہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ٹرسٹ کی ایک بڑی جیپ دور سے آتی نظر آئی پھر وہ نومین لینڈ میں داخل ہوئی اور موگاسا کی حفاظتی باڑ سے قریباً سو گز دور رک گئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن تمازت نہ ہونے کے برابر تھی اور رات بھر کی زوردار بارش کے بعد ہر شے نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ جیپ کے اندر سے نیلی وردیوں والے تین مسلح گارڈز اترے اور جیپ کے دائیں بائیں اور عقب میں کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک واکی ٹاکی کے ذریعے کسی سے بات کرنے لگا۔ اسی دوران میں جیپ کی ایک کھڑکی کا شیشہ نیچے اتارا گیا اور ایک شخص کھڑکی میں سے گردن نکال کر باہر جھانکنے لگا۔ اس کے سر پر گول ٹوپی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر میرے سینے میں یکبارگی درجنوں شادیانے بج اٹھے۔ وہ زریں گل تھا۔ سو فی صد زریں گل۔ وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اردگرد دیکھ رہا تھا جیسے جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ کہاں آنکلا ہے پھر اسی کھڑکی میں سے ایک اور چہرہ بھی اپنی جھلک دکھانے لگا۔ یہ کلثوم تھی۔ وہ بھی طوطے کی طرح گردن گھما کر اردگرد دیکھنے لگی۔

اچانک زریں گل کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ زریں گل آنکھیں سکوڑ کر میری جانب دیکھتا رہا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکا۔ پہچانتا بھی کیسے میں میک اپ میں تھا۔ جیپ کے اندر جو دھم ہیولے نظر آ رہے تھے وہ یقیناً غزالہ، تابی اور شائستہ وغیرہ کے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں اتنی جلدی اپنے ساتھیوں کی صورتیں دیکھ سکوں گا۔ یہ سب کچھ حیران کن آسانی اور تیزی سے ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک عجیب سا شک جاگا۔ ایک ایسا شک جس پر بعد میں مجھے خود بھی ہنسی آئی۔ شاید یہ اس پراسرار ماحول کا اثر تھا کہ میں چند لمحوں کے لیے اس انداز میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے ٹرسٹ میں بوکارلو کا سحرانگیز تماشا یاد آیا تھا۔ بوکارلو نے ہپناٹزم یا نظربندی کا ایک شاندار نمونہ پیش کیا تھا۔ اس نے ہمیں وہ کچھ دکھایا تھا جو حقیقت میں وہاں موجود نہیں تھا۔ ہم نے بوکارلو کو کنگ کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا جبکہ واقعتاً ایسا نہیں ہوا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہیں یہ بھی تو سجیشن یا نظربندی کا کوئی کرشمہ نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ زریں، کلثوم اور غزالہ وغیرہ یہاں موجود نہ ہوں بس دکھائی دے رہے ہوں۔ سوچ کی یہ بیکار لہر گزر گئی تو یہ بے معنی خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔

میں نے اشوکا سے کہا "سردار رانے سے کہو کہ ذوجون سمیت تمام کمانڈوز کو کوٹھڑی سے نکال کر یہاں پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔"

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ ٹرانس میٹر پر سگنل ملنا شروع ہو گیا۔ میں نے YES کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف حسبِ توقع کنگ براؤن ہی تھا۔ وہ بولا "ہمارا خیال ہے کہ سرخ جیپ نمبر ایم پی سی ۱۸ موگاسا بستی کے سامنے پہنچ چکی ہے۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کنگ نے کہا "اس میں تمہارے چاروں ساتھی اور مفرور پروفیسر کی بیٹی موجود ہیں۔ تم ذوجون اور کمانڈوز کو سامنے لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے ہم لا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"شاہ جہاں۔ دیکھو کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ ہم تمہارا ہر مطالبہ منظور کر رہے ہیں۔ اب اصغی اور دوسرے لوگوں کو صحیح سلامت ہمارے پاس پہنچنا چاہیے۔"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ہماری بالارسیوں کی طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ بس تم اپنی طرف خیال رکھو۔ ایڈریونا ہی نوجوان کی طرح تمہارا کوئی ہٹیلا کمانڈو مہم جوئی کی کوشش نہ کرے۔"

اگلے دس پندرہ منٹ بخیروعافیت گزر گئے۔ وہ کچھ ہو گیا جس کی امید مجھے بہت کم تھی۔ ذوجون سمیت اٹھائیس

کمانڈوز ٹرسٹ کے گارڈز کے پاس چلے گئے اور ہمارے ساتھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ان میں زریں، کلثوم، غزالہ، تابی اور شائستہ شامل تھے۔ غزالہ ایک سرمئی لباس میں تھی۔ اس کے بال ایک اسکارف میں بندھے ہوئے تھے۔ گھونگریالے بالوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا تابی اس کی گود میں تھا۔ وہ سب حیران نظر آ رہے تھے۔ میں ان کے سامنے موجود تھا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکے تھے۔ سب سے پہلے شائستہ کی نگاہ اپنے محترم والد پر پڑی تھی۔ وہ تڑپ کر دوڑی اور دیوانہ وار اپنے اشک بار باپ سے لپٹ گئی۔ باپ بیٹی کا ملاپ دیدنی تھا۔ پروفیسر تو شائستہ کو ختم کر بیٹھا تھا۔ آج اس کی لاڈلی نے اس کے لیے دوبارہ جنم لیا تھا۔ وہ اسے چوم رہا تھا، لپٹا رہا تھا، اپنے آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھو رہا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار اور زرد نظر آتی تھی۔ جیسے گلاب کی سوکھی ہوئی ٹہنی ہو۔

اس دوران میں زریں، کلثوم اور غزالہ کی نگاہیں اردگرد کسی کو تلاش کرتی رہی تھیں۔ یقیناً وہ جانتے تھے کہ یہاں ان کی ملاقات مجھ سے اور صفدر سے ہونے والی ہے لیکن ہم دونوں میں سے کوئی انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے خان صاحب! کس کو تلاش کر رہے ہو؟" میں نے زریں کے کندھے پر دھپ لگاتے ہوئے کہا۔

میں اصل آواز میں نہیں بولا تھا لہٰذا زریں کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مجھے پہچان سکتا۔ زریں نے مجھے قدرے ناگواری سے دیکھا، تاہم اسے خوشی بھی ہوئی تھی کہ یہاں کوئی اردو بول سکتا تھا۔ اس نے کہا "ام آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ آپ کون ہے اور ام کو یہ لوگ کس جگہ پر لے کر آیا ہے؟"

"یہ لارسی قبیلے کی بستی ہے۔ اس کو موگاسا کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے اچھے لوگ ہیں، خاص طور سے پٹھانوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔"

"ام بھی پٹھان ہے۔" زریں نے ذرا خوش ہو کر کہا پھر ذرا چونک کر بولا "لیکن آپ کون ہے؟"

"میں یہاں کے سردار کا مالشیا ہوں۔ میں مالش بہت اچھی کرتا ہوں۔"

"مالش تو ام بھی۔۔۔" ایک دم زریں کہتے کہتے رک گیا پھر بات بدل کر بولا "یہاں بستی میں کسی بندے کا نام شاہ جہاں یا صفدر بھی ہے؟"

"شاہ جہاں نام کا ایک بندہ تو تھا یہاں۔۔۔ لیکن۔" میں نے مایوسی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن کیا؟" غزالہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اس کی حسین آنکھوں کی بے قراری مزہ دے گئی۔ شاید

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زندان میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت
300
روپے
بہترین کتابت،
خوبصورت گرد وپیش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ
محصول ڈاک 30 روپے
ناشر
2847414

میں ان تینوں کو کچھ اور بھی ستاتا لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا۔ صفدر شفا خانے میں نیم بے ہوش پڑا تھا۔ میرے دل میں پریشانی کی ایک گرہ سی لگی ہوئی تھی۔ زریں نے کہا "آپ چپ کیوں ہو گیا۔ خو کہاں ہے شاہ جہاں صاحب"

میں نے تابی کو پیار کیا اور اپنی اصل آواز میں کہا "میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔" کلثوم تو کچھ دور تھی لیکن زریں اور غزالہ دونوں میری آواز سن کر اچھل پڑے۔ زریں کا تو باقاعدہ منہ کھل گیا تھا۔ میں نے کہا "منہ بند کرو' منہ کے راستے کچھ نظر نہیں آئے گا اور زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں' میں شاہ جہاں ہی ہوں' اس وقت میک اپ میں ہوں۔"

"اوہ مائی گاڈ!" غزالہ کے منہ سے بے اختیار نکلا "وہ بڑے غور سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

جذبات کے سبب غزالہ کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور اس نے بے اختیار میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ میں نے نیچے جھک کر تابی کے رخساروں کو چوما۔ وہ بدستور ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

یہ یقین ہونے کے بعد کہ میں شاہ جہاں ہی ہوں زریں لپک کر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ جذبات کی شدت سے اس کا بدن کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ کافی دیر بعد وہ مجھ سے جدا ہوا اور بولا "آپ سے تو بولنا ہی نہیں چاہیے استاد صیب! آپ کے دل میں امارے لیے کوئی خاصیت ہی نہیں ہے۔"

"خاصیت نہیں اہمیت۔" میں نے درست کیا۔

"جو بھی ہے' بہرحال آپ کے دل میں امارے لیے نہیں ہے۔ آپ نے اکیلے یہاں آکر امارا دل بہت دکھایا ہے۔ آپ کو کم از کم بتانا تو چاہیے تھا۔"

"مجھے خود کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ ہمیں تو اچانک وہاں سے اٹھا کر یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ فرصت ملتی ہے تو میں تمہیں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔"

پروفیسر اور شائستہ اردگرد سے بے خبر ابھی تک ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے شائستہ کو کسی ننھی بچی کی طرح بانہوں میں سنبھال رکھا تھا۔

"صفدر کہاں ہے؟" غزالہ نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا "غزالہ! صفدر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اسے تمہاری بے حد ــــ بے حد ضرورت ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہو۔"

"کیا مطلب؟" غزالہ اور زریں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ بیمار ہے۔ اسے علاج کی بلکہ شاید سرجری کی ضرورت ہے۔"

"اوہ خدایا! کیا ہوا اسے۔" غزالہ نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"وہ شدید بخار میں ہے اور زخمی بھی ہے۔ آؤ میں تمہیں ملاؤں اس سے۔"

میں نے کلثوم کو وہیں پروفیسر اور شائستہ کے پاس چھوڑا اور خود تیز قدموں سے شفا خانے کی طرف چل دیا۔ غزالہ اور زریں میرے ساتھ آرہے تھے۔

شفا خانے میں پہنچ کر غزالہ نے صفدر کی حالت دیکھی اور پریشان ہو گئی۔ "یہ آپ نے کیا کر دیا ہے اسے' یہ تو شدید انفیکشن ہے۔ اس کے علاوہ ڈی ہائیڈریشن بھی ہو چکی ہے۔ اوہ مائی گاڈ۔ اسے تو فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ ہم ــ میرے خیال میں اسے اسپتال پہنچانا ہوگا۔"

غزالہ نے فوراً موبائل کلینک کے اندر سے آلات منگوائے اور صفدر کے وائٹل سائنز چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے زخم بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ زریں گل نے صفدر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار ہاتھ کو چوم رہا تھا۔ غزالہ نے اسے پیچھے ہٹا دیا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر صفدر کا معائنہ کرنے لگی۔

میں نے کہا "غزالہ! یہاں سے نزدیک ترین اسپتال بھی کم از کم ۲۰ گھنٹے کی مسافت پر ہے اور جس قسم کے راستے ہیں' تم جانتی ہو' تم اسے کم از کم اس قابل کر دو کہ یہ سفر کر سکے۔"

"لیکن ــــ"

"دیکھو غزالہ!" میں نے اس کی بات کاٹی "تم ڈاکٹر ہو اور اس معاملے کو مجھ سے بہتر جانتی ہو لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ صفدر کی بیماری کی وجہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "صفدر کی جلد پر یہ سوزش اور سرخ نشان دیکھ رہی ہو ــ یہاں یہاں اسے کانٹے چبھے ہوئے ہیں۔ بہت سے کانٹے تو اس کے جسم سے نکال دیے گئے تھے لیکن جو اندر ہی ٹوٹ گئے ہیں انہوں نے یہ سوزش اور سرخی پیدا کی ہے۔ مقامی معالج کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کانٹوں کو مریض کے جسم سے نکالا جانا بہت ضروری ہے ورنہ اس کا بخار نیچے نہیں آئے گا۔"

غزالہ نے بڑی توجہ سے صفدر کی جلد پر سرخ نشانات کو

دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "مجھے نشتر' دو تین چمٹیاں اور اسٹیچنگ کا سامان درکار ہے۔ اس کے علاوہ انتقال خون کی بھی ضرورت ہے۔ کیا یہ انتظام ہو سکے گا؟"

"ٹریلر کے اندر سرجری کا کچھ سامان موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس میں سے ضرورت کی چیزیں مل جائیں گی۔"

غزالہ نے ایک دلیر سرجن کی طرح اپنی آستینیں چڑھالیں اور تیار ہو گئی۔ اس کی صلاحیتوں کا میں معترف تھا۔ اس سے پہلے کم از کم دو مواقع ایسے آئے تھے جب اس نے بے سروسامانی کی حالت میں نازک سرجری کی تھی اور کامیاب رہی تھی پھر بحری جہاز ہرکولیس میں مسز ڈورتھی کے خاوند کو موت کے پنجے سے چھڑانے کے لیے غزالہ نے جو دیوانہ وار کوشش کی تھی' وہ بھی فراموش کی جانے والی بات نہیں تھی۔ بے شک مسز ڈورتھی کا خاوند زندگی ہار گیا تھا مگر غزالہ کی انتھک جدوجہد مسز ڈورتھی سمیت ہر دیکھنے والے کی آنکھ میں نقش ہو گئی تھی۔ نہ جانے مجھے کیوں یقین سا تھا کہ غزالہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی مسیحائی کا حق ادا کر سکتی ہے۔ صفدر کو غزالہ کے حوالے کر کے میرا بوجھ جیسے نصف سے بھی کم رہ گیا تھا۔

شفا خانے کے اندر سرجری کے لیے ایک علیحدہ پورشن منتخب کر لیا گیا۔ صفدر اور زریں کا بلڈ گروپ ایک تھا۔ زریں فوراً خون دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جوش سے بولا "استاد صیب امارا تو دل چاہتا ہے کہ امارے خون کے ساتھ امارا جان بھی نکال کر صیدر صیب کے اندر ڈال دو۔"

میں نے کہا "بے وقوف اس کی اپنی جان بھی ابھی اس کے جسم میں ہی ہے' جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں' اس طرح ایک جسم میں دو جانیں بھی نہیں رہ سکتیں۔"

"جو اللہ تعالیٰ کرے' امارے صیدر صیب کا جان سو برس تک اس کے جسم میں رہے۔" زریں نے صدق دل سے دعا کی۔

غزالہ نیم بے ہوش صفدر کے ساتھ مصروف تھی جب اچانک تڑتڑ کی خوفناک آواز سنائی دی۔ یہ سیون ایم ایم کی فائرنگ تھی۔ اوپر تلے تین برسٹ چلائے گئے۔ میں نے حیران نظروں سے اشوکا کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بھی حیرت آمیز خوف تھا۔ ہم دونوں شفا خانے سے نکلے اور دوڑتے ہوئے آواز کی سمت گئے۔ خوفناک بات یہ تھی کہ آواز اس جھونپڑے کی طرف سے آئی تھی جہاں اسقی کو رکھا گیا تھا۔ ہم جھونپڑے کے قریب پہنچے تو چیخیں سنائی دیں۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" اشوکا نے بھاگتے بھاگتے کہا۔

میں نے اپنا ریوالور جیب سے نکال لیا۔ چند قدم آگے میں نے لاروتاپے کے ایک نوجوان ساتھی کو دیکھا۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور وہاں سے خون پچکاری کی طرح نکل رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن دبا رکھی تھی اور چیختا ہوا شفا خانے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے سورج اچانک میرے سر پر آن گرا ہے اور میں بے رحم شعلوں میں گھر گیا ہوں۔ مجھے جھونپڑے کے عین سامنے دو لاشیں نظر آئیں۔ ان میں سے ایک جھبل بار کے نائب سردار لاروتاپے کی تھی۔ وہی سخت گیر لیکن بے حد زیرک سردار جس نے پچھلے چند دنوں میں میری توقع سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا تھا۔ اس نے اسقی کی نگرانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس کے سینے میں کم از کم تین گولیاں لگی تھیں اور ایک نے تقریباً دل کے مقام پر سوراخ کیا تھا۔ لاروتاپے کے دو تین ساتھی جو خود بھی زخمی تھے اپنے سردار کو اٹھا کر شاید شفا خانے لے جانا چاہ رہے تھے۔ وہ بدحواسی میں ایسا کر رہے تھے ورنہ یہ بات غالباً انہیں بھی معلوم تھی کہ سردار زندہ نہیں بچا ہے۔

میں دوڑ ... جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ ایک سیاہ فام لڑکی جان کنی کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔ اس کے بالائی جسم سے لباس کھسک گیا تھا اور وہ عریاں ہو گئی تھی۔ اس کے نسوانی اعضا خون میں لت پت تھے لیکن جب جان نکل رہی ہو تو جسم ڈھانپنے کا خیال کسے آتا ہے۔ میں نے چاروں طرف اسقی کے لیے نگاہ دوڑائی "اسقی ــــ اسقی ــــ" میں نے اسے آوازیں دیں۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

لاروتاپے کے ایک شدید زخمی ساتھی نے جھونپڑے کی کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ اسقی یہاں سے نکل گیا ہے۔

میں بھی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ اتفاقاً ہی ریتلی زمین پر مجھے چھوٹے پاؤں کے نشانات نظر آگئے۔ یہ شیطان جونیئر کے نقوش تھے۔ میں ان نشانات کے اوپر چلتا چالیس پچاس قدم آگے گیا۔ نشانات اصطبل کے دروازے پر پہنچ کر ختم ہو گئے۔ اسقی یقیناً اصطبل میں موجود تھا۔ اصطبل ایک بڑے احاطے اور دو تین وسیع کوٹھریوں کی شکل میں تھا۔ ان ہال نما کوٹھریوں کی چھتیں گارے اور گھاس پھونس سے بنائی گئی تھیں۔ درجنوں اونٹ اور گھوڑے گدھے یہاں بند تھے۔ ایک طرف اپلوں کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی اصطبل کا بڑا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اصطبل کے دو ملازم حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ وہ خاموش اور محتاط رہیں۔

کوئی اصطبل کے اندر چھپا ہوا ہے۔ میرے تاثرات اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور نے دونوں ملازمین کو سہما دیا تھا۔ میں نے اصطبل کے اندر اسقی کے پاؤں کے نشانات ڈھونڈے اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اصطبل کے اندرونی حصے کی طرف گیا ہے۔ احاطہ پار کر کے میں بھی اندرونی حصے میں آگیا۔ یہاں پسینے میں نہائے ہوئے گھوڑوں کے جسموں کی مخصوص بو تھی۔ بیسیوں ہی گھوڑے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ان کے درمیان گھومتا رہا اور اسقی کو تلاش کرتا رہا گاہے گاہے میں اسے آواز بھی دے رہا تھا۔

میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔ اچانک میری نگاہ خون کے چند قطروں پر پڑی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اسقی زخمی بھی ہے۔ یقیناً یہ زخم سنگین نہیں تھا ورنہ اگر خون زیادہ بہتا تو اسقی اتنی دور چل کر بھی نہ آسکتا۔ میری نگاہ ایک تاریک گوشے پر پڑی۔ مجھے شک ہوا کہ وہاں کسی چیز نے حرکت کی ہے۔ میں احتیاط سے اس جانب بڑھا۔ اچانک ایک پتھر میرے چہرے پر لگا اور میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ پتھر وزنی تھا۔ میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ ماسٹر اسقی تاریک گوشے سے نکلا اور اندھا دھند مخالف سمت میں بھاگا "رک جاؤ اسقی ورنہ گولی چلا دوں گا۔"

وہ ایسی دھمکیوں میں آنے والا کہاں تھا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔ دوڑتے دوڑتے اس نے تیزی سے رخ بدلا اور لکڑی کی ایک بڑی چوکی کے نیچے گھس گیا۔ پندرہ بیس فٹ مربع کی یہ چوکی ایک دیوار کے ساتھ رکھی تھی اور اس پر اپلوں کا مینار نما ڈھیر لگا ہوا تھا۔ زمین سے چوکی کی بلندی بہ مشکل پون فٹ رہی ہوگی۔ اسقی اوندھے منہ لیٹ کر اس کے نیچے او جھل ہوگیا تھا۔

میں بھی اوندھے منہ لیٹ گیا۔ نیچے تاریکی تھی کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ "باہر آؤ اسقی ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

جواب میں اس نے گالیوں کی بارش کردی اور چیخنے لگا کہ میں یہاں سے دفعان ہو جاؤں۔ اسی دوران میں پروفیسر اللہ دتا اور اشوکا بھی مجھے ڈھونڈتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ میں نے انہیں اسقی کے بارے میں بتایا اور وہ چوکی نما پلیٹ فارم بھی دکھایا جس کے نیچے وہ چھپا ہوا تھا۔

اشوکا نے مجھے اطلاع دیتے ہوئے کہا "بہت گڑبڑ ہوگئی ہے شاہ جہاں صاحب! لارونابے سمیت چار افراد ہلاک ہوگئے ہیں۔ دو تین شدید زخمی بھی ہیں۔"

"اگر فائرنگ کس نے کی ہے؟"

"کچھ پتا نہیں چلا۔ بس ایک زخمی نے اتنا بتایا ہے کہ وہ کوئی مقامی شخص تھا اس نے سامنے والے جھونپڑے کے عقب سے گولیاں چلائی ہیں اور پھر جھونپڑے سے بھاگ نکلا ہے۔ اس نے اپنا سن ایک پگڑی میں چھپا رکھا تھا۔"

"بہرحال جو بھی ہوا ہے اچھا نہیں ہوا۔ قاتل کا فوراً پتا لگنا چاہیے.... سردار راٹے کیا کر رہا ہے؟"

"ابھی تو وہ لاش اٹھا رہا ہے اور زخمیوں کو اسپتال پہنچا رہا ہے۔" پروفیسر نے مختصر جواب دیا۔

اسی دوران میں اسقی نے اپنی پناہ گاہ کے اندر سے پھر گالی گلوچ شروع کردی۔ اصطبل کے ملازمین نے لکڑی کی چوکی کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک ملازم کے ہاتھ کی دو انگلیاں بے دردی سے چبا ڈالیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس شیطان صفت کا کیا کیا جائے۔ اسی دوران میں سردار اولام کے ساتھ زریں گل بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اسے جب صورت حال کا پتا چلا اور یہ معلوم ہوا کہ لکڑی کی چوکی کے نیچے جو بچہ گھسا ہوا ہے وہ کنگ ایرن کا بگڑا تگڑا بیٹا ہے تو زریں کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ بولا "بگڑوں تگڑوں کا علاج مولا بخش ہوتا ہے جی.... آپ دیکھیں ہم اس خنزیر کے بچے کو ابھی نیچے سے نکالتا ہے۔" اس نے قریب پڑا ہوا لمبا بانس اٹھایا اور بلا توقف چوکی کے نیچے گھسیڑ دیا۔ بانس کے ذریعے اس نے زور زور سے اسقی کو ٹھوکے دینے شروع کیے تو ایک بار پھر اس کے منہ سے گالیاں ابل پڑیں۔ تاہم چند ہی لمحے میں یہ گالیاں چیخوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ زریں ہر ضرب کے ساتھ دانت پیس کر کہتا تھا "نکل بچے باہر.... نکل بچے باہر۔"

واقعی ایک آدھ منٹ میں اسقی باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے اسے دبوچ لیا۔ وہ ہزار میل فی گھنٹا کی رفتار سے ٹانگیں چلانے لگا۔ اصطبل کے ہٹے کٹے ملازم نے اس کی ٹانگیں بھی دبوچ لیں۔ اسقی کی ایک انگلی معمولی زخمی تھی۔ غالباً دھینگا مشتی میں یا بھاگنے کے دوران میں ہی اسے یہ زخم لگا تھا۔ انگلی سے خون کے قطرے گر رہے تھے۔ اسقی کو اپنی زخمی انگلی کی یا خون کی مطلق پروا نہیں تھی۔ میں نے اپنا رومال پھاڑ کر اس کی انگلی پر پٹی باندھی۔ اس دوران میں وہ تین افراد کی گرفت میں پارے کی طرح مچلتا اور چیختا چلا تا رہا تھا۔

اچانک دو افراد دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی یہ وہی سیاہ فام تھے جو کھجور کے بلند درخت پر مچان کے اندر بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا تعلق لارونابے سے تھا۔ ایک سیاہ فام نے ہانپتے ہوئے

لہجے میں اشوکا سے کچھ کہا۔ اشوکا کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہوگیا "کیا بات ہے؟" میں نے اشوکا سے پوچھا۔

"یہ بندہ کہتا ہے کہ ٹرسٹ کی بہت سی گاڑیاں اور چار پانچ بلڈوزر بڑی تیزی سے بستی کی طرف آرہے ہیں۔ گاڑیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دور تک گرد و غبار دکھائی دے رہا ہے۔"

یہ بے حد تشویش ناک بلکہ ہولناک خبر تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ کوئی بہت بڑی غلط فہمی خون ریز لڑائی کا سبب بننے والی ہے۔ میرا دھیان سیدھا اسقی کی طرف گیا۔ کہیں ٹرسٹ والوں نے یہ تو نہیں سمجھ لیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ میں اسقی کو نقصان پہنچ گیا ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ بستی میں مخبر موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے بدنیتی کی بنیاد پر یا غلط فہمی سے ٹرسٹ تک یہ اطلاع پہنچاوی ہو کہ اسقی کو نقصان پہنچ گیا ہے۔ اگر ایسا تھا تو مجھے فوری طور پر اس کا تدارک کرنا چاہیے تھا۔ میں نے پروفیسر اور اشوکا کو ہدایت کی کہ اسقی کی کڑی حفاظت کریں۔ خود میں دوڑتا ہوا اپنے جھونپڑے میں پہنچا۔ وہ مخصوص ٹرانس میٹر وہیں موجود تھا جس پر میں کنگ سے براہ راست رابطہ کرتا تھا۔ جونہی میں جھونپڑے میں داخل ہوا سخت

پریشانی کے باوجود مجھے اندازہ ہوگیا کہ جھونپڑے کی اشیا کو الٹ پلٹ کیا گیا ہے۔ میں نے ٹرانس میٹر دیکھا وہ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے دیوانوں کی طرح ہاتھ چلا کر سامان میں سے ٹرانس میٹر ڈھونڈنا چاہا لیکن وہ وہاں ہوتا تو ملتا۔ یکایک مجھ پر لرزہ خیز انکشاف ہوا کہ پچھلے بیس پچیس منٹ میں جو کچھ ہوا ہے وہ کسی سازش کا تانا بانا ہے۔ کوئی گہری سازش ہے جس نے لارسیوں اور ٹرسٹ کے درمیان ہونے والے معاہدے کو سبوتاژ کیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ ساری ٹرسٹ کی اپنی ہی کوئی چال ہو۔ بہرحال اس وقت یہ سوچ زیادہ اہم نہیں تھی۔ اس وقت مغربی افق پر نمودار ہونے والا گرد و غبار کا سرخی مائل طوفان اہم تھا۔ زمین کی وہ تھرتھراہٹ اہم تھی جو بلڈوزروں اور گاڑیوں کی تیز رفتار آمد کا پتا دے رہی تھی اور سنسنی کی وہ لہر اہم تھی جو بستی میں یہاں سے وہاں تک جنگ جو لارسیوں کے چہروں پر نظر آنے لگی تھی۔

عقب سے آکر غزالہ نے میرا بازو تھاما "یہ.... کیا ہونے لگا ہے شاہ جہاں؟"

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چودھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جو کہ جون 2002ء میں شائع ہوگا

شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل

ایک شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنادیا تھا۔ وہ پیدا ہوا تو اس کا نام پناہ جہاں رکھا گیا۔ مگر دنیا نے اسے جہانی استاد کے نام سے جانا۔ اکڑی ہوئی گردنیں اس کے روبرو خم ہوتی چلی گئیں۔ جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے نام اس کے سامنے بچہ لگنے۔ قانون کے محافظوں کے لیے وہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اس نے خود کو قانون کے حوالے کردیا۔ لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں اس کا مقدر بنیں۔ مگر حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ زندگی جہانی استاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی ہر نئی کروٹ اسے ان جانے راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادل ناخواستہ اس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

تاوان

دور ہی سے دکھائی دے رہا تھا کہ ٹرسٹ والوں کے ارادے انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ آندھی کی رفتار سے بستی کی طرف اڑے چلے آرہے تھے۔

اشوکا نے گھبرا کر کہا "شاہ جہاں صاحب! یہ کیا ہونے جارہا ہے۔ کیا ان لوگوں کو استی کی جان کی پروا بھی نہیں رہی ہے؟"

"لگتا تو یہی ہے کہ انہیں کسی شے کی پروا نہیں رہی ہے۔"

اشوکا نے گرد و غبار کے اس بادل کی طرف اشارہ کیا جو جیپوں اور ٹرکوں کی اندھا دھند پیش قدمی کی وجہ سے فضا میں بلند ہوا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس مہیب بادل کا رنگ سرخ دکھائی دے رہا تھا اور اس کے اندر سے گاڑیوں کے شیشے شکارے مار رہے تھے۔ اشوکا نے کہا "وہ دیکھیے جناب' سرخ رنگ کی جیپ۔ وہ کنگ براؤن کی ذاتی گاڑی ہے۔ آپ اسے ٹرانس مٹر بنا نہیں' وہ کیا پاگل پن کررہا ہے۔"

"تم بھی بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میرے پاس ٹرانس مٹر ہوتا تو میں اس وقت یہاں خاموش کیوں کھڑا ہوتا۔ ٹرانس مٹر وہاں نہیں ہے جہاں میں نے چھوڑا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اسے غائب کردیا گیا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔" اشوکا کے منہ سے نکلا۔ اس نے اپنے سر سے پسینہ پونچھا اور جھونپڑے کی طرف دوڑا شاید ٹرانس مٹر تلاش کرنے گیا تھا۔

لیکن اب ٹرانس مٹر تلاش کرنے کا وقت نہیں بچا تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا اس پر اب مہر لگ گئی تھی۔ حملہ آور یلغار کرتے ہوئے موگا سا کی وفائی باڑ تک آپہنچے تھے۔ میں نے دو عدد دیوہیکل بلڈوزروں کو دیکھا' وہ جھاڑیوں کی بلند و بالا باڑ کو روندتے ہوئے بستی کی حدود میں داخل ہوگئے۔ ان بلڈوزروں کے عقب میں ٹرسٹ کی دو جیپوں کے علاوہ پولیس کی آٹھ دس گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ موگا سا بستی کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا' اس میں مقامی پولیس بھی برابر کی شریک تھی۔

میں نے اشوکا کو آواز دی "رک جاؤ اشوکا۔" وہ ٹھہر گیا۔ میں نے کہا "اس حرام کے جنے استی کو لاؤ۔"

"کک۔ کیا آپ اسے ماردیں گے؟" غزالہ نے سہم کر پوچھا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کرنا پڑے۔" میں نے سنگلاخ لہجے میں کہا۔

"او میرے خدا! یہ کیا ہورہا ہے؟" غزالہ سرتاپا کانپ گئی اور اس نے ننھے تابی کو یوں اپنے بازوؤں میں چھپایا جیسے مرغی چوزے کو چھپاتی ہے۔

میں نے اشوکا کو ہدایت کی تھی کہ وہ استی کو اصطبل سے لے آئے لیکن اس سے پہلے ہی زریں گل دوڑتا ہوا اصطبل سے نکلا۔ اس نے استی کو دبوچ رکھا تھا۔ سردار رانے بھی اس کے عقب میں بھاگا آرہا تھا۔ سردار رانے

مجھے اور زریں گل کو لے کر اس چبوترہ نما مقام پر چڑھ گیا جہاں سے وہ اپنے لوگوں سے خطاب کیا کرتا تھا۔ اس بلند جگہ پر چڑھنے سے سردار رانے کا مقصد یقیناً یہی تھا کہ ٹرسٹ کے حملہ آوروں کی نگاہ زریں کے ہاتھوں میں تڑپتے مچلتے اسٹی پر پڑ جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ حملے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

مگر اس سے پہلے کہ اسٹی کو یوں حملہ آوروں کے سامنے لانے کا کوئی نتیجہ نکلتا، دستی بموں کے کئی ساعت شکن دھماکے ہوئے اور گرد و غبار نے اردگرد کی ہر شے کو چھپا لیا۔ اس کے ساتھ ہی حملہ آوروں کی طرف سے خوفناک فائرنگ شروع ہو گئی۔ درجنوں گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے آس پاس سے گزریں۔

اب بلندی پر رہنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہم جتنی تیزی سے چبوترہ نما مقام پر چڑھے تھے، اتنی ہی تیزی سے نیچے اتر آئے۔ اسٹی مشینی رفتار سے ٹانگیں چلا رہا تھا اور کسی بد روح کی طرح چیخ رہا تھا۔ زریں نے اس کی وحشت اور خباثت کا غلط اندازہ لگایا تھا، ورنہ وہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے بغیر اسے اصطبل سے نہ نکالتا۔ چلتے چلتے اس شیطان زادے نے زریں کے پیٹ پر بڑے زور سے کاٹا اور خود کو چھڑا لیا۔ مجھ سے ایک لمحے کی چوک ہوتی تو وہ چھلاوے کی طرح گرد و غبار کے دبیز بادل میں گم ہو جاتا۔ میں نے اسے گردن سے دبوچ کر اٹھا لیا اور دوڑتا ہوا ایک مورچے میں گھس گیا۔ یہ مورچا خاردار باڑ سے قریباً پچاس گز کی دوری پر تھا۔ فوجی طرز کے یہ مورچے میں نے اور صفدر نے اپنی نگرانی میں بنوائے تھے۔ یہ قوس کی شکل کی خندق تھی جس کے سامنے ریت اور مٹی کی دیوار تھی۔ اس اڑھائی تین فٹ اونچی دیوار میں فائرنگ اور تیر اندازی کے لیے رخنے بھی رکھے گئے تھے۔ ایسے ہی کئی درجن مورچے خاردار باڑ کے ساتھ ساتھ موجود تھے۔ اس کے علاوہ لارسیوں کی بنائی ہوئی اپنی کمین گاہیں بھی تھیں۔ جس مورچے میں ہم گھسے تھے وہاں موجود رائفل مین بھی اندھا دھند جوابی فائرنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔ گولیوں کے خول تیزی سے خندق میں بکھرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک دم ہی چاروں طرف قیامت سی برپا ہو گئی تھی۔ ٹرسیٹوں کے اس پاگل پن کی وجہ قطعاً میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسٹی کسی خوں خوار جانور کی طرح میرے ہاتھوں میں مچل رہا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کے دھارے بہہ رہے تھے اور اس نے میرے دائیں بازو پر کئی جگہ کاٹ کھایا تھا۔ یقیناً وہ مجھے تکلیف پہنچا کر میری گرفت کمزور کرنا چاہتا تھا اور پھر میرے ہاتھوں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن یہ اتنے سنگین لمحات تھے کہ اسٹی کے کاٹنے سے مجھے بالکل تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دانت میرے بازو کی کھال میں گھس رہے ہیں اور گوشت کو کچل رہے ہیں لیکن احساس شل سا ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں اس لارسی رائفل مین کی پیشانی پر گولی لگی جو میرے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا۔ بغیر آواز نکالے وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ زریں نے بلا توقف مرنے والے کی رائفل تھام لی اور فائرنگ کرنے لگا۔ ان لمحوں میں وہ سراپا پٹھان نظر آیا۔ جنگ جو، دلیر اور بہترین نشانے باز جو اپنے دشمن کے مقابل پہنچتا ہے تو سراپا مزاحمت بن جاتا ہے اور زندگی موت اس کے لیے ہم معنی لفظوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک دیو ہیکل بلڈوزر جھونپڑوں کو مسمار کرتا اور فاقہ زدہ لارسی نیزہ بازوں کو روندتا ہوا عین ہمارے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس کے اوپر سے سب مشین گن کی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ فائرنگ کرنے والا نظروں سے اوجھل تھا مگر اس کی موجودگی یقینی تھی۔ زریں گل کی چلائی ہوئی ایک گولی بلڈوزر ڈرائیور کے سینے میں لگی۔ گرد و غبار کے بادل کے اندر سے میں نے سفید فام ڈرائیور کو بلڈوزر کے اوپر سے گرتے اور اس کے آہنی پہیے کے نیچے آ کر قیمہ بنتے دیکھا۔ تیز رفتار بلڈوزر بے مہار ہو کر ان جھونپڑوں میں جا گھسا جنہیں دستی بموں کے دھماکے سے آگ لگ چکی تھی۔ بلڈوزر پر موجود دو مسلح افراد چھلانگیں لگا کر اترے۔ ان میں سے ایک ہوا میں تیرتے ہوئے تیر کا شکار ہوا اور دوسرا گرد و غبار کے بادل میں گم ہو گیا۔

گرد و غبار اور سیاہ دھوئیں کے دبیز بادلوں کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ بلڈوزروں نے بستی کی طرف حفاظتی باڑ کو جگہ جگہ سے روند ڈالا ہے اور اب ٹرسٹی حملہ آور آزادانہ بستی میں گھستے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی وحشیانہ فائرنگ اور فلک شگاف نعروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ شعلہ جوالہ بنے ہوئے ہیں اور آج ہر حد سے گزر جانا چاہتے ہیں۔ جلد ہی اس رائفل کا ایمونیشن ختم ہو گیا جو زریں گل کے ہاتھ میں تھی۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ دوسری رائفل حاصل کرنے کے لیے خندق سے باہر نکل گیا۔ اس کا یوں اندھا دھند نکل جانا مجھے مناسب نہیں لگا مگر اسے روکنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ سراپا پٹھان بنا ہوا تھا اور اوپر سے لالہ سدھیر کا شاگرد بھی تھا۔ فرنگیوں کا جانی دشمن، توپوں اور شعلوں کا دھواں نگل جانے والا اور میدان جنگ کی راکھ کو تبرک جان کر سر پہ ڈالنے والا۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی شے میرے شانے میں شدت سے چبھ رہی ہے۔ یہ غزالہ کی انگلیاں تھیں۔ اس نے غیر ارادی طور پر بڑی مضبوطی سے مجھے تھام رکھا تھا۔ جوں جوں لڑائی کی صورت حال سنگین ہو رہی تھی، اس کی اضطرابی گرفت میرے شانے پر سخت تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کراہ کر بولی "شاہ جہاں! یہاں سے نکل جائیں۔ لگتا ہے کہ یہ لوگ یہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

غزالہ کا تجزیہ کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ بستی میں گھسنے کے بعد ٹرسٹی بڑی تیزی سے چھاتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی جدید رائفلیں سامنے آنے والے ہر ذی نفس کو چھلنی کر رہی تھیں اور دستی بم جھونپڑوں کو تنکوں کی طرح اڑا رہے تھے۔ جو بلڈوزر زریں گل کے درست نشانے کی وجہ سے آگ میں گھس گیا تھا اس کی جگہ دو بلڈوزر مزید نمودار ہو گئے تھے۔ ان بلڈوزروں کے پہیے کیچڑ اور خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ یہ لارسیوں کا خون تھا۔ فاقہ زدہ بچوں، مدقوق جوانوں اور سہمی ہوئی عورتوں کا خون۔۔۔ یہ بڑا اندوہناک منظر تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اپنے ریوالور کی نال اسٹی کی کھوپڑی سے لگاؤں اور اس کا بھیجا نکال کر اس کی لاش بلڈوزروں کے سامنے پھینک دوں۔ اچانک خندق کے بالکل سامنے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ دستی بم کے ننھے ٹکڑے میرے برابر میں بیٹھے ہوئے لارسی نوجوان کے [illegible] میں تبدیل [illegible] ایم ایم رائفل کے [illegible] دھماکے کے ساتھ ہی [illegible] بھی خندق میں آن گرا۔ اس میں کسی خنجر کی [illegible] خون آلود گرم بھی تھی۔ یہ [illegible] غزالہ کی جھولی میں گری تھی۔ دہشت کے سبب غزالہ کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کی انگلیاں میرے شانے کے گوشت میں دھنستی چلی جا رہی تھیں۔

اب یہ بات واضح تھی کہ اس مورچے میں مزید رکنا موت کو دعوت دینا ہے۔ میں غزالہ سمیت خندق سے نکلا اور بوما کی طرف دوڑا۔ غزالہ کو میں نے اپنی آڑ میں لے رکھا تھا اور غزالہ نے تابی کو آڑ میں لے رکھا تھا۔ اسٹی بدستور میرے بازو کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ اشوکا میرے بائیں ہاتھ پر تھا، اس نے دستی بم سے ہلاک ہونے والے لارسی نوجوان کی خون آلود رائفل اٹھا لی تھی۔ سردار رانے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہم بوما کے قریب پہنچے تو وہاں بھی کشت و خون کے مناظر عروج پر نظر آئے۔ ٹرسیٹوں نے تین اطراف سے بوما پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے جیپوں، ٹرکوں اور بلڈوزروں کی آڑ لے رکھی تھی اور زوردار فائرنگ کر رہے تھے تاہم یہاں لارسیوں کی مزاحمت بھی جوبن پر نظر آئی۔ وہ مخصوص جنگی نعرے لگاتے ہوئے گروہ در گروہ ٹرسیٹوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی ڈھالیں تھیں اور چمک دار بھالے تھے۔ جدید رائفلوں کے سامنے ان روایتی ہتھیاروں کی کوئی اہمیت نہیں تھی مگر جوش و جذبے کی آندھی انہیں اڑا رہی تھی اور وہ موت سے کھلونے کی طرح کھیل رہے تھے۔

ہم نے جنگ جو عورتوں کی ایک ٹولی کو دیکھا، یہ سیاہ فام نیم عریاں عورتیں فلک شگاف نعرے لگاتی ایک طرف سے برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھوں میں طویل نیزے تھے۔ سب مشین گن کی باڑ آئی تو کئی عورتیں زمیں بوس ہو گئیں مگر باقی عورتیں دو بلڈوزروں پر چڑھ گئیں۔ انہوں نے نیزوں اور کٹاروں کے اندھا دھند وار کر کے بلڈوزروں پر سوار افراد کو قتل کر دیا اور آتشیں ہتھیار چھین لیے۔ جنگ جو عورتوں کی اس دلیرانہ کارروائی نے بوما کے اردگرد جمع ہو جانے والے سیکڑوں لارسیوں کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ وہ رنگ برنگے جھنڈے لہراتے اور ہتھیار تولتے ہوئے ٹرسیٹوں پر جھپٹے۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا کہ ابھی ایک دو منٹ میں لڑائی کا پانسا پلٹ جائے گا مگر پھر میری نگاہ اتفاقاً بوما کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے لگا کہ خون رگوں میں ٹھہر گیا ہے۔ مغرب کی طرف جھکے ہوئے سورج کی روشنی میں بوما کی چھت پر نیلی وردیوں والے ٹرسٹی گارڈز نظر آ رہے تھے۔ وہ وردیوں میں تھے اور جدید ترین رائفلوں سے مسلح۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ جس بوما کے دفاع کے لیے لارسی سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے ہیں اس کی چھت پر گارڈز اچانک کیسے پہنچ گئے ہیں۔ شاید یہ بھی کسی اندرونی سازش کا شاخسانہ تھا۔ بہرحال اس وقت اس موضوع پر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ بوما سے نکل کر بلڈوزروں پر حملہ آور ہونے والے سیکڑوں لارسی جان لیوا فائرنگ کی زد میں آ گئے ہیں۔ بوما کی چھت پر موجود گارڈز ان لوگوں کو لمحوں میں چھلنی کرنے کی قدرت رکھتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اشوکا اور میں چیخ چلا کر دس پندرہ لارسیوں کو روک لیتے یا ممکن تھا کہ عالم جوش میں وہ بھی نہ رکتے۔ میں نے غزالہ کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا بوما کی مخروطی عمارت کی طرف دوڑا۔ اشوکا بھی میرے ساتھ آ رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب بدقسمت لارسی فرشتہ اجل کے پھیلائے ہوئے جال میں آ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ جنگ جو عورتوں کی تقلید میں بلڈوزروں اور ٹرکوں پر چڑھتے، عقب سے ان پر اندھا دھند

فائرنگ شروع ہو گئی۔ پہلے ہی ہلے میں درجنوں لارسیوں کو بھون دیا گیا اور درجنوں زخمی ہو کر خاک و خون میں تڑپنے لگے۔

ہم چاروں دوڑتے ہوئے بوما کی عمارت میں گھس گئے۔ بوما کا بڑا پجاری لنگوٹی پوش بولوس ایک گول ستون کے ساتھ کھڑا تھا اور اپنے عقیدت مندوں کو چیخ چیخ کر ہدایت دے رہا تھا کہ وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ اس بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں بوما سے باہر نکال کر وہ ناگہانی موت کے سپرد کر دے گا۔ اس کا پیدا کیا ہوا مذہبی جوش و خروش اور جذبۂ قربانی ایک ٹھوس حقیقت تھا لیکن وہ درجنوں گارڈز بھی ایک ٹھوس حقیقت تھے جو بوما کی چھت پر پہنچ چکے تھے اور جن کے ہاتھوں میں چالیس چالیس گولیوں والی خود کار رائفلیں تھیں۔ وہ بلندی سے لارسیوں کا شکار کر رہے تھے اور بہت سے شکار ہونے والوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسے شکار ہوئے ہیں۔ اچانک ایک طرف سے کڑاکے کی آواز آئی۔ عبادت گاہ کا ایک محرابی دروازہ ٹوٹا اور بیسیوں حملہ آور اندر گھس آئے۔ پلک جھپکتے میں بوما کے اندر دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ حملہ آور نہ صرف فائرنگ کر رہے تھے بلکہ تیز دھار آلات کا استعمال بھی کر رہے تھے۔ ان کی رائفلوں پر سنگینیں چڑھی تھیں اور کئی ایک کے ہاتھوں میں خنجر وغیرہ بھی دکھائی دیے تھے۔ نیلی وردیوں والے یہ سارے گارڈز بلٹ پروف جیکٹس میں تھے۔ ان کے چہرے جوش اور غضب سے آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب سے غزالہ کی چیخ اور اشوکا کی کراہ ایک ساتھ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' اشوکا نے میرے جسم پر آنے والا وار اپنے ہاتھ پر روکا تھا۔ رائفل کی سنگین اس کی ہتھیلی سے آر پار ہو گئی تھی۔ میں نے رائفل بردار کی پیشانی پر صرف دو فٹ کے فاصلے سے فائر کیا اور سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے دور پھینک دیا۔ یکایک بوما کے اس حصے میں اندھیرا چھا گیا۔ چھت سے لٹکا ہوا وہ فانوس دھماکے سے زمیں بوس ہو گیا تھا جس میں ہر وقت ایک سو کے قریب شمعیں جلتی رہتی تھیں۔ فانوس کے گرتے ہی سرخ رنگ کے طویل پردوں میں آگ بھڑک اٹھی اور چھوٹی قیامت بڑی قیامت میں بدل گئی۔

اشوکا نے چیخ کر کہا "اس طرف آیئے۔"

بوما کا بغلی دروازہ اچانک کھل گیا تھا۔ ہم لاشوں اور زخمیوں کو پھلانگتے ہوئے اس دروازے کی طرف بڑھے۔ راستے میں میں نے اپنے ریوالور سے دو فائر مزید کیے اور کم از کم ایک گارڈ کو جہنم واصل کیا۔ باہر نکلتے ہی ہم بوما کے مغربی حصے کی طرف بڑھے۔ شفاخانہ اسی طرف تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر صفدر کی تھی۔ اس کی حالت خراب تھی۔ اپنا دفاع کرنا تو دور کی بات ہے وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا کلیجا دہل گیا کہ پورا شفاخانہ آگ کی زد میں تھا۔ وہ ایک بہت بڑے الاؤ کی شکل اختیار کر چکا تھا اور ہر شے دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ غزالہ نے دل تھام لیا "ہائے میرے خدا! صفدر کہاں ہو گا؟"

یہ بڑا ہولناک سوال تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اتنے میں سردار رانے نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور داڑھی اور لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ وہ جنونی انداز میں چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو اشوکا سے چلا کر پوچھا کہ ہم ا وائرلیس استعمال کر کے گنگ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟ اشوکا نے اسے بتایا کہ ٹرانس میٹر غائب ہے۔ پھر اشوکا نے دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شفاخانے کی طرف اشارہ کیا اور سردار رانے سے پوچھا "کیا کوئی زندہ بھی بچا ہے؟"

"ہاں کچھ لوگ نکلے ہیں۔" رانے نے عجلت میں جواب دیا "لیکن ۔۔۔ صفدر صاحب کا ٹھیک پتا نہیں۔"

اشوکا صفدر کو دیکھنے کے لیے تیزی سے اس جانب بڑھ گیا جدھر رانے نے اشارہ کیا تھا۔ اشوکا کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا لیکن ان سنگین ترین لمحات میں وہ اپنی تکلیف کو یکسر بھولا ہوا تھا۔ اشوکا ہندو تھا' تاہم اپنے مذہب اور اپنی قوم کی عمومی ذہنیت کے برعکس وہ ایک مختلف شخص تھا۔ بحیثیت انسان وہ مجھے ایک اچھا شخص لگا تھا۔ شاید وہ صرف ایک انسان ہی تھا۔ مذہب' معاشرے' عقیدے اور مزاج سے الگ تھلگ صرف ایک انسان۔ چند سیکنڈ بعد اشوکا واپس آ گیا۔ آگ کی تپش کے سبب اس کی کلائیوں کے کچھ بال جھلس گئے تھے۔ اس نے بتایا کہ سردار رانے کی بات درست ہے۔ شفاخانے سے کچھ افراد زندہ سلامت نکل گئے ہیں اور غالب امکان ہے کہ ان میں صفدر صاحب بھی شامل ہیں۔

اسی دوران میں چند گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں' ہمیں لپک کر موبائل کلینک کے عقب میں پناہ لینا پڑی۔ سردار رانے چیخ چیخ کر ہم سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اشوکا نے بتایا کہ وہ بارود کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ پچھلے چند روز میں مقامی ماہروں نے گندھک اور فاسفورس وغیرہ کی آمیزش سے بڑی محنت کے ساتھ آتش گیر بارود تیار کیا تھا۔ اس بارود کو مٹی

کے بڑے بڑے ہنڈولوں میں بند کر کے بموں کی شکل دے دی گئی تھی۔ ان دیسی بموں کو ڈیڑھ دو گز لمبی رسی کی مدد سے ہوا میں گھمایا جاتا تھا اور دشمن کی طرف اچھال دیا جاتا تھا۔ یہ بم تیار کر کے اسی پختہ کوٹھڑی میں رکھے گئے تھے جو بوما کے عقب میں واقع تھی۔ لارسی سرداروں نے طے کیا تھا کہ لڑائی کی صورت میں اس بارود کو آخری حربے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اب سردار رانے مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اس آخری حربے کو استعمال کیا جائے یا نہیں؟

میں نے تلملا کر کہا "اب کیا مزید برے وقت کا انتظار ہے تمہیں؟ سب کچھ تو ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس بارود کو چلا دو' ورنہ وہ کسی کام نہیں آئے گا۔"

اشوکا نے میرا جواب سردار رانے تک پہنچایا تو وہ جھک کر دوڑتا ہوا بوما کی طرف چلا گیا۔ اسی اثنا میں اکا دکا گولیاں موبائل کلینک کے عقب میں بھی پہنچنے لگیں۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ٹرسٹ کے وحشی گارڈز ہر مزاحمت کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم زمین پر اوندھے لیٹ جائیں اور موبائل کلینک کے نیچے رینگ جائیں۔ ہم نے اس آپشن پر عمل کیا۔ ٹریلر کے دیوہیکل پہیے ہمیں اوٹ فراہم کر رہے تھے۔ اشوکا کے پاس رائفل موجود تھی وہ گاہے گاہے ٹریلر کے نیچے سے فائر بھی کر رہا تھا۔ ٹریلر کے نیچے سے ہم نے ارد گرد کے کئی مناظر دیکھے۔ سب سے اہم منظر تو گارڈز اور پولیس فورس پر لارسیوں کا بارودی حملہ تھا۔ لارسی بڑی دلیری کے ساتھ کمین گاہوں سے باہر نکلے اور بارودی ہنڈولوں کو مخصوص انداز میں ہوا میں گردش دے کر گارڈز کی طرف اچھالا گیا۔ دھماکے ہوئے اور اکثر مقامات پر آگ بھڑکتی ہوئی نظر آئی۔ ایک دو جیپیں بھی آگ کی زد میں آ گئیں۔ تاہم ان ہنڈولوں سے لارسیوں نے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بارود سے شدید تباہی کی جو توقع کی جا رہی تھی وہ غلط ثابت ہوئی پھر دوسرا BACK SET یہ ہوا کہ پورے کا پورا بارود استعمال بھی نہیں کیا جا سکا۔ آناً فاناً گارڈز نے دو طرف سے پیش قدمی کی اور باقی ماندہ بارود پر قابض ہو گئے۔ اس آخری حربے کی ناکامی کے بعد صحیح معنوں میں لارسیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جوش اور غضب کی جگہ جان بچانے کے فطری جذبے نے لے لی۔ ٹریلر کے نیچے سے میں نے چند دل دوز مناظر دیکھے۔ چند لارسیوں کو ہتھیار پھینکنے کے باوجود گولیوں سے بھون دیا گیا اور ان پر سے بلڈوزر گزار دیا گیا۔ ایک جیپ سے چند عورتوں پر جال پھینکا گیا اور جیپ ان عورتوں کو جال سمیت گھسیٹتی ہوئی دھوئیں کے ہالے میں گم ہو گئی۔ ٹریلر سے صرف چند گز کی دوری پر ایک جواں سال ماں سے اس کا زخمی بچہ چھین کر آگ میں پھینکا گیا اور گنگ کا ایک ہرکارہ روتی بلکتی عورت کو کھینچنے لگا پھر دھوئیں کے بادل نے سب کچھ چھپا لیا۔

"وہ دیکھیں شاہ جہاں۔" لرزتی کانپتی غزالہ نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

بوما کا سب سے بڑا پجاری ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور ایک زخمی گھوڑے کے قریب گر گیا۔ پجاری بولوس کی آنتیں اس کے پیٹ سے باہر لٹک رہی تھیں' غالباً وہ گرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اسی دوران میں کسی دستی بم کا پرخچہ اڑتا ہوا آیا اور میرے پہلو میں لیٹے اشوکا کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ درحقیقت وہ اشوکا کی شہ رگ اور اس کی گردن کی ہڈی کو کاٹتا ہوا دوسری جانب سے نکل آیا تھا۔ اشوکا کے جسم نے چند جھٹکے کھائے اور ساکت ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے یہ سب کچھ یوں آناً فاناً ہوا کہ ہم دم بخود رہ گئے۔

میرے سینے میں آتش فشاں دہکنے لگا تھا۔ سر سے پاؤں تک پورے جسم میں جیسے آگ ہی آگ پھیل گئی تھی۔ اسٹی میرے بازو کے شکنجے میں دیر تک مچلنے کے بعد قدرے نڈھال ہو گیا تھا۔ میں نے نہایت وحشت کے عالم میں اپنا ریوالور اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ گنگ براؤن نے 'جو کچھ برے سے برا ہو سکتا تھا اس نے کیا تھا' اب مجھے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔ اب لازم تھا کہ سیکڑوں بے گناہوں کی لاشوں کے عوض گنگ براؤن کو اس کے بیٹے کی لاش پیش کر دی جائے۔ میری انگلی ریوالور کے ٹریگر پر آئی اور اس وقت ۔۔۔ عین اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سے دوچار ہوں۔

میں نے بے شمار قتل کیے تھے۔ کبھی کبھی وحشت کے عالم میں ایسے لوگوں کو بھی مارا تھا جنہیں میں مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس قسم کی صورت حال سے میں پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا جیسے اب تھا۔ میرے اندر سے آواز آئی "گنگ براؤن دنیا کا بدترین انسان سہی لیکن اس سے بدلہ چکانے کے لیے تم جسے قتل کر رہے ہو' وہ ہزار ہا خرابیوں کے باوجود ایک بچہ ہے۔ تم کسی بھی پہلو سے دیکھو' اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے کہ وہ ابھی نابالغ ہے۔ اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں ۔۔۔ اور

اگر وہ ابتدائی مراحل میں ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ وہ مکمل نہیں اور اگر وہ مکمل نہیں تو پھر تم اس کے بارے میں حتمی اور آخری فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ آج سے پندرہ بیس یا پچاس سال بعد یہ بچہ کیا ہوگا؟

اس کے ساتھ ہی اندر سے ایک اور آواز ابھری۔ ”یہ شیطان ابن شیطان ہے۔ جس کا بچپن ایسا شر انگیز و ہولناک ہے اس کی بلوغت اور جوانی کیا ہوگی۔ سانپ کو جوان ہونے اور پھن اٹھانے سے پہلے ہی کچل ڈالو گے تو نیکی کرو گے۔ اس خطے کی اگلی نسل کو مستقبل کے ایک بہت بڑے بردہ فروش سے بچاؤ گے۔“

چند لمحوں کے مختصر ترین وقت میں ذہن نفی اور اثبات کی ہزار ہا پرتوں میں سے گزر گیا۔ میری انگلی ٹریگر کا ٹھوس لمس محسوس کر رہی تھی اور میری نگاہ اسقی کے خباثت بھرے چہرے پر جمی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ غزالہ کی انگلیاں ایک بار پھر میرے شانے میں گڑتی چلی جا رہی تھی "پلیز شاہ جہاں۔" اس کے ہونٹوں سے لرزتی کانپتی صدا نکلی۔

غزالہ کے ان دو لفظوں کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ان دو لفظوں میں بے شمار التجائیں اور درخواستیں شامل تھیں۔ وہ اسقی کے لیے مجھ سے رحم مانگ رہی تھی۔

میری انگلی ٹریگر پر ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ وہ صرف دو چار لمحے ہی تھے لیکن وہ صدیوں پر بھاری تھے۔ آخر یہ لمحے گزر گئے۔ اپنے سامنے پھیلی ہوئی تمام تر تباہی کے باوجود اور اپنے اندر بھڑکتی ہوئی تمام تر آگ کے باوجود میں اپنی انگشت شہادت کو ٹریگر پر حرکت نہیں دے سکا۔ اسی دوران میں ایک جیپ کے پہیے چرچرائے اور وہ ٹریلر کے عین سامنے آن رکی۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا، اس جیپ میں ڈرائیونگ سیٹ پر زریں گل موجود تھا۔ اس کے پہلو میں ڈری سہمی کلثوم بھی دکھائی دے رہی تھی۔ زریں نے نیچے جھک کر مجھے دیکھا اور چیخ کر کہا کہ میں اور غزالہ جیپ کے اندر آجائیں۔

زریں فی الواقع بڑے وقت پر پہنچا تھا۔ میں نے ایک ... اس بھری نظر اپنے پہلو میں مردہ پڑے اشوکا پر ڈالی اور غزالہ کا بازو تھام کر ٹریلر کے نیچے سے نکل آیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم جیپ کے اندر تھے۔ یہ وہی جیپ تھی جس میں ہم سائیں ... کے کھنڈر سے جنگل کا خوفناک سفر کر کے موگاسا بستی میں ... تھے۔ زریں گل مضطر نظروں سے ٹریلر کے نیچے دیکھ رہا ... غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اشوکا ابھی تک نیچے سے کیوں نہیں نکلا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اشوکا مردہ حالت میں ہے۔ میں نے کہا "اشوکا مر چکا ہے۔"

"اوہ خدایا!" زریں کے منہ سے نکلا۔

"چلو گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

"ام کو کدھر جانا ہے؟"

"سب سے پہلے صفدر کو ڈھونڈو۔"

"ذرا اپنے پیچھے دیکھیں استاد صیب۔"

میں نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا۔ غزالہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہمیں جیپ کی تیسری نشست پر صفدر نیم دراز نظر آیا۔ ایک سیاہ فام لڑکی نے نیم بے ہوش صفدر کا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے سہارا دے رکھا تھا "بہت اچھا کیا۔" میرے منہ سے زریں کے لیے بے اختیار تعریفی کلمات نکلے۔

"لیکن پروفیسر اور شائستہ کہاں ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔

زریں نے ایک اگلی جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کھلی جیپ تھی اور اس میں دور ہی سے پروفیسر اللہ رنا اور شائستہ کے علاوہ گھونگریالے بالوں والا بوڑھا داماں بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ داماں ہی تھا جس نے کل رات نہایت گھنے اور پُرخطر جنگل میں ہماری رہنمائی کی تھی اور ہمیں دو اور چار ٹانگوں والے کتوں سے بچا کر موگاسا تک پہنچایا تھا۔ اس سفر کے دوران میں پروفیسر اور داماں کے درمیان کافی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس وقت داماں پروفیسر کے ساتھ جیپ میں موجود تھا۔ اب صرف سائیں عالی کی کمی تھی۔ میں اس کی تلاش میں مسلسل چاروں طرف نگاہ دوڑا رہا تھا لیکن وہ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب تھا۔

اسقی نے میرے بازو کے شکنجے میں ایک بار پھر زور و شور سے تڑپنا شروع کر دیا تھا۔ اس خرانٹ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم اس میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کر کے کہیں اور نکل رہے ہیں۔ اس نے اپنے بے رحم دانتوں سے میرے زخمی بازو کو اور زخمی کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر اس کی گردن کو مخصوص انداز میں مسلا اور بے ہوش کر کے جیپ کے فرش پر پٹخ دیا (بعد میں کئی روز تک غزالہ میرے زخمی بازو پر مرہم وغیرہ لگاتی رہی تھی اور میں سوچتا رہا تھا کہ اگر اسقی کو بے ہوش کرنے کا کام میں پہلے کر گزرتا تو اچھا تھا)

اسی اثنا میں جیپوں سے بیس تیس گز کی دوری پر دستی بموں کے دو مزید دھماکے ہوئے۔ اردگرد چھایا ہوا دھواں اور گرد و غبار کچھ مزید گہرا ہو گیا۔ اس گرد و غبار میں جلتے ہوئے گوشت کی بو تھی اور جان کنی کے عالم میں تڑپتے ہوئے

انسانوں کی چیخیں تھیں۔ رائفل کی کئی گولیاں ہماری جیپ کی باڈی میں لگیں اور غزالہ نے "روتے ہوئے نابی" کو اپنے بازوؤں میں کچھ اور بھی چھپا لیا۔ زریں نے کلچ چھوڑا اور جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ گرد و غبار کے بادلوں میں گھستی چلی گئی، پروفیسر والی جیپ ہم سے دس پندرہ گز آگے تھی۔ اچانک پولیس کی ایک جیپ نمودار ہوئی اور اس نے سامنے سے ٹکر مار کر پروفیسر والی جیپ کو روک لیا۔ زریں گل کی رائفل نشست پر پڑی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور بے دھڑک پولیس والوں پر فائر کھول دیا۔ پلک جھپکتے میں تینوں جیپ سوار چیختے زخمی ہو کر جیپ میں گر گئے۔ ان میں سے ایک کھوپڑی صاف اڑ گئی تھی۔ اس منظر سے نگاہ بچانے کے لیے غزالہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

پروفیسر نے بڑی تیزی سے جیپ کو ریورس کیا اور ایک سائیڈ سے آگے نکال لے گیا۔ اچانک غزالہ کی سریلی چیخ عین میرے دائیں کان میں گونجی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، دو بٹے کٹے گارڈز ہماری جیپ پر چڑھنے کی کوشش میں تھے۔ یقیناً وہ ان شکاریوں میں سے تھے جو اس میدان جنگ سے عورتوں اور بچوں کو زندہ پکڑنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کو گولی کا نشانہ بنایا، دوسرا زریں کی تیز رفتار ڈرائیونگ کی وجہ سے جیپ کے پائیدان پر توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور گر گیا۔

میں اپنے اردگرد قتل عام کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ یہ لارسیوں کا قتل عام تھا۔ کسی لارسی مرد کی جاں بخشی نہیں کی جا رہی تھی۔ جہنم مکانی جوری نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔ کنگ براؤن کی اس "سیاہ فام ایجنٹ" نے مجھے بتایا تھا کہ موگاسا پر قیامت صغریٰ نازل ہونے والی ہے۔ بستی پر حملے کی صورت میں کسی لارسی بچہ کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ یقیناً یہ اسی پروگرام پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جیپ سے کود کر اندھا دھند بوما کی طرف دوڑ لگا دوں اور گارڈز کے جبڑے اڑاتا ہوا کنگ براؤن تک پہنچ جاؤں۔ اسے مار ڈالوں یا خود مر جاؤں۔ دکھ اور تلملاہٹ کے ایسے لمحات بہت کم آئے تھے مجھ پر۔ اگر مجھے صفدر، غزالہ اور دیگر ساتھیوں کا خیال نہ ہوتا تو شاید میں واقعی جیپ سے کود جاتا اور اپنا اچھا یا برا انجام لارسیوں کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔

○☆○

موگاسا سے پچیس تیس میل کی دوری پر ہم ایک تاریک کھوہ میں موجود تھے۔ ہماری دونوں جیپیں گھنے جھاڑ

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زندان میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت 300 روپے
یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں
رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے
محصول ڈاک 30 روپے
بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کے لئے کتاب کی قیمت اور ڈاک خرچ ادارہ کے نام منی آرڈر یا ڈرافٹ بنا کر ارسال کریں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414©

جھنکاڑ میں یوں چھپی ہوئی تھیں کہ بس ناپید ہو کر رہ گئی تھیں۔ نہایت دشوار گزار اور دلدلی راستوں سے گزر کر اگر ہم اس محفوظ غار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے تو اس میں قدرت کے بعد سب سے زیادہ ہاتھ بوڑھے داماں کا تھا۔ اس نے "کل" رات کی طرح ایک بار پھر خطرناک ترین جنگل میں ہماری شاندار رہنمائی کا فریضہ انجام دیا تھا۔ وہ ہمیں ایسے راستوں سے گزار کر لایا تھا کہ اگر فرشتہ اجل بنفس نفیس بھی ہمارے تعاقب میں ہوتا تو شاید گھبرا کر ہمارا پیچھا چھوڑ دیتا۔ داماں کا سفر نرسٹ کے خوں خوار گارڈز کے لیے ایک چیلنج تھا کہ اگر ہمارے پیچھے آسکتے ہو تو آؤ۔ گارڈز نے شروع میں اس چیلنج کو قبول کیا تھا۔ چار پانچ میل تک ہمیں اپنے عقب میں ان کی گاڑیوں کی روشنیاں اچھتی کودتی نظر آئی تھیں مگر پھر آہستہ آہستہ اوجھل ہو گئی تھیں۔ داماں کا کمال یہ تھا کہ نہایت دشوار گزار اور دلدلی راستوں سے گزرنے کے باوجود ہمیں اپنی گاڑیاں ترک نہیں کرنا پڑی تھیں۔ ایک دو مقامات ایسے ضرور آئے تھے کہ ہمیں جیپیں آگے لے جانے میں سخت دشواری محسوس ہوئی تھی تاہم کسی نہ کسی طرح ہم یہ رکاوٹیں عبور کر گئے تھے۔ یوں داماں نے خود کو ایک بار پھر صحیح معنوں میں فرانسیلیمنی گائیڈ ثابت کیا تھا۔

ڈھائی تین گھنٹے گزرنے کے باوجود استی ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھا' مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ دیر تک ہوش میں آجائے گا۔ صفدر کی بے ہوشی بھی اب گہری نیند میں بدل چکی تھی۔ موگاسا میں خون ریز لڑائی شروع ہونے سے بس دو چار منٹ پہلے ہی غزالہ نے صفدر کی سرجری مکمل کرلی تھی۔ اس کے جسم کے اندر گہرائی میں ٹوٹے ہوئے کم از کم چھ کانٹے نکالے گئے تھے اور بینڈیج کردی گئی تھی۔ غزالہ کو یقین تھا کہ اب اس کی حالت بہتر ہونا شروع ہوجائے گی۔ جسمانی حالت تک تو غزالہ کی بات درست تسلیم کی جاسکتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ صفدر کی ذہنی حالت اتنی جلدی ٹھیک ہونے والی نہیں۔ کوئی جان سے پیاری ہستی اسے کبھی مندمل نہ ہونے والا زخم لگا گئی تھی۔ ایک ایسا دکھ دے گئی تھی کہ صفدر سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ویرا کے حوالے سے سائیں عالی کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑے وجدانی لہجے میں پیش گوئی کی تھی کہ صفدر کا غم لازوال ہے۔ ویرا اب اسے نہیں ملے گی۔ میں سائیں کے ان الفاظ کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا دل ہولنے لگتا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ صفدر کو ویرا نہ ملے اور وہ زندہ بھی رہے۔ صفدر کی

حالت سے مجھے اس محبت کی گہرائی کا تھوڑا بہت اندازہ ہوچکا تھا جو وہ ویرا کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا۔

غزالہ کھوہ کے ایک گوشے میں نیم دراز تھی۔ کھوہ میں روشنی رکھنے کے لیے ہم جیپ سے بڑے سائز کی ایک ٹارچ نکال لائے تھے۔ یہ ٹارچ زریں نے ایک ڈوری سے باندھ کر کھوہ کی چھت سے یوں لٹکا دی تھی کہ وہ بلب کا کام دینے لگی تھی۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں غزالہ کے پہلو میں تابی نظر آرہا تھا۔ وہ دونوں بالکل ماں بچے کی طرح لگ رہے تھے۔ تابی کی ایک ٹانگ غزالہ کے پیٹ پر تھی اور غزالہ تھپک تھپک کر اسے سلانے کی کوشش کررہی تھی۔ اتنے میں صفدر نیند کی حالت میں کراہا۔ وہ غزالہ کا مریض تھا لہٰذا وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور صفدر کے سرہانے پہنچ گئی۔ صفدر نے گہری نیند کی حالت میں پانی مانگا۔ میں جلدی سے پانی لینے کے لیے اٹھا مگر غزالہ نے مجھے روک دیا "نہیں' ابھی صفدر کے لیے پانی ٹھیک نہیں۔" اس نے بطور ڈاکٹر ہدایت کی۔

صفدر کی ایک پٹی میں سے خون رس رہا تھا۔ یقیناً انتہائی دشوار گزار سفر کے دوران میں اس زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔ میں اکیلا ہوتا تو یہ صورت حال مجھے مزید پریشان کردیتی مگر غزالہ مطمئن تھی اور اس کا اطمینان دیکھ کر میں بھی مطمئن تھا۔ وہ صفدر کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اس کی خون آلود پٹی کھولنے میں مصروف ہوگئی۔

پروفیسر میرے قریب آن بیٹھا۔ اس کے سر کے بال ایک طرف سے جھلسے ہوئے تھے۔ یہ جھلسے ہوئے بال میدان جنگ کی نشانی تھے۔ فی الواقع پروفیسر نے لڑائی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ زریں گل نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ پروفیسر نے نرسٹ کے کم از کم چھ گارڈز کو ہلاک کرنے کے بعد جیپ پر قبضہ کیا تھا۔ بعد ازاں وہ اسی جیپ پر شائستہ اور راماں وغیرہ کو سوار کرنے کے بعد نرسٹیوں کے نرغے سے نکل آیا تھا۔ دراصل پروفیسر اب ایک جنگ جو شخص کے روپ میں ڈھل چکا تھا اور جنگ و جدل اب اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کچھ عرصہ پہلے لوگوں کا علاج معالجہ کرنا۔ وہ منٹوں میں مریضوں کو شفا دینے کا اعجاز رکھتا تھا۔ اب وہ بارود سے لوگوں کو موت دینے کا ہنر بھی سیکھ چکا تھا۔ پروفیسر نے اپنی لانگ رینج رائفل گود میں رکھی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ اچانک کنگ کے نرسٹیوں کو ہوا کیا ہے۔ کہیں یہ سب کسی غلط فہمی کا نتیجہ تو نہیں!"

"میرے اپنے ذہن میں بھی یہ بات آئی ہے۔" میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ کسی مخبر نے کنگ براؤن کو کوئی غلط سلط

اطلاع پہنچاری ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ استی کے حوالے سے کوئی غلط اطلاع؟"

"بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ ورنہ کنگ براؤن اپنے بیٹے کے سلسلے میں جتنا محتاط تھا وہ ایسا سنگین قدم اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی وجہ سے کنگ براؤن استی کی زندگی کی طرف سے اچانک بالکل مایوس ہوگیا ہو۔"

"لیکن بغیر کسی تصدیق کے صرف شک کی بنا پر ایسی سنگین ترین کارروائی؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔" پروفیسر نے طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم ہوگئے۔ میری نگاہوں میں چند گھنٹے پہلے کا وہ منظر گھومنے لگا جب میں اپنے اردگرد پھیلی ہوئی تباہی دیکھ کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال استی کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔ ان جاں گسل لمحات میں میرے ذہن کے اندر کچھ سوالات اٹھے تھے جن کے سبب میں استی کو شوٹ کرنے سے رک گیا تھا۔ غالباً ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پروفیسر اللہ دتا نے کیا تھا۔ یعنی اپنے بیٹے کے سلسلے میں بے حد محتاط ہونے کے باوجود کنگ نے موگاسا پر وحشیانہ حملہ کیوں کیا؟ یہ حملہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ تو نہیں تھا؟ اس وقت میرے ذہن میں برق کی رفتار سے لپکنے والی جن سوچوں نے میری انگلی کو ٹریگر پر حرکت کرنے سے روکا تھا ان میں سے ایک سوچ یہ بھی تھی۔ میں کسی بہت بڑی غلط فہمی کے نتیجے میں استی کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک زریں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ کوئی بھاری بھرکم شے کندھے پر اٹھائے کھوہ کی طرف آرہا تھا۔ وہ کوئی آدھ گھنٹا پہلے جیپوں کی تلاشی لینے گیا تھا۔ دور ہی سے پتا چل رہا تھا کہ اسے کوئی اہم چیز ملی ہے۔ وہ قریب آیا اور میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو واقعی میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ ایک کافی بڑا وائرلیس سیٹ تھا۔ اس کی بیٹری بھی بڑی اور طاقت ور نظر آتی تھی۔

"یہ ام کو پروفیسر حبیب والی جیپ کے اندر سے ملا ہے۔ پچھلی سیٹوں کے نیچے گھسا ہوا تھا۔" زریں گل نے اطلاع دی۔

میں وائرلیس سیٹ کو ٹارچ کے عین نیچے لے آیا اور بے تابی سے اس پر جھک گیا۔ وائرلیس سیٹ بالکل چالو حالت میں تھا' بس ایک دو تار اکھڑے ہوئے تھے۔ شاید افرا تفری میں زریں ہی اکھاڑ لایا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر میں نے سیٹ کو چالو کرلیا۔ فریکوئنسی سیٹ کرنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا' یقیناً پروفیسر اور زریں وغیرہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہم بدنام زمانہ بردہ فروش کنگ براؤن سے بات کرنے جارہے تھے۔ موگاسا کی خوفناک لڑائی کے بعد یہ بدبخت کنگ سے ہمارا پہلا رابطہ تھا۔

چند بار سگنل گیا' پھر کلک کی آواز آئی اور اسپیکر سے ایک بھاری آواز ابھری لیکن یہ آواز کنگ کی نہیں تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں پہچان گیا۔ یہ آواز کنگ کے دست راست راجر کی تھی "ہیلو کون؟" وہ تیسری بار چیخ کر بولا۔

"تمہارے باپ کا باپ!" میں نے سکون سے جواب دیا۔

"شش۔۔۔ شاہ جہاں تم؟" دوسری جانب سے راجر کی حیرت میں غرق آواز ابھری۔

"کیوں' تمہارا کیا خیال تھا کہ موگاسا کے ..... سیکڑوں بے گناہ لارسیوں کی طرح میں بھی کسی بلڈوزر کے نیچے روندا جاچکا ہوں۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ یوں لگا کہ راجر پر عارضی سکتہ طاری ہوگیا ہے پھر وہ ایک دم آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ اس کے حلق سے مغلظات کا طوفان برآمد ہونا شروع ہوا۔ وہ اتنے زور سے دہاڑ رہا تھا کہ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ وہ چیخا "تو بڑا بدقسمت ہے شاہ جہاں کہ لڑائی میں مر نہیں گیا۔ تیری موت ایسی دردناک ہوگی کہ کہانی بن جائے گی۔" اس کے بعد راجر نے پھر میری شان میں زبردست "قصیدے" پڑھے اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "تونے استی کو قتل نہیں کیا ہے شاہ۔۔۔ تونے اپنے خاندان اور پورے خانوارے کو خارش زدہ کتوں والی موت بخش دی ہے۔ اپنی پوری نسل کو زندہ در گور کردیا ہے تونے۔ تیرا بہت عبرت ناک حشر ہونے والا ہے۔ میں یسوع کی قسم کھاتا ہوں' تیری لاش۔۔۔" اس سے آگے اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کوشش کے باوجود فقرہ مکمل نہیں کرسکا۔

میرے ذہن میں ہلچل مچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے کے اندیشے بالکل درست ثابت ہوگئے تھے۔ موگاسا پر وحشیانہ حملہ کنگ براؤن کی سنگین غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ وہ کنگ براؤن جو خود کو مواصلات کا بادشاہ سمجھتا تھا اور جس کے کول کمرے میں لاسلکی ذرائع سے دنیا بھر سے پل پل کی خبریں جمع ہوتی تھیں' اور جو خود کو وائس آف امریکا اور بی بی سی وغیرہ سے

زیادہ باخبر گردانتا تھا' اپنے ہی بیٹے کے بارے میں بے خبر رہا تھا اور ڈس انفارمیشن کا شکار رہا تھا۔

میں نے کچھ دیر کے لیے وائرلیس سیٹ کا ائرپیس اپنے کان سے الگ کر دیا تاکہ بپھرا ہوا راجر اچھی طرح چیخ چنگھاڑ لے۔ کچھ دیر بعد میں نے راجر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ تو نے غلطی سے شراب میں خنزیر کا موت ملا کر پی لیا ہے' وہ سیدھا تیرے دماغ کو چڑھ گیا ہے اور تو پاگل کتے کی طرح چیختا چلا جا رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندہ کو مردہ نہ کہتا۔ جس اندھیرے کی پیداوار کو تم ماسٹر استی کہتے ہو وہ تاحال مرا نہیں' زندہ ہے۔"

"تم.... تم بکواس کرتے ہو۔ دھوکا دے رہے ہو ہمیں۔"

"کاش میں کسی کو ایسا دھوکا دے سکتا۔ ایسی طلسمی قوت ہوتی مجھ میں کہ مردے کو زندہ ظاہر کر سکتا تو سب سے پہلے میں اس حرامی چین کو زندہ رکھاتا جس کے مرنے سے تم سب نے تازہ ترین بیواؤں کی طرح بال کھول لیے ہیں اور اپنے ناخنوں سے اپنا ہی گوشت نوچ رہے ہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا ثبوت ہے میرے پاس۔ کنگ کا مشکوک نطفہ ابھی زندہ ہے اور میرے پاس موجود ہے۔"

میں نے زریں کو اشارہ کیا۔ وہ استی کو ٹانگ سے گھسیٹتا ہوا وائرلیس سیٹ کے پاس لے آیا۔ استی کی بے ہوشی اب ٹوٹ گئی تھی' چند منٹ پہلے اس نے نیند میں کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ زریں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حسب عادت اس نے انگریزی میں بڑی مدلل قسم کی گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ وہ وائرلیس کے بالکل قریب تھا لہٰذا اس کی آواز راجر تک پہنچی۔

"سن رہے ہو تم؟" میں نے راجر کو مخاطب کر کے پوچھا۔

دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ شاید راجر کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی لرزتی آواز سنائی دی "تم... جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ ریکارڈ شدہ آواز ہے۔"

"چلو تم اس پلّے سے خود بات کر لو۔" میں نے استی کی گردن دبوچ کر اس کا منہ وائرلیس کے قریب کر دیا۔

راجر کی آواز آئی "استی۔ کیا تم... میرا مطلب ہے کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

"ہاں میں سن رہا ہوں۔" استی نے نیند سے بوجھل لہجے میں کہا۔

"تت... تم کہاں ہو؟" راجر کے انداز میں ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت تھی۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔" استی نے ہم سب کو ایک مشترکہ گالی دینے کے بعد کہا پھر ذرا توقف سے بولا "کیا تم انکل راجر ہو؟"

راجر نے اس سوال کا جواب ہاں میں دیا۔

استی نے پوچھا "میرے ڈیڈ کہاں ہیں۔ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے زریں کو اشارہ کیا۔ وہ چیختے چلاتے اور ٹانگیں مارتے استی کو کھینچ کر دور لے گیا۔ پروفیسر نے زریں کو اشارہ کیا۔ اس اشارے کا مطلب تھا کہ زریں لارو ناب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے استی کی تھوڑی سی ٹھکائی کر دے تاکہ اس کی "ماں بہن ایک کرنے والی" زبان کو تھوڑا سا سکون آ جائے۔

میں نے راجر کو کنگ کے دلال کا خطاب دیا اور وائرلیس پر اس سے پوچھا کہ کیا وہ اب بھی استی کو مردہ قرار دے گا۔

دوسری طرف راجر کا وہ حال ہوا تھا جو ایک بہت پھولے ہوئے غبارے کا ہوا نکلنے کے بعد ہوتا ہے۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا "کیا میں ماسٹر استی سے دوبارہ بات کر سکتا ہوں۔"

"تم دس مرتبہ بھی بات کر لو گے تو صورت حال یہی رہے گی۔ اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم اس وائرلیس کی لوکیشن کھوج کر ہم تک پہنچ جاؤ گے تو یہ خناس بھی دماغ سے نکال دو۔ تم بارہ گھنٹے میں بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے ہو اور یہاں پہنچ کر بھی تم کوئی توپ نہیں چلا سکو گے۔ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ استی ہمارے پاس ہے اور گن پوائنٹ پر ہے۔"

"اگر... اگر ماسٹر زندہ تھا تو تم نے حملے کے وقت کنگ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

"مجھے ایک پاگل نے کاٹ لیا تھا جو اتفاق سے کتا بھی تھا۔ تم یہ سب باتیں چھوڑو اور اپنے باپ کنگ سے میری بات کرواؤ۔"

"کنگ تو اسپتال میں ہیں۔" جیسے اچانک ہی راجر کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا اسے بچہ ہونے والا تھا؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو کنگ کا یہ گماشتہ شیر ببر کی طرح گرجنے لگتا مگر اس وقت اس کی دم میں نمدہ نفث تھا اور دراز

مرل چوہے سے بھی حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہکلا کر بولا "تم... میں چند منٹ بعد تم سے دوبارہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ یہ رابطہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"میں دلالوں سے رابطہ نہیں کرتا۔ ہاں اگر وہ پردہ پوش (کنگ) خود بات کرے تو اور بات ہے۔"

"تم... حد سے بڑھ رہے ہو۔"

"نہیں۔ ابھی حد سے نہیں بڑھا ہوں لیکن کان کھول کر سن لو' اگر نرسٹ کی طرف سے لارسیوں پر مزید ظلم ہوا تو مجھے حد سے بڑھنا پڑے گا۔ کنگ سے رابطہ نہیں کرا سکتے ہو تو اسے خود جا کر یہ بات بتا دو۔ اس سے کہہ دو کہ جو کچھ وہ کر چکا ہے وہی بہت زیادہ ہے۔ اب وہ اپنا ہاتھ روک لے ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

پروفیسر نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "تو یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اس وجہ سے ہوا ہے کہ کنگ نے اپنے بیٹے کو مردہ سمجھ لیا تھا.... مگر ایسا کیوں ہوا؟"

"یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے اور چال بھی۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ کسی کی چال ہے۔ لارسیوں اور نرسٹیوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کو عین موقع پر سبوتاژ کیا گیا ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

پروفیسر کے ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ یقیناً اس ہنگامے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو لڑائی شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے برپا ہوا تھا۔ اس ہنگامے میں کسی نامعلوم حبشی کی طرف سے اندھا دھند فائرنگ کی گئی تھی۔ اس فائرنگ میں استی کے نگران لارو ناب سمیت چار افراد موقع پر ہلاک ہو گئے تھے اور استی کو جھونپڑے سے فرار ہو کر اصطبل میں گھس جانے کا موقع مل گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسی خون ریز واقعے کو بنیاد بنا کر کچھ لوگوں نے نرسٹ کو یہ خبر پہنچا دی ہو کہ استی کو جان سے مار دیا گیا ہے۔ جب دو فریقوں کے درمیان کشیدگی عروج پر ہو تو اس قسم کی افواہیں اکثر دھماکا خیز ثابت ہوتی ہیں۔

اپنے قریب غزالہ کے قدموں کی چاپ سن کر میں چونک گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور میرا بازو روشنی کی طرف کر کے بغور دیکھنے لگی۔ اس بازو پر استی نے دو درجنوں جگہ کاٹا تھا۔ کہیں صرف دانتوں کے نشان تھے' کہیں خون رس رہا تھا اور کہیں سے کھال ہی اتر گئی تھی۔ غزالہ نے اپنے شولڈر بیگ میں سے اسپرٹ نکالا اور بڑی نرمی و محبت سے میرے بازو کو صاف کیا۔ اس ویرانے میں وہ بس یہی کر سکتی تھی۔

غزالہ کے قرب کی خوشبو میرے جسم و جاں کو معطر کرنے لگی۔ وہ جب قریب آتی تھی تو ایسا ہی کچھ ہوتا تھا۔ جن دنوں ہم ماریا نرسٹ میں مقیم تھے' ایک ہوشربا رات کو میرے اور غزالہ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی فاصلہ رکھیں گے۔ دلوں میں موجود محبت اور ایک دوجے کو پانے کی خواہش اپنی جگہ رہے گی اور دوری اپنی جگہ۔ اپنے جذبے کی صداقت پر کامل یقین رکھتے ہوئے کسی اچھے وقت کا انتظار کیا جائے گا۔

غزالہ سے کہہ کر میں نے زریں گل کے پیٹ پر بھی اسپرٹ لگوایا۔ یہاں بھی استی نے کاٹا تھا۔ زریں پیٹ پر دوا لگوانے سے شرما رہا تھا مگر پھر اسے اس مقولے پر عمل کرنا پڑا کہ وکیل اور ڈاکٹر سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ اس طرح کا ایک دوسرا مقولہ بھی میں نے زریں کو یاد دلایا کہ دائی سے پیٹ کہاں تک چھپایا جا سکتا ہے۔

نیند ہم سب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ہم دم بخود چڑیوں کی طرح کھوہ کے اس گھونسلے میں دبکے بیٹھے تھے۔ آنکھوں میں ان خون ریز مناظر کا تصور تھا جو ہم نے سر شام موگاسا میں دیکھے تھے اور کانوں میں بدقسمت لارسیوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ یہ کلثوم تھی۔ یوں تو وہ قبائلی لڑکی تھی۔ بڑی سخت جان اور حوصلے والی تھی' مگر وہ جس مخصوص دور سے گزر رہی تھی اس میں عورتوں کا مزاج غیر معمولی طور پر حساس ہو جاتا ہے اور دل نرم پڑ جاتا ہے۔ کلثوم کو امید سے ہوئے اب پانچ چھ مہینے ہو چلے تھے' کبھی کبھی اس کی طبیعت بھی ناساز ہو جاتی تھی۔ گزر جانے والی شام کو اس کی آنکھوں نے موگاسا میں جو خون ریزی اور درندگی دیکھی تھی اس نے اس کے دل پر اثر کیا تھا اور وہ اس نامہرباں شب کے سناٹے میں رونے لگی تھی۔ غزالہ اس کے پاس جا بیٹھی' اس کا سر گود میں لے لیا اور اسے دلاسا دینے لگی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ تابی کو تھپکتی جا رہی تھی۔

بوڑھا داماں پروفیسر کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ کلثوم کے رونے سے داماں کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "کنگ نے بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم یہ بات تو جانتے تھے کہ نرسٹ والے بڑے لوگ ہیں مگر کتنے بڑے ہیں اس کی خبر آج ہی ہوئی ہے۔"

داماں کے دو ساتھی بھی بستی میں ہی رہ گئے تھے' اس کے علاوہ وہ نوجوان لڑکی بھی نہیں نکل سکی تھی جو داماں نے صرف ایک دن پہلے نرسٹیوں سے بطور انعام حاصل کی تھی'

کچھ خبر نہیں تھی کہ ان تینوں کا انجام کیا ہوا تھا۔ بہرحال داماں کو ان تینوں کے انجام سے زیادہ سائیں عالی کی فکر تھی۔ وہ پچھلے دو گھنٹے میں مجھ سے دس پندرہ مرتبہ سائیں عالی کے بارے میں پوچھ چکا تھا' میں خود بے خبر تھا اسے کیا بتاتا' بہر طور اتنی تسلی میں نے داماں کو دی تھی کہ اسے سائیں عالی کے متعلق فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور جو خطرات ہمارے لیے بے حد گمبھیر ہوتے ہیں وہ سائیں صاحب کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

داماں نے ایک طویل آہ کھینچی اور بولا "کاش میں بستی چھوڑنے سے پہلے ایک مرتبہ سائیں صاحب کو دیکھ سکتا۔ ان کے قدموں کو بوسہ دے سکتا۔"

اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ نہ صرف سائیں کو دیکھ چکا ہے بلکہ کھنڈر سے موگاسا تک سائیں کے ساتھ سفر بھی کر چکا ہے۔

میں نے داماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا "تم گھبراؤ نہیں۔ مجھے یقین ہے بہت جلد سائیں صاحب سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ وہ اچانک ہی کسی طرف سے نمودار ہوجایا کرتے ہیں۔"

داماں آنکھوں میں آنسو بھر کر سجدے میں گر گیا اور اس نے سجدے میں گرے گرے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کردیے۔ یہ مقامی لوگوں کا مخصوص دعائیہ انداز تھا۔ وہ گڑگڑا کر بولا "اے دیوتاؤں کے دیوتا! ہم مظلوموں پر رحم کر۔ تو نے اپنا خاص بندہ ہماری طرف بھیجا ہے۔ اس بندے کو اتنی طاقت بخش کہ وہ ظالموں کا پنجہ موڑ سکے۔ اس بندے کو اپنی حفاظت اور امان میں رکھ اور ہم سب کو اتنی عقل عطا فرما کہ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔"

داماں کی دعا طویل تھی۔ دعا کے دوران میں وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اس نے یہ دعا مقامی زبان میں نہیں انگریزی میں مانگی تھی۔ غالباً اس طرح وہ ہمیں بھی ذہنی طور پر اس دعا میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ داماں کی انگریزی حیرت انگیز طور پر صاف اور شستہ تھی۔ اشوکا کی ناگہانی موت کا غم داماں کی موجودگی سے قدرے ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اشوکا کی جدائی کا دکھ اپنی جگہ تھا تاہم اتنی تسلی ضرور تھی کہ بوقت ضرورت داماں بھی ہمارے لیے ترجمانی کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے داماں نے جو دعا مانگی تھی وہ بڑی رقت آمیز تھی اور میرے خیال میں یہ صرف داماں کے دل کی آواز نہیں تھی یہ اس علاقے میں بسنے والے ہر اس سادہ لوح غریب کی آواز تھی جو ٹرسٹ اور پولیس کی چیرہ دستیوں کا شکار تھا' یا لارسی اور حاکمیت کی لعنت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ میں اس دعا سے پوری طرح اتفاق تو نہیں کرتا تھا پھر بھی اس دعا نے دل پر اثر کیا تھا۔

وہ رات ہم سب نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں کھوہ کے اندر بیٹھے ہم سب کسی داستان کے کردار نظر آتے تھے۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا اور کھانے پینے کی حاجت بھی نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہمارے اندر حلق تک بارود کا دھواں اور جلے ہوئے گوشت کی بو بھری ہے۔

موگاسا سے میلوں دور نکل آنے کے باوجود ہم ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھے۔ میں نے غزالہ' شائستہ' زریں اور کلثوم کو وہ تمام حالات بتائے جن سے ہم ٹرسٹ سے روانہ ہونے کے بعد گزرے تھے۔ صندور کے ساتھ ویرا کے طوفانی عشق اور شادی کے واقعات سب کے لیے انکشاف انگیز ثابت ہوئے۔ ویرا کی اچانک گمشدگی اور صندور کی حالت زار کے تذکرے نے سب کو اداس کردیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تفصیل سے بتایا کہ سائیں عالی مالے کے قریبی کھنڈرات میں کیا سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔ یہ جان کر سب حیران ہوئے کہ سائیں نے ان ویران کھنڈرات کے اوپر ایک جدید اور خوب صورت بستی کی بنیاد رکھی ہے' اس خوب صورت و جدید بستی میں سائیں عالی گلے میں لاکھوں ڈالر کے ہار ڈالے بڑی شان سے گھومتا ہے اور گوریوں کے جھرمٹ اس کے ارد گرد موجود رہتے ہیں۔

زریں نے ٹرسٹ کے واقعات بتاتے ہوئے کہا "ہم سب وہاں آرام سے رہا ہے۔ بس ایک دکھ تھا کہ آپ وہاں نہیں تھے۔ بغاوت کے بعد ٹرسٹ کے اندر نگرانی بڑا سخت کردیا گیا تھا پھر بھی ہم لوگوں کو گھومنے پھرنے کا آزادی تھا مگر جب کنگ کا بچو گڑا' سنی آپ لوگوں کے ہاتھ اغوا ہوا تو ادھر ٹرسٹ میں کھلبلی مچا۔ یوں لگتا تھا کہ ٹرسٹ میں کرفیو لگ گیا ہے۔ خوب پکڑ دھکڑ ہوا۔"

شائستہ نے تائید کرتے ہوئے کہا "پہلے تو ہمیں پتا نہیں چلا کہ اتنی سختی کیوں کردی گئی ہے پھر یہ خبر نکل گئی کہ ماسٹر کو کچھ لوگ جنگل سے پکڑ کر لے گئے ہیں اور انہوں نے اس کی رہائی کے لیے مطالبے پیش کیے ہیں۔ ٹرسٹ میں عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اس میں باغی گروپ کا ہاتھ ہے پھر معلوم ہوا کہ صحرائی درویش سائیں عالی کے دو باغی مریدوں نے یہ

کارروائی کی ہے۔ بہرحال ماسٹر کے سلسلے میں جن محافظوں نے بے پروائی برتی تھی انہیں کڑی سزائیں دی گئیں اور کئی ایک کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

اچانک ایک بار پھر ایک منحوس آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ جنگلی کتوں کی آواز تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی یہ آواز دو اطراف سے بلند ہو رہی تھی اور تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔

"اوہ خدایا۔ یہ مصیبت ہمارا پیچھا کب چھوڑے گی؟"

پروفیسر بڑبڑایا۔ اس نے شائستہ کو بے اختیار اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔

میں نے ہونٹوں سے "شی" کی طویل آواز نکال کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ احتیاطاً ٹارچ بھی بجھا دی گئی۔ سب مضطرب نظر آرہے تھے تاہم میرا اور پروفیسر کا اضطراب سب سے بڑھ کر تھا' ہم ابھی چند دن پہلے ہی اس جنگلی آفت سے نبرد آزما ہو چکے تھے۔ پروفیسر کی گردن پر ابھی تک ایک موٹی سفید پٹی بندھی تھی۔ یہ جنگلی کتوں کے ساتھ اس ہولناک معرکے کی نشانی تھی جو بارش زدہ جنگل میں پرسوں رات ہوا تھا۔

کتوں کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ پروفیسر نے دانت پیستے ہوئے اپنی جدید رائفل کو کاک کرلیا۔ میں اور زریں بھی رائفلوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک سنسنی سی فضا میں دوڑ گئی تھی۔ غزالہ مجھ سے لگی بیٹھی تھی' اس کا ایک ہاتھ بے اختیار میرے شانے پر آگیا تھا' ان سنگین لمحات میں بھی غزالہ کے ہاتھ کا لمس اور اس کا یوں مجھ سے لگ کر بیٹھنا مجھے اچھا لگا۔ شاید یہ مرد کی فطرت میں شامل ہے۔ خطرے کے وقت اس کو اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے اور وہ عورت کو تحفظ دے کر ایک طرح کا تفخر و انبساط محسوس کرتا ہے۔ اگلا ایک منٹ ہم سب نے شدید اضطراب میں گزارا۔ کتوں کے غول ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ان کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئیں اور پھر جنگل کی وسعتوں میں بکھر گئیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہوا کا رخ ہمارے کام آیا ہے۔" پروفیسر نے خیال ظاہر کیا۔

"یہی بات ہے۔" میں نے تائید کی۔

داماں نے کہا "ہمیں اپنے زخموں کو بالکل ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ ان کتوں کی تھوتھنیاں لہو کی بو بہت فاصلے سے سونگھ لیتی ہیں۔"

پھر اچانک راماں کو کوئی خیال آیا اور وہ چونک پڑا۔ اس نے کھوہ میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ جو سیاہ فام لارسی لڑکی اتفاقاً ہی موگاسا سے ہمارے ساتھ یہاں پہنچ گئی تھی وہ کھوہ کے ایک گوشے میں بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ وہ ایک چھریرے بدن کی اور قدرے لمبی لڑکی تھی۔ اس نے مقامی رواج کے مطابق چہرے پر بہت سا رنگ و روغن تھوپا ہوا تھا۔ ہونٹوں کا رنگ نیلا تھا' آنکھوں کے گرد سبز حلقے تھے۔ پیشانی پر سرخ دھاریاں تھیں۔ اس کے گلے میں ایک طویل مالا تھی۔ یہ انسانی دانتوں سے بنائی گئی تھی۔

داماں نے لڑکی کے گلے کی مالا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میرے اندازے کے مطابق یہ لارسی لڑکی عاملہ ہے۔ موگاسا میں ایسی درجنوں لڑکیاں موجود تھیں۔ کم از کم دو تین درجن تو ضرور ہوں گی۔ یہ لڑکیاں حیرت انگیز خفیہ صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یوں تو اکثر لارسی نحرکار ہوتے ہیں مگر یہ لڑکیاں خاص طور پر خفیہ علوم جانتی ہیں۔ مم۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی بھی ان مشکل حالات میں ہمارے لیے کار آمد ثابت ہوسکتی ہے۔"

راماں اٹھ کر لڑکی کے قریب چلا گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ لڑکی پہلے تو خاموش رہی پھر اس نے بھاری بھرکم آواز میں راماں کی باتوں کا جواب دیا۔ لڑکی کی آواز سن کر میں ٹھٹک گیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں پہلی بار غور سے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور اسے پہچان لیا۔ رنگ و روغن کے پیچھے ایک شناسا چہرہ تھا۔ یہ موتابہ تھی۔ اسی دراز قد عامل موتابہ نے موبائل کلینک میں جوری کی 'وجودگی' کا انکشاف کیا تھا اور پھر اسی کی پیش گوئی کے نتیجے میں میں ویرا کے بارے میں جاننے کے لیے سائیں عالی کے پاس پہنچا تھا۔

میں نے راماں کے ذریعے موتابہ سے چند باتیں کیں۔ وہ کم آمیز اور گم صم تھی۔ میرا اس پر ایک احسان تھا کہ میں نے اسے ایک موقع پر جسم فروشی سے بچایا تھا۔ غالباً اسی احسان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مجھ سے خندہ پیشانی سے باتیں کیں۔ موگاسا میں ہونے والی خون ریزی پر وہ بھی بہت رنجور نظر آتی تھی۔ شاید اسی دکھ کا بوجھ تھا کہ اس کی سرخ آنکھیں کچھ اور بھی سرخ دکھائی دینے لگی تھیں۔ بہرحال موتابہ کی ہمارے ساتھ موجودگی ہم سب کے لیے انکشاف ثابت ہوئی۔

وہ رات کٹ گئی اور اگلے دن کا آگ برساتا سورج طلوع ہوگیا۔ یہ کھوہ جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے ہوئے ایک نیلے

میں واقع تھی' پھر بھی سورج کی حدت کھوہ کے اندر تک پہنچی تھی۔ زریں گل نے صبح سویرے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس نے جیپ میں سے ایک خالی کین تلاش کیا تھا اور گھنے درختوں میں ڈیڑھ دو میل کا سفر کرکے ایک بارشی گڑھے تک پہنچ گیا تھا۔ ۲-۳ گھنٹے پہلے ہونے والی بارش کا پانی (جسے تازہ ہی کہنا چاہیے) گڑھے میں موجود تھا' وہ کین بھر کر لے آیا تھا اور اب خوراک یعنی شکار کی تلاش میں جانا چاہتا تھا' میں نے اسے پیار سے ڈانٹ کر منع کردیا کہ اتنی تیز رفتاری مناسب نہیں تھی۔

استی کو باندھ دیا گیا کیونکہ وہ ایک بار پھر مستی دکھا رہا تھا۔ صفدر کی حالت قدرے بہتر ہوئی تھی۔ غزالہ پوری جاں فشانی سے اس کی دیکھ بھال کررہی تھی اور اس نے صفدر کی صحت کے حوالے سے میری پریشانی تقریباً ختم کرکے رکھ دی تھی۔ بہرحال صفدر کی ذہنی حالت جوں کی توں تھی۔ وہ غنودگی میں بار بار ویرا کا نام پکارتا تھا۔ اس نے بے ہوشی ہی کے کسی درجے میں شاید تصور کرلیا تھا کہ ویرا اس کے آس پاس موجود ہے۔ وہ ویرا سے پانی مانگتا تھا۔ ویرا کو بتاتا تھا کہ اسے پیشاب کی حاجت محسوس ہورہی ہے۔ اس نے ایک دو بار غزالہ کا ہاتھ تھاما اور اسے دیر تک تھامے رکھا۔ شاید وہ اس ہاتھ کو بھی ویرا کا ہاتھ سمجھ رہا تھا۔ دوپہر کے بعد صفدر نے چند بار آنکھیں بھی کھولیں۔ وہ ہر شے کو دھندلائی ہوئی نظر سے دیکھتا تھا۔ غزالہ اس کے بالکل سامنے تھی' وہ اس کا چہرہ تکتا رہا مگر اس کی آنکھوں میں شناسائی کا تاثر نہیں ابھرا۔

غزالہ نے مجھ سے پریشان لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! مجھے لگتا ہے کہ صفدر کی بینائی پر بھی تھوڑا بہت اثر پڑا ہے۔ کئی زہر ایسے ہوتے ہیں کہ وہ براہ راست بصارت پر اثر کرتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب زہریلے کانٹوں سے ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال یہی ہے۔ وہ کانٹے کئی پہر تک صفدر کے جسم میں رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ ہمیں دیکھ نہیں رہا؟"

"نہیں۔ خدانخواستہ ایسی بات بھی نہیں۔ بس نظر متاثر ہوئی ہے۔ جوں جوں جسم سے زہر کا اثر زائل ہوگا' بینائی بھی بہتر ہوجائے گی۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے اسے بات مکمل کرنے کو کہا تو وہ گہری سانس لے کر بولی "ڈاکٹر کی حیثیت سے میں دیکھ رہی ہوں کہ صفدر کو جسمانی علاج کے علاوہ ذہنی سکون کی بھی ضرورت ہے۔ وہ ویرا نامی

اس لڑکی کی کمی غیر معمولی شدت سے محسوس کررہا ہے۔"

زریں بھی پاس کھڑا تھا۔ گلوگیر آواز میں بولا "ام سے صپدر کا حالت دیکھا نہیں جاتا جناب! آپ اس لڑکی کو ڈھونڈیں ورنہ ام کو روانہ فرمائیں۔ ام اس کے پاؤں پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لائے گا۔"

"وہ ملے تو تب ہے ناں؟"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی ملتا ہے جناب! اور خود آپ کو پتا ہی ہے کہ ام جس کے پیچھے پڑجاتا ہے اس کو ڈھونڈ کر چھوڑتا ہے۔ ام نے پہلے پیل لاہور جاکر لالہ سد ھیر لوری صاحب کو بھی ایسے ہی ڈھونڈا تھا۔ ایک مرتبہ۔۔۔"

زریں مزید تفصیل بتاتے بتاتے چپ ہوگیا۔ شاید اسے صورت حال کے بوجھل پن کا احساس ہوگیا تھا۔

وہ سارا دن کسی اہم واقعے کے بغیر گزر گیا۔ کھوہ کے اندر ہماری پیاس تو بجھتی رہی لیکن پیٹ پوجا کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا۔ شام سے تھوڑی دیر بعد زریں گل کھوہ کے باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا۔ اس نے بتایا "ام نے ایک گھڑسوار کو دیکھا ہے' وہ اماری ہی طرف آرہا ہے۔"

"اکیلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ام کو تو اکیلا ہی نظر آیا ہے۔"

میں رائفل تھام کر زریں گل کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گھڑسوار ہماری پناہ گاہ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہماری موجودگی سے قطعی بے خبر ہے۔ میں نے اس کے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ دور تک کسی حرکت یا روشنی کے آثار نظر نہیں آئے۔ میں دوڑ کر چند قدم آگے گیا اور پکار کر کہا "رک جاؤ۔" رائفل کا رخ گھڑسوار کی جانب تھا۔

میری آواز سے گھڑسوار ٹھٹک کر رکا۔ اس کا ہاتھ اپنے کندھے کی طرف بڑھا تھا جہاں تیر کمان لٹک رہا تھا مگر جب اس نے میرا دھمکی آمیز انداز دیکھا تو کندھے کی طرف اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ میں اور زریں دوڑ کر آگے گئے اور اجنبی کو گھوڑے سے نیچے اتار لیا۔ وہ خاصا تنومند لارسی تھا۔ جسم موٹا نہیں تھا مگر چوڑا اور مضبوط تھا۔ عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے گھوڑے کی پشت پر ایک زخم تھا جس پر مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔ گھوڑے کی دونوں جانب دو خرجینیں (تھیلیاں) لٹکی ہوئی تھیں۔ ہم نے ان تھیلیوں کو دیکھا۔ ان میں تھوڑا بہت خشک راشن بھی موجود تھا۔

ہمیں دیکھنے اور اچھی طرح پہچاننے کے بعد لارسی کا رویہ دوستانہ ہوگیا تھا۔ یقیناً وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں لارسی کو

گھوڑے سمیت کھوہ میں لے آیا۔ گھوڑے کو کھوہ کے دہانے پر جھاڑیوں میں باندھ دیا گیا۔ لارسی نوجوان کے چہرے پر چوٹوں کے نیلگوں نشان تھے۔ کلائی پر ایک زخم بھی تھا۔ یقیناً کل شام موگاسا میں ہونے والی زوردار لڑائی کی نشانیاں تھیں۔ گھوڑے کی پشت کا زخم کسی دستی بم کے ٹکڑے سے آیا تھا۔

واماں کے ذریعے اس موبل نامی نوجوان سے جو بات چیت ہوئی وہ خاصی انکشاف انگیز اور معلومات افزا تھی۔ موبل نے بتایا کہ کل شام کی لڑائی میں بستی کے کم و بیش چار سو افراد ہلاک ہوئے ہیں اور ان میں تین ساڑھے تین سو کے قریب مرد ہیں۔ شاید اس سے بھی زیادہ تباہی ہوتی مگر ایمونیشن کم ہونے کی وجہ سے لارسیوں نے شدید مزاحمت نہیں کی اور جب انہوں نے دیکھا کہ گارڈز حاوی ہوگئے ہیں تو وہ بستی سے پسپا ہو کر گھنے جنگل میں منتشر ہوگئے۔ عورتوں اور بچوں کو پکڑنے کے لیے جو ٹرک گھنے جنگل میں گھسے انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور اکثر مقامات پر انہیں جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔

میں نے موبل نامی اس نوجوان سے پوچھا "تم اب تک کہاں تھے؟"

وہ بولا "میں بستی کے اناج گودام میں چھپا ہوا تھا۔ بوبو دیوتا نے مجھے گارڈز کی نظروں سے بچائے رکھا۔ آج دوپہر مجھے گودام سے نکلنے اور بھاگنے کا موقع مل گیا۔"

"کسی نے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا؟"

"نہیں۔۔۔ اگر کوئی پیچھا کرتا تو میں یقیناً پکڑا جاتا کیونکہ میرا گھوڑا زخمی تھا اور زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔"

"دوپہر تک بستی کے حالات کیا تھے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ٹرسٹ کے گارڈز نے بستی کے دو تہائی جھونپڑے راکھ کردیے ہیں یا ان پر لوہے کی مشینیں (بلڈوزرز) چڑھا کر انہیں ملیامیٹ کردیا ہے۔ بستی کے بوما کو بھی نذر آتش کردیا گیا ہے۔ بوما کے باقی ماندہ حصوں میں شرابی گارڈز رات بھر لارسی لڑکیوں کی آبروریزی کرتے رہے ہیں۔ میں جس اناج گودام میں چھپا ہوا تھا اس کے باہر بھی چند گارڈز اور پولیس والے موجود تھے۔ وہ لارسی عورتوں سے کھانا پکوا کر کھاتے رہے' بعد میں ان میں سے کئی نوجوان لڑکیوں کو زبردستی جیپوں کے اندر لے جایا گیا لیکن اب صبح سے حالات کچھ بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" پروفیسر نے پوچھا۔

موبل نے واماں کے ذریعے بتایا "صبح سے گارڈز کچھ نرم پڑگئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے واپس چلے گئے ہیں' جو تھوڑے بہت بستی میں رہ گئے ہیں انہوں نے بھی توڑ پھوڑ والے کام بند کردیے ہیں۔ صبح سویرے میں نے دیکھا تھا کہ کچھ گارڈز اور پولیس والے مل کر بوما کے باقی ماندہ حصے کو آگ سے بچانے کی کوشش کررہے تھے۔"

"اور کیا دیکھا تم نے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ جنگل میں بھاگ جانے والے لوگوں کا پیچھا بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوپہر کو جب میں اناج گودام سے بھاگ کر بستی سے نکلا تو میں نے کچھ عورتوں اور بچوں کو واپس جھونپڑوں میں آتے دیکھا۔ یقینی بات ہے کہ یہ لوگ گارڈز کی مرضی سے ہی آئے ہوں گے۔"

"اس کے علاوہ کوئی بات؟" میں نے پوچھا۔

موبل نے کہا "رات کو میں نے چند شرابی گارڈز کو گودام کی دیوار کے قریب بیٹھ کر باتیں کرتے سنا تھا۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ ٹرسٹ کا بادشاہ کنگ براؤن رات کو حملے کے فوراً بعد بیمار ہوگیا ہے۔ اسے ٹرسٹ کی علاج گاہ میں داخل کیا گیا ہے اور ماہر ڈاکٹر اس کا علاج کررہے ہیں۔ اس کے سینے میں بڑا زبردست قسم کا درد ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔"

پچھ اسی قسم کی اطلاع اس سے پہلے وائرلیس پر راجر کی زبانی بھی ہمیں مل چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس خبر میں سچائی موجود ہے۔

واماں نے موبل سے پوچھا "تم کس راستے سے یہاں تک پہنچے ہو؟"

موبل اسے اپنے پیچیدہ روٹ کے بارے میں بتانے لگا پھر اس نے بتایا کہ اس سفر کے دوران میں صحرائی درویش (سامیں عالی) کے چند عقیدت مند قبائلیوں سے بھی اس کی ملاقات ہوئی ہے۔ یہ لوگ شمال میں ترائی کے جنگل سے آرہے تھے۔ ان تک صحرائی درویش کی شہرت پہنچی تھی اور وہ اس کی قدم بوسی کرنا چاہتے تھے۔ موبل نے ان لوگوں کو بتایا کہ ایک روز پہلے تک صحرائی درویش موگاسا میں موجود تھا مگر اب چونکہ موگاسا پر حملہ ہوا ہے اس لیے صحرائی درویش کا کچھ پتا نہیں۔ وہ بڑے جوشیلے قبائلی تھے۔ ان لوگوں نے موبل کے سامنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ صحرائی درویش کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہیں اور وہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ہی واپس جائیں گے۔

موبل نے جو کچھ بتایا تھا اس سے صورت حال کی ایک دھندلی سی تصویر ہمارے سامنے آگئی تھی۔ واقعات کی چند

کڑیاں خود بخود آپس میں مل رہی تھیں۔ یہ واقعات کچھ یوں تھے۔ کل رو سیر موگاسا میں نامعلوم شخص کی طرف سے ہونے والی فائرنگ کے بعد کنگ براؤن کو یہ روح فرسا خبر پہنچائی گئی کہ بین کی طرح اسٹی کو بھی موگاسا میں ہلاک کردیا گیا ہے اور اب موگاسا والوں کے پاس نرسٹ کو دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ وہ راکی گمشدگی اور بین کی موت کے بعد کنگ براؤن پہلے ہی غضب ناک تھا' اسٹی کی موت کی خبر نے اس کے رہے سہے حواس بھی چھین لیے۔ وہ بے پناہ غضب کے عالم میں اپنے وحشی گارڈز اور پولیس کے ساتھ موگاسا پر چڑھ دوڑا۔ اس نے موگاسا کو خاک و خون میں لوٹا دیا لیکن اس کو اسٹی ملا اور نہ اس کی لاش۔ شدید صدمے کے عالم میں کنگ براؤن کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال پہنچ گیا۔ اسی دوران میں وائرلیس پر میری بات کنگ کے دست راست راجر سے ہوئی اور میں نے اس بدبخت کو بتایا کہ اسٹی زندہ سلامت میرے پاس موجود ہے۔ اس اطلاع کے بعد راجر اور کنگ کے دیگر ساتھیوں کو اپنی شدید ترین غلطی کا احساس ہوا۔ یقیناً وہ بوکھلاہٹ میں سر پیٹ کر رہ گئے ہوں گے۔ موحل نے گارڈز اور پولیس کے رویے میں جس مثبت تبدیلی کی اطلاع دی تھی اس کی وجہ یقیناً وہی گفتگو تھی جو کل رات وائرلیس پر میرے اور راجر کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دم میرے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھے ہوا کے دوش پر پھر کچھ منحوس آوازیں سنائی دی تھیں۔ کل رات کی طرح جنگلی کتوں کا گروہ پھر اس جنگل میں موجود تھا۔ وہ اس قحط زدہ علاقے میں خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پروفیسر اور زریں وغیرہ نے بھی کتوں کی منحوس آوازیں سن لیں۔ سب نے خاموشی سادھ لی۔ کھوہ کے اندر جلتی ہوئی ٹارچ بجھا دی گئی لیکن موحل کے اس زخمی گھوڑے کا کیا کیا جاتا جو کھوہ سے باہر موجود تھا اور جس نے خطرہ محسوس کرکے ہنہنانا شروع کردیا تھا۔ آج ایک بات اور خطرناک تھی۔ ہوا کا رخ ہماری طرف سے کتوں کی جانب تھا۔ بہرحال ہم توقع کررہے تھے کہ اس مرتبہ بھی یہ آدم خور بلائیں چیختی چلاتی ہمارے قریب سے گزر جائیں گی۔

ہم دم سادھے بیٹھے رہے۔ وقت گزرتا رہا اور گزرنے والے ہر سیکنڈ کے ساتھ ہمارے لیے خطرہ بڑھتا رہا۔ آوازیں قریب تر آرہی تھیں۔ پروفیسر کا بازو ایک بار پھر ڈری سہمی شائستہ کے گرد حمائل ہوگیا تھا۔ وہ بھی کسی ننھی بچی کی طرح پروفیسر کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس بے چاری نے پچھلے چند ماہ میں بڑے دکھ دیکھے تھے۔ یہ لاجواب دکھ تھے۔ وہ ایک آدم خور کی بیوی بنی تھی۔ اس کے شیر خوار بچے کو اس کے آدم خور شوہر نے کھایا تھا' احتجاج پر اسے لوہے کی دیواروں میں زندہ چن دیا گیا تھا اور اس کے باپ کو اس کی موت کی خبر دے دی گئی تھی۔ اب اس کے آدم خور شوہر (مانٹکل) کی موت کے بعد اس کی کچھ زنجیریں ٹوٹی تھیں لیکن آزاد وہ اب بھی نہیں تھی۔ ایک پُرخطر جنگل میں کچھ اور طرح کے دکھ اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

بالکل اچانک ہی خوں خوار کتوں کے گروہ ہماری کھوہ کے اردگرد پہنچ گئے۔ ان کی ہوس ناک آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری موجودگی سے آگاہ ہوچکے ہیں۔ کھوہ سے باہر بندھے ہوئے گھوڑے کی ہنہناہٹ اب دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ غالباً وہ رسی تڑوانے کے لیے بری طرح اچھل کود بھی رہا تھا۔ اس کے زخم سے بہتے ہوئے خون کی خوشبو پلک جھپکتے میں کتوں کو اس کی طرف کھینچ لائی تھی۔ غزالہ کی ڈری ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "اب کیا ہوگا شاہ جہاں؟"

میں ان سنی کرتا ہوا دہانے کی طرف لپکا۔ ہم نے ایک بڑے پتھر کو دھکیل کر دہانے کے سامنے کیا۔ دہانہ اس پتھر سے بہت بڑا تھا۔ ایسے دو پتھر مزید ہوتے تو بھی دہانے کو مکمل طور پر ڈھانپا نہ جاسکتا۔ ہاں پتھر رکھنے سے تھوڑی سی اوٹ ضرور فراہم ہوگئی تھی۔ اس پتھر کی اوٹ سے میں نے طاقت ور ٹارچ کا روشن دائرہ جھاڑیوں میں پھینکا تو لرزہ خیز منظر دکھائی دیا۔ کوئی ایک درجن خوں خوار کتے بدقسمت گھوڑے سے چمٹے ہوئے تھے۔ کوئی پشت پر چڑھا تھا' کوئی دم سے لٹکا تھا' کوئی اس کے پیٹ سے آنتیں باہر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ گھوڑے کی آواز کربناک چیخوں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ میں نے اور زریں نے کتوں کی جانب اندھادھند فائرنگ کی۔ کتے منتشر ہوئے لیکن اس سے پہلے وہ گھوڑے کا کام تمام کرچکے تھے۔ اس کے اعضا پھڑپھڑا رہے تھے۔ پیٹ پھٹ گیا تھا اور گردن سے گوشت کے بہت سے لوتھڑے غائب تھے۔

کتوں کی ایک دوسری ٹولی کھوہ کے اندر ہماری بو سونگھ چکی تھی۔ یہ کتے کریہہ آوازوں میں چیخ چلا رہے تھے اور ہماری جانب کھسک رہے تھے۔ "کتے کے بچے!" زریں نے دانت پیس کر کہا اور ایک بار پھر سیون ایم ایم کا برسٹ کتوں کی طرف چلایا۔ "تڑ تڑ" کی لرزہ خیز آواز سے ایک بار پھر جنگل گونجا اور کتے وقتی طور پر جھاڑیوں کی طرف پسپا ہوگئے۔ یقیناً ایک دو کتے کام بھی آگئے تھے۔

تاریکی سے ابھرنے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور وہ ہر طرف سے کھوہ کو گھیر رہے ہیں۔ یہ کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی جو اس سے پہلے کمنڈر سے موگاسا کی طرف آتے ہوئے پیش آئی تھی۔ ہم نے اپنی رائفلوں سے نئے میگزین منسلک کیے اور اس سنگین چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوگئے مگر اس سے پہلے کہ فائرنگ شروع ہوتی یا کوئی اور واقعہ ہوتا' راماں میرے پاس آیا اس نے دراز قد موتابہ کی طرف اشارہ کیا اور بولا "یہ لاڈسی ساحرہ کہتی ہے کہ آپ ان جنگلی کتوں پر گولی وغیرہ مت چلائیں۔"

"اگر گولی نہیں چلائیں گے تو ایک دو منٹ کے اندر اندر وہ کھوہ میں گھس آئیں گے۔"

"وہ کہتی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ انہیں کھوہ میں نہیں آنے دے گی۔"

میں نے چونک کر موتابہ کی طرف دیکھا۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ پُراسرار نظر آرہا تھا۔ چہرے پر تھوپے گئے رنگ و روغن نے اسے کچھ اور بھی ناقابل فہم بنادیا تھا۔ وہ کھوہ کے عین وسط میں ایک قدرے کشادہ جگہ پر کھڑی ہوگئی۔ ایک تیر کی نوک سے اس نے کھوہ کے ناہموار فرش پر ایک پیچیدہ حصار کھینچا پھر اسی تیر کی نوک سے اس نے اپنی ایک ہتھیلی زخمی کی۔ ہتھیلی خون سے تربتر ہوگئی تو اس نے حصار کے اندر فرش پر تین جگہ پر اپنے ہاتھ کا نشان ثبت کردیا۔ اس کے بعد وہ آلتی پالتی مار کر اور آنکھیں بند کرکے بیٹھ گئی اور کسی نامعلوم عمل میں مصروف ہوگئی۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور جوان جسم پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔ گاہے گاہے وہ اپنے حلق سے کسی جنگلی جانور جیسی طویل اور بلند آواز بھی نکالتی تھی۔

کھوہ سے باہر کتوں کا شور انتہا کو پہنچ گیا تھا' ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ دو سو سے کم نہیں ہوگی۔ انہوں نے ہر سمت سے کھوہ کو گھیر لیا تھا اور گھیرا تنگ کررہے تھے۔ ہم نے اپنی رائفلیں بالکل تیار کر رکھی تھیں اور چوکس تھے۔ غزالہ نے حسب سابق ننھے نالی کو اپنی گود میں سمیٹ لیا تھا اور خود میرے کندھے سے پیوست ہوگئی تھی۔ ہر انسان اپنی صلاحیت کے لحاظ سے کبھی طاقت ور ہوتا ہے اور کبھی کمزور۔ کبھی رہنما ہوتا ہے اور کبھی رہنما کا متلاشی۔ کبھی استاد اور کبھی طالب علم۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب صفدر کی حالت خراب تھی اور غزالہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کی دیکھ بھال کررہی تھی تو وہ "کمانڈنگ پوزیشن" میں تھی اور میں اس کی ہدایات پر عمل کررہا تھا... مگر اب اس خطرے کے وقت بااختیار پوزیشن میری تھی اور غزالہ بدلتی ہوئی صورت حال میں ہر لمحہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ لڑکی کیا کررہی ہے؟" اس نے میرے کان میں سہمی ہوئی سرگوشی کی۔

"تم بھی دیکھ ہی رہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ یہ وقت ضائع کررہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کچھ کرپائے گی؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہاں آکر بہت کچھ ایسا دیکھا ہے کہ جس پر یقین کرنا آسان نہیں۔ میں نے چند دن پہلے اسی لڑکی کو نئی زندگی بخشنے کے لیے زمین میں زندہ دفن ہوتے دیکھا ہے۔"

کتوں کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں لیکن ایک بات میں نے نوٹ کی اور یقیناً میری طرح دوسروں نے بھی نوٹ کی ہوگی' یہ آوازیں ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں۔

موتابہ کا چہرہ پسینے سے تر ہوگیا تھا۔ پسینے کی اس فراوانی نے اس کے چہرے کے رنگ و روغن کو بگاڑنا شروع کردیا۔ آنکھوں کے اردگرد کا سبز رنگ ڈھلک کر رخساروں پر آگیا۔ رخساروں کا رنگ ہونٹوں کے نیلے رنگ میں گڈمڈ ہونے لگا۔ مدھم روشنی میں وہ بھیانک نظر آنے لگی' کسی لمحے تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور ہمارے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے' خاص طور سے جب وہ اپنے حلق سے عجیب وغریب آواز نکالتی تھی تو انسان نہیں لگتی تھی۔

پھر ایک سنسنی خیز صورت حال سامنے آئی۔ پے در پے آوازوں کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ جنگلی کتے کھوہ سے دور ہٹ رہے ہیں' ان کا شور بھی کم ہوتا جارہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کس وجہ سے ہورہا تھا مگر ہورہا تھا۔ ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی رونما ہوئی تھی جس کے سبب یہ خون آشام جانور منتشر ہورہے تھے۔ جنگلی جانوروں کا ردعمل اکثر سمجھ سے بالاتر ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو حیوانیات کے ماہر بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرسکتے۔ جانور کبھی بے وجہ مشتعل ہوتے ہیں اور کبھی بے وجہ اپنے شکار کو چھوڑ کر چل پڑتے ہیں۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی ناقابل فہم ردعمل تھا۔

پانچ دس منٹ کے اندر اندر کھوہ کے اردگرد سے کتوں کے غول چھٹ گئے۔ اب ان کی آوازیں دور افتادہ جنگل سے آرہی تھیں۔ کچھ دیر بعد موتابہ نے آنکھیں کھولیں اور بے دم سی ہوکر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بوڑھا راماں

بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ اسے پانی پلانے میں مصروف ہوگیا۔ میں اور پروفیسر بڑی احتیاط سے باہر نکلے رائفلیں ہمارے ہاتھ میں تھیں۔ کچھ دیر پہلے جن تاریک درختوں میں جنگلی کتوں کی چمکدار آنکھیں چنگاریوں کی طرح حرکت کررہی تھیں وہاں اب مکمل سکون تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی موتل کے گھوڑے کی طرف ڈالی۔ یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ گھوڑے کی جگہ اس کا پنجر پڑا ہے۔ بس کسی کسی جگہ ہی گوشت باقی رہ گیا تھا۔

پروفیسر نے کہا "تم نے ایک بات نوٹ کی۔ ہوا کا رخ بدل چکا ہے۔"

پروفیسر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ افریقی شکاری کتوں کا منتشر ہوجانا ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے ہو۔ ہم جائزہ لینے کے بعد کھوہ میں واپس آگئے۔

کچھ دیر تک کھوہ میں اس نئے ہنگامے پر بات ہوتی رہی۔ جنگلی کتوں کا خطرہ دوبارہ بھی پیش آسکتا تھا اور اس کے سدباب کی ضرورت تھی۔ سدباب یہی ہوسکتا تھا کہ دہانہ کسی طرح بند کردیا جائے۔ بہرحال فی الوقت تو سب کو پیٹ پوجا کی ضرورت تھی۔ کچھ بھی کھائے ہوئے اب ہمیں تیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ آنتوں میں جیسے بل سے پڑ رہے تھے۔ موتل کے گھوڑے کی تھیلیوں سے جو اشیاء برآمد ہوئی تھیں ان میں کچھ خشک راشن بھی موجود تھا۔ خشک گوشت' بھنے ہوئے چنے اور اونٹ کی چربی میں تلے ہوئے آلو وغیرہ۔ موتل نے خوش دلی سے یہ راشن استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ خود موتل کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا' شاید اسے گھوڑے کی دردناک موت کا دکھ بھی تھا۔

میں نے سب سے پہلے استی کو تلے ہوئے آلو کھانے کو دیئے تو زریں نے ناک بھوں چڑھائی "خواہ اس خنزیر کے بچے کو تو بھوکا مرنے دینا چاہیے۔"

"اوئے پاگل' ٹرسٹ میں تم بھی تو کھاتے پیتے ہی رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کنگ کو اور خود کو ایک ہی لائن میں کھڑا کر رہے ہیں؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ کنگ کے اس بچونگڑے کو قیدی کے حقوق تو حاصل ہونے ہی چاہئیں۔"

"قیدیوں کا جو حقوق ہم نے یہاں رکھا ہے شاید آپ نے بھی نہ دیکھا ہو۔" زریں تنک کر بولی "فرصت ملے گی تو آپ کو بتاؤں گا۔"

بحث ختم کرنے کے لیے غزالہ نے زریں کو آواز دی۔ اس نے آلوؤں کو مسل کر اور پیس کر ایک پیسٹ سا بنا لیا تھا اور صفدر کو کھلانے کی کوشش کررہی تھی۔ زریں نے صفدر کا منہ اونچا کرنے کے لیے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا' غزالہ بڑی محبت سے اسے کھلانے لگی۔ صفدر کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گاہے گاہے سخت بیزاری سے اپنا سر جھٹک دیتا تھا۔ بہرطور غزالہ نے کوشش ترک نہیں کی اور کچھ نہ کچھ صفدر کے حلق سے اتارنے میں کامیاب رہی۔ صفدر اب کسی حد تک اپنے حواس میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ویرا کو پکارنا اور اس کا نام لینا اب بند کردیا تھا۔ بس وہ گاہے گاہے اپنی ٹانگ کی پٹی کی طرف ہاتھ لے جاتا تھا اور کہتا تھا کہ اسے درد ہو رہا ہے۔

راجر سے بات کیے اب مجھے چودہ گھنٹے ہونے والے تھے۔ میں نے وائرلیس سیٹ بھی بند ہی رکھا ہوا تھا۔ اب میں ضرورت محسوس کررہا تھا کہ راجر یا کنگ برائن سے تھوڑا سا مکالمہ مزید کرلیا جائے اور ہوسکے تو کنگ کو استی کی آواز بھی سنا دی جائے۔ ان لوگوں کے چودہ طبق تو روشن ہو ہی چکے تھے' اب مزید طبق روشن کرنے کی ضرورت تھی۔ میں جانتا تھا کہ جب تک شیطان زادہ ہمارے پاس موجود ہے' ہم بڑے شیطان کو بندر کی طرح نچا سکتے ہیں۔ پروفیسر سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے وائرلیس سیٹ آن کیا اور ٹرسٹ سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ فریکوئنسی ایڈجسٹ کرنے والی ناب ہل گئی تھی۔ میں فریکوئنسی ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ لہروں کا شور کبھی سیٹ پر ابھر آتا' کبھی کم ہو جاتا' اچانک ایک نئی فریکوئنسی پر سائیں عالی کی آواز ابھری اور میرا ہاتھ جیسے ہزار وولٹ کے ننگے تار سے چھوگیا۔ مجھے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ سائیں عالی سے یوں اتفاقاً ملاقات ہوجائے گی۔ سائیں عالی اپنے ٹرانس میٹر پر کسی سے بات کررہا تھا۔ وہ بڑی روانی سے انگلش بول رہا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا "اگر تم کالی بن چھوٹی مکھی کا شہد ملا کر پیو گے تو پھر تمہیں کبھی بھی دماغی کمزوری نہیں ہوگی۔ یہ وہم اور پریشانیاں وغیرہ دراصل دماغی کمزوری ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ میرے بارے میں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دس پندرہ جنات ہروقت میری خدمت پر مامور رہتے ہیں اور سب سے بڑا جن میں نے گلے میں ڈالا ہوا ہے۔ یعنی دولت۔ یہ دولت ایک ایسا جن ہے جس کے چمٹنے کی تمنا ہر کوئی رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جن صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے جن کو یہ نہیں چمٹتا۔ بعض لوگوں....

اس جن کے بجائے اس جن کی خواہش چمٹ جاتی ہے۔ یہ لوگ بڑے خوار ہوتے ہیں اور زبردست گھاٹے میں رہتے ہیں۔" سائیں عالی حسب عادت بے تکان بول رہا تھا۔

دوسری طرف سے کسی نے امریکن لہجے میں کہا "پھر بھی سائیں صاحب' اگر کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتایئے۔ آپ کے مختصر نوٹس پر ہر شے مہیا کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی پولیس افسر کی طرف سے آپ کو تنگ کیا گیا ہے تو اس کا حشر بھی خراب کیا جاسکتا ہے۔"

یہ دوسری آواز لہروں کے شور میں دبی ہوئی تھی پھر بھی سنائی دیتی تھی اور پہچانی جاسکتی تھی' اس آواز نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا' یوں محسوس ہوا جیسے کھوپڑی کے اندر ایک دم سیکڑوں بلب روشن ہوگئے ہوں۔ میری سماعت دھوکا نہیں کھاسکتی تھی' یہ دوسری آواز امریکن ارب پتی مسٹر جی کلارک صاحب کی تھی۔

میں نے اپنے ہونٹ مائیک کے قریب کیے اور چیخ کر مداخلت کی "کلارک صاحب' ہیلو کلارک صاحب! میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔ ہیلو... میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ مسٹر جی کلارک اور سائیں عالی اپنی گفتگو میں مصروف رہے۔ یہ جان کر مجھے سخت مایوسی ہوئی کہ مواصلاتی خلل کی وجہ سے میری آواز ان تک پہنچ نہیں رہی تھی اور اگر پہنچ بھی رہی تھی تو ناقابل سماعت حد تک شور میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے فریکوئنسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو سائیں عالی اور مسٹر کلارک کی آوازیں بھی فیڈ آؤٹ ہونے لگیں۔ میں فریکوئنسی کی ناب کو دوبارہ پہلے والی پوزیشن پر لے آیا۔ مسٹر جی کلارک کہہ رہے تھے "اگر آپ کہیں تو میں وفاقی حکومت کے کسی بڑے افسر کو آپ کی طرف بھجوا دیتا ہوں۔"

"میں نے کہا ہے نا برادر! ابھی مدد کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو بتا دوں گا۔ تم نے پاؤنڈز اور ڈالروں کی شکل میں جو جن میری طرف بھیجا ہے وہ میری بڑی مدد کررہا ہے۔"

"آپ کھنڈر میں واپس کب پہنچے تھے؟" مسٹر کلارک کی شور میں دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آج دوپہر ہی آگیا تھا۔ سوئمنگ پول کے قریب ہی ایک زبردست باغیچہ بنوا رہا ہوں۔ آج اس باغیچے میں پہلا پودا میں نے مالے کھتی کے سب سے غریب جوڑے کے ہاتھوں سے لگوایا ہے۔ وہ اتنا خوش تھا کہ رو رہا تھا اور شاید تمہیں پتا نہیں باغیچوں کو اگر خوشی کے آنسوؤں کا پانی دیا جائے تو ریتلی زمین کے باوجود وہ بڑی تیزی سے پھلتے پھولتے ہیں۔ تم دیکھنا تھوڑے ہی دنوں میں یہ باغیچہ پھولوں سے مہک رہا ہوگا اور انگریز میموں اور مقامی مردوں کے مشترکہ بچے یہاں اٹکھیلیاں کررہے ہوں گے۔"

مسٹر کلارک کی مدھم آواز وائرلیس سیٹ پر ابھری "وہ پولیس افسر دوبارہ تو نہیں آیا؟"

"نہیں... اور جو یہاں موجود تھے وہ بھی بھاگ گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ ٹرسٹ والوں کو ایک دم عقل آنا شروع ہوگئی ہے۔"

"یہ سارا چکر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ گارڈز اور پولیس کا ایک دم ہلا بولنا اور پھر اچانک پیچھے ہٹ جانا۔"

"اس میں نیک جنات کا عمل دخل ہے۔ شاید یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آسکیں۔"

مسٹر کلارک نے کچھ کہا مگر شور کے سبب جملہ سمجھ میں نہیں آسکا۔ سائیں کی آواز بھی اب زیادہ صاف نہیں رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر مائیک سے منہ لگا کر اپنی آواز مسٹر کلارک یا سائیں عالی تک پہنچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ مسٹر کلارک کے دو تین جملوں میں سے چند الفاظ سنائی دیئے۔ ان الفاظ سے پتا چلا کہ وہ سائیں سے اس فائرنگ کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو خون ریز لڑائی سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی اور یہ دریافت کررہے ہیں کہ کیا اس فائرنگ میں استی کو واقعی گولی لگ گئی تھی۔

سائیں نے کہا "مجھے جنات نے بتایا ہے کہ استی کو کچھ نہیں ہوا اور وہ صحیح سالم شفیع محمد کے پاس موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں کھنڈر سے سارے گارڈز اور پولیس والے دُم دبا کر بھاگ گئے ہیں۔"

اچانک سائیں کی آواز بالکل مدھم ہوئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ میں فریکوئنسی کی ناب کو دائیں بائیں گھماتا رہا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

وائرلیس پر ہونے والی یہ ساری بات چیت پروفیسر کے علاوہ زریں اور دراماں وغیرہ بھی سنتے رہے تھے۔ تانی نے گرمی اور حبس سے بے چین ہوکر رونا شروع کردیا تھا۔ غزالہ اسے کندھے سے لگا کر ٹہلتی رہی تھی اور تھپکتی رہی تھی' اب وہ سوگیا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط اور نرمی سے اسے لٹا دیا۔ مختوم کھجور کے ایک چوڑے پتے سے تانی کو پنکھا جھلنے لگی۔ ماسٹر استی کے ہاتھ رسی سے بندھے ہوئے تھے اور وہ کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی زریں کو گھورنے لگتا تھا۔ بہرحال غنیمت

تھا کہ وہ گالیاں نہیں بک رہا تھا ورنہ خواتین کی موجودگی میں یقیناً ہمیں شرمندگی ہوتی۔ گالیوں کی روک تھام کا "کریڈٹ" یقیناً آنجہانی لارڈ ناب کو جاتا تھا۔ اس نے پچھلے دنوں میں کی بوکو کا بڑا مناسب استعمال کر کے اسقی کی دشنام طرازی اور "ننگا ہو کر دکھانے" کی عادتیں ترک کرا دی تھیں یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وقتی طور پر چھڑوا دی تھیں۔ پھر بھی اس سنپولیے کے اندر اتنا زہر تھا کہ آنکھوں سے چھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ گاہے گاہے بڑی نفرت کے ساتھ ہماری جانب تھوک دیتا تھا۔

غزالہ کے دل میں نجانے کیا آئی کہ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے اسقی کے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور اس سے کچھ پوچھا۔ غالباً پوچھا ہوگا کہ بھوک وغیرہ تو نہیں لگی۔ اچانک اسقی نے ٹانگ چلائی اور غزالہ کے پیٹ میں لگی۔ وہ دہری سی ہوگئی۔ اسقی زمین پر گر کر مشینی رفتار سے ہوا میں ٹانگیں چلانے لگا اور چیخ پکار کرنے لگا۔ وہ اتنی زور سے چیخ رہا تھا جیسے یہیں سے اپنی آواز براہ راست ٹرسٹ تک پہنچانا چاہتا ہے "چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو!" ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہا تھا۔

میں نے زریں کو اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے کھجور کی ایک چھڑی سے ماسٹر اسقی کی مناسب سی ٹھکائی کر دی۔ اس ٹھکائی سے خاطر خواہ فائدہ ہوا اور وہ خاموش ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ جس قدر سخت کھال کا تھا اتنا ہی ڈھیٹ بھی تھا۔ ہونٹوں میں بدستور بدبداتا رہا۔ یقیناً گالیاں ہی بک رہا تھا۔ میں نے غزالہ کو سمجھایا کہ اسقی کا مزاج کس ڈھنگ کا ہے.... اور درخواست کی کہ وہ آئندہ اس کے ساتھ اس طرح کی محبت جتانے کی کوشش نہ کرے۔ غزالہ نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری بات سے پوری طرح متفق نہیں۔

میں ایک بار پھر وائرلیس سیٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں چاہتا تھا کہ کنگ کلارک یا سائیں عالی میں سے کسی کے ساتھ میرا رابطہ ہو جائے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے وائرلیس سیٹ پر جو گفتگو سنی تھی وہ نہایت انکشاف انگیز تھی۔ خاص طور سے میرے لیے تو وہ بے حد اہم گفتگو تھی۔ میں پچھلے کئی ہفتوں سے اس الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ سائیں کے پاس اچانک اتنی دولت کہاں سے آگئی ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں سے بے دریغ لٹاتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر جی کلارک کا خیال بھی سیکڑوں مرتبہ میرے ذہن میں آچکا تھا کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ جو دفینہ انہوں نے ہماری امانت کے طور پر اپنے پاس سنبھال رکھا ہے وہ کہاں ہے، وغیرہ وغیرہ.... ان تمام گمبھیر سوالوں کے جواب مجھے اس گفتگو سے مل گئے تھے۔ سائیں کے ہاتھ میں اب جی مسٹر جی کلارک صاحب کی دولت تھی اور یہ دولت ایک ایسے سمندر کی طرح تھی جس کا دوسرا کنارہ کم از کم مجھے تو دکھائی نہیں دیا تھا۔ یہ دولت سائیں عالی کے ہاتھ میں کیوں تھی؟ سائیں عالی اور مسٹر کلارک اس دولت کے فراخدلانہ استعمال سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے؟ ان مقاصد کا ماریطانیہ کے اس خطے سے کیا تعلق تھا؟ یہ سارے سوال جواب طلب تھے۔ بہرطور کچھ نہ کچھ اندازہ مجھے ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی دوسری الجھن کا جواب بھی وضاحت سے مل رہا تھا۔ مسٹر جی کلارک بنفس نفیس یہیں ماریطانیہ میں موجود تھے۔ وہ ہماری پل پل کی خبر رکھے ہوئے تھے اور ٹرسٹ کے ساتھ ہماری جنگ میں انہوں نے ہمارے شانے کے ساتھ شانہ ملا رکھا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ماریطانیہ میں ابھی تک ان سے میرا براہ راست رابطہ نہیں ہوا تھا۔

مجھے وائرلیس سیٹ پر دوبارہ کوشش کرتے ہوئے چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ یکایک ایک بار پھر دبے ہوئے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کتوں کی آوازیں اس مرتبہ عین سامنے سے آرہی تھیں۔ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی یہ آوازیں دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہوگئیں۔ ہمارے ہاتھ ایک بار پھر رائفلوں کی طرف بڑھ گئے۔ بوڑھے داماں نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور کہا کہ ہم جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ وہ ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی دراز قد مرتا کے پاس پہنچ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ اپنے رنگ برنگ چہرے اور بکھرے بالوں کے ساتھ ہمیشہ سے زیادہ عجیب نظر آرہی تھی۔ داماں نے اس سے چند باتیں کیں۔ مونابہ نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور غیر ارادی طور پر آگے پیچھے جھول رہی تھی۔

دو تین منٹ بعد بوڑھا داماں واپس ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت تک کتوں کی آوازیں بالکل نزدیک سے آنے لگی تھیں۔ یہ آوازیں کچھ بدلی بدلی لگتی تھیں۔ داماں نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "یہ جنگلی کتے نہیں ہیں۔ یہ بوکیر کتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ لوگ بھی ہیں۔"

اس اطلاع سے ہماری پریشانی میں کوئی کمی واقع نہیں رہی ہوگی بلکہ شاید کچھ اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ یہ کتا بردار کون تھے؟

کیا ان کا تعلق گاروز سے تھا؟ کیا یہ مقامی تھے؟ اس طرح کے کئی سوال ہم سب کے ذہن میں اودھم مچانے لگے تھے۔ داماں کی اطلاع درست ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس مرتبہ کھوہ کو تین اطراف سے گھیرنے والے جنگلی کتے نہیں تھے۔ ان کی آوازوں کا آہنگ مختلف تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گئے تھے جیسے ان سب کی رسیاں کھینچ لی گئی ہوں۔ میں پروفیسر اور داماں محتاط انداز میں کھوہ کے دہانے تک پہنچے اور پھر باہر جھانکا۔ باہر کا منظر حیران کن تھا۔ تاریکی میں بیسیوں روشنیاں جل رہی تھیں اور ایک مدھم سا شور بھی سنائی دیتا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا یہ شور ناقابل فہم تھا۔

داماں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "جناب! میرا خیال ہے کہ یہ جوذم قوم کے لوگ ہیں۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو پھر۔۔۔ ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

"جوذم۔" میں نے زیر لب دہرایا اور پروفیسر کی طرف دیکھا۔

جوذم کا لفظ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ موگا سا بستی میں جب موناب کو پجاری کی طرف سے پندرہ بھیڑیں قربان کرنے کی سزا سنائی گئی تھی تو موناب نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے اور کہا تھا کہ وہ اتنی مالی استطاعت نہیں رکھتی۔ اس کا حل پجاریوں نے یہ نکالا تھا کہ موناب اپنا جسم ایک مرد کو فروخت کرے اور معاوضے میں اسے جو رقم ملے وہ اس سے کفارہ ادا کرے۔ پجاریوں نے جس مرد کا ذکر کیا تھا وہ جوذم تھا اور موناب کو اس "پیشکش" کا مناسب معاوضہ دے سکتا تھا۔ بہرحال موناب نے یہ تجویز قبول نہیں کی تھی۔ بعد ازاں مجھے جوذم افراد کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ جوذم مرد اگر کسی عورت کو بیوی بناتے ہیں یا جسمانی تعلق قائم کرتے ہیں تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جوذم مردوں کا جوذم عورتوں کے ساتھ رہنا ہی محفوظ تصور کیا جاتا ہے لیکن جوذم لڑکیاں کچھ فرسودہ رسموں کے سبب اکثر بچپن میں ہی مر جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک لمحے کے اندر کئی خیال ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ اسی دوران میں ہمارے اردگرد موجود روشنیوں میں سے چند روشنیوں نے حرکت کی اور دھیرے دھیرے ہماری طرف بڑھنے لگیں۔

میں نے زریں گل سے کہا "وائرلیس کہیں چھپا دو۔۔۔ جلدی کرو۔"

زریں گل اندر کی طرف دوڑا۔ نوجوان لاری موئل بھی ہمارے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چیتے کی سی چمک تھی اور سینہ دیوار نظر آتا تھا۔ پروفیسر کے علاوہ داماں کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی اور وہ سب پیش آمدہ خطرے کا سامنا کرنے کو تیار تھے۔ چار پانچ منٹ کے اندر آنے والے ہمارے سامنے پہنچ گئے۔ یہ کل پانچ افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ وہ لمبے تڑنگے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے۔ بالائی دھڑ ننگے تھے۔ زیریں جسم پر ایک نیکر نما لباس تھا جو گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا۔ ان میں سے ایک شخص زیادہ چوڑے چکلے جسم کا مالک تھا اور یقیناً یہی اس ٹولی کا لیڈر تھا۔ اس کے پہلو میں ایک کتا اپنی لمبی زبان نکالے کھڑا تھا۔ یہ گرے ہاؤنڈ تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں دیکھ کر بھی مشعل برداروں کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے روایتی ہتھیاروں پر اور اپنی تعداد پر پورا بھروسا ہے۔

لمبا تڑنگا شخص جس کے سیاہ چہرے پر دھاریاں سی بنی ہوئی تھیں، آگے آیا اور تیز تیز لہجے میں کچھ بولنے لگا۔ اس کی آواز بارعب تو تھی مگر کرخت نہیں تھی۔ میں نے بوڑھے داماں کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مشعل بردار سے کچھ باتیں کیں۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوا کہ مشعل برداروں سے ہم کلام ہونے میں داماں کو بھی کچھ دشواری پیش آ رہی ہے۔ غالباً علاقے کی نسبت سے زبان میں جو تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے وہ آڑے آ رہا تھا۔ وہ چار منٹ کی گفتگو کے بعد داماں میری طرف واپس آ گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

"ہاں کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا اندیشہ درست ہے جناب۔۔۔ یہ جوذم ہی ہیں۔ یہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ان کے علاقے کی حدود میں داخل ہوئے ہیں حالانکہ یہ بالکل بکواس کر رہے ہیں۔ میں اس جنگل کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ جوذم کا علاقہ یہاں سے بیس تیس میل کے فاصلے سے شروع ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ قانون نہیں ہے کہ اگر کوئی مسافر بھٹک کر کسی دوسرے قبیلے کی حدود میں داخل ہو جائے تو اسے پکڑ لیا جائے بلکہ اس مسافر کی وجہ سے کسی مویشی، انسان یا درخت کو نقصان بھی نہ پہنچا ہو۔"

"تم نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی ہے جناب لیکن جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہے۔ یہ بڑے بدبخت لوگ ہیں جناب۔ یہ لوگ۔۔۔" داماں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو؟" پروفیسر نے داماں کو ٹہوکا دیا۔

داماں تھوک نگل کر بولا "یہ جوذم لوگ عورت کے جسم کی خوشبو بڑی دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ ہمارے ساتھ عورتیں ہیں۔ ان کی نیت ٹھیک رہ ہی نہیں سکتی۔ ہم کچھ بھی کہیں، یہ ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر ہی رہیں گے۔"

"تمہارا کیا مشورہ ہے۔ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

داماں لرزائی آواز میں بولا "آپ عالی جناب صحرائی درویش کے پیروکار ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہمارا تو یہ ایمان بن گیا ہے کہ صحرائی درویش جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس بے پناہ دنیاوی اور روحانی طاقت ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں جناب؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس صورت حال میں شاید ہمیں اپنے بل بوتے پر ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"اگر ہم ان کے گھیرے سے نکلنا چاہیں تو کیا ہماری رائفلیں اور ہمارا ایمونیشن ہمارا ساتھ دے سکتا ہے؟"

داماں کے چہرے پر جھریاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نفی میں سر ہلا دیا "نہیں جناب۔" وہ مایوسی سے بولا "ہمارے پاس کل پانچ رائفلیں ہیں۔ گولیاں بس اتنی ہیں کہ ہم چار پانچ منٹ سے زیادہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کی تعداد آپ کی توقع سے زیادہ ہے۔ جب مقابلے کے بعد یہ ہمیں پکڑیں گے تو پھر ان کا رویہ بہت سخت اور ظالمانہ ہوگا۔"

پروفیسر نے کہا "ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح ان کو باتوں میں الجھایا جائے اور تھوڑا سا وقت حاصل کیا جائے۔ اس دوران میں وائرلیس پر سائیں عالی یا مسٹر کھارک سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جائے۔"

"یہ تجویز تو مناسب ہے لیکن پتا نہیں کہ رابطہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔

پروفیسر نے داماں سے کہا کہ وہ مشعل برداروں کو کچھ دیر تک باتوں میں الجھانے کی کوشش کرے۔ داماں پروفیسر سے ہدایات لے کر مشعل برداروں کی طرف چلا گیا۔ میں واپس کھوہ میں آ گیا۔ سب سہمے ہوئے تھے۔ زریں گل نے وائرلیس سیٹ کھوہ کے آخری سرے پر دو پتھروں کے نیچے رکھ دیا تھا اور اوپر کچھ جھاڑ جھنکاڑ ڈال دیا تھا۔ میں نے وائرلیس سیٹ پھر سے نکالا اور واپس پر رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ سائیں عالی کی آمد اور روانگی کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ بگولے کی طرح آتا تھا اور بگولے کی طرح غائب ہو جاتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وائرلیس سیٹ پر بھی اس کی آواز قطعی غیر متوقع طور پر نمودار ہوئی تھی اور پھر غائب ہوئی تھی۔ اب میں دوبارہ کوشش کر رہا تھا مگر اس کا رڈ روڈ دیا نہیں تھا۔ اب وائرلیس کی بیٹری بھی کمزور ہونا شروع ہو گئی تھی اور گاہے گاہے لہروں کا شور دب سا جاتا تھا۔ یہ بڑا قیمتی وقت تھا مگر ضائع ہو رہا تھا۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ غزالہ، کلثوم اور زریں بڑی محویت سے مجھے وائرلیس کے ساتھ الجھتے دیکھ رہے تھے۔

اچانک ایک مانوس شور نے ہمیں چونکا دیا۔ یہ وہی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی تھی جو اس سے پہلے ہمیں کھوہ کے دہانے پر سنائی دی تھی۔ جب بہت سے افراد اکٹھے باتیں کرتے ہیں تو ایسی آواز سنائی دیتی ہے۔ شائستہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے بتایا کہ گھیرا ڈالنے والے قریب آ رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت کھوہ میں گھس آئیں گے۔ میں نے وائرلیس سیٹ دوبارہ پتھروں اور شاخوں کے نیچے چھپا دیا۔ اب انسانوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کتوں کی آوازیں بھی بہت قریب سے آ رہی تھیں۔ میں زریں کے ساتھ تیزی سے کھوہ کے دہانے پر پہنچا۔ کھوہ کے آس پاس کا علاقہ مشعلوں کی روشنی سے روشن تر ہوتا جا رہا تھا پھر ہم نے ان گنت افراد کو کھوہ کے سامنے اور اطراف سے نمودار ہوتے دیکھا۔ ان کے سیاہ جسم مشعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ مشعلوں کی آگ نے گرمی میں اضافہ کر دیا تھا اور ہر جسم سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ جھاڑیوں سے نمودار ہونے والے ہر شخص کا سر منڈا ہوا تھا۔ ان کے بالائی جسم عریاں تھے جبکہ زیریں جسموں پر لنگوٹ، نیکریں، چمڑے کے بنے ہوئے مختصر لبادے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر افراد کے ہاتھوں میں چھ سات فٹ لمبا ایک نیزہ نما ہتھیار تھا۔ یہ نیزے سے قدرے لمبا تھا اور اس کی دو انیاں تھیں، بعض کے پاس تین انیوں والے ہتھیار تھے۔ اس کے علاوہ بعض افراد کے پاس تیر کمان اور کلہاڑے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ ان کے چوکس کتے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کی سرخ زبانیں اور دُمیں مشعلوں کی روشنی میں تیزی سے گردش کرتی دکھائی دیتی تھیں۔

صرف پانچ رائفلوں کی مدد سے اتنے زیادہ افراد کا مقابلہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ عقل مندی یہی تھی کہ اس وقت کوئی مزاحمت نہ کی جاتی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ زریں گل کی طرف سے تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور ہاتھ میں

بھری ہوئی رائفل تھی۔ اس کا پٹھانی خون جوش مار جاتا اور وہ دو چار بندوں کو ڈھیر کر دیتا تو پھر ہمارا ابھی حشر نشر ہو جاتا تھا۔ میں نے زریں کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا گھوڑا بالکل ٹھنڈا رکھے۔ زریں گل نے اثبات میں سر ہلایا مگر منہ ایسے ہی بنایا جیسے کڑوی گولی حلق سے اتارنا پڑی ہو۔ ہتھیار بند افراد نے ہمیں مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا۔

داماں نے پژمردہ لہجے میں جوذم سردار کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "آپ اپنے ہتھیار ان لوگوں کے حوالے کر دیں۔"

"مگر یہ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"اپنی بستی میں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی سختی نہیں کی جائے گی اور ہماری حیثیت مہمانوں کی ہے۔"

"اگر ایسی ہی مہمان نوازی ہے تو پھر ہمارے ہتھیار ہمارے پاس کیوں نہیں رہنے دیے جاتے؟"

"یہ ان کا اصرار ہے کہ ہتھیار ان کے حوالے کر دیے جائیں۔"

بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میرے تمام ساتھی میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی رائفلیں مشعل بردار جوامز کے حوالے کر دیں۔ اتنے کثیر دشمن کے مقابلے میں معمولی ہتھیاروں کے ساتھ مزاحمت کا سوچنا بھی محال تھا' پھر ہمارے ساتھ خواتین تھیں اور بیمار صفدر تھا۔ اگر ہم صرف دو چار صحت مند افراد ہوتے تو گھنے اور تاریک جنگل میں جوذمز کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی جا سکتی تھی مگر موجودہ صورت حال میں یہ ناممکن تھا۔

جونہی ہم نے ہتھیار پھینکے' چاروں طرف سے نیزوں کی انیاں ہمارے قریب تر پہنچ گئیں۔ کئی افراد کھوہ میں گھس گئے اور خواتین و بچوں کو باہر نکال لائے۔ ذرا ہی دیر بعد زریں گل کا چھپایا ہوا وائرلیس سیٹ بھی کھوہ سے برآمد ہو گیا۔ دو افراد نے یہ وائرلیس سیٹ لے جا کر جوذم سردار کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ جوذم سردار نے جھک کر مشعل کی روشنی میں ذرا غور سے وائرلیس سیٹ کو دیکھا پھر اس نے اپنے ایک تنومند ساتھی سے کچھ کہا۔ اس شخص نے نیچے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وائرلیس سیٹ پر دے مارا۔ وزنی پتھر کی ایک ہی ضرب نے وائرلیس سیٹ کا حلیہ بگاڑ دیا اور اس کے کئی کل پرزے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ہم سب کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔

ہم سے ہتھیار پھنکوانے کے بعد جوذم سردار کا رویہ قدرے سخت ہو گیا تھا۔ وہ رائفلوں سے خوف زدہ نظر آتا تھا۔ اب رائفلیں ہمارے ہاتھ میں نہیں تھیں' زمین پر پڑی تھیں پھر بھی وہ انہیں ڈری ہوئی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حکم پر دو گرانڈیل افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے ہماری رائفلوں میں سے دو رائفلیں بیرل کی طرف سے پکڑیں پھر انہیں بے دریغ ایک بڑے پتھر پر مارنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی قوت سے اس وقت تک رائفلوں کو پتھر پر پٹختے رہے جب تک وہ ٹوٹ پھوٹ کر تقریباً بے کار نہیں ہو گئیں۔ بعد ازاں باقی رائفلوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

اسی دوران میں دو سر منڈے جوذم بھاگتے ہوئے آئے۔ ان سیاہ فام تاجکیوں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں سردار کو کچھ بتایا۔ دراصل انہوں نے ہماری دونوں جیپوں کا سراغ لگا لیا تھا۔۔۔ اور بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

سردار کی ہدایت پر عورتوں سمیت ہم سب کی تلاشی لی گئی اور ہمارے ہاتھ رسی کے ساتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔ یہ رسی کھجور کی چھال کو بٹ کر بنائی گئی تھی اور بے حد سخت تھی۔ ہم سب کو نیزوں کے حصار میں جھاڑیوں تلے کھڑا کر دیا گیا۔ صفدر ابھی تک کھوہ میں ہی تھا' خبر نہیں تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ ہم میں سے فقط غزالہ کے ہاتھ نہیں باندھے گئے تھے کیونکہ اس نے نابی کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ جوذم سردار اور اس کے ساتھی ان درختوں کی جانب چلے گئے جہاں جیپوں کو چھپایا گیا تھا۔ آٹھ دس منٹ گزر گئے پھر ہمیں ایک شور سنائی دیا۔ یہ شور جوذم گھڑ سواروں نے بلند کیا تھا۔ اس شور کے ساتھ آگ کے دو بڑے شعلے بلند ہوئے اور درختوں سے اوپر تک جانے لگے۔ دونوں جیپوں پر پیٹرول یا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔ ان دشوار گزار راستوں پر سفر کرنے کے لیے جیپ ایک بہت بڑی نعمت کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ دونوں گاڑیاں دس بارہ لاکھ سے کم قیمت کی نہیں تھیں۔ بے خبر جنگلیوں نے انہیں کوڑا کرکٹ سمجھ کر جلا ڈالا تھا۔ شاید ان پر یہ مثال صادق آتی تھی کہ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ اس سے پہلے وہ ہماری نہایت کار آمد اور قیمتی رائفلوں کا ستیاناس کر چکے تھے۔ شعلوں کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کچھ افراد ہماری رائفلوں کی گولیاں اور بھرے ہوئے میگزین وغیرہ آگ کے اندر پھینک رہے ہیں پھر ہماری ٹوٹی پھوٹی رائفلیں' ہمارا تباہ حال وائرلیس سیٹ' ہماری ٹارچیں اور ہماری دوربین' سب کچھ آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی دوران میں ایک گھڑ سوار جوذم کی نگاہ غزالہ کی کلائی کی گھڑی پر پڑ گئی۔ وہ گھوڑے سے اترا اور بڑی بد تمیزی کے ساتھ غزالہ کے ہاتھ سے گھڑی اتروا لی۔ غزالہ کے

چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی مگر وہ بولی کچھ نہیں۔ غزالہ کے بعد پروفیسر شائستہ اور میرے ہاتھوں سے بھی گھڑیاں اتروا لی گئیں۔ ایک شخص یہ گھڑیاں لے کر آگ کے الاؤ پر پہنچا اور گھڑیاں آگ میں پھینک دیں۔ غالباً یہ لوگ مشین قسم کی کوئی شے ہمارے پاس نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں بھی اپنے جیسا کر رہے تھے۔

جس وقت جوذم گھڑ سوار ہماری گھڑیاں اتروا رہا تھا' اس وقت میں نے ایک بات نوٹ کی اور چونک گیا۔ جواں سال لاری سول ہمارے درمیان نہیں تھا حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کھوہ کے سامنے وہ بھی ہمارے ساتھ نیزوں کے گھیرے میں کھڑا تھا۔ میں نے چور نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ یہ ایک مثبت صورت حال تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چمکیلی آنکھوں والا وہ ہوشیار نوجوان افراتفری اور تاریکی کا فائدہ اٹھا کر کہیں کھسک گیا ہے۔ اگر وہ کھسک گیا تھا تو پھر دو امکانات ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ جان بچا کر یہاں سے بھاگ جائے اور محفوظ علاقے میں پہنچ جائے۔ دوسرا یہ کہ وہ ہمارا ساتھ دے اور کسی طریقے سے ہماری مدد کی کوشش کرے۔

سب کچھ نذر آتش کرنے کے بعد جوذم سردار نے ہمارے لیے ایک چھکڑا منگوایا۔ اس کے چار پہیے تھے اور اس کے آگے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ ہمیں چھکڑے میں سوار ہونے کا حکم دیا۔ حکم دینے والے کا انداز دوستانہ تھا مگر یہ ایسی دوستی نہیں تھی کہ ہم انکار کی جرات کر سکتے۔ دو اور تین انیوں والے ان گنت نیزے ہماری طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کتوں کی سرخ زبانیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے ہمیں گھیر رکھا تھا۔ ہم اس شکرام نما چھکڑے میں سوار ہو گئے۔ اندر لکڑی کی نشستیں موجود تھیں۔ ان میں پیال بھر کر اوپر چمڑا منڈھ دیا گیا تھا۔ یہ نشستیں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھیں۔ چھکڑا اوپر سے بند تھا۔ اندر دھواں بھرا ہوا تھا ہمارا دم گھٹنے لگا۔ زریں اطمینان سے بولا "اس چھکڑے میں گھس کر ام کو اپنا وطن یاد آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"پشاور اور کوہاٹ کا سینما گھر ایسے ہی ہوتا ہے' دھوئیں سے بھرا ہوا' پھٹی پرانی سیٹوں والا اور ایک دم گرم۔" پھر وہ ذرا توقف کر کے بولا "ویسے یہ یزید کا بچہ ام کو لے کر کدھر جا رہا ہے؟"

"یہ تو آنے والے وقت میں ہی پتا چلے گا۔"

"آنے والے وقت کا خاک پتا چلے گا۔ ان اچکوں نے ام سب کا گھڑی تو اتار لیا ہے۔"

صفدر کو ابھی تک کھوہ سے باہر نہیں نکالا گیا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر یہ لوگ صفدر کو لے کر نہیں آئے تو ہم یہاں سے روانہ نہیں ہوں گے۔ پروفیسر شائستہ اور ہمارا مترجم داماں اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ ان کے عقب میں غزالہ' نابی' کلثوم اور مہتاب تھے۔ آستی' زریں اور میں سب سے پیچھے تھے۔ یہ کافی بڑا چھکڑا تھا۔ ابھی بھی اس میں گنجائش موجود تھی۔ اسی دوران میں چھکڑے کو چلا کر کھوہ کے بالکل سامنے پہنچا دیا گیا۔ دو افراد دونوں طرف سے صفدر کو سہارا دے کر چھکڑے تک لائے۔ چھکڑے کے فرش پر تھوڑی سی پیال بچھائی گئی اور صفدر کو اس پر دراز کر دیا گیا۔

ہمارے ارد گرد جو جوذم موجود تھے ان کی تعداد کم و بیش تین چار سو تھی۔ وہ جنگل میں دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کی مشعلوں سے نکلنے والے دھوئیں نے فضا کو مزید گرم اور مکدر کر رکھا تھا۔ ہم روانہ ہونے لگے تو ایک دم زریں چونک گیا۔ بلند آواز میں بولا "ام ارا ایک ساتھی کم ہے' رک جاؤ' ساتھی کم ہے۔" وہ سول کا ذکر کر رہا تھا۔

میں نے زور سے اس کی ران پر چٹکی کاٹی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔

دوسری طرف پروفیسر نے بھی اسے تادیبی نظروں سے گھورا "کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟" وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔

"تیرا سر ہوا ہے۔ بس چپکا بیٹھا رہ' ورنہ ایک جھانپڑ دوں گا گدی پر۔"

"لل۔۔۔ لیکن وہ۔"

"سول اپنی مرضی سے گیا ہے۔ ادھر ادھر کھسک گیا ہے۔"

"اوہ!" زریں نے گول گول آنکھیں گھمائیں "یہ تو بڑا اچھا ہوا ہے۔ ام نے ایک مشہور انڈین فلم میں بھی اس طرح کا سین بار بار دیکھا تھا۔ راج کپور کی فلم تھی شاید۔"

"راج کپور کی ایک فلم میں اسے زیادہ بک بک کرنے پر سخت مار بھی پڑی تھی۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"ہم۔۔۔ میرا نام جوکر" تو نہیں تھی!" زریں روانی میں بولا۔

"دیکھو خاموش ہو جاؤ ورنہ پیٹ ڈالوں گا اور جبری کے سامنے پٹنا تمہارے مستقبل کے لیے زیادہ اچھا نہیں ہو گا۔"

زریں نے کلثوم کی طرف دیکھا اور واقعی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

چھکڑے کو چاروں طرف سے نیزہ برداروں نے یوں گھیرا ہوا تھا جیسے بہت سی چیونٹیاں چینی کے دانے کو گھیر لیتی ہوں۔ ہمارے ارد گرد مشعلوں کی پھڑپھڑاہٹ تھی' گھوڑوں کی ہنہناہٹ تھی اور کتوں کا شور تھا۔ اس شان سے ہماری سواری باد بہاری ایک نامعلوم سمت میں روانہ ہوئی کہ ہر قدم پر کسی جان لیوا حادثے کا گمان ہوتا تھا۔

ناولوں اور سفرناموں میں اس قسم کے واقعات اکثر پڑھے جاتے ہیں۔ ویرانے میں کسی نامعلوم قبیلے کے لوگ اچانک للکارے مارتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور اجنبی مسافروں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ ان مسافروں کو بڑے اہتمام سے دیگوں میں ابالا جاتا ہے اور چٹ کرلیا جاتا ہے۔ جو لوگ ہمیں پکڑ کر لے جارہے تھے وہ آدم خور تو نہیں تھے' نہ ہی انہوں نے ہمیں بھوکی نظروں سے دیکھا مگر وہ کچھ دوسرے حوالوں سے ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے تھے۔

تاریک و حبس زدہ رات میں قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہمیں جنگل میں کچھ روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ جوذام قبیلے کی بستی تھی۔ بستی ایک بلند ٹیلے کے دامن میں واقع تھی۔ بستی کا کچھ حصہ ٹیلے کی ترائی پر بھی تھا۔ بستی میں داخل ہوتے ہی اونٹوں' گھوڑوں اور انسانوں کے ہیولے نظر آئے۔ بستی کے مکان مختلف طرز کے تھے۔ انہیں مٹی اور گارے سے بڑی اچھی طرح لیپا گیا تھا۔ ان مکانوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی پیالہ نما برتن کو زمین پر اوندھا رکھ دیا گیا ہو۔ ان مکانوں کو جھونپڑوں کے بجائے گول چھت والی کوٹھڑیاں کہنا زیادہ مناسب تھا۔ بستی میں کئی جگہ کھجور اور تاڑ کے خشک تنے استادہ تھے۔ ان تنوں پر مشعلیں گاڑی گئی تھیں جو اسٹریٹ لائٹس کا کام دے رہی تھیں۔ ہم گلیوں میں داخل ہوئے تو بہت سے تنگ دھڑنگ حبشی ہمیں دیکھنے کے لیے دونوں طرف جمع ہوگئے۔ ان سب کے سر منڈے ہوئے تھے۔ عورتیں ان میں خال خال ہی نظر آتی تھیں۔ رکھوالی کے کتوں نے ہمارا استقبال آسمان سر پر اٹھا کر کیا۔

ہمیں بستی کے وسط میں ایک کشادہ میدان میں پہنچایا گیا۔ یہاں دو صحت مند گائے موجود تھیں۔ ان کے تھن دودھ سے بھاری ہو کر لٹک رہے تھے۔ ہمارے سامنے دو لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ مکمل لباس میں تھیں' یہاں تک کہ انہوں نے سر بھی ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس خطے میں عورتوں کا یہ حلیہ اسی بستی میں دیکھنے میں آیا تھا۔ ان لڑکیوں نے پیتل کے برتنوں میں بڑی مشاقی سے گایوں کا دودھ دوہنا شروع کیا۔ جب تک ہم چھکڑے سے نیچے اترے' دونوں لڑکیوں کے برتن دودھ سے بھر چکے تھے۔ اس کے بعد ایک لمبا تڑنگا جوذام حبشی آگے آیا۔ اس نے ایک تیز دھار نوکیلا خنجر پکڑ رکھا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے ایک گائے کو گردن کے قریب چھوٹا سا زخم لگایا۔ گائے اچھل کر رہ گئی۔ تاہم اس کی رسی ایک دوسرے حبشی نے بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھی۔ گائے کی گردن کی ایک رگ کھل گئی اور اس کا خون ایک ہچکولے کھاتی ہوئی سرخ دھار کی صورت گرنے لگا لیکن یہ خون زمین پر نہیں گر رہا تھا' اس برتن میں گر رہا تھا جس میں گائے کا اپنا دودھ موجود تھا۔ دوسری گائے سے بھی یہی سلوک کیا گیا اور قریباً آدھ لیٹر خون اس سے حاصل کیا گیا۔ بعد ازاں یہ دودھ پیالوں میں ڈال کر ہمیں پیش کیا گیا۔

یہ کراہت آمیز مشروب تھا اور جوذام سردار کے رویے سے محسوس ہو رہا تھا کہ ہمیں یہ مشروب پینا ہی پڑے گا۔ اس قسم کی بالجبر خاطر مدارات ہم پہلے بھی برداشت کر چکے تھے بلکہ وہ تو کچھ زیادہ ہی کراہت انگیز صورت حال تھی۔ اس مشروب میں انسانی خون کی آمیزش تھی۔ ہمارے ہاتھ کھول کر پیالے ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے گئے۔ جوذام سردار نے چہرے پر میزبانوں کی سی مسکراہٹ سجائی اور ہمیں یہ مشروب پینے کی ترغیب دینے لگا۔ ہم سب کے سب ہچکچا رہے تھے' خاص طور سے خواتین کے چہروں پر سخت کرب کی کیفیت تھی۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی' جوذام سردار کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوتی جارہی تھی۔ سردار کے ساتھی بھی آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔

داماں نے مجھ سے التجا آمیز لہجے میں کہا "جناب! میرا خیال ہے کہ آپ یہ دودھ دو دو گھونٹ پی ہی لیں۔ ورنہ یہ لوگ اسے بدشگونی سمجھیں گے۔"

"بدشگونی کیوں سمجھیں گے؟"

"یہ مقدس جانوروں کا دودھ اور خون ہے۔ مقامی لوگ اس مشروب کے لیے ترستے ہیں۔"

داماں ٹھیک کہہ رہا تھا' ہم ایسے میزبانوں کے قبضے میں تھے جن کی میزبانی کسی بھی وقت نامہربانی میں بدل سکتی تھی۔ میں نے ذریں اور پروفیسر وغیرہ کو اشارہ کیا۔ ہم نے دل پر جبر کرکے پیالوں میں سے دو دو گھونٹ بھر لیے۔ عورتوں میں سے صرف دراز قد سوناہ نے یہ دودھ پیا تھا۔ غزالہ' کلثوم اور شائستہ کے چہروں پر سخت کراہت تھی۔ بستی کے معززین ایک بڑی خشک نظروں سے ان تینوں کو دیکھ رہے تھے پھر کوشش کرکے کلثوم نے بھی دو گھونٹ بھر لیے مگر غزالہ اور شائستہ ہچکچائی ہوئی کھڑی تھیں۔ جوذام سردار نے کرخت آواز میں

کچھ کہا۔ بوڑھے داماں نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "جوذام سردار کہہ رہا ہے کہ اگر یہ عورتیں نہیں پینا چاہتی ہیں تو نہ پئیں۔ ہم ان کے لیے کوئی اور انتظام کردیتے ہیں۔ ہمیں شرمندگی ہے کہ ہم نے ان کو پریشان کیا۔"

"لگتا ہے کہ غصے سے کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"سخت غصے سے۔ آپ براہ مہربانی ان سے کہیں کہ یہ ایک ایک گھونٹ ہی بھر لیں۔" داماں نے کہا۔

میں نے غزالہ کے پاس جاکر سرگوشی میں کہا "یہ مجبوری ہے۔ زیادہ نہیں تو ایک گھونٹ بھر لو۔"

غزالہ نے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے اس کی نگاہیں مجھ سے ٹکرائیں' اس ایک لمحے میں اس نے ایک مکمل بات کہہ دی تھی۔ اس نے کہہ دیا کہ تمہارے لیے تو میں کچھ بھی پی سکتی ہوں۔ اس کی پیشانی پر بہت سی سلوٹیں ابھریں' آنکھیں بند کرکے اس نے ہونٹ پیالے کے کنارے سے لگائے اور گھونٹ بھر لیا۔ غزالہ کی تقلید میں شائستہ نے بھی خود پر جبر کرکے یہی عمل دہرایا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے' چند لمحے بعد دونوں ابکائیاں لینے لگیں۔ پچھلی صفوں میں موجود جوذام ہنسنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حلق سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکال رہے تھے۔ جوذام سردار نے زیر لب مسکراتے ہوئے غزالہ اور شائستہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عورت کی بھوک اور آنکھوں میں ہوسناکی صاف نظر آرہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے اندرونی جذبات پر اس نے فی الحال رکھ رکھاؤ کا پردہ ڈال رکھا تھا اور بات صرف جوذام سردار تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہاں موجود ہر شخص نے خواتین کو یوں دیکھا تھا جیسے کسی ہفتوں کے فاقہ زدہ شخص کو اچانک اپنے سامنے سجا سجایا دستر خوان نظر آجائے۔

مشروب سے ہماری "تواضع" کرنے کے بعد ہمیں ایک بڑی کوٹھڑی میں منتقل کردیا گیا۔ ہم گول چھت والی اس کوٹھڑی میں پہنچے تو یہاں موم کی بنی ہوئی ایک عجیب و غریب سی روشنی تھی۔ زمین پر کھجور کی چٹائی بچھی تھی اور منصور پہلے سے یہاں موجود تھا۔ وہ ایک تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ماسٹر اسحٰق کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے تھے۔ غیر متوقع طور پر اسحٰق خاموش اور پرامن تھا۔ شاید وہ ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بڑی ناسریاں رات تھی' موسم کے لحاظ سے بھی اور حالات کے اعتبار سے بھی۔ ہم سخت حبس اور گمبھیر اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ہماری کوٹھڑی سے باہر دو ننگ دھڑنگ مسلح جوذام پہرا

دے رہے تھے۔ کوٹھڑی کے اندر حبس تھا' مچھر تھے اور آنے والے وقت کی پریشانی تھی۔ ہمیں سخت پیاس لگی ہوئی تھی مگر پانی ہمیں بڑی "کفایت شعاری" کے ساتھ دیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں پانی کی قلت ہے۔

میں نے داماں سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے' ان کا رویہ آئندہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟"

بوڑھے داماں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن غلط تسلی بھی دینا نہیں چاہتا۔ جوذام بے حد ضدی' بے رحم اور خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر یہ خالی ہاتھوں سے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ علاقے کے جن حصوں میں یہ لوگ آباد ہیں وہاں شکار کثرت سے ملتا ہے اور چراگاہیں بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوذام لوگوں کو خوش حال سمجھا جاتا ہے۔ خوش حالی کے باوجود یہ لوگ اپنے علاقے سے نکل کر دور دور تک لوٹ مار کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو طویل سفر کرکے ساحل تک بھی جا پہنچتے ہیں۔ لوٹ مار میں ان کا نشانہ عام طور پر جوان عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ عورت ان لوگوں کے لیے ایک نایاب جنس کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں سراسر قصور بھی ان کا اپنا ہے۔ ان لوگوں میں کچھ مذہبی رسمیں ایسی ہیں جن کی ادائیگی کی وجہ سے نو زائیدہ بچیوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ تقریباً دس بچیوں میں سے شاید ہی کوئی ایک آدھ بچتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس پوری بستی میں بھی ابھی تک ہمیں چند عورتیں ہی نظر آئی ہیں۔ عورت کی کم یابی کے سبب اس جنگلی قبیلے میں ایک سے زیادہ شوہروں کا رواج ہے۔ ایک عورت کو سال کے مختلف حصوں میں مختلف مردوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ایک ہی وقت میں وہ کئی مردوں کے ساتھ رہتی ہے۔"

میں نے کہا "تمہارا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمیں نقصان پہنچائیں گے؟"

"کوئی کرشمہ ہوجائے تو دوسری بات ہے ورنہ یہ لوگ یقینی طور پر عورتوں کے ساتھ برا سلوک کریں گے۔" داماں کے لہجے میں مایوسی تھی اور گہرے اندیشے تھے۔

اب نصف شب گزر چکی تھی۔ کوٹھڑی کے روزنوں سے باہر چاند کی مدھم سی روشنی تھی۔ دور کہیں جنگل سے کبھی کبھی کسی شب بیدار جانور کی آواز آجاتی تھی۔ داماں نے مجھے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے شیر کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ ان جنگلوں کا باسی تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔

غزالہ تائی کو سلانے کے لیے اس کے ساتھ نیم دراز ہوگئی تھی۔ پروفیسر کے انکار کے باوجود شائستہ بڑی محبت سے اس کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھی۔ گاہے گاہے وہ بڑی محبت سے اپنے باپ کے ہاتھوں کو بوسہ بھی دے لیتی تھی۔ باپ بیٹی میں واقعی مثالی محبت تھی۔ کلثوم اپنے شوہر نامدار زریں کے پیٹ پر پٹی باندھنے میں مصروف تھی۔ وہاں شیطان زادے استی نے اتنی زور سے کاٹا تھا کہ تقریباً بوٹی ہی نکال لی تھی۔ زریں کو جب بھی اس زخم کا خیال آتا تھا اس کی آنکھیں استی کے لیے قہر برسانے لگتی تھیں۔ استی بدستور چمگادڑ کی طرح جاگ رہا تھا، وہ بظاہر تو پرسکون دکھائی دیتا تھا مگر اس کا کچھ بھروسا نہیں تھا کہ کب کیا کر گزرے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار یا تیز دھار آلہ آجاتا تو وہ کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

کوٹھڑی کی دو دیواروں میں چھوٹے چھوٹے کئی سوراخ تھے۔ انہیں ننھے منے روزن بھی کہا جا سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ روزن کچھ تاریک سے ہوگئے ہیں۔ جیسے انہیں کسی شے سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ میں موم بتی لے کر روزنوں کی طرف بڑھا تو پتا چلا کہ ان روزنوں کے ساتھ کئی آنکھیں چپکی ہوئی ہیں۔ یقیناً یہ وہ پہرے دار تھے جو کوٹھڑی کی نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ چونکہ کوٹھڑی کے اندر روشنی تھی لہٰذا وہ خاموشی سے تاکا جھانکی کر رہے تھے۔ ان کی نگاہیں لازماً خواتین پر ہی تھیں، میں روزنوں کی طرف بڑھا تو آنکھیں وہاں سے اوجھل نہیں ہوئیں۔ بڑی ڈھٹائی سے وہیں پر جمی رہیں۔ ان غلیظ نگاہوں کی دیدہ دلیری پر دماغ بھنا سا گیا لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے داماں سے کہا اور داماں نے ایک جانب کی دیوار پر اپنی چادر اس طرح سے لٹکا دی کہ روزن اس کے عقب میں چھپ گئے۔ کوئی دوسرا کپڑا دستیاب نہیں تھا ورنہ وہ دوسری طرف لٹکا دیا جاتا۔

"موتابہ کہاں ہے؟" میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دیکھیے۔ وہاں بیٹھی ہے۔" داماں نے کوٹھڑی کے تاریک ترین گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دھیان سے دیکھا، وہ کسی لکڑی کی طرح ساکت و جامد تھی۔ اپنی سیاہ فامی کی وجہ سے سیاہی کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ میں روشنی لے کر تھوڑا سا آگے گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایک عجیب و بے نام سی کیفیت تھی۔ پسینہ اس کے چہرے سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرنا چاہا۔ داماں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا، پھر سرگوشی میں بولا "اسے اس کے حال پر رہنے دیں۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دو افراد ہاتھوں میں پانی کے برتن لیے اندر داخل ہوئے۔ ہمیں قریباً آدھا آدھا پیالہ پانی دیا گیا۔ یہ ہماری طلب سے بہت کم تھا، پھر بھی غنیمت تھا۔ ایک شخص نے بارعب لہجے میں داماں سے کچھ کہا۔ داماں نے ترجمانی کرتے ہوئے بتایا "یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم اندر کی روشنی بجھا دیں اور خاموشی سے سو جائیں۔"

حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق۔ ہم نے روشنی بجھا دی اور لیٹ گئے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اب جنگل کی طرف سے ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہوگئی۔ اس ہوا کے جھونکے روزنوں سے گزر کر جب ہمارے پسینے سے بھیگے ہوئے کپڑوں کو چھوتے تو خوشگوار احساس ہوتا۔

میں دیر تک خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ مسٹر کلارک کی آواز ابھی تک میری سماعت میں گونج رہی تھی۔ اب یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ مسٹر کلارک نہ صرف ماریطانیہ میں موجود ہیں بلکہ ہماری مصیبتوں سے پوری طرح باخبر بھی ہیں۔ مسٹر کلارک ایک نہایت بارسوخ، طاقت ور اور باحیثیت شخصیت کا نام تھا، اگر وہ کنگ براؤن کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے تو کنگ جیسے دیوزاد کو بھی دن میں تارے نظر آسکتے تھے۔ سائیں عالی اور مسٹر کلارک کے درمیان جو گفتگو ہوتی تھی وہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ گفتگو ثابت کر رہی تھی کہ مسٹر کلارک اور سائیں عالی کے باہمی تال میل سے ماریا ٹرسٹ کے خلاف کوئی چال چلی جا رہی ہے۔

گھڑیاں تو ہمارے پاس تھیں نہیں، وہ غالباً رات کا آخری پہر تھا جب بستی کے کسی حصے سے نامانوس شور ابھرا۔ بہت سی انسانی چیخیں اور بھرکنوں کی لگاتار آوازیں جیسے بہت بھرکے کتے ایک ساتھ چیخنے چلانے پر کمربستہ ہوگئے ہوں۔ ان آوازوں کے درمیان ڈوبتی ابھرتی آواز بھیڑیے کی تھی۔ ہوا کے دوش پر ڈوبتی ابھرتی یہ طویل آواز میرے لیے جانی پہچانی تھی۔ اس سے پہلے انڈیا میں گولکنڈا کے جنگل میں میرا اور عالم قریشی کا سابقہ ان آوازوں سے پڑ چکا تھا۔ ایک مقامی وڈیرے کے ریسٹ ہاؤس میں ہم کئی روز تک ان آوازوں کے گھیرے میں رہے تھے۔ بستی کے جنوب مغربی حصے سے بھیڑیے کی جو آواز ابھر رہی تھی وہ تنہا نہیں تھی۔ یہ ایک پورے گروہ کی آوازیں تھیں۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ

بھوکے بھیڑیوں کے کسی گروہ نے بستی کے مویشیوں پر حملہ کردیا ہے اور لوگ ان درندوں کو بستی سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے اور پروفیسر نے روزنوں میں سے دیکھا۔ بستی میں یکے بعد دیگرے بہت سی مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ ان کی روشنی میں منڈے ہوئے سروں والے تنومند جوذم بھاگتے دوڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے انداز سے پریشانی اور بدحواسی عیاں تھی۔ اچانک مجھے ایک بھیڑیا نظر آیا۔ یہ افریقی طرز کا قدرے دبلا اور لمبا جانور تھا۔ اس کی سیاہ تھوتھنی خون سے رنگی ہوئی تھی۔ تین جوذم اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے، پھر ان میں سے ایک نے بھاگتے بھاگتے بھیڑیے پر نیزہ پھینکا۔ نشانہ خطا گیا، بھیڑیا تیز رفتاری سے تاریکی میں گم ہوگیا۔

"وہ دیکھیے استاد صیب!" زریں نے ایک دوسرے روزن کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں آگ کی سرخی دکھائی دے رہی تھی۔

"شاید آگ لگ گئی ہے!" پروفیسر نے تبصرہ کیا۔

دیکھتے دیکھتے شعلے بلند ہوگئے اور روزنوں میں سے بھی نظر آنے لگے۔ قبائلیوں کی چیخ و پکار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ آتش زدگی والی جگہ ہماری کوٹھڑی سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور رہی ہوگی پھر بھی ہمیں تپش کا احساس ہونے لگا۔ بھیڑیوں کی آوازیں اب مدھم پڑ گئی تھیں مگر آگ پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کے پاس تو پینے کے لیے بھی پانی نہیں تھا، آگ بجھانے کے لیے کہاں سے آتا۔ آگ پر قابو پانے کے لیے یقیناً کچھ دوسری تدبیریں اختیار کی جا رہی تھیں۔ کوٹھڑی کے اندر سبھی جاگ رہے تھے۔ جو پہلے اونگھ رہے تھے وہ بھی اب بیدار ہوگئے تھے۔ بھیڑیے بستی کے اردگرد چکرا رہے تھے اور ان کی آوازیں کبھی بلند کبھی پست ہو جاتی تھیں۔ ہماری کوٹھڑی کے اردگرد غالباً اکا دکا پہرے دار ہی باقی رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ پروفیسر اور زریں نے مل کر کوٹھڑی کے دروازے کو ہلانے جلانے کی کوشش کی۔ وہ ایک مضبوط دروازہ تھا اور باہر سے مقفل تھا۔ اگر ہم سب مل کر زور لگاتے تو شاید دروازہ ٹوٹ جاتا لیکن اس کے بعد کیا ہوتا۔ بے شک بستی میں افراتفری مچی ہوئی تھی مگر ہمارے ساتھ عورتیں تھیں اور بیمار صفدر تھا۔ ہم اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکلنے کے قابل نہیں تھے۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں میرا دھیان لادی ساتھی مولی کی طرف چلا گیا۔ وہ جابری گرفتاری کے وقت بڑی صفائی سے موقع سے کھسک گیا تھا۔ دل میں ایک امید سی تھی کہ شاید وہ کسی موقع پر ہماری کچھ مدد کر سکے۔ اسے معلوم تھا کہ ہم صحرائی درویش کے مرید ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ ہمارے بارے میں سائیں عالی تک اطلاع پہنچانے کی کوشش کرتا۔

چیخ و پکار اور افراتفری اپنے عروج پر پہنچ کر دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ آگ کے شعلے بھی کچھ مدھم پڑ گئے تھے۔ پانچ دس منٹ کے اندر آگ پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا۔ ہم نے کوٹھڑی کے روزنوں سے دو زخمیوں کو دیکھا انہیں چارپائیوں پر ڈال کر تیزی سے کسی سمت لے جایا جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا جس کے جسم پر جلنے کے آثار تھے، دوسرا ایک بناکٹا نوجوان تھا جو یقیناً بھیڑیے کے حملے سے زخمی ہوا تھا۔ یقیناً اسی انداز میں کچھ اور لوگ بھی زخمی ہوئے تھے۔ بستی والوں کی چیخ و پکار سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

یہ ہنگامہ صبح صادق کے وقت سرد ہوا۔ اس دوران میں استی سویا رہا تھا۔ صفدر نے ایک دوبار آنکھ کھولی تھی۔ خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا تھا اور "پانی پانی" پکارا تھا۔ مجھے جو پانی ملا تھا وہ میں نے پیالے سمیت اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب تک اس خیال سے میں پیاس برداشت کرتا رہا تھا کہ صفدر کو پانی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میری یہ منصوبہ بندی کامیاب رہی تھی اور میں نے گھونٹ گھونٹ کر کے دو تین مرتبہ صفدر کو پانی پلا دیا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلی تو دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ ہماری امید بندھی کہ شاید ہونٹ تر کرنے کے لیے تھوڑا بہت پانی ملے۔ دروازہ کھلا اور تین سرمنڈے جوذم دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کی جگہ خنجر دکھائی دے رہے تھے۔ آتے ساتھ ہی انہوں نے دراز قد موتابہ کو دبوچ لیا۔ وہ اسے اٹھا کر باہر لے جانا چاہتے تھے۔ میں ان کے آڑے آیا۔ ایک جوذم نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ یہ منظر دیکھ کر زریں تلملا کر دھکا دینے والے سے لپٹ گیا۔ ایک دوسرے جوذم نے زریں کے سر پر ضرب لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں نے اس کے منہ پر مکا جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بوڑھے داماں کے قریب جا گرا۔ اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی، آٹھ دس افراد تند ریلے کی طرح اندر گھسے اور انہوں نے اپنے نیزوں کی انیاں میرے اور زریں کے جسم سے لگا دیں۔ یہ زہر میں بجھے ہوئے نیزے تھے۔ ان کی نوکوں کی رنگت ان کی ہلاکت خیزی کا ثبوت تھی۔ میں نے زریں کا بازو تھام کر اسے مجبور کردیا کہ وہ مزید ہنگامہ خیزی سے

باز رہے۔ یہی بات بوڑھے داماں نے بہ زبان انگلش ہم سے کہی۔ وہ چیخ کر بولا "یہ زہریلے نیزے ہیں۔ یہ جان سے مار دیں گے۔"

کرخت چہرہ جوذام پہرے داروں نے نیزوں کی انیاں ہمارے جسموں پر رکھ دیں اور ہمیں دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس موقعے پر ہماری معمولی سی مزاحمت بھی ہمارے جسم پر زہریلا زخم لگا سکتی تھی۔ تین جوذام پہرے دار موتابہ کو گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ داماں انگریزی میں مجھے مسلسل تسلی دے رہا تھا "کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ابھی اسے واپس لے آئیں گے۔ شاید پوچھ گچھ کے لیے لے گئے ہیں۔"

جب پہرے دار موتابہ کو لے کر نکل گئے اور دروازہ پھر سے بند ہو گیا تو میں نے داماں سے پوچھا "تم کیسے کہہ رہے ہو کہ وہ اسے کچھ نہیں کہیں گے اور اسے ابھی واپس لے آئیں گے؟"

داماں نے کہا "اگر وہ بری نیت سے لے جاتے تو میرے منہ میں خاک..... وہ آپ کی ساتھی عورتوں میں سے کسی کو لے جاتے اور یہ کام وہ رات کو ہی کر گزرتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ وہ موتابہ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کریں گے؟"

"ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ ہم سب میں میرے علاوہ صرف موتابہ کو ہی مقامی زبان آتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ اس پر تشدد کریں گے!"

"آپ اس لڑکی کی طرف سے زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ وہ نہ صرف لارسی ہے بلکہ پراسرار طاقتوں کی مالک بھی ہے۔ وہ ان کے لیے تر نوالہ نہیں بنے گی۔"

میں اور داماں سوراخ نما روزنوں سے آنکھیں لگا کر باہر جھانکنے لگے۔ موتابہ کوٹھڑی سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر موجود تھی۔ کھینچا تانی میں اس کا گریبان پھٹ گیا تھا اور جسم کا کچھ حصہ عریاں ہو رہا تھا۔ موتابہ کے ہاتھ پھر سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ وہ پہرے داروں کے نرغے میں تھی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص آگے کی طرف جھکا ہوا اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس بستی میں یہ واحد شخص تھا جس کے سر پر لمبے بال نظر آئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری بستی کے حصے کے بال اس نے اپنے سر پر رکھ لیے ہیں۔ اس کے کھچڑی بال اس کے شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ چند منٹ تک کرخت لہجے میں موتابہ سے باتیں کرتا رہا پھر بے تابی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ طویل قامت جوذام سردار بھی وہاں موجود تھا۔ لگتا ہے کہ جب لمبے بالوں والا جوذام سردار سے بھی بات کر لیتا

تھا۔ اسی دوران میں موتابہ کو پینے کے لیے پانی پیش کیا گیا۔ اس نے پانی پینے سے صاف انکار کر دیا۔ زبردستی پلانے کی کوشش کی گئی تو اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔ غالباً اس کو اندیشہ تھا کہ پانی میں کچھ ملا دیا گیا ہے۔

لمبے بالوں والے شخص نے اپنے منہ میں کچھ ڈالا اور اسے چبانا شروع کر دیا۔ یہی لگا کہ وہ کسی درخت یا پودے کی جڑ وغیرہ چبا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ بے قراری سے ٹہلتا بھی جا رہا تھا۔ اس کی صورت میں عجیب سی کرختگی اور غصیلا پن تھا۔ اچانک وہ کچھ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ لمبے بالوں والا ٹہلتا ٹہلتا موتابہ کے قریب سے گزرا اور پھر یک لخت اس نے موتابہ کو دبوچ لیا۔ اڑنگا لگا کر اس نے موتابہ کو پشت کے بل ریت پر گرا دیا اور اس پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ موتابہ کے بال اس نے اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ رکھے تھے اور اس کے اوپر لیٹ سا گیا تھا۔ موتابہ کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے لہٰذا وہ ایک بیٹھے کٹے مرد کی مزاحمت کے قابل نہیں تھی۔ بس وہ چیخ رہی تھی اور لمبے بال والے کے نیچے مچل رہی تھی۔ لمبے بالوں والے نے اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا اور اپنے ہونٹ اس کی گردن سے پیوست کر دیے۔

یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کھلے میدان میں درجنوں افراد کے سامنے یہ شخص موتابہ کی عصمت دری پر تلا ہوا ہے۔ میرے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ ذہن ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر مزاحمت کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ داماں کی استخوانی انگلیاں بڑی مضبوطی سے میرے شانے پر جم گئیں۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "گھبرانے کی بات نہیں جناب۔ یہ وہ مسئلہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے موتابہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لمبے بالوں والا جونک کی طرح موتابہ سے چمٹا ہوا تھا۔ کسی ڈریکولا کی طرح وہ اس کی گردن سے پیوست ہو گیا تھا۔

داماں میری سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کہ وہ موتابہ پر کوئی عمل کر رہا ہے۔"

"یہ کیسا عمل ہے کہ ایک کمزور لڑکی کو ہمارے سامنے روندا جا رہا ہے؟"

اچانک میں نے دیکھا کہ چیخ چلاتی موتابہ کی آواز تھم گئی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اسی دوران میں لمبے بالوں والا منحوس صورت اس کے اوپر سے اٹھ گیا۔ اس کے بھدے ہونٹوں پر خون کی سرخی نظر آ رہی تھی۔ ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ موتابہ کے خون کی سرخی ہے۔ دیکھتے ہی

دیکھتے موتابہ کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی آنکھیں مکمل طور پر بند ہو گئیں۔

زریں گل پھنکار کر بولا "ہم کو تو لگتا ہے استاد صیب کہ یہ جادوگر کا بچہ اس کا سارا خون پی گیا ہے۔ دیکھیں وہ بالکل مردے کی طرح نظر آ رہی ہے۔"

"میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بے ہوش ہوئی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دو افراد آگے بڑھے۔ انہوں نے دراز قد موتابہ کو ہاتھوں پر اٹھایا اور قریب ہی واقع ایک دوسری کوٹھڑی میں لے گئے۔ وہ جب ہماری کوٹھڑی کے قریب سے گزرے تو میری نگاہ موتابہ کی گردن پر پڑی۔ اس کی گردن پر کاٹے جانے کا زخم صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

ہم میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا تاہم داماں کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ بات کسی نہ کسی حد تک اس کے پلے پڑ رہی ہے۔ دو چار منٹ بعد جوذام سردار سمیت چند افراد کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ لمبے بالوں والا شخص بھی ان میں شامل تھا۔ انہوں نے کوٹھڑی کی اچھی طرح تلاشی لی، خاص طور سے جہاں رات کو موتابہ لیٹی تھی وہاں سے چٹائی اٹھا کر اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ اس کے بعد ہم سے کچھ کہے سنے بغیر یہ لوگ باہر چلے گئے۔ ہاں وہ مقامی زبان میں بہت کچھ بڑبڑاتے رہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بوڑھے داماں نے کوٹھڑی کے ایک روزن سے منہ لگایا اور التجا آمیز لہجے میں جوذام سردار سے کچھ کہا۔

بعد میں داماں نے مجھے بتایا کہ اس نے پانی کے لیے کہا ہے۔ داماں کی درخواست کا مثبت اثر ہوا۔ چند منٹ بعد پہرے دار پانی لے کر آ گئے۔ پانی یہاں نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ سب ترسی ہوئی نظروں سے پانی کی صراحی کو دیکھ رہے تھے۔ فی کس چار چار گھونٹ پانی ناپ کر پیالوں میں ڈالا گیا اور ہمیں دیا گیا۔ میں نے اپنے حصے میں سے آدھا پانی پیا اور آدھا صفدر کے لیے رہنے دیا۔ زریں نے میری حرکت دیکھ لی تھی، اس نے بھی آدھا پانی بچا کر پیالے میں ڈال دیا۔ غزالہ نے اپنے حصے میں سے ایک دو گھونٹ اسقی کو دیے جو اس نے بغیر کسی شکریے اور "احساس" کے قبول کر لیے۔

اس پانی سے بمشکل ہمارے حلق ہی تر ہو سکے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ پانی کی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ دستیاب نہ ہو۔ میں نے داماں سے پوچھا "یہ لوگ کوٹھڑی میں کیا ڈھونڈتے پھر رہے تھے؟"

داماں نے ایک گہری سانس لی اور بولا "دراصل ان لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ موتابہ کچھ خاص صلاحیتوں کی مالک ہے چونکہ وہ لارسی بھی ہے اس لیے وہ اس سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔"

"پراسرار صلاحیتوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

داماں بولا "وہی طاقت جو تقریباً ہر لارسی میں ہوتی ہے، خاص خاص لارسیوں میں یہ طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے جیسے یہ موتابہ ہے۔"

"موتابہ کے بارے میں انہیں کیسے پتا چلا ہے؟"

داماں نے عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا "ان لوگوں کو شک ہے کہ رات کو جو کچھ ہوا اس کی ذمے دار موتابہ ہے۔ اس ہی کے کسی عمل کی وجہ سے رات کو قریبی جنگل میں سے بھیڑیے نکلے اور بستی پر حملہ آور ہوئے۔"

میں اور پروفیسر حیرانی سے داماں کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی آنکھوں میں اسرار کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "بھیڑیوں کا بستی پر حملہ آور ہونا ان لوگوں کے لیے انوکھا واقعہ ہے۔ اس حملے میں تین افراد مارے گئے ہیں اور درجنوں زخمی ہوئے ہیں۔ افراتفری میں آگ بھڑک اٹھی تھی جس سے بہت سا مالی نقصان ہوا ہے۔ مویشی جلے ہیں اور دو افراد زخمی بھی ہوئے ہیں۔"

"تت..... تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ ایسا موتابہ کی وجہ سے ہوا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ موتابہ عام نہیں خاص لڑکی ہے۔"

میری نگاہوں میں کل شام کا وہ منظر گھوم گیا جب ہم اس بستی سے دور کھوہ میں محصور تھے۔ آدم خور جنگلی کتوں نے کھوہ کو گھیر لیا تھا۔ اس وقت بھی داماں نے کہا تھا کہ موتابہ بہت خاص لڑکی ہے اور موجودہ صورت حال میں یہ ہماری مدد کر سکتی ہے اور پھر واقعی معمول سے ہٹ کر ایک بات ہوئی تھی۔ جنگلی کتوں نے کھوہ کے اندر گھس کر حملہ نہیں کیا تھا اور کچھ دیر بعد تتر بتر ہو گئے تھے۔ کیا واقعی موتابہ میں اس قسم کی صلاحیت موجود تھی کہ وہ انسانوں کے علاوہ جنگلی جانوروں کے ذہن پر اثر انداز ہو جاتی تھی؟

پروفیسر بھی داماں کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔

زریں بھی منہ پھاڑے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اسے انگریزی کا بس کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ ویسے بھی داماں کا انگریزی لب ولہجہ کافی مختلف تھا۔ پہلی مرتبہ سننے پر یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی افریقی زبان بول رہا ہے پھر دھیان دینے سے انکشاف ہوتا تھا کہ یہ تو "اچی" انگریزی ہے۔ پروفیسر نے داماں سے پوچھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے موتابہ کے ساتھ ان لوگوں نے کیا کیا ہے؟"

داماں کی پیشانی اور آنکھوں کے اردگرد کی جھریاں کچھ مزید گہری ہو گئیں۔ وہ پُرسوچ لہجے میں بولا "جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے جناب! موتابہ کو جوڈم سردار کے حکم پر طویل بے ہوشی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔"

"طویل بے ہوشی؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل جناب، یہ جو لمبے بالوں والا شخص آپ نے دیکھا ہے اس کا نام بوتارا ہے۔ یہ اس بستی کا جادوگر ہے اور علاج معالجہ بھی کرتا ہے۔ اس قسم کے ایک دو افراد یہاں کی ہر قبائلی بستی میں موجود ہوتے ہیں۔ بوتارا نے ہی آج صبح اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ رات کو بستی پر آنے والی آفت کی وجہ یہ لارسی لڑکی ہے اور میرے خیال میں اس نے درست نشان دہی کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ رات کو موتابہ مراقبے میں تھی اور بہت دیر تک کسی عمل میں معروف رہی تھی۔ ہم میں سے کئی سو گئے تھے مگر وہ جاگتی رہی تھی۔"

"ہاں اسے جاگتے ہوئے تو میں نے بھی دیکھا تھا۔" پروفیسر نے تائید کی۔

"اسی لیے آج صبح سویرے موتابہ کو یہاں سے نکالا گیا ہے۔ شاید یہ لوگ اسے جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے اس لیے بے ہوش کر دیا ہے۔ کسی بڑے سے بڑے عامل یا سحر کار کو بھی غفلت کی حالت میں پہنچا دیا جائے تو وہ بالکل عام انسان کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ کوٹھڑی سے نکالنے کے بعد موتابہ کو کچھ پلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ کوئی بے ہوشی کی دوا ہی رہی ہوگی۔ موتابہ نے پینے سے انکار کیا تھا لہٰذا بوتارا نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بوتارا کے کاٹنے سے موتابہ بے ہوش ہو گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے دیکھا ہوگا کہ موتابہ کو نیچے گرانے سے پہلے بوتارا نے اپنے منہ میں کچھ چبایا تھا۔ یہ ایک خاص پودے کی جڑ تھی اور یہی وہ دوا تھی جس نے موتابہ کو بے ہوش کیا۔ آپ اسے قبائلی طرز کا ٹیکا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس طریقے سے بہت سی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔ ٹیکے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ دوا براہ راست مریض کے خون میں داخل کر دی جائے۔ اس قبائلی طریقے سے بھی دوا براہ راست خون میں چلی جاتی ہے۔"

میں اور پروفیسر حیرانی سے داماں کی باتیں سن رہے تھے، خاص طور سے پروفیسر کی دلچسپی زیادہ تھی۔ وہ خود بھی ایک نامی گرامی معالج تھا۔ اس کا طریقہ علاج بھی عام ڈگر سے ہٹ کر تھا، پاکستان اور خاص طور سے لاہور میں ہزاروں ایسے افراد تھے جو اسے مسیحا کا درجہ دیتے تھے۔ پروفیسر نے داماں سے پوچھا "تم نے ابھی طویل بے ہوشی کا ذکر کیا ہے۔ کیا اس دوا کا اثر دیرپا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ بالکل خشک ریت میں اگنے والا ایک سخت کڑوا صحرائی پودا ہے اور بہت کم ملتا ہے۔ اس کی خاصیت وہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔ کوئی جانور بھی اسے کھا لے تو وہ کئی روز تک مسلسل بے ہوش یا نیم بے ہوش رہ سکتا ہے۔ موتابہ کے گردن کے زخم کی وجہ سے دوا اس کے اندر پہنچ چکی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ وہ جلد... ہوش میں نہیں آئے گی۔"

ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے اور اس پراسراریت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے جو اس تاریک جنگل کی ہر شے میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم سب کو زہریلے نیزوں کے کڑے پہرے میں کوٹھڑی سے باہر لے جایا گیا۔ پانی کی شدید قلت تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کی عیاشی تصور میں ہی نہیں آ سکتی تھی۔ ناشتا ہم نے کوٹھڑی سے باہر ہی کیا۔ ناشتے میں مکئی کی روٹی، شہد اور تھوڑا سا دودھ تھا۔ رات بھر حبس زدہ کوٹھڑی میں رہنے کے بعد کھلی ہوا میں آنا اچھا لگا۔ صفدر بھی زریں کا سہارا لے کر باہر آ گیا تھا۔ ہم سب کی طرح اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ بالکل زرد تھا اور سرخ ہونٹ سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ وہ بڑا ہمت والا تھا کہ اتنی جلدی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا، ورنہ چند روز پہلے تک اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور حال چال پوچھا۔ وہ بڑی نقاہت بھری آواز میں باتیں کرتا رہا۔ دو تین جملوں کے بعد ہی اس کا سانس پھول جاتا تھا۔ اس نے پچھلے چند روز بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کے عالم میں ہی گزارے تھے۔ وہ جنگل میں خاردار جھاڑیوں میں گرنے کے بعد بے ہوش ہوا تھا اور اس کے بعد کی بہت کم باتیں اسے یاد تھیں۔ موگاسا کی خون

ریزی کا ہنگامہ بھی اس نے جیسے خواب کے عالم میں دیکھا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ زریں نے اسے کندھے پر لاد رکھا تھا اور شعلوں کے درمیان سے دوڑتا ہوا جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف چیخ پکار تھی اور دستی بموں کے دھماکے تھے پھر اس نے خود کو ایک طویل سفر کے بعد کھوہ میں پایا تھا۔ یہاں چھت سے ٹارچ لٹک رہی تھی اور غزالہ اس پر جھکی ہوئی اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھی پھر اس نے کسی نام پر مجھے دیکھا تھا۔ میں نے اس کے سر کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا تھا اور پیالے سے پانی پلا رہا تھا۔ بس اس طرح ٹکڑوں میں بٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے مناظر صفدر کو یاد تھے۔ میں نے اپنی گفتگو کے ذریعے ان ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کی اور صفدر کو بتایا کہ ہم کن حالات سے گزر کر اس بستی تک پہنچے ہیں۔ میں نے صفدر کو غزالہ کی اس ہنگامی کوشش کے بارے میں بھی بتایا جس کے ذریعے طویل نوکیلے زہریلے کانٹے صفدر کے جسم سے نکلے اور اس کی طبیعت بہتر ہونا شروع ہوئی۔ بہر طور میں نے ایسی تمام باتیں صفدر سے چھپا لیں جو اس کی فکر مندی میں اضافہ کر سکتی تھیں۔ اس کی حالت ابھی ٹھیک نہیں تھی۔ اتنی سی گفتگو کر کے ہی وہ تھک سا گیا تھا اور بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

ایک سوال ایسا تھا جو ورد بن کر صفدر کے ہونٹوں سے چپکا ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں مچل رہا تھا اور اس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا مگر یہ سوال صفدر مجھ سے پوچھ نہیں رہا تھا۔ شاید وہ بھی جانتا تھا کہ اس سوال کو پوچھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس سوال کا جواب اسے نفی میں ملنا تھا۔ اس سوال کا تعلق ویرا سے تھا اور اس کے ملنے سے تھا۔ ہم دونوں ہی اس سوال کی تلخی اور مایوسی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ صفدر کی آنکھوں کی ویرانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سینے کے اندر کوئی آری چل رہی ہے۔ کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھ کر صفدر نڈھال ہو گیا۔ کہنے لگا "میں لیٹنا چاہتا ہوں۔"

داماں نے پہرے داروں سے بات کی اور زریں کے ساتھ مل کر صفدر کو واپس کوٹھڑی میں چھوڑ آیا۔ جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا، فضا میں رچی ہوئی خوشگوار خنکی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے بھی رات کو ہونے والی تباہ کاری کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ گول چھتوں والی جھونپڑیوں کی پوری ایک قطار جل کر سیاہ ہو گئی تھی۔ ان جھونپڑیوں کا بہت سا جلا ہوا ملبا کوئلے کے ڈھیر کی صورت دو بڑے بڑے درختوں کے نیچے پڑا تھا۔ یہاں چند جلے ہوئے گدھوں اور بکریوں کی لاشیں بھی تھیں۔ جوڈم افراد ان مردہ جانوروں کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر انہیں بستی سے دور لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دن کی روشنی میں بستی کا جائزہ لینے کے بعد ایک بار پھر ہمیں احساس ہوا کہ یہاں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو چند عورتیں نظر آئیں وہ بھی منہ سر ڈھانپے ہوئے تھیں۔ جو چیز جتنی کم یاب ہوتی ہے اسے اتنا ہی سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے۔

سورج جب اوپر آ گیا تو پہرے داروں نے ہمیں اٹھنے اور واپس گنبد نما کوٹھڑی میں گھسنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے کلثوم ہی کوٹھڑی میں داخل ہوئی تھی۔ ہم سب ابھی چند قدم پیچھے تھے۔ ایک دم اندر سے کلثوم کی چیخ سنائی دی، پھر وہ تیزی سے باہر نکلی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا "کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"صفدر ۔۔ زخمی ۔۔ ہاتھ ۔۔" اس نے کہا۔

میں تیزی سے اندر داخل ہوا۔ صفدر نیم دراز تھا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر چلے آئے تھے۔ اس کا بایاں ہاتھ زخمی تھا۔ دو انگلیوں کے ناخنوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا پتھر صفدر کے پاس ہی پڑا تھا "یہ کیا ہوا صفدر؟" میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کچھ نہیں بولا، بس گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ صفدر نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی پشت پر پتھر سے ضربیں لگائی ہیں اور اسے لہولہان کر لیا ہے۔

"تم نے کیوں کیا ایسا؟" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

وہ ایک دم میرے گلے سے لگ گیا۔ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ بڑی جاں گسل کوشش تھی۔ مجھے اپنے کندھے پر نمی کا احساس ہوا۔ آنکھوں کے بند توڑ کر آنسو میرے کندھے پر لڑھک گئے تھے۔ ایک بار پھر مجھے اس بے پناہ غم کا احساس ہوا جو ویرا کے حوالے سے صفدر کے دل میں موجود تھا۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا، اس کی سرخ آنکھیں اشک بار تھیں۔

"تم نے ہاتھ زخمی کیوں کیا؟"

"اپنا دھیان ہٹانے کے لیے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا "شاید جسم کی تکلیف اندر کے دکھ کو ہلکا کر دے۔"

"تم بڑے حوصلے والے ہو صفدر! مجھے تم سے بڑی

امیدیں ہیں۔ مجھے بھروسا ہے کہ تم سینے پر غم کا پہاڑ لے کر بھی مسکرا سکتے ہو۔"

"میں۔۔۔ کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کے اعتماد پر پورا اتروں مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ تکلیف' یہ اذیت میرے بس سے باہر ہو جائے گی۔ خدا۔۔۔ کبھی کبھی ہم جیسے کمزور انسانوں کو اس قدر کیوں آزماتا ہے؟ کیوں ایسا بھاری غم دیتا ہے کہ جسے سنبھالا جا سکتا ہے نہ اٹھایا جا سکتا ہے اور نہ پھینکا جا سکتا ہے۔"

"آزمائش اسی کو تو کہتے ہیں۔"

"یہ آزمائش ہے یا موت ہے۔" وہ بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا "اس نے میرے ساتھ کیوں کیا ہے ایسا۔۔۔ کیوں اتنا بڑا دکھ دے گئی ہے مجھ کو۔ کیا دنیا کی سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ لبھاتی ہیں' پیار بڑھاتی ہیں' زندگی بن جاتی ہیں اور پھر ایک ہی جھٹکے سے سارے رشتے ناتے توڑ کر نہ ختم ہونے والی جدائی دے جاتی ہیں۔ کسی قربانی یا کسی مجبوری کی آڑ لے کر ایک الگ دنیا بسا لیتی ہیں اور کسی کے دل میں۔۔۔ اپنی یادوں کے تیر توڑ کر تمام عمر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ کیوں کرتی ہیں ایسا؟ کیوں زندگیوں کو موت سے بدتر کر دینے والے سنگین کھیل کھیلتی ہیں؟"

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں صفدر۔ وہ ایسی نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے لاپتا ہونے میں کوئی بھید ہے اور اگر وہ خود بھی گئی ہے تو اس کے پیچھے کوئی اٹل مجبوری ہوگی۔ وہ آئے گی۔ ضرور واپس آئے گی۔"

"وہ نہیں آئے گی۔" صفدر نے بے پناہ کرب سے کہا "مجھے اس کے خط سے اس کے پختہ ارادے کا پتا چل گیا ہے۔ وہ ہر رشتہ ہمیشہ کے لیے توڑ گئی ہے۔"

صفدر کی ذہنی حالت ابھی تک پوری طرح نارمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ کسی وقت بہک سا جاتا تھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی نارمل نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ تھی۔ یہ دھندلاہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کی نگاہ پر زہر کا اثر ابھی باقی ہے۔

مجھے اور صفدر کو باتیں کرتے دیکھ کر باقی ساتھی باہر ہی رک گئے تھے اور ایک طرح سے انہوں نے اچھا ہی کیا تھا۔ یوں صفدر کو کھل کر بات کرنے کا موقع ملا تھا اور اس کے دل کا بوجھ بھی قدرے ہلکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باقی افراد بھی اندر آ گئے۔ غزالہ کو دیکھ کر صفدر نے زخمی ہاتھ کپڑے کے نیچے چھپا لیا مگر غزالہ کی تیز نگاہی نے اس کی حرکت دیکھ لی۔ اس نے صفدر کا ہاتھ کپڑے کے نیچے سے برآمد کیا اور منہ سے "چچ چچ" کی آواز نکال کر صفدر کو پیار سے ڈانٹا' پھر اس کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔

صفدر نے زریں کو اشارے سے بلایا اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی سی تیرنے لگی تھی۔ "بہت شکریہ زریں! تم نے میری خاطر بڑا خطرہ مول لیا' آگ میں گھس کر مجھے نکالا۔"

"صیدر بھائی! تم نے شکریہ بولا تو ام کو لگا جیسے امارا گردن پر مکا مار دیا' شکریے کا لفظ تو غیروں کے لیے ہوتا ہے۔ کاش اس رات امارا اور کلثوم کا جان بھی آپ کے کام آ جاتا۔"

"کلثوم سے پوچھے بغیر اسے درمیان میں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

میں چاہتا تھا کہ صفدر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئے مگر مسکراہٹ کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

زریں گل نے کہا "ام کلثوم کو درمیان میں اس لیے گھسیٹ رہا ہے کہ جب ام نے صیدر بھائی کو اسپتال میں سے نکالا تو اس وقت کلثوم بھی امارے ساتھ تھا۔ اس نے ایک حرامی گارڈ کے سر پر لوہے کا ڈنڈا مار کر اسے گرایا تھا' اگر گارڈ کو نیچے نہ گراتا تو ام کبھی بھی صیدر بھائی کو وہاں سے نکال نہ سکتا۔"

صفدر نے نقاہت سے کہا "اب میرا دل چاہتا ہے کہ کلثوم کا بھی شکریہ ادا کروں لیکن تم بھی برا مان جاؤ گے اس لیے خاموش ہی رہتا ہوں۔"

"آپ کے اس مکالمے پر ام کو محمد علی اور زیبا بھابی کا ایک فلم کا سین یاد آ گیا ہے۔" زریں نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے کہا "جب ملک الموت تمہیں اپنی شکل دکھائے گا اس وقت بھی تمہیں کسی فلم کا سین ہی یاد آئے گا۔ منکر نکیر کو بھی تم کسی انڈین فلم کی اسٹوری میں الجھا دو گے' حشر کے دن بھی قبر سے اٹھ کر تم سب سے پہلے یہی پوچھو گے کہ کون سے سنیما میں کون سی فلم لگی ہے۔"

میں صفدر کے چہرے پر مسکراہٹ لانا چاہتا تھا مگر لگتا تھا کہ اب وہ زندگی میں کبھی مسکرائے گا نہیں۔

غزالہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھے بلا رہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا۔ وہ کوٹھڑی کے ہو سوراخوں سے آنکھیں لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی باہر جھانکا۔ کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر ایک دیوار کے سائے میں پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا رنگین بنچی نشست پر بیٹھا تھا۔ نشست کرسی سے ملتی جلتی تھی۔ لڑکے نے صرف ایک

پین رکھا تھا۔ اس کے جسم پر جلنے کے نشانات تھے۔ ایک ٹانگ ایک بازو اور سینے کا تین چوتھائی حصہ بری طرح متاثر نظر آتا تھا۔ بظاہر لڑکا پرسکون دکھائی دیتا تھا۔ دو ملازم صورت افراد لڑکے کو کھجور کے بنے ہوئے دو بڑے بڑے پنکھوں سے ہوا دے رہے تھے۔ لڑکے کے زخموں پر کوئی سفید دوا بھی لگائی گئی تھی۔

غزالہ نے پوچھا "آپ جانتے ہیں' یہ لڑکا کون ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بستی کے معزز طبقے سے ہوگا۔ بڑی شان سے بیٹھا ہوا ہے۔"

غزالہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "مجھے ڈر ہے کہ یہ بچے گا نہیں۔"

میں چونک کر غزالہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی "اس کے جسم کا کافی حصہ جل چکا ہے اور بعض جگہ یہ گہرائی تک جلا ہوا ہے۔ جلے ہوئے مریض کی حالت شروع میں زیادہ بری نہیں ہوتی مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے' زہر پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔"

میں غزالہ کی قابلیت کا معترف تھا۔ اگر اس نے یہ بات کہی تھی تو سوچ سمجھ کر ہی کی تھی۔ یہ بات میرے علم میں بھی تھی کہ جلا ہوا مریض شروع میں زیادہ تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ اسی دوران میں داماں بھی وہاں آ کھڑا ہوا۔ میں نے داماں سے پوچھا "اس لڑکے کے بارے میں جانتے ہو؟"

داماں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا "بستی میں عورتوں کی کمی کے باوجود جوذم سردار کی دو بیویاں ہیں۔ یہ اس کی پہلی بیوی کا منجھلا لڑکا ہے۔ یہ رات کو لگنے والی آگ میں زخمی ہوا ہے۔"

غزالہ نے داماں سے کہا "اس کے باپ کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ لڑکے کا فوری علاج معالجہ کرائے۔ ہو سکے تو اسے کسی اسپتال تک پہنچائے' ورنہ ایک دو دن تک یہ لڑکا بہت تنگ ہو جائے گا۔"

داماں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ غزالہ نے اسے سمجھایا کہ لڑکے کے سینے سمیت اس کے جسم کا کافی حصہ جل چکا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ جانتی ہے کہ فی الوقت ٹھیک نظر آنے والا یہ لڑکا کل تک چارپائی سے لگ جائے گا۔

خبر نہیں کہ داماں نے غزالہ کی بات پر یقین کیا یا نہیں بہرحال میرے اور غزالہ کے کہنے پر داماں نے ایک پہرے دار کو روزنوں کے قریب بلایا اور جو کچھ غزالہ نے کہا تھا وہ اس تک پہنچا دیا۔ ادھیڑ عمر پہرے دار غور سے سنتا رہا بہرحال ہماری بات سننے کے بعد بھی اس کے چہرے پر کسی طرح کی فکرمندی نمودار نہیں ہوئی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے داماں کی بات کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی۔ تاہم اس نے داماں سے وعدہ کیا کہ وہ یہ ساری بات لڑکے کی والدہ اور جوذم سردار تک پہنچا دے گا۔

غزالہ کے علاوہ پروفیسر نے بھی لڑکے کو روزنوں میں سے دیکھا۔ اس نے بھی یہی خیال ظاہر کیا کہ لڑکا آگ سے ٹھیک ٹھاک متاثر ہوا ہے۔

پہرے داروں نے روزنوں میں سے لڑکیوں کو گھورنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا بلکہ گزرنے والے وقت کے ساتھ اس میں شدت آتی جا رہی تھی۔ ہمارے اندر یہ احساس بتدریج بڑھ رہا تھا کہ اس قبیلے کی حراست میں آنے کے بعد ہماری ساتھی خواتین شدید خطرے سے دوچار ہو گئی ہیں۔ مونا۔ کو یہاں سے لے جایا جا چکا تھا اور اس کا بھی ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔

دوپہر کو ہمیں پھر تھوڑا تھوڑا پانی پلایا گیا۔ یہ گنبد نما چھت والی کوٹھڑیاں جھونپڑوں کی نسبت کافی ٹھنڈی تھیں' پھر بھی آگ برساتے سورج کے سامنے یہ کہاں تک ٹھنڈی رہ سکتی تھیں۔ دوپہر کے وقت پسینہ دھاروں کی صورت بہنے لگا۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمیں دستی پنکھے فراہم کر دیے گئے۔ دوپہر کے بعد ایک گیم تحیم عمر رسیدہ حبشی کوٹھڑی کے باہر پہنچا۔ اس نے ہمارے مترجم داماں کو کوٹھڑی سے باہر نکالا اور اس سے بات چیت میں مصروف ہو گیا۔ دیکھنے میں تو اس کا انداز اور لب و لہجہ دوستانہ ہی نظر آتا تھا۔ داماں پریشان انداز سے بار بار اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد یہ گفتگو ختم ہوئی اور داماں واپس کوٹھڑی میں پہنچا۔

بوڑھے داماں کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا؟"

"کیا ہوا؟" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

داماں نے مجھ سے کہا "میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کوٹھڑی میں علیحدہ "کانفرنس روم" کہاں سے مہیا ہو سکتا تھا۔ ہم ایک گوشے میں چلے گئے اور قریب قریب بیٹھ کر سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ داماں نے رل گرفتہ آواز میں کہا "جوذم سردار کی نیت آپ کی ساتھی لڑکیوں پر خراب ہو چکی ہے۔ فی الوقت اس نے جو مطالبہ کیا ہے وہ ایک لڑکی کے بارے میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

بوڑھے واماں کا چہرہ کچھ اور بھی بوڑھا نظر آنے لگا۔ وہ بولا "مجھے اپنی بدبخت زبان سے ایک نہایت ناگوار بات نکالنا پڑ رہی ہے۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" اس کی زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔

میں نے کہا "تم مکمل کر کہو، میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ کا ان مس صاحبہ سے کیا تعلق ہے؟" واماں نے غزالہ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ۔۔۔ میری منگیتر ہے۔" میں نے مختصر جواب دینا مناسب سمجھا۔

"اس بدبخت سردار نے کہا ہے کہ آج رات وہ مس صاحبہ کو۔۔۔" واماں کوشش کے باوجود بات مکمل نہیں کر سکا۔

میری انگلیوں کی پوروں میں وہی سنسناہٹ دوڑ گئی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر کے مرنے مارنے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ ہمارے لیے کوئی بہت پُرخطر لمحہ آنے والا ہے۔

واماں نے لرزتے ہاتھ سے میری طرف ایک باریک چوڑی بڑھا دی۔ یہ چوڑی سونے کی بنی ہوئی تھی۔ وہ بولا "جوڈم سردار جس عورت کو عارضی طور پر اپنی بیوی بناتا ہے یہ چوڑی اس کو پہنائی جاتی ہے۔ جب تک وہ عورت سردار کی بیوی رہتی ہے، کوئی اس کی طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس جہنمی سردار نے یہ چوڑی مس صاحبہ کے لیے بھجوائی ہے۔ میرے منہ میں خاک، ہو سکتا ہے کہ کل تک دوسری لڑکیوں کے لیے بھی ایسی ہی چوڑیاں آ جائیں۔ یہ لوگ۔۔۔ ٹلنے والے نہیں ہیں، میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

میں نے باریک سی اس چوڑی کو توڑ موڑ کر روزن سے باہر پھینک دیا۔ پہرے دار حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے واماں سے کہا "ان سے کہہ دو کہ یہ چوڑی جا کر اپنے سردار کے نتھنوں میں گھسیڑ دیں۔"

واماں بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس نے میری ترجمانی نہیں کی۔ بہرحال پہرے داروں کو اندازہ ہو گیا کہ میں کس قدر "خوش" ہوں اور ان کے سردار کے لیے کس قدر "خیر سگالی" کا اظہار کر رہا ہوں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد تین مسلح افراد اندر آئے اور مجھے کوٹھڑی سے باہر چلنے کا حکم دیا۔ غزالہ، شائستہ، کلثوم اور صفدر کو کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ انہیں اس پیغام کی خبر نہیں تھی جو جوڈم سردار نے بھجوایا تھا۔ انہیں جوڈمیوں کی خصلت کا کچھ علم تھا۔ مسلح افراد مجھے لے جانے لگے تو غزالہ اور شائستہ وغیرہ پریشان ہو گئیں۔ نے انہیں تسلی دی اور پہرے داروں کے ساتھ باہر آ پہرے داروں نے واماں کو بھی ساتھ لے لیا۔

دن بھر کی گرمی اب سہ پہر کے سایوں میں ڈھل تھی، انسان ہی نہیں، جانور بھی گرمی اور پیاس سے ہلکان آ گئے تھے۔ کچھ جلے ہوئے مکانات کے درمیان سے گزا مسلح پہرے دار ہمیں ایک اور کوٹھڑی میں لے آئے۔ کوٹھڑی کی دیواریں زیادہ موٹی تھیں جس کے سبب یہ ٹھنڈی تھی۔ ویسے بھی یہ ہوادار تھی اور اندر سے آرام دہ بھی بنایا گیا تھا۔ یہاں بہت سی انسانی اور ج ہڈیاں، کھوپڑیاں اور چمڑے پر لکھی ہوئی پُراسرار تحریریں آ رہی تھیں۔ ایک طرف شیشے کے دو بڑے بڑے جار کوئی محلول تھا اور جڑی بوٹیاں رکھی تھیں۔ 'بستی کا ساحر' تکیے سے ٹیک لگائے چٹائی پر بیٹھا تھا۔ یہ لمبے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص تھا جس نے آج صبح عجیب طریقے سے ہمیں بے ہوش کیا تھا اور رات کسی نامعلوم مقام پر پہنچایا تھا۔ کا نام بوتارا معلوم ہوا تھا۔

ساحر نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہم دونوں کے نرمی اور محبت سے پیش آیا۔ بہرحال اس کا لہجہ اٹل اور کُن تھا۔ اس نے واماں کے ذریعے مجھ سے کہا "تم حرکت کی ہے وہ تمہارے لیے بہت خطرناک ہو سکتی تھی۔ تم لوگ چونکہ اس قبیلے کے رسم و رواج سے آگاہ نہیں لہٰذا محترم سردار نے درگزر کیا ہے۔ سردار کی دی ہوئی چ کسی بھی عورت کے لیے ایک مقدس اعزاز کی حیثیت ہے۔"

"ہم سردار پر اور اس کے اعزاز پر ایک ہزار بار بھیجتے ہیں۔" میں نے کہا۔

واماں نے ان الفاظ کا یقیناً نرم ترجمہ کر کے ساحر پہنچایا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص کرختگی نظر نہیں آ وہ بولا "لیکن تم یہ بات مت بھولو کہ یہاں تم قیدی ہو۔ وہی کچھ کرنا ہوگا جو سردار چاہے گا اور ہم چاہیں گے۔ چاہیں بزورِ بازو حاصل کر سکتے ہیں مگر ہم طاقت استعمال نہیں کرنا چاہتے۔"

"جو کچھ تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہو گا۔"

"شاید تم لوگوں کے ذہن میں کچھ غلط فہمیاں بھی ہیں۔" ساحر بولا "بدخواہوں نے ہمارے بارے میں کچھ

حقیقت باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس عورت کے ساتھ جوڈم مرد جسمانی تعلق قائم کر لیتا ہے وہ زندہ نہیں رہتی یا پھر وہ بیمار ہو جاتی ہے یا پاگل ہو جاتی ہے۔ یہ بالکل من گھڑت باتیں ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم لوگ اگر کسی عورت کے ساتھ سوتے ہیں تو اسے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ مرتی ہے نہ پاگل ہوتی ہے۔ کیا تم اپنی عورتوں کو ہمارے لیے وقف کرو گے؟"

ساحر کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ وہ بولا "تم پھر بھول رہے ہو کہ تم قیدی ہو۔ تمہیں زیر کر کے یہاں لایا گیا ہے۔"

"بہت خوب۔۔۔ زیر کر کے لایا گیا ہے! چار سو آدمی گیارہ بندوں کو گھیر کر پکڑ لیں تو اسے زیر کرنا کہتے ہیں۔ تمہارے قبیلے میں اگر دلیری اور جواں مردی یہی ہے تو پھر بزدلی اور کمینگی کے لیے دوسرے الفاظ ڈھونڈنا پڑیں گے۔"

اسی دوران میں کوٹھڑی کا نیم وا دروازہ کھلا اور لمبا تڑنگا جوڈم سردار جتس نیس اندر داخل ہو گیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے اور واماں کو اندازہ ہوا کہ وہ دروازے کی اوٹ سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھا جیسے نگاہوں میں مجھے تول رہا ہو۔ اس کے منڈے ہوئے سر پر پسینہ چمک رہا تھا اور چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔

اس کی بات کا ترجمہ کرنے سے پہلے ہی واماں کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ بولا "سردار کا کہنا ہے کہ آپ نے اپنی اوقات سے بڑھ کر بات کی ہے۔ آپ کو آپ کی بات کا بھرپور جواب دیا جائے گا۔ آپ کو پہلے زیر کیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ سے آپ کی ساتھی خاتون کا ہاتھ مانگا جائے گا۔"

"کون کرے گا مجھے زیر؟" میں نے پوچھا۔

جوڈم سردار نے واماں کی وساطت سے جواب دیا "میں خود کروں گا۔ تم اپنے ہاتھ پاؤں کو آج کا دن استعمال کر لو کیونکہ اس کے بعد یہ تمہارے استعمال کے قابل نہیں رہیں گے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ جوڈم سردار مجھے کھلی زور آزمائی کا چیلنج کر رہا ہے اور ایسی بات وہی کرتا ہے جسے خود پر بے پناہ اعتماد ہوتا ہے۔ وہ کرخت مزاج لگتا تھا اور جسمانی طور پر بھی پہاڑ کا پہاڑ تھا۔ ایسے مدمقابل کو دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سا سنسنی آمیز جوش بھر جاتا تھا۔ جوڈم سردار کی بات سن کر بھی ایسا ہی ہوا۔ دل سے دعا نکلی کہ میرا مدمقابل نہ صرف اپنے ارادے پر قائم رہے بلکہ وہ ایک اچھا مدمقابل بھی ثابت ہو۔ ایسا مدمقابل جسے ٹکراتے ہوئے میرا خون پسینہ ایک ہو جائے اور دن میں تارے نظر آنے لگیں۔ شاید ایک اچھے مدمقابل کی بھوک میرے اندر کافی عرصے سے پروان چڑھ رہی تھی۔ جب خون آشام شکر شکرا مدمقابل ہوتا تھا تو گاہے گاہے اس بھوک کے مٹنے کا اہتمام ہوتا رہتا تھا لیکن اب کافی عرصے سے شکر سے بھی ٹاکرا نہیں ہوا۔ میں نے جوڈم سردار کو نگاہوں میں تولا اور بدن میں دوڑتی ہوئی سنسنی کی لہریں اور بھی بلند ہو گئیں۔ اس سے پہلے کہ جوڈم سردار اس حوالے سے مزید کوئی بات کرتا، گنجے سر والا ایک گول مٹول سا جوڈم اندر داخل ہوا۔ اس نے بڑے احترام سے جھک کر سردار کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ سردار نے ایک گہری سانس لی اور مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے بستی کا ساحر بھی اپنے لمبے بالوں کو سمیٹ کر باہر نکل گیا۔

پہرے دار نیزوں کے گھیرے میں ہمیں کوٹھڑی کی طرف واپس لے آئے۔ راستے میں، میں نے دیکھا کہ کچھ ننگ دھڑنگ جوڈم شکاری جنگل سے شکار کے بعد واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک نیل گائے اور دو ہرن لمبے بانسوں پر لٹکا رکھے تھے۔ یہ بانس انہوں نے کندھوں پر رکھے ہوئے تھے اور قطار کی صورت بستی کے وسطی حصے کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے منہ تیزی سے چل رہے تھے جیسے وہ چیونگم چبا رہے ہوں لیکن یہ چیونگم نہیں تھی۔ یہ چائے کی خشک پتی تھی۔ اس پتی کو یہاں منہ میں چبانے کا رواج تھا۔ پتی میں کسی پودے کے خشک بیج بھی ملائے جاتے تھے۔ یہ مسالا ان لوگوں کو چاق چوبند رکھتا تھا۔

ہم کوٹھڑی میں واپس پہنچے تو چار پانچ پہرے دار روزنوں سے اندر جھانکنے میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہوس اور چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں تھیں۔ خوب صورت عورت واقعی ان لوگوں کے لیے ایک عجوبہ تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو سب بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ حقیقت حال کسی کو معلوم نہیں تھی لیکن ماتھے سب کے ٹھنک چکے تھے۔

وہ رات جیسے تیسے گزری۔ شب بھر قریبی جنگل سے درندوں کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ یہ آوازیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ غزالہ میرے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی، ہمارے درمیان [illegible] تھا۔ جنگل سے ابھرنے والی آوازوں نے غزالہ کو کچھ اور نزدیک سمٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے تسلی آمیز

انداز میں غزالہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بھی چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ہاتھ رات بھر میرے ہاتھ میں رہا۔ وہ جنگلی جانوروں سے خوف زدہ تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس بستی میں بھی دو ٹانگوں والے بے شمار جنگلی درندے موجود ہیں اور ان میں سے ہی ایک درندہ اس پر بھی اپنے دانت تیز کر رہا ہے۔ اپنے نکیلے پنجوں کے ساتھ اس کے نازک جسم پر حملہ آور ہونے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اس رات نیم غنودگی کے عالم میں میرا ذہن کئی سمتوں میں بھٹکتا رہا۔ اشوکا کی موت کا منظر ذہن کو کچوکے لگاتا رہا اور میں موت کے گمبھیر سایوں کو اپنے آس پاس محسوس کرتا رہا۔ موگاسا کی لڑائی کا وہ کایا پلٹ منظر بھی بار بار نگاہوں میں آیا جب نرست کے گارڈز اچانک عبادت گاہ کی چھت پر نظر آئے تھے۔ ان کی یہ کارروائی ابھی تک ایک معما تھی۔ کنگ کی اچانک بیماری بھی سوچ کا محور بنی رہی۔

صبح سویرے بوجھل طبیعت کے ساتھ میں اٹھ گیا۔

شائستہ زریں گل سے پوچھ رہی تھی کہ یہ لوگ (یعنی جوذم) اتنی بھوکی نظروں سے ہماری طرف کیوں دیکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ پہلی بار عورتوں کو دیکھ رہے ہیں۔ زریں گل نے جواب میں ایک انگریزی فلم کا تذکرہ کردیا اور بات دوسری طرف نکل گئی۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ خواتین کو صورت حال کی اصل سنگینی کا پتا چلے۔ واماں ایک گوشے میں گم صم بیٹھا تھا اور پہلے سے زیادہ بوڑھا نظر آرہا تھا۔ اسے بجا طور پر یہ اندیشہ لاحق تھا کہ آج کسی وقت کلثوم اور شائستہ کے لیے بھی چوڑیوں کا منحوس تحفہ آجائے گا۔ ویسی ہی ایک ایک باریک چوڑی جیسی کل غزالہ کے نام سے آئی تھی۔

دوپہر سے تھوڑی دیر بعد دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ جس طرح بھوکے کو چاند بھی روٹی نظر آتا ہے' ہمیں بھی ہر آہٹ پر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے لیے پانی آیا ہے۔ گلے خشک ہو چکے تھے اور گرمی کی شدت کے باوجود پسینہ آنا بند ہوگیا تھا۔ میں اور زریں اپنے حصے کے پانی میں سے دو دو گھونٹ منصور کے لیے وقف کر رہے تھے۔ منصور کو اس کارروائی کی بھنک تک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ دروازہ کھلا اور نیزہ برداروں کے علاوہ دو افراد اندر آگئے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر مرد تھا' دوسری عورت تھی۔ عورت کی عمر چالیس سال سے اوپر ہی رہی ہوگی۔ سیاہ فام عورتوں کی طرح اس کی ناک اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی تھی۔ جسم فربہ اور بھدا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق اس نے جسم ایک بڑی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا اور چہرے کا زیادہ حصہ بھی پردے میں تھا۔ یہ عورت سخت پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے واماں کے ذریعے ہم سے پوچھا "تم میں سے وہ عورت کون ہے جس نے کل صبح میرے بیٹے کے علاج معالجے کا مشورہ دیا تھا؟"

عورت کے اس مختصر سے فقرے نے ہمیں سمجھا دیا کہ یہ اس لڑکے کی والدہ ہے جس کے بارے میں غزالہ نے کل صبح اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ عورت کی پریشانی سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ غزالہ کی بات درست ثابت ہوئی ہے اور آگ سے متاثر ہونے والے لڑکے کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ بوڑھے واماں نے پہلے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر اس نے غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوذم عورت کو بتایا کہ وہ لڑکی یہ ہے۔

عورت نے غزالہ سے پوچھا "کیا تم علاج کرتی ہو؟"

غزالہ نے اثبات میں جواب دیا۔

عورت کا لہجہ قدرے نرم ہوگیا۔ اس نے واماں کے ذریعے غزالہ سے کہا "میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم میرے بچے کو دیکھو۔"

غزالہ نے پہلے تو جانے سے انکار کیا' پھر وہ اس شرط پر رضامند ہوگئی کہ میں اس کے ساتھ جاؤں گا اور زخمی لڑکے کو دیکھنے کے بعد ہم واپس اسی کوٹھڑی میں آجائیں گے۔ عورت نے آمادگی ظاہر کی۔ اس نے پہرے داروں کو یہ ہدایت بھی کی کہ ہمارے پانی کے کوٹے میں تھوڑا سا اضافہ کردیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد میں اور غزالہ پہرے داروں کے گھیرے میں کوٹھڑی سے نکلے اور عورت کے ساتھ چل دیے۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ دھوپ سے گھبرا کر اپنی گنبد نما کوٹھڑیوں میں دبک جانے والے لوگ اب باہر نکل آئے تھے اور بستی کی گلیوں میں چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ جوذم مرد رک رک کر اور گھوم گھوم کر غزالہ کو دیکھتے تھے اور ان کی آنکھوں سے ہوس کی رال ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ غزالہ نے اپنا سراپا چادر میں چھپا رکھا تھا' پھر بھی وہ یقیناً نگاہوں سے چھدی جا رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں سرخ انگارا سلاخ ہو جس سے میں دو چار سو آنکھیں پھوڑ کر رکھ دوں۔

ہم گول چھت والی ایک کشادہ رہائش گاہ کے سامنے پہنچے۔

اچانک فربہ اندام عورت نے اپنا ہاتھ کلیجے پر رکھ لیا اور اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ رہائش گاہ کے اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ ایک مقامی طرز کی

چارپائی پر وہی لڑکا موجود تھا جسے کل ہم نے اپنی کوٹھڑی سے باہر دیکھا تھا۔ لڑکے کے سارے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ خاصی تکلیف میں نظر آتا تھا۔ اس کی پتلیاں الٹ گئی تھیں اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ چارپائی کے اردگرد کم و بیش ایک درجن عورتیں موجود تھیں۔ ان سب عورتوں نے حسب رواج اپنے چہرے چادروں میں چھپا رکھے تھے' صرف ان کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ لڑکے کی تشویش ناک حالت کے پیش نظر ان عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کردیا تھا۔ لڑکے کی فربہ اندام والدہ بھی اندر داخل ہوتے ہی لڑکے سے لپٹ گئی اور واویلا شروع کردیا۔

ایک ادھیڑ عمر سوکھا سڑا شخص آگے بڑھا۔ یہ مقامی معالج تھا۔ اس نے پہلے لڑکے کے منہ میں ایک سیال ٹپکانے کی ناکام کوشش کی' اس کے بعد وہ پیچھے ہٹ کر منہ میں اناپ شناپ پڑھنے لگا۔ اس کے قریب ہی لوہے کی ایک بالٹی رکھی تھی۔ اس میں سبز رنگ کی ایک لعاب دار دوا تھی۔ وہ ایک بڑے چمچ میں یہ دوا لے کر مریض لڑکے کی پٹیوں پر ٹپکانے لگا۔

غزالہ جھنجلا کر بولی "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں اس لڑکے کے ساتھ۔۔۔ اگر اس نے بچنا ہے تو بھی نہیں بچے گا۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ان بے وقوفوں نے اس کا سارا جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے زخم تو چند گھنٹوں میں گل سڑ جائیں گے۔ اس کے جسم کو کھلا رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"یہ لوگ ہماری بات سمجھ نہیں پائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمانی کے لیے واماں کو بلا لینا چاہیے۔"

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں فربہ اندام عورت کو بتایا کہ بوڑھے واماں کو یہاں بلایا جائے۔ ہم آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

فربہ اندام عورت نے ایک ملازمہ کو دوڑایا۔ چند ہی منٹ بعد پسینے میں بھیگا ہوا واماں ہمارے روبرو تھا۔ غزالہ نے واماں کے ذریعے فربہ اندام عورت سے کہا "آپ کے بیٹے کے لیے یہ پٹیاں وغیرہ سخت خطرناک ہیں' یہ اتروا دیجیے۔ اس کے بعد میں سوچتی ہوں کہ اس کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔"

جب فربہ اندام عورت نے بات ادھیڑ عمر معالج تک پہنچائی تو وہ تیز تیز لہجے میں کچھ بولنے لگا۔ واماں نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا "معالج سخت خفا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ زخموں کو ہوا لگ جائے گی اور بد روحوں کے خبیث اثرات ان زخموں سے چمٹ جائیں گے۔"

غزالہ نے فربہ اندام عورت سے کہا "میں اس قسم کے مریضوں کا علاج کرچکی ہوں' میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ پٹیاں وغیرہ آپ کے بیٹے کو شدید نقصان پہنچائیں گی۔ آپ انہیں جتنی جلدی اتار دیں' بہتر ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"

دو تین منٹ تک ادھیڑ عمر معالج اور فربہ اندام عورت میں بحث ہوئی۔ فربہ اندام عورت کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آرہا تھا۔ اس نے واماں کے ذریعے غزالہ سے مخاطب ہو کر کہا "اے مہربان لڑکی! کیا تجھے یقین ہے کہ یہ پٹیاں اتار دینے سے میرا بچہ ٹھیک ہوجائے گا؟"

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ تم لوگوں نے کافی وقت ضائع کردیا ہے۔ بہرحال اس امر کا

مجھے پختہ یقین ہے کہ لڑکے کے جسم کو ہوا لگے گی اور اس کے زخموں کی صفائی ہوگی تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔"

میں نے غزالہ سے کہا "تم نے جتنا کہہ دیا ہے' یہی بہت ہے۔ ہمیں زیادہ ذمے داری نہیں لینا چاہیے۔"

غزالہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد فربہ اندام عورت نے وہاں موجود خواتین کو باہر جانے کے لیے کہا۔ ادھیڑ عمر معالج بھی بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ فربہ اندام عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے غزالہ سے کچھ کہا۔ غزالہ آگے بڑھی اور اس نے لڑکے کی بدبودار پٹیاں اس کے جسم سے اتارنا شروع کردیں۔ میں بھی غزالہ کا ساتھ دینے لگا۔ بیشتر جگہوں سے پٹیوں کے ساتھ ہی مریض کی کھال بھی اس کے جسم سے اتر گئی اور نیچے سے سرخ سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ گرمی اور دوا کی وجہ سے لڑکے کے زخم بڑی تیزی سے بگڑ رہے تھے۔

میں اور غزالہ قریباً دو گھنٹے تک لڑکے کے ساتھ مسلسل مصروف رہے۔ غزالہ کی ہدایت پر ملازمین نے نیم کے پتے وغیرہ ڈال کر دو بالٹی پانی ابالا۔ غزالہ نے اس پانی کی مدد سے بڑی جاں فشانی کے ساتھ لڑکے کے زخموں کو دھویا اور خشک کیا۔ معالج نے کوٹھڑی کے سب کھڑکیاں دروازے بند کروا رکھے تھے' غزالہ نے یہ سب کچھ کھلوا دیا۔

غزالہ کے خوب صورت چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس ساری کارروائی کے دوران میں بہت کچھ سوچ بھی رہی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "نتوڑ کے زخم "سیپ ٹک" ہو رہے ہیں بلکہ ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے بہترین اینٹی بایوٹک دوا کی ضرورت ہے۔"

"اور دوا کے بارے میں یہاں صرف سوچا ہی جاسکتا ہے۔"

"شاید آپ کو معلوم نہ ہو' چاندی ایک زبردست قسم کی جراثیم کش دھات ہے۔ ایلوپیتھی میں اکثر بہترین قسم کی اینٹی بایوٹک دواؤں میں SILVER کی آمیزش ہوتی ہے۔ ایک کتاب میں' میں نے پڑھا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں جب دواؤں کی شدید کمی تھی تو فوج کے بعض سینئر ڈاکٹر جلے ہوئے مریضوں کے لیے اپنے طور پر اینٹی بایوٹک دوا میں تیار کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے خالص چاندی کو پتھر کے کسی پیالے وغیرہ میں گھسا جاتا تھا' پھر اس میں دودھ اور ہلدی وغیرہ کی آمیزش سے دوا تیار کی جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ چند اشیا تو ہمیں یہاں سے بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔"

"تم دوا تیار کرنا چاہتی ہو؟"

"مجھے پورا یقین ہے کہ یہ دوا اس لیس دار سیال سے تو بہتر ہوگی جو یہ نیم حکیم زخموں پر استعمال کر رہا تھا۔"

مشورے کے بعد ہم نے یہ بات داماں کے ذریعے فربہ اندام عورت تک پہنچا دی۔ فربہ اندام عورت کا نام روبا تھا۔ وہ جوذم سردار کی پہلی بیوی تھی۔ بستی میں اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بیٹے کی نازک حالت نے اسے باؤلا سا کر رکھا تھا۔ سردار کی توجہ اب روبا کی طرف نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ یہ لڑکا روبا کو اپنی زندگی کا واحد سہارا نظر آتا تھا۔ وہ اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

کئی گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد غزالہ نے ایک ایسا آئنٹ منٹ تیار کر لیا جس کا جزو خاص چاندی تھا۔ اس کام میں میرے علاوہ روبا کے دو تین ملازمین نے بھی غزالہ کی مدد کی تھی۔ دوسری طرف دوا دیز عمر معالج جو اس سے پہلے لڑکے کا علاج کر رہا تھا' سخت بھنایا ہوا تھا۔ اس نے پوری بستی میں پراپیگنڈا کیا تھا اور کہا تھا کہ سفید چمڑی والی لڑکی نے سخت بے وقوفی کی ہے اور بچے کی جان شدید خطرے میں ڈال دی ہے۔ ایک طرح سے اب یہ ایک نازک مسئلہ بن گیا تھا۔ ے نہ چاہتے ہوئے بھی ہم پر لڑکے کے علاج کی بھاری اری آ گئی تھی۔ گو غزالہ نے لڑکے کی والدہ سے پہلے تھا کہ لڑکے کی حالت ٹھیک نہیں' پھر بھی بہت سی اب غزالہ پر جم گئی تھیں۔

یعنی لڑکے کے پورے جسم پر دوا مل دی تھی۔ ستر پوشی کے لیے لڑکے کے جسم پر ململ کی باریک سی چادر ڈال دی گئی تھی۔ دو ہٹے کٹے سیاہ فام ملازمین مسلسل ان ڈوریوں کو حرکت دے رہے تھے جن کے ذریعے چھت پر موجود ایک بہت بڑا پنکھا حرکت میں آتا تھا۔ اس قسم کا پنکھا ہمیں بس اس بستی کی اسی کوٹھڑی میں نظر آیا تھا۔

غزالہ ایک لمحہ سوئے بغیر ساری رات مریض لڑکے کے سرہانے بیٹھی رہی' میں اور داماں بھی وہیں موجود رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہم دونوں نے سو لیا مگر غزالہ نے اونگھ کر بھی نہیں دیکھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اپنے مریض کے ساتھ غزالہ کی عجیب قسم کی ایسوسی ایشن ہو جاتی ہے۔ وہ اسے اپنا مسئلہ بنا لیتی ہے اور اس کے سوا باقی سب کچھ بھول جاتی ہے۔ میں نے کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے لگائے کہا "غزالہ! کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ میں بھی ایک مریض بن جاؤں۔ بالکل پکا مریض۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اپنے مریض پر بہت توجہ دیتی ہو نا۔"

"میری توجہ کے لیے آپ کو مریض بننے کی ضرورت نہیں۔" اس کے لبوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ تھی۔

"پھر کیا بننے کی ضرورت ہے؟"

"آپ کو سب کچھ حاصل ہے۔ میری توجہ بھی۔"

"کوئی ثبوت؟ کوئی گواہی؟"

"اچھا آپ ذرا جا کر تابی کو دیکھ آئیں' کہیں رو نہ رہا ہو۔" اس نے موضوع بدلا۔

"کبھی جی چاہتا ہے کہ بچہ بن جاؤں۔ تابی کی طرح کیونکہ مریضوں کے بعد دوسرے نمبر پہ تمہاری توجہ کے مستحق بچے ٹھہرتے ہیں۔"

"بچے نہیں۔ بس ایک بچہ تابی۔"

"کبھی کبھی تو تابی سے بھی رقابت محسوس کرنے لگتا ہوں حالانکہ اس سے بہت پیار بھی کرتا ہوں۔"

"رقابت کیوں؟"

"لگتا ہے کہ اس نے محبت بانٹ لی ہے۔ وہ محبت جو پہلے ہی بہت تھوڑی سی تھی۔"

"آپ کی دونوں باتیں غلط ہیں اور دوسری بات زیادہ غلط ہے۔"

"کیا مطلب۔ محبت تھوڑی نہیں تھی؟"

"آپ نے تو سچ مچ بچہ بننے کی کوشش شروع کر دی۔ برائے مہربانی ذرا جا کر تابی کو دیکھ آئیے۔"

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے کہا اور باہر چلا آیا۔

میں جان بوجھ کر غزالہ سے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ شدید قسم کی ٹینشن غزالہ پر اثر انداز ہو جو اس وقت ماحول میں پائی جاتی تھی۔ غزالہ ابھی تک اس بات سے بالکل بے خبر تھی کہ جوذم سردار کی طرف سے اسے منحوس چوڑی کا تحفہ بھیجا گیا ہے اور کسی بھی وقت اس تحفے کے عوض غزالہ کو ہم سے مانگا جا سکتا ہے۔ میرے اور غزالہ کے درمیان یہ ساری گفتگو چونکہ اردو میں ہوئی تھی لہٰذا داماں قریب ہونے کے باوجود بے خبر رہا تھا۔

میں اپنی کوٹھڑی میں پہنچا تو صبح کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ کوٹھڑی کے پہرے دار رات بھر جاگنے کے بعد اب کچھ سست نظر آ رہے تھے۔ میں اندر پہنچا' تابی بڑے مزے سے کلثوم سے چمٹ کر سویا ہوا تھا۔ انتھی بھی محو خواب تھا۔ صفدر کوٹھڑی کی نیم پختہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور پروفیسر اسے پیالے سے پانی پلا رہا تھا۔ میں نے صفدر کی خیر خیریت دریافت کی۔ اس دوران میں میری نگاہ ایک طرف رکھے بوری نما تھیلے پر پڑی۔ اس میں کچھ وزنی اشیا موجود تھیں۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

پروفیسر نے مجھے اشارے سے خاموش کر دیا۔ کچھ دیر بعد جب صفدر پانی پی کر لیٹ گیا تو پروفیسر نے مجھے تھیلا کھولنے کا اشارہ کیا۔ تھیلے میں سے کچھ فولادی اشیا برآمد ہوئیں۔ ان اشیا کو جنگی ساز و سامان کا حصہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ ایک سینہ بند تھا۔ ایک آہنی خود تھا۔ لوہے کے دو خول تھے جو کلائیوں سے کہنیوں تک بازو کو ڈھانپ لیتے تھے۔ ایسے ہی دو خول پنڈلیوں کے لیے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے سرگوشی میں پروفیسر سے پوچھا۔

"پرسوں جوذم سردار نے تم سے کسی مقابلے وغیرہ کی بات کی تھی؟" پروفیسر نے الٹا مجھ سے سوال پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ پرسوں جب سونے کی چوڑی موصول ہونے کے بعد میں اور داماں ساحر کی طرف گئے تھے' وہاں سردار...... بھی آ گیا تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر مجھے مقابلے کی دعوت دی تھی۔

پروفیسر بولا "یہ اشیا اسی سلسلے میں تمہیں دی گئی ہیں۔" "تمہیں سمجھا نہیں؟"

"رات کوئی نو دس بجے سردار خود یہاں آیا تھا۔ اس نے پہلے تمہارے بارے میں پوچھا پھر یہ تھیلا میری طرف پھینک دیا۔ وہ خاصا برہم نظر آتا تھا' اشاروں کی زبان میں اس نے یہی بتایا کہ مقابلے کی تیاری کر لی جائے۔"

میرے دل میں ایک امید سی تھی کہ شاید غزالہ سردار کے بیٹے کو بچانے کے لیے جو تگ و دو کر رہی ہے اس کے صلے میں سردار کے شیطانی ارادے میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے مگر یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد بوڑھا داماں بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پہرے داروں سے اس تھیلے کے ساز و سامان کے بارے میں پوچھے۔

میری ہدایت پر داماں نے ادھیڑ عمر پہرے دار سے چند منٹ گفتگو کی پھر مجھے تفصیل بتاتے ہوئے بولا "لگتا ہے جناب کہ جوذم سردار نے پرسوں والی بات اپنے دل سے لگا رکھی ہے۔ اس نے آپ کو پیغام بھجوایا ہے کہ آج سہ پہر کے بعد بستی کے میدان میں ڈھلوان کے پاس آپ سے اس کا دوبدو مقابلہ ہوگا۔ جو اس مقابلے میں جیتے گا وہ اپنی بات منوانے کا حق دار ہوگا۔"

"ہار جیت کا فیصلہ کیسے ہوگا؟"

ایک دم داماں کا چہرہ بجھ سا گیا' وہ بولا "جو بھی اپنے حریف کو پہلا زخم لگا لے گا وہ جیت جائے گا۔ اس قسم کے مقابلوں کے لیے جوذم قبیلے میں یہی اصول رائج ہے۔"

"پہلا زخم؟"

"جی ہاں' اس قسم کے مقابلوں میں پہلا زخم ہی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ دراصل یہ لڑائی جس ہتھیار سے لڑی جاتی ہے وہ زہر میں بجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ زہر اس علاقے کے نایاب اور خطرناک ترین خاکستری بچھو سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں اس بچھو کو جس نام سے پکارا جاتا ہے انگریزی میں اس کا ترجمہ آپ "پانچ سانس" کر سکتے ہیں۔ اس سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس بچھو کا کاٹا ہوا زیادہ سے زیادہ چار پانچ سانسیں لیتا ہے۔"

میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ ایک بار پھر میرا دھیان تھیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ سینہ بند اور دوسرا سامان کس لیے ہے؟"

"یہ سردار نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔" داماں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "مقابلے میں آپ کو یہ حفاظتی چیزیں استعمال کرنا ہوں گی۔ یہ آپ کی طرف اس لیے بھیجی گئی ہیں کہ آپ پہن کر ان کا سائز دیکھ لیں۔"

پروفیسر اور داماں پریشان نظر آ رہے تھے مگر میرے سینے میں ہلکا ہلکا جوش لہریں لینے لگا تھا۔ جس طرح موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے' اسی طرح میرے اور صفدر کے لیے بھی

اس طرح کے خطرے اور اس طرح کی بیماریاں غذا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ہماری روح ایسے حالات سے جلا پاتی تھی اور دل و دماغ کی "اوور ہالنگ" ہوتی تھی۔ اس دوران میں اچانک صفدر نے کروٹ بدلی اور اس کا رخ ہماری جانب ہوگیا۔ ہم نے اپنی گفتگو کو بریک لگا دیے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ صفدر کو موجودہ حالات کی بھنک پڑے۔ اسے مکمل آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں داماں کے ساتھ سردار کی بیوی روہا کی کوٹھڑی کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی ہم کوٹھڑی سے چند قدم دور تھے کہ اندر سے رونے کی آواز آئی۔ ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ اگر روہا کے بیٹے کو کچھ ہوگیا تھا تو پھر ہمارے خوفناک مسائل میں گوناگوں اضافہ ہونے والا تھا۔ میں اور داماں تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ غزالہ مریض لڑکے کے سرہانے موجود تھی اور چمچ سے اسے پانی پلا رہی تھی۔ اس کی ماں روہا رو تو رہی تھی مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔ شاید خوشی کے موقع پر اس طرح رونا بھی یہاں کے رسم و رواج میں شامل تھا۔

غزالہ نے بتایا کہ لڑکے کی حالت کافی بہتر ہے۔ اس نے نہ صرف آنکھیں کھولی ہیں بلکہ ماں سے ایک دو باتیں بھی کی ہیں۔ ایک رات میں ہی لڑکے کے زخم پہلے سے اچھے نظر آنے لگے تھے۔ اس کی صحت کے حوالے سے دیگر علامات بھی درست تھیں۔ روہا نے جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر غزالہ کا سر چوما اور خبر نہیں کیا کچھ بولنے لگی۔ غزالہ اردو میں بولی "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے شاہ جہاں! یہ عورت اتنی خوشی کا اظہار کر رہی ہے مگر لڑکے کی حالت ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں۔ صحیح صورت حال تو شام تک ہی سامنے آسکے گی۔"

"شام بھی خیر کی خبر ہی لائے گی۔ تم اپنا کام جاری رکھو، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

"بس اس کمرے میں زیادہ لوگوں کو نہیں آنا چاہیے۔ اگر کسی نے آنا بھی ہو تو وہ جوتا وغیرہ اتار کر آئے۔ اسپرٹ تو میرے پاس موجود ہے لیکن اس کے علاوہ صاف ابلا ہوا پانی بھی درکار ہے۔"

میں نے داماں کے ذریعے غزالہ کی بات لڑکے کی والدہ تک پہنچا دی۔

غزالہ کچھ دیر بعد لڑکے کی والدہ روہا کے ساتھ مل کر لڑکے کو مرہم لگانے میں مصروف ہوگئی۔ میں داماں کے ساتھ باہر آگیا۔ میں داماں سے روہا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ داماں نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ روہا جوڈم سردار زے کی پہلی بیوی ہے۔ اب رنگین مزاج سردار چونکہ دوسری عورتوں میں مشغول رہتا ہے لہٰذا پہلی بیوی کے ساتھ اس کے تعلقات درست نہیں رہے۔ بستی کے لوگ سردار زے کی عزت تو کرتے ہیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ روہا کو بھی ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ روہا کے لیے جو خطاب استعمال کیا جاتا ہے اس کا لفظی مطلب ماں ہی ہے۔ میں نے داماں سے کہا "تمہارا کیا خیال ہے، یہ عورت ہماری کوئی مدد کر سکتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ سردار غزالہ کو بری نظر سے دیکھ رہا ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس عورت کی وجہ سے وہ باز آجائے؟"

"آپ نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔" داماں نے کہا "یہ عورت آپ دونوں کی بہت شکر گزار نظر آرہی ہے۔ خاص طور سے آپ کی منگیتر کے لیے اس کے دل میں بڑی عزت پیدا ہوگئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو صورت حال بتائی جائے اور چوڑی والی بات سے آگاہ کیا جائے تو یہ ہمارے لیے کوشش کرے۔"

"تو ٹھیک ہے، تم ایک دو گھنٹے کے اندر موقع دیکھ کر اس سے بات کرلو۔ زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ سردار اس سلسلے میں بہت جلدی میں محسوس ہوتا ہے۔"

"ہاں میں نے بھی وہ سینہ بند اور خود وغیرہ دیکھا ہے جو اس نے آپ کے لیے ارسال کیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس قسم کی لڑائی وہ آپ سے لڑنا چاہ رہا ہے اس میں اس کو کمال مہارت حاصل ہے۔ اس علاقے میں بہت دور دور تک کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو اس طرز کی لڑائی میں سردار زے کا مقابلہ کر سکے۔"

"مجھے مقابلہ کرنے پر تو کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے لیکن اگر اس آزمائش کے بغیر ہی یہ معاملہ سدھر جائے تو بہتر ہے۔"

میرے کہنے پر بوڑھے داماں نے روہا نامی اس عورت سے بات کی۔ پندرہ بیس منٹ بعد داماں نے واپس آکر بتایا کہ روہا نے اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے بلکہ اس نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر میرے بیٹے کی جان بچ گئی تو میں تم لوگوں کے لیے مزید سہولتیں بھی حاصل کروں گی۔

اس بات کے قریباً ایک گھنٹے بعد جوڈم سردار اپنی پہلی بیوی کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت جوان چیتا بھی تھا۔ یہ پالتو تھا۔ سردار ایک خوب صورت زنجیر کی مدد سے اسے یوں اپنے ساتھ لیے چلا آرہا تھا جیسے وہ پالتو کتا ہو۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ بالکل نوجوان چیتا تھا اور سردار زے اس سے بہت محبت رکھتا تھا) چیتے کو باہر ہی دو گرانڈیل ملازموں کی تحویل میں چھوڑ کر سردار اندر رہائش گاہ میں چلا گیا۔ میں اور داماں رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر درختوں کی اوٹ میں بیٹھے تھے، سردار یا اس کے ساتھیوں نے ہمیں دیکھا نہیں۔ دو چار منٹ بعد رہائش گاہ کے اندر سے تیز لہجے میں باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ سردار اور سردارنی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ان کی آواز بلند ہوتی چلی گئی پھر سردار بھنایا ہوا سا کوٹھڑی سے نکلا اور اپنے پالتو چیتے اور ملازمین کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بستی کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور داماں اپنی کوٹھڑی میں واپس پہنچے تو وہ تھیلا وہاں موجود نہیں تھا جس میں سینہ بند، خود اور دیگر سامان مجھے ارسال کیا گیا تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا "وہ سامان کدھر گیا؟"

وہ بولا "ابھی ایک پہرے دار آیا تھا، اٹھا کر لے گیا ہے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ لمبا تڑنگا سردار زے بہت تمتمایا ہوا ہماری کوٹھڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ ایک ملازم کے ہاتھ میں وہی تھیلا تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی یہاں سے لے کر گیا تھا۔ سردار زے نے ملازم کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور سامان سمیت گھما کر میرے سینے پر دے مارا۔ اندر سے مختلف اشیا نکل کر زمین پر بکھر گئیں۔ یہ ساری وہی اشیا تھیں جو میں اس سے پہلے دیکھ چکا تھا۔ آہنی خود، سینہ بند، لیگ گارڈ وغیرہ۔ سردار نے میری طرف انگلی اٹھائی اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ اس کی بکواس ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن اندازہ یہی تھا کہ وہ مقابلے کی اور غزالہ کی بات کر رہا ہے۔ وہ اپنی کالی زبان سے یقیناً یہی کہہ رہا تھا کہ وہ غزالہ کو چھوڑے گا نہیں اور اگر میں اسے روکنا چاہتا ہوں تو پھر مجھے مقابلہ کرنا ہوگا۔

ابھی سردار زے کی تلخ کلامی جاری ہی تھی کہ فربہ اندام روہا تیزی سے کوٹھڑی کی طرف آتی دکھائی دی۔ سردار اور اس کی بیوی کے درمیان ہمارے سامنے ہی تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ دونوں ہاتھ نچا نچا کر باتیں کر رہے تھے پھر لمبے بالوں والا ساحر بونارا بھی موقع پر پہنچ گیا۔ وہ لڑتے جھگڑتے میاں بیوی کو اپنے ساتھ ایک قریبی جھونپڑے میں لے گیا۔ غالباً بونارا یہی چاہتا ہوگا کہ میاں بیوی تنہائی میں کھل کر دل کی بھڑاس نکال لیں۔ جھونپڑے کے اندر ہونے والے یہ مذاکرات کم و بیش ایک گھنٹا جاری رہے۔ اس دوران میں دو تین مزید معزز صورتوں والے افراد بھی جھونپڑے میں داخل ہوئے اور باہر نکلے۔ آخر سردار زے اور اس کی فربہ اندام بیوی کی صورت بھی نظر آگئی۔ دونوں بدستور بول رہے تھے لیکن اب ان کی آوازوں میں تندی تیزی نہیں تھی، چہرے کے تاثرات بھی نارمل تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ طے ہوگیا ہے۔

دوپہر کے وقت سردار زے کا ایک کارندہ آیا اور وہ تھیلا اٹھا کر لے گیا جو اس سے پہلے روہا کا بھیجا ہوا آدمی اٹھا کر لے گیا تھا۔ داماں نے پرمسرت لہجے میں مجھے بتایا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ سردار اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہوگیا ہے جو اس نے آپ کی منگیتر کے حوالے سے کیا تھا۔

"لیکن میری منگیتر کے علاوہ بھی تو یہاں کچھ لڑکیاں موجود ہیں؟"

"وہ تو شاید ابھی تک خطرے میں ہی ہوں گی۔" داماں کا چہرہ پھر بجھ سا گیا۔

"تم نے روہا سے باقی لڑکیوں کے بارے میں بات نہیں کی تھی؟"

"میں نے ذکر تو کیا تھا لیکن روہا نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی ساری توجہ اپنے بچے کی طرف ہے اور اس حوالے سے آپ کی منگیتر کی طرف ہے۔ آپ کی منگیتر نے جس جاں فشانی سے لڑکے کا علاج کیا ہے اور اب بھی کر رہی ہیں اس نے روہا کو بہت متاثر کیا ہے اور میرے خیال میں اس علاج سے بھی اہم وہ رسک تھا جو ڈاکٹر صاحب نے مقامی معالج کی پٹیاں وغیرہ اتار کر لیا۔ اگر لڑکے کو کچھ ہو جاتا تو وہ معالج تو آپ سب کے لیے طوفان کھڑا کر دیتا۔"

شام کے وقت گانوتا ای اس لڑکے کی طبیعت پھر خراب ہوگئی، تاہم غزالہ کی مسلسل کوشش سے جلد ہی وہ سنبھل گیا۔ غزالہ نے یہ رات بھی لڑکے کے سرہانے بیٹھ کر گزار دی۔ تابی غزالہ کے لیے مسلسل بے چین ہو رہا تھا، روہا کی اجازت سے غزالہ تابی کو بھی اپنے پاس لے آئی۔ ہمارا پانی کا کوٹا بڑھا دیا گیا تھا، اس کے علاوہ ایک ایک کر کے ہمیں کوٹھڑی سے باہر گھومنے پھرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ یقیناً اس قسم کی سہولتیں ہمیں روہا کی بدولت ہی حاصل ہوئی تھیں۔ سخت گرمی کے باوجود کلثوم اور شائستہ نے کوٹھڑی سے باہر نکلنے والی سہولت استعمال نہیں کی تھی۔ باہر نکلنا تو درکنار، وہ خود کو کوٹھڑی کے اندر بھی محفوظ تصور نہیں کرتی

تھیں۔ پہرے دار آتے جاتے انہیں کھا جانے والی نظروں سے گھورتے تھے۔ مجھے کلثوم اور شائستہ سے بھی زیادہ فکر موتابہ کی تھی۔ اسے ان جوڈمز کی تحویل میں اب پانچ چھ دن ہونے کو آئے تھے۔ پتا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔ موتابہ نے اب تک ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔ اس کی پوشیدہ ذہنی صلاحیتوں سے انکار کرنا آسان نہیں تھا۔ پچھلے چند دنوں میں ہم اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کی چند جھلکیاں دیکھ چکے تھے۔ اس آخری رات کا منظر ابھی تک میرے ذہن میں تازہ تھا جب وہ کوٹھڑی کے اندر مراقبے کی حالت میں بیٹھی تھی اور پسینہ اس کے سیاہ جسم سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا اور پھر اس مراقبے کا عجیب و غریب نتیجہ نکلا تھا۔ جوڈمز کی اس بستی میں شہلکہ بچ گیا تھا۔ ان لوگوں کی قسمت نے ساتھ دیا تھا ورنہ شاید پوری بستی نذرِ آتش ہو جاتی۔ قریبی جنگل سے بھیڑیوں کا نکل کر بستی میں گھس آنا بستی والوں کے لیے ایک انوکھا اور وحشت ناک تجربہ تھا۔ بعد ازاں اسی واقعے کی پاداش میں موتابہ کو ہم سے جدا کر دیا گیا تھا۔

میں نے داماں کے ذریعے اس سلسلے میں روبا سے بات کی۔ میں نے روبا (سردار کی پہلی بیوی) کو موتابہ کے حوالے سے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ روبا بولی "تم لوگ بالکل بے فکر رہو، اس لڑکی کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں آج دوپہر خود اسے دیکھ آئی ہوں۔ وہ بڑے سکون سے سو رہی ہے اور اگر تمہارے دل میں یہ اندیشہ ہے کہ کوئی اسے نقصان پہنچائے گا تو یہ اندیشہ بھی ذہن سے نکال دو۔ وہ ایک ساحرہ ہے۔ اوپر سے لارسی بھی ہے۔ کوئی جوڈم مرد اسے بری نگاہ سے دیکھ کر اپنا انجام خراب کرنا نہیں چاہے گا۔ یہ تو شیطانی قوتوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔"

"لیکن اسے علیحدہ کیوں رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ معمولی لڑکی نہیں ہے۔ وہ لارسی ہونے کے علاوہ عامل بھی ہے۔ ہماری بستی کو اس سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ساحر بوتارا کی ہدایت پر اسے خواب آور دوا دی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن مسلسل نیند کی حالت میں ہے۔ وہ جب تک اسی حالت میں رہے گی، ہمیں کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔"

داماں نے کہا "محترم خاتون! آج سردار صاحب کا ایک کارندہ مجھ سے بھی پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ شاید سردار حضور کو مجھ پر بھی کسی طرح کا شک ہو گیا ہے۔"

روبا بولی "ہو گیا تھا مگر اب رفع ہو گیا ہے۔ دراصل تم پر لارسی ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا اور تم جانتے ہی ہو کہ لارسیوں کے بارے میں یہاں کتنا خوف پایا جاتا ہے۔ لوگ ان کے عملیات سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ بات بھی مشہور ہے کہ سانپ اور لارسی کی آنکھوں میں نہیں دیکھنا چاہیے ورنہ انسان سحرزدہ ہو جاتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بات درست نہیں۔" میں نے کہا "میں نے جھیل زار اور موگاسا میں سیکڑوں لارسیوں کو نرسلیوں کے ہاتھوں سے تہ تیغ ہوتے دیکھا ہے۔"

"جنگ کی بات اور ہوتی ہے۔" روبا نے کہا پھر وہ ذرا توقف سے بولی "کیا تم لوگ ان باتوں کو مانتے ہو؟"

"کن باتوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"یہی جادو... سحر... آسیب اور وہ ان دیکھی چیزیں جو رات کے اندھیرے میں ہمارے آس پاس موجود رہتی ہیں۔"

"کچھ کچھ۔"

"کیا تم ان اچھی اور بری روحوں کو بھی مانتے ہو جو جنگلوں میں بھٹکتی ہیں اور پورے چاند کی راتوں میں بستیوں کے گرد منڈلانے لگتی ہیں؟"

"میں ایسی روحوں کے بارے میں پہلی بار سن رہا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کے لہجے میں کہا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی "ایسی روحیں موجود ہوتی ہیں اور وہ روحیں جو نیک ہوتی ہیں ہماری التجائیں اور درخواستیں سنتی ہیں اور دیوتاؤں تک پہنچاتی ہیں۔ شرط یہی ہے کہ یہ التجائیں دل کی گہرائی سے کی جائیں۔ میں نے بھی کل رات دل کی گہرائیوں سے رو رو کر التجا کی تھی کہ میرا بچہ موت کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ یہ میری زندگی کا واحد سہارا ہے۔ دیوتاؤں نے روحوں کے ذریعے سے میری یہ بات سن لی اور اس خوب صورت لڑکی کو میرے لیے "رحمت" بنا کر بھیجا جسے تم لوگ ڈاکٹر کہتے ہو۔ ہاں، وہ پتا نہیں کتنی دور سے میرے لیے رحمت بن کر آئی ہے۔"

میرے اشارے پر داماں نے روبا سے پوچھا "محترم خاتون! کیا وہ لڑکی اب محفوظ رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ سردار زنے یا کوئی اور پھر سے اس کا مطالبہ تو نہیں کرے گا؟"

"اے عمر رسیدہ شخص! کیا تجھے میرے قول پر بھروسا نہیں ہے؟" روبا نے ذرا برہم ہو کر کہا۔

"نہیں محترم خاتون! میں شک کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں نے تو بس یونہی پوچھ لیا تھا۔"

وہ بولی "شک کرنے والے لوگ مجھے بالکل اچھے نہیں

لگتے۔ اس خوب صورت لڑکی کے بارے میں، میں نے جو کہہ دیا ہے، وہ کہہ دیا ہے۔ وہ دس سال بھی یہاں رہے تو بالکل محفوظ رہے گی۔ وہ میری امان میں ہے اور میری امان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پوری بستی کی ماں کی پناہ میں ہے۔"

رات تک لڑکے گانو کی حالت مزید بہتر ہو گئی۔ غزالہ بھی اب مطمئن تھی۔ میرا ایک بازو ابھی تک زخمی تھا، یہاں استی نے خوں خوار کتے کی طرح درجنوں مرتبہ اپنے دانت آزمائے تھے۔ کئی جگہ سے کھال ہی ادھڑ گئی تھی۔ چونکہ کوئی مناسب دوا نہیں مل سکی تھی لہٰذا زخم ابھی تک کچے تھے۔ غزالہ نے جو اینٹی بایوٹک دوا لڑکے گانو پر آزمائی تھی، وہی میرے بازو پر بھی لگا رکھی۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ یہ دوا جلے ہوئے جسم پر ہی زیادہ کار آمد ہے۔ لڑکے کی بہتر حالت کے پیش نظر غزالہ نے یہ رات اپنے ساتھیوں کے درمیان گزارنے کا فیصلہ کیا۔ داماں سمیت ہم اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گئے۔

حسب معمول رات بھر قریبی جنگل سے درندوں کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ میرے اور غزالہ کے درمیان تابی تھا۔ غزالہ نے اپنا ہاتھ تابی کے سینے پر رکھ دیا تھا، میں نے اپنا ہاتھ غزالہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ صرف ہاتھ کا تعلق تھا مگر بڑا خوشگوار تھا۔ یہ تعلق نہایت سنگین حالات کے سمندر میں ایک خوشگوار جزیرے کی طرح تھا۔ غزالہ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے حوالے سے پچھلے دو چار دن میں کیا کھینچا تانی ہوئی ہے۔ میں نے غزالہ کو کچھ نہیں بتایا تھا اور داماں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ غزالہ کے کانوں میں جوڈم سردار کے واہیات مطالبے کی بھنک تک نہ پہنچے۔

رات دیر تک نیند میری آنکھوں سے دور رہی۔ غزالہ کی سانسوں کی مدھم آہٹ بتانے لگی کہ وہ سو گئی ہے مگر میں جاگتا رہا۔ غزالہ کے ہاتھ کے لمس اور اس کی قربت کو پوری شدت اور محبت کے ساتھ محسوس کرتا رہا، پھر میرا ذہن سوچ کے گھوڑے دوڑاتا ہوا کسی اور طرف نکل گیا۔ مسٹر جی کلارک اور مرد عجب سائیں عالی کی صورتیں ذہن میں ابھریں، پھر موگاسا کی لڑائی کے خونچکاں مناظر پردہ تصور پر تھرتھرانے لگے۔ اشوکا کی موت کا منظر نگاہوں کے سامنے آیا، نرسلیوں کی وحشیانہ یلغار، لارسیوں کی دم توڑتی ہوئی مزاحمت، جنگ کی دم بدم بدلتی ہوئی صورت حال، سب کچھ ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین سوال پھر شدت سے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ وہ کیا وجہ تھی کہ استی کی جان کی پروا کیے بغیر کنگ براؤن نے موگاسا پر وحشیانہ حملہ کروا دیا؟ دل کے اندر سے بار بار یہی آواز آتی تھی کہ یہ سب کچھ کسی بڑی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ ایسی غلط فہمی جو پیدا ہوئی تھی یا جان بوجھ کر پیدا کی گئی تھی۔ اگر جان بوجھ کر پیدا کی گئی تھی تو پھر کس نے کی تھی۔ کیا سردار دانے کی صفوں میں ہی کوئی کالی بھیڑ موجود تھی؟

مجھ سے دس بارہ فٹ کی دوری پر شیطان زادہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سویا پڑا تھا۔ اس کی سرکشی پچھلے چار پانچ روز میں خاصی حد تک کم ہو گئی تھی۔ درحقیقت اس کی طبیعت کا زیادہ زور تو لاروتابے نے ہی توڑ دیا تھا۔ کی بوکو کے مناسب استعمال سے اس نے ماسٹر استی کو لاچار کر دیا تھا۔ اب لاروتابے والا کردار زریں گل ادا کر رہا تھا۔ جونہی استی میں بغاوت یا سرکشی کے آثار نمودار ہوتے تھے، زریں لال لال آنکھیں نکال کر اسے دیکھتا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں خبر نہیں کیا کچھ بڑبڑا کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ استی کہیں جوڈم پہرے داروں کے سامنے کوئی باغیانہ حرکت نہ کر ڈالے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو پہرے داروں کے ہاتھ ضرور کھٹک جاتے۔ ابھی تک تو وہ استی کو ہمارا "ساتھی" سمجھ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ زبردستی کا "ساتھی" ہے۔ یعنی جس طرح ہم جوڈمز کی قید میں ہیں، یہ شیطو نگڑا ہماری قید میں ہے۔ میں نے زریں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہر وقت استی پر نگاہ رکھے۔

اگلے روز شام تک روبا کے بیٹے گانو کی حالت مزید سنبھل گئی۔ داماں نے ہمیں بتایا کہ روبا نے ہم سب کو شام کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ ایک طرح سے یہ اس کے بیٹے کا جشن صحت یابی ہے۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی پہرے دار ہمیں لینے کے لیے آ گئے۔ صفدر، پروفیسر اور استی کو ہم نے کوٹھڑی میں ہی رہنے دیا۔ شائستہ بھی جانے کو تیار نہیں تھی مگر جب غزالہ نے کلثوم کو چلنے پر آمادہ کر لیا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستی کے بیچوں بیچ سے گزر کر ہم پہاڑی ڈھلوان کی طرف آ گئے۔ راستے میں ہم نے جوڈمز افراد کو دیکھا وہ اپنے جلے ہوئے مکانات کی مرمت وغیرہ کر رہے تھے۔ ایک دو جگہ گول چھتوں والی نئی کوٹھڑیاں بھی تعمیر کی جا رہی تھیں۔ پہاڑی ڈھلوان پر ایک ہموار جگہ تلاش کی گئی تھی اور وہاں ایک بڑا سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ شامیانے کے نیچے چٹائیاں بچھی تھیں اور کھانا وغیرہ پکایا جا رہا تھا۔ روبا اپنے بیمار بیٹے کو بھی یہاں کھلی ہوا میں لے آئی تھی۔ وہ ایک طرف نرم بستر پر گاؤ تکیہ لگائے لیٹا تھا اور ڈوبتے سورج کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ

ملازم اسے مسلسل پنکھا جھلنے میں مصروف تھے۔

شامیانے کے نیچے پندرہ بیس مہمان موجود تھے۔ یہ سب سیاہ فام جوذام تھے۔ ان میں دو پردہ پوش عورتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ یہاں عورتوں کی قلت تھی تاہم میں نے دیکھا تھا کہ جو عورتیں بھی تھیں' جسمانی لحاظ سے دلکش اور تنک سک سے درست تھیں۔ ان میں ناز و ادا کی جھلک تھی اور اٹھنے بیٹھنے میں وہ بڑی نزاکت اور نسوانی رکھ رکھاؤ سے کام لیتی تھیں۔ غالباً انہیں بھی احساس تھا کہ وہ ان ویرانوں میں ایک نایاب جنس کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آنے کو تو غزالہ اور شائستہ وغیرہ ہمارے ساتھ آگئی تھیں مگر اب مردوں کی گرم نگاہ سے گھبرائی ہوئی تھیں۔ پرتپش نگاہیں ہر طرف سے انہیں زچ کر رہی تھیں۔ انہوں نے لمبی چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور چہرے بھی چھپائے ہوئے تھے پھر بھی دیکھنے والے تھے کہ دیکھتے ہی جا رہے تھے۔

اس مختصر سی تقریب کی روح رواں روبا تھی۔ وہ اپنے فربہ جسم کو حرکت دیتی سیاہ آبنسی کی طرح ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ ہم بھی دیگر افراد کے ساتھ چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ مقامی طور پر چاول اور کھجور سے تیار کی گئی شراب کے پیالے مہمانوں میں گردش کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈا پانی بھی تھا جو یہاں پر اہم ترین مشروب سمجھا جاتا تھا۔ ایک دو افراد کو میں نے چائے کی خشک پتی چباتے ہوئے بھی دیکھا۔ یہ رواج میں نے یہاں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔

روبا لپک کر غزالہ کی طرف آئی اور بولی "تمہارا یہاں آنا میرے لیے بڑی مسرت کا سبب ہے' میں آج اپنے بیٹے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ رہی ہوں تو یہ دیوتاؤں کے بعد تمہارا ہی احسان ہے۔"

غزالہ نے داماں کے ذریعے جواب دیا "میں نے تو بس ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ آپ کی عزت افزائی کا بہت شکریہ۔"

غزالہ روبا کے بیٹے کے پاس پہنچی۔ داماں کے ذریعے اس کا حال احوال دریافت کرنے لگی۔ اسی دوران میں سردار زے بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بیٹے سے چند باتیں کیں' پھر بیوی سے تبادلہ خیال کرنے لگا۔ وہ اس تقریب میں آ تو گیا تھا مگر اس کے تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ مجبوراً آیا ہے۔ بیوی سے باتیں کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کھچاؤ صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں ایک آدھ بار اس کی نگاہ غزالہ پر پڑی اور ہر بار اس کی آنکھوں میں شکست خوردگی کے آثار ابھر آئے۔

سردار زے بیٹے کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا تو روبا ہمارے پاس چلی آئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "تم لوگ رقص پسند کرتے ہو؟"

میں نے داماں کی وساطت سے جواب دیا "ہم یہاں آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ جو آپ کو پسند ہوگا وہی ہمیں ہوگا۔"

وہ مسکرائی "ابھی کھانے میں تھوڑی سی دیر ہے۔ لوگوں کی وقت گزاری کے لیے میں نے ایک عورت کو بلایا ہے۔"

چند لمحے بعد ایک رقاصہ ہمارے سامنے نمودار ہوگئی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ رقاصہ ہونے کے باوجود وہ سرتاپا پردہ پوش تھی۔ صرف اس کے پاؤں اور آنکھوں کا مختصر سا حصہ عیاں تھا' باقی سب کچھ ایک طویل سیاہ لبادے نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس لبادے پر چمک دار کڑھائی کی گئی تھی۔ رقاصہ لڑکی کے پاؤں اور کلائیوں میں گھنگھرو سی بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے ناچنا شروع کیا تو گھنٹیوں نے سماں باندھ دیا۔ وہ اپنے جسم کو بڑے دلکش انداز میں ربر کی طرح توڑ موڑ رہی تھی۔ دو تین سازندے عجیب شکلوں والے مقامی ساز بجا کر رقاصہ کو لے فراہم کر رہے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک رقاصہ کا دلچسپ رقص جاری رہا' آخر میں رقاصہ نے ایک لمحے کے لیے اپنے چہرے سے نقاب کھسکا کر حاضرین کو "دیدار" کرایا۔ وہ سیاہ فام نہیں تھی۔ یقیناً خوب صورت بھی رہی ہوگی مگر ہم چونکہ ذرا دور تھے لہٰذا تاریکی میں ٹھیک سے اس کی شکل نہیں دیکھ سکے۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر سے نقاب پوش ہو کر ایک طرف اوجھل ہوگئی۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ لڑکی کے رقص کا انداز کہیں دیکھا ہوا ہے۔ اس کا سراپا بھی کچھ دیکھا بھالا لگا تھا۔

غزالہ نے میرے کان میں سرگوشی کی "ان حبشیوں میں یہ سفید لڑکی کیسے؟"

"ہو سکتا ہے کہ جیسے تم ہو ویسے یہ بھی ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ پکڑ کر لائی گئی ہوگی؟"

"اپنی خوشی اور رغبت کے ساتھ کون یہاں آسکتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ غزالہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کچھ کہتی' ایک طرف سے ایک جوڑا برآمد ہوا۔ عورت جواں سال تھی۔ بمشکل چوبیس پچیس برس کی ہوگی۔ نوجوان کی عمر اس سے تھوڑی سی کم نظر آتی تھی۔ دونوں نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے اور سروں پر پرندوں کے پر سجا رکھے

تھے۔ وہ دونوں شامیانے کے نیچے آگئے۔ رکوع کے انداز میں جھک کر دونوں نے پہلے سردار کو سلام کیا پھر سردارنی یعنی روبا کو تعظیم پیش کی' اس کے بعد بستر پر نیم دراز لڑکے کے سامنے سر جھکایا اور ایک طرف دو زانو بیٹھ گئے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

وہ بولا "یہ شادی کی رسم ہے۔ یہاں کچھ قبائل میں یہ رواج ہے کہ مریض کو کوئی خوشی کی تقریب دکھائی جاتی ہے۔ مثلاً پیدائش کا جشن' کسی تہوار کا جشن یا شادی وغیرہ۔ عام لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایسی کوئی تقریب دیکھنے سے مریض جلد اچھا ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو شادی کی تقریب دیکھنے سے اس کے اندر بھی امنگ ترنگ پیدا ہوتی ہے۔ وہ بیماری سے لڑنے اور جلد صحت یاب ہونے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے۔"

شادی کی تقریب زیادہ طویل نہیں تھی۔ لارسیوں کی طرح ان لوگوں میں بھی شادی کے موقع پر دلہا سب کے سامنے اپنی دلہن کا طویل بوسہ لیتا تھا۔ جواں سال دلہن چٹائی پر نیم دراز ہوگئی اور دلہا کے چہرے نے دیر تک اس کے چہرے کو ڈھانپے رکھا۔ شائستہ کی نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھے ایک اور نوجوان پر پڑی۔ وہ شامیانے کے بانس سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور بڑا افسردہ نظر آرہا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" شائستہ نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ابھی یہ رو رہا تھا۔"

"شاید دلہن کا بھائی ہوگا۔"

"بھائی نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ اور ہے۔" غزالہ نے شوخی سے کہا۔

میں نے یہ سوال انگریزی میں داماں سے پوچھا تو وہ اطمینان سے بولا "یہ دلہن کا پہلا شوہر ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہاں ایک عورت کو کم از کم تین شادیاں کرنا پڑتی ہیں۔ یہ عورت جو دلہن بنی بیٹھی ہے' اس سے پہلے دو شادیاں کر چکی ہے۔ اس کا پہلا شوہر وہ اُدھر سردار کے پیچھے بیٹھا ہے۔ وہ ذرا بڑی عمر کا ہے اس لیے اسے اتنا زیادہ غم نہیں مگر یہ دوسرا تازہ تازہ شوہر تھا۔ اسے محرومی کا احساس ہو رہا ہے۔"

غزالہ اور شائستہ یہ باتیں سن کر ششدر تھیں۔ داماں کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لہٰذا وہ عام لہجے میں بول رہا تھا۔ شائستہ نے داماں سے پوچھا "کیا اس عورت کی پہلی دونوں شادیاں ختم نہیں ہوئیں؟"

"نہیں۔" داماں نے نفی میں سر ہلایا "یہ عورت سال کے مختلف حصوں میں تینوں مردوں کے ساتھ رہے گی۔"

"یہاں تو سب کچھ الٹ گیا ہے۔" غزالہ نے کہا "جو سلوک باہر کی دنیا میں بے چاری عورتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہاں مردوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

شادی کی تقریب کے بعد کھانے کا انتظام تھا۔ ہمارے ہاتھ دھلائے گئے۔ ہاتھ دھونے کے لیے بمشکل اتنا ہی پانی ملا جس سے ہاتھ گیلے ہوگئے۔ میں نے داماں سے پوچھا "یہاں پانی کی اتنی کمی کیوں ہے حالانکہ ہریالی بھی ہے۔"

داماں نے یہی سوال ایک پاس ہی بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر جوذام سے پوچھا۔ اس کے ساتھ ایک درمیانی عمر کی عورت بھی تھی۔ عورت کی دوسری جانب بھی ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ ان کے بیٹھنے کے انداز سے محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں اس عورت کے شوہر ہوں۔ ادھیڑ عمر جوذام نے داماں کو جو کچھ بتایا وہ اس نے انگلش میں مجھ تک پہنچا دیا۔ اس نے کہا "یہاں دو کنوئیں موجود ہیں۔ پوری بستی انہی کنوؤں کا پانی استعمال کرتی ہے۔ ان میں سے ایک کنواں بہت زیادہ پانی دیتا تھا مگر آج کل لوگ اس کنوئیں سے پانی حاصل نہیں کرتے۔ اسے سخت منحوس سمجھا جا رہا ہے۔ اس کنوئیں سے پانی لیتے ہوئے کئی افراد کی اچانک موت واقع ہوئی ہے۔ عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ یہ کنواں بد روحوں کے سائے میں آگیا ہے۔"

اسی دوران میں ہمارے سامنے کھانا چن دیا گیا تھا۔ یہ بکرے کا گوشت تھا جسے زیتون کے تیل میں پکایا گیا تھا۔ کچھ پھل تھے۔ دودھ اور خشک کھجور کی مدد سے سویٹ ڈش سی تیار کی گئی تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ پانی بھی تھا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم واپس اپنی کوٹھڑی میں پہنچ گئے۔ اب رات ہو چکی تھی۔ بستی کے طول و عرض میں مشعلیں روشن تھیں۔ ہماری کوٹھڑی میں بھی دو شمع دان روشن ہو چکے تھے۔ پروفیسر کچھ خاموش سا دکھائی دے رہا تھا۔ "کیا بات ہے پروفیسر طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت تو شاید ٹھیک ہی ہے مگر حالات ٹھیک نہیں؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

پروفیسر نے غزالہ اور شائستہ وغیرہ کی نگاہ بچا کر اپنے تکیے کے نیچے سے کوئی شے نکالی اور اپنی ہتھیلی پر رکھ لی۔ میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ دو چوڑیاں تھیں۔ ایک طلائی تھی' دوسری چاندی کی "یہ کس نے دی ہیں؟"

"جب تم دعوت کھانے گئے ہوئے تھے' ایک پہرے دار دے گیا تھا۔" پروفیسر نے دانت پیس کر کہا "ایک چوڑی سردار کی طرف سے ہے' دوسری جو چاندی کی ہے' ساحر کی جانب سے۔"

پروفیسر کے بتائے بغیر ہی میں سمجھ رہا تھا کہ ایک چوڑی شائستہ کے لیے اور دوسری کلثوم کے لیے ہے۔ میں نے یہ تلخ سوال پوچھ کر پروفیسر کا موڈ مزید خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر کی باتوں سے مجھے خود ہی معلوم ہو گیا کہ طلائی چوڑی شائستہ کے لیے اور نقرئی چوڑی کلثوم کے لیے ارسال کی گئی ہے۔ میرے جسم کا خون میرے سر کو چڑھنے لگا تھا۔ آخر وہی ہوا تھا جس کا خطرہ میں کل شام سے محسوس کر رہا تھا۔ سردار زے نے پہلا وار ناکام ہو جانے کے بعد دوسرا وار کیا تھا۔ غزالہ کا پیچھا تو اس نے چھوڑ دیا تھا مگر اب شائستہ پر رال ٹپکانی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ کلثوم کو بھی ہدف بنا لیا گیا تھا۔ اسی دوران میں ایک دم کراہ کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ زریں کے چہرے پر طیش کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کوٹھڑی کے سوراخوں میں سے اندر جھانکنے والے ایک پہرے دار کی آنکھ میں ایک چھڑی چبھو دی تھی۔ پہرے دار نے دونوں ہاتھ آنکھ پر رکھے ہوئے تھے اور گالیاں بک رہا تھا۔

"ارے پاگل' یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"امارے بس میں ہو استاد صیب! تو ان سب حرام زادوں کی آنکھوں میں خنجر اتار دوں۔ ایسے دیدوں کی طرح گھورتے ہیں کلثوم کو کہ خون میں آگ لگ جاتی ہے اور کلثوم کو ہی کیا' ور سب کو گھورتے ہیں۔ ام سے یہ سب کچھ اب برداشت نہیں ہوتا۔"

"اور اب جو تمہارے ساتھ ہونے والا ہے وہ برداشت کر لو گے۔ ابھی یہ خبیث تمہیں کھینچ کر باہر لے جائیں گے اور مار مار کر جانور بنا دیں گے۔"

"ام کو یہ مار منظور ہے لیکن یہ منظور نہیں کہ یہ بدبخت اماری عورتوں کو کمینی نظروں سے دیکھتا رہے اور ام خاموش بیٹھا رہے۔ ایسے معاملوں میں امارا دل بہت چھوٹا سا ہے۔"

اسی دوران میں ہمارے قید خانے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور تین افراد زریں کو کھینچ کر باہر لے گئے۔ جس شخص کی آنکھ میں زریں نے چھڑی چبھوئی تھی اس کی آنکھ سے خون نکل رہا تھا' تاہم آنکھ پھوٹنے سے بچ گئی تھی۔ زریں کو باہر نکال کر ان لوگوں نے خوب مارا۔ زریں کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا اور لباس پھٹ گیا تاہم وہ بڑے سکون سے پٹتا رہا۔ دو تین منٹ بعد زریں کو پھٹے پرانے کپڑے کی طرح اندر پھینک دیا گیا۔ وہ تڑخ کر بولا "بس اتنا ہی دم تھا تمہارے بازوؤں میں؟ اور مارو۔ اور مارو ام کو۔ لیکن ام کو اپنے استاد صیب کی قسم ام باز نہیں آئے گا۔ تم جب بھی اماری عورتوں کو تاڑے گا' ام تمہاری آنکھ میں ڈنڈا مارے گا۔"

کلثوم اپنی اوڑھنی سے زریں کے ہونٹوں اور ناک سے بہنے والا خون صاف کرنے لگی۔ جس وقت زریں کی پٹائی ہو رہی تھی وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ اب اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر نے کہا "مت رو بیٹی! مت رو۔"

میں نے کہا "رونا تو اب اس کی قسمت میں عمر بھر کا لکھا گیا ہے۔ جن کو بے وقوف شوہر ملتے ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے۔"

"ہائے میرا پیٹ!" زریں نے کراہتے ہوئے کہا۔

جہاں چند دن پہلے استی نے کاٹا تھا وہاں زخم ابھی موجود تھا۔ مار کٹائی میں یہ زخم چھل گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔

غزالہ نے کہا "چلو میں دوا لگا دیتی ہوں تمہیں۔"

زریں بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ پیٹ میں چودہ ٹیکے لگیں گے تو آرام آئے گا۔ یہ پاگل کتے کی اولاد ہے اور باپ سے بڑھ کر زہریلا ہے۔"

اس کا اشارہ یقیناً استی کی طرف تھا۔ استی اردو نہیں سمجھتا تھا ورنہ رد عمل ظاہر کرنے سے ہرگز باز نہ آتا۔

جو خود ساختہ دوا غزالہ نے لڑکے گانو کو لگائی تھی' زہی زریں کے پیٹ پر لگانے لگی' جب وہ زریں کی مرہم پٹی کر رہی تھی' میں سوچ رہا تھا کہ کلثوم پر غلط نگاہ نہ برداشت کرنے والے کو جب پتا چلے گا کہ یہ لوگ کلثوم کو یہاں سے غلط نیت کے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔

وہ رات تو خیریت سے گزر گئی۔ اگلے دن شام سے کچھ دیر پہلے پہرے دار دو زنانہ لباس لے کر آ گیا۔ شوخ رنگوں کے یہ دو جوڑے جس مقصد سے آئے تھے وہ ہم اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے یہ کپڑے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ پہرے دار نے کپڑے زبردستی کوٹھڑی میں پھینکے تو میں نے انہیں باہر پھینک دیا بلکہ وہ دونوں چوڑیاں بھی پھینک دیں جو کل ہمیں ارسال کی گئی تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ ان چوڑیوں کی توہین پہرے داروں سے کسی طور برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ آگ بگولا ہو گئے۔ پتا نہیں کہ کیا کیا بکتے رہے؟ پھر بھناتے ہوئے واپس چلے گئے۔ دس منٹ بعد سردار زے خود وہاں آ دھمکا۔ چیتا اس کے ساتھ تھا اور اس کی موجودگی سردار کی شخصیت کو اور بھی ہیبت ناک بناتی تھی۔ دونوں چوڑیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور بڑے تیز لہجے میں کچھ بولنے لگا۔ داماں نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "سردار سخت برہم ہے کہ ان چوڑیوں کی توہین کی گئی ہے۔ اب ہمیں سردار کے سامنے یہ چوڑیاں اپنے ہاتھوں سے دونوں لڑکیوں کو پہنانی ہوں گی۔"

"اس سے کہو یہ ناممکن ہے۔ ہم جان تو دے سکتے ہیں لیکن لڑکیاں اس کے حوالے نہیں کر سکتے۔"

"تم جان دے دو گے تو کیا لڑکیاں بچ جائیں گی؟" سردار نے پوچھا۔

"شاید وہ بھی نہیں بچیں گی۔ وہ تمہارے ہاتھوں بے آبرو ہونے سے' اپنی جان دینا بہتر سمجھیں گی۔"

سردار کے ہونٹوں پر مکروہ ہنسی ابھری "جان دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جب واقعی موت سر پر پہنچ جاتی ہے تو پھر آن بان آبرو سب کچھ بے حقیقت نظر آنے لگتا ہے۔" اس نے فلسفیوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔ اس جنگلی سے مجھے ایسی بات کی توقع نہیں تھی یا شاید داماں نے سردار کے لفظوں کا ترجمہ ذرا اچھے الفاظ سے کر دیا تھا۔

میں نے کہا "اگر میں اس کوٹھڑی سے باہر ہوتا تو پھر تمہاری بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتا۔"

"تم باہر آ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ بپھر کر بولا "تمہارے جیسے مکوڑوں کو ہم چٹکی میں مسل دیتے ہیں۔ اگر تمہارے دماغ میں اب بھی زور آزمائی کا کیڑا رینگ رہا ہے تو میں بالکل تیار ہوں لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اس مرتبہ کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔ میں نے اس لڑکی کو لے کر جانا ہے اور ہر صورت لے جاؤں گا۔"

اس کے ساتھ ہی سردار نے بڑے طیش کے عالم میں اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا۔ وہ تیز قدموں سے باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہی منحوس بوری نما تھیلا اٹھا لایا جس میں جنگی ساز و سامان تھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" غزالہ نے میرا بازو دبوچتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھتی جاؤ۔"

سردار نے تند لہجے میں کہا "یہ چوڑیاں ہیں۔ اور یہ چوکولوہد (تھیلا) ہے۔ ان میں سے جو چاہو' اٹھا لو اور بہتر ہے کہ چوڑیاں اٹھا لو اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بہنوں کے ہاتھوں میں پہنا دو کیونکہ اسی صورت میں تم زندہ رہ سکتے ہو۔"

سردار کا انداز متاثر کن تھا۔ لگتا تھا کہ قوت بازو کے علاوہ اسے اپنے طریقۂ لڑائی پر بھی بھروسا ہے۔ میرے سینے میں بیٹھا بیٹھا جوش لہریں لینے لگا۔ میں نے چوکولوہد یعنی تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سردار نے اپنا پاؤں میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور داماں کی وساطت سے بولا "اگر تمہارے دماغ میں یہ ہے کہ اس طرح تم کچھ مہلت حاصل کر لو گے تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ جو کچھ بھی ہونا ہے وہ آج رات ہی ہونا ہے۔ یہ لڑکیاں اس کوٹھڑی سے جائیں گی یا تم میرے ساتھ مقابلہ کرو گے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"تم پہلے بھی یہی چاہتے تھے لیکن پھر اپنی اس ماں کو بیچ میں لے آئے۔" سردار کا اشارہ اپنی بھولی بسری بیوی روبا کی طرف تھا۔

"میں اسے بیچ میں نہیں لایا تھا' وہ خود کو اور تمہارے بیمار بیٹے کو بیچ میں لے آئی تھی۔ میں تو ابھی اسی وقت تم سے لڑنے اور تمہارے ٹکڑے کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

سردار نے تھیلا میری طرف پھینک دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

غزالہ اور شائستہ سمیت سب کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ زریں کی سمجھ میں انگریزی نہیں آئی تھی لہٰذا وہ بونقوں کی طرح منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بہرحال چوڑیاں تو اس نے دیکھ ہی لی تھیں اور ان کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نیا بحران کس نوعیت کا ہے۔ اس کے گلے کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں اور آنکھیں لال ہوئی تھیں۔ وہ پھنکار کر بولا "خدا کی قسم استاد صیب! ام کو اپنی جان کا کوئی پروا نہیں لیکن ام اپنی اور آپ کی بے عزتی ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔"

"ام بھی نہیں کرے گا استاد صیب۔" کلثوم نے کہا۔ وہ شوہر نامدار کی تقلید میں کبھی کبھی مجھے استاد صیب کہہ دیتی تھی۔

"تم دونوں میاں بیوی شیر کے بچے ہو۔ مجھے پتا ہے۔ لیکن اس موقع پر تھوڑا سا حوصلہ رکھو۔ اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں ضرور تکلیف دیں گے۔"

کچھ دیر بعد روبا ہماری کوٹھڑی کی کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے داماں کی وساطت سے مجھے مخاطب کیا اور بولی "میں نے ابھی سنا ہے کہ تم نے زے سے مقابلے کی دعوت قبول کی ہے؟"

میں نے کہا "محترم خاتون! مجھے اپنی جان خطرے میں

ڈالنے کا کوئی شوق نہیں، مجھے مجبور کردیا گیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے شائستہ اور کلثوم کے حوالے سے سب کچھ روبا کو بتادیا۔ ان چوڑیوں اور لباسوں کا ذکر بھی کیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں بھجوائے گئے تھے۔

روبا کے چہرے پر تفکر کی گہری پرچھائیاں لہرا گئیں۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولی "تمہاری منگیتر (غزالہ) کے سلسلے میں تو میں نے زبے کو منا لیا تھا مگر لگتا ہے کہ اب وہ مانے گا نہیں۔ شاید....." وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

وہ جھجک کر بولی "شاید تم لوگوں کو ہی اپنے اندر تھوڑی سی نرمی پیدا کرنا پڑے گی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ہم لڑکیاں ان کے حوالے کردیں؟"

"مجھے نہیں پتا کہ تم لوگوں کے رسم و رواج کیا ہیں مگر یہاں کے رسم و رواج بالکل اور طرح کے ہیں۔"

اس موقع پر غزالہ آگے آئی اور بولی "محترم خاتون! ہمارے ہاں اس قسم کے حالات میں عورتیں اپنی جان لے لیتی ہیں۔"

روبا نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر فکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر میرے سراپا کو دیکھا اور بولی "تمہیں معلوم ہے کہ زبے نے تمہیں مقابلے کی دعوت کیوں دی ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"وہ جس قسم کا مقابلہ تم سے کرنا چاہ رہا ہے، اس میں آج تک اس سے کوئی نہیں جیتا۔ کہا جاتا ہے کہ زبے کی ماں جوذم تھی اور اس کا باپ فیاٹی آدم خور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن میں ایک مادہ چیتا کا دودھ پیتا رہا تھا اور مادہ چیتا کے ایک بچے کے ساتھ ہی پل کر بڑا ہوا تھا۔ وہ بے انتہا پھرتیلا اور چوکس شخص تھا۔ بعد ازاں وہ ایک قبائلی لڑائی میں فیاٹیوں ہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ زبے اپنے باپ کی طرح بے حد پھرتیلا اور جنگ جو شخص ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس جنگ جو جوذم قبیلے کا سردار ہے۔ جو چیتا تمہیں زبے کے ساتھ نظر آتا ہے یہ اسی چیتے کی نسل ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ زبے کا "بھائی" تھا۔

"تم مجھے ایک مضبوط اور چوکس شخص نظر آتے ہو مگر جس مقابلے کی دعوت تم قبول کررہے ہو اس میں جیتنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ اس لڑائی میں جو پہلے زخم لگالے وہی جیت جاتا ہے کیونکہ پہلے ہی زخم کا مطلب موت ہوتا ہے اور یہ موت حیران کن طور پر چار پانچ سانسوں کے اندر واقع ہوجاتی ہے۔ شاید تم یقین نہ کرپاؤ مگر ہوتا ایسے ہی ہے۔ جو ہتھیار اس لڑائی میں استعمال ہوتے ہیں وہ ایک انتہائی زہریلے بچھو کے زہر سے پان لگائے گئے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "محترم خاتون! ان میں سے کچھ باتیں میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ آپ کی فکر مندی بجا ہے، میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے لیے فکر مند ہیں مگر سردار زبے نے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔"

"اچھا میں اس بارے میں زبے سے بات کرتی ہوں لیکن ایک بار پھر تمہیں کہتی ہوں کہ زبے سے مقابلہ کرنے پر زور مت دو۔"

روبا تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ روبا کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اسے سننے کے بعد غزالہ، شائستہ اور صفدر وغیرہ بھی تمام حالات سے آگاہ ہوگئے تھے۔ یعنی جو بات ہم اب تک ان سے چھپاتے رہے تھے وہ عیاں ہوگئی تھی۔ غزالہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس گفتگو کے بعد اسے یہ علم ہوا تھا کہ ایک ایسی ہی طلائی چوڑی دو چار دن پہلے اس کے لیے بھی آچکی ہے اور یہ کہ میں نے اس چوڑی کو توڑ موڑ کر پیرے دار کو واپس دے دیا تھا۔ شائستہ بھی پریشان نظر آنے لگی تھی، تاہم کلثوم اور زریں بے خبر تھے کیونکہ وہ انگلش نہیں سمجھتے تھے۔ زریں بگڑ کر بولا "استاد میب! آپ ضرور ہم سے کچھ چھپا رہا ہے۔ ہم کو لگ رہا ہے کہ جیسے کلثوم اور ہم آپ لوگوں کے درمیان بالکل اجنبی ہے۔"

میں زریں کو پریشان اور مشتعل کرنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا بات گول مول کردی۔

ایک سراسیمگی سی سب کے چہروں پر محسوس ہورہی تھی۔ یہاں تک کہ صفدر بھی آزردہ نظر آرہا تھا۔ وہ کراہ کر بولا "شاہ جہاں صاحب! اگر ہم میں سے کسی کی قربانی کی ضرورت ہے تو سب سے پہلے میں حاضر ہوں۔ یہ زندگی تو میرے لیے ویسے بھی بوجھ بنی ہوئی ہے۔"

میں نے اسے حوصلہ دیا "مجھے کچھ نہیں ہوگا یار! ہم نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے، یہاں سے صحیح سالم واپس جانا ہے، لاہور کے لکشمی چوک سے مرغ چھولے کھانے ہیں، رکھا شاپ کے تکے، بندو خاں کا روسٹ، بشیرا دارالماہی کی مچھلی، نرالے کے رس گلے۔ ابھی ہمارا کافی دانہ پانی پڑا ہوا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے تو لگتا ہے کہ بہت کم دانہ پانی باقی رہ گیا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ مایوسی کا شکار ہورہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے اندر ترنگ پیدا کرنے کے لیے یہاں کے جوذموں کی رسم پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ لوگ بیمار کے سامنے شادی کی تقریب برپا کرتے ہیں تاکہ اس کی طبیعت بحال ہو۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں ایک شادی کر ہی لوں۔ فرض بھی ادا ہوجائے گا اور میری خوشی دیکھ کر تمہارے چہرے پر بھی رونق آجائے گی۔ کیا خیال ہے؟"

"میں نے تو شادی کرکے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اللہ کرے آپ کو حاصل ہوجائے۔" اس کی اداسی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ آنکھوں میں پانی جھلملانے لگا تھا۔

مجھے یوں لگا کہ میں صفدر کی آنکھوں میں جھلملاتے پانی کو دھیان سے دیکھوں تو اس میں مجھے دیبا کی صورت نظر آجائے گی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد روبا پھر ہماری کوٹھڑی کی کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا چہرہ گواہ تھا کہ اپنے خاوند سے اس کے مذاکرات ناکام رہے ہیں۔ وہ بولی "زبے اپنی بات پر ڈٹا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ رسم کے طور پر بھیجی گئی چوڑیاں قبول کی جائیں یا پھر تم اس سے مقابلہ کرو۔ میں نہیں جانتی کہ تم لوگوں کے ذہن میں کیا ہے مگر اپنی بات دہرانا چاہتی ہوں، اگر تم لوگوں کو پہلا حل قبول نہیں تو پھر کوئی تیسرا حل نکالو۔ دوسرے حل کی طرف نہ ہی جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔"

"ہم کیا حل بتاسکتے ہیں۔ آپ ہی کچھ بتائیں۔" غزالہ نے کہا۔

روبا بولی "زبے آج ہی رات فیصلہ چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کل تک کی مہلت لے لی ہے۔ اب تمہارے پاس کچھ وقت ہے۔ اس بارے میں اچھی طرح سوچ لو۔"

اگلا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ دوپہر تک یہ بات تقریباً طے ہوگئی کہ مجھے سردار زبے سے مقابلہ کرنا ہے۔ سردار کا اعتماد دیدنی تھا۔ یہ ایسا اعتماد تھا جو مدمقابل کو ایک لمحے میں ڈانواں ڈول کرسکتا تھا۔ اسے پروا ہی نہیں تھی کہ وہ جان بوجھ کر خود کو ایک آزمائش میں ڈال رہا ہے حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس مقابلے سے پہلو تہی کرسکتا تھا۔ شاید مقابلے میں اپنے مدمقابل کی جان لینا بھی اس کی تفریحات میں شامل تھا۔ روبا کی زبانی پتا چلا تھا کہ وہ ایسے مقابلوں میں درجنوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔

دوپہر کے وقت دو عمر رسیدہ افراد ہمارے پاس آگئے۔ ان کی لمبی داڑھیاں تھیں مگر تمام جوذم مردوں کی طرح ان کے سر بھی منڈے ہوئے تھے۔ انہوں نے واماں کی مدد سے مجھے اس مقابلے کے تمام قواعد و ضوابط سمجھائے۔ تاہم یہ قواعد سمجھانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر مجھ سے تصدیق کی کہ میں سردار زبے کے ساتھ مقابلے کے لیے آمادہ ہوں؟

میں نے آمادگی ظاہر کردی تو دونوں بوڑھوں نے بتایا کہ اس مقابلے میں دونوں حریفوں کا جسم حفاظتی اشیا سے ڈھکا ہوتا ہے۔ صرف کہنی سے اوپر بازو ننگے ہوتے ہیں یا گھٹنوں سے اوپر ٹانگیں۔ اس کے علاوہ سینہ بند سے نیچے پیٹ کا تھوڑا سا حصہ بھی غیر محفوظ ہوتا ہے۔ مقابلے کے دوران میں حریف انہی جگہوں پر وار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقابلہ کرنے والے دونوں افراد کے دونوں ہاتھوں میں خنجر نما آلہ ہوتا ہے جس کی دھار انتہائی زہریلی ہوتی ہے۔ جس شخص کو تھوڑا سا گہرا زخم لگ جاتا ہے وہ چند لمحے میں گر جاتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس مقابلے میں پہلا زخم لگانے والا جیت جاتا ہے۔

مجھے مقابلے کی مکمل تفصیلات سمجھانے کے بعد دونوں بزرگان نے مجھے حفاظتی چیزیں پہنا کر دیکھیں۔ آہنی خود تھوڑا سا چھوٹا تھا۔ ان کی ہدایت پر فوراً دو مزید خود منگوا لیے گئے۔ ان میں سے ایک میرے سائز کا نکل آیا۔ بوڑھوں کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ مقابلے کا وقت شام سے کچھ دیر پہلے ہے اور مجھے مقابلہ شروع ہونے سے آدھ گھنٹا پہلے مقابلے کا لباس پہن کر موقع پر پہنچنا ہوگا۔

سہ پہر تک کا وقت بڑی مشکل سے گزرا۔ اس وقت سورج دن بھر آگ برسانے کے بعد مغرب کی سمت جھکنا شروع ہوگیا تھا جب پہرے داروں کی ایک ٹولی ہماری کوٹھڑی کے سامنے پہنچ گئی۔ اس وقت تک میں لڑائی کا لباس زیب تن کرچکا تھا۔ اپنا آپ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں حرکت کرتا تھا تو فولادی اشیا "کھڑ کھڑ" جسم پر بجتی تھیں۔ آئینہ میرے سامنے نہیں تھا، اگر ہوتا تو مجھے یہی لگتا کہ پرانے دور کا کوئی رومن لشکری کھڑا ہے۔

پہرے داروں میں سے ایک نے کہا "اگر آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی تماشا گاہ میں جانا چاہے تو جاسکتا ہے۔"

صفدر نے کہا "میں جانا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر اور زریں بھی تیار تھے۔ تاہم غزالہ، شائستہ اور کلثوم میں سے کسی کو اتنی ہمت نہیں تھی۔ کلثوم اور شائستہ تو باقاعدہ رو رہی تھیں، غزالہ قدرے حوصلے میں

تھی۔ وہ پہلے بھی اس قسم کے کئی سنگین مرحلے دیکھ چکی تھی۔ شاید یہ اس کے دل کی آواز تھی کہ میری زندگی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ بہرحال آنکھیں اس کی بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ میں نے حیران پریشان تانی کا گال چوما اور سہرے والوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ گھروں اور درختوں کے سائے طویل تھے۔ ہم چند راستوں سے گزر کر پہاڑی ڈھلوان کے نزدیک پہنچ گئے۔ یہاں سن کی رسی کی مدد سے ایک عارضی سا اکھاڑا یا رنگ بنایا گیا تھا۔ اس اکھاڑے کے اوپر شامیانہ تان دیا گیا تھا۔ اکھاڑے کے اردگرد ایک بڑے دائرے کی شکل میں تین چار سو افراد جمع تھے۔ ابھی مزید افراد پہنچ رہے تھے۔ خواتین ایک طرف تھیں' وہ سب لمبی سیاہ چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں' صرف ان کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ مردوں کے گنجے سر ڈھلتی دھوپ کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اس ہجوم میں بچہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرے پیچھے ہی پیچھے داماں' زریں اور پروفیسر بھی موقع پر پہنچ گئے۔ زریں کی تند مزاجی کے پیش نظر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ صفدر بھی وہاں آ گیا ہے۔ وہ زریں کے کندھے کے سہارے آہستہ آہستہ چل کر وہاں پہنچا تھا۔ اس کا رنگ اب بھی لیموں کی طرح زرد تھا۔ چار پانچ منٹ بعد ہم نے سردار کو آتے دیکھا۔ چیتے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی شان سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے ابھی کوئی حفاظتی تجے نہیں پہنی تھی۔ یہ اشیا اس نے موقع پر پہنچ کر پہنیں۔ سینہ بند' آہنی خود اور دیگر لوازمات اس نے جسم پر سجا لیے اور بڑی شان سے اکھاڑے کے اردگرد ٹہلنے لگا۔ دونوں بوڑھے (جنہوں نے بعد میں ریفری کا کردار ادا کیا) میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھے مقابلے میں استعمال ہونے والا خنجر دکھایا۔ اس کے نو انچ لمبے پھل کو بڑی احتیاط سے چمڑے کے ایک غلاف میں بند کیا گیا تھا۔ غلاف ہٹا کر ایک بوڑھے نے مجھے خنجر کی نیلگوں دھار دکھائی اور بولا "یہ دنیا کی زہریلی ترین دھار ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس کا ایک چھوٹا سا کرشمہ دکھا سکتا ہوں۔"

اس نے اپنے قریب کھڑے ایک نوجوان کو اشارہ کیا۔ وہ ایک بلی کا بچہ پکڑ لایا۔ بلی کا بچہ سیاہ فام نوجوان کے ہاتھوں میں بری طرح مچل رہا تھا اور نوجوان کو پنجہ مار کر اس کے ہاتھ سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ بوڑھے نے بڑی احتیاط سے خنجر کی دھار بچے کی اگلی ٹانگ پر چلائی۔ نرم سیاہ بالوں کے اندر سے خون کی دھار نکلی' بچہ ایک دو بار زور سے مچلا پھر اچانک نوجوان کے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ بمشکل پانچ چھ سیکنڈ کے اندر اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس مقابلے میں یقیناً پہلا زخم لگانے والے کی جیت تھی۔

بوڑھے نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم جوان ہو۔ صحت مند ہو' ابھی تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔ دیوتا بھی جواں سال لوگوں کی موت کو پسند نہیں کرتے' اگر تم چاہو تو ہم اب بھی تمہیں اس لڑائی سے دستبردار کرا سکتے ہیں۔"

"جن شرطوں پر آپ مجھے دستبردار کرائیں گے وہ شرطیں مجھے منظور نہیں لہٰذا بہتر ہے کہ آپ مجھے لڑنے دیں۔" میں نے یہ بات داماں کی وساطت سے کہی تھی۔

دونوں بوڑھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

چند ہی منٹ بعد میں اور جوذم سردار زرے اکھاڑے میں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ لڑائی بھڑائی کئی برسوں سے میری زندگی کا لازمی حصہ تھی۔ جب سے صفدر ملا تھا' ہنگامہ خیزی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ہمیں ایک ساتھ لڑتے ہوئے اور خطرات سے کھیلتے ہوئے عجیب طرح کا لطف آتا تھا۔ آج اس ہنگامے میں صفدر بھی موجود تھا مگر افسوس کہ وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے مجھے دیکھ سکتا تھا' میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ سنگین نوعیت کا مقابلہ دیکھنے کے لیے یہاں آئے۔ ایک ایسی لڑائی کا مشاہدہ کرے جس کا انجام میری یا سردار زرے کی موت کی شکل میں سامنے آ سکتا تھا مگر وہ چلا آیا تھا۔ اب وہ آ گیا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس نے آ کر اچھا ہی کیا تھا۔ اس کی موجودگی میرے حوصلے کو مہمیز کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے جیسے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور میرے جسم کو توانائی سے بھر رہی تھیں۔

لڑائی سے پہلے سردار زرے میرے بالکل قریب چلا آیا اور چند فقرے ادا کیے۔ داماں نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا "سردار زرے آپ سے پوچھ رہا ہے' کیا آپ کو معلوم ہے کہ سردار نے آپ سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟"

"کیوں کیا ہے؟"

سردار نے داماں کے ذریعے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں کچھ معلوم ہوا تھا۔ ساحر بونارا انسان کے اندر جھانک دیکھنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم ایک جنگجو شخص ہو اور بے شمار لوگوں کو پچھاڑ چکے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ساحر کا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ آج تم سے ایک دلچسپ مقابلہ ہو گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے حالانکہ میں تمہارے ساحر کی

باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتا۔"

"کیا تم نے اپنے ساتھیوں کو اپنی وصیت کے بارے میں بتا دیا ہے۔" زرے نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تم ایسا کر چکے ہو؟"

وہ ہنسا "میری وصیت تو پچھلے پانچ سال سے لکھی پڑی ہے۔ ابھی تک اسے کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی نہیں آئے گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ آج تمہارا غرور ٹوٹ جائے!"

"یہ خواہش بہت سے مرنے والوں کے دلوں میں رہ گئی ہے۔ دیوتاؤں نے میری قسمت میں لکھ رکھا ہے کہ میں اس لڑائی میں اپنے حریفوں کو پہلا زخم لگاؤں۔ آج بھی وہی ہو گا جو میرے مقدر پر نقش ہے۔"

ہجوم بہت پرجوش تھا۔ لوگوں میں شراب کے پیالے بھی گردش کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات نوٹ کی۔ یہ لوگ ذبح کیے جانے والے جانوروں کا خون بھی مشروب کی طرح پیتے تھے۔ اس وقت بھی کئی پیالہ برداروں کے ہونٹ بالکل سرخ نظر آ رہے تھے۔ دونوں بوڑھے اکھاڑے کی دونوں جانب کھڑے ہو گئے۔ میرے ہاتھوں میں بھی دو مہلک خنجر تھما دیے گئے۔ نیلگوں دھار والے یہ خنجر اپنے اندر عجیب سی دہشت سمیٹے ہوئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے زرے کی طرح میں نے بھی اپنے ہاتھوں میں دو انتہائی زہریلے سانپ پکڑ رکھے ہیں۔ ایسے سانپ جن کی پھنکار سے ہی موت واقع ہو سکتی ہے۔

ڈھلتے سورج کی دھوپ میں ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ہم کچھ دیر تک نیم دائرے میں گردش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو نگاہوں میں تولتے رہے' پھر پہلا وار زرے نے ہی کیا' اس کے بائیں ہاتھ نے تیزی سے حرکت کی اور مہلک خنجر میرے کندھے سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ اس پہلے وار کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مد مقابل کھبا ہے یعنی بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے۔ میں بائیں ہاتھ کی طرف سے محتاط ہو گیا۔ زرے کے اگلے دو وار بھی میں نے پھرتی سے بچائے۔ تیسرا وار سینہ بند پر لگا اور میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹا۔ تماشائیوں نے آوازے بلند کیے۔ یہ آوازے یقیناً اپنے سردار کے حق میں تھے۔

زرے کی پیش قدمی روکنے کے لیے میں نے ٹانگ چلائی اور وہ سینے پر چوٹ کھا کر پیچھے ہٹ گیا' اس کے ساتھ ہی لپک کر میں نے زرے کی ناف پر وار کرنا چاہا' یہی وقت تھا جب مجھے زرے کی بے پناہ پھرتی کا اندازہ ہوا۔ اس نے میرا وار اتنی آسانی سے بچایا کہ مجھے حیرت ہوئی۔ اس کی نگاہ جیسے بیک وقت میرے دونوں ہاتھوں سے چپکی ہوئی تھی اور وہ ہاتھوں میں جنبش آنے سے پہلے ہی ان کا رخ بھانپ لیتا تھا۔ زرے کی پھرتی کا اندازہ ہونے کے بعد میں زیادہ محتاط ہو گیا۔ اگلے دو تین منٹ میں ہم دونوں نے ایک دوسرے پر بمشکل دو تین حملے ہی کیے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے زرے کا کوئی وار میرے بدن کے غیر محفوظ حصے پر نہیں لگا۔ ان حملوں کے دوران میں مجھ پر ایک اور زبردست انکشاف ہوا اور میرے خیال میں یہ بڑا مہلک انکشاف بھی تھا۔ پہلے وار کے بعد میں نے زرے کو کھبا سمجھا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کھبا نہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو یکساں تیزی اور مہارت سے استعمال کرتا تھا۔ ایک لمحے میں' میں جان گیا کہ اس خاص قسم کی لڑائی میں زرے کی مسلسل فتوحات کی وجہ کیا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت کے ساتھ حملہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ میں اس کے دائیں ہاتھ پر توجہ مرکوز کرتا تھا تو وہ بائیں ہاتھ سے وار کر دیتا تھا' اگر بائیں ہاتھ پر میری توجہ ہوتی تھی تو دائیں ہاتھ کی بجلی چمک جاتی تھی۔ بالکل اچانک مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ لڑائی میری توقع سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

میں نے مد مقابل سے اپنا فاصلہ بڑھا دیا' یہ ایک طرح سے کچھ وقت حاصل کرنے کی کوشش تھی' ساتھ ساتھ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا حکمت عملی اپنانی چاہیے۔ ٹانگوں پر گھٹنوں تک گارڈز تھے لہٰذا میں نے ٹانگوں کا استعمال بڑھا دیا' میری کئی زوردار ککس زرے کے سینے اور چہرے پر لگیں' ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے خنجر بھی گرا مگر اس نے فوراً اٹھا لیا۔ خنجر گر جانے سے شاید زرے کو سبکی محسوس ہوئی تھی' اس کے حملوں میں شدت آ گئی' مجھے اپنے چاروں طرف بجلی کوندتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا ایک کونے میں لے آیا۔ عقب سے زریں کی بلند و بالا آواز آئی "شاباش استاد صیب! آگے بڑھو۔ اس کی ٹانگوں کے بیچ مارو۔ شاباش۔"

وہ "شاگرد" ہو کر مجھے شاباشی سے نواز رہا تھا۔ گاہے گاہے صفدر کی نحیف آواز بھی ابھرتی تھی' وہ میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ میری نگاہیں زرے کے خنجروں پر تھیں۔ ان خنجروں کا بوسہ موت کا بوسہ تھا۔ میرے خیال میں دست بدست لڑائی میں سب سے اہم ہتھیار میرا وہ مخصوص داؤ تھا جو میں گردن پر لگاتا تھا۔ میں گردن کو بازو کے شکنجے میں لے کر خاص انداز سے دباؤ ڈالتا تھا تو مد مقابل بے بس ہو جاتا تھا لیکن اس قسم

کے راؤ جنہیں مارشل آرٹس کی زبان میں "لاکس" کہا جاتا ہے صرف اسی وقت لگائے جا سکتے ہیں جب لڑنے والے آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ یہاں صورت حال مختلف تھی۔ موت سے مسلک تر خنجر ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ یہ خنجر مجھے سردار زے سے دور رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مجھے اپنی پیشانی سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہونے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے وار کرنے کی دہری صلاحیت زے کو میرے لیے انتہائی خطرناک بنا چکی تھی۔ دو تین موقعوں پر ایسا ہوا کہ خنجر کی دھار میرے جسم کے غیر محفوظ (UN PROTECTED) حصے کو چھوتی گزر گئی۔ زے کا اعتماد پہلے ہی دیدنی تھا' اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے جھک کر زے کا ایک وار بچایا تو اچانک اس نے نیچے سے گھٹنا چلا دیا۔ چوٹ میری ٹھوڑی پر لگی۔ میں تیورا کر پشت کے بل گرا۔ مجھے اٹھنے میں بس ایک لمحے کی تاخیر ہوئی تھی۔ یہی تاخیر زے کو ایک سنہری موقع فراہم کر گئی۔ وہ کسی شکاری پرندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے تڑپ کر خود کو اس کی زد سے بچانا چاہا۔ اس سے پہلے کہ میں پوری طرح کروٹ بدلتا' وہ بلائے ناگہانی کی طرح میرے اوپر آگیا۔ مسلک خنجر کی نوک کہنی سے اوپر میرے بازو میں لگی اور گوشت چیرکر گزر گئی۔ ایک انگارے جیسی جلن کا احساس ہوا اور میرے ذہن نے مجھے بتایا کہ میں موت کی سرحد پر آگیا ہوں۔ میرے اندر سے اٹھنے والی ایک آواز نے مجھ سے پوچھا "کیا واقعی سب کچھ ختم ہو گیا ہے؟ کیا ابھی میری لاش اس اکھاڑے سے اٹھائی جانے والی ہے؟" نزالہ کا اشک بار چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور ایک ہی لمحے میں پتا نہیں کیا کچھ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ دھندلائی ہوئی سی نظروں سے میں نے دیکھا' سردار زے دوسرا وار کرنے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ہی وحشت رقصاں تھی۔ اس مرتبہ زے کا وار میں نے اپنی کلائی پر روکا اور اس کے "سینہ بند" پر ٹانگ مار کر اسے دور ہٹا دیا۔

خود کو میں نے کہنیوں کے بل زمین سے اٹھایا۔ اس موقع پر سردار مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا مگر اس نے حملہ آور ہونے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ بس تماشائی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ "پانچ سانس" کا زہر مجھے موت کے حوالے کر چکا ہے اور اب کوئی لمحہ جاتا ہے کہ میں بے دم ہو کر گرنے والا ہوں۔۔۔ اور یہ کوئی سردار زے ہی کی بات نہیں تھی' خود مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا۔ ایک آگ سی پورے بدن میں پھیل گئی تھی۔ پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک درد کی ناقابل بیان لہریں اٹھی تھیں اور روح کو تار تار کر گئی تھیں۔ میں کہنیوں کے بل نیم دراز تھا اور اٹھ کر بیٹھنے کی سکت مجھ میں نہیں تھی۔ بہت کوشش کر کے میں نے اپنے جسم کو تھوڑا سا سیدھا کیا۔ سردار زے خنجر بدست میرے سر پر کھڑا تھا۔ وہ شاید میری آخری ہچکی کا انتظار کر رہا تھا۔

درد کی ناقابل بیان لہریں جسم میں اٹھنے کے بعد ذرا ماند پڑیں تو میرے دل نے گواہی دی کہ بد ترین وقت گزر گیا ہے۔ ہلاکت آفریں زخم کھانے کے باوجود میں زندہ ہوں۔ کسی وجہ سے۔۔۔ کسی طور بھی ہوئی ہے مگر یہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے کہ اس مقابلے میں پہلا زخم کھانے والا جانبر نہیں ہو سکتا۔ سردار زے یقیناً میری طرف سے بالکل بے فکر ہو چکا تھا۔ اس کی یہی بے فکری اسے میرے بہت قریب لے آئی تھی۔ میں نے اپنے تن بدن کی تمام نڈھال قوتوں کو جمع کیا اور اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر سردار کی ناف میں رسید کیں۔ وہ دوہری شدت سے دوہرا ہوا تو اس کا رخ بھی مخالف سمت میں ہو گیا۔ میں جست لگا کر اس کے اوپر گرا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر آیا' اس کا سر اتنی شدت سے زمین سے ٹکرایا کہ "آہنی خود" کا چرمی تسمہ ٹوٹ گیا اور "خود" لڑھک کر دور جا گرا۔ سردار زے کا ایک ہاتھ اس کے اپنے ہی جسم کے نیچے دب گیا تھا' دوسرے ہاتھ کو میں نے بے دردی سے موڑا تو کہنی کی ہڈی کڑکڑانے کی دہشت ناک آواز آئی۔ اس ہاتھ کا خنجر زے کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے بھی ایک ہاتھ کا خنجر چھوڑ دیا تھا' دوسرے ہاتھ کا خنجر میں نے زے کی گردن کے پچھلے حصے سے لگا دیا۔ میرے ہاتھ کا ذرا سا دباؤ خنجر کی دھار اس کے سیاہ گوشت میں اتار سکتا تھا۔

اس دھار کو محسوس کر کے زے ماہی بے آب کی طرح تڑپا۔ میں نے اسے اپنے نیچے سے نکلنے نہیں دیا۔ اس کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ بلند ہوئی اور ایک بار پھر اس نے مجھے اپنے اوپر سے اچھالنا چاہا مگر ناکام ہوا۔ ہجوم پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ بس اکیلے زریں گل کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اٹھ کر ناچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے ورنہ شاید وہ باقاعدہ خٹک ناچ شروع کر دیتا۔ وہ چیخ رہا تھا "ماردو استاد۔۔۔ ماردو!"

چند لمحے تک میرے اعصاب بری طرح کشیدہ رہے' پھر میں نے زے کی گردن پر خنجر چلانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے اپنا خنجر والا ہاتھ فضا میں اٹھایا' اس کا مطلب تھا کہ میں مقابلہ جیت چکا ہوں۔ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

وہ سب جیسے سکتہ زدہ ہو چکے تھے پھر دونوں بوڑھے لڑکھڑاتے ہوئے میری طرف آئے۔ انہوں نے پہلے زے کے ہاتھ سے خنجر لیا' پھر میرے ہاتھ سے بھی لے لیا۔ چاروں خنجروں کو بڑی احتیاط کے ساتھ دوبارہ چمڑے کے خولوں میں محفوظ کر دیا گیا۔ بوڑھوں کی ہدایت پر میں نے اپنے جسم سے جنگی ساز و سامان علیحدہ کر دیا۔ سردار بھی اپنی گرد جھاڑ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی مگر وہ اتنا سخت جان تھا کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تک نمودار نہیں ہوئے تھے۔ میرے اپنے بازو سے بھی مسلسل خون نکل رہا تھا۔ کافی گہرا کٹ آیا تھا اور میں ابھی شدید چبھن محسوس کر رہا تھا۔ سردار زے کی طرح دونوں بوڑھے بھی مجھے حیرت اور تعجب کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور کچھ یہی کیفیت ہجوم کی بھی تھی۔ شاید انہیں اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جان لیوا زخم کھانے کے باوجود میں ابھی تک ان کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ وہ جسے پانچ سانس کا زہر کہتے تھے وہ میرے جسم میں اترا تھا اور میں اس کے بعد بھی درجنوں سانس لے چکا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ اپنے سینے میں سامیں عالی کی چبھوئی ہوئی سوئی یاد آئی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی دو تین اور باتیں بھی یاد آ گئیں۔ ایک دیوار جیسے نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس سے پہلے بھی دو یا تین دفعہ زہر میرے جسم پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہا تھا۔ جب ہم ماریا نرسٹ میں تھے تو ماسٹر استی اور اس کے شیطان ٹولے کی طرف سے مجھے دودھ میں زہر دے دیا گیا تھا' یہ زہر میں "ڈکار" گیا تھا پھر سانپ کے کاٹنے کا واقعہ ہوا تھا۔ اس زہر نے بھی جسم پر خاطر خواہ اثر نہیں کیا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ میں نے سنجیدگی سے سوچا تھا کہ شاید میرے جسم میں واقعی زہر کے خلاف مدافعت پیدا ہو چکی ہے اور اب یہ میرا اہم بلکہ اہم ترین واقعہ ہوا تھا۔ نیلگوں دھار والے خطرناک زریں خنجر کا زخم کھا کر بھی میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔

دونوں بوڑھے جنہوں نے اس مقابلے میں ریفری کے فرائض انجام دیے تھے' سرجوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چاروں خنجر ان کے ہاتھ میں تھے پھر بوڑھوں نے وہ خنجر علیحدہ کیا جس سے سردار زے نے بڑی چابک دستی کے ساتھ میرے بازو پر زخم لگایا تھا۔ خنجر کا غلاف احتیاط سے علیحدہ کیا گیا۔ بوڑھے بڑے دھیان سے خنجر کی دھار دیکھتے رہے۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں خنجر کے پھل پر منعکس ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں خنجر سمیت اکھاڑے سے باہر چلے گئے۔ ان کی واپسی قریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ ان کے چہروں پر نظر آنے والی حیرت موجود تھی بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے درمیان موجود تھا۔ زریں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ ضرور مجھے کندھے پر اٹھانے کی کوشش کرتا۔ صفدر کے بیمار چہرے پر بھی زندگی کی رمق نظر آنے لگی تھی۔ پروفیسر بار بار میرا کندھا تھپک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے میرے بازو کا زخم غور سے دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا "تمہیں پتا ہے یہ دونوں عمر رسیدہ ریفری ابھی تھوڑی دیر پہلے کہاں گئے تھے؟"

"کہاں گئے تھے؟"

"انہوں نے زہریلے خنجر کی دھار چیک کی ہے۔ وہ دیکھو اس پتھر کے پاس بلی کا ایک اور بچہ مردہ پڑا ہے۔"

میں نے ہجوم کے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ پروفیسر درست کہہ رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے' میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

الجھے الجھے بظاہر سیدھے سادے' تحیر' تجسس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر رشتہ داروں اور حالات کی ظلمتوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی'
جن کی بدقسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کر دیا۔

ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ پڑھ کر ...
...

بہترین کتابت' خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

پروفیسر بولا "سائیں عالی کی بات پر یقین کرنا ہی پڑے گا۔ تمہارے جسم میں زہر کے خلاف زبردست قوتِ مدافعت پیدا ہو چکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم زہر پروف ہو گئے ہو۔"

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا۔ وقتی طور پر تو میڈی کیشن سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے لیکن مستقل طور پر زہر سے محفوظ ہو جانا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن ہے۔ اور میں یہ بات ایک معالج کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اور صرف کہہ ہی نہیں رہا، تم پر ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ بہرحال ابھی اس بحث کا وقت نہیں۔ وہ دیکھو وہ لوگ سر جوڑے کیا کر رہے ہیں۔" پروفیسر نے ایک جانب اشارہ کیا۔

دونوں بوڑھے ریفری، چند دیگر "معززین" کے ساتھ اکھاڑے کے اندر موجود تھے اور صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اپنے ٹوٹے ہوئے بازو کو گلے میں ڈال کر اور چہرے پر تکلیف سجا کر سردار زے بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا تھا۔ اس گفتگو میں وہ بھی گاہے گاہے حصہ لے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اس مقابلے کے نتیجے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ قواعد کے مطابق یہ مقابلہ پہلا زخم لگانے والا جیت جاتا ہے اور پہلا اور واحد زخم زے نے ہی لگایا ہے لیکن دوسری طرف دیکھا جائے تو پہلا زخم کھانے کے فوراً بعد تم نے زے کو بالکل بے بس کر دیا ہے۔ وہ کوشش کے باوجود ہل بھی نہیں پا رہا تھا اور خنجر اس کی گردن پر تھا اس صورت میں ممکن ہے کہ مقابلے کو برابر ہی قرار دے دیا جائے۔"

"اس صورت میں سردار اور میں ہم پلّہ قرار پا جائیں گے اور سردار یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے؟"

"لیکن فیصلہ کرنے والوں کو ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا ہو گا۔ تم سردار کی جان لے سکتے تھے۔ اس کھلم کھلا مقابلے میں تمہارے لیے یہ عین ممکن تھا کہ سردار کی گردن کاٹ ڈالو۔ ایک طرح سے تم نے سردار کو نئی زندگی دی ہے۔"

"دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

قریباً دس منٹ بعد دونوں بوڑھے اکھاڑے کے بیچ درمیان کھڑے ہو گئے اور ان میں سے سینئر بوڑھے نے نتیجے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے مطابق سردار زے فاتح قرار پایا۔ واماں نے بوڑھے ریفری کے مکمل اعلان کا ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "اس مقابلے میں پہلا زخم لگانے والے کی جیت ہوتی ہے کیونکہ زخمی چند لمحے سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ اس موجودہ مقابلے میں پہلا زخم کھانے والا حریف زندہ رہا ہے اور اس طرح کا واقعہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس شخص پر کسی سحر کا اثر ہے یا اس نے کوئی خاص قسم کی غیر معمولی دوا استعمال کی ہے، اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ بہرحال محترم سردار اس مقابلے میں جیت گئے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے حریف کو کسی بھی دوسرے طریقے سے قتل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔"

"بہت انصاف والا فیصلہ ہے!" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان مکار جوڑوں سے ایسے ہی فیصلے کی توقع تھی۔" واماں نے مایوسی سے کہا۔

"بہرحال میری طرف سے ایک بات اس ٹنڈے سردار کو ابھی بتا دو۔ وہ جس طرح کا مقابلہ چاہے مجھ سے کر سکتا ہے مگر ہماری عورتوں کی طرف کسی کی میلی نگاہ نہیں اٹھنی چاہیے۔"

واماں یہ بات کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس نے بڑے ادب سے سردار زے سے یہ بات کہہ ڈالی۔ سردار زے سپاٹ چہرے کے ساتھ میری جانب دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا اندازہ لگانا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گئے۔ سردار کی پہلی بیوی روبا ہمیں کوٹھڑی کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ وہ میری زندگی بچ جانے پر بار بار دیوتاؤں کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس نے واماں کے ذریعے مجھ سے کہا "لگتا ہے کہ تم پر دیوتاؤں کا خاص کرم ہے ورنہ اس مقابلے میں زے کا کوئی حریف آج تک زندہ نہیں بچا۔"

میں نے کہا "تم میری زندگی بچنے پر دیوتاؤں کا شکر ادا کر رہی ہو۔ سردار زے کی زندگی بھی تو بچی ہے۔ میں نے اسے پچھاڑنے کے بعد بھی زندہ چھوڑ دیا ہے۔"

"اس میں یقیناً تمہارا بڑا پن ہے۔ سردار زے اور اس کے ساتھیوں کو تمہاری اس مہربانی کی قدر کرنی چاہیے۔"

ہم کوٹھڑی میں واپس پہنچ گئے۔ غزالہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک رہے تھے۔ اسے بھی ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس لڑائی میں دونوں حریف اکھاڑے سے زندہ سلامت باہر آ جائیں گے۔ کلثوم کسی چھوٹی بچی کی طرح باقاعدہ مجھ سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ تابی غزالہ کی گود

سے اتر کر میری گود میں آ گیا۔ معصومیت سے میرا چہرہ چھونے لگا اور توتلی باتیں کرنے لگا۔ ماسٹرا سٹی حسبِ معمول دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کل رات اس نے پھر گالیاں بکی تھیں اور کلثوم کا چہرہ نوچنے کی کوشش کی تھی جواب میں زریں نے اسے دو تین کرارے تھپڑ رسید کیے تھے، وہ ایک دم خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا اور بڑبڑانے لگا تھا، بعد ازاں زریں نے لال لال آنکھوں سے گھور کر اس کی بڑبڑاہٹ بھی بند کرا دی تھی۔

روبا کی مہربانی سے اب ہمیں اس کوٹھڑی میں قدرے بہتر سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں اور سب سے بڑی سہولت پانی کی تھی۔ پینے کے لیے اب ہمیں دگنا پانی مل رہا تھا۔ چند نرم بچھونے بھی مل گئے تھے۔ رات کو چراغ کی مدھم روشنی میں غزالہ نے بڑی نرمی اور محبت سے میرے زخمی بازو کی مرہم پٹی کی۔ غزالہ کا کہنا تھا کہ اصولی طور پر تو اس زخم پر ٹانکے لگنے چاہئیں مگر یہاں اسٹیچنگ کا سامان نہیں تھا لہٰذا اس نے صرف پٹی باندھنے پر اکتفا کیا۔ اپنی بنائی ہوئی اینٹی بایوٹک دوا غزالہ نے میرے بازو پر بھی استعمال کی۔ میرے بازو پر پٹی کرتے ہوئے اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ میں نے پوچھا "تمہیں یقین تھا کہ میں زندہ واپس آ سکوں گا؟"

"سو فی صد۔"

"وجہ؟"

"یہ اپنے دل سے پوچھیے۔" اس نے دلربا انداز میں مختصر جواب دیا۔

اس رات ہمیں اپنی کوٹھڑی میں چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ چیخ و پکار کسی نوجوان عورت کی تھی اور کسی بھی کوٹھڑی کے اندر سے ابھر رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز صاف سنی جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ عورت پر تشدد ہو رہا ہے اور وہ منت سماجت کر رہی ہے۔ کبھی وہ رونے لگتی تھی، کبھی بولنے لگتی تھی۔ شاید وہ کچھ مدہوش مردوں کی دست درازی کا شکار تھی۔ یہ آوازیں ہمیں بری طرح پریشان کرتی رہیں۔ کلثوم تو جلد سو گئی تھی مگر غزالہ اور شائستہ رات بھر نہ سو سکیں۔ یہی حال میرا، زریں اور پروفیسر کا بھی تھا۔ میرے کہنے پر واماں نے ایک پہرے دار سے ان آوازوں کے بارے میں پوچھا تو وہ بڑی بدتمیزی سے بولا "خبیث بڈھے چپ ہو کر بیٹھ جا۔ یہ تیری بیٹی نہیں ہے۔"

دوسرے پہرے دار شیطانی انداز میں مسکرانے لگے تھے۔ وہ کوٹھڑی سے ابھرنے والی آوازوں کو بڑے ذوق و شوق سے سن رہے تھے۔

واماں بولا "میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ کہیں سے کوئی لڑکی اغوا کر کے لائے ہیں۔"

"یہ کون سی زبان بول رہی ہے؟"

"یہ لارسی لڑکی ہے اور ہو سکتا ہے کہ موگاسا ہی کی ہو۔"

میں نے کہا "مجھے شک پڑتا ہے کہ سردار زے بھی یہاں موجود ہے۔"

"ہاں آواز تو میں نے بھی سنی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ لڑکی کو کھلونا بنا کر وہ آج کی شکست کا غم غلط کر رہا ہو۔" واماں نے کہا۔

ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ آخری پہر لڑکی کی آواز آنا بند ہو گئی۔ پتا نہیں تھا کہ بے چاری کے ساتھ کیا گزری ہے۔ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے مجھے بھی نیند آ گئی۔ مقابلے کے ذہنی تناؤ اور پھر جسمانی تھکن کے بعد یہ بہت گہری نیند تھی۔ میں سویا تو پھر دوپہر سے تھوڑی ہی دیر پہلے اٹھا۔

آنکھ کھلتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہماری کوٹھڑی کے مکینوں میں ایک اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ وہ سیاہ فام ہونے کے باوجود جسمانی لحاظ سے کافی دلکش نظر آتی تھی، تاہم اس کی تمام تر دلکشی اس وقت غارت ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر کٹا پھٹا نامکمل لباس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غزالہ نے اس کے جسم پر ایک چادر ڈال دی تھی۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے اور یقیناً یہ جنسی تشدد ہی تھا۔ غالباً لڑکی کو زبردستی شراب وغیرہ بھی پلائی گئی تھی، وہ ابھی تک اسی نشے میں مدہوش نظر آتی تھی اور گاہے گاہے مدہوشی ہی کی حالت میں بڑبڑانے بھی لگتی تھی۔ اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اسی بدقسمت لڑکی کی چیخ و پکار ہم رات کو سنتے رہے ہیں۔

شام تک لڑکی کی حالت قدرے بہتر ہو گئی بلکہ اس نے غزالہ کے ہاتھوں تھوڑا سا دودھ بھی پیا۔ غزالہ نے ہمیں منع کر دیا تھا کہ ابھی لڑکی سے کسی قسم کا کوئی سوال نہ کیا جائے۔ وہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ ہمیں ڈر تھا کہ شاید وحشی جوڑم لڑکی کو پھر کوٹھڑی سے باہر لے جانے کی کوشش کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ کلثوم اور شائستہ کے حوالے سے بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اگلے روز ناشتے کے بعد لارسی لڑکی نے واماں کو کئی اہم باتیں بتائیں۔ یہ باتیں انکشافات کے زمرے میں آتی تھیں اور ان سے ہمیں اردگرد کے حالات کا علم بھی ہوا۔

پہلے تو لڑکی نے صرف اتنا بتایا کہ موگاسا کی لڑائی کے بعد وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ٹرسٹیوں کے ڈر سے بھاگی تھی۔ موگاسا سے ایک دن کی مسافت پر وہ گھنے جنگل میں پہنچی اور وہاں ژروام قبیلے کے ڈاکوؤں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس کا منگیتر مارا گیا اور ڈاکو اسے اٹھا کر یہاں بستی میں لے آئے۔

بعد ازاں لڑکی نے ان واقعات کو ذرا مزید تفصیل سے بیان کیا اور تب ہم پر یہ چونکا دینے والا انکشاف ہوا کہ وہ جسے اپنا منگیتر بتا رہی ہے وہ در اصل سردار رانفے کا چھوٹا بھائی اولام ہے۔

اولام کا نام ہمارے لیے نیا نہیں تھا' اس نام کو سننے کے بعد لڑکی کے بتائے ہوئے واقعات میں ہماری دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ میں نے لڑکی سے پوچھا "تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سردار رانفے کا بھائی اولام مر گیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور دو موٹے آنسو اس کے چکنے رخساروں پر پھسل گئے۔ وہ بولی "ان وحشی ڈاکوؤں نے سردار اولام کو مار ڈالا۔ وہ تیر سے زخمی ہو کر گر گیا تھا' اس کے سر کو ایک بھاری پتھر سے کچل دیا گیا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوری۔" اس نے جواب دیا۔

"کوری! کیا تم شروع سے بتانا پسند کرو گی۔ ہم تینوں وعدہ کرتے ہیں کہ یہ باتیں صرف ہم تک رہیں گی اور اگر ہمیں موقع ملا تو ہم تمہاری مدد کی کوشش بھی کریں گے۔"

کوری نامی وہ لڑکی کچھ دیر تک تذبذب میں رہی پھر اس نے کہنا شروع کیا "شاید آپ مجھے شکل سے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ صحرائی درویش کے مریدوں میں سے ہیں۔ سردار رانفے آپ کی بہت عزت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی۔" اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنے آنسو پونچھے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی "میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ شاید اسی طرح میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ سردار اولام مجھے پسند کرتا تھا' میری یہ مجال نہیں تھی کہ اس کی پسندیدگی سے آنکھ چراؤں۔ میں جانتی تھی اولام میں کچھ خرابیاں ہیں لیکن اسے ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔ آپ کو معلوم نہیں ہو گا' بلکہ شاید کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا اولام بظاہر اپنے بھائی کا وفادار نظر آنے کے باوجود وفادار نہیں تھا۔ وہ اندر سے اپنے بڑے بھائی کا دشمن تھا اور گزرنے والے وقت کے ساتھ یہ دشمنی بہت گہری ہو چکی تھی۔ اتنی گہری کہ جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔"

اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنے زخمی ہونٹ سے رستا ہوا خون انگلی سے صاف کیا اور بولی "کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ٹرسٹ والوں نے اچانک موگاسا بستی پر ہلا کیوں بول دیا تھا؟"

"ہاں سوچا ہے۔ کئی بار سوچا ہے؟" میں نے واماں کی وساطت سے جواب دیا۔

وہ بولی "تو پھر کیا جواب ملا آپ کو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

وہ گویا ہوئی "یہ بات آپ کے لیے حیرانی کا سبب ہو گی' موگاسا پر اچانک حملہ سردار اولام کی وجہ سے ہوا۔ یہ سارا اولام ہی کا منصوبہ تھا۔ اس کے اندر یہ خواہش تھی کہ اس کا بھائی برباد ہو جائے بلکہ وہ بستی ہی برباد ہو جائے جس پر وہ حکومت کرتا ہے' جو اس کی پہچان ہے۔ جب اولام نے دیکھا کہ لارسیوں اور ٹرسٹیوں کے درمیان لڑائی بند ہونے والی ہے اور اپنے بیٹے کی "یرغمالی" کی وجہ سے ٹرسٹ کا بادشاہ لارسیوں کی بہت سی شرطیں ماننے پر تیار ہو گیا ہے تو اولام کو اپنا سپنا بکھرتا نظر آیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ ٹرسٹی موگاسا کو تباہ کیے بغیر واپس چلے جائیں۔ اس نے منصوبے کے تحت پہلے کنگ کے یرغمالی بیٹے پر فائرنگ کروائی۔ اس فائرنگ میں اتفاقاً کنگ کا بیٹا بچ گیا مگر اولام نے کنگ تک یہ بات پہنچائی کہ اس کا بیٹا مارا گیا ہے اور اب لارسیوں کے پاس اسے واپس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ بظاہر سردار کا وفادار نظر آنے والا اولام ٹرسٹیوں کا سب سے قابل اعتبار جاسوس تھا۔ ٹرسٹی اس کی اطلاع پر آنکھیں بند کر کے یقین رکھتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اولام نے انہیں غلط اطلاع دی ہے اور فائرنگ میں ماسٹر اسٹی محفوظ رہا ہے۔ وہ انتقام میں اندھے ہو کر موگاسا پر چڑھ دوڑے اور اس کے بعد موگاسا میں جو کچھ ہوا وہ آپ سب کو معلوم ہی ہے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ سرہلانے میں پروفیسر بھی میرا ساتھ دیا۔

کوری بولی "اولام نے ایک اور چالاکی بھی دکھائی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جونہی موگاسا پر حملہ ہو گا' آپ لوگ (ٹرانس مِٹر) استعمال کر کے کنگ کو بتا دیں گے کہ اسٹی تو زندہ ہے۔ اس نے آپ کو اس کام سے روکنے کے لیے جھونپڑے سے آپ کا آلہ چرا لیا۔ اس کے علاوہ بھی اولام نے ایک زبردست چال کھیلی۔ اس نے حملے کے فوراً بعد ٹرسٹ کے کچھ گارڈز کو ایک جھونپڑے میں چھپایا اور بوما تک پہنچا دیا جب لڑائی زوروں پر تھی۔ یہ ٹرسٹی بوما کی چھت پر موجود

ہو گئے اور انہوں نے وہاں سے اندھا دھند گولیاں چلا کر بہت سے لوگوں کی لاشیں گرا دیں۔ کیا آپ میری باتوں پر یقین کر رہے ہیں؟" اس نے ذرا رک کر پوچھا۔

"کیوں نہیں کریں گے۔" میں نے جواب دیا "یہ سب کچھ ہمارے ساتھ بیتا ہے۔ میرا آلہ (ٹرانس مِٹر) چوری ہوا ہے اور واقعی میں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے اس کی زبردست کمی محسوس کی ہے۔ شاید آلہ ہوتا تو یہ لڑائی رک جاتی۔ تم نے بوما کی چھت سے فائرنگ ہونے کی جو بات کی ہے' میں اس کا بھی چشم دید گواہ ہوں۔"

وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی "لڑائی کے بعد سردار رانفے ٹرسٹیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب اس پر بہت سی مصیبتیں آنے والی تھیں۔ ان مصیبتوں کا تصور اولام کو اندر سے خوش کر رہا تھا لیکن پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کی کسی کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ فاتح ٹرسٹیوں کا رویہ بالکل اچانک تبدیل ہو گیا۔ ان کی ساری وحشت ایک دم نرمی میں بدل گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایک روز پہلے لڑائی میں پکڑے گئے سارے قیدی چھوڑ دیے بلکہ انہیں بستی میں نئے جھونپڑے بنانے میں بھی مدد دی گئی۔ زخمیوں کا علاج کرایا گیا اور بوما میں سلگتی آگ سرتوڑ کوشش سے بجھائی گئی۔ اس وقت ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اولام بھی ٹرسٹیوں کے بدلے ہوئے رویے پر ششدر تھا۔ مگر کل مجھے اس سوال کا جواب مل گیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"کنگ کے بیٹے کو آپ لوگوں کے پاس زندہ سلامت دیکھ کر۔" کوری نے جواب دیا۔

"کیا تم اسے پہچانتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ موگاسا میں میں نے اسے آپ کے پاس دیکھا تھا۔ ایک روز اس نے لاروتا بے کو گندی گالیاں دی تھیں اور انہوں نے کی بوکو سے اس کی پٹائی کی تھی۔ کل یہاں اس لڑکے کو آپ لوگوں کے پاس دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ اولام نے ٹرسٹیوں کو لڑکے کے مرنے کی غلط اطلاع پہنچائی تھی اور یہ کہ لڑکا آپ کے پاس زندہ سلامت موجود ہے۔" کوری نے چند لمحے توقف کیا' اس کی پیشانی پر سوچ کی مدھم لکیریں تھیں۔ پر سوچ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میرا اندازہ ہے کہ آپ لوگوں نے لڑائی کے بعد کسی طرح ٹرسٹیوں تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ یرغمالی لڑکا زندہ ہے۔ اسی اطلاع کی وجہ سے ٹرسٹیوں کا رویہ ایک دم بدلا تھا۔"

میں نے کہا "کوری تمہارا اندازہ درست ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ ٹرسٹیوں کا رویہ بدلنے کے بعد؟"

وہ بولی "بہت کچھ ہوا جی۔ ٹرسٹی گارڈز دو دن کے اندر ہی بستی سے نکل گئے۔ جاتے جاتے وہ سردار رانفے اور اس کے قریبی ساتھیوں کو بھی چھوڑ گئے۔ شاید آپ کو اس بات کی اطلاع نہ ہو کہ سردار رانفے ایک بار پھر موگاسا بستی میں سردار کی حیثیت سے موجود ہے۔ بچے کھچے لوگ بھی بستی میں دوبارہ جمع ہو گئے ہیں اور تباہ ہونے والے جھونپڑوں کی جگہ نئے جھونپڑے بنا رہے ہیں۔ پرسوں دوپہر تک سردار رانفے کو اولام کی سازش کا بھی پتا چل گیا۔ اولام ہی کے ایک قریبی دوست نے سردار رانفے کے سامنے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ سردار کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اولام پکڑے جانے سے پہلے ہی بستی سے بھاگ نکلا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ ہم دونوں گھوڑے پر سوار ہیں پہاڑوں کی سیر تک ہم بھاگتے رہے۔ سردار رانفے کے محافظ ہم دونوں کے تعاقب میں تھے۔ رات کو ہم ایک گھنے جنگل میں پناہ کے لیے گھس گئے۔ ان درختوں میں پہنچ کر ہم سردار رانفے کے محافظوں سے تو بچ گئے لیکن ان ژروام ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ ہم نے ایک درخت پر پناہ لے رکھی تھی' ژروام ڈاکوؤں کو علم ہو گیا۔ ان کی تعداد دس پندرہ کے قریب تھی۔ انہوں نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی۔ اولام نے جواب میں تیر اندازی

کی۔ اُدھر سے بھی تیر چلائے گئے۔ ایک تیر اولام کی گردن میں لگا۔ وہ درخت سے نیچے گر گیا۔ وحشی جوداموں نے اولام کا سر ایک بھاری پتھر سے کچل دیا پھر مجھے درخت سے اتار کر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اولام کے پاس ایک رائفل بھی موجود تھی۔ رائفل میں صرف تین چار گولیاں تھیں جو اولام نے برے وقت کے لیے سنبھال رکھی تھیں۔ جودام ڈاکوؤں نے رائفل کو پتھروں پر مار مار کر توڑ ڈالا اور مجھے اپنے ساتھ یہاں لے آئے۔"

"کل رات ہم تمہاری چیخ و پکار سنتے رہے ہیں مگر تم دیکھ ہی رہی ہو کہ فی الحال ہم بھی تمہاری طرح بے بس ہیں۔" پروفیسر نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔

ایک دم پھر اس کے چکنے سیاہ رخساروں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔ اس نے ہچکیاں لے لے کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں داماں کی وساطت سے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہاں لانے کے فوراً بعد [illegible] کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ پہلے اسے ایک طلائی چوڑی پہنائی گئی۔ یہ چوڑی پہننے کے تھوڑی ہی دیر بعد سردار زے اس کے کمرے میں گھس آیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کا ایک بازو اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ کوری نے مزاحمت کی تو سردار کے کارندوں نے اسے رسی سے جکڑ دیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد سردار چلا گیا اور ایک ادھیڑ عمر پہرے دار اندر داخل ہوا۔ اس نے کوری کی کلائی سے سونے کی چوڑی اتار کر چاندی کی چوڑی پہنائی اور سونے کی چوڑی کوری کے سرہانے کے نیچے رکھ دی۔ کچھ دیر بعد لمبے بالوں والا اور نہایت چمکیلی آنکھوں والا ساحر بوتارا کوری کی خلوت گاہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے بھی ٹوٹی پھوٹی کوری کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس سے پہلے زے کر چکا تھا۔ رات کا باقی حصہ بھی اسی طرح گزرا۔ دو تین اور بدبودار مرد کوری کے پاس آئے اور چلے گئے۔ صبح دم نیم بے ہوش کوری کو اٹھا کر ہماری کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔

کوری کی ساری کہانی ہمارے سامنے آ چکی تھی اور اس کے علاوہ یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ اس کوٹھڑی سے باہر کے حالات کیا ہیں۔ سردار رانے۔۔۔ اور اولام کے اندرونی اختلاف کی کہانی ہم سب کے لیے تعجب خیز تھی۔ موگا ساماں قیام کے دوران میں مجھے ایک دو بار اولام پر موہوم سا شک ہوا تھا مگر یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ موگاساکی قتل و غارت کا مرکزی کردار یہی اولام ہے۔ کوری نے اولام کے انجام کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اگر وہ درست تھا تو پھر

مکافات عمل کا اصول اس پر صادق آیا تھا۔ سردار رانے ایک بار پھر اپنی تباہ حال بستی میں موجود تھا۔ کوری کی باتوں سے دوبارہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ کنگ براؤن کے لیے ماسٹر اسٹی دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم ہے۔ وہ اپنے ہونہار سپوت اور مستقبل کے اس "عظیم بردہ فروش" کی زندگی کے متعلق کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں۔ موگا میں جو کچھ بھی ہوا تھا وہ ایک سنگین غلط فہمی کا نتیجہ تھا اور اب زرشیوں کو اس غلط فہمی کا شدید قلق بھی تھا۔

پروفیسر نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے شاہ جہاں! کنگ اب خاموش ہو کر بیٹھ گیا ہو گا؟"

"یہ تو ناممکن ہے۔ اس کے ہرکارے ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے۔"

"پھر وہ لوگ اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچے؟"

"بظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ جوڈمزکی یہ آبادی جنگل کے اندر کافی گہرائی میں واقع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ان لوگوں کو کچھ وقت لگ جائے۔"

اب ہم اردو بول رہے تھے لہٰذا زریں گل کی سمجھ میں بھی بات آ رہی تھی۔ وہ بولا "ہمارے دل کو یقین ہے استاد صیب کہ کنگ اپنے اس بچہ ٹکڑے کا پیچھا دنیا کے آخری کنارے تک کرے گا۔ اس شیطانی نطفے کی شکل میں ہمارے پاس حرامی کنگ کا بہت بڑا کمزوری آ گیا ہے۔ آپ نے پاکستانی فلم قربانی دیکھا تھا۔ اس میں۔۔۔"

"اس میں جو کچھ بھی تھا وہ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ٹوکا۔

"آپ کے بس میں ہو تو لکڑی کا ایک موٹا ڈنڈا اٹھا کر ہمارے منہ میں ٹھونک دے۔ آپ زیادہ تر تو انگریزی بولتا رہتا ہے۔ اگر کسی وقت اردو بولتا بھی ہے تو ہماری بات نہیں سنتا۔ ہمارا دل تو کسی وقت چاہتا ہے کہ خودکشی ہی کر لے۔"

"خودکشی اسلام میں حرام ہے۔" میں نے کہا "تم کہو کہ ایک بار پھر اس روزن میں سے کسی پہرے دار کی بیس چھڑی مار کر اسے زخمی کرو۔ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ لوگ تمہیں کوٹھڑی سے نکال کر خود ہی مار دیں گے۔"

"صیدر بھائی! تم سن رہا ہے نا۔ استاد صیب کے میں ہمارا اتنا خاصیت ہے۔"

"خاصیت نہیں اہمیت۔" میں نے کہا۔

"جو بھی ہے لیکن آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ ہم پر اچھا خون پسینہ چھڑکتا ہے اور آپ ہمارے سامنے ایک ایسی زبان میں بات کرتا ہے جو بالکل بھی ہماری سمجھ میں

آتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ادھر لاہور میں ہی رہتا۔ ادھر میکلوڈ روڈ پر جا کر پشتو فلمیں دیکھتا اور شام کو اسٹوڈیو کے گیٹ پر جا کر اپنے فلمی ہیروز کا دیدار کرتا۔"

"ہیروز کا یا ہیروئنوں کا؟" میں نے پوچھا۔

"ہیروئن تو اب ہمارے پاس اپنا ہے۔ ہم کو تو بس بدر منیر اور لالہ سدھیر کو دیکھنے کا پیاس ہے۔"

شاید زریں گل کے ساتھ کچھ دیر مزید نوک جھوک جاری رہتی مگر پھر کوری کی ہلکی ہلکی سسکیوں نے ہمیں اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ داماں کے ذریعے پروفیسر سے مخاطب ہو کر بولی "میں نے جودم لوگوں کے برے کرداروں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، یہاں آ کر وہ سب سچ ثابت ہو گیا۔ عورت کے لیے یہ لوگ اتنے ہی خطرناک ہیں جتنا جنگل کا شیر کسی چرندے کے لیے ہو سکتا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ بھی عورتیں ہیں۔ آپ کے ساتھ پتا نہیں یہ لوگ کیا سلوک کریں گے۔ بہرحال ایک بات میں آپ سے ضرور کہوں گی، عورت کے متعلق ان لوگوں کی کسی بات پر بالکل یقین نہ کریں۔"

وہ سارا دن بھی عجیب کشمکش میں گزر گیا۔ مسلح پہرے دار چوبیس گھنٹے ہماری کوٹھڑی کے گرد موجود رہتے تھے۔ روزنوں میں سے گھورنا انہوں نے ترک نہیں کیا تھا، ہم نے ہی ہار کر تاک جھانک ترک کر دیا تھا۔ بہرحال مقابلے کے بعد سے پہرے داروں کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیں تھوڑی سی عزت دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے تھے تو ان کی آنکھوں میں تعجب کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ یہ تعجب یقیناً کل کے مقابلے اور اس میں میرے زندہ بچ جانے کے حوالے سے تھا۔ کبھی کبھی وہ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگتے تھے۔ ان کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ ان چہ میگوئیوں کا موضوع میں ہی ہوں۔ شام کے وقت وہ دونوں بوڑھے کوٹھڑی میں آئے جنہوں نے کل مقابلے میں ریفری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ انہوں نے پٹی کھلوا کر میرے بازو کا زخم دیکھا، پھر داماں کے ذریعے مجھ سے سوالات کرتے رہے "کیا تم نے مقابلے سے پہلے کوئی دوا استعمال کی تھی؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی سحر یا روحانی عمل وغیرہ کرایا تھا؟"

"بالکل نہیں۔ ہم ایسی باتوں پر زیادہ یقین ہی نہیں رکھتے۔"

"اس کے باوجود تم لوگ اپنے ساتھ ایک خطرناک جادوگر لڑکی لیے پھرتے ہو۔" ایک بوڑھے نے نکتہ اٹھایا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ موتاب کی طرف ہے۔

"وہ لڑکی اتفاقاً ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔"

"یہ تمہارے جھوٹوں میں سے ایک اور جھوٹ ہے۔ تم اس لڑکی کو ایک ہتھیار کے طور پر اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ تو ہماری قسمت اچھی تھی کہ بروقت ہمیں اس کی خطرناکی کا علم ہو گیا، ورنہ وہ اپنے جادوئی اعمال سے اس بستی کو کھنڈر بنا دیتی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بڑے سکون میں ہے اور اسی وجہ سے ہم سب بھی سکون میں ہیں۔"

"کہیں۔۔۔ تم لوگوں نے اسے مار تو نہیں دیا؟"

"ایسی حرکت بہت سوچ سمجھ کر کی جائے گی۔" ایک بوڑھے نے مبہم جواب دیا۔

کچھ دیر تک پولیس والوں کی طرح پوچھ تاچھ کرنے کے بعد دونوں بوڑھے چلے گئے۔ اب ایک اور پر اندیشہ رات ہمارے سر پر تھی۔ ایسی رات جس میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔ کوری کی حالت زار ہم سب کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ خاص طور سے شائستہ اور کلثوم تو بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ کلثوم کو پریشان دیکھ کر زریں کا موڈ بھی بگڑا ہوا تھا لہٰذا کھانے کے بعد جب اسٹی نے بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برتن ایک طرف پھینکے تو زریں کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے اسٹی کو بالوں سے پکڑ کر چند بار زور سے جھنجوڑا، شاید وہ اسے تھپڑ وغیرہ بھی مارتا مگر غزالہ نے حسب سابق جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بچا لیا۔ رات کو ہم ساتھ ساتھ ہی چٹائیوں پر لیٹ گئے۔ تنھا تابی میرے اور غزالہ کے درمیان تھا۔ رات اندھیری اور بھیانک تھی۔ جنگل سے شب بیدار درندوں کی آوازیں ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ غزالہ کا ہاتھ تابی کے سینے پر تھا حسب دستور میں نے بھی اپنا ہاتھ تابی پر رکھ دیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ باہم مل گئے۔ دوری میں یہ قربت کا ایک انوکھا انداز تھا۔ ہاتھ جسم تو نہیں تھے لیکن وہ دو جسموں ہی کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے رہے، ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔ گریز، پیش قدمی، خود سپردگی غرض ہر کیفیت ہاتھوں کے اس ملاپ میں موجود تھی۔ کوٹھڑی کے باریک روزنوں میں سے چاند کی اکا دکا کرنیں کوٹھڑی میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایسا ہی کوئی بھٹکا ہوا ہوا کا جھونکا بھی اندر چلا آتا تھا۔ اس جھونکے میں چاندنی میں نہائے ہوئے جنگل کی خوشبو اپنے تمام تر بھیدوں کے ساتھ موجود ہوتی تھی اور اس کے علاوہ کچھ

آوازیں ہوتی تھیں۔ جنگل کے درمیان بہتی ہوئی کسی نامعلوم ندی میں تیرتی ہوئی نامعلوم کشتی کے سیاہ فام ملاحوں کی آوازیں۔ کوئی قدیم افریقی گیت جس میں آزادی' بارش اور اناج سے لدے ہوئے کھیتوں کا ذکر ملتا تھا اور ان الھڑ دوشیزاؤں کا تذکرہ تھا جن کے ہونٹ سیاہ انگوروں کی طرح شیریں اور فرحت بخش تھے جن کی سیاہ آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک تھی۔ تمام تر مشکلات کے باوجود اس رات کا فسوں ہمیں متاثر کر رہا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے پیوست تھے۔

اگلا دن سہ پہر تک تو خیریت سے گزرا پھر مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ سردار زے کی پہلی بیوی روبا کوٹھڑی میں ہمارے پاس آئی۔ وہ خاصی فکرمند دکھائی دیتی تھی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "تمہیں پہلے ہی کہا تھا نا کہ سانپ سے نیکی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"تم نے سردار کو نئی زندگی دی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ تم اگر چاہتے تو مقابلے کے آخر میں سردار کو جان سے مار سکتے تھے۔ یہ زندگی موت کا مقابلہ تھا اور اس میں مرنے مارنے پر کسی بھی طرح کی پابندی نہیں تھی۔ سچ یہی ہے کہ تم نے سردار پر احسان کیا۔ شاید تمہارے ذہن میں ہو کہ سردار اور اس کے ساتھی تمہارے ساتھ نرمی کا کوئی معاملہ کریں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مجھے افسوس اور رنج کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سردار تم سے کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اس نے جو کہہ دیا ہے وہ کر کے رہے گا۔"

"کیا آپ کا اشارہ کلثوم اور شائستہ کی طرف ہے؟"

روبا نے بڑے دکھ سے اثبات میں سر ہلایا "ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ آج ہی رات دونوں لڑکیوں کو یہاں سے نکال لے جائیں۔ میں نے سنا ہے کہ سردار اس معاملے کو اپنی عزت بے عزتی کا مسئلہ بنائے ہوئے ہے اور زیادہ تاخیر کرنا نہیں چاہتا۔"

"پھر.... آپ کا کیا مشورہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے روبا نے غور سے میرا چہرہ دیکھا جیسے میرے دکھ اور پریشانی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو پھر آہستہ سے بولی "مجھے ایک ہی ڈر ہے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ زے مزید بھڑک جائے اور اپنے پہلے وعدے سے بھی مکر جائے۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری منگیتر کے سلسلے میں زے مجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ.... اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ زے اپنے وعدے پر اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب ہم اسے من مانی کرنے دیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں لیکن مجھے ڈر سا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ اس بارے میں کچھ سوچو۔ جب بہت زیادہ نقصان کا ڈر ہو تو کبھی کبھی چھوٹا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سردار زے یہاں کا حکمران ہے۔ تم سب اس کی قید میں ہو۔ وہ ہر طرح کی سفاکی تمہارے ساتھ برت سکتا ہے۔"

روبا ڈھکے چھپے لفظوں میں کچھ دیر تک ہمیں سمجھاتی رہی اور قریب آنے والے خطرے سے آگاہ کرتی رہی پھر شام کو آنے کا کہہ کر چلی گئی۔ اس کی آمد نے ہم سب کی فکرمندی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ بے بسی کا ایک احساس تھا جو ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ چند دن پہلے سردار زے کے حوالے سے میرے ذہن میں جو اچھے خیالات پیدا ہوئے تھے وہ بھی اب یکسر ختم ہو چکے تھے۔ سردار زے نے اگر میرے ساتھ مقابلہ کرنا قبول کیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ دلیر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنی جیت کا سو فیصد یقین تھا۔

شام سے کچھ دیر پہلے فضا میں بے حد حبس تھا۔ پروفیسر ہلکا بخار محسوس کر رہا تھا۔ پروفیسر کو شک تھا کہ یہ ملیریا ہے۔ غزالہ کا خیال بھی یہی تھا۔ بہرحال بخار کی شدت زیادہ نہیں تھی۔ شام کے فوراً بعد فضا کا حبس اس طرح کم ہوا کہ تیز آندھی چلنا شروع ہو گئی۔ کوٹھڑی سے باہر جلتی ہوئی مشعلیں وغیرہ بجھ گئیں پھر کوٹھڑی کے اندر بھی اندھیرا چھا گیا۔ تیز ہوا کے ساتھ گرد اور ریت وغیرہ بھی کوٹھڑی میں داخل ہو رہی تھی۔ اچانک تاریکی میں ابھرنے والی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آواز کوٹھڑی کے ایک روزن سے ابھری تھی۔ کسی شخص نے بھاری آواز میں کچھ کہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ اس آواز کو سن کر بوڑھا داماں روزن کے بالکل قریب چلا گیا۔ آواز نے سرگوشی میں کچھ کہا' جواب میں داماں نے بھی سرگوشی کی۔ سرگوشیوں کا یہ سلسلہ تقریباً آدھے منٹ تک جاری رہا پھر داماں روزن کے پاس سے ہٹ گیا۔

"کون تھا؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

"ایک جانا پہچانا شخص۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"موبل۔" داماں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ موبل کا نام سنتے ہی ایک

چست چالاک لاری نوجوان کا سراپا نگاہوں میں گھوم گیا۔ جس وقت جوام افراد نے ہم سب کو پہاڑی کھوہ سے گرفتار کیا' موبل بھی ہمارے ساتھ تھا مگر پھر وہ بڑی صفائی سے غائب ہو گیا تھا۔ اس بستی کی طرف آتے ہوئے اور اس بستی میں پہنچ کر مجھے کئی بار موبل کا خیال آیا تھا اور یقیناً میرے ساتھیوں نے بھی اس کے بارے میں سوچا ہو گا۔ ایک دو بار میرے دل میں یہ امید بھی پیدا ہوئی تھی کہ شاید موبل کسی حوالے سے ہماری مدد کرنے کی کوشش کرے' آج کئی روز بعد بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر میں پھر اس کا نام سن رہا تھا۔

داماں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ وہ بولا "موبل ہمارے آس پاس ہی موجود ہے۔ اس نے ایک بڑی اہم اطلاع دی ہے۔"

"کیا؟"

"اس کا کہنا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہمیں جو کھانا دیا جائے گا اس میں نشہ آور دوا ہے' ہم کوشش کریں کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور اگر کھانا ہی پڑے تو بڑی تھوڑی مقدار میں کھائیں اور باقی ادھر پھینک دیں۔"

"اور کیا کہا ہے اس نے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ آج کی رات بڑی اہم ہے۔ ہم پوری طرح چوکس رہیں۔ وہ ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ اس نے تھوڑا بہت انتظام کر بھی لیا ہے۔ باقی جلد ہو جائے گا۔"

"انتظام سے اس کی کیا مراد ہے؟"

"یہ تو وہی جانتا ہے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر وہ ہماری کوٹھڑی کے قریب آ گیا تھا۔ ویسے یہ نوجوان ہے تیز طرار۔ اتنا خطرناک کام کر رہا ہے پھر بھی بالکل پریشان نظر نہیں آتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔"

داماں' میں اور پروفیسر دیر تک سرگوشیوں میں مشورہ کرتے رہے۔ صفدر سویا ہوا تھا۔ زریں کو اس مشورے میں شامل کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ پروفیسر کا خیال یہی تھا کہ اگر داماں کو کسی طرح کا دھوکا نہیں ہوا اور یہ واقعی موبل تھا تو پھر ہمیں اس کی اطلاع کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔ وہ بولا "ہم خود بھی جانتے ہیں کہ آج کی رات اہم ہے۔ سردار زے کی طرف سے کوئی کینگی ہو کر رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ کلثوم اور شائستہ کو یہاں سے لے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ہمیں مزاحمت اور ہنگامے سے باز رکھنے کے لیے انہوں نے کھانے میں خواب آور دوا ملانے کا پروگرام بنایا ہو۔"

"لیکن ہمارے لیے یہ بھی تو مشکل ہو گا کہ ہم کھانے سے انکار کر دیں۔" میں نے کہا۔

"اگر اس طرح روشنیاں گل رہیں تو پھر کھانے سے ہاتھ کھینچنا آسان ہو جائے۔"

کچھ دیر بعد ہم نے صفدر کو بھی جگا لیا۔ ضروری تھا کہ تمام ساتھیوں کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کر دیا جاتا۔ اپنے اردگرد موبل کی موجودگی کا سن کر سب کو حیرت ہوئی۔ اس حیرت میں یقیناً کچھ نہ کچھ خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔

کوٹھڑی سے باہر آندھی کے جھکڑ بدستور شور مچا رہے تھے۔ کوٹھڑی کے باہر پہرے داروں نے ایک دو مشعلیں جلائی تھیں مگر وہ بدستور پھڑپھڑا رہی تھیں اور بار بار بجھ جاتی تھیں۔ سلاخ دار کھڑکی کے راستے ان مشعلوں کی تھوڑی بہت روشنی کوٹھڑی میں بھی آ رہی تھی۔ اس دوران میں کھانا بھی آ گیا۔ کھانے میں گوشت کا شوربا تھا۔ مقامی طرز کے موٹے چاول تھے اور دودھ وغیرہ تھا۔ حسب پروگرام سب نے ایک ایک دو دو لقمے ہی لیے۔ پہرے داروں کی نگاہ بچا کر باقی کھانا چٹائی کے نیچے ڈال دیا یا کچے فرش پر ادھر ادھر پھینک دیا۔ کوٹھڑی کی کم روشنی اس کام میں ہماری مدد کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسلح پہرے دار اندر آئے اور خالی برتن لے کر چلے گئے۔ ہم سب کو فضا میں کسی ہنگامے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ شائستہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح نظر آتی تھی۔ پروفیسر نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا جیسے وہ ننھی سی بچی ہو۔ غزالہ دیوار سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں کی کچھ آوارہ لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کسی انجانے خدشے کے تحت وہ بار بار تانی کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچتی تھی اور اس کا منہ سر چومنے لگتی تھی۔ وہ معصوم اپنے اردگرد کے حالات سے قطعی لاتعلق اپنا انگوٹھا چوسنے میں مصروف تھا۔ صفدر اٹھ کر کوٹھڑی کے اندر ہی ٹہل رہا تھا۔ میں اس کی دلی کیفیت سمجھتا تھا۔ صفدر کا دل چاہتا تھا کہ اس کی جسمانی کمزوری کسی جادو کے زور سے لمحوں میں اڑن چھو ہو جائے۔ وہ ایک دم سے بھلا چنگا ہو کر ہمارے شانے سے شانہ ملائے اور خطرناک ترین حالات میں کود پڑے۔ میں جانتا تھا کہ دیدا کا بے رحم غم دن رات اس کے دل کو اپنے ناخنوں سے نوچ رہا ہے۔ اس بے پناہ کرب سے قرار حاصل کرنے کے لیے وہ خود کو کسی قیامت خیز ہنگامے میں گم کر دینا چاہتا ہے مگر اس کی جسمانی کمزوری اور اس کا ذہنی انتشار اس کے راستے میں حائل تھا۔ زریں گل

اور کلثوم کوٹھڑی کے ایک تاریک گوشے میں موجود تھے اور اپنی ہی دنیا میں گم تھے۔ شاید زریں گل قصہ خوانی بازار کا کوئی قصہ سنا کر اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

حسب پروگرام کھانے کے صرف پندرہ بیس منٹ بعد ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ظاہر ہے کہ سونا کسی نے نہیں تھا۔ کوئی سو ہی نہیں سکتا تھا۔ بس دم سادھے پڑے رہے۔ قریباً ایک گھنٹا اسی طرح گزر گیا پھر ہمیں اندازہ ہوا کہ کوٹھڑی سے باہر کوئی ہلچل موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے دلوں میں بھی ہلچل شروع ہو گئی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ موبل کیا کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے اس میں ہمارا کردار کیا ہو گا؟ اور آیا وہ جو کوشش کرنے جارہا ہے اس میں کامیابی کا امکان بھی ہے یا نہیں؟ ہم مکمل اندھیرے میں تھے اور بس آنے والے وقت کا انتظار کر سکتے تھے۔

پندرہ بیس منٹ شدید تذبذب کے عالم میں گزر گئے پھر کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور کچھ پہرے دار اندر آ گئے۔ میں آنکھوں کی جھریوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کی تعداد چار تھی۔ وہ بڑے روکھائی رہے رہے تھے ورنہ اس سے پہلے جب وہ اندر داخل ہوتے تھے تو زہر میں بجھے ہوئے نیزے ان کے ہاتھوں میں مشین گنوں سے زیادہ خطرناک نظر آتے تھے۔ ایک پہرے دار کے ہاتھ میں مشعل تھی وہ جھک جھک کر سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر کے پاس لیٹی ہوئی شائستہ کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ ایک ہٹا کٹا پہرے دار آگے بڑھا اس کا گنجا سر مشعل کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ نیچے جھک کر اس نے شائستہ کو پھول کی طرح اٹھایا اور کندھے پر لاد لیا۔ شائستہ کے لمبے بال الٹ کر جوزم پہرے دار کی پشت پر جھولنے لگے۔ اگلی باری کلثوم کی تھی' اسے بھی زریں کے پہلو سے اٹھا لیا گیا۔ پہرے دار واپس مڑے اور کوٹھڑی سے نکل گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ بھاری بھرکم چوبی دروازہ پھر سے بند کر کے "تالا لگا دیتے" ایک چیختی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ یہ بلاشبہ موبل کی آواز تھی۔ اس نے خطرناک لہجے میں کسی کو دھمکایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بوڑھے واماں کو بھی پکارا تھا۔ واماں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ واماں کے اٹھتے ہی ہم سب بھی اٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کوٹھڑی سے باہر صرف پانچ چھ جوزم پہرے دار موجود تھے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے پھر میری نگاہ نوجوان موبل پر پڑی۔ اس نے ادھیڑ عمر جوزم پہرے دار کی گردن پر ایک لمبے خنجر کی دھار اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ پہرے دار جنبش بھی کرتا تو دھار گردن کو زخمی کر ڈالتی۔ وہ بڑے پرسکون لیکن خطرناک لہجے میں پہرے داروں کو دھکار رہا تھا پھر ہم نے دیکھا کہ پہرے داروں نے تڑپتی مچلتی کلثوم اور شائستہ کو اپنی گرفت سے "آزاد کر دیا" وہ دونوں لپک کر ہمارے درمیان آ گئیں۔ پہرے دار بڑبڑاتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگے۔ ان کے چہروں سے بے بسی اور جھنجلاہٹ صاف عیاں تھی۔

موبل نے واماں سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ واماں نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا اور ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ واماں کے پیچھے جانے سے پہلے میں نے ان نیزوں میں سے ایک اٹھا لیا جو موبل کے حکم پر جوزم پہرے داروں نے ابھی زمین پر پھینکے تھے۔ زریں اور پروفیسر نے بھی میری تقلید کی۔ ہم واماں کے پیچھے چلتے ہوئے صرف پندرہ بیس قدم آگے گئے اور ٹھٹک کر رک گئے۔ ہمارے سامنے وہی چھکڑا نما گھوڑا گاڑی موجود تھی جس پر لاد کر جوزم ہمیں یہاں اس بستی میں لائے تھے۔ چھکڑا بالکل تیار حالت میں تھا۔ واماں نے کہا "جناب! موبل کہتا ہے کہ ہم سب چھکڑے میں چلے جائیں۔"

ہم سب چھکڑے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک اور "حیرت" ہماری منتظر تھی۔ چھکڑے کے چوبی فرش پر ایک لڑکی بندھی پڑی تھی۔ اس جوزم لڑکی کا لباس پھٹا ہوا تھا اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس لڑکی کو موبل نے "یرغمالی" کی حیثیت سے یہاں ڈالا ہوا ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد موبل بھی چھکڑے تک پہنچ گیا۔ ادھیڑ عمر جوزم پہرے دار جو پہرے داروں کا انچارج تھا' بدستور موبل کی مضبوط گرفت میں مچل رہا تھا۔ اس کی توانا گردن تیز دھار خنجر کے مسلسل دباؤ سے زخمی ہو چکی تھی اور خون نکل رہا تھا۔ موبل پہرے دار کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا عین چھکڑے کے پاس لے آیا۔ اس نے ایک نظر۔ ایک شوخ نظر ہم پر ڈالی پھر انچارج پہرے دار کے ان ساتھیوں کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے ہی پیچھے باہر آ گئے تھے اور اب خوں خوار بھیڑیوں کی طرح ہمارے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے انچارج پہرے دار کو کوئی اہم وارننگ دی۔ انچارج پہرے دار جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگا۔

چھکڑے کے اندر واماں نے میرے کان میں پرجوش سرگوشی کی "لگتا ہے کہ ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سردار نے کی چھوٹی بیوی ہماری ہم سفر ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ لڑکی جو فرش پر بندھی پڑی ہے' سردار کی بیوی ہے۔"

چند سیکنڈ بعد موبل نے انچارج پہرے دار کی گردن سے خنجر ہٹا کر اس کے کولہوں پر زوردار لات رسید کی اور اسے دور پھینک دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ جست لگا کر چھکڑے پر سوار ہو گیا۔ ہمارے درمیان سے گزر کر وہ چھکڑے کے اگلے حصے میں پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑوں کی باگیں اس طرح سنبھالیں کہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اور اس کا ایک گھٹنا اس لڑکی کی گردن پر تھا جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ نرے کی چہیتی بیوی ہے۔ چھکڑے پر سوار ہونے سے پہلے موبل نے انچارج پہرے دار کے کان میں جو سرگوشی کی تھی وہ یقیناً نرے کی چہیتی بیوی ہی کے بارے میں تھی۔ اس نے پہرے دار کو بتایا تھا کہ اگر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی گئی تو انجام اس چہیتی کی موت کی صورت میں نکلے گا۔ اس سے پہلے کہ موبل گھوڑوں کی لگام کو جھٹکا دیتا اور یہ چھکڑا اپنی جگہ سے حرکت میں آتا' ڈھلوان کی طرف سے تیر اندازی شروع ہو گئی۔ چند تیر چھکڑے میں لگے اور ایک تیر ایک گھوڑے کی گردن میں گھس گیا۔ وہ گھوڑا بری طرح اچھلا اور پھر بدک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ دوسرا گھوڑا بھی اس کے ساتھ گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ موبل نے لگام کو جھٹکے دے کر گھوڑوں کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سود رہی۔ گھوڑا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور من چاہی سمت میں دوڑتا چلا جا رہا تھا پھر اس کا رخ پہاڑی ڈھلوان کی طرف ہو گیا' یہ اور بھی خطرناک بات تھی۔

پروفیسر چیخ کر واماں سے بولا "اس سے کہو چھکڑا روکے ورنہ یہ الٹ جائے گا۔"

اس سے پہلے کہ واماں' پروفیسر کی بات موبل تک پہنچاتا' چھکڑا ناہموار زمین پر اچھلتا کودتا ڈھلوان پر پہنچ چکا تھا۔ جوزم گھڑ سوار تیزی سے چھکڑے کے پیچھے آ رہے تھے۔ اچانک چھکڑے کی داہنی جانب کے دونوں پہیے ایک پتھر سے ٹکرائے اور چھکڑا الٹ گیا۔ گھوڑوں کی تیز ہنہناہٹ انسانی چیخوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ گرنے سے ایک لمحہ قبل میں نے نالی کو غزالہ کی گود سے اچک لیا تھا' چھکڑے نے دو قلابازیاں کھائیں تاہم نالی میری بانہوں کے گھیرے میں بالکل محفوظ رہا۔ چھکڑے کی چھت ٹوٹ گئی تھی اور ہم سب اس پھل فروش کے پھلوں کی طرح بکھر گئے تھے جو اپنے خوانچے سمیت کیچڑ میں پھسل گیا ہو۔ ہمارے سنبھلتے سنبھلتے جوزم گھڑ سوار

انور ملگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بُربا کی داستانِ حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارو ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
- عمر کا پندرھواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظرِ کرم ان سب کے لئے باعثِ نجات بنی۔

قیمت 250 روپے — محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20 عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ وہ نیزے سونت کر بے دریغ ہماری طرف بڑھے۔ میں نے اور زریں گل نے انہیں روکا۔ نیزوں اور کلہاڑیوں سے لڑنے کا ہمیں مطلق تجربہ نہیں تھا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہماری ضرورت نے بھی ہمیں لڑائی کا یہ نیا ڈھنگ سکھا دیا تھا۔ زریں گل نے چھکڑے کے اندر سے ہی ایک کلہاڑی اٹھالی تھی۔ وہ اس کلہاڑی کو دلیرانہ انداز میں استعمال کرتا ہوا دو تین جوام حملہ آوروں کو دھکیل کر دور لے گیا۔ میرے ہاتھ میں وہی نیزہ تھا جو میں نے کوٹھڑی سے نکلتے وقت حاصل کیا تھا۔ اس نیزے کی طوالت میرے لیے بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ میں نے ایک جوام کو زخمی کیا اور دیگر دو پر پے در پے حملے کر کے انہیں ایک گوشے میں محصور کر دیا۔ تاریکی کی چھاؤں میں لڑی جانے والی یہ لڑائی میرے لیے انوکھی تھی۔

حسنِ اتفاق یہ تھا کہ چھکڑا دو قلابازیاں کھانے کے بعد خود ہی سیدھا ہو گیا تھا۔ گھوڑے کی گردن شاید شدید زخمی نہیں ہوئی تھی' وہ اب کنٹرول میں نظر آ رہا تھا۔ موبل چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا' جیسا کہ بعد میں داماں سے معلوم ہوا' وہ ہمیں پھر سے چھکڑے میں سوار ہونے کا مشورہ دے رہا تھا لیکن اس کام کے لیے اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ درجنوں مزید گھڑسوار بستی سے ڈھلوان کی طرف لپکے آ رہے تھے۔ ان کی بھڑکتی ہوئی مشعلیں بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ یقیناً ہمارے چھکڑے میں سوار ہونے سے پہلے ہی وہ ہمیں جا لیتے۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہم نے خود کو مکمل طور پر گھیرے میں پایا۔ درجنوں تیز اندازوں نے ہمیں نشانے پر لے رکھا تھا۔ موبل نے سردار زرے کی جس بیوی کو بطور یرغمال ساتھ لے رکھا تھا' وہ بھی چھکڑا الٹنے سے نجانے کس طرف لڑھک گئی تھی۔ گہری تاریکی میں اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس صورت حال میں مزید مزاحمت بیکار تھی۔ میں نے نیزہ پھینک دیا' میرے اشارے پر زریں نے بھی کلہاڑی پھینک دی۔ جوام پہرے داروں نے چاروں طرف سے ہمیں دبوچ لیا اور زمین پر گرا کر ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ یہاں تک کہ عمر رسیدہ داماں اور نوعمر اسقی تک کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے۔ زریں اور موبل چونکہ احتجاجی انداز میں بول رہے تھے لہٰذا ان پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش بھی کی گئی۔ خاص طور سے زریں ان کے غضب کا نشانہ تھا۔ وہ زریں سے بہت خار کھانے لگے تھے۔ چھکڑا الٹنے سے سب کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ شکر کا مقام تھا کہ کوئی بھی شدید زخمی نہیں ہوا تھا۔

اسقی کی ٹانگ پر چوٹ آئی تھی اس لیے وہ بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ جب ہم سب کو نیزوں کی مدد سے واپس بستی کی طرف دھکیلا گیا تو اسقی سے چلنا مشکل ہو گیا۔ میں نے ایک پہرے دار سے اشاروں کی زبان میں کہا کہ اس بچے سے چلا نہیں جا رہا' اسے میرے کندھے پر لاد دو۔

پہرے دار نے اسقی کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ غرا کر پیچھے ہٹ گیا "میں لعنت بھیجتا ہوں۔ میں خود چلوں گا۔" اس نے باغیانہ لہجے میں کہا۔

میں خاموش ہو گیا لیکن کچھ آگے جا کر اسقی واقعی کراہنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے پیشکش کی تو وہ نیم رضامند نظر آنے لگا۔ میں نے پہرے دار کو اشارہ کیا۔ اس نے قہقہہ لگا کر اسقی کو اٹھا کر میری کمر پر لاد دیا۔ بھاگ دوڑ میں ہم بستی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ ہمیں قریباً نصف میل تک چلنا پڑا۔ راستے میں اسقی نے میرے زخمی بازو سے رستا ہوا خون دیکھا اور خشک لہجے میں بولا "تمہارا خون نکل رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے اتار دو۔ میں پیدل چلوں گا۔"

"کیوں؟"

"تم زخمی ہو۔"

"زخمی تو تم بھی ہو اور تمہارا پاؤں زخمی ہے جبکہ میرا زخم بازو کا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔ وہ جب سے ہمارے قبضے میں آیا تھا یہ پہلی گفتگو تھی جو اس نے انسانوں کے انداز میں کی تھی ورنہ اس سے پہلے تو وہ دھمکیاں دیتا تھا یا گالیاں بکتا تھا۔ ہم بستی میں پہنچے تو پوری بستی بیدار ہو چکی تھی' مشعلیں روشن تھیں اور رکھوالی کے کتے چاروں طرف شور مچا رہے تھے۔ نیزوں کے سائے میں ہمیں واپس اسی کوٹھڑی تک پہنچایا گیا جہاں ہم پچھلے کئی روز سے مقیم تھے۔ اب تو اس کوٹھڑی کو دیکھ کر ہی دم گھٹنے لگتا تھا۔

اچانک مجھ پر ایک روح فرسا انکشاف ہوا اور میرے تمام دبے ہوئے اندیشے ایک دم جوان ہو کر ذہن میں اودھم مچانے لگے۔ کوٹھڑی کے منحوس دروازے میں داخل ہونے سے صرف چند سیکنڈ پہلے مجھے اندازہ ہوا کہ کلثوم اور شائستہ کو ہمارے ساتھ کوٹھڑی کے اندر نہیں بھیجا جا رہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کا سارا خون میرے سر کو چڑھ گیا ہے۔ جس بدترین لمحے کا اندیشہ ہم دیر سے محسوس کر رہے تھے وہ بالآخر آ پہنچا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم شائستہ اور کلثوم کو نوچے کھسوٹے جانے کے لیے جوام

بھیڑیوں کے سپرد کر دیں اور خود کوٹھڑی کے فرش پر بیٹھ کر رات بھر ان کی چیخیں سنتے رہیں۔ اس سے تو موت بہتر تھی۔ ایک پہرے دار نے نیزے کی دہری انی سے مجھے کوٹھڑی کی طرف دھکیلا تو میں اڑ گیا۔ پہرے دار نے تھوڑی سی زور آزمائی کی مگر میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ انچارج پہرے دار آگے بڑھا۔ اس کی چربی دار گردن پر ابھی تک تین چار سرخ لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ یہ خونی لکیریں اس خنجر کی وجہ سے آئی تھیں جو کچھ دیر پہلے موبل نے اس کی گردن پر دھرا ہوا تھا۔ انچارج پہرے دار نے غرا کر مجھے کوٹھڑی میں چلنے کو کہا۔

میں نے داماں کے ذریعے جواب دیا "ہم تمام کے تمام کوٹھڑی میں جائیں گے یا کوئی بھی نہیں جائے گا۔"

"یہ دونوں لڑکیاں نہیں جائیں گی۔ یہ سردار کا حکم ہے۔ تمہیں بھی یہ حکم ماننا ہو گا ورنہ ابھی اسی وقت تمہاری لاش اس دروازے کے سامنے تڑپتی نظر آئے گی۔" پہرے دار نے خوفناک لہجے میں کہا۔ اس نے تیز دھار کلہاڑی میری گردن پر رکھ دی تھی۔

"تم جو کچھ بھی کہو مگر یہ لڑکیاں ہم سے جدا نہیں ہوں گی۔"

"تم اپنی موت کو آواز دے رہے ہو۔ یہ وقت پھر تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ خاموشی سے سر جھکا کر کوٹھڑی میں گھس جاؤ۔" پہرے دار نے دارننگ دی۔

"میں انکار کرتا ہوں۔"

"ہم سب انکار کرتے ہیں۔" عقب سے صفدر کی آواز آئی۔

دو پہرے دار مجھے دہری انی والے نیزوں سے دھکیلنے کے لیے آگے بڑھے' عین اسی وقت میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر ٹانگ چلائی۔ انچارج پہرے دار لڑکھڑاتا ہوا اپنے ایک ساتھی پر گرا اور اسے لے کر زمین بوس ہو گیا۔ دوسری طرف مرد قلندر زریں گل نے بھی اچھل کر ایک ٹانگ قریب آتے ہوئے نیزہ بردار کے سینے پر رسید کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک پشتو نعرہ لگایا اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو گیا۔ قبل اس کے کہ وہ جگہ ایک بار پھر میدان جنگ بن جاتی اور ہم میں سات دو چار اپنے ہی خون میں لتھڑ کر تڑپنے لگتے' ہماری خیرخواہ روبا کی آواز نے سب کو چونکا دیا' وہ دوڑتی ہوئی موقع پر پہنچی تھی۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا اور بپھرے ہوئے پہرے دار اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے۔ روبا کے عقب میں بھی دو نیزہ بردار تھے۔ روبا آگے آئی اور مشتعل پہرے داروں کے آگے ہماری سلامتی کی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہماری خیرخواہی کا حق ادا کر رہی تھی۔ میں نوٹ کر رہا تھا کہ وہ جب کبھی بھی غزالہ کی طرف دیکھتی ہے اس کی آنکھوں میں احسان مندی اور شکرگزاری کا جذبہ روز روشن کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ پتا نہیں کہ غزالہ نے اس جذبے کی چمک محسوس کی تھی یا نہیں مگر میں نے ضرور محسوس کی تھی۔ روبا دو چار منٹ تک تحکمانہ انداز میں پہرے داروں سے باتیں کرتی رہی پھر وہ داماں کے ذریعے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "میں اکیلے میں تم سے دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تم لوگ صورت حال کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہے ہو اور یہ بات تمہارے لیے بڑی خطرناک ثابت ہونے والی ہے۔"

"ہم سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" میری جگہ صفدر نے سینہ تان کر جواب دیا۔

"کبھی کبھی انسان کی برداشت بالکل حقیر شے بن جاتی ہے۔ آؤ میرے ساتھ' میں تمہیں کچھ بتاؤں۔"

روبا مجھے اور داماں کو لے کر ایک قریبی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ یہاں تیل کا چراغ روشن تھا۔ چربی کے تیل کی بو فضا کو مکدر کر رہی تھی۔ روبا نے دروازہ اندر سے بند کیا اور دبے ہوئے لہجے میں بولی "کیوں خواہ مخواہ اپنی جان گنوا رہے ہو۔ میں نہ پہنچتی تو وہ عورتوں کے سوا تم سب کو نیزوں میں پرو ڈالتے۔"

"ہمیں پروئے جانے کا کچھ زیادہ شوق نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ عزت کے بدلے زندگی بھیک ہم قبول نہیں کر سکتے۔" میں نے داماں کے ذریعے جواب دیا۔

"دونوں لڑکیوں کو کچھ نہیں ہو گا۔ تم انہیں جانے دو۔"

"بہت خوب! تمہارا مطلب ہے کہ وہ ہم سے دور رہ کر جوام مردوں کے نرغے میں رات بسر کریں گی اور محفوظ رہیں گی؟"

"عام حالات میں شاید ایسا نہ ہوتا مگر اب ہو گا۔" روبا نے کہا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

روبا نے عجیب انداز میں مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی "میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم لوگ بہت خوش قسمت ہو' ورنہ اس طرح موت کے چنگل میں پھنس کر کون نکلتا ہے۔"

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا "شاید آپ ہم سے کچھ چھپا رہی ہیں؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" اس نے غیر معمولی

انداز میں سر ہلایا "تم لوگوں کے لیے میرے پاس ایک اہم اطلاع ہے۔ لیکن یہ اطلاع سننے سے پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہارے ساتھ سفید رنگ کا جو بارہ تیرہ سالہ لڑکا ہے' وہ کون ہے؟"

میرا جسم سنسنا اٹھا "کیوں۔۔۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو' پھر میں تمہیں وہ اہم اطلاع دوں گی جو یقیناً تمہارے لیے خوشی کا باعث ہو گی۔"

میں نے کہا "آپ کے اس آزاد قبائلی علاقے سے بہت آگے ایک شہر ہے۔ وہاں کے ایک بہت بڑے سیٹھ کا بیٹا ہے یہ۔"

"سچ بتاؤ' کیا تم نے اسے اغوا کر رکھا ہے؟"

"اغوا نہیں کیا' بس یوں سمجھیں کہ اسے اپنی ڈھال بنایا ہے۔ اس کے طاقت ور باپ کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ جونہی ہم اس ظالم شخص کی زد سے نکل جائیں گے' اسے چھوڑ دیں گے۔"

"جس ظالم کی تم بات کر رہے ہو اس کے بارے میں شاید میں بھی تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ وہ جو ادام جو جنوب کے دور دراز علاقے تک سفر کرتے ہیں' بتاتے ہیں کہ وہاں کے قبائل میں کونگ نامی اس شخص کا خوف پایا جاتا ہے۔ اس شخص کے کارندے کھیتوں سے مزدور عورتوں اور مردوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور پھر ان کے خاندان والے کبھی ان کی صورتیں نہیں دیکھتے۔ اسے انسانوں کا بہت بڑا تاجر بتایا جاتا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟"

"آپ بہت حد تک ٹھیک فرما رہی ہیں لیکن جس شخص کو آپ کونگ بتا رہی ہیں اس کو دراصل کنگ کہا جاتا ہے۔"

وہ بولی "میرے لیے تو ایسے شخص کے لیے کونگ کا لفظ ہی زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ ہماری زبان میں یہ بدی اور جبر کے ایک دیوتا کا نام ہے۔ بہرحال۔۔۔ میرے لیے تمہاری یہ اطلاع حد سے زیادہ انکشاف انگیز ہے کہ اس کونگ نامی شخص کا بیٹا تمہاری تحویل میں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے پاس لاتعداد مسئلوں کی چابی موجود ہے اور اگر تم عقل مندی سے کام لو تو اس چابی کو بڑے اچھے طریقے سے استعمال کر سکتے ہو۔ یہ بات۔۔۔ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں ایک خاص نتیجے پر پہنچی ہوں۔"

"کیسا نتیجہ محترم خاتون؟" میں نے پوچھا۔

"اس لڑکے کے پیچھے آنے والے لوگ لڑکے کی سلامتی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔"

"کیا کچھ لوگ لڑکے کے پیچھے آئے ہیں؟" میں نے روبا کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس نے سنسنی خیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا آپ تفصیل سے کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

روبا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تفصیل میں جانے کا وقت تو نہیں ہے۔ بس یہ سمجھو کہ ابھی کچھ دیر پہلے میرے دو بڑے قابل اعتماد مخبر زائی کے جنگل سے واپس آئے ہیں۔ وہ شکار کھیلتے ہوئے کافی آگے نکل گئے تھے۔ انہوں نے یہ اہم اطلاع مجھ تک پہنچائی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ جنگل میں کئی سو "اجنبی" موجود ہیں۔ "اجنبی" کا لفظ ہمارے ہاں باہر کی دنیا کے ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو سفر اور جنگ وغیرہ کے لیے مشینیں استعمال کرتے ہیں۔ ان ہلاکت خیز مشینوں کو ہمارے ہاں بہت منحوس اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ ایسی کسی بھی مشین یا آلے کو استعمال کرنا ہمارے مذہب کے اندر جرم ہے۔ میرے دونوں مخبروں نے ان "اجنبیوں" کے بڑے سردار کے ساتھ دیر تک بات چیت کی ہے اور ان کے ارادوں کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ ان لوگوں کے ارادے تم سب کے لیے بڑے فائدے مند ثابت ہونے والے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں!"

"میرے مخبروں کا اندازہ یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر تک اجنبی ہماری اس بستی کو گھیرے میں لے لیں گے۔ وہ ہم سے لڑنا نہیں چاہتے اور نہ ہمارے ساتھ کسی طرح کی دشمنی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا پہلا اور آخری مقصد اس بچے کو تم سے حاصل کرنا ہے۔ امکان یہی ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر تم سے وہ لڑکا واپس لینا چاہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ تمہارے کچھ مشکل مطالبے بھی مان لیں لیکن اگر تم انہیں لڑکا واپس نہیں کرو گے تو بھی وہ تمہارے خلاف لڑنے یا زبردستی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ انہیں ہر صورت میں لڑکے کی سلامتی پیاری ہے۔ وہ اس مسئلے کو ہر قیمت پر امن و امان سے حل کرنا چاہتے ہیں۔"

"یہ ساری باتیں مخبروں نے آپ کو بتائی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ اور وہ دونوں کوئی معمولی مخبر نہیں۔ پختہ عمر کے ذہین بندے ہیں اور یوں سمجھو کہ اس بستی کے سب سے سیانے کھوجی ہیں۔"

"کیا اجنبیوں کی آمد کے بارے میں آپ نے سردار زے کو بتا دیا ہے؟"

"بس' اب تم سے بات کر کے زے کی طرف ہی جا رہی ہوں۔ میں اسے سب کچھ بتا دوں گی مگر لڑکے کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ یہ لڑکا تمہارے ہاتھ میں اسم اعظم کی طرح ہے۔ اسے پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھو۔"

پھر روبا نے اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالا اور بڑی احتیاط سے ایک تیز دھار چھری میرے حوالے کر دی "اسے اپنے کپڑوں میں چھپا لو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہارے بہت کام آئے گی۔"

میں نے چھری قمیص کے نیچے رکھ لی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی اور میری طرف گھوم کر بولی "لڑکیوں کے سلسلے میں وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔ میں ان کی طرف سے پوری ذمے داری لیتی ہوں۔ میں خود ان کی نگرانی کروں گی۔ اگر اپنا سمجھتے ہو تو مجھ پر بھروسا کرو۔"

"اگر آپ ذمے داری لیتی ہیں تو پھر مجھے اعتراض نہیں۔"

ہم کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے واپس پہنچے۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ منڈے ہوئے سروں والے تیم تحیم مسلح پہرے داروں نے زریں' صفدر' پروفیسر اور دیگر افراد کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان سب کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے۔ یہ پہرے دار غزالہ' کلثوم اور شائستہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شروع میں ان کی یہ نگاہیں ہمارے تن بدن میں آگ لگا دیتی تھیں مگر اب کسی حد تک ہم نے صورت حال سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں کلثوم اور شائستہ کو اشارہ کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں' وہ پہرے داروں کے ساتھ چلی جائیں۔ ہمارے سامنے ہی روبا نے کلثوم اور شائستہ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور پہرے داروں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ کلثوم اور شائستہ کو بے بسی کی حالت میں پہرے داروں کے ساتھ جاتے دیکھ کر زریں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بدر منیر یا لالہ سدھیر کی طرح ایک خوفناک بڑھک مارتا اور کوئی بڑی سی قسم کھا کر میدان جنگ میں سر کے بل کود پڑتا' میں نے اسے کندھا مار کر اپنی طرف متوجہ کیا "کوئی بے ہودگی نہ کرنا۔ سردار کی بیوی سے میری بات ہو گئی ہے' کلثوم اور شائستہ اس کے پاس بالکل محفوظ ہیں۔"

وہ کانپ کر بولا "میرے دماغ میں آپ کی بات نہیں آ رہی۔"

"جب دماغ آنے گا تو بات بھی آ جائے گی۔ فی الحال وہ ہری ہری گھاس چرنے گیا ہوا ہے؟"

"کون؟"

"تمہارا مینڈ دماغ۔" میں نے کہا اور وہ مجھے لال لال آنکھوں سے گھور کر رہ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بار پھر کوٹھڑی کے اندر تھے۔ بھاری بھرکم چوبی دروازہ مقفل کرنے سے پہلے میرے ہاتھ کھول دیے گئے تاکہ میں ساتھیوں کے ہاتھ بھی کھول سکوں۔ ہاتھ کھل گئے تو غزالہ نے سب سے پہلے اسٹی کا زخمی پاؤں دیکھنا چاہا۔ وہ حسب عادت غزالہ کو گھورنے لگا۔ غزالہ نے بڑے پیار سے اسے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا۔ آخر جب زریں گل نے اس کے پیٹ پر رسید کرنے کے لیے کھجور کی چھڑی پکڑی تو وہ سرخ چہرے کے ساتھ نیم رضامند ہو گیا۔ اس کے پاؤں کی پشت پر چوٹ آئی تھی۔ پاؤں ٹخنے تک سوج گیا تھا۔ غزالہ بڑی توجہ اور محبت سے اس کے زخمی پاؤں کا معائنہ کرتی رہی' پھر اس نے اپنی اوڑھنی میں سے ایک طویل پٹی پھاڑی اور خاص تکنیک سے اسٹی کے پاؤں پر باندھ دی۔ اس کام میں پروفیسر نے بھی اس کی مدد کی۔ سب سے زیادہ مدد زریں گل کی رہی جو چھڑی لیے اسٹی کے سر پر کھڑا رہا اور گاہے گاہے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اسے گھورتا رہا۔

سب ہی کو تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔ لاری سی لڑکی کوری جو پہلے ہی دردناک طور پر زخمی تھی کچھ اور زخمی ہو گئی تھی۔ اسٹی کے بعد غزالہ کوری کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ زریں کی پیشانی پر چھکڑے کے پہیے کا اندرونی RING لگا تھا اور وہاں نیلگوں ہلال سا بن گیا تھا۔ ننھا تابی اپنے اردگرد کے حالات سے قطعی بے خبر دلچسپی سے اس ہلال کو تک رہا تھا اور کبھی زیر لب مسکرانے بھی لگتا تھا۔ میں نے وہ ساری گفتگو ساتھیوں کے گوش گزار کر دی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس قبیلے کی "معزز ماں" روبا سے ہوئی تھی۔ یہ گفتگو سب ہی کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھی اور اس کے ساتھ ساتھ خوش آئند بھی۔ یہ تو ہم سب کو معلوم تھا کہ ٹرنٹی اپنے تحرم سلکوک ماسٹر اسٹی کی تلاش میں بالآخر یہاں تک بھی آ پہنچیں گے مگر کب اور کیسے پہنچیں گے یہ خبر نہیں تھی۔ اب سب کو توقع پیدا ہو گئی تھی کہ ایک دو گھنٹے کے اندر صورت حال میں ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا' ابھی بمشکل آدھ پون گھنٹا گزرا تھا کہ ہم نے بستی کے طول و عرض میں ہلچل محسوس کی۔ ایکا ایکی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں اور مشعلیں ہر طرف گردش کرنے لگیں۔ یوں محسوس ہوا کہ

نصف شب کے وقت اچانک ساری بستی کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ رکھوالی کے کتوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ اس چیخ و پکار میں گاہے گاہے چیتے کی تیز باریک آواز بھی بجلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ یقیناً یہ سردار زبے کے پالتو چیتے ہی کی آواز تھی۔

زریں نے گول گول آنکھیں گھما کر کہا ”کہیں پھر تو جنگلی بھیڑیوں نے حملہ نہیں کردیا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ جنگلی نہیں شہری بھیڑیے ہیں۔“ پروفیسر نے کہا۔

صفدر کو شاید کچھ دیر کے لیے اونگھ آگئی تھی۔ ہماری آوازیں سنیں تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شمع دان کی روشنی میں' میں نے دیکھا اس کے رخساروں پر سفید لکیریں سی چمک رہی تھیں۔ یہ آنسوؤں کی گزرگاہ تھی۔ شاید حالت خواب میں اس کے رکے ہوئے آنسو آپوں آپ ہی بہتے رہے تھے۔ وہ بے خبر تھا کہ اس کے رخساروں پر چمکنے والی دو نمکین لکیریں اس کے اندر رستے ہوئے زخموں کی چغلی کھا رہی ہیں۔ وہ زخم جو اسے بے وفا بے رحم ویرا نے دیے تھے اور اسے تڑپتا چھوڑ کر بڑی خاموشی سے کسی انجانی دنیا میں گم ہوگئی تھی۔ شاید کبھی واپس نہ لوٹنے کے لیے؟

وقت گزرنے کے ساتھ بستی میں نظر آنے والی ہلچل میں اضافہ ہوتا گیا۔ کوٹھڑی سے باہر نظر آنے والے پہرے داروں کے چہروں پر بھی ہراس کی کیفیت تھی' وہ آپس میں ذری ذری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ان کے چہروں پر جو سفاکی اور خشونت نظر آتی تھی وہ ایک طرح کے خوف اور ہیجان میں ڈھل گئی تھی۔ جیسے کسی دور افتادہ سیارے کی نہایت ترقی یافتہ مخلوق نے اچانک زمین کے باسیوں پر حملہ کردیا ہو۔ جنوب کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے کوٹھڑی کے روزنوں میں سے گزرے تو ان کے ساتھ گاڑیوں کے انجنوں کا مدھم سا شور بھی ہماری سماعت سے ٹکرایا۔ پروفیسر نے ہیجانی لہجے میں کہا ”اس کا مطلب ہے' روبا کی اطلاع درست تھی۔“

”نہ صرف درست تھی بلکہ بروقت بھی تھی۔“

غزالہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اسے ایک طرف کلثوم اور شائستہ کی فکر تھی دوسری طرف نرسیوں کی آمد بھی اس کی دھڑکنوں کو زیروزبر کر رہی تھی۔ ہاں کلثوم کے حوالے سے میری یقین دہانی پر زریں ایک دم پرسکون سا ہوگیا تھا۔ وہ اس قسم کی صورت حال کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن میری ذات پر اسے جو اندھا اعتماد تھا اس کی ایک جھلک آج پھر نظر آئی تھی۔ زریں کی اس ”عقیدت“ پر مجھے بے ساختہ پیار آرہا تھا۔ میری زبان سے نکلے ہوئے بس ایک ”حرف یقین“ نے اسے ہر خطرے سے بے نیاز کردیا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد بستی کے جنوبی کنارے کی طرف سے اچانک مشین گنوں کے خوفناک قہقہے سنائی دیے اور ان کی گونج دور تک پھیل گئی۔ ان آوازوں کے ساتھ ہی بستی کے اندر سے عورتوں اور بچوں کی خوف زدہ چیخیں ابھریں۔ ہم نے کوٹھڑی کے روزنوں میں سے دیکھا کہ کئی پہرے دار زمین پر اوندھے لیٹ گئے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ آگے کو پھیلا دیے تھے۔ یہ ان کی عبادت کا کوئی انداز تھا' وہ بلند آواز میں کوئی مناجات بھی پڑھ رہے تھے۔

مشین گنوں کی آواز بس ایک ہی دفعہ سنائی دی۔ زریں گل بولا ”ہمارا خیال ہے استاد صیب کہ یہ ہوائی فائرنگ تھا۔ شاید نرسی ان لوگوں پر اپنا پریشر ککر ڈالنا چاہتا ہے۔“

”پریشر ککر نہیں صرف پریشر۔“

پروفیسر بولا ”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ یہ ہوائی فائرنگ تھی۔ برسٹ متواتر چلائے گئے ہیں اور اس کے بعد ایک گولی بھی نہیں چلی۔“

ہم شدید تذبذب کے عالم میں تھے اور پیش رفت کا انتظار کر رہے تھے۔ رات بیت رہی تھی' ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کیا وقت ہوگا۔ ہماری گھڑیاں جوام افزار نے گرفتاری کے وقت ہی اتروا کر آگ میں پھینک دی تھیں۔ قیاس ہے کہ رات کے ڈھائی تین بجے کا عمل ہوگا جب بابا کانا سردار زبے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہماری کوٹھڑی کے سامنے پہنچا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹتی ہوئی صاف نظر آتی تھیں۔ ٹوٹا ہوا ہاتھ اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے مسلح پہرے داروں کو ہدایت کی کہ وہ دروازے کا قفل کھول کر اندر داخل ہوں۔ میں اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ میں نے واماں کے ذریعے زبے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”سردار زبے! میں تمہارا ارادہ جان چکا ہوں۔ قفل کھلوانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہم یہ لڑکا' مر کر بھی تمہارے حوالے نہیں کر رہے۔“

سردار کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ مزید بدل گیا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا ”پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں تو تم سے کچھ بات کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔“

”تم نے بات کرنا ہوتی تو یہاں کھڑکی سے کر لیتے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم اس لڑکے کو یہاں سے لے جانا

چاہتے ہو لیکن میں قسم کھا کر تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم صرف اس کی لاش ہی یہاں سے لے جاسکتے ہو۔“ میں نے قمیص کے نیچے سے چھری نکال کر سردار زبے کے سامنے لہرائی۔

زبے اور اس کے ساتھیوں کے چہرے ڈھیلے سے گئے۔ یقیناً چھری کی موجودگی پر انہیں بے پناہ حیرت ہوئی تھی۔ سردار گڑبڑا کر بولا ”مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”لیکن مجھے معلوم ہے کیونکہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے آگ اگلنے والی مہلک مشینوں کی آواز سن لی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس لڑکے کے والی وارث اسے لینے کے لیے پہنچ گئے ہیں۔ اب یہ تہرا کھیل ہے۔ تم اجنبیوں کی زد میں ہو' ہم تمہاری زد میں ہیں اور یہ شیطان زادہ ہماری زد میں ہے۔۔۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ آخری ”زد“ ہی سب سے اہم ہے۔“

سردار زبے نے بے چینی سے اپنا شفاف سر کھجایا اور پھر ایک دم اس کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ واماں کے ذریعے قدرے نرم لہجے میں بولا ”دیکھو! تم ایسا کھیل کھیلنے کی کوشش مت کرو جس میں تم اور تمہارے ساتھی تڑپ تڑپ کر مرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ اچھے طریقے سے اور بغیر خون خرابے کے حل ہو جائے۔ تم یہ لڑکا ہمارے حوالے کردو' ہم تمہیں اپنی طرف سے اور اس لڑکے کے وارثوں کی طرف سے ضمانت دیتے ہیں کہ تمہیں نہ صرف آزاد کیا جائے گا بلکہ اپنے علاقے سے اپنی حفاظت میں نکال دیا جائے گا۔“

میں نے کہا ”جب تم یہ سب کچھ کر گزرو گے تو ہم لڑکا واپس کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔“

”ضد مت کرو اور نہ یہ بھولو کہ تمہاری دو عورتیں اس وقت بھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم انہیں۔۔۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹکا سکتے ہیں۔“

میں نے ماستی کو سر کے بالوں سے دبوچ لیا اور چھری کی دھار اس کی موٹی گردن پر رکھ دی ”ان لڑکیوں کی طرف میلی نگاہ سے دیکھو گے تو اس لڑکے کے ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اس سے آگے بڑھو گے تو میں بھی اس سے آگے بڑھوں گا۔ میں انسان ہوں' مجھے انسان ہی رہنے دو۔ تم درندے بنو گے تو نہ چاہتے ہوئے میں بھی درندگی پر مجبور ہو جاؤں گا۔“ میرے لہجے کی وحشت نے سردار زبے کو ٹھٹکنے پر مجبور کردیا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا ”میں جانتا ہوں تم لوگ روبا پر بہت یقین رکھتے ہو' اگر تم چاہو تو روبا اس بات کی ضمانت دے سکتی ہے کہ لڑکے کی حوالگی کے بعد ہم تمہیں بحفاظت اپنے علاقے کی حدود سے باہر نکال دیں گے۔“

”ہمیں کسی روبا شوبا کی ضمانت نہیں چاہیے۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے' ہم اس وقت تک تمہاری کوئی بات نہیں سنیں گے جب تک اس لڑکے سمیت کسی محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے۔“

جوزام سردار افسردہ نظروں سے ماشر استی کو دیکھنے لگا۔ شاید وہ افسوس کر رہا تھا کہ اتنا اہم قیدی اب تک اس کی تحویل میں رہا اور وہ اس کے بارے میں کچھ جان نہ سکا۔ کئی منٹ تک ہمارے اور سردار زبے کے درمیان مذاکرہ جاری رہا پھر سردار ہانپتا کانپتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا سارا دم خم ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ نرسی اس قبیلے کے لیے سپر پاور کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ انتہائی دشوار گزار راستوں سے گزر کر قبیلے کی شہ رگ پر آبیٹھے تھے۔

لاری نوجوان موحل بڑے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا' اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر حال میں خوش اور مطمئن نظر آنے والا نوجوان ہے۔ اس نے ہماری رہائی کے لیے بڑا دلیرانہ اور خطرناک قدم اٹھایا تھا' اس قدم کی پاداش میں جوزام اس کی تکا بوٹی کر کے اپنے تندور کتوں کو کھلانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اس کی پیشانی پر تشویش کی شکن تک نہیں تھی۔ وہ اب بھی شریر نظروں سے پہرے داروں کو گھور رہا تھا۔ موحل کا یہ انتہائی باعتماد انداز مجھے پسند آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ہم تک کیسے اور کب پہنچا۔ اس نے واماں کی وساطت سے جو کچھ بتایا وہ یوں تھا۔ ہماری گرفتاری کے وقت وہ موقع سے اوجھل ہوگیا تھا۔ بعد ازاں اس نے کافی فاصلہ رکھ کر جوزام گھڑسواروں اور ہمارے چھکڑے کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ کامیابی سے اس بستی تک پہنچا اور نواحی جنگل میں چھپا رہا۔ ایک خوب صورت چرواہی نے موحل کی مدد کی' وہ نہ صرف موحل کی پناہ گاہ میں اسے کھانا پہنچاتی رہی بلکہ بستی کی صورت حال بھی بتاتی رہی (موحل کے طور اطوار سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عشقیہ مزاج رکھتا ہے اور یقیناً لڑکیاں بھی اس میں کشش محسوس کرتی تھیں) رات کی تاریکی میں موحل نے بستی کے ایک دو چکر بھی لگائے' آخر دو دن پہلے وہ یہاں ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہوگیا۔ بستی کی ایک اور جواں سال عورت نے بھی موحل کی مدد کی۔ اسی عورت کی زبانی کل سہ پہر موحل کو معلوم ہوا تھا کہ ہمارے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملائی جا رہی ہے' بعد میں اسی عورت کے تعاون سے یا بے وقوفی سے موحل' سردار زبے کی چہیتی بیوی تک بھی پہنچا اور اس کو اٹھا کر چھکڑے میں لایا۔

موحل یہ ساری باتیں یوں بتا رہا تھا جیسے یہ زندگی موت کا

کھیل نہ ہو کرکٹ یا فٹ بال میچ کی کمنٹری ہو۔ موسل کا رنگ عام حبشیوں کی طرح زیادہ سیاہ نہیں تھا بلکہ گندمی رنگ کی طرف مائل تھا' اس کے بال بھی مختلف تھے۔ اس کی شخصیت کا سب سے اہم جزو اس کی نہایت پرکشش آنکھیں تھیں جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں۔ وہ مسکرا کر بولا "میرا تو خیال تھا کہ ہمیں پکڑنے کے بعد جوزم فوراً ہماری ٹھکائی شروع کر دیں گے مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہو گیا ہے۔"

"یقیناً ہماری قسمت نے زور مارا ہے' ورنہ فرار کی یہ ناکام کوشش ہمیں بڑی مہنگی پڑتی۔ بہرحال تمہاری جدوجہد کا شکریہ ادا نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر وابستگی کا حق ادا کیا ہے۔"

ہم باتیں کر رہے تھے اور پہرے دار ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہمارے فرار کے ہنگامے میں ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں شدید زخمی ہوا تھا' اس کے علاوہ بھی کئی افراد کو چوٹیں آئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ان لوگوں کو اپنے بڑوں کی طرف سے اجازت مل جائے تو یہ ابھی مار مار کر ہم سب کی ہڈیاں چٹکا دیں۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد صورت حال میں ایک اور پیش رفت ہوئی۔ سردار زے اپنا ٹوٹا بازو گلے میں لٹکائے دوبارہ نمودار ہوا۔ اس مرتبہ زے کے ہمراہ راجر بھی تھا۔ کنگ براؤن کا وہی جانا پہچانا اسسٹنٹ جو مائیکل کی موت کے بعد آج کل "دست راست" کا کردار ادا کر رہا تھا۔ راجر کے سرخ و سپید چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اسے اس دور دراز علاقے میں دیکھنا ہمارے لیے تعجب خیز تھا۔ نیلی وردیوں والے وہ راتقل بردار گارڈز راجر کے عقب میں آ رہے تھے۔ نرسٹ کے ان نہایت خطرناک گارڈز کو دیکھتے ہی میں نے فوراً ماسٹر استی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چمک دار پھل والی چھری میرے ہاتھ میں تھی۔

راجر کو دیکھتے ہی شیطان زادے کو پھر گالم گلوچ کا دورہ پڑ گیا۔ وہ ہم سب پر چیخنے لگا اور مشینی انداز میں ٹانگیں چلانے لگا۔ حسب سابق وہ بار بار میرے بازو پر کاٹنے کی کوشش بھی کر رہا تھا مگر اس مرتبہ میں نے اس کی گردن کو خاص انداز سے جکڑ رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد جب استی کا جوش و خروش ذرا ٹھنڈا پڑا تو راجر سے میری بات چیت شروع ہوئی۔ راجر نے انگریزی میں کہا "ہم ماسٹر استی کو لینے آئے ہیں اور کسی صورت خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔"

"مجھے بھی لگتا ہے کہ تم خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔ تمہارے ہاتھ میں اس شیطان جونیئر کی لاش ہوگی۔"

راجر کے چہرے پر سایہ لہرا گیا۔ وہ سنبھل کر بولا "تم چاہتے کیا ہو؟"

"جو ہم چاہتے تھے وہ تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ ہم تمہیں ماسٹر استی واپس کرنا چاہتے تھے اور خاموشی کے ساتھ تمہارے علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے مگر تم نے موگاسا کی امنٹ سے امنٹ بجا کر اور ان گنت بے گناہوں کو قتل کر کے صورت حال بالکل بدل دی ہے۔"

"وہ سب ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"وحشیانہ قتل عام کو "غلط فہمی" کہہ کر تم مرنے والوں کو واپس نہیں لا سکتے ہو لہٰذا اب وہی کچھ ہوگا جو ہونے والا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس چلے جاؤ۔ یہ رحم جوزم جو کچھ ہمارے ساتھ کریں گے وہی استی کے ساتھ ہم ہوگا۔ بس ایک بات یاد رکھنا اور ذہن میں اچھی طرح بٹھا لینا۔ اگر ان جوزمز کی طرف سے یا تمہاری طرف سے استی کو ہم سے چھیننے کی کوشش کی گئی تو میں اسے فوراً قتل کر دوں گا۔ ٹھیک ہے کہ اس کے بعد ہمارا حشر بھی برا ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ ہماری موت کو عبرت ناک بنا دیا جائے لیکن ہمارے دل میں یہ ٹھنڈک تو ہوگی کہ ہم نے اس صدی کے سب سے بڑے بردہ فروش کو ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا ہے۔"

"دیکھو مسٹر شا! ایک بچے کے سامنے اس طرح کی گفتگو مناسب نہیں۔ تم استی کو اپنے ساتھیوں کے حوالے کر دو ہم تنہائی میں بات کرتے ہیں۔"

"ہم جب سے موگاسا سے نکلے ہیں' میں نے تمہارے شیطان زادے کو ایک لمحے کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں کیا اور اب بھی کرنا نہیں چاہوں گا۔ باقی جہاں تک بچے کی بات ہے' یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے' اس کے اندر ایک خرانٹ بردہ فروش کی روح ہے۔ جو بچہ کملا اور اس کے خوار کو نرسٹ کی بھول بھلیوں میں بھگا بھگا کر موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور اس قسم کے دوسرے "معصومانہ" کارنامے انجام دے سکتا ہے' وہ ہر طرح کی گفتگو سن سکتا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ بظاہر راجر پرسکون نظر آ رہا ہے مگر میرے لہجے کی وحشت اسے اندر سے لرزہ براندام کر رہی ہے۔ میرے اور راجر کے درمیان سب کے سامنے ہی قریباً آدھ گھنٹا گفتگو ہوئی۔ اس نے کئی طرح سے مجھے قائل کرنے

کی کوشش کی مگر میرا اٹل جواب یہی تھا کہ ہم استی کو حوالے نہیں کریں گے چاہے ہم سب کی جان چلی جائے۔ اسی دوران میں سردار زے نے ایک بار پھر ٹانگ اڑائی۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ کلثوم اور شائستہ اس کی تحویل میں ہیں اور ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جواب میں میں نے بھی اپنی دھمکی دہرا دی۔۔۔ اور یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ اگر یہ لوگ استی کو واپس لینے کے لیے شائستہ اور کلثوم کو "لیور" کے طور پر استعمال کرتے تو میں واقعی وحشت میں استی کو کسی عضو سے محروم کر دیتا۔ میری جوابی دھمکی سننے کے بعد اور میرے سینے کی آگ کو محسوس کرنے کے بعد راجر ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ناگواری نظروں سے سردار زے کو گھورا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے کہہ رہا ہو کہ وہ بھونڈی دھمکیاں دے کر بگڑی ہوئی صورت حال کو مزید بگاڑنے کی کوشش نہ کرے۔ راجر کے رویے سے عیاں تھا کہ اسے ہر صورت میں استی کی سلامتی برقرار رکھنے کی ہدایات ملی ہوئی ہیں۔ وہ کوئی "رسکی" قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ راجر کے ساتھ میری گفتگو اس اثر کے ساتھ ختم ہوگئی کہ ہم استی کو کسی حال میں جوزم قبیلے یا نرسٹیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔۔۔ ہاں اگر ہم یہاں سے بحفاظت نکل کر کسی محفوظ علاقے میں پہنچ جائیں تو پھر اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔

پروفیسر نے کہا "اب یہ ہرکارہ کہاں گیا ہے؟" اس کا اشارہ یقیناً راجر کی طرف تھا۔

"شاید وائرلیس پر کسی حرامی سے اس کو رابطہ کرنا ہو۔" زریں نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ ممکن نہیں۔" میں نے کہا "ہم بڑے دور افتادہ علاقے میں ہیں۔ اتنے فاصلے سے ٹرانس میٹر یا وائرلیس کہاں کام کرے گا۔ جو لوگ یہاں پہنچے ہیں' وہ آپس ہی میں مشورہ کریں گے۔"

اس مشورے کا نتیجہ پندرہ بیس منٹ بعد نکل آیا اور ہمارے نقطہ نظر سے یہ بڑا اچھا نتیجہ تھا۔ ہم نے روبا کو دیکھا۔ اس کے ساتھ منڈے ہوئے سروں والے تین مجسم ضخیم پہرے دار تھے۔ یہ لوگ کلثوم اور شائستہ کو ہمارے پاس واپس لا رہے تھے۔ چند ہی لمحے بعد کلثوم اور شائستہ کوٹھڑی میں ہمارے درمیان موجود تھیں۔ ان کے تاثرات سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کے ساتھ کسی طرح کی بدتمیزی نہیں ہوئی۔ کلثوم زریں گل سے کھسر پھسر کرنے لگی اور شائستہ کو پروفیسر نے ننھی گڑیا کی طرح بانہوں میں سمیٹ لیا۔ شائستہ اور کلثوم کو واپس بھیج کر ایک طرح سے راجر نے ہماری طرف مفاہمت کا پیغام بھیجا تھا۔ گفتگو کے دوران میں دونوں طرف جو تلخی سی پیدا ہوگئی تھی وہ اس مثبت پیغام سے قدرے کم ہوگئی۔ روبا کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ تھی' وہ جانتی تھی کہ حالات ہمارے حق میں جا رہے ہیں۔

وہ واماں کے ذریعے غزالہ سے مخاطب ہو کر بولی "میں نہیں جانتی کہ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میرے بچے کی جان بچا کر تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں گی اور اپنے بچے کو دیکھتی رہوں گی' مجھے تم یاد آتی رہو گی۔ میری طرف سے یہ حقیر سی نشانی قبول کرو۔" روبا نے کسی نامعلوم پتھر سے تراشا گیا ایک رنگ اپنی انگلی سے اتارا اور غزالہ کی طرف بڑھا دیا۔

تھوڑے سے تذبذب کے ساتھ غزالہ نے رنگ قبول کر لیا۔ روبا بولی "یہ بڑا نایاب اور پراسرار پتھر ہے۔ اسے کھونا مت' یہ تمہیں بہت فائدہ دے گا۔"

شاید روبا اپنے عقیدے کے مطابق اس پتھر کے بارے میں کچھ اور بھی بتاتی مگر اسی دوران میں پہرے دار نزدیک

ساحر جمیل سید
راکھشس
ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سر کٹا جسم کس کا تھا؟ سلگتے انگاروں سے جنم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کبیر صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔
قیمت 125.00 روپے
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
S:7247811
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال

آ گئے اور وہ غزالہ اور شائستہ وغیرہ سے رسمی کلمات کہہ کر واپس چلی گئی۔

"روبا کے رویے پر غور کیا تم نے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"ہاں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ الوداعی ملاقات کر رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ اس منحوس کوٹھڑی اور منحوس قبیلے سے ہماری جان آناً فاناً چھوٹ جائے۔"

"امکان تو اس سے زیادہ کا بھی ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ راجر اور اس کے ساتھی ہمیں من چاہی جگہ پر جانے کی اجازت دے دیں۔"

"ایسی صورت میں ہم کدھر جائیں گے؟" صفدر نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو نرسلیوں کی زد سے بچنے کے لیے ہمیں ماریطانیہ کی حدود سے باہر نکلنا پڑے گا۔"

ماریطانیہ چھوڑنے کی بات سن کر ہی صفدر کے چہرے پر کرب کا سایہ لہرا گیا۔ یہ ماریطانیہ ہی تھا جس نے اسے ایک ناقابل فراموش زخم دیا تھا۔ جو زخم دے وہ قابل نفرت ہو جاتا ہے مگر صفدر کے لیے اس زمین، اس فضا اور اس آسمان سے نفرت کرنا ممکن نہیں تھا۔ شاید اس گرد و پیش میں اسے ویرا کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں، اور مر کر بھی نہ مرنے والی اس کی جھلک نظر آتی تھی۔

اچانک ہم گفتگو کرتے کرتے بری طرح چونک گئے۔ کہیں پاس سے شور ابھرا اور بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ چند ہی لمحے بعد ہم نے کم و بیش پندرہ جوذام افراد کو دیکھا۔ ان کے چہرے مشعلوں کی روشنی میں تمتما رہے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ آتے ساتھ ہی انہوں نے کوٹھڑی کی سلاخ دار کھڑکی میں سے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہمیں ایسے اقدام کی قطعی توقع نہیں تھی۔ کئی لمبے نیزے کھڑکی میں سے اندر گھس آئے۔ ایک نیزہ مول کے کندھے میں گھسا، دوسرا کوری کے سینے سے آر پار ہو گیا۔ تیسرا پروفیسر اللہ دتا کے پیٹ میں لگا۔ زریں نے خود کو نیزے کے وار سے بچاتے ہوئے نیزہ پکڑا اور نیزہ بردار کو زور سے اندر کی طرف کھینچا، وہ کھڑکی کی آہنی سلاخوں سے ٹکرایا اور گر گیا، نیزہ زریں کے ہاتھ میں آ گیا، وہ کھڑکی میں سے جوابی وار کرنے لگا۔ میں نے دیکھا حملہ آوروں میں سے دو افراد کوٹھڑی کا تالا توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر انہوں نے جلتے ہوئے پرانے کپڑے کھڑکی کے راستے کوٹھڑی میں پھینک دیے۔ روغن میں ڈوبے ہوئے ان کپڑوں نے ایک دم کوٹھڑی میں آگ بھڑکا دی۔

دھواں ہمارے پھیپھڑوں میں بھرا اور ہم سب بے طرح کھانسنے لگے۔ آگ اتنی سرعت سے پھیلی کہ پلک جھپکتے میں ہم کوٹھڑی کے ایک گوشے میں محصور ہو گئے۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" میں سلاخ دار کھڑکی سے منہ لگا کر زور زور سے چیخا مگر آگ لگانے والے اپنا کام کر کے بھاگ چکے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ سردار زرے کوئی باغی گروپ تھا۔ شاید اس گروپ نے اس بات کو ا توہین جانا تھا کہ ہم بخیر و عافیت یہاں سے نکل جائیں۔ کوٹھڑی سے کچھ فاصلے پر ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ آگ لگانے والے گروہ کا پہرے داروں سے تصادم ہوا ہے۔ یہ کوٹھڑی ہمارے لیے دہکتا ہوا تنور ثابت ہو رہی تھی۔ ایک ہی لمحے میں موت ہم سب کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ خوبرو کوری جاں کنی کے عالم میں تڑپ رہی تھی۔ پروفیسر کا لباس بھی خون سے رنگین ہو چکا تھا۔

یکایک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ایک عجیب اور پراسرار سا احساس۔ یہ احساس کئی بار پہلے بھی مجھے ہو چکا تھا۔ میں اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکتا اور نہ سمجھا دے سکوں گا۔ یہ احساس اس وقت ذہن میں جگہ بناتا تھا جب مرد عجیب سائیں عالی میرے آس پاس موجود ہوتا تھا۔

میں نے دھوئیں کے مرغولوں میں سے بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا، کوئی بھاگتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ شاید سائیں عالی تھا مگر نہیں وہ سائیں عالی نہیں تھا۔ وہ شاید سائیں عالی کا کوئی چیلا تھا۔ میں سیاہ دھوئیں میں سے صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کے گلے میں گھنٹیاں تھیں۔ ان گھنٹیوں کی آواز میں سن سکتا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بڑی تیزی سے کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے جھکا اور چابی کے ذریعے تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دو سیکنڈ کے اندر اس نے تالا کھول دیا۔ عین اسی وقت دھوئیں کے اندر سے میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے تو آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

میرے سامنے آفت جاں، فتنہ ساماں، مجسم ہوش سروج۔۔۔ المعروف بہ الو کی پٹھی موجود تھی۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ سائیں کی یہ عجوبۂ روزگار چیلی یہاں کیسے پہنچی بلکہ یہ سوچنے کا وقت تھا کہ ہم اس کوٹھڑی سے کیسے نکلیں اور کیسے جان بچائیں؟

اسقی کو میں نے بدستور اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ تیز دھار چھری میرے دائیں ہاتھ میں تھی۔ جونہی سروج نے دروازہ کھولا، میں تیزی سے باہر نکلا۔ زریں میرے عقب میں تھا۔ اس نے زخمی پروفیسر کو بڑی پھرتی سے اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔ غزالہ، کلثوم اور شائستہ بھی بری طرح کھانستے ہوئے باہر نکل آئی تھیں۔ ہم ایک راہداری میں سے گزرے اور باہر نکل آئے۔ تازہ ہوا میں پہنچ کر جیسے جان میں جان آ گئی۔ مسلح جوذام پہرے دار مختلف کونوں کھدروں سے نکلے تھے اور انہوں نے ہمیں تیزی سے گھیرے میں لے لیا تھا۔

اس اچانک برپا ہو جانے والے ہنگامے پر یہ پہرے دار بھی ششدر نظر آتے تھے پھر ہمیں سردار زرے اور سفید فام راجر کی صورتیں نظر آئیں۔ راجر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سردار زرے بھی بوکھلایا ہوا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے راجر سے چیخ کر پوچھا۔

راجر نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بولا "تحمل سے شاہ۔ تحمل سے۔ پتا نہیں یہ کون لوگ تھے، سردار زرے کا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

پھر سردار زرے بھی تیز تیز لہجے میں بولنے لگا۔ واماں نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "سردار کہتا ہے کہ یہ صرف چند لوگوں کی ایک ٹولی کی شرارت ہے۔ وہ لوگ بھاگ گئے ہیں۔ ہمارے آدمی انہیں پکڑنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔"

میں نے راجر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "راجر، یہ دوسری مرتبہ ہوا ہے کہ ہم سے دھوکا کیا گیا ہے۔ شاید تم لوگوں کو اسقی کی زندگی درکار نہیں ہے۔"

میرے لہجے کی تپش نے راجر کو سرتاپا لرزا دیا۔ وہ بولا "نہیں شاہ! کوئی حماقت نہ کرنا۔ ہم تمہاری ہر بات مان رہے ہیں اور یہ اس لیے ہے کہ ہم اسقی کو بالکل محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر اسقی کو کچھ ہو گا تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔ ہمیں دبوچنے کے لیے اب تم کسی تیسرے موقع کی تلاش میں ہو۔ میں اس تیسرے موقع سے پہلے ہی اس حرامی کو لاش میں تبدیل کر دوں گا۔"

میرے جسم کا سارا خون جیسے میرے دماغ کو چڑھ گیا تھا اور اپنی آواز خود مجھے بھی اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

راجر نے اپنے ساتھیوں کے علاوہ جوذام پہرے داروں کو بھی ہدایت کی کہ وہ ہم سے دور ہٹ جائیں۔ راجر کی ہدایت پر اس کے ساتھیوں نے اپنی رائفلیں بھی جھکا لی تھیں۔ راجر نے بڑے نرم لہجے میں کہا "دیکھو شاہ، ہم تمہارا یہ مطالبہ مان رہے ہیں کہ تم یہاں سے جہاں جانا چاہو، جا سکتے ہو۔ اس سلسلے میں ہم تمہیں پورا تحفظ بھی فراہم کریں گے مگر اپنی من چاہی منزل پر پہنچ کر تمہیں اسقی کو ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔"

"میں اس موقع پر کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال منزل پر پہنچ کر اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

"مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں راجر۔" میں نے اس کی بات کاٹی "بس ہاں یا نہ میں جواب دو۔ اگر تمہارا جواب "نہ" میں ہے تو پھر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ جو کچھ ہم پر گزر گئی وہی اس شیطان زادے پر بھی گزر جائے گی۔"

راجر نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھسر پھسر کی پھر سردار زرے اور ساحر بوتارا کے ساتھ چند سرگوشیوں کا تبادلہ کیا، اس کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ میرا مطالبہ مان لیا گیا ہے، ہم جوذام قبیلے کی اس بستی سے روانہ ہو سکتے ہیں۔

اسی دوران میں دو جوذام پہرے دار خوب رو کوری کی لاش لے کر باہر آ گئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والے اچانک حملے میں ایک نیزہ اس کے پیٹ میں لگا تھا۔ وہ پہلے ہی جرائم پیشہ ہوس پرستوں کے ہاتھوں زخم زخم تھی، ایک اور زخم لے کر راہی عدم ہو گئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ بھی وہیں پہنچ گئی تھی جہاں اولام پہنچا تھا۔ سردار زرے نے غداری کی سزا اولام کو بھیانک موت کی صورت میں دی تھی اور اولام کا ساتھ دینے کی سزا کوری کو موت کی صورت میں مل گئی تھی۔

پروفیسر کو بھی پیٹ میں ہی نیزہ لگا تھا۔ تاہم یہ زخم کوری کے زخم جیسا سنگین نہیں تھا۔ پروفیسر کا زخم پیٹ کے زیریں حصے میں تھا۔ اس کی قمیص خون سے تربتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غزالہ اردگرد کے ماحول سے لاتعلق، پروفیسر کو طبی امداد دینے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر پسینے کے قطرے مشعلوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

لاڑ کی نوجوان مول کے کندھے پر بھی نیزے کا زخم آیا تھا۔ اس نے اپنے کندھے کو اپنے دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔ خون اس کے ہاتھ کے نیچے سے بھی نکلتا دکھائی دے رہا تھا تاہم مول کے چہرے پر تکلیف یا پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ شخص ہر قسم کی تکلیف سے لطف اندوز ہونے کا گر جانتا ہے۔

دس پندرہ منٹ کے اندر غزالہ نے نہ صرف پروفیسر کے جسم سے خون کا اخراج روک دیا بلکہ اسے اس قابل بھی بنا

دیا کہ وہ سفر کرسکے۔ میں سروج کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑا رہا تھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ تالا کھولنے کے بعد اور ہمیں کوٹھڑی سے نکالنے کے بعد وہ پراسرار طور پر اوجھل ہوگئی تھی۔ تاہم مجھے یقین تھا وہ کہیں ہمارے آس پاس ہی موجود ہے۔ جس دوران میں غزالہ پروفیسر اور مرلی کو طبی امداد دے رہی تھی' دو بڑی جیپیں ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی تھیں۔ ان جیپوں کو راجر کے کارندے ڈرائیو کررہے تھے۔ نیکروں اور ٹوپیوں والے وہی منحوس ہرکارے جو ٹرسٹ کی چاردیواری میں عفریتوں کی طرح چکرایا کرتے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی میرے ذہن میں ٹرسٹ کا اندرونی ماحول اجاگر ہوگیا۔ غلاموں اور لونڈیوں کی ٹولیاں۔ سی بو کو کی "شائیں شائیں۔" قدم قدم پر لگے ہوئے نگران وڈیو کیمرے' جدید ترین آسائشیں اور پتا نہیں کیا کچھ۔

راجر نے بتایا کہ یہ جیپیں ہمارے لیے ہیں اور ہم ان پر سوار ہوکر جہاں جی چاہے' جاسکتے ہیں۔

میں نے کہا "ہم سب ایک ہی جیپ پر سوار ہوں گے۔"

"سب کے لیے بیٹھنا بہت مشکل ہوجائے گا۔" راجر نے کہا۔

"ہم یہ مشکل جھیل لیں گے لیکن تمہارے لیے کوئی آسانی پیدا نہیں کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی تک میری بات پر یقین نہیں آیا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ تھوڑی دیر پہلے ہونے والے ہنگامے سے بوتارا یا سردار زے کا کوئی تعلق نہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ حملہ آوروں نے تالا توڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سردار زے کے ساتھی ہوتے تو تالا کھول کر اندر آتے اور تم سب کو نیزوں پر رکھ لیتے۔"

"بہرحال اس جھوٹ سچ کا پتا بھی چل جائے گا۔ فی الحال ہمارے آخری ساتھی کو ہمارے پاس پہنچاؤ۔"

"آخری ساتھی؟ میں سمجھا نہیں؟" راجر نے کہا۔

"اس لاوی لڑکی کا نام موتابہ ہے۔ اسے مقامی ساحر بوتارا نے بے ہوش کرنے کے بعد کہیں بند کر رکھا ہے۔ ہم موتابہ کے بغیر یہاں سے روانہ نہیں ہوسکتے۔"

راجر اور سردار زے کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہوئی' پھر لمبے بالوں والا ساحر بوتارا بھی ان سرگوشیوں میں شریک ہوگیا۔ ان کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ کچھ گمبھیر ہے۔

"کیا بات ہے راجر؟ کہیں تم لوگوں نے اس کی جان تو نہیں لے لی۔" صفدر نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' بس وہ بیمار ہے۔ شاید سفر کے قابل نہیں ہے۔"

"وہ جس حالت میں بھی ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا فیصلہ ہم کریں گے کہ ہم اسے ساتھ لے جائیں یا نہیں؟" میں نے کہا۔

راجر زے اور بوتارا میں ایک بار پھر سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد ساحر بوتارا آگے آیا اور اس نے مترجم کے ذریعے کہا "یہ معاملہ تھوڑا سا پیچیدہ ہے۔ شاید آپ لوگوں کے لیے اس میں الجھن ہو۔ موتابہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں لیکن وہ زندہ ہے۔ اس کی حالت کو آپ لوگ سکتے کی حالت بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ سانس نہیں لیتی' اس کی دھڑکن بھی نہیں ہے مگر وہ زندہ ہے۔ اپنی اس حالت کی ذمے دار بھی موتابہ خود ہی ہے۔ اس نے اپنے آپ پر یہ کیفیت اپنی مرضی سے طاری کی ہے اور اگر......"

"تم اپنی یہ بکواس بند رکھو تو بہتر ہے۔" میں نے چیخ کر کہا "میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں' ابھی اسی وقت!"

میرے اشتعال نے راجر کو چونکا دیا۔ اس نے مترجم کے ذریعے زے سے کچھ کہا۔ زے دو تین افراد کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو افراد ایک مسہری اٹھائے ہوئے نمودار ہوئے۔ مسہری پر دبلی پتلی دراز قامت موتابہ موجود تھی۔ وہ بالکل سیدھی لیٹی تھی۔ اس نے سینے تک ایک سیاہ چادر کھینچ رکھی تھی' آنکھیں بند تھیں۔ مشعلوں کی روشنی میں اس کے سیاہ چہرے پر کوئی چمک دار غلاف نظر آرہا تھا جیسے گوندیا سریش وغیرہ سے اس کے چہرے اور ہاتھوں پر لیپ کردیا گیا ہو۔

مسہری ہمارے قریب لاکر رکھ دی گئی۔ میں نے موتابہ کا چہرہ دیکھا' اس کے سینے کے زیر و بم کو محسوس کرنے کی کوشش کی اور میرے دل نے گواہی دی کہ یہ لاوی ساحرہ مرچکی ہے۔ اس کی شفاف گردن پر ابھی تک زخم کا وہ نشان موجود تھا جو مقامی جادوگر بوتارا کے کاٹنے سے آیا تھا۔ وہ سارا واقعہ ابھی تک جیسے میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جس دن ہم اس بستی میں پہنچے تھے اس سے اگلے دن بوتارا نے موتابہ کو ایک اذیت ناک تجربے سے گزارا تھا۔ اس نے موتابہ کو زمین پر گرایا تھا' اپنے منہ میں کوئی جڑی بوٹی چبائی تھی اور پھر سانپ کی طرح موتابہ کی گردن پر اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔ اس تیز اثر جڑی بوٹی نے موتابہ کو دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش کر ڈالا تھا۔ اور آج کئی دن بعد ہم اپنی اس ساتھی کو بے حس و حرکت اس مسہری پر دراز دیکھ رہے تھے۔

میری آنکھوں میں جیسے انگارے سے دہکنے لگے تھے۔ مینا نے غزالہ سے کہا "اسے دیکھو غزالہ! مجھے تو یہ زندہ نہیں لگتی ہے۔"

غزالہ موتابہ کے قریب بیٹھ گئی۔ مرلی نے ایک جوزم کے ہاتھ سے مشعل پکڑی اور زیادہ روشنی فراہم کرنے کے لیے مسہری کے سرہانے کھڑا ہوگیا۔ غزالہ نے موتابہ کی ناک کے سامنے الٹا ہاتھ رکھا اور سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نبضیں دیکھیں۔ تب آنکھوں سے پپوٹے اٹھائے اور پتلیاں چیک کرتی رہی۔

"یہ لوگ بکواس کررہے ہیں' یہ مرچکی ہے۔" غزالہ نے بڑے کرب سے کہا۔

میرا جی چاہا کہ لپک کر ساحر بوتارا کی طرف جاؤں اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری دستے تک اس کے سینے میں گھسا دوں۔ اس منحوس شخص کے بارے میں میرا شبہ حقیقت میں بدل چکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ ساحر موتابہ کی جان لے لے گا۔ موتابہ نوجوان تھی' وہ کئی روز بلا شرکت غیرے ساحر کے قبضے میں رہی تھی اور یہ لوگ تو عورت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مرتے تھے۔

میں نے پھنکارتے لہجے میں بوتارا سے پوچھا "حرام زادے' تونے مار ڈالا ہے اسے۔ بتا کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟"

"تم اپنی زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں کہہ چکا ہوں یہ مری نہیں ہے۔ یہ سکتے میں ہے۔"

"تمہاری اس بک بک سے تمہارے قبیلے کے لعنتی تو متاثر ہوسکتے ہیں ہم نہیں۔ تم نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"اگر یہ مردہ ہوتی تو تین دن میں اس کا جسم گلنا شروع ہوجاتا۔ تم لوگ اس کے قریب بھی نہ جاسکتے بدبو کی وجہ سے۔"

غزالہ نے جھک کر بڑے غور سے موتابہ کا چہرہ دیکھا' موتابہ کے چہرے پر لگا ہوا محلول غزالہ نے انگلی سے چھوا' سونگھا اور انگوٹھے سے مل کر دیکھا پھر بولی "یہ کوئی خاص قسم کا کیمیکل ہے' اس کیمیکل کے نیچے بھی کسی چیز کی کوٹنگ موجود ہے۔ میرے خیال میں یہی کیمیکل ہیں جنہوں نے لاش کو خراب نہیں ہونے دیا۔"

بوتارا بلند آواز میں چیخنے چلانے لگا۔ وہ بڑی برہمی میں تھا اور جب وہ سر کو زور سے جھٹکتا تھا تو اس کے بال لہراتے محسوس ہوتے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی حرکات سے بھی ظاہر تھا کہ وہ بڑے زور و شور سے ہمارے موقف کی تردید کررہا ہے پھر وہ لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

راماں نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "بوتارا کا کہنا ہے کہ لڑکی زندہ ہے' وہ اپنی بات کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہ کوئی چیز لینے گیا ہے۔"

سب دم بخود تھے اور انتظار کررہے تھے کہ آنے والے لمحوں میں کیا سامنے آتا ہے۔ اچانک مجھے ایک اور شک گزرا۔ میں نے سردار زے سے مخاطب ہوکر کہا "کہیں وہ بدبخت تمہیں اور ہم سب کو چکما تو نہیں دے گیا۔"

سردار زے اور راجر نے چونک کر بوتارا کی کوٹھڑی کی جانب دیکھا پھر سردار زے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ بوتارا کے پیچھے گیا۔ سردار زے کی واپسی بھی جلد نہیں ہوئی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا' میرا اندیشہ درست ثابت ہوتا جارہا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد سردار زے گلے میں اپنا زخمی بازو لٹکائے اکیلا ہی واپس آگیا (یہ بازو مقابلے میں میرے ہی ہاتھوں ٹوٹا تھا)

سردار نے آکر بتایا "محترم بوتارا موجود نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قصوروار ہیں۔ ان کی کہی ہوئی بات ہر شک سے بالا ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار بوتارا اور زے کے لیے صلواتیں نکل گئیں۔ صفدر بھی دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ موتابہ کی موت نے ہمارے سینوں کو غم سے لبریز کردیا تھا مگر یہ وقت ایسا تھا کہ ہم اپنا خون جلانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔

○☆○

گھنا جنگل پیچھے رہ گیا تھا۔ ہم سب ایک بڑی جیپ میں سوار تھے۔ صفدر' غزالہ' سمعی' زریں' کلثوم' شائستہ' مرلی سب ایک ہی جگہ بیٹھے تھے' پروفیسر اللہ دتا کو سب سے پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا تھا۔ غزالہ اور شائستہ پروفیسر کے قریب بیٹھی تھیں اور ہر گھڑی اس کا دھیان رکھ رہی تھیں۔ بدقسمت موتابہ جو جوزم بستی میں جاتے وقت ہمارے ساتھ تھی اب ایک لاش کی شکل میں سفر کررہی تھی۔ اس کی لاش دوسری جیپ میں تھی' اور اس جیپ میں لاش اور ڈرائیور کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ راجر اور اس کے مسلح ساتھیوں نے ہمیں اپنی حفاظت میں جوزم بستی سے نکالا تھا اور اب بھی وہ کچھ فاصلہ رکھ کر ہمارے ساتھ ساتھ آرہے تھے۔ ان کی دو جیپیں ہمارے دائیں بائیں تھیں اور ایک عقب میں تھی۔

اسٹنی کی صورت میں ٹرپ کا جو پتا ہمارے ہاتھ آچکا تھا‘ اس نے اب خوب کام دکھانا شروع کردیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ راجر اور اس کے ساتھی جو کچھ عرصہ پہلے تک فولاد کی طرح سخت تھے‘ اب موم کی ناک بن گئے ہیں اور ہم اس ناک کو جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ ہم جوڈوم بستی سے دو تین میل دور ہی آئے تھے جب جھاڑیوں کے عقب سے ہماری جیپوں پر تیر اندازی کی گئی۔ ایک تیر اس جیپ کے بینٹ میں لگا جس پر موٹاپے کا مردہ مجسم تھا۔ تاز بیٹھا ہوا تھا اور آگے بڑھنے سے پہلے دوسرا تاز لگا تاز را۔ پانچ دس منٹ کے اس وقفے میں ہمیں ان نامعلوم جنگلیوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق رہا۔ اس دوران میں نیلی وردیوں والے ٹرسٹ کے مسلح محافظ باقاعدہ پوزیشن لے کر بیٹھے رہے اور ان کی انگلیاں مسلسل ٹریگرز پر رہیں۔ غالب گمان یہی تھا کہ گھات لگا کر کی جانے والی یہ تیر اندازی اسی گروہ کے لوگوں کی طرف سے ہے جنہوں نے اس سے پہلے کوٹھڑی میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ پہیا بدلنے کے بعد ہمارا کارواں آگے روانہ ہوا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے؟ کوئی بات بھی ذہن میں واضح نہیں تھی۔ فی الوقت پہلی ترجیح یہی تھی کہ جلد از جلد اس قبیلے کی حدود سے باہر نکل جائیں۔ ہماری جیپیں بیس پچیس میل فی گھنٹا کی معمولی رفتار سے چلتی رہیں اور تقریباً آدھ گھنٹے میں ہم قبیلے کی حدود سے دور نکل آئے۔ منڈے ہوئے سروں والے ان کراہت زدہ اور خطرناک لوگوں کی بستی دور رہ گئی جہاں عورت ایک نایاب نسل تھی اور جہاں ہر مرد کی آنکھوں میں ہمیں "پیاس" نظر آتی تھی۔

اچانک جھاڑیوں میں سے کوئی نکلا اور ہماری جیپ کے سامنے آگیا۔ اب سورج کافی اوپر آچکا تھا۔ قرب و جوار خوب روشن ہوگئے تھے۔ ہمارے سامنے آنے والی ایک عورت تھی‘ اس نے اپنا سراپا ایک لمبی چادر میں چھپا رکھا تھا۔ ہم نے ذرا دھیان سے دیکھا تو پہچان لیا‘ وہ سروج تھی۔

"گاڑی روکو۔" میں نے ترکی ڈرائیور سے کہا۔

اس نے جیپ روک دی۔ سروج نے تحقیقی انداز میں جیپ کے اندر جھانکا۔ مجھے‘ صفدر اور غزالہ وغیرہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ صفدر کا میک اپ تو ختم ہو چکا تھا لیکن میں تاحال میک اپ میں تھا۔ اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر سروج نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے اندر آگئی۔ لمبی سیاہ چادر کے نیچے سروج نے ایک گلابی چوغہ سا پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں ویسی ہی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں تھیں جو سائیں عالی کے گلے میں نظر آتی تھیں۔ جیپ میں داخل ہوتے ہی اس نے بڑے انداز سے ہاتھ جوڑے اور بولی "سب کو نمستے۔"

زریں گل نے بہت برا سا منہ بنایا۔

میں نے کہا "دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں ٹٹول کر دیکھوں‘ تم سروج ہی ہو یا میری نگاہ دھوکا کھا رہی ہے۔"

وہ بولی "ٹٹول کر دیکھ لو‘ تمہیں منع کس نے کیا ہے۔"

اس کے جواب پر غزالہ نے نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھا۔

صفدر‘ زریں‘ کلثوم سب میری ہی طرح سروج کی اچانک آمد پر سخت حیران تھے۔ ان سب نے سروج پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ وہ بولی "میں آپ سب کے ہر سوال کے جواب بڑی تفصیل سے دوں گی مگر اس وقت ایک اہم مسئلہ ہمیں درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"ہمارے پاس دو تین آپشن ہیں۔" صفدر نے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں آپ کے پاس کوئی بھی آپشن نہیں ہے۔" سروج بڑے وثوق سے بولی "یہ بات آپ دفعہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ کسی پاکستانی سفارت کار تک پہنچ جائے اور اسے اپنی ساری بپتا سنائی جائے یا پھر پولیس سے تحفظ حاصل کیا جائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح کے آپشن میں آپ کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ماربا ٹرسٹ اور کرنادھرتا کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ سفارت کاروں یا پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ کر بھی آپ غیر محفوظ ہی رہیں گے۔ میرے خیال میں اس وقت ہمارے لیے سب سے بہتر راستہ سائیں جی کا راستہ ہے اور سائیں جی کی خواہش بھی یہی ہے کہ آپ ان کے پاس پہنچ جائیں بلکہ آپ میری اس آمد کو سائیں جی کی طرف سے سندیسا سمجھ لیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم جھیل زار کے قریبی علاقے کی طرف چلے جائیں؟"

"بالکل۔ سائیں جی وہاں موجود ہیں اور آپ لوگوں کا بڑی شدت سے انتظار کررہے ہیں۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں‘ آپ وہاں کے ماحول کو دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔"

"اور اگر ہم سائیں کی طرف جانے سے انکار کردیں تو؟"

"یہ آپ کی مرضی ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ سائیں جی کی مرضی اور آگیا کے بغیر یہاں سے آگے

ہیں۔"

"شاید تم ام کو سائیں عالی کی بددعا سے ڈرانے کی کوشش کررہی ہو۔" زریں گل تنک کر بولا "ام سمجھتا ہے کہ تمہارے جیسی چیلی کو پال کر سائیں صاحب خود بھی شرمندہ ہے۔ تم انڈیا کی فلم انڈسٹری میں ہی رہتا تو زیادہ اچھا تھا۔ وہ انڈسٹری شاید بنا ہی تم جیسی خراب عورتوں کے لیے ہے۔ جیسے مچھلی پانی میں سکون محسوس کرتا ہے تم جیسا لڑکی وہاں کے گند میں خوش رہتا ہے۔"

"تم نے مجھے خراب عورت کہا؟" سروج آنکھیں نکال کر چیخی۔ غالباً اس کے تمام پرانے زخم ہرے ہوگئے تھے۔

"خراب عورت کہا تو تم پر احسان کیا‘ ورنہ تم تو عورت کہلانے کی حق دار بھی نہیں ہو۔ جتنا دن تم اماری نظروں سے اوجھل رہا ہے ام نحوست کے سائے سے بچا رہا ہے۔ ام سب کے ایمان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تم پھر امارے درمیان ٹپک پڑا ہے۔ اب خدا ہی امارے حال پر رحم فرمائے تو فرمائے۔"

"تم پرلے درجے کے احمق اور احسان فراموش ہو۔ بد بخت انسان ابھی چند گھنٹے پہلے میں نے تمہاری مدد کی ہے‘ ورنہ کوٹھڑی کے اندر ہی کھانس کھانس کر تم ٹک باشی ہوگئے ہوتے تم۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ میں نے ہی تمہاری کوٹھڑی کا تالا کھولا تھا۔"

زریں گل ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا‘ تاہم سروج کی بات کے جواب میں خاموش رہنا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔ پہلو بدل کر بولا "انشاء اللہ تم بھی جلد ہی کسی مصیبت میں گرفتار ہوگا اور ام تمہارا مدد کرکے تمہارے احسان کا بدلہ چکا دے گا۔"

"بھگوان نہ کرے مجھے تمہاری مدد لینی پڑی‘ اس سے میں مرنا بہتر سمجھوں گی۔"

زریں لاجواب ہو کر بولا "دیکھو‘ تم زبان سنبھال کر بات کرو‘ ورنہ ام اس بات کا لحاظ نہیں کرے گا کہ تم بہت عرصے بعد امارے سامنے آیا ہے۔ ام ابھی تمہارا ستیاناس کردے گا۔"

میں نے زریں اور سروج دونوں کو جھڑکا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہوگئے۔ صفدر نے مجھ سے کہا "سروج کی اس بات سے تو مجھے بھی اتفاق ہے کہ ہم فیصلہ کرلیں کہ ہمیں اب کہاں جانا ہے؟"

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم سائیں عالی کی طرف جارہے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد سوچیں گے کہ آگے کہاں جانا ہے۔"

آسیب

آسیب‘ خوف‘ دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب‘ ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۷۵/روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ‘ اردو بازار‘ لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ‘ چوک میو ہسپتال‘ لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

زریں گل نے برا سا منہ بنایا مگر باقی سب میری رائے سے اتفاق کرتے نظر آتے تھے۔ گاڑیاں ایک بار پھر روانہ ہو گئیں۔ اب ان کا رخ مشرق کے بجائے جنوب کی طرف تھا۔

راستے میں، میں سروج کا حال احوال پوچھتا رہا۔ اس سے ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ آخری بار میں نے اسے لاہور کے ایک نفسیاتی اسپتال میں دیکھا تھا۔ گلگت کی وادی موت سے واپس آنے کے بعد سروج کی ذہنی حالت ابتر ہو گئی تھی۔ اس وقت صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک مرو پراسرار سائوس کے دائرہ اثر میں ہے۔ کوئی انجانی سی کشش ہر وقت اسے اپنی جانب کھینچتی رہتی تھی اور وہ رہ رہ کر اٹھ اٹھ کر نامعلوم منزل کی طرف دوڑتی تھی۔ مگر اب وہ کیفیت موجود نہیں تھی۔ نہ ہی سروج کے تاثرات اور لب و لہجے سے کوئی "ایب نارمل" تاثر ملتا تھا۔ وہ مکمل طور پر صحت مند اور چاق چوبند نظر آتی تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے بھی تیز و طرار اور فتنہ ساماں ہو گئی ہے۔ وہ پھر ہی پہلے والی سروج نظر آتی تھی جس کے جسم کی بوٹی بوٹی تھرکتی محسوس ہوتی تھی اور جس کا انگ انگ خاموشی کی زبان میں دعوت گناہ دیتا تھا۔ وہ پتا نہیں کیا شے تھی۔ ایک آگ اس کے اندر تھی اور ایک آنچ اس کے لب و رخسار پر موجود رہتی تھی اور اس کی آنکھوں میں رکھتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی محسوس ہو جاتا تھا کہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جو اپنی ذہانت اور خوب صورتی کے پر لگا کر اونچا، بہت اونچا اڑنا چاہتی ہے۔ وہ جلد سے جلد بہت کچھ سمیٹنا چاہتی ہے اور اپنی خواہشات کے سامنے ہر ضابطے قاعدے کو ہیچ سمجھتی ہے۔

راجر اور اس کے مسلح ساتھیوں کی حفاظت میں ہمارا سفر جاری تھا۔ یہ نہایت دشوار اور کٹھن سفر تھا۔ ائرکنڈیشنڈ جیپ سے باہر افریقہ کا سورج آگ برسا رہا تھا اور چرند پرند بےکان نظر آتے تھے۔ کافی دیر تک تکلیف سہنے کے بعد پروفیسر گہری نیند سو گیا تھا۔ اس نیند میں بےہوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ شائستہ مسلسل اپنے ڈیڈی کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ اسٹی ایک بار پھر جارحانہ موڈ میں تھا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ احتیاطاً باندھ دیے تھے، وہ پھر بھی گاہے گاہے ٹانگیں چلانے لگتا تھا۔ میں نے زریں سے کہا "اس چھوٹے فرنگی کی طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے۔ اسے ذرا لالہ مدھیر بن کر دکھاؤ۔" زریں اپنی جگہ منہ پھلائے بیٹھا رہا۔

"اوئے لکڑی کے بندر! کیا ہوا ہے تجھے؟" میں نے زریں کے پہلو میں ٹھوکا دیا۔

"بس استاد صیب' ام کو تنگ نہ کریں۔" وہ جھلا کر بولا۔

"میں جھانپڑ ماروں گا تیری گردن پر۔ کلثوم کے سامنے "بے عزتی خراب" ہو جائے گی۔ سیدھی طرح بتا کیا بات ہے؟"

وہ بولا "استاد صیب' ام آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہے کہ یہ الو کا پٹھی ام کو بالکل زہر کے مافق لگتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہی امارا خون جلنا شروع ہو جاتا ہے' اس کا اور امارا دشمنی اب اتنا بڑھ چکا ہے کہ اس کے برے منہ سے کوئی اچھا بات بھی نکل جاتا ہے تو وہ ام کو برا ہی لگتا ہے۔ اب آپ لوگ سائیں عالی کی طرف جا رہا ہے مگر اس کے کہنے پر جا رہا ہے اس لیے امارا دل بالکل جانے کو نہیں چاہتا۔"

"اوئے باگڑ بلے! تو یہ مت سمجھ کہ میں سروج کی بات مان کر سائیں کی طرف جا رہا ہوں' یہ تو ہم نے بس اس پر احسان ہی دھرا ہے' میرا اپنا ارادہ بھی سائیں عالی کی طرف جانے کا ہی تھا۔ اور وہاں جا کر اگر تیرا جی خوش نہ ہو تو میرا نام بدل دینا۔ وہاں ان کھنڈرات میں سائیں عالی وہی کچھ کر رہا ہے جس کے تم خواب دیکھا کرتے تھے۔"

"ام سمجھا نہیں؟" زریں نے پلکیں جھپکائیں۔

میں نے کہا "سائیں عالی وہاں فرنگیوں کی ایسی کی تیسی کر رہا ہے۔ ان کی دم میں نمدہ فٹ کر رکھا ہے اس نے۔ اس کے پاس بہت سی دولت آ گئی ہے' اس دولت کے زور پر وہ فرنگی عورتوں اور مردوں کو ٹھمّی کا ناچ نچا رہا ہے۔"

"یہ ٹھمّی کون ہے استاد صیب؟"

"تیری خالہ کی بڑی بیٹی ہے۔ اوئے پاگل خانے میں محاورہ بول رہا ہوں۔ کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ سائیں نے وہاں ڈالروں اور پاؤنڈوں کے زور پر بے شمار سفید فاموں کو ملازم رکھا ہوا ہے۔ وہ پیسے کے لالچ میں اس کے لیے ہر قسم کے کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ لانڈری کا کام کرتے ہیں اور جوتے تک پالش کرتے ہیں۔ خوب صورت انگریز اور امریکن لڑکیاں سائیں عالی کی خواہش پر غریب مسکین حبشیوں کو اپنا سرتاج مانتی ہیں اور ان کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ دیکھنے والا تماشا ہے اور تمہاری تو روح خوش ہو جائے گی۔"

زریں کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ کرید کرید کر مجھ سے اس بارے میں پوچھنے لگا۔ "گا ہے گا ہے" وہ صفدر کے تاثرات بھی دیکھ رہا تھا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ میں کہیں اس سے مذاق تو نہیں کر رہا ہوں۔

بوڑھا داماں ایک طرف گم صم بیٹھا تھا' اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور جیپ کے جھٹکوں کے ساتھ ساتھ اس کا سر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ شاید تصور ہی تصور میں وہ سائیں عالی کے حضور پہنچا ہوا تھا۔ سائیں عالی کے دیدار کی خاطر پچھلے چند ہفتوں میں اس نے ہمارے ساتھ ہی بے شمار صعوبتیں سہی تھیں اور دربدر ہوا تھا۔ وہ اپنے عقیدے کے حوالے سے بہت پختہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سائیں عالی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ وہ راستے میں کئی بار آزلری کے دیوتا "ژورے" سے تشبیہ دے چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مفلسی اور غلامی کے شکنجے میں کسے ہوئے اس خطے میں سائیں عالی کی شکل و شباہت میں دراصل "ژورے" نمودار ہوا ہے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے سائیں سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ ایک دو بار باتوں باتوں میں داماں نے یہ بھی کہا تھا کہ دشمنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے والے عظیم آزلری سردار یونات اور سائیں عالی میں کوئی گہرا ربط ہے۔ میں نے داماں سے اس ربط کے بارے میں پوچھا تھا مگر اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا۔

اسی دوران میں شائستہ نے رونا شروع کر دیا۔ اس سے اپنے زخمی والد کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ غزالہ نے حالانکہ پوری طرح تسلی دی تھی کہ پروفیسر اور موطل کو آنے والے زخم عام نیزوں کے ہیں۔ یعنی ان نیزوں کو زہریلی بان دغیرہ نہیں لگی ہوتی تھی' پھر بھی شائستہ کے اندیشے دور نہیں ہو رہے تھے اور وہ بار بار پروفیسر کی پیشانی چوم کر آنسو گرانے لگتی تھی۔ غزالہ نے شائستہ کو پروفیسر کے پاس سے اٹھا دیا اور جیپ کی اگلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھ کر تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگی۔ غزالہ کا وجود اس لحاظ سے ہم سب کے لیے غنیمت تھا کہ کسی بھی قسم کے طبی مسئلے میں اس پر ذمے داری ڈال کر ہم سب کا بوجھ ایک دم ہلکا ہو جاتا تھا۔ وہ اس مسئلے کو اپنی جی جان سے لگا لیتی تھی اور جو کچھ بھی اس سلسلے میں ہو سکتا تھا، کر گزرتی تھی۔

○☆○

ہم رات کے وقت ان نواحی کھنڈرات میں پہنچ گئے جہاں سائیں عالی نے ایک نئی بستی آباد کر رکھی تھی۔ نہایت ویران اور قحط زدہ علاقے میں پائی جانے والی یہ بستی صحیح معنوں میں جنگل میں منگل کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ جس طرح سائیں عالی خود عجیب و غریب تھا اسی طرح اس کا یہ کام بھی ناقابل فہم اور انوکھا تھا۔

سائیں عالی کی بستی کی روشنیاں ہمیں کافی دور ہی سے نظر آنے لگیں۔ یہ برقی روشنیاں تھیں اور ان بڑے بڑے جنریٹرز کی طاقت سے روشن ہوتی تھیں جو سائیں نے یہاں زمین دوز جگہوں پر نصب کر رکھے تھے۔ ابھی ہم بستی سے ایک میل دور ہی تھے کہ ہماری جیپ شاندار پختہ سڑک پر پہنچی۔ سڑک کی دونوں جانب اسٹریٹ لائٹس تھیں اور پھول بوٹے تھے۔ کھلی جگہ پر تعمیر وغیرہ کا کام ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ علاقے کے مفلس و نادار لوگوں کے لیے سائیں عالی کی ہدایت پر چھوٹے چھوٹے گھروں والی کالونیاں تعمیر ہو رہی ہیں۔ ایسی ایک کافی بڑی کالونی غالباً تکمیل کے مراحل میں تھی کیونکہ وہاں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

زریں بولا "ام کو تو لگ رہا ہے کہ ام کوئی سپنا وغیرہ دیکھ رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ واقعی سائیں صیب نے کیا ہے؟"

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ذرا آگے چلو۔" میں نے کہا۔

"اگر آپ کے کہنے کے مطابق سائیں صیب نے واقعی فرنگیوں کی دم میں نمدہ فٹ کر رکھا ہے تو پھر ام تو اس کے پاؤں کو بوسہ دے گا۔ اس نے وہ کام کیا ہے جس کا حسرت لے کر امارا کئی نسلیں اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔"

"لیکن ابھی تو تم سائیں کی چیتی چیلی سے لڑ رہے تھے؟"

زریں کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ گہری سانس لے کر بولا "ام سمجھتا ہے کہ اس الو کا پٹھی کا سائیں کے ساتھ وہی حیثیت ہے جو پھول کے ساتھ کانٹے کا ہوتا ہے۔ کاش یہ کانٹا ٹوٹ جائے۔ ام تو سمجھتا تھا کہ یہ بدبخت نفسیاتی اسپتال کے اندر سے ترقی فرما کر پاگل خانے پہنچ گیا ہو گا اور وہیں پر کہیں مر کھپ جائے گا لیکن یہ تو پھر مسرت شاہین کی طرح سج بن کر امارے روبرو آ گیا ہے۔"

پھر ایک دم زریں کی نگاہ ان اونچے ٹاورز پر پڑی جو یہاں نگران پوسٹ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ زریں کی آنکھیں کچھ اور بھی کھل گئیں۔ بولا "ام کو تو لگ رہا ہے کہ ام ویران صحرا میں سفر کرتے کرتے ایک دم یادگار چوک میں آ گیا ہے۔"

"کون سا یادگار چوک؟"

"لاہور کا جی اور کون سا؟ امارے ایک طرف مینار پاکستان کا روشنی ہے' دوسری طرف شاہی مسجد کا مینار ہے۔ یہ اتنا اونچا اونچا مینار سائیں صیب نے کس لیے بنوایا ہے؟"

سروج نے زریں کی بات سن لی اور جلدی سے بولی "سائیں جی نے یہ مینار اس لیے بنوائے ہیں کہ کوئی خطرناک

جنگلی جانور چوری چھپے بستی میں نہ گھس آئے لیکن جانور بھی بڑے نخرے ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح گھس ہی جاتے ہیں۔"

شکر کا مقام تھا کہ سروج کا طنز زریں گل کی سمجھ میں نہیں آیا ورنہ نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ زریں نے نگاہ غلط انداز سے سروج کو گھورا اور کلثوم کو اپنی تازہ معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔

رات کا وقت تھا پھر بھی کھنڈرات کی حالت دیکھ کر ہم انگشت بدنداں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائیں نے یہاں کا جغرافیہ بدل دیا تھا۔ اب یہ کھنڈرات ایک جدید بستی کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ایک ایسی بستی جس میں جدت کے ساتھ قدامت کی شان دار جھلک بھی ملتی تھی۔ ہمیں ایک دو ایسی جگہیں نظر آئیں جو اتنی رات گئے بھی روشن تھیں اور وہاں سفید فام اور سیاہ فام خواتین و حضرات آ جا رہے تھے۔ یہ ہوٹل اور ریسٹورنٹ قسم کی جگہیں تھیں۔ پارکنگ ایریا میں جیپیں اور گاڑیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ اندر سے میوزک کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک جگہ ہمیں چھوٹا سا پٹرول پمپ نظر آیا۔ ایک جگہ شاپنگ سینٹر قسم کی عمارت زیر تعمیر تھی۔ رات کے اس پہر بھی کئی مقامات پر برقی روشنیوں میں تعمیر کا کام جاری تھا۔ یہ کام کرنے والے زیادہ تر سفید فام ہی تھے۔ تعمیر کے لیے جدید سامان استعمال ہو رہا تھا۔ نئے ماڈل کے بلڈوزر، ٹرک اور کرینیں وغیرہ۔

سروج کی ہدایت پر ٹرسٹی ڈرائیور نے ریوڈیکل جیپ ایک پارکنگ لاٹ میں روک دی۔ یہ اسپتال تھا۔ پچھلی مرتبہ میں یہاں آیا تھا تو اسپتال میں رنگ و روغن ہو رہا تھا۔ آج یہ اسپتال باقاعدہ کام کر رہا تھا۔ اسپتال کے پارکنگ ایریا میں ایک دو بڑے ٹریلر بھی موجود تھے، یہ کشتی شفا خانے تھے۔ ایسے ہی ایک کشتی شفا خانے میں چھپ کر کچھ عرصہ پہلے ورا موگا سا بستی پہنچی تھی اور پھر ایک طوفانی رومانس کے نتیجے میں صفدر سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس موبائل کلینک کو دیکھ کر کئی بھولی باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

سروج کی ہدایت پر اسپتال کے چاق چوبند عملے نے پروفیسر کو فوراً اسپتال کے اندر پہنچایا، میرے کہنے پر موٹل بھی اپنے زخمی کندھے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اسپتال کے اندر ہمیں خوب صورت امریکن اور انگریز نرسیں نظر آئیں۔ ڈاکٹر حضرات میں کچھ سفید اور کچھ کالے تھے۔ ایک جگہ ہم نے اسپتال کے ایک سفید فام ملازم کو وارڈ کے فرش پر ٹاکی مارتے دیکھا اور دنگ رہ گئے۔ یقیناً یہ کوئی امریکن تھا۔

یہ منظر دیکھ کر زریں گل کی باچھیں کھل گئی تھیں، شاید تھوڑی ہی دیر میں اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

موٹل کو تو مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا، تاہم پروفیسر اللہ دتا کو داخل کر لیا گیا۔ شائستہ اور فرزانہ بھی پروفیسر کے ساتھ اسپتال میں ہی رہ گئیں۔ باقی ہم سب رات گزارنے کے لیے ایک شان دار اور آرام دہ عمارت میں پہنچ گئے۔ استی بدستور ہماری تحویل میں تھا اور جب تک وہ ہماری تحویل میں تھا، ہمیں ٹرسٹیوں کی طرف سے کسی سازش یا چالبازی کا زیادہ اندیشہ نہیں تھا۔ ہمیں بستی کے اندر چھوڑ کر ٹرسٹ کی جیپیں واپس چلی گئی تھیں۔ راجر مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے بتایا تھا کہ فی الحال ہم سب بہت تھکے ہوئے ہیں۔ بات بعد میں ہو گی۔

راجر نے ایک طاقت ور واکی ٹاکی مجھے فراہم کر دیا تھا۔ میں نے اس شرط کے ساتھ واکی ٹاکی لے لیا تھا کہ بار بار کال کر کے ہمیں ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو ہم واکی ٹاکی مستقل طور پر بند کر دیں گے یا کسی گٹر میں پھینک دیں گے۔

وہ رات ہم نے تقریباً سفر میں ہی گزار دی تھی۔ تین چار بجے کے لگ بھگ ہم سونے کے لیے لیٹے۔ زریں گل نے جاگنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ہم استی کی طرف سے بے پروائی نہیں برت سکتے تھے۔ میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی۔ ائیر کنڈیشنڈ عمارت میں احساس ہی نہیں ہوا کہ باہر آگ برسانے والا سورج کافی اوپر آ چکا ہے۔ زریں گل خوابیدہ استی کے سرہانے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میرے جاگنے کے بعد شاید وہ فوراً ہی سو جاتا لیکن جب اس نے ایک انگریز ملازمہ کو جھک جھک کر سلام کرتے دیکھا تو اس کی نیند رفو چکر ہو گئی۔ ملازمہ نے باتھ روم میں تولیے، صابن اور ٹوتھ پیسٹ سمیت ضرورت کی مختلف اشیا رکھیں پھر بڑے ادب سے جھک کر پوچھا "آپ ناشتے میں کیا لینا پسند فرمائیں گے؟"

زریں فوراً بولا "یہ کیا پوچھ رہی ہے استاد صیب؟"

میں نے کہا "یہ پوچھ رہی ہے کہ ہم ناشتے میں کیا لیں گے؟"

زریں نے کہا "اس سے کہیں کہ تنور میں روٹی پکا کر لائے بقلم خود۔۔۔ اور ساتھ میں دیسی انڈوں کا آملیٹ ہو جس میں ٹماٹر اور پیاز کاٹ کر ڈالا گیا ہو۔"

میں نے کہا "بھئی! ابھی تو آئے ہو۔ ذرا تحمل سے کام لو۔ سارے بدلے ناشتے میں ہی چکاو گے کیا؟"

وہ واپس جانے لگی تو زریں نے اسے اشارے سے روکا۔ وہ رک گئی۔ زریں نے اٹھ کر باتھ روم کا معائنہ کیا۔ غالباً وہ ملازمہ پر رعب جمانے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب بہانہ نہیں ملا تو اس نے ٹوتھ پیسٹ اٹھایا، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بیزاری سے ملازمہ کی طرف اچھال دیا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "یہ میڈ ان یو ایس اے ہے۔ اس میں یقیناً کسی حرام جانور کی چربی ڈالی گئی ہو گی۔ ام کو سارا پتا ہے۔ لاہور میں مولوی صیب نے ام کو بتایا تھا۔۔۔"

پھر اس نے ملازمہ کی طرف متوجہ ہو کر اشاروں کنایوں میں اسے سمجھایا کہ وہ یہ پیسٹ نہیں کرے گا۔ نہ ہی وہ یہ برش استعمال کرے گا کیونکہ یہ حرام ریشوں سے بنا ہے۔ اس نے ملازمہ کو بتایا کہ وہ اس کے لیے انگلی کے ساتھ دانتوں میں لگانے والا منجن لے کر آئے۔ ملازمہ کو سمجھانے کے لیے اس نے ہتھیلی پر خیالی منجن رکھ کر بار بار انگلی سے لگایا اور دانت صاف کیے۔

ملازمہ خوش اخلاقی سے اثبات میں سر ہلاتی رہی پھر باہر چلی گئی۔ خبر نہیں کہ اس کی سمجھ میں کیا آیا تھا، وہ ایک استرا لے آئی۔

زریں تو پہلے ہی اس قسم کی صورت حال کا متمنی تھا۔ اس نے ملازمہ کو خوب برا بھلا کہا اور روہانسا کر کے باہر بھیج دیا۔ میں نے کہا "بڑے کھوتے ہو تم؟ پیسٹ واپس کر دیا اب استرے سے دانت صاف کرو۔"

زریں بولا "کبھی کبھی تو امارا دل چاہتا ہے کہ ام پٹھان ہونے کے بجائے آدم خور قبائلی ہوتا۔ ام اپنے دانت صاف کرنے کے بجائے ان کو تیز کرتا اور ناشتے میں ایک آدھ نوجوان فرنگن کی کلیجی استعمال کر لیتا۔ دوپہر کے کھانے میں بھی کسی امریکی کی ران کا پلاؤ کھاتا، ساتھ میں کسی صحت مند انگریز کی چانپ کے تکے ہوتے۔ واہ کیا مزہ آتا!"

"ماشاء اللہ۔ کیا نیک خواہشات ہیں۔" میں نے تائید کی۔

ہماری شیو کئی دنوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ شیو کر کے اور نہا دھو کر ہم نے اپنے جسموں سے ہفتوں کا میل کچیل چھڑایا۔ وارڈ روب میں بہت سے لباس موجود تھے۔ زریں گل کے لیے شلوار قمیص اور پشاوری چپل کا اہتمام بھی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سائیں اور اس کے کارندوں کو ہماری آمد کا پہلے سے اندازہ تھا۔

ناشتا بھی بڑا دھانسو قسم کا تھا۔ ہم سب نے ڈائننگ ہال میں اکٹھے ہی ناشتا کیا۔ استی کھانے سے انکار کر رہا تھا۔ وہ بدبخت صبح صبح سگریٹ کا تقاضا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ باتھ روم میں جانے سے پہلے وہ سگریٹ ضرور پیتا ہے۔ زریں نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ وہ اسے سگریٹ نہیں دے گا چاہے وہ چھ ماہ بھی باتھ روم میں نہ جائے۔ آہستہ آہستہ استی کی یہ عادت بدل گئی تھی مگر کسی کسی دن اسے اب بھی سگریٹ کا دورہ پڑتا تھا۔ اتنی سی عمر میں اس کی یہ عادتیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔

زریں نے ناشتا بڑے مزے سے اور پیٹ بھر کر کیا۔ ناشتے کے بعد وہ ایک شان دار ڈکار لینے کی تیاری کر رہا تھا جب چست پتلون قمیص میں ملبوس سروج لہراتی ہوئی اندر آ گئی۔ زریں کی ڈکار اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ کلثوم نے مخصوص انداز میں پوچھا "زریں جی! یہ لڑکی کون؟"

زریں نے جل کر کہا "یہ لڑکی نہیں ایک چلتا پھرتا بددعا ہے۔ یہ کسی وقت کسی کو بھی لگ سکتا ہے۔ اس سے پناہ مانگو۔"

سروج نے ہمیں بتایا کہ سائیں عالی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ پروفیسر کی حالت اب بہتر ہے اور فرزانہ تھوڑی دیر میں یہاں آ رہی ہے۔

ہم سروج کے ساتھ کھنڈر کے اس سجے سجائے حصے میں پہنچے جہاں معمولی پراسرار قسم کا سامان سائیں عالی فروکش تھا۔ وہ ایک قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ایک سفید فام شخص اس کے پاؤں کی میلی کچیلی انگلیوں کے ناخن نکال رہا تھا۔ دوسرا سفید فام اس کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ سرور کے عالم میں سائیں کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے گلے میں ڈالروں اور پاؤنڈوں کی گڈیاں ہار کی شکل میں جھول رہی تھیں اور جس قالین پر وہ بیٹھا تھا اس پر بھی ڈالر وغیرہ ہی بچھے ہوئے تھے۔

"آ گئے ہو سیر سپاٹا کر کے۔" سائیں نے آنکھیں بند کیے ہوئے پوچھا۔

"تم اسے سیر سپاٹا کہتے ہو؟ ہم موت کے منہ سے بچ کر آئے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بچ کر نہیں آئے ہو، بچا کر لائے گئے ہو۔" سائیں نے جھوم کر کہا "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ جوڈم سروار سے ہونے والے مقابلے میں تم اصولی طور پر ہار گئے تھے کیونکہ تمہیں پہلا زخم لگ گیا تھا۔ اگر "پانچ سانس کے زہر" نے تم پر اثر نہیں کیا تو اس میں تمہاری کوئی خوبی نہیں۔ یہ میری

خوبی ہے کیونکہ جنات نے تمہیں زہر کے اثر سے آزاد کیا ہے۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

"میرا نہیں میرے جنات کا شکریہ ادا کرو کیونکہ تمہارے لیے یہ نایاب تریاق میرے موکل ہی لے کر آئے تھے۔ راستے میں بے چاروں کو حادثہ پیش آیا اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنات کو حادثہ پیش آنا کوئی معمولی چیز نہیں۔ وہ ہوا میں ہوتے ہیں۔ جو ٹکر کھا کر لڑکھڑاتا ہے' ہزاروں فٹ کی بلندی سے سر کے بل گرتا ہے۔"

"تمہاری باتیں سن کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو تجھ سے کہتا ہوں کہ کانجی میں چھوٹی مکھی کا شہد ملا کر پیا کر' یہ دماغ کی مضبوطی کے لیے اکسیر ہوتا ہے۔"

"تم نے ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کب بلایا ہے؟"

"سورج نے بتایا ہے کہ وہ ہمیں لینے کے لیے ہی بروزم بستی میں پہنچی تھی۔"

"ہاں ہاں' یاد آیا۔ میں تم لوگوں سے کوئی کام لینا چاہ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا کام تھا' اب یاد نہیں آ رہا' کل سویرے ناشتے سے پہلے سر نیچے ٹانگیں اوپر کروں گا تو مجھ یاد آ نے گا۔ دراصل چھوٹی مکھی کا شہد تو اس علاقے میں کافی مل جاتا ہے لیکن اصلی کانجی نہیں ملتی' یہی وجہ ہے کہ میرا دماغ بھی کچھ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ویسے تمہارا سر بھی تو بانڈی جتنا ہے' تم اپنے دماغ پر زور ڈالو اور اندازہ لگاؤ کہ میں تمہیں کس کام کے لیے طلب کر سکتا ہوں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' ہزاروں قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں تمہارے ذہن میں آ سکتی ہیں۔ تم ہمیں جنات کے بے سروپا قصے سنا سکتے ہو' ہمیں اپنے سر سے جوئیں نکالنے کا حکم دے سکتے ہو' اور کچھ نہیں تو جوش میں آ کر ہمیں گالیاں دے سکتے ہو۔ بہرحال پریشانی کی بات نہیں' تم آرام سے سوچو' ہماری قسمت میں جو بھی مصیبت لکھی ہوئی وہ آ کر ہی رہے گی۔"

میرے سر کے بالوں کے علاوہ صفدر اور زریں کے بال بھی کافی بڑھ چکے تھے۔ سائیں نے اپنے قریب رکھا ہوا فون اٹھایا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اس نے اپنے کسی کارندے کو حکم دیا تھا کہ نائی کو بھیجو۔

فون رکھنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ابھی جو نائی تمہارے بال کاٹنے گا وہ کوئی معمولی حجام نہیں ہے' اس کے شاگرد پورے یورپ میں پھیلے ہوئے ہیں' اس کے علاوہ امریکا میں بھی اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور فلم اسٹار ریلی سوالا زعرف کو جک کی ننڈ ہر دو سرے دن کیا کرتا تھا اور مہینے میں صرف اس ایک ننڈ سے تیس ہزار ڈالر سستے وقتوں میں کماتا تھا۔ آج یہ استادوں کا استاد خود چل کر تمہارے پاس آئے گا اور تمہارے بال کاٹے گا۔"

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی اور سائیں عالی چونکا اٹھا کر دھیمے لہجے میں کسی سے بات کرنے لگا۔ سورج نے میرے کان میں سرگوشی کی "سائیں جی کی بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ یہ واقعی پیلے نورنیا کا ایک بڑا ماہر حجام ہے۔ اس کے علاوہ یہ بندہ جو سائیں جی کے سر کی مالش کر رہا ہے' ایک نریو تھراپسٹ ہے۔"

"لگتا ہے کہ سائیں دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے۔"

"لیکن جتنی لٹا رہے ہیں اس سے زیادہ آ رہی ہے۔"

بوڑھا داماں بھی ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ وہ سائیں عالی کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر یہ بات اسے ابھی تک معلوم نہیں تھی کہ یہی سائیں عالی ہے' وہ اب تک سائیں عالی کو سائیں عالی کا خاص مرید ہی سمجھ رہا تھا۔

جب ایک دو مقامی افراد نے سائیں کے پاؤں چھوئے اور اسے بے پناہ عقیدت سے سائیں عالی کہہ کر مخاطب کیا تو داماں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ کبھی بے پناہ حیرت سے سائیں کو دیکھتا تھا اور کبھی مجھے۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا' مجھ سے مخاطب ہو کر لرزتی آواز میں بولا۔

"کیا واقعی ۔۔۔ یہی سائیں صاحب ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

داماں کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا "آپ نے ۔۔۔۔ اتنا عرصہ مجھ سے چھپائے رکھا۔ آپ نے کیوں کیا ایسے؟"

"وہ ایک مجبوری تھی' اس کے لیے ہم تم سے معافی چاہتے ہیں۔"

داماں کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اچانک اسے نجانے کیا ہوا' وہ دیگر لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ عجیب جنونی سا انداز تھا۔ اس نے سائیں کے عین سامنے پہنچ کر کچھ مذہبی کلمات ادا کیے' ان کلمات میں بس ڈورے (آزادی کا دیوتا) کا لفظ ہی ہماری سمجھ میں آیا' پھر داماں کا جسم لکڑی کی طرح اکڑ گیا' اسی طرح اکڑے اکڑے وہ اوندھے منہ سائیں عالی کے عین سامنے پختہ فرش

پر گرا۔ اس کے ہاتھوں نے اسے سہارا دیا تھا پھر بھی گرنے سے اس کی پیشانی پر چوٹ آئی اور خون بہہ نکلا۔ داماں فرط عقیدت سے اپنا سر سائیں عالی کے پاؤں پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی زخمی پیشانی کا لہو سائیں کے پاؤں پر ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ داماں کی دیکھا دیکھی' چند اور مقامی افراد بھی اوندھے منہ فرش پر گر گئے اور مناجات وغیرہ پڑھنے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کے سامنے میلا کچیلا سائیں نہیں' واقعی کوئی دیوتا بیٹھا ہے۔

اتنے میں چند لارسی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے پہلے دستور کے مطابق سائیں کو تعظیم پیش کی' پھر آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ ایک بوب دوشیزہ بھی تھی۔ یہ دوشیزہ مادر زاد برہنہ تھی۔ اس کے گلے میں ایک زنجیر تھی جسے ایک عمر رسیدہ لارسی نے تھام رکھا تھا۔ لڑکی کو کسی گائے بھینس کی طرح باقاعدہ ہانک کر لایا جا رہا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر کسی طرح کا تاثر نہیں تھا' وہ خوب صورت اور پرکشش ہونے کے باوجود ایک حیوان ہی نظر آ رہی تھی۔ بس خالی خالی نظروں سے آس پاس دیکھتی تھی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز کھائے لگتی تھی۔

اچانک دو تین عورتیں بھی اندر داخل ہوئیں' ان تومند لارسی عورتوں نے برہنہ بوب لڑکی کو دبوچ کر فرش پر پٹخ دیا اور ہر طرف سے جکڑ لیا۔ وہ کسی جانور ہی کی طرح چیخنے چلانے لگی۔ میری نگاہوں میں کچھ عرصے پہلے کا وہ منظر تازہ ہو گیا جب میں نے ایسی ہی دو سفید فام لڑکیوں کو جھیل زادی کی قربان گاہ پر ذبح ہوتے دیکھا تھا۔

میں نے لپک کر آگے بڑھنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی سائیں عالی اپنا عصا فرش پر ٹھونک کر زور سے چیخا "رک جاؤ۔"

لارسی جہاں کے تہاں رک گئے۔ سائیں نے اشارے سے کہا کہ لڑکی کو چھوڑ دو۔ سائیں کا کہا حکم تھا۔ ایک ایسا حکم جس سے سرتابی کا کوئی لارسی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

جونہی لڑکی کو چھوڑا گیا' وہ بدکے ہوئے جانور کی طرح چیختے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی۔ لارسی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے۔ سائیں نے پکار کر کہا "شفیع محمد! اسے پکڑو۔"

میں نے لپک کر فرش پر گھسٹتی ہوئی وہ زنجیر پکڑ لی جس کا دوسرا سرا لڑکی کے گلے میں تھا۔ جھٹکا لگنے سے وہ فرش پر پھسل کر گر گئی۔ میں نے اسے اٹھنے میں مدد دی' وہ بالکل کسی جانور ہی کی طرح اپنے پنجوں سے مجھ پر حملہ آور ہوئی' زریں اور مول نے آگے بڑھ کر میری مدد کی اور لڑکی کو دبوچ لیا۔

سائیں نے حکم دیا کہ لڑکی کے برہنہ جسم کو ڈھک دیا جائے۔

دو لارسی دوڑ کر گئے اور ایک بڑی چادر لے آئے۔ میں نے یہ چادر لڑکی کے گرد لپیٹی اور دو تین گرہیں لگا کر اس کا جسم ڈھک دیا۔ سائیں نے بہ آواز بلند کہا "نوجوان لڑکیوں کو یوں قتل کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ عمر اس لڑکی کے مرنے کی نہیں بلکہ اس کی شادی کی ہے۔ اس کا گھر آباد کرنے کی ہے۔"

ایک مترجم سائیں عالی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے سائیں کی بات کا ترجمہ کیا۔ موقع پر موجود تمام لارسیوں کے سر جھک گئے۔ سائیں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کی شادی ہو۔ کون اس سے شادی کرے گا؟"

لارسی دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے سیاہ چہروں سے شدید تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ نوجوان اپنے بزرگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سائیں نے اپنے قریب بیٹھے ایک نوجوان حبشی سے پوچھا "تم اس لڑکی سے شادی کرو گے؟"

نوجوان کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں قریب بیٹھے ایک بزرگ سے بات کی پھر مترجم کے ذریعے بولا "اگر سائیں جی کا حکم ہے تو میری مجال نہیں کہ میں انکار کر سکوں۔"

اس کے لب و لہجے سے یہ بات عیاں تھی کہ مذہبی طور پر وہ لوگ ایسی شادی کو مناسب خیال نہیں کرتے مگر یہ بات چونکہ سائیں کی زبان سے نکلی تھی لہٰذا انہیں دل و جان سے قبول تھی۔ سائیں نے اپنے گلے میں موجود ڈالروں میں سے ایک گڈی کھینچ کر نوجوان کی طرف اچھال دی اور حاتم طائی کے انداز میں بولا "جاؤ بچے۔۔۔ اس چھوکری سے شادی بناؤ' کھاؤ پیو اور عیش کرو۔"

یوں لگتا تھا کہ سائیں عالی پر مقامی لوگوں کی شادیاں کرانے کا بھوت سوار ہے۔ شاید وہ جلد سے جلد نوزائیدہ بچوں کی چہکاریں سننا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں سفید فام ہیئر ڈریسر اپنے ساز و سامان کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا اور ہم اپنے بال ترشوانے کے لیے کمرے میں آ گئے۔

ہماری رہائش گاہ نہایت شان دار تھی۔ ایک طرف کی کھڑکیوں سے سوئمنگ پول کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہاں خوب رو سفید فام لڑکیاں اپنے حبشی شوہروں اور دوستوں کے ساتھ چہلیں کرتی دیکھی جا سکتی تھیں۔ کوئی پیراکی کے لباس میں اوندھی سیدھی لیٹی ہے اور دھوپ سینک رہی ہے' کوئی میوزک لگا کر اپنے پارٹنر کے ساتھ تھرک رہی ہے۔ ہر

طرف رنگینی نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ پیسے کے ساتھ کیا کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے جن لوگوں کا دین ایمان ہی دولت ہو انہیں دولت کے زور سے کس کس طرح نچایا جا سکتا ہے۔ اب یہاں پر خوب صورت لڑکیاں غریب صورت لارسیوں کے ساتھ نظر آ رہی تھیں' وہ کوئی معمولی لڑکیاں نہیں تھیں۔ نیویارک' لندن اور فرانس جیسے شہروں کی رہنے والی "اعلیٰ ترین مخلوق" تھیں یہ۔ مگر دولت کی طاقت نے انہیں نہ صرف اس ویران صحرا میں پہنچایا تھا بلکہ صحرا نشینوں کے ساتھ سونے اور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ یہاں سب کچھ نرسٹ کے برعکس ہو رہا ہے۔ نرسٹ میں سفید فام آقاؤں کے ہاتھ میں سیاہ فام اور گندمی رنگت والے غلاموں کنیزوں کی رسی تھی جبکہ یہاں سیاہ فام' سفید چمڑی والوں پر غلبہ رکھتے تھے اور ان سے مختلف خدمات لے رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ نرسٹ میں سب کچھ ظلم و جبر کی مدد سے کیا جا رہا تھا جبکہ یہاں ساسیں کی کالونی میں باہمی رضامندی سے اصول ضابطے طے کیے گئے تھے۔ جو سفید فام مرد و زن یہاں موجود تھے اپنی خواہش اور چاہت سے موجود تھے اور یہ چاہت دراصل دولت کی چاہت تھی۔ میں نے صفدر سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بولا "شاہ جہان صاحب! غلامی تو شاید دونوں طرف ہی ہے۔ ایک طرف "کی بوکو" کی غلامی ہے اور دوسری طرف دولت کی۔"

صفدر کی بات میں کافی وزن تھا۔ صفدر کی عمومی حالت پہلے سے کچھ بہتر نظر آتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں جلتا ہوا دریا کا غم روز اول کی طرح روشن تھا۔ ہم سب نے شیو وغیرہ کروالی تھی مگر صفدر کی شیو ابھی تک بڑھی ہوئی تھی اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ یہ چھوٹی چھوٹی ملائم داڑھی اس کے کتابی چہرے پر بھلی لگتی تھی۔ وہ پہروں گم صم لیٹا چھت کو گھورتا رہتا تھا اور پنکھے کی ہوا میں اس کے بالوں کی آوارہ لٹیں پیشانی پر جھولتی رہتی تھیں۔

پروفیسر کی حالت ابھی تک زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے زخم میں انفیکشن تھا اور گاہے گاہے غنودگی سی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس ویران صحرا میں ہونے کے باوجود بہترین طبی سہولتوں سے مستفید ہو رہا تھا۔ وی آنا کا ایک قابل سرجن ڈاکٹر اسمتھ اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور یہ وہ ڈاکٹر تھا جس سے معائنہ کروانے کے لیے امیر کبیر لوگوں کو بھی ہفتوں انتظار کرنا پڑتا ہو گا۔ اس خستہ حال ویرانے میں ڈاکٹر اسمتھ صحرا کے جھونپڑی نشینوں کے لیے بھی ہر وقت دستیاب تھا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

میں صبح سو کر اٹھا تو صفدر بدستور سو رہا تھا۔ اس کا خوابیدہ چہرہ دیکھ کر ہی میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ رات دیر تک کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ہے۔ اسی دوران میں زریں آ گیا۔ اس کی گول گول آنکھیں حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ چھوٹتے ہی بولا "استاد حبیب! آپ کو پتا ہے کہ لارسی لڑکی موتابہ کی لاش کہاں ہے؟"

"ہاں۔ کل سورج نے بتایا تھا کہ اس کی لاش پر جو مسالا لگایا گیا ہے' وہ اسے ابھی ایک دو دن مزید خراب نہیں ہونے دے گا۔ موگاسا سے موتابہ کے کچھ عزیز یہاں پہنچ جائیں گے تو پھر اس کی آخری رسم ادا کی جائے گی۔"

"یہ تو پرانا اطلاع ہے جناب! نیا اطلاع یہ ہے کہ مقامی لارسیوں نے موتابہ کی لاش پر کچھ اور مسالا وغیرہ لگایا ہے اور اسے ایک صندوق میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔ خو ان کا خیال ہی کہ وہ مرا نہیں ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ غزالہ نے خود اسے چیک کیا تھا۔"

"اماری چیکنگ کو یہ لوگ نہیں مانتا ہے جناب۔ یہ کہتا ہے کہ وہ سب مل کر اپنے دیوتا کی عبادت فرمائے گا اور ان عبادت کی برکت سے لڑکی زندہ ہو جائے گا۔"

"اس قسم کی خرافات یہ لوگ بولتے ہی رہتے ہیں۔ ان بے چاروں کی عقل سمجھ ہی اتنی ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ موگاسا کی لڑائی کے وقت انہوں نے دیوتاؤں سے کیسی کیسی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ کہتے تھے کہ حملے کے وقت پتھروں کی بارش ہو گی اور درختوں سے بچھو گریں گے۔"

"وہ تو ام بھی مانتا ہے جناب کہ یہ لوگ بڑا سیدھا سادہ ہے لیکن ان کا کچھ باتیں عجیب و غریب بھی تو ہوتا ہے۔ اب اسی جادوگر لڑکی موتابہ کی بات لے لیں' آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ زمین میں بہت دیر دفن رہنے کے بعد زندہ سلامت نکل آیا تھا اور پھر جوذام بستی کا منظر تو خود آپ نے بھی ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس لڑکی کے جنتر منتر سے جنگل کے بھیڑیے بستی میں آ دھمکے تھے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ لڑکی زندہ ہو جائے گی؟"

"یہ تو ام نہیں کہتا جناب لیکن ان لارسیوں میں کوئی ایسا بات ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتا۔ اب آپ اسی موبل کو لے لیں۔ اس کے بارے میں ام کو دو تین عجیب باتوں کا پتا چلا ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ اس کے سونگھنے' دیکھنے اور سننے وغیرہ کا حس بہت تیز ہے۔ اتنا تیز کہ وہ بلی کے مانند میلوں دور سے بھی کسی چیز کی بو سونگھ سکتا ہے۔"

"ہاں' اس کا تھوڑا بہت علم تو مجھے بھی ہے۔ موگاسا کی لڑائی کے فوراً بعد جب غار میں ہم پر جنگلی کتوں نے حملہ کیا تھا تو موبل کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے اور اس نے بڑی دور سے ان کی آمد محسوس کر لی تھی۔"

"اس کا دوسرا تمام حس بھی اسی طرح تندو تیز ہے جناب لیکن اس ساری تیزی کا کسر اس کی پانچویں حس پر نکل گیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"دیکھیں جناب' ام زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن کچھ باتیں تو ام کو بھی معلوم ہے' خدا اتنے عرصے سے آپ کا شاگرد رہتا ہے۔ امارے اندر پانچ حسیں ہوتا ہے۔ دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا اور چھونا۔ اس موبل کا چار حسیں تو بے تحاشا تیز ہے۔ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا اور چکھنا۔ لیکن پانچواں حس بالکل نہیں ہے۔ یعنی چھونے اور درد محسوس کرنے کا حس۔ اس شخص کو بہت کم درد ہوتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ بہت زیادہ درد کا کمال ہے اس کا۔ آپ نے پرسوں رات جوذام بستی میں دیکھا ہی ہو گا۔ اس کے کندھے پر نیزہ لگا تھا اور خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا مگر یہ بڑے آرام سے کھڑا تھا۔"

زریں گل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ منظر میں نے بھی دیکھا تھا۔ خود مجھے بھی محسوس ہوتا تھا کہ موبل میں کچھ غیر معمولی چیزیں موجود ہیں۔

زریں گل بولا "موبل کے بارے میں شاید آپ کو ایک اور خاص بات کا پتا نہ ہو۔ یہ بندہ چھ ان پڑھ ہے مگر اسے آٹھ دس افریقی زبانیں آتا ہے' اس کے علاوہ یہ کوئی بھی زبان اتنی تیزی سے سیکھتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتا ہے۔ بالکل دنگ رہ جاتا ہے۔"

غالباً زریں کی یہ بات بھی درست تھی۔ موبل کو ہمارے ساتھ رہتے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر وہ اردو کے کئی الفاظ ٹوٹے پھوٹے تلفظ میں ادا کرنے لگا تھا۔

میں نے کہا "پھر تو بہتر ہے کہ تم اسے پشتو سکھا دو۔ تمہیں اور کلثوم کو پشتو مارنے کے لیے ایک رضا کار مل جائے گا۔"

"وہ ضرور پشتو بھی بولے گا جناب۔ اردو کا اکا دکا لفظ تو وہ بولنے ہی لگا ہے' کل ام کو اردو میں ہی کہہ رہا تھا کہ ام کو اردو بتاؤ۔"

"لیکن خدا کے لیے تم اسے اردو مت بتانا۔ ورنہ وہ بھی تمہاری ہی طرح لفظوں کی ٹانگیں توڑے گا۔ ام کو چائے اچھا لگتا ہے' امارا بھائی پشاور کو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

زریں نے آنکھیں نکالیں "آپ کا مطلب ہے ام غلط اردو بولتا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں' دراصل تمہارے منہ میں جا کر اردو خود غلط ہو جاتی ہے۔ خو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ام نے اور بات کہا تھا' تم امارا بات کو اور طرف لے گیا ہے۔" میں نے زریں کے انداز میں بات کی تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

اسی دوران میں موبل بھی وہاں آ گیا۔ اس نے ابھی تک ایک پتلون نما پاجامہ پہن رکھا تھا۔ یہ پاجامہ اس نے پنڈلیوں تک اڑس رکھا تھا' یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی کوئی ندی پار کر کے آیا ہے۔ اس کا بالائی جسم عریاں تھا۔ پسینے میں چمکتا ہوا یہ کسرتی جسم دیکھنے والے کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ موبل کے کندھے پر سفید پٹیوں سے چپکی ہوئی تھی اور یہ اسی زخم کی نشانی تھی جو اسے جوذام بستی میں لگا تھا۔ وہ بے تکلفی سے مسکراتا ہوا اندر آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ اردو میں "السلام علیکم" کہنے کے بعد اس نے مقامی زبان بولنا شروع کر دی۔ بوڑھا داماں بھی آ گیا تھا لہٰذا وہ ترجمہ کرنے لگا۔ اس نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "موبل نے ابھی بازار میں ایک لڑکی دیکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ خیامی لڑکی ہے۔ خیامیوں کے بارے میں آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ یہ بڑے خطرناک جنگلی ہوتے ہیں۔ انسانوں کا گوشت وغیرہ کھا جاتے ہیں۔"

"ہاں میں اس بارے میں سب کچھ جانتا ہوں بلکہ ایک بہت بڑے آدم خور (مائیکل) سے دست بدست جنگ بھی کر چکا ہوں۔"

موبل نے داماں کی وساطت سے کہا "یہ لڑکی میری معشوق رہ چکی ہے جناب اس لیے میں نے اسے لوگوں کی بھیڑ میں فوراً پہچان لیا۔"

"یار کتنی لڑکیاں تمہاری معشوق رہ چکی ہیں؟ پانچ چھ کے نام تو تم اب تک گنوا چکے ہو۔"

"کافی زیادہ ہیں جناب۔" موبل نے بتیسی نکال کر انکسار سے کہا "صحیح تعداد کا تو مجھے خود بھی پتا نہیں ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ بڑا مثالی کردار ہے۔ بہرحال' اس خیامی لڑکی کے حوالے سے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جناب لڑکی کے ساتھ تین چار نیامی مرد بھی تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے ڈھانوں میں چھپانے کی کوشش کی تھی مگر موگل کی نظر سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تو ایک کوس دور سے خرگوش کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس نسل کا ہے۔ نیامیوں کی تو شکل و صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ چیخ چیخ کر اپنی نسل کا اعلان کردیتی ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا' ان کے جبڑے خاصے چوڑے ہوتے ہیں اور ناک درمیان سے بالکل پچکی ہوتی ہے۔ وہ لڑکی اور مرد دو لارسی بزرگوں کے ساتھ ٹیلوں کی طرف گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب کسی چکر میں تھے۔"

"یہ بات تم کیوں کر کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل میری نگاہ لڑکی پر پڑ گئی تھی' اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک دم گھبرا گئی اور اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر کر ایک مرد کی اوٹ لے لی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب میرا شبہ ہی ہو' مگر شبہ ٹھیک بھی تو ہو سکتا ہے۔"

کچھ دیر بعد میں اور زریں گل اپنے ساتھ موگل کو لے کر ٹیلوں کی طرف جا رہے تھے۔ داماں بھی ہمارے ساتھ تھا۔ کھنڈرات کے اردگرد میلوں دور تک سارا علاقہ صحرائی تھا مگر جنوب کی طرف کچھ ٹیلے وغیرہ موجود تھے اور ان ٹیلوں پر جھاڑیاں بھی تھیں۔ ہم ان جھاڑیوں میں پہنچے اور عقابی نگاہ والے موگل کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔ اچانک ہمیں دو خوف زدہ لارسیوں کے چہرے نظر آئے۔ یہ چہرے ہمیں دیکھنے کے بعد ایک دم جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے۔

ہم دوڑتے ہوئے ان تنگ دھڑنگ لارسیوں کے پیچھے گئے۔ جلد ہی ہم جھاڑیوں کے عین درمیان ایک قدرے کشادہ جگہ پر پہنچے' یہاں ایک ہولناک دینے والا منظر نظر آیا۔ بالکل یہی لگا جیسے کسی گائے وغیرہ کو ذبح کیا گیا ہے اور اس کی کھال اتارنے کی تیاری ہو رہی ہے لیکن ذبح ہونے والی چیز گائے نہیں تھی' ایک عورت تھی۔ وہ ایک خوب صورت بوب دوشیزہ تھی۔ وہ حسرت ناک انداز میں مادر زاد برہنہ پڑی تھی۔ اس کی شہ رگ سے بہنے والا خون ایک چھوٹے سے مٹی کے گڑھے میں جمع ہو چکا تھا۔ لڑکی کے ریشمی بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور آنکھیں تارا ہو چکی تھیں۔ جس تیز دھار چھری سے اس بدنصیب کو ذبح کیا گیا تھا وہ اس کے شفاف بے داغ سینے پر دھری تھی اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ یہ منظر دل کو خون کے آنسو رلا دینے والا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی چار پانچ لارسی تو بھاگ گئے۔ تاہم ایک دو بزرگ خوف زدہ انداز میں وہاں کھڑے رہے۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے داماں کے ذریعے ایک بزرگ لارسی سے پوچھا۔

وہ کانپتے ہوئے بولا "ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے سائیں جی کی مرضی کے بغیر یہ سب کچھ کیا ہے مگر یہ ضروری تھا۔ یہ سائیں جی کی صحت اور سلامتی کے لیے بھی ضروری تھا۔ اگر ہم نہ کرتے تو دیوتاؤں کی ناراضگی کا خطرہ مول لیتے۔"

"احمق ہو تم لوگ!" میں نے غصے میں تپ کر کہا "دنیا کا کوئی دیوی دیوتا ایسا نہیں جو انسانی جان پر ظلم ڈھانے سے خوش ہوتا ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔"

"ہم مجبور تھے حضور۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں ہم نے اس لڑکی کو تو کچھ نہیں کہا جس کی جاں بخشی کل سائیں جی نے کی تھی' یہ دوسری لڑکی ہے جناب....."

"مگر لڑکی تو ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"ہم نے سائیں جی کے لیے منت مانی تھی جناب۔ یہ منت پوری کرنا ہمارے لیے ضروری تھی۔ آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ آپ سائیں جی کو ہماری اس خطا کے بارے میں کچھ نہ بتائیں۔"

"بتانا ضروری ہے' اور اگر ہم نہ بھی بتائیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا۔ تم کیا سمجھتے ہو سائیں جی بھی ہماری تمہاری طرح ہی دیکھتے ہیں۔" داماں نے غصے سے لرزتے ہوئے کہا۔ اس کی بے پناہ عقیدت اس کی آنکھوں سے چھلکتی نظر آتی تھی۔

وہ دونوں بزرگ جو اس بہیمانہ قربانی کے اصل ذمے داروں میں سے تھے' منت سماجت کرنے لگے۔ تاہم اسی دوران میں سائیں کے رائفل بردار ذاتی محافظوں میں سے بھی کئی افراد موقع پر پہنچ گئے۔ یہ سب کے سب نہایت تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ ابھی تک میری ان لوگوں سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی واسطہ پڑا تھا' تاہم ان کی شکلیں گواہ تھیں کہ یہ خطرناک ترین لوگ ہیں۔

ان کمانڈوز کے ذریعے جلد ہی یہ خبر سائیں عالی تک بھی پہنچ گئی۔ قربانی پیش کرنے والے لارسی افراد کو سائیں کے کمانڈوز نے تحویل میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کو ٹیلوں سے واپس کالونی میں لایا گیا۔ بوب لڑکی کی لاش کو ایک بڑے پلاسٹک بیگ میں بند کر دیا گیا۔ اس رنگین بیگ نے بدقسمت مقتولہ کی ستر پوشی بھی کردی۔ ان پانچ نیامیوں کو باقاعدہ گرفتار کرلیا گیا جو بھینٹ چڑھنے والی لڑکی کا گوشت حاصل کرنے یہاں پہنچے تھے۔ ان آدم خور نیامیوں کا تعلق موگاما کے قریب واقع ایک صحرائی بستی سے تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کالونی میں سائیں عالی کی قیام گاہ کے باہر مجمع لگ گیا۔ لوگوں کی ٹولیاں مسلسل اس کشادہ جگہ پر جمع ہو رہی تھیں۔ ان میں غالب اکثریت تو سیاہ فام لارسیوں کی تھی تاہم سائیں عالی کے لیے مختلف خدمات انجام دینے والے بے شمار سفید فام بھی یہاں جمع ہو گئے تھے۔ خبر یہی تھی کہ سائیں عالی پکڑے جانے والے افراد کے لیے کسی سخت سزا کا اعلان کرے گا۔ کچھ دیر بعد سائیں اپنے حجرے سے نکل کر لوگوں کے سامنے جلوہ افروز ہوا۔ عجیب ہیئت کذائی تھی اس کی۔ سر پر ٹوٹوں کا تاج' گلے میں ٹوٹوں کی گذباں۔ دو خدمت گار جو غالباً انگریز تھے' بطخ ٹوٹوں کے بنے ہوئے پنکھوں سے درباری انداز میں ہوا دے رہے تھے۔ اس کے عقب میں آفت جاں سروج تھی' وہ حسب معمول چست شرٹ میں تھی اور کسی کنیز کی طرح سائیں کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔ سائیں کے نمودار ہوتے ہی سینکڑوں لارسیوں اور دیگر سیاہ فاموں نے رکوع کے انداز میں جھک کر اسے تعظیم پیش کی اور اپنے ہاتھ ناف پر باندھ لیے۔ سائیں عالی نے ایک نظر قطار میں کھڑے ملزمان پر ڈالی' پھر مترجم کے ذریعے کہنا شروع کیا۔

"ہم سب سردار بوعات اور سردار بوکارلو کی طرح آزادی کے پرستار ہیں۔ ہماری جنگ ہر اس شخص سے ہے جو اپنے جیسے انسان کو آزاد نہیں سمجھتا اور اسے محکوم بنانا چاہتا ہے۔ اگر ہم واقعی آزادی کے پرستار ہیں تو پھر ہمیں اپنے عمل سے یہ بات ثابت بھی کرنا ہوگی۔ ورنہ ہمارے خیال اور سوچ بالکل بیکار ہیں۔ افسوس کہ میں آپ لوگوں میں کچھ ایسی چیزیں دیکھ رہا ہوں جو ہرگز نہیں ہونی چاہئیں۔ ان میں سے ایک چیز جانوروں کی طرح پالی ہوئی لڑکیوں کی بھینٹ ہے۔ یہ بھینٹ کبھی ان لڑکیوں کو قتل کرکے چڑھائی جاتی ہے' کبھی ان کی عصمت دری کرکے اور کبھی کسی اور طریقے سے۔ یہ اپنے جیسے انسان پر ایک ایسا ظلم ہے جس کے لیے کوئی عذر تراشا نہیں جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیوتاؤں کی تعلیم بھی نہیں ہے۔ ماضی کے لوگوں نے اپنی مرضی کے مطابق دیوتاؤں کی باتوں کو بگاڑا ہے اور یہ باتیں بگڑتے بگڑتے اس حال میں آپ لوگوں تک پہنچی ہیں۔"

سائیں کے لب و لہجے نے مجھے حیران کر دیا۔ بر وقت اوٹ پٹانگ بولنے والا بڑے سنجیدہ اور مدلل لہجے میں بات کر رہا تھا اور سینکڑوں کا مجمع نہایت عقیدت اور خاموشی سے سن رہا تھا۔ سائیں کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ وہ اپنے عقیدت مندوں کو بوب لڑکیوں کے حوالے سے اپنے خیالات پر نظرثانی کرنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برسوں پرانی یہ روایت آناً فاناً ختم نہیں ہو سکتی لہٰذا وہ بڑے مدبرانہ انداز میں ذہنوں میں ابتدائی تبدیلی لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک اور دانش مندی بھی کی اور وہ یہ کہ اس نے بوب لڑکی قربان کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں دی' صرف وارننگ وغیرہ دے کر چھوڑ دیا۔ نیامیوں کو بھی بس تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کی گئی اور ان سے یقین دہانیاں لے کر انہیں رہا کردیا گیا۔

○☆○

صفدر کے کہنے پر میں نے بھی اپنا میک اپ ختم کر دیا تھا اور اب اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ میرے میک اپ ختم کرنے سے سب سے زیادہ خوشی غزالہ کو ہوئی تھی اور اس کے بعد ننھے تابی کو جو مجھ سے کافی مانوس تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ یہ کھنڈرات جنہیں اب "کالونی" کا نام دے دیا گیا تھا' ایک زبردست انقلاب کے آثار پیش کر رہے ہیں۔ اس مفلوک الحال قحط زدہ علاقے کے بے شمار لوگ اس کالونی کی طرف یوں کھنچے آ رہے تھے جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھنچتا ہے۔ یہ لوگ کالونی کے نواح میں آکر آباد ہو رہے تھے' یہاں انہوں نے خیمہ بستیاں بنالی تھیں اور کہیں کہیں عارضی جھونپڑے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ جدید ترین کالونی کے مضافات میں یہ خیمہ بستیاں جدت اور قدامت کا عجیب امتزاج پیش کرتی تھیں۔ وہ لوگ جو سائیں عالی کے گرد جمع ہو رہے تھے' اسے آزادی کے دیوتا ذورے کا عکس قرار دے رہے تھے اور ان کا یقین تھا کہ سائیں کے سبب یہاں اس آفت زدہ علاقے میں آزاد اور خوش حال زندگی کا دور شروع ہوگا۔ نجانے کیوں اس سارے منظر کے پس منظر میں مجھے مسٹر جی کلارک بھی نظر آتے تھے لیکن وہ ذاتی طور پر کہیں موجود نہیں تھے۔ برسوں میں نے سائیں عالی سے اس بارے میں استفسار کیا تھا مگر وہ حسب توقع آئیں بائیں شائیں کرنے لگا تھا۔

ایک دن میں نے صبح سویرے اسپتال کی طرف جاتے ہوئے بوڑھے داماں کو دیکھا' داماں کے ساتھ اس کے قبیلے کے قریباً تین درجن مرد و زن تھے۔ وہ سائیں سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے اس کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر داماں رک گیا۔ اس نے جھک کر مجھے تعظیم پیش کی پھر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ غالباً یہی کہا ہوگا کہ میں سائیں کا مرید خاص ہوں۔ اس اطلاع کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ اچانک جھک جھک کر میرے بازو چھونے

گئے۔ تیمور نے تو باقاعدہ میرے پاؤں پر سر رکھنے کی کوشش کی۔ زریں بھی میرے ساتھ تھا، کچھ جذباتی پرستاروں نے زریں کے پاؤں پر بھی یلغار کی۔ زریں بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہا تھا ”اوئے کافر کا بچہ۔ اوئے پاگل۔ ام کو گناہ گار مت کرو۔“

ہم دونوں نے بمشکل اپنے پاؤں اور کپڑے ان سیدھے سادے عقیدت مندوں کی یلغار سے بچائے اور وہاں سے تقریباً بھاگ ہی کھڑے ہوئے۔

دو دن مزید اسی طرح کھاتے پیتے اور آرام کرتے گزر گئے۔ اسٹیفی بدستور ہماری تحویل میں تھا۔ اس پر چھ سخت نگران مقرر کر دیے گئے تھے، یہ تین شفٹوں میں چوبیس گھنٹے اسٹیفی کی نگرانی کرتے تھے۔ ہیڈ نگران زریں گل خود تھا۔ وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ گاہے گاہے واکی ٹاکی پر راجر سے بھی بات ہو رہی تھی۔

راجر اور اس کے بے شمار مسلح ساتھیوں نے اس کالونی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، تاہم وہ بہت فاصلے پر تھے۔ میری اطلاعات کے مطابق زیادہ دو میل کا فاصلہ تھا۔ یہ بات یقیناً وہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ اس آبادی کے قریب آئے تو کشیدگی بڑھ سکتی ہے اور جب تک اسٹیفی ان کے پاس واپس نہ چلا جاتا وہ کسی حال میں کشیدگی بڑھا نہیں سکتے تھے۔

تیسرے دن صبح نو بجے کے لگ بھگ جب ہم اپنی شاندار رہائش گاہ میں ناشتا کر رہے تھے، واکی ٹاکی پر پھر راجر کا سگنل موصول ہو گیا۔ ”یہ تو کھانا بھی آرام سے نہیں کھانے دیتے۔“ غزالہ نے بیزاری سے کہا۔

زریں گل کی بیوی کلثوم معصومیت سے بولی ”غزالہ باجی۔ آپ ام کو بالکل بیویوں کے مافق لگا۔“

غزالہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ”تم اپنی چونچ بند رکھا کرو۔“ اس نے کلثوم کو ڈانٹا۔

”چونچ؟ یہ کیا ہوتا ہے؟“ کلثوم نے پوچھا۔

”تمہارا سر۔“ غزالہ نے کہا۔

”امارا سر۔ امارا سر تو بند ہے۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ سے سر کو ٹٹولا۔

”سر ہی نہیں تمہارا دماغ بھی بند ہے۔“ غزالہ نے ڈانٹا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے واکی ٹاکی آن کیا۔ دوسری طرف سے حسب توقع راجر ہی کی آواز بلند ہوئی ”راجر اسپیکنگ!“

”شاہ جہاں اسپیکنگ۔ کہو۔ اس وقت صبح صبح کیسے تکلیف کی؟“

وہ بولا ”تم چین کی نیند سوتے ہو اس لیے تمہارے لیے یہ صبح صبح ہے۔ جو رات بھر جاگتے ہیں، ان کے لیے دن بہت دیر سے چڑھا ہوا ہے۔“

”یہ کون لوگ ہیں رات بھر جاگنے والے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم... اور کون؟“

”میں سمجھا شاید تم ان ہزاروں ستم زدہ لوگوں کی بات کر رہے ہو جن کے جگر کے ٹکڑے ان کے سینے سے نوچ کر تم نے حراست میں رکھے ہوئے ہیں۔ جو ہر پل اپنے پیاروں کی راہ تکتے ہیں اور جن کی ترسی ہوئی نگاہیں ہر لحظہ دروازوں پر لگی رہتی ہیں۔“

”تم طنز کے تیر چلا چکے ہو تو میں آگے کچھ کہوں؟“

”ہاں ہاں میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کنگ براؤن تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”او برخوردار کنگ... ویری گڈ۔ ویل ڈن... لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ ابھی ڈاکٹروں نے اسے بات چیت سے منع رکھا ہے۔“

”انہوں نے اصرار کر کے اجازت لی ہے۔ ابھی ان کی حالت پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔ میں تم سے درخواست کروں گا کہ انہیں اشتعال دلانے والی کوئی بات نہ کرنا۔“

”حیرانی کی بات ہے، افریقہ کے سب سے بڑے بردہ فروش کا پی اے اور مجھ جیسے معمولی شخص سے درخواست کر رہا ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ یہ تو قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔“

”اچھا ایک منٹ ویٹ کرو۔ کنگ تم سے بات کریں گے۔“

چند سیکنڈ بعد کنگ کی مخصوص پُررعب آواز واکی ٹاکی پر گونجی ”ہیلو کنگ اسپیکنگ!“

”ہیلو۔ کیا حال ہے بیٹا۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔ یقیناً دوسری طرف کنگ کا پارا اور بلڈ پریشر ساتویں آسمان کو چھو گیا ہوگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اتنی زور سے چیختا کہ اس واکی ٹاکی کا ساؤنڈ سسٹم ”تباہ“ ہو جاتا لیکن اس وقت کنگ کی رگ جان میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا بیٹا میرے پاس یرغمال تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دل کے دوسرے دورے سے بچنے کے لیے اسے اپنا لب و لہجہ قابو میں رکھنا ہے۔ وہ بولا ”تم مسخری چھوڑ کر ہم سے سنجیدہ بات کرو۔ ہم تم سے اسٹیفی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تو صاف ظاہر ہے یار! تم اس وقت مجھ سے عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں تو بات نہیں کرو گے۔ اپنے شیطو ٹکڑے کے بارے میں ہی کچھ کہو گے۔ کہو کیا کہتا ہے؟“

”اسٹیفی کو چھوڑنے کے بدلے تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں جو چاہتا تھا میں نے بتایا تھا۔ موگا سا میں ہم دونوں نے جو ”بک بک“ کی تھی وہ تمہیں بھی یاد ہو گی۔ اس بک بک کے بعد ہم ایک فیصلے پر پہنچے تھے مگر اس فیصلے کے تھوڑی ہی دیر بعد تم نے اور تمہارے گماشتوں نے فیصلے کی دھجیاں اڑا دیں۔ موگا سا کے نہتے لوگوں پر تم نے جو ظلم کیا اس نے تاتاریوں کی یاد تازہ کر دی۔ اب تم مجھ سے کسی بہتر سلوک کی کیسے توقع رکھتے ہو؟“

”تم جانتے ہو شاہ! وہ سب کچھ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا اور ہمارے خیال میں اگر اسٹیفی اب تک زندہ سلامت تمہارے پاس موجود ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ تمہیں بھی غلط فہمی کا احساس ہے۔“

”بہرحال جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں وہ پہلا معاہدہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اب نئی بات ہو گی۔“

”لیکن کب ہو گی؟“

”بہت جلد۔ پہلے تم اپنے دل کے حالات ٹھیک کر کے صحت مند ہو جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ بات بات میں پھر تمہاری بات بگڑ جائے۔ بڈھا بندہ اگر عیاش بھی ہو تو اس کی ہوا نکلتے کتنی دیر لگتی ہے؟“

”تم بکواس بند نہیں کر سکتے... ناں!“ کنگ زور سے دہاڑا۔

اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ غالباً اس کے ہاتھ سے واکی ٹاکی راجر نے لے لیا تھا۔ چند لمحے وہ کھانستا رہا اور اس کے کھانسنے کی آواز آتی رہی، پھر واکی ٹاکی پر راجر کی جلی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ دانت پیس کر بولا ”تمہیں کہا تھا نا کوئی بکواس نہ کرنا۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف اس کے بڑھاپے کا ذکر کیا تھا، کوئی حسینہ پاس کھڑی ہوتی تو بھی بات تھی۔ واکی ٹاکی پر بڑھاپے اور ہوا نکل جانے کی بات کس نے سنی ہے؟“

”میں تم سے پھر بات کروں گا۔“ راجر نے تیزی سے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔

غزالہ، زریں، کلثوم اور صفدر سوالیہ نظروں سے میرا منہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کنگ اب ”بک بک“ کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

اسی دوران میں موسل بھی آ گیا۔ وہ ایک نہایت اہم خبر لایا تھا، اس نے بتایا کہ جس صندوق میں موتابہ کی لاش رکھی گئی ہے وہ کل نو تعمیر شدہ بوما (لارسی عبادت گاہ) میں پہنچایا گیا ہے۔ چند بوڑھے لارسی رات بھر وہاں موجود رہے ہیں، آج صبح منہ اندھیرے بوڑھا واماں بھی وہاں گیا تھا، اس کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی بھیڑ تھی۔ بھیڑ غالباً بھینٹ چڑھانے کے لیے لائی گئی تھی۔ واماں ڈیڑھ دو گھنٹے وہاں رہنے کے بعد واپس آیا تھا۔

موتابہ والا واقعہ اب کچھ پراسرار رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ اس لاش کے اندر سے کیا کھوج رہے تھے۔ میں نے غزالہ سے پوچھا ”تم نے لاش کو دیکھا تھا غزالہ معائنہ کیا تھا اس کا؟ کیا کوئی شک کی بات اس میں تھی؟“

”شک سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”کہا جاتا ہے کہ انسان پر سکتہ وغیرہ طاری ہو جاتا ہے؟“

غزالہ نے نفی میں سر ہلا دیا، وہ میری اس بات سے اتفاق نہیں کر رہی تھی۔

غزالہ کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ بولی ”بس ایک چیز مجھے تھوڑی سی الجھن میں مبتلا کرتی ہے۔ موتابہ کی آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ اس رنگ سے تھوڑا سا مختلف تھا جو مردے کی آنکھوں کا ہوتا ہے۔ اب پتا نہیں ایسا موسم کے سبب تھا یا پھر یہ مقامی لوگوں کی کوئی خصوصیت تھی۔“

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی دھڑکن تو موجود ہو مگر اسے محسوس نہ کیا جا سکے؟“ میں نے پوچھا۔

”میڈیکل میں ایسے کیسز شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں، پھر بھی دھڑکن تو محسوس ہو ہی جاتی ہے۔ ہاں نبض کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بہت کمزور ہونے کی وجہ سے نبض محسوس نہ ہو پائے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ دھڑکن بہت کمزور ہو جاتی ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں۔ کارڈیالوجی کے معاملات میں ایسے چانسز ہوتے ہیں لیکن ایسی صورت حال طویل عرصے تک نہیں چل سکتی۔“

صفدر نے کہا ”ہو سکتا ہے کہ واماں اس حوالے سے کوئی اہم بات بتا سکے۔“

زریں گل نے فوراً تائید کی ”امارا بھی خیال ہے کہ واماں اندر کی بات جانتا ہو گا۔“

ناشتے کے فوراً بعد میں، زریں گل اور موسل اپنی رہائش

گاہ سے نکلے اور راماں کی طرف روانہ ہوئے۔ راماں خیمہ بستی میں تھا' راستے میں ہمیں کالونی کی گہما گہمی نظر آئی۔ جگہ جگہ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ روشانگ سینٹر کام کرنے لگے تھے۔ ایک بڑی عمارت کی پیشانی پر "زرعی ترقی" کا بورڈ آویزاں تھا۔ بچوں کا پارک' کلینک' کار پارکنگ سب کچھ یہاں موجود نظر آ رہا تھا۔ ہم نے خوش باش سفید فام لڑکیوں کو دیکھا جو اپنے سیاہ فام ساتھیوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے لہراتی بل کھاتی چلی جا رہی تھیں۔ کہیں گورے مزدور اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے نظر آئے۔ ان ماڈرن مزدوروں کو دیکھ کر زریں گل کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بے ساختہ بولا "سائیں عالی نے امارا دل جیت لیا ہے' ام تو سمجھتا ہے کہ یہ امارا سپنا تھا جو سائیں نے پورا کیا ہے۔ یہ انگریز لوگ ام پر بہت حکمرانی کرتا رہا ہے' جب ہم ان کو کسی کا حکم مانتے دیکھتا ہے تو امارا روح تازہ ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ دیکھو' روح تازہ کرنے والا ایک اور منظر۔ وہ گورا اس حبشی کے سر کی مالش کر رہا ہے۔"

زریں نے دیکھا اور اس کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو گیا۔

ایک گھر کے اندر خوب رو سفید فام لڑکی کپڑے دھو دھو کر الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ زریں ٹہلتا ذرا اس کے قریب چلا گیا اور بولا "گُڈ... گُڈ... ویری گُڈ۔ تم اسی قابل۔"

لڑکی کو آخری الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لہٰذا وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

ہم کالونی سے نکلے اور مضافات کی خیمہ بستی میں پہنچ گئے' جب ہم ان خیموں کے پاس پہنچے جہاں راماں کے قبیلے والے رہائش پذیر تھے تو ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ خیموں... اردگرد کچھ ہلچل تھی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو کچھ افراد کو دست و گریباں پایا۔ دو سیاہ فام عورتوں سمیت کئی افراد آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ان میں واماں بھی تھا۔ وہ اپنے ایک ہم عمر کی داڑھی نوچ رہا تھا اور اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ وہ شخص جواب میں چیخ چلا رہا تھا اور واماں کو دھکیل دھکیل کر پیچھے ہٹا رہا تھا۔ قریب ہی ایک سیاہ رنگ کا نہایت شاندار... گھوڑا بھی کھڑا تھا۔ میں اور زریں گل اس لڑائی کے درمیان کود پڑے اور لڑنے والوں کو روکنے لگے۔ ایک عورت کا لباس پھٹ گیا تھا اور اس کا بالائی دھڑ بالکل عریاں ہو گیا تھا مگر اسے زیادہ پروا نہیں تھی۔ ہمیں اپنے درمیان دیکھ کر راماں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھ روک لیے اور ہانپتا کانپتا ہوا ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

"کیا بات ہو گئی ہے' کیوں بچوں کی طرح لڑ رہے ہیں؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

راماں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ ان کا آپس کا کوئی معمولی جھگڑا تھا مگر صورت حال بتا رہی تھی کہ یہ معمولی جھگڑا نہیں ہے' کوئی سنگین معاملہ ہے۔

وِل ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "یہ کسی لڑکی کا چکر ہے۔ وہ کسی پر الزام لگا رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ایک پر دست درازی کی ہے۔"

میں نے واماں سے پوچھ گچھ کی تو وہ صاف انکار کر گیا۔ وہ یقیناً کچھ چھپا رہا تھا۔ آپس میں جھگڑنے والے اب ایک دوسرے پر لعن طعن کر رہے تھے۔ اس لعن طعن سے وِل نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ خاصا دھماکا خیز تھا۔ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا' "لوگ۔ تو سائیں جی کی بات کر رہا ہے۔"

وِل کا مطلب تھا کہ سائیں جی پر الزام تراشی جا رہی ہے۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یقیناً زریں کا بھی یہی حال ہوا ہو گا۔ میں نے لڑنے جھگڑنے والے تمام افراد کو ڈانٹ ڈپٹ کر زبان بندی کا حکم دیا اور ان سب کو لے کر خیمے کے اندر چلا گیا۔ زریں اور ایک دوسرے شخص کو میں نے باہر پہرے پر بٹھا دیا۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بکواس ہے یہ؟" میں نے واماں سے پوچھا۔

راماں نے لرز کر ہاتھ جوڑے اور اس شخص کی طرف اشارہ کر دیا جس کی داڑھی تھوڑی دیر پہلے راماں کے ہاتھ میں تھی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بدبخت میرا سگا بھائی ہے جناب۔ اس کا نام رسا ہے اور یہ جو لڑکی سامنے بیٹھی ہے یہ اس کی بیٹی اور میری بھتیجی ہے۔ یہ دونوں... یہ دونوں..."

آواز راماں کے حلق میں اٹک گئی اور وہ کوشش کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔

میں نے کہا "کیا یہ دونوں سائیں پر کوئی الزام لگا رہے ہیں؟"

واماں اور اس کے دو ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واماں نے توبہ کرنے کے انداز میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور لرزتی آواز میں بولا "یہ بدبخت جو کچھ کہہ رہے ہیں' اس کے لیے میں انہیں دس بار بھی قتل کروں تو یہ کم ہے۔"

جنون سے بے قابو ہو کر بوڑھا واماں ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی رسا کی طرف لپکا مگر میں نے راستے میں ہی اسے روک لیا اور تھام کر ایک طرف لے گیا۔ راماں کی آنکھوں سے جھنجھلاہٹ... آنسو رواں تھے اور وہ کھا جانے والی نظروں سے اپنے بھائی رسا اور اس کی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ تعجب یہ تھا کہ وہ دونوں بھی زار و قطار رو رہے تھے' خاص طور سے لڑکی کا برا حال تھا۔

ناقابل یقین صورت حال تھی اور نہایت تہلکہ خیز بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ذاتی طور پر میں سائیں عالی کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے حوالے سے کوئی ایسی بات میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ بہرحال دونوں طرف کا موقف سنے بغیر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ دوسری طرف کا موقف بھی ہمیں راماں ہی بتا سکتا تھا کیونکہ مقامی زبان کا ترجمہ اسی نے کرنا تھا۔ میں نے کہا "واماں! میں چاہتا ہوں کہ تم پورا انصاف کرتے ہوئے ترجمہ کرو اور مجھے وہی کچھ بتاؤ جو تمہارا بھائی کہہ رہا ہے۔"

واماں نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رسا نے راماں کی وساطت سے کہا "جناب! کہتے ہوئے زبان کانپتی ہے اور دل روتا ہے لیکن جو سچ ہے اسے میں کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ میں تباہ ہو گیا ہوں جناب' میرا کچھ باقی نہیں رہا۔ میری بیٹی کی شادی ہماری پسند کی جگہ پر نہیں ہو رہی تھی۔ راماں ہی کے کہنے پر ہم اسے بڑی عقیدت کے ساتھ سائیں کے پاس لے کر گئے۔ سائیں نے رات کو آنے کا کہا۔ ہم رات کو گئے۔ سائیں نے ہمیں باہر بٹھا دیا اور لڑکی کو اندر حجرے میں لے گیا۔"

یہاں تک کہہ کر رسا نامی اس شخص کا صبر جواب دے گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ لڑکی بھی رو رہی تھی' سیاہ فام ہونے کے باوجود قبول صورت تھی۔ اس کی نسوانی کشش بہت نمایاں تھی کہ بالائی دھڑ کے مقابلے میں... کمر بہت پتلی تھی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ اس بارے میں کیا کہتی ہے۔

وہ راماں کی وساطت سے کہنے لگی "میرے باپ نے وہی کچھ کہا ہے جو میں نے اسے بتایا ہے۔"

"تم نے سائیں عالی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا کمرے میں روشنی تھی؟"

"جی' وہاں دو تین شمع دان جل رہے تھے۔"

"سائیں نے تم سے کیا کہا؟"

"اس نے... مجھے ایک نشے والا مشروب پلایا' پھر مجھے بغل میں لے کر مرد عورت والی باتیں کرنے لگا۔"

لڑکی کم عمر اور سادہ مزاج تھی۔ جھوٹ بولنے کے لیے جس چنچل اور عیاری کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس لڑکی میں دور دور تک نظر نہیں آتی تھی۔ میرا دماغ چکرانے لگا' کیا واقعی اپنے خبطی پن میں سائیں سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو گئی تھی۔ اب اگر یہ بات باہر نکل جاتی تو کام بہت خراب ہو جاتا تھا۔ جو لوگ شدت سے پسند کیے جاتے ہیں ان کی کوئی کمزوری منظر عام پر آ جائے تو اسی شدت سے ان کے خلاف غم و غصہ بھی ابھرتا ہے۔ لوگ سائیں کی عقیدت میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ اسے دیوتا قرار دینے لگے تھے۔ ان کی محبتیں' عقیدتیں اور چاہتیں موسلا دھار بارش کی طرح سائیں پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ اگر سائیں کی عظیم الشان شخصیت پر اس واقعے کے چھینٹے پڑ جاتے تو ہو سکتا تھا کہ یہ سارے کا سارا نقشہ ہی بدل جاتا۔

میں نے راماں کے ذریعے لڑکی سے کہا "تمہیں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاید تم نے کسی اور شخص کو سائیں عالی سمجھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار سائیں صاحب کو دیکھ کر انہیں شناخت کرو۔"

وہ چیخنے لگی "نہیں... نہیں۔ مجھے مت لے کر جاؤ اس کے سامنے۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

لڑکی کا باپ بھی دہائی دینے لگا "نہیں حضور نہیں۔ اب ہمیں کہیں نہیں جانا' نہ کسی کے پاس جانا ہے۔ بس اب ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دیں۔ نہیں تو میری بیٹی کا دم گھٹ جائے گا۔"

اسی دوران میں خیمے سے باہر بہت سے افراد جمع ہو گئے' وہ بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ راماں نے مجھ پر یہ تشویش ناک انکشاف کیا کہ لوگوں کو یہاں ہونے والے جھگڑے کا علم ہو گیا ہے اور جھگڑے کا سبب بھی پتا چل گیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے تو کوشش کی تھی اور لڑتے جھگڑتے تمام افراد کو خیمے میں لے آیا تھا مگر نکلنے والی بات نکل گئی تھی۔

شام تک یہ بات پوری کالونی اور خیمہ بستیوں میں پھیل

گئی۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے لیکن میں نے ایک حیرت انگیز چیز نوٹ کی۔ لڑکی کی طرف سے لگائے جانے والے سنگین الزام پر سائیں کی عقیدت غالب تھی۔ لوگوں کے چہروں پر فکرمندی تو تھی مگر ان کی آنکھوں میں اس بات کا یقین جھلکتا تھا کہ ان کا سائیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ کچھ لوگوں نے برملا کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ سائیں جی کے خلاف دشمنوں کی سازش ہے۔ سائیں کے ذاتی کمانڈوز نے لڑکی اور اس کے والد کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور ایک طرح سے انہوں نے یہ اچھا ہی کیا تھا' ورنہ خدشہ تھا کہ لوگ ان دونوں پر بہتان تراشی کا الزام لگائیں گے اور انہیں نقصان پہنچائیں گے۔

غزالہ نے کہا "ان لوگوں کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ بڑی سمجھ بوجھ کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ورنہ اس طرح کی افواہ پر فوراً یقین کر لینے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

شائستہ نے کہا "میرے خیال میں تو سائیں عالی کو اس موقع پر کوئی تقریر وغیرہ کرنی چاہیے اور اپنی صفائی میں بیان دینا چاہیے۔"

"لوگ اگر ایسے بیان کے بغیر ہی سائیں کی صفائی مان رہے ہیں تو بیان دینے کی کیا ضرورت ہے؟" صفدر نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" غزالہ نے تائید کی "جہاں بیان آتا ہے۔ وہاں بیان کی تردید یا تائید بھی ہوتی ہے۔"

سائیں عالی اپنے حجرے میں مست تھا۔ اسے جیسے کسی بات کی پروا ہی نہیں تھی (حالانکہ چیدہ چیدہ لوگوں کے چہروں پر سائیں کے حوالے سے الجھن بھی نظر آ رہی تھی)

دو ماہر انگریز باورچی اس کے لیے کھلے آسمان تلے کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ ان ماہر ترین باورچیوں سے سائیں جو "ڈش" پکوا رہا تھا وہ کوئی بھی اناڑی خاتون خانہ بہ آسانی تیار کر سکتی تھی۔ یہ ابلے ہوئے چاول تھے۔ سائیں کو ان چاولوں پر اورک کی کھیر ڈال کر کھانا تھی۔ ان گنت دوسرے کھانوں کی طرح اورک کی کھیر بھی سائیں کی اپنی ایجاد تھی۔

پروفیسر اللہ وتا اسپتال سے رہائش گاہ پر آ گیا تھا۔ شائستہ نے دن رات جس طرح اپنے والد کی تیمارداری کی تھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس دوران میں بے چاری نے پلک جھپک کر بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ پروفیسر کے سرہانے بیٹھتی بھی نہیں تھی' بس کھڑی رہتی تھی۔ کھڑے رہ رہ کر اس کے پاؤں بھی سوج گئے تھے۔ پروفیسر بھی سائیں عالی کے حوالے سے اڑنے والی اس خبر پر حیران تھا۔ اس نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا "مجھے یقین ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ تختی

سے بات کی جائے تو وہ اصل بات بتا دے گی۔ یہ سائیں کا کی ساکھ خراب کرنے کی کوشش ہے اور یہ کوشش یقیناً وہ لوگ کر سکتے ہیں جنہیں سائیں کا اثر و رسوخ پسند نہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ نرسنیوں کا کارنامہ ہے؟"

"اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔"

باتوں باتوں میں موناب کا ذکر شروع ہو گیا۔ اس کی ذات ہمارے لیے ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔ ہم آج صبح اس کے حل کے واسطے ہی راماں کی طرف گئے تھے' ہم اس موناب کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے مگر وہاں لڑکی عصمت دری والا چکر شروع ہو گیا تھا۔

زوبی کافی دیر سے غائب تھا۔ میں نے کلثوم سے پوچھا تو وہ بولی "وہ ام کو نہیں بتاتا' چپ چپ نکل جاتا۔"

میں نے کہا "اس کو چپ چپ مت نکلنے دو۔ وہ خرانٹ ہے' انگریز لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر لاحول پڑھتا رہتا ہے۔ پتا نہیں کہ اب تک گھوم پھر کر لاحول کی کتنی تسبیح کر چکا ہو گا۔"

"نہیں نہیں استاد صیب! وہ کسی اور کام سے ہو گا۔"

"لو اور سن لو۔ اور بھلا کون سا کام آتا ہے اس کو۔ صرف مالش کر سکتا ہے اور یہاں جتنے بھی مالشیے ہیں وہ انگریز ہیں یا امریکن ہیں۔ کسی مقامی بندے کو تو سائیں نے ایسا کوئی "عہدہ" دیا ہی نہیں ہے۔"

کلثوم بولی "پھر ہو سکتا ہے وہ ام سے چوری مچھلی کھانے چلا گیا ہو؟"

"مچھلی کھانے۔ لیکن چوری کیوں؟"

"وہ کہتا ہے کہ عورتیں اگر مچھلی کھائے تو وہ کالا ہو جاتا ہے۔"

"وہ بڑا بے ایمان ہے' تمہیں غلط سلط باتیں بتاتا ہے اور خود کھاتا پیتا ہے۔ تم بھی خوب مچھلی کھاؤ' تمہارا رنگ گورا رہے گا' اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔"

اسی دوران میں زوبی گل ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ میں نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا "لگتا ہے کہ کڑاہی کے اندر سے مچھلی نکال کر کھا کر آیا ہے۔"

وہ بولا "استاد صیب! ام کو شاباش دو۔" اس نے کندھا باقاعدہ میرے آگے کر دیا۔

میں نے چپکی شاباش دینے کے بعد پوچھا "ہاں کیا کر کے آئے ہو؟"

خوشی کا اظہار کیا اور مزید مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ موول میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں سروج کے سراپا پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا "صاحب۔ یہ لڑکی کون؟"

"اس لڑکی کی طرف مت دیکھو۔ بے شک تم بڑے ماہر شکاری ہو مگر اس پر دل پھینکنے کی کوشش کرو گے تو تمہارا "ہی" آ جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں سر؟"

"شکاری کا "ش" آ جائے تو وہ "شکار" ہو جاتا ہے۔"

موول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یکایک میں چونک کر موول کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ واقعی حیرت انگیز تیزی سے اردو سیکھ رہا تھا۔ یہ رفتار ناقابل یقین تھی۔ کلثوم کو ہمارے ساتھ رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا' پھر بھی وہ بے شمار الفاظ بول نہیں سکتی تھی اور بے شمار الفاظ ایسے بھی تھے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ لیکن اس موول کے اندر تو شاید کوئی آسیب تھا یا پھر کوئی پراسرار کمپیوٹر فٹ تھا جو ہر چیز کو اپنے اندر جذب کرتا جاتا تھا۔ موول کی دیگر صلاحیتیں بھی قابل غور تھیں۔ اس کے کندھے کے زخم پر پہلے دن بھی زبردستی بینڈیج کی گئی تھی۔ اس کے بعد زخم پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی' اب زخم بے چارہ صبر شکر کر کے خود ہی ٹھیک ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور سائیں عالی تشریف لے آئے مگر اس انداز سے کہ لوگ بھونچکا رہ گئے۔ سائیں باقاعدہ بازی گروں کی طرح ہاتھوں پر چل رہا تھا۔ اس کی میلی کچیلی ٹانگیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ شاید لوگوں کو حیران کر کے اور ان کی توقع کے عین خلاف کام کر کے سائیں کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ سر نیچے ٹانگیں اوپر کرنے کی وجہ سے سائیں کی گدڑی بھی الٹ کر اس کے کمر پر آ گئی تھی اور نیچے سے وہ جانگیہ نظر آنے لگی تھی جو غالباً "سائیں صاحب" نے مہینوں سے زیب تن کر رکھی تھی۔ بہرحال سائیں کے عقیدت مندوں کو اس کی یہ ادا بھی بری نہیں لگی' نہ ہی وہ کچھ زیادہ حیران پریشان ہوئے۔ وہ اسی طرح مودب بیٹھے رہے۔ سائیں نے سیڑھیوں کے قریب آ کر خود کو سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' اور گلے میں نوٹوں سے بنی مالائیں اور نوٹوں کی گڈیاں وہ ہم برہم ہو رہی تھیں۔ سروج نے بڑے ادب سے آگے بڑھ کر ان چیزوں کو سائیں کے گلے میں درست کیا۔ سائیں نے اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ وسیع مجمع پر ڈالی اور حسب

سابق گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ہمارا کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں کسی کے ساتھ لڑنا ہے۔ ہم لوگوں کے دلوں کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور ہم ایسا کر گزریں گے۔ ہمارے دشمن چالیں چل رہے ہیں لیکن اوپر والے نے چاہا تو وہ اپنی چالوں پر خود ہی شرمندہ ہوں گے۔ سچائی کبھی چھپتی نہیں ہے' جو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دنیا کے سب سے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ آپ سب لوگ یک جان ہو جائیں اور اپنے اتحاد کی طاقت سے دشمن کو اتنا کمزور کر دیں کہ وہ مزاحمت کے قابل ہی نہ رہے اور اگر مزاحمت کرے بھی تو منہ کی کھائے۔ آپ سب ایک دوسرے کا سہارا بنیں' ایک دوسرے کی مدد کریں اور نئے آنے والوں کو نہ صرف اپنے اندر شامل کریں بلکہ ان کو اپنا حصہ بنا لیں۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

ایک گونج دار آواز ابھری اور اس نے قرب و جوار کو ہلا دیا۔ یہ سائیں کے سیکڑوں پرستاروں کی اثباتی آواز تھی۔

سائیں نے اپنا عصا سروج کے ہاتھ سے لیا اور بولا "خوش حالی کا راز محنت میں ہے۔ آپ سب کو محنت کر کے اس خطے کو خوش حال بنانا ہے۔ محنت کے لیے صحت ضروری ہے۔ اپنی صحتوں کا بھی خیال رکھو۔ خوب کانجی پیو۔ کانجی کے اندر اگر چھوٹی مکھی کا شہد بھی ملا لو تو سونے پر سہاگا ہے۔ آپ لوگ یوں سمجھ لیں کہ کانجی ہمارا۔ ہم سب کا قومی مشروب ہے۔" سائیں بڑی سے اتر گیا تھا اور اسے دوبارہ پیڑی پر چڑھانا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

"ہم نے کانجی کے لیے کالی گاجروں کی سپلائی کا انتظام کیا ہے۔ اس سلسلے میں دس لاکھ ڈالر کی گرانٹ دی گئی ہے۔ پانچ چھ لاکھ کالی گاجروں کے لیے ہے' باقی رائی' کلونجی اور نمک مرچ وغیرہ کے لیے' چھوٹی مکھی کے شہد کے لیے دو لاکھ ڈالر علیحدہ سے مخصوص کیے گئے ہیں اور یہ رقم ہم نے انسانوں کے نہیں' جنات کے سپرد کی ہے کیونکہ یہ جنات گرانٹ ہڑپ نہیں کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں میں اتنی انسانیت نہیں ہوتی جتنی جنوں میں جنیت ہوتی ہے۔"

کانجی پر لیکچر دینے کے بعد سائیں نے اوجڑی کے ملک شیک اور بینگن کے کوفتوں کے بارے میں بھی اپنے عقیدت مندوں کو بہت کچھ بتایا۔ اسی دوران میں ایک طرف سے ہلکا ہلکا شور سنائی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک مشتعل ہجوم جلوس کالونی کی

وہ بولا "فتح کر کے نہیں' ام پکڑ کر لایا ہے۔ اس بندے کو جو سائیں صیب کو بے گناہ ثابت کر دے گا۔ ابھی' ہے کمانڈوز کے حوالے کر کے آ رہا ہے ام!" زریں کے لباس پر خون کے باریک چھینٹے بھی نظر آ رہے تھے۔

"کیا اوٹ پٹانگ بول رہے ہو۔ کون ہے وہ شخص؟" میں نے پوچھا۔

"وڈاماں کا بھتیجا ہے اور اس لڑکی کا سگا بھائی ہے جس نے دعویٰ فرمایا ہے کہ سائیں صاحب نے۔" زریں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

صفدر نے کہا "یار! ساری بات شروع سے بتاؤ۔"

زریں نے گردن اکڑا کر کہا "ام ذرا سوئمنگ پول کی طرف گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شاپنگ سینٹر ہے۔ وہاں اسلحے کا بھی ایک دکان ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ ام کو اسلحے کا شوق ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ تو ہر پٹھان کو ہوتا ہے۔ ہم اسلحہ دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکے پر نظر پڑا۔ وہ لباس سے غریب نظر آتا تھا۔ وہ رائفل خرید رہا تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ اچھا خاصا مہنگا رائفل ہے۔ ام حیران ہوا کہ لڑکے کے پاس اتنا ڈالر کہاں سے آیا۔ ایک دم ام کو محسوس ہوا کہ لڑکے کا شکل کچھ جانا پہچانا ہے۔ ام نے اس کو کہیں دیکھا ہوا ہے مگر کہاں؟ کچھ اندازہ نہیں تھا۔ بالکل اچانک پتا چلا کہ اس کا شکل تو اس لڑکی سے ملتا ہے جس نے آج صبح سائیں صیب پر الزام زانی کیا ہے۔ ام کو شک پڑ گیا۔ لڑکا رائفل لے کر وہاں سے نکلا تو ام نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ لڑکا کالونی سے باہر جا رہا تھا۔ ام نے بھی اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ جلد ہی ام ٹیلوں میں پہنچ گیا۔ یہاں آ کر لڑکے کو شک گزرا کہ ام اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے کئی بار مڑ مڑ کر دیکھا' پھر ایک دم جیران کے مانند گھنی جھاڑیوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔ ام نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دیا۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک گڑھے میں گر گیا۔ ام نے اسے دبوچ لیا۔ اس نے ام پر رائفل سیدھا کرنا چاہا لیکن ام نے رائفل چھین لیا۔ اس نے چھری نکالنے کا کوشش کیا۔ بس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ ام نے اسے پکڑا اور درخت کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ تلاشی لیا تو اس کی جیبوں سے بہت سا ڈالر وغیرہ نکلا اور ایک لکھا ہوا کاغذ بھی ملا۔ اسی دوران میں سائیں عالی کا دو کمانڈوز بھی گشت کرتا ہوا ادھر آ گیا۔ ام نے لڑکے کو ان کے حوالے کر دیا۔"

"اب لڑکا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کمانڈوز نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ تھوڑا سا مار ابھی تو اسے۔ اس نے سب کچھ بک دیا ہے۔ کچا مجرم ہے' ہمارے پاکستان کا مصطفیٰ قریشی یا ادیب وغیرہ ہوتا تو کچھ بتا کے نہ دیتا۔"

"بکا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ یہ رقم اسے اس کی بہن اور باپ سے ملا ہے۔ انہوں نے یہ رقم کالونی کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک فرنگی سے لیا تھا۔ اس فرنگی کا تعلق یقیناً بسنٹ سے تھا۔ اس انگریز نے لڑکی کے باپ کو انعام میں ایک گھوڑا بھی دیا تھا۔ وہ گھوڑا یہ لوگ اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے ہیں۔"

مجھے وہ شاندار گھوڑا یاد آ گیا جو صبح خیمہ بستی میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہی گھوڑا اس شخص کی مخبر فروشی کا انعام تھا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا اس لڑکے کی بے حسی پر۔ جس کی بہن نے اپنے اوپر عصمت دری کی تہمت لگوائی تھی اور وہ اس تہمت کے صلے میں ملنے والی رقم سے رائفل خریدنے نکلا تھا پھر میرے ذہن میں لڑکی اور اس کے باپ کی غریب سادہ صورتیں ابھر آئیں اور ایک بار پھر اس بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ چہرے اکثر دھوکا دیتے ہیں۔ لڑکی کا معصومانہ انداز' آنکھوں میں آنسو گردن پر خراشیں' وہ سب ایک جھوٹ کی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد میں زریں گل اور ڈول اس مقام پر پہنچے جہاں پکڑے جانے والے لڑکے کو رکھا گیا تھا۔ یہ پرانے کھنڈر کا ہی ایک حصہ تھا۔ اس کو مرمت کیا گیا تھا اور سلاخیں وغیرہ لگا کر لاک اپ کی شکل دے دی گئی تھی۔ زریں گل نے بتایا تھا کہ اس نے لڑکے کے ساتھ معمولی دھینگا مشتی کی ہے مگر یہ معمولی دھینگا مشتی نہیں تھی' وہ یقیناً کچھ دیر کے لیے لال سدھیر بن گیا تھا کیونکہ لڑکے کے چہرے پر بڑے بڑے نیل تھے اور ناک منہ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ لاک اپ میں لانے کمانڈوز نے بھی اس کی تھوڑی بہت ٹھکائی کی تھی۔ لڑکے کی شکل واقعی اپنی بہن سے بہت ملتی تھی اور یہی مشابہت تھی جس کے سبب زریں گل شک میں مبتلا ہوا تھا۔ ہماری موجودگی میں بھی لڑکے سے پوچھ گچھ جاری رہی۔ اسی دوران میں الزام تراش لڑکی اور اس کے باپ کو بھی لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ یقیناً بوڑھے کے ساتھ تھوڑی بہت مار پیٹ ہو چکی تھی اور ابھی مزید ہونے والی تھی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور وڈاماں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور بولا "جناب! ان لوگوں

طرف چلا آ رہا تھا۔ یہ گھڑ سوار جلوس تھا۔ گھڑ سواروں کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور ساتھ میں کچھ جھکڑے بھی تھے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ لارمیوں کا جلوس ہے۔ یہ لوگ نزدیک آئے تو مشعل بردار سردار راسفے کو ہم نے دور ہی سے پہچان لیا۔ سردار راسفے کی سب سے بڑی پہچان اس کی وہ عینک تھی جو کچھ عرصہ پہلے اسے غزالہ نے تحفے میں دی تھی۔ جنگلوں میں رہنے والے اس قبائلی سردار کی آنکھوں پر یہ عینک عجیب تو لگتی تھی مگر اب اس کی شناخت بن گئی تھی۔

سردار راسفے گھوڑے سے اترا اور سیدھا سائیں عالی کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی ایک قطار میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ سائیں کے قریب پہنچ کر سردار راسفے نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے۔ اس کے ساتھیوں نے بھی تعظیم کا یہی انداز اختیار کیا۔ سائیں عالی نے شان بے نیازی سے سردار راسفے کے سر پر ہلکا سا ڈنڈا رسید کیا۔ یہ ایک طرح سے اس امر کا اظہار تھا کہ اس نے سردار راسفے کی تعظیم قبول کی ہے۔ کچھ دیر تک مترجم کے ذریعے سردار راسفے اور سائیں عالی میں گفتگو ہوتی رہی۔ ہم چونکہ دور تھے لہٰذا آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سردار راسفے کے ساتھی ان تین بڑے چھکڑوں کی طرف بڑھے جو جلوس کے ساتھ آئے تھے۔ چھکڑوں کے عقبی دروازے کھولے گئے تو ان میں سے قطار اندر قطار بوب لڑکیاں اترنا شروع ہو گئیں۔ انہیں پانچ پانچ کی ٹولیوں میں رسی کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ وہ سب کی سب صحت مند اور قبول صورت تھیں۔ جانوروں کی سی حیران حیران آنکھوں کے ساتھ وہ چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

"یہ سب کیا چکر ہے؟" صفدر نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ سائیں کی تبلیغ کا اثر ہوا ہے۔ سائیں نے بوب لڑکیوں اور ان کی قربانی کے بارے میں جو تقریر کی تھی یہ اسی کا رد عمل ہے کہ سردار راسفے ان لڑکیوں کو موگاسا سے یہاں لے آیا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ انہیں آزاد کر دیا جائے گا؟"

"بظاہر تو یہی لگ رہا ہے بلکہ ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ ایسا ہی ہو۔"

اسی دوران میں سائیں عالی کی نگاہ ہم پر پڑ گئی۔ اس نے اپنا عصا ہماری طرف سیدھا کیا اور چیخ کر بولا "او منے مرود! تم سب وہاں کیا کر رہے ہو۔ ادھر آؤ' اپنے پرانے یار سے ملو۔"

سائیں کا اشارہ یقیناً سردار راسفے کی طرف تھا' اب سردار راسفے نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سردار راسفے کو آخری بار ہم نے موگاسا کے میدان جنگ میں دیکھا تھا۔ گھمسان کی لڑائی میں وہ سینہ تانے شیر کے مانند یہاں سے وہاں بھاگا پھر رہا تھا۔ اس نے عین لڑائی کے دوران میں مجھ سے ایک دو مشورے بھی مانگے تھے۔ وہ لڑائی بڑے جذبے سے لڑی گئی تھی مگر طاقت اور سازش نے مل کر اس جذبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ جب صرف تلوار اور نیزے کا زمانہ تھا' "جذبہ" جنگ کے میدانوں کے نقشے بدل دیتا تھا مگر اب درمیان ہلاکت خیز تکنیک اور پتا نہیں کیا کچھ آ چکا ہے۔ سردار راسفے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی صفوں میں ایک خطرناک کالی بھیڑ اس کے اپنے بھائی کی شکل میں موجود ہے۔ اس کے بھائی اولامو نے ٹرینی رائفل برداروں کو عبادت گاہ کی چھت پر پہنچایا تھا جہاں سے انہوں نے گولیوں کی بارش کر کے "نہتے جذبے" کو لہولہان کر ڈالا تھا۔

سردار راسفے ہماری طرف بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے میرا رخسار چوما اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ باری باری سب سے ملا پھر اس نے ہم سے غزالہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ غزالہ کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ہم نے اولاپاں کے ذریعے اسے بتایا کہ غزالہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے سردار راسفے سے پوچھا "یہ بوب لڑکیاں یہاں کیسے آئی ہیں؟"

وہ بولا "صحرائی درویش نے ان لڑکیوں کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس نے موگاسا کے لوگوں پر بے حد اثر کیا ہے اور نہ صرف موگاسا کے لوگوں پر بلکہ لارمیوں کی تینوں بڑی بستیوں میں درویش کی باتیں بڑی توجہ سے سنی گئی ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ موگاسا میں موجود تمام بوب لڑکیوں کو صحرائی درویش کے حوالے کر دیا جائے اور وہ ان کے بارے میں جو فیصلہ بھی کریں اسے دل و جان سے قبول کیا جائے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا "اگر ہم آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور نرسٹ کے خلاف اس لیے لڑ رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو غلام بناتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے اندر بھی کسی ایسی رسم کو باقی نہیں رہنے دینا چاہیے۔"

تمام بوب لڑکیاں سائیں عالی کی تحویل میں دے دی گئیں اور جلسہ برخاست ہو گیا تو ہم سردار راسفے کو اپنی رہائش گاہ پر لے آئے۔ اس جدید رہائش گاہ کو دیکھ کر اور یہاں کی شاندار سہولتوں کے درمیان آ کر سردار راسفے کی

ہے۔ واقعی غلطی ہوئی ہے مگر کچھ بھی ہے' میرا خون ہے یہ' آپ ان کی جاں بخشی کروا دیجئے۔"

"مگر یہ تو ابھی غلطی مان بھی نہیں رہے ہیں۔ صرف لڑکے نے تسلیم کیا ہے۔"

"یہ بھی مان لیں گے۔"

"تو پھر منواؤ۔ اگر نہیں مانیں گے تو پھر چمڑی تو ادھڑے گی۔"

واماں کمانڈوز سے اجازت لے کر لاک اپ میں چلا گیا۔ اس نے اپنے بھائی اور بھتیجی کو سمجھانا شروع کیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ انہیں سخت بے عزتی اور خوفناک تشدد سے ڈرا رہا ہے۔ جلد ہی وہ دونوں مان گئے اور انہوں نے اقبال جرم کرلیا۔

بوڑھے نے جو کچھ مترجم کے ذریعے بتایا وہ یوں تھا "دو دن پہلے جب ہم یہاں سائیں جی کے پاس پہنچنے کے لیے اپنی بستی سے آ رہے تھے تو جنگل میں کچھ لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ جیپوں پر سوار تھے اور انہوں نے نیلی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ جیپ سوار دراصل کونگ (کنگ) کے کارندے ہیں۔ ان کے ساتھ دو جوام بھی تھے جو عورتوں کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے پہلے تو ہمیں رسیوں سے باندھ دیا پھر بری طرح ڈرایا دھمکایا۔ میری بیٹی اور بیوی بلند آواز سے رونے لگیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کوئی جوام عورت سے چھو بھی جائے تو وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ نیلی وردی والوں نے کہا کہ ایک صورت ایسی ہے جس سے ہماری جان بچ سکتی ہے اور ہمیں بہت فائدہ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہمیں بہت سی رقم دی اور ایک گھوڑا بھی سواری کے لیے دیا۔ ہم نے جان بچانے کے لیے ان کی ساری باتیں مان لیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ایک اہم کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے پوری تفصیل بتائی کہ ہم نے سائیں کو کس طریقے سے بدنام کرنا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بستی (کالونی) میں ہمارے آدمی موجود ہیں۔ اگر ہم نے وہاں جا کر ارادہ بدل دیا تو ہمارا انجام بہت زیادہ خراب ہو جائے گا۔"

واماں کے بھائی نے جو کچھ بتایا یہ تقریباً وہی تھا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ اس میں تشدد کے ڈراوے والی بات درست نہ ہو یا اس کی اتنی اہمیت نہ ہو جتنی واماں کا بھائی بیان کر رہا تھا بہرحال ان لوگوں کا لالچ تو ثابت ہو ہی گیا تھا۔ کمانڈوز سے پتا چلا کہ واماں کے بھائی اور بھتیجی کے پاس سے بھی کافی رقم ملی ہے' یہ رقم انہوں نے اپنے خیمے کے اندر گڑھا کھود کر چھپا رکھی تھی۔

اس سارے معاملے میں واماں کا کردار بے مثال تھا۔ وہ اس بات پر بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا کہ سائیں پر ایسا الزام لگایا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی اس کے اپنے بھائی کی طرف سے۔ وہ اس جرم پر اپنے بھائی کو دس مرتبہ قتل کرنے پر بھی آمادہ تھا۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری کالونی اور خیمہ بستیوں میں پھیل گئی کہ سائیں جی کے خلاف ہونے والی سازش پردہ فاش ہو گیا ہے اور مجرم پکڑے گئے ہیں۔ ہر جگہ خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ سائیں کے عقیدت مند سیاہ فام سیکڑوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے سائیں کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ یقیناً ان کی خواہش تھی کہ سائیں ان کو اپنا دیدار کرائے۔ فرط عقیدت اور محبت سے ان کی آنکھوں میں آنسو دمک رہے تھے۔ اس رات صحیح معنوں میں مجھے احساس ہوا کہ یہ سادہ دل لوگ سائیں کو کتنی گہرائی سے چاہتے ہیں۔ وہ دیوانوں کی طرح اس دروازے کو تک رہے تھے جس کے عقب سے سائیں عالی برآمد ہو سکتا تھا۔

ٹیوب لائٹس کی روشنی میں یہ سارا علاقہ جگمگا رہا تھا کسی قریبی ریستوران میں ایک بج رہا تھا اور کوئی افریقی نغمہ موسیقی کی لہروں سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں بکھر رہا تھا۔ کافی دیر بعد سائیں عالی کی چیلی سوج دروازے سے نمودار ہوئی۔ وہ حسب دستور پتلون شرٹ میں ملبوس تھی' ایک اچھے سے بجلی کوندتی محسوس ہوتی تھی۔ شرٹ وہ ایسی ہلکی پھلکی پہنتی تھی کہ جسم میں پیدا ہونے والی معمولی سی جنبش بھی محسوس کی جا سکتی تھی' پھر وہ کم بخت اس بات سے بخوبی آگاہ بھی تھی کہ اس کے جسم کے کون کون سے شعبے ہیں جو نمایاں کارکردگی دکھاتے ہیں اور جنہیں زیادہ پر موثر کیے جانے کی ضرورت ہے۔ وہ ان شعبوں کی دیکھ بھال اور حرکات و سکنات پر زیادہ توجہ دیتی تھی اور یہ سب کچھ ایسی معصومانہ بے ساختگی کے ساتھ ہوتا تھا کہ بناوٹ کا گمان تک نہیں گزرتا تھا۔ سیکڑوں کی تعداد میں جو لوگ دروازے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے وہ سائیں کے پرستار تھے لہٰذا ان کی آنکھوں میں سوج کو دیکھ کر بھی شرم و حیا موجود رہی ورنہ تو ایسی پیٹانسٹ تھی جو اپنی جگر پاش اداؤں سے سو سالہ بزرگ کے جسم میں بھی بجلی لہریں دوڑا سکتی تھی۔ سوج نے مترجم کی زبانی لوگوں کو بتایا کہ سائیں صاحب کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ آپ لوگوں کو درشن دیں گے۔ حبشیوں نے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر

"ہم اس بارے میں تم سے بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ باقی جہاں تک اس لڑکی کی بات ہے وہ ایک نمبر کی حرافہ ہے۔ اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ وہ لباس کی طرح بستر بدلنے کی عادی ہے' ہم اسے ایک ایسا بستر فراہم کریں گے جو اس کی قبر میں بچھایا جائے گا۔" کنگ کی آواز سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

"مگر اس نے کیا کیا ہے؟"

"انجان مت بنو' تم سب لوگ جانتے ہو کہ اس نے کیا کیا ہے۔"

کنگ براؤن کے منحوس چھپکلے کی مدھم آواز فون پر سنائی دی۔ وہ ریسیور کے بالکل قریب کہیں موجود تھا۔ وہ ایک نہایت زہریلا جانور تھا۔ کنگ کے قریب موجود تتلیاں اس جانور کی موجودگی سے خوف زدہ رہتی تھیں مگر اس کا اظہار کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو برخوردار!" میں نے پھر تاؤ دلایا۔ وہ زور سے گرجا "تم اپنی زبان ٹھیک نہیں کر سکتے ہو باسٹرڈ۔" اس کے ساتھ ہی اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

میں نے کہا "مجھے لگتا ہے تمہاری کالی شخصیت کو کالی کھانسی لاحق ہو گئی ہے۔ میں تمہارے لیے کسی کتے کا پیشاب بھجواتا ہوں کیونکہ بردہ فروشوں کی کھانسی دور کرنے کے لیے وہ بہت مفید ہے۔"

کنگ بولنے کے قابل نہیں تھا کیونکہ وہ مسلسل کھانس رہا تھا۔ میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سردار رافے نے مترجم کے ذریعے مجھ سے پوچھا "کنگ براؤن کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے اسے مختصراً آگاہ کیا۔ سردار رافے کے چہرے پر خاص قسم کے تاثرات ابھرے۔ وہ بولا "کسی خوب صورت لڑکی کے بارے میں سنا تو ہم نے بھی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ ڈیڑھ دو ماہ نرسٹ میں رہی ہے اور اس دوران میں اس نے کنگ کے کئی اہم عہدے داروں کو آپس میں لڑا دیا ہے۔ ایک دو بندے تو اس کی رقابت میں قتل بھی ہو گئے ہیں' ایک بڑا عہدے دار جس کا نام معلوم نہیں' حراست میں ہے۔ کنگ کو اس افراتفری کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا ہے۔"

"وہ اپنی مرضی سے تو نرسٹ میں نہیں گئی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اس بارے میں تو معلوم نہیں۔ بس یہ پتا چلا ہے کہ وہ بڑی چالاک ہے ایک وقت دو تین مردوں سے آنکھ لڑاتی رہی ہے اور پھر انہیں آپس میں ہی لڑا دیا ہے اور وہ کوئی معمولی مرد نہیں تھے' نرسٹ کے بہترین واقفوں میں سے تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت کرنے پر آئے تو بہت کچھ کر گزرتی ہے۔"

"یہ تو عورت بھی ہے اور سائیں عالی کی چیلی بھی ہے۔" مترجم نے کہا۔

سردار رافے چونک کر مترجم کی طرف دیکھنے لگا "کیا یہ واقعی درویش کی چیلی ہے؟"

"جی ہاں۔ ہر وقت سائے کی طرح درویش جی کے ساتھ رہتی ہے۔"

مترجم ضرورت سے زیادہ باتونی تھا اور خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑا رہا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ سردار رافے سوج کے بارے میں جان کر بھی زیادہ حیران نہیں ہوا۔ یوں لگا جیسے سائیں عالی کی چیلی کا آبرو باختہ ہونا اس کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے بلکہ وہ مجھے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے نظر آیا۔

میں نے مترجم کے ذریعے پوچھا "کس سوچ میں پڑ گئے ہو سردار؟"

سردار رافے نے مترجم کے ذریعے کہا "مجھے پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ یہ بات دیوتا ذورے سے متعلق ہی ہے۔"

"کیسی بات؟"

"دیوتا کی ایک کنیز کی بات۔ وہ کنیز بڑی زبردست رقاصہ تھی۔ اس کا رقص دیکھ کر ذورے کے دوست اور دشمن سب مدہوش ہو جاتے تھے۔ ذورے دیوتا اس کنیز رقاصہ کو اپنے دشمنوں پر غلبہ پانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ دشمن رقاصہ کے ناچ میں اتنے محو ہو جاتے تھے کہ قلعے کی فصیل کی حفاظت کرنا بھی بھول جاتے تھے۔ دیوتا ذورے کے جاں نثار ان موقعوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور بڑے موثر حملے کرتے تھے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ یہ لڑکی ذورے دیوتا کی اس کنیز ہی کا کوئی روپ ہے۔ ہماری چرمی کتابوں میں اس کنیز رقاصہ کا نام ساہے تھا۔"

میں نے صفدر کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ صفدر کے ہونٹوں پر بھی دبی سی مسکراہٹ آ گئی۔ سب کچھ سائیں عالی کے حق میں جا رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ یہاں جو کچھ بھی الٹا سیدھا ہو رہا تھا وہ سائیں کو فائدہ پہنچا رہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ سب اتفاق تھا یا اس میں بھی سائیں کی کوئی کرشمہ کاری ہی تھی۔

سردار رافے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد مترجم کے

ذریعے کہا "کیا میں اس لڑکی کا دیدار کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "ضرور دیدار کرو لیکن اپنا دل مضبوط کر لینا۔ ویسے تم نے دو تین بیویاں پہلے بھی پال رکھی ہیں۔ مزید بکھیڑے میں پڑنے کی سکت نہیں ہو گی تم میں۔"

سردار رافے کو میری بات ناگوار نہیں گزری یا شاید اس نے سنی ہی نہیں تھی۔ اس کا ذہن اپنی چوری کتابوں، ذورے اور کنیز رقاصہ میں الجھا ہوا تھا شاید!

سردار رافے بوڑھے راماں کو سمجھانے کے لیے چلا گیا۔ صفدر ابھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک گھومنے پھرنے یا باتیں کرنے کے بعد اس پر نقاہت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صفدر سونے سے پہلے تھوڑی دیر تک مزید مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ موہانہ والے واقعے کے حوالے سے خاصی الجھن میں مبتلا تھا۔ کل صبح منہ اندھیرے اس نے خود دیکھا تھا کہ چند بوڑھے افراد کی ایک ٹولی سیاہ رنگ کی بھیڑ لے کر بڑی خاموشی سے ہوا میں داخل ہوئی تھی اور یہ لوگ کوئی ایک گھنٹے تک وہاں رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسی ہی ایک اطلاع موئل بھی دے چکا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ روزانہ کچھ لوگ صبح سویرے پراسرار انداز میں ہوا کے اندر جاتے ہیں...... کچھ دیر بعد صفدر باتیں کرتے کرتے ہی سو گیا۔ میں نے بھی اسے مزید ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں جانا۔

موسم خوشگوار تھا۔ تاریک آسمان پر بے شمار ستاروں کی قندیلیں روشن تھیں اور ہوا چل رہی تھی۔ میں ٹیرس پر چلا گیا۔ ٹیرس بلندی پر تھا۔ یہاں سے دور تک کالونی کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ ٹیرس کے سامنے کھلے احاطے میں زمرد کی گھاس لگی تھی اور خوب صورت پھولوں والے گول قد پودے تھے۔ ٹیوب لائٹس کی بلکی روشنی میں یہ جگہ خوب صورت نظر آتی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور چہل قدمی والے انداز میں گھومنے لگا۔ ایسے موسم میں غزالہ خود بخود میرے ذہن میں داخل ہو جاتی تھی۔ میں اس کو ہزار رنگوں والے لباسوں میں دیکھتا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اس کو خوب صورت مناظر کے پیش منظر میں بٹھا لیتا تھا۔ اس کے بالوں کے مختلف اسٹائل، اس کے میک اپ کے مختلف رنگ ڈھنگ، سب کچھ میرے تصور کے پردے پر بنتا بگڑتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ دل چاہا کہ غزالہ کے کمرے کی طرف جاؤں۔ مجھے امید تھی کہ وہ ابھی جاگ رہی ہو گی۔ میں تھوڑی دیر اس کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا۔ آنکھوں کی شرارتیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ

ایک جانب سے سروج آ دھمکی۔ اس کا فرار نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ ٹی شرٹ کے بٹن آمد نگار کھلے تھے آستینیں اڑسی ہوئی تھیں، پاؤں میں جوگر تھے۔ مجھے دیکھا اور بڑے انداز سے میرے قریب چلی آئی "اس وقت تو بھگوان سے کچھ بھی مانگتی تو مل جاتا۔ تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"میں نے ایسا کون سا نازک گناہ کیا ہے جس کی سزا کے طور پر اتنی خوب صورت رات میں تم مجھ پر مسلط ہو گئی ہو۔"

"باتیں اب بھی اچھی کرتے ہو۔" پھر ذرا توقف سے بولی "تمہاری وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہے۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔"

"تمہاری اطلاع بڑی مناسب ہے لیکن فقرے کے دوسرے حصے میں تم نے جو مشورہ دیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔"

"کیوں؟"

اس نے توبہ شکن انگڑائی لی "ابھی نیند نہیں آ رہی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، بڑی روکھی پھیکی جگہ ہے یہ تو۔ دل مردہ کر دینے والی اور طبیعت اداس کر دینے والی۔"

"تمہاری اداسی تو بمبئی کے کسی نائٹ کلب میں ہی دور ہو سکتی ہے جہاں شراب چھلک رہی ہو، چاروں طرف سے تمہیں گرم گرم نگاہوں کی گھور ہو رہی ہو، تیز تیکھے فقرے تمہارے کانوں میں پڑ رہے ہوں۔"

"ایسی بھی بات نہیں یار! لیکن اتنی روکھی پھیکی نظر بھی کیا ہوئی۔ دیکھنے والے کے انداز میں تھوڑی سی زندگی تو ہونی چاہیے۔ یہاں تو جو بھی دیکھتا ہے لگتا ہے کہ مدر ٹریسا کو دیکھ رہا ہے یا پردھان منتری اندرا گاندھی کے درشن کر رہا ہے۔ آنکھیں جھکی جھکی، نظر رکی رکی۔ گردن میں خم۔"

"ان بے چاروں کو کیا پتا کہ تمہیں عزت راس ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی طرف سے تمہیں احترام دے رہے ہیں۔ وہ سائیں عالی کو دیوتا کا عکس سمجھتے ہیں اور تمہیں دیوتا کی خاص داسی جو دیوتا کی مرضی اور منشا سے ایسے کام کرتی ہے جو کوئی دوسرا کرے تو گناہ گار کہلائے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ ذورے دیوتا کی سابقہ ہم نام کوئی کنیز تھی، وہ زبردست رقاصہ تھی۔ دیوتا نے اسے آزادی دے رکھی تھی کہ وہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی مرد کو لبھا سکتی ہے۔ شاید یہ لوگ تمہیں بھی اس قسم کی

آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہاں ہم نے اسے استی سے بھی ملایا اور اسے بتایا کہ موگا سا میں خون ریزی کرنے کے بعد کنگ براذن کا رویہ کیوں بدل گیا تھا۔ اس حوالے سے کئی باتیں رافے پہلے بھی جانتا تھا۔ جو وہ نہیں جانتا تھا وہ ہم نے بتا دیں، اپنے بھائی اولام کی موت کے بارے میں بھی سردار رافے کو کافی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اولام کی کچلی ہوئی سر والی لاش رافے کے کارندوں کو جنگل سے مل گئی تھی۔ اولام کی محبوبہ کوری کے انجام سے رافے ابھی تک بے خبر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کوری بھی ہلاک ہو چکی ہے، اس حوالے سے دیگر تفصیلات بھی ہم نے سردار رافے کو بتائیں۔

سردار رافے کے دو ساتھی بھی ہماری رہائش گاہ میں آئے تھے۔ سردار رافے کے علاوہ وہ دونوں بھی حیرت بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ زریں گل نے ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ اسکرین پر چلتی پھرتی تصویریں رافے اور اس کے ساتھیوں کے لیے عجوبہ تھیں۔ پنکھا، ائر کنڈیشنر، فریج، ٹیوب لائٹ، وہ ہر شے کو بے پناہ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے زریں گل کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ سردار رافے کو کالونی میں گھما پھرا کر دکھا سکے۔

سردار رافے اور اس کے ساتھیوں کی واپسی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہوئی۔ ان کے چہرے مجسم حیرت تھے۔ وہ بہت سی چیزوں کو جادو کی کرشمہ کاری سمجھ رہے تھے اور اس کرشمہ کاری کا سارا کریڈٹ بھی سائیں عالی کو دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں کے ستارے واقعی بڑے عروج پر ہیں، ہر بات اس کے حق میں جا رہی تھی۔ موگا سا میں خون ریزی کے بعد ٹیسٹ کے دریے میں جو اچانک مثبت تبدیلی رونما ہوئی تھی اس کا کریڈٹ بھی سائیں عالی کو مل رہا تھا حالانکہ وہ سب کچھ ہمارے بریگیڈیئر اسمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسی طرح سائیں پر بہتان لگا کر اس کی کردار کشی کی جو کوشش کی گئی تھی اس کا نتیجہ بھی الٹ نکلا تھا۔ سائیں کی عقیدت اور ہر دل عزیزی کا گراف ایک دم اونچا ہو گیا تھا۔

ہم سردار رافے سے باتیں کر رہے تھے جب اچانک راماں اندر داخل ہوا، وہ اوندھے منہ سردار رافے کے قدموں میں گر پڑا اور دہائی دینے لگا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اپنا ماتھا فرش پر رگڑ رہا تھا۔ اس کی زخمی پیشانی ایک بار پھر زخمی ہو گئی اور اس سے خون رسنے لگا۔ ہم نے بمشکل اسے فرش سے اٹھایا اور سنبھالا۔ زریں اور موئل وغیرہ راماں کو دلاسا دیتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں نے سردار رافے سے پوچھا کہ راماں کو ایکا ایکی کیا ہوا ہے؟

وہ بولا "کیا اس کے بھائی سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے؟"

میں نے اس واقعے کی تفصیل سردار رافے اور اس کے ساتھیوں کو ایک مترجم کے ذریعے بتا دی۔

سردار رافے اور اس کے ساتھیوں کے چہرے بھی تاریک تر نظر آنے لگے۔ سردار رافے بولا "پھر تو اس شخص کا رونا بلکنا سمجھ میں آتا ہے۔ یہ اپنے بدبخت بھائی کے کرتوت پر بہت شرمندہ ہے اور دیوتاؤں سے اپنی بخشش چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں کسی طرح اس کے بھائی کو اور اسے اس "عظیم گناہ" سے پاک کر دوں۔"

"تم کیسے پاک کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"پاک کرنے کے لیے ہمارے مذہب میں کئی رسمیں ہیں جن میں انسانی قربانی تک شامل ہے، تاہم میرا خیال ہے کہ جو گناہ ہوا ہے اس کا تعلق صحرائی درویش کی ذات سے ہے اور میں ہرگز اتنا حق نہیں رکھتا کہ صحرائی درویش کے گناہ گار کو از خود پاک کر سکوں۔ وہ دیوتا کا سایہ ہیں۔"

یہی بات اس سے پہلے ایک دن راماں نے بھی کہی تھی اور بتایا تھا کہ دیوتا ذورے کی روح سائیں عالی میں موجود و موجزن ہے، میں اس بارے میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اب میرا دل چاہا کہ رافے سے اس بارے میں کچھ دریافت کروں۔ میں اپنا مدعا زبان پر لایا تو سردار رافے نے کہنا شروع کیا "ہم لوگ اپنے عظیم سردار بوغات کی موت اور درویش کے ظہور کے درمیان گہرا تعلق سمجھتے ہیں۔ شاید تمہیں یاد نہ ہو، جن دنوں عظیم سردار بوغات یہاں سے کچھ فاصلے پر صحرا میں جاں بحق ہوئے، اس کے فوراً بعد صحرائی درویش نے کھنڈر میں اپنا رنگ جمانا شروع کیا تھا۔ سردار بوغات کے بارے میں ہمارا یقین ہے کہ ان میں دیوتا ذورے کی روح آئی تھی اور ان سے عظیم فیصلے اور کام کرواتی تھی۔ یہ سب کچھ ہمارے قبیلے میں پورے اعتماد سے کہا اور سنا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کے نہایت قدیم ٹکڑوں پر یہ تصدیق شدہ تحریریں بھی موجود ہیں کہ کسی دیوتا کی روح جب کسی شخص کے اندر مسکن بناتی ہے تو اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس شخص کی اپنی روح اس کے جسم سے نکل نہیں جاتی اور عین اس وقت جب اس شخص کی اپنی روح اس کے مادی جسم کو چھوڑتی ہے تو دیوتا کی روح بھی اپنا مسکن تبدیل کرتی ہے اور کسی دوسرے اہل شخص کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ہمیں سردار بوغات کی

موت کے بعد ایک دو ایسی تحریریں بھی ملی ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحرائی درویش ہی عظیم بوغات کے اصل جانشین ہیں۔"

"کیسی تحریریں؟" میں نے پوچھا۔

"قدیم زبان کی تحریریں جو بہت خاص لوگ ہی لکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں کہ وہ تحریریں کس نے لکھی ہیں اور کب لکھی گئی ہیں مگر ان میں سائیں جی کی طرف واضح اشارہ موجود ہے بلکہ اشارے موجود ہیں۔ ان اشاروں میں ہندوستان کا ذکر ہے' لمبے بالوں والے میلے کچیلے شخص کا ذکر ہے اور ایک ایسے بابرکت ہاتھ کا ذکر ہے جس کے سائے میں خوش حالی اور خوشی ہے۔"

سردار راسفے کے انکشاف کے بعد صورت حال مزید واضح ہو گئی تھی۔ اب وہ بے پناہ "عقیدت" زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی جو یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنے درویش کے لیے پائی جاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ عظیم بوغات کی موت کے صدمے سے دوچار ہونے کے بعد انہیں صحرائی درویش کی صورت میں وہی نورانی سہارا پھر سے میسر آ گیا ہے۔

صفدر نے درخواست کے لہجے میں سردار راسفے سے کہا "آپ داماں کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ وہ صدمے سے نیم پاگل ہو رہا ہے' کہیں کچھ کر نہ بیٹھے۔ کئی بار کہہ چکا ہے کہ وہ بھائی کو قتل کر دے گا یا اپنی جان لے لے گا۔"

"میں اسے سمجھاتا ہوں۔ ریو ماؤں نے چاہا تو وہ سنبھل جائے گا۔"

اسی دوران میں واکی ٹاکی پر سگنل نمودار ہو گیا۔ میں نے آن کا بٹن دبایا' دوسری طرف بردہ فروش کنگ براؤن کی آواز تھی۔ اس کے لب و لہجے سے نقاہت عیاں تھی مگر بارعب انداز برقرار تھا۔ وہ بولا "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے شاہ... تم جانتے ہو' ہم بے قراری سے انتظار کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تم بے قراری سے انتظار ہی نہیں کر رہے اور بھی بہت کچھ کر رہے ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"انجان مت بنو برخوردار!" میں نے مار ڈالنے والے لہجے میں کہا "تم سب جانتے ہو۔ جو تازہ ترین حرکت تم نے کروائی ہے اس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری قسمت میں اپنے شیٹو گڑے کو زندہ دیکھنا نہیں ہے۔"

"تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔"

"تم نے سائیں عالی کی مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر انہیں جھٹکے آزمانے شروع کر دیے ہیں۔ تمہارے گماشتوں نے سائیں پر بہتان باندھنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اپنی طرف سے تو تم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی قدرت نے سائیں کی عزت رکھی ہے۔"

"ہماری سمجھ میں تمہاری بکواس اب بھی نہیں آئی۔"

میں نے مختصراً اسے بتایا۔ وہ سنتا رہا' ساتھ میں "ہوں ہاں" بھی کرتا رہا۔ آخر میں حسب توقع اس نے کوئی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ غرا کر بولا "کہیں چوہا پیشاب کرے گی تو اس کا الزام تم ہم پر اور ہمارے ساتھیوں پر لگاؤ گے؟ تم صاف صاف بتاؤ' چاہتے کیا ہو؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔ تیرے پیار کی انتہا چاہتا ہوں۔"

"مسخری مت کرو۔" وہ چلایا تو اسے کھانسی ہونے لگی۔ "مجھے سیدھی طرح بتاؤ' ماسٹر اسٹی کو کب اور کہاں ہمارے حوالے کر رہے ہو؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم میرے اور سائیں کے خلاف سازشیں کب بند کر رہے ہو؟"

"بکو مت' ہم کوئی سازشیں نہیں کر رہے' سازشیں تم کر رہے ہو اور تمہارا وہ بھوتنا درویش کر رہا ہے۔ اس نے ہماری طرف وہ خبیث لڑکی بھیجی جس نے ہمارے اعلیٰ عہدے داروں میں پھوٹ ڈلوائی اور آپس میں انہیں لڑایا۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے' یہ ہمارا وعدہ ہے' وہ بلک بلک کر مرے گی۔"

"کہیں تمہاری شراب میں کسی نے کچھ ملا تو نہیں دیا ہے۔ یہ کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو؟"

"تم بے پر کی اڑاؤ تو وہ ٹھیک ہے' ہم حقیقت حال بتائیں تو وہ الٹی سیدھی ہے۔ ہم جانتے ہیں' سروج نام کی لڑکی یہاں سے نکل کر واپس سائیں کے پاس پہنچ چکی ہے۔"

سروج کے نام نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ مجھے کنگ کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ مجھے پہلے سے شک ہو رہا تھا کہ اقت جاں سروج کی یہاں آمد کسی مقصد سے خالی نہیں ہے' میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہاں کسی مشن پر آئی ہے یا مشن سے فارغ ہو کر آئی ہے۔

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے کہا "کنگ! تم ہوا میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہو۔ وہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔ تمہارا جو نقصان ہوا ہے... اگر واقعی ہوا ہے تو وہ کسی اور نے کیا ہوگا۔"

گیا تھا۔ سروج نے پتلون اور ٹی شرٹ کی جگہ سادہ سی نما مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ کتھئی رنگ کا یہ چست لباس اس کے جسمانی نشیب و فراز کو خوب نمایاں کر رہا تھا۔ سروج کے بال جوڑے کی صورت بندھے ہوئے تھے اور جوڑے میں پھولوں کا ہار تھا۔ سروج کی پنڈلیاں ننگی تھیں اور کلائیوں میں سفید رنگ کی بھاری بھرکم چوڑیاں تھیں۔

حیرت ناک بات یہ تھی کہ سروج زمین پر نہیں چل رہی تھی۔ بوما کی سیڑھیوں پر بہت سے سیاہ فام نوجوان اوندھے لیٹے ہوئے تھے' انہوں نے سیڑھیوں کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ انسانی فرش سا بن گیا تھا' سروج ان نوجوانوں کے اوپر پاؤں رکھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے' جلد ہی وہ مسکراتی ہوئی عبادت گاہ کے اندر داخل ہو گئی۔

"یہ ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔" صفدر نے گہری سانس لے کر کہا "جب دیکھا کہ کنیز ساجے کی حیثیت سے اسے پیار' عزت اور شہرت مل رہی ہے تو یہ بھی اسی طرح کی بن گئی۔ زریں نے بتایا ہے کہ کھنڈر میں واقع پرانی عبادت گاہ کی ایک دیوار پر رقاصہ ساجے کی ایک خیالی تصویر بنی ہوئی ہے۔ سروج نے اسی تصویر کی مدد سے اپنا حلیہ بدلا ہے۔ اسی کی طرح آنکھوں میں کاجل بھی ڈالا ہے اور جوڑا بھی باندھا ہے۔"

"اس طرح حلیہ بدلنے سے اس کا مقصد کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔ خیال یہی ہے کہ شغل کر رہی ہے۔ کل شام میں نے خود دیکھا تھا' بہت سے مرد اور عورتیں باقاعدہ اس کی قدم بوسی کر رہے تھے۔ وہ بڑی شان سے کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اپنے ولی صاحب بھی اس کے آس پاس ہی گھوم رہے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے دونوں میں کوئی گٹھ جوڑ ہے۔ موتی بھی ایک نمبر کا رل پھینک ہے اور یہ سروج تو بنگسی بلی ہے ہی۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سروج عبادت گاہ سے باہر نکل آئی۔ نوجوان مرد سیڑھیوں پر اوندھے لیٹ گئے اور سروج اسی شان سے واپس آئی جیسے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر اب دو سفید لکیریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لکیریں یقیناً عبادت گاہ کے بڑے پجاری نے لگائی تھیں۔ وہ مذہب کے لحاظ سے ہندو تھی مگر اب موقع محل دیکھ کر افریقیوں کے انداز میں عبادت کرنے لگی تھی۔

سروج کو دیکھنے کے لیے میں اور صفدر رہائش گاہ سے باہر نکل آئے۔ سروج سیدھی ہماری ہی طرف چلی آئی۔

اس کی آنکھوں میں شوخ مسکراہٹ تھی "یہ کیا ہو رہا ہے بھئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جو منظور خدا ہو رہا ہے۔ اب ذرا ہوش سے بات کرنا' میں دیوتا کی خاص داسی ہوں' یہ نہ ہو کسی بات پر ناراض ہو کر تمہیں بھسم کر ڈالوں۔"

"جلانا اور بھسم کرنا تو تمہاری خصلت ہے' اس کام کے لیے تمہیں کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہارے ذہن میں میرے خلاف یہ زہر اس پٹھان نے بھر رکھا ہے۔ اس دن مجھے بہت خوشی ہوگی جس دن وہ بھی ان سیاہ فاموں کی طرح میرے سامنے لیٹا ہوگا اور میں اس پر اپنا پاؤں رکھ کر گزروں گی۔"

"جس دن پٹھان کو اس طرح تمہارے قدموں میں بچھنا پڑا وہ تمہیں گولی مار کر خود بھی انا للہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ منہ لگاتے ہوئے اس کی الٹی کھوپڑی سے ڈرا کرو۔ میں نے سائیں عالی سے سن رکھا ہے کہ تمہاری موت کسی پشتو بولنے والے کے ہاتھوں سے ہوگی۔"

"اچھا' مہربانی کر کے زیادہ باتیں مت بناؤ۔ بس چپکے سے یہ بتا دو کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔"

"ایک دم مہراتی۔" میں نے کہا۔

وہ سر جھٹک کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس نے بڑے شاہانہ انداز میں ہاتھ ہلا کر سیاہ فام کارندوں کو کوئی حکم دیا۔ ایک طرف سے ایک ڈولی نمودار ہوئی۔ اس کی دونوں جانب دو لمبے بانس لگے ہوئے تھے۔ ڈولی کا دروازہ تھوڑا سا اونچا تھا۔ بانسوں کو نصف درجن نوجوانوں نے اپنے کندھوں کا سہارا دے رکھا تھا۔ یہ سب ننگ دھڑنگ لنگوٹی پوش تھے۔ ایک ایسا ہی ننگ دھڑنگ ڈولی کے دروازے کے سامنے کسی جانور کی طرح کہنیوں اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ سروج بڑے ناز سے اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر ڈولی میں گھس گئی۔ مزدوروں نے ڈولی اٹھائی اور سروج کو لے کر اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سروج کے اطوار سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈرامے کی رقاصہ بن کر اس کی ساری بوریت دور ہو گئی ہے۔

موتابہ کے حوالے سے بھی صورت حال پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ اس شام میں نے داماں کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ وہ لوگ صبح کے وقت بوما کے اندر کیا کرنے جاتے ہیں۔

وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگا "کوئی خاص بات نہیں جناب لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"مجھے شک ہو رہا ہے داماں کہ تم لوگوں کا باقاعدگی سے

ایک خاص وقت میں ہوما کے اندر جانا موناجہ کے سلسلے میں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں جناب! موناجہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

صاف پتا چل رہا تھا داماں کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی مگر وہ خوف زدہ نظر آنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے کی جھریاں بے تحاشا گہری ہو گئی تھیں۔ میں نے اس سے کالی بھیڑ کے بارے میں پوچھا جو روزانہ صبح منہ اندھیرے ذبح کرنے کے لیے ہوما کے اندر لائی جاتی تھی' داماں نے اس کے بارے میں بھی کوئی واضح جواب نہیں دیا' بس یہی کہا کہ وہ جانور ہوبو دیوتا کے قدموں میں قربان کیا جاتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ موضوع بدل دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ داماں مزید پریشان ہو۔ بہرحال دل میں میں نے طے کرلیا تھا کہ کل صبح سویرے اٹھوں گا اور دیکھوں گا کہ ہوما کے اندر کیا کارروائی ہوتی ہے۔ میں نے پروفیسر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ مجھے صبح تین چار بجے کے قریب جگا دے۔ پروفیسر اب اسپتال سے گھر آ گیا تھا۔ ابھی اس کی طبیعت نارمل نہیں ہوئی تھی۔ وہ پچھلے پہر رات کو اکثر جاگتا ہی رہتا تھا لیکن اس روز وہ مجھے جگا نہ سکا۔ اس نے پانچ بجے کے قریب جگایا' اس وقت تک ہلکا اجالا پھیل گیا تھا۔ میں جانتا تھا بھیڑ ذبح کرنے والی پراسرار تقریب اب واپس جا چکی ہوگی۔

اگلی رات میں نے فیصلہ کیا کہ خود جاگ کر اس وقت کا انتظار کروں گا۔ اس رات پروفیسر اور میں دونوں جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ سائیں عالی کی تعمیر شدہ اس عجیب وغریب بستی کی وسعتوں میں روشنیاں جلتی رہیں' میوزک بجتا رہا' جنریٹرز "گھوں گھوں" کرتے رہے اور رکھوالی کے کتے گاہے بگاہے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے رہے۔ پروفیسر اللہ دتا بھی موناجہ والے واقعے کے بارے میں حیران تھا۔ اگر موناجہ ایک لاش تھی تو پھر اسے دفنایا کیوں نہیں جا رہا تھا اور اگر وہ بفرض محال زندہ تھی تو پھر لکڑی کے بند تابوت میں کیوں رکھا گیا تھا اسے۔ پروفیسر ایک حیرت انگیز معالج بھی تھا۔ اس نے مجھے نبض کی کیفیت اور علم الابدان کے حوالے سے کئی اہم باتیں بتائیں۔

پروفیسر پر اکثر نقاہت طاری ہو جاتی تھی' اس سے زیادہ باتیں کرنا مناسب نہیں تھا لیکن وہ خود ہی گفتگو پر تلا ہوا تھا۔ موناجہ کے بعد مسز جی کلارک کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ جو دو افراد کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے میں نے لانگ رینج کے وائرلیس سیٹ پر اتفاقاً سائیں عالی اور مسز کلارک کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اس گفتگو کی سماعت کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ سائیں عالی کی یہاں موجودگی صرف سائیں عالی کا فیصلہ ہی نہیں ہے' مسز جی کلارک بھی اس میں پوری طرح شریک ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب جی مسز کلارک پس منظر میں رہ کر سارے سلسلے کو فنانس کر رہے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید یہاں پہنچ کر ہم مسز کلارک کی صورت دیکھ سکیں گے' یا ان سے بات وغیرہ کر سکیں گے مگر ابھی تک یہ امید بر نہیں آئی تھی۔ میں سائیں سے دو مرتبہ مسز کلارک کا ذکر کر چکا تھا۔ ایک مرتبہ چیلی صاحب یعنی سروج سے بھی پوچھ چکا تھا مگر کہیں سے کوئی ٹھوس جواب نہیں ملا تھا۔

رات دو بجے کے لگ بھگ پروفیسر کو اونگھ آنے لگی' میں نے اسے سونے کا مشورہ دیا اور خود باہر نکل کر ٹیرس پر ٹہلنے لگا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ صاف آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ تھے اور شبنم تواتر سے برس رہی تھی۔ غزال میرے قریب آن کھڑی ہوئی اور میرے ساتھ ساتھ ٹھنڈی گھاس پر ٹہلنے لگی۔ اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور اس کے گرم ہونٹ میری گردن سے چھونے لگے لیکن یہ سب کچھ تصوراتی تھا۔ میں اس خوب صورت رات میں اس ٹیرس پر بالکل تنہا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں چینا بابی کو سینے سے لگائے گہری نیند سو رہی تھی۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اس رخ پر چلا گیا جدھر سے عبادت گاہ کی عمارت دکھائی دیتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ بھینٹ چڑھانے والے لوگوں کی آمد سے پہلے ہی عبادت گاہ میں چلا جاؤں اور کسی محفوظ جگہ سے وہ تماشا دیکھوں جو روزانہ یہاں کیا جاتا ہے۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں لگا کر کمر سے باندھا اور اوپر سے ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن لی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ربر سول کے جوتے پہن کر میں اپنی رہائش گاہ سے نکل آیا۔ احتیاط سے چلتا ہوا میں عبادت گاہ کے پہلو میں پہنچ گیا۔ اس جانب دیوار قدرے کم اونچی تھی۔ میں دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ کوئی پہرے دار موجود نہیں تھا' یہاں دروازے تمام مقفل تھے۔ عبادت گاہ کی چھت پر پہنچا جائے تو وہاں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سوچ پر عمل کیا اور تھوڑی سی کوشش سے چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ خوش قسمتی سے دروازہ کھلا مل گیا۔ میں نے اندر داخل ہونے کے لیے جوتے اتار دیے کچھ بھی تھا بہرحال یہ کسی کی عبادت گاہ تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں اندرونی حصے میں پہنچا۔ یہاں ہر طرف گہری تاریکی اور

کوئی شے سمجھ رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں بھی ہے تو بھی سائیں کی چیلی ہونے کی حیثیت سے تمہارا احترام کرنا ان کا فرض ہے۔"

"مجھے تو ہر لگتا ہے یہ سب کچھ۔" وہ بڑی ادا سے گھاس پر لیٹ گئی اور ایک پودے کی شاخ توڑ کر منہ کے سامنے ہلا کر خود پر تبسم کرانے لگی۔

میں اس شعلۂ جوالہ کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا جسم نظر بازوں کی سلگتی نگاہوں کا بھوکا رہتا تھا۔ جب وہ محسوس کرتی تھی کہ اسے ہر طرف سے گھورا جا رہا ہے اور اس کے تو بہ شکن نسوانی خدوخال کو ترسی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے تو اس کی خوب صورت آنکھوں میں نشہ تیرنے لگتا تھا۔ یہاں اس کالونی میں آ کر اس کا یہ نشہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اس چمکیلی رات میں آوارہ روح کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی۔

اس کی مخمور نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے گھاس پر بٹھا لیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ "کبھی مجھے یاد بھی کرتے تھے یا نہیں؟"

"بہت زیادہ۔ ہر وقت لاحول پڑھتا رہتا تھا۔"

"بکواس نہیں کرو۔ مجھے درست بات بتاؤ۔ کہتے ہیں کہ راہی جس درخت کے نیچے دو گھڑی کے لیے بیٹھتا ہے وہ درخت بھی اسے یاد رہتا ہے' ہم تم تو پھر بہت قریب رہے ہیں۔"

"تمہارے لیے ہو سکتا ہے کہ وہ سنہری یادیں ہوں لیکن میرے لیے تلخ یادیں ہیں اور اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے کہ میں وہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔"

اس کی آنکھیں نیم باز ہو گئیں "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ہمیں سب یاد ہے ذرا ذرا۔ اف بھگوان تم ویسے کے ویسے کٹھور ہو۔ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی کچھ نہیں جانتے۔" اس نے میرا ہاتھ تھامنے کی ناکام کوشش کی۔

میں نے کہا "اچھا ایک بات بتاؤ' تم بار یا زسٹ میں گئی تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ کنگ براؤن کی زمین دوز دنیا میں؟"

"ہاں گئی تھی۔"

"کیسے؟"

"یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ بہرحال اتنا بتا دیتی ہوں کہ سائیں کی سفارش ہی مجھے وہاں پہنچا یا تھا۔"

"سنا ہے کہ وہاں بہت سے گل کھلائے ہیں تم نے؟"

"بہت سے تو نہیں' بس تین چار۔" وہ ڈھٹائی سے بولی

"دو گل تو ایسے کھلے کہ کھل کر بکھر ہی گئے' ایک باغباں کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ ایک شاخ سے ٹوٹ کر ادھر ادھر پھر رہا ہے۔"

"یعنی' تمہاری بدنظری کا شکار ہونے والوں میں سے دو مر گئے' ایک پکڑا گیا اور ایک ابھی تک تمہارے چکر میں ہے۔"

"یو آر کوائٹ رائٹ۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولی "اور وہ جو چکرایا چکرایا پھر رہا ہے' وہ بڑی بم شے ہے' شاید تمہیں وشواس نہیں ہوگا۔ وہ کنگ براؤن کا خاص اسسٹنٹ راجر ہے۔ ایک عاشقانہ لڑائی میں اس کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے اور ایک ڈیڑھ مہینے سے پہلے وہ بول چال کے قابل نہیں ہوگا۔"

میں چونک کر رہ گیا۔ مجھے راجر کی آخری مختصر گفتگو یاد آ گئی۔ وہ یوں بول رہا تھا جیسے اس نے منہ میں روڑے ڈال رکھے ہوں یا پھر زبردست نشہ کر رکھا ہو۔ شاید یہ "آفت کی پرکالہ" ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ نہایت دانا بینا اور باوقار شخص کو بھی اپنے چلتروں سے گھوڑا بنا لے اور اس کے منہ میں لگام ڈال کر اس پر سوار ہو جائے۔

"تم نے راجر کے ساتھ کیا کیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ مجھے لے کر زسٹ کے "اے کلب" میں چلا گیا تھا۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو کہ "اے کلب" وہ جگہ ہے جہاں زسٹ کی بہترین رنگینیاں اکٹھی ہو گئی ہیں' وہاں باتوں باتوں میں راجر ترنگ میں آ گیا اور اس نے بہت زیادہ پی لی۔ نشہ اتنا زیادہ ہوا کہ اس نے مجھ سے بغل گیر ہونے کے بجائے ایک ستون سے بغل گیر ہونے کی کوشش کی اور یہی نہیں' ستون کے بوسے لینے بھی شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنگ کی فیملی میں سے ایک بندے نے راجر پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل دی' اس پر لڑائی ہوئی اور راجر کو منہ پر سخت چوٹ آ گئی۔"

"تم جہاں جاؤ گی وہاں اسی طرح کے چاند چڑھیں گے۔"

"یہاں تو ابھی تک کوئی چاند نہیں چڑھا۔" اس نے پھر مخمور انداز میں میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔

"تم ایسی کوشش نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔ ٹیرس کافی بلندی پر ہے' تمہیں گر کر کافی چوٹ آئے گی۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی پھر ایک دم اسے نجانے کیا ہوا کہ آگے بڑھ کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ زبردست کھلاڑی تھی وہ۔ ایک ہی لمحے میں اس نے اپنے بدن

کا سارا گداز اور لوچ میرے کندھے میں منتقل کر دیا تھا۔ میں نے بیزاری سے جھٹک کر اسے پیچھے ہٹایا۔ اسی دوران میں نجانے کہاں سے زریں گل نمودار ہو گیا۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ مجھ سے پشتو میں مخاطب ہو کر بولا "استاد صیب! یہ ایک نمبر کا بدمعاش عورت ہے۔ آپ اس کے سائے سے بھی دور رہیں۔ ورنہ ام کو آپ ہی کا قسم ام آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے گا۔"

"پاگل خانے' یہ سائیں عالی کی چیلی ہے اور اس وقت سائیں عالی ہی یہاں سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ تمہارے پیٹ میں جو روٹی ہے' تمہارے تن پر جو کپڑے ہیں اور تمہارے ہونٹ میں جو نسوار ہے وہ سب سائیں عالی کی ہے۔"

"ام کو تو شک ہے جناب کہ...." زریں بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"آگے بھی بکو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "ام کو تو شک ہے جناب کہ سائیں صیب کے پاس ہمارے رفیقے ہی کا دولت ہے۔ جی کلارک صیب نے یہ سارا دولت یا اس کا کچھ حصہ سائیں صیب کو دے دیا ہے۔"

"یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ مسٹر جی کلارک خود بھی امیر کبیر ہستی ہیں۔ یہ دولت وہ اپنے پاس سے بھی سائیں کو دے سکتے ہیں۔"

"ام کو سائیں صیب کی طرف سے کوئی بے اعتباری نہیں ہے' ام ان کا عقیدت مند ہے لیکن یہ جو چیلی ہے یہ ایک دن ضرور امارے ہاتھ سے ضائع ہوگا۔ جب امارا شادی نہیں ہوا تھا' امارا کئی بار دل چاہا تھا کہ اس کو پکڑ کر مسلمان کر دے۔ اس کو اپنا بی بی بنائے۔ ٹوپی والا برقع پہنائے اور اگر یہ گھر سے باہر نکلے تو اس کے نتھنوں پر شہتوت کا ڈنڈا مارے لیکن اب تو ام صرف ٹھنڈا آہیں بھر سکتا ہے۔"

"ارے پٹھان! یہ تم ایک گھنٹے سے کیا بک بک کر رہے ہو۔ یہاں بات کرنی ہے تو اردو میں کرو۔" سروج چیخ کر بولی۔

"اور تم جب فرنگیوں کی زبان میں 'ٹٹ بٹ' کرتا ہے اس وقت تمہیں خیال نہیں آتا؟"

"میں تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتی' جاؤ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"ام خود تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتا' پتا نہیں تجھے سات آٹھ سال میں کتنا کا فرنگ لگا ہے تمہارے منہ سے۔"

سروج اسے باقاعدہ مارنے کے لیے دوڑی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ زریں چیخ کر بولا "استاد صیب' یہ ایک دم خطرناک عورت ہے۔ یہ آپ کو نقصان پہنچائے گا۔ ام کو پورا یقین ہے' ام نے ابھی اس کا ایک ایک بات دیکھا ہے۔"

"کون سی بات؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ آپ سے لپٹا تھا نا؟ پتا ہے کیوں لپٹا تھا؟ آپ کو نہیں پتا لیکن ام نے ادھر کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت غزال بی بی نے سامنے دروازے میں سے جھانکا تھا۔ ام سب دیکھ رہا تھا۔ غزال بی بی کو آپ سے بدظن فرمانے کے لیے اس خبیث نے وہ حرکت کیا تھا۔"

زریں گل کی فرد جرم نے سروج کا چہرہ لال بھبوکا کر دیا۔ ممکن تھا کہ پانی پت کی یہ لڑائی مزید طول کھینچتی مگر اسی وقت سردار رانفے اور داماں وغیرہ واپس آگئے۔ سروج اور زریں دونوں کو خاموش ہونا پڑ گیا۔ سردار رانفے نے داماں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا' پھر بھی داماں کی بوڑھی آنکھوں میں مسلسل آنسو چمک رہے تھے اور وہ بار بار کہہ رہا تھا "مجھے پاک کرا دیں۔ میرے بھائی کو پاک کرا دیں۔ ہمارے گھرانے نے صحرائی درویش کی مقدس ذات پر کیچڑ اچھالی ہے' ہم سے بڑا ظلم ہو ہے۔"

اگلے دو تین روز میں سروج کو مزید شہرت ملی۔ سردار رانفے نے ہمیں جو بات بتائی تھی وہ سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ سائیں عالی کو اگر یہاں ڈورے کا عکس سمجھا جا رہا تھا' سروج کو ڈورے کی رقاصہ کنیز ساجے کا پرتو قرار دیا جا رہا تھا۔ لوگ اب سائیں کی طرح سروج کو بھی جوق در جوق دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ عجب طرفہ تماشا تھا۔ وہ پارسا نہیں تھی اور اس کی یہی صفت اس کی خوبی بن گئی تھی۔ وہ ڈورے کی کنیز تھی اور مقامی عقیدے کے مطابق وہ اپنے جسم اور اپنی عصمت کی قربانی ڈورے کی رضا سے ڈورے کے مقاصد کے لیے دیتی تھی۔

ایک صبح صفدر نے مجھے جگایا اور بولا "شاہ جہاں صاحب! ایک تماشا آپ کا منتظر ہے۔"

"کیسا تماشا؟"

"سروج۔۔۔ عبادت گاہ میں جا رہی ہے۔"

"عبادت گاہ میں؟ یہاں کون سا مندر ہے؟"

"وہ مندر میں نہیں بوما میں جا رہی ہے۔ آپ اس بہروپن کا حلیہ تو ملاحظہ فرمائیں۔"

میں صفدر کے ساتھ کھڑکی میں پہنچا' وہاں سے کالونی کا خوب صورت بوما کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ بوما حال ہی میں جب

والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ پہلے وہ درجنوں میں تھے پھر ہر طرف سر ہی سر نظر آنے لگے۔ "اس گوشے سے نکلنے کے لیے یہ وقت بہترین ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

پتا نہیں کہ موئل کی سمجھ میں آئی یا نہیں' بہرحال اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم نے تھوڑی سی پھرتی دکھائی اور اس کمرے میں سے نکل کر لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔ بوما کا احاطہ بھی اب بھر گیا تھا اور لوگ باہر تک جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان سب کے چہرے اندرونی جوش سے تمتما رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے موئل سے پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ اردو کے الفاظ کی کمی کے سبب خاص وضاحت نہیں کر سکا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ بہت پراسرار تھا اور ہماری آنکھوں کے عین سامنے ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے بند تابوت کے اندر "وتابے" کی لاش کو سانس لیتے دیکھا تھا' یہ جیتا جاگتا منظر میری آنکھوں کے راستے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ میرے سامنے وہ نوجوان مترجم کھڑا تھا جو داماں کی غیر موجودگی میں ہمارے لیے ترجمہ کرتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ نوبس میں کیا باتیں کرنے لگے ہیں؟"

وہ بولا "یہ فیصلہ ہو رہا ہے صاحب!"

"کیسا فیصلہ؟"

وہ میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا "صاحب! صحرائی درویش کی داسی آپ کی کوئی عزیزہ تو نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا "یہ اچھی بات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سخت مصیبت میں گرفتار ہونے والی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ.... ان کو اپنی جان کی قربانی دینا پڑ جائے۔ صورت حال ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے۔"

"تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں صاحب۔۔۔ حقیقت ہے۔ صحرائی درویش کی داسی شاید خود کو جان بوجھ کر قدیم داسی ساجے کے روپ میں پیش کرتی رہی ہیں۔ اس طرح انہیں بے حد عزت اور شہرت ملی ہے مگر اب ان کی یہی شناخت ان کے لیے آفت بننے والی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ایک لارسی ساحرہ کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے۔۔۔ صحرائی درویش کی خاص داسی کو بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔ دراصل یہ لوگ انہیں صحرائی درویش کی نہیں بلکہ ڈورے دیوتا کی داسی سمجھ رہے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ صحرائی درویش کی اجازت سے ایسا ہوگا؟"

"اصولی طور پر تو صحرائی درویش کی اجازت سے ہی ایسا ہوتا تھا لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ صحرائی درویش اس وقت کالونی میں موجود نہیں۔ وہ ہفتے کی رات سے غائب ہیں اور جب بھی وہ ہفتے کی رات کو غائب ہوتے ہیں' تین چار دن تک واپس نہیں آتے مگر جو معاملہ درپیش ہے وہ فوری نوعیت کا ہے۔ اس میں صحرائی درویش کا انتظار ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت یہ بڑے نازک لمحے ہیں۔ اگر فوری طور پر لارسی بزرگوں نے فیصلہ نہیں کیا تو شاید ساحرہ موتابے کبھی زندگی کی طرف نہ لوٹ سکے۔ اس کا زندگی کی طرف لوٹنا بے حد اہم ہے۔ اگر وہ لوٹ آتی ہے تو وہ اتنی غیر معمولی عورت ہوگی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی سابق صلاحیتیں کئی گنا اضافے کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوں گی۔ لارسیوں کا ایک دیرینہ خواب پورا ہو جائے گا۔"

میں تعجب سے مترجم کی باتیں سن رہا تھا' اس دوران میں صفدر اور زریں بھی ہمارے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔ حسب توقع ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

سروج کچھ نیزہ بردار لارسیوں کے گھیرے میں بوما کی طرف آ رہی تھی۔ لارسی اسے بڑے احترام لیکن مصمم ارادے کے ساتھ لا رہے تھے۔ سروج اسی لباس اور حلیے میں تھی جس میں وہ کل نظر آ رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا' سروج کا رنگ اڑا ہوا تھا اور قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اس کی لپک جھپک اور آن بان کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ پوری طرح سنجیدہ ہونے کا لمحہ ہے۔ یہاں کوئی نہایت پریشان کن واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا۔

سروج کو بوما کے بڑے دروازے کے عین سامنے پہنچایا گیا۔ لارسی نیزہ بازوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ بوما کا محرابی دروازہ خاصا بلند تھا۔ دو نوجوان

عجیب سی خوشبو تھی جیسے لوبان وغیرہ کو سلگایا گیا ہو۔ میں بڑی احتیاط سے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوا' یہاں مدھم روشنی تھی۔ یہ روشنی ایک چھوٹے سے آتش دان سے بلند ہو رہی تھی۔ یہاں چربی کے تیل کی مدد سے آگ جلائی گئی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ یہ آگ ہروقت روشن رہتی ہے۔ یہی لگا جیسے میں شب و روز بھڑکنے والی اولمپک مشعل دیکھ رہا ہوں۔ یہ مشعل یا آگ بوبودیوتا کے قدموں میں روشن تھی۔ بوبودیوتا یعنی آگ کا ہاتھی میرے سامنے ایک بڑے مجسمے کی صورت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ یاقوت چمک رہے تھے اور بدن پر بھی قیمتی کشیدہ کاری تھی۔ دیواروں پر رنگین تصاویر بنائی گئی تھیں۔ ان میں بوبودیوتا مختلف حالتوں میں نظر آتا تھا۔ کچھ حالتیں ایسی بھی تھیں جنہیں مخرب الاخلاق کہا جاسکتا تھا مگر ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ بھڑکتی آگ میں دیواروں پر مختلف اشیا کے سائے بھوتوں کی طرح نظر آتے تھے۔ خود میرا سایہ بھی عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رہا تھا۔ بوبودیوتا کے عقب میں میری نگاہ لکڑی کے اس صندوق پر پڑی جس پر عجیب و غریب نقش و نگار تھے اور کسی نامعلوم زبان کے الفاظ درج تھے۔ یقیناً اسی صندوق میں موتابے کی لاش تھی۔ بڑا پراسرار ماحول تھا اور دل نے شدت سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ میں صندوق کے قریب پہنچا' یہاں خوشبوؤں کی لپٹیں زیادہ تھیں۔ صندوق نما تابوت کی چاروں جانب خون کے بے تحاشا چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اردگرد کا فرش بھی خون کے پرانے داغوں سے سرخ تھا۔ میں نے ایک شمع دان میں سے شمع نکالی' اسے آتش دان کی آگ سے روشن کیا اور تابوت کے قریب پہنچ کر احتیاط سے ڈھکنا اٹھا دیا۔

میرے سامنے موتابے کی لاش پڑی تھی۔ مگر لاش سانس لے رہی تھی۔ سینے کا مدھم زیروبم میری نگاہ نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔ میں کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر میں نے نبض ٹٹولی۔ نبض نہیں تھی۔ کافی کوشش کے باوجود میں نبض محسوس نہیں کر سکا۔ کلائیوں کے بعد میں نے گردن اور ٹخنے سے بھی نبض ٹٹولنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ ہاتھ پاؤں بالکل بے حرکت تھے' چہرہ سو فیصد لاش کا تھا' آنکھیں بند تھیں' دھڑکن بند تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔ سانس چل رہی تھی۔ عکس رابو کی بڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ کیسی لاش تھی۔ اگر یہ موت تھی تو سانس کیوں لیتی تھی' اگر زندگی تھی تو دھڑکتی کیوں نہیں تھی۔ ایک بار پھر وہی فقرہ ذہن میں گونجا جو میں پہلے بھی کئی بار دہرا چکا ہوں۔ یقیناً اس دنیا میں بہت کچھ۔۔۔

بہت کچھ ایسا ہے جو ہماری عقل اور ہماری سائنس کے دائرے سے باہر ہے۔

میں نے ڈھکنا آہستگی کے ساتھ دوبارہ بند کر دیا اور شمع بجھا کر واپس شمع دان میں رکھ دی۔ اب مجھے کسی ایسے محفوظ گوشے کی تلاش تھی جہاں سے میں بھینٹ چڑھانے والوں کی کارروائی دیکھ سکتا۔ میں ہال نما کمرے سے نکلا اور ایک چھوٹی سی تاریک راہداری میں آگیا' راہداری کے سرے پر کسی کمرے کا دروازہ تھا۔ تاریکی میں دروازہ نظر تو نہیں آتا تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ دروازہ موجود ہوگا۔ اگر دروازہ تھا تو پھر کمرا بھی تھا۔ میں ابھی دروازے سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک نامانوس آہٹ سنائی دی' یوں لگا جیسے میرے بالکل قریب کوئی ذی نفس موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا بچاؤ کرتا' کوئی بے پناہ طاقت کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا۔ میرے سر کا تصادم عقبی دیوار سے ہوا اور آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ میں نے مدمقابل کے چہرے پر مکا مارا اور پھر گھٹنے کی بھرپور ضرب سے اسے دہرا ہونے پر مجبور کر دیا۔ گھٹنے کی ضرب دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی تھی اور خاصی شدید تھی مگر یہ جان کر مجھے تعجب ہوا کہ مدمقابل کے حلق سے کراہ نہیں نکلی' شاید وہ گونگا تھا مگر گونگے بھی حلق سے آواز تو نکالتے ہی ہیں۔ جوابی وار میرے سینے اور پیٹ کے درمیان کیا گیا' سر کی ٹکر بڑی سخت تھی۔ میں بمشکل برداشت کر سکا۔ اس وار سے مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ میرے حریف نے واقعی میرے گھٹنے کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ مجھے اس کی بے پناہ قوت برداشت کا شدید احساس ہوا۔ میں نے اسی دوران میں اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں نے اسے گھما کر دیوار سے مارا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ اپنا بہترین داؤ استعمال کر سکوں۔ یعنی اس کی گردن داب سکوں۔ اچانک میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مدمقابل نے مجھے دھکیلتے ہوئے منہ سے دبی دبی آواز نکالی تھی۔ میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ یہ موٹل کی آواز تھی۔ میں نے اس کی گردن قابو تو کر لی لیکن زور نہیں لگایا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "موٹل!"

مدمقابل کی گرفت یک لخت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً میرا مدمقابل بھی دیکھ رہا تھا "آ۔۔۔ آپ۔۔۔ شاہ جہاں؟" موٹل کے ہونٹوں سے رکی رکی آواز نکلی۔

"تم یہاں کیسے؟" میں نے پوچھا۔

موٹل نے دیا سلائی جلائی اور ایک موم بتی روشن

لارسی پھرتی سے اس دروازے کے اوپر چڑھ گئے اور انہوں نے وہاں ایک موٹی رسی لٹکا دی۔ یوں لگا جیسے سوان کو پھانسی دینے کا انتظام ہو رہا ہے۔

"یہ کیا خرافات ہے؟" میں نے مترجم سے پوچھا۔

وہ بولا "ڈورے دیوتا کی داسی بے شک لارسیوں کے لیے بے حد قابل احترام ہے مگر اس کو بھینٹ چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے قربان گاہ پر الٹا لٹکایا جائے۔ دراصل اس بھینٹ کی اصل شرط یہی ہے کہ داسی کے جسم کا سارا خون مقدس برتن میں جمع ہو جائے۔ بعد ازاں ساحرہ کی لاش کو زندہ جسم میں تبدیل کرنے کے لیے یہ خون بھینٹ کے خون کی جگہ تابوت پر چھڑکا جائے گا۔"

حالانکہ زریں گل' سوان کا سخت ترین مخالف تھا مگر موجودہ صورت حال نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔ صفدر کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ سوان نے اب باقاعدہ چیخنا شروع کر دیا تھا اور خود کو نیزہ بازوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا خاص انداز میں باندھا گیا جوڑا کھل گیا تھا اور ساڑی نما لباس بھی ابتر نظر آ رہا تھا۔ اس نے حالات کی سنگینی کو محسوس کر لیا تھا اور جان گئی تھی کہ یہ منہ زور جنگلی اس کے ساتھ کوئی "شان دار" قسم کا سلوک کرنے والے ہیں۔

میں ہجوم کو چیرتا ذرا آگے بڑھا۔ اپنے مترجم کو بھی میں نے ساتھ لے لیا تھا۔ چند سیکنڈ میں' میں اس پرہجوم مقام تک پہنچ گیا جہاں لارسی بوڑھے جمع تھے' وہ ہم آہنگ ہو کر مناجات پڑھ رہے تھے' ان کے انداز میں بے حد بے چینی اور عجلت تھی۔ میں نے خود کو ان کروانے ایک بوڑھے سے مترجم کے ذریعے پوچھا کہ وہ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں؟

بوڑھے نے ہیجانی انداز میں جواب دیا "ہم دیوتا کی داسی کو بھینٹ چڑھا رہے ہیں' کیونکہ ساحرہ کو زندہ کرنے کے لیے یہ بھینٹ بہت ضروری ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "تم لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ صحرائی درویش نے صرف نو دن پہلے تم لوگوں کو کیا نصیحت کی ہے۔ انہوں نے انسانی قربانی کو ظلم قرار دیا ہے' اور ایسا کرنے والے کو بدترین مجرم ٹھہرایا ہے' کیا تم لوگ خود کو بدترین مجرم ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

بوڑھے لارسی نے ادب سے کہا "ہم جو کچھ کر رہے ہیں صحرائی درویش کی خاطر ہی کر رہے ہیں' اگر اس داسی کی بھینٹ کے طفیل ساحرہ موتابے زندہ ہو گئی تو وہ اپنی حیران کن طاقت سے تہلکہ مچا دے گی' جہاں تک داسی کی بھینٹ کی

بات ہے تو داسی کوئی عام عورت نہیں ہے' اسے عام انسان کہنا اس کی توہین ہے۔ دراصل تو ڈورے دیوتا کی منظور نظر! اس کی مصاحب ہے' تمہارے ذہن کی رسائی بہت کم ہے' اس خوش قسمتی کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو اس داسی کو ملنے والی ہے۔ بھینٹ چڑھائے جاتے وقت اسے چند لمحوں کی تکلیف ہوتی ہے' وہ ہزار گنا خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگلے جہان میں ایسے ایسے انعامات اس داسی کے منتظر ہیں کہ ہمیں پتا چل جائے تو ہم اس کی جگہ قربان ہونے کے لیے ایک دوسرے کا خون کر دیں۔"

"بزرگوار! میں تمہارے خیالات سے اختلاف نہیں کر رہا' مگر اس لڑکی پر خوش قسمتی کی بارش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ صحرائی درویش سے مشورہ کر لیا جائے۔ ہم۔۔۔"

"میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" بوڑھے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے' اگر ہم نے ساحرہ موتابے کو زندگی کی طرف لانے کے لیے جلد ہی کوئی قدم نہ اٹھایا تو وہ ہمیشہ کے لیے زندگی اور موت کے درمیان لٹک جائے گی۔ یہ بڑے قیمتی لمحے ہیں۔"

بوڑھے لارسی کے کئی ساتھی بھی تیز تیز لہجے میں بولنے لگے۔ ان سب کے چہرے ابھرتے سورج کی دھوپ میں سرخ لگ رہے تھے اور آنکھیں کسی اندرونی وجدان کے سبب چمک رہی تھیں۔ وہ کوئی دلیل کوئی منطق ماننے کو تیار نہیں تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ان کا جنون و خروش ان کی مذہبی ہٹ دھرمی صورت حال کو خطرناک کر دے گی۔ اسی دوران میں اچانک میری نگاہ سردار دراف پر پڑ گئی۔ اس مشکل وقت میں وہی ہماری مدد کر سکتا تھا۔ میں سردار دراف کی طرف بڑھا اور مترجم کی مدد سے اسے سمجھایا کہ اس لڑکی کو کوئی نقصان پہنچا تو سائیں عالی قیامت برپا کر دے گا' یہاں جو کچھ بھی ہوگا اس کی ذمے داری صرف اور صرف سردار دراف پر ہوگی۔

سردار دراف نے غزال کی دی ہوئی عینک ناک درست کی اور بولا "میں خود بھی نہیں چاہتا کہ ایسا ہو مگر بوڑھے افراد کی حیثیت مقدس پجاریوں کی سی ہے۔ قبیلے کے لوگوں پر ان کا زبردست اثر و رسوخ ہے۔ وہ اس وقت مسئلے کا حل لڑکی کی قربانی ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ ہمارے مذہب کا ایک حصہ ہے اور قدیم کتابوں

کردی۔ ہم ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں ہم نے اسی تاریک راہداری میں بیٹھ کر باتیں کیں۔ موبل واقعی حیرت انگیز بلکہ حیرت ناک تھا۔ وہ بڑی تیزی سے اردو سیکھتا جا رہا تھا۔ بہرحال جو کچھ اس نے مجھے اشاروں کنایوں اور الفاظ کی مدد سے سمجھایا' اس سے پتا چلا کہ وہ بھی روزانہ منہ اندھیرے دی جانے والی پراسرار بھینٹ کے حوالے سے تجسس میں مبتلا تھا۔ آج وہ اسی کھوج میں یہاں داخل ہوا تھا۔ اس کی آمد کا وقت مجھ سے صرف دس منٹ بعد کا تھا۔ اسے چھت کا دروازہ کھلا ملا تھا اور وہ خراماں خراماں چلا آیا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہوا تھا کہ ہم نے قریباً ایک ہی وقت میں ایک ہی طریقے سے ایک ہی کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے موبل نے میری نہایت شدید ضرب کتنی آسانی سے برداشت کی ہے' اس کے ساتھ ہی موبل کے بارے میں مجھے وہ تمام ناقابل یقین باتیں یاد آئیں جو میں نے اب تک مختلف لوگوں سے سنی تھیں۔ وہ اندھیرے میں جانور کی طرح دیکھ سکتا تھا۔ بہت دور سے دیکھ سکتا تھا لیکن دوسری حسوں کے مقابلے میں اس میں درد کی حس بالکل کند تھی۔

اچانک کھڑکھڑاہٹ کی آوازوں نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ ہوما کے بیرونی دروازے پر کچھ ارکان موجود تھے۔ یقیناً بھینٹ کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک محفوظ گوشہ پہلے سے دریافت کر لیا تھا۔ یہ ایک اسٹور نما کمرا تھا اور اس کی کھڑکی ہال نما کمرے میں کھلتی تھی۔ مجھے نوے فیصد توقع تھی کہ ہم یہاں نظر میں آنے سے محفوظ رہیں گے۔ ہوما کا بیرونی دروازہ کھلا پھر یکے بعد دیگرے دو مزید دروازے کھلے' ہال نما کمرے میں شمع دان روشن کیے گئے۔ میں نے چند بوڑھے لارسیوں کو دیکھا' ان کی داڑھیاں لمبی اور افریقی طرز کی تھیں' ماتھے پر لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ وہ سب منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور دیواروں پر رینگتے ہوئے ان کے سائے آسیب زدہ تھے۔ میں نے ان میں بوڑھے داماں کو بھی دیکھا۔ بھینٹ کے لیے لائی جانے والی بھیڑ بھی ہال نما کمرے کے اندر پہنچا دی گئی تھی۔ ایک شخص کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بھیڑ کو چند افراد نے مل کر فرش پر لٹایا۔ نیزہ بردار نے کچھ پڑھ کر بھیڑ پر پھونکا پھر نیزہ اتنی زور سے اس کے سینے میں مارا کہ وہ آر پار ہو گیا۔

تڑپتی ہوئی بھیڑ کے سینے سے خون کا فوارہ ابلا اور ایک پرات نما برتن میں جمع ہونے لگا۔ دو چار منٹ بعد دو نوجوان لارسی مردہ بھیڑ کا جسم اٹھا کر لے گئے۔ بوڑھے افراد نے اپنے اپنے چلو میں بھیڑ کا لہو بھرا اور اس کے چھینٹے تابوت نما صندوق پر دیے۔ اس کے بعد تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا گیا اور داماں سمیت تمام لارسی بوڑھے تابوت کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر مجھے مسرت اور کامیابی کے آثار نظر آئے۔ وہ سب آگے پیچھے جھولنے لگے اور تیزی سے کچھ پڑھنے لگے۔ ان کی آنکھوں کی چمک میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' ان کے پڑھنے کی رفتار بڑھتی گئی اور جوش میں اضافہ ہوتا گیا' ان کی نگاہیں مسلسل تابوت پر لگی تھیں۔ ایک بوڑھا آتش دان میں مسلسل خوشبوئیں پھینک رہا تھا۔ ان خوشبوؤں سے سارا ماحول مہکنے لگا تھا۔

کافی دیر یہ سلسلہ جاری رہا پھر یوں لگا کہ جیسے بوڑھے افراد کا جوش و خروش قدرے ماند پڑ گیا ہے۔ ان کی کوئی توقع تھی جو پوری نہیں ہو رہی تھی۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے' اس کے بعد آتش دان میں لوبان اور عنبر وغیرہ پھینکنے والے نے مٹھیاں بھر بھر کر بہت سی خوشبو آتش دان میں جھونک دی اور آتشیں ہاتھی کے قدموں میں ماتھا ٹیک کر ایک ناقابل فہم نعرہ بلند کیا۔ تابوت کے گرد بیٹھے بوڑھوں نے ایک بار پھر زور شور سے ہلنا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی اور سیاہی مائل چہرے اندرونی جذبے سے تمتما رہے تھے۔ عجب وجدانی سی کیفیت تھی یہ۔ ایک جنون تھا' ایک وارفتگی تھی۔ ان کی آوازوں میں ایک پھنکارتی آگ کی سی حدت تھی اور ایک ناقابل بیان فسوں تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ تابوت کے اندر کوئی حرکت ہوئی ہے۔ جیسے کسی خوابیدہ شخص نے ہاتھ پاؤں ہلا کے کروٹ بدلنا چاہی ہو۔ تمام بوڑھے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بہت اونچی آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں کسی نے ہوما کے اندرونی اور بیرونی دروازے کھول دیے۔ بوڑھے اتنی بلند آواز سے پڑھ رہے تھے کہ ان کی آوازیں باہر تک جا رہی تھیں۔ داماں بھی ان لوگوں میں شامل تھا مگر وہ زبانی پڑھنے کے بجائے کسی کتاب سے دیکھ کر کوئی مختلف چیز پڑھ رہا تھا۔ شاید داماں کو اس گروہ میں اسی لیے شامل کیا گیا تھا کہ وہ پڑھا لکھا تھا اور دیکھ کر پڑھ سکتا تھا۔ ہوما کے دروازے کھل گئے تو بوڑھوں کی بلند آوازیں سن کر باہر سے بھی لوگ اندر آنا شروع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے

اس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔"

"کیا لکھا گیا ہے؟"

"ہزاروں سال پہلے جب ڈورے دیوتا اپنے ذاتی وجود کے ساتھ اس دنیا میں موجود تھا اور اس کی رقاصہ کنیز ساجے بھی زندہ تھی تو اسی طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا تھا۔ ایک لارسی ساحر موت کے دروازے میں داخل ہونے کے بعد پھر واپس آیا تھا۔ اسے واپس لانے کے لیے رقاصہ کنیز ساجے کو اپنی زندگی کی قربانی دینا پڑی تھی پھر اس کے بعد یہ روایت چل نکلی پچھلی صدیوں میں پانچ چھ بار اس طرح کا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ ان میں سے دو واقعات ایسے تھے جن میں کسی عظیم ساحر یا ساحرہ کو زندہ کرنے کے لیے ڈورے دیوتا کی کسی خاص داسی کو قربانی دینا پڑی۔ جبکہ داسیاں زیادہ ہوتی تھیں تو قربانی کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے ہوتا تھا مگر اس مرتبہ چونکہ ایک ہی داسی ہے۔ اس لیے اسے ہی اپنا آپ بھینٹ چڑھانا ہوگا۔"

میں ڈورے کے حوالے سے سردار راگے کی خرافات بیزاری سے سن رہا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ وہ خاموش ہو تو میں اپنی بات کروں۔ جونہی وہ خاموش ہوا' میں نے کہا "سردار! تم صرف یہ بتاؤ کہ ہم اس وقت اس لڑکی کو کیونکر بچا سکتے ہیں؟"

راگے نے ناک پر عینک درست کرنے کے بعد گہری سانس لی اور بولا "اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو صحرائی درویش کو ڈھونڈنا پڑے گا لیکن اس کے لیے آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' کیونکہ یہ لوگ بھینٹ چڑھانے میں زیادہ تاخیر برداشت نہیں کریں گے۔ بس دو تین گھڑی میں آپ صحرائی درویش کو یہاں لے آئیں۔ میں کہہ سن کر نگران لوگوں سے تین گھڑی کی مہلت لے لیتا ہوں۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سوج کو لکڑی کے ایک صلیب نما تختے سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اس کے دونوں بازو دونوں اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ سوج کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔ وہ ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ مجھے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی مرنا نہیں چاہتی۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا اور روتی آواز میں مجھ سے کہنے لگی "یہ لوگ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ کیا دوش ہے میرا؟"

"تمہاری بے خبری ہی تمہارا دوش ہے۔ تم خود کو بڑے شوق کے ساتھ ڈورے دیوتا کی کنیز کے طور پر پیش کرتی رہی ہو۔ لوگوں سے اپنی قدم بوسی کرواتی رہی ہو' اب تمہاری یہی شناخت تمہارے گلے پڑ گئی ہے۔ ایک لارسی ساحرہ پر کوئی پراسرار عمل کرنے کے لیے یہ لوگ تمہیں بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔"

"بھگوان کے لیے شاہ جہاں۔۔۔ مجھے ان پاگلوں سے بچاؤ۔ کہیں سے سائیں عالی کو بلاؤ۔ وہ سب ٹھیک کر لیں گے۔"

"سائیں عالی کے بارے میں تم سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ تم ہی بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ہیں؟"

"وہ ہفتے کی شام سے غائب ہیں۔ بھگوان کی سوگند مجھے کچھ خبر نہیں ہے۔ میں نے پچھلے ہفتے پوچھا تھا تو انہوں نے میرے ٹخنوں پر ڈنڈے مارے تھے اور کہا تھا کہ خبردار' اب نہ پوچھنا۔"

"پھر میں کیا کروں۔۔۔ تم ہی بتاؤ۔"

"تم مترجم کے ذریعے ان لوگوں کو بتاؤ کہ میں نے غلط بیانی کی تھی۔ میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں' میں دیوتا کی کنیز نہیں ہوں۔ میں نے صرف بہروپ بھرا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا تعلق انڈین فلم انڈسٹری سے ہے

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 200 روپے

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر علی میاں پبلیکیشنز 7247414

اور تم نے یہ بات ثابت بھی کر دی ہے۔ تم نے کنیز ساجے کے روپ میں اتنی زبردست ایکٹنگ کی ہے کہ اب یہ لوگ تمہاری کسی صفائی کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔"

"دیکھو شاہ جہاں! یہ وقت طنز کے تیر چلانے کا نہیں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"تم تسلی رکھو۔ میں نے ان لوگوں سے کچھ وقت لے لیا ہے۔ وقت ختم ہونے تک یہ لوگ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

میں سروج کو اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ بوما کے اندر اور باہر لارسیوں کا اژدحام تھا۔ بوما میں اس خاص جگہ کو مسلح محافظوں نے گھیرے میں لے لیا تھا جہاں مونابہ کی لاش پڑی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ فرتوت سائیں عالی کو کہاں تلاش کروں۔ میں نے صفدر اور زریں کو ہدایت کی کہ وہ سروج کا خیال رکھیں اور خود سائیں عالی کو ڈھونڈنے نکل گیا۔ موٹل بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم ایک جیپ پر سوار ہوئے اور اس جانب روانہ ہو گئے جدھر ہفتے کی شام سائیں عالی کو جاتے دیکھا گیا تھا۔ میں زریں اور صفدر کو ہدایت کر آیا تھا کہ سروج کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے اور اگر جنونی لارسیوں کو روکنے کے لیے انہیں ہتھیار بھی نکالنا پڑیں تو نکال لیں۔

یہ ایک لق و دق ویرانہ تھا' اس ویرانے میں ہمیں سائیں کا اتا پتا کون بتا سکتا تھا۔ اچانک میری نگاہیں چمک اٹھیں۔ میں نے دور چٹیل صحرا میں ایک ہیولا سا دیکھا۔ اس ہیولے کے ساتھ ایک جانور تھا' یہ غالباً کتا ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ سائیں کا ہیولا ہے۔ آج کل اکثر اس کے ساتھ ایک آوارہ کتا بھی نظر آتا تھا۔ ہم تیزی سے ہیولے کی طرف بڑھے۔ میرا اندازہ درست نکلا یہ سائیں عالی ہی تھا۔ اس کے لمبے بال گرم ہوا میں اڑ رہے تھے' چہرے اور جسم پر راستے کی گرد تھی۔ وہ لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے جیپ اس کے بالکل قریب جا کر روکی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے اچک کر جیپ پر سوار ہوا اور حسب عادت نشست پر بیٹھنے کی بجائے دو نشستوں کے درمیانی خلا میں گھس کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "ہم تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے' ادھر تمہاری کالونی میں تمہاری چیلی کی ایسی کی تیسی ہو رہی ہے۔ تمہارے عقیدت مند اسے سفر آخرت پر روانہ کر رہے ہیں۔"

وہ اطمینان سے بولا "سفر آخرت پر روانہ تو ہونا ہے مگر کچھ اور لوگوں کو ہونا ہے' تمہیں سروج کی طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جنات کی حفاظت میں ہے۔ ایک تو وہ جنات ہیں اوپر سے کمانڈوز بھی ہیں' اب خود سوچو سروج کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

"تم پہلے بھی اس طرح کی تسلیاں دیتے رہے ہو جو غلط ثابت ہوتی ہیں۔ تم نے کہا تھا موگاسا والوں کو کچھ نہیں ہو گا' مگر کنگ نے موگاسا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔"

"بچی جس طرح انسان آخر انسان ہوتا ہے' اسی طرح جن بھی آخر جن ہوتا ہے۔ اس میں بھی بشری کمزوریوں کی طرح جنتری کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس روز میرے جن ذرا... OVER CONFIDENCE کا شکار ہو کر کوہ قاف کے چلغوزے ہوٹل میں ہونے کھانے چلے گئے تھے۔ پیچھے سے یہ سارا کام ہو گیا۔ بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں پھر بھی تم نے دیکھا کہ ہم نے سچویشن کو کس طرح سنبھالا۔ موگاسا پر حملہ کرنے والوں نے بعد میں موگاسا والوں کے پاؤں چھوئے....."

"تم اس وقت کہاں سے رہے ہو؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"میں ذرا بمبئی تک گیا تھا۔ دلیپ کمار اور سائرہ بانو میں تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہی راجندر کمار والا چکر ہے' دلیپ کمار کے دماغ سے ابھی تک شک نہیں گیا ہے' خوامخواہ بیوی کو پابندیوں میں جکڑتا رہتا ہے۔ وہ بھی مزاج کی ذرا تیز ہے۔ سائرہ کی ماں نے بلایا تھا کہ ان دونوں کو ذرا سمجھاؤ۔" سائیں عالی نے حسب عادت ہانکنی شروع کر دی۔

میں ریتلی زمین میں جیپ کو حتی الامکان رفتار سے چلاتا ہوا واپس کالونی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اب سورج کافی اوپر آ گیا تھا' دھوپ کی تمازت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کالونی کی صاف ستھری ہموار سڑکوں پر خوش لباس لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ چمکدار گاڑیاں بھی آمد و رفت جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ہم بوما کے سامنے پہنچے' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بوما کے بلند محرابی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں لٹکتے ہوئے رسے میں سروج عرف الو کی پٹھی کی لاش موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی تمام ظاہری اور باطنی حشر سامانیوں کے ساتھ ابھی تک زندہ ہے۔

سائیں عالی کو دیکھتے ہی سیکڑوں لارسی گھٹنے زمین پر ٹیک کر بیٹھ گئے۔ یہ ان کی عقیدت کا اظہار تھا' بہت سے ایسے بھی تھے جو زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور فرط عقیدت و

احترام سے اپنا چہرہ زمین پر رگڑنے لگے۔ سائیں لاٹھی ٹیکتا ہوا بوما کی طرف بڑھا۔ اس کے گلے میں نوٹوں کے ہار بج پھڑا رہے تھے اور گھنٹیاں آواز دے رہی تھیں۔ بزرگ لارسیوں کے ہمراہ سائیں عالی بوما کے اندر چلا گیا' واماں بھی اس کے پیچھے پیچھے عقیدت سے دوہرا ہو کر چلا جا رہا تھا۔ یہ لوگ تقریباً دس پندرہ منٹ بوما کے اندر رہے پھر باہر آ گئے۔ سائیں عالی سب سے آگے تھا' اس کے عقب میں بوڑھے پجاری اور سردار رانفے وغیرہ مودب انداز میں چلے آ رہے تھے۔ پجاریوں کے چہرے کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ وہ رنگ اور جوش جو صبح سویرے ان کے چہروں پر نظر آتا تھا اب مفقود تھا۔ سردار رانفے کی ہدایت پر چند لارسی محافظ آگے بڑھے۔ انہوں نے پہلے سروج کو جھک کر تعظیم پیش کی پھر اس کی بندشیں کھول کر اسے صلیب نما تختے سے علیحدہ کر دیا۔ سروج بڑی بوکھلائی ہوئی سی تھی۔ وہ سائیں کے پیچھے ہی پیچھے اس کی قیام گاہ کی طرف چلی گئی۔

صفدر نے پوچھا "یہ کیا چکر ہے جناب؟"

میں نے کہا "مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے جتنا تمہیں ہے۔ شاید زریں گل کو کچھ پتا ہو۔"

زریں منہ پھلا کر بولا "ام کو کیا پتا' اور ام کو پتا کرنے کا ضرورت بھی کیا ہے' اس عورت کے مرنے جینے سے ام کو کوئی دلچسپی نہیں۔"

وہ کچھ دیر کے لیے فکر مند ضرور ہوا تھا مگر اب سروج کو صاف بچتے دیکھ کر اس کے اندر کی دشمنی پھر عود کر آئی تھی۔

اسی دوران میں بوڑھا واماں دکھائی دیا۔ میں نے آواز دے کر اسے قریب بلا لیا۔ وہ تھوڑا سا خجل دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے ندامت تھی کہ وہ اب تک ہم سے اس مصروفیت کی تفصیل چھپاتا رہا ہے جس کا تعلق مونابہ کی لاش اور سیاہ بھینس کی قربانی وغیرہ سے تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ کسی طرح کا بوجھ ذہن پر نہ لائے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ لڑکی کی قربانی کس طرح ٹلی ہے۔

وہ بولا "صحرائی درویش نے جو کچھ کہا' وہ سب کو ماننا پڑا اور اس کے ماننے میں ہی سب کی بہتری تھی کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"صحرائی درویش نے فرمایا ہے کہ اس سے پہلے جب کبھی بھی کسی لارسی ساحر کو موت سے زندگی کی طرف لانے کے لیے' دورے دیوتا کی داسی کی قربانی دی گئی ہے' وہ داسی کی رضامندی سے دی گئی ہے۔ قربانی کے لیے قرعہ اندازی ضرور ہوتی تھی تاہم جس داسی کے نام قرعہ نکلتا تھا اس کی خواہش معلوم کی جاتی تھی۔ اگر تو وہ بہ رضا و رغبت بلیدان پر آمادہ ہوتی تھی تو اس کی بھینٹ چڑھا دی جاتی تھی ورنہ دوبارہ قرعہ ڈالا جاتا تھا۔ صحرائی درویش نے فرمایا ہے کہ داسی بلیدان پر آمادہ نہیں لہٰذا اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا' ویسے بھی اس طرح کی قربانی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"اب کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" واماں نے کہا "چونکہ اب مزید کوئی داسی نہیں ہے لہٰذا قربانی کا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مونابہ کی لاش یونہی پڑی رہے گی۔" صفدر نے پوچھا۔

"گستاخی معاف!" واماں نے کہا "آپ اسے اب لاش نہیں کہہ سکتے۔ اس میں زندگی داخل ہو چکی ہے مگر وہ زندگی خود کو ظاہر نہیں کر پا رہی۔ جونہی اس "زندگی" کو مطلوبہ قوت حاصل ہو گئی وہ ہمارے سامنے آ جائے گی۔ سائیں صاحب کا خیال ہے کہ کسی اور طریقے سے بھی ساحرہ مونابہ کو زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ کسی اور شخص کے بلیدان سے داسی کے بلیدان کی کمی پوری ہو سکتی ہے یا ہو سکتا ہے کہ سائیں جی کے مقدس ذہن میں کوئی اور خیال ہو۔"

میرا ذہن گھن چکر بنا ہوا تھا اور یقیناً میرے ساتھیوں صفدر اور زریں وغیرہ کا بھی یہی حال تھا۔ ہم مونابہ کو ایک لاش کی صورت جوڑم بستی سے واپس لائے تھے۔ اب وہ لاش نیم زندہ ہو چکی تھی اور لارسیوں کا خیال تھا کہ عن قریب وہ زندہ ہو جائے گی۔ میرے ذہن میں جوڑم بستی کے آخری مناظر گھومنے لگے' وقت رخصت مونابہ کی لاش دیکھ کر ہم آگ بگولا ہو گئے تھے' جوڑم ساحر بوتارا نے ایک عجیب و غریب دعویٰ کیا تھا' اس نے کہا تھا کہ مونابہ ہمیں مردہ نظر آ رہی ہے لیکن اس کے اندر زندگی موجود ہے' وہ زندہ ہے۔ ہم نے اسے جھوٹا قرار دیا تھا' نتیجے میں وہ بگڑ کر ایک طرف چلا گیا تھا اور واپس نہیں آیا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ اس قدر برہم کیوں تھا۔ وہ ہم سے زیادہ جانتا تھا اور شاید وہ جھوٹ بھی نہیں بول رہا تھا۔

ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔ پروفیسر گاڈ تکیے کے سہارے بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ مونابہ کی پراسرار حالت ہماری گفتگو کا

اصل موضوع تھی۔ پروفیسر نے موتابہ کی کیفیت پر بڑے ماہرانہ انداز میں روشنی ڈالی اور ہمیں بتایا کہ سکتہ، مجبس دم اور ہپناٹزم وغیرہ کے حوالے سے کیا کیا اسرار ہیں عملی تجربے پر ہمارے مشاہدے میں آسکتی ہیں۔ پروفیسر کی باتوں کا حاصل یہ تھا کہ موتابہ کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے' اسے سائنسی سطح پر پرکھنا عین ممکن ہے۔

دوپہر کے وقت موبل عبادت گاہ کا ایک چکر لگا کر آیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ عبادت گاہ میں اب بھی بہت سے پجاری موجود ہیں۔ وہ بوما کے اندرونی حصے میں ہیں' انہوں نے موتابہ کے تابوت کو مسلسل گھیر رکھا ہے۔ مناجات وغیرہ بھی پڑھی جارہی ہیں۔ موبل نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا کہ تابوت کے اندر سے سانس لینے کی زوردار آواز آرہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک بہت بھاری بھرکم شخص گہری نیند میں سانس لے رہا ہے۔ سانس کے ساتھ ایک خاص قسم کی خرخراہٹ بھی سنائی دیتی ہے۔

صبح پیش آنے والے واقعے کی سنسنی خیزی سارا دن بستی میں محسوس کی جاتی رہی۔ کالونی کے لوگ بوما کی طرف آنا چاہتے تھے اور اس لاری ساحرہ کو دیکھنا چاہتے تھے جو موت کے منہ میں جاکر پھر واپس آرہی تھی یا آنے کی "جرات" کررہی تھی' تاہم سائیں کے چاق وچوبند کمانڈوز جنہیں یہاں پولیس کی حیثیت بھی حاصل تھی' لوگوں کو بوما سے دور رکھے ہوئے تھے۔ ہم رات کا کھانا کھا رہے تھے جب واکی ٹاکی پر سگنل نمودار ہوا۔ غزالہ بیزاری سے بولی "ان لوگوں کو تو شاید آپ کے کھانے پینے سے بیر ہے' عین کھانے کے وقت ہی یاد کرتے ہیں۔"

کلثوم معصومیت سے بولی "باجی! آپ جب بھی ایسے بولتا ام کو لگتا جیسے ایک بیوی بولتا۔"

"ہم اپنی بک بک بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔" غزالہ کو سچ مچ غصہ آگیا۔

کلثوم نے سادگی سے سر جھکالیا اور چور نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے واکی ٹاکی آن کیا' دوسری طرف راجر تھا "ہیلو' راجر اسپیکنگ!"

"خیریت ہے بھئی! کیا منہ میں کنکر ڈال رکھے ہیں۔" میں نے اس کے لڑکھڑاتے لہجے پر تبصرہ کیا۔

"تمہارے لیے گنگ براؤن کا ضروری پیغام ہے۔"

"چلو پیغام بھی سن لیتے ہیں مگر پہلے اپنا حال چال تو سناؤ۔ پتا چلا تھا کہ تمہارا کوئی جبڑا شبڑا ٹوٹ گیا ہے۔ شاید کسی لڑکی کا چکر تھا جس کی وجہ سے تمہارا جھگڑا ہوگیا تھا۔"

"میں اس وقت تم سے مطلب کی بات کرنا چاہتا ہوں' اس لڑکی کے بارے میں بات پھر کبھی کرلیں گے۔ گنگ کی طرف سے تمہارے لیے پیغام ہے۔ بوکارلو سخت بیمار ہے۔ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ میں انفیکشن ہوچکا ہے۔ اگر اسے علاج کی بہترین سہولتیں حاصل نہ ہوئیں تو اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کے لیے بہتر ہے کہ ماسٹرا سٹی والا معاملہ جلد سے جلد طے کرلو۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ طے ہوگیا تو بوکارلو بھی تم لوگوں کے پاس واپس آسکے گا۔"

"دیکھو راجر! اگر تم نے ماسٹرا سٹی کو جلد واپس لینے کی کوشش میں کوئی اوچھی حرکت کی تو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

"ہم کوئی اوچھی حرکت نہیں کررہے مگر تم ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کررہے ہو۔"

"اوچھی حرکت اور کیا ہوتی ہے۔ تمہارے گرو گھنٹال نے سائیں عالی کی ساکھ خراب کرنے کے لیے ایک گھٹیا ترین الزام اس پر لگایا' ایک لڑکی کو اس کے خلاف بولنے پر آمادہ کیا۔ یقیناً آئندہ کے لیے بھی تمہارے ذہنوں میں کچھ ایسے ہی منصوبے ہوں گے۔ ان منصوبوں کو ذہن سے جھٹک دو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ تمہارے گرو گھنٹال کو ایک اٹیک ہوچکا ہے اور دوسرے کے امکانات وہ خود پیدا کررہا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں اس کی پھوک نکلتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"تمہاری بولنے کی عادت تمہارے لیے مشکلات پیدا کررہی ہے۔ میں تمہارے منہ لگنا نہیں چاہتا ہوں' صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بوکارلو کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹرا سٹی والے معاملے کو جتنی جلدی ختم کرلو گے تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

واکی ٹاکی پر گفتگو ختم کرنے کے بعد میں نے ساتھیوں کو گفتگو کی تفصیل بتائی۔ صفدر نے کہا "اڑتی اڑتی سی یہ بات تو میں نے بھی سنی تھی کہ محترم بوکارلو بیمار ہیں اور انہیں نرسنگ کے اسپتال میں رکھا گیا ہے۔"

اچانک سڑک پر شور سنائی دیا۔ میں اور زریں کھانے کی میز سے اٹھے اور لپک کر دروازے پر پہنچے' ہم نے چند سفید فام کمانڈوز کو دیکھا' وہ کسی شخص کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ شخص چھلاوے کی طرح ادھر ادھر چکرا رہا تھا اور کمانڈوز کے ہاتھ نہیں آرہا تھا پھر ایک کمانڈو نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے عقب سے دبوچ لیا۔ شاپنگ سینٹر کے عین

سامنے کمانڈوز اپنے شکار کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئے۔ یہ نہایت خطرناک کمانڈوز تھے اور ان کی ایک ایک حرکت سے ان کی بہترین تربیت اور مشاقی کی عکاسی ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کمانڈوز اپنے شکار کو زمین پر لٹا کر بے بس کردیں گے مگر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس شخص نے کمانڈوز سے باقاعدہ دھینگا مشتی شروع کردی۔ ایک کمانڈو کے چہرے پر ٹکر لگی اور وہ اچھل کر شاپنگ سینٹر کے شوکیس سے ٹکرایا۔ دبیز کل شیشہ چکنا چور ہوگیا اور بجلی کی لائٹس دھماکوں سے پھٹ گئیں۔ ایک دوسرا کمانڈو اپنے مدمقابل کے سر پر رائفل کا دستہ آزمانے کے لیے آگے بڑھا تو مدمقابل کے سر کے اوپر سے ہو کر پشت کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی کمانڈوز کے مدمقابل نے ہوا میں الٹی قلابازی لگائی اور ایک قدرے بلند جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میں نے کمانڈوز کے مدمقابل کو دیکھا اور حیران رہ گیا وہ موبل تھا۔ میں اسے کمانڈوز سے بچانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا لیکن مجھ سے پہلے ہی اس کا ایک اور ہمدرد کمانڈوز کے سامنے حائل ہوگیا۔ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں' میں نے اس خوب رو ہمدرد کو دیکھا۔ وہ سروج تھی۔ اس کے بال منتشر تھے۔ اس وقت وہ اپنے سابق لباس پینٹ بوشرٹ میں نظر آرہی تھی۔ وہ موبل اور مشتعل کمانڈوز کے درمیان آگئی اور چیخ چیخ کر کچھ بولنے لگی۔

سروج کی چیخ پکار نے کمانڈوز کو ہاتھ روکنے پر مجبور کردیا۔ اس دوران میں' میں بھی موقع پر پہنچ گیا۔ موبل بڑے سکون سے ایک دکان کے چبوترے پر کھڑا تھا' اس نے شوکیس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی ایک لکڑی ہتھیار کے طور پر تھام لی تھی اور کمانڈوز سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بالکل آمادہ نظر آتا تھا۔

سروج نے کمانڈوز کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا "میں تم لوگوں کو بتا رہی ہوں کہ یہ میری مرضی سے وہاں آیا تھا۔ اب تم لوگ جاؤ یہاں سے۔ سائیں جی کو میں خود جواب دے لوں گی۔"

"لیکن اگر یہ آپ کی مرضی سے آیا تھا تو پھر اس نے دیوار کیوں پھاندی؟" ایک کمانڈو نے اعتراض کیا۔

"دیوار بھی میری مرضی سے پھاندی تھی۔ تم اب زیادہ بحث نہ کرو' جاؤ یہاں سے۔" سروج خاصی تلخی سے بولی۔

کمانڈوز ڈھیلے پڑگئے اور موبل کو خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔

"یہ کیا چکر چل رہے ہیں یہاں؟" میں نے سروج سے پوچھا۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی "کوئی چکر نہیں ہے۔ موبل کو میں نے خود گھر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ میں اس کی گلابی اردو سننا چاہتی تھی۔ یہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ دروازہ بند تھا اور میں سو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے بے وقوفی کی اور دیوار پھاند کر اندر چلا آیا۔ سائیں عالی کے پہرے داروں نے کہیں دیکھ لیا' وہ اس کے پیچھے پڑگئے۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"اتنی سی بات نہیں ہوگی' میں تمہاری خصلت کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم جو مرضی سمجھتے رہو' مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بہرحال ایک بات بتادوں' موبل کو پریشان نہ کرنا۔"

اس نے بڑے انداز سے بال جھٹکے اور لوچ دار چال چلتی واپس چلی گئی۔

میں نے موبل کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑی سادگی سے بتیسی نکال دی۔ پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا تھا یہ شخص؟ ہر قسم کے حالات میں اس کے چہرے پر ایک ہی طرح کے تاثرات رہتے تھے۔ اس میں کئی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔ جن میں حیران کن تیزی سے زبان سیکھنے کی صلاحیت بھی تھی۔ وہ ناقابل یقین رفتار سے اردو سیکھ رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر میں لے آیا۔ موبل کے ساتھ کمانڈوز کی دھینگا مشتی دیکھ کر جو ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا' وہ بھی دھیرے دھیرے منتشر ہونے لگا تھا۔ کمانڈوز کے ساتھ لڑائی میں موبل کے ہاتھ پر چوٹ آئی تھی اور اس کی دو انگلیاں اتر گئی تھیں مگر اسے جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ میں موبل کو سیدھا اپنے کمرے میں لے گیا۔

میں نے اس سے کہا "موبل! دیکھو میں دل سے تمہاری قدر کرتا ہوں' مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ تم سروج کے پاس کیا کرنے گئے تھے؟"

وہ اٹک اٹک کر بولا "اس نے مجھ کو مانگا (بلایا) تھا۔"

"کیوں مانگا تھا؟"

"یہ تو جاکر ہی پتا چلنا تھا۔ دو دن آگے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے گھر آؤں۔"

میں نے کہا "دیکھو موبل! یہ بڑی تیز طرار لڑکی ہے۔ مجھے شک ہے کہ یہ تم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کررہی ہے۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔"

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ یہ خطرناک ہے یا نہیں۔ میں بس دو تین بار ہی اس کے ساتھ سویا ہوں۔"

"سویا ہوں!" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ سوئے ہو؟ رات گزاری

ہے اس کے ساتھ؟"

موہل نے سکون کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ موہل میری توقع سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ جیسے ہر وقت اپنا دل ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا' جہاں کوئی خوب رو نسوانی چہرہ نظر آتا تھا وہ بڑی گرم جوشی سے اپنا دل اس کے حوالے کر دیتا تھا' اور حیرت کی بات یہ تھی کہ فریق ثانی بھی اس "عشق پیشہ لاوی" سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ پتا نہیں کہ اپنے پھٹے پاجامے کی جیب میں وہ کون سی گیدڑ سنگھی لیے پھرتا تھا۔

اس سے پہلے ایک روز صفدر نے میرے سامنے خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید موہل آفت جان سروج کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ آج موہل نے خود بڑی ڈھنائی سے "اقبال عشق" کر لیا تھا بلکہ محبوب کے ساتھ دو تین دفعہ سونے کا انکشاف بھی کیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر ایک جھانپڑ رسید کر دوں مگر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔ پتا نہیں اس کی شوخ آنکھوں میں کیا بات تھی کہ اپنی کئی ایک برائیوں کے باوجود وہ اچھا ہی لگتا تھا۔

میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ذہین موہل کو اندازہ ہو گیا کہ مجھے اس کا انکشاف زیادہ اچھا نہیں لگا۔ اس نے فوراً ٹوٹی پھوٹی اردو میں معذرت پیش کر دی اور مجھ سے کہا کہ اگر میں سروج صاحب سے اس کا ملنا جلنا اچھا نہیں سمجھتا تو آئندہ وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔

میں نے کہا "دیکھو موہل! تم ایک باصلاحیت نوجوان ہو۔ اپنی توانائی اور اپنا وقت یونہی ادھر اُدھر ضائع مت کرو۔ خطرات سے کھیلنا اچھی بات ہے لیکن ہر وقت خود کشی کا موقع ڈھونڈتے رہنا بھی عقل مندی نہیں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا مگر اس کے تاثرات چغلی کھا رہے تھے کہ اس کے جلتے ہوئے سر کا تعلق اس کے دل و دماغ سے ٹم ٹم ہی ہے۔

مجھے رہ رہ کر سروج پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سو سال کی زندگی بس دو چار برس کے اندر ہی گزار لینا چاہتی ہے۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کہیں چین ہی نہیں تھا اسے۔ ابھی کچھ روز پہلے نرسنگ میں گل کھلایا کرتی تھی' اب یہاں آتے ہی پھر گل کاری شروع کر دی تھی۔

دوسرے روز شام کو سائیں عالی کی رہائش گاہ کے عین سامنے کھلے احاطے میں ایک تقریب کا سا منظر تھا۔ رنگ برنگے لباس پہنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں سائیں عالی کے سفید فام ملازمین اور ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ وہ لاوی نوجوان بھی تھے جو چند ماہ پہلے تک اس صحرا میں فقیروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے مگر اب وہ بہترین لباس پہنے اپنے پہلو میں خوش شکل سفید فام لڑکیاں لیے اس ہجوم میں موجود تھے۔ کالونی کے اردگرد موجود خیمہ بستیوں سے بھی بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے یہاں آموجود ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب بے پناہ عقیدت سے اس دروازے کو دیکھ رہے تھے جہاں سے سائیں عالی المعروف بہ صحرائی درویش نے برآمد ہونا تھا۔ صحرائی درویش کو بس دور سے ایک نظر دیکھ لینا ہی ان لوگوں کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان سادہ مزاج لوگوں نے سائیں کو اتنے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کا ہم پلہ نظر آنے لگا تھا۔

یہ تقریب ان بوب دوشیزاؤں کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی جو حال ہی میں سردار وافے نے سائیں عالی کی تحویل میں دی تھیں۔ ان خوب رو صحت مند بوب لڑکیوں کے حوالے سے سائیں عالی نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ آئندہ لاوی ان لڑکیوں کو بھینٹ چڑھانے کے لیے ہرگز استعمال نہیں کریں گے۔ انہیں عام انسانوں کی حیثیت سے دیکھا جائے گا اور عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں عالی پر شادیاں کروانے کا بھوت سوار ہے۔ شاید اس کے بس میں ہوتا تو وہ روئے زمین پر موجود تمام بالغ لڑکوں کو بالغ لڑکیوں کے ساتھ ازدواجی رشتے میں باندھ دیتا۔ اس چھ بوب دوشیزاؤں کے لیے بھی بہت سے دولہا حضرات کا انتظام کیا تھا۔ یہ تمام دولہا حضرات مقامی لوگ تھے۔ ان میں اکثریت لاوی نوجوانوں کی تھی تاہم دوسرے قبائل کے نوجوان بھی ان میں شامل تھے۔ بوب دوشیزاؤں کی کل تعداد ۳۸ تھی۔ ان کے لیے پورے ۸۰ دولہے ہی منتخب کیے گئے تھے۔ انتخاب کا طریقہ انوکھا تو تھا مگر بڑا معنی خیز بھی تھا۔ سائیں عالی کے حکم پر اس کے کارندوں نے ان نوجوانوں کا انتخاب کیا تھا جو اپنی بستی میں سخت ترین کاشت کار شمار ہوتے تھے۔ یہ سب کے سب خاصے مضبوط جسموں والے باہمت نوجوان تھے۔ ان کو نئے لباس دیے گئے تھے اور گھر بسا کر نئی زندگی شروع کرنے کے لیے معقول وسائل بھی مہیا کیے گئے تھے۔ یہ سب نوجوان "نوکری اور چھوکری" ملنے کی امید پر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

تمام کی تمام بوب دوشیزاؤں کو بڑی بڑی چٹانوں پر دو قطاروں کی صورت بٹھایا گیا تھا۔ ان کو نہلا دھلا کر نکھارا گیا تھا اور اچھے لباس فراہم کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں تو خاصی حسین تھیں۔ دولہا بننے والے سیاہ فام نوجوان

بھی دو قطاروں کی صورت چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ سب کو سائیں عالی کا انتظار تھا۔ حسب توقع سائیں عالی کافی تاخیر کے ساتھ برآمد ہوا۔ چیلی سروج بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص لباس پینٹ شرٹ میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا انگ انگ پارے کی طرح مچلتا دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً دو روز پیشتر جو کچھ اس کے ساتھ بیتا تھا وہ کافی حد تک اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ سائیں عالی کے سر پر ایک سبز سی ٹوپی نظر آ رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو اس نے آدھے تربوز کا چھلکا اپنے سر پر ٹوپی کی طرح دھرا ہوا تھا۔

سائیں عالی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا "جتنی بوب لڑکیاں ہیں اتنے ہی امیدوار بھی یہاں موجود ہیں۔ ہر ایک کی خواہش ہو گی کہ سب سے خوب صورت اور صحت مند لڑکی اس کے حصے میں آئے۔ ایسی ہی باتیں جھگڑے فساد کا سبب بنتی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمام نوجوانوں کو ان کی قابلیت کے لحاظ سے نمبر لگا دیے جائیں۔"

سائیں عالی کی بات کا ترجمہ واماں نے بڑی وضاحت کے ساتھ کر دیا اور سائیں کے اگلے فرمان کا انتظار کرنے لگا۔ سائیں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "قابلیت کے مطابق نمبر لگانے کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا پہلے تمام دولہا کھانا کھائیں گے اور دلہنوں کو بھی کھانا دیا جائے گا۔"

سائیں کے بس کہنے ہی کی دیر تھی۔ ایک طرف سے درجنوں افراد کھانے کے طشت لیے ہوئے برآمد ہو گئے۔ اس کھانے میں بڑے سائز کی گرم روٹیاں تھیں اور روسٹ مرغ کی طرز کا سالن تھا' ساتھ میں دہی کی نمکین لسی تھی۔ کھانا شروع ہوا۔ بوب لڑکیاں اپنے مخصوص انداز میں کھا رہی تھیں' انہیں جیسے اپنے اردگرد سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہیں دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے بھیڑ بکریاں اپنی کھرلی میں چارے پر منہ مار رہی ہوں۔ دولہا بننے والے نوجوان بھی سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کھاتے ہوئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کر رہے تھے۔

آدھ گھنٹے بعد کھانا ختم ہوا تو سائیں عالی کی ہدایت پر اس کے کارندوں نے تمام نوجوانوں کے آگے باقی بچ رہنے والے کھانے کا حساب لگانا شروع کر دیا۔ روٹیاں تِنی گئیں' سالن وغیرہ کا معائنہ کیا گیا۔ جن چند ایک فربہ اندام دلہوں نے زیادہ کھایا تھا ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ بسیار خوری کے سبب وہ سائیں عالی کی نظروں میں پسندیدہ قرار نہیں پائیں گے۔ یہ بات ابھی سب کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سائیں عالی نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو نمبر لگانے والی بات کی تھی اس کا تعلق اس کھانے سے ہی تھا۔

سائیں عالی کے بہت سے اوٹ پٹانگ کاموں کی طرح یہ کام بھی بے ڈھنگا ہی نظر آتا تھا۔ سائیں کے کارندے روٹیاں گن گن کر اندازہ لگا رہے تھے کہ کون سے دولہے سرفہرست ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس "اہم مقابلے" کے نتائج آ گئے۔ یہ نتائج موصول ہونے کے بعد سائیں عالی بڑی تمکنت سے ہجوم کے سامنے پہنچا جیسے یہ "کھانے" کے نتائج نہ ہوں قومی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج ہوں اور سائیں ریڈیو اور ٹیلی وژن پر ان نتائج کا اعلان کرنے جا رہا ہو۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "شاید آپ لوگوں کو معلوم نہ ہو اس دلچسپ مقابلے میں وہ دولہا سرفہرست رہا ہے جس نے سب سے زیادہ کھانا کھایا ہے۔ یعنی پانچ روٹیاں اور ڈھائی مرغے۔ اب اس دولہے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بوب دوشیزاؤں میں سے سب سے پہلے اپنی دلہن کا انتخاب کرے' اس کے بعد دوسرے نمبر پر آنے والے کو یہ حق حاصل ہو گا اور اس کے بعد تیسرے نمبر پر آنے والے کو' یونہی یہ سلسلہ آخر تک چلے گا۔"

سائیں نے ذرا توقف کر کے مرچوں والی دودھ پتی کا گھونٹ لیا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "شاید آپ لوگوں میں سے کچھ کو حیرانی ہوئی ہو کہ زیادہ کھانے والا دولہا سرفہرست کیوں ہے۔ ایسے شخص کو تو پیٹو کہنا چاہیے۔ میں اس

سیاہ راکھ کے بگولے کا قصہ جس میں سینکڑوں خبیث قوتیں چکرا رہی تھیں۔

راکھ

قیمت 100 روپے

خوزک آسیب کا حسین روحا سے کیا تعلق تھا؟

ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟

گھنشا کی کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟

تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ درراصل کھانا انسان کے کام کاج کے حساب سے ہونا چاہیے۔ اب یہ سارے نوجوان کاشت کار ہیں۔ یہ سخت جسمانی محنت کا کام ہے' یہ کام وہی شخص زیادہ اچھے طریقے سے کرے گا جو خوب پیٹ بھر کر کھائے گا۔ ہمارے ہاں پنجاب میں جب لوگ کوئی مویشی خریدتے ہیں تو اسے کھرلی پر چرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جو جانور زیادہ چرتا ہے وہ زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔"

سائیں کی بات پر لوگ بہت خوش ہوئے' اور زور و شور سے تائید میں سرہلانے لگے' جیسے سائیں عالی نے حکمت یا فلسفے کی کوئی اعلیٰ و ارفع بات کی ہو۔

کچھ دیر بعد دلہا حضرات کی طویل فہرست تیار ہوگئی۔ سائیں کے حکم پر سرفہرست نوجوان دلہا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے یوب لڑکیوں میں سے نیلی آنکھوں والی ایک خوب رو دوشیزہ اپنے لیے چن لی۔ لڑکی واقعی دلکش تھی۔ سائیں کے حکم پر لڑکی کو اٹھایا گیا اور نوجوان کے پہلو میں لاکر بٹھا دیا گیا۔ وہ بالکل خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی اور اپنے مضبوط دانتوں کی مدد سے سیب کھانے میں مصروف تھی۔ سیاہ فام نوجوان باری باری اٹھنے لگے اور اپنی اپنی دلہن منتخب کرنے لگے۔

زریں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "کاش ام کو معلوم ہوتا کہ اس آزمائش میں زیادہ کھانے والا فاتح قرار پائے گا' ام اس مقابلے میں ضرور حصہ لیتا۔"

"اور بعد میں گل نوم جوتے مار مار کر تمہاری کھوپڑی نرم کردیتی۔" صفدر نے کہا۔

"نہیں صیدر بھائی! ام نے یہ مقابلہ تمہارے لیے کرنا تھا۔ سب سے بہترین یوب لڑکی جیتنے کے بعد ام اسے آپ کے حوالے کردیتا۔ شاید اس طرح آپ کا غم کچھ ہلکا ہوجاتا۔"

زریں گل نے یہ بات ازراہ مذاق کہی تھی مگر اس بات نے صفدر کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ یقیناً ویرا کی یاد بڑی شدت سے اس کے ذہن میں ابھری تھی' وہ ایک دم خاموش سا ہوگیا اور پھر وہاں سے واپس چلا گیا۔ اس کی چال میں ابھی تک نقاہت موجود تھی۔ میں نے زریں کو گھورتے ہوئے کہا "تم بات کرتے ہوئے تھوڑا سا سوچ لیا کرو۔ اگر کھوپڑے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ رکھا ہوا ہے تو اسے استعمال بھی کرنا چاہیے۔"

وہ گڑبڑا کر بولا "ام نے تو کوئی ایسا بات نہیں کیا استاد میب۔ اگر صیدر بھائی کو برا لگا ہے تو ام ابھی جاکر اس سے معافی مانگتا ہے۔"

موول نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "معافی کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں بھئی۔ معافی کا مطلب تمہیں ضرور آنا چاہیے۔ تم جس قسم کے کام کررہے ہو تمہیں معافی کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔"

میرا اشارہ سروج والے معاملے کی طرف تھا مگر بات موول کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ اسی دوران میں سروج بھی لہراتی بل کھاتی موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے ٹی شرٹ کے بالائی دو بٹن کھول رکھے تھے اور ہر کس و ناکس کو اپنے شباب کی جھلک دکھانے کی کوشش کررہی تھی۔ گاہے گاہے اپنے بالوں کو جھٹکنا اور اپنی پھنسی ہوئی ٹی شرٹ کو کھینچ کر درست کرنا اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ ہمارے قریب آکر اس نے بے تکلفی سے موول کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے سرگوشیوں میں مصروف ہوگئی۔ وہ واضح طور پر مجھے زچ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ شاید اسے وہم تھا کہ اس طرح وہ میرے دل میں کسی طرح کا رقیبانہ جذبہ جگانے میں کامیاب ہوجائے گی۔ میں اس کی خام خیالی پر ہنسنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا' اس جیسی عورت کے لیے چند لمحے پریشان ہونا بھی میرے نزدیک زبردست حماقت کے زمرے میں آتا تھا۔

وہ موول کو کھینچنے لگی' غالباً اپنے ساتھ اس پنڈال نما جگہ کی طرف لے جانا چاہتی تھی جہاں یوب دوشیزاؤں کو ازدواجی بندھن میں باندھا جارہا تھا۔ موول جانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کررہا تھا' یقیناً اس کے ذہن میں میری "گل" والی باتیں موجود تھیں۔ سروج کی کھینچا تانی دیکھ کر زریں سے رہا نہیں گیا' وہ بول اٹھا "موول میب چلے جاؤ۔ ورنہ یہ تم کو اغوا کرکے بھی لے جاسکتا ہے' اس کا یہاں بڑا زور چلتا ہے۔"

سروج بھڑک کر بولی "پٹھان! تو اپنی زبان بند رکھ ورنہ گارڈز سے کہہ کر ابھی تیری شلوار ڈھیلی کرا دوں گی۔"

"او چل کام کر۔ اگر تو عورت ذات نہ ہوتا تو تمہاری اس بات کا ام بڑا اچھا سا جواب دیتا۔ امارا خیال ہے کہ تم تین دن پہلے کا وہ بات بھول گیا ہے جب تیرا سب کچھ ڈھیلا ہوگیا تھا۔ اس وقت جان بچانے کے لیے تمہیں لارسی سرداروں کے پاؤں چاٹنا پڑتا تو وہ بھی خوشی سے چاٹ لیتا' آج باتیں آرہی ہیں لیکن اس وقت تیرے اگلے پچھلوں کی بولتی بند ہوگئی تھی۔ کیسے بھک منگوں کی طرح بلک بلک کر کہہ رہا

تھا امروزشی ہے' ام سے دوش ہوا' ام کسی کا کنیز نہیں ہے' بارا جان بخشی فرمادو۔ بس ام کو اور کچھ نہیں کہنا۔"

سروج نے زریں کو بے نقط سنائیں اور چیخ کر بولی "تم پرلے درجے کے بے حس اور احسان فراموش ہو۔ تم بھول گئے ہو کہ چند دن پہلے جو تم بستی میں تمہاری لعنتی زندگی صرف میری وجہ سے بچی تھی۔"

زریں ترت بولا "تمہارا وہ احسان ام نے پرانے کپڑے کے مانند لپیٹ کر واپس تمہارے منہ پر دے مارا ہے۔ پرسوں جب لارسیوں نے تمہیں الٹا لٹکا کر ذبح فرمانے کا ارادہ کیا تھا ام نے ہی تمہارے لیے بھاگ دوڑ کیا تھا اور سائیں عالی کو یہاں لے کر آیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ سائیں جی خود یہاں آرہے تھے۔ تم کچھ نہ کرتے تو بھی وہ یہاں پہنچ جاتے۔"

"لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے اگر لارسی تمہاری ٹانگیں دبوچ لیتے تو کیا ہوتا۔ شاید تم کو خبر نہیں' استاد میب بھی سائیں جی کو ڈھونڈنے چلا گیا تھا۔ اس وقت صرف ام نے اور صیدر بھائی نے تمہارا حفاظت کا ڈیوٹی دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بعد امارا مہربانی مانو کہ ام دونوں تمہارے سر پر موجود رہا اور لارسیوں کو تمہیں ذبح فرمانے کا جرات نہ ہوا۔"

شاید زریں اور سروج کی چخ چخ مزید طول کھینچتی مگر دو خوف زدہ لارسیوں کی آمد نے ہمیں بری طرح چونکا دیا۔ یہ دونوں لارسی سردار رانفے کے پاس پہنچے' سردار رانفے اس وقت سائیں عالی کے قریب کھڑا تھا اور یوب دوشیزاؤں کی اجتماعی شادی میں سائیں عالی کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ لارسیوں نے سردار رانفے کے کان میں ڈری ڈری کھسر پھسر کی۔ سردار رانفے کا تاریک چہرہ کچھ اور بھی تاریک نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی مصروفیت فوراً ترک کی اور لارسیوں کے ساتھ پنڈال سے روانہ ہوگیا۔ سروج نے بھی یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا اور فکر مند نظر آنے لگی تھی۔ میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور سردار رانفے کے پیچھے روانہ ہوا' اب رات کے دس بجے کا عمل تھا۔ کچھ دیر پہلے آندھی کے چند تیز جھکڑ چلے تھے جن کے سبب کالونی کے کئی حصوں سے بجلی رو غائب ہوگئی تھی اور اب یہ حصے گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس تاریکی میں' میں اور زریں تیزی سے سردار رانفے کے پیچھے جارہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رانفے کا رخ بوما کی طرف ہے۔ بوما جہاں پچھلے کئی روز سے موتابہ کی پراسرار لاش پڑی تھی۔ اب تو اسے لاش کہنا بھی عجیب سا لگتا تھا۔ آج صبح سویرے میں اور موول بہانے سے بوما میں گئے تھے۔ اس وقت بھی دو تین بوڑھے لارسی موتابہ کے تابوت کے گرد موجود تھے۔ تابوت کے اندر سے بوجھل سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اس نامانوس آواز کو سن کر دل پر عجیب سا خوف طاری ہوجاتا تھا۔ ایک عجیب سی بے قراری اور ہیجانی کیفیت تھی سانسوں کی اس آواز میں۔ اس آواز کا انوکھا پن یہ بھی تھا کہ یہ کافی بلند تھی' یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے ایک لڑکی کے بجائے کوئی جسیم جانور کھینچ کھینچ کر سانسیں لے رہا ہے۔

ہم دونوں سردار رانفے کے پیچھے ہی پیچھے تاریک بوما میں داخل ہوگئے۔ چار دیواری میں قدم رکھتے ہی احساس ہوا کہ یہاں کوئی انوکھا واقعہ رونما ہوچکا ہے۔ بوما میں جو دو تین پجاری موجود تھے ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے اور معبد کی طرف سے کسی کے رونے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ ہم اس معبد میں داخل ہوئے جہاں بوبوریو تا کا مجسمہ تھا اور ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی۔ موتابہ کا تابوت بھی یہاں موجود تھا۔ تابوت پر پڑنے سے پہلے میری نگاہ ایک لاش پر پڑی اور میں لرز کر رہ گیا۔ یہ ایک جواں سال حبشی پجاری کی لاش تھی۔ حسب رواج اس کے جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور چہرے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ شمع دان کی روشنی میں لاش کے جسم پر کوئی زخم یا خراش وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی' البتہ سینے میں دل کے مقام پر ایک خوفناک گھاؤ تھا اور وہاں سے دل جیسے نوچ کر نکال لیا گیا تھا۔ سینے کے اندر ٹوٹی ہوئی پسلیوں اور بکھری ہوئی نسوں کا منظر وحشت ناک تھا۔ مقتول کی حیرت زدہ آنکھیں چھت کو دیکھ رہی تھیں اور اس کے چہرے اور گردن پر خون کے چھینٹے تھے۔ ایک شخص اس کے قریب بیٹھا گھٹی گھٹی آواز میں رو رہا تھا۔

"او خدایا' یہ کیا ہوگیا۔" زریں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے زریں کی ڈری ہوئی نگاہ کا تعاقب کیا۔ وہ تابوت کو دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا اور اس میں موتابہ موجود نہیں تھی۔

کھلے ہوئے تابوت کو دیکھ کر سردار رانفے کا چہرہ بھی خوف کی تصویر نظر آنے لگا تھا۔ اچانک ایک طرف سے بوڑھا واماں نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور جھریوں بھرا چہرہ ہمیشہ سے زیادہ بوڑھا نظر آرہا تھا۔ اس نے لرزتے لہجے میں کہا "وہی کچھ ہوا ہے جناب! جس کا خطرہ تھا۔ ساحرہ موتابہ تابوت میں سے غائب ہے۔ وہ از خود یہاں سے گئی ہے اور جاتے جاتے اس نوجوان پجاری کی جان

بھی لے گئی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ ہوا ہے جناب اور یہ ہونا ہی تھا۔ مقدس چری کتابوں میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے۔ اگر ساحرہ یا ساحرہ کو زندگی کی طرف لوٹنے کے لیے پجاریوں کی طرف سے مدد نہ ملے تو پھر شیطانی قوتیں اس کی مدد کرتی ہیں۔ ارواح زندہ ہونے میں مدد دیتی ہیں اور پھر اپنے من چاہے راستے پر چلاتی ہیں۔ سوناب زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے مگر مجھے شبہ ہے کہ اس کے سر پر بدی کی قوت مسلط ہو چکی ہے۔ اس کا ثبوت یہ قتل ہے جو ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ہوا ہے۔"

بوڑھے داماں کی باتیں افسانوی رنگ لیے ہوئے تھیں اور کم از کم میری سمجھ میں تو نہیں آ رہی تھیں۔ کسی مردے کا زندگی کی طرف لوٹ آنا میرے لیے ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔ ہاں پروفیسر اللہ رنا کی کچھ باتیں میرے دل کو ضرور لگتی تھیں۔ پروفیسر کا کہنا تھا کہ جوزم بستی میں سوناب کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم اس کے ذہن کے زیرِ اثر تھا اور سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ بقول پروفیسر یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ ساحرہ سوناب نے خود کو شدید خطرے میں دیکھ کر اپنے جسم پر یہ کیفیت از خود ہی طاری کر لی ہو۔ پروفیسر اس سارے معاملے کو "خود ترغیبی" کے حوالے سے دیکھتا تھا۔

سردار رانے نے کانپتے لہجے میں کہا "جو کچھ ہوا ہے بہت برا ہوا ہے۔ ہمیں جلد از جلد سوناب کو ڈھونڈنا ہوگا۔"

میں نے داماں کے ذریعے رانے سے پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ سوناب از خود چل کر یہاں سے گئی ہے؟"

"اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ دو روز تک مسلسل ہم سے مدد مانگتی رہی ہے۔ وہ زندہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کی روح اس کے بے جان جسم کے اندر تڑپ رہی تھی۔ ہم اس کی مدد نہیں کر سکے۔ ہم نے اسے کھو دیا۔ اب وہ ہماری نہیں ہے۔ اس کی حیثیت اب ایک خطرناک باغی کی ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ ہمیں فوری طور پر اسے ڈھونڈنا ہوگا۔"

زریں گل خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ زریں ایک دلیر شخص تھا۔ وہ دس مسلح قاتلوں کو دیکھ کر بھی خوف زدہ ہونے والا نہیں تھا مگر پراسرار معاملات اور مافوق الفطرت واقعات اسے ہمیشہ سے نروس کرتے تھے۔ گھمن میں بھی وہ کئی موقعوں پر بے حد دہشت زدہ ہوا تھا۔

بوما میں پیش آنے والے پراسرار واقعے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پوری کالونی میں پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں مرد و زن بوما کے اردگرد جمع ہو گئے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور مختلف افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ سردار رانے گھوڑے کی سواری کو ترجیح دیتا تھا۔ جیپ یا کار وغیرہ پر بیٹھنا اسے بالکل پسند نہیں تھا لیکن یہ نازک صورتِ حال تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تھوڑی دیر میں جیپ لے کر بوما کے دروازے پر پہنچا اور سوار ہونے پر قائل کیا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت جیپ پر سوار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ سردار رانے کے ساتھیوں میں سے سب اہم داماں تھا۔ جیسا کہ ہمیں بھی معلوم تھا کہ داماں ... اندر کسی جانور یا انسان کا کھرا اٹھانے میں زبردست ... رکھتا ہے۔ داماں کی حیثیت اس علاقے کے تجربہ کار کھوجی کی تھی۔ داماں کے علاوہ زریں اور سوٹل بھی جیپ پر سوار ہو گئے۔ ہمارے پاس رائفلیں تھیں جبکہ رانے کے ساتھی نیزوں سے مسلح تھے۔ رات کے اندھیرے میں کھوجی کے لیے کھرا پکڑنا ایک دشوار عمل ہوتا ہے۔ ... بھی یہ دشواری پیش آئی۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک کالونی کے اردگرد چکراتے رہے۔ پختہ راستوں پر تو کسی طرح کا ... ملنا ناممکن تھا لیکن جہاں پختہ سڑکیں ختم ہوتی تھیں وہاں آگے زمین نرم اور ریتلی تھی۔ ایسی زمین پر قدموں کے ... آسانی سے ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ جلد ہی ہمیں ایک ... کے بیان سے تھوڑی سی مدد بھی حاصل ہو گئی۔ یہ ... ایک گم شدہ بھیڑ کی تلاش میں خیمہ بستی کے اردگرد ... تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس ... لڑکی کا سایہ بڑی تیزی کے ساتھ ان درختوں میں سے ... دیکھا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سایہ لڑکی کا ہو... باوجود ایک مرد کے سائے کی طرح طویل تھا۔

قد کی طوالت سوناب ہی کی خصوصیت تھی۔ ... لڑکی کا جو رخ بتایا تھا اس رخ پر ہم نے تھوڑی سی ... تو جیپ کی تیز ہیڈ لائٹس میں داماں کو نسوانی پاؤں کے ... مل گئے۔ یہ پاؤں دبلا اور لمبا تھا۔ گمان کیا جا سکتا ... سوناب کا پاؤں ہوگا۔ قدموں کے یہ نشانات ان ... طرف جا رہے تھے جہاں درخت اور صحرائی جھاڑیاں ... سے موجود تھیں۔

ہم بڑی احتیاط سے ان نشانات پر چلتے ہوئے بڑھنے لگے۔ سردار رانے اور اس کے دونوں ساتھی صم تھے۔ گاہے گاہے سردار رانے کے ہونٹ ... والے انداز میں ہلنے لگتے تھے۔ شاید وہ کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ "اس طرف کوئی بستی بھی ہے؟" میں نے دا... پوچھا۔

"جی ہاں۔" داماں نے جواب دیا "ٹیلوں کے وسط میں ... پانی کا چھوٹا سا تالاب ہے اس کے پاس بستی موجود ہے۔"

"کیوں نہ نشانات کو یہیں چھوڑ کر سیدھے راستے سے اس بستی میں پہنچیں۔ اگر وہاں کھوج نہ ملا تو واپس ان نشانات پر آ جائیں گے۔"

میری یہ تجویز داماں کو پسند آئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جیپ کو دائیں جانب موڑ کر قدرے ہموار راستے پر لے جاؤں۔

میں نے داماں کی ہدایت پر عمل کیا۔ صرف دس منٹ میں ہم ٹیلوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی تک پہنچ گئے۔ اس صحرائی بستی میں سو کے قریب کچے پکے مکانات تھے۔ رات کافی ہو چکی تھی پھر بھی کہیں کہیں روشنی موجود تھی۔ کبھی کبھی کسی بھیڑ بکری کے بولنے یا اونٹ کے بلبلانے کی آواز آ جاتی تھی۔ ہم نے جیپ بستی کے اندر جا کر روکی۔ یہ ایک چشمہ تھا جس کے گرد ہریالی اور چھوٹے بڑے درخت نظر آتے تھے۔ داماں کی رہنمائی میں ہم سیدھے بستی کے مکھیا کے پاس پہنچے۔ سردار رانے اور داماں نے مکھیا سے بات کی۔ وہ ایک دم ہراساں نظر آنے لگا۔ تاہم وہ بار بار نفی میں بھی سر ہلا رہا تھا۔ اس کے سر ہلانے کا مطلب غالباً یہی تھا کہ وہ بستی میں کسی بھی اجنبی عورت کی آمد یا موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سوئی سوئی آنکھوں والے بہت سے لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ ہماری ہدایت پر بستی کے مکھیا نے بستی کے گلی کوچوں میں سوناب کی تلاش شروع کرا دی۔ ہم خود بھی مسلح حالت میں بستی کے اندر اور اس کے اردگرد چکرانے لگے۔ سردار رانے نے ہمیں تاکید کی تھی کہ اگر سوناب نظر آئے تو ہم اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ ہی اسے جانی نقصان پہنچایا جائے۔ اگر اس پر قابو پانے کے لیے ہتھیار استعمال کرنا ضروری بھی ہو تو صرف اسے زخمی کیا جائے۔

بستی کے لوگوں کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی کہ وہ اپنے گھروں میں محتاط رہیں کیونکہ ایک خطرناک فرد ان کے آس پاس موجود ہے۔ ہم نے قریباً آدھ گھنٹا اس بستی میں سوناب کی تلاش میں گزارا مگر ناکامی ہوئی۔

داماں بولا "میرا خیال ہے کہ ہمیں دوبارہ کھرے کی طرف جانا چاہیے۔"

"مگر کھرے کے ذریعے ہم بڑی سست رفتاری سے سفر کریں گے۔ اس دوران میں وہ تیز رفتاری سے نجانے کہاں سے کہاں نکل جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر یہ تو ہوگا کہ ہم درست سمت میں سفر کریں گے، ادھر اُدھر بھٹکیں گے نہیں۔" داماں نے مودب لہجے میں رائے دی۔

ہم واپس اپنی جیپ تک پہنچے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف سے اندر داخل ہوا اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ سوناب کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم درست جگہ پہنچ چکے ہیں، سوناب یہیں ہمارے اردگرد موجود ہے۔ ہم بستی میں جاتے وقت ایک لارسی کو حفاظت کے لیے جیپ کے اندر ہی چھوڑ گئے تھے۔ اب جیپ کی پچھلی نشست پر اس کی لاش پڑی تھی۔ اس کی گردن سے قریباً پاؤ بھر گوشت غائب تھا۔ یہ گہرا زخم اس بدنصیب لارسی کو عین شہ رگ کے مقام پر لگا تھا اور شاید ایک دو منٹ کے اندر ہی اس کی جان لے گیا تھا۔ میرے بعد سردار رانے، سوٹل اور زریں کی نگاہ بھی لاش پر پڑ گئی۔ ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔

جیپ کی پچھلی نشست خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ مقتول کے گھونگریالے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔

"وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔" داماں نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

سوٹل کی عقابی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس کے حساس نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ بالکل کسی شکاری جانور کی طرح۔

ٹارچ کی روشنی میں، میں نے لاش کو غور سے دیکھا۔ اس شخص کو ہلاک ہوئے بمشکل پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے۔ ایک دم سردار رانے کو نجانے کیا ہوا۔ وہ اچھل کر جیپ کے بونٹ پر چڑھ گیا اور زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستی میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ درجنوں مشعلیں روشن ہو گئیں اور لوگ تیزی سے جیپ کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ ان کے نیم عریاں سیاہ جسم مشعلوں کی سرخی مائل روشنی میں چمک رہے تھے اور ہر آنکھ میں تحیر آمیز خوف ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ سب تیز تیز لہجے میں باتیں کرنے کے علاوہ پر تجسس انداز میں جیپ کے اندر بھی جھانک رہے تھے۔ سردار رانے نے جیپ پر کھڑے کھڑے تقریر کرنے والا انداز اپنا لیا اور لوگوں کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ہدایات دینے لگا۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

"لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ اپنے گھروں کے دروازے بند رکھیں۔ بستی کے چاروں طرف پہرے کا انتظام کریں اور اپنے پالتو اور جنگلی جانوروں کی طرف سے محتاط رہیں۔"

"جانوروں سے محتاط رہیں؟ کیا مطلب؟"

داماں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا "اپنی بات کی صحیح وضاحت تو محترم سردار ہی کر سکتا ہے' تاہم میرا خیال ہے کہ تھوڑا بہت آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

داماں نے اسرار انگیز لہجے میں کہا "ساحرہ موتابہ ایک خاص صلاحیت کی مالک تھی۔ اکثر لارسی پیدائشی طور پر ہپناٹزم (آنکھوں کا جادو) کی تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے ہیں' لیکن کچھ لارسیوں میں یہ صلاحیت غیر معمولی ہوتی ہے۔ موتابہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ اس کی یہ صلاحیت اس پہلو سے خاص الخاص تھی کہ وہ انسانوں کے علاوہ حیوانوں سے بھی ذہنی رابطہ کر سکتی تھی۔ آپ نے جو ڈوم بستی میں دیکھا ہی تھا' ایک رات وہ مرانبے میں گئی تھی اور نواحی جنگل کے بھیڑیے بستی میں وارد ہو گئے تھے۔ اس واقعے سے ایک دن پہلے آپ نے جنگلی کتوں والا واقعہ بھی دیکھا تھا۔"

داماں نے ذکر کیا تو ان واقعات کی یاد ذہن میں تازہ ہو گئی۔ یقیناً وہ ناقابل فہم واقعات تھے۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ موتابہ اپنی اس غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ ان بستی والوں کے خلاف کرے گی؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

"ایسا ضروری نہیں ہے جناب لیکن اس خطرے کو بالکل رد بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لارسیوں کے اپنے عقیدے ہیں۔ ان عقیدوں کے مطابق جب کوئی ساحر عارضی موت کے بعد اس طرح زندہ ہوتا ہے تو اس کی ساحرانہ صلاحیتوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہم لارسیوں کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ایسے ساحروں نے لارسیوں کے لیے گراں قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ چرمی کتابوں میں جگہ جگہ ایسے کارناموں کا ذکر موجود ہے مگر موتابہ کے سلسلے میں مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایک باغی اور سرکش کی حیثیت سے بیدار ہوئی ہے۔"

"تم جن تحریروں کا ذکر کر رہے ہو' ان کے بارے میں تم نے خود ہی کہا تھا کہ ان میں کئی جگہ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے۔"

"میں نے بالکل کہا تھا جناب! مگر موتابہ کی خفیہ صلاحیتوں کا تھوڑا بہت مظاہرہ تو آپ بھی دیکھ چکے! آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ چند روز پہلے تک وہ مکمل ایک لاش کی حالت میں تھی' اب وہ زندہ ہے۔ میں ادب سے عرض کرتا ہوں جناب کہ اگر یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو پھر وہ بھی ہو سکتا ہے جس کا اندیشہ سردار رانے کے دماغ میں ہے۔"

سردار رانے بستی کے لوگوں کو ہدایات دینے کے بعد جیپ کے بونٹ سے اتر چکا تھا۔ اس کا سیاہ چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ہمیں فوراً سائیں جی کے پاس واپس پہنچنا چاہیے اور ان سے رہنمائی لینی چاہیے۔"

"لیکن اگر موتابہ یہاں کہیں آس پاس موجود ہے تو ہماری واپسی تک وہ دور نکل سکتی ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"اگر وہ ہمارے آس پاس ہے بھی تو ہم اسے پکڑنے یا گھیرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔" رانے نے جواب دیا۔ "ہم پانچ افراد ہیں۔ ان جنگلوں میں موتابہ کو تلاش کرنے اور پکڑنے کے لیے درجنوں افراد کی ضرورت ہوگی۔"

"کیا اس بستی کے لوگ ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔

رانے نے بڑے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا "یہ لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے ان میں سے کوئی گھر سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔"

شاید رانے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہماری جیپ کے گرد سے بھیڑ آناً فاناً چھٹ گئی تھی۔ کھڑکیاں بڑی تیزی کے ساتھ بستی کے در و دیوار کے اندر اوجھل ہو رہی تھیں۔ جیپ میں پڑی ہوئی خونچکاں لاش کے ساتھ ہم اس تاریک مقام پر اکیلے کھڑے رہ گئے تھے۔ میں ذرا سیٹ سنبھالنے کے لیے جیپ کی طرف بڑھا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ مولی ہمارے ساتھ موجود نہیں ہے۔ وہ پتا نہیں کدھر نکل گیا تھا۔ میں نے اس کی تلاش میں ہر طرف نگاہیں دوڑائیں مگر تاریکی میں نگاہیں کہاں تک دوڑ سکتی تھیں۔

"زریں گل۔ مولی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"خواستاد سیب! یہ الو کا چرخہ پہلے بھی اسی طرح ہے۔ آپ کو یاد ہی ہوگا۔ جب جوڈم لوگوں نے ام پر حملہ کیا تو یہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ بالکل بے لگام اونٹ کے ماننداس کی طبیعت۔"

ہم نے کچھ دیر مولی کو تلاش کیا' پھر جیپ پر سوار ہو کر کالونی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیپ کے اندر لارسی کی لاش بارل کو بوجھل کر رہی تھی۔

تیز رفتاری سے جیپ بھگاتے ہوئے ہم سیدھے سائیں جی کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ گارڈز نے ہمیں اندر جانے سے روکا۔ میں ذرا سختی سے بولا تو سروج کمان کی طرح تنی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے ایک مہین نائٹی پہن رکھی تھی۔ اس نائٹی کے اندر اس کا بے قرار جسم سر پٹختا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جیپ کے اندر جھانکتے ہوئے بولی "تم لوگوں کے ساتھ مولی بھی تو تھا' وہ کہاں ہے؟"

"وہ وہیں رہ گیا ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"ہائے رام۔ اسے کچھ ہو نہ جائے۔" اس نے زندگی کی ایکٹنگ کی۔

"یہ ناز نخرے ایک طرف رکھو' سائیں کو باہر بلاؤ۔" میں نے جھڑک کر کہا۔

"سائیں جی نہیں آ سکتے۔ وہ خصوصی دعا میں مصروف ہے۔"

میں سروج کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سائیں جی مجھے لرزہ خیز حالت میں نظر آیا' سائیں نے ایک پرات میں مانو بوز کھایا تھا اور پھر اسی پرات میں سر رکھ کر اپنی ناتمامی کی گردن نہیں' یوں الٹی حالت میں' وہ کسی خشک لکڑی کی طرح بالکل ساکت کھڑا تھا۔

"سائیں' کچھ پتا ہے تمہیں' باہر کیا ہو رہا ہے۔ پوری بستی سہمی ہوئی ہے۔"

سائیں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں چند قدم آگے چلا گیا۔ سائیں عالی کو دوبارہ پکارنے کے لیے ہونٹ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ مدھم آواز سنائی دی۔ یہ سائیں کے خراٹوں کی آواز تھی۔ وہ عجیب الخلقت بالدار رہا تھا۔ اور وہ کوئی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ واقعی سو رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اسے ایسے ہی گہری نیند میں سوتے دیکھ چکا تھا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے دھکا دوں اور وہ دھڑام سے فرش پر جا گرے' لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور کیا پتا تھا کہ ایسا کرنے کے باوجود بھی سائیں جاگے گا یا نہیں۔ اس کی طرح اس کی نیند بھی اپنی مثال آپ تھی۔

اسی دوران میں سروج نے عقب سے میرا کندھا تھام لیا "تمہارے لیے شاہ جہاں سائیں جی کو ڈسٹرب نہ کرنا۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی' انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ مجھے ہدایت کر رکھا ہے۔"

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اسن بلاکے سے ذرمان کی کہانی جس کا
نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے
ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت: ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ،
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور
فون: ۷۲۴۷۲۱۴

سٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۸۵۲

"کیا قیامت کھڑی ہو جائے گی؟"

"وہ میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

"اچھی بات ہے اس چمڑی نے ہی تو تمہیں مصیبت ڈالی ہوئی ہے اور دوسروں کی زندگیاں بھی حرام کر رکھی ہیں۔" میں لمبے لگ بھرتا ہوا باہر نکل آیا۔ سردار راے اور دیگر افراد امید بھری نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا "سائیں کوئی وظیفہ کر رہا ہے شاید۔ اگر اس سے زبردستی بات کی گئی تو وہ پٹڑی سے اتر جائے گا اور پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

سردار راے نے جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس نے کہا "اگر سائیں جی وظیفہ فرما رہے ہیں تو پھر انہیں بالکل اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مشکل گھڑی میں وہ ہمارے ہی لیے کچھ کر رہے ہوں۔ مناجات میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ان سے بہت بگڑے کام بھی سنور جاتے ہیں۔"

داماں نے میرا بازو تھاما اور انگلی سے ایک طرف اشارہ کر کے مجھے کچھ دکھانا چاہا۔ میں نے غور سے دیکھا تو نیم تیرگی میں مجھے سائیں کا کتا نظر آیا۔ ہر دم آزاد نظر آنے والے اس کتے کو آج سائیں نے زنجیر ڈال کر ایک درخت سے بندھوا رکھا تھا۔

"آج کتا بندھا ہوا کیوں ہے؟" میں نے ایک گارڈ سے پوچھا۔

گارڈ کے بجائے میرے سوال کا جواب داماں نے دیا۔ وہ بولا "اگر ہم غور کریں جناب تو اس میں ایک اشارہ ہے' ہمیں ایک مصیبت سے آگاہ کیا گیا ہے' اور یہ "مصیبت" وہی ہے جس کا تذکرہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے کیا تھا۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ موتابہ کی بغاوت کی وجہ سے یہاں موجود جانور ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

"اس کا قوی امکان موجود ہے جناب' موتابہ کی پراسرار قوت ہماری دشمنی میں کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ درحقیقت موتابہ کی بغاوت سے ہم سب کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ موتابہ کی وہی غیر معمولی صلاحیت اور شکتی جس کے ذریعے ہم اپنے دشمن کو ناکوں چنے چبوا سکتے تھے اب ہمارے ہی خلاف استعمال ہو سکتی ہے' اور میرے خیال میں وہ لارسیوں کے بہیمانہ قتل کے بعد اس کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔"

سائیں عالی سے ملاقات میں ناکام ہونے کے بعد ہم واپس بوما کی طرف چلے آئے۔ یہاں بہت سے افراد جمع تھے' صورت حال کے بارے میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں سیکڑوں امریکن اور یورپین ملازم بھی ہجوم میں دکھائی دے رہے تھے جو گراں قدر معاوضوں پر یہاں سائیں کی خدمت گزاری کر رہے تھے۔ ایسے اکثر افراد کا نقطہ نظر وہی ہونا چاہیے تھا۔ ان کے خیال میں ایک جادوگر لڑکی کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانا محض ایک افسانہ تھا۔ لڑکی کو کسی نے تابوت میں سے اغوا کیا تھا' اور اغوا کی راہ میں حائل ہونے والے پجاری کو قتل کر دیا تھا۔ اس قسم کی دو تین تھیوریاں بھی ان افراد میں گردش کر رہی تھیں۔ تاہم زندہ لارسی اور دیگر سیاہ فام سخت ہراساں نظر آتے تھے' ان کے خیال میں موگاسا کی تباہی کے بعد اس علاقے پر بدبختی کے مزید سائے منڈلا رہے تھے اور کوئی مزید آفت آنے والی تھی۔ ان کے خیال میں لارسی ساحرہ کا از خود بیدار ہو کر غائب ہو جانا سخت خطرناک تھا۔

سردار راے نے ہنگامی طور پر اپنے جاں نثاروں کا قریباً ایک سو مسلح افراد کا دستہ تیار کیا اور ان لوگوں کو ساتھ لے کر نیلوں میں گھری ہوئی بستی کی طرف روانہ ہوا۔ سردار راے کا مقصد موتابہ کو ڈھونڈنا اور اس پر قابو پانا تھا۔ پجاریوں اور عاملوں کی ایک دس رکنی جماعت سردار راے کے ساتھ روانہ ہوئی۔ یہ مشعل بردار گھوڑوں پر سوار ہو کر نیلوں کی جانب گئے۔

رات کا باقی حصہ اسی طرح بھاگ دوڑ میں گزرا۔ تک موتابہ کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی کوئی نیا واقعہ رونما ہوا۔ سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد سردار راے اپنے دستے کے ساتھ کالونی میں واپس پہنچ گیا۔

میں نو دس بجے کے قریب سو کر اٹھا' بوما میں خاموشی تھا' احاطے میں اور احاطے سے باہر عبادت کرنے والے آ رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ کل رات کے اندر قتل ہونے والے لارسی کی آخری رسومات جاری ہیں' مگر پروفیسر کی زبانی معلوم ہوا کہ قتل ہونے والوں کی رسومات تو آج علی الصباح ہی ادا کر دی گئی تھیں' یہ لوگ ویسے ہی عبادت کے لیے جمع ہیں۔ درحقیقت یہاں پیش آنے والے پراسرار واقعات نے بہت سے لوگوں کو بوما کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنے مسائل کا حل اپنی عبادت گزاری اور مناجات وغیرہ میں ڈھونڈ رہے تھے۔ سارا دن کالونی میں مختلف افواہیں گردش کرتی رہیں' ایک عجیب سی سنسنی فضا میں پائی جاتی تھی۔ سائیں سے ہنوز ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی بیلی سروہی بات بتاتی تھی' سائیں جی ابھی عبادت میں مصروف ہیں۔ موتابہ کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ ایک بے روح تھا۔ پتا نہیں کہ کس جانب نکل گیا تھا۔ غالب یہی تھا کہ وہ موتابہ کے کھوج میں ہی نکلا ہے۔

اگلے روز صبح کے وقت داماں کے ذریعے ہمیں ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ داماں نے بتایا کہ آبادی کے نو تعمیر شدہ جدید اسپتال کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے۔ غالباً ان میں سے کسی سردار کو کوئی حادثہ وغیرہ پیش آیا ہے۔

میں اور داماں موقع پر پہنچے تو صورت حال مختلف نکلی۔ پتا چلا کہ کالونی کے طول و عرض میں رات کئی افراد کو سانپوں نے ڈسا ہے۔ ان میں سے تین چار ہلاک ہو چکے ہیں اور باقی اسپتال میں زیر علاج ہیں۔

داماں نے سرسراتے لہجے میں کہا "مجھے تو یہی لگ رہا ہے جناب کہ یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ان واقعات کا تعلق موتابہ کی واپسی سے ہے؟"

"بالکل جناب' اور مجھے خدشہ ہے کہ یہ صرف ابتدا ہے' ابھی اس قسم کے اور کئی واقعات ہوں گے' دیوتا ہمارے حال پر رحم کریں۔" اس نے اسپتال کے سامنے کھڑی ہوئی ایک بھیڑ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اسپتال کے ایک میڈیکل آفیسر سے بات کی۔ امریکن نے بتایا "کل شام سے اسپتال میں سانپ ڈسے جانے کے تقریباً تیس کیس آئے ہیں۔ ان میں سے افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور چار پانچ ایسے ہیں جن کی حالت تشویش ناک ہے۔"

میں نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟ اتنی زیادہ تعداد میں سانپ کے کیس آنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

امریکن ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ یہ سب کچھ حیران کن ہے۔ مقامی لوگ تو اس صورت حال کو بالکل اور رنگ میں پیش کر رہے ہیں' بہرحال ہمارے لیے بھی یہ کافی پریشان کن ہے۔ اس قسم کی صورت حال کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ بعض اوقات کسی خاص سبب سے جانور اور حشرات وغیرہ مائیگریٹ کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کسی وائرس کا شکار ہو کر معمول سے زیادہ جارح ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی سازش کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"

امریکن ڈاکٹر کافی دیر تک اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اس معاملے کی سائنسی اور علمی توضیح تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا' اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک بات بالکل بھول رہا تھا۔ وہ تاریک براعظم میں تھا۔ وہ افریقہ کے ایک دور دراز علاقے میں تھا۔ ایک ایسا علاقہ جس کی مٹی کا خمیر ہی پراسراریت سے اٹھا تھا۔

سانپوں سے ڈسے جانے کا واقعہ تھوڑی ہی دیر میں کالونی کے طول و عرض میں مشہور ہو گیا۔ خوف کی لہر تو پہلے ہی موجود تھی اب وہ مزید بلند ہو گئی۔ لوگ احتیاطی تدابیر میں مصروف ہو گئے۔ بے شمار لارسی صحرائی ٹیلوں کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے وہ چوڑے پتوں والی ایک خاص جڑی بوٹی توڑ توڑ کر لائے۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ جہاں اس بوٹی کی شاخیں موجود ہوتی ہیں وہاں کوئی بھی زہریلا جانور مثلاً شہد کی مکھی' بچھو یا سانپ وغیرہ حملہ نہیں کرتا۔

اسی قسم کی اضطرابی کیفیت کالونی کی حدود سے باہر خیمہ بستیوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ سائیں عالی کے عقیدت مندوں کی یہ بستیاں کالونی سے باہر بہت دور تک پھیل گئی تھیں اور ان کی وسعت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق سائیں عالی کی قربت سے فیض یاب ہونے کے لیے کالونی کے گرد و نواح میں جمع ہو رہے تھے۔ شاید سائیں کو خود بھی اتنی پذیرائی اور محبت کی توقع نہیں تھی جتنی اسے یہاں مل رہی تھی۔

داماں نے مجھے بتایا "خیمہ بستیوں میں لوگ زیادہ پریشان ہیں۔ یہ خیمہ بستیاں کھلے علاقے میں ہیں اور وہاں سانپوں وغیرہ سے حفاظت کا موثر بندوبست کرنا بھی آسان نہیں۔"

"کیا وہاں بھی کل رات سانپ سے ڈسنے کے واقعات ہوئے ہیں؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

وہ بولا "حیرت کی بات تو یہی ہے جناب۔ یہ سارے واقعات کالونی کے اندر ہوئے ہیں اور محفوظ ترین جگہوں پر ہوئے ہیں۔ اب اسی پختہ عمارت کو لیں جس میں آپ رہ رہے ہیں۔ یہاں کسی کیڑے مکوڑے کا داخل ہونا بھی آسان نہیں' کجا یہ کہ سانپ داخل ہو جائے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی سروج وہاں آ دھمکی۔ یہ تیسری بار تھی کہ وہ ہماری رہائش گاہ پر وارد ہوئی تھی۔ زریں' کلثوم' غزالہ' صفدر سب وہیں موجود تھے "سب کو نمستے" اس نے اندر داخل ہوتے ہی بڑی ادا سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

غزالہ فوراً ہی نانی کو دیکھنے کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ سورج کو دیکھتے ہی غزالہ اپ سیٹ ہو جاتی تھی۔ ماضی کی کچھ تلخیاں شاید ایک دم اس کے ذہن میں ابھر آتی تھیں۔ سورج نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "موہل کہاں ہے؟"

"ہم موہل کے پہرے دار نہیں ہیں کہ ہر وقت اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"تم اس سے اتنا چڑتے کیوں ہو۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"خوچے اس نے نہیں بگاڑا تم نے بگاڑا ہے۔" زریں بے دھڑک بولا "اور مسلسل بگاڑتا جا رہا ہے۔ پتا نہیں کہ ہماری کس خطا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تم کو پھر ہم پر نازل فرما دیا ہے۔ تم جاؤ یہاں سے۔ ہم کو کچھ پتا نہیں ہے کہ تمہارا وہ چھ لگنا کہاں ہے۔"

"میں تم سے نہیں پوچھ رہی ہوں۔ تم اپنی زبان بند رکھو۔ میں تم سے پوچھ رہی ہوں شاہ جہاں، تم پرسوں اس کو ساتھ لے کر گئے تھے اور ادھر ہی چھوڑ آئے ہو۔ کیا میرا اتنا سا ادھیکار (حق) بھی نہیں کہ میں اس کے متعلق پوچھ سکوں۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ تمہارا ادھیکار تو ہر اس مرد پر ہے جو نہیں اچھا لگے۔ تمہارے لیے اگر سرکاری سانڈنی کا لفظ استعمال کیا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔"

"دیکھو شاہ جہاں! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں سائیں جی سے تمہاری شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ ۳۶ گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک موہل واپس کیوں نہیں آیا اور اگر وہ نہیں آیا تو کیا تم لوگوں کا فرض نہیں کہ اسے تلاش کرو؟"

"وہ یہاں کا باسی ہے، چپے چپے سے واقف ہے۔ ہم اسے ڈھونڈنے نکلیں گے تو خود گم ہو جائیں گے پھر وہ ہمیں ڈھونڈتا پھرے گا۔ اگر تمہیں زیادہ بے قراری محسوس ہو رہی ہے تو راماں کو ساتھ لے جاؤ اور دو چار باڈی گارڈ لے لو۔"

"اور گانا گاؤ ۔۔۔ میرے سجن چلا بھی آ۔ چلا بھی آ۔" زریں نے بڑے دردبھرے لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" سورج کے کان کھڑے ہو گئے۔

"کچھ نہیں۔ یہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا۔" میں نے مداخلت کی۔ سورج پھر بھی زریں کو کینہ توز نظروں سے گھورتی رہی۔

"ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں اس کی تلاش میں۔" طیش کے عالم میں بال جھٹک کر بولی پھر اس نے راماں کو ساتھ لیا اور نکل گئی۔ زریں بڑے دھیان سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ابھی میری پاکٹ سے ریوالور نکال کر اعشاریہ تین آٹھ کی گولی اسے ٹھونک دیتا۔

سورج کے جانے کے بعد وہ بڑبڑایا "اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت کا دروازہ کھولتے کھولتے پھر بند کر دیا۔ یہ الو کا بچہ اس روز اللانک کر قربان ہو جاتا تو اس قربانی کے طفیل سب پر سے بلا ٹل جاتی۔"

"چلو دعا کرو اللہ تعالیٰ ایسا کوئی اور موقع پیدا فرمائے۔" صفدر نے کہا۔

"آمین ثم آمین۔" زریں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ایسے بددعا نہیں دیتے۔" شائستہ نے منع کیا۔

"وہ خود بددعا ہے، اس کو ہم بددعا دے گا تو بددعا کھلا گا۔" زریں نے پختہ یقین کے ساتھ کہا۔

سردار راسنے اور اس کے ساتھیوں نے دن بھر موہل کی تلاش جاری رکھی۔ وہ اردگرد کے پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ پجاری اور عامل وغیرہ بھی تھے جو مختلف انداز سے مناجات اور عملیات جاری رکھے ہوئے تھے۔ سردار راسنے نے اپنی طرف سے ایک اعلان جاری کیا تھا۔ اس اعلان کے مطابق اس نے لارسیوں اور دیگر قبائلیوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ ان دنوں میں خود کو بستی تک محدود رکھیں اور جنگلی و پالتو جانوروں کی طرف سے خصوصی احتیاط برتیں۔

رات کو میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پراسراریت اس سارے ماحول میں آکسیجن کی طرح رچی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہم ہوا میں نہیں پراسراریت میں سانس لے رہے ہیں۔ آج صبح سے سانپوں کا خوف ایک حقیقت کی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور اس کی تصدیق ہر مقامی اور غیر مقامی شخص نے کی تھی۔ پروفیسر نے شائستہ سے کہہ کر رہائش گاہ کے تمام دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کروا دیے تھے اور ملازمین سے کہا تھا کہ وہ گھر کے کونے کھدرے اچھی طرح دیکھ بھال لیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم تو صاف ستھرے اور محفوظ مکان میں موجود ہیں لیکن جو لوگ جو کھلے جنگل میں خیمہ زن ہیں اور افواہوں کے زیر اثر ہیں وہ کتنے پریشان ہوں گے۔

رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ ہماری رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک ریستوران میں ایلوس پریسلے کا

انگریزی نغمہ فضا میں گونج رہا تھا "میرے خدا مجھ پر ایسے ہی مہربان رہنا"۔ کبھی کبھی چکنی سڑک پر پھسلتی ہوئی کسی گاڑی کا ہارن سنائی دے جاتا تھا یا رکھوالی کے کتے ایک ساتھ مل کر شور مچانے لگتے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ جس بیڈ روم میں غزالہ اور تابی سوتے ہیں اس میں ایگزاسٹ فین کے لیے ایک خلا موجود ہے جو باہر سے اچھی طرح بند نہیں ہے۔ اسی خلا کے ساتھ ہی باہر کی طرف ایک نہایت گھنی بیل بھی موجود تھی۔ ایسی بیلیں عموماً حشرات الارض کے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتی ہیں۔

دل میں وہم کا بیج پڑ گیا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ جا کر اس روشن دان کا کوئی سدباب کر دوں۔ میں بستر سے اٹھا۔ سلیپر پہنے اور غزالہ کے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میری آواز پہچان کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سلیپنگ گاؤن کے اندر اس کا کومل بدن کسی پھول دار شاخ کی طرح لچکتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بالوں کو ایک گلابی ربن کے ساتھ باندھ رکھا تھا، آنکھوں میں نیند کا نشہ تھا۔ بے اختیار جی چاہا کہ ہر مصلحت کو ایک طرف رکھ کر اسے سینے سے لگا لوں لیکن پھر وہ وعدہ ایک دیوار کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو گیا جو نروسٹ میں میرے اور غزالہ کے درمیان ہوا تھا۔ میں اس وعدے کی حد میں رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس وعدے کی رو سے طے تھا کہ جب تک "شیخ عاصم" کا مکروہ سایہ ہمارے درمیان موجود ہے، ہم ایک دوسرے سے دور رہیں گے اور جب یہ مکروہ سایہ درمیان سے نکل جائے گا تو پھر ہم ماضی کو یکسر فراموش کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

غزالہ نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ یہ گھر "سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ" تھا۔ باہر ایک شدید گرم رات کا ڈیرا تھا مگر اندر اکتوبر نومبر کا سا خوشگوار موسم تھا۔ تابی ڈبل بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے گندمی چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت تھی۔ "خیریت تو ہے؟" غزالہ نے پوچھا۔

"اب تک تو خیریت ہی تھی۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ ابھری۔

"تم سے دور رہ کر خوش رہتا ہوں، قریب آتا ہوں تو خود کو دنیا کا سب سے محروم انسان تصور کرتا ہوں۔"

"دور رہ کر خوش رہتے ہیں تو پھر دور ہو جائیں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"بعض اوقات زیادہ خوشی سے بھی تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے جسے شادی مرگ کہتے ہیں۔ شاید میرے ساتھ بھی پھر ایسا ہی ہو۔"

"اچھا اس وقت آپ کیا چاہتے ہیں؟" وہ ادا سے بولی۔

"میرے چاہنے کی بات نہ کرو ورنہ بہت دشواری ہو گی تمہیں۔"

اس کے حسین چہرے پر شفق کا رنگ بکھر گیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ میں نے اسے مزید تاؤ سے بچانے کے لیے تیزی سے موضوع بدلا "میں ذرا تمہارے کمرے کو دیکھنے آیا تھا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ روشن دان دیکھ رہی ہو؟" میں نے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا "وہی پریشان کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"شاید آپ کے ذہن میں کل رات والے واقعات ہیں۔"

"کیا تمہارے ذہن میں نہیں ہیں؟ میرے خیال میں اور تم تھوڑا بہت ڈر بھی رہی ہو۔ غالباً اسی لیے سوئی بھی نہیں ہو۔ ویسے نہ سونے کی تو ایک سو ایک وجوہات ہو سکتی ہیں۔" میں نے پھر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"جی نہیں۔ کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں بس سو ہی رہی تھی۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔ وہ مسکراہٹ چھپانا چاہ رہی تھی۔ میں بیڈ کی نکڑ پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور روشن دان کا جائزہ لینے لگا۔ میرے کہنے پر غزالہ نے مجھے ایک چادر دے دی۔ میں نے اس چادر کا گولا سا بنایا اور اس کے ذریعے روشن دان کو اچھی طرح بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکایا۔ یہ آواز ہماری رہائش کے بالکل سامنے سے ابھری تھی۔ یہ دو تین افراد کے بے طرح چیخنے کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک منحوس شور بھی میرے کانوں میں پڑا پھر دو تین فائر ہوئے۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ میرے پاس ریوالور ہے یا نہیں۔ ریوالور موجود تھا۔ میں جست لگا کر نیچے اترا۔

"کیا ہوا؟" غزالہ نے چیخ کر پوچھا۔

میں اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا تاکہ اسے اندر سے لاک کر سکوں۔ ابھی میں نے بمشکل دروازے کے ہینڈل کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ ایک زوردار چھناکے کے ساتھ ایک کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو کر گرا اور ایک سیاہی مائل جنگلی کتا جست بھرتا ہوا اندر

داخل ہوا۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے ریوالور نکالا' خوں خوار جانور اس وقت تک غزالہ کے سر پر پہنچ چکا تھا' غزالہ چیخ کر ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی' اس کی آنکھیں دہشت ناک انداز میں وا تھیں۔ میں نے ریوالور دونوں ہاتھوں میں تھام کر جانور کے سر کا نشانہ لیا۔ گولی اس کی گردن میں لگی اور وہ اچھل کر ڈبل بیڈ پر گرا۔ نابی چند لمحے پہلے ہی چیختا ہوا بیدار ہو گیا تھا۔ جنگلی کتے کو اپنی گود میں گرتے دیکھ کر اس کی چیخیں فلک شگاف ہو گئیں۔ غزالہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر نابی کو اٹھایا اور میری طرف لپکی' اس وقت تک ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے ایک اور کتا جست بھرتا ہوا اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس نے عقب سے غزالہ پر جھپٹا مارا' غزالہ نابی سمیت اوندھے منہ قالین پر گری۔ میں نے بلا توقف دو فائر مزید کیے اور یہ کتا بھی ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہماری رہائش میں کم از کم ایک درجن کتے گھس آئے ہیں اور ہر طرف اودھم مچا رہے ہیں۔ میں نے قریبی کمرے سے شائستہ کی چیخیں سنیں۔ پتا نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ میں لپک کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی طرف گیا۔ میں نے ایک چوبی الماری کو دھکا لگانا شروع کیا تو غزالہ بھی نابی کو چھوڑ کر میرے ساتھ شریک ہو گئی۔ اس آٹھ فٹ اونچی الماری کو ہم نے کھڑکی کے عین سامنے لا کھڑا کیا۔ بس کھڑکی کا پانچ چھ انچ ٹکڑا الماری کے عقب میں محفوظ ہونے سے رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے کم از کم جنگلی کتا تو داخل نہیں ہو سکے گا۔

تڑپتے پھڑکتے کتوں کو دیکھ کر نابی مسلسل چیختا چلا جا رہا تھا۔ غزالہ نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور خوف زدہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے ریوالور کا چیمبر دیکھا اور یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ صرف ایک گولی باقی تھی۔

غزالہ نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "یہ کیا ہو گیا ہے شاہ جہاں؟"

غزالہ کا سوال بے معنی تھا۔ وہ خود بھی دیکھ رہی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے زیادہ فکر پروفیسر اور شائستہ کی تھی۔ پروفیسر اتنا کمزور تھا کہ مشکل سے چل پھر سکتا تھا' خبر نہیں کہ وہ اپنا دفاع کر بھی سکا تھا یا نہیں' پھر شائستہ تھی' کلثوم تھی۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں دروازہ کھولنا چاہ رہا تھا۔ مگر جب غزالہ اور نابی پر نگاہ پڑی تو حوصلہ ڈھے سا گیا۔

"غزالہ تم نابی کو لے کر باتھ روم میں گھسو اور اندر سے کنڈی چڑھاؤ۔"

غزالہ نے تیزی سے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ باہر کتوں کا شور تھا اور نسوانی چیخیں ابھر رہی تھیں۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ سامنے راہداری میں موجود دو قد آور کتے وحشی درندوں کی طرح مجھ پر جھپٹے ایک کی کھوپڑی میں میری گولی نے سوراخ کر دیا' دوسرے نے اچھل کر میرا بازو اپنے منہ میں جکڑا۔ میں اپنا بازو اس کے شکنجے سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا' اچانک ایک قریبی کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے کلثوم اور زریں کو دوڑ کر سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ دوسری منزل میں داخل ہوئے اور آہنی دروازہ انہوں نے زور سے بند کر دیا۔

اسی دوران میں' میں بھی اپنی آستین کتے کے جبڑے سے چھڑانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں واپس کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ غزالہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس نے میرے زخمی بازو کو دیکھا اور لپک کر میرے پاس چلی آئی۔ درحقیقت میری آستین ہی کتے کے جبڑے میں آئی تھی' صرف ایک دو جگہ دانتوں کے نشان آئے تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔

"باہر کیا ہو رہا ہے؟" غزالہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ سب لوگ اوپری منزل پر چلے گئے ہیں۔ یہ ان کے لیے اچھا ہی ہوا ہے۔ ابھی میں نے دروازہ کھولا تو راہداری میں کھڑے کتوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کا فائدہ یہ ہوا کہ کلثوم اور زریں کو بھاگ کر بالائی منزل پر جانے کا موقع مل گیا۔"

"وہ دیکھیں۔" غزالہ نے خوف زدہ انداز میں ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

الماری کے عقب میں سے کھڑکی کا جو تھوڑا سا شیشہ دکھائی دیتا تھا' اس میں دو کتوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے' وہ غرا رہے تھے اور بے قراری سے اپنے سروں کو دائیں بائیں حرکت دے رہے تھے۔ ہمارے جسموں کی بو پا کر وہ جیسے دیوانے سے ہو رہے تھے۔

"اب کیا ہو گا شاہ جہاں؟" غزالہ نے میرے قریب سمٹتے ہوئے کہا۔ نابی اس کی بانہوں میں تھا۔

"ہم تو کافی حد تک محفوظ ہو گئے ہیں۔ پریشانی دیگر لوگوں کی ہے' یقیناً اور کمروں میں بھی اسی طرح کتوں کی یلغار ہوئی ہے۔"

غزالہ بولی "باتھ روم کی کھڑکی سے چیخیں صاف سنائی

دے رہی تھیں۔ سامنے والے مکان کی چھت پر بھی میں نے ایک کتے کو دیکھا ہے۔"

میں غزالہ کے ساتھ باتھ روم میں پہنچا۔ کھڑکی پانچ فٹ کی بلندی پر تھی۔ یہاں سے ایک قریبی مکان اور ہیولی سڑک کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ریستوران کی جانب سے یکے بعد دیگرے کئی فائر سنائی دیے۔ اس کے بعد کتوں کی آواز اور پھر پے در پے چیخیں ابھریں۔ یوں لگتا تھا کہ کالونی میں افراتفری کا عالم ہے' ابھی ایک منٹ پہلے اسپتال کی طرف سے بھی رائفل اور شاٹ گن کے کئی فائر سنائی دیے تھے۔

اچانک غزالہ کی چیخ نکل گئی۔ آوازوں سے اندازہ ہوا تھا کہ جنگلی کتوں کی ایک اور ٹولی دندناتی ہوئی اندر گھس آئی ہے۔ کچھ کتے بڑی شدت کے ساتھ کھڑکی پر حملہ آور ہوئے اور کھڑکی کے باقی دو شیشے بھی چکنا چور کر دیے۔ اگر ہم بروقت الماری کو کھڑکی کے سامنے کھڑا نہ کر دیتے تو ہمارا بچنا محال تھا۔ لکڑی کی بھاری بھرکم الماری اور کھڑکی کے بیچ جو تھوڑا سا خلا تھا اس میں کئی کتوں نے اپنی تھوتھنیاں گھسا دیں اور اندر گھسنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ ان کی بدبودار سانسوں سے کمرے کی فضا متعفن ہونے لگی۔ میں نے الماری کو سہارا دے رکھا تھا کہ کہیں وہ اپنی جگہ سے کھسک نہ جائے۔

صورت حال سخت تشویش ناک تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جنگلی کتوں کے کئی گروہ کالونی میں داخل ہو گئے ہیں' اور یہ آدم خور جانور سیکڑوں کی تعداد میں گھروں کے اندر چکرا رہے ہیں۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر راستی کا خیال بھی آ رہا تھا۔ راستی گھر کی بالائی منزل پر چند ہوشیار لارسی محافظوں کی نگرانی میں تھا۔ اس افراتفری میں اسے کوئی نقصان پہنچ جاتا یا وہ آفت زادہ نکل بھاگتا تو ہمارے لیے شدید مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ اس وقت ہماری سلامتی اور آزادی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ راستی خیر خیریت کے ساتھ ہماری تحویل میں رہے۔

میں نے اپنا خالی ریوالور بیڈ پر پھینک دیا۔ اسی بیڈ پر قد آور کتے کی خونچکاں لاش پڑی تھی۔ دوسری لاش سرخ قالین پر تھی اور اسے سرخ تر کر چکی تھی۔ مجموعی طور پر کمرے کی صورت حال ایسی تھی کہ کمرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ معصوم نابی نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر چھوڑا تھا۔

ہم دونوں خاموش تھے مگر ہمارے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ وہ تمام اندیشے حرف بحرف درست ثابت ہوئے تھے جو پچھلے دو تین روز سے ہمارے اندر پروان چڑھ رہے تھے اور جن کا ذکر بار بار سردار رافے وغیرہ نے کیا تھا۔ سردار رافے نے کہا تھا کہ موتاپہ جس طور سے زندگی کی طرف لوٹی ہے وہ ہم سب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوگی۔ رافے نے موتاپہ کی اس صلاحیت کا ذکر کیا تھا جس کے ذریعے وہ حیوانات کے ذہنوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ آج ہم ان سارے اندیشوں کو ٹھوس حقیقت کی صورت اپنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ ہم سب کل رات کے واقعات سے پریشان تھے اور سانپوں وغیرہ کی دخل اندازی کے خلاف انتظامات کر رہے تھے مگر آفت ایک اور شکل میں ٹوٹ پڑی تھی۔ ہم میں سے کوئی توقع نہیں کر رہا تھا کہ اس طرح DOGS AFRICAN HUNTING سے ملاقات ہو جائے گی۔

کتوں کا شور ہماری رہائش گاہ کے اندر واضح جانب سنائی دے رہا تھا۔ یہاں ایک اسٹور تھا اور اسٹور کے ساتھ وہ چھوٹا سا کمرا تھا جس میں U.P.S کے علاوہ ائرکنڈیشننگ پلانٹ وغیرہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کتوں کا ایک گروہ اس مختصر کمرے میں گھس گیا ہے اور وہاں توڑ پھوڑ کر رہا ہے۔ اسی طرح کی دخل در معقولات کچن کی طرف جاری تھی۔ بستی کے مختلف حصوں سے گاہے گاہے فائرنگ کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی کتوں کا شوروغل مزید بلند ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں ہماری رہائش گاہ کے اسٹور روم کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی زوردار آواز سنائی دی۔ کتوں کی دھما چوکڑی کے سبب شاید کچھ برقی تار گڈمڈ ہو گئے تھے۔ غزالہ کے بیڈ روم میں ٹیوب لائٹ اور پنکھے کے اندر یکایک بڑی تیز برقی رو آئی پھر وہ ایک دم مدھم ہو گئے۔

دو کتے آپس میں لڑتے جھگڑتے اور غراتے ہوئے ہمارے کمرے کے دروازے کے عین سامنے پہنچ گئے۔ وہ کئی بار دروازے سے ٹکرائے اور ہر بار ان کے ٹکرانے سے دل ہلا دینے والی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر جھانکا اور ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ خوں خوار کتے گوشت کے ایک لوتھڑے پر لڑ رہے تھے' اور یہ لوتھڑا انسانی جسم کا حصہ تھا۔ یہ غالباً پیٹ یا سینے کی کھال تھی' اس خون آلود کھال پر انسانی بال صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ یہ کھال سیاہ نہیں تھی۔ گندمی تھی یا پھر سفیدی مائل تھی۔ کیا کہا جا سکتا تھا کہ یہ کس بدنصیب کے جسم کا حصہ ہے۔ ایک ہی سیکنڈ کے اندر پروفیسر' صفدر' زریں وغیرہ کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاتا محسوس

ہوا۔

"بیزار ہو رہے ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔ وہ میرے قریب جھک آئی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں نے سوراخ سے آنکھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ غزالہ سوراخ میں سے جھانکنے کی کوشش کرے۔ شکر کا مقام تھا کہ اس نے اصرار نہیں کیا۔

جسم میں عجیب سی نقاہت اتر گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حالات ہمیں کس رخ پر لے جارہے ہیں' رہ رہ کر اسٹی کا خیال ذہن میں آرہا تھا۔ اس افراتفری میں اگر ہم اسٹی پر گرفت قائم نہ رکھ سکتے تو یہ ہمارا بہت بڑا نقصان ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک خطرہ اور بھی تھا۔ کالونی کی زبردست افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ہمارے اصل دشمن یعنی زرشی بھی کسی کارروائی پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

"کولنگ کچھ زیادہ نہیں ہو گئی۔" غزالہ نے اسٹی کو بازوؤں میں چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے بھی لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

غزالہ بغور اس پوائنٹ کو دیکھ رہی تھی جہاں سے ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈی ہوا کمرے میں داخل ہوتی تھی۔ عمارت میں ایسے ہی بہت سے پوائنٹ موجود تھے۔ میں نے بھی محسوس کیا کہ ہوا زیادہ تیزی سے کمرے میں آرہی ہے اور یہ زیادہ ٹھنڈی بھی ہے۔ شاید تاروں کے گنڈلہ ہونے سے جو شارٹ سرکٹ ہوا تھا اس نے گڑبڑ کی تھی۔ اس عمارت میں نصب شدہ طاقت ور ائر کنڈیشننگ یونٹ جدید طرز کا تھا' اس میں کئی طرح کے فنکشن موجود تھے۔ جس مشین میں زیادہ فنکشن ہوتے ہیں اس کی خرابی بھی پیچیدہ ہوتی ہے۔ غزالہ نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ ائر کنڈیشنر میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔"

"ہاں ٹھنڈ بڑھتی جارہی ہے۔" میں نے تائید کی۔

"کہیں یہ برداشت سے باہر ہی نہ ہو جائے۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی ٹمپریچر حیران کن حد تک کم ہو گیا۔ کمرے کے جن پوائنٹ سے ٹھنڈی ہوا خارج ہوتی تھی وہاں سے باقاعدہ دھند کی شکل میں منجمد ہوا نکلتی نظر آرہی تھی۔

"بہت سردی ہو گئی ہے۔" غزالہ نے سکڑتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھاری کپڑا ہے تو نکال لو۔" میں نے کہا۔

"دو تین چادروں کے سوا کوئی کپڑا نہیں ہو گا۔" وہ سسکاری لے کر بولی۔

میں ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے قریب پہنچا۔ ہاتھ نکال کر کمرے سے باہر کا ٹمپریچر محسوس کرنے کی کوشش کی۔ میری توقع کے مطابق اندر باہر کا ٹمپریچر ایک ہی تھا۔ عمارت کی ساری نچلی منزل شدید کولنگ کی زد میں آ گئی تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ دونوں بیرونی دروازے بھی بند تھے اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ٹمپریچر گرتا چلا جارہا تھا۔ طرفہ تماشا تھا۔ ایک نہایت گرم رات کے بطن میں ہم سردی سے ٹھٹھرنا شروع ہو گئے تھے۔ کولنگ کے ساتھ ساتھ گیس کی ناگوار بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ غزالہ کا خیال تھا کہ یہ امونیا گیس ہی ہے۔

دس منٹ کے اندر صورت حال یہ ہو گئی کہ ہم تینوں خود کو فریج کے فریزر میں محسوس کرنے لگے۔ تابی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

جنگلی کتے بدستور ہمارے اردگرد موجود تھے۔ میں نے غزالہ سے کہا "ہر خراب صورت حال کا ایک روشن پہلو بھی ہوتا ہے۔"

"مثلاً کیا؟" وہ تابی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"ممکن ہے اس شدید سردی اور بو سے گھبرا کر کتے یہاں سے راہ فرار اختیار کر جائیں۔"

"فی الحال تو ایسے آثار نظر نہیں آتے۔" وہ مایوسی سے بولی۔

دو چار منٹ بعد اچانک ٹیوب لائٹ کی روشنی بالکل مدھم پڑ گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ائر کنڈیشنر کا زہری یوشن یونٹ مزید تیزی سے سرد ہوا پھینکنے لگ گیا۔ اس بند عمارت کے اندر ہم ایک عجیب چویشن میں پھنس گئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ درجہ حرارت صفر سے بھی نیچے چلا گیا ہے۔ غزالہ شب خوابی کے مہین لباس میں تھی۔ میں اور تابی بھی معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سردی ہم سب کی ہڈیوں میں گھستی چلی جارہی تھی۔

"کوئی ہے' کوئی یہاں ہے؟" میں نے کئی بار زور سے آواز دی۔

اس آواز کا جواب کمرے کے اردگرد موجود کتوں کے سوا اور کسی نے نہیں دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہمارے سوا باقی سب مکینوں نے بالائی منزل کے محفوظ دروازوں کے پیچھے پناہ لے لی ہے۔

ہماری رہائش گاہ سے باہر کی صورت حال بھی سنگین

ہوتی چلی جارہی تھی۔ آہٹوں اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ رات بھیگنے کے ساتھ ہی کتوں اور گیدڑوں کے کچھ اور گروہ کالونی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب ہر طرف ان کا شور و غل تھا اور ان کی چھینا جھپٹی کی آوازیں تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح لگتا تھا مگر یہ خواب نہیں تھا۔ ہم اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر یا الماری کو اس کی جگہ سے کھسکا کر ابھی اس خونی حقیقت کا مزہ چکھ سکتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آج اردگرد کے ویرانے میں موجود تمام تر جنگلی کتوں کا رخ اس کالونی کی طرف ہو گیا ہے اور آج وہ یہاں موجود ہر شے کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں۔

میں نے بیڈ شیٹ اتار کر اسے دو دیگر چادروں کے ساتھ جوڑا اور اسے غزالہ اور تابی کے گرد ایک بکل کی صورت میں لپیٹ دیا۔ خود میں ہاتھ بغلوں کے اندر دبا کر ایک کونے میں سمٹ گیا۔ بے موسم کی مصنوعی ٹھنڈ ہڈیوں کے اندر اترتی جارہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ہڈیوں کے گودے کو بھی جما ڈالے گی۔ اگر میں اس کمرے کے اندر سے نکل سکتا تو چند سیکنڈ کے اندر بجلی تار کاٹ کر یا کسی اور طریقے سے ائر کنڈیشنر کو بند کر سکتا تھا' مگر کمرے سے نکلنا ہی اصل مسئلہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ طاقت ور ائر کنڈیشنر جو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک ہمارا خدمت گار تھا' بغاوت پر آمادہ ہونے کے بعد ہمارے لیے کتنا تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے۔ شاید یہ بھی ساحرہ موناپ والا کردار ہی ادا کر رہا تھا۔ ایک انگریز مصنف کا قول میرے ذہن میں گردش کرنے لگا' اس نے کچھ اس سے ملتی جلتی بات کہی تھی "مشینیں اس وقت تک ہی اچھی ہیں جب تک ہمارے قابو میں رہتی ہیں' جب وہ ہمیں قابو کر لیتی ہیں تو پھر بہت بری ہو جاتی ہیں۔"

مجھے خود سے الگ بیٹھ کر ٹھٹھرتے دیکھا تو غزالہ سے رہا نہیں گیا۔ وہ بولی "آپ بھی یہاں آجائیے۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

غزالہ نے اصرار کر کے مجھے بکل کے اندر بلا لیا۔ بیڈ شیٹ دو چادروں کے ساتھ مل کر ہلکے پھلکے کمبل کی شکل اختیار کر گئی تھی' بہرحال یہاں تو دوہرا لحاف بھی ہوتا تو ناکافی ہوتا۔ ہم ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے' تابی ہمارے درمیان سمٹا ہوا تھا۔ ہمارے جسموں کی حرارت ایک دوسرے کا سہارا بن رہی تھی۔ ناقابل برداشت سردی یقیناً ان خونی جانوروں کو بھی متاثر کر رہی تھی جنہوں نے اس چار دیواری کے اندر ہمارا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ وہ آپس میں الجھ رہے تھے' حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔

یہ آوازیں ماحول کو اور بھی وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ غزالہ اور تابی میری بانہوں میں سمٹ آئے تھے۔ ہمارے سانسوں کی گرمی ایک دوجے کو راحت پہنچا رہی تھی' ایک دوسرے کے جسم پر ہماری گرفت ایک دوسرے کے لیے ڈھال بنی ہوئی تھی۔ اس وحشت ناک ماحول میں بھی غزالہ کے پیکر کی نرمی و گرمی میرے احساس کو یوں سہلا رہی تھی جیسے شدید غم کے موسم میں خوشی کی کوئی امید ہمارے دل کو مردہ ہونے سے بچاتی ہے۔ وہ میرے پاس تھی بالکل قریب تھی۔ اس کا ایک رخسار میرے سینے سے لگا تھا۔ اس کی سانس میرے بدن کو چھو رہی تھی۔ اچانک کہیں قریب ہی ایک زوردار چھناکا سنائی دیا۔ کوئی بڑے سائز کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رہائش گاہ کے عقبی حصے سے لرزہ خیز چیخیں سنائی دیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خوں خوار جانور کسی کمرے میں داخل ہوئے ہیں اور وہاں گھرے ہوئے افراد پر حملہ آور ہو گئے ہیں۔ چیخوں سے کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ "قابو آنے والے" کون ہیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ سب کچھ اپنے کانوں سے سننے کے باوجود ہم اپنی پناہ گاہ میں دبکے رہنے پر مجبور تھے۔ جب چیخیں زیادہ لرزہ خیز ہوئیں تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں غزالہ سے بازو چھڑا کر ایک بھاری بھرکم کرسی کی طرف بڑھا۔ میں نے کرسی کو اتنی زور سے دیوار پر مارا کہ وہ ٹوٹ گئی۔ میں نے کرسی کی ایک لمبی لکڑی ہتھیار کے طور پر اٹھائی اور دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ راہداری خالی نظر آرہی تھی۔ شاید سارے جانور اپنے چیختے چلاتے شکار کی طرف چلے گئے تھے۔ میں باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے راہداری میں بوڑھا داماں نظر آیا۔ وہ حتی الامکان رفتار سے میری طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔ اس کے عقب میں دو کتے تھے۔ اس سے پہلے کہ داماں دروازے تک پہنچتا ایک کتے نے عقب سے اسے دبوچ لیا۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر لکڑی کا بھرپور وار کتے کی کھوپڑی پر کیا۔ ہڈی ٹوٹنے کی لرزہ خیز آواز آئی اور کتا بھیانک چیخ مار کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ داماں بھاگ کر ادھ کھلے دروازے سے اندر گھس گیا۔ دوسرے کتے نے مجھ پر حملہ کیا۔ یہ منحوس جانور کئی ہفتوں سے کسی بلا کی طرح ہم سے چمٹے ہوئے تھے' پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ میرے دل و دماغ میں عجیب سی نفرت بھر گئی تھی ان کے خلاف۔ میں نے حملہ آور کتے کے منہ پر لکڑی ماری۔ یقیناً اس کے ایک دو دانت حلق میں گر گئے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر دوبارہ مجھ پر آتا' میں نے واپس کمرے میں گھس کر دروازہ

بند کرلیا۔ ادھ کھلے دروازے میں سے غزالہ نے کتوں کے ساتھ میری جھڑپ دیکھی تھی اور دو تین مرتبہ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

دروازہ لاک کرکے میں داماں کی طرف متوجہ ہوا' وہ صوفے پر گرا ہوا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا لباس عقب سے تار تار ہوگیا تھا۔ تاہم اس کی کمر پر صرف خراشیں ہی آئی تھیں' ہاں اس کی پنڈلی کے پچھلے گوشت پر گہرا زخم موجود تھا اور یہاں سے اس کے لباس کی دھجی بھی اڑی ہوئی تھی۔ غزالہ نے لپک کر الماری میں سے میڈیکل باکس نکالا اور داماں کی مرہم پٹی میں مصروف ہوگئی۔ داماں نے آبدیدہ لہجے میں کہا "وہ دونوں ماری گئیں۔"

"کون دونوں؟" میں نے پوچھا۔ ایک ہی سیکنڈ کے اندر ذہن میں سیکڑوں اندیشے چیخ اٹھے تھے۔

"دونوں ملازم عورتیں۔ وہ میرے ساتھ ہی پرانے کچن میں بند ہوگئی تھیں۔ کتے مسلسل ہمارے گرد چکرا رہے تھے۔ ابھی چند منٹ پہلے ایک اور گروہ کوٹھی میں گھس آیا ہے۔ انہوں نے کھڑکی توڑ دی اور اندر گھس آئے۔ ہم نے بھاگنے کی کوشش کی' نوعمر ملازمہ گر گئی' اس کی ماں نے اسے اٹھانا چاہا' اتنے میں کتے کچن کے دروازے میں سے نکل کر ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ نوعمر ملازمہ کی چیر پھاڑ ہوتے میں نے خود دیکھی ہے' اس کی ماں بھی نہیں بچی ہوگی۔ اس کے ساتھ تین چار کتے لپٹے ہوئے تھے۔"

واقعہ بیان کرتے ہوئے داماں کی آواز کانپ رہی تھی اور سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

دونوں ملازماؤں کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ ماں بیٹی بڑی سلجھی ہوئی خدمت گار تھیں' یوں تو دونوں سیاہ فام تھیں' مگر دل کی اچھی تھیں۔ چند دن پہلے زریں گل نے نوجوان خادمہ کو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ڈانٹا ڈپٹا تھا' اس بے چاری نے اتنا اثر لیا تھا کہ دو دن روتی رہی تھی۔

"کیا پرانے کچن کی طرف بھی ایسی ہی سردی ہے؟" میں نے داماں سے پوچھا۔

"نہیں جناب وہ حصہ علیحدہ ہے۔ وہاں ٹھنڈک زیادہ نہیں ہے مگر گیس کی بو ادھر بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

"باقی لوگوں کا کچھ پتا ہے تمہیں؟"

"وہ خوش قسمت ہیں جی' بالائی منزل پر جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ بس ادھر میں رہ گیا تھا یا آپ تینوں رہ گئے ہیں۔"

میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا "تمہارا کیا خیال ہے داماں' اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

اس نے لرزاں آواز میں کہا "جناب! میرے خیال میں تو یہ دعا اور مناجات کا وقت ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے' اسے دیوتا ہی روک سکتے ہیں' یہ میرے یا آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔"

داماں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی پلکوں کے نیچے سے بہنے والے آنسو اس کے سیاہ رخساروں پر لڑھک گئے۔ گیس کی بو اب قدرے زیادہ ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی سردی کی شدت تھوڑی سی کم محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحے تک داماں یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا' پھر وہ قالین پر اوندھا گر گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے آگے کی جانب پھیلا رکھے تھے۔ یہ ایک طرح سے عاجزانہ بندگی کا انداز تھا۔ داماں بڑے رقت آمیز انداز میں دعا مانگنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "آپ بھی دعا مانگیں۔ آپ تو سامی جی کے خاص مرید ہیں۔ اس بستی کو آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں جناب' یہ فقط دعاؤں اور مناجات کا وقت ہے۔ دیوتا ہمارے حالوں پر رحم فرمائیں۔"

میں نے داماں سے پوچھا "اسٹی اور اس کے حکمرانوں کی کچھ خبر ہے؟"

داماں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور اس کے ہونٹ تیزی سے بدبداتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک ایک آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں لرز کر رہ گیا۔ کچھ دن پہلے یہی آواز میں نے بارش میں بھیگے ہوئے ایک جنگل میں ایک ترمر خور دلدل کے قریب سنی تھی۔ یہ کوگر کی آواز تھی۔ وہی کوگر جسے چیتے اور شیر کی درمیانی شکل کہا جاتا ہے۔ یہ درندہ اکثر اوقات شیر اور چیتے ہی کی طرح خوں خوار ثابت ہوتا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ داماں نے یہ آواز مجھ سے بھی پہلے سن لی تھی اور یہی آواز سننے کے بعد وہ پوری شدت کے ساتھ مناجات میں مصروف ہوا تھا۔ کوگر کی آواز گیراج کی طرف سے آئی تھی پھر فوراً یہ آواز عقبی باغیچے کی جانب سے آئی' یا تو کوگر پلک جھپکتے میں باغیچے کے اندر پہنچ گیا تھا یا پھر یہ دو کوگر تھے۔ اگلے چند سیکنڈ میں دوسرا اندازہ درست ثابت ہوا' رہائش گاہ میں اس وقت کم از کم دو کوگر موجود تھے۔ گاہے گاہے ان کی پرخطر آواز بلند ہوتی تھی اور در و دیوار میں سرایت کر جاتی تھی۔ داماں نے جنگل کے سفر کے دوران میں ہمیں بتایا تھا کہ کوگر اور جنگلی کتے ایک

دوسرے کے کام میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتے' عموماً ایک دوسرے پر حملہ آور بھی نہیں ہوتے۔ میں نے ایک مرتبہ امریکن کوگر دیکھا تھا۔ اس کی خاص نشانی یہ تھی کہ اس کی دونوں آنکھوں کے اوپر ایک سیاہ دھبا پایا جاتا تھا۔ وہاں اس جانور کو پہاڑی شیر کا نام بھی دیا جاتا ہے' لیکن جو کوگر نما جانور میں نے یہاں دیکھا تھا اس کے خدوخال قدرے مختلف تھے۔

اگلے دو چار منٹ کے اندر چار دیواری میں موجود دونوں کوگر ہمارے دروازے کے عین سامنے پہنچ گئے۔ ٹریک براعظم افریقہ آج ہمیں اپنا اصل روپ دکھا رہا تھا۔ ہم پراسرار طور پر خطرناک جانوروں کے گھیرے میں تھے اور یہ گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ بستی کے طول و عرض سے گاہے گاہے فائرنگ کی آواز آتی تھی۔ یہ آواز اس امر کا ثبوت تھی کہ جو کچھ ہمارے ساتھ اس چار دیواری میں ہو رہا ہے' اس سے ملتی جلتی صورت حال بہت سی چار دیواریوں میں پائی جا رہی ہے۔

"آپ نے کچھ محسوس کیا؟" غزالہ نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"ٹھنڈ کم ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ائرکنڈیشنر نہایت زور و شور سے چلنے کے بعد ایک دم بند ہوگیا ہے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں زبردست ٹھنڈ' زبردست گرمی میں بدلنا شروع ہوگئی۔ میں نے پنکھا چلانے کی کوشش کی مگر اس نے حکم ماننے سے انکار کردیا۔ ٹیوب لائٹ بھی بالکل مدھم ہوکر رہ گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت بجھ جائے گی۔ خود سے صرف چند فٹ کی دوری پر جنگلی کتوں اور خوفناک درندوں کی موجودگی کا احساس اتنا روح فرسا تھا کہ دل ہول جاتا تھا۔ ائرکنڈیشنر بند ہونے کے بعد گرمی بڑھ گئی تھی اور گیس کی بو میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ شاید "گیس لیکیج" کی وجہ سے ہی ائرکنڈیشنر نے کام کرنا چھوڑا تھا۔ اب رات کے دو بج رہے تھے' اس نہایت خطرناک صورت حال میں گرفتار ہوئے اب ہمیں ڈھائی تین گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ خطرناک ہونے کے علاوہ یہ صورت حال نہایت عجیب و غریب بھی تھی۔ پہلے خوشگوار ٹھنڈ' پھر نہایت شدید اور ناقابل برداشت ٹھنڈ اور اب ہر لحظہ بڑھتی ہوئی گرمی اور حبس۔

اچانک کمرے کا دروازہ اتنی شدت سے دھڑ دھڑ بجا کہ ہم اچھل کر رہ گئے' ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے دروازہ اچھل کر اندر آگرے گا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے حیران ہوکر داماں سے پوچھا۔

وہ اوندھے منہ لیٹے لیٹے بولا "لگتا ہے کہ ہمارا آخری وقت آگیا ہے۔ کوگر دروازے سے الجھ رہا ہے' وہ اسے توڑ ڈالے گا۔ اس کے لیے ایسا کرنا قطعاً مشکل نہیں ہے۔" داماں کے لہجے میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا

چند سیکنڈ تک دھڑ دھڑ بجنے کے بعد دروازہ ساکت ہوگیا تھا۔ یوں لگا جیسے جانور کسی اور طرف نکل گیا ہے لیکن پھر ایک دو منٹ بعد دروازہ اتنی زور سے بجا کہ یہی لگا کہ اب اکھڑ جائے گا۔ اس کے زیریں حصے میں چھوٹا سا خلا پیدا ہوگیا۔ اس خلا میں سے کوگر کا پنجہ نمودار ہوا' پھر نصف بازو اندر آگیا۔ جانور کے بالوں کا رنگ براؤن تھا۔ پنجے کی ساخت بالکل شیر کے پنجے کی سی تھی۔ چند سیکنڈ بعد پنجہ باہر چلا گیا۔ جانور نے ایک بار پھر پلائی وڈ کے معمولی دروازے سے الجھنا شروع کردیا تھا۔

غزالہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس نے تانی کا چہرہ اپنے سینے میں چھپالیا تھا اور اسے بالکل ادھر ادھر دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔ گاہے گاہے عقبی باغیچے کی طرف سے بھی کوگر کی تیز غراتی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی۔ اس آواز کے بارے میں درست اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ باغیچے کے اندر سے آرہی ہے یا باہر سڑک پر سے۔ گاہے گاہے کالونی کے اندر جو فائرنگ ہو رہی تھی اور جس طرح کی آوازیں ابھر رہی تھیں ان سے شک ہوتا تھا کہ مزید کوگر بھی یہاں موجود ہیں۔

ہم چاروں کی نگاہیں کمرے کے دروازے پر جمی تھیں جو طوفان کی زد میں آئے ہوئے خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ لکڑی کی دنی الماری کو دروازے کے سامنے کھڑا کیا جا سکتا تھا مگر پھر کھڑکی کا راستہ کھل جاتا۔ کھڑکی کی جانب بھی کتوں کے غرانے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ پسینہ ہم سب کے جسموں سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ غزالہ ایک فائل کور کو دستی پنکھے کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ وہ تانی کو ہوا دے رہی تھی گاہے گاہے اس دستی پنکھے کا رخ میری طرف بھی کردیتی تھی۔

میں سر پکڑ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ کافی دیر عبادت میں مصروف رہنے کے بعد داماں اٹھ بیٹھا' اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ رقت بھرے لہجے میں بولنے لگا۔ وہ اس سارے واقعے کا تعلق صرف اور صرف موتابہ کے ساتھ جوڑ رہا تھا۔ میں نے کہا "داماں' ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں'

صرف ایک رخ پر ہی دیکھتے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ان جانوروں کا اس طرح بستی میں داخل ہوجانا ایک اتفاق کے تحت ہی ہو' اس سے پہلے بھی تو جنگلی کتے اسی طرح حملہ آور ہوتے رہے ہیں' ایک مرتبہ قریبی درختوں میں آگ لگنے کی وجہ سے سانپوں نے بھی اسی طرح افراتفری پھیلا دی تھی۔"

"آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے لیکن جناب بڑے ادب سے عرض کرتا ہوں' میری عمر بھی ساٹھ سال سے اوپر ہوچکی ہے اور ساری زندگی میں نے انہی صحراؤں اور ویرانوں کی خاک چھانی ہے۔ جتنا یہاں کے لوگوں اور جانوروں کے بارے میں' میں جانتا ہوں شاید کوئی دوسرا نہ جانتا ہو۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل معمول سے ہٹ کر ہے۔ یہ ایک آفت ہے جو ہماری کوتاہی کی وجہ سے ہم پر نازل ہوئی ہے۔ دیوتا ہمارے حال پر رحم فرمائیں' بستی میں پتا نہیں کیا کچھ ہوگیا ہوگا۔"

ایک دم غزالہ کے ہونٹوں سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ دروازہ ایک بار پھر اچانک ہی کوگر کا تختہ مشق بن گیا تھا۔ وہ بری طرح ہلا اور اس کے نچلے حصے سے تقریباً چھ مربع انچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر علیحدہ ہوگیا۔ اس خلا کے اندر سے کوگر کے جسم کی براؤنش جھلک نظر آنے لگی۔

غزالہ لرزاں آواز میں بولی "مجھے لگتا ہے کہ دو چار منٹ میں یہ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔"

"پھر کیا کریں؟ یہاں سے نکل چلیں۔"

"لیکن کہاں؟"

میں نے الماری اور کھڑکی کے درمیانی خلا میں سے باہر جھانکا۔ اس کھڑکی سے تقریباً پندرہ بیس قدم کی دوری پر ایک دروازہ موجود تھا۔ یہ آہنی دروازہ ایک راہداری کے ذریعے کوٹھی کے گیراج سے ملا ہوا تھا۔ اگر ہم کسی طرح اس دروازے تک پہنچ جاتے اور یہ دروازہ ہمیں کھلا ملتا تو ہمارے بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی۔ بلکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہم اس کوٹھی سے ہی نکلنے میں کامیاب ہوجاتے۔ گیراج میں ایک شاندار لینڈ روور گاڑی موجود تھی۔ وہ ہمیں اس چار دیواری سے باہر لے جاسکتی تھی لیکن مسئلہ اس دروازے تک پہنچنے کا تھا' اور یہ دیکھنے کا تھا کہ دروازہ واقعی کھلا بھی ہے یا نہیں۔ میں پچھلے ایک گھنٹے میں دو تین مرتبہ دروازے کو دیکھ چکا تھا۔ اسٹیل کے بنے ہوئے اس دیدہ زیب دروازے میں ہنسی قفل تھا۔ چند دن پہلے میں نے ایک دو بار اس دروازے کو کھلا ہوا دیکھا تھا پھر ایک مرتبہ میں نے اس دروازے کے ذریعے شارٹ کٹ لگا کر گیراج تک جانے کی کوشش کی تھی اور دروازہ مجھے مقفل ملا تھا۔

اب عجیب الجھی ہوئی پوزیشن تھی۔ اگر ہم شدید خطرہ مول لے کر اس کمرے سے نکلتے اور دروازے میں گھسنے کی کوشش کرتے اور دروازہ بند ملتا تو اس کمرے میں واپس پہنچنے سے پہلے ہماری تکا بوٹی ہوجاتی۔ دوسری صورت میں بھی موت ہر لحظہ ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ پلائی ووڈ کا دروازہ زیادہ دیر تک ہماری ڈھال بننے والا نہیں تھا۔ اگر ہماری قسمت اچھی ہوتی اور درندہ اس دروازے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بند کردیتا تو اور بات تھی ورنہ موت کے دہانے پر تو ہم پہنچے ہی ہوئے تھے۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" غزالہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"آپ بار بار اس دروازے کو دیکھ رہے ہیں؟"

"اگر وہ دروازہ مقفل نہیں تو ہم اس کمرے سے کھڑکی کے راستے نکل کر دروازے کی طرف جانے کا رسک لے سکتے ہیں۔ یہ کل پندرہ بیس قدم کا فاصلہ ہے۔ کوگر دروازے کی طرف موجود ہے' کتے بھی اسی طرف راہداری میں ہیں' اگر یہ جانور دوڑ کر ہماری طرف آتے ہیں تو بھی ہم ان کے پہنچنے سے پہلے اندر گھس کر دروازہ بند کرسکتے ہیں۔"

"لیکن اگر دروازہ مقفل ہوا تو؟"

"پھر کوگر کے لیے ایک شاندار لنچ مہیا ہوجائے گا۔ ممکن ہے کہ وہ دو تین اور ساتھیوں کو بھی اس دعوت میں شریک کرلے۔" میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

غزالہ نے داماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ کا کیا خیال ہے بابا جی' دروازہ کھلا ملے گا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں بٹیا! میں بھی تمہاری طرح اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔" داماں نے مایوس لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر دروازہ کھلا بھی ہے تو..." غزالہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"تو کیا؟" میں نے کہا۔

"تو بھی ہم یہاں سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" اس نے فقرہ مکمل کیا۔

"یہ خطرہ مول نہیں لیں گے تو بے موت مرنے کا خطرہ لاحق ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔

ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ کمرے کا دروازہ ایک بار پھر بھونچال کی زد میں آگیا۔ بھاری بھرکم کوگر معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ کبھی لگتا تھا کہ اس کے

ساتھ جسم رگڑ رہا ہے کبھی لگتا تھا کہ پنجے مار رہا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ چیتے جیسی تیز آواز بھی حلق سے برآمد کرتا تھا۔ اس آواز کے جواب میں باغیچے کی جانب سے آواز آتی تھی۔ یہ دوسری آواز قدرے پتلی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ مادہ ہے یا نوجوان بچہ ہے۔

گرمی اب انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ہمارے کپڑے پسینے سے تربتر تھے۔ تابی بار بار رونے لگتا تھا۔ اسے پنکھا جھل جھل کر غزالہ کی بانہیں شل ہوگئی تھیں۔ اب ہمارا کیا بنے گا؟ شاید اپنے سے بھی زیادہ فکر اسے میری اور تابی کی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ موجودہ صورت حال کے بارے میں وہ خود کچھ بھی نہیں سوچ رہی ہے۔ جب میں موجود ہوتا تھا تو غیر ارادی طور پر وہ سوچنے کا کام مجھ پر چھوڑ دیتی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے بے پناہ اعتماد کا لاشعوری اظہار بھی تھا۔ اس کے دل میں یہ یقین تھا کہ میں مشکل ترین حالات میں بھی سلامتی اور بچاؤ کا کوئی راستہ ڈھونڈ نکالوں گا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میں اس وقت محسوس کرتا تھا جب کوئی میڈیکل پرابلم اور علاج معالجے کا مرحلہ درپیش ہوتا تھا۔ غزالہ کی موجودگی اور اپنے شعبے میں اس کی مہارت مجھے ہر فکر سے آزاد کردیتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر غور سے دروازے کا جائزہ لیا۔ اگر ہم الماری کو اس کی جگہ سے آٹھ دس انچ مزید سرکا دیتے تو ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے ہمارے باہر جانے کا انتظام ہوسکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس رخ پر صرف ایک یا دو کتے موجود تھے۔ مجھے توقع تھی کہ میں ٹوٹی ہوئی کرسی کی مضبوط لکڑی سے ان کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب ہوجاؤں گا' مگر بات پھر ایک سوالیہ نشان پر پہنچ کر ختم ہوجاتی تھی۔ اسٹیل کا دروازہ بند تھا یا کھلا؟

"سائیں عالی کے گارڈز پتا نہیں کیا کر رہے ہیں۔ ان کے پاس جدید ترین رائفلیں ہیں۔" غزالہ نے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے نشانہ بن گئے ہوں۔ حملہ بالکل اچانک ہوا ہے۔ جنگلی کتے جس رخ سے آئے ہیں اس سے لگتا ہے کہ انہوں نے گارڈز پر پہلے حملہ کیا ہے۔"

"لیکن اگر..." غزالہ کی بات کو ایک دم بریک لگ گئے۔

چھت پر سے دھماچوکڑی کی آوازیں آئیں۔ جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو' پھر ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس کے بعد ریوالور کا فائر ہوا۔ چند سیکنڈ بعد خاموشی چھا گئی۔

"یہ کیا تھا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"شاید کوئی جانور اوپر بھی پہنچ گیا ہے اور اگر واقعی ایسا ہوا ہے تو وہ کوگر ہوگا۔ کیونکہ یہ جنگلی کتے درخت پر نہیں چڑھ سکتے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ کوئی کوگر درخت کے ذریعے بالائی منزل پر پہنچ گیا ہے؟"

"بالکل ایسا ہوسکتا ہے' پورچ کے اوپر جو بیڈ روم بنے ہوئے ہیں' ان کے سامنے بالکونی ہے۔ دو درخت اس بالکونی کے بالکل ساتھ موجود ہیں۔"

اچانک غزالہ کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی۔ کوگر کی دہشت ناک آواز ابھری تھی اور یہ ایک آواز نہیں تھی' دو آوازیں تھیں۔ وہ دونوں جانور بری طرح غراتے ہوئے ایک دوسرے سے الجھ گئے تھے۔ ان کی یہ دھینگا مشتی دروازے کے بالکل قریب ہی ہو رہی تھی۔ شاید ان کی یہ لڑائی انسانی گوشت کے کسی لوتھڑے پر ہی ہوتی تھی۔ لڑتے لڑتے وہ ایک دم دروازے سے ٹکرائے۔ زوردار آواز آئی۔ دروازے کی جیسے چولیں ہل گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک کوگر کا پنجہ دروازے کی دوہری پلائی کو پھاڑتا ہوا اندر گھس آیا۔ دروازے کی وہ پلائی جو اندر کی طرف تھی ایک مربع فٹ سے زائد جگہ میں اکھڑ گئی اور اندر سے ٹوٹی ہوئی لکڑیوں کا تانا بانا جھانکنے لگا۔ دروازے کی حالت اس چراغ جیسی تھی جو کھلی جگہ پر تیز ہواؤں کی زد میں آگیا ہو اور بس کسی لمحے بجھا چاہتا ہو۔

میں نے پیچھے جھک کر سوراخ میں سے جھانکا۔ قریباً چھ فٹ لمبا کوگر دروازے کے بالکل سامنے نظر آ رہا تھا۔ اپنے ساتھی کے ساتھ اس کی لڑائی جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک ختم بھی ہوگئی تھی' اب وہ بڑے سکون سے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور ہونٹوں پر زبان چلا رہا تھا۔ اس کی خم دار دم تیزی سے گردش کرتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے سینے کے درمیان کا حصہ سفیدی مائل تھا جبکہ باقی جسم براؤن تھا۔ اس نسل کے اکثر جانوروں کی طرح اس کوگر کا سر بھی اس کے جسم کے مقابلے میں خاصا چھوٹا تھا۔ اس عدم تناسب کی وجہ سے وہ بلی اور شیر جیسی خوب صورتی سے محروم نظر آتا تھا۔ کوگر نے دروازے کے سوراخ میں سے ہماری جانب دیکھا۔ ان بھوکی آنکھوں میں لہو کی پیاس تھی اور بلا کی سفاکی تھی۔

غزالہ دروازے کی طرف سے رخ پھیرے کھڑی تھی۔ غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ غلطی سے بھی اس کی نگاہ دروازے کے سوراخ سے پار جائے۔ تابی نے زور زور شور سے رونا شروع کردیا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس نے کوگر کی جھلک دیکھی

تھی یا یونہی کوگرز کی چیخ و پکار نے اس کا خون خشک کیا تھا۔ دروازے کے ایک حصے کو تباہ کرنے کے بعد اب کوگر یوں لاتعلق بن کر دروازے کے سامنے کھڑا تھا جیسے دروازے سے اور ہم سے اسے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو لیکن ہم جانتے تھے کہ اس کی یہ لاتعلقی تادیر برقرار رہنے والی نہیں ہے۔ جلد ہی دوبارہ اس کا ساتھی پھر سے دروازے کے ساتھ دست درازی شروع کردیں گے۔

شدید گرمی حبس اور خطرے کے احساس کے ساتھ ہم نے پورا ایک گھنٹا اس کمرے میں مزید گزار دیا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر سائیں عالی کا خیال آرہا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا۔ کانجی میں شہد ملا کر پی رہا تھا یا انڈین فلم انڈسٹری کے اندرونی راز فاش کر رہا تھا۔ اور ہم یہاں پھنسے ہوئے تھے۔ دونوں کوگرز بدستور دروازے کے آس پاس موجود تھے۔ کتے بھی ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ وہ آپس میں الجھ رہے تھے' غرا رہے تھے۔ مختلف چیزوں کو توڑ پھوڑ رہے تھے۔ گیس کی بو آنا اب بند ہوگئی تھی۔ مگر وہ در و دیوار میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ اب بھی ہر اس پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پوری کالونی کے لوگ اپنی اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔ ہر بندہ کسی کونے کھدرے میں گھسا ہوا ہے اور شاید صبح ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ کالونی کی گلیوں میں کتے گیدڑ اور کوگر دندنا رہے تھے۔ مصیبت کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں۔ رات بھی کٹنے میں نہیں آرہی تھی۔ غزالہ کے کہنے پر میں نے دو تین مرتبہ زریں صفدر وغیرہ کو آوازیں دی تھیں مگر یہ آوازیں بالائی منزل تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا بالائی منزل پر پناہ گزیں ہونے والے ساتھیوں کا خیال تھا کہ ہم کوٹھی سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

کوگرز نے دروازے کو جھنجوڑ کر اس کا انجر پنجر ہلا کر دیا تھا۔ دروازے کا سوراخ کافی بڑا ہو چکا تھا' تھوڑا سا مزید بڑا ہو جاتا تو کوئی دبلا پتلا کتا اس میں گھس کر اندر آسکتا تھا۔ یہ آدم خور کتے تھے اور ہمارے جسموں کی بو انہیں اس کمرے کے اردگرد رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ہم نے بیڈ گھسیٹ کر دروازے کے سامنے کر دیا تھا' تاہم یہ تدبیر بھی کچھ ایسی کارگر نہیں تھی۔ اگر کوگرز دروازہ توڑ ڈالتے تو پھر بیڈ کی تین چار فٹ اونچی پشت بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔

میری نگاہ ایک بار پھر گھوم پھر کر اس دروازے پر مرکوز ہوگئی جو اس جہنمی رات میں ہماری امید کا واحد سہارا تھا۔ کھڑکی اور دروازے کا درمیانی فاصلہ میں نگاہوں ہی نگاہوں میں کئی بار ناپ چکا تھا۔ اس فاصلے کو طے کرنے میں ہمارا جو وقت لگنا تھا' وہ بھی میرے ذہن میں تھا۔ اس دوران میں اگر ایک دو کتے حملہ آور ہوتے تو ان سے دفاع کا پلان بھی بن گیا تھا لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ جب ہم دروازے تک پہنچیں گے تو وہ ہمیں کھلا ملے گا۔ میں اسٹیل کے اس دروازے کو دیکھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ یہ دروازہ نہیں ہے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے اور اس سوالیہ نشان کے پیچھے ہماری زندگی یا موت چھپی ہوئی ہے۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے غزالہ سے کہا "میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں کھڑکی کے راستے باہر نکل کر اسٹیل کے دروازے کو چیک کرتا ہوں' اگر تو یہ کھلا ہے میں اندر چلا جاؤں گا اور دروازہ دوبارہ بند کرلوں گا۔ اس کے بعد موقع دیکھ کر تم تینوں بھی آجانا۔"

"لیکن اگر دروازہ نہیں کھلا تو پھر کیا ہوگا۔ آپ کے پاس اتنا وقت ہرگز نہیں ہوگا کہ واپس آسکیں۔"

"ہوگا۔ کیوں نہیں ہوگا۔ تم دیکھنا یہ کتے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"بات صرف کتوں کی نہیں شاہ جہاں۔ اس درندے کی ہے جسے آپ کوگر کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو یہ شیر ہی لگ رہا ہے۔ اس کی آواز چال ڈھال سب وہی ہے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولی "میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔" اس کی آواز اس کے خشک حلق میں اٹک گئی اور وہ آگے کچھ نہیں بول سکی۔

"یہ رسک تو ہمیں لینا ہی ہے غزالہ! ورنہ اب کسی بھی لمحے کوگر یا کتے اندر داخل ہو جائیں گے۔ میں تنہا ہوں۔ اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا' تمہیں کیا بچاؤں گا۔"

"کچھ بھی ہے' میں نے آپ کو نہیں جانے دینا۔ دیکھیں اب صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر ہے۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبب لگا دے گا۔"

میں نے اسے رسٹ واچ دکھاتے ہوئے کہا "ابھی تین بجے ہیں' صبح ہونے میں پورے چار گھنٹے باقی ہیں' لیکن یہ دروازہ تو شاید اب آدھا پون گھنٹا بھی مزید نہیں نکالے گا۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی اسٹیل کے دروازے کے عین سامنے گدھے کے سائز کا ایک جنگلی کتا چکرانے لگا۔ اس نے جیسے ہماری گفتگو سن لی تھی اور ہمارے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی تھوتھنی پر سرخ دھبے تھے جو اس کے قاتل ہونے کی نشان دہی کر رہے تھے۔ خبر نہیں تھی کہ یہ ہمارے ساتھیوں میں سے کس کا خون ہے۔ کتے کے

نچلے دانت دو مہلک خنجروں کے مانند تھے۔ غزالہ نے میرا بازو مزید مضبوطی سے تھام لیا "آپ دیکھ رہے ہیں نا۔ یہ صرف ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"یہ انتظار نہیں کر رہے۔" میں نے جھلا کر کہا "یہ اندر آنے کی کوشش میں ہیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب ہونے والے ہیں۔"

راماں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "جناب! آپ کچھ زیادہ ہی مایوس ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک سائیں جی کا سایہ ہمارے سر پر موجود ہے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ آپ بس دعا کریں۔"

"دعا کے ساتھ اب دوا ضروری ہوگئی ہے راماں۔" میں نے کہا پھر انگلی سے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ایک آدم خور کتا اپنی بھوک سے بے تاب ہو کر بار بار اپنا سر شکستہ دروازے کے سوراخ میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر بار جب وہ ایک جھٹکے سے سر اندر گھساتا تھا' دروازے کی کچھ اور پلائی اپنی جگہ سے اکھڑ جاتی تھی۔ کتے کی کریہہ آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔ میں نے کرسی کے ٹوٹے ہوئے ہتھے سے کتے کی آنکھ پر ضرب لگائی اور وہ بھیانک آواز میں چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

میں اور راماں ایک بار پھر اس خیال آرائی میں مصروف ہوگئے کہ اسٹیل کا دروازہ ہمیں کھلا ملے گا یا مقفل؟ کتنی عجب بات تھی چند قدم کا فاصلہ ہمارے لیے زندگی موت کا قرینہ بن گیا تھا۔ اس سفر کے اختتام پر ایک دروازہ اپنا بھید اپنے سینے میں چھپائے خاموش کھڑا تھا۔ ہم اپنی جان پر کھیلے بغیر اس کا بھید پا نہیں سکتے تھے۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ تابی کب سے "پیشاب" کا کہہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگلے دو چار منٹ میں غزالہ اسے پیشاب کے لیے باتھ روم میں لے جائے گی۔ میں اس وقت اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔

میں شدت سے انتظار کرنے لگا کہ غزالہ تابی کو باتھ روم میں لے کر جائے لیکن وہ بھی شاید میرا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ کئی بار تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے ذہن کے اندر جھانک لیتی ہے۔ وہ میرے قریب سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جب تابی نے زیادہ ضد کی تو۔۔۔ باتھ روم کا دروازہ کھول کر کھڑی ہوگئی اور باتھ روم کی دہلیز پر ہی تابی کو پیشاب کے لیے بٹھا دیا۔

میں تلملا کر رہ گیا۔ وہ تابی کو لے کر واپس آئی تو میں نے اٹل لہجے میں اس کے سامنے اپنا منصوبہ دہرا دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسٹیل ڈور کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ مقفل ملے گا تو میں واپس آؤں گا۔ اگر کھلا ملے گا تو میں اندر چلا جاؤں گا اور موقع محل دیکھ کر وہ بھی راماں کے ساتھ اندر چلی آئے۔

"پلیز شاہ جہاں۔ کچھ دیر اور انتظار کرلیں۔" وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی۔

"اب انتظار کرنا بے وقوفی ہوگی۔" میں نے سختی سے کہا اور الماری کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

راماں خاموشی سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ارادے کی حمایت کی تھی اور نہ مخالفت۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ ایک لمحے کے لیے لگتا تھا کہ وہ میرے لیے دعاگو ہے' دوسرے لمحے لگتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ میں اب باز نہیں آؤں گا غزالہ نے منہ پھیر کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس کو روتے دیکھ کر تابی بھی پھر سے اشک بار ہو گیا تھا۔ میں نے کرسی کا ٹوٹا ہوا ہتھا تھاما۔ کھڑکی سے منہ لگا کر غور سے باہر راہداری میں جھانکا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم اور بیمار روشنی میں سیڑھیوں کے قریب بس ایک کتا نظر آرہا تھا۔ ممکن تھا کہ ایک دو اور بھی ہوں مگر کھڑکی سے ایک ہی نظر آرہا تھا۔ میں نے زور لگا کر الماری کو تھوڑا سا کھسکایا۔ اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ میں کھڑکی کھول کر باہر نکل سکوں۔

جونہی میں نے آہستگی کے ساتھ کھڑکی کھولی' سیڑھیوں کے قریب بیٹھا کتا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی دُم ہولے ہولے گردش کرنے لگی۔ میں نے اسے یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اپنی نگاہ اسٹیل کے دروازے پر مرکوز کی۔ بالکل جس طرح سو میٹر ریس سے پہلے ایتھلیٹ اردگرد سے لاتعلق ہو کر "فنشنگ پوائنٹ" کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ اچانک راماں نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔" اس نے مودب لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"تو پھر کیا ٹھیک ہے؟"

"آپ کی اس کمرے میں زیادہ ضرورت ہے۔" وہ شستہ انگلش میں بولا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میری بات کا جواب دینے کے بجائے راماں نے وہ کچھ کیا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے ایک جانب دھکیل کر

اس نے تیزی سے کھڑکی پار کی اور اپنی بوڑھی ٹانگوں کی پوری طاقت کے ساتھ اسٹیل ڈور کی طرف دوڑا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ "داماں" میں نے چیخ کر کہا' اس وقت تک وہ کئی قدم آگے نکل چکا تھا۔ میں اور غزالہ پھٹی آنکھوں سے داماں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابھی اس نے آٹھ دس میٹر ہی طے کیے تھے کہ سیڑھیوں کے قریب کھڑا کتا اپنی جگہ سے حرکت میں آیا اور تیر کی طرح داماں کی طرف لپکا۔ اب داماں اسی صورت بچ سکتا تھا کہ اسٹیل ڈور اسے کھلا ملتا۔ سوالیہ نشان کے مٹنے کا وقت آگیا تھا۔ بوڑھے داماں نے تڑپ کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اسے ایک جھٹکے سے نیچے کی طرف کیا۔ ہینڈل نیچے گیا۔۔۔ لیکن دروازہ نہیں کھلا۔۔۔ دروازہ بند تھا۔ اسے قفل لگا ہوا تھا' داماں نے ہیجانی انداز میں کئی بار ہینڈل کو جھٹکا دیا مگر نتیجہ وہی رہا۔ قد آور کتے نے داماں پر جست کی اور اس کی گردن عقب سے دبوچ لی' داماں نے واپس مڑنا چاہا مگر اس وقت سیڑھیوں کی طرف سے تین کتے برآمد ہوئے اور خوں خوار انداز میں چلاتے ہوئے داماں سے لپٹ گئے' ہمارے پاس اب آنکھیں بند کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن کان تو کھلے تھے۔۔۔ اور ان میں داماں کی کربناک چیخیں گونج رہی تھیں۔

میں نے الماری کو دھکیل کر وہ خلا پھر سے بند کر دیا جہاں سے داماں باہر نکلا تھا۔ الماری سے سر ٹیک کر میں داماں کی جان کنی کے مشکل ترین لمحے گزارنے کی کوشش کرنے لگا۔ قریباً آدھے منٹ میں ہی داماں کی چیخیں معدوم ہو گئیں اور صرف خوں خوار کتوں کی وحشیانہ غراہٹیں ہی باقی رہ گئیں۔

غزالہ کی ہچکیاں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن میری آنکھیں بند تھیں' میں غزالہ کی طرف دیکھ رہا تھا نہ بدنصیب داماں کی جانب۔۔۔ دو تین منٹ بعد میں نے دل کڑا کر کے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ داماں کا پیٹ پھٹ چکا تھا۔ اندرونی عضلات راہداری کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ کم از کم چھ کتے اس بوڑھے قبائلی کے جسم کے ٹکڑے کرنے میں مصروف تھے جس نے بڑی جرأت سے اپنی قربانی دے کر ہمیں زندہ رہنے کا ایک موقع فراہم کیا تھا۔ راہداری کا فرش داماں کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ قریب ہی دو دونوں کوگر اطمینان سے کھڑے تھے جو اب تک ہمارے کمرے کا دروازہ جھنجوڑتے رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہوں نے جنگلی کتوں کے مارے ہوئے شکار کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید ایسے شکار پر منہ مارنا ان کی جبلت میں ہی شامل نہیں تھا۔

میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ نہ صرف اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں' اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں۔

"غزالہ۔۔۔!" میں نے اسے دو تین بار پکارا تو اس نے اپنی اشک بار آنکھیں کھولیں۔

نہ اسے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ داماں کے ساتھ کیا ہوا' نہ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت تھی۔ یہ بھیانک حقیقت ہم دونوں پر واضح ہو چکی تھی کہ داماں جو چند منٹ پہلے ہمارے درمیان تھا اب ہم میں نہیں ہے۔

داماں کو کھونے کے بعد ہم ایک بار پھر وہیں کھڑے تھے جہاں اس بھیانک رات کے شروع میں تھے۔ ہمارے موت کا گھیرا تنگ سے تنگ ہو رہا تھا۔ غزالہ نے اپنا مستقل طور پر جھکا چھوڑا تھا اور اب ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ دونوں کوگر اب پھر دروازے کی طرف آگئے تھے۔ اچانک ایک خوفناک کڑاکا سنائی دیا اور دروازہ پورے کا پورا اکھڑ کر اندر کمرے میں آگرا۔

غزالہ اور تابی کی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے غزالہ کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا باتھ روم میں لے آیا۔ اس سے پہلے کہ کوگر اور کتے بیڈ روم میں گھستے ہم تینوں باتھ روم میں بند ہو چکے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ جان بچانے کا یہ آخری حربہ تھا جو ہم نے استعمال کیا تھا۔ غزالہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد خوں خوار جانور پورے کمرے میں چکرانے لگے' آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوگرز نے فریج کا دروازہ کھول لیا ہے اور فریج کے اندر کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ رہے ہیں۔ وہ بیڈ کے فوم کو اپنے پنجوں سے ادھیڑ رہے تھے اور مسلسل غرا رہے تھے پھر کسی وزنی شے کے گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی۔ کوگرز نے یا جنگلی کتوں نے ٹی وی سیٹ الٹا دیا تھا۔ وہ باتھ روم کے دروازے سے بھی ٹکرا رہے تھے۔ باتھ روم کے دروازے کے نیچے قریباً دو انچ کی درز موجود تھی۔ خوں خوار کتوں کی تھوتھنیاں اس درز کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

غزالہ کی خوب صورت آنکھوں میں بے بسی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے تابی کو تسلی دے رہی تھی مگر اس کی اپنی آواز تسلی سے محروم تھی۔

یکایک کالونی کے وسطی حصے کی طرف سے فائرنگ کی دھماکے دار آوازیں آئیں۔ ایل ایم جی اور سیون ایم ایم رائفلوں سے فائرنگ ہو رہی تھی پھر دھیرے دھیرے فائرنگ کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔

میں نے کہا "مجھے لگتا ہے فزالو سائیں کے حکم پر اس کے کمانڈوز نے فائرنگ شروع کی ہے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

"شاید وہ لوگ اب تک اجالا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا' اس فائرنگ میں کم از کم دس بارہ افراد حصہ لے رہے تھے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے دو اطراف میں بڑھ رہے تھے۔ چند منٹ بعد فائرنگ کی آواز ہماری رہائش گاہ کے بالکل سامنے سے آئی۔ میں نے باتھ روم کے دروازے کے اندر تھوڑی سی جھری پیدا کی' دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا) اس جھری میں سے مجھے غزالہ کے بیڈ روم کا تھوڑا سا حصہ دکھائی دینے لگا' اس کے علاوہ ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے راہداری بھی نظر آنے لگی۔

میں نے موئل کو دیکھا' اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی اور اس پر سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ ایک کوگر لپکتا ہوا موئل کی طرف گیا' موئل نے بڑے سکون سے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور اسے راستے میں ہی ڈھیر کر دیا۔ اس دوران میں ایک کتا بھی موئل کی سنگین سے زخمی ہوا۔ سنگین اس کے تالو میں کئی انچ تک گھسنے کے بعد باہر نکلی تھی۔ موئل کے ساتھ ہی سائیں عالی کے دو کمانڈوز بھی اندر گھس آئے تھے۔ انہوں نے ہیلمٹ کے علاوہ حفاظتی جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ انہوں نے چاروں طرف فائرنگ کی۔ دو منٹ میں اندر کو تھی جانوروں سے خالی ہو گئی۔ ایک کوگر اور کچھ کتے وہیں بیڈ روم کے سامنے تڑپ رہے تھے' باقی فرار ہو گئے تھے۔

میں دوڑ کر داماں کی کٹی پھٹی لاش کی طرف گیا۔ میں نے ایک چادر اس کے لخت لخت جسم پر ڈالی اور اس کی خون آلود پیشانی چوم لی۔ غزالہ بھی اس کا چہرہ دیکھ کر مسلسل رو رہی تھی۔ ماریطانیہ آنے کے بعد ہمیں دو مترجم ملے تھے' دونوں یکے بعد دیگرے ہلاک ہو گئے تھے۔ پہلے اسو کاسا کی لڑائی میں مارا گیا تھا اور اب داماں یہاں بڑے ہی افسوسناک طریقے سے داعی اجل کو لبیک کہہ گیا تھا۔

موئل تشفی آمیز انداز میں میرا شانہ سہلا رہا تھا۔ داماں کو ٹھکانے سے اٹھا کر میں بالائی منزل پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ موئل اور سائیں کے کمانڈوز بھی ساتھ تھے' ہم نے ابھی نصف سیڑھیاں ہی طے کی تھیں کہ بالائی منزل کا دروازہ از خود کھل گیا۔ میری پریشان نگاہ سب سے پہلے زریں گل اور منصور پر پڑی۔ ان کے عقب میں شائستہ اور کلثوم کے چہرے نظر آ رہے تھے۔

"سب ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

شائستہ کا جواب اثبات میں تھا "سب ٹھیک ہیں۔" اس نے کہا۔

بہرحال میں نے جب تک سب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیا مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ ایک کوگر کو بالائی منزل پر بھی ہلاک کیا گیا تھا' یہ قدرے چھوٹا اور نوجوان کوگر تھا۔ اس کے جسم پر مدھم داغ سے تھے۔ زریں گل کی ترہب سے چلائی ہوئی گولی کوگر کی عین پیشانی پر لگی تھی اور اسے ختم کر گئی تھی۔ قدرے حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ ۳۸ بور ریوالور کی گولی تھی۔ آنکھ کے قریب لگنے والی یہ گولی یقیناً سیدھی کوگر کے دماغ میں گھس گئی تھی۔ منصور بالکل محفوظ تھا۔ ہاں اس کے نگرانوں میں سے ایک لارسی کوگر کے حملے سے زخمی ہوا تھا۔

موئل کی زبانی پتا چلا کہ سائیں عالی کے کمانڈوز نے بڑی موثر کارروائی کی ہے اور فائرنگ کے نتیجے میں جنگلی جانور کالونی سے نکل گئے ہیں۔ تاہم موئل کی باتوں کے دوران میں بھی کہیں کہیں فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم موئل اور کمانڈوز کے ہمراہ اپنی رہائش گاہ سے باہر آگئے۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس اجالے میں جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے۔ سڑک کے کنارے دو تین جگہ مجھے کتوں کی لاشیں پڑی نظر آئیں۔ ایک چوراہے میں بہت سے افراد جمع تھے' یہاں ان دو افراد کی لاشیں پڑی تھیں جنہیں کتوں نے ہلاک کیا تھا۔ ان پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ دونوں افراد کالونی کے چھوٹے سے فلنگ اسٹیشن کے ملازم تھے۔

ایسی ہی لاشیں کالونی میں کئی جگہ موجود تھیں۔ چند لاشیں اور بہت سے زخمی افراد اسپتال میں بھی پہنچائے جا چکے تھے۔ سائیں عالی کی رہائش گاہ سے چند فاصلے پر درخت پر چڑھے ہوئے ایک بڑے کوگر کو سائیں عالی کے کمانڈوز نے برسٹ مار کر ہلاک کیا تھا' اب اس کوگر کی لاش شاخوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ بہت سے مقامی اور غیر ملکی افراد اس لاش کو دیکھنے کے لیے درخت کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں موئل کی زبانی ہم پر ایک نیا انکشاف ہوا' سروج کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔

موئل نے کہا "سائیں کے کارندے اور کمانڈوز پچھلے ایک گھنٹے سے اسے ڈھونڈ رہے ہیں مگر اس کا کوئی کھوج

نہیں۔"

"چلو خس کم جہاں پاک۔" زریں نے اطمینان سے کہا "وہ ضرور کسی کوگر کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوگا۔"

میں نے موبل کے ذریعے پریشان حال سوار رافے سے بات کی تو اس نے بتایا "سروج صاحب اپنی قیام گاہ میں نہیں ہیں' رات کو تو سب کا یہی خیال تھا کہ وہ جانوروں کی یورش کی وجہ سے کہیں دبک گئی ہیں مگر اب تو اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے' اس کے باوجود ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔"

"آخری بار اسے کہاں دیکھا گیا تھا؟"

"انہوں نے رات کے کھانے کے بعد کلب میں ناچ کیا تھا۔ بہت سے مقامی اور غیر مقامی لوگوں نے بڑے شوق سے یہ ناچ دیکھا تھا۔ بہت سے سفید فام لوگوں نے انہیں بہترین رقاصہ قرار دیا تھا اور ناچ ختم ہونے کے بعد ان سے باتیں کی تھیں۔"

میں نے رافے سے کہا "کہیں اسے کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو۔ میرا مطلب ہے کسی جانور نے.....؟"

"نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سروج صاحب صحرائی درویش کی خاص بندی ہیں۔ ہم لارسیوں کا اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ صحرائی درویش ذورے دیوتا کا پرتو ہیں اور سروج صاحب ان کی خاص داسی سا جے ہیں۔ رات کو اتفاقاً میں نے بھی ان کا تھوڑا سا ناچ دیکھا تھا۔ وہ بے مثال ناچ کوئی عام لڑکی کر ہی نہیں سکتی۔"

"وہ بہت سے ایسے کام کرتی ہے جو کوئی عام لڑکی نہیں کر سکتی۔" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"آخر وہ جا کہاں سکتی ہے؟" صفدر نے کہا۔

"ام نے کہا ہے نا کہ وہ کسی کوگر یا کتے کے پیٹ میں جا سکتی ہے۔"

"تم اپنی چونچ ذرا بند رکھو۔" میں نے زریں کو جھڑکا "یہ کافی سیریس معاملہ ہے۔ کہیں وہ سچ مچ کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئی ہو۔"

ہم سب نے بھی سروج کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ اس کے بیڈ روم میں' اس کے بستر پر کوئی سلوٹ موجود نہیں تھی۔ نہ ہی اس نے سلیپنگ گاؤن پہنا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کل رات کو کلب سے گھر آئی ہی نہیں تھی۔

میں نے زریں اور موبل کو ساتھ لیا اور کلب میں اس کی تلاش شروع کی۔ یہ کلب زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بے حد شاندار تھا۔ ڈانس فلور بھی زبردست تھا۔ کلب کے اندر گھس کر یوں لگتا تھا جیسے ہم نیویارک یا پیرس کی کسی تفریح گاہ میں گھس آئے ہوں۔ بالائی منزل پر کمرے بھی بنے ہوئے تھ
ان کمروں کی کھڑکیوں میں سے سوئمنگ پول اور سرکہ
کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

کل رات یہ تفریح گاہ بھی جنگلی کتوں کی دستبرد کا
ہوئی تھی۔ کئی ایک شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ڈانس فلور پر کو
کا بول دبراز تھا اور ایک طرف راہداری کے قالین پر خو
ایک بہت بڑا دھبا موجود تھا۔ اب معلوم نہیں یہ کسی جانو
خون تھا یا انسان کا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آگئے اور سروج
تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ اچانک میں نے دیکھا
موبل الرٹ ہو گیا۔ اس کے حساس نتھنے کسی جانور
نتھنوں کی ہی طرح پھولنے پچکنے لگے تھے پھر وہ تیزی سے ا
طرف نکل گیا۔ چند منٹ بعد آ کر وہ ہمیں اطلاع دے رہا
کہ اس نے سروج کو ڈھونڈ لیا ہے۔

"کہاں ہے وہ؟"

موبل نے مجھے ہاتھ سے روکا "آپ اسے نہیں د
سکتے' وہ ایسی حالت میں ہے کہ آپ اسے نہیں دیکھ سکتے۔
بالکل برہنہ ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔"

"وہ زندہ تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"زندہ ہے جی۔ اس سے کسی نے زبردستی کی ہے۔ ہم
چاہیے کہ یہاں کی کسی خاتون ملازم کو بلائیں تاکہ وہ اس
جسم کو ڈھانپ سکے۔" یہ سنسنی خیز اطلاع تھی۔

میں نیچے جا کر ایک عورت کو اس کام کے لیے لے آیا
تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک کمرے میں بیٹھے سروج کے نار
حالت میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ موبل نے اپنے ٹو
پھوٹے لہجے میں جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا "سروج صاحب
کلب کے منیجر کے ذاتی کمرے میں موجود ہیں۔ وہ قالین پر
ہیں۔ ان کا لباس ان کے قریب ہی بکھرا پڑا ہے۔ ان کے
پر مخصوص ٹیپ چڑھا کر ان کی آواز بند کر دی گئی ہے۔ ا
ٹیپ کی مدد سے ان کے ہاتھ پاؤں بھی باندھے گئے ہیں۔"

"یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟"

"کوئی سر پھرا بھی ہو سکتا ہے استاد حبیب۔" زریں
کہا "یہ الو کا پٹھا جس قسم کی حرکتیں کرتا ہے کوئی بھی اس
جان اور عزت کا دشمن ہو سکتا ہے۔" پھر وہ خود ہی اپنی بات
درست کرتے ہوئے بولا "خیر عزت کا لفظ تو یوں ہی اد
زبان سے نکل گیا ہے۔ ام اور آپ اچھی طرح جانتے
یہ بہت پہلے اپنی عزت کا پتنگ بنا کر کچے دھاگے سے اڑا
ہے اور بو کاٹا کرا چکا ہے۔"

موبل کو زریں کی باتیں زیادہ اچھی نہیں لگیں کیونکہ ان دنوں وہ سروج کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

صفدر بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کہا "اگر سروج منیجر کے کمرے میں تھی تو پھر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔"

"بالکل جی۔" زریں نے لقمہ دیا "ام نے اس منیجر کو دیکھا ہے۔ بالکل اماری پاکستانی فلموں کا مصطفیٰ قریشی لگتا ہے' اور اگر مصطفیٰ قریشی نہ بھی ہو تو اس الو کی دُمچی میں اتنا ٹیلنٹ موجود ہے کہ یہ شریف سے شریف بندے کو بھی مصطفیٰ قریشی بلکہ ہمایوں قریشی بنا سکتا ہے۔ امارا خیال ہے کہ اس چھمک چھلو نے کل رات جو ڈانس فرمایا ہے' اسی کی وجہ سے اس کا یہ حالت ہوا ہے۔ اس کا دھماکا خیز ناچ دیکھ کر کسی "ناظرین" کا بھرکی گھوم گیا ہوگا اور وہ اسے دبوچ کر لے گیا ہوگا کمرے میں۔"

زریں کی بات وزن سے خالی بھی نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ کل رات کے ہیجان خیز ڈانس کا نتیجہ یہ نکلا ہو کہ مدہوش منیجر نے سروج کو اس کے فن کی "عملی داد" دینے کا پروگرام بنا لیا ہو۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد سروج نارمل حالت میں آگئی یعنی اس نے لباس وغیرہ پہن کر اپنا حلیہ درست کر لیا۔

میں اور صفدر اس کمرے میں پہنچے جہاں وہ گم صم بیٹھی تھی۔ اس کی گردن پر خراشیں تھیں اور پیشانی پر بھی نیل پڑا ہوا تھا۔

"کون تھا وہ؟" میں نے سروج سے پوچھا۔

"وہی حرام زادہ فاحشہ ماں کا حرامی بچہ!"

"ایسے تو اردگرد بہت سے ہیں۔ کوئی نام بھی تو ہوگا اس کا۔"

"کنگ براؤن کا اسسٹنٹ... راجر۔" وہ نفرت سے بولی۔

"راجر یہاں تھا؟" میں اچھل پڑا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "وہ بڑا کمینہ اور کینہ پرور شخص ہے۔ ایک مہینے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ٹرسٹ میں میری وجہ سے ایک بندے کے ساتھ اس کی مارکٹائی ہو گئی تھی' تبھی اسی کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا مجھ سے۔"

"وہ واقعہ تو شاید تم نے بتایا بھی تھا' راجر نے بہت زیادہ بلیک پی تھی اور کنگ فیملی کے ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔"

سروج نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں راجر کے لیے نفرت کی بجلی کوند رہی تھی۔ وہ بولی "ہم اپنے چکروں میں پڑے ہوئے تھے' ہمیں پتا نہیں چل سکا۔ وہ حرامی (راجر) پچھلے دو دن سے یہیں کالونی میں تھا۔ اس کلب کا منیجر رابن بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ڈانس کے بعد اس نے مجھے کمرے میں بلایا تھا کہ کوئی مہمان مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں یہاں پہنچی تو راجر نشے میں مدہوش بیٹھا تھا۔" ایک لمحے توقف کر کے اس نے اپنے آنسو ضبط کیے اور بولی "اس نے مجھ سے برا سلوک کیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں... میں اس کی جان لے لوں گی۔"

میں نے اور صفدر نے اسے تسلی تشفی دینے کی کوشش کی۔

وہ بہت بھری ہوئی تھی۔ بے شک اس کے لیے عزت و آبرو اور شرم و حیا جیسے الفاظ بے معنی تھے' پھر بھی زبردستی کا رویہ تو ہر کسی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

میں اور صفدر باتیں کرتے ہوئے باہر آگئے۔ صفدر نے کہا "بڑے تعجب کی بات ہے۔ راجر جیسے اہم شخص نے ایک نوجوان عاشق کی طرح ایکٹ کیا ہے۔ وہ سروج کے پیچھے خود کو خطرے میں ڈال کر یہاں تک چلا آیا۔"

"عورت بڑوں بڑوں کی مت مار دیتی ہے' اور پھر سروج جیسی ہو تو کیا ہی کہنے۔ اب تک جو اطلاعات ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شیطان کی ٹولی نے ٹرسٹ میں کافی کھلبلی مچائی تھی۔ کنگ کے تین چار اہم عہدے دار اس کے چکر میں ایک ساتھ پڑ گئے تھے۔"

"ہاں اس بارے میں تو آپ نے بتایا تھا۔ دو بندے مارے بھی گئے تھے۔"

"یہ وہی چکر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چکر میں دو بندوں کی جان چلی جائے وہ کافی سنگین چکر ہوگا۔"

ہم کلب سے باہر نکلے تو مین گیٹ پر کئی افراد جمع تھے اور چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ زریں گل کی زبانی پتا چلا کہ سروج والی بات پھیل گئی ہے اور کافی لوگوں کو پتا چل گیا ہے کہ ٹرسٹ کے ایک اہم عہدے دار نے یہاں پہنچ کر سامیں جی کی چیلی سے مجرمانہ سلوک کیا ہے۔ میں نے دیکھا' اکثر قبائلیوں کے چہروں پر غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔ اکثر قبائلی پتی چباتے تھے۔ اس پتی میں وہ ایک دو مزید اشیا بھی شامل کر لیتے تھے۔ جب وہ پریشان ہوتے تھے یا طیش کی صورت حال ہوتی تھی' ان کے جبڑے زیادہ تیزی سے چلنے لگتے تھے۔ میں نے وہاں موبل کو بھی دیکھا۔ سروج سے "قریبی تعلق" کی وجہ سے وہ بھی خاصا جز بز نظر آ رہا تھا۔

اچانک ایک طرف سے شور اٹھا۔ کچھ نو عمر لڑکے تو باقاعدہ چیخ پڑے تھے۔ ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ دو تین کتوں کی لاشیں پھلانگتے ہوئے ہم ریستوران کے عقب میں واقع ایک تنگ گلی میں پہنچے' یہاں ایک سوزوکی کار کے نزدیک بہت سے افراد جمع تھے۔ اس ہجوم میں سائیں عالی کے تین چار مسلح کمانڈوز بھی نظر آرہے تھے۔

نزدیک پہنچ کر ہم نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ ایک شخص نے اوندھے منہ لیٹ کر کار کے نیچے گھسنے کی کوشش کی تھی۔ کار کے نیچے خلا بہت کم تھا اور گھسنے والے کا جسم ذرا فربہ تھا' اس کا نصف دھڑ کار کے نیچے پھنس گیا تھا اور نصف باہر تھا۔ جو حصہ باہر تھا اسے جنگلی کتوں نے بری طرح نوچ کھسوٹ ڈالا تھا۔

ایک کمانڈو نے مجھے بتایا کہ یہی مجرم ہے۔

"کون مجرم؟"

"جس نے سائیں جی کی خادمہ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔"

میں نے چونک کر کار کے نیچے دیکھا اور میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ کار کے نیچے پھنسا ہوا شخص راجر تھا۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے' وہ زندہ تھا۔ مگر اس کی پشت اور اس کی ٹانگیں۔ خدا کی پناہ۔ اس کی ٹانگوں اور پشت کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ رانوں کے پچھلے حصوں پر تو گوشت کا نشان نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم کولھوں سے اوپر اس کا جسم بالکل محفوظ تھا۔ وہ آدھا زندہ تھا اور آدھا مسخ شدہ لاش بن چکا تھا۔ سسکتی ہوئی زندگی اور پارہ پارہ موت کا یہ سنگم بڑا عبرت ناک تھا۔

کمانڈوز نے اسے بمشکل کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کا بہت سا خون ضائع ہوچکا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ بہت کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ وہ اپنے ہی خون کے دھبوں اور اپنے ہی لباس کے چیتھڑوں کے درمیان یوں لیٹا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا محال تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ رات کو جب جنگلی کتوں کی ٹولیوں نے کالونی پر ہلا بولا تو راجر بھی اس ہلے کی زد میں آیا۔ غالباً کتوں کے ساتھ اس کی خونی ملاقات رات کے آخری پہر میں ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ سروج کو کمرے میں بند چھوڑ کر وہ کالونی سے نکلنا چاہ رہا ہو اور اپنی گاڑی تک پہنچنے سے پہلے کتوں کی زد میں آگیا ہو۔ اس نے اس سوزوکی کار کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں اس کا نصف جسم گوشت سے محروم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے قریب سے دیکھا تو اس کے منہ سے اب تک شراب کی بو آرہی تھی۔

اسپتال کا عملہ دوڑا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ وہ اسٹریچر لائے تھے' یقیناً وہ اسے طبی امداد دینا چاہ رہے تھے۔ راجر کی صورت حال دیکھ کر ایک عام شخص بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا سفر ختم ہوچکا ہے۔ کل کی رات نے جو من مانیاں کی تھیں وہ اس کی زندگی کی آخری مانیاں تھیں۔ بہرحال کوشش کرنا تو ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے بعض اوقات غیر متوقع طور پر ایسی کوششیں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ ابھی راجر کا اسٹریچر اٹھایا نہیں گیا تھا کہ میری نگاہ سروج پر پڑی۔ وہ اچانک لوگوں کے عقب سے نمودار ہوئی تھی' اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا پھر مجھے اس کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آیا۔ اس نے ریوالور نیم مردہ راجر کی طرف سیدھا کیا اور دھماکوں سے تین گولیاں اس کے سر میں اتار دیں۔ اسٹریچر پر اس کا جسم اچھل کر رہ گیا۔ خون کی دھاریں اس کی پیشانی سے نکلیں اور اس کے ایک رخسار پر پھیلتی چلی گئیں۔ اس کا چہرہ اور بھی خوفناک نظر آنے لگا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے جبڑے پر ابھی تک اس کی پٹی موجود تھی اور اس ہاتھا پائی کی یاد دلاتی تھی جو اس نے رسٹ میں سروج کے لیے کی تھی۔

راجر کی عبرت ناک موت پر لوگ دانتوں میں انگلیاں دبا رہے تھے۔ میں نے زندگی میں بہت سی لاشیں دیکھی تھیں مگر اس طرح کی زندہ لاش پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

بات شاید عقیدت کی ہوتی ہے۔ عقیدت ہو تو ہر طرح کے حالات عقیدے کی روشنی میں مثبت ہی نظر آتے ہیں۔ یہاں اس کالونی میں بھی کچھ ایسا ہی ہورہا تھا۔ دوپہر تک ہر طرف سائیں عالی کی قصیدہ خوانی سنائی دینے لگی تھی۔ سائیں کے عقیدت مند قبائلی سروج والے واقعے کو بڑھا چڑھا کر بیان کررہے تھے۔ سائیں عالی یعنی ڈورے دیوتا کی داسی کے ساتھ زیادتی کرنے والے کے عبرت ناک انجام کو مرچ مسالا لگا کر بیان کیا جارہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کل رات بستی پر مصیبت ہی اس لیے آئی تھی کہ ڈورے دیوتا کی داسی کے ساتھ زیادتی ہوئی اور زیادتی کرنے والے کو روکا نہیں جاسکا۔

موہل نے جو اعداد و شمار اکٹھے کرکے ہمیں بتائے کے مطابق کل رات کالونی میں اور اردگرد کی خیمہ بستی میں کم از کم ۲۴ افراد ہلاک ہوئے اور دو سو کے قریب اسپتال میں پہنچے۔ ہلاک ہونے والوں میں ہمارا ساتھی اور ہم خیال حترجم داماں بھی تھا۔ داماں کی موت نے ہم سب کو ملول کیا تھا' خاص طور سے غزالہ اور میں تو صدمے سے چور ہو

تھے۔ داماں نے ہمارے لیے اپنی جان قربان کی تھی۔ میں اس کے نزدیک سائیں عالی کا خاص مرید تھا اور سائیں عالی کے تو نام کو بھی وہ سجدے کرتا تھا۔ میری زندگی بچانے کے لیے اس نے اپنی جان داؤ پر لگائی تھی اور بڑی خوشی سے لگائی تھی۔

داماں کی آخری رسومات شام کے وقت ادا کی گئیں۔ سیکڑوں قبائلی ان رسوم میں شریک ہوئے۔ دراصل کل رات مرنے والے بیشتر افراد کی رسوم ایک ساتھ ہی ادا کی گئی تھیں۔ بستی میں خوف و ہراس کی فضا پائی جاتی تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا۔ ابھی اس بستی پر مزید مصیبتیں آئیں گی۔ زیادہ تر لوگوں کی یہی رائے تھی کہ موہابہ کو جلد از جلد پکڑا جانا چاہیے اور اگر وہ پکڑی نہیں گئی اور پجاریوں نے مناسب طریقے سے اس پر قابو نہیں پالیا تو یہی کچھ ہوتا رہے گا جو کل رات ہوا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ موہابہ چونکہ شر کی قوتوں کی اسیر ہوگئی ہے اس لیے وہ علاقے کے لوگوں کو اسی طرح نقصان پہنچاتی رہے گی۔

اگلی رات صبح تک اکثر لوگ جاگتے رہے۔ انہیں دھڑکا تھا کہ پھر کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ لوگوں نے گھروں کے کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر رکھے تھے۔ دروازوں کی درزوں کے اندر اور دیگر سوراخوں میں کپڑے وغیرہ ٹھونس دیے گئے تھے تاکہ حشرات الارض بھی دخل اندازی نہ کرسکیں۔ اکثر گھروں میں اسلحے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ وہ لوگ جو کالونی سے باہر خیمہ بستیوں میں مقیم تھے انہوں نے بھی حتی الامکان حفاظتی تدبیریں کی تھیں۔ اپنے عقیدے کے مطابق زہریلے جانوروں کے لیے دافع تصور کی جانے والی بوٹی کے کچھ پتے ہر خیمے میں رکھے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ آگ بھی جلائی گئی تھی۔

رات گئے تک کالونی میں مختلف افواہیں بھی گردش کرتی رہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ قریبی بستی میں چند بدمست ہاتھیوں نے اودھم مچایا ہے اور بہت سے لوگوں کو روند ڈالا ہے پھر یہ خبر پھیل گئی کہ جنگل میں سفر کرنے والی ایک برات پر بندروں نے حملہ کیا ہے اور بہت سے لوگوں کو شدید زخمی کردیا ہے۔ رات کو ہم سب بھی دیر تک جاگتے رہے' داماں کی المناک موت زیر بحث رہی' اس کے علاوہ سروج سے ہونے والی زیادتی اور نتیجے میں راجر کی عبرت ناک موت بھی گفتگو کا موضوع رہی۔ بے شک راجر مر رہا تھا مگر سروج نے اسے اپنے ہاتھ سے شوٹ کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ قتل تھا'

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کرکے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جاسکتی —— ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

تین حصوں میں مکمل

قیمت -/۱۵۰

ڈاک خرچ -/۲۰

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون-۷۲۴۷۴۱۴

مگر وہ سائیں کی چہیتی چیلی تھی۔ اسے پتا نہیں سائیں نے کتنے خون معاف کر رکھے تھے۔ کچھ کو وہ اپنے ہاتھوں سے مارتی تھی' کچھ کو باتوں سے اور کچھ کو "راتوں" سے۔ ٹرسٹ میں سورج جو گل کھلا کر آئی تھی وہ ہم نے نہیں دیکھے تھے مگر کل رات اور آج صبح جو کچھ سورج کے ساتھ پیش آیا تھا اس سے کچھ کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گل کتنے زبردست ہوں گے۔ اس گل کاری کے نتیجے میں دو افراد کی جان ٹرسٹ میں گئی تھی اور آج صبح ایک عاشق دل فگار یہاں کام آیا تھا۔

رات کو جب دیگر لوگ سوگئے تو میں نے موبل کو اپنے پاس بلایا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند اور ربڑ کی طرح چوکس نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم دو دن کہاں غائب رہے ہو اور دیکھو۔ سچ سچ بتانا۔"

وہ شکستہ اردو میں بولا "میرا خیال ہے کہ کچھ کچھ اندازہ آپ کو بھی ہو گیا ہوگا۔ میں ساحرہ موتابہ کے کھوج میں نکلا تھا۔ اس کا آزاد رہنا ہم سب کے لیے بے حد خطرناک ہے۔"

"پھر کیا کھوج ملا تمہیں؟"

"ایک کھوج ملا ہے جی۔ اگر نہ ملتا تو شاید میں واپس ہی نہ آتا۔ ناکام لوٹنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس گپھا (غار) کا سراغ لگالیا ہے جہاں موتابہ موجود ہے۔"

"خیال ہے یا کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"موبل کا خیال کسی ثبوت سے کم نہیں ہوتا جناب۔ اگر مزید تصدیق کی ضرورت ہے تو پھر بوبا سے ایک دو پجاریوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہ "گپھا" میں گھسے بغیر اندازہ لگالیں گے کہ موتابہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔"

"کیسے اندازہ لگائیں گے؟"

"ان کی شکتی ان کے کام آئے گی۔"

"تو پھر لو ان پجاریوں کو۔ ہم اسی وقت چلیں گے۔ دشمن کو ڈھیل دینا خطرناک ہوتا ہے۔ اس وقت موتابہ کی حیثیت دشمن کی سی ہے۔"

"میرے خیال میں اس کام کے لیے یہ وقت ہرگز مناسب نہیں۔ ہمیں رات آخری پہر نکلنا ہوگا تاکہ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے اس جگہ پہنچ سکیں۔"

"اس کی کیا وجہ ہے؟"

"اس کی وجہ شاید آپ نہ سمجھ سکیں۔ یہ مذہبی وجہ ہے۔"

"ٹھیک ہے' جیسے تم مناسب سمجھو۔" میں نے طویل بحث سے بچنے کے لیے کہا۔

رات آخری پہر ہم بوبا میں پہنچے' زریں گل کے علاوہ سردار رانفے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم بوبا سے دو تین پجاریوں کو ساتھ لینا چاہتے تھے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پجاری وہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ کچھ بتا کر بھی نہیں گئے تھے سردار رانفے نے کہا "دو تین چھوٹے پجاری لے جانے کے بجائے کیوں نہ بڑے پجاری صاحب کو ساتھ لے لیا جائے وہ ذرا بیمار ہیں لیکن میری درخواست رد نہیں کریں گے۔"

ہم رضامند ہوگئے اور بڑے پجاری صاحب کی قیام گاہ کی طرف چل دیے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بڑے پجاری بھی شروع رات سے کہیں نکلے ہوئے ہیں۔

سردار رانفے نے خیال ظاہر کیا کہ شاید بڑے پجاری صاحب بوبا سے چھوٹے پجاریوں کو لے کر موتابہ کی تلاش میں نکلے ہوئے ہوں۔

اس دلیل میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ بہرطور ہم نے کالونی سے ہی تین بزرگ لارسیوں کو ساتھ لیا اور ایک جیپ کے ذریعے ٹیلوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ رہنمائی کے لیے موبل ہمارے ساتھ تھا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور وہ میرے پہلو میں موجود تھا۔ میں راستے بھر موبل سے پوچھتا رہا کہ گپھا میں موتابہ کے موجود ہونے کے بارے میں وہ کیونکر جانتا ہے؟

موبل اس بات کا کوئی ٹھوس جواب نہ دے سکا۔ بس یہی کہتا رہا کہ موتابہ وہاں موجود ہے۔ اگر وہاں موجود نہیں تو پھر شاید اس علاقے میں ہی نہ ہو۔

ہماری جیپ ٹیلوں کے قریب پہنچ کر درختوں میں داخل ہوگئی۔ یہ درخت بتدریج جنگل کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بالآخر ایک جگہ ہمیں جیپ روکنا پڑی' یہاں سے ہم پیدل آگے روانہ ہوئے۔ میں' زریں گل اور موبل رائفلوں سے مسلح تھے۔ سردار رانفے کے پاس اس کا روایتی ہتھیار دو برچھیوں والا نیزہ تھا۔ ہم محتاط قدموں سے ایک بلند ٹیلے کے دامن میں پہنچے۔ یہاں ایک کھوہ کے دہانے کے آثار نظر آئے۔ تینوں بزرگ لارسی بڑی تیزی سے اپنی مالاؤں کو حرکت دیتے ہوئے کسی وظیفے میں مصروف ہوگئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ راستے بھر خوف زدہ ہی رہے ہیں۔ شاید سردار رانفے کا حکم نہ ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ نہ آتے' پھر راستے سے ہی واپس چلے جاتے۔ زریں گل بھی ڈرا ہوا تھا۔ نادیدہ چیزوں کا خوف ہمیشہ سے اس کا پتا پانی کرتا تھا۔

ہم ٹارچوں کی مدد سے بالکل گپھا کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اچانک ہم سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہوگئے۔ ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ بوبا کے پجاری کہاں گئے تھے' اس کے علاوہ صاف

پجاری کی غیر موجودگی کا سبب بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ ان پانچ پجاریوں کی لاشیں گپھا کے دہانے کے عین سامنے ایک درخت سے جھول رہی تھیں۔ ان سب کے ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے انہیں باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔

میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کا روشن دائرہ ایک لاش کے چہرے پر پڑا اور جسم میں جھرجھری سی پھیل گئی۔ یہ کھچڑی بالوں والے ایک مسکین صورت پجاری کی لاش تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ چہرے کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ اس شخص کو مرے بمشکل دو تین گھنٹے ہوئے ہیں۔ میں نے جسم چھوا' وہ ابھی تک نرم تھا۔ تمام پجاریوں کے سیاہ جسموں پر فقط لنگوٹیاں تھیں۔

موبل کی لرزتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی "آپ کو اب تو یقین آگیا۔ وہ اسی "گپھا" میں موجود ہے۔"

سردار رانفے کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی یہاں سے بھاگ کھڑا ہوگا یا چکرا کر گر جائے گا۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ اس نے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ موبل نے ترجمہ کرتے ہوئے بتایا "سردار کا کہنا ہے کہ اگر ہمیں زندگی عزیز ہے تو فوراً یہاں سے دور ہٹ جائیں۔ اگر پجاری اس بلا سے خود کو بچا نہیں سکے تو ہم بھی نہیں بچ سکیں گے۔"

ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے۔ حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کوئی انجانی شے مجھے یہاں رکنے پر مجبور کر رہی ہے' مجھے اس گپھا کی تاریکی کی طرف کشش کر رہی ہے۔ خدا جانے یہ نفسیاتی کیفیت تھی یا حقیقت میں ایسا تھا۔ بعد ازاں زریں نے بھی بتایا کہ ان لمحوں میں اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ گپھا کے دہانے پر اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دمے کا کوئی مریض زور زور سے سانس اپنے اندر کھینچ رہا ہے' اور اس کے سانس کی آواز دہانے سے باہر آرہی ہے۔

ہم واپس اپنی جیپ کے پاس پہنچ کر رک گئے اور اجالا پھیلنے کا انتظار کرنے لگے۔ پروگرام یہی بنا تھا کہ جب اچھی طرح اجالا پھیل جائے گا تو ہم کچھ دیگر مسلح افراد کے ہمراہ واپس گپھا تک پہنچیں اور گپھا کے اندر جو کچھ بھی ہے اسے سامنے لائیں گے۔ سردار رانفے کی دلی خواہش تھی کہ اگر اس موقع پر سائیں جی یہاں پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔ میں نے سوچا کہ میں خود کالونی جاؤں اور سائیں عالی کو لانے کی کوشش کروں۔ میں جانتا تھا کہ سائیں عالی یہاں آگیا تو قبائلیوں کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا اور وہ دوبارہ گپھا کی طرف جانے پر رضامند ہو جائیں گے۔ دوسری صورت میں یہ امر مشکوک تھا کہ وہ واپس "گپھا" کی طرف جائیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ عین موقع پر سردار رانفے سمیت وہ کوئی نہ کوئی عذر تراشنے کی کوشش کریں گے۔

میں جب کالونی کی طرف واپس جانے لگا تو سردار رانفے اور دیگر لارسی بھی تیار ہوگئے۔ ہم سب دوبارہ جیپ میں بیٹھے اور واپس کالونی کی طرف چل دیے۔ راستے میں ہم ٹیلوں میں گھری ہوئی اسی بستی کے قریب سے گزرے جہاں چند دن پہلے ہم موتابہ کے تعاقب میں آئے تھے۔ اس تعاقب کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہمیں جیپ میں اپنے ایک ساتھی کی لاش لے کر جانا پڑی تھی۔

بستی سے باہر موجود چند افراد نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری جیپ روک لی۔ سردار رانفے کو پہچان کر ان سب نے تعظیم پیش کی۔ اب صبح ہو گئی تھی اور قرب و جوار صاف نظر آرہے تھے۔ بستی کے ایک بوڑھے شخص نے آگے بڑھ کر بتایا کہ بستی میں چند دن سے پراسرار واقعات پیش آرہے ہیں۔ جنگلی جانور بستی میں گھس آتے ہیں۔ انسانوں اور جانوروں پر حملہ کردیتے ہیں۔ رات کو کسی وقت عجیب سی آواز سنائی دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مشرقی ٹیلوں کی طرف سے کوئی عورت بستی والوں کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ کبھی وہ انہیں لالچ دیتی ہے' کبھی ڈراتی دھمکاتی محسوس ہوتی ہے۔ بوڑھے نے یہ بھی بتایا کہ کل شام بستی کے دو جھونپڑوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس قسم کا ایک واقعہ پرسوں صبح بھی ہوا تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک چونکا دینے والا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ بستی کے ایک اور جھونپڑے میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ اس جھونپڑے کے قریب کچھ خشک درختوں نے بھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑلی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اگلے چند منٹوں میں یہ آگ "جنگل کی آگ" بن جائے گی۔ یہاں درخت خشک تھے اور بہت قریب قریب تھے۔ سردار رانفے نے بھی اس خطرے کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کرلیا تھا' اس کا چہرہ تاریک تر ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ موبل نے سردار کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔

"سردار کہہ رہا ہے کہ یہ سب کچھ موتابہ کر رہی ہے اور موتابہ کا سدباب صرف دو بندے کرسکتے ہیں۔ سائیں عالی صاحب یا پھر محترم بوکارلو۔ جو ٹرسٹیوں کی قید میں ہیں۔"

میرا اندیشہ درست نکلا۔ جھونپڑے میں پراسرار طور پر جو آگ بھڑکی تھی اس نے قریبی درختوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ خزاں رسیدہ خشک درخت ایندھن کی طرح دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ اس چھوٹی سی دیہاتی بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ دھوئیں کے گہرے بادل بڑی تیزی سے فضا میں پھیلنے لگے تھے۔

"ہمارا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنا چاہیے' نہیں تو ہم پھنس جائے گا۔" زریں نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

ہم سب جیپ کی طرف گئے مگر اس سے پہلے کہ ہم سوار ہوتے' جیپ کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا۔ حرارت بہت زیادہ ہوگئی تھی اور مزید بڑھ رہی تھی۔ جنگل کی آگ کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن آج زندگی میں پہلی بار اس آگ کا بھیانک منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی' اس ہوا کے سبب آگ مزید تیزی سے پھیل رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جادوئی منظر دیکھا۔ آگ کے شعلوں سے قریباً تیس چالیس گز دور خشک جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے بھک بھک کی آواز سے اچانک آگ پکڑلی اور جنگل کی آگ کا حصہ بن گیا۔ ان آتش زدہ درختوں میں سے کئی چھوٹے موٹے جانور نکلے اور ادھر اُدھر بھاگ گئے..... بے شمار پرندے فضا میں چکرا رہے تھے اور چیخ چلا رہے تھے۔

بستی والوں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی تھی کہ اگر وہ کچھ دیر مزید بستی میں رکے رہے تو آگ کے گھیرے میں آجائیں گے۔ وہ اپنے مال مویشی سمیت تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلنا شروع ہوگئے تھے۔ حبشی عورتیں اور مرد اپنی بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کو تیزی سے ہنکاتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ محفوظ راستے پر سفر کرتے ہوئے ہم جلد ہی آگ کی زد سے نکل آئے۔ مقامی لوگوں میں زبردست خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ موال نے مجھے بتایا "یہ لوگ مصیبت کی اس گھڑی میں سائیں عالی کو ہی واحد سہارا سمجھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شیطانی طاقتوں نے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا ہے اور اس حالت میں صحرائی درویش ہی ان کی مدد کرسکتے ہیں۔"

سورج اب بلندی پر آگیا تھا اور تیز گرم دھوپ نشیب و فراز کو اپنے شکنجے میں جکڑنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کالونی میں واپس پہنچ گئے۔ یہاں بھی افراتفری کا سماں تھا۔ گپھا کے سامنے پانچ پجاریوں کی دردناک موت نے کالونی میں اور کالونی سے باہر کھلبلی مچادی تھی۔ مقامی لوگ خاص طور سے بہت ہراساں نظر آتے تھے۔ انہوں نے دور ٹیلوں سے اٹھنے والے دھوئیں کے دیوہیکل مرغولے بھی دیکھ لیے تھے۔ وہ اس نئی آفت کو بھی پجاریوں کی موت اور جنگلی کتوں کے خوفناک حملے سے منسلک کررہے تھے۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہورہا ہے اس کی وجہ صرف اور صرف باغی ساحرہ موتابہ ہے۔ وہ تاریک گپھا کے اندر موجود ہے اور وہاں سے اپنی طلسمی قوتوں کو حرکت میں لاکر مقامی لوگوں پر اپنے قہر کی بجلیاں گرا رہی ہے۔

مقامی لوگوں کے اس خیال کو رد کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ہم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اپنے حواس سے محسوس کررہے تھے۔ موتابہ کے نیم مردہ جسم کا تابوت سے غائب ہونا' کالونی میں زہریلے سانپوں کی آمدورفت' اس کے بعد جنگلی جانوروں کا حملہ' پھر پانچ پجاریوں کی رسّوں سے جھولتی ہوئی لاشیں۔ یہ سب ایسے ٹھوس حقائق تھے جنہیں جھٹلانا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ مضافاتی بستی سے کالونی میں پہنچنے والے لوگ سائیں عالی سے ملنا چاہتے تھے۔ سائیں عالی کے لیے ان کی پیشانیوں سے سجدے ٹپک رہے تھے مگر سائیں سے ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ اپنے حجرے میں سے اپنی مرضی سے نکلتا تھا اور کبھی سارا سارا دن اس کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ سائیں کے چاق و چوبند گارڈز نے ان صحرائی لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ لوگ وہیں ٹھہر گئے اور ضد کرنے لگے کہ انہیں سائیں جی کا دیدار کرایا جائے۔

جب ان کا تقاضا حد سے بڑھ گیا تو سائیں کی نمائندگی کرنے کے لیے اس کی چیلی سروج لوگوں کے سامنے آئی۔ وہ اکثر اپنے توبہ شکن لباس یعنی ٹی شرٹ اور بے حد تنگ پتلون میں نظر آتی تھی' لیکن آج اس نے پھر وہی ذورے دیوتا کی کنیز والا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ ایک ساڑی نما چست لبادہ تھا۔ اس میں پنڈلیاں عریاں رہتی تھیں اور بازو بھی کہنیوں سے اوپر تک دکھائی دیتے تھے۔ گریبان بے حد کشادہ اور نظر نواز تھا۔ وہ بڑی تمکنت سے ہجوم کے سامنے آئی تو لوگ اس کی تعظیم کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اوندھے لیٹ گئے "ساجے۔ ساجے۔" کی آوازیں بلند ہوئیں۔

ان آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ ذورے دیوتا کی مقدس کنیز کا نام پکار رہے ہیں' وہ مقدس کنیز جو ذورے دیوتا کے معتقدین کی خاطر ہر وقت اپنا شباب بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار رکھتی تھی۔ سروج نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہجوم سے مخاطب ہوکر بولنا شروع کیا "آپ لوگ پریشان مت

ہوں اور نہ ہی نراش ہوں۔ آپ سائیں جی کی امان میں ہیں اور سائیں جی کے شریر میں ذورے دیوتا کی آتما ہے جو اب ہر گھڑی آپ کی نگہبان ہے۔ یہ وقتی مشکلات ہیں' ان کو بہت جلد دور ہوجانا ہے۔ آپ لوگ حوصلہ مند رہیں' بہت اچھا وقت ہمارے بہت قریب ہے۔ آپ اچھی خبریں سننے والے ہیں۔ آپ لوگ بھی دوسرے لوگوں کی طرح کالونی کے مضافات میں پڑاؤ ڈالیں اور سائیں جی کی طرف سے اگلی ہدایات کا انتظار کریں....."

سروج کی تقریر دل پذیر کا ترجمہ ایک مترجم ساتھ ساتھ کرتا جارہا تھا۔ سیاہ فام سامعین بڑی محویت سے سن رہے تھے۔ ابھرتے سورج کی روشنی میں ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور پسینہ دھاروں کی صورت ان کی گردنوں پر بہہ رہا تھا۔

○☆○

سورج ڈھلتے ہی جب دھوپ کی تمازت ذرا کم ہوئی' سائیں عالی کے حکم پر تیس کمانڈوز کا ایک دستہ اس گپھا کی طرف روانہ ہوا جہاں پانچوں پجاریوں کی لاشیں درختوں سے جھول رہی تھیں۔ سائیں کے حکم پر سوار راٹے بھی اپنے پچاس مسلح افراد کے ساتھ کمانڈوز کا ہم رکاب ہوگیا۔ ان لوگوں کو پجاریوں کی لاشیں واپس بستی میں لانا تھیں تاکہ آخری رسومات ادا کی جاسکیں۔ آخری رسومات کا تمام انتظام پہلے ہی کرلیا گیا تھا۔

صفدر نے مجھ سے پوچھا "کیا موتابہ کو غار کے اندر سے پکڑنے کی کوشش بھی کی جائے گی؟"

"میرے خیال میں ابھی ایسا نہیں ہوگا۔" میرے بجائے موال نے جواب دیا "صحرائی درویش نے کہا ہے کہ یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

موال ناقابل یقین تیزی کے ساتھ ہماری زبان سیکھ رہا تھا۔ کچھ الفاظ کی ادائیگی وہ ضرور غلط کرتا تھا' مگر کوشش کرکے اس کی بات مکمل طور پر سمجھ میں آجاتی تھی۔

میں نے موال سے پوچھا "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ موتابہ اس گپھا میں موجود ہی نہ ہو۔"

اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا "آپ دیکھ لینا' وہ جب بھی ملی غار سے ہی ملے گی۔ وہ جگہ اس کے لیے سب سے محفوظ ہے۔"

قریباً دو گھنٹے بعد سائیں عالی کے بھیجے ہوئے لوگ پجاریوں کی لاشوں سمیت کالونی واپس پہنچ گئے۔ یہ لاشیں بڑے احترام کے ساتھ ایک بڑے چھکڑے میں رکھی گئی تھیں۔ چھکڑا چاروں طرف سے بند تھا اور اس کی چھت پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ اس ویرانے میں پھولوں کا دستیاب ہوجانا خاصا حیران کن تھا۔ چھکڑے کی دونوں جانب ایک ایک گھڑسوار تھا۔ اس گھڑسوار کے آگے آگے ایک ڈھولچی زور و شور سے ڈھول پیٹ رہا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے سائیں کی قیام گاہ کے عین سامنے واقع میدان میں' پجاریوں کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ فضا میں دہشت اور سراسیمگی رچی بسی تھی۔ جس وقت پجاریوں کی رسومات ادا ہورہی تھیں' دور مشرقی افق بالکل سرخ نظر آرہا تھا۔ یہ سرخی اس آگ کی تھی جو ٹیلوں سے آگے جنگل میں لگی ہوئی تھی۔ اس رات ایک بار پھر بستی کے ایک حصے سے چیخ و پکار کی آوازیں ابھریں اور بھگدڑ کا سا منظر نظر آنے لگا۔ میں اور زریں گل اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ کالونی کی کچھ سڑکوں پر پھر زہریلے سانپ نظر آئے ہیں۔ ان میں سے کچھ سانپ ایک ریستوران میں گھس گئے تھے اور کئی افراد کو کاٹ لیا تھا۔ میں اور زریں گل دوڑتے ہوئے اس ریستوران کے سامنے پہنچے۔ یہاں ایک نیون سائن پر دو بڑے سانپ لٹک رہے تھے۔ زریں نے اپنے ریوالور کی مدد سے ان دونوں سانپوں کو شوٹ کیا۔ سڑک پر بھی سانپوں کی موجودگی کا شبہ ہورہا تھا' تاہم تاریکی کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چند لمحے بعد ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس سڑک پر پڑیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سڑک پر درجنوں سانپ موجود تھے اور کالونی کے وسطی حصے کی طرف رینگ رہے تھے۔ زریں نے بھی سانپوں کی اس یلغار کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے ریوالور کا رخ سڑک کی طرف کیا اور فائرنگ شروع کردی۔ اس کا یہ طریقہ زیادہ کارگر نہیں تھا۔ اس کی کوئی اچٹتی ہوئی گولی ان لوگوں میں سے کسی کو لگ سکتی تھی جو پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک ڈاٹسن کار کو ہاتھ دے کر روکا۔ گاڑی ایک سفید فام دوشیزہ ڈرائیو کررہی تھی۔ میں نے اس حیران لڑکی کو کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا' میں نے اندھا دھند گاڑی بائیں جانب موڑی اور اس سڑک پر چڑھا دی جہاں سانپوں کا جلوس نظر آیا تھا۔ گاڑی کو ساٹھ ستر گز آگے لے جانے کے بعد میں نے اسے ریورس کردیا۔ اسی طرح میں نے سڑک پر چار پانچ چکر لگائے۔ گاڑی کی لائٹس میں درجنوں سانپ خون میں لت پت نظر آئے۔ اسی دوران میں دو اور کار سواروں نے بھی میری تقلید شروع کردی اور

سانپوں کی یلغار کو روک دیا۔

رات کا باقی حصہ افراتفری میں ہی گزرا۔ خوف زدہ لوگ مزید خوف زدہ ہو گئے تھے۔ کالونی کی تمام اسٹریٹ لائٹس روشن کر دی گئیں اور لوگوں نے گھروں میں بھی تمام روشنیاں جلالیں۔ جنگل میں لگنے والی آگ اب کالونی سے کچھ قریب محسوس ہونے لگی تھی۔ فضا میں جلی ہوئی لکڑی اور دھوئیں کی بو نمایاں تھی۔ بعض یورپین اور امریکن افراد کا خیال تھا کہ سانپوں کا یہ تازہ حملہ جنگل کی آگ کے سبب ہے۔ سانپ اور دیگر حشرات نقل مکانی کر رہے ہیں اور کالونی کی طرف آرہے ہیں۔ یہ لوگ اس سے پہلے پیش آنے والے واقعات کو بھی اسی حوالے سے دیکھ رہے تھے۔

اگلے روز سہ پہر کے بعد جب باہر سورج آگ برسا رہا تھا اور ہماری رہائش گاہ میں ائر کنڈیشنر کی زبردست ٹھنڈک تھی، میں اور غزالہ پاس پاس بیٹھے تھے اور اس لرزہ خیز رات کی باتیں یاد کر رہے تھے جب اسی چار دیواری کے اندر ہمیں خون آشام درندوں نے گھیر لیا تھا۔ پہلے ہمارے لیے اس ائر کنڈیشنر کی بدولت قطب شمالی کا موسم پیدا ہو گیا تھا پھر ائر کنڈیشنر بند ہونے سے سورج سوا نیزے پر آگیا تھا۔ ہمیں داماں کی ناقابل فراموش قربانی یاد آئی۔ اس نے اسٹیل کے بند دروازے کا "راز" جاننے کے لیے اپنا آپ خوں خوار جنگلی کتوں کے حوالے کر دیا تھا۔ داماں کی آخری کراہیں جیسے اب بھی میرے کانوں میں گونجتی تھیں اور مجھے اس بے مثال عقیدت کی یاد رلاتی تھیں جو داماں سائیں عالی کے لیے رکھتا تھا۔ ہم باتیں کر رہے تھے جب سروج دندناتی ہوئی اندر آگئی۔ وہ بدستور کنیز ساجے کے لباس میں تھی۔ غزالہ کو دیکھتے ہی بولی "پلیز اٹھنا مت، مجھے تمہارے ایک مشورے کی ضرورت ہے۔"

غزالہ جو واقعی اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی، بے دلی سے بیٹھی رہ گئی۔ تاہم سروج کی شکل دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نظر آنے لگے تھے۔

سروج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "میں ایک مشکل میں پھنس گئی ہوں شاہ جہاں۔"

"اب کس مشکل میں پھنس گئی ہو؟" میں نے اس کی بات اچکی۔

میرا اشارہ اس مجرمانہ حملے کی طرف تھا جو چند روز پہلے سروج پر آنجہانی راجر نے کیا تھا اور جس کی ادکا دکا نشانیاں خراشوں کی صورت ابھی تک سروج کی گردن پر موجود تھیں۔

وہ بیزاری سے بولی "پوری بات تو سن لو۔ پہلے ہی نیا میں شروع کر دی ہے۔" پھر غصے کا گھونٹ بھر کر کہنے لگی "سردار رانبے کا کہنا ہے کہ آج چاند کی چودھویں رات ہے، آج مجھے ڈانس کرنا ہوگا ورنہ لوگ بہت مایوس ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا "تمہاری بات میں کوئی بھی نئی بات نہیں۔ چاند کی چودھویں رات کو تو ہر مہینے آنا ہی ہوتا ہے، تم ڈانس بھی کرتی رہتی ہو اور اپنے عاشقوں کو مایوس کرنا بھی تمہارا روز کا معمول ہے۔"

وہ جھنا کر بولی "مذاق مت کرو۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔ یہ دیکھو، یہ ہے وہ لباس جو مجھے ڈانس کرتے وقت پہننا ہے۔" اس نے بڑی بے شرمی سے ایک برائے نام لباس میری طرف اچھال دیا۔

غزالہ کے لیے اب مزید یہاں رکنا ممکن نہیں تھا، وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ میں نے سروج کے پھینکے ہوئے لباس کی طرف دیکھا۔ یہ چمڑے کی دو مختصر سی دھجیاں تھیں۔ اس نہایت ملائم چمڑے پر چند قیمتی یاقوت ٹانکے گئے تھے اور ربوبو دیوتا کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اچھا لباس ہے۔ تم اسی قسم کے کاموں میں خوش رہتی ہو۔"

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "اتنا برا لباس میں نے نہیں دیکھا ہے۔ میں کسی صورت یہ ڈانس نہیں کروں گی۔"

"نہ کرو گی تو تمہارا گرو گھنٹال ناراض ہو جائے گا اور تمہارے ٹخنوں پر ڈنڈے مار مار کر تمہارا جلوس نکال دے گا۔"

"لیکن اتنے لوگوں کے سامنے میں یہ کیسے کر سکوں گی۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

میں جانتا تھا وہ صرف اداکاری کر رہی ہے ورنہ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اس قسم کے مظاہرے تو اس کے خون کو گرما کر اسے شعلہ جوالہ بناتے تھے۔

میں نے کہا "یوں لگتا ہے کہ یہ یہاں کی کوئی مذہبی رسم ہے، اب تم ڈورے ریوتا کی "رقاصہ کنیز" ہو۔ یہ رسم تو تمہیں ادا کرنا ہی پڑے گی۔"

"موسل کہاں ہے؟" وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"اس سے کیا کہنا ہے؟"

"کچھ کہنا ہی ہوگا نا۔"

"شاید تم اس سے پوچھنا چاہتی ہو کہ موسل جی! میں یہ رقص کروں یا نہ کروں۔"

"ہاں وہ میرا دوست ہے، میں اس سے پوچھنا ضروری سمجھتی ہوں۔"

"اس کی جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔ بے شک تم چمڑے کے یہ دو ٹکڑے بھی جسم سے نہ چپکانا۔"

وہ غضب ناک انداز میں غرائی "میں تمہاری نہیں، اس کی رائے پوچھنے کے لیے آئی ہوں۔ کہاں ہے وہ؟"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ شاید بوما کی طرف گیا ہے۔"

سروج پاؤں پٹختی ہوئی اور بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی موسل اندرونی حصے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ غالباً اس نے کہیں قریب سے ہماری ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ خاصا ذہین شخص تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا سروج سے ملنا جلنا مجھے پسند نہیں ہے۔ میری کسی واضح ہدایت کے بغیر ہی اس نے سروج کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے لڑکیوں کی بھلا کیا کمی تھی۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کرامت تھی کہ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھتا تھا وہ لڑھک جاتی تھی، اور اگر لڑھکتی نہ تھی تو ڈانواں ڈول ضرور ہو جاتی تھی۔

مجھ سے شستہ اردو میں کہنے لگا "یہ سروج رقص کیوں نہیں کرنا چاہتی؟"

میں نے کہا "تم نے سن ہی لیا ہوگا، وہ کہتی ہے کہ لباس بہت مختصر ہے۔"

"آپ نے اس کو بتانا تھا کہ یہ مذہبی رقص ہے۔ بے شک اس کا لباس کم ہے لیکن کوئی اس کی طرف گندی نظروں سے نہیں دیکھے گا۔"

"اگر میں یہ بات اس سے کہہ دیتا تو پھر وہ رقص کرنے سے بالکل ہی انکار کر دیتی۔"

"کیا مطلب جناب؟"

"تم بہت ہوشیار ہو لیکن اس الو کی چرخی کو اب بھی پوری طرح نہیں سمجھے ہو۔ وہ تو چاہتی ہی یہ ہے کہ لوگ اس کو گندی نظروں سے دیکھیں، جو کچھ کہتی ہے اوپر اوپر سے کہتی ہے۔"

موسل نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور سر ہلا کر رہ گیا۔

رات کو کھنڈر میں بڑا الف لیلوی منظر تھا۔ پوری رات کا چاند اس وسیع کھنڈر کو روشن کر رہا تھا۔ کچھ روشنی کافوری شعلوں کی بھی تھی۔ یہ مشعلیں کھنڈر کے مختلف حصوں میں بڑی ترتیب اور سلیقے سے لگائی گئی تھیں۔ ہر جگہ چار چار مشعلیں اکٹھی نصب کی گئی تھیں۔ کھنڈر کی محرابوں اور طاقوں میں شمع دان روشن تھے۔ ایک قدیم افریقی خوشبو نے بام و در کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایک کشادہ جگہ پر چار عدد ڈھولچی ایک قطار میں بیٹھے تھے ان کے عقب میں نفریاں بجانے والے تھے۔ مقامی سیاہ فاموں کا ایک جم غفیر ڈورے ریوتا کی کنیز ساجے کا رقص دیکھنے کے لیے بڑی عقیدت سے کھنڈر میں موجود تھا۔ جن جوڑوں کی نئی نئی شادیاں سائیں نے کروائی تھیں وہ خاص طور سے خوشگوار موڈ میں نظر آتے تھے۔ وہ فراخ دلی سے DATE VINE پی رہے تھے۔ لڑکیوں کی ادائیں دعوت انگیز تھیں اور مردوں کے ہاتھ بہک رہے تھے۔

پہلے دو تین اور لڑکیوں نے رقص کیا۔ ان میں سے ایک سیاہ فام لڑکی کا رقص خاصا حیران کن تھا۔ اس نے ایک بڑا اژدہا اپنے جسم کے گرد یوں لپیٹ رکھا تھا کہ آدھا جسم اس کے نیچے چھپ کر رہ گیا تھا۔ آخر سازوں کا آہنگ بدلا اور تماشائیوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ان کے محبوب دیوتا کی کنیز ساجے رقص کے لیے تشریف لا رہی تھی۔ ساجے یعنی سروج نمودار ہوئی تو تماشائی اظہار عقیدت کے لیے دو زانو ہو گئے۔ سروج نے ایک کھلا لبادہ پہن رکھا تھا۔ شروع میں اس کے رقص کا انداز بھی دھیما تھا لیکن پھر بتدریج سازوں کی لے اور رقص کی لے تیز ہوتی گئی۔ سروج نے اپنا بالائی لبادہ اتار پھینکا۔ اس کے بدن کی بجلی نے تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اس کے انگ انگ سے شعلے لپک رہے تھے۔ وہ فرش پر تھی مگر اس کے پاؤں جیسے ہوا پر پڑ رہے تھے۔ بے شک یہ مذہبی رقص تھا، تماشائیوں کا انداز بھی مودبانہ تھا لیکن میرا ذہن یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ مردوں خاص طور سے نوجوان مردوں کے دلوں میں کھد بد نہیں ہو رہی ہوگی۔ رقص میں یقیناً سروج کو ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اپنے فن کے زور سے لوگوں کو مبہوت کر رکھا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں ہلکا سا شور سنائی دیا۔ یہ شور کھنڈر کے باہر سے بلند ہوا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا موسل اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔

"موسل کہاں ہے؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

"ابھی تو یہیں پر تھا۔" زریں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اور زریں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے شور والی جگہ کی طرف بڑھے۔ کھنڈر سے باہر سڑک کے عین

درمیان ہم نے موئل کو دو افراد سے گتھم گتھا دیکھا۔ اس نے دو سیاہ فاموں کو ان کے گریبانوں سے تھام رکھا تھا اور باری باری دونوں کو اپنے سر کی ٹکریں رسید کر رہا تھا۔ وہ دونوں مزاحمت کر رہے تھے اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھے پھر ان میں سے ایک خود کو چھڑا کر بھاگا۔ زریں گل چیل کی طرح جھپٹا اور اس بھاگنے والے کو چھاپ لیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔

ان دونوں افراد کو کمانڈوز کے حوالے کر دیا گیا۔ موئل نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مجھے بتایا "یہ لوگ ہم میں سے نہیں ہیں۔ یہ کسی خطرناک ارادے سے یہاں آئے ہیں۔ ان کے تین ساتھی بھاگ گئے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ یہ باہر کے لوگ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ دیکھتے رہیں، ابھی یہ سب کچھ بتائیں گے۔" موئل نے پورے یقین سے کہا۔

کھنڈر کے اندر سروج کا ہیجان خیز رقص اب ختم ہو گیا تھا۔ رقص دیکھ کر فارغ ہونے والے لوگ اب اس نئے ہنگامے کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہم دونوں مشکوک افراد کو پکڑ کر کمانڈوز کے زمین دوز ٹھکانے پر لے آئے۔ ان افراد سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ پہلے تو وہ دونوں نوجوان کچھ بھی بتانے سے انکار کرتے رہے مگر جب کمانڈوز نے ان کی ٹھکائی کی اور انہیں چھت سے الٹا لٹکایا تو وہ بولنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کا تعلق ٹرسٹ سے ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ استی کو چھڑانے کے لیے آئے ہوں گے۔ اس وقت استی کی رہائی سے زیادہ ٹرسٹ کو کوئی اور چیز عزیز نہیں تھی۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ استی کو چھڑانے کے لیے کنگ کے شاطر ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ ضرور پروان چڑھ رہا ہو گا۔ عین ممکن تھا کہ کھنڈر سے پکڑے جانے والے یہ دونوں افراد بھی کسی ایسے ہی منصوبے کا حصہ ہوں۔

یہ دونوں نوجوان خاصے سخت جان تھے۔ اگلے دو گھنٹوں میں انہوں نے کمانڈوز سے جانوروں کی طرح مار کھائی مگر اپنے مقاصد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہتے رہے کہ وہ لارسیوں کا بھیس بدل کر یہاں حالات کا جائزہ لینے کے لیے آئے تھے۔ رات بارہ بجے کے لگ بھگ میں اور موئل اس تہ خانے سے واپس آ گئے جہاں دونوں افراد سے پوچھ تاچھ کی جا رہی تھی۔

گھر آ کر میں نے موئل سے پوچھا "تمہیں ان پر شک کیسے ہوا؟"

وہ بولا "وہ دونوں سڑک کے کنارے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ انہیں روشنی میں کھڑے نہیں ہونا چاہیے، اس طرح وہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ دوسرا کہہ رہا تھا کہ اگر ان کے بہروپ کو ٹرسٹ میں کسی نے نہیں پہچانا تو یہاں بھی کوئی نہیں پہچانے گا۔ اس وقت ان کے ساتھ تین افراد اور بھی تھے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "اس وقت تو تم ہمارے ساتھ کھنڈر کے اندر کھڑے تھے اور سروج کا رقص دیکھ رہے تھے سڑک پر ہونے والی باتیں تم نے کیسے سن لیں؟"

وہ مسکرایا "بس سن لیں۔ اس وقت ہجوم بڑی توجہ سے سروج کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سب لوگ بالکل خاموش تھے۔ اس خاموشی میں ان لوگوں کی باتیں میرے کانوں تک پہنچ گئیں۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہو۔ بعض اوقات میرے کان بہت دور کی آوازیں بھی سن لیتے ہیں۔"

موئل جو کچھ کہہ رہا تھا وہ بظاہر ناقابل یقین تھا، مگر میں جانتا تھا کہ یہ اتنا بھی ناقابل یقین نہیں ہے۔ موئل کی کچھ حیران کن صلاحیتیں ہم اب تک ملاحظہ کر چکے تھے۔ غیر معمولی قوت سماعت بھی موئل کی ایک حیران کن صلاحیت تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ موئل جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت کے قریب ہے۔ رقص کے دوران میں اس نے مشکوک آوازیں سنی تھیں اور ہمارے پاس سے کھسک کر دوڑتا ہوا باہر گیا تھا۔

علی الصباح میں اور موئل دوبارہ اس تہ خانے میں پہنچے جہاں دونوں گرفتار شدگان سے تفتیش ہو رہی تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو ایک نوجوان کو بے ہوش پایا۔ تشدد کی وجہ سے دوسرے کی حالت بھی پتلی ہو رہی تھی۔ وہ نیم برہنہ حالت میں فرش پر پڑا تھا اور اس کی پشت پر سے کھال ادھڑ کر رہ گئی تھی۔ انچارج کمانڈر ایک توی ہیکل زنجی تھا۔ اس نے انگلش میں مجھے بتایا کہ ان افراد نے کسی حد تک اپنی زبان کھولی ہے۔ میں نے تفصیل جاننا چاہی تو وہ بولا "ان کا کہنا ہے کہ یہ اپنے باس مسٹر راجر کی تلاش میں یہاں پہنچے تھے۔ مسٹر راجر بغیر کسی کو بتائے ٹرسٹ سے نکل آئے تھے اور تین چار روز سے ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ خیال تھا کہ انہوں نے اس نئی بستی کا رخ کیا ہو گا۔"

"اس خیال کی کیا وجہ تھی؟" میں نے پوچھا۔

زنجی کمانڈو بولا "جو کچھ ان دونوں بندوں نے بتایا ہے ں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر راجر کا مس سروج کے ساتھ نجیدہ افیئر چل رہا تھا۔ کم از کم مسٹر راجر کے لیے تو یہ ایک نجیدہ افیئر تھا۔ جب مس سروج ٹرسٹ سے اچانک غائب رگئیں تو مسٹر راجر کو بہت شاک پہنچا۔ وہ انہیں ہر صورت لاش کرنا چاہتے تھے۔"

میں نے زنجی کمانڈو سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اسٹیٹ منٹ درست ہے؟"

"میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا، بہرحال اس بات میں زن ضرور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر راجر یہاں کالونی میں نچے ہیں اور ان کی موت بھی یہیں واقع ہوئی ہے۔"

"لیکن دیگر امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" ں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ راجر کی آڑ میں یہ لوگ استی کی رلگا رہے ہوں یا پھر کوئی اور مقصد بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ موناب والے معاملے کی ٹوہ میں یہاں پہنچے ہوں۔ یقینی بات ہے کہ اس افراتفری کی خبریں ٹرسٹ تک پہنچ رہی ہوں گی جو موناب کے سبب یہاں مچی ہوئی ہے۔"

زنجی کمانڈو بولا "مجھے آپ کی پہلی بات میں زیادہ وزن سوس ہوتا ہے۔ اگر مسٹر راجر والا معاملہ نہیں ہے تو پھر یہ سٹر استی کا چکر ہو سکتا ہے۔"

"بھاگ جانے والے تین بندوں میں سے کوئی پکڑا گیا یا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

کمانڈو نے نفی میں سر ہلایا "اگر ان میں سے کوئی پکڑا جاتا تو شاید ہمارا کام آسان ہو جاتا۔"

گھر واپس آنے کے بعد میں نے صفدر اور پروفیسر سے غور کیا۔ دونوں کا خیال یہ تھا کہ استی کی نگرانی کا انتظام زید سخت کرنا چاہیے۔ میں نے جا کر استی سے ملاقات کی۔ وہ ہماری رہائش گاہ کی بالائی منزل پر موجود تھا۔ کم از کم مسلح افراد چوبیس گھنٹے اس کے قریب موجود رہتے تھے۔ جس کمرے میں استی کو رکھا گیا تھا وہاں ایک آہنی دروازے کے سوا آمد و رفت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمرے سے باہر بھی مسلح لارسی ہر وقت موجود رہتے تھے۔ استی اب کافی حد تک نئے ماحول کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ اس کا زیادہ وقت وڈیو گیمز کھیلنے یا وی سی آر پر کارٹون فلمیں دیکھتے گزرتا۔ وہ بہت چیخا چلایا تھا کہ اسے کارٹون فلموں کے بجائے "ہلوں" والی فلمیں مہیا کی جائیں مگر سگریٹوں کی فرمائش کی طرح اس کی یہ فرمائش بھی پوری نہیں کی گئی تھی۔ اب مجبوری کا نام شکریہ کے مصداق وہ کارٹون فلموں پر ہی گزارہ کر رہا تھا۔ زریں گل نے ڈنڈے کے مناسب استعمال سے اس پر اچھا خاصا رعب گانٹھ لیا تھا۔ اب بھی وہ جب بھی پٹڑی سے اترتا تھا اور کسی بات پر ضد کرتا تھا تو زریں کی آمد اس کی تکلیف کے لیے تیر بہدف ثابت ہوتی تھی اور وہ فوراً شفا پاتا تھا۔ بہرحال پہرے داروں کو گالیاں دینا اور چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا اب بھی اس کے دلچسپ مشغلے تھے۔

میں لارسی پہرے داروں کو استی کی نگرانی کے سلسلے میں ضروری ہدایات دے رہا تھا جب میرے واکی ٹاکی پر سگنل موصول ہوا۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسری طرف کنگ ہو گا، مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ لڑکی پاکستانی یا انڈین رہی ہو گی کیونکہ وہ اردو بول رہی تھی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے کہا "آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ کا نام شار جہاں ہے اور کنگ کا بیٹا ماسٹر استی اس وقت آپ کی تحویل میں ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟"

"اگر تم ٹھیک بھی کہہ رہی ہو تو اس کال سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ عجلت سے بولی "آپ لوگوں نے کل کسی وقت ٹرسٹ کے دو بندوں کو پکڑا ہے، آپ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید وہ ماسٹر استی کو چھڑانے آئے تھے، یا پھر وہ کنگ کے اسسٹنٹ مسٹر راجر کو ڈھونڈنا چاہتے تھے، لیکن آپ کے۔۔۔"

ابھی لڑکی نے یہاں تک ہی کہا تھا کہ کھٹ پٹ کی آواز آئی اور لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار مردانہ غراہٹ ابھری۔ لڑکی کو کھینچ کر شاید فرش پر پٹخ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک منحوس آواز سنائی دی۔ وہی منحوس آواز جو ٹرسٹ کے در و بام میں ہر وقت گونجتی تھی اور انسان پر انسان کے ظلم کی کہانی سناتی تھی۔ یہ کی بوکو کی آواز تھی۔ شائیں شائیں کے ساتھ لڑکی کی کربناک چیخیں ابھریں پھر لڑکی کا لباس "چرچر" کی آواز کے ساتھ پھٹ گیا تھا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ کسی نے واکی ٹاکی بند کر دیا تھا۔

میں سناٹے میں کھڑا رہ گیا۔ اس ادھوری گفتگو نے ذہن میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ یہ کال مجھے ٹرسٹ کے اندر سے ہی کی گئی ہے۔ جس نے کی تھی وہ یقیناً کنگ کے بہت قریب رہی ہو گی کیونکہ اس کی رسائی اس خاص واکی ٹاکی تک ہو گئی تھی جس کے ذریعے کنگ مجھ سے رابطہ کرتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ کنگ کی خوب رو خادماؤں میں سے کوئی ایک ہو۔ جو اطلاع وہ دینے جا رہی تھی وہ یقیناً بہت اہم رہی ہو گی مگر افسوس اطلاع مجھ تک پہنچ نہیں پائی تھی۔

وہ مجھے ان دونوں افراد کے بارے میں بتانا چاہتی تھی جو پکڑے گئے تھے اور غالباً اس خاص مقصد کے بارے میں بتانا چاہتی تھی جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے۔

اب پتا نہیں اس بے چاری پر کیا گزر رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ کسی عقوبت خانے میں اسے لرزہ خیز جسمانی اذیت سے دوچار کیا جا رہا ہو۔ پہرے داروں کو اسٹی کی نگرانی کے متعلق ضروری ہدایات دے کر میں نچلی منزل پر واپس آ گیا۔ جس وقت میں سیڑھیاں اتر رہا تھا' مجھے کالونی کے وسطی حصے سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ رائفل سے اوپر تلے کئی فائر کیے گئے تھے۔ میں نے اس فائرنگ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کالونی میں سانپوں اور دیگر حشرات کی آمد و رفت کے سبب اکثر اکا دکا فائر ہوتے رہتے تھے۔ تاہم کچھ دیر بعد پتا چلا کہ یہ فائر عام نوعیت کے نہیں تھے۔ موبل ہی کی زبانی مجھے اطلاع ملی کہ ان دونوں افراد کو نامعلوم قاتلوں نے ہلاک کر دیا ہے جن سے تہ خانے میں کمانڈرز پوچھ گچھ کر رہے تھے۔

○☆○

صورت حال الجھتی جا رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ موگاسا بستی کی طرح یہاں بھی زست کے ہرکارے موجود ہیں اور اپنے پاؤں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پروفیسر اور صفدر کے خیال میں ان لوگوں کا سدباب ضروری تھا ورنہ وہ یہاں بھی کوئی خوفناک چال چل سکتے تھے۔ دوسری طرف بوا سے لارسی ساحرہ موتابہ کے فرار نے بھی کھلبلی مچا رکھی تھی۔ ایک عجیب سا خوف رہ رہ کر مقامی لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ موتابہ کی وجہ سے ان پر مزید آفات آئیں گی۔ اگر ان لوگوں کو سائیں عالی پر بے پناہ اعتقاد نہ ہوتا اور سائیں عالی کا سہارا میسر نہ ہوتا تو شاید وہ کب کے یہاں سے تتر بتر ہو چکے ہوتے۔ کھنڈر سے تقریباً دس میل دور کے جنگل میں آگ بدستور لگی ہوئی تھی۔ دھوئیں کے سیاہ مرغولے اکثر مشرقی افق پر دکھائی دیتے تھے' رات کے وقت سرخ روشنی بہت اوپر تک نظر آتی تھی۔ اس دور دراز علاقے میں آگ بجھانے کے لیے بھلا کس نے آنا تھا' جنگل کو خود ہی جل کر بجھ جانا تھا۔

تیسرے روز صبح سویرے زریں نے مجھے بتایا کہ سردار رانفے چند پجاریوں کے ساتھ بوا میں موجود ہے۔ ان سب لوگوں نے سیاہ لبادے پہن رکھے ہیں اور سر جوڑے بیٹھے ہیں۔ شاید وہ کسی طلسمی عمل میں مصروف ہیں۔ میں اس وقت بے کار ہی بیٹھا تھا' اٹھ کر زریں کے ساتھ بوا کی طرف چل دیا۔ بوا میں سردار رانفے سے ملاقات ہوئی اور انکشاف ہوا کہ وہ لوگ موتابہ کو پہاڑی گپھا سے نکالنے اور اس پر قابو پانے کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ کیونکہ اگر جلد ہی ایسا نہ کیا گیا تو لارسیوں پر مزید آفات نازل ہوں گی۔

"یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" میں نے موبل کے ذریعے سردار رانفے سے پوچھا۔

سردار رانفے بولا "اس خطرے کا احساس کرنے کے لیے بہت عالم فاضل ہونا ضروری نہیں۔ موتابہ ایک باکمال ساحرہ تھی' اب اس کی اندرونی قوت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ کاش وہ ہمارے تعاون سے زندہ ہوتی مگر وہ بد قوتوں کے تعاون سے زندہ ہوئی ہے اور ان قوتوں کا حصہ بن چکی ہے۔"

"کیا تم لوگوں نے اپنے منصوبے کے لیے سائیں عالی سے مشورہ کیا ہے؟"

"ہم نے اس کے لیے بہت کوشش کی ہے مگر پتا نہیں ہمارے دیوتاؤں کی کیا مرضی ہے۔ سائیں جی اس سلسلے میں ابھی تک خاموش ہیں۔ ہاں انہوں نے ہمارے منصوبے کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ موتابہ کو زیادہ وقت نہ دیا جائے۔"

"یہ سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے سب نے؟"

"یہ لباس ایک طرح کا حفاظتی حصار ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں جو گپھا کی طرف جانے والوں کے حفاظتی حصار کا کام دیں گی۔"

سردار رانفے نے مجھے آنکھوں پر باندھی جانے والی پٹیاں دکھائیں۔ اس کے علاوہ گوندھے ہوئے آٹے جیسی کوئی شے تھی جو ان لوگوں نے اپنے کانوں میں ٹھونسنی تھی تاکہ باہر کی کوئی آواز ان کی سماعت تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے سازو سامان میں سب سے دلچسپ شے تانبے کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کھلونا نما ہاتھی تھا۔ یہ ہاتھی ایک تعویذ کی طرح افراد نے اپنے گلے میں آویزاں کر رکھا تھا۔ اس ہاتھی کے جسم پر جنگل ہی کی چھوٹی چھوٹی نکیلی سوئیاں تھیں۔ ایسا ایک کھلونا ہاتھی سردار رانفے کے گلے میں بھی جھول رہا تھا۔ سردار رانفے باتیں کرتے ہوئے بے خیالی میں بار بار ہاتھی یعنی بوبو دیوتا کو چھوتا تھا' جیسے اضطراب کے ان لمحوں میں اس کھلونا ہاتھی کا لمس اسے روحانی سکون پہنچا رہا ہو۔

میں نے سردار رانفے سے پوچھا "اگر میں اپنے ساتھیوں سمیت آپ کے ساتھ جانا چاہوں تو؟"

سردار مضطرب نظر آیا' اس کا خیال تھا کہ یہ خطرناک کام ہے اور اس کام میں روحانی طور پر طاقت

ور یعنی پجاریوں کو ہی حصہ لینا چاہیے۔ عام شخص چاہے کتنا بھی دلیر اور مضبوط ہو اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے۔

میں نے کہا "تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو عام مت سمجھو۔ ہم سائیں جی کے پیروکار ہیں اور روحانی طور پر تمہارے پجاریوں سے بڑھ کر نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔"

سردار رانفے نے کہا "اگر آپ لوگ ضرور جانا چاہتے ہو تو پھر اس کے لیے آپ کو سائیں جی سے یا ان کی کنیز سے اجازت لینا ہوگی۔ اس اجازت کے بغیر میں یہ خطرہ نہیں لے سکتا۔"

اتفاقاً عین اسی وقت میری نگاہ سروج پر پڑ گئی۔ وہ کنیز اپنے مخصوص لباس میں بڑی شان کے ساتھ کالونی کے مضافات کی طرف جا رہی تھی۔ شاید کسی نئی بستی کے قبائلی کالونی کے نواح میں خیمہ زن ہوئے تھے۔ جب بھی اس طرح کے لوگ کالونی کے نواح میں پڑاؤ ڈالتے تھے' سروج اپنے سائیں عالی کی نمائندگی کرتے ہوئے ان سے ملاقات کرتی تھی اور ان کی حوصلہ افزائی کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ سروج ڈولی میں بیٹھی تھی۔ ڈولی کے لمبے بانسوں کو کہاروں نے سہارا دے رکھا تھا۔ میرے اشارے پر سروج نے ڈولی رکوائی۔

سردار رانفے کے سامنے ہی میں نے سروج سے پوچھا "میں سردار اور دیگر لوگوں کے ساتھ موتابہ کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔ کیا تمہاری عدالت عالیہ سے اس امر کی اجازت ہے؟"

وہ میرے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی "جانا چاہو تو چلے جاؤ' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"ہاں تمہیں کیوں اعتراض ہوگا۔ اچھا ہے کہ اس خطرناک کام میں خس کم جہاں پاک ہو جائے گا۔"

وہ بولی "اگر ایسی بات ہے تو پھر اس پٹھان کو ضرور ساتھ لے کر جانا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اشارہ کیا' کہاروں نے ڈولی آگے بڑھا دی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اور موبل بھی سردار رانفے کے ساتھ گپھا کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے زریں گل کو خود دعوت نہیں دی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ غار کے آس پاس پہنچتے ہی اس کی حالت پتلی ہو جائے گی۔ رہا تورا تو ابھی تک اس کی جسمانی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اس مہم جوئی میں حصہ لے سکتا۔ اس کا رنگ ابھی تک لیموں کی طرح زرد تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ نظر آتی تھی۔ میں نے تو اب براہ راست اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے رفار ویرا کا غم ہر گھڑی ایک الاؤ کے مانند روشن رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے اندر ایک جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں میں بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خود ہی جیتنا تھا یا ہارنا تھا۔ ویرا یوں لاپتا ہوئی تھی کہ اس کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ نشان۔ اب تو سائیں عالی کی کہی ہوئی بات ہی درست لگتی تھی۔ سائیں نے کہا تھا کہ صفدر کے نصیب میں ہجر کی ایک ایسی رات آئی ہے جس کی صبح دور دور تک نظر نہیں آتی۔

ہم دوپہر سے تھوڑی دیر قبل کالونی سے روانہ ہوئے۔ سردار رانفے اور دیگر لوگوں کی طرح میں اور موبل بھی لمبے سیاہ لبادوں میں ملبوس تھے۔ یہ لبادے سر کو بھی ڈھانپتے تھے صرف چہرے کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا۔ ہاتھوں پر سیاہ دستانے اور پاؤں میں سیاہ جرابیں تھیں۔ ایک ایک کھلونا ہاتھی ہمارے گلے میں بھی ڈال دیا گیا۔ ہمارے ساتھ جانے والوں میں سردار رانفے کے علاوہ دس پجاری بھی تھے۔ ان میں دو بڑے پجاری تھے اور آٹھ چھوٹے۔ بڑے پجاریوں کی اہم نشانی یہ تھی کہ ان کی پیشانیوں پر سفید رنگ سے چار چار لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ سردار رانفے کا نائب "موبارے" نامی جنگ جو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جنہیں گپھا کے قریب جانا تھا اور موتابہ کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرنا تھی۔ اس کے علاوہ قریباً ایک سو مزید افراد بھی ہمارے ساتھ گپھا کی طرف جا رہے تھے۔ یہ عام مسلح لشکری تھے۔ ان لوگوں کو گپھا سے قریباً ڈیڑھ فرلانگ کی دوری پر رہنا تھا اور غار کو اپنے گھیرے میں رکھنا تھا۔ جس وقت ہم غار کے نزدیک پہنچے' شام ہونے والی تھی اور سورج کی تمازت کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ پروگرام یہی تھا کہ ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے کر گزریں' جوں جوں ہم غار کے نزدیک پہنچ رہے تھے دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں اور پجاریوں کی انگلیاں اپنی مالاؤں پر زیادہ تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ غار سے قریباً دو فرلانگ دور ہی بڑے پجاری کی ہدایت پر سب لوگ ٹھہر گئے۔ مسلح لارسیوں نے غار کو چاروں طرف سے گھیرنا شروع کر دیا اور جن افراد کو غار کے دہانے پر پہنچنا تھا انہوں نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ ان افراد میں دس پجاریوں کے علاوہ میں' موبل اور سردار رانفے بھی شامل تھے۔ گوندھے ہوئے آٹے جیسی شے ہم نے اپنے کانوں میں اس طرح ٹھونس لی کہ ہمارے کان تقریباً بند ہو کر

رہ گئے۔ کانوں کو اس طرح بند کرنے سے پہلے سردار رانے نے ہمیں کچھ ضروری ہدایات بھی دے رکھی تھیں۔ ان ہدایات میں ایک انوکھی اور دلچسپ ہدایت یہ بھی تھی کہ اگر ہم میں سے کسی کو اپنے ذہن پر کسی طرح کا اثر محسوس ہو' یا ہمیں یوں لگے کہ ہم اپنی منشا کے خلاف کوئی کام کرنے جا رہے ہیں تو ہم اپنے گلے میں آویزاں کھلونا ہاتھی کو استعمال کریں۔ استعمال کا طریقہ یہ تھا کہ ہاتھی کو اپنی مٹھی میں بند کرکے زور سے دبایا جاتا' یہاں تک کہ ہاتھی کے جسم پر لگی ہوئی سوئیاں ہمیں تکلیف دینے لگتیں۔ اس وقت تو اس "ہدایت" کا مقصد ہماری سمجھ میں نہیں آیا مگر بعد ازاں جب میں از خود اس تجربے سے گزرا تو حقیقت حال کا پتا چلا۔

کانوں کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد ایک ایک سیاہ پٹی ہمارے حوالے کر دی گئی۔ یہ سیاہ پٹی میں نے بھی آنکھوں پر باندھ کر دیکھی۔ اس میں سے نظر تو آتا تھا مگر بے حد مدھم' صرف یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ آگے کوئی رکاوٹ ہے یا نہیں

"ان چیزوں سے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے سردار رانے سے پوچھا۔

"اس کا درست جواب تو بڑا پجاری ہی دے سکتا ہے۔" رانے نے جواب دیا "جہاں تک میرا خیال ہے یہ احتیاطی تدبیریں ہمیں موتاب کے شر سے اور اس کی طلسمی کشش سے بچائیں گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' یہ طلسمی کشش کس قسم کی ہوگی؟"

"اس کشش کے چند نمونے ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ تم نے بھی دیکھا تھا کہ جوزام بستی میں جب موتاب مراقبے میں گئی تھی تو قریبی جنگل سے بھیڑیے نکل کر بستی میں آ گئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی مختلف جنگلی جانور موتاب کی جادوئی کشش کے سبب کالونی کا رخ کر رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق چند دن پہلے پجاریوں کا جو عظیم سانحہ رونما ہوا اس کی وجہ بھی یہی طلسمی کشش ہی تھی۔ یہ سب کچھ بابا روگی (آنکھوں کا جادو) ہی کا کرشمہ ہے۔ درحقیقت بابا روگی کی مختلف شکلیں اور مختلف طریقے ہیں۔ کچھ طریقوں میں عامل اور معمول کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہوتا ہے مگر کچھ طریقے ایسے بھی ہیں جن میں عامل غائبانہ طور پر اپنے معمول پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اب موتاب ہمارے سامنے نہیں ہے' نہ ہم اس کی آواز سن رہے ہیں نہ اسے دیکھ رہے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں اس کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ وہ اپنی قوت سے ہمارے دل و دماغ کو مفلوج کر سکتی ہے اور ہمیں اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گپھا کے سامنے قتل ہونے والے پانچوں پجاریوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ ہوا ہے۔ ایسے شواہد ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پجاریوں نے گپھا کے سامنے اپنے ہاتھوں سے خود کو پھانسی لگایا تھا۔"

سردی کی ایک لہر مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ مجھے وہ خوفناک منظر یاد آ گیا جب ہم نے گپھا کے سامنے پانچ لارسی پجاریوں کو درختوں سے جھولتے دیکھا تھا۔ گپھا یعنی غار کے ارد گرد مسلح لارسیوں کا گھیرا مکمل ہو چکا تھا' وہ نیزوں' برچھیوں اور تیر کمان وغیرہ سے مسلح تھے۔ بڑے پجاری کی طرف سے انہیں ہدایت تھی کہ وہ موتاب کو دیکھیں تو صرف اور صرف اس کی شہ رگ کو نشانہ بنائیں کیونکہ جب تک اس کی شہ رگ نہیں کٹے گی اس کی موت واقع نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کو مکمل ہدایات دینے کے بعد بڑے پجاری نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم غار کے دہانے کی جانب بڑھے۔ سورج دور مغربی افق کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے سائے ہمارے سامنے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ آگے جا کر بڑے پجاری نے اپنی آنکھوں پر سیاہ رنگ کی مخصوص پٹی باندھ لی' ہم سب نے بھی اس کی تقلید کی۔ ابھی ہمیں یہ پٹیاں باندھے ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ خطرناک ڈھلوان پر سے ایک پجاری کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا پچاس ساٹھ فٹ نیچے جا گرا۔ اس کی چیخ خوفناک تھی۔ ہم نے پٹیاں اتاریں' اور دوڑتے ہوئے مضروب کے پاس پہنچے۔ وہ جھاڑیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور سر پر بھی گہرا زخم نظر آ رہا تھا۔ اسے جھاڑیوں سے نکالنے اور اٹھا کر کھڈ سے باہر لانے میں آدھ پون گھنٹہ لگ گیا۔ سردار رانے نے بڑی مہارت سے مضروب کی ٹانگ کے گرد چند لکڑیاں رکھیں اور پٹی باندھ دی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون بھی روک دیا گیا تھا۔ اس چکر میں اندھیرا ہو گیا۔ اس اندھیرے سے بچنے کے لیے ہی ہم دن سے کوشش کر رہے تھے۔ بڑے پجاری کا خیال تھا کہ زخمی کو واپس بھیج دیا جائے مگر سردار رانے کی رائے مختلف تھی۔ اس نے کہا کہ زخمی واپس گیا تو غار کو گھیرے میں لینے والے مسلح لارسیوں کے حوصلے پر برا اثر پڑے گا۔

ہم زخمی سمیت غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔ پٹیاں ایک بار پھر ہماری آنکھوں پر تھیں۔ چاند تاروں کی روشنی موجود تھی لیکن ان پٹیوں کے سبب ہمیں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ ہم درختوں اور پتھروں کو ٹٹول ٹٹول کر

رہے تھے۔ دہانے سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ہم رک گئے۔ سردار رانے اپنے ساتھ کسی جنگلی بیل کی بہت سی لکڑیاں لایا تھا۔ ان لکڑیوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جلائے جانے پر بہت زیادہ دھواں دیتی تھیں۔ یہ دھواں کسی حد تک زہریلے اثرات رکھتا تھا۔ اس کی وجہ سے آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا تھا اور سانس کی آمد و رفت مشکل ہو جاتی تھی۔ ان لکڑیوں کے تین گٹھے ہمارے پاس موجود تھے۔

غار کے دہانے کے عین سامنے ایک قدرتی سائبان کے نیچے ہم نے ڈیرا جما لیا تھا۔ رات نو بجے کے لگ بھگ دو پجاری کارروائی کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بدستور باندھ رکھی تھیں۔ انہوں نے لکڑیوں کے ایک گٹھے پر پانی گرایا۔ لکڑیوں پر پانی گرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایک دم جلنے کے بجائے زیادہ مقدار میں دھواں دیں۔ اس کے بعد اندر کی خشک لکڑیوں کو سلگایا گیا۔ اس طرح سے یہ آنسو گیس کا ایک بہت بڑا "فتیع" تیار ہو چکا تھا۔ اب اس دھواں دیتے ہوئے گٹھے کو غار کے اندر پھینکنا تھا مگر اس سے پہلے کہ دونوں پجاری گٹھا لے کر غار کی طرف بڑھتے بڑے پجاری نے انہیں چیخ کر روک دیا۔

ہم سب کے کان بند تھے۔ بڑے پجاری کے چیخنے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دی۔ نہ ہی سیاہ پٹیوں کے سبب کسی کو ٹھیک طرح نظر آیا کہ بڑا پجاری کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ وہ دونوں ہاتھ کھول کر سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔ چند لمحے بعد بڑے پجاری نے اپنی آنکھوں پر سے سیاہ پٹی اتار دی اور کانوں میں سے وہ چیز بھی نکال دی جس نے ہماری سماعت کو روک رکھا تھا۔ سردار رانے اور بڑے پجاری کے درمیان بات چیت ہوئی۔ بڑا پجاری بار بار غار کے دہانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہاں دو آوارہ کتے فرتے تھے۔ ان کتوں کے جسم سیاہی مائل تھے اور جسم پر دھبے سے تھے۔ ان کا حلیہ خونخوار جنگلی کتوں سے بالکل ملتا تھا۔ وہ غار کے دہانے پر استراحت کرنے کے انداز میں بیٹھے تھے۔ سردار رانے نے موئل کی زبانی مجھے بتایا کہ موتاب غار کے اندر موجود نہیں۔

"اس بات کا علم کیسے ہوا؟" میں نے موئل ہی کے ذریعے سردار سے پوچھا۔

وہ بولا "بڑے پجاری کا کہنا ہے کہ جس جگہ موتاب موجود ہو وہاں ایک خاص فاصلے تک کوئی ایسا چوپایہ موجود نہیں رہتا جو گوشت خور ہو۔ یہاں ان کتوں کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ موتاب اس وقت گپھا کے اندر موجود نہیں۔"

"پجاری صاحب کا کیا خیال ہے' کیا وہ یہاں سے جا چکی ہے؟"

"شاید ایسا نہیں ہے۔ ہم نے ارد گرد کے علاقے کی بہت چھان بین کی ہے۔ یہاں اس گپھا سے بہتر چھپنے کی کوئی اور جگہ ہے ہی نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ عارضی طور پر یہاں سے نکلی ہوئی ہے' ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر تک واپس آ جائے۔"

"تو کیا ہم یہاں انتظار کریں گے؟"

"بالکل' انتظار تو کرنا پڑے گا۔"

بڑے پجاری کی ہدایت پر دوسرے پجاریوں نے سلگتی ہوئی لکڑیوں پر پانی ڈال دیا تھا اور یہ لکڑیاں ایک دم بہت کڑوا دھواں دے کر بجھ گئی تھیں۔ ہم سائبان کے نیچے دبک کر بیٹھے رہے اور پیش آنے والے نادیدہ لمحوں کا انتظار کرتے رہے۔ ہم ٹیلے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے اور ٹیلے ہی کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ تیرگی نے ہمیں اپنے اندر پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ یہاں سے چند ہی گز کے فاصلے پر وہ درخت تھے جن پر چند روز پہلے ہم نے پانچ عدد لاشیں جھولتی دیکھی تھیں۔ وہ پانچوں افراد کسی نادیدہ قاتل کا شکار ہوئے تھے' آج اسی مقام پر ہم موجود تھے اور خود کو کسی نادیدہ قاتل کے آس پاس محسوس کر رہے تھے۔ وہ قاتل یا وہ "قاتل قوت" ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی مگر نجانے کیوں یہ احساس ہر گھڑی قوی تر ہو رہا تھا کہ وہ آس پاس ہے اور ہم اس کی زد میں ہیں۔ بڑے پجاری کی نگاہیں بدستور غار کے دہانے پر بیٹھے دونوں آوارہ کتوں پر لگی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ جب موتاب غار کی طرف واپس لوٹے گی' ان کتوں میں واضح اضطراب نظر آنے لگے گا اور وہ دُم دبا کر یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ بہرحال ابھی تک کتے پُرسکون تھے اور لگتا تھا کہ صبح تک پُرسکون ہی بیٹھے رہیں گے۔

رات لمحہ لمحہ سرک رہی تھی۔ ہم سب جاگ رہے تھے اور پوری طرح چوکس تھے۔ بڑے پجاری سمیت تمام پجاریوں کی انگلیاں تیزی سے اپنی مالاؤں پر گردش کر رہی تھیں۔ میں اور موئل دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میرے پاس ریوالور تھا' موئل کے پاس خودکار رائفل تھی' سردار رانے کا نائب "سوارے" بھی خودکار رائفل سے مسلح تھا۔ پجاریوں کے پاس کسی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ صرف بڑے پجاری کے پاس عجیب وضع کا ایک لمبا سا نیزہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ نیزہ ہتھیار سے زیادہ ایک ڈیکوریشن پیس ہے۔ سر تا پا سیاہ لبادوں میں ملبوس ہم انسانوں سے زیادہ

ہوائی چیزوں کے قبیلے سے لگ رہے تھے۔ کچھ ایسی ہوائی چیزیں جو شب کی تاریکی میں اپنے ٹھکانوں سے نکلی تھیں اور کسی مشترکہ آسیبی مقصد کے تحت ایک جگہ جمع ہوگئی تھیں۔ زخمی پجاری اپنی زخمی ٹانگ کو ایک ہاتھ سے سہارا دیے بالکل پرسکون بیٹھا تھا۔ بڑے پجاری نے دیر تک اس کی ٹانگ پر کچھ عمل کیا تھا جس کے بعد زخمی کو نفسیاتی طور پر بہت سکون محسوس ہوا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے لگائے اونگھنے لگا تھا۔

ہم بیٹھے رہے۔ موبل نے اونگھنا شروع کردیا تھا۔ میں بھی غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ رات ٹھنڈی ہوگئی تھی اور ایک مسحور کن ہوا چلنے لگی تھی۔ اچانک ایک غراہٹ سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک پجاری نے چیتے کی طرح تڑپ کر موبارے کے کندھے سے خودکار رائفل اتار لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نوجوان پجاری نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور رائفل کا رخ اپنے ساتھیوں کی طرف کردیا۔ یہ سارا عمل ایک دو سیکنڈ میں مکمل ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا' نوجوان پجاری نے اپنے ساتھیوں پر فائر کھول دیا' اس کے انداز میں بلا کی وحشت تھی۔ اس نے اوپر تلے تین برسٹ مارے اور اپنے ساتھیوں کو خون میں نہلا دیا۔ میں نے دیکھا کہ چند گولیاں شہ زور جنگ جو موبارے کے سر میں لگیں اور کھوپڑی کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا گرا' اس دوران میں میں اپنا ریوالور نکال چکا تھا۔ میں نے دو فائر نوجوان پجاری کے سر پر کیے مگر اتفاق کے تحت وہ بچ گیا۔ اس نے رائفل کا رخ میری اور موبل کی جانب کرکے بے دریغ ٹریگر دبایا' میں نے پھرتی سے زمین پر گر کر خود کو بچایا۔ موبل بھی اسی انداز سے بچ نکلا۔ اس سے پیشتر کہ پجاری پھر ٹریگر دباتا' موبل کسی طاقت ور اسپرنگ کے مانند ہوا میں اچھلا اور ہوا ہی میں قلابازی لگا کر پجاری پر گرا۔ اس کی ٹانگیں پجاری کے سینے پر لگی تھیں۔ پجاری الٹ کر گرا اور نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی' وہ اٹھ کر تاریکی میں بھاگا۔ موبل چھلاوے کی طرح اس کے پیچھے لپکا' اچانک میری نگاہ بڑے پجاری پر پڑی..... وہ شدید زخمی تھا مگر اس قابل تھا کہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ میں نے اپنے لبادے سے ٹارچ نکال کر جلائی۔ اس کی روشنی میں بڑے پجاری کا جسم لہولہان نظر آیا۔ ایک گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور وہاں سے بہنے والا خون اس کی توند کو بھگوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ عجیب ہیجانی منظر پیش کر رہا تھا۔ ابھی دو سیکنڈ پہلے بڑے پجاری نے جھک کر زمین سے کوئی چیز اٹھائی تھی۔ اب ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو پتا چلا کہ یہ نوجوان پجاری کی گری ہوئی رائفل ہے۔ بڑا پجاری جو خود بھی چند لمحوں کا مہمان نظر آتا تھا' لڑکھڑاتا ہوا اپنے مردہ اور نیم مردہ ساتھیوں کے قریب پہنچا۔ پھر میری آنکھوں نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔ اس نے رائفل کا رخ اپنے بے حرکت ساتھیوں کی طرف کرکے ایک بار پھر گولیوں کی بوچھار کردی۔ جیسے وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی زندہ نہ رہے۔

میں نے لپک کر بڑے پجاری کے ہاتھ سے رائفل چھینی' وہ تیورا کر نیم پختہ زمین پر گرا۔ میری ٹارچ کا لرزتا دائرہ اس کے چہرے پر آیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے پجاری کی آنکھیں پتھرا گئیں' وہ مرچکا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چند ہی سیکنڈ میں یہ سب کیا ہوگیا ہے؟ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اپنے چاروں جانب لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ دس پجاریوں میں سے [illegible] زندہ بچا تھا جو بھاگ نکلا تھا۔ سردار رانفے کا جنگ باز بیٹا موبارے ہلاک ہوا تھا اور خود سردار رانفے بھی شدید زخمی تھا۔ اس وقت اس سائبان تلے صرف سردار رانفے جس میں زندگی کی رمق نظر آ رہی تھی۔

میں نے کچھ آگے جا کر موبل کو آوازیں دیں مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ [illegible] کے پیچھے کافی دور نکل گیا ہے۔ میں نے اپنے قدموں تلے پجاری کو دیکھا جس کی ٹانگ ابھی کچھ دیر پہلے خندق میں گر کر ٹوٹی تھی۔ اب اس کی ٹانگ میں دو تین گولیاں پیوست تھیں لیکن اس سے اسے کیا فرق پڑتا تھا۔ عین دل کے مقام پر لگنے والی ایک گولی اسے راہیٔ عدم کر چکی تھی۔

میں وہیں لاشوں کے درمیان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ذہن کے نہاں خانوں سے ایک سوال چیخ بن کر ابھر رہا تھا۔ کیا موت کی نحوست ایک بار پھر لارسیوں کو ایک سانحے سے دوچار کر گئی ہے؟ نو عدد اہم ترین پجاری جو صرف ایک منٹ پہلے زندہ تھے اب بے جان لاشوں کی صورت میرے سامنے تھے۔ ان کے سیاہ لبادے' سیاہ دستانے اور موزے ان کے اپنے ہی خون سے سرخ ہوچکے تھے۔ وہ سخت احتیاطی تدابیر کے ساتھ یہاں آئے تھے لیکن یہاں پہنچ کر وہ قدرے ریلیکس ہوگئے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ شاید موہا اب غار میں موجود نہیں۔ انہوں نے اپنی سماعت کو آزاد اور آنکھوں سے پٹیاں اتار رکھی تھیں۔ کیا پتا ان کی

روائی ان کے لیے موت کا سامان بن گئی ہو۔

شاید زندگی میں پہلی بار میں نے ایک ایسے شخص کے انداز میں سوچا جو حقائق سے زیادہ مافوق الفطرت عناصر پر یقین رکھتا ہو۔ میرے دل کے اندر سے یہ آواز ابھری کہ مجھے احتیاطی تدابیر اختیار کرلینی چاہئیں جنہیں اختیار نہ کرنے کی وجہ سے یہاں نو جیتے جاگتے انسان لاشوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں نے پلاسٹک شائن جیسا وہ مادہ پھر سے اپنے کانوں میں ٹھونس لیا اور آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ لی۔ یہ بہت باریک پٹی تھی اس کے اندر سے بھی میں ٹارچ کا روشن دائرہ دیکھ سکتا تھا اور دائرے کی زد میں آنے والی چیزیں دیکھ سکتا تھا۔ میں سردار رانفے کے سرہانے آن بیٹھا۔ اس کے سینے کی دائیں طرف گولی لگی تھی۔ ایک گولی اس کی دائیں ٹانگ میں پیوست تھی اور ایک نے اس کے ہاتھ کی دو انگلیاں کاٹ دی تھیں۔

وہ بے ہوش تھا۔ تاہم اس کا سانس روانی سے چل رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ سے خون کا اخراج کم کرنے کے لیے کس کر پٹی باندھ دی' سینے کے زخم کا میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ غار کے دہانے کے پاس موجود کتے غراتے ہوئے تیزی سے ایک جانب نکل گئے۔ یہ کتے فائرنگ کے زبردست شور کے دوران میں بھی یہاں موجود رہے تھے مگر اب آناً فاناً ایک طرف نکل بھاگے تھے۔ ایک اندیشہ خود بخود میرے ذہن میں چنگھاڑا' کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ موتابہ اس غار کے دہانے کی طرف آ رہی تھی۔ برف کی ایک لہر ٹھنڈک بن کر میرے رگ و پے میں اتر گئی۔ میں ٹیلے کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ریوالور پر میری گرفت خود بخود مضبوط ہوگئی تھی۔ میرے کان بند تھے' اردگرد کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں کوئی آواز تھی بھی یا نہیں۔ میں بے حرکت بیٹھا رہا اور آنے والے لمحوں کا انتظار کرتا رہا۔ دل و دماغ ایک عجیب سے سحر میں جکڑے چلے جا رہے تھے۔ کوئی کشش تھی جو مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ مجھے لگا میرے دماغ کے اندر پراسرار انگلیاں رینگ رہی ہیں۔ یہ انگلیاں میری سوچوں کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔ میرے ارادوں کو اپنی گرفت میں لے رہی تھیں۔ مجھے اپنے بدن کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ مجھے وہ آسیبی کیفیت یاد آ گئی جو گلگت سے آگے وادی موت میں مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ پراسرار سانوں کے اندر پہنچ کر میرے ارادے گرفتار ہوئے تھے اور میں مجبور محض بن کر رہ گیا تھا۔ آج میں ان لمحات میں ایک بار پھر خود کو مجبور محض محسوس کرنے لگا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ ایک آکٹوپس کے بے شمار ہاتھ میرے بدن سے لپٹ گئے ہیں۔ یہ ہاتھ مجھے تاریک غار کے دہانے کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ میرے کان بند تھے لیکن کچھ غیر مرئی آوازیں ان بند کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ کوئی پکار رہا تھا۔

میرے پاس آؤ....

میرے نزدیک چلے آؤ.....

اپنے اردگرد کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ بس مجھے یاد رکھو اور میری طرف بڑھ آؤ۔ میری طرف آجاؤ۔

اس آواز کی کوئی شکل نہیں تھی' کوئی لفظ نہیں تھے پھر بھی مفہوم پوری طرح میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میرے پاؤں جیسے غار کی طرف بڑھنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ ایک غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ میں نے خود کو جگائے رکھنے کی کوشش کی۔ میرے دل کے اندر گہرائی سے یہ آواز ابھری کہ اگر میں نے یہ غنودگی اپنے حواس پر طاری ہونے دی تو پھر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ میں بھی اپنے اردگرد بکھری لاشوں کے ساتھ ایک لاش بن جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد میرا بے جان جسم بھی اس درخت کے ساتھ جھول رہا ہو جس کے ساتھ پندرہ دن پہلے پانچ پجاریوں کی لاشیں جھول رہی تھیں۔

ان لمحات میں نجانے کیسے میرا ہاتھ اس کھلونا ہاتھی پر پڑ گیا جو میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ تانبے کے اس ہاتھی پر تانبے ہی کی چھوٹی چھوٹی سوئیاں تھیں۔ میرے ذہن میں سردار رانفے کی کہی ہوئی بات آئی۔ میں نے ہاتھی کو مٹھی میں لے کر دبانا شروع کیا۔ سوئیاں میری ہتھیلی میں چبھیں اور درد کی لہریں پورے بازو میں پھیل گئیں۔ چند لمحے بعد اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹ رہی ہے۔ آکٹوپس کے ان بے شمار ہاتھوں کی گرفت میرے جسم پر نرم پڑ گئی تھی جو مجھے ہر طرف سے جکڑتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے تانبے کے اس کھلونا ہاتھی کو اور زور سے دبایا۔ سوئیاں گوشت کے اندر دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میری غنودگی ختم ہونے لگی۔ مجھے لگا جیسے اس کھلونے کی شکل میں ایک قابل اعتبار سہارا مجھے مل گیا ہے (اس واقعے کے کئی دن بعد جب سوچا تو احساس ہوا کہ یہ کوئی جادوئی عمل نہیں تھا' نہ ہی کھلونا ہاتھی میں کوئی ایسی روحانی قوت تھی جس نے مجھے پراسرار کشش کے پنجے سے نکالا' یہ تو ایک سیدھی سادی بات تھی جو تھوڑے سے غور کے بعد کسی بھی شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جسمانی تکلیف پہنچنے کی صورت میں انسان

کے ذہن پر سے دباؤ خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ یہ عمل عام زندگی میں اکثر ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ سخت شرم کے موقع پر انگلیاں مروڑنا، شدید غم کے موقع پر بال نوچنا، خود کو زخمی کر لینا، غصے کے عالم میں دیوار پر مکے برسانا یا اس قسم کے اور کئی افعال۔ یہ سب کچھ در حقیقت ہم اپنی ذہنی کیفیت کی شدت کو کم کرنے کے لیے کرتے ہیں)

میں کھلونا ہاتھی کو اپنی مٹھی میں دبائے بیٹھا رہا اور خدا سے دعا کرتا رہا کہ میرے اعصاب چٹخنے سے بچے رہیں۔ یہ ایک ایسی آسیبی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جسم جیسے ٹوٹ کر ہزاروں حصوں میں تقسیم ہو جانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر اسی عذاب ناک کیفیت میں گزری۔ اندازاً آٹھ دس منٹ میں اسی حالت میں رہا تھا پھر میں نے سیاہ پٹی کی اوٹ سے دیکھا کہ موہل واپس آ رہا ہے۔ موہل کی واپسی کے ساتھ ہی میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی وہ جان لیوا کیفیت یک دم معدوم ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے میں کسی ڈراؤنے خواب سے جاگ گیا ہوں۔

میں نے آنکھوں پر سے پٹی ہٹا دی۔ کانوں میں بھرا ہوا پلاسٹک شائن جیسا مرکب بھی نکال دیا۔ موہل سائبان کے نیچے بکھری ہوئی لاشیں دیکھ کر ششدر تھا۔ اس نے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ زخمی سردار کے چہرے پر ڈالا اور مزید غم زدہ نظر آنے لگا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "یہ سب کیا ہو گیا جناب، ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تو سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"وہ بھاگ گیا یا پکڑا گیا؟"

"بھاگ گیا۔ پتا ہی نہیں چلا کدھر گیا ہے۔"

"سردار کے ساتھیوں کو فائرنگ کا پتا چل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ سخت پریشان تھے۔ گپھا کی طرف آنا چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں بمشکل روکا ہے۔"

اسی دوران میں موہل کی نگاہ میرے ہاتھ پر پڑی اور وہ بری طرح چونک گیا۔ میں نے بھی پہلی بار ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ہتھیلی زخمی تھی اور خون رس رہا تھا۔ ہیجانی کیفیت میں میں نے کھلونا ہاتھی کو کافی زور سے دبایا تھا۔ سوئیاں گوشت میں اندر تک دھنس گئی تھیں "یہ کیا ہوا ہے؟" موہل نے پوچھا۔

میں نے مختصر لفظوں میں اسے بتایا۔

اسی اثنا میں سردار دانے کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔ ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ موہل نے بتایا کہ پانی مانگ رہا ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن طبی امداد کا دور دور پتا نہیں تھا۔ ہم نے رانے کو پانی پلایا۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے اچھی طرح لاشوں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے کسی کے اندر زندگی کی رمق نہیں تھی۔ میں نے رانے کو بڑی احتیاط سے کندھے پر اٹھایا اور ہم رانے کے ان ساتھیوں کی جانب روانہ ہو گئے جنہوں نے غار کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

نجانے کیا بات تھی، موہل کے آنے کے بعد سے وہ پراسرار کشش محسوس نہیں ہوئی تھی جو مجھے ان دیکھے ہاتھوں سے غار کی جانب کھینچ رہی تھی۔ نہ ہی کانوں میں وہ پراسرار سرگوشیاں گونجی تھیں۔ ہم زخمی رانے کو اٹھائے رانے کے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو ایک دم ہمارے گرد ہجوم ہو گیا۔ ہر چہرہ مضطرب نظر آنے لگا۔ یقیناً اس اضطراب میں مزید اضافہ ہو جاتا اگر ہم ان لوگوں کو بتا دیتے کہ ہمارے ساتھ جانے والے تمام پجاری اس وقت لاشوں کی صورت میں غار کے دہانے پر پڑے ہیں۔ سردار کے ساتھیوں نے بڑی پھرتی سے کچھ شاخوں کو جوڑ کر ایک اسٹریچر سا بنایا اور سردار کو اس پر لٹا کر کالونی کی طرف روانہ ہو گئے۔

لاشوں کا اٹھایا جانا ضروری تھا مگر اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ غار کی طرف واپس جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اگر پجاری حالات سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود اور حفاظتی انتظامات کرنے کے باوجود دو مرتبہ موتا بہ کی دہشت کا شکار ہو سکتے تھے تو ہم تو کسی گنتی میں ہی نہیں آتے تھے۔ اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ رات کے اندھیرے میں جنگلی جانور لاشوں کو خراب کریں، مگر یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں تھا۔

ہم واپس کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس ہموار راستے پر پہنچ گئے جو سیدھا کالونی کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کی بائیں جانب وہ جنگل تھا جہاں چھ روز سے آگ لگی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں آگ کے شعلے صاف نظر آتے تھے، ہوا میں اڑتی ہوئی چنگاریاں شیطانی رقص کا سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ جلتی ہوئی لکڑی کی بو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہمارے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ ہم تین چار فرلانگ آگے گئے ہوں گے جب اچانک موہل چونکا۔ اس کے کان کسی شکاری جانور کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مجھے لگتا ہے وہ خبیث کہیں آس پاس موجود ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ پجاری جس نے قتل کیے؟"

موہل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے غیر ارادی طور پر رائفل اپنے کندھے سے اتار لی تھی پھر وہ تیزی سے ایک طرف لپکا، میں نے اس کا تعاقب کیا۔ ابھی ہم پندرہ بیس گز دور ہی گئے ہوں گے کہ گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا کوئی شخص اپنی پناہ گاہ سے نکل کر بڑی رفتار سے دوڑا۔ یقیناً موہل کا اندازہ درست تھا۔ جھاڑیوں سے نکل کر بھاگنے والا "قاتل پجاری" تھا۔ نہایت دشوار راستے پر قریباً دو فرلانگ تک ہم نے اس کا تعاقب کیا پھر یکایک میں نے موہل کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ اس کا پاؤں ایک آہنی شکنجے میں تھا۔ یقیناً یہ کسی شکاری کا لگایا ہوا پھندا تھا۔ اس نے لمبی گھاس میں یہ پھندا یقیناً کسی جانور کے لیے لگا رکھا ہوگا۔ مگر جانور کے بجائے اس میں موہل پھنس گیا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ موہل کی ٹانگ غالباً معمولی زخمی ہوئی تھی۔ میں نے موہل کو اس کے حال پر چھوڑ کر مفرور پجاری کا تعاقب جاری رکھا۔ تاریکی میں ایسا تعاقب کافی دشوار ہوتا ہے لیکن چونکہ یہاں درخت زیادہ نہیں تھے صرف لمبی زرد گھاس تھی لہٰذا مجھے بھاگتے ہوئے نوجوان پجاری کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہم جنگل کی آگ کے قریب تر پہنچ چکے تھے۔ سانسوں میں دھواں بھرنے لگا تھا اور گرمی ایک دم بہت بڑھ گئی تھی۔ پجاری سیدھا آگ کی جانب بھاگا جا رہا تھا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ اسی طرح بھاگتا ہوا آگ کے اندر گھس جائے گا۔ اس سے پہلے میں بڑے پجاری کو بھی ہیجانی انداز میں اپنے ہی ساتھیوں پر گولیاں برساتے دیکھ چکا تھا۔

ریوالور میرے ہاتھ میں تھا "رک جاؤ!" میں نے پکار کر کہا۔

ظاہر ہے میری اردو تو اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ہاں لب و لہجہ اسے خبردار کر سکتا تھا۔ مگر اس کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ آگ کے بالکل نزدیک پہنچ گیا ہے تو میں نے اس کی ٹانگوں پر دو فائر کیے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب یہ دونوں فائر رائگاں گئے پھر میری آنکھوں نے یہ حیرت ناک منظر دیکھا کہ نوجوان پجاری خراماں خراماں بھڑکتی ہوئی آگ کے اندر گھس گیا۔ میں نے شعلوں کی روشنی میں دیکھا کہ اس کے سیاہ لبادے نے ایک دم آگ پکڑ لی۔ پجاری کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ مگر اس چیخ میں کرب کم اور جوش زیادہ تھا۔ اس نے سراپا شعلہ پوش ہونے کے بعد رخ پھیر کر میری طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ اس کے چہرے پر عجیب خوفناک تاثرات تھے۔ مجھے لگا کہ وہ ہنس رہا ہے۔ پتا نہیں میرا وہم تھا یا وہ واقعی ہنس رہا تھا۔ اس کے حلق سے ایک اور چیخ بلند ہوئی، پھر وہ اوندھے منہ آگ میں گرا اور شعلوں میں چھپ گیا۔

میں اپنی جگہ سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ میرے ارد گرد دور تک ویرانہ تھا، سامنے آگ میں دھڑا دھڑ جلتے ہوئے درخت تھے، اچانک ایک بار پھر وہی کیفیت میرے دل و دماغ کو جکڑنے لگی جو کچھ دیر پہلے غار کے دہانے کے سامنے مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ کسی انجانی قوت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دماغ میں پراسرار انگلیاں سرسرانے لگیں۔ غیر مرئی سرگوشیاں میرے کانوں میں گونجیں "میرے قریب آؤ۔ میرے پاس آ جاؤ۔"

میرے آس پاس تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا مگر آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ایک بار پھر مجھے یہ عجیب و غریب احساس ہوا کہ اس سرگوشی کی کوئی زبان نہیں تھی، نہ ہی اس کے الفاظ تھے مگر پھر بھی مفہوم میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ ایک دم میری ٹانگوں میں سکت نہیں رہی۔ میں وہیں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ کہیں پھر مجھ پر غنودگی تو طاری نہیں ہو رہی؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ اس سوال کا جواب غیر واضح تھا۔ شاید غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرا ہاتھ از خود کھلونا ہاتھی کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے مٹھی میں دبایا اور زور سے بھینچنا شروع کیا۔ درد کی لہریں پورے بازو میں پھیل گئیں۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی لیکن پھر اچانک درد کی لہریں بے بس ہو گئیں، دھند غالب آنے لگی۔ میں شاید بے ہوش ہو رہا تھا۔ اگر میں بے ہوش ہو جاتا تو موت یقینی تھی۔ آگ ایک کے بعد دوسری جھاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ پھنکارتے ہوئے شعلوں کا فاصلہ مجھ سے کم تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے ذہن کو جھٹکا، اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں، اٹھ کر بھاگنا چاہتا ہوں لیکن بھاگ نہیں سکتا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے، دماغ سن ہو گیا تھا۔ ایک دم میرے سامنے کی تین چار جھاڑیوں نے آگ پکڑ لی اور دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ دھوئیں سے میرا دم گھٹتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک دم موت کی دہلیز پر پہنچ گیا ہوں۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا، میں نے کوئی نشہ نہیں کیا تھا، کوئی خواب آور دوا نہیں کھائی تھی، پھر

میرے حواس معطل کیوں ہو رہے تھے۔ کیا یہ دھوئیں کا اثر تھا یا ناقابل فہم ماحول کا اثر تھا۔ ذہن کی گہرائی سے جواب آیا۔ مجھے خواہ مخواہ ثبوت اور جواز نہیں ڈھونڈنے چاہئیں۔ مجھے مان لینا چاہیے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ماورائی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہے اور نہ دلیل، منطق سے کوئی تعلق۔ یکایک میں نے چاروں طرف سے خود کو شعلوں کے حصار میں پایا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے ایک بار پھر گلے میں توبراں کھلونا ہاتھی کو مٹھی میں دبوچا لیکن اب یہ تدبیر بھی کارگر نہیں رہی تھی۔ مجھے شاید درد محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مکمل طور پر ہوش و حواس کھو دیتا، ایک ہاتھ نے میرا بازو تھام لیا اور مجھے اپنی جانب کھینچا۔ یہ بڑی مہربان گرفت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ گرفت مجھے آگ میں بھسم نہیں ہونے دے گی۔ شاید یہ اسی اطمینان ہی کا ردعمل تھا کہ ایک دم میری مزاحمت ختم ہو گئی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے دیکھا کہ آگ کا ایک ستون سا میری طرف بڑھ رہا ہے۔

○☆○

دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک نیم تاریک کمرے میں پایا۔ اس کمرے کی دیواریں کچی تھیں اور ان پر ایسی کیچڑ کا لیپ کیا گیا تھا جس میں بھوسا شامل کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں صرف ایک چراغ روشن تھا۔ ساتھ والے کمرے سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میرے جسم پر ابھی تک وہی سیاہ لبادہ تھا جو پجاریوں نے فراہم کیا تھا۔ سیاہ دستانے، جرابیں اور کھلونا ہاتھی ایک طرف تپائی پر پڑے تھے۔ میں کچھ دیر تک تو خالی خالی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتا رہا، پھر مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں شعلوں کے درمیان تیورا کر گر گیا تھا۔ کچھ شعلے میرے بالکل نزدیک پہنچ گئے تھے۔ میں نے اپنے زیریں جسم پر آگ کی شدید تپش محسوس کی تھی۔ شاید میری ٹانگیں آگ کی لپیٹ میں آگئی تھیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، اسی وقت ایک ہاتھ میرے سینے پر آیا اور اس نے مجھے پھر سے لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے دیکھا، یہ ایک درمیانی قامت کا شخص تھا۔ ایک براؤن رنگ کے لبادے نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ سر پر پہنچ کر اس لبادے نے ایک ٹوپی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس ٹوپی کے سبب اجنبی کا چہرہ جیسے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس شخص نے بڑی نرمی سے میرے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور ایک پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ اس پیالے میں ایک خوش ذائقہ محلول تھا، معمولی تذبذب کے بعد میں نے یہ محلول حلق سے نیچے اتار لیا۔ اس شخص نے دوبارہ بڑی نرمی سے میرا سر تکیے پر رکھ دیا۔ میں اس دوران میں مسلسل اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس بات کا یقین تو مجھے بہرحال ہو چکا تھا کہ اسی شخص نے مجھے جنگل کی آگ سے نکالا تھا۔ اس وقت بھی یہ شخص غالباً اسی پراسرار لبادے میں تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔

اس نے ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ تاریکی اور کچھ اس شخص کی ٹوپی کے سبب یہ ممکن نہیں ہوا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی ٹانگوں کو ہلانا چاہا، اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میری بائیں ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے لے کر ٹخنے تک لوہے کی طرح اکڑی ہوئی ہے۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا۔ ٹانگ پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی، اس پٹی کے نیچے لکڑی کے ٹکڑے وغیرہ رکھے گئے تھے۔ کیا میری ٹانگ کی ہڈی کو نقصان پہنچا ہے؟ یہ سوال چیخ بن کر میرے ذہن سے ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آگ کا وہ ستون یاد آیا جو میری بے ہوشی سے چند سیکنڈ قبل مجھے اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوا تھا۔ وہ ستون کیا تھا؟ میرے دل نے پکار کر کہا کہ وہ کوئی جلا ہوا درخت تھا، جو جل کر گرا تھا اور اس کی کچھ شاخیں مجھ سے ٹکرائی تھیں۔

"میری ٹانگ کے ساتھ کیا ہوا ہے؟" میں نے جھلا کر اپنے خیرخواہ سے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ران کی ہڈی میں معمولی سا بال آگیا ہے، چند دن کے آرام سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

میرے مخاطب نے مجھے انگریزی میں ہی جواب دیا تھا۔ وہ اتنے یقین سے بات کر رہا تھا جیسے اس دور دراز صحرا میں اس کچے مکان کے اندر اس نے میرے ایکسرے لیے ہوں اور پوری تسلی کر لی ہو۔ اس شخص کا لہجہ بھی مجھے کچھ جانا پہچانا لگا تھا۔

میں نے سر گھما کر ایک بار پھر اسے بڑے دھیان سے دیکھنے کی کوشش کی۔ چراغ کی روشنی کا زاویہ ایسا تھا کہ اجنبی کا چہرہ مکمل تاریکی میں تھا۔ رہی سہی کسر اس کی ٹوپی کے گھونگھٹ نے پوری کر دی تھی۔ مٹی کے چراغ کی لو مزید مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ چراغ کو ٹھیک کرنے کے لیے اجنبی

اس کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ اس کے بازو پر پڑی۔ بازو کی جگہ بس خالی آستین جھول رہی تھی۔ اجنبی کا ایک بازو کہنی سے کٹا ہوا تھا۔

میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ابھی مجھے اجنبی کے لب و لہجے نے چونکایا تھا، اب اس کے بازو نے مکمل طور پر ششدر کر دیا۔ میں بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا تم میری طرف دیکھنا پسند کرو گے؟"

وہ بدستور چراغ کی طرف متوجہ رہا، اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "شاید تم مجھے پہچان گئے ہو۔ تمہاری حسیں کافی تیز ہیں۔"

"کیا آپ محترم بوکارلو ہیں؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے رخ میری طرف پھیر لیا اور اپنے سر سے ٹوپی ہٹا کر اپنی پشت پر پھینک دی۔ وہ بوکارلو ہی تھا۔ میرا جسم سنسنا اٹھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یہاں اس حال میں بوکارلو سے ملاقات کروں گا۔ بوکارلو تو اپنے بھائی کنگ براؤن کی تحویل میں تھا۔ اسے سات کوٹھڑیوں میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ وہ ایک ایسی جیل کا قیدی تھا جس کی دیواریں آسمان تک بلند تھیں۔۔۔ اور اب کنگ کا یہ معتوب قیدی اس نیچی چھت والے بوسیدہ مکان میں میرے سامنے کھڑا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو گی۔" میرے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"بس یہ سب دیوتاؤں کا کرشمہ ہے۔" بوکارلو نے مخصوص لہجے میں کہا "دیوتا جب چاہتے ہیں تو چیونٹی سے ہاتھی کو مروا دیتے ہیں، دیوتاؤں کی مرضی سے پہاڑوں کی سنگلاخ دیواروں میں راستے کھل سکتے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن کوئی سبب تو ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ٹرسٹ سے نکلنے کا بھی کوئی سبب ہو گا۔"

"ہاں یہ جہان تو اسباب کا جہان ہے۔ میری رہائی بھی ایک سبب کی مرہون منت رہی ہے۔ کوئی شخص تھا جو ٹرسٹ کی بلند دیواروں میں میرے لیے راستہ پیدا کر گیا۔ جو کام بہت سے زور آور مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے وہ اس اکیلی کمزور سی جان نے کیا۔ شاید تم اسے دیکھو تو حقیر اور بے وقعت جانو، لیکن وہ میرے لیے میرے قریب ترین ساتھیوں سے بھی بڑھ کر اہم ثابت ہوا۔"

"کیا میں اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

اس سے پہلے کہ بوکارلو کوئی جواب دیتا، ساتھ والے کمرے میں موجود بوڑھے کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ بوکارلو لپک کر اس کے پاس چلا گیا۔ وہ چار پانچ منٹ تک بوڑھے کی دیکھ بھال میں مصروف رہا اور مدھم لہجے میں اس سے باتیں کرتا رہا پھر وہ باہر نکل گیا۔ میرا دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ بوکارلو کی رہائی موجودہ حالات میں بے حد اہم تھی۔ ژانواں ڈول لارسیوں کو بوکارلو کی موجودگی سے بے پناہ تقویت مل سکتی تھی۔ وہ ان کا روحانی پیشوا تھا۔ سردار بوغات کی موت کے بعد صرف دو افراد تھے جن کی روحانیت پر لارسی اندھا اعتماد رکھتے تھے۔ ایک سائیں عالی اور دوسرا بوکارلو۔ مجھے یقین تھا کہ اگر لارسیوں کو ابھی یہ اطلاع پہنچا دی جائے کہ بوکارلو اپنے جابر بھائی کنگ براؤن کی زنجیریں توڑ کر ان کے درمیان آ موجود ہوا ہے تو وہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں اور خیموں سے باہر نکل آئیں اور ناچنا شروع کر دیں۔ یہ ایک دھماکا خیز خبر تھی کہ محترم بوکارلو ٹرسٹ کے کسی عقوبت خانے میں نہیں، اس صحرا میں اپنے لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔

کچھ دیر تک دوسرے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں پھر مجھے اندازہ ہوا کہ بوکارلو باہر چلا گیا ہے۔ میں نے ٹانگ کو ہلانے کی کوشش کی تو درد کی ٹیسیں پورے بدن میں پھیلتی محسوس ہوئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نہ صرف میری ٹانگ پر ضرب آئی ہے بلکہ دونوں ٹانگیں کچھ جلی ہوئی بھی ہیں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے آگ کا جو ستون میں نے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تھا اس نے مجھے اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کے خونچکاں واقعات میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے اور پجاریوں کی جھلسی لاشیں تصور کے پردے پر اچھل مچانے لگیں۔ موتا۔ لارسیوں کے لیے ان کی توقع سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔

اچانک مجھے بھاگتے قدموں کی آواز آئی پھر بوکارلو ہانپتا ہوا سا اس دیہاتی مکان میں داخل ہوا۔ اس نے کھانستے ہوئے بوڑھے سے چند باتیں کیں، پھر دونوں کمروں کے چراغ بجھا دیے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ ذرا ہی دیر بعد مجھے جیپوں کے انجنوں کی آواز سنائی دی۔ یہ کم از کم دو جیپیں تھیں۔ میں دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ ان منحوس جیپوں کا تعلق ٹرسٹ سے ہے۔ یہ جیپیں آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھیں۔ ان کا انداز گشت کرنے کا سا تھا۔ جیپوں کی آواز ہمارے بالکل نزدیک پہنچ گئی، کئی آوارہ کتے جیپوں کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ایک دو گھروں کے دروازے زور سے کھٹکھٹائے گئے۔ لوگوں کے بولنے کی مدھم

آوازیں آئیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں اس وقت کسی صحرائی بستی کے مکان میں موجود ہوں۔ یہ بات بھی اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ جو زرشی بھیڑیوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں وہ یقیناً بوکارلو کو ہی تلاش کر رہے ہیں۔ بوکارلو نے شاید ساتھ والے کمرے کے مکین بوڑھے شخص کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی کھانسی پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب کھانس نہیں رہا تھا۔ صرف اس کے حلق سے "کھوں کھوں" کی آواز نکل رہی تھی۔ آہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ زرشی محافظ گلی میں موجود ہیں اور جگہ جگہ تلاشی لے رہے ہیں پھر جیپیں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور زرشی اس بستی سے واپس چلے گئے۔ بوکارلو نے دونوں کمروں کے چراغ پھر سے روشن کر دیے۔ وہ بالکل پر سکون نظر آ رہا تھا۔

وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی بڑی بڑی خواب ناک آنکھوں میں دیکھنا محال تھا۔ ایسی گہرائی اور کشش تھی اس کی آنکھوں میں کہ انسان اندر تک کپکپا جاتا تھا۔ میں جھیل زار میں اس انوکھے تجربے سے ایک دو بار پہلے بھی گزر چکا تھا۔ وہ باوقار لہجے میں بولا "میں جانتا ہوں کہ تم میری رہائی کے لیے کوششیں کرتے رہے ہو۔ اس کے لیے میں تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکر گزار رہوں۔"

"یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میرے لیے زیادہ فخر کی بات ہوتی کہ آپ کی رہائی میں میرا کوئی کردار ہوتا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس میں تم سب کا کردار ہے۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا "کیا ماسٹر اسٹی اب بھی تمہاری تحویل میں ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا' بوکارلو نے کہا "یقیناً یہ ایک ناپسندیدہ کام ہے مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔"

میں کوشش کر رہا تھا کہ بوکارلو کی آنکھوں میں نہ دیکھوں' اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے پتھر کا دل اور فولاد کے اعصاب درکار تھے۔ اس نے بڑی نرمی سے پوچھا "کیا تم کالونی سے آئے ہو؟" میں نے ہاں میں جواب دیا۔ بوکارلو بولا "میرا خیال ہے کہ وہاں بھی میری تلاش ہوئی ہوگی۔ زرسٹ سے کوئی نہ کوئی ضرور پہنچا ہوگا وہاں۔"

"مجھے معلوم نہیں جناب!" میں نے کہا' مگر پھر ایک دم میں چونک گیا۔

مجھے پانچ چھ دن پہلے کے واقعات یاد آ گئے۔ مجھے وہ پراسرار زرشی یاد آئے جنہوں نے سورج کے رقص کے دوران میں موبل سے دھینگا مشتی کی تھی۔ ان میں سے دو موبل کے قابو میں آ گئے تھے اور باقی بھاگ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ گمنام کال بھی مجھے یاد آ گئی جو مجھے واکی ٹاکی پر موصول ہوئی تھی۔ اس کال میں مجھے کسی نامعلوم لڑکی نے ایک ادھوری اطلاع دی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کالونی میں پکڑے جانے والے دونوں بندے ماسٹر اسٹی کو چھڑانے کے چکر میں یہاں نہیں آئے' نہ ہی وہ راجر کو ڈھونڈنا چاہ رہے ہیں' ان کی آمد کا مقصد کچھ اور ہے۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی آواز آنا بند ہو گئی تھی اور کھڑ کھڑ کی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔

میرا دل کہنے لگا کہ اس روز لڑکی جو اطلاع دینا چاہ رہی تھی اس کا تعلق بوکارلو سے ہی تھا۔ وہ مجھے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ بوکارلو زرسٹ کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور جو بندے کالونی میں پکڑے گئے ہیں وہ اسی کو کھوجتے پھر رہے ہیں۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟" بوکارلو نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کا اندازہ درست ہے۔ آپ کی تلاش میں کچھ لوگ کالونی میں بھی پہنچے ہیں۔ پانچ چھ دن پہلے ایسے دو بندے پکڑے بھی گئے ہیں۔ ان سے کالونی کے ایک تہ خانے میں پوچھ گچھ ہو رہی تھی کہ کسی نامعلوم شخص نے انہیں گولی مار دی۔ ان دونوں افراد کے کچھ ساتھی فرار ہونے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔"

کچھ دیر بعد بھیڑیوں کی منحوس آواز ایک بار پھر آنا شروع ہو گئی لیکن اس مرتبہ یہ آواز کافی فاصلے سے گزر گئی اور بوکارلو کو کسی قسم کی احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بوکارلو نے مجھ سے پوچھا کہ میں کل رات کہاں سے آ رہا تھا اور جنگل کی اس آگ تک کیسے پہنچا؟

بوکارلو نے "کل رات" کا لفظ استعمال کیا تو مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ میں تقریباً بیس گھنٹے بے ہوش پڑا رہا ہوں۔ طبیعت میں ابھی تک کسل مندی اور بھاری پن موجود تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میری بے ہوشی تکلیف کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ بوکارلو نے مجھے کوئی خواب آور دوا دے رکھی تھی۔

میں نے بوکارلو کو مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنا دی۔ ان میں سے بہت سی باتیں بوکارلو کو پہلے ہی معلوم تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ساحرہ موتابہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ موتابہ کا پراسرار طور پر تابوت سے غائب ہونا' کسی پہاڑی غار میں پناہ لینا' اس غار یا گپھا کے دہانے پر پانچ پجاریوں کی خودکشی' کالونی پر جنگلی جانوروں کی یلغار۔ یہ سارے واقعات بوکارلو کو پہلے سے معلوم تھے۔ ہاں غار کے دہانے پر پیش آنے والے تازہ ترین واقعے کے بارے میں اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ جان کر سخت حیران ہوا کہ غار کے دہانے پر مزید گیارہ افراد قتل ہو گئے ہیں جن میں نو پجاری بھی ہیں۔ میں نے اسے دسویں پجاری کا احوال بھی بتایا' جس کے تعاقب میں بھاگتا ہوا میں آتش زدہ جنگل میں پہنچا تھا۔ وہ خوفناک منظر ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا جب نوجوان پجاری دیوانہ وار آگ میں گھس گیا تھا اور جب شعلوں نے اس کے جسم کو لپیٹ میں لیا تھا تو اس نے ایک ایسی چنگھاڑ ماری تھی جس میں کرب نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی مسکراہٹ تھی۔

بوکارلو کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ اس نے گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا "میرا اندازہ ہے کہ کل رات موتابہ نے پجاریوں کو دھوکا دیا تھا' وہ اس گپھا کے اندر ہی کہیں موجود رہی ہوگی۔ وہ شیطانی قوتوں کے اثر میں ہے' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خود بھی شیطان صفت ہو چکی ہے۔ اس نے کل کوئی چال کھیلی ہوگی۔"

بوکارلو چند دیر مجھ سے مصروف گفتگو رہا' پھر کھوئے کھوئے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ میری دونوں ٹانگوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ دونوں ٹانگوں کے درد کی نوعیت مختلف تھی۔ بائیں ٹانگ میں چوٹ لگی تھی جبکہ دائیں ٹانگ جلن کا شکار تھی۔ میری بے ہوشی کے دوران میں ہی غالباً بوکارلو نے اس ٹانگ پر کوئی دوا وغیرہ لگائی تھی۔ نصف شب کے بعد میں نے ہولے ہولے کراہنا شروع کر دیا۔ چند لمحے بعد بوکارلو میرے سرہانے آن کھڑا ہوا۔ چراغ کی روشنی میں اس کا سرخ و سپید چہرہ بڑا افسانوی سا رنگ لیے ہوئے تھا۔ بوکارلو نے ایک بار پھر میرے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجھے تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور ایک پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس مرتبہ مشروب کا ذائقہ مختلف تھا۔

مشروب پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد گہری غنودگی نے میرے حواس کو ڈھانپنا شروع کر دیا پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو میں اپنے اردگرد کی ہر شے کو بہت دور اور فاصلے پر محسوس کر رہا تھا۔ ایک نیلگوں دھند سی تھی جس کے اندر ہر شے چکرائی ہوئی لگتی تھی۔ میں پوری طرح بیدار ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہو نہیں پا رہا تھا۔ ایک عجیب سی خود فراموشی نے دل و دماغ کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس خود فراموشی میں جسمانی درد اور ذہنی تفکرات ایک بہت دور کی بازگشت کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔ یہ کوئی نسوانی جسم تھا' اس کی خوشبو میری رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ مجھے اپنے رخساروں اور رہ رخنوں پر کسی کے ریشمی لمس کا احساس ہوا۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہتا تھا لیکن غنودگی کی نیلگوں دھند ہر بار مجھے ڈھانپ لیتی تھی۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے زیریں بدن پر لباس نہیں اور ایک نرم نازک ہتھیلی میری جلی ہوئی ٹانگ پر بڑی ملائمت سے حرکت کر رہی ہے اور صرف ٹانگ پر ہی نہیں یہ ہتھیلی سارے زیریں جسم پر آزادانہ حرکت کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے لگا کہ یہ غزالہ کا چہرہ ہے۔ اس کے مہربان لمس کے سرور نے مجھے ہر تفکر سے آزاد کر دیا۔ میرا ذہن ایک بار پھر غنودگی کے نرم نرم سیاہ ریشم میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوبارہ مجھ پر بیداری کی کیفیت طاری ہوئی تو نسوانی جسم کی خوشبو بدستور میرے آس پاس موجود تھی۔ اس مرتبہ سورج کی روشنی کمرے میں موجود تھی۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند بھی کم تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر پوری توجہ سے اس ہیولے کو دیکھا جو میرے سرہانے بیٹھا ہولے ہولے میرے بالوں میں اپنی حنائی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ مجھے جھٹکا سا لگا اور دل میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ غزالہ نہیں تھی۔ وہ سورج تھی۔ اس نے اپنا مخصوص لباس ٹی شرٹ اور پتلون پہن رکھا تھا۔ بال بڑے سلیقے سے ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ اسے دھکیل کر خود سے دور ہٹا دوں۔ مگر فی الوقت اس کی حیثیت میری تیمار دار کی سی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی ہے۔ نہ ہی میرے پاس یہ سب کچھ سوچنے کا وقت تھا۔ میری دائیں ٹانگ میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے ہلکی سی کراہ نکلی تو ایک اچھی تیمار دار کی طرح سورج فوراً میری بے چینی کی وجہ سمجھ گئی۔ وہ میری پائنتی کی طرف آ بیٹھی اور میری ٹانگ پر کوئی مرہم قسم کی چیز لگانے لگی۔ یہ جادو اثر چیز تھی۔ مجھے ٹھنڈک محسوس ہوئی اور آہستہ آہستہ میں پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

تیسری دفعہ میری آنکھ نجانے کتنی دیر بعد کھلی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی دونوں ٹانگوں کو مکمل سکون محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے سینے پر کوئی بوجھ سا دھرا ہے۔ یہ زندہ بوجھ تھا۔ یہ سانس لے رہا تھا اور اس میں سے نسوانی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ حواس مکمل بحال ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سورج ہے۔ وہ قریباً میرے ساتھ ہی لیٹی ہوئی تھی' اس کا سر میری ٹھوڑی کے نیچے تھا۔ بالائی جسم کا پورا بوجھ میرے سینے پر تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے میرے سر کے بال تھام رکھے تھے۔

میں خاموش لیٹا رہا اور اپنے حواس کو ٹھیک طرح سے بحال کرتا رہا۔ جب دل و دماغ پر چھائی ہوئی دھند اچھی طرح صاف ہو گئی تو میں نے سروج کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے دور ہٹا دیا۔ وہ تلملا کر رو گئی "کیا ہوا ہے۔ ہاتھ ہلانا ضروری نہیں تھا' زبان بھی ہلا سکتے تھے۔"

"زبان انسانوں کے لیے ہوتی ہے' جانوروں کے لیے نہیں۔"

"جانور میں نہیں تم ہو' جو گدھے کی طرح دولتیاں جھاڑ رہے ہو۔" وہ بھڑک کر بولی۔

"یہ نہ ہو کہ مجھے واقعی تمہیں جانور بن کر دکھانا پڑے۔"

"واہ بھگوان! کیا شان ہے۔ ہلنے کی ہمت نہیں اور جانور بننے کا شوق ہے۔" اس کے بعد اس نے ایک ایسی واہیات بات کی کہ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

اس پاگل کے منہ لگنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "جاؤ پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

وہ چہک کر بولی "محترم بوکارلو کے حکم پر میں یہاں تمہاری تیمارداری کے لیے موجود ہوں۔"

میں نے کہا "تمہاری تیمارداری یہی ہے کہ تم میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ یہ بہت بڑا احسان ہوگا تمہارا۔"

"احسان کرنے اور کرانے کے اور بھی کئی ایک طریقے ہیں۔" وہ بڑی بے باکی سے ایک آنکھ میچ کر بولی۔ اس کی بے حقیقت شرٹ میں سے اس کا جسم طوفان کے مانند پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ یقیناً اس کی یہی کافر ادائیں تھیں جن کے سبب ٹرسٹ میں دو افراد قتل ہوئے تھے اور بعد میں راجر بھی اس آفت زادی کو "ریپ" کرنے کے بعد موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ اگر کوئی عام فاحشہ ہوتی تو چند دنوں کے اندر تین عاشقوں کی جان لینے کے بعد تائب ہو جاتی یا کم از کم کچھ عرصے کے لیے ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ تو بالی ووڈ کی تربیت یافتہ ساحرہ تھی۔ دو چار عاشقوں کو کھا کر ڈکار بھی نہ لینا اس کے لیے معمولی کام تھا۔ اس بدبخت کی گردن پر ابھی تک اس وحشیانہ دراز دستی کی خراشیں موجود تھیں جو راجر نے موت سے پہلے اس سے کی تھی۔ چند ہی دن بعد وہ جیسے تیسے یہ سب کچھ فراموش کر چکی تھی اور نئی "مہمات" سر کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس کے فقرے نے اور آنکھ میچنے کے انداز نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں نے غرا کر کہا "تم جاتی ہو یہاں سے یا میں کوئی چیز اٹھا کر تمہارے سر پر مارو‌ں۔"

"تم اتنی ہی بک بک کرو جتنی کرنے کے قابل ہو۔" وہ بھی جواباً غرائی۔

میں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر قریب پڑے شیشے کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اس وقت بوکارلو تیز قدموں سے اندر داخل ہوا "رک جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ گرجا۔

میرا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ بوکارلو نے ناراضگی کے انداز میں آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے جگ لے لیا اور بولا "وہ چار دن سے دن رات تمہاری دیکھ بھال کر رہی ہے۔ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو؟"

"یہ ایک بے ہودہ اور۔۔۔"

"خاموش۔" بوکارلو نے مجھے سختی سے جھڑک دیا "میں اس کے بارے میں کوئی غلط لفظ سننا پسند نہیں کروں گا۔"

"لیکن۔۔۔"

"میں نے کہا ہے نا مسٹر شاہ جہاں۔ میں اس کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ تمہاری تیمارداری کرے گی اور تمہیں اس کے ساتھ تمیز سے پیش آنا ہوگا۔"

بوکارلو لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔ سروج بڑے غصے سے اپنی پتلی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور جلتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

صبح مجھے سروج کے کندھوں کے سہارے باتھ روم تک جانا پڑا۔ جس طرح کا بوسیدہ کمرا تھا ویسا ہی باتھ روم تھا۔ اس دن میں نے پہلی بار ہلکا سا ناشتا بھی کیا ورنہ اس سے پہلے تو بوکارلو کے دیے ہوئے مشروب پر ہی گزارہ تھا۔ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہاں میری دیکھ بھال کی تمام تر ذمے داری سروج پر ہی ہے۔ ناشتے کے بعد سروج کسی کام سے باہر چلی گئی۔ بوکارلو میرے پاس موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی چار پانچ دن مزید میری ٹانگ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ میں اس سے اپنے ساتھیوں کے بارے میں اور کالونی کے حالات کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر بوکارلو نے اس حوالے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ غالباً وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے اپنا کٹا ہوا ہاتھ اپنی شال کے اندر چھپا رکھا تھا۔ وہ لاریسوں کے مخصوص لباس میں تھا اور اپنی شکل کے سوا مکمل لاریسی نظر آتا تھا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے تین چار روز پہلے تم سے کہا تھا نا کہ ٹرسٹ سے میری آزادی کسی کی مرہون منت ہے۔ کوئی تھا جس کی وجہ

سے میں ٹرسٹ کی بلند دیواریں پھلانگنے میں کامیاب ہوا۔"

میں نے کہا "ہاں آپ نے ذکر فرمایا تھا۔"

وہ بولا "شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ وہ سروج تھی۔ یقیناً تمہاری نگاہ میں وہ ایک بری لڑکی ہوگی اور وہ واقعی وہ ایسی ہے بھی۔۔۔ مگر سروج ٹرسٹ میں نہ پہنچتی اور اپنی چالبازی سے میرے لیے راستہ ہموار نہ کرتی تو شاید اب تک ٹرسٹ کے اندر میرا خاتمہ بالخیر ہو چکا ہوتا۔ اس لڑکی نے اپنی خوب صورتی اور اپنا تن من داؤ پر لگایا تاکہ میں ٹرسٹ کی قید سے رہائی پا سکوں۔"

"کیا یہ آپ کی مدد کے لیے ہی ٹرسٹ میں گئی تھی؟"

"بے شک ایسا ہی تھا۔ یہ سارا منصوبہ سائیں عالی کا بنایا ہوا تھا۔ سائیں عالی نے کسی طرح سروج کو ٹرسٹ میں پہنچایا تھا' بعد کا سارا کام سروج نے خود سنبھال لیا۔ اس نے انتظامیہ کے ایک ایسے اعلیٰ عہدے دار کو اپنے حسن کا گرویدہ بنایا جو میری رہائی کا سبب بن سکتا تھا۔ فقط چند روز کے اندر یہ درمیانی عمر کا شخص سروج پر یوں فریفتہ ہوا کہ اس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا۔ اسی دوران میں اسمتھ نامی اس شخص کے ایک ماتحت کو سروج اور اسمتھ کی دوستی کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سروج اسمتھ سے کیا کروانا چاہ رہی ہے۔ اسمتھ نے خود کو بچانے کے لیے اپنے ماتحت کو جان سے مار دیا۔ تاہم اس کی یہ کارروائی براور کنگ کے خاص اسسٹنٹ راجر سے چھپی نہیں رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ راجر' اسمتھ کو گرفتار کرا دیتا' سروج اس کی سفارش بن کر راجر کی خواب گاہ میں پہنچ گئی۔ راجر کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اسمتھ اور سروج کا کیا رشتہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سروج ایک خدمت گار لڑکی ہے جو اسمتھ نے رشوت کے طور پر اس کی طرف بھیجی ہے' تاکہ وہ اس کے جرم کا پردہ فاش نہ کرے۔ سروج نے جب یہ دیکھا کہ راجر کی حیثیت اسمتھ سے کہیں بڑھ کر ہے اور وہ اس کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے تو اس نے اسمتھ کو بالکل نظرانداز کر دیا اور راجر کے بیڈ روم میں نظر آنے لگی۔ وہ راجر کو اس معاملے میں اتنا آگے لے گئی کہ راجر بھی وہی کام کرنے پر آمادہ ہو گیا جو اسمتھ کرنے پر آمادہ تھا۔ یعنی ٹرسٹ سے میرا فرار۔۔۔ بلکہ راجر یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اسمتھ کے سینے میں رقابت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سروج کو کھو کر وہ رات دن کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ جب سروج کی فرمائش پوری کرتے ہوئے راجر نے ٹرسٹ سے میرے نکلنے کا انتظام کیا تو اسمتھ کو بھنک پڑ گئی اور اس نے کنگ کو خبردار کرنے کا تہیہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی راجر نے اسمتھ کا کام تمام کر دیا۔ میرے آزاد ہونے کے بعد سروج بھی بڑی ہوشیاری سے ٹرسٹ میں سے نکل آئی۔ اس کی ہوشیاری اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ راجر ہی کی مدد سے نکلی' حالانکہ راجر اسے ایک لمحے کے لیے بھی خود سے دور کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات کا تمہیں پتا ہی ہے۔ راجر بہت بھنایا اور سروج کو ڈھونڈتا ہوا اس کے پیچھے کالونی میں چلا آیا۔"

میں بڑی توجہ سے سروج کی روداد سن رہا تھا۔ آج وہ مقصد مجھ پر آشکار ہو گیا تھا جس کے لیے سروج ٹرسٹ میں گئی تھی۔

اگلے دو روز بھی اسی طرح گزرے۔ میں باہر کے حالات جاننا چاہتا تھا مگر سروج کچھ بتاتی نہیں تھی اور نہ ہی بوکارلو بتاتا تھا۔ وہ دونوں کہتے تھے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ سروج کی حد تک تو میں یہ بات مان سکتا تھا لیکن بوکارلو جیسا جہاں دیدہ اور باخبر شخص بھی اندھیرے میں ہوتا اس کا مجھے یقین نہیں تھا۔ ان دو دنوں میں میری معلومات کے اندر بس اتنا اضافہ ہوا تھا کہ میں سائیں عالی کی بسائی ہوئی انوکھی بستی "کالونی" سے قریباً دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی صحرائی بستی میں موجود تھا۔ یہاں ایک بوڑھے قبائلی نے ہمیں یعنی مجھے' بوکارلو اور سروج کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ (سروج کو میری تیمارداری کے لیے بوکارلو نے ہی رازداری سے یہاں بلایا تھا)

اس دن کی جھڑپ کے بعد سروج کو مجھ پر مکمل برتری حاصل ہو گئی تھی۔ وہ میری تیمارداری کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنی من مانیاں بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ آتے جاتے اپنے چہرے کو میرے چہرے پر جھکا دینا' میرے ساتھ لگ کر بیٹھ جانا یا لیٹ جانا' میری ٹانگ کی پالش کرتے ہوئے اپنے آوارہ ہاتھ کو آزاد چھوڑ دینا۔ اس قسم کی خرافات وہ انجام دیتی رہتی تھی اور ساتھ ساتھ میری بے بسی سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔ میں کسی وقت چپ رہتا تھا کسی وقت جھڑک دیتا تھا لیکن وہ بڑی موٹی کھال کی تھی' اس قسم کی "مزاحمتی تحریکیں" اس پر کہاں اثر کیا کرتی تھیں۔

پھر ایک روز انتہا ہو گئی۔ رات کے کھانے کے بعد سروج نے میرے ہونٹوں سے مشروب کا پیالہ لگایا۔ بوکارلو کی ہدایت کے مطابق رات کو سونے سے قبل وہ مجھے یہ مشروب ضرور پلاتی تھی۔ ایسا ہی ایک پیالہ صبح دم پلایا جاتا تھا۔ دونوں مشروبات کے ذائقے میں فرق تھا اور غالباً تاثیر میں بھی

لیکن اس روز سروج نے جو مشروب میرے ہونٹوں سے لگایا' وہ خاصا مختلف تھا۔ نہ صرف اس کا رنگ مختلف تھا بلکہ ذائقہ بھی خاصا کڑوا تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ پگھلا ہوا تارکول میرے حلق میں انڈیلنا چاہ رہی ہو۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" میں نے ایک گھونٹ لے کر ہی پیالہ پیچھے ہٹا دیا۔

"اب یہاں تمہیں کوک اور پیپسی تو مل نہیں سکتی۔"

"لیکن یہ ہے کیا بلا؟"

"افریقی جڑی بوٹیاں ہیں۔ ان کا رنگ دیکھو بالکل کسی حبشی کا سا ہے۔ یہ تمہیں طاقت دیں گی اور تمہاری ہڈی بھی جلد جڑ جائے گی۔"

"میری ہڈی ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے ہلکا سا فریکچر ہے لیکن ہے تو سہی۔ چلو اب اچھے بالک بنو اور چڑھا جاؤ۔ رام بھلی کرے گا۔"

دوسری کو بوکارلو نے بھی کہا تھا کہ وہ میرے مشروب میں کچھ تبدیلی لا رہا ہے۔ دل پر جبر کر کے میں نے وہ نہایت کڑوا اور گاڑھا مشروب آخری گھونٹ تک چڑھا لیا تھا۔ آخر میں ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ سروج کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ وہ ہنستی بھی تو اس کا پورا جسم ہنسنے لگتا تھا۔ ایک تھرتھراہٹ اوپر سے نیچے تک سفر کرتی تھی اور یہ تھرتھراہٹ ان حصوں میں نمایاں تر ہوتی تھی جنہیں وہ زیادہ خوب صورت سمجھتی تھی۔

آج اس نے لباس بھی بہت ہیجان خیز پہن رکھا تھا۔ خلاف معمول وہ ایک بنارسی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ ماتھے پر تلک بھی لگا ہوا تھا۔ اس ساڑھی میں اس کی کمر بہت نیچے سے بہت اوپر تک عریاں تھی اور یہی حال پیٹ کا تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں وہ میرے اردگرد ٹہلتی رہی اور ناز و ادا دکھاتی رہی۔ اس کی کلائیوں کی رنگ برنگی چوڑیاں بار بار چھنک رہی تھیں اور مجھے کسی نادیدہ خطرے کا احساس دلا رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر بری طرح گھومنے لگا ہے۔ یقیناً یہ اسی واہیات مشروب کا کرشمہ تھا لیکن اب سروج سے کچھ کہنا سننا فضول تھا' وہ وہ کچھ کر چکی تھی جو کرنا چاہتی تھی۔

خبر نہیں اس بدبخت نے میرے معدے میں کیا انڈیل دیا تھا۔ دو چار منٹ کے اندر ہی مجھے اپنے سارے بدن میں سوئیاں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایک آگ سی تھی جو سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک میرے بدن میں بھڑک اٹھی تھی۔ اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا جسم پھٹ جائے گا اور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں گا۔ شاید اس وقت کوئی بدصورت ترین عورت بھی میرے سامنے ہوتی تو میں اس میں تھوڑی بہت کشش محسوس کیے بغیر نہ رہتا۔ کچھ ایسی حالت ہو گئی تھی دل و دماغ کی جو شاید لفظوں کے احاطے میں آ ہی نہیں سکتی۔ سروج نے اپنی ساڑھی کا آنچل ڈھلکا دیا تھا۔ اس کا حسین جسم ایک ایسی دعوت بن کر میری آنکھوں کے سامنے آیا تھا جسے ٹھکرانے کے لیے بار بار مرنا اور بار بار جینا پڑتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ ہی نشہ تھا اور وہ رقص کے انداز میں ہولے ہولے ہلتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنی سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' میں اس سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا مگر کیسے' میرے لیے تو اس کے سہارے کے بغیر چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔

"چلی جاؤ یہاں سے سروج' خدا کے لیے دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" میں نے کہا۔

"یہ حکم ہے یا التجا؟" اس کی کھنکتی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"التجا ہی سمجھ لو۔"

"میں جانتی ہوں یہ التجا تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اپنی جان جگر کے لیے کر رہے ہو۔ اس سے بے وفائی نہیں کرنا چاہتے نا۔ اس کے لیے اپنے آپ کو' اپنے جسم کو سنبھال کر رکھنا چاہتے ہو۔ کسی ان چھوئی ناری کی طرح اپنی آبرو کی حفاظت کر رہے ہو۔" اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا "وہ کون سا محاورہ ہے تمہاری اردو میں۔ ہاں۔ نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی' یا یوں کہہ لو کہ پاگز بلا حج کو چلا۔" اس نے پھر ایک جلترنگ کا سا قہقہہ لگایا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گئی ہے' اس کے آفت جاں جسم کا کچھ بوجھ میرے سینے پر منتقل ہو گیا تھا۔ میرے بدن میں بھڑکتی ہوئی طلسمی آگ انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے اپنے دماغ کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ خود کو اس جیتی جاگتی قیامت کی زد سے بچانا چاہا' لیکن یہ قیامت تو شاید ٹلنے کے لیے آئی ہی نہیں تھی۔ میرا دماغ سروج کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے گداز ریشمی بدن کے سوا کچھ اور محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔ میرے جسم کے جنگل میں لگی ہوئی نیلی آگ میری انگلیوں میں منتقل ہونے کی کوشش کر رہی تھی' میرے ہونٹوں میں سرایت کرنے کے لیے سر پٹخ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ میں غزالہ سے بے وفائی کا مرتکب ہونے والا ہوں۔ اس کے اعتبار کی دیوار میں نقب

لگانے کا جرم مجھ سے سرزد ہونے والا ہے۔ یہ بڑا سخت امتحان تھا۔ اس ظالم نے میرے اندر نجانے کون سا سیال انڈیلا تھا' اپنی "مزاحمت" جس پر مجھے بڑا ناز تھا' چکنا چور ہو کر رہ گئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں خود کو زخمی کر لوں۔ اتنی اذیت دوں خود کو کہ سروج کے ریشمی بدن کی منہ زور قربت میرے دماغ سے محو ہو جائے۔

میں نے لرزتی آواز میں کہا "خدا کے لیے سروج' مجھ سے دور چلی جاؤ۔"

وہ سرسراتی آواز میں بولی "تاکہ غزالہ کے لیے تمہاری سنبھال کر رکھی ہوئی پارسائی غارت نہ ہو جائے؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ میں کچھ چاہتا ہوں' مجھے مزید امتحان میں مت ڈالو۔"

اس نے اپنے دہکتے ہونٹ میری دکھی گردن سے پیوست کرتے ہوئے کہا "اس کی ایک شرط ہے۔"

"کیا شرط؟" میں نے اپنے ذہن کو بمشکل سروج سے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اپنی غلطی کی معافی مانگو' اور معافی کی عملی شکل یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے میری جو بے عزتی ہوئی اس کا مداوا کرو۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"تم نے میرے اور موہل کے درمیان دیوار کھڑی کی۔ تمہاری وجہ سے۔ ہاں صرف تمہاری وجہ سے موہل مجھ سے دور ہوا۔ اب تمہاری وجہ سے اسے میرے قریب آنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا اس سے۔ یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔ بس اب تم جاؤ یہاں سے۔"

"تمہارے جھوٹے وعدوں پر بڑے اعتبار کیے ہیں' اب نہیں کروں گی۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں سوگند کھاتی ہوں' تمہیں پارسا نہیں رہنے دوں گی۔ آج رات نہیں تو کل رات' کل رات نہیں تو پرسوں رات' میں تمہارے ساتھ سو کر دکھا دوں گی اور وہ بھی تمہاری مرضی سے۔ ویسے پارسا تو میں نے یوں ہی کہہ دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم کتنے پارسا ہو!"

"کیا چاہتی ہو تم؟"

"موہل کو ابھی اور اسی سے یہاں بلاؤ۔"

"لیکن کیسے؟"

"ایسے۔" اس نے اپنے لباس کے اندر سے ہی ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولی "دوسرا سیٹ موہل کے پاس ہے۔ تم بلاؤ گے تو سر کے بل دوڑا چلا آئے گا۔ پتا نہیں کتنا بے تاب ہے تمہارے لیے۔"

سروج کی یہ آفر فائدہ مند تھی۔ ایک تو اس طرح میری گمشدگی کی اطلاع میرے ساتھیوں کو ہو جاتی' دوسرے موہل یہاں آ جاتا تو مجھے باہر کے حالات کے متعلق معلومات بھی مل جاتیں۔ موہل کے آنے سے ممکن تھا کہ مجھے یہاں سے نکلنے کا کوئی موقع بھی مل جاتا۔

میں نے اپنے اینٹھے ہوئے بدن کو سہارا دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سروج کے جسم کی مدہوش قربت کی وجہ سے دماغ پر جو منہ زور دھند چھا رہی تھی وہ قدرے چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کے نیم عریاں سراپا سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا "موہل سے رابطہ کرو۔"

اس نے واکی ٹاکی کا انٹینا باہر کھینچا' دو ننھے منے بٹن اپنی حنائی انگلیوں سے دبائے اور سیٹ میری طرف بڑھا دیا۔ تاہم سیٹ مجھے تھمانے سے پہلے اس نے مجھے چند ضروری ہدایات بھی دے دی تھیں۔

چند لمحے بعد سیٹ میں سے موہل کی آواز آئی۔ پہلے وہ کسی اور زبان میں بولا لیکن جب میں نے اسے مخاطب کیا تو اس کی زبان سے اردو کا دریا بہہ نکلا۔ حیران کن تیزی سے اسے اردو میں مہارت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً وہ تیز رفتاری سے سیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ اب واکی ٹاکی کے استعمال ہی کو دیکھا جائے۔ ایک جنگلی کے لیے چند ہفتوں میں اتنا کچھ جان لینا یقیناً تعجب خیز تھا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے۔ آپ نے ہم سب کو بہت پریشان کیا ہے۔ ہم آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے ہیں۔" ایسے ہی نہ جانے کتنے فقرے اس نے ایک ہی سانس میں بول ڈالے۔

جواباً میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں خیریت سے ہوں۔ سروج نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں موہل کو صرف اس شرط پر اپنے ٹھکانے سے آگاہ کروں گا کہ وہ اس بارے میں کسی اور کو نہیں بتائے گا۔

میں نے اسی شرط کے ساتھ موہل کو بتایا کہ میں گوروتائی بستی میں' بستی کے سب سے عمر رسیدہ رہائشی "باگوت" کے گھر پر ہوں۔ وہ اکیلا یہاں چلا آئے۔

مجھ سے مکمل پتا ٹھکانا معلوم کرنے کے بعد موہل فوراً روانہ ہو گیا۔

○☆○

وہ رات موہل نے بوڑھے باگوت کے مکان پر گزارے

ساتھ گزاری۔ بوکارلو رات بھر مکان سے غائب رہا' بوڑھا باگوت رات بھر کسی قریبی کمرے میں کھانستا رہا' میں رات بھر جاگتا رہا اور موبل رات بھر سروج کے ساتھ واویش مچاتا رہا۔ کوئی ایسی ظالم شے پلا دی تھی اس الو کی بچی نے مجھے..... کہ رات بھر میرے دماغ پر ایک جادوئی دھند چھائی رہی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ رات بھر میرا ذہن صرف اور صرف "عورت" کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنے اس انداز فکر پر مجھے ندامت بھی تھی لیکن میں اپنی کوئی مدد نہیں کر پا رہا تھا۔ غزالہ کا تصور سیکڑوں بار دل نشیں روپ دھار دھار کر میرے سامنے آتا رہا اور میں اس دوری کو بے پناہ شدت سے محسوس کرتا رہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو کچھ میں نے پیا ہے اس نے براہ راست میرے دماغ پر اثر کیا ہے۔

رات آخری پہر مجھے نیند آگئی' صبح اٹھا تو دل و دماغ اور جسم کی وہ انوکھی کیفیت کافی حد تک معدوم ہو چکی تھی۔ میں دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا اور کھسکتا ہوا دوسرے کمرے تک پہنچا۔ اس کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تو ایک پرانی طرز کے پلنگ پر سروج مدہوش پڑی نظر آئی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ بال بکھرے تھے اور چہرہ اترا اترا تھا۔ اتنے میں موبل بھی اپنے بالوں سے پانی کے قطرے جھاڑتا ہوا اندر آگیا۔ میں نے بے سدھ پڑی سروج پر ایک نگاہ دوڑائی۔ میں اس کی فطرت کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ زندگی کو ایک طوفان کی طرح گزار رہی تھی۔ وہ ہر کام میں آندھی کی سی رفتار اور شدت چاہتی تھی اور ایسی شدت اسے آج کل موبل سے مل رہی تھی۔ کچھ بھی تھا موبل ایک نوجوان جنگلی تھا' لمبا چوڑا اور سرکش گھوڑے جیسا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی "محبت" میں بھی تہذیب نہیں تھی اور شاید ایسا ہی "غیر مہذب" رویہ سروج کو بھی درکار تھا۔ کوئی ایسا مرد جو کچھ دیر کے لیے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔

میں اور موبل سروج کو محو خواب چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آبیٹھے۔ رات کو تو موقع نہیں مل سکا تھا۔ اب میں جلد از جلد موبل سے کالونی کے حالات جان لینا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے تو موبل سے میں نے اس شب کے واقعے کے بارے میں پوچھا جب پجاری کے تعاقب کے دوران میں موبل کا پاؤں ایک شکنجے میں پھنس گیا تھا۔ موبل نے بتایا کہ اس واقعے میں اس کا پاؤں معمولی زخمی ہوا تھا۔ اس کے بعد موبل نے اس پریشانی کا ذکر کیا جو میری گمشدگی کے سبب سب لوگوں کو لاحق ہوئی اور مسلسل لاحق رہی پھر اس نے موتابہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے یہ مایوس کن اطلاع دی کہ ابھی تک موتابہ کا کچھ نہیں کیا جاسکا' پجاریوں کا کہنا ہے کہ وہ بدستور گپھا میں موجود ہے لیکن اب گپھا کی طرف جانے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔ موبل نے کہا "آپ کو سن کر حیرانی ہوگی کہ موتابہ کی وجہ سے لوگوں میں اتنا خوف پایا جاتا ہے کہ صرف دن کے وقت سوتے ہیں اور رات بھر جاگ کر عبادت کرتے ہیں۔ موتابہ کی وحشت اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ ہم نو پجاریوں کی لاشیں گپھا کے دہانے پر ہی چھوڑ آئے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"لاشوں کا وہیں پڑے رہنا نقصان دہ ثابت ہوا۔ اگلے روز جب لاشیں وہاں سے اٹھا کر لائی گئیں تو ان میں سات کا سر موجود نہیں تھا۔ پجاریوں کو پورا یقین ہے کہ یہ سر موتابہ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئی ہے۔"

"سر کاٹ کر لے جانے سے کیا ہوتا ہے؟"

موبل نے کہا "ہمارے ہاں' بلکہ اردگرد کے تمام علاقوں میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسانی لاش کے سر کی مدد سے جادو کیا جاتا ہے اس کا توڑ نہیں ہو سکتا اس لیے ان قبائل میں اکثر لوگ اپنے دشمنوں کے سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ چونکہ موتابہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے' اس لیے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی شیطانی قوت اور بھی بڑھ گئی ہے اور اب اس پر قابو پانا کسی کے بس کا روگ نہیں رہا۔ لوگ سائیں عالی سے امید ہے یا پھر وہ محترم بوکارلو کو یاد کررہے ہیں۔"

لاشوں کے سر کاٹے جانے کی اطلاع واقعی حیران کن تھی۔ اس کے علاوہ موبل نے بوکارلو کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ علاقے کے لوگ اس کو بڑی شدت سے یاد کررہے ہیں۔ میں نے موبل کو یہ بتا کر ششدر کردیا کہ 'بوکارلو یہاں پہنچ چکے ہیں۔'

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولا "آپ کو دھوکا ہوا ہے۔"

"دھوکا نہیں ہوا۔ مجھے جنگل میں جس چونہ پوش نے آگ سے بچایا تھا وہ محترم بوکارلو ہی تھے' میں پچھلے بارہ روز سے محترم بوکارلو کے ساتھ ہی رہ رہا ہوں۔ شاید تھوڑی دیر میں تم ان کو دیکھ بھی سکو گے۔"

موبل کے گندمی چہرے پر جوش و خروش کے عجیب رنگ نظر آنے لگے۔ وہ اپنی دائیں ٹانگ پر زور ڈال کر کھڑا ہوا اس نے بڑی پھرتی سے ہوا میں الٹی قلابازی لگائی اور منہ سے خوشی کی ایک چنگھاڑ بلند کی۔ اس کے بعد اس نے بڑ

نا چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے شرمندہ نظر آنے لگا' بدحواسی کو سنبھالتے ہوئے دوبارہ مجھے پہلے سے نشست پر بیٹھ کر دھیمے لہجے میں بولا "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی خوشی پر قابو نہیں رہا۔ بوبو دیوتا کا ہاتھ ہمارے سر پر ہے۔ اب آپ دیکھیں گے کہ سارے مسئلے کیسے حل ہوتے ہیں۔ محترم بوکارلو اب سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

عین اسی وقت ہمیں کچھ فاصلے پر جیپوں کا شور سنائی دینے لگا۔ پہلا خیال تو ذہن میں یہی آیا کہ شاید نرسٹ کے پالتو پھر بوکارلو کی تلاش میں چلے آئے ہیں مگر پھر اندازہ ہوا کہ نرسٹ کی نہیں "کالونی" کی گاڑیاں ہیں اور یہ ایک دو نہیں ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں نامی اس صحرائی بستی میں داخل ہوئیں اور گرد و غبار بادل ہمارے کمرے تک بھی چلے آئے۔ سروج بھی سستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ موبل نے بیرونی دروازے سے باہر جھانکا اور واپس آکر بتایا "میرا خیال ہے کہ لوگوں کو بوکارلو کے آنے کا پتا چل گیا ہے۔ وہ ان کا دیدار کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔" موبل کے لہجے میں دبا دبا جوش

موبل کی اطلاع بالکل درست ثابت ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں آنے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔ انہوں نے باگوت کے اس خستہ حال مکان کو حصار میں لے لیا نعرے بلند کررہے تھے۔ ان نعروں کا مفہوم میری اور سروج کی سمجھ سے بالاتر تھا تاہم ان میں چھپا ہوا جوش و ولولہ اور ہیجان بالکل عیاں تھا۔ ان نعروں سے اس بے پناہ اور عقیدت کا اظہار بھی ہوتا تھا جو یہاں کے لوگ سے رکھتے تھے۔ جب شور حد سے بڑھا تو میں بھی کا سہارا لیتا ہوا کھڑکی تک چلا گیا۔ ابھرتے سورج کی دور دور تک سیاہ فام چہروں کا ہجوم تھا۔ لوگوں کی پیشانیاں پسینے کی چمک سے لشکارے مار رہی ہر آنکھ میں مسرت اور امید کا دریا بہہ رہا تھا۔ اچانک دیکھا کہ لوگوں کا زاویہ نگاہ بدل گیا۔ اب وہ ذرا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں اس مکان کی پر تھیں جہاں ہم موجود تھے۔ چھت کی طرف دیکھتے ہی فلک شگاف نعرے لگائے۔ سیکڑوں بازو ہوا میں اٹھے بہت سے لوگوں نے باقاعدہ اچھلنا شروع کردیا

سروج آنکھیں ملتی ہوئی میرے پہلو میں آن کھڑی ہوئی تھی اور تعجب سے کھڑکی کے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی "میرا خیال ہے کہ محترم بوکارلو مکان کی چھت پر چلے گئے ہیں۔"

"لوگوں کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہو رہا ہے۔"

"لیکن یہ لوگ یہاں پہنچے کیسے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے یا موبل نے وعدہ خلافی کی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ موبل نے کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی۔"

"تو پھر کس نے بھنک پڑنے دی ہے؟"

"کئی امکانات ہوسکتے ہیں۔ بہرحال اس وقت چخ چخ کرکے میرا دماغ مت چاٹو۔"

سروج منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔ اسی دوران میں بوکارلو کی آواز چھت پر سے آنے لگی۔ وہ وہاں بلندی پر کھڑا ہو کر اپنے عقیدت مندوں سے خطاب کررہا تھا۔ اس کی آواز دور تک جارہی تھی' شور مچاتا ہوا ہجوم یوں خاموش ہوگیا تھا جیسے کسی کے منہ میں زبان تک نہ ہو میرے کہنے پر موبل نے میرے اور سروج کے لیے بوکارلو کی تقریر کا ترجمہ شروع کردیا۔

بوکارلو کہہ رہا تھا "میرے دوستو! اب وقت آگیا ہے کہ ہم نرسٹ کی غلامی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر اب بھی ہم نے کچھ نہ کیا تو پانی ہمارے سروں پر سے گزر جائے گا۔ آپ سب کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ خاص طور سے لارسیوں کو دیوتاؤں نے خاص انعامات سے نوازا ہے۔ ہر لارسی کے سینے میں روحانی قوت کا دریا بہتا ہے' اگر ہم اس قوت کو استعمال میں لاسکیں تو یہ قوت ایک سیلاب بن جائے گی اور اس میں ماریا نرسٹ ایک تنکے کی طرح بہتا نظر آئے گا۔ میں جانتا ہوں اس وقت آپ لوگ بہت پریشان ہیں۔ لارسی ساحرہ موتابہ کی وجہ سے آپ لوگوں کو کچھ مشکلات پیش آرہی ہیں' دیوتاؤں نے چاہا تو یہ مشکلات عارضی ثابت ہوں گی۔ اب میں آپ لوگوں کے درمیان ہوں۔ میری اور سائیں صاحب کی موجودگی میں آپ لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں....."

ہجوم نے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ بے شمار بازو اور نیزے ہوا میں لہراتے نظر آئے۔

بوکارلو نے تقریر جاری رکھی۔ اس نے لوگوں کو امید دلائی کہ وہ عن قریب خوش خبریاں سنیں گے۔ اس نے اپنے عقیدت مندوں سے درخواست کی کہ وہ نرسٹ کے ظلم اور جبر کی کمند زنجیر توڑنے کے لیے اتحاد کے جھنڈے تلے ایک ہوجائیں۔ آخر میں بوکارلو نے مختلف عبادات کا ذکر کیا اور

اپنے عقیدت مندوں کو ایسے عملیات بتائے جن کی وجہ سے وہ موجودہ خوف و ہراس پر قابو پا سکتے تھے۔ بوکارلو کے کہنے پر ہجوم منتشر ہو کر واپس کالونی کی طرف چلا گیا تاہم بہت سے لوگ موقع پر موجود رہے' ان میں سردار رافے کا نیا نائب اور دیگر معززین بھی تھے۔ رافے کا سابق نائب موبارے نو پجاریوں کے ساتھ گپھا کے سامنے ہلاک ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بوکارلو کو پورے اعزاز کے ساتھ کالونی میں لے جانا چاہتے تھے۔ بہت سے لوگ اس بات پر سخت حیران ہوئے کہ صحرائی بستی کے اس بوسیدہ مکان میں مجرم بوکارلو کے علاوہ میں اور سروج بھی موجود تھے۔ میری موجودگی نے لوگوں کو زیادہ حیران کیا کیونکہ وہ مجھے کئی روز تک تندہی سے ڈھونڈتے رہے تھے۔ میں نے سردار رافے کے نئے نائب بوگارد سے سردار کی خیر خیریت دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ کالونی کے جدید اسپتال میں فوری طور پر اس کا آپریشن ہوا تھا' اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر بعد بوکارلو گاڑیوں کے ایک بڑے سے جلوس کے ساتھ بڑے تزک و احتشام سے کالونی کی طرف روانہ ہوا۔ کالونی کے راستے میں جگہ جگہ لوگوں نے بوکارلو کا والہانہ استقبال کیا اور مقامی انداز میں ایک نائک اچھا کر اور اچھل اچھل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ راستے میں جگہ جگہ بیٹھی پھول نچھاور کیے گئے اور ناریل کا پانی بہایا گیا۔

میں گاڑی سے اترا تو سب سے پہلے زریں گل نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ میں اس کے کندھے پر تھوڑا سا بازو ڈال کر چلتا ہوا اپنی رہائش گاہ میں داخل ہو گیا۔ غزالہ' کلثوم' شائستہ تائی سب میرے اردگرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور حال احوال دریافت کرنے لگے۔ یقیناً صفدر اور پروفیسر وغیرہ بھی میرے لیے سخت پریشان رہے تھے اور ان کے تاثرات ماضی قریب کی اس پریشانی کی گواہی بھی دے رہے تھے۔ اپنوں میں پہنچ کر میری اکیف نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ ویسے بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب میں بغیر سہارے کے چل سکتا ہوں۔ کالونی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ لوگ واقعی موتا۔ کی دہشت کا بری طرح شکار رہے ہیں۔ ہر چہرہ ہراس کی تصویر نظر آتا تھا۔

رات کو میں اور غزالہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ غزالہ نے سہ پہر کو ہی اسپتال سے میرے نئی ایکسرے کرا لیے تھے۔ گھٹنے سے ذرا اوپر ران کی ہڈی میں بال جیسا ہلکا سا فریکچر ہوا تھا۔ اب یہ فریکچر بھی تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا' پھر بھی غزالہ کا خیال تھا کہ مجھے مسلسل آرام کرنا چاہیے۔

وہ بولی "ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو میرا مشورہ ہے کہ کم از کم دو ہفتے مزید آپ گھومنے پھرنے کی کوشش نہ کریں۔"

میں نے کہا "میں دو سال تک گھومنے پھرنے سے رک سکتا ہوں اگر تم اسی طرح میرے سامنے بیٹھی رہو اور باتیں کرتی رہو۔"

میرے اس اچانک حملے نے اس کے رخسار سرخ کر دیے' اس نے چور نظروں سے تائی کو دیکھا۔ جیسے ڈر ہو کہ وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے پھر ذرا شوخی سے بولی "میں دو سال تک آپ کے سامنے بیٹھنے کو تیار ہوں اگر آپ بیٹھے رہیں۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے' میں کسی کالج بوائے کی طرح چھیڑ چھاڑ کی کوشش کروں گا؟"

"کہتے ہیں کہ ایک سنجیدہ سے سنجیدہ شخص کے اندر بھی ایک شرارتی بچہ چھپا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے اندر رہتا ہے۔"

"کاش تمہارے اندر بھی کوئی ایسا بچہ یا بچی چھپی ہوتی۔ اتنے اتنے حسین موقع اور ایسی ایسی خوب صورت تنہائیاں ملیں' لیکن وہ نامعقول بچی کبھی ظاہر نہیں ہوئی' کبھی ظاہر ہوئی تمہارے اندر سے ایک دانا و بینا بڑھیا ہی ہوئی۔"

"اچھا جی میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"الفاظ واپس لینے کی ضرورت نہیں بھی ایسا ہو' ہر بندے کے اندر ایک بچہ چھپا رہتا ہے لیکن بچے نے کسی سے پکا پکا وعدہ کر لیا ہو کہ وہ ایک حد میں رہے گا تو پھر زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہوتی۔"

"اچھا چھوڑیں اس موضوع کو۔ کوئی اور بات کریں۔" غزالہ نے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے کہا۔

جوڑا باندھنے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے تو اس کی سفید کہنیاں تو مجھی آستین کی قمیص میں سے جھانکیں اور نسوانی خدوخال نہایت دلکش ہو گئے۔ میری نگاہوں کی چوری پکڑتے ہوئے اس نے دوپٹا سینے پر پھیلایا اور اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

"بستی کے حالات کے بارے میں کوئی خاص بات؟"

"شاید آپ اسمتھ کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ اسمتھ سے تو میں مل چکا ہوں۔ میں موتا کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ یہ سارا معاملہ کیا ہے؟"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پراسرار طاقت کی مالک ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے تو ایک بار پھر گلگت کے مناظر دکھنے لگے ہیں۔ بہت کچھ اس سے ملتا جلتا ہو رہا ہے۔ وہاں میں جسے ہپناٹزم کہا جا رہا تھا یہاں بابا روکی (آسیب) کا نام دیا جا رہا ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ جو کچھ یہاں دکھائی دے رہا ہے' ہپناٹزم کے "زمرے" میں ہی ہے یہ تو تم نے بھی بتایا تھا کہ ہپناٹزم کے کئی روپ ہیں۔

میں آپ سے متفق ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کے قبائلی اور خاص طور سے لاری جسمانی طور پر کمزور مگر روحانی طور پر بڑے مضبوط ہیں۔ جو کچھ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں عین ممکن ہے کہ ہپناٹزم اور "ترغیب" کی ہی کوئی شکل ہو۔"

میں نے اپنا دہ تحیر خیز تجربہ تفصیل سے غزالہ کو سنایا جب جنگل کے بیچ درمیان کسی آسیب کے سائے میں میں خود کو قطعی بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

غزالہ نے کہا "یہاں لوگوں میں کئی دن سے عجیب افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ موتا سائے کی شکل دھار کر پچھلے پہر رات کو کالونی کی گلیوں میں گھومتی ہے۔ کچھ لوگوں نے بہت فاصلے سے اس کو جانے کو دیکھا ہے جو سرتا کی پناہ گاہ ہے اور جہاں زندہ پجاریوں کی لاشیں ملی ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دو سرے پہر دانے کے سامنے تھوڑی سی روشنی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی شخص آگ جلا کر رہا ہے کے بعد بجھ جاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں نے بہرانہ آوازیں بھی سنی ہیں۔ اس کے علاوہ سائیں کالونی کے اردگرد حفاظت کا انتظام کیا گیا ہے۔ مسلح دستے رات بھر کالونی کے گرد موجود رہتے ہیں۔ قبیلے والے بھی اپنی اپنی بستیوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ باوجود رات بھر جنگلی جانور آس پاس غراتے رہتے ہیں۔ مجھے رہیں' ابھی تھوڑی دیر میں آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ رات کو ایک دو بار جنگلی جانوروں پر فائرنگ بھی ہوتی ہے۔"

کل سے اگلی رات کا ذکر ہے۔ میں اور زریں گل سردار رافے کی عیادت کر کے واپس آ رہے تھے تو راستے میں مجھ سے کہا "غزالہ بی بی آپ سے ناراض تو نہیں؟"

کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی۔۔۔ ویسے اگر آپ سچ پوچھتا ہے تو غزالہ بی بی کو اس بات پر بہت دکھ ہوا تھا کہ وہ الو کا پٹھا آپ کے ساتھ وہاں اس گارڈن میں موجود تھا اور آپ کا تابعداری فرما رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ غزالہ بی بی آپ سے ملے گا تو اس بات پر آپ سے شکوہ فرمائے گا مگر ام نے کئی بار اندازہ لگایا ہے کہ اس کا دل بہت بڑا ہے۔ وہ بہت صبر کرنے والا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں زریں گل سے کچھ مزید پوچھتا' میری نگاہ اس مکان کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں بوکارلو قیام پذیر تھا۔ یہ خوب صورت مکان سائیں عالی کی رہائش گاہ کے عین سامنے واقع تھا۔ میں نے بوکارلو کو دیکھا' وہ ایک جیپ میں سوار کہیں سے آیا تھا۔ گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ جیپ سے اترا۔ اس کے سیکڑوں عقیدت مند اس سے ہاتھ ملانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں چند افراد سے ہاتھ ملایا باقی لوگوں کو محافظوں نے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ بوکارلو اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہاں کالونی میں پہنچ کر میں نے دو تین مرتبہ بوکارلو کو دیکھا تھا۔ نجانے کیوں اس کی حرکات و سکنات میں مجھے تصنع سا نظر آتی تھی۔ وہ اپنے پرستاروں کے سامنے بھی بہت کم آتا تھا۔ سیکڑوں لوگ جو میں سمجھتا اس امید پر اس کی قیام گاہ کو گھیرے رہتے تھے کہ شاید اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ میں بوکارلو سے ملوں اور اس سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں بات کروں۔ میں نے زریں گل کو تو بھیج دیا اور خود بوکارلو کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ محافظوں نے مجھے اندر جانے دیا۔ گھر کے اندر موجود ملازم نے مجھے نشست گاہ میں بٹھایا۔ وہ بوکارلو کو میری آمد کی اطلاع دینے جا رہا تھا جب اتفاقیہ بوکارلو نے خود ہی دروازہ کھول کر نشست گاہ میں جھانکا اور مجھے دیکھ کر چونک گیا۔ میں بھی اس کا چہرہ دیکھ کر چونکا۔ اگر میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو بوکارلو ایک دو منٹ پہلے تک زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم نظر آ رہی تھیں۔ پلکیں ابھی تک بھیگی بھیگی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے واپس لوٹ گیا۔ دو چار منٹ بعد دوبارہ آیا تو اس کا چہرہ دھلا ہوا تھا اور وہ خود بھی قدرے نارمل نظر آ رہا تھا۔ وہ مضمحل سے انداز میں میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے' تم اچانک کیسے چلے آئے؟"

"بس آپ سے ملنے کو دل چاہا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جب سے آپ یہاں آئے ہیں کچھ خاموش اور گم صم ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ بوکارلو میری بات کی تردید کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا پھر یہ دیکھ کر میرے تعجب میں بے پناہ اضافہ ہو گیا کہ بوکارلو کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نظر آ رہی ہے۔ وہ بولا "میں جانتا ہوں شا! تم نے ٹرسٹ سے میری رہائی کے لیے بڑی کوشش کی ہے' شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اپنے قریب محسوس کر رہا ہوں۔ سچ پوچھو تو آج مجھے یہی لگ رہا ہے کہ میں ایک طویل عرصے سے تمہیں جانتا ہوں۔ قربت اور شناسائی کا یہی احساس ہے جو مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں تمہیں وہ بات بتاؤں جو ابھی تک کسی کو نہیں بتائی ہے۔"

میں نے کہا "میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو کچھ مجھے بتائیں گے وہ آپ کی منشا کے بغیر کسی اور تک نہیں پہنچے گا۔"

کمرے کے کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ آس پاس کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔ بوکارلو نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا "تم نے یہاں یہ اڑتی اڑتی سی خبر سنی ہوگی کہ رات کے وقت اس گپھا کے دہانے پر روشنی نظر آتی ہے جہاں' دتابہ نے پناہ لے رکھی ہے۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

بوکارلو نے کہا "وہ خبر غلط نہیں ہے۔ دس بارہ روز سے اس گپھا کے دہانے پر واقعی روشنی ہوتی ہے اور وہ روشنی میں ہی جلا آ رہا ہوں۔"

میں حیرت سے بوکارلو کا زرد رو چہرہ تکنے لگا۔ بوکارلو نے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ سے اپنی چادر کا پلو درست کیا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "تم نے یہ بات بھی سنی ہوگی کہ موتابہ گپھا کے دہانے پر قتل ہونے والے نو پجاریوں کے سر کاٹ کر لے گئی تھی اور ان سروں پر جادوئی عمل کرنے سے اس کی اندرونی طاقت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں۔ میں نے موتل کی زبانی یہ بات سنی تھی۔"

"یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے۔" بوکارلو نے ڈرامائی لہجے میں کہا "موتابہ سے مقابلہ کرنا اور اس کی سرکشی پر قابو پانا اب آسان نہیں رہا۔"

"گستاخی معاف! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

بوکارلو نے عجیب سے انداز میں کہا "یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے شا! لوگ مجھے ہر درد کی دوا سمجھ رہے ہیں۔ ان کی عقیدت نے مجھے ایک ایسے اونچے مقام پر بٹھا رکھا ہے جہاں پہنچتے ہوئے نگاہ بھی تھک جاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر ا آنکھوں میں آس امید کے دیے روشن ہو جاتے ہیں' کا جوش و جذبہ دیدنی ہو جاتا ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ موتابہ کے شر سے محفوظ رکھنا میرے لیے بائیں ہاتھ ہے لیکن۔۔۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے شا۔"

بوکارلو کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں تھیں۔ ا ذرا توقف کر کے کہا "حقیقت یہ ہے شا کہ میں موتا ساتھ لڑائی بری طرح ہار چکا ہوں۔"

میں حیرانی سے بوکارلو کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جس کی اور شان و شوکت کا ڈنکا چار سو بج رہا تھا اور جس کا نا ہی لوگوں کے حوصلے پہاڑ ہو جاتے تھے' وہ بڑی بے کہہ رہا تھا کہ وہ جنگ شروع نہیں کر رہا بلکہ ختم کر دیا۔ ور یہ جنگ ہار چکا ہے "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میر سے بے ساختہ نکلا۔

بوکارلو نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا "تم روشن روشن خیال فرد ہو' شاید اس تاریک خطے کے تاریک رواج پوری طرح تمہارے ذہن میں نہ آئیں۔ ہم یقین تو تمہیں آ ہی چکا ہوگا کہ یہاں بہت کچھ ایسا "ماورائی" کہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ موتابہ ایسا ہی ماورائی کردار ہے۔ اس کی شیطانی قوت کی سلسلہ میں نے یہاں پہنچتے ہی شروع کر دی تھی۔ میں روز تک گپھا کے سامنے روحانی عمل میں مصروف رہا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ الٹا خود ہی ٹوٹ پھوٹ گیا یہ دیکھو۔" بوکارلو نے ڈرامائی لہجے میں کہا اور اپنے سے قمیص اوپر تک اٹھا دی۔

میں لرز کر رہ گیا۔ حیرت انگیز طور پر بوکارلو کے جسم پر زخم نظر آ رہے تھے۔

یہ زخم دیکھنے میں کسی تیز دھار آلے کے نہیں بلکہ چوٹ وغیرہ کے تھے۔ ان زخموں کو دیکھ کر یوں لگتا کسی نے بوکارلو کو دہکی ہوئی آہنی سلاخ سے داغا ہو۔ زخموں سے خون بھی رستا ہوا تھا اور اس خون بوکارلو کے زیریں لباس پر چھوٹے چھوٹے سرخ داغ۔ "کیا ہے محترم بوکارلو؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "یہ سب کچھ شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ سمجھو کہ موتابہ واقعی ہم سب کے لیے ایک شدید خطرے کا روپ دھار چکی ہے۔" بوکارلو کے لہجے درجے کی مایوسی اور نقاہت تھی۔

میں ششدر تھا۔ بوکارلو کی رہائش گاہ سے باہر

بڑوں مرد و زن جمع تھے۔ وہ فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اپنے محبوب پیشوا بوکارلو کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ شاید ان کے لیے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ بوکارلو اپنے اندر شکست کی چادر اوڑھے' زخم زخم جسم کے ساتھ نڈھال بیٹھا ہے۔ واقعی بوکارلو جیسے ہر دل عزیز شخص کے لیے یہ ستم کا "اینٹی کلائمیکس" ناقابل بیان بوجھ تھا۔ خود مجھے بھی ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوکارلو کی جنگ ختم ہو چکی ہے اور وہ شکست کھا چکا ہے۔

کمرے میں کتنی ہی دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ اس دوران باہر سے لوگوں کے ولولہ انگیز نعروں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بجھے بجھے لہجے میں بوکارلو سے پوچھا "اب کیا ہوگا جناب۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

بوکارلو نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ سائیں عالی جسے صحرائی درویش بھی کہا جاتا ہے ہمارے اندازوں سے زیادہ اونچا مقام رکھتا ہے۔ لارسی پجاریوں کا عقیدہ ہے کہ اربوغات میں ڈودے دیوتا کی روح تھی' اور بوغات کی موت کے بعد یہ روح اب محترم صحرائی درویش میں منتقل ہو گئی ہے۔۔۔ لیکن ہمارے لیے مایوسی کا مقام یہ ہے کہ سائیں عالی مسلسل مستی کی حالت میں ہے' اور وہ اس انتہائی اہم معاملے کو بالکل سنجیدگی سے نہیں لے رہا۔ پتا نہیں کہ قدرت کی اس میں کیا حکمت ہے۔ شاید ہماری کوششوں میں کمی ہے اور ہماری کوتاہیوں کی سزا ہمیں ملنے والی ہے۔" عظیم بوکارلو کے لہجے میں ایک بار پھر بے پناہ مایوسی جھلک رہی تھی۔

"کیا آپ موتابہ کے خلاف مزاحمت اب ترک کر رہے ہیں؟" میں نے بوکارلو سے پوچھا۔

"ابھی تو کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ شاید کچھ دیر بعد صورت حال بدل جائے۔"

اسی دوران میں گھر سے باہر کچھ نوجوان لڑکیاں ہم آواز ہو کر ایک گیت گانے لگیں۔ یہ گیت میں دو دن پہلے سن چکا تھا اور اس کا ترجمہ بھی مجھے موتل نے سنایا تھا۔ یہ کچھ اس طرح تھا۔

ہمارا محبوب بوکارلو پھر سے ہمارے درمیان ہے۔
وہ اپنی آنکھوں کی طاقت سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے

وہ جس مردہ چیز پر ہاتھ رکھے
وہ زندہ ہو جاتی ہے
وہ جس کی نفس سے نگاہ پھیرے

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول۔ دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، تڑپتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمپل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے دل نواز کے مختلف چار روپ۔ ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔
ڈاک خرچ فی کتاب ۲۰ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

اس میں روح باقی نہیں رہتی۔

اس کے ہوتے ہمیں کس بات کا خوف ہے؟

اپنے بادشاہ کے ہوتے ہمیں کس بادشاہ کا خوف ہے۔

یہ منقبت سن کر بوکارلو کی خوب صورت کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ میں اس کی دلی کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس مزید بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا اور جانے کی اجازت چاہی۔ بوکارلو نے نقاہت سے ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا "دیکھو ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں وہ ہمارے درمیان ہی رہنی چاہئیں۔ مجھے اپنی آن بان کی اتنی فکر نہیں لیکن میں اپنے بارے میں لوگوں کی آسمیں امیدیں ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا۔"

میں نے کہا "جناب! میں نے تو آپ کے بات شروع کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ یکی سمجھیں کہ آپ یہ بات کسی کو نہیں بتا رہے۔"

بوکارلو کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں باہر نکل آیا اور پھر روشن چہروں والے عقیدت مندوں کے ہجوم سے گزر کر اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔

بوکارلو کی مایوسی نے میرے دل و دماغ کو بھی عجیب سی مایوسی سے بھر دیا تھا۔ رہائش گاہ کے کامن روم میں زریں اور کلثوم نوک جھوک میں مصروف تھے۔ زریں بڑے غصے سے کہہ رہا تھا "تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ عیش آرام میں رہ رہی ہو اس لیے باتیں بنانی آ گئی ہیں۔ اس ائرکنڈیشنڈ کمرے سے باہر نکل کر دیکھو بولتی بند ہو جائے گی۔"

کلثوم منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ہنسی زریں کو مزید تاؤ دلا رہی تھی۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" میں نے زریں سے پوچھا۔

زریں کے بجائے غزالہ نے جواب دیا "دراصل یہ دونوں ہی تھوڑے سے جلے ہوئے ہیں۔ کلثوم کو زریں نے خود ہی کہیں یہ بات بتائی تھی کہ اگر بندے کی جوتی پر جوتی چڑھ جائے تو اسے سفر درپیش آ سکتا ہے۔ کلثوم نے بس زریں کی یہ بات پلے سے باندھ لی۔ اب وہ روزانہ بڑی خاموشی کے ساتھ زریں کی جوتی پر جوتی چڑھا رہی ہے' وہ چاہتی ہے کہ زریں کو ایک لمبا سفر درپیش ہو تاکہ ہم سب یہاں سے نکل سکیں۔ زریں روزانہ صبح کو اپنی جوتی پر جوتی چڑھی دیکھتا ہے اور پیچ و تاب کھا جاتا ہے۔ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ حرکت کلثوم کرتی ہے۔"

اسی دوران میں نوک جھوک کے بعد زریں گل روٹھا ہوا باہر نکل گیا اور کلثوم اسے منانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ گئی۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ آس پاس کوئی ملازم موجود نہیں تھا' صفدر خود دیکھنے کے لیے گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آ کر بتایا "موئل ہے۔ آپ سے ملنا چاہ رہا ہے' میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

میں نے صفدر سے پوچھا "تم مسکرا کیوں رہے ہو؟"

وہ بولا "بس ایک مسکرانے والی بات تھی۔ آپ اس کو دیکھیں گے تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

غزالہ' شائستہ وغیرہ اصرار کرنے لگیں کہ صفدر انہیں بھی وہ بات بتائے۔ صفدر نے کچھ نہیں بتایا۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو فوراً ہی میری نگاہ موئل کی گردن پر پڑی۔ وہاں لپ اسٹک کا سرخ نشان نظر آیا۔ اب صفدر کے مسکرانے کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ موئل ایسے معاملوں میں بڑا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ لڑکیاں اکثر اس پر مہربانی کرنے پر آمادہ ہو جاتی تھیں۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ایک قریبی بستی کا نام لیا اور بتایا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے گیا تھا۔

"دوست مذکر تھا یا مونث؟"

"مذکر۔" موئل نے بدستور سنجیدگی سے کہا "وہ میرا کا رشتے دار بھی ہے۔ جب اس علاقے میں قحط سالی نہیں ہوئی تھی تو ہم اکثر شکار کے لیے جایا کرتے تھے' وہ بیمار ہے' میں نے سوچا اس کی تیمارداری کر آؤں۔ آپ کو معلوم نہ ہو' بستی اس گپھا سے زیادہ دور نہیں جہاں موتاب نے پناہ لے رکھی ہے۔ اس بستی کے لوگوں کی گواہی ہے کہ پچھلے کئی دنوں سے رات کے وقت گپھا کے دہانے کے عین سامنے آگ روشن ہوتی ہے اور رات گئے تک روشن رہتی ہے۔ ان لوگوں سے مجھے ایک خاص بات معلوم ہوئی۔ پتا چلا ہے کہ نرسٹ کے کارندے پرسوں رات سے گپھا کے اردگرد موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ گپھا کے اندر بھی گئے ہیں اور حیرت کی بات ہے وہ موتاب کو دیکھ کر آئے ہیں۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ اب گپھا کے آس پاس موتاب کی حفاظت کر رہے ہیں۔ کل دو سرپھرے دیہاتی شراب پیے ہوئے درختوں کی لکڑی اٹھانے کے لیے گپھا کی جانب گئے تو نرسٹ کے محافظوں نے انہیں مار پیٹ کر واپس بھگا دیا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ نرسٹی موتاب کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے جناب۔ موتاب شیطانی طاقتوں کے زیر اثر ہے اور نرسٹیوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی

ہے۔ ان کا ایک درجے کے قریب آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی موتاب جو کچھ کر رہی ہے وہ نرسٹیوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ وہ تو یقیناً چاہیں گے کہ موتاب کو کوئی گزند نہ پہنچے اور وہ ہمارے خلاف اپنی پراسرار کارروائیاں جاری رکھے۔"

"ممکن ہے کہ حقیقت تمہاری معلومات سے کچھ مختلف ہو؟" میں نے کہا۔

وہ اطمینان سے بولا "میں ٹھوس ثبوت لے کر آیا ہوں جناب!"

اس نے اپنی ایک آستین اوپر اٹھائی۔ اس کی کہنی کے قریب ایک باریک چھرا لگا تھا' زخم سے خون رس رس کر خود بند ہو گیا تھا۔ چھرا ابھی تک موئل کے جسم میں موجود تھا لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ اس نے رسنے والے خون کو بڑی بے پروائی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کر دیا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی گردن پر نظر آنے والا سرخ نشان بھی لپ اسٹک کا نہیں بلکہ یہ اس کی دو خون آلود انگلیوں کا نشان ہے جو اس نے بے دھیانی میں گردن سے لگا لی ہوں گی۔ دو انگلیوں کا یہ نشان بالکل کسی دوشیزہ کے ہونٹوں کا نشان محسوس ہوتا تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ بد سے بدنام برا۔

میں نے موئل سے پوچھا "یہ چھرا کیسے لگا؟"

وہ بولا "اپنے دوست سے ملنے کے بعد میں گپھا کی طرف گیا۔ وہاں واقعی نرسٹی گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا اور پکڑنے کی کوشش کی۔ میں بھاگ کھڑا ہوا' انہوں نے مجھ پر فائر کیے لیکن میں بچ گیا۔ بس یہ معمولی سا زخم آیا ہے۔"

وہ جسے معمولی سا زخم کہہ رہا تھا' یہ کارتوس سے نکلنے والے چھرے کا زخم تھا۔ میں نے موئل کو بتایا کہ اس کے بازو سے چھرا نکالنا ضروری ہے' میں غزالہ کو آواز دینے کا سوچ رہا تھا کہ موئل نے اپنے زخم کو چٹکی میں لے کر حیرت انگیز بے پروائی سے یوں دبایا کہ چھرا خود بخود ابھر کر باہر نکل آیا۔ اس عمل کے دوران میں موئل کے چہرے پر درد کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیا۔ زخم میں سے تھوڑا سا خون نکلا جسے اس نے بڑے عام سے انداز میں ہونٹ رکھ کر چوس لیا۔ لپ اسٹک کی طرح اس کے ہونٹ سرخ دکھائی دینے لگے۔ میں بڑی حیرت سے اس عجوبہ روزگار لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔

موئل سے مل کر اور اس سے باتیں کرنے کے بعد میری تشویش میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے پہلے سے شبہ ہو رہا تھا کہ نرسٹی موجودہ صورت حال سے اور موتاب کی کیفیت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ کالونی میں پچھلی کئی راتوں سے جو افراتفری مچی ہوئی تھی وہ نرسٹیوں کے لیے ہر لحاظ سے سودمند تھی۔ میں نے اس سلسلے میں صفدر اور پروفیسر سے مشورہ بھی کیا تھا اور ان کا خیال بھی یہی تھا کہ نرسٹی موجودہ صورت حال سے خوش ہوں گے۔

ایک دو گھنٹے کے اندر یہ خبر قریباً پوری کالونی میں پھیل گئی کہ نرسٹیوں کے کچھ لوگ کسی عامل کے ہمراہ غار کے اندر گئے ہیں اور انہیں موتاب سے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔ اس کے علاوہ دیہاتیوں کے ذریعے یہ بات بھی سب کو معلوم ہو چکی تھی کہ نرسٹی گارڈز نے غار کی حفاظت کی ذمے داری سنبھال لی ہے اور روحانی ساحرہ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ یہ اطلاعات لارسیوں اور دیگر قبائلیوں میں مایوسی پھیلا رہی تھیں۔ تاہم سب سے مایوس کن بلکہ حوصلہ شکن خبر ابھی ان تک پہنچی ہی نہیں تھی۔ وہ اس حیرت ناک حقیقت سے لاعلم تھے کہ ان کا محبوب بوکارلو جس کی قصیدہ گوئی میں وہ سارا زور بیان صرف کر رہے ہیں' موتاب کی بے اماں سرکشی سے شکست کھا چکا ہے۔

اسی دوران میں رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ موئل واپس چلا گیا۔ میں کھانے کے کمرے میں آ گیا' وہاں سب میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کی وسیع ٹیبل پر کھانا لگ چکا تھا۔ میں صفدر کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ دو باوردی بیرے میز کی دونوں جانب چوکس کھڑے تھے۔ میں نے پانی مانگا' ایک بیرے نے آگے بڑھ کر پانی پیش کیا۔ میں ذرا سا چونک گیا۔ ایک درمیانے ہوٹل کے عام سے بیرے کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں مشغول شخص کی دائیں جانب سے سروس دی جاتی ہے لیکن جس بیرے نے میرے سامنے پانی کا گلاس رکھا وہ بڑے بے ڈھنگے پن سے اور بائیں جانب سے آیا تھا۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ یہ چہرہ بھی کچھ اجنبی لگا۔

"تم آج نئے آئے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ج۔۔۔جی ہاں۔" وہ واضح طور پر گھبرا گیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ بیرا نہیں بیرے کے روپ میں کوئی اور ہے۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہ اس کی پتلون کی غیر معمولی طور پر پھولی ہوئی جیب پر پڑ گئی۔ ایک دم مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا "یہ کیا ہے؟" میں نے اس کی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے تڑپ کر نکل کانے

والی چھری اٹھائی اور میری گردن پر حملہ کیا، میں نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا اور پھر اس کی ٹانگوں کے درمیان ہاتھ دے کر اسے اٹھایا اور الٹا کر کھانے کی میز پر پھینک دیا۔ بہت سی کراکری چکنا چور ہو گئی، سالن کے ڈونگے الٹ گئے۔ بہرحال میں نے ہیرے کی پتلون کی جیب پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ میں جان چکا تھا کہ ہیرے کی جیب میں کوئی نہایت خطرناک شے موجود ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا لیکن وزنی چوکور ڈبا تھا۔ صفدر نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہیرے کا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے دو طوفانی کِکّے اس کے جبڑوں پر رسید کیے اور اس کی تن فن ختم کر دی۔ صفدر نے اس سے چھری چھین لی۔ میں نے اس کی جیب میں ہاتھ گھسیڑ کر ڈبا باہر نکالا۔ بدترین خدشے درست ثابت ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا لیکن نہایت طاقت ور ٹائم بم تھا۔ گھڑی کے ڈائل میں سے ٹک ٹک کی خوفناک صدا بلند ہو رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ بم بلاسٹ ہونے میں بس تین چار منٹ ہی باقی ہیں۔ میں نے ٹائم بم کو الٹ کر دیکھا، مجھے دو مختلف رنگوں کے تار نظر آئے جو ٹائم ڈوائس سے DETONATOR کی طرف جا رہے تھے۔ میں اس میکنزم کو کافی حد تک سمجھتا تھا۔

میں نے چیخ کر کہا "کوئی مجھے ایک پیچ کس دو!"

غزالہ الماری کے قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ لپک کر دراز کی طرف بڑھی۔ اسکریو ڈرائیور نکالنے کے لیے اس نے دراز کھولا۔ ایک دم اس کی چیخ نکل گئی "یہ کیا ہے؟!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا اور لرز گیا۔ یہ بھی ایک ٹائم بم تھا، بالکل اسی طرز کا جیسا میرے ہاتھ میں تھا۔ اس ٹائم بم کی سوئی زیرو کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ سب سکتے کی سی حالت میں کھڑے تھے، میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا، میں نے دونوں بم باتھ روم میں پھینک دیے اور لکڑی کا مضبوط دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ عین ممکن تھا کہ ہماری رہائش گاہ میں مزید بم بھی موجود ہوں "بھاگو!" میں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ہم بیرونی دروازے کی طرف دوڑے۔ میری ٹانگ میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ ابھی ہم دروازے سے دور ہی تھے کہ ہمارے سامنے اور دائیں طرف یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے۔ میں نے بالکونی کا ایک حصہ زمیں بوس ہوتے دیکھا، میرے عین سامنے ایک ستون کے پرخچے اڑے اور اس کے کئی ٹکڑے میرے سینے اور ٹانگوں پر لگے۔ یوں لگتا تھا کہ عمارت کی نچلی منزل میں کئی جگہ چھوٹے سائز کے ٹائم بم نصب کیے گئے ہیں۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ سب کچھ ماسٹر استی کو چھڑانے کے لیے کیا گیا ہے۔

دھماکے ہوتے ہی عمارت میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے عمارت کی بالائی منزل سے سائیلنسر لگے پسٹل کے فائر سنائی دیے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ ٹائم بموں کے پھٹنے سے جو دھواں پھیلا ہے اس میں خاص قسم کے کیمیائی اثرات موجود ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس دھوئیں میں چند سانس اور لیے تو میرے حواس معطل ہو جائیں گے۔ میں نے سانس روک لی اور ایک بار پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کا ایک حصہ گر چکا تھا، میں ایک کھڑکی پھلانگ کر باہر آیا۔ اپنے عین سامنے پورچ میں مجھے دو لاشیں نظر آئیں۔ ان لاشوں کا تعلق ان لارسی جانبازوں سے تھا جو دن رات جاگ کر ماسٹر استی کی نگرانی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ میری ٹانگ میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، مجھے لگا کہ شاید میں دو قدم بھی اور نہیں چل سکوں گا۔ میں وہیں ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت کوریڈور کی طرف دو دھماکے اور ہوئے۔ شیشے کی بے شمار کرچیاں بارش کی طرح میرے چاروں طرف گریں۔ کچن کی طرف آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے دو ملازموں کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ ان میں ایک کے [illegible] لہولہان تھے۔

یہی وقت تھا جب دھوئیں کے مرغولوں کے اندر مجھے ٹرسٹ کے دو گارڈز نظر آئے۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور انہوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ دونوں جدید ترین رائفلوں سے مسلح تھے۔ ایک تیسرا شخص گارڈز کے ساتھ تھا۔ یہ ماسٹر استی تھا۔ اس کا ہاتھ گارڈ کے ہاتھ میں تھا۔ تینوں ایک گاڑی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ گاڑی دیکھنے میں بکتر بند جیسی تھی۔ ایسی گاڑیاں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ استی کو دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اس دور دراز خطے میں ہماری سلامتی کی ضمانت تھا، ٹرسٹ والے اس ضمانت کو چھیننے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے اور آج وہ اس کوشش میں کامیاب [illegible] آرہے تھے۔

میں نے ایک مردہ لارسی کی رائفل اٹھالی تھی۔ "رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!" میں نے چیخ کر کہا۔

استی نے اور دونوں گارڈز نے گھوم کر

دیکھا۔ تاریکی اور دھوئیں کے سبب انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ میری پوزیشن کا تعین کیے بغیر ایک گارڈ نے میری جانب فائرنگ کی۔ میں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ رائفل میں نے شکستہ دیوار پر رکھ کر استی کا نشانہ لے لیا۔

دو برسٹ مارنے کے بعد گارڈز استی کو لے کر پھر بکتر بند گاڑی کی طرف دوڑے۔ استی میرے نشانے پر تھا، میری انگلی ٹریگر پر تھی، میں ایک سیکنڈ میں پگھلا ہوا سیسہ اس کے جسم میں اتار سکتا تھا، اسے زندگی سے محروم کر سکتا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو صرف دو سیکنڈ بعد استی گاڑی کے اندر ہوتا، میری پہنچ سے بہت دور نکل چکا ہوتا۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا اور یہ ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ اس ایک لمحے میں میں آگ کے سات سمندروں کے اندر سے گزر گیا۔ میری انگلی ٹریگر پر حرکت کرنے سے انکاری تھی۔ یہ انگلی ایک باغی فوجی کی حیثیت اختیار کر گئی تھی جو جنگ کے عین درمیان اپنے کمانڈر کا حکم ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ لمحہ گزر گیا۔ استی جست لگا کر گاڑی کے ادھ کھلے دروازے میں روپوش ہو گیا۔ میں نے ایک گارڈ کو نشانہ بنایا۔ وہ پشت کے بل ایک انرجنٹ لائٹ کے کھمبے کے پاس گرا اور تڑپنے لگا۔ بکتر بند گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آئی اور دھوئیں کے مرغولوں میں روپوش ہو گئی۔ میں نے بھاگ کر ایک قریبی گاڑی کی طرف جانا چاہا، ان لمحوں میں میں اپنی زخمی ٹانگ کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ میرا بھاگ کر گاڑی کی طرف بڑھنا ایک ایسا ہی عمل تھا جیسے کوئی شخص نیند کی حالت میں اپنے کٹے ہوئے ہاتھ سے سر کھجانے کی کوشش کرے۔ میں نے صرف دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ کولہے سے لے کر گھٹنے تک شدید ٹیسیں اٹھیں اور میں نہ چاہنے کے باوجود سڑک پر بیٹھ گیا۔

○☆○

استی کا ہماری تحویل سے نکل جانا ہمارے لیے ایک زبردست دھچکا تھا۔ درحقیقت ٹرسٹ کے اسپیشل کمانڈوز نے استی کو ایک زبردست منصوبے کے تحت چھڑوایا تھا۔ اس منصوبے پر وہ لوگ کئی دنوں سے مسلسل کام کر رہے تھے۔ ینگ براؤن بیماری کے باوجود بنفس نفیس اس مشن کی نگرانی کر رہا تھا۔ کالونی کے اندر سے بھی دو افراد اس منصوبے کا حصہ تھے۔ میں چونکہ کئی روز تک کالونی سے باہر گوروتاہی نامی بستی میں رہا تھا، صفدر بھی پوری طرح صحت مند اور نارمل نہیں تھا لہٰذا ان منصوبہ سازوں کو آگے بڑھنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ ہماری رہائش گاہ میں کام کرنے والے دو ملازم ٹرسٹیوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے، پروگرام کے مطابق ٹائم بموں کے دھماکے عین اس وقت ہونا تھے جب ہم سب ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہوتے، ایسی صورت میں شاید ہی ہم میں سے کوئی زندہ بچتا، دو نہایت طاقت ور بم ڈائننگ ٹیبل کے نیچے بھی چپکائے گئے تھے، ان دو بموں کے بلاسٹ ہونے سے بھاری بھرکم ڈائننگ ٹیبل کرسیوں سمیت تنکا تنکا ہو کر ہوا میں بکھر گئی تھی۔ ہماری رہائش گاہ کے کئی حصے بری طرح تباہ ہو گئے تھے اور کچن کی سمت دو تین کمرے آگ لگنے سے کوئلہ بن گئے تھے۔

خوش قسمتی کی بات تھی کہ ان دھماکوں میں کوئی شدید جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک ملازم کا بازو ضائع ہوا تھا، باقی افراد میں سے تین چار کو چھوٹے بڑے زخم آئے تھے۔ شائستہ کے بال جل گئے تھے اور ایک ہاتھ کی انگلیاں زخمی ہوئی تھیں، اسی طرح زریں اور کلثوم کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ سلامتی کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہی بنا ہوتا ہے۔ اگر مجھے ویٹر کے انداز پر شبہ نہ ہوتا اور ویٹر سے دھینگا مشتی کے نتیجے میں ہم سب ڈائننگ ٹیبل سے ہٹ نہ جاتے تو نتیجہ یقیناً بہت خوفناک نکلنا تھا۔ رہائش گاہ کی بالائی منزل پر حالانکہ کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا لیکن وہاں سب سے زیادہ جانی نقصان ہوا تھا۔ استی کی حفاظت اور نگرانی پر مامور چھ کے چھ افراد قتل ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو افراد لڑائی کے دوران میں بالکونی سے نیچے بھی گرے تھے۔ ان ہی دو ہلاک شدگان میں سے ایک کی رائفل اٹھا کر میں نے استی کو نشانہ بنانے کا "ناکام ارادہ" کیا تھا۔ ہلاک ہونے والے تمام لارسی نوجوان اور جانباز تھے۔ ان کی موت نے ہم سب کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ ان چھ جانبازوں کے بدلے میں صرف ایک ٹرسٹی ہلاک ہوا تھا۔ گولی اس کی بلٹ پروف جیکٹ اور ہیلمٹ کے درمیان اس کی گردن میں لگی تھی اور سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔

اس واقعے کی خبر دیکھتے ہی دیکھتے کالونی میں اور کالونی سے باہر پھیل گئی۔ سراسیمگی تو پہلے ہی طاری تھی اب اس میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ خاص طور سے میں اور میرے سارے ساتھی بے حد فکر مند اور افسردہ تھے، ہم جانتے تھے کہ استی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا کتنا خوفناک واقعہ ہے اور اس کے نتائج ہم سب کے لیے کتنے بھیانک نکل سکتے ہیں۔

اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی سیکڑوں ہزاروں قبائلی جوق در جوق کالونی کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ سب جوشیلے نعرے لگا رہے تھے، ان نعروں کے ذریعے وہ اپنے محبوب قائد

بوکارلو سے یہ درخواست کر رہے تھے کہ وہ اپنی روحانی طاقت کو حرکت میں لائے اور اپنے لوگوں کو ان مشکلات سے نجات دلائے جو انہیں چاروں طرف سے گھیر رہی ہیں۔ یہ سیدھے سادے لوگ بوکارلو پر اندھا عقیدہ رکھتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ان کا محبوب بوکارلو اپنی تمام تر طاقت اور صلاحیت کے باوجود ہافی ساحرہ کی منہ زور شیطانی قوت کے سامنے بے بس رہا ہے' اور اپنے لبادے میں اپنے زخم زخم جسم کو چھپائے بیٹھا ہے۔ حقیقی بات یہ تھی کہ ایک طرف مجھے بوکارلو پر ترس آرہا تھا اور دوسری طرف ان لوگوں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے جو بوکارلو سے بے شمار امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

صفدر نے گمبھیر لہجے میں کہا "شاہ جہاں صاحب! وقت بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے جلد کرنا ہوگا۔"

پروفیسر نے کہا "دیکھا جائے تو ہمارے سامنے بس دو راستے ہیں' مقامی لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم یہاں سے نکل جائیں اور نرسٹیوں کی زد سے بچنے کی کوشش کریں یا پھر مقامی لوگوں کے درمیان رہیں اور جو کچھ اچھا یا برا ان کے ساتھ ہوتا ہے وہ ہمارے ساتھ بھی ہو۔"

"اچھے کی توقع رکھنا تو اب فضول ہے۔" شائستہ نے مایوسی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر جھیل زارلور موگاسا کی تباہی کے مناظر گھوم گئے۔ بچوں کی کٹی پھٹی لاشیں' عورتوں کی چیخ پکار' آگ اور خون کی ہولی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کالونی میں اور کالونی کے اردگرد موجود سیکڑوں ہزاروں قبائلیوں کے ساتھ جو کچھ ہوگا اس کے ذمے دار صرف اور صرف ہم ہیں۔ ہماری وجہ سے ان کے اندر سر اٹھانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ ان کے اندر مزاحمت جوان ہوئی اور انہوں نے آزاد زندگی کے خواب زیادہ شدت سے دیکھنے شروع کیے۔ اب اپنے اسی حوصلے اور جذبہ مزاحمت کی وجہ سے وہ نرسٹ کے بدترین سلوک کے مستحق ٹھہرنے والے تھے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ان پر نرسٹ کا قہر آسمانی بجلی کی طرح گرنے والا تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے استی کو کیوں چھوڑ دیا؟ میں کیوں اس کو زندہ یا مردہ حالت میں روک نہ سکا۔ میں جو خود کو بہت سخت دل سمجھتا تھا ان لمحوں میں اتنا کمزور کیوں ہوگیا؟ کیا میرے اندر ابھی تک اس شاہ جہاں کی رمق موجود تھی جو جل کوٹ کی حسین فضاؤں میں غزالہ کے ساتھ آموں کے باغوں میں چوکڑیاں بھرتا تھا' جسے پھولوں' تتلیوں اور چاندنی راتوں سے پیار تھا۔ جس کی ماں نے اسے ایک شریف اور مثالی شہری بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ شاید اس شاہ جہاں کی رمق میرے اندر زندہ تھی ورنہ میں اپنے نشانے پر آئے ہوئے شیطان زادے کو کیسے چھوڑ دیتا جو ہم سب کی سلامتی کو اپنے ساتھ لے کر بکتر بند گاڑی میں بند ہو گیا تھا۔

اب رات کے دو بج چکے تھے۔ کالونی میں اور کالونی سے باہر حد نگاہ تک پھیلی ہوئی خیمہ بستیوں میں افراتفری کا عالم تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور اس کے کندھے کے سہارے چلتا ہوا سائیں عالی کے حجرے میں پہنچ گیا۔ سائیں عالی کو دیکھ کر مجھے روما یاد آگئی کہ جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ آدھی رات کو سائیں عالی پانی کے ٹھنڈے ٹب میں گردن تک ڈوب کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہزاروں ڈالروں اور پاؤنڈوں کے ہار اتار کر سامنے کھونٹی پر لٹکائے ہوئے تھے۔ ابھی تھوڑے پر اس کی بے شمار گھنیناں اور مالائیں بھی جھول رہی تھیں۔ سروتی نے اپنی ... سینیں اڑسی ہوئی تھیں اور سائیں سینے پر سے جوئیں نکال نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما رہی تھی۔ سائیں بڑی سنجیدگی سے جوں کو چٹکی میں پکڑتا اور پانی میں غوطے دیتا اس نے میرے سامنے ایک جوں کو چند غوطے دیے اور پھر اسے مخاطب کرکے بولا "اب چیخیں مارنے سے کوئی فائدہ نہیں' اب تو پوری سزا ملے گی۔ چلو تم بھی ادھر بیٹھو اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔" اس نے نظر آنے والی جوں کو بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سائیں عالی؟" میں نے کہا۔

"اپنا علاج ہو رہا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "میں بھی حیران تھا کہ روز کانجی میں جھوٹی مکھی کا شہد ملا کر پیتا ہوں پھر گرمی خشکی کیوں نہیں جاتی۔ کل ایک مسلمان جن ابوالہول سے ملاقات ہوئی' وہ کوہ قاف کے فوارہ چوک میں حلوے کی دکان بھی کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے سر میں جوئیں ہیں۔"

میں نے جلے ہوئے لہجے میں کہا "تم نے ابوالہول سے اپنی گرمی خشکی کا علاج تو پوچھ لیا اب اس دردناک موت کا علاج بھی پوچھو جو ہم سب کا مقدر بننے والی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو شفیع محمد؟"

"نرسٹ والے استی کو چھڑا کر لے گئے ہیں۔ اب بہت جلد تمہاری اس کالونی کی اینٹ سے اینٹ بجا

دیے ہیں۔ وہ ایسا قتل عام کریں گے کہ دیکھنے والے بھول نہیں سکیں گے۔"

"ہوہو ہاہا۔" سائیں نے قہقہہ لگایا "دل دھڑکا گھوڑے کا۔ دل دھڑکا۔ دل دھڑکا۔" اس نے پانی کے اندر بیٹھے بیٹھے ناچنے کی کوشش کی اور بہت سا پانی ٹب سے باہر گرا دیا۔

"سائیں ہوش کے ناخن لو' یہ مسخریوں کا وقت نہیں۔" میں نے بڑے کرب سے کہا۔

سائیں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی' وہ اسی حالت میں رہا' مجھے گھورتے ہوئے بولا "جاؤ تم اپنا کام کرو۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کو آرام مل جائے گا۔"

"ہاں۔ تمہارے کہنے پر اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو موگاسا میں آرام مل چکا ہے' بہت سے لوگ ابدی نیند سو چکے ہیں۔"

"تم ہر بات کا الٹ مطلب لیتے ہو شفیع محمد۔ موگاسا میں جو بس رہی چند لوگ مرے تھے جن کے سانس پورے ہو چکے تھے' باقی سب کو میرے جنات کی ایلیٹ فورس نے بچا لیا تھا۔ تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ اگر وہ ایلیٹ فورس وقت پر نہ پہنچتی تو موگاسا میں کتنا نقصان ہو جاتا۔"

"بس اسی طرح بیٹھے بک بک کرتے رہنا۔" میں نے ... رکھا اور لنگڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔ ... میرے ذہن میں ... اٹھ رہے تھے۔ ... فضا میں بارود ... کی بو محسوس ہو رہا تھا۔ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر میرے ذہن نے ایک اور راستہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ انداز تھا جو منطق اور عقل سے ماورا ہوتا ہے' جو جنون کی انگلی تھام کر چلتا ہے اور جس کا ہتھیار بس انسان کے اپنے اندر بھڑکنے والا جذبہ کا آتش فشاں ہوتا ہے۔

میں چلتا جا رہا تھا' زریں گل میرے ساتھ ساتھ آ رہا تھا "آپ کہاں جا رہا ہے استاد صیب۔" زریں نے مجھے ٹوکا۔

میں رک گیا اور اس وقت پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں یہاں تک زریں کے سہارے کے بغیر آیا ہوں۔ میرا رخ کالونی کے اس حصے کی طرف تھا جو آگے جا کر خیمہ بستیوں کے وسیع سلسلے سے مل جاتا تھا۔ زریں گل نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں' یہی سوال میں نے اپنے آپ سے پوچھا' میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ میرے دل نے بلا توقف جواب دیا' میں موتابہ کی طرف جانا چاہتا ہوں' اس خطرے سے ٹکرانا چاہتا ہوں جو لارسیوں کے لیے عذاب بنا ہوا ہے اور نرسٹیوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر اس موقع پر ہم نے کسی طرح موتابہ کے خلاف کامیابی حاصل کر لی تو ہزاروں قبائلیوں کے دم توڑتے ہوئے حوصلے پھر سے زندہ ہو جائیں گے' خوف و دہشت کی وہ فضا ذہنوں پر سے چھٹ جائے گی جو ہر لمحے گمبھیر سے گمبھیر تر ہو رہی ہے۔ پچھلے پانچ چھ دنوں کے اندر ایک بہت بڑا ہجوم کالونی کے اردگرد خیمہ زن ہو چکا تھا۔ یہ مختلف جگہوں اور بستیوں کے لوگ تھے' ان میں ایک کثیر تعداد لارسیوں کی تھی تاہم اس کے علاوہ بھی مختلف قبیلوں اور نسلوں کے لوگ اس ہجوم میں شامل تھے' یہ فاقہ زدہ' مفلوک الحال لوگ دور دراز علاقوں سے گرتے پڑتے یہاں پہنچے تھے' انہیں یہاں تک لانے والی واحد چیز سائیں عالی کی کشش تھی۔ اس تھوڑے ہی عرصے میں سائیں عالی ان لوگوں کے لیے ایک افسانوی کردار بن گیا تھا' وہ اسے آزادی' خوش حالی اور نجات کی علامت سمجھنے لگے تھے۔ سائیں کو دور سے دیکھ لینا ہی ان لوگوں کے نزدیک ایک بہت بڑی سعادت تھا۔

بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس سعادت کے لیے ہفتوں سے بستی کے نواح میں خیمہ زن تھے۔ آج شام میں نے ایک بلند جگہ سے دیکھا تھا تو حد نگاہ تک خیمے ہی خیمے اور لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ انسانوں کا یہ سیلاب ایک "زبردست طاقت" کا روپ دھار سکتا تھا' شرط صرف یہ تھی کہ ان کے حوصلوں کو مسمار نہ ہونے دیا جائے۔

میں نے فوری طور پر ایک جیپ حاصل کی۔ ایک ٹارچ منگوائی' زریں گل کو ساتھ لیا اور "گھورو" نامی اس صحرائی بستی کی طرف چل دیا جہاں زخمی ہونے کے بعد میں نے چند دن گزارے تھے۔ موتابہ کی پناہ گاہ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

○☆○

بڑا خواب ناک سا منظر تھا۔ میں نے جیپ ٹیلوں کے دامن میں ہی رہنے دی تھی۔ میں اور زریں گل اس غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں آخری اطلاعات کے مطابق موتابہ موجود تھی۔ دہانے سے ہمارا فاصلہ اب تقریباً نصف فرلانگ تھا' مجھے خدشہ تھا کہ یہاں ہماری مڈھ بھیڑ نرسٹ کے ان گارڈز سے ہو سکتی ہے جنہوں نے موحل کے بقول غار کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ہم نے بہت محتاط انداز اختیار کر لیا۔ گہری تاریکی اور خود رو جھاڑیاں ہمیں تحفظ فراہم کر رہی تھیں۔ ایک دو جگہ ہمیں باتوں کی مدھم آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز موحل کے اس بیان کی تصدیق کرتی

تھی کہ غاریا گپھا کے اردگرد ٹرسٹ کے گارڈز نے حصار قائم کر رکھا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر حصار کو کراس کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ شاید ٹرسٹ کے گارڈز کے تصور میں یہ بات نہیں تھی کہ اس تاریک رات کے اس پہر میں ایسی خوفناک جگہ پر کوئی تنہا آنے کی کوشش کرے گا۔ اس بے فکری کی وجہ سے وہ قدرے ریلیکس ہوگئے تھے۔ میں زریں کے کندھے کا معمولی سہارا لے کر چل رہا تھا' جلد ہی ہم دونوں "قاتل غار" کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ابھی تک زریں نے کچھ پوچھا تھا اور نہ میں نے بتایا تھا' مجھے معلوم تھا کہ زریں اندر سے ڈرا ہوا ہے لیکن کمال ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے ابھی تک مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا' بس خاموشی سے چلا آرہا تھا میرے ساتھ۔ ہم غار کے دہانے پر پہنچے تو چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا' اردگرد کا ماحول پراسرار ہوگیا' یہی وہ مقام تھا جہاں اب تک چودہ پجاری بڑی بے دردی سے قتل ہوچکے تھے۔ میری کیفیت جنونی سی ہورہی تھی۔ میں نے رائفل زریں کے ہاتھ سے لے لی۔

"استاد صیب! آپ کیا کرنا چاہ رہا ہے؟"

"میں غار کے اندر جاؤں گا۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

زریں نے پریشان نظروں سے میری طرف دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں میں نے اندازہ لگایا کہ پسینہ زریں کے چہرے پر دھاروں کی صورت بہہ رہا ہے۔ ایک عجیب سی سنجیدگی طاری تھی اس اوٹ پٹانگ شخص پر۔ اس نے رائفل کی نال تھام لی "نہیں استاد صیب!" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "آپ نے کبھی امارا بات نہیں مانا' ہر خطرے کی جگہ پر ام کو پیچھے رکھا ہے اور خود آگے گیا ہے' یا صیدر کو آگے کیا ہے۔ آج ام آگے جائے گا۔ کیا امارا اتنا سا حق بھی نہیں ہے آپ پہ....."

اس نے زور لگا کر رائفل مجھ سے لینے کی کوشش کی۔

"نہیں زریں گل!" میں نے جھڑک دیا "جب تمہاری ضرورت ہوگی تو تم بھی آگے جاؤ گے لیکن اس وقت وہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

"امارا کسی جگہ کوئی کام نہیں ہوتا۔ اگر امارا کوئی کام نہیں ہے تو آپ ام کو ساتھ ساتھ کیوں لیے پھرتا ہے۔ ام کو رہنے دیا ہوتا وہیں اپنے وطن میں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ اس کا جذبہ اس لحاظ سے اور بھی حیران کن تھا کہ پراسرار صورت حال اسے بے حد خوف زدہ کردیا کرتی تھی۔ مگر آج میری محبت میں وہ اس پراسراریت کو بھی فراموش کرچکا تھا۔

"میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو زریں گل! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن....."

"لیکن کچھ نہیں۔ آپ کا ٹانگ زخمی ہے' آپ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا ہے۔ ام آپ کو ایسا خطرناک کام نہیں کرنے دے گا۔"

میں نے زریں گل کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کسی صورت نہیں مانا۔ وہ خود سر ہوتا جارہا تھا' اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔ مجبوراً میں زریں گل کو اپنے ساتھ اندر لے جانے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ تمام خطرات اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں دہانے کے اندر داخل ہوگیا۔ اکلوتی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی۔ رائفل میں نے دائیں ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ زریں ریوالور بدست میرے پیچھے آرہا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ اس تاریک غار میں دور تک گونج رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک کشادہ اور طویل غار ہے۔ میں غار کی ناہموار زمین پر پاؤں جما جما کر چل رہا تھا' میری ٹانگ میں لنگراہٹ تھی مگر ان لمحات میں یہ لنگراہٹ اور یہ درد مجھے کوئی دور دراز کی چیز محسوس ہوتے تھے۔ اردگرد کے تمام حالات ذہن سے محو ہوگئے تھے' بس ایک ہی بات یاد رہی تھی' مجھے لاری ساحرہ موناہ تک پہنچنا ہے۔

جو کچھ میں کررہا تھا یہ عقل اور منطق کے پیمانے پر پرکھا جانے والا عمل نہیں تھا بلکہ پرکھا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس غار کی تاریکی میں جو دشمن موجود تھا اس کا ہتھیار اس کی جسمانی طاقت یا مہارت نہیں تھی' وہ تو ایک ماورائی قوت سے لیس تھا۔ اس کی زہرناکی اس سے پہلے چندرہ عدد پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی اور لارسیوں کا قابل فخر روحانی پیشوا اس کے ہاتھوں زخم زخم ہوچکا تھا۔ میں ایک سیون ایم ایم رائفل لے کر اس غیر مرئی دشمن کی ناقابل فہم طاقت سے پنجہ لڑانے اس کے مسکن میں گھس رہا تھا۔ بے شک یہ سب کچھ دلیل اور عقل کے پیمانے پر پرکھا جانے والا عمل نہیں تھا۔ یہ تو ایک منہ زور وجدانی کیفیت تھی جو اکثر شدید ترین مایوسی اور غیر معمولی خطرات کے وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ اس کیفیت کی سب سے پہلی مثال میری زندگی کا وہ جانکاہ موقع تھا' جب ظالم شیخ راشد بن ارشد نے میری لاڈلی بہن شفتا کو اغوا کیا تھا' اور میں انصاف کی بھیک مانگنے کے لیے بھک منگوں کی طرح در در پر ہو آ بلکتا پھرتا تھا۔ پھر مجھ سے وہ کچھ ہوگیا تھا جس کی کسی نے توقع ہی نہ کی تھی۔ میں نے کئی لاشیں گرائی تھیں اور اپنی شفتا کو کندھے پر لاد کر بے سمت نکل گیا تھا۔

میں اور زریں جما جما کر پاؤں رکھتے آگے بڑھتے رہے۔ غار کے اندر سے ایک ناموافق بو آرہی تھی۔ جیسے بہت دنوں کے بھیگے ہوئے باسی کپڑوں کی گٹھڑی کسی بند کمرے میں کھول دی گئی ہو۔ مچھر بھی چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک دو جگہ ہم پتھریلی دیواروں پر دھوئیں کے نشانات نظر آئے' جیسے کسی نے دیوار کے ساتھ آگ جلائی ہو "کوئی ہے؟" میں نے چلا کر کہا۔ میری آواز کی بازگشت دیر تک غار میں گونجی' رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ کچھ آگے جاکر ہم بری طرح چونکے۔ سرنگ نما غار کے ایک خم پر ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ ہم اس روشنی تک پہنچے تو ایک پتھر پر ایک چراغ روشن دیکھا۔ ارنی کے آدھے خول میں چربی کا تیل بھر کر جلایا گیا تھا۔ جلتی چربی کی بو صاف پہچانی جارہی تھی۔ اس تنہا چراغ کے اردگرد کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم بغیر رکے آگے بڑھ گئے۔ دس بیس گز آگے ایک اور ایسا ہی چراغ نظر آیا۔ یہاں بھی کوئی متنفس نہیں تھا۔ ایک سنسناتی ہوئی خاموشی میں بس چمگادڑوں کی ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی تھی اور اعصاب کو چکنا چور کرتی تھی۔ اس سے پہلے جب میں سردار رانے اور پجاریوں کے ساتھ غار کے دہانے پر آیا تھا تو ہم سب نے آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور کانوں کو بھی بند کر رکھا تھا' آج ایسی کوئی احتیاطی تدبیر ہم نے اختیار نہیں کی تھی' اس کے باوجود اعصاب کی وہ کیفیت نہیں تھی جو تب رہی تھی۔ شاید میرے اندر کے خوف اور فکر کو میرے اندر کے منہ زور وجدان نے مسخر کرلیا تھا۔ میں بغیر رکے چلتا ہی چلا جارہا تھا۔ میرے عقب میں زریں یوں آرہا تھا' جیسے خود سے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ بس میرے ہی جسم کا ایک حصہ ہو۔ اور پھر وہ مدھم آواز میرے کانوں میں پڑنے لگی جو اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار سنی تھی' یہ بوجھل سانسوں کی آواز تھی' جیسے کوئی بہت بھاری بھرکم جانور غنودگی کی حالت میں کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا ہو۔ میرے اعصاب تن گئے' رائفل پر گرفت مضبوط ہوگئی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے سانسوں کی آواز واضح ہوتی گئی۔ پھر وہی بے الفاظ سرگوشیاں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ان سرگوشیوں کا کوئی ترجمہ نہیں تھا' پھر بھی پتا نہیں کیسے اور کیونکر وہ مکمل طور سے میری سمجھ میں آرہی تھیں۔ کوئی عورت جادوئی لہجے میں کہہ رہی تھی "میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں بلا رہی ہوں۔ میرے پاس آجاؤ۔ بہت پاس آجاؤ۔"

اور میں چلا جارہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر نتیجے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ حواس پر نیلی دھند چھا رہی تھی مگر میں اس دھند کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ان لمحوں میں ٹانگ کا درد کسی دور افتادہ بازگشت کی طرح سنائی دیتا تھا..... اور پھر فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا۔ مجھے ناریل کے خولوں میں جلتے ہوئے کئی چراغ نظر آئے۔ ان چراغوں سے کچھ فاصلے پر نیم تاریکی میں کوئی سیاہ وجود موجود تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ لارسی ساحرہ موناہ کا وجود ہے۔ وہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کی دونوں ٹانگیں انگریزی حرف وی کی شکل میں پھیلی تھیں۔ میں نے ذرا غور سے اس کی صورت دیکھی اور سراپا کانپ گیا۔ موناہ کی چمک دار سیاہ جلد ہلکے براؤن رنگ میں تبدیل ہوچکی تھی' بس کہیں کہیں بدنما سیاہ نشان باقی رہ گئے تھے۔ وہ زندہ تھی لیکن اس کا جسم ایک پھولی ہوئی متعفن لاش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ٹانگیں بازو پیٹ غرض ہر شے پھولی ہوئی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جلد میں کہیں کہیں کریکس (درازیں) بھی موجود ہیں۔ موناہ کے قریب ہی مجھے وہ دو کتے بھی نظر آئے جو چند دن پہلے ہم نے گپھا کے دہانے پر دیکھے تھے اور جنہیں دیکھنے کے بعد بڑے پجاری نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا تھا کہ موناہ گپھا میں موجود نہیں..... میں نے ایک بار پھر غور سے موناہ کی طرف دیکھا۔

موناہ کے چہرے پر سب سے خوفناک شے اس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے ٹیبل ٹینس کی دو گیندوں کی طرح اس کی بھوؤں کے نیچے رکھے

ایم اے راحت کا ایک شاہکار ناول
پارس
اس شخص کا قصہ جو اپنی تلاش میں نکلا تھا
عشق' جرم اور جنون سے جنم لینے والا ہنگامہ خیز ناول
آغاز سے انجام تک سطر سطر ہنگامہ
اول تا آخر بیان سے باہر
قیمت -/...
ڈاک خرچ -/۲۰
ناشر
علی میاں پبلی کیشنز فون ...
عزیز مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور
اسٹاکسٹ
رفاعی سیلرز اینڈ مینوفیکچرز فون ...
نسبت روڈ۔ چوک میو ہسپتال۔ لاہور

تھے۔ مجھے لگا کہ نیلم نینس کی یہ بالیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ دماغ میں چھائی ہوئی نیلگوں دھند گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے جنگل کی آگ اور اس آگ میں اپنا کرتا یاد آ گیا۔ شاید ایک بار پھر میرے حواس اسی طرح جواب دینے والے تھے۔ میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی کو جمع کیا اور رائفل کا رخ اس منحوس وجود کی طرف کر دیا جس کا نام موتابہ تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اسے شوٹ کر سکوں گا یا نہیں مگر میں یہ کام کرنا ضرور چاہتا تھا۔ میرے کانوں میں بوڑھے پجاری کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ مرنے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ موتابہ کو مارنے کے لیے اس کی شہ رگ کو نشانہ بنانا ہوگا۔ میرا نشانہ موتابہ کی شہ رگ تھی' اس سے پہلے کہ میں ٹریگر دباتا' اچانک چند وجود مجھ سے اور زریں سے چمٹ گئے۔ میری رائفل کا رخ چھت کی طرف ہو گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا' مجھ سے چمٹے ہوئے افراد سیاہ فام تھے۔ ان کے توی ہیکل جسموں پر لباس کا ایک تار نہیں تھا اور پھر میری نگاہ ان میں سے دو افراد کے جبڑوں پر پڑی۔ یہ غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑے صرف اور صرف ضیامیوں کے ہو سکتے تھے۔ وہی ضیامی جو انسان ہوتے ہوئے بھی جانوروں سے بڑھ کر خون خوار تھے۔ وہ تنگ دھڑنگ ضیامی آدم خور مجھ سے اور دو زریں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے حلق سے جنگلی درندوں کی سی غرانٹیں بلند ہو رہی تھیں۔ میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں حرکت میں آ گئے ہیں' میں نے اپنی گردن کو ضیامیوں کے مہلک دانتوں کی زد سے بچاتے ہوئے انہیں زور دار ضربیں لگائیں۔ چار پانچ سیکنڈ کے اندر ایک ضیامی مجھ سے اپنی گردن تڑوا بیٹھا اور دوسرا اتنی زور سے پتھریلی دیوار کے ساتھ ٹکرایا کہ اس کا سر ناریل ہی کی طرح پھٹ گیا اور اس کے مغز کا کچھ حصہ دیوار سے چپکا دکھائی دیا۔ اس مختصر لڑائی کے دوران میں نے چیخ کر زریں گل کو بھی خبردار کر دیا تھا کہ یہ مقابل عام حبشی نہیں بلکہ ضیامی ہیں اور وہ خود کو ان کے دانتوں سے بچائے۔ اس اطلاع کے باوجود زریں کے بازو کی ایک سرخ سرخ بوٹی مجھے ایک ضیامی کے دانتوں میں نظر آئی۔ وہ اگلا وار یقیناً زریں کی شہ رگ پر کرتا مگر اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ میں پکڑی رائفل نے شعلہ اگلا اور ضیامی اپنے سر میں گولی کا سوراخ لے کر ناریل کے چراغوں پر گرا اور اپنے ساتھ ہی دو چراغ بھی بجھا گیا۔ چوتھا ضیامی عریاں حالت میں زمین پر بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ زریں نے اس کے جسم کے کسی نازک حصے پر کاری ضرب لگائی تھی اور اسے جاں بہ لب کر دیا تھا۔

میری رائفل بڑی مضبوطی کے ساتھ میرے ہاتھ میں تھمی تھی' میں اس پوزیشن میں تھا کہ پھولی ہوئی زندہ لاش کو شوٹ کر سکوں لیکن ایک بار پھر مجھ سے وہی غلطی ہوئی جو میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے موتابہ کی ابھری ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔ میرے ذہن میں چکراتی ہوئی نیلی دھند ایک بار پھر اچانک گہری ہو گئی۔ میرے اندر سے کہیں ایک دور افتادہ آواز آئی کہ جیسے شاید چپاتا نز ہو رہا ہوں۔ ایک طاقت ور عامل کی ترغیب مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر رہی ہے۔ میں نے خود کو اس ٹرانس سے نکالنے کی زبردست کوشش کی لیکن سب کچھ میرے بس سے باہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شدید غنودگی کے ان لمحوں میں ایک بڑی عجیب بات ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے نیم تاریکی میں میرے سامنے متعفن زندہ لاش کے بجائے ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہے۔ بے لباس ہے۔ اس کا حسین بے داغ جسم' اس کے دل نشیں خط و خال' اس کی خوشبو' اس کا دلکش تبسم' سبھی کچھ میں نے بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔ میرے اندر سے ایک سرگوشی آواز ابھری' یہ لڑکی کوئی اور نہیں۔ یہ میری زندگی ہے میری متاع حیات ہے' یہ وہی ہے جس کے لیے میں جیتا ہوں اور مرتا ہوں' یہ وہی ہے جس کی قربت کی پیاس برسوں میری رگ جاں میں بسی ہوئی ہے۔ یہ غزالہ ہے۔

میں نے زود بے زبان کے ساتھ محسوس کیا کہ رائفل پر سے میری گرفت ختم ہو گئی ہے۔ پختہ زمین پر رائفل گرنے کی آواز جیسے مجھے سیکڑوں میل کے فاصلے سے آئی۔ مجھے لگا میں نیم تاریکی میں لپٹے ہوئے اس وجود کی طرف قدم بڑھا رہا ہوں۔

اچانک میری پشت پر کسی نے لاٹھی کی زوردار ضرب لگائی' میرے ذہن میں گہری ہوتی ہوئی نیلی دھند ایک دم چھٹنے لگی۔ میں نے بے حد حیرت سے دیکھا' میرے قریب سے سائیں عالی دوڑتا ہوا گزرا' وہ اس نیم تیرگی میں پہنچا جہاں موتابہ' پھولی ہوئی زندہ لاش کی صورت موجود تھی۔ پھر میں نے سائیں اور موتابہ کو دو خوں خوار حریفوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ سائیں کا یہ وحشیانہ روپ میرے لیے بالکل انوکھا اور ناقابل یقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ایک نشیب میں گرے۔

اچانک پورا غار موتابہ کی کربناک چیخوں اور دھاڑوں سے بچے کی طرح لرزتا محسوس ہوا۔ میں نے رائفل کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

رائفل چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے لپک کر رائفل تھام لی۔ ٹارچ ابھی تک میرے دوسرے ہاتھ میں موجود تھی۔ موتابہ کی چیخوں سے ابھی تک پورا غار گونج رہا تھا میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ موتابہ اور سائیں عالی کی تلاش میں نشیب کی جانب پھینکا۔

وہ دونوں کہیں دکھائی نہیں دیے۔ میں چند قدم آگے بڑھا' چیخوں کی آواز اب بند ہو گئی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے موتابہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے اور اس کے گلے سے خر خر کی آواز نکل رہی ہے۔ اچانک ٹارچ کی روشنی میں مجھے سائیں عالی کی پشت نظر آئی۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ موتابہ ایک پھولی ہوئی متعفن لاش تھی مگر زندہ تھی۔ سائیں عالی کے ساتھ جدوجہد میں اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ وہ پشت کے بل زمین پر پڑی تھی۔ سائیں عالی اس کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا اور پوری قوت سے اس کی گردن دبا رہا تھا۔

موتابہ کی آنکھیں پہلے ہی خوفناک حد تک باہر کو ابلی ہوئی تھیں' اب یہ آنکھیں اور بھی بھیانک ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا کہ ٹینس کی یہ گیندیں اس کے رخساروں کے اوپر ہی دھری ہیں اور کسی بھی وقت نیچے لڑھک جائیں گی۔ موتابہ کی سیاہی مائل زبان باہر نکل آئی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم نے جھٹکا کھایا اور وہ بے حرکت ہو گئی۔

سائیں عالی نے اپنے سیاہ لبادے کے اندر سے ایک خم دار خنجر نکالا اور جنونی انداز میں موتابہ کی شہ رگ پر پے در پے وار کیے۔ حیرت انگیز طور پر موتابہ کا بے حرکت جسم ایک بار پھر تڑپا پھڑکا اور اس نے کربناک چیخیں بلند کیں۔ اس کے بعد ایک دم اس کے جسم کی کھال پھٹتی اور ادھڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سیاہی مائل خون کے لوتھڑے اس کے جسم سے نکلے اور زمین پر پھیل گئے۔ بوتے ہمیں اپنا دماغ پھٹتا ہوا لگ رہا تھا موتابہ کی مسخ لاش کی طرف دیکھنا بھی محال تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اب نہیں مری' اسی دن مر گئی تھی جس دن ہم نے اسے جزام بستی میں لاش کی صورت دیکھا تھا۔ اس دوران میں وہ اندر سے تو گلتی سڑتی رہی ہے مگر باہر سے سلامت رہی ہے۔

ہمارے بس میں ہوتا تو ہم وہاں ایک پل نہ رکتے۔ موتابہ کی لاش کے دہشت ناک منظر سے نگاہیں چرا کر بھاگ نکلتے لیکن سائیں عالی تمام تر بدبو اور کراہت کے باوجود لاش کے قریب موجود تھا اور ہمیں بھی رکنے کا کہہ رہا تھا۔ سائیں کے چہرے پر ایک ایسی جلالی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے۔ یہ کیفیت اس کی اوٹ پٹانگ شخصیت سے بالکل لگا نہیں کھاتی تھی۔ سائیں کے عقب میں ہمیں چند کٹے ہوئے سر بھی نظر آ رہے تھے۔ جس طرح قربانی کے جانور کے سر کو آگ پر بھونا جاتا ہے' یہ سر بھی کچھ کچھ جلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ایک ہی نگاہ میں گن لیا۔ ان کی تعداد نو تھی۔ غالب امکان تھا کہ یہ انہی نو پجاریوں کے سر ہیں جو چند روز پہلے گپھا کے عین سامنے ہلاک ہوئے تھے۔

میں نے اور زریں نے دل کڑا کیا اور چند قدم چل کر سائیں کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ موتابہ کے ختم ہوتے ہی میرا ذہن اس اثر سے آزاد ہو گیا ہے جو مجھے ہر طرف سے جکڑتا چلا جا رہا تھا۔ غنودگی کی وہ حالت بھی اب ناپید تھی جو دو منٹ پہلے تک مجھے بے بس کیے ہوئے تھی۔ تین تنگ دھڑنگ ضیامی آدم خور دم توڑ چکے تھے' چوتھا جس کے نازک حصے پر زریں نے ضرب لگائی تھی جاں کنی کے عالم میں تھا۔

سائیں کی آواز غار میں گونجی۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولا "شفیع محمد! یہ مر گئی ہے' لیکن یہ قابل نفرت نہیں ہے۔ تم جانتے ہو یہ تمہاری ساتھی تھی۔ اس نے تم سب کے ساتھ مل کر مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ ایک سانحہ ہے۔ شاید اس میں ہمارا بھی قصور رہا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

سائیں عالی بولا "یہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر موت سے زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ زندہ ہونے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اس عمل کے ایک نازک مرحلے میں اسے ہماری مدد کی ضرورت تھی لیکن ہم اس کی مدد نہ کر سکے۔ یہ جہاں پہنچ چکی تھی وہاں سے واپس نہیں لوٹ سکتی تھی' یہ بھٹک گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہمیں اس باکمال لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے مارنا پڑا۔ اب یہ مر چکی ہے مگر ہم اس کی گلی سڑی ہوئی بدبودار لاش کو اس طرح یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ یہاں کے رواج کے مطابق ہم اسے ٹھکانے لگائیں گے۔"

"کیا تم اسے جلانا چاہتے ہو؟"

سائیں نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے ہدایت کی کہ میں کچھ دور رکھے ہوئے ناریل کے چراغ اٹھا لاؤں۔

میں نے رائفل اور ٹارچ نیچے پتھریلی زمین پر رکھیں اور ناریل کے خولوں میں جلتے ہوئے دو چراغ اٹھا لیا۔ سائیں کے اشارے پر دو چراغ زریں گل بھی لے آیا۔ ان چراغوں میں چربی کا صاف کیا ہوا تیل تھا جو اشارے سے بھڑک سکتا تھا۔ سائیں عالی نے یکے بعد دیگرے چاروں چراغ لاش پر پھینک

سے۔ شعلے تیزی سے بھڑکے اور انہوں نے آناً فاناً مسخ لاش کو لپیٹ میں لے لیا۔ بدبودار دھواں بڑی تیزی سے غار میں بھرتا چلا جا رہا تھا۔ وہاں ٹھہرنا اب بہت مشکل تھا۔ وہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میں نے نیچے جھک کر اس چوتھے فدائی کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے تک جاں کنی میں تڑپ رہا تھا۔ اسے اس دھوئیں میں چھوڑ کر جانے کا مطلب اسے موت کے حوالے کرنا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی' نبض ساکت تھی۔ وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔ ہم تقریباً بھاگنے والے انداز میں غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔ اس وقت باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔

"یہ فائرنگ کیسا ہے استاد صیب؟" زریں نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ غار سے باہر موجود نرسٹیوں نے کوئی کام دکھایا ہے۔"

"اگر ایسا بات ہے تو پھر ام کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں یہیں غار میں رک کر دھوئیں میں دم بخت ہونا چاہیے اور پھر روسٹ ہونا چاہیے۔" میں نے جل کر کہا۔

ہم احتیاط کے ساتھ دہانے سے باہر نکلے۔ کچھ فاصلے پر تاریکی میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھنے سے پہلے ہی ہمیں اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ دو طرفہ فائرنگ ہے' اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اچانک ایک طرف سے چند سائے برآمد ہوئے۔ اگر غور سے نہ دیکھا جاتا تو وہ تاریکی کا ہی حصہ محسوس ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا کہ وہ ہم پر گولی چلا دیں گے۔ تاہم اسی دوران میں سائیں عالی نے اپنا نعرہ مستانہ بلند کر دیا۔

سائیں کو پہچانتے ہی نہ صرف ان لوگوں کی رائفلیں نیچے جھک گئیں بلکہ وہ خود بھی سب کے سب سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ کالونی ہی کے لارسی جنگ جو تھے۔ ایک مترجم کے ذریعے انہوں نے بتایا "زرسٹی محافظوں کے ساتھ ہماری زوردار جھڑپ ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے اس غار کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور کسی کو اس جانب آنے نہیں دیتے تھے۔"

"کیا نتیجہ نکلا ہے اس جھڑپ کا؟" میں نے مترجم کے ذریعے ہی پوچھا۔

"بیس سے زیادہ زرسٹی ہم نے مار دیے ہیں۔ باقیوں کو پکڑ لیا ہے۔" وہ سینہ پھلا کر بولا۔

"اس کا نتیجہ خطرناک بھی نکل سکتا ہے۔" میں نے اس لارسی جنگ جو کو ٹٹولنے کے لیے کہا۔

"ہم ہر اچھے برے نتیجے کے لیے تیار ہیں اور جب میں "ہم" کہتا ہوں تو اس کا مطلب ہے پندرہ بیس ہزار لارسی۔ اور ابھی مزید لوگ دور دراز علاقوں سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ کل تک ان کی تعداد تیس ہزار سے اوپر ہو جائے گی اور میں بوبو دیوتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ سارے کے سارے لوگ سائیں جی پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سائیں جی کے ایک اشارے پر وہ زرسٹ پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اگر ان لوگوں کے دلوں میں کوئی تھوڑا بہت خوف ہے تو وہ صرف باغی ساحرہ موتابہ کا ہے۔ اگر یہ خوف دور ہو جائے تو پھر ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔"

میں نے سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔ میں نے بھی فی الحال موتابہ کے بارے میں خاموش رہنے کا ہی فیصلہ کیا۔

غار کے دہانے سے اب دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس دھوئیں میں چربی کے تیل کے علاوہ جلے ہوئے گوشت کی بو بھی شامل تھی۔ لارسی جنگ جوؤں نے بھی اس بو کو محسوس کر لیا تھا' اب وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید چاہتے تھے کہ میں انہیں غار کے اندر کی صورت حال کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ آخر ان میں سے ایک نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا "جناب' کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ موتابہ کا کیا ہوا ہے؟"

میں نے سیاسی لوگوں کے انداز میں جواب دیا "اس بارے میں سائیں صاحب ہی کچھ بتا سکتے ہیں اور وہ اپنی مرضی سے ہی بتائیں گے۔"

قریباً تین گھنٹے بعد ہم کالونی میں واپس پہنچ گئے۔ کالونی میں یہ خبر ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکی تھی کہ کنگ براؤن کے خاص کمانڈوز ایک تیز رفتار کارروائی کے ذریعے کنگ کے بیٹے کو یہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کارروائی میں جو لوگ ہلاک ہوئے تھے ان کی لاشیں ایک قطار کی صورت بوما کے سامنے رکھی تھیں۔ ان میں وہ چھ جانباز لارسی شامل تھے جنہیں میں نے خاص طور سے ابستی کی حفاظت پر مامور کر رکھا تھا۔ ان نوجوانوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ مرنے والوں کے لواحقین کی آہ و بکا فضا کو سوگوار کر رہی تھی تاہم اس سوگواری میں گہرائی کے اندر ایک طرح کا جوش و خروش بھی لہریں لے رہا تھا۔

غزالہ رات بھر میری طرف سے سخت پریشان رہی تھی۔ اس نے مجھے واشگاف ہدایت کر رکھی تھی کہ میں اپنی

ٹانگ پر رحم کھاؤں اور مکمل آرام کروں۔ میں نے مکمل آرام کرنے کے بجائے مکمل بے آرامی کی تھی اور ساری رات مہم جوئی میں گزار دی تھی۔ اس وقت جوش میں تو کچھ زیادہ پتا نہیں چلا تھا مگر اب ٹانگ میں ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

غزالہ نے ناراض نظروں سے مجھے گھورا اور منہ بنا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بلند آواز سے کہا "اس وقت کلثوم یہاں ہوتی تو ضرور تمہیں شرم سے سرخ ہونے کا موقع دیتی۔ وہ یہی کہتی کہ تمہاری یہ ادا بالکل بیویوں سے ملتی ہے۔"

غزالہ واقعی سرخ نظر آنے لگی مگر بولی کچھ نہیں۔ میں نے تابی کا سہارا لیتے ہوئے کہا "یار! تم ہی کچھ سفارش کرو۔"

وہ غوں غاں کرنے لگا اور مسکرانے لگا۔ میں نے کہا "تمہاری یہ زبان تمہاری ماں ہی کی سمجھ میں آتی ہے۔ اگر تم نے میرے حق میں بات کی ہو گی تو وہ یقیناً مسکرا دے گی۔ دوسری صورت میں تم نے یقیناً معاملہ بگاڑنے کی کوشش کی ہو گی۔"

غزالہ کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے کہا "بھئی اگر مسکرانے کا ارادہ ہے تو مسکرا دو۔ اگر پردے میں مسکرانا ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے' آپ نے ہمیشہ اپنی مرضی کرنا ہوتی ہے۔"

"چلو اس دفعہ مرضی نہیں کروں گا۔ تم بات تو کرو۔"

"آپ بے حد سخت جان۔۔۔ بلکہ ڈھیٹ قسم کے شخص ہیں۔"

"ڈھیٹ والی بات تو غلط ہے' بہرحال سخت جان میں ضرور ہوں۔ اگر سخت جان نہ ہوتا تو تمہاری سنگ دلی کب کا مجھے توڑ پھوڑ چکی ہوتی۔"

"میں نے آپ کو بستر سے اترنے سے منع کیا تھا' آپ باقاعدہ کشتیاں کرتے پھر رہے ہیں۔"

"میں نے بستر سے نہ اترنے کا وعدہ کیا تھا' مگر اس کے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو گی۔"

"اللہ نہ کرے۔۔۔ اگر آپ کی ٹانگ کو کچھ ہوا تو میں ذمے دار نہیں ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' تابی نے حسب عادت غزالہ کے بال مٹھی میں جکڑے اور ساتھ جھول سا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ "ماما نائیں۔ ماما نائیں" پکارنے لگا۔ وہ اب اکا دکا لفظ بولتا تھا اور نائیں کا لفظ ناپسندیدہ چیز کے لیے استعمال کرتا تھا۔ جیسے اگر دودھ نہیں پینا تو "دودو نائیں۔"

"او چھوڑو میرے بال۔" غزالہ سسکاری لیتے ہوئے بولی۔

وہ نائیں نائیں پکارتا رہا۔ میں نے کہا "دیکھ لو اس نے تمہاری بات کا کتنا ٹھوس جواب دیا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ اگر میری ٹانگ کو کچھ ہوا تو اس کی ذمے دار تم ہی ہو۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ایک عقبی کمرے سے زریں گل کے زور زور سے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ غالباً کلثوم سے جھگڑ رہا تھا۔ میں نے کہا "لگتا ہے کہ کلثوم نے پھر اس کی جوتی پر جوتی چڑھا دی ہے۔"

غزالہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا "آپ ان کی جوتی کو چھوڑیں' اپنی جوتی اتاریں اور لیٹ جائیں یہاں سیدھے۔ میں آپ کی ٹانگ چیک کروں گی۔" اس نے مجھے باقاعدہ دھکیل کر صوفے پر لٹا دیا اور میری ٹانگ دیکھنے لگی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اب میری زندگی کا زیادہ تر حصہ مختلف چیک اپ کرانے میں ہی گزرے گا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" وہ بھی قدرے شوخ انداز میں بولی۔

اب دن کے دس گیارہ بج چکے تھے۔ کالونی کے اندر سے اور اردگرد کی وسیع خیمہ بستیوں میں سے مسلسل نعرہ زنی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کالونی میں ہر طرف لوگوں کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے تھے اور لارسیوں کا ہجوم بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہیں ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہوا تھا کہ موتابہ ہلاک ہو چکی ہے' اگر انہیں پتا چل جاتا تو یقیناً ان کا جوش و خروش کئی گنا بڑھ جاتا۔ ایک ادھ کھلی کھڑکی میں سے مجھے گاہے گاہے لڑکیوں کا وہ گیت بھی سنائی دے جاتا تھا جو میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں سن چکا تھا۔ لارسی دوشیزائیں بڑی عقیدت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گا رہی تھیں۔ یہ گیت بوکارلو کی شان میں پڑھا ہوا قصیدہ تھا۔

ہمارا محبوب بوکارلو پھر سے ہمارے درمیان ہے
وہ اپنی آنکھوں کی طاقت سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے
وہ جس مردہ چیز پر ہاتھ رکھے وہ زندہ ہو جاتی ہے
وہ جس ذی نفس سے نگاہ پھیرے

اس میں روح باقی نہیں رہتی
اس کے ہوتے ہمیں کس بات کا خوف ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ لوگوں کی عقیدت میں اور حقیقت حال میں کتنا فرق ہے۔ بوکارلو اپنی کوشش کے باوجود موتابہ کے سامنے بے بس رہا تھا۔ موتابہ کے خاتمے کا کام سائیں عالی کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔

غزالہ نے میری ران کے گرد ٹیک وار پٹی باندھتے ہوئے کہا "آپ نے ابھی تک بتایا نہیں' رات بھر کہاں رہے ہیں اور موتابہ کا کیا بنا ہے؟"

غزالہ نے موتابہ کا ذکر کیا تو ایک بار پھر غار کے سنسنی خیز مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ موتابہ کا پھولا ہوا بد رنگ جسم جو بالکل ایک پھٹی ہوئی لاش کے مانند تھا پھر موتابہ کی شہ رگ کاٹے جانے کے بعد ایک دم اس لاش کا پھلنا اور گلنا۔ وہ جسم اس جسم سے کتنا مختلف تھا جو ڈوام بستی تک ہمارے ساتھ گیا تھا۔ موتابہ گو جسمانی تناسب نہیں رکھتی تھی اور عام عورتوں سے کافی دراز قد تھی' مگر پھر بھی اس میں نسوانی کشش موجود تھی۔ مجھے موگاسا کا وہ واقعہ یاد تھا جب ایک جوڈام نے کچھ بھیڑوں کے عوض موتابہ کے جسم سے کھیلنے کی خواہش کی تھی' سخت مجبور ہونے کے باوجود موتابہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج رات آخری پہر اسی موتابہ کو ہم نے ایک بلا کے روپ میں دیکھا تھا اور قتل کیا تھا۔ موتابہ کے بارے میں سوچ کر دل ایک بار پھر ملول ہو گیا۔

"یہ آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" غزالہ نے پوچھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں غزالہ کو موتابہ کے بارے میں بتا دیا۔ موتابہ کے دردناک انجام نے غزالہ کو بھی ملول کر دیا۔

اسی دوران میں زریں گل اندر داخل ہوا۔ اس نے کہا "استاد صیب! باہر چوک میں لوگوں کا رش بہت بڑھ گیا ہے۔ اتنا رش تو ام نے بدر منیر صیب کی فلم "یوسف خان' شیر بانو" پر بھی نہیں دیکھا تھا۔ ام کو معلوم ہوا ہے کہ سائیں عالی صیب یہاں لوگوں سے خطاب فرما رہا ہے۔"

میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ ہجوم کا رخ سائیں کی رہائش گاہ کی طرف ہی تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بھی زریں گل کے سہارے باہر نکل آیا اور جلسہ گاہ کے آخری سرے پر کھڑا ہو کر سائیں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ چار پانچ منٹ بعد سائیں عالی اس شان سے برآمد ہوا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں بوکارلو کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ آفت جاں سروج ہوش ربا لباس میں ان دونوں کے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لوٹا تھا۔ مائیک کے سامنے پہنچ کر سائیں عالی نے سروج کے ہاتھ سے لوٹا لیا۔ اس کی لونٹی سے منہ لگایا اور منہ میں پانی بھر کر غرارہ کرنے لگا۔ اس کے حلق سے غرغر غر کی طویل آواز نکلی اور مائیک کے ذریعے دور تک پھیل گئی۔ غرارے کے بعد اس نے پانی کی پچکاری سروج کے قدموں میں ماری لیکن وہ پانی نہیں تھا' کوئی تیل قسم کی شے تھی۔ سائیں نے کہا "ڈیزل کے ساتھ غرارے کیے جائیں تو آواز صاف ہوتی ہے' اور بولنے والے کا انجن زیادہ دھواں بھی نہیں دیتا۔ آپ سب لوگوں کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ صبح اٹھ کر نہار منہ دو چار تولے گریس کھایا کریں اور رات کو ڈیزل کے ساتھ غرارے کیا کریں۔"

اس کی اوٹ پٹانگ تمہید کا ترجمہ ایک مترجم نے حاضرین تک پہنچایا۔ حاضرین کی تعداد کا ٹھیک اندازہ لگانا مشکل تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی' سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ شاید کل رات قبائلی جنگ جوؤں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لارسیوں اور دیگر قبائلیوں کی تعداد تیس پینتیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔ سائیں نے پہلے اپنے جنات کی شان میں تھوڑے سے قصیدے پڑھے پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "میں آپ کے سامنے یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ باغی ساحرہ کی شکل میں جو خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا' وہ اب ٹل گیا ہے۔ ساحرہ ہلاک ہو چکی ہے۔"

سائیں عالی کی بات کا ترجمہ جب لوگوں تک پہنچا تو انہوں نے فلک شگاف نعرے بلند کیے اور شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سائیں نے بوکارلو کا اکلوتا ہاتھ پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور بولا "میں آپ لوگوں کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اہم کامیابی ہمیں صرف بوکارلو کے تعاون اور کوشش سے ہی مل سکی ہے۔ بوکارلو کی مسان شکتی کے بغیر شاید یہ کام ہونا ممکن نہیں تھا۔"

لوگوں نے ایک بار پھر زبردست جوش و خروش کا اظہار کیا۔ بوکارلو بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک پھیکا پن تھا۔ اس پھیکے پن کی وجہ میں جانتا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ سائیں جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ موتابہ کی موت میں بوکارلو کا کوئی کردار نہیں ہے۔ سائیں نے بوکارلو کو فقط اس کے عقیدت مندوں کے سامنے سرخ رو کرنے کے لیے اس کے سر پر سہرا باندھا ہے۔ یہ بات بھی عیاں تھی کہ یہ سہرا بوکارلو نے اپنی مرضی و خوشی سے نہیں بندھوایا ہوگا۔ سائیں نے اسے اس کام کے لیے مجبور کر دیا ہوگا۔ ہجوم کے کسی گوشے سے ایک بار پھر نوجوان لڑکیوں کا

گایا ہوا عقیدت بھرا گیت میرے کانوں تک پہنچنے لگا۔

ہمارا محبوب بوکارلو پھر سے ہمارے درمیان ہے
وہ اپنی آنکھوں کی طاقت سے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے

سائیں کے کردار کا یہ مثبت پہلو' زندگی میں پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ اپنی خود نمائی اور بڑائی کو یکسر نظر انداز کر کے اس نے اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ایک شخص کو اپنی کامیابی میں شریک ٹھہرایا تھا۔ اس کے اس اقدام سے سیکڑوں' ہزاروں لوگوں کی عقیدت کا بھرم رہ گیا تھا۔

سائیں نے اپنی تقریر کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے سابق خیالات کو دہرایا "ہماری لڑائی کسی کے خلاف نہیں۔ ہماری لڑائی غربت' بھوک' بیماری اور غلامی کے خلاف ہے۔ ہمیں کسی کنگ براؤن یا کسی ترسٹی کو فتح نہیں کرنا' ہمیں لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا ہے' اس مقام پر اتنے زیادہ ہجوم کا جمع ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے مقصد کو حاصل کر لیں گے۔ اور اللہ نے چاہا تو کسی بڑے خون خرابے کے بغیر حاصل کر لیں گے۔ جتنے لوگ یہاں جمع ہو چکے ہیں' اگر یہ خالی ہاتھ بھی ترسٹ کی طرف پیش قدمی کریں تو انہیں کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ جو ان کی راہ میں آئے گا وہ چٹان بھی ہوگا تو تنکے کی طرح بہہ جائے گا۔"

لوگوں کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ گیا۔ ہزاروں بازو فضا میں بلند ہوئے' ہزاروں تمتماتے ہوئے چہروں اور دہکتی ہوئی آنکھوں نے سائیں عالی اور بوکارلو کی طرف دیکھ کر پرجوش نعرے بلند کیے۔ یہ ہجوم پتا نہیں کہاں کہاں سے چل کر یہاں جمع ہوا تھا۔ اس میں کئی قبیلوں اور نسلوں کے لوگ تھے' لیکن اس وقت وہ سب کے سب ایک ہی جسم لگ رہے تھے۔ اس سارے جسم میں ایک ہی دل دھڑک رہا تھا اور اس کی نگاہ ایک ہی مقصد پر لگی تھی۔

ہجوم میں بلند ہونے والے ہیجانی نعروں سے اندازہ ہوا کہ لوگ سائیں عالی سے اجازت چاہ رہے ہیں' سیاہ فام انسانوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ایک طوفان کی طرح ترسٹ کی طرف بڑھنا چاہ رہا ہے۔ سائیں عالی نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ کھلی آستینوں والے سیاہ لبادے کے ساتھ سائیں کسی پرندے کی طرح دکھائی دیا۔ اس نے لوگوں کو صبر اور تحمل کی تلقین کی۔ وہ بولا "وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو' لیکن مقررہ وقت پر ہوگا۔ جہاں برسوں سے انتظار کر رہے ہو' وہاں تھوڑا سا انتظار اور کرو۔"

سائیں کی تقلید میں بوکارلو نے بھی اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور لہریں مارتے ہوئے اس انسانی سمندر کو کناروں کے اندر رکھنے کی کوشش کی۔ سائیں کی آواز مائیک کے ذریعے کالونی کے اندر اور باہر دور دور تک گونجی۔ وہ بولا "میرے جنات ہوا میں بہت بلندی پر اڑ رہے ہیں۔ وہ مجھے اطلاع دے رہے ہیں کہ ابھی آپ کے بہت سے ساتھی راستوں میں ہیں' وہ دور دراز جگہوں سے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ان کا انتظار ضروری ہے۔" اس نے آسمان کی طرف رخ کر کے خبر نہیں ہوا میں کیا کیا اشارے کیے۔ یوں وہ ظاہر کر رہا تھا جیسے جنات سے محو گفتگو ہے۔

چند لمحے بعد اس نے دوبارہ ہجوم کو مخاطب کیا "آپ لوگ ابھی اپنے اپنے گھروں اور خیموں میں جائیں۔ دودھ کی کچی لسی بنائیں اور اس میں تھوڑا سا پیاز گھوٹ کر ڈال لیں۔ چھوٹی مکھی کا شہد تو آپ سب کے پاس ہوگا ہی۔ وہ بھی اس میں شامل کر لیں۔ یہ مشروب انسان میں صبر و تحمل پیدا کرتا ہے اور اس کے فالتو جوش کو قابو میں رکھتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پیاز اور شہد کا نام اکٹھا سن کر ان کو متلی ہونے لگتی ہے' ایسے لوگوں کے لیے میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں۔"

سائیں مکمل طور پر پٹڑی سے اتر چکا تھا اور جو منہ میں آ رہا تھا' بولتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ سن رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ وہ ان باتوں سے بھی "معنی اور اشارے" ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد یہ جم غفیر منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ سردار رانے تو زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں تھا۔ اس کا نیا نائب بوگارو جسے صرف گارو بھی کہا جاتا تھا' بڑی تندہی سے دفاعی انتظامات کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے کالونی کے ارد گرد واقع نگرانی کے ٹاورز پر نفری تعینات کر دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے سیکڑوں لشکریوں کو مختلف دستوں میں بانٹ کر خیمہ بستیوں کی حفاظت کے لیے روانہ کر رہا تھا۔ بیشتر لشکری اسلحہ استعمال کرنا جانتے تھے اور وہ جدید ترین اسلحے سے لیس نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ جدید اور قیمتی اسلحہ انہیں سائیں عالی کے ڈالروں اور پاؤنڈوں کی مدد سے ہی فراہم ہوا تھا۔ اس اسلحے میں خود کار رائفلیں' ماؤزر اور لائٹ مشین گنیں شامل تھیں۔

یہ اسی شام کا واقعہ ہے' غزالہ نے مجھے بتایا کہ بوما کے پیچھے ایک مکان میں کوئی جھگڑا وغیرہ ہو رہا ہے۔ وہاں بہت سے لارسی جمع ہو گئے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔

میں نے زریں گل کو ساتھ لیا اور اپنی رہائش گاہ سے

نکلا۔ غزالہ نے جو انجکشن دیا تھا۔ اس نے ٹانگ کے درد کو کافی حد تک کم کر دیا تھا اور اب میں چلنے پھرنے میں آسانی محسوس کر رہا تھا۔ ہم موقع پر پہنچے تو واقعی صورت حال سنگین نظر آئی۔

بے شمار لارسیوں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ وہ ایک چار دیواری کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ دیگر لارسی انہیں آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ میں اور زریں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے آگے بڑھے مجھے چار دیواری کے اندر سے دو تین بار مدھم نسوانی چیخوں کی آواز آئی۔

اسی دوران میں لوگوں کے درمیان میری نگاہ موفل پر پڑ گئی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور میری طرف بڑھ آیا "یہ کیا بے ہودگی ہو رہی ہے یہاں؟" میں نے بلند آواز میں اس سے پوچھا۔

وہ بولا "بہت گڑبڑ ہوئی ہے۔ چلئے باہر آئیے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

"لیکن اندر کوئی لڑکی چیخ رہی تھی۔"

"وہ ایک لڑکی نہیں تھی جی۔ تین چار لڑکیاں ہیں لیکن اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے ساتھ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔"

موفل نے باقاعدہ میرا بازو پکڑا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا باہر نکل آیا۔ ہجوم کے تیور اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی بہت سے لوگ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں گے۔ اتنے میں سردار رانے کا نائب گارڈ بھی وہاں پہنچ گیا اور صورت حال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

دل نے کہا "مجھے لگتا ہے جی کہ یہ ٹرسٹ والوں کی ایک اور سازش ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ابھی آپ نے اس مکان میں جو چیخیں سنیں، وہ بوب لڑکیوں کی تھیں۔ چند لارسیوں نے ڈنکے کی چوٹ پر تین چار دوشیزاؤں کی عصمت دری کی ہے۔ ان کے مسلح ساتھیوں نے کسی کو لڑکیوں کی مدد کے لیے چار دیواری کے نزدیک نہیں جانے دیا۔"

"لیکن کیوں؟ یہ لوگ سائیں عالی کو روحانی پیشوا مان رہے ہیں اور سائیں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کسی بوب لڑکی کو قربان کیا جائے گا اور نہ اس کی عصمت دری کی جائے گی۔"

"بس یہی تو مسئلہ ہے جناب۔ بوب لڑکیوں کی قربانی اور عصمت دری یہاں کی پختہ مذہبی رسم بن چکی ہے۔ لوگوں نے سائیں صاحب کے حکم پر یہ سلسلہ روک تو دیا تھا لیکن بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس فیصلے سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ بہرحال سائیں کا حکم میرے اکثر لارسی بھائیوں کے لیے دیوتاؤں کے فرمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ یہ لوگ سائیں کے حکم کو دل سے بھی تسلیم کر لیتے لیکن دو تین دن سے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوا ہے اور اس نے لوگوں میں بے چینی بڑھا دی ہے۔"

"نئے مسئلے کے بارے میں تم نے ہمیں تو کچھ نہیں بتایا حالانکہ روز ملاقات ہوتی ہے۔"

"مجھے بھی آج ہی معلوم ہوا ہے جی۔" موفل نے کہا "دراصل یہ چکر آج سے دس پندرہ دن پہلے شروع ہوا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے سائیں جی نے قریباً ۵۰ بوب لڑکیوں کی شادیاں مقامی نوجوانوں سے کرا دی تھیں۔ اب یہ لڑکیاں بیویوں کی حیثیت سے اپنے مردوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ بہرحال دو تین لڑکیاں ایسی تھیں جن کے لیے کوئی موزوں مرد نہیں مل سکا تھا۔ وہ لڑکیاں سردار رانے کی تحویل میں تھیں۔ اب سائیں جی کے حکم پر سردار رانے ان میں سے ایک خوب شکل لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ اگر سردار رانے کیھا کے دہانے پر زخمی نہ ہو جاتا تو پچھلے ہفتے یہ شادی ہو بھی چکی ہوتی۔ بہت سے لارسیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ مگر سائیں جی کے بے پناہ احترام کی وجہ سے وہ خاموش رہنے پر مجبور ہیں، ان میں سے ایک طبقہ ایسا ہے جو کچھ زیادہ ہی جوشیلا ہے۔ یہ لوگ کئی دنوں سے چپکے چپکے اس بارے میں باتیں بناتے رہے ہیں۔ اب سب کچھ ان کی برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا "اگر سردار رانے بوب لڑکی سے شادی کر بھی رہا ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دراصل جناب، بہت عرصے سے ہمارے ہاں بوب دوشیزاؤں کو فقط قربانی کے جانوروں کی حیثیت دی جاتی رہی ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا، ان کا رہن سہن جانوروں سے قریب تر ہے۔ اب اگر سائیں جی کے حکم پر سردار رانے بوب دوشیزہ سے شادی کر لیتا ہے تو اس بوب کو قبیلے کی سردارنی کی حیثیت مل جائے گی۔ فرض کریں اگر شادی کے فوراً بعد سردار کو کچھ ہو جاتا ہے تو مقامی رواج کے مطابق سردار کی سب سے چھوٹی بیوی کو اس وقت تک سربراہ کی

حیثیت حاصل رہے گی جب تک نیا سردار چن نہیں لیا جاتا۔ لارسیوں کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ ایک بوب کو سردارنی یا سربراہ کا رتبہ دے دیا جائے۔ یہ لوگ اس بات کو ایسے ہی سمجھیں گے جیسے کسی شخص کو کسی آوارہ کتے کے پاؤں چومنے کے لیے کہا جائے۔"

"مگر سائیں کو اس طرح کی ہدایت جاری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو سائیں جی ہی بتا سکتے ہیں۔"

زریں بولا "ہو سکتا ہے کہ کسی نے افواہ پھیلایا ہو۔ وہ حرامی ٹرسٹ کا لوگ ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو مرتبہ سائیں صیب کو بدنام کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔"

موفل بولا "میرا بھی پہلے یہی خیال تھا، لیکن اب پتا چلا ہے کہ سائیں جی واقعی اس خوب صورت بوب سے سردار رانے کی شادی کرانا چاہتے ہیں۔ سروج کو بھی اس بات کا علم ہے، بلکہ کچھ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ مزید دو چار بوب لڑکیوں کی شادیاں اہم لارسی سرداروں سے کرائی جائیں گی اور اس طرح کم ترین بوب لڑکیوں کو وہ رتبہ دے دیا جائے گا کہ لارسیوں کو ان کے سامنے سر جھکانا پڑیں گے۔"

زریں اپنے مخصوص انداز میں بولا "خو چہ! اس بارے میں تو بعد میں بات کریں گے پہلے ام کو یہ بتاؤ کہ ابھی جن تین چار لڑکیوں کا عزت مٹی میں ملایا گیا ہے ان کا کیا قصور تھا۔"

"ان کا قصور بس یہ تھا کہ وہ بوب تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ ہم لارسیوں میں سے ایک طبقہ ایسا ہے جس نے اس بات کو کچھ زیادہ ہی دل سے لگایا ہوا ہے۔ سائیں جی کے بے حد احترام کی وجہ سے وہ سائیں جی کو تو کچھ کہہ نہیں سکتے ان کا سارا غم اور غصہ ان بوب لڑکیوں کی طرف مڑ گیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ بوبو دیوتا نے بوب لڑکیاں صرف جان اور عزت کی بھینٹ چڑھانے کے لیے پیدا کی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس چار دیواری میں انہوں نے جو عمل کیا ہے وہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے کیا ہے یا آپ یوں کہہ لیں کہ انہوں نے اپنی طرف سے ایک مری ہوئی رسم کو زندہ کیا ہے۔"

میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے کہا "اگر تم جیسے لوگ بھی ظلم اور جبر کا مطلب نہیں سمجھو گے تو پھر اور کون سمجھے گا۔ تمہاری بہنوں اور بہو بیٹیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ٹرسٹ لے جایا جاتا ہے۔ انہیں جانوروں کی طرح سدھا کر جسم فروش بنایا جاتا ہے۔ تمہارے مردوں کو غلاموں کا روپ دیا جاتا ہے۔ تم سب لوگ اسی سفاکی کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہو۔ مگر تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہاں اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں جو ٹرسٹ میں کنگ براؤن کر رہا ہے۔"

"میں معافی چاہتا ہوں جناب! لیکن یہ سفید فام لڑکیاں تو پالی ہی اس لیے جاتی تھیں کہ۔۔۔"

"خاموش۔ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں، میں سب جانتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

جس چار دیواری میں بوب لڑکیوں کے ساتھ زبردستی کا سلوک کیا گیا تھا، وہاں اب بھی لارسیوں کا جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ سیکڑوں لارسی تھے اور وہ واضح طور پر دو گروہوں میں بٹے ہوئے نظر آتے تھے، اگر مسلح محافظوں کا ایک جم غفیر وہاں موجود نہ ہوتا تو یقین ممکن تھا کہ وہاں خون خرابا شروع ہو جاتا۔ یہی لوگ تھے جو کل رات تک یک جان نظر آ رہے تھے۔ سائیں کے ایک اشارے پر وہ مرنے اور مار دینے کے لیے تیار تھے، لیکن آج ان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور واضح طور پر نظر بھی آ رہی تھی۔ مجھے زریں گل کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ اس صورت حال کے پیچھے ٹرسٹ کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔

سائیں عالی سے تو بات کرنا فضول تھی۔ بہت کم امکان تھا کہ وہ کسی بات کا ڈھنگ سے جواب دے گا۔ میں نے سروج سے رابطہ کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے موفل سے کہا "تم جاؤ اور کسی طرح سروج کو یہاں لے آؤ۔"

وہ بولا "ٹھیک ہے جناب! میں اسے ڈھونڈ لاتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے تمہیں اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ تم ہر وقت اس کے ساتھ چپکے رہتے ہو، تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

میرے طنز کی وجہ سے موفل کٹ کر رہ گیا اور کان لپیٹ کر باہر نکل گیا۔ دس منٹ بعد سروج میرے سامنے تھی۔ وہ کنیز ساجے کے روپ میں تھی، وہی روپ جس کے سبب وہ کچھ دن پیشتر پھانسی لگتے لگتے بچی تھی (زریں گل اس وقت کو یاد کر کے درجنوں بار حسرت ناک آہیں بھر چکا تھا)۔

میں نے کسی لمبی تمہید کے بغیر ہی سروج سے پوچھا "سروج! یہ سب کیا ہو رہا ہے یہاں۔ سائیں عالی بنا بنایا کھیل کیوں بگاڑ رہا ہے۔ کیا واقعی اس نے سردار رانے کی شادی بوب لڑکی سے کرنے کی بات کی تھی؟"

سروج نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا "ہاں

یہ بات ہوئی ہے۔"

"لیکن کیوں۔ یہ نیا پنگا لینے کی اسے کیا ضرورت تھی؟"

"تم اسے پنگا نہیں کہہ سکتے اور اگر یہ پنگا ہی ہے تو پھر یہ سردار رانے نے لیا ہے۔" وہ تنک کر بولی۔

"سردار رانے نے کیا کیا ہے؟"

"شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مرد جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے اس کی حرص بڑھتی جاتی ہے۔ سردار کی کئی بیویاں ہیں پھر بھی کسی جوان چھوکری کو دیکھ کر رال ٹپکانے لگتا ہے تین لڑکیاں سردار رانے کی تحویل میں تھیں۔ دس بارہ روز پہلے کی بات ہے رات کو مجبور کی شراب پینے کے بعد عیاشی کا بخار سردار کے دماغ کو چڑھ گیا اور اس نے ایک بوب لڑکی کو پکڑ کر اس کے ساتھ من مانی کرلی۔ صبح سویرے اس بات کی خبر سائیں جی کو بھی پہنچ گئی۔ وہ سردار کی حرکت پر بڑے ناراض ہوئے۔ دراصل سائیں جی یہاں بوب لڑکیوں کو وہی عزت دینا چاہتے ہیں جو عام عورتوں کو حاصل ہے لیکن سردار نے بوب کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کر ڈالا تھا۔ کسی عام شخص سے یہ حرکت ہوئی ہوتی تو اور بات تھی' یہ کام سردار نے کیا تھا۔ سائیں جی نے اسی وقت سردار کو حکم دیا کہ اس نے ایک کنواری لڑکی کے ساتھ من مانی کی ہے اب وہ اس کو عزت دینے کے لیے اس کے ساتھ شادی کرے۔"

اب بات کسی حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔

میں نے سروج سے پوچھا "اب کیا ہوگا۔ یہ لوگ تو بات کو کسی اور رخ پر لے گئے ہیں۔"

وہ بولی "مجھے وشواس ہے کہ کنگ کے ایجنٹ یہاں بھی موجود ہیں۔ انہوں نے ہی اس مسئلے کو اچھالا ہے اور گمبھیر بنایا ہے۔"

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب اس گمبھیرتا کو کم کیسے کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ تم سائیں کو سمجھاؤ' اسے بتاؤ کہ اس کے فیصلے کی وجہ سے لاریوں میں پھوٹ پڑ رہی ہے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے سامنے آکر ان کی مرضی کے مطابق اعلان کردے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنہ بات پھیل جائے گی اور بڑا نقصان ہوگا۔ اتنے بڑے ہجوم کی ساری طاقت پھوٹ کی وجہ سے بیکار ہو جائے گی۔"

وہ بولی "شاہ جہاں! تم زیادہ بھولے بادشاہ بننے کی کوشش مت کرو۔ تم کو اچھی طرح جانکاری ہے کہ سائیں جی کیول (صرف) اپنی مرضی پر چلتے ہیں۔ میں لاکھ سر پٹخوں وہ وہی کریں گے جو چاہیں گے۔"

"پھر بھی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔"

"یہ کوشش تم کر کے دیکھ لو۔" اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں۔ ٹرسٹ کے خلاف قبائلیوں کا اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو جانا ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ شاید سائیں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر یہ سب لوگ خالی ہاتھ بھی ٹرسٹ کی طرف چل نکلتے تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ مگر اب یہ زبردست طاقت پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی اور مظلوم قبائلیوں کی کامیابی ظالم ٹرسٹ کی کامیابی میں تبدیل ہو رہی تھی۔

میں نے صفدر کو ساتھ لیا اور سائیں عالی کی طرف چل دیا۔ اب رات کے آٹھ نو کا عمل تھا۔ کالونی میں اور کالونی سے باہر ہلچل کے آثار صاف محسوس ہوتے تھے۔ ٹرسٹ کے زوردار حملے کا خطرہ تو پہلے ہی سے موجود تھا' اب اندرونی خون خرابے کی صورت حال بھی پیدا ہو گئی تھی۔ موناب کی موت کے اعلان کے بعد اطمینان کی جو ایک لہر سی قبائلیوں میں دوڑی تھی وہ مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ میں اور صفدر سائیں عالی کی بسائی ہوئی جدید بستی کی سڑکوں سے گزرے اور اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہاں مسلح گارڈز کا پہرا تھا' تاہم سروج کی چالاکی سے ہمیں سائیں تک رسائی کا موقع مل گیا۔ دروازے کے ساتھ والے کمرے میں سائیں کا کتا زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ایک دڑبے کے اندر بڑی سی صحت مند دیسی مرغی بیٹھی کڑ کڑا رہی تھی۔ سائیں عالی گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور بڑی محویت سے ایک طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے چیخ کر مجھے روک دیا "ٹھہر جاؤ۔ دیکھتے نہیں ہو۔ ابھی تمہارے پاؤں کے نیچے آکر تین چار جانیں ضائع ہو جاتی تھیں۔"

"کون سی جانیں؟" میں نے نیچے خالی فرش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "تمہاری نظر اتنی تیز نہیں ہے کہ میری جوؤں کو دیکھ سکو۔ جہاں تم پاؤں رکھ رہے تھے وہاں میری چار جوئیں موجود ہیں۔ میں نے انہیں سزا کے طور پر مرغا بنا رکھا ہے۔ جب تک یہ چاروں نیک چال چلنی کا وعدہ نہیں کریں گی میں انہیں چھوڑوں گا نہیں۔ انہوں نے تو مستیاں کر کر کے میرا سر پولا کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "سائیں! مجھے توقع تو نہیں کہ تم میری بات مانو گے لیکن پھر بھی کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مسخری کا نہیں سنجیدگی کا وقت ہے۔"

"سنجیدگی کا وقت رات بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا ہے اور بارہ بج کر پانچ منٹ پر ختم ہو جاتا ہے۔ بہرحال تمہاری خاطر میں سنجیدگی میں اوور ٹائم لگا لیتا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔"

میں نے کہا "سائیں عالی! میں مانتا ہوں کہ تم ان قبائلیوں کے لیے بہت کچھ کر رہے ہو اور مزید بھی کرنا چاہتے ہو مگر کہیں کہیں تم غلطیاں بھی کر رہے ہو۔ چند دن پہلے بھی ایک فاش غلطی تم سے ہوئی ہے' جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہاں جمع ہونے والے ہزاروں قبائلی جو دو دن پہلے تک یک جان نظر آ رہے تھے اب اختلاف کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور کوئی پتا نہیں کہ آپس میں ہی خون خرابا شروع کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ تم اتنے بے خبر نہیں ہو۔ تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یوما کے پیچھے ایک مکان میں تین بوب لڑکیوں کی آبرو لوٹ لی گئی ہے۔"

میں نے سب کچھ سائیں عالی کے گوش گزار کر دیا اور آخر میں اس سے درخواست کی کہ وہ سردار رانے کے ساتھ بوب لڑکی کی شادی کے بارے میں اپنا بیان بدل لے ورنہ لاری دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں گے۔

سائیں بظاہر توجہ سے میری باتیں سنتا رہا مگر جب میں خاموش ہوا تو اس نے پھر اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیں۔ اس نے بتایا کہ اس نے قبائلیوں کا جوش و خروش قابو میں رکھنے کا انتظام کر دیا ہے۔ جب وہ دودھ کی کچی لسی میں پیاز کا شیرا اور شہد ملا کر پئیں گے تو ٹھنڈے ٹھار ہو جائیں گے۔

میں نے کہا "سائیں! سمجھنے کی کوشش کرو' یہ وہی ٹرسٹی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے دو دفعہ تمہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے' وہ قبائلیوں کی نظر میں تمہیں گرانا چاہتے ہیں اور تم انہیں خود موقع فراہم کر رہے ہو۔ بوب لڑکی سے رانے کی شادی نہیں ہوگی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی' لیکن اگر قبائلیوں کا اتحاد ٹوٹ گیا تو ضرور قیامت آجائے گی۔ موگا سامیں تو کچھ بچت ہو گئی تھی یہاں کچھ نہیں بچے گا۔"

"تم میری اور میرے جنات کی توہین کر رہے ہو۔" وہ غصے سے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازے پر رک کر اس نے خالی فرش کی طرف دیکھا اور جوؤں سے مخاطب ہو کر بولا "چلو اب اٹھ جاؤ اور آجاؤ میرے پیچھے پیچھے۔"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ سائیں عالی کی صلاحیتوں سے انکار کرنا تو ممکن نہیں تھا لیکن اکثر وہ چکنے گھڑے کی طرح کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیتا تھا۔

سائیں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سروج اندر آگئی۔ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی "ہاں اب بتاؤ' ہو گئی تسلی؟ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا' سائیں جی کی زبان سے جو بات نکل گئی ہے وہ اسے واپس نہیں لیں گے۔ آج صبح بھی وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے' سردار کی حالت شادی کے قابل ہوئی ہے کہ نہیں۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی اور میں سردار رانے کی رہائش گاہ کی طرف چل دیا۔ صفدر بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ میں نے صفدر سے کہا کہ وہ اب گھر جائے۔

"لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"بس ایک کام ہے واپس آکر بتاؤں گا۔"

"آپ زیادہ دیر نہ لگائیں۔ ورنہ غزالہ لٹھ لے کر میرے پیچھے پڑ جائے گی اور وہ بھی ٹھیک ہی کرتی ہے۔ آپ اپنی ٹانگ کو زیادہ بے آرام نہ کریں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ آگے جا کر موہل سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق چوبند اور چوکس نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ سردار رانے کے نائب گاروں نے صورت حال کو کسی حد تک سنبھال لیا ہے۔ وقتی طور پر آپس کی لڑائی کا خطرہ ٹل گیا ہے لیکن۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے اسے اکسایا۔

وہ بولا "ٹرسٹ کی طرف سے پریشان کن خبریں آ رہی ہیں۔ اسفی کی رہائی پر کنگ اور اس کے ساتھیوں نے ٹرسٹ میں زبردست جشن منایا ہے۔ مقامی پولیس اور انتظامیہ کے کئی اعلیٰ افسر بھی اس جشن میں شریک تھے۔ اسی جشن میں قبائلیوں اور سائیں جی کے خلاف ایک بڑا اور فوری آپریشن کرنے کی پلاننگ کی گئی ہے۔ ٹرسٹ سے اس طرح کی خبریں آ رہی ہیں کہ آج رات یا کل تک یہ آپریشن شروع ہو جائے گا۔"

"تمہیں یہ اطلاع کس سے ملی ہے؟"

"بو کارلو صاحب سے۔ بو کارلو صاحب کو یہ اطلاع ان کے دو خاص آدمیوں نے دی ہے۔"

اسی دوران میں بو کارلو بھی اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے قدم اٹھاتا' ہماری طرف بڑھا۔ اس کے کٹے ہوئے بازو کی آستین ہوا میں لہرا رہی تھی۔ میں جب بھی اس کٹے ہوئے بازو کو دیکھتا تھا' مجھے کنگ براؤن اور اس کا خون خوار چھپکلا یاد آجاتے تھے۔ بو کارلو نے بلا تمہید کہا "مسٹر شا! میں تمہاری ہی طرف آ رہا تھا۔ ٹرسٹ سے جو خبریں آ رہی

ہیں' ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ مقامی انتظامیہ کی مدد کے ساتھ کالونی پر ہلا بولنے کے لیے تیار ہیں۔ پلان کے مطابق اس سارے علاقے کو گھیرے میں لیا جائے گا اور لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اعلان کیا جائے گا کہ قبائلی منتشر ہو کر اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے جائیں۔ منتشر ہونے کے لیے انہیں آدھے یا ایک دن کا وقت دیا جائے گا۔ اس کے بعد زوردار کارروائی کرکے باقی ماندہ لوگوں کو منتشر کیا جائے گا۔ مزاحمت کرنے والوں پر بے دریغ فائرنگ کی جائے گی اور سرکردہ لوگوں کو چن چن کر گرفتار کیا جائے گا۔"

"محترم بوکارلو! آپ کو یہ اطلاعات کب ملیں؟"

"صرف ایک گھنٹا پہلے لیکن یہ پلاننگ شام چھ سات بجے ہی ہو گئی تھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے کل رات تک کنگ براؤن اور اس کے ہرکارے کشمکش و پیچ میں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کالونی میں قبائلیوں کے اتنے بڑے اجتماع نے انہیں پریشان کر دیا تھا' مگر اب جبکہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ قبائلی آپس کی پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں' انہوں نے جان بوجھ کر جارحانہ کارروائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

اسی دوران میں رانفے کا نائب گارو بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس حبس زدہ رات میں اس کی سیاہ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ بوکارلو نے افراتفری کے عالم میں گارو کو ساتھ لیا اور دفاعی انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے کالونی کے شمالی حصے کی طرف چلا گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور آہستہ روی سے قدم اٹھاتا سردار رانفے کی رہائش گاہ کی طرف اپنا باقی کا سفر پورا کرنے لگا۔ حسین سفید فام لڑکیاں اپنے حبشی شوہروں کے ساتھ یہاں وہاں چکرا رہی تھیں۔ دکانوں پر سفید فام ملازم نظر آ رہے تھے' ایک فلنگ اسٹیشن پر ایک امریکی نوجوان ایک ڈاٹسن کار میں پیٹرول بھر رہا تھا' ڈرائیور کی وردی میں جو شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا وہ بھی امریکن یا انگریز ہی تھا۔ یہ سب سائیں کے ڈالروں اور پاؤنڈوں کی کرشمہ کاری تھی۔ اس نے یورپ اور امریکا سے بہترین ہنرمند اور "حسین مند" اکٹھے کرکے یہاں معمولی کاموں پر لگا رکھے تھے۔ غالباً اس طرح اس نے لارسیوں اور دیگر قبائلیوں کے ذہنوں سے وہ کہنہ خوف و رعب دور کیا تھا جو سفید فاموں کے حوالے سے ان میں پایا جاتا تھا۔ یہ خوف دور ہونے کا اعجاز ہی تھا کہ لوگوں میں سائیں عالی کے لیے مقناطیسی کشش پیدا ہوئی تھی اور وہ ہر طرف سے سائیں کی اس عجوبہ بستی کی طرف کھنچے چلے آئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اس خوب صورت مکان میں پہنچ گیا جو سائیں نے سردار رانفے کو عارضی طور پر بستی میں رہنے کو دیا تھا۔ یہاں رہنے کے لیے سردار رانفے نے اپنی دو بیویوں کو موگا سا سے منگوا لیا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں وہ تین چار بوب دوشیزائیں بھی تھیں جو سائیں نے رانفے کی تحویل میں دے رکھی تھیں۔ وہ خوش شکل بوب دوشیزہ بھی ان میں ہی تھی جس کو سردار رانفے نے اپنی "سرداری" کا نشانہ بنایا تھا۔ عام بوب دوشیزاؤں کی طرح اس کی عمر بھی سولہ اور بائیس سال کے درمیان تھی۔ چہرا اور ہاتھ پاؤں بالکل بے داغ' جلد ملائم' آنکھیں ہلکی نیلی' صحت ایسی کہ یوں لگتا تھا ابھی خون رخساروں سے یا ہونٹوں سے ٹپک پڑے گا اور یہ وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے اس صحرا کے مظلوم لوگوں اور بدنام زمانہ بردہ فروش کنگ کی لڑائی ایک نئی نہج پر آ گئی تھی۔

سردار رانفے کی بیویاں میرے لیے ٹھنڈا مشروب لائیں۔ مقامی رواج کے مطابق انہوں نے گھونگھٹ نکال رکھے تھے۔ ان کے لباس لمبے سفید لبادوں پر مشتمل تھے' ہاتھوں میں پتھر اور دھات کی درجنوں چوڑیاں تھیں۔ ایسی چوڑیاں بوب لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھی تھیں مگر ان کے لباس مقامی خواتین سے مختلف تھے۔ بوب لڑکیوں کے لباس سرخ لبادوں پر مشتمل تھے اور ان کے پورے بازو کندھوں کی گولائیوں تک عریاں نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ بوب لڑکیاں پردہ بھی نہیں کرتی تھیں۔

بوب لڑکیوں کی حرکات و سکنات بالکل جانوروں جیسی تھیں' وہ اردگرد کی ہر شے کو خالی خالی نظروں سے یا حیرانی سے دیکھتی تھیں۔ اجنبی چہرے کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی تھیں' اگر پیار سے ان کے سر اور جسم پر ہاتھ پھیرا جاتا تو پالتو جانور ہی کی طرح شانت دکھائی دینے لگتی تھیں۔

میں اس بوب لڑکی کے قریب گیا جس کی شادی سردار رانفے سے کرائی جانی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی' لیکن جب میں نے نرمی سے اس کے سر اور کندھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ "ریلیکس" دکھائی دینے لگی۔ وہ دیگر لڑکیوں کی طرح کچھ بول نہیں سکتی تھی' صرف حلق سے ناقابل فہم آوازیں ہی نکال سکتی تھی۔ میں نے شربت کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے بالکل کسی پالتو جانور ہی کے انداز میں اپنا چہرہ تھوڑا سا پیچھے ہٹایا اور حلق سے ناپسندیدگی کی مدھم آواز نکالی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ننھے تابی کے لیے چند ٹافیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دو تین ٹافیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے ایک ٹافی کھول کر اسے دی۔ اس نے پکڑنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ میں نے ٹافی اس کے منہ کی طرف بڑھائی۔ اس نے اپنی خوب صورت سرخ سرخ زبان نکال کر ٹافی کو دو بار چکھا' پھر ذرا تذبذب سے ٹافی منہ میں ڈال لی۔ میں نرمی سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے زندگی میں کئی قتل کیے تھے تاہم اس معصوم لڑکی کو قتل کرتے ہوئے میرا دل ڈول رہا تھا۔۔۔ لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے تھوڑا سا بے رحم بننا پڑے گا۔ یہ لڑکی زندہ رہتی تو پھر شاید بہت سے لوگوں کو مرنا پڑتا۔ مردوں' عورتوں اور بچوں کی ان گنت لاشیں اس کالونی کے گلی کوچوں میں بکھری دکھائی دیتیں۔ یہ بوب لڑکی جس کا کوئی نام نہیں تھا کوئی خاندان نہیں تھا صرف بھینٹ چڑھائے جانے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ اسی مقصد سے اسے پالا گیا تھا' اسی مقصد سے کھلایا پلایا گیا تھا۔ آج اس کی بھینٹ چڑھنے کا وقت آ گیا تھا۔ افسوس کا مقام یہ تھا کہ یہ بھینٹ مجھے چڑھانی پڑ رہی تھی۔

میں نے جیب میں موجود ساری ٹافیاں اور دو بڑی چاکلیٹ اسے کھلا دیں۔ یہ کھانے پینے کی آخری چیزیں تھیں جو اس کے حلق سے نیچے اتر رہی تھیں۔ سردار رانفے کی بیویاں میرے سامنے مشروب رکھ کر باہر جا چکی تھیں۔ ایک بوب دوشیزہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ دوسری کسی لاوارث بکری کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ پلک جھپکنے میں' میں نے بوب لڑکی کی گردن اپنے دائیں بازو کی مخصوص گرفت میں لی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی' میں نے ایک بے رحم جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی مدھم آواز میرے کانوں میں آئی۔ اس کا جسم ایک دم تڑپ کر مچلا۔ اس سے پہلے کہ دوسری بوب لڑکی میری طرف دیکھ پاتی' میں مقتول لڑکی کو بازو کی گرفت سے آزاد کر چکا تھا۔ دوسری لڑکی نے صرف اتنا دیکھا کہ اس کی ساتھی' کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دھڑام سے بستر پر گری اور اینٹھ کر ساکت ہو گئی۔

زندہ لڑکی کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں اور وہ ایک گوشے میں سمٹ گئی۔ اس کی آوازیں سن کر سردار رانفے کی بیویاں اور دو ملازمائیں بھاگی آئیں۔ میں نے اشاروں سے انہیں بتایا کہ رانفے کی ہونے والی دلہن اچانک گر گئی ہے۔ وہ اسے ہلانے جلانے لگیں۔ ایک اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگی' دوسری پانی کے لیے دوڑی۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتی تھی کہ بھینٹ کے لیے پالی جانے والی

بے نام بوب لڑکی اپنی بھینٹ چڑھا چکی ہے۔ عورتوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں دھیمے قدموں سے باہر نکل آیا۔

○☆○

بوب لڑکی کے مرنے سے وہ مسئلہ ختم ہو گیا جس نے قریباً تیس ہزار قبائلیوں کی طاقت میں آناً فاناً دراڑیں ڈال دی تھیں۔ اس مسئلے کی وجہ سے قبائلیوں کے دلوں میں سائیں عالی کی غیر مشروط وفاداری میں جو فرق آیا تھا' وہ بھی یکسر ختم ہو گیا۔ مزید بہتری یوں ہوئی کہ اسی رات گیارہ بجے کے لگ بھگ بوکارلو نے قبائلیوں کے جم غفیر کے سامنے ایک نہایت مؤثر تقریر کی۔ اس تقریر نے اس جم غفیر کے دلوں سے شکوک و شبہات دور کرکے انہیں پھر سے ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور ان کے سارے جوش اور غضب کا رخ نرسٹ کی طرف پھیر دیا۔ بوکارلو کی جادوئی شخصیت کی طرح اس کی یہ تقریر بھی جادو بھری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ تقریر نہیں کر رہا' اپنے کسی معمول کو ہپناٹزم کر رہا ہے۔ بوب لڑکی کی اچانک موت کے بارے میں کسی کو بھی حقیقت معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اس کی گردن کی ہڈی پراسرار طور پر ٹوٹی ہوئی ملی تھی۔ لارسیوں کا خیال تھا کہ یہ ہڈی گرنے سے ٹوٹی ہے' وہ اس واقعے کو دیوتاؤں کا چمتکار سمجھ رہے تھے۔

اگلا روز بھی خیر خیریت سے طلوع ہوا اور دوپہر تک پہنچ گیا۔ نرسٹ اور انتظامیہ کی طرف سے شدید حملے کی خبر غلط ثابت ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ان لوگوں کو بھی کالونی کی بدلی ہوئی صورت حال کا علم ہو گیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ وہ قبائلیوں اور لارسیوں کی جس اندرونی افراتفری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے وہ ختم ہو گئی ہے' اور اب انہیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ تین ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوئے۔ یقیناً انہوں نے اپنے نیچے صحرا نشینوں کا ایک عظیم الشان اجتماع دیکھا۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر اس اجتماع کے اردگرد چکراتے رہے' پھر دور چلے گئے۔ یقیناً وہ باقی صحرا کا نقشہ دیکھنے گئے تھے۔ کالونی کی طرف آنے والے مختلف راستوں پر لارسیوں اور دیگر قبائلیوں کی آمد ہنوز جاری تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی ٹولی بلند آواز سے نعرے لگاتی ہوئی اس عظیم الشان ہجوم میں شامل ہو جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر پھر واپس آ گئے۔ انہیں دیکھ کر ہزاروں قبائلیوں نے اپنے ہتھیار ہوا میں لہرائے اور معاندانہ نعرے بازی کی۔ ہیلی کاپٹر بہت نیچی پرواز نہیں کر رہے تھے' شاید انہیں فائرنگ کا بھی خوف تھا۔ بلندی ہی سے انہوں نے طاقت ور لاؤڈ

اسپیکروں کے ذریعے مقامی زبان میں ہجوم کو کچھ ہدایات دینا شروع کردیں۔ بس دو تین فقرے ہی تھے جو بار بار دہرائے جا رہے تھے۔ موفل نے بتایا کہ ہجوم کو منتشر ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے اور دھمکایا جا رہا ہے کہ اگر کسی نے قانون کے مجرموں کو پناہ دینے کی کوشش کی تو حکومت ان کے ساتھ نہایت سختی سے نمٹے گی۔

میں نے موفل سے پوچھا "تمہارے خیال میں مجرم کون لوگ ہیں؟"

"ہم سب' جنہوں نے کنگ کے لختِ جگر کو اغوا کیا اور اپنے پاس یرغمال بنائے رکھا۔"

"یعنی اسقی کو یرغمال بنانے والے مجرم ہیں اور سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو ساری زندگی کے لیے غلام بنانے والا بردہ فروش حکومت کی اور انتظامیہ کی گود میں بیٹھا ہے۔"

موفل سر ہلا کر رہ گیا۔ اچانک وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ایک طرف سے تڑ تڑ کی خوفناک آوازیں آئیں۔ ایک ہیلی کاپٹر پر دو بھاری گنوں سے تابڑ توڑ فائرنگ کی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر کے ایک حصے سے دھواں بلند ہونے لگا اور وہ ایک طرف کو جھک گیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد ہیلی کاپٹر تیزی سے واپس مڑ گئے۔ زخمی ہیلی کاپٹر واضح طور پر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور اپنے پیچھے دھوئیں کی لمبی لکیر چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بلند و بالا کھجور کے درخت یا پام سے ٹکرا جائے گا۔ کچھ ہی دیر بعد تینوں ہیلی کاپٹر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ان کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔ قریباً تیس ہزار سیاہ فاموں کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ وہ ایک سیلابِ بے اماں کی طرح ماریا ٹرسٹ کی طرف یلغار کرنا چاہتے تھے۔

اسی دوران میں میری نگاہ بوکارلو پر پڑی' وہ کچھ لارسی سرداروں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ انہیں سمجھا رہا تھا کہ وہ اپنے اپنے قبیلے اور گروہ کے لوگوں کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ میں اور موفل بھی بوکارلو کے پاس چلے گئے۔ پچھلے ایک دو واقعات میں میرا کردار دیکھنے کے بعد بوکارلو مجھ پر خاطر خواہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا "ہیلی کاپٹروں پر ماریطانیہ کے جھنڈے تم نے بھی دیکھے ہوں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ انتظامیہ پوری طرح کنگ کا ساتھ دے رہی ہے اور اب ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کے بعد یہ انتظامیہ اور بھی مشتعل ہو جائے گی۔"

"یہ بات تو یقینی ہے جناب۔" میں نے تائید کی۔

بوکارلو نے قبائلیوں کے بے کراں ہجوم کی طرف اشارہ کیا "یہ لوگ بہت بپھرے ہوئے ہیں لیکن صرف جوش کے زور پر ٹرسٹ اور انتظامیہ کی مشترکہ طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک یہ بہت بڑا اور پرجوش ہجوم ہے لیکن اگر پولیس اس ہجوم پر گولی چلانے پر آمادہ ہو گئی تو لاشیں بھی ان گنت ہی گریں گی۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ ابھی یہ ہجوم ٹرسٹ کی طرف پیش قدمی نہیں کرے۔"

"نہیں۔۔۔ پیش قدمی تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں بے گناہ لارسیوں کی جانیں بھی بچانا چاہتا ہوں۔" بوکارلو کی بڑی بڑی خواب ناک آنکھوں میں الجھن کے گرداب تھے۔

الجھن میں ڈوب کر میں بھی اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔ پریشانی میں' میں اکثر غزالہ سے مشورہ کر لیا کرتا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک بہت اچھی ڈاکٹر ہی نہیں ایک اچھی مشیر بھی ہے۔ ہم نے شام کی چائے اپنی رہائش گاہ کی چھت پر پی۔ یہاں سے کالونی کے پختہ مکان دور تک نظر آتے تھے اور اس سے آگے حدِ نگاہ تک خیمہ بستیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اپنے اپنے ٹھکانوں کی شناخت کے لیے مختلف گروہوں نے جھنڈے وغیرہ بھی لگا رکھے تھے۔ کہیں لمبے لمبے بانسوں پر مختلف اشیا لٹکا دی گئی تھیں تاکہ ایک ہی جیسے خیموں کے ہجوم میں اپنی منزل تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ تین روز پہلے ٹرسٹیوں نے اسقی کو چھڑانے کے لیے جو خوفناک اٹیک کیا تھا اس میں ہماری رہائش گاہ کا ایک حصہ تقریباً تباہ ہو گیا تھا۔ اس حصے کی تعمیرِ نو کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے غزالہ سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور بوکارلو کی پریشانی بھی بیان کی۔ غزالہ بولی "آپ کے اندیشے بجا ہیں۔ انتظامیہ مکمل طور پر ٹرسٹ کے ساتھ ہے۔ ہیلی کاپٹر پر فائرنگ والے واقعے کے بعد انتظامیہ اور پولیس کا رویہ قبائلیوں کے خلاف مزید سخت ہو جائے گا۔ ہجوم بے شک بہت بڑا ہے مگر جتنا بڑا ہجوم ہے اتنی ہی زیادہ ہلاکتوں کا بھی خطرہ ہے۔"

"پھر کیا ہونا چاہیے؟"

"پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اس مسئلے کی چابی کسی سائیں عالی کے پاس ہی ہو گی۔"

"لیکن اس چابی کا کیا فائدہ جب تالا ہی توڑنا پڑ جائے۔"

"آپ نے بھی تو ہمیشہ سائیں سے اکھڑے اکھڑے بات کی ہے۔ ذرا پیار محبت سے کام لینے کی کوشش کریں' ہو سکتا ہے فائدہ ہو جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی پنڈلیاں دبانا شروع کر دوں۔"

"لیکن ویسے بھی تو نہ کریں جیسے آپ کرتے ہیں۔ سائیں کی صلاحیتوں سے انکار کرنا اب ہم میں سے کسی کے لیے ممکن نہیں ہے اور میرے خیال میں آپ کے لیے بھی نہیں ہے۔"

دس پندرہ منٹ بعد میں ایک بار پھر سائیں عالی کی طرف جا رہا تھا' اس مرتبہ صفدر میرے ساتھ نہیں تھا۔ سروج نے ایک بار پھر سائیں تک رسائی میں میری مدد کی۔ سائیں۔۔۔ قیلولہ کر رہا تھا۔ حالانکہ شام ہو چکی تھی مگر وہ اب تک سویا ہوا تھا۔ اگر اس کی باقی کرامات کو نظرانداز کر کے صرف اس کے سونے کا انداز ہی دیکھ لیا جاتا تو اسے صاحبِ کرامات مانا جا سکتا تھا۔ وہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے سویا ہوا تھا۔ چولا الٹ گیا تھا اور اس کی میلی کچیلی چڈی اور پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ کمرے میں باقاعدہ اس کے خراٹے گونج رہے تھے "سائیں عالی" میں نے اسے پکارا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

میں نے دو تین بار دہرایا لیکن جب کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے جھلا کر زور سے "سائیں عالی" کہا۔

وہ دھڑام سے نیچے گرا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا "تم۔۔۔ تم اتنی زور سے کیوں بولے ہو؟" وہ غرایا۔

میں نے اپنی جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے نرم لہجہ اختیار کیا "میں غلطی پر معذرت چاہتا ہوں۔ میں بہت دیر سے پکار رہا تھا لیکن تم سن نہیں رہے تھے۔"

"جھوٹ بولتے ہو' تم نے صرف تین بار پکارا ہے اور میں نے سنا ہے۔"

"تو پھر بولے کیوں نہیں تھے؟"

"بے وقوف میں سو رہا تھا۔"

"اچھی بات ہے؟ سو بھی رہے تھے اور سن بھی رہے تھے۔"

"میں سوتے ہوئے بھی سنتا ہوں اور سنتے ہوئے بھی سوتا ہوں۔ بڑا اچھا سپنا دیکھ رہا تھا۔ پرستان میں نئے الیکشن کا اعلان ہوا ہے۔ ووٹر کی کم از کم عمر اڑھائی سو سال سے دو سو سال کر دی گئی ہے۔ دو سو سال کا جن تو بس بچہ ہی ہوتا ہے۔ بہرحال اور وہ بھی جن کا۔۔۔ الیکشن مذاق بن کر رہ جائیں گے۔ بہرحال نوجوان "جن" اس اعلان پر بہت خوش تھے اور بازاروں میں ہم عمر پریوں کے ساتھ ہوش ربا رقص کر رہے تھے' اتنے میں تم نے آ کر جگا دیا۔"

میں نے کہا "سائیں! تم اتنے بے خبر نہیں ہو جتنا بنتے ہو۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ تم ہم سے زیادہ ہی جانتے ہو۔ گزرنے والے ہر منٹ کے ساتھ حالات سنگین ہو رہے ہیں۔ ابھی سہ پہر کے وقت ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کا واقعہ ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ہیلی کاپٹر تباہ ہی ہو گیا ہو۔ ڈر اس بات کا ہے کہ کنگ براؤن مقامی انتظامیہ کے ساتھ مل کر قبائلیوں کو تہس نہس کروا لے گا۔ کنگ براؤن کا راستہ بس ایک بات نے روک رکھا تھا۔ اسقی ہماری تحویل میں تھا' اب اسقی ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

"مادی چیزوں پر بھروسا کیوں کرتے ہو۔ مادی چیزیں تو ہاتھ سے نکل ہی جاتی ہیں۔ بہرحال اب کیا چاہتے ہو؟"

"اس مسئلے کا حل۔"

"اس مسئلے کا حل مرغی کے نیچے ہے۔"

"مرغی کے نیچے؟ کیا مطلب؟"

"کھاحڑا! مرغی کے نیچے کا مطلب ہے مرغی کے نیچے۔ ساتھ والے کمرے میں جو مرغی بیٹھی ہوئی ہے اس کے نیچے۔"

"تم پھر مذاق کر رہے ہو۔"

"مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ جاؤ جا کر دیکھو۔" سائیں نے آنکھیں نکالیں۔

چار و ناچار' میں ساتھ والے کمرے میں گیا۔ نیم تاریک گوشے میں دڑبا پڑا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دھیان سے اندر جھانکا۔ نسواری رنگ کی دیسی مرغی انڈوں پر بیٹھی تھی۔ مرغی کے ارد گرد بھی دڑبے میں کچھ نہیں تھا۔

میں نے واپس جا کر سائیں سے کہا "مرغی کے نیچے تو انڈے ہیں۔"

وہ بولا "اوئے کھوتے! وہ انڈے نہیں تیرے مسئلے کا حل ہے۔ مرغی انڈوں پر نہیں تیرے مسئلے کے حل پر بیٹھی ہے۔ جا ذرا غور سے دیکھ۔"

میں سمجھ گیا کہ سائیں اشاروں کنایوں میں بات کر رہا ہے۔ اگر وہ اتنی شدت سے ایک بات کہہ رہا تھا تو پھر یقیناً اس میں کوئی رمز تھی۔

میں واپس اس دوسرے کمرے میں گیا۔ میں نے دڑبے کا دروازہ کھولا۔ میرا ارادہ انڈوں پر سے مرغی کو ہٹانے کا تھا۔ اسی دوران میں سروج چیل کی طرح میری طرف آئی۔

"شاہ جہاں! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"مرغی کو انڈوں سے مت ہٹانا۔ سائیں جی سے مار پڑ جائے گی مجھے۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ کہتے تھے کہ اگر مرغی انڈوں سے ہٹ گئی تو انڈے ٹھنڈے ہو جائیں گے اور اگر مرغی سے بچے نہ نکلے تو پھر میں تم سے بچے نکلواؤں گا۔"

"اگر تمہارے ساتھ ایسا ہوا تو یقیناً ہمیں بہت خوشی ہوگی۔" میں نے مرغی کو گردن سے پکڑ کر دڑبے سے باہر پھینک دیا۔

مرغی کے نیچے انڈے تھے اور انڈوں کے درمیان ایک چھوٹا سا سفید ٹرانس میٹر پڑا تھا۔ ٹرانس میٹر دیکھ کر میرے دل میں امید کی کرن نمودار ہوئی۔ میں نے ٹرانس میٹر اٹھایا۔ ایک کھٹکا دبایا تو ٹرانس میٹر کا بالائی حصہ کھٹ سے کھل گیا۔ یہاں باقاعدہ مائیک موجود تھا اور چھوٹی سی راڈ بھی لگی ہوئی تھی۔ میں حیران سروج اور پریشان مرغی کو چھوڑ کر واپس سائیں کے پاس جا پہنچا۔ راڈ کھینچ کر میں نے ایک سبز بٹن دبایا تو ٹرانس میٹر سے سگنل جانا شروع ہو گیا۔ سائیں عالی دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے تسلی ہوئی کیونکہ اگر میں کوئی غلط کام کرتا تو سائیں مجھے ٹوک سکتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد طاقت ور ٹرانس میٹر سے ایک آواز ابھری اور اس آواز نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ یہ امریکی ارب پتی مسٹر جی کلارک کی آواز تھی۔

"ہیلو مسٹر کلارک! میں شاہ جہاں بول رہا ہوں۔ اوور!"

دوسری طرف چند لمحے سناٹا رہا پھر مسٹر کلارک کی تحیر میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری "اوہ شاہ جہاں! تمہاری آواز سننے کو تو کان ترس گئے تھے۔ اوور!"

"ادھر بھی یہی حال ہے جناب! ہم سب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟ اوور۔"

"میں اس وقت KAEDI میں موجود ہوں۔ یہ ایک کافی بڑا شہر ہے اور جس جگہ تم موجود ہو یہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ شاید تمہیں یہ سن کر خوشی ہو کہ میں اس وقت اس شہر کے کرتا دھرتا بلکہ اس پورے صوبے کے کرتا دھرتا گورنر محمد خونا کے پاس بیٹھا ہوں۔ علاقے کا پولیس چیف اور مقامی انتظامیہ کے کچھ دیگر عہدے دار بھی یہاں موجود ہیں۔ اوور!"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جناب! ہم یہاں سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ دراصل یہاں قبائلیوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو چکا ہے' اندازاً تیس سے چالیس ہزار قبائلی ہیں۔ وہ بے حد مشتعل بھی ہیں۔ ابھی چند گھنٹے پہلے یہ ہیلی کاپٹر یہاں آئے تھے' قبائلیوں نے ان پر فائرنگ کی ہے اور ایک ہیلی کاپٹر کو نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں خطرہ ہے کہ کنگ براؤن مقامی انتظامیہ کو ساتھ ملا کر ہم پر چڑھ دوڑے گا۔ اوور۔"

"اب ایسا کچھ نہیں ہوگا' تم بے فکر رہو اور ساتھیوں کو بھی تسلی دو۔ تمہاری طرف کے سارے حالات میرے علم میں ہیں اور پل پل کی خبر مل رہی ہے۔ تم ٹرانس میٹر کے قریب ہی رہو۔ میں ابھی چند منٹ بعد تمہیں خود کال کرتا ہوں۔ اوور اینڈ آل!"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سائیں عالی نے "شفیع محمد۔ تو میری ہر بات کو مذاق میں لیتا ہے۔ تجھ سے کہا تھا نا کہ مرغی انڈوں پر نہیں بیٹھی تیرے مسئلے کے حل پر بیٹھی ہے۔" اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا "ویسے شفیع محمد! تو بڑا لچرا۔ بردہ فروشوں کی طرح بچوں کو ٹافیاں کھلاتا ہے اور ان کی جان لے لیتا ہے۔" سائیں کے معنی خیز لہجے نے بری طرح چونکا دیا۔

میرا دھیان آپوں آپ اس بوب لڑکی کی طرف چلا گیا جو کل میرے ہاتھوں قتل ہوئی تھی۔ سائیں کا اشارہ یقیناً اسی واقعے کی طرف تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس موقع پر سائیں کے سامنے خاموش ہی رہوں۔

قریباً دس منٹ بعد سفید رنگ کے گول مٹول ٹرانس میٹر پر سگنل موصول ہوا۔ دوسری طرف حسب توقع مسٹر کلارک ہی تھے۔ اس سے پہلے جب ان سے بات ہوئی تو پس منظر میں کچھ دوسرے لوگوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں لیکن اب مکمل خاموشی تھی۔ یقیناً مسٹر کلارک نے تنہائی ڈھونڈ لی تھی۔ انہوں نے تیزی سے کہا "شاہ جہاں! میں نے مقامی ایڈمنسٹریشن کے اعلیٰ عہدے داروں سے بات کی ہے۔ بے شک اس سے پہلے کچھ لوگ کنگ براؤن کی طرف داری کر رہے تھے مگر اب سب ٹھیک ہے۔ آج شام دو پولیس افسر فوری طور پر معطل ہو گئے ہیں۔ باقی بے حد ہو گئے ہیں۔ اوور!"

"سر! یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔ آپ نے اچھے موقع پر ایک بڑا اچھا قدم اٹھایا ہے۔ میں سوچ بھی سکتا تھا کہ اس طرح اچانک آپ کی اعانت اور توجہ حاصل ہو جائے گی۔ میرے خیال میں آپ رہنمائی کرنے کی بہترین پوزیشن میں ہیں۔ ہمیں بتائیں کہ اب ہمیں

چاہیے۔ اوور!"

مسٹر کلارک نے کہا "میرے خیال میں تو یہ عمل کا وقت ہے۔ جتنا بڑا ہجوم یہاں جمع ہو گیا ہے اس کی توقع شاید کسی کو بھی نہیں تھی۔ دراصل یہ اجتماع اس دیرینہ ظلم کے خلاف ایک قدرتی ری ایکشن ہے جو کنگ نے یہاں روا رکھا ہوا تھا۔ اس عظیم اجتماع سے فائدہ نہ اٹھانا سراسر غلطی ہوگی۔ اوور!"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو ٹرسٹ کی طرف مارچ کی ہدایت کر دی جائے؟ اوور!"

"کیا وہ اس کام کے لیے تیار ہیں۔ اوور؟"

"انہیں روکنا مشکل ہو رہا ہے۔ اوور۔"

"تو ٹھیک ہے شاہ جہاں۔ سائیں صاحب کے ذریعے یا مسٹر بوکارلو کے ذریعے ان لوگوں کو مارچ کی ہدایت کر دو۔ ہجوم کے آگے چلنے والے لوگ اپنے ہتھیار تیار رکھیں لیکن انہیں ظاہر نہ کریں۔ اور جب تک ان پر گولی نہ چلائی جائے وہ بھی گولی نہ چلائیں۔ اوور۔"

"جناب قبائلیوں کے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ کیا وہ بھی اس مارچ کا حصہ بننے جائیں؟ اوور۔"

"اگر انہوں نے مارچ میں شریک ہونا ہے تو پھر بہتر ہے کہ وہ عقب میں رہیں۔ ہراول دستوں سے ان کا فاصلہ تقریباً ایک فرلانگ رہنا چاہیے' تاکہ کسی بھگدڑ کی صورت میں یہ لوگ نقصان سے محفوظ رہیں۔ اوور۔"

مارچ کے حوالے سے کچھ دیر تک میرے اور مسٹر جی کلارک کے درمیان گفتگو ہوئی پھر مسٹر کلارک کی ہدایت پر میں نے بوکارلو کو بھی ادھر ہی بلا لیا۔ مسٹر کلارک نے بوکارلو کے ساتھ بھی صلاح مشورہ کیا۔ سب کا خیال یہی تھا کہ ماریا ٹرسٹ پر ایک کاری ضرب لگانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مسٹر کلارک نے ہمیں اپنی طرف سے پوری تسلی دے دی اور کہا کہ مقامی انتظامیہ کو کافی حد تک ہوش آ گیا ہے۔

صلاح مشورے کے بعد پروگرام یہ بنا کہ چند گھنٹے بعد صبح کا اجالا نمودار ہوتے ہی مارچ کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ توقع رکھنا تو فضول تھا کہ سائیں عالی ہماری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کو مارچ کا حکم دے گا' لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ مارچ کا اعلان مسٹر بوکارلو کریں گے۔ بہرحال لوگوں کو الرٹ رکھنے کے لیے اسی وقت لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے یہ اعلان کر دیا گیا کہ علی الصباح بوکارلو کی طرف سے ایک نہایت اہم اعلان کیا جائے گا۔

جیسے تیسے رات گزر گئی۔ صبح کا اجالا نمودار ہوتے ہی سائیں عالی کی قیام گاہ کے سامنے اور ارد گرد عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آنے لگا۔ سیکڑوں جھنڈے لہرا رہے تھے' برچھیاں اچھل رہی تھیں اور لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ابھی سورج نمودار نہیں ہوا تھا جب مسٹر بوکارلو بلند چبوترے پر نمودار ہوئے۔ لوگوں کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا۔

مسٹر بوکارلو نے اپنا اکلوتا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اسے بار بار لہرا کر لوگوں سے درخواست کی کہ وہ خاموش ہوں تاکہ لاؤڈ اسپیکروں کی آواز ان کی سماعت تک پہنچ سکے۔ ہجوم بتدریج خاموش ہوتا چلا گیا۔ جب لوگ پوری طرح متوجہ ہو گئے تو بوکارلو نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولنے کے لیے اپنا منہ مائیک سے نزدیک کیا لیکن اس سے پہلے کہ بوکارلو کے منہ سے پہلا لفظ نکلتا ایک طرف سے سائیں عالی بھی نمودار ہو گیا۔ اس کا کھلا لبادہ صبح کی ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا اور طویل عصا دائیں ہاتھ میں تھا۔ سائیں کو دیکھ کر ہزاروں قبائلیوں کے ہجوم میں مد و جزر پیدا ہوا اور وہ بلند نعرے لگانے لگے۔ بوکارلو نے بڑے خلوص سے سائیں کو پیشکش کی کہ وہ مائیک پر آئے اور مترجم کے ذریعے اپنے عقیدت مندوں سے بات کرے۔ سائیں عالی نے نفی میں سر ہلا کر انکار کر دیا اور بوکارلو کو اشارے سے کہا کہ وہی لوگوں سے بات کرے۔

بوکارلو نے جب مارچ کا اعلان کیا تو ہجوم کا جوش و خروش نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ سیکڑوں مقامات پر ہوائی فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ کا شور تھما تو بوکارلو نے مارچ کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں۔ ان میں سے اہم ہدایت یہ تھی کہ جب تک مخالف سمت سے گولی نہ چلائی جائے مارچ کے شرکا بھی فائرنگ نہیں کریں گے۔ بوکارلو کا خطاب اختتام پذیر ہوا تو سائیں عالی جو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اچانک اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے ایک قبائلی کے ہاتھ سے خاکستری رنگ کا بہت بڑا جھنڈا لیا۔ اس جھنڈے کو اس نے ہوا میں لہرایا اور مقامی زبان میں ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔ اس نعرے کے ساتھ اس نے جھنڈے کو جو حرکت دی اس کا مطلب یہی تھا کہ لوگ اس کے پیچھے چل پڑیں۔

سائیں عالی کے اس اشارے نے عوام الناس پر وہی اثر کیا جو بارود پر آگ کرتی ہے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھا اور تیس چالیس ہزار مفلوک الحال قبائلی حرکت میں آ گئے۔ ٹرسٹ کی طرف پیدل مارچ شروع ہو چکا تھا۔ یہ مظلوم کی پیش قدمی ظلم کی طرف تھی۔

○☆○

سائیں عالی کی بسائی ہوئی انوکھی بستی "کالونی" سے ماریا زسٹ تک کا سفر خاصا طویل تھا۔ تاہم خاص راستوں پر سفر کرتے ہوئے مارچ کے شرکا شام چار بجے کے لگ بھگ زسٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ دن بھر کی دھوپ اور مشقت نے ان کے جسموں کو نڈھال کیا تھا مگر ان کی روحیں سورج کی پہلی کرن کی طرح توانا اور تر و تازہ تھیں۔ گرد سے اٹے ہوئے مدقوق چہروں پر ایک ایسی تپش تھی جو ظلم اور جبر کی ہر نشانی کو راکھ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں کبھی زندگی میں سائیں عالی کا یہ روپ دیکھوں گا۔ حیران کن برداشت اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائیں نے صبح سے اب تک وہ خاکستری جھنڈا اٹھائے رکھا تھا جس کے اشارے سے اس نے تیس چالیس ہزار کے ہجوم کو حرکت دی تھی۔ ننگے سر ننگے پاؤں، بغیر پانی کا ایک گھونٹ پیے سائیں بڑھا چلا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے بپھرے ہوئے انسانوں کا ایک سیلاب تھا۔ سائیں سے ذرا پیچھے بوکارلو تھا اور بوکارلو کے ساتھ سردار رانے کی نمائندگی کرتے ہوئے گارو چل رہا تھا۔ اس سے پیچھے درجہ بدرجہ لارسی اور قبائلی سردار تھے۔ گاہے گاہے نعروں کی گونج سے قرب و جوار لرز اٹھتے تھے۔ دوپہر سے کچھ دیر بعد صرف ایک مرتبہ کافی فاصلے پر دو ہیلی کاپٹروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تھی' اس کے علاوہ اب تک اس مارچ کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی۔ کہیں زسٹی گارڈز کی منحوس نیلی وردیاں دکھائی دی تھیں اور نہ پولیس نظر آئی تھی۔ راستے میں آنے والے دیہات اور چھوٹی موٹی بستیوں کے لوگ بھی اس ہجوم میں شامل ہوتے گئے تھے اور ہجوم کا پھیلاؤ مزید بڑھ گیا تھا۔ زسٹ کے در و دیوار نظر آئے تو نعروں کی گونج چار سو پھیلنے لگی۔ میں صفدر' زریں اور موبل اگلی صفوں میں تھے۔ میرے ہاتھ میں چھوٹی نال کی خودکار رائفل تھی' زریں اور موبل بھی مسلح تھے۔ ہجوم زسٹ کے مین گیٹ سے قریباً نصف فرلانگ دور تھا جب زسٹ کی عمارت سے پہلی گولی چلی۔ اس کے بعد زسٹ کی فصیل نما دیواروں سے تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس فائرنگ میں 'جی تھری' سیون ایم ایم' ایل ایم جی اور مشین گن جیسے ہتھیار استعمال کیے جا رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں درجنوں افراد زخمی ہوئے اور تڑپنے لگے۔ میں نے سائیں عالی کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا' بوکارلو خود ہی اوندھے منہ گر گیا تھا۔ ہجوم کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہوئی۔ پروگرام کے مطابق یہ فائرنگ صرف اگلی دو صفوں میں سے ہو رہی تھی۔ یہ اتنی شدید فائرنگ تھی کہ کچھ دیر کے لیے میدان جنگ کا سا منظر نظر آیا۔

اس شدید فائرنگ کی آڑ لے کر درجنوں جانباز زسٹ کی فصیل نما دیواروں کی طرف بڑھے۔ ان کے کندھوں پر بانس کی ہلکی پھلکی مگر طویل سیڑھیاں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی درجن سیڑھیاں زسٹ کی دیوار سے جا لگیں۔ اچانک میری نگاہ زریں گل پر پڑی۔ میں حیران رہ گیا۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ ہمارے پہلو سے نکل کر سیڑھی بردار جانبازوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹی نال کی خودکار رائفل تھی۔ میں نے اسے بڑی دلیری سے ایک سیڑھی پر چڑھتے دیکھا۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں اس کی چمکیلی ٹوپی دور ہی سے نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر جنگ جو پٹھان کی روح پوری طرح بیدار ہو گئی ہے اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہے۔ وہ لالے سدھیر کا عقیدت مند تھا مگر اس وقت اسے لالہ سدھیر بھی دیکھتا تو رشک کرتا۔ یہ کوئی فلمی لڑائی نہیں تھی۔ زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ اس خون ریز شوٹنگ میں غلطی کرنے سے "کٹ" کی آواز نہیں آنا تھی' زندگی "کٹ" ہو جانا تھی۔

دو منٹ کے اندر کم و بیش دو سو لارسی جانباز زسٹ کی دیوار کے اوپر نظر آنے لگے۔ مین گیٹ کے قریب اور دائیں بائیں شدید لڑائی ہوئی۔ لڑائی نے طول کھینچا تو صفدر وغیرہ کو سائیں عالی کے پاس چھوڑ کر میں اور موبل بھی زسٹ کی بلند دیوار پر پہنچ گئے۔ لارسی جانبازوں کے ساتھ پوزیشن سنبھال کر ہم نے بھی قریباً پانچ منٹ فائرنگ کی۔ اچانک مزاحمت کرنے والے زسٹی اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ وہ اپنے پیچھے درجنوں لاشیں چھوڑ گئے تھے۔ نیچے احاطے میں بہت سے زخمی بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مارچ کے شرکا میں سے بھی بیس پچیس افراد کو گولی لگی تھی۔ ان میں سے کچھ ہلاک ہوئے تھے اور باقی زخمی تھے۔

لارسی حملہ آوروں نے سیڑھیاں اوپر کھینچیں اور دوسری طرف لگا کر زسٹ کے احاطے میں اترنا شروع ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر زسٹ کا مقفل دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔ مین دروازے کا کھلنا تھا کہ ہجوم کسی سیلابی ریلے کی طرح احاطے میں گھسنا شروع ہو گیا۔ میں بھی زریں گل اور موبل کے ساتھ نیچے اتر آیا تھا۔ یہ وہی احاطہ تھا جہاں چند ماہ قبل ہم بے بس قیدیوں کی حیثیت سے لائے گئے تھے۔ ہمیں مخصوص سفید لباس پہنائے گئے تھے اور احاطے کی بیرکوں میں بند کیا گیا تھا۔ زسٹ کے اندرونی حصے کو دیکھ کر گزرے ہوئے تمام شب و روز میری نگاہوں میں گھوم گئے۔

چند سیکنڈ کے اندر ایک پوری فلم چل گئی۔ اسی چار دیواری میں پٹاخے جیسی لڑکی سوزی سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ یہیں پر میں نے لمبے تڑنگے انچارج مرتعی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ زسٹ کے اس حصے کو "ہوسٹل" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی ہوسٹل تھا جہاں میں نے قید ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی روز سخت بے یقینی کی کیفیت میں گزار دیے تھے۔ ان دنوں یہاں ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی' نیلی دھاریوں والے سفید کپڑوں میں ملبوس لڑکیاں کشیدہ کاری اور قالین بافی میں مصروف نظر آتی تھیں۔ نگران نرم لہجے میں بات کرتے تھے اور ہر طرف امن اور شانتی کا دور دورہ تھا۔ مگر بعد ازاں ثابت ہوا تھا کہ یہ سب کچھ بہروپ ہے۔ زسٹ کا اصل روپ ہوسٹل نہیں وہ زیر زمین دنیا ہے جسے کیمپس کہا جاتا ہے اور جو ایک طویل سرنگ کے ذریعے ہوسٹل سے ملی ہوئی ہے۔

جب مشتعل قبائلی ہزاروں کی تعداد میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو گئے تو پھر بوکارلو نے ان کا رخ کیمپس کی طرف کر دیا۔ کیمپس تک جو طویل زیر زمین سرنگ جاتی تھی وہ دراصل لوہے کی ایک پرانی کان تھی جو اب متروک ہو چکی تھی۔ شروع شروع میں جب مجھے اس سرنگ کے ذریعے کیمپس لے جایا گیا تھا تو میری سواری ایک رنگین شیشوں والی اسٹیشن ویگن ہوا کرتی تھی۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی تھی' کانوں میں ڈاٹس دی جاتی تھیں اور سخت جانچ پڑتال کے مراحل سے گزارا جاتا تھا۔ آج اس سرنگ میں کوئی جانچ پڑتال اور کوئی نگرانی نہیں تھی۔ جہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی وہاں تک دھڑا دھڑ قبائلی ایک سیلاب کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ سارے کے سارے لوگ بوکارلو کی آنکھوں کے سحر میں جکڑ کر ٹرانس میں چلے گئے ہیں' اور اب بوکارلو انہیں جیسے اور جہاں چاہے استعمال کر رہا ہے۔ قبائلیوں کو کہیں مزاحمت پیش نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہر وہ فرد جس نے زسٹ کی نیلی وردی پہن رکھی ہے زمین میں سما گیا ہے یا آسمان نے اسے اٹھا لیا ہے۔ آثار سے صاف نظر آتا تھا کہ دو تین گھنٹے پہلے تک وہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ شاید ان کو توقع تھی کہ انتظامیہ پولیس فورس کے ذریعے ان کی بھرپور مدد کرے گی لیکن ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اجتماع میں شریک افراد کی تعداد بھی ان کے اندازوں سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آج شکست اور پسپائی کا دن ہے اور وہ پسپا ہو گئے تھے۔

انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر نے طویل سرنگ کو طے کیا اور اس مقام پر پہنچ گیا' جہاں بڑے سائز کی چار جدید لفٹیں نصب تھیں۔ ان لفٹوں کی مدد سے ہی کیمپس کی حیرت ناک زیر زمین دنیا میں اترا جا سکتا تھا' یہاں پہنچ کر ہجوم رک گیا۔ لفٹوں کے ذریعے بیک وقت سو سے زائد افراد نیچے نہیں جا سکتے تھے لیکن بوکارلو تو یہاں کا بھیدی تھا۔ کسی وقت اس نے اپنے بھائی کنگ کے ساتھ مل کر یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اسے یہاں کی سب اونچ نیچ معلوم تھی۔ وہ ایک کشادہ راہداری میں گھما کر ہجوم کو اسٹیل کے ایک بڑے سلائیڈنگ پھاٹک کے سامنے لے آیا۔ اس پھاٹک کو ایک پوشیدہ بٹن کے ذریعے کھولا گیا تو سامنے ایک ڈھلوان راہداری نظر آئی۔ یہ ڈھلوان راہداری بھی وہی کام کر رہی تھی جو لفٹوں نے کرنا تھا۔ ہجوم نے زور مارا اور چند ہی منٹ میں ہزاروں لوگ کیمپس کے اندر پہنچ گئے۔

یہاں کسی پوشیدہ پناہ گاہ سے ہجوم پر تھوڑی سی فائرنگ ہوئی لیکن جلد ہی اس فائرنگ کو خاموش کر دیا گیا۔ مشتعل ہجوم نے نیلی وردیوں والے پانچ چھ مسلح گارڈز کو پکڑ لیا اور پلک جھپکنے میں ان کی تکا بوٹی کر دی گئی۔ لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گارڈز کے سر کاٹ کر جسموں سے علیحدہ کر دیے اور انہیں دیواروں پر دے مارا۔

یہاں طویل بیرکوں میں سلاخوں کے پیچھے وہ سہمی ہوئی مخلوق نظر آئی جسے یہاں بردوں کا نام دیا جاتا تھا۔ وہ ہزاروں بردے تھے۔ ہر رنگ' ہر نسل اور ہر قوم کے۔ ان میں نازک اندام عورتیں بھی تھیں' معصوم بچے بھی اور جوان مرد بھی۔ ان آہنی سلاخوں کے پیچھے وہ سب بھیڑ بکریوں کی مثال تھے' کیوکو کی شامیں شائمیں ان کے روز و شب کا رخ متعین کرتی تھی آج ان کے ستم رسیدہ چہرے آہنی سلاخوں کے پیچھے حیران پریشان نظر آ رہے تھے۔ بہرحال ان لاتعداد بردوں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو صورت حال کو جان گئے تھے۔ ان کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے تھے۔

کیمپس کے در و دیوار سے گزرتے ہوئے مزید کئی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ مجھے آدم خور مائیکل یاد آیا اور اس کا وہ ظلم و ستم یاد آیا جو اس نے پروفیسر کی بیٹی شائستہ سے روا رکھا تھا۔ اس نے اپنے ظلم کی معراج کو یوں چھوا تھا کہ ایک دن اپنے ہی نومولود بچے کو کھا گیا تھا۔

کیمپس کے انہی در و دیوار میں مجھے کم سن کملا کی چیخیں بھی گونجتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ اپنے بچے سمیت بانسر

استقی اور اس کے دوستوں کے آگے اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگی تھی اور موت کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھی۔

انہی دیواروں میں حرص کے پجاریوں نے انو جیسی لڑکیوں کے ساتھ شیطان کو شرما دینے والے کھیل کھیلے تھے اور اسی چھت کے نیچے کہیں وہ ہال بھی تھا جہاں میں نے ان درجنوں نوجوانوں کے لاشے جھولتے ہوئے دیکھے تھے جنہوں نے کنگ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کی غلطی کی تھی۔

آج یہ در و دیوار قبائلیوں کے نعروں سے تھرا رہے تھے۔

"وہ دیکھیے جناب... وہ کیا ہے۔" صفدر نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں چونک گیا۔ وہ کیمپس کا وسطی حصہ تھا اور وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ آگ لگی ہے۔"

"بلکہ لگائی گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ پسپا ہوتے ہوئے گارڈز کا کام ہے۔" صفدر نے کہا۔

اسی دوران میں مدھم چیخیں بھی سنائی دیں۔ یہ دس بیس افراد کی چیخیں نہیں تھیں... نہ ہی سو پچاس افراد کی تھیں' یہ سیکڑوں افراد کی آہ و زاری تھی۔ کافی فاصلہ تھا اس لیے یہ آہ و زاری ایک گونج کی طرح سنائی دیتی تھی۔ مومل کی تیز سماعت نے یہ آوازیں شاید ہم سے بھی پہلے سن لی تھیں۔ وہ چند گز دور کھڑا تھا اور چیخ چیخ کر مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ صفدر اور میں مومل سمیت دھوئیں کی طرف بڑھے۔ پچیس تیس لارسی جانباز بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم دوڑتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں آگ نے ایک وسیع رقبے کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ لکڑی' لوہا' ہارڈ بورڈ اور پتھر' لگتا تھا کہ سبھی کچھ جل رہا ہے۔

اچانک زریں گل نے چیخ کر ہمیں مخاطب کیا "وہ دیکھیں استاد صیب۔ کنگ کا چھپکلا!"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ دھوئیں کے مرغولوں میں سے ایک بڑا چھپکلا تڑپتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ مگر وہ کنگ والا چھپکلا نہیں تھا اور نہ ہی وہ ایک تھا۔ وہ کئی چھپکلے تھے۔ آگ اور دھوئیں کی زد سے بچنے کے لیے وہ رینگتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کی زردی مائل آنکھیں دور ہی سے چمکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایسے چھپکلے یہاں کیمپس میں بہت تھے۔ ڈیڑھ دو درجن چھپکلے تو ماسٹر استقی نے ہی شیشے کے ایک بڑے بکس میں پال رکھے تھے۔ استقی اور اس کے یار دوست ان چھپکلوں کے ذریعے قیدی لڑکیوں کو خوف زدہ کرنے کا کام بھی لیتے تھے۔ ایسا ہی ایک منظر میں نے ایک مرتبہ خود "اے کلب" میں دیکھا تھا۔

چھپکلوں کو اپنی طرف رینگتے دیکھ کر لارسیوں اور دیگر قبائلیوں میں افراتفری کے آثار نظر آئے۔ چھپکلوں کی طرف پہلی گولی میں نے ہی چلائی تھی لیکن اس کے فوراً بعد تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ چند سیکنڈ کے اندر درجنوں چھپکلے نشانہ بنے اور ان کے خون کے چھینٹوں سے فرش سرخ ہو گیا۔

آگ لحہ بہ لحہ پھیلتی جا رہی تھی۔ تپش سے کھڑے ہونا محال ہو رہا تھا۔ جو لوگ اس آگ کی دوسری جانب تھے ان کی اذیت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر چند منٹ کے اندر کوئی حل نہ نکالا گیا تو پنجروں میں بند سیکڑوں مرد و زن دردناک موت سے دوچار ہو جائیں گے۔

اس زیر زمین دنیا میں آگ پر قابو پانے کا مکمل انتظام موجود تھا مگر افراتفری اور ہجوم کی وجہ سے ان سہولتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانا ممکن نہیں تھا پھر بھی بوکارلو کی ہدایت پر بوکارلو کے قریبی ساتھیوں نے بھرپور کوشش شروع کر دی۔ گیس اور پانی کے آگ بجھانے والے آلات کے ذریعے آگ پر قابو پانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی گئی۔ مگر آگ میں کچھ ایسا زور تھا کہ کسی خوں خوار عفریت کی طرح بڑھتی اور پھنکارتی چلی آ رہی تھی۔

اچانک مومل میرے قریب آیا اور اس نے سرگوشی میں کہا "جناب! یہاں کم از کم چار جگہیں ایسی ہیں جہاں سے گیس خارج ہو رہی ہے۔ یہی گیس آگ کو بجھنے نہیں دے رہی۔ شاید آپ کے کانوں تک آواز نہ پہنچ رہی ہو لیکن میں گیس خارج ہونے کی مدھم آواز سن رہا ہوں۔ یہ آواز اس طرف سے آ رہی ہے۔" مومل نے بڑے یقین سے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم سب مومل کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے قائل ہو چکے تھے اور دو تین بار ان صلاحیتوں سے قابل ذکر فائدہ بھی اٹھا چکے تھے۔ میں نے فوری طور پر بوکارلو کو اس بارے میں بتایا۔ بوکارلو نے کہا "اگر یہ بات درست ہے اور واقعی گیس خارج ہو رہی ہے تو پھر اس کا سدباب کیا جا سکتا ہے۔"

بوکارلو نے بتایا کہ قریباً سو گز آگے مین راہداری میں گیٹ والو موجود ہے جہاں سے اس سارے پورشن کی گیس بند کی جا سکتی ہے۔

اب مسئلہ اس گیٹ والو تک پہنچنے کا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ منٹ میں آگ مزید آگے بڑھ آئی تھی اور اب لکڑی اور اسٹیل کا وہ آرائشی پل بھی آگ کی زد میں تھا جو کیمپس کے اس حصے کو وسطی حصے سے ملاتا تھا۔ وقت بڑی تیزی سے

ہمارے خلاف گزر رہا تھا۔ ہم نے بڑی عجلت میں دو تین تجویزوں پر غور کیا لیکن کسی پر عمل ممکن نظر نہیں آیا۔

اچانک مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے صفدر کو دیکھا۔ اس نے ایک بڑا کمبل نما کپڑا اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور بڑی تیزی سے اس پل کی طرف بڑھ رہا تھا جو بری طرح آگ کی زد میں تھا اور جس کا نچلا حصہ تقریباً کوئلا بن چکا تھا۔ یہ نہایت خطرناک کام تھا بلکہ خودکشی کے مترادف تھا۔ "صفدر..." میں چلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا لیکن اتنے شور میں تو دس گز کے فاصلے سے بھی آواز کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے صفدر پل پر پہنچ گیا اور دوڑتا ہوا شعلوں میں گم ہو گیا۔ شاید وحشت کے عالم میں میں بھی اس کے پیچھے ہی لپک جاتا مگر زریں گل نے جو خود بھی چیخ رہا تھا' مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

میں اپنی جگہ سکتے کی حالت میں رہ گیا تھا۔ جن دیگر افراد نے بھی صفدر کو دیکھا تھا وہ دم بخود کھڑے تھے۔ یہ ایک خطرناک ترین فعل تھا۔ صفدر کے واپس آنے کی امید کھلی ہوا میں رکھے ہوئے مدھم چراغ کی طرح تھی۔ سب کچھ ہمارے سامنے ہوا تھا اور اب ہم جلتے ہوئے خالی پل کو دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

چند سیکنڈ گزرے اور یہ سیکنڈ صدیوں پر بھاری تھے۔

اچانک ہم نے محسوس کیا کہ آگ کا پھیلاؤ ایک دم کم ہو گیا۔ شعلوں کی وحشی پھنکاریں بھی دیکھتے ہی دیکھتے ماند پڑ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بہت سا دھواں چھت اور فرش کے درمیانی خلا میں بھرنا شروع ہو گیا۔ یقیناً یہ ان اشیا کا دھواں تھا جو جلتے جلتے اچانک بجھ گئی تھیں۔ اسی دوران میں میں نے صفدر کو دیکھا۔ وہ واپس آ رہا تھا۔ اس کے نیلے کمبل کو کئی جگہ سے آگ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا پورا جسم اس کمبل نما کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پل تک پہنچا۔ لگتا تھا' وہ زخمی ہے' جب وہ پل کے عین درمیان تھا' جلتا ہوا پل ٹوٹ گیا۔ ایک خوفناک آواز کے ساتھ پل کے ٹکڑے پندرہ بیس فٹ نیچے پانی کی آرائشی جھیل میں گرے اور اس کے ساتھ ہی صفدر بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اچانک میرا دایاں بازو کئی جگہوں سے ٹوٹ کر لٹک گیا ہے۔ وہ میرا بازو ہی تو تھا۔

سب سے پہلے میں اور زریں ہی پل کی طرف دوڑے تھے' لیکن اگر ہمارا خیال تھا کہ اس طرح صفدر کو ڈھونڈ لیں گے تو یہ خام خیال تھا۔ لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے کوئلہ ہو چکے تھے' جب وہ ایک ساتھ پانی میں گرے تو ایکا ایکی اتنا دھواں پیدا ہوا کہ قرب و جوار کی ہر شے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں سپاہی اپنے مرنے والے ساتھیوں اور دوستوں کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان کی لاشوں کو پھلانگ کر جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ کچھ یہی کیفیت اس وقت ہم بھی محسوس کر رہے تھے' ہمیں صفدر کے انجام کی کچھ خبر نہیں تھی۔ مگر ہم رک نہیں سکتے تھے۔ وہ سیکڑوں ہزاروں چیخیں ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھیں جو اپنے لہجے میں اذیت ناک موت کا کرب سمیٹے ہوئے تھیں۔ اس سے پہلے کہ یہ ساری کی ساری چیخیں دم توڑ جاتیں ہمیں چیخنے والوں کی مدد کو پہنچنا تھا۔ پل کے بڑے بڑے ٹکڑے پانی میں گر کر بجھ گئے تھے۔ وہ اس طرح گرے تھے کہ جھیل کے اندر انگریزی حرف V کی سی شکل بن گئی تھی۔ ہم ان ٹکڑوں پر پاؤں رکھ کر دوسری طرف جا سکتے تھے۔ سب سے پہلے سائیں عالی ہی آگے بڑھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خاکستری جھنڈا جوش کے عالم میں لہرایا اور جھیل کی طرف قدم بڑھائے۔ گہرے دھوئیں میں سانس لینا دوبھر تھا۔ آگے بڑھنے والوں نے گیلے کپڑے اپنے چہروں کے گرد لپیٹ لیے۔

اگلے پانچ منٹ کے اندر سیکڑوں قبائلی پار پہنچ گئے۔ آگ بجھانے والے آلات کے ذریعے اور جھیل سے پانی لے لے کر انہوں نے جلد ہی آگ پر قابو پا لیا۔ ہر طرف دھوئیں کے بادل تھے' آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور کھانس کھانس کر پھیپھڑے جواب دے گئے تھے۔ میں اور زریں گل آرائشی جھیل کے گرم پانی میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے اور صفدر کو آوازیں دے رہے تھے۔ کوئی ایک درجن لارسی جانباز بھی اس تلاش میں ہمارے ساتھ تھے مگر گہرے دھوئیں اور تاریکی نے اس تلاش کو ناکام بنا دیا۔ ہمارے سانس رکنے لگے تو ہم نے کم دھوئیں والے حصے کی طرف پسپائی اختیار کر لی۔ یہ وہی ایریا تھا جہاں بڑے بڑے بیرک نما پنجروں میں انسانوں کے تاجروں نے اپنا مال تجارت رکھا ہوا تھا۔ خدشہ تھا کہ دھوئیں اور تپش کے سبب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ بوکارلو نے کئی ایک بیرکوں کے تالے تڑوا کر دروازے کھلوا دیے اور قیدیوں کو صیاد کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

جس جگہ نوخیز لڑکیوں کو ڈانس سکھایا جاتا تھا اور غلامی کے دیگر آداب بتائے جاتے تھے' وہاں کھڑکیوں کے ذریعے آگ کے شعلے داخل ہوئے تھے اور انہوں نے دو درجن کے قریب افراد کو جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد

لڑکیوں کی تھی۔ یورپی محلات کے لیے فروخت کیے جانے والے غلاموں کی صحت اور خوب صورتی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ایسے غلاموں کے جسموں کو سڈول اور پرکشش بنانے کے لیے ایک وسیع و عریض جمنازیم بھی یہاں موجود تھا۔ اس جمنازیم میں صرف باڈی بلڈنگ کے لیے پانچ وسیع و عریض ہال موجود تھے۔ یہ سارے کے سارے ہال تو آگ کی زد میں نہیں آئے تھے مگر دو تین ہال بری طرح بھسم ہو گئے تھے۔ یہاں جس سے لگنے والی آگ یوں آناً فاناً پھیلی تھی کہ کئی افراد کو اپنی جگہ سے ہلنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ یہاں جل مرنے والوں کی تعداد بھی کافی تھی لیکن مرنے والوں میں ایک بھی سفید فام نہیں تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کنگ کے کارندوں نے بڑی پلاننگ کے تحت یہ جگہ چھوڑنے کے بعد آگ لگائی تھی۔ مرنے والوں کے علاوہ زخمی اور دھوئیں سے بے ہوش ہونے والوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ راہداریوں میں چیختے چلاتے ہوئے لوگ ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ بوکارلو کے حکم پر ایسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر کیمپس کے عظیم الشان اسپتال کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ کیمپس میں کسی جگہ کوئی گارڈ یا ٹرسٹ کا کارندہ نظر نہیں آیا۔ شواہد بتاتے تھے کہ وہ لوگ بڑی افراتفری میں بھاگے ہیں۔ اسلحہ، ضروری کاغذات، وردیاں، جوتے، بہت کچھ وہ لوگ پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

اس دوران میں کیمپس کے کسی حصے سے اندھا دھند فائرنگ کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد موول کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک شراب خانے میں چھپے ہوئے پندرہ بیس گارڈز پکڑے گئے تھے۔ مشتعل ہجوم نے ان سب کو فرش پر لٹا کر ہلاک کر ڈالا ہے۔ میرا دل صفدر کے لیے رو رہا تھا۔ کبھی دل میں آس پیدا ہوتی تھی کہ وہ زندہ ہے، وہ اتنی بے رحمی سے ہم سب کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ کبھی لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے جھیل کے گرد پھیلے ہوئے دھوئیں میں روپوش ہو گیا ہے۔

اسی دوران میں کچھ افراد نے اطلاع دی کہ کیمپس کے خاص الخاص حصے "اے کلب" میں کنگ کے کچھ کارندے اب بھی مورچا زن ہیں اور اندر گھسنے والوں پر فائر کر رہے ہیں۔ بوکارلو نے مجھ سے کہا کہ میں جا کر دیکھوں۔

میں نے موول کے علاوہ تیس چالیس لارسی جانبازوں کو ساتھ لیا اور "اے کلب" کی طرف بڑھا۔ اس بات کی امید تو بہت کم تھی کہ کنگ براؤن یا اس کا کوئی قریبی ساتھی یہاں سے پکڑا جائے گا مگر پھر بھی آس مکمل طور پر ٹوٹی نہیں تھی۔

ہم بڑی احتیاط سے "اے کلب" میں داخل ہوئے۔ یہ دنیا کے حسین ترین عشرت کدوں میں سے ایک تھا۔ زمین کے نیچے عیاشی کی بہترین سہولتیں ہی فراہم نہیں کی گئی تھیں، ٹیکنالوجی کی مدد سے قدرتی مناظر بھی تخلیق کر دیے گئے تھے۔ درخت پھول آبشاریں کیا تھا جو یہاں موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے کیسینو، سوئمنگ پول، جمنستان اور ناچ گھر بھی یہاں موجود تھے۔ آج یہ سارے کا سارا عیش محل بپھرے ہوئے قبائلیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ فائرنگ کرنے والے افراد صرف چار تھے۔ وہ نشے میں دھت ہو کر ایک ڈانس ہال کی بالائی منزل پر اپنی سفید فام ساتھیوں کے ساتھ داد عیش دے رہے تھے۔ وہ وقت پر اپنی عیش گاہ سے نکل نہیں سکے تھے اور راہداری کا بیرونی دروازہ لاک ہونے کے سبب وہیں پھنسے رہ گئے تھے۔ قبائلی ان آٹھ سفید فاموں کو بھی ہلاک کر دینا چاہتے تھے مگر میں آڑے آیا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا۔ ان آٹھوں افراد کی مشکیں کس کے انہیں کیمپس کے وسطی حصے کی طرف بوکارلو کے پاس بھیج دیا گیا۔

میرے منع کرنے کے باوجود سیکڑوں قبائلی "اے کلب" میں گھس آئے اور دنیا کی مہنگی ترین آرائشی اشیا کو توڑنے پھوڑنے میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ساتھ وہ کنگ براؤن اور اس کے حواریوں کو تلاش بھی کر رہے تھے۔ چاروں طرف کہرام سا برپا تھا۔ فانوس گر رہے تھے۔ شیشے ٹوٹ رہے تھے، شراب کی بوتلیں ہوا میں اچھل رہی تھیں۔

اتنے میں موول دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا "جناب! ادھر بڑے دروازے کے پاس ایک تہ خانے کا کھوج لگا ہے۔ لگتا ہے کہ وہاں کچھ افراد چھپے ہوئے ہیں۔"

"چلو آؤ میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں چل دیے۔ موول بولا "بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے وہاں۔ وہ لوگ دروازہ پیٹ رہے ہیں۔ لوہے کا بڑا مضبوط دروازہ ہے ورنہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔"

"اگر تہ خانے کا کھوج لگا کس طرح؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا "میں نے ہی بتایا تھا۔ مجھے فرش کے نیچے سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جو عام لوگ نہیں سن سکتے تھے۔ آپ بھی نہیں سن سکیں گے۔"

"اگر تم نے آوازیں سن لی ہیں تو تمہیں یہ بھی اندازہ ہو گا کہ وہ کتنے لوگ ہیں۔"

"میرا خیال ہے جناب! وہ سو سے کم نہیں ہیں۔ ان میں دو چار عورتیں اور چند بچے بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ماسٹر

استی بھی ان میں ہو۔"

"کیا تم آوازیں پہچان سکتے ہو؟"

"نہیں یہ مشکل ہے جناب، لیکن میں بو میں سونگھ سکتا ہوں۔ وہ لوگ مکمل طور پر تہ خانے میں بند ہیں لیکن ان کے لگائے ہوئے پرفیوم، ان کی پی ہوئی شراب اور سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو مجھ تک پہنچ سکتی ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس گول کمرے کے سامنے پہنچ گئے، جسے کنگ براؤن کا آفس قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس گول کمرے میں ایک بہت بڑا نیم گول پینل تھا۔ اس پینل پر لاتعداد بٹن اور لیور وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ پینل کے سامنے بہت سی ٹی وی اسکرینیں تھیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی دیکھا تھا، ان اسکرینوں پر ٹرسٹ کے گوشے گوشے کے مناظر نمودار ہو رہے تھے۔ ٹرسٹ کے طول و عرض میں لگے ہوئے سیکڑوں پوشیدہ اور ظاہر کیمروں کے ذریعے کنگ اس کمرے میں بیٹھ کر ہر چیز پر نگاہ رکھتا تھا۔ آج ان تمام اسکرینوں پر صرف اور صرف قبائلی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ٹرسٹ کے ایک ایک انچ پر قابض ہو چکے تھے۔ ان کی فاقہ زدہ روحیں، ایسے کھانوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں، جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مہنگی ترین شرابوں کی بوتلیں تھیں، وہ آراستہ خواب گاہوں کے ریشمی گدوں پر اچھل رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔

گول کمرے کے اندر سے گزر کر ہم ایک کشادہ ہال میں داخل ہو گئے۔ یہاں پسینے میں شرابور سیکڑوں لارسی موجود تھے۔ انہوں نے فرش سے دبیز قالین ہٹا دیا تھا۔ نیچے اسٹیل کا بنا ہوا ایک چوکور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ڈھکن نما دروازہ یقیناً کسی تہ خانے میں کھلتا تھا۔ کئی توانا لارسی ہتھوڑوں اور کدالوں کے ذریعے اس دروازے کو توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ ضربوں کی آواز سے پورا ہال گونج رہا تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ اس طرح یہ دروازہ ٹوٹ سکے گا۔" موول نے کہا۔

"تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! میں تو بس ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں، اور وہ یہ کہ نیچے کم از کم سو افراد چھپے ہوئے ہیں، اور عین ممکن ہے کہ وہ اہم افراد ہوں۔"

اسی دوران میں بوکارلو کے کچھ قریبی ساتھی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ چاق چوبند افراد کی ایک ٹولی اور تھی۔ ساتھیوں میں سے کچھ بندوں کو میں پہچانتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے ٹرسٹ کے اندر ہونے والی خون ریز بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ ان افراد کو ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی بندی خانے سے نکالا گیا تھا۔ ان میں سے چند افراد کے ہاتھوں میں میں نے بڑے بڑے ڈائنا مائٹ دیکھے۔ یہ ڈائنا مائٹ آہنی دروازے کے ساتھ چسپاں کر دیے گئے۔ سب افراد ہال سے باہر نکل گئے۔ چند منٹ بعد ڈائنا مائٹ پھٹنے کی خوفناک آواز آئی اور ہر طرف دھواں اور گرد و غبار پھیل گیا۔ میں نے بوکارلو کے ساتھیوں کو منع کر دیا تھا کہ ڈائنا مائٹ پھٹنے کے بعد وہ اندر داخل نہیں ہوں گے اور انتظار کریں گے کہ اندر والے کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔

دھواں چھٹنے کے بعد ہم نے ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر جھانک کر دیکھا، ڈائنا مائٹ خاصا طاقت ور ثابت ہوا تھا۔ آہنی ڈھکنے سمیت فرش کا ایک حصہ صاف اڑ گیا تھا اور اس مقام پر ایک بڑا خلا نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس خلا میں کوئی حرکت یا آواز نہیں تھی۔ میں تین چار لارسی جانبازوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے آگے بڑھا۔ چھوٹی نال کی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ٹانگ کی چوٹ کے سبب میں ہلکا سا لنگڑا رہا تھا۔ میں نے پکار کر کہا "یہاں جو لوگ بھی ہیں، ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔ مزاحمت کی کوشش بیکار ہے۔ یہاں چاروں طرف مسلح افراد ہیں۔" یہ فقرے میں نے انگلش میں ادا کیے تھے۔

میں نے اپنا اعلان تین بار دہرایا۔ کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے بڑی احتیاط سے آگے بڑھ کر خلا میں جھانکا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس تہ خانے کے بارے میں موول کا اندازہ تقریباً درست تھا۔ یہاں اندازاً ایک سو مرد و زن موجود تھے۔ یہ سب کے سب کنگ براؤن کی فیملی سے تھے۔ کنگ اگر بادشاہ تھا تو یہ سب شہزادے اور شہزادیاں تھے کچھ کنگ کے کزن تھے اور ان کی فربہ اندام بیویاں تھیں۔ وہ سب سکڑے سمٹے دیواروں سے لگے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہراس تھا اور چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ فرش کے ٹوٹنے سے جو بے تحاشا گرد اڑی تھی وہ ان کے سروں پر اور لباسوں پر نمایاں نظر آ رہی تھی۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو اس چار دیواری میں آقائی کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے۔ ان کے ابرو کے اشارے سے زندگی موت کے فیصلے ہوتے تھے مگر اب وہ قابل رحم حالت میں تھے۔

میں نے کنگ براؤن کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ تاہم کنگ کی تلاش میں نگاہ دوڑاتے ہوئے میری نظر ماسٹر استی پر پڑ گئی۔ وہ دو موٹے تازے افراد کے عقب میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بس

ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملیں۔ اس کا جبڑا ہمیشہ کی طرح حرکت میں تھا۔ وہ چیونگ گم چبا رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں شور سنائی دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ قبائیوں کا جمِ غفیر رکاوٹوں کو توڑتا ہوا اس ہال میں گھس آیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں جنونی چمک تھی اور چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ یکایک مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ لوگ تہ خانے میں گھس جائیں گے اور قتل عام شروع کر دیں گے "ان کو روکو۔" میں نے اپنے ساتھی لارسیوں سے کہا۔

انہوں نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر رائفل سیدھی کی "رک جاؤ۔" میں چیخا۔

وہ لوگ شاید من مرضی کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ مجھ پر گولی چلا سکتے تھے اور میں بھی چلا سکتا تھا لیکن انہوں نے مجھ پر گولی نہیں چلائی اور نہ مجھ کو اتنا حوصلہ ہوا کہ ان پر فائر کر سکوں۔ وہ ایک سیلاب کی طرح آئے اور مجھے دھکیلتے اور رہنماتے ہوئے تہ خانے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت کوئی ان کو روک نہیں سکتا تھا۔ جلیانوالہ باغ جیسا کوئی منظر دو چار سو افراد کو مار بھی دیتا تو یہ ہجوم تہ خانے میں ضرور گھستا۔ درحقیقت تہ خانے میں موجود لوگوں کی بدقسمتی پر اسی وقت مہر لگ گئی تھی جب ان کا کھوج ملا تھا۔ ہال میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں بچی تھی اور مشتعل لوگوں کا سیلاب سا تھا جو ابھی امڈا چلا آ رہا تھا۔

اگلے دو چار منٹ بڑے لرزہ خیز تھے۔ تہ خانے سے مرد و زن کی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں۔ یہ گوشت و پوست کے انسانوں کی چیخیں تھیں جو موت سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ چیخیں بے مہار ہجوم کے وحشیانہ للکاروں میں دب کر رہ گئیں۔ موئل نے لرزاں آواز میں کہا "میرا خیال ہے کہ تہ خانے میں ایک بھی انسان زندہ نہیں بچے گا۔"

"لگتا تو یہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کٹے ہوئے سر نیزوں پر ٹنگے ہوئے تہ خانے سے باہر آنے لگے۔ نیلی آنکھوں والی ایک موٹی عورت کا سر۔ گھنی مونچھوں اور کرخت چہرے والے ایک جواں سال شخص کا سر۔ سنہری بالوں والی ایک خوب رو لڑکی کا سر جس کے ماتھے پر گولی کا سوراخ تھا۔ سر مسلسل آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہجوم ذرا کم ہوا تو میں اور موئل اس وسیع تہ خانے میں داخل ہو گئے۔ یہ تہ خانہ مذبح خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دیواروں سے انسانی گوشت کے لوتھڑے چپکے تھے اور خون کی دھاریں تھیں۔ مرنے والے اور مارنے والے دونوں کے لباس خون سے رنگین نظر آ رہے تھے۔ ایک سفید فام کے جسم میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ وہ اینٹھ رہا تھا اور لوگ اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میں اور موئل لاشوں کے انبار میں ماسٹر استی کو ڈھونڈ رہے تھے' وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک طرف کچھ لوگ امیرزادوں کی کٹی پھٹی لاشوں سے قیمتی اشیا علیحدہ کرنے میں مصروف تھے۔ ان لوگوں میں سے اچانک ایک لارسی نے نعرہ مستانہ بلند کیا اور لاشوں میں سے کوئی چیز پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھالی۔ یہ ماسٹر استی کا کٹا ہوا سر تھا۔

لوگ پرجوش نعرے لگاتے ہوئے اس سر کے گرد جمع ہو گئے۔ میں مستقبل کے اس بہت بڑے بردہ فروش کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ صرف چار دن پہلے اسے فاتحانہ انداز میں ہمارے قبضے سے نکالا گیا تھا' آج وہ زندگی کے قبضے سے نکل کر موت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ اسے مستقبل کا بہت بڑا بردہ فروش سمجھنے کے باوجود میرا دل اس کے لیے ملول ہوا۔ اس کے خون سے بھیگے ہوئے بال اور گردن کی کٹی ہوئی رگیں میرے حافظے میں جم کر رہ گئیں۔

لارسی نوجوان دیوانوں کی طرح ٹرسٹ کے کونے کھدروں میں کنگ براؤن کو تلاش کر رہے تھے۔ دروازے توڑے جا رہے تھے' تالے چٹخا چور ہو رہے تھے۔ ایک جگہ ایک موٹی بھدی سفید فام عورت کو زمین پر گرا کر ٹھوکروں سے مارا جا رہا تھا۔ اس کی کھال ادھڑ گئی تھی اور لباس تار تار تھا۔ میں نے اس خبیث کو پہچان لیا۔ یہ باندیوں کی نگران اعلیٰ تھی۔ میں نے اسے قیدی عورتوں پر بے پناہ ظلم و ستم ڈھاتے دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے اس عورت کو جان سے مار ڈالا۔

○☆○

اس رات ٹرسٹ میں جو کچھ ہوا وہ تہلکہ خیز تھا۔ وقت کے "عظیم" بردہ فروش کنگ کی بسائی ہوئی زیرِ زمین دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ کیمپس کا ایک حصہ جل کر خاک ہو گیا تھا اور بیشتر حصہ مشتعل انسانوں کے سیلاب نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کنگ کے خانوادے سمیت اس یلغار میں تین سو کے قریب افراد مارے گئے تاہم گارڈز اور انتظامیہ کی ایک بڑی تعداد کیمپس کے ایک خفیہ راستے کے ذریعے عین وقت پر نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ مرنے والوں میں کنگ کا اکلوتا بیٹا ماسٹر استی اور اس کے کئی قریبی دوست شامل تھے' تاہم کنگ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ کیمپس کا جو حصہ جل کر سیاہ ہوا تھا اس میں سے قیدیوں اور محافظوں کی دو سو

زیب لاشیں ملی تھیں۔ ان میں سے بیشتر شناخت کے قابل نہیں رہی تھیں۔

میں' زریں گل اور موئل ساری رات دیوانوں کی طرح صفدر کو تلاش کرتے رہے مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پانی کی آرائشی جھیل میں درجنوں کو لاشیں موجود تھیں شکل تو رکنار کئی لاشوں کے بارے میں تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ انسانوں کی ہیں یا جانوروں کی۔ کیمپس کے وسیع و عریض اسپتال کے مردہ خانے میں قطار اندر قطار لاشیں رکھی تھیں' ان کے چہروں پر کپڑے ڈال دیے گئے تھے۔ میں اور زریں نے ایک ایک لاش کا چہرہ ننگا کر کے دیکھتے رہے۔ ہر بار جب ہم کسی لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹاتے دل کو ناقابل بیان اذیت سہنا پڑتی۔ اس روز صحیح معنوں میں پتا چلا کہ مردہ خانے میں لاشوں کے چہروں سے کپڑے ہٹا کر اپنے کسی پیارے کو ڈھونڈنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔

مردہ خانے سے نکل کر ہم ایک بار پھر ٹوٹے ہوئے پل کے آس پاس صفدر کو ڈھونڈنے لگے' اسی دوران میں ایک لارسی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ بوکارلو محترم نے ہمیں اسپتال میں بلایا ہے۔

ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ میں نے موئل کے ذریعے لارسی سے پوچھا "کیا محترم بوکارلو کے پاس ہمارے گمشدہ ساتھی کے بارے میں خبر ہے؟"

وہ جھجک کر بولا "میرا خیال ہے جناب کہ ایسا ہی ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا یہ کوئی اچھی خبر ہے؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں جناب۔ آپ جائیں گے تو پتا چلے گا۔"

لارسی کا لب و لہجہ ہمارے دلوں کو خون کر رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا "تم بکتے ہو۔ ہمارا ساتھی صحیح ہے نا؟"

وہ روہانسی آواز میں بولا "مجھے کچھ معلوم نہیں جناب! میں تو صرف اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں۔ ویسے کوئی پریشانی والی بات ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ شدید زخمی ہوں یا پھر۔" آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

ہم دوڑنے والے انداز میں اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا' طویل راہداری میں بچھے ہوئے وہ فاصلہ جس طرح میں نے طے کیا میں ہی جانتا ہوں۔ کسی فلم کے مناظر کی طرح صفدر کا چہرہ' اس کی باتیں' اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے سب کچھ بار بار نگاہوں کے سامنے گھومتا تھا۔ وہ میرا یار' میرا ہم راز جو سورج کی ست رنگ کرنوں کی طرح شوخ اور ہواؤں کی طرح چنچل و توانا تھا' ایک بےوفا لڑکی کی جان لیوا بےوفائی کا شکار ہوا تھا اور دسمبر کے جنگل کی طرح زرد اور ویران رہ گیا تھا۔ وہ پتا نہیں کیا لڑکی تھی' صفدر کو اپنے جسم کی حرارت سے پگھلا کر اور اسے چندر یشمی راتوں کا تحفہ دے کر نجانے کدھر گئی تھی۔ پچھلے دو ڈھائی ماہ صفدر نے جس طرح گزارے تھے کچھ میں ہی جانتا تھا۔ وہ اوپر سے سلامت نظر آتا تھا لیکن اندر سے مسمار ہو چکا تھا۔ وریا کی جدائی نے اسے کھنڈر کر ڈالا تھا اور اب یہ کھنڈر بھی پتا نہیں تھا یا نہیں۔

ہم اسپتال میں بوکارلو کے پاس پہنچے۔ بوکارلو کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ صفدر کو ہنگامی طور پر آپریشن تھیٹر میں پہنچایا گیا ہے۔ وہ خاصا زخمی ہوا ہے خاص طور سے اس کے چہرے پر چوٹیں آئی ہیں۔

"اس کی زندگی تو بچ جائے گی۔" میں نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روک کر پوچھا۔

"آپ اپنے عقیدے کے مطابق دعا کریں۔ قدرت نے چاہا تو اس کی زندگی بچ جائے گی۔"

"اس کے زخم کس طرح کے ہیں۔"

"ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"آپریشن کس نوعیت کا ہے؟"

"آرتھوپیڈک اور جنرل سرجری۔" بوکارلو نے جواب دیا۔

"صفدر کا پتا کس طرح چلا؟" میں نے بوکارلو سے پوچھا۔

"اسے سائیں جی صاحب نے ڈھونڈا ہے۔ غالباً جھیل کے آس پاس سے ہی ڈھونڈا ہے کیونکہ سخت تپش کے باوجود اس کے کپڑے گیلے تھے۔ سائیں جی نے اسے کندھے پر لادا ہوا تھا اور نعرے لگاتے خود ہی اسپتال کی طرف چلے آ رہے تھے۔ لوگوں میں سے کچھ نے صفدر کو پہچان لیا اور اسے سائیں صاحب کے کندھوں سے اتار کر اسپتال پہنچایا۔"

ہم صفدر کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے مگر ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم صرف انتظار کر سکتے تھے۔

اب دن کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ جلد ہی ٹرسٹ میں یہ خبر پھیل گئی کہ ٹرسٹ کو چاروں طرف سے پولیس اور نیم فوجی دستوں نے گھیر لیا ہے اور بہت سی نفری ٹرسٹ کے بالائی حصے "ہوشل" میں داخل ہو گئی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے اپنے سامنے اس شخصیت کو پایا' جس نے پس پردہ رہ کر اس بہت بڑی کامیابی میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسے اس

کارروائی کا ماسٹر مائنڈ بھی کہا جا سکتا تھا۔ مسٹر جی کلارک ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے تھری پیس سوٹ کے ساتھ سرخ و سفید ٹائی لگا رکھی تھی' چہرہ ہمیشہ کی طرح مطمئن اور آسودہ تھا۔

آج ایک طویل۔ طویل عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ "ارنگا" میں ان سے ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ وہ ہم سے ملنے امریکا سے آئے تھے اور ہم تنزانیہ سے اڑن چھو ہو کر برطانیہ پہنچ گئے تھے۔

انہوں نے باقاعدہ مجھے گلے سے لگایا' پھر فرداً فرداً سب سے ملے۔ انہوں نے سائیں عالی کے بارے میں پوچھا۔ حسب معمول سائیں کے بارے میں کسی کو پتا نہیں تھا۔ مسٹر جی کلارک نے بوکارلو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہیں کہ وہ آہستہ آہستہ ٹرسٹ کی حدود سے نکلنا شروع ہو جائیں۔ حدود سے نکلنے کے بعد وہ منتشر ہو جائیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی کو گرفتار نہیں کریں گے۔ تاہم یہ رعایت اور اس قسم کی دوسری رعایتیں محدود مدت کے لیے ہوں گی۔ شام سے پہلے مظاہرین کا انخلا مکمل ہو جانا چاہیے۔

بوکارلو نے مسٹر کلارک کو یقین دلایا کہ وہی کچھ ہو گا جو وہ کہیں گے۔

○☆○

شام تک حالات میں کئی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ یہ بوکارلو ہی کا کام تھا کہ انہوں نے ہزاروں بپھرے ہوئے سرکش لوگوں کو ٹرسٹ کی حدود سے نکالنے میں کامیابی حاصل کی۔ ٹرسٹ میں سے سیکڑوں ایسی تو عمر بچیاں برآمد ہوئیں جن کو کم سنی میں ہی "عورتیں" بنا دیا گیا تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے آنے والے نوخیز ان کم عمر مظلوموں کو خرید کر اپنے عشرت کدے میں لے جاتے تھے اور نہیں سوچتے تھے کہ ان کے گھروں میں بھی ایسے ہی بچے موجود ہیں۔ کیمپس کے ایک خفیہ مقام سے بے شمار ہیجڑے برآمد ہوئے۔ یہ وہ جوانان رعنا تھے جنہیں فروخت کے لیے ہیجڑا بنا دیا جاتا تھا۔ اب ذرائع ابلاغ کے سیکڑوں نمائندے ٹرسٹ کی حدود میں دندنا رہے تھے اور ہر پل نئی خبر نکل رہی تھی۔

میں مسٹر جی کلارک سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کام کے لیے یہ وقت موزوں نہیں تھا۔ کاروسیت کئی لاری سرداروں نے مجھے مبارک باد دی اور ٹرسٹ کے گھیراؤ کو ایک بہت بڑی کامیابی قرار دیا۔ یقیناً یہ بڑی کامیابی تھی مگر اس کامیابی کی خوشی ایک غم نے غارت کر دی تھی۔ یہ صفدر کا غم تھا۔ دس گھنٹے گزرنے کے باوجود ابھی تک ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ ڈاکٹروں کی خاموشی ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعصاب کو مزید توڑ رہی تھی۔

اب غزالہ' تائی' کلثوم' پروفیسر اور شائستہ بھی مارو ٹرسٹ میں پہنچ چکے تھے۔ وہ مارچ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور آج صبح سویرے جیپ کے ذریعے کالونی سے یہاں پہنچے تھے۔ اسپتال کے ویٹنگ روم میں غزالہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور مسلسل تسلی دے رہی تھی۔ وہ بولی "سب ٹھیک ہو جائے گا شاہ جہاں۔ اللہ نے زندگی بخشی ہے صحت بھی دے گا۔"

میں نے آزردہ لہجے میں کہا "غزالہ! ہمارے صفدر کو اس ناگن لڑکی کے غم نے مار ڈالا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ اسے ایک پل کے لیے بھی ذہن سے نکال نہیں سکتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ صفدر کی موجودہ حالت کی ذمے دار بھی وہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" غزالہ نے پوچھا۔

"صفدر کی دلیری اور بے جگری میں کوئی شبہ نہیں غزالہ مگر کل شام اس نے جو عمل کیا تھا اس میں دلیری کے ساتھ ساتھ سنگین قسم کی مایوسی بھی شامل تھی۔ اگر میں یہ کہوں شاید غلط نہ ہو کہ اس نے ایک طرح سے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ وہ کمبل لپیٹ کر ایک جلتے ہوئے "تنور" میں کود گیا تھا۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کی توقع ہر اس شخص کو تھی جس نے اسے دیکھا۔"

وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی "لیکن یہ بھی تو دیکھیں شاہ جہاں' صفدر کے اس عمل سے کتنے لوگوں کی جانیں بچ گئیں۔ ممکن تھا کہ اگر بروقت گیس بند نہ ہوتی تو یہ آگ پورے کیمپس کو لپیٹ میں لے لیتی۔"

اسی دوران میں دو ڈاکٹر ہمارے پاس پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ مریض کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ہم تھوڑی دیر تک ان کو دیکھ سکیں گے۔

زریں گل دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ غزالہ کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر گئے تھے۔ کلثوم شائستہ پروفیسر سب کے مرجھائے ہوئے چہروں پر تازگی آ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر صاحب ہمیں چند راہداریوں سے گزار کر انتہائی نگہداشت کے وارڈ کے سامنے لے گئے۔ شیشے کے دیوار گیر شیشے کی دوسری جانب ہمیں صفدر نظر آیا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ وہ نیم دراز تھا۔ چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گلوکوز اور خون کے بیگ لگے ہوئے تھے۔

زریں گل گلوگیر آواز میں بولا "سب سے پہلے ام صفدر بھائی کے پاس جائے گا۔ دو دن سے امارا دل چاہ رہا ہے کہ سب سے پہلے ام اس کو گڈ مارننگ بولے۔"

"لیکن اب تو شام ہو رہی ہے۔" شائستہ نے اسے یاد دلایا۔

"تو ٹھیک ہے ام گڈ ایوننگ بولے گا' لیکن سب سے پہلے ام ہی بولے گا۔"

"ٹھیک ہے بھئی' پہلے تم چلے جاؤ لیکن کسی فلم کی اسٹوری سنانے نہ بیٹھ جانا۔" میں نے کہا۔

زریں گل نے وارڈ میں جانے کے لیے خاص چولا پہنا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا صفدر کی طرف چلا گیا۔ غزالہ نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے اسی دن کا اخبار نکالا۔ انگریزی کے اس اخبار میں قبائلیوں کے عظیم الشان مارچ اور ٹرسٹ کی بربادی کے حوالے سے تفصیلی خبریں آئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر نکلتا ہوا ہمارے قریب آ گیا تھا۔ یہ ایک نیگرو تھا۔ اس نے غزالہ سے شستہ انگریزی میں کہا "مس! کیا آپ یہ اخبار اپنے مریض کے لیے لے جا رہی ہیں۔" غزالہ نے اثبات میں جواب دیا۔

نیگرو ڈاکٹر بولا "لیکن مس! آپ کا مریض پڑھ نہیں سکے گا۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر!" غزالہ نے کہا "میں ان کے پاس رکھ دوں گی۔ جب وہ بہتر ہوں گے تو پڑھ لیں گے۔ آج کا اخبار ان کے لیے کافی اہم ہے۔"

ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مس! اب وہ یہ اخبار کبھی نہیں پڑھ سکیں گے۔ آئی ایم سوری۔ ان کی دونوں آنکھیں ضائع ہو چکی ہیں۔"

اخبار غزالہ کے ہاتھ سے گر گیا۔ ہم سکتے کی سی حالت میں ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں زریں گل بھی سسکیاں لیتا ہوا وارڈ سے باہر آ گیا۔ وارڈ کا دروازہ بند ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا "استاد صیب! امارے صفدر بھائی کا آنکھیں چلا گیا۔ صفدر بھائی کا دونوں آنکھیں چلا گیا۔ اب کبھی ام کو دیکھ نہیں سکے گا استاد صیب۔"

مجھے اسپتال کے در و دیوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ بے دم سا ہو کر میں واپس نشست پر بیٹھ گیا۔

اگلے دو تین روز میں نے اور میرے ساتھیوں نے رنج و غم کے عالم میں گزارے۔ صفدر کی بینائی کا چلے جانا ہم سب کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا۔ ہم سب کے دل جیسے غم کے ایک پہاڑ تلے دبے تھے اور ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ غزالہ اور شائستہ نے تو رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ صفدر اس المیے پر بالکل افسردہ نہیں تھا۔ ایک دن جب میں اس کے بستر کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا اور اسے دوا پلا رہا تھا' اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا "کتنی عجیب بات ہے شاہ جہاں صاحب۔ آنکھیں ختم ہونے کے باوجود انسان خواب دیکھ سکتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو ان فلسفیانہ باتوں کو۔ لو دوا پیو۔"

وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ مجھے آنکھیں جانے کا کوئی دکھ نہیں۔ جب ان آنکھوں کا انتظار ہی ختم نہیں ہوتا تھا' ان کی قسمت ہی نہیں جاگنی تھی تو پھر ان کے باقی رہنے کا کیا فائدہ تھا۔"

"صفدر! تم اسے بھول کیوں نہیں جاتے۔ یہ کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ وہ تمہاری زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ زندگی اتنی غیر اہم نہیں کہ پوری کی پوری کسی ایک شخص کے لیے برباد کر دی جائے۔"

"کبھی میرے سوچنے کا انداز بھی یہی تھا جناب۔ لیکن اب نہیں۔ گستاخی معاف۔ آپ بیتی اور جگ بیتی میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

"صفدر یار! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے مجبور۔ بہت مجبور ہو گئی ہو۔ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا ہو اور یہ بھی تو ناممکن نہیں کہ وہ۔ میرا مطلب ہے کہ زندگی اور موت تو انسان کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنا سر بستر کی پشت سے لگا دیا۔ آنکھوں کے علاوہ اس کی تھوڑی اور سر بھی پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ عجیب لہجے میں بولا "میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے شاہ جہاں صاحب اور میرے دل کی گواہی ہے کہ جب تک میں اسے معاف نہ کروں وہ مر بھی نہیں سکتی۔"

میں خاموشی سے صفدر کو دیکھتا رہا۔ میرا یہ یار چند ماہ پہلے تک چیتے کی طرح چوکس اور شیر کی طرح مضبوط اور صحت مند تھا مگر اب لاچاری کی تصویر بنا بستر پر پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو ٹوٹا تھا۔ ایک ٹانگ جھلس گئی تھی اور پل سے گرنے کے بعد پشت پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی' میں نے مڑ کر دیکھا' وہ زریں گل تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "موتی کدھر ہے' اسے صفدر کے لیے کھانا لے کر آنا تھا۔"

زریں بولا "خو استاد صیب! اس چھوکرے کا اپنا بہت

سا معروفیت ہے۔ پچھلے چوبیس گھنٹے میں اس نے یہاں دو خوب صورت نرسوں کو پھنسایا ہے۔ ایک نرس صاحبہ تو رات کو پھنسا تھا' وہ موبل کی وجہ سے ساری رات صفدر بھائی کے بستر کے گرد ہی چکر لگاتا رہا ہے۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے ام اس نرس کو موبل کے ساتھ راہداری میں دیکھ کر آیا ہے دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ تم تو اخبار لینے گئے تھے۔" میں نے کہا۔

زریں چونک کر بولا "اوے! ام تو بھول ہی گیا۔"

اس نے قمیص اوپر کی اور نیفے میں اڑسا ہوا اخبار میرے سامنے کر دیا۔ اس تازہ اخبار میں بھی کنگ براؤن اور ماریا نرسٹ کے بارے میں خبریں اور رپورٹیں موجود تھیں۔ ماریا نرسٹ کا کچا چٹھا اعلیٰ حکام کے سامنے آگیا تھا اور نرسٹ سے خفیہ رابطے رکھنے والے با اثر افراد کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ دوسری طرف کنگ براؤن اور اس کے دو قریبی ساتھیوں کی تلاش میں بھی جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ اخبار کی خبروں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ سارے جنوبی ماریطانیہ میں کنگ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

"کچھ ہمیں بھی بتائیں کیا لکھا ہے اخبار میں؟" صفدر نے کہا۔

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آنسو آنکھوں تک آنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ میں نے نرمی سے صفدر کا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگا "سب ٹھیک ہو جائے گا صفدر۔ حوصلہ رکھو۔" اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا۔

صفدر کی دونوں آنکھیں مکمل طور پر ضائع ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹروں کے مطابق ایک آنکھ کی پتلی کو بچانے کی کوشش کی جا سکتی تھی مگر سیپٹک "انفیکشن" کے ڈر سے اسے نکالنا ہی بہتر سمجھا گیا تھا۔ اب اس کی دونوں آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے تھے' جنہیں روئی اور پٹیوں کے نیچے چھپایا گیا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل ہول رہا تھا کہ میں ہنستے مسکراتے صحیح سلامت صفدر کے ساتھ یہاں افریقہ کے ساحل پر اترا تھا' اب ایک ٹوٹے پھوٹے معذور صفدر کو لے کر واپس جاؤں گا۔ صفدر کے والدین کے دل پر کیا بیتے گی' ان لوگوں کے دل پر کیا بیتے گی جو اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اور انجم کے دل پر کیا بیتے گی۔ جو مشرقی لڑکی کا ایک خوب صورت روپ تھی۔ وہ برسوں سے صفدر کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ایک پجارن کی طرح اسے اپنے دل کے معبد میں بٹھا کر پوجنا چاہتی تھی۔

اسی روز شام کو اکیلے میں مسٹر جی کلارک سے میری طویل ملاقات ہوئی۔ اس طویل گفتگو میں بہت سے انکشافات ہوئے اور کئی رازوں سے پردہ اٹھا۔ وہ ساری گفتگو بیان کروں گا تو یہ ایک طویل بیان ثابت ہو گا۔ مختصراً یہ کہ مسٹر جی کلارک نے اس تمام عرصے میں ہم پر اور ہمارے مقصد پر گہری نگاہ رکھی تھی۔ پس پردہ رہ کر انہوں نے وہ سب کچھ کیا تھا جو ہمارے لیے کر سکتے تھے۔ ہمارے اندازوں کے عین مطابق سائیں عالی کا اچانک صحرا میں نزول ایک گہری منصوبہ بندی کا حصہ تھا۔ مسٹر جی کلارک اور سائیں عالی اس منصوبے کے کرتا دھرتا تھے۔ مسٹر جی کلارک کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے لاکھوں ڈالر اور پاؤنڈ سائیں عالی کے سامنے ڈھیر کر دیے تھے۔ سائیں عالی دولت کے اس انبار کے ساتھ اپنے مخصوص پراسرار انداز میں صحرا میں نمودار ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس خطے کا ہر دل عزیز شخص بن گیا تھا۔ سائیں کی اس حیرت انگیز پذیرائی میں یقیناً کچھ ناقابل فہم عوامل کو بھی دخل تھا۔ جن دنوں سائیں صحرا میں ظاہر ہوا' اس سے چند ہی دن پہلے عظیم لارسی سردار بوعات کا قتل ہوا تھا۔ اس قتل کے فوراً بعد قدیم زبان میں لکھی ہوئی پراسرار تحریر ملی' جس سے لارسیوں نے یہ مطلب لیا کہ سردار بوعات کی جانشینی سائیں عالی کو ملی ہے۔ وہ اس عقیدے پر مستحکم ہو گئے کہ ذوبے دیوتا کی روح جو اس سے پہلے سردار بوعات میں موجود تھی' اب سائیں عالی میں حلول کر گئی ہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میں ٹرانس میٹر کے ذریعے سائیں عالی اور مسٹر جی کلارک میں گہرا رابطہ رہا تھا۔ مسٹر جی کلارک جانتے تھے کہ ہم ایک بہت بڑی بین الاقوامی تنظیم کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ مسٹر کلارک کا اپنا کاروبار بھی چونکہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا لہٰذا وہ کنگ براؤن کے مافیا کے ساتھ ٹکرا کر اپنے لوگوں کے لیے خطرات پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے' یہی وجہ تھی کہ اس جنگ میں پوری طرح شریک ہونے کے باوجود وہ آخر تک پس منظر میں ہی رہے تھے۔

غالباً مسٹر جی کلارک سے میری گفتگو کئی گھنٹے مزید جاری رہتی۔ اور مسٹر کلارک مجھے دفینے کے حوالے سے بھی تمام تفصیلات سے آگاہ کرتے لیکن اسی دوران میں انہیں ٹرانسمیٹر پر کال موصول ہوئی جس میں کسی اسسٹنٹ نے مسٹر کلارک کو اطلاع دی کہ سائیں عالی کا کھوج مل گیا ہے' وہ واپس کالونی میں پہنچ گیا ہے اور ابھی کچھ دیر بعد ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرنے والا ہے۔

بٹ کے گھیراؤ کے بعد سے سائیں عالی گدھے کے ی طرح غائب تھا۔ مقامی انتظامیہ جس تندہی سے راؤن کو تلاش کر رہی تھی اسی جاں فشانی سے سائیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اب اچانک وہ نمودار ہو گیا تھا۔ مسٹر ک کے پاس ایک ذاتی ہیلی کاپٹر "آر سی۔ ڈیلکس" موجود تھا۔ انہوں نے ماریطانیہ کی حکومت سے کی باقاعدہ اجازت لے رکھی تھی۔ ہیلی کاپٹر ماریا سے صرف چار پانچ کلومیٹر دور ایک نجی ہیلی پیڈ پر موجود مسٹر بوکارلو کے ساتھ ایک تیز رفتار کار میں ہیلی پیڈ پہنچے اور ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر پندرہ بیس منٹ میں کالونی پہنچ گئے۔ تاریک صحرا کے بیچوں بیچ کالونی اور ارد گرد کی بستیوں کا فضائی نظارہ دلکش تھا۔ کالونی کی رنگ برنگی روشنیوں کے ارد گرد خیمہ بستیوں میں چراغوں اور کے ٹمٹماتے جگنو تھے' کہیں کہیں شفاف سڑکوں پر بھی رواں نظر آتی تھیں' یہ سارا سلسلہ کم و بیش چھ ل میں پھیلا ہوا تھا۔

یں فضا سے ہی نظر آ گیا تھا کہ کالونی کے وسط میں ایک اجتماع موجود ہے۔ اندازاً بیس پچیس ہزار لوگ تھے اور سائیں عالی کے "خطاب" کا انتظار کر رہے

کالونی میں پہنچے۔ ہمارے پہنچتے پہنچتے سائیں عالی اسٹیج آ چکا تھا۔ حسب معمول' گلے میں نوٹوں کے ہار' انگلیاں تھیں۔ زبوز کا آدھا خول بالکل ٹوپی کی طرح اس پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں چیختے چلاتے جسم ب فطرت سروج تھی۔ سائیں کو دیکھ کر لارسی اپنے کے مطابق جھک گئے۔ دو امریکن تکنیک کار جو غالباً بگرز وغیرہ کی دیکھ بھال کر رہے تھے' ادنیٰ ملازموں کی سائیں عالی کے میلے کچیلے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تک پھیلے ہوئے شاندار ساؤنڈ سسٹم کے ذریعے نے تقریر شروع کی۔

سائیں کی تقریر میں جوش اور جذبے کی فراوانی تھی۔ وہ تھا "۔۔۔ ہماری جنگ ختم نہیں ہوئی' ابھی شروع ہوئی ہے تک ہم غلامی کی عفریت کے خلاف لڑ رہے تھے تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں' اب ہمیں اس غلسی' بیماری اور جہالت کے خلاف لڑنا ہے۔ یہ بے یں ترسی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی ان کو آباد کریں گے۔ ان میں سے اپنے لیے خوش گے۔ اس زمین سے ساتھوں کے ساگ' بچوں

کی چکاریں اور جیون کے رنگ پھوٹیں گے۔ کیا آپ سب یک جان ہو کر محنت اور مشقت کے لیے تیار ہیں؟"

سائیں کا یہ سوال جب ترجمہ ہو کر اس کے عقیدت مندوں تک پہنچا تو ایک ایسی گونج پیدا ہوئی جس نے قرب و جوار کو تھرا دیا۔ یہ سائیں کے عقیدت مندوں کا جواب تھا۔ وہ اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار تھے۔

سائیں نے پکار کر کہا "کنگ کا بھوت بھاگ گیا۔ غلامی اور چاکری کا خوف ختم ہو گیا۔ تمہاری۔۔۔ تمہاری عورتوں اور تمہارے بچوں کی زنجیریں ٹوٹ گئیں' اب ذوبے دیوتا کے سائے تلے تم آزاد ہو۔ آزاد ہو۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اوٹ پٹانگ بولنے والا سائیں عالی موقع پڑنے پر ایسے فصیح و بلیغ انداز میں بھی بات کر سکتا ہے۔ عقیدت مندوں کے فلک شگاف نعروں سے اطراف گونجنے لگے تھے۔

اگلے روز مسٹر جی کلارک نے مجھے بتایا کہ ان کا ذاتی ہوائی جہاز ماریطانیہ پہنچ گیا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس جہاز کے ذریعے ہم سب اکٹھے پاکستان پہنچیں۔ مسٹر کلارک کے منہ سے پاکستان واپس جانے کی بات ایک خواب کی طرح لگی۔ یقین نہیں آیا کہ ہم واپس اپنے وطن پہنچیں گے۔ اپنے لوگوں' اپنے گلی کوچوں اور اپنی فضا کو دیکھیں گے۔ رجال ساہی' عالم قریشی' میری بہن شگفتہ' حمزہ' انجم۔۔۔ پتا نہیں کون کون سے چہرے نگاہوں میں گھوم گئے۔ اسی روز مسٹر کلارک کے ایک اسسٹنٹ نے کوشش کر کے فون کے ذریعے میری بات ساہی صاحب سے کرا دی۔ اتنی مدت کے بعد ساہی صاحب کی آواز سن کر کانوں کو بہت عجیب لگا۔ ساہی صاحب نے میری آواز پہچانی تو ان کی اپنی آواز بھرا گئی۔

وہ بولے "تم لوگوں سے جدائی کے دور میں مسٹر کلارک کی محبت نے ہمیں بہت سہارا دیا ہے۔ وہ مسلسل ہم سے رابطے میں رہے ہیں اور ہماری ڈھارس بندھاتے رہے ہیں۔"

"میری بہن کیسی ہے ساہی صاحب؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ دن رات تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔"

میں نے فرداً فرداً سب کی خیریت پوچھی۔ پھر غزالہ نے تھوڑی سی بات کی' اپنے اہل خانہ کے بارے میں پوچھا۔ فون پر بات کرتے ہوئے غزالہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ اسے مزید آزردہ ہونے سے بچانے کے لیے

میں نے فون غزالہ سے لے لیا۔

ساہی صاحب نے کہا "یہاں کے ذرائع ابلاغ میں بھی اس واقعے کی گونج سنائی دی ہے جو وہاں ماریطانیہ میں ہوا ہے۔ انسانوں کی تجارت روکنے کے حوالے سے جو کارروائی ہوئی ہے اسے یہاں پاکستان میں بھی سراہا جا رہا ہے۔ تاہم یہاں ابھی کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ اس یادگار کارروائی میں کچھ پاکستانیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب جب تم لوگ پاکستان پہنچو گے تو مسٹر جی کلارک صاحب سے مشورے کے بعد اس نیوز کو پروجیکٹ کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔" پھر اچانک جیسے ساہی صاحب کو کچھ یاد آیا۔ انہوں نے پوچھا "صفدر کہاں ہے؟"

"وہ پاس نہیں ہے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"وہ خیریت سے تو ہے نا؟"

"ج۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اب ہماری طرح پاکستان آنے کے لیے بے چین ہے۔"

"یہاں بھی کچھ لوگ اس کے لیے بہت بے چین ہیں۔" ساہی صاحب نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ان کا اشارہ یقیناً انجم کی طرف ہی تھا۔ میرے دل میں گھونسا سا لگا۔

فون بند کرنے کے بعد بھی میں دیر تک پاکستان۔۔۔ صفدر۔۔۔ اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ رنگ رنگ کی سوچیں ذہن پر حملہ آور ہوتی رہیں اور رگ و پے میں سنسنی پھیلاتی رہیں۔ ایسی سنسنی جس میں پریشانیوں کی دھند بھی تھی۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہم پھر کالونی سے ماریا ٹرسٹ واپس پہنچ گئے۔ صفدر ٹرسٹ کے جدید ترین زیر زمین اسپتال میں تھا۔ غزالہ اور زریں گل چوبیس گھنٹے صفدر کے پاس موجود تھے۔ میں صفدر کے پاس پہنچا تو زریں گل اس سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ بڑے دلچسپ انداز میں صفدر کو موول کے بارے میں بتا رہا تھا۔ دو نرسوں کے ساتھ بیک وقت موول کا طوفانی عشق۔۔۔ اس کا موضوع تھا۔ وہ صفدر کو بتا رہا تھا کہ کس طرح موول کے چکر میں پڑ کر ایک نرس کو معطل ہونا پڑا ہے اور کس طرح دوسری نرس نے کل ایک مریض کو غلط انجکشن لگا دیا تھا اور مریض کے لواحقین سے بے چاری نرس کی پٹائی ہوتے ہوتے بچی ہے۔ زریں نے بتایا کہ پچھلے تین چار روز میں دونوں آفت زدہ نرسوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر موول پر "مال پانی" بھی خرچ کیا ہے۔

موول واقعی ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا جس پر دیر تک اور بہت دلچسپ گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اس کے حیرت انگیز کردار کی چند جھلکیاں ہم نے ماریا ٹرسٹ کے دوران میں بھی دیکھی تھیں۔ موول نے شدید ہنگامہ آرائی کے دوران میں کچھ بہت مدھم آوازیں سن لی تھیں اور ان معلومات کی روشنی میں ہم نے موثر کارروائی کی۔ اس جدید سائنسی دور میں ایک جاہل قبائلی کی ان ناقابل یقین صلاحیتوں پر یقین کرنا کچھ ایسا آسان نہیں تھا لیکن یہ بھی تھا روز روشن کی طرح ہمارے سامنے تھا۔

ابھی مجھے صفدر کے پاس بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مسٹر جی کلارک کا باوقار مصری اسسٹنٹ منصور ہمارے پاس پہنچا اور اس نے بڑی شائستگی سے آٹھ عدد ٹکٹ ہمارے حوالے کر دیے۔ شستہ انگریزی میں بولا "جناب! یہ آپ کے قابل احترام ساتھیوں کے ٹکٹ ہیں۔ تمام کاغذات مکمل ہیں۔ دارالحکومت سے تین بجے فلائٹ ہے۔"

مسٹر جی کلارک صاحب کے تعلقات اور ان کے لمبے ہاتھوں کے بارے میں کوئی شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ہماری وطن واپسی کے حوالے سے پیدا ہونے والے تمام بکھیڑوں سے بہ آسانی نمٹ لیں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ بہرحال میرے اندازے کے مطابق ان ٹکٹوں میں دو کم تھے۔ میں نے ٹکٹ دیکھے۔ یہ صفدر، غزالہ، زریں، کلثوم، پروفیسر اور شائستہ کے تھے۔

مجھے ٹکٹ گنتے دیکھ کر عمر عابد بولا "جناب! شاید آپ کے علم میں یہ بات نہیں۔۔۔ سائیں جی اور سوہنا پاکستان نہیں جا رہے۔"

یہ واقعی ہم سب کے لیے ایک "اطلاع" تھی۔ عمر عابد نے کہا "دراصل سر (مسٹر کلارک) نے سائیں حضور سے اس بارے میں تفصیلی بات کی تھی۔ وہ مس سوہنا سمیت یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ابھی تو ان کا ارادہ عارضی قیام کا ہے لیکن ہو سکتا ہے بعد میں یہ قیام طویل ہو جائے۔"

زریں کے علم میں یہ بات آئی تو وہ افسوس سے ہاتھ ملنے لگا، پھر ہنسنے لگا۔

غزالہ نے کہا "پہلے تم نے اداس بکرے کی طرح منہ بنایا ہے، پھر ہنسے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

وہ بولا "غزالہ بی بی! ام اداس اس لیے ہوا کہ سائیں جی کا سیب یہاں رہ جائے گا اور خوش اس لیے ہوا کہ

وہ تو یہاں رہ جائے گا۔ امارا تو دلی دعا ہے کہ اس کا یہاں کسی افریقی سردار سے بیاہ ہو جائے اور وہ اسے کانگو کے جنگلوں میں اتنی دور لے جائے کہ وہاں سے بھاگ کر بھی یہ واپس نہ آ سکے۔" "ہم سب صفدر کے سامنے تو خوش رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اندر سے کتنے خوش ہیں یہ ہم ہی جانتے تھے۔

میں نے عمر عابد سے کہا "جی کلارک صاحب تو کہتے تھے کہ ہمارے سفر کا انتظام ان کے ذاتی طیارے میں ہوگا۔"

"ہاں۔ انہوں نے کوشش فرمائی تھی مگر ایک دو قانونی پیچیدگیاں تھیں۔ انہیں دور ہونے میں تین چار روز لگ جاتے جبکہ سر یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو جلد از جلد پاکستان پہنچایا جائے۔"

وقت پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے کچھ ہدایات کے ساتھ صفدر کو سفر کی اجازت دے دی تھی۔ وہ دن اور اگلا دن بھی سفر کی تیاریوں اور کچھ ضروری امور نمٹانے میں صرف ہو گیا۔ یہ بات اب طے ہو چکی تھی کہ سائیں عالی اور سوہنا ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ان دونوں سے ملاقات کرنے کے لیے ہم مسٹر کلارک کے "آر سی" کے ذریعے ہی ماریا ٹرسٹ سے کالونی پہنچے۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور ریگزاروں کے بیچوں بیچ سائیں عالی کی روشنی ہوئی تو یہ بستی جگمگا رہی تھی۔ ہم سائیں سے ملنے پہنچے تو وہ "حسبِ عجب" حاجت سے فارغ ہونے کے لیے صحرا کی طرف نکلا ہوا تھا۔ یہاں کالونی کی جدید بستی میں سب سہولتیں رنج سب کچھ موجود تھا لیکن سائیں کو تالاب میں بیٹھ کر ہی تسلی ہوتی تھی یا پھر کوئی اور چکر تھا۔ ہم نے سوہنا سے ملاقات کی۔ وہ کنیز سائے کے مخصوص لباس میں تھی۔ یہ لباس مختصر نہیں تھا، اس کے باوجود کوئی ایسی بات تھی جس میں کر اسے پہن کر سوہنا اور بھی عریاں اور ہوش ربا لگنے لگی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب وہ اپنی بیاز جیسی شرٹ اور کسی ہوئی پتلون میں خالی خالی ہی نظر آتی تھی۔ سوہنا نے مجھے زریں گل اور پروفیسر کو بتایا "یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ سائیں جی کے ارادوں کو بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ فی الحال تو وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم یہیں رہیں گے۔ اب کہا نہیں جا سکتا تھا کہ یہ "مزید" کتنا ہوگا۔ انہوں نے بڑی تیزی سے نئے مکانات کا اعلان کر دیا ہے۔ کھیتی باڑی کے لیے وسیع زمین بھی یہاں تک چن لی جائے گی۔"

"مقامی انتظامیہ کی طرف سے کوئی رکاوٹ تو نہیں؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"نہیں جی۔ لگتا ہے کہ شری جی کلارک کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ کل آبادکاری کے ایک مقامی وزیر نے یہاں آ کر سائیں صاحب سے ملاقات کی ہے۔ ابھی مزید لوگ بھی آئیں گے۔"

اسی اثنا میں سائیں عالی بھی آ گیا۔ وہ کپڑوں سمیت نہا کر آیا تھا۔ اس کا کالا چغہ اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا، ٹوٹ اور دیگر لوازمات گلے میں نظر نہیں آ رہے تھے، تاہم تربوز کا آدھا خول بدستور سر پر تھا۔

اس نے آتے ساتھ ہی دل دھڑکا کا نعرہ لگایا "دل دھڑکا مسافر کا۔۔۔ ہا دل دھڑکا۔" پھر بھیگے بکرے کی طرح اپنے جسم کو جھاڑا، گیلے بالوں کے سارے چھینٹے ہم پر پڑے۔ پروفیسر اور زریں سائیں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ سوہنا میرے پاس اکیلی کھڑی رہ گئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ہولے سے بولی "میں یہاں تو سخت بور ہو جاؤں گی ڈیئر۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ لگتا ہے دم گھٹ رہا ہے۔ بڑا خشک جیون ہے یہاں۔ ہر کوئی ایسی عزت اور احترام سے دیکھتا ہے جیسے کسی انسان کو نہیں پتھر کے مندر کو دیکھ رہا ہو۔ میں تو الرجک ہو گئی ہوں اس مصنوعی پن سے۔" زریں گل بولا "یہ کیا کہہ دیا؟ تمہیں تو زیادہ عزت راس ہی نہیں" تنے جی وی آئی پی بنا دیا گیا۔

"ہاں۔ تمہیں تو زیادہ عزت راس ہی نہیں"۔ میں نے کہا۔

"حکومت!" وہ بولی "میں واقعی کچھ بھی ہو سکتا ہے جی۔ لیکن امارا کیا چکر ہو سکتا ہے؟"

"لیکن بھئی کچھ لوگ یہاں پر والے سے ہمیشہ اچھا امید رکھنا شایان شان بے عزتی دیتے ہیں۔" یہاں امارے استقبال وغیرہ کا کوئی شخص نے بھی تمہارا شکوہ دور کرنے سیب بھی تو یہی فرماتا تھا کہ یہاں میرا اشارہ اس بھیانہ حملے کی ہو گا۔"

میں کھلبلی مچا دی تھی۔ ۔۔۔ پریس کانفرنس۔" میں نے صبح سوہنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ زخموں پر نمک چھڑکنے کے سوا اور کچھ ہے۔"

ہو جاؤ۔ اڑ جاؤ اپنی اس بریل طوطی۔۔۔ سب لوگوں کو نہیں بلایا گیا۔ میری جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔" وہ پاؤں پٹختی کھڑی رہی، میں اپنی جگہ کھڑا زیر لب مسکراتا رہا۔ وہ پوچھا جا رہا تھا یا اب تمہیں

سائیں عالی پروفیسر اور زریں گل کو لہرا گیا مگر سنبھلتے ہوئے بولا گولڈن سیب کے مربے کو تین دن تک ڈیپ سے بھی بات کر رہا تھا۔ جائے تو اس کے کھانے سے کیا کیا ظاہری و باطنی ہو۔" ہیں اور انسان کے کون کون سے طبق روشن ہوتے گزرے ہوں گے کہ

اس نے اپنی چیلی سوج پر بھی کوئی ایسا ہی تجربہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ "فور اسٹروک" انجن کی طرح سبک گام ہو چکی تھی۔

میں نے بمشکل سائیں کی باتوں سے پروفیسر اور زریں گل کی جان چھڑائی اور ان دونوں کو لے کر سائیں کی رہائش گاہ سے باہر آگیا۔ یہاں سوج موجود تھی اور اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ ہم نے اسے خدا حافظ کیا۔ اس نے بھی رسمی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

زریں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "یہ الو کا پٹھا ناراض کیوں نظر آ رہا ہے؟"

"کیوں۔ اس کے ناراض ہونے پر پابندی ہے؟"

"ہمارا مطلب ہے' موول کے ہوتے اس کا بستر تو گرم ہی رہے گا پھر اس کو یہاں کیا کمی ہے؟"

شکر ہے کہ زریں کی سرگوشی سوج کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ تاہم وہ کان کھڑے کرتے ہوئے پھنکاری "یہ پٹھان کیا کہہ رہا ہے تم سے؟"

"تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ اپنی نسوار کا ذکر کر رہا ہے۔ اس کی ڈبی راستے میں کہیں گر گئی ہے۔"

ظاہر ہے کہ سوج اس وضاحت پر مطمئن نہیں ہوئی۔ محمود ہی اس موقع پر کچھ بول دیتا تو ضرور گھمسان کا رن فون۔ میں نے چونکہ زریں کو اشارے سے منع کر دیا تھا صفدر۔ اور اسے پی کر چپ رہا۔

رنگ کی سوچیں ذہن ہم ماریطانیہ سے روانہ ہوگئے۔ پہلے ہم میں سنسنی پھیلاتی ریزیں K پہنچے۔ یہ سفر ہم نے مسٹر کلارک کی دھند بھی تھی۔ نار میں طے کیا تھا۔ KAEDI سے ہم دوپہر ایک بجے کے دارالحکومت آئے۔ دارالحکومت واپس پہنچ گئے۔ صفدر نرائے ہم مصری ائرلائن کے طیارے میں تھا۔ غزالہ اور زریں لیے روانہ ہوگئے۔ موجود تھے۔ میں صفدر ماریطانیہ کی سرزمین چھوڑ رہے تھے' باتوں میں مصروف تھا۔ ست پر نیم دراز تھا۔ ہوائی جہاز کی موول کے بارے میں خالی نگاہوں سے اس خطہ زمین کو وقت موول کا طوفانی وہ محبت کی ایک ناقابل فراموش کہانی بتا رہا تھا کہ کس صفدر کی زخمی آنکھوں پر گہرا تاریک چشمہ معطل ہو تا پڑا بھی دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس کا انداز ایسا مریض کو غلط ب کچھ دیکھ رہا ہے۔ غالباً وہ تصور کی نگاہ سے جاری نہ کر رہا۔ جھیل زار کے خوب صورت قرب و جوار کر چھلے تھے ں تھے۔ وہ حسین جگہ جہاں دریا سے اس کی ملاقات ملی تھی: پلی بڑھی تھی اور ایک تناور درخت بنی تھی۔ موگا سا میں اس درخت پر بہاریں آئی تھیں اور وہ ایک دم مرجھا بھی گیا تھا۔

میں صفدر کا دل بہلانے کے لیے باتیں کرتا رہا۔ بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا یوں لگتا تھا کہ وہ ساتھ آیا ہی نہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کر وہیں ماریطانیہ میں ہے۔ جہاز افریقہ کی وسعتوں پر پرواز کرتا رہا اور آنے والے وقت اور حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹرسٹ کی تباہی اور گنگ براؤن کا راہ فرار اختیار کرنا لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لیے ایک نیک شگون تھا۔ ایک ایسی کامیابی تھی جسے پوری دنیا میں محسوس کیا جاتا۔ اس کامیابی میں ہم سب کا بھی کردار تھا۔ مجھے اپنی کسی تعریف اور تحسین کی ضرورت نہیں تھی' خواہش تھی کہ میرے ساتھیوں کو وہ LIMENTS دیے جائیں جن کے وہ حق دار ہیں۔ خصوصاً اس صفدر کی قربانی غیر معمولی تھی۔ اس نے جس طرح کو داؤ پر لگا کر لاتعداد پابند سلاسل افراد کو زندہ بچایا تھا وہ قابل صد ستائش تھا اور بات صرف صفدر کی نہیں تھی' اس مشن میں میرے ساتھیوں نے ایک طویل عرصے تک دکھ سہے تھے اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ خدمات کا اعتراف کیا جاتا تو اس میں ان کی ہی نہیں ملک کی بھی عزت تھی۔

مسٹر جی کلارک کو بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ ان کے ذاتی طیارے نے ہماری فلائٹ کے گھنٹے بعد دارالحکومت سے پرواز کی تھی۔ ہماری جی کلارک بھی اس وقت فضا میں تھے۔

○☆○

جس وقت ہمارے طیارے نے لاہور ائرپورٹ کے رن وے کو چھوا سہ پہر کے چار بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ ایک صاف شفاف دن تھا۔ نرم سنہری دھوپ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جہاز سے باہر آتے ہی مجھے فضا میں مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔ اس خوشبو کا کوئی اور نہ جگہ تھی۔ یہ بس لاہور کی خوشبو تھی۔ یہ اٹھتی تھی۔ ریستورانوں میں چکراتی تھی' بھری پری گھومتی تھی' تاریخی مقامات سے بغل گیر ہوتے خوشبو دریائے راوی کے کنارے مٹی میں داخل ہو جاتی تھی۔

یہ خوشبو سانس کے راستے میرے جسم میں داخل ہوئی روح میں سیکڑوں گلاب کھل اٹھے۔ میں نے لاہور

آسمان کو دیکھا' زمین کو دیکھا اور پھر سے دل کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ سب خواب نہیں ہے' میں واقعی اپنے ساتھیوں سمیت اپنے پیارے وطن میں واپس پہنچ چکا ہوں۔ صفدر کو ایک وہیل چیئر کے ذریعے بڑی احتیاط سے جہاز سے باہر لایا گیا۔ ہم ائرپورٹ کی بس میں بیٹھ کر لاؤنج میں پہنچے۔ یہاں ضروری کارروائی کے دوران میں میری نگاہیں بار بار دروازے سے باہر اس ہجوم کی طرف اٹھتی رہیں جو مسافروں کو ریسیو کرنے کے لیے لاؤنج سے باہر موجود تھا۔

اچانک ہجوم میں میری نگاہ فربہ اندام و خوش خوراک عالم قریشی پر پڑی' اس کے ساتھ ہی شفا کا "ہنگیر" تو بھی کھڑا تھا۔ وہ دونوں مجھے پہچان چکے تھے اور بڑے جوش و تپاک سے ہاتھ ہلا رہے تھے' میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ اچانک سادہ کپڑوں میں ملبوس دو افراد میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر مجھے شک گزرا کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔ وہ مجھے گھور رہے تھے۔

"جی فرمائیے۔" میں نے کہا۔

ایک لمبے تڑنگے شخص نے بڑے نارمل لہجے میں کہا "آپ کا نام شاہ جہاں ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے وہیل چیئر پر نیم دراز صفدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور یہ آپ کے ساتھی صفدر صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔

"آپ دونوں ہمارے ساتھ تشریف لائیں۔ ایس ایس پی صاحب آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

میرے پوچھنے پر اس شخص نے تائید کی کہ اس کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہی ہے۔

میں نے کہا "لیکن اس وقت تو ہم اترے ہی ہیں۔ باہر ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"پلیز یہ بہت ضروری ہے۔ آپ تشریف لائیں۔" اس نے پولیس والوں کے عام رویے کے برعکس بڑی تہذیب سے کہا۔

"لیکن جانا کہاں ہے؟"

"یہاں پاس ہی انتظامیہ کا آفس ہے۔ بس ہم آپ کے پانچ دس منٹ ہی لیں گے۔"

میرے ذہن میں بے شمار اندیشے سر اٹھانے لگے۔ دل سے سوال اٹھا' کہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات تو نہیں ہو رہی۔ بہرحال پولیس والوں کا لب و لہجہ تشویش ناک نہیں تھا۔

میں نے پولیس والے سے ایک دو وضاحتیں طلب کیں پھر اس کے ساتھ چل دیا۔ صفدر بھی وہیل چیئر پر ہمارے ساتھ آنے کو تیار تھا لیکن میں نے پولیس والے سے کہہ دیا تھا کہ صفدر کو وہیں رہنے دیا جائے۔ ایک دو کوریڈورز سے گزر کر ہم ایک شان دار آفس میں پہنچے۔ یہ ائرپورٹ ایڈمنسٹریشن کے اعلیٰ افسر کا کمرا تھا۔ افسر خود کمرے میں موجود نہیں تھا تاہم دروازے پر سیکیورٹی گارڈ چوکسی سے پہرا دے رہا تھا۔

"لیکن یہاں تو کوئی نہیں۔" میں نے پولیس والے سے پوچھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شخص سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا۔

وہ مسکرایا "بس آپ کو دو منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔"

"یار! تم مسلسل تجسس میں ڈال رہے ہو۔ بات کیا ہے؟"

"بس ایک سرپرائز ہے آپ کے لیے۔" وہ بولا۔

اسی دوران میں زریں گل بھی ائرپورٹ انتظامیہ کے دو اہل کاروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

اسے بٹھا کر اہل کار باہر چلے گئے تو زریں گل بولا "یہ کیا چکر ہے استاد صیب! ام کو یہاں آتے ہی وی آئی پی بنا دیا گیا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا چکر ہو سکتا ہے؟"

وہ بولا "ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے جی۔ لیکن ہمارا دادا فرمایا کرتا تھا کہ اوپر والے سے ہمیشہ اچھا امید رکھنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہاں ہمارے استقبال وغیرہ کا کوئی انتظام کیا گیا ہو۔ ساہی صیب بھی تو یہی فرماتا تھا کہ یہاں کوئی پریس بریفنگ وغیرہ ہوگا۔"

"پریس بریفنگ نہیں۔ پریس کانفرنس۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں وہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ سب لوگوں کو نہیں بلایا گیا۔ میرے اور صفدر کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا' یا اب تم کو بلایا گیا ہے۔"

زریں کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا مگر سنبھلتے ہوئے بولا "ایک سفید کپڑوں والا پروفیسر وغیرہ سے بھی بات کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ باقی لوگ بھی یہاں آ رہا ہو۔"

ہمیں بیٹھے ہوئے ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ

آفس کا دروازہ کھلا اور ایک دم سات آٹھ افراد اندر چلے آئے۔ ان میں سے دو پولیس کی وردی میں تھے باقی سادہ لباس میں نظر آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ سب کے سب پولیس والے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے لباس کے نیچے اسلحہ لگا رکھا تھا بلکہ چند کے ہاتھوں میں بھی رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔

فربہ جسم اور گنجے سر والے ایک معزز سفید پوش کو میں فوراً پہچان گیا۔ یہ ایس ایس پی راجا اشفاق گوندل تھا۔ موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں اور بھی بڑی نظر آتی تھیں اور صورت کو مزید کرخت بناتی تھیں۔ اشفاق گوندل نے بھی مجھے پہچان لیا' اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بولا "تم زیر حراست ہو شاہ جہاں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے کہا۔

"آہستہ بولو۔ یہ پنجابی فلم کی شوٹنگ نہیں ہے۔ اگر زیادہ بے چینی ہے تو یہ دیکھ لو۔ یہ تمہارے اور تمہارے دونوں ساتھیوں کے ناقابل ضمانت وارنٹ ہیں۔" اس نے تین کاغذ میری طرف بڑھا دیے۔

میں نے سرسری نظر ڈالی۔ وہ وارنٹ گرفتاری ہی تھے۔ زریں گل کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ کبھی میری اور کبھی پولیس والوں کی طرف دیکھتا تھا۔

"چلو بھئی۔" ایک پولیس والے نے مجھے باقاعدہ دھکا دیتے ہوئے کہا۔

تین رائفلیں میری اور زریں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ اگر میں چاہتا تو اس موقع پر ہنگامہ ہو سکتا تھا' لیکن میں چاہتا نہیں تھا۔ ابھی ہم نے پاکستان کی سرزمین پر قدم ہی رکھا تھا۔ قدم رکھتے ہی کوئی فساد کھڑا ہو جاتا تو میرے اور میرے خیر خواہوں کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہوتا "کہاں جانا ہے؟" میں نے اشفاق گوندل سے دریافت کیا۔

"کوئی اچھی جگہ ہی ہو گی۔ تمہاری شان کے خلاف تو ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔" وہ مخصوص انداز میں واہیات کہا کر بولا۔

میں سمجھ گیا کہ یہی وہ سرپرائز ہے جو تھوڑی دیر قبل پولیس اہلکار نے دینے کا اعلان کیا تھا۔ ہمارا دستی سامان پولیس والوں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

ہمیں آفس کے عقبی دروازے سے باہر نکالنے کے لیے اس کا تالا کھولا گیا۔ میں نے ایس ایس پی سے کہا "کیا میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے سکتا ہوں۔"

"تم بے فکر رہو۔ انہیں سب معلوم ہو جائے گا۔" اس کے ساتھ ہی ایس ایس پی نے پولیس انسپکٹر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

پولیس والوں کے نرغے میں ہم عقبی دروازے سے نکلے۔ ایک کوریڈور سے گزر کر پورچ نما جگہ پر پہنچے یہاں ایک تاریک شیشوں والی پولیس جیپ موجود تھی۔ دو جیپیں اور بھی تھیں ان میں سے ایک کی کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مجھے اور زریں کو فوراً تاریک شیشوں والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ چار مسلح اہلکار ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک انسپکٹر نے ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست سنبھال لی۔ پچھلی گاڑی میں ایس ایس پی اشفاق گوندل خود بیٹھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ صفدر کو بھی غالباً پولیس حراست میں ہی اسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔

یہ شام کا وقت تھا وہی دھوپ تھی' وہی لاہور کا موسم تھا۔ اور وہی اس شہر کی الگ خوشبو تھی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ مجھ سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اور گھنی مونچھوں و کرخت چہروں والے پولیس اہلکار قریب آ گئے تھے۔ راستے میں جیپ کے اندر ایک گمبیر خاموشی طاری رہی۔ چند منٹ کے سفر میں کسی نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ یہ لوگ ہمیں کینٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد میں اور زریں گل حوالاتی کی حیثیت سے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھے تھے۔ بمشکل دس ضرب دس فٹ کا کمرا ہو گا۔ اسی کمرے کے اندر پانچ فٹ اونچی دو دیواروں کے اندر ٹوائلٹ بنایا گیا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا لوٹا دروازے پر دھرا تھا اور اندر سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ فرش پر پیال بچھی تھی۔ تاہم ہماری خصوصی عزت افزائی کی گئی اور تھانے کے کسی کمرے سے پرانی سی دری لا کر بچھا دی گئی۔

ہم حالات کی اس ستم ظریفی پر ششدر تھے۔ عرصے بعد جو شخص وطن واپس آتا ہے اس کے دل میں کئی امنگیں ہوتی ہیں۔ اپنا گھربار دیکھنے کی آرزو ہوتی ہے۔ پیاروں سے ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ خوب آرام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اگر اس نے کوئی اہم فریضہ انجام دیا ہو یا کوئی نمایاں کارکردگی دکھائی ہو تو وہ اپنے بہی خواہوں کی طرف سے تعریف و توصیف کی توقع رکھتا ہے۔ ہم بھی دیر بعد لوٹے تھے مگر جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا تھا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

کچھ دیر بعد ایک موٹا تازہ شخص' جو خوب گورا چٹا بھی تھا' دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے نہایت قیمتی

سگریٹ پھونکتا ہوا ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ افسر ہی لگتا تھا۔ ایسی شکلیں اکثر سیکرٹری' ڈپٹی کمشنر یا کمشنر وغیرہ کی کرسیوں پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ بہرحال میں نے اس شخص کو پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ یوں ہمارا جائزہ لے رہا تھا جیسے تفریح کے لیے آنے والے پنجرے میں بند جانوروں کو دیکھتے ہیں۔ میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر اس شخص کا گریبان پکڑوں اور اسے آہنی سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر دوں۔

بہر طور میں نے اپنے اندرونی جذبات کو لگام ڈالتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں اس سے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہمارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"اسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کی تعریف؟"

"میرا تعلق سی آئی اے سے ہے۔ تمہارے کیس میں میری حیثیت تفتیشی افسر کی ہے۔" اس نے پھر مختصر جواب دیا۔

"کیس؟ کون سا کیس؟"

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور بولا "کیس ایک نہیں ہے۔ ایک سے زائد ہیں۔ بہرحال میں جس کیس میں انویسٹی گیٹ کر رہا ہوں' وہ اغوا کا ہے۔"

"کس کا اغوا؟"

"بہت اہم اغوا ہے۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولا "تم نے امارات کے شہری شیخ عاصم کی منکوحہ بیوی کو ورغلا کر اغوا کیا ہے اور اس جرم میں تمہارے دو ساتھی بھی شریک ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔

زریں بھی منہ کھولے سلاخوں کے پار دیکھ رہا تھا۔

"تم ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا واہی تباہی بول رہے ہو۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "واہی تباہی تم بول رہے ہو۔ تم کسی چھوٹی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے ہو یہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ اسے ہلکا لینے کی کوشش کرو گے تو ٹانگیں جڑ جائیں گی تمہاری۔" مجھے خوفناک نظروں سے دیکھتا ہوا وہ واپس چلا گیا۔

زریں کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "استاد صیب! یہ ادھر پہنچتے ہی امارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ام کو لگتا ہے' واقعی یہ کوئی بڑا مصیبت ہے۔ ام کو یہاں آتے ہی لاتے ہوئے گئے ہیں۔ ابھی تک ساہی صیب نے بھی کچھ نہیں کیا۔"

"انتظار کرو۔ اور دیکھو کیا سامنے آتا ہے۔"

اچانک زریں کی آنکھیں ذرا روشن ہو گئیں۔ بولا "استاد صیب! امارا خیال ہے کہ مسٹر کلارک پاکستان پہنچ چکا ہو گا۔ وہ ضرور بہ ضرور امارے لیے کچھ کرے گا۔ ام سب جانتے ہیں کہ اس کا ہاتھ بہت لمبا ہے۔"

"لمبا ہاتھ تو ہے' مگر ان کو پتا نہیں کب تک خبر ہو گی' اور خبر ہونے بھی دی جائے گی یا نہیں۔ ہماری پولیس بڑی با اختیار ہے۔ یہ ہمیں ابھی مار کر گاڑ دیں گے تو کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور کچھ نہیں تو پولیس مقابلہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

زریں نے پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "استاد جی! امارا دل گواہی دیتا ہے کہ ام بری طرح پھنس گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند گھنٹوں میں اور بری طرح پھنس جائے۔ اس سے پہلے کہ کچھ بھی ہمارے بس میں نہ رہے' ام کو اپنے بچاؤ کا کوشش کر لینا چاہیے۔"

"کوشش سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"اگر حوالات کا دروازہ کھولا جائے تو ام دونوں بھاگنے کا کوشش کرے۔ ام ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور آپ بھی ضرور جانتا ہو گا' ان میں ہمت والا لوگ تھوڑا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ جب ایک دم کوئی کام ہو جائے تو یہ لوگ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آپ کو وہ گجرات والا واقعہ یاد ہے نا۔" زریں نے ایک پرانی بات یاد دلانی چاہی۔

میں نے کہا "وہ چھوٹی سی دیہاتی پولیس چوکی تھی مگر مرزا یہ بہت بڑا پولیس اسٹیشن ہے۔ ویسے بھی ہماری آمد کی خوشی میں یہاں خاص انتظام نظر آ رہا ہے۔"

زریں جوش سے بولا "ام اس خاص "انتظام" کو اٹھا کر پٹخ دے گا۔ اگر امے۔ اگر ام ادھر افریقہ میں آدم خور قبائلیوں کا دانت کھٹا کر سکتا ہے تو ادھر یہ موٹی توند والا دو چار سنتری امارا کیا چھین لے گا۔ یہ لوگ ام کو جانتا نہیں ہے۔ ام ان لاٹھیوں اور بندوقڑیوں سے ڈرنے والا نہیں ہے۔ امے۔ ام ان کو سبق سکھاوے گا۔"

زریں کا جوش بالکل "جینوئن" تھا' لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ فی الوقت یہ جوش بے موقع ہے اور خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ساتھ تسلی تشفی بھی دی۔ وہ بار بار گہری مایوسی اور کرب کے عالم میں سر ہلا رہا تھا۔ اس انوکھے استقبال پر اس کا رنجیدہ ہونا

سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ قریباً ایک گھنٹا اسی طرح گزر گیا پھر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی' چار پانچ باوردی پولیس والے نمودار ہوئے' ان کے ساتھ دو افسر نما افراد تھے۔ ایک وہی سرخ وسپید تھا جس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ملاقات ہوئی تھی۔

پولیس والوں نے اندر داخل ہو کر سب سے پہلے مجھے ہتھکڑی لگائی۔ اس کے بعد گن پوائنٹ پر اس مختصر کوٹھڑی سے باہر نکالا گیا "کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں ایک پولیس آفیسر نے میری گدی پر ریوالور کا دستہ مارتے ہوئے کہا "بک بک کی ضرورت نہیں' بس چلتے جاؤ۔" ایک بار پھر اپنے جسم کا خون مجھے سر کو چڑھتا محسوس ہوا۔

وہ لوگ مجھے پولیس اسٹیشن کے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں ایک میلی کچیلی صف بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف جستی ٹرنک پڑا تھا جس کے نیچے اینٹیں رکھی گئی تھیں۔ دیواروں سے دو پولیس اہلکاروں کی وردیاں لٹک رہی تھیں۔ میں اس کمرے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ "تفتیش" کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔

مجھے ایک لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ چند منٹ بعد اشفاق گوندل اندر داخل ہوا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ کمرے میں ہم دونوں اکیلے تھے۔ اشفاق گوندل نے بھی وہی بات کہی جو تھوڑی دیر پہلے حوالات کے سامنے سرخ وسپید افسر نے کہی تھی۔ وہ بولا "شاہ جہاں! میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم جس بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو اس کو اور بڑا مت کرو۔ اقبال جرم کرلو تو یہ تمہارے لیے اچھا ہوگا اور ہم سب کے لیے بھی آسانی رہے گی۔"

"کس بات کا اقبال جرم؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"تم نے مدعی شیخ عاصم کی بیوی کو ورغلا کر اغوا کیا' اور اسے کئی ماہ اپنی حبس بے جا میں رکھا۔ اس جرم میں تمہارے دو ساتھی' صفدر علی اور زریں گل خان بھی شریک تھے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں شیخ عاصم کی بیوی غائب نہیں ہے۔ وہ ائرپورٹ پر ہم سب کے ساتھ موجود تھی۔ وہ ایک عاقل بالغ لڑکی ہے' اس کا بیان حقیقت کو کھول کر بیان کردے گا۔"

"اس نے یہی بیان دیا ہے کہ تم اسے زبردستی لاہور سے لے گئے تھے۔ وہ واپس آنا چاہتی تھی مگر تم نے اسے ذرا دھمکا کر روکے رکھا اور اس دوران میں مستقل اس کی آبروریزی کرتے رہے۔" اشفاق گوندل نے عجیب ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

"اس کے علاوہ کچھ اور۔" میں نے ادب سے دریافت کیا۔

"اس کے علاوہ یہ کہ لاہور سے روانہ ہوتے وقت مسماۃ غزالہ عاصم کے پاس پچاس ہزار نقدی اور کچھ جڑاؤ زیورات تھے جن کی مالیت پندرہ لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ یہ ساری چیزیں بھی تمہارے قبضے میں ہیں۔"

"اور یہی چیزیں تم مجھ سے برآمد کرانے کے لیے اور مجھ سے اقبالی بیان لینے کے لیے مجھے اس عقوبت خانے میں لائے ہو۔"

"جیسا بھی تم سمجھ لو۔" وہ بدستور ڈھٹائی سے بولا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا اشفاق گوندل ولد نذیر احمد گوندل۔" میں نے انگلی اٹھا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے کہا "اگر تم نے کسی کی باتوں میں آکر میرے ساتھیوں کو کچھ کہا تو میں اس کے لیے تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"کیا کرو گے تم؟"

"جو بھی ہو سکے گا۔"

"شاید رجال ساہی والا کیڑا تمہارے دماغ میں کلبلا رہا ہے۔ ایسے پانچ دس کیڑے اور بھی تمہاری حمایت میں آجائیں تو تمہیں اس شکنجے سے نکال نہیں سکیں گے جس میں پھنس گئے ہو۔ ساہی اس وقت تمہارے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ بے چارے کو پتا نہیں کہ یہ کتنا اونچا گیم ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا' پھر ہنس کر بولا "اور یہ جو تم نے ساتھیوں والی بات کی ہے یہ بھی بڑی خوب ہے۔ میرے ساتھیوں کو کچھ کہا تو میں اس کے لیے تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ یہی کہا ہے نا تم نے۔ اس کا جواب بھی ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں مل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ساتھیوں کے بجائے اپنی فکر پڑ جائے گی۔ یہ جسم کی مار بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ بڑے بڑے رانی خاں کے سامنے ناک رگڑتے ہیں۔" اس نے زہریلی نظروں سے مجھے دیکھا اور چلا گیا۔

قریباً دس پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ میری سمجھ میں آرہا تھا کہ یہ آتے ساتھ ہی ہمارے ساتھ کیا ہونے لگا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ بس ہمارے پاکستان پہنچنے کے منتظر تھے۔ جو لوگ ہمارے استقبال کے لیے آئے تھے ان کے دلوں پر پتا نہیں کیا بیتی تھی اور جو گھروں میں ہمارا انتظار کر رہے تھے وہ نجانے کیا سوچ رہے تھے؟ غزالہ' کلثوم'

پروفیسر شائستہ' یہ سب نجانے کہاں اور کس حال میں تھے؟

اچانک دروازہ کھلا اور چھ سات ہٹے کٹے اہلکار دندناتے ہوئے اندر گھسے۔ [illegible] جھپٹے اور مجھے ٹھوکروں و گھونسوں پر رکھ لیا۔ یکایک میرا جسم ایک بے رحم طوفان کی زد میں آگیا تھا۔ میری زخمی ٹانگ سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں پشت کے بل فرش پر گر گیا تھا۔ خود کو بچانے کے فطری عمل کے تحت میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے سامنے کر لیے تھے۔ ہاتھ چونکہ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے لہٰذا میں انہیں صرف اپنے دفاع کے لیے ہی استعمال کر سکتا تھا اور وہ بھی صرف ڈھال کے طور پر۔ کمرے میں روشنی اتنی کم تھی کہ میں مارپیٹ کرنے والے اہلکاروں کی صورتیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ شاید یہ روشنی جان بوجھ کر ہی کم رکھی گئی تھی۔

دو منٹ کے اندر میرا بالائی لباس تار تار ہو گیا اور جسم سے جگہ جگہ خون نکلا۔ مارنے والے ساتھ ساتھ پنجابی لہجے میں گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ایک شخص نے شدید نفرت کے عالم میں مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور کئی بار میرا چہرہ زمین پر رگڑنے کی کوشش کی۔ وہ دو منٹ ایک طوفان کی طرح تھے۔ ایک ایسا طوفان جس نے میرے جسم کی چولیں ہلا ڈالیں پھر یہ جلاد صفت لوگ جیسے اچانک دندناتے ہوئے آئے تھے ایسے ہی اچانک واپس چلے گئے۔ دروازہ پُرشور آواز سے بند کر کے باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ میں ایک کونے میں اوندھا پڑا تھا۔ قمیص پھٹ کر جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی جبکہ بنیان ادھڑ کر گلے میں پڑی تھی۔ گھڑی ٹوٹ گئی تھی جسے وہ لوگ جاتے جاتے ساتھ لے گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سر سے بہنے والے خون کی ایک لکیر میرے رخسار پر رینگ رہی ہے۔

میں نے پھٹی ہوئی قمیص سے یہ خون صاف کیا۔ ساتھ ساتھ ذہن سوچنے کے عمل میں بھی مصروف تھا۔ جو لوگ مجھے مارپیٹ کر گئے تھے وہ بے شک پولیس والے تھے لیکن مقامی نہیں تھے۔ اس کے علاوہ سرخ وسفید چہرے والا تفتیشی افسر بھی مقامی نظر نہیں آتا تھا۔ شاید جان بوجھ کر ایسے اہلکاروں کو میرے سامنے لایا گیا تھا جو مجھے جانتے نہیں تھے اور نہ میں ان کو جانتا تھا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ایک بار پھر آہنی دروازے کے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔

کسی سنتری نے آنے والے کو کھٹاک سے سیلوٹ مارا۔ چابیوں کا بھاری گچھا کھنکا اور قفل میں چابی گھومنے کی آواز

طاہر جاوید مغل کے طلسم تراش قلم سے ایک خوبصورت ناول

آندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔

قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

براہِ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: [illegible]

اسٹاکسٹ، علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون: [illegible]

سنائی رہی۔

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ڈی ایس پی اشفاق گوندل اندر آگیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس نے ہلکے بوسکی رنگ کی کھڑ کھڑ کرتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ دائیں ہاتھ میں فیروزے کی موٹی انگوٹھی دمک رہی تھی۔ اشفاق گوندل کے عقب میں ایک چوکس باوردی رائفل مین تھا۔ خود اشفاق گوندل کی قمیص کے نیچے بھی پسٹل لگا ہوا تھا۔ اشفاق کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے تاثرات سے محسوس ہو رہا تھا کہ میری درگت دیکھ کر اسے افسوس ہو رہا ہے۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ میرے ہاتھ بدستور ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میرا اور گوندل کا درمیانی فاصلہ بھی کم نہیں تھا۔ اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا ۳۸ بور پسٹل نکالا اور اسے اس طرح گود میں رکھ لیا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ فوراً سے پہلے اسے استعمال کر سکے۔ اس کے بعد گوندل نے رائفل مین کو اشارہ کیا' وہ سلیوٹ مار کر باہر چلا گیا۔ سلاخ دار کھڑکی سے آٹھ دس گز دور جا کر وہ اٹین شن کھڑا ہو گیا۔ بہرحال اس کی ساری توجہ ہماری طرف ہی تھی۔

گوندل نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا "شاہ جہاں! اگر میں یہاں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے ہمدردی ہے مگر مجھے اپنی نوکری بھی بچانی ہے۔ اس لیے تم سے کہوں گا کہ بدترین سلوک سے بچنے کے لیے تم اقبال جرم کر لو۔"

"اور اگر میں نہ کروں تو؟"

"پھر مجھ سے کسی طرح کا گلہ نہ رکھنا۔" اس کے لہجے میں خوفناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

"کیا کرو گے' تھرڈ ڈگری استعمال کرو گے۔ ہڈیاں توڑ دو گے۔"

"اس سے بھی آگے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تم سب جانتے ہو۔ یہ محکمہ ایسے ہی تو بدنام نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پولیس مقابلے میں تمہیں پار بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"تم مجھے کی بات کیوں کر رہے ہو۔ یہاں تم ہی محکمہ ہو۔ تم نے ابھی کہا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے ہمدردی موجود ہے۔ تم بتاؤ میری ہمدردی میں کیا کر سکتے ہو؟"

"یہی کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں۔ اقبالی بیان پر دستخط کر دو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں سب کچھ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں تو محض ایک بہت بڑی مشین کا پرزہ ہوں۔ مجھے اپنی کارکردگی کے لیے اوپر رپورٹ دینی ہے اور اس رپورٹ کے لیے مجھے جو ٹائم دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔"

"اس معاملے کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟"

"تمہیں بتایا ہے نا یہ اونچے لیول کا کھیل ہے۔ مدعی کا نام مجھے معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اس نام سے ہی تمہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتنا سخت شکنجہ ہے۔"

گوندل نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ یہ میرا ٹائپ شدہ اقبالی بیان تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میں نے واقعی شیخ عاصم کی منکوحہ کو ورغلا کر اغوا کرنے کا جرم اپنے دو ساتھیوں صفدر علی اور زریں گل خاں کی مدد سے کیا ہے۔ مغویہ مسماۃ غزالہ عاصم تقریباً سات ماہ تک میری حبس بے جا میں رہی ہے اور اس دوران میں میری دست درازی کا شکار رہی ہے۔ میں اسے لے کر بیرون ملک چلا گیا تھا۔ پہلے ہم افریقی ملک تنزانیہ میں رہے پھر انٹرپول کے خوف سے ماریطانیہ چلے گئے۔ اس دوران میں میں نے متعدد بار مغویہ پر مجرمانہ حملے بھی کیے۔ مغویہ کے پاس جو چودہ پندرہ لاکھ کے زیورات تھے وہ بھی میری ہی تحویل میں رہے ہیں۔

میں نے اس اقبالی بیان کو ٹکڑے کر کے فرش پر پھینک دیا۔

اشفاق گوندل کا رنگ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ کہنے لگا "میں پھر کہہ رہا ہوں مجھ سے کسی طرح کا گلہ نہ کرنا۔ تمہاری ہٹ دھرمی سر آنکھوں پر لیکن مجھے بھی اپنی کمائی بچانی ہے۔ تمہاری ہمدردی کو دل میں لے کر بیٹھا رہوں گا تو ہمدردی جائے گی اور نوکری بھی۔ [illegible] ہونا نہیں چاہتا۔"

"تم میری ہمدردی کا دعویٰ کر رہے ہو تو ایک بار میری ملاقات ساہی صاحب سے کروا دو۔"

"پھر وہی ساہی صاحب!" گوندل نے زچ ہو کر کہا "میں پہلے بھی بکواس کر چکا ہوں کہ یہ گیم ساہی شاہی کے بس نہیں ہے۔ وہ زیادہ اپنی شیخی دکھائے گا تو اپنی ٹانگیں بھی تڑوا لے گا۔ اس کی بزرگی پر رحم کرو اور اس کو ایک طرف ہی رہنے دو۔"

"لگتا ہے کہ تم صرف زبانی جمع خرچ کر رہے ہو۔ کرنا ہی نہیں چاہتے ہو۔"

"میں تمہارا زرخرید غلام نہیں ہوں کہ تمہیں اپنی صفائیاں پیش کروں۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ اب

کچھ کروں گا جو قانون کے مطابق کرنا ضروری ہے۔"

"تمہاری اور تمہارے باپ کی قانون پسندی کو میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں اشفاق گوندل! اگر تمہیں معقول پیسے مل جائیں تو تم قانون کی تشریف پر لات مار کر اپنے گھر اور باہر کی ہر شے بیچ سکتے ہو۔"

اشفاق کا سرخ چہرہ سرخ تر ہو گیا۔ وہ دانت پیس کر غرایا "کسی بھول میں نہ رہنا شاہ جہاں! میں ڈرتا نہیں ہوں تجھ سے۔ مانتا ہوں تو بہت بڑا غنڈا ہے' لیکن قانون کے سامنے بڑوں بڑوں کی غنڈا گردی کو آخر کار ناک رگڑنی پڑی ہے۔ تو کوئی پہلا بہادر خاں نہیں ہے' تجھ سے پہلے بھی بڑے بڑے پھنے خاں گزرے ہیں "ان کا انجام ذہن میں رکھ لینا۔"

وہ اٹھا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ سنتری نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

لگتا تھا کہ اشفاق گوندل ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ معاملہ ساہی صاحب کے بس کا بھی نہیں تھا۔ اب آغا کے دھیان مسٹر جی کلارک کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اس مشکل وقت میں وہی میری اور میرے دونوں ساتھیوں کی مدد کر سکتے تھے لیکن خبر نہیں تھی کہ انہیں ہمارے حالات کی خبر کب ہو گی اور ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ کئی بار ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ مدد کے لیے آنے والے کو ستنا پڑتا ہے۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔ مجھے صفدر سے بھی زیادہ فکر زریں گل کی تھی۔ وہ کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو جاتا تھا۔ خاص طور سے اگر میرے بارے میں کوئی شخص غلط سلط بات کہہ دیتا تھا تو زریں جان دینے اور لینے پر تل جاتا تھا۔ اگر پولیس والے اس کے سامنے اپنے خاص انداز میں میرا "ذکر خیر" کرتے تو عین ممکن تھا کہ اس کا پارا چھت کو چھو جاتا اور اس کے بعد کوئی المناک واقعہ پیش آ جاتا۔

اشفاق گوندل کو میری کال کوٹھڑی سے نکلے آدھ پون گھنٹا ہی ہوا تھا کہ وہی گورا چٹا شخص اندر داخل ہو گیا جس نے خود کو میرے کیس میں انویسٹی گیٹر بتایا تھا۔ وہ پتلون قمیص میں تھا اور بظاہر کافی نفیس اور دھیما نظر آتا تھا لیکن اس کی خباثت وہی تھی جو ایک نہایت خوب صورت لیکن زہریلے سانپ میں ہوتی ہے۔ جس طرح سانپ بڑی آہستگی اور متانت سے حرکت کرتا ہے اور جب تک ڈنک نہیں مار، اس کی پھرتی اور سفاکی کا علم نہیں ہوتا' یہ گورا چٹا شخص بھی اس مزاج کا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ پانچ چھ افراد کی ٹیم تھی۔ کمرے میں ایک بار پھر نیم تاریکی کر دی گئی تھی۔ اس نیم تاریکی میں صورتیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ گورے چٹے شخص کے اشارے پر ایک بار پھر تومند افراد مجھ پر پل پڑے۔ اس مرتبہ میں نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی' اور اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے چند جوابی ضربیں بھی لگائیں مگر یہ ایک بے سود مزاحمت تھی۔ دو پہلوان نما افراد نے مجھے عقب سے جکڑ لیا' باقی سامنے سے مکے اور ٹھوکریں برسانے لگے۔ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ دو تین منٹ بعد میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے "کھڑی ہتھکڑی" لگ چکی ہے۔

کھڑی ہتھکڑی کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ یہ بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔ ہتھکڑی کو تقریباً چھ سات فٹ کی بلندی پر کسی شے سے اس طرح منسلک کر دیا جاتا ہے کہ حوالاتی بیٹھ نہیں سکتا۔ ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں' پاؤں سوج جاتے ہیں اور اپنی بدنصیب ٹانگوں کو چند لمحوں کا سکون دینے کے لیے حوالاتی اپنے نچلے دھڑ کو کئی مضحکہ خیز زاویوں میں توڑتا موڑتا ہے۔

گورے چٹے شخص نے مجھے اپنا نام آصف جاہ بتایا اور دھیمے لہجے میں سمجھایا کہ اگر میں جانوروں جیسے سلوک سے بچنا چاہتا ہوں تو اپنی اکڑ چھوڑ کر سیدھے رستے پر آجاؤں اور جو کچھ اشفاق گوندل صاحب فرما گئے ہیں وہ من و عن مان لوں۔ دوسری صورت میں میری چیخیں بغیر لاؤڈ اسپیکر کے دو میل کی دوری سے سماعت کی جا سکیں گی۔

پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میں تمہیں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں۔"

اس نے ایک کارندے کو اشارہ کیا' وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور چند قدم چل کر ایک راہداری میں موجود دو دروازے کھول دیے۔ دروازے کھلنے کے بعد جو چند آوازیں میرے کانوں میں پڑیں انہوں نے میری رگوں میں لہو منجمد کر دیا۔ یوں لگا جیسے ٹانگیں ایک دم برف میں لگ گئی ہیں۔ یہ زریں گل کی آوازیں تھیں۔ وہ کرب ناک انداز میں چیخ رہا تھا۔ اس کی چیخوں میں تکلیف کا اظہار تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک آتش فشانی غضب تھا اور ایک پھنکارتی ہوئی آگ بھی تھی۔ وہ چیخنے کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کو گالیاں دے رہا تھا اور خطرناک ترین نتائج کی دھمکیاں بھی اس کی نوک زبان پر تھیں۔

میں نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ ظاہر ہے کہ یہ اضطراری حرکت ہی تھی ورنہ کب تک میرے یوں جھٹکے دینے سے ہتھکڑی ٹوٹ سکتی تھی اور نہ وہ آہنی سلاخیں اپنی جگہ سے اکھڑ سکتی تھیں جن سے ہتھکڑی منسلک

تھی۔ میں نے آصف جاہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آصف جاہ! تم مجھے ٹھیک سے جانتے نہیں ہو، جو مجھے جانتے ہیں وہ خود میرے سامنے نہیں آتے۔ انہوں نے تجھے قربانی کا بکرا بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ وہ تیرا بہت برا کر رہے ہیں آصف جاہ! میں تجھے بتا رہا ہوں' وہ تیرا بہت برا کر رہے ہیں۔"

آصف جاہ نے ایک قہقہہ لگایا اور اپنے سرخ ہونٹوں کو حادثاً بھینچتے ہوئے بولا "اس کوٹھڑی سے زندہ نکل سکو گے تو کچھ کرو گے نا۔ لیکن اس میں خوش ہونے کی کوئی بات نہیں۔ مرنا یہاں اتنا آسان بھی نہیں ہوگا انشاءاللہ۔"

اس نے اہلکار کو اشارہ کیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے راہداری کے دونوں دروازے بند کر دیے۔ زریں گل کی گرجتی برستی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ میری قمیص اور بنیان جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ دونوں بازو کھڑی ہتھکڑی کی وجہ سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

تاریکی میں ایک سانولے جلاد صورت شخص کے مدھم خدو خال نظر آ رہے تھے۔ وہ بید کی ایک موٹی چھڑی لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ آصف کے ایک اشارے پر وہ میرے جسم کی کھال اودھیڑنا شروع کر دے گا' اور پھر یہی ہوا' آصف نے سر سے اشارہ کیا۔ شائیں کی آواز آئی۔ ظالم چھڑی لہرا کر بڑی طاقت سے میرے عریاں سینے پر لگی۔ چھڑی کیا تھی' برچھی تھی' درد کی لہریں پورے جسم میں سفر کر گئیں۔ ہونٹوں پر آنے والی کراہ کو میں نے بمشکل ہونٹوں کے اندر روکا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید زریں گل کو بھی اسی قسم کی چھڑی کے ساتھ "خوش آمدید" کہا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی میرے ذہن نے ایک اور تشویشناک نتیجہ بھی نکالا۔ پولیس کے طریقہ واردات سے مجھے بخوبی آگاہی تھی۔ جن حوالاتیوں کو قانونی طور پر ۲۴ گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانا ہو' انہیں اس طرف واشگاف تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جاتا۔ اہلکاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے حوالاتیوں سے عدالتی ریمانڈ کے بعد "حسن سلوک" کیا جائے اور اگر ریمانڈ سے پیش تر چوبیس گھنٹے کے اندر کچھ اگلوانا ضروری ہو تو پھر ان کے ساتھ حسن سلوک ذرا ٹیکنیکل طریقے سے کیا جاتا ہے۔ ایسی چوٹیں لگائی جاتی ہیں جو ظاہری طور پر نمایاں نظر نہیں آتیں۔

میرے ساتھ اور غالباً زریں کے ساتھ بھی جو مارپیٹ کی گئی تھی وہ بڑی "واشگاف" تھی۔ میرے ناک منہ سے خون رس رہا تھا' اور بھی کئی چوٹیں آئی تھیں' اور اب تازہ ترین چوٹ بید کی چھڑی کی تھی جس نے کھال چھیل دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمیں ریمانڈ وغیرہ کے بغیر ہی پولیس حراست میں رکھے جانے کا پروگرام ہے۔ اگر واقعی ایسی بات تھی تو پھر رجال ساہی اور مسٹر جی کلارک ہمارے لیے فوری طور پر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر تھوڑا سا تعجب ہوا کہ چھڑی کی پہلی جان لیوا ضرب کے بعد آصف جاہ نے چھڑی بردار کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اس نے مجھے دوسری ضرب نہیں لگائی۔ آصف آہستگی سے میرے قریب آیا اور اتنے فاصلے پر کھڑا ہو گیا کہ اگر میں دہشت میں ٹانگ وغیرہ چلانا چاہوں تو ضرب اسے نہ لگے۔ میں نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور مجھے آصف کے خدو خال مدھم مدھم نظر آنے شروع ہو گئے۔ وہ بولا "میں تمہیں صبح تک کی مہلت اور دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اس کے بعد تمہارے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔"

وہ اپنے ساتھیوں سمیت باہر چلا گیا۔ کمرے کی روشنی پھر بحال ہو گئی۔

میں نے وہ ساری رات کھڑے کھڑے گزار دی۔ ٹانگیں اکڑ کر رہ گئی تھیں۔ بیٹھنا ایک بہت بڑی نعمت محسوس ہوتا تھا' اور یہ نعمت مجھ سے بہت فاصلے پر تھی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے' اس عذاب ناک رات میں دو تین مواقع ایسے بھی آئے جب واقعی کھڑے کھڑے غنودگی طاری ہو گئی۔ ایسے میں جسم ڈولا تو ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے ہاتھوں کو شدید جھٹکا لگا اور آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ حالات ہمارے لیے اتنی تیزی اور بے رحمی سے تبدیل ہوئے ہیں۔ وطن عزیز کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہم سیدھے تھانے پہنچے تھے اور اب میں کسی اخلاقی مجرم کی طرح کھڑی ہتھکڑی میں جکڑا اس کوٹھڑی میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔

تھانے کی عمارت کافی بڑی تھی' کیونکہ گاڑیوں وغیرہ کی جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں وہ کافی فاصلے سے آ رہی تھیں۔ یہ علاقہ زیادہ گنجان بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے رات کو کئی بار کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی' انگریزوں کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی تھی۔ اب معلوم نہیں تھا کہ یہ آواز کسی اچھی وجہ سے بند ہوئی ہے یا بری وجہ سے۔ صفدر کا خیال بھی رہ رہ کر ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔

میرے کانوں نے فجر کی اذانوں کی آواز سنی۔ یوں لگا جیسے کان ایک مدت بعد اس آواز سے فیض یاب ہوئے ہیں' یوں تو ماریطانیہ بھی ایک اسلامی جمہوریہ تھا مگر ہم جس دور افتادہ علاقے میں پھنسے ہوئے تھے وہاں تو ہمیں شاذ و نادر ہی کہیں اسلام کی جھلک نظر آئی تھی۔ فجر کی اذان سے قریباً ایک گھنٹا بعد میری کوٹھڑی کی لائٹ ایک بار پھر بند ہو گئی۔ صرف راہداری میں جلتے ہوئے بلب کی مدھم سی روشنی کوٹھڑی کے ایک حصے کو نیم روشن کرتی رہی۔ میں اب اچھی طرح جان چکا تھا کہ کمرے کی بتی کا بند ہو جانا میرے لیے نیک شگون نہیں ہے۔

اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ دو چار منٹ بعد آصف جاہ اپنی ٹیم کے ساتھ کوٹھڑی میں گھس آیا اور نئے سرے سے پوچھ تاچھ شروع کر دی۔ میرے' غزالہ اور کلثوم وغیرہ کے حوالے سے ایسے ایسے شرمناک سوال کیے گئے کہ خون کھول اٹھا۔ دس منٹ کے اندر میرے اور آصف جاہ کے درمیان دو تین بار تکرار ہوئی۔ اس کے بعد گالی گلوچ شروع ہو گئی۔ طیش سے بے قابو ہو کر آصف جاہ نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ میں نے پہلے سے تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اس نے تھپڑ مارا تو میں اس کا بڑا مناسب جواب دوں گا اور میں نے یہی کیا۔ دونوں ٹانگیں جوڑ کر میں نے اس کے چہرے پر رسید کیں۔ میرے پاؤں ننگے تھے' اس کے باوجود یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ آصف جاہ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور پھر پہلو کے بل فرش پر گرا۔ میں تاریکی کے سبب دیکھ نہیں سکتا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس کی بتیسی ہل گئی ہوگی اور ناک منہ سے خون بھی جاری ہو گیا ہوگا۔

پھر آصف کے منہ سے جو زخمی درندے کی سی غراہٹیں برآمد ہوئیں انہوں نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ شاید اسے مجھ سے ایسی شدید جوابی کارروائی کی توقع نہیں تھی۔ وہ چند لمحے تو سکتے کی سی کیفیت میں رہا' پھر اس کی ہدایت پر دو اہلکار میری ٹانگوں سے لپٹ گئے تاکہ میں انہیں حرکت نہ دے سکوں۔ آصف جاہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹا اور مجھ پر دھڑا دھڑ چھڑی کی ضربات لگانے لگا۔ ضربات میرے جسم کے ننگے حصوں کے علاوہ میرے سر اور چہرے پر بھی لگ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ آصف جاہ کے منہ سے گالیوں کا آبشار بہہ رہا تھا۔ میں بھی خاموش نہیں رہا' اور گالیوں کی حد تک اس یا لعنت کا جواب پتھر سے دیا۔

چھڑی گھما گھما کر جب وہ نڈھال ہو گیا۔ تو اپنے ایک کارندے سے ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "پاؤں باندھو اس کے۔"

دو نہایت تنومند اہلکار پوری قوت کے ساتھ میری ٹانگوں سے لپٹے رہے۔ وہ نے ایک زنجیر کے ذریعے میری ٹانگیں پنڈلیاں جکڑ دیں اور زنجیر کے حلقوں میں چابی کا وزنی تالا لگا دیا۔ یہ کارروائی کرنے کے بعد آصف جاہ نے ایک بار پھر مجھے سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دیں اور اپنی دنیا و "عاقبت" کے بارے میں سوچنے کے لیے آدھ گھنٹے کی مزید مہلت دی۔ اس کے بعد وہ اپنے جلاد صفت ساتھیوں سمیت باہر چلا گیا۔ کمرے کی بتی ایک بار پھر روشن ہو گئی۔

اپنی شکلیں نہ دکھانے کے سلسلے میں آصف جاہ کے کارندے جو خصوصی احتیاط کر رہے تھے وہ میرے لیے تسلی بخش تھی۔ اس احتیاط سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے مار کر اس کوٹھڑی کے اندر ہی دفن کرنے کی جو دھمکیاں آصف جاہ دے رہا ہے' ان میں شک کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہ سامنے کی بات تھی کہ اگر وہ لوگ واقعی مجھے "غائب" کرنے کا ارادہ فرما چکے ہیں تو پھر مجھ سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے پردہ کرنے سے مجھے نفسیاتی طور پر بھی سہارا مل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھ پر پوری طرح حاوی ہونے کے باوجود مجھ سے خوف زدہ بھی تھے۔

آصف جاہ مجھ سے آدھ گھنٹے کا کہہ کر گیا تھا' تاہم اس کی واپسی میں تاخیر ہوتی چلی گئی کم و بیش دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں تھانے کے کسی قریبی کمرے سے چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہیں۔ یہ زریں کی آوازیں نہیں تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ "خالی جیب" والے کسی بدنصیب حوالاتی پر تشدد ہو رہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو کبھی ایسا بھی لگتا ہے کہ پولیس تشدد کوئی جادو کا کھیل ہے۔ ایسے پریشان حال لوگ جن کے پاس زہر خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے جب اس تشدد کی زد میں آتے ہیں تو پتا نہیں کیسے جان چھڑانے کی خاطر ہزاروں روپیہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔ ایک لوٹے کے اندر سے بالٹی بھر پانی' کال لیٹ جادو ہی کا کھیل تو ہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد کمرے کی روشنی پھر بجھ گئی۔ میں نے خود کو تازہ آفت کے لیے تیار کر لیا۔ کپتان صاحب ایک بار پھر اپنی ٹیم کے ہمراہ جارحانہ کھیل کھیلنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس مرتبہ ان سب کے رویے پہلے سے زیادہ سخت تھے۔ شاید اوپر سے انہیں مزید "بے رحمی" کا پروانہ جاری ہو گیا تھا۔

میری ہتھکڑی کی زنجیر کو اس طرح کھینچا گیا کہ میں ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس کے بعد دس پندرہ منٹ تک مجھے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کے دوران میں ہی مجھ کو ایک عجیب سا احساس ہوا' مجھے لگا کہ دائیں طرف سلاخ دار کھڑکی کی دوسری جانب تاریکی میں کوئی اور شخص بھی موجود ہے جو مجھے دیکھ رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے بھی جب آصف جاہ اور اس

کے ساتھ بھی آئے تھے تو مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا مگر اس مرتبہ یہ احساس زیادہ شدید اور واضح تھا۔ کوئی وہاں تھا جو میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور میری کراہیں سن رہا تھا۔ کون تھا وہ پردہ نشیں؟ کس کے دل میں میرے خلاف اتنی نفرت تھی کہ وہ تھانے میں آکر اپنے کانوں سے میری چیخیں سننے کی خواہش رکھتا تھا؟ میری چھٹی حس مجھے میرے اس سوال کا جواب دے رہی تھی مگر ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

چند منٹ بعد میرے شک کو کچھ اور تقویت مل گئی۔ میں نے دیکھا کہ آصف جاہ دوسری مرتبہ کمرے سے نکل کر اس تاریک گوشے کی طرف گیا اور مجھے باتوں کی بہت مدھم آواز بھی سنائی دی۔ واپس آکر آصف جاہ نے مجھ سے ایسے سوالات کیے جن کا مقصد یہ جاننا تھا کہ تنزانیہ اور برطانیہ میں قیام کے دوران میں غزالہ سے میرا رابطہ کس حد تک رہا ہے۔

میں نے وہی جوابات دیے جو اس سے پہلے بھی دے چکا تھا۔ میں نے آصف جاہ کو بتایا کہ میرا اور غزالہ کا کمرا کبھی بھی ایک نہیں رہا' نہ ہی کبھی میں اور غزالہ اکیلے کسی ذیلی سفر پر نکلے ہیں۔ غزالہ کے ساتھ میرے نکاح یا خفیہ شادی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ غزالہ ابھی تک عاصم کے نکاح میں ہے وغیرہ وغیرہ۔

آصف جاہ کا پارا جو کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا ہو گیا تھا ایک بار پھر چڑھنے لگا۔ وہ چیخنے چلانے لگا اور پھر گالیاں بکنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی گالیوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ غصے سے پھٹ پڑنے کے قریب ہو گیا۔ اس نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ مجھے بے لباس کرکے الٹا لٹکا دیا جائے۔

میں نے ایک آزمایا ہوا حربہ آصف جاہ پر استعمال کیا' وہ بار بار خود کو بہت آکڑ خاں اور بدمعاش افسر گردان رہا تھا۔ اب تک وہ قریباً دس بار میرے ذہن میں یہ بات ڈال چکا تھا کہ وہ صرف وردی کے اندر ہی طاقت ور نہیں ہے' وردی اتار کر بھی بہت زور آور ہے اور کئی بدمعاشوں کو ناکوں چنے چبوا چکا ہے۔ میں نے اس کی اسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کہا "باتیں چودھریوں والی کرتے ہو اور کردار تمہارا ہیجڑوں جیسا ہے۔ بلکہ ہیجڑوں میں بھی تھوڑا بہت غیرت کا مادہ ہوتا ہے۔ اکیلے بندے کو باندھ کر مار رہے ہو اور مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہو۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ایک کے ساتھ ایک آؤ۔ تم سب کے سب یہیں رہو' بس میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔ گھڑی اتار کر اپنے سامنے رکھ لو' اگر تین منٹ کے اندر اندر تم سب کو ہیجڑا ثابت نہ کردوں تو تمہارے پاؤں پر سر رکھ دوں گا اور جو کہو گے کروں گا۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری باتوں میں آکر یہاں تمہارے لیے دنگل کا انتظام فرما دوں گا۔" آصف جاہ زہرخند سے بولا۔

"مجھے نہیں یقین کہ تم ایسا کرو گے' کیونکہ تمہارے جیسے شُہدے صرف باتیں بنا سکتے ہیں۔ ان کے منہ میں زبان کی جگہ کتے کا چمڑا ہوتا ہے' جس کے کہے کا انہیں کوئی پاس نہیں ہوتا۔ شاید تم بھول گئے ہو' کل رات تم نے اکیلے ہی میری ٹانگیں چیر دینے کا اعلان کیا تھا۔ اب تو میں تمہیں پانچ چھ ہیلپر بھی دے رہا ہوں۔"

آصف جاہ نے ایک بار پھر مجھ پر گالیوں کی بارش کردی۔ میں نے بھی بمبئی میں قیام کے دوران میں ایسی بہت سی بدزبانی سیکھ رکھی تھی۔ میں نے اس کی ایک گالی کے جواب میں دو دیں۔ وہ فٹ فٹ بھر زمین سے اچھلنے لگا۔ اس نے مجھ پر بے تحاشا ٹانگیں چلائیں اور جسم کے نازک حصوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ ہانپ کر رک گیا تو میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

اچانک وہ کچھ ہوا جس کی میں نے ہرگز توقع نہیں کی تھی۔ سلاخ دار کھڑکی سے باہر تاریکی میں آہٹ ہوئی پھر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور شیخ عاصم میرے سامنے تن کھڑا ہوا۔ کمرے کے برعکس راہداری میں روشنی تھی۔ شیخ عاصم کا سراپا مجھے صاف نظر آیا۔ میں حیرت زدہ اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے' جو شک میرے ذہن میں جاگا تھا وہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ میرا رقیب روسیاہ شیخ عاصم کافی دیر سے اس تاریک گوشے میں موجود تھا اور بنفس نفیس میری بے بسی ملاحظہ کررہا تھا۔ شیخ عاصم سے میری آخری ملاقات ابوظہبی میں ہی ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پہلی بار غزالہ صحیح معنوں میں شیخ عاصم سے متنفر ہوئی تھی۔ وہ عاصم کو چھوڑ کر اچانک غائب ہو گئی تھی اور شیخ عاصم امارات میں پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ ان دنوں عاصم نے مجھ سے بڑا نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا کیونکہ صحرا میں ایک موقع پر میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ شاید میں عاصم کے رویے کو درست ہی مان لیتا مگر پھر اپنے ایک اہم قبیلے شیخ عشارب کے نام لکھا ہوا عاصم کا خط پکڑا گیا تھا جس میں عاصم نے عشارب کو تسلی دی تھی کہ وہ اندر سے بدلا نہیں ہے صرف خود کو بدلا ہوا ظاہر کررہا ہے۔ آج پھر میں اس رقیب کو روبرو پا رہا تھا۔

شیخ عاصم نے عادت کے مطابق دو تین پیگ لگا رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں تھا اور وہ میری آنکھوں میں دیکھتا چلا جارہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ میرے لیے اس کے دل میں نفرت اور قہر کی بجلیاں لپک رہی ہیں۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا "شاہ جہاں! تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے اس کے بعد تم کسی رعایت کے مستحق تو ہرگز نہیں ہو' لیکن میں تمہاری تمام تر کمینگی کے باوجود تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ تم نے آصف جاہ کو جو طعنہ سنایا ہے وہ میں نے بھی سنا ہے۔ مجھے تمہارا چیلنج قبول ہے۔ تمہیں اکیلا بندہ مارے گا۔ صرف ایک۔۔۔ تمہارے ہاتھ پاؤں کھول دیے جائیں گے۔"

"میں بڑے سے بڑے کافر کی زبان پر تو یقین کرسکتا ہوں' تمہاری زبان پر نہیں۔ تم بھی اپنے اس شُہدے جیسے کی طرح شُہدی دھمکیاں ہی دے سکتے ہو۔"

"میں تم سے بدزبانی کرنا نہیں چاہتا۔ میری مسلمانی کا انکار تو تم کرو گے اور میرے پاؤں بھی چاٹو گے' لیکن اس سے پہلے تمہاری حسرت پوری ہونی چاہیے۔" پھر وہ آصف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "مسٹر آصف! اس کی درگت صرف ایک بندہ بنائے گا۔ باقی سب باہر آجائیں۔"

"لیکن سر۔۔۔؟"

"میں نے کہا ہے نا مسٹر آصف! آپ اپنے ماتحتوں کو لے کر باہر آجائیں۔" شیخ عاصم نے پھر کہا۔

"او کے سر۔" آصف جاہ نے خوشامدی انداز میں کہا۔ "اس کے پاؤں کھول دو' لیکن ہتھکڑی لگی رہنے دو۔"

آصف نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ عاصم بولا "اب یہ ہے کہ تم کسی کو ہیجڑا بناتے ہو یا خود بنتے ہو۔"

شیخ عاصم واپس چلا گیا۔ چند لمحے بعد آصف جاہ اور اس کے جلاد صفت گماشتے بھی باہر نکل گئے۔ تنگ کمرے میں میں ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔ حسب معمول چند سیکنڈ بعد کمرے کی بتی بھی روشن ہو گئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اب دن کے تین بجنے والے تھے۔ اٹھارہ گھنٹے پہلے مجھے کھڑی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ تب سے میں بیٹھ نہیں سکا تھا۔ ٹانگیں بالکل اکڑ کر رہ گئی تھیں۔ پورے جسم پر چھتریوں اور دیگر ضربات کے نشان تھے' کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ شیخ عاصم دھمکی لگا کر گیا تھا کہ اس تھانے میں وہ مجھے صرف ایک اکیلے اہلکار سے لڑوائے گا۔ وہ مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں پاکستان اور سری لنکا میں اس کے بڑے پھنے خاں قسم کے کارندوں کو ناکوں چنے چبوا چکا ہوں' اس کے باوجود اس نے ایسی بات کی تھی۔

میں کمرے کے فرش سے تین چار انچ اوپر ہوا میں جھولتا رہا اور عاصم کے اگلے قدم کا انتظار کرتا رہا۔ ہوا میں لٹکنے سے ہاتھوں کو ناقابل برداشت کھنچاؤ سہنا پڑ رہا تھا لیکن اس سے ٹانگوں کو بہت آرام مل گیا تھا۔ میں گاہے گاہے اپنی ٹانگوں کو سکیڑ کر ان میں خون کی گردش بحال کررہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ایک بار پھر راہداری میں قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے آصف جاہ اور شیخ عاصم کو دیکھا' ان کے ہمراہ دو تین افراد اور بھی اس عقوبت خانے کی طرف چلے آرہے تھے۔ وہ لوگ جب مکمل روشنی میں آئے تو مجھے شیخ عاصم کے ساتھ ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا اور میری رگوں میں خون اچھل کر رہ گیا۔ اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھی کہ شیخ عاصم نے کس بل بوتے پر میرا چیلنج قبول کیا تھا۔ بلکہ چیلنج سے بھی آگے چلا گیا تھا اور "ایک سے ایک" کے لڑنے کی بات کی۔ شیخ عاصم کے ساتھ شیطان ابن شیطان شنکر شکرا نظر آرہا تھا۔ میں شنکر کو بھی آج ایک مدت بعد دیکھ رہا تھا۔ ابوظہبی کے نواحی صحرا میں جو واقعات پیش آئے تھے ان میں سے ایک سنگین واقعہ میرا اور شنکر کا مقابلہ تھا۔ اس مقابلے میں شکست یا ہار نہیں تھی' زندگی یا موت تھی۔ کئی روز تک اس مقابلے کی تیاری قبائلی سردار کی قائم مقام بیگم خوب روشاری نے کروائی تھی۔ اکھاڑے میں زہر آلود حربے چھپائے گئے تھے اور ہمیں ایک خاص انداز کی لڑائی لڑنی تھی۔ اس لڑائی میں شنکر کو شکست ہوئی تھی مگر اچانک ہونے والی فائرنگ کے سبب اس کی جان بچ گئی۔ بعد ازاں وہ شفاخانے سے فرار ہو گیا تھا۔ آج وہ بلائے ناگہانی کی طرح پھر میرے روبرو تھا۔

بالکل سفید آنکھوں والے ایک سنتری نے آگے بڑھ کر کمرے کا مقفل دروازہ کھولا اور شنکر شکرا اندر داخل ہو گیا۔ اس نے حسب عادت آدھی آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا پورا جسم کسرتی تھا۔ تاہم بازوؤں کی مچھلیاں خاص طور سے نمایاں تھیں اور ہلکی سی جنبش پر پھڑکتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی پتلون قیمتی تھی اور پاؤں میں بڑے اسمارٹ سے جوتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح سفاکی کی برف جمی ہوئی تھی۔ بالکل پرسکون دکھائی دیتا تھا مگر میں جانتا تھا' جب وہ حرکت کرے گا تو برق رفتار ہو جائے گا۔

اس نے میری طرف دیکھ کر زمین پر تھوکا اور بولا "بہت

انتظار کروایا ہے تم نے۔ چلو یہ بھی شکر ہے کہ انتظار رائگاں نہیں گیا۔ وہاں افریقہ میں تم کسی درندے کے پیٹ میں چلے جاتے تو میں جیون بھر قسمت کو روتا رہتا۔ سچ کہتے ہیں کہ بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔"

میں اب حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ شنکر کو روبرو دیکھ کر جسم و جاں میں وہی آگ جاگ گئی تھی جو برسوں سے جاگ رہی تھی۔ جب بھی یہ لعین میرے سامنے آتا تھا میری یہی کیفیت ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جسم کی تمام خوابیدہ قوتیں یک لخت بیدار ہو گئی ہیں اور میں وہ شاہ جہاں نہیں رہا جو شنکر کے سامنے آنے سے پہلے تھا۔ اس کیفیت میں جوش، اندیشے، غضب، نفرت سب کچھ گھل مل جاتا تھا۔ میں نے کہا "میں بھی تمہیں ایک پل کے لیے بھولا نہیں ہوں شنکر۔ شاید تیرے کچھ سانس باقی تھے جو تو شفا خانے سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ قبیلے کا دستور تو یہی کہتا تھا کہ ہارنے والے کو لازمی مرنا ہو گا۔"

شنکر کے نیلے پیلے بے رحم ہونٹ بھنچ گئے اور وہ کچھ اور بھی خطرناک نظر آنے لگا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے شیخ عاصم کی طرف دیکھا۔ عاصم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شنکر نے ایک لفظ کہے بغیر جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکالی اور میری ہتھکڑی کھول دی۔ میرے ننگے پیروں نے کمرے کے ٹھنڈے فرش کو چھوا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری ٹانگوں میں جسم کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہیں لیکن مجھے یہ بوجھ سہارنا تھا بلکہ شنکر کے غضب ناک حملوں کا بوجھ بھی سہارنا تھا۔ قرائن سے صاف پتا چل رہا تھا کہ شنکر کو یہاں میری طبیعت صاف کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔

میری ہتھکڑی اتار کر باہر پھینک دی گئی۔ چند ہی لمحے بعد میں اور شنکر آمنے سامنے تھے۔ مجھے وہی جلتے ہوئے صحرا والے مناظر یاد آ گئے۔ یوں لگا جیسے سلسلہ بالکل وہیں سے شروع ہوا ہے جہاں سے کئی مہینے پہلے ٹوٹا تھا مگر اب صورت حال میں بہت فرق تھا۔ میں اس حوالات میں ایک ملزم کی حیثیت سے بند تھا۔ آصف جاہ کے بہیمانہ تشدد نے میری حالت غیر کر رکھی تھی اور بات صرف جسمانی تشدد ہی کی نہیں تھی مجھے ذہنی طور پر بھی ٹارچر کیا گیا تھا۔ زریں گل کی چیخیں اسی ٹارچر کا حصہ تھیں۔ جرم و سزا کی دنیا کے دو جانے پہچانے اور پرانے حریف ایک بار پھر آمنے سامنے تھے۔ اس مرتبہ مقابلہ ممبئی کے کسی کلب یا جوا خانے میں نہیں تھا، نہ ہی یہ دہلی کی کوئی بدنام گلی تھی، نہ ہی سری لنکا کا کوئی شراب خانہ تھا، اس مرتبہ جائے مبارزت لاہور کا ایک تھانہ تھی۔ یہ

عجیب اجارہ داری تھی۔ پولیس اسٹیشن کے اندر ایک تاریک گوشے میں بیٹھ کر پہلے شیخ عاصم میری بے بسی کا تماشا دیکھتا رہا تھا اور اب شنکر شنکرا میری خبر لینے کے لیے یہاں موجود تھا۔ شنکر ایک غیر ملکی تھا، پاکستانی بھی ہوتا تو پولیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، پھر وہ کس حیثیت سے اس لاک اپ میں داخل ہوا تھا اور پولیس افسران کے سامنے میرے ساتھ دنگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ یہ تو اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ تھا۔ یہ اثر و رسوخ کا کھیل تھا اور اثر و رسوخ کی بنیاد دولت پر ہوتی ہے اور دولت بہت تھی ابو ظہبی کے رئیس زادے کے پاس۔

میں نے کہا "شنکر! اگر خود کو ایک بہادر دشمن سمجھتے ہو تو پھر مجھے بھی ایک آزاد فضا مہیا کرو۔ کسی ایسی جگہ دو دو ہاتھ کرو جہاں ہم دونوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں۔"

کھڑکی کی دوسری جانب شیخ عاصم بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا، آصف جاہ پھنکار کر بولا "یہ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ یہ تمہاری بات کا جواب دیا ہے شیخ صاحب نے۔ تم نے کہا تو کہ تمہیں باندھ کر مارا جا رہا ہے، اب تمہیں آزاد کر کے مارا جائے گا اور مارنے والا بھی ایک ہی ہو گا۔"

شنکر کی بھوری آنکھیں جو ہمیشہ مجھے سانپ کی آنکھیں نظر آتی تھیں مجھ پر جھپٹنے کے لیے اور میرا لہو پینے کے لیے بے قرار تھیں۔ ان آنکھوں کے گرد نظر آنے والے زخموں کے نشان ایک پرانے معرکے کی یادگار تھے، اب کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر یہ نشان جوں کے توں ہی تھے۔ شنکر اپنے دونوں بازو پھیلا کر میرے قریب آ گیا تھا، میں اس کی لڑائی کا ہر ہر انداز اب بڑی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ شنکر کا خطرناک ترین وار اس کے گھٹنے کی ضرب ہے۔ وہ یہ ضرب عام طور سے اپنے مدمقابل کی ٹانگوں کے درمیان لگاتا تھا۔ یہ ضرب کھا کر میں نے بڑے بڑے سخت جان فائٹرز کو مچھلی کی طرح تڑپتے اور سرنگوں ہوتے دیکھا تھا، بیسیوں نہیں تو درجنوں افراد ایسے ضرور ہوں گے جو شنکر کی اسی ضرب کی وجہ سے راہی عدم ہوئے۔ دوسری طرف شنکر کو بھی میرے خطرناک ترین داؤ کا پتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں اس کی نگاہ ہر وقت میرے دائیں بازو پر رہتی تھی، اس عیار لومڑ نے ایک آدھ بار کے سوا مجھے کبھی یہ موقع نہیں دیا تھا کہ میں اس پر یہ داؤ آزما سکوں۔ یقیناً آج بھی وہ میرے اس داؤ کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ جونہی شنکر نے اپنے دائیں ہاتھ کی کشتی بنائی میں سمجھ گیا کہ وہ حملہ کرنے جا رہا ہے۔ میں نے اس کا

ر تیزی سے جھک کر بچایا اور پھر ایک دم اس کی کمر دبوچ ۔ از لگا کر میں نے اسے پشت کے بل گرانا چاہا۔ اس کا ر دیوار سے ٹکرایا لیکن وہ گرا نہیں۔ اس نے ٹانگ میرے پیٹ پر رسید کی اور مجھے دور ہٹا دیا۔

میری ٹانگ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر ان ٹیسوں پر ر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میرے حریف کا شمار وقت کے رناک ترین اسٹریٹ فائٹرز میں ہوتا تھا، اس کے سامنے ک لمحے کی غفلت کا مطلب اچانک موت تھا۔ صفدر جب ت مند تھا تو ایک بہترین فائٹر تھا لیکن میں نے آج تک ے شنکر کے مدمقابل نہیں آنے دیا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی صفدر میں ایک کمزوری تھی۔ وہ حریف پر جھپٹتے ہوئے اکثر پنے دفاع سے غافل ہو جاتا تھا۔ شنکر جیسے لوگ اس غفلت معاف نہیں کرتے اور عموماً اس کی سزا موت کی صورت ا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی ٹانگ سے اٹھنے والی ٹیسوں سے دھیان یکسر ہٹا لیا اور شنکر کے طوفانی حملوں سے خود کو نے کے لیے ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔

لڑائی کے دوران میں ہی مجھے خیال آیا کہ صحرا میں خونی ابلے کے دوران میں، میں نے تیز دھار حربے کا بھرپور وار ر کے سینے پر کرنا چاہا تھا اس نے یہ وار ہاتھ پر روکا تھا اور حرکت کے سبب اس کی ایک انگلی تقریباً کٹ گئی تھی۔ نے اس کی انگلی دیکھی وہ واقعی کٹی ہوئی تھی۔ یعنی اس ایک ہاتھ میں صرف چار انگلیاں تھیں۔ اپنے بدترین ف کا یہ جسمانی نقص دیکھ کر دل کو راحت کا احساس ہوا، نکہ یہ کوئی ایسا نمایاں نقصان نہیں تھا مگر نقصان تو تھا۔ یہ را قابل ذکر نقصان تھا جو شنکر کو میری وجہ سے پہنچا تھا۔ سے پہلے اس کی آنکھوں کے گرد جو زخم آئے تھے وہ بھی سلسلے کی کڑی تھے۔

اگلے دو چار منٹ میں میرے اور شنکر کے درمیان د جدوجہد ہوئی۔ شنکر نے میرے جسم پر چند ضربیں لگائیں ب میں، میں نے بھی حساب برابر کر دیا۔ شنکر کے چہرے پر والی میری ایک لات کافی زوردار تھی، وہ چند لمحوں کے ڑکھڑا گیا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ اپنی دیرینہ ش پوری کرتے ہوئے اس کی گردن اپنے بازو کے حصار لے لوں مگر جونہی میں اس کی پشت پر پہنچا وہ چوکس ہو گیا خود کو میری زد سے دور لے گیا۔ یہ لڑائی چونکہ کسی بھی کے ہتھیار کے بغیر ہو رہی تھی اس لیے کسی کو بھی شدید ان پہنچنے کا خطرہ اس وقت تک نہیں تھا جب تک کوئی ضرب نہ لگ جاتی۔

اچانک اوپر تلے کئی مکے میرے چہرے پر لگے اور میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے شنکر کے گھٹنے کو خم کھاتے دیکھا۔ اس مہلک وار سے بچنے کی میں نے بھرپور کوشش کی۔ میں بچ تو گیا لیکن صاف نہیں بچ سکا۔ ضرب میری ٹانگوں کے درمیان لگانے کی کوشش کی گئی تھی، ضرب میری ران پر لگی۔ یہی زخمی ران تھی۔ میں تیورا کر گر گیا۔ اس کے بعد شنکر نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میرا پورا جسم جیسے ایک دم ہی آہنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا تھا۔ دو تین پنچ ٹھوڑی پر لگے۔ یہ کوئی معمولی پنچ نہیں تھے، ان کے پیچھے شنکر کے بازو کی غیر معمولی قوت تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔

میری ٹانگ کا درد ناقابل برداشت تھا، کوشش کے باوجود میں شنکر کی مزاحمت نہیں کر پایا۔ چند لمحے یا شاید چند منٹ کے لیے جسم اور ذہن کا رابطہ منقطع سا ہو گیا۔ حواس بحال ہوئے تو میرے ہاتھ پھر سے ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے۔ کمرے میں پھر سے تاریکی کا راج تھا۔ دو تین سایوں نے مجھے دبوچ رکھا تھا اور پھر سے میری ہتھکڑی کو ایک آہنی کنڈے سے منسلک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے پاؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی پہلے کی طرح باندھے جا چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں پھر اسی حالت میں تھا جس میں شنکر شنکرا کے آنے سے پہلے تھا۔

میرا شکستہ جسم اب کچھ اور شکستہ ہو چکا تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف ٹانگ میں تھی۔ یہ نشانی میں ماریطانیہ کے صحرا سے لے کر آیا تھا۔ ٹانگ میں اٹھنے والی ہر ٹیس کے ساتھ جلتے ہوئے جنگل، بھنتے ہوئے ریوانے پجاری اور ہر طرف پھیلتے ہوئے دھوئیں کا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا، اس کے ساتھ ہی آگ کا وہ ستون نگاہوں کے سامنے چمکتا تھا، جو درحقیقت ایک جلا ہوا درخت تھا جس کے گرنے سے میری ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔

سلاخ دار کھڑکی کی دوسری جانب سے شیخ عاصم کی زہریلی آواز کانوں سے ٹکرائی "اب تو تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہیے شاہ جہاں۔ تمہیں صرف ایک بندے نے لتاڑا ہے۔"

میری ٹھوڑی سے لہو کی بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ میں نے کندھے سے رگڑ کر ٹھوڑی صاف کی اور بس شیخ عاصم کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

مجھے زخموں سے چور چھوڑ کر وہ لوگ چلے گئے۔ شیطان ابن شیطان شنکر بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شاید وہ

مزید تشدد سے پہلے تھوڑا سا وقفہ دینا چاہتے تھے۔ تشدد اگر تسلسل کے ساتھ ہو تو کبھی کبھی بے اثر بھی ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے پانی پلا پلا کر مارنے کا محاورہ ایجاد ہوا ہے۔ رات کے ڈیڑھ دو کا عمل ہوگا' میں اس عقوبت خانے میں بے یار و مددگار پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے وطن میں آکر ہم مزید غریب الوطن ہو گئے ہیں۔ اس بھرے پرے شہر لاہور کے بیچوں بیچ میں ایک تھانے میں بند تھا اور کوئی پرسان حال نہیں تھا' اور یہ وہی شہر لاہور تھا جس کے خواب ہم نے ماریطانیہ اور تنزانیہ میں دن رات دیکھے تھے۔ اس شہر کے گلی کوچوں' اس کے لوگ اور اس کی محبتوں کو یاد کیا تھا۔ ایک ہی دن میں یہ شہر پتھر کا کیوں ہو گیا تھا۔ شکر شکرا کو جرائم پیشہ گروہوں میں "بمبئی کا راجا" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ آج اس بمبئی کے راجا نے ایک پاکستانی تھانے میں گھس کر پولیس اہلکاروں کے سامنے ایک پاکستانی کو مارا تھا۔

اچانک میں چونک گیا۔ سلاخ دار کھڑکی کی دوسری جانب ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دیکھا مدھم روشنی میں ایک پولیس اہلکار میری طرف آرہا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا شخص تھا۔ وردی سے اندازہ ہوا کہ حوالدار ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ کمبل سا تھا۔ اس نے کمبل کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور بڑی احتیاط سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ اس نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر ایک دم آگے بڑھ کر اس نے میرے عریاں شانے کو اور بازو کو چومنا شروع کر دیا۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اور "شی" کی آواز نکال کر مجھے خاموش کر دیا۔

بڑی آہستگی کے ساتھ اس نے ایک دوسری چابی میری ہتھکڑی میں لگائی اور اسے بھی کھول دیا۔ میرے ہاتھ کھل کر نیچے آئے تو اس نے انہیں بھی چوما' موٹے موٹے آنسو میرے ایک ہاتھ کی پشت پر گرے۔ وہ سرگوشی میں بولا "چلو جناب' میرے ساتھ چلو' میں آپ کو یہاں سے نکال دوں۔"

"تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔

"میں ایسا نہ کروں گا تو میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔"

اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ کمبل کے نیچے سے ایک بھرا ہوا ریوالور نکالا اور میری خون آلود پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ اس کے بعد بوسیدہ کمبل اس نے میرے شانوں پر پھیلا دیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ کوئی سازش نہ ہو۔ کبھی کبھی حوالاتیوں کو اسی طرح جان بوجھ کر فرار کرایا جاتا ہے اور پھر گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ اگلے روز پولیس مقابلے کی خبر چھپتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر دھیان سے حوالدار کا چہرہ دیکھا۔ اگر وہ کوئی بہت بڑا اداکار نہیں تھا تو پھر اس کے آنسو اصلی ہی تھے اور وہ جذبہ بھی اصلی تھا جو اس کے سینے میں لہریں لے رہا تھا۔

میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے۔"

"حوالدار فیض محمد۔"

"فیض محمد! میرا خیال ہے کہ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

وہ بولا "اتنا آسان تو واقعی نہیں تھا مگر قدرت نے ایک موقع دیا ہے۔ گڑھی شاہو کی طرف ایک بڑا پولیس مقابلہ ہو رہا ہے۔ تین چار گھنٹے سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ ہمارے تھانے کی نفری بھی وہاں پہنچی ہوئی ہے۔ جو ایک دو سنتری آس پاس ہیں انہیں چکر دینا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے' آپ بس نکلنے والی بات کریں۔"

میں نے کہا "میرا ایک ساتھی بھی یہاں ہے۔"

"وہ یہاں نہیں ہے' اسے کہیں اور بھیج دیا گیا ہے۔ میں آپ کو بعد میں سب کچھ بتا دوں گا' مگر اس وقت بس آپ نکل چلیں۔"

میں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ قسمت جس نے اکثر میرے ارادوں کا ساتھ دیا تھا۔

ٹھیک ایک منٹ بعد میں اور حوالدار فیض محمد دو بند دروازوں سے گزرنے کے بعد تھانے کے احاطے میں عقبی دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے کہا "فیض محمد! تم جو کچھ کر رہے ہو یہ تمہیں بہت بڑی مصیبت میں ڈال دے گا۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم بھی میرے ساتھ ہی نکل چلو۔"

"میں جانتا ہوں صاحب جی! اب مجھے یہاں سے نکلنا ہے لیکن میں اپنے طریقے سے نکلوں گا۔" اس نے ایک پرچی میرے ہاتھ میں تھما دی "اگر آپ کے پاس کوئی اور ٹھکانا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس ایڈریس پر پہنچ جائیے۔ اللہ نے چاہا تو آپ کچھ دن کے لیے بالکل محفوظ رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں نکلتا ہوں' لیکن تم نے بھی جو کچھ کرنا ہے ذرا جلدی کرو۔"

"میں سب سمجھ رہا ہوں جناب۔"

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر اسی دوران میں ایک کمرے کی بتی روشن ہوئی اور آہٹ وغیرہ سنائی دی۔ حوالدار نے اشارے سے کہا کہ میں نکل جاؤں۔ میں پنجوں کے بل اچھل کر چھوٹی دیوار کا بالائی کنارہ تھاما اور بازوؤں کے زور پر جسم کو اوپر کھینچا۔ دیوار کے اوپر اوندھا لیٹ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک چھوٹی سڑک تھی۔ ایک تھڑے پر ایک اپ میں دو افراد سوئے پڑے تھے۔ پندرہ بیس گز دور گھنے کے رس والی ایک خالی ریڑھی کے نیچے دو کتے غالباً گھر بسانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

میں دیوار سے کود کر نیچے آیا۔ کمبل میں منہ سر لپیٹا اور مخالف سمت میں بڑھا۔ موسم خنک تھا' ہلکی سی ہوا بھی چل رہی تھی۔ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا میں جلدی نسبت روڈ پر نکل آیا۔ ایک پولیس موبائل سائرن بجاتی ہوئی لکشمی چوک کی طرف سے آرہی تھی۔ میں سگریٹ پان کے ایک کھوکھے کے عقب میں ہو گیا۔ یہاں پیشاب کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا' قریب ہی ایک فقیر اپنی گودڑی میں لپٹا خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے غور سے اس فقیر کی صورت دیکھی۔ دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ "خستہ حال شخص" سائیں عالی ہو اور وہ حق ہو کا نعرہ لگا کر کھڑا ہو جائے پھر وہ آنکھیں نچا کر کہے' ہاں شیخ محمد! کس کس نامعقول جلسے کی گردن مروائی ہے تم نے؟ میرے پاس دو بیوی والے جن فارغ بیٹھے ہوئے ہیں' مگر سائیں وہاں نہیں تھا' وہ تو ہزاروں میل دور اپنی جدید بستی میں کہیں دار عیش دے رہا تھا۔ سینڈلس کے جھرمٹ میں ذور رے وہ بوتا بن کر بیٹھا ہوا تھا۔

پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی گزر گئی تو میں پھر لکشمی چوک کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک راہ گیر سے میں نے وقت پوچھا رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ بہرحال میں جانتا تھا کہ لکشمی چوک اب بھی جاگ رہا ہوگا۔ یہاں رات بھر خورد و نوش کی محفلیں جمی رہتی ہیں۔ لکشمی چوک کی دودھیا روشنیوں نے میرے اندازے کو درست ثابت کیا۔ فلموں کے شو ذرا دیر ہوئی ٹوٹ چکے تھے' بس اب شب بیدار قسم کے لوگ یہاں وہاں چھوٹی موٹی ٹولیوں میں نظر آرہے تھے۔ ان میں اکثریت رائل پارک کے مکینوں کی تھی۔ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا اور سوچنے کے لیے ضروری تھا کہ کہیں بیٹھا جائے۔ میں ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ معدہ چوہیں گھنٹے سے خالی تھا۔ گرم تکوں اور سیخ کبابوں کی خوشبو دماغ کو چڑھی اور بھوک مزید شدت سے چمک گئی۔ جیب خالی تھی لہٰذا کچھ کھانے پینے کا سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ عجیب صورت حال تھی۔ حویلی کے دفینے کے کروڑوں روپے ہماری ملکیت تھے لیکن اس وقت مجھے ایک نان چنے اور چائے کی پیالی کے لیے ترسنا پڑ رہا تھا۔

ذہن میں بار بار یہ بات آرہی تھی کہ ساہی صاحب کو براہ راست فون کروں' یا پھر کسی اور شخص کے ذریعے ساہی صاحب تک یہ بات پہنچاؤں کہ ایک حوالدار کی "جذباتی محبت" کے طفیل میں تھانے سے نکل آیا ہوں اور اب اس حال میں فلاں جگہ بیٹھا ہوں لیکن ہر بار میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ایسا کوئی بھی فون میرے لیے پھندا ثابت ہوگا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ ہر ایسی جگہ پر پولیس پہنچ چکی ہو جہاں میرے پہنچنے یا رابطہ کرنے کا چانس ہو۔ میں بیٹھا سوچتا رہا۔ کمبل میں نے اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ چہرے کے سوا میرا سارا جسم ہی چھپ گیا تھا۔ چہرے پر بھی چوٹوں کے نشان موجود تھے۔ کئی جگہ سے خون بھی رسا ہوا تھا۔ راستے میں ایک سرکاری نلکے سے میں نے منہ ہاتھ دھویا تھا اور شکل کو کسی حد تک قابل قبول کر لیا تھا۔ میلے کچیلے بیرے نے آکر پوچھا "کیا چاہیے استاد؟"

دل تو چاہا کہ کہوں' جو کچھ ہے سب لے آؤ' مگر پھر برداشت کیا اور کہا "ابھی ٹھہر جاؤ۔"

بیرا نما لڑکے نے پانی کا گلاس ذرا زور سے میز پر مار کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور چولھے کے قریب کھڑا ہو کر اپنی تخیلی فیس سکھانے لگا۔ اسی دوران میں گشتی پولیس کے کانسٹیبل اندر آگئے۔ انہوں نے اپنی ٹوپیاں اتار کر جیبوں میں ڈال رکھی تھیں اور جسم پر چادریں لپیٹی تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔ انہوں نے سیخ کبابوں اور نان وغیرہ کا آرڈر دیا اور سگریٹ پھونکنے لگے۔ ایک دو بار انہوں نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں نے مجھے بے چین سا کر دیا' میں دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہہ کر ہوٹل سے نکل آیا۔ اب میرا رخ اسٹیشن کی طرف تھا۔

راستے میں گول چکر تھا۔ گول چکر کے اندر گھاس پر چند بلوا کمبل اور چادریں وغیرہ اوڑھے لیٹے تھے۔ میں بھی وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ جلد از جلد کسی چار دیواری کے اندر چلا جاؤں۔ یقیناً میرا حلیہ وائرلیس پر پورے لاہور میں نشر ہو چکا تھا' اور کسی بھی وقت قانون کے کسی محافظ کی نگاہ میری قانون شکنی پر پڑ سکتی تھی۔ ابھی مجھے گول چکر میں بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک کھلے ہاتھ پیر کا شخص میرے قریب آبیٹھا۔ اس کی مونچھیں گھنی تھیں اور آنکھیں کسی نشے کے زیر اثر نیم وا تھیں۔ اس نے جسم کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی' سر پر مفلر باندھا ہوا تھا "کہاں سے آیا ہے میرے شہزادے؟" اس نے لاہوری انداز میں پوچھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"بات تو کوئی نہیں' بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا میرے شہزادے۔" چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے چادر کے اندر سے شراب کا ادھا نکالا اور بولا "کوئی مال پانی میری جان؟"

"نہیں مہربانی۔"

"اوئے اگر پینا نہیں تو کچھ پلا ہی دو۔ کوئی سگریٹ کوئی چرس سوٹا؟"

"نہیں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اوئے اگر نہیں ہے تو کوئی پیسہ ہی نکال۔ آج اپنی جیب تو بالکل پھوکٹ ہو رہی ہے۔"

"پیسہ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اوئے تو بوتا بڑا خشک ہے۔" اس نے تیور بدل کر کہا "چل نکال کوئی دس پندرہ سو روپے۔ چل شاباش۔"

اچھا تماشا تھا۔ ایک کن ٹٹا' استاد جمالی سے ٹیکس وصول کرنا چاہ رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ مجھے لوٹ نہیں سکتا' کیونکہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

میری خاموشی کو میرا تذبذب سمجھ کر اس نے ایک قدم اور بڑھایا اور اپنا موٹا بھدا ہاتھ زبردستی میرے کمبل میں گھسانا چاہا۔ میں نے جواباً اس کے ہاتھ میں ریوالور کی نال تھما دی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اسی لمحے میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ یوں پکڑ لیا کہ ہتھیلی اوپر کی طرف تھی۔ میرا انگوٹھا ہاتھ کی پشت پر تھا اور تین انگلیاں کلائی کو نیچے کی طرف دبا رہی تھیں۔ میں نے دانت بھینچ کر زور لگایا تو ایک ہی لمحے میں "لاہوری آوارہ گرد" کی آنکھیں پھیل گئیں۔ درد کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا کہ وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا ہے لیکن بھاگنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا' پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی' مگر دوسرا ہاتھ استعمال کرنے سے پہلے ہی وہ دوہرا ہو کر رہ گیا۔

میں نے غرا کر کہا "کسی کو آواز دینے کی کوشش کی تو ابھی پنجہ توڑ دوں گا۔"

وہ شاید واقعی چیخنا چاہ رہا تھا۔ اس نے فوراً منہ بند کر لیا۔

میں نے کہا "کتنے پیسے ہیں تیرے پاس؟"

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔ تھوڑے سے ہیں۔"

"چل جتنے بھی تھوڑے ہیں۔ نکال۔ چل دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا' پھر ارد گرد دیکھ کر بے چارگی کے عالم میں ہاتھ جیب کے اندر ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ یہ ڈیڑھ سو روپے تھے۔ اس کے علاوہ ایک لائٹر تھا۔ فلم اسٹار فردوس کی تصویر والا ایک بٹوا تھا۔ تھوڑی سی ریزگاری تھی۔ میں نے ریوالور پتلون کی بیلٹ میں لگایا اور یہ ساری اشیا جیب میں منتقل کر لیں "چل اب قمیص اتار۔"

اس موقع پر اس شخص نے تھوڑی سی مزاحمت کرنا چاہی' مگر ہاتھ کا شکنجہ اس پیر کامل کی طرح تھا جو اپنے مرید کو راستے سے بھٹکنے نہیں دیتا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا اور دردناک آواز میں بولا "پہلوان جی۔ لوگ دیکھ رہے ہیں' بس جان دیو۔"

"جان تو میں نے اللہ کو دینی ہے' باقی لوگوں کی بات چھوڑو۔ وہ شاید یہی سمجھیں گے کہ تمہارا مالش کرانے کا پروگرام بن گیا ہے۔"

معمولی پس و پیش کے بعد اس نے اپنے آزاد ہاتھ سے قمیص اتار دی۔ وہ پوری طرح میرے ٹرانس میں آ چکا تھا۔ میرے ریوالور سے بھی زیادہ میرے ہاتھ کی گرفت اور میرے ننگے جسم پر نظر آنے والے زخموں نے اسے مرعوب کیا تھا۔ آخر میں' میں نے اپنا بوسیدہ کمبل اسے دے دیا اور اس کی ڈبی دار سوتی چادر خود لے لی۔ اس کا مفلر بھی میرے سر پر آ گیا تھا۔

وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی تھی مگر وہ کسی عقیدت مند کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا "یہ گھڑی میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔ اب نکلو یہاں سے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑی بری جگہ پر گولی ماروں گا۔ چلو شاباش۔" وہ لرزتی ٹانگوں سے کھڑا ہو گیا پھر تیزی سے مڑا اور اپنے ننگے جسم کے گرد کمبل درست کرتا ہوا لکشمی چوک کی طرف نکل گیا۔ آج کی رات کا یہ آخری پہر یقیناً اس کے لیے بھاری رہا تھا۔

جونہی وہ سڑک پر پہنچا' میں نے پاس سے گزرتے ایک رکشا کو ہاتھ دیا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ فی الحال میں اپنی جان پہچان والے کسی بھی شخص کے دروازے پر دستک نہیں دوں گا۔ رکشے میں بیٹھے بیٹھے میں نے وہ پرچی نکالی جو حوالدار نے مجھے دی تھی۔ لائٹر کی روشنی میں' میں نے ایڈریس پڑھا۔ یہ شیخوپورہ سے چند میل آگے ایک گاؤں کا پتا تھا۔ پتے پر کسی کرم دین کا

نام لکھا ہوا تھا اور گاؤں کا نام "رلا جھا پور" تھا۔

میں نے اسٹیشن کے ایک قدرے صاف ستھرے ہوٹل سے جلدی جلدی تھوڑا سا کھانا کھایا' پھر فیصل آباد جانے والی پسنجر بس پر سوار ہو گیا۔ اس بس نے کچھوے کی چال سے مجھے صبح آٹھ بجے کے قریب شیخوپورہ سے آٹھ دس میل آگے اتار دیا۔ یہاں سے میں ایک دیہاتی تانگے پر سوار ہوا اور قریباً چھ میل سفر کیا۔ اس سے آگے ایک تنگ کچے راستے پر مجھے پیدل جانا تھا۔ یہ کافی کٹھن سفر تھا۔ دھوپ کی وجہ سے حرارت ہو گئی تھی' جسم پر پسینہ آ گیا تھا۔ میں چادر اتار دینا چاہتا تھا لیکن اتار نہیں سکتا تھا کیونکہ قمیص پر کئی جگہ خون لگ چکا تھا اور ریوالور بھی میں نے پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ جسم کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا۔ شنکر شکرا نے وہ ساری وحشت میرے جسم پر اتاری تھی جو مہینوں سے اس کے دل و دماغ میں اکٹھی ہو رہی تھی۔

شاید اسے شیخ عاصم کی طرف سے اجازت ہوتی تو وہ مجھے جان سے ہی مار ڈالتا۔ اس کی قہرناک ضربوں کی وحشت وقت گزرنے کے ساتھ مجھے مزید شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بے شک مجھے زیر کیا تھا مگر کیسے کیا تھا یہ مجھے معلوم تھا' اور شاید اسے بھی معلوم ہو گیا ہو گا۔ میری ٹانگ زخمی تھی اور باقی جسم بھی ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میں شنکر جیسے دشمن کا بھرپور مقابلہ کر سکتا۔

حوالدار فیض محمد نے جس گھر کا ذکر کیا تھا' وہ امرودوں کے ایک بڑے باغ کے اندر واقع تھا اور باقی کے گاؤں سے کچھ ہٹ کر تھا۔ میں نے ایک کاشت کار سے کرم دین نامی شخص کا پوچھ کر کنفرم کر لیا کہ یہی وہ مکان ہے جس کا ایڈریس مجھے دیا گیا تھا' مگر میں فوری طور پر اس گھر کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے مجھے یہ دیکھنا تھا کہ حوالدار فیض محمد خود یہاں پہنچا ہے یا نہیں۔ اگر وہ خود یہاں نہیں پہنچ سکا تھا تو پھر میرے لیے سخت خطرناک تھا کہ اس گھر میں پناہ لوں۔ میں اس باغ کے اردگرد گھومتا رہا' کبھی یہاں بیٹھ گیا' کبھی وہاں۔ گاؤں کے لوگ اکثر سادہ ہوتے ہیں اور کسی کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی پسند نہیں کرتے۔ میرے حلیے اور حرکات و سکنات پر بھی زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔ ایک جگہ دو نوجوان کیکر کے درخت تلے بیٹھے بارہ ٹہنی قسم کی کوئی چیز کھیل رہے تھے' ان کے مویشی آس پاس گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ کیسی بے فکری تھی' کیسی آزادی تھی۔ شہر کے ہنگاموں سے دور' شیخ عاصم' شنکر شکرا اور آصف جاہ جیسے درندوں سے محفوظ فاصلے پر یہ دونوں نوجوان کتنے آسودہ اور خوش نظر آتے تھے۔

ان میں سے ایک نے میرے چہرے کی چوٹیں دیکھیں اور معصومیت سے بولا "بھا! تمہاری کسی سے لڑائی ہوئی ہے؟"

"نہیں ریڑھے سے ٹکر ہو گئی تھی۔"

"اچھا اسی لیے لنگڑا رہے ہو۔ کیا شہر سے آئے ہو؟" اس نے میری پتلون دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اُدھر ساتھ والے گاؤں سے ایک بندے سے پیسے لینے ہیں۔ میرا ساتھی وہاں گیا ہوا ہے' میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے بہانہ بنایا۔

"تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟"

"میں تب جاؤں گا' اگر وہ پیسے نہ دے گا اور معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

لڑکا سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے امرودوں کے باغ کے عین درمیان واقع نیم پختہ مکان کی طرف اشارہ کیا اور لڑکے سے پوچھا "وہ کس کا گھر ہے؟"

"کرم دین کا۔ یہ امرودوں کا باغ اسی کا ہے۔ اس کی بیوی باغ کی دیکھ بھال کرتی ہے۔"

"کیوں؟ وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ بھی یہیں ہے' لیکن پچھلے چار پانچ سال سے وہ بستر پر پڑا ہوا ہے۔ بیمار رہتا ہے۔"

شاید میں کچھ اور بھی پوچھتا مگر اچانک مجھے خاموش ہونا پڑا۔ دور ایک پگڈنڈی پر مجھے درمیانے قد کا ایک شخص تیز تیز چلتا نظر آیا۔ مجھے شک گزرا کہ وہ حوالدار فیض محمد ہی ہے۔ وہ سادہ لباس میں تھا' اس نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے وہیں درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے اپنا آپ کچھ اور بھی چادر میں لپیٹ لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی فیض محمد مجھے دیکھ پائے۔

فیض محمد مجھ سے دس پندرہ گز کی دوری سے گزر گیا۔ ایک لڑکے نے بلند آواز سے کہا "چاچا فیضی سلام!"

"وعلیکم سلام پتر۔" فیض محمد نے دور ہی سے جواب دیا اور باغ والے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ میرے جسم پر وہ کمبل نہیں تھا جو میں تھانے سے لایا تھا بلکہ اسٹیشن کے اُچکے لفنگے سے اتروائی ہوئی چادر تھی۔ میں نے اس چادر کا گھونگھٹ سا نکال لیا تھا۔ رہی سہی کسر مفلر نے پوری کر دی تھی۔ فیض محمد مجھے دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا "یہ بندہ کون ہے؟"

وہ بولا "یہ کرم دین کا پرانا یار ہے' بلکہ اب تو دونوں منہ بولے بھائی بنے ہوئے ہیں۔ چاچا فیضی' کرم دین کی خیر خبر لینے یہاں آتا رہتا ہے۔ سنا ہے کہ چاچا فیضی تھوڑی بہت حکمت

بھی جانتا ہے۔"

"یہ کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"اس کا تو پتا نہیں۔" دیہاتی نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔

فیض محمد عرف فیضی کو مکان میں داخل ہوئے آدھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ میں نے ادھر ادھر گھوم کر حالات کا جائزہ لیا۔ اسی طرح آدھ گھنٹا میں نے مزید گزار دیا۔ میں یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کوئی حوالدار فیضی کے پیچھے یہاں تک تو نہیں پہنچا ہے۔ مکمل تسلی تو اب بھی نہیں ہوئی تھی بہرحال میں کسی حد تک مطمئن ضرور ہو گیا تھا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بجے ہوں گے جب میں باغ میں داخل ہوا اور کرم دین کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ایک جواں سال عورت نے کھولا۔ اس کی عمر تیس سال سے اوپر تھی مگر وہ کافی حد تک اسمارٹ اور صحت مند نظر آتی تھی۔

میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونکی' پھر احتیاط سے بولی "کس سے ملنا ہے جی۔"

"فیضی سے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہو۔۔۔ تو آپ ہی شہر سے آئے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ایک منٹ رکیں میں ابھی آتی ہوں۔" وہ دروازہ بند کر کے جلدی سے واپس چلی گئی۔ چند لمحے بعد فیضی دروازے پر نمودار ہوا اور مجھے اندر لے گیا۔

یہ کافی کشادہ مکان تھا۔ صحن میں ایک طرف بھینس کے ساتھ دو بکرے بندھے ہوئے تھے دوسری طرف چارا کاٹنے والی دستی مشین تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بڑے ترپال پر امرودوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ شاید ابھی تھوڑی دیر پہلے تک جواں سال عورت امرودوں کی چھانٹی کر رہی تھی۔ فیضی مجھے جلدی سے اندر لے گیا۔

ہم برآمدے سے گزرے' یہاں مجھے ایک کمزور مدقوق شخص پڑا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی تھوکنے کے لیے ایک چھوٹی ہانڈی میں راکھ بھر کر رکھی گئی تھی۔ قریب ہی حقہ بھی پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کرم دین ہے۔ فیضی مجھے کمرے میں لے گیا۔

"شکر ہے جی آپ پہنچ گئے۔ میرا دل تو ڈر رہا تھا۔" فیض نے کہا۔

"میں بھی مسلسل تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں' شکر ہے کہ تم پہنچ گئے۔"

فیض نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے لیے چارپائی وغیرہ بچھا رکھی تھی۔ سفید کھیس' سرہانہ رنگ دار دری۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "جناب! میں غریب بندہ ہوں۔ یہ سب کچھ آپ کے لائق تو نہیں ہے مگر جو کچھ ہے قبول کریں۔"

میرے بیٹھتے بیٹھتے جواں سال عورت دروازے کی اوٹ میں نظر آئی اور فیض کو تازہ دودھ سے بھرا ہوا شیشے کا جگ اور گلاس تھما کر چلی گئی۔

میں نے کہا "فیض! تم نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے اور کر رہے ہو' میں اسے کبھی بھول نہیں سکوں گا' اور اگر زندہ رہا تو تمہارا یہ احسان چکانے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

وہ بولا "احسان چکانے کی کوشش تو میں کر رہا ہوں جناب' اور دیکھیں کوشش بھی کتنی چھوٹی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

اس نے گہری سانس لی "جاگیردار قادر زماں کو بھولے تو نہیں ہوں گے آپ۔۔۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اپنے مرنے سے دو تین سال پہلے اس نے علاقے میں کتنی اَت اٹھائی ہوئی تھی' وہ فرعون بن گیا تھا۔ ان دنوں میں نیا نیا حوالدار ہوا تھا۔ ایک روز حویلی میں ایک پولیس پارٹی تلاشی لینے چلی گئی تھی۔ قادر زماں نے اے ایس آئی سمیت سارے پولیس اہلکاروں کو ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا تھا۔ میں جان بچا کر بھاگ گیا تھا مگر قادر زماں کے بونے گارڈ مجھے پکڑ کر واپس لے آئے تھے۔ جاگیردار سخت غصے میں تھا شاید وہ مجھے کھڑے کھڑے گولی ہی مار دیتا مگر آپ آڑے آ گئے تھے۔ قادر زماں کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے آپ نے جاگیردار سے کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وہ واقعہ یاد آ گیا ہوگا۔"

حوالدار فیضی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں دھندلے دھندلے نقش ابھر آئے تھے۔ ایک پولیس اہلکار نے قادر زماں کے خوں خوار بونوں سے بچنے کے لیے میرے عقب میں پناہ لی تھی اور رو رو کر التجا کی تھی کہ میں اسے بچا لوں۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے فیضی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں۔ بے اختیار ہو کر اس نے ایک بار پھر میرے ہاتھ چومنا چاہے' میں نے اسے گلے لگایا اور دلاسا دیا۔ وہ روتے ہوئے بولا "جناب کل رات جب میں نے آپ کو کھڑی ہتھکڑی میں دیکھا اور پھر دیکھا کہ آپ کو بے دردی سے مارا جا رہا ہے تو میرا دل خون ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے آپ کی جگہ میں کھڑا ہوں اور آپ کو مارنے والوں کی جگہ وہ حبشی بونے ہیں جو دانتوں سے لوگوں کا

گوشت ادھیڑ دیتے تھے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں نے آپ کی مصیبت کی وہ گھڑیاں کتنی تکلیف سے دیکھیں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے' آپ کو ان ظالموں کے درمیان نہیں رہنے دوں گا۔"

"تمہیں پتا ہے اس ہمدردی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"پتا ہے جی۔ نوکری چلی جائے گی' ہتھکڑی لگ جائے گی' پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ جو کچھ بھی ہے قبول ہے۔ یہ سب کچھ میں کسی معمولی بندے کے لیے نہیں کر رہا' آپ کے لیے کر رہا ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ کے کسی کام آ سکا ہوں۔ ایسے ہزاروں ہوں گے جو آپ کے ایک اشارے پر آپ کے لیے جان دے سکتے ہوں گے۔"

اس کا سر ایک والہانہ محبت کے سبب جھکا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "فیض محمد اب اور شرمندہ نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی بہت قابلیت مجھ میں ہو لیکن جو کچھ تم دیکھ رہے ہو' اس میں تمہاری نظر کی خوب صورتی بھی شامل ہے۔"

"میں نے بھکر شہر میں اور جھوک ضامن میں بہت دفعہ دیکھا ہے جی آپ کو۔ آپ کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے رہتے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ منہ پر تعریف کر رہا ہوں۔ میں نے بڑے بڑے پھنے خانوں کو آپ کے سامنے ناک رگڑتے دیکھا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "ابھی ایک دن پہلے تم نے کچھ اور بھی دیکھا ہے۔"

"کیا مطلب جناب؟"

"حوالات میں ہونے والی لڑائی بھول گئے ہو۔ ایک لمبے بندے نے مجھے مارا ہے۔"

"زخمی کو مارنا کوئی جواں مردی نہیں ہے جناب!" اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا "آپ کو رستے میں کوئی مشکل تو نہیں آئی؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا "یہ قمیص شلوار کہاں سے ملے؟ اور یہ چادر۔۔۔؟"

"بس تمہارے جیسا ایک کرم فرما راستے میں مل گیا تھا۔ دستی" کچھ نقدی میری جیب میں ڈال گیا اور یہ چیزیں بھی دے گیا۔" میں نے بات بنائی۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں بعد میں سوچتا رہا' آپ کی جیب میں تو کوئی پیسہ بھی نہیں ہے' یہاں کیسے پہنچیں گے۔"

اس نے نیم گرم دودھ کا گلاس بھر کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ دیہاتی دودھ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ہلکے زرد رنگ کی خوب موٹی ملائی اور ایک خاص قسم کی مہک۔۔۔ چینی بھی بڑی مناسب تھی' برتن خوب صاف ستھرے تھے۔ اس کے علاوہ بھی گھر کی ہر چیز میں بڑا سلیقہ اور صفائی نظر آتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گھر والی سگھڑ اور محنتی ہے۔ میں نے دودھ کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "تم یہاں کیسے پہنچے ہو؟"

وہ بولا "بس جی میرا پہنچنا کون سا مشکل تھا۔ تھانے سے نکل کر سیدھا سرنگ چونگی آیا۔ کوارٹر سے اپنا یہ بیگ لیا اور سرگودھا والی بس پر بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا۔"

"تم نے بہت بڑا قدم اٹھایا ہے فیض محمد۔ چلو تم تو یہاں پہنچ گئے ہو۔ تمہارے گھر والوں کا اور بچوں کا کیا ہوگا؟"

اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی "جناب! کوئی آگے پیچھے ہے ہی نہیں تو فکر کس بات کی۔ ایک لڑکی ہے وہ بیاہ کر دبئی چلی گئی ہے۔ بیوی دو سال پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی' کوئی عزیز رشتے دار یہاں ہے نہیں۔ دم وادم' دھوکا نہ غم۔ ایک دو یار بیلی ہیں۔ ایک تو خود بھی پولیس والا ہے' دوسرا سرکاری ملازم ہے۔ زیادہ ہوا تو ان کو دو چار دن حوالات میں رہنا پڑ جائے گا۔ باقی رہی وردی۔۔۔ تو وہ تو میں نے دل ہی دل میں اسی وقت اتار پھینکی تھی جب آپ کی مدد کا فیصلہ کیا تھا۔ ساری عمر نوکری ہی تو نہیں کرنی تھی' سمجھوں گا پانچ چھ سال پہلے ریٹائر ہو گیا ہوں۔"

میں نے تعجب سے اپنے سامنے بیٹھے حوالدار فیض محمد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی میں مجھے سچے موتیوں جیسا انمول جذبہ نظر آیا۔ جس وقت حوالات میں مجھے فیض محمد ملا تھا' اس سے چند لمحے پہلے میں عجیب انداز سے سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا' میرے لاہور کو کیا ہو گیا ہے۔ اس وطن کی مٹی اور اس لاہور کا چپہ چومنے کے لیے میں دن رات ترستا ہوں اور آج یہ لاکھوں انسانوں کا شہر پتھر کا ہو گیا ہے۔ ان پتھروں کے بیچوں بیچ مجھے جان لیوا تکلیف سے گزارا جا رہا ہے اور پتھر خاموش ہیں۔۔۔ اور پھر اس کا جواب لاہور نے شاید حوالدار فیض محمد کی صورت میں دیا تھا اور یہ بڑا تسلی بخش جواب تھا۔ ابھی شہر زندہ دلان میں "زندہ دل" موجود تھے۔ ان لمحوں میں مجھے کسی دانا کا قول یاد آنے لگا۔ اس نے کہا تھا' زندگی کی کھیتی میں کچھ نہ کچھ بکھیرتے جاؤ' ایک دن اپنے پیچھے باغ کھلا ہوا دیکھو گے۔ غالباً میری بکھیری ہوئی ایک چھوٹی سی نیکی آج ایک شجر سایہ دار بن کر میرے سامنے آ گئی تھی۔

ابھی میں دودھ پی کر فارغ ہوا ہی تھا کہ دوپہر کا کھانا آ گیا۔ کھانا لانے والی کرم دین کی بیوی ہی تھی۔ اس نے چارو

اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا لیکن چہرہ بھی کسی حد تک نظر آ رہا تھا۔ وہ خوب گوری چٹی عورت تھی۔ آنکھیں ہلکی بادامی تھیں۔ اونچی لمبی بھی تھی۔ رخساروں کا رنگ ایسا تھا کہ لگتا تھا ابھی لہو ٹپک پڑے گا۔ وہ تنور پر روٹیاں لگا کر آئی تھی، شاید اس لیے بھی زیادہ سرخ نظر آ رہی تھی۔ "بھاجی سلام۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

میں نے سلام کا جواب دیا اور تکلیف کے لیے معذرت چاہی۔ وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی "بھاجی! آپ کا اپنا گھر ہے۔ جب تک جی چاہے رہیں۔"

کھانا بڑا مزے دار اور صاف ستھرا تھا۔ ایک مدت بعد دیہاتی کھانا کھا کر طبیعت بحال ہو گئی۔ دیسی گھی میں پکا ہوا مٹر آلو کا سالن تھا۔ ساتھ میں آم اور لسوڑے کا اچار۔ تنوری روٹی، مولی کی چٹنی اور سب سے بڑھ کر گھر کی نمکین لسی۔ فیض میرے ساتھ کھانے سے جھجک رہا تھا مگر میں نے زبردستی اسے اپنے ساتھ شامل کیا۔

شاید یہ ماحول اور یہ جگہ مجھے زیادہ لطف اندوز کرتی اگر میرے ذہن میں اپنے ساتھیوں زریں گل اور منصور کا خیال نہ ہوتا۔ میں جلد سے جلد ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ لاہور میں دیگر حالات کیا ہیں؟ ان حالات کے سلسلے میں سب سے اہم سوال مسٹر جی کلارک کے بارے میں تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ لاہور پہنچے یا نہیں، اور اگر پہنچ گئے تو اب کہاں ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد ذہن میں یہ بات آئی کہ عالم قریشی کے پاس ایک ایسی فون لائن بھی ہے جس کے بارے میں صرف اس کے گھر والے ہی جانتے ہیں۔ عالم نے مجھے بھی یہ خفیہ نمبر دے رکھا تھا۔ میں نے فوراً ذہن پر زور دیا اور تھوڑی سی دقت کے ساتھ مجھے یہ نمبر یاد آ گیا۔ دل نے چاہا کہ اس نمبر کے ذریعے عالم قریشی سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں۔ مگر یہ کام ابھی نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اس روجھاپور نامی گاؤں سے نکلوں اور کسی ایسی جگہ پہنچوں جہاں سے فون کیا جا سکے۔ پھر ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ فون روجھاپور کے آس پاس سے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر خدانخواستہ کال ٹریس ہو ہی جاتی تو میری یہ پناہ گاہ بے کار ہو سکتی تھی۔

فیض نے میرے لیے اسپرٹ کا انتظام کیا۔ اسپرٹ سے میں نے اپنے زخم اور خراشیں وغیرہ صاف کیں۔ کرم دین کی بیوی کا نام شاہدہ تھا۔ وہ میرے لیے روئی کا ایک بہت بڑا پھاہا لے آئی۔ اس روئی میں ہلدی اور تیل وغیرہ ملایا گیا تھا اور اسے توے پر گرم بھی کیا گیا تھا۔ شاہدہ کی رائے تھی کہ اگر میں یہ پھاہا ٹانگ پر باندھ لوں تو دو دن میں بڑی بھلی چنگی ہو جائے گی۔ میں جانتا تھا کہ آرتھوپیڈک نقطہ نظر سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن بات طریقہ علاج کی نہیں ہوتی جذبے کی ہوتی ہے۔ میں نے پھاہا لے کر ٹانگ پر باندھ لیا۔ کھانا کھانے کے بعد تمام تر تفکرات کے باوجود غنودگی طاری ہو گئی۔ میں سو گیا، اٹھا تو شام کے سائے طویل ہو چکے تھے۔ کھڑکی میں سے دور سورج کا سرخ تھال نظر آ رہا تھا۔ کیکر اور دھریک کے بلند درختوں پر پنچھی چہک رہے تھے، دور کہیں سے ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے شاہدہ کو دیکھا، وہ صحن میں گھر کا کام کاج کر رہی تھی۔ کسی وقت برآمدے سے کرم دین کی کھانسی کی کمزور آواز بھی آ جاتی تھی۔ بھینس کا دودھ دھو کر بھری ہوئی بالٹی شاہدہ رسوئی کے قریب لائی، پھر مرغیوں کو اکٹھا کر کے ڈربے کی طرف لانے لگی۔ وہ بڑے بھرپور جسم کی مالک تھی، یوں لگتا تھا کہ ابھی اس کا بدن لباس میں سے پھٹ پڑے گا۔ دوسری طرف بے چارے کا شوہر تھا جو طویل عرصے سے بستر سے لگا ہوا تھا۔

وہ گاہے گاہے بیوی کو "شاہدہ" کی آواز دیتا تھا۔ وہ لپکتی ہوئی آتی تھی۔ کبھی اس کا تکیہ درست کر رہی ہے، کبھی دوا پلا رہی ہے، کبھی کروٹ بدلنے میں مدد دے رہی ہے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میاں بیوی میں محبت ہے۔ ماہ و سال کی گردش اور طویل بیماری کی خلیج نے بھی اس محبت کو کم نہیں کیا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میاں بیوی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شادی کے آغاز میں دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں اور چند دن بعد ہی فوت ہو گئی تھیں۔ ایک بمشکل دو ماہ زندہ رہ سکی تھی۔ اس کے ڈیڑھ دو سال بعد کرم دین بیمار ہو گیا تھا۔ یہ باتیں حوالدار فیض نے مجھے بتائی تھیں۔

فیض کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاہدہ کمرے سے کوئی چیز لینے آئی تو میں نے فیض کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا "بھاجی! وہ دربار تک گئے ہیں، ابھی سلام کر کے آ جائیں گے۔"

"کون سا دربار؟"

وہ ہولے سے مسکرائی تو اس کے دنداسا لگے دانت چمک اٹھے "بابے چانن والے کے مزار شریف کو یہاں دربار کہتے ہیں۔ آج جمعرات ہے نا۔ جمعرات کو وہاں چراغاں ہوتا ہے اور نیاز وغیرہ بٹتی ہے۔"

اسی دوران میں فیض بھی آ گیا۔ وہ ایک رومال میں تبرک کے طور پر میٹھے چاول لے کر آیا تھا۔ بڑی عقیدت سے

اس نے رومال میرے سامنے پھیلایا اور درخواست کی کہ میں اس تبرک میں سے ایک لقمہ لوں۔ میں نے لقمہ لیا۔ گیندے کے پھول، اگربتیاں، عطر، کئی خوشبوئیں ان چاولوں میں شامل ہو گئی تھیں اور اس کے ساتھ ایک سادہ لوح عقیدت کی مہک بھی تھی۔ میرے بعد فیض چاولوں والا رومال کرم دین کے پاس لے گیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اسے تبرک کے چاول کھلانے لگا پھر دونوں دیر تک آہستہ آواز میں باتیں کرتے رہے۔ میں بھی اٹھا اور لنگڑاتا ہوا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

کرم دین کی آنکھیں گہرائی میں اتر چکی تھیں، وہ بڑی مشکل سے بول سکتا تھا۔ میں نے فیض سے پوچھا "ان کو کیا تکلیف ہے؟"

فیض بولا "یہ درخت سے گرے تھے، کمر پر چوٹ آئی تھی، شروع میں تو سہارے سے اٹھ بیٹھ لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ بالکل معذور ہو گئے۔ اکثر بخار وغیرہ بھی رہتا ہے۔"

گاؤں کی طرح اس مکان میں بھی بجلی کی روشنی موجود تھی، مگر بجلی کئی کئی گھنٹے غائب رہتی تھی۔ اب بھی سرشام ہی لائٹ چلی گئی تھی۔ شاہدہ نے برآمدے میں لالٹین جلائی اور کمروں میں دیے وغیرہ روشن کر دیے۔ خالص دیہاتی ماحول کا نقشہ تھا۔ مجھے جل کوٹ کی یاد آنے لگی۔

رات کو روشنیاں وغیرہ بجھا کر ہم سو گئے۔ صرف برآمدے میں لالٹین کی مدھم لو جلتی رہنے دی گئی تھی۔ فیض اور میں ایک کمرے میں سوئے تھے۔ کرم دین اور اس کی بیوی برآمدے میں تھے۔ برآمدے کے دروں کو چقوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے یونہی کمرے کا جائزہ لینے کے لیے لائٹر روشن کیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ فیض اپنے بستر پر نہیں۔ دروازے کو دیکھا تو اسے باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ یہ بڑی پریشان کن صورت حال تھی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو کنڈی کیوں لگا گیا تھا۔ ایک دم ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ کہیں میرے ساتھ کوئی گیم تو نہیں ہوا تھا۔ فیض بظاہر تو ایسا نظر نہیں آتا تھا، لیکن انسان کے دل میں کون جھانک سکتا ہے۔ میرا دھیان بے اختیار ریوالور کی طرف چلا گیا۔ یہ ریوالور فیض نے ہی تھانے میں دیا تھا، میں نے ریوالور قمیص کے نیچے لگایا۔ میرا دھیان چھت کی طرف چلا گیا۔ ہوا اور روشنی وغیرہ کے لیے دیہات میں کبھی کبھی کمروں کی چھتوں پر روشن دان بھی رکھے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی روزن تھا، اسے لکڑی کے ایک ڈھکنے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں نے چارپائی کھسکا کر روزن کے عین نیچے کی اور تھوڑا سا اچھل کر روشن دان سے لٹک گیا۔ میرا تجسس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں دیکھوں کہ مجھے کمرے میں بند کیوں کیا گیا ہے۔ چند ہی لمحے بعد میں چھت پر تھا۔

بغیر آواز پیدا کیے چھت سے صحن تک آنے میں مجھے کوئی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ بھینس کے چھپر کے قریب جو ڈھارا (کچی چھت والا کمرا) ہے اس میں ہلکی سی روشنی ہے اور کوئی موجود ہے۔ میں ننگے پاؤں بے آواز چلتا ڈھارے تک پہنچا۔ پختہ لکڑی کی بے ڈھنگی کھڑکی میں ہلکی سی درز موجود تھی۔ میں نے درز سے جھانکا اور سن رہ گیا۔ اندر دیے کی مدھم روشنی تھی۔ بستر پر شاہدہ اور فیض بغل گیر نظر آ رہے تھے۔ شاہدہ کے بال منتشر تھے۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور اس نے خود کو فیض کی بانہوں میں گم کر رکھا تھا۔ میں ایک بار دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر جس طرح آیا تھا، اسی طرح احتیاط کے ساتھ کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ برآمدے سے کرم دین کے کھانسنے کی مدھم آواز آ رہی تھی اور اس کھانستے ہوئے شوہر سے صرف چند گز کی دوری پر اس کی بیوی ایک دوسرے شخص کے ساتھ مصروف تھی۔

عورت کے بہت سے روپ میں نے ایسے دیکھے تھے جنہوں نے بری طرح چونکایا تھا۔ یہ روپ بھی ان میں سے ایک تھا۔ ایک طرف بیمار شوہر سے محبت اور اس کی مسلسل خدمت گزاری، دوسری طرف شوہر کے دوست کے ساتھ تعلقات۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ کرم دین ان تعلقات سے مکمل طور پر بے خبر نہیں ہے۔

نیند آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد فیض دبے پاؤں واپس آیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کنڈی گرائی اور کمرے میں چلا آیا پھر اندر سے کنڈی لگا کر وہ آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح دم میں نے گھر کی "مالکن" کو دیکھا۔ اس نے لباس بدلا ہوا تھا اور اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ بڑی تیزی کے ساتھ وہ گھر کے کام کاج کرتی پھر رہی تھی۔ فیض کو دیکھ کر بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص نے رات کس طرح گزاری ہے۔ ناشتا ایک بار پھر دیہاتی طرز کا تھا اور بے حد تگڑا تھا۔ دیسی گھی کے پراٹھے، دیسی انڈوں اور پیاز کا آملیٹ، حلوا اور میٹھی لسی۔ شاہدہ نے میرے لیے نیا پراٹھا بھی بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔

دوپہر تک حوالدار فیض نے میرے لیے ایک نئے جوڑے کا انتظام کر دیا تھا۔ میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ

رکھا۔ پانی اور اسپرٹ سے اپنے زخم اور خراشیں وغیرہ صاف کیں۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ قمیص کے نیچے ریوالور لگایا' چادر اوڑھی اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ فیض نے پانچ سو روپے میری جیب میں ڈال دیے تھے اور کہا تھا کہ مزید کا انتظام بھی وہ شام تک کر سکتا ہے۔ میں نے فی الحال اسے منع کر دیا تھا۔

"کب تک آجائیں گے؟" فیض نے پوچھا۔

"شام سے پہلے انشاء اللہ۔"

"احتیاط کیجیے گا۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا "بلکہ بہتر تھا کہ آپ آج نہ جاتے۔"

"کیا بات ہے تم کچھ چھپا رہے ہو۔"

فیض نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اخبار نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ پچھلے صفحے پر ایک اشتہار تھا۔ اس میں میری تصویر تھی۔ نیچے درج تھا۔ شاہ جہاں رلد وقار احمد مختلف فوجداری مقدمات میں طویل عرصے سے پولیس کو مطلوب ہے۔ ۸ تاریخ کو شاہ جہاں کو لاہور ائرپورٹ سے گرفتار کیا گیا تھا مگر گرفتاری کے فوراً بعد وہ پولیس حراست سے فرار ہو گیا۔ شاہ جہاں کے بارے میں اطلاع دینے والے کو معقول انعام دیا جائے گا۔ شناخت راز میں رکھی جائے گی۔

اخبار میں میری جو تصویر دی گئی تھی وہ ڈھائی سال پرانی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ میری گرفتاری اور فرار کی تاریخ ۸ بتائی گئی تھی۔ یعنی وہ دو عذاب ناک راتیں جو میں نے حوالات میں گزاری تھیں کسی گنتی میں نہیں تھیں۔

میں نے اخبار فیض کو واپس تھما دیا اور اسے بتایا کہ میرا جانا ضروری ہے۔

پیدل چل کر میں اس مقام تک پہنچا جہاں سے تانگا مل سکتا تھا۔ تانگے پر میں نے چھ سات میل کا رشوار گزار سفر کیا اور ایک نواحی قصبے میں پہنچ گیا۔ شلوار قمیص پہن کر اور چادر کی بکل مار کر میرا حلیہ مقامی لوگوں جیسا ہی ہو گیا تھا پھر بھی چہرے کی خراشوں کی وجہ سے اکثر لوگ غور سے میری طرف دیکھتے تھے۔ قصبے میں چھوٹا سا تار گھر تھا اور ٹیلی فون کی سہولت بھی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ میں نے خفیہ فون نمبر ملایا تو عالم قریشی کی بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"ہیلو کون ہے؟" وہ "ہیلو" کو حسب عادت بہت لمبا کھینچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "لوگوں کی آنکھوں پر چربی چڑھتی ہے تمہارے کانوں پر چڑھ گئی ہے۔ اپنے باپ کی آواز بھی اب نہیں پہچانتے ہو۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر عالم قریشی کی لرزتی آواز آئی "شاہ جہاں تم؟ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کہاں سے بول رہے ہو تم؟ لیکن ٹھہرو ۔۔۔ مجھے مت بتاؤ' کسی کو بھی مت بتاؤ۔ یہاں سارے لاہور کی پولیس ہاکیاں ڈنڈے لے کر تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ میں کیا بتاؤں تمہیں' یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"اوئے گھامڑ! جو کچھ ہو رہا ہے بتا نا۔ اسی لیے تو تجھے فون کیا ہے۔"

عالم قریشی نے کہا "یار! پتا نہیں تیرے ستارے گردش سے کب نکلیں گے' میں تو خود آدھا رہ گیا ہوں تیری پریشانی میں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے' ساہی صاحب خود کئی گھنٹے تک ہیڈ کوارٹر میں رہے ہیں' آئی جی صاحب خود ان سے پوچھ تاچھ کرتے رہے ہیں۔ مجھے بھی دوبارہ تھانے بلایا گیا ہے۔ کوئی پتا نہیں ماں کے ہیر کے کب پھر بلاوا لے کر آجائیں۔ میں تمہاری پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا مگر بتانا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر حمزہ (ننھا کا بھتیجا) مسلسل پولیس کی حراست میں ہے۔ اس کے گھر والے رو رو کر بے حال ہو رہے ہیں۔ آج کا اخبار دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں۔ اچھی تصویر چھاپی ہے۔"

"شاہ جہاں! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم تو تیرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے پہنچے تھے' وہاں اور ہی چکر چل گیا۔ زریں گل شمالی چھاؤنی کے تھانے میں ہے۔ ایس ایچ او میرا واقف ہے' میں اس سے ملا ہوں۔ اس نے مجھ سے تو وعدہ کیا ہے کہ زریں کو ہاتھ تک نہیں لگایا جائے گا' آگے اللہ جانے۔ صفدر اسپتال میں ہے' وہاں بھی پولیس اہلکار نگرانی کر رہے ہیں۔ صفدر کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی ہے اس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یقین نہیں آتا ہے کہ یہ وہی صفدر ہے جسے ہم نے آخری بار دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سارے دکھ تو بعد میں بھی بیان ہوتے رہیں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ مشرقی کلارک صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے کہا "میری معلومات کے مطابق مشرقی کلارک لاہور آئے تھے۔ وہ دو روز پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرے پھر کسی ضروری کام سے اسلام آباد چلے گئے۔ اب ان کا مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔"

"غزالہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے گھر میں ہے۔ اس کے والدین سخت پریشان

ہیں۔ شیخ عاصم نے انہیں ہر طرف نشر کر دیا ہے۔ درحقیقت اب یہ شخص بالکل کھل کر سامنے آگیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ پہلے کی طرح پھر غزالہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ عدالت سے بھی رجوع کرے۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو میں تو غزالہ اور اس کے گھر والوں کو کسی خفیہ جگہ پر منتقل کر دوں۔"

"پروفیسر اور شائستہ کا کچھ پتا ہے؟"

"وہ خیریت سے ہیں۔ بہرحال پولیس انہیں بھی تنگ کر رہی ہے۔ سب کچھ شیخ عاصم کروا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خود بھی ڈرا ہوا ہے۔ وہ یہاں لاہور میں فیصل آباد کے ایک بڑے زمیندار چوہدری اعجاز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ایک بندے نے بتایا ہے کہ گلبرگ میں اعجاز کی کوٹھی کو پولیس کی بھاری نفری نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ دراصل افسران کو شبہ ہے کہ تم فرار ہونے کے بعد شیخ عاصم اور اس کے دوستوں کے لیے سخت خطرناک ثابت ہو سکتے ہو۔"

میں نے عالم قریشی کو بتایا کہ میں دو روز بعد اسی وقت دوبارہ اس سے رابطہ کروں گا۔

وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا "میں تو تمہیں مشورہ دوں گا شاہ جہاں! اگر نکل سکتے ہو تو پاکستان سے ہی نکل جاؤ۔ یہ بدبخت شیخ عاصم تمہیں یہاں چین سے نہیں رہنے دے گا۔"

"شیخ عاصم سے ڈر کر میں اپنا گھر کیوں چھوڑوں۔ میں اسے یہاں سے بھگاؤں گا یا ملیامیٹ کر دوں گا اسے۔ میرا خیال ہے کہ اب عاصم سے فیصلہ کرنے کا وقت آگیا ہے۔"

"ایک بار تمہیں پھر بتا دوں شاہ جہاں۔ عاصم کے چکر میں کبھی لاہور کی طرف منہ نہ کرنا۔ یہاں ہر قدم پر تمہارے لیے پھندا ہے۔"

تھوڑی دیر مزید عالم قریشی سے بات کر کے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

گاؤں تک واپسی کا سفر سخت پریشانی میں کٹا۔ سب کی طرف سے ہی پریشانی تھی لیکن ڈاکٹر حمزہ کا خیال زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ وہ بالکل مختلف مزاج کا لڑکا تھا' اگر اس پر تشدد کیا جاتا تو شاید وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر پاتا۔

گاؤں واپس پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ بڑا سہانا منظر تھا' کھیت کھلیان' پگڈنڈیاں' کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کاشت کاران کا ہاتھ بٹاتی ہوئی سونے کی رنگت والی محنتی عورتیں۔ سر پر نیلا آسمان' پرندوں کی ڈاریں' راستوں پر اڑتی گرد' مویشیوں کی آمد و رفت۔ یہ سب نظارے مجھ سے بہت دور جا چکے تھے مگر پچھلے دو دن میں یہ ایک دم میرے پاس آگئے تھے۔ میں اس دیہاتی زندگی کو اپنے جسم کے اندر اترتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان نظاروں کے لیے میرے اندر ایک گہرا خلا موجود تھا' اب یہ نظارے سامنے آئے ہیں تو تیزی سے اس خلا میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔

میں گھر پہنچا' فیض اور شاہدہ بیمار کرم دین کے قریب بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر شاہدہ نے کہا "بھائی! آپ بھنے ہوئے چنے کھائیں گے؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی فیض بولا "پوچھ کیا رہی ہے' جا لے آ۔"

وہ لچکتی جھجکتی ہوئی باہر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد گرم گرم خستہ چنے بھٹی سے لے کر آگئی۔ کرم دین نے نحیف آواز میں شاہدہ کو بتایا کہ بھینس کا دودھ دوہنے کا وقت ہو گیا ہے' وہ "جی اچھا" کہتی ہوئی بھینس کے چھپر کی طرف چلی گئی۔ پتا نہیں وہ ایسی ہی تیز رفتاری سے کام کیا کرتی تھی یا فیض کی وجہ سے اسے پر لگے ہوئے تھے۔

میں اور فیض کرم دین کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کرم دین' اس کی بیماری' اس کے گھر اور اس کی محنتی بیوی کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کرم دین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ شاید حالات کے جبر نے اس کہانی کے تین کرداروں کو ایک خاموش معاہدے پر مجبور کر رکھا تھا۔ شاہدہ کی اپنے بیمار خاوند سے محبت اور وابستگی ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اسی طرح شاید اس کے جسمانی تقاضے بھی ایک ٹھوس حقیقت تھے۔ وہ جواں سال تھی۔ اس کی رگوں میں پرتپش لہو تھا۔ اس لہو کی تپش کا مداوا بن کر فیض اس کی زندگی میں آیا تھا۔ فیض کی بیوی فوت ہو چکی تھی' وہ فطرتاً شریف النفس تھا اور نیک نام بھی۔ غالباً کرم دین نے بھی یہی سوچا تھا کہ اگر جواں سال شاہدہ کے جسمانی تقاضے اسے کسی ایسی راہ پر لے جاتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جاتی ہے تو یہ زیادہ نقصان کی بات ہو گی۔ اس نے درمیانی راستہ فیض کی صورت میں قبول کر لیا تھا۔ انسان کی فطرت بھی عجیب و غریب شے ہے۔ ایسے ایسے تماشے دکھاتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ نہایت ناقابل قبول باتیں بھی کسی وقت عین قابل قبول ہو جاتی ہیں۔

ایک رات میں نے اور گزاری۔ اس رات بھی دوسرے پہر فیض بڑی خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکلا اور

باہر سے کنڈی چڑھا کر غائب ہوگیا۔ میں جانتا تھا وہ کہاں گیا ہے۔ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ بہرطور کرم دین کے گھر میں ہر سہولت مجھے مہیا تھی۔ فیض قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔ اسے مطلق پروا نہیں تھی کہ وہ میری خاطر ایک بہت بڑی مصیبت اپنے گلے ڈال چکا ہے۔ کل رات بچی چھت والے کمرے میں میں نے جو منظر دیکھا تھا اسے الگ کردیا جاتا تو فیض ہر لحاظ سے ایک اچھا شخص ہی نظر آتا تھا۔ وہ ہمدرد تھا، راست گو تھا اور سب سے بڑھ کر احسان شناس تھا۔ اس نے اپنی احسان مندی سے مغلوب ہو کر ایک فیصلہ کیا تھا اور اب اس پر پوری طرح ڈٹ گیا تھا۔

اگلے روز سہ پہر کو فیض نے بتایا کہ وہ ایک قریبی گاؤں جا رہا ہے۔ وہاں شاہدہ کی ایک دیرینہ سہیلی رہتی تھی۔ اس کی والدہ سخت بیمار تھی۔ فیض کو چونکہ دیسی علاج میں بھی تھوڑی بہت مہارت تھی لہٰذا شاہدہ نے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی سہیلی کی والدہ کو دیکھ آئے۔ فیض نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "میں کل صبح آجاؤں گا جی۔ باقی یہاں آپ کو کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوگی۔ کرم دین کی بیوی ہر وقت آپ کے پاس موجود ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے بتا دیں۔"

"ہاں بھئی، یہ کرم دین کی بیوی تو واقعی بڑی مہرباں عورت ہے۔" میں نے سراہتے ہوئے کہا۔

میری لنگڑاہٹ میں بتدریج کمی واقع ہو رہی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے میں نے تھوڑی سی چہل قدمی کی۔ شاہدہ بیمار خاوند کی چارپائی پر بیٹھی تھی اور بڑی محبت سے اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ وہ کھانستا تھا تو وہ جلدی جلدی اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ اس کے چمکیلے بالوں کی لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ میں آکر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ گزرے ہوئے طوفانی دنوں کی فلم ذہن کے پردے پر چلنے لگی۔ اب نرسٹ کی ہنگامہ خیزیاں خواب و خیال کی طرح لگ رہی تھیں۔ سیاہ فام انسانوں کا بپھرا ہوا سمندر جو لہریں مارتا ہوا نرسٹ پر چڑھ دوڑا تھا۔ مظلوموں کے تمتماتے ہوئے چہرے، ان کی آنکھوں سے لپکتے ہوئے شعلے۔ اور پھر کنگ برائن کے ہرکاروں کی حرامزدگی۔ انہوں نے پسپا ہونے سے پہلے نرسٹ کے خاص حصے کیمپس کو آگ لگا دی تھی۔ اگر بروقت وہ آگ بجھائی نہ جا سکتی تو یقیناً ہزاروں انسان جو کنگ کے لیے صرف "بھدے" تھے جل کر راکھ ہوجاتے۔ بچانے والی قدرت کی ذات ہے اور آگ بجھانے والی بھی قدرت ہی تھی مگر اس سلسلے میں صفدر کی دلیرانہ کوشش کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے آنکھوں جیسی قیمتی چیز قربان کی تھی مگر یہ "رائیگاں قربانی" نہیں تھی۔ ان واقعات کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک بار پھر ماسٹرا سٹی کا کٹا ہوا سر میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ ایک لاری نے بڑے جوش کے عالم میں اس سر کو والی بال کی طرح ہوا میں اچھالا تھا اور خوشی سے بھرپور نعرہ لگایا تھا۔ سچ کہتے ہیں وحشت سے وحشت ہی جنم لیتی ہے اور محبت سے پھول کھلتے ہیں۔

انہی ہنگامہ خیز خیالوں میں الجھا ہوا میں سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ غالباً جب میں سویا ہوا تھا تو شاہدہ آکر لائٹ آف کر گئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میری آنکھ کسی آہٹ کی وجہ سے کھلی تھی۔ شاید بیرونی دروازے کی کنڈی گرائی گئی تھی۔ میں کتنی ہی دیر چارپائی پر چت پڑا جاگتا رہا پھر مجھے شبہ سا ہوا کہ اس گھر میں کرم دین اور اس کی بیوی کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔

مجھے ہر طرح چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ریوالور قمیص کے نیچے لگایا اور چپل پہن کر آہستگی سے باہر آگیا۔ برآمدے میں لالٹین کی نہایت مدھم روشنی تھی۔ چارپائی پر سویا ہوا کرم دین بے چارہ چارپائی کا حصہ ہی نظر آتا تھا۔ شاہدہ کل اور پرسوں رات کی طرح آج بھی چارپائی پر موجود نہیں تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آج بھی کوئی بچی چھت والے ڈھارے میں موجود ہے۔ دروازے کی درزوں سے مدھم روشنی کی جھلک میں نے دیکھ لی۔ آج تو فیض گھر میں نہیں تھا پھر آج یہ عورت اس ڈھارے میں کیا کر رہی تھی۔ میں دبے قدموں صحن سے گزرا اور ڈھارے تک پہنچا۔ اوس کی وجہ سے ہوا میں خنکی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کی گلیوں میں کتے شور مچا رہے تھے۔ میں نے پرسوں رات کی طرح ایک بار پھر کھڑکی کی درز میں سے جھانکنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ مجھے ایک مرد کی پشت نظر آئی۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر کالی چادر تھی۔ وہ خاصا اونچا لمبا نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے شاہدہ تھی۔ شاہدہ کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس گردن سے نیچے اس کے جسمانی نشیب و فراز ہی دکھائی دے رہے تھے۔ سلک کی ہلکی سی قمیص اس کے منہ زور شباب کو سنبھالنے میں ناکام نظر آتی تھی۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ کالی چادر والا کہہ رہا تھا "تم ان پولیس والوں کو نہیں جانتی ہو۔ سب کچھ اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں۔ ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"نمبردار یار محمد کا بیٹا اصغر میرا دوست ہے' پڑھا لکھا ہے۔ اس کو بیچ میں ڈالتے ہیں پھر ہی بات بنے گی۔ کوئی گواہی شواہی تو ہوگی کہ بندہ ہم نے پکڑوایا ہے۔"

"تو پھر دیر نہ کرو۔ ابھی جاکر لے آؤ اسے۔ کل کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ایسا موقع بندے کو بار بار نہیں ملتا۔ پورا پچاس ہزار کا انعام ہے۔" شاہدہ نے کہا۔

کالی چادر والا نیچے جھکا اور تپائی سے ایک اخبار اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ مجھے نظر نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے مگر دیکھے بغیر ہی مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ یقیناً کالی چادر والے کی آنکھوں کے سامنے اس وقت وہ اشتہار تھا جو میرے بارے میں چھپا تھا۔ غالباً یہ تازہ اشتہار تھا کیونکہ جو پہلا اشتہار تھا اس میں انعامی رقم وغیرہ کا ذکر نہیں تھا۔ اب کرم دین کی بیوی پچاس ہزار کی بات کر رہی تھی۔

اخبار دیکھ کر کالی چادر والے نے پھر چارپائی پر رکھ دیا۔ شاہدہ سے بولا "ہتھیار کیا ہے اس کے پاس؟"

"تمہیں بتایا تو تھا ایک پستول ہے۔"

"مجھے کب بتایا تھا۔"

"اچھا، شاید دماغ سے نکل گیا ہوگا۔ ایک پستول اس کے پاس ہے۔ تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہے۔ اب بھی تکیے کے نیچے ہوگا۔"

"تو پھر تم ایک کام کرو۔ سب سے پہلے وہ پستول نکال لاؤ۔ میں ابھی پانچ منٹ میں اصغر کو لے کر آجاتا ہوں۔"

"شوکت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اس طرح کے کام کرنے ہوں تو پھر ڈر کو ایک طرف رکھنا پڑتا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"اچھا، میں جاتی ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم سنبھال لینا۔"

"اگر وہ سویا پڑا ہے تو پھر گڑبڑ کیا ہونی ہے۔" شوکت نے اسے تسلی دی۔

میں ایک طرف تاریکی میں سمٹ گیا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ آہستگی سے کھلا اور شاہدہ دبے پاؤں باہر نکلی۔ جونہی وہ برآمدے میں اوجھل ہوئی، میں لپک کر ڈھارے میں داخل ہوگیا۔ لمبا تڑنگا شوکت دروازے کے پاس ہی موجود تھا۔ کرم دین کے ڈر سے وہ باہر نہیں آیا تھا بہرحال اس کی ساری توجہ شاہدہ کی کارروائی ہی کی طرف رہی ہوگی۔ ایک دم مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

وہ گھنی مونچھوں اور گھونگریالے بالوں والا گورا چٹا دیہاتی تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نکلتی یا وہ ہاتھ پیر ہلاتا، میں اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔ میں نے بازو کو مخصوص جھٹکا دیا۔ ایک دم "شوکت صاحب" کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ حلق سے خرخر کی آواز نکال کر وہ بے ہوش ہوگیا۔ اب دو گھنٹے سے پہلے اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈالا اور شاہدہ کے استقبال کے لیے تیار ہوگیا۔ حسب توقع چند سیکنڈ بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی، میں دروازے کی اوٹ میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے بے ہوش ساتھی کو دیکھتی میں نے عقب سے اس کی گردن بھی دبوچ لی۔ اس کا منہ کھلا مگر حلق سے آواز نہیں نکلی۔

اس کا صحت مند جسم مچھلی کی طرح میرے بازوؤں میں مچلا لیکن پھر ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اگر زیادہ ہلچل کرے گی تو گردن ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اب اس کا لرزاں جسم خود سپردگی کی حالت میں میرے بازوؤں میں تھا۔ میں نے کہا "تم بہت تیز طرار ہو مگر یہ تیزی طراری کارآمد نہیں۔ میں نے ذرا زور لگایا تو تمہاری گردن گاجر کی طرح ٹوٹ جائے گی۔ میری بات دھیان سے سنو۔ میں تمہاری گردن پر اپنا بازو ڈھیلا کروں گا مگر چیخنے کی کوشش نہ کرنا۔"

تھوڑی سی کوشش کرکے میں اسے سمجھانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اس کی گردن پر گرفت ڈھیلی کردی۔ وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ ساتھ ہی وہ گھوم کر میری طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے وا تھیں۔

پھر اس کی نگاہ بے ہوش شوکت پر پڑی۔ یقیناً اس کی چیخ نکل جاتی، مگر میں نے اس کا منہ ڈھانپ لیا "حوصلہ رکھو! یہ مرا نہیں، زندہ ہے۔"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی "تت... تم نے کیا کیا ہے اس کو؟"

"تھوڑا سا کلوروفارم سنگھایا ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ۔ ہم نے کیا برا کیا ہے تمہارا؟"

"برا کیا تو نہیں مگر اب برا کرنے والی تھیں۔ میں نے تمہاری اور اس بندے کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ لہٰذا بک بک کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

شاہدہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اسی دوران میں برآمدے کی طرف سے کرم دین کی نحیف آواز ابھری۔ وہ شاہدہ کو آوازیں دے رہا تھا۔ غالباً اسے پیاس لگی تھی۔ چند بار شاہدہ کو پکارنے کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ شاہدہ

نے کسمسا کر کہا "بس۔ مجھے جانے دو۔ وہ بلا رہے ہیں نہیں۔"

"تمہیں اس کی اتنی فکر ہوتی تو راتوں کو تمہاری چارپائی اس طرح خالی نہ ہوتی۔ تم ایک دھوکے باز عورت ہو۔"

"میں نے۔۔۔ کسی کو دھوکا نہیں دیا۔"

"بیمار شوہر کو سوتا چھوڑ کر غیر مردوں سے رنگ رلیاں منانا دھوکا نہیں تو اور کیا ہے۔"

"کون سے غیر مرد؟" وہ ہکلا کر بولی۔

"یہ مرد نہیں تو کیا آڑو کا درخت ہے؟" میں نے بے ہوش پڑے شوکت کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ۔۔۔ تو میرا سگا بھائی ہے۔ شوکت نام ہے اس کا۔"

میں ایک لمحے کے لیے چکرایا' پھر میں نے کہا "اور شاید حوالدار فیض بھی تمہارا بھائی ہے۔"

اس مرتبہ شاہدہ کا زرد رنگ کچھ اور زرد ہوگیا۔ وہ بولی "بھائی! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"خبردار جو مجھے بھائی کہا۔ تم ایک غلط کار عورت ہو۔ تم اپنے اس سگے بھائی کے ساتھ مل کر ابھی جو منصوبہ بنا رہی تھیں وہ سارا میں نے سنا ہے۔ پچاس ہزار ریال پکاتے ہوئے تمہیں بھائی کا خیال آیا اور نہ اپنے یار فیض کا۔ تم نے اسے جان بوجھ کر گھر سے باہر بھجوایا۔ تاکہ اس کے جانے کے بعد مجھے پکڑوا سکو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔" میں نے ریوالور نکال کر اس کے سر سے لگا دیا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ایک دم رونے لگی' سر جھکا کر بولی "مجھے معاف کر دو بھائی۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں آپ کی گناہگار ہوں۔ میں۔۔۔ میں لالچ میں آگئی تھی۔ دراصل۔۔۔ دراصل۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"ہاں بکو۔۔۔ بکو۔" میں نے کہا۔

اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ پورے جسم میں تلاطم تھا۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس نے جھک کر اپنی اوڑھنی اٹھائی' اپنا آپ ڈھانپا اور مجھ سے کچھ دور جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کچھ دیر تک کھڑی روتی رہی۔ تب ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگی۔

میں نے بے ہوش شوکت کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالا اور کمبل اوڑھا دیا۔ اس کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ واقعی شاہدہ کا بھائی ہے۔ میں نے کمبل کے نیچے ہاتھ ڈال کر اچھی طرح اس کی تلاشی لی۔ ذاتی استعمال کی دیگر اشیا کے علاوہ اس کے لباس سے ایک گراری دار چاقو بھی برآمد ہوا۔

قریباً آٹھ انچ پھل کا یہ چاقو میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد شاہدہ کو لے کر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا شوہر کرم دین اسے چند بار پکارنے کے بعد پھر سو چکا تھا۔ میں نے شاہدہ سے کہا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ جائے۔ وہ چارپائی کے بالکل کنارے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کرسی سنبھال لی۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں اتنے روپوں کی۔ کیا نہیں تھا تمہارے پاس؟" میں نے اسے گھور کر پوچھا۔

اس نے اپنے شفاف رخساروں پر پھیلتے ہوئے آنسو پونچھے۔ کچھ دیر تک ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی' پھر بولی "بھائی! شاید آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے کیونکہ میں آپ کی نظر میں بہت خراب عورت ہوں۔"

"تمہاری بات ایسی غلط بھی نہیں ہے لیکن تم کہو' میں یقین کرنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ خدا کی قسم کھا کر بولی "بھائی! میں یہ پیسے کرم دین کے لیے چاہتی تھی۔ میں اس کا علاج کرانا چاہتی تھی۔ میں اس کو ایسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ بے شک میں بری عورت ہوں مگر پیدا کرنے والے کی قسمیں۔ میں کرم دین سے بڑا پیار کرتی ہوں۔ میں اس کو کچھ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کمرے میں دیے کی مدھم روشنی میں شاہدہ سے دیر تک میری بات ہوئی۔ اس بات چیت کے دوران میں وہ ایک بار اپنے بھائی کو دیکھنے دوسرے میں گئی' ایک بار کرم دین کے پکارنے پر اس نے اسے پانی پلایا۔ شاہدہ کی بات چیت سے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ عورت واقعی کبھی کبھی ایک ناقابل فہم پہیلی ہوتی ہے۔ شاہدہ بھی ایک مشکل اور تقسیم شدہ عورت تھی۔ اس کی فطری اور مزاجی مجبوریوں کی وجہ سے فیض اس کی زندگی میں ضرور آیا تھا مگر اپنے شوہر سے اس کی محبت بھی کم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ذہن میں اب بھی وہ حسین ماضی بسا ہوا تھا جس کا تعلق اس سے اور کرم دین سے تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی حسین ماضی میں جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس گھر میں اس آنگن میں بیتے دنوں کو پھر سے اپنے روبرو دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے ہنستے مسکراتے صحت مند شوہر کی بانہوں میں سونا چاہتی تھی۔ خواب ساری زندگی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کرم دین میں اب کچھ باقی نہیں رہا تھا مگر شاہدہ کے دل میں شاید آس باقی تھی۔ آج رات اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ اس کی انہی دبی ہوئی خواہشوں کا غماز تھا۔ اتفاقاً اس نے اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی اور اس "سنہری موقع" سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

○☆○

اگلے روز بذریعہ فون ایک بار پھر عالم قریشی سے بات چیت ہوئی۔ عالم قریشی حسب معمول کچھ کھا رہا تھا۔ فون پر بھی مجھے چپ چپ کی آواز سنائی دی۔ میری آواز پہچان کر وہ ایک دم الرٹ ہوگیا۔ اس نے چند خبریں سنائیں' ان میں ایک دو اچھی خبریں بھی تھیں۔ اچھی خبروں میں سے ایک یہ تھی کہ ساہی صاحب کی کوششوں سے حمزہ تھانے سے واپس آگیا تھا۔ زریں گل کی گرفتاری بھی ڈال دی گئی تھی۔ امید تھی کہ ایک دو روز میں ساہی صاحب اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوا دیں گے' اور یوں تھانے سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

عالم قریشی نے مجھے بتایا کہ کل اچانک شیخ عاصم کے محافظوں نے رات کے وقت اپنے ہی ایک ساتھی پر فائرنگ کر دی جس کے سبب وہ شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ اپنے اس ساتھی کو انہوں نے "مشکوک فرد" سمجھا تھا۔ اس واقعے سے اس شدید ٹینشن اور خوف کا اظہار ہوتا تھا جو میرے حوالے سے شیخ عاصم کے محافظوں میں پایا جاتا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ میں ان کے آس پاس کہیں موجود ہوں اور شیخ عاصم کے بڑے بھائی کی طرح شیخ عاصم کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

میں نے اگلے سات آٹھ روز کرم دین کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے گزارے۔ فیض دن رات میری خدمت میں مصروف تھا۔ اس کا بس چلتا تو مجھے چارپائی سے پاؤں بھی نہ اتارنے دیتا۔ میں نے شاہدہ کی پرزور درخواست اور منتوں سماجتوں کی وجہ سے فیض کو اس رات والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاہدہ نے اپنے سگے بھائی شوکت کی طرف سے بھی رو رو کر ضمانت دی تھی کہ وہ اس معاملے میں ہرگز ہرگز اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ میں شوکت کے سلسلے میں پوری طرح مطمئن تو نہیں تھا مگر شاہدہ کی ضمانت پر میں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ شاہدہ نے میرے سامنے اس بات کا بھی اقرار کیا تھا کہ اس نے فیض کو باقاعدہ منصوبے کے تحت ہی گاؤں سے باہر بھیجا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ مجھے گرفتار کرانے کا الزام اپنے سر نہیں لے گی' بلکہ اپنے بھائی شوکت کو آگے کرے گی اور فیض پر ظاہر کرے گی کہ مجھے پکڑوانے والا شوکت ہے۔

بہرحال پچھلے چھ سات روز میں' میں نے شاہدہ اور اس کے بھائی کی طرف سے کوئی شکایت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا بھائی تو بعد میں نظر ہی نہیں آیا تھا۔ ہاں اس دن کے بعد ایک تبدیلی ضرور آئی تھی۔ رات کو فیض کا چپکے سے کمرے سے غائب ہونا ختم ہوگیا تھا۔ یقیناً شاہدہ نے اسے کوئی اشارہ دے دیا تھا۔ شاید یہ کہہ دیا ہو کہ مہمان کو ہم دونوں پر شک ہوگیا ہے یا اس قسم کی کوئی اور بات کہہ دی ہو۔ میری خاطر مدارات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ بہترین خالص خوراک مل رہی تھی' جس میں دودھ' دہی' دیسی انڈے اور دیسی مرغی کا گوشت شامل تھا۔ پھلوں کی بھی یہاں کمی نہیں تھی۔ یہ تو گھر ہی امرودوں کے باغ کے اندر واقع تھا۔ شاہدہ مالٹے اور کینو وغیرہ بھی لے آتی تھی۔

میری ٹانگ حیرت انگیز تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ یقیناً یہ مسلسل آرام اور اچھی خوراک کے سبب تھا۔ دیگر چوٹیں بھی اب کافی بہتر تھیں۔ ٹھکر شکرا نے اپنی ساری وحشت مجھ پر نکالنے کی کوشش کی تھی' بڑی ماہرانہ ضربیں لگائی تھیں۔ ان خوفناک چوٹوں کے اثرات میں ابھی تک جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ٹھکر شکرا کی وحشت کو برداشت نہ کر سکتا۔ ٹھکر کے بارے میں سوچتے سوچتے کسی وقت شکست کا احساس بھی ذہن کو کچوکا لگاتا تھا مگر میں جلد ہی اس کچوکے سے سنبھل جاتا تھا اور اپنا دھیان کسی اور طرف لگا لیتا تھا۔ ایک روز میں کمرے کے اندر بیٹھا ریوالور صاف کر رہا تھا کہ حوالدار فیض ہانپا ہوا سا آیا۔ کہنے لگا "جناب! آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

"خیریت کی تو ہے نا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ خیریت کی ہے۔ شیخ عاصم آپ کے آس پاس موجود ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مجھے ابھی پتا چلا ہے جی کہ شیخ عاصم یہاں سے بیس بائیس میل دور چوہدری اعجاز کی "رکھ" میں موجود ہے۔ وہ اپنے مقامی دوست چوہدری اعجاز کے ساتھ شکار کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ لوگ آٹھ دس جیپوں پر سوار یہاں پہنچے ہیں۔ برساتی نالے کے ساتھ ساتھ انہوں نے چھولداریاں لگائی ہوئی ہیں۔"

"بہت خوب! یہ تو اچھی خبر ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

شیخ عاصم بے خبری میں میرے قریب چلا آیا تھا۔ میرے لیے آسان ہوگیا تھا کہ میں اس کے ساتھ ایک بھرپور "ملاقات" کر سکوں۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں صاحب جی۔" فیض نے بڑی

عقیدت سے کہا "آپ اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھیں۔ میں نماناں سا بندہ ہوں لیکن آپ کے لیے جان قربان کر سکتا ہوں۔"

"میں تمہارے جذبے کی بڑی قدر کرتا ہوں فیض۔ اگر تمہاری ضرورت ہوگی تو تمہیں ضرور آواز دوں گا۔"

اسی رات فیض نے میرے کہنے پر دو گھوڑوں کا انتظام کیا۔ کسی طرح بارہ بور کی ایک رائفل بھی اس نے حاصل کرلی تھی۔ ہم دونوں رات دس بجے کے لگ بھگ رو جھا پور سے اس رکھ کی طرف روانہ ہوئے جہاں شیخ عاصم' چوہدری اعجاز کے ہمراہ خیمہ زن تھا۔ میرے ذہن میں فقط ایک ہی بات تھی۔ میں ایک بار عاصم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتا تھا' اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ جو عورت تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی' تمہارے سایے پر بھی لعنت بھیجتی ہے تم اس کو اپنے ساتھ رکھنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ کیوں اب اپنی ہار تسلیم نہیں کرلیتے ہو۔ امارات میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ شیخ عاصم اپنے رویے میں تبدیلی کے باوجود اندر سے اتنا ہی کمینہ ہے جتنا پہلے تھا۔ اس نے شیخ عشارب کو جو خط لکھا تھا اس کو پڑھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ شیخ کے نزدیک غزالہ کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آخر میں غزالہ' شیخ عاصم سے قطعی مایوس ہوگئی تھی۔ اپنی تمام تر شوہر پرستی کے باوجود اس نے شیخ عاصم پر لعنت بھیج دی تھی اور امارات میں تابی کو لے کر خاموشی سے غائب ہوگئی تھی۔ شیخ عاصم نے اس واقعے کے بعد غزالہ کی تلاش میں بہت سر پٹخا تھا لیکن وہ اسے ملی نہیں تھی۔ بعد ازاں ہم نے غزالہ کو پاکستان میں ڈھونڈا تھا۔ غزالہ نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ شیخ عاصم سمیت ہر اس شخص کی نگاہ سے اوجھل رہے گی جو اسے پہچانتا ہے لیکن پھر ہوا یوں تھا کہ ہم سب غزالہ سمیت آرم خور مائیکل کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور وہ ہمیں لے کر بحری راستے سے تاریک براعظم افریقہ روانہ ہوگیا تھا۔

اب پھر شیخ عاصم اور غزالہ کی کہانی وہیں سے شروع ہوئی تھی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ شیخ عاصم نے غزالہ کے حصول کے لیے سر توڑ کوشش شروع کردی تھی اور مجھ پر اعلانیہ یہ الزام دھرا تھا کہ میں اس کی بیوی کو ورغلا کرلے گیا ہوں۔ رات کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں ہمارے گھوڑے پہلو بہ پہلو دوڑتے رہے۔ آج سردی بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ہوا سامنے سے آرہی تھی۔ حوالدار فیض نے کمبل کی بکل مار رکھی تھی۔ میں نے شلوار قمیص پر جرسی پہن رکھی تھی۔ وہ مفلر جو میں نے لاہور اسٹیشن کے قریب "ٹھاکی گیرے" سے حاصل کیا تھا' ابھی تک میرے پاس تھا' میں نے اسے سر اور کانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ہم دونوں کے پاس کیت گھوڑے تھے' یہ دونوں بڑی ہموار چال چل رہے تھے' اور دیہاتی راستوں پر چلنے کا انہیں خاطر خواہ تجربہ بھی تھا۔ راستے میں ایک جگہ ہمیں دو گھڑ سوار پولیس والے نظر آئے تاہم خیریت ہی گزری۔ انہوں نے ہمیں روکنے یا بازپرس کرنے کی کوشش نہیں کی۔

حوالدار فیض ان راستوں کا شناور تھا' ہم چودہ پندرہ میل فاصلہ طے کرچکے تھے مگر ابھی تک ہمیں پختہ سڑک پر نہیں آنا پڑا تھا۔ فیض نے بتایا کہ جن راستوں پر ہم چل رہے ہیں یہ ویسے بھی سفر کو کم و بیش آٹھ میل کم کردیتے ہیں۔ راستے میں کئی جگہ ہمیں گیدڑوں کی آوازیں آئیں تو اور کتوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے ہمارا تعاقب بھی کیا (اور مجھے ماریطانیہ کے خوفناک افریقی جنگلی کتوں کی یاد دلائی) راستے میں میرا ذہن مسلسل مصروف رہا۔ میں شیخ عاصم کے متعلق سوچ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے ملاقات کس طرح کی جاسکتی ہے۔ راستے میں ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ ہم گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے جب ایک شخص گھوڑے سوار ہمارے قریب سے گزرا' اسے دیکھ کر فیض ٹھٹک گیا بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا "ار شہباز ہے...!"

جس شخص کو اس نے شہباز کہا تھا' وہ بھی آواز کر رک گیا' اور گھوڑا موڑ کر ہمارے پاس آگیا۔ گھوڑے کے پیچھے ایک شکاری کتا بھی تھا۔ وہ ایک اونچا لمبا دیہاتی نوجوان تھا۔ تہبند' قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے کندھے سے شاٹ گن لٹکی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی گردن کے ساتھ ایک بڑا سا تھیلا لٹک رہا تھا۔ ایسے تھیلے اکثر شکاری حضرات اپنے ساتھ رکھتے ہیں تاکہ اس میں شکار ہوئے خرگوش اور پرندے وغیرہ ڈال سکیں۔

شہباز نامی یہ نوجوان اور حوالدار فیض ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ شہباز نے فیض سے پوچھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ فیض نے بہانہ بنایا کہ قریبی گاؤں میں کوئی عزیز بیمار ہے اس کی خبر لینے جارہے ہیں "اور تم کہاں جارہے ہو؟" فیض نے پوچھا۔

"شکار پر۔" شہباز نے جواب دیا "اگر تھوڑا سا وقت ہے تو آؤ میرے ساتھ' تمہیں بڑے مزے کا شکار کھلاؤں۔"

"مزے کا کیا مطلب؟" فیض نے پوچھا۔

"آج کل یہاں علاقے میں ایک خاص قسم کی مرغابی

آئی ہے۔ اس کے سینے پر نیچے کی طرف سفید دھاری سی ہوتی ہے یہ عام مرغابی سے تھوڑی سی بڑی بھی ہے اور اس کا گوشت ایسا مزے دار ہے کہ جو کھاتا ہے بس سوچتا ہی رہ جاتا ہے۔ شکاریوں نے بس ابھی تک بیس تیس پرندے ہی شکار کیے ہوں گے۔ ایک دانے کی قیمت چار سو روپے تک پڑ رہی ہے یہاں۔"

"تو اس مرغابی کے شکار پر جارہے ہو تم۔"

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ ایک بڑے خاص بندے نے دو دانوں کی فرمائش کی ہے۔ اب دیکھیں قسمت ساتھ دیتی ہے کہ نہیں۔"

فیض بولا "تمہاری بات سن کر دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ چلیں مگر "بیمار" کی مجبوری ہے۔ چلو پھر کسی دن پروگرام بنا لیتے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا ٹھکانا بتایا۔ فیض نے شہباز سے میرا تعارف بھی اپنے ایک ساتھی اور دوست کی حیثیت سے کرایا۔ یہ شہباز اپنی بات چیت سے بلند آواز اور دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایسے لوگ بڑی تیزی سے بے تکلف ہوتے ہیں اور زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے ہر حالات میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

میں نے اور فیض نے اپنا سفر جاری رکھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد ہم اس مقام تک پہنچ گئے جسے رکھ کہا جاتا تھا۔ ذیک کے ساتھ ساتھ یہ ایک گھنا جنگل تھا اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کیکر' ٹاہلی اور جنتر کے درخت بڑی کثرت سے تھے۔ جلد ہی ہمیں کافی فاصلے پر مدھم روشنیاں نظر آئیں۔ فیض نے کہا "میرا خیال ہے جناب! یہی شکاریوں کا کیمپ ہے۔ یہ دیکھیں یہ زمین پر ٹائروں کے نشان بھی نظر آرہے ہیں۔"

اس نے ٹارچ کی روشنی زمین پر پھینکی۔ واقعی وہاں کے چوڑے ٹائروں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

"بہتر تو یہی ہے کہ ہم ابھی یہیں رکیں۔" میں نے کہا "یقین ہے کہ شیخ عاصم نے اپنی سکیورٹی کا سخت انتظام کر رکھا ہوگا۔"

فیض نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم نے اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو ایک درختوں کے ساتھ باندھ دیے اور ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ مشرق کی طرف سے صبح صادق کے آثار نظر آنے لگے۔ گیدڑوں اور کتوں وغیرہ کی آوازیں بتدریج کم ہونے لگیں' پرندوں کی چہچہاہٹ آہستہ آہستہ نمایاں ہونے لگی تھی پھر جوں جوں روشنی بڑھتی گئی یہ چہچہاہٹ ایک جھنکار کی صورت اختیار کرتی گئی۔

فیض نے اپنی رائفل مسلسل ہاتھ میں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا "یہ جنگلی سؤروں کا علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ خطرناک جنگلی بلے بھی یہاں کثرت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہمیں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر ذرا جھجکتے ہوئے لہجے میں بولا "آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے ابھی بتایا ہے کہ جس شخص سے آپ ملنا چاہتے ہیں اس کے اردگرد سخت سکیورٹی ہے اور یہ سکیورٹی آپ ہی کی وجہ سے ہے' پھر ملاقات کیسے ہوگی؟"

"یہ سوال میرے ذہن میں بھی ہے' لیکن امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ سکیورٹی اتنی زیادہ نہ ہو جتنی ہم سمجھ رہے ہیں۔ جب بندہ سیرو تفریح پر نکلتا ہے تو خود کو کافی "ایزی" محسوس کرنے لگتا ہے۔"

"ویسے ایک بات ہمارے حق میں جاتی ہے جناب۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ ہم اپنا منہ سر اسی طرح لپیٹے رکھیں تو بھی عجیب نہیں لگے گا۔"

"لیکن جب دھوپ نکل آئے تو اتنی ٹھنڈ نہیں رہتی۔"

"آج دھوپ نکلنے کا امکان بھی کم ہی ہے۔" حوالدار نے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے دیکھ کر کہا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' کچھ دیر بعد دن نکلا تو وہ ابر آلود تھا' درختوں کے درمیان ہوا بھی سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھی۔ میں نے فیض کو درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا دیا اور اس سے کہا کہ وہ یہیں پر رک کر میری واپسی کا انتظار کرے گا۔ اگر میں شام تک واپس نہ آؤں تو وہ واپس "رو جھا پور" چلا جائے' میں خود ہی پیدل وہاں پہنچ جاؤں گا۔

فیض میرے حوالے سے بڑی فکرمندی ظاہر کررہا تھا۔ پہلے اس نے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی کیمپ کی طرف جائے گا' پھر کہنے لگا کہ وہ یہیں رک کر میرا انتظار کرے گا اور مجھے ساتھ لے کر ہی واپس جائے گا' مگر میں نے اس کی دونوں تجاویز مناسب طریقے سے رد کردیں۔ آٹھ بجے کے لگ بھگ میں اپنے ریوالور سمیت شکاری کیمپ کی طرف روانہ ہوگیا۔

شکاری کیمپ چھ سات بڑے خیموں اور دو تین چھولداریوں پر مشتمل تھا۔ کیمپ کے قریب کئی شاندار جیپیں اور دو پک اپس بھی نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ

ورجنوں گھوڑے بھی تھے۔ یقینی بات تھی کہ شکار کے یہ سارے انتظامات چوہدری اعجاز نے ہی کر رکھے ہیں' شیخ عاصم تو ایک معزز مہمان کی حیثیت سے ایک دو روز کے لیے ساتھ چلا آیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اس رکھ میں اردگرد کے سیکڑوں دیہاتی جمع ہیں۔ شکار گاہ کے عین درمیان میں آٹھ دس ایکڑ پر ایک وسیع میدان سا تھا۔ دیہاتی اس میدان کے اردگرد موجود تھے بہت سے درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ اکثر کے پاس لاٹھیاں' کلہاڑیاں اور کچھ کے پاس بندوقیں وغیرہ بھی تھیں۔

میں بھی ان تماشائی دیہاتیوں کے بیچ جا کھڑا ہوا۔ میں نے چادر کی بکل مار لی تھی اور مفلر بدستور میرے سر اور چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ایک قریب کھڑے دیہاتی لڑکے سے میں نے بات چیت شروع کر دی۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں مہمان ہوں' قریبی دیہہ سے آیا ہوں' یہاں لوگوں کا اکٹھ دیکھ کر رک گیا ہوں' یہ کیا سلسلہ ہے؟ اس دیہاتی لڑکے نے کہا "یہ چوہدری اعجاز کی رکھ ہے۔ چوہدری اعجاز اس موسم میں اکثر سور کے شکار کے لیے یہاں آتے ہیں۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ کوئی عربی شہزادہ بھی آیا ہوا ہے' اس لیے اتنا لمبا چوڑا انتظام ہے۔"

"سور کا شکار تو جنگل میں گھس کر کیا جاتا ہے۔ اس میدان میں کیا ہوگا؟"

وہ بولا "شکار جنگل میں نہیں' اس میدان میں ہی ہوگا۔ چوہدری صاحب کے بندے جنگل سے شکار کو ہنکا کر میدان میں لائیں گے پھر چوہدری صاحب اور ان کے دوست شکار کھیلیں گے۔"

اس طرح کی ایک کارروائی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ انڈیا میں دیکھے ہوئے وہ مناظر سنسنی خیز اور یادگار تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد کئی چاق و چوبند گھڑ سوار میدان میں آ گئے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں پرانی وضع کے نیزے تھے۔ ان میں سے ایک شخص خاصا بارعب اور لمبا چوڑا تھا۔ سرخ و سپید رنگت' گھنی مونچھیں' جدید شکاری لباس کے باوجود اس کا دیہاتی پن نمایاں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی چوہدری اعجاز ہوگا۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جنگل کی طرف سے ڈھول پیٹنے اور کنستر وغیرہ بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے قریب کھڑے نوجوان دیہاتی نے بتایا کہ درختوں میں ہانکا شروع ہو گیا ہے۔ میدان کے اردگرد کھڑے اکثر دیہاتی بلند درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ کچھ نے تناور درختوں اور گاڑیوں وغیرہ کی آڑ لے لی تھی۔ ماحول میں ایک زبردست قسم کی سنسنی پائی جاتی تھی۔

ہانکے کی آوازیں قریب تر آتی چلی گئیں۔ ہانکے کے دوران میں ہی ایک دو فائر بھی سنائی دیے۔ بالآخر وہ سنسنی خیز منظر نگاہوں کے روبرو آ گیا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔ جنگلی سؤروں کا ایک گروہ درختوں سے برآمد ہوا۔ ان کی تعداد آٹھ کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے دو تین بچے بھی تھے۔ نیزہ بردار گھڑ سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور بھاگتے سؤروں کو زیر کر دیا۔ مشاق شکاریوں نے نیزوں کی مدد سے دو تین سؤروں کو ڈھیر کر دیا۔ ایک سوار کا نیزہ سؤر کے چربی دار بدن کے اندر ہی ٹوٹ گیا۔ گھڑ سوار نیچے گر گیا۔ سؤر نے مشتعل ہو کر گھوڑے کو بھی معمولی زخمی کیا' بہرطور اس زخمی سؤر کو فائر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ باقی جانور بھی یکے بعد دیگرے اسی طرح تلف ہوئے۔

اس انتہائی دلچسپ کھیل کے سیکڑوں تماشائیوں میں بہت سے معزز مہمان بھی تھے۔ یہ لوگ کیمپ کے عین سامنے آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں بائیں مسلح گارڈ تھے۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا' پھر بھی میں ان معززین میں سے عاصم کو پہچان سکتا تھا۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ سفید پینٹ میں ملبوس تھا۔ سردی سے بچاؤ کے لیے اس نے چرمی جیکٹ پہن رکھی تھی۔

ایک "ہیٹ" یعنی شکار کا ایک دور ختم ہو گیا تو ہلاک شدہ جانوروں کی لاشیں اٹھا کر میدان سے باہر لے جائی گئیں۔ شکاریوں نے تھوڑا سا ریسٹ کیا اور پھر نیا ہانکا شروع ہو گیا۔ یہ ہانکا جنوب کی طرف سے شروع کیا گیا تھا اور اس کا رخ بھی میدان کی طرف ہی تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے سنسنی خیز انتظار کے بعد ہانکا میدان تک پہنچا۔ اس بار پھر چھ کے قریب جنگلی سؤر یکے بعد دیگرے میدان میں داخل ہوئے۔ سؤروں کے ساتھ دو تین کتے اور گیدڑ بھی تھے۔ شہسوار ایک بار پھر نیزے سونت کر متحرک ہوئے۔ جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کا عمل شروع ہوا' اس مرتبہ تنومند چوہدری نے بھی ایک تنومند سؤر کو اپنے نیزے کا شکار بنایا۔ چوہدری کا نشانہ شاندار تھا' لوگوں نے اسے داد دی۔ اس کا نیزہ سؤر کے دل کے مقام پر لگا اور وہ چند سیکنڈ میں راہیٔ عدم ہو گیا۔

شکار کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا' اچانک ایک شخص کو دیکھ کر چونکا۔ یہ حوالدار رفیق کا دوست شہباز تھا۔ اس نے تھیلے میں کوئی شے بڑی احتیاط سے لپیٹ رکھی تھی۔ شاٹ گن بدستور اس کے کندھے پر تھی۔ اس نے شلوار ٹخنوں سے اوپر تک اڑس کر پائنچوں کو باندھا ہوا تھا۔ چپلیاں اور جوتے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے' جنہیں وہ گیلے کپڑے سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"ہاں بھئی شہباز علی! شکار مل گیا؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے مجھے پہچان لیا اور خوش دلی سے بولا "آہو یار! بڑا اچھا شگون تھا' دو پرندے شکار کیے ہیں۔"

اس نے بڑی مسرت کے ساتھ تھیلے کا منہ تھوڑا سا کھولا اور مجھے مرغابی نما خوب صورت پرندے کی جھلک دکھائی۔ یہ خاص نسل کی مرغابی تھی۔ اس کے سینے پر سفید دھاری نمایاں نظر آتی تھی۔ شہباز نے شکار کے بعد دونوں پرندوں کو بڑی احتیاط سے ذبح بھی کیا تھا۔

ایک دم اس نے میرے اردگرد دیکھا اور بولا "فیض کدھر ہے؟"

میں نے کہا "وہ گاؤں میں ہی رہ گیا ہے۔ اس کے بڑے بھائی کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہے۔ میں واپس جا رہا تھا کہ یہ ہنگامہ دیکھ کر یہاں رک گیا۔"

شہباز جوش سے بولا "یہ چوہدری اعجاز کی رکھ ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا عربی شہزادہ بھی آیا ہوا ہے۔ دراصل میں نے یہ پرندے ان لوگوں کو دکھانے کے لیے ہی شکار کیے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو کوئی انعام شنام بھی لے کر آؤں گا۔"

ایک دم میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے کہا "کیا تو مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ کہہ دینا کہ میرا ساتھی ہے۔"

"کیوں۔ تم کیوں جانا چاہتے ہو؟"

"یار! مجھے بڑا شوق ہے کسی عربی شہزادے کو پاس سے دیکھنے کا۔ خاص طور سے ان کے خیموں کو اندر سے دیکھنے کو جی کرتا ہے۔ سنا ہے یہ خیمے اندر سے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔"

شہباز علی بولا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔"

"یار! میں کوئی تیرے انعام میں حصے دار تھوڑا ہی ہوں گا۔ بس ذرا عربی شہزادے کو پاس سے دیکھ لوں گا۔"

شہباز علی نیم رضامند نظر آنے لگا۔

ڈھائی تین بجے کے قریب شکار کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لوگ منتشر ہونے لگے۔ موسم بدستور ابر آلود تھا' کسی وقت بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ میں اور شہباز خیموں کے قریب پہنچے شہباز علی نے آگے بڑھ کر چوہدری اعجاز کے محافظوں کو اپنی آمد کے بارے میں بتایا۔ اندازہ ہوا کہ محافظ شہباز کو شکاری کی حیثیت سے پہلے سے جانتے ہیں۔ انہوں نے شہباز کو تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہا اور بتایا کہ ابھی لنچ کیا جا رہا ہے۔ لنچ کے بعد اس کی ملاقات کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

ہم دونوں بڑے ادب سے ایک طرف کھڑے رہے۔ کبھی امید بندھ جاتی کبھی ٹوٹ جاتی۔ ایک گھنٹے بعد وہ محافظ آئے اور ہمیں اس شاندار خیمے کی طرف لے چلے جس میں شیخ عاصم قیام پذیر تھا۔ شیخ عاصم کے استعمال میں رہنے والا یہ خصوصی خیمہ میں اس سے پہلے ابوظہبی کے نواحی صحرا میں بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ خیمہ ۴۰ درجے کی گرمی میں بھی اندر سے ٹھنڈا ہی رہتا تھا۔ اس خیمے کو دیکھتے ہی مجھے ابوظہبی کا صحرا یاد آیا اور اس صحرا میں ملنے والے تمام کردار خوبرو شاری' عشق پیشہ الماجد' ابی باقر' عشارب اور پتا نہیں کون کون یاد آ گئے۔ عرصہ گزر گیا تھا مگر انوکھی قبائلی سردار شاری اور الماجد کے ہنگامہ خیز عشق کی یادیں میرے ذہن میں تازہ تھیں۔ بہرحال ہم جوتے اتار کر اور کپڑے جھاڑ کر شیخ عاصم کے شاندار خیمے میں داخل ہوئے۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

محافظ الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔ ہم دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ شہباز علی نے بڑے ادب سے شیخ عاصم کے سامنے جھک کر تھیلا کھولا' مگر اس سے پہلے کہ عاصم پرندوں پر نگاہ ڈالتا اس کی نگاہ میرے چہرے پر جم گئی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ناگواری کی جھلک نظر آئی۔ شاید یہ ناگواری اس وجہ سے تھی کہ میں نے ابھی تک مفلر چہرے سے ہٹایا نہیں تھا۔ یوں تو شہباز نے بھی اپنی پگڑی سے سر اور چہرہ ڈھانپ رکھا تھا مگر خیمے میں داخل ہوتے وقت اس نے چہرہ ننگا کر لیا تھا۔

"تم کون ہو؟" شیخ عاصم نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

میں نے اطمینان سے قمیص کے اندر سے ریوالور نکالا اور شیخ عاصم کی کھوپڑی کا نشانہ لے لیا۔ شیخ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے چہرے سے مفلر ہٹا دیا "خبردار شیخ عاصم! تم کسی کو آواز نہیں دو گے۔"

میرے لہجے نے شیخ کو منجمد کر دیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک حیران نظروں سے میرا چہرہ تکتا رہا پھر اپنے مخصوص بارعب لہجے میں بولا "کیا چاہتے ہو تم؟"

"تم سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھی انگلش میں جواب دیا "میں چاہتا ہوں کہ ہم غزالہ کے بارے میں کھل کر

بات کرلیں۔"

"تم۔۔۔ میری بیوی کے بارے میں بات کرنے والے کون ہوتے ہو؟"

"وہ تمہاری بیوی نہیں ہے عاصم۔۔۔ اور تم اپنا لہجہ بھی درست رکھو' ورنہ میں قسم کھاتا ہوں کہ اسی جگہ تمہیں ڈھیر کردوں گا' چاہے اس کے بعد تمہارے کتے میرا جسم بھی چھلنی کردیں۔"

میرے لہجے میں چھپی ہوئی آگ نے شیخ عاصم کو سمجھادیا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر گزروں گا۔ ویسے بھی کمر پر لگنے والی شدید چوٹ کے بعد سے شیخ عاصم میں وہ پہلے والا دم خم اور پھرتی نہیں رہ گئی تھی۔

شیخ عاصم کا نہایت قیمتی کولٹ پسٹل اس کے قریب ہی فولڈنگ تپائی پر رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ پسٹل قبضے میں لے لیا۔ میرے ساتھ آنے والا شہباز علی ابھی تک سکتے کی حالت میں کھڑا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک دم یہ کیا ہوگیا ہے۔ ایک عام سے دیہاتی نے نہ صرف عالی شہزادے پر پستول تان لیا ہے بلکہ اس کو اپنے رعب میں بھی لے آیا ہے۔

ایک دم اس کا خوف اپنی حد سے بڑھ گیا۔ وہ پلٹ کر وسیع خیمے کے دروازے کی طرف بھاگا۔ میں نے کولٹ پسٹل والا ہاتھ گھما کر اس کی گدی پر مارا۔ یہ بڑی جچی تلی ضرب تھی۔ شہباز علی اوندھے منہ قالین پر گرا اور گرتے ہی ساکت ہوگیا۔ موقع دیکھ کر عاصم نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی کوشش کی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے مکمل طور پر کھڑا ہو سکتا' ریوالور ایک بار پھر اس کی طرف سیدھا ہوچکا تھا۔

میں نے عاصم سے کہا کہ میرے سر پر خون سوار ہے وہ میرا امتحان لینے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ خیمے کے دروازے پر پہنچے اور محافظوں کو ہدایت کردے کہ اگلی ہدایت تک کوئی بھی خیمے میں داخل نہ ہو۔ کچھ تذبذب کے بعد شیخ عاصم نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے دروازے میں سے سر باہر نکال کر محافظوں سے کہہ دیا کہ کچھ دیر کے لیے اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا میں ریوالور لیے اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کردیا۔ فائبر گلاس کا یہ دروازہ عام دروازوں کی طرح تھا اور اس پورے خیمے کی طرح یہ دروازہ بھی فولڈ ہو کر ڈھائی فٹ مربع کی جگہ میں آسکتا تھا۔

خیمے کے دو حصے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دوسرے حصے میں کوئی موجود نہ ہو۔ میں نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ خیمے پورشن ایک چھوٹے سے لگژری بیڈ روم کی طرح تھا۔ بیڈ روم میں کسی لڑکی کے لباس ٹنگے ہوئے تھے' ایک طرف زنانہ جوتوں کے چار پانچ جوڑے رکھے تھے۔ ایک فولڈنگ الماری میں قیمتی وہسکی کی بوتلیں بھی ہوئی تھیں۔ سگریٹ' بہترین پرفیومز' وی سی آر' پورٹ ایبل ٹی وی' ایکس فلمیں' مساج کے لوازمات وہ سب کچھ یہاں موجود تھا جو شیخ عاصم کی زندگی کا حصہ تھا۔

میں نے نفرت سے پردہ برابر کردیا۔ شیخ عاصم اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔ اس نے سگار سلگایا اور صوفے پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا "کیا فیصلہ کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے عاصم کی کھوپڑی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا "میرے لیے تمہیں گولی مارنا بہت آسان ہے مگر میں تمہیں گولی مارنے نہیں' تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ لہٰذا میں یہ آتشیں ہتھیار درمیان میں سے ہٹا رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم بھی شرافت کے دائرے میں رہو گے۔"

میں نے شیخ کا پسٹل ایک طرف پھینک دیا اور ریوالور پھر سے قمیص کے نیچے لگالیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے کہا "عاصم! میرا خیال ہے کہ تمہاری یادداشت کمزور نہیں ہے' تم ابو ظہبی کے صحرا کے دن رات بھولے نہیں ہوگے۔ تمہیں شاری کا خون خوار بندر اور اس کا کیا حملہ تو یاد ہوگا' اگر میں بروقت بندر کو ہلاک نہ کرتا تو اس کی جگہ تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ شاید میرے اس ایثار نے تمہارے اندر بھی میرے لیے نرم گوشہ پیدا کیا ہے' مگر نرم گوشہ تو تب پیدا ہوتا جب تمہارے اندر انسانیت کی کوئی رمق باقی ہوتی۔ تم نے اس بات کو یکسر فراموش کرتے ہوئے کہ میں نے تمہاری جان بچا کر خود کو بدترین خطرات کی نذر کردیا تھا' اپنی دشمنی کے پودے کو پانی دینا جاری رکھا۔ تمہاری عارضی مفاہمت کی حقیقت اس وقت پوری طرح کھل گئی تھی جب شیخ عشارب کے نام لکھا ہوا تمہارا خط پکڑا گیا تھا' بہرحال میں ان بسری باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔"

"دہرا رہے ہو اور کہتے ہو کہ دہرانا نہیں چاہتا۔ بہتر ہے کہ تم صرف مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات یہ ہے عاصم کہ تم غزالہ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ تمہارے ساتھ رہنا تو دور کی بات ہے وہ اپنے آس پاس تمہارا سایہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔"

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو شاہ جہاں! یہ حقیقت حال نہیں' یہ تمہارا خواب ہے اور یہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ تم نے بڑی کوشش کی ہے ہم میاں بیوی کے درمیان آنے کی مگر تم کامیاب ہوئے ہو اور نہ کبھی ہوسکو گے۔ ہماری ازدواجی زندگی میں اتنا بڑا خلا ہرگز نہیں کہ تم اپنے منحوس وجود کے ساتھ اس میں گھس سکو۔"

"یہ خلا نہیں دراڑ ہے شیخ عاصم اور یہ اتنی پھیل چکی ہے کہ تم روئے زمین کی ہر شے اس میں پھینک دو تو بھی پاٹی نہیں جاسکے گی۔ میں جانتا ہوں عاصم' تم صرف اور صرف مجھے اذیت دینے کے لیے یہ سب کچھ کررہے ہو۔ تم مجھے ہر گھڑی شکست خوردہ دیکھنے کے آرزومند ہو مگر تم جانتے نہیں ہو کہ دیر ہوئی تمہاری فتح بدترین شکست میں بدل چکی ہے اور ایسا کرنے والی غزالہ خود ہے۔ تم اس کے قریب ترین ہو لیکن ہزاروں میل کی دوری پر ہو' میں دور ہو کر بھی قریب ہوں۔"

شیخ عاصم نے قیمتی صوفے پر پہلو بدلا "ایسے مکالمے میں نے فلموں میں بہت سنے ہیں۔ تم مطلب کی بات کرو شاہ جہاں لدو تارا حمد۔"

"مطلب کی بات سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"روپے کی بات۔۔۔ وہ بات جو درجنوں بار تمہارے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئی ہے۔ کتنی رقم درکار ہے تمہیں' ہماری زندگی سے نکلنے کے لیے۔۔۔ بولو کتنی چاہیے؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ایسی لعنتی سوچ اگر تمہارے دماغ میں آئی ہے تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری فطرت ہی یہی ہے۔"

"میری فطرت کے بارے میں تم مجھے بہت مرتبہ بتا چکے ہو۔ کبھی اپنی فطرت کے بارے میں بھی سوچا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت تم نے غزالہ سے واقعی محبت کی ہو لیکن اب یہ محبت ایک بے شرم ہٹ دھرمی بن کر رہ گئی ہے۔ تم ہاتھ دھو کر ایک شادی شدہ عورت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو اور کیا ہے اب تک تم نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ محبت "حاصل کرلینے" کا ہی تو نام نہیں۔ محبت کرنے والے ساری زندگی درد سہتے ہیں مگر جس سے محبت کرتے ہیں اس کی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تم نے کیا کیا ہے۔"

میں نے کہا "شیخ عاصم! اگر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی لگتا کہ تم نے واقعی غزالہ سے شادی کی ہے اور تم بیوی کا درجہ دینے کا ارادہ رکھتے ہو تو میں کبھی تم دونوں کے پاس سے بھی نہ گزرتا لیکن ناقابل تردید حقیقت یہی ہے کہ تم نے بدترین بلیک میلنگ کے ذریعے غزالہ کو اپنے جال میں جکڑا ہے' اور اسے صرف میرے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میرے پاس اس خط کے فوٹو اسٹیٹ موجود ہیں جو تم نے عشارب کو لکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی ایسے بہت سے ثبوت ہیں جو عدالت کے سامنے لائے گئے تو وہ دنوں میں غزالہ کو تمہاری قید سے رہائی دلا دیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' یہاں کیا لینے آئے ہو۔ عدالت میں آنا۔ وہیں پر بات ہوگی۔"

"سوچ لو شیخ عاصم! اس راکھ میں انگلیاں پھیرنے سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا' ہاں صرف راکھ پڑ سکتی ہے سر میں۔"

"تم بھی سوچ لو۔ عدالتی لڑائی لڑو گے تو دانتوں پسینے آجائیں گے۔ جس سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اسے کٹہرے میں بلایا جائے گا' ایسے سوال پوچھے جائیں گے جن کو زبان پر نہیں لایا جاسکتا پھر روپیہ خرچ ہوگا۔۔۔ اور تھوڑا بہت بھی نہیں ہوگا۔ دفینے کا مال تمہیں مل جاتا تو شاید بات بن جاتی۔ چھوٹی موٹی غنڈا گردیاں کرکے اور جوئے جیت کر اتنا بڑا مقدمہ نہیں لڑ سکو گے۔ بہتر ہے کہ دینے کے بجائے کچھ لے لو۔ میں اپنی گھریلو زندگی کے صدقے کے طور پر دو چار کروڑ تمہیں دے سکتا ہوں لیکن اس کے بعد تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ اپنا منحوس سایہ لے کر ہماری زندگی سے بہت دور چلے جاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں تمہاری طرح بد اخلاق بھی ہوتا اور تمہارے منہ پر تھوک سکتا تو ان لمحوں میں مجھے بڑی خوشی محسوس ہوتی۔"

شیخ عاصم کا رنگ سرخ انگارا ہوگیا' وہ بولا "اب بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں مزید برداشت نہیں کرپاؤں گا۔"

"شاید تمہیں چیخنے چلانے کی جلدی ہے۔ میں جانتا ہوں لنچ کے بعد تم آدھی بوتل ضرور چڑھاتے ہو۔ ممکن ہے کہ قیلولے کے وقت تم نے اس حسینہ کو بھی بغل میں لینا ہو جس کے کپڑے اس پردے کے پیچھے پڑے ہیں۔ غزالہ کے ساتھ تمہاری بے لوث اور لازوال محبت کی ایسی بہت سی نشانیاں میں امارات میں بھی دیکھ چکا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ یہ ساری نشانیاں سر پر اٹھا کر لے جانا عدالت میں۔ میں دیکھ لوں گا تمہیں بھی اور تمہارے خیر خواہوں کو بھی۔ ایک ایک کا پیشاب خطا نہ کرایا تو میرا نام شیخ

عاصم نہیں۔"

"تم اپنی زبان کو لگام دو عاصم۔ میں تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتا۔"

"تم جس راستے سے آنا چاہتے ہو آ جاؤ۔ تمہیں مکمل آزادی ہے۔ اگر تمہارے دماغ میں یہ کیڑا ہے کہ تم بڑے سنگ کمانڈو اور خطرناک جنگجو ہو تو یہ حسرت بھی نکال لینا۔ میرے پاس تمہارے اس مرض کے کئی تیر بہدف نسخے ہیں۔ میرے خیال میں تھوڑا سا افاقہ تو تمہیں حوالات میں بھی ہوا تھا' باقی مکمل علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔ مرض جڑ سے نہ چلا جائے تو نام بدل دینا۔" شیخ عاصم ڈھکے چھپے الفاظ میں شنکر شکرا کا ذکر کر رہا تھا۔

میں نے کہا "تمہاری وہ غلط فہمی بھی جلد نکال دوں گا۔ ذرا چھری کے نیچے سانس لے لو۔"

"ٹھیک ہے لے رہا ہوں سانس۔ جب چھری چلاؤ گے دیکھ لوں گا۔"

"اچھی بات ہے شیخ عاصم' اس کا مطلب یہی ہے کہ تم نے اوکھلی میں سر ضرور دینا ہے اور جب تک تمہارا ناریل چٹخے گا نہیں تمہیں چین نصیب نہیں ہو گا۔"

میں نے باہر کا رخ کیا تو شیخ عاصم نے سگار کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "ایک بات بتا دوں۔ جس کے بل بوتے پر تم کھڑا ہونے کی کوشش کر رہے ہو وہ اتنا قابل اعتبار نہیں ہے۔ میں اس سفید بندر کی بات کر رہا ہوں جسے مسٹر جی کلارک کہتے ہو۔ مانا ہے کہ اس کے پاس پیسہ ہے لیکن یہ پیسہ اسی لیے ہے کہ وہ پیسے سے پیار کرتا ہے۔ وہ تم پر بے دریغ دولت نہیں لٹائے گا۔ بے شک وہ دولت تمہاری ہی کیوں نہ ہو۔"

"تم مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہو؟"

"وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔ وہ عرصہ ہوا دفینے کے نوادرات بیچ چکا ہے لیکن تم سب ابھی تک پھوکٹ ہو اور وعدوں پر گزارہ کر رہے ہو۔ امید ہے کہ آئندہ بھی وعدوں پر ہی گزارہ کرو گے' یہ سفید بندر کسی کے نہیں ہوتے۔"

"رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ بڑے اچھے لوگوں میں سے تم جیسے گلے سڑے والے نکل آتے ہیں' برے لوگوں میں سے ایسے خوب صورت انسان برآمد ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

"گھبراؤ مت' تمہاری عقل بھی ضرور دنگ ہو گی۔" عاصم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے بے ہوش دیہاتی نوجوان شہباز علی کو بہ آسانی اپنے کندھے پر لاد لیا "اگر تھوڑی بہت اخلاق کی رمق ہے تم میں تو مجھے یہاں سے آزادی کے ساتھ نکلنے دینا۔" میں نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آیا۔ باہر نکلنے سے پیشتر میں نے مفلر سے چہرہ پھر ڈھانپ لیا تھا۔

محافظ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ وہ لپک کر اندر خیمے میں گئے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا' اگر عاصم نے میری واپسی میں رکاوٹ ڈالنا تھی تو پھر ابھی کچھ نہ کچھ ہو جانا تھا۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ کچھ آگے پہنچا تو چند اور سیکورٹی گارڈز نے مجھے روک لیا۔ اسی دوران میں وہ گارڈز بھی وہاں پہنچ گئے جو میرے خیمے سے نکلنے کے فوراً بعد اندر داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہمارے راستے میں آنے سے منع کر دیا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ جو شکاری اپنے شکار کیے ہوئے پرندے دکھانے کے لیے شہزادے کے خیمے میں گیا تھا وہ اپنے ساتھی کے کندھے پر لد کر باہر آیا تھا۔

کیمپ سے کچھ آگے درختوں میں شہباز نامی اس نوجوان کا گھوڑا اور کتا موجود تھے۔ میں نے ایک شخص کی مدد سے شہباز کو گھوڑے پر لادا اور خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ شہباز کی شاٹ گن میں نے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دی۔ شام کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اردگرد کے افراد کو حیران چھوڑ کر درختوں کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے اپنے تعاقب کا پورا خیال رکھا تھا' چار پانچ میل کے سفر کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ تعاقب نہیں ہو رہا۔ چکر کاٹ کر میں واپس درختوں کے اس جھنڈ میں آ گیا جہاں میں حوالدار فیض کو انتظار کرنے کا کہہ گیا تھا۔ حوالدار فیض درختوں میں موجود تھا۔ وہ میرے ساتھ شہباز کو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر حیران ہوا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے شہباز سے ملاقات اور اس کی بے ہوشی تک کا احوال سنایا۔ فیض حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔

اسی دوران میں شہباز ہوش میں آ گیا۔ اس کی گردن میں سخت تکلیف تھی اور دل بھی خراب ہو رہا تھا۔ دو تین قے کر کے اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ وہ مجھے بے حد خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چارہ انعام کے شوق میں "عربی شہزادے" کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بے ہوش ہو کر یہاں چلا آیا تھا۔ میرے پاس نقدی نہیں تھی' نہ ہی اس وقت فیض کے پاس زیادہ روپے تھے ورنہ میں اسے خوش کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ بے حد ڈرا سہما ہوا تھا۔ میں نے فیض کے ساتھ مل کر اسے سمجھایا کہ وہ ایک نہایت

سنگین چکر میں پھنس سکتا ہے' لہٰذا اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ اب چند روز کے لیے گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ ہی کسی سے آج دوپہر پیش آنے والے واقعے کا ذکر کرے۔

شہباز نامی یہ نوجوان اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا' اندھیرا گہرا ہو گیا تو وہ اپنے گھوڑے اور کتے کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ شہباز اپنے گھر نہ ہی جائے تو بہتر ہے۔ اگر شیخ عاصم یا چودھری اعجاز کے کارندے اس نوجوان کا کھوج لگا لیتے تو پھر فیض کا کھوج بھی لگ سکتا تھا' اور اگر فیض کا کھوج لگ جاتا تو پھر میں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ بہرحال یہ بات تسلی بخش تھی کہ شہباز بھی فیض کے خفیہ ٹھکانے یعنی کرم دین کے گھر سے واقف نہیں تھا۔ شہباز علی کے روانہ ہونے کے فوراً بعد ہم دونوں نے بھی وہ جگہ چھوڑ دی۔ سردی آج رات بھی تھی لیکن کل سے کچھ کم ہی تھی۔

شیخ عاصم سے جو تند و تیز مکالمہ ہوا تھا اس کے فقرے ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ آگ جو کچھ عرصے کے لیے میرے جسم کے اندر بجھ گئی تھی پاکستان پہنچنے پر شیخ عاصم کے رویے کے سبب پھر بھڑک اٹھی تھی۔ ہم درمیانی رفتار سے گھوڑے چلاتے اونچے نیچے راستوں' پگڈنڈیوں اور خود رو گھاس کے اوپر سفر کرتے رہے۔ واپسی پر ہم نے قدرے مختلف راستہ اختیار کیا تھا۔ ایک گاؤں کے نزدیک سے گزرے تو وہاں بے تحاشا روشنیاں نظر آئیں اور لاؤڈ اسپیکر پر گانوں کی آوازیں اور مختلف اعلانات وغیرہ سنائی دیے۔

حوالدار فیض نے بتایا "یہ راوو والی گاؤں ہے۔ یہاں بچے پیر کا میلہ لگتا ہے۔ مویشیوں کی ایک بڑی منڈی بھی لگتی ہے یہاں' دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ آج میلے کا دوسرا دن ہے' ابھی دو دن اور رہے گا۔"

وہ کمیت گھوڑا جو فیض کے نیچے تھا خاص قسم کا خشک چارا کھاتا تھا۔ اس چارے میں جوی کے اندر دوانہ وغیرہ ڈالا جاتا ہے۔ خشک چارا نہ ہونے کے سبب یہ گھوڑا کل رات سے بھوکا تھا اور اب اس کے لیے دو قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے فیض سے مشورہ کیا اور ہم چارے کے لیے مویشیوں کی منڈی کی طرف چلے گئے۔ بڑے بڑے شامیانوں کے نیچے بے شمار مویشی موجود تھے۔ گائے' بھینس' بھیڑیں' بکریاں' گدھے وغیرہ۔ مویشیوں کے تاجروں نے جانوروں کو سردی سے بچانے کے لیے الاؤ وغیرہ جلا رکھے تھے۔ منڈی کے ساتھ ہی میلہ بھی تھا۔ میلے کا منظر بھی بڑا روایتی قسم کا تھا۔ شامیانوں کے اندر بجلی کے بلب اور گیس لیمپ وغیرہ جل رہے تھے۔ مٹھائی کی دکانیں' کھلونے' کپڑے اور برتنوں کی دکانیں' پکوڑے' تھیٹر' کھیل تماشے' سبھی کچھ یہاں موجود تھا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی لہٰذا بازار میں خواتین اور بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ قریب ہی ایک موت کے کنوئیں کے اندر دو موٹر سائیکلیں چلیں اور گھڑگھڑاہٹ سے قرب و جوار گونجنے لگے۔ میلے کے مناظر دیکھتے دیکھتے اچانک میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں گھوڑے سے اترا ہوا تھا اور لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر لگام فیض کو تھمائی۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ کیا ہوا ہے۔ میں سنی ان سنی کرتا ہوا ہجوم میں داخل ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ میں لوگوں کے درمیان راستہ بناتا تیزی سے آگے بڑھنے لگا اور اس چہرے کو ڈھونڈنے لگا۔ میری نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں' اس شخص نے اورنج کلر کی کڑھائی دار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں چند قدم آگے گیا تو قمیص کی جھلک پھر نظر آئی۔ میں نے قمیص کو نگاہ میں رکھا اور لوگوں سے ٹکراتا ہوا اس قمیص والے کی طرف بڑھنے لگا۔

قمیص والا ایک شامیانے کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا' میں دوڑ پڑا۔ کئی لوگوں سے ٹکراتا ہوا میں شامیانے کے عقب میں پہنچا۔ قمیص والا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ جو چہرہ مجھے ابھی دکھائی دیا تھا وہ میرا جانا پہچانا تھا۔ یہ شنکر شکرا کا قریبی ساتھی راہول لوبا تھا۔ راہول لوبا سے کراچی اور بمبئی میں کئی سنسنی خیز ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ یہ شخص میرے ہاتھوں مرتے مرتے بھی بچا تھا۔ راہول کا اس میلے میں پایا جانا میرے لیے تعجب خیز تو تھا مگر ناقابل یقین نہیں تھا۔ شنکر شکرا پاکستان میں موجود تھا بلکہ شیخ عاصم کے اردگرد ہی پایا جاتا تھا۔ اب شیخ عاصم اس علاقے میں موجود تھا تو ممکن تھا کہ شنکر بھی آس پاس ہی ہو۔ شنکر کے ساتھ اس کے ساتھی بھی ہو سکتے تھے۔

راہول کو دوبارہ ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر میں فیض کے پاس واپس آ گیا۔ اس نے ایک دکان دار سے بالٹی لے کر گھوڑے کو چارا ڈال دیا تھا اور اب جلیبیاں کھانے کے ساتھ ساتھ میرا انتظار بھی کر رہا تھا "کیا ہوا ہے جی؟ آپ کس کے پیچھے گئے تھے؟"

"تھا ایک پرانا دوست۔"

"آپ نے آواز دے دینی تھی۔" اس نے نقطہ اٹھایا۔

"نام یاد نہیں رہا تھا۔" میں نے فیض کو ٹال دیا۔

اچانک ایک طرف سے شور سنائی دیا اور میلے میں بھگدڑ کے آثار نظر آئے۔ یوں لگا جیسے پولیس والے لاٹھی چارج کر رہے ہیں۔ ہم نے ایک بھاگتے ہوئے شخص کو روک کر پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔

وہ بولا "ادھر تھیٹر میں موسیقی کا پروگرام تھا۔ ایک مشہور فلمی ڈانسر نے بھی آنا تھا وہ نہیں آئی اس لیے لوگوں نے کرسیاں توڑنی شروع کر دی ہیں۔"

بھگدڑ کی وجہ سے کئی دکانوں کے شامیانے گر گئے تھے، دکانوں کا نقصان بھی ہوا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ہم نے آگے جا کر دیکھا۔ کچھ افراد زخمی ہوئے تھے۔ اسی دوران میں کچھ لوگ مٹھائی کی ایک دکان پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔

جس تھیٹر میں ہنگامہ ہوا تھا اسے بھی نقصان پہنچا تھا۔ لوگوں نے بورڈ توڑ پھوڑ دیے تھے، وہ قناتیں بھی گرا دی تھیں جن کے پیچھے کر انتظامیہ کے لوگ ٹکٹ فروخت کرتے تھے اور لڑکیاں ناچ گا کر تماشائیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ تھیٹر کے وسیع و عریض شامیانے کو پولیس کے سپاہیوں اور انتظامیہ کے لٹھ بردار افراد نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ بات وہی تھی جو ابھی تھوڑی دیر قبل ایک تماشائی نے بتائی تھی۔ مشہور فلمی ڈانسر کے نام پر ٹکٹ بیچے گئے تھے اور وہ ڈانسر تھیٹر میں پہنچی ہی نہیں تھی۔ نتیجے میں تماشائیوں نے توڑ پھوڑ کر کے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے بالکل سامنے چند گز کے فاصلے پر پھر راہول نظر آیا۔ اس کا رخ تھیٹر کی طرف تھا۔ اس کی اورنج کلر قمیص ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔

میں نے فیض سے کہا "یہی ہے وہ بندہ جسے میں تلاش کر رہا تھا۔ میں نے یونہی کہا تھا یہ دوست وغیرہ نہیں ہے۔ یہ مخالف پارٹی کا بندہ ہے۔"

"کیا اسے قابو کرنا ہے؟"

"بات تو یہی ہے لیکن پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔"

فیض پوری طرح الرٹ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس لائسنس یافتہ رائفل موجود تھی۔ میری قمیص کے نیچے بھی ریوالور لگا ہوا تھا۔ نجانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ راہول کے ساتھ شاید ایک دو بندے ہی اور ہیں۔ شنکر کے خلاف میرے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس آگ کو شنکر ہی ٹھنڈا کر سکتا تھا، اور شنکر کا پتا مجھے راہول سے مل سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ شنکر بھی یہاں کہیں آس پاس ہی پایا جاتا ہو۔

میں نے ایک بار پھر مفلر میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا تھا۔ ایک مچھلی پکوڑے والے کے پاس کھڑے ہو کر ہم ہاتھ تاپتے رہے اور ساتھ ساتھ راہول پر بھی نگاہ رکھی۔ اس کے ساتھ دو افراد تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ایک تو موٹا سکھ یعنی کلین شیو سکھ تھا، اور یہ شخص یقیناً راہول کے ساتھ ہی انڈیا سے آیا تھا، دوسرا بندہ مجھے چوہدری اعجاز کا کارندہ لگتا تھا۔ یہ موٹا تازہ شخص یقیناً اپنے دونوں بھارتی دوستوں کو میلہ دکھانے لایا تھا۔ دور ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ تینوں نے خوب شراب پی رکھی ہے اور فل مستی میں ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں افراد ایک مشہور سرکس کی طرف چلے گئے۔ اس جانے پہچانے سرکس کے گرد بھی لوگوں کا بے تحاشا رش تھا۔ وہ تینوں افراد ٹکٹ لے کر اندر چلے گئے تو ہم بھی اندر جانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ تھوڑا سا مہنگا ٹکٹ تھا اور اس میں کرسیاں وغیرہ تھیں۔ میں اور فیض دو تین قطاریں چھوڑ کر راہول اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ لڑکیاں سائیکل چلانے کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ان کے لباس ہیجان خیز تھے۔ کئی نوجوان اٹھ اٹھ کر بڑھکیں بھی مار رہے تھے۔ راہول اور اس کے ساتھی بھی شراب کی مستی میں تھے، انہوں نے بھی بڑھکوں اور ہلکڑے وغیرہ میں اپنا حصہ ڈالا۔ اسی دوران میں ایک شخص آیا۔ اس نے چوہدری اعجاز کے موٹے تازے کارندے کے کان میں کوئی بات کہی اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ شخص بھی ساتھ گیا جو میرے اندازے کے مطابق موٹا سکھ تھا۔ وہ دونوں غالباً تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔ اب صرف راہول وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔

میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے حوالدار فیض سے کہا "تم کسی طرح اس شخص کو تھیٹر سے باہر لاؤ۔ اس سے کہو کہ کھنڈالی کا ایک بندہ ہے اور وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فوراً آ جائے گا۔"

"یہ کھنڈالی کیا ہے؟"

"یہ ہوشیار پور کے قریب ایک قصبہ ہے۔ یہ شخص وہیں کا رہنے والا ہے۔ اگر یہ تمہارے ساتھ آتا ہے تو اسے تھیٹر کی پچھلی طرف لے آؤ جہاں گاڑیاں کھڑی ہیں۔"

فیض کو پوری طرح سمجھا کر میں تھیٹر سے نکل آیا اور گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس طرف نیم تاریکی تھی۔ ایک طرف پرال کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے تھے۔ اس کے پاس ہی

کئی گاڑیاں اور ٹریکٹر ٹرالیاں وغیرہ کھڑی تھیں۔ گاڑیاں زیادہ تر سرکس اور تھیٹرز وغیرہ کے مالکان کی تھیں۔ میں نے کئی گاڑیوں کے دروازے چیک کیے۔ ایک اسٹیشن ویگن کا دروازہ مجھے کھلا ملا۔ یہ ویگن ویسے بھی مکمل تاریکی میں کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب کھڑا ہو کر فیض اور راہول کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی وہ مجھے نظر آ گئے۔ وہ سیدھے میری طرف ہی آ رہے تھے۔ میں ویگن کی اوٹ میں چلا گیا اور ایسے بیٹھ گیا جیسے لوگ پیشاب وغیرہ کے لیے بیٹھتے ہیں۔ جونہی وہ دونوں میرے قریب پہنچے میں نے اچھل کر راہول کی توانا گردن دبوچ لی۔ ہاتھ درست نہیں پڑا تھا، راہول نے مچل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی، میں نے دائیں ہاتھ کا بھرپور مکا اس کے جبڑے پر رسید کیا اور اسے نڈھال کر دیا۔

چند ہی لمحے بعد وہ اسٹیشن ویگن کی طویل سیٹ پر بے سدھ پڑا تھا۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اور فیض نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر میرے مفلر کے ذریعے باندھ دیے تھے۔ جب راہول کے حواس بحال ہوئے تو اس نے مچلنا شروع کر دیا۔ مگر میں اور فیض دونوں اس کے اوپر بیٹھے تھے اور وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

اس کی جامہ تلاشی میں ایک جدید پسٹل، چند بھرے ہوئے میگزین اور شراب کا پوا برآمد ہوا۔ اس کی سانس میں بھی وہسکی کی بو رچی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ ایک مرتبہ بمبئی کے ایک ڈیرے پر راہول نے میرے پاؤں پکڑ کر اور اپنی ناک سے زمین پر لکیریں کھینچ کر مجھ سے اپنی جان بخشی کروائی تھی۔ آج شاید پھر وہی منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اسٹیشن ویگن سے باہر کسی لاؤڈ اسپیکر پر نورجہاں کا گانا گونج رہا تھا۔ لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے۔ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔

میں نے راہول سے کہا "میڈم نورجہاں یہ گانا شاید تمہارے ہی لیے گا رہی ہے۔ آج پھر تم کو اپنی جان بچانے کے لیے بہت رونا دھونا پڑے گا لیکن جان بچے گی اسی صورت میں جب تم مجھے اپنے باپ شنکر کا پتا بتاؤ گے اور بے چوں چراں اس کے پاس لے چلو گے۔"

میں نے دیکھا کہ راہول کی ڈری ہوئی آنکھوں میں آمادگی کی جھلک ابھری ہے۔ یہ معاملہ میری توقع کے مطابق فوراً حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور اس کے چہرے کے قریب رکھا اور اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ کچھ دیر چوں چراں کرنے کے بعد راہول نے بتا دیا کہ شنکر شکرا، شیطان ابن شیطان اس وقت کہاں ہے۔

○☆○

میں اور فیض، گاؤں سے قریباً دو فرلانگ دور پٹواری منظور حسن کے ڈیرے پر پہنچے۔ یہ ڈیرا کیکر اور ٹاہلی کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس پختہ ڈیرے سے باہر ایک نرسری تھی۔ نرسری کے گیٹ پر دو جیپیں اور ایک بڑی کار کھڑی تھی۔ اس کے علاوہ اسکوٹرز وغیرہ بھی تھے۔ ہم راہول ٹوپا کو اسٹیشن ویگن کے اندر ہی بندھا چھوڑ آئے تھے۔ وہ بے ہوش تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے ساتھی دیوانوں کی طرح اسے یہاں وہاں تلاش کر رہے ہوں گے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ راہول کو سورگ باشی کر کے ہی اسٹیشن ویگن سے نکلوں مگر مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال بھی رکھنا تھا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ اگر میں شنکر کے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کروں گا تو وہ میرے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ خاص طور سے ڈیزی گل اور سندر تو سو فیصد اس کے نشانے پر تھے۔ جس چیز نے چند منٹ پہلے میرے غضب کو ہوا دی تھی وہ راہول کا ایک بیان تھا۔ یہ بیان راہول نے ابھی بے ہوش ہونے سے پہلے اسٹیشن ویگن میں دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ لاہور میں شنکر نے تین روز پہلے ایک "کارنامہ" انجام دیا ہے۔ میری تلاش کے سلسلے میں اس نے پروفیسر اللہ دتا اور اس کی بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ پوچھ گچھ کے دوران جو کچھ مجھے راہول سے معلوم ہوا وہ کچھ اس طرح تھا۔

شنکر رات کے وقت پروفیسر اللہ دتا کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے پروفیسر کے ایک عقیدت مند کی جان لے لی تھی اور پروفیسر کی بیٹی شائستہ کو مار مار کر اس کی کئی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں۔ پروفیسر کو بھی بیٹی کے سامنے بہت ذلیل و رسوا کیا گیا تھا۔ اسے چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا گیا تھا اور کپڑے پھاڑ دیے گئے تھے۔

یہ اطلاع میرے لیے سوہان روح ثابت ہوئی تھی۔ شائستہ اور پروفیسر کی مصیبت نے پہلے سے زخمی دل کو مزید زخمی کر دیا تھا۔ شنکر کے لیے میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ شعلۂ جوالہ بن گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ راہول کی اطلاع درست ثابت ہو اور پٹواری منظور حسن کے ڈیرے پر شیطان ابن شیطان سے ملاقات ہو جائے۔ تاریک پگڈنڈیوں پر چلتے ہم نرسری کے قریب پہنچے تو اندر سے گانے بجانے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں نے حوالدار فیض کو وہیں درختوں میں چھوڑا اور خود ڈیرے میں داخل ہو گیا۔ ایک پہلوان نما شخص میرے سامنے آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ

ے کوئی سوال جواب کرتا' میں نے ایک قدم بڑھ کر اس کے جبڑے پر طوفانی مکا رسید کیا۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ تیورا کر گلاب کے پودے پر گرا۔ میں نے کھڑے کھڑے پاؤں کی ایک اور ضرب اس کے جبڑے پر رسید کی اور اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا۔ اس شخص کے پاس اسلحہ وغیرہ نہیں تھا یا شاید اس نے اپنے تن و توش کی وجہ سے اسلحہ لگانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں ایک چار فٹ اونچی چار دیواری پھلانگ کر ڈیرے کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں سے گھونگھروؤں کی صدا آ رہی تھی۔ ایک نسوانی آواز ہارمونیم اور طبلے سے ہم آہنگ ہو کر گا بھی رہی تھی۔ ڈیرے کے اندرونی دروازے بند تھے۔ میں ایک شیڈ کے ساتھ لٹک کر چھت پر پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے ممٹی کا دروازہ مجھے کھلا مل گیا۔ میں احتیاط سے سیڑھیاں اترتا ہوا ڈیرے کے اندر پہنچ گیا۔ یہاں بجلی کے ہیٹر لگے ہوئے تھے اور فضا میں سگریٹوں اور الکحل کی بو تھی۔ میں شنکر کی غیر معمولی حسیات اور عقابی نگاہوں سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے راہول کا جدید پسٹل ہاتھ میں لے لیا اور بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

نجانے کیوں میری چھٹی حس گواہی دینے لگی تھی کہ آج یہاں شنکر سے ملاقات ہو جائے گی۔ سینے میں ایک جوش لہریں لینے لگا تھا اور رگ پٹھے تن گئے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر کر ایک برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے کے دروازے میں سے لکڑی کی الماری دکھائی دے رہی تھی۔ اس الماری میں پٹواری صاحب کے بڑے بڑے رجسٹر اور کھاتے وغیرہ رکھے تھے۔ ایک ضخیم شحیم حقہ بھی یہاں موجود تھا۔ دیوار کے ساتھ ریوالور کا خالی ہولسٹر لٹکا ہوا تھا۔ لکھنے کے ڈیسک پر سوزوکی کار کی چابی دھری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پٹواری کی گاڑی کی چابی ہے جو باہر نرسری کے پاس کھڑی ہے۔ میں نے چابی اٹھالی۔ اس کے بعد میں دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا آگے بڑھا۔ گانے بجانے کی آواز بالکل قریب سے آ رہی تھی۔ کسی بدمست تماشائی کی ایک دو بڑکیں بھی سنائی دیں پھر میں نے ایک کھڑکی کے شیشے کی دوسری جانب ایک ہال نما کمرے کا منظر دیکھا۔ سرخ رنگ کے بہت بڑے قالین پر محفل سجی ہوئی تھی۔ تماشائی فقط چار پانچ تھے اور ان میں سے ایک شیطان ابن شیطان تھا۔ اس نے جیکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی اور ایک گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے سامنے ایک نہایت ہی مہنگی امپورٹڈ شراب کی بوتل تھی اور بھنا ہوا گوشت تھا۔ وہ فون سن رہا تھا اور خالی خالی نظروں سے رقص بھی دیکھ رہا تھا۔ رقص کرنے والی کی صورت دیکھ کر ہی میں پہچان گیا۔ یہ وہی فلمی ڈانسر تھی جس کے "فراق" میں ادھر میلے میں ہنگامہ ہوا تھا۔ مجھے صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ جس کے لیے غریب تماشائیوں نے ٹکٹ خریدے تھے اور راتیں جگائی تھیں وہ امیر تماش بینوں کے روبرو ناچ رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اسے زبردستی لایا گیا ہو' اور یہ بھی ممکن تھا کہ زیادہ روپے کے لالچ میں وہ خود ہی یہاں حاضر ہو گئی ہو۔ کل صبح وہ تھیٹر والوں کو ان کا ایڈوانس مع نقصان اور جرمانے کے واپس کر سکتی تھی۔ بہرحال اس رقاصہ کی جو حالت ہو رہی تھی وہ شاید وہاں نہ ہوتی۔ وہاں تو اسے صرف رقص دکھانا تھا اور بڑکیں سننا تھیں' یہاں اس کے ساتھ باقاعدہ کھینچا تانی بھی ہو رہی تھی۔ شنکر کے ساتھیوں نے رقاصہ کے بدن پر اتنی شراب انڈیلی تھی کہ اس کا لباس جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اب یہ لباس اس کے جسم کو چھپانے میں قطعی ناکام تھا' اس کے باوجود تماشائی چاہ رہے تھے کہ یہ "بے ضرر" لباس بھی اس کے بدن پر نہ رہے پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بھیگی ہوئی قمیص اور قمیص کا زیریں لباس جسم سے علیحدہ ہو کر ہوا میں لہرا گیا۔۔۔ وہ ناچ رہی تھی اور بڑکوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شنکر شکرا نے فون ٹھیک طرح سننے کے لیے اپنی انگلی اپنے خالی کان میں ٹھونس لی تھی۔

رقاصہ کی ایک ساتھی لڑکی بھی تھی۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک وہ بھی ناچتی رہی تھی کیونکہ اس کے پاؤں میں گھونگھرو اور پیشانی پر پسینہ تھا۔ اب وہ ایک تماشائی کی آغوش میں تھی اور اس کی پرجوش محبت کا سامنا کر رہی تھی۔ میرے لیے اب اپنے اندر کی آگ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر اس کھڑکی پر پہنچا جس کے عین نیچے شنکر نیم دراز تھا۔ پہلے میں نے باہر ہی سے ٹیلی فون کے تار کا پلگ کھینچ کر ٹیلی فون کو خاموش کیا۔ جب اندر شنکر ہیلو ہیلو کر رہا تھا' میں کھڑکی سے کود کر اندر داخل ہوا اور شنکر کو دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا میں نے اس کی منحوس گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے لی لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی گرفت مضبوط کر سکتا' وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس کی فولادی کہنی میری پسلیوں میں لگی۔ گردن میری گرفت سے نکل گئی۔ شنکر کا "ردعمل" جسے "ری فلیکس" بھی کہا جاتا ہے اکثر ایسا ہی برق رفتار ہوتا تھا۔ جس طرح آپ کسی درندے کو پکڑنے کی کوشش کریں اور وہ آپ کی انگلی کا لمس ہوتے ہی تڑپ کر آپ سے دور چلا جائے۔

میں نے خود کو سنبھالا اور ٹیلی فون کے ریسیور کے تار کو بڑی تیزی سے دو مرتبہ شنکر کی گردن کے گرد بل دے دیا پھر اس تار سے کھینچ کر شنکر کو دیوار سے دے مارا۔ رقاصائیں اپنے سازندوں سمیت چیختی ہوئی بھاگ گئی تھیں۔ حیرت کے مارے تماشائیوں کے منہ کھلے تھے۔ دیوار سے تصادم اتنا شدید تھا کہ شنکر چکرا کر رہ گیا۔ اس نے مجھ پر مکا چلایا میں نے جھک کر وار خالی دیا اور اسے ایک بار پھر گھما کر اس کے ایک ساتھی پر دے مارا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ شنکر کی گردن مضبوط تار کے دوہرے شکنجے میں کسی گئی تھی اور میں تار پر اپنی گرفت مضبوط رکھے ہوئے تھا۔ شنکر کے ایک ساتھی نے مجھ پر فائر کرنے کی کوشش کی' میرے ہاتھ میں پکڑے پسٹل نے گولی اگلی اور اس کی آنکھوں کے عین درمیان سوراخ ہو گیا۔ پٹواری اور اس کے ساتھی نے یہ منظر دیکھا تو دم دبا کر بھاگے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر شنکر نے اچانک میری ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈالا اور جوڈو کی تکنیک کے مطابق میری طاقت کو میرے ہی خلاف استعمال کرتے ہوئے مجھے ہوا میں اٹھا لیا۔ یہ بڑا برق رفتار عمل تھا اور اس کی توقع شنکر جیسے لڑاکے سے ہی کی جا سکتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کھڑکی سے ٹکرایا ہوں اور شیشوں کو توڑتے ہوئے باہر جا گرا ہوں۔ بہرطور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مجھے کچھ زیادہ چوٹ نہیں آئی اور اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوا کہ شنکر اپنے مردہ ساتھی کا گرا ہوا ریوالور اٹھانے کے لیے کمرے کے کونے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ یہ میری پلاننگ کا حصہ تھا۔

چند ہی لمحے بعد میں سوزوکی کار کے اندر تھا اور اسے تیزی سے یوٹرن دے رہا تھا۔ مجھے اپنے عقب میں شنکر کی چنگھاڑ سنائی دی۔ اس نے سوزوکی کار پر دو فائر کیے۔ ایک گولی باڈی میں لگی' دوسری اسٹیئرنگ کے عین اوپر سے ونڈ اسکرین توڑتی گزر گئی۔ میں نے سر جھکا رکھا تھا ورنہ شنکر کا فائر کارگر رہتا۔ سوزوکی اچھلتی کودتی کچے راستے پر بڑھی تو شنکر کی جیپ بھی غراتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ میرا رخ میلے کی طرف تھا۔ اپنے ازلی دشمن سے طویل عرصے بعد میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس ملاقات کو ذرا دلچسپ بنانا چاہتا تھا۔

راستے میں شنکر نے دو بار گاڑی پر فائرنگ کی۔ دونوں پچھلے ٹائر برسٹ ہو گئے مگر میں اسی طرح کار کو دوڑاتا رہا' جلد ہی میں میلے کے اندر تھا۔ میلے میں موجود سینکڑوں لوگوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی مگر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ یہ منچلوں کا ہجوم تھا' ہوائی فائرنگ ہوتی ہی رہتی تھی۔ پولیس سامنے کھڑی تماشا دیکھتی رہتی تھی۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے بھی جب تھیٹر کے باہر ہنگامہ ہوا تھا تو انتظامیہ کے کارندوں نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ اس فائرنگ کو بھی کھیل کی فائرنگ سمجھ لیا گیا تھا' بہرحال جب دونوں گاڑیاں دھول اڑاتی ہوئی طوفانی رفتار سے میلے میں داخل ہوئیں تو لوگوں کے ماتھے ٹھنکے۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔ شنکر بھی اپنی جیپ سے کود کر باہر آ گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ اس کی ٹکر اتنی زوردار ہوئی تھی کہ اس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس نے پسٹل میری طرف تانا ہوا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل جیب میں رکھا تو وہ بھی ہاتھ جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ ہم دونوں آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

میں نے کہا "شنکر تم ایک ہارے ہوئے شخص ہو۔ صحرا میں سوار شاری کے سامنے جو مقابلہ ہوا تھا اس میں تم چاروں شانے چت ہوئے تھے۔ تمہاری زندگی میرے نشانے پر تھی مگر میں نے تمہیں مارا نہیں تھا' اس کے بعد تم اسپتال سے فرار ہو گئے' اور دم دبا کر اس طرح بھاگنے کو ہی شاید اپنی فتح سمجھ لیا۔ میں پھر کہوں گا کہ تم ایک ہارے ہوئے شخص ہو لیکن ہارنا اور بات ہے بے غیرت ہونا دوسری بات۔ تم بے غیرت ہو اس لیے پھر مونچھوں کو تاؤ دے کر میرے سامنے آ گئے ہو اور اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کی بھونڈی کوششیں کر رہے ہو۔"

وہ سانپ کی طرح پھنکارا "بکواس کرنا تمہاری پرانی علت ہے۔ میں بھی تمہیں مارنا چاہتا تو اس دن حوالات میں ختم کر سکتا تھا جب چھپکلی کی طرح فرش پر تڑپ رہے تھے لیکن بھگوان کی سوگند میں تمہاری ہتیا کرنا نہیں چاہتا۔ مارنا تو کوئی سزا نہیں ہے۔ ورودھی (دشمن) کو زندہ رکھنا اور اسے ہر ملاقات پر ایک ذلت ناک مات دینا ہی بہتر انتقام ہے۔ میں بھی تمہیں مارنا نہیں چاہتا بس یہ کوشش کر رہا ہوں کہ تم اپنی نظروں میں مر جاؤ۔ یاد کرو وہ وقت۔ تمہیں خود پر مان تھا کہ کراچی اور بمبئی میں تم سے بڑا اسٹریٹ فائٹر اور کوئی نہیں۔ ایک بڑے لمبے بانس پر چڑھے ہوئے تھے تم۔ کوئی استاد کہتا تھا تو غرور سے پھٹنے لگتے تھے۔ تمہارے کہنے پر تمہارے چمچوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ پچھلی دو تین صدیوں میں تم جیسا چاقو زن پیدا نہیں ہوا۔ میں نے کورنگی کراچی میں ایک بڑے ہجوم کے سامنے تمہارا مان تمہارے چمچوں کے سامنے توڑا تھا۔ کچھ یاد ہیں وہ باتیں۔"

"مجھے تو سب یاد ہے لیکن تمہیں صرف اپنے مطلب کی باتیں یاد ہیں۔۔۔ اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آج کی بات

بھی تم بھول جاؤ گے۔ نہ یہ میلہ یاد رہے گا نہ یہاں بننے والی اپنی پاؤں کا درگت یاد رہے گی۔"

"کیا کرو گے تم؟"

"قتل تو شاید نہ کر سکوں مگر آج تمہاری چند ہڈیاں میں نے ضرور توڑ دینی ہیں۔ یہ ہڈیاں توڑنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتا دوں کہ یہ پروفیسر کی بیٹی سے ہونے والی بدسلوکی کا انتقام ہے۔ لاہور کی حوالات میں تم نے میرے ساتھ جو کیا تھا اس کا بدلہ تب لوں گا جب تم اسپتال سے فارغ ہو کر آؤ گے۔"

شنکر کے باریک ہونٹ مضبوطی سے بھنچ گئے۔ وہ پھنکارا "مجھے تو ڈر ہے کہ آج یہ کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ میں شاید تمہاری ہتیا سے خود کو نہ روک سکوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک غلیظ گالی میری طرف اچھال دی۔ میں اس کے قریب تھا ایک دم جھکائی دے کر میں نے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی' وہ ذرا سا جھکا تو میں نے اسے گرفت میں لیا اور پورے زور سے دھکیلتا چلا گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے غیظ و غضب کی سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ اردگرد مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں شنکر سمیت چوڑیوں اور نقلی زیورات کی ایک دکان میں گرا تھا۔ بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا بہت کچھ تہ و بالا ہو گیا تھا۔ میری ٹکریں پوری قوت سے شنکر کے چہرے پر لگ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ مشینی انداز میں اس سفاک کے منحوس جسم پر ضربیں لگا رہے تھے۔

بس ایک دھند سی تھی جو میرے ہر طرف پھیل گئی تھی۔ بے شک مجھے بھی چوٹیں لگ رہی تھیں لیکن پتا نہیں کیا تھا۔ آج ان چوٹوں کی تکلیف مجھے حقیقت سے کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے اردگرد سیکڑوں لوگ ایک دائرے کی شکل میں اکٹھے ہو چکے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ پولیس والوں نے میرے اور شنکر کے درمیان آنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یہ بھی خبر تھی کہ زبردست افراتفری کے سبب چند دکانوں میں آگ بھڑک اٹھی ہے اور لوگ چیخ رہے ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ منڈی مویشیاں میں آگ کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی ہے۔ یہ سب کچھ میرے علم میں تھا مگر ایسے لگتا تھا کہ یہ سب کچھ میرے آس پاس نہیں کہیں بہت دور ہو رہا ہے۔ جو چیز میرے نزدیک تھی وہ صرف اور صرف شنکر تھا اور اس کا ٹھوس قابل نفرت جسم تھا۔ میں اس جسم کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ نقصان جو اسے زندہ رکھ کر پہنچایا جا سکے۔

ان گھمسان کے لمحوں میں اگر کوئی ہوش مندی کی بات میرے ذہن میں تھی تو وہ فقط یہ تھی کہ مجھے شنکر کے مہلک ترین وار' اس کے گھٹنے کی ضرب سے بچنا ہے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب تھا۔ قریباً پانچ منٹ کی خوفناک لڑائی کے بعد شنکر کی دائیں ٹانگ پنڈلی پر سے ٹوٹ گئی۔ اس کے جسم پر درجنوں چوٹیں آئی تھیں اور لہو پرنالے کی طرح اس کے منہ سے بہہ رہا تھا۔ جہاں گھوڑوں اور بھینسوں کی لید تھی اور پانی کا کوئی پائپ رسنے سے کیچڑ ہو رہی تھی وہاں شنکر لت پت ہو کر گر گیا تھا۔ اس نے دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو کر گر گیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک آخری ٹھوکر اس کے چہرے پر رسید کی اور ایک بار پھر اسے لید آمیز کیچڑ میں گرا دیا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کانپتی چلی جا رہی تھی۔

وہ جیپ پاس ہی کھڑی تھی جس پر شنکر میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میں جست لگا کر جیپ میں سوار ہوا اور اسے لوگوں کے درمیان سے آگے بڑھایا۔ ایک سب انسپکٹر رائفل کا فائر کر کے جیپ کا ٹائر برسٹ کرنا چاہتا تھا مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو گولی ہجوم میں سے کسی کو بھی چاٹ سکتی ہے۔ وہ گڑبڑا کر رہ گیا' ایک انسپکٹر نے ہمت کی اور جیپ کا دروازہ کھول کر مجھ پر جھپٹنا چاہا۔ اس کی جھپٹ بڑی کمزور تھی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ صرف اپنی نوکری بچانے کے لیے یہ ڈری سہمی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جارحیت کے بجائے مجھے رحم کی درخواست نظر آئی۔ میں نے ٹانگ مار کر اسے چلتی جیپ سے نیچے گرا دیا۔

جیپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر تماشائیوں نے جلدی سے راستہ دیا۔ طاقت ور جیپ اچھلتی کودتی چنگھاڑتی اونچے نیچے راستے پر لپکتی چلی گئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا کئی شامیانے جل رہے تھے اور دور کہیں بہت فاصلے پر پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دے رہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس فورس کو میلے کے مقام تک پہنچتے پہنچتے دس منٹ لگ جائیں گے۔ یہ دس منٹ۔ اس یخ بستہ رات میں میرے لیے لاپتا ہونے کے لیے کافی تھے۔

○☆○

میں نے شنکر کی زیر استعمال جیپ کو گنے کے ایک کھیت میں پھنسا چھوڑ دیا تھا۔ بہرحال جیپ چھوڑنے سے پہلے میں نے تیزی سے اس کی تلاشی لی تھی اور ایک دو کام کی چیزیں میرے ہاتھ لگی تھیں۔ اس کے بعد میں نے رات کی گہری

تاریکی میں کھیتوں کے اندر اور چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر قریباً دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور رودھا پور پہنچ گیا تھا۔ رودھا پور جو اب تک میرے لیے ایک نہایت محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔

کرم دین کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا حلیہ کسی حد تک درست کر لیا تھا۔ خون آلود پھٹا ہوا سویٹر اتار پھینکا تھا اور اسے امرودوں کے باغ میں ایک گڑھے کے اندر دفن کر دیا تھا۔ منہ ہاتھ پانی کے ایک کھالے میں دھویا تھا اور قمیص کے داغ وغیرہ بھی صاف کیے تھے۔ اس کے بعد ہی میں نے کرم دین کے گھر کی کنڈی کھڑکائی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ کرم دین کی بیوی شاہدہ نے میری آواز پہچاننے کے بعد دروازہ کھولا۔ اس کے بال بے ترتیب تھے لباس بھی بے ترتیب تھا اور وہ خود بھی بے ترتیب لگ رہی تھی۔ اس نے میرے عقب میں جھانکا اور بولی "بھاجی! اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہیں اور روے کہاں ہیں؟"

نفیس کا نام زبان پر لاتے ہوئے وہ اکثر اٹک جاتی تھی۔ مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا تھا کہ وہ کیوں اٹکتی ہے۔ میں نے کہا "وہ ایک دوست کے ہاں رک گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ نہ آیا تو دن چڑھے پہنچ جائے گا۔"

میں اندر آ گیا۔ بلب کی روشنی میں شاہدہ نے دھیان سے میرا سراپا دیکھا۔ کہنے لگی "لگتا ہے کہیں آپ کی لڑائی شڑائی ہوئی ہے۔ آپ کی ٹانگ تو ٹھیک ہے بھاجی؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ بس میری قمیص گیلی ہے کوئی خشک کپڑا لا دو۔"

"میں ابھی لائی بھاجی۔ اور گرم دودھ بھی لاتی ہوں آپ کے لیے۔ اتنی دیر میں آپ رضائی کے اندر دڑ کر ذرا گرم ہوں۔" اس نے پھرتی سے رضائی میرے لیے پھیلا دی۔ کرم دین کھانس رہا تھا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے جلدی سے کرم دین کو پانی پلایا اور پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ کبھی تو لگتا تھا کہ وہ دو کے بجائے چار ہاتھوں سے کام کرتی ہے۔ دو ہی منٹ بعد وہ میرے لیے نہ صرف گرم دودھ لے آئی بلکہ نفیس کا ایک کرتہ بھی استری کر لائی۔

"میں نے دودھ میں تھوڑا سا گھی بھی ملا دیا ہے بھاجی۔ اس سے جسم کو ٹکور ہو گی لیکن پہلے آپ یہ گیلی قمیص بدل لو۔" میں قمیص بدل کر دودھ پی چکا تو وہ کمرے کے دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی "بھاجی' آپ پہلے ہی پریشان لگ رہے ہو۔ لیکن آپ کو بتانا بھی ضروری ہے۔ یہاں پر یک گڑبڑ ہو گئی ہے۔" میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول
اندھیر نگری
چار جلدوں میں مکمل
قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے
◉ ایکشن اور سسپنس کا ننددنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
◉ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
◉ بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
◉ پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان
براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
منجانب
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور ☏7247414

شاہدہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پریشانی کے سائے تھے۔ پھر وہ ہمت کر کے بولی "در اصل۔۔۔ آپ کو نادر جگی نے بلایا ہے۔"

"نادر جگی؟ یہ کون ہے؟"

"اوہ' تو آپ کو فیض نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "نادر یہاں کا بدمعاش ہے۔ پولیس بھی اس کے نام سے کانپتی ہے۔ وہ اس علاقے میں جو چاہے کر سکتا ہے جی۔ در اصل نادر کے کسی بندے نے آپ کو ہمارے گھر میں آتے جاتے دیکھ لیا ہے۔ آج سویرے نادر کا پیغام لے کر نمبردار جی خود یہاں آئے تھے' مجھ سے پوچھ رہے تھے 'لڑکیے! وہ بندہ کون ہے جو تمہارے گھر آتا جاتا ہے۔ میں نے کہا' مجھے تو کچھ پتا نہیں جی۔ فیض کا کوئی دوست ہے۔ نمبردار نے پوچھا' فیض کہاں ہے؟ میں نے کہا وہ بھی اپنے یار کے ساتھ باہر نکلا ہوا ہے۔ نمبردار مجھ سے لوہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ کہنے لگا' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بندہ دو ہفتے سے تیرے گھر میں ہے اور تجھے صرف اتنا ہی پتا ہے کہ وہ تیرے بندے کے دوست کا دوست ہے۔ میں نے کہا کہ قسم لے لیں' مجھے اس سے زیادہ کچھ پتا نہیں۔ وہ کہہ کر چلا گیا کہ جیسے ہی ان دونوں میں سے کوئی آئے اسے نادر جگی کے ڈیرے پر بھیج دو۔"

میں نے سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا اور تکیے سے ٹیک لگالی۔ وہ بولی "نادر جگی بڑا خطرناک بندہ ہے بھاجی۔ آپ اس سے کوئی اونچی نیچی بات نہ کرنا۔ جو بھی وہ پوچھے سچ سچ بتا دینا۔ سچی بات کو کوئی آنچ نہیں ہوتی۔"

"ہاں سچ بات کو کوئی آنچ نہیں ہوتی لیکن پتا نہیں پھر بھی لوگ سچ کیوں نہیں بولتے۔" میں نے کہا تو شاہدہ کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔

وہ بڑی تیزی سے میری بات کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ فیض اور اس کے خفیہ تعلق کی طرف ہے۔ ایک دم میرے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ میں نے شاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں تو یہاں سے جب بھی نکلا ہوں' بڑی احتیاط سے نکلا ہوں۔ پتا نہیں یہ بات باہر کیسے نکلی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تیرے بھائی شوکت نے ہی کوئی چکر چلایا ہو۔"

وہ ایک دم کانوں کو ہاتھ لگانے لگی اور قسمیں کھانے لگی "بھاجی! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے شوکت کی طرف سے آپ کو گارنٹی دی ہے تو کسی وجہ سے ہی دی ہے۔ اس کے بارے میں ہر شک اپنے دماغ سے نکال دیں۔"

اتنے میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ شاہدہ کا بیمار خاوند کرم دین ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس کی مدھم آواز برآمدے سے ابھری "شاہدہ۔۔۔ دیکھ کون ہے؟"

شاہدہ بڑبڑائی "کون ہو سکتا ہے؟" پھر خود ہی بولی "ہو سکتا ہے وہ ہوں۔" "وہ" سے اس کی مراد فیض تھی۔

وہ احتیاط سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اسی دوران میں گھوڑے کی مدھم ہنہناہٹ سنائی دی اور میں سمجھ گیا کہ یہ فیض ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہدہ' فیض کے ساتھ اندر آگئی۔ مجھے دیکھ کر فیض کے چہرے پر ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ مجھے ٹٹولتے ہوئے بولا "آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

میں نے کہا "ٹھیک نہ ہوتا تو اتنی دور سے چل کر یہاں کیسے آتا۔"

کہنے لگا "مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ مجھے لگتا تھا کہ پتا نہیں آپ کو دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔۔۔"

میں نے آنکھ سے فیض کو اشارہ کیا کہ شاہدہ یہاں موجود ہے وہ اس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے۔ فیض نے میرا اشارہ سمجھتے ہوئے شاہدہ سے کہا کہ وہ ایک گلاس گرم دودھ اس کے لیے لے آئے کیونکہ اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔ شاہدہ باہر چلی گئی۔ فیض میرے نزدیک ہوتے ہوئے بولا "جناب! یہ وہی بندہ تھا نا جس نے حوالات میں آپ کے ساتھ لڑائی کی تھی؟"

فیض کا اشارہ ننکر کی طرف تھا۔ میں نے فیض کے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ بولا "لیکن یہ بدبخت یہاں کیسے پہنچ گیا لاہور سے۔"

"اس کا تو مجھے بھی پتا نہیں۔"

"میرے دماغ سے تو اس کی شکل ہی نہیں نکل رہی۔ کتنی درندگی سے لڑ رہا تھا۔۔۔ یہ آپ ہی کا کام ہے کہ نہ صرف اس کا مقابلہ کیا بلکہ لنگڑا کر کے بھی پھینک دیا۔"

"تم لڑائی کے وقت کہاں تھے؟"

"میں نے کہاں جانا تھا جی۔ جس وقت آپ نے پنڈانا منظور چن کے ڈیرے کے اندر بندے کو گولی ماری تو میں سمجھ گیا کہ معاملہ سخت گڑبڑ ہو گیا ہے پھر تھوڑی ہی دیر بعد میں نے آپ کو دوڑ کر پٹواری کی سوزوکی کار میں گھستے اور میلے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ خبیث بھی جیپ پر سوار ہو کر آپ کے پیچھے گیا۔ راستے میں اس نے سوزوکی کار پر کئی بار فائر بھی مارے۔ میرے دل سے دعا نکل رہی تھی کہ آپ صحیح سلامت رہیں۔۔۔ پھر جب کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ میں بھی بھاگتا ہوا موقع پر پہنچا تو میں نے آپ کو اس شخص کے ساتھ گتھم گتھا دیکھا۔ آپ دونوں کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا

اور پولیس والے بس دور دور سے سیٹیاں بجاتے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت تک دو تین شامیانوں کو آگ لگ چکی تھی اور تیزی سے پھیل رہی تھی۔"

حوالدار فیض نے میلے میں ننکر کے ساتھ ہونے والی میری لڑائی کا پورا نقشہ کھینچ ڈالا۔ آخر میں اس نے بتایا "آگ کی وجہ سے ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کے ساتھ لڑنے والے کو اسپتال کس طرح پہنچایا گیا۔ مجھے تو اس وقت بس آپ کے گھوڑے کی فکر تھی' تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے آپ کا گھوڑا مل گیا' اس کی لگام میں نے اپنی زین کے ساتھ باندھی اور جنگل خوار ہوتا یہاں پہنچ گیا۔"

فیض کی روداد کے دوران میں ہی شاہدہ میرے اور فیض کے لیے گرم گرم روٹی پکا کر لے آئی تھی۔ ساتھ میں آلو انڈے کا زبردست سالن تھا اور دودھ پتی بھی تھی۔ اس عورت میں کاہلی سستی نام کو نہیں تھی۔ مشین کی طرح ہر طرف گھوم جاتی تھی۔ فیض کا بیان ختم ہوا تو میں نے اسے بتایا کہ یہاں کیا ماجرا پیش آیا ہے۔ نادر جگی کا نام سن کر فیض کی آنکھوں میں بھی پریشانی لہرا گئی۔ وہ اس حوالے سے شاہدہ سے سوال جواب کرنے لگا۔ شاہدہ اور فیض دونوں خوف زدہ نظر آتے تھے۔

شاہدہ خالی برتن سمیٹ کر باہر چلی گئی تو فیض بولا "یہ نادر بڑا کمینہ سا آدمی ہے۔ پتا نہیں اسے آپ کا پتا چلا کیسے۔"

"چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا' اب کیا کرنا ہے؟ اس نے یہی پوچھنا ہوگا کہ میں کون ہوں' کہاں سے آیا ہوں اور کیوں وغیرہ وغیرہ۔"

"بس یہی تھانے داری ہوتی ہے ایسے لوگوں کی۔ ہر بندے کو بلیک میل کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "پریشان ہونے کی بات نہیں' ہم کوئی مناسب سا بیان اس کے سامنے دے دیں گے' لیکن ایک بات کی احتیاط بہرحال کرنا ہوگی' ہمارے بیان آپس میں ملنے چاہئیں۔"

"ہاں جی' وہ تو ضروری ہے۔"

"تمہارے خیال میں کس طرح کا بیان ہونا چاہیے؟"

"جی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" فیض نے اپنی نالائقی مان لی۔

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "میرا نام جہاں داد ہے۔ میں رحیم یار خاں میں رہتا ہوں۔ میرا لکڑی کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ ایک مرتبہ میں لاہور میں ایک تاریخ بھگتنے آیا تھا' وہیں ضلع کچہری میں میری تم سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جو دوستی میں بدل گئی۔ چند مہینے پہلے رحیم یار خاں میں میری کاروباری رقابت چل نکلی جو دشمنی میں بدل گئی۔ نتیجے میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ دشمنی کی آگ سے بچنے کے لیے میں تمہارے پاس لاہور چلا آیا' اور لاہور سے یہاں روجھاپور آ گیا۔"

ہم نے اس بیان کی ساری تفصیل طے کرلی تاکہ اگر نادر جگی پولیس والوں کی طرح باریکی میں چلا جائے تو بھی بات بگڑنے نہ پائے۔ اس بیان میں رحیم یار خاں کا نام اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ بہت فاصلے پر تھا' وہاں جانا اور بیان کی تصدیق کرنا کار دشوار تھا۔ میں نے فیض سے کہا "اب لگے ہاتھ تم بھی بتا دو کہ تم نادر کو کیا بتاؤ گے؟"

"وہی جو سارے قصبے کو معلوم ہے۔ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ دیسی علاج کرلیتا ہوں۔ کرم دین میرا گہرا دوست ہے' اس کے علاج معالجے کے لیے یہاں روجھاپور آتا رہتا ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ کرم دین سے زیادہ تم اس کی جوان بیوی کے علاج معالجے کے لیے آتے ہو۔

کافی دیر تک تفصیل طے کرنے کے بعد میں تو سو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ فیض پریشانی کے سبب باقی رات جاگتا ہی رہا۔ صبح ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ باہر کا دروازہ زور سے بجنے لگا۔ فیض جو اونگھ رہا تھا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "میرا خیال ہے کہ نادر کا بندہ آیا ہوگا۔" اس کے لہجے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

باورچی خانے میں سے شاہدہ کی ڈری ہوئی شکل بھی نظر آرہی تھی۔ فیض جبل گھسیٹتا ہوا دروازے تک گیا "کون؟" اس نے پوچھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

آنے والا شاہدہ کا بھائی شوکت تھا۔ میری طرف کھسیانی نظروں سے دیکھتا ہوا وہ بہن کی طرف باورچی خانے میں چلا گیا۔ جس رات میں نے اس کی مرمت کی تھی اس کے بعد آج اس کی صورت دکھائی دی تھی۔ وہ دیر تک بہن کے ساتھ کھسر پھسر میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد فیض بھی ان دونوں کے پاس جا بیٹھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد شوکت جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔ فیض میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا "کیا چکر ہے؟"

وہ بولا "یہ نوجوان شاہدہ کا بھائی ہے۔ شاید پہلے اس سے

آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے نفی میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ فیض نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ بھی وہی نادر والی بات بتانے آیا تھا۔ اس کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ نادر نے مجھے اور آپ کو اپنے ڈیرے پر بلایا ہے۔ وہ اپنی طرف سے مجھے سمجھانے آیا تھا کہ میں کوئی الٹی سیدھی بات نادر کے سامنے نہ کروں' کیونکہ اکثر وہ اپنے بندوں کے ذریعے بات کی تصدیق بھی کرالیا کرتا ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم لوگوں نے اس بندے کا ذہنوں پر کافی خوف سوار کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا تو کبھی اس سے سامنا نہیں ہوا ہے۔ بس کرم دین وغیرہ سے سنا ہے کہ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ کرم دین کو اس کے بارے میں کافی کچھ پتا ہے لیکن بتاتا کم کم ہی ہے۔"

ابھی ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ ایک اکہرے بدن کا نوجوان کرم دین کے دروازے پر پہنچا اور اس نے بڑی کراری آواز میں ہمیں اطلاع دی کہ نادر بجگی صاحب ہمیں ڈیرے پر یاد فرما رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ہم پہنچ رہے ہیں۔"

شاہدہ ہمدردہ لہجے میں بولی "ویسے اچھا ہوگا آپ نمبردار کو ساتھ لے جائیں۔"

"دیکھ لیں گے۔" فیض نے کہا اور آنکھوں سے شاہدہ کو اشارہ کیا کہ وہ کرم دین کے پاس جائے تاکہ وہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہو۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں نادر بجگی کے ڈیرے میں داخل ہو رہے تھے۔ کھلے احاطے میں بکائن کے پیڑ تلے ایک سیکنڈ ہینڈ جیپ کھڑی تھی اور تین گھوڑے بندھے ہوئے تھے' قریب ہی دھوپ میں تین نوجوان لڑکے مرغا بنے ہوئے تھے اور ان کی پیٹھ پر دو دو اینٹیں رکھی تھیں۔ نادر بجگی اندر کمرے میں موجود تھا۔ اس نے تہبند قمیص پہن رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ سر پر ایک بڑا رومال اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے عورتیں دوپٹہ رکھتی ہیں۔ اس رومال کی وجہ سے اس کا چہرہ دونوں جانب سے تھوڑا تھوڑا چھپا ہوا تھا۔ نادر کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور شکل کرخت تھی۔ یقیناً کچھ لوگ اسے دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو جاتے ہوں گے۔ ایک منحوس صورت شخص نادر کے قریب ہی رائفل لیے کھڑا تھا' ایک حجام بڑے ادب سے نادر کے قریب بیٹھا اس کے پاؤں کے ناخن تراش رہا تھا۔

ہم دونوں نادر کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ایک بھرپور نظر ہم دونوں پر ڈالی اور بولا "کھڑے کیوں ہو' بیٹھ جاؤ۔"

ہم موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ نادر کی تیز نظریں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ رعونت سے بولا "کیا نام ہے تمہارا اور کہاں سے آئے ہو؟"

"میرا نام جہاں داد ہے جی اور رحیم یار خاں کا رہنے والا ہوں۔"

"یہ تمہاری ٹھوڑی اور گردن پر چوٹیں کیسی ہیں؟"

"بس کچھ لوگوں سے لڑائی ہو گئی تھی جی۔ اسی لیے رحیم یار خاں سے یہاں آنا پڑا۔"

"اس کے بعد میں نے وہی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا جو پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ ساتھ ساتھ میں دل میں دعا بھی کر رہا تھا کہ ان مشٹنڈوں میں سے کسی نے اخبار میں چھپنے والی تصویر نہ دیکھی ہو۔ ویسے جس ڈھنگ کے یہ لوگ تھے' امید نہیں تھی کہ اخبار وغیرہ دیکھتے ہوں گے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک کارندہ اندر آیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "دو منڈے تھک کر گر گئے ہیں جی اور معافیاں مانگ رہے ہیں۔"

"انہیں پانچ پانچ چھتر لگاؤ اور ابھی آدھ گھنٹا اور مرغا بناؤ۔ انہیں بتانا کہ اگر اگلی دفعہ ایسا ہوا تو پھر رد جھاپور کے بازار میں چھترول ہوگی ان کی۔"

کارندہ سر ہلا کر باہر چلا گیا اور اس کے فوراً بعد باہر سے مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں۔

نادر بجگی اور اس کے رائفل بردار کارندے کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ جن لڑکوں کے ساتھ مار پیٹ ہو رہی ہے وہ موٹر مکینک ہیں۔ ان کا گناہ یہ تھا' انہوں نے نادر کے ایک کارندے کی موٹر سائیکل ٹھیک کرنے کے بعد اس سے پیسے مانگے تھے۔

نادر شاید ابھی ہم سے مزید پوچھ تاچھ کرتا لیکن اسی دوران میں ایک کارندے نے آ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر جانے سے پہلے فیض سے مخاطب ہو کر بولا "ٹھیک ہے جاؤ تم لوگ۔ ایک دن ٹھہر کر بیٹھک پر آنا' وہاں بات ہوگی۔"

فیض نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ نادر باہر جا کر جیپ میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا۔

O☆O

جس جگہ کو نادر نے بیٹھک کہا تھا' وہ بھی ایک طرح کا ڈیرا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ ڈیرا قصبے کے اندر تھا۔ مکانوں میں گھری ہوئی ایک پرانی حویلی سی تھی۔

منزلہ حویلی کو بیٹھک کا نام دیا گیا تھا۔ یہاں دو ٹیلی ویژن اور وی سی آر موجود تھے۔ تین چار کمروں میں فرش پر دریاں وغیرہ بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے کئی آوارہ گرد قسم کے نوجوان یہاں نظر آئے۔ ان کی حیثیت نادر کے پالتو غنڈوں کی سی تھی۔ وہ یہاں نادر کے کھاتے میں عیش کرتے تھے۔ تین وقت ٹھیک ٹھاک کھانا پکتا تھا' چرس' حشیش' شراب وغیرہ بھی دستیاب تھی۔ یہ لوگ یہاں تاش کھیلتے تھے اور گپیں ہانکتے تھے۔ بظاہر ان لوگوں کے ذمے کوئی کام نہیں تھا مگر ایسی بات بھی نہیں تھی۔ نادر اگر انہیں کھلا پلا رہا تھا تو کام بھی لیتا تھا۔ وہ قصبے کے اندر اور باہر مختلف لوگوں سے باقاعدہ جگا ٹیکس وصول کرتا تھا۔ اس ٹیکس کا نام حسب دستور چندہ رکھا گیا تھا۔ لوگوں کے جھگڑے مٹانا' ان میں جھگڑے ڈالنا۔ خالی جگہوں پر قبضہ کرنا' مقبوضہ جگہوں سے کرایہ اور بھتا وغیرہ وصول کرنا' یہ ساری اہم ذمے داریاں ان غنڈوں ہی کے ذریعے نبھائی جاتی تھیں۔ بیٹھک کا انچارج اشرف چیتا نامی شخص تھا۔ ایسا بھدا' سست رفتار اور بدحرام چیتا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں یہ بات تھی کہ وہ عیار بہت تھا۔ فیض سے پتا چلا کہ چیتے کی پولیس میں بھی کافی یاری دوستی ہے۔ اگلے ایک ہفتے میں ہم تین مرتبہ بیٹھک میں گئے۔ اس دوران میں صرف ایک بار نادر بیٹھک میں موجود تھا۔ بہرحال وہ ہم سے ملا نہیں۔ ہمارا رابطہ چیتا صاحب سے ہی رہتا تھا۔ جب ہماری تیسری پیشی بیٹھک میں ہوئی تو چیتے نے کسی پولیس افسر کی طرح فیض کو حاضری سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ہاں مجھے ہدایت ہوئی کہ میں آنا جانا جاری رکھوں۔ جب ہم چیتے سے یہ ہدایت وصول کرکے بیٹھک سے باہر نکل رہے تھے' اچانک نادر کی جیپ دندناتی ہوئی بیٹھک میں داخل ہوئی۔ ہم بھی نادر کو دیکھ کر رک گئے۔ وہ چیتے سے مخاطب ہو کر بولا "دوسری جیپ کدھر ہے؟"

چیتے نے ادب سے عرض کی "وہ پچھلی گلی میں کھڑی ہے۔"

"چلو آٹھ دس بندے لے لو' نور باغ جانا ہے۔ وہی چوہدری رشید کی کڑی کا معاملہ ہے' آج اس کی برات ہے۔"

چیتے نے اپنا سراثبات میں ہلایا اور فوراً کارندوں کو اکٹھا کرنے لگا۔ یہ دس بجے کا وقت تھا' اس بیٹھک کے مکینوں کے لیے یہ وقت "صبح کاذب" کا تھا۔ رات بھر خرمستی اور نشے بازی کے بعد بہت سے "ہشیر ہمہ" آرام فرما رہے تھے۔ ان کو جھنجوڑ مار کر بھی جگایا جاتا تو ایک گھنٹے سے پہلے ہوشیار باش نہ ہوتے۔ جو جاگ رہے تھے انہی سے کام چلانا تھا۔ اشرف چیتے نے جیپ منگوائی اور پالتو غنڈوں کو ان میں سوار کرنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے مجھے بھی جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولا "چلو آؤ تم بھی۔"

"لیکن میں نے..."

"چلو یار! جوان بندے ہو کیا عورتوں کی طرح میں میں کررہے ہو۔ اور ویسے بھی یہ نیکی کا کام ہے۔ ایک بدمعاش ایک لڑکی کی عزت برباد کرنے کے چکر میں ہے۔ اسی کا ہاتھ روکنا ہے۔"

"اوئے یہ میرا ساتھی فیض۔"

"او اس بڈھے کو چھوڑو۔ یہ دعا کرے گا ہمارے لیے۔" چیتے نے باقاعدہ مجھے دھکا دیتے ہوئے جیپ پر چڑھا دیا۔

جیپ بھی کیا تھی' آثار قدیمہ کا قابل رحم نمونہ۔ جب چھ سات سواریاں اس میں بیٹھ گئیں تو اور بھی قابل رحم ہو گئی۔ نادر کی جیپ کے پیچھے ہی پیچھے یہ جیپ بھی جھٹکے کھاتی ہوئی پھاٹک سے باہر نکل آئی۔ میں نے فیض کو اشارے سے کہا کہ وہ گھر واپس چلا جائے' میں آجاؤں گا۔

وہ تھوڑا پریشان تو تھا لیکن شاید دل کی گہرائی میں اسے تھوڑی سی خوشی بھی محسوس ہوئی ہو۔ میری غیر موجودگی میں وہ شاہدہ کے درد کا "مداوا" کرسکتا تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے دونوں "چوری چھپے" میری وجہ سے دور رہنے پر مجبور تھے۔ ہماری جیپ قصبے کی گلیوں سے گزری۔ نادر کے لیے ہر آنکھ میں خوف آمیز ادب ٹھہرا ہوا تھا۔ کئی لوگوں نے باقاعدہ جھک کر اسے سلام کیا۔ ہم قصبے کی نیم پختہ سڑک سے نکل کر جوہڑ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور بالکل کچے راستے پر مسلسل ہچکولے کھانے لگے۔ جو میرے ساتھ جیپ پر سوار تھے ان کے پاس دو دو دیسی ساخت کے دو ریوالور تھے۔ گولیاں بھی محدود تھیں۔ درحقیقت یہ بہت معمولی قسم کے غنڈے تھے۔ معمولی اسلحے کے ساتھ بہت گھٹیا قسم کی کارروائی کرتے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ جانا چاہتا تو ان میں سے کسی کے لال میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھے مجبور کرتا۔ سرغنہ سمیت یہ پوری بدمعاش پارٹی' محاورے کے مطابق میرے بائیں ہاتھ کی مار تھی۔ میں صرف وقت گزاری اور تفریح طبع کے لیے ان کے ساتھ ہولیا تھا۔

پچھلے چودہ پندرہ روز میں میری شیو کافی بڑھ گئی تھی۔ چھوٹی سی داڑھی کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ سر کے بال بھی ان دنوں کافی لمبے ہوگئے تھے۔ اس حلیے میں مجھے ...

ڈھائی تین سال پرانی تصویر سے یکسر مختلف نظر آرہا تھا' جو اخبار میں چھپی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تیز نظر شاہدہ کے سوا ابھی تک کسی کو مجھ پر شبہ تک نہیں گزرا تھا۔ تیز دھوپ میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا سفر کرکے ہم "نور باغ" نامی گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ اس دور دراز دیہاتی علاقے میں سڑک' بجلی' پانی نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ ہزاروں سال پرانے کنوئیں چل رہے تھے اور بیل گاڑیاں اور گھوڑے بھی ہزاروں سال ہی پرانے تھے۔

ایک گھڑ سوار دھول اڑاتا ہوا نادر کی جیپ کی طرف بڑھا۔ اس کے سر پر کلف لگی پگڑی تھی اور گھوڑے پر زین کی جگہ سوتی چادر تہہ کرکے رکھی گئی تھی۔ وہ شخص ہمیں اپنی رہنمائی میں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں ایک برات ایک ویران پر درختوں کے نیچے ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ برات کل مبلن نامی گاؤں میں اتری تھی اور اب دلہن کو لے کر واپس جارہی تھی۔ اس برات کو کسی مقامی بدمعاش کی طرف سے خطرہ تھا۔ اسی خطرے کے تدارک کے لیے نادر جنجی کو یہاں لایا گیا تھا۔ میں نے اب تک جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کے مطابق نادر جنجی "کرائے کا بدمعاش" تھا۔ ایسے لوگوں کو صرف پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ اگر مخالف پارٹی نادر کا کرایہ ادا کر دیتی تو آج یہ شخص برات کی حفاظت کی بجائے' دلہن کو اٹھانے کے لیے یہاں موجود ہوتا۔

"محافظ بدمعاش" پہنچ گیا تو برات نے لٹیرے بدمعاش کے خوف کو پس پشت ڈال کر اپنے سفر کا آغاز کردیا۔ ساری برات تانگوں پر سوار تھی' دلہا دلہن بھی تانگے پر تھے۔ وہ ایک سا ایک قدرے نئے تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ دلہن کم عمر لگتی تھی اور قد کاٹھ سے پنجاب کی جٹی نظر آتی تھی۔ دلہا اور دلہن کے درمیان غالباً دلہا کی کوئی عزیزہ ایسے بیٹھی تھی جیسے دو لڑنے والوں کے درمیان صلح صفائی کرانے والا حائل ہوجاتا ہے۔ برات کے ساتھ چند گھوڑے بھی تھے۔ دو گھڑسواروں کے پاس پرانے زمانے کی دو نالی رائفلیں تھیں۔

نصف گھنٹے کے بعد وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا' برات ابھی بمشکل دو تین میل آگے ہی گئی تھی کہ کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ دونوں جیپیں برات سے قریباً دو سو گز پیچھے تھیں۔ کچھ ایک قریبی قبرستان کے درختوں سے برآمد ہوئے' وہ گھوڑوں پر سوار تھے' انہوں نے برات کو گھیرا اور ہوائی فائرنگ شروع کردی۔ نادر اور اس کے ساتھی بھی "تا فانا" موقع پر پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو طرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔

برات میں چیخ پکار مچی ہوئی تھی' فائرنگ شروع ہوتے ہی بیشتر تانگے اندھا دھند ایک بغلی راستے پر بھاگ نکلے۔ حملہ آوروں نے قبرستان کے اندر پناہ لے لی تھی۔ نادر اور اس کے ساتھی اپنی جیپوں کے عقب میں تھے' کچھ ایک پرانے کنوئیں کی دیوار کے پیچھے پوزیشن لے کر فائر کررہے تھے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں چیتے کے ساتھ جیپ کے عقب میں تھا۔ چیتا دو نالی رائفل سے فائر کررہا تھا۔ اس نے میرے ذمے یہ کام لگایا کہ میں گولیوں والی بیلٹ میں سے گولیاں نکال نکال کر اسے دیتا جاؤں۔ اپنے لیے یہ ڈیوٹی مجھے بڑی پسند آئی۔ چیتا بار بار کرخت لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اپنا سر نیچے رکھوں ورنہ گولی میرے کھوپڑے میں سوراخ کردے گی۔ تین چار منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اس فائرنگ میں کوئی شخص ہلاک یا زخمی نہیں ہوا تھا۔

اچانک میری نگاہ کھیتوں کی طرف اٹھ گئی۔ چارے کے اونچے کھیت کے پار مجھے اسی تانگے کی جھلک نظر آئی جس پر دلہا دلہن سوار تھے۔ تانگا تیز رفتاری سے اس سمت میں اڑا جارہا تھا جس طرف سے ایک گھنٹا پہلے روانہ ہوا تھا۔ یہ مخدوش صورت حال تھی۔ میں نے انگلی کے اشارے سے چیتے کو تانگے کی جھلک دکھائی۔ چیتا مجھے لے کر جلدی سے چارے کے کھیت میں گھس گیا۔ تانگا اوپر سے چکر کاٹ کر آرہا تھا۔ ہم کھیت کے اندر تیزی سے سفر کرکے تانگے کے پہنچنے سے پہلے اس کے راستے میں کھڑے ہوسکتے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جب دلہا دلہن والا تانگا کچے' اچھلتا کودتا ایک موڑ پر پہنچا ہم وہاں پہلے سے موجود تھے۔ چیتے نے اپنی قمیض کے نیچے سے ایک دیسی ساخت کا پستول نکال کر مجھے دے دیا تھا۔ تاہم میں فی الحال اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

تانگا ہمارے سامنے پہنچا تو ہمیں اس پر صرف دلہن نظر آئی۔ اسے دو افراد نے بری طرح دبوچ رکھا تھا۔ تیسرا اگلے حصے میں کھڑا تھا اور چھانٹا لہرا لہرا کر گھوڑے کو تیز بھگا رہا تھا۔ چیتے نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور حملہ آوروں پر فائرنگ نہیں کی۔ ایسے میں دلہن بھی زد میں آسکتی تھی۔ اس نے بے دریغ گھوڑے کو نشانہ بنایا۔ اس نے دو گولیاں چلائیں جن میں سے ایک تازی مرد کو لگی۔ وہ لہرایا' لڑکھڑایا اور پھر زمیں بوس ہو کر تانگے سمیت لڑھکتا چلا گیا۔

ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ چیتے کی رائفل خالی ہوچکی تھی اس نے بھاگتے بھاگتے پستول میرے ہاتھ سے

واپس لے لیا۔ کوچبان تو گھوڑا گرنے کے ساتھ ہی کھیتوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ ایک شخص چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا تھا اور اس کی رائفل اچھل کر کوئی بیس گز دور جا گری تھی۔ تیسرے شخص کی ٹانگ میں چیتے نے گولی ماری اور اسے بھاگنے سے روک لیا۔

دلہن کی حالت پتلی تھی' اس کا لباس پھٹ گیا تھا اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ ہمیں بھی اپنا دشمن سمجھ رہی تھی اور بھاگنے کی فکر میں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا ورنہ شاید وہ بھاگ ہی جاتی۔ اس بے چاری کے جسم سے اتنی بے دردی کے ساتھ زیور نوچا گیا تھا کہ کان چر گئے تھے اور نتھ نکالنے سے ناک بھی زخمی ہو گئی تھی۔ اس کی گردن اور چہرے پر تشدد کے آثار تھے۔ یعنی اغوا کرنے والے اتنے بے صبر تھے کہ انہوں نے اسے راستے میں ہی نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا تھا' اگر وہ اسے اپنے ٹھکانے پر لے جاتے تو پتا نہیں کیا سلوک کرتے۔ گھوڑا مر چکا تھا اور بے ہوش شخص کی ٹانگیں اس کے نیچے دب کر رہ گئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا' یہی بے ہوش شخص اغوا کرنے والوں کا سرغنہ اور واردات کا بڑا مجرم تھا۔

○☆○

رات کو میں واپس فیض کے دوست کرم دین کے گھر پہنچ گیا۔ فیض بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساری کارگزاری سنائی۔ آخر میں وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ کو زیادہ گھومنا پھرنا نہیں چاہیے۔ نہ صرف پولیس آپ کی تلاش میں ہے بلکہ شیخ عاصم کے کارندے بھی شکاری کتوں کی طرح آپ کی تلاش میں ہوں گے۔ میلے والے واقعے کے بعد یقیناً ان کے سینے میں مزید آگ بھڑک اٹھی ہو گی۔ پٹواری منظور کے ڈیرے پر بندہ قتل ہونے کی خبر آس پاس کے سارے علاقے میں پھیلی ہے۔"

"اور شنکر کی ٹانگ ٹوٹنے کی خبر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ یہ بات بھی آج شریف محمد کے کھوہ پر ہو رہی تھی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ بات جب پر لگا کر اڑتی ہے تو پھر اور سے اور ہو جاتی ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ میلے میں دو گروہوں کے درمیان لڑائی ہوئی ہے اور کئی بندوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہیں۔"

صبح سویرے تگڑا دیہاتی ناشتا کرنے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور سوچنے بیٹھ گیا۔ لاہور میں عالم قریشی سے بات کیے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے۔ میں لاہور کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا' خاص طور سے صفدر اور زریں گل کا حال۔ اس کے علاوہ میں مسٹر جی کلارک صاحب کے بارے میں بھی جاننا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کریں گے' مگر ابھی تک ان کی کارکردگی سامنے نہیں آسکی تھی۔

نو دس بجے کے لگ بھگ میں عالم کو فون کرنے کے لیے کرم دین کے گھر سے نکلا۔ میں نے وہی رات والی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس کے ساتھ "نور باغ" میں بھاگ دوڑ کرتا رہا تھا۔ ایک دو جگہ کیچڑ لگا تھا جو وہیں لگ کر سوکھ گیا تھا۔ چپل کا ایک تسمہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ دھاری دار چادر کی بکل مارے میں آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یہ لنگڑاہٹ اس لڑائی کی نشانی تھی جو میلے میں شنکر کے ساتھ ہوئی تھی۔ دراصل لڑائی کے جوش میں تو اپنی زخمی ٹانگ کا مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا مگر بعد میں شاہدہ کے پھاہوں کے باوجود دو تین روز درد سے کراہتا رہا تھا۔ بہرحال اب کچھ آرام محسوس ہونے لگا تھا۔

میں کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر چلا جا رہا تھا تو اچانک عقب سے جیپ کی آواز آنے لگی۔ میری توقع کے عین مطابق یہ نادر جنگی ہی تھا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کہیں سے چلا آ رہا تھا۔ میں مؤدب انداز میں راستے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قریب آکر نادر نے جیپ روک لی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا' پھر بولا "آجاؤ گاڑی میں۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔"

نادر جنگی کا حکم نادر شاہی تھا۔ میں جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک نشست کے نیچے شراب کا کریٹ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی نادر کے دوسرے ٹھکانے یعنی ڈیرے پر پہنچ گئی۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا ڈیرا ایسی جگہ ہے جہاں نادر اور اس کے دوست کھل کر موج مستی کرتے ہیں۔ بیٹھک چونکہ قصبے کے اندر تھی اس لیے وہاں نادر کے چیلے چانٹے ذرا حد میں رہتے تھے۔ ڈیرے میں پہنچ گئے۔ نادر نے بڑی رعونت سے مجھے جیپ صاف کرنے کا حکم دیا۔ میں بھی پتا نہیں کس موڈ میں تھا بڑے شوق سے تیار ہو گیا۔

میں نے اپنی چادر اتاری اور اسی سے جیپ صاف کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس خستہ حال جیپ کے پہیے کھیتوں کے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے' اسے دھلائی کی ضرورت تھی۔ میں جیپ صاف کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ نادر کا ایک ساتھی آیا اور مجھے اندر لے گیا۔ یہاں نادر

دیہاتی ٹائپ کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسی دوران میں اشرف چیما اور اس کے دو ساتھی بھی آگئے۔ چیما مجھے دیکھ کر چہکنے لگا "اوئے پاجامے! تیرا اتنا ڈیل ڈول ہے لیکن تو ایک گولی نہ چلا سکا۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

میں نے کہا "پہلوان جی! آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ پہلے فیر میں ہی گھوڑے کو ڈھیر کر دیا۔"

"اور اگر فیر نہ لگتا تو پھر گھوڑا نکل جانا تھا نا میرے شہزادے۔ تجھے میں نے پستول بغل میں لے کر چیچی مارنے کو دیا تھا؟"

"اچھا چھوڑو مذاق مت اڑایا کرو۔ ہر بندہ اوپر والے نے کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہوتا ہے۔ یہ شکل صورت سے سمجھ دار ہی لگتا ہے' کسی نہ کسی کام ضرور آئے گا۔" نادر نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اچھا جاؤ تم۔ ادھر بڑے کمرے میں بھولے وغیرہ کے ساتھ بیٹھو۔ تھوڑا سا موج میلہ کر لو۔ شراب پی لیتے ہو نا؟"

"جب... بس... کبھی کبھی۔" میں نے کہا۔

نجانے کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہاں دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کالے کا پتا چلانے کے لیے ضروری تھا کہ نادر کی ہاں میں ہاں ملائی جائے' اور خود کو ویسا ہی ظاہر کیا جائے جیسا وہ مجھ کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے شراب کی بابت پوچھا تھا تو میں نے اثبات میں جواب دینا مناسب سمجھا۔ میں اٹھ کر درمیانی کمرے میں آگیا۔ یہاں نادر کے چھ سات چیلے چانٹے پہلے سے موجود تھے اور نمبردار کے فارم کی تلی ہوئی مچھلی کھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک لڑکی اندرونی کمرے سے نکل کر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شراب کی دو بوتلیں تھیں۔ ایک بوتل اس نے بڑی ادا سے بغل میں دبا رکھی تھی۔ یہ پانی کے رنگ کی دیسی شراب تھی۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ اس نے ریشمی لاچا کرتہ پہن رکھا تھا' دیکھنے میں نخریلی فلمی ہیروئن نظر آتی تھی۔ اس نے نیچے جھک کر بوتلیں دری پر رکھیں تو اس کے کشادہ گریبان میں بجلی سی لپک گئی۔

نادر کے چیلے اس سے بے ہودہ مذاق کرنے لگے۔ وہ بھی تھی۔ ہر ایک کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی رہی۔ ایک لڑکے نے ٹی وی آن کر دیا۔ نیچے وی سی آر چل رہا تھا۔ کوئی انڈین چربہ قسم کی چیز نظر آنے لگی۔ خوب رو ہیروئن اپنے جسم کو ربر کی طرح توڑ موڑ رہی تھیں اور کی ادائیں دکھا رہی تھیں۔ ایک مشہور انڈین ہیرو بھی اپنے بازوؤں کی مچھلیاں دکھا رہا تھا اور اسکرین پر اچھل کود رہا تھا۔ میں نے سوچا ان فلمی رقاصاؤں میں شاید کسی سائیں کی چیلی سروج بھی موجود ہو' اسی دوران میں گانا ختم ہو گیا اور بچوں کو بھی دو منٹ میں بالغ کر دینے والا ایک نہایت بھڑکیلا دو گانا شروع ہو گیا۔ نادر کے ساتھی وی سی آر دیکھنے کے ساتھ ساتھ بے ہودہ تبصرے بھی کر رہے تھے' شراب کا دور چل رہا تھا اور تلی ہوئی مچھلی کی مہک سارے کمرے میں تھی۔

یہ محفل تقریباً ایک گھنٹا جاری رہی۔ اتنے میں نادر کا ایک کارندہ آیا اور مجھے وہاں سے اٹھا کر نادر کے پاس لے گیا۔

نادر اس وقت بالکل اکیلا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا "تو ہمت والا بندہ لگتا ہے لیکن تیری حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا ہے۔ اگر دنیا سے دب کر رہے گا تو پھر یہ حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔ یہ دنیا بندے کے کپڑے تک اتار لیتی ہے۔ اس دنیا کا مقابلہ کرنے کے لیے طاقت ہونی چاہیے یا پیسہ ہونا چاہیے۔ اگر دونوں ہوں تو پھر کیا ہی بات ہے۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

وہ بولا "اگر اس ماں کے سالے فیض کے ساتھ لگا رہے گا تو کیا کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ نیم حکیم بن جائے گا اور سارا دن تمام رستہ لے کر دوائیاں کوٹے گا۔ بہت ہوا تو ہزار بارہ سو مہینے کا کما لے گا۔ ہزار بارہ سو سے کچھ نہیں ہوتا' نہ شادی ہوتی ہے' نہ چولہا جلتا ہے' نہ تن ڈھانکا جاتا ہے۔ دشمنیاں پالنا اور نبھانا تو بڑی دور کی بات ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔"

نادر نے اپنی باتوں کو مؤثر دیکھا تو ذرا جوش سے بولا "اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے پاس پیسہ ہو اور تو سر اٹھا کر جی سکے تو پھر اس کا گر میں تجھے بتا سکتا ہوں۔ بس اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو تجھے تھوڑی سی ہمت کرنی ہو گی۔ دوسرے جو بات بھی میرے اور تیرے درمیان ہو گی' اسے صرف اور صرف اپنے تک رکھنا ہو گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں جی۔ میں آپ کی دونوں شرطیں پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں کرنی۔ شرطیں پوری کرنی ہیں۔" نادر نے ہر ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

میں نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور کہا "جناب جن لوگوں نے مجھے بے بار کر کے رحیم یار خاں سے نکالا ہے' ان سے متھا لگانے کے لیے' میں اپنا تن من آپ کو پیش کرتا

ہوں' آپ اس سے جو کام لینا چاہیں لیں جی۔"

"کام بڑا معمولی ہوگا۔ تم حیران ہو جاؤ گے کہ اتنے معمولی کام کے اتنے سارے پیسے۔ بس ایسے کاموں کے لیے تھوڑی سی دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جی۔ کل پتا نہیں کیوں میں گولی نہیں چلا سکا۔ ورنہ میں خطرے سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔"

"تو تم تیار رہو۔"

"میں بالکل تیار ہوں جی۔ آپ حکم کریں۔"

"حکم ایک دو دن بعد کروں گا۔ ابھی تم یہاں ڈیرے پر رہو اور عیش کرو۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نادر نے بھولے کو آواز دی "اوئے بھولے! تیری بہن کا خصم مرے' ادھر آ میری بات سن۔"

بھولا نشے میں تھا' پھر بھی دو سیکنڈ کے اندر دروازے پر پہنچ گیا۔ نادر اس سے مخاطب ہو کر بولا "جا کرم دین امرودوں والے کے گھر جا' وہاں سے جہاں داد کا سامان لے آ۔ آج سے یہ یہیں ڈیرے پر رہے گا۔ اسے ذرا موج میلہ کراؤ اور فری کرو اپنے ساتھ۔"

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر نادر نے انگلی اٹھا کر مجھے خاموش کر دیا۔ میں بھولے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بھولے نے اس مرتبہ مجھے جس کمرے میں پہنچایا وہاں دری کی بجائے پلنگ بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف واٹر کولر رکھا تھا' دوسری طرف میز تھی' جس پر گولڈ لیف سگریٹ کی دو ڈبیاں' لائٹر اور شراب کی بوتل نظر آ رہی تھی۔ اس مرتبہ شراب دیسی نہیں ولایتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر پاکستانی اور انڈین ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں تھیں۔ یہ تصویریں اخباروں سے حاصل کی گئی تھیں اور آٹے یا گوند سے دیواروں پر چپکائی گئی تھیں۔ بھولے نے کہا "یارا! تم یہاں بیٹھ کر شوق کرو۔ میں ابھی تمہارا سامان لے کر آتا ہوں۔"

"چلو' میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں تم ادھر ہی رہو' ورنہ نادر صاحب ناراض ہوں گے۔ وہ ناراض ہو جائیں' تو سمجھو اوپر والا بھی ناراض ہو جاتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں نادر کو اور اس کے چمچے کو گالی دی۔ نادر ایک کم تر درجے کا بدمعاش تھا۔ اینٹ اٹھاؤ تو نیچے سے ایسے کئی بدمعاش نکل آتے ہیں۔

میں پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ میں کرم دین کے گھر سے لاہور فون کرنے کے لیے نکلا تھا مگر پہنچ گیا تھا یہاں نادر جگی کے ڈیرے پر۔ اب مجھے اس معاملے سے کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ نادر جگی پراسرار سا شخص تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ کئی کئی دن قصبے سے غائب رہتا تھا' اس کی غیر موجودگی میں اشرف چیما اس کا قائم مقام ہوتا تھا۔ نادر کے گرد آوارہ قسم کے بے روزگار نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ وہ ان سے چھوٹے موٹے کام لیتا تھا مگر لگتا تھا کہ ان چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ بھی وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ سوچتے سوچتے سوچوں کا رھارا لاہور کی طرف مڑ گیا۔ کئی دن گزر گئے تھے لیکن لاہور کے تھانے میں میں نے زریں گل کی جو کربناک چیخم دھاڑ سنی تھی وہ مجھے ابھی تک ہانٹ کر رہی تھی۔ میں نے طے کیا ہوا تھا کہ گوندل وغیرہ کو اس بارے میں ضرور کھینچوں گا۔ پروفیسر اور شائستہ کے ساتھ ہونے والا سلوک بھی ناقابل قبول تھا۔

میرے خیالوں کا تانا بانا ایک لڑکی کی آمد نے توڑا۔ یہ وہی تھی جس سے ذرا پہلے بڑے کمرے میں نادر کے چچوں نے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ گلابی لاچے کرتے میں وہ شعلہ جوالہ ہی نظر آتی تھی۔ پاؤں میں پازیبیں' کانوں میں جھمکے' ہونٹوں پر لالی' اس نے پنجابی فلموں کی ہیروئن نظر آنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اور وہ نظر آ بھی رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہیروئن کی نسبت اس کی شکل تھوڑی سی مانجھی تھی۔ وہ ایک تھالی میں میرے لیے گرم گرم پکوڑے لائی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔

وہ بڑی دلیری سے میرے ساتھ ہی پلنگ پر بیٹھ گئی "کہاں سے آیا ہے دلبر جانی؟"

اس نے فلمی انداز میں آنکھیں مٹکائیں اور "شو اسٹارٹ" مجھے دلبر جانی کا خطاب دے دیا۔

"رحیم یار خاں سے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے؟"

"ابھی تو تیرا انکار ہی کر رہا ہوں۔"

"تو بڑا شرارتی ہے دلبر جانی۔" اس نے میرے سینے پر پیار سے مکا مارا "میرا کہنے کا مطلب تھا کہ رحیم یار خاں کام کیا کرتا تھا' وہاں تیرا اور کون کون ہے۔ مطلب ہے ماں باپ' بیوی' معشوق وغیرہ۔"

میں نے اسے مختصر الفاظ میں وہی کچھ بتایا جو نادر کو بتایا تھا۔ رانو نامی یہ لڑکی بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ نادر نے اسے میرا ایکسرے لینے کے لیے بھیجا ہے۔ حالانکہ ایکسرے تو وہ خود بھی کر چکا تھا لیکن

اس کی پوری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ لڑکی بڑی باتونی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ میں بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کروں تاکہ اسے میرے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم ہو سکے۔

وہ مزید پکوڑے لانے کے لیے گئی تو میں نے شراب کی بوتل کی طرف دھیان دیا۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں دو پیگ تو اس میں سے استعمال ہو گئے تھے' باقی بوتل میز پر رکھی تھی اور لشکارے مار رہی تھی۔ میں نے الماری کے اندر سے پلاسٹک کا ایک بیگ تلاش کیا اور آدھی سے زیادہ بوتل اس میں انڈیل کر گرہ لگا دی۔ بیگ پھر سے الماری میں پہنچ گیا۔ باقی بوتل میں نے میز پر دھری تھی اور "مخمور" سا ہو کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔

اسی دوران میں دروازے پر آہٹ ہوئی' میں نے سمجھا کہ چھمک چھلو آ گئی ہے مگر وہ بھولا تھا۔ اس نے کہا "یارا! میں تیرے کپڑے شپڑے لے آیا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ وہ مسکرایا "شاباشے۔ صحیح جا رہے ہو۔"

"پر وہ میری سلونی کہاں گئی ہے' اسے کہو تمہارا اکمل تمہارے بغیر تڑپ رہا ہے۔"

"اوئے پاگل! اسے سلونی نہ کہنا وہ برا مان جائے گی۔"

"برا کیوں مان جائے گی' فلمی ایکٹرا تنے برے ہوتے ہیں تو پھر وہ ان جیسی شکل کیوں بناتی ہے۔"

"بات یہ نہیں ہے یارا۔ وہ اصل میں اپنے آپ کو بابرہ شریف سمجھتی ہے۔ تم اسے سلونی کہو گے تو اس کا دھیان اپنے گندمی رنگ کی طرف چلا جائے گا۔ بات سمجھا کرو نا۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا "اس کا اصلی جوبن دیکھنا ہے تو پھر سے ممتاز یا بابرہ شریف کہہ کر دیکھو۔ تم پر صدقے واری نہ جائے تو نام بدل دینا۔" بھولے نے آخری فقرہ ایک آنکھ میچ کر کہا تھا۔

وہ باہر چلا گیا اور چند سیکنڈ بعد ہی رانو تھالی میں گرم گرم پکوڑے لے کر آ گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رانو مجھ پر صدقے واری "جائے لہٰذا میں نے اسے رانو کہہ کر ہی رکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرا سر گھوم رہا ہے۔

وہ بولی "جانی! تم بھی گھوڑے کی طرح ایک ہی ڈیک میں ہی بوتل چڑھا گئے ہو نا' سر تو اب گھومے گا ہی۔"

ایک بار پھر میرا اندازہ لگانا معلوم کرنے کے لیے اس کی ادا حرکت میں آ گئی' کمراب فرق یہ تھا کہ زبان کے ساتھ تو اس کے ہاتھ بھی حرکت کر رہے تھے۔ وہ مجھے جذباتی طور پر بھڑکانا چاہ رہی تھی اور مجھ سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ آدھی بوتل میرے اندر ہے حالانکہ وہ موٹی بیگ میں تھی۔ مجھ سے کچھ اگلوانے کی جو کوشش وہ کر رہی تھی وہ بے حد بھونڈی تھی' اگر وہ اس سے ایک ہزار گنا اچھے انداز میں کوشش کرتی تو شاید پھر بھی مجھے متاثر نہ کر سکتی۔ بہرحال رانو پر اور رانو کے ذریعے نادر جگی پر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے میں رانو کے ساتھ تھوڑا بہت "تعاون" کر رہا تھا۔ میں نے تپی ہوئی بابرہ شریف کو بانہوں میں لے لیا اور اس کی کارروائیوں کا ہلکا پھلکا "ردعمل" پیش کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ سے "شدید ردعمل" کی توقع کرنے لگی لیکن اس صورت حال سے بچنے کا انتظام میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں نے اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے بہت زیادہ چڑھا لی ہے۔

"ارے گھوڑے! ہوش کر۔" اس نے مجھے بانہوں میں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کر' میں گھوڑا نہیں ہوں' میں تو تیرا غلام ہوں سبز پری۔ میں تیرے ساتھ اڑنا چاہتا ہوں' لیکن ذرا ٹھہر۔ میں ذرا اپنے گھر سے اپنے پر لے آؤں۔"

میں نے ڈگمگانے کی اداکاری کی اور پلنگ پر گر کر انٹا غفیل ہو گیا۔ رانو نے ایک دو بار مجھے ہلایا' پھر مایوسی سے بولی "چلا گیا اپنے گھر۔ ماں سے پر لینے کے لیے۔"

○☆○

اگلے تین چار دن میں نے وہیں ڈیرے پر گزارے۔ ان دنوں میں بھولے نے مجھے ریوالور پکڑنے اور چلانے کی تھوڑی سی "تربیت" بھی دی۔ چوتھے روز صبح سویرے نادر نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ آج ہی کہیں سے آیا تھا' پچھلے تین روز میں مجھے ڈیرے پر اس کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ آج بھی وہ کافی جلدی میں نظر آتا تھا۔ بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا "جہاں داد آج ایک کام کرنا ہے تم نے۔"

"میں نمک حلال ہوں جی۔ آپ کا نوکر ہوں۔ جو حکم کریں۔"

"آج دوپہر چیما تمہیں ایک تھیلا دے گا۔ تم نے یہ تھیلا ایک جگہ پہنچانا ہے۔ یہاں سے پانچ چھ میل دور سدھو پورہ گاؤں ہے۔ وہاں ایک اسکول کا افتتاح کرنے کے لیے کوئی افسر شفسر آ رہا ہے۔ اس نے کوئی چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنا ہے۔ تم نے یہ تھیلا جلسے کے وقت اس افسر کے کہیں آس پاس رکھنا ہے۔"

میں نے نادر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کوئی بم شم ہے جی؟"

"نہیں بم نہیں ہے۔ کوئی اور چیز ہے لیکن جو کچھ بھی ہے تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ بس تم نے تھیلا رکھ کر آجانا ہے۔ تمہارا کام ختم۔ پورے تین ہزار کی دیہاڑی لگے گی آج تمہاری۔ اوپر سے جانی واکر کی دو بوتلیں انعام کے طور پر۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "میں تیار ہوں جی۔"

نادر نے کچھ اور ضروری باتیں مجھے سمجھائیں اور ہزار روپے کا ایک کرارہ سا نوٹ حوصلہ افزائی کے طور پر پہلے ہی میری جیب میں ڈال دیا۔

دو بجے کے قریب اشرف چیتا مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس نے کہا "آج ایک چھوٹا کام تمہارے ذمے لگایا گیا ہے۔ اسے ٹھیک سے کرو گے تو کل بڑا کام بھی مل جائے گا۔ چھوٹے کام کے پیسے اتنے ہیں تو بڑے کام کے اور بھی زیادہ ہوں گے۔ نادر صاحب کے کہنے پر چلو گے تو بڑی جلدی نوٹوں کا ڈھیر لگا لو گے۔"

نادر نے مجھے کینوس کا ایک تھیلا دیا۔ اس کی شکل بڑے سفری بیگ جیسی تھی۔ بیگ کے اوپر خشت منجن کے الفاظ جلی حروف میں لکھے گئے تھے۔ اس قسم کے بیگ لے کر لوگ اکثر بسوں میں چڑھ آتے ہیں اور اپنی پراڈکٹ کے حوالے سے ایک دل پذیر تقریر کر کے مسافروں سے پیسے بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اشرف چیتا نے بیگ کی زپ کھولی' اس میں واقعی منجن کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور پیکٹ وغیرہ نظر آرہے تھے۔ یہ سب اشیا لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی کے اوپر ہی رکھی تھیں۔ اشرف چیتا نے تختی ہٹائی تو مجھے بری طرح چونکنا پڑا۔ سفری بیگ میں دو درجن کے قریب زہریلے سانپ تھے۔ یہ چھوٹے سائز کے سانپ ڈیڑھ دو فٹ تک لمبے تھے اور ان کے جسم پر بھوری سے نشانات تھے۔ پنجاب کے علاقوں میں ایسے سانپ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کو "کوڑی والے سانپ" بھی کہا جاتا ہے۔ نادر نے سانپ دکھا کر بیگ پھر سے بند کر دیا اور بولا "یہ دیکھو۔ یہ سائیڈ پر اس بیگ کی دوسری زپ ہے۔ تم نے بیگ رکھنے سے ذرا پہلے اس زپ کو کھول دینا ہے۔"

میں نے بڑی اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ بدھا پور کے ایک تانگے والے نے مجھے سرد پورہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر اتار دیا اور واپس چلا گیا۔ گاؤں میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ پولیس کی دو گاڑیاں بھی مجھے گاؤں کی طرف جاتی نظر آئیں۔ کچے راستے کی دونوں جانب چونے سے لائنیں لگائی گئی تھیں اور صفائی ستھرائی کا وہ سارا انتظام نظر آتا تھا جو ایسے موقعوں پر اہم ہوتا ہے۔ میں عام سی شلوار قمیض میں تھا' پاؤں میں چپل تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے ایک چادر میں نے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے ایک دو راہگیروں سے بات کی۔ معلوم ہوا کہ آج واقعی یہاں ایک ہائی اسکول کا افتتاح ہو رہا ہے۔ نادر نے بتایا تھا کہ کوئی افسر منسٹر یہاں آرہا ہے مگر پتا چلا کہ یہ "افسر" ایک وفاقی وزیر ہے اور وہ اپنے اس آبائی حلقے میں ایک پر ہجوم جلسے سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لا رہا ہے۔ نادر نے مجھے ہدایات دی تھیں اور جن کی تفصیل مجھے بعد میں اشرف چیتا نے بھی بتائی تھی وہ یہ تھیں کہ میں جلسے کے دوران میں اسٹیج کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کروں گا اور پھر بیگ رکھ کر غائب ہو جاؤں گا۔

ان ہدایات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو کارروائی مجھے سونپی گئی تھی' وہ وزیر صاحب یا ان کے کسی ساتھی کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں تھی۔ اس کا مقصد فقط جلسے کو ناکام کرنا اور لوگوں میں خوف و ہراس پھیلانا تھا۔ ممکن تھا کہ اس افراتفری میں بھگدڑ کے سبب یا سانپ کاٹنے سے کچھ لوگوں کو جانی نقصان بھی پہنچ جاتا۔ میں نے سرد پورہ کے ایک دو افراد سے جو گفتگو کی تھی اس سے اندازہ ہوا تھا کہ اس علاقے میں زبردست کشیدگی پائی جاتی ہے۔ آنے والے الیکشن کے پیش نظر دو پارٹیاں یہاں اپنی اپنی سیاسی اجا داری کے لیے زبردست کوششیں کر رہی ہیں۔ اس صورت حال کی روشنی میں ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جو کارروائی میں کرنے جا رہا تھا اس سے دونوں متحارب پارٹیوں میں کشیدگی اتنی بڑھ جاتی کہ ان میں تصاد ہو جاتا۔ اس قسم کی صورت حال چاہے مقامی سطح پر ہی کیوں نہ ہو ملک دشمنوں کے لیے بڑی سود مند ہوا کرتی ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ناخوشگوار واقعات مل کر ہی ایک بڑے ا کا سبب بن جاتے ہیں۔

جلسہ شروع ہونے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ میں بیگ کندھے سے لٹکائے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ گنے کا ایک کھیت میرے کام کے لیے مناسب تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھ کر اس میں داخل ہو گیا۔ شیشے کا ایک گلاس میں نے بدھا پور قصبے سے ہی حاصل کر لیا تھا۔ یہ گلاس اس وقت میرے لیے بڑا اہم تھا' اس کے علاوہ ربڑ کا بنا ہوا ایک دستانہ تھا' یہ دستانہ بھی مجھے قصبے کی ایک دکان سے مل گیا۔ سانپ اتنا خطرناک جانور نہیں جتنا اسے سمجھا جاتا ہے' بے شک زہریلا ہی کیوں نہ ہو۔ جو لوگ سانپ کے مزاج اور عادات

سے واقف ہوتے ہیں' ان کے لیے سانپ پر قابو پانا چنداں دشوار نہیں ہوتا۔ میں اس سلسلے میں ماہر تو نہیں تھا لیکن تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سانپ کے حوالے سے میرے ذہن میں کوئی بے جا خوف نہیں تھا' اور اگر تھوڑا بہت تھا بھی تو اب دور ہو چکا تھا۔ کیونکہ میں ماریطانیہ میں بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ سانپوں کی پراسرار کارروائی کے بعد سے زہر میرے جسم پر اثر نہیں کرتا ہے۔

میں نے ہاتھ پر دستانہ چڑھایا اور تھوڑی سی زپ کھول کر ایک سانپ کو باہر نکال لیا۔ میں نے ڈیڑھ فٹ لمبے زہریلے سانپ کو سر کے قریب سے دبوچ لیا۔ سانپ کا نچلا دھڑ حرکت کر رہا تھا لیکن اس کا سر گرفت میں ہونے کے سبب بالکل بے حرکت تھا۔ میں نے ہاتھ کا دباؤ تھوڑا سا بڑھایا تو سانپ کا منہ کھل گیا۔ اس کے دو چھوٹے لیکن نہایت مہلک دانت نظر آنے لگے۔ میں نے گلاس کا کنارہ اس کے کھلے منہ میں ڈال دیا۔ سانپ کے دانت گلاس کی اندرونی سطح سے بچے ہوئے۔ میں نے خاص انداز سے دباؤ ڈالا۔ سانپ کا پیلا سا زہر دو دھاروں کی صورت میں رِستا ہوا گلاس کے پیندے تک پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ کے اندر یہ جان لیوا کیڑا بے ضرر ہو چکا تھا۔ میں نے سانپ کو واپس بیگ میں ڈال دیا۔

اگلے چند منٹ کے اندر میں نے یہ عمل بار بار دہرایا' تمام ایسے سانپ جن کے منہ کی تھیلیوں میں زہر موجود تھا' زہر سے خالی ہو چکے تھے۔ گلاس کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ زہر سے بھر گیا تھا۔ زرد رنگ کا یہ چمکیلا سیال درجنوں افراد کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ میں نے زہر ضائع کر دیا اور سانپوں والے بیگ سمیت واپس سرد پورہ کی طرف چل دیا۔

یہ ساری محنت میں نے اس لیے کی تھی کہ میں فی الوقت طور جگی نام کے اس بدمعاش کا اعتماد اپنے اوپر قائم رکھنا چاہتا تھا' دوسری طرف میں یہ بھی چاہتا تھا کہ میرے سانپ چھوڑنے والے عمل سے کسی طرح کا جانی نقصان نہ ہو۔ اس درمیانی حل میں نے یہ نکالا تھا کہ سانپوں کا زہر نکال دیا جا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ زہر پھر سے کتنی دیر بعد ا شروع ہوتا ہے مگر اتنا اندازہ تو تھا کہ ایک دو گھنٹوں میں یہ ن لیوا سیال سانپ کے اندر تیار نہیں ہوتا۔

سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ بدلیوں کی اوٹ سے سورج ی کبھی اپنی جھلک دکھاتا تھا اور "سردی" کو تھوڑی سی یں دکھا کر واپس چلا جاتا تھا۔ جہاں اسکول کا افتتاح ہونا ہاں اب ایک بڑا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک بڑی سیاسی پارٹی کے بے شمار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نعروں سے سرد پورہ کے در و دیوار گونجتے محسوس ہوتے تھے۔ وزیر صاحب اب بس تشریف لانے ہی والے تھے۔

اسکول کے دروازے پر فیتہ کاٹنے کے بعد انہیں اسکول کا مختصر معائنہ کرنا تھا اور پھر جلسہ گاہ میں آکر خطاب فرمانا تھا۔ ان کے لیے جو اسٹیج تیار کیا گیا تھا' وہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر خاصی اونچائی پر تھا۔ میں ہجوم کے درمیان کھسکتا ہوا آگے چلا گیا۔ اسٹیج سے کچھ ہی فاصلے پر میں سفری بیگ سمیت ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے یہاں پانچ دس منٹ انتظار کرنا پڑا اور انواع و اقسام کے سیاسی نعرے سننے پڑے۔ آخر وزیر موصوف تشریف لے آئے۔ وزیروں مشیروں کے قبیلے کے عمومی حلیے کے عین مطابق وزیر صاحب کی توند شیروانی میں سے پھٹی پڑ رہی تھی مگر گردن اتنی موٹی تھی کہ مشکل سے ہی گھوم سکتی تھی۔ دس منٹ کے اندر اپنی دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر وزیر صاحب اسٹیج پر تشریف لے آئے "میرے بھائیو! بہنو اور بزرگو!" وزیر صاحب نے فرمایا' میں جانتا تھا اس کے بعد وہ ایک گھنٹا مسلسل جھوٹ بولیں گے۔

لوگوں کو ان کے جھوٹ سے نجات دلانے کے لیے میں نے نیچے جھک کر بیگ کی زپ کھولی اور اسے ایک ٹریکٹر کے نیچے کھسکا دیا۔ اس کے فوراً بعد میں وہاں سے نکل آیا۔ جلسہ گاہ کے پاس ہی سے میں نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے سے لفٹ حاصل کر لی۔ جس وقت ٹریکٹر ٹرالی جلسہ گاہ سے قریباً ایک کلومیٹر دور آچکی تھی مجھے چند فائر سنائی دیے۔ یہ ہوائی فائرنگ بھی ہو سکتی تھی مگر گمان غالب یہی تھا کہ یہ جلسے میں پھیلنے والی بدامنی کی جھلک ہے۔

میں لاہور فون کرنے کے لیے بے قرار تھا' یہ میرے لیے اچھا موقع تھا کہ واپس ڈیرے پر جانے سے پہلے میں عالم قریشی کو ایک فون کر لوں۔ یہ وہی راستہ تھا جو لدھوکے کے قریب سے گزرتا تھا' اس سے پہلے بھی میں نے تین مرتبہ اسی قصبے سے فون کیا تھا۔ میں آگے جا کر ٹریکٹر ٹرالی سے اتر گیا اور پیدل ہی لدھوکے کی طرف روانہ ہو گیا۔

عالم قریشی سے رابطہ کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی میرا فون آئے گا' دوپہر بارہ بجے اور چار بجے کے درمیان آئے گا۔ عالم قریشی ان اوقات میں فون کے آس پاس ہی رہتا تھا "ہیلو شاہ جہاں! کیسے ہو؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"کل سے کچھ اچھا ہوں۔"

"اللہ کرے تم ہر بار یہی کہو کہ کل سے کچھ اچھا ہوں

اور اسی طرح کہتے کہتے بہت اچھے ہو جاؤ۔ باقی فی الحال یہاں تو حالات اتنے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ حمزہ بدستور پولیس کی تحویل میں ہے۔ اس کے لیے میں نے اپنے طور پر بہت بھاگ دوڑ کی ہے' امید ہے کہ پرسوں تک اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ شیخ عاصم اینڈ کمپنی پولیس کے اعلیٰ حکام کی مدد سے تمہاری تلاش بھی سرگرمی سے کر رہی ہے۔ ایک بڑے خاص بندے نے مجھے بتایا ہے کہ۔۔۔"

ایک دم عالم قریشی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید کوئی نیا خیال اس کے ذہن میں آگیا تھا۔ چند لمحے سوچ کر بولا "کہیں شنکر شنکرا کے ساتھ تو تمہارا ٹاکرا نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "پہلے تم بات مکمل کرو کہ بڑے خاص بندے نے تمہیں کیا بتایا ہے۔"

وہ حسب عادت بولا "پہلے تم بتاؤ' ورنہ بات میرے ذہن سے نکل جائے گی۔"

"ہاں ہوا تھا ٹاکرا۔"

"لڑائی بھی ہوئی تھی؟"

"بے شک ہوئی تھی۔"

"بس بات صاف ہو گئی نا۔ ایک خاص بندے نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ شنکر شنکرا لاہور میں کسی جگہ زیر علاج ہے' اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے' اس کے علاوہ بھی چوٹیں آئی ہیں جو کسی جھگڑے کا نتیجہ ہیں۔ میرا ذہن فوراً تمہاری طرف چلا گیا تھا۔ تمہارے سوا اس سے پنجہ لڑانے کی ہمت اور کون کر سکتا ہے۔" ایک لمحہ توقف کرکے عالم قریشی نے کہا "اس حرامی نے پروفیسر اللہ دتا اور ان کی بیٹی پر جو بہیمانہ تشدد کیا ہے اس نے دل چیر کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب جس وقت بھی شنکر سے تمہارا سامنا ہوگا تم پروفیسر اور اس کی بیٹی کا حساب چکانے کی کوشش ضرور کرو گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"میرے باگڑ بلے! تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔"

"او دل خوش کر دتا ای چن ماہیا! اگر اس وقت تم یہاں لاہور میں ہوتے تو قسم پیدا کرنے والے کی تمہیں سیدھا نرالے کی دکان پر لے جاتا اور کم از کم ایک سیر رس گلے تو ضرور تمہارے منہ میں ٹھونستا۔ اس واقعے کی ساری تفصیل تم سے سننے کو بہت دل چاہ رہا ہے لیکن فون پر یہ سب کچھ مناسب نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائید کی "فی الوقت تم سے زریں اور صفدر کا حال پوچھنے کے لیے فون کیا تھا اور اس کے علاوہ مسٹر کلارک کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں' ان کا کچھ پتا چلا یا نہیں؟"

عالم قریشی بولا "صفدر بدستور اسپتال میں ہے۔ اس کی آنکھوں کے زخموں میں انفیکشن ہو گئی تھی۔ مناسب علاج کی وجہ سے اب وہ بہتر ہے۔ زریں جوڈیشل ریمانڈ پر کوٹ لکھپت جیل میں ہے۔ میں آج ہی اس کی بیوی کلثوم کی ملاقات اس سے کرا کے لایا ہوں۔ دونوں خوش خوش باتیں کرتے رہے ہیں۔ اتنی پشتو ماری ہے دونوں نے کہ ابھی تک میرے کان شاں شاں کر رہے ہیں۔ ویسے زریں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے تمہارے فون کا بتا دوں لیکن پھر سوچا کہ کہیں وہ کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ بہرحال اتنا پتا تو اسے چل ہی چکا ہے کہ تم کسی طرح پولیس کی حراست سے نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہو۔"

"مسٹر کلارک صاحب کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر عالم قریشی نے ذرا الجھے ہوئے لہجے میں کہا "شاہ جہاں! میں جانتا ہوں مسٹر کلارک پر تمہیں بہت اعتماد ہے۔ لہٰذا میں کوئی ایسی بات کہنا نہیں چاہتا جو تمہیں اچھی نہ لگے لیکن۔۔۔ کسی وقت الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ عرصہ ہو چکا ہے کہ تم نوادرات اور دیگر اشیاء مسٹر کلارک کو دے چکے ہو۔ جو اطلاعات اب تک ملی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کافی دیر پہلے ان نوادرات کو فروخت کر چکے ہیں پھر کیا بات ہے کہ ابھی تک کوئی "مالی فائدہ" تم تک نہیں پہنچا۔ تمہارے باقی دونوں جیسے یار یعنی صفدر اور زریں تمہاری وجہ سے خاموش ہیں اور مجھے پتا ہے کہ وہ ہمیشہ خاموش ہی رہیں گے' لیکن یار! ذرا سوچو ان کے ذہن میں بھی یہ بات آتی تو ہوگی۔"

"کیا بات؟"

"یہی کہ مسٹر کلارک تم سب سے دور دور کیوں ہیں۔ صفدر نے بتایا ہے کہ تنزانیہ میں مسٹر کلارک سے تمہاری ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ جس دن مسٹر کلارک نے تم سے ملنے پہنچنا تھا اسی روز تم ایک چکر میں پھنس گئے اور پھر ماریطانیہ جا پہنچے۔ چلو یہ اب سیٹ تو ہو گیا مگر اس کے بعد بھی تو تم کئی ماہ ماریطانیہ میں رہے ہو پھر تمہاری ملاقات مسٹر کلارک سے کیوں نہ ہو سکی' جبکہ وہ تمہارے آس پاس بھی موجود تھے۔"

میں نے کہا "عالم' ان باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہاں حالات ایسے ہرگز نہیں تھے کہ مسٹر کلارک ہم سے ملاقات کرتے۔ وہ اپنے وسیع و عریض بزنس کی وجہ سے کنگ براؤن کے ساتھ براہ راست ٹکر نہیں لے

سکتے تھے۔ کنگ کو نیچا دکھانے کے لیے ماریطانیہ میں انہوں نے جو کچھ کیا پس منظر میں رہ کر کیا۔"

"لیکن یار! جب کنگ کا دھڑن تختہ ہو گیا تو اس کے بعد تو مسٹر کلارک سے تمہاری ملاقاتیں ہوئی ہیں' بلکہ مسٹر کلارک تمہارے ساتھ ہی ماریطانیہ سے پاکستان کے لیے روانہ بھی ہوئے تھے۔ ان ملاقاتوں کے دوران میں کم از کم ایک بار تو انہیں تمہارے ساتھ دفینے کے بارے میں بات کرنی چاہیے تھی۔"

"بس تم اسے ایک اتفاق ہی کہہ سکتے ہو۔ وہ ملاقاتیں بڑی مختصر تھیں اور سنگین قسم کے حالات میں ہوئی تھیں پھر بھی ایک مرتبہ مسٹر کلارک نے یہ موضوع چھیڑا تھا لیکن اسی دوران میں ایک شخص زخمی صفدر کے بارے میں اطلاع لے کر آگیا اور ہماری بات ادھوری رہ گئی۔"

"پھر بھی شاہ جہاں' میں نے۔۔۔"

"دیکھو عالم میں نے اس کی بات کاٹی "جس طرح میں تم پر اعتماد کرتا ہوں اسی طرح مسٹر کلارک پر بھی کرتا ہوں۔ جس طرح کسی اور سے تمہارے بارے میں غلط سلط بات نہیں سن سکتا۔ اسی طرح شاید مسٹر کلارک کے بارے میں بھی نہیں سن سکتا۔"

"اچھا خیر چھوڑو یہ بات۔" عالم نے تیزی سے کہا "تم نے مسٹر کلارک کے بارے میں پوچھا فی الوقت تو یہی لگتا ہے کہ وہ پاکستان میں نہیں۔ آخری مرتبہ چند روز پہلے انہیں اسلام آباد میں دیکھا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تمہاری رہائی کے لیے در پردہ کوئی کوشش کی ہو لیکن ایسی کسی کوشش کا نتیجہ ابھی تک تو نظر نہیں آیا۔"

"ساقی صاحب کیا کر رہے ہیں؟"

"انہوں نے بہت ٹینشن لی ہے۔ ان کی شوگر بہت ہائی ہو گئی تھی۔ اب قدرے بہتر ہیں۔ ان سے جو کچھ بن پڑ رہا ہے کر رہے ہیں۔ صفدر اور زریں کے لیے ایک بڑے اچھے وکیل کا انتظام انہوں نے کیا ہے۔ وہ بڑا گز مین ہے' تم ملو گے تو تمہیں مزہ آئے گا۔"

عالم قریشی سے میں نے چند منٹ مزید گفتگو کی۔ وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ گوجرانوالہ کے خستہ اور لذیذ چڑوں کے بارے میں' کرکٹ سیزن کے بارے میں' گوالمنڈی میں ہونے والی ایک بڑی لڑائی کے بارے میں' نئی فلموں کے بارے میں اور پتا نہیں کس کس بارے میں۔ وہ پکا لاہوریا تھا اور لاہور کے حوالے سے اس کا پیٹ چٹ پٹی باتوں سے حلق تک بھرا ہوا تھا۔ مجھے جلدی تھی میں نے اس سے جان چھڑائی اور فون بند کرکے نادر جگی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

سارے راستے میں عالم قریشی کی وہ باتیں ذہن میں چکراتی رہیں جو اس نے مسٹر جی کلارک کے حوالے سے کی تھیں' مجھے یقین تھا کہ عالم کی ان باتوں میں کوئی وزن نہیں ہے۔

شام تک میں نادر کے ڈیرے پر واپس پہنچ گیا۔ نادر نے دیکھنے کے ساتھ ہی مجھے شاباش دی اور پیٹھ ٹھپکی۔ اس نے کہا "تمہاری کارروائی کامیاب رہی ہے اور جلسہ ناکام ہوا ہے۔ ایک بار پھر شاباش۔"

اس نے اشرف چیتا کو اشارہ کیا۔ چیتے نے فوراً ہزار ہزار کے دو نئے نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ نادر بولا "چلو آؤ اب آرام کرو۔"

آرام سے نادر کی مراد شاید بے آرامی تھی' کیونکہ میں جونہی اپنے کمرے میں داخل ہوا' چھمک چھلو یعنی رانو پھر آکر میرے سر پر سوار ہو گئی۔ وہ آج اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر بھی لائی تھی۔ اس ٹیپ ریکارڈر پر وہ نور جہاں کا کوئی شوخ سا گانا لگا کر کمرے کے اندر ہی رقص فرمانا چاہتی تھی۔ میں نے سر درد کا بہانا کرکے اسے بمشکل اس حرکت سے باز رکھا لیکن اسے بھی قریب رہنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ وہ فوراً سرسوں کا تیل لے کر آگئی اور میرے سر پر مالش کرنے پر زور دینے لگی کیونکہ اس کی تشخیص کے مطابق میرے سر میں درد کی وجہ گرمی خشکی تھی۔ میں نے اسے بمشکل اس حرکت سے بھی روکا۔

اسی دوران میں بھولا بھی آگیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے اور رانو کے حوالے سے کوئی بے ہودہ فقرہ کہتا میں نے کہا "بھولے! نادر صاحب نے مجھے شاباش تو دے دی ہے لیکن بتایا کچھ نہیں کہ جلسے میں کیا ہوا ہے؟"

وہ بولا "جلسے میں تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے لیکن آج یہاں کیا ہوگا' کیونکہ یہ بابرہ شریف مجھے بڑی بھڑکی ہوئی لگتی ہے۔"

میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا "یار! بیکار کی باتیں چھوڑ۔ مجھے یہ بتا کہ کوئی بندہ شندہ تو نہیں مر گیا جلسے میں؟"

"اوئے پیارے! ہمارے ساتھ رہے گا تو انشاء اللہ بندے شندے بھی مریں گے تیرے ہاتھوں سے' ویسے فی الحال تو کوئی نہیں مرا۔ بھگدڑ کی وجہ سے دو چار زخمی ضرور ہوئے ہیں۔ بہرحال ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ وزیر صاحب کا جلسہ نہیں ہو سکا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔"

"اچھا کل کا کیا پروگرام ہے تمہارا؟" رانو نے بڑی ادا سے ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر پوچھا۔

"کل تمہارا ہی پروگرام ہے سوہنیو! جائیں گے باگی پنڈ اور طبیعت صاف کریں گے اس مولوی کی۔" بھولے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہارے منہ سے اچھی خبر سننے کا انتظار کروں گی۔"

بھولے نے رانو کو گندے انداز میں آنکھ ماری اور گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی رانو نے میرے سر پر تیل انڈیل دیا تھا اور اپنی نرم انگلیوں سے مالش کر رہی تھی۔ اس کی چوڑیاں میرے کانوں میں چھن چھن کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "یہ بھولا اور تم کس مولوی کی بات کر رہے تھے؟"

وہ بولی "ہے ایک خبیث بھلا پا۔ شکل مومناں کرتوت کافراں۔ زبردستی باگی پنڈ کی مسجد پر قبضہ کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ تعویذ گنڈا بھی کرتا ہے۔ اوپر سے جتنا گورا ہے اندر سے اتنا ہی کالا ہے۔ چار چھ ہفتے پہلے کی بات ہے۔ ایک عورت اپنی سولہ سترہ سالہ لڑکی کو پھونک موانے اس کے پاس لائی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ مولوی برکت کی نیت ایک دم لڑکی پر خراب ہو گئی۔ اس نے لڑکی کی ماں کو گھر بھیج دیا اور کہا کہ وہ لڑکی کا کوئی اور لباس لے کر آئے تاکہ وہ اس پر دم وغیرہ کر سکے' ماں چلی گئی تو برکت نے لڑکی کو ڈرایا کہ اس پر کسی نے کالا علم کر دیا ہے اور اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اس نے لڑکی کو بتایا کہ اس کے کپڑوں پر بھی کالے جادو کا اثر ہے اور وہ جتنی جلدی ان کپڑوں کو اتار پھینکے اس کے لیے بہتر ہے۔ اس نے لڑکی کو ایک چادر دی جو اس نے لباس اتارنے کے بعد اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ پتا نہیں وہ بدبخت اس سے آگے اور کہاں تک جاتا' اتفاق سے' لڑکی کی ماں جلدی واپس آگئی اور مولوی برکت کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ بعد میں لڑکی نے روتے ہوئے ماں کو بتایا کہ مولوی برکت اس سے کس طرح کی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس واقعے کا شور سارے گاؤں میں ہو گیا' لیکن کچھ بندے خواہ مخواہ مولوی برکت کی سائیڈ لینے لگ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ مولوی برکت پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔ لڑکی کی ماں جھوٹ نہیں بول سکتی' میں اسے بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ایک شریف عورت ہے اور یہ بات میں نہیں کہتی ہوں پورا باگی پنڈ کہتا ہے۔ ایڑھ مہینے پہلے اس جھگڑے کا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ مولوی برکت ایک مہینے بعد خود ہی گاؤں چھوڑ دے گا۔ مولوی برکت نے بھی یہ بات مانی تھی۔ مگر اب اس کی نیت مخالف پارٹی کی ہلاشیری کی وجہ سے پھر خراب ہے۔ لڑکی کی ماں نے میری منت کی کہ برکت ابھی تک ڈٹا ہوا ہے۔ میں نادر صاحب سے کہہ کر گاؤں سے اس کی چھٹی کراؤں۔ میں بے شک بری عورت ہوں جہاں داو لیکن میرا دل برا نہیں ہے۔ میری خواہش تھی کہ مولوی برکت کو اس کے کیے کی سزا ملے۔ مہربانی ہے نادر صاحب کی کہ انہوں نے میری بات کا بھرم رکھا ہے۔"

وہ باتیں کر رہی تھی اور مجھ سے قریب تر ہو رہی تھی۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو وہ کچھ اور بھی۔ کہنے لگی "آج میں اس دن والی غلطی نہیں کروں گی۔ بوتل نہیں ملے گی آج تمہیں۔ تمہارے حصے کی بوتل آج میں نے بھولے اور ٹیڈی کو دے دی تھی۔"

ایک دم میرے ذہن میں نئی بات آئی۔ رانو سے جان چھڑانے کا طریقہ سمجھ میں آگیا تھا۔ میں نے کہا "تیرا ستیا ناس ہو' یہ کیا ظلم کیا ہے تم نے۔ لال پری کے بغیر تو میں کسی کام کا نہیں ہوں' تم تو بابرہ شریف کی نقل ہو اصلی بابرہ شریف بھی آجائے تو میرے کان پر جوں تک نہ رینگے' اسی طرح ٹھنڈا ٹھار پڑا رہوں۔ اب جاکہیں سے تھوڑی سی لے کر آمیرے لیے۔"

میں جانتا تھا کہ آج ڈیرے پر ولایتی شراب کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تھوڑی دیر تو مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر بولی "دیسی لے آؤں؟"

"تیرا بیڑا تر ہے۔ مجھے کتے مار پلا کر جوانی میں ہی قبر میں پہنچانا چاہتی ہو۔ قبر میں سونے سے اچھا ہے کہ میں آج اکیلا ہی سو رہوں۔"

وہ سٹپٹا کر رہ گئی پھر میری ہٹ دھرمی دیکھ کر پاؤں پٹختی باہر چلی گئی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پندرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جو کہ مارچ 2003 میں شائع ہوگا

شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل

اس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنادیا تھا۔ وہ پیدا ہوا تو اس کا نام شاہ جہان رکھا گیا۔ مگر دنیا نے اسے جہانگیر کہا۔ استاد جی کے نام سے جانا ... دنیا ... آکڑ ہوئی گردنیں اس کے روبرو خم ہوتی چلی گئیں۔ ہمیشہ بڑے بڑے نام اس کے سامنے بجھ گئے۔ قانون کے محافظوں نے ... قانون ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اس نے خود کو پنجاب پولیس کے حوالے کردیا۔ لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں ... استاد سے گزرنے والے حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ قسمت حساس مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی ہر ... داستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادل ناخواستہ اسی سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے سنگ پرپیچ اور انوکھے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک ہنگامہ خیز سرگزشت

اگلے روز اشرف چیتے نے چھ سات پالتو غنڈے ساتھ لیے اور مجھے بھی اپنے ساتھ جیپ میں بٹھالیا۔ منزل کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم باکی پنڈ جارہے تھے کسی مولوی برکت نام کے بندے کی "بے عزتی" خراب کرنے کے لیے۔ پروگرام یہ تھا کہ حجرے میں سے مولوی برکت کا سارا سامان نکال کر باہر سڑک پر پھینک دیا جائے گا۔ اس کے بعد حجرے کو تالا لگایا جائے گا۔ مولوی برکت اگر مزاحمت کرے تو اسے دھکے دے کر گاؤں سے نکال باہر کیا جائے گا۔

ہم سب جیپ پر سوار تھے۔ اشرف چیتے کے پاس رائفل تھی جبکہ دو بندوں کے پاس دیسی ساخت کے ریوالور تھے۔ باقی سب افراد صرف "جعلی تکس" کے لیے تھے۔ راستے میں بات چیت بھی ہوتی رہی۔ بھولے نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا "یہ کتیا جھوٹ بولتی ہے۔ میرے خیال میں مولوی برکت ویسا بندہ نہیں جیسا یہ بتا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرے اندازے کے مطابق یہ ایک دوسرا ہی رولا ہے۔ رانو شریف لڑکی نہیں ہے اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ اس سے پہلے یہ باکی پنڈ میں رہتی تھی اور وہاں بھی اس کے طور طریقے وہی تھے جو یہاں ڈیرے پر ہیں۔ مولوی برکت اور بستی کے چند اور شریف لوگوں کو رانو کے رہن سہن پر سخت اعتراض تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ رانو باکی پنڈ سے چلی جائے۔ مولوی برکت اس معاملے میں سب سے آگے تھا۔ مولوی صاحب سے اسی بات کا بدلہ لینے کے لیے رانو نے یہ ساری الزام تراشی کرائی ہے۔"

میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی رانو کے بیان پر شک تھا۔ وہ جس قماش کی لڑکی تھی اس سے ہر طرح کی توقع کی جاسکتی تھی۔

کچے راستے اور کئی پھٹی جیپ پر سفر کرتے ہم قریباً ایک گھنٹے میں پندرہ بیس کلومیٹر ہی طے کرسکے۔ راستے میں اس کے سوا کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا کہ ایک مقامی شخص نے ہمیں روکا اور اپنی خراب گاڑی ٹھیک کرنے کے لیے ہم سے "پلگ پانا" مانگا۔ اس کے اس طرح روکنے پر اشرف چیتا ایک دم بھڑک اٹھا اور بڑی بد اخلاقی سے اس شخص کو گالیاں دینے لگا۔ پلگ پانے کا نام لے لے کر اس نے مذکورہ شخص کے لیے ماں بہن کی ایسی گالیاں ایجاد کیں کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کی جان چھڑوائی۔ بعد میں پتا چلا کہ ایسے ہی ایک دم بھڑک اٹھنا چیتے کی عادت ہے۔ ہم لوگ قریباً دو بجے باکی پنڈ پہنچے۔ باکی پنڈ کہنے اور سننے کو گاؤں تھا مگر اس گاؤں کی آبادی پندرہ بیس گھروں سے زیادہ نہیں تھی۔ درحقیقت یہ ایک ٹیلے کے دامن میں بسی ہوئی چھوٹی سی بستی تھی۔ برگد کے دو گھنے درختوں تلے ایک چھوٹی سی مسجد بھی نظر آرہی تھی۔ مسجد سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرا تھا اور یہی مولوی برکت کا حجرہ تھا۔

ہماری جیپ بستی میں پہنچی تو ہر طرف ہلچل نظر آنے لگی۔ گنجے سر والا ایک موٹا تازہ سانولا شخص فوراً آگے آیا اور ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص اس ٹولے کا سربراہ ہے جو مولوی برکت کو یہاں سے نکالنے کی فکر میں ہے۔ شور سن کر مولوی برکت بھی اپنے حجرے سے باہر نکل آیا۔ مولوی صاحب کی

عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ لمبی گھنی داڑھی اور سرخ و سپید رنگت۔ صورت دیکھ کر دل سے آواز آئی کہ یہ شخص اس طرح کی حرکت نہیں کرسکتا پھر بھی دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے۔ بڑی بڑی نورانی صورتوں کے پیچھے بڑے بڑے مکروہ لوگ چھپے رہتے ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص سے ڈیرہ غازی خان میں میری ملاقات ہوئی تھی جو اب تک حافظے کی تختی پر نقش تھی۔

بہرحال مولوی برکت صاحب نے مسلح افراد کو اپنے سامنے دیکھا تو ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا "کیا بات ہے؟" مولوی برکت نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

اشرف چیا آگے بڑھ کر بولا "بات بتائیں گے تو پھر سے بے عزت ہوجاؤ گے اور ٹانگوں سے پسینہ بہنے لگے گا' بہتری ہے کہ بوریا بستر اٹھاؤ اور فورا چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اتنے میں مولوی برکت کا ایک حمایتی آگے بڑھا اس کے ساتھ کھلے ہاتھ پیر کا ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ اشرف چیئے سے مخاطب ہو کر بولا "پہلوان جی! یہ معاملہ اب بڑی پنچایت کے بس ہے۔ پنچایت ہو فیصلہ کرے گی وہ۔۔۔"

"اوئے ایسی کم تیسی تیری پنچایت کی۔" اشرف چیا پھنکار کر بولا اور پھر اس کی زبان سے مولوی برکت اور اس کے سارے حمایتیوں کے لیے گالیوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ مولوی برکت کے حمایتی نے ذرا مزاحمت کی تو اشرف چیا اور اس کے ساتھی اس پر پل پڑے۔ مجھے امید تھی کہ شاید بستی کے کچھ لوگ "مار کھانے" والے کی مدد کو آئیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ مولوی برکت کے لیے ہمدردی رکھنے کے باوجود کوئی آگے نہیں بڑھ سکا۔ اشرف چیا اور اس کے ساتھیوں نے مار مار کر مولوی برکت کے حمایتی کا بھرکس نکال دیا۔ مولوی برکت آگے بڑھے تو انہیں بھی دھکوں اور دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولوی برکت کی پگڑی کھل کر گر گئی اور چپل بھی پاؤں سے نکل گئی۔ چیئے کے دو ساتھیوں نے زور زور سے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی برکت کی ڈری سہمی بیوی باہر نکلی۔ اس نے اپنا منہ سر دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ غنڈوں نے اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا اور پھر حجرے کے اندر سے سامان نکال نکال کر باہر پھینکنے لگے۔

مولوی برکت کی بے چارگی پر ترس آرہا تھا مگر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کرتا تو وہ بھرم ختم ہوجاتا جو میں نے مشکل سے بنایا تھا۔ درحقیقت مجھے نادر جگی کی مصروفیات میں کسی

گہرے چکر کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ یہ شخص کسی ایسے "سیٹ اپ" کا حصہ ہے جو ملک دشمنی کی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ خود کو ایک معمولی بدمعاش ظاہر کرکے میں نادر جگی کے قریب آگیا تھا اور اس سیٹ اپ کے اندر گھس گیا تھا' اگر میں یہاں جذبات میں آکر مولوی برکت کی مدد کر بیٹھتا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ مولوی برکت کی مدد مجھے کرنی چاہیے تھی مگر یہ فرد واحد کی مدد تھی' اگر میں نادر جگی کی جڑیں ڈھونڈ لیتا تو شاید اس سے ہزاروں لاکھوں کا بھلا ہو جاتا۔

مولوی برکت کو انتہائی مشکل اور بے چارگی میں دیکھ کر بھی میں خاموش رہا اور دل ہی دل میں اس کی بہتری کا خواہش مند رہا۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب اس معاملے میں واقعی بے گناہ ہوں مگر ماضی کے کسی اور گناہ کی پاداش میں اس توہین کا سامنا کر رہے ہوں۔ مولوی صاحب تنہا ہونے کے باوجود مرعوب نہیں تھے' وہ اس اشرف چیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے تھے اور یہ ایک سچے شخص کی پہچان ہوتی ہے مگر اس زمانے میں اکثر سچا شخص ہی پٹتا ہے۔ یہاں بھی صورت حال سنگین ہوتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ اشرف چیئے کا ہاتھ مولوی صاحب پر اٹھ جائے گا۔ ابھی یہ کشمکش جاری تھی کہ اچانک اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ ایک گولی تو جیسے میرے سر کو چھوتی ہوئی گزری۔

اشرف چیا چیخ کر بولا "لیٹ جاؤ!"

ہم سب جیپ کے اردگرد لیٹ گئے۔ اشرف چیا بھی ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ فائرنگ کے بعد ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ جو دو گولیاں چلی تھیں' ان میں سے ایک گولی گنجے سر والے اس سانولے شخص کے سینے میں لگی جو بڑھ چڑھ کر اشرف چیا کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ وہیں زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ مولوی برکت سمیت باقی سب لوگ جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں دو تین فائر مزید ہوئے۔ میں نے جیپ کے نیچے سے دیکھا کہ کھلی چھت والی دو جیپیں تیزی سے بستی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اشرف چیا اور اس کے ساتھیوں نے بھی جیپیں دیکھ لی تھیں' جیپوں پر کم از کم دس بارہ افراد سوار تھے۔ یقینا وہ بری نیت سے آرہے تھے۔ اس صورت میں اس کھلی جگہ پر رہنا خطرناک تھا' ہم ایک قریبی مکان میں گھس گئے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو یہ لوگ شنکر شکرا کے ساتھی ہیں'

مجھے یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ فائرنگ میں براہ راست مجھے نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس دیہاتی مکان کی بیرونی چاردیواری قریبا پانچ فٹ اونچی تھی اور مٹی گارے سے بنی ہوئی تھی۔ یہ دیوار اتنی موٹی تھی کہ ہمیں فائرنگ کی زد سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ ہم نے اس دیوار کے عقب میں پوزیشن لے لی۔

حملہ آوروں نے یقینا ہمیں اس گھر میں گھستے دیکھ لیا تھا' یہی وجہ تھی کہ جیپیں رکنے کے بعد خودکار رائفل سے جو دو برسٹ مارے گئے وہ اسی گھر کی بیرونی دیوار میں لگے۔ جیپیں اس گھر سے قریبا ڈیڑھ سو گز دور دو بڑے ویٹ تھریشرز کی اوٹ میں کھڑی ہوگئیں۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" بھولا نے لرزاں لہجے میں اشرف چیا سے پوچھا۔

"مجھے تو لگتا ہے جندر ا گینگ کے لوگ ہیں۔" چیئے نے ڈرے ڈرے لہجے میں جواب دیا۔

"مگر ان کے پاس تو صرف ایک نیلی جیپ ہے۔" بھولے نے اعتراض کیا۔

"ہو سکتا ہے کسی سے ادھار لی ہو۔" چیئے نے کہا۔

"جو بھی ہیں' ان کے ارادے تو اچھے نہیں لگتے۔"

"وہ دیکھو وہ کیا ہے؟" چیئے کے ایک ساتھی نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

یہ فقرہ ادا کرنے کے فورا بعد اسے اپنا سر نیچے جھکا لینا پڑا کیونکہ ایک گولی دیوار پر اس کے بالکل نزدیک لگی تھی۔

میں نے بھی اس جانب دیکھا جدھر چیئے کے ساتھی نے اشارہ کیا تھا۔ بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ دو مزید جیپیں چند گھڑسواروں کے ساتھ بستی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دوپہر کی سنہری دھوپ میں دور دور تک سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ سواروں اور گھڑسواروں کے پاس اسلحے کی موجودگی ظاہر ہو رہی تھی۔

بھولے نے لرزتی آواز میں کہا "پہلوان جی! یہ تو کافی لمبا چکر چلا رہا ہے ان لوگوں نے' مجھے پہلے ہی شک تھا کہ "سنا" جندرے کے بھائی "طیفے" کے زخمی ہونے کا بدلہ ضرور لینا ہے ان لوگوں نے ہم سے۔"

بھولے اور چیئے کو یہ معاملہ اپنی دشمنی کی روشنی میں کچھ اور نظر آرہا تھا جبکہ میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ میں نے ایک جیپ میں شنکر کے ساتھی راہول نوبا کو دیکھ لیا تھا' اس کے علاوہ ایک شخص کے حلیے پر مجھے شنکر کے ساتھی وشوا شو کا شبہ بھی ہو رہا تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ ان لوگوں نے راستے میں کہیں مجھے پہچان لیا ہے اور فوری طور پر پیچھے

لگ گئے ہیں۔ جیسا کہ میں جانتا تھا' علاقے کا سب سے بااثر شخص چوہدری اعجاز ان دنوں شنکر کا میزبان بنا ہوا تھا' عین ممکن تھا کہ راہول نوبا کے ساتھ جو بہت سے مسلح افراد نظر آرہے تھے وہ چوہدری اعجاز کے نمک خوار ہی ہوں۔

اگلے چار پانچ منٹ میں آنے والے مسلح افراد نے اس چھوٹی سی بستی کے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔ وہ گاہے گاہے اس چاردیواری پر فائر بھی کر رہے تھے جو ہماری پناہ گاہ تھی۔ جوابی طور پر اشرف چیا نے بھی اپنی رائفل سے چار پانچ فائر نکالے تھے۔ اشرف چیا اور اس کے ساتھیوں کے پاس زیادہ ایمونیشن بھی نہیں تھا' یہ واضح طور پر یک طرفہ مقابلہ نظر آتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ چیا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ حالات کس طرح زیر کو زبردست اور زبردست کو زیر کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک اشرف چیا اور اس کے ساتھی زبردست تھے اور مولوی برکت صاحب زیردست۔ اب مولوی برکت کی جگہ اشرف چیا زیردست نظر آرہا تھا۔ وہ چاردیواری میں دبکا ہوا تھا اور اس کے بارعب جمنوا کی لاش ایک گندی نالی کے عین اوپر پڑی تھی۔

دو چار منٹ بعد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بہت سے مسلح افراد نے بستی کو چاروں طرف سے حصار میں لے لیا ہے۔ یہ حصار کافی مضبوط تھا تاہم اس وقت اور مضبوط ہوگیا جب ایک ٹریکٹر ٹرالی بھی اچھلتی کودتی ہوئی موقع پر پہنچ گئی۔ اس ٹرالی میں سے قریبا دو درجن دیہاتی چھلانگیں لگاتے ہوئے اترے۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں اسلحہ نظر آرہا تھا' کچھ کلہاڑیوں اور لاٹھیوں وغیرہ سے مسلح تھے۔ یہ لوگ بھی گھیرا ڈالنے والوں کے ساتھ شامل ہوگئے۔ مجھے اب اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ لوگ چوہدری اعجاز کے کارندے ہیں اور راہول نوبا اور شنکر وغیرہ کی میزبانی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اگر شنکر ٹانگ تڑوا کر اسپتال میں نہ پڑا ہوتا تو اس وقت یقینا وہ بھی یہاں موجود ہوتا۔

ایک قریبی گھر کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم باہر آجاؤ' ورنہ سارے ہی اندر گولیوں سے بھونے جاؤ گے۔"

اشرف چیا اور بھولا حیرت سے ایک دوجے کی طرف دیکھنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا اصل روپ زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکے گا' لیکن پھر مجھے ایک اور ذہنی جھٹکا لگا۔ بھولے کے ساتھ کھسر پھسر کرنے کے بعد چیئے نے بلند آواز میں کہا "تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ شاہ جہاں' ہمارے ساتھ

نہیں ہے وہ تاریخ پر لاہور گیا ہوا ہے۔"

"بکواس مت کرو!" قریبی مکان سے بارعب آواز نے کڑک کر کہا "وہ تمہارے ساتھ ہے ہم نے اسے پہچانا ہے۔ میں تمہیں دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں، اسے حوالے کردو ورنہ اس گھر کے اندر ہی جلا ڈالیں گے سب کو۔"

"جو بندہ ہمارے ساتھ ہے ہی نہیں اسے حوالے کیسے کردیں۔" چھیتا لرزتی آواز میں بولا۔

"ہم تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دیتے ہیں، اچھی طرح سوچ لو۔"

"تم پانچ گھنٹے کی مہلت بھی دو گے تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ۔"

"بس تمہیں کہہ دیا نا کہ پانچ منٹ کی مہلت ہے۔" بارعب آواز نے چھیتے کی بات کاٹی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اس دوران میں میں سمجھ چکا تھا کہ "شاہ جہاں" اشرف وغیرہ کے کسی ساتھی کا نام بھی ہے۔ وہ یہی خیال کررہے تھے کہ حملہ آور ان سے ان کے ساتھی کو طلب کررہے ہیں۔

میں نے چھیتے سے کہا "پہلوان جی! یہ شاہ جہاں کون ہے؟"

وہ غرا کر بولا "تم پوچھ کر کیا کرو گے" اور یہ اپنا سر ذرا دیوار سے نیچے رکھو ورنہ کھوپڑا اڑ جائے گا۔"

میں نے سر اور نیچے کرلیا۔ میری بے عزتی دیکھ کر بھولے کا ایک ساتھی مدھم آواز میں بولا "شاہ جہاں دراصل پہلوان جی کے ایک دوست کا نام ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ ہماری مخالف پارٹی کا سرغنہ استاد جندرا ہے۔ کچھ دن پہلے استاد جندرا کے بھائی طیفے کو شاہ جہاں نے بری طرح مارا تھا۔ اس کے دونوں بازو کلہاڑی سے کاٹ دیے تھے اور ناک شاک بھی توڑ دی تھی۔ یہ لوگ طیفے کا بدلہ لینے کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

میں حیران ہورہا تھا، بعض اوقات بندے کا اندرونی خوف بھی اسے کیسے کیسے دھوکے دیتا ہے۔ انسان کے اندیشے ہیولوں کو ٹھوس جسموں کا روپ دے دیتے ہیں، اور وہ بالکل غیر متعلق واقعات کو اپنے اندرونی خوف کے مطابق خود سے منسوب کرلیتا ہے۔

پانچ منٹ پورے ہونے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا کہ بارعب آواز پھر گونجی "ہاں بھئی! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

چھیتا بولا "دیکھو جوان! اگر تم لوگوں کو یقین نہیں تو اپنا ایک بندہ اندر بھیج دو۔ وہ آکر دیکھ لے۔ شاہ جہاں ہمارے ساتھ نہیں ہے۔"

"ہم اندر کیوں آئیں۔ تم باہر آجاؤ۔ اگر وہ بندہ تمہارے ساتھ نہیں تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

چھیتے نے سوالیہ نظروں سے بھولے کو دیکھا، وہ جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگا۔ چھیتے کے باقی ساتھی بھی باہر نکلنے والی بات سے خوف زدہ ہوگئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں دھوکے سے باہر بلا کر گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔

دو تین منٹ خاموشی رہی پھر سامنے والے مکان کی چھت پر شلوار قمیص والا ایک مسلح شخص نظر آیا۔ وہ چھلانگ لگا کر ایک قریبی مکان کی چھت پر چلا آیا۔ اس کی پوزیشن خطرناک ہوگئی تھی۔ اشرف چھیتا نے اس پر فائر جھونک مارا وہ منڈیر کے پیچھے اوجھل ہوگیا، اس کے ساتھ ہی ہمیں آڑ فراہم کرنے والی کچی دیوار پر گولیوں کی بارش ہوگئی۔ ہم دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ قریبی مکان کی چھت پر آنے والے شخص نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! باہر آجاؤ، اپنے ساتھ ان کرائے کے کتوں کو کیوں مروا رہے ہو۔"

یہ شخص غیر ضروری دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کافی قریب آچکا تھا۔ میں نے اس کے پاس لمبی نال والی "ایل ایم جی" دیکھ لی تھی۔ یہ گن قبضے میں آجاتی تو کافی دیر تک حملہ آوروں کو ڈاج دینے کا امکان پیدا ہوسکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اب بھی اپنا بہروپ چھوڑنے کو تیار نہیں تھا جو میں نے چھیتے وغیرہ کے سامنے اختیار کر رکھا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس بہروپ کے سبب مجھ پر کوئی اہم انکشاف ہوگا۔

میں نے ایک بار پھر چھت کی طرف دیکھا۔ جس گھر میں ہم چھپے ہوئے تھے اس کے برآمدے میں سے ایک سیڑھی اوپر جاتی تھی۔ اگر میں چھت پر چلا جاتا تو آسانی سے دوسری چھت پر چھلانگ لگا کر ایل ایم جی والے کو دبوچ سکتا تھا۔ بلکہ اب تو ایل ایم جی والے کے ساتھ ایک اور شخص بھی شامل ہوگیا تھا اور مجھے شک پڑ رہا تھا کہ وہ راہول ٹوبا ہے۔ اس نے ابھی تک وہی اورنج رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی جو میں نے میلے میں دیکھی تھی۔ میرے ہاتھوں میں کھجلی سی ہونے لگی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس وقت میرا "بھولی" صفدر میرے ساتھ ہو، ہم نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے اس ہنگامے میں کود پڑیں۔۔۔ اور "مار دھاڑ" کے ارمان جی بھر کر نکالیں۔ صفدر کا تصور ذہن میں ابھرا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

ایل ایم جی والے شخص کو دیکھنے کے لیے میں نے سر تھوڑا سا اوپر کیا تو چھیتے نے جھنجلا کر میری گردن پکڑ لی اور نیچے کو دباتے ہوئے بولا "اوئے! تجھے دس بار کہا ہے، سر نیچے رکھ

ورنہ مغز بکھر جائے گا تیرا۔"

میں نے سعادت مندی سے سر جھکالیا۔ دونوں طرف سے اکا دکا فائر ہورہے تھے۔ شاید اس طرح حملہ آور "چھیتے اور بھولے" کا ایمونیشن ختم کرنا چاہتے تھے، تاہم جس رفتار سے چھیتا اور اس کے ساتھی فائرنگ کررہے تھے وہ ایک ڈیڑھ گھنٹا بہ آسانی نکال سکتے تھے۔ میں سخت کشمکش میں تھا، جب بندہ بہت کچھ کرسکتا ہو مگر کر نہ سکے تو شدید الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اگر میں بھرپور طریقے سے کوشش کروں تو حملہ آوروں میں سے ایک دو اہم افراد کو یرغمال بنا سکتا ہوں۔ اگر یرغمالی ہمارے پاس ہوتے تو یہاں سے نکلنے کی راہ بھی نکل سکتی تھی۔

حملہ آوروں کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا اور چھیتا اینڈ کمپنی کے چہرے ٹوٹے ہوئے پیالوں جیسے ہوگئے تھے۔ اگر صورت حال اگلے پانچ دس منٹ میں یہی رہتی تو پھر میرا حرکت میں آنا لازمی تھا۔ میں اپنا ٹارگٹ یعنی "ساتھ والے مکان کی چھت" چن چکا تھا۔

جس گھر میں ہم نے پناہ لی تھی وہاں کے مکین دیر ہوئی بھاگ چکے تھے مگر ایک بوڑھا ابھی تک موجود تھا اور سہم کر برآمدے میں بیٹھا تھا۔ غالباً اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ موت کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر چلا جائے۔ میں نے ایک دو بار اشارے سے بوڑھے کو کہا کہ وہ اندر چلا جائے لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے خیالات کے تانے بن رہا تھا۔ میں مستقبل قریب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فرض محال اگر میں راہول ٹوبا اور اس کے پاکستانی بہی خواہوں کے قبضے میں آجاتا تو کیا ہوتا۔ یقیناً مجھے پاپ زنجیرگ باس کے سامنے پیش کیا جاتا اور ان لوگوں کا بگ باس فی الوقت شیخ عاصم ہی تھا۔ شیخ عاصم کے سامنے مجھ سے نمٹنے کے دو راستے تھے، ایک تو یہ کہ وہ مجھے اپنی تحویل میں رکھتا اور مرضی کے بیانات پر دستخط کروانے کی کوشش کرتا، دوسرے یہ کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کردیتا۔ آثار سے ثابت ہورہا تھا کہ اس وقت پولیس بھی وہی کچھ کررہی ہے جو امارات کا یہ شہزادہ چاہتا ہے۔ شیخ عاصم اور اس کا قبیلہ میرے خلاف اپنے اندر اتنا زہر بھر چکا تھا کہ اب شاید مجھے قتل کرکے بھی ان کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ مجھے زندہ رکھنا چاہتے تھے اور مسلسل عذاب سے دوچار کرنا چاہتے تھے۔ شیخ عاصم کے رشتے دار شیخ عشارب نے درجنوں معززین کے سامنے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ برات خالی ہاتھ واپس جانے کی توہین کا بدلہ نہیں لے گا چین سے نہیں بیٹھے گا۔ مجھے بھی وہ ہولناک شب و روز ابھی تک بھولے نہیں تھے۔ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر اور میری عزیز ترین ہستیوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر میری پیاری بہن شفتا کا رشتہ حاصل کیا گیا تھا پھر شفتا کو بیاہنے کے لیے شیخ عاصم نے اپنے بھتیجے شیخ ایاز کو دولہا بنایا تھا اور بڑے تکبر سے برات لے کر لاہور پہنچا تھا۔ ڈیفنس میں واقع شیخ عاصم کی جس کوٹھی میں امارات سے آنے والے لوگوں کی برات ٹھہری تھی، اسی کوٹھی کے منحوس تہ خانے میں عالم قریشی، زریں اور کلثوم وغیرہ کو عاصم نے یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا اور ان کو زندگی کے بدترین عذاب سے گزار رہا تھا۔ میں اپنے عزیز ساتھیوں کی کربناک چیخوں سے اپنے کان بند نہیں کرسکتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی لاڈلی بہن کو شیخ ایاز کے نکاح میں دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ بعد ازاں شادی سے کچھ ہی دیر پہلے غزالہ آڑے آئی تھی۔ اس نے اپنے لیے بے شمار خطرات مول لیتے ہوئے میرے ساتھیوں کو اپنے شوہر عاصم کی حبس بے جا سے چھڑانے کا اہتمام کیا تھا۔ اب نفرت اور انتقام کے شعلوں میں لپٹی ہوئی کہانی شیخ عاصم پھر وہیں سے شروع کرنا چاہ رہا تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آیا تھا۔ اس نے اپنے بازو بھی کافی مضبوط کرلیے تھے۔ شنکر شکرا جو امارات میں شیخ عاصم سے کچھ دور ہوگیا تھا اب پھر اسی کے کھونٹے سے بندھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نجانے چوہدری اعجاز جیسی اور کتنی بلائیں اس کے گرد موجود تھیں۔

سردیوں کا مختصر دن تیزی سے ڈھلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ میں بھی تیزی آگئی تھی۔ شاید یہ بات حملہ آور بھی سمجھ رہے تھے کہ اندھیرا پھیل گیا تو ان کی گرفت کمزور ہوجائے گی۔ اب ہم برآمدے تک پسپا ہوگئے تھے۔ گولیاں صحن میں تواتر سے پرواز کررہی تھیں۔

مٹی کی وہ دیوار جس نے ہمیں آڑ فراہم کر رکھی تھی ادھڑ ادھڑ کر گرنا شروع ہوگئی تھی۔ گھر کے صحن میں بندھی ہوئی ایک حاملہ بکری راہی اجل کو لبیک کہہ گئی تھی اور مٹی کے کئی برتن فائرنگ سے چکنا چور ہوگئے تھے۔

اچانک صورت حال میں ایک ذرا سی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس تبدیلی کا میرے سمیت کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یکایک فائرنگ میں زبردست تیزی آگئی۔ خودکار رائفلوں کی تڑتڑ نے ماحول کو لمحوں میں گرما دیا۔ یہ فائرنگ اس مختصر بستی کی شمالی اور جنوبی سمت سے شروع ہوئی تھی۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ فائرنگ ہم پر نہیں ہمارے مخالفین پر کی جارہی ہے۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی ہم پر کی جانے والی

فائرنگ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ہم پر دباؤ ذرا کم ہوا تو ہم جو اندرونی کمرے تک پسپا ہو گئے تھے' پھر برآمدے میں پہنچ گئے۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ شاید اشرف چیتا اور بھولا وغیرہ کے ساتھی امداد کو پہنچے ہیں لیکن پھر جلد ہی مجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ فائرنگ بڑے منظم طریقے سے ہو رہی تھی اور جدید ہتھیاروں سے تھی۔ دو تین منٹ کے اندر حملہ آوروں نے ورر گا دی۔ جس زیکٹر زائی پر مسلح افراد یہاں پہنچے تھے وہ اچھلتی کودتی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے چند ہی سیکنڈ بعد جیپ بھی تو دو گیا وہ ہونی نظر آئیں۔ بہرحال اکا دکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ اشرف چیتا جھک کر چلتا ہوا بیرونی دیوار تک گیا اور دیوار کے اوپر سے باہر کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ گھبرایا ہوا واپس آیا اور بھولے' نیذی وغیرہ سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ ان کی گفتگو میں بس یہی بات میری سمجھ میں آئی کہ جن لوگوں نے مداخلت کر کے ہماری جان حملہ آوروں سے چھڑائی ہے وہ پولیس والے ہیں۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ تو آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے والی بات تھی۔ جس طرح مجھے شیخ عاصم اور شنکر سے خطرہ تھا اسی طرح پولیس سے بھی۔ بلکہ پولیس کے اعلیٰ حکام تو اس وقت شیخ عاصم کے دوستوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اشرف چیتا میرے پاس آیا اور اپنی دو نالی رائفل مجھے تھماتے ہوئے بولا "تم یہاں برآمدے میں رہو اور اگر کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو اسے روکو۔ میں اور بھولا اوپر چھت پر جا کر دیکھتے ہیں۔"

بھولا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا "رائفل لوڈ ہے۔ تھوڑا دباؤ گے تو گولی چل جائے گی' ذرا دھیان سے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے رائفل تھام لی۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اس رائفل سے چلائی جانے والی گولی کسی نہ کسی کو ضرور لگی ہے۔ یہ رائفل مجھے ملوث کرنے کے لیے مجھے تھمائی گئی تھی۔ ابھی اشرف چیتا اور بھولا بمشکل آدھی سیڑھیوں پر چڑھے تھے کہ تین چار افراد چھلانگیں لگا کر صحن میں داخل ہوئے اور مختلف چیزوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بندے نے گرج کر کہا "ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ' تم پولیس کے گھیرے میں ہو۔"

اسی دوران میں چھت پر بھی قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ اچانک سیڑھیوں کی طرف سے ایک آواز میرے کانوں میں پڑی اور جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ ساہی صاحب کی آواز تھی۔ وہ اپنے کسی ماتحت کو پکار کر ہدایات دے رہے تھے۔

ساہی صاحب کی یہاں موجودگی میرے لیے ایک زبردست انکشاف تھا۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ساہی صاحب یہاں کیسے اور کیونکر پہنچے ہیں' اہم بات یہی تھی کہ وہ یہاں موجود ہیں۔ سامنے صحن میں مٹی کے ایک تندور کے پیچھے چھپے ہوئے پولیس اہلکار نے دوبارہ چیخ کر کہا "گولی مت چلاؤ' باہر آ جاؤ' میں سب انسپکٹر ہوں۔"

میں نے رائفل نیچے گرا دی۔ اسی اثناء میں چیتا اور بھولا وغیرہ بھی ہاتھ اٹھائے نیچے آ گئے۔ چھت پر سے اترنے والے افراد نے ان پر رائفلیں تان رکھی تھیں۔ یہ سارے پولیس والے سادہ لباس میں تھے۔ یہ سات آٹھ افراد تھے' قریباً ہر ایک کے ہاتھ میں رائفل نظر آ رہی تھی پھر میں نے ساہی صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی شلوار قمیص میں ہی تھے۔ ان کے ہاتھ میں ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور تھا۔

مجھے پہچان کر ساہی صاحب کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ میری طرف بڑھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے' میں "گھبرا" کر پیچھے ہٹ گیا "نہیں سر جی! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو ویسے ہی ان کے ساتھ تھا۔"

ساہی صاحب ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کے تیز ذہن نے ایک لحظے میں بھانپ لیا کہ دال میں کالا ہے۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں دو قدم مزید پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ بدستور فضا میں بلند کر رکھے تھے۔ ایک طرح سے میرے کھڑے ہاتھ ساہی صاحب کے لیے اشارہ تھے کہ ہم اجنبی بنے رہیں۔

سفید پوش پولیس والوں نے اشرف چیتا کے سارے ساتھیوں کو گھیر کر ایک کمرے میں اکٹھا کر دیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہماری اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ اشرف چیتا اور اس کے ساتھیوں کے پاس کل تین ہتھیار تھے' یعنی ایک دو نالی رائفل اور دو عدد دیسی ساخت کے پستول لیکن اب صرف ایک دو نالی رائفل اور ایک دیسی پستول برآمد ہوا۔ دوسرا پستول بھولے نے موقع دیکھ کر کہیں پھینک دیا تھا یا چھپا دیا تھا۔ جو پستول برآمد ہوا اس کا لائسنس نیذی کے پاس موجود تھا۔ رائفل لائسنس کے بغیر تھی۔ اسی لیے عین موقع پر مجھے پکڑا دی گئی تھی۔ میرا دوسرا اندازہ بھی درست نکلا۔ اس رائفل کی وجہ سے مخالف پارٹی کا ایک بندہ قتل اور دوسرا شدید زخمی ہوا تھا۔

ساہی صاحب اب صورت حال کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے گرج کر پوچھا "یہ بندوق تیری ہے؟"

"نہیں سر جی۔ یہ اس کی ہے۔" میں نے انگلی سے اشرف چیتے کی طرف اشارہ کیا۔

توقع کے عین مطابق وہ صاف مکر گیا "نہیں جناب! یہ اسی کی بندوق ہے۔ ہم تو اسے جانتے بھی نہیں۔"

"پھر یہ تمہارے ساتھ کیسے ہے؟"

"ہم جیپ پر آ رہے تھے' اس نے رستے میں ہم سے لفٹ مانگی تھی۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ سب سارے جھوٹ بول رہے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"جھوٹ سچ کا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔" ساہی صاحب نے رعب سے کہا پھر انہوں نے اشرف سے مخاطب ہو کر پوچھا "یہ لوگ کون تھے' جنہوں نے یہاں تمہیں گھیر رکھا تھا۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں جی کہ میں ان کو نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق بھی اسی سے ہو۔" اشرف چیتا نے ایک بار پھر ڈھٹائی سے میری طرف اشارہ کیا۔

میں نے ایک بار پھر "احتجاج" کیا۔ ساہی صاحب نے ایک بار پھر "جھڑک" کر مجھے خاموش کرا دیا۔

دو ڈھائی گھنٹے جاری رہنے والی اس فائرنگ میں حیرت انگیز طور پر بہت کم جانی نقصان ہوا تھا۔ بالکل شروع میں مسجد کے سامنے اس شخص کو گولی لگی تھی جو بڑھ چڑھ کر مولوی برکت کی مخالفت کر رہا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک درختوں کے نیچے زمین پر پڑی تھی۔ بس کسی نے اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا تھا۔ دوسرا شخص جو ہلاک ہوا تھا وہ وہی ایل ایم جی والا تھا جو ضرورت سے زیادہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے بالکل قریب چلا آیا تھا۔ اشرف نے اس پر دو نالی سے جو فائر کیے تھے ان میں سے ایک اس کے سر میں لگا تھا اور اسے ختم کر گیا تھا۔ ایک اور حملہ آور کے پیٹ میں بھی رائفل کی گولی لگی تھی۔ کچھ دیر بعد مقامی چوکی کا انچارج سب انسپکٹر بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ جب اسے ساہی صاحب کے عہدے کا معلوم ہوا تو اس کی پتلون ڈھیلی ہونے لگی۔

○☆○

ساہی صاحب دوسرے گرفتار شدہ افراد کے ہمراہ مجھے بھی راؤ والی سے لاہور میں لے آئے۔ ہمیں تھانے نہیں لے جایا گیا بلکہ مسلم ٹاؤن کی ایک الگ تھلگ کوٹھی میں رکھا گیا۔ اس کوٹھی میں پہنچ کر تنہائی میں ساہی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور دیر تک لگائے رکھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ مجھے

انور طیبی کے قلم سے ایک دلچسپ ناول

ہزار داستان

کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی کی برباری داستان حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنتارد ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
- عمر کا پندرھواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سید بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنتارد کا طلسم توڑ دیا۔
- سید بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔

قیمت 250 روپے | محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گیٹ اپ اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 07247414

علی بکسٹال

پرانی کیپٹل لاہور

ایک دم بوڑھے اور کمزور دکھائی دیے۔ غالباً پچھلے ایک مہینے میں وہ جن کڑی آزمائشوں سے گزرے تھے انہوں نے ساہی صاحب کو نڈھال کردیا تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ میں اس چار دیواری میں ہر طرح محفوظ ہوں۔

کئی روز بعد میں نے شیو کی۔ نہایا دھویا اور صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ اس دوران میں میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس کوئی موجود ہے اور چپکے چپکے مجھے دیکھ رہا ہے۔ دو آنکھیں۔۔۔ دو پراسرار آنکھیں تسلسل سے میرا جائزہ لے رہی ہیں۔ میں اسے اپنا وہم بھی قرار دے سکتا تھا مگر میری چھٹی حس نے مجھے اکثر درست بات ہی بتائی تھی۔ یہ کوئی خاص میری ہی بات نہیں تھی۔ ایک عام شخص کو بھی جب اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ کوئی اسے خاموشی سے دیکھ رہا ہے تو وہ خود کو بے چین محسوس کرنے لگتا ہے۔

نہا دھو کر میں نشست گاہ میں پہنچا تو وہاں ساہی صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ یہ کھانے کا وقت تھا لیکن شاید ہم دونوں کی بھوک ہی اڑی ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کیا اس کوٹھی میں آپ کے علاوہ بھی میرا کوئی جاننے والا موجود ہے؟"

ساہی صاحب نے اس بات کا جواب نفی میں دیا اور پوچھا "تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی دماغ میں بات آئی تھی۔" میں نے کہا۔

ساہی صاحب نے مختصراً مجھے بتایا کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچے۔ شنکر کی ٹانگ راہ والی نامی گاؤں کے میلے میں ٹوٹی تھی۔ اس کے بعد ساہی صاحب کو یقین ہو گیا تھا کہ میں کہیں راہ والی کے آس پاس ہی موجود ہوں۔ پولیس لائن میں ان کے ایسے مخلص اور انتہائی با اعتماد دوست موجود تھے جن کے لیے ساہی صاحب کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان دوستوں نے اعلیٰ حکام کے علم میں لائے بغیر ساہی صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور شیخوپورہ کے آس پاس کے علاقے میں میری تلاش جاری تھی۔ آج صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ جب میں نادر رجی کے ڈیرے سے چپا وغیرہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر نکلا تو سادہ لباس میں پولیس کے ایک چوکس اہلکار نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے وائرلیس کے ذریعے فوراً شیخوپورہ اطلاع کردی۔ اتفاقاً ساہی صاحب بھی اس وقت شیخوپورہ میں ہی تھے وہ فوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستے میں جس شخص نے چپا سے ملک بابا پوچھا تھا اور جسے چپا نے ماں بہن کی گالیاں دینا شروع کردی تھیں، وہ دراصل وہی پولیس اہلکار تھا جس نے مجھے پہچاننے کے بعد ساہی صاحب کو وائرلیس کی تھی۔ کچھ تاخیر کے ساتھ جب ساہی صاحب اپنی فورس کے ساتھ ہاکی پنڈ پہنچے تو شنکر کے ساتھ راہول نوبا وغیرہ کے ساتھ ہماری فائرنگ شروع ہو چکی تھی اور وہ لوگ ہمارے گرد گھیرا تنگ کر چکے تھے۔ ساہی صاحب نے بروقت مداخلت کی اور وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، بعد کے واقعات مجھے معلوم ہی تھے۔

مجھ سے زیادہ ساہی صاحب تجسس کا شکار تھے، وہ میری روئداد سننا چاہتے تھے اور سب سے زیادہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں نے پکڑے جانے والے دیگر افراد یعنی چپا اور بھولا وغیرہ کے سامنے ڈراما کیوں کیا ہے۔

میں نے اب تک کی ساری روداد ساہی صاحب کو سنائی، حوالدار فیض کی قربانی سے لے کر کمانی ساز عورت شاہدہ تک اور شیخ عاصم سے لے کر کن کٹے بدمعاش نادر رجی تک سب کچھ ساہی صاحب کے گوش گزار کردیا۔ ساہی صاحب یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ دو دن پہلے سرحد پورہ میں وفاقی وزیر کا جلسہ میری کارروائی کی وجہ سے درہم برہم ہوا تھا۔ ساہی صاحب بولے "بظاہر تو وہ زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا مگر اس کا نتیجہ بڑا دور رس نکلا ہے۔ دو سیاسی گروپوں میں پہلے سے موجود کشیدگی ایک دم بہت بڑھ گئی ہے۔ سنا ہے کہ سرگودھا میں بھی ایک جلسے میں سانپ چھوڑے جانے کا واقعہ ہوا ہے۔ یہ واقعہ یقیناً دوسری پارٹی نے کیا ہے۔۔۔۔"

میں نے کہا "مجھے اس سارے معاملے کی جڑیں گہری نظر آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جو اتفاقاً ہاتھ آیا ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن یہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور ہم اس چھوٹے بدمعاش نادر رجی کے ذریعے کسی بہت بڑے ہیوی ویٹ بدمعاش تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

ساہی صاحب نے ایک گہری سانس لی "یہ سب تو چلتا ہی رہے گا، کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"کیا مطلب جناب؟"

"تمہارا رقیب شیخ عاصم۔ تم اچھی طرح جانتے ہو دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت شیخ کے پاس بڑی فراوانی سے موجود ہے۔ اس نے پچھلے ایک سال میں یہاں پاکستان میں اپنا اثر و رسوخ بہت بڑھایا ہے۔ وہ اکثر اسلام آباد جاتا رہتا ہے اور وہاں کے بڑے بڑے گریڈ میں بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ بڑی بے تابی سے تمہاری پاکستان واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ تمہاری آمد کے ساتھ ہی اس نے اپنی ڈوریاں ہلائی ہیں اور تمہارے گرد گھیرا بہت تنگ کردیا ہے۔ یقین کرو شاہ جہاں! یہ سب کچھ اب میرے بس میں بھی نہیں رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے میری ملاقات ہو اور میں تمہیں بتا سکوں کہ تم سے تمام ہمدردی کے باوجود میں کتنا بے بس ہو چکا ہوں۔"

میں نے نظر بھر کر ساہی صاحب کو دیکھا اور دل پر گہری چوٹ لگی۔ وہ کچھ نہ بھی بتاتے تو ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میرے لیے انہوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے، بہت مشکلات جھیلی ہیں۔ مگر وہ میری خاطر جہاں بھی گئے تھے وہاں ان سے پہلے شیخ عاصم کا اثر و رسوخ پہنچ چکا تھا۔ اعلیٰ افسران نے یہ جاننے کے باوجود کہ بدنام محکمے کا یہ انسانی نیک نام بندہ جو کہہ رہا ہے درست ہے، ان کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا اور یہ سب کیوں تھا، صرف اس لیے کہ ساہی صاحب ایک دیانت دار پولیس ملازم تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حصص نہیں تھے۔ شیخ عاصم کی طرح ان کے بحری جہاز نہیں چلتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجارتی مراکز میں پلازے کھڑے نہیں کر رکھے تھے اور جس کے پاس یہ سب کچھ نہیں تھا، وہ سچا ہوتے ہوئے بھی شیخ عاصم کے سامنے جھوٹا تھا، وہ غزالہ ہوتی، میں ہوتا یا ساہی صاحب ہوتے۔

ساہی صاحب کے چہرے پر رنج والم کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ سگریٹ ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا مگر وہ شاید اسے بھی بھول چکے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ دیں گے "شاہ جہاں! اب مجھ سے یہ بوجھ مزید نہیں اٹھائے جاتے۔ مجھے اب معاف کردو۔ میری اور اپنی اس ملاقات کو اب آخری ملاقات بنا دو۔ میں شگفتا اور انجم کی حفاظت کی ذمے داری سے بھی سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو میں ان دونوں کو تمہارے حوالے کردیتا ہوں۔"

بہرحال یہ الفاظ ساہی صاحب کی زبان پر آئے نہیں، شاید آ ہی نہیں سکتے تھے۔ ذمے داریوں کے بوجھ تلے دب کر ساہی صاحب کا دم تو گھٹ سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ایسا کلام نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "کئی دفعہ بات میرے ذہن میں آتے آتے رہ گئی ہے۔ میں تم سے دفینے کے نوادرات اور دیگر سامان کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ان کا کیا بنا ہے؟"

میں نے کہا "آپ جانتے ہی ہیں، میں نے انڈیا میں ہی سارا سامان مسٹر جی کلارک کے حوالے کردیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ان تمام اشیاء کو کیش کی شکل میں لائیں گے اور جونہی یہ کام مکمل ہوا ہمیں بتا دیں گے۔"

"کیا ابھی تک کام مکمل نہیں ہوا؟" ساہی صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے پتا چلا تھا کہ بیشتر نوادرات بک چکے ہیں مگر شاید ابھی کچھ چیزیں باقی ہیں۔"

"شاید کا کیا مطلب۔" ساہی صاحب پھر چبھتے لہجے میں بولے "کیا مسٹر کلارک نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ ایک اتفاق ہی ہے جناب کہ ملائیشیا میں دو تین ملاقاتوں کے باوجود مسٹر کلارک سے اس بارے میں بات نہیں ہو سکی۔"

ساہی صاحب نے ایک گہری سانس لی اور بولے "شاہ جہاں! میرے لیے تم بیٹوں کی طرح ہو۔ میری بیٹی فریال کے دل میں بھی تمہارے لیے بے پناہ عزت اور محبت ہے۔ ہم دونوں نے ہمیشہ تمہارا بھلا ہی سوچا ہے۔ اب بھی جو بات میں کہہ رہا ہوں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں، حالانکہ اس میں مجھے اندیشہ بھی ہے کہ تم برا نہ مان جاؤ۔ مجھے اس سارے معاملے میں کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی ہے۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے مسٹر جی کلارک کی نیت میں کوئی شبہ ہے مگر اتنی تاخیر؟ مسٹر کلارک ایک تیز رفتار شخص ہیں، دو ملٹی نیشنل کمپنیاں چلا رہے ہیں، وہ گھنٹوں اور منٹوں کی قدر و قیمت کو جانتے ہیں پھر وہ اتنی بڑی رقم کے اس معاملے کو اتنا لٹکا کیوں رہے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ الجھنے کی بات یہ ہے کہ نو دس ماہ گزرنے کے باوجود انہوں نے ابھی تک تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! آپ مجھے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں تو میں بھی آپ کو اپنے بڑے کی حیثیت دیتا ہوں۔ باپ کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا، کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ آپ کی ذات میں میں نے ایک باپ کی محبت تلاش کی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے، میری خاطر اور میری ہمدردی میں کہا ہے۔ میں نے اس کا بالکل برا نہیں مانا۔ جہاں تک مسٹر کلارک کا سوال ہے، میں ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ اس معاملے میں تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن۔۔۔"

"میں جانتا ہوں شاہ جہاں کہ تمہیں کلارک پر بے حد بھروسا ہے۔" ساہی صاحب نے میری بات کاٹی "لیکن یہ معاملہ صرف تمہارا نہیں ہے، اس میں تمہارے دو ساتھی برابر کے حصے دار ہیں، اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں جن

ایک دم بوڑھے اور کمزور دکھائی دیے۔ غالباً پچھلے ایک مہینے میں وہ جن کڑی آزمائشوں سے گزرے تھے انہوں نے ساہی صاحب کو نڈھال کردیا تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ میں اس چاردیواری میں ہر طرح محفوظ ہوں۔

کئی روز بعد میں نے شیو کی۔ نہایا دھویا اور صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ اس دوران میں میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس کوئی موجود ہے اور چپکے چپکے مجھے دیکھ رہا ہے۔ دو آنکھیں۔۔۔ دو پراسرار آنکھیں مسلسل میرا جائزہ لے رہی ہیں۔ میں اسے اپنا واہم بھی قرار دے سکتا تھا مگر میری چھٹی حس نے مجھے اکثر درست بات ہی بتائی تھی۔ یہ کوئی خاص میری ہی بات نہیں تھی۔ ایک عام شخص کو بھی جب اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ کوئی اسے خاموشی سے دیکھ رہا ہے تو وہ خود کو بے چین محسوس کرنے لگتا ہے۔

نہا دھو کر میں نشست گاہ میں پہنچا تو وہاں ساہی صاحب میرا انتظار کررہے تھے۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ یہ کھانے کا وقت تھا لیکن شاید ہم دونوں کی بھوک ہی اڑی ہوئی تھی۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کیا اس کوٹھی میں آپ کے علاوہ بھی میرا کوئی جاننے والا موجود ہے؟"

ساہی صاحب نے اس بات کا جواب نفی میں دیا اور پوچھا "تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی دماغ میں بات آئی تھی۔" میں نے کہا۔

ساہی صاحب نے مختصراً مجھے بتایا کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچے۔ شنکر کی ٹانگ راہوالی نامی گاؤں کے میلے میں ٹوٹی تھی۔ اس کے بعد ساہی صاحب کو یقین ہوگیا تھا کہ میں کہیں راہوالی کے آس پاس ہی موجود ہوں۔ پولیس لائن میں ان کے ایسے مخلص اور انتہائی بااعتماد دوست موجود تھے جن کے لیے ساہی صاحب کا کہا حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان دوستوں نے اعلیٰ حکام کے علم میں لائے بغیر ساہی صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور شیخوپورہ کے آس پاس کے علاقے میں میری تلاش جاری تھی۔ آج صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ جب میں نادر جگی کے ڈیرے سے چھپا وغیرہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر نکلا تو سادہ لباس میں پولیس کے ایک چوکس اہلکار نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے وائرلیس کے ذریعے فوراً شیخوپورہ اطلاع کردی۔ اتفاقاً ساہی صاحب بھی اس وقت شیخوپورہ میں ہی تھے وہ فوراً وہاں سے روانہ ہوگئے۔ راستے میں جس شخص نے چھپا سے بلک بانا پوچھا تھا اور جسے چھپا نے ماں بہن کی گالیاں دینا شروع کردی تھیں، وہ دراصل وہی پولیس اہلکار

تھا جس نے مجھے پہچاننے کے بعد ساہی صاحب کو وائرلیس کی تھی۔ کچھ تاخیر کے ساتھ جب ساہی صاحب اپنی فورس کے ساتھ ہاکی پنڈ پہنچے تو شنکر کے ساتھ راہول نوبار وغیرہ کے ساتھ ہماری فائرنگ شروع ہو چکی تھی اور وہ لوگ ہمارے گرد گھیرا تنگ کرچکے تھے۔ ساہی صاحب نے بروقت مداخلت کی اور وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، بعد کے واقعات مجھے معلوم ہی تھے۔

مجھ سے زیادہ ساہی صاحب تجسس کا شکار تھے، وہ میری روئداد سننا چاہتے تھے اور سب سے زیادہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں نے پکڑے جانے والے دیگر افراد یعنی چھپا اور بھولا وغیرہ کے سامنے ڈراما کیوں کیا ہے۔

میں نے اب تک کی ساری روداد ساہی صاحب کو سنائی، حوالدار فیض کی قربانی سے لے کر کمانی ساز عورت شاہدہ تک اور شیخ عاصم سے لے کر کن ٹٹے بدمعاش نادر جگی تک سب کچھ ساہی صاحب کے گوش گزار کردیا۔ ساہی صاحب یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ دو دن پہلے سرہد پورہ میں وفاقی وزیر کا جلسہ میری کارروائی کی وجہ سے درہم برہم ہوا تھا۔ ساہی صاحب بولے "بظاہر تو وہ زیادہ اہم واقعہ نہیں تھا مگر اس کا نتیجہ بڑا دوررس نکلا ہے۔ دو سیاسی گروپوں میں پہلے سے موجود کشیدگی ایک دم بہت بڑھ گئی ہے۔ سنا ہے کہ سرگودھا میں بھی ایک جلسے میں سانپ چھوڑے جانے کا واقعہ ہوا ہے۔ یہ واقعہ یقیناً دوسری پارٹی نے کیا ہے۔۔۔۔"

میں نے کہا "مجھے اس سارے معاملے کی جڑیں گہری نظر آرہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جو اتفاقاً ہاتھ آیا ہے۔ ممکن ہے میرا اندازہ غلط ہو لیکن یہ صحیح بھی ہوسکتا ہے اور ہم اس چھوٹے بدمعاش نادر جگی کے ذریعے کسی بہت بڑے ہیوی ویٹ بدمعاش تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

ساہی صاحب نے ایک گہری سانس لی "یہ سب تو چلتا ہی رہے گا، کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"کیا مطلب جناب؟"

"تمہارا رقیب شیخ عاصم، تم اچھی طرح جانتے ہو دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت شیخ کے پاس بڑی فراوانی سے موجود ہے۔ اس نے پچھلے ایک سال میں یہاں پاکستان میں اپنا اثر و رسوخ بہت بڑھایا ہے۔ وہ اکثر اسلام آباد جاتا رہتا ہے اور وہاں کے بورو کریسی میں بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ بڑی بے تابی سے تمہاری پاکستان واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہے کہ تمہاری آمد کے ساتھ

ہی اس نے اپنی ڈوریاں ہلائی ہیں اور تمہارے گرد گھیرا بہت تنگ کردیا ہے۔ یقین کرو شاد جہاں! یہ سب کچھ اب میرے بس میں بھی نہیں رہا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے میری ملاقات ہو اور میں تمہیں بتاسکوں کہ تم سے تمام زہر ہمدردی کے باوجود میں کتنا بے بس ہو چکا ہوں۔"

میں نے نظر بھر کر ساہی صاحب کو دیکھا اور دل پر گہری چوٹ لگی۔ وہ کچھ نہ بھی بتاتے تو ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میرے لیے انہوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے، بہت مشکلات جھیلی ہیں۔ مگر وہ میری خاطر جہاں بھی گئے تھے وہاں ان سے پہلے شیخ عاصم کا اثر و رسوخ پہنچ چکا تھا۔ اعلیٰ افسران نے یہ جاننے کے باوجود کہ بدنام محکمے کا یہ انسانی نیک نام بندہ جو کہہ رہا ہے درست ہے، ان کی بات پر اعتبار نہیں کیا تھا اور یہ سب کیوں تھا، صرف اس لیے کہ ساہی صاحب ایک دیانت دار پولیس ملازم تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حصص نہیں تھے۔ شیخ عاصم کی طرح ان کے بحری جہاز نہیں چلتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجارتی مراکز میں پلازے کھڑے نہیں کر رکھے تھے اور جس کے پاس یہ سب کچھ نہیں تھا، وہ سچا ہوتے ہوئے بھی شیخ عاصم کے سامنے جھوٹا تھا، وہ غزالہ ہوتی، میں ہوتا یا ساہی صاحب ہوتے۔

ساہی صاحب کے چہرے پر رنج و الم کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ سگریٹ ان کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا مگر وہ شاید اسے بھی بھول چکے تھے۔ مجھے لگا جیسے وہ ابھی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ دیں گے "شاہ جہاں! اب مجھ سے یہ بوجھ مزید نہیں اٹھائے جاتے۔ مجھے اب معاف کردو۔ میری اور اپنی اس ملاقات کو اب آخری ملاقات بنادو۔ میں شفقا اور انجم کی حفاظت کی ذمے داری سے بھی سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو میں ان دونوں کو تمہارے حوالے کردیتا ہوں۔"

بہرحال یہ الفاظ ساہی صاحب کی زبان پر آئے نہیں، شاید آ ہی نہیں سکتے تھے۔ ذمے داریوں کے بوجھ تلے دب کر ساہی صاحب کا دم تو گھٹ سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ایسا کلام نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "کئی دفعہ بات میرے ذہن میں آتے آتے رہ گئی ہے۔ میں تم سے دفینے کے نوادرات اور دیگر سامان کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ان کا کیا بنا ہے؟"

میں نے کہا "آپ جانتے ہی ہیں، میں نے انڈیا میں ہی سارا سامان مسٹر جی کلارک کے حوالے کردیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ان تمام اشیاء کو کیش کی شکل میں لائیں گے اور

جونہی یہ کام مکمل ہوا ہمیں بتادیں گے۔"

"کیا ابھی تک کام مکمل نہیں ہوا؟" ساہی صاحب نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے پتا چلا تھا کہ بیشتر نوادرات بک چکے ہیں مگر شاید ابھی کچھ چیزیں باقی ہیں۔"

"شاید کا کیا مطلب۔" ساہی صاحب پھر چبھتے لہجے میں بولے "کیا مسٹر کلارک نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ ایک اتفاق ہی ہے جناب کہ ماریطانیہ میں دو تین ملاقاتوں کے باوجود مسٹر کلارک سے اس بارے میں بات نہیں ہو سکی۔"

ساہی صاحب نے ایک گہری سانس لی اور بولے "شاد جہاں! میرے لیے تم بیٹوں کی طرح ہو۔ میری بیٹی فریال کے دل میں بھی تمہارے لیے بے پناہ عزت اور محبت ہے۔ ہم دونوں نے ہمیشہ تمہارا بھلا ہی سوچا ہے۔ اب بھی جو بات میں کہہ رہا ہوں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں، حالانکہ اس میں مجھے اندیشہ بھی ہے کہ تم برا نہ مان جاؤ۔ مجھے اس سارے معاملے میں کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی ہے۔ خدانخواستہ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے مسٹر جی کلارک کی نیت میں کوئی شبہ ہے مگر اتنی تاخیر۔۔۔؟ مسٹر کلارک ایک تیز رفتار شخص ہیں، دو ملٹی نیشنل کمپنیاں چلا رہے ہیں، وہ گھنٹوں اور منٹوں کی قدر و قیمت کو جانتے ہیں پھر وہ اتنی بڑی رقم کے اس معاملے کو اتنا لٹکا کیوں رہے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ الجھنے کی بات یہ ہے کہ نو دس ماہ گزرنے کے باوجود انہوں نے ابھی تک تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! آپ مجھے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں تو میں بھی آپ کو اپنے بڑے کی حیثیت دیتا ہوں۔ باپ کا سایہ بچپن میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا، کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ آپ کی ذات میں میں نے ایک باپ کی محبت تلاش کی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے، میری خاطر اور میری ہمدردی میں کہا ہے۔ میں نے اس کا بالکل برا نہیں مانا۔ جہاں تک مسٹر کلارک کا سوال ہے، میں ان پر پورا اعتماد رکھتا ہوں۔ اس معاملے میں تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن۔۔۔"

"میں جانتا ہوں شاد جہاں کہ تمہیں کلارک پر بے حد بھروسا ہے۔" ساہی صاحب نے میری بات کاٹی "لیکن یہ معاملہ صرف تمہارا نہیں ہے، اس میں تمہارے دو ساتھی برابر کے حصے دار ہیں، اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں جن

کا تعلق صرف تمہاری ذات سے ہی نہیں ہے۔"

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ تم مسٹر کلارک سے ملو۔ ان سے بات تو کرو۔ کچھ پتا تو چلے کہ نوادرات کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم تم تک کب پہنچے گی۔"

"آپ تو جانتے ہیں کہ میں دو تین ہفتے دیہاتی علاقے میں رہا ہوں۔ مجھے یہاں کے حالات کا زیادہ علم نہیں۔ آپ ہی بتائیں کہ مسٹر کلارک کہاں مل سکتے ہیں۔"

"دیکھو اب تمہارے اسی سوال میں الجھن موجود ہے۔ مسٹر کلارک تمہارے ساتھ ہی برطانیہ سے پاکستان آئے تھے مگر دو تین دن بعد ہی وہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ کر اسلام آباد سے نجانے کہاں پرواز کر گئے۔ ممکن ہے کہ وہ تمہارے ہی چکر میں پھر رہے ہوں لیکن صورت حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ائرپورٹ سے تمہارے تینوں کے گرفتار ہونے کے بعد مسٹر کلارک نے اسلام آباد میں صفدر اور زریں کی رہائی کے لیے کچھ اعلیٰ عہدے داروں سے ملاقاتیں کی تھیں' بہرحال ان ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ اب تک سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ۔" بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے تھوڑا سا توقف کیا' پھر فقرہ دہراتے ہوئے بولے "یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام آباد میں شیخ عاصم نے جو ملاقاتیں کی ہیں' انہوں نے مسٹر کلارک کی ملاقاتوں کا اثر ضائع کر دیا ہو۔"

میرے اور ساہی صاحب کے درمیان اس اہم ترین موضوع پر دیر تک بات ہوتی رہی۔ ساہی صاحب کا موقف یہ تھا کہ شیخ عاصم اپنی طاقت کے بل بوتے پر مجھے جن قانونی اور غیر قانونی جکڑوں میں پھنسا رہا ہے ان سے نکلنے کے لیے مجھے بے شمار روپے کی ضرورت ہوگی' ورنہ میں عاصم کی چکی کے دو پاٹوں یعنی دولت اور اثر و رسوخ کے درمیان پس کر رہ جاؤں گا۔ ساہی صاحب چاہتے تھے کہ میں مسٹر کلارک سے ملوں اور انہیں بتاؤں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس وقت اپنی رقم کی اشد ضرورت ہے۔ ساہی صاحب نے غیر محسوس طور پر مجھے یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ مجھے اس طرح مسٹر کلارک پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا' اور اگر میں نے کر ہی لیا ہے اور اس معاملے میں خاطر خواہ تاخیر بھی ہو چکی ہے تو اب مجھے مزید ڈھیلا نہیں پڑنا چاہیے۔

میں نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا "میں آپ کی باتوں سے پوری طرح متفق نہیں ہوں جناب! لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں کلارک صاحب سے ملوں تو اس کے لیے مجھے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ کلارک صاحب کہاں ہیں۔"

"میں اس سلسلے میں تمہیں ایک چھوٹا سا سراغ دے سکتا ہوں۔" ساہی صاحب نے کہا "اسلام آباد میں ایک ایسی لڑکی موجود ہے جو ہمیں مسٹر کلارک کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتی ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"ایک امریکن ہے' اس کا نام کرسٹی ہے۔ میں مسٹر کلارک کے بارے میں تمہارے جذبات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا لیکن حقیقت واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ پچھلے ہفتے کی شام اسلام آباد پولیس نے ایک سفید فام لڑکی کو شکر پڑیاں کے قریب بہت تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے روکا۔ وہ نشے میں تھی۔ اس نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ بدتمیزی کی اور انہیں بتایا کہ وہ کون ہے۔ اس کے بیان کے مطابق وہ مسٹر جی کلارک کی ہونے والی بیوی تھی۔ تمہیں سن کر حیرانی ہوگی کہ لڑکی کی عمر صرف اٹھارہ انیس برس تھی۔ بعد ازاں چند منٹ کے اندر کچھ توپ قسم کے لوگوں کی سفارشیں آئیں اور پولیس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر لڑکی کو چھوڑ دیا۔ وہ لڑکی اس وقت بھی اسلام آباد کے گولڈ ہوٹل میں موجود ہے۔"

"گولڈ ہوٹل؟ یہ نام میں پہلی بار سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نیا ہوٹل ہے لیکن تیزی سے مقبول ہوا ہے۔ لاہور اور کراچی میں بھی یہ کام کر رہا ہے۔"

میں نے بھی لاہور میں گھومتے ہوئے ایک دو جگہ گولڈ ہوٹل کے نفیس ہورڈنگ دیکھے تھے۔

میں نے موضوع کی طرف واپس آتے ہوئے کہا "ساہی صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ لڑکی نے نشے میں دعویٰ کیا کہ وہ مسٹر جی کلارک کی ہونے والی بیوی ہے۔ اس کا یہ بیان ہمارے کس کام آ سکتا ہے؟"

"اس کا یہ بیان بہرحال اس بات کا ثبوت ہے کہ لڑکی مسٹر کلارک کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہے اور اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ میری تحقیق کے مطابق اس واقعے کے دو روز بعد مسٹر کلارک بڑی رازداری سے گولڈ ہوٹل پہنچے تھے اور انہوں نے تین گھنٹے اس سوئٹ میں قیام کیا تھا جہاں وہ کرسٹی نامی لڑکی ٹھہری ہوئی ہے۔"

مجھے ایک اور ذہنی دھچکا لگا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ ہوا ہے شاہ زماں! میں اب بھی مسٹر کلارک کے کردار پر کسی طرح کا شک نہیں کر رہا ہوں' اور اگر کوئی ایسی

بات ہے بھی تو یہ مسٹر کلارک کا نجی معاملہ ہے۔ مسٹر کلارک جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں یہ کوئی ایسی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں غرض اس بات سے ہونی چاہیے کہ مسٹر کلارک سے ہماری ملاقات ہو جائے اور دفینے کے حوالے سے ہمیں اصل صورت حال کا پتا چل جائے۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "آپ نے کب معلوم کیا کہ وہ لڑکی اسی گولڈ نامی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے؟"

"آج صبح۔ فیصل آباد جانے سے پہلے میں نے اسلام آباد فون کیا تھا۔"

"اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور طریقہ؟"

"کراچی میں مسٹر جی کلارک کی مشہور فرم وائٹ اسٹار کا ریجنل آفس ہے۔ وہاں کے انچارج سے دریافت کیا جا سکتا ہے لیکن توقع نہیں ہے کہ وہ لوگ معلومات دینے پر آمادہ ہوں گے۔"

"آپ مجھے وہاں بات تو کرنے دیں۔"

"ٹھیک ہے تم کوشش کر کے دیکھ لو۔ پندرہ بیس دن پہلے اسلام آباد میں مسٹر کلارک نے جن لوگوں سے ملاقاتیں کی تھیں ان کے نام بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔"

رات کا باقی حصہ ہم نے اسی تگ و دو میں گزارا کہ مسٹر کلارک سے رابطہ ہو سکے مگر ناکامی ہوئی۔ کم از کم چار جگہ میں نے بھی فون کیا مگر کہیں سے مثبت جواب نہیں ملا۔ میں فون کرتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ کہیں "ٹیپ" وغیرہ کا سلسلہ نہ ہو' تاہم ساہی صاحب نے مجھے پوری تسلی دی اور بتایا کہ ان رہائش گاہ کی طرح یہاں کا فون بھی مکمل طور پر "رسک فری" ہے۔ اگلے روز بھی میں نے کوشش جاری رکھی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ساہی صاحب میرے پاس آئے۔ ان کا با اعتماد مستعد اور وفادار سب انسپکٹر شجاعت رانا بھی ان کے ساتھ تھا۔ ساہی صاحب نے کہا "سچ پوچھو تو تمہیں اس دور دراز دیہہ سے تلاش کرنے میں سب سے اہم کردار شجاعت نے ہی ادا کیا ہے۔ یہ پورے ایک ہفتے سے شیخوپورہ میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ بے چارے کے چھوٹے بھائی کی شادی تھی۔ نکاح میں شرکت کے لیے صرف دو تین گھنٹے کے لیے شیخوپورہ سے واپس آیا تھا پھر بھاگ دوڑ میں لگ گیا تھا۔"

شجاعت کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بلکہ وقت سے جانتا تھا جب وہ نیا نیا اے ایس آئی ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ شخصیت پر ناموں کا اثر ہوتا ہے۔ شجاعت کے سلسلے میں بھی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ دلیر شخص تھا۔

مختصر گفتگو کے بعد شجاعت باہر چلا گیا۔ ساہی صاحب نے مجھ سے پوچھا "اب ان نقلی شہروں چیتوں کا کیا کرنا ہے' ان میں سے دو نے تو رات کو رونا بھی شروع کر دیا تھا۔"

ساہی صاحب کا اشارہ اشرف چیتا اور بھولا وغیرہ کی طرف تھا۔ میں نے پوچھا "انہیں آپ نے رکھا کہاں ہے؟"

"دو تین کمرے چھوڑ کر ان کا کمرا ہے۔ دیکھنے میں حوالات جیسا ہی لگتا ہے۔ میرا خیال ہے ان کمبختوں کو ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں ہیں۔"

ساہی صاحب نے ہمیں یہاں لاتے ہوئے واقعی بڑی احتیاط کی تھی۔ نہ صرف چیتے اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی بلکہ احتیاطاً ساہی صاحب نے میری آنکھوں پر بھی مفلر بندھوا دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہ مسلم ٹاؤن کی ایک کوٹھی ہے۔

میں نے کہا "انہوں نے میرے بارے میں کچھ پوچھا ہے؟"

"ہاں سویرے وہ کالے رنگ کا پہلوان پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا' اس کی چمڑی ادھیڑ دی ہے' دوپہر کے بعد تمہاری باری آئے گی۔ وہ سب ہاتھ جوڑنے لگے اور منت سماجت کرنے لگے۔"

میں نے کہا "جناب! میں چاہتا ہوں کہ میرا جو "امیج" ان کے ذہن میں بنا ہے وہ برقرار رہے۔ وہ مجھے رحیم یار خاں کا رہائشی بنیاں راؤ ہی سمجھتے رہیں۔ میں ایک بار ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

"اسی حلیے میں؟"

"نہیں جی' حلیہ تو کل والا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں اسی کیچڑ آلود شلوار قمیص میں اشرف چیتے سے ملنے جا رہا تھا۔ جسم پر گرم چادر تھی' مفلر میں نے سر پر لپیٹ لیا تھا۔ سب انسپکٹر شجاعت نے مجھے بازو سے پکڑا تھا۔ ایک لمبوترے کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ کمرے کے دروازے کو چائنا کا تالا لگا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر آہنی گرلیں تھیں۔ گرلوں کے ساتھ بھولا' چیتا' ٹیڈی اور ان کے دیگر ساتھی مسکین صورتیں بنائے کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر شجاعت نے قفل کی چابی نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نجانے کیوں ایک بار پھر مجھے یہ پراسرار احساس ہوا کہ

کوئی میرے آس پاس موجود ہے اور میری ہر ہر حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس چار دیواری میں کہیں دو آنکھیں تھیں جو مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

شجاعت نے دروازہ کھولا اور مجھے زور سے اندر دھکیل کر دروازہ پھر سے بند کردیا۔ بھولا اور نیڈی وغیرہ گرل کے پیچھے سے سب انسپکٹر شجاعت کو دیکھ رہے تھے۔ بھولا ہاتھ جوڑ کر بولا "ہم سے بے شک ہماری اولاد کی قسم لے لیں جی' ہم بے گناہ ہیں۔ ہم میں سے کسی نے گولی چلائی بھی ہے تو صرف اپنی جان بچانے کے لیے چلائی ہے۔ ہم ایسا نہ کرتے تو جندرے (بدمعاش) کے بندے ہمیں مار ڈالتے۔"

سب انسپکٹر زہریلے لہجے میں بولا "زندہ تو ہم بھی نہیں چھوڑیں گے۔ زندہ رہنے کا بس ایک ہی راستہ ہے' سب کچھ صاف صاف بک دو۔ کس کس سے جگا ٹیکس لے رہے ہو' کہاں کہاں ڈکیتیاں کی ہیں اور اس کنجری رانو کا بھی اتا پتا بتاؤ جو تمہارے گرو نادر جلی کے ساتھ لاپتا ہوئی ہے۔"

"ہمیں کچھ معلوم نہیں سرکار' جب ہم باکی پنڈ آئے تو رانو اور نادر صاحب ڈیرے پر ہی تھے۔"

"اب نہیں ہیں اور جہاں ہیں' وہاں کا پتا تمہیں ہے۔"

سب انسپکٹر چلا گیا تو وہ سب میرے گرد جمع ہوگئے۔ میں نے رو دینے والے لہجے میں اشرف چھیا سے کہا "پہلوان جی! مجھے ان ظالموں سے بچاؤ۔ انہوں نے مار مار کر میری ہڈیاں پولی کردی ہیں۔ یہ پولیس والے نہیں جانتے' لیکن تم تو جانتے ہو' میں نے ایک گولی نہیں چلائی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بندہ تمہارے ہاتھوں سے مرا ہے۔ آخر تم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ نہ بولو اپنی جان بچانے کے لیے۔"

چھیا ان سارے پھوسڑ غنڈوں میں سے قدرے دلیر تھا۔ اس نے ابھی تک خود کو حوصلے میں رکھا ہوا تھا' میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے سرگوشی کی "دیکھو' میں نے جو کچھ کیا ہے ڈر کر نہیں کیا بلکہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ تم اس کام میں نئے نئے آئے ہو۔ تمہارے کھاتے میں کوئی چھوٹی بڑی واردات نہیں ہے۔ دیکھنا تم ایک دو پیشیوں میں ہی چھوٹ جاؤ گے۔ جب ہمارا وکیل' جج کے سامنے کہے گا کہ تم نے اپنی جان بچانے کے لیے گولی چلائی تو جج فوراً مانے گا اور پھر جب تم چھوٹ کر باہر آؤ گے تو نادر صاحب کی نظر میں تمہاری عزت بہت زیادہ بڑھ چکی ہوگی۔"

"لیکن میرے گھر..."

"لیکن کو چھوڑ یار۔" چھیے نے تیزی سے میری بات کاٹی "ہم نے تجھے زیادہ دیر اندر رہنے ہی نہیں دینا ہے۔ بس میرے باہر نکلنے کی دیر ہے' تم نے بھی میرے پیچھے پیچھے آجانا ہے۔ بس تو لمبے چکر میں نہ پڑنا۔ سیدھا سیدھا اقبال کرلے کہ بندوق تیری ہے اور گولی تو نے اپنی جان بچانے کے لیے چلائی تھی۔"

میں چھیے کی باتیں سن رہا تھا اور دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ بڑے بھونڈے طریقے سے مجھے قتل کیس میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ میرا ہمدرد بھی بن رہا تھا۔ اس نے مجھے نرا کاٹھ کا الو سمجھ لیا تھا۔ اس حوالے سے ہمارے درمیان آدھ پون گھنٹا سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ چھیے کے ساتھیوں نے بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق چھیے کی مدد کرتے ہوئے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر چھیا مطمئن نظر آنے لگا کہ میں وہی کچھ کروں گا جو مجھ سے کہا گیا ہے۔ قریباً دو گھنٹے بعد سب انسپکٹر شجاعت مجھے "تفتیش" کے لیے پھر لبوترے کمرے سے باہر لے گیا۔

نشست گاہ میں ساہی صاحب بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا "شاہ جہاں! تم کپڑے بدل لو' میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔"

"کیسی بات؟"

"ہم اسلام آباد چلتے ہیں اور اس لڑکی کرسٹی سے ملتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم مسٹر کلارک سے ملاقات میں کامیاب رہیں گے۔"

"لیکن جائیں گے کس طرح؟ آپ جانتے ہیں میری تلاش ہو رہی ہے؟"

"اس کا انتظام بھی ہوگیا ہے۔ یہاں سے ایک لاش پولیس کی تحویل میں راولپنڈی لے جائی جارہی ہے۔ جس ایمبولینس میں لاش جائے گی تم بھی اس میں جاؤ گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ راستے میں کسی طرح کی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ میں بائی ایئر اسلام آباد پہنچ جاؤں گا۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد یہ پروگرام طے ہوگیا۔ میں نے ساہی صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے حلیہ بدلنے کے لیے کچھ ضروری چیزیں لادیں۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ریڈی میڈ میک اپ کا سامان موجود رہتا ہے کیونکہ اکثر اوقات پولیس اہلکاروں کو خوانچہ فروش' خاکروب اور نشئی وغیرہ کا روپ دھار کر ملزمان کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ میرے کہنے پر ساہی صاحب نے ایک گھنٹے کے اندر کچھ ضروری چیزیں مجھے لادیں۔ ان میں مونچھوں کے علاوہ' ناک میں پھنسانے والے اسپرنگ' چشمہ اور بالوں کا رنگ

وغیرہ شامل تھا۔ ان چیزوں کی مدد سے میں نے اپنا حلیہ تھوڑا بہت تبدیل کرلیا۔ اب اگر مجھے طائرانہ نظر سے دیکھا جاتا تو میں کھچڑی بالوں والا ایک پچاس پچپن سالہ شخص نظر آتا تھا۔ بہرحال غور سے دیکھنے والا مجھے پہچان بھی سکتا تھا۔

پانچ بجے کے قریب وہ ایمبولینس آگئی جس میں لاش اسلام آباد لے جائی جارہی تھی۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ یہ ایک سیاسی کارکن کی لاش ہے۔ آج صبح ہی اسے نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے اس وقت گولی ماردی جب وہ اپنی پارٹی کی ایک کارنر میٹنگ میں شرکت کے لیے جارہا تھا۔ ساہی صاحب کی باتوں سے پتا چلا کہ شہر میں تخریبی کارروائیاں معمول سے زیادہ ہوگئی ہیں اور مختلف سیاسی گروپوں کے درمیان کشیدگی بھی بڑھ رہی ہے۔

ایمبولنس کے ذریعے اسلام آباد روانہ ہونے سے پہلے میں نے ساہی صاحب کے سامنے ایک بار پھر حوالدار رفیق کا ذکر کیا اور انہیں بتایا کہ اس نے میری خاطر اپنے لیے کتنے زیادہ خطرات مول لیے ہیں۔ ساہی صاحب نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی اور کہا کہ وہ سب انسپکٹر شجاعت کے ذریعے حوالدار سے رابطہ کرتے ہیں اور اس کی مشکلات کا حل سوچتے ہیں۔ ساہی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے بھی آدھ گھنٹا پہلے اشرف چھیا اور بھولا وغیرہ کو پولیس اسٹیشن منتقل کروایا ہے اور ان کی گرفتاری ڈال دی ہے۔

ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ میں بذریعہ ایمبولینس لاہور سے اسلام آباد روانہ ہوا ایمبولنس کے پچھلے حصے میں میں دو ہیڈ کانسٹیبلز کے ساتھ موجود تھا۔ لاش ہمارے درمیان تھی۔ راوی کے پل پر سے گزرتے ہوئے راوی کے پانی کو دیکھا اور دل سے ہوک سی اٹھی۔

شام کے ڈھلتے سورج میں اس راوی کے کنارے غزالہ کا ہاتھ تھام کر ٹہلنا میرا ایک دیرینہ خواب تھا۔ یہ خواب اور ان جیسے دوسرے خواب مجھ سے بہت دور تھے' پتا نہیں انہیں کبھی شرمندہ تعبیر بھی ہونا تھا یا نہیں۔ ساہی صاحب کی باتوں سے معلوم ہوا تھا کہ غزالہ اپنے والدین کے گھر میں ہے۔ ساہی صاحب نے گلبرگ میں ان کے گھر کے گرد پولیس گارڈ لگوادی تھی اور سادہ لباس میں بھی دو تین اہلکار ہمہ وقت گھر کے اردگرد موجود رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اہلکار ڈرائیور کے روپ میں گھر کے اندر بھی موجود رہتا تھا۔ غزالہ کی والدہ یعنی چچی فاخرہ عارضۂ قلب کی مریضہ تھیں' مجھے اندیشہ تھا کہ اگر بھڑکے ہوئے داماد یعنی شیخ عاصم کی طرف سے انہیں زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تو کہیں ان کا چل

چلاؤ ہی نہ ہو جائے۔ چچا جلیس اور چچی فاخرہ نے کبھی میری یہ بات دل سے تسلیم نہیں کی تھی کہ شیخ عاصم حقیقت میں ان کا داماد نہیں بلکہ ان کی بیٹی کا اغوا کنندہ ہے لیکن اب جبکہ شیخ عاصم بالکل کھل کر سامنے آچکا تھا یقیناً وہ دونوں بھی عرق ندامت میں نہا رہے تھے۔ اب میرے دل میں کبھی کبھی یہ موہوم امید جاگتی تھی کہ شاید میری زندگی کو طوفانوں کے حوالے کرنے کے بعد اور مجھے برسوں ناقابل برداشت اذیت پہنچانے کے بعد چچی کے سنگلاخ دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ میری خاطر نہ سہی اپنی بیٹی کی خاطر سہی۔

ہم قریباً ساڑھے دس بجے رات راولپنڈی پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق ایمبولنس نے مجھے مری روڈ پر ایک جگہ اتار دیا۔ یہاں ساہی صاحب پہلے ہی سے پرائیویٹ کار میں موجود تھے۔ وہ مجھے سیدھے اسلام آباد لے گئے اور گولڈ ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچا دیا۔ گولڈ ہوٹل کی عمارت چار منزلہ تھی۔ یہ ہوٹل میری توقع سے زیادہ خوب صورت اور اعلیٰ پائے کا تھا۔ عمارت میں توسیع کی بھی خاصی گنجائش رکھی گئی تھی۔ راستے میں ہی یہ طے ہوگیا تھا کہ ساہی صاحب گاڑی میں موجود رہیں گے جبکہ میں کرسٹی سے ملنے ہوٹل کے اندر جاؤں گا۔

شیشے کے آٹومیٹک دروازے سے گزر کر اور پگڑی پوش دربان کا سلام وصول کرکے میں ریسپشن پر پہنچا۔ ایک خوب صورت اینگلو انڈین لڑکی نے اسنا لٹش انداز میں خوش آمدید کہا اور مجھ سے وجہ نزول پوچھی "میں کرسٹینا فوسٹر سے ملنا چاہتا ہوں' سوئٹ نمبر ۸۰۸۔" میں نے کہا۔

استقبالیہ پر موجود لڑکی نے کاؤنٹر سے نیچے کسی ایکسٹرا ٹک پینل کو دیکھا اور بولی "ویری ساری سر! ہم فی الحال انہیں ڈسٹرب نہیں کرسکتے۔"

"لیکن یہ ارجنٹ ہے۔ مس کرسٹینا یعنی کرسٹی سے میرا ملنا بہت ضروری ہے۔"

"ویری ساری سر! ہم گیسٹ کی ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔"

میں نے تھوڑی سی تکرار کی تو اسسٹنٹ منیجر وہاں پہنچ گیا۔ وہ خشک مزاج سا شخص تھا۔ اس نے دو ٹوک لہجے میں مجھے بتایا کہ ہم صبح تک اپنے گیسٹ کو ڈسٹرب نہیں کرسکتے۔ لہٰذا مجھے واپس جانا ہوگا یا لابی میں بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔

میں سٹپٹایا ہوا لابی میں جا بیٹھا۔ ابھی دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ قسمت نے زور مارا۔ ہیڈ ویٹر بھاگتا ہوا آیا۔ اس

نے کہا "سر! آپ ذرا ایک منٹ تشریف لائیے۔"

میں استقبالیہ پر پہنچا تو ریسپشنسٹ لڑکی نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف کرسٹی ہی تھی' دراصل کسی ضرورت کے تحت اس نے خود ہی روم سروس کو فون کیا تھا۔ روم سروس والوں نے اسے بتایا تھا کہ کوئی شخص اس سے ملنے کے لیے بیٹھا ہوا ہے۔

"ہیلو۔" نیند میں ڈوبی ہوئی سی ایک کم سن آواز ابھری۔

"ہیلو مس کرسٹی! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے نام سے نہیں جانتیں مگر میرے خیال میں ماریطانیہ' شاہ جہاں اور دفینے وغیرہ کا حوالہ کافی ہوگا۔"

ایک دم یوں لگا جیسے کرسٹی کی آواز سے خمار غائب ہوگیا ہے۔ اس نے پوچھا "آپ اکیلے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا' وہ بولی "ریسیور متعلقہ شخص کو دیجئے۔" میں نے ریسیور استقبالیہ پر موجود لڑکی کو دے دیا۔

چند ہی لمحوں بعد میں ہیڈ ویٹر کی معیت میں دوسری منزل پر واقع سوئٹ نمبر ۲۰۸ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ذہن بدستور سوچ بچار میں موجود تھا۔ ساہی صاحب نے کل مسٹر کلارک کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ مسلسل ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ مجھے اب بھی مسٹر کلارک پر مکمل بھروسا تھا مگر جب ساہی صاحب' عالم فرہنگی' صفدر اور دیگر افراد کی باتوں کا سوچتا تھا تو دل چند لمحوں کے لیے ڈانواں ڈول سا ہو جاتا تھا۔ اس نو عمر لڑکی کے معاملے نے بھی ذہن کو الجھا رکھا تھا۔

انہی سوچوں میں گم میں راہداری کے دبیز قالین پر چلتا ہوا سوئٹ نمبر ۲۰۸ میں پہنچا اور کرسٹی کو پہلی بار دیکھا۔ دل و دماغ کی حیرانی کچھ اور بڑھ گئی۔ کرسٹی بمشکل اٹھارہ انیس کی نظر آتی تھی۔ وہ شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لچک دار لباس میں تھی۔ ٹراؤزر اور آدھی آستین کے شرٹ نما لبادے میں سے اس کے جسمانی خدوخال واضح تھے۔ اس کے سنہری بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے اور خوب صورت نیلی آنکھوں میں خمار سا تھا۔ اس خوب رو لڑکی کی آنکھوں میں مجھے ایک ایسی چمک نظر آئی جو میں نے اکثر نہایت جذباتی اور غیر معمولی ارادے کے مالک لوگوں میں دیکھی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے یہ لڑکی جذباتی اور جسمانی طور پر اپنی اصل عمر سے تین چار برس آگے ہے۔ اس کے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا اوپر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد کرسٹی نے مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھا پھر اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی

"تو آپ شاہ جہاں کے حوالے سے ملنے آئے ہیں؟" میں نے معمولی تذبذب کے بعد اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی "بہت خوب! یعنی آپ اپنے حوالے سے ہی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"پہلے میں نے سمجھا تھا کہ شاید آپ مسٹر شاہ جہاں کے بڑے بھائی ہیں لیکن اب یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ ہی شاہ جہاں ہیں۔ آپ نے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر رکھی ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔"

"بہت شکریہ اگر تم نے پہچان لیا' ورنہ آج کل کوئی کسی کو کہاں پہچانتا ہے۔"

"یہ بات عام لوگوں کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن مشہور چہروں کو تو لوگ پہچان ہی لیتے ہیں۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کبھی کسی فلم یا ڈرامے میں کام نہیں کیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"فلم کا تو میں نہیں کہہ سکتی مگر ڈراما تو آپ اب بھی کر رہے ہیں۔"

وہ خاصی حاضر جواب تھی۔ اس نے مجھ سے ڈرنک کا پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے اپنے لیے گلاس میں تھوڑی سی سرخ شراب انڈیلی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں بھید بھری تھیں۔ کہنے لگی "اس سے پہلے آپ کو نہیں دیکھا مگر لگتا ہے کہ مدتوں سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جانتی ہوں۔ دراصل کلارک سے اتنا ذکر سنا ہے آپ لوگوں کا کہ سب کچھ دماغ پر نقش ہو گیا ہے۔ آپ کا ساتھی صفدر بہت دلیر اور کمال کا نشانے باز شخص ہے مگر افسوس ایک زیادتی کے نتیجے میں وہ آپ سے بچھڑ گیا ہے پھر ایک بختون زریں گل ہے۔ وہ بھی بے حد دلچسپ اور دلیر شخص ہے' پھر ایک پراسرار فقیر سائیں جلال ہے' کہا جاتا ہے وہ مخفی قوتوں کا مالک ہے اور ناقابل فہم طور پر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔"

"تمہاری معلومات واقعی وسیع ہیں مس کرسٹی۔"

"ابھی آپ نے کچھ سنا ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے اطمینان سے بیٹھ کر سنیں گے۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "فی الحال تو میں مسٹر کلارک کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں' مجھے ایک اخباری خبر سے پتا چلا تھا کہ مسٹر کلارک یہاں گولڈ ہوٹل میں آپ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے سوچا شاید آپ سے کوئی سراغ مل جائے۔"

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا کہ یہاں آگئے۔ لل۔

لیکن۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی' پھر بولی "کلارک سے میری آخری ملاقات کوئی بارہ دن پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں۔ اگر وہ اسلام آباد میں ہوتے تو مجھ سے ملنے ضرور آتے۔"

وہ مسٹر کلارک کا نام یوں لے رہی تھی جیسے اپنے ہم عمر کا نام لیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں کی عمروں میں کم از کم ۳۵ سال کا فرق تھا۔

وہ عجیب سی لڑکی تھی۔ شراب نے اسے کچھ اور بھی عجیب کر رکھا تھا۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی مجھ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے امریکا سے ہزاروں میل دور اپنے کسی محلے دار سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے۔ وہ بڑی بے باکی سے مسٹر کلارک کی باتیں کرنے لگی "بے شک ہماری عمروں میں فرق ہے لیکن پیار کا عمر سے بھلا کیا تعلق۔ مسٹر شاہ جہاں پیار تو ایک ایسے خود رو پودے کا نام ہے جو کسی بھی جگہ کسی بھی وقت اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں بھی پھوٹ سکتا ہے کلارک میرے آئیڈیل ہیں اور وہ مجھ سے پیار بھی بہت کرتے ہیں' بس کسی کسی وقت ان پر اپنی رانائی اور بڑائی جتانے کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں مجھے مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے' لیکن یقین مانو ان کی مار پیٹ میں بھی محبت اور مزہ ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیں میرے بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے' چھ سات دن پہلے بس اتنی سی بات پر ناراض ہو گئے کہ میں نے کھلے گریبان کی شرٹ کیوں پہن رکھی ہے اور تیز شیڈ کی لپ اسٹک کیوں لگائی ہے۔ واکنگ اسٹک پڑی تھی' زور سے میرے بازو پر دے ماری۔ میں نے کہا بھی کہ سب کچھ آپ کی خوشی کے لیے ہی کرتی ہوں مگر اس وقت غصے میں انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ بعد میں خود ہی شرمندہ بھی ہو گئے۔ بہرحال ان کی شرمندگی بھی ان کے غصے کی طرح بڑی پیاری ہوتی ہے۔ میں ابھی آپ کو ان کے غصے والی ایک تصویر دکھاتی ہوں۔" وہ تصویر لینے کے لیے الماری کی طرف بڑھ گئی۔

یہ لڑکی کافی پیچ دار تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ بارہ روز سے اس نے مسٹر کلارک کو دیکھا نہیں' اب روانی میں کہہ گئی تھی کہ چھ سات دن پہلے مسٹر کلارک نے اس پر جسمانی تشدد کیا۔ وہ تصویر لے آئی۔ اس میں وہ مسٹر کلارک کے ساتھ قریباً ہم آغوش نظر آ رہی تھی۔ مسٹر کلارک کچھ خفا خفا سے تھے اور وہ وہسکی کا جام ان کے ہونٹوں سے لگا کر ان کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب تک کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ مسٹر کلارک کے ساتھ اس حسین و نوخیز لڑکی کا کوئی چکر ضرور ہے لیکن کس حد تک ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے جب کرسٹی نے تصویر نکالنے کے لیے الماری کی دراز کھولی تھی تو مجھے وہاں ایک دو زیورات بھی نظر آئے تھے۔ ایک نہایت قیمتی نیکلس جس میں کم از کم دس یاقوت اور ایک زمرد جڑا ہوا تھا مجھے نمایاں طور پر دکھائی دیا تھا۔ اس نیکلس کا اسٹائل اور بناوٹ دیکھتے ہی میرے دل نے گواہی دی کہ یہ اسی بیش قیمت دفینے کا حصہ ہے جو ہم نے چنے پل کی حویلی سے برآمد کیا تھا۔ اس دفینے کی وجہ سے ہم پر کیا کیا آفتیں ٹوٹی تھیں اور کیسے کیسے خونی مگرمچھوں سے ہمارا واسطہ پڑا تھا یہ کچھ ہم ہی جانتے تھے۔ کرسٹی کے پاس دفینے کے کسی زیور کا نظر آنا حیرانی کی بات نہیں تھی۔ ہم نے مسٹر کلارک کو اختیار دیا تھا کہ وہ اس دفینے کی اشیاء کو جیسے چاہیں فروخت کریں۔ مسٹر کلارک خود بھی نوادرات اور قدیم زیورات کے شیدائی تھے' یقینی بات تھی کہ انہوں نے بہت سی چیزوں کی قیمت ادا کرکے انہیں اپنے پاس بھی رکھ لیا ہوگا۔ غالباً یہ نیکلس بھی انہی اشیاء میں سے ایک تھا۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں اس شعلہ مزاج و آتش بدن لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے میں موجود تھا اور اس کے انوکھے پیار کی کہانی سن رہا تھا' جبکہ ایس ایس پی ساہی صاحب پارکنگ لاٹ میں گاڑی کے اندر سو کھ رہے تھے۔ مجھے ایک تصویر دکھانے کے بعد کرسٹی ایک پوری البم اٹھا لائی' اس البم میں نوے فیصد تصویریں کرسٹی اور مسٹر کلارک کی تھیں۔ کہیں وہ ایک ساتھ لیموزین گاڑی میں بیٹھے تھے' کہیں کسی عالیشان یورپی ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ کہیں باغ کی روش پر چہل قدمی کر رہے تھے۔

جب میں البم دیکھ رہا تھا کرسٹی نے کہا "ایکسکیوزمی! آپ البم دیکھیں۔ میں ابھی دو منٹ میں آئی۔"

وہ دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہوٹل کا لگژری سوئٹ تین کمروں اور ایک بالکونی پر مشتمل تھا۔ بالکونی سوئمنگ پول کی طرف تھی۔ یہ سب کچھ میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کرسٹی باہر نکل گئی تو فوراً میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ کوئی اہم فون کرنے گئی ہو۔ میں نے دروازے کے کی ہول میں سے جھانکا کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر تک میں دروازے کے پاس کھڑا سن گن لیتا رہا' یوں محسوس ہوا کہ ساتھ والے کمرے میں کوئی نہیں۔ میں نے آہستگی کے ساتھ دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اس دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس

کمرے سے آگے وہ شاندار بالکونی تھی جو سوئمنگ پول کی طرف کھلتی تھی۔ بالکونی کی دوسری جانب سوئٹ کا تیسرا کمرا تھا۔ میں ہمت کر کے بالکونی میں چلا گیا۔ اگر کرسٹی دیکھ بھی لیتی تو میں کہہ سکتا تھا کہ ہوٹل کی عمارت دیکھنے کے لیے بالکونی میں آیا ہوں۔ تیسرے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں تھوڑی دیر تذبذب میں رہا۔ یہ بڑی سیلانی سی لڑکی تھی' اگر میری کسی حرکت کی وجہ سے شک میں پڑ جاتی تو سخت رد عمل بھی ظاہر کر سکتی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے کی ہول سے آنکھ لگائی اور مجھے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں۔ کمرے میں ارب پتی مسٹر جی کلارک موجود تھے۔ وہی مسٹر کلارک جن کے متعلق کرسٹی نے ابھی چند منٹ پہلے بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد یا شاید پاکستان میں ہی نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھے۔ کرسٹی ان کے قریب جھکی ہوئی تھی اور سنسنی خیز انداز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

مسٹر کلارک نے کرسٹی کی بات کے جواب میں تیزی سے نفی میں سر ہلایا پھر انہوں نے کپڑے بدلنے شروع کر دیے۔ کرسٹی نے وارڈ روب میں سے ان کے جوتے نکال کر بیڈ کے قریب رکھ دیے اور جو سلیپر مسٹر کلارک نے اتارے تھے وہ الماری میں رکھ دیے۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ مسٹر کلارک کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ تو کیا وہ مجھ سے ملے بغیر یہاں سے جا رہے ہیں؟ یہ سوال جتنا تحیر خیز تھا اتنا ہی دل ہلا دینے والا بھی تھا۔

انسان کسی پر کتنا بھی بھروسا کرتا ہو لیکن ایک وقت ایسا آ سکتا ہے کہ اس کا بھروسا ڈانواں ڈول ہو جائے۔ شاید مجھ پر بھی ایسا ہی وقت آ رہا تھا۔ یہ آزمائش کا لمحہ تھا۔ ایسا لمحہ جو چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دے' میں تو پھر ایک انسان تھا۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے مسٹر کلارک پر اعتماد کیا تھا اور اب بھی کر رہا تھا۔

جب مجھے اندازہ ہوا کہ مسٹر کلارک اور کرسٹی کمرے سے نکلنے والے ہیں' میں تیزی سے درمیان والے کمرے میں واپس آ گیا۔ اگر مسٹر کلارک چاہتے تو میری نگاہوں میں آئے بغیر بھی اس سوئٹ سے نکل سکتے تھے۔ ایک نسبتاً چھوٹا دروازہ بالکونی کے اندر سے بھی ہوٹل کی راہداری میں کھلتا تھا۔ میرا دل جیسے سینے کے بجائے میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھا کہ مسٹر کلارک مجھ سے ملتے ہیں یا ملے بغیر چلے جاتے ہیں۔ شواہد کی طرف دیکھتا تھا تو ستر فیصد امکان اس بات کا نظر آتا تھا کہ وہ مجھ سے ملیں گے نہیں۔ وہ اسی سوئٹ میں موجود تھے مگر کرسٹی نے ان کی موجودگی سے انکار کیا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ میں نے مسٹر کلارک کے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی لیکن کوئی اس کمرے میں داخل نہیں ہوا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا' مسٹر کلارک بالکونی والے دروازے کی طرف سے جا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے۔ صرف ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آئی کہ باہر نکل کر مسٹر کلارک کو روکوں' لیکن پھر میں نے مسٹر کلارک کو روکنے کے بجائے اپنے خیال کو روک لیا۔ میرے دل کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "مسٹر کلارک ایسے نہیں ہیں' مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ اگر بھروسا کیا ہے تو پھر آخر تک بھروسا کرو۔ ہو سکتا ہے کہ مسٹر کلارک کی کوئی ناگزیر مجبوری ہو جس کی بنا پر وہ سامنے نہ آنا چاہتے ہوں۔"

بہرحال وہ طوفانی لمحہ گزر گیا۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اسی جگہ بیٹھا رہا جہاں کرسٹی مجھے بٹھا کر گئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس کمرے میں آ گئی "سوری مسٹر شاہ جہاں! میں ذرا لیٹ ہو گئی۔ آپ نے البم دیکھی؟"

"ہاں' بڑی اچھی تصویریں ہیں۔"

"ہم اچھے لوگ ہیں تو تصویریں کیوں اچھی نہیں آئیں گی۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہو اگلے مہینے ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔"

"پیشگی مبارک باد۔۔۔! ویسے مسٹر کلارک سے ملاقات ہو جاتی تو اس خبر کی خوشی دوبالا ہو جاتی۔"

"وہ کہیں ایک جگہ ٹکتے ہوں تب ہے نا۔ لنچ امریکا میں تو شام کی چائے کینیڈا میں لیکن ایک بات ہے' دور ہو کر بھی وہ مجھ سے دور نہیں ہوتے۔"

"ہاں جی۔ یہ بات تو ہے۔ جس سے محبت ہو وہ ہزاروں میل دور بھی ہو تو لگتا ہے کہ ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہے۔"

وہ مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ دیر تک اپنے ناخنوں کی پالش کو گھورتی رہی پھر بولی "کافی پئیں گے آپ؟ اس ہوٹل کی کافی اپنی مثال آپ ہے۔"

"لیکن اس وقت۔۔۔"

"کافی کا کوئی وقت نہیں ہوتا اور اچھی کافی تو کسی بھی وقت پی جا سکتی ہے۔ آئیں چلیں' نیچے اسنیک بار میں چل کر پیتے ہیں' کیونکہ کافی کا مزہ اسی وقت آتا ہے جب پورے اہتمام سے پی جائے۔"

چارو ناچار میں اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا "بس دو منٹ' میں ذرا کپڑے بدل لوں۔" وہ تیزی سے وارڈ روب کھولتے ہوئے بولی۔

خواتین کی عادت کے مطابق اس نے دو منٹ کی جگہ پورے دس منٹ لگائے۔ اس دوران میں میرے ذہن میں کھلبلی مچی رہی۔ ایک طرف مسٹر کلارک پر میرا اٹل اعتماد تھا۔ دوسری طرف وہ ساری نصیحتیں تھیں جو اس حوالے سے مجھے ساہی صاحب نے کی تھیں اور میرے دوسرے خیر خواہ بھی کرتے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ میں دو مختلف اطراف میں کھنچا جا رہا ہوں' اسی اثنا میں کرسٹی لباس بدل کر آ گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کی نوخیزی ایک نئی نویلی تلوار کے مانند تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ شب خوابی کے ہیجان خیز لباس میں ہی رہتی۔ اس نے ایک اسکرٹ جیسا لبادہ پہنا تھا۔ اس کے شانے بازو اور شانوں سے نیچے سامنے اور پیچھے کی طرف جسم کا بہت سا حصہ عریاں تھا۔

یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اتنی رات کو صرف میرے ساتھ کافی پینے کے لیے بیڈ روم سے نکل آئی ہے۔ کہیں یہ کرسٹی کی کوئی چال تو نہیں تھی؟ پچھلے ایک گھنٹے میں یہ بات بڑی اچھی طرح ثابت ہو گئی تھی کہ وہ ایک تیز طرار لڑکی ہے اور موقع پڑنے پر جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔ کیا وہ پھر کوئی جھوٹ بول رہی تھی۔ بہرحال ایک بات اطمینان کی تھی اور وہ یہ کہ کرسٹی میرے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں تر نوالہ نہیں ہوں۔ اگر اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے میرے ساتھ اونچ نیچ کی تو میں اس کا بڑا تسلی بخش جواب دے سکتا ہوں۔

ہم دونوں سوئٹ نمبر ۴۰۸ سے باہر نکلے اور تیسری منزل پر واقع اس اسنیک بار کی طرف چل دیے جہاں کرسٹی کے بقول ہمیں اسلام آباد کی سب سے بہترین کافی پینا تھی۔ اعشاریہ ۴۴ کا ایک کولٹ پسٹل میری جیکٹ کے اندر موجود تھا اور میں اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا مگر یہ پسٹل استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ جونہی ہم ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے عجیب سی صورت حال کا سامنا ہوا۔ اس ہال نما کمرے میں تاریکی تھی۔ ڈور کلوزر کے ذریعے دروازہ بند ہو گیا تھا' لہٰذا باہر سے بھی روشنی اندر نہیں آ رہی تھی "یہ کہاں آ گئے ہم؟" میرے منہ سے نکلا۔

جواب میں ایک دم ہال کمرا روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ ہال کمرے کا منظر دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ دو قطاروں میں تقریباً چودہ افراد میری دونوں جانب موجود تھے۔ یہ سب ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ تھے۔ وہ بڑے مودب انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں ہوٹل کے منیجر کے علاوہ وہ اسسٹنٹ منیجر بھی دکھائی دے رہا تھا جس نے استقبالیہ کاؤنٹر پر میرے ساتھ بڑی خشکی سے بات کی تھی۔ ہمیں پچیس فٹ کے فاصلے پر مجھے اپنے عین سامنے مسٹر جی کلارک نظر آئے۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھے۔ ان کے سفید بال ہمیشہ کی طرح بڑے سلیقے سے سر پر جمے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر مجھے عجیب سا تبسم اور روشنی نظر آئی۔ میں نے گھوم کر کرسٹی کی طرف دیکھا' اس کے احمریں ہونٹوں پر بھی دبی دبی مسکان تھی۔ ہوٹل کا ادھیڑ عمر منیجر آگے بڑھا اور اس نے تازہ گلابوں کا ہار میرے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا "ویلکم سر! ہم آپ کو آپ کے اس ہوٹل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

"آپ کو آپ کے ہوٹل میں۔" منیجر کے الفاظ کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے دیکھا کہ مسٹر کلارک اور کرسٹی سمیت سب تالیاں بجا رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا ہال تالیوں سے گونجنے لگا تھا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا جب مسٹر کلارک آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

گرم جوشی سے گلے ملنے کے بعد وہ پیچھے ہٹے اور مجھے اس خوب صورت میز تک لے گئے جہاں ایک فریش کریم کیک ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ میں نے حیران لہجے میں کہا "جناب! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ یہ منیجر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔"

"بھئی اس نے کوئی مشکل بات تو نہیں کہی ہے۔ بس تمہیں' تمہارے ہوٹل میں خوش آمدید ہی کہا ہے نا۔"

"مجھے۔۔۔ میرے ہوٹل میں؟"

"ہاں تمہارے ہوٹل میں اور یہ صرف ایک ہوٹل نہیں ہے' گولڈ ہوٹلز کی چین ہے۔ لاہور اور کراچی میں یہ ہوٹل کام شروع کر چکے ہیں' فیصل آباد میں بھی جلد افتتاح ہونے والا ہے۔ خیر یہ باتیں اور اس طرح کی دوسری باتیں تو ہوتی ہی رہنی ہیں۔ فی الحال تم اپنی پہلی آمد کی خوشی میں یہ کیک کاٹو۔" کلارک صاحب نے خوشی سے بھرپور آواز میں کہا۔

وہ تقریباً کھینچ کر مجھے میز تک لے گئے اور چھری ہاتھ میں پکڑوا کر کیک کٹوایا۔ کرسٹی میرے بائیں جانب کھڑی تھی پھر ایک بار مختصر ہال تالیوں سے گونجا۔ اسسٹنٹ منیجر میرے پاس آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ رکھے تھے۔ جھک کر مسکین لہجے میں بولا "میری معذرت قبول کیجیے جناب! میں

نے آپ کے ساتھ گستاخی سے بات کی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے رسمی انداز میں کہا۔ ذہن میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔

منہ میٹھا کرنے کے بعد مسٹر جی کلارک کے اشارے پر سب رخصت ہو گئے۔ صرف مسٹر کلارک اور کرسٹی کھڑے رہ گئے پھر کرسٹی بھی چلی گئی۔ مسٹر کلارک مجھے لے کر ایک بغلی کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بہت خوبی سے سجایا گیا تھا۔ میں نے کہا "جناب! میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔ یہ سب کیا سرپرائز ہے۔"

"یہ بالکل سرپرائز ہی ہے لیکن جس طرح میں یہ سرپرائز دینا چاہتا تھا ویسے نہیں ہو سکا پھر بھی کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔" انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر خوشی سے بھرپور آواز میں بولے "گولڈ ہوٹل کی چین تمہاری ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں یہ ہوٹل کام شروع کر چکے ہیں، فیصل آباد میں ابھی کچھ دیر ہے۔ تمہارے یہ ہوٹل بڑی تیزی سے مقبولیت اختیار کر رہے ہیں اور ہوٹل انڈسٹری میں ان کا مقام بننا شروع ہو گیا ہے۔"

میں حیرت میں گم سن رہا تھا۔ کلارک صاحب ایک ضخیم فائل اٹھا لائے۔ یہ ایک پلازہ نما عمارت کا کنسٹرکشن پلان تھا۔ کلارک صاحب نے بتایا کہ یہ عمارت کراچی کے صنعتی علاقے میں تعمیر ہو رہی ہے۔ کسی قابل انجینئر نے اس عمارت کے درجنوں نقشے مختلف زاویوں، بغلوں اور پہلوؤں سے تیار کیے تھے اور انہیں اس فائل کی شکل دے دی تھی۔

مسٹر کلارک کہہ رہے تھے "اس میں اتنی حیران ہونے کی بات بھی نہیں ہے شاہ جہاں۔۔۔ اور نہ ہی یہ میرا کوئی احسان ہے تم لوگوں پر۔ یہ جو کچھ بنا ہے تمہارے ہی روپے سے بنا ہے۔ ہاں میں نے اتنا ضرور کیا ہے کہ اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تم سے پوچھے بغیر تمہاری رقوم کو کچھ کاموں میں لگا دیا ہے۔ دراصل شاہ جہاں! تمہارے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تین سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران میں تم نے میرے بارے میں کئی تجزیے کیے ہوں گے، اسی طرح میں نے بھی ایک تجزیہ کیا ہے اور وہ یہ کہ تم ایک تعلیم یافتہ بے حد باصلاحیت اور باہمت شخص ہو لیکن جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے، تمہیں اس کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں اور نہ ہی دلچسپی ہے۔ یہ اکنامکس کا اصول ہے کہ رقم کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو اگر وہ حرکت میں نہیں رہے گی تو ختم ہوتی چلی جائے گی۔ اس کو ہم سرمایے کی سرکولیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی اصول کو سمجھتے ہوئے میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔"

میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا جناب! کہ میں آپ کی باتوں کے جواب میں کیا کہوں۔"

"چلو تم کچھ نہ کہو، بس سنتے رہو۔"

مسٹر جی کلارک اٹھے۔ انہوں نے چابی لگا کر ایک دراز کھولی اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دے دیا۔ اس لفافے میں دو بینکوں کی چار پانچ کیش ڈپازٹ رسیدیں تھیں۔ اس کے علاوہ دونوں بینک کی اکاؤنٹ سٹیٹمنٹ بھی تھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ میرے اکاؤنٹس میں کتنی رقم جمع ہے۔ ایک اکاؤنٹ میں قریباً اسی لاکھ کا ڈپازٹ تھا، دوسرے اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم کا ہندسہ ایک کروڑ سے اوپر تک جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کئی لاکھ کے بیئرر سرٹیفکیٹ اور پرائز بانڈز وغیرہ تھے۔

کلارک صاحب نے کہا "شاہ جہاں! یہ ساری وائٹ منی ہے۔ بالکل صاف شفاف اور بے داغ۔ تم اس کو بیچ چوراہے کے بھی رکھ دو تو کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ پاکستان کے قانون کے مطابق ان فنڈز کے ASSETS میں سے حکومت کا شیئر مکمل حساب کتاب کے ساتھ نکال دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے اسٹیٹ بینک میں جو رقوم جمع کرائی گئی ہیں ان کی رسیدیں اس سبز فائل میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ متعلقہ محکمے سے کلیئرنس کا سرٹیفکیٹ بھی لیا گیا ہے۔ انکم ٹیکس اور دیگر ٹیکسوں کے واجبات بھی کلیئر ہیں۔ تھوڑی بہت ASSESSMENT ابھی باقی ہے لیکن وہ روٹین ورک ہے، چلتا ہی رہتا ہے۔ ان سارے معاملات کے لیے ایک نہایت قابل وکیل ہائر کر لیا گیا ہے، تمہیں یا تمہارے ساتھیوں کو ٹیکسیشن کے حوالے سے اگر کوئی مسئلہ پیش آئے گا تو وہ اسے مناسب ترین طریقے سے حل کرے گا۔"

انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "کروڑ پتی بننا اتنا مشکل نہیں شاہ جہاں! جتنا کروڑ پتی بنے رہنا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم کروڑ پتی بنے رہو۔ بلکہ اس سے آگے جاؤ۔ بہت آگے۔"

اسی دوران میں فون کی مدھم سی گھنٹی بجی۔ یہ فون سنگاپور سے تھا۔ مسٹر کلارک اپنے کسی کاروباری دوست کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ مجھے وہ نازک لمحہ یاد آ رہا تھا جو ابھی ایک گھنٹا پہلے کرسٹی کے سوئٹ میں مجھ پر گزرا تھا۔ وہ ایک کڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ میں نے مسٹر کلارک کو بالکونی کے ساتھ والے کمرے میں دیکھ لیا تھا، اور مسٹر کلارک مجھ سے ملے بغیر کہیں جا رہے تھے۔ مسٹر کلارک پر میرا غیر متزلزل اعتماد ایک لمحے کے لیے

صرف ایک لمحے کے لیے ڈانواں ڈول ہوا تھا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ ہاں وہ کڑی آزمائش تھی اور میں خوش تھا کہ اس آزمائش میں کامیاب رہا تھا۔ مسٹر کلارک کے بارے میں جو میں نے سوچا تھا وہ درست ثابت ہوا تھا اور جو میرے کچھ ساتھیوں نے سوچا تھا وہ درست ثابت نہیں ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ میں نے مسٹر کلارک کے اندر کے شخص کو دوسروں سے بہتر جانا تھا۔

اس کارخانۂ قدرت میں ہر چیز اور ہر کیفیت کی اہمیت ہے۔ خاموشی بھی ایک ایسی ہی کیفیت ہے۔ کبھی ایک لمحے کی خاموشی انسان کو تختۂ دار پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی اس کے سر پر تاج سجا دیتی ہے۔ یہ خاموش لمحہ کبھی انسان کو ذلت کے غار میں دھکیل دیتا ہے اور کبھی اسے بہت بڑی ذلت اور مصیبت سے بچا لیتا ہے۔ میں نے بھی اپنے دل کی بات نہ مان کر ایک لمحے کی خاموشی اختیار کی تھی اور اس خاموشی نے مجھے اپنے بہت بڑے محسن اور خیر خواہ کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

فون پر گفتگو ختم کر کے مسٹر کلارک پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے بینک کے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہارے نئے اکاؤنٹس کھلوانے کے لیے تمہارے دستخطوں کی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے تمہارے انہی اکاؤنٹس سے کام چلایا ہے جو پہلے سے موجود تھے۔ ان دونوں بینکوں کے منیجر حضرات تم سے ملنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے بے چین ہیں۔"

"یہ رات اپنے اندر میرے لیے واقعی بے پناہ حیرتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے شوخ و چنچل کرسٹی سے ملاقات ہوئی ہے اور اب آپ نے یہ ڈھیر سارے انکشافات فرما دیے ہیں۔" میں نے کہا۔

مسٹر کلارک کے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے اپنے ملائم کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "کرسٹی بہت پہلے سے جانتی تھی کہ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ماربلانیے سے پاکستان آنے کے بعد میں مسلسل یہیں ہوں، یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ اس دوران میں میں صرف دو دن کے لیے پاکستان سے باہر گیا تھا۔ پچھلے تین روز سے میں یہیں اسی سوئٹ میں موجود ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب اچانک کرسٹی نے مجھے تمہاری آمد کی اطلاع دی تو مجھے جھٹکا لگا۔ میں اس وقت سوئٹ کے ہی ایک دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے فوراً لباس بدلا اور تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے نیچے آ گیا۔"

اس کے بعد مسٹر کلارک نے مجھ سے اب تک کی صورتحال دریافت کی۔ میں نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ تھانے سے اپنے فرار سے لے کر ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی پناہ گاہ تک میں نے سب کچھ مسٹر کلارک کے گوش گزار کر دیا۔

مسٹر کلارک نے کہا "شاہ جہاں! تم نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ شیخ عاصم کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے اور اب وہ پہلے کی طرح خطرناک نہیں رہا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ عداوت سے باز نہیں آئے گا۔ بہرحال جو بھی ہے، اب خدا کے کرم سے حالات وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ اب اس کا مقابلہ بے سروساماں شاہ جہاں سے نہیں۔ اب تمہاری حیثیت اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ تم اب خم ٹھونک کر اس کے مقابل آ سکتے ہو۔ قانونی، معاشی، جسمانی ہر طرح کی جنگ اس سے لڑ سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں ان مادی وسائل کے بغیر بھی تم نے شیخ عاصم کے سامنے کہیں کمزوری نہیں دکھائی تھی مگر مادی وسائل کی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے شاہ جہاں۔" ایک لمحہ توقف کر کے وہ بولے "اس کے علاوہ بھی تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے شاہ جہاں۔ یوں سمجھو کہ عاصم کی ناک میں نکیل ڈالنے کے لیے میں نے اپنے طور پر بھی کچھ کیا ہے۔ میں پاکستان سے باہر اسی سلسلے میں گیا تھا۔ اس کی تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

مسٹر کلارک قیمتی سگار سلگاتے ہوئے پھر گویا ہوئے "میں جانتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں ایک سوال بار بار ابھر رہا ہو گا۔ جو ذخیرہ اب تک ملا ہے اس میں تم تین حصے دار تھے۔ یعنی ان ASSETS میں تمہارے علاوہ صفدر اور زرینہ گل کا حصہ بھی ہے۔ میں تمہیں آج یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ان دونوں کا حصہ بھی "ہارڈ کیش" کی صورت میں میرے پاس موجود ہے۔ یہ رقم اس وقت پاکستان میں ہونی چاہیے تھی لیکن میری لیگل ایڈوائزری کے مطابق اس میں ایک دو قانونی دشواریاں ہیں۔ بہرحال جس وقت صفدر اور زرینہ چاہیں گے میں صرف ۴۸ گھنٹے کے نوٹس پر یہ رقوم پاکستان لے آؤں گا۔ ممکن تھا کہ میں قانونی دشواری دور کر کے یہ رقوم بھی تمہاری رقم کی طرح پاکستان لے آتا لیکن تمہاری رقم کو میں نے جس طرح یہاں اپنی مرضی سے پھیلایا ہے شاید ان دونوں کی رقوم کو نہ پھیلا سکتا۔"

"میں سمجھا نہیں جناب؟"

وہ بولے "وہ دونوں بھی مجھے تمہاری ہی طرح عزیز ہیں لیکن جتنا اختیار میں تم پر رکھتا ہوں شاید ان دونوں پر نہیں رکھتا۔ یہ ان دونوں کی رقوم ہیں' میں چاہتا ہوں کہ وہ انہیں اپنی مرضی اور صوابدید کے مطابق ہی استعمال کریں۔"

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں جناب۔ اور اگر میں شرمندہ ہو رہا ہوں تو وہ دونوں تو یقیناً پانی پانی ہو جائیں گے۔ آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا ہے یہ کوئی بہت اپنا ہی کر سکتا ہے۔ آپ ہر لحاظ سے بہتر سوچنے کی پوزیشن میں ہیں' اس لیے صوابدید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس بات کے جواب میں ان دونوں کے خیالات بھی سوفیصد یہی ہوں گے۔"

مسٹر کلارک نے کہا "خیر آپ ہمیں ان دونوں کے خیالات جاننے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے قانونی مشاورت کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ امید ہے کہ اگر کوئی اور کیس نہ بنا تو چند پیشیوں میں ہی ان کی ضمانتیں ہو جائیں گی۔"

کلارک صاحب ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھے اور الماری میں سے ایک دوسری فائل نکالی انہوں نے فائل میرے سامنے رکھ دی۔ یہ فائل قریباً ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل تھی۔ یہ دراصل ان تمام نوادرات اور زیورات وغیرہ کی ایک طویل فہرست تھی جو میں نے انڈیا میں مسٹر کلارک کے حوالے کیے تھے۔ گندھارا آرٹ اور منی ایچرز وغیرہ کے جو نمونے ایک قومی اثاثے کے طور پر محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دینے کے لیے علیحدہ کیے گئے تھے۔ ان کا اندراج بھی فہرست کے ایک خانے میں موجود تھا۔ مکمل فہرست کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یہ نہایت مفصل اور جامع فہرست تھی۔ لگتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس فہرست سے خارج نہیں کی گئی۔ ہار کی چین' انگوٹھی کا نگ' چاندی کا ناقابل شناخت ٹکڑا اور ایسی بے شمار چھوٹی چھوٹی اشیا بھی فہرست میں شامل تھیں۔ اس سے آگے درج تھا کہ یہ چیز کیسے بکی' آکشن میں' نمائش میں یا کسی دوسرے طریقے سے۔ اس سے آگے چیز کی قیمت فروخت اور خریدار کا نام پتا وغیرہ درج تھا۔ میں نے چند صفحے پلٹ کر فائل بند کر دی۔ میں نے کہا "جناب! ابھی آپ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے ان معاملات کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں' لہٰذا بہتر ہے کہ فی الحال آپ یہ ساری دستاویزات اپنے پاس ہی رکھیں۔ میرے خیال میں تو جناب ان دستاویزات کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

کلارک صاحب بس مسکراتے ہی رہے۔ کہنے لگے "حساب تو حساب ہوتا ہے اور قریب ترین لوگوں میں بھی اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مجھے بس پریشانی اس بات کی تھی کہ تم سے ملاقات میں تاخیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تمہاری تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی لیکن دوسرے لوگوں کی طرف سے ڈر تھا کہ وہ کیا سوچیں گے۔ اتنے مہینے ہو گئے اور نوادرات کی رقم اٹکی ہوئی ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اب میرے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے۔ کیا مجھے فوری طور پر قانون کا سامنا کرنا چاہیے؟"

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولے "اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے۔ شیخ عاصم نے تمہیں پھنسانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ایک اور فوجداری کیس بھی تمہارے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی قانون کے سامنے آئے بغیر حالات کا جائزہ لیا جائے۔"

اس معاملے میں کچھ دیر تک ہم تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی اور کرسٹی اندر داخل ہوئی۔ کلارک صاحب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ گڑبڑا کر بولی "بس یونہی میں دیکھنے چلی آئی تھی' آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"بہت شکریہ۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" مسٹر کلارک نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی چھپاک سے واپس چلی گئی۔

کلارک صاحب گہری سانس لیتے ہوئے بولے "میرے خیال میں اس لڑکی نے تمہیں ضرور الجھن میں ڈالا ہو گا۔"

"جی ہاں۔ ان کی کچھ باتوں نے واقعی پریشان کیا۔"

"کچھ نہیں اس کی تو ساری باتیں ہارٹ اٹیک کرانے والی ہوتی ہیں۔ یہ میری جان کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں' امید ہے کہ کامیابی ہو جائے گی۔"

"اس نے کوئی بیان وغیرہ دیا تھا کہ یہ آپ کی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ سے شادی کرنے والی ہے۔"

"یہ اس سے بھی بڑے بڑے دعوے کر چکی ہے لیکن ان میں حقیقت کوئی نہیں۔ درحقیقت یہ بے حد موڈی اور تصورات میں رہنے والی لڑکی ہے۔ مجھے اپنا آئیڈیل قرار دیتی ہے۔ میں اسے کئی مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ وہ بے شک مجھے آئیڈیل بنائے لیکن اسی طرح جیسے اپنے سے کسی بڑے کو بنایا جاتا ہے۔ میں ہر لحاظ سے اس کا بزرگ ہوں اور اگر اس کے

ذہن میں میرے متعلق کوئی الٹی سیدھی بات ہے تو نکال باہر کرے۔ کیونکہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہے وہ کسی طور ممکن نہیں۔ ایسے میں وہ خودکشی کی دھمکیاں دیتی ہے اور ایک بار اس قسم کی حماقت کر بھی چکی ہے۔ تم جانتے ہی ہو شاہ جہاں! کہ میں نے شادی نہیں کی۔ میری شادی درحقیقت اپنے پروفیشن سے ہو چکی ہے اور یقین کرو اس حوالے سے میں نے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں کی۔ ممکن ہے کہ لوگ میرے بارے میں مختلف انداز میں سوچتے ہوں۔ کچھ مجھے رنگین مزاج سمجھتے ہوں۔ کچھ میری غیر شادی شدہ زندگی پر ترس کھاتے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے شاہ جہاں کہ عورت سے زندگی بھر دور رہنے کے باوجود مجھے کبھی عورت کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں اپنے آپ سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس قسم کی لڑکیاں اس سے پہلے بھی مجھے ڈسٹرب کرتی رہی ہیں مگر ان کو نظرانداز کرنے میں مجھے کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کرسٹی میں خاص بات یہ ہے کہ یہ بڑی حد تک جنونی بھی ہے۔ تم نے ابھی اس کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی دیکھی ہو گی' تمہیں پتا ہے یہ کیا ہے۔"

"اس کے بیان کے مطابق اس نے بھڑکیلے کپڑے پہن کر سرخی وغیرہ لگائی تھی جس پر آپ نے اسے مارا تھا۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ایسے ہی شوقیہ جھوٹ بولتی ہے۔ دراصل پرسوں رات اس نے شراب پی اور پھر چاقو کی نوک سے اپنے بازو کے گوشت میں میرے اور اپنے نام کے پہلے حروف کندہ کیے۔ اس قسم کی حرکات اس کے لیے روزمرہ کا معمول ہیں۔ میں اس کا نفسیاتی علاج بھی کروا رہا ہوں۔ پچھلے مہینے جب میں فلوریڈا میں تھا اس کی ماں اسے لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا کہ اسے مجھ پر پورا یقین اور بھروسا ہے' میں کرسٹی کو اپنے پاس رکھوں اور اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں۔ یہ نہ ہو کہ یہ کسی دن کوئی ایسا قدم اٹھا جائے جو سب کی بدنامی کا باعث بنے۔"

مسٹر کلارک کے ساتھ گفتگو طویل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ساری رات بھی بیٹھے رہتے تو یہ گفتگو شاید اختتام کی طرف نہ آتی۔ بے شمار سوال اور بے شمار جواب تھے۔ دوسری طرف مسٹر کلارک کا وقت قیمتی تھا اور میں بھی گاڑی میں ساہی صاحب کو سوکھتا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے مسٹر کلارک کو اپنا رابطہ نمبر دے دیا اور ان سے بھی درخواست کی کہ وہ مجھے نمبر دے دیں۔ مسٹر کلارک نے مجھے تین چار فون نمبرز دیے۔ سب سے اوپر گولڈ ہوٹل اسلام آباد کا نمبر ہی تھا۔ وہ بولے "اگلے سات آٹھ روز تک میں تمہارے ہوٹل میں ہی قیام پذیر ہوں۔"

"تمہارے ہوٹل" کے الفاظ نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ میں نے کہا "جناب! یقین کیجئے مجھے اب بھی یہ سب کچھ ایک سپنے کی طرح لگ رہا ہے۔"

"آہستہ آہستہ تمہیں یقین آ جائے گا اور یہ یقین بھی آ جائے گا کہ یہ ٹوٹنے والا سپنا نہیں ہے۔" مسٹر کلارک مسکرائے۔

میرے سامنے میز پر لاکھوں روپے کی ڈپازٹ سلپس پڑی تھیں اور میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنا روپیہ اور اتنی پراپرٹی میں کس کام میں لے آؤں گا۔ یہ حقیقت تھی کہ دفینے کے تیسرے حصے کی ملکیت حاصل ہوئے مجھے قریباً ایک سال ہونے کو آیا تھا لیکن اس ایک برس میں میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر یہ ساری رقوم مجھے مل گئیں تو میں ان کا کیا کروں گا۔

اب اس سرمائے کو اپنے سامنے دیکھ کر چھوٹی بڑی کئی خواہشوں نے ذہن میں سر اٹھایا تھا لیکن ان خواہشوں کا تعلق اپنی ذات سے ہرگز نہیں تھا۔ پہلا خیال تو صفدر کا ذہن میں آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دولت سے انسان ہر شے خرید سکتا ہے۔ کیا میں اس دولت سے صفدر کی آنکھیں خرید سکتا تھا؟ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے چہرے میرے ذہن کے پردے پر ابھرے تھے جن کے مسائل کا تعلق معاشیات سے تھا۔ نجانے کیوں ایک مدت بعد اٹک جیل کے پرسوز آواز والے قیدی نور محمد کا چہرہ بھی تصور میں ابھر آیا۔ وہ کسمپرسی کے عالم میں میری آنکھوں کے سامنے مرا تھا' اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی نور محمد اور اس کے لواحقین کا خیال میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا پھر ایک تازہ ترین چہرہ بھی میرے تصور میں ابھرا' یہ شاہدہ کے قریب المرگ شوہر کرم دین کا چہرہ تھا۔

اس وقت رات کے تین بجے تھے جب میں مسٹر کلارک سے رخصت ہوا اور لفٹ کی طرف بڑھا تاکہ ساہی صاحب کو ان کے طویل انتظار سے نجات دلواؤں۔ جب میں چار گھنٹے پہلے مسٹر کلارک کے پاس آیا تھا تو میرے پرس میں کل گیارہ سو روپے تھے اور یہ روپے بھی ساہی صاحب نے زبردستی میری جیب میں رکھے تھے' اب واپس جاتے ہوئے میں کروڑپتی تھا۔ میرے بینک اکاؤنٹس میں بھاری بھرکم رقوم جمع تھیں' میں گولڈ ہوٹل کے سلسلے کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ یہ کوئی معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ میں سبک رفتار' بے آواز لفٹ سے اترا ہی تھا کہ مجھے ساہی صاحب کا چہرہ نظر آیا۔ وہ

پریشانی کی کیفیت میں لفٹوں کی طرف ہی آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکے اور رک گئے۔

"خیریت تو ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ویسے تو خیریت ہے لیکن ایک بڑی مشکل صورت حال سامنے آئی ہے۔" ساہی صاحب نے عجلت میں سے کہا' پھر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ تک پہنچے تھے۔ راستے میں ہوٹل انتظامیہ کے دو تین افراد نے مجھے دیکھا اور بڑے ادب سے سلام کیا۔ ساہی صاحب اس وقت پریشانی میں تھے' ورنہ وہ یہ ضرور پوچھتے کہ مجھے اس طرح "پروٹوکول" کیوں دیا جارہا ہے۔ ہم آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ساہی صاحب نے سانسیں درست کرتے ہوئے کہا "اس شخص کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"کس شخص کے ساتھ؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

ساہی صاحب آگے کی طرف جھکے اور انہوں نے گاڑی میں موجود وائرلیس آن کردیا۔ دو سرخ بلب تیزی سے جلنے بجھنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کسی شخص کے بولنے کی آواز بھی آنے لگی۔ یہ شخص بھی یقیناً وائرلیس سیٹ کے سامنے ہی موجود تھا مگر وہ کافی فاصلے پر تھا لہٰذا اس کی آواز واضح طور پر ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کمرے کی گونج اور دوسرا شور بھی آواز میں شامل ہوگیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص اپنے وائرلیس سیٹ سے کم و بیش دس فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے تاہم لب و لہجے اور انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ اپنی فریاد دو تین بار دہرا کر وہ خاموش ہوگیا۔

"یہ کیا چکر ہے ساہی صاحب؟"

ساہی صاحب نے جواب میں مختصراً جو کچھ بتایا وہ اس طرح تھا۔ ساہی صاحب یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرتے کرتے بور ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی میں موجود وائرلیس سیٹ کو استعمال کرنا شروع کردیا۔ یہاں اسلام آباد اور راولپنڈی کی پولیس میں ان کے کئی دوست موجود تھے۔ انہوں نے کئی دوست احباب سے بات کی۔ جس آخری شخص سے انہوں نے بات کی وہ راولپنڈی پولیس کے ایک سینئر سپرنٹنڈنٹ جمشید غوری تھے۔ جمشید غوری سے ساہی صاحب کا رابطہ عجب انداز سے ہوا۔ کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور یوں لگا جیسے وائرلیس سیٹ کے اوپر سے مائیکرو فون کو اٹھایا نہیں گیا بلکہ کھڑکھڑایا گیا ہے۔ جمشید غوری کی آواز بھی کافی دور سے آرہی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس میں سے HELP ME کے الفاظ ساہی صاحب نے واضح طور پر سنے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جرائم پیشہ شخص نے جمشید صاحب کے گھر میں داخل ہوکر انہیں کرسی وغیرہ سے باندھ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وائرلیس سیٹ کے قریب آکر بات نہیں کرپا رہے ہیں۔ شاید انہوں نے وائرلیس سیٹ کو آن کرنے کے لیے کسی چھڑی وغیرہ کا سہارا لیا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ساہی صاحب کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی اور کو اس معاملے میں ملوث کرنے کے بجائے ہمیں خود ان کی مدد کو جانا چاہیے۔ اس کا گھر یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

ساہی صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم تیزی سے بڑی سڑک پر آگئے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ایک بڑی کوٹھی کے سامنے گیٹ پر کھڑے تھے۔ گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے کیبن میں سنتری بیدار موجود تھا مگر رات کے اس آخری پہر وہ بھی نیند کے جھونکوں میں تھا۔ اس سرکاری سنتری کی سرکاری رائفل اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ہم نے آواز دے کر اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور ہم نے سوالات کی بارش کردی۔ ساہی صاحب نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو اس نے کھٹاک سے سلیوٹ مارا اور ہمارے لیے گیٹ کے ساتھ بنا ہوا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" ساہی صاحب نے گرج کر پوچھا۔

"وہ اندر ہی ہیں جی۔"

"گھر کے باقی لوگ۔"

"وہ سب ایک شادی پر گئے ہوئے ہیں' ابھی تک واپسی نہیں ہوئی۔"

"چلو ہمیں اپنے صاحب کے کمرے میں لے چلو۔" میں نے کہا۔

"لیکن سر بات کیا ہے... خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے' تم اندر چلو۔"

باوردی سنتری لرز گیا۔ رہی سہی کسر یوں پوری ہوگئی کہ اس نے میرے ہاتھ میں ریوالور بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اندر معاملہ خراب ہے۔ ہم ذرا سی دیر میں پورچ میں پہنچے اور پھر اندرونی عمارت میں داخل ہوگئے۔ چاروں

طرف مکمل خاموشی تھی "صاحب کا کمرا کون سا ہے؟" میں نے سنتری سے پوچھا۔

اس نے سامنے ہی ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ساہی صاحب ذرا پیچھے رہے' میں ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر آگے بڑھا۔ دروازے کے ساتھ لگ کر سن گن لینے کی کوشش کی' اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ نہ چیخنے نہ بولنے کی۔ میں نے ہاتھ کی پشت سے دروازے پر مدھم دستک دی۔ اس دستک کے جواب میں بھی خاموشی ہی رہی۔

میرے اشارے پر سنتری نے اپنے صاحب کو دو تین بار پکارا اور ذرا زور سے دستک دی۔ یہ کوششیں بھی بیکار ہی ثابت ہوئیں۔

دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی گئی تھی۔ ساہی صاحب نے مشورہ دیا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہیے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر کندھے کی زوردار ضرب لگائی' چٹخنی اکھڑ گئی اور دروازہ کھل گیا۔ درمیانی عمر کا ایک صحت مند شخص سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کی عینک میز پر دھری تھی۔ وہ کرسی پر ہی ایک طرف کو جھک گیا تھا اور اس کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک وائرلیس سیٹ موجود تھا۔ وائرلیس سیٹ آن تھا اور اس میں سے شور کی آواز ابھر رہی تھی۔ میں اور ساہی صاحب لپک کر کرسی کے پاس گئے۔ یقیناً یہی شخص ایس ایس پی جمشید تھا۔ اس کے سینے کا زیروبم بتا رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔ اس کے گلے سے خرخر کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس شخص کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔

"جمشید۔" ساہی صاحب نے پکار کر کہا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"ٹھہریئے جناب!" میں نے ہاتھ بڑھا کر ساہی صاحب کو روک لیا۔

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا' مجھے ایک دو چیزیں الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا "آپ نے ایک بات نوٹ کی کہ ایس ایس پی صاحب کرسی سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔"

"ہاں... بندھے ہوئے تو نہیں ہیں۔" ساہی صاحب نے تائید کی۔

"تو پھر یہ اٹھ کر وائرلیس سیٹ تک کیوں نہیں گئے۔ دور ہی سے چیخ چیخ کر بات کرتے رہے کیا انہیں اٹھ کر چلنے میں دشواری پیش آتی تھی؟"

میرے ساتھ ساتھ ساہی صاحب بھی سوالیہ نظروں سے سنتری کی طرف دیکھنے لگے۔ سنتری بولا "نہیں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ صاحب جی چل سکتے ہیں۔ لیکن آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں جی۔ آپ صاحب جی کو اٹھائیں یا پھر ڈاکٹر کو یہاں بلائیں۔ یہ دل کے مریض ہیں۔ انہیں کچھ ہو ہی نہ جائے۔"

سنتری بے تابی سے آگے بڑھا تو میں نے باقاعدہ ہاتھ سے پکڑ کر اسے روک لیا۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا "یہ دیکھیں' یہ ہے وہ واکی ٹاکی جس کے ذریعے سے ایس ایس پی صاحب نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے وائرلیس سیٹ کو آن کیا اور پھر آپ تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کی لیکن سوال یہی ہے کہ وہ خود کرسی سے کیوں نہ اٹھے۔ جبکہ وہ اٹھ سکتے تھے۔"

میرے سوال میں موجود پُراسراریت نے ساہی صاحب کے ساتھ ساتھ سنتری کو بھی متاثر کیا۔ اس کی سفید سفید آنکھوں سے تحیر جھانکنے لگا۔

یہ بات تو صاف ظاہر تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک ایس ایس پی بالکل ٹھیک ٹھاک تھے اور تندرست آواز میں مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ اگر وہ ٹھیک ٹھاک تھے تو پھر اٹھ کر وائرلیس سیٹ کے قریب کیوں نہ چلے گئے یا دروازہ کھول کر باہر کیوں نہ نکل گئے' اور اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ وہ کس کے خلاف مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ بظاہر کوئی ایسا ثبوت نظر نہیں آیا تھا جس سے شک ہوتا کہ پچھلے ایک دو گھنٹے میں کوئی اس عمارت کے اندر داخل ہوا ہے۔

ساحر جمیل سیّد
راکھشس
ایک شیطان نونی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ بندہ بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سرکٹا جسم کس کا تھا؟ سلگتے انگاروں سے جنم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کربناک صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔
قیمت 125.00 روپے
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ جو شخص کرسی پر بیٹھا تھا وہ دل کے دورے کے زیر اثر تھا۔ اسے اسپتال پہنچائے جانے کی فوری ضرورت تھی لیکن دوسری طرف میرا ذہن شدید الجھن میں گرفتار تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر گڑبڑ نہیں تھی تو یہ شخص آزاد ہونے کے باوجود اس کمرے سے نکل کیوں نہیں گیا تھا۔

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" ساہی صاحب نے تیزی سے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے یہاں کوئی بوبی ٹریپ ہو۔ ہم آگے بڑھیں اور کوئی نقصان ہو جائے۔" میں نے جواب دیا۔

ساہی صاحب نے پُرتشویش نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ بوبی ٹریپ میں دھماکا خیز مواد بڑی ہوشیاری سے نصب کیا جاتا ہے۔ دھماکا خیز مواد کا تعلق کسی بھی چیز سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً دروازہ کھولنے سے، قالین پر پاؤں رکھنے سے، ٹیلی فون اٹھانے سے، غرض کسی بھی ایسے عمل سے "بلاسٹ" ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو ہمیں اپنے آس پاس کوئی ایسی شے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سنتری کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ دوبارہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور نوکر تھا اور اس کے علاوہ ایک لحیم شحیم نوجوان تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ لحیم شحیم نوجوان کرسی پر بے ہوش پڑے ایس ایس پی جمشید کا بیٹا تھا۔ وہ ڈاکٹری کے پانچویں سال میں تھا۔ اپنے والد کو اس حالت میں دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

وہ تیزی سے والد کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو ایک لمحے میں اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ "پیچھے ہٹو!" وہ چیخا "انہیں دل کا دورہ پڑا ہوا ہے۔" مجھے دھکیلتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

"پاپا... پاپا۔" اس نے دو تین بار والد کو جھنجوڑا پھر نوکر کے ساتھ مل کر انہیں اٹھانا چاہا۔

ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔ مجھے جیسے کسی نے اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا تھا۔ ساہی صاحب پہلے ہی دروازے سے باہر تھے، وہ بھی لڑھک کر پشت کے بل گر گئے تھے۔ چند ساعت کے لیے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا تھا۔ میں نے سر کو زور زور سے جھٹک کر حواس بحال کیے۔ کھڑکی کا ایک پٹ ٹوٹ کر برآمدے میں جا گرا تھا۔ اس پٹ کے پاس ہی ایک کٹا ہوا انسانی ہاتھ پڑا تھا۔

فطری ردعمل کے تحت میں نے خود کو ٹٹولا۔ میں صحیح سالم تھا۔ ایک بازو اور ایک ٹانگ پر بس ہلکی سی جلن ہو رہی تھی۔ میں نے لپک کر ساہی صاحب کو اٹھایا۔ وہ چونکہ کمرے سے باہر تھے اس لیے محفوظ رہے تھے۔ میں نے اپنی پنڈلی پر سے پتلون سرکائی۔ کوئی بڑا زخم نہیں تھا۔ کچھ بارودی ریزے اڑ کر لگے تھے جن کی وجہ سے خون رسنے لگا تھا۔

کمرے کے اندر کوئی مسلسل چیختا چلا جا رہا تھا۔ یہ وہ سنتری تھا جو ایس ایس پی کے بیٹے کو لے کر آیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی پر سے صاف اڑ چکا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی خون اگلتی کلائی تھام رکھی تھی۔ ایس ایس پی کا جوان بیٹا کمرے کے عین درمیان اس حالت میں پڑا تھا کہ اس کی کھوپڑی اڑ چکی تھی اور پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ جس کرسی پر ایس ایس پی جمشید بیٹھا تھا وہ ناپید ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایس ایس پی بھی... بس مجھے اس کے بالائی دھڑ کا کچھ حصہ نظر آیا۔ یہ دھڑ وائرلیس سیٹ کے عین اوپر پڑا تھا اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب کوٹھی سے باہر ایمبولینس گاڑی کا سائرن سنائی دینے لگا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ایس ایس پی کے بیٹے نے یہاں کمرے میں آنے سے پہلے قریبی کلینک میں ایمبولینس کے لیے فون کر دیا تھا۔ ساہی صاحب نے مجھ سے کہا "تم یہاں سے نکل جاؤ۔ بس یا ریل کے ذریعے لاہور پہنچ جاؤ۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔"

انہوں نے پرس سے کچھ نقدی نکال کر مجھے دینا چاہی۔ میں نے کہا "جناب، جو گیارہ سو روپیہ آپ نے لاہور میں دیا تھا وہ میرے پاس ہے۔"

"بس ٹھیک ہے، تم لاہور پہنچو۔"

○☆○

اگلے روز دوپہر گیارہ بجے میں واپس مسلم ٹاؤن کی اسی کوٹھی میں پہنچ گیا جو ساہی صاحب کے بقول میری محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس جمشید غوری کو اس کے ڈاکٹر بیٹے سمیت دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ جمشید غوری کا ایک ملازم شدید زخمی ہوا تھا۔ اس حوالے سے اخباروں میں بھی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں موجود تھیں۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب ساہی صاحب اپنے دوست جمشید کو کرسی سے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکنا چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں بمشکل روکا تھا۔ اگر میں نہ روکتا تو شاید آج کے اخبار میں ان کی خبر

بھی موجود ہوتی اور ممکن تھا کہ میری بھی ہوتی۔

اخبارات نے پولیس ذرائع کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا وہ چشم کشا تھا۔ اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ جمشید مرحوم کرسی سے اٹھ کیوں نہیں سکے تھے۔ جس طاقت ور بم نے ایس ایس پی جمشید کی جان لی وہ ان کی کرسی کے فوم کے نیچے موجود تھا۔ تین کلوگرام کے اس بم کا میکنزم بارودی سرنگ سے ملتا جلتا تھا۔ یہ میکنزم وزن ڈالنے سے حرکت میں آتا ہے۔ جب وزن پڑتا ہے تو ایک سوئچ دب جاتا ہے، جب تک وزن پڑا رہتا ہے سوئچ دبا رہتا ہے، جب وزن ہٹتا ہے تو سوئچ اپنی اصلی حالت میں واپس آتا ہے اور اس وقت دھماکا خیز مواد یعنی ٹی این ٹی بلاسٹ ہو جاتا ہے۔

ایس ایس پی جمشید کو کافی دنوں سے گمنام دھمکیاں مل رہی تھیں۔ شاید اسی لیے وہ ان دنوں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بہت محتاط تھے۔ صرف تین ہی دن پہلے انہوں نے بم ڈسپوزل یونٹ کو اپنے گھر بلایا تھا اور یونٹ نے پورے گھر کا معائنہ کیا تھا۔ مگر "دشمن" نے شاید اس معائنے کے بعد گھات لگائی تھی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اپنی موت سے پہلے کے پندرہ بیس منٹ جمشید غوری نے کتنی اذیت میں گزارے ہوں گے۔ جب وہ کرسی پر بیٹھے ہوں گے انہیں فوراً اندازہ ہو گیا ہو گا کہ نشست کے نیچے کیا ہوا ہے۔ وہ اسلحہ شناس تھے۔ نشست کے نیچے پلیٹ نما بم کا سوئچ دبنے کی آواز انہوں نے سن لی ہو گی۔ جب انہوں نے یہ آواز سن لی تھی تو پھر انہیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اس کرسی سے اٹھ نہیں سکتے اور اگر اٹھیں گے تو سیکنڈوں میں ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ انہوں نے وائرلیس سیٹ بھی ران کی مدد سے آن کیا تھا۔ وہ وائرلیس پر ساہی صاحب کو مدد کے لیے پکارتے رہے تھے اور پھر شدید تناؤ کی کیفیت میں انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ وہ کرسی کے اوپر ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔

الیکشن کے دن قریب آ رہے تھے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ لوگ پُرامن حالات کو درہم برہم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اخبار میں روزانہ ہی کوئی نہ کوئی ایسی خبر موجود ہوتی تھی جس سے بدامنی اور افراتفری کا تاثر ملتا تھا۔

شام کے بعد ساہی صاحب بھی راولپنڈی سے واپس پہنچے۔ ایس ایس پی کے ساتھ ہونے والے ہولناک واقعے نے ساہی صاحب کو ملول کر رکھا تھا۔ وہ نڈھال لہجے میں بولے "جب لوگ پولیس کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو ساری پولیس کو بدکردار اور کرپٹ کہہ رہے ہیں حالانکہ ہر محکمے کی طرح اس محکمے میں بھی اچھے برے لوگ موجود ہیں، اچھے لوگوں کی ایک مثال جمشید بھی تھا..."

ہم دونوں میں کافی دیر تک جمشید غوری مرحوم کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران میں کافی وغیرہ پی کر ساہی صاحب قدرے پُرسکون ہو چکے تھے۔ وہ مسٹر جی کلارک سے میری ملاقات کا احوال جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ ابھی تک انہیں ٹھیک سے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مسٹر کلارک سے میری ملاقات ہو پائی ہے یا نہیں۔ میں نے انہیں شروع سے آخر تک سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ ساہی صاحب سنتے رہے۔ جوں جوں میری بات آگے بڑھتی گئی ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے انہیں اپنے اکاؤنٹس کی وہ ڈپازٹ سلپس دکھائیں جن پر لاکھوں روپے میرے نام سے جمع کرائے گئے تھے۔ میں نے انہیں حصص اور بیریئر سرٹیفکیٹس وغیرہ کی تفصیلات بتائیں پھر گولڈ ہولڈنگز کے سلسلے کے بارے میں معلومات دیں۔ ساہی صاحب خوش اور مطمئن نظر آنے لگے تھے اور ساتھ ساتھ حیران بھی تھے۔

انہوں نے کہا "شاہ جہاں! شاید تمہیں میری کچھ باتیں بری لگی ہوں، میرا خیال ہے کہ مجھے مسٹر جی کلارک کے بارے میں اس انداز سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"نہیں ساہی صاحب! آپ نے وہی کچھ کہا جو آپ کو کہنا چاہیے تھا۔ آپ اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھے۔ دوسری طرف کلارک صاحب بھی ٹھیک تھے۔ دراصل وہ مجھے سرپرائز دینا چاہ رہے تھے۔ انہیں بہتر موقع نہیں مل رہا تھا اور موقع کی تلاش میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔"

ساہی صاحب نے پوچھا "صفدر اور تمہارے پٹھان دوست زریں گل کے شیئرز کا کیا بنا؟"

"ان کا حصہ مسٹر کلارک کے پاس بارنا کیش کی صورت میں موجود ہے۔ ہم جب بھی کہیں گے مسٹر کلارک وہ رقوم پاکستان میں لے آئیں گے۔"

ساہی صاحب نے دریافت کیا "تمہارے بارے میں مسٹر کلارک کی کیا رائے ہے۔ کیا تمہیں خود پر قائم مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے قانون کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔"

"میں نے اس بارے میں مسٹر کلارک سے بات کی تھی۔ ان کی رائے آپ کی رائے سے ملتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شیخ عاصم فی الوقت میرے خلاف بڑا سرگرم ہے۔ ابھی وہ مجھ پر ایک اور فوجداری مقدمہ بھی بنوا رہا ہے۔ بہتر یہی ہے

کہ ابھی کچھ دن تک میں روپوش ہی رہوں۔"

ساہی صاحب اپنے لیے کافی کا نیا کپ بنانے لگے۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ اچانک ایک بار پھر مجھے وہی عجیب و غریب احساس ہوا جو پچھلے دو تین روز سے گاہے بگاہے ہو رہا تھا۔ یہ خود کو دیکھے جانے کا احساس تھا۔ یوں لگا جیسے کہیں سے دو آنکھیں مجھے جھانک رہی ہیں۔ میں نے بے قرار ہو کر دائیں بائیں دیکھا۔

ساہی صاحب نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے۔" میں نے کہا۔ "اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہاں آپ کے سوا اور کون کون موجود ہے؟"

"بس میں ہوں۔ ایک چوکیدار ہے ایک خانساماں اور ایک گھریلو ملازم۔ ان تینوں کو تم نے دیکھا ہے لیکن تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"یونہی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی اور بھی یہاں موجود ہے۔" ساہی صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری "ویسے تمہاری چھٹی حس واقعی تیز ہے۔" انہوں نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ بولے "مسٹر جی کلارک نے تمہیں ایک بڑا سرپرائز دیا ہے لیکن ایک چھوٹا سرپرائز تمہارے لیے میرے پاس بھی موجود ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی خاموشی سے مجھے دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھ رہا نہیں۔ دیکھ رہی ہے۔" ساہی صاحب پھر مسکرائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ملازم وفادار کو آواز دی۔ وفادار آیا تو ساہی صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا "جاؤ اسے لے آؤ۔"

وفادار حسین اثبات میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے سامنے ایک لمبی تڑنگی لڑکی کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ واقعی سرپرائز تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس مقام پر اس لڑکی سے اس طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ ناشا تھی۔ زریں کی بیوی کلثوم کی بڑی بہن۔ گلگت سے آگے وادی موت کے بھولے بسرے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ اسی وادی میں یہ لڑکی شعلے کی طرح لپکتی تھی اور بجلی کی طرح تڑپتی تھی۔ اس آزاد منش لڑکی کا ایک ایک انداز ہمارے ذہنوں میں نقش ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وادی موت میں صفدر اور زریں نے مشترکہ طور پر ناشا کو جنگلی گھوڑا خطاب دیا تھا۔ وہ جنگلی گھوڑی ہی کی طرح کڑیل اور خود سر تھی۔ وہ آج بھی تقریباً ویسے ہی لباس میں نظر آ رہی تھی جو وادی میں پہنتی تھی۔ ایک پتلون نما پاجامہ تھا جو اس کے ٹخنوں سے ایک فٹ اوپر ہی ختم ہو جاتا تھا۔ ایک ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا جسے شرٹ بھی کہا جا سکتا تھا اور کرتہ بھی۔ اس کے بال قبائلی انداز میں مینڈھیوں کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ناشا بھی حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دراصل میں میک اپ میں تھا لہٰذا وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ بس گھورتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ساہی صاحب کی پروا کیے بغیر ناشا کو اپنی اصلی آواز میں مخاطب کیا اور بتایا کہ میں ہی [illegible] ہوں۔ کافی دیر کے بعد وہ صورتِ حال کو سمجھ پائی۔ اردو یا پشتو نہیں جانتی تھی لیکن جن دنوں ہم وادی سے واپس آنے والے تھے وہ تھوڑی تھوڑی پشتو بولنے لگی تھی۔ زریں گل کے ساتھ رہ کر میں بھی پشتو بول لیتا تھا۔ زریں سے پہلے بھی میں پشتو سے ناواقف نہیں تھا۔ ناشا میری طرف بڑھی اور اس نے ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا "میں تمہیں یہاں دیکھ کر سخت حیران ہوئی ہوں۔"

"میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو۔ میں تم لوگوں سے ملنے کے لیے کتنی دور اور کتنی مشکلوں سے چل کر یہاں آئی اور تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ مجھے بتاؤ۔ تم لوگ مجھے کلثوم سے کیوں نہیں ملاتے ہو؟"

میں نے کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں۔ اب ٹھیک ہو جائے گا سب۔"

"دیکھو۔ میں نے سب لوگوں کا بہت لحاظ کیا ہے۔ وہ تم مجھے بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ مخصوص لہجے میں بولی۔

"بالکل جانتا ہوں۔ بالکل جانتا ہوں۔" میں نے تیزی سے سر ہلایا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے سر ہلانے میں دیر کی تو وہ کہیں بھڑک ہی نہ جائے۔

اس کی ہنگامہ خیزی اور تند مزاجی سے میں اچھی طرح واقف تھا۔

ساہی صاحب کے کہنے پر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی بھی ایسے تنی ہوئی تھی جیسے کسی درخت کی شاخ بیٹھی ہو۔ اس کے ہر انداز سے وحشی پن نمایاں تھا۔

میں نے اردو میں ساہی صاحب سے پوچھا "جناب! یہ آپ کہاں سے ڈھونڈ لائے ہیں۔"

"ڈھونڈی تو نہیں سمجھو پیچھے پڑ گئی ہے۔ کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر خیبر میل کے ساتھ یہ یہاں پہنچی تھی۔ اسٹیشن سے باہر یہ منہ اٹھا کر پھر رہی تھی۔ ایک بس ڈرائیور نے اسے ورغلانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی چادر اتار کر ایک طرف پھینکی اور بس ڈرائیور کو کنڈیکٹر سمیت بری طرح پھینٹ دیا۔ دونوں دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اس کا حلیہ عجیب و غریب تھا۔ تقریباً یہی حلیہ تھا جو اب نظر آ رہا ہے۔ اس کے گرد لوگ اکٹھے ہو گئے اور تماشا لگ گیا۔ اسی دوران میں گشتی پولیس والوں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور تھانے لے آئے۔ خوش قسمتی سے میں نے اسے تھانے میں دیکھ لیا۔ اس کی شکل کلثوم سے ملتی ہے اس لیے مجھے کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ جب اس نے پشتو لہجے میں بار بار تمہارا اور زریں گل کا نام لینا شروع کیا تو میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ میں اسے گھر لے آیا۔ اس وقت تک تم لوگ پاکستان نہیں پہنچے تھے۔ یہ مسلسل کلثوم اور زریں سے ملنے کی ضد کر رہی تھی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ وہ دونوں فی الوقت پاکستان میں نہیں ہیں، میں بہت جلد ان کی ملاقات ان دونوں سے کرا دوں گا۔"

"لیکن یہ اتنی دور سے یہاں تک پہنچ کیسے گئی؟" "اس بارے میں یہ خود ہی تمہیں بتائے گی۔ پوچھو اس سے۔"

میں نے ناشا سے پوچھا تو وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولی "تم کو اندازہ نہیں کہ میں نے کتنا لمبا سفر کتنی مشکلوں سے کیا ہے۔ تم کو پتا ہی ہے کہ وادی سے باہر آنا کتنا مشکل کام ہے۔ وادی سے باہر آنے کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑے ہیں ان کا تو مجھے ہی پتا ہے۔ ایک بلتستانی میرا ہم راز تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی گلگت پہنچی تھی۔ وہاں سے ایک ہفتے کے سفر کے بعد ہم ایک بہت بڑے شہر (پشاور) پہنچے۔ یہاں ہم چار پانچ رات رہے پھر اس سواری پر بیٹھے جسے تم لوگ ریل کہتے ہو۔ اس ریل کے اندر ہی اس بلتستانی نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میرے پاس چار پانچ قیمتی پتھر اور سونے کے گہنے تھے۔ وہ ان سب چیزوں کو لے کر رفو چکر ہو گیا۔ میں جب اس شہر میں پہنچی تو بالکل بے آسرا تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اپنی بڑی بہن کو میں نے کس طرح تلاش کرنا ہے پھر یہ شخص مجھے اپنے گھر لے آیا۔"

ناشا نے بڑی بے پروائی سے ساہی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ناشا کو بتایا "یہ بہت بڑے افسر ہیں۔ جس طرح تمہاری وادی میں ہزاری مردار وغیرہ ہوتے ہیں' سمجھو کہ یہ بھی سردار ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو یہاں تمہیں بڑی مشکل ہو سکتی تھی۔ تم یہاں کے لوگوں کو جانتی نہیں ہو۔"

وہ لاپروائی سے بولی "میں سب جانتی ہوں۔ سارے مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ندیدے' بھوکے اور مرغ تاڑنے والے۔ شاید ہی چند ایک بھلے مانس ہوتے ہوں۔ لیکن تم ان باتوں کو چھوڑو۔ مجھے بس کلثوم سے ملا دو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم کتنا تڑپے ہیں اس کے لیے۔ تم پتھر دل لوگ ہو۔ شاید تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا ہو گا کہ کلثوم کے کچھ پرانے رشتے بھی ہیں جو اسے یاد کرتے ہوں گے۔"

"ناشا! تم یہ سب اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمہیں پتا نہیں' یہاں ہم پر کیا بیتی ہے۔ ہم کئی ماہ تک ایک بڑے خوفناک چکر میں پھنسے رہے ہیں۔ بہرحال' پریشانی کی کوئی بات نہیں کلثوم اور زریں گل بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"مگر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟"

"اس کی وجہ بھی میں تمہیں بتاؤں گا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ساہی صاحب کا ہم راز اور معتمد سب انسپکٹر شجاعت اندر داخل ہوا۔ اس نے ساہی صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہے۔ ساہی صاحب اٹھ کر اس کے ساتھ باہر چلے گئے۔

اسی روز رات کو میں نے وہ فون نمبرز نکالے جو مسٹر جی کلارک نے مجھے رابطے کے لیے دیے تھے۔ میں نے ایک نمبر ڈائل کیا' یہ اسلام آباد کا نمبر تھا۔ چند لمحے بعد ایک شیریں نسوانی آواز کانوں میں پڑی "جی۔ گولڈ ہوٹل۔"

ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ سچی بات ہے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں گولڈ ہوٹلز کا مالک ہوں۔ میں نے کہا "سوئٹ نمبر ۱۰۸ پلیز۔"

گھنٹی بجی اور کرسٹی کی مخمور آواز سنائی دی "ہیلو کرسٹی اسپیکنگ!"

میں نے اپنا تعارف کرایا اور کرسٹی سے کہا کہ مسٹر کلارک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کرسٹی نے پہلے چار پانچ منٹ خود بات کی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ مسٹر کلارک آج کل کرسٹی پر بہت مہربان ہیں۔ اس کے لیے نت نئے تحفے لا رہے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مسٹر کلارک اب اس کے لیے بڑوں والے تحفے لاتے ہیں یعنی اب انہوں نے اسے

بچہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے ویک اینڈ پر ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا' میں جانتا تھا کہ ان میں سے ننانوے فیصد باتیں جھوٹی ہیں۔

خدا خدا کر کے کلارک صاحب کی آواز فون پر سنائی دی۔ میں نے انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کیا۔ مسٹر کلارک نے مجھے خوش خبری سنائی کہ پرسوں زریں گل کی ضمانت ہو جائے گی۔ وہ صفدر کے حوالے سے بھی بڑے پرامید تھے۔ گفتگو کے دوران میں مسٹر کلارک نے اس خوفناک بم دھماکے کا ذکر بھی کیا جس میں ایس ایس پی جمشید غوری اور ان کا بیٹا جاں بحق ہو گئے تھے۔

میں نے مسٹر کلارک کو یہ بتا کر حیران کیا کہ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ فون پر تفصیل تو نہیں بتائی جا سکتی تھی تاہم مسٹر کلارک سمجھ گئے کہ میں نے اور ساہی صاحب نے کل رات اس واقعے کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے مسٹر کلارک کو دادی سوت کے حیرت ناک کردار ناشا کی آمد سے بھی آگاہ کیا اور انہیں بتایا کہ ناشا اپنی بہن کلثوم اور زریں سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔

اگلے روز ایک عجیب واقعہ رونما ہو گیا۔ صبح دس بجے کے لگ بھگ ساہی صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ ناشا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ وہ پریشان نظر آرہے تھے۔ کہنے لگے "میں نے گھر میں ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ چوکیدار' خانساماں اور گھریلو ملازمہ سے بھی پوچھا ہے۔"

"کیا اس سے پہلے بھی وہ اس طرح کہیں گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس تین چار ہفتے پہلے ایک بار ایسا ہوا تھا۔ وہ میری غیر موجودگی میں چوکیدار سے لڑ جھگڑ کر باہر نکل گئی تھی۔ بازار میں پہنچی تھی تو اس کا عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ لوگوں سے جان چھڑا کر بڑی مشکل سے گھر لوٹی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹا تھا اور چوکیدار کو حترجم بنا کر اسے سمجھایا تھا کہ میری اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے۔ اس کے بعد تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔"

ساہی صاحب پریشانی کے عالم میں باہر چلے گئے۔ سب انسپکٹر شجاعت بھی ان کے ساتھ تھا۔ یقیناً وہ ناشا کی تلاش میں ہی نکلے تھے۔

صورت حال واقعی تشویش ناک تھی۔ ناشا شہر کے ماحول اور یہاں کی اونچ نیچ سے قطعاً ناواقف تھی۔ اوپر سے اس کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ وہ فوراً مرکز نگاہ بن جاتی تھی۔ ابھی کل رات ہی کلثوم اور زریں گل کے بارے میں میرے ساتھ اس کی بات چیت ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں سے ملنے کے لیے سخت بے تاب نظر آتی تھی۔ غالباً اسے یہ بھی شبہ تھا کہ اسے جان بوجھ کر کلثوم سے ملایا نہیں جا رہا۔ میں نے سوچا' کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کلثوم اور زریں کی تلاش میں ہی کہیں نکل گئی ہو۔

دوپہر کے وقت ساہی صاحب واپس آگئے۔ ان کی صورت دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ناشا ابھی تک لاپتا ہے۔ ساہی صاحب نے بتایا "تھوڑا سا اشارہ ملا ہے۔ یہاں پاس ہی منی مارکیٹ ہے۔ مارکیٹ کے ایک دکان دار نے کل رات گیارہ بجے کے لگ بھگ لمبے قد کی ایک لڑکی کو بڑی تیزی سے ایک بس میں سوار ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے اپنے جسم کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ توجہ کی بات یہ تھی کہ لڑکی بس کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی جو مردوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ شجاعت اس سلسلے میں پوچھ تاچھ کر رہا ہے۔ دس بارہ بسیں اس روٹ پر چلتی ہیں۔ ان کے کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں وغیرہ سے رابطہ کیا جا رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ساہی صاحب بولے "مجھے کئی دن سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں ناشا پھر کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر جائے۔ میں نے چوکیدار کو خاص طور سے ہدایت کر رکھی تھی' رات دس بجے کے بعد وہ خاص طور سے بہت چوکس رہے کیونکہ اس وقت خانساماں رشید سونے کے لیے چلا جاتا ہے۔ کل رات بھی چوکیدار گیٹ پر چوکس تھا۔ ناشا کوٹھی کی عقبی جانب سے نکلی ہے۔ وہ بندر کی طرح ایک درخت پر چڑھ کر دیوار تک پہنچی ہے اور وہاں سے باہر کود گئی ہے۔ اس کے پاؤں کے نشان وہاں کچی زمین پر موجود ہیں۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں' وہ بڑی شعلہ مزاج قسم کی لڑکی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس کے ہاتھوں سے کوئی بندہ ضائع نہ ہو جائے۔ کسی نے اس کے ساتھ ولن کا کردار ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک جائے گی۔ وہ تین بندوں کے ہاتھ پاؤں تو دو جھٹکے میں توڑ سکتی ہے۔"

اسی دوران میں سب انسپکٹر شجاعت کا فون آگیا۔ ساہی صاحب نے فون اٹینڈ کیا۔ آٹھ دس منٹ کی گفتگو کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولے "شجاعت نے بس کے کنڈکٹر کو ٹریس کر لیا ہے۔ کنڈکٹر بتاتا ہے کہ ایک پاگل سی لڑکی کل رات ساڑھے دس

گیارہ بجے کے درمیان منی مارکیٹ اسٹاپ سے بس میں سوار ہوئی تھی۔ وہ مردوں والے حصے میں سوار ہو گئی تھی۔ اگلے اسٹاپ پر کنڈکٹر نے اسے عورتوں والے حصے میں بھیج دیا۔ وہ ہر بات کے جواب میں غوں غاں کر رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گونگی ہے۔ اس نے کرایہ بھی نہیں دیا تھا' وہ بس کے آخری اسٹاپ پر اتری تھی اور پیدل ہی شاہدرہ بازار کی طرف چل دی تھی۔"

میں نے کہا "ممکن ہے کہ کنڈکٹر کو کچھ اور بھی معلوم ہو لیکن خوف کے سبب چھپا رہا ہو۔"

ساہی صاحب بولے "کنڈکٹر اور ڈرائیور دونوں زیر تفتیش ہیں۔ شجاعت خود ان سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔"

"زریں اور کلثوم کو تو ناشا کے بارے میں معلوم نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہ غلطی مجھ سے ہو چکی ہے۔ پچھلی ملاقات میں میں نے زریں کو بتایا تھا کہ اس کی ایک رشتے دار اس سے ملنے کے لیے بہت دور سے یہاں پہنچی ہے۔ وہ پہچان گیا تھا کہ وہ کلثوم کی بہن ناشا ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے حد حیران بھی ہوا تھا۔"

میں نے کہا "جناب! پھر تو اس کا جلد سے جلد ملنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ کل تک زریں کی ضمانت ہونے والی ہے۔ اس کے بعد زریں اور کلثوم' ناشا سے ملنے کے لیے بے چین ہو جائیں گے۔"

سارے دوپہر میں گھنٹے مزید گزر گئے۔ میری اور ساہی صاحب کی پریشانی عروج پر پہنچ چکی تھی اور پھر ایک ایسی خبر آئی جس نے میرے تمام اندیشے درست ثابت کر دیے۔ صبح نو بجے کے لگ بھگ میں نے ساہی صاحب کو بڑی جلدی میں تیار ہوتے دیکھا' غالباً وہ اپنے گھر جا رہے تھے اور وہاں سے تھانے روانہ ہونے والے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "شاہ زیب! میرا خیال ہے کہ ناشا کا کھوج لگ گیا ہے... مگر خبر کچھ اچھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میرا دل سینے میں اچھل کر رہ گیا۔

"شاہدرہ کے قریب ایک فیکٹری میں بندہ قتل ہو گیا ہے۔ پتا چلا ہے کہ یہ کسی پاگل عورت کا کام ہے۔ عورت کا جو حلیہ بتایا گیا ہے وہ ناشا سے ملتا جلتا ہے۔"

"آپ وہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔ تم ٹیلی فون کے قریب رہنا' جونہی کوئی واضح بات معلوم ہوئی میں تمہیں اطلاع دوں گا۔"

ساہی صاحب چلے گئے' میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کل سب انسپکٹر شجاعت نے بس کنڈکٹر کے حوالے سے بتایا تھا کہ ناشا شاہدرہ کے قریب بس سے اتری تھی۔ اب یہ واردات بھی شاہدرہ کی کسی قریبی فیکٹری میں ہوئی تھی۔ اگر ساہی صاحب نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ اس واردات کا تعلق ناشا سے ہو گا تو یہ کچھ ایسا غلط اندازہ نہیں تھا۔ ملزمہ کے لیے "عجیب حلیے کی پاگل عورت" کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے' یہ الفاظ بھی ناشا ہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

میں انتظار کرتا رہا۔ ساہی صاحب کا ٹیلی فون نہیں آیا' سہ پہر کے وقت وہ خود ہی آگئے۔ شجاعت بھی ان کے ساتھ تھا۔ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ حسب معمول ساہی صاحب میری اس پناہ گاہ میں ایک پرائیویٹ گاڑی کے ذریعے آئے تھے۔ یہ رنگ دار شیشوں والی ایک ڈاٹسن کار تھی۔

ساہی صاحب نے مجھے بتایا "اٹھانوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ کل رات شاہدرہ کی فیکٹری میں ہونے والی واردات ناشا ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔"

"میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ ناشا کا نہ ملنا سنگین مشکلات کا سبب بنے گا۔" میں نے کہا۔

ساہی صاحب نے پریشانی کے عالم میں سر ہلایا اور شجاعت سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں کی اس پروفیشنل گفتگو سے مجھے جو کچھ واردات کے بارے میں معلوم ہوا وہ کچھ اس طرح تھا۔

"کل رات شام کے بعد صادق فونڈری کا چوکیدار عارف خان اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا کہ ایک خستہ حال لڑکی اس کے پاس آئی۔ اس کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے' اس کے پاؤں میں عجیب وضع کے جوتے تھے اور حلیہ بھی عجیب تھا۔ اس نے عارف خان سے پشتو میں بات کی اور اس سے کہا کہ وہ آٹھ پہر سے بھوکی ہے' وہ خدا کے نام پر اسے کھانا کھلا دے۔ عارف خان کو اس پر ترس آیا۔ وہ لڑکی کو وہیں گیٹ کے پاس بٹھا کر خود اس کے لیے کھانا لینے اپنے کوارٹر میں آیا۔ اسے بمشکل تین چار منٹ ہی لگے ہوں گے وہ واپس آیا تو لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ فیکٹری مالک ابراہیم میاں کا بھتیجا فیروز اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک چوکیدار عارف خان کو دفتر میں سے شور شرابے کی آواز آئی۔ وہ دفتر کی طرف بھاگا۔ اس نے دیکھا کہ عجیب حلیے والی لڑکی دفتر میں موجود تھی۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا کٹا مرد بھی تھا۔ وہ بھی حلیے سے پٹھان نظر آتا تھا۔ دفتر کے قالین پر فیروز کا لہولہان جسم پڑا تھا۔ جواں سال پٹھان کے ہاتھ میں وہ کرنسی نوٹ تھے جو اس نے ابھی ابھی سیف سے نکالے تھے۔ چوکیدار عارف خاں

اس وقت خالی ہاتھ تھا۔ اچانک لمبی تڑنگی لڑکی نے عارف کے سر پر کوئی رزنی شے ماری وہ چکرا کر گر گیا۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو لڑکی اپنے ساتھی کے ساتھ بھاگ چکی تھی' قالین پر فیروز کا مردہ جسم پڑا تھا۔"

یہ بیان صادق فونڈری کے چوکیدار عارف خان کا تھا۔ اس میں سچائی کتنے فیصد تھی یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتا چلنا تھا۔

چوکیدار عارف کے بیان میں خستہ حال لڑکی کے ساتھ ایک مرد کا ذکر بھی آرہا تھا۔ یہ مرد کون ہو سکتا تھا؟ ناشا کے ساتھ تو راوی سے کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ وہ رو ماہ سے ساہی صاحب کی تحویل میں تھی' اگر کوئی ہوتا تو ساہی صاحب سے چھپا نہ رہ سکتا۔ ناشا کے بیان کے مطابق بس ایک بلتستانی تھا جو لاہور پہنچنے سے پہلے ہی اسے دھوکا دے کر بھاگ گیا تھا۔

فیکٹری کے نائٹ واچ مین عارف کا بیان کئی پہلوؤں سے مشکوک نظر آرہا تھا۔ جب اس نے فیروز کے دفتر سے چیخوں کی آواز سنی تو وہ خالی ہاتھ وہاں کیوں پہنچ گیا؟ اس کے پاس رائفل موجود تھی اور ایسے وقت رائفل اس کے پاس ہونی چاہیے تھی۔ عارف خاں کے سر پر جو چوٹ کی تھی وہ بھی شجاعت کے بقول کوئی ایسی زوردار نہیں تھی۔ اس چوٹ کی وجہ سے عارف جیسے لمبے تڑنگے پٹھان کا چکرا کر گر جانا اور رو گرد سے بے خبر ہو جانا مشکوک تھا۔

شجاعت نے کہا "میں نے موقع واردات بڑے غور سے دیکھا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فنگر پرنٹس رپورٹ بھی آئی ہے۔ شک ہوتا ہے کہ دفتر میں جو دھینگا مشتی ہوئی ہے وہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ہوئی ہے۔ عورت ناشا ہوگی اور مرد ظاہر ہے کہ فیروز تھا۔"

"یعنی عارف کا یہ بیان غلط ہے کہ ناشا کے ساتھ کوئی مرد بھی تھا۔" میں نے پوچھا۔

شجاعت نے اثبات میں سر ہلایا "لگتا تو ایسے ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چوکیدار نے اپنی کھال بچانے کے لیے ناشا کے ساتھی کا کردار اس کہانی میں ڈالا ہو۔ اگر وہ یہ کہتا کہ اس کی موجودگی میں ایک اکیلی لڑکی اس کے صاحب کو جان سے مار گئی اور اسے بے ہوش کر گئی تو اس کی جواں مردی پر حرف آتا ہے۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔" ساہی صاحب نے کہا "لیکن مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ سارا بیان بڑی سوچ بچار کے بعد عارف خان کے منہ میں ڈالا گیا ہے۔"

انسپکٹر شجاعت کے ہاتھ میں چار پانچ تصویریں نظر آرہی تھیں۔ یہ تصویریں پولیس کے فوٹو گرافر نے موقع پر اتاری تھیں۔ دو تصویروں میں مقتول فیروز کی لاش بڑی وضاحت سے دکھائی دے رہی تھی۔ فیروز کے بال لمبے تھے' گلے میں سونے کا لاکٹ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ جینز شرٹ میں تھا۔ عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل و صورت سے وہ لاپرواہ قسم کا امیرزادہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر ناخنوں کے کھرونچوں کے نشان بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ یہ نشان یقیناً اس لڑکی کے ناخنوں کے تھے جو فیروز کے دفتر میں داخل ہوئی تھی۔ ساہی صاحب کے خیال میں اٹھانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ لڑکی ناشا ہے۔

مقتول کی موت سر کی شدید ضربات سے ہوئی تھی۔ تصویر میں بھی اس کے سر کا ایک حصہ پچکا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ پیشانی بدہیئت ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے سر کو بڑی وحشیانہ طاقت سے دیوار سے پٹخا گیا ہے۔

ساہی صاحب بولے "اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق فیروز ایک رنگین مزاج نوجوان تھا۔ اپنے تایا زاد بھائیوں کی نسبت اسے صادق فاؤنڈری کے کاروبار میں بہت کم دلچسپی تھی۔ اس کا باپ جو اس فاؤنڈری میں برابر کا حصے دار تھا کچھ عرصہ پہلے فوت ہو چکا تھا' اپنے تایا ابراہیم میاں کے بہت مجبور کرنے پر فیروز نے ڈیڑھ دو ماہ پہلے ہی فیکٹری میں آنا شروع کیا تھا۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ اس فیکٹری میں ناشا کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہو جس پر وہ مشتعل ہو گئی ہو۔ قتل جیسا قدم اس نے کسی معمولی وجہ سے تو نہیں اٹھایا ہوگا۔"

ساہی صاحب نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے گہری سانس لی اور بولے "پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ آنے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے قائم ہو سکتی ہے۔" پھر ایک دم جیسے انہیں کوئی نیا خیال آیا۔ وہ چونک کر بولے "تمہارے لیے ایک اور اطلاع بھی ہے شاہ جہاں۔"

"اللہ کرے یہ اچھی اطلاع ہو۔" میں نے کہا۔

وہ بولے "زریں گل کی ضمانت ہو گئی ہے۔ بہت تگڑا وکیل تھا۔ اس نے استغاثہ کی ایسی تیسی کر ڈالی ہے۔ چار دن کے اندر اس نے دو کیسوں میں زریں کی ضمانت کرائی ہے۔"

"چلو' یہ تو خوشی کی بات ہے مگر اب زریں اور کلثوم فوراً ناشا سے ملنا چاہیں گے۔ ویسے وہ دونوں اب ہیں کہاں؟"

"اب تک تو کلثوم' غزالہ کے ساتھ رئیس احمد کے گھر میں تھی۔ اب سنا ہے کہ وہ ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں منتقل ہو گئی ہے۔ تمہارا دوست زریں بھی ضمانت کے بعد سیدھا اسی کوٹھی میں منتقل ہوا ہے۔ اسے گاڑی اور ٹیلی فون وغیرہ کی سہولت بھی فوری طور پر مل گئی ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ سب کچھ مسٹر جی کلارک کی ایماء پر ہوا ہے۔ وہ صفدر اور زریں کے معاملات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ پس پردہ رہ کر انہوں نے صفدر اور زریں کے لیے بھی کافی کچھ کیا ہے۔ اندیشہ تھا کہ صفدر کی حالت بہتر ہونے پر شاید اسے اسپتال سے جیل منتقل کر دیا جائے مگر اب پتا چلا ہے کہ وہ مزید تین ہفتے تک اسپتال میں ہی رہے گا۔ اس سہولت کے پیچھے بھی مسٹر کلارک کا ہی ہاتھ ہے۔"

"کیا زریں سے کسی طرح رابطہ ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زریں یا صفدر سے رابطہ تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ یقینی بات ہے کہ تمہیں گرفتار کرنے کے لیے تمہارے دوستوں پر گہری نگاہ رکھی گئی ہے۔ وفاقی پولیس کے دو اعلیٰ عہدے دار تمہاری گرفتاری میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ آج شام پھر مجھے اور تمہارے دوست عالم قریشی کو ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! عالم قریشی کا خیال رکھیں' میری وجہ سے بے چارے کو بڑی مشکلیں جھیلنی پڑ رہی ہیں۔"

"تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں شاہ جہاں! مجھ سے جو کچھ بن پڑ رہا ہے کر رہا ہوں۔ آج بھی میرا جانا زیادہ ضروری نہیں تھا' میں کل بھی جا سکتا تھا مگر میں عالم کی وجہ سے جا رہا ہوں۔"

"آج پھر آپ زریں سے بھی ملاقات کر لیں۔ اسے ناشا کی گمشدگی کا پتا تو نہیں؟"

"میرے اندازے کے مطابق نہیں۔"

"وہ اور کلثوم فوراً ناشا سے ملنا چاہیں گے' آپ انہیں کسی طور ٹالنے کی کوشش کریں۔"

"میں نے اس بارے میں سوچ لیا ہے' تم بالکل بے فکر رہو۔ مجھے امید ہے کہ چھ سات دن تک کلثوم اور زریں مطمئن رہیں گے۔ انشاء اللہ اس دوران میں ناشا مل جائے گی۔"

ساہی صاحب چلے گئے۔ میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ اگر یہ قتل واقعی ناشا کے ہاتھوں ہوا تھا تو پھر وہ ایک سنگین مصیبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

سوچتے سوچتے میری نگاہ سامنے تپائی پر رکھے اخبار پر پڑ گئی۔ دو سیاسی گروپوں میں ہنگامہ آرائی اور مار کٹائی کی خبر چھپی تھی۔ ایک کارنر میٹنگ میں گولیاں چل گئی تھیں سر پھٹے تھے اور ہوائی فائرنگ ہوئی تھی۔ ایسی خبریں ان دنوں اخبارات میں تواتر سے چھپ رہی تھیں۔ مذکورہ خبر شیخوپورہ کے گرد و نواح سے تھی۔ وہی علاقہ جہاں تھانے سے فرار کے بعد میں حوالدار فیض کے ساتھ کئی دن رہا تھا۔

الیکشن کے موسم میں اکثر سیاسی ماحول گرم ہو جاتا تھا' لیکن موجودہ صورت حال اس کے سوا تھی۔ یہاں واضح طور پر کشیدگی پائی جاتی تھی جو مختلف واقعات کی وجہ سے بڑھتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پس پردہ کچھ ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ ایسے ہی دو چھوٹے چھوٹے واقعات کا تو میں خود بھی چشم دید گواہ تھا۔ بلکہ دوجھاپور کے غنڈے نادر جگی کے حکم پر ایک جلسے میں میں نے اپنے ہاتھوں سے سانپ چھوڑے تھے۔ نادر جگی کا خیال آیا تو دوجھاپور کے دوسرے کرداروں حوالدار فیض' بیار کرم دین اور اس کی آہو چشم بیوی شاہدہ کی صورتیں بھی نگاہ میں گھوم گئیں۔ خاص طور سے میں حوالدار فیض کے بارے میں پریشان تھا۔ وہ صرف میری خاطر نوکری کو لات مار کر سپاہی سے چور بنا ہوا تھا۔

اس روز شام کو ساہی صاحب ایک ایسی اطلاع لائے جس سے سو فیصد ثابت ہو گیا کہ فاؤنڈری میں داخل ہونے والی لڑکی ناشا ہی تھی۔ ساہی صاحب نے بتایا "آج ہم نے موہنی روڈ کے ایک تاجر سمیع اللہ خاں کو شامل تفتیش کیا ہے۔ ہمیں ایک مقامی مخبر کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ کل رات سمیع اللہ خاں کے گھر میں کوئی لڑکی گئی تھی اور وہ رات بھر وہاں رہی تھی۔ سمیع اللہ راوی روڈ کی ٹمبر مارکیٹ میں دکان کرتا ہے۔ اس نے پہلے تو مخبر کی اطلاع کی تردید کی مگر پھر ڈرانے دھمکانے پر زبان کھول دی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا ہے کہ کل رات بارہ بجے کے بعد آہٹ سن کر وہ اپنے کچن میں پہنچا تو وہاں اسے ایک عجیب و غریب صورت نظر آئی۔ اس نے جو حلیہ پولیس کو بتایا ہے وہ سو فیصد ناشا کا ہے۔ سمیع کا کہنا ہے کہ جنگلی لڑکی کے لباس پر خون کے دھبے بھی تھے۔ وہ فریج کھولے بیٹھی تھی اور جو کچھ اس کے سامنے آرہا تھا' کھائی چلی جا رہی تھی۔ سمیع اللہ نے دوڑ کر اپنا ریوالور اٹھایا اور کوشش کی کہ لڑکی کو کچن کے اندر ہی بند کر دے لیکن وہ اس کی توقع سے زیادہ تیز اور طاقت ور نکلی۔ بڑی دلیری کے ساتھ اس نے جھپٹا مار کر سمیع کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا

اور دھکا مار کر اسے نیچے گرا دیا مگر پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا کہ اس نے ریوالور فرش پر پھینک دیا اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور بھوں بھوں رونے لگی۔ سارے اہلِ خانہ اکٹھے ہو گئے۔ سمیع خان کُل شہر کا رہنے والا تھا اور پشتو بول لیتا تھا۔ اس نے لڑکی سے بات چیت کی۔ بہت کوشش کے بعد لڑکی نے تھوڑا بہت اپنے بارے میں بتایا۔ پتا چلا کہ کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اسے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اتفاقاً لڑکی ایک جرم کی چشم دید گواہ بن گئی تھی۔ اس نے اتفاقاً ایک چار دیواری میں چند افراد کو ایک واردات کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تین چار افراد تھے اور ایک نوجوان لڑکی کی نیم برہنہ لاش ایک بوری میں بند کر رہے تھے۔ لڑکی گھر کی سیڑھیوں کے نیچے ایک تاریک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اچانک ان لوگوں کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ انہوں نے لڑکی کو پکڑنا چاہا اور وہ بھاگ نکلی۔

سمیع اللہ خاں اور اس کے گھر والوں نے لڑکی کی کہانی سنی اور انہیں یہی اندازہ ہوا کہ لڑکی جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ انہوں نے لڑکی سے اس کے لباس پر موجود خون کے دھبوں کے بارے میں پوچھا۔ لڑکی یہ کہہ کر ٹال گئی کہ یہ خون اس کی نکسیر پھوٹنے سے لگا ہے۔ سمیع اللہ خاں بھلا مانس اور کسی حد تک کم حوصلہ آدمی تھا۔ وہ کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رات بھر لڑکی کو پناہ دی اور سویرے اس سے درخواست کی کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ سمیع کے کہنے پر وہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل گئی۔" ساہی صاحب نے ایک ہی سانس میں پوری تفصیل میرے گوش گزار کر دی۔

شجاعت بڑا ہوشیار پولیس والا تھا۔ اس نے سمیع اللہ خاں کے بیان کو پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمیع جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس کی غلطی بس یہی تھی کہ اس نے لڑکی کے بارے میں پولیس کو اطلاع نہیں دی۔

میں نے شجاعت کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ سمیع خاں نے پولیس کو بے خبر رکھ کر واقعی غلطی کی ہے بلکہ اسے سنگین غلطی کہنا چاہیے۔ جب ناشا سمیع خاں کے گھر پناہ گزین ہوئی تو اس کے لباس پر خون کے دھبے تھے۔ یقیناً یہ صادق فاؤنڈری میں قتل ہونے والے فیروز کا خون ہی رہا ہوگا۔"

ساہی صاحب نے سر ہلا کر میری بات سے پورا اتفاق کیا۔

شجاعت نے کہا "یہ سارا سلسلہ گھوم پھر کر صادق فاؤنڈری کی طرف ہی جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ناشا نے رات ہی صادق فاؤنڈری میں واردات ہوتے دیکھی ہو۔ وہ وہاں سے بھاگنے لگی ہو؟ فاؤنڈری والوں نے اسے پکڑا ہو اور اسی دوران میں ناشا کے ہاتھوں سے فیروز قتل ہو گیا ہو۔ فیروز کو قتل کر کے وہ بھاگی ہو اور چھپتی چھپاتی سمیع خاں کے گھر پناہ کے لیے پہنچ گئی ہو۔"

ساہی صاحب بولے "مگر سمیع خاں کو بیان دیتے ہوئے ناشا ہوشیاری سے فیروز کے قتل والی بات چھپا گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ قتل ناشا نے کیا ہی نہ ہو؟" میں نے کہا۔

"کاش ایسا ہوا ہوتا۔ مگر شواہد اس کے خلاف جا رہے ہیں۔" ساہی صاحب بولے "مقتول کے چہرے پر ناخنوں کے کھرونچے اور چوکیدار کا بیان کردہ حلیہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ قتل ناشا کے ہاتھوں ہی ہوا ہے۔ کیوں اور کیسے ہوا اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔"

"مگر جناب، چوکیدار کے بیان کو تو ہم پہلے ہی مشکوک قرار دے چکے ہیں۔"

"سارے بیان کو نہیں، اس کے کچھ حصے کو۔" ساہی صاحب نے وضاحت کی۔

"لیکن جناب، جب گواہ مشکوک ہوتا ہے تو اس کا سارا بیان ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔"

ساہی صاحب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری "مجھے معلوم ہے شاہ جہاں کہ تم نے قانون کا امتحان پاس کر رکھا ہے مگر یہ عدالت نہیں ہے یہاں ہم آف دی ریکارڈ بات کر رہے ہیں۔"

"ویسے میرے دماغ میں ایک اور بات بھی آ رہی ہے۔" میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ ناشا نے بوری بند لاش والا واقعہ کسی اور جگہ دیکھا ہو، بلکہ فیروز کے قتل والا واقعہ فیکٹری میں ہوا ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ساہی صاحب بولے۔

"ہو سکتا ہے کہ ناشا نے لاش کو بوری میں بند کیے جانے کا منظر کسی اور گھر میں دیکھا ہو۔ وہاں سے بھاگ کر وہ صادق فاؤنڈری میں چھپی ہو۔ صادق فاؤنڈری میں اس کے ہاتھوں فیروز نامی نوجوان قتل ہو گیا ہو۔"

ساہی صاحب نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ بات ابھی کچھ دیر پہلے میرے ذہن میں بھی آئی تھی۔۔۔ بلکہ میرے خیال میں تو یہ بھی ممکن ہے کہ بوری بند لاش والی واردات ناشا نے ایک دن پہلے دیکھی ہو، فیروز کے قتل والا چکر اگلے روز چلا ہو۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! میں آپ کو مشورہ دینے کا اہل تو ہرگز نہیں ہوں لیکن جو بات ذہن میں آ رہی ہے وہ یہی ہے کہ صادق فاؤنڈری کے چوکیدار سے کچھ اگلوایا جائے۔"

"ہم کوشش تو کر رہے تھے لیکن یہاں بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ فاؤنڈری والوں کے ہاتھ لمبے ہیں اور پہنچ بھی کافی اوپر تک ہے۔ شاید انہیں خدشہ تھا کہ ہم چوکیدار عارف کو گرفتار کریں گے، انہوں نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرائی ہے اور ویسے بھی ہر طرح سے اس پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔"

"تو ان لوگوں میں سے کسی اور کو پکڑ لیں۔ یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ فاؤنڈری کا مالک ابراہیم اور اس کے بیٹے بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"ان کی گرفتاری تو دور کی بات ہے فی الحال ان میں سے کسی کو تھانے بلانا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بندہ مرا ہے، ان کی حیثیت مظلوموں کی ہے۔ دسیوں لڑکے کے جنازے میں شہر کے کئی بھاری بھرکم لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایک دو وزیروں نے بھی جنازے میں شرکت کی ہے۔ چار پانچ دن میں معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا پھر کسی نوکر چاکر پر ہاتھ ڈالیں گے۔"

شجاعت ایک گشتی پارٹی کے ساتھ ناشا کی تلاش میں روانہ ہو رہا تھا۔ ساہی صاحب بھی کافی تھکے تھے آرام کے لیے گھر جانا چاہ رہے تھے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد بھی میں بیٹھا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ وادیٔ موت کی شعلہ جوالا لڑکی ناشا لاہور میں موجود تھی اور اس کے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا تھا۔ لاہور لاکھوں انسانوں کا شہر، ہزاروں سڑکوں اور ان گنت گلیوں کا شہر، وہ افق تا افق ایک ناقابلِ عبور بھول بھلیاں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس شہر میں سے کسی گمشدہ شخص کو ڈھونڈنا بھوسے کے فلک بوس ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنا تھا۔ ناشا اب اپنی آخری پناہ گاہ سمیع خاں کے گھر سے بھی غائب ہو چکی تھی۔ اب وہ کہاں تھی؟ کس سے الجھنے والی تھی؟ کیا قیامت ڈھانے والی تھی؟ کچھ پتا نہیں تھا۔

معاً میری نگاہ آج کے باسی اخبار پر پڑی اور ایک اعلان دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ صادق فاؤنڈری کے روحِ رواں ابراہیم میاں کے بھتیجے اور مرحوم نذیر میاں کے بیٹے فیروز نذیر کی "رسمِ قل" کا اعلان تھا۔ وہ ایڈریس بھی لکھا گیا تھا جہاں آج یہ رسم ادا ہونا تھی بلکہ اب تک ہو چکی تھی۔ یہ مسلم ٹاؤن ہی کا ایڈریس تھا۔ کوٹھی کے نمبر اور بلاک سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ بیٹھے بٹھائے میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے اٹھ کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ میں ابھی تک اسی ریڈی میڈ میک اپ میں تھا جس میں اسلام آباد گیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں سوائے کرنل اور مسٹر کلارک کے مجھے کوئی شناخت نہیں کر سکا تھا۔ راہبی پور اسی رہائش گاہ میں ناشا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ شروع میں وہ بھی مجھے پہچاننے میں قطعی ناکام رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس میک اپ پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور اگر اس میں تھوڑا سا اضافہ مزید کر لیا جائے مثلاً بالوں کا اسٹائل بدل کر عینک وغیرہ پہن لی جائے تو نظر کو بآسانی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کوٹھی سے نکلوں اور ناشا کی تلاش میں خود بھی ہاتھ پیر ہلاؤں۔

میں نے اپنے اس ارادے پر عمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور آدھ پون گھنٹے میں باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میرے چہرے پر نظر کی رنگ دار شیشوں والی عینک کا اضافہ ہو چکا تھا، اس کے علاوہ سر پر ایک ٹوپی بھی آ گئی تھی۔ لباس پتلون اور جیکٹ پر مشتمل تھا۔ طائرانہ نظر سے دیکھا جاتا تو میں کھچڑی بالوں والا ادھیڑ عمر کا پڑھا لکھا شخص نظر آتا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو سندھی چوکیدار نے مجھے روک لیا "سائیں! آپ باہر نہ جائیں، میں پہلے ہی مالک سے بہت شرمندہ ہوں۔"

"کیا شرمندگی ہے؟"

"وہ چھوکری جو غائب ہو گیا ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں جی کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔"

"بھئی! وہ تو چھوکری تھی۔ میرے جانے سے تمہیں کیا خطرہ ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کے جانے سے بھی مالک ناراض ہوگا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس کی ذمے داری لیتا ہوں۔" چوکیدار کو سمجھا بجھا کر میں کوٹھی سے نکل آیا۔

رات ٹھنڈی تھی۔ مسلم ٹاؤن کا علاقہ زیادہ گنجان نہیں ہے۔ سرِ شام ہی سڑکیں خالی نظر آنے لگتی ہیں۔ نہر کی طرف سے بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ قریباً ایک کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد میں اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جہاں آج سہ پہر

متوفی فیروز کی رسم قل ادا ہوئی تھی۔ اب نو بج رہے تھے تاہم کوٹھی کے سامنے گاڑیوں کی ایک طویل قطار اب بھی موجود تھی۔ کچھ لوگ باہر نکل نکل کر گاڑیوں میں سوار ہو رہے تھے۔ یقیناً یہ لوگ ابراہیم فیملی کے قریبی عزیز ہی رہے ہوں گے۔ یہ ایک نوجوان کی رسم قل تھی' اس کے باوجود کئی خواتین رنگ دار کپڑے پہنے ہوئے تھیں' شاید کچھ نے ہلکا پھلکا میک اپ بھی کر رکھا ہو۔ وسیع کوٹھی کے مین گیٹ کے سامنے دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ کوٹھی کے عین سامنے درختوں میں گھری ہوئی ایک گراؤنڈ تھی۔ میں نیم تاریک گراؤنڈ میں چلا گیا اور ایک پتھریلے بنچ پر بیٹھ گیا۔ اکا دکا اور افراد بھی گراؤنڈ میں موجود تھے۔

اچانک میری نگاہ ایک جواں سال شخص پر پڑی اور میرے دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو یہ ابراہیم میاں کا بیٹا ہے۔ وہ گورا چٹا بارعب نوجوان تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ پہن رکھی تھی۔ فربہ جسم کے سبب وہ جھوم جھوم کر چل رہا تھا۔ ایک سیاہ مرسیڈیز کا دروازہ کھولنے کے لیے وہ واسکٹ کی جیب میں چابی ٹٹولنے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے براہ راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر سڑک کی طرف بڑھا۔ جب اس شخص نے تالے میں چابی گھما کر مرسیڈیز کا دروازہ کھولا میں اس کے عین پیچھے موجود تھا۔ کھلے دروازے میں ہاتھ ڈال کر میں نے بڑی صفائی سے پچھلے دروازے کو اندر سے "ان لاک" کر دیا۔ جس وقت وہ شخص دروازہ کھول کر اندر بیٹھا' میں نے عقبی دروازہ کھولا اور اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ چونکا اور مڑ کر میری طرف دیکھا' میں نے ریوالور کی نال اس کے چہرے سے لگا دی "خبردار آواز نکالی تو گولی چلا دوں گا۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے دھمکی دی۔

جواں سال شخص کا منہ کھلا رہ گیا۔ اپنی طرف کا دروازہ وہ پہلے ہی بند کر چکا تھا' میں نے پچھلا دروازہ بند کیا اور اسے گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

وہ منمنایا "دیکھو' اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ تم گاڑی سے نکل جاؤ۔"

"مجھے پیسوں کی نہیں تمہاری ضرورت ہے' اور تمہاری ضرورت بھی تب تک ہے جب تک میری بات بنو گے۔ دوسری صورت میں ابھی فائر کر کے تمہارا قصہ پاک کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ کیا تم گاڑی چھیننا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی چھیننا نہیں چاہتا۔ بس تم سے چند باتیں کرنی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تمہارے تیس منٹ لوں گا' اس کے بعد تم جانے کے لیے آزاد ہو گے۔"

وہ تھوڑی دیر غیر یقینی کیفیت میں رہا' مگر جب میں نے اس کی چربیلی گردن پر ریوالور کا دباؤ بڑھا دیا تو اسے گاڑی چلاتے ہی بنی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس واقعے کے دوران میں ایک مسلح گارڈ ہم سے صرف پانچ چھ گز کے فاصلے پر موجود رہا تھا۔ اس نے ایک دو بار اپنے مصیبت زدہ مالک کی طرف دیکھا بھی مگر یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے۔

کوٹھی سے تقریباً دو کلومیٹر آگے آ کر میں نے گاڑی ایک زیر تعمیر مارکیٹ کے احاطے میں رکوا دی۔ یہ مارکیٹ ایک ذیلی سڑک پر واقع تھی اور اس امر کا خطرہ نہیں تھا کہ کوئی آتے جاتے ابراہیم فیملی کی کار یہاں کھڑی دیکھ لے گا۔ جس شخص کو میں گن پوائنٹ پر یہاں لایا تھا اس کا نام راحیل تھا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ابراہیم میاں کا بیٹا تھا۔ چھ بھائیوں میں اس کا نمبر اوپر سے دوسرا تھا۔ راحیل میاں خاصا ہوشیار چالاک شخص تھا۔ وہ راستے میں بھی مسلسل بولتا رہا تھا۔ وہ بات چیت کے ذریعے مجھے آمادہ کرنا چاہتا تھا کہ میں اسے رہا کر دوں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور چالاکی بھی کی تھی۔ سگریٹ سلگانے کے لیے جب اس نے ڈیش بورڈ میں سے لائٹر نکالا تھا تو بڑی صفائی سے ٹیپ ریکارڈر کا خاص بٹن "پش" کر دیا تھا۔ بظاہر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ ٹیپ ریکارڈر آن ہے اور ہماری آوازیں ریکارڈ کر رہا ہے۔

گاڑی رک گئی تو میں پچھلی نشست پر ہی ایسے زاویے سے بیٹھ گیا کہ راحیل کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ سردی میں بھی اس کے سرخ و سپید چہرے پر پسینے کی نمی تھی۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "میں نے تمہیں آدھ پون گھنٹے میں آزاد کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ تم سب کچھ صاف صاف اگل دو۔"

"کس بارے میں؟"

"فیروز کے قتل کے بارے میں۔ سارا واقعہ بغیر کسی ہیر پھیر کے بیان کر دو۔ میں ابھی تمہاری گاڑی سے نکل کر چلا جاؤں گا۔"

"ہم نے پولیس سے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے۔" وہ عیار لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا' میں نے ریوالور کی نال اس کی گردن میں دھنسا دی۔

"مجھے جھوٹ نہیں صرف سچ چاہیے۔ صرف سچ!"

"دیکھو چاچا! تم خود کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہو۔ یہ ریوالور مجھ سے پیچھے ہٹا لو۔" اس نے میرے کھچڑی بال دیکھ کر مجھے چاچا کا خطاب دے دیا۔

"میں ریوالور پیچھے ہٹا لیتا ہوں بھتیجے جی! بلکہ کہتے ہو تو جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ ابھی اتنی طاقت ہے مجھ میں کہ تم جیسے بزدلوں کے ساتھ خالی ہاتھ نمٹ لوں۔ اچھے وقتوں کی اچھی خوراکیں کھائی ہوئی ہیں۔"

اچانک فربہ اندام راحیل نے مہم جوئی کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ بے خبری میں "چاچے" کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا مارے اور قصہ ختم ہو جائے۔ جونہی میں نے اسے حرکت کرتے دیکھا جوابی کارروائی کی۔ اپنے ریوالور کو اس کی زد سے دور ہٹا کر میں نے دایاں ہاتھ استعمال کیا۔ راحیل کا انگوٹھا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے بے دردی سے انگوٹھا مروڑا۔ راحیل مجھے دبوچنا چاہ رہا تھا۔ انگوٹھا شدت سے مڑا تو وہ نشست پر ہی دہرا ہو گیا۔ مرسیڈیز کے اندر ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ راحیل کے ہونٹوں سے کرب ناک کراہ نکل گئی۔ غصے اور تکلیف سے بے قابو ہو کر اس نے ایک بار پھر مجھ پر جھپٹنے کی سعی کی مگر اس مرتبہ اسے پہلے سے بھی زیادہ دردناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹوٹا ہوا انگوٹھا مسلسل میری گرفت میں تھا۔ وہ مڑا تو راحیل کی چیخیں نکل گئیں۔

میں نے کہا "برخوردار! جب کسی کو چاچا کہتے ہیں تو پھر اس سے ہاتھا پائی نہیں کیا کرتے۔"

"چھوڑو مجھے.... میں تمہارے...."

اس کی دھمکی آمیز آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کربناک انداز میں کراہنے لگا۔ زخمی انگوٹھے نے اس کے ساتھ وہی کیا تھا جو ناک میں تنی جانے والا سوراخ سرکش جانور کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ انگوٹھا نکیل کی شکل اختیار کر گیا تھا اور میں اس نکیل کے ذریعے اس فربہ اندام سانڈ کو جس طرف چاہتا موڑ سکتا تھا۔

گولیوں سے دھمکیوں اور دھمکیوں سے نرم لہجے تک کا فاصلہ راحیل نے پانچ دس منٹ میں طے کر لیا۔ آخر وہ مجھے اصل صورتِ حال بتانے پر آمادہ ہو گیا۔ یعنی ایک فرماں بردار بھتیجے کی حیثیت سے اس نے اپنے چاچے کی بات مان لی۔

اس نے کراہتے ہوئے کہا "یہ بات درست ہے کہ وہ لڑکی فیکٹری میں ایسی ہی آئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بندہ نہیں تھا۔"

"کیا وہ چوکیدار عارف خان سے کھانا مانگنے آئی تھی؟"

"نہیں۔ وہ مین گیٹ سے باہر کاٹھ کباڑ کے ایک ڈھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ چوکیدار نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر فیکٹری میں لے آیا۔"

"بولتے رہو۔ میں بار بار تمہارا پلپے کا بٹن آن نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا (پلپے کے بٹن سے میری مراد اس کا انگوٹھا ہی تھی)

راحیل نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا "چوکیدار عارف اسے دفتر میں فیروز کے پاس لے گیا۔ چوکیدار نے فیروز کو بتایا کہ یہ لڑکی چوری کی نیت سے فیکٹری کے اسکریپ میں چھپی ہوئی تھی۔ یہاں لڑکی نے ایک دم فیروز پر حملہ کر دیا اور...."

ایک دم راحیل کے ہونٹ سے چیخ نکل گئی۔ میں نے بے رحمی سے اس کا "پلپے بٹن" دبایا تھا "دیکھو بھتیجے! مجھے سنسر شدہ فلم نہیں چاہیے۔ جو کچھ ہوا ہے پوری تفصیل سے بتاؤ۔ ایک اکیلی لڑکی کی یہ ہمت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ دو بپھرے ہوئے مردوں سے بھڑ جائے جبکہ ان میں سے ایک کے پاس بھری ہوئی دونالی بھی ہو۔ یہ بات بالکل طے ہے کہ جس وقت لڑکی نے فیروز پر حملہ کیا اس وقت دفتر میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مگر پرچے کی رپورٹ بھی کیا کہتی ہے۔"

"تم.... مجھے بتاؤ کیا تم پولیس والے ہو؟" راحیل نے پوچھا۔

"میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ سمجھو کہ اس لڑکی سے مجھے بھی کوئی نقصان پہنچا ہے۔ اسے ڈھونڈنا میرے لیے ضروری ہے۔"

"اگر تم پولیس سے نہیں ہو تو فیکٹر پوائنٹ کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے۔"

"میرے بھتیجے! تم ان چکروں میں مت پڑو۔ میرے اپنے ذرائع ہیں۔ تم مجھے دو تین دن کی مہلت دو تو میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہاری کتنی سہیلیاں ہیں جن کے بارے میں تمہاری بیوی کو پتا نہیں' پھر یہ کہ تم نے اپنے انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکس میں کہاں کہاں گھپلے کر رکھے ہیں۔"

لگتا تھا کہ میرے اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر نشانے کے قریب ہی لگے ہیں۔ راحیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے کہا "چلو شاباش۔ سارا واقعہ سنسر کیے بغیر بتاؤ۔"

جواب میں راحیل نے رک رک کر اور ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے "چوکیدار عارف خان اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ناشا کو دبوچنے میں کامیاب ہوا تھا اور اسے فیروز کے دفتر میں لے گیا تھا۔ فیروز عیاش طبع نوجوان تھا۔ گھبرائی ہوئی اکیلی لڑکی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی (فیروز خاصا کڑیل جوان تھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ ناشا کو ذرا دھمکا کر بہ آسانی اپنا مطلب نکال لے گا اور اگر اس نے مزاحمت کی تو بھی اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر وہ اس پر قابو پا لے گا) فیروز نے چوکیدار کو نکال دیا اور خوب مزہ ناشا کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا۔ جب وہ دست درازی پر اترا تو ناشا بپھر گئی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں فیروز پر حملہ کیا۔ اس نے ایک سے زائد مرتبہ فیروز کا سر اتنی زور سے دیوار پر پٹخا کہ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔ فیروز کی چیخیں سن کر چوکیدار عارف اور اس کا ایک ساتھی دفتر کی طرف بھاگے۔ عین اس وقت ناشا بھی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس نے چوکیدار عارف کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑھکتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ رائفل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ چوکیدار کے سر پر جو چوٹ تھی وہ اسی دھکے کی وجہ سے تھی۔ بعد ازاں فیکٹری میں اور ارد گرد کے کھیتوں میں ناشا کو بہت ڈھونڈا گیا لیکن اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔"

راحیل کا بیان ختم ہوا تو میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ چوکیدار عارف نے جو بیان دیا ہے وہ جھوٹ کا پلندا ہے اور یہ بیان تم لوگوں نے اس کے منہ میں ڈالا ہے۔"

راحیل نے صرف کراہنے اور منہ میں بڑبڑانے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا انگوٹھا اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے انگوٹھا چھوڑ دیا اور پشت سے ٹیک لگا لی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے راحیل کی جیبوں کی اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کی مکمل تلاشی لی تھی۔ تلاشی سے برآمد ہونے والا سارا سامان میرے سامنے نشست پر پڑا تھا۔ ہزار ہزار کے کرنسی نوٹ، نہایت قیمتی سگریٹ، لائٹر، پاکٹ سائز ڈائری، وزیٹنگ کارڈز، ٹیلی فون انڈکس، رسیدیں اور نا معلوم کیا کچھ۔ میں نے سب اشیا کو طائرانہ نظر سے دیکھا تھا۔ تاہم ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ میں نے یہ کاغذ راحیل کے سامنے لہرایا۔

"یہ کیا چیز ہے بھتیجے!" میں نے پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"یہ تمہارے کسی نمک خوار کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ اس نے لکھا ہے "میاں صاحب! آپ کی ہدایت کے مطابق لڑکی کو بڑی محنت سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر وہ لاہور میں ہی ہے تو دیکھ لینا ایک دو دن میں اسے لا کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا، پولیس کو تو حرام کھانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں۔ جس طرح اندھے کتے ہرنوں کا شکار نہیں کر سکتے اسی طرح زیادہ تر پلسیے بھی مجرم کو ڈھونڈ نہیں سکتے۔ یہ اس وقت مجرم کو ڈھونڈتے ہیں جب کسی طرف سے مخبری ہوتی ہے۔ آپ کے تھانے کی پولیس ابھی تک اس چکر میں پڑی ہوئی ہے کہ قتل ہوا کیسے تھا؟ جب تک انہوں نے لڑکی کی تلاش میں نکلنا ہے تب تک تو وہ آزاد علاقے میں پہنچ چکی ہو گی۔ بہرحال میں جلد ہی آپ سے پھر رابطہ کروں گا۔"

رقعہ پڑھنے کے بعد میں نے راحیل سے پوچھا "یہ کس کی تحریر ہے۔"

"ایک دوست ہے اپنا۔ شوکا نام ہے اس کا۔ مزنگ میں رہتا ہے۔"

"وہی تو نہیں جس نے بھینس پال رکھی ہیں اور ملتان روڈ پر چارا کاٹنے کا ٹوکا لگایا ہوا ہے؟" راحیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم اس بدمعاش کے ذریعے لڑکی کو تلاش کروا رہے ہو؟"

"اس نے خود کہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

میں نے ریوالور راحیل کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "دیکھ میرے بھتیجے! مجھے تیرے اور تیرے خیر خواہوں کے ستارے گردش میں نظر آ رہے ہیں۔ اس لڑکی کو عام لڑکی نہ سمجھو وہ تمہارا ستیاناس کر کے رکھ دے گی۔ کچھ بھی ہے میں تم سے ہمدردی محسوس کر رہا ہوں تمہارا جوان چچا زاد بھائی قتل ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور رانی تمہیں اٹھانی پڑے۔ اس لڑکی کی تلاش کا کام پولیس پر چھوڑ دو گے تو یہ تم سب کے لیے بہتر ہو گا۔"

راحیل اب مسلسل کراہ رہا تھا۔ اس کا انگوٹھا ٹھنڈا ہو کر اسے مزید تکلیف دینے لگا تھا۔ میں نے اب تک راحیل کے بارے میں پورا تجزیہ کر لیا تھا۔ وہ امیر کبیر تو بے شک تھا۔ وزیروں اور اعلیٰ افسروں تک بھی اس کی پہنچ رہی ہو گی لیکن وہ کچھ زیادہ باحوصلہ شخص نہیں تھا۔ ایسے لوگوں کو بس دولت کمانے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ چھوٹے موٹے جرم بھی یہ لوگ کر لیتے ہیں مگر کسی بڑے چکر میں پھنستے ہوئے بہت ڈرتے ہیں۔ راحیل کے چچا زاد بھائی فیروز نے بھی اپنی دانست میں

کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ اس نے چوری کے شبے میں پکڑی جانے والی ایک اول جلول لڑکی سے زیادتی کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اول جلول لڑکی اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوئی تھی اور یہ لوہے کا چنا فیروز کے حلق میں پھنس کر اس کی جان لے گیا تھا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ درد سے کراہتے ہوئے اس فربہ اندام امیرزادے نے واردات کے سلسلے میں مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ کافی حد تک درست ہے۔

گاڑی کا ٹیپ ریکارڈر ابھی تک آن تھا۔ راحیل نے یہ ٹیپ ریکارڈر میرے خلاف ثبوت حاصل کرنے کے لیے چپکے سے آن کیا تھا مگر اب اس ٹیپ ریکارڈر میں موجود کیسٹ اس کے اپنے خلاف ایک ٹھوس ثبوت بن چکی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر کیسٹ نکال لی۔ راحیل نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر اس کا پھیکا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا۔

○☆○

میں رات قریباً بارہ بجے گھر واپس لوٹا۔ ساہی صاحب گھنٹے بھر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ دراصل انہوں نے اپنے گھر کے قریب سے مسلم ٹاؤن کی اس کوٹھی میں فون کیا تھا۔ خانساماں رشید نے بتایا تھا کہ صاحب یعنی میں گھر میں نہیں ہوں۔ ساہی صاحب نے آدھ گھنٹے بعد پھر کال کی تھی اور اس کے بعد متفکر ہو کر یہاں چلے آئے تھے۔

وہ میرے اس طرح گھر سے جانے پر ناخوش تھے۔ وہ مجھ سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ شیخ عاصم اور شنکر کے ساتھی مجھے ڈھونڈنے کے لیے پورے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بہرحال جب میں نے ساہی صاحب کو اپنے باہر جانے کی وجہ بتائی اور اپنی کارکردگی سے بھی آگاہ کیا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ درحقیقت میں نے ابراہیم میاں کے بیٹے سے براہ راست "تفتیش" کر کے ایک زبردست شارٹ کٹ لگایا تھا۔ اگر ساہی صاحب یا کوئی اور پولیس افسر ابراہیم کی فیملی کے کسی فرد سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں کھڑی کی جاتیں۔ ان رکاوٹوں کو عبور کر کے بھی وہ شاید ہی مطلوبہ فرد سے پوچھ گچھ کر سکتا۔

مجھے جو کچھ راحیل میاں سے معلوم ہوا تھا وہ میں نے ساہی صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ یہ ساری کارگزاری میں نے اپنی زبان سے نہیں سنائی بلکہ وہ کیسٹ آن کر دی جو راحیل کی مرسیڈیز سے نکالی تھی۔

ساہی صاحب بہت توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "میرا ناچیز مشورہ یہ ہے جناب! کہ اس شوکے نامی بندے کی خفیہ نگرانی کروائیں۔ یہ بہت لمبے ہاتھوں والا شخص ہے اور بہت ہوشیار بھی ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ اس شخص کو ناشا کے سلسلے میں کوئی کامیابی حاصل ہو جائے۔"

ساہی صاحب نے میرے ہاتھ سے وہ رقعہ لیا جس پر شوکے کی طرف سے لکھی گئی تحریر موجود تھی۔ اس تحریر پر آج ہی کی تاریخ موجود تھی۔ تحریر پڑھنے کے بعد ساہی صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ واقعی اس بندے کی نگرانی ہونی چاہیے۔

ساہی صاحب رات گئے اپنی رہائش گاہ پر واپس چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ ساہی صاحب نے بتایا تھا کہ شنکر ابھی تک ایک کلینک میں زیر علاج ہے۔ اس کی ٹانگ پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔ شیخ عاصم بھی لاہور ہی میں موجود تھا۔ ان دونوں کی موجودگی کے سبب میں اپنے ہی شہر لاہور میں اجنبی ہو گیا تھا۔ ایک نادیدہ جال تھا جو میرے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ شنکر اور شیخ عاصم کا پھیلایا ہوا یہ آہنی جال میرے لیے تھا۔ اس جال نے مجھے میرے شہر کے گلی کوچوں اور لوگوں سے دور کر رکھا تھا۔ ایک طرح سے میں مسلم ٹاؤن کی اس کوٹھی میں قید تنہائی کاٹ رہا تھا۔ زریں، کلثوم، منصور، حمزہ، شفتا سب میرے آس پاس موجود تھے مگر مجھ سے بہت دور تھے۔

شوکے گوجر نامی شخص کی نگرانی اتنی کامیاب ثابت ہوگی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت ساہی صاحب نے بذریعہ سیل فون مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ ناشا کا کھوج لگ گیا ہے۔ درحقیقت اس کا کھوج شوکے نے لگایا تھا، پولیس شوکے کا تعاقب کرتی ہوئی ناشا تک جا پہنچی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ناشا ابھی تک اسی سمیع اللہ خان نامی شخص کے پاس موجود تھی جو راوی روڈ پر نمبر کا کام کرتا تھا۔ پولیس کے چھاپے پر سمیع اللہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ لڑکی رات بھر اس کے گھر میں رہنے کے بعد صبح سویرے چلی گئی تھی جبکہ حقیقت مختلف تھی۔ سمیع اللہ پٹھان تھا اور ایک پٹھان کی روایت نبھاتے ہوئے اس نے ناشا کو پناہ دی تھی۔ ناشا اب بھی کوٹھی کے تہ خانے میں موجود تھی۔ شوکے گوجر کے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد پولیس بھی پہنچ گئی تھی اور ناشا کو شوکے گوجر سے حاصل کر لیا تھا۔ سمیع اللہ خان بھی فی الحال پولیس کی تحویل میں تھا۔

اس رات گیارہ بجے کے لگ بھگ کوٹھی کے پورچ میں ساہی صاحب کی رنگ دار شیشوں والی ڈاٹسن آ کر رکی۔ اس میں ساہی صاحب اور ناشا کے علاوہ سب انسپکٹر شجاعت اور عزت کا بھتیجا ہیڈ کانسٹیبل ریاست علی بھی موجود تھے۔ ناشا ابھی تک اپنے قبائلی لباس میں ہی تھی۔ تاہم یہ لباس اچھی طرح پھٹا ہوا تھا اور خون کے وہ دھبے بھی نظر نہیں آتے تھے جن کا ذکر اپنے پچھلے بیان میں سمیع اللہ نے کیا تھا۔ ناشا کی پیشانی پر چوٹ کا نشان بھی تھا۔ یہ نشان اسی دھینگا مشتی کا تھا جو ٹیکسی میں فیروز اور ناشا کے درمیان ہوئی تھی۔ ناشا خاموش تھی اور اس کی آنکھوں میں گہری ناراضگی نظر آ رہی تھی۔ ناشا کو باقاعدہ ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی بیلٹ سے باندھ رکھی تھی۔ ہتھکڑی کو دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا اور اس کے ساتھ ہی اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ فی الوقت ناشا کی حیثیت ایک قاتلہ کی ہے۔ چونکہ وہ تیز مزاج بھی تھی اس لیے ساہی صاحب کو احتیاطاً ہتھکڑی لگانا پڑی تھی۔

ہم ایک اندرونی کمرے میں بیٹھ گئے۔ ناشا مسلسل مجھے گھورے چلی جا رہی تھی۔ ساہی صاحب نے کہا "اس کو ہتھکڑی لگانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر تم ذمے داری لو تو میں ہتھکڑی کھلوا دیتا ہوں۔"

میں نے ساہی صاحب کو منع کر دیا۔ ساہی صاحب بولے "میں تمہارے پاس اس لیے لایا ہوں کہ اس سے اپنی زبان میں بات کرو اور اسے سمجھاؤ کہ یہ اپنے بند ہونٹ کھولے۔ ابھی تک اس نے ایک لفظ بول کر نہیں دیا ہے۔"

میں نے پشتو میں ناشا سے بات چیت کی۔ میں نے پہلے تو اپنے شدید دکھ کا اظہار کیا کہ وہ ہم میں سے کسی کو بتائے بغیر یہاں سے نکل گئی، جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا۔ اس کے بعد میں نے ناشا سے پوچھا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہاں اور کیوں گئی تھی۔

ناشا نے تو جیسے اپنے ہونٹ ہی سی لیے تھے۔ میں دیر تک سر کھپاتا رہا مگر اس نے بس ایک بات ہی کی "پہلے مجھے میری بہن سے ملواؤ پھر بتاؤں گی۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے اسے زیادہ مجبور کیا تو وہ مشتعل ہو جائے گی اور تھانے کی طرح یہاں بھی اودھم مچا دے گی۔

ہار کر میں نے ساہی صاحب سے کہا "یہ کہتی ہے کہ جب تک اپنی بہن اور بہنوئی کی صورت نہیں دیکھے گی ایک لفظ نہیں بتائے گی۔"

ساہی صاحب کی پیشانی پر بھی الجھن نظر آ رہی تھی۔ وہ بولے "زریں اور کلثوم یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہیں۔ مگر جو خطرہ ہے اس کا تمہیں پتا ہے۔ اگر وفاقی پولیس ان کی نگرانی کروا رہی ہے تو پھر انہیں اس کوٹھی میں لے کر آنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم اپنی اس پناہ گاہ سے محروم ہو جائیں۔"

سب انسپکٹر شجاعت بولا "اگر آپ کہیں تو میں کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ زریں اور مسز زریں کو ان کی رہائش گاہ سے گاڑی میں بٹھا کر نکلتا ہوں۔ اگر تعاقب کا شبہ ہوا تو لبرٹی مارکیٹ سے گھما کر واپس لے جاؤں گا۔"

اس موضوع پر ساہی صاحب اور شجاعت کے درمیان کچھ دیر بات چیت ہوئی پھر ساہی صاحب نے اسے گاڑی دے کر بھیج دیا۔ درحقیقت وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ ناشا کی بات مانے بغیر اس کی زبان کھلوانا بہت مشکل ہے۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد سب انسپکٹر شجاعت ڈاٹسن گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا پورچ میں داخل ہوا۔ گاڑی میں زریں اور کلثوم کو دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔

زریں گل اگلی نشست پر تھا۔ وہ گاڑی سے نکلا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر پشاوری ٹوپی تھی۔ زریں کی پیشانی پر ابھی تک ایک گہرا نیل نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ نیل اس مار پیٹ کی نشانی تھا جو زریں سے تھانے میں کی گئی تھی۔ زریں مجھے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی صورت میں جو ہلکی پھلکی تبدیلیاں کر رکھی تھیں انہوں نے زریں کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ بہرحال جلد ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر جوش کی لہر دوڑی اور وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"استاد صیب! ام آپ کے لیے بہت پریشان تھا۔ بہت پریشان تھا۔"

"اوئے باندرا تھانے میں پھینٹی تو تجھے لگی ہے۔ پریشان تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

"ام کو پھینٹی کا کوئی فکر نہیں۔ امارا تو جان بھی چلا جائے تو پروا نہیں، بس آپ کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ بتائیں اب ٹھیک ہیں نا؟"

"سولہ آنے ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں کلثوم بھی کار میں سے نکل آئی تھی۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔ کلثوم کی گود میں ایک پیارا سا ننھا سا زریں گل نظر آ رہا تھا۔ میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کلثوم کو اور اس کے بچے کو دیکھتا رہا پھر میں

نے زریں کی طرف دیکھا۔ اس کے زخمی چہرے پر بڑی شفاف مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا "دیکھیں استاد صیب! اللہ تعالیٰ جب تکلیف دیتا ہے تو ساتھ میں خوشی بھی دیتا ہے۔ دیکھیں کلثوم نے ہم کو کتنے پیارے بچے کا باپ بنایا ہے۔"

میں کلثوم کے پاس پہنچا، اسے اپنے ساتھ لگایا پھر بے اختیار ننھے منے زریں گل کو اٹھا لیا۔ وہ واقعی زریں گل تھا۔ گول گول آنکھیں، گول چہرہ، انار کی طرح سرخ اور ابھرے ہوئے رخسار، وہ بڑی چمکیلی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے زریں گل کی طرح وہ بھی مجھے اس بدلے ہوئے حلیے میں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی عمر بمشکل دس بارہ روز تھی۔

زریں گل اپنا چہرہ بچے پر جھکاتے ہوئے بولا "استاد صیب! اس کے کان دیکھیں کتنے پیارے ہیں، بالکل لالے سدھیر کے کان لگتے ہیں۔ لگتے ہیں نا؟"

"اوئے چغد! کان سب کے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ کانوں کو چھوڑو بچے کو دیکھو کتنا پیارا ہے۔" میں نے اس کے روئی کے گالوں جیسے سرخ رخسار چومے۔ کلثوم خوشی سے سرخ ہو رہی تھی۔

وہ بولی "استاد صیب! یہ زریں بہت خراب ہے۔ کہتا ہے کہ بچے کا شکل مجھ سے نہیں ملتا۔ آپ بتائیں اس کا شکل مجھ سے ملتا ہے نا؟"

"دونوں سے ملتا ہے۔ تھوڑا تم سے۔ تھوڑا زریں سے۔" میں نے کہا۔

زریں نے پھر ٹانگ اڑائی "لیکن استاد صیب! اس کا کان تو بالکل سدھیر صاحب سے ملتا ہے۔ ہم آپ کو سدھیر صاحب کا تصویر دکھا سکتا ہے۔ خدا کی قسم آپ پہچان نہیں سکے گا کہ یہ سدھیر صاحب کا کان ہے یا اس کا۔"

میں نے ایک بار پھر بچے کو چوما۔ کلثوم بولی "استاد صیب! کیا سچ ہمارا بڑا بہن یہاں آیا ہوا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بچے کو واپس کلثوم کی گود میں دیا اور ان تینوں کو لے کر اندر آ گیا۔ جہاں ہیڈ کانسٹیبل ریاست علی اور ساہی صاحب کے علاوہ ناشا بھی موجود تھی۔ ناشا نے کلثوم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے، پھر وہ لپک کر ناشا سے لپٹ گئی۔ بچہ ان دونوں کے درمیان تھا۔ دونوں بہنوں کا ملاپ دیدنی تھا۔ ناشا بڑی وارفتگی سے کلثوم کا منہ چوم رہی تھی، اس کے جسم پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

پھر وہ بچے کی طرف متوجہ ہوئی۔ روتے روتے اس کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک ناقابل فہم آواز نکلی۔ اس نے (بچے) کو چوما، اسے اپنے ساتھ لگا کر بھینچا، پھر چوما پھر بھینچا، پھر اس کا جانگیا اتار کر اس کے ننھے سے عضو کو انگلی سے چھوا، ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر پھونک ماری۔ جواب میں کلثوم بھی یہی کیا۔ یہ یقیناً کوئی قبائلی رسم تھی۔

اچانک کلثوم کی نگاہ ناشا کی کلائی میں موجود ہتھکڑی پر پڑ گئی۔ اس نے حیرت سے ناشا کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی کلثوم کے چہرے پر پھوار کی طرح برستی ہوئی خوشی معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ ایک عجب بھری اداسی نے لے لی۔ کلثوم نے اپنی زبان میں پہلے ناشا سے کچھ پوچھا، ناشا نے جواب نہیں دیا تو کلثوم نے زریں سے پوچھا۔

زریں میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "استاد صیب! یہ کیا چکر ہے۔ ناشا کے ہاتھ میں ہتھکڑی؟"

"بس ایک مسئلہ ہو گیا تھا زریں گل۔ بہرحال پریشانی بات نہیں جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ناشا کے چہرے کو خفت آمیز سرخی نے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں ناراضگی صاف پڑھی جاتی تھی۔ زریں کا بچہ اس کی بانہوں میں تھا اور وہ اسے مسلسل پیار کر رہی تھی۔

میں نے زریں کو اشارہ کیا اور دوسرے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اسے ناشا کے بارے میں شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ زریں گل بھی یہ سن کر مضطرب ہو گیا کہ ناشا کے ہاتھ سے لاہور کی ایک دولت مند فیملی کا لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ میں نے زریں کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ایف آئی آر بڑی کمزور ہے۔ ساہی صاحب نے بھی کوشش کی ہے کہ سخت کیس نہ بن سکے۔ ویسے بھی ناشا نے جو کچھ کیا اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے کیا۔ مجھے یقین ہے کہ قانون اس کے ساتھ انصاف کرے گا۔"

"اف خدایا۔ ہمارا سارا خوشی خاک میں مل گیا۔"

"کچھ نہیں ہوا۔ خواہ مخواہ ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔" میں نے سختی سے کہا "اور ہاں۔ کلثوم کو بھی تسلی دو۔ خدا کا شکر کرو کہ ناشا جیتی جاگتی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جلد ہی وہ پھر سے ہمارے درمیان ہو گی۔"

میں نے پانچ دس منٹ زریں کو سمجھایا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ وہ منصور کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ رہائی کے بعد وہ ایک بار اسپتال جا کر اس سے مل بھی چکا تھا۔ زریں نے مسٹر جی کلارک کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ وہ اس سے مل کر اسے دفینے کے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ مسٹر

کلارک نے زریں گل کی رہائی اور اس کو SETTLE کرنے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، زریں ان سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد زریں نے کلثوم کو سمجھانے بجھانے کے لیے دوسرے کمرے میں بلا لیا۔ میں اور ساہی صاحب ناشا سے سوال جواب کرنے لگے۔ ہم نے ناشا کی شرط پوری کر دی تھی بلکہ شرط سے بھی زیادہ کچھ کیا تھا۔ بہن کے ساتھ ساتھ اسے پیارے سے بھانجے سے بھی ملا دیا تھا۔ توقع تھی کہ اب وہ اپنی زبان کا تالا کھول دے گی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد یہ توقع پوری ہو گئی۔ ناشا نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے "مجھے کوٹھی کے چوکیدار سے معلوم ہوا تھا کہ یہاں شہر میں ایک بلتستانی موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی بندہ ہو جو مجھے ریل گاڑی میں سوتا چھوڑ کر اور میرے گہنے لے کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مجھے اس بلتستانی کا پتا کرنا چاہیے۔ اگر یہ وہی بلتستانی ہوتا جس نے مجھے دھوکا دیا تھا تو میں اس کی خبر لے سکتی تھی اور اگر وہ کوئی دوسرا ہوتا تو بھی کلثوم سے ملنے میں وہ میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے چوکیدار سے ایک کاغذ پر بلتستانی کا پتا لکھوایا اور چوکیدار کی بتائی ہوئی بس میں بیٹھ گئی۔ چوکیدار نے کہا تھا کہ جہاں بس کا سفر ختم ہو جائے گا وہاں میں اتر جاؤں۔ وہاں سے لکڑیوں کا وہ ٹال پاس ہی ہے جہاں بلتستانی رہتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ میں کسی کو بھی پتے والا کاغذ دکھاؤں گی تو وہ مجھے ٹال تک پہنچا دے گا۔ لیکن جب میں بس سے اتری کالی ٹوپی والے دو بندوں (پولیس والوں) نے مجھے دیکھ لیا۔ میں پہلے بھی ان کی وجہ سے مصیبت میں پڑی تھی، اس لیے ان دونوں کو دیکھتے ہی ایک اندھیری گلی میں گھس گئی۔ وہ سیٹیاں بجاتے ہوئے میرے پیچھے آئے، میں دوڑ پڑی۔ دوڑتے دوڑتے جب مجھے ایسا لگا کہ پکڑی جاؤں گی تو میں ایک گھر کے کھلے دروازے سے اندر گھس گئی اور چھپ کر بیٹھ گئی۔ میں گھر کی سیڑھیوں کے نیچے ایک اندھیرے کونے میں چھپی ہوئی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی پھر میں نے دو بندے دیکھے۔ ان میں سے ایک کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ وہ دونوں ایک لڑکی کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے کر گئے۔ لڑکی کے جسم پر پورا لباس نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے مارا پیٹا گیا ہے اور زخم لگائے گئے ہیں۔ میں نے ادھ کھلی کھڑکی میں سے دیکھا کہ دونوں بندے لڑکی کی لاش کو بوری میں بند کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اتنے میں اچانک میرا پاؤں لگنے سے سیڑھیوں کے نیچے کھڑی ایک سائیکل گر گئی۔ اندر کمرے میں دونوں بندے ڈر کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک باہر نکل رہا ہے تو میں سیڑھیوں کے نیچے سے نکل کر دوڑ پڑی۔ باہر کا دروازہ اب بند تھا، میں دیوار پھاند کر اندھیری گلی میں پہنچ گئی اور چھپتی چھپاتی ایک بڑی سڑک پر آ گئی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لوگ اب بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ میں ایک قبرستان کے پاس سے گزر رہی تھی جب اچانک ایک بندے نے پیچھے سے آ کر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے سر کی ٹکر مار کر اس کی ناک توڑ دی اور قبرستان میں گھس کر دوسری طرف نکل آئی۔ قبرستان کے اس حصے میں بہت سے درخت تھے اور جھاڑیاں تھیں۔ میں ان جھاڑیوں کے اندر گھس کر بیٹھ گئی۔ پورے چھ پہر میں بھوکی پیاسی ان جھاڑیوں میں دبکی رہی۔ اگلے روز شام کے کچھ دیر بعد دو تین ننگ دھڑنگ بندے وہاں روشنیاں (گیس لیمپ) لے کر آئے۔ وہ شاید وہاں قبر کھودنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں دیکھ لیا۔ میں پھر بھاگ اٹھی۔ وہ اپنے اوزار لے کر میرے پیچھے دوڑے۔ میں قبرستان سے نکل کر ایک سڑک پر آ گئی۔ کچھ آگے جا کر مجھے لوہے کا ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ اس دروازے کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ایک طرف لوہے کے ٹکڑوں اور کاٹھ کباڑ کا ایک بڑا ڈھیر تھا۔ میں اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گئی۔ مجھے ڈھونڈنے والے کسی اور طرف نکل گئے تھے۔ ابھی مجھے ڈھیر کے پیچھے چھپے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک بندہ آیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے مجھے کھڑا ہونے کو کہا پھر دو بندے اور بھی آ گئے۔ وہ مجھے پکڑ کر لے گئے۔ یہ شاید کوئی بڑا کارخانہ تھا۔ پٹھان چوکیدار نے مجھے کہا کہ میں چوری کی نیت سے یہاں چھپی ہوئی تھی، وہ مجھے اپنے صاحب کے سامنے پیش کرے گا پھر وہ تینوں مجھے گھسیٹ کر اپنے صاحب کے کمرے میں لے گئے۔"

اس سے آگے کی روداد وہی تھی جو اس سے پہلے ہمیں مقتول فیروز کے تایا زاد بھائی راحیل اور ناشا کو پناہ دینے والے سمیع خان سے معلوم ہو چکی تھی۔ صارم فونڈری کے اندر مقتول فیروز نے ناشا پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہا جس کی قیمت اسے اپنے چٹخے ہوئے سر کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔ بعد ازاں فیکٹری سے بھاگ کر بھوکی پیاسی ناشا ٹمبر کے تاجر سمیع کے گھر میں پناہ گزیں ہو گئی۔

ناشا نے اپنی روداد مکمل کر لی تو اس کی آنکھوں میں

آنکھیں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے کہا "ناشا! تم نے جس مظلوم لڑکی کی لاش دیکھی ہے' وہ بھی تو کسی کی بہن یا بیٹی تھی۔ اس کو انصاف دلانے کے لیے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولی۔

"تم ہمیں اس مکان تک لے جا سکتی ہو جہاں تم نے لڑکی کی لاش دیکھی تھی۔"

"کیا اس کے بعد تم لوگ مجھے اپنے گھر واپس جانے دو گے؟" وہ سادگی سے بولی۔

"نہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو تم نے ٹھیک سے اپنی بہن اور اپنے بھانجے کو دیکھا بھی نہیں۔ ابھی تو کلثوم تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوگی۔"

"میں نے سب باتیں کر لی ہیں۔ اب مجھے واپس جانے دو۔" اس نے اپنی ہتھکڑی کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

آخر وہ اتنی سادہ بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ہاتھوں بندو مر گیا ہے۔ وادی موت میں قتل کی سزا تھی۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہاں بھی سزا ہوگی۔

میں نے اسے تسلی تشفی دی۔ وہ مطلوبہ مکان کی نشان دہی کرنے پر آمادہ ہو گئی مگر جب ساہی صاحب اور سب انسپکٹر شجاعت وغیرہ اسے لے کر جانے لگے تو وہ پھر اڑ گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسی صورت میں جائے گی اگر میں ساتھ جاؤں گا۔

میں ساہی صاحب کا منہ تکنے لگا۔ ساہی صاحب کی خواہش یہ تھی کہ میں اس چار دیواری سے کم سے کم نکلوں۔ وہ کچھ دیر میرے ذریعے ناشا کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب وہ نہیں مانی تو ساہی صاحب نے مجھے بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم زریں اور کلثوم کو وہیں چھوڑ کر ساہی صاحب کی رنگ دار شیشوں والی ڈاٹسن گاڑی میں آ بیٹھے۔ ہیڈ کانسٹیبل ناشا کی ہتھکڑی سمیت پچھلی نشست پر تھا۔ ناشا کے ساتھ میں تھا۔ ڈرائیونگ سب انسپکٹر شجاعت کے سپرد تھی' ساہی صاحب شجاعت کے ساتھ والی نشست پر تھے۔

اب رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے مال روڈ پر پہنچے اور پھر "پی سی" اور پنجاب اسمبلی ہال کے سامنے سے ہوتے ہوئے لوئر مال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارا رخ شاہدرہ کی طرف تھا۔ راستے میں ایک پولیس ناکے پر ہمیں روکا گیا مگر سب انسپکٹر شجاعت کی شکل دیکھ کر گزرنے کی اجازت دے دی گئی۔ موقع پر موجود چند اہلکاروں نے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم شاہدرہ کے قریب ایک نسبتاً صاف ستھری آبادی میں پہنچے۔ ناشا بڑے دھیان سے گرد و جوار کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے بس کا آخری اسٹاپ پہچان لیا تھا۔ وہاں سے اس نے ہمیں دائیں طرف مڑنے کو کہا۔ وہ ایک ایک چیز کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو موڑ مڑنے کے بعد اس کے کہنے پر شجاعت نے کار کی رفتار مزید کم کر دی۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر ناشا نے انگلی اٹھائی اور بولی "رک جاؤ۔۔۔ رک جاؤ۔"

وہ براؤن رنگ کے ایک چھوٹے سے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کا سا عنصر بھی تھا۔ یقیناً یہاں دیکھا ہوا اندوہناک منظر اسے یاد آ گیا تھا۔ گاڑی کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سب انسپکٹر شجاعت سادہ لباس میں تھا۔ وہ اترا اور براؤن گیٹ کی طرف چل دیا۔ یہ قریباً دس بارہ مرلے کا مکان ہوگا۔ دائیں بائیں ایک ایک پلاٹ خالی تھا' باقی گھر بنے ہوئے تھے۔ یہ متوسط درجے کی آبادی تھی۔

تین چار منٹ بعد شجاعت گاڑی میں واپس آ گیا۔ اس نے بتایا "گیٹ میں جستی تالا لگا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ گیراج بھی خالی پڑا ہے۔"

ساہی صاحب کی ہدایت پر سب انسپکٹر شجاعت قریبی دکانوں سے ایک پان سگریٹ والے کو پکڑ لایا۔ پان سگریٹ والا رات کے آخری پہر پڑنے والی اس افتاد پر قدرے ہراساں نظر آتا تھا۔

ساہی صاحب کے سامنے ہی شجاعت نے مراد نامی اس پان فروش سے سوال جواب کیے۔ پتا چلا کہ یہ مکان شاہی نامی ایک بندے نے کرایے پر لیا ہوا ہے۔ وہ کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے' وہ آڑھت کا کام کرتا ہے اور کام کے سلسلے میں چھٹے ساتویں روز لاہور آتا ہے۔ اکثر اس کے ساتھ دوست بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ نہ بھی ہو تو اس کے یار دوست اس مکان میں رہتے ہیں۔ مراد پان فروش نے بتایا کہ پچھلے چار پانچ روز سے مکان بند پڑا ہے۔

پوچھ تاچھ کے بعد شجاعت دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور اس نے گیٹ کا چھوٹا در کھول دیا۔ ناشا سمیت ہم مکان کے اندر چلے گئے۔ شجاعت کے ہاتھ میں سرکاری ریوالور تھا۔ ساہی صاحب بھی موقع پڑنے پر ریوالور استعمال کرنے کے لیے

پوری طرح تیار تھے۔ پان فروش کے پیچھے دو تین اور محلے دار بھی موقع پر پہنچ گئے تھے اور دور سے ڈرے ڈرے چہروں کے ساتھ پوری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

شجاعت نے آگے بڑھ کر ایک اندرونی دروازہ کھولا تو ہلکی سی بو کا احساس ہوا۔ روشنی جلا کر شجاعت اندر پہنچا۔ بغلی دروازہ کھولنے پر بو ایک دم تیز ہو گئی۔ یہ بو خطرے کی گھنٹی تھی۔ ہم اس بغلی دروازے میں داخل ہوئے' یہ گھر کا اسٹور روم تھا۔ اسٹور روم کے دروازے پر ہی مجھے ایک خون آلود بوری نظر آ گئی۔ بوری خالی تھی۔ ناشا نے انگلی سے بوری کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ یہی وہ بوری ہے۔ میں نے سب انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "شجاعت! میرا خیال ہے کہ بو اس جستی پیٹی میں سے آ رہی ہے۔"

شجاعت نے اثبات میں سر ہلایا اور لائٹ آن کر کے جستی پیٹی کی طرف بڑھا۔ یہ بڑے سائز کی پیٹیاں گھروں میں عام طور پر لحاف وغیرہ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ شجاعت نے منہ پر رومال رکھ کر پیٹی کا ڈھکن اٹھایا تو اندر ہولناک منظر دکھائی دیا۔ یہاں ایک لاش پڑی تھی۔ یقیناً یہ اسی بدنصیب لڑکی کی لاش تھی جسے چند روز پہلے ناشا نے دیکھا تھا۔ منہ پر رومال باندھ کر میں بھی آگے بڑھا۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چار پانچ روز پرانی ہے۔ وہ پھول کر متعفن ہو چکی تھی۔ نجانے کیوں یہ لاش دیکھ کر مجھے تین چار ماہ پہلے دیکھی ہوئی موتابہ کی لاش یاد آ گئی۔ "کالونی" سے آگے اس پراسرار غار میں میں نے موتابہ کو ایسی ہی ملتی جلتی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ پھول کر پھٹ رہی تھی مگر زندہ تھی۔ ان مناظر کے تصور نے اس جستی پیٹی کے اندر نظر آنے والے منظر کی کراہت کم کر دی۔

دل کڑا کر کے ناشا بھی آگے بڑھی اور اس نے لاش کو پہچانتے ہوئے کہا "ہاں یہی وہ لڑکی ہے۔"

میرے اندازے کے مطابق اس لڑکی کی عمر بائیس تئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ نامکمل لباس میں تھی۔ اس کے جسم پر موجود سفید قمیص اور سویٹر کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کالج یونیورسٹی کی یونیفارم پہنے ہوئے ہے۔ لڑکی یقیناً خوب صورت رہی ہوگی مگر اب وہ ایک متعفن لاش تھی۔ اس کا شباب اس کی خوب صورتی اور خوشبو سب کچھ اس جستی پیٹی میں بند رہ کر ختم ہو چکا تھا۔ پتا نہیں وہ بدنصیب کس کی بیٹی تھی' کس کی بہن تھی۔ وہ لوگ اسے کہاں ڈھونڈ رہے تھے اور ڈھونڈ بھی رہے تھے یا نہیں۔ یہ سب کچھ ابھی تاریکی میں تھا۔

اپنی آنکھوں میں ارمان سجا کر کالج یا یونیورسٹی جانے والی اس شریف صورت لڑکی کو نوچا کھسوٹا گیا تھا اور اس کے سارے ارمان و خواب اس کی آنکھوں کے اندر ہی دفنا دیے گئے تھے۔ میری رگوں میں خون کی تپش بڑھنے لگی اور سینے میں وہی وحشت جاگنے لگی جو ایسے موقعوں پر مجھے بے رحم بنا دیا کرتی تھی۔ میرا دل چاہا کاش اس لڑکی کے مجرم اس وقت میرے سامنے ہوں اور میں ان کے ٹکڑے کر سکوں۔ میری اپنی کہانی بھی تو اسی درندگی اور جبر سے شروع ہوئی تھی۔ میری شفقا کو ایسے ہی انجام سے دوچار کرنے کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ اس کی معصومیت کی شہ رگ پر درندگی کے جبڑے گاڑھ کر اس کا خون پینے کی کوشش کی گئی تھی اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر جبر کی بلند و بالا آہنی دیواروں سے ٹکرا گیا تھا۔ لڑکی کو بڑی احتیاط کے ساتھ جستی پیٹی کے اندر سے نکالا گیا اور کمرے کے فرش پر ڈال دیا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کے جسم کو ایک چادر سے ڈھک دیا۔

ساہی صاحب نے مجھ سے کہا "شاہ جہاں! تم اب شجاعت کے ساتھ واپس مسلم ٹاؤن چلے جاؤ۔ یہاں ابھی مقامی تھانے کے لوگ بھی آ جائیں گے' تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"لیکن ناشا؟"

"اس کا ابھی یہاں رہنا ضروری ہے۔ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے ساہی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا اور اس منحوس کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے کے پاس مجھے وہ سیڑھیاں نظر آئیں جن کے نیچے چھپ کر ناشا نے چند دن پہلے لڑکی کی لاش دیکھی تھی۔ قریب ہی وہ سائیکل بھی پڑی تھی جس کے گرنے سے مجرم ہوشیار ہوئے تھے اور ناشا کے پیچھے بھاگے تھے۔ سیڑھیوں کے قریب سے ہوتا ہوا میں بیرونی دروازے پر پہنچا اور گلی میں آ گیا۔ یونہی سرسری سی نگاہ میں نے مکان کی نیم پلیٹ پر ڈالی تھی۔ اچانک مجھے چونکنا پڑا۔ میں نے ذرا غور سے نیم پلیٹ دیکھی۔ ذہن میں جنبش سی ہوئی۔ لکڑی کی نیم پلیٹ پر عام سے انداز میں لکھا گیا تھا "شاہ جہاں عرف شاہی آف شیخوپورہ" اس کے نیچے دوسرا نام درج تھا "شیدی آف شیخوپورہ"

ان دونوں ناموں نے میرے ذہن میں عجیب سی سرسراہٹ جگا دی۔ ان ناموں کے ساتھ شیخوپورہ کا لفظ بھی موجود تھا جو مزید سنسنی کا باعث بن رہا تھا۔ شاہ جہاں کا نام میں کیسے بھول سکتا تھا' جب میں نادر جگی کے ساتھیوں کے

امراو ایک حویلی میں پھنس گیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ شاہ جہاں نادر رجبی کے ایک ساتھی کا نام بھی ہے۔ نیڈی بھی نادر ہی کے ایک ساتھی کا نام تھا۔ دونوں شیخوپورہ کے تھے اور روجھ پور میں رہتے تھے۔ پان فروش مراد بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے ابھی بتایا تھا کہ یہ مکان شاہی نام کے بندے نے کرایے پر لے رکھا ہے۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟" میرے اس سوال کا جواب مراد نے اثبات میں دیا۔

میں نے کہا "اور اس کے دوست نیڈی کو؟"

وہ بولا "اس کے دوست میں نے دیکھے ہیں' ان کو شکلوں سے پہچانتا ہوں مگر نام نہیں جانتا۔"

میں شاید کچھ دیر مزید وہاں ٹھہر جاتا مگر ساہی صاحب کی ہدایت کے مطابق جلد جانا ضروری تھا۔ ذہن میں ایک عجیب سا شک لے کر میں شاہدرہ کے اس مکان سے واپس مسلم ٹاؤن آگیا۔

اب تھوڑی ہی دیر بعد رات کی تاریکی دن کے اجالے میں بدلنے والی تھی۔ زریں گل اور کلثوم کوٹھی میں ہی موجود تھے۔ ننھا زریں گل ماں کی گود میں پرسکون نیند سو رہا تھا۔ میں نے زریں سے پوچھا "اس کا نام نہیں رکھا۔"

"نہیں استاد صیب! ام نے یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ اس کا نام آپ ہی رکھے گا۔ ام تو چاہتا تھا کہ اس کو گڑتی بھی آپ ہی دے لیکن آپ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔"

میں زریں گل اور کلثوم سے بہت باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ہنسی خوشی کی باتیں۔ ننھے زریں کی باتیں۔ لیکن لڑکی کی اجڑی بچھڑی لاش دیکھ کر دل بوجھل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف کلثوم اور زریں کے دل بھی ناشا کی وجہ سے بوجھل تھے۔ زریں کے سمجھانے بجھانے پر کلثوم کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ تاہم اس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ سنبھلنے سے پہلے وہ کافی روئی ہے۔

ابھی اجالا پھیلا نہیں تھا کہ سب انسپکٹر شجاعت زریں اور کلثوم کو لینے آگیا۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ایک دو دن تک میں پھر ان دونوں کو یہاں بلاؤں گا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے پھر بے اختیار زریں کے بچے کو پیار کیا۔

○☆○

وہ سارا دن میں نے خاصی بے چینی میں گزارا۔ شام کو ساہی صاحب آئے اور مجھے ان سے باہر کی صورت حال معلوم ہوئی۔ ساہی صاحب خاصے پریشان نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ٹائی کی گرہ کھول کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولے "قتل ہونے والی لڑکی کا نام رخشندہ ہے۔ وہ ایک سابق ایم پی اے چوہدری اشفاق احمد کی بیٹی ہے۔ وہ لوگ لاہور میں رہتے ہیں لیکن رخشندہ راولپنڈی میں اپنے ماموں کے پاس تھی اور وہیں پر گورنمنٹ کالج میں سال چہارم کی طالبہ تھی۔"

"تو کیا اسے راولپنڈی سے لا کر قتل کیا گیا؟"

ساہی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا "ہفتے کے دن وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی مگر رات تک واپس نہیں آئی۔ اس روز وہ ماموں کے ساتھ کار پر جانے کے بجائے بس پر کالج چلی گئی تھی۔ دراصل اپنی ممانی سے رخشندہ کا کچھ جھگڑا ہوا تھا جس کے سبب وہ ناراض تھی۔ جب وہ رات تک واپس نہیں آئی تو ماموں اور ممانی کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے سوچا کہ شاید ناراضگی کی وجہ سے وہ اپنی ایک قریبی سہیلی زلیخا کی طرف چلی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ وہ اسی طرح اپنی سہیلی کی طرف چلی گئی تھی۔ زلیخا کی طرف پتا کیا گیا مگر رخشندہ وہاں بھی نہیں ملی۔ ماموں ممانی کو اب صحیح معنوں میں تشویش لاحق ہوئی۔ لاہور میں رخشندہ کے والدین کو اطلاع دیے بغیر وہ پورے دو دن راولپنڈی میں ہی رخشندہ کو ڈھونڈتے رہے۔ آخر مایوس ہو کر انہوں نے لاہور میں رخشندہ کی گمشدگی کی اطلاع دے دی۔

راولپنڈی اور لاہور میں رخشندہ کے لواحقین مزید آٹھ پہر تک اسے خاموشی سے ہی تلاش کرتے رہے۔ وہ رخشندہ کی گمشدگی کو بدنامی کے خوف سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا انہوں نے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ کل رات چوہدری اشفاق احمد نے اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ ماڈل ٹاؤن تھانے میں درج کرائی ہے۔ اس رپورٹ میں چوہدری اشفاق نے اپنے سیاسی حریف ملک جہاں داد اور اس کے بھائی پر شک کا اظہار کیا ہے۔"

"یعنی دو گروہوں میں دشمنی ہے؟" میں نے پوچھا۔

ساہی صاحب نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ دہری دشمنی ہے۔ ایک تو سیاسی رقابت دوسرے نجی عداوت۔ ملک جہاں داد کا چھوٹا بھائی جو چھوٹا سلطان کے نام سے مشہور ہے چوہدری اشفاق کی مقتول بیٹی رخشندہ پر نظر رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ رخشندہ بھی اسے تھوڑا بہت پسند کرتی ہو مگر وہ اپنی مجبوریاں سمجھتی تھی اسے معلوم تھا کہ سیاسی رقابت کی وجہ سے یہ دونوں خاندان کبھی ایک نہیں ہو سکتے' لہٰذا وہ ہمیشہ چھوٹے سلطان کو نظر انداز کرتی رہی

تھی۔ چھوٹا سلطان مسلسل اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ایک بار بیتنہ طور پر اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ وہ رخشندہ کو اغوا کر لے جائے گا اسی تناؤ کے پیش نظر اور رخشندہ کو اس ماحول سے دور رکھنے کے لیے اس کے والد نے اسے پنڈی میں اس کے ماموں کے پاس بھیج دیا تھا۔ اب وہ پچھلے ایک سال سے پنڈی میں ہی تھی اور وہیں پر پڑھ رہی تھی۔ اغوا کرنے والے اسے بے ہوشی کی حالت میں پنڈی سے لاہور لائے۔ یہاں شاہدرہ کی اس کوٹھی میں رخشندہ کو محبوس رکھا گیا۔ اس کی عصمت دری کی گئی اور پھر اسے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا گیا۔"

وہی کہانی جو ازل سے دہرائی جا رہی ہے۔ وہی عورت جو قرنوں سے تختۂ مشق ہے۔ مردوں کی دشمنیوں کا خمیازہ بھگتنے والی وہی بنت حوا جو ہر دور میں لہولہان رہی ہے اور لہو روتی رہی ہے۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا اس واردات میں۔

میں نے کہا "جب! جب ناشا نے دیکھا تو رخشندہ کو موت کے گھاٹ اتارنے والے اسے بوری میں بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر کل رات ہمیں رخشندہ کی لاش جستی پیٹی میں سے ملی ہے۔"

"اس بات پر غور کیا ہے میں نے" ساہی صاحب نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ لاش ٹھکانے لگانے کے بارے میں قاتلوں کو اپنا پروگرام فوری طور پر بدلنا پڑا ہوگا۔ ناشا نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ جب ناشا سیڑھیوں کے نیچے سے نکل کر بھاگی تو ایک قاتل تو فوری طور پر ناشا کے پیچھے بھاگ گیا۔ دوسرے نے ناشا کی لاش کو جستی پیٹی میں پھینکا اور گھر کی روشنیاں بند کرنے کے علاوہ دروازے وغیرہ بند کیے۔ اس کے بعد وہ بھی اپنے ساتھی کے پیچھے نکل گیا۔"

"ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ لوگ واپس نہیں آئے ہوں گے کیونکہ وہ ناشا کو نہیں پکڑ سکے تھے۔"

ساہی صاحب نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور بولے "یہ مکان شاہ جہاں عرف شاہی نام کے ایک شخص نے کرایے پر لے رکھا تھا۔ اس شخص کے مستقل ایڈریس پر پولیس پارٹی بھیجی گئی تھی' وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آئی ہے۔ شیخوپورہ کا وہ ایڈریس فرضی نکلا ہے۔ وہاں شاہ جہاں نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ ہم دیگر ذرائع سے بھی کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید کل دوپہر تک کچھ پیش رفت ہو۔"

"مقتول لڑکی کے لواحقین کا کیا رد عمل ہے؟"

"بہت سخت!" ساہی صاحب نے چونک کر کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں دونوں گروہوں میں شدید قسم کا تصادم نہ ہو جائے۔ لڑکی کے لواحقین اس قتل کا ذمے دار جہاں داد اور اس کے بھائی کو قرار دے رہے ہیں۔ ان کا کیس اس لحاظ سے مضبوط ہے کہ کل شام چوہدری اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن تھانے میں جو ایف آئی آر کٹوائی ہے اس میں چھوٹے سلطان کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ دونوں سیاسی فریقوں کو قتل و غارت پر آمادہ کرنے کے لیے کسی تیسرے گروہ نے رخشندہ کے قتل والا ستم ڈھایا ہو؟"

"ہونے کو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے واقعات آج کل عام ہو رہے ہیں۔ کسی وقت تو یہ بات سو فیصد یقینی لگنے لگتی ہے کہ کچھ خفیہ ہاتھ منصوبے کے تحت کشیدگی کو ہوا دے رہے ہیں۔"

"کم از کم دو واقعات کا تو میں بھی چشم دید گواہ ہوں۔" میں نے کہا۔

ساہی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھ سے جلسے میں سانپ چھوڑنے والا واقعہ تفصیل سے سن چکے تھے۔ اس کے علاوہ راولپنڈی میں ایس ایس پی جمشید غوری کا ہولناک قتل ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غوری اور ان کے ڈاکٹر بیٹے کے پرخچے اڑنے کا خوفناک منظر ابھی تک ذہن پر نقش تھا۔

ساہی صاحب اٹھ کر ٹہلنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جہاں دیدہ سوچ تھی۔ بولے "اس کیس میں جلد پیش رفت ہونا ضروری ہے۔ تاکہ اگر یہ چھوٹے سلطان کا کام نہیں تو اس کی تصدیق ہو سکے۔ دوسری صورت میں اشفاق احمد کا گروہ خون خرابے سے باز نہیں آئے گا۔"

جو بات میرے ذہن میں آ رہی تھی وہ ساہی صاحب کے ذہن میں نہیں تھی۔ میرا دھیان بار بار شاہ جہاں آف شیخوپورہ اور نیڈی آف شیخوپورہ کی طرف جا رہا تھا۔ میری چھٹی حس دہائی دے رہی تھی کہ میں رخشندہ کے قاتلوں کو جانتا ہوں اور ان تک پہنچ سکتا ہوں لیکن یہ بات میں ابھی ساہی صاحب کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔

ساہی صاحب کی آواز نے مجھے میرے خیال سے چونکایا۔ وہ بولے "ناشا کی طرف سے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے حوالات میں بھی گھر جیسا آرام حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ناشا سزا سے بچ جائے گی۔ مقتول فیروز کے خلاف ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ خاص طور سے تم نے جو کیسٹ دی ہے وہ عدالت میں سارا پول کھول کر رکھ

دے گی۔ آج صبح وہ کیسٹ اعلیٰ افسران نے سنی ہے۔ ڈی آئی جی صاحب بھی موجود تھے۔"

میں نے ساہی صاحب سے درخواست کی کہ وہ زریں گل سے ملیں اور اسے تسلی تشفی دیں۔

ساہی صاحب نے کہا "ٹھیک ہے، میں اس کی طرف سے ہوتا ہوا گھر جاؤں گا۔"

پھر جیسے اچانک ایک نیا خیال ان کے ذہن میں آیا اور وہ بولے "شیخ عاصم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تمہیں؟"

"نہیں تو۔"

"وہ آج صبح امارات چلا گیا ہے۔ اس کے دو قریبی ساتھی بھی اس کے ساتھ گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اسے ایمرجنسی میں جانا پڑا ہے۔"

"اور شنکر شکرا؟"

"وہ تو بدستور بستر پر پڑا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میری تلاش کا کاروبار ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ کم از کم عاصم کے واپس آنے تک۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" ساہی صاحب نے کہا۔

کچھ دیر تک عاصم اور شنکر کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے کے بعد ساہی صاحب جانے کے لیے اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے فوراً بعد میں نے مسٹر جی کلارک کو ان کے ذاتی نمبر پر کال کی۔

مسٹر کلارک ابھی تک گولڈ ہوٹل کے سوئٹ نمبر ۱۰۸ میں مقیم تھے۔ آج وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھے۔ انہوں نے کہا "میں کل سے تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے میرے پاس ایک چھوٹی سی خوش خبری بھی ہے۔"

"تو پہلے آپ خوش خبری ہی سنا دیں۔ اس قسم کی چیز سنے ہوئے مدت گزر گئی ہے۔"

وہ بولے "شاید تمہیں پتا چلا ہی ہوگا، میں برطانیہ سے پاکستان آنے کے دو دن بعد ہی میں واپس چلا گیا تھا۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ مسٹر کلارک بولے "میرا وہ دورہ ایک بڑی کاروباری ڈیل کے لیے تھا۔ اس کاروباری ڈیل نے تمہارے "دوست" شیخ عاصم کے چھکے چھڑا دیے ہیں۔ اس امر کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ مڈل ایسٹ میں شیخ عاصم کی کم از کم دو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا دیوالیہ نکل جائے گا اور تیسری کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔"

سنسنی کی ایک لہر سی میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ مسٹر جی کلارک آج کل ہر روز ایک نیا تہلکہ خیز انکشاف کر رہے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پس پردہ رہتے ہوئے بھی ہمارے شانے سے شانہ ملا کر ہمارے دشمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ یقیناً شیخ عاصم بھی ان دشمنوں میں شامل تھا۔ مسٹر کلارک نے بڑی مہارت اور خاموشی سے اس سفاک درندے کو بڑی کاری ضرب لگائی تھی۔ ایسی ضرب شیخ عاصم کو مسٹر کلارک ہی لگا سکتے تھے۔

میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے ایس ایس پی ساہی صاحب مجھے اطلاع دے رہے تھے کہ شیخ عاصم ایمرجنسی میں لاہور سے امارات روانہ ہو گیا ہے۔ کہیں اس کی یہ روانگی بھی تو اسی سلسلے کی کڑی نہیں؟"

غالباً دوسری طرف مسٹر کلارک ہولے سے مسکرائے تھے۔ انہوں نے کہا "تمہارا اندازہ درست ہے اور میرا خیال ہے کہ میرا اندازہ بھی درست ثابت ہوگا۔"

"آپ کا اندازہ؟"

"ہاں۔ میرا اندازہ ہے کہ شیخ عاصم اب ایک مہینے سے پہلے پاکستان واپس نہیں آئے گا۔ ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے۔"

"لگتا ہے کہ اسے ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی ہے۔"

"اگر سنبھلے گا نہیں تو مزید لگے گی۔" مسٹر کلارک نے بااعتماد لہجے میں کہا۔ میرے لیے ان کے اندر کا خلوص ہمیشہ کی طرح لب و لہجے سے عیاں تھا۔

پھر مسٹر کلارک نے مجھ سے ناشا کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے تازہ ترین صورتِ حال انہیں بتائی۔ وہ توجہ سے سنتے رہے۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے مشورے بھی انہوں نے دیے۔ میں نے انہیں زریں گل کے باپ بننے کی خبر سنائی۔ یہ خبر مسٹر کلارک کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ بلکہ وہ زریں گل کو مبارک باد بھی دے چکے تھے۔ جب مسٹر کلارک بات چیت کر رہے تھے، کہیں پاس ہی ڈیک بج رہا تھا۔ موسیقی کی مدھم آواز فون پر بھی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً یہ موسیقی مسٹر کلارک نہیں سن رہے تھے۔ یہ انگلش کا پرانا سا گانا تھا اور کرسٹی ہی سن سکتی تھی۔ اس کے بول تھے "ڈاڈی اماں مجھے نصیحتیں مت کرو۔ کیونکہ کبھی تم بھی میری طرح جوان تھیں..."

○☆○

اب میرا ارادہ واپس روجھانپور جانے کا بن رہا تھا اور کام میں جلد سے جلد کرنا چاہتا تھا۔ شاہد رو کے مکان میں رخشندہ کی زخمی لاش دیکھ کر میری جو کیفیت ہوئی تھی وہ ابھی تک برقرار تھی۔ میں اس کے بے رحم قاتلوں کے چہرے

دیکھنے کو خواہش مند تھا۔ سینے میں کوئی شے سلگتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ پرسوں ساہی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ میرے ساتھ شیخوپورہ کے نواحی گاؤں باگی پنڈ سے گرفتار ہونے والے بھولا اور اس کے ساتھی جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ مزید معلومات ساہی صاحب سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب ساہی صاحب آئے۔ اس وقت تک میں لاہور سے شیخوپورہ روانہ ہونے کے لیے پوری تیاری کر چکا تھا۔ ساہی صاحب نے بغیر کسی تمہید کے بتایا کہ وہ کل زریں اور کلثوم سے ملے ہیں اور ان کی پریشانی بڑی حد تک کم کر دی ہے۔ ساہی صاحب نے ایک واکی ٹاکی میری طرف بڑھایا اور یہ خوشگوار اطلاع دی کہ میں جب چاہوں اس آلے کے ذریعے زریں گل سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ یہ فرانس کا بنا ہوا ایک طاقت ور SET تھا۔ بیٹری بھی زبردست تھی۔ میں نے اسی وقت ٹرائی کی اور زریں سے رابطہ قائم ہو گیا۔

زریں اور کلثوم دونوں ہی آج قدرے اچھے موڈ میں تھے۔ پس منظر میں ان کے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ گانا بھی لگا ہوا تھا۔ گانے کے شور کے سبب زریں کی آواز صاف نہیں تھی۔ میں نے کہا "اوئے باندر! یہ ریڈیو تو بند کر۔"

وہ بولا "ریڈیو نہیں استاد صیب ٹیپ ریکارڈر ہے۔ کاکا رو رہا تھا۔ ام نے اسے چپ کرانے کے لیے لگایا ہے۔"

میں نے "شاباش ابھی سے اس کے کانوں میں گانے ڈال۔ آوارہ ہوں، گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں۔"

زریں نے کہا "اچھا جی، میں بند کر دیتا ہوں۔"

چند لمحے بعد کیسٹ کی آواز معدوم ہو گئی اور زریں کی صاف سنائی دینے لگی، میں نے پوچھا "اوئے! یہ اتنا رو کیوں رہا ہے؟"

وہ خوش ہو کر بولا "ام نے اس کا ختنہ کروا دیا ہے استاد صیب ایک دم فٹ۔ اب ام کو کوئی خطرہ نہیں۔"

"خطرہ نہیں؟ کیا مطلب؟"

زریں بولا "استاد صیب! آپ اکثر فرمایا کرتا ہے نا کہ بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ ایک نہ ایک دن اس کے سامنے ضرور آتا ہے۔ بس ام کو بھی وہم تھا کہ ایک دن ام کو بھی مصیبت نہ پڑ جائے۔"

"اوئے صاف بکواس کر کہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔"

وہ مسکراتے لہجے میں بولا "بات تھوڑا سا شرم والا ہے لیکن آپ کو بتانے میں کیا حرج ہے۔ دراصل ام نے اپنے باپ کو بہت ستایا تھا۔ خوام چھ سات سال کا ہو گیا تھا۔ وہ امارا ختنہ کروانا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی ختنے کی بات کرتا تھا ام گھر سے بھاگ جاتا تھا اور وہ ام کو گلیوں میں ڈھونڈتا پھرتا تھا پھر جس روز امارا ختنہ ہوا ام نے وہ ہنگامہ مچایا کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ امارا ٹانگ لگنے سے امارا دادا کا جبڑا ہل گیا تھا اور امارے باپ کا تین انگلی استرا لگنے سے شدید زخمی ہو گیا تھا اور تو اور نائی کا اپنا ایک انگلی کا ختنہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ختنے کے بعد بچہ روتا ہے لیکن اس روز نائی روتا ہوا امارے گھر سے نکلا تھا۔ بس ام کو وہ واقعہ یاد آ گیا۔ ام نے سوچا کہ ام اس خطرے کا سدباب شروع میں ہی فرما دے۔"

مجھے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔ اپنے لہجے کی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے میں نے کہا "لیکن ابھی بھی کیا جلدی تھی۔ ابھی نام رکھا نہیں اور ختنے کی پڑ گئی۔"

"استاد صیب! ام پہ نام کا کوئی بوجھ نہیں لیکن ختنے کا بہت بوجھ تھا۔ ویسے بھی استاد صیب! اللہ تعالیٰ نے ام مسلمانوں کے لیے جو بھی حکم دیا ہے اس میں کوئی نہ کوئی اچھائی تو ہوتا ہے اور بڑے کہتے ہیں کہ اچھائی کے کام میں بالکل دیر نہیں ہونا چاہیے۔"

"اچھا۔ کلثوم کا کیا حال ہے؟" میں نے موضوع بدلا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دم سمال ہو گیا ہے۔"

"سمال نہیں اسمارٹ!"

"جی ہاں وہی۔ ہر وقت ہنستا کھیلتا رہتا ہے۔ لگتا ہے کہ اس نے بچہ پیدا ہی نہیں فرمایا۔ بس ایک مصیبت ہے، ہر وقت اوٹ پٹانگ رسمیں ادا کرتا رہتا ہے۔ ان کے قبیلے میں بالکل چھوٹے بچے کو نرم چمڑے کا جوتا پہناتے ہیں۔ اب کلثوم ام سے کہتا ہے کہ اس کے لیے جوتا ڈھونڈ کر لاؤ۔ اتنا چھوٹا جوتا ام کہاں سے ڈھونڈے۔"

"مجھے تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔" میں نے کہا۔

چند منٹ زریں اور کلثوم سے بات چیت کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ساہی صاحب دلچسپی سے میری گفتگو سن رہے تھے۔ گاہے گاہے مسکرا بھی دیتے تھے۔ ہم نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ میں نے ساہی صاحب کو اس گفتگو کے بارے میں بتایا جو کچھ دیر پہلے میرے اور مسٹر کلارک کے درمیان شیخ عاصم کے حوالے سے ہوئی تھی۔ اس... اطلاع نے ساہی

صاحب کو بھی بے حد مسرور کیا کہ شیخ کو مسٹر کلارک نے کاروباری چوٹ لگائی ہے اور وہ بھنگٹے امارات بھاگ گیا ہے۔ اس کی تفصیلی گفتگو کے بعد میں نے ساہی صاحب کے سامنے اپنا پروگرام رکھ دیا اور انہیں بتایا کہ میں سابقہ حلیے اور حیثیت سے ایک بار پھر رودھا پور جانا چاہتا ہوں۔ میں نے ساہی صاحب کو وہ وجہ بھی بتائی جس کے لیے میں وہاں جانا ضروری سمجھتا تھا۔

میرے ذہن میں موجود شک کو ساہی صاحب نے بھی اہمیت دی۔ شاہ جہاں آف شیخوپور اور لوڈینڈی آف شیخوپورہ' یہ دونوں نام ایک ہی نمبر پلیٹ پر پائے گئے تھے۔ ان دونوں ناموں کے بارے میں میں نے شیخوپورہ کے نواحی قصبے رودھا پور میں سنا تھا۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ ان دونوں ناموں کے حوالے سے میں بدقسمت لڑکی رخشندہ کے بہیمانہ قتل کا کھوج لگالیتا۔ سیاسی کشیدگی کی فضا میں اس قتل نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ آج کے اخبارات میں بھی اس قتل کے حوالے سے شہ سرخیاں موجود تھیں۔ دو تین مقامات پر ہنگامہ بھی ہوا تھا۔ اشفاق احمد کا گروپ اس قتل کا ذمے دار واضح طور پر اپنے حریف ملک جہاں داد کے بیٹے چھوٹے سلطان کو قرار دے رہا تھا اور اس کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کر رہا تھا۔ تاہم پولیس کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر چھوٹے سلطان کی گرفتاری سے گریزاں تھی۔

ساہی صاحب سے مشورے کے بعد میں رودھا پور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے وہی بوسیدہ شلوار قمیص اور چپل پہن لی جو باگی پنڈ سے گرفتاری کے موقعے پر پہن رکھی تھی۔ گلے میں وہ مفلر ڈال لیا جو "لاہور ہوٹل چوک" والے انوائی گیرے کی یادگار تھا۔ راولپنڈی میں بم دھماکے والے واقعے میں میری پنڈلی پر چھوٹے چھوٹے چند زخم آئے تھے' میں نے یہاں دوا وغیرہ لگا کر تازہ پٹی باندھ لی۔ یہ پٹی بھی میری پلاننگ میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ ساہی صاحب کے جانے کے بعد کچھ ہی دیر بعد میں بھی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی سے روانہ ہو گیا۔ اپنا ریڈی میڈ میک اپ میں نے ختم کر دیا تھا اب میں اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا' لہٰذا احتیاط کی بھی زیادہ ضرورت تھی۔ بادل چھائے تھے' ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی' میں نے مفلر اس انداز میں لپیٹا تھا کہ کسی حد تک چہرہ بھی چھپ سکے۔ ایک ویگن پر سوار ہو کر میں اسٹیشن پہنچ گیا۔ راستے میں چیئرنگ کراس کے قریب ویگن کو قریباً آدھا گھنٹا رکنا پڑا یہاں ٹریفک کا زبردست اژدحام تھا۔ معلوم ہوا کہ مال روڈ سے ایک جلوس گورنر ہاؤس کی طرف جا رہا ہے۔ ویگن میں داخل ہونے والی دو سواریوں سے گفتگو کی اس سے پتا چلا کہ یہ احتجاجی جلوس سابق ایم پی اے چوہدری اشفاق کی بیٹی کے قتل کے حوالے سے ہی ہے۔ اس قتل کی بازگشت پورے شہر میں سنائی دے رہی تھی۔

میں اسٹیشن کے قریب ویگن سے اترا اور پیدل ہی جی ٹی ایس کے بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ گرد آلود پاؤں کے ساتھ چپل گھسیٹتا ہوا میں ایک وسیع و عریض ہورڈنگ (پینافلیکس بورڈ) کے نیچے سے گزرا تو خود بخود ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر آگئی۔ یہ وسیع و عریض ہورڈنگ گولڈ ہوٹل کا تھا۔

○☆○

میں شام کے وقت شیخوپورہ پہنچا۔ وہاں سے حسب سابق ایک دیہاتی تانگے پر سوار ہوا۔ اس کے بعد سیہ تاریک رات میں طویل فاصلے تک پیدل سفر کر کے رودھا پور پہنچ گیا۔ رات کے ساڑھے دس کا وقت تھا۔ رودھا پور کا چھوٹا سا قصبہ نیند کے جھونکوں میں تھا۔ کہیں کہیں کسی کھیت میں ٹریکٹر یا ڈیزل انجن چلنے کی آواز آتی تھی۔ قصبے سے باہر قبرستان کی بھول بھلیوں میں آوارہ کتے شور مچا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ دو گھڑسوار پولیس والوں سے سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ابھی میں قصبے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ دور سے کرم دین کے گھر کی مدھم روشنی نظر آئی۔ امرودوں کے باغ میں گھرا ہوا یہ مکان میرے لیے جانا پہچانا تھا۔ میں نے کئی دن یہاں گزارے تھے اور کرم دین کی بیوی شاہدہ کی مہمان نوازی "انجوائے" کی تھی۔ بہرحال آج میں کرم دین کا مہمان بننے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آج میری منزل نادر جگی کا ڈیرہ تھی۔ میں وہاں پولیس کی حراست سے بھاگے ہوئے مجرم کی حیثیت سے جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے دیکھ کر نادر جگی اور اشرف چیا وغیرہ کا ردعمل کیا ہو گا' تاہم جو کچھ بھی تھا جلد ہی سامنے آنے والا تھا۔

میں کرم دین کے گھر سے قریباً ایک فرلانگ کی دوری سے گزرا۔ میرا دھیان دوالدار نفیض اور شاہدہ کے عجیب و غریب سوشتے کی طرف چلا گیا۔ عین ممکن تھا کہ رات کے اس پہر نیچی چھت والے اس کمرے میں اسی قسم کا منظر ہو جیسا میں نے ایک رات دیکھا تھا۔ شاہدہ' نفیض کی باہوں میں ہو اور بے چارہ کرم دین جاگتے ہوئے بھی سو رہا ہو۔

ڈیرے تک پہنچنے میں مجھے دس پندرہ منٹ مزید لگ گئے۔ میں پھاٹک کے سامنے پہنچا تو تاریکی سے نکل کر ایک سایہ میرے سامنے آ گیا۔ اس کے کندھے سے ہولسٹر لٹک رہا تھا۔

"کون ہو؟" اس نے بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔

میں نے مفلر چہرے سے ہٹا دیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں غور سے دیکھا اور متحیر آواز میں بولا "اوئے جہاں داد تم؟" میں نے آواز سے پہچانا اس شخص کا نام ماجھو تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں گھبراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا "ماجھو! نادر صاحب کہاں ہیں؟"

"اوئے۔ تم تو جیل میں تھے' یہاں کیسے پہنچے ہو۔ کیا بھاگ آئے ہو۔" ماجھو نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"یار! ساری بات بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے اندر لے چلو۔ سردی سے میری جان نکل رہی ہے۔"

ماجھو چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد مجھے ڈیرے میں لے گیا۔ احاطے میں دو تین گھوڑوں کے علاوہ نادر جگی کی جیپ بھی کھڑی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ نادر یہاں نہ ہوتا تو مجھے مشکل پیش آسکتی تھی۔ ماجھو مجھے اندرونی کمرے میں لے گیا اور بلب کی روشنی میں غور سے میرا سراپا دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔ آج سویرے کوٹ لکھپت جیل سے ہمیں پیشی کے لیے ضلع کچہری لایا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جلوس نے ٹرک کو گھیر لیا۔ لوگوں نے پولیس والوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ کچھ لڑکوں نے دروازہ توڑ دیا۔ سارے قیدی باہر آ گئے۔ کچھ کو پھر پولیس والوں نے پکڑ لیا' کچھ بھاگ گئے۔"

"تو تم بھی بھاگنے والوں میں شامل ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی شلوار اوپر اٹھا کر اپنی زخمی ٹانگ دکھائی۔

ماجھو کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے' وہ اندر گیا اور کچھ دیر بعد نادر جگی کو لے کر آ گیا۔ نادر جگی نے صرف تہبند اور بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا جسم کسی ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ نادر کے سامنے مجھے ایک بار پھر اپنی ساری کہانی دہرانی پڑی اور یہ بھی بتانا پڑا کہ میں لاہور سے کس طرح خجل خوار ہو کر یہاں تک پہنچ پایا ہوں۔ نادر جگی کا چہرہ نارمل نظر آ رہا تھا تاہم مجھے لگا کہ وہ اندر سے خوش نہیں ہے۔ اس نے پوچھا "کسی کو اپنے پیچھے تو نہیں لگا لایا؟"

میں نے جلدی جلدی نفی میں سر ہلایا "نہیں جی۔ میں راستے میں بار بار دیکھتا رہا ہوں۔ اگر کوئی میرے پیچھے لگا ہوتا تو میں پاگل تھا کہ یہاں اپنے ڈیرے پر آتا۔"

"تیرے پاس کرایے کے پیسے تھے؟"

"ہاں جی! جیل میں ایک یار بن گیا تھا اس نے دو سو روپیہ خرچہ وغیرہ کے لیے دیا تھا۔"

"رحیم یار خاں میں تیرے وارثوں کو تیرے بارے میں کچھ پتا چلا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں جی۔ انہیں کچھ پتا نہیں اور نہ ہی میں بتانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی اب میرے والی وارث تو آپ ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔" میں جان بوجھ کر اٹک گیا۔

"کیا۔۔۔ مگر؟" نادر نے ذرا غرا کر پوچھا۔

"جناب! چیا صاحب اور بھولا صاحب نے میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "میں قسم کھاتا ہوں جی کہ میں نے باگی پنڈ میں رائفل کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ چیا صاحب اور بھولا ہی گولیاں چلاتے رہے تھے' مگر جب بندہ مر گیا تو انہوں نے رائفل مجھے پکڑا دی اور بعد میں پولیس والوں سے بھی یہی کہا کہ گولی میں نے چلائی تھی اور تو اور انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ہمارا ساتھی ہی نہیں ہے۔ اس نے تو راستے میں ہم سے لفٹ مانگی تھی۔ مجھے۔۔۔ پولیس نے بڑا مارا ہے جی۔ مجھے ساری ساری رات ٹھنڈ میں کھڑا رکھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پھانسی سے کم میں میری جان نہیں چھوٹے گی۔"

نادر مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں ایک مختلف قسم کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ بولا "اوئے ایسی کم تیسی پولیس کی۔ پولیس تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہمارے ہوتے ہوئے۔"

"مگر جناب! ایک بات کہنا چاہتا ہوں' کہیں آپ غصہ نہ کر جائیں۔"

"نہیں کرتا۔ کہو تم۔"

"تھانے میں اور پھر جیل میں کسی نے میری خبر نہیں لی ہے۔ میں نے رات دن انتظار کیا ہے' آپ کی شکل میری نظروں میں گھومتی رہی ہے۔"

نادر مکاری سے بولا "دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہاری طرف سے بے خبر نہیں تھے۔ میرے بندے دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ تمہارا پتا چلایا جائے۔ ان خبیثوں نے تمہیں چیئے اور بھولے وغیرہ سے الگ رکھا ہوا تھا۔ میرا تو خیال ہے کہ کسی تھانے کی بجائے تمہیں کسی گھر دغیرہ میں رکھا گیا تھا۔ پولیس کے پاس ایسے بہت سے ٹھکانے ہوتے ہیں جہاں وہ گرفتاری ڈالے بغیر بندے کو کئی کئی دن رکھ سکتی ہے۔ شروع شروع میں چیا اور

بھولا بھی تمہارے ساتھ ہی بند تھے' پھر انہیں تو قلعہ گوجر سنگھ تھانے میں لے گئے اور تم اسی مکان میں رہے۔ چھیتے اور بھولے وغیرہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر انہیں قلعہ گوجر سنگھ لایا گیا تھا اس لیے وہ بھی نہیں بتا سکتے تھے کہ تم کہاں ہو... اور جیل میں تو میرا خیال ہے کہ تم دو تین دن پہلے ہی گئے ہو گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

نادر مدبرانہ انداز میں بولا "جہاں تک تمہارا یہ گلہ ہے کہ چھیتے اور بھولے نے تم پر راتعل ڈال دی تھی تو اس کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ دراصل ہم جیسے لوگوں کو موقع محل کے لحاظ سے کئی طرح کے بیان دینے پڑتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہوتی ہے کہ بندہ خود کچہری اور مقدمے سے بچ کر نکل آئے اور وہ ہم نے تمہیں نکال ہی لانا تھا۔"

نادر جنگی پانچ دس منٹ تک مجھے "سمجھانے بجھانے" اور تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے "خبیث ذہن" میں میرے حوالے سے کوئی نئی بات آگئی ہے۔ کوئی ایسی فائدہ بخش بات جو شروع میں نہیں آئی تھی۔ اس بات کی وجہ سے اس کا رویہ تبدیل ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ایک کارندے اختر کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ مجھے چھوٹے تہ خانے میں لے جائے اور میرے کھانے اور آرام کا بندوبست کرے۔ اختر نے مجھے ساتھ لیا۔ میں اس کے ساتھ لنگڑاتا ہوا چل دیا۔ اپنی چوٹ کے بارے میں میں نے نادر کو بتایا تھا کہ یہ پولیس کی حراست سے فرار کے دوران میں لگی تھی۔ آنسو گیس کا ایک شیل میری ٹانگ کے بالکل قریب آ پھٹا تھا۔

اختر مجھے لے کر ڈیرے کے عقبی حصے میں پہنچا اور پھر چند نیم پختہ سیڑھیاں اتر کر ایک تہ خانے میں لے آیا۔ یہاں بلب روشن تھا۔ ایک الماری کے علاوہ دو چارپائیاں' لحاف اور حقہ وغیرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈیرے کے اکثر کمروں کی طرح اس تہ خانے کی دیواروں پر بھی پاکستانی اور انڈین ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں چسپاں تھیں۔ ایک طرف چھوٹا سا ٹیلی ویژن بھی پڑا تھا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں یہ کمرہ بالکل آباد بلکہ شاداب ہو گیا۔ میری پرانی "خیر خواہ" چھم چھم کرتی رانو عرف فلمی ہیروئن بابرہ شریف بھی آ موجود ہوئی۔ رات کے اس پہر بھی وہ بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھی اور ہر قسم کی "سوٹنگ" کے لیے بالکل تیار نظر آتی تھی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے گلے میں بانہیں ڈالیں اور بولی "وے گھونے کہاں چلا گیا تھا۔ میری تو جند جان ہی نکال کر لے گیا تھا۔ پتا نہیں میں تجھے کتنا یاد کرتی رہی ہوں۔"

اس نے میرے سامنے گرم گرم چکن قورمہ رکھا تین چار تندوری روٹیاں بھی رومال میں لپیٹ کر رکھ دیں اس کے بعد وہ کوکے منگانی باہر گئی اور گرم دودھ کا گلاس لے آئی۔ یہ گلاس قریباً ایک فٹ لمبا تھا اور پیتل کا بنا ہو۔ "لے سوہنیا! گرم گرم دودھ پی تیری ساری ٹھنڈ بھاگ جائے گی اور پھر بھی نہ بھاگی تو بے شک مجھے پی لینا۔" وہ آنکھ مخمور بنا کر بولی۔

لقمہ میرے گلے میں پھنستے پھنستے رہ گیا۔ کھانسی آئی تو جلدی جلدی میری کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی "ہائے ہائے" تو نے کھایا۔ کوئی تیرے پیچھے تو نہیں پڑا ہوا۔"

"پیچھے تو پڑا ہوا ہے۔ بلکہ بڑا پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی پولیس پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ بھاگ کر آیا ہوں۔" میں نے بات بدلی۔

"وے انہوں نے تجھے زیادہ مارا تو نہیں؟"

"لے بات کر رہی ہے۔ انہوں نے کوٹ کوٹ کر میرا حشر کر دیا ہے۔ کھانسی بھی کروں تو سارا پنڈا چیخیں مارنے لگ جاتا ہے۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔ چل کوئی بات نہیں۔ تو کھانا کھا۔ پھر میں انگیٹھی لے کر آتی ہوں اور دیسی گھی سے تیرے پنڈے کی مالش کرتی ہوں۔"

"خدا کا نام لے۔ مجھ سے تو ہاتھ نہیں لگایا جاتا پنڈے پر اور تو کہتی ہے کہ مالش کرتی ہوں۔"

"وے میں تجھے بڑے ہولے ہاتھ لگاؤں گی۔ سرور نہ آگیا تو میرا نام بدل دینا۔" وہ میرے ساتھ بھڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

میں نے پہلے تو اس سے جھٹکارا پانے کا سوچا' مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ رانو بہت باتونی تھی لگتا تھا کہ باتوں باتوں میں کچھ ایسی باتیں بھی اس کے منہ سے نکل جاتیں جو میرے لیے مفید ثابت ہوتیں۔

میں کھانا کھا چکا تو وہ برتن سمیت کر باہر لے گئی۔ تاہم دس منٹ بعد وہ پھر آن موجود ہوئی۔ اس نے اسٹیل کی پیالی میں دیسی گھی گرم کیا ہوا تھا۔ وہ میری مالش کرنے کی فکر میں تھی مگر میں اس کے سامنے کپڑے اتارنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ نہ نیل' نہ سوجن نہ لاش۔

رانو نے منہ ذرا دوسری طرف کیا تو میں پیالی کا گھی دو تین گھونٹوں میں پی گیا۔

"وے! یہ کیا کیا تم نے؟" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

"بھئی! گھی ہی استعمال کرنا تھا وہ میں نے کر لیا ہے۔ یہ اندر سے ٹکور کرے گا۔"

"اچھا چل لیٹ میں تمہیں دبا دیتی ہوں۔"

اس نے مجھے پیٹ کے بل لٹا دیا اور مٹھی چاپی کرنے لگی ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں بات چھیڑ دی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح ہم نے مولوی برکت پر ہاتھ ڈالا اور کس طرح مولوی برکت کو سبق سکھاتے سکھاتے خود ہمیں مصیبت پڑ گئی۔ میں نے کہا "وہاں شاہ جہاں نام کے بندے کی بات بھی ہوئی تھی۔ سنا ہے اس بندے نے نادر جنگی صاحب کے کسی مخالف کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے تھے۔"

"ہاں۔ یہ لڑائی کچھ ہفتے پہلے ہوئی تھی۔ شاہ جہاں بڑا ہی اچھا ہے۔ ڈانگ سوٹے کی لڑائی بھی بڑی اچھی کر لیتا ہے۔ اس کے پاس ہاتھ کی صفائی بھی ہے۔ ایسی رائفل سب سے پہلے نادر صاحب نے لی تھی' اس کے بعد شاہ جہاں نے لی تھی۔"

میں نے کہا "سنا ہے کہ لاہور میں بھی اس کا گھر ہے؟"

"ہاں نہیں ہے کرایے پر لیا ہوا ہے' وہاں اس نے کسی لڑکی سے یاری بھی لگائی ہوئی ہے۔"

"آج کل وہ کہاں ہے؟"

"زیادہ تو ادھر ہی ہو گا۔" رانو نے میرے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے چھ سات دن پہلے اس نے بڑی ہمت کا کارروائی ڈالی ہے۔ کسی جگہ سے بڑا جی داری کا کام کیا ہے۔"

"کیا کام؟"

"مجھے پتا ہوتا تو تجھ سے کیوں پوچھتا۔ بس اڑتی اڑتی سی سنی ہے میں نے۔"

"اچھا۔ میں اس سے پوچھوں گی۔ اسے ایسی باتوں کا سارا پتا ہوتا ہے۔"

"نہیں میرا نام نہ لینا۔"

"وہ کیوں؟"

"بس ویسے! وہ کہیں گے کہ نیا نیا بندہ ہے' خواہ مخواہ ہماری کھوج میں لگا ہوا ہے۔"

رانو کچھ دیر تک مجھ سے لپٹتی چمٹتی رہی۔ وہ جہاں مجھے ہاتھ لگاتی تھی میں بتاتا تھا کہ وہاں بھی چوٹ ہے۔ وہ زچ ہو کر بولی "پولیس والوں نے تمہارے پنڈے پر کوئی جگہ چھوڑی بھی ہے کہ نہیں؟"

"لگتا ہے کہ واقعی نہیں چھوڑی۔"

"کہیں مکر تو نہیں کر رہے ہو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ مجھ سے ہمدردی کرنے کی بجائے' مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو۔"

کچھ دیر بعد بیزار ہو کر وہ تہ خانے سے چلی گئی۔ میں چھینٹ کا پھول دار لحاف گردن تک کھینچ کر چت لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ ایم پی اے چوہدری اشتاق کی بیٹی سے ناروا سلوک کرکے اسے قتل کرنے والے معاملے سے شاہ جہاں عرف شاہی کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔

نادر جنگی کا چہرہ بھی بار بار میری نظر میں گھوم رہا تھا۔ جب میں یہاں آیا تھا تو نادر جنگی مجھے دیکھ کر قدرے پریشان نظر آنے لگا تھا۔ تاہم کچھ ہی دیر بعد اس کا رویہ تبدیل ہو گیا تھا۔ نادر کا رویہ تبدیل ہونے کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ شاید اس نے مجھے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا کے اپنے نمبر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مفرور کو اپنے ڈیرے سے پکڑوانے پر پولیس نادر سے خوش ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوتا کہ میں واقعی نادر کا ساتھی نہیں ہوں۔ دوسری وجہ یہ ممکن تھی کہ نادر نے مجھ سے کوئی خطرناک کام لینے کا فیصلہ کیا ہو۔ میں ایک مفرور قاتل کی حیثیت سے یہاں پناہ گزیں تھا۔ جس شخص کو پھانسی کا پھندا نظر آ رہا ہو اسے چھوٹے موٹے خطرات ہیچ لگتے ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش پالنے والے لوگ ایسے مفرور قاتلوں سے زبردست کام لیتے ہیں۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ نادر کا رویہ بدلنے کی کوئی تیسری وجہ نہیں ہو سکتی۔ نادر کے نزدیک میں ایک کاٹھ کا الو تھا اور اس الو کے ذریعے وہ کئی طریقوں سے اپنا الو سیدھا کر سکتا تھا۔

اگلے روز میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ رانو دوا اور پٹی لے آئی۔ میں نے خود ہی اپنی زخمی پنڈلی کی بینڈیج کی۔ دوپہر تک میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا کہ نادر جنگی شاید مجھے گرفتار کرانا چاہ رہا ہے۔ میرا دوسرا اندازہ درست معلوم ہوتا تھا۔ وہ بربخت مجھ سے کوئی سخت قسم کا کام لینا چاہ رہا تھا۔ دوپہر کے وقت ماجھو میرے پاس آیا۔ اس کے پاس بھرا ہوا پستول تھا۔ ساتھ گولیوں کی بیلٹ بھی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا "نادر

صاحب کا کہنا ہے کہ جو مرد ہتھیار چلانا نہیں جانتا وہ زنانوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم بھی پستول وغیرہ چلانا سیکھو۔"

ماجھو نے پستول میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا "تو کیا اس تہ خانے میں پستول چلاؤں؟"

"تہ خانے میں کیا ہے یہ کافی لمبی جگہ ہے۔ ادھر کونے میں کھڑے ہو جاؤ۔ وہ سامنے ریت کی بوری پڑی ہے۔ حقے کی ڈبی میں سے کوئلہ نکالو اور بوری پر نشان لگالو۔"

پھر ماجھو نے خود ہی آگے بڑھ کر بوری پر نشان لگا دیا۔ میں بھی پوری پوری ایکٹنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ کبھی پستول کو ٹیڑھا پکڑ لیتا تھا۔ کبھی ایک ہاتھ دستے پر اور دوسرا بیرل پر رکھ لیتا تھا۔ ماجھو نے مجھے ٹھیک سے پستول "پکڑنا" سکھایا پھر نشانہ لگانے کو کہا۔

میں نے دو تین فائر تو ادھر ادھر مارے پھر ایک گولی ایسی چلائی کہ وہ بوری ہی کو نہیں لگی۔ ماجھو نے میری پشت پر دھپ ماری "اوئے کھوتے! ایک آنکھ بند کر کے نال کے اوپر سے دیکھ۔ دماغ میں خیال کر کہ تیرے سامنے ریت کی بوری نہیں فلم ایکٹرس آشا پاریکھ کھڑی ہے۔ تم نے نباہ کر کے اس دشمن لڑکی کے بے وفا سینے میں گولی مارنی ہے۔ چل شاباش۔"

میں نے اس مرتبہ بالکل ٹھیک ٹھیک نشانہ لگایا۔ گولی اندر کے چھوٹے سے دائرے کے بیچ میں لگی۔ ماجھو نے یہی خیال کیا کہ گولی اتفاقاً نشانے پر لگ گئی ہے۔ وہ چہکا "دیکھا کیسی ترکیب بتائی تجھے۔ جب بھی نشانہ لگاؤ ایسے ہی اپنے کسی دشمن کے بارے میں سوچو۔"

میں نے ایک بار پھر ٹھیک نشانہ لگایا۔ ماجھو نے آنکھیں گھمائیں اور بولا "لگتا ہے کہ آشا پاریکھ سے تجھے کوئی خاص ہی دشمنی ہے۔"

ماجھو کو مطمئن رکھنے کے لیے اگلے دو تین فائر میں نے پھر ادھر ادھر مار دیے۔

رات کو کھانا کھا کر بیٹھا ہی تھا کہ آفت جاں پھر آ دھمکی۔ ریشمی کرتہ لاچہ، کانوں میں بڑے بڑے جھمکے۔ وہ اٹھتی بیٹھتی بھی فلم ایکٹرسوں کے انداز میں تھی۔ اس قیامت کے ہاتھ میں ایک "روز حشر" بھی تھا یعنی بوتل۔ وہ اچھی کوالٹی کی انڈین شراب لے کر آئی تھی۔ اس کے ارادے سنگین لگتے تھے۔ میں نے کہا "آج تو بالکل بابرہ شریف لگ رہی ہو۔"

وہ خوش ہو گئی اور جھٹ سے میرے رخسار کا بوسہ لیا۔

میں نے کہا "شاہ جہاں کا کچھ پتا چلا؟"

وہ بولی "میں نے ماجھو سے پوچھا تھا۔ وہ کہتا ہے آج کل شاہ جہاں سرحد پور میں ہی ہے۔ ماجھو بھی کافی دنوں سے شاہ جہاں سے نہیں ملا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے تو واردات کا کوئی پتا نہیں۔"

اب خبر نہیں کہ ماجھو نے واقعی رانو کو کچھ نہیں بتایا تھا یا پھر وہ چالاکی دکھا رہی تھی اور مجھے اپنے گروہ میں نیا بندہ سمجھ کر ٹال مٹول کر رہی تھی۔ اس نے پھر تکلف والی خر مستیاں شروع کر دیں۔ شاید یہ بھی کئی عورتوں کی نفسیات ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ چاہتی ہیں اگر انہیں دستیاب نہ ہو تو پھر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہیں حتیٰ کہ اپنی نسوانیت بھی ایک طرف رکھ دیتی ہیں۔ میں اپنا بھرم برقرار رکھنے کے لیے اس کا تھوڑا بہت ساتھ دیتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچاؤ کا محفوظ اور مناسب راستہ بھی تلاش کرتا رہا۔ اس مرتبہ قدرت نے حیران کن طریقے سے مدد کی۔ جس وقت میں رانو کو بھونڈے طریقے سے خود سے جھٹکنے کا ارادہ کر رہا تھا اچانک تہ خانے کی چھت پر بھاگتے قدموں کی آواز آئی پھر کوئی تیزی سے سیڑھیاں اترا اور لوہے کے دروازے پر دھم دھم دستک دی۔

"کون ہے؟" بکھری بکھری سی رانو نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"حرام زادی دروازہ کھول، پولیس آ گئی ہے؟" باہر سے اختر نے دانت کچکچا کر کہا۔

رانو کا رنگ زرد پڑ گیا "ہائے میں مر گئی۔" اس نے فلمی انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا۔

جونہی اس نے دروازہ کھولا اختر پھنکار کر بولا "دوسرے تہ خانے کی چابی کدھر ہے؟" رانو نے نافہ اپنے ازاربند سے چابی کھول کر اختر کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اختر نے کہا "چل تو بھی ادھر ہی آ جا۔" وہ رانو کو بازو سے پکڑ کر دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ جاتے جاتے وہ مجھے سختی سے ہدایت کر گیا کہ میں دروازہ اندر سے بند کر دوں اور کوئی آواز نہ نکالوں۔

میں نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور بستر پر لحاف لے کر لیٹ گیا۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ آج رات کسی وقت پولیس یہاں ضرور آئے گی۔ درحقیقت یہ میرے اور ساہی صاحب کے پلان کا حصہ تھا۔ میرے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ضروری تھا کہ لاہور سے پولیس میرا کھوج لگاتی ہوئی نادر کے ڈیرے پر پہنچے اور نادر سے پوچھے کہ اس کے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہونے والا "جہاں دار" بھاگ کر یہاں تو نہیں آیا۔

میں جانتا تھا کہ پولیس نادر رنگی سے زیادہ باز پرس نہیں کرے گی اور نہ ہی سخت قسم کی تلاشی لے گی بس خانہ پری کر کے چلی جائے گی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ڈیرے پر رہ کر پولیس چلی گئی۔ صبح معلوم ہوا کہ سب انسپکٹر شجاعت کے ساتھ روجھاپور کا تھانے دار حیات محمد ڈوگر بھی تھا۔ وہ نادر رنگی سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے زبردست قسم کا کھانا کھایا تھا۔ چائے وغیرہ پی تھی اور چلے گئے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ اگلے دو روز تک ڈیرے کی فلمی ہیروئن سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ وہ ڈیرے پر ہی نہیں تھی۔ شاید پولیس کے چھاپے سے ڈر کر وہ چار روز کے لیے روپوش ہو گئی تھی۔ ایک اور لڑکی ڈیرے پر نظر آتی تھی مگر میرے ساتھ اس کی زیادہ راہ و رسم نہیں تھی۔ ماجھو میری ٹریننگ پر خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ اس نے مجھے پستول چلانا تو تقریباً "سکھا" ہی دیا تھا۔ چاقو کے بھی ایک دو ہاتھ اس نے مجھے بتائے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو چاقو چلانا سکھا رہا ہے جو چودہ پندرہ سال سے اس میدان کا مانا ہوا کھلاڑی ہے اور استاد جمالی کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔

میں نے باتوں باتوں میں ماجھو سے بھی شاہ جہاں عرف شاہی کے متعلق ٹوہ لینے کی کوشش کی مگر مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ ایک دو بار تو جی میں آئی کہ سیدھا جا کر نادر رنگی کا ٹینٹوا دبا دوں اور اس کی ہڈی پسلی توڑ کر اس سے سب کچھ اگلوا لوں لیکن ایسا کرنے سے ممکن تھا کہ کئی اہم سراغ میرے ہاتھ سے نکل جاتے۔ میں حالاتی طور پر نادر رنگی کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا اور میری اس حیثیت سے میرے لیے کئی آسانیاں بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں واضح طور پر اپنے ارد گرد بدامنی اور خطرناک سیاسی کشیدگی کی فضا محسوس کر رہا تھا اور یہ کام چھوٹے پیمانے پر نہیں بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا تھا۔ نادر رنگی اس بہت بڑی چال کا ایک چھوٹا سا مہرہ تھا لیکن اس مہرے سے پوری بساط کے نقشے پر روشنی پڑ سکتی تھی۔

اگلے روز نادر رنگی نے شام کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں تہ خانے سے برآمد ہوا تو بڑے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی۔ وی سی آر پر انڈین گانوں کا چترہار لگا ہوا تھا۔ اسکرین پر موجود چاندنی نامی لڑکی ایک غنڈے کی آغوش میں تھی اور وہ شراب کے نشے میں اس سے جنسی مذاق کر رہا تھا۔

میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا نادر رنگی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان جسے یقیناً تھوڑی دیر پہلے مارا پیٹا گیا تھا، تھر تھر کانپ رہا تھا اور ساتھ ساتھ نادر رنگی کے پاؤں بھی دبا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو اس کی ناک کے پانی سے مل کر بار بار فرش پر ٹپکتے تھے اور وہ انہیں بازو اٹھا کر آستین سے پونچھ لیتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ لڑکا کس جرم کی پاداش میں اس "پرائیویٹ تھانے" میں لایا گیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو نادر رنگی نے لڑکے کو اٹھنے کا حکم دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو نادر نے اسے گھومنے کو کہا۔

اس نے گھوم کر اپنا رخ دروازے کی طرف پھیر لیا۔ نادر رنگی نے بیٹھے بیٹھے اس کی پیٹھ پر زوردار ٹانگ جمائی۔ وہ خوف سے چیختا ہوا دروازے پر جا گرا۔ نادر نے گرجتے ہوئے کہا "جا دفع ہو جا۔ اپنی بہن کو سمجھا۔ اتنی نیک پروین ہے تو دروازے بند کر کے گھر میں بیٹھا کرے۔ جوانی کے نشے میں گھر سے نکلے گی تو دیکھنے والے تو دیکھیں گے۔"

نوجوان نے خوف زدہ انداز میں فوراً اثبات میں سر ہلایا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے اوجھل ہو گیا۔

نادر رنگی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں مؤدب انداز میں بیٹھ گیا۔ نادر رنگی بولا "تجھے پتا چل ہی گیا ہوگا، اتوار کو پولیس نے تیری تلاش میں یہاں چھاپا مارا تھا۔ میں نے بھگا دیا سالوں کو۔ آئندہ بھی آئے تو تجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ نادر کی مرضی کے بغیر یہاں بکری کان بھی نہیں ہلا سکتی۔"

میں نے احسان مندی والی صورت بنائی "آپ کی مہربانیاں پہلے ہی کم نہیں تھیں جناب! مجھے اپنے پاس پناہ دے کر آپ نے مجھے غلام بنا لیا ہے۔"

"اوئے یہ کوئی احسان نہیں۔" نادر نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا "آخر یہ مصیبت بھی تو ہماری وجہ سے ہی آئی ہے نا۔" اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور نوکر سے کہا کہ وہ دروازہ بند کر کے باہر چلا جائے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہونے لگی ہے۔

نادر بولا "ماجھو بتا رہا تھا کہ تجھے پستول وغیرہ چلانا آ گیا ہے۔"

"پستول تو جناب میں پہلے ہی چلا لیتا تھا بس ذرا جھجک سی تھی وہ بھی دور ہو گئی ہے۔"

"ہتھیار بندے کی شان ہوتی ہے۔ جسے ہتھیار چلانا نہ آئے میں تو اسے مرد سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا "پوری

پر تو تم نے کافی گولیاں چلائی ہیں۔ کیا خیال ہے اب نہیں اصلی شے پر بھی گولی چلانی سکھائی جائے۔"

"اصلی شے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"بندہ۔۔۔ گوشت پوست کا اصلی بندہ۔"

"لل۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ تو قتل ہو جائے گا۔"

"پھر کیا فرق پڑتا ہے۔ قتل کا الزام تو تم پر پہلے ہی لگا ہوا ہے۔ اس ایک قتل کے الزام سے تجھے میں نے ہی بچانا ہے اور اگر دس قتلوں کا الزام ہو گا تو ان سے بھی میں نے ہی بچانا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر پھر بھی۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں کملے! اس جگ کے قانون نرالے ہیں۔ جو دو روپے کی چوری کرے وہ چور ہے۔ جو دو کروڑ لوٹ لے وہ عزت دار کاروباری ہے۔ جو کسی کا سر پھاڑ دے وہ تھانے جاتا ہے، جو دس بندے مار دے اس سے لوگ خوف کھاتے ہیں اور قانون بھی ڈرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے "عام معافی" لے کر قانون ان کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب مگر قتل۔۔۔"

"اوئے پھر وہی قتل۔ میں کہتا ہوں قتل کوئی جرم نہیں ہے۔ اصل جرم ہے پکڑے جانا اور جیل سے باہر نہ آ سکنا۔ اب میں چاہوں تو ابھی کسی بھی بندے پر ۳۰۲ کے چھ مقدمے بنوا سکتا ہوں اور مقدمے بھی ایسے کہ بس اُس کی جیل سے باہر آئے۔ تمہیں کہا ہے نا کہ قتل کوئی جرم نہیں، اصل جرم یہ ہے کہ بندے کی سپورٹ کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اب دیکھ اشرف جیجے اور بھولے نے کئی کئی بندے مار کے ہوئے ہیں، کسی کیس کا کوئی کھوج کھرا ہی نہیں۔ جس تازہ کیس میں وہ پکڑے گئے ہیں اس میں بھی بس ایک دو ہفتوں میں انہوں نے باہر آ جانا ہے۔"

میں چہرے پر تذبذب کی کیفیت سجائے خاموش بیٹھا رہا۔ نادر جٹی بڑی "دانائی" سے مجھے سمجھاتا رہا کہ اگر میں اس کے اشاروں پر چلوں گا تو دنیا میں ہی جنت کا مزہ لوں گا اور میری آنے والی نسلیں بھی میری زندگی کو رشک کی نگاہ سے دیکھا کریں گی۔ باتوں کے دوران میں ہی اس نے دس ہزار روپے کی ایک نئی گڈی میری طرف اچھال دی "یہ لو تمہارا پیشگی انعام۔ بندہ گرا کر آؤ گے تو دوگنا اور ملیں گے۔"

میں نے دلچسپی سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی متانت سے بولا "میرے اشارے پر دس اور بندے یہ کام کرنے کو تیار ہو جائیں گے مگر میں تم سے کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہارے اندر دلیری وافر موجود ہے، بس اسے باہر نکالے جانے کی ضرورت ہے۔ ایک دفعہ تم نے "ٹھاہ" کر دی تو بس سمجھ لو تمہاری چھاتی دو گز چوڑی ہو جائے گی پھر جو دشمن تم رحیم یار خاں میں چھوڑ آئے ہو وہ تمہیں کیڑے مکوڑے لگنے لگیں گے۔ پیشاب کی دھار مارو گے تو وہ سارے حرامی بہہ جائیں گے۔"

نادر جٹی نے قریباً آدھ گھنٹے تک میرے ساتھ سر کھپایا اور مجھے "نیم رضامند" کرنے میں کامیاب ہو گیا (میں ایک دم رضامند ہو کر اسے شبے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا)

○☆○

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ رات کے نو بجے تھے۔ اختر نے مجھے بھرا ہوا پستول دیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے پستول کے دو بھرے ہوئے میگزین بھی میرے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ڈال دیے۔ اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر منزل تک لے جائے گا مگر کام کر کے واپس مجھے خود ہی آنا ہو گا۔ میری منزل سرد پورہ گاؤں تھی۔ مجھے اسی گاؤں کے ایک بندے کو پار کرنا تھا۔ یہ سرد پورہ وہی گاؤں تھا جہاں کچھ روز پہلے بھی میں نے کارروائی ڈالی تھی۔ اسی گاؤں کے اسکول کے افتتاح کے موقع پر میں نے وزیر صاحب کے جلسے میں سانپ چھوڑے تھے۔ آج یہاں مجھے ایک بندے کو راہیٔ عدم کرنا تھا۔

مجھے ابھی تک بندے کے کوائف نہیں بتائے گئے تھے۔ میں مسلسل سوچ رہا تھا، جلسے کی کارروائی میں تو میں نے جانی نقصان کے خطرے کو ٹال دیا تھا۔ میں نے سانپوں کو چھوڑنے سے پہلے انہیں زہر سے خالی کر دیا تھا مگر اب صورت حال ذرا ٹیڑھی تھی۔ اگر میں بندہ قتل نہ کرتا تو نادر جٹی تنگ ہو جاتا۔ اگر قتل کر دیتا تو ناحق خون بہاتا۔ میں سوچتا رہا، بہرحال یہ بات تو طے تھی کہ نادر کے کہنے پر کسی انسان کا خون اپنے سر نہیں لوں گا۔ مجھے کوئی درمیانی راستہ ہی ڈھونڈنا تھا۔

ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ اختر نے مجھے موٹر سائیکل پر بٹھایا اور ڈیرے سے لے کر چل دیا۔ وہ ڈیرے کی پچھلی جانب سے نکلا تاکہ کسی کی نظر ہم دونوں پر نہ پڑ سکے۔ عام رستے سے جانے کی بجائے اس نے درختوں کے اندر سے ایک اجاڑ راستہ اختیار کیا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ میں نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ مفلر سے میں نے سر اور چہرہ یوں ڈھانپ رکھا تھا کہ بس آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ دائیں طرف حد نگاہ تک کھیت نظر آتے تھے۔ ان میں کہیں کہیں کسانوں کی جھونپڑیاں تھیں جن میں لالٹینیں روشن تھیں۔ اس راستے پر ہمیں بس ایک بیل

گاڑی اور دو تین سائیکل سوار ہی ملے۔ سرد پورہ تک یہ فاصلہ قریباً چھ میل تھا۔ یہ فاصلہ ہم نے آدھ گھنٹے میں طے کیا اور شکر کیا کہ موٹر سائیکل پنکچر ہوئے بغیر ہم منزل تک پہنچ گئے ہیں۔

راستے میں بھی اختر مجھے "حوصلہ" دیتا رہا تھا۔ اس نے نادر جٹی کے اثر و رسوخ اور دبدبے کے ایسے نقشے کھینچے تھے کہ اگر میں واقعی جہاں داد ٹائپ کا شخص ہوتا تو نادر جٹی کو دیوتا کے درجے کا شخص سمجھنے لگتا۔ میں راستے میں اختر سے پوچھ رہا تھا کہ جس بندے کو میں نے لڑھکانا ہے آخر اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔ اختر نے یہی کہا تھا کہ موقع پر پہنچ کر بتاؤں گا اور موقع اب آ گیا تھا۔ سرد پورہ کی روشنیاں اب سو ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔ گاؤں کی مدھم ٹمٹماتی ہوئی زرد روشنیاں۔

میں نے ایک کھلے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ وہ جگہ ہے جہاں وزیر صاحب کا جلسہ ہوا تھا۔ اس سامنے والی ٹاہلی کے نیچے ڈیکٹر کھڑا تھا جس کے نیچے میں نے سانپوں والا تھیلا رکھا تھا۔"

اختر بولا "بس اسی ٹاہلی سے دائیں طرف دیکھو۔ دو مکان ساتھ ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کچا ہے اور دوسرا پکا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اختر بولا "تمہارا شکار اس کچے مکان میں ہی ہے۔ باہر کی دیوار زیادہ اونچی نہیں پھلانگ کر اندر چلے جاؤ۔ بیمار وہ کمرا ہی ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک ساتھی ہو لیکن وہ بھی کچا ہی ہے۔ اس وقت وہ اپنی گہری نیند سویا ہو گا۔ قیامت بھی آئے تو نہیں جاگے گا۔ تم دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو تمہارا شکار ہی باہر نکلے گا۔ وہ اونچے لمبے قد کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم سے ایک آدھ انچ لمبا ہی ہو۔ اس کا سر منڈا ہوا ہو گا۔ وہ استرا پھیر کر رکھتا ہے۔ کھوپڑی پر گہرا زخم بھی تمہیں فوراً ہی نظر آ جائے گا۔ اس کا نام شاد باب ہے۔ عام طور پر اسے شاہی بھی کہتے ہیں۔"

اختر کے آخری الفاظ مجھے کرنٹ لگا گئے۔ شاد جہاں عرف شاہی۔ یہی نام تو تھا جو مجھے کھینچ کر پھر سے روجھان پور لایا تھا۔ میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر اختر نے کہا "کیا بات ہے۔ تم چونک گئے ہو۔ تم جانتے ہو شاہی کو؟"

"ہاں ایک دو بار بھولے اور شیدی وغیرہ سے ذکر سنا ہے کہ یہ شاہی تو نادر صاحب کا وفادار کارندہ ہے۔"

"کارندہ ہے نہیں کارندہ تھا۔ اب تم اس کو باغی کارندہ کہہ سکتے ہو۔ آج تم اسے "ٹھاہ" کرو گے تو نادر صاحب کا دل خوش ہو جائے گا۔"

میں نے دل میں سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ کل کلاں نادر صاحب تمہیں بھی "ٹھاہ" کرا کے دل خوش کر لیں۔

اختر نے مجھے چند ضروری باتیں سمجھائیں اور واپسی کا راستہ بتا کر خود وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جس شخص کو قتل کرنے کی ذمہ داری مجھے نادر جٹی نے سونپی تھی، وہ شاید واقعی واجب القتل تھا اور وہ شخص مجھ سے چند قدم کی دوری پر ایک نیم پختہ مکان میں موجود تھا۔ اندھیرے میں سرسراتی ہوئی دکھائی ہوا ہاتھ پاؤں شل کر رہی تھی لیکن شاہی کا نام سن کر میرے جسم میں گرمی اور تپش کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ ڈیرے پر رانو نے بھی مجھے بتایا تھا کہ شاد جہاں عرف شاہی سرد پورہ میں رہتا ہے۔ میں نے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر پستول اور میگزین کی موجودگی کا اندازہ کیا اور احتیاط سے نیم پختہ مکان کی چار دیواری کی طرف روانہ ہو گیا۔

مکان کی دیوار پھاند کر اندر جانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ صحن خالی تھا۔ بس ایک طرف چھپر تلے ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ برآمدے میں سے پانی کی تیز بو آ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر دیکھا تو خشک پانی سے بھری بوری کئی بوریاں برآمدے میں رکھی تھیں۔ شاید یہ شخص پانی وغیرہ کی ازمت ہی کرتا تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر ایک دروازے کے پاس پہنچا اچانک میں ٹھٹک گیا۔ مجھے اپنے بالکل قریب سے ایک نامانوس آواز سنائی دی تھی۔ جیسے کوئی گونگا شخص بولنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔

میں دائیں طرف ایک کھڑکی کے نزدیک پہنچا تو آواز کچھ بلند ہو گئی۔ پستول ہاتھ میں لے کر میں ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں ایک متنفس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ متنفس بھی غالباً کوئی عورت ہی تھی۔ ایک چارپائی کے نیچے لالٹین پڑی تھی۔ اس لالٹین کی لو مدھم کرنے کے بعد چارپائی کے نیچے کھسکا دیا گیا تھا۔ میں نے لالٹین نکال کر اس کی لو اونچی کی۔ ہلکی زرد روشنی میں مجھے ایک عجیب منظر نظر آیا۔ ایک لڑکی جو شکل سے ہی فاقہ زدہ اور بدحال نظر آتی تھی چارپائی سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے اوپر میلا سا لحاف تھا۔ میں نے لحاف اٹھایا مگر پھر فوراً ہی مجھے لحاف دوبارہ لڑکی کے اوپر ڈال دینا پڑا۔ اس بے چاری کے جسم پر لباس کے نام پر ایک تار بھی موجود نہیں تھا۔ موٹی رسی کے ساتھ اسے اتنی بے رحمی سے باندھا گیا تھا کہ رسی اس کے گوشت میں اندر تک گھس گئی تھی اور اس

کے ہاتھ پاؤں کی موٹی موٹی نسیں نظر آ رہی تھیں۔ لڑکی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آواز گلے میں ہی گھونٹ دی گئی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ زیادہ تیزی سے مچلنے لگی اور اس کے حلق سے نکلنے والی غوں غاں کی آوازیں بھی تیز ہو گئیں۔ یقیناً وہ مجھ سے مدد چاہ رہی تھی۔

یکایک میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ کوئی میرے آس پاس موجود تھا۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا اور جتنی تیزی سے میں مڑا اتنی ہی تیزی سے نیچے بھی جھک گیا۔ ایک لاٹھی سرسراتی ہوئی میرے سر سے گزر گئی لیکن اگر میں سمجھ رہا تھا کہ میں وار بچانے میں مکمل طور پر کامیاب رہا ہوں تو یہ غلطی تھی۔ لاٹھی گھمانے والے نے لاٹھی کو درمیان سے پکڑ رکھا تھا۔ ایک سرا تو میرے سر سے گزر گیا مگر دوسرے سرے نے بڑی دفادرے میرے پستول والے ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ چوٹ زوردار تھی۔ ہاتھ جھنجھنا اٹھا اور پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میرے سنبھلتے سنبھلتے حملہ آور نے ایک اور وار کر ڈالا۔ اس مرتبہ چوٹ میرے شانے پر لگی۔ میں نے بھنا کر اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ اس مرتبہ اس نے لاٹھی کو سرے سے پکڑ کر گھمایا۔ میں نے اچھل کر اپنے ٹخنے بچائے اور قریب رکھی ہوئی کرسی دفاع کے لیے اپنے سامنے کر لی۔ میرے دل سے آواز آ رہی تھی کہ ہو نہ ہو یہ حملہ آور شاہی ہی ہے۔ رانو نے ڈیرے پر مجھے بتایا تھا کہ شاہی بڑا جی دار لٹھ باز ہے اور ناور کے بعد سب سے پہلے ولایتی رائفل اس نے ہی خریدی تھی۔ اب یہ لٹھ باز میرے روبرو تھا اور بڑے طیش میں دکھائی دیتا تھا۔ اگلے ایک منٹ میں میں نے اس کے کم و بیش پچیس وار بڑی صفائی سے بچائے اور اسے حیران کر دیا۔ لکڑی کی مضبوط کرسی میرا زبردست دفاع کر رہی تھی۔ جونہی میں نے محسوس کیا کہ مدمقابل ہانپ گیا ہے میں نے ٹوٹی ہوئی کرسی سے اس کے ہاتھ پر چوٹ لگائی۔ لاٹھی پر اس کی گرفت نرم پڑی تو میں نے اپنے جسم کا وزن لاٹھی پر ڈال کر لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھڑا دی اس کے بعد مدمقابل جو یقیناً شاہی ہی تھا میرے نشانے پر آ گیا۔ میں نے گھونسوں اور ٹھوکروں سے اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر دی۔ یہاں تک کہ وہ فرش پر گر پڑا اور زخمی سانپ کی طرح لوٹنے لگا۔

اسی دوران میں اپنے گرے ہوئے پستول پر بھی میری نظر پڑ گئی تھی۔ میں نے پستول اٹھا لیا اور شاہی کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک کونے میں سٹ کر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد میں نے لالٹین اٹھا کر اس کی لو اونچی کی اور پورا کمرا روشن ہو گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کی دھینگا مشتی میں اس کشادہ کمرے کی اکثر اشیا ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ ایک پرچھتی اکھڑ کر نیچے لٹک گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس چارپائی کا بازو بھی ٹوٹ گیا تھا جس پر لاچار لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے حلق سے مسلسل احتجاجی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں نے غور سے مدمقابل کا زخمی چہرہ دیکھا۔ پہلی نظر میں ہی وہ مجھے ایک کمینہ اور بدکردار شخص لگا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا' ٹھوڑی پر زخم کا بدنما نشان تھا۔ وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے کہا "تیرا نام ہی شاہی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے فاقہ زدہ سانولی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "اپنی اس بہن کو یہاں کیوں باندھا ہوا ہے؟"

اس کے ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ وہ کہتا بھی کیا۔ جو کچھ تھا سامنے تھا اور عیاں تھا۔ شاہی صورت سے ہی ہوس پرست بھیڑیا نظر آتا تھا۔ اس تنہا مکان میں یہ نوچی کھسوٹی اور بندھی ہوئی لڑکی' شاہی کی شیطانیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ کوئی ثبوت ملنے سے پہلے ہی مجھے یقین ہونے لگا کہ لاہور کے اس مکان میں درخشندہ نامی اس بدنصیب طالبہ کے ساتھ گزرنے والا سانحہ بھی اسی شاہی کا سیاہ کارنامہ ہے۔ درخشندہ کی لاش کا منظر میری نگاہوں میں آیا تو کانوں میں انگارے سے دہکنے لگے۔ جی چاہا پستول کی ساری گولیاں شاہی کی چمکیلی آنکھوں میں اتار دوں۔ تین ایک آنکھ میں تین دوسری آنکھ میں۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" میرے ہونٹوں سے پُرطیش غراہٹ نکلی۔

شاہی ذرا سا لڑکھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ کالی شلوار اور کالی لائنوں والی لمبی قمیص پہنے ہوئے تھا "چلو دوسرے کمرے میں۔" میں نے پستول کی حرکت سے اشارہ کیا۔

وہ مجھے گھورتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آج اس مختصر مکان میں شاہی اور بدنصیب لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں۔ میں نے کمرے کے دونوں دروازے اندر سے بند کر لیے اور شاہی کو سامنے چارپائی پر بٹھا لیا۔ اس نے لڑائی میں میرے ہاتھ دیکھ لیے تھے اور اب ایک دم ہی مجھ سے بے حد مرعوب نظر آنے لگا تھا۔

میں نے کہا "ہاں بتا اب مجھے۔ درخشندہ کو راولپنڈی سے لاہور کون لایا تھا؟

"کون درخشندہ؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"چوہدری اشفاق احمد کی بیٹی۔ وہی معصوم لڑکی جسے تم نے بے آبرو کر کے قتل کر دیا۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مم۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کوئی غلطی لگ رہی ہے۔"

میں نے شاہی کا بازو پکڑا اور زور سے مروڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ میں بازو مروڑتا چلا گیا۔ کم از کم دو ہڈیاں ٹوٹنے کی بڑی واضح آواز سنائی دی۔ شاہی ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخا تھا لیکن اس کے چیخنے سے پہلے ہی میں اس کا منہ ہتھیلی سے ڈھانپ چکا تھا۔ درد کی ناقابلِ برداشت شدت سے شاہی کا پورا سراپا تھرتھر کانپنے لگا۔

اگلے پانچ منٹ کے اندر شاہی نے تسلیم کر لیا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں رمضان اور انور کے ساتھ مل کر مقتول طالبہ درخشندہ کو راولپنڈی سے لاہور لایا تھا۔ درخشندہ کو بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا تھا۔ شاہدرہ کے اس مکان میں شاہی اور انور وغیرہ نے طالبہ کی بے حرمتی کی اور پھر اس کی لاش کو بوری میں بند کر کے چوہدری اشفاق کی کوٹھی کے سامنے پھینکنے کا پروگرام بنایا۔ وہ اور اس کے ساتھی جانتے تھے کہ اس قتل کا سارا شبہ چوہدری اشفاق کے سیاسی مخالف ملک داور اور اس کے بیٹے چھوٹے سلطان پر کرے گا لیکن یہ لوگ لڑکی کی لاش کو چوہدری اشفاق کی کوٹھی کے سامنے نہ پھینک سکے۔ کسی شخص نے انہیں لاش کو بوری میں بند کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس چشم دید گواہ کے خوف سے انہوں نے لاش وہیں جھنی بیلی میں پھینکی اور شاہدرہ والا مکان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

میرے استفسار پر روتے کراہتے شاہی نے بتایا کہ اس نے یہ سب کچھ ناور جٹی کے کہنے پر کیا تھا۔ ناور جٹی نے اس کام کے معاوضے میں شیخوپورہ میں ایک پلاٹ اسے دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کام ہوتے ہی وہ مکر گیا اور شاہی کو چند ہزار دے کر ٹرخانا چاہا۔ اس سے پہلے بھی ایک دو ایسے واقعات ہو چکے تھے۔ اس تازہ واقعے نے شاہی کے دل میں دبی ہوئی رنجش کو ہوا دے دی۔ دونوں میں چار پانچ روز پہلے کافی جھگڑا بھی ہوا تھا۔

آخر میں میں نے شاہی سے پوچھا "یہ لڑکی کون ہے جس کو باندھ کر تم اپنے باپوں کی کھڑی بھاری کر رہے ہو۔"

معمولی تذبذب کے بعد شاہی نے لڑکی کے بارے میں بھی حقیقت بیان کر دی۔ دراصل اس کا ٹوٹا ہوا بازو اس کی زبان کھلوانے میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ شاہی نے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک بھیک مانگنے والی لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت نما لڑکی بھی تھی۔ یہ دونوں اپنے قبیلے سے بھاگی ہوئی تھیں۔ شاہی نے اس دوسری لڑکی کو تو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا تھا اور اس لڑکی کو گھر میں بند کر دیا تھا۔ یہ لڑکی بیمار تھی اور اسے دمے کی شکایت تھی۔ ویسے بھی وہ عام سی شکل و صورت کی تھی مگر لڑکی تو تھی۔ شاہی جیسے بدکار کو تو بس اپنے نفس کی طلب پوری کرنی تھی۔ اس نے پچھلے ۴۸ گھنٹے سے لڑکی کو یہاں محبوس رکھا ہوا تھا۔

پتا نہیں کیوں اس گفتگو کے دوران میں جتنی بار بھی میری نگاہ شاہی کے چہرے پر پڑی میرے سینے میں نفرت کی ایک بلند لہر سر اٹھا کر رہ گئی۔ میں اس شخص کو زندہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید ناور نے نہ کہا ہوتا تو بھی میں اسے مار ڈالتا۔ اب تو اسے مارنا اور بھی حسبِ حال تھا۔ میں شاہی سے جو کچھ پوچھ سکتا تھا اس سے پوچھا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ میرے بس میں ہوتا تو اپنی خواہش کے مطابق پستول کی چھ گولیاں آدھی آدھی اس کی دونوں آنکھوں میں اتار دیتا مگر فائرنگ سے ارد گرد کے لوگ متوجہ ہو سکتے تھے۔ میں نے باتیں کرتے کرتے اچانک اس کی گردن دبوچ لی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے اس کا نرخرہ توڑ ڈالا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا تو میں لڑکی والے کمرے میں پہنچا۔ میں اسے کھولنا چاہتا تھا مگر کھولنے سے پہلے اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں دوست ہوں اور وہ خواہ مخواہ شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔

میں لالٹین لے کر چارپائی کے قریب پہنچا۔ لڑکی بے حرکت آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکی کے بدن میں جنبش نہیں تھی۔ میں لپک کر آگے گیا اور لالٹین کی روشنی لڑکی کی نیم وا سفید آنکھوں پر ڈالی۔ وہ عالمِ نزع میں تھی۔ آخری سانس لے چکی تھی یا شاید لینے والی تھی۔ میں نے بوسیدہ کپڑا کھینچ کر اس کے منہ سے نکالا' اس کے رخساروں کو پکڑ کر اس کا چہرہ بار بار ہلایا' اس کو آوازیں دیں لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کے اندر میری پیشانی سے پسینہ بہہ نکلا۔ پچھتاوے کی آگ بھڑک کر پورے بدن میں پھیل گئی۔ کاش میں نے لڑکی کی طرف پہلے توجہ دی ہوتی۔ وہ بری طرح تڑپ پھڑک رہی تھی۔ شاید یہ سانس کی تکلیف کی وجہ سے تھا۔ یہ بات تو شاہی نے ابھی دس منٹ پہلے مجھے بتائی تھی کہ وہ دمے کی مریضہ ہے۔ کاش مجھے یہ بات پہلے معلوم ہوتی۔ کئی واقعات انسان کے ذہن پر گہرا اثر کرتے ہیں اور دیر بلکہ مدتوں تک دل و دماغ کو کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔ اس بھیک مانگنے والی کی اچانک موت کا واقعہ بھی ان

میں سے ایک ہے۔ مجھے کبھی اس فاقہ زدہ لڑکی کا نام معلوم نہ ہوسکا نہ یہ پتا چلا کہ وہ کہاں کی تھی اور کن حالات میں بھیک مانگنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اور پھر نتیجے کے طور پر شاہی جیسے بدکار قاتل کے چنگل میں پھنسی تھی لیکن اس کا بیرونا اس کے تڑپنے کا انداز اس کے حلق سے نکلنے والی فریادی آوازیں۔ یہ سب کچھ ان گنت راتوں تک مجھے بے چین کرتا رہا۔ اس سارے واقعے میں اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ میں نے شاہی کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ کاش اپنے ہی جیسے انسانوں پر ستم کے پہاڑ توڑ کر اسے زندگی سے موت کی طرف دھکیلنے والے ہوس کار ایک لمحے کے لیے یہ سوچ لیں کہ اگر کوئی ان سے طاقت ور فرد اسی طرح انہیں بے بس کرکے اور تکلیفیں دے دے کر زندگی سے موت کی طرف دھکیل دے تو ان پر کیا گزرے۔

گرد پورہ سے واپس ڈیرے تک پہنچنے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی میرا مفلر جو شاہی سے لڑائی کے دوران میں گر گیا تھا اب پھر میرے چہرے پر نقاب کی صورت نظر آ رہا تھا۔ ڈیرے تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک ٹریکٹر ٹرالی والے سے لفٹ لے لی تھی۔ جس وقت میں ڈیرے پر پہنچا رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔

ڈیرے کے احاطے میں نادر جنگی کی جیپ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خود بھی ڈیرے پر نہیں تھا۔ گھوڑوں میں سے بھی بس ایک کمزور گھوڑا ہی چھپر کے نیچے کھڑا تھا۔ میں اندر پہنچا۔ لڑکی چاندنی فوراً میرے بستر کو تکوں کی دہکتی ہوئی انگیٹھی لے آئی۔ کسی کونے کھدرے سے ماجھو بھی نکل کر آگیا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے سوال کیا کہ ہوگیا؟ میں نے آنکھوں آنکھوں ہی میں جواب دیا کہ ہوگیا۔

اس نے پرجوش انداز میں میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے پوچھا "نادر صاحب اور دوسرے لوگ کہاں ہیں؟"

وہ بولا "باگی پنڈ میں چوہدری کے بیٹے کی منگنی ہے وہاں مجرے کا پروگرام ہے شہر سے کچھ افسر لوگ بھی آئے ہوئے ہیں۔ نادر صاحب وہیں گئے ہوئے ہیں۔ پوری جیپ بھر کر گئی ہے۔ اختر اور سراج گھوڑوں پر گئے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ قتل کے وقت نادر جنگی موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرنا چاہتا ہوگا۔ لہٰذا ساتھیوں سمیت باگی پنڈ چلا گیا۔

ماجھو مجھ سے کھسر پھسر کرتا رہا اور پوچھتا رہا کہ میں نے شاہ جہاں عرف شاہی کو کیسے ٹھکانے لگایا ہے۔ میں نے چیدہ چیدہ باتیں اسے بتائیں۔ اسی دوران میں نادر جنگی کی جیپ کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ نادر اپنے ساتھیوں سمیت ڈیرے پر واپس پہنچ گیا۔

جونہی وہ واپس پہنچا ماجھو نے اسے آنکھوں آنکھوں میں کامیابی کی اطلاع دے دی۔ نادر کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ علیحدہ کمرے میں لے گیا اور پوری تفصیل سنانے کی ہدایت کی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا لیکن جو پوائنٹ مجھے مشکوک بنا سکتے تھے وہ چھوڑ دیے۔ میں نے نادر کو بتایا کہ شاہی نے مجھ پر ناگہانی حملہ کیا تھا اور میرا پستول میرے ہاتھ سے گرا دیا تھا مگر پھر مجھ سے لڑتے لڑتے اچانک وہ گر گیا۔ اس کا سر بڑے زور سے چارپائی کے پائے سے ٹکرایا اور وہ نیم بے ہوش ہوگیا۔ اس کی گردن پر سخت چوٹ آئی تھی۔ میں نے موقع تاڑ کر اس کے سینے پر سواری کی اور گردن دبا کر اسے ہلاک کر دیا۔

آخر میں میں نے نادر کو بھیک مانگنے والی کے بارے میں بھی بتایا۔ تاہم یہ نہیں بتایا کہ وہ میری موجودگی میں ہی ہلاک ہوئی۔ صرف اتنا کہا کہ مکان کے ایک کمرے میں میں نے اس کی رسیوں سے بندھی ہوئی لاش دیکھی ہے۔ لڑکی کی لاش کو نادر نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کے لیے اہم ترین بات یہ تھی کہ شاہی میرے ہاتھوں ہلاک ہوگیا ہے۔ نادر نے باقاعدہ چہچہو ٹھوک کر مجھے شاباش دی اور وعدہ کیا کہ پرسوں تک انعام کی باقی رقم بھی مجھے مل جائے گی۔ میں نے رسماً انکار کرتے ہوئے کہا "نہیں جناب! میرے لیے آپ کا خوش ہونا ہی سب سے بڑا انعام ہے۔"

نادر بولا "بس اب تم تہ خانے میں چلے جاؤ۔ دو روز تک میں نے کیوں تم نے باہر نہیں نکلنا۔ چلو جاؤ شاباش۔ شاہی کے قتل کے بعد پولیس نے ڈیرے پر ضرور آنا ہے اور دوبارہ آنے ہی والی ہوگی۔"

نادر سے ہدایات لے کر میں ایک بار پھر اس تہ خانے میں آ گیا جسے یہاں چھوٹا خانہ کہا جاتا تھا۔

اگلے ۴۸ گھنٹے تک میں اس تہ خانے میں ہی رہا۔ یہاں مجھے تین وقت بہترین کھانا، دودھ اور شراب وغیرہ ملتی رہی۔ شراب میں بڑی احتیاط سے ضائع کر رہا تھا۔ فکر کا مقام یہ تھا کہ پولیس چھاپے کے بعد سے راتوں ڈیرے پر نظر نہیں آئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا ایک پولیس والے کے ایس ڈی او بھائی کا دل خوش کرنے کے لیے نادر نے اسے شیخوپورہ بھیج رکھا تھا۔

تہ خانے میں قیام کے دوران میں جہاں مجھے بھیک مانگنے والی نامعلوم لڑکی کا غم ستاتا رہا وہاں گاہے گاہے زرین گل، کلثوم اور ان کے نومولود بچے کی خوشگوار یاد بھی آتی رہی۔ کسی وقت میں بیٹھے بیٹھے تاشا کے بارے میں بھی سوچنے لگتا۔ اس عجیب و غریب لڑکی نے اچانک دادی کی موت سے پہلے کے حالات میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ وہ اب پولیس کی تحویل میں تھی۔ مجھے توقع تھی کہ ساہی صاحب اس کا پورا خیال رکھ رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مسٹر کلارک نے جو "دھماکا" کیا تھا وہ بھی سنسنی خیز تھا۔ انہوں نے بڑے مہذب انداز میں شیخ عاصم سے ٹکر لی تھی اور کاروبار کے میدان میں اس کو زک ڈال دی تھی۔ وقتی طور پر وہ میرا اور غزالہ کا خیال چھوڑ کر امارات بھاگ گیا تھا۔ گاہے گاہے مسٹر کلارک کا خیال ذہن میں آ رہا۔

تیسرے روز رات کے وقت ماجھو میرے ٹھکانے پر آیا۔ اس نے کہا "جا شہزادے نادر صاحب نے تجھے بلایا ہے۔"

میں تہ خانے سے نکلا اور ماجھو کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ میرے کانوں میں گانے بجانے کی مدھم آواز آئی۔ میں نے ماجھو سے پوچھا "یہ چھم چھم کیا ہو رہی ہے؟"

وہ بولا "مجرا ہو رہا ہے۔ پرسوں رات نادر صاحب چوہدری شبیر کے بیٹے کی شادی پر باگی پنڈ گئے تھے تو وہاں انہی دو طوائفوں نے مجرا کیا تھا۔ نادر صاحب کو ان کا کام پسند آیا انہوں نے دونوں کو یہاں بلا لیا۔"

ہم اوپر پہنچے تو ڈیرے کے ہال نما کمرے میں خوب ہلا گلا تھا۔ بھنے ہوئے گوشت کی مہک کے ساتھ شراب کی بو بھی آ رہی تھی۔ ہال نما کمرے میں کم و بیش بیس افراد جمع تھے۔ ایک خوب صورت طوائف ہارمونیم کے سامنے بیٹھ کر گا رہی تھی دوسری نوخیز لڑکی رقص میں مصروف تھی۔ موٹی موٹی گردنوں اور موٹی موٹی توندوں والے تماش بین ان پر نوٹ وغیرہ نچھاور کر رہے تھے، ہارمونیم کے سامنے بیٹھی طوائف لک لک کر گا رہی تھی تھوڑا تھوڑا چن وے کمیا... ہر نارہ گیا گھنگھاں دے اولے....

نادر جنگی نے میری طرف دیکھ کر پسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں فلاں جگہ پر بیٹھ جاؤں۔ آج سردی ضرورت سے زیادہ تھی۔ سب نے سویٹر کوٹ وغیرہ پہن رکھے تھے۔ کئی نے چادروں کی بکل مار رکھی تھی

اچھوت

لیکن رقص کرنے والی نرم و نازک لڑکی صرف ایک ریشمی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اگر وہ بھی سویٹر کوٹ وغیرہ پہن لیتی تو اس کا رقص کون دیکھتا۔ رقاصہ کی بہت سی دوسری مجبوریوں کی طرح شاید اس سردی کا سامنا کرنا بھی اس کی مجبوری تھا۔

تماش بینوں میں مقامی معززین کے علاوہ کچھ شہری افراد بھی موجود تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ان میں واپڈا کا وہ ایس ڈی او بھی ہو جس کی دل پشاوری کے لیے اس ڈیرے کی بابرہ شریف شرمگیں ہوئی تھی۔ نادر جنگی کے یہ سارے دوست احباب صوفوں اور کرسیوں پر براجمان تھے جبکہ اس کے کارندے وغیرہ نیچے قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی کارندوں میں شامل تھا لہٰذا نیچے قالین پر تھا۔ میرے قریب ہی جو سوٹڈ بوٹڈ معزز چارلی کا پرفیوم لگائے صوفے پر براجمان تھا مجھے اس کے پاؤں کے قریب جگہ ملی تھی۔ وہ رقاصہ کے رقص اور گانے کے بولوں میں مگن تھا اور غیر ارادی طور پر اپنا پاؤں ہلاتا جا رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ اس شخص کو میں نے کہیں دیکھا تھا۔ کسی بڑی اچھی صاف ستھری جگہ پر۔ کہاں دیکھا تھا؟ کہاں دیکھا تھا؟ ایک دم ذہن میں روشنی سی بھڑکی۔ یہ شخص گوند ہوٹل اسلام آباد کا اسسٹنٹ منیجر تھا۔ میں نے چند روز پہلے اسے ہوٹل میں ہی دیکھا تھا۔ جب میں نے ہوٹل جاکر زرینی سے ملنے پر اصرار کیا تھا تو یہ شخص آگے آیا تھا اور ذرا تلخ لہجے میں مجھ سے بات کی تھی۔ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں تھا مگر شکل ذہن میں نقش تھی۔ میں اس شخص کو یہاں اس محفل میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری چھٹی حس نے کہا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ شخص بڑی تسلی سے بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ اس کا "باس" یعنی گوند ہوٹلز کا مالک ایک ادنیٰ کارندے کے روپ میں اس کے قدموں میں بیٹھا ہے۔ میں نے اپنا چہرہ مفلر میں کچھ اور بھی چھپا لیا۔

حاضرین رقص دیکھنے میں مگن تھے۔ شراب شباب اور کباب نے یک جا ہو کر محفل کو رنگین زبنا دکھا تھا۔ دونوں رقاصاؤں کے بدن بجلی کی طرح کوند رہے تھے۔ ایک تجیم شحیم شخص جس کا رنگ الٹے توے کی طرح سیاہ تھا اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر رقاصاؤں پر دس دس اور پچاس پچاس کے نئے نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ بالکل گول چہرے والا ایک ادھیڑ عمر شخص نشے میں آؤٹ ہونے کے قریب تھا۔ وہ پہلے تو اپنے ہونٹوں میں سو سو کے نوٹ دبا کے ایک رقاصہ کو دعوت دیتا رہا کہ وہ اپنے دانتوں سے یہ نوٹ اس کے ہونٹوں سے نکالے، جب ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ اس نے اسی طرح نچھاور کر دیا تو اس کی مستی اور بڑھ گئی، وہ اٹھ کر ناچنے والیوں کے ساتھ ہی ناچنا شروع ہو گیا۔ اس کی توند مضحکہ خیز منظر پیش کر رہی تھی۔

اچانک میری نگاہ نادر کے قریب بیٹھے ایک شخص پر پڑی اور میں چونک گیا۔ یہ شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس کا نام اسحاق تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ شخص بھی مجھے جانتا ہے۔ اب اس محفل میں مجھے دو افراد کی نگاہوں سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ایک تو گولڈ ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر تھا جو میرے عین پیچھے بیٹھا تھا۔ دوسرا یہ اسحاق نامی شخص تھا۔ اسسٹنٹ منیجر سے تو مجھے بہت زیادہ خطرہ نہیں تھا کیونکہ اس شخص نے جب مجھے ہوٹل میں دیکھا تھا اس وقت میں ایک ادھیڑ عمر شخص کے حلیے میں تھا۔ جبکہ اب میں اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ اسسٹنٹ منیجر جب تک مجھ پر خصوصی توجہ نہ دیتا اور طویل دورانیے کے لیے مجھ سے گفتگو نہ کرتا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ مجھے پہچان سکتا مگر یہ اسحاق نامی جو دوسرا شخص تھا یہ مجھے فوراً پہچان سکتا تھا۔

میں نے چہرے پر لپٹا ہوا مفلر اپنی ناک پر کچھ اور اونچا کر لیا۔ رخ ایسا تھا کہ میں اپنا چہرہ اسحاق نامی اس شخص کی طرف سے پھیر نہیں سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اگر میں تھوڑی دیر مزید یہاں بیٹھا رہا تو یہ بندہ مجھے پہچان لے گا۔ میں نے محفل سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔ ناچنے والی ایک لڑکی جب ناچتے ناچتے نادر رنگی کی گود میں لیٹی اور سب اس کی ہاتھی ادا کی طرف متوجہ ہوئے، میں کھانستا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شراب کی بو اور دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے سے نکل کر ذرا سکون محسوس ہوا۔ رقاصہ نادر کی گود میں لیٹے لیٹے ناچ رہی تھی اور گا رہی تھی۔ "ہن دے بلوری اکھ والیا۔ اساں دل تیرے نال لا لیا...... وغیرہ وغیرہ۔

میں واپس تہ خانے میں آگیا اور بستر پر نیم دراز ہو کر سگریٹ سلگا لیا۔ ذرا دیر بعد ماجھو بھی وہاں آن موجود ہوا "ارے ڈنگر! میں تجھے اوپر لے کر گیا تھا تو پھر واپس آگیا ہے۔" ماجھو نے کہا۔

"بس ویسے ہی ذرا سر میں درد تھا۔"

"ارے پاگلا! دو پیگ لگانے تھے درد وفو چکر ہو جاتا تھا۔"

"نہیں بھاجی! پیگ لگانے سے ہی تو طبیعت گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"نادر صاحب ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے تجھے کہہ کر بلایا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تاکہ تم واپس آگئے ہو تو بہتر پھیریں گے تجھے۔"

"مگر بھاجی! بندے کی طبیعت تو خراب ہو سکتی ہے نا۔ کسی وقت نادر صاحب کی بھی خراب ہوتی ہوگی۔"

اس دوران میں اوپر سے کسی نے ماجھو کو آواز دی۔ وہ تہ خانے سے باہر چلا گیا۔ میں لیٹا رہا اور حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ گولڈ ہوٹل اسلام آباد کے اسسٹنٹ منیجر کی یہاں موجودگی ایک اتفاق ہو سکتی تھی اور اگر اتفاق نہیں تھی تو پھر اس کے پیچھے بھی کوئی چکر تھا۔ اسسٹنٹ منیجر سے زیادہ پریشان مجھے اسحاق نام کے بندے نے کیا تھا۔ چند برس پہلے کاربن نامی ایک غنڈے سے میرا ٹاکرا ہوتا رہا تھا۔ اسحاق دراصل کاربن کا دست راست تھا۔ اس وقت وہ قدرے دبلا اور جوان سال نظر آتا تھا مگر اب تو ٹھیک ٹھاک مرد بن چکا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہا درجے کی سخت گیری اور خباثت ظاہر ہوتی تھی۔ جسم مجسم ضخیم ہو چکا تھا اور اس کے طور اطوار مرعوب کرنے والے تھے۔ جن دنوں میں نے کاربن کو آڑے ہاتھوں لیا تھا ان دونوں اسحاق عرف ساقی کی بھی میرے ہاتھوں زبردست درگت بنی تھی۔ اس وقت کی چند تصویریں بھی کہیں میرے پاس موجود تھیں۔ بہرحال اس وقت کے ساقی اور اب کے اسحاق میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دے رہا تھا۔

لیٹے لیٹے مجھے اونگھ آگئی۔ ماجھو نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تھا "ارے! کیا گھوڑے بیچ کر سو گیا ہے؟ اٹھ جا۔ ادھر رانا صاحب نے لیٹنا ہے۔ تو اپنا بوریا بستر آج اوپر میرے کمرے میں لے آ۔"

"رانا صاحب کون؟"

"نادر صاحب کے دوست ہیں۔ رانا اسحاق۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ سیڑھیوں کی طرف

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ماجھو گھبرا کر بولا "میرا خیال ہے کہ اسحاق صاحب آگئے۔ میں جا رہا ہوں تو فانی اپنا بستر لے کر اوپر آ جا۔"

ماجھو سیڑھیاں چڑھتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے فوراً اپنا مفلر چہرے پر لپیٹا اور دل ہی دل میں دعا گو ہو گیا کہ آنے والا اسحاق عرف ساقا نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ اکثر دعا کو اثر کے ساتھ اختلاف ہو جاتا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ چند لمحے بعد تجیم تحیم ساقا ڈگمگاتا ہوا اندر آگیا۔ وہ نشے میں تھا۔ نادر کا ایک ملازم بھی اس کے ساتھ تھا اس نے ساقے کی بھاری بھرکم خودکار راکفل اور گولیوں والی بیلٹ اٹھا رکھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں اس نے جلدی کے ساتھ ایک گوشے میں رکھیں اور میرے ساتھ مل کر اسحاق صاحب کے لیے بستر درست کر دیا۔ ابھی ہم نے بمشکل بستر درست کیا ہی تھا کہ اسحاق دھڑام سے اس کے اوپر آن گرا اور بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ میں حتی الامکان اپنا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے کاکے۔" اس نے نادر کے ملازم کو دعوت سے مخاطب کیا "وہ میرے سگریٹ اوپر کہیں کمرے میں رہ گئے ہیں۔ جا لے کر آ۔"

ملازم نے ادب سے سر جھکایا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ میں بھی جلدی جلدی اپنا بستر گول کرنے لگا۔ بستر گول کر کے میں نے بغل میں دبایا۔ ابھی سیڑھیوں کی طرف کھسکنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسحاق نے بھاری آواز میں مجھے مخاطب کیا "ادھر آ بھئی! یہاں بیٹھ کر تھوڑی سی ٹانگیں دبا دے میری۔"

میں ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر میں نے اسحاق کی طرف رخ پھیرے بغیر کہا "میں بستر چھوڑ کے ابھی آیا جی۔"

اس سے پہلے کہ اسحاق عرف ساقا مزید کچھ کہتا، میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا جلدی سے اوپر آگیا۔ برآمدے سے ہو کر میں اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں ماجھو، اختر اور بھولا، نندی وغیرہ سوتے تھے۔ بھولا اور نندی تو جیل میں تھے لہٰذا اب یہ کمرا ماجھو اور اختر وغیرہ کے ہی استعمال میں تھا۔ میں نے چٹائی پر بستر بچھا دیا اور نیم دراز ہو گیا۔ کہنے کو تو میں ساقے سے کہہ آیا تھا کہ ابھی آتا ہوں لیکن اس کے پاس جانے کا مطلب اپنا راز فاش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

جب سے میں نے شانی کو جہنم واصل کیا تھا نادر رنگی کا اعتبار مجھ پر بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب میں پوری طرح اس کے ڈھب پر آگیا ہوں اور وہ مجھ سے اہم کام لے سکتا ہے۔ یہی کچھ میں چاہتا تھا۔ اب اس صورت حال میں اگر اس حرامی ساقے کی وجہ سے بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا تو بہت نقصان کی بات تھی۔ "بدبخت پتا نہیں کہاں سے آ ٹپکا ہے؟" میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے تو مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ شاید ٹانگیں دبوانے کے لیے اسے کوئی اور بندہ مل گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نشے کے زیر اثر وہ سو ہی گیا ہو۔ شراب تو اکثر مے کشوں کو حسین عورت کے قرب سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے اور وہ خراٹے لینے لگتے ہیں ٹانگیں دبوانا تو معمولی سی خواہش تھی۔

بہرحال چند منٹ بعد میرے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ نادر رنگی تیز قدموں سے اندر آیا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھے آواز دی "جہاں داد۔"

"جی مالک!" میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟" نادر غصے سے بولا۔

"کیا ہوا جناب؟"

"تجھے اسحاق صاحب نے کیا کہا تھا؟"

"جی پ...... پتا نہیں جی۔"

"پتا کیوں نہیں؟ انہوں نے کہا تھا ذرا ٹانگیں دبا دو۔ تم نے کہا، جی ابھی آتا ہوں۔ اب یہاں چوڑے ہو کے لیٹے ہوئے ہو۔"

"اوہو۔" میں جلدی سے کھڑا ہو گیا "میرے دماغ سے ہی نکل گیا جناب۔"

نادر چند لمحے مجھے غصے سے گھورتا رہا، پھر بولا "اپنے دماغ کو ذرا ٹھکانے پر رکھا کرو۔ رانا صاحب ہمارے عزت دار مہمان ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے؟ نادر نے ایسے ہی سب وتوف بندے بھرتی کیے ہوئے ہیں۔"

"م۔ میں شرمندہ ہوں جی۔"

"چلو جاؤ۔ ان کی بات سنو۔ اور ان سے معافی بھی مانگنا۔"

"جو حکم جناب!" میں نے مفلر اپنے گلے میں ڈالا۔

"اور یہ گند اٹھانے والوں کی طرح ہر وقت مفلر منہ پر لپیٹ کر نہ رکھا کرو۔ یہاں کوئی پولیس نہیں پھر رہی، جو تمہیں پہچان لے گی۔" نادر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے جناب۔"

میں ایک بار پھر تہ خانے کی طرف بڑھا۔ صورت حال تشویش ناک تھی۔ تہ خانے میں لائٹ بدستور جل رہی تھی۔ ممکن نہیں تھا کہ اس روشنی میں ساقا مجھے پہچان نہ سکتا۔ میں

نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ میرے اندازے کے مطابق نادر جنگی اسے شب بخیر کہنے کے لیے تہ خانے میں گیا تھا اور وہیں اس نے نادر سے میری شکایت کر دی تھی۔

میں سیڑھیاں اترتا ہوا تہ خانے میں پہنچا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ تہ خانے میں ساتے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ نیم دراز تھا اور اپنی گھنی مونچھوں کے نیچے سے سگریٹ کا دھواں نکال رہا تھا۔ میں نے مفلر چہرے کے سامنے کر لیا تھا مگر یہ ایک بیکار کوشش تھی' میں جانتا تھا کہ یہ مفلر مجھے شناخت سے بچا نہیں سکتا اور یہی ہوا۔ ساتے نے آنکھیں کھول کر بڑے غور سے مجھے دیکھا پھر ایک دم اس کی آنکھیں کچھ اور کھل گئیں۔ اس کے چہرے پر زردی نے ایسے یلغار کی جیسے کسی نے برش سے زرد رنگ اس کے چہرے پر پھیر دیا ہو۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا تھا۔

"تت... تم۔ تم استاد جانی...!"

"ہاں۔ تمہارا باپ!" میں نے اس کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے کہا "اور اگر تم نے ذرا زور سے کسی کو بلانے کی کوشش کی... تو کل سویرے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے تمہارے جنازے کا ٹائم نشر ہو جائے گا۔"

گھنی مونچھوں کے نیچے ساتے کے ہونٹ کانپتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے جسم کو کہنیوں کے بل اٹھایا اور بیٹھ گیا۔ اب اس کا پورا جسم ایک لرزتے کانپتے گیند کی طرح میرے سامنے تھا "بیٹھ کیوں گئے ہو' لیٹ جاؤ۔" میں نے غرا کر کہا۔

وہ اس قدر مرعوب تھا کہ فوراً سے پہلے دوبارہ لیٹ گیا "اپنی ٹانگیں سیدھی کرو۔" میں نے تحکم سے کہا۔

اس نے ٹانگیں سیدھی کر دیں۔ تھوک نگل کر بولا "مم... مجھے یقین نہیں آ رہا۔ اتنی دیر بعد نہیں۔ مم... میرا مطلب ہے کہ آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے سارے شک دور ہو جائیں گے۔"

میرے لہجے نے اسے مزید گڑبڑا دیا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا پھر ایک دم ہاتھ جوڑ کر بولا "استاد صاحب! اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معاف کر دیں۔ آپ... آپ کا منہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ہوں گے۔ توبہ توبہ جی۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میرے جیسا بندہ آپ جیسے بندے سے ٹانگیں دبوانے کی جرأت کرے... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ جرأت تو تم نے کر لی ہے اس لیے ٹانگیں تو دبوانا ہی پڑیں گی۔ چلو شاباش لیٹ جاؤ دوبارہ۔"

اس کا چہرہ بالکل ہلدی ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا "ہم تو آپ کے کارندوں کے کارندوں جیسے بھی نہیں ہیں سرکار۔ آپ سے خدمت کرانے سے اچھا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لوں۔ آپ کو رب کا واسطہ ہے۔ ایسی بات مت کریں آپ!"

وہ خود کو میرے کارندوں کا کارندہ ٹھہرا رہا تھا اور اپنی دانست میں میری عزت افزائی کر رہا تھا۔ ایک دم سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر نادر جنگی کے بولنے کی آواز آئی۔ مجھے شک گزرا کہ وہ اس طرف آنے والا ہے۔ میں نے سرگوشی کے لہجے میں غرا کر کہا "چلو لیٹ جاؤ دوبارہ اور ٹانگیں سیدھی کرو۔"

وہ تذبذب میں تھا' میں دوبارہ غرایا تو اس نے خوف زدہ ہو کر مشینی انداز میں میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دانت پیس کر کہا "دیکھ ساتے! اگر نادر یہاں آ جائے اور اس کو ذرا بھی شک ہوا کہ تو مجھ کو پہلے سے جانتا ہے یا مجھ سے ڈر رہا ہے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تو اس تہ خانے سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔ اپنے آپ کو بالکل اطمینان میں رکھ اور سب کچھ بھول جا۔ بس یہ یاد رکھ کہ تو راجا اسحاق صاحب ہے اور میں نادر کا کارندہ ہوں۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔"

"مم... مگر..."

"بکواس بند کر سور کے تخم! میری بات کا جواب دے۔ جو میں نے کہا وہ تیری سمجھ میں آیا۔"

ساتے نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ میں اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ لحاف کے نیچے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کا نشہ یوں ہرن ہوا تھا کہ نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر جنگی کی آواز سیڑھیوں کے بالکل پاس سے آئی' وہ تہ خانے کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر روشنی بجھا دی۔ اب بس سیڑھیوں کی طرف سے آنے والی ہلکی روشنی میں ساتے کے چہرے کے تاثرات کافی حد تک چھپے رہ سکتے تھے۔ نادر نے تہ خانے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا "راجا صاحب! کیا سو گئے؟"

"نن... نہیں۔" ساتے نے مختصر جواب دیا۔

"میں بڑا شرمندہ ہوں راجا جی۔ یہ بے وقوف نشے میں تھا' اوپر جا کر سو گیا۔" نادر نے کہا۔ اس کا اشارہ میری طرف ہی تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔" ساتا ہکلا کر

بولا۔

"اوئے کھوتے! معافی مانگی ہے راجا صاحب سے؟" نادر نے مجھ سے پوچھا۔

"آہو جی! غلطی کی تھی تو پھر معافی بھی تو مانگنی تھی۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"اچھا راجا جی آپ آرام شرام کرو۔" نادر نے ساتے سے مخاطب ہو کر کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر تو ساتے کی ٹانگیں دباتا رہا' پھر میں نے اٹھ کر تہ خانے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

ایک دم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے لائٹ پھر سے روشن کر دی۔ ساتا ایک دم چارپائی سے اٹھا اور بندروں کے انداز میں میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے اسے کندھوں سے تھام کر پیچھے ہٹایا۔ وہ مجسم خوف نظر آ رہا تھا "میں آپ کا خادم ہوں جی۔ آپ پچھلی باتیں بھول جائیں۔ میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو۔ مجھے بتائیں۔ میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں نے کہا "پہلی خدمت تو یہی ہے کہ تم انسانوں کی طرح واپس بستر پر بیٹھ جاؤ اور جو کچھ میں پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ جھوٹ بولنے والوں سے مجھے کتنی نفرت ہے۔"

"مم... مجھے پتا ہے جی۔"

"اور تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ ایک مرتبہ تم نے اور تمہارے استاد کاربین نے میرے ساتھ متھا لگایا تھا تو میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟"

"ہاں جی۔ پتا ہے۔"

"لیکن میں ذرا ذرا بھول گیا ہوں۔ مجھے یاد دلاؤ کہ اس وقت کیا ہوا تھا۔"

مارے ندامت کے ساتے کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ عاجزی سے بولا "مجھے سب پتا ہے جی۔ آپ مجھے بس حکم کریں' اگر میں نہ مانوں تو..."

"اوئے حکم کے بچے! میں جو بکواس کر رہا ہوں مجھے اس کا جواب دے۔ اس وقت کیا ہوا تھا تیرے اور کاربین کے ساتھ؟"

ساتا تھوک نگل کر بولا "آ... آپ نے۔ آپ نے..." وہ پھر اٹک گیا۔

"آگے بکواس کرنا ہے یا ماروں جوتا؟"

"آ... آپ نے ہمیں سرخی پوڈر لگوا دیا تھا... اور... ہمارے سروں پر دوپٹے ڈال کر ہماری تصویریں کھنچوائی تھیں۔"

"اور وہ تصویریں اب بھی میرے پاس موجود ہیں... اور ایک دو تصویروں میں تم اور کاربین طوائفوں کی طرح ڈانس کرتے بھی نظر آ رہے ہو۔ میں وہی سب کچھ یہاں بھی دہرا سکتا ہوں' لہٰذا اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرنا۔ مختصر لفظوں میں سب کچھ صاف صاف بتا ڈالو۔"

جواب میں ساتے نے واقعی سب کچھ صاف صاف کہہ ڈالا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

ساتا آج کل اکثر بارڈر پر پار جاتا رہتا تھا۔ وہ الائچی وغیرہ کی اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بارڈر پار جا رہا تھا۔ روجھا پور کا قصبہ راستے میں پڑتا تھا' اس لیے وہ اپنے یار نادر جنگی کے پاس رک گیا تھا۔ کل شام کو اسے آگے روانہ ہو جانا تھا۔ ساتے کے ساتھ ایک اور بندہ بھی بارڈر پار کر رہا تھا۔ وہ بھی اس وقت یہیں نادر جنگی کے ڈیرے پر موجود تھا۔ یہ دوسرا بندہ' اپنے خلاف بننے والے کسی کیس سے ڈر کر انڈیا بھاگ رہا تھا۔

میں نے ساتے کے ساتھ کافی دیر تک بات چیت کی اور مختلف زاویوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ مجھے اس سے اپنے مطلب کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ساتے کا تعلق بس چھوٹی موٹی اسمگلنگ سے ہی ہے۔ اسمگلنگ کا دھندا شروع کیے بھی اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ساتے سے کہا "دیکھ ساتے! میں ایک کام کے سلسلے میں یہاں موجود ہوں یہاں میری حیثیت نادر جنگی کے کارندے کی ہے۔ اگر میری اس حیثیت کو تمہاری وجہ سے کوئی نقصان پہنچا تو میں تیرا حشر خراب کر دوں گا۔"

"جناب! آپ جو کہو گے میں ویسا ہی کروں گا۔ اگر آپ کا حکم ہے تو میں اپنے ساتھی سمیت ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں۔ اسی وقت جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تمہاری زبان سے یا تمہاری کسی حرکت سے نادر کو میرے بارے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"نہیں ہو گا جانی صاحب... بالکل نہیں ہو گا۔ بس... بس مجھے خوف ایک ہی بات کا ہے اگر نادر کو کسی اور وجہ سے آپ پر شک شبہ ہو گیا تو۔ کہیں آپ پھر بھی مجھ کو ہی مجرم نہ سمجھیں۔"

"نہیں ہو گا شک۔ میں کافی دنوں سے ہوں یہاں۔"

ساقے نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اگر نادر جگی اپنے اس معزز مہمان کو میرے سامنے اس حالت میں دیکھ لیتا تو شاید حیرت سے بے ہوش ہو جاتا۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا کے اس سمندر میں ہر مچھلی سے بڑی ایک اور مچھلی ہوتی ہے جس کا خوف چھوٹی مچھلی کو لاحق رہتا ہے اور یہ سلسلہ نیچے سے بہت اوپر تک چلتا ہی رہتا ہے۔ ساقے نے عاجزی سے کہا "بس آپ سے ایک درخواست کرنی ہے جی۔"

"ہاں بکو۔"

"یہاں نادر کے ڈیرے پر میری کچھ عزت بنی ہوئی ہے۔ اگر۔۔۔"

"بس بس۔ میں سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی "یہاں جو باتیں ہوئی ہیں تیرے اور میرے درمیان ہی رہیں گی۔ مجھے پتا ہے تو جھگڑے سے رانا صاحب بنا ہوا ہے۔ بہرحال رانا صاحب ہی بنا رہے گا۔"

جھوٹ موٹ کے "رانے" کو سمجھا بجھا کر میں واپس ماجھو کے کمرے میں آ گیا۔ بہرحال رات بھر تشویش میرے دل میں موجود رہی۔ ساقے ٹائپ کے جرائم پیشہ لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہو گیا تھا' ساقا کل بارڈر پار کر کے انڈیا جا رہا تھا۔ جانے جاتے وہ اپنے یار نادر جگی کے سامنے میرا پول کھول جاتا تو میں نے کیا کر لینا تھا۔ رات بھر کسی قریبی کمرے سے نسوانی قہقہوں اور باتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ دونوں طوائفیں ڈیرے پر ہی موجود تھیں۔ نادر اور اس کے ساتھی اس یخ بستہ شب کی تاریکی میں یقیناً ان طوائفوں کے "فن" کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔

اگلا سارا دن میں نے بے کسی کی حالت میں ہی گزارا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ میری ساری تدبیریں دھری رہ جاتیں اور ساقا میرا راز فاش کر کے رفوچکر ہو جاتا۔ میں نے ساقے کو بھی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ دس گیارہ بجے غسل خانے سے برآمد ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ پھر غسل خانے میں چلا گیا۔ اس وقت۔۔۔۔۔ مجھے ساقے سے دوبارہ بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں اپنے ا پنی کیس سے کپڑے لینے کے بہانے غسل خانے میں گیا۔ ساقا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کتنے بجے جاؤ گے یہاں سے؟"

"شام کے فوراً بعد۔"

"سواری کیا ہو گی۔"

"میرے پاس اپنی جیپ ہے۔ وہی نیلے رنگ کی جو احاطے میں ٹاہلی کے نیچے کھڑی ہے۔"

"تو کیا جیپ پر ہی انڈیا میں گھس جاؤ گے۔"

"نہیں جی۔ جیپ تو سرحدی پنڈ گلاب پور کے باہر کھڑی کر دیں گے۔ میرے بندے خود ہی وہاں سے لے جائیں گے۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی ایک شخص اندر آ گیا۔ میں چونک گیا۔ یہ گولڈ ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر ہی تھا۔ اس نے ساقے کے قریب جا کر سرگوشی کے لہجے میں کوئی بات کی پھر مجھ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے ثابت تھا کہ وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بندہ رات کو چلا گیا ہو گا مگر وہ ابھی تک ڈیرے پر موجود تھا۔ اب اس نے جس انداز میں غسل خانے میں آ کر ساقے سے بات کی تھی' یہ انکشاف ہوا تھا کہ یہی ساقے کا وہ ساتھی ہے جو اس کے ساتھ بارڈر پار کر رہا ہے۔

میں نے ساقے سے اس بات کی تصدیق چاہی تو اس نے فوراً تصدیق کر دی۔ میں نے ساقے سے پوچھا "تم نے کہا تھا کہ یہ بندہ کسی کیس سے ڈر کر انڈیا بھاگ رہا ہے۔"

ساقا بولا "کچھ نہیں جی' معمولی سا کیس ہے' لیکن آپ کو پتا ہی ہے کہ زیادہ تر پڑھے لکھے بندے اندر سے ڈرپوک ہوتے ہیں۔"

"مگر کیس کیا ہے؟"

"یہ اسلام آباد کے کسی ہوٹل میں ملازم ہے۔ اس ہوٹل کی بلڈنگ بنانے کا ٹھیکا اس کے کسی رشتے دار کے پاس تھا۔ اپنے رشتے دار کے ساتھ مل کر اس نے مال شال بنایا تھا۔ ہوٹل کا مالک کوئی انگریز ہے اور آپ کو پتا ہی ہے کہ یہ انگریز لوگ بڑے باریک بین ہوتے ہیں۔ اس نے یہ گھپلا پکڑ لیا ہے۔ ۵۰ لاکھ سے اوپر کا چکر ہے حالانکہ اس کے حصے میں تو چار چھ لاکھ ہی آیا ہو گا۔ بہرحال اب یہ کچھ دیر کے لیے انڈیا جا رہا ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ ہوتی رہی۔ اس دور دراز قصبے میں بیٹھ کر بھی میں اپنے کاروباری معاملوں سے باخبر تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مجھے کاروبار سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر مسز کلارک نے مجھے ڈنڈے کے زور سے کاروباری بنا دیا تھا۔ اور اب ایک کاروباری معاملہ خود بخود اچھل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ساقا جس ہوٹل کا ذکر فرما رہا ہے وہ گولڈ ہوٹل ہی ہے۔

"کیا بات ہے جی آپ کچھ سوچ میں پڑ گئے ہیں۔ کہیں میرے بارے میں کوئی شک تو نہیں ہے آپ کو؟"

"جس وقت شک پڑے گا اسی وقت تیری گردن توڑ دوں گا۔ لہٰذا جب تیری گردن کڑک کر کے ٹوٹ جائے' اس وقت سمجھ لینا کہ مجھے تجھ پر شک ہوا تھا۔"

"اللہ نہ کرے جی کہ ایسا ہو۔"

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں فوراً ساقے کے بستر کی سلوٹیں دور کرنے لگا۔ آنے والا نادر ہی تھا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے تو میں باہر آ گیا۔

میں دوپہر کو ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ ساقے کو گرفتار کرا دوں گا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو نئی بات بتائی تھی اس کے بعد ساقے اور اس کے ساتھی کی گرفتاری اور بھی ضروری ہو گئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ گولڈ ہوٹل اسلام آباد کے بھگوڑے ملازم کی گرفتاری مسز جی کلارک کے لیے مددگار ثابت ہو گی۔۔۔ اور جب بعد میں انہیں میرے بارے میں پتا چلے گا تو وہ میری اس پہلی "کاروباری کارکردگی" سے خوش ہوں گے۔

میں تین بجے کے قریب نادر جگی کے ڈیرے سے نکلا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' میں نے حسب معمول منہ سر مفلر میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں ٹیلی فون کرنے جا رہا تھا اور اس مقصد کے لیے مجھے ایک قریبی گاؤں تک کا سفر کرنا تھا۔

پہلے میں نے سب انسپکٹر شجاعت کو فون کیا مگر اس سے رابطہ نہیں ہو سکا پھر میں نے ساہی صاحب کو مسلم ٹاؤن والی کوٹھی پر ٹرائی کیا۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ اپنی خیر خیریت سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے ساہی صاحب سے پوچھا کہ شہر کے حالات کیسے ہیں۔

وہ بولے "دو دن پہلے تو کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ اخبار بھی چیخ رہے تھے کہ رخشندہ کے قاتلوں کو "اتنے گھنٹوں" کے اندر پکڑا جائے۔ بہرحال اب کچھ سکون ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "جناب! شاہدرہ کے مکان میں جن دو بندوں نے رخشندہ کو قتل کیا تھا' ان میں سے ایک تو میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس کا نام شاہ جہاں عرف شاہی تھا اور وہ سربد پورہ گاؤں کا رہائشی تھا۔ منگل کے روز مقامی تھانے میں اس کے قتل کی رپورٹ درج ہو چکی ہو گی۔ جس وقت وہ مارا گیا اس وقت بھی ایک بھکارن لڑکی اس کے مکان میں قید تھی اور اس کی درندگی کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ لڑکی بھی اسی رات دم گھٹنے کی وجہ سے مر گئی۔"

ساہی صاحب فوراً بولے "ہاں۔ اس واقعے کی خبر میری نظر سے بھی گزری ہے۔"

میں نے ساہی صاحب سے کہا "رخشندہ کے اصل قاتل اب بھی ہم سے پوشیدہ ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ مجھے یہاں بدھا پور میں چند روز مزید رہنے کا موقع مل گیا تو میں ان کا کھوج لگا لوں گا۔"

ساہی صاحب نے کہا "بات صرف رخشندہ کے قاتلوں کی ہی نہیں۔ ملک میں مجموعی طور پر جو بدامنی پھیلائی جا رہی ہے یہ زیادہ تشویش ناک ہے۔ اللہ کرے کہ اس بدامنی کے مجرم بھی جلد سامنے آ جائیں۔"

میں نے اپنی مصروفیت کی تفصیلات سے ساہی صاحب کو آگاہ کیا۔ انہوں نے چند مشورے دیے۔ اس دوران میں شیخ عاصم کا ذکر بھی آیا۔ ساہی صاحب بولے "مسز کلارک کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ شیخ عاصم پاکستان سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ہے اور ابھی تک اس کی کوئی خبر نہیں۔ کل ایک اماراتی تاجر سے معلوم ہوا ہے کہ شیخ عاصم سری لنکا سے سڈنی اور استنبول سے لندن تک بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اس کی یہ بھاگ دوڑ اپنے کاروباری معاملات سلجھانے کے لیے ہے۔ سنا ہے کہ وہ جتنا بھاگ رہا ہے اتنا ہی الجھ رہا ہے۔ راس الخیمہ میں شیخ کی ایک بڑی فیکٹری کو شٹ ڈاؤن کا سامنا ہے۔"

"مسز کلارک نے آپ کی بات تو نہیں ہوئی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں میری تو نہیں ہوئی مگر زریں سے ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک گولڈ ہوٹل میں ہے۔ کل کسی اور جگہ شفٹ ہوئے ہیں۔ انہوں نے زریں کے بیٹے کے لیے چند تحائف بھجوائے تھے اور فون کیا تھا۔"

تحائف کی بات سے ایک دم میں چونک گیا۔ میں نے زریں کے بیٹے کو بس چوم چاٹ کر بھیج دیا تھا' دیا دلایا کچھ نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ایسے موقعوں پر بچوں کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے۔ غزالہ کو ایسی باتوں کی بہت خبر رہتی تھی۔ وہ ساتھ ہوتی تو شاید مجھے یاد دلا دیتی۔ میں نے ساہی صاحب سے زریں اور کلثوم کا حال احوال پوچھا' صفدر اور عالم قریشی کی خیر خیریت دریافت کی۔ اس کے بعد وہ اصل بات بھی بتائی جس کے لیے فون کیا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کو بتایا کہ آج شام چھ سات بجے کے قریب نادر کے ڈیرے سے نیلے رنگ کی جیپ نمبر ایل اے ای ۲۸۸ دو بندوں کے ساتھ روانہ ہو گی۔ یہ لوگ بارڈر پار کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام اسحاق ہے' دوسرا پتلون قمیص والا ایک شخص ہے اور وہ گولڈ ہوٹل اسلام آباد کا اسسٹنٹ منیجر ہے۔

میں نے ساہی صاحب سے یہ بھی کہا کہ پتلون قمیص والے کی گرفتاری کے بعد وہ سسٹرچی کلارک کو ضرور اطلاع دیں' وہ اس اطلاع پر بہت خوش ہوں گے۔

آخر میں میں نے ساہی صاحب سے کہا "ان دونوں کی گرفتاری بالکل خفیہ ہونی چاہیے۔ ان میں سے اسحاق نامی بندہ میرا پرانا واقف کار ہے۔ وہ بدبخت کسی بھی موقع پر نادر جگی کے سامنے میرا راز فاش کر سکتا ہے۔ ان کو پکڑنے کے بعد ان لوگوں کی جیپ آپ ناروال کے پاس گلاب پور گاؤں کے قریب چھوڑ دیں۔ اسحاق کے ساتھی یہی سمجھیں گے کہ وہ انڈیا چلا گیا ہے۔"

میں نے پوری بات تفصیل سے ساہی صاحب کو سمجھا دی تھی۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے' ایسا ہی ہو گا۔"

○☆○

اگلے دو تین دن سکون سے گزرے۔ نادر جگی یہی سمجھ رہا تھا کہ رانا اسحاق انڈیا چلا گیا ہے مگر میں جانتا تھا کہ وہ لاہور پولیس کے کسی خفیہ ٹھکانے پر بیٹھا اپنے برے وقت کو رو رہا ہو گا۔ اتفاقات انسان کو عجیب عجیب مناظر دکھاتے ہیں۔ اب یہ ایک انوکھا اتفاق ہی تو تھا کہ میں نے یہاں دوجھاپور میں بیٹھے بیٹھے اپنا ایک کاروباری معاملہ سلجھایا تھا اور اپنے ہوٹل کے فراڈیے ملازم کو گرفتار کرایا تھا۔

تیسرے دن رانو بھی پھر ڈیرے پر آ دھمکی۔ وہ حسب معمول ریشمی کرتے لاچے میں چھم چھم کرتی پھر رہی تھی۔ تاہم وہ ذرا مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ جس ایس ڈی او کو خوش کرنے شیخوپورہ گئی تھی' وہ کچھ زیادہ ہی خوش ہوتا رہا ہے۔ بہرحال فلمی ہیروئنوں والی ساری خصوصیات رانو میں موجود تھیں۔ جس طرح اکثر ہیروئنیں تین تین شفٹوں میں شوٹنگ کر کے بھی چوتھی شفٹ کے لیے تیار رہتی ہیں' رانو بھی قائم دائم تھی۔ مجھے ڈیرے پر دیکھ کر وہ کھل اٹھی "وے گھوڑے! مجھے پہلے پتا ہوتا کہ تم ڈیرے پر ہو تو اس نامراد کے دودھ میں جمالوٹا ڈال کر یہاں بھاگ آتی۔ پتا نہیں کیا ہے۔ تم نے تو مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔" نامراد سے رانو کی مراد پولیس والے کا عزیز ایس ڈی او تھا۔

رات کو کھانے کے بعد وہ دیر تک میرے سر پر سوار رہی۔ بہرحال اس نے اپنے چھیڑنے پر ہی اکتفا کیا۔ شاید وہ کئی راتوں کی تھکی ہوئی تھی یا پھر شاید اسے بھی "قربت میں دوری" والی یہ ادھوری ملاقاتیں پسند آنے لگی تھیں۔ اپنی عقل سمجھ کے مطابق وہ مجھے رجھانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ اس کی نوے فیصد ادائیں فلمی ہیروئنوں سے ادھار لی ہوئی تھیں۔ اس کے انداز دیکھ کر میں دل میں مسکراتا تھا مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیتا تھا۔

اس رات بارہ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ گاڑیوں میں سے ایک گاڑی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ لینڈ کروزر ہے۔ ابھی تک نادر جگی کے ڈیرے پر میں نے ماٹھی گاڑیاں اور ماٹھے بدمعاش ہی دیکھے تھے لیکن لینڈ کروزر کی آمد سے پتا چلتا تھا کہ کوئی "نسبتاً اونچی ہستی" یہاں تشریف لائی ہے۔

میں خانے سے نکل کر اندر احاطے میں آیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ ایک ٹویوٹا کار کے ساتھ ایک لینڈ کروزر بھی احاطے میں موجود تھی۔ لینڈ کروزر میں ایک جسیم کتا بھی تھا۔ اس السیشن کتے کی سرخ زبان لینڈ کروزر کے عقبی شیشے میں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے ذرا آگے جا کر نادر کی بیٹھک میں دیکھا۔ آنے والے تین مرد تھے اور ایک عورت۔ عورت درمیانی عمر کی تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ بال بوائے کٹ انداز میں تراشے گئے تھے۔ وہ بڑے دھڑلے سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ یہ تینوں مہمان نادر جگی کے ساتھ بڑی خاص قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ دور سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سر جوڑے راز و نیاز میں مصروف ہیں۔ عورت کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ وہ اخبار بار بار دوسرے افراد کے سامنے کرتی تھی اور انہیں کچھ بتانے لگتی تھی۔

ماجو نے مجھے بیٹھک کے سامنے کھڑے دیکھا تو بولا "جا شہزادے' ہم ادھر برانڈے (برآمدے) میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔"

یہ خاص بات دس پندرہ منٹ میں ختم ہو گئی۔ نادر جگی نے مجھے اور ماجو کو اندر بیٹھک میں بلایا۔ چاروں مہمان صوفوں پر براجمان تھے۔ ان میں سب سے نمایاں وہی عورت تھی جو بڑے ٹھسے سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی اور باقاعدہ سگریٹ پی رہی تھی۔ عورت کی آنکھیں گہری بھوری بادامی تھیں۔ رنگ صاف اور عمر اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی چمکیلی آنکھوں میں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ غیر معمولی عورت ہے۔ اس نے ایک نظر مجھے سر تا پا گھورا اور نظروں ہی نظروں میں میرا ایکسرے اتارنے کی کوشش کی۔ نادر جگی بولا "یہ بندہ آپ کے ساتھ جائے گا۔ یہ ہر طرح بھروسے کے قابل ہے۔ اس کا نام جہاں دار ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" عورت نے مردوں جیسی بھاری بھرکم

آواز میں کہا پھر سگریٹ کا کش لے کر بولی "اس کے علاوہ ایک عورت بھی تو چاہیے۔"

"وہ کس لیے میڈم؟" نادر نے پوچھا۔

"کھانا وغیرہ پکانے کے لیے۔ ویسے بھی گھر میں عورتیں ہوں تو آس پڑوس کے لوگ شک کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

"اچھا۔ میں انتظام کرتا ہوں۔ رانو نام کی لڑکی ہے۔ اس کام کے لیے ٹھیک رہے گی۔" پھر نادر جگی مجھ سے مخاطب ہوا "جہاں دار! یہ اپنی کرم فرما میڈم شہزادو ہیں۔ تم ان کے ساتھ شیخوپورہ جاؤ گے اور ان کے گھر میں رہو گے۔ تم نے ویسے ہی کرنا ہے جس طرح یہ کہیں گی۔ مجھے کسی طرح کی شکایت نہیں آنی چاہیے۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں جناب۔ میڈم کے حکم پر جان دے دوں گا جی۔"

"جان شان کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف پہرے داری کرنی ہے وہاں۔" میڈم شہزادو مردانہ انداز میں بولی۔ وہ خاصی کرخت عورت نظر آتی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو نادر بولا "رانو تمہارے ساتھ جائے گی۔ اسے کہو کہ وہ بھی تیار ہو جائے۔"

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اور رانو جیپ پر سوار تھے اور میڈم شہزادو کے ساتھ شیخوپورہ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ دھند کی وجہ سے جیپ آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ کڑاکے کی سردی میں جیپ کے اندر خوشگوار حرارت تھی اور ہلکی آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ میڈم شہزادو کے ساتھیوں میں سے دو افراد انگریزی میں بات کرنے لگے۔ یقیناً ان کا خیال یہی تھا کہ میں اور رانو انگریزی سے بالکل ناواقف ہوں گے۔ یہ دونوں افراد سیاسی باتیں کر رہے تھے۔ آنے والے الیکشن میں وہ اپنے ایک امیدوار کو ہر صورت میں کامیاب کرانا چاہتے تھے اور جوڑ توڑ کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں بدنصیب مقتولہ رخشندہ کا ذکر بھی آیا' اور ان ہنگاموں کا ذکر بھی آیا جو رخشندہ کے قتل کے بعد لاہور اور پنڈی میں ہوئے تھے۔ یہ دونوں افراد اس بات پر قدرے مایوس بھی تھے کہ ان ہنگاموں نے زیادہ زور نہیں پکڑا اور جلد ہی ختم ہو گئے۔

میں لاتعلق بنا بیٹھا تھا مگر میرے کان ان دونوں افراد کی گفتگو پر ہی لگے تھے۔ میڈم شہزادو ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی سگریٹ پھونک رہی تھی۔ اس کے سارے طور اطوار مردانہ تھے۔ قد کاٹھ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کی شخصیت میں جو رعب تھا وہ اردگرد کی ہر شے پر اثر انداز نظر آتا تھا۔ ایک عجیب بات میں نے اور نوٹ کی تھی۔ میڈم شہزادو اپنے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرتی تھی۔ شروع میں تو اس کا یہ انداز مجھے بڑا مضحکہ خیز لگا لیکن جب بار بار اس کے منہ سے یہی کچھ سنا تو حیرت ذرا کم ہو گئی۔

ہم جس وقت شیخوپورہ پہنچے فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ شیخوپورہ کوئی بڑا شہر نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس کے لیے "قصبے" کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ میڈم شہزادو ہمیں ایک کوٹھی میں لے آئی۔ کوٹھی عام سی تھی اور بمشکل نو دس مرلے میں ہو گی۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ در و دیوار کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ چار دیواری میں موجود ابتری دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس مکان کو کسی خوش سلیقہ عورت کی خدمات حاصل نہیں۔ شاید یہاں عورت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ بعد ازاں یہ دوسرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

میڈم شہزادو کے ساتھی تینوں مرد راستے میں ہی اتر گئے تھے۔ شہزادو ہمیں سیڑھیاں چڑھا کر مکان کے بالائی حصے پر لے آئی۔ یہاں چارپائی پر ایک شخص لحاف لیے بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے [illegible] پڑی تھی اور شراب کی خالی بوتل چارپائی کے نیچے لڑھکی پڑی تھی۔ میڈم شہزادو نے اسے جلتی نظروں سے گھورا تاہم اسے جگانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "یہ باورچی خانہ ہے۔ سوئی گیس موجود ہے۔ کھانے پکانے کا سارا سامان بھی یہاں پڑا ہوا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔" میرے ساتھ ساتھ رانو نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

شہزادو بولی "یہ دو کمرے ہیں۔ ایک تمہارے لیے۔ ایک اس لڑکی کے لیے۔" پھر اس نے رانو کو سر تا پا گھورا۔ رانو ہمیشہ کی طرح سجی بنی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک' رخساروں پر غازہ۔ شہزادو کرخت لہجے میں بولی "میں یہ نخرے ٹخرے پسند نہیں کرتا ہوں۔ اس گھر میں یہ سرخی پاؤڈر نہیں چلے گا اور نہ ہی یہ رنگ رنگیلے کپڑے۔ بس سادے سادے رہو۔ یہاں تمہیں کسی طرح کی کمی نہیں ہو گی مگر کام میں سستی میں پسند نہیں کرتا۔ دونوں کان کھول کر سن لو۔"

ہم دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ شہزادو بولی "وہ چارپائی پر سو رہا ہے' وہ میرا بھائی نجیب ہے۔ اسے شراب کی لت ہے مگر جب ہوش میں ہوتا ہے تو پھر ہوشمندی کی بات ہی کرتا ہے۔ اس کی بات ماننی ہے۔ لیکن اگر نشے میں کچھ کہے تو پھر مجھ سے مشورہ کر لینا ہے۔ اگر میں گھر

میں نہ ہوں تو پھر تیلی فون پہ مجھ سے بات کرنی ہے۔ اپنے دو تیلی فون نمبر میں تمہیں ابھی دے رہا ہوں۔"

اس کے بعد میڈم شہرزاد ہمیں ایک راہداری سے گزار کر ایک اندرونی دروازے کے سامنے لے گئی۔ میڈم کی دیگر عادات کی طرح اس کی چال بھی سو فیصد مردانہ تھی۔ وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس کمرے کے سوا تم پورے گھر کو استعمال کر سکتے ہو۔ یہاں تالا لگا ہوا ہے۔ اس کمرے میں کچھ قیمتی سامان پڑا ہوا ہے۔ اس کمرے کی طرف سے تمہیں ہوشیار رہنا ہے۔"

اس نے ایک قریبی الماری میں سے ایک نرول نو دا کفل نکالا اور مجھے تھما دی۔

ہم دونوں کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی نیچے چلی گئی۔

رانو نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر اپنا میک اپ اتارا اور کپڑے سے رگڑ رگڑ کر اپنی سرخی صاف کر دی۔ اس کے بعد اپنے تھیلے میں سے ایک نسبتاً سادہ لباس نکال کر اس نے پہن لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ چارپائی پر سوئے کیم شحیم شرابی سے بھی کچھ خوف زدہ نظر آتی تھی۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ شرابی نے بیدار ہو کر اسے آس پاس پنجابی فلموں کی ہیروئن کو دیکھا تو کہیں وہ معروف فرشتے کا نشانہ نہ بن جائے۔ میڈم کے شرابی بھائی کے خراٹے سارے گھر میں گونج رہے تھے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور داڑھی کانٹوں کی طرح تھی۔ وہ واقعی ایک سویا ہوا جن تھا۔ بیدار ہو کر اس جن نے کیا کرنا تھا مجھے یا رانو کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

رانو نے باورچی خانے میں جا کر ناشتا بنایا اور ٹرے میں سجا کر نیچے میڈم شہرزاد کو دے آئی۔ میڈم کی ہدایت کے مطابق ناشتے میں دو انڈے، جیم، مکھن اور ڈبل روٹی شامل تھی۔ ناشتا دے کر رانو واپس آئی تو اس وقت تک سویا ہوا جن بھی جاگ چکا تھا۔ ہم دونوں باورچی خانے میں سے اس کی بیداری کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے اٹھتے ساتھ ہی پہلے چند بھرپور انگڑائیاں لیں پھر شراب کی تلاش میں قریبی الماری میں ہاتھ گھمایا۔ ایک بوتل میں چوتھا حصہ شراب موجود تھی۔ نجیب نے بوتل منہ سے لگائی اور ایک ہی سانس میں خالی کر گیا پھر وہ ڈگمگاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہاں سے نکلا تو سیدھا باورچی خانے کی طرف آیا۔ منہ دھو کر اور بالوں میں کنگھی کر کے وہ قدرے انسان نظر آنے لگا تھا۔

باورچی خانے میں مجھے اور رانو کو دیکھ کر وہ ذرا چونکا

"اوئے! تم کون ہو؟" اس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔

"آپ کے نوکر ہیں جی۔ میڈم صاحب ہمیں لے کر آئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میڈم صاحب لے کر آئی ہے تو میڈم صاحب بھیج بھی دے گی۔ بس یہ دعا کرو کہ جب تم جاؤ تو اپنے پاؤں پر چل کر جاؤ۔ اکثر نوکر یہاں سے ہڈیاں تڑوا کے جاتے ہیں۔"

"سمجھ۔ میں سمجھا نہیں جی۔" میں نے ہکلا کر کہا۔

"میڈم بڑی سخت ہے۔ جو نوکرانی پرسوں یہاں سے فارغ ہوئی ہے اس کا قصور بس اتنا تھا کہ اس نے ریڈیو پر گانا سنا تھا۔ اب وہ تین چار مہینے تک بستر سے اٹھ نہیں سکے گی۔ میڈم نے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی ہے۔"

رانو تھوک نگل کر رہ گئی۔ نجیب اسے گھور کر بولا "اب ڈرتی ہی رہو گی یا ناشتا بھی کرواؤ گی۔"

"جج۔۔۔ جی صاحب جی۔ بس ابھی لاتی ہوں۔" رانو نے کہا اور فوراً کام میں جت گئی۔

کیم شحیم نجیب پاس ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور حسب نسب پوچھنے لگا۔ وہ سخت گیر تو تھا مگر اتنا بھی نہیں تھا جتنا ہم اسے جاگنے سے پہلے سمجھ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بندہ مشکل سے میٹرک تک پڑھا ہے اور عام سی سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں میڈم شہرزاد ہر لحاظ سے ایک چالاک اور دبنگ عورت تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ ہمیں ہماری ڈیوٹیاں وغیرہ بتا کر واپس گئی تھی۔ میں نے اس کے لباس کو غور سے دیکھا تھا اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی چری جیکٹ کے اندر ریوالور یا پستول موجود ہے۔

○☆○

اگلے دو روز میں صورت حال کافی حد تک واضح ہو گئی۔ اس مکان میں میڈم شہرزاد اور اس کے بھائی کے سوا اور کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ میڈم کا بھائی میڈم کے برعکس ایک معمولی سمجھ بوجھ والا بندہ تھا۔ وہ قیمتی بوسکی کی شلوار قمیص پہنتا تھا۔ قیمتی سگریٹ پیتا تھا اور انڈین شراب کی دو پیٹیاں اس نے ایک پچھلے کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بے تحاشا شراب پیتا تھا۔ شام سے ذرا پہلے وہ پینا شروع کرتا اور رات نو دس بجے تک نشے سے بے دم ہو جاتا۔ نشے کے دوران میں وہ بکری کی طرح ممیاتا رہتا تھا۔ کبھی کچھ گنگناتا، کبھی بکتا۔۔۔ پھر وہ مدہوش ہو کر پڑا رہتا تھا اور صبح تک پڑا رہتا تھا۔ بہرحال ایک بات تھی۔ شروع میں رانو کو اس کی طرف سے جو خطرہ لاحق ہوا تھا وہ درست نہیں تھا۔ نجیب نے رانو کی طرف کوئی

خاص توجہ نہیں دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ عورتوں سے اسے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تھوڑا سا کرخت تو تھا مگر اپنی بہن کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میڈم شہرزاد تو ایک آتش فشاں تھی۔ یہ آتش فشاں کسی بھی وقت کسی بھی وجہ سے اچانک پھٹ سکتا تھا۔

پچھلے دو تین دنوں میں یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ان لوگوں نے دوسری منزل کے اندرونی کمرے میں کوئی خاص شے چھپا رکھی ہے۔ اس شے کو خاص نگرانی کی ضرورت تھی۔ نجیب نگرانی کرتا تو تھا مگر جب وہ پی کر مدہوش ہو جاتا تھا تو پھر اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میڈم دو جما پورے مجھے لے کر یہاں آئی تھی۔ اس نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی کہ میری ڈیوٹی شام کے بعد شروع ہو گی اور صبح تک جاری رہے گی۔

پہلے اڑتالیس گھنٹے تک مجھے شک تھا کہ شاید اس کمرے میں کسی بندے کو محبوس رکھا گیا ہے لیکن دھیرے دھیرے یہ شک دور ہو گیا تھا۔ کمرے میں کوئی آہٹ ہوتی تھی نہ کھانے پینے کی کوئی شے اندر پہنچائی گئی تھی۔ میڈم چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک بار کمرے کی طرف ضرور جاتی تھی لیکن وہ ابھی تک اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ صرف ایک بار اس نے بھصی قفل میں چابی گھما کر دروازہ کھولا تھا اور دہلیز ہی سے کمرے میں جھانک کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

یہ چوتھے دن کی بات ہے۔ میں کمرے میں لیٹا اخبار دیکھ رہا تھا۔ رانو فرش پر جھاڑو دے رہی تھی۔ جھاڑو دیتی دیتی وہ راہداری کی طرف چلی گئی۔ نجیب ابھی تک خراٹے نشر کر رہا تھا۔ اچانک میڈم کی چیختی دبی بھاری آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی یوں لگا کہ وہ کسی کو مار پیٹ رہی ہے۔ میں اخبار پھینک کر آواز کی سمت لپکا۔ آواز "اندرونی کمرے" کی طرف سے ہی آ رہی تھی۔ میں راہداری میں گیا تو رانو کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ وہ میڈم کی منت سماجت کر رہی تھی "معاف کر دیں جی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ہائے میں مر گئی۔ ہائے میری ٹانگ۔"

میں دوڑتا ہوا موقعے پر پہنچا۔ رانو فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی اور میڈم کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ یہ میڈم اسے ایک کنڈی کے ساتھ پیٹ رہی تھی۔ رانو کی قمیص پھٹ چکی تھی اور اندر سے زیریں لباس جھانک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر میڈم نے کنڈی پھینک دی اور پاٹ دار آواز میں رانو کو گندی گالیاں دینے لگی۔ وہ مردانہ انداز میں مردانہ گالیاں دے رہی تھی "تیرے کی پچی آ کیا دیکھ رہی تھی دروازے سے منہ لگا لگا کر۔"

"مم۔۔۔ میڈم۔۔۔ میں نے تو۔"

"بکواس بند کر۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر اندر دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیکھا ہے یا نہیں؟"

رانو کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ میڈم نے ایک بار پھر اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

کافی دیر بعد جب میڈم اپنا غصہ اتار کر اور آئندہ کے لیے وارننگ دے کر نیچے چلی گئی تو میں نے روتی سسکتی رانو سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ وہ بولی "بس غلطی سے میں نے اندر دیکھ لیا تھا۔ چابی کی موری سے آنکھ لگائی ہی تھی کہ پتا نہیں میڈم کہاں سے آ ٹپکی۔"

رانو کی ایک آنکھ سوج گئی تھی اور ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کچھ دیکھا بھی ہے تو نے کہ بس سو جوتی مار ہی کھائی ہے؟"

وہ بولی "دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ تھانے دارنی کی بچی۔ اتنی بری طرح مارا ہے کہ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا ہے۔"

میں نے کہا "وہ واقعی تھانے دارنی ہے۔ شاید تجھے پتا نہیں۔ پانچ چھ سال پہلے یہ پولیس میں اے ایس آئی تھی پھر ایک اسکول کھول لیا پھر ایک ٹرانسپورٹ کمپنی بنا لی اور بزنس مین بن گئی۔"

"تجھے یہ کس نے بتایا ہے؟"

"اس کے بھائی نے۔ وہ خود بھی اس سے ڈرتا ہے۔"

"یہ ہے ہی ڈرنے والی چیز۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں دیکھ کر تراہ سی آ جاتی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس کا شرابی بھائی مجھے تنگ کرے گا۔ پر یہاں تو الٹا حساب ہے۔ بھائی تو کچھ نہیں کہتا پر یہ کھانے والی نظروں سے دیکھتی رہتی ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ عورت کی نظروں سے نہیں بندے کی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گندی گالیاں دیتی ہے۔ پرسوں میں کنگھی سے بال بنا رہی تھی۔ چوٹی کو چھوڑ کر منہ ہاتھ دھونے لگ پڑی۔ اس نے پیچھے سے آ کر میری کمر پر اتنی زور سے چٹکی کاٹی کہ میری چیخ نکل گئی۔ اوپر سے بڑی بڑی گالیاں دینے لگی اور کہنے لگی کہ میں نے اگر اب چولہا جلتا ہوا چھوڑا تو وہ مجھے چولہے پر ہی بٹھا دے گی۔"

یہ میڈم شہرزاد واقعی عجیب و غریب عورت تھی۔ اس کی لینڈ کروزر دیکھنے میں تو پرانے ماڈل کی تھی مگر خوب چمکتی ہوئی دکھتی تھی۔ میڈم اپنی گاڑی آخر خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ کبھی

کبھی وشید نامی ایک ڈرائیور بھی گھر میں دکھائی دیتا تھا۔ میڈم اور اس کے بھائی کی طرح وہ بھی ذرا پُراسرار سا بندہ تھا۔ بہت کم بولتا تھا۔ گلی محلے میں سے کوئی میڈم کے گھر آتا جاتا نہیں تھا۔ میڈم اکثر دس گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکلتی تھی اور شام چار بجے کے قریب واپس آتی تھی۔ اس نے دو فون نمبر مجھے دیے ہوئے تھے مگر ان نمبروں پر رنگ کرنے کی نوبت ابھی تک تو نہیں آئی تھی۔

یہ بات صاف ظاہر تھی کہ میڈم اچھی عورت نہیں اور کرایے کا یہ مکان اس نے کسی منصوبے کے تحت حاصل کر رکھا ہے۔ کوئی چیز تھی جو اس نے یہاں چھپا رکھی تھی اور وہ خاصی اہم چیز تھی۔ میڈم بے حد کرخت مزاج تھی۔ اس سے بات کرنے والا ہر لمحے یہی محسوس کرتا تھا کہ ابھی میڈم کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے گی۔ گھر میں ایک دودھ فروش ایک باکرا اور ایک کوڑا کرکٹ اٹھانے والا آتا تھا۔ یہ لوگ بھی بس سہمے سہمے ہی نظر آتے تھے۔ ایک روز ڈرائیور وشید نے صبح کے وقت آنا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ میڈم نے مجھے حکم دیا کہ میں ذرا گاڑی صاف کردوں۔ میں چابی لے کر گاڑی صاف کرنے لگا۔ اندر سے "میٹ" وغیرہ اٹھا کر بھی جھاڑے۔ یہیں ایک نشست کے نیچے سے مجھے اخبار کا ایک صفحہ ملا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی صفحہ تھا جو پندرہ روز پہلے روجھان پور میں میڈم کے ہاتھ میں نظر آیا تھا اور یہ صفحہ اپنے ساتھیوں کو دکھا دکھا کر راز و نیاز کی باتیں کررہی تھی۔ میں نے خاموشی کے ساتھ وہ صفحہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا۔

اپنے کمرے میں واپس آکر میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور صفحہ دیکھنے لگا۔ یہ شہ سرخی والا پہلا صفحہ تھا، جبکہ صفحہ پھاڑ کر علیحدہ کردیا گیا تھا۔ میں اس اکلوتے صفحے کو دھیان سے دیکھنے لگا۔ بڑی سرخی تو اسرائیل اور فلسطین کے بارے میں تھی۔ نیچے ایک ٹریفک حادثے کی خبر تھی پھر الیکشن کی تیاریوں کے حوالے سے چند خبریں تھیں۔ ملک میں جو سیاسی کشیدگی پائی جارہی تھی اس کا عکس بھی ایک دو خبروں میں نظر آتا تھا۔ نچلے حصے میں ایک خبر ایسی تھی جو ہر لحاظ سے اہم تھی اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس رات نادر جگی کے ڈیرے پر میڈم اسی خبر کے حوالے سے بات کررہی تھی۔

یہ خبر قومی سطح کے ایک معروف سیاسی رہنما کے بارے میں تھی۔ پبلک میں تو انہیں کچھ اور کہا جاتا تھا لیکن ان کے قریبی ساتھی انہیں بھائی جی کے غیر معروف نام سے پکارتے تھے۔ یہ سیاسی رہنما پچھلے دو سال سے قید میں تھے۔ الیکشن کے موقع پر ان کی سزا میں خود ہی تخفیف کرکے انہیں رہا کردیا گیا تھا۔ یہ خبر بھائی جی کی رہائی کے بارے میں تھی اور اس شان دار جلوس کے بارے میں تھی جو انہیں جیل کے دروازے سے ان کی رہائش گاہ تک لایا تھا۔ یہ لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جس میں جوش و خروش کی بلند لہریں تصویر دیکھ کر بھی محسوس کی جاسکتی تھیں۔ اس خبر کے نیچے باکس میں ایک اور اہم خبر بھی موجود تھی۔ اس خبر کے مطابق رواں مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو بھائی جی کی رہائش گاہ پر پارٹی کے سرکردہ لیڈروں کا ایک نہایت اہم اجلاس ہورہا تھا جس میں الیکشن کے حوالے سے حتمی لائحہ عمل تیار کیا جارہا تھا۔ میں نے دیوار پر لگے کیلنڈر کی طرف دیکھا۔ ابھی چوبیس تاریخ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پارٹی کا یہ اہم اجلاس ہونے میں اب بھی تین چار روز باقی ہیں۔ میری چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگی کہ اس رات نادر جگی کے ڈیرے پر جو راز و نیاز ہورہا تھا وہ بھائی جی نامی ان سیاسی رہنما کے حوالے سے ہی تھا۔ اچانک مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے میڈم غصے میں بھری سرخ انگارہ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ آج اس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ اوپر سویٹر تھا۔

"تم دونوں کیا کررہے ہو یہاں!" وہ غصے میں پھنکاری۔ "میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم علیحدہ کمروں میں رہو گے اور کوئی ٹھرک شرک نہیں جھاڑو گے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میڈم۔۔۔ میں تو نو بجے ہی بیٹھا ہوا تھا۔"

"غلط فہمی کے بچے! میں پوچھتی ہوں وہ حرام زادی کہاں ہے؟" میڈم نے اندر آکر دروازے کے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اچانک اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کمرے میں گھستے وقت اور دروازہ اندر سے بند کرتے وقت غور نہیں کیا تھا۔ رانو عرف بابر شریف بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ وہ باتھ روم میں نہا رہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ ہولے سے کھلا اور رانو نے ڈری ڈری نظروں سے باہر دیکھا۔ میڈم پھنکاری "باہر آ حرام زادی!"

رانو کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ اس کی ساری فلمی اداؤں پر آج گویا عذابِ الٰہی کا نزول تھا۔ وہ لرزتی کانپتی باہر آئی۔ ابھی اس نے لباس بھی پورا نہیں پہنا تھا۔ اس نے بالائی جسم پر قمیص کی بجائے صرف تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ پانی اس کے بالوں سے قطرہ قطرہ گر رہا تھا۔ میڈم نے اسے وحشت ناک

نظروں سے گھورا پھر ایک دم اپنی پتلون میں سے چمڑے کی بیلٹ نکالی اور اس سے رانو کی ٹھکائی شروع کردی۔ رانو کے ہاتھ سے تولیا بھی گر گیا۔ اس کا زیریں بدن تو ڈھکا ہوا تھا مگر بالائی جسم پر بس قمیص کے نیچے پہنا جانے والا مختصر لباس ہی تھا۔ ننگے بدن پر چمڑے کی بیلٹ کی زوردار ضربیں پڑیں تو رانو کی چیخیں نکل گئیں۔

پھر ایک دم میڈم بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی۔ گندی گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ تابڑ توڑ مجھ پر بیلٹ برسانے لگی۔ میرے ہاتھوں چہرے اور سینے پر کئی ضربیں لگیں۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں اس سے بیلٹ چھین کر اسے قابو کرسکتا تھا مگر ایسا کرنے سے میرا بہروپ ختم ہوجاتا تھا اور یہ بہروپ مجھے ہر قیمت پر برقرار رکھنا تھا۔ میں مار کھاتا ہوا کونے میں سمٹ گیا۔ ساتھ ساتھ میں اپنی صفائی بھی پیش کررہا تھا۔ جب میں بالکل نیچے بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ دیے تو میڈم ایک بار پھر آسمانی بجلی کی طرح رانو پر جھپٹی۔ رانو کو بستر پر گرا کر اس نے ٹھیک ٹھاک مار لگائی۔ ساتھ ساتھ وہ اس پر غرا بھی رہی تھی کہ خبردار چیخو مت! کچھ دیر بعد جب اس کے غصے کا چڑھا ہوا دریا کچھ اترا تو وہ بیلٹ کو دوبارہ پتلون میں لگاتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد رانو روتی رہی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے ہل رہا تھا۔ وہ اشک بار لہجے میں بولی "میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے روجھان پور واپس چھوڑ آؤ۔"

میں نے کہا "پاگلے! نادر صاحب تجھے کچا کھا جائیں گے۔ انہوں نے کہا نہیں تھا تجھ سے کہ جب تک میڈم کہیں گی تمہیں وہاں رہنا پڑے گا۔"

"نادر صاحب! کچھ کہیں نہ کہیں، یہ مجھے ضرور کچا کھا جائے گی۔ مجھے تو لگتا ہے اس کو سایہ ہے۔ کوئی ظالم جن چمٹا ہوا ہے اسے۔ بھلا عورتیں بھی ایسی ہوتی ہیں۔ اس کی آنکھیں دیکھو۔ لگتا ہے کہ کسی جنگلی جناور کی آنکھیں ہیں۔"

"بے وقوف، یہ پولیس میں رہی ہے اور تجھے پتا ہی ہے کہ پولیس میں رہ کر بندہ کچھ اور طرح کا ہوجاتا ہے۔"

رانو کی پشت پر کئی جگہ بیلٹ کے لال نشان پڑے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ اس کی کلائی پر ایک جگہ بیلٹ کا بکل لگا تھا اور وہاں چھوٹا سا زخم بن گیا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنی قمیص پہنی اور ہائے ہائے کرتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے پتا تھا کہ نو بجے تک ہر صورت اسے ناشتا لے کر نیچے جانا ہے ورنہ میڈم پھنکارتی ہوئی اوپر آجائے گی اور ایک بار پھر رانو پر چڑھائی کردے گی۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ رانو ڈیرے پر بڑی تیز طرار اور خرانٹ نظر آتی تھی مگر میڈم کے زیرِ سایہ آکر مظلوم اور ستم رسیدہ ہوگئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا تھا کہ اونٹ اب پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔

ابھی رانو نے چولہا ہی جلایا تھا کہ نیچے سیڑھیوں کی طرف سے میڈم کی کرخت آواز ابھری وہ رانو کو نیچے طلب کررہی تھی۔

رانو کا رنگ پھر ہلدی ہوگیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اب کسی اور معاملے میں اس کی کم بختی آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے کوئی کپڑا ٹھیک سے استری نہ کیا ہو۔ میڈم کے باتھ روم میں صابن رکھنا بھول گئی ہو یا کہیں کوئی پنکھا وغیرہ کھلا رہ گیا ہو۔ رانو نے میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا اور ڈگمگاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ اپنی ساری چوکڑی بھول چکی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رانو نے روجھان پور میں کس طرح ایک مولوی برکت صاحب پر ذاتی دشمنی کی وجہ سے جھوٹا الزام لگوایا تھا اور انہیں گاؤں بدر کرانے کی کوشش کی تھی۔ کیا پتا کہ اسی معاندانہ کارروائی کا عتاب اس پر نازل ہوا ہو۔

رانو نیچے چلی گئی۔ وہ چولہا پھر جلتا ہوا چھوڑ گئی تھی۔ بدحواسی میں بندے سے ایسی ہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ میں نے چولہا بند کیا۔ میرے کان نیچے کی طرف ہی لگے ہوئے تھے۔ توقع کے برخلاف مار پیٹ کی کوئی آواز نہیں آئی نہ ہی رانو کی دہائی سنائی دی۔ پانچ دس منٹ بعد رانو اوپر آگئی۔ اس کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی میڈم کے کہنے پر ڈرائیور وشید نے کی تھی۔ اس کے علاوہ میڈم نے رانو کو کوئی ٹیوب بھی دی تھی۔ اس ٹیوب کی دوا رانو نے اپنی پشت کی چوٹوں پر لگانی تھی۔ رانو کی باتوں سے پتا چلا کہ میڈم نے اسے دو سو روپیہ بھی دیا ہے۔ ایک سو روپیہ علیحدہ اس قمیص کے لیے دیا ہے جو چند دن پہلے میڈم کی مار پیٹ میں پھٹ گئی تھی۔

"عجیب تیز مزاج سی عورت ہے۔ مجھے تو اس کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مجھے تو پاگل لگتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بندے کو کسی بات پر غصہ چڑھنا چاہیے۔ اس کو تو بات کے بغیر بھی چڑھ جاتا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں غسل خانے میں جاؤں گی تو اوپر سے تم آجاؤ گے اور دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھ جاؤ گے۔"

"چلو بھئی! اگر ایسا ہو بھی گیا تھا تو کون سی قیامت آگئی تھی۔ ہم اس کی نوکری کررہے ہیں۔ اس کی ہر بات اپنے سر

آنکھوں پر رکھتے ہیں مگر اس کو ہمارے آپس کے معاملوں میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے تو ہم پر کرفیو لگایا ہوا ہے۔"

میں نے افسوس سے سرہلاتے ہوئے کہا مگر اندر سے میں خوش ہی ہو رہا تھا۔ اگر میڈم شہزادی کی طرف سے یہ کرفیو نہ ہوتا تو یہ بابرہ شریف میرا ناک میں دم کر دیتی۔ دن رات ایک ہی جگہ رہتے ہوئے رانو عرف بابرہ شریف سے بچنا محال تھا۔

دس ساڑھے دس بجے میڈم حسب معمول گاڑی پر کہیں نکل گئی۔ یہی وقت میڈم کے شرابی بھائی محترم نجیب صاحب کے بیدار ہونے کا تھا۔ میڈم کو رخصت کرنے کے بعد رانو، نجیب کے ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ نجیب سگریٹ بے تحاشا پیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت حقہ بھی پیتا تھا۔ آج پھر اس نے مجھ سے حقے کی فرمائش کی۔ چلم بھرنے کے لیے خشک لکڑی کا چھوٹا سا اسٹاک چھت پر موجود تھا۔ میں لکڑیاں لایا اور کوئلے بنانے کے لیے آگ دہکائی تیز ہوا چل رہی تھی لہٰذا برآمدے میں آگ دہکانے کی بجائے میں انگیٹھی اٹھا کر اندرونی کمرے کی طرف لے گیا۔ انسان کو آسمان کیسے کیسے تماشے دکھاتا ہے۔ شاہ جہاں ایل ایل بی، گولڈ ہوٹلز کے سلسلے کا مالک ایک معمولی بدمعاش کی چلم بھرنے کے لیے دھوئیں میں پھونکیں مار رہا تھا۔ عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں مڑ کر دیکھتا۔ زور کی ٹھوکر پیٹھ پر لگی۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ نجیب کھڑا لال لال آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا "اوئے بدبخت۔ تجھے کس کنجر نے کہا تھا، یہاں آگ جلانے کو۔ کیا سب کو مروانے کا ارادہ ہے۔ اٹھا یہاں سے یہ انگیٹھی۔ اٹھا۔"

نجیب کے لہجے میں طیش کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا۔

میں نے فوراً انگیٹھی اٹھائی۔ ایک دو کوئلے اوپر سے گرے انہیں نجیب نے خائف پاؤں سے مسل دیا۔ وہ مجھے اپنے آگے لگا کر باہر برآمدے میں لے آیا "یہاں بیٹھ مر" اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "غلطی ہو گئی جی۔ معافی چاہتا ہوں۔ اگر ایسی بات تھی تو آپ نے مجھے بتا دیا ہوتا۔"

"اچھا زیادہ بک بک مت کر۔ اپنا کام کر۔" نجیب نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور ایک بار پھر اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔

شاید دیکھنے گیا تھا کہ کوئی چنگاری وغیرہ وہاں پڑی نہ رہ گئی ہو۔

صورت حال کو سمجھنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں نے آگ اس دروازے کے قریب جلائی تھی جو ہر وقت مقفل رہتا تھا اور جس کی نگرانی نجیب کے علاوہ میرے سپرد بھی تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ ہو نہ ہو اس کمرے میں آتش گیر مادہ رکھا گیا ہے۔ نجیب کے یوں سیخ پا ہونے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ میں انگیٹھی کے سامنے ہاتھ تاپتا رہا اور سوچتا رہا میں نے آتش گیر مادے کی موجودگی کو بھائی جی کے بارے میں چھپنے والی اخباری خبر سے ملا کر دیکھا تو ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں کسی وقت کسی جگہ پر یہ آتش گیر مادہ اور بھائی جی ایک ساتھ پائے جانے والے تھے۔

مجھے اپنے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی ہوا کہ میں کسی رائیگاں کوشش میں مصروف نہیں ہوں۔ اگر اس کمرے میں واقعی آتش گیر مادہ رکھا گیا تھا تو پھر چار دن بعد کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اگلے روز کی بات ہے نجیب صبح بیدار ہوا تو اس کے گردے میں شدید تکلیف شروع ہو گئی۔ وہ آدھ پون گھنٹا باتھ روم میں گھس کر بیٹھا رہا، باہر آیا تو تکلیف کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ مجھ سے بولا "جہاں دار اے! مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

نیچے اسکوٹر موجود تھا جو کبھی کبھار نجیب کے استعمال میں آتا تھا۔ میں نے نجیب کو اسکوٹر پر بٹھایا اور تین چار فرلانگ دور رستم کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ نجیب وہاں بینچ پر بیٹھ کر کراہنے لگا۔ مجھ سے بولا "جہاں دار! تم جاؤ۔ گھر میں کسی کا ہونا ضروری ہے۔ تو مجھے پونے گھنٹے بعد مجھے آ کر لے جانا۔"

میں نے تعمیل میں سر جھکایا اور اسکوٹر اسٹارٹ کر کے واپس آ گیا۔ میڈم دس بجے ہی گھر سے جا چکی تھی۔ میرے اور رانو کے سوا گھر میں تیسرا کوئی نہیں تھا۔ میرا دھیان اس وائی ٹاکی کی طرف چلا گیا جو میں اپنے اٹیچی کیس میں چھپا کر لاہور سے لایا تھا۔ یہ وہی طاقتور لیکن ہلکا پھلکا ٹرانسمیٹر تھا جو ساہی صاحب نے مجھے بوقت رخصت دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں جب چاہوں اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے زریں گل وغیرہ سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے یہ ٹرانسمیٹر اٹیچی کیس کی چھت کی دو تہوں میں اس طرح چھپایا تھا کہ آسانی سے برآمد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹرانسمیٹر کو چھت کے اندر داخل کرنے کے لیے جو راستہ میں نے بنایا تھا اس پر ایک بڑا اسٹیکر اس

طرح چسپاں کردیا تھا کہ راستہ بالکل کیموفلاج ہوگیا تھا۔

اسٹیکر اتار کر میں نے واکی ٹاکی باہر نکالا۔ اس کا انٹینا پورا اوپر کھینچا اور اسے آن کرکے زریں سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے کا دروازہ میں نے اندر سے بند کرلیا تھا اور کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا تاکہ صوتی لہریں بہ آسانی ڈوائس تک پہنچ سکیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد زریں کی پرمسرت آواز ڈوائس پر ابھری "ہیلو۔ کون؟"

"جس کے مونڈھے پر دھون۔" میں نے کہا۔

زریں مجھے پہچان کر خوش ہوگیا پھر بولا "اس کا کیا مطلب ہے استاد صیب۔ جس کے مونڈھے پر دھون۔"

"یہ پنجابی ہے چندا! اس کا مطلب ہے' جس کے کندھوں پر گردن۔ بہرحال سناؤ۔ کیسی گزر رہی ہے۔ کیا کررہے تھے۔"

"ام کلثوم کو نورجہاں کا گانا سکھا رہا تھا۔ وہی گانا جو قلم استاد رانی پر پکچرائز ہوا تھا۔ اظہار بھی مشکل ہے' کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ مجبور ہیں اف اللہ۔ ام چپ رہ بھی نہیں سکتے۔"

"گانا سکھانے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔" میں نے پوچھا۔

"استاد صیب! یہ سارا اس بچو نگڑے کا بکھیڑا ہے جس کا ام نے ابھی تک نام بھی نہیں رکھا ہے۔ دراصل یہ شروع شروع میں وہ بہت روتا تھا۔ ام نے اسے بہلانے کے لیے اس کے پاس ٹیپ ریکارڈر لگانا شروع کردیا۔ میوزک سن کر وہ سوجاتا تھا۔ اب اس شیطان کو عادت پڑگیا ہے۔ جب تک اس کے پاس ٹیپ ریکارڈر نہ لگائیں وہ سوتا نہیں ہے۔ اور خبیث اتنا ہے کہ ٹیپ ریکارڈر پہ بھی بس اپنی پسند کا آواز سنتا ہے۔ نورجہاں کا گانا ہوگا تو خاموش ہوجائے گا' ورنہ پھر رونا شروع کردے گا۔ کل نورجہاں کے گانوں کے درمیان میں کہیں غلطی سے رونا لیلیٰ کا گانا بج گیا' اس نے وہ غل مچایا کہ ام آپ کو کیا بتائے۔"

"گویا کلثوم کو گانا کس خوشی میں سکھا رہے ہو۔"

"دراصل ام آگے کا سوچ رہا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ رات کو کسی وقت دو دو گھنٹے لائٹ بند رہتا ہے۔ لائٹ بند ہوگا تو ٹیپ ریکارڈر کیسے چلے گا۔ ایسے میں کلثوم کو نورجہاں کا گانا آتا ہوگا تو وہ گزارا مزارا کرلے گا۔ آپ کہہ سکتا ہے کہ ام خیراندیش بننے کا کوشش فرمارہا ہے۔"

"خیراندیش نہیں۔ دوراندیش۔" میں نے تصحیح کی۔

"جی ہاں یہی۔" زریں نے فوراً تائید کی۔

میں نے کہا "تم اکیلے ہی نہیں' دونوں میاں بیوی دوراندیش ہو۔ بچے کی بڑی اچھی تربیت شروع کی ہے تم نے۔"

"شکریہ۔ جی شکریہ۔" زریں نے سمجھے بغیر کہا پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔

"ویسے استاد صیب! آپ ایک دم لاپروا ہوگیا ہے۔ کو بتائے بغیر آپ کہاں غائب ہوجاتا ہے۔ امارا کئی کام آپ کی وجہ سے ہی رکا ہوا ہے۔ اب بچے کا نام رکھنے کا معاملہ ہی لے لیں۔ وہ ابھی تک بے چارا نام کے بغیر پڑا ہے۔ اس کا نام صرف اور صرف آپ نے رکھنا ہے۔"

میں نے کہا "جن گاڑیوں کو ابھی نمبر نہیں ملا ہوتا' وہ نمبر کی جگہ "اپلائیڈ فار" کی پلیٹ لگا دیتے ہیں' تم بھی چھوٹے زریں پر یہ پلیٹ لگا دو۔"

"آپ تو مذاق فرماتا ہے استاد صیب! ام کو ڈر ہے کہیں امارا بچہ نام کے بغیر ہی نہ رہ جائے۔ آپ کا کیا پتا کس وقت غائب ہوجائے اور کتنے عرصے تک غائب رہے۔ پچھلی مرتبہ افریقہ پہنچا تھا' اب اس سے بھی آگے جاسکتا ہے آپ۔"

"نام رکھنا کوئی بہت ضروری تو نہیں۔ تم اسے زریں دوم بھی کہہ سکتے ہو یا جیسے فلموں کے نام ہوتے ہیں۔ زریں گل پارٹ ٹو وغیرہ وغیرہ۔"

وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے بولا "آپ نے ام کا لطیفہ سن رکھا ہوگا۔ یہ لطیفہ دراصل امارے ہی علاقے کا ہے۔ ادھر کوہاٹ میں ایک بندے کو دوسری شادی کا شوق چرایا۔ اس کے سر پر بال ذرا کم تھے' وہ ایک بوڑھے حکیم صاحب کے پاس پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ وہ ام کے سر کے بالوں کا کچھ کریں۔ حکیم صاحب کا علاج مہنگا ہوتا تھا مگر بندہ امیر تھا اس نے حکیم صاحب کو منہ مانگے پیسے دیے اور دوا لے کر گھر آگیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا تھا کہ یہ بڑی قیمتی اور نادر دوا ہے۔ اس کا نسخہ پورے پاکستان میں صرف اور صرف ان کے پاس ہے۔ وہ یہ دوا دو دن سر پر لگائے گا۔ اس کے سر کے سارے بال ایک ہفتے میں جھڑ جائیں گے اور بالکل صاف شفاف ٹنڈ نکل آئے گا۔ ہفتے کے بعد وہ پھر آئے۔ تب وہ اس نسخے کا دوسرا دوائی عنایت فرمائے گا۔ دوسرا دوائی ایک ہفتے میں اس کے سر پر گھنے بال اگا دے گا۔ وہ بندہ جب ایک ہفتے بعد اپنا چمکتا ہوا ٹنڈ لے کر حکیم صاحب کے پاس پہنچا تو حکیم صاحب کا دکان بند تھا۔ پتا چلا کہ دو دن پہلے حکیم صاحب اللہ کو پیارا ہوگیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہی

سارے خفیہ نسخے قبر میں لے گیا تھا۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔"

"اللہ آپ کو ہزار سال زندگی دے استاد صیب۔ بلکہ امارا اور کلثوم کا عمر بھی آپ کو لگ جائے۔ امارا کہنے کا مطلب بس اتنا تھا کہ اگر آپ کہیں چلا گیا تو آپ کا بھتیجا تو بغیر نام کے ہی رہ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ ابھی اس کا کوئی اچھا سا نام رکھ دیں۔"

میں نے کہا "تم ایسا کرو اس مرتبہ کلثوم سے نام رکھوالو۔ اگلے آٹھ دس نام میں رکھ دوں گا۔"

وہ میرا مذاق نظرانداز کرتے ہوئے بولا "کلثوم سے تو ہرگز یہ بات نہیں کہے گا۔ وہ اپنے قبیلے کا کوئی نام رکھ دے گا۔ مثلاً سارس۔ لوکوسٹ۔ ڈوجی گاما وغیرہ۔ آپ کو کیا بتائیں استاد صیب۔ بچے کی پیدائش پر اس نے ایسا ایسا رسم ادا کیا ہے کہ امارا ناک میں دم ہوگیا ہے۔ پتا نہیں کس کس چیز کا دھونی دیتا رہا ہے اسے۔ بے چارے کا رنگ کالا پڑگیا ہے۔ اسے اوٹ پٹانگ چیزیں کھلاتا ہے۔ کل لیموں کا اسکنجوی (لیموں کا شربت) میں اسے خمیری روٹی ڈبو ڈبو کر کھلا رہا تھا۔ بھلا یہ کوئی رسم ہے اسکنجوی کا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں' یہ سکنجوی والا نسخہ اسے ضرور سائیں عالی نے دیا ہوگا۔"

"امارا اپنا بھی یہی خیال تھا جناب۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اوٹ پٹانگ چیزوں والا بیماری کلثوم کو سائیں عالی سے ہی لگا ہے۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ صفدر کا حال سناؤ۔"

"صفدر کو بس ایک دو دن میں اسپتال سے مکمل چھٹی مل جائے گا۔ امارا دل چاہ رہا ہے استاد صیب کہ صفدر کی صحت کی خوشی میں ام بہت بڑا جشن کرے۔ اس جشن میں ہزاروں لوگوں کو کھانا کھلائے۔ مسٹر کلارک نے امارے اکاؤنٹ میں اتنا زیادہ پیسہ جمع کردیا ہے کہ ام کو گھبراہٹ ہونے لگا ہے۔ ام صفدر کی صحت کا خوشی منانا چاہتا ہے اور گھبراہٹ بھی کچھ کم کرنا چاہتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ آپ امارے پاس نہیں۔ آپ کے بغیر ام یہ سب کچھ کیسے کرسکتا ہے۔"

"میرے ہوتے ہوئے بھی تم یہ سب کچھ نہیں کرسکتے۔ ابھی وقت ہماری بہت سی مجبوریاں ہیں۔ ویسے بھی ابھی صفدر کے جشن صحت کا وقت نہیں ہے۔ اللہ کرے کسی وقت یہ موقع آئے' پھر ہم سب مل کر اس موقعے کو یادگار بنائیں اور صفدر بھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔"

میری بات سمجھتے ہوئے زریں نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی۔ بولا "استاد صیب! صفدر دوبارہ دیکھ سکے گا نا؟"

"وہ ضرور دیکھے گا' اسے ہماری محبتیں دیکھنے پر مجبور کردیں گی۔"

کچھ دیر تک میں اور زریں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ زریں نے مجھ سے میرے حالات کے بارے میں بھی پوچھا' میں نے مختصراً بتایا۔ زریں کی آواز بہت دھیمی آرہی تھی' کسی وقت لہروں کا شور بہت زیادہ ہوجاتا تھا۔ اتنے میں ننھے زریں کے رونے کی صدا سنائی دینے لگی۔ زریں بولا "استاد صیب! آپ بند نہ کریں' میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔" زریں گل ننھے زریں کے پاس چلا گیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ گاہے گاہے کلثوم کی مدھم آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ دونوں پشتو بول رہے تھے۔ میں ان کی آوازیں سن کے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ کلثوم شاید ننھے کو بہلانے کے لیے ٹیپ لگا رہی تھی۔ زریں کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کلثوم سے کہہ رہا تھا۔ "آگ سنی کا گانا لگاؤ' تن توپے واردوں' من توپے واردوں۔"

"نہیں نہیں۔ وہ دوسرا ٹھیک رہے گا۔" کلثوم نے کہا۔

لگ رہا تھا کہ ان کی بحث طول پکڑے گی میں نے ڈوائس بند کردیا۔

گھڑی دیکھی۔ نجیب کو "رستم کلینک" میں بیٹھے پون گھنٹا ہوچکا تھا۔ واکی ٹاکی کو دوبارہ اٹیچی میں محفوظ کرنے کے بعد میں اسکوٹر پر کلینک پہنچا۔ نجیب "کلینک" کے اندر ایک بیڈ پر لیٹا تھا اور اسے گلوکوز کی ڈرپ لگی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ابھی دو ڈھائی گھنٹے مزید انہیں کلینک میں ہی رکنا ہوگا۔

نجیب کی تکلیف قدرے کم تھی۔ اس پر غنودگی طاری ہورہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ٹیلی فون پر میڈم کو اطلاع کردوں۔ وہ بولا "اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم واپس گھر پہنچو اور ذرا ہوشیاری سے رہو۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ ڈاکٹر کے قریب سے گزرا تو وہ مجھے ایک طرف لے جاکر آہستگی سے بولا "یہ آپ کے کیا لگتے ہیں۔" میں نے اسے بتایا کہ ہمارا نوکر اور مالک کا رشتہ ہے۔ وہ بولا "کہیں یہ صاحب! تھوڑا بہت نشہ تو نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "تھوڑے بہت کا تو پتا نہیں لیکن شراب کی

تین بڑی بوتلیں یہ روزانہ پی جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے کہا "یہ میری نوکری کا معاملہ ہے جناب! آپ یہ شراب والی بات ان کی زبان سے ہی اگلوائیں تو اچھا ہے۔"

ڈاکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور میں سلام کر کے باہر آگیا۔

گھر واپس آکر میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی۔ میڈم کو شام سے پہلے نہیں آنا تھا۔ گھر میں میرے اور رانو کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کمرے کی تلاشی لی جائے؟ میں نے بیرونی دروازہ اندر سے بند کیا۔ رانو باورچی خانے میں مصروف تھی۔ میں خاموشی سے اس خاص کمرے کی طرف آگیا۔ اسکوڈرائیور کی ڈکی میں سے چند اوزار میں اوپر آتے ہوئے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ میں نے کوشش کی اور چار پانچ منٹ کے اندر خاص کمرے کا دروازہ کھولنے میں کامیاب رہا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے لائٹ آن کرنے والا بٹن دبایا۔ دودھیا بلب روشن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

کمرے کے فرش پر لکڑی کی کئی بڑی بڑی پیٹیاں دھری ہوئی تھیں۔ ان پیٹیوں کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ ان میں آتش گیر مادہ ہے۔ پلاس کی مدد سے کیل کھینچنے کے بعد میں نے ایک پیٹی کا ڈھکن اٹھایا۔ پیٹی میں ڈائنامائیٹ کی اسٹکس تھیں۔ دس دس اسٹکس کا ایک بنڈل تھا۔ یہ بڑے طاقتور ڈائنامائیٹ تھے۔ دوسری پیٹی کھولی تو اس میں بموں کے فیوز، گھڑیاں اور تار وغیرہ نظر آئے۔ تیسری پیٹی میں تیار شدہ بم موجود تھے۔ یہ سارے ٹائم بم تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بم مقامی طور پر تیار کیے گئے ہیں مگر ان کی کوالٹی شاندار تھی۔ میں نے چالیس پچاس پونڈ وزنی ایک بم کو احتیاط سے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بالکل مسلح (ARMED) تھا۔ صرف واچ کو سیٹ کرنے کے بعد ایک تار جوڑے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد گھڑی کی ٹک ٹک شروع ہو جاتی اور مقررہ وقت پر بم تباہی پھیلا دیتا۔ اس ایک پیٹی میں چھ طاقتور ٹائم بم موجود تھے۔ ان بموں کو دیکھ کر عجیب سی سنسنی کا احساس ہوتا تھا۔ لوہے کے اس خاردار ڈرائنگ روم میں ایک نہایت تباہ کن موت چھپی ہوئی تھی۔ اب یہ بات بھی اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس روز میرے ٹک جلانے پر عجیب اتنا تپ گیا کیوں ہوا تھا۔

میں نے دیگر پیٹیاں بھی دیکھیں۔ ان میں بم بنانے کا سامان تو موجود تھا لیکن کوئی بھی بم تیار حالت میں موجود نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان پیٹیوں میں چھتیس بم "اسپیئر پارٹس" کی شکل میں موجود تھے۔ بموں کا سارا "ٹی این ٹی" ایک علیحدہ کارٹن میں بڑے طریقے سے محفوظ کیا گیا تھا۔ اس کارٹن پر سرخ مارکر سے چاروں طرف "خطرے" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

یہ واقعی خطرہ تھا اور بہت بڑا خطرہ تھا۔ یہ سارا دھماکا مواد ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں تھا جو علاقے طول و عرض میں بدامنی کی کارروائیاں کر رہے تھے۔ اپنے مفادات کے لیے یہ لوگ بڑی سفاکی سے بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے بھرپور طریقے سے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ میرے دل گواہی دی کہ آئندہ کارروائی میں وہی چھ بم استعمال ہونے والے ہیں جو یہاں بالکل تیار حالت میں موجود ہیں۔ میرا گمان یہی تھا کہ یہ بم معروف سیاسی رہنما بھائی جی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف استعمال ہونے والے ہیں۔

کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں باہر آگیا۔ یہاں میں نے ایک چھوٹا سا رسک بھی لیا اور وہ یہ کہ دروازے کو دوبارہ مقفل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں دوبارہ اس کمرے میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ ایک بار تو دروازے کا قفل کھل گیا تھا۔ پتا نہیں تھا کہ دوسری بار کھل سکے گا یا نہیں۔ جب تک دروازہ کھول کر نہ دیکھا جاتا اس کے غیر مقفل ہونے کا پتا نہیں چل سکتا تھا اور اب تک میں نے دیکھا نہیں تھا کہ دونوں بہن بھائی میں سے کسی نے دروازے کو چیک کیا ہو۔

رانو مسلسل باورچی خانے میں مصروف تھی۔ اسے نہیں چلا تھا کہ پچھلے بیس تیس منٹ میں کہاں رہا ہوں۔

رات تک میں خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ شام کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میرے اس شک کو یقین میں بدل دیا کہ میڈم شہزادو اور اس کے ساتھی معروف رہنما بھائی جی کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور یہ کارروائی پرسوں کی میٹنگ میں ہونے والی بھی ہے۔ اس میٹنگ کا اخباروں میں کافی چرچا تھا۔ بعض مبصروں کا خیال تھا کہ میٹنگ میں ہونے والے فیصلے ملکی سیاست کو ایک نیا رخ دیں گے۔ بھائی جی طویل عرصہ جیل میں گزار کر باہر نکلے تھے اور عوام میں ان کی مقبولیت نمایاں نظر آرہی تھی۔ شام سے تھوڑی دیر بعد ایک سوزوکی کار کوٹھی کے گیٹ پر آکر رکی۔ اس میں سے ایک کالا بھجنگ شخص برآمد ہوا۔ اس کے سر پر گرم ٹوپی تھی۔ چادر اس نے یوں لپیٹ رکھی تھی کہ

چہرے کا زیادہ تر حصہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی میں سے نکلا اور میڈم کے ڈرائیور رشید کے ساتھ میڈم کے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے باہر جا کر وہ گاڑی دیکھی جس میں یہ سیاہ رنگت والا شخص یہاں پہنچا تھا۔ کار کے اندر نشستوں کے درمیانی خلا میں مجھے ایک جھنڈا نظر آیا۔ جھنڈے کو لپیٹ کر نشست کے نیچے گھسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ بھائی جی کی سیاسی پارٹی کا جھنڈا تھا۔

یہ جھنڈا دیکھنے کے بعد مجھے شک گزرا کہ کالے رنگ والا شخص بھائی جی کی پارٹی کا ورکر ہے اور میڈم اسے غالباً بھائی جی سے توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آدھ پون گھنٹے بعد میرے اس شبے کو زبردست تقویت مل گئی بلکہ ایک طرح سے تصدیق ہی ہو گئی۔ میں نے میڈم کو اس کے بیڈ روم میں دیکھا وہ اس الماری پر جھکی ہوئی تھی جس میں وہ کیش وغیرہ رکھتی تھی۔ ایک چھوٹا سا بریف کیس بھی میڈم کے پاس تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے میڈم کو بریف کیس میں نوٹوں کی ایک گڈی رکھتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک جھلک ہی مجھے صورتِ حال سمجھانے کے لیے کافی تھی۔

بریف کیس لے کر میڈم دوبارہ کالی رنگت والے شخص کے پاس پہنچی اور باتوں میں مصروف ہو گئی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد سیاہ فام شخص بریف کیس سمیت کمرے سے نکلا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر گرم چادر کی اوٹ میں تھا۔ سوزوکی کار میں بیٹھ کر وہ شخص خاموشی سے نکل گیا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں اور میں بڑی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ پرسوں بھائی جی کی سیاسی میٹنگ میں کوئی ہولناک واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

اب زیادہ تاخیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ جو کچھ کرنا چاہتا ہوں "آج ہی رات کر گزروں۔ رات کا کھانا حسبِ معمول ہم نے ساڑھے نو بجے کھایا۔ میڈم کا بھائی اس وقت تک نشے میں دھت ہو چکا تھا۔ نشے کے بعد جیسے اس کے پیٹ میں جنات گھس جاتے تھے "وہ تین تین کلو گوشت اور دس دس روٹیاں کھا جاتا تھا۔ روٹیاں پکا پکا کر رانو کے ہاتھ شل ہو جاتے تھے۔ رات دس گیارہ بجے تک رانو تھک کر چور ہو جاتی تھی مگر اس وقت اکثر اسے میڈم کی طرف سے بلاوا آ جاتا تھا۔ میڈم اسے بڑے دھڑلے سے حکم دیتی تھی "میں تھکا ہوا ہوں" یہاں بیٹھ جاؤ اور میری ٹانگیں دباؤ۔"

میڈم کا خود کو مذکر کہنا شروع میں بڑا عجیب لگتا تھا مگر یہاں آکر میڈم میں اتنا کچھ عجیب دیکھا تھا کہ کچھ بھی عجیب نہیں لگتا تھا۔ اس رات بھی ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ نجیب بالکل دھت ہو گیا اور بستر پر لڑھک کر سو گیا۔ رانو کو چونکہ میڈم نے ٹانگیں دبانے کے لیے نہیں بلایا تھا لہٰذا وہ ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اب مجھے رانو کے سونے کا انتظار تھا۔ جس وقت رانو ٹی وی دیکھ رہی تھی "میں گھر کی چھت پر گیا تھا" وہاں ایک کونے میں ریت کا چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ میں نے دس پندرہ کلو ریت پلاسٹک کے ایک تھیلے میں بھری اور اپنے بستر کے نیچے چھپا دی۔

ٹی وی پروگرام ختم ہونے کے قریب تھا۔ رانو پروگرام دیکھنے کے ساتھ ساتھ انگڑائیاں بھی لے رہی تھی۔ آج کل میرے اور اس کے درمیان الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ نادر جی کے ذریعے پردہ وہ ہر وقت مجھ پر "گرم" رہتی تھی لیکن آج کل میں خود کو "گرم" ظاہر کر رہا تھا (مجھے پتا تھا کہ یہاں رانو سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ میڈم کی لگائی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے وہ بہت بدکی ہوئی رہتی تھی۔ میں اس کے کمرے میں آتا تھا تو اس کی کوشش ہوتی تھی کہ میں فٹ واپس چلا جاؤں)

ٹی وی پروگرام ختم ہوا تو میں رانو کو مخمور نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ وہ ایک دم ہوشیار ہو کر بولی "جہاں دار! تو نے مجھے ذلیل کرانا ہے اور خود بھی بڑا بے عزت ہونا ہے۔ اب جا اپنے کمرے میں" اس نے دیکھ لیا تو ابھی دونوں کی چمڑی ادھیڑ دے گی۔"

میں نے رانو کی گھبراہٹ کا مزہ لیتے ہوئے کہا "رانو! مجھے تو لگتا ہے کہ ذیرے پر جو تو میرے ساتھ پیار شیار جتاتی تھی وہ سارا ناٹک ہی تھا۔ جو پیار کرتے ہیں وہ اس طرح ڈرتے تو نہیں۔ تو نے کبھی انجمن یا ممتاز کو نہیں دیکھا گولیوں کی بوچھاڑ سے گزر کر بھی اپنے یار سے مل لیتی ہیں۔"

"لیکن وہاں سلطان راہی اور اقبال حسن بھی تو ہوتا ہے۔ تو بہت ماٹھا ہیرو ہے۔ اگر تیرے بھروسے پر میں میڈم کی پوشل پر پاؤں رکھ دوں گی نا" تو وہ مجھے کچا کھا جائے گی۔ چل جا اپنے کمرے میں۔"

"دیکھ لے۔ اب تو خود ہی مجھ کو دھتکار رہی ہے" پھر میرا دل کھٹا ہو گیا نا تو مجھ سے گلہ نہ کرنا۔"

"اچھا نہیں کروں گی گلہ۔" وہ مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

"اچھا ایک جپھی تو ڈال دے۔"

"تو نے ضرور مجھے چھتر پڑوانے ہیں۔" وہ ذرا سی میرے

ساتھ گئی اور پھر مجھے باہر دھکیل کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

اب مجھے اطمینان تھا کہ وہ جلد ہی سو جائے گی۔ پھر بھی قریباً آدھ گھنٹا تو مجھے انتظار کرنا ہی پڑا۔ میں سیڑھیوں کی طرف گیا اور وہ دروازہ اپنی طرف سے بند کردیا جو بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا واحد راستہ تھا۔ اب اگر میڈم کسی طور جاگ بھی جاتی تو اوپر نہیں آسکتی تھی (یا یوں کہہ لیں کہ میڈم اوپر نہیں آسکتا تھا) میں نے ریت والا تھیلا لیا اور خاموشی سے "خاص کمرے" میں گھس گیا۔

کمرے میں موجود چھ عدد ٹائم بموں کی ساخت اور ان کا میکنیزم سمجھنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسکریو ڈرائیو اور پلاس کی مدد سے جب میں نے ایک بم کی بالائی کیپ ہٹائی تو پھر باقی کا کام میرے لیے زیادہ دشوار نہیں رہا۔ میں نے اندرونی تار کاٹ کر آتش گیر مادے اور بارودی فیتے کا تعلق ختم کردیا۔ اس کے بعد ڈھکنا کھولنے کے لیے ایک سیل کو توڑنا پڑا۔ سیل ٹوٹتے ہی آتش گیر مادے یعنی ٹی این ٹی کو نکال کر میں نے اس کی جگہ ریت بھردی۔ ترہ پون گھنٹے کے اندر میں نے اس عمل کو چھ مرتبہ دہرایا اور چھ بم ناکارہ کردیے۔ تمام ٹی این ٹی میں نے تھیلے میں بھرلیا تھا۔

ہر چیز احتیاط سے مقررہ جگہ پر رکھ کر اور ایک بار کمرے کا ناقدانہ جائزہ لے کر میں باہر نکل آیا۔ اسٹیل کے مڑے تڑے تار سے دروازہ دوبارہ مقفل کرنے میں مجھے کچھ دشواری تو پیش آئی' بہرحال دروازہ مقفل ہوگیا۔ میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ ٹوٹ جانے والی سیلیں میں نے اپنے اٹیچی کیس میں کپڑوں کی تہ میں چھپادیں۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میں نے ۳۶ گھنٹے بعد رونما ہونے والے ایک خون ریز واقعے کو روک لیا ہے۔ ایسا واقعہ جو ایک معروف پارٹی کے کئی اہم سیاسی رہنماؤں کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ صبح دس بجے کے لگ بھگ ریڈ سوزوکی کار کوٹھی کے گیٹ پر پہنچی جو دو روز پہلے بھی آئی تھی مگر آج سوزوکی کار میں کالا بھجنگ شخص تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد مزید تھے۔ ان دونوں افراد کو میں نادر جگی کے ڈیرے پر میڈم کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے ایک طوطے کی ناک والا دبلا پتلا شخص تھا۔ اپنے جسم کے برعکس اس کی آواز بہت بھاری تھی اور وہ میڈم ہی کی طرح بہت غصیلا بھی نظر آتا تھا۔ اس نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اور نفیس سی ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔

کالے شخص سمیت یہ تینوں افراد میڈم کے ساتھ کھسر پھسر کرتے رہے پھر "خاص کمرے" کی طرف بڑھے۔ ان سب کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی اور وہ جلدی میں نظر آتے تھے وہی ہیجانی کیفیت اور عجلت جو کسی اہم مشن کے موقعے پر مشن کے ذمے داروں میں نظر آتی ہے۔ میڈم نے اپنی پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ ایک شخص باہر کھڑا رہا تھا جبکہ باقی دو کمرے کے اندر داخل ہوگئے تھے۔ طوطے کی ناک والے شخص کے ہاتھ میں ریگزین کے دو بڑے بیگ تھے۔ یقیناً یہ بیگ بم لے جانے کے لیے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ میڈم اور اس کے ساتھی دو تین منٹ میں خاص کمرے سے باہر آجائیں گے مگر دس منٹ گزرنے کے باوجود وہ باہر نہیں نکلے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اسی دوران میں میں نے طوطے کی ناک والے شخص کو دیکھا۔ وہ اپنی ہتھیلی پر کوئی شے لیے برآمدے کی طرف آیا۔ روشنی میں اس نے غور سے اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس شخص کی ہتھیلی پر ریت تھی۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی ریت میں گھمائی اور چہرے پر زلزلہ لیے ہوئے واپس مڑ گیا۔

اگلے ہی لمحے کمرے کے اندر سے بولنے کی زوردار آوازیں آنے لگیں۔ طوطے کی ناک والا گرج رہا تھا۔ جواب میں میڈم بھی غصیلے انداز میں کچھ کہہ رہی تھی پھر میں نے دیکھا کہ ایک بم کا بیرونی خول اڑتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا اور دور تک لڑھک گیا۔ طوطے کی ناک والے کی پاٹ دار آواز گونجی "یہ ساری ریت ہے۔ سب کی سب ریت ہے۔" اس کے ساتھ ہی چھوٹے سائز کا ایک اور بم اس نے فرش پر پٹخ دیا۔

میڈم ہیجانی انداز میں چیخی "نجیب۔۔۔ نجیب کدھر ہو تم۔"

نجیب بیدار ہوچکا تھا مگر ابھی تک غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ بہن کی کڑاکے دار آواز سن کر وہ دوڑا ہوا خاص کمرے میں گیا۔ میں اور رانو برآمدے میں موجود تھے۔ رانو اس صورت حال پر بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کوئی چوری وغیرہ ہوگئی ہے جس کا الزام ہم دونوں پر لگنے والا ہے۔ کمرے کے اندر میڈم گرجی "نجیب! یہ سب کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں تمہارے اور اس جہاں وار کے سوا اور کون تھا ادھر میں۔"

"ہم۔۔۔ مگر ہوا کیا ہے؟" نجیب مخمور آواز میں بولا۔

"ہمارا خانہ خراب ہوگیا ہے۔ بیڑا غرق ہوگیا ہے ہم

سب کا۔ یہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے تمہیں نظر نہیں آرہا ہے۔"

میڈم اور نجیب کے درمیان چند فقروں کا تبادلہ ہوا پھر میڈم دندناتی ہوئی ہمارے پاس آگئی۔ اس کا چہرہ غضب سے انگارہ ہو رہا تھا "جہاں وارے! تیرے اور نجیب کے سوا اور کون آیا تھا اس گھر میں؟"

"اور تو بس رانو ہی تھی جی۔" میں نے سہم کر کہا۔

"اوئے! میں پوچھتا ہوں تم تینوں کے سوا اور کون آیا تھا یہاں؟"

"کوئی نہیں میڈم!"

"دیکھو سوچ کر جواب دو۔ میں نے تمہیں الٹا لٹکا کر زندہ ہی زندہ تمہاری کھال اتار لینی ہے۔" میڈم نے ہم دونوں پر گالیوں کی بوچھار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک کارندے کی حیثیت سے میڈم کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "ہم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی میڈم۔۔۔ ہم بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہیں۔ اگر آپ کا کوئی نقصان ہوا ہے تو ہم اس کے ذمے دار بالکل نہیں ہیں۔"

میڈم کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ طوطے کی ناک والا بھی طیش سے سرخ ہو رہا تھا۔ میڈم چند لمحے تک خوفناک نظروں سے مجھے اور اپنے بھائی کو گھورتی رہی۔ اس کے طیش میں ایک طرح کی بے بسی بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا کرے۔

اچانک طوطے کی ناک والا مڑا اور تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ میڈم پکاری "رک جاؤ ڈیوی! میں کہتا ہوں رک جاؤ۔"

طوطے کی ناک والا بہت بھنایا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میڈم اس کے پیچھے لپکی۔ وہ باہر تک اس کے پیچھے گئی وہ رکے بغیر باہر نکل گیا۔ میڈم نے فوراً اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے ہی نکل گئی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ جاتے جاتے وہ کالے بھجنگ شخص کو کوئی خاص ہدایت کرگئی تھی۔

اس "ہدایت" کی نوعیت کا اندازہ تھوڑی دیر بعد ہوگیا۔ کالا شخص گھر کے بیرونی دروازے پر چوکس کھڑا ہوگیا۔ یقیناً وہ اس لیے یہاں موجود تھا کہ ہم دونوں کہیں راہِ فرار اختیار نہ کرجائیں اور ہوسکتا تھا کہ اسی قسم کا اندیشہ میڈم کے ذہن میں اپنے بھائی کے حوالے سے بھی موجود رہا ہو۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہونے والی گفتگو کے دوران میں واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ میڈم اپنے بھائی کو بھی شک کی نظروں سے گھور رہی ہے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں اپنے کمرے میں گیا۔ رانو بھی میرے پیچھے آئی وہ سخت سہمی ہوئی تھی۔ اس کے سارے فلمی انداز اڑن چھو ہوچکے تھے۔ وہ ہکلا کر بولی "جہاں وارے! اب کیا ہوگا۔ میری تو جان نکل جارہی ہے۔ یہ میڈم تو ہماری کھال ادھیڑ دے گی۔ مجھے مارنے کے لیے تو یہ ویسے بھی بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا بے وقوف! تو جا اپنے کمرے میں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

رانو کے جاتے ہی میں نے اٹیچی کیس کھولا۔ اٹیچی کیس کی چھت کی ربڑ کی تہ میں میں نے جہاں وا کی تاکی رکھا ہوا تھا' وہیں نوٹوں کی ایک گڈی بھی پڑی تھی۔ ہزار روپے والے یہ پورے سو نوٹ تھے۔ میں نے کسی ہنگامی ضرورت کے لیے ساتھ لے لیے تھے۔ میں نے اس میں سے ساٹھ نوٹ نکال لیے۔ کپڑوں کی تہ میں بموں کی جو سیلیں رکھی تھیں وہ بھی نکال کر جیب میں ڈال لیں۔

رانو کچن میں جاکر نجیب کے لیے ناشتا تیار کرنے لگی تھی۔ وہ باتھ روم میں گھسا ہوا تھا۔ نیچے صحن میں کالا محافظ چوکس ہو کر ہمارا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نجیب کے کمرے میں گھس گیا۔ ساٹھ ہزار کی نقدی میں نے الماری کے اس خانے میں رکھ دی جہاں نجیب کی شراب پڑی رہتی تھی۔ نقدی میں نے بوتلوں کے پیچھے اس طرح چھپائی کہ آسانی سے ڈھونڈی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے بموں کی سیلیں جیب سے نکالیں۔ نجیب کی بوسکی کی ایک قمیص کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ یہ دھونے والی قمیص تھی۔ نجیب جو کپڑا اتارتا تھا وہ ہمیشہ سیدھا کیے بغیر ہی ٹکا دیتا تھا۔ میں نے سیلیں نجیب کی قمیص کی جیب میں رکھ دیں۔ چند منٹ بعد نجیب باتھ روم سے باہر آگیا اور کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔ وہ آج بڑی بے دلی سے کھا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد اس کی غصیلی بہن واپس آجائے گی اور سخت کارروائی کرے گی۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ مسلسل مجھ پر بھی برس رہا تھا۔ جو کچھ یہاں ہوا تھا وہ اس کا الزام مجھ پر تو نہیں دھر رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں مجھ میں یا رانو میں اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ ہم اس طرح کی کارروائی کرسکتے۔ ہاں یہ ہوسکتا تھا کہ ہماری بے پروائی یا ملی بھگت سے کوئی اور بندہ اس چار دیواری میں داخل ہوا ہو اور یہ کام کرگزرا ہو۔ نجیب کا شک

اس لیے بھی توی ہو گیا تھا کہ پرسوں وہ گردے کی تکلیف کے سبب کافی دیر کلینک میں رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوا ہے اسی وقفے میں ہوا ہے یہی کوئی ڈھائی تین گھنٹے کے اندر۔

چند نوالے لے کر نجیب نے کھانے کی ٹرے ایک طرف لڑھکا دی۔ اس نے اپنی ٹرپل ٹو رائفل پکڑی اور میرے سر پر آن کھڑا ہوا "دیکھو جہاں دار! تم نادر کے بندے ہو اس لیے ابھی میں تمہارا لحاظ کر رہا ہوں۔ یہاں تم نے جو کچھ کیا ہے مجھے صاف صاف بتا دو ورنہ یاد رکھنا میں بندے کو بہت تڑپا کر مارتا ہوں۔"

میں نے ہاتھ جوڑ دیے اور نجیب کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس معاملے میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے کہا "میں کچھ بھی نہیں تھا جی۔ مگر نادر صاحب نے مجھے سہارا دیا ہے۔ میں نادر صاحب کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

نجیب گرجا "یہاں ہم نے تم سے جان کی قربانی نہیں مانگی تھی۔ بس اس کمرے میں پڑے سامان کی حفاظت کرنی تھی تم سے وہ بھی نہیں ہو سکی ہے۔"

"مگر ہوا کیا ہے جی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔"

"جو سامان کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ کسی نے اول بدل کر دیا ہے اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے اس کے ذمے دار تم ہو' صرف تم۔" نجیب کا پارہ ایک دم بہت اوپر چڑھ گیا۔

اس نے رائفل تھما کر میرے بازو پر ضرب لگائی پھر میرے بال مٹھی میں جکڑ کر کئی دو ہتڑ میری گردن پر مارے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہن ہی کے انداز میں وہ مجھے اور رانو کو ننگی گالیاں دے رہا تھا۔ رانو نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔

اسی دوران میں لینڈ کروزر کا ہارن سنائی دیا۔ میڈم واپس آگئی تھی۔ نجیب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں' رانو کا رنگ بھی پیلا پھٹک ہو گیا تھا۔ میڈم ایسے آئی جیسے تیز سیلابی پانی فراٹے بھرتے ہوئے آتا ہے۔ اس کی بھوری آنکھوں میں قہر کی بجلیاں تھیں۔ وہ آتے ساتھ ہی بھائی پر برس پڑی "تم دو کوڑی کے نہیں ہو' بس شرابی ہو اور شرابی رہو گے۔ کسی دن کوڑے کے کسی ڈھیر پر گر کر مرو گے۔ اتنی بڑی لاش ہے تمہاری' دس بندوں کا کھانا ڈکار جاتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں اب تک کیا کارنامہ انجام دیا ہے تم نے۔ جب بھی کوئی چھوٹا موٹا کام تمہیں سونپا ہے تم نے میرے منہ پر کالک ہی ملی ہے۔" فرط غضب سے میڈم کے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔

نجیب نے میری طرف اشارہ کیا "مجھے یہ بندہ ٹھیک نہیں لگتا۔ مجھے یقین ہے اسی بدبخت نے کوئی چکر چلایا ہے۔" نجیب نے کھڑے کھڑے مجھ پر ٹانگ چلائی۔ میں چاہتا تو اس وار سے بچ سکتا تھا' مگر میں بچنا نہیں چاہتا تھا۔ ٹانگ میرے سینے پر لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔

نجیب نے دوسری ٹھوکر میری ناف میں رسید کی۔ بھائی کو ایکشن میں دیکھا تو بہن کو دگنا جوش آگیا۔ اس نے سیڑھیوں والا دروازہ اندر سے بند کیا' اپنی پتلون سے بیلٹ نکالی اور میرے ساتھ ساتھ رانو پر بھی ٹوٹ پڑی۔ رانو تو اس کی دہشت سے ہی زمین پر گر پڑی تھی۔ میں اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک کونے میں سمٹ گیا۔ وہ ہم دونوں کو بے دریغ مار رہی تھی۔ موٹے بکل کی ضربیں میری کلائیوں اور ہاتھوں پر لگ رہی تھیں۔ میں اس ڈرامے میں جو کردار ادا کر رہا تھا اس کی ڈیمانڈ یہی تھی کہ میں یہ مار کھاؤں اور دبے دبے لفظوں میں میڈم کے سامنے صفائی بھی پیش کروں۔

میڈم تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں مردوں سے بڑھ کر قوت تھی۔ اس نے اچھل اچھل کر کئی ٹھوکریں میرے سینے پر رسید کیں۔ رانو کے تو وہ اوپر ہی سوار ہو گئی تھی۔ اس نے رانو کے گلے میں بیلٹ لپیٹی اور اسے کھینچ کر کمرے کے وسط میں لے آئی "میں تم دونوں کو اس پنکھے سے لٹکا کر پھانسی دے دوں گا۔ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو سچ بک دو۔" وہ دھاڑی' اس نے رانو کے گلے میں بیلٹ اتنی زور سے کسی تھی کہ رانو کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ نرمی کھانے کے بجائے وہ بیلٹ کو مزید کستی چلی جا رہی تھی۔ رانو نے رحم طلب نظروں سے میڈم کو اور پھر مجھے دیکھا۔

میں واقعی پریشان ہو گیا' رانو کی مدد کے لیے میں آگے بڑھا' نجیب نے مجھے دھکا دیا۔ میں نے اس دھکے کو غنیمت جانا اور سیدھا شراب کی ان بوتلوں پر گرا جو الماری میں رکھی تھیں۔ پانچ چھ بوتلیں ایک ساتھ نیچے گریں' اس کے ساتھ ہی نوٹوں کی گڈی بھی گری۔ ہزار ہزار کے کرارے نوٹ الماری کے خانے سے نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ نجیب کے ساتھ ساتھ میڈم شہزادے نے بھی چونک کر ان نوٹوں کی طرف دیکھا۔

پھر میڈم تعجب سے نجیب کی طرف دیکھنے لگی "یہ رقم کہاں سے آئی؟"

"پ۔۔۔ پپ۔۔۔ پتا نہیں۔" نجیب ہکلایا۔

"تمہاری الماری سے نکلی ہے اور تمہیں پتا نہیں۔"

میڈم غرائی۔

"مم۔ میں نے تو یہاں نہیں رکھی تھی' تم نے رکھی ہو گی۔"

"کیا بک رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے' میں تیری الماری میں رقم رکھوں گا۔" میڈم دھاڑی۔ اس کی آنکھوں میں شبہات نمودار ہو رہے تھے۔

نیچے جھک کر میڈم نے کچھ نوٹ اٹھائے جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ وہ جعلی تو نہیں۔ رانو کی گردن چونکہ چھوٹ گئی تھی لہٰذا وہ ایک طرف بیٹھ گئی تھی اور بری طرح کھانستی چلی جا رہی تھی۔ اسے ابکائیاں بھی آرہی تھیں۔

میڈم بڑے غصے کے عالم میں اس الماری کی طرف گئی جہاں سے شراب کی بوتلیں گری تھیں۔ اس نے الماری میں چاروں طرف ہاتھ گھمایا۔ کئی دوسرے خانے بھی کھول کر دیکھے' شاید وہ مزید رقم کی تلاش کر رہی تھی۔ نجیب گم صم کھڑا تھا۔ ایک دو بار اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میڈم نے اس پر مطلق توجہ نہیں دی۔ الماری کے بعد میڈم' نجیب کی دیگر اشیا کھنگالنے لگی۔ میری دلی تمنا تھی کہ وہ نجیب کے کھونٹی پر لٹکے کپڑے بھی دیکھے۔ پتا نہیں یہ قبولیت کی گھڑی تھی' یہ تمنا بھی فوراً ہی پوری ہو گئی۔ میڈم نے بوسکی کی قمیص کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر چونک گئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر جیب الٹی۔ اسٹیل کی چھوٹی چھوٹی بیلیں فرش پر گر گئیں۔ میڈم نے انہیں غور سے دیکھا' پھر اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ شعلہ فشاں نظروں سے نجیب کو دیکھنے لگی' ایک لمحے کے لیے تو لگا کہ وہ پاگل ہو کر نجیب پر ٹوٹ پڑے گی۔ مگر وہ شعلہ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ بہت گہری عورت بھی تھی۔ اس نے کڑک کر ہم دونوں کو کمرے سے باہر دفع ہونے کا حکم دیا۔ جونہی ہم باہر نکلے اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میرے دل نے نوید سنائی کہ نجیب پر کڑا وقت آگیا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد کمرے کے اندر سے گھن گرج کی آوازیں آنے لگیں۔ پہلے تو الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر جب آوازیں مزید بلند ہو گئیں تو الفاظ سمجھ میں آنے لگے۔ میڈم چنگھاڑی "میں کہتا ہوں' مجھے بس ایک بات کا جواب دے کتے! یہ رقم کہاں سے آئی تیرے پاس۔"

جواباً نجیب بھی چنگھاڑا "کتیا! میں نے تجھے بتایا ہے کہ یہ میری رقم نہیں ہے۔"

"یہ تیری ہے' تیری ہے۔ تو پکا شرابی ہے' شراب کے لیے اپنی بیوی کو بیچ سکتا ہے اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی بیچ دیتا۔ تجھ میں اور ہیرا منڈی کے دلال میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

"دیکھ زبان سنبھال کر بات کر۔ میرا منہ کھل گیا نا تو پھانسی پر لٹکی نظر آئے گی۔"

"میں تجھے جان سے مار دوں گا۔" میڈم غرائی "تو نے مجھے برباد کر دیا ہے۔ حرام زادے چند ہزار روپوں کی خاطر تو نے میرا ستیاناس کر دیا ہے۔ یہ دیکھ۔ یہ چیزیں تیرے کرتے کی جیب سے نکلی ہیں۔ یہ گواہی دے رہی ہیں کہ تو نے اپنی ماں بہن بیچی ہے۔"

"میرے خلاف کسی نے ڈراما کیا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ۔۔۔ مجھے اس جہاں دار پر شک ہے۔ مگر تیری کھوپڑی میں تو کسی پاگل کتیا کا بھیجا ہے۔"

"پاگل جانور کا بھیجا تیرے کھوپڑے میں ہے۔ جہاں داد اتنے جوگا نہیں کہ یہ کام کر سکتا۔ یہ تو ہے۔ صرف تو ہے جس نے روپوں کے لیے منہ کالا کیا ہے۔"

اگلے ایک منٹ کے اندر کمرے کے اندر درجۂ حرارت اتنا اونچا چلا گیا کہ یوں لگا جیسے ابھی دونوں گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ پھر اچانک ہی سناٹے میں رہ گیا۔ کمرے کے اندر سے سائلنسر لگا پستول چلنے کی آواز آئی تھی۔ اوپر تلے دو فائر کیے گئے اور پھر خاموشی چھا گئی۔ رانو نے غالباً یہ آواز نہیں سنی تھی اور اگر سنی تھی تو سمجھی نہیں تھی لیکن میں جان گیا تھا کہ کمرے کے اندر ایک قتل ہو گیا ہے۔ نجیب نے شہزادو کو یا شہزادو نے نجیب کو گولی مار دی تھی۔ جو کچھ بھی تھا ابھی راز میں تھا۔ پردہ اٹھنے کے بعد ہی پتا چلنا تھا کہ بہن زندہ بچی ہے یا بھائی۔

رانو خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور میرے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا' میڈم شہزادو باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر زلزلہ تھا اور آنکھوں میں جنونی چمک۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول نظر آرہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میڈم میرے اندازے سے کہیں زیادہ خطرناک عورت ہے۔ ان لمحوں میں اس کی بھوری آنکھیں واقعی بھوکی شیرنی کی آنکھیں تھیں۔

اس کے پستول کا رخ ہماری طرف نہیں تھا لیکن توجہ پوری کی پوری ہماری طرف تھی۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ یہ بڑے خطرناک لمحے ہیں۔ میڈم کے ذہن میں جو خوفناک خیال رینگ رہا تھا' اس کا کچھ کچھ اندازہ مجھے ہو گیا تھا۔ غالباً میڈم ہمیں چشم دید گواہوں کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔ خونی واردات کے بعد قاتل عام طور پر چشم دید گواہوں

سے بہت خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں بھی جان سے مار دینے کا سوچنے لگتے ہیں۔

یہ واقعی پر خطر لمحے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے ادھ کھلے دروازے میں دیکھا' مجھے نجیب کی صرف ایک ٹانگ نظر آئی۔ وہ فرش پر گر پڑا تھا اور یقیناً لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میڈم پندرہ بیس سیکنڈ تک ہمیں پرسوچ نظروں سے دیکھتی رہی۔ میری نگاہ اس کے سائیلنسر لگے پستول پر تھی۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے قریب تھا۔ میں نے اپنا جسم غیر محسوس طور پر تول رکھا تھا اور درمیانی فاصلے کو بھانپ رکھا تھا۔ اگر میڈم اپنے پستول کا رخ ہماری طرف پھیرتی تو پھر اس کا سامنا جہاں دار سے نہیں جہانی استاد سے ہوتا اور وہ کتنی بھی پھرتیلی اور سفاک سہی جہانی استاد کو اتنی آسانی سے زیر نہیں کر سکتی تھی۔

آخر شدید تذبذب کے دو چند سیکنڈ گزر گئے۔ میڈم نے پستول اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اسی کمرے میں داخل ہو گئی جس میں نجیب کی لاش پڑی تھی "یہ۔ کیا ہو گیا میڈم؟" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں ہوا' ایک مادر فروش' غدار اپنے انجام کو پہنچا ہے۔" وہ پھنکاری۔

پھر اس نے حیران کن سنگدلی سے مقتول کی ایک ٹانگ پکڑی اور دوسری ٹانگ پکڑنے کا حکم مجھے دیا۔ ہم نجیب کو فرش پر گھسیٹتے ہوئے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے۔ نجیب کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ایک گولی اس کے سر میں اور دوسری سینے پر لگی تھی۔ اس کا خون فرش پر پھیلا ہوا تھا اور لاش گھسیٹنے سے بھی فرش پر ایک طویل نشان بن گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نجیب کے خون سے بھی شراب کی بو اٹھ رہی ہے۔

رانو برآمدے میں سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ میڈم نے اسے حکم دیا کہ وہ فرش کو صاف کر دے۔ اس کے بعد میڈم بڑی تیزی کے ساتھ الماریوں میں سے اپنی ضروری اشیا نکالنے لگی۔ ان اشیاء میں کپڑے اور کاغذات وغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ سارا سامان اس نے دو بیگوں میں بند کیا۔ اس نے ہمیں بھی حکم دیا کہ ہم اپنے استعمال کی چیزیں سمیٹ لیں۔ دس پندرہ منٹ کے اندر ہم یہ مکان چھوڑنے کو تیار تھے۔

میڈم نے کہیں فون ملایا اور بولی "انور! میں صوفیہ کالونی والا گھر چھوڑ رہی ہوں۔ باقی سارا ایمونیشن یہیں پڑا ہے' تم ایک گھنٹے بعد یہاں آجاؤ اور سب کچھ سنبھال لو۔"

پھر وہ ایک دم بہت دھیمی آواز میں بولنے لگی۔ غالباً اپنے انور نامی ساتھی یا کارندے کو یہاں ہونے والے خونی واقعے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ بس اس کا کوئی کوئی لفظ سمجھ میں آرہا تھا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد میڈم نے مجھ سے کہا "جہاں دار! تم سامان نیچے گاڑی میں پہنچاؤ۔" اس نے گاڑی کی چابی میری طرف اچھال دی۔

میں اس کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔ میڈم دروازے وغیرہ بند کرنے لگی۔ اس کے انداز میں خوف نہیں تھا۔ ایک قسم کا رنج آمیز غصہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنا سگا بھائی قتل کیا تھا اور اس کی پتھرائی آنکھوں سے ایک آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ وہ مختلف کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی طرف سے بھی پوری طرح چوکس تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر بالفرض ہم دونوں میں سے کوئی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا تو میڈم ایک لمحے میں باخبر ہو جاتی۔ ویسے بھی گھر کے بیرونی گیٹ کو تالا لگا ہوا تھا اور چابی میڈم کی پتلون کی جیب میں تھی۔

نجیب کی لاش دیکھنے کے بعد رانو کا زرد رنگ کچھ اور بھی زرد پڑ گیا تھا' وہ میڈم کی ہدایات پر کٹھ پتلی کی طرح عمل کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم میڈم کے ساتھ اس کی لینڈ کروزر میں سوار ہو کر کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے تھے۔ میڈم کی گاڑی میڈم کا ہمراز ڈرائیور رشید ڈرائیو کر رہا تھا۔ میڈم بڑے ٹھسے کے ساتھ اس کے ساتھ والی نشست پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی۔ ہم دونوں درمیانی نشستوں پر تھے۔ میڈم خاموش تھی مگر یہ آتش فشاں والی خاموشی تھی۔ شیخوپورہ روڈ کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک کشادہ علاقے میں آگئے۔ یہاں قدرے بڑی کوٹھیاں موجود تھیں۔ ڈھائی تین کینال پر واقع ایک کوٹھی ہماری منزل ٹھہری۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے کیکر' بکائن اور جامن کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ڈرائیو وے سے گزر کر ہم پورچ میں پہنچے اور پھر اندر چلے گئے۔ کوٹھی باہر سے تو زیادہ خوب صورت نہیں تھی لیکن اندر سے عالی شان تھی اور کسی رئیس کی رہائش گاہ لگتی تھی۔ دبیز پردے' فانوس' قالین اور لکڑی کا زبردست آرائشی کام۔ یہاں مجھے وہ ریڈیو کل اسٹیشن کتا بھی نظر آیا جو میں نے نادر کے ذریعے میڈم کی جیب میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ بھی یہاں کئی قسم کے جانور موجود تھے۔ لان میں ایک طرف جانوروں کے پنجرے تھے اور چھوٹا سا چڑیا گھر نظر آرہا تھا۔ ہرن' مور' بلیاں' کتے بہت کچھ تھا۔ ایک انوکھی شے جو دکھائی دی' وہ سانپ تھے۔ ایک

پنجرے میں بڑے سائز کے کئی سانپ موجود تھے۔ کچھ درخت کے ایک خشک تنے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کچھ کینچلی مارے ادھر ادھر پڑے تھے۔

ڈرائیور رشید مجھے اور رانو کو کوٹھی کے عقبی حصے میں لے گیا۔ یہاں اس نے ہمیں دو کمروں میں ٹھہرا دیا۔ دیکھنے میں یہ کمرے سرونٹ کوارٹرز لگتے تھے مگر یہاں سہولت کی ہر شے موجود تھی اور فرنیچر بھی خوب صاف ستھرا تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں ایک پٹھان چوکیدار موجود تھا۔ اس کی آنکھیں اور مونچھیں اس کی صورت میں نمایاں ترین تھیں۔ یہ دونوں چیزیں بہت بڑی تھیں۔ آنکھوں میں وہ خاص قسم کی سرخی ٹھہری ہوئی تھی جو نشے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ شام تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ رحمان نامی پٹھان مجھ پر اور رانو پر ہمہ وقت نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ درحقیقت ہم دونوں نجیب کے قتل کے چشم دید گواہ تھے اور میڈم فی الوقت ہمارے سلسلے میں کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ہم دونوں کو نادر بخش سے ادھار مانگ کر لائی تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد وہ ہم دونوں کو بھی شوٹ کر دیتی۔ یا کم از کم شوٹ کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ کوٹھی یوں تو کوٹھیوں کے درمیان تھی مگر پراسرار سی لگتی تھی۔ نوکر چاکر بہت خاموش طبع تھے اور کسی قدر سہمے ہوئے بھی لگتے تھے۔ گاہے گاہے پالتو جانوروں کی آوازیں کوٹھی میں گونجتی تھیں مگر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان آوازوں میں بھی ایک طرح کی خوف زدگی شامل ہے۔ شاید خوف و ہراس کی اس کیفیت کا سبب میڈم تھی اور اس کا وہ موڈ تھا جس میں وہ یہاں "تشریف" لائی تھی۔ کوٹھی کی بیرونی دیواریں پندرہ فٹ تک اونچی تھیں اور ان کے اوپر نوک دار آہنی سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ رکھوالی کے تین کتے کوٹھی میں موجود تھے۔ یہاں آکر اندازہ ہونے لگا تھا کہ میڈم ذرا "اونچے درجے" کی جرائم پیشہ ہے۔

شام کے فوراً بعد ڈرائیور رشید میرے پاس آیا اور بولا "جہاں دار! تجھے میڈم صاحب نے بلایا ہے۔"

رانو بھی پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی ہولناک پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔ میں نے اسے تسلی بخش نظروں سے دیکھا اور رشید کے ساتھ کوٹھی کے اندر پہنچ گیا۔ رشید نے مجھے ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ میڈم کسی قریبی کمرے میں تھی اور فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ اگر کوئی میڈم کو دیکھے بغیر اس کی آواز سنتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ کوئی مرد بول رہا ہے۔ آواز' لب و لہجہ' ڈکشن سب کچھ مردانہ تھا۔ برآمدے میں افریقی طوطوں کا ایک پنجرہ تھا' یہ طوطے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ میڈم کی آواز ان کے شور میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں محسوس کر سکتا تھا کہ میڈم نشے میں ہے۔ شاید آج اس نے بھائی کے قتل کا غم غلط کرنے کے لیے پی تھی۔

اچانک میڈم چنگھاڑتی ہوئی قریبی کمرے سے برآمد ہوئی "اوئے صادقے! تجھے کہا نہیں تھا کہ ان ماں کے خصموں کو یہاں سے باہر لے جا۔" میڈم کا اشارہ طوطوں کی طرف تھا جو مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جس کا نام صادقے تھا' وہ آس پاس موجود نہیں تھا۔ میڈم ایک بار پھر چیخی "اوئے صادقے! کنجر کے پتر کہاں مر گیا ہے تو۔ صادقے۔ صادقے"

ایک بوڑھا نوکر لرزتا ہوا حاضر ہوا "مالکن! صادقا تو بازار گیا ہے۔"

میڈم نے صادقے کو ایک موٹی گالی نکالی اور پنجابی انداز میں چلا کر بولی "کس سے پوچھ کر گیا ہے وہ۔"

بوڑھے کے ہونٹ بس تھرا کر رہ گئے۔ طوطے مسلسل شور مچا رہے تھے۔ میڈم دھاڑی "وہ کنجر کا بال' ضرور میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔" پھر ایک دم اس کی توجہ شور مچاتے طوطوں کی طرف ہو گئی "خاموش۔ میں کہتا ہوں خاموش!" وہ سینے کی پوری طاقت سے بولی۔ تب یکایک جنونی انداز میں اس نے اپنی چرمی جیکٹ کے اندر سے سائیلنسر لگا پستول نکال لیا "خاموش!" وہ ایک بار پھر شرابی لہجے میں چنگھاڑی۔

معصوم پرندے اس خونی غیض و غضب سے کہاں آگاہ تھے جس نے اس چار دیواری کے اندر کسی عفریت کی طرح پنجے گاڑ رکھے تھے' وہ بولتے رہے۔ میڈم نے پسٹل سیدھا کیا اور ٹریگر دباتی چلی گئی۔ رنگین پروں والے پانچ خوب صورت پرندے پنجرے کے اندر ہی تڑپ کر مر گئے۔ ان کے خون کے چھینٹے پنجرے اور فرش پر گلکاری کر گئے۔

"دفع ہو جاؤ!" میڈم بوڑھے سے مخاطب ہو کر حلق کے بل چیخی "جب وہ حرامی صادقا آئے تو اسے بھیجو میرے پاس۔"

بوڑھے نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور واپس مڑا۔ یہی وقت تھا جب ایک نوعمر لڑکا بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کا رہا ہوگا۔ اس نے

شلوار قمیص پہن رکھی تھی' اوپر شاید لنڈے کا کوٹ تھا۔ وہ بڑی بے پروائی سے چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر بوڑھا ٹھٹک گیا۔ میں نے قیافہ لگایا کہ شاید یہی صاوقا ہے۔

اگلے چند سیکنڈ میں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ لڑکے کو دیکھ کر میڈم ایک دم خوں خوار شیرنی نظر آنے لگی۔ دوسری طرف لڑکے کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو ایک شیرنی کو دیکھ کر ہونی چاہیے تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہوگیا۔ اس نے چیونگم منہ سے نکال کر اپنی شلوار کی جیب میں ہی کہیں چپکالی۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔" میڈم خطرناک لہجے میں بولی۔

لڑکا سکتہ زدہ سا میڈم کے قریب چلا گیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ پنجرہ اتار کر باہر باغ میں لے جاؤ؟"

لڑکے نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ وحشت اور بے چارگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ تم میری اجازت کے بغیر یہاں سے باہر نہیں جاؤ گے۔" لڑکے نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا "تو پھر کیوں گئے تھے باہر۔" میڈم نے اسے سر کے بالوں سے دبوچ لیا "مم۔ معاف کردیں مالکن۔ غلطی ہوگئی۔"

ایک دم جیسے کمرے میں بھونچال آگیا۔ میڈم نے اتنی زور سے لڑکے کو تھپڑ مارا کہ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ میڈم نے نہایت وحشت کے عالم میں اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش کردی پھر اس نے ایک کونے سے وہ آہنی سریا اٹھایا جس سے روشن دان وغیرہ بند کیے جاتے ہیں۔ اس سریے کو ڈنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے وہ لڑکے کو جنونی انداز میں پیٹنے لگی۔ وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ اس کی جیب سے چیونگم کی رنگ برنگی گولیاں نکل کر فرش پر لڑھک گئی تھیں۔ میڈم کے جاہ و جلال سے ارد گرد کی ہرنیں سہمی ہوئی تھیں' نوکر دم بخود کھڑے تھے۔ وہ لڑکے کو اٹھا اٹھا کر دیواروں سے پٹخ رہی تھی۔ ایک دم لڑکا بے سدھ ہوگیا۔ اسے کہیں ناقابلِ تلافی ضرب لگ گئی تھی۔

لڑکے کی شلوار میں آزاربند کی جگہ لاسٹک تھا۔ مار پیٹ کے دوران میں ہی یہ شلوار کھسک کر اس کے گھٹنوں تک چلی گئی تھی۔ اب وہ اسی حالت میں فرش پر پہلو کے بل پڑا تھا۔ اس کے سر اور منہ سے خون بہہ بہہ کر قالین کو رنگین کر رہا تھا۔ بوڑھے نوکر نے ایک دم آگے بڑھ کر میڈم کے پاؤں پکڑ لیے "رب کا واسطہ میڈم۔ خدا رسول کے صدقے اس کی جان بخش دیں۔"

میڈم نے بے سدھ پڑے لڑکے کو بھی کئی شدید ٹھوکریں ماریں اور پھر روندناتی ہوئی باہر چلی گئی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا بوڑھا نوکر صاوقے کا تایا تھا۔ صاوقا ایک یتیم لڑکا تھا اور اپنے تایا کے ساتھ ہی میڈم کے پاس ملازم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکے کو دیکھا۔ اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔

میں نے بوڑھے سے کہا "اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

بوڑھا بولا "تم مالکن سے پوچھو۔ اگر وہ اجازت دیں گی تو جاسکیں گے۔"

ڈرائیور رشید خشک لہجے میں بولا "نہیں مالکن اجازت نہیں دیں گی۔"

"تو پھر۔ اس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔ یہ مرجائے گا۔" میں نے جل کر کہا۔

"تو مرجائے۔"

"تت..... تم مالکن کو بتا تو سکتے ہو۔" بوڑھا بلک کر بولا "یہ دیکھو کتنی تیزی سے خون نکل رہا ہے۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ مالکن نے اجازت نہیں دینی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر کریم یہاں آکر اسے دیکھ لے۔"

"تو پھر بلاؤ نا اس ڈاکٹر کریم کو۔" میں نے اندرونی غضب کو حتی الامکان کنٹرول میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں پوچھتا ہوں میڈم سے۔" ڈرائیور رشید نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ لگتا تھا کہ اس وقت وہ بھی میڈم کے سامنے جاتے ہوئے ڈر رہا ہے۔

میں نے بڑے دکھ کے ساتھ لڑکے کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کے چہرے پر ڈاڑھی پھوٹ ہی رہی تھی۔ میں نے بوڑھے کے ساتھ مل کر اس کی خون آلود شلوار اوپر ناف تک چڑھا دی۔ وہ اپنے ہی لہو میں لت پت پڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ سانس غیر ہموار تھا۔ اس کے اردگرد اس کی جیب سے نکلنے والی ریزگاری اور چیونگم کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یقین نہیں آیا کہ چند منٹ پہلے یہی لڑکا مین گیٹ سے گزر کر خراماں خراماں اندر آیا تھا۔

ابھی ہم وہیں بیٹھے تھے کہ بالکل صاف شفاف سروالا ایک فربہ اندام شخص اندر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس نوری نامی شخص کی حیثیت میڈم کے دستِ راست اور اسسٹنٹ کی تھی۔ اس نے ایک نظر بے ہوش پڑے لڑکے کو

دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش لہرائی بہرحال اس نے یہ تشویش چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ کڑک کر بولا "یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے تم لوگوں نے' چلو نکلو سب یہاں سے۔"

جو دو تین نوکر ہمت کرکے کمرے میں آگئے تھے' فربہ اندام شخص کی دھاڑ سن کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ بوڑھا بھی لرزتا کانپتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے فربہ اندام شخص کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "آپ کو رب کا واسطہ نوری صاحب' اس بچے کو بچالیں۔"

"اچھا اچھا' تم باہر چلو۔" نوری اسے ہاتھ سے دھکیلتا ہوا بولا۔

ہم باہر نکلے تو نوری نے دروازہ بند کردیا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد ایک ڈاٹسن کار کوٹھی میں داخل ہوئی۔ اس میں سے سانولے رنگ کا ایک شخص برآمد ہوا اور تیزی سے اندر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود میڈیکل باکس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔

ڈاکٹر قریباً ڈیڑھ گھنٹا کوٹھی میں موجود رہا۔ اس دوران میں ڈرائیور رشید دو بار بازار بھی گیا۔ یقیناً کوئی میڈیسن وغیرہ لینے گیا تھا۔ بہرحال یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ میڈم زخمی صاوقے کو اسپتال لے جانے کی اجازت نہیں دے گی۔

میں واپس اپنے کمرے میں آچکا تھا۔ ذہن میں بدستور میڈم شہزادو کی وحشت کے مناظر گھوم رہے تھے۔ نجیب کی لاش۔ خوب صورت افریقن طوطوں کے کٹے پھٹے جسم' صاوقے نامی لڑکے کا خونچکاں چہرہ۔ سب کچھ پردہ تصور پر جما ہوا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کو کھسکتا رہا۔ رات گیارہ بجے کے قریب میں سوگیا۔ رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھلی۔ کسی کے چیخنے اور پھر زور زور سے رونے کی آواز آئی تھی۔ میں نے غور کیا۔ یہ اسی بوڑھے کی آواز تھی جو شام کے وقت زخمی لڑکے کی زندگی کے لیے میڈم کی منتیں کر رہا تھا۔

میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میں ننگے پاؤں باہر نکلا اور کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف گیا۔ دو تین ملازمین نے بوڑھے کو سنبھالا ہوا تھا۔ بوڑھا اپنا سر پیٹ رہا تھا اور کربناک آواز میں رو رہا تھا۔ ایک ملازم اسے خاموش کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا تاکہ بوڑھے کی آواز بلند نہ ہو پھر وہ لوگ اسے سنبھالتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔

صاف ظاہر تھا کہ زخمی لڑکا جانبر نہیں ہوسکا۔ سینے میں غم کا دھواں سا بھر گیا۔ اتنے میں گنجے سر اور فربہ جسم والا نوری وہاں پہنچ گیا۔ اس نے غصیلے مگر پست لہجے میں ملازمین کو ڈانٹا اور کہا کہ وہ یہاں جمع نہ ہوں۔ میں بھی واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ کانوں میں روتے کرلاتے لڑکے کی چیخیں تھیں اور آنکھوں میں میڈم کی وحشت ناک صورت۔ کل میں نے میڈم کے کئی ایسے انداز دیکھے تھے جو پہلے میری نگاہوں سے اوجھل تھے میڈم کی حرکات و سکنات میں مردانہ پن اتنا نمایاں تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اس کی آواز بھاری تھی۔ غور سے دیکھنے پر بالائی ہونٹ کے اوپر ہلکے ہلکے سیاہ روئیں نظر آتے تھے جیسے کسی لڑکے کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ وہ زور آور بھی تھی اور اس کے بازوؤں کے باقاعدہ مسل بنے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ جسمانی طور پر نارمل نہیں ہے اور شاید یہی "ایب نارملٹی" تھی جس نے اسی حد درجہ متشدد اور غضب ناک بنا رکھا تھا۔

اگلے روز سارا دن کوٹھی کے طول و عرض میں پراسرار خاموشی چھائی رہی۔ اس خاموشی کو بس کسی وقت کسی پرندے یا جانور کی آواز ہی مجروح کرتی تھی۔ بوڑھا بس مجھے ایک مرتبہ نظر آیا۔ ڈرائیور رشید اور پٹھان چوکیدار اسے سہارا دے کر بالائی منزل پر لے جارہے تھے۔ لڑکے کی لاش کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ اس جواں مرگ کو کفن نصیب ہوا یا نہیں۔ اس کے کسی عزیز اقارب نے اس کی شکل دیکھی یا نہیں' اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ بہرحال شام کے وقت پٹھان چوکیدار نے اپنے ایک ساتھی سے پشتو میں جو گفتگو کی اس سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ لڑکا رات کو مرگیا تھا۔

اگلے دو روز میں نے اور رانو نے اسی کوٹھی میں گزارے۔ یہاں ہمارے سپرد ابھی کوئی کام نہیں تھا' نہ ہی میڈم نے ہمیں اپنا "دیدار" کرایا تھا۔ رانو تو میڈم کے نام سے ہی سہمی ہوئی رہتی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی "جہاں داو۔ قسم سے مجھ کو تو لگتا ہے کہ میڈم عورت ہے ہی نہیں۔ اس کے اندر کوئی بندہ چھپا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کا تو مجھے پتا نہیں۔ بس اس کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ یہ زنانی نہیں ہے۔ یا پھر... یا پھر ہوسکتا ہے کہ اس پر کوئی سایہ شایہ ہو۔ تم نے اس کی آواز نہیں سنی؟"

"ہاں آواز تو سنی ہے۔"

"پھر دیکھ نا۔ زنانی ہوکر وہ کہتی ہے کہ میں جاتا ہوں میں آتا ہوں۔ ایسا تو وہی کرتا ہے جس کو سایہ ہوگیا ہو۔"

"لیکن جس کو سایہ ہو گیا ہو وہ تو کبھی کبھار ایسا کرتا ہے۔ یہ تو ہمیشہ ہی ایسے بولتی ہے۔"

رانو نے کہا "جہاں داد! تم مانو نہ مانو۔ میں تجھے بتا دوں۔ یہ زنانی نہیں ہے اس کے اندر کوئی شے ہے اور شے بھی کوئی ایسی ویسی نہیں بہت خطرناک ہے۔" رانو کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں اور بالکل گول گول ہو گئی تھیں۔

رانو کو ابھی یہ پتا نہیں تھا کہ یہاں آ کر میڈم نے ایک اور قتل کر دیا ہے۔ وہ ابھی تک نجیب کے قتل کو ہی لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو شک تھا کہ میڈم سے اس کے بھائی کا قتل بھی ہوائی چیزوں نے ہی کرایا ہے۔

اگر میں رانو کو بتاتا کہ وہ "ہوائی چیز" میں ہی ہوں جس نے میڈم کو نجیب کے قتل پر ابھارا تھا' تو شاید وہ یقین نہ کرتی۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی ساتھی ضرور تھی مگر مجرموں کی طرح عیار نہیں تھی۔ اس کی سوچ بھی محدود تھی۔ کنوئیں کے مینڈک کی طرح وہ بس اشرف جیسے اور نار رنگی کو ہی جرم کی دنیا کا محور و مرکز سمجھتی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی کہ "جہان جرم" میں ایسے ایسے سورما پائے جاتے ہیں جن کے معمولی کارندوں کی جیبوں میں نار رنگی جیسے درجنوں بدمعاش ریزگاری کی طرح پڑے رہتے ہیں۔

جہاں تک نجیب کے قتل کی بات تھی' مجھے اس کی موت پر قطعی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ کوئی شریف شہری تو تھا نہیں۔ پتا نہیں اپنی جابر بہن کے زیر سایہ اس کے ہاتھوں خلق خدا پر کیا کیا ستم ہو چکے تھے۔ حالات کی کروٹ نے نجیب کو اس کی بہن کے ہاتھوں ہی مروا ڈالا تھا اور ایک ایسی غلطی کی پاداش میں مروایا تھا جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میڈم شہزاد اپنے بھائی کی طرف سے پہلے ہی بہت زیادہ بدگمان تھی۔ اس تازہ واقعے نے اسے بالکل "آؤٹ آف کنٹرول" کر دیا تھا۔ اس نے جنونی کیفیت میں نجیب کو شوٹ کروا ڈالا تھا۔ بہرحال جرم کی دنیا میں "کرے کوئی بھرے کوئی" کا سلسلہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔

میڈم کی اس پراسرار کوٹھی میں کئی عجیب باتیں میں نے نوٹ کی تھیں۔ ان میں سے ایک عجیب بات یہ تھی کہ میڈم نے تمام نر اور مادہ جانوروں کو علیحدہ علیحدہ پنجروں میں رکھوایا ہوا تھا۔ یہاں مجھے کسی جانور یا پرندے کا بچہ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے ڈرائیور رشید سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے۔

وہ بولا "تم ان سوالوں جوابوں کے چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ میڈم کو پتا چلا تو تمہاری جان مصیبت میں آ جائے گی۔"

"لیکن میں تو ایک عام سا سوال پوچھ رہا ہوں۔"

"اس عام سے سوال کا جواب تمہارے پاس بھی موجود ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"تمہارے ساتھ وہ رانو نام کی چھوکری ہے مگر میڈم نے تم دونوں کو علیحدہ کمروں میں رکھا ہوا ہے۔ کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس لیے رکھا ہے کہ میڈم کو کسی بھی جوڑے کا ایک ساتھ رہنا پسند نہیں۔"

شاید میں میڈم کی ذاتی زندگی کے بارے میں رشید کو کچھ اور بھی کریدتا' مگر اسی دوران میں میری نظر میڈم پر پڑ گئی۔ وہ مردانہ چال چلتی ہوئی پورچ سے اندرونی دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جسیم کتے کی زنجیر تھی' ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ وہ اپنے پسندیدہ لباس پتلون اور جیکٹ میں تھی۔ کوٹھی کے نوجوان مالی کی بیوی' گلاب کے پودوں کی گوڈی کرنے میں مالی کی مدد کر رہی تھی۔ میڈم ان کے قریب سے گزری تو دونوں نے اٹھ کر سلام کیا۔ میڈم نے مالی کی بیوی کو بالکل ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے ایک نظرباز مرد کسی عورت کو دیکھتا ہے۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میڈم کے حوالے سے میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ بظاہر وہ نار رنگی کی دوست تھی مگر نار رنگی سے کہیں زیادہ اثر و رسوخ اور طاقت کی مالک تھی۔ اس کے مزاج کی اہم خصوصیت اس کی حد سے بڑھی ہوئی سفاکی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی معمولی سی بات پر بھڑک کر کسی بھی شخص کو قتل کر سکتی ہے۔ وہ کسی ایسے "سیٹ اپ" کا حصہ تھی جو خطرناک ترین تخریبی کارروائیاں کر رہا تھا۔ بھائی جی اور اس کے اہم ترین ساتھیوں کو بم سے اڑا دینے کی منصوبہ بندی کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

اس شام میڈم اپنی پجارو میں ڈرائیور رشید اور پٹھان گارڈ کے ساتھ بیٹھ کر کہیں چلی گئی۔ رانو بھی سرشام ہی سو گئی تھی۔ میرے لیے اچھا موقع تھا کہ میں اپنے کمرے میں گھس کر ساہی صاحب کا دیا ہوا طاقت ور واکی ٹاکی استعمال کروں اور زریں گل سے تبادلہ خیال کروں۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا ڈوا کرس "واکی ٹاکی" تھا مگر اس کی رینج کسی بھی اچھے ٹرانسمیٹر سے کم نہیں تھی۔ دو چار منٹ کی کوشش کے بعد میں زریں کی آواز سننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ میری آواز پہچان کر بولا "خواستار صیب! آپ کہاں کھو گیا ہے۔ قسم سے امارا دل اس وقت گا رہا ہے۔ یہ رنگین محفل' حسینوں کا میلہ۔ ملیے

میں تڑپے امارا دل اکیلا۔"

"اچھا کیا کر رہے ہو اس وقت؟"

"اس وقت تو ام آپ سے بات کر رہا ہے۔"

"ارے لکڑی کے بندر! مجھ سے بات کرنے سے پہلے کیا کر رہے تھے؟"

"سچ بتاؤں۔"

"ہاں سچ بتاؤ' ورنہ تمہیں کالے کوے کاٹیں گے۔"

زریں دبے دبے جوش سے بولا "ام کلثوم کو اندر کمرے میں بلا رہا تھا۔ دراصل آج اس نے نہا کر نیا کپڑا پہنا ہے اور اتنا خوب صورت لگ رہا ہے کہ ام کیا بتائے۔ امارا تو دل ہی ڈولا مچھلی کے مافق ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

"او کے بدقماش! دن دیہاڑے ڈاکا ڈال رہے ہو۔"

"خواستار صیب! امارے لیے تو آج کل رات دن برابر ہی ہے۔ وہ آپ کا بھتیجا ہر وقت میرے اور کلثوم کے درمیان دیوار بنا رہتا ہے۔ کسی وقت تو ام کو اس سے جلن محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب دیکھو اس کے لاڈ ہو رہے ہیں' اس کی چوما چاٹی ہو رہی ہے۔ امارے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہا ہے ماں بیٹے کے بستر پر۔ یہ کہاں کا انصاف ہے استاد صیب۔ اتنا ظلم تو فلم "سسرال" میں بھی نہیں ہوا تھا۔ تکلیف کا بات ہے نا استاد صیب کہ درخت کے پھل سے بار فرمایا جائے اور تنے پر کلہاڑے چلائے جائیں۔"

"اچھا' تم اپنی رام کہانی بند کرو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"آپ بتائیں ام بالکل حلقہ بگوش ہے۔"

"حلقہ بگوش نہیں ہمہ تن گوش۔" میں نے تصحیح کی۔ اس سے پہلے کہ میں اور کچھ کہتا' ہمیں پاس سے ننھے زریں کے رونے کی آواز آئی۔

زریں نے کہا "بڑا شیطان ہے نورجہاں کا گانا بند ہوتے ہی رونا شروع کر دیتا ہے۔ ماں کی لوری کے بعد اسے سب سے زیادہ نورجہاں کا آواز پسند ہے۔" پھر وہ لمحے توقف کر کے زریں گل بولا "امارے پاس آپ کے لیے ایک حیران کرنے والا خبر ہے۔ بلکہ آواز ہے۔"

"کیسی آواز؟"

"آپ خود سنیں۔" زریں نے کہا اور واکی ٹاکی کسی اور کو تھما دیا۔

چند سیکنڈ بعد ساہی صاحب کی آواز سن کر میں واقعی حیران ہو گیا۔ ساہی صاحب بھی زریں کے ہاں موجود تھے۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا کیونکہ میں جو کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا' وہ ساہی صاحب ہی بہتر طور پر بتا سکتے تھے۔ ساہی صاحب نے پوچھا

"کہاں ہو شاہ جہاں۔ دوجھا پور سے ہمارے مخبر نے اطلاع دی تھی کہ تم نادر کے ڈیرے پر نہیں ہو پھر زریں کی زبانی پتا چلا کہ تم شیخوپورہ میں جی پی او کے قریب کسی مکان میں شہزاد نامی عورت کے ساتھ ہو اور رانو بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

"میں اب بھی اسی عورت کے ساتھ ہوں جناب اور رانو بھی میرے ہمراہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کسی اہم انکشاف کے قریب پہنچ چکا ہوں۔"

"تمہارا مطلب رخشندہ کے مرڈر سے ہے۔"

"جی ہاں۔ بات تو اصل اور بڑے مجرم تک پہنچنے کی ہے۔ جس شاہی نامی بندے کے ذریعے رخشندہ کو قتل کرایا گیا تھا وہ تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ میں نے پچھلی ملاقات میں آپ کو بتایا بھی تھا۔"

"ہاں وہ ساری تفصیل مجھے مقامی تھانے کے انچارج سے بھی معلوم ہوتی تھی۔" ایک لمحہ توقف کے بعد ساہی صاحب نے کہا "تمہیں کسی طرح کی مدد کی ضرورت تو نہیں؟"

"بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات آپ سے کہنی تھی۔ اس کا تعلق معروف سیاسی رہنما بھائی جی سے ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔" ساہی صاحب چونک کر بولے۔

"بھائی جی آج کل سیاست کے میدان میں بہت سرگرم ہے۔ اس کے جلسوں اور میٹنگوں کی خبریں اخباروں میں بھی آ رہی ہیں۔ اس کی سیکیورٹی کی طرف سے آپ کو محتاط رہنے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہوئی ہے؟" ساہی صاحب نے پوچھا۔

"بہت خاص۔ غالباً آپ کو معلوم ہی ہو گا جیل سے رہائی کے بعد اٹھائیس تاریخ کو بھائی جی نے اپنی رہائش گاہ پر اپنے پارٹی لیڈروں کی میٹنگ بلائی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ میرا ماتحت انسپکٹر ارشاد خود وہاں موجود رہا تھا۔"

"یہ میٹنگ ایک بہت بڑے سانحے کا شکار ہوتے ہوتے بچی ہے۔ بچانے والی تو اللہ کی ذات ہے مگر کوئی نہ کوئی وسیلہ ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس میٹنگ کو بچانے میں میرا کردار اہم رہا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ کوئی سبوتاژ کی کارروائی ہونے والی تھی۔"

"جی ہاں' بڑی خوفناک منصوبہ بندی تھی۔ کم از کم چھ

طاقت ور ٹائم بم نشست گاہ کے اردگرد نصب کیے جا رہے تھے۔ اور یہ کام گھر کے بھیدی کے ذریعے ہو رہا تھا۔ بھائی جی کا ایک قریبی ساتھی اور سرگرم کارکن جس کا نام مجھے نعیم راہی معلوم ہوا ہے مجرموں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا ہنستا کھیلتا شخص ہے۔ میں تاریخ کو جیل سے رہائی کے موقعے پر بھائی جی کے جلوس کی جو تصویر چھپی تھی' اس میں وہ ٹرک پر بھائی جی کے بالکل پیچھے کھڑا نظر آ رہا ہے۔"

ساہی صاحب حیرت کے عالم میں میری بات سن رہے تھے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں بتایا کہ کس طرح میں میڈم کی رہائش گاہ پر ٹائم بموں کی موجودگی سے آگاہ ہوا اور کس طرح کارروائی سے صرف دو رات پہلے میں انہیں ناکارہ بنا سکا۔ آخر میں میں نے کہا "یقینی بات ہے جناب! کہ پہلی کوشش کی ناکامی کے بعد یہ لوگ زیادہ شدت سے بھائی جی کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ خاص طور سے جب تک وہ نعیم نامی بندہ آزاد ہے کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

ساہی صاحب نے مشکور لہجے میں کہا "شاہ جہاں! تم نے بڑے ٹھیک وقت پر بڑی اہم معلومات پہنچائی ہیں۔ میں آج ہی اس سلسلے میں اقدام کرتا ہوں۔ بھائی جی کی سیکیورٹی کی طرف سے چند خدشات سامنے آئے تھے مگر اب تمہاری اطلاع کے بعد تو کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے "شاہ جہاں! مجھے تم پر فخر ہے۔ اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" ان کا لہجہ ایک دم ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

"آپ کا اعتماد ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے میرے پاس ایک سرپرائز بھی ہے۔" ساہی صاحب نے کہا پھر مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے واکی ٹاکی کسی اور کو تھما دیا ہے۔

دوسری طرف سے جو آواز ابھری' اس نے میرے تن بدن میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ یوں لگا کہ لمحوں میں میرا سیروں خون بڑھ گیا ہے۔ یہ صفدر تھا۔ آخری بار صفدر کی آواز میں نے وطن واپسی پر لاہور ایئرپورٹ کے لاؤنج میں سنی تھی۔ اس کے فوراً بعد شیخ عاصم کی کرم نوازی سے پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا تھا۔ بعد ازاں صفدر کے بارے میں خبریں تو ملتی رہی تھیں مگر صفدر کی آواز میرے کانوں میں نہیں پڑ سکی تھی۔ آج واکی ٹاکی پر اس کی زندگی سے بھرپور آواز سن کر دل خوش ہو گیا۔

"کیسے ہو صفدر؟" میں نے پوچھا۔

"اے ون۔۔۔ اور آپ؟"

"میں میرا اے ون۔ آج تو میرے لیے حیرتوں کے دروازے کھل رہے ہیں۔ میں نے تو زریں کو کال کی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی یہ کال اتنی بھاگوان ثابت ہو گی۔ پہلے ساہی صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر تم سے۔ واٹ اے سرپرائز۔ تم کب آئے اسپتال سے؟"

"اسپتال والوں نے تو دس دن پہلے ہی چھوڑ دیا تھا مگر مسٹر کلارک چاہتے تھے کہ مجھے جیل یاترا نہ کرنی پڑے اور اسپتال سے ہی میری ضمانت ہو جائے۔"

"گویا زریں کے بعد تم بھی ضمانت پر تشریف لے آئے ہو۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ کاش میں بھی اڑ کر تم لوگوں تک پہنچ سکتا۔"

"تو آپ آ جائیں۔ ایسی بھی کیا مجبوری ہے؟"

"مجبوری تو بہت بڑی ہے بھائی۔ آج کل ایک بنڈر والا کے قبضے میں ہوں' بڑی عجیب و غریب شے ٹکرائی ہے۔ تم یہاں ہوتے تو دونوں مل کر حیران ہوتے۔"

"ساہی صاحب نے تھوڑا بہت بتایا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ کالج کی کسی طالبہ کے قتل کا معاملہ ہے۔"

"ہاں اس معاملے میں سے ایک دو مزید بڑے بڑے معاملے نکل آئے ہیں۔ آج کل انہی میں الجھا ہوا ہوں۔ نکل تو یہاں سے سکتا ہوں لیکن اگر نکلوں گا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔"

"آپ کے دوست کا تو سنا ہے کہ آج کل بہت برا حال ہے۔"

"کون سا دوست؟"

"وہی جس نے پاکستان میں ہمارا شایان شان استقبال کرایا ہے۔ عزت مآب شیخ عاصم۔ ساہی صاحب بتا رہے تھے کہ وہ آج کل جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہے اور ملک ملک بھاگا پھر رہا ہے۔"

"ہاں اس بلا کو کلارک صاحب نے ہی کوئی تعویذ ڈالا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تعویذ تو کلارک صاحب کے پاس واقعی بہت ہیں۔ کچھ الٹے اور کچھ سیدھے۔ ایک الٹا تعویذ ڈال کر انہوں نے شیخ عاصم کو گھن چکر بنایا ہے اور ایک سیدھا ڈال کر ہمیں امرا میں شامل کروا دیا ہے' سنا ہے آپ تو باقاعدہ بزنس مین بھی ہو چکے ہیں۔ گولڈ ہوٹلز کی چین آپ کے گلے میں ہے۔"

"بزنس مین تو میں واقعی ہوں۔" میں نے خوش دلی سے

کہا "وہاں ہو جھاپور میں بیٹھ کر بھی میں نے اپنے سارے کاروبار پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی۔ ایک ملازم نے ذرا سی ڈیٹھی بیٹنگی کی اور میں نے اسے پکڑوا دیا۔"

صفدر ہنستے ہوئے بولا "آپ کے اس کارنامے کا احوال مجھے ساہی صاحب سے معلوم ہو گیا ہے۔ آپ جیسے دو چار کاروباری پاکستان کو اور مل جائیں تو ملک کی تقدیر بدل جائے۔"

"بہت شکریہ۔ تمہاری آنکھوں کی انفیکشن کا اب کیا حال ہے؟"

"آپ ایک ایسی انفیکشن کا احوال پوچھ رہے ہیں جو مجھے لاحق ہی نہیں ہو سکتی۔ آنکھیں ہوں گی تو انفیکشن ہو گی نا۔ ہاں زخموں کی انفیکشن اب ٹھیک ہے۔"

صفدر کی بات سے مجھے زوردار ذہنی جھٹکا لگا' واقعی جو عضو تھا ہی نہیں اس میں انفیکشن کیسے ہو سکتی تھی۔ صفدر ہنستے ہوئے بولا "ویسے سچ کہتا ہوں شاہ جہاں صاحب! یہ دنیا جتنی بدصورت ہوتی جا رہی ہے' اس میں آنکھوں سے محرومی بھی کوئی اتنا بڑا نقصان نہیں' بلکہ اس محرومی کے کئی پہلو تو اب اچھے لگنے لگے ہیں۔"

میں نے کہا "ہمیں دنیا کو خوب صورت بنانے کی کوشش کرنی چاہیے' نہ کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینی چاہئیں۔"

"اچھا چھوڑیں یہ باتیں۔ آپ بتائیں کب لوٹ رہے ہیں۔"

"تم لوٹ آؤ گے تو میں بھی لوٹ آؤں گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تاریک براعظم سے جو مایوسی اور اذیت تمہیں ملی ہے اس سے چھٹکارہ پا لو گے تو پھر سب کچھ پلٹ آئے گا۔" میرا اشارہ وریا کے غم کی طرف بھی تھا۔

صفدر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "کوشش کر رہا ہوں۔ اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔"

"تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تمہاری کوشش ایسی رائگاں بھی نہیں ہے۔ یقین کرو تمہاری آواز سن کر میرا حوصلہ بڑھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے مردہ بازوؤں کو توانائی واپس مل رہی ہے۔"

صفدر نے کہا "اچھا۔ آپ کے لیے میرے پاس بھی ایک سرپرائز ہے۔"

"لگتا ہے آج سرپرائز ڈے ہے۔ پہلے زریں نے ساہی صاحب کا سرپرائز دیا پھر ساہی صاحب نے تمہارا اور اب تم بھی سرپرائز دے رہے ہو۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔"

چند سیکنڈ گزرے اور پھر غزالہ کی آواز نے میرے کانوں میں جلترنگ بجا دیے "ہیلو شاہ جہاں! کیسے ہیں آپ؟"

"اوہ گاڈ۔ آج تو واقعی "سرپرائز ڈے" ہے۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ زریں کو فون کروں گا تو ایسی اچھی اچھی آوازیں سننے کو ملیں گی' کیسی ہو تم؟"

"بس جیسا آپ چھوڑ گئے تھے ویسی ہی ہوں۔"

"کیسا چھوڑ گیا تھا؟"

"پریشان' خوف زدہ۔۔۔ ایئرپورٹ سے باہر آ کر ساہی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کو اور زریں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ہمارے لیے۔"

"یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کے لیے صرف اور صرف میں قصوروار ہوں۔"

"اب فلمی ہیروئنوں کی طرح یہ نہ کہنا کہ میں ہی دنیا سے چلی جاؤں تو اچھا ہے۔"

"جی' دل تو یہی چاہتا ہے۔"

"دل کو کچھ اچھی اچھی باتیں چاہنے دو۔ نئی زندگی کی باتیں' ایک پھول بھرے آنگن کی باتیں۔۔۔ اور ایک ایسی شام کی باتیں جس پر کسی شیخ عاصم کا سایہ نہ ہو۔"

"لگتا ہے یہ سائے کبھی سمٹ نہیں سکیں گے۔"

"پھر وہی مایوسی کی باتیں۔ تمہیں یاد ہے کہ ماریطانیہ میں ہمارے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اگر تم معاہدہ توڑو گی تو پھر میں بھی نظر ثانی کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی آج کل میں بہت رومانٹک ہو رہا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"تم نے کہا تھا کہ تم کبھی مایوسی کی باتیں نہیں کرو گی اور میں نے کہا تھا کہ ہم اس وقت تک اپنے درمیان فاصلے برقرار رکھیں گے جب تک شیخ عاصم سے ہمارا پیچھا چھوٹ نہیں جاتا۔ بولو یہ بات ہوئی تھی یا نہیں۔۔۔"

"اچھا پھر بات کریں گے اب۔۔۔"

"میری بات سنو غزالہ۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی "تم نے ہی مجھے ہمت اور توانائی دینی ہے' اگر تم مایوسی کی باتیں کرو گی تو یقین رکھو' میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ میری "حالات سے ٹکرانے کی طاقت" تمہارے پاس ہے۔"

"اچھا بابا نہیں کرتی۔"

"کیا نہیں کرتی۔"

"مایوسی کی باتیں۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔

"یہ ہوئی نا بات۔ اب ذرا مسکرا کر دکھاؤ۔"

"اس راکی تاکی پر تو نہیں دکھا سکتی۔"

"چلو پھر تھوڑا سا ہنس دو۔"

"سمجھیں میں ہنس پڑی۔"

"اگر صرف سمجھنے سے کام چل سکتا ہے تو میں پھر کچھ اور بھی سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"کیا میں سمجھ لوں کہ میں نے تمہیں چوما ہے؟" میں نے شوخی سے کہا۔

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی "انکل ساہی دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاید وہ آپ سے مزید بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں واکی ٹاکی انہیں دیتی ہوں۔"

"اچھا ٹھہرو' بات سنو۔ یہ چکر کیا ہے۔ تم سب یہاں زریں کے گھر کس سلسلے میں جمع ہوئے ہو؟"

"اوہو' تو ابھی تک آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔ بھئی یہ زریں کے بیٹے کا عقیقہ ہے۔ دو موٹے تازے بکرے ذبح ہوئے ہیں۔ ننھا زریں شان دار لباس پہنے وہ سامنے پرام میں لیٹا ہے۔ بالکل چاند کا ٹکڑا لگ رہا ہے۔ سب بہت خوش ہیں۔ بس ایک ناشا کی کمی محسوس ہو رہی ہے اور ایک آپ کی۔ ناشا تو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہے اور آپ پتا نہیں کس ریمانڈ پر شیخوپورہ میں ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ یہ تم نے واقعی حیران کن خبر سنائی ہے۔ ایک طرح سے یہ آج کے دن کا چوتھا سرپرائز ہے۔ اب تو واقعی دل چاہنے لگا ہے کہ اڑ کر آ جاؤں۔"

"تو پھر آ جائیں نا۔"

"خدا کی بندی میرے ارادوں کو ڈانواں ڈول مت کرو۔ اگر تم نے ایک بار مزید اسی ادا سے کہہ دیا نا تو میں یہاں سب کچھ چوپٹ کر کے چلا آؤں گا۔ اس کے بعد "ملک و قوم" کا جتنا بھی نقصان ہوگا اس کی ذمے داری صرف تم پر ہوگی۔"

وہ مسکراتے لہجے میں بولی "ملک و قوم کے لیے تو جان بھی قربان ہے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ ویسے بھی آپ نے یہاں آکر کیا کرنا ہے' زریں کو واکی ٹاکی پر ہی مبارک باد دے دیں۔"

"بھئی سو کھی مبارک باد تو میں ایک مرتبہ پہلے بھی دے چکا ہوں۔ مجھے اب یاد پڑ رہا ہے کہ بچے کو پہلی بار دیکھ کر اسے کچھ دیتے دلاتے بھی ہیں۔"

"یعنی آپ نے کچھ نہیں دینا تھا؟" میں نے جواب میں غزالہ کے خدشے کی تائید کی۔ وہ بولی "کئی معاملوں میں آپ بھی نرے وہی ہیں' زریں اور کلثوم بھی کیا سوچتے ہوں گے۔"

"بھئی اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جلدی سے شادی کر لو۔ مجھے بھی کچھ دنیا کی سمجھ بوجھ آ جائے۔ تمہارے جیسی زمانہ شناس بیوی ہوگی تو میری کئی خامیوں پر پردہ پڑ جائے گا۔"

"لگتا ہے کہ آپ پھر پٹڑی سے اتر رہے ہیں۔ میں واکی ٹاکی ساہی صاحب کو دے رہی ہوں۔"

میں اس سے تابی کا حال احوال پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اسی دوران میں واکی ٹاکی ساہی صاحب کے پاس چلا گیا۔ میں نے کہا "جناب! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ یہاں عقیقے کے سلسلے میں جمع ہیں۔"

"باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور وقت کم ہوتا ہے۔ بہت کچھ دماغ سے نکل جاتا ہے۔"

ساہی صاحب نے کہا' پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولے "مجھے نہیں معلوم کہ تم اپنی تفتیش کے کس مرحلے میں ہو بہرحال اگر تم مناسب سمجھو تو مشکوک افراد سے پولیس کے ذریعے بھی پوچھ گچھ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں جناب! ابھی یہ مرحلہ نہیں آیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ابھی کسی بندے پر شک زیادہ پختہ نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں جناب! جس میڈم کے ہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں اس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ ان معاملات میں پوری طرح ملوث ہے۔ بلکہ میں اس عورت کے ہاتھوں ہونے والے دو افراد کے قتل کا عینی گواہ بھی ہوں۔۔۔ مگر میں ابھی کسی شخص پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہ رہا۔ تفتیش خود آگے بڑھ رہی ہے تو ہمیں تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جونہی ایسا مرحلہ آیا میں آپ کو آگاہ کروں گا۔"

آخر میں ساہی صاحب نے مجھے بتایا کہ میری نشان دہی پر اسحاق عرف ساقے اور اسسٹنٹ منیجر کو شیخوپورہ سے پکڑ لیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اسسٹنٹ منیجر کی گرفتاری کے بارے میں محترم کلارک صاحب کو بتا دیا گیا ہے اور اب ملزم اسلام آباد پولیس کی تحویل میں ہے۔"

ساہی صاحب سے دو چار باتیں کرنے کے بعد اور زریں اور کلثوم کو مبارک باد دینے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اگلے روز صبح میں ذرا دیر سے اٹھا۔ رانو گم صم سی

میرے سرہانے بیٹھی تھی' وہ کافی تھکی تھکی سی لگتی تھی "کیا ہوا تمہیں؟" میں نے رانو سے پوچھا۔

وہ بولی "جہاں دار! مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے اس جگہ سے۔۔۔ اور اس سے بھی زیادہ ڈر میڈم سے لگنے لگا ہے۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟"

"تم سوئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے میڈم نے ڈرائیور رشید کو بھیج کر مجھے بلا لیا۔ مجھ سے کہنے لگی کہ میرے سر کی مالش کرو۔ کوئی ایک گھنٹا مالش کراتی رہی' پھر کندھے دبواتی رہی' ساتھ ساتھ مجھے گھورتی بھی رہی۔ میں قسم کھاتی ہوں جہاں دار' اس کی نظریں بالکل کسی مرد کی نظریں ہیں۔ اس پر ضرور کسی شے کا سایہ ہے۔ اللہ بخشے میری ایک پھوپی کو بھی اسی طرح جن چمٹ گئے تھے اور ایک جن نہیں چمٹا تھا' جنات کا پورا کنبہ چمٹ گیا تھا۔ اس کنبے میں چھوٹے بڑے' بچے بوڑھے کوئی ایک سو جن تھے۔ جمعرات کی رات کو وہ سب مل کر میری پھوپی کو اتنا مارتے تھے کہ وہ قبر کے کنارے پر پہنچ جاتی تھی۔ ان میں سے ایک جن بڑا بدمعاش تھا' وہ خاص طور پر میری پھوپی کو بہت تنگ کرتا تھا۔ میری پھوپی کی عمر بھی کوئی خاص نہیں تھی' یہی کوئی اٹھائیس تیس سال ہوگی۔۔۔"

"اچھا تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی

"تمہارا خیال ہے کہ میڈم کو بھی کوئی جن چمٹا ہوا ہے۔"

"اگر ایسی بات نہیں تو پھر وہ زنانی ہو کر زنانیوں کو ایسی گندی نظروں سے کیوں دیکھتی ہے۔ وہ جب مجھے ہاتھ لگاتی ہے تو اللہ کی قسمیں ایسا ہی لگتا ہے کہ کوئی مرد ہاتھ لگا رہا ہے۔"

"یہ سارا تیرا وہم ہے۔" میں نے کہا۔

ہماری باتوں کے دوران میں ہی ڈرائیور رشید بھی وہاں چلا آیا۔ وہ چوبیس پچیس برس کا خاموش طبع لیکن بڑا ہوشیار نوجوان تھا۔ میڈم اس پر کافی اعتماد کرتی تھی۔ کہنے کو تو وہ صرف ڈرائیور تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو ہفتے میں رشید سے میرے تعلقات کافی اچھے ہو گئے تھے۔ وہ فارغ وقت میں اکثر میرے پاس آ بیٹھتا تھا۔ وہ تاش کا رسیا تھا اور خود کو زبردست کھلاڑی سمجھتا تھا۔ وہ کھلاڑی تو تھا مگر ایسا زبردست نہیں تھا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو تین گنا بڑھا لیتا تو بھی تاش کے کھیل میں مجھے مات نہیں دے سکتا تھا۔ بہرحال میں اکثر اس سے ہار جاتا تھا۔ ہاں کھیل میں دلچسپی اور کشمکش برقرار رکھنے کے لیے کبھی اسے ہرا بھی دیتا تھا۔

آج بھی وہ فارغ تھا اور ناشتا کر کے آیا تھا۔ میں نے ناشتا کر لیا تو ہم عقبی لان میں چلے گئے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھیلنا شروع کر دیا۔ کھیل کے دوران میں میں بڑے غیر محسوس طریقے سے رشید کو میڈم کے حوالے سے کریدتا بھی رہتا تھا۔ میں نے آج پھر میڈم کی بات چھیڑ دی۔

میں نے کہا "یار رشید! کسی وقت تو قسم سے ایسے لگتا ہے کہ میڈم کے جسم کے اندر کوئی مرد چھپا بیٹھا ہے۔ کیا تمہیں بھی ایسے لگتا ہے؟"

رشید عجیب انداز سے زیر لب مسکرایا۔ وہ کچھ کہنے جا رہا تھا مگر پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے ہو۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ تمہارے دماغ پر ہر وقت میڈم ہی سوار رہتی ہے۔"

"اس لیے سوار رہتی ہے کہ تم کچھ بتاتے ہی نہیں ہو اس کے بارے میں۔"

"یہ ایک دکھری ٹائپ کا معاملہ ہے یار۔"

"کیسا دکھری ٹائپ کا۔"

"تم نے کبھی اخبار میں خبر پڑھی ہے کہ فلاں لڑکی اسپتال میں آپریشن کے بعد لڑکا بن گئی؟"

"ہاں ایسی خبر کبھی کبھی آتی رہتی ہے۔"

رشید بولا "بس یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔" میں سنانے میں رہ گیا۔ رشید بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن میں نے یہ بات سنی ہے کہ کوئی ایک سال پہلے میڈم کے اس طرح کے دو آپریشن ہوئے تھے۔ وہ آپریشن کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی سنا ہے کہ میڈم کے ڈاکٹرز نے بعد میں اسے علاج کے لیے انگلینڈ بھی بھیجا تھا۔"

"تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میڈم اب عورت نہیں ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اور شاید۔۔۔ وہ مرد بھی نہیں ہے۔"

رشید کی بات سے مجھے عرصہ پہلے دیکھی ہوئی ایک انگلش فلم یاد آئی' اس میں ایک ایسی ہی عورت کو بھٹکی ہوئی روح قرار دیا گیا تھا۔

"تم میڈم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟" میں نے رشید عرف شیدے سے پوچھا۔

"قریباً آٹھ مہینے ہو گئے ہیں میڈم کے پاس۔"

"کیا میڈم پہلے بھی ایسے ہی غصے کی تیز تھی۔"

"میڈم شروع سے ہی ایسی تھی۔ میرے پنڈ کا ایک بندہ چاچا رفیق' تین سال پہلے میڈم کی ڈرائیوری کرتا رہا ہے۔ وہ

کہتا ہے کہ میڈم اُس وقت بھی ذرا سی بات پر بندے کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتی تھی۔ پولیس کے محکمے میں میڈم کی بڑی دھاک تھی پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ میڈم نے ایک حوالاتی عورت کو اتنا مارا کہ اس کے پیٹ کا بچہ ضائع ہو گیا اور وہ بھی دو چار روز بعد مر گئی۔ میڈم پر کیس چلا۔ بعد میں اسے پولیس سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد میڈم نے ایک اسٹیٹ ایجنسی کھولی اور اس میں بھی کافی مال بنایا۔ پراپرٹی کے کام کے دوران میں ہی میڈم کی جان پہچان اس ڈیوی نامی بندے سے ہوئی جسے تم نے پہلے مکان میں دیکھا تھا۔ وہی بندہ میڈم کو اس "نئے کاروبار" میں لے آیا۔ اب میڈم ایک زبردست گینگ میں شامل ہے۔ بڑے تکڑے دار بندوں سے میڈم کی ہاتھ اللہ ہے۔ یہ ایسے بندے ہیں جن کے لیے انسان مارنا، مچھر مکھی مارنے کے برابر ہے۔ اس کام میں مال بھی بہت ہے۔ سمجھو گینگ کا ہر بندہ لکھ پتی تو ضرور ہے، ہو سکتا ہے کہ کئی کروڑ پتی بھی ہوں۔"

میڈم ہی کی باتیں ہو رہی تھیں جب اچانک پٹھان چوکیدار لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھ سے کہا "ماکن! تم کو بلا رہا ہے۔"

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ایک بہت اہم بات میرے دماغ سے نکل گئی تھی۔ کل میڈم کی طرف سے مجھے پیغام ملا تھا کہ میں صبح ناشتا نہیں کروں گا۔ میرے پوچھنے پر پیغام لانے والے ملازم نے بتایا تھا کہ یہ بات میڈم ہی کو معلوم ہے کہ انہوں نے ناشتے سے کیوں روکا ہے۔ بعد میں میں نے اپنے طور پر قیافہ لگایا تھا کہ شاید میڈم میرا کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرانا چاہتی ہے۔ دو دن پہلے بھی میں نے ڈاکٹر کو دیکھا تھا، اس نے دو تین ملازمین کا خون لیا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر کریم تھا جو بدنصیب لڑکے صادقے کے زخمی ہونے کے بعد کوٹھی میں آیا تھا۔ شواہد بتاتے تھے کہ ڈاکٹر کریم، میڈم کے کارندے کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں پٹھان چوکیدار کے ساتھ میڈم کی طرف چل دیا۔ میں الجھن میں تھا، اگر میں میڈم کو بتاتا کہ میں ناشتا کر بیٹھا ہوں تو اس نے بہت سیخ پا ہونا تھا، اگر یہ کہتا کہ ناشتا نہیں کیا تو پول کھل بھی سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ جس ملازم نے ناشتا لا کر دیا تھا، وہ اس بارے میں بتا بھی چکا ہو۔

جب میں نشست گاہ کی طرف بڑھا، میں نے ڈاکٹر کریم کو اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر مجھ پر دو باتیں واضح ہو گئیں۔ نمبر ایک مجھے ناشتے سے روکے جانے کی وجہ یہی تھی کہ میڈم میرا کوئی ٹیسٹ کرانا چاہتی تھی۔ نمبر دو میڈم جان چکی تھی کہ میں ناشتہ کر لیا ہے، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر کریم واپس جا رہا تھا۔

میں نشست گاہ میں داخل ہوا تو میڈم غصے سے تمتمائی بیٹھی تھی۔ غصے کے عالم میں اس کی بھوری آنکھوں سے گرم شعاعیں نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم نے ناشتا کیا ہے؟"

میں پاگل نہیں تھا کہ جھوٹ بول کر اپنا انجام مزید خراب کرتا۔ میں نے کہا "غلطی ہو گئی میڈم۔ میں بھول گیا تھا۔"

وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی "تمہیں پتا ہے کہ بندہ بات بھولتا کب ہے؟ جب وہ بات کو اور بات کرنے والے کو اہمیت نہیں دیتا۔ جب میں نے تمہیں اسپیشل پیغام بھجوایا تھا کہ تم ناشتا نہیں کرو گے تو پھر تمہیں یاد کیوں نہ رہا۔"

"میں اپنا قصور مانتا ہوں میڈم۔"

"بہت بڑا احسان ہے تمہارا کہ تم نے اپنا قصور مان لیا ہے۔ بہت بڑی نوازش ہے تمہاری۔" وہ دانت پیستی ہوئی بولی اور خطرناک انداز میں میری طرف بڑھی۔

میری آنکھوں میں صادقے کی مسلک پٹائی کا منظر گھوم گیا۔ مگر میں صادقا نہیں تھا، میں میڈم کا ہاتھ روک سکتا تھا بلکہ توڑ بھی سکتا تھا۔ اور ایسے تمام افراد کے ہاتھ توڑ سکتا تھا جو میڈم کی حمایت میں مجھ پر اٹھتے لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجھے اپنا بہروپ برقرار رکھنا تھا، اور بہروپ کی ڈیمانڈ یہی تھی کہ میں میڈم کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو روکنے کی کوشش نہ کروں۔ قریب آتے ہی میڈم نے ایک زنانے کا تھپڑ مجھے مارا۔ جو آدھا میرے ہاتھ پر اور آدھا گردن پر لگا۔ اس کے بعد تو میڈم جیسے پاگل ہی ہو گئی۔ اس نے مجھ پر ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اس کا منہ کٹری کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اس میں سے غلیظ ترین گالیاں ابل رہی تھیں۔ اس نے جنونی انداز میں میرے بال پکڑ لیے اور میرا چہرہ قالین پر رگڑنے کی کوشش کی۔

پھر اچانک وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے میری پسلیوں میں زوردار ٹھوکر لگائی اور مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے سے دفع ہو جانے کے لیے کہا۔

میں ہونٹوں سے رسنے والا خون پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔ ابھی دس پندرہ قدم ہی دور گیا تھا کہ میڈم نے پھر آواز دی۔ میں واپس آیا۔ وہ کڑک کر بولی "جاؤ، ٹیلی تاکی لے کر آؤ اور

صاف کرو قالین کو۔"

میرے ہونٹوں سے ٹپکنے والے خون کے چند قطرے قالین پر گرے تھے۔ یہ بالکل نیا قالین تھا۔ جس قالین پر چند دن پہلے نوجوان صادقے کی ناشکری تھی وہ یہاں سے اٹھوا دیا گیا تھا۔ میڈم کے نادر شاہی حکم پر میں گیلا کپڑا لے کر آیا اور میڈم کے قدموں میں بیٹھ کر خون صاف کرنے لگا۔ شاید اس وقت میڈم کے دماغ میں خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی طیش کا مظاہرہ کر گئی ہے۔ اس نے غیر متوقع طور پر مجھے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس نے نوکر سے کہہ کر میرے لیے مالٹے کا جوس منگوایا، اس میں گلوکوز بھی ملایا گیا تھا۔ وہ سخت لہجے میں بولی "میں بھلکڑ لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ آئندہ احتیاط کرنا، کل تو چھٹی ہے۔ پرسوں صبح یہاں آنا اور ناشتے کے بغیر آنا۔"

پھر وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی نشست گاہ سے باہر چلی گئی۔

اس کے جانے کے دو منٹ بعد ہی اس کا دست راست شفاف سر والا نور احمد عرف نوری اندر آیا۔ اس نے پانچ ہزار روپیہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "اس میں سے ایک ہزار تمہاری ساتھی لڑکی کے لیے ہے۔"

میں نے شکر گزاری کے انداز میں سر ہلا دیا۔ اندر سے میرا لہو کھول رہا تھا۔ یہ میڈم کتے کی بچی، اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سلوک کرتی تھی اور پھر ان کے ہاتھ میں روپے تھما کر سمجھتی تھی کہ اس نے اپنے سلوک کا مداوا کر دیا ہے۔

مجھے گاہے گاہے میڈم کی وہ نظریں بھی یاد آ رہی تھیں، جن سے اس نے مجھے پٹائی کے بعد دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی چمک تھی ان نگاہوں میں۔ شاید میڈم واقعی ایک بھٹکی ہوئی بدروح تھی۔ وہ عورت تھی مگر عورت رہنا نہیں چاہتی تھی۔ مرد بنی تھی مگر مرد بن نہیں سکتی تھی۔ وہ ایک درمیان میں لٹکی ہوئی ہستی تھی، جسے ہر دو اصناف سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زد میں آئے ہوئے ہر مرد عورت کو شدید رویے کا نشانہ بناتی تھی۔ اس کی اندرونی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ انسان تو کجا اس نے جانوروں کے درمیان بھی نادیدہ دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔ کوئی نر اپنی مادہ کے قریب بھی نہیں پھڑک سکتا تھا۔ ایک طرف تو وہ انہیں پال پوس رہی تھی، دوسری طرف انہیں فطرت سے دور رکھ کر ان پر ظلم بھی توڑ رہی تھی۔

اگلے روز میڈم کے حکم کے مطابق میں ناشتا کیے بغیر اس کے پاس حاضر ہوا۔ وہ نیکر اور سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ ڈاکٹر کریم بھی موجود تھا۔ اس نے مجھ سے میری عمر، تعلیم اور ازدواجی حیثیت وغیرہ کے بارے میں چند سوال کیے اور پھر ٹیسٹ کے لیے میرا خون ایک سرنج میں حاصل کر لیا۔

میڈم کچھ فاصلے پر بیٹھی اپنے کتے سے پیار کر رہی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر جب وہ ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ سوال میری زبان پر آ گیا جو پرسوں سے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب! یہ ٹیسٹ کس لیے ہے؟"

"یہ میڈم صاحب کو پتا ہو گا۔" وہ بڑے خشک لہجے میں بولا۔

میں نے دل ہی دل میں اس ضمیر فروش کو ایک گالی نکالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جس وقت میں کمرے سے باہر نکل رہا تھا پورچ میں ایک شاندار جیپ آ کر رکی۔ اس ٹویوٹا جیپ میں چھوٹی چھوٹی کھچڑی ڈاڑھی والا ایک فربہ اندام شخص بیٹھا تھا۔ اس نے سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ یہ سندھی ٹوپی اس لیے عجیب لگتی تھی کہ فربہ اندام شخص کا لباس پینٹ کوٹ اور ٹائی وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اس کے ساتھ ایک رائفل مین بھی تھا۔ دو افراد جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ جونہی جیپ رکی، رائفل مین دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ اس نے فربہ اندام شخص والی سائیڈ کا دروازہ کھولا۔ جب سندھی ٹوپی والے اس فربہ اندام شخص نے جیپ سے اترنے کے لیے پاؤں باہر نکالا، میں نے ایک عجب منظر دیکھا۔ رائفل مین نے جلدی سے جھک کر اس کے پاؤں کو چوما۔ اسی دوران میں میڈم بھی اندر سے نکل آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مردانہ وار سندھی ٹوپی والے سے مصافحہ کیا۔ میں نے شاید پہلی بار اس سخت گیر عورت کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ سندھی ٹوپی والے کے ساتھ آنے والے افراد باہر نکلنے کے بعد برآمدے میں ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ میڈم اپنے "معزز مہمان" کے ساتھ اندر چلی گئی۔ یہ شخص میڈم کا ساتھی تو ہرگز نہیں تھا۔ میڈم کے استقبالیہ انداز سے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پہلی بار اس سے ملی ہے۔ یہ شخص مجھے تو کوئی عطائی قسم کی شے لگا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دو بڑے بڑے فیروزے دمک رہے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ تھا۔ وہ میڈم کے ساتھ اندر جا چکا تھا مگر جو تیز خوشبو اس نے لگائی تھی وہ ابھی تک سارے پورچ اور برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رانو لان کی دھوپ میں بنی ٹھنی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "جہاں داد! تجھے کہا تھا ناکہ اس میڈم کو کچھ چمٹا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ پکی بات ہے کہ ابھی جو بندہ اندر گیا ہے وہ کوئی پہنچا ہوا بندہ ہے۔ ایسے ہی بندے 'لوگوں کے جن شن نکالتے ہیں۔ تم دیکھ لینا' یہ اندر جاکر میڈم کو کسی کمرے میں بند کرے گا' پہلے تو جن کو آرام سے کہے گا کہ وہ میڈم کو چھوڑ کر چلا جائے اگر وہ نہ مانا... اور عام طور پر جن مانتے بھی نہیں ہیں تو پھر یہ میڈم کو' میرا مطلب ہے کہ میڈم کے جن کو پھینٹی لگائے گا۔ میری پھوپی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔"

اس کے بعد اس نے اپنی پھوپی کے ہونے والی تاریخی مارکٹائی کی تفصیل بتانی شروع کر دی۔ اس مارکٹائی میں پھوپی بے چاری کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں مگر رانو اور دوسرے لوگوں کا خیال یہی تھا کہ یہ پھوپی کی نہیں درا صل جنات کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔

میں اور رانو باتیں کرتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ کل میڈم نے مجھے زدوکوب کیا تھا' اس کی نشانی میرا پھٹا ہوا ہونٹ تھا۔ رانو کئی بار اس ہونٹ کے بارے میں اور میری سوجی ہوئی انگلیوں کے بارے میں دریافت کر چکی تھی۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ رات کو سوتے ہوئے چارپائی سے گر پڑا تھا۔

رانو بولی "مجھ کو لگتا ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم منجی سے گرے ہو۔ منجی سے تو بچے گرتے ہیں۔"

میں نے کہا "سوہنیو' پیار محبت میں بڑا بھی بچہ ہی بن جاتا ہے۔ دماغ میں تو ہر وقت تم گھسی رہتی ہو۔ پتا نہیں کیا دیکھا رات کو کہ چارپائی سے گر پڑا۔"

"تو بڑا کھوچل ہے جہاں داد۔ بس باتیں بناتا رہتا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے کہ میں تجھے کچھ کر کے دکھاؤں۔ اچھا چل آ ذرا میرے پاس بیٹھ۔" میں نے اس کا بازو پکڑا۔

"ہائے میں مرگئی۔" اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا "میڈم نے دیکھ لیا تو میری کھال اتار دے گی اور ساتھ میں تیری بھی۔"

"او ہو۔ ذرا سی چونچ لڑانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے جان بوجھ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

وہ جو ہر وقت شعلہ جوالا بنی رہتی تھی' آج کل بالکل برف ہو رہی تھی۔ بازو چھڑاتے ہوئے بولی "نہ بابا نہ۔ مجھ میں اب گٹ کھانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"پر میرے اندر جو آگ لگی ہے اس کا کیا کروں؟"

"ڈیرے پر جاکر جو مرضی کر لینا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ ڈیرے پر جانے سے پہلے ہی تو نے میرا دل کھٹا کر چھوڑنا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے حفظ ماتقدم کے طور پر کہا۔

وہ "ممی آن سنی" کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

سارا دن میرے ذہن میں یہ مسلسل یہ سوال گونجتا رہا کہ میڈم اس طرح ملازمین کا خون ٹیسٹ کیوں کروا رہی ہے۔ کوئی گہرا چکر لگ رہا تھا۔ طوطے کی ناک والا ڈیوی بھی ایک بار شکل دکھانے کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔ جب بم ناکارہ ہونے کا انکشاف ہوا تھا تو ڈیوی سخت سیخ پا ہوا تھا اور بھناتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ میڈم اس کے پیچھے بھاگی تھی مگر شاید اسے ٹھنڈا نہیں کر پائی تھی۔ اس کے بعد میڈم کا پارا عروج کو پہنچ گیا تھا' یہاں تک کہ جنونی کیفیت میں اس کے ہاتھوں اس کا بھائی ہی مارا گیا تھا۔

یہ اسی دن کی بات ہے میں نے شام کو ناور جگی کی پرانے ماڈل کی جیپ پورچ میں کھڑے دیکھی۔ یہ جیپ رانو نے بھی دیکھ لی تھی اور بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کو توقع پیدا ہو گئی تھی کہ ناور اسے میڈم کی ذو سے نکال کر لے جائے گا۔ وہ بے چاری یہاں ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہی تھی۔

ناور کوئی ایک گھنٹا میڈم کے پاس موجود رہا پھر وہ ہمارے پاس چلا آیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ تہبند قمیص میں تھا۔ اس نے اپنے سر پر دوپٹہ سا اوڑھ رکھا تھا' منہ سے شراب کی بو بھی آ رہی تھی۔ شاید میڈم کے پاس بیٹھ کر اس نے ایک دو پیگ لگائے تھے۔ وہ بولا "جہاں داد! میڈم تجھ سے خوش ہے۔ میں رانو کو واپس لے جا رہا ہوں مگر تم ابھی یہیں رہو گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جو آپ کا حکم۔" میں نے کہا۔

ناور نے رانو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کڑیئے! تو جا اپنا سامان شمان باندھ۔"

"یہ جہاں داد نہیں جائے گا؟" رانو نے پوچھا۔

"کہہ تو رہا ہوں کہ ابھی نہیں جائے گا۔ میں فارسی بول رہا ہوں۔" رانو اپنا سامنہ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے اس سارے معاملے میں کوئی گڑبڑ نظر آ رہی تھی۔ آخر ایسے لوگوں کا ساتھ نبھاتے ہوئے ایک مدت ہو گئی تھی۔

ان کے انداز میرے لیے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ناور نے اپنی قمیص کے نیچے سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بولا "یہ میڈم نے تیرے لیے دیے ہیں۔ پتا ہے کتنے ہیں' پورے پندرہ ہزار ہیں۔ اس میں سے دو تین ہزار خرچے مرچے کے لیے رکھ لے' باقی اپنے پچھلوں کو بھیج دے رحیم یار خاں میں۔"

"خرچے مرچے کے لیے تو میرے پاس ہیں۔ کل صبح بھی میڈم نے پانچ ہزار روپیہ دیا تھا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں یہ سارے تیرے گھر والوں کو بھجوا دیتا ہوں۔ ایڈریس تو ادھر ڈیرے پر پڑا ہی ہوا ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی جناب۔"

"تیرے ایک دو کپڑے اور کام کی دوسری چیزیں ڈیرے پر پڑی ہیں' وہ میں نے اختر کے پاس رکھوا دی ہیں۔"

ناور جگی کی باتوں سے مجھے خطرے کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ناور نے مجھے کسی خطرناک کام کے لیے میڈم کے حوالے کر دیا ہے اور اس کا باقاعدہ معاوضہ وصول کر کے رانو کے ہمراہ واپس روجھان پور جا رہا ہے۔ جیسا کہ چند دن بعد انکشاف ہوا میرے یہ سارے اندازے درست تھے۔ ناور نے مجھے ایک ایسے کام کے لیے میڈم کے حوالے کیا تھا جس میں میری موت کا امکان ۹۵ فیصد کے قریب تھا۔ ناور نے میری جان کی قیمت میڈم سے پورے چالیس ہزار روپے وصول کی تھی۔ میڈم نے پچیس ہزار روپے میرے لیے علیحدہ دیے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ رقم میرے لواحقین کو پہنچا دی جائے۔ تاکہ اگر میں میڈم کے تجربے کے دوران میں اللہ کو پیارا ہو جاؤں تو میرے پچھلوں کی اشک شوئی ہو سکے۔ ناور نے اس پچیس ہزار کے مجھے پندرہ ہزار بتائے تھے اور یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ پندرہ بھی بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں۔

بہرحال یہ انکشافات تو چند دن بعد ہوئے۔ فی الوقت تو میں صرف الجھن میں گرفتار تھا۔ وقتِ رخصت رانو نے مجھے الوداعی نظروں سے دیکھا۔ اور شاید نظروں نظروں میں یہ بھی کہا کہ ڈیرے پر آؤ گے تو پھر تم سے بات کروں گی۔ ناور جگی نے بھی شانہ تھپک کر چند الوداعی کلمات کہے اور اپنی جیپ میں وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔

ایک دو روز تو وہاں خیریت سے گزرے۔ کوٹھی میں میرا کام اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ بستر پر پڑ کر اینٹھتا رہوں یا پھر ڈرائیور رشید کے ساتھ تاش وغیرہ کھیل لوں۔ میں جب سے یہاں آیا تھا کوٹھی میں موجود ہر شخص سہما سہما نظر آتا تھا۔ اس طور سے نوجوان لڑکے صادق کی اچانک موت کے بعد تو جیسے ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اگر کوٹھی میں ورجنوں پالتو جانور نہ ہوتے اور ان کی آوازیں نہ گونجتی رہتیں تو شاید اس وسیع کوٹھی میں قبرستان کا سا سناٹا ہوتا۔ رات کے وقت دروازے بند کرنے کے بعد کوٹھی کے بیرونی احاطے میں تین خطرناک کتے کھلے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ ان کتوں کی بھاری بھرکم آوازیں رات بھر کوٹھی میں گونجتی تھیں۔ جانوروں کی آوازوں میں سے ایک اہم آواز ایک مور کی بھی تھی۔ وہ کئی دنوں سے بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک طرح کی کراہٹ تھی' ایک درد بھری پکار تھی۔ شاید یہ پرندہ بھی اس درد جدائی کا مارا ہوا تھا جو یہاں موجود سارے جانداروں کی قسمت میں تھا۔

میں اکثر ڈرائیور رشید یا پٹھان چوکیدار کے ساتھ ہی کھانا کھاتا تھا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے جب دوپہر کا کھانا مجھے علیحدہ کمرے میں بھجوا دیا گیا۔ کھانا لانے والے ملازم نے کہا' ڈرائیور رشید کام سے گیا ہوا ہے جبکہ پٹھان ملازم کی طبیعت ٹھیک نہیں' وہ آج کھانا نہیں کھائے گا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ شکوک تو میرے ذہن میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ میں نے اس کھانے میں سے صرف دہی کی لسی پی' باقی سارا کھانا ایک موی لفافے میں لپیٹ کر کوٹھی کے پچھواڑے خالی پلاٹ میں پھینک دیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کھانے میں کوئی گڑبڑ تھی۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اکثر لیٹ جاتا تھا۔ آج بھی لیٹ گیا۔ مجھے لیٹے ہوئے ایک گھنٹا ہوا تھا جب اچانک میرے سارے قیافے درست ثابت ہو گئے۔ اپنے قیافوں کے اس طرح درست ثابت ہونے پر مجھے دلی مسرت محسوس ہوئی۔ مجھے بالکل یہی لگا جیسے میں نے گھپ اندھیرے میں ایک تیر چلایا تھا اور وہ بالکل نشانے پر لگا ہے۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ پٹھان چوکیدار رحمان اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر تک میرا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ہولے سے آواز دی "جہاں داد... او برادر جہاں داد۔"

میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ چوکیدار نے آگے بڑھ کر مجھے کندھے سے ہلایا' دو تین بار مزید مجھے پکارا پھر وہ باہر چلا گیا۔

چند منٹ بعد چوکیدار کے ساتھ دو بندے مزید اندر داخل ہوئے۔ ان کی آوازوں سے مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ کوٹھی کے ہی ملازم ہیں۔ یہ تسلی کرنے کے بعد کہ میں بے ہوشی کی کیفیت میں ہوں۔ مجھے اٹھا کر ایک اسٹریچر پر ڈالا گیا

اور ایک اندرونی راہداری سے ہاتھوں ہاتھ گزار کر میڈم کی نشست گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ وہیں اسٹریچر کو قالین پر رکھ دیا گیا تھا۔ میڈم کی نشست گاہ میں مجھے دو جانی پہچانی آوازیں سنائی دیں۔ ایک بھاری بھرکم آواز میڈم کی تھی اور دوسری بھاری بھرکم اسی سندھی ٹوپی والے کی جسے چند روز پہلے میں نے بڑے طمطراق سے ٹویوٹا جیپ سے اترتے دیکھا تھا۔ مجھے نشست گاہ میں چھوڑ کر پٹھان چوکیدار کے سوا باقی افراد وہاں نما کمرے سے نکل گئے۔ پٹھان چوکیدار میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی نسوار کی بو والی سانس میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی مگر اس بو پر وہ خوشبو بہت حاوی تھی جو سندھی ٹوپی والے نے لگا رکھی تھی۔ یہ عجیب طلسماتی سی خوشبو تھی اور یوں لگتا تھا کہ سیدھی دماغ کے اندر گھس کر اسے اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔

سندھی ٹوپی والا فربہ اندام شخص میرے قریب آیا۔ نیچے بیٹھ کر اس نے میری نبض دیکھی' میرے ناخنوں کا رنگ دیکھا۔ پلکیں اٹھا کر پتلیوں کا معائنہ کیا' پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ میڈم کے قریب جا بیٹھا "تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میڈم اور سندھی ٹوپی والا کھسر پھسر کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ بس کوئی کوئی لفظ میری سمجھ میں آتا تھا۔ میڈم' ٹوپی والے کو ابدال جی کہہ کر بلا رہی تھی۔ وہ میڈم کو میڈم ہی کہہ رہا تھا۔ ابدال جی نے ایک دو ایلوپیتھک دواؤں کے نام لیے پھر کسی سانپ کا ذکر کیا۔ میڈم نے پوچھا کہ کتنا ٹائم لگے گا؟ ابدال جی نے کہا' زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا۔ بس اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور بہت گہری سانسیں لے رہا تھا۔

میرے سر کی طرف کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے پٹھان چوکیدار اور ابدال جی کوئی شے اٹھا کر میری طرف لا رہے ہیں۔ آنکھوں میں تھوڑی سی درز کر کے میں نے دیکھا' یہ شیشے کا بنا ہوا ایک خول تھا۔ اس خول کو ایک چھوٹے سے گنبد کا نام دیا جاسکتا تھا مگر یہ گنبد گول نہیں بلکہ بیضوی تھا۔ اس کی لمبائی اتنی تھی کہ میں اس کے نیچے باآسانی لیٹ سکتا تھا۔ اونچائی چار فٹ سے زائد تھی۔ ابدال جی نے چوکیدار کے ساتھ مل کر شیشے کا یہ بیضوی گنبد بڑی احتیاط سے اٹھایا اور میرے اوپر رکھ دیا۔ اب میں اسٹریچر سمیت اس گنبد یا خول کے اندر تھا۔

میرے جسم میں سنسنی کی لہریں پھیلنا شروع ہوگئی تھیں۔ یہ "ابدال جی" نامی شخص مجھے پہلی نگاہ میں ہی کوئی عامل یا عطائی قسم کی شے لگا تھا۔ اب میں اس عطائی کے قبضے میں تھا اور میڈم نجانے اس کے ہاتھوں میرے ساتھ کیا سلوک کروانے والی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ کسی خاص مقصد کے لیے میرے جسم سے خون حاصل کیا جائے گا۔ میں نے آنکھوں میں تھوڑی سی درز بنا کر دیکھا۔ شیشے کا جو بیضوی خول میرے اوپر رکھا گیا تھا' اس کی چھت میں ایک چھوٹا سا سوراخ بھی تھا جسے شیشے اور اسٹیل کے ڈھکنے سے بند کیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ابدال جی اس گول سوراخ کے اوپر جھکا اور تھوڑی سی سفید روئی اندر پھینک دی۔ یہ وہی تیز خوشبو تھی جو ابدال جی لگاتا تھا۔ جونہی طلسماتی خوشبو میں بسی ہوئی یہ روئی خول کے اندر گری' پورا خول مہک گیا۔ یہ قدرتی نہیں بلکہ کیمیکل خوشبو تھی۔ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا اور سانس لینے میں بھی قدرے دشواری ہوئی۔ روئی پھینکنے کے بعد سوراخ دوبارہ بند کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خول سے باہر میڈم اور ابدال جی میں جو باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ سر کا بھاری پن کم ہوگیا۔ سانس بھی آسانی سے آنے لگی طبیعت میں ایک طرح کی فرحت اور سکونت پائی جانے لگی تھی پھر "ابدال جی" کی صورت دوبارہ خول سے باہر نظر آئی۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھوں پر مجھے سفید دستانے نظر آرہے تھے۔ پٹھان چوکیدار غالباً کمرے سے جا چکا تھا' اب میڈم اور ابدال جی کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ ابدال جی نے خول کا سوراخ ایک بار پھر کھولا۔ وہ براہِ راست میری طرف دیکھ رہا تھا لہٰذا میں نے اپنی آنکھیں مکمل طور پر بند کرلیں۔ ابدال نے سوراخ میں سے کوئی شے خول میں پھینکی اور سوراخ پھر سے بند کر دیا۔

جو چیز اس نے پھینکی تھی وہ میری ٹانگوں کی طرف گری تھی۔ میں آنکھوں میں درز پیدا کر کے بھی اس شے کو دیکھ نہیں سکتا تھا پھر اچانک میرا دل زور سے دھڑکا۔ مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے بالکل قریب سانپ کی خوفناک پھنکار سنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پتا چلا کہ کوئی زندہ جسم میری پنڈلیوں پر رینگ رہا ہے اور یہ جسم ایک نہیں تھا دو تھے۔ ایک میری پنڈلیوں پر تھا اور دوسرا میرے دائیں کندھے کے بالکل پاس۔ پھر جو کندھے کے پاس تھا' وہ رینگتا ہوا میرے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے اپنی آنکھوں میں درز پیدا کر کے اس دشمن جاں کو دیکھا۔ وہ

حشرات الارض کے قبیلے کا موذی ترین رکن سیاہ کوبرا تھا۔ اس کا چمکیلا پھن کم و بیش پانچ انچ چوڑا تھا اور اس کا قریباً تین کلو بلاکت خیز وزن میرے سینے پر دھرا تھا۔

یہ آزمائش کا وقت تھا۔ بے ہوشی کا ناٹک برقرار رکھنا اب ایک مشکل ترین عمل تھا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا تھا مگر زیادہ دیر نہیں لیٹ سکتا تھا۔ ذہن میں مختلف سوالات نے بھگدڑ مچا رکھی تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور کیوں؟ کیا میڈم اور ابدال جان لینا چاہ رہے تھے۔ اگر وہ میری جان ہی لینا چاہتے تھے تو پھر خون کے ٹیسٹ' دوائیاں اور یہ شیشے کا خول وغیرہ یہ سب کیا معنی رکھتے تھے۔ کیا مجھ پر کوئی تجربہ کیا جا رہا تھا؟ اور اگر واقعی تجربہ ہو رہا تھا تو پھر اس تجربے کا تعلق یقیناً میڈم شہزادی کی ابنارمل شخصیت سے تھا۔ شاید اس بھٹکی ہوئی روح نے کسی منزل تک پہنچنے کے لیے "ابدال جی" نامی اس عطائی کی خدمات حاصل کی تھیں؟ چند لمحوں کے اندر اندر ان گنت سوال میرے ذہن سے گزر گئے۔

میرا پورا بدن ان لمحوں میں لوہے کی طرح اکڑا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی دونوں زہریلے سانپوں میں سے کسی کے زہریلے دانت میرے جسم میں پیوست ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے حرکت میں آجانا چاہیے۔ لیکن عین اسی لمحے ایک اور خیال میرے ذہن میں لپکا اور بجلی کی طرح پورے جسم میں کوند گیا۔ میں اپنی ایک غیر معمولی صلاحیت کو بالکل فراموش کیے بیٹھا تھا۔ کسی بھی طرح کے زہر کے خلاف میرے جسم میں ایک حیرت انگیز "مدافعت" موجود تھی اور یہ مدافعتی قوت اب کوئی وہم نہیں تھی' ٹھوس حقیقت بن چکی تھی۔ میں کئی بار بڑی وضاحت سے اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ سائیں کا دیا ہوا یہ تحفہ اب ایک "ناقابلِ تردید سچ" کی حیثیت سے میرے پاس تھا۔ میں نے اپنے حوصلے کو جمع کیا اور دونوں مہلک سانپوں کے درمیان بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ چھاتی پر چڑھا ہوا سانپ اب میری گردن پر رینگ رہا تھا۔ اس کا لجلجا گرم لمس میرے بدن میں جھرجھری پیدا کر رہا تھا۔ اس کا پیٹ نیچے سے کھردرا تھا اور مجھے نہانے والے برش کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ گردن پر پہنچ کر موذی جانور نے رخ پھیرا اور میرے کھلے گریبان میں سر گھسیڑ کر میرے کندھے تک پہنچ گیا۔ اس کی بل کھائی ہوئی دم میرے کان کے قریب تھی اور پھنکار کی آواز بھی سے پیدا ہو رہی تھی محسوس ہوا جو ہوتا تھا۔ سانپ کے جسم نے جھٹکا کھایا اور میرے کندھے پر جیسے کسی نے جلتا ہوا انگارا رکھ دیا۔ سانپ نے مجھے ڈنک مارا تھا۔ میں نے اپنی کراہ بمشکل اپنے ہونٹوں کے اندر روکی۔

سانپ کے دانت گوشت میں پیوست ہونے کے بعد درد کی ایک لہر بازو میں اٹھی تھی اور پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ ابھی میں درد کے اس پہلے شدید جھٹکے سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ پاؤں کی طرف رینگتا ہوا دوسرا سانپ میری پنڈلی پر آگیا۔ اس کے جسم کا پچھلا حصہ میرے پاؤں کے گرد بل کھائے ہوئے تھا۔ گرم گرم لجلجا جسم جس کے اندر جان لیوا زہر تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دوسرا سانپ بھی جلد ہی مجھے ڈنک مارے گا۔ شاید ڈنک سے بھی زیادہ تکلیف ڈنک کے انتظار کی تھی۔ میں نے اپنا دل کڑا کر لیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں میرے ہونٹوں سے کراہ نہ نکل جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میڈم اور "ابدال جی" کی نظروں میں میری بے ہوشی مشکوک ٹھہر سکتی تھی۔ پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی اور پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ پہلے سانپ کے حملے کے صرف پچیس تیس سیکنڈ بعد دوسرے سانپ نے بھی کارروائی ڈال دی۔ اس نے میری پنڈلی پر دانت گاڑے۔

ایک بار پھر درد کی شدید لہر اٹھی۔ اس طوفانی لہر کو میں نے اپنے ہونٹوں کے کناروں کے اندر بمشکل روکا۔ میرا پورا بدن اینٹھ رہا تھا۔ شاید میری پیشانی پر پسینے کی نمی بھی نمودار ہوگئی ہو۔ یہ خیال سوہانِ روح تھا کہ میرے جسم میں دو عدد کوبرا سانپوں کا زہر داخل ہو چکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "کوبرا" کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ یعنی دیکھتے ہی دیکھتے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جو ذرا سخت جان ہوتے ہیں' وہ کچھ وقت نکال بھی لیتے ہوں گے۔ کچھ لوگوں کو فوری طور پر ابتدائی طبی امداد دی جاتی ہے جس کے بعد وہ زندہ سلامت اسپتالوں تک بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن یہاں تو صورتِ حال مختلف تھی۔ مجھے ایک نہیں دو سانپوں سے کٹوایا گیا تھا' اور طبی امداد کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ نفسیاتی اثر تھا کہ مجھے اپنے پورے بدن میں چنگاریوں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ گلے کی نالیاں اندر سے چٹخنے جلنے جا رہی ہیں۔

یہ بڑے اذیت ناک لمحے تھے۔ میں نے اپنے یقین کی بنیاد پر خود کو ایک نہایت کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا اور وہ یقین یہ تھا کہ مجھ پر زہر اثر نہیں کرتا۔ خود کو آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ مجھے اتنی جلدی میں کرنا پڑا تھا کہ میں اس کے نتائج و عواقب پر پوری طرح غور نہیں کر سکا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میرے اندر زہر کے خلاف جو قوتِ مدافعت' موجود

نہ وہ کس پیمانے تک کام کر سکتی ہے پھر مجھے یہ ادراک بھی نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ قوت مدافعت میرے اندر کم ہوتی ہے یا زیادہ... یا یکساں رہتی ہے۔ ان گنت اندیشے ذہن پر یلغار کر رہے تھے اور میں شیشے کے اس بیضوی خول کے اندر بے حرکت پڑا تھا۔

قریباً بیس منٹ تک میں شدید ترین اذیت میں رہا۔ یوں لگتا تھا کہ موت کے ہرکارے دہکی ہوئی نوکیلی سلاخیں لے کر میری رگوں میں گھس گئے ہیں اور مسلسل ضربیں لگا رہے ہیں۔ پورا جسم تڑخ رہا تھا۔ میں اندر سے تڑپ رہا تھا لیکن باہر سے ساکت تھا۔ کبھی سامنے عالی کا ہیولا رونما ہونے لگتا' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ اٹھاتا اور کہتا "کچھ نہیں ہوگا شفیع محمد! کچھ نہیں ہوگا۔" کبھی نزہالہ کا چہرہ تصور میں ابھرتا' میری اذیت کو بھانپ کر اس کی نگاہیں نم دیدہ ہو جاتیں' کبھی شفقا کی شبیہ ذہن میں آتی' مجھے اس کی آواز کسی کنویں میں سے آتی محسوس ہوتی "آپ میرے پاس آ کر بھی میرے پاس نہیں آئے۔ آپ کیسے بھائی جان ہیں۔ میں آپ سے نہیں بولوں گی۔"

کتنی ہی دیر تک ذہن پر یہ اندھیرے اجالے کی سی کیفیت طاری رہی' پھر یہ کیفیت اور درد کی بے اماں لہر اچانک ہی کم ہونے لگی۔ شاید مشکل ترین مرحلہ گزر گیا تھا۔ میں پہلے کی طرح ایک بار پھر زہر کی ہلاکت خیزی سے محفوظ رہا تھا۔ بہرحال میں ابھی مکمل طور پر نارمل نہیں ہوا تھا۔ میرا پورا بدن آگ کی طرح تپ رہا تھا اور دھڑکن بہت تیز تھی۔ میں نے آنکھوں کی جھری میں سے دیکھا۔ ابدال جی کا دستانہ پوش ہاتھ سوراخ کے راستے شیشے کے خول میں داخل ہوا' یکے بعد دیگرے اس دستانہ پوش ہاتھ نے دونوں سانپ خول میں سے نکال لیے۔ ڈھکنا پھر بند کر دیا گیا۔

پانچ منٹ بعد شیشے کا بیضوی خول میرے اوپر سے ہٹا دیا گیا۔ ابدال جی نے بہت قریب سے میرا معائنہ کیا۔ اس کے بعد ایک سوئی میرے بائیں بازو کی نس میں داخل کر دی۔ میں نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا' میرا خون پلاسٹک کے مخصوص تھیلے میں جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ایک بیگ بھر گیا تو دوسرا لگا دیا گیا اور پھر تیسرا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ دو نہایت زہریلے سانپوں سے ڈسے جانے کے باوجود میں زندہ تھا' اور اب یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میرے جسم سے خون نکال کر مجھے مارا جا رہا تھا۔ زہر کی مدافعت تو سانپوں کی بخشی ہوئی کرشماتی قوت نے کر دی تھی مگر جسم خون سے خالی ہو جاتا تو پھر کس شے نے کام دکھانا تھا.... چوتھے کے بعد پانچواں بیگ لگا تو میرے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے اور ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اب بے حرکت پڑے رہنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں تیزی سے سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے۔ کمرے میں عطائی ڈاکٹر ابدال جی اور میڈم کے سوا اور کوئی نہیں تھا' ان دونوں پر قابو پانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر اس کے بعد... وہ سارا ڈراما فلاپ ہو جانا تھا جسے کامیاب کرنے کے لیے میں نے اب تک خلاف طبیعت باتیں برداشت کی تھیں اور کر رہا تھا۔

خون کا پانچواں بیگ بھرا جا رہا تھا جب ابدال جی نے "پی آر بٹس" کا استعمال شروع کر دیا۔ وہ میرا بلڈ پریشر چیک کرنے کے ساتھ ساتھ مدھم آواز میں میڈم سے باتیں بھی کر رہا تھا "وَنڈرفل! بندہ سخت جان ہے۔ شاید اس کی جان بھی بچ جائے۔" ابدال جی نے کہا۔

"مگر رنگ تو بالکل پیلا پڑ گیا ہے۔"

"بس ہمیں ایک بیگ اور چاہیے۔ آپ فوراً ڈاکٹر کریم کو بلائیں۔"

میڈم تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ساتھ ہی مردانہ قدموں کی آواز بھی تھی پھر میں نے ڈاکٹر کریم کی آواز بھی سنی۔ ایک اسٹیتھوسکوپ میرے سینے پر آیا۔ ڈاکٹر کریم نے میری نبض ٹٹولی۔ پلکیں اٹھا کر میری پتلیاں دیکھیں۔ "انجکشن تیار کرو ڈاکٹر۔" ابدال جی نے ڈاکٹر کریم سے کہا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ "اینٹی پوائزن" خاص سانپ کے کاٹنے کا انجکشن تھا۔

میرے جسم سے خون کا چھٹا بیگ نکالنے کے فوراً بعد یہ انجکشن مجھے لگا دیا گیا' اس کے ساتھ ہی بلڈ ٹرانسفر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ مجھے بڑی تیزی سے خون دیا جا رہا تھا۔ خون جسم میں داخل ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے زندگی کے بجھتے ہوئے دیے میں پھر سے تیل ڈال دیا گیا ہے۔ یہ لہو جسم کے اندر ایندھن کا کام ہی تو کرتا ہے۔ میرا بلڈ پریشر ایک بار پھر بحال ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تیسرا بیگ خون میرے جسم میں داخل ہو گیا تو انتقال خون کی رفتار کم کر دی گئی۔ ڈاکٹر کریم نے ابدال کے مشورے سے دو تین مزید انجکشن مجھے ٹھونک دیے تھے۔ وہ بار بار میرا بلڈ پریشر اور نبض وغیرہ چیک کر رہا تھا۔

دوسری طرف میرے جسم سے حاصل کردہ زہریلے خون کو کسی نامعلوم عمل سے گزارا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھوں کی درز سے دیکھا تو ایک گوشے میں ادھورا سا منظر نظر آیا۔ ابدال جی شیشے کی ایک گول صراحی پر جھکا ہوا تھا۔ اس صراحی سے شیشے

کی دو نلکیاں نکل کر ایک دوسرے جار میں داخل ہو رہی تھیں۔ شاید کچھ اور لوازمات بھی ہوں گے مگر مجھے بس اتنا ہی نظر آیا۔ سارے کمرے میں وہ نہایت تیز خوشبو بکھرا رہی تھی جو سنہری ٹوپی والے نے فراوانی سے اپنے لباس پر استعمال کر رکھی تھی۔

میڈم اور ابدال جی مدھم سی آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا بس کوئی کوئی لفظ ہی میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میرے جسم میں خون کی مقدار مناسب حد تک پہنچنے میں قریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اسی دوران میں ابدال جی اور میڈم کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں کمرے میں موجود نہیں تھے' غالباً کسی دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر کریم نے میرے گال تھپتھپانا شروع کر دیے۔ ساتھ ہی وہ خوش گوار سے انداز میں بولا "آ جا ہوش میں بدبخت... آ جا۔" یہ ایک طرح سے میرے لیے اطلاع تھی کہ میں ضرورت سے زیادہ بے ہوشی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی پلکوں میں تھوڑی سی جنبش پیدا کی پھر ہونٹوں کو ذرا سی حرکت دی۔ بتدریج میں "ہوش" میں آنا شروع ہو گیا۔ دو افراد نے میرا اسٹریچر اٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے واپس میرے کوارٹر میں لے جا رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے قریب ہی ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے ایک صاف ستھرے بستر پر لٹا کر ٹانگوں پر چادر اوڑھا دی گئی۔ میں نے خود کو تھوڑا کسمسانا شروع کر دیا تھا۔ میں ظاہر کر رہا تھا کہ ہوش میں آ چکا ہوں تاہم ابھی گہری غنودگی میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ابدال جی بھی مجھے دیکھنے کے لیے آیا۔ دونوں انگریزی میں بات کرنے لگے۔ ابدال جی نے کہا "قابل رشک بندہ ہے۔ علاج کی کامیابی کا امکان دو سو فیصد بڑھ گیا ہے۔" "میں سمجھا نہیں؟" ڈاکٹر ابدال نے دبے لہجے میں کہا۔

"دوسری بار دوسرے بندے کا بلڈ ٹرانسفر کرنے کی بجائے پہلے بندے کا ہی ٹرانسفر کیا جائے تو کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا بچنا ہماری خوش قسمتی ہے۔"

"دوسری TRANSFUSION (منتقلی خون) کب ہوگی؟" ڈاکٹر کریم نے پوچھا۔

"کم از کم ایک ماہ بعد۔" ابدال جی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا "بہتر ہے کہ تم بھی دو تین گھنٹے مزید یہاں رہو۔ اس کی نبض وغیرہ چیک کرتے رہو۔ اس کے نارمل ہونے کے بعد ہی تمہیں یہاں سے جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کرتا ہوں۔" ڈاکٹر کریم نے کہا۔

ڈاکٹر کریم سے چند باتیں مزید کرنے کے بعد ابدال جی وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس کی تیز خوشبو بھی معدوم ہو گئی۔

ابھی یہاں جو گفتگو ہوئی تھی اس سے مجھ پر یہ اہم انکشاف ہوا تھا کہ آج جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے یہ ایک بار پھر دہرایا جانے والا ہے۔ شاید چار پانچ ہفتے بعد مجھے پھر اسی تکلیف دہ عمل سے گزارا جائے گا۔ اس کے علاوہ دوسرا انکشاف یہ تھا کہ میں میڈم اور اس کے بدبخت معالج کے لیے خاص الخاص اہمیت اختیار کر گیا ہوں۔ میرے زندہ بچ جانے کے سبب میڈم کے علاج کی کامیابی یقینی ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر کریم کی موجودگی میں ہی قریباً ایک گھنٹے بعد میں مکمل "ہوش" میں آ گیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر کریم نے میرے کندھے اور پنڈلی پر بینڈیج بھی کر دی تھی۔ انہی دونوں جگہوں پر سانپوں نے اپنے دانت آزمائے تھے۔ "ہوش" میں آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور کیسے یہاں پہنچا ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر کرو تمہاری جان بچ گئی ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا تھا مجھے؟" میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ یہ نقاہت حقیقی تھی۔

"تمہیں سانپ نے ڈسا ہے' دو جگہ پر۔ یہ دیکھو یہاں کندھے پر... اور یہ پنڈلی پر۔"

میں نے مناسب ردعمل ظاہر کیا اور اپنے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات پیدا کر لیے۔ ڈاکٹر کریم نے کہا "تم اپنے کمرے میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ تو شکر ہے کہ چوکیدار رمضان تمہارے کمرے میں گیا اور اس نے دیکھ لیا۔ نوکر تھا کر تمہیں یہاں لے آئے۔"

"مجھے کچھ پتا نہیں ڈاکٹر جی۔ میں تو کھانا کھا کر لیٹا تھا۔ اس کے بعد خود کو یہاں دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر پھر سے لٹا دیا "نہیں نہیں' لیٹے رہو۔" اس نے قدرے ملائمت سے کہا۔ "تم کو سانپ کے کاٹنے کا انجکشن دیا ہے ہم نے۔ تم جتنا آرام کرو گے اتنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔"

"سانپ پکڑا گیا یا نہیں؟" میں نے منطقی سوال کیا۔

"بس... پکڑا گیا تھا۔ مار دیا ہے۔" ڈاکٹر نے زور دے کر کہا۔ وہ ایک ایسی چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا تھا جس کا میری کیفیت میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ سانپ تو یہ لوگ خود لائے اور

انہوں نے ہی مجھے ڈسا تھا۔ میڈم اور ابدال جی کی گفتگو میں، میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ ابدال جی کا خیال تھا کہ اس عمل میں میرے بچنے کا امکان پانچ دس فیصد سے زیادہ نہیں۔ اب میں بچ گیا تھا اور ان کے لیے قیمتی بھی ہو گیا تھا۔

○☆○

میڈم شہرزاد سے میری ملاقات اسی کمرے میں تیسرے روز ہوئی۔ میڈم حسب معمول جینز اور شرٹ میں تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ تر و تازہ اور سرخ نظر آئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ سرخی اور تازگی میرے خون ہی کی ہے۔

"اب تم کیسے ہو جان والو؟" میڈم نے ملائمت سے کہا۔

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اللہ کے بعد آپ ہی کا شکر گزار ہوں جی۔ اگر آپ اپنے نوکر پر اتنا ترس نہ کرتیں تو شاید میری لاش بھی گل گئی ہوتی۔"

"نہیں نہیں، بچانے والا اللہ ہے۔ تمہاری زندگی نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتا تھا۔" اس نے اپنے لیے مذکر صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے میڈم؟"

"حکم یہی ہے کہ تم چند دن آرام کرو۔ ڈاکٹر کریم روزانہ تمہیں دیکھنے کے لیے آئے گا۔ تم اسی کمرے میں رہو گے۔ خوب کھاؤ پیو چند دن میں تمہاری صحت بحال ہو جائے گی۔"

میں جانتا تھا کہ میڈم کو میری صحت کی نہیں اپنی صحت کی فکر ہے پھر بھی میں نے بتیسی نکال کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ میں میڈم اور نادر جگی وغیرہ کے سامنے ایک عام سا بندہ نظر آؤں۔ اپنی چال ڈھال، بات چیت میں نے مکمل طور پر بدل لی تھی۔ الفاظ استعمال کرتے ہوئے میں خیال رکھتا تھا کہ کوئی بھاری بھرکم لفظ یا انگریزی کی اصطلاح وغیرہ استعمال نہ ہو جائے۔ مثلاً اگر میں نے یہ کہنا ہوتا تھا کہ میں نے کھانا کھا لیا ہے تو اس کی جگہ کہتا تھا کہ میں نے روٹی کھا لی ہے۔ اگر کہنا ہوتا تھا کہ مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے تو اس کی جگہ کہتا تھا کہ ڈر لگ رہا ہے۔ فکرمندی کی جگہ پریشانی، اندیشے کی جگہ خوف، رائفل کی جگہ بندوق جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ ویسے تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں مگر ان کا مجموعی اثر بڑا اچھا پڑتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنا کردار نبھانے میں ابھی تک پوری طرح کامیاب ہوں۔

اگلے چار پانچ روز بڑے مزے میں گزرے۔ نقاہت ابھی باقی تھی بہرحال بہترین کھانا مجھے مہیا کیا جا رہا تھا۔ اس میں دودھ، جوس، انڈے، گوشت سبھی اچھی غذائیں شامل تھیں۔ روزانہ شام کو ڈاکٹر کریم میرا معائنہ کرنے آ رہا تھا۔ میڈم کا لب و لہجہ بھی مجھ سے بات کرتے ہوئے ذرا نرم پڑ چکا تھا۔ اس کمرے میں قیام کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ میں میڈم کے قریب تھا۔ میڈم کی مصروفیات اور آمد و رفت پر میری نگاہ رہتی تھی۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ کامن روم کی کوئی کھڑکی کھلی رہ جاتی تھی اور میڈم فون پر جو بات چیت کرتی تھی وہ میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اپنے ڈیوی نامی ساتھی سے میڈم کی چپقلش چل رہی ہے۔ یہ چپقلش اس دن سے شروع ہوئی تھی جس دن میڈم نے سخت طیش میں آ کر اپنے سگے بھائی کو گولی سے اڑا دیا تھا۔ تاہم یوں میں سے رغبت برآمد ہوئی تھی اور ڈیوی اس بات پر بے حد برہم ہوا تھا کہ میڈم ایموشن کی حفاظت نہیں کر سکی۔ بعد ازاں میڈم نے غم و غصے کے عالم میں اپنے شرابی بھائی کو پچھاڑ دیا تھا۔

ایک دن میں نے پھر ڈیوی کو دیکھا۔ وہ پورچ میں گاڑی سے اتر کر میڈم کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ حسب سابق جینز کوٹ میں تھا۔ اس کے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے اور طوطے جیسی ناک معمول سے زیادہ لمبی اور نکیلی نظر آ رہی تھی۔ یوں تو وہ دبلا پتلا تھا لیکن اسٹیل کی کیل کی طرح بڑا تیز اور سخت جان دکھائی دیتا تھا۔

ڈیوی کے میڈم کے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی میں ایک ملحقہ کمرے کے باتھ روم میں چلا گیا۔ اس جگہ سے مجھے نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو کی مدھم آواز سنائی دے سکتی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق میڈم اور ڈیوی کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ نشست گاہ میں ہی ہوئی لیکن یہ گفتگو اگر میڈم کے کمرے میں ہوتی تو پھر بھی شاید میرے کانوں تک پہنچ جاتی۔ یہ اتنی گرماگرم اور بلند گفتگو تھی کہ دیواروں کے آر پار سنائی دے رہی تھی۔

میڈم نے گرج کر کہا "یاس ہم دونوں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ آج صبح انہوں نے تیسرا فون کیا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔" ڈیوی انگلش میں بولا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ تم سستی کر رہے ہو۔ آج کا کام کل پر اور کل کا پرسوں پر ڈال رہے ہو۔"

"میں کیا کروں۔ خودکشی تو نہیں کر سکتا ہوں۔ پولیس بہت چوکس ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر وہ اس حرامی بھائی جی کی حفاظت کرنے میں لگ گئے ہیں۔ ویسے بھی

ہماری ذمے داری میری تو نہیں ہے۔"

"مگر جگہ اور وقت کا فیصلہ کرنا تو صرف تمہاری ذمے داری ہے۔" میڈم بھی جواباً غرائی۔

"جگہ اور وقت کا فیصلہ میں نے کیا تھا، اور ایسا کیا تھا کہ لوگ مدتوں یاد رکھتے۔ اس حرامی بھائی جی کے ساتھ کم از کم بیس وِنگ لیڈر اور پھڑک جاتے۔ انٹرنیشنل میڈیا پر تہلکہ مچ جاتا تھا۔ سارا کام تم لوگوں کی وجہ سے خراب ہوا۔"

ایک دم میڈم کی ٹون بدل گئی۔ وہ انتہائی غضب ناک لہجے میں بولی "دیکھ ڈیوی! میں کہتا ہوں اس بات کا پیچھا اب چھوڑ دے۔ اس ایک غلطی کے بدلے میں نے اپنے بھائی کی جان لی ہے۔ سنا ہے تو نے 'میں نے اپنے بھائی کی جان لی ہے۔' اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس قربانی کے بعد بھی اگر بھائی جی زندہ پھرتا رہا تو لعنت ہے ہم سب پر۔ سو بار لعنت ہے.... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں ڈیوی۔ اگر تم اب بھی ٹال مٹول کرتے رہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ میں سچ کر رہا ہوں گا میں سچ کہتا ہوں۔"

"تم مجھے دھمکا رہی ہو۔"

"ہاں یہ دھمکی ہے۔ اور یہ دھمکی پوری بھی ہو جائے گی۔ میں جب تمہاری شکل دیکھتا ہوں اپنے مردہ بھائی کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا ہے۔ اگر تم نے دو چار دن کے اندر کچھ کیا نہیں تو میں.... تمہیں بتا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

کچھ دیر میڈم اور ڈیوی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی پھر ڈیوی قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ دونوں کے درمیان طے ہوا کہ معروف سیاسی لیڈر بھائی جی کو قتل کرنا ہے اور تین چار دن کے اندر کرنا ہے۔

میں خاموش کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ خطرناک قاتل جس کے قتل کا فیصلہ کر رہے ہیں وہ نجانے کہاں ہو گا۔ یہاں اسے زیادہ سے زیادہ چار دن کی مہلت ملی تھی وہاں وہ برسوں کے منصوبے بنا رہا ہو گا۔

یہ گفتگو سننے کے بعد مجھے بھائی جی کی فکر لاحق ہونا لازمی تھی۔ یوں تو میں نے ساہی صاحب کو دوبارہ تاکید کی تھی کہ پولیس بھائی جی کی سیکیورٹی کی طرف سے بے حد محتاط رہے مگر اس تازہ ترین گفتگو کے بعد میری خواہش تھی کہ ایک بار پھر ساہی صاحب سے رابطہ کروں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرے واکی ٹاکی کی بیٹری ڈاؤن ہو چکی تھی۔ اس کا "چارجر" میرے پاس نہیں تھا اگر ہوتا بھی تو کھلے عام لگانے کو چارج

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی رنگ میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپکو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول، دل میں اترنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت: ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی، مزے لیتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نو اد کے مختلف چار روپ، ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۲۵ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۲۵ روپے

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب "پی سی او" جا کے ہی فون کا سہارا رہ جاتا تھا۔ ٹیلی فون کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کوٹھی سے باہر نکلتا۔ یہ کام بھی آسان نہیں تھا۔ میڈم کی خصوصی اجازت کے بغیر کوئی یہاں آجا نہیں سکتا تھا۔ خاص طور سے میرا نکلنا تو بہت ہی مشکل تھا۔ میں ہر وقت میڈم کی نگاہ میں تھا۔ میری حفاظت اسی طرح کی جا رہی تھی جس طرح عید قرباں سے چند دن پہلے قربانی کے جانور کی کی جاتی ہے۔

چوبیس گھنٹے میں شدید تذبذب میں رہا۔ پھر ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں خریدنے کا بہانہ بنا کر کوٹھی سے نکل آیا۔ پبلک ٹیلی فون تلاش کرنے میں کافی دشواری ہوئی۔ بہرحال ٹیلی فون مل گیا۔ میں نے ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ فون مصروف مل رہا تھا۔ میں نے وقفے وقفے سے تین چار بار ڈائل کیا مگر رابطہ قائم نہیں ہوا۔ ساہی صاحب کہیں بہت لمبی بات کر رہے تھے یا پھر فون خراب تھا۔ ناکام ہو کر میں واپس آ گیا۔

رات بھر فکر ناچتی رہی۔ کل میڈم اور ڈیوی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ اس امر کی طرف واضح اشارہ کر رہی تھی کہ بھائی جی کے خلاف کوئی خطرناک کارروائی ہونے والی ہے۔ گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی ہارون نامی شخص نے میڈم اور ڈیوی کو اس کارروائی کی ذمے داری دے رکھی تھی۔ اس کارروائی میں جو تاخیر ہوئی تھی اس کے سبب میڈم اور ڈیوی میں تلخی بہت بڑھ گئی تھی۔ اب اس تلخی کا سارا ملبہ یقیناً بھائی جی کی زندگی پر ہی پڑنا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میڈم اپنی پجارو میں بیٹھ کر کہیں نکلی ہوئی تھی۔ ڈیوی آندھی اور طوفان کی طرح کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس نے ملازموں سے پوچھا کہ میڈم کہاں ہے۔ ملازموں نے بتایا کہ وہ نکلی ہوئی ہیں مگر بتا کر نہیں گئیں۔ ڈیوی بہت سٹپٹایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ بڑی مضبوطی سے بھینچ گئے۔ چند سیکنڈ سوچ میں گم رہنے کے بعد اس نے میڈم کے منیجر نوری کو بلایا اور پوچھا کہ اس وقت کوٹھی میں کتنے کارندے ہیں۔

نوری بولا "صاحب! اسلم، عارف اور پہلوان تو میڈم کے ساتھ گئے ہیں۔ بس رشید اور رحمان ہیں یا پھر یہ بندہ ہے۔" اس نے آخر میں میری طرف اشارہ کیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" ڈیوی تیزی سے بولا "تم چاروں میرے ساتھ آؤ۔"

"ٹھیک ہے سر... لیکن..."

"لیکن کیا؟" ڈیوی نے کڑک کر نرمی سے پوچھا۔

نوری نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے رہنے دیں، یہ ذرا بیمار ہے۔"

"بیمار کیا ہے؟ بھلا چنگا تو ہے۔" ڈیوی غرایا۔

"اسے... سانپ نے کاٹ لیا تھا چھ سات دن پہلے۔"

"چھ سات دن پہلے ہی کاٹا تھا نا۔ چلو چلو جلدی کرو۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔"

نوری نے پھر اعتراض کرنا چاہا مگر ڈیوی کا موڈ دیکھ کر خاموش رہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم تین چار افراد ڈیوی کے ساتھ ایک سیاہ اسٹیشن ویگن میں بیٹھ رہے تھے۔ آخری کوشش کے طور پر نوری نے ایک بار پھر دبی آواز میں ڈیوی سے کہا "جناب آپ غصہ نہ کریں... لیکن مجھے یقین ہے کہ میڈم کو جہاں داد کا ہمارے ساتھ جانا پسند نہیں آئے گا۔ انہوں نے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ جہاں داد کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔"

ڈیوی کا پارہ پھر چڑھ گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا "اس خبیث کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ کیوں سنبھال سنبھال کر رکھ رہی ہے اسے۔ کیا اس سے اپنے بچے پیدا کرے گی وہ خچر۔"

اپنی میڈم کے لیے خچر کا لقب سن کر نوری کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ نوری نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

میں دوسرے افراد سمیت گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رشید اور رحمان دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ رحمان کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل بھی اور اس کے ساتھ تیس گولیوں والا خم دار میگزین لگا تھا۔ سری لنکا میں ایک دفعہ میں یہ طاقت ور رائفل خود بھی استعمال کر چکا تھا۔ گاڑی کے اندر ایک لڑکی پہلے سے موجود تھی۔ اس قبول صورت لڑکی کا حلیہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس نے شلوار پہن رکھی تھی مگر بالائی جسم پر صرف بنیان تھی۔ دوپٹہ بھی ندارد تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خون کے دھبے تھے، بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ کسی نے اس بے چاری کو بہیمانہ سلوک کا نشانہ بنایا ہے مگر وہ اطمینان سے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر ایک مطمئن تاثر تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کے نیم عریاں جسم پر نظر آنے والا خون دراصل سرخ رنگ ہے۔ وہ کسی ایسے ناٹک کا کردار تھی جو ابھی تھوڑی دیر میں کھیلا جانے والا تھا۔

ڈیوی بار بار دستی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو

گاڑی اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا، پھر ہم چاروں کو جلدی جلدی ہدایات دینا شروع کر دیں۔ ان کی ہدایات سے مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ بھائی جی کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ ہونا یہ تھا کہ کھیلا جانے والا ناٹک یہ بھائی جی کی موت کا ناٹک تھا۔ دراصل ابھی صرف ایک گھنٹا پہلے بھائی جی کی پارٹی کا ایک سرگرم ممبر اور قریبی ساتھی ہارٹ اٹیک سے اچانک انتقال کر گیا تھا۔ بھائی جی ہنگامی طور پر اس کی رہائش گاہ واقع شاہدرہ میں آئے تھے۔ ان کے ساتھ پولیس کے گارڈ نہیں تھے صرف تین چار ذاتی محافظ تھے۔ ڈیوی نے اس موقعے کو غنیمت جانا تھا اور بھائی جی کا راستہ روک کر ان پر فائرنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ پروگرام اتنا آناً فاناً بنا تھا کہ ڈیوی کو ضروری تیاری کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ بھاگا ہوا میڈم کے ٹھکانے پر آیا تھا اور ہمیں لے کر روانہ ہو گیا تھا۔

ڈیوی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "دیکھو جہاں داد۔ تمہارا کام بھائی جی کے محافظوں والی گاڑی کو روکنا ہے۔ بھائی جی کی گاڑی محافظوں والی گاڑی کے پیچھے ہو گی۔ یہ لڑکی سڑک پر لیٹ جائے گی، تم نے دونوں ہاتھ پھیلا کر محافظوں کی جیپ کے سامنے کھڑے ہونا ہے اور کسی طور پیچھے نہیں ہٹنا ہے اور نہ ڈرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اور لڑکی کو دیکھنے کے باوجود محافظ رکے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ تمہیں تھوڑی سی دلیری دکھانی ہو گی اور ان کا راستہ روکنا ہو گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ محافظ تمہیں کچل کر گزر جائیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اندر سے میرے سینے میں اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ ساہی صاحب سے میری ساری گزارشات بیکار ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں بھائی جی کی سیکیورٹی کی طرف سے جو مشورہ دیا تھا اس پر شاید درست طریقے سے عمل نہیں کیا گیا تھا۔ اگر عمل کیا گیا ہوتا تو بھائی جی کے لیے اس طرح جال نہ پھیلایا جا رہا ہوتا۔ نوری ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا، وہ کوٹھی میں ہی رہ گیا تھا۔ میں نے وقت رخصت اس کا چہرہ دیکھا تھا، وہ اندر سے بری طرح ابل رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے سلسلے میں ڈیوی کی زبردستی اسے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

اسٹیشن ویگن تیزی سے روانہ ہوئی اور بڑی رفتار سے شاہدرہ کے مضافات کی طرف چل پڑی۔ ڈیوی سمیت سب کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اعصاب کو قابو میں رکھنے کے لیے نیم برہنہ لڑکی چرس بھرا سگریٹ پینے لگی۔ چرس کی بو سے پریشان ہو کر ڈیوی نے مقامی لڑکی کو گندی گالی دی اور سگریٹ بجھانے کو کہا۔ ڈیوی کا موڈ بالکل آتش فشاں ہو رہا تھا۔ یہ آتش فشانی غالباً پرسوں میڈم کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی کا نتیجہ تھی۔ میڈم نے واشگاف الفاظ میں ڈیوی کو بتا دیا تھا کہ بھائی جی کی موت کے مشن کے سلسلے میں اس کا بھائی اپنی جان سے گیا ہے، اب یہ مشن ہر صورت پورا ہونا چاہیے۔

اسٹیشن ویگن صرف ایک گھنٹے میں شاہدرہ کے نواح میں پہنچ گئی۔ اس دوران میں ڈیوی ساتھیوں کو کارروائی کے سلسلے میں مسلسل ہدایات دیتا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جب گاڑیاں رک جائیں اور محافظ نیچے اتر آئیں تو میں انہیں لڑکی کے بارے میں بتاؤں اور کہوں کہ کوئی اسے زخمی کر کے یہاں پھینک گیا ہے۔ جب محافظ لڑکی کی طرف متوجہ ہو جائیں تو میں موقعے سے کھسکنے کی کوشش کروں اور درخت وغیرہ کی آڑ لے لوں۔

پٹھان رحمان گل اور رشید کو ڈیوی نے ہدایت کی کہ وہ صبر سے پچھلی گاڑی کا دروازہ یا شیشہ کھلنے کا انتظار کریں اس کے بعد دو طرف سے فائرنگ کریں۔ محافظوں کو نپٹنے کی ذمے داری اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور اور خود ڈیوی پر تھی۔ بھائی جی کے لیے گھات لگانے کی جگہ ڈیوی پہلے ہی منتخب کر چکا تھا۔ اس جگہ کا انتخاب گواہی دیتا تھا کہ اس قسم کے کاموں کا ڈیوی کو خاطر خواہ تجربہ ہے۔ یہ ایک نالے کا پل تھا۔ پل کی دونوں جانب جھنڈ اور کیکر وغیرہ کے گھنے درخت تھے۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی اور یہاں زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھا۔ جب ہم موقعے پر پہنچے، اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ہم نے اسٹیشن ویگن کچے میں اتار کر اس طرح چھپا دی کہ فوری طور پر نظر نہ آ سکے۔ ویگن کی نمبر پلیٹیں ظاہر ہے کہ تبدیل کی جا چکی تھیں۔ اسپیشل تحفے کے طور پر ڈیوی نے رشید اور رحمان گل کو دو چھوٹے چھوٹے گیند دیے۔ ان سفید گیندوں کا سائز کرکٹ بال سے تھوڑا ہی چھوٹا ہو گا۔ ان گیندوں پر دو چھوٹی چھوٹی PINS لگی ہوئی تھیں۔ یہ دراصل تیز روشنی کے گولے تھے۔ ڈیوی نے جلدی جلدی رشید اور رحمان کو ان کے استعمال کا طریقہ بتایا۔ اس نے ان دونوں کو سمجھایا کہ اگر پچھلی گاڑی میں سے کوئی شخص بچ کر نکلے اور جھاڑیوں میں چھپنے کی کوشش کرے تو وہ تیز روشنی چھوڑنے والے یہ گولے استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈیوی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ پچھلی گاڑی میں موجود افراد میں سے کوئی ایک بھی زندہ بچ رہے۔ اس نے بڑی تیزی سے

تمام افراد کو مقررہ پوزیشنوں پر کھڑا کردیا اور خود اسٹیشن ویگن کے قریب پوزیشن سنبھال لی۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوند رہی تھی اور جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ ایک واکی ٹاکی مسلسل اس کے کان سے لگا تھا اور وہ گاہے گاہے کھسر پھسر کرنے لگتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کا رابطہ اپنے کسی ایسے ساتھی سے ہے جو مرگ والے گھر میں موجود ہے اور بھائی جی کے آس پاس ہی گھوم پھر رہا ہے۔ جونہی بھائی جی کو وہاں سے روانہ ہونا تھا اس شخص نے ڈیوی کو مطلع کردینا تھا۔

ڈیوی نے مجھے اور لڑکی کو سمجھا دکھا تھا کہ جونہی وہ اسٹیشن ویگن کی ہیڈ لائٹس دو تین بار جلا کر بجھائے ہم دونوں اپنے کردار کے لیے تیار ہوجائیں۔ لڑکی کو سڑک کے درمیان لیٹ جانا تھا اور مجھے محافظوں کی تیز رفتار جیپ کے سامنے کھڑا ہو کر اسے روکنے کی کوشش کرنی تھی۔ میں اور نیم عریاں لڑکی جھنتر کی جھاڑیوں میں دبکے کھڑے تھے۔ ہمارے اردگرد جھینگروں کی آوازیں تھیں' کبھی کبھی کوئی پرندہ کسی درخت کی شاخوں میں پھڑپھڑاتا تھا کہیں پاس ہی کھیت میں ٹیکٹر چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ لڑکی بے حس و حرکت کھڑی تھی بظاہر میں بھی بے حس و حرکت تھا مگر میرے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ میں اس ٹیم کا حصہ تھا جو بھائی جی کو مارنے کے لیے یہاں پہنچی تھی لیکن میں اسے بچانے کا سوچ رہا تھا۔ میرا ذہن دو تین پہلوؤں پر سوچ رہا تھا اور یہ سارے پہلو "بھائی جی نامی" اس سیاست دان کے تحفظ کے سلسلے میں تھے۔ ان لوگوں نے مجھے کوئی ہتھیار نہیں دیا تھا مگر موقع پڑنے پر ہتھیار چھینا بھی تو جاسکتا تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں محافظوں کی گاڑی روکنے کی "مخلصانہ" کوشش ہی نہ کروں۔ گاڑی نزدیک پہنچے تو میں راستے سے ہٹ جاؤں۔ اس صورت میں یقینی بات تھی کہ ڈیوی مار مار کر میری ہڈیاں پسلی کردے گا اور عین ممکن تھا کہ غضب کی فراوانی میں مجھ پر گولی ہی چلا دیتا۔ ایک تیسرا طریقہ ذہن میں یہ تھا کہ جونہی محافظوں کی گاڑی میرے قریب رکے میں محافظوں کو خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کروں۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ سڑک پر پڑی ہوئی لڑکی میری بات سن سکتی تھی یا میرے انداز سے میری حرکت کو بھانپ سکتی تھی۔

ہم وہاں جھنتروں کے درمیان کھڑے رہے اور میرا ذہن تیزی سے سوچتا رہا۔ بھائی جی کے قتل کا اسٹیج بالکل تیار ہوچکا تھا مگر ابھی بھائی جی کی انٹری نہیں ہوئی تھی۔ فضا میں طوفان سے پہلے کا سکوت تھا' بس کبھی کبھار کوئی تیز رفتار گاڑی یا موٹر سائیکل اس سکوت کو توڑتی گزر جاتی تھی۔ لڑکی نے اردو میں منمنا کر کہا "مجھے سگریٹ کی بڑی طلب ہو رہی ہے اگر تم کہو تو پی لوں۔"

"میرے باپ کا کچھ نہیں جاتا لیکن ڈیوی صاحب کے اسٹاک میں بڑی گندی گالیاں موجود ہیں۔"

"ڈیوی صاحب کو پتا نہیں چلے گا' وہ کافی دور ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ لڑکی نے بڑی بے حجابی سے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور چرس سے بھرا ہوا سگریٹ نکال لیا۔ سگریٹ گریبان میں پھنس کر چرمر ہوگیا تھا اس نے اسے انگلیوں کی پوروں سے دبا دبا کر سیدھا کیا' پھر اپنی جوتی کے اندر سے چھوٹا سا لائٹر برآمد کیا اور سگریٹ سلگا کر کش لینے لگی "پی لے نوشی' ہوسکتا ہے کہ یہ تیرا آخری سگریٹ ہو۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا' ہم دونوں تو گاڑیاں رکتے ہی کھسک جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"بچنا اتنا آسان بھی نہ سمجھو۔" وہ زہرخند لہجے میں بولی "دیکھنا' گاڑیاں رکنے کے ساتھ ہی گولیاں مینہ کی طرح برسنے لگیں گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ڈیوی صاحب ہمیں بھی بھون ڈالیں گے۔"

"اگر کامیاب کارروائی" کے لیے ضروری ہوا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

"تم اپنی باتوں سے پڑھی لکھی لگتی ہو۔"

"پڑھی لکھی ہوں' اسی لیے تو پھنسی ہوں۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے' میں ایک جسٹس کی بیٹی ہوں۔ جج کی دختر۔ جو انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر لوگوں کی قسمت کے فیصلے کرتے تھے۔ ان کے ایک غلط فیصلے نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے اور اسی فیصلے نے ایک شخص کو بہت بڑا مجرم بھی بنایا ہے۔"

"شاید تم کوئی کہانی سنانا چاہتی ہو' لیکن اس کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔"

وہ نشے کی ترنگ میں تھی' میری بات نظر انداز کرکے بولتی چلی گئی "کیا تم یقین کرو گے کہ اس مجرم نے مجھے میرے باپ کے سامنے ریپ کیا تھا۔ اس نے ہمارے گھر میں داخل ہوکر ہم سب اہل خانہ کو یرغمال بنایا' پھر میرے باپ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور بولا کہ یہ کرسی ہے اس پر بیٹھ کر دیکھو۔ اس نے میرے باپ کو کرسی سے باندھا' پھر ان کے سامنے پہلے میری ممی کو ریپ کیا' پھر مجھے۔۔۔"

وہ جیسے ایک دم بولنا شروع ہوئی تھی ایسے ہی ایک دم خاموش بھی ہوگئی۔ اس کی ذہنی حالت ابتر نظر آتی تھی۔ شاید

یہ نشے کی وجہ سے تھا' ورنہ جسمانی طور پر وہ دلکش اور فٹ دکھائی دیتی تھی۔ جسے اس نے آخری سگریٹ کہا تھا' وہ آخری نہیں تھا۔ اس نے پہلے سگریٹ کے بعد دو سگریٹ مزید پیے۔ ایک اس نے اپنی بنیان میں سے نکالا اور دوسرا نیفے میں سے۔ کارروائی لیٹ ہوتی جارہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ لاہور واپس جانے کے لیے بھائی جی کے پروگرام میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ شاید وہ مرگ والے گھر میں ابھی مزید رکنا چاہتے تھے میرے دل سے دعا نکلی کہ ایسا ہی ہو۔ ان کا ارادہ بدل جائے یا پھر وہ اپنا راستہ بدل لیں یا پھر کوئی اور اپ سیٹ ہوجائے۔

تقریباً ایک گھنٹا اسی کشمکش میں گزر گیا۔ ڈیوی بہت بے زار نظر آرہا تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ ہمارے قریب سے بھی گزرا۔ واکی ٹاکی مسلسل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یوں ظاہر کررہا تھا جیسے اس کی اسٹیشن ویگن میں کوئی خرابی واقع ہوئی ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے دو موٹر سائیکل سواروں نے موٹر سائیکل روک کر ڈیوی کو اپنے تعاون کی پیشکش بھی کی جسے ڈیوی نے شکریے کے ساتھ مسترد کردیا۔

اچانک میں نے ڈیوی کو چونکتے دیکھا۔ وہ اس رخ پر دیکھ رہا تھا جدھر سے ہم آئے تھے میں نے بھی دھیان سے دیکھا تو مجھے میڈم شہزادی کی جیپ نظر آئی۔ جیپ ہمارے قریب سے گزر کر تھوڑا سا آگے نکل گئی مگر پھر اس کے بریک چرچرائے۔ وہ رکی اور ریورس گیئر میں اسٹیشن ویگن کے پاس پہنچ کر ٹھہرگئی۔ میں نے دیکھا جیپ میں میڈم خود سوار تھی اور وہی اسے ڈرائیو بھی کررہی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی اور ڈیوی کی طرف بڑھی۔ دونوں جھاڑیوں میں گھس گئے۔ ان کی باتیں سننا بہت ضروری تھا۔ میں نے نوشی نامی اس لڑکی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود جھاڑیوں کے درمیان سے با آہستگی راستہ بناتا ہوا اس مقام کی طرف چلا گیا جہاں میڈم اور ڈیوی اوجھل ہوئے تھے ابھی میں اس مقام سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میڈم خشک لہجے میں کہہ رہی تھی "میرا خیال ہے کہ تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ اس نے ادھر سے گزرنا ہوتا تو اب تک گزر چکا ہوتا۔"

"لیکن وہ دوسرے راستے سے بھی نہیں گزرا ہے۔ وہاں میرا بندہ موجود ہے۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے مرگ والے گھر میں ہی ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا ہو۔"

"یہ ممکن نہیں۔ جنازہ صبح نو دس بجے سے پہلے نہیں ہوگا۔ بھائی جی اتنی دیر وہاں نہیں رک سکتا۔ وہ ایک بار گھر ضرور جائے گا۔"

"لیکن اب وہ پہلے والا چانس نہیں ملے گا تمہیں۔ کافی پولیس وہاں پہنچ چکی ہوگی۔ بھائی جی واپس آئے گا تو ساتھ میں پولیس کی گاڑی بھی ضرور ہوگی۔" میڈم نے کہا۔

"کچھ بھی ہے۔ میں نے اس کا انتظار کرنا ہے اور آج یہ ٹنٹا ختم کرنا ہے۔"

"میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم ایک ناکام گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اول تو بھائی جی ادھر سے گزرے گا نہیں اور اگر گزرے گا تو پولیس ساتھ ہوگی۔ پولیس اس کے بارے میں بڑی محتاط ہے۔"

"تم جاؤ۔ میں آج کچھ نہ کچھ کرکے رہوں گا۔" ڈیوی کے لہجے میں شعلوں کی تپش تھی۔

"ٹھیک ہے میں جارہی ہوں۔" میڈم نے کہا "وہ جہاں داد بھی میرے ساتھ جارہا ہے۔ باقی بندے یہیں رہیں گے۔"

"جہاں داد کیوں جارہا ہے۔" ڈیوی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اس کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"کیوں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" ڈیوی کا لہجہ بدستور زہریلا تھا۔

"جب تم سے نوری نے کہا بھی تھا کہ میڈم نے جہاں داد کو باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے تو تم کیوں لائے اسے یہاں؟ کیا یہ زبردستی ہے۔"

"اچھا تو تم نوری کے اکسانے پر یہاں آئی ہو۔ جہاں داد کو لے جانے کے لیے۔ بڑے زبردست لگتے ہیں بھئی اس بندے کے۔ میڈم اس کے لیے خود شیخوپورہ سے گھگٹ بھاگی چلی آئی ہے۔"

"تم جو کچھ بھی سمجھ لو۔ میں جہاں داد کو اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔" میڈم نے کڑک کر کہا۔

چند لمحے ایک گمبھیر اور ضدی خاموشی طاری رہی' پھر ڈیوی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "لیکن میں جہاں داد کو واپس نہیں بھیج رہا۔ مجھے اس کی ضرورت ہے وہ یہیں رہے گا۔"

"دیکھو ڈیوی! خواہ مخواہ بات مت بڑھاؤ۔ اتنے بندوں سے تمہارا کام چل جائے گا۔ میں ڈیوی کو لے جانے آئی ہوں اور لے کر جاؤں گی۔ کہاں ہے وہ..... جہاں داد۔ جہاں داد۔" میڈم نے دو مرتبہ مجھے زور سے آواز دی۔

"نہیں شہزادی!" ڈیوی بڑے طیش سے غرایا "تم اسے نہیں لے جاؤ گی۔ اب یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔" میڈم غرائی۔

"نہیں ہٹوں گا۔"

ایک دم میڈم پھٹ پڑی "مجھ سے بدزبانی کرتا ہے کمینے۔۔۔ حرامی۔" اس کے ساتھ ہی طمانچے کی زوردار آواز تاریکی میں گونج گئی۔ یہ طمانچہ میڈم نے بے قابو ہو کر ڈیوی کے منہ پر رسید کیا تھا۔

یکایک یوں محسوس ہوا جیسے جنڈ اور کیکر کے درختوں میں بھونچال آ گیا ہے۔ ناگہانی طور پر میڈم اور ڈیوی ایک دوجے سے بھڑ گئے تھے۔ رحمان گل اور رشید ٹارچیں روشن کرتے ہوئے موقعے کی طرف لپکے۔ ٹارچوں کی روشنی میں میں نے میڈم اور ڈیوی کو باقاعدہ لڑتے ہوئے دیکھا۔ اس موقعے پر پہلی بار مجھے پتا چلا کہ میڈم مردوں والے طور اطوار ہی نہیں رکھتی مردوں کی طرح لڑ بھی سکتی ہے۔ میڈم نے بڑی پھرتی سے ڈیوڈ عرف ڈیوی کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ ذرا خمیدہ ہوا تو میڈم کی ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی اور وہ اپنے ہلکے جسم کے ساتھ لڑھک کر دور جا گرا۔ گرتے کے ساتھ ہی ڈیوی کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب کی طرف گیا۔ وہ ریوالور نکال رہا تھا۔ میڈم خالی ہاتھ تھی۔ اس نے جست لگائی اور درختوں میں گھس گئی۔ ڈیوی نے ریوالور نکال کر بڑی تیزی سے دو فائر کیے۔ ایک گولی پٹھان رحمان گل کے پیٹ میں لگی۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ دوہرا ہو کر گر گیا۔ ڈیوی تڑپ کر اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔ آناً فاناً دو طرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک طرف رشید اور میڈم تھے، دوسری طرف ڈیوی اور اس کا ساتھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو سیاہ اسٹیشن ویگن ڈرائیو کر کے یہاں تک لایا تھا۔ میڈم اپنے سائیلنسر لگے پسٹل سے فائرنگ کر رہی تھی۔ یہ وہی پسٹل تھا جو اس سے پہلے وہ اپنے بھائی پر اور پھر پنجرے میں بند طوطوں پر استعمال کر چکی تھی۔ رشید کے پاس خودکار رائفل تھی۔ تاریکی میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ گولیوں کے دھماکوں سے قرب و جوار لرزنے لگے تھے۔ میڈم کا زخمی چوکیدار رحمان گل رینگ رینگ کر میڈم کی پجارو جیپ کی اوٹ میں آ گیا۔ میڈم بھی جیپ کی اوٹ میں ہی کھڑی تھی۔ میں نے ڈیوی کے ساتھ لڑکی نوشی کو تلاش کیا مگر وہ اس جگہ موجود نہیں تھی۔ پتا نہیں کس طرف کھسک گئی تھی۔ میں بھی درختوں کی آڑ لیتا ہوا میڈم کی طرف آ گیا۔ فائرنگ کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی مگر فضا میں انتہا درجے کی کشیدگی موجود تھی۔ زخمی رحمان گل فائرنگ سے بچنے کے لیے میڈم کی جیپ میں گھس گیا تھا اور اندر سے اس کے کراہنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد میڈم نے جیپ کی اوٹ سے سر نکالا۔ ڈیوی اور اس کا ساتھی عین سامنے درختوں کے جھنڈ میں موجود تھے۔ اس جھنڈ کے اندر سے انہوں نے کم از کم ایک سو فائر کیے تھے مگر اب وہاں خاموشی طاری تھی۔

"کہیں وہ کوئی چال تو نہیں کھیل رہے؟" رشید نے سرگوشی کی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھاگ نکلے ہوں حرامی۔" میڈم نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ یقیناً ڈیوی کے ایک دو مکے میڈم کے منہ پر لگے تھے۔ اس موقعے پر رشید نے خیال ظاہر کیا کہ روشنی دینے والا گولا پھینک کر اطراف کا جائزہ لیا جائے مگر میڈم نے رشید کو اس خطرناک حرکت سے منع کر دیا۔ میڈم نے اپنے سائیلنسر لگے پسٹل سے جھاڑیوں کی طرف دو فائر کیے۔ جواب میں خاموشی طاری رہی تو رشید نے اپنی ٹارچ اٹھائی اور احتیاط سے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی آگے نکل کر رحمان گل کی گری ہوئی ٹارچ اٹھائی۔ ہم نے ٹارچوں کے روشن دائرے جھاڑیوں میں ادھر ادھر گھمائے جلد ہی ہمیں ڈیوی کی لاش نظر آ گئی۔ میڈم کے پسٹل کی دو گولیاں عین ڈیوی کے چہرے پر لگی تھیں۔ اس کا خون خشک پتوں پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔

"اوہ گاڈ۔ یہ کیا ہو گیا؟" میڈم کے ہونٹوں سے نکلا۔

میں نے میڈم کو پہلی بار خوف زدہ دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ خود بھی لڑکھڑا سی گئی۔ رشید نے جھک کر دیکھا۔ ڈیوی سو فیصد مر چکا تھا۔ یہی وقت تھا جب پہیوں کے چرچرانے کی تیز آواز آئی۔ ڈیوی کا ساتھی اسٹیشن ویگن کے ذریعے فرار ہو رہا تھا۔

"اوہ، وہ کتا بھاگ رہا ہے۔" میڈم نے کہا اور ہمیں ساتھ لیتی ہوئی اپنی جیپ کی طرف لپکی۔ اس سے پہلے کہ ہم جیپ میں بیٹھتے اور ڈیوی کے ساتھی کا پیچھا کرتے، وہ کافی دور نکل چکا تھا۔ پھر بھی میڈم نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ اس نے جیپ کو تھوڑا سا ریورس کر کے سڑک پر چڑھایا۔ ابھی اس نے پہلا گیئر لگایا نہیں تھا کہ اچانک ایک اسکوٹر پجارو جیپ کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ جیپ پر ایک پولیس سب انسپکٹر سوار تھا اور باقاعدہ وردی میں تھا۔

اس نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا اور رشید کو گھورتے ہوئے بولا "یہ فائرنگ کیسی تھی؟"

"کون سی فائرنگ؟" میڈم نے کہا۔

"میں تم لوگوں کو الو کا پٹھا نظر آ رہا ہوں۔ ابھی یہاں گولی چل رہی تھی۔" وہ اسکوٹر سے اتر آیا۔ میڈم کے اشارے پر رشید جیپ سے اتر آیا۔ جس وقت میڈم سب انسپکٹر کے سوال کا جواب دے رہی تھی، رشید عقب سے آیا اور اس نے رائفل کے دستے کی طوفانی ضرب سب انسپکٹر کے سر پر لگائی، وہ تیورا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ میڈم کے ہرکارے نے دوسری ضرب سب انسپکٹر کی گدی پر لگائی، وہ بے حرکت ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا اور اندر سے سونے کے خول والا دانت جھانک رہا تھا۔ اب ڈیوی کے مفرور ساتھی کے پیچھے جانا تو بالکل بیکار تھا۔ میڈم ایک بار پھر تیزی سے جھاڑیوں میں گھس گئی۔ اس نے مردہ ڈیوی کی جیبوں کی تلاشی لے کر دو چار اشیاء نکالیں، پھر واپس جیپ تک آ گئی۔ وہ واضح طور پر ہراساں نظر آ رہی تھی اور یہ سارا ہراس ڈیوی کے اچانک قتل کے سبب تھا۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر ڈیوی پر فائرنگ کر رہی تھی لیکن یہ گمان اسے نہیں تھا کہ ڈیوی یوں اچانک لاش میں تبدیل ہو جائے گا یا شاید پھر اس وقت غیظ و غضب کے عالم میں وہ اس قتل کے نتائج و عواقب بھولی ہوئی تھی۔

میں نے اس پتھر دل کی پیشانی پر پسینہ چمکتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ میں اور رشید بھی بیٹھ گئے۔ اسٹیشن وین کی ہیڈلائٹس میں سڑک پر بے ہوش سب انسپکٹر اوندھے منہ پڑا تھا، اس کا اسکوٹر ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میڈم نے گاڑی بڑی تیزی سے آگے بڑھائی، یوٹرن لیا اور واپس شیخوپورہ کی طرف چل دی۔ گاڑی کے فرش پر پٹھان رحمان گل بری طرح کراہ رہا تھا، گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور زخم سے مسلسل خون رس رہا تھا، تاہم وہ مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں تھا۔

میڈم نے گاڑی ڈاکٹر کے ایک کلینک کے سامنے روکی۔ یہ کسی قصبے کا کلینک تھا۔ دو تین دکانیں تھیں جنہیں ملا کر کلینک کی شکل دے دی گئی تھی۔ میڈم نے گاڑی کلینک سے کچھ فاصلے پر تاریکی میں ہی روکی تھی۔ اس نے رشید سے کہا "گل خان کو اٹھا کر اندر لے جاؤ، وہاں ڈاکٹر احسان ہو گا۔ اس سے میرا نام لینا۔ چلو جلدی کرو۔"

رشید نے خون آلود رحمان گل کو کندھے پر اٹھایا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ رشید نے میڈم سے پوچھا "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"ابھی پتا نہیں، بعد میں بات ہو گی۔" میڈم نے کہا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

میں میڈم کی خوف زدگی کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بڑی کھوچل سی تھی۔ پولیس وغیرہ سے ڈرنے والی نہیں تھی۔ اس نے میرے سامنے بڑے اعتماد اور دھڑلے سے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا اور بعد ازاں صادق نامی لڑکے کی جان لی تھی۔ اب اگر وہ ڈر رہی تھی تو اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ شاید اسے ڈیوی کے ساتھیوں کی طرف سے کسی شدید کارروائی کا اندیشہ تھا، یا پھر اس شخص کی طرف سے کوئی خطرہ تھا جس کا نام ہارون تھا اور جسے میڈم اور ڈیوی باس کا خطاب دیتے تھے۔

گاڑی شیخوپورہ جانے والے راستے پر بھاگی جا رہی تھی۔ چار پانچ میل آگے جا کر وہ ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی۔ اب رات کے قریباً ساڑھے آٹھ ہونے والے تھے۔ ہمارے اردگرد خودرو جھاڑیاں تھیں اور تاریکی تھی۔ کہیں کہیں کسی کھیت کے اندر کسی کاشتکار کی جھونپڑی میں لالٹین کی روشنی دکھائی دیتی تھی یا کسی سمت سے گاڑی کی روشنی نظر آتی تھی۔ جیپ کی رفتار ستر اسی میل سے کم نہیں تھی۔ شاید جتنی رفتار سے جیپ جا رہی تھی اتنی ہی رفتار سے میڈم کا ذہن بھی سوچ رہا تھا۔ یقیناً وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اس صورتِ حال سے کیسے نکلا جائے۔ کہتے ہیں کہ غصہ حرام ہے۔ وہ اسی لیے حرام ہے، غصے کی حالت میں میڈم اور ڈیوی میں جھگڑا ہوا تھا اور چند منٹ کے اندر اندر اس جھگڑے کا نتیجہ ڈیوی کی لاش کی صورت میں نکل آیا تھا۔ اچانک ایک جگہ میڈم نے گاڑی روک دی۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا اور میڈم کے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے تھے۔ اس کا دایاں پاؤں بے دھیانی میں بار بار ایکسیلریٹر دبا رہا تھا۔ گاڑی غرا رہی تھی، چنگھاڑ رہی تھی لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی تھی۔ میڈم کی طرح وہ بھی جیسے شدید تذبذب میں تھی۔

پھر میڈم نے گاڑی ایک دم کچے میں اتار کر گھنی جھاڑیوں میں گھسا دی۔ اس نے گاڑی کی اندرونی روشنی جلائی اور ڈیش بورڈ کھول کر افراتفری میں کچھ اشیاء نکالنے لگی۔ اس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ گاڑی چھوڑ رہی ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم دونوں گاڑی سے باہر تھے۔ میڈم دس پندرہ سیکنڈ تک خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی، جیسے سوچ رہی ہو کہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہیے یا نہیں۔ پھر اس کے انداز نے بتایا کہ وہ مجھے ساتھ لے جا رہی تھی۔ میڈم نے آج شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ قمیص پر مردانہ واسکٹ تھی اور نیچے کھسہ تھا۔ اس نے گاڑی سے ایک لمبی

چادر نکال کر سر تا پیروں اوڑھ لی کہ گھٹنوں سے اوپر اوپر اس کا سب کچھ چھپ گیا۔ وہ سائلنسر لگا پستول بھی جواب تک میرے سامنے دو افراد کو قتل کر چکا تھا۔

ہم پکی سڑک پر آ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک دیہاتی تانگا نظر آیا۔ میڈم کے کہنے پر میں نے تانگا روکا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ میڈم شہزاد آگے بیٹھی میں پیچھے حالانکہ عورت کی حیثیت سے میڈم کو پیچھے بیٹھنا چاہیے تھا لیکن وہ خود کو عورت سمجھتی کہاں تھی۔ پانچ دس منٹ میں تانگے نے ہمیں بڑی سڑک پر اتار دیا۔ بڑی سڑک سے ہم ایک لاری میں بیٹھے اور لاہور سے پچیس تیس کلو میٹر دور "مرید کے" نامی قصبے میں اتر گئے۔ اب رات کے دس بج چکے تھے۔ اس شہر نما قصبے کی رونقیں ماند پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم لاری سے اتر کر پیدل ہی ایک طرف چل دیے۔ میڈم مجھ سے ایک قدم پیچھے یوں چل رہی تھی جیسے بیوی اپنے دیہاتی خاوند کے پیچھے چلتی ہے۔ دیکھنے والوں کو کیا معلوم تھا کہ اس چادر میں لپٹی ہوئی "بیوی" کے اندر ایک ایسی قاتلہ میرے ساتھ چلی آ رہی ہے جو سخت سے سخت مرد سے بھی سخت تر ہے اور جس کے لباس میں اس وقت بھی ایک جان لیوا ہتھیار موجود ہے۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میڈم مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ میں ایک معمول کی طرح اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ایک اسٹاپ پر سے میڈم پھر میرے ساتھ ایک تانگے پر بیٹھی۔ میڈم نے مجھے ہدایت کر دی تھی کہ راج نگر گاؤں کے لیے سالم تانگے کا کرایہ طے کروں۔ تانگے والے نے پہلے تو وہاں جانے سے انکار کیا پھر پچیس روپے مانگے تو مجھے اندازہ ہوا کہ راج نگر وہاں سے کافی دور ہے۔

تانگے والے کو منہ مانگا کرایہ دے کر ہم بیٹھ گئے۔ اس مرتبہ میں آگے اور میڈم پیچھے بیٹھی تھی۔ شاید اسے عقل آ گئی تھی کہ ایک بیوی کی حیثیت سے اسے تانگے کے پیچھے ہی بیٹھنا چاہیے۔

تاریکی اور سردی میں ایک گھنٹے کے ہچکولے دار سفر کے بعد ہم راج نگر پہنچ گئے۔ شاید تقسیم ہند سے پہلے یہ ہندوؤں کا گاؤں تھا۔ یہاں ایک بڑا مندر موجود تھا۔ اشنان وغیرہ کے لیے مخصوص تالاب کے آثار بھی گاؤں سے باہر ہی نظر آ گئے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ آثار قدیمہ اس گاؤں میں موجود تھے۔ ان آثار کی تفصیل مجھے ایک دو روز بعد معلوم ہوئی۔

جس وقت ہم گاؤں پہنچے آدھی رات کا وقت ہو چکا تھا۔ گاؤں کا چوہدری ایک "بشارت" نامی شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ خاصا صحت مند اور سرخ و سپید تھا۔ چوہدری بشارت سے پہلے اس کے ایک گن مین نے ہم سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات حویلی کے دروازے پر ہی ہوئی تھی۔ میڈم نے اپنا منہ سر ابھی تک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ گن مین نے مخدوش نظروں سے مجھے سر تا پا گھورا اور بولا "ہاں جی! کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے۔"

میں نے میڈم کی ہدایت کے مطابق کہا "چوہدری بشارت سے کہو "کالی کوٹھی" والے مہمان آئے ہیں۔"

"کالی کوٹھی والے؟" گن مین حیرت سے بولا "مہمانوں کا کوئی نام تو ہو گا۔"

"تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔" میڈم کرخت لہجے میں بولی۔

گن مین اسے گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ چند منٹ بعد جو نتیجہ نکلا وہ حیرت انگیز تھا۔ میں نے ننگے پاؤں ننگے سر چوہدری بشارت کو تیز قدموں سے دروازے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ خوف بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ قریب آ کر بڑے دھیان سے میڈم کی طرف دیکھنے لگا "کون ہیں آپ؟" چوہدری نے توجہ میڈم کی طرف مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا۔

میڈم نے اپنے چہرے سے چادر تھوڑی سی کھسکائی اور بولی "اتنی جلدی بھول گئے ہو چوہدری۔"

ایک دم چوہدری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ہکلا کر بولا "میڈم آپ... اوہو۔ آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ آپ اندر آئیں۔ آپ اندر آئیں۔" اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ چوپٹ کھول دیا پھر وہ بلند آواز سے پکارنے لگا "اوئے اکبرے، رمضو۔ اوئے اچھو۔ کہاں مر گئے ہو تم سب۔ دیکھو مہمان آئے ہیں۔"

میڈم ہنکار کر بولی "کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھیڑ بھاڑ نہیں چاہتا ہوں۔ مجھے بس خاموشی سے بیٹھک میں لے چلو۔"

"ٹھیک ہے جی۔ جیسا آپ کہیں۔"

جو ملازم چوہدری کی پکار پر بھاگے آئے تھے انہیں چوہدری نے اشارے سے واپس بھیج دیا۔ وہ ہمیں لے کر حویلی کے وسیع احاطے سے گزرا پھر برآمدے سے گزر کر ایک اندرونی کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک دو بڑے پلنگ رکھے تھے اور بان سے بنی ہوئی رنگین پایوں والی کرسیاں تھیں۔ دیواروں پر کلہاڑیاں اور برچھیاں وغیرہ ٹنگی تھیں۔ ایک طرف لمبی نال والا جہازی سائز حقہ پڑا تھا۔ بالکل دیہاتی ماحول تھا۔ چوہدری بشارت نے بڑے احترام سے میڈم کو ایک پلنگ پر بٹھایا۔ میں ناف پر ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا رہا اور

میڈم کے اشارے کا منتظر رہا۔

جونہی چوہدری بشارت نے بیٹھک کا دروازہ بند کیا، میڈم نے اپنی چادر اتار پھینکی اور قمیص کے نیچے سے سائلنسر لگا پستول بھی نکال کر سامنے بستر پر پھینک دیا۔ چادر اتارتے ہی اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بالکل مردانہ ہو گیا۔ اس نے ٹانگیں پھیلا کر خود کو پیچھے کی طرف جھکایا اور اپنے بازوؤں سے خود کو سہارا دیا۔ کئی گھنٹے کی بھاگ دوڑ سے وہ کچھ تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"میں آپ کو یہاں دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں میڈم! میں تو سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔" چوہدری بظاہر خوشی سے کہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ میڈم کو یہاں دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی ہے اور وہ دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کر رہا ہے۔

میڈم نے کہا "میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ مشکل کی ایک گھڑی میں مجھے اس طرح اچانک تمہاری حویلی کا رخ کرنا پڑے گا۔ میرے ذہن سے تو تمہارے گاؤں کا نام ہی اتر گیا تھا، بڑی مشکل سے یاد آیا ہے۔"

پھر ایک دم میڈم کا دھیان میری طرف چلا گیا۔ وہ تحکمانہ انداز میں بولی "جہاں دار! تم جاؤ۔ تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اطمینان سے سو جاؤ۔"

"جو حکم میڈم!" میں نے کہا اور سر جھکا کر باہر آ گیا۔

مجھے اس حویلی کے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ کمرا بھی دیہاتی انداز میں سجا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑا سا پلنگ پڑا تھا، چارپائی بھی رکھی تھی۔ چھت کے قریب دیواروں پر رنگ سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ کمرے کا فرش کچا تھا تاہم اسے بڑی نفاست سے پوتا گیا تھا۔ ایک ملازم نے مجھ سے کھانے کے بارے میں پوچھا، میرے انکار پر وہ گرم دودھ میں دیسی گھی ڈال کر لے آیا۔ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے جسم کے لیے یہ دودھ بہت مقوی ثابت ہوا۔ میں پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور حالات کی تندی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری پنڈلی پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی سانپ سے ڈسے جانے کی یادگار تھی۔ وہ واقعہ یاد کر کے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ عرصہ پہلے سائیں عالی کے کہے ہوئے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا "شفیع محمد۔ جا۔ میں نے تجھے زہر کے خوف سے آزاد کر دیا ہے۔ جا آزاد کر دیا ہے۔"

سائیں کے اس فقرے میں ہمیشگی پائی جاتی تھی یعنی زہر کے خوف سے آزادی عارضی نہیں تھی۔ وہ واقعہ اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ ان دنوں میں ماریا ڈیسٹ کے اندر ہاسٹل میں قیام پذیر تھا۔ ینگ براؤن کی طرف سے ہمیں ایک شاندار رہائش گاہ فراہم کی گئی تھی۔ یہ سائیں والا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا۔ سائیں یک دم ایک طرف سے برآمد ہوا تھا اور اس نے باقاعدہ حملہ کرنے والے انداز میں میرے سینے میں وہ خاص سوئی چبھوئی تھی اور بھاگ گیا تھا۔ اس سوئی کی وجہ سے میرے سینے پر جو سوزش اور جلن نمودار ہوتی تھی وہ کتنے ہی روز باقی رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ قمیص کے اندر ڈال کر سینے پر پھیرا۔ وہاں اب بھی ایک چھوٹا سا ابھرا ہوا نشان موجود تھا۔

میں کچھ دیر تک سائیں عالی اور اس کی روحانی صلاحیتوں کے بارے میں سوچتا رہا، پھر میرا دھیان میڈم کی طرف اور اس کی خرافات کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک نامعلوم عطائی سے مجھے سانپ ڈسواتے تھے پھر میرے جسم سے خون حاصل کیا تھا۔ گمان غالب یہی تھا کہ اس نے یہ خون اپنے جسم میں منتقل کرایا تھا اور اب جلد ہی وہ اس عمل کو دہرانے والی تھی۔ مگر فی الحال تو وہ اپنے ایک سنگین مسئلے میں گرفتار ہو گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے اس کے ہاتھوں اپنا ایک اہم ساتھی قتل ہو گیا تھا اور وہ کچھ اندیشوں کے تحت بھاگ کر یہاں چلی آئی تھی۔ ایک طرح سے میڈم کے اس سنگین مسئلے کا تعلق بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ اس نے مجھے کسی قیمتی شے کی طرح بڑی حفاظت اور احتیاط سے اپنی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔ میری خاطر تواضع اور نگہداشت کے سلسلے میں نوکروں کو خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ ڈیوی اپنے ہی موڈ میں آیا تھا اور نوری کے بہت منع کرنے کے باوجود مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ جس کام کے لیے مجھے لایا تھا وہ ایک خطرناک کام تھا۔ جو کارروائی ہم کرنے والے تھے اس میں ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میڈم شوں پوں کرتی بھناتی ہوئی میرے پیچھے چلی آئی تھی۔

بہرحال اب تو جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آئندہ کیا ہوتا ہے۔ میڈم اس دور دراز دیہاتی حویلی میں موجود تھی اور یہاں کا چوہدری بشارت اس سے کافی دبا ہوا نظر آتا تھا۔ خیالوں کے تانے بانے بنتا میں سو گیا۔ سویرے آٹھ بجے کے قریب آنکھ کھل گئی۔ میں نے دروازے کے سامنے سے ایک گوری چٹی لڑکی کو گزرتے دیکھا۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ اس کی عمر بائیس چوبیس سال رہی ہو گی۔ شباب اس کے انگ انگ سے ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔ دوانیا۔ ...یکھنی

ہوئی دروازے کے سامنے سے گزری اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ سویرے سویرے اخبار نظر آنے کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں میں اخبار آتا ہے اور اس حویلی میں سارے مکین بالکل دیہاتی بھی نہیں ہیں۔

ناشتا حسب توقع بڑا تگڑا اور پر تکلف تھا۔ ناشتا لانے والے ملازم کا نام نواب دین تھا۔ ایک آدھ گھنٹے میں یہ خالص دیہاتی بندہ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ نواب دین چوہدری بشارت کے بااعتماد اور رازداں ملازموں میں سے تھا۔ نواب دین کے سوا فقط ایک اور ملازم کو یہ بات معلوم تھی کہ حویلی میں کون مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان کی حیثیت کیا ہے۔

نواب دین کی باتوں سے پتا چلا کہ اس حویلی میں چوہدری بشارت اور اس کا چھوٹا بھائی چوہدری لیاقت رہتے ہیں۔ چوہدری بشارت کی بیوی تین چار سال پہلے فوت ہو چکی ہے' چھوٹا بھائی چوہدری لیاقت بھی شادی شدہ ہے۔ آج کل چوہدری بشارت کی والدہ اپنے بیٹے کے لیے نئی دلہن لانے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اردگرد کے دس پندرہ گاؤں چوہدری بشارت اور چوہدری لیاقت کی ملکیت تھے' علاقے میں ان کا خاصا دبدبہ تھا۔ خاص طور سے چوہدری بشارت تو ہر سیاہ سفید کا مالک تھا۔

نواب کی آخری بات ممکن تھا کہ درست ہو مگر کل رات تو مجھے چوہدری بشارت کا دبدبہ کہیں نظر نہیں آیا تھا' وہ میڈم کے سامنے بھیگی بلی ہی بنا رہا تھا۔

میرا سارا دن اسی ایک کمرے میں گزرا۔ نواب دین نے باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ میرا اور میڈم کا اپنے اپنے کمروں میں رہنا ضروری ہے۔ کیوں رہنا ضروری ہے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔

شام کے وقت میں نے دروازے میں سے جھانکا تو برآمدے کی دوسری جانب بھرپور سی لڑکی نظر آئی۔ اس نے آدھی آستین کی دیہاتی قمیص پہن رکھی تھی۔ دودھ اور میدے سے گندھی اس کی سپید سڈول بانہیں دور ہی سے چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ دس بارہ سال کا ایک خوب رو لڑکا چارپائی پر دراز تھا۔ لڑکے کا سر گاؤ تکیے پر تھا۔ لڑکی اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ لڑکا ٹانگیں دبوانے کے ساتھ ساتھ انگریزی کی کتاب بھی پڑھ رہا تھا۔ کسی وقت وہ کوئی غلط لفظ بول دیتا تھا تو لڑکی اسے ٹوک دیتی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکا اس دوشیزہ کا چھوٹا بھائی ہوگا اور اگر لڑکی شادی شدہ ہے تو پھر اس کا دیور بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھنے میں عمر اتنی ہرگز نہیں تھی کہ لیٹے ہوئے لڑکے کو اس کا بیٹا سمجھا جا سکتا۔ شاید میں کچھ دیر مزید بھی مختلف اندازے لگانے میں مصروف رہتا مگر اسی دوران میں نواب دین آ گیا اور اس نے میرے انداز کو بھانپتے ہوئے میرے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں نے پوچھا "نواب! یہ کون ہے؟"

"یہ چھوٹے چوہدری لیاقت کی گھر والی (بیوی) ہے۔"

"اور یہ لڑکا؟"

"یہی تو چھوٹے چوہدری صاحب ہیں۔" نواب نے اطمینان سے کہا۔

"یا کیا۔ یہ چوہدری صاحب ہیں؟"

"ہاں جی! یہی چوہدری صاحب ہیں۔ بڑے چوہدری صاحب کو ان کی شادی چھوٹی عمر میں کرنی پڑی ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے' زمیں داروں میں جائداد وغیرہ کا مسئلہ ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی باہر کے خاندان میں ہو جائے تو جائداد بھی ساتھ ہی چلی جاتی ہے۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ لڑکے کی صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ کہاں وہ ملوک سا کم سن لڑکا اور کہاں اس کی جوان بیوی جس کی جوانی کپڑوں سے باہر ہو رہی تھی۔ ایسے تماشے کے بارے میں سنا تو پہلے بھی کئی مرتبہ تھا مگر دیکھ آج ہی رہا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟" نواب دین نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے اس شادی کو؟"

"دو تین سال تو ہو گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ شروع میں تو یہ اپنے دلہا کو گود میں اٹھائے پھرتی ہوگی۔"

وہ مسکرایا "نہیں چھوٹی چوہدرانی نے تو دلہا کو گود میں نہیں اٹھایا' مگر زمیں داروں کے گھرانوں میں کہیں کہیں ایسا ہوتا بھی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ نواب دین مجھ سے میری اور میڈم کی آمد کے بارے میں سوال پوچھے گا یا یہ جاننا چاہے گا کہ میڈم کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ مگر اس سلسلے میں وہ بالکل خاموش ہی رہا۔ غالباً اسے چوہدری بشارت کی طرف سے خاموش رہنے کی خاص ہدایت کی گئی تھی۔ میں نے نواب دین سے فرمائش کی تو اس نے مجھے بھی صبح کا باسی اخبار لا دیا۔ یہ وہی اخبار تھا جو صبح سویرے حویلی کی چھوٹی چوہدرانی کے زیر مطالعہ تھا۔

میں نے اخبار دیکھا اور حسب توقع مجھے پچھلے صفحے پر شیخوپورہ روڈ والے واقعے کی خبر نظر آ گئی۔ خبر کی سرخی یوں تھی "راکی گینگ کا سرغنہ ڈیوڈ عرف ڈیوی ہلاک" ذیلی سرخیاں کچھ اس طرح تھیں۔ ڈیوی دو متحارب گروہوں کی ڈبھنگ میں ہلاک ہوا۔ ڈیوی کا ساتھی نوجوان اور لڑکی بچ نکلنے میں کامیاب۔ ڈیوی کا ٹکراؤ اپنے ہی گینگ کے لوگوں سے ہوا۔ قتل کے سلسلے میں میڈم شہرزاد نامی عورت پر شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ واقعے میں پولیس کا سب انسپکٹر سخاوت علی بھی شدید زخمی ہوا۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

خبر کی تفصیل میں ۷۵ فیصد واقعات وہی تھے جو ہمارے سامنے پیش آئے تھے۔ باقی ۲۵ فیصد واقعات پولیس نے اپنے مفاد کے تحت شامل کر دیے تھے۔ اس خبر سے مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ ڈیوی کسی گروہ کا سرغنہ تھا۔ میڈم بھی "راکی گینگ" نامی اس گروہ میں شامل تھی۔

میڈم جیسی عورت کے خوف زدہ ہونے کی دو ہی وجوہات سامنے آتی تھیں یا تو وہ ڈیوی کے ساتھیوں سے خوف زدہ تھی یا پھر اسے اپنے ہاروت نامی باس کی فکر لاحق تھی۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ باس کے نزدیک میڈم کے ہاتھوں ڈیوی کا قتل ایک ناقابل معافی جرم ہوتا۔ اگر ایسی بات تھی تو پھر میڈم کا اپنے باس سے خوف زدہ ہونا قابل فہم تھا۔ میڈم کتنی بھی دھڑلے دار عورت سہی مگر باس تو باس ہی ہوتا ہے۔

اگلے روز مجھے حویلی کی بیٹھک سے اونچی آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ فاصلہ کافی تھا' یہ گفتگو میری سمجھ میں ہرگز نہیں آ سکتی تھی۔ ہاں اتنا معلوم ہو رہا تھا کہ بولنے والے چوہدری بشارت اور میڈم ہیں۔ میڈم کا انداز دھمکانے والا تھا' چوہدری بشارت دبے دبے لہجے میں بول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے چوہدری بشارت کو بیٹھک کے دروازے سے نکلتے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا لیکن یہ غصے کی نہیں شرمندگی اور ندامت کی سرخی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میڈم نے اسے کسی بات پر ڈانٹا ہے۔ نجانے کیوں مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میڈم کسی حوالے سے اس چوہدری بشارت نامی شخص کو بلیک میل کر رہی ہے۔ غالباً چوہدری بشارت کی کوئی کمزوری میڈم کے علم میں تھی اور اس کے بل بوتے پر وہ چوہدری کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی تھی۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ چوہدری بشارت نے ہمیں خوشی سے نہیں مجبوری سے مہمان بنایا ہے۔ اسی روز شام کے بعد میں نے کم سن شوہر اور جوان بیوی کی ایک اور جھلک دیکھی۔ کم سن چوہدری رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھا تھا' جوان چوہدرانی بھی کرسی پر تھی' وہ اپنے شوہر نامدار کو انگریزی کا سبق پڑھا رہی تھی۔ چوہدری صاحب نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی اوپر کالا ڈار واسکٹ تھی۔ گلے میں سونے کا کنٹھا تھا۔ جیسا کہ میں نے دیکھا تھا' کم سن چوہدری کبھی کبھی پگڑی بھی باندھتا تھا۔

چوہدرانی سبق پڑھا رہی تھی اور چوہدری جماہیاں لے رہا تھا۔ چوہدرانی جزبز نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ استانی ہوتی تو یقیناً اپنے ناہنجار شاگرد کے کان مروڑنے شروع کر دیتی مگر وہ بیوی تھی' اپنے شوہر کی شان میں گستاخی کیسے کر سکتی تھی۔ لہٰذا وہ لاڈ پیار سے اسے کتاب کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں اچانک چھوٹے چوہدری صاحب کو کچھ نظر آیا' انہوں نے کتاب ایک طرف پھینکی اور صحن کی طرف بھاگے۔ یہاں نیم کے درخت کے پاس ایک کشادہ ڈربا موجود تھا۔ چھوٹے چوہدری نے ڈربے میں سے ایک کبوتر نکالا اور اسے پکڑ کر چھت کی طرف دوڑ گیا۔ وہ ماہر کبوتر باز دکھائی دیتا تھا۔

○☆○

اگلے دو روز اسی حویلی میں گزرے۔ چوہدری بشارت کے ساتھ اس کی والدہ اور بہن بھی قیام پذیر تھی۔ چوہدری کا والد فوت ہو چکا تھا۔ اس کی بہن ایک قبول صورت لڑکی تھی اور غیر شادی شدہ تھی۔ اس کا نام نسرین تھا' چھوٹے چوہدری کی پڑھی لکھی بیوی کا نام فوزیہ تھا۔ اس نے بی اے کر رکھا تھا جبکہ چھوٹا چوہدری ابھی چھٹی میں پڑھتا تھا۔ بلکہ پڑھتا کم تھا اور کبوتر زیادہ اڑاتا تھا۔ وہ بیوی کو فوزی کہہ کر بلاتا تھا اور اکثر معاملوں میں اس سے بچوں کی طرح ضد کرتا تھا۔ بہرحال ابھی وہ عورت مرد والے معاملات اور جذبات سے کوسوں دور تھا۔

حویلی میں آنے کے بعد میڈم سے صرف ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تھی۔ میڈم نے کہا تھا "ہمیں چند دن یہاں رہنا ہے۔ تم حویلی سے باہر نہیں نکلو گے بلکہ کوشش کرو کہ کمرے سے بھی زیادہ نہ نکلنا پڑے۔ کسی نوکر چاکر سے اپنے بارے میں بات کرنے کی بھی بالکل ضرورت نہیں۔"

میں اب تک میڈم کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا مگر پھر ایک رات ایسی آئی کہ میں میڈم کی ہدایت پر کاربند نہ رہ سکا۔ مجھے نہ صرف کمرے سے نکلنا پڑا بلکہ ایک بندے سے بہت لمبی چوڑی بات چیت بھی کرنا پڑی۔ رات نو ساڑھے نو کا وقت تھا جب اچانک گرج چمک کے بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ بارش کا زور کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا گیا۔ میں جاگ رہا تھا اچانک میری نگاہ کھڑکی

سے باہر گئی۔ حویلی کے پچھواڑے والے احاطے میں پیپل کا ایک درخت بارش اور ہوا کے زور سے جھوم رہا تھا۔ بجلی چمکی اور مجھے یوں لگا جیسے اس درخت کے پتوں میں کوئی چھپا ہوا ہے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ شاید درخت میں کوئی کپڑا الجھا ہوا ہے یا پھر شہد کا کوئی بڑا چھتا ہے پھر مجھے یاد آیا کہ دن کے وقت مجھے ایسا کوئی چھتا یا کپڑا یہاں نظر نہیں آیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک چھت پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ یہ چاپ ظاہر کرتی تھی کہ کوئی دبے پاؤں حویلی کی برساتی کی طرف جا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ان گنت اندیشے کلبلا اٹھے۔ اگر واقعی کوئی چوری چھپے حویلی میں داخل ہوا تھا تو پھر اس کی آمد کا تعلق میڈم سے بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ڈیوی کے گینگ کا ہی کوئی بندہ ہو جو میڈم کا کھوج لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہو۔ یہ جو کوئی بھی تھا پہلے قریبی درخت پر چڑھا تھا اور وہاں سے کود کر چھت پر آگیا تھا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ نواب دین کو آواز دوں' پھر میں خود ہی باہر نکلا اور برآمدے میں سے گزر کر سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ سیڑھیوں پر تاریکی تھی۔ میں نے ربڑ کی چپل پہن رکھی تھی۔ احتیاط سے پنجوں پر پاؤں دھرتا میں برساتی میں پہنچ گیا۔ یہاں مکمل خاموشی تھی۔ برساتی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہوا کے زور سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ میں نے چھت کا جائزہ لیا چھت بھی جتنی نظر آرہی تھی خالی ہی تھی۔ میں پہلے تو واپس پلٹنے لگا مگر پھر شک رفع کرنے کے لیے چھت کی طرف آگیا۔ بارش کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ برساتی سے آگے تین چار فٹ تک شیڈ نکلا ہوا تھا۔ میں شیڈ کے نیچے چلا گیا۔ گاؤں کے کچے مکان مکمل تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور بڑی خاموشی سے بارش میں نہا رہے تھے۔ یکایک تاریکی میں سے ایک شخص نکلا اور میرے سامنے آگیا "کون ہے؟" اس نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے کہا۔

دفعتاً اس نے ریوالور نکال لیا۔ میں نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اس کے ریوالور پر ہاتھ مارا' ریوالور گر گیا۔ میں نے سر کی زوردار ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا مگر گرا نہیں' کافی سخت جان شخص لگتا تھا وہ۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور اس کے کندھوں سے چادر پھسل کر نیچے جا گری' اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے ہاتھ میں چاقو نظر آیا۔ جب مدمقابل کی چادر گری تو میں نے دیکھا کہ اس کے جسم پر وردی ہے۔ وہ پولیس کا آدمی تھا۔

اس نے مجھے چاقو کا ڈراوا دے کر اپنا گرا ہوا ریوالور اٹھانا چاہا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کی وردی کی جھلک دیکھنے کے بعد میں اس پر حملہ نہیں کروں گا' مگر میں نے ایک قدم بڑھ کر پھر لات گھمائی اور اس مرتبہ اس کے چاقو کو نشانہ بنایا۔ چاقو تو اس کے ہاتھ سے نہیں نکلا مگر اس کی چھاتی پر چوٹ پڑی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا اور اسی حالت میں برق رفتاری سے میری جانب آیا۔ اس نے غلیظ گالی دیتے ہوئے مجھ پر چاقو کا وار کیا۔ میں نے وار بچا کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی وہ گیند کی طرح لڑھک کر دیوار سے ٹکرایا لیکن اس کے ہونٹوں سے کوئی کراہ نکلی اور نہ چاقو اس کے ہاتھوں سے چھوٹا۔ ایک لمحے میں سنبھل کر وہ پھر میرے سامنے آگیا۔ وہ ایک ضدی سانڈ کی طرح مجھ سے باقاعدہ مقابلے کے موڈ میں نظر آنے لگا تھا۔ وہ زور آزمائی کا خواہش مند تھا لہٰذا میں نے بھی فرض جانا کہ اسے موقع فراہم کروں۔ پولیس والوں کے پاس چاقو وغیرہ کم ہی ہوتے ہیں یا تو یہ فرضی پولیس والا تھا یا پھر پولیس والا ہونے کے ساتھ ساتھ "بدمعاش" بھی تھا۔

طوفانی موسم اور گھن گرج میں ہم ایک دوجے کے روبرو کھڑے تھے۔ اس مرتبہ میرے حریف نے خطرناک جھکائی دے کر حملہ کیا۔ اس حملے کے جواب میں میں نے اسے یہ سبق سکھایا کہ چاقو کے پیچھے چاقو بردار کے جسم کا پورا وزن ہونا چاہیے ورنہ وار میں طاقت نہیں ہوتی اور یہ وار آسانی سے بچایا بھی جا سکتا ہے' اس مرتبہ میری ٹانگ پھر اس کی پسلیوں پر لگی تھی۔ اس دہری چوٹ نے اسے درد سے بے تاب کر دیا۔ گالیاں بکتے ہوئے اس نے اندھا دھند کئی وار مجھ پر کیے مگر اس کا چاقو صرف ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ بوکھلا سا گیا تھا' اسی بوکھلاہٹ میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سنبھلنے کی کوشش میں گھٹنوں کے بل گرا' میں نے لپک کر اس کی گردن اپنے بازو میں دبوچی اور مخصوص جھٹکا دے کر اسے لمبا لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

وہ اتنا سخت جان تھا کہ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ میں نے انگلیاں کھول کر اس کا چاقو چھڑایا۔ میرا خیال تھا کہ چھت پر دھما چوکڑی کی آوازیں سن کر نیچے سے کوئی نہ کوئی ضرور اوپر پہنچے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا' یہ چھت بڑی چھت سے علیحدہ تھی اور یہاں میرے' میڈم اور نواب دین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میڈم اور نواب دین دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ ایک نوکر اشفاق بھی برآمدے میں سوتا تھا مگر وہ شام کو چوہدری بشارت کے ساتھ کسی ضروری کام سے لاہور چلا گیا

تھا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا پھر میں نے بے ہوش شخص کو کندھے پر لادا۔ اس کی ایک اتری ہوئی جوتی اٹھائی۔ اس کا ریوالور جیب میں ڈالا اور سیڑھیاں اتر کر بڑی احتیاط سے اپنے کمرے میں واپس پہنچ گیا۔ میرا لباس شرابور ہو چکا تھا۔ بے ہوش شخص بھی لت پت تھا۔ طوفانی بارش کے سبب لائٹ گئی ہوئی تھی' میں نے لالٹین کی لو اونچی کر کے غور سے اپنے حریف کا جائزہ لیا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ عمر انتیس تیس سال کے قریب تھی۔ وہ سراپا ایک کرخت پولیس والا نظر آتا تھا۔ اس کے شولڈر کے پھول اس کا عہدہ سب انسپکٹر ظاہر کر رہے تھے۔

میرے سر کی ٹکر سے اس کا ایک رخسار پھٹ گیا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا' صرف ایک کھڑکی تھی اس کے پردے بھی برابر کر دیے۔ اپنے حریف کی جامہ تلاشی لے کر اور اس کا ریوالور وغیرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ اصلی پولیس والا ہے۔ یہ اصلی پولیس والا تھا اور کسی مشن پر حویلی میں داخل ہوا تھا تو ظاہر تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ پولیس کی مزید نفری بھی حویلی کے ارد گرد موجود ہو گی۔ یہ بڑی مخدوش صورت حال تھی۔ کسی بھی وقت پولیس والے حویلی میں داخل ہو سکتے تھے۔

کئی اندیشے میرے ذہن میں تھے لیکن اگلے آدھ پون گھنٹے میں بیشتر غلط ثابت ہو گئے۔ حویلی کے گیٹ پر کوئی دستک ہوئی اور نہ کوئی گرجتی برستی آواز سنائی دی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ گاہے گاہے بادل بھی گرج رہے تھے اور بارش بھی برس رہی تھی۔ میں نے اس پولیس والے کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ دیے اور ایک آزاربند سے اس کے دونوں پاؤں بھی کس دیے۔ اس کے بعد میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ پانچ دس منٹ بعد اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں اس کے عین سامنے کرسی پر بیٹھا تھا' وہ فرش پر لیٹا ہوا تھا' میں نے تو کپڑے بدل لیے تھے مگر وہ ابھی تک گیلے کپڑوں میں تھا اور یقیناً سردی محسوس کر رہا تھا۔

وہ اچھی طرح ہوش میں آچکا تو میں نے ریوالور اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "کون ہو تم۔۔۔ اور یہ وردی کہاں سے ملی ہے تمہیں؟"

"یہ میری وردی ہے۔ میں یہاں کے تھانے کا سب انسپکٹر ہوں۔ ایس ایچ او افتخار لاہوری میرا چاچا ہے۔"

میں نے اسے اور اس کے چاچے کو ایک موٹی گالی نکالتے ہوئے کہا "میں بھی لاہوری ہوں اور تم دونوں کو ایسا رنڈا دے سکتا ہوں کہ تمہاری نسلیں بھی کانوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو جائیں گی' لہٰذا اگر بخیر و عافیت کل کا سورج دیکھنا چاہتے ہو تو سچ سچ بتا دو کہ یوں رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح حویلی میں کیوں گھسے ہو؟"

وہ مرعوب ہوئے بغیر اکڑ کر بولا "پولیس کو جہاں جرم کا شک ہو گا وہاں وہ ضرور پہنچے گی چاہے وہ کسی کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔"

"یہاں کیا جرم ہوا ہے؟"

"جرم ہوا ہے اسی لیے آیا ہوں نا۔"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا' وہ رنگین مزاج بھی لگتا تھا۔ میں نے سوچا کہیں یہ چھندر حویلی کی کسی خاتون کے چکر میں یہاں نہ آیا ہو۔ کم از کم دو خوش شکل لڑکیاں تو حویلی میں میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے ایک بڑے چوہدری کی بہن تھی اور دوسری بڑے چوہدری کی بیوی۔ میں نے یہ شک ذہن میں رکھ کر اس شخص سے چند سوال پوچھے' اور نتیجہ یہی نکالا کہ میرا یہ شک غلط ہے۔ ویسے بھی چوہدریوں کی بہن تو بڑے چوہدری کے ساتھ لاہور گئی ہوئی تھی۔ چھوٹے چوہدری کی بیوی فوزیہ پڑھی لکھی اور نفاست پسند نظر آتی تھی' وہ اس سانولے سے دیہاتی سب انسپکٹر کے ساتھ کیسے اٹیچ ہو سکتی تھی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھی سیدھی انگلیوں نہیں نکلے گا۔ یہ شیر افگن نامی سب انسپکٹر بے حد ڈھیٹ مٹی سے بنا ہوا تھا اور بے حد کرخت بھی تھا۔ بندھا ہوا ہونے کے باوجود وہ مجھے مسلسل دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے ہاتھ پاؤں کھول دوں اور وہ کسی بیرونی مدد کے بغیر میرے ساتھ دو بدو مقابلہ کرے۔ وہ دعوے سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں اسے کھول دوں گا تو جو کچھ پوچھوں وہ بتائے گا اور میرے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کرے گا۔ میں نے کہا "میں زور آزمائی کا ایک موقع تمہیں دے چکا ہوں' اب تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے یا پھر اپنی ہڈیاں تڑوانی ہوں گی۔"

"تو توڑ دو ہڈیاں۔ مار دو مجھے جان سے۔" وہ غرایا۔

قریب ہی ایک پلاس پڑا تھا۔ میں نے اس کے جسم کا نازک حصہ پلاس میں پکڑا تو اس نے بے اختیار چیخنے کے لیے منہ کھول دیا۔ اس سے پہلے کہ چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوتی میں نے ایک کپڑا اس کے منہ میں یوں گھسیڑا کہ منہ بس

بند ہی ہو کر رہ گیا۔ پلاس بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا۔ سب انسپکٹر شیر افگن ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخنے لگا، تاہم یہ چیخیں اس کے حلق کے اندر ہی اودھم مچا رہی تھیں۔ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، وہ مچل تو کھا سکتا تھا لیکن اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

چند سیکنڈ میں اس کا سانولا چہرہ پسینے سے نہا گیا۔ وہ ایک کرخت پولیس والا تھا۔ اپنے شکنجے میں آئے ہوئے حوالاتیوں کے ساتھ وہ پتا نہیں کیا کیا سلوک کرتا رہا تھا۔ آج وہ خود شکنجے میں تنا تھا اور اسے بازار میں بکنے والی ہر شے کا بھاؤ معلوم ہو گیا تھا۔ صرف دو تین منٹ میں سب انسپکٹر افگن کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ میری ہر بات ماننے پر آمادہ ہو گیا۔ میں نے اس کے حلق میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا تو وہ ہر سوال کے جواب میں فر فر بولنے لگا۔ بولتے ہوئے اس کی نگاہ جونہی میرے ہاتھ میں پکڑے پلاس (جمور) پر پڑتی تھی اس کا سانولا رنگ کچھ اور سانولا ہو جاتا تھا۔

میں نے پوچھا ”افگن صاحب! آپ کس لیے تشریف لائے تھے یہاں؟“

وہ بولا ”میں نے اخبار میں خبر پڑھی تھی۔ مجھے شک پڑا کہ چوہدری بشارت کی حویلی میں جو عورت مرد آئے ہیں ان کا تعلق شیخوپورہ روڈ پر ہونے والے قتل سے ہے۔“

”شک کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے، تمہیں بیٹھے بٹھائے شک کیسے پڑ گیا پھر اگر تم نے تفتیش ہی کرنی تھی تو سیدھے طریقے سے کرتے اور اگر تم نے چھاپہ مارنا تھا تو پھر بھی تمہارے ساتھ تمہارے عملے کا ہونا ضروری تھا۔“

وہ جواب میں بولا ”میرا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ جب میں کسی مشتبہ پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو میرے ساتھ عملہ نہیں ہوتا۔“

• ”میں نے کبھی ایسا پولیس والا نہیں دیکھا۔“

”لیکن۔۔۔ میں ہوں۔“ اس نے کہا۔

پھر وہ مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ اس کی باتوں سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ کچھ اس طرح تھا۔ شیر افگن ایک زمیں دار گھرانے کا بگڑا تگڑا فرد تھا۔ اسے باوردی بدمعاش کہا جائے تو بالکل غلط نہ ہوگا۔ علاقے میں اس کا بڑا ٹھکا تھا۔ وہ مجرموں کو کھلے عام مارتا تھا اور کبھی کبھی گاؤں کے چوراہے میں باقاعدہ ان کے ساتھ مقابلے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹا پہلے اس نے چھت پر میرے ساتھ بھی باقاعدہ مقابلے کی سی سچویشن بنالی تھی۔

بہرحال وہ میرے سوالوں کا کوئی ٹھوس جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اسے کیسے شک پڑا کہ رات کو حویلی میں آنے والے مہمان وہی ہیں جنہوں نے ایک دن پہلے قتل کی واردات کی ہے۔ دراصل اس جواب سے ایس آئی افگن نے خود کو خواہ مخواہ پھنسا لیا تھا۔ پتا نہیں اس نے یہ جواب کیوں دیا تھا۔ بظاہر مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ بدحواسی میں ایک الٹی سیدھی بات اس کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اب وہ اس بات کے لیے مختلف دلیلیں پیش کر رہا تھا۔ کہنے لگا ”جس رات واردات ہوئی اسی رات تم لوگ یہاں پہنچے اس لیے مجھے شبہ ہو گیا۔۔۔“ پھر کہنے لگا ”حویلی میں اخبار صرف اتوار کو آتا ہے مگر اس روز چوہدری بشارت نے اسپیشل طور پر اخبار منگوایا تھا۔ اس لیے مجھے شک پڑا۔“

یہ اور اس طرح کی دوسری دلیلیں کافی کمزور تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عیار سب انسپکٹر کسی گہرے چکر میں یہاں آیا تھا اور مجھ سے بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ اس کا تنہا آنا بھی اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔

میں نے ایک بار پھر پلاس کا استعمال کیا۔ تھوڑی سی بے رحمی نے میرا کام کافی آسان کر دیا، ورنہ جس قسم کا یہ بندہ تھا مجھے ناکوں چنے چبوا دیتا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا میں نے اسے پانی وغیرہ پلایا، اس نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ طوفانی بارش کی گھن گرج میں اس کے رونے کی آواز ڈوب سی گئی تھی۔

میں نے کہا ”دیکھو شیر افگن! میں تجھ سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ صرف سچ!“

اس مرتبہ اس نے واقعی سب کچھ سچ سچ بک دیا۔ اس نے قریباً آدھے گھنٹے کے اندر کراہتے ہوئے رک رک کر جو کچھ بتایا وہ میں اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہوں ”سب انسپکٹر شیر افگن کی حیثیت چوہدری بشارت کے رازداں کی سی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم باتیں چھپاتے تھے۔ چوہدری بشارت نے بہت کوشش کر کے شیر افگن کی تبدیلی اپنے تھانے میں کروائی تھی۔ افگن کو یہاں آئے ہوئے ابھی صرف ڈیڑھ دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ افگن آج یہاں میڈم کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔ وہ میڈم کو قتل کیوں کرنا چاہتا تھا؟ کس کے کہنے پر اور کس طرح کرنا چاہتا تھا، ان سوالوں کے جواب بھی افگن کی طویل گفتگو میں موجود تھے۔

شیر افگن کو میڈم کے قتل پر چوہدری بشارت نے مامور کیا تھا اور اس لیے کیا تھا کہ وہ میڈم کی بلیک میلنگ سے بچنا چاہ رہا تھا۔ میرا یہ اندازہ سو فیصد درست نکلا تھا کہ میڈم

چوہدری بشارت کو کسی حوالے سے بلیک میل کر رہی ہے۔ بلیک میلر کے پاس اپنے شکار کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ میڈم کے پاس بھی ایک کمزوری موجود تھی۔ یہ کوئی دو سال پہلے کی بات تھی۔ چوہدری بشارت اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایبٹ آباد گیا۔ ایبٹ آباد میں چوہدری بشارت کے ایک شہری دوست کا کوٹھی نما مکان تھا۔ گرمیوں میں اس دوست کے اصرار پر چوہدری بشارت وہاں چلا گیا۔ اس مکان کے ساتھ جو کوٹھی تھی وہ اسی میڈم شہزادو کی تھی۔ یہ کوٹھی خالی پڑی تھی۔ دوسری طرف چوہدری بشارت کے گھر میں ایک انوکھی کہانی چل رہی تھی۔ اس کہانی کا تعلق چوہدری بشارت اور اس کے چھوٹے بھائی کی بیوی سے تھا۔ چوہدری کا چھوٹا بھائی چوہدری لیاقت کم سن تھا اور ایک جوان جہان خوب صورت بیوی کا شوہر تھا۔ دنیا والوں کے سامنے تو چوہدری بشارت کا رویہ فوزیہ کے ساتھ جیٹھوں اور بڑے بھائیوں والا تھا۔ وہ اس کے سر پر باقاعدہ پیار دیتا تھا اور اسے بڑے لاڈ سے بلاتا تھا، مگر اندر خانے وہ فوزیہ پر ہوس کی نظر رکھتا تھا۔ اس کی اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی، ماں کے بے حد اصرار کے باوجود وہ دوسری شادی نہیں کر رہا تھا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اپنے کم سن بھائی کی بیوی میں الجھا ہوا تھا۔ شروع میں تو فوزیہ اس بدبخت کی مذمت کرتی رہی مگر پھر اس کی شیطانیت میں الجھ گئی۔ دھیرے دھیرے وہ اسی رنگ میں رنگ گئی جس میں اسے جیٹھ صاحب رنگنا چاہتے تھے۔ کم سن شوہر اپنے معاملات سے یکسر بے خبر اور لاتعلق تھا۔ جن دنوں چوہدری بشارت کی فیملی ایبٹ آباد ٹھہری ہوئی تھی چوہدری بشارت اور فوزیہ کے درمیان غلیظ تعلق کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک رات مکان کی چھت پر دونوں خوش فعلیوں میں مصروف تھے انہیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ساتھ والی خالی کوٹھی میں بھی چند گھنٹے پہلے مکین آ چکے ہیں۔ میڈم اپنے بھائی نجیب (مرحوم) اور ڈرائیور رشید کے ساتھ شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی پہنچی تھی۔ اتفاقاً لائٹ گئی ہوئی تھی جس کی وجہ سے دونوں کوٹھیوں میں کوئی روشنی نہیں جل رہی تھی۔ میڈم چھت پر آئی تو اس نے بشارت اور نوجوان فوزیہ کو نازیبا حالت میں دیکھا۔ میڈم کو عورت مرد یا کسی بھی نر مادہ کا ملاپ سخت ناپسند تھا اور اسے مشتعل کر دیتا تھا۔ بشارت اور فوزیہ کو بھی اس حالت میں دیکھ کر وہ بھڑک اٹھی اور ان پر چیخنے لگی۔ اس نے انہیں برا بھلا کہا۔ وہ دونوں پہلے ہی چور تھے بدک کر نیچے چلے گئے۔ اگلے روز چوہدری، میڈم سے ملا اور اس سے تعلقات بہتر کرنے کی کوشش کی۔ چند دن بعد تعلقات تو ٹھیک ہو گئے لیکن چوہدری بشارت کا راز میڈم کے ہاتھ آ گیا۔

پچھلے دو سال میں دو تین موقعے ایسے آئے تھے جب چوہدری بشارت میڈم کے ہاتھوں بلیک میل ہوا تھا۔ میڈم نے دو مرتبہ چوہدری سے رقم حاصل کی تھی اور ایک مرتبہ چوہدری کو زمین کے ایک جھگڑے میں میڈم کی وجہ سے اپنی مونچھ نیچی کرنی پڑی تھی۔ اب پچھلے تقریباً ایک سال سے میڈم اور چوہدری کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تاہم تین چار دن پہلے میڈم پھر چوہدری کے سامنے آ گئی تھی۔ چوہدری ایک اکڑ خاں شخص تھا۔ یار باروں والا ہونے سے بہتر اس نے یہی سمجھا تھا کہ میڈم شہزادو کا ٹنٹا ختم کروا دے۔ یہ موقع بھی اچھا تھا۔ چوہدری کو پتا لگ چکا تھا کہ میڈم شیخوپورہ روڈ والی واردات کے بعد فرار ہوئی ہے، اس نے سوچا کہ پولیس کو اس بارے میں اطلاع کر دی جائے مگر اس میں بھی خطرہ تھا۔ ممکن تھا کہ میڈم اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ نکال لیتی اور پھر بعد میں چوہدری بشارت کا سوا ستیاناس کر دیتی۔ چوہدری نے پولیس کو اطلاع فراہم کرنے کی بجائے اپنے سب انسپکٹر دوست سے مشورہ کیا اور چھاپے کی کارروائی میں میڈم کو بار کر دینے کا پروگرام بنایا۔ یہ پروگرام بالکل واضح تھا۔ سب انسپکٹر شیر افگن کہہ سکتا تھا کہ میڈم کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا تھا۔ وہ اس شبے کی تصدیق کے لیے حویلی میں گھسا، ملزمہ نے اس پر اپنے سائیلنسر لگے پستول سے فائرنگ کی جواب میں اس نے بھی گولی چلائی جس نے ملزمہ کو ہلاک کر دیا۔ پروگرام کے مطابق آج شب چوہدری بشارت حویلی میں موجود ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اس معاملے میں اس کا ملوث ہونا بعید از قیاس تھا۔ میڈم کی موت کے بعد قانون چوہدری بشارت سے یہ پوچھ سکتا تھا کہ میڈم چوہدری کے گھر پناہ گزیں کیوں تھی۔ اس سوال کا موزوں جواب بھی بشارت اور سب انسپکٹر افگن نے تیار کر رکھا تھا۔ اس جواب کی رُو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ میڈم نے بے پناہ دھونس اور دبدبے سے حاصل کی تھی اور اس سے پہلے بھی وہ اس طرح کے کام کرتی رہی ہے۔

سازش کا سارا تانا بانا سامنے آ چکا تھا۔ سب انسپکٹر کے حویلی میں گھسنے کی ساری پلاننگ چوہدری بشارت کے مشورے سے ہوئی تھی۔ برساتی کا دروازہ اسی لیے کھلا رکھا گیا تھا کہ سب انسپکٹر بآسانی نیچے اتر کر میڈم کی خواب گاہ میں پہنچ سکے۔ یہ سارا کھیل میری وجہ سے خراب ہوا تھا۔ میں جاگ رہا تھا اس لیے اٹھ بیٹھا اور سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ جب افگن نے سیڑھیوں کے قریب آہٹ سنی تو اوپر چھت پر

ہی ٹھہر گیا' پھر چھت پر ہم دونوں کے درمیان باقاعدہ دنگل ہوگیا۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ غنڈہ صفت سب انسپکٹر بندھا ہوا میرے سامنے پڑا تھا۔ وہ بالکل عاجز اور مسکین نظر آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے منہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔ اس کی ساری ہیکڑی اس کی ناک اور آنکھوں کے راستے بہہ گئی تھی۔ انسان کتنا بے بس ہے' مگر اپنی صحت' طاقت اور اختیار کے زعم میں وہ اپنی بے بسی کو فراموش کیے رہتا ہے۔ نمرود' فرعون' چنگیز خاں یہ سب انسان ہی تو تھے' بے حساب طاقت ہونے کے باوجود اگر وہ بھی کسی ''بلاس'' کی زد میں آجاتے تو یقیناً اسی طرح روتے بلکتے اور آخر میں مسکین صورتیں بنا لیتے۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میڈم کا اعتماد جیتنے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن ایک اندیشہ بھی تھا۔ میڈم کے سامنے میرا تصور ایک چھوٹے درجے کے ذرے ذرے سے غنڈے کا تھا۔ اس غنڈے کو مجبور کر کے نادر جتی نے اس سے ایک قتل تو کرایا تھا مگر وہ از خود کسی کی جان لینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ مگر آج جو کچھ میں نے کیا تھا وہ ایک چھوٹے درجے کے ذرے ذرے غنڈے کا کام نہیں تھا۔ میں نے ایک سخت جان پولیس والے کی شاندار درگت بنائی تھی اور اسے بے بس کر کے اس سے نہایت اہم معلومات حاصل کی تھیں۔

بہرحال سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میڈم کو اپنے اس ''کارنامے'' سے آگاہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

میں نے سب انسپکٹر افگن کو وہیں بندھا چھوڑا اور خود جا کر میڈم کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میڈم نے پہلے اندر سے پوچھا ''کون ہے؟''

میرے جواب دینے پر وہ باہر آئی۔ وہ مردانہ شلوار قمیص میں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے نسوانی خدوخال بتدریج معدوم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جسم کے علاوہ اس کے چہرے پر بھی مردانگی نمایاں ہو رہی تھی ''کیا بات ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ کمرے سے باہر نہ نکلنا۔''

''میں باہر نہ نکلتا تو آپ کو۔ میرے منہ میں خاک...... بہت زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔''

''کیا بکواس کرتے ہو۔''

''آپ ذرا میرے ساتھ آئیں' میں سب کچھ بتاتا ہوں۔''

''میں اس وقت کہیں نہیں جا سکتی۔ تم نے جو بتانا ہے بتاؤ۔''

''یہ آپ کے خیال سے زیادہ اہم بات ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔''

وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر شال لے کر میرے ساتھ چل دی۔ چند ہی لمحے بعد ہم دونوں کمرے میں تھے۔ فرش پر سب انسپکٹر کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔

''یہ۔ کون ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''یہ آپ کی جان لینے کے لیے حویلی میں گھسا تھا۔''

''کیا بکتے ہو؟''

''میں ٹھیک کہتا ہوں میڈم۔'' پھر میں نے سب انسپکٹر افگن کے سامنے ہی ساری روئداد میڈم کے گوش گزار کر دی۔ میڈم کے چہرے پر مختلف رنگ آتے جاتے رہے۔ اختتام تک پہنچتے پہنچتے میڈم کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

اپنے بیان کی تصدیق میں نے سب انسپکٹر افگن سے بھی کرائی۔ میرے اشارے پر اس نے وہی باتیں دہرائیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے سامنے کی تھیں۔ میڈم بالکل شعلہ جوالا نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اوپر تلے کئی ٹھوکریں افگن کی پسلیوں میں رسید کیں اور دانت پیس پیس کر چوہدری بشارت کو مردانہ گالیاں دیں۔ شاید چوہدری بشارت موقعے پر موجود ہوتا تو وہ اس کی جان لے لیتی۔ سفاکی اور بے رحمی اس کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ اس سفاک کیفیت کے دوران میں اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تعریفی جھلک نظر آئی مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ افگن کی طرف متوجہ ہوگئی ''تیری تو اب لاش بھی نہیں ملے گی بچو!'' وہ اسے ٹھوکر مار کر بولی ''اور وہ چوہدری بشارت' حرامی' جو لیاقت کی بیوی سے بدکاری کرتا ہے' اسے تو میں وہ سبق سکھاؤں گی کہ نسلیں توبہ توبہ کرتی رہیں گی۔''

طیش سے بے قابو ہو کر اس نے میز پر سے افگن کا ہی گراری دار چاقو اٹھا لیا۔ اس کا انداز دیکھ کر افگن کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر افگن کے ہاتھ کھلے ہوتے تو وہ ضرور انہیں میڈم کے سامنے جوڑ دیتا۔ اس کے ہونٹ تھرانے لگے جب میڈم نے چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھایا تو افگن کے منہ سے خوف زدہ چیخ (چانگر) نکل گئی۔ میڈم نے چاقو والا ہاتھ اس کے سینے کے عین سامنے روک لیا۔

افگن کی حالت قابلِ ترس تھی لیکن وہ خود ترس کے قابل نہیں تھا۔ اس نے پتا نہیں کتنے بے گناہ حوالاتیوں کی اسی طرح چیخیں نکلوائی تھیں۔ دبنگ سے دبنگ انسان بھی جب اذیت کی چکی میں پستا ہے تو پہلے وہ خود روتا ہے پھر اس

کے اندر کا بچہ رونے لگتا ہے اور جب وہ بچہ روتا ہے تو دل ڈوب جاتا ہے اور نگاہوں کو یقین نہیں آتا۔ یہی سب انسپکٹر میرا افگن تھا جو ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے چھت پر مجھے غلیظ ترین گالیاں دے رہا تھا اور درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ رہا تھا' اب یوں لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت اس کی پتلون گیلی ہو جائے گی۔ اندر کا بچہ رو رہا تھا' وہی اندر کا بچہ اس کی پتلون بھی گیلی کر سکتا تھا۔ آہ حضرتِ انساں کی بے چارگیاں۔

میڈم نے خوفناک لہجے میں کہا ''تھانے میں کس کس کو معلوم ہے کہ تو بشارت کی حویلی میں آیا ہے؟''

''بس۔۔۔ بس' میرے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو معلوم ہے۔''

''اگر تو صبح تک واپس نہیں جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟''

''وہ پریشان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ صبح ہونے سے پہلے ہی میرا پتا کرنے چلا آئے۔''

''تجھے یقین ہے کہ وہ اور کسی کو نہیں بتائے گا۔''

''وہ تو نہیں بتائے گا لیکن جب مجھے زیادہ دیر ہو جائے گی تو عملہ میری تلاش شروع کر دے گا۔ آج کل دہشت گردوں کا ایک گروہ ہمیں خطرناک دھمکیاں دے رہا ہے۔''

میڈم نے افگن کو گالی دی اور بولی ''میں دیکھ لوں گی تیرے حرامی عملے کو بھی۔''

میڈم کے منہ سے مذکر کا صیغہ سن کر افگن کو حیران ہونا چاہیے تھا مگر وہ اتنا خوف زدہ تھا کہ اسے حیران ہونے کی فرصت بھی نہیں تھی۔

افگن کے بیان کے بعد ہم نے اس کے ہیڈ کانسٹیبل کا انتظار بھی شروع کر دیا تھا۔ رات کا باقی حصہ تیزی سے گزر گیا۔ صبح ہوگئی اور پھر سورج بھی نکل آیا مگر ہیڈ کانسٹیبل نے دستک نہیں دی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ہیڈ کانسٹیبل خطرے کی بو سونگھ کر کسی اور طرف نکل گیا تھا۔ اس ہیڈ کانسٹیبل کا نام بعد ازاں خوشی محمد معلوم ہوا۔ دن چڑھنے سے پہلے ہی ہم نے سب انسپکٹر افگن کے منہ میں اچھی طرح کپڑا ٹھونس کر اوپر پٹی باندھ دی تھی اور اسے پلنگ کے نیچے یوں گھسا دیا تھا کہ آسانی سے نظر نہیں آسکے۔ اس کا ریوالور اور جوتے وغیرہ میں نے لکڑی کی الماری میں رکھ دیے تھے۔

میڈم مجھے ضروری ہدایات دے کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نواب دین معمول کے مطابق آٹھ بجے کے قریب میرے لیے ناشتا لے کر آیا۔ یہ ناشتا میں نے اس سے دروازے پر ہی وصول کر لیا اور بتایا کہ کپڑے بدل رہا ہوں۔ ناشتے کے آخر میں وہ لسی لے کر آتا تھا۔ میں نے آج اسے لسی لانے سے منع کر دیا اور دروازہ اندر سے بند کر کے اطمینان سے ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ میں پلنگ پر تھا پلنگ کے نیچے افگن تھا۔ ناشتے کے دوران میں میں اسے دھمکا بھی جارہا تھا کہ اگر اس نے کسی کی موجودگی میں چوں چراں کرنے کی کوشش کی تو میں ایک بار پھر پلاس استعمال کرنے کے لیے آزاد ہوں گا۔

آج اتوار تھا۔ حویلی میں اخبار بھی آیا تھا۔ چھوٹی چوہدرانی فوزیہ پڑھ رہی تھی۔ میں کھڑکی کی درز سے اسے دیکھنے لگا۔ صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ فوزیہ کی صورت میں بھی معصومیت تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی اپنے جیٹھ جی کے ساتھ مل کر ایک گھناؤنا کھیل کھیل رہی ہے' پھر میرا دھیان کم سنی کی شادیوں کی طرف چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ رسم و رواج اور لالچ کے خود ساختہ بندھنوں میں جکڑے ہوئے ایسے لوگ یقیناً جاہلوں کے امام کہلانے کے مستحق ہیں۔ کبھی وہ جوان لڑکیوں کی شادیاں دودھ پیتے بچوں سے کرتے ہیں۔ کبھی کم سن لڑکیوں کو بڈھے کھوسٹ مردوں کے عقد میں دے دیتے ہیں۔ کبھی کوئی جوڑا کاروکاری کی بھینٹ چڑھتا ہے کبھی کسی کی شادی مقدس کتاب سے کرا دی جاتی ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو' فوزیہ اور بشارت کا جرم اپنی جگہ بھیانک تھا' اور وہ ان مجرموں میں سے تھے جو کسی طور معافی کے مستحق نہیں ہوتے۔

حویلی میں چوہدری بشارت کی واپسی دن بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ میں نے اسے مین گیٹ سے اندر آتے دیکھا۔ وہ تہبند قمیص پہنتا تھا۔ سر پر اکثر پگڑی بھی رکھتا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا حویلی میں داخل ہوا تو کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کی پریشانی' سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ جو پلاننگ کر کے لاہور گیا تھا اس کا نتیجہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ حویلی پہلے کی طرح پرسکون تھی۔ میڈم کی ''لاش'' کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا نہ پولیس والوں کا جمگھٹا نظر آرہا تھا۔ چوہدری کے ساتھ اس کا اونچی لمبی گوری چٹی بہن اور نوکر اشفاق بھی تھا۔

حویلی میں داخل ہونے کے بعد چوہدری بشارت نے سب سے پہلے میڈم کے بارے میں دریافت کیا۔ ملازم نواب دین نے بتایا کہ میڈم اپنے کمرے میں ہیں اور لیٹی ہوئی ہیں

''انہیں ناشتا وغیرہ کرا دیا تھا؟'' بشارت نے پوچھا۔

''جی چوہدری صاحب۔'' نواب دین نے ادب سے کہا۔

''اور وہ جہاں برادر؟''

''وہ بھی اپنے کمرے میں ہیں جی۔''

چوہدری نے نواب دین کو اپنے قریب بلا کر اس سے کچھ

کھسر پسر کی۔ نواب دین اثبات میں سر ہلاتا رہا پھر باہر چلا گیا۔ یقیناً وہ سب انسپکٹر شیر افگن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ شاید چوہدری بشارت نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے حویلی لے کر آئے یا اس طرح کی کوئی اور بات کی تھی۔ میں یہ سب کچھ کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا اور شیر افگن نیلی افگن بن کر میرے پلنگ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر تک چوہدری بشارت برآمدے میں بیٹھا رہا۔ فوزیہ اس کے لیے پیتل کے لمبے گلاس میں رہی کی لسی لے کر آئی۔ بشارت نے دو چار گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ فوزیہ اپنے جیٹھ صاحب کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی مگر جیٹھ صاحب اپنی ہی پریشانی میں غرق نظر آرہے تھے۔ کچھ دیر بعد فوزیہ لہراتی بل کھاتی واپس چلی گئی اور چوہدری چار پانچ منٹ تک حقہ پھونکنے کے بعد میڈم کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کھیل شروع ہو گیا ہے۔ شیر افگن والا ریوالور اب میرے قبضے میں تھا۔ میں نے ریوالور چیک کر کے اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔ فوزیہ برآمدے میں گھوم پھر رہی تھی۔ وہ اندر اپنی نند کے پاس چلی گئی تو میں اپنے کمرے سے نکلا اور میڈم کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا اور میڈم کا کمرا حویلی کے زنان خانے سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں میرے اور میڈم کے علاوہ صرف نواب دین اور اس کا ساتھی ملازم اشفاق ہی رہائش پذیر تھے۔ تاہم حویلی کے اس پورشن اور زنان خانے کے درمیان کوئی دیوار وغیرہ نہیں تھی۔ میں میڈم کے دروازے کے سامنے پہنچا۔ دروازے پر دبارڈالا وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی۔ دروازہ میڈم نے ہی کھولا اور مجھے جلدی سے اندر بلا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دروازہ پھر اندر سے بند کر دیا۔

اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ میڈم کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا پستول نظر آرہا تھا۔ چوہدری بشارت کی پگڑی فرش پر پڑی تھی۔ وہ سامنے پلنگ پر بیٹھا تھا' اس کی ایک باچھ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ تھر تھر کانپتا چلا جا رہا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے میڈم نے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ دوہرا ہو گیا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ اس کا دم نکل جائے گا۔ میڈم پھنکاری "دیکھ بشارتے! میں اپنی بات دہرانے کی عادی نہیں ہوں۔ ایک منٹ کے اندر یہاں تیری لاش تڑپتی نظر آئے گی۔ ورنہ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کر۔ چل اٹھ۔"

چوہدری کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا' وہ شدید تذبذب میں نظر آرہا تھا۔ میڈم نے دو قدم آگے بڑھ کر پستول اس کے سر سے لگا دیا "چل اٹھ۔" وہ پھر دہاڑی۔

چوہدری نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی گھنی مونچھوں کے نیچے سے بہتا ہوا خون صاف کیا۔ اپنی پگڑی اٹھا کر سر پر رکھی اور کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ایک کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ چند لمحے ساکت کھڑا رہا تب اس نے اپنے ملازم نواب دین کو آواز دی۔ بد حواسی میں وہ بھول گیا تھا کہ نواب دین کو تو وہ خود ہی کسی کام سے بھیج چکا ہے۔ اسے یاد آیا تو اس نے دوسرے ملازم اشفاق کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اشفاق بھاگا ہوا آیا۔ چوہدری بشارت نے اس سے کہا "بی بی نسرین کو میرے پاس بھیجو۔"

اشفاق جی اچھا کہہ کر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ چوہدری کی بہن نسرین ہی تھی۔ میڈم نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیا اور دروازے کو پھر سے چٹخنی چڑھا دی۔ نسرین نے کمرے کا ماحول دیکھا اور ایک دم اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اس نے اپنے بھائی کی باچھ سے رستا ہوا خون بھی دیکھ لیا تھا "کیا ہوا ہے۔ کیا ہوا ہے یہاں؟" وہ ڈر کر بولی۔

ایک دم میڈم نے جھپٹ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دانت پیس کر کہا "ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن تم نے شور مچایا یا زور دکھایا تو پھر تم دونوں بہن بھائیوں کا حشر بڑا خراب ہو گا۔ بڑے ترلے ڈال ڈال کر مرو گے تم۔" میڈم نے اپنا پستول جو دروازہ کھولتے ہوئے اپنے پیچھے کر لیا تھا' اب سامنے لے آئی تھی۔

پستول دیکھ کر نسرین کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ میڈم نے اسے یوں دبوچ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ چند لمحے بعد جب میڈم نے اندازہ لگا لیا کہ اسے چھوڑ بھی دیا گیا تو وہ مزاحمت نہیں کرے گی تو میڈم نے اس کے بال اپنی مٹھی کی گرفت سے آزاد کر دیے اور اسے پلنگ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ تھر تھر کانپتی بیٹھ گئی۔ وہ عام سمجھ بوجھ والی ایک عام سی دیہاتی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کی خصوصیت بس یہ تھی کہ اس کا قد کاٹھ اچھا تھا اور اس کے جسم پر مہنگا لباس تھا۔ وہ رو دینے کے قریب تھی۔ چوہدری ایک کونے میں کھڑا بے بسی سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ میڈم کے ہتھیار سے زیادہ خود میڈم سے خوف زدہ نظر آتا تھا اور یہ بات ہے بھی سچ۔ ہتھیار کی حقیقت بہت کم ہوتی ہے' اصل حقیقت اس شخص کی ہوتی ہے جو ہتھیار کے پیچھے ہوتا ہے اور اسے چلاتا ہے۔ میڈم نے شعلہ بار نظروں سے چوہدری کی آنکھوں میں دیکھا اور فیصلہ کن لہجے میں بولی "جتنے دن میں یہاں ہوں' تیری یہ بہن اس کمرے میں میرے ساتھ رہے گی۔ اگر تیرے گندے بھیجے نے پھر کسی کیڑے نے حرکت کی تو بغیر کسی وارننگ کے اس لڑکی کی لاش گر جائے گی اور تجھے یہ بھی اچھی طرح پتا ہے بشارتے کہ میرا کہا پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔"

بشارت نے تھوک نگلا "تم۔ تم مجھے اپنے پاس رکھ لو' اس کو جانے دو۔"

"دیکھ بشارتے! خوامخواہ بونگیاں مت مار! جو میں نے کہا ہے' وہی ہونا ہے۔ یہ لڑکی یہاں میرے ساتھ رہے گی' اب یہ فیصلہ کرنا تیرا کام ہے کہ تو اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں اور ایک بات یاد رکھ' جو کچھ تو میرے ساتھ کرنے والا تھا اس کے بعد مجھ سے رحم کی امید نہ رکھنا۔"

خوف زدہ لڑکی نے ایک دم اٹھ کر بھاگنے کی اضطراری کوشش کی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ پھر پلنگ پر جا گری۔ اس سے پہلے کہ وہ چیختی میڈم نے ایک بار پھر اسے دبوچ لیا اور اس کے منہ پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے جما دیا۔ چوہدری نے سب کچھ دیکھا مگر کر کچھ نہیں سکا۔ غالباً اس کی بدکاریوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ میڈم کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ نسرین نے تھوڑا سا مچل کر دیکھا پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میڈم کا آہنی ہاتھ ابھی تک اس کے منہ پر جما تھا۔ میڈم نے چوہدری سے مخاطب ہو کر غضب ناک لہجے میں کہا "دیکھ بشارتے! کسی کو شک نہیں پڑنا چاہیے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ ایک بار پھر کانوں کی کھڑکیاں کھول کر سن لو۔ اگر تیری طرف سے یا تیرے یار سب انسپکٹر کی طرف سے معمولی سی حرکت بھی ہوئی تو سب سے پہلے تیری اس بہن کی جان جائے گی۔"

میڈم کے لہجے میں ایسی آگ تھی کہ چوہدری کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ جیسے اس نے اقرار کر لیا کہ اس کی طرف سے یا اس کے یار افگن کی طرف سے ہر طرح کی ضمانت ہے۔ میڈم نے کہا "جہاں داد! تم چوہدری کو اس کتے کے پاس لے جاؤ تاکہ یہ اپنی زبان میں اسے سب کچھ سمجھا سکے۔ اسے تب ہی کھولنا جب تمہاری تسلی ہو جائے۔" میڈم کا اشارہ سب انسپکٹر افگن کی طرف تھا۔

چوہدری نے اپنی لرزاں و ترساں بہن کی طرف دیکھا اور رندھی آواز میں بولا "میڈم! میں۔۔۔ میں تمہیں اپنی طرف سے پوری تسلی دیتا ہوں' میں یا شیر افگن تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ لل۔۔۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟"

"اگر کسی تیسرے بندے کی طرف سے تمہارے خلاف کچھ ہو تو۔۔۔ اس کی سزا میری بہن کو نہیں ملنی چاہیے۔"

میڈم غرائی "یہاں کوئی تیسرا بندہ یا تیسری پارٹی نہیں ہے۔ اگر میرے خلاف کچھ ہوا تو وہ تمہاری طرف سے ہو گا۔ صرف تمہاری طرف سے۔ یہ بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔"

"لیکن میں نے تو۔۔۔"

"خاموش!" میڈم غرائی "میں نے جو کہنا تھا' کہہ دیا ہے۔ اب نکلو یہاں سے۔۔۔ نکلو۔"

چوہدری لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ نسرین کہیں میڈم سے مزاحمت شروع نہ کر دے۔ میڈم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں جہاں داد! تم جاؤ چوہدری کے ساتھ۔ میں سنبھال لوں گی اسے۔"

میں چوہدری کے ساتھ باہر آگیا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں شیر افگن میرے پلنگ کے نیچے بندھا پڑا تھا۔ اس کی ناک سے سوں سوں کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور افگن کو کھینچ کر پلنگ کے نیچے سے نکال لیا۔ چوہدری کے کہنے پر میں نے افگن کے منہ سے کپڑا کھینچ نکالا۔

چوہدری اور افگن ایک دوجے کو شکست خوردہ نظروں سے دیکھتے رہے پھر چوہدری نے اپنی باچھ سے رستا ہوا خون پونچھا اور بولا "افگن! ہمیں میڈم کے کہنے پر چلنا ہو گا۔"

"وہ کتیا۔ حرام زادی۔ میں اسے۔۔۔"

"خاموش ہو جاؤ۔" چوہدری نے تیزی سے افگن کی بات کاٹی "نسرین' میڈم کے قبضے میں ہے۔ وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں۔۔۔ اپنی بہن کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

اس کے بعد شیر افگن اور چوہدری میں پانچ دس منٹ بات ہوئی۔ افگن کو چوہدری نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ اب بہتری اسی میں ہے کہ میڈم کے قیام کے پانچ چھ دن خاموشی سے کاٹ لیے جائیں۔ افگن یوں تو اعتراض کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی راضی ہے۔ اس نے میرے ہاتھ دیکھ لیے تھے اور میڈم کی کینیکری بھی پہچان لی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس نے اس نٹنے میں مزید گردن گھسیڑی تو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد چوہدری نے مجھ سے کہا "اس کے ہاتھ پاؤں کھول

دو۔"

"یہ سب کچھ آپ کی ذمے داری پر ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں میری ذمے داری ہے۔" چوہدری نے سٹپٹا کر کہا۔

میں نے شیر افگن کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ اس کی تن فن ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اس کا ریوالور اور چاقو بھی اسے واپس کر دیے۔ وہ خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔

○☆○

اگلے پانچ چھ روز ہم نے اسی حویلی میں گزارے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ حویلی میں اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ یوں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا مگر چوہدری بشارت۔۔۔۔ چوہدری نہیں رہا تھا۔ مردانہ حویلی میں تو اس کا حکم بالکل نہیں چل رہا تھا۔ حویلی میں میڈم کا حکم چل رہا تھا اور اس لیے چل رہا تھا کہ چوہدری کی بہن نسرین یرغمال کے طور پر میڈم کے پاس تھی۔ میڈم کمرے سے بہت کم نکلتی تھی اور جب بھی نکلتی تھی نسرین اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ میڈم ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کرتی تھی۔ میڈم کے جسم پر ایک شال ہوتی تھی اور اس شال کے نیچے وہ پستول ہوتا تھا جو اس سے پہلے نجانے کتنے افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس سائیلنسر لگے پستول نے جو آخری قتل کیا تھا وہ ڈاڈی کا تھا۔

حویلی میں کسی اور کا تو پتا نہیں لیکن فوزیہ ضرور صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ چکی تھی۔ وہ کسی حد تک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ یقیناً وہ سمجھ چکی تھی کہ نسرین اگر ہر وقت میڈم کے ساتھ رہتی ہے تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہے۔ وہ اپنے عاشق چوہدری بشارت کا بجھا بجھا رویہ بھی بڑی وضاحت سے محسوس کر چکی تھی۔ چوہدری بشارت کا چہرہ ہر وقت لٹکا رہتا تھا اور فوزیہ کی ادائیں اور عشوہ طرازیاں اس پر بالکل اثر نہیں کرتی تھیں پھر ایک روز میں نے محسوس کیا کہ چوہدری بشارت اور نسرین کی طرح فوزیہ بھی حالات کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ سب کچھ اسے چوہدری بشارت نے ہی بتا دیا تھا۔ حالات سے آگاہی ہونے کے بعد فوزیہ کا منہ بھی دو کلے منہ ہو گیا تھا۔ اس نے سرخی پاؤڈر لگایا اور نہ بھڑکیلا لباس پہنا۔ بس زنان خانے کے برآمدے میں خاموشی سے بیٹھی اپنے شوہر کو پڑھاتی رہی۔ وہ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی لہٰذا جب پڑھائی کے دوران

میں شوہر صاحب نے اسے تنگ کیا تو اس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ جواب میں اس کے "مجازی خدا" نے اپنی پانچویں جماعت کی سائنس کی کتاب بیوی کے منہ پر دے ماری۔ چوٹ لگی تو چھوٹی چوہدرانی بھنا گئی اور یہ بھول گئی کہ دکھاوے کے طور پر ہی سہی اسے اپنے سرتاج کا احترام کرنا چاہیے۔ اس نے سائنس کی بک جواباً سرتاج کے منہ پر دے ماری۔ سرتاج کہاں چپکا بیٹھنے والا تھا وہ اپنی شریکِ حیات پر جھپٹا اور اسے مار نے لگا۔ جواب میں فوزیہ نے بھی سرتاج کے بال نوچے اور اس کی پشت پر مکے مارے۔ اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور بال بکھر گئے۔

اسی دوران میں فوزیہ کا "اصلی گھر والا" دندناتا ہوا اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے فوزیہ کے مجازی خدا کو بمشکل فوزیہ کی گرفت سے نکالا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر اپنی شریکِ حیات پر ٹانگیں چلا رہا تھا "ہوش کر لیاقت۔۔۔۔ ہوش کر۔" چوہدری بشارت نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹا اور پھر دو تین تھپڑ بھی اسے جڑ دیے۔

وہ زور زور سے رونے لگا' دوسری طرف فوزیہ بھی رونے لگی تھی۔ اندر سے چوہدریوں کی بیٹا رہاں دہائی دے رہی تھی "ہائے ہائے کی ہو گیا۔ اے مرن جوگی میرے پتر کو مار کر چھوڑے گی۔ ہائے رہا! وہ کون سا ویلا تھا جب میں نے اپنے ملوک پتر کو اس ڈائن کے پلے باندھ دیا۔"

چوہدری بشارت زور سے چیخا "تو تو چپ کر ماں۔ تو کیا واویلا کر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں چپ کر جاتی ہوں۔ تم مار دو اپنے بھرا کو۔ تمہارا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے اور ساتھ میں اس قفنے کٹن کا بھی۔ میں سب جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اس موت جوگی نے آکر میرا گھر گندا کر دیا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے کرتے بڑھیا کی آواز غصے اور بے بسی کے احساس سے پھٹ گئی تھی۔

فریقین کے دل کی بھڑاس باتوں کے ذریعے نکل گئی تو وہ قدرے ٹھنڈے نظر آنے لگے۔ اس قسم کی جھڑپ میں یہاں دوسری تیسری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ چوہدری بشارت کی بوڑھی ماں کو میں نے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا' وہ بیمار تھی اور اپنے کمرے میں ہی بند رہتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں کھیلے جانے والے شرمناک کھیل سے کافی حد تک آگاہ ہو چکی ہے' اور اس امر کی وجہ بھی جان چکی ہے کہ اس کا بڑا بیٹا مسلسل اصرار کے باوجود دوسری شادی کیوں نہیں کرتا ہے۔

آج پھر اتوار تھا۔ اخبار آیا ہوا تھا لیکن گھر والے چونکہ لڑنے جھگڑنے میں مصروف تھے لہٰذا اخبار خالی پڑا تھا۔ میں نے نواب دین سے کہا اور وہ میرے لیے اخبار اٹھا لایا۔ میں نے اخبار دیکھا' اس میں ایک دو خبریں میرے مطلب کی بھی تھیں۔

پہلی خبر ناشا کے بارے میں تھی۔ ناشا کو اخبارات کے ذریعے کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ ناشا کے کردار میں کئی ایسی باتیں تھیں جو لوگوں کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھیں۔ سب سے پہلے تو اس کا حلیہ ہی ایسا تھا کہ وہ ہر نگاہ میں آجاتی تھی۔ لمبی ترنگی' خوب رو اور چال ڈھال کا جنگلی انداز۔ پھر اس کا لباس بھی اسے ہر ایک سے ممتاز کرتا تھا۔ ایک طرف تو دلکش تھی' دوسری طرف نہایت سخت جان اور کرخت بھی تھی۔ اس نے جس طرح ایک فیکٹری اونر کے دفتر میں تن تنہا اپنی عزت کا دفاع کیا تھا اور لٹیرے کو ہلاک کیا تھا' ہر دل میں اس کا ایک مقام بنا گیا تھا۔ ملک کے ایک معروف قانون دان نے بلامعاوضہ ناشا کا مقدمہ لڑنے کا اعلان کیا تھا اور اس نے امید ظاہر کی تھی کہ عدالت ناشا کو باعزت بری کرے گی۔

اخبار میں ناشا کی ایک تصویر بھی چھپی تھی۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب اسے گرفتار کیا گیا تھا' وہ اپنے مخصوص جنگلی لباس میں تھی۔ اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں تھے اور وہ پولیس والوں کے درمیان کسی ایکشن فلم کے کردار کی طرح کھڑی تھی۔ ایک دوسری تصویر میں ناشا کو عدالت میں پیشی کے لیے لایا جا رہا تھا۔ پریس فوٹو گرافروں سے بچانے کے لیے لیڈی اہلکاروں نے اس کے سر پر کپڑا ڈال دیا تھا۔ ایک بے قابو ہجوم ناشا کو دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔

ناشا کے علاوہ ایک چھوٹی سی خبر شیخوپورہ روڈ والے قتل کے بارے میں بھی موجود تھی۔ پولیس کے ذرائع سے بتایا گیا تھا۔ ابھی تک ملزموں کا سراغ نہیں لگ سکا۔ وہ پولیس سب انسپکٹر جسے واردات کے وقت سر اور گردن پر ضربیں لگا کر بے ہوش کیا گیا تھا' کئی دن بے ہوش رہنے کے بعد معجزاتی طور پر ہوش میں آگیا تھا اور اس نے بتایا کہ قاتلوں میں ایک عورت بھی شامل ہے اور وہ دوبارہ دیکھنے پر اسے پہچان سکتا ہے۔ سب انسپکٹر کے اس بیان کے بعد میڈم شہزادی پر پولیس کا شبہ مضبوط تر ہو گیا تھا۔

میں اخبار دیکھ رہا تھا جب مجھے میڈم کی جھلک نظر آئی۔ وہ برآمدے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور اپنے ہاتھوں کے ناخن کاٹنے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کی شال کے نیچے بھرا ہوا پستول بدستور موجود ہے۔

میڈم آج مجھے تقریباً ۴۸ گھنٹے کے بعد دکھائی دی تھی۔ وہ آج کل بالکل خاموش نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کچھ سوچا سوچا لگتا تھا اور آنکھوں کے کنارے سرخ محسوس ہوتے تھے۔ میڈم کے الجھاؤ اور خاموشی کی وجہ بظاہر تو یہی نظر آتی تھی کہ اس کے ہاتھوں اچانک اپنے قریبی ساتھی کا قتل ہو گیا تھا' لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے اپنا جو علاج معالجہ شروع کرا رکھا تھا اس کے سلسلے میں اسے کوئی پریشانی لاحق ہو۔ وہ اپنے ساتھ کوئی دوا وغیرہ نہیں لا سکی تھی۔ اس کا معالج بھی شیخوپورہ میں ہی کہیں رہ گیا تھا۔ مریض کے لیے معالج سے دوری اکثر پریشان کن ہوتی ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میڈم دن بدن کرخت اور غصیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا چہرہ ہر وقت تمتمایا رہتا تھا جیسے وہ بخار کی کیفیت میں ہو۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں وہ بے وجہ بھڑک نہ اٹھے۔ وہ برآمدے میں بیٹھی ناخن تراشتی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ میں اخبار پر نظر دوڑاتا رہا۔ اچانک اندر سے میڈم کے دھاڑنے کی آوازیں آئیں، وہ چوہدری بشارت کی بہن نسرین پر گرج برس رہی تھی۔

"حرام زادی! میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر تم نے یہاں سے جانے کی بات کی۔ یہاں تجھے کیا تکلیف ہے' تمہاری دم پر کس نے پاؤں رکھا ہوا ہے۔"

جواب میں نسرین کی باریک سی آواز سنائی دی۔ اس نے کچھ کہا تھا۔ اس بات کا جواب نسرین کو جس طمانچے کی صورت میں ملا اس کی آواز مجھے باہر تک سنائی دی پھر شاید وہ نسرین کو باقاعدہ پیٹنے لگی تھی۔ نسرین کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ چوہدری بشارت تو حویلی میں موجود ہی نہیں تھا۔ نواب دین برآمدے میں کھڑا تھا مگر اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ میڈم کے کمرے میں جا کر اپنی نسرین بی بی کی مدد کرے۔ چھوٹی چوہدرانی فوزیہ بھی برآمدے میں آگئی اور منہ کھول کر وہ آوازیں سننے لگی جو کمرے سے برآمد ہو رہی تھیں۔ اب ہمیں حویلی میں آئے دس بارہ روز ہو چکے تھے۔ فوزیہ' نواب دین' اشفاق سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے' وہ جان چکے تھے کہ چوہدری کی پراسرار مہمان نے چوہدری کی بہن کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ غالباً اب چوہدری نے بھی گھر والوں سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا

اور انہیں اعتماد میں لے کر صورت حال بتا دی تھی۔ یقینا اس نے اہل خانہ سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی صورت میڈم کے کمرے کے پاس نہیں جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ مارپیٹ کی آوازیں سن کر بھی کوئی نسرین کی مدد کے لیے نہیں گیا تھا۔

دو تین منٹ بعد آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ شاید میڈم کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ باہر نکلی اور برآمدے میں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔ وہ سخت مضطرب نظر آ رہی تھی۔ بار بار اپنا ماتھا مسلتی تھی' کبھی سر پیچھے کی طرف پھینک کر لمبے لمبے سانس لیتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میڈم نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر نسرین لیٹی ہوئی تھی اور اپنا چہرہ بازو میں چھپائے شاید رو رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ میڈم نے اس کی ایک کلائی نائلون کی رسی کے ساتھ بڑی مضبوطی سے باندھی ہوئی ہے۔ رسی کا دوسرا سرا پلنگ کے رنگین پائے سے گرہیں لگا کر باندھ دیا گیا تھا۔ نسرین کی کہنی پہ نیل بھی نظر آ رہا تھا' یقیناً یہ صبح ہونے والی مارپیٹ کا نتیجہ تھا۔

میڈم مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "جہاں داد! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس الو کی پٹھی کے پاس بیٹھو' میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لوں۔"

"جیسے آپ کا حکم میڈم جی۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

میڈم نے پستول مجھے تھماتے ہوئے کہا "یہ رکھ لو۔ اگر یہ حرام زادی کوئی گڑبڑ کرے تو بے شک اس کے ناریل میں سوراخ کر دو۔"

"آپ بے فکر رہیں میڈم!"

مجھے ضروری ہدایات دے کر اور سائیلنسر لگا پستول سونپ کر میڈم میرے والے کمرے میں چلی گئی۔ میں ایک کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

نسرین پہلو کے بل پڑی تھی۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی کمر کے گرد بل کھا کر کولہے پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی لیکن جاگ رہی تھی۔ جب میڈم کو گئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تو نسرین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک گال ابھی تک سرخ تھا اور آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک اشک بار نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی' پھر اس نے ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ بولی "تم مجھے شکل سے اچھے بندے لگتے ہو۔ رب کا واسطہ ہے' اس پاگل کے چنگل سے نکال دو۔ یہ میری جان لے لے گی۔ مجھے اس کمرے سے باہر جانے دو۔ تمہیں خدا رسول کا واسطہ۔"

میں نے پستول کے سائیلنسر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بی بی! میری حیثیت میڈم کے نوکر کی ہے' میں اس کے حکم سے باہر نہیں جا سکتا۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتاؤ۔"

وہ بولی "تو پھر گولی مار کر میرا کام ختم کر دو۔" آنسو اس کے شفاف رخساروں پر روانی سے بہہ رہے تھے۔

"مگر ہوا کیا ہے۔ کیا وہ مارتی ہے تمہیں؟"

وہ بولی "مجھے تو لگتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہے۔ اور اگر عورت ہے تو پھر اس کے اندر کوئی شے گھسی ہوئی ہے۔ کوئی سایہ شایہ ہے اسے۔ میں سچ کہتی ہوں' اس کے اندر کچھ ہے۔"

کچھ اسی قسم کے الفاظ میڈم کے بارے میں نارنگی کی ملازمہ رالو نے بھی کہے تھے۔ دراصل میڈم کا مزاج اور اس کا سارا جسمانی نظام ایک تبدیلی کے اثر میں تھا۔ اس تبدیلی نے میڈم کو شعلہ جوالا بنا کر رکھ دیا تھا۔ نسرین روتے ہوئے بولی "تم میڈم کے کیا لگتے ہو؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں اس کا ادنیٰ نوکر ہوں۔"

"تمہیں تو پتا ہو گا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ یہ عورت ہے یا مرد؟"

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ کسی مرد نے عورت کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ یہ مجھے دیکھتی ہے تو یہی لگتا ہے کہ کوئی مرد دیکھ رہا ہے۔ اس کی آواز' اس کا بولنا' اس کا چھونا سب مردوں جیسا ہے۔ یہ اپنا نام بھی مردوں کی طرح لیتی ہے۔ کل یہ ایک نئی بات کر رہی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ مجھے میڈم نہ کہو اور اس طرح نہ بلاؤ جیسے عورت کو بلاتے ہیں۔ مجھے مرد کی طرح بلاؤ۔ یہ آخر کیا شے ہے' میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ میرے قریب ہوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں کسی مرد کے قریب ہوں۔ یہ دیکھو' میں نے پلنگ گھسیٹ کر کتنی دور کر لیا ہے' پھر بھی..... پھر بھی اس کی گندی نظریں ہر وقت مجھ سے چمٹی رہتی ہیں۔"

ایک دم نسرین کو اندازہ ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ

بول گئی ہے۔ کچھ بھی تھا میں اس کے لیے ایک غیر مرد تھا اور وہ میرے سامنے ایک نازک موضوع پر بات کر رہی تھی۔ اس نے سر پر اوڑھنی درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا تو کہنی سے اوپر اس کی گوری چٹی ملائم جلد پر انگلیوں کے نشان نظر آئے۔ یہ نشان یقیناً میڈم کی بھاری بھرکم انگلیوں کے تھے۔ اس نے نسرین کا بازو اتنی زور سے پکڑا تھا کہ وہاں دباؤ کا نشان رہ گیا تھا۔ نسرین کی کلائی بھی چھلی ہوئی تھی۔ یہ وہی کلائی تھی جس میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بے چاری شاید اندھیرے میں اپنا بازو رسی میں سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

اچانک میڈم کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً سوئے بغیر ہی اپنے کمرے میں واپس آ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر نسرین کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جلدی سے دوبارہ پلنگ پر لیٹ گئی اور آنکھیں کبوتر کی طرح بند کر لیں۔ میڈم کے بال منتشر تھے۔ وہ بڑی بے آرام اور بیزار دکھائی دیتی تھی۔ آنکھیں سرخ اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے میرے سامنے رنگین گلاس پانی پیا' پھر کرسی پر آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے کمرے میں واپس جانے کا حکم دے دیا۔

میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ میڈم کے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ غالباً یہ گڑبڑ اس ادھورے علاج معالجے کا شاخسانہ تھی جس کا تعلق عطائی ڈاکٹر ابدال جی سے تھا۔ میڈم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اس کے چہرے پر ورم سا آ گیا ہے۔ اگلے روز میڈم نے مجھے کمرے میں بلایا۔ یہ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو نسرین کو بے خبر سوتے ہوئے پایا۔ وہ بے ترتیب پڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر ہے۔ میں نے میڈم سے پوچھا تو اس نے تصدیق کر دی۔ کہنے لگی "الو کی پٹھی ساری رات چوں چوں کرتی رہتی ہے' کبھی آنسو بہانے شروع کر دیتی ہے۔ میں نے نیند کی دو گولیاں دے دی تھیں۔"

"آپ نے کیسے یاد کیا؟" میں نے میڈم کا پریشان چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

میڈم نے بڑے مردانہ انداز سے سگریٹ سلگایا اور بولی "جہاں داد! تم ایک کام کرو۔ تمہیں لاہور جانا ہو گا۔"

"جو حکم آپ کا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "دراصل' میں اپنا علاج کرا رہا تھا۔ مجھے ہائی ٹمپریچر کی تکلیف ہے۔ ہر مہینے مجھے دو خاص انجکشن لگتے ہیں۔ اگر انجکشن وقت پر نہ لگیں تو میری حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اس مہینے بھاگ دوڑ کی وجہ سے انجکشن بہت لیٹ ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ حکم کریں۔ جہاں سے بھی ملے میں وہ انجکشن لے آؤں گا۔"

"بڑی سنجیدہ تکلیف ہے میری۔" میڈم نے ٹھنڈی سانس بھری "انجکشن بھی یہاں کہیں سے نہیں ملتے۔ یہ انجکشن ڈاکٹر ابدال صاحب کے پاس سے ملیں گے اور وہی لگائیں گے بھی۔ ڈاکٹر ابدال جی کو تو تم نے شیخوپورہ والی کوٹھی میں دیکھا ہی ہو گا؟"

"ہاں جی۔ وہی جو پینٹ کوٹ پہنتے ہیں اور سر پر سندھی ٹوپی رکھتے ہیں۔"

"ہاں وہی۔ وہ آج کل لاہور میں ہی ہیں' میں تمہیں ان کا ایڈریس دے دیتا ہوں تم کسی طرح چھپ چھپا کر ان تک پہنچو۔ اور انہیں یہاں لے آؤ۔ میں تمہیں ان کے نام رقعہ دے دیتا ہوں۔ ان کے پاس اپنی گاڑی ہے۔ وہ اسی میں سامان لے آئیں گے' ساتھ میں تم بھی آ جانا۔" میڈم شہزاد نے کہا۔

"سامان؟ کیا انجکشن کے لیے کسی سامان کی ضرورت ہو گی؟"

ایک دم میڈم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بولی "سامان وہی جو ڈاکٹروں کا ہوتا ہے اس کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔"

نجانے کیوں میری نگاہ میں شیشے کا بیضوی خول اور وہ دیگر لوازمات گھوم گئے تھے جو میڈم نے پچھلی دفعہ انتقالِ خون کے لیے استعمال کیے تھے۔

میڈم کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کہنے لگی "لیکن یہ کام بڑی احتیاط سے کرنے والا ہے۔ لاہور بہت بڑا شہر ہے اور وہاں جگہ جگہ پولیس کے ناکے بھی ہوتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں میڈم!" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر فدویانہ انداز میں کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ تم صرف ایک مرتبہ لاہور گئے ہو' اور وہ بھی صرف اسٹیشن کے علاقے میں ہی رہے ہو۔ تم مطلوبہ پتے تک کیسے پہنچو گے۔"

"میں پہنچ جاؤں گا میڈم۔ آپ بالکل بھی فکر نہ کریں۔"

میڈم الجھی ہوئی تھی۔ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی' سردی میں بھی اس کی گردن سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "اچھا' تم ایک اور کام کرو۔ تم آج رات حویلی سے باہر

نکلو اور کسی طرح یہ معلوم کر کے آؤ کہ ٹیلی فون یہاں سے کتنی دور ہے۔ مجھے پتا ہے کہ اس گاؤں میں تو فون شون نہیں ہے۔ ساتھ والے گاؤں میں بھی نہیں۔ یا پھر... ہو سکتا ہے کہ بشارت اور اس کی بہن مجھ سے جھوٹ بول رہے ہوں۔ تم خود جاؤ اور پتا کرو کہ فون یہاں سے کتنی دور ہے۔ اس کے بعد میں خود ڈاکٹر ابدال جی سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میری غیر موجودگی میں تم اس کتیا کا پہرہ دینا۔" میڈم کا اشارہ نسرین کی طرف تھا۔

میں نے کہا "جیسے آپ کا حکم۔ اندھیرا ہونے کے فوراً بعد میں نکل جاؤں گا۔"

مجھے کچھ ضروری ہدایات دے کر میڈم نے واپس بھیج دیا۔ اس کی سانس تیزی سے آ جا رہی تھی اور وہ کبھی کبھی مسلسل کھانسنے بھی لگتی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں صورتِ حال کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے وہ سنگین واقعہ بڑی اچھی طرح یاد تھا جب میڈم نے اپنی غرض کے لیے بڑی بے دردی سے میرے جسم کو زہریلے سانپوں سے ڈسوایا تھا اور میرے زہریلے خون کو کوئی کیمیائی عمل کرانے کے بعد اسے اپنے جسم میں منتقل کرایا تھا۔ اس خطرناک عمل میں چونکہ میں بچ گیا تھا لہٰذا میڈم کے لیے بہت قیمتی ہو گیا تھا۔ اپنے علاج کے دوسرے مرحلے میں اگر میڈم پھر میرا ہی جسم استعمال کرتی تو علاج کی کامیابی کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے اور یہی میری قیمت تھی۔ مجھے یاد تھا کہ جب میرے جسم میں نیا خون منتقل کرنے کے بعد ڈاکٹر کریم مجھے دوسرے کمرے میں لایا تھا تو ڈاکٹر ابدال جی اور ڈاکٹر کریم کے درمیان اہم گفتگو ہوئی تھی۔ اس گفتگو سے مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ ابھی جس خطرناک عمل سے میں گزرا ہوں وہ ایک ماہ بعد پھر دہرایا جائے گا۔ اب اس واقعے کو گزرے قریباً ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس عمل کے دہرائے جانے میں خاطر خواہ تاخیر ہو چکی ہے۔ شاید یہی تاخیر تھی جس کے سبب میڈم کی ذہنی اور جسمانی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ اب اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی اور وہ اپنے علاج کے دوسرے مرحلے کی خاطر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

میں میڈم کی ہدایت کے مطابق ٹیلی فون کی تلاش میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر میڈم شہزاد کی پلاننگ کے مطابق وہ عطائی ڈاکٹر یہاں راج نگر نامی گاؤں پہنچ گیا تو مجھے ایک بار پھر ایک جان لیوا مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا مجھے ایک بار پھر خود کو ایک نامعقول تجربے کے لیے ایندھن کے طور پر پیش کر دینا چاہیے؟ یہ کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔ سانپوں کی تحفہ کی ہوئی کرشماتی قوت یقیناً مجھ میں موجود تھی لیکن اس قوت کی حقیقت اور LIMTS کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس قوت پر اندھا اعتماد کرنا... ایسا ہی تھا جیسے کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دی جاتی۔ میرا ذہن اس صورتِ حال کے بارے میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میں جانے کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ ایک طرح کی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے حویلی سے نکلنے کا موقع مل رہا تھا۔ ٹیلی فون مل جاتا تو پھر اس ساہی صاحب سے بات کرنے کی کوشش بھی کی جا سکتی تھی۔

مگر پھر ایک دم میرا سارا پروگرام دھرا رہ گیا۔ میڈم نے نواب دین کے ہاتھ مجھے پھر سے اپنے کمرے میں بلوایا اور کہا کہ میں ٹیلی فون کی تلاش میں نہ نکلوں بلکہ ایک اور کام کروں۔ وہ بار بار اپنے فیصلے بدل رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ شدید تذبذب کی کیفیت میں ہے۔ اس نے نئے کام کے بارے میں مجھے نہیں بتایا کیونکہ نسرین اب جاگ رہی تھی۔ وہ میڈم کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میڈم کرسی پر بیٹھی تھی اور اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا رکھی تھی۔ میڈم نے آج مردانہ شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور قریب قریب مرد ہی نظر آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آواز پہلے سے زیادہ بھاری ہو گئی ہے۔ ہونٹوں کے اوپر کی سیاہی بھی پہلے سے گہری ہو گئی تھی۔ اب تو اس کے لیے مونث کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے واقعی عجیب سا لگنے لگا تھا۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے مجھے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ میں اب جاؤں۔ وہ مجھے اگلے پروگرام کے بارے میں بتائے گی (یا بتائے گا)۔

میں رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ رات گیارہ بارہ بجے کا وقت ہو گا جب میں نے میڈم کے کمرے سے کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنی۔ آواز کا بھاری پن بتا رہا تھا کہ یہ میڈم شہزاد ہی ہے۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں دبے قدموں برآمدے میں آیا۔ حویلی میں ہر طرف سناٹا تھا۔ مکین اور ملازم سو رہے تھے۔ چوہدری بنارت ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ میں میڈم کے کمرے کے عین سامنے پہنچ گیا۔ کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ دروازے سے کان لگائے۔ مدھم آوازیں سنائی دیں "چھوڑو مجھے... دیکھو ایسے نہ کرو یہ بات ٹھیک نہیں۔" نسرین کی آواز ابھری۔

"اچھا چھوڑ دیتا ہوں... لیکن تم بھی آرام سے بیٹھ کر

بات کرو۔" میڈم کی بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے نسرین کو اپنے بازوؤں میں جکڑ رکھا ہے۔

"کیا بات کروں۔ میں کیا بات کروں؟" نسرین نے جز بز ہو کر کہا۔

"اگر میں تم سے شادی کرنا چاہوں تو؟" میڈم شہزاد نے کہا۔

"یہ... کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟ کیا میں بھوکا ننگا ہوں۔ کیا کمی ہے مجھ میں۔"

"مگر لوگ..."

شہزاد نے نسرین کی بات کاٹ کر "لوگوں" کو ایک ننگی گالی دی اور بولی (یا بولا) "تمہیں کچھ نہیں لینا لوگوں سے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں تم کو پسند کرنے لگا ہوں اور تم بھی کہہ رہی ہو کہ تم مجھے ناپسند نہیں کرتی ہو پھر کیا جھگڑا ہے۔ اگر تم چاہو گی تو میں تمہیں اس علاقے بلکہ ملک سے ہی دور لے جاؤں گا۔"

چند لمحے گہری خاموشی طاری رہی۔ اس گفتگو سے مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ نسرین شہزاد کو بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ اپنے اس آسیبی صیاد کو بہلا پھسلا کر اس کی قید سے رہائی کی کوشش کرے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی نہایت نامعقول باتیں سن رہی تھی اور ان کے جواب بھی دے رہی تھی۔ میڈم شہزاد کسی بھولی بھالی شخصیت کا نام نہیں تھا، مگر وہ کسی ایسی جسمانی اور ذہنی ابتری کا شکار تھی جس نے اس کی عقل خبط کر رکھی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ دن بدن جنون کا شکار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نسرین کی ڈری ڈری آواز آئی "اچھا۔ تم کہتے ہو تو میں بھائی سے بات کرتی ہوں لیکن مجھے نہیں یقین کہ کچھ ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو اگر تم راضی ہو تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ وقت آنے پر میں سب سنبھال لوں گا۔" جواب میں نسرین نے کچھ کہا۔ آواز مجھے صاف سنائی نہیں دی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا شہزاد کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ اس کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی "مجھے لگتا ہے تمہارے سر میں بھیجے کی جگہ بھوسا بھرا ہوا ہے۔ حرام زادی... کتیا۔" اس کے ساتھ ہی طمانچے کی آواز سنائی دی۔ نسرین کی گھٹی گھٹی چیخ ابھری۔

"خاموش۔ میں کہتا ہوں آواز نہ نکلے۔ خاموش۔"

اس کے ساتھ ہی نسرین کی دبی دبی کراہیں ابھرنے لگیں۔ شہزاد نے غالباً اس کا بازو بری طرح مروڑ دیا تھا "ہائے میرا بازو ٹوٹ گیا۔" نسرین نے گھٹی گھٹی آواز میں دہائی دی، پھر وہ اس کی منت سماجت کرنے لگی۔ اس کی منت سماجت پر شہزاد نے اسے چھوڑ دیا... پھر خود کلامی کے انداز میں اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شیشے کی کوئی چیز فرش پر پٹخ کر توڑ دی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ مجھے ایک بار پھر وہی انگریزی کہانی یاد آ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی کہانی کے وہ الفاظ یاد آ گئے تھے جن میں اس قسم کی عورت کو ایک بھٹکی ہوئی روح سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس کہانی میں وہ عورت برے کردار کی مالک نہیں تھی لہٰذا اسے روح کہا گیا تھا۔ یہاں میڈم بدکردار عورت تھی لہٰذا اسے بدروح کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ یعنی بھٹکی ہوئی بدروح۔

صبح نو دس بجے کے قریب میڈم شہزاد یا شہزاد نے مجھے پھر طلب کر لیا۔ میں کمرے میں پہنچا تو نسرین کل کی طرح بدہوش پڑی تھی۔ بظاہر وہ آج بھی خواب آور دوا کے اثر میں تھی۔ شہزاد نے کرسی سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور اس کے ہونٹوں سے سگریٹ کا دھواں نکل رہا تھا "بیٹھ جاؤ۔" شہزاد نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ شہزاد کے ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں۔ اس کا چہرہ آج بھی تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے شعلے سے نکلتے محسوس ہوتے تھے۔ اس نے کہا "جہاں داد! آج رات تم ایک کام کرو۔ تم شیخوپورہ جاؤ۔ میں تمہیں ایک ایڈریس دیتا ہوں۔ تم نے اس ایڈریس پر پہنچنا ہے۔ یہ ایک کوٹھی ہے۔ گیٹ پر لیٹر بکس موجود ہے۔ میں تمہیں جو لفافہ دوں گا تم نے لیٹر بکس میں ڈالنا ہے اور آ جانا ہے۔"

"جو آپ کا حکم میڈم!"

میڈم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی "جہاں داد! آج کے بعد تم میرے لیے میڈم کا لفظ استعمال نہیں کرو گے۔"

"جو حکم میڈم۔" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"پھر وہی میڈم؟"

"غلطی ہو گئی جی۔ اب دھیان رکھوں گا۔" میں نے دانت نکالے اور گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا۔

میز کے نیچے کئی کاغذ مڑے تڑے پڑے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ شہزاد نے رات کے وقت کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً کوئی طویل خط وغیرہ تھا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ یہ خط میرے ذریعے کسی خاص شخص تک پہنچ جائے۔

شہزاد نے مجھے شیخوپورہ کا ایڈریس بڑی اچھی طرح سمجھایا۔ یہ گورنمنٹ کالج کے قریب شاہی روڈ کا علاقہ تھا۔ اس نے کوٹھی نمبر بتایا۔ وہاں کسی راجا مختار کے نام کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ایک لفافہ لیٹر بکس میں ڈال کر مجھے کال بیل بجانا تھی اور فوراً وہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بس میں سوار ہو کر واپس مرید کے آجانا تھا۔

تمباکو نوشی شہزاد کی عادت تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ آج کل ایک سگریٹ کے بعد دوسرا اس کے ہونٹوں سے لگ جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی زبردست قسم کی ابتری مچی ہوئی تھی۔ ضروری ہدایات دینے کے بعد اس نے ایک لفافہ بھی مجھے تھما دیا اور کچھ نقدی دیتے ہوئے کہا کہ میں شام ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں۔

میں لفافہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نسرین پلنگ پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی ایک کلائی بدستور رسی میں بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ اپنے بھائی کے گناہوں کی پاداش میں وہ بیٹھے بٹھائے ایک سنگین مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ ایک سفاک جنونی کے قبضے میں تھی اور اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب یہ بات مجھ پر سو فیصد ثابت ہو گئی تھی کہ علاج کے دوسرے دور میں تاخیر ہونے کے سبب شہزاد کسی زبردست پیچیدگی کا شکار ہے اور اس کا ہر پل سولی پر گزر رہا ہے۔

میں لفافہ لے کر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ لفافے پر انگریزی میں راجا مختار کا نام لکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اندر تحریر بھی انگریزی میں ہی ہو گی۔ شہزاد کی انگریزی اچھی تھی' میں نے اسے کئی مرتبہ ڈیوی سے فر فر انگریزی بولتے سنا تھا۔

میں اس لفافے کو کھولنا چاہتا تھا مگر اس طریقے سے کہ بعد میں اسی طرح بند بھی کیا جا سکے۔ بہرحال مناسب یہی تھا کہ میں یہ کام حویلی سے روانہ ہونے کے بعد کروں۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے مجھے چوہدری بشارت نظر آیا۔ وہ پندرہ بیس روز کے اندر ہی اپنی عمر سے بڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بال منتشر تھے۔ شہزاد کی موجودگی ایک گھن کی طرح تھی اور یہ گھن اسے چاٹ رہا تھا۔ چوہدری کے علاوہ کم سن چوہدری اور فوزیہ وغیرہ بھی سہمے ہوئے نظر آتے تھے۔ فوزیہ چوہدری بشارت کے لیے گرم دودھ لے کر آئی ساتھ میں ابلے ہوئے انڈے تھے۔ وہ لاہور سے آیا تھا۔ شاید وہ اس کی سردی اور تھکاوٹ دور کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کی باتیں اور ادائیں بھی چوہدری کی تھکاوٹ دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گی مگر چوہدری کے تاثرات بتا رہے تھے کہ فوزیہ کی موجودگی اسے زہر لگ رہی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ مرد کسی عورت کی خواہش میں بہت آگے نکل جاتا ہے پھر وہ عورت تو اسے مل جاتی ہے لیکن عورت کے ساتھ ساتھ بے شمار مصائب بھی اسے ملتے ہیں پھر جب مصائب اور مسائل کا گھیرا تنگ ہونے لگتا ہے تو مرد کے لیے اس عورت کی کشش کم ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اس عورت کو اپنے مسائل کی جڑ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ سب کیا دھرا اس کا اپنا ہی ہے۔ فوزیہ نے بھی جلد ہی چوہدری کی بیزاری کو محسوس کر لیا۔ وہ دودھ اور انڈے چوہدری کے سامنے چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں چلی گئی۔ اس کا شوہر ایک طرف لاتعلق بیٹھا تھا اور اپنی چنگ جوڑ رہا تھا' قریب ہی اس کے کبوتر دانا دنکا چگنے میں مصروف تھے۔

شام کے فوراً بعد میں شیخوپورہ جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے گرم چادر کی بکل مار لی تھی۔ ایک مفلر بھی سر پر اوڑھ لیا تھا۔ میرے پاس واحد ہتھیار میرا خم دار خنجر ہی تھا جو میں نے شیخوپورہ کے سول لائن روڈ سے حاصل کیا تھا۔ یہ خنجر شاید میری نفسیاتی ضرورت بن چکا تھا اس کی موجودگی سے مجھے بڑی تسلی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صفدر جیسا کوئی جگری دوست شانے سے شانہ ملا کر میرے ساتھ چل رہا ہے۔

میں حویلی سے نکلا تو راج نگر گاؤں کے گلی کوچے میرے سامنے تھے۔ تاریکی اور سردی نے اکثر لوگوں کو گھروں میں بند کر رکھا تھا۔ میں ٹھٹھرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ راج نگر کے بڑے مندر کے پاس سے ہوتا ہوا میں ایک نامعلوم عمارت کے کھنڈر سے گزرا اور اس مقام پر آگیا جہاں گاؤں کے تانگے وغیرہ کھڑے رہتے تھے۔ مرید کے جانے کے لیے مجھے ڈبل کرایہ دینا پڑا کیونکہ اس وقت کوئی اور سواری مرید کے نہیں جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھانے کے بعد میں مرید کے پہنچ گیا۔ آٹھ سوا آٹھ کا وقت ہو گا۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ میں نے چادر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ پیشانی مفلر میں چھپی ہوئی تھی۔ درحقیقت میری صرف آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں سگریٹ مٹھی میں دبا کر دیہاتی انداز میں کش لے رہا تھا۔

جی ٹی روڈ کی طرف جا کر میں ایک چائے خانے میں گھس گیا۔ دیواروں پر لکھا تھا کہ یہاں سیاسی گفتگو سے پرہیز کریں مگر "سیاسی گفتگو" ایسی تحریروں سے کہاں رکتی ہے۔ زور و

شور سے گفتگو ہو رہی تھی۔ آنے والے الیکشن کے بارے میں دھواں دھار تبصرے کیے جا رہے تھے۔ میں نے چائے منگوائی اور ساتھ میں ولکی قسم کے بسکٹ اور ایک ابلا ہوا انڈا منگوا کر وہاں کچھ دیر بیٹھنے کا جواز پیدا کر لیا۔ بڑی احتیاط اور تیزی کے ساتھ میں نے شہزاد کا دیا ہوا لفافہ کھولا۔ میری توقع کے عین مطابق اندر سے جو تحریر برآمد ہوئی وہ انگریزی میں تھی۔ شاید میڈم نے احتیاط کے طور پر انگریزی لکھی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں میرے متعلق شبہ ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ اگر میں لفافہ کھول بھی لوں گا تو انگریزی کہاں میری سمجھ میں آئے گی۔

میں نے پڑھنا شروع کیا۔ میڈم شہزاد نے یہ طویل خط اپنے باس ہارون پاشا کے نام لکھا تھا۔ مضمون کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا "باس! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ڈیوی کی موت کے بعد میں آپ کے بدترین سلوک کا مستحق ہو گیا ہوں۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ آپ سے مجھے کوئی نہیں بچا سکتا سوائے آپ ہی بچا سکتے ہیں۔ میں آپ سے بچنے کے لیے نہیں چھپ رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں چھپ نہیں سکتا۔ میں نے صرف تھوڑی سی مہلت حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ وہ اس لیے کیا ہے تاکہ میں آپ کے حضور تھوڑی سی صفائی پیش کر سکوں۔"

اس کے بعد شہزاد نے کچھ منت سماجت کی باتیں لکھی تھیں' اس کے بعد لکھا تھا "باس! حقیقت یہ ہے کہ ڈیوی نے کبھی مجھے دل سے اپنا ساتھی تسلیم نہیں کیا۔ آپ کو لنٹن روڈ والے بم بلاسٹ کا واقعہ یاد ہو گا۔ اس نے مجھے موقعے سے گرفتار کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ رشید اور اکبر بھی اس بات کے گواہ ہیں۔ اگر آپ بروقت کارروائی نہ فرماتے تو شاید آج میرا ٹھکانا پھانسی کی کوٹھڑی ہوتی۔ اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے' ایسے کئی واقعے ہیں جن کے متعلق کچھ نہ کچھ آپ بھی جانتے ہیں۔ بھائی جی کی رہائش گاہ پر جو کارروائی ہونا تھی' اس میں یقیناً مجھ سے غفلت ہوئی' میں ایمونیشن کی حفاظت کی ذمے داری پوری نہ کر سکا لیکن باس! اس کی سزا میں نے خود کو یوں دی کہ اپنا بھائی ختم کروا دیا۔ بجائے اس کے کہ ڈیوی مجھ سے اظہار ہمدردی کرتا وہ ہر روز میرے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا۔ اس نے مجھ پر ایسے ایسے شرمناک الزام لگائے ہیں کہ میرے لیے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس سب کے باوجود میں اس بات کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ پچھلے مہینے جو کچھ شیخوپورہ روڈ پر ہوا وہ صرف اور صرف وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا اور یہ اشتعال ڈیوی کی طرف سے دلایا گیا تھا۔ اس اشتعال کے نتیجے میں جو دو طرفہ فائرنگ ہوئی اس میں اتفاقاً ڈیوی کو گولی لگ گئی..."

خط کافی طویل تھا۔ اس میں شہزاد نے ہر ممکن طریقے سے اپنی صفائی پیش کی تھی اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر باس کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ڈیوی کی ہلاکت پر وہ بہت دل گرفتہ ہے اور درخواست گزار ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس خط میں وہ ساری وحشت اور لرزہ خیزی موجود تھی جو شہزاد کے دل میں باس کے حوالے سے پائی جاتی تھی۔ شہزاد خود بھی بے رحمی اور سفاکیت میں کسی سے پیچھے نہیں تھی (یا تھا) لیکن باس کے خوف سے اس کا بابالی ہونا اس خط سے ثابت ہوتا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد میں نے اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کرائی اور اسے پھر سے لفافے میں بند کر دیا۔ اب یہ خط مجھے شیخوپورہ میں راجا مختار نامی کسی بندے تک پہنچانا تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بندہ بھی شہزاد کی طرح باس سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے یہ خط باس تک پہنچے گا اور اس طرح پہنچے گا کہ شہزاد کو بھی سامنے نہیں آنا پڑے گا۔ ایک طرح سے شہزاد نے باس سے دور رہتے ہوئے باس کے سامنے اپنا کیس پیش کیا تھا اور یوں اپنے حوالے سے باس کے رویے میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

شہزاد ایک نہایت سفاک اور جنونی عورت کا نام تھا۔ بلکہ اسے عورت کہنا بھی عورت کی توہین تھا اور اگر اسے مرد کہا جاتا تو یہ مرد کی توہین تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک سفاک اور جنونی ہستی تھی۔ اس کے لیے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ میں نے چائے خانے میں ہی بیٹھ کر دو سگریٹ پھونکے اور پھر شہزاد کے حوالے سے ایک نہایت اہم فیصلہ کر لیا۔ شہزاد میری منزل نہیں تھی' نہ ہی تارو، جگی یا ڈیوی تھے۔ میری منزل ان کا "بگ باس" تھا۔ میں اس زہریلے درخت کی جڑ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ شہزاد کا خط پڑھ کر مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ہارون پاشا نامی باس ہی اس درخت کی جڑ ہے۔

شیخوپورہ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ساہی صاحب کے نمبر پر فون بھی کیا۔ خوش قسمتی تھی کہ ساہی صاحب اور زرین گل دونوں سے بات ہو گئی۔ پہلے ساہی صاحب بولے۔ انہوں نے میرا حال احوال دریافت کیا۔ میں نے کہا "جناب حال تو نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ آج کل ایک عطائی ڈاکٹر کی زد میں ہوں اور خطرناک تجربے سے گزر رہا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

"میں فون پر سمجھا بھی نہیں سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آ کر سب کچھ بتاؤں گا۔"

"لیکن خدا کے بندے آؤ گے کب؟"

"آپ کے لیے سنسنی خیز اطلاعات لے کر آؤں گا۔ آپ یہی سمجھ لیں کہ دیر آید درست آید۔"

"اب کہاں سے بول رہے ہو؟"

"مریدکے سے۔ ویسے آج کل میرا ٹھکانا مریدکے سے آگے مغرب کی طرف آٹھ دس میل کے فاصلے پر واج گجر گاؤں ہے۔ وہاں میں چوہدری بشارت کی حویلی میں موجود ہوں۔ میڈم شہزاد بھی میرے ساتھ ہے۔ لیکن آپ یہ اطلاع بس اپنے تک ہی رکھیں اور کسی طرح کی مداخلت بھی نہ ہو تو بہتر ہے۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں تم بے فکر رہو۔" ساہی صاحب نے کہا۔

"بھائی جی کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو خیریت سے ہے۔"

"میں نے کہا پچھلے مہینے کی اٹھائیس تاریخ کو شام کے بعد اس کی خیریت بڑے شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ شکر ہے کہ وہ بچ گیا۔ میں اس کی تفصیل آپ کو آ کر بتاؤں گا۔ ایک بار آپ سے پھر کہنا چاہتا ہوں کہ بھائی جی کی سیکیورٹی اس وقت زبردست رسک پر ہے۔ اس کی طرف سے بہت محتاط رہیں۔"

ہم کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ساہی صاحب نے مجھے شیخ عاصم کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ ابھی تک امارات سے واپس نہیں آیا تھا۔ کراچی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے کاروباری وعدہ خلافی پر شیخ عاصم پر کئی کروڑ ڈالر کے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ انہوں نے مسٹر کلارک کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے واپس امریکا چلے گئے ہیں۔ ساہی صاحب نے مجھے یہ دلچسپ اطلاع بھی دی کہ زریں گل نے گلبرگ لاہور کے علاقے میں ایک بڑی کوٹھی خریدی ہے اب اسے مسمار کر کے ایک شاندار کوٹھی بنوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ وہ اسی سلسلے میں مشورے کے لیے میرے پاس آیا ہوا ہے۔

ساہی صاحب نے ریسیور زریں گل کو تھما دیا۔ ریسیور ہاتھ میں آنے کی دیر تھی زریں مشین کی طرح بولنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر باتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور اگر آج میں فون نہ کرتا تو یہ ذخیرہ دھماکے سے پھٹ جاتا۔ اس نے پانچ منٹ کے اندر اندر پچھلے چند ہفتوں کی مکمل کارروائی مجھے سنا دی۔ ایک دم اس کے پاس اتنا روپیہ آ گیا تھا کہ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ روپے کے ساتھ ہی بے شمار نئے رشتے دار، مطلب پرست دوست اور وابستگی کے خواہش مند حضرات اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور زریں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ غلطی اس کی اپنی تھی، اس نے فوری طور پر نیکی کمانے کے لیے اپنے آبائی شہر کوہاٹ کا رخ کیا تھا اور وہاں ایک مسجد، ایک اسکول اور ایک اسپتال کے لیے خطیر رقوم دے ڈالی تھیں۔ اس واقعے کے بعد پورے شہر کو پتا چل گیا تھا کہ چپلی کباب اور نان بیچنے والا زریں گل اب ایک کروڑ پتی بن چکا ہے یہی وجہ تھی کہ اس کے بہت پرانے پرانے رشتے دار ظہور پذیر ہو گئے تھے اور انہوں نے کوہاٹ سے لاہور تک کا فاصلہ ناپنا شروع کر دیا تھا۔

زریں بولا "استاد صیب! آج کل ام کو وہ سارا فلمیں یاد آ رہا ہے جن میں ہیرو صاحب پہلے غریب ہوتا ہے اور پھر ایک دم امیر بن جاتا ہے۔ اپنے سدھیر صیب کا مشہور فلم ہے نوکری "تو آپ کو یاد ہی ہوگا" بس یہ سمجھیں کہ اس فلم میں جو کچھ سدھیر صاحب کے ساتھ ہوا تھا وہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اور وہ بھی ہو رہا ہے جو سدھیر صیب کے ساتھ نہیں ہو سکا تھا۔"

میں نے کہا "اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ دیکھو تمہیں دولت، اولاد اور آزادی ایک ساتھ ملی ہے۔"

وہ بولا "آزادی تو بہت اچھا لگ رہا ہے مگر اس دولت اور اولاد نے تو ام کو ہماری کلثوم سے دور کر دیا ہے۔ پہلے اولاد اپنا کام دکھا رہا تھا یعنی ننھا زریں گل ام کو اپنی ماں کے پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا، راتوں کو جاگ جاگ کر امارا پہرہ دیتا تھا، اب ایک اور رپھڑا کھڑا ہو گیا ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"لوگ سچ کہتا ہے، یہ دولت چیز ہی ایسا ہے۔ آٹھ دس روز پہلے پتا نہیں کہاں سے پشتو فلموں کا کوئی نیا نیا ہیروئن لڑکی امارے گھر آ گیا۔ کہنے لگا ام آپ کی کہانی سے بہت متاثر ہوا ہے۔ ام آپ کے بارے میں پشتو فلم بنائے گا۔ اس فلم میں سارا روپیہ امارا ابا جان لگائے گا، فلم کا نام "ونیے کی تلاش" ہوگا۔ اس لڑکی نے امارے ساتھ دو چار تصویریں بھی بنوا لیا۔ ان تصویروں کی وجہ سے امارا سارا کاروبار ٹھنڈا ہو گیا۔"

"کاروبار ٹھنڈا ہو گیا؟ کون سا کاروبار۔"

"محبت کا کاروبار جناب۔۔ ننھے زریں کی وجہ سے یہ

کاروبار پہلے ہی بہت مندا تھا اب بالکل ہی بھٹا بیٹھ گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ اسٹاک مارکیٹ ہی کریش ہو گیا۔"

"تصویروں کی وجہ سے کیسے اسٹاک مارکیٹ کریش ہو گئی۔"

"وہ تصویر اخبار میں چھپا جناب۔۔ اخبار سے کلثوم نے دیکھ لیا۔ وہ ناراض ہو گیا، بس امارے محبت کا اسٹاک مارکیٹ کریش ہو گیا۔ اب پتا نہیں کب مندے کا بحران ٹلے گا۔"

"مندے کا بحران نہیں۔ مندے کا رجحان۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہا ہے مگر ام بہت پریشان ہے جناب اور امارا سب سے بڑا پریشانی یہ ہے کہ اس وقت آپ امارے پاس نہیں ہے۔ ام کو وہ مشہور گانا ہر دوسرے تیسرے مرتبہ یاد آتا ہے۔ تم نجانے کس جہاں میں کھو گئے۔ ام بھری دنیا میں تنہا ہو گئے۔"

زریں گل کو تسلی تشفی دے کر اور اس سے چند ضروری باتیں کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے اب جلد سے جلد شیخوپورہ پہنچنا تھا۔ مریدکے سے میں بس میں سوار ہوا۔ یہ دیسی سی بس تھی جیسی ہمارے دیہی علاقوں میں عام چلتی ہے۔ شدید سردی میں بھی بس کے اندر دو پارہ ائیر کنڈیشنر لگے ہوئے تھے۔ یہ ائیر کنڈیشنر دراصل وہ کھڑکیاں تھیں جن میں شیشے موجود نہیں تھے۔ ٹھنڈی ہوا برق رفتاری سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اطمینان کی بات بس یہی تھی کہ یہ ائیر کنڈیشنر ہر دو چار منٹ بعد بند ہو جاتے تھے۔ یہ اس وقت بند ہوتے تھے جب کھٹارا بس رکتی تھی۔ ہر دو قدم کے فاصلے پر یہ بس کوئی سواری اٹھاتی تھی اور ہر چار قدم کے فاصلے پر سواری اتارتی تھی۔ پنجابی میں ایسی پسنجر گاڑیوں کو "کھوتا گڈی" کہا جاتا ہے، یہ کھوتا گڈی سے بھی کچھ آگے کی چیز تھی۔ فی الوقت غنیمت تھی، اگر دن کا وقت ہوتا تو اس بس میں پھل کی چھابڑیوں سے لے کر چارپائیوں تک اور مرغیوں سے لے کر بکریوں تک سبھی کچھ موجود ہوتا۔ اتنی رات گئے بھی ایک مداری بمعہ اپنے بندر کے اور دو دودھ فروش بمعہ اپنے بڑے بڑے ڈرموں کے بس میں موجود تھے۔

ناز نخرے سے چلتی اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی یہ بس شیخوپورہ کی طرف رواں رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں مریدکے سے شیخوپورہ نہیں جا رہا، لاہور سے ہندن کا طویل سفر طے کر رہا ہوں۔ بس میں ایک پرانا سا ٹیپ ریکارڈر زور و شور سے پنجابی گانے بجا رہا تھا۔ جدا دل ٹٹ جائے جدنی گل تک ہائے، بھنوں جوت لگے اجانے۔۔ اور پھر۔۔ بھگی پے گئی

چمن نا روں دی اڈیاں اجے وی نہ آئیوں سجناں وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ میٹھی آوازیں تھیں جو میں اور غزالہ جل کوٹ میں لڑکپن میں سنا کرتے تھے۔ اس قسم کے نغمے ان دنوں ویڈیو اور ٹیپ ریکارڈز پر عام بجا کرتے تھے۔ نجانے کیوں اس کھٹارا بس میں بیٹھ کر اور ان گھسے پٹے گانوں کو سن کر بھی مجھے سکون سا محسوس ہونے لگا۔ میرا ذہن تصور کے پر لگا کر اڑا اور جل کوٹ کی اسی خوب صورت دیہاتی فضا میں پہنچ گیا جہاں میں اور میری غزالہ آزاد پنچھیوں کی طرح اڑتے تھے، آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور ایک دوسرے کے حوالے سے سہانے خوابوں کی پرورش کرتے تھے۔ کتنے امید بھرے تھے وہ دن۔ آنے والے حسین دنوں کی آس میں ہم ہر دکھ ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھی آتے تھے تو ان کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ کاش کوئی مجھ سے میرے حصے کی ساری خوشیاں لے لیتا، ساری دولت ساری آسائش سب کچھ لے لیتا اور میری انگلی پکڑ کر مجھے واپس اس مقام پر لے جاتا جہاں جل کوٹ کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میں نے غزالہ کو پہلی بار بالوں میں کنگھی کرتے دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے کہتا "لو میں نے تمہیں تمہارا ماضی لوٹا دیا ہے، اب اس مقام سے تمہاری زندگی پھر سے شروع ہو رہی ہے۔ اب اپنی غفلتوں اور غلطیوں کو دہرانا مت۔"

میں اسی مقام سے اپنی زندگی پھر شروع کرتا۔ اپنی ساری کوتاہیوں کا مداوا کر دیتا۔ وقت کی شاخوں سے توڑ توڑ کر خوشیوں کے وہ سارے پھل اپنے پیاروں کی جھولیوں میں ڈال دیتا جو میری کوتاہیوں سے شاخوں پر ہی سوکھ گئے تھے یا حالات کی آندھی میں بکھر گئے تھے یا دست ستم نے شب خون مار کر توڑ لیے تھے۔ آہ یہ کیسی حسرتیں پلا کرتی ہیں انسان کے سینے میں۔ شاید اکثر لوگ جب اپنے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسے ہی انداز میں سوچتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے پچھتاوے انہیں گھیرتے ہیں۔ میں کوئی خوابوں خیالوں میں بسنے والا رومان پسند شخص نہیں تھا لیکن مریدکے سے شیخوپورہ جاتے ہوئے اس ٹھٹھرتی ہوئی شب میں کھٹارا بس کے اندر بھولے بسرے گانے سنتے ہوئے میں ماضی کے صحرا میں بہت دور نکل گیا اور رابطوں کے نخلستان ڈھونڈنے لگا۔

میں گیارہ بجے کے قریب شیخوپورہ پہنچ سکا۔ شامی روڈ کے علاقے میں مطلوبہ پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے پندرہ بیس منٹ مزید لگ گئے۔ خیر مجھے راجا مختار کی نیم پلیٹ والی کوٹھی نظر آ گئی۔ گیٹ سفید تھا۔ شہزاد کی اطلاع کے عین مطابق گیٹ میں لیٹر بکس بھی موجود تھا۔ یہ ایسے لیٹر بکس ہوتے ہیں جن

میں اندر کی طرف شیشہ لگا ہوتا ہے۔ جونہی کوئی خط وغیرہ بکس میں آتا ہے اہلِ خانہ کو فوراً ہی نظر آجاتا ہے۔ میں پہلے تو جائزہ لینے کی خاطر گیٹ کے قریب سے گزر کر قریباً سو گز آگے جا کر میں واپس آیا اور شہزاد کا دیا ہوا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال کر کال بیل بجا دی۔

کال بیل بجانے کے فوراً بعد میں ایک قریبی گلی میں چلا گیا۔ یہ سارا رہائشی علاقہ تھا۔ اس کشادہ گلی میں بھی کوٹھیاں موجود تھیں۔ گلی میں کہیں کہیں گاڑیاں کھڑی تھیں' کہیں کہیں رکھوالے کتے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ ٹی وی پر کوئی مشہور ڈراما دکھایا جا رہا تھا۔ قریبی کوٹھی کے اندر سے قوی خان کے گرج دار ڈائیلاگ سنائی دے رہے تھے "انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن تم۔ تم تو نرے اشرف بھی نہیں رہے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں کہتا ہوں اشرف! دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

کہیں پاس ہی کسی کمرے کی نیم گرم فضا میں ٹیپ ریکارڈر پر فریدہ خانم نغمہ سرا تھی۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا۔ میں تھوڑی دیر تک ٹھٹھری ہوئی تاریک گلی میں موجود رہا پھر واپس کشادہ سڑک پر آ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کال بیل کی آواز پر کوئی شخص گیٹ تک آیا تھا۔ کوٹھی کے گیراج کی لائٹ جو پہلے بجھی ہوئی تھی اب جل رہی تھی۔ اگر کوئی شخص آیا تھا تو پھر امکان تھا کہ اسے لفافہ بھی مل گیا ہوگا۔

اب اپنے منصوبے کے مطابق مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے میں اس کوٹھی میں آنے جانے والے پر نگاہ رکھ سکوں۔ دور دور تک مجھے کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی' سب کوٹھیاں تھیں۔ کوٹھیوں کے آگے گارڈنیا کی چھوٹی چھوٹی باڑیں تھیں۔ یہاں چھپا ہوا کوئی بھی شخص باآسانی نظر آسکتا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ اس میں تھوڑا سا خطرہ تو تھا بہرحال رسک لیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میں قریباً دو فرلانگ آگے آیا اور ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ گیا۔ ایک نسبتاً کمزور ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے "بیگم کوٹ" تک کا کرایہ طے کیا اور ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ "بیگم کوٹ" جانے کے لیے ذرا موڑ جونہی شیخوپورہ روڈ کی طرف مڑا میں نے ایک نسبتاً ویران جگہ پر اسے اچانک بریک لگانے کے لیے کہا۔ جونہی گاڑی رکی میں نے ڈرائیور کی گردن پر اپنا ہنر آزمایا۔ ایک کراہ کے ساتھ دبلا پتلا ڈرائیور میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اس کی نبض وغیرہ دیکھی پھر بڑی احتیاط سے اسے گاڑی کی ڈگی میں منتقل کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ کم از کم چار گھنٹے سے پہلے وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور واپس راجا مختار کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ میری واپسی میں بمشکل بیس منٹ لگے ہوں گے یا شاید اس سے بھی کم۔ کوٹھی سے سو گز آگے جا کر میں نے پرائیویٹ ٹیکسی کار روک دی اور اس کا بونٹ اٹھا کر کوائل کو "مین انجن" سے ملانے والی لیڈ دونوں طرف سے اتار کر جیب میں رکھ لی۔

میرا پروگرام صبح تک اسی جگہ رہنے کا تھا۔ اگر کوئی پوچھتا بھی تو گاڑی کی خرابی کا بہانہ معقول تھا۔ میں آرام سے گاڑی کی سیٹ پر نیم دراز بھی ہو سکتا تھا اور سردی سے بچ سکتا تھا۔ ایسے میں پوچھنے والے سے یہ بہانا بنایا جا سکتا تھا کہ میرا ساتھی پرزہ لینے بس اڈے کی طرف گیا ہوا ہے' یا ایسا ہی کوئی اور عذر تراشا جا سکتا تھا۔ بہرحال مجھے اپنے مقصد کے لیے طویل انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ابھی مجھے اس جگہ رکے بمشکل آدھ گھنٹا ہی ہوا تھا کہ مجھے راجا مختار کی کوٹھی میں حرکت کے آثار نظر آئے۔

میں نے ایک شخص کو بڑا گیٹ کھولتے ہوئے دیکھا۔ جونہی گیٹ کھلا میں نے بھی گاڑی کو تیار حالت میں کیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایک ۲۰۰۲ ماڈل بریلینا کار کوٹھی میں سے نکلی اور روانہ ہو گئی میں نے بھی اپنی گاڑی کو حرکت دی اور بریلینا کے پیچھے چل پڑا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ رات کے اس پہر جو شخص کوٹھی میں سے نکلا ہے اس کے نکلنے کا تعلق میرے ارسال کردہ خط سے ہی ہے۔ وہ شخص یہ خط لے کر ارجنٹ طور پر مکتوب الیہ یعنی باس کی طرف جا رہا ہے۔

اگر واقعی ایسا تھا تو پھر تخریب کاری کے اس "نیٹ ورک" کا سرا میرے ہاتھ آنے والا تھا۔ تاہم میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس موقعے پر مجھے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص میرے آگے جا رہا تھا وہ یقیناً کوئی ہوشیار اور چوکس شخص تھا۔ وہ اپنے باس کی طرف جا رہا تھا۔ اگر تعاقب میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوتی تو اس کا خبردار ہونا لازمی تھا۔ میں نے اس تاریک رات میں اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کرتے ہوئے سفید بریلینا کار کا تعاقب جاری رکھا۔ گاڑی شیخوپورہ سے نکلی اور لاہور جانے والی مین روڈ پر آ گئی۔ میں نے اپنی ڈاٹسن گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور بریلینا کی "ٹیل لائٹس" کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تعاقب جاری رکھا۔ بریلینا کافی رفتار سے جا رہی تھی' ایسے میں تعاقب کرنا مزید دشوار ہو گیا تھا' میں ڈرائیونگ کے حوالے سے اپنی ساری صلاحیتیں استعمال کر رہا تھا۔ بریلینا سے اپنا فاصلہ میں نے کم و

بیش ایک فرلانگ رکھا ہوا تھا۔ یہ فاصلہ کسی وقت کم بھی ہو جاتا تھا مگر میں پھر سے بڑھا لیتا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں۔

لاہور میں داخل ہونا کسی حد تک خطرناک تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ناکے لگے رہتے تھے۔ میں ایک مفرور تھا اور مقامی پولیس کے علاوہ وفاقی ایجنسیاں بھی میری تلاش میں کافی ٹکریں مار چکی تھیں۔ اس وقت میں ایک مسروقہ کار میں تھا۔ کار کی ڈگی کھولی جاتی تو اس میں کار والے کا بے ہوش جسم بھی ملتا۔ ڈگی میں سے ایسا "سامان" مل جائے تو ناکے والے آگے جانے کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ بہرحال اب یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ سفید بریلینا لاہور میں داخل ہو رہی تھی اب مجھے بھی ہر صورت لاہور میں داخل ہونا تھا۔ لاہور جو ایک یخ بستہ شب میں لپٹا سو رہا تھا۔ جہاں صفدر تھا' زریں گل تھا اور ان کے علاوہ غزالہ' شفقا' حمزہ' ساہی صاحب۔ سارے ہی تھے لیکن میں ان میں ہوتے ہوئے بھی ان میں نہیں تھا۔ میری مجبوریاں مجھے اپنے پیاروں سے دور رکھے ہوئے تھیں۔

سفید کار راوی کے پل پر پہنچی۔ اس نے ٹال ٹیکس ادا کیا۔ میں بھی ٹول ٹیکس ادا کرتا ہوا پل میں داخل ہوا۔ پل پر عموماً پولیس کا ناکہ چوبیس گھنٹے موجود ہوتا ہے۔ اس وقت بھی پولیس والے موجود تھے اور آتے جاتے گاڑی سواروں کو تیکھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بھی گھورا گیا' چلتی گاڑی میں سے میں نے بھی ایک نگاہ پولیس والوں پر ڈالی۔ یکایک میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ مجھے یوں لگا کہ پولیس والوں میں فربہ اندام اشفاق گوندل بھی موجود ہے۔ وہی کرخت چہرہ ایس ایس پی جس نے برطانیہ سے واپسی پر ہمارا شان دار استقبال کیا تھا۔ تھانے میں اس نے ہم سے خالص پلسیوں والا سلوک کیا تھا اور خاص طور سے زریں گل کو بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ گاڑی ایک لمحے میں اس مقام سے گزر گئی' میں ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکا کہ یہ وہی بدبخت ہے یا کوئی اور۔

ہم یادگار چوک کے قریب سے ہوتے ہوئے لوئر مال روڈ پر پہنچے اور پھر ریواز گارڈن آ گئے۔ سفید بریلینا ریواز گارڈن میں داخل ہو گئی۔ اب میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں مجھے زیادہ احتیاط کرنی پڑ رہی تھی۔ گاڑی ریواز گارڈن کی ایک کشادہ سڑک پر پہنچی اور آہستہ ہوتی پھر وہ ایک وسیع کوٹھی کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ میں کوٹھی کے سامنے سے آگے نکلتا چلا گیا۔ میں نے نیم پلیٹ پڑھنے کی کوشش کی مگر نیم تاریکی کے سبب کامیابی نہیں ہوئی۔ ابھی میں کوٹھی سے تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ اچانک مجھے تعاقب کا احساس ہوا۔ کوئی میرے پیچھے بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے بیک ویو مرر میں دھیان سے دیکھا۔ یہ ایک پرائیویٹ کار تھی مگر دھیان سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ کار کے پیچھے ایک پولیس کار بھی چلی آرہی ہے۔ میں نے ایک دم کار کی رفتار بڑھا دی۔ کار کی رفتار بڑھنے کی دیر تھی کہ عقب سے پولیس کی موبائل کا چیختا ہوا سائرن سنائی دینے لگا۔ پرائیویٹ کار بھی ایک دم تیز رفتار ہو گئی تھی اور میرے نزدیک آتی جا رہی تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ابھی پولیس والوں کے ہاتھ نہیں آنا۔ میں بھی بے دریغ ایکسی لریٹر دباتا چلا گیا۔ جوہڑی کے قریب ایک زبردست ناکہ لگا ہوا تھا۔ شاید وائرلیس پر میری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی' یا پھر پولیس موبائل کے سائرن کے سبب "ناکے والے" چوکس ہو گئے تھے۔ وہ سڑک کے درمیان میں آ گئے اور مضبوط ارادے کے ساتھ مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میرا ارادہ رکنے کا تھا ہی نہیں۔ پولیس کی اس بے جا مداخلت سے میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ ان چنگاریوں کو اشفاق گوندل کا تصور بھی ہوا دے رہا تھا۔ دریائے راوی کے پل پر میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ اس خبیث نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے اور اسی کی ہدایت پر پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ میں نے ناکے پر موجود اہلکاروں کو اپنی رفتار سے بتا دیا کہ میں رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں۔ ساتھ ہی میں نے اپنا دایاں ہاتھ ہارن پر جما دیا تھا۔ کچھ اہلکار تو تتر بتر ہو گئے مگر ایک کا تصادم کار کے ساتھ ہوا۔ زوردار تصادم تھا کار کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی اور گنجے سر والا ایک سب انسپکٹر گاڑی کے اندر آ گرا۔ وہ عجیب مضحکہ خیز حالت میں پڑا تھا۔ اس کا چہرہ میرے ساتھ والی نشست پر تھا' ٹانگیں ہوا میں معلق تھیں۔ تاریکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ میری ساری توجہ سامنے سڑک پر مرکوز تھی اور ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر۔ مجھے مزنگ چونگی چوک کی طرف سڑک برائے مرمت بند ملی۔ "برائے مرمت بند" کا بورڈ دیکھ کر میں نے زور سے بریک لگائے' اندر گرا ہوا سب انسپکٹر جھٹکے کے ساتھ باہر جا گرا لیکن اس کے گرنے سے پہلے میں نے اس کے ہولسٹر میں سے ریوالور کھینچ لیا تھا۔ گاڑی کو تھوڑا سا ریورس کرنے کے بعد میں نے بائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر موڑ لیا۔ اسی دوران میں پولیس موبائل نے سائیڈ پر آ کر مجھے ٹکر ماری اور دھکیل کر دیوار سے لگانا چاہا لیکن

وقت تھا جب میری نگاہ موبائل کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے موٹے تازے پولیس افسر پر پڑی میرے سینے میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ میرا قیافہ سو فیصد درست نکلا تھا۔ پولیس موبائل کی اگلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص اشفاق گوندل ہی تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نگاہ ملی اس کی آنکھوں میں بھی بجلی سی کوند رہی تھی۔ پولیس موبائل مجھے سامنے سے دھکیلتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک دم زور سے بریک پیڈل دبایا۔ پولیس موبائل اپنی جھونک میں دکانوں سے ٹکرائی۔ پہلے اس نے گنے کے رس والی ایک ریڑھی الٹائی، پھر ایک پان فروش کے کھوکھے کو نقصان پہنچایا، پھر بجلی کے ایک کھمبے سے رگڑ کھاتی ہوئی ایک فروٹ شاپ میں جا گھسی۔

اس تصادم کی وجہ سے پولیس کی موبائل زخمی ہو گئی تھی اور راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ڈاٹسن کو ریورس گیئر لگایا مگر یہ گیئر واپس بھاگنے کے لیے نہیں تھا مومینٹم بنانے کے لیے تھا۔ پچیس تیس گز پیچھے جا کر میں نے گاڑی کو پوری رفتار سے آگے بڑھایا۔ اس وقت پولیس کا عملہ موبائل میں سے نکل رہا تھا اور اشفاق گوندل مجھ پر فائر کرنے کے لیے اپنے ہولسٹر میں سے ریوالور نکال رہا تھا لیکن اس کے پاس وقت ختم ہو چکا تھا۔ اگر ریوالور اس کے ہاتھ میں ہوتا تو بھی شاید وہ اتنے مختصر ٹائم میں مجھ پر گولی نہ چلا سکتا۔ برق رفتار ڈاٹسن کو دیکھ کر پولیس اہلکار جان بچانے کے لیے بھاگے، اشفاق بھی بھاگ سکتا تھا لیکن اس کی افسری اور اس کے غصیلے پن نے اسے نقصان پہنچایا۔ وہ آخری لمحے تک گولی چلانے کی فکر میں رہا۔ ڈاٹسن طوفانی رفتار سے پولیس موبائل سے ٹکرائی۔ میں نے فربہ اندام اشفاق کو اڑ کر ایک بند دکان کے تھڑے پر گرتے دیکھا۔ ڈاٹسن تقریباً دو سو فٹ تک موبائل کو دھکیلتی اور گھسیٹتی چلی گئی۔ آخر موبائل الٹ گئی اور مجھے اس میں سے چنگاریاں سی چھوٹتی نظر آئیں۔ اس تصادم کا شور اتنا زیادہ تھا کہ رات کا سناٹا چیخ اٹھا۔ جونہی میری گاڑی کو راستہ ملا میں سیدھا آگے نکلتا چلا گیا۔ اب میں لٹن روڈ پر تھا، میری دائیں جانب مزنگ چونگی چوک اور بائیں جانب جین مندر کا علاقہ تھا۔ جونہی میں لٹن روڈ پر پہنچا دو پولیس موبائلز کے سائرنوں سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ پولیس والوں نے اپنے وائرلیس استعمال کرتے ہوئے اردگرد کی گشتی گاڑیوں کو لٹن روڈ کی طرف کھینچ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جی میں آئی کہ سنگین تصادم سے بچنے کے لیے میں گاڑی روک دوں، لیکن پھر جونہی اشفاق گوندل کی شکل نگاہوں میں گھومی سینے میں بھڑکتے شعلے بلند تر ہو گئے اور میں نے ارادہ بدل دیا۔ میں نے سوچا ٹھیک ہے اگر آج ان لوگوں نے "میچ" ڈال دیا ہے تو پھر میچ ہی سہی۔ میں نے گاڑی کو جین مندر چوک کی طرف موڑا اور اسپیڈ بڑھاتا چلا گیا۔ پولیس کی تین گاڑیاں جن میں کار بھی شامل تھی تیزی سے میرے پیچھے آ رہی تھیں پھر مجھ پر پہلا فائر ہوا۔ گولی گاڑی کی باڈی میں گھس گئی۔ دوسری گولی نے عقبی اسکرین توڑ دی۔ تیسری نے دایاں پچھلا ٹائر بیکار کر دیا ایک اور گولی سنسناتی ہوئی ڈیش بورڈ میں لگی اور ٹیپ ریکارڈر کے ٹکڑے اڑ کر میرے چہرے پر لگے۔ بھنا کر میں نے بریک لگائے۔ میرا یہ عمل بالکل غیر متوقع تھا۔ سب سے تیز رفتار موبائل رکتے رکتے بھی میرے قریب آ گئی۔ میں نے سب انسپکٹر کے ریوالور سے اس پر تین فائر کیے۔ ایک گولی نے موبائل کا ٹائر برسٹ کر دیا۔ موبائل کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی مگر چونکہ گاڑی بریک لگا رہی تھی اور اس کا سارا وزن اگلے پہیوں پر تھا، اس لیے ٹائر پھٹنے سے وہ اچانک لڑکھڑائی اور ایک دیوار سے جا ٹکرائی۔ پیچھے آنے والے ڈرائیور نے بھی اپنی موبائل اس میں ٹھونک دی۔

میں برسٹ ٹائر کے ساتھ ہی ڈاٹسن کو دوڑاتا چلا گیا۔ اسکرین ٹوٹ جانے سے نہایت سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ فلیٹ ٹائر کی وجہ سے اسٹیئرنگ سمیت ساری گاڑی بری طرح تھرا رہی تھی۔ میں نے گاڑی کو "میانی صاحب قبرستان" کی تاریک سڑکوں کی طرف موڑ دیا۔ پولیس کی گاڑیاں بھی قبرستان کے علاقے میں گھس آئیں۔ یہ شہر خموشاں تھا اور یہاں موت کے ہرکارے زندگی کا تعاقب کر رہے تھے۔ مجھ پر وقفے وقفے سے مسلسل فائر کیے جا رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ایک اگلا ٹائر بھی فلیٹ ہو گیا اور ڈاٹسن مکمل طور پر اپنے دائیں پہلو پر جھک گئی۔ میں لاہور کے اس سب سے بڑے قبرستان کی تاریک وسعتوں میں گھستا چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک جانے پہچانے علاقے میں ہوں، کچھ عرصہ پہلے بھی ان پراسرار سڑکوں پر میری آمد و رفت ہوئی تھی۔ مجھے وہ انوکھا شفا خانہ یاد آیا جہاں حمزہ کی مردہ ٹانگ کو زندگی ملی تھی۔ وہ پراسرار معالج جو کسی بلی کی طرح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتا تھا اور اس کی لمبی سفید داڑھی زمین پر گھسٹتی تھی۔ اچانک مجھے ایک جانا پہچانا درخت نظر آیا۔ میں نے گاڑی تیزی سے اس جانب موڑ دی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ مجھے یہاں پناہ مل سکتی ہے۔

گاڑی درخت کے قریب پہنچ کر خود بخود رک گئی جیسے وہ بھی پولیس والوں کے آگے بھاگ بھاگ کر اب تھک ہار گئی ہو۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور گھنی جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ موٹر سائیکل پر میرے پیچھے آنے والا ایک تیز پھرتیلا انسپکٹر بھی موٹر سائیکل زمین پر گرا کر میرے پیچھے دوڑا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ دوڑ یا کبڈی کا ماہر کھلاڑی ہے۔ چھوٹے موٹے گڑھوں اور قبروں کو پھلانگتا ہوا بلائے ناگہانی کی طرح میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی برق رفتاری نے مجھے بھنا دیا۔

یقیناً وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کی کم بختی اسے میری طرف کھینچے لیے چلی آ رہی ہے۔ کیکر کے ایک گھنے جھنڈ میں وہ جونہی میرے قریب پہنچا اور مجھ پر ریوالور تاننے کی کوشش کی، میں نے ایک دم پلٹ کر اس پر حملہ کیا۔ میرے سر کی ٹکر اس کے سینے پر لگی اور اس کی پشت ایک درخت سے ٹکرائی۔ میں نے اس کا ریوالور والا ہاتھ فضا میں بلند کر دیا تھا پھر میں نے اس ہاتھ کو تیزی سے موڑا اور بغل کے نیچے لے کر گھٹنے کی جچی تلی ضرب لگائی۔ ہڈی ٹوٹنے کی بڑی واضح آواز سنائی دی۔ ریوالور پکے ہوئے پھل کی طرح مضروب کے ہاتھ سے گر گیا۔

وہ تھا بڑا سخت جان۔ ہاتھ ٹوٹ جانے کے باوجود اس نے میرا گریبان اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا "میں پولیس والا ہوں۔ اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گا لیکن تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

میں نے دو خوفناک ٹکریں اس کے چہرے پر مار کر اس کے منہ کا بھرتہ بنا دیا۔ اس "ہرکولیس" نے گریبان پر سے اپنی گرفت پھر بھی نرم نہیں کی۔ میں نے ایک بار پھر بے رحمی سے اس کے بازو پر وار کیا۔ اس مرتبہ بازو کم از کم دو جگہ سے ٹوٹا۔ تب مقابل انسپکٹر کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے ٹانگ مار کر اسے ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں پھینک دیا۔

میں نے اس انسپکٹر کو پہچان لیا تھا۔ یہ ان پولیس والوں میں شامل تھا جنہوں نے پاکستان آنے کے فوراً بعد ہمارا شایان شان استقبال کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ زریں کو وحشیانہ زدوکوب کا نشانہ بنانے والوں میں یہ شیر جوان بھی شامل ہو۔ شاید میں اس شخص کی مزید مزاج پرسی کرتا لیکن میرے پاس مہلت ہی نہیں تھی۔ میں پلٹ کر قبرستان کے اس حصے کی طرف دوڑا جہاں سادھو کا ٹھکانا تھا۔ یہ باوا نانی سادھو خود کسی طویل بیماری کا شکار رہا تھا لیکن دوسروں کے لیے مسیحا کا

محی الدین نواب کے قلم سے ایک
دل گداز داستان

قیمت: ۱۲۵ روپے

ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں۔

ایک ایسا ناول جسے آپ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون:۔ ۷۲۲۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور
فون:۔ ۷۲۲۳۸۵۴

دو وجہ رکھتا تھا۔ وہ میرے ہونے والے بہنوئی حمزہ کے لیے بھی مسیحا ہی ثابت ہوا تھا۔ اس نے حمزہ کی مردہ ٹانگ میں پھر سے زندگی دوڑا دی تھی لیکن قیمتی دواؤں کے ذریعے نہیں کسی خاص قسم کی مٹی کے ذریعے۔

قریباً ڈیڑھ سو گز بھاگنے کے بعد میں اس مقام پر پہنچ گیا۔ اچانک تاریکی میں سے ایک لحیم شحیم ادھیڑ عمر نکلا اور میرے سامنے جھپٹا "کون ہو تم؟" اس نے غرا کر پوچھا اور اس کے ساتھ ہی ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر پھینکا۔

میں سادھو باوا کا عقیدت مند ہوں۔ ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں شاید تم نے مجھے دیکھا بھی ہو۔" میں نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

اچانک دو تین ہوائی فائر ہوئے۔ یہ ان پولیس والوں نے ہی کیے تھے جو میرے پیچھے قبرستان میں گھس آئے تھے۔ میرا مخاطب چونک کر بولا "تم شاید کسی سے بھاگ کر یہاں آئے ہو۔ کہیں تمہارے پیچھے پولیس تو نہیں؟"

"میں ہر سوال کا جواب دوں گا لیکن پہلے مجھے "باوا" سے ملواؤ۔"

میرے لہجے میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ لحیم شحیم ادھیڑ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد آمادہ ہو گیا۔ وہ یہاں کا گورکن ہی تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک بنیان اور لنگوٹ تھا۔ وہ مجھے لے کر باوا کے حجرے میں آ گیا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی مجھے کراہنے کی وہ مخصوص آواز آئی جو سوتے جاگتے ہر وقت سادھو باوا کے منہ سے نکلتی رہتی تھی۔ میں حجرے میں داخل ہوا۔ حسب سابق اس حجرے میں مٹی کے دو چراغ روشن تھے۔ یہاں ہر شے مٹی کی تھی۔ مٹی کا گھڑا، مٹی کے برتن، مٹی کی چوکی۔ سامنے ایک بڑے طاق میں شیشے کی بوتلوں میں جو دوائیں رکھی تھیں وہ بھی سب کی سب مٹی ہی تھیں، بس ان کے رنگ مختلف تھے۔ کوئی سرخ مٹی، کوئی زردی مائل، کوئی سفید۔ کسی کی ساخت ملائم تھی، کسی کی بھربھری۔ سادھو باوا سر کے نیچے تکیہ رکھے کروٹ لیے لیٹا تھا۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ لمبی سفید داڑھی اس کے سینے تک چلی گئی تھی۔

میں نے سادھو کو سلام کیا۔ وہ نقاہت بھری آواز میں بولا "میں پہچان گیا ہوں تجھے۔ تو سائیں جی کا بندہ ہے نا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لگتا ہے کچھ لوگ تیرے پیچھے لگے ہیں۔" سادھو نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ہاں سادھو جی ایسا ہی ہے۔"

وہ اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے کچھ دیر میرا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے میرے ساتھ آنے والے گورکن سے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ گورکن جلدی جلدی اثبات میں سر ہلاتا رہا، پھر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم حجرے میں سے نکلے۔ حجرے کی پچھلی جانب تین چار ایسی قبریں تھیں جن پر سائبان بنے ہوئے تھے۔ ایک سائبان میں باقاعدہ بلب بھی جل رہا تھا۔ جیسے مرنے کے لواحقین کو ڈر ہو کہ اندھیرے میں ان کا "مرحوم" ڈرنا شروع ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کی سوچ پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ توہم پرستی میں یہ لوگ بہت آگے چلے جاتے ہیں ان کا بس چلے تو بجلی کے تار قبر کے اندر تک رکھوا دیں اور لحد میں روشنی اور پنکھے وغیرہ کا انتظام بھی کر دیں۔ اسی طرح بعض لوگ قبروں کے کتبوں پر قرآنی آیات اور مبارک دعائیں وغیرہ بھی لکھوانے ہیں۔ حالانکہ شب کے اندھیرے میں قبرستانوں کے اندر آوارہ جانور پھرتے رہتے ہیں اور ان مقدس آیات کی بے حرمتی کا احتمال رہتا ہے۔ بہرحال ایسے معاملات پر حتمی رائے تو کوئی عالم دین ہی دے سکتا ہے۔

میں گورکن کے عقب میں چلتا ہوا ایک پچھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہاں نیچی چھت والے دو کچے کمرے مزید تھے۔ یہ دونوں کمرے حجرے سے بمشکل بیس پچیس قدم کے فاصلے پر ہوں گے۔ گورکن نے مجھے ایک کمرے میں داخل کیا اور کہا "آپ یہاں بالکل چپ چاپ بیٹھے رہو۔ دروازہ اندر سے بند رکھو۔ جب تک میں آواز نہ دوں کھولنا مت اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ سوہنا اچھا ہی کرے گا۔"

میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ مٹی کی دیواروں والے اس کمرے میں بھی مٹی کا ہی ایک دیا جل رہا تھا۔ ایک کونے میں قبر کھودنے کے اوزار، کدال، کسی، کھرپا وغیرہ رکھے تھے۔ ایک کونے میں دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہاں درمیانی عمر کا ایک شخص ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ پورے بدن پر مٹی کا لیپ کیا گیا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ یہاں سادھو کے ڈیرے پر اکثر حمزہ کا علاج بھی اسی طور کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر بار بار مٹی کا لیپ کیا جاتا تھا اور یہ عمل کئی روز جاری رہا تھا۔ حمزہ بیشتر وقت سویا رہتا تھا۔ یہ شخص بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اسے

جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کمرے سے باہر پولیس کی موجودگی کا پتا چلتا تھا۔ یہ اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس یہاں قبرستان کے اندر گھس آئی ہے اور اس نے سادھو باوا کے ڈیرے کو گھیر لیا ہے۔ پولیس والوں کی اونچی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کے علاوہ گاڑیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

وہ ریوالور جو میں نے زخمی سب انسپکٹر کے ہولسٹر سے نکالا تھا، ابھی تک میرے پاس تھا۔ تاہم اس میں اب ایک دو راؤنڈ ہی باقی تھے۔ تین چار منٹ شدید کشمکش میں گزرے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس والے سادھو کے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے کترا رہے ہیں۔ جس پچھلے کمرے میں میں موجود تھا اس کا راستہ بھی سادھو کے کمرے سے ہو کر گزرتا تھا لہٰذا یقینی بات تھی کہ مجھ تک پہنچنے سے پہلے پولیس والوں کو سادھو باوا کے کمرے میں داخل ہونا پڑے گا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اگر پولیس والوں کی طرف سے سادھو کے ساتھ سختی کی گئی یا اسے نقصان پہنچایا گیا تو پھر میں خاموش نہیں رہوں گا۔ انفاق گوندل کو دیکھنے کے بعد میرے اندر کا موسم بالکل بدل گیا تھا اور میں دو چار لاشیں گرانے کا رسک بآسانی لے سکتا تھا۔

جس کمرے میں میں چھپا ہوا تھا وہاں سے حجرے میں ہونے والی بات چیت سنی جا سکتی تھی بلکہ تھوڑی سی کوشش کے بعد حجرے کا منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ بند دروازے کے جھری سے آنکھ لگا کر میں اور آگے گیا تو میرا چہرہ روشن دان کے سامنے پہنچ گیا۔ حجرے کا تین چوتھائی حصہ مجھے وضاحت سے نظر آنے لگا۔ سادھو حسب معمول کروٹ کے بل لیٹا تھا اور کراہ رہا تھا۔ یہی وہ انوکھا معالج تھا جس کے ہاتھ سے قدرت نے حمزہ کو شفا دی تھی اور اسے موت سے زندگی کی طرف لوٹایا تھا۔ اس پرآشوب رات میں میں اتفاقاً پھر اس محسن کی طرف چلا آیا تھا لیکن اب پریشان بھی تھا۔ میری وجہ سے اس پر کوئی مصیبت آئے یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے حجرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ریوالور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ دروازہ بند تھا لیکن اسے کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ "کون ہے؟" سادھو نے نحیف آواز میں پوچھا۔

باہر سے جو کچھ کہا گیا وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سادھو نے کہا "آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

ایک ڈی ایس پی اندر داخل ہوا۔ اس نے بوٹ اتار رکھے تھے۔ ٹوپی بھی اتار رکھی تھی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ سادھو کے سامنے دو زانو بیٹھ گیا۔ سادھو بھی کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ڈی ایس پی نے بڑے احترام سے مصافحہ کیا اور بولا "حضرت جی! تکلیف دینے کے لیے بہت بہت معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ایک مفرور اس طرف آیا ہے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ آپ کے ڈیرے میں ہی نہ گھس گیا ہو۔"

سادھو نے کہا "میں تو تکلیف کی وجہ سے رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ اگر کوئی آتا تو اس کمرے سے گزر کر جاتا۔ پھر بھی آپ تسلی کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

ڈی ایس پی نے ایک دم آگے بڑھ کر سادھو کے گھٹنے چھو لیے "نہیں نہیں حضرت جی، میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ میں نے تو اندر بھی نہیں آنا تھا لیکن آپ کے خادم نے بتایا کہ آپ جاگ رہے ہیں۔ میں نے سوچا چلو نیاز حاصل کر لوں۔ اچھا مجھے اجازت دیں، میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھا اور الٹے قدموں چل کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے چند لمحے بعد خادم گورکن اندر آ گیا۔ اس نے حجرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی۔ میں نے سادھو باوا کو ایک بار پھر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چلتے دیکھا بالکل جیسے چھوٹے بچے چلتے ہیں۔ کمر کی کسی خاص تکلیف کے باعث وہ سیدھا لیٹ سکتا تھا اور نہ سیدھا چل سکتا تھا۔ جب وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا تھا تو اس کی لمبی داڑھی زمین سے چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں وہ عجیب و غریب لگتا تھا۔ وہ اپنے خادم کے ساتھ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ میں جلدی سے نیچے اتر آیا اور ایک طرف رکھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور سادھو باوا آمنے سامنے تھے۔ سادھو نے کراہتے ہوئے کہا "پولیس والے آ کر چلے گئے ہیں لیکن وہ ابھی آس پاس ہی موجود ہوں گے۔ تم کچھ دیر اور رکو۔"

میں نے کہا "سادھو جی! جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا۔ اب مجھے شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں نے آپ کو رات کے اس پہر بے آرام کیا ہے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ سائیں جی کا بتاؤ۔ پیرو مرشد کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "سائیں جی بالکل خیریت سے ہیں۔"

"کیا وہ پاکستان میں ہیں؟" بزرگ سادھو نے کراہتے

ہوئے پوچھا۔

"نہیں وہ پاکستان سے باہر ہیں۔ وہ ایک افریقی ملک ماریطانیہ میں ہیں۔ انہوں نے وہاں کے غریب مظلوم لوگوں کے لیے بہت کام کیا ہے۔ وہاں کے لوگ انہیں دیوتا کا درجہ دے رہے ہیں۔ وہ انہیں ذورے دیوتا کہتے ہیں جس کا مطلب آزادی کا دیوتا ہے۔"

سادھو کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ یہ خلوص اور عقیدت کی چمک تھی۔ اس نے کہا "جب بھی تمہاری ملاقات ہو سائیں جی سے میرا سلام ضرور کہنا۔"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ قریباً آدھ گھنٹا میں نے وہیں سادھو کے حجرے میں گزارا۔ سادھو کے ایک خادم نے آکر سادھو کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی اور مودب انداز میں باہر چلا گیا۔ سادھو کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ بولا "پولیس ابھی تک موجود ہے۔ لگتا ہے کہ وہ جلدی واپس جانے والے نہیں۔ اگر چلے بھی گئے تو ان کے دو چار بندے یہاں ضرور چھپے رہیں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے ان کا کافی نقصان ہوا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی مرا نہیں۔ دو تین زخمی ضرور ہوئے ہوں گے۔"

"کوئی گاڑی شاڑی بھی الٹی ہے؟"

"ہاں میرا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا کر الٹ گئی۔"

میرا خیال تھا کہ شاید سادھو کوئی اور سوال بھی کرے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سادھو کے بڈیوں بھرے چہرے پر سوچ کی لکیریں پھیلیں پھر اس نے اپنے خادم گورکن سے مخاطب ہو کر کہا "قبر کھودو۔"

میں حیران ہوا۔ پتا نہیں کہ یہ کس کی قبر کھودنے کا حکم جاری ہوا تھا۔ گورکن باہر چلا گیا۔ سادھو نے کہا "تم بھی جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ یعنی وہ مجھے رخصت کر رہا تھا۔

میں چند لمحے الجھن میں رہا پھر سادھو بابا کو خدا حافظ کہہ کر گورکن کے پیچھے چل دیا۔ گورکن واپس انہی مردوں کی طرف گیا تھا جہاں میں چھپا بیٹھا رہا تھا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں ننگ دھڑنگ شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کمرے کا عقبی دروازہ بھی تھا۔ عقبی دروازہ کھول کر ہم ایک چھوٹے سے احاطے میں پہنچ گئے۔ چھ فٹ اونچی چار دیواری کے اندر چار پانچ قبریں تھیں۔ میرے ساتھ آنے والے گورکن نے تیز رفتاری سے ایک قبر کھودنی شروع کر دی۔ چند منٹ کے اندر وہ قبر کے تختوں تک پہنچ گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ قبر نہیں کچھ اور ہے۔ یہ "مہانی صاحب قبرستان" کے بے شمار اسراروں میں سے ایک اسرار تھا۔ گورکن نے تختے ہٹائے نیچے انسانی ڈھانچے کی بجائے مٹی ہی کی سیڑھیاں نظر آئیں۔ گورکن نے کہا "آپ کو تکلیف تو ہوگی' تھوڑا سا جھک کر چلنا پڑے گا مگر زیادہ فاصلہ نہیں۔"

گورکن سیڑھیاں اترا تو میں بھی اتر گیا۔ گورکن کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اس کی روشنی میں' میں نے خود کو ایک سرنگ نما مقام پر پایا۔ سرنگ کا قطر بمشکل پانچ فٹ ہوگا۔ مجھے گورکن کی طرح جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ تو شاید یہاں آمدورفت کا عادی تھا لیکن مجھے واقعی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہمارے قدموں کے نیچے بھربھری مٹی تھی۔ ہم قریباً دو سو گز تک اسی طرح گئے پھر ایک دروازے پر پہنچ گئے۔ گورکن نے بڑے اعتماد سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم پھر ایک چار دیواری میں تھے۔ یہاں ایک قبر پر ہری سی چادر چڑھی تھی۔ سرہانے کی طرف دو تین دیئے جل رہے تھے۔ یہاں مجھے ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس کے لمبے بال کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے۔ پہلی نظر میں' میں اسے عورت سمجھا لیکن وہ مرد تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا تھیں۔ رات کے اس پہر وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور آسیب کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گورکن نے چار دیواری کا دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا' پھر مجھے اشارہ کیا کہ میدان صاف ہے میں نکل جاؤں۔ گورکن کی ہدایت پر میں باہر آ گیا۔ گورکن نے باہر نکلنے سے پہلے ایک چادر مجھے تھما دی تھی۔ میں نے چادر اوڑھ لی۔

میرے سامنے کھائی سی تھی۔ جیسے سطح مرتفع کی کٹی پھٹی زمین ہوتی ہے۔ میں نیچے اتر گیا۔ پولیس کا گھیرا پیچھے رہ گیا تھا۔ جلد ہی میں ایک ذیلی سڑک بہاولپور روڈ پر پہنچ گیا سردی ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں نے منہ سر چادر میں لپیٹ لیا۔ جونہی ایک ٹیکسی کار میرے نزدیک سے گزری' میں نے اسے روکا اور بیٹھ گیا "کہاں جانا ہے استاد جی۔"

میں ایک دم چونکا لیکن پھر ڈرائیور کے تاثرات دیکھ کر تسلی ہوئی۔ اس نے مجھے رسمی انداز میں استاد جی کہا تھا۔

"کہاں چلنا چاہیے؟" میں نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

"کیا کہا استاد جی۔" ڈرائیور نے چونک کر پوچھا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "اچھا ریواز گارڈن چلو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا۔ کچھ آگے ہمیں پولیس کی کئی گاڑیاں نظر آئیں۔ ایمبولینس کے سائرن بھی گونج رہے تھے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے ٹکر مار کر پولیس کی موبائل الٹائی تھی "لگتا ہے کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اس طرف۔" ڈرائیور نے خیال آرائی کی۔

"رات کو سڑکیں خالی ہوتی ہیں۔ جو حادثے ہوتے ہیں وہ اکثر خطرناک ہوتے ہیں۔" میں نے ہنکارا بھرا۔

ٹیکسی چوبرجی چوک پہنچی اور پھر ریواز گارڈن کی طرف مڑ گئی۔ جس شخص کا تعاقب کرتے ہوئے میں شیخوپورہ سے لاہور پہنچا تھا' اس کا نام راجا مختار تھا۔ راجا مختار کی کوٹھی کے لیٹر بکس میں' میں نے میڈم کا دیا ہوا لفافہ ڈالا تھا۔ اس لفافے کو وصول کرنے کے فوراً بعد ہی راجا مختار لاہور روانہ ہوگیا تھا۔ میں نے راجا مختار کی برلینا کار کا تعاقب کیا تھا اور ریواز گارڈن تک پہنچا تھا۔ یہاں اچانک پولیس کی گاڑیوں کے ساتھ میری دوڑ اور مار ماری شروع ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں وہ کوٹھی محفوظ تھی جہاں راجا مختار رکا تھا۔ یقیناً یہ کوٹھی اسی ہارون پاشا نامی بندے کی تھی جسے میڈم نے اپنے خط میں باس لکھا تھا اور جس کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کی تھیں۔ اگر آج رات کے اس آخری پہر ہارون پاشا نامی اس بندے سے میری ملاقات ہو جاتی تو میری کئی ہفتوں کی بھاگ دوڑ ٹھکانے لگ جاتی۔

چہرے پر جلن سی ہو رہی تھی۔ پولیس والوں کے ساتھ مار ماری کے دوران میں ایک گولی کار کے ڈیش بورڈ میں لگی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر ٹوٹ گیا تھا اور کئی کرچیاں میرے چہرے پر لگی تھیں۔ یہ کرچیاں اب جلن کا احساس پیدا کر رہی تھیں۔ ٹیکسی ریواز گارڈن پہنچی تو میں مطلوبہ کوٹھی سے کچھ فاصلے پر اتر گیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اب کسی بھی وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو سکتا تھا۔ میں درمیانی رفتار سے چلتا ہوا اس کوٹھی کے سامنے سے گزرا جہاں راجا مختار کی کار رکی تھی۔ کوٹھی کا گیٹ کافی اونچا تھا یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ گاڑی اندر ہی ہے یا واپس جا چکی ہے۔ میں نے نیم پلیٹ پڑھی۔ یہ کسی مسز ایوب کے نام پر تھی۔ کوٹھی کافی وسیع تھی۔ شاید یہ علاقے کی بہترین کوٹھی تھی۔

میں سیدھا نکلتا چلا گیا اور بڑی سڑک پر پہنچ کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ ایک چوکیدار نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا لیکن پوچھ گچھ کی جسارت نہیں کی۔ کچھ ہی دیر بعد دن کا اجالا رات کے اندھیرے کو نگلنے لگ گیا۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک بیکری سے میں نے دودھ اور بسکٹ لیے اور ایک قریبی پارک میں بیٹھ کر کھا لیے۔ آٹھ بجے کے قریب میں اپنے پروگرام کے مطابق اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جا کر کوٹھی کے گیٹ پر کال بیل کا بٹن دبایا۔ ایک مسلح چوکیدار باہر نکلا۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے سرتاپا گھورا۔

میں نے کہا "میں پاشا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کون پاشا؟"

"ہارون پاشا صاحب! میں ان کے لیے ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"یہاں اس نام کا کوئی شخص نہیں رہتا۔"

میں نے پورچ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ برلینا کار یہاں نظر نہیں آ رہی تھی جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں پہنچا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ کہیں میں غلط کوٹھی میں تو نہیں آ گیا۔

اسی دوران میں اندر سے ایک بھاری بھرکم بندہ نکلا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا "کیا بات ہے؟" اس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"میرا نام صادق ہے۔ میں شیخوپورہ سے آیا ہوں۔ میرے پاس ہارون پاشا صاحب کے لیے ایک خاص پیغام ہے' لیکن یہ پیغام میں انہی کو دوں گا۔"

لمبے تڑنگے شخص نے دھیان سے مجھے دیکھا' پھر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ یہاں مجھے ایک دو بڑے بڑے فلمی پوسٹر نظر آئے۔ ڈرائنگ روم کے اندر بھی فلمی اداکاروں کی تصویریں خوب صورت فریموں میں آویزاں تھیں۔ ان تصویروں میں کہیں کہیں لمبا تڑنگا شخص بھی نظر آ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں اچانک دو مسلح افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بغیر اجازت طلب کیے میری تلاشی لی اور میری قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال کر ایک طرف کونے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ چوکس حالت میں میرے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

لمبے تڑنگے شخص نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے اپنا تعارف ٹھیک نہیں کرایا۔ اپنا اصل تعارف کرواؤ اور یہ بتاؤ

کہ یہاں کس لیے آئے ہو۔"

"پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ باس پاشا اسی کوٹھی میں رہتے ہیں؟"

"اگر میرا جواب ہاں میں ہو تو پھر؟"

"پھر میں یہ کہوں گا کہ میں ان سے میڈم کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کون میڈم؟" مخاطب کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔

"میڈم شہزادی۔"

لمبا تڑنگا شخص ہیجانی انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں بھی تھیں' پھر وہ میری طرف انگلی اٹھا کر بولا "کہیں تیرا نام جہاں داد تو نہیں ہے؟"

میں خاموش رہا۔ وہ تیزی سے بولا "میں سمجھ گیا' تیرا نام ہی جہاں داد ہے۔" اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی کمر کو خم دیا اور میری پنڈلی پہ سے کپڑا ہٹایا۔ یہاں سانپ کے کاٹے کا نشان ابھی تک موجود تھا۔ لمبے تڑنگے شخص کے چہرے پر چمک نمودار ہو گئی۔ وہ میرا شانہ تھام کر بولا "کہاں ہے میڈم؟ بتاؤ کہاں ہے؟"

میں نے اطمینان سے کہا "میں آپ کو میڈم کے بارے میں ہی بتانے آیا ہوں' لیکن میری خواہش ہے کہ میں یہ اطلاع محترم پاشا صاحب کو دوں۔"

"تو بتاؤ نا۔ سوچ کیا رہے ہو؟"

"تو آپ ہی پاشا ہیں؟"

"ہاں' میں ہی ہوں۔ بتاؤ کہاں ہے میڈم؟"

لمبے تڑنگے شخص کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے' وہ پاشا نہیں ہے۔ میں نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے پاشا صاحب کی تصویر دیکھی ہوئی ہے میڈم کے پاس۔ میں پاشا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے لمبے تڑنگے شخص کے چہرے پر طیش کے آثار ابھرے' یوں لگا جیسے وہ دانت پیس کر مجھے تھپڑ جڑ دے گا' مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور بولا "میں تجھے بعد میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لے کہ پاشا صاحب یہاں نہیں ہیں۔ وہ اگلے کئی ہفتوں تک یہاں نہیں ہوں گے۔ میں ان کا قریبی ساتھی ہوں اور ان کی غیر موجودگی میں سارے معاملات میں ہی سنبھالتا ہوں۔"

"لیکن جی......"

"اگر مگر مت کرو۔" وہ دھاڑا "میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ایک۔ ایک لمحہ قیمتی ہے۔" پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ اس نے کہا "تجھے نادر رنجگی نے میڈم کے پاس بھیجا تھا نا؟"

"جی ہاں۔"

لمبے تڑنگے شخص نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ چوتھی پانچویں کوشش میں وہ کامیاب ہو گیا "نادر کو بلاؤ۔" وہ بڑے رعب سے بولا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا "ہیلو۔ کون؟ نادر ہے؟ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تمہارے کارندے جہاں داد کا پتا چل گیا ہے۔ وہ اس وقت میرے گھر میں میرے پاس بیٹھا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ کہہ رہا ہے کہ وہ میڈم کے بارے میں کوئی اہم خبر لایا ہے اور صرف باس کو بتائے گا۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ باس یہاں نہیں ہوتا۔ اسے ذرا اپنی زبان میں سمجھاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی لمبے شخص نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ نادر رنجگی کی گھبرائی ہوئی آواز میں نے فون پر سنی۔ وہ رو جھا ہو رہے نہیں بول رہا تھا کیونکہ پس منظر میں ٹریفک کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ وہ بولا "تم کہاں تھے جہاں داد! تمہاری تلاش میں دو درجنوں بندے پاگلوں کی طرح شہر شہر گھومتے رہے ہیں اور سنو۔ تم جو کچھ میڈم کے بارے میں بتانا چاہتے ہو' وحدت صاحب کو فورا بتا دو۔ سمجھو کہ اس وقت یہی باس ہیں۔"

میں نے کہا "نادر صاحب! میڈم دراصل۔۔۔"

"نہیں۔ نہیں مجھے کچھ مت بتاؤ۔ اس طرح وحدت صاحب ناراض ہوں گے۔ تم انہیں جو کچھ بتاؤ گے مجھے بھی پتا چل جائے گا۔"

نادر نے بڑی دانائی سے مجھے سمجھایا حالانکہ ایسی ایسی چھوٹی موٹی نادانیاں میں جان بوجھ کر کرتا تھا تا کہ میرا بھرم قائم رہے "ٹھیک ہے جناب۔ جیسے آپ کا حکم۔"

"فون بند مت کرنا وحدت صاحب سے پوچھو کہ وہ کوئی بات تو کرنا نہیں چاہتے۔"

میں نے کہا "جناب! آپ نے نادر صاحب سے کوئی بات تو نہیں کرنی؟"

"نہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"اچھا جی خدا حافظ۔" میں نے نادر رنجگی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ بگ باس ہارون پاشا نہ لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ میں اگر میڈم کی مخبری کر رہا تھا تو اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو میں اس کے کرتوتوں کی

سزا اسے دلوانا چاہتا تھا۔ دوسرے میں باس پاشا کا اعتماد حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اب باس پاشا خود تو یہاں تھا نہیں۔ دوسری طرف اطلاع دینے میں زیادہ تاخیر بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ راج نگر گاؤں میں چوہدری بشارت کے گھر میڈم بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اگر میں کچھ دیر تک مزید واپس نہ جاتا تو میڈم کا چونکنا یقینی تھا۔ ایسی صورت میں وہ راج نگر سے راہ فرار بھی اختیار کر سکتی تھی۔

میں نے وحدت نامی شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "جناب! میڈم کی طرف سے مجھ پر بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میڈم نے مجھ سے قربانی کے جانور جیسا سلوک کیا ہے۔ میڈم نے نادر رنجگی صاحب کے ذریعے مجھے پندرہ ہزار روپے دیے تھے تاکہ میں اپنے گھر والوں کو بھیج سکوں۔ میرا خیال تھا کہ میڈم نے خدا ترسی کی ہے لیکن یہ خدا ترسی نہیں یہ تو میری جان کی قیمت تھی۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے جناب کہ مجھے سانپوں نے نہیں ڈسا تھا بلکہ میڈم نے جان بوجھ کر ڈسوایا تھا۔ اس کے بعد اس نے میرا خون جسم سے نکلوا کر اپنے جسم میں ڈلوایا۔ پتا نہیں وہ کیا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں مرنے سے بچ گیا۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ موقع ملتے ہی میڈم کے شکنجے سے نکل جانا ہے۔ یہ موقع مجھے کل شام ملا ہے۔ شیخوپورہ روڈ پر زیدی صاحب کے قتل کے بعد میڈم میرے ساتھ مرید کے چلی گئی تھی۔ مرید کے سے آگے راج نگر نامی ایک گاؤں ہے۔ وہ وہاں کے چوہدری بشارت کے پاس چھپی ہوئی ہے۔"

لمبے تڑنگے وحدت نے پوچھا "تم گاؤں سے کب کے نکلے ہوئے ہو؟"

"شام تقریباً سات بجے نکلا تھا۔"

"تو اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"یہاں کا پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔"

"پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میڈم ہوشیار ہو کر وہاں سے بھاگ نکلی ہو۔"

"ابھی تک تو نہیں بھاگی ہوگی جی۔ جب میں گاؤں سے نکلا تھا وہ نشے میں دھت ہو رہی تھی۔ ابھی اس نے ڈیڑھ گھنٹے مزید پینی تھی۔ جب وہ نشہ کر کے سوتی ہے تو پھر عام طور پر دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی۔"

"یہاں کا پتا تمہیں ملا کیسے؟"

میڈم نشے میں عام طور پر باس پاشا کا نام لیتی تھی۔ پرسوں رات اس نے اتنا زیادہ نشہ کر لیا کہ مستی میں بہت سی باتیں بک دیں۔ وہ ایک گھنٹے تک بغیر رکے بولتی رہی۔ اس نے اسی نشے میں مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے مجھے سانپوں سے ڈسوا کر میرا خون اپنے اندر داخل کرایا ہے۔ پھر جب اس نے باس پاشا کی باتیں چھیڑیں تو مجھے باس کا ایڈریس بھی دے دیا۔ صبح جب نشہ اترا تو وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔"

وحدت نامی شخص اثبات میں سر ہلانے لگا۔ (میڈم کے نشے والی بات میں نے وحدت کو مطمئن کرنے کے لیے بتائی تھی' ورنہ حقیقت یہ تھی کہ باس پاشا کا پتا میں نے راجا کا تعاقب کر کے معلوم کیا تھا) ہو سکتا ہے کہ وحدت کو میری باتوں پر مکمل یقین نہ آیا ہو لیکن وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طرح ساہکار ناول
زندان میں پھول
قیمت 300 روپے
انجذبہ الجھنا سطر سطر تجسس اور
درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان
ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی،
جن کی بدبختی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کر دیا۔
بہترین کتابت، خوبصورت گرد پوش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

وحدت یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ وقت بہت قیمتی ہے اور اگر وہ میڈم کو پکڑنا چاہتے ہیں تو انہیں تیزی سے حرکت کرنا ہوگی۔ پندرہ منٹ کے اندر ساری تیاری ہو گئی۔ ایک نئی ٹویوٹا جیپ میں چھ مسلح افراد سوار ہوئے' ساتواں میں تھا۔ وحدت خود اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے۔ جیپ آندھی کی طرح رواز گارڈن سے نکلی اور لوئر مال سے ہوتی ہوئی راوی کے پل کی طرف چل دی۔ راوی کے پل سے ایک فرلانگ پہلے ہی ہمیں "جام ٹریفک" ملی۔ پتا چلا کہ الیکشن کے سلسلے میں کوئی بڑا جلوس نکلا ہے اور اس جلوس کی وجہ سے شاہدرہ چوک میں ٹریفک بلاک ہے۔

قریباً ایک گھنٹا ہم نے بڑی بے صبری سے آگے بڑھنے کا انتظار کیا لیکن اس ایک گھنٹے میں جیپ بمشکل نصف فرلانگ رینگی ہوگی۔ سخت مایوس ہو کر وحدت نے ٹریفک کو اور ٹریفک جام کرنے والوں کو کئی موٹی گالیاں دیں اور جیپ سے نکل آیا۔

ہم نے جیپ ڈرائیور کے حوالے کی اور خود پیدل ہی پل کی طرف بڑھے۔ پل پار کر کے ہم شاہدرہ کی طرف آئے۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جی ٹی روڈ پر بھی قریباً تین میل تک گاڑیوں کی لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ دو جلوسوں میں شدید تصادم اور پتھراؤ وغیرہ ہوا ہے جس کے سبب ٹریفک کی روانی کا یہ حشر ہوا ہے۔

خدا خدا کر کے ہم "ٹریفک جام" سے گزرنے کے بعد ایسی جگہ پہنچے جہاں گاڑیاں حرکت میں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں دس پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد ایک اچھی حالت کی ٹیکسی ملی لیکن ایک ٹیکسی میں آٹھ افراد کا بیٹھنا اور کچے پکے راستے پر سفر کرنا محال تھا۔ لہٰذا ایک اور ٹیکسی ڈھونڈی گئی اور یوں کافی تاخیر سے مریدکے کی طرف ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ہم ایک گھنٹے میں مریدکے پہنچے اور وہاں سے کچے پکے راستے پر ہمارا سفر شروع ہوا۔ جس وقت ہم رانی نگر گاؤں پہنچے گیارہ بجنے والے تھے۔ ابھی ہم گاؤں سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ افراتفری کے آثار نظر آئے۔ میں نے چوہدری بشارت کے کچھ کارندوں کو دیکھا وہ گھوڑیوں پر سوار اور بندوقیں لہراتے ایک طرف جا رہے تھے۔ گاؤں سے باہر جوہڑ کے کنارے درجنوں افراد ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

پھر مجھے چوہدری بشارت خود نظر آیا۔ وہ اپنی جیپ پر سوار بڑی تیزی سے نہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی جیپ میں پانچ چھ مسلح افراد سوار تھے۔ اس موقعے پر میری چھٹی حس نے زبردست کام کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میڈم نوری یہاں سے فرار ہو گئی ہے اور جاتے جاتے وہ کوئی ایسا کام کر گئی ہے جس نے چوہدری بشارت اور اس کے ساتھیوں کو آگ بگولا کر دیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی دوڑیں بھی لگوا دی ہیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "گاڑی روکو۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" وحدت نے پوچھا۔

"یہ ابھی ہمارے سامنے سے جو جیپ گزری ہے' چوہدری بشارت کی ہے۔ میڈم اسی کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔"

"ٹھہری ہوئی تھی سے کیا مطلب؟" وحدت نے پوچھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم نے یہاں پہنچنے میں دیر کر دی ہے۔ میڈم خطرے کی بو سونگھ کر یہاں سے فرار ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چوہدری بشارت اور اس کے کارندے میڈم ہی کے پیچھے گئے ہوں۔"

وحدت نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں چوہدری کے پیچھے جانا چاہیے۔ دوسری ٹیکسی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے وحدت کی رائے سے اتفاق کیا۔ وحدت کے تین ساتھی دوسری ٹیکسی سمیت وہیں موجود رہے جبکہ ہم چوہدری کی جیپ کے پیچھے چل دیے۔ چوہدری کی جیپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی دھول اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ ہم اس دھول کے اندر سفر کر رہے تھے۔ ٹیکسی کار کی ونڈ اسکرین دھول سے اٹ گئی تھی۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد چوہدری کی جیپ ایک موڑ پر درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ جب ہم اس موڑ پر پہنچ کر مڑے تو جیپ سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ اس کا اگلا پہیہ ایک گہرے کھڈے میں چلا گیا تھا اور وہ مکمل طور پر ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ جیپ کے پھنس جانے سے راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ مجبوراً ہمیں بھی گاڑی روکنا پڑی۔ چوہدری کے کارندے جیپ کو کھڈے سے نکالنے کے لیے زور لگا رہے تھے چوہدری بھی نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ چوہدری کی نگاہ... مجھ پر پڑ جائے گی۔ میں نے خود کو وحدت کے ایک ساتھی کے عقب میں چھپانا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے ہی چوہدری بشارت مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آئے۔ وہ لپک کر میری طرف آیا اور

ٹیکسی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی۔ چوہدری کی گھن گرج سن کر اس کے ساتھی بھی تیزی سے میری طرف آئے۔ چوہدری چیخ رہا تھا "زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور میری طرف سیدھا کر لیا تھا۔ چوہدری کے جواب میں وحدت کے ساتھیوں نے بھی ایک لمحے کے اندر اسلحہ نکال لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر دونوں طرف سے ہتھیار سیدھے ہو گئے اور انگلیاں ٹریگرز پر آ گئیں۔ وحدت اور اس کے ساتھی حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے لیکن میری سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ میڈم نے چوہدری بشارت کے ساتھ کوئی ہاتھ کیا تھا اور بھاگ گئی تھی۔ چوہدری بشارت اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک میں میڈم کا ساتھی اور کارندہ تھا۔ اب میڈم کے لیے جو بھی غیظ و غضب ان لوگوں میں موجود تھا اس کا رخ میری طرف ہو گیا تھا۔ شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ ذرا سی غلط فہمی کے سبب اندھا دھند گولیاں چل سکتی تھیں۔ میں نے چوہدری بشارت سے کہا "چوہدری جی! پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد مجھے ذبح بھی کر دو گے تو مجھے قبول ہے۔"

چوہدری کا ریوالور والا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا "چوہدری جی! مجھے نہیں پتا یہاں میڈم نے کیا کیا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں' میں آپ کا دشمن نہیں ہمدرد ہوں۔ میں ہی ان لوگوں کو ٹیکسی کار پر لاہور سے لے کر آیا ہوں۔ میڈم نے بھولورہ روڈ پر جو بندہ مارا تھا وہ انہی لوگوں کا تھا۔ یہ میڈم کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"یہ سچ کہہ رہا ہے۔" وحدت نے لقمہ دیا "ہم میڈم ہی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اگر آپ بھی میڈم کو ڈھونڈ رہے ہیں تو پھر ہمارا راستہ ایک ہی ہے۔"

اس مختصر گفتگو نے دونوں طرف سے تناؤ کافی کم کر دیا۔ چوہدری نے اپنا ریوالور غیر ارادی طور پر نیچے جھکا لیا تھا۔ ویسے بھی چوہدری اور اس کے ساتھیوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹیکسی کار میں کوئی للو پنجو سوار نہیں ہیں۔ وحدت اور اس کے ساتھیوں کے پاس بہترین اسلحہ تھا اور ویسے بھی وہ چوہدری کے ساتھیوں پر بھاری نظر آ رہے تھے۔

میں نے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے چوہدری سے پوچھا "اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہمیں بھی کچھ بتائیں۔ یہاں کیا معاملہ ہوا ہے؟"

جواب میں چوہدری نے جو کچھ کہا اور جو کچھ میں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا اس سے انکشاف ہوا کہ کچھ دیر پہلے میڈم حویلی سے بھاگ گئی ہے اور وہ اکیلی نہیں بھاگی اپنے ساتھ نسرین کو بھی زبردستی لے گئی ہے۔ جیسا کہ ہمیں بعد ازاں معلوم ہوا میڈم نے میرے واپس نہ آنے کی وجہ سے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی حساس اور زود فہم تھی۔ اس نے گاؤں سے نکلنے کے لیے ایک پرانی کار استعمال کی تھی۔ یہ کار چوہدری بشارت کے ایک دوست کی تھی۔ نسرین کو گن پوائنٹ پر رکھ کر میڈم کار میں جا بیٹھی تھی۔ ڈرائیور میڈم کا غیظ و غضب دیکھ کر بھاگ گیا تھا اور وہ گاڑی بھگا کر لے گئی تھی۔ بعد ازاں ڈرائیور نے چوہدری بشارت کو میڈم کے اس "کارنامے" کی اطلاع دی تھی۔

اگلے اٹھارہ گھنٹے ہم علاقے میں مسلسل میڈم اور نسرین کو ڈھونڈتے رہے۔ ہمارے ساتھ چوہدری بشارت کے درجنوں مزید کارندے بھی شامل ہو گئے تھے۔ اگلے روز گاؤں سے قریباً دس کلومیٹر دور ایک ویران ٹیلے کے قریب کار کے ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ ان نشانات کو چوہدری بشارت کے دوست نے پہچان لیا۔ یہ اسی کی گاڑی تھی۔ تھوڑی سی مزید جستجو کی گئی تو ہم ایک کھنڈر میں پہنچ گئے۔ کھنڈر میں کئی دیہاتی مرد و زن جمع تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی اہم واقعہ ہوا ہے۔

چوہدری بشارت گاڑی سے اتر کر دوڑتا ہوا چند دیہاتیوں کے پاس پہنچا۔ چوہدری کے پوچھنے پر دیہاتیوں نے بتایا کہ یہاں واردات ہوئی ہے۔ کوئی شخص ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کر کے بھاگ گیا ہے۔

اسی دوران میں کھنڈر کے اندر سے تین چار عورتیں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ایک لڑکی کے سر پر لمبی چادر ڈال کر اس کا منہ سر چھپا رکھا تھا۔ عورتوں کا سہارا لے کر لڑکی آہستہ آہستہ درختوں کی طرف آ رہی تھی۔ لڑکی کا قد کاٹھ اور جسمانی بناوٹ دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ یہ چوہدری بشارت کی بہن نسرین ہی ہے۔ چند لمحے بعد پردہ پوش لڑکی نے بھی چوہدری بشارت کو دیکھ لیا۔ وہ ایک دم دوڑتی ہوئی آئی اور بھائی سے لپٹ کر بلند آواز سے رونے لگی۔ چوہدری اسے چادر کے اندر ہی لپیٹ کر اپنی جیپ میں لے آیا۔

چوہدری تو بہن کو لے کر فوراً واپس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا اور ہم موقعے پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ایک کسان نے بتایا "ہم قریب ہی کھیتوں میں منہ اندھیرے پانی لگا رہے تھے۔ کسی زنانی کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ہم دوڑتے ہوئے اس کھنڈر میں پہنچے تو یہ لڑکی

وحدت یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ وقت بہت قیمتی ہے اور اگر وہ میڈم کو پکڑنا چاہتے ہیں تو انہیں تیزی سے حرکت کرنا ہوگی۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ساری تیاری ہوگئی۔ ایک نئی ٹویوٹا جیپ میں چھ مسلح افراد سوار ہوئے' ساتواں میں تھا۔ وحدت خود اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ صبح کے دس بج چکے تھے۔ جیپ آندھی کی طرح ریواز گارڈن سے نکلی اور لوئر مال سے ہوتی ہوئی راوی کے پل کی طرف چل دی۔ راوی کے پل سے ایک فرلانگ پہلے ہی ہمیں "جام ٹریفک" ملی۔ پتا چلا کہ الیکشن کے سلسلے میں کوئی بڑا جلوس نکلا ہے اور اس جلوس کی وجہ سے شاہدرہ چوک میں ٹریفک بلاک ہے۔

قریباً ایک گھنٹا ہم نے بڑی بے صبری سے آگے بڑھنے کا انتظار کیا لیکن اس ایک گھنٹے میں جیپ بمشکل نصف فرلانگ رینگی ہوگی۔ سخت مایوس ہو کر وحدت نے ٹریفک کو اور ٹریفک جام کرنے والوں کو کئی موٹی گالیاں دیں اور جیپ سے نکل آیا۔

ہم نے جیپ ڈرائیور کے حوالے کی اور خود پیدل ہی پل کی طرف بڑھے۔ پل پار کر کے ہم شاہدرہ کی طرف آئے۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جی ٹی روڈ پر بھی قریباً تین میل تک گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ دو جلوسوں میں شدید تصادم اور پتھراؤ وغیرہ ہوا ہے جس کے سبب ٹریفک کی روانی کا یہ حشر ہوا ہے۔

خدا خدا کر کے ہم "ٹریفک جام" سے گزرنے کے بعد ایسی جگہ پہنچے جہاں گاڑیاں حرکت میں نظر آرہی تھیں۔ یہاں دس پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد ایک اچھی حالت کی ٹیکسی ملی لیکن ایک ٹیکسی میں آٹھ افراد کا بیٹھنا اور کچے پکے راستے پر سفر کرنا محال تھا۔ لہٰذا ایک اور ٹیکسی ڈھونڈی گئی اور یوں کافی تاخیر سے مریدکے کی طرف ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ہم ایک گھنٹے میں مریدکے پہنچے اور وہاں سے کچے پکے راستے پر ہمارا سفر شروع ہوا۔ جس وقت ہم راوی نگر گاؤں پہنچے گیارہ بجنے والے تھے۔ ابھی ہم گاؤں سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ افراتفری کے آثار نظر آئے۔ میں نے چوہدری بشارت کے کچھ کارندوں کو دیکھا وہ گھوڑیوں پر سوار اور بندوقیں لہراتے ایک طرف جا رہے تھے۔ گاؤں سے باہر جوہڑ کے کنارے درجنوں افراد ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

پھر مجھے چوہدری بشارت خود نظر آیا۔ وہ اپنی جیپ پر سوار بڑی تیزی سے نہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی جیپ میں پانچ چھ مسلح افراد سوار تھے۔ اس موقعے پر میری چھٹی حس نے زبردست کام کیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میڈم نرگس فرار ہوگئی ہے اور جاتے جاتے وہ کوئی ایسا کام کر گئی ہے جس نے چوہدری بشارت اور اس کے ساتھیوں کو آگ بگولا کر دیا ہے اور اس کے علاوہ ان کی دوڑیں بھی لگوا دی ہیں۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "گاڑی روکو۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" وحدت نے پوچھا۔

"یہ ابھی ہمارے سامنے سے جو جیپ گزری ہے یہ چوہدری بشارت کی ہے۔ میڈم اسی کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔"

"ٹھہری ہوئی تھی سے کیا مطلب؟" وحدت نے پوچھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم نے یہاں پہنچنے میں دیر کر دی ہے۔ میڈم خطرے کی بو سونگھ کر یہاں سے فرار ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چوہدری بشارت اور اس کے کارندے میڈم ہی کے پیچھے گئے ہوں۔"

وحدت نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں چوہدری کے پیچھے جانا چاہیے۔ دوسری ٹیکسی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے وحدت کی رائے سے اتفاق کیا۔ وحدت کے تین ساتھی دوسری ٹیکسی سمیت وہیں موجود رہے جبکہ ہم چوہدری کی جیپ کے پیچھے چل دیے۔ چوہدری کی جیپ کچے راستے پر اچھلتی کودتی دھول اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ ہم اس دھول کے اندر سفر کر رہے تھے۔ ٹیکسی کار کی ونڈ اسکرین دھول سے اٹ گئی تھی۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد چوہدری کی جیپ ایک موڑ پر درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ جب ہم اس موڑ پر پہنچ کر مڑے تو جیپ سامنے ہی کھڑی نظر آئی۔ اس کا اگلا پہیہ ایک گہرے کھڈے میں چلا گیا تھا اور وہ مکمل طور پر ایک طرف کو جھک گئی تھی۔ جیپ کے پھنس جانے سے راستہ بھی بند ہوگیا تھا۔ مجبوراً ہمیں بھی گاڑی روکنا پڑی۔ چوہدری کے کارندے جیپ کو کھڈے سے نکالنے کے لیے زور لگا رہے تھے چوہدری بھی نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔

مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ چوہدری کی نگاہ... مجھ پر پڑ جائے گی۔ میں نے خود کو وحدت کے ایک ساتھی کے عقب میں چھپانا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے ہی چوہدری بشارت مجھے دیکھ چکا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آئے۔ وہ لپک کر میری طرف آیا اور

ٹیکسی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی۔ چوہدری کی گھن گرج سن کر اس کے ساتھی بھی تیزی سے میری طرف آئے۔ چوہدری چیخ رہا تھا "زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور میری طرف سیدھا کر لیا تھا۔ چوہدری کے جواب میں وحدت کے ساتھیوں نے بھی ایک لمحے کے اندر اسلحہ نکال لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر دونوں طرف سے ہتھیار سیدھے ہوگئے اور انگلیاں ٹرائیگرز پر آگئیں۔ وحدت اور اس کے ساتھی حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے لیکن میری سمجھ میں بات آرہی تھی۔ میڈم نے چوہدری بشارت کے ساتھ کوئی ہاتھ کیا تھا اور بھاگ گئی تھی۔ چوہدری بشارت اور اس کے ساتھیوں کے نزدیک میں میڈم کا ساتھی اور کارندہ تھا۔ اب میڈم کے لیے جو بھی غیظ و غضب ان لوگوں میں موجود تھا اس کا رخ میری طرف ہوگیا تھا۔ شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ ذرا سی غلط فہمی کے سبب اندھا دھند گولیاں چل سکتی تھیں۔ میں نے چوہدری بشارت سے کہا "چوہدری جی! پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد مجھے ذبح بھی کر دو گے تو مجھے قبول ہے۔"

چوہدری کا ریوالور والا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے گاڑی سے باہر آتے ہوئے کہا "چوہدری جی! مجھے نہیں پتا یہاں میڈم نے کیا کیا ہے۔ لیکن ایک بات میں آپ کو بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں' میں آپ کا دشمن نہیں ہمدرد ہوں۔ میں ہی ان لوگوں کو ٹیکسی کار پر لاہور سے لے کر آیا ہوں۔ میڈم نے شیخوپورہ روڈ پر جو بندہ مارا تھا وہ انہی لوگوں کا تھا۔ یہ میڈم کو دن رات ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"یہ سچ کہہ رہا ہے۔" وحدت نے لقمہ دیا "ہم میڈم ہی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اگر آپ بھی میڈم کو ڈھونڈ رہے ہیں تو پھر ہمارا رستہ ایک ہی ہے۔"

اس مختصر گفتگو نے دونوں طرف سے تناؤ کافی کم کر دیا۔ چوہدری نے اپنا ریوالور غیر ارادی طور پر نیچے جھکا لیا تھا۔ ویسے بھی چوہدری اور اس کے ساتھیوں نے دیکھ لیا تھا کہ ٹیکسی کار میں کوئی للو پنجو سوار نہیں ہیں۔ وحدت اور اس کے ساتھیوں کے پاس بہترین اسلحہ تھا اور وہ بھی چوہدری کے ساتھیوں پر بھاری نظر آرہے تھے۔

میں نے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے چوہدری سے پوچھا "اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہمیں بھی کچھ بتائیں۔ یہاں کیا معاملہ ہوا ہے۔"

جواب میں چوہدری نے جو کچھ کہا اور جو کچھ میں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا اس سے انکشاف ہوا کہ کچھ دیر پہلے میڈم حویلی سے بھاگ گئی ہے اور وہ اکیلی نہیں بھاگی اپنے ساتھ نسرین کو بھی زبردستی لے گئی ہے۔ جیسا کہ ہمیں بعد ازاں معلوم ہوا میڈم نے میرے واپس نہ آنے کی وجہ سے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی حساس اور زود فہم تھی۔ اس نے گاؤں سے نکلنے کے لیے ایک پرانی کار استعمال کی تھی۔ یہ کار چوہدری بشارت کے ایک دوست کی تھی۔ نسرین کو گن پوائنٹ پر رکھ کر میڈم کار میں جا گھسی تھی۔ ڈرائیور میڈم کا غیظ و غضب دیکھ کر بھاگ گیا تھا اور وہ گاڑی بھگا کر لے گئی تھی۔ بعد ازاں ڈرائیور نے چوہدری بشارت کو میڈم کے اس "کارنامے" کی اطلاع دی تھی۔

اگلے اٹھارہ گھنٹے ہم علاقے میں مسلسل میڈم اور نسرین کو ڈھونڈتے رہے۔ ہمارے ساتھ چوہدری بشارت کے درجنوں مزید کارندے بھی شامل ہوگئے تھے۔ اگلے روز گاؤں سے قریباً دس کلومیٹر دور ایک ویران بیلے کے قریب کار کے ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ ان نشانات کو چوہدری بشارت کے دوست نے پہچان لیا۔ یہ اسی کی گاڑی تھی۔ تھوڑی سی مزید جستجو کی گئی تو ہم ایک کھنڈر میں پہنچ گئے۔ کھنڈر میں کئی دیہاتی مرد و زن جمع تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی اہم واقعہ ہوا ہے۔

چوہدری بشارت گاڑی سے اتر کر دوڑتا ہوا چند دیہاتیوں کے پاس پہنچا۔ چوہدری کے پوچھنے پر دیہاتیوں نے بتایا کہ یہاں واردات ہوئی ہے۔ کوئی شخص ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کر کے بھاگ گیا ہے۔

اسی دوران میں کھنڈر کے اندر سے تین چار عورتیں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ایک لڑکی کے سر پر لمبی چادر ڈال کر اس کا منہ سر چھپا رکھا تھا۔ عورتوں کا سہارا لے کر لڑکی آہستہ آہستہ درختوں کی طرف آرہی تھی۔ لڑکی کا قد کاٹھ اور جسمانی بناوٹ دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ یہ چوہدری بشارت کی بہن نسرین ہی ہے۔ چند لمحے بعد پردہ پوش لڑکی نے بھی چوہدری بشارت کو دیکھ لیا۔ وہ ایک دم دوڑتی ہوئی آئی اور بھائی سے لپٹ کر بلند آواز سے رونے لگی۔ چوہدری اسے چادر کے اندر ہی لپیٹ کر اپنی جیپ میں لے آیا۔

چوہدری تو بہن کو لے کر فوراً واپس گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا اور ہم موقعے پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ایک کسان نے بتایا "ہم قریب ہی کھیتوں میں منہ اندھیرے پانی لگا رہے تھے کسی زنانی کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ہم دوڑتے ہوئے اس کھنڈر میں پہنچے تو یہ لڑکی

یہاں لاوہ موٹی پڑی تھی۔ اس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میں دوڑ کر واپس اپنے گھر گیا اور گھر کی دو زنانیوں کو لے آیا۔ انہوں نے کڑی کو کپڑے پہنائے اور ہوش میں لانے کی کونٹ (کوشش) کرنے لگیں۔ وہ ہوش میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ میرے وڈے پتر کی بیوی ضلع ہسپتال میں نرس ہے۔ میرا چھوٹا پتر اسے ساتھ والے گاؤں سے بلا کر لایا۔ خدا خدا کر کے کڑی کو ہوش آئی ہے۔"

"اس نے کچھ بتایا بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کیا بتائے گی جی۔" ایک دوسرا کسان بولا "ایسے موقع پر کڑی بے چاری کیا بتا سکدی ہے۔"

"کچھ پتا چلا کہ لڑکی کے ساتھ کون تھا؟"

"جو بھی تھا وہ دوڑ گیا جی۔" پہلے دیہاتی نے جواب دیا "ہم نے ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ دیکھیں وہ سامنے زمین پر ٹائروں کے نشان وغیرہ بھی ہیں۔"

ایک ادھیڑ عمر شخص مایوسی سے سر ہلا کر منہ سے چچ چچ کی آواز نکالنے لگا "پتا نہیں کیا زمانہ آ گیا ہے جی۔ دن دیہاڑے عزتیں خراب ہو رہی ہیں۔"

بظاہر وہ شخص افسوس کا اظہار کر رہا تھا لیکن محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندر افسوس کم اور دلچسپی زیادہ ہے۔

اتنے میں ایک نوجوان آگے آیا۔ وہ چہرے مہرے سے سنجیدہ شخص نظر آتا تھا۔ اس نے چوہدری بشارت کے ساتھیوں میں سے تین چار افراد کو کہا کہ وہ ذرا علیحدہ ہو کر اس کی بات سنیں۔ میں بھی ان تین چار افراد میں شامل ہو گیا۔ وہ بولا "میری بیوی نرس ہے۔ اس نے ہی لڑکی کو مرہم پٹی کی ہے اور ہوش دلایا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ لڑکی سے زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ بس اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کے ساتھ جو بندہ تھا اسی نے مارا ہے اسے۔ پہلے اس کے کپڑے پھاڑے ہیں پھر اپنی پینٹ کی بیلٹ سے اسے پیٹتا رہا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لڑکی جانے سے انکار کر رہی تھی۔"

میری آنکھوں کے سامنے میڈم کی شبیہ گھومنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب میڈم ہی کا کارنامہ ہے۔ وہ اپنی وحشت میں عجیب وغریب کام کر رہی تھی۔ درحقیقت اس کا سب سے بڑا مسئلہ اپنا علاج تھا۔ وہ ادھورے علاج کے عذاب کا شکار ہو رہی تھی۔ اسے جلد از جلد خون کے نئے ڈوز کی ضرورت تھی۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس نے میری دو دن کا خطرہ مول لیتے ہوئے مجھے راج نگر سے اپنے باس کے نام خط دے کر شیخوپورہ بھیجا تھا۔ وہ سمجھتی تھی (یا سمجھتا تھا) کہ جب تک باس کے ساتھ اس کے معاملات درست نہیں ہو جاتے وہ اسی طرح راج نگر میں پناہ گزیں رہنے پر مجبور ہوگی اور راج نگر جیسے دور دراز گاؤں میں رہتے ہوئے وہ اپنے عطائی ڈاکٹر ابدال جی سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی۔ اور اگر رابطہ ہو بھی جاتا تو علاج معالجے کی وہ خاص سہولتیں اسے راج نگر میں حاصل نہیں تھیں جو لاہور میں ہو سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے مشتعل باس کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک گمنام خط کے ذریعے اپنی صفائی پیش کی تھی۔ مگر میں چونکہ میڈم کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی شیخوپورہ سے واپس نہیں آیا تھا لہٰذا میڈم کا ماتھا ٹھنک گیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں کہیں پکڑا گیا ہوں یا پھر میری نیت خراب ہو گئی ہے۔ وہ خطرے کی بو سونگھ کر راج نگر سے نکل بھاگی تھی۔

یہاں کھنڈر میں جو کچھ ہوا اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بھی کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی۔ میڈم نے نسرین کو اپنے ساتھ مزید آگے لے جانے کی کوشش کی تھی۔ نسرین نے انکار پر اس نے مارنا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران میں غالباً اس نے بھانپ لیا تھا کہ دیہاتی نسرین کا شور سن کر کھنڈر کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ نسرین کو دو چار کاری ضربیں لگا کر کار پر بھاگ نکلی تھی۔

وحدت نے مجھ سے کہا "اب بتاؤ تمہارا کیا آئیڈیا ہے۔ میڈم شہزادو نے کدھر کا رخ کیا ہوگا۔"

"یہ سانپ اپنی بانبی کی طرف ہی جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ شہزادو ڈاکٹر ابدال جی کی طرف گئی ہوگی؟"

"ایسا ہو سکتا ہے جی۔"

وحدت نے اپنے چار ساتھیوں کو تو وہیں دیہاتی علاقے میں چھوڑا اور خود دو مزید ٹیکسی کار میں لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ جو ساتھی "دیہاتی علاقے" میں رہ گئے تھے انہیں وحدت نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ چوہدری کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شہزادو کو بھرپور طریقے سے تلاش کریں۔

ہمارا واپسی کا سفر ایک بار پھر رکاوٹوں کا شکار ہوا۔ دو سیاسی پارٹیوں میں تصادم کی وجہ سے کشیدگی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ کئی سڑکوں پر ٹائر جل رہے تھے اور اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں مشتعل سیاسی کارکنوں کی ٹولیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ راستے میں دو جلی ہوئی کاریں اور ایک موٹر سائیکل بھی نظر آئی۔ لوئر مال روڈ پر ولنہ ہوٹل کا ایک بہت

بڑا ہورڈنگ گرا ہوا تھا۔ اپنے اس "نقصان" پر مجھے افسوس ہوا مگر اس سے زیادہ افسوس اس امر پر ہوا کہ وزنی ہورڈنگ ایک چھوٹی سی پان شاپ پر گرا تھا اور شاپ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

شہر میں پھیلی ہوئی افراتفری دیکھ کر وحدت کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ معنی خیز تبصرے بھی کر رہا تھا "ساڈا قصور بھائی جی کا ہے۔ جب اسے پتا تھا کہ مخالف پارٹی کے جلوس کا روٹ بھی یہی ہے تو اس نے اپنا روٹ کیوں نہ بدلا۔"

"بھائی جی اپنا راستہ کم ہی بدلتا ہے۔" دوسرے شخص نے کہا "آپ کو یاد ہی ہوگا پچھلی مرتبہ اس نے جلسے کے معاملے میں پھڈا ڈال لیا تھا۔ جہاں رانا صاحب کا جلسہ تھا وہیں اپنا جلسہ کرنا چاہ رہا تھا۔"

"اور اس نے کر کے بھی دکھا دیا تھا۔" وحدت نے کہا "لگتا ہے کہ بھائی جی زور پکڑ رہا ہے اس کے جلسوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔"

وحدت کا ساتھی سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا "بھائی جی کی انتخابی مہم کو دو وجوہات سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ایک تو وہ جیل سے رہا ہو کر آیا ہے دوسرے لاہور میں کالج کی لڑکی والے واقعے سے اسے سپورٹ ملی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ وحدت کے ساتھی کا اشارہ کس واقعے کی طرف ہے۔ یہ وہی واقعہ تھا جس نے چند ہفتے پہلے پورے ملک میں ہلچل مچا دی تھی۔ رخشندہ کی لاش شاہدرہ کے علاقے سے ملی تھی اور اس کے قاتلوں میں وہ شاہی نامی بندہ بھی شامل تھا جو بعد ازاں میرے ہاتھوں سیدپور میں ہلاک ہوا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ آگ وحدت اور میڈم شہزادو کے ساتھیوں ہی کی لگائی ہوئی تھی۔

ہم ڈیفنس کے علاقے میں داخل ہوئے۔ وحدت نے مجھے راستے میں ہی بتا دیا تھا کہ وہ عطائی ڈاکٹر ابدال کے ٹھکانے سے واقف ہے۔ ڈیفنس میں ہم ابدال سے ملتے ہی رہتے تھے لیکن اس کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اگر میڈم شہزادو راج نگر سے فرار ہو کر ابدال جی کے پاس ہی پہنچی تھی تو پھر ہماری آمد سے آگاہ ہو کر وہ یہاں سے بھی راہ فرار اختیار کر سکتی تھی۔

ٹیکسی کار مطلوبہ کوٹھی سے کافی فاصلے پر ہی روک دی گئی۔ لمبا تڑنگا وحدت اپنے ساتھی کے ہمراہ پیدل ہی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ کوٹھی کے گیٹ پر چند افراد کھڑے تھے۔ وہ کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہاں بھی کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ہم گیٹ پر پہنچے تو اندر سے عورتوں کے بلند آواز میں بولنے کی صدا آئی۔ فارمی مرغی جیسی ایک موٹی عورت برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ لمبے تڑنگے وحدت کو یقیناً جانتی تھی۔ وہ تیزی سے وحدت کی طرف آئی۔ "کیا بات ہے باجی؟" وحدت نے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔" وہ رندھے گلے سے بولی۔

"کیا ہوا؟" وحدت نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے ایک بندہ یہاں آیا تھا۔ ابدال بھائی کا پوچھ رہا تھا۔ وہ تو شادی کی شاپنگ کے لیے دبئی گئے ہوئے ہیں۔ ساتھ آپا بھی گئی ہوئی ہیں۔ میں بھی گھر میں نہیں تھی۔ بس چار پانچ لڑکیاں ہی تھیں۔ بیٹھی ڈھولک وغیرہ بجا رہی تھیں۔ اس بندے نے پہلے تو لڑکیوں کو گالیاں نکالی ہیں پھر مارنا شروع کر دیا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی کیا حال کیا ہے اس نے بچیوں کا۔"

پھر وہ ہمیں ایک اندرونی برآمدے میں لے گئی۔ یہاں تین چار لڑکیاں جیسی رو رہی تھیں۔ ایک نیم بے ہوش صوفے پر پڑی تھی۔ دو لڑکیاں اس کے ہاتھ پاؤں کی مالش کر رہی تھیں۔ نیم بے ہوش لڑکی کافی خوب صورت تھی۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اس کا چہرہ لال نظر آ رہا تھا۔ یہ طمانچوں کی لالی تھی۔ اس کے نازک رخساروں پر انگلیوں کے نشان بڑے واضح تھے۔ ایک لڑکی کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ ایک کی آنکھ گھونسا لگنے کی وجہ سے نیلی ہو رہی تھی۔ ایک کا سر پھٹا ہوا تھا اور چوڑیاں ٹوٹنے کی وجہ سے کلائیاں بھی لہولہان ہو رہی تھیں۔ ایک طرف پھٹی ہوئی ڈھولک پڑی تھی۔ دوسری طرف موتیے کے ٹوٹے ہوئے گجرے اور ہار۔ یوں لگتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں کوئی عفریت ہنگامہ برپا کر گیا ہے۔

موٹی عورت نے ایک اسمارٹ سی لڑکی سے کہا "کومل! تم بتاؤ۔ کیا ہوا ہے؟"

کومل نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "اس نے دروازے پر بیل دی۔ میں نے پوچھا کون ہے۔ وہ بولا کہ ابدال جی سے ملنا ہے۔ ان سے کہیں شہزادو آیا ہے۔" میں نے جواب میں کہا کہ انکل تو گھر پر نہیں ہیں۔ وہ پوچھنے لگا کہ کہاں گئے ہیں۔ میں نے کہا وہ لاہور سے باہر ہیں۔ ابھی پتا نہیں کب آئیں گے۔ وہ ایک دم مجھے دھکیل کر اندر آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ بھی تپا ہوا تھا۔ ایک دم

مجھے لگا کہ وہ عورت ہے لیکن اس کی آواز چال ڈھال سب کچھ مردوں جیسا تھا۔ شاید اس کے چہرے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ مردوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ میں نے اسے روکنا چاہا' لیکن وہ خود ہی کمرے میں گھس گیا اور رابعہ ال جی۔ ابدال جی کی آوازیں دینے لگا۔ اتنے میں دوسری لڑکیاں بھی ڈھولک چھوڑ کر وہاں آ گئیں۔ میں نے ایک بار پھر اسے بتایا کہ انکل یہاں نہیں ہیں' اگر اسے کوئی کام ہے تو وہ بتائے۔ وہ تڑخ کر بولا' کہاں گیا ہے وہ؟ میں نے عمیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' یہ ان کی بیٹی ہیں۔ چند دن بعد ان کی شادی ہے۔ وہ خریداری کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ایک دم وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے۔۔۔" ایک دم لڑکی کی آواز بیٹھ گئی اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

کومل کی بات مکمل کرنے کے لیے دوسری لڑکی بولی "مجھے تو وہ کوئی پاگل لگتا تھا۔ ایک دم اس نے بے چاری عمیرہ کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور چیخنے لگا "کیوں بھیجا ہے اسے دبئی۔ بڑا شوق ہے تجھے دلہن بننے کا۔ بڑی آگ لگی ہوئی ہے تجھے۔ پتا نہیں کیا کیا بکواس کر رہا تھا کمینہ۔"

پھر اس نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اتاری اور عمیرہ کو بے دریغ مارنے لگا۔ ہم اسے بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو اس نے ہم پر بھی حملہ کر دیا۔ مینا کی آنکھ پر اس کا مکا لگا اور وہ گر پڑی۔ اس کے پاس پستول بھی تھا' پستول کا دستہ مار کر اس نے فرح کا سر پھاڑ دیا۔ اتفاق سے چوکیدار بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ پستول نے ہم سب کو ڈرا دیا تھا۔ اس خبیث کے اندر جیسے کوئی جن گھسا ہوا تھا۔ اتنے زور سے بیلٹ گھما رہا تھا کہ اللہ توبہ۔"

لڑکیوں کے چہروں پر ابھی تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پولیس کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ وحدت نے جلدی جلدی فربہ اندام عورت سے کچھ سوال جواب کیے اور پھر ہم لوگ وہاں سے نکل آئے۔

شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہم یہاں پر بھی تھوڑا سا لیٹ ہو گئے تھے۔ اگر آدھ پون گھنٹا پہلے پہنچ جاتے تو میڈم شہزادو سے ہماری ملاقات ہو سکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اندرونی اضطراب نے اسے باؤلا کر رکھا ہے۔ اس نے جس بے دردی سے چوہدری کی بہن نسرین کو مارا تھا اسی بے دردی سے یہاں بھی مار پیٹ کی تھی۔ اس نے کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے تھے۔ شادی کی ڈھولک پھاڑ دی تھی اور ہر وہ شے برہم برہم کر دی تھی جس کا تعلق عروسی تقریب سے تھا۔ اس کی یہ برہمی اس کی ان نفسیاتی الجھنوں کی چغلی کھاتی تھی جن کا تعلق مرد و زن کے تعلق سے تھا۔ میں نے میڈم کے گھر میں درجنوں پالتو جانور دیکھے تھے لیکن اس نے ہر نر اور مادہ کو علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ شاید آج یہاں بھی اس نے ایک جوڑے کو ملاپ سے پہلے ہی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی شادی کے گیت سنتی ہوئی معصوم صورت لڑکی کو اس بے دردی سے مارا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اس کی ٹھوڑی اور ماتھے پر بیلٹ کا بکل لگا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔

پولیس کی آمد سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے نکل جانا تھا ورنہ شاید وحدت موقعے پر موجود لوگوں سے مزید سوال جواب بھی کرتا۔ ہم وحدت کی رہائش گاہ ریواز گارڈن کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاہم وحدت نے اپنے دو کارندے وہیں ڈیفنس میں چھوڑ دیے تھے۔ ان کی ذمے داری تھی کہ وہ قرب و جوار میں شہزادو اور اس کی دیہاتی گاڑی کا سراغ لگائیں۔

راستے میں وحدت نے اپنا ہانڈی جیسا سر افسوس میں ہلاتے ہوئے کہا "جہاں داد! تم نے اطلاع تو بڑی اہم دی تھی لیکن ذرا لیٹ دی۔"

میں نے کہا "جناب! شاید آج کا دن ہی ہمارے لیے خراب تھا۔ اگر ہم راوی کے پل پر ٹریفک میں نہ پھنستے تو یقیناً شہزادو کو راج نگر چھوڑنے سے پہلے ہی پکڑ لیتے۔"

"ہاں یہ بات بھی ہے۔" وحدت نے تسلیم کیا۔

ہم ریواز گارڈن کی وسیع کوٹھی میں پہنچے تو وحدت کی وہ جیپ پورچ میں کھڑی تھی جسے ہم راوی پل کی پھنسی ہوئی ٹریفک میں چھوڑ آئے تھے۔ یقیناً یہ جیپ وحدت کا ڈرائیور واپس لے کر آیا تھا۔ جونہی وحدت گھر میں داخل ہوا ایک ملازم نے آ کر کہا "جناب! آپ کے لیے دو بار باس کا فون آ چکا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پندرہ بیس منٹ تک پھر کال کریں گے۔"

باس کا ذکر سن کر وحدت کے چہرے پر زرد رنگ سا بکھر گیا۔ وہ اپنے کارندے سے تفصیل پوچھنے لگا کہ پہلا فون کب آیا تھا' دوسرا کب آیا تھا' باس نے کیا کہا تھا وغیرہ وغیرہ۔

وحدت کے انداز سے ظاہر تھا کہ باس کا فون سننا اس کے لیے اور اس کے دیگر ساتھیوں کے لیے بے حد ٹینشن کا باعث ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا "میں اندر جا رہا ہوں جب تک میں واپس نہ آؤں مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

پھر وہ باس کا فون اٹینڈ کرنے کے لیے کسی اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ اس سے پہلے میں نے میڈم شہزادو کی

دبنگ اور مردمار عورت کو بھی باس کے ذکر پر لرزہ براندام دیکھا تھا۔ اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد میڈم پرسکون رہی تھی' ڈیوی کو قتل کرنے کے بعد یوں خوف زدہ ہو گئی تھی جیسے اس نے ملک الموت کو دیکھ لیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیوی کے قتل کے بعد اسے باس کے عتاب کا ڈر تھا۔

وحدت علی باس کا فون اٹینڈ کرنے کے بعد واپس آیا تو اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی منی بوندیں تھیں۔ رومال سے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے اس نے اپنے قریبی ساتھی ملک رفیق سے کہا "اروش کو بلا لو۔ اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

ملک رفیق نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑی دھیمی آواز میں وحدت سے باتیں کرنے لگا۔ اروش کا نام وحدت نے بڑے سنسنی خیز انداز میں لیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اروش کون تھا اور اسے کیوں بلایا جا رہا تھا۔ وحدت اور ملک رفیق کے درمیان دھیمے لہجے میں جو باتیں ہو رہی تھیں ان میں ایک دو بار مجھے "بھائی جی" کا لفظ سنائی دیا۔ غالباً یہ لوگ بھائی جی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے اور اب جلد از جلد یہ قصہ ختم کرنا چاہتے تھے۔ شاید اگر ڈیوی شیخوپورہ روڈ والے واقعے میں قتل نہ ہوتا تو اب تک وہ بھائی جی کا کچھ نہ کچھ کر چکا ہوتا لیکن وہ اپنے تمام پرجوش ارادوں سمیت میڈم شہزادو کی گولی سے ٹھنڈا ہو گیا تھا اور یوں بھائی جی والا معاملہ بھی کچھ دنوں کے لیے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے خیالات سے چونکنا پڑا۔ مجھے نادر جگی کی جیپ کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ یہ قدرے پرانی جیپ تھی اور روجھان پور میں اس کے ٹائر اکثر کیچڑ میں لتھڑے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم اس وقت یہ قدرے صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ جیپ میں نادر جگی کے علاوہ اس کا کارندہ اشرف چیتا بھی تھا۔ نادر جگی حسب معمول تہبند اور کرتے میں تھا۔ اس نے سر پر عورتوں کے انداز میں چادر لے رکھی تھی۔ اس کی گھنی مونچھوں کے اوپر اس کی ناک پھیلی ہوئی اور بہت غصیلی نظر آتی تھی۔

وہ جیپ سے اترتے ہی میری طرف بڑھا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر اس نے شاباشی کے انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا اور بولا "بہت اچھے جہاں داد۔ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔ میڈم کے بارے میں وحدت صاحب کو اطلاع دے کر تم نے ہم سب کی ایک بڑی مشکل دور کر دی ہے۔ وحدت صاحب تم سے بہت خوش ہیں۔"

میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "نادر صاحب! میں تو آپ کے حکم پر میڈم کے پاس گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہاں میرے ساتھ یہ سلوک ہو گا۔ یہ دیکھیں جناب۔۔۔ اور یہ بھی دیکھیں۔" میں نے پہلے اپنی پنڈلی پر سے اور پھر کندھے پر سے قمیص ہٹائی۔ دونوں جگہ سانپ کے کاٹنے کے نشانات موجود تھے۔

نادر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "مجھے سب پتا چل گیا ہے جہاں داد۔ ہم میں سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ میڈم ایسا کام کرے گی۔ میں تمہارے لیے بہت پریشان رہا ہوں۔ سمجھو کہ جو تکلیف تمہیں ہوئی ہے وہ مجھے بھی ہوئی ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں نادر جگی کو ایک موٹی گالی دی۔ اس بدبخت نے مجھے ایک جان لیوا تجربے کے لیے میڈم کے سامنے تقریباً بیچ ڈالا تھا۔ اب وہ چہرے پر ہمدردی سجا کر مجھے تسلی تشفی دے رہا تھا۔ شاید مجھے ایک بار پھر قربانی کا بکرا بنانے کا کوئی آئیڈیا اس کے ذہن میں تھا۔ اسی دوران میں وحدت علی بھی وہاں آ گیا۔ نادر جگی نے جھک کر اس سے معانقہ کیا اور مودب انداز میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ اشرف چیتا بھی مجھے گرم جوشی سے ملا۔

چیتے کو میں نے کافی دنوں بعد دیکھا تھا' جب ہمیں باکی پنڈ سے پولیس نے گرفتار کیا تھا تو اشرف چیتا' بھولا اور ٹیڈی وغیرہ بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔ قتل کا کیس تھا اور امید نہیں تھی کہ ان لوگوں کی جان اتنی جلدی چھوٹ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ چیتے کو سامنے دیکھ کر میں قدرے حیران ہوا "بڑی خوشی ہوئی چیتا صاحب کہ آپ باہر آ گئے۔ بھولے اور ٹیڈی وغیرہ کا کیا بنا ہے۔"

"وہ لوگ ابھی اندر ہی ہیں۔ میری ضمانت بھی بڑی مشکل سے ہوئی ہے۔ بس خوشی کی بات یہ ہے کہ ہو گئی ہے۔"

چیتے کے ساتھ باتوں کے دوران میں پتا چلا کہ وہ مستقل طور پر یہاں وحدت صاحب کے پاس آیا ہے۔ وحدت صاحب کو ایک بندے کی ضرورت تھی اور انہوں نے کئی دنوں سے نادر جگی کو اس بارے میں کہہ رکھا تھا۔ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا "چیتا بھائی! یہ تو بڑا اچھا ہوا ہے۔ میں یہاں اکیلا بڑا اداس ہو رہا تھا۔"

اشرف چیتا بولا "میرا خیال ہے کہ نادر صاحب اور وحدت علی صاحب ہم سب کی اداسی ختم کرنے کا زبردست انتظام کر رہے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وحدت علی صاحب ایک دو دن میں کوئی بڑی کارروائی

ڈالنے والے ہیں۔"

"کہیں یہ بھائی جی کا چکر ہی تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہو بھی سکتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ بھائی جی کا دانہ پانی اب کم رہ گیا ہے۔ باقی ہم تو بھائی چھوٹے درجے کے کارندے ہیں۔ اصل گل بات کا پتا تو بڑوں کو ہوگا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "چیتا بھائی' یہ اروش صاحب کون ہیں؟"

"کیا یہ کسی کا نام ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اشرف چیتا بولا "میں یہ نام تم سے پہلی بار سن رہا ہوں۔"

میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "ابھی کچھ دیر پہلے وحدت علی صاحب اپنے ایک ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ اروش کو بلا لو۔ کام بہت لیٹ ہوتا جا رہا ہے۔"

"چلو جو بھی ہے سامنے آجائے گا۔" اشرف چیتا نے کاہلی سے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ کہنے کو تو وہ چیتا تھا لیکن بہت سست اور کاہل چیتا تھا۔ اس کا جسم بھی ذرا چربیلا ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے روجھا پور کے حالات پوچھے۔ اس سے پتا چلا کہ رانو آج کل اسپتال میں ہے۔ اسے کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ وہ حسبِ معمول کسی پنجابی فلم کی ہیروئن بنی ملتی لہراتی کھیتوں میں سے گزر رہی تھی کہ ایک کتے نے دلہن کا روپ دھار کر اس کی پنڈلی چبالی۔ اب اس کے پیٹ میں ٹیکے لگ رہے تھے۔ اشرف چیتا کی زبانی حوالدار فیض' اس کے بیمار دوست کرم دین اور کرم دین کی بیوی شاہدہ کے حالات بھی معلوم ہوئے۔ پتا چلا کہ کرم دین بہت بیمار ہے اور حوالدار فیض اس کی جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ فیض نے کرم دین کے علاج پر روپیہ لگانے کے لیے کہیں اپنی زمین بھی بیچی ہے۔

کرم دین اس کی بیوی اور فیض کا رشتہ عجیب تھا۔ یہ ایک انوکھی تکون تھی۔ میں جانتا تھا کہ فیض اپنے بیمار دوست کرم دین سے پوری طرح مخلص ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بیوی سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ کرم دین بھی اس تعلق کے بارے میں جانتا تھا کہ اس کے باوجود وہ فیض کو اپنا ہمدرد دوست سمجھتا تھا۔ اب چیتا کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ فیض اپنے بیمار دوست کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کر رہا ہوگا۔ حوالدار فیض نے مجھے شیخ عاصم اور اشفاق ٹنڈل کے چنگل سے نکالنے کے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ میں اس کی قربانی بھولا نہیں تھا اور نہ بھول سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد نادر جگی' وحدت علی سے مل کر باہر آگیا۔ وہ کافی دیر مجھ سے میرے اور میڈم کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ نادر جگی نے مجھے سمجھایا کہ میڈم کی حیثیت اب ایک مفرور باغی کی ہے۔ اگر میں میڈم کو پکڑوانے میں کوئی کردار ادا کر سکا تو وحدت علی صاحب کی نظر میں میرا مقام اونچا ہو جائے گا اور اگر ان کی نظر میں مقام اونچا ہوگا تو سمجھو کہ باس کی نگاہ میں بھی اونچا ہو گیا۔ نادر جگی نے میرے لیے نادر شاہی انداز میں ہدایت جاری کی کہ میں اب وحدت صاحب کے پاس ہی رہوں گا۔ اشرف چیتا کے بارے میں بھی اس نے یہی بات کہی۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے امید کی کرن دکھائی اور امید کی کرن یہ تھی کہ اگر میں اسی طرح لگن اور ایمان داری سے کام کرتا رہا تو انشاء اللہ بہت جلد چھوٹے بدمعاشوں کی صف سے بڑے بدمعاشوں کی صف میں آجاؤں گا۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ ایک روز میرا شمار بدمعاش بھی بن جاؤں۔

میں نے بتیسی نکال کر نادر جگی کے احسانات اور اس کی محبتوں کا اعتراف کیا۔ میں نے کہا "آپ نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے میں کبھی اسے بھلا نہیں سکتا۔ اگر آپ میری انگلی نہ پکڑتے نادر صاحب! تو میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔"

اشرف چیتا نے دانت نکالتے ہوئے لقمہ دیا "اس حرامی فیض نے تم سے دوائیاں اور کشتے رگڑوا رگڑوا کر تمہیں نیم حکیم یا پنساری بنا چھوڑنا تھا۔"

میں نے سر ہلا کر اشرف چیتا کے خیال کی تائید کی۔

اگلے تین چار روز میں نے ریواز گارڈن کی اسی شان دار کوٹھی میں گزارے۔ مجھے معلوم ہوا کہ باس جسے بارون پاشا کے نام سے جانا جاتا تھا خود اس کوٹھی میں کبھی بھی نہیں آیا' بلکہ اطلاعات کے مطابق وہ پاکستان میں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ امریکا میں تھا۔ امریکا سے بس اس کی فون کال آتی تھی۔ اپنی تنظیم کے کارندوں اور سرکردہ افراد سے باس کا رابطہ بس فون ہی کے ذریعے تھا۔ یہ فون اکثر وحدت علی کے پاس ہی آتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی آنجہانی ڈیوی بھی باس کا فون ریسیو کرتا تھا۔ باس کبھی کبھی اپنی تنظیم کے ارکان سے ٹیلی فونک کانفرنس بھی کرتا تھا۔ ایسی کانفرنسوں میں اہم نوعیت کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ اس تنظیم کی زیادہ تر کارروائیاں قانون شکنی کی تھیں۔ اس تنظیم کو ڈیشا گینگ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ جہاں تک وحدت علی کا تعلق تھا وہ بظاہر فلم انڈسٹری سے تھا۔ اس نے چند فلمیں پروڈیوس کی تھیں۔

آج کل بھی اس کی ایک فلم زیرِ تکمیل تھی۔ اس فلم کے خوب صورت پوسٹرز میں۔ نے کوٹھی کے اندر بھی آویزاں دیکھے تھے۔ ملک رفیق' وحدت علی کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ اسے بھی فلم لائن سے دلچسپی تھی۔ ویسے یہ شخص محکمہ جیل خانہ جات میں تھا اور حال ہی میں جیلر پروموٹ ہوا تھا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا ملک رفیق اور وحدت علی کی دوستی بس فلم سازی کی حد تک تھی۔ تنظیم کی مجرمانہ سرگرمیوں سے شاید ملک رفیق کا تعلق نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو بہت کم تھا۔

باس کی شخصیت اس چار دیواری میں ایک آسیب کی طرح موجود تھی۔ وہ یہاں موجود نہیں تھا لیکن پھر بھی جیسے اپنی غیر مرئی نگاہوں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک بار باس کا فون ضرور آتا ہے۔ جب وحدت علی فون سن کر باہر نکلتا تھا تو اکثر وہ عرق آلود ہوتا تھا۔ جب اسے فون کا انتظار ہوتا تھا تو اس وقت بھی اس کی نبض تھمی ہوئی ہوتی تھی۔ اس باس نے بھی "کاروباری سیاست" کرنے والے سیاست دانوں کا سا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ ملک سے باہر بیٹھ کر اپنے لوگوں کو کنٹرول کر رہا تھا۔

میں نے اس اروش نامی شخص کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جسے وحدت علی نے کوئی خاص مشن سونپنے کے لیے کوٹھی پر بلایا تھا۔ بہرحال اس سلسلے میں مجھے کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں۔ ابھی تک اس اروش نامی بندے کی صورت بھی میں نہیں دیکھ پایا تھا۔ ہاں میری چھٹی حس یہ ضرور بتا رہی تھی کہ بھائی جی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے ایک بار پھر کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔

ایک روز میں نے موقع تاک کر بازار سے ساہی صاحب کے خاص نمبر پر فون کیا۔ ساہی صاحب سے بات ہو گئی۔ وہ چھوٹتے ہی بولے "شاہ جہاں! یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم۔ پہلے ہی تمہارے لیے مصیبتیں کچھ کم نہیں ہیں۔"

"میں نے کیا کیا ہے جی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"ٹھیک ہے' ابھی تم نے کیا ہی کچھ نہیں۔ اشفاق ٹنڈل کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ دو سب انسپکٹر سخت گھائل ہیں۔ شکر کرو کہ کسی کی جان نہیں گئی۔"

میں نے کہا "یہ لوگ جعلی پولیس مقابلوں کے تمغے سینے پر سجاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان لوگوں کو تھوڑا سا ٹف ٹائم بھی ملنا چاہیے۔"

"تم اسے تھوڑا سا ٹف ٹائم کہہ رہے ہو۔ تمہاری گاڑی نے پورے شہر میں کھلبلی مچا رکھی ہے۔ کم از کم چھ پولیس والے زخمی ہوئے ہیں۔ دو گاڑیوں کا ستیاناس ہوا ہے۔ عام لوگوں کا مالی نقصان اس کے علاوہ ہے اور پھر ایک سنگین بات یہ ہے کہ میانی صاحب قبرستان میں جو ڈاٹسن گاڑی تم نے چھوڑی ہے اس کی ڈگی میں سے گاڑی کا بے ہوش ڈرائیور ملا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم نے شیخوپورہ سے یہ ٹیکسی اسلحے کے زور پر چھینی ہے۔"

"ہاں جناب! چھینی تو ایسے ہی تھی' لیکن اب میں نے کسی اور مقصد سے فون کیا ہے۔" ساہی صاحب نے میرے آخری الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! تم اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھاتے چلے جا رہے ہو' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جناب! کچھ دشمن گھٹ بھی تو رہے ہیں۔ شیخ عاصم کا کیا حال ہے۔"

"وہ تو ابھی تک واپس پاکستان نہیں آیا۔ دو روز پہلے اس کا منیجر بھی امارات واپس چلا گیا ہے۔"

میں نے کہا "عاصم جیسے ایک دشمن کی جگہ اشفاق ٹنڈل جیسے ڈیڑھ دو درجن دشمن بھی بن جائیں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

ساہی صاحب کے پاس کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں لیکن میرے پاس ٹائم کم تھا۔ میں نے مختصر لفظوں میں ساہی صاحب کو انفارم کیا کہ بھائی جی کو جانی نقصان پہنچانے کے لیے تازہ کوشش شروع ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے کسی اروش نامی بندے کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔

ساہی صاحب نے کہا "یہ نام میں پہلی بار سن رہا ہوں' کوئی حلیہ وغیرہ ہے اس شخص کا؟"

"ابھی تک تو نہیں ہے لیکن جیسے ہی مجھے معلوم ہوا میں آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں بھائی جی کی سیکیورٹی مزید سخت کروا دیتا ہوں۔ انہوں نے اپنی طرف سے ایک پرائیویٹ ایجنسی کی خدمات بھی حاصل کر رکھی ہیں۔ اگر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس وقت بھائی جی ملک کے ان چند افراد میں سے ہیں جن کے گرد بہترین حفاظتی انتظامات موجود ہیں۔"

ساہی صاحب کو دوبارہ فون کرنے کا وعدہ کرکے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں واپس آیا تو وحدت علی اپنے دوست جیلر ملک رفیق کے ساتھ ٹیرس میں بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے قریب بلایا اور پوچھا کہ میں کہاں گیا تھا۔

میں نے کہا "بازار تک گیا تھا جی۔ سگریٹ لینے تھے اور لائٹر بھی۔"

"سگریٹ اور لائٹر لینے میں ایک گھنٹا لگ جاتا ہے؟"

"تا کنٹرول نہیں رہا تھا۔"

"وہاں جنرل اسٹور پر کھڑے فون کس کو کر رہے تھے؟"

میں نے بمشکل اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے کہا "شیخوپورہ میں ایک دکان دار دوست بن گیا تھا' اس سے بات کر رہا تھا۔"

"ادھر بیٹھ جاؤ۔" وحدت علی نے کچھ دور رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ نصیحت کرنے والے انداز میں بولا "آئندہ تم اس طرح بتائے بغیر گئے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"میں معافی چاہتا ہوں جناب!"

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "دیکھو جہاں داد! تم میں آگے بڑھنے والی بات ہے۔ تمہارا دماغ بھی ٹھیک کام کرتا ہے' لیکن مجھے تم میں بے پروائی نظر آ رہی ہے۔ آگے بڑھنا چاہتے ہو تو اپنی بے پروائی دور کرو۔ اس کے علاوہ اپنے کان اور اپنی آنکھیں ہر وقت کھلی رکھو۔"

"میں اپنی خامیاں دور کرلوں گا جناب۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"ٹھیک ہے اپنے کوارٹر میں جاؤ۔" وحدت علی نے کہا۔

میرا کوارٹر کوٹھی کے اندر نہیں بلکہ پچھواڑے میں تھا۔ یہ تین چار بوسیدہ سے کوارٹر تھے۔ یہ کوارٹر کوٹھی کے اندر موجود سرونٹ کوارٹروں سے کچھ بڑے تو تھے لیکن زیادہ صاف ستھرے نہیں تھے۔ کوٹھی میں وحدت کے علاوہ اس کی فربہ اندام بیوی اور دو خوب رو بیٹیاں بھی رہائش پذیر تھیں۔ ان رہائشی حصے اور کوارٹرز کے درمیان دیوار تھی۔

میں اور اشرف جیتا ایک ہی کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ میں کوارٹر میں پہنچا تو اشرف سگریٹ کے لمبے کش لگا رہا تھا۔ ہندوستانی شراب کی بوتل بھی اس نے چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ کہنے لگا "جہاں داد! تجھ کو شوٹنگ دیکھنے کا شوق ہے؟"

"کیسی شوٹنگ؟"

"اوئے کھوتے! فلم کی شوٹنگ اور کس کی؟"

"کہاں ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہو نہیں رہی۔ دو تین دن میں ہوگی بلکہ شاید پرسوں ہی ہو جائے۔ وحدت صاحب کی نئی فلم ہے۔ وہ کچھ سین اپنے گھر میں ہی لے رہے ہیں۔"

"مجھے تو اتنا شوق نہیں جیتا بھائی' لیکن اگر رانو ہوتی تو وہ ضرور پاگل ہو جاتی۔ آپ کو تو پتا ہے وہ ہر وقت ہیروئن بنی پھرتی ہے۔"

"اسی لیے چیر پھاڑ کرنے والے کتے اس کے پیچھے لگتے ہیں۔"

اشرف جیتا کی اطلاع درست تھی۔ واقعی دو روز بعد کوٹھی میں گہما گہمی کے آثار نظر آئے۔ شوٹنگ کا سامان پہنچ گیا۔ دو چار فلمی قسم کے لوگ بھی کوٹھی کے لان اور برآمدے میں گھومتے پھرتے نظر آئے۔ وہ غالباً شوٹنگ کے زاویے وغیرہ دیکھ رہے تھے۔ وحدت علی بڑی سنجیدگی سے شوٹنگ کے متعلق یونٹ کے ہنرمندوں سے بات چیت کر رہا تھا۔ شوٹنگ کے پیش نظر وحدت علی نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو دو تین دن کے لیے کہیں اور شفٹ کر دیا تھا۔

کوٹھی کے اندر ہمارا جانا بہت کم ہوتا تھا لیکن جس دن شوٹنگ شروع ہوئی وحدت علی کا ایک کارندہ ہم دونوں کو بلا کر اندر لے گیا۔ کوٹھی کے اندر صرف وہی لوگ موجود تھے جن کا شوٹنگ کے لیے موجود رہنا ضروری تھا' یا پھر وحدت علی کے ملازم تھے۔ کوئی فالتو آدمی اندر نہیں آنے دیا گیا تھا۔ کوٹھی کے وسیع ڈرائنگ روم میں شاٹ لیا جا رہا تھا۔ لائٹس' کیمرے' ساؤنڈ سسٹم' ریفلیکٹرز' سب کچھ یہاں موجود تھا مگر ان چیزوں کو اس طرح PLACE کیا گیا تھا کہ شوٹنگ کا ماحول نظر نہیں آتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کسی نامور فلمی ہیروئن یا ہیرو سے ملاقات ہوگی لیکن جو چہرہ کیمرے کے سامنے آیا اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کلثوم کی بہن ناشا کو دیکھا۔ وہ اپنے اسی جنگلی لباس میں تھی جس میں گلگت سے لاہور پہنچی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور خوب صورت آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ وہ ایک عورت کے ساتھ سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑی تھی۔ اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی میں جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہوگیا۔ میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ناشا تو ایک امیرزادے کو قتل کرنے کے کیس میں جیل کے اندر تھی۔ وہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ نہ صرف پہنچ گئی بلکہ شوٹنگ میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ ناشا کے ساتھ کھڑی عورت نے سیڑھیوں کے اوپر سے ہی ناشا کو نیچے ڈرائنگ روم میں پڑی تپائی دکھائی۔ اس تپائی پر گرما گرم کھانا چنا ہوا تھا۔ بھنی ہوئی مرغی اور گندم کی روٹی کی خوشبو ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔ ساتھ میں موسمی پھل مالٹا امرود اور کیلے وغیرہ بھی رکھے تھے۔

جونہی ناشا کی نظر تپائی پر پڑی اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے دیر تک بھوکا رکھا گیا ہے۔ اپنی ساتھی عورت کا اشارہ پا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ کیمرہ اسٹارٹ ہو چکا تھا اور ناشا کی ہر جنبش کو فلم بند کر رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھنے سے پہلے ذرا جھجکی۔ وحدت علی نے اشارے سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گئی اور بے تابی سے کھانے لگی۔

اس شاٹ کے پندرہ بیس منٹ بعد ناشا کا ایک اور شاٹ لیا گیا۔ وہ واش بیسن کا نلکا کھول کر منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ یہ شاٹ بھی ناشا کی بے خبری میں لیا گیا۔ موقعے پر موجود افراد بڑی حیرت اور دلچسپی سے اس لمبی تڑنگی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سرتاپا جنگلی تھی اس کے باوجود خوب صورت بھی تھی۔ وہ بار بار پریشان ہو جاتی تھی جو عورت اس کے ساتھ یہاں آئی تھی وہ پشتو وغیرہ جانتی تھی۔ وہ مسلسل ناشا سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک دو بار وحدت کا دوست ملک رفیق بھی ناشا کے پاس گیا اور اشاروں کنایوں سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن میں آیا کہ ملک رفیق جیلر ہے۔ وہ لاہور ہی میں تعینات تھا۔ ناشا بھی لاہور کی جیل میں تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ناشا کو جیل سے نکال کر یہاں لانے والا ملک رفیق ہی ہو۔ جیلوں میں اس قسم کی بے قاعدگیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اعلیٰ عہدے داروں کی ملی بھگت سے قیدی کبھی کبھی جیل سے باہر بھی آ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر قید بھگتنے والا شخص سارا دن لاہور میں سیر کرنے کے بعد اور رات اپنے گاؤں میں گزارنے کے بعد اگلے روز پھر جیل میں پہنچ جاتا ہے۔ روپیہ خرچ کرنے والے کے لیے پاکستان میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میرے خیالات کی تصدیق سہ پہر کے بعد ہوگئی۔ اشرف جیتا نے مجھے رازداری سے بتاتے ہوئے کہا "یہ جو جنگلی لڑکی تم دیکھ رہے ہو نا اس کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے اخباروں میں لمبی لمبی خبریں چھپی تھیں۔ اس نے لاہور میں ایک کارخانے دار کے اوباش بیٹے کو قتل کر ڈالا تھا۔"

"ہاں ہاں میں نے بھی پڑھا تھا۔ کافی چرچا ہوا تھا اس کا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس لڑکی کے اوپر کوئی سایہ وغیرہ ہے ورنہ ایک لڑکی چاہے وہ جنگلی ہی کیوں نہ ہو اتنی زور آور اور سخت جان نہیں ہو سکتی۔ لیکن جیتا بھائی! یہ لڑکی یہاں کیسے پہنچی۔ اسے تو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔"

"جو لوگ جیل کا کاروبار چلاتے ہوں ان کے لیے جیل توڑنا مشکل نہیں ہوتا۔ اسے وحدت علی صاحب کا دوست ملک رفیق صاحب لے کر آیا ہے اور تمہیں پتا ہی ہوگا کہ ملک رفیق جیلر ہے۔ دراصل اس لڑکی کی تصویر وحدت علی صاحب نے اخبار میں دیکھی تھی پھر اس کے بارے میں پڑھا بھی۔ وحدت صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی فلموں میں نئی نئی چیزیں نئے نئے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ بس ان کے دماغ میں یہ بات گھس گئی کہ اس لڑکی کو اپنی کسی نہ کسی فلم میں ضرور دکھانا ہے پھر انہوں نے اپنی آنے والی فلم میں ہی لڑکی کو دکھانے کا پروگرام بنالیا۔"

"بڑی بات ہے جی۔ بڑے لوگوں کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہوتا لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی جب یہ فلم لوگ دیکھیں گے تو کسی ایک کو پتا چل جائے گا کہ یہ لڑکی تو جیل میں تھی فلم میں کیسے نظر آگئی۔"

"جو لوگ اسے جیل سے نکال سکتے ہیں' وہ اس مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔" اشرف جیتا نے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ فلم کے یہ سین لڑکی کی گرفتاری سے پہلے لیے گئے تھے یا پھر کوئی اور بہانہ تراشا۔"

میں شکر کر رہا تھا کہ ناشا نے مجھے دیکھا نہیں تھا ورنہ وہ ضرور لپک کر میری طرف آتی اور مجھے مصیبت میں ڈال دیتی۔ اب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک شوٹنگ جاری رہتی ہے میں کوٹھی میں نہیں جاؤں گا۔ موجودہ بہروپ کے ساتھ میرا ناشا سے ملنا کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔

میں رات کو دیر تک سوچتا رہا۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ وحدت علی کی کوٹھی میں اس طرح ناشا سے میری ملاقات ہو جائے گی۔ پہلے دن کی شوٹنگ ختم ہوگئی تھی اور ناشا ابھی تک کوٹھی میں ہی تھی۔ اسے رات بھی یقیناً کوٹھی میں ہی رہنا تھا۔ ناشا کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اس کا تعلق وادی موت سے تھا اور وہ خود بھی موقع پڑنے پر سراپا موت بن سکتی تھی۔ جیلر ملک رفیق نے اسے جیل سے نکال کر یقیناً ایک بڑا رسک لیا تھا۔ بہرحال ایک بات تھی۔ مجھے ناشا کی سلامتی کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وحدت یا اس کے دوسرے فلمی دوست ناشا کی عزت کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔ یقیناً انہیں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لڑکی جیل کیوں گئی تھی۔ اس نے اپنی عزت کی طرف ہاتھ بڑھانے والے کو زندگی سے موت کی طرف بھیج دیا تھا۔

اگلے روز دوبارہ شوٹنگ ہوتی رہی۔ اس رہائشی علاقے میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وحدت علی کی کوٹھی کے اندر

ایک ایسی جنگلی لڑکی موجود ہے جو ایک پراسرار وادی سے یہاں پہنچی ہے۔ وہ غیر معمولی قوتوں کی مالک لڑکی وحدت علی کی کوٹھی میں روپوش ہو رہی ہے۔ میں اس روز کوٹھی کے اندر نہیں گیا۔ رات کو میں اپنے کوارٹر میں اکیلا تھا۔ اشرف چیتا کسی کام سے دو دن کے لیے روجھان پور گیا تھا۔ میں اکیلا لیٹا اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میڈم کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟ مجھے یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگی جنونی کیفیت میں ہوگی۔ اس کا معالج اس کو ادھورے علاج کے عذاب میں مبتلا کرکے چلا گیا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم کو جتنی ضرورت اپنے معالج 'بداللہ جی' کی ہے' اتنی ہی ضرورت میری بھی ہے۔ میں اس کے لیے بے حد اہم ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے کہیں بھیجنے سے کتراتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ناخوشگوار اتفاق ہو جائے اور میں اس سے دور چلا جاؤں۔ میں اس کی ضرورت تھا۔ اس کی تندرستی اور صحت کا ضامن تھا۔ وہ ایک بار پھر مجھے موت سے ہم کلام کرنا چاہتی تھی۔ میرے جسم میں زہریلے سانپوں کا زہر داخل کرا کے میرا خون پینا چاہتی تھی۔ یہ خون پینا ہی تو تھا۔ اس نے اتنی بے دردی سے میرے جسم سے خون نکلوایا تھا کہ میری دھڑکنیں رکتے رکتے بچی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا' سوچتے سوچتے ایک دم میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے آکر بری طرح جھنجوڑ دیا ہو۔ مجھے دراصل ایک خیال نے جھنجوڑا تھا۔ جس کوارٹر میں وحدت علی نے میری رہائش کا انتظام کیا تھا یہ نہ صرف کوٹھی کی حدود سے باہر تھا بلکہ دوسرے کوارٹروں سے بھی بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس کی بیرونی دیوار پانچ فٹ سے بلند نہیں تھی۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں کئی بار سوچا تھا کہ وحدت علی نے مجھے دیگر ملازموں کی طرح کوٹھی کے اندر جگہ دینے کی بجائے باہر کیوں رکھا ہوا ہے۔ اندر دو تین سرونٹ کوارٹر خالی پڑے تھے اور تو اور اشرف چیتا کو بھی کوٹھی کے اندر کوارٹر میں ہی جگہ ملی تھی۔ وہ تو میں نے اصرار کرکے اسے اپنے کوارٹر میں رکھا تھا۔ اب یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا تھا۔ وحدت علی نے شاید میڈم کو پکڑنے کے لیے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

وحدت علی بھی جانتا تھا کہ میڈم جہاں بھی ہوگی ہر صورت مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے مجھے کوٹھی سے باہر جگہ دی تھی تاکہ اگر میڈم میرا سراغ لگائے تو میں اسے ایک آسان ٹارگٹ نظر آؤں۔ عین ممکن تھا کہ وحدت علی نے اس کوارٹر کے ارد گرد اپنے کارندے مقرر کر رکھے ہوں اور وہ خفیہ طور پر کوارٹر کی نگرانی کر رہے ہوں۔

میں نے مزید سوچا تو کئی کڑیاں آپس میں مل گئیں۔ دو دن پہلے اشرف چیتا مجھے ایک پک اپ میں لے کر یونہی شہر میں سارا دن ادھر ادھر پھرتا رہا تھا۔ اس وقت مجھے شبہ ہوا تھا کہ ایک کار ہمارا تعاقب بھی کر رہی ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ بھی میڈم کے لیے بچھایا گیا کوئی جال ہو۔ اگر میڈم یا اس کا کوئی وفادار کارندہ مجھے پک اپ میں دیکھتا تو یقیناً پک اپ کا پیچھا کرتا یا اس کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیتا۔ اگر کوئی پیچھا کرتا تو پھر وحدت علی کے گماشتے اسے "تفتیش" کے لیے پکڑ لیتے۔

اسی طرح پرسوں جب میں اکیلا ہی فون کرنے نکل گیا تھا تو وحدت علی سخت ناراض ہوا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اگر راستے میں میڈم یا اس کا کوئی کارندہ مجھے پکڑ کر "غائب" کر لیتا تو میڈم کے حلق میں پھنسنے والا کانٹا ان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ دوسرے لفظوں میں میری حیثیت میڈم کے حلق میں پھنسنے والے کانٹے کی تھی۔ میں ننھا بدمعاش تھا اور مجھ سے وہی سلوک ہو رہا تھا جو "ننھے بدمعاش" سے ہونا چاہیے۔ پہلے ناورجگی نے مجھے قربانی کا بکرا بنانے کی کوششیں کی تھیں۔ اس کے بعد ڈوبی نے بھائی جی کی گاڑی رکوانے کے لیے مجھے پتھر کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد میڈم نے مجھے خرید کر میرا کام تمام کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وحدت علی اپنی دانست میں مجھے میڈم کے لیے چارا بنا رہا تھا۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہی کچھ کر رہا تھا جو مجھ سے "بڑے بدمعاش" مجھ سے کروانا چاہ رہے تھے۔

ایک رات مزید اسی طرح گزر گئی۔ یہ اگلی رات کا واقعہ ہے میں اپنے کمرے میں بوسیدہ سی چارپائی پر لیٹا تھا۔ میں نے لحاف سینے تک کھینچ رکھا تھا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ریڈیو سن رہا تھا۔ پہلے موسیقی کا پروگرام براڈکاسٹ ہوتا رہا پھر خبریں آنے لگیں۔ الیکشن کی تیاریوں اور سیاسی جوڑ توڑ کی خبریں نمایاں تھیں۔ بھائی جی کے بارے میں ایک دو خبریں موجود تھیں۔ ان خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بھائی جی کی سیاسی قوت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بھائی جی نے ملک کے وسطی حصے میں کئی بڑے بڑے جلسے کیے تھے۔

خبریں سنتے سنتے اچانک میں چونک گیا۔ مجھے کوارٹر کے برآمدے کی طرف کسی کے قدموں کی مدھم آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکالا اور ایک دم چوکس ہو گیا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ کوئی کمرے کی کھڑکی کے پاس موجود ہے اور بڑے محتاط طریقے سے قرب و جوار کا

جائزہ لے رہا ہے۔ میرے ذہن میں "میڈم" کا لفظ گونجا۔ کیا سچ مچ وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ میڈم یا اس کے کارندے یہاں پہنچ گئے تھے؟

میں ریوالور پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے دروازے کی طرف آیا۔ اسی دوران میں دروازے پر بے ڈھنگی سی دستک ہوئی "کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ جواب میں پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا' باہر کوئی نہیں تھا' بس تیز سرد ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ آندھی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ برآمدہ اور صحن دونوں خالی تھے۔ اچانک ایک ہیولا نکل کر سامنے آگیا۔ یہ عورت کا ہیولا تھا' میں دنگ رہ گیا۔ یہ ناشا تھی۔ وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"ناشا! تم یہاں؟" میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

وہ جلدی سے اندر آگئی۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کا سرخ و سپید چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ گھٹنوں تک پہنچتی ہوئی نیکر اور ڈھیلی ڈھالی ویلوٹ کی قمیص میں تھی۔ اس کے بال قدرے سلیقے سے جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا یہ حلیہ فلم والوں نے بنایا ہے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولی "تم بڑے دھوکے باز ہو۔ تم سب کے سب دھوکے باز ہو۔ پرسوں تم نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ ایک دم انجان بن گئے۔"

"تم کب کی بات کر رہی ہو؟"

"میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔" وہ ٹوٹی پھوٹی پشتو میں بولی "میں بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں' میری مدد کرو۔ تمہیں اپنے دیوتا کا واسطہ میری مدد کرو۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے ناشا؟"

"جیسے بھی ہو سکتا ہے کرو۔ نہیں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں تمہاری اونچی اونچی دیواروں والی اس بستی میں بے موت مر جاؤں گی۔ مجھے بچا لو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے بچا سکتے ہو۔ یہاں سے نکال سکتے ہو۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔"

"کل رات میرے دل میں آئی کہ میں چھت پر جاؤں۔ میں چھت پر گئی اور وہاں سے میں نے تمہیں اس مکان میں داخل ہوتے دیکھا۔"

"مگر آج تم کوٹھی سے کیسے نکلی ہو؟"

"بس نکل آئی ہوں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ دیوتا میری مدد کرتے ہیں' وہ میرے دل میں ایسی بات ڈال دیتے ہیں کہ مجھے راستہ مل جاتا ہے۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات کو رد نہیں کرتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس مرتبہ تمہارے دیوتاؤں نے تمہارے دل میں پوری بات نہیں ڈالی۔ تم کوٹھی سے نکل کر اس کوارٹر میں آئی ہو تو یہ ایسے ہی ہے کہ بندہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کوارٹر سے باہر کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو یہاں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں یہاں گھستے ضرور دیکھ لیا ہوگا۔"

"تمہارا خیال درست ہے شاید۔" ناشا نے کہا "لیکن وہ زیادہ بندے نہیں بس ایک بندہ تھا' جب میں اس مکان کے دروازے کے پاس پہنچی تو وہ ایک دم درختوں سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس کے کندھے سے ہتھیار بھی لٹک رہا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر مکا مارا' اس کا سر دیوار سے ٹکرایا' وہ نیچے گر گیا۔ میں نے اس کے سر پر پتھر (اینٹ) مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔"

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں نے اسے گھسیٹ کر بڑے درختوں میں ڈال دیا ہے۔"

"تیرا ستیاناس۔ تو ضرور پھانسی کے پھندے تک پہنچے گی۔" میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟"

میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کہ وہ بندہ اکیلا نہ ہو۔ اس کے ساتھی بھی ہوں۔"

"یہ ضروری تو نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"دیکھو ناشا۔" میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا "تم نے ایک خطرناک کام کیا ہے اور بلاوجہ کیا ہے۔ تم پر جو کیس بنا ہے وہ بے حد کمزور ہے۔ تم نے اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے ایک اوباش شخص کو مارا ہے۔ تم کچھ ہی دنوں میں باعزت بری ہونے والی ہو پھر تم آزادی اور اطمینان سے واپس جا سکو گی اور جب تمہارا دل چاہے گا یہاں واپس بھی آسکو گی۔ کلثوم اور زریں سے مل سکو گی۔ اپنے ننھے بھانجے سے مل سکو گی۔ تم یہاں سے بھاگ کر نہیں جا سکتی ہو اور اگر فرض محال چلی بھی گئیں تو پھر واپسی تمہارے لیے بڑی مشکل ہوگی۔"

"میں واپس آنا نہیں چاہتی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"تم وقتی بات کر رہی ہو۔ یہاں سے جانے کے بعد

تمہارا دل پھر واپس آنے کو چاہے گا۔"

میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے کان باہر کی آوازوں پر بھی لگے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ کسی بھی لمحے وحدت علی کے کارندے یہاں پہنچ جائیں گے اور ناشا کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھی میں واپس لے جائیں گے۔ لیکن دس پندرہ منٹ گزر جانے کے باوجود ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ شاید ناشا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی اس کوارٹرز کی نگرانی پر بس ایک ہی بندہ مقرر تھا جسے ناشا نے طوفانی ضربات لگا کر غافل کردیا ہے۔

باہر تیز طوفانی ہوا فرانے بھرتی رہی اور اندر میں وادی موت کی جنگلی حسینہ کو اس امر پر قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ جیسے آئی ہے ویسے ہی خاموشی سے واپس چلی جائے۔ وہ نیم رضامند نظر آنے لگی تھی مگر پوری طرح رضامند نہیں ہوئی تھی۔

وہ بولی "اب مجھ کو ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ڈر کا لفظ میں نے تمہاری زبان سے پہلی مرتبہ سنا ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ ڈر کیوں لگ رہا ہے۔"

"میں نے اس بندے کو زخمی کیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس بندے کی وجہ سے وہ لوگ مجھے ماریں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود بتا رہی ہو کہ وہاں اندھیرا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے تمہیں پہچانا ہی نہ ہو۔ اگر پہچان بھی لیا ہے تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہے۔"

ناشا بہت آزردہ خاطر نظر آتی تھی۔ جیل کی دیواروں کا تصور اس کا دل لرزا دیتا تھا۔ وہ اس کوٹھی میں تھی اور ایک فلم کی عکس بندی میں حصہ لے رہی تھی لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ اپنے اردگرد بس تیز روشنیاں دیکھتی تھی اور کیمرے کی حرکت نوٹ کرتی تھی۔ کل وہ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی کہ ایک شخص اس کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا اور نامعلوم زبان میں اس سے باتیں کرنے لگا تھا اتنے میں ایک اور شخص آیا تھا اور پہلے کو مارنے پیٹنے لگا تھا۔ اس واقعے نے ناشا کو حیران کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کچھ فلم بندی کا حصہ تھا۔

باہر تیز ہوا کے ساتھ ساتھ گرج چمک کے ساتھ بارش بھی ہونے لگی تھی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ ٹھکا ٹھک بج رہا تھا۔ ہوا کے زور سے دروازے کا ایک پٹ بار بار دیوار سے ٹکراتا تھا اور شور پیدا کرتا تھا۔ میں دروازہ بند کرنے کے لیے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ اچانک ایک پرچھائیں نے میرے پیچھے حرکت کی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا کسی وزنی شے کی شدید ضرب میری گردن کے پچھلے حصے پر لگی۔ میں تیورا کر اوندھے منہ گرا، اسی اثناء میں ایک اور ضرب سر پر لگی۔ مجھے چکر سا آگیا۔ میں چکر سے سنبھلا تو تین چار افراد میری پشت پر سوار تھے۔ میرے ہاتھ اسٹیل ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے۔ ایک شخص نے میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میرا سر فرش سے لگا رکھا تھا اور ریوالور کی نال میری کنپٹی پر تھی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ میں کچھ بھی نہ کرسکا۔

پھر میں نے میڈم شہرزاد کو دیکھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے قریب تھا۔ وہ مردانہ شلوار قمیض میں تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ خوں خوار انداز میں میری طرف دیکھتی چلی جارہی تھی۔ میرے قریب پہنچ کر وہ غرائی "تم نے کیا سمجھا تھا میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ میں اپنے مجرم کا پیچھا قبر تک کرتا ہوں۔"

"میں نے کیا جرم کیا ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا میرے نزدیک کم از کم موت ہے لیکن فی الوقت میں تمہیں زندہ رکھنے پر مجبور ہوں۔ تم نے نمک حرامی کی ہے۔ میں نے تمہیں جس کام سے بھیجا تھا تم نے اس کی بجائے میرا کام تمام کرنے کی کوشش کی ہے۔" اس کے ساتھ ہی میڈم نے دو زوردار ٹھوکریں میری پسلیوں میں رسید کیں۔ میں تکلیف سے دہرا ہوگیا۔ اس کے حکم پر میرے پاؤں بھی رسی سے جکڑ دیے گئے۔

کمرے سے باہر نکلنے کے بعد جو کچھ ہوا۔ اتنا آناً فاناً تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ زوردار ضربات نے چند سیکنڈز کے لیے مجھے چکرا ڈالا تھا۔ اسی دوران میں میرے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے گئے تھے۔ بارش کا انداز طوفانی ہوگیا تھا۔ زور سے بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں میڈم کا چہرہ سرخ انگارہ نظر آیا۔ اس نے اپنے ایک کارندے کی پتلون سے بیلٹ کھینچی اور اس کی کئی شدید ضربیں میری پشت پر لگائیں۔ پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولی "طفیلے! تم گاڑی کو دروازے کے سامنے لے آؤ۔"

طفیلا سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کا ایک ساتھی بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ اب میڈم اور اس کا ایک ساتھی برآمدے میں رہ گئے تھے۔ میڈم کے منہ سے غلیظ گالیاں نکلیں اور اس نے ایک بار پھر میرے پہلو میں ٹھوکریں رسید کیں۔ میں جانتا تھا کہ ناشا کمرے میں ہے۔ اگر اس نے سب کچھ دیکھ لیا تھا تو پھر وہ کچھ بھی کرسکتی تھی اور وہی

ہی ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ اچانک کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور میں نے ناشا کو کسی چیل کی طرح میڈم پر جھپٹتے دیکھا۔ اس نے میڈم کو اوندھے منہ پختہ فرش پر گرایا اور اس کی پشت پر چڑھ بیٹھی لیکن میڈم بھی کوئی عام عورت نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو شاید عورت ہی نہیں تھی۔ وہ کسی سانڈ کی طرح طاقت ور اور مضبوط تھی۔ میں نے شیخوپورہ روڈ پر اس کو ڈاکوؤں کے ساتھ مردانہ وار لڑتے دیکھا تھا۔ ناشا کی گرفت میں آتے ہی وہ مچھلی کی طرح تڑپی میں نے ناشا کو اچھل کر ایک ستون سے ٹکراتے دیکھا۔ میڈم کا ساتھی ناشا کو دبوچنے کے لیے بڑھا، میں نے لیٹے لیٹے دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس کے پیٹ میں رسید کیں۔ یہ چوٹ اتنی شدید اور طاقت ور تھی کہ اس شخص کے سر کا عقبی حصہ بڑے زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ یہ دبلا پتلا شخص تھا، منہ کے بل فرش پر گرا اور وہیں پڑا رہ گیا۔

دوسری طرف میڈم اور ناشا گتھم گتھا ہوگئی تھیں۔ ایک پاشا گینگ کی بے حد سفاک قاتلہ تھی، دوسری وادی موت کی کڑکتی ہوئی بجلی تھی۔ میں نے اسے وادی میں بے رحمی سے قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خوب رو ہونے کے ساتھ ساتھ فولاد کی طرح سخت تھی۔ وہ ہر رسم و رواج کی باغی تھی۔ خاص طور سے ستم سہنے کی رسم تو اسے بالکل پسند نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پر دنیا کے ہر مرد سے متنفر تھی۔ یہاں تک کہ اپنے باپ سے بھی۔ مجھے یاد تھا جب وادی موت میں ناشا کا باپ میرے ہاتھوں قتل ہوا تو ناشا اس بدکار کی موت پر خوش ہوئی تھی۔ آج بھی ایک مرد نما عورت اس کے مقابل تھی۔

وہ دونوں جنونی انداز میں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میڈم نے مردانہ انداز میں کئی بھرپور مکے ناشا کے منہ پر مارے وہ گھٹنوں کے بل گر گئی لیکن جب میڈم نے اس کی گردن دبوچنی چاہی تو اس نے بیٹھے بیٹھے میڈم کی ٹانگوں میں سر گھسیڑ دیا اور ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ اب دونوں صحن میں پہنچ گئی تھیں اور بارش میں شرابور ہو رہی تھیں۔ شدید چوٹ کھانے کے بعد میڈم نے اپنے لباس کے نیچے سے کمانی دار چاقو نکال لیا۔ ناشا نے تڑپ کر میڈم کا پہلا وار بچایا پھر میڈم کو فوراً بازو سے پکڑ لیا۔ دونوں سانڈنیوں کی طرح زور مار رہی تھیں۔ ناشا، میڈم کے ہاتھ سے چاقو چھڑوانا چاہتی تھی جبکہ میڈم کسی طور چھوڑ نہیں رہی تھی، پھر ناشا نے بالکل جنگلی انداز میں اپنے دانت میڈم کی کلائی میں گاڑ دیے۔ چاقو میڈم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر اس کے ساتھ ہی میڈم کا داؤ بھی چل گیا۔ اس نے ناشا کے جبڑے پر سر کی ٹکر رسید کی۔ یہ ٹکر ایک جانب سے لگی تھی۔ ناشا کا سر دائیں سے بائیں بری طرح ہل گیا۔ مارشل آرٹ کی تکنیک کے مطابق ایسی ضربات حریف کو ناک آؤٹ کرنے کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ ناشا ڈگمگا کر گر گئی۔ میڈم آناً فاناً اس پر سوار ہوگئی اور اس کا سر دو تین بار فرش پر ٹکرا ٹکرا کر اسے نیم جان کردیا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ میڈم اس طرح اچانک ناشا کو مغلوب کرلے گی۔ ذہنی طور پر مجھے جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اسی دوران میں میڈم کے دونوں ساتھی بھی واپس آگئے۔ انہوں نے مل کر پہلے ناشا کے منہ میں کپڑا ٹھونسا، پھر اس کی مشکیں کس دیں۔ ناشا بری طرح تڑپ رہی تھی لیکن بے بس تھی۔ اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا اور وہاں سے اس کا حسین جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔

میڈم نے اپنا پستول میری کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو اس پر سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ اس طوفانی موسم میں کسی کے کان تک ہلکی سی آواز بھی نہیں پہنچے گی اور گولی تمہارے دماغ میں اتر جائے گی۔"

"تم چاہتی کیا ہو میڈم؟"

اس نے بھرپور ٹھوکر میرے چہرے پر رسید کی۔ نمک کا ذائقہ میرے منہ میں گھل گیا۔ وہ سانپ کی طرح پھنکاری "مت کہو مجھے میڈم! میرا نام شہرزاد ہے۔۔۔" پھر اس نے عجیب سے لہجے میں اپنا فقرہ مکمل کیا "میرا نام شہرزاد ہے اور میں عورت نہیں ہوں۔"

اس نے گھوم کر اپنے ساتھی طفیلے کو مخاطب کیا "ان دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو۔"

"جو حکم جناب!" طفیلے نے کہا۔

میڈم سائیلنسر لگا پستول لیے میرے سر پر کھڑی تھی۔ میڈم کے کارندوں نے پہلے مچلتی تڑپتی ناشا کو باہر گاڑی میں ڈالا، پھر مجھے اٹھا کر لے گئے۔ دروازے کے عین سامنے ملک کے نیلے پردوں والی آسمانی رنگ کی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ مجھے پچھلی نشست پر ڈال دیا گیا۔ میڈم یوں میرے سرہانے بیٹھ گئی جیسے عید قربان پر بکرے کو گاڑی پر لوڈ کرنے کے بعد اس کے قریب بیٹھا جاتا ہے۔ شاید اس کے نزدیک میری حیثیت ایک بکرے کی سی ہی تھی۔ وہ مجھے اپنی خبیث خواہشات پر قربان کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اور اس کے لیے نجانے کیا طریقہ اختیار کرنے والی تھی۔

لیکن یہ اس کی بھول تھی کہ وہ مجھ سے اپنی مرضی کے

مطابق سلوک کر سکتی ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق سلوک کرنے میں کامیاب ہوئی تھی تو اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ میں اس تنظیم کے سرکردہ فرد تک پہنچنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب میں پہنچ چکا ہوں۔ اب مجھے میڈم کے سامنے اپنا بہروپ بنائے رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں پانسہ پلٹنے کے لیے کوئی بے ضرر سی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اسٹیشن ویگن حرکت میں آ گئی تھی اور اب بڑی سڑک کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"یہ عورت کون ہے تیرے ساتھ؟" میڈم نے پوچھا۔ اس کا اشارہ ناشا ہی کی طرف تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"مگر یہ تیرے کوارٹر سے برآمد ہوئی ہے۔ اور شاید تیرے کمرے میں تھی۔"

"نہیں یہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ چوری چھپے گھس آئی ہوگی۔"

میڈم مجھے زہریلی نظروں سے گھورنے کے بعد خاموش ہوگئی۔ میرے لیے اس کی آنکھوں میں قہر ہی قہر تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے پوچھا "کہاں لے جا رہی ہو مجھے؟"

وہ اب ایک بار پھر بپھر گئی۔ مجھے گریبان سے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑا اور گالیاں بکتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے عورت کی طرح مخاطب مت کرو۔"

میں نے کہا "اچھا بتاؤ۔ کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"تیری خاطر تواضع کرنے۔ کافی بھاگ دوڑ کر لی ہے تم نے اب تمہیں تھوڑا سا آرام کرنا چاہیے۔"

"شاید پھر مجھ پر زہریلے سانپ چھوڑنے کا ارادہ ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ تم پر سانپ چھوڑے گئے تھے۔"

"راج نگر کی حویلی میں ایک دن نشے میں وحشت ہو کر خود ہی تمہارے منہ سے نکل گیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ میں شراب پی کر کبھی اتنا مدہوش نہیں ہوتا کہ مرضی کے خلاف کچھ بول دوں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"پھر مجھے الہام ہوا تھا۔"

وہ مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی "کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہو۔ مجھے سچ بتاؤ کون ہو تم۔"

"شاید زیادہ پی پی کر تمہارا حافظہ بھی خراب ہوگیا ہے۔ تم جانتی ہو۔ میرا مطلب ہے تم جانتے ہو کہ میرا نام جہاں داد ہے اور میں ناور جگی صاحب کا بے دام نوکر ہوں۔"

"تم بے دام کے نوکر نہیں، مہنگے داموں بکے ہوئے نمک حرام ہو۔ مجھ سے تمہیں کیا تکلیف پہنچی تھی جو میرے بارے میں مخبری کرنے کے لیے یہاں وحدت علی کے پاس چلے آئے۔"

"شاید تمہارا خیال ہے کہ دو عدد کوبرا سانپوں کے ڈسنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور نہ ہی جسم میں سے آدھا خون کشید کر لینے سے کوئی زحمت ہوتی ہے۔ بہرحال پھر بھی میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنی چاہوں گا کہ میں یہاں تمہاری مخبری کے لیے آیا تھا۔ میں نے تو..."

"بکواس بند کرو۔" اس نے میری بات کاٹی "میں کوئی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"تم شاید کوئی کہانی بنانے کے موڈ میں ہو۔"

"تم ذرا چھری تلے سانس لو۔ سب کچھ معلوم پڑ جائے گا تمہیں۔"

مجھ سے گفتگو کے دوران میں میڈم گاہے گاہے ناشا کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ ویگن کی اندرونی لائٹ روشن تھی۔ اس روشنی میں ناشا کے پھٹے ہوئے لباس میں سے اس کے جسم کے سرخ و سپید حصے جھانک رہے تھے۔ میڈم کی ہوس زدہ نگاہیں انہی "مناظر" کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک بے نام وحشت تھی اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں۔

ویگن لاہور کے شمالی حصے کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ بارش کا زور برقرار تھا اور ویگن کے نیلے پردوں کے پیچھے آسمانی بجلی کے چمکنے کا منظر دلکش تھا۔ میری سوچ رہ رہ کر وحدت علی کی طرف جا رہی تھی۔ پاشا گینگ کے دوسرے "ارکان" کی طرح وحدت نے بھی عیار فریبی کا کردار ادا کیا تھا۔ میرا یہ اندیشہ بالکل درست نکلا تھا کہ وحدت نے مجھے میڈم کے لیے چارے کے طور پر کوارٹر میں رکھا ہوا ہے لیکن اس سلسلے میں اس نے غلطی یہ کی تھی کہ کوارٹر کی نگرانی کے لیے صرف ایک بندے کو مقرر کر رکھا تھا۔ اس بندے کو ناشا نے لمبا لٹا دیا تھا۔ اتفاق یہ ہوا تھا کہ کچھ دیر بعد میڈم بھی ہوشیاری سے وہاں آ دھمکی تھی۔ شاید آج میڈم کے ستارے عروج پر تھے۔ وہ نہ صرف حفاظت کے ساتھ کوارٹر میں داخل ہوگئی تھی بلکہ اس کے کارندے ناشا اور مجھے بھی زیر کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اسٹیشن ویگن ایک بڑی کوٹھی کے پورچ میں رکی۔ ویگن کی کھڑکیوں پر چونکہ پردے پڑے ہوئے تھے

تھے اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ کوٹھی کی بیرونی چار دیواری بھی خاصی اونچی تھی۔ بہت وسیع گراسی لان تھا اور مہنگے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہمیں ویگن سے اتار کر کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دبیز قالین بچھا تھا۔ فانوس، غالیچے، ڈیکوریشن پیس وہ سبھی کچھ موجود تھا جو عالی شان کوٹھیوں میں موجود ہوتا ہے۔ کسی پالتو پرندے کی چہچہاہٹ بھی مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

میڈم کے کارندوں نے ہم دونوں کو قالین پر ہی ڈال دیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے نے ناشا کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ وہ بلند آواز سے چیخنے لگی اور اپنی زبان میں نجانے کیا کچھ بولنے لگی۔ میڈم کے کارندے ناشا کی چیخ و پکار کی وجہ سے قطعی فکرمند نہیں تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کافی وسیع کوٹھی ہے اور ارد گرد کوئی ایسا نہیں جو ہماری مدد کو آ سکے۔ کچھ دیر چیخنے چلانے کے بعد ناشا خاموش ہوگئی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پشتو میں کہا "یہ کون لوگ ہیں اور ہم سے کیا چاہتے ہیں۔"

"ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال تم پُرسکون رہو۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔"

وہ بولی "مجھے تم پر بھروسا ہے۔ تم زور اور ہمت والے ہو۔ میں نے وادی میں جاتریوں کے ساتھ تمہاری لڑائیاں بھی دیکھی تھیں لیکن... آج تو تم زخمی ہو۔ بزدل دشمن نے ایک پیچھے سے تم کو بے بس کیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہاری گردن پر سخت چوٹ لگی ہوگی۔"

ناشا کا اندازہ درست تھا۔ میری گردن درد سے پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ بہرحال میں نے اپنی تکلیف اس پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میڈم کا کارندہ طفیل غرا کر بولا "یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم دونوں نے۔ خاموش ہو جاؤ۔"

اسی دوران میں میڈم بھی اندر آ گئی۔ ناشا کے ساتھ لڑائی میں اس کا لباس کیچڑ آلود ہو گیا تھا اور کہیں کہیں سے پھٹ بھی گیا تھا۔ اب وہ اپنے پسندیدہ لباس پینٹ قمیص میں ملبوس تھی اور اس نے دھاری دار سوئٹر پہن رکھا تھا۔ میڈم کے ساتھ اس کا تنخواہ دار ڈاکٹر کریم بھی تھا۔ میری اور میڈم کی نگاہیں بس ایک لمحے کے لیے ملیں پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میڈم اور ڈاکٹر کریم آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ناشا نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا "یہ کون ہے۔ کسی وقت یہ عورت لگتی ہے کسی وقت مرد لگتا ہے۔"

"یہ ایک عجوبہ ہے۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔" میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ ناشا مزید کچھ کہتی طفیل نے ایک بار پھر اسے بری طرح جھڑک دیا۔

میڈم اور ڈاکٹر کریم ٹہلنے والے انداز میں میرے پاس آئے۔ ڈاکٹر کے گلے میں اسٹیتھسکوپ جھول رہا تھا۔ بی پی آپریٹس بھی اس کے پاس تھا۔ اس نے وہیں میرے قریب بیٹھ کر میرا بی پی چیک کیا۔ نبض دیکھی۔ ٹارچ کی روشنی پھینک کر میری آنکھیں دیکھیں۔ اس نے کوئی لفظ نہیں بولا۔ میں بھی خاموش رہا۔ میرا معائنہ کرنے کے بعد وہ میڈم سے انگریزی میں بولا "میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہے۔ کام چلے گا۔"

میڈم نے انگریزی میں کہا "اسے صبح تک تیار کر دو۔ ڈاکٹر ابدال جی آج رات تین بجے کی فلائٹ سے واپس پہنچ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کل صبح زیادہ سے زیادہ دس بجے تک وہ ہمارے پاس ہوں گے۔"

"اوکے سر۔" ڈاکٹر کریم نے کہا۔

اس کے "سر" کہنے پر مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ میڈم اب سرتاپا مرد بننے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس کے ساتھی اور ملازم اب اس کے لیے میڈم کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ کچھ دیر تک میڈم سے بات کرنے کے بعد ڈاکٹر کریم واپس چلا گیا۔ میڈم وہیں کھڑی رہی اور کینہ توز نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ناشا کو گھورتی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اندر سے سلگ رہی ہے۔ اس کمرے میں اب میڈم اور ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میڈم نے کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیے پھر پلٹ کر میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے۔

اچانک اس نے میرا منہ اس طرح دبوچا کہ اس کی آہنی انگلیاں میرے رخساروں میں پیوست ہو گئیں۔ وہ پھنکار کر بولی "تم جانتے ہو میں جھوٹے شخص کو کچا چبا جاتا ہوں۔ بتاؤ یہ لڑکی تمہارے ساتھ کیا کر رہی تھی کمرے میں؟"

"میں نے کہا ہے ناکہ یہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ یہ کہیں باہر چھپی ہوئی تھی۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔ یہ رات کے اندھیرے میں تمہارے کمرے کے اندر سے نکلی ہے۔ تم ایک ہی کمرے میں تھے بلکہ ایک ہی بستر پر تھے۔"

"ایسا نہیں تھا... اور اگر ہے بھی تو..."

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے ایک ٹھوکر میرے سر پر ماری۔ میری گردن جو پہلے ہی پھوڑا ہو رہی تھی

دور سے بھنجھنا اٹھی "یہ بات مت بھولو کہ تمہاری حیثیت ابھی تک میرے ملازم کی ہے۔ میں نے تمہاری تنخواہ ادا کی ہوئی ہے۔ میں تم سے جواب طلب کرسکتا ہوں۔ میں نے تمہیں سختی سے ہدایت کی تھی کہ جب تک تم میری ملازمت میں ہو کسی عورت کے قریب بھی نہیں پھٹکو گے۔ کہا تھا تم سے یا نہیں؟ بولو کہا تھا یا نہیں۔"

اس نے پھر کئی ٹھوکریں مجھے جڑ دیں۔ میں نے کہا "جو کام میں نے نہیں کیا اس کا اقرار کیسے کرسکتا ہوں۔ جس طرح رانو میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور تھی اسی طرح یہ لڑکی بھی دور رہی۔"

"یعنی تم اقرار کرتے ہو کہ یہ تمہارے کمرے سے نکلی تھی۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔"

وہ کچھ دیر کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر غضب کی ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی "اچھا۔ مجھ سے کیا تکلیف پہنچی تھی تجھے جو تو نے مجھے پکڑوانے کی کوشش کی۔"

"میں تجھے بتا چکا ہوں کہ۔۔۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا وہ ایک بار پھر مجھ پر پل پڑی۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں اس کا پسندیدہ ہتھیار یعنی بیلٹ تھی۔ اس نے بے دریغ مجھ پر بیلٹ برسائی پھر ناشا پر حملہ آور ہوگئی۔ وہ بڑی درندگی سے ناشا کو پیٹ رہی تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ ناشا عام عورتوں کی طرح اس کے سامنے چیخ پکار کرے اور منت سماجت کا رویہ اپنائے لیکن وہ بھی عام عورت نہیں تھی' اس کے ارادے اور جسم میں چٹانوں کی سختی تھی۔ اس کے جبڑے مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے اور غضب آمیز غراہٹوں کے سوا اس کے حلق سے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی خاموشی اور سخت جانی نے میڈم کو اور بھی مشتعل کردیا۔ اس نے ناشا کی قمیص بالکل ہی پھاڑ دی اور اس کی پشت پر ضربیں لگانے لگی۔ آخر بے پناہ ضبط کے باوجود ناشا کے ہونٹوں سے چیخ سی نکل گئی۔ اس چیخ نے میڈم کو اپنی فتح مندی کا احساس دلایا اور اس کا غصہ قدرے کم ہوگیا۔ ناشا کو چند مزید ضربیں لگانے کے بعد اس نے بیلٹ پھینک دی۔ مارپیٹ کے دوران میں وہ ناشا کو نہایت غلیظ گالیاں بھی دیتی رہی۔ بڑے بڑے بدزبانوں سے میرا واسطہ پڑا تھا لیکن میڈم کی بدزبانی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ خاص طور سے عورتوں کے لیے ایسی واہیات گالیاں ایجاد کرتی تھی کہ سننے والا کانپ جاتا تھا۔ بیلٹ پھینکنے کے بعد وہ پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔

ناشا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے لیکن یہ بے بسی کے آنسو نہیں تھے' ان میں ایک بھڑکتی ہوئی آگ تھی۔ اگر وہ اس وقت بندھی نہ ہوتی تو پتا نہیں کیا کر گزرتی۔ بارش کا زور اب کم ہوگیا تھا۔ اب کچھ اور طرح کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ یہ پالتو جانوروں کی آوازیں تھیں۔ ایسی ہی آوازیں میڈم کی شیخوپورہ والی کوٹھی میں بھی میں سنا کرتا تھا۔ وہاں بھی میڈم نے ہرن' کتے' جنگلی بلے' بارہ سنگھے اور پتا نہیں کیا کیا کچھ رکھا ہوا تھا لیکن ستم یہ تھا کہ انسانوں کی طرح وہ جانوروں اور پرندوں کا ملاپ بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ نر علیحدہ کرلاتے رہتے تھے اور مادائیں علیحدہ۔ شاید یہ بھی ایذا رسانی کی ایک قسم تھی جو میڈم کو لطف اندوز کرتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ لاہور والی اس رہائش گاہ میں بھی میڈم نے انسانوں اور جانوروں پر یہ ستم روا رکھا ہوا ہے۔

رات بہت سرد تھی' میں اور ناشا رات بھر قالین پر پڑے رہے' کبھی کبھی ناشا کے ہونٹوں سے ہلکی سی کراہ بھی نکل جاتی تھی۔ اس کے سرخ و سپید جسم پر بے شمار سرخ نشان ابھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں سے خون بھی رس رہا تھا۔ مجھے ناشا کی سخت جانی پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ بڑے حوصلے میں تھی۔ جانوروں اور پرندوں کی آوازیں رات بھر ہمارے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ ان میں سے ایک باریک تیز آواز میرے لیے کچھ نامانوس سی تھی۔

ناشا بولی "تم جانتے ہو یہ کس کی آواز ہے؟"

"نہیں۔"

"یہ ریچھ ہے' برفانی ریچھ۔ ادھر ہمارے علاقے میں ملتا ہے۔ اس کا سارا جسم سفید یا سرمئی بالوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ گرمیوں میں شکار کرتا ہے اور سردیوں میں زیادہ وقت سویا رہتا ہے۔ اس کا خون بڑا گرم ہوتا ہے۔ اتنا گرم کہ سردی سے اکڑ کر مرجانے والے بندے میں اگر زندگی کا تھوڑی سی گرمی بھی باقی ہو تو اس کا خون منہ میں ٹپکانے سے وہ بندہ آنکھیں کھول دیتا ہے۔"

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "تمہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میں شرمندہ ہوں کہ فی الوقت تمہاری کوئی مدد نہیں کرپا رہا۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ جو بھی قصور ہے' میرا ہی ہے۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا' بس مجھ سے غلطی ہوگئی۔ کلثوم کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی۔ پتا نہیں ہوگیا تھا مجھے۔ جب تک کلثوم میرے ساتھ رہی میں اس

سے لڑتی جھگڑتی ہی رہی لیکن جب وہ زریں سے شادی کرکے ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہوئی تو اس کی یاد مجھے دن رات رلانے لگی۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میرے دل کے اندر سے آواز آنے لگی کہ کلثوم کو بچہ ہونے والا ہے۔ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔ میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے کلثوم کے پاس رہنا چاہتی تھی' اس کے بہتیروں کام کرنا چاہتی تھی۔ میں کلثوم کے بچے کے لیے پیارے پیارے کپڑے بھی کرلائی تھی' لکڑی اور پھولوں کے بنے ہوئے کھلونے لائی تھی' لیکن اپنے دغاباز ساتھی کی وجہ سے وہ سب کچھ راستے میں ہی مجھ سے چھن گیا۔ میں کلثوم سے اور اس کے بچے سے ملی تو ضرور لیکن میرا ایک بھی خواب پورا نہ ہوسکا اور اب میں ایک قیدی ہوں' مجھ پر قتل کا الزام ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

میں نے کہا "تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تمہیں روتا دیکھوں گا۔"

وہ بولی "بس اب ان کی دیواروں سے میرا دل گھبراتا ہے۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں تم میری مدد کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گی۔"

"نہیں ناشا! میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔ تم کلثوم سے ملو گی۔ اس کے بچے کے ساتھ وقت گزارو گی۔ اپنے ملک کی سیر کرو گی۔ خوب گھومو پھرو گی اور خوشی خوشی یہاں سے جاؤ گی۔"

"یہ نہیں ہوسکتا' مجھے لگتا ہے کہ اگر میں کچھ دن مزید یہاں رہی تو مجھ سے کوئی اور نقصان ہوجائے گا۔ کوئی اور قتل ہوجائے گا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی وہاں قید خانے (جیل) میں کیسے کیسے برے لوگ ہیں۔ وہ عورتوں کو کس کس طرح ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ان کی مجبوری سے کیسے کیسے فائدے اٹھاتے ہیں۔ وہاں کے مرد ملازم عورتوں سے برا سلوک کرتے ہیں بلکہ کچھ عورتوں کو باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔"

میں ناشا کی باتیں سنتا رہا۔ میرے لیے یہ باتیں حیران کن نہیں تھیں۔ میں برسوں لاہور جیل اور اٹک جیل کا قیدی رہا تھا۔ میں نے ماضی میں بے شمار لرزہ خیز مناظر دیکھے تھے۔ میں نے بااثر قیدیوں کو جیل میں نوابوں کی طرح رہتے دیکھا تھا۔ میں نے برسوں سے قید عورتوں کو جیل میں بچے جنتے دیکھا تھا' میں نے وہاں شراب و کباب کے دور دیکھے تھے۔ میں نے قیدیوں سے ملاقات کے لیے آنے والی خواتین کو عملے کے ہاتھوں شرمناک سلوک کا شکار ہوتے دیکھا تھا۔ میں نے کم سن قیدیوں کو مظالم کی چکی میں پستے دیکھا تھا۔ یہ ایک لمبی فہرست تھی۔ میں بیان کرنے لگوں تو یہ بیان ختم ہونے میں نہ آئے۔

بارش رکنے کے بعد جانور مسلسل بول رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ آواز بھی بلند ہوتی تھی جسے ناشا نے ریچھ کی آواز قرار دیا تھا۔ وہ آواز کے اتار چڑھاؤ پر غور کرتے ہوئے بولی "تمہیں پتا ہے برفانی ریچھ ایسی آواز کب نکالتا ہے؟"

"کب نکالتا ہے؟"

"جب وہ اپنی مادہ کو پکارتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ریچھ اپنی مادہ کے پاس جانا چاہتا ہے۔"

"ہاں۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرم ابھر کر اوجھل ہوگئی پھر وہ بولی "لیکن جب ریچھ ایسے بولتا ہے تو پھر دوسری طرف سے ریچھنی کی آواز بھی آتی ہے۔ شاید تم نے غور نہیں کیا یہ ایک آواز نہیں دو آوازیں ہیں۔ ایک آواز سامنے سے آرہی ہے' دوسری ذرا بائیں طرف سے۔ یہ دوسری آواز ذرا باریک بھی ہے۔"

میں نے تھوڑی دیر غور کیا اور مجھے ناشا کی بات درست معلوم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ناشا کی باریک بینی اور تجربے کاری کا احساس بھی ہوا۔ وہ وادی موت کی جنگلی دوشیزہ تھی' اس سرد آفت نے ایک عمر برف زاروں پر ننگے پاؤں گھومتے گزاری تھی۔

کچھ دیر بعد ریچھ اور ریچھنی کی آوازیں بند ہوگئیں۔ شاید وہ جنگلی بلے آپس میں الجھ گئے تھے' ان کی کرخت آوازیں سناٹے کا سینہ چیرنے لگیں۔ کہیں قریب ہی شب بیدار پرندے الو نے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد جب صبح نزدیک تھی' بارش پھر شروع ہوگئی۔ بارش کے شروع ہوتے ہی جانور خاموش ہوگئے۔

رات کو میڈم اور ڈاکٹر کریم کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی اس سے پتا چلا تھا کہ عطائی ڈاکٹر ابدال صبح دس بجے تک یہاں پہنچ جائے گا' اور اس کے فوراً بعد میرے اوپر زہرناک تجربے کا عمل شروع ہوجائے گا' لیکن گھڑی کی سوئیاں بتدریج آگے بڑھتی رہیں' ابدال آیا اور نہ کسی طرح کی سرگرمی دکھائی دی۔

میں سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے یہ مصیبت ٹل ہی جائے۔ دوپہر ایک بجے کے قریب میڈم شہزاد نے صرف ایک بار

جھلک دکھائی۔ وہ پینٹ کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ رات کو ناشا کے ساتھ لڑائی میں جہاں جہاں خراشیں آئی تھیں اس نے کوئی دوا وغیرہ لگا رکھی تھی۔ ایک قیمتی زنجیر سے بندھا سفید ی مائل کتا بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ کینہ توز نظروں سے ناشا کو دیکھتی رہی۔ ناشا کے پھٹے ہوئے لباس میں سے جھلکتا ہوا کندن بدن، شہرزاد کی آنکھوں میں حرص و ہوس کی آگ جگا رہا تھا۔ ان لمحات میں یہ سو فیصد مرد کی آنکھیں محسوس ہوتی تھیں۔

سہ پہر پانچ بجے کے لگ بھگ ڈاکٹر کریم نے بھی چکر لگایا۔ اس کے ساتھ میڈم شہرزاد کا منیجر نوری بھی تھا۔ ڈاکٹر کریم نے ایک بار پھر میرے وائٹل سائنز چیک کیے۔ ہم کل رات سے بھوکے تھے۔ ڈاکٹر کریم نے نوری کو ہدایت کی کہ مجھے صرف پینے کے لیے کوئی چیز دی جائے۔ ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد نوری میرے لیے دودھ لے کر آگیا۔ مجھے شک تھا کہ اس دودھ میں کچھ ملایا گیا ہے۔ غالباً عطائی ڈاکٹر ابدال اب پہنچنے والا تھا اور مجھے یہ نشہ آور دودھ پلا کر بے ہوش کیا جا رہا تھا۔ میں نے دودھ پینے سے صاف انکار کر دیا۔ نوری نے بہت زور لگایا لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کھینچا تانی میں دودھ بھی گر گیا۔ نوری گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

شام کے چھ بجے تھے جب کمرے سے باہر ہلچل کے آثار نظر آئے۔ کسی جیپ وغیرہ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ یقیناً عطائی ڈاکٹر ابدال جی آگیا تھا۔ میں اور ناشا اسی طرح قالین پر بندھے پڑے تھے۔ رسی کی سخت بندش کی وجہ سے میرے پاؤں سن ہو چکے تھے۔ سخت بندش کے سبب ناشا کے ہاتھ پاؤں کی رگیں بھی ابھر آئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تین افراد اندر داخل ہوئے اور ناشا کو اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئے۔ ناشا نے مزاحمت کی، چیخی چلائی بھی لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

ناشا کے جانے کے چند ہی منٹ بعد کوریڈور میں کئی قدموں کی چاپ ابھری اور پھر میں نے ابدال جی کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہ آج بھی پینٹ کوٹ اور ٹائی میں تھا۔ سندھی ٹوپی بھی سر پر موجود تھی۔ کھچڑی داڑھی کے ساتھ اس کا چہرہ کچھ اور بھی بھاری بھرکم نظر آتا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے شہرزاد کے ساتھ اس کی تھوڑی بہت سخت کلامی بھی ہوئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس سخت کلامی کا تعلق اس واقعے سے ہو جو میڈم شہرزاد نے ابدال کی غیر موجودگی میں اس کی خواتین سے کی تھی۔ ابدال کی بیٹی کو تو اس نے بے ہوش ہی کر ڈالا تھا۔ اب پتا نہیں کہ میڈم شہرزاد نے ابدال کو کیسے منایا تھا اور علاج کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر کریم، نوری اور میڈم بھی ابدال کے ساتھ تھے۔

ابدال نے ڈاکٹر کریم سے انگریزی میں بات چیت کی اور میری صحت و جسمانی حالت کے بارے میں دریافت کیا۔ میری ایک دو رپورٹیں بھی ابدال نے دیکھیں اور دانشوروں کے انداز میں سر ہلاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کئی معاملوں میں ڈاکٹر کریم عطائی معالج ابدال جی سے متفق نظر نہیں آتا لیکن مجبوری کے تحت وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ ابدال کا ایک دست بستہ ملازم بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ کسی غلام کی طرح سر جھکائے ابدال کے پیچھے کھڑا رہتا تھا اور اس کے اشارے کا انتظار کرتا تھا۔

چند منٹ وہاں رک کر ابدال باہر چلا گیا۔ باقی لوگ بھی چلے گئے۔ بس میڈم اور ڈاکٹر کریم کھڑے رہے۔ ان کے نزدیک میں ابھی تک نا سمجھی کا ادنیٰ کارندہ تھا۔ وہ دونوں میری موجودگی میں انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ میں بھی اپنے چہرے پر "نا سمجھی" کے تاثرات برقرار رکھتا تھا۔

میڈم شہرزاد نے انگریزی میں کہا "خبیث نے دودھ نہیں پیا۔ اب کیا کرنا ہے۔"

"میں نے کہا تھا جناب! کسی طرح بھی ہو اسے کچھ نہ کچھ کھلا پلا دیں۔"

"کوئی انجکشن لگا دو۔" میڈم شہرزاد نے کہا۔

"نہیں۔ ابدال جی نے آپ کے سامنے منع کیا تھا کہ کسی صورت کوئی انجکشن نہیں دینا۔"

"تو پھر زبردستی منہ کھول کر ڈال دیتے ہیں کچھ اس کے اندر۔"

"اس میں دیر لگ جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ایسے ہی چلنے دیں۔ اس کو اچھی طرح اسٹریچر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں۔ تکلیف تو ہو گی لیکن اچھا ہے۔ اسے بھی مزاحمت کی کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔"

میں نے شہرزاد کی آنکھوں میں سفاک چمک ابھرتے دیکھی۔ جیسے کہ کریم کی بات نے اسے خوش کر دیا ہو۔

چند لمحے بعد ایک اسٹریچر آگیا۔ ایسے اسٹریچر ہاتھوں سے اٹھائے جاتے ہیں۔ شہرزاد کے کارندوں نے مجھے قالین سے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈال دیا۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر تھے اور ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ پاؤں بھی بندھے تھے۔

اسٹریچر پر تین چار چمڑی پٹیاں موجود تھیں۔ ان پٹیوں کی مدد سے مجھے اسٹریچر کے ساتھ اس طرح جکڑ دیا گیا کہ جنبش بھی مشکل تھی۔ اسٹریچر اٹھا کر کمرے کے وسط میں رکھ دیا گیا۔ مجھے ایک بار پھر شیشے کا وہی منحوس خول نظر آیا جس کی شکل بنوی تھی۔ شیشے کا خول ابدال کی ہدایت کے مطابق میرے اوپر رکھ دیا گیا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ خول ایئر ٹائٹ ہے۔ بولنے والوں کی آوازیں اب بہت مدھم سنائی دیتی تھیں۔ غضب و بچھ اور ایک مور کی آواز بھی کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں خود کو اس شکنجے سے نکال نہیں سکتا، پھر بھی میں نے کمرے میں موجود افراد کو دکھانے کے لیے تڑپنے مچلنے کی کوشش کی۔ میں نے چیخ کر میڈم سے پوچھا کہ وہ میرے ساتھ یہ کیوں کر رہی ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ میری اس کی کیا دشمنی ہے؟ میں گلا پھاڑ کر بول رہا تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ میری مدھم آواز ہی باہر پہنچ پاتی ہوگی۔ میری یہ چیخ و پکار دکھاوے کی تھی ورنہ مجھے پتا تھا کہ پکڑنے والوں نے مجھے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔ مجھے ایک خاص لمحے کا انتظار تھا۔ اس خاص لمحے میں میرا داؤ چل سکتا تھا اور میں شہرزاد اور اس کے حواریوں کی گردن دبوچ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لمحہ یا وہ مرحلہ ضرور آئے گا۔ ایک شدید تکلیف کے بعد ہی سہی لیکن وہ موڑ آنے والا تھا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزرے پھر اس تجربے کا تلخ ترین عمل شروع ہو گیا۔ ابدال جی نے دستانے چڑھائے اور لکڑی کے ایک سوراخ دار ڈربے میں ہاتھ ڈال کر سیاہ کوبرا نکالا۔ شیشے کے خول میں موجود سوراخ کا ڈھکن کھولا گیا اور سانپ اندر پھینک دیا گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد دوسرا سانپ بھی خول میں پہنچ گیا۔ سوراخ کا ڈھکن بند کر دیا گیا۔ میں میڈم پر چیخ رہا تھا۔ میڈم اور اس کے ساتھی میری نگاہ کے دائرے سے باہر چلے گئے تھے۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ کمرے میں ہی ہیں اور سانپوں کے میرے جسم پر رینگنے کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ وہی نرم گرم کراہت آمیز لمس جس کا تجربہ مجھے کچھ عرصہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ شیش ناگ کی آواز وحشت کی علامت ہے اور یہ آواز اس کی دم کی نہایت تیز حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز بہت قریب سے میرے کانوں میں گونج رہی تھی پھر یکے بعد دیگرے دونوں سانپوں نے اپنا "فرض" انجام دے دیا۔ دو دو کی شدید لہروں سے سچ مچ میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اس مرتبہ دونوں سانپوں نے صرف تین چار سیکنڈ کے وقفے سے مجھے کاٹا تھا اور دونوں نے میری پنڈلی کو نشانہ بنایا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا جسم پسینے میں نہا گیا اور ایک آگ سی رگ و پے میں دوڑتی اور لپکتی محسوس ہوئی۔ گلا خشک ہو گیا اور دل نہایت تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن میری توقع کے عین مطابق یہ کیفیت ڈیڑھ دو منٹ میں ختم ہو گئی۔ میرے اندر موجود محافظ قوت نے ایک بار پھر ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس مرتبہ میری تکلیف کا دورانیہ اور اس کی شدت پہلے کے مقابلے میں کافی کم رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ سانپ کا یہ زہر ایک بار پہلے بھی میرے جسم میں داخل ہو چکا تھا۔ تین چار منٹ کے اندر میں اندرونی طور پر بالکل نارمل ہو گیا، صرف سانپ کے دانت لگنے کی تکلیف پنڈلی پر باقی رہی۔ بہرحال میں نے خود کو نارمل ظاہر نہیں کیا اور چند ہی منٹ بعد "مکمل بے ہوش" ہو گیا۔

ابدال جی سوراخ میں ہاتھ ڈال کر دونوں سانپ یکے بعد دیگرے نکال چکا تھا پھر شیشے کا خول بھی اٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر کریم نے میرا جسمانی معائنہ کیا۔ پنڈلی کے زخموں پر عارضی پٹی باندھی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں پھر مطمئن ہو کر میرے ہاتھ پاؤں کھلوا دیے۔ اب کچھ دیر بعد میرے جسم سے خون نکالنے کا عمل شروع ہونا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ انجکشن وغیرہ بھی لگائے جانے تھے۔

میرے ہاتھ پاؤں کھل گئے تھے اور یہی وہ لمحات تھے جن کا میں انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دزدیدہ آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کمرے میں میڈم، ڈاکٹر کریم اور عطائی ابدال کے علاوہ صرف منیجر نوری تھا۔ ان میں سے صرف نوری کے لباس میں کوئی ریوالور وغیرہ ہو سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جونہی وہ ایک سرنج اور انجکشن لے کر ڈاکٹر کریم کے پاس پہنچا۔ میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی میرا یہ عمل اتنا اچانک اور لرزہ خیز تھا کہ میڈم سمیت باقی افراد بھونچکا رہ گئے۔ میں نے بڑی تیزی سے نوری کی جیبیں ٹٹولیں پھر پوری قوت سے اسے میڈم پر دھکا دے دیا۔ میڈم شہرزاد کی نکر فربہ اندام نوری سے ہوئی دونوں شیشے کے بیضوی خول پر گرے اور اسے چکنا چور کر گئے۔

عطائی ابدال ابھی تک دم بخت کھڑا تھا۔ میں نے دو ذکر اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی، وہ بھینسے کی طرح ڈکرایا اور گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اسے ٹائی سے پکڑ کر میں نے گھمایا اور دیوار سے دے مارا۔ اتنی دیر میں میڈم شہرزاد نے سنبھالا لے لیا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ شاید وہ کوئی ہتھیار حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے عقب سے دھکا

دے دیا۔ اس کا تصادم الماری سے ہوا' پھر وہ الٹ کر فرش پر گری۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔ اسے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ نادر جگی کا معمولی کارندہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو یوں اچانک آڑے ہاتھوں لے گا۔ ابھی تک تو شاید وہ یہ بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ میں اچانک اسٹریچر سے اٹھ کیسے گیا ہوں۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری' اس کا جبڑا ٹوٹ گیا اور ہونٹ سے خون بہہ نکلا۔ نوری نے مجھ پر کرسی چلائی' میں نے یہ وار جھک کر خالی جانے دیا۔ دھاچوکڑی کی آوازیں سن کر ایک اور لمبا تڑنگا کارندہ اندر آگیا۔ اگلے دو منٹ میں ان تین چار افراد کی ایسی بدبختی آئی جس کے بارے میں انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر دیواروں سے ٹکرائے۔ دو کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ایک کی ناک کی ہڈی کا ٹکڑا کا نکلا اور ابدال جی تو مرنے کے قریب ہوگیا' اسے غش سا آگیا تھا۔ توند پر پڑنے والی پہلی زوردار ضرب ہی اس کے لیے کافی شافی ثابت ہوئی تھی۔

ہاں لمبا تڑنگا کارندہ ذرا سخت جان ثابت ہوا۔ اس نے مجھ سے دو چار چوٹیں کھانے کے بعد قمیص کے نیچے سے ماؤزر نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ماؤزر والا ہاتھ سیدھا کرتا میں اس سے لپٹ گیا۔ ماؤزر کے لیے ہم دونوں کے بیچ چند سیکنڈ کے لیے زبردست کشمکش ہوئی' پھر یوں ہوا کہ ماؤزر تو اس کے ہاتھ میں ہی رہا لیکن گولی میری مرضی سے چلنے لگی۔ پہلی گولی شہزادی کی ٹانگ میں لگی' دوسری ابدال کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک گولی نے میڈم کے چہیتے کارندے نواز کی پیشانی میں سوراخ کیا اور ایک گولی خود ماؤزر والے کا سینہ ہی چھید گئی۔ ماؤزر والا گرا تو میں نے ماؤزر اس سے چھین لیا۔ ایک وحشت سی مجھ پر سوار ہو چکی تھی۔ تین چار مزید بندوں کا خون کر دینا اس وقت میرے لیے بالکل مشکل نہیں تھا۔

میڈم موقع دیکھ کر زخمی ٹانگ کے ساتھ ہی کمرے سے کھسک گئی تھی۔ میں اس کی تلاش میں دوڑتا ہوا باہر آیا۔ یہ ایک وسیع کوٹھی تھی مگر اس وقت کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید فائرنگ کی آواز سن کر وہ کونے کھدروں میں دبک گئے تھے یا ویسے ہی بھاگ گئے تھے۔ ایک کمرے کے سامنے مجھے ڈاکٹر کریم کا اسٹیتھسکوپ پڑا نظر آیا۔ افراتفری میں بھاگتے ہوئے وہ یہ آلہ یہاں گرا گیا تھا۔ میڈم کو تلاش کرتا ہوا میں برآمدے کی طرف آیا تو تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا' یہ میڈم کا ہیولا تھا' اس نے کسی کو گھسیٹ کر گاڑی

میں ڈالا۔ جس کو گاڑی میں ڈالا گیا تھا وہ عورت تھی اور چیخ رہی تھی۔ اس کی کربناک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ناشا تھی۔

اس سے پہلے کہ میڈم پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لیتی میں نے ماؤزر اس کی طرف سیدھا کیا اور چلا کر کہا "رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

وہ بھی جواباً چلائی "تیری یہ یار میرے پسٹل کی زد میں ہے۔ میں اڑا دوں گا اس کو۔"

برآمدے سے آنے والی روشنی اب میڈم کے ہیولے پر پڑ رہی تھی۔ وہ خوفناک نظر آرہی تھی۔ اس کا جبڑا ٹوٹنے سے منہ ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ ٹھوڑی' گردن' سینہ سب کچھ خون آلود تھا۔

میں نے ماؤزر اس کی طرف سیدھا کرتے ہوئے کہا "میرے ہاتھ میں ماؤزر ہے۔ تم اپنا پسٹل نیچے پھینک دو۔"

میڈم نے گالی بکتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ تمہیں اس لڑکی کی جان سے کوئی سروکار نہیں ہے ٹھیک ہے' تم چلاؤ گولی لیکن میں بھی اسے ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔" اس نے آگے جھک کر سائلنسر لگے پستول کی نال ناشا کے جسم سے لگا دی۔

میرے لیے یہ بڑے کٹھن لمحے تھے۔ میڈم میری زد میں تھی لیکن میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے میڈم کو تین قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائے گی۔

میں برآمدے میں چلتا ہوا میڈم کی پجارو کے قریب پہنچ گیا۔ تاہم اب بھی میرا فاصلہ میڈم سے تقریباً سو فٹ تھا۔ میڈم نے اپنے پستول کا رخ ناشا کی طرف ہی رکھا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ جیپ کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ تھا' میڈم نے ہیڈ لائٹس روشن کیں اور جیپ کا رخ گیٹ کی طرف کرنے کے لیے اسے بائیں جانب موڑا۔ وہ پورا موڑ نہیں مڑ سکی۔ مجبوراً اسے جیپ کو ریورس گیئر لگانا پڑا تاکہ پورا موڑ مڑنے کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔ یہ فیصلہ کن لمحے تھے' اگر میڈم ناشا کو لے کر نکل جاتی تو پتا نہیں ناشا کے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ مجھے لگا جیسے وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کے قبضے میں چلی جائے گی اور جب آج کی سیاہ رات کا سورج طلوع ہوگا تو خوبرو جنگلی لڑکی کی کٹی پھٹی لاش کسی ویرانے میں پڑی نظر آئے گی۔

ماؤزر میرے دونوں ہاتھوں میں تھا' میں نے اسے میڈم کی کھوپڑی کی طرف سیدھا کر رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے

بھی غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر میرا نشانہ خطا جاتا تو میڈم فوراً ناشا کو گولی مار دیتی۔ میری انگلی لبلبی پر تھی اور نگاہیں میڈم کے سر پر جمی تھیں مگر اس سے پہلے کہ میں لبلبی دبا دیتا' وہ ہوا جس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ میڈم کی جیپ تیزی سے ریورس ہوئی تو اس کا عقبی حصہ لوہے کے ایک پنجرے سے جا ٹکرایا۔ پرشور آواز سے اس پنجرے کی کئی سلاخیں ٹیڑھی ہوگئیں اور دروازہ کھل گیا۔

یہ پنجرہ کوٹھی کے اس حصے میں واقع تھا جہاں میڈم نے پالتو جانور رکھے ہوئے تھے۔ جس پنجرے کا دروازہ ٹیڑھا ہو کر کھلا تھا وہ اسی ریچھ کا پنجرہ تھا جس کی آواز میں نے اور ناشا نے رات بھر سنی تھی۔ پجارو کی ہیڈ لائٹس میں' میں نے دیکھا' درمیانے جسم کا سفید ریچھ چنگھاڑتا ہوا اپنے پنجرے میں سے نکلا۔ اس نے پہلے اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھائے پھر زور سے جیپ کے پچھلے حصے سے ٹکرایا۔ وزنی جیپ درندے کی ٹکر سے ڈگمگا سی گئی۔

میڈم نے پہلا گیئر لگا کر جیپ آگے بڑھائی تو بدمست ریچھ بھی تیزی سے جیپ کے ساتھ ہی آگے گیا پھر میں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ریچھ نے پجارو کی کھلی ہوئی کھڑکی میں پنجہ مارا اور میڈم پر حملہ آور ہوگیا۔ جیپ سیدھی گیٹ کی طرف جا رہی تھی لہرا کر دیوار سے ٹکرائی۔ اس کا دروازہ کھل گیا اور لمبی تڑنگی میڈم باہر آن گری۔ ریچھ کے حلق سے کربناک آواز نکلی اور وہ پھر میڈم پر جھپٹا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ ریچھ کی تھوتھنی میڈم کے پہلو میں ہے اور اس کا ایک پنجہ میڈم کے پیٹ پر ہے۔

میڈم کے حلق سے خوفناک چیخیں نکلیں۔ وہ کسی طرح اٹھ کر لنگڑاتی ہوئی بھاگی۔ نہایت جسیم اور طاقتور جانور حیرت انگیز پھرتی سے میڈم کے پیچھے لپکا۔ ان لمحوں میں میرے جی میں آئی کہ اس پاگل ریچھ کو گولی مار دوں لیکن نجانے کیوں میری انگلی لبلبی پر حرکت کرتے کرتے رہ گئی۔ میری نگاہوں میں نوجوان لڑکے صاوقے کی موت کا منظر گھوم گیا۔ میڈم نے بھی تو اسے اسی طرح اٹھا اٹھا کر پٹخا اور مارا تھا۔ چند گز آگے جا کر ریچھ نے میڈم کو پھر دبوچ لیا۔ میں نے میڈم کو کسی تنکے کی طرح ہوا میں بلند ہو کر زمین پر گرتے دیکھا۔ ریچھ اپنی تھوتھنی سے اسے دور تک گھسیٹتا چلا گیا۔ اسی دوران میں کوٹھی کے کسی حصے سے دو تین فائر ہوئے جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ فائر میڈم کے ڈرائیور رشید نے آتھ برائیم کے ساتھ کوٹھی کی بالائی منزل سے کیے تھے۔

ریچھ زخمی ہوا اور میڈم کو چھوڑ کر پائیں باغ کی طرف بھاگا۔ میں دوڑ کر میڈم کے قریب پہنچا۔ اتنے میں ڈرائیور رشید بھی آگیا۔ اس نے پورچ کی بڑی لائٹ جلائی۔ میڈم کی حالت لرزہ خیز تھی۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں اور ڈرائیور رشید ساکت کھڑے رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میڈم کی آنکھیں الٹ گئیں۔ ایک جھرجھری کے ساتھ وہ ساکت ہوگئی۔ وہ مر چکی تھی... یا شاید مر چکا تھا۔ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکی تھی... یا پار کر چکا تھا۔ وہ کیا تھی... یا وہ کیا تھا؟ بس ایک معمہ تھا۔ وہ دو راستوں کے درمیان بھٹکا ہوا راہی تھا اور اسے حالات نے نہیں بھٹکایا تھا' وہ جان بوجھ کر بھٹکا تھا۔ اس نے اپنے قدم اپنی فطرت کے خلاف ایک ایسے راستے پر ڈالے تھے جو اس کی منزل کو نہیں جاتا تھا۔ اس نے ہر ایک پر زیادتی کی' یہاں تک کہ اپنے اوپر بھی اور خود سے اپنی نسوانیت چھیننے کے چکر میں اتنی دور نکل گیا کہ نہ عورت رہا اور نہ مرد۔ اس کی موت بھی اس کے ظلم و جبر کے حوالے سے وارد ہوئی۔ اس کے جبر کا شکار ایک جانور ہی اس کی موت کا سبب بن گیا اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ہم حیران رہ گئے۔

ڈرائیور رشید میڈم کا کارندہ تو تھا ہی لیکن میرا دوست بھی تھا۔ اس نے تاسف سے کہا "میڈم... ختم ہوگئی ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "لیکن وہ ختم نہیں ہوا جس نے میڈم کو ختم کیا ہے۔"

ہم دونوں باغ کی طرف لپکے۔ کچھ ہی دور انار اور سرو کے درختوں میں ہمیں ریچھ کی سفید جھلک نظر آئی۔ وہ پودوں کے اوپر گرا پڑا تھا۔ ڈرائیور رشید نے باغ کے اس حصے کی لائٹس جلائیں۔ ریچھ کی گردن پر سرخ گلاب کھلا ہوا تھا۔ تھری ایم ایم کی طاقتور گولی اس کی گردن چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہمیں بالکل ایسے ہی لگا جیسے وہ زخمی ہونے کے بعد بھی اپنی مادہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ بڑی حد تک پاگل ہو چکا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے بعد اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ میرے اشارے پر رشید نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں چلائیں اور کراہتے ہوئے جانور کو ٹھنڈا کر دیا۔ کہیں پاس سے ہی ریچھنی کی درد بھری آواز ابھر رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہوگیا جہاں واد۔" رشید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہی ہے۔"

"تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون ہے جو گاڑی میں پڑی ہے۔"

"اس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بس یہ

سمجھ لو کہ اس لڑکی کا بچ نکلنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل چلتے ہیں۔ میڈم کے بعد اب یہاں کچھ باقی نہیں بچا۔ اندر کمرے میں نواز اور ابصار مرچکے ہیں۔ زری اور ڈاکٹر کریم صاحب بھاگ گئے ہیں۔ دو تین اور بندے بھی بھاگ نکلے ہیں۔"

اتنے میں سامنے پورچ کی طرف سے تیز نسوانی آواز ابھری۔ رشید بولا "میرا خیال ہے یہ تمہاری ساتھی لڑکی کی آواز ہے۔"

"ہاں وہ بندھی ہوئی ہے اور پجارو کی پچھلی سیٹ پر پڑی ہے۔"

ہم دوڑتے ہوئے پجارو تک آئے۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا اور ہیڈ لائٹس بھی آن تھیں۔ دیوار کے ساتھ ٹکرانے سے پجارو کا سامنے والا حصہ پچک گیا تھا۔

"کیا خیال ہے اسی گاڑی پر نکل جائیں۔" رشید نے کہا۔

"ذرا سوچنے دو۔" میں نے کہا۔

"سوچنے کا وقت نہیں ہے جہاں داد۔ یہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ دو تین پلاٹ چھوڑ کر دائیں طرف اور بھی کوٹھیاں ہیں۔ وہ لوگ یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میڈم ہی کے مزید ساتھی یہاں آجائیں۔"

رشید بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہاں گزرنے والا ہر لمحہ مجھے اور ناشا کو مصیبت سے قریب تر کر رہا تھا۔ مجھے فکر صرف عطائی ابدال کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اندر لاشوں کے درمیان گرا پڑا تھا۔ اسے ایسی حالت میں چھوڑ جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے کوٹھی کی چھت پر افراد کی نقل و حرکت نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوٹھی بالکل خالی نہیں ہے۔ ہمارے جاتے ہی یہاں موجود لوگ نیچے آجائیں گے اور ابدال وغیرہ کو سنبھال لیں گے۔

ڈرائیور رشید نے مجھ سے کہا "بہتر ہے کہ تم یہ رائفل مجھ سے لے لو اور مجھے رائفل کے زور پر ہی یہاں سے لے جاؤ۔ یہ میرے لیے بہتر رہے گا۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ رائفل رشید سے لے لی اور اسے رائفل سے دھکیل کر جیپ میں بٹھا دیا۔ میں نے رشید کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا تھا۔ خود میں نے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ذرا ہی دیر بعد جیپ غراتی ہوئی کوٹھی کے گیٹ میں سے نکل آئی۔ دو تین فرلانگ آگے جا کر اندازہ ہوا کہ ہم ماڈل ٹاؤن شپ کے علاقے میں ہیں' یہاں کوٹھیاں بڑی تھیں اور کوٹھیوں کے درمیان بہت سے خالی پلاٹ بھی تھے۔ ناشا پچھلی نشست پر رسیوں سے جکڑی پڑی تھی۔ میں اسے رسیوں کی بندش سے آزاد کرنا چاہتا تھا لیکن فی الحال جیپ روکنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے ناشا کو تسلی دی "کہاں چلنا ہے؟" رشید نے پوچھا۔

"ریواز گارڈن۔" میں نے کہا۔

"یعنی وحدت علی صاحب کے پاس؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

آدھے گھنٹے میں ہم ریواز گارڈن پہنچ گئے۔ رات کے نو دس کا وقت تھا۔ کل رات اسی جگہ سے مجھے اور ناشا کو میڈم نے اٹھایا تھا اور ٹاؤن شپ والی کوٹھی میں پہنچایا تھا۔ میں نے گاڑی سیدھی وحدت علی کی رہائش گاہ کے مین گیٹ پر رکوائی۔ دیوہیکل کتوں نے ہمارا استقبال کیا پھر چھوٹا گیٹ کھلا اور مجھے وحدت علی کے جنیر دوست ملک رفیق اور چند کارندوں کی صورتیں نظر آئیں۔ پجارو کو دیکھتے ہی ملک رفیق ہماری طرف لپکا۔ پہلے اس نے مجھے دیکھا اور پھر ناشا کو۔ ناشا کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی۔

اس کے اشارے پر وحدت علی کے گارڈ نے اپنی رائفل سیدھی کرلی تھی۔ وہ گرج کر بولا "خبردار۔ جیپ سے نیچے آجاؤ۔"

میں نے کہا "ہم تو جناب! خود چل کر آپ کے پاس آرہے ہیں' ہم پر رائفل تاننے کی کیا ضرورت ہے۔"

اسی دوران میں وحدت علی اور دیگر افراد بھی باہر نکل آئے۔ میڈم کی جیپ دیکھ کر سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جب ملک رفیق نے انہیں بتایا کہ ناشا بھی اندر ہی موجود ہے تو ان کی حیرتوں میں اضافہ ہوا۔

ٹھیک دس منٹ بعد میں اور ناشا کوٹھی کے اندر پہنچ چکے تھے۔ ناشا کی بندشیں وغیرہ ابھی تک کھولی نہیں گئی تھیں۔ وحدت علی اور ملک رفیق نے مجھے سامنے بٹھا رکھا تھا اور میں انہیں اپنے ساتھ بیتنے والی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ سوائے اس کے کہ میں اور ناشا پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ناشا مجھے پہچان کر میرے پاس کوارٹر میں آئی تھی۔ اس کی بجائے میں نے یہ بتایا کہ ناشا اتفاقاً میرے کوارٹر میں آکر چھپ گئی تھی۔ اسی دوران میں میڈم مجھے پکڑنے کے لیے اپنے کارندوں سمیت آگئی اور یوں میرے ساتھ ساتھ ناشا بھی دھرلی گئی۔ میں نے اپنی ساری روئداد میں "ناشا" کا نام تک نہیں لیا تھا بس

اسے یہ "لڑکی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے اس لڑکی کا نام تک معلوم نہیں یہ ساری بات میں نے راستے میں ہی ناشا کو بھی سمجھا دی تھی۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ میری اور اپنی شناسائی کسی طور ظاہر نہیں کرے گی۔ ناشا اس بات سے بہت ڈری ہوئی تھی کہ میں اسے واپس انہی لوگوں کے پاس لے جا رہا ہوں جنہوں نے اسے اونچی دیواروں کے اندر بند کر رکھا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ان لوگوں کے پاس جانا ہی اس کے لیے سودمند ہے۔ وہ بہت جلد ہر الزام سے بری ہو کر عزت کے ساتھ ہمارے درمیان آئے گی۔

میں اپنی ساری روئداد سنا چکا تو وحدت اور ملک رفیق نے مجھ سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ میڈم واقعی ہلاک ہو گئی ہے یا مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "جناب! صرف ایک گھنٹا پہلے میں اور رشید اس کی لاش اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ پاگل ریچھ نے اس کا پیٹ تقریباً پھاڑ دیا تھا۔ شاید وہ اسپتال پہنچ بھی جاتی تو بچ نہ سکتی۔"

"میڈم کے ملازموں میں سے کون کون مرا ہے؟" وحدت نے پوچھا۔

"رشید سے مجھے ایک کا نام نواز اور دوسرے کا ابصار معلوم ہوا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ نواز بھی مر گیا ہے؟" وحدت نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے بیان کی تصدیق کی۔ وحدت علی کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ نواز نامی اس شخص کا مرنا بھی اس کے لیے اطمینان بخش اور باعثِ مسرت ثابت ہوا ہے۔

"کسی نے یہاں آتے ہوئے تمہارا تعاقب تو نہیں کیا؟"

میں نے کہا "جناب! میں نے اس بات کا پورا دھیان رکھا ہے۔"

میری مستعدی نے وحدت علی اور ملک رفیق کو متاثر کیا۔ وحدت علی نے اپنے ایک کارندے کو اندر بلایا۔ یہ وہی کارندہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے میڈم کی جیپ کسی محفوظ مقام پر چھوڑنے گیا تھا۔ وحدت علی نے اس سے پوچھا "جیپ کی اچھی طرح تلاشی لے لی تھی؟"

"بالکل جناب! جو چیزیں نکلی ہیں آپ کے کمرے میں پڑی ہیں۔"

"فنگر پرنٹس صاف کیے تھے؟"

"جی جناب۔"

"کہاں چھوڑا ہے جیپ کو؟"

"محمود بوٹی بند کے قریب ویران سڑک پر۔"

"ٹھیک ہے۔ جہاں داد کے ساتھ آنے والے بندے کو یہاں بھیجو۔" اس کا اشارہ رشید کی طرف تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب رشید سے بھی وہی سوال کیے جائیں گے جو مجھ سے کیے گئے ہیں اور پھر جوابات کا موازنہ کیا جائے گا۔

ناشا ساتھ والے کمرے میں موجود تھی لیکن میں وہاں جا نہیں سکتا تھا۔ ناشا یہاں پہنچ کر بھی قیدی ہی تھی۔ اس کی بندشیں برقرار تھیں۔ صرف وہ بندشیں جو بہت سخت تھیں ذرا ڈھیلی کر دی گئی تھیں۔ بہرحال مجھے اس بات کی پوری امید تھی کہ ناشا کے ساتھ ناروا سلوک نہیں ہوگا۔ جیلر ملک رفیق ناشا کی گمشدگی سے اتنا پریشان تھا کہ ڈیڑھ دن میں ہی ڈیڑھ مہینے کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ہوشیاری رکھتے ہوئے ناشا کو جیل سے نکالا تھا اور اپنے فلمی دوست کی فلمی ضرورت پوری کی تھی لیکن یہ ہمدردی اسے مہنگی پڑی تھی' اب وہ پچھلے 36 گھنٹے سے پاگلوں کی طرح ناشا کو تلاش کروا رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اب وہ پہلی فرصت میں ناشا کو واپس جیل میں جمع کرائے گا اور اگر وحدت علی کی شوٹنگ کے کچھ سین رہ گئے ہوں گے تو یہ کام کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے گا۔

کچھ دیر بعد وحدت علی میرے پاس آیا۔ اس نے جذباتی انداز میں میرا شانہ تھپکا اور بولا "میں تم سے بہت خوش ہوں جہاں داد۔ تم نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "لیکن میں تم سے خوش نہیں بل ڈاگ کے بوتھے والے۔ تم نے میڈم کو پکڑنے کے لیے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میڈم کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے' تمہاری باری آئے گی تو تمہیں بھی مل جائے گی۔"

وحدت علی نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور قریباً دو ہزار روپیہ میری جیب میں ٹھونس دیا "دو چار دن خوب آرام کرو اور رکھ ڈیو۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ تم کوئی معمولی بندے نہیں ہو۔ تم خاص بندے ہو اور تمہاری خاص قدر کی جائے گی۔"

میں جانتا تھا کہ وحدت علی یہ بات کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ

میری پنڈلی کے زخم دیکھ چکا تھا۔ اب اسے اس بات پر پختہ یقین ہو گیا تھا کہ میرے بارے میں اس نے جو کچھ سنا اور جانا ہے وہ بالکل درست ہے۔ مجھ پر واقعی کسی طرح کا زہر اثر نہیں کرتا ہے۔

اس نے کہا "میں نے ملازم سے کہہ دیا ہے۔ وہ کل تمہیں کلینک لے جائے گا اور مرہم پٹی کروا دے گا۔"

میں نے کہا "وہ لڑکی (ناشا) بھی کافی زخمی ہے۔ میڈم نے اسے درندوں کی طرح مارا ہے۔"

"ہاں اس کی مرہم پٹی بھی کرواتے ہیں۔" پھر وہ ذرا توقف سے بولا "تمہارے لیے ایک خاص خبر بھی ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی خاموش رہا۔ شاید فلمی انداز میں تجسس پیدا کر رہا تھا پھر اس نے کہا "ممکن ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں باس تم سے بات کریں۔"

"بب۔ باس؟" میں نے بے حد حیران ہو کر کہا "کہاں ہیں باس؟"

"باس خود یہاں موجود نہیں ہوتے لیکن ان کی آواز موجود ہوتی ہے۔ ابھی کچھ دیر میں وہ کال کریں گے۔ تم نے اسی کمرے میں رہنا ہے' ادھر ادھر نہیں ہونا۔۔۔ اور ہاں۔ باس لمبی بات پسند نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہیں اس کا مختصر جواب دینا۔ یہ جواب سچا اور درست ہونا چاہیے۔ انہیں کوئی بات دہرانی نہ پڑے۔ ان کی بات خوب غور سے سننا۔"

میں مسلسل اثبات میں سر ہلا رہا تھا پھر میں نے پوچھا "اس جنگلی لڑکی کے بارے میں باس کو کچھ بتانا ہے یا نہیں؟"

وحدت علی نے مجھے کڑی نظروں سے گھورا "ابھی تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ باس سے کچھ چھپانا نہیں' پھر وہی بات شروع کر دی ہے۔"

"اوہو۔ معافی چاہتا ہوں جی۔ میرے دماغ سے نکل گیا تھا۔"

"ابھی تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ باس سے بات کرتے ہوئے دماغ کو ٹھکانے پر رکھنا ہے۔ اگر باس خوش ہو جائیں گے تو دنیا میں جنت کا مزہ پاؤ گے ورنہ جنت بھی جہنم لگے گی۔ تم میں کچھ باتیں ہیں جن کی وجہ سے پاشا گینگ میں تمہارا نام بن سکتا ہے۔ یہ بات میں تم کو دل کی گہرائی سے کہہ رہا ہوں لیکن نام بنانے کے لیے "کام" بھی ضروری ہے۔"

میں نے سعادت مندی سے کہا "میں اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کروں گا جی۔ شاید آپ سوچیں کہ میں وفادار نہیں ہوں' جس طرح میڈم کے خلاف آپ کو بتایا ہے اس طرح آپ کے خلاف کسی اور کو بتا دوں گا۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے جناب! میں میڈم اور نادر رنجی صاحب کے لیے جان بھی قربان کر سکتا تھا۔ میں میڈم سے میڈم کے سلوک کی وجہ سے دور ہوا تھا آپ جانتے ہی ہیں کہ اس نے کس طرح مجھے ایک تجربے کے لیے جانور کی طرح استعمال کیا' اور جب میں اس جان لیوا تجربے سے حیرت انگیز طور پر بچ گیا تو بھی اسے مجھ پر ترس نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ مجھ پر تجربے کا پروگرام بنا لیا۔ شاید وہ میرا کام تمام کر کے ہی چھوڑنا چاہتی تھی۔"

وحدت علی نے تدبّر سے میرا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ وہ غدار تھی اور غدار کا دشمن' دوست ہوتا ہے۔ تم ہمارے دوست اور ساتھی کے طور پر سامنے آئے ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اچھے دنوں کی امید دلا سکتا ہوں۔"

میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت ارسال کی۔ وہ مجھے جس پاشا گینگ کی رکنیت کی نوید سنا رہا تھا ایسے کئی گینگ میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے گزار دیے تھے۔

مجھے باس کی کال کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کر کے وہ باہر چلا گیا۔

میں دیر تک "باس" کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے بارہ بجے' ایک بجا اور پھر دو بج گئے۔ کال نے نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی۔ وحدت علی نے مجھے آ کر بتایا کہ کسی وجہ سے کال نہیں آ سکی' بہرحال پریشانی کی بات نہیں۔ باس جلد ہی مجھ سے بات کریں گے۔

اگلے روز اشرف چیتا سے ملاقات ہوئی۔ ایک بار پھر مجھے اس کے سامنے اپنی ساری روداد دہرانا پڑی۔ اپنے اور ناشا کے اغوا سے لے کر ابھی تک سبھی کچھ چیتا کے گوش گزار کرنا پڑا۔ ایک ذکال ریچھ کے ہاتھوں میڈم کی موت کے واقعے نے اشرف کو بھی بہت متاثر کیا۔ اس نے اس سلسلے میں کئی سوالات بھی پوچھے۔ آخر میں چیتا نے کہا "کچھ خبر ہے تمہیں۔ آج میڈم سے چھٹکارے کا باقاعدہ جشن منایا جا رہا ہے۔"

"کون منا رہا ہے؟"

"وحدت علی صاحب' اور کون؟ دراصل وحدت صاحب اور ڈیوی گہرے دوست بھی تھے۔ ڈیوی کی موت نے وحدت صاحب کو بہت دکھی کیا تھا۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ کل میڈم کی موت سے ڈیوی کو انصاف مل گیا ہے۔"

"کیا ہو گا جشن میں؟"

"وہ سب کچھ جو جشنوں میں ہوتا ہے۔ بہت سے فلمی

چہرے بھی اس ہلے گلے میں شامل ہوں گے۔ بڑی رونق ہو گی۔"

میں نے موضوع بدلتے ہوئے اشرف چیتا سے پوچھا "وہ لڑکی اب کہاں ہے جو میرے ساتھ ہی میڈم کے شکنجے میں آئی تھی؟"

"وہ کوٹھی میں نہیں ہے۔ مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن اندازہ یہی ہے کہ جیلر ملک رفیق صاحب اسے واپس جیل لے گئے ہیں۔ لڑکی کی گمشدگی سے وہ بڑے پریشان ہو گئے تھے۔"

میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ ناشا اب کوٹھی میں نہیں ہے۔ وہ سارا دن اسی طرح ہی گزر گیا۔ میری گردن پھوڑے کی طرح دکھتی رہی۔ رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ ہر ٹیس کے ساتھ میڈم یاد آتی رہی اور اس کا انجام بھی۔ اس کی آخری ہچکی کا منظر ابھی تک میری آنکھوں میں جما ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید وہ زندہ بھی رہتی تو کسی دن خودکشی کر لیتی۔ اس بات کی امید تو کم ہی تھی کہ ابدال جیسے عطائی اسے عورت سے مرد بنا سکتے ہیں اور عورت بن کر زندہ رہنا اسے قبول نہیں تھا۔

رات کو وحدت علی کی اس عالی شان کوٹھی میں واقعی میلے کا سماں تھا۔ اشرف چیتا کی پیش گوئی کے مطابق کئی فلمی پریاں بھی اس ہنگامے میں اپنے جلوے دکھا رہی تھیں۔ ان میں وحدت کی اپنی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ وحدت کی وہ بیٹی جو فلموں میں کام کرتی تھی' اس رنگین محفل میں تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ اس کا نام ارمان تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کس کس کا ارمان تھی۔ وہ جب اٹھلا کر چلتی تھی تو اس کے بدن کا ہر حصہ زبانِ حال سے پکار کر دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ ایک مشہور ہیرو صاحب بھی اس محفل میں نگاہوں کا مرکز تھے۔ وہ جدھر جاتے تھے نگاہیں ان کا تعاقب کرتی تھیں۔ محفل میں شراب کے پیمانے گردش کر رہے تھے اور "باربی کیو" کی مہک تھی۔ رقص و موسیقی کا انتظام بھی یہاں کیا گیا تھا لیکن یہ پروگرام کھانے کے بعد کے تھے۔ میں اور اشرف چیتا اس محفل میں شریک تھے اور نہیں بھی۔ ہم دونوں بالائی منزل پر تھے اور ایک بالکونی سے اس وسیع و عریض ہال کمرے میں جھانک رہے تھے جہاں محفل جمی تھی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی اہم مہمان تشریف لایا ہے۔ اس مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے وحدت علی کی بیٹی ارمان خود لپک کر دروازے کی طرف گئی۔ چند لمحے بعد مہمان اندر داخل ہوا اور مہمانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ اپنا یار زریں گل تھا۔ کم بخت پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ نہایت شان دار شلوار قمیص اور شیروانی۔ پاؤں میں قیمتی جوتی' ہاتھ میں مہنگے سگریٹ کا پیکٹ۔ ایک نوکر مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

وحدت کی بیٹی پروانے کی طرح زریں کے گرد گھوم رہی تھی۔ معروف ہیرو سمیت چند افراد نے آگے بڑھ کر زریں سے مصافحہ کیا اور خوش آمدید کہا۔ وحدت کی بیٹی ارمان بڑی اپنائیت سے زریں کا تعارف دیگر مہمانوں سے کرا رہی تھی۔ زریں گل یوں اکڑا ہوا تھا جیسے اس نے کپڑے کی بجائے لوہے کی شیروانی پہن رکھی ہو۔

ایک دم میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ ٹیلی فون پر اپنی آخری بات چیت میں زریں نے بتایا تھا کہ فلموں کی کوئی نئی نئی ہیروئن اس سے ملی ہے اور اس سے تعلقات بڑھا رہی ہے۔ زریں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ہم سب پر کوئی فلم بنانا چاہ رہی ہے۔ اس فلم کا نام وہ شاید "دبنگے" کے حوالے سے رکھے گی اور اس فلم میں سارا سرمایہ اس کے ابا جان لگائیں گے۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ نئی نئی ہیروئن ارمان ہو اور اس کا "ابا جان" وحدت علی ہو۔

میرا یہ اندازہ آگے چل کر بالکل درست ثابت ہوا۔ فی الحال تو میں زریں گل کے ٹھیکے دیکھ رہا تھا۔ وہ یوں اترایا پھرتا تھا جیسے کوئی بادشاہ اپنے محل کی چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ ارمان نے نہایت ہیجان خیز لباس پہن رکھا تھا اور وہ بدستور زریں گل کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

میں نے اشرف چیتا سے پوچھا "یہ شیروانی والا پٹھان کون ہے؟"

چیتا بولا "سنا ہے کہ سرحد کا کوئی امیرزادہ ہے۔ فلمی لائن میں دلچسپی رکھتا ہے۔ آج کل وحدت صاحب کی بیٹی اس پر بہت مہربان ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی مہنگی فلم بنانے کا چکر چل رہا ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس بندے کو کہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ آؤ کچھ موج میلہ کریں۔"

"کیا مطلب؟"

چیتے نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا "آج کوٹھی میں کافی مال آیا ہوا ہے۔ ایک ایک دانہ ہم بھی پسند کر لیتے ہیں۔ ادھر کمرے میں دس بارہ لڑکیاں میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔"

"کیا کرو گے لڑکیوں کا؟"

"پاگل خانے' لڑکیوں کے بغیر جشن کا خاک مزہ آئے گا۔ چل آ میرے ساتھ۔" وہ میرا بازو کھینچتا ہوا ایک طرف لے چلا۔ نشے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو اٹھ رہی تھی۔ ہم کمرے میں پہنچے تو وہاں واجبی سی شکل والی بس تین لڑکیاں تھیں۔ ایک بہت دبلی تھی' ایک سانولے رنگ کی تھی۔ اشرف نے کہا "وحدت تیرے کی۔ تم بالکل بے کار بندے ہو۔ خواہ مخواہ بحث میں وقت ضائع کیا۔ یار لوگ سارا ستھرا مال لے گئے' باقی یہ چھان بورا رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "چل پھر چھوڑ اس چھان بورے کو پھر کبھی سہی۔"

"او نہیں یار! کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا چنگا ہے۔ بلکہ بہت چنگا ہے۔"

اس نے ایک لڑکی کا ہاتھ تھام کر بغل میں دبایا اور لہراتا ہوا واپس چل دیا۔ لڑکی نے چست پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے پائیں بنگے تھے اور گہرے رنگ کے قالین پر کچھ زیادہ ہی سفید نظر آ رہے تھے۔ غالباً وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنی مجبوریوں کے تحت فلم یا ٹی وی کا رخ کرتی ہیں ان کے ذہن میں ہوتا ہے کہ وہ خوب صورت ہیں' فن کارانہ صلاحیتیں رکھتی ہیں لیکن جب وہ شوبز کی چکاچوند میں پہنچتی ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک خوب رو اور باصلاحیت بھرا ہوا ہے بھرا نہیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہاں صلاحیت کی نہیں خوب روئی کی قدر ہے اور خوب روئی بھی شخصیت کی نہیں صرف جسم کی۔ یہاں ان کے جسم سے کھیلا جاتا ہے اور بیگار کے طور پر فلم کے دو چار سین یا چند خوب صورت وعدے ان کی مٹھی میں تھما دیے جاتے ہیں پھر دھیرے دھیرے وہ اسی رنگ میں رنگی جاتی ہیں۔ وہ دو چار "سینوں" یا چند ٹھمکوں والی ایکسٹرا گرل بن کر اپنی جوانی گزار دیتی ہیں۔ اشرف چیتا جسے اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا وہ بھی کوئی ایسی ہی ثانوی اداکارہ تھی۔ چار پانچ دن میں ہی چیتا اس کوٹھی کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک راہداری میں پہنچا۔ یہاں دونوں طرف بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک دو کمروں کے اندر سے مجھے نسوانی ہنسی اور چھیڑ چھاڑ کی آوازیں بھی آئیں۔ چیتا لڑکی کو لے کر شتابی سے ایک کمرے میں گھس گیا۔ اس نے مجھ سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ تم کہاں جا رہے ہو؟

نیچے فنکشن ہال میں خوب شور و غل ہو رہا تھا۔ ایک فلمی کامیڈین حاضرین کو ہنسانے کے لیے لطیفے سنا رہا تھا اور معروف لوگوں کی نقلیں اتار رہا تھا۔ فلمی ہیروئنیں آواز سے آواز ملا کر اسے داد دے رہی تھیں۔ بدمست قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ تقریب اصل میں کس وجہ سے برپا ہے۔ ان کے خیال میں یہ تقریب اس لیے کی گئی تھی کہ وحدت علی کی سابقہ فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی تھی۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ اس تقریب کا مقصد ایک خطرناک دشمن کی موت کو CELEBRATE کرنا ہے۔

میں نے طویل گیلری نما بالکل بالکونی سے نیچے ہال کمرے میں جھانکا۔ حاضرین ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ ایک لڑکی میزوں کے اردگرد رقص کرنے لگی تھی۔ میں نے زرتین کو تلاش کیا۔ وہ کسی عربی رئیس کی طرح بڑی شان سے صوفے پر براجمان تھا۔ وحدت علی کی بیٹی بدستور اس سے چپکی ہوئی تھی۔ میرا دل زرتین گل سے بات کرنے کو مچل رہا تھا لیکن موجودہ صورت حال میں یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس "ہنود لتے" کو دو چار گالیاں دیں اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

اچانک میں نے وحدت کو دیکھا وہ بڑی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ میرے قریب آتے ہی وہ بولا "چلو آؤ جہاں دار! باس تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

وہ مجھے لے کر واپس ہوا۔ ہم قالین پوش راہداری میں تقریباً دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ پلائی وڈ کا ایک بڑا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہاں قریباً ایک درجن افراد موجود تھے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کی صورتوں ہی سے نظر آتا تھا کہ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ سب پاشا گینگ کے رکن تھے۔ ان میں سے کچھ سینئر تھے اور کچھ جونیئر کسی وقت میڈم شہرزاد اور ڈیوی وغیرہ بھی ان کے ساتھ بیٹھتے ہوں گے لیکن اب وہ دونوں نہیں "ارر" بیٹھے تھے۔ ایک بڑا سا مواصلاتی آلہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ یہ دراصل ایک ٹیلی فون تھا۔ اس کی آواز اتنی بڑھائی جا سکتی تھی کہ پورے کمرے میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ دو گارڈ دروازے کے قریب بالکل چوکس کھڑے تھے۔ وحدت نے مجھے مائیک کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ مائیک کے قریب جھک کر بولا "جہاں دار حاضر ہے سر۔" اس کے ساتھ ہی وحدت نے مجھے اشارہ کیا کہ میں مائیک میں بولوں۔ میں نے کہا "میں جہاں دار ہوں جناب عالی۔"

"ہیلو جہاں داد۔" ایک پاٹ دار آواز ابھری "میں تمہاری کارکردگی سے خوش ہوں۔ تم نے ایک باغی کو انجام تک پہنچانے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں ایسے ہی جرأت مند اور باحوصلہ افراد کی ضرورت ہے۔"

"میں۔ کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں جناب.... میں تو کسی قابل ہی نہیں ہوں۔"

اس کے بعد باس نے مجھ سے اس واقعے کے بارے میں چند ایک سوالات پوچھے جو ٹاؤن شپ کی کوٹھی میں پیش آیا تھا اور جہاں میڈم شہرزاد اپنے ہی پالتو جانور کے ہاتھوں لرزہ خیز موت کا شکار ہوئی تھی۔ میں نے وحدت کی ہدایت کے مطابق ٹھیک ٹھیک اور مختصر جواب دیے۔ باس نے مجھ سے زہریلے سانپوں کے حوالے سے بھی بات کی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا واقعی کسی قسم کا زہر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ میں نے باس کی بات کا جواب اثبات میں دیا اور اس بارے میں وہ کچھ بتایا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ باس نے مجھ سے بات ختم کر لی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وحدت علی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے کہا کہ اب میں باہر جا سکتا ہوں۔

میں اس ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی اہم نوعیت کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ ممکن تھا کہ اس میٹنگ کا تعلق اسی سازش سے ہو جس کا مقصد بھائی جی کی جان لینا تھا۔ اب الیکشن مہم زوروں پر تھی۔ جذبات ابھرے ہوئے تھے۔ ایسے میں خدانخواستہ بھائی جی جیسی شخصیت کا قتل ہو جاتا تو ایک آگ بھڑک اٹھتی۔ اس آگ پر قابو پانا کسی کے بس میں نہ رہتا۔ تخریب کار جو مقصد درجنوں بم دھماکوں اور دیگر کارروائیوں کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے تھے وہ اس ایک قتل کے ذریعے کر سکتے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد کمرے میں ہونے والی میٹنگ برخاست ہو گئی۔ پاشا گینگ کے لوگوں میں سے کچھ گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے اور کچھ رنگا رنگ تقریب میں شامل ہو گئے۔ دس منٹ کے بعد کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ یہ ایک پرتکلف ضیافت تھی۔ درجنوں ڈشوں کی خوشبو فضا میں چکرا رہی تھی اور بیرے گردش کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد موسیقی کا شاندار پروگرام تھا۔ وہاں طویل گیلری میں ہی ایک آرام دہ صوفہ پڑا تھا' میں وہاں نیم دراز ہو گیا۔ انیس بی جان گا رہا تھا۔ محبت کے دم سے یہ دنیا حسین ہے۔ محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

شاید واقعی اس دنیا کا حسن محبت اور پیار کے دم سے تھا۔ میری نگاہوں میں غزالہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس کی صورت دیکھنے کو آج دل بری طرح مچل رہا تھا۔ ایسی لہر کبھی کبھار ہی دل میں اٹھتی تھی لیکن جب اٹھتی تھی بہت شدید ہوتی تھی۔ آج وہ بے طرح یاد آ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ' اس کی نگاہیں' اس کے ہونٹ' رخسار' شفاف گردن اور گردن پر کندھے سے ذرا اوپر ایک تل۔ جی چاہا وہ پاس ہو اور اس سے باندھے ہوئے عہد و پیمان کو ایک طرف رکھ کر کم از کم ایک بار تو اسے گلے لگا ہی لوں پھر اس کے کان میں جذباتی سرگوشی کرتے ہوئے پوچھوں "اے ستم گر ستم کی اس رات کے اور کتنے پہر باقی ہیں۔"

غزالہ کو سوچتے سوچتے اس کے تصور کو ذہن میں سجاتے سجاتے میں وہیں صوفے پر سو گیا۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی شب کے تین بجے ہوئے تھے۔ اشرف چیتا میرے سرہانے کھڑا تھا۔ پنجابی لہجے میں اردو بولتے کہنے لگا "اوئے جگر! تم تو ایسے سوئے پڑے ہو جیسے درد کی گولیاں چڑھائی ہوئی ہیں۔"

اندھیر نگری
محی الدین نواب
چار حصے
قیمت فی حصہ 150 روپے

سنہری جونک
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس عہد
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

مقدس نشان
ایم اے راحت
قیمت 90 روپے

راکھشس
ایک پراسرار اور خوفناک ناول
ساحر جمیل سید
قیمت 125 روپے

راکھ
ایک خوفناک ناول
وجیہہ سحر
قیمت 100 روپے

"بس سونگھ سونگھ کر ہی نشہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔
میں نے گیلری سے نیچے جھانکا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی۔ تاہم ہال کمرے کے ایک گوشے میں چار پانچ افراد قیمتی صوفوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے شیشے کی تپائی پر دو بوتلیں رکھی تھیں اور ہاتھوں میں پیمانے چمک رہے تھے۔ ایک خوب صورت تتلی بڑی ادا سے ان کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ اس نے کمان کی طرح جھک کر وحدت کا پیمانہ بھرا اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں نے چیتا سے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولا "آج کی رات بڑی خاص ہے جگر! کل کے لیے لمبا ہی پروگرام بن رہا ہے۔ بلکہ سمجھو بن چکا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیسا پروگرام؟"

"بھائی جی کا پروگرام!" اس نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ آنکھ دبانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ہاتھ کی خیالی چھری اپنی گردن پر چلائی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ بھائی کا کام تمام ہو رہا ہے؟"

"سمجھو ہو ہی گیا ہے اور صرف بھائی ہی نہیں' دس پندرہ بڑے بڑے اور بہج بھی اٹھیں گے۔ تڑتھلی مچ جائے گی شہزادے۔"

"کیا کوئی جلسہ وغیرہ اڑانے کا پروگرام ہے؟"

"جلسوں میں تو تیرے میرے جیسے عام بندے ہی پھڑکتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی اور چکر ہے۔ بڑے بڑے موٹے بکرے ذبح ہوں گے۔"

"یعنی ٹھیک سے تجھے بھی پتا نہیں ہے۔"

"ٹھیک سے یہ پتا ہے کہ کل بھائی جی والا کام ہو جانا ہے۔ یہ نیچے جو گل بات ہو رہی ہے یہ اسی سلسلے میں ہے۔"

اشرف چیتا' میرے قریب ہی صوفے پر پھیل گیا۔ اس کا نشہ اتر چکا تھا اور وہ کچھ تھکا تھکا سا بھی نظر آ رہا تھا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے جو اس نے بند کمرے میں گزارے تھے غالباً انہوں نے اسے تھکا دیا تھا۔

میں نے پوچھا "کل جو پروگرام ہے اس میں ہم بھی شریک ہوں گے یا ہمیں گھر میں ہی بیٹھنا ہو گا۔"

وہ بولا "تم شاید گھر میں ہی رہو گے۔ میرے اندازے کے مطابق وحدت صاحب تمہیں ابھی اس چار دیواری سے باہر نہیں نکالنا چاہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میڈم اور اس کے کارندے تازے تازے قتل ہوئے ہیں۔ ہاں مجھ کو شاید کوئی ڈیوٹی دے دی جائے۔"

میری نظریں بدستور نیچے ہال کمرے میں جمی ہوئی تھیں۔ وحدت نے اپنے سامنے ایک سفید کاغذ پھیلا رکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی اور مونچھوں والا ایک شخص اس کاغذ پر جھکا ہوا لکیریں کھینچ رہا تھا' ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کو کچھ سمجھا بھی رہا تھا۔ اس نے پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر ہلکے رنگ والا چشمہ تھا۔ وہ بڑے اعتماد انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کے گرد بیٹھے افراد اس کی شخصیت سے بے حد متاثر نظر آتے تھے۔ میں نے اشرف چیتا سے پوچھا "یہ نیلی جیکٹ والا بندہ کون ہے؟"

وہ بولا "سمجھو کل جو برات چڑھے گی یہ اس کا لاڑا (دلہا) ہے۔ اسی کا نام اروش ہے۔ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے تم خود سوچو' وحدت صاحب جیسے بندے جس شخص کو کسی کام کے لیے لمبی رقم دیں وہ کیا شے ہو گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ بندہ وحدت صاحب کے لیے کرائے پر کام کر رہا ہے۔"

"میری اطلاع تو یہی ہے۔"

میں نے نیچے ہال کمرے میں نگاہیں جما دیں۔ گول میز کے گرد بیٹھے افراد میں وہ سب سے ممتاز نظر آ رہا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کے سر کے سفیدی مائل بال چمک رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کرخت صورت بندے کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ اور کب! یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ تاہم ذہن میں کچھ ناخوشگوار اور سنسنی خیز تاثرات ابھر رہے تھے۔

گفتگو کے دوران میں ہی سفیدی مائل بالوں والا اروش اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کی طرف گیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی۔ اچانک میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں سکتے میں رہ گیا۔ آنکھیں سکوڑ کر میں نے ایک بار پھر دھیان سے اس شخص کو دیکھا۔ انہی لمحات میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سفیدی مائل بالوں والا خوب صورت "تتلی" پر جھپٹا۔ پلک جھپکتے میں اس نے لڑکی کو نیچے فرش پر گرا دیا پھر اس کا ہاتھ لڑکی کے گریبان پر آیا۔ لڑکی کی چیخ اور سلک کی قمیص پھٹنے کی آواز ایک ساتھ ابھری۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ شاید اس نے نشے کی وجہ سے ایسا کیا ہے' لیکن ایسی بات نہیں تھی' سفیدی مائل بالوں والا نشے کی حالت میں بھی ہوش مندوں سے بڑھ کر ہوش مند تھا۔ گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تمام افراد اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔

سفیدی مائل بالوں والا لڑکی کو پچھاڑ کر اس کے اوپر بیٹھا تھا۔ لڑکی کا گریبان دور تک پھٹ گیا تھا اور اس کی آنکھیں بھی خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ سفیدی مائل بالوں والے نے لڑکی کے لباس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی۔ میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ یقیناً کوئی مخصوص ٹائپ کی ٹاکی تھا۔

سفیدی مائل بالوں والے نے بڑی پھرتی سے ہاتھ تھما کر لڑکی کے باقی لباس کی بھی تلاشی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی میں جیسے اٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ سکتے کی حالت میں فرش پر پڑی تھی۔ وحدت کے کہنے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تھر تھر کانپتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

میں اور چیتا طویل گیلری میں کھڑے تھے اور نیچے ہال نما کمرے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ سفیدی مائل بالوں والے نے لڑکی کے لباس سے واکی ٹاکی برآمد کر لیا تھا اور اب برہم نظر آتا تھا۔ تاہم اس کی یہ برہمی اگلے ایک دو منٹ میں ختم ہوئی۔ وحدت علی نے بڑے دھیمے انداز میں اسے سمجھایا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' لڑکی کے لباس میں موجود واکی ٹاکی وحدت علی نے خود ہی اسے دیا تھا۔ لڑکی کی غلطی بس یہ تھی کہ وہ اس اہم میٹنگ میں یہ واکی ٹاکی لے کر آ گئی تھی۔

وحدت علی نے لڑکی کو سرزنش کرنے کے بعد واکی ٹاکی اپنے پاس رکھ لیا۔ لڑکی اپنا لباس تبدیل کرنے کے لیے ہال نما کمرے سے باہر چلی گئی۔

میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ نگاہیں سفیدی مائل بالوں والے اروش پر مرکوز تھیں۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی اور مونچھوں والا جو شخص نیچے ہال کمرے میں موجود تھا اور جس نے ابھی لڑکی کو گرایا تھا۔ اروش نہیں تھا۔ وہ شنکر شنکرا تھا۔ میں اپنے اس دشمن کو ہزاروں افراد کے ہجوم سے بھی پہچان سکتا تھا۔ اسی طرح میں اس کی آواز کو بھی سیکڑوں آوازوں میں سے شناخت کر سکتا تھا۔ شنکر نے اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کر رکھی تھی لیکن یہ تبدیلی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس کی شناخت ہی مشکل ہو جاتی۔ ڈاڑھی مونچھ تو اصلی ہی نظر آتی تھی۔ بالوں کو رنگا گیا تھا۔ جلد کی رنگت بھی کچھ چینج نظر آ رہی تھی۔

شنکر کو یہاں دیکھ کر میرا حیران ہونا ایک قدرتی عمل تھا۔ شنکر سے آخری ملاقات (یا مکالمات) راہ والی گاؤں کے قریب ایک میلے میں ہوئی تھی۔ ایک زوردار مقابلے کے بعد میں نے شنکر کی ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ خراماں خراماں جہنم جا پہنچا تھا۔ پچھلے دو تین مہینوں میں مجھے اس کی کچھ خبر نہیں ملی تھی۔ آج وہ یہاں اس ہال نما کمرے میں فلم ساز وحدت علی کی عظیم الشان کوٹھی میں موجود تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے مجھے اشرف چیتا نے بتایا تھا کہ معروف سیاسی لیڈر بھائی جی کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام فائنل ہو چکا ہے۔ اس پروگرام کے مطابق کل کا دن بھائی جی کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔

اس سے پہلے بھی دو مرتبہ بھائی جی کو ٹھکانے لگانے کا پروگرام ترتیب دیا جا چکا تھا۔ ایک مرتبہ یہ پروگرام میڈم اور ڈیوی نے مشترکہ طور پر ترتیب دیا تھا' دوسری مرتبہ تنہا ڈیوی نے پلاننگ کی تھی۔ مشترکہ پروگرام اس لیے ناکام ہوا تھا کہ میں نے وہ ایمونیشن ضائع کر دیا تھا جو بھائی جی اور ان کے ساتھیوں کو دھماکے سے اڑانے کے لیے استعمال ہونا تھا۔ دوسری مرتبہ ڈیوی اور میڈم میں ٹھن گئی تھی۔ عین موقعے پر شروع ہونے والی اس سنگین کشمکش کے نتیجے میں ڈیوی ہلاک ہو گیا تھا اور میڈم' باس سے خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی۔

لیکن اب جو پروگرام بنا تھا یہ کسی عام مجرم کا نہیں جرائم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ شنکر شنکرا کا بنایا ہوا تھا اور میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ بھائی جی کی زندگی کتنے خطرے میں ہے۔ شنکر جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جنہیں "ایول جینیئس" کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ جرم کو سائنس بنا دیتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شنکر کی عیاری اکثر مجھے اندر سے ہلا دیتی تھی۔ جب بھی اس بدبخت سے سامنا ہوتا تھا مجھے اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں ہر طرف سے سمیٹ کر ایک جگہ مرکوز کرنا پڑتی تھیں' اس کے باوجود یہ اندیشہ رہتا تھا کہ میری ذرا سی غفلت شیطان ابن شیطان کو سنہری موقع فراہم کر دے گی۔ میری کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی ہو رہی تھی' میرے دل کے اندر سے آواز آ رہی تھی کہ کوئی انہونی ہی بھائی جی کو۔۔۔ اور امن و امان کی صورت حال کو بچا پائے گی۔

اب یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ شنکر یہاں کیونکر اور کیسے پہنچا ہے۔ بس اتنا جان لینا ہی کافی تھا کہ وہ ایک ماہر قاتل کے طور پر یہاں موجود ہے اور وہاشائیگ نے اسے بھائی جی کی جان کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ ایک طرح سے یہ بھائی جی کی جان کی قیمت نہیں تھی یہ ملک کے امن و امان کی قیمت بھی تھی۔ کل اگر بھائی جی مارا جاتا تو ایک قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ ساڑھے چار بج چکے تھے۔ اب ڈیڑھ دو گھنٹے میں اجالا ہونے والا تھا۔ اور یہ

اجالا اپنے ساتھ بہت سی تاریکی بھی لا رہا تھا۔

میں ساہی صاحب سمیت دیگر لوگوں کو بھائی جی کی سیکیورٹی کی طرف سے تین چار بار خبردار کر چکا تھا۔ میری کوشش کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا تھا۔ بھائی جی کی حفاظت کے بہترین انتظامات کیے گئے تھے۔ تاہم یہ پندرہ بیس روز پہلے کی بات تھی۔ حفاظت کے انتظام کتنے بھی سخت ہوں چند دن یا دو چار ہفتے گزر جانے کے بعد ان میں نرمی آجاتی ہے۔ یقینی بات تھی کہ بھائی جی کی سیکیورٹی بھی خود بخود نرم ہو چکی ہوگی اور اگر نرم نہیں تھی تو بھی یہ وقت مطمئن ہو کر بیٹھنے کا نہیں تھا۔ شنکر شکرا میدان میں تھا۔ اس نے بھائی جی کی سپاری اٹھائی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی سپاری نہیں تھی۔ یہ سپاری اس شخص نے اٹھائی تھی جو پانی پر لکیر کھینچتا تھا تو وہ بھی پتھر کی لکیر کی طرح انمٹ ہوتی تھی۔

اس کوٹھی میں تین ٹیلی فون لائنیں موجود تھیں۔ میں ٹیلی فون کے ذریعے ساہی صاحب سے رابطہ کر سکتا تھا مگر اس میں خطرات پوشیدہ تھے۔ کوئی مجھے فون کرتے دیکھ سکتا تھا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ فون کہیں اور سن لیا جائے۔ کئی امکانات تھے۔ بہتر یہی تھا کہ میں ایک دو گھنٹے کے اندر یہاں سے نکلوں اور باہر کسی جگہ سے ساہی صاحب کو فون کروں۔ انہیں بتاؤں کہ آج کا دن بھائی جی پر بہت بھاری ہے۔

کوٹھی میں وحدت کے سات آٹھ کارندوں کے علاوہ پانچ کے قریب ملازم بھی موجود تھے۔ باقی لوگ رنگا رنگ فنکشن کے بعد ایک دو بجے چلے گئے تھے۔ فنکشن میں اچھی خاصی عیاشی کی گئی تھی۔ بظاہر تو یہ فنکشن وحدت کی ایک قسم کی نمایاں کامیابی کی خوشی میں کیا گیا تھا لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ میڈم کی موت کی خوشی تھی۔ میڈم کے مرنے سے وحدت علی کو اپنے ایک بڑے دشمن سے چھٹکارا ملا تھا۔ اس فنکشن میں شراب پانی کی طرح بہائی گئی تھی اور انگور کی بیٹی کے ساتھ ساتھ انسان کی بیٹی سے بھی دل بہلایا گیا تھا۔ اشرف چیتا بھی ایک ایسی ہی بیٹی کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے مصروف رہا تھا اور اب کافی تھکا ہوا تھا۔ وہ سونے کے لیے چلا گیا۔ میں یونہی ادھر ادھر چکراتا رہا اور اجالے کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیرا چھٹنے کے بعد ہی میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔

نیچے ہال کمرے میں ہونے والی میٹنگ اب ختم ہو چکی تھی اور فضا میں ایک پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شنکر سمیت سب لوگ کوٹھی میں ہی موجود تھے۔ میرے لیے یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا کہ میرا بدترین دشمن اسی چھت کے نیچے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر موجود ہے۔ شنکر کے یہاں موجود ہونے سے میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ میں یہاں پاشا گینگ میں ایک عام کارندے جہاں داد کی حیثیت سے موجود تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک ایک بندے کے سوا یہاں کسی نے مجھے شاہ جہاں کے طور پر پہچانا نہیں تھا۔ اس ایک بندے کا سدباب میں نے روجھا پور میں بڑے اچھے طریقے سے کر دیا تھا۔ اب میرے ہوٹل کے اسسٹنٹ سمیت وہ بدمعاش ساہی صاحب کی حراست میں تھا لیکن اب شنکر شکرا کی عقابی نگاہ سے بچنا محال تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر میں وحدت کے کارندے کی حیثیت سے یہاں موجود رہوں گا تو شنکر کی نگاہ میں ضرور آؤں گا اور اس کے ساتھ ہی میرا وہ بہروپ ختم ہو جائے گا جو میں نے کئی ماہ سے بمشکل بچا رکھا ہے۔

ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ میں نے بیرونی گیٹ کا رخ کیا۔ مسلح گارڈ نے پوچھا "کیا بات ہے۔ کہاں جا رہے ہو۔"

"سگریٹ ختم ہو گئے ہیں یار! بڑی مشکل میں ہوں۔ ابھی آجاتا ہوں۔"

"چوہدری صاحب کا حکم ہے۔ کوئی باہر نہیں جا سکتا۔"

چوہدری سے اس کی مراد "وحدت علی" تھی۔

"لیکن کیوں؟"

"یہ ام کو نہیں مالوم!" پٹھان گارڈ نے بے رخی سے کہا۔

تب میں نے دیکھا کہ کوٹھی کی ایک ملازمہ بھی باہر جانے کے لیے دوسرے گارڈ کی منت سماجت کر رہی تھی۔ اس کی گود میں بچہ تھا اور اسے الٹیاں آرہی تھیں۔ وہ بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہی تھی۔ اتنے میں ایک اور مسلح شخص وہاں پہنچ گیا۔ اس بندے کو میں نے پہلے اس کوٹھی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل نور رائفل تھی اور اس نے انگلی باقاعدہ لبلبی پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ گرج کر بولا "واپس جاؤ۔ چوہدری صاحب کا آرڈر ہے کوٹھی سے کوئی باہر جا سکتا ہے اور نہ اندر آسکتا ہے۔"

ڈبل نور والے کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ پھر گرجا "میں نے کہہ دیا ہے نا کہ واپس جاؤ۔ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن۔۔۔"

"اگر کچھ کہنا ہے تو چوہدری صاحب سے کہو۔ چلو ہٹو یہاں سے۔"

گیٹ پر موجود جسیم کتے بھی خوفناک آوازوں میں غرانے لگے تھے۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ کوٹھی سخت پہرے میں ہے۔ کوئی یہاں سے جا سکتا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ کوٹھی کے عقبی گیٹ کے قریب بھی دو مسلح گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ باؤنڈری وال کے ساتھ بھی ایک شخص رائفل تھامے مستعدی سے ٹہل رہا تھا۔

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ یہ احتیاطی تدابیر شنکر کی ہدایت پر اختیار کی گئی ہیں۔ وہ ایک نمبر کا خرانٹ شخص تھا۔ اس سے ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں بالائی منزل پر واپس آگیا۔ میں نے اشرف چیتا کو جگا کر بتایا کہ کوٹھی کی مکمل ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔

وہ بولا "مجھے رات کو ہی پتا چل گیا تھا۔ دراصل اروش صاحب کو شک ہے کہ ہمارے اندر سے ہی کوئی ہے جو ہمارے منصوبے کی مخبری کر دیتا ہے۔ اس مخبری کی وجہ سے پولیس ہوشیار ہو جاتی ہے اور بھائی جی صاف بچ جاتا ہے۔ اس مرتبہ اس مخبری کا انتظام کیا گیا ہے۔ اروش صاحب نے کہا ہے کہ "کام" ہو جانے تک کوئی یہاں سے آجا نہیں سکے گا۔"

میرا ذہن پیچ کر رہ گیا۔ میرا شک درست ثابت ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور شک گزرا۔ عین ممکن تھا کہ کوٹھی کے فون بھی ڈیڈ کروا دیے گئے ہوں۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟" اشرف چیتا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ اروش کافی ہوشیار بندہ لگتا ہے۔ واقعی اگر مخبری ہو رہی ہے تو پھر اس مخبری کو روکنے کا یہ بہترین طریقہ ہے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مخبری کر کون رہا ہے؟"

"تم کر رہے ہو اور کون کر رہا ہے۔" اشرف چیتا نے کہا۔

"م۔۔۔ میں کر رہا ہوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ دماغ سنسنا اٹھا تھا۔

چیتا نے قہقہہ لگایا اور بولا "یار! تیرے میرے جیسوں پر ہی شک جو بنتا ہے۔ چھوٹے کارندے جو ہوئے ہم۔"

چیتے کے منہ سے ابھی تک شراب کی بو آرہی تھی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ باتھ روم میں گیا تو میں فون چیک کرنے کے لیے کامن روم میں آگیا۔ یہاں ایک ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہو گیا۔ فون بالکل ڈیڈ پڑا تھا۔

ایک ٹیلی فون سیٹ ٹی وی لاؤنج میں بھی موجود تھا۔ میں لاؤنج میں پہنچا۔ یہاں صوفوں پر پاشا گینگ کے دو کارندے

مدہوش سو رہے تھے۔ ان کے قریب ہی پھولوں کے ٹوٹے ہوئے گجرے پڑے تھے، ایک لیڈیز رومال میز پر پڑا تھا۔ شراب کباب سمیت عیاشی کے تمام لوازمات ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ لاؤنج کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ رات کو جشن کے دوران میں گینگ کے کچھ کارندے اس لاؤنج کو بیڈ روم کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان کی عیاشی کا ساتھ دینے کے لیے یقیناً کئی ایکسٹرا گرلز اور معاون اداکارائیں بھی یہاں موجود تھیں۔ تاہم اب یہاں دو مدہوش کارندوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے فون سیٹ کا ریسیور اٹھایا۔ اس ریسیور پر بھی قبرستان کی سی خاموشی تھی۔

اشرف چیتا مجھے آوازیں دیتا ہوا آرہا تھا۔ میں نے جلدی سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اشرف چیتا مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگا "کیا بات ہے جہاں داد! کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔"

"بس یونہی۔۔۔"

"میرا خیال ہے کہ آج کا دن ہے ہی پریشانی والا۔ ہر بندہ ٹینشن میں ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟ اصل نتیجے کا پتا تو دو ڈھائی بجے کے قریب چلے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا اندازہ کہتا ہے کہ بھائی جی والا "کام" دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان ہوتا ہے۔"

"میری پریشانی کی وجہ کچھ اور بھی ہے چیتا بھائی۔"

"وہ کیا؟"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "چیتا بھائی! اب تم سے کیا چھپانا۔ رحیم یار خاں میں ایک کڑی سے میرا ملنا جلنا تھا۔ ڈھائی تین سال تک ہمارا زبردست ٹانکا رہا ہے پھر وہ کڑی اپنے ماں پیو کے ساتھ ایک دم رحیم یار خاں سے چلی گئی۔ میں کئی مہینے اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ نہ ملی پچھلے ہفتے کوئی ایک سال بعد میں نے اسے یہاں انارکلی میں دیکھا۔ اس سے تھوڑی سی بات بھی ہوئی۔ اس نے آج دس بجے بانو بازار میں ملنے کا ٹائم دیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ادھر سے نکلوں گا اور اس سے مل کر آجاؤں گا۔۔۔ پر ادھر تو معاملہ ہی اور ہو گیا ہے۔ چوہدری صاحب نے گیٹ ہی بند کروا دیے ہیں۔"

چیتے نے کہا "گیٹ تو واقعی بند ہیں اور مجھ کو لگتا ہے کہ دو ڈھائی بجے سے پہلے کھلیں گے بھی نہیں۔ چل یار! مجبوری ہے پھر کسی دن ملاقات کر لینا۔"

"لیکن چیتا بھائی! میں تو اس کا اتا پتا بھی نہیں لے سکا تھا۔ اگر آج اس سے نہ ملا تو ہو سکتا ہے وہ نظر ہی نہ آئے پھر۔"

"اب بتا میں کیا کر سکتا ہوں۔ چوری چھپے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو گے تو فوراً پکڑے جاؤ گے۔ اروش صاحب نے بڑی سخت نگرانی کروائی ہوئی ہے۔ ویسے نہیں ایک بات اور بتا دوں۔ زیادہ اڑاریاں مارنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا اس چار دیواری کے اندر رہنا ہی بہتر ہے۔ میڈم کی موت کے بعد تمہارے لیے لاہور میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ تم نے میڈم کی مخبری بھی کی تھی اور میڈم کے یار دوست اس بات کو اتنی جلدی بھولیں گے نہیں۔"

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میری بے چینی حقیقی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مجھے ساہی صاحب سے رابطہ کرنا تھا تاکہ انہیں ایک شدید خطرے سے آگاہ کر سکوں۔ میرے خرانٹ مدِمقابل نے رابطے کے سارے راستے بند کر دیے تھے۔

میں نے چور نظروں سے وال کلاک کی طرف دیکھا نو بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ میں نے سوچا' بھائی جی ناشتا کر رہا ہو گا یا کر چکا ہو گا۔ اس کا "پروگرام سیکرٹری" آج کی معروفیات کو حتمی شکل دے رہا ہو گا۔ کتنے بجے کہاں جانا ہے' کس سے ملنا ہے' کتنی دیر ملنا ہے۔ ملاقات کا کیا ایجنڈا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بھائی جی کے آج کے ملاقاتیوں میں دوپہر کے وقت ایک غیر متوقع ملاقاتی بھی تشریف لا سکتا ہے۔ جس کا نام عزرائیل ہے۔ اسے اپائنٹمنٹ کے بغیر آنا ہے اور اسے روکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہو گی۔ اس کی گفتگو کا ایجنڈا بھی بہت مختصر ہوتا ہے "چلو بھئی! تمہارا وقت پورا ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں' کوئی عذر نہیں' کوئی بہانا نہیں' بس اٹھو۔ باقی باتیں وہاں جا کر ہوں گی۔"

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میری بے چینی بڑھتی گئی۔ میں دل ہی دل میں شنکر کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ میں نے یہ اندازہ بخوبی لگا لیا تھا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں ہے۔ اگر میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں تو پھر مجھے شدید خطرہ مول لینا ہو گا۔ خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ شنکر میرے ساتھ ہی اس چھت کے نیچے موجود تھا۔ میرا اور اس کا سامنا کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔ جس گھڑی شنکر سے میرا سامنا ہوتا' اسی گھڑی وہ بہروپ بھی ختم ہو جاتا جس میں میں نے چار مہینے میں بڑی مشکل سے رنگ بھرے تھے۔

کوٹھی کے اندر پراسرار سرگرمی جاری تھی۔ دس بجے کے قریب میں نے نیچے ہال کمرے میں وحدت علی اور ملک رفیق کو دیکھا۔ وحدت علی کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد اروش یعنی شنکر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ نمایاں تھی۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کا چھوٹا سا وائی ٹاکی تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ شنکر کی جیکٹ کی ایک جیب پسٹل کے بوجھ سے بھاری تھی۔ شنکر کے چہرے پر بھی ٹینشن موجود تھی۔ وہی ٹینشن جو کوئی بھی اہم کام انجام دینے سے پہلے ذمے دار افراد کے چہرے پر نظر آتی ہے۔ وہ خوب صورت تتلی بھی وہاں موجود تھی جسے کل رات فرش پر گرا کر شنکر نے اس کا لباس پھاڑ دیا تھا۔ آج وہ پتلون اور جرسی میں نظر آ رہی تھی۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ میری بے چینی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ مجھے ہر صورت یہاں سے نکلنا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ کوٹھی کے عقب میں باغیچہ تھا اور چند تناور درخت بھی موجود تھے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کہ چھت پر سے باہر جانے کی کوئی سبیل نظر آ جائے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچا اور دانت پیس کر رہ گیا۔ وہاں بھی دو مسلح گارڈز کرسیوں پر بیٹھے تھے اور چلغوزے کھا رہے تھے۔ میں سٹپٹایا ہوا نیچے آ گیا۔ پورچ میں ٹازیٹ تینوں والی دو اسٹیشن ویگن موجود تھیں۔ ان میں میرے سامنے چند بیگ لادے گئے۔ یہ لمبوترے بیگ تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ ان میں اسلحہ وغیرہ ہو گا۔

میرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے یہاں سے نکل کر ساہی صاحب سے رابطہ کروں۔ دوسرا یہ کہ اپنا بہروپ بچاؤں اور بھائی جی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ بھی آج ہونے والا ہے ہو جانے دوں۔ یہ دوسرا راستہ اختیار کرنا بہت مشکل تھا۔ یہ راستہ اختیار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ملک دشمن عناصر کی ایک نہایت کاری ضرب سے بچنے کی بجائے اس ضرب کو اپنا کام کرنے دیا جائے۔

اگلے پانچ دس منٹ کے اندر میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں نے ریوالور لوڈ کر کے اپنی جیکٹ میں لگایا اور کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ اس کوشش کے دوران میں اگر گارڈز سے ٹکراؤ ہو جاتا تو وہ بھی مجھے قبول تھا۔ میں نے گیلری سے جھانک کر نیچے ہال کمرے میں دیکھا۔ شنکر وہاں موجود تھا وحدت علی اور دیگر افراد بھی تھے۔ شنکر وائی ٹاکی:

کسی سے بات کر رہا تھا۔ وحدت ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے صوفے پر بیٹھا تھا۔ شکی اس کے لیے گلاس تیار کر رہی تھی۔ چند منٹ پہلے جو ہلچل اور سنسنی ہال کمرے میں دکھائی دے رہی تھی وہ اب موجود نہیں تھی۔ شنکر کی گفتگو کا انداز بھی دھیما تھا۔

اس اثنا میں اشرف چیتا مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے کہا "لو بھئی! سارا ڈھول ڈھمکا ٹھنڈا ہو گیا؟"

"کیا مطلب؟"

"بھائی جی کی ابھی کچھ سانسیں باقی ہیں شاید۔۔۔ سرحد کا ایک بڑا سیاسی لیڈر واقعہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ آج صبح ہارٹ اٹیک ہوا تھا اسے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کے گھوڑے! لیڈر کے مرنے سے سیاسی کاروبار بھی ایک دو دن کے لیے ٹھپ ہو گیا ہے۔ آج بھائی جی نے جو سیاسی میٹنگ بلائی ہوئی تھی وہ بھی کینسل ہو گئی ہے۔ سب سیاسی چوہدری اور وڈیرے پشاور جا رہے ہیں جنازہ شنازہ پڑھنے کے لیے۔"

میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا لیکن دل میں لڈو پھوٹ گئے تھے۔ اس اچانک واقعے نے مجھے ایک نہایت شدید کشمکش سے بچا لیا تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر بھائی جی پر سے بلا وقتی طور پر ٹل گئی تھی۔ اس مہلت کے دوران میں ساہی صاحب کو ویڈ الرٹ کر سکتا تھا۔

○☆○

اگلے تین چار دن قدرے سکون سے گزرے۔ شنکر شکرا دوبارہ کوٹھی میں نظر نہیں آیا تھا اور یہی میرے سکون کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ میں نے بذریعہ فون ساہی صاحب کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ جان کر کہ شنکر بھی بھائی جی والے معاملے میں "انوالو" ہو چکا ہے، ساہی صاحب خاصے پریشان ہوئے تھے اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ انہوں نے جتنا پریشان ہونا تھا اتنا ہی زیادہ محتاط بھی ہونا تھا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بھائی جی کے خلاف نئی پلاننگ تیار ہونے میں ابھی چند روز لگیں گے۔ وحدت علی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ میں مصروف تھا اور چار پانچ روز کے لیے کاغان گیا ہوا تھا۔ میڈم مرحومہ کا ڈرائیور رشید میڈم کی ہلاکت کے بعد میرے ساتھ ہی یہاں وحدت علی کے پاس آیا تھا۔ وہ ابھی تک یہیں تھا۔ وحدت علی نے اسے ایک گاڑی کی ڈرائیونگ سونپ دی تھی۔ یہ گاڑی کبھی کبھی وحدت علی کا جگری دوست ملک رفیق بھی استعمال کرتا تھا۔

میری معلومات کے مطابق ملک رفیق جس خاموشی سے ناشا کو جیل سے نکال کر لایا تھا اسی خاموشی سے اسے واپس بھی پہنچا چکا تھا۔ ساہی صاحب کی کوشش سے ناشا کو جیل میں اچھی سہولتیں مہیا تھیں اور اسے بی کلاس میں رکھا گیا تھا۔

اشرف چیتا بھی میرے ساتھ ہی ایک کوارٹر میں موجود تھا۔ اب ہم جس کوارٹر میں تھے وہ اس وسیع کوٹھی کی حدود کے اندر ہی تھا۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ وحدت علی نے مجھے بیرونی کوارٹر میں صرف اس لیے رکھا تھا کہ وہ میرے ذریعے میڈم کو ٹریپ کرنا چاہتا تھا۔

آج کل میری نقل و حرکت پر زیادہ پابندی نہیں تھی۔ میں حسبِ ضرورت بازار چلا جاتا تھا اور ایک دو گھنٹے کوٹھی سے باہر رہ کر واپس آ جاتا تھا۔ ایک دن میں شام کے بعد نکلا اور پیدل ہی پرانی انارکلی کی طرف چل دیا۔ سردی کافی تھی، میں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔ یہ مفلر مجھے دہرا فائدہ دیتا تھا۔ سردی سے بچاتا تھا اور دشمن نگاہوں سے بھی۔ میں ساہی صاحب کو فون کرنے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی میں اب اس صورتِ حال سے اکتا سا گیا تھا۔ طویل عرصہ تنزانیہ اور برطانیہ وغیرہ کی خاک چھان کر میں وطن واپس لوٹا تھا لیکن یہاں آ کر بھی پردیسی ہی تھا۔ ابھی تک میں اپنے پیاروں کی صورتیں نہیں دیکھ سکا تھا بلکہ وہ پیارے جو افریقا میں میرے ساتھ تھے، اب وہ بھی مجھ سے دور ہو گئے تھے۔ ایک طرف جہاں مجھے اپنی بہن شفتا اور حمزہ وغیرہ کی یاد تڑپاتی تھی، وہیں غزالہ اور صفدر بھی ہر گھڑی ذہن پر چھائے رہتے تھے۔ میں ان سب کے قریب ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت دور تھا۔ پاکستان میں آ کر صورتِ حال کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ شیخ عاصم اور شنکر وغیرہ تو دشمن تھے ہی وفاقی اور صوبائی پولیس بھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ یعنی قانون شکن بھی دشمن تھے اور قانون بھی دشمن تھا۔

میں اسی صورتِ حال کے متعلق ساہی صاحب سے مذاکرات کرنا چاہتا تھا۔ ابھی میں یونیورسٹی گراؤنڈ کے قریب پہنچا تھا کہ اچانک ایک کار میرے قریب رکی۔ کار کے رکنے کا انداز خطرناک تھا، میرے اعصاب تن گئے۔ کار کا دروازہ کھلا اور ایک شخص دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ زریں گل تھا۔ میں بوکھلا گیا۔ زریں سرِعام مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ بڑی نامناسب حرکت تھی۔ میں فی الوقت پاشا گینگ کا ادنیٰ رکن تھا اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ "ابے خبیث! یہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے اس کے کان میں غصیلی سرگوشی کی۔

زریں نے مجھے ایسا جن جپھا مارا تھا کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے لے کر گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔

ہم دونوں تاریک شیشوں والی نئی نکور مرسیڈیز میں آ بیٹھے۔ اندر خوشگوار حرارت تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ زریں کی گاڑی ایک سفید فام شخص ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ فرانسیسی تھا۔ اس کا نام جیکسن تھا اور یہ فرانسیسی کے علاوہ اردو بھی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ زریں نے ابھی تک میرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ نہایت قیمتی کپڑے کی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اوور کوٹ تھا۔ سر پر بڑی زبردست پٹھانی ٹوپی تھی۔

زریں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا "جیکسن! تم ذرا گاڑی سے باہر چلے جاؤ۔ ام دونوں پرائیویٹ بات کرنا چاہتا ہے۔"

باوردی ڈرائیور نے ادب سے سر جھکایا اور باہر جا کر سڑک کے کنارے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ تنہائی ملتے ہی زریں نے ایک بار پھر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے بمشکل روکا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے زریں! میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ ابھی میں تم سب کے لیے اجنبی ہوں۔ میرے اردگرد جو لوگ موجود ہیں وہ مجھے کسی اور حیثیت سے جانتے ہیں۔"

"ام جانتا ہے استاد صیب لیکن آپ کو دیکھ کر ام دور کیسے رہ سکتا ہے۔ یہاں قریب ہی ایک بہت بڑا فلم ساز وحدت علی صیب رہتا ہے۔ ام نے فون پر اس کے بارے میں آپ کو بتایا بھی تھا۔ ام اس سے ملنے جا رہا تھا۔ ایک دم آپ پر نظر پڑ گیا۔"

میں نے کہا "وحدت سے ملنے جا رہے تھے یا اس کی جھلک چھلوبٹی سے؟"

زریں حیران رہ گیا پھر بولا "نہیں استاد صیب۔ آپ کو پتا ہے اب ام شادی شدہ ہے۔"

"مجھے سب پتا ہے زریں! میں نے اپنی آنکھوں سے تجھے وحدت کی بیٹی کے ساتھ لپٹتے چپکتے دیکھا ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتا ہے استاد صیب! ام ایسا نہیں ہے۔ لیکن آپ نے ام کو دیکھا کہاں ہے؟"

"تم ایسے نہیں تھے لیکن اب ہو گئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ دولت نے تمہاری آنکھوں پر چربی چڑھا دی ہے۔ چند دن پہلے شالیمار کے ٹھاٹ باٹ اور پکھن میں میں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے ملاحظہ کیے ہیں۔"

"کہاں استاد صیب؟"

"سیٹھ وحدت علی کی کوٹھی میں۔ فنکشن کی رات کو وحدت کی بیٹی ارمان تیری باہوں میں تھی اور تو شہزادہ گلفام بنا ہوا تھا۔ بنا ہوا تھا کہ نہیں!" میں نے باقاعدہ زریں کا کان مروڑا۔

زریں نے کہا "ام آپ کو سب کچھ بتاتا ہے استاد صیب! آپ پریشان مت ہوں۔ ام گھر چل کر آرام سے بات کرنا ہے۔"

"کہاں ہے گھر؟"

"زیادہ دور نہیں ہے، ام دو منٹ میں وہاں پہنچے گا لیکن یہ ہمارا اپنا گھر نہیں ہے۔ ام کرائے کے گھر میں رہ رہا ہے۔ اپنا گھر بنوا رہا ہے۔ وہ بھی راستے میں پڑتا ہے، ام آپ کو ابھی دکھاتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد زریں کی شاندار مرسیڈیز میں ہم ڈیفنس کی طرف جا رہے تھے۔ میں اور زریں پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ گاڑی فرانسیسی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ گاڑی کی پچھلی اسکرین کے پاس بہت سے چھوٹے بڑے خوب صورت کھلونے پڑے تھے۔ یقیناً یہ چھوٹے زریں گل کی تفریح کا سامان تھا۔ زریں کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ ساری باتیں مجھ سے ایک ہی بار پوچھ لینا چاہتا تھا۔ سفر کرتے ہوئے ہمیں جگہ جگہ الیکشن کی گہماگہمی بھی نظر آئی۔ در و دیوار پر ہر طرف امیدواروں کے اشتہارات تھے۔ راستے میں ایک جگہ زریں کے اشارے پر ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کی۔ ہماری گاڑی ایک عظیم الشان زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے رکی تھی۔ یہ کوئی چار کینال کی کوٹھی تھی۔ رہائشی عمارت کے آگے ایک وسیع گراسی لان تھا۔ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ مالک مکان دل کھول کر پیسہ خرچ کر رہا ہے اور تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ ایک شاندار عمارت ثابت ہوگی۔

زریں نے پرجوش لہجے میں کہا "یہ دیکھیے استاد صیب! یہ ہے ہمارا غریب خانہ۔ کلثوم کا اور ہمارا آشیانہ۔ ہمارا خواہش تھا کہ ام اس کا سنگِ بنیاد آپ کے ہاتھوں سے رکھوائے لیکن افسوس کہ آپ ام کو دست درازنہ ہو سکا۔"

"دست دراز نہیں دستیاب۔"

"جی ہاں۔ وہی۔۔۔ استاد صیب گھر ٹھیک ہے نا؟"

"سب ٹھیک ہے لیکن تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو۔ خیر چلو۔ پہلے گھر چلو۔" میں نے کہا۔

گاڑی کے شیشے تاریک تھے، ویسے بھی رات کا وقت تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اگر زریں کے گھر کی نگرانی ہو بھی رہی

ہے تو میں نظروں میں آنے سے محفوظ رہوں گا۔ میں نے زریں کو سمجھاتے ہوئے پشتو میں کہا "میں تمہاری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤں گا تاکہ باہر سے مجھے دیکھے جانے کا امکان نہ رہے۔ تم گاڑی کو سیدھا پورچ میں لے جاؤ۔ اس بات کا پتا صرف ڈرائیور کو ہے کہ میں تمہارے ساتھ گاڑی میں موجود ہوں۔ جب تک میں تمہارے گھر رہوں گا یہ ڈرائیور تمہارے سامنے موجود رہے گا۔ اودھر ادھر نہیں جائے گا۔"

"یہ ڈرائیور بالکل امارے اعتبار کا بندہ ہے استاد صیب۔"

"لیکن میں پھر بھی رسک لینا نہیں چاہتا ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"ٹھیک ہے استاد صیب جیسے آپ کی مرضی۔ وہ کون سا مشہور گانا ہے۔ جو تم کو ہو پسند وہی بات کہیں گے۔ تم دن کو اگر رات کہو رات کہیں گے۔"

ایک دم زریں نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا "وہ دیکھیں استاد صیب!"

میں نے زریں کی انگلی کا تعاقب کیا۔ گولڈ ہوٹل کی ایک اسٹیشن ویگن ائرپورٹ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس کی دونوں سائیڈز پر بڑے بڑے حروف میں گولڈ ہوٹلز پرائیویٹ لکھا ہوا تھا۔ زریں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولا "استاد صیب! ام کو مسٹر کلارک نے سب کچھ بتایا ہے۔ اماری اور صفدر کی طرح آپ بھی اب ایک کروڑ پتی شخص ہے۔ لاہور میں بھی آپ کا ہوٹل بڑا شاندار جا رہا ہے۔ ابھی پرسوں ام نے آپ کے ہوٹل میں ڈنر فرمایا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ساتھ کون تھا؟ کلثوم یا وحدت کی بیٹی؟"

زریں نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا اور پشتو میں بولا "استاد صیب! آپ کلثوم کو ٹھیک سے جانتا نہیں ہے۔ اس کے کان میں ایسا بھنک بھی پڑ جائے تو وہ احتجاج کے طور پر گلے میں پھندا ڈال لے۔ ارمان کے ساتھ امارا بس اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ ام پر فلم بنانا چاہ رہا ہے اور آپ کو پتا ہے کہ ام فلم میں دلچسپی رکھتا ہے۔"

"وہ تم پر فلم بنانا نہیں چاہتی، تم کو الو بنانا چاہتی ہے بلکہ بنا رہی ہے۔ تمہیں پتا نہیں کہ یہ لوگ فلم کے شیدائیوں کو کیسے کیسے الو بناتے ہیں۔ اگر اللہ کی قدرت سے تمہارے پاس پیسہ آ ہی گیا ہے تو تھوڑی سی عقل بھی استعمال کرنا سیکھ لو۔"

شاید ہماری گفتگو مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں ہم زریں کی رہائش گاہ کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں ذرا اپنی برتھ پر لیٹ گیا۔ گاڑی ایک بڑی کوٹھی کے پورچ میں داخل ہو کر رک گئی۔ ہم احتیاط سے اندر چلے گئے۔ کلثوم اپنے نومولود کے بچے کو گود میں اٹھائے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ہیجان کر ششدر رہ گئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے گل ہو گیا تھا۔ میں نے ننھے زریں کو اس کی گود سے لے لیا۔ ایک گول گول معصوم آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پہلے مسکرایا پھر مٹھیاں بھینچ کر منہ بسورنے لگا۔ زریں نے کہا "دیکھیں استاد صیب! آپ نے ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا۔ اس بات پر آپ سے احتجاج فرما رہا ہے۔ آپ اس کا نام رکھیں۔۔۔ اور ابھی رکھیں۔ ام بہت دیر کر چکا ہے۔ اب اس سے زیادہ دیر نہیں کیا جا سکتا۔"

کلثوم نے کہا "استاد صیب! آج کا دن بھی بہت اچھا ہے۔ امارے قبیلے میں رواج ہے کہ بچوں کا نام آج کے دن ہی رکھا جاتا ہے۔ آج چاند کا دوسرا تاریخ ہے۔"

"ایک تو تم ہر کام میں اپنے قبیلے کے رواج کو گھسیٹتا ہے۔ اب تم کو امارے قبیلے کا بات کرنا چاہیے۔ تم کو یہ کہنا چاہیے کہ آج کا دن بہت اچھا ہے کیونکہ آج جمعۃ المبارک ہے۔"

کلثوم اور زریں میں فوراً ہی نوک جھوک شروع ہو گئی۔ کچھ دیر لڑنے کے بعد وہ دونوں پھر مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں بچے کا نام ابھی اور اسی وقت تجویز کروں۔ میں نے "اسد" تجویز کیا۔ دونوں کو بے حد پسند آیا۔ جب میں نے اسد کے معنی بتائے تو دونوں مزید خوش ہو گئے۔ زریں بولا۔

"اللہ نے چاہا تو امارا بیٹا "اسد یعنی شیر" ہی کی طرح دلیر اور جرات مند ثابت ہوگا۔ جونہی یہ جوان ہوگا ام اس کو فوج میں بھرتی کروائے گا۔ یہ کشمیر کی آزادی کا جنگ لڑے گا۔"

میں نے کہا "اوئے نامعقول! تیرا مطلب ہے کہ اس وقت تک کشمیر آزاد ہی نہیں ہوگا۔ گدھے! یہ تو بس اب تھوڑی دیر کی بات ہے۔ بہت جلد وہاں آزادی کا جھنڈا لہرانے والا ہے۔"

زریں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا "واقعی استاد صیب! یہ بات تو امارے ذہن میں ہی نہیں آیا تھا۔۔۔ لیکن کشمیر کی آزادی کے باوجود ام اس کو فوج میں ہی بھرتی کرے گا۔ آخر ام کو کشمیر کی آزادی کا حفاظت بھی تو کرنا ہوگا۔"

میں نے زریں کے بیٹے کو چوما اور دونوں کی نگاہ بچا کر

چپکے سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ اس کی چھوٹی سی جیب میں ڈال دیا۔

زریں نے چہکتے ہوئے کہا "استاد صیب! آئیے ام آپ کو ایک شخص سے ملاتا ہے۔"

وہ مجھے لے کر ایک بند روم میں پہنچا۔ میں وہاں صفدر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی ریڈیو بج رہا تھا۔ صفدر نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے کندھوں پر گرم شال تھی۔ اس نے آگے جھک کر آتش دان میں لکڑیاں درست کیں پھر ٹھٹک سا گیا۔ غالباً میرے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا تھا "زریں۔۔۔ زریں" اس نے پکار کر کہا۔

زریں خاموش رہا۔ میں بے آواز چلتا ہوا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا "کون ہے؟" صفدر نے چونک کر پوچھا۔

میں اپنے یار سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی شیو تھوڑی سی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ بالوں کی دو لٹیں اس کی خوب صورت پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ہولے سے اس کے رخسار کو چھوا۔ اس نے ایک دم میرا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحے وہ بالکل ساکت کھڑا رہا پھر اس کا ہاتھ پھسل کر میری کلائی پر آیا۔ اس کے ہونٹ لرزے۔۔۔ وہ اٹک اٹک کر آواز میں بولا "شاہ۔۔۔ جہاں صاحب!"

ہم تڑپ کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ صفدر کے کشادہ سینے میں وہی محبت وہی گرم جوشی تھی جس کے لیے میں ہر گھڑی ترستا تھا۔ صفدر وہ شخص تھا جس کی موجودگی میں مجھے ساری دنیا اپنے قدموں کے نیچے نظر آنے لگتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہم دونوں چاہیں تو کھڑے کھڑے آسمان کو چھو سکتے ہیں اور ماہ و انجم توڑ کر زمین پر بچھا سکتے ہیں۔ صفدر کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ بھی ناممکن نظر نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں کیسا ناتا تھا میرے اور اس کے بیچ! اکثر ہم دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی بات ایک ہی وقت پر ابھرتی تھی اور اکثر ہمارا ردعمل بھی ایک ہی ہوتا تھا۔

ہم دونوں کتنی ہی دیر گلے لگے رہے۔ میں نے آہستگی سے صفدر کے رخسار کو چوما پھر ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔

○☆○

وہ ساری رات ہی ہم نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ کلثوم وقفے وقفے سے قہوہ ہمیں بھجواتی رہی۔ ہم آتش دان کے سامنے بیٹھے اخروٹ، مونگ پھلی کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ یہ باتیں ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

زریں اور کلثوم سے تو میں مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں بھی مل چکا تھا لیکن صفدر سے کئی مہینوں بعد پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ لاہور ائرپورٹ پر اترنے کے بعد ہم آج پہلی بار ملے تھے۔

ان چند مہینوں میں میرے ساتھ جو جو کچھ بیتا تھا میں نے سب صفدر کے گوش گزار کر دیا۔ میرا فیض اور شاہدہ وغیرہ سے ملنا، پھر نادر جگی کی حویلی میں مقیم ہونا، پتنگ گینگ میں شامل ہونا، مینڈم اور رضوی وغیرہ سے نبرد آزما ہونا، زریں بھی محویت سے سنتا رہا اور گاہے گاہے مجھ سے سوالات پوچھتا رہا۔

بعد ازاں صفدر اور زریں نے اپنے بارے میں بتایا۔ دونوں پر دو دو کیس تھے اور دونوں میں ان کی ضمانتیں ہو چکی تھیں۔ زریں نے چند دن پہلے ساہی صاحب سے مشورہ کیا تھا اور صفدر کو اپنے پاس ہی لے آیا تھا۔ یہاں اس نے ملک کے بہترین آئی اسپیشلسٹ کو بلایا تھا اور صفدر کا چیک اپ کروایا تھا۔ چند روز پہلے مزید ٹیسٹوں کے لیے صفدر اسپتال بھی گیا تھا۔ ابتدائی رپورٹس تو حوصلہ افزا تھیں، ابھی مزید تشخیص بھی ہونا تھی۔ مسٹر جی کلارک آج کل اسپین میں تھے۔ انہوں نے کیلی فورنیا سے یہاں کئی بار فون کیا تھا۔ وہ یہاں کے حالات سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے صفدر کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی تمام رپورٹس یہاں سے آسٹریا روانہ کرے۔ انہوں نے وہاں کے کسی نامور ڈاکٹر سے رابطہ بھی قائم کر رکھا تھا۔

میرے، صفدر اور زریں کے درمیان دفینے کے حوالے سے بھی تفصیلی بات چیت ہوئی۔ میں نے صفدر اور زریں کو تفصیل سے اس ملاقات کے بارے میں بتایا جو میرے اور مسٹر جی کلارک کے درمیان اسلام آباد کے گولڈ ہوٹل میں ہوئی تھی۔ جواباً زریں اور صفدر سے جو کچھ معلوم ہوا اس سے پتا چلا کہ مسٹر جی کلارک نے ان دونوں سے فرداً فرداً اور اکٹھے ملاقاتیں کی ہیں اور ان دونوں کے سرمائے کے بارے میں ان سے مشورے کیے ہیں۔ مسٹر کلارک کی خواہش تو یہ تھی کہ ان دونوں کا پورا پورا سرمایہ ان دونوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے مگر صفدر اور زریں نے باہمی مشورے سے ابھی سرمائے کا کچھ حصہ اپنے اکاؤنٹس میں منتقل کرایا تھا۔ باقی سرمایہ ابھی بیرون ملک تھا۔ وہ اس کے لیے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایک اچھے شہری کی حیثیت سے ان دونوں کی خواہش تھی کہ اس سرمائے کے ساتھ جو کچھ کیا جائے، وہ ملک کے اندر ہی کیا جائے۔

گفتگو کا سلسلہ چلا تو پھر ہر موضوع خود بخود ہی زیر بحث آتا چلا گیا۔ صفدر نے کہا ”مجھے پتا چلا ہے شاہ جہاں صاحب‘ کہ آپ نے شنکر کو لنگڑا کر ڈالا ہے۔“

”یہ تو پرانی بات ہے بھئی۔ اب پھر وہ دو ٹانگوں پہ چل رہا ہے‘ بلکہ دوڑنا شروع ہو گیا ہے ابھی صرف چند دن پہلے وحدت علی کی کوٹھی میں پھر اس سے ملاقات ہوئی ہے۔“

میں نے اس ملاقات کی ساری تفصیل صفدر اور زریں کو بتائی اور یہ بھی بتایا کہ آج کل وہ شیطان زادہ ایک ادھیڑ عمر بارلیش شخص کی صورت لاہور میں گھوم رہا ہے۔

صفدر نے پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا ”آپ کو یاد ہے جناب! جب شنکر ایک پارسی سیاح کے روپ میں لاہور آیا تھا اور کئی مہینے یہاں رہا تھا۔ ہم اسے دیوانوں کی طرح ڈھونڈتے پھرے تھے آخر وہ اپنی بلیک ڈاگ اور لڑکی والی عادت کی وجہ سے پکڑا گیا تھا۔“

”بلیک ڈاگ اور لڑکی والا عادت؟“ زریں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

صفدر نے اسے بتایا ”یہ آج سے کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے‘ شنکر نے لاہور اور آس پاس کے علاقے میں خوب تر تھلی مچائی تھی۔ شنکر کی پرانی عادت رہی ہے کہ وہ مہینے کا پہلا اور تیسرا ہفتہ بھرپور عیاشی سے گزارتا ہے‘ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ان دو موقعوں پر اسے بہترین شراب ملے اور کوئی کم سن لڑکی اس کی ساتھی ہو۔ یہاں شاہی محلے کے ایک علاقے میں ایک پرانی حویلی کے نیچے ایک بڑا ۔ خانہ تھا۔ وہاں جارج کالا نام کا ایک غنڈا شراب خانہ چلاتا تھا۔ اس شراب خانے میں ہر طرح کا دھندا ہوتا تھا۔ جارج چھوٹی عمر کی بے چین لڑکیوں کو یہاں لاتا تھا اور ان سے دھندا کرواتا تھا۔ اس نے اپنے شراب خانے کا جو نام رکھا ہوا تھا اس کا مطلب اردو میں تھا۔ نئی لڑکی پرانی شراب! بلیک ڈاگ شراب کا ان دنوں بڑا چرچا تھا۔ بلیک ڈاگ اگر پورے لاہور میں نہیں ہوتی تھی تو جارج کے پاس پھر بھی ہوتی تھی۔ شنکر مہینے کا پہلا اور تیسرا ہفتہ جارج کے شراب خانے میں گزارتا تھا۔ وہ شام کے بعد آتا تھا اور صبح جاتا تھا۔ ہمیں اس کے معمول کا پتا چل گیا۔ اسی معمول کی وجہ سے ہم نے اسے جا پکڑا۔ زبردست مارا ماری کے بعد شنکر تو بھاگ گیا تھا لیکن اس کے دو بندے پکڑے گئے تھے۔“

زریں نے چونک کر کہا ”صفدر بھائی! تم نے کیا نام لیا شراب خانہ چلانے والے کا؟“

”جارج۔ اسے جارج کالا بھی کہتے تھے۔“

زریں نے کہا ”ام نے اپنے ملازم آزاد خاں سے کل ہی جارج کالے کا نام سنا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ مشہور غنڈے جارج کالے کے بیٹے ”مٹھو کاکا“ نے ادھر امارے ہی علاقے میں عورتوں کا دھندا شروع کر رکھا ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھوٹی عمر کی لڑکیاں اپنی کوٹھی میں لاتا ہے اور وہاں بڑا بڑا کاریں آ کر رکتا ہے۔ جارج کالے کا پہنچ بہت اوپر تک ہے اس لیے علاقے کے شریفوں میں سے کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔“

زریں کی بات اہم تھی۔ جارج کالے اور شنکر میں بڑا پرانا یارانہ تھا۔ یہ بات ممکن نہیں تھی کہ شنکر لاہور میں موجود ہو اور جارج کالے سے ملتا نہ ہو۔ میرے ذہن میں گھنٹی سی بجنے لگی اور ایک سوال بڑی تیزی سے ابھرا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ شنکر جارج کے بیٹے مٹھو کاکا کے عشرت کدے میں آتا ہو۔

صفدر اور زریں باتیں کر رہے تھے لیکن میرا ذہن مسلسل جارج‘ مٹھو کاکا اور شنکر وغیرہ میں الجھا ہوا تھا۔ آج کل شنکر سے میری ایک ”تفصیلی“ ملاقات بہت ضروری ہو گئی تھی۔ یہ ملاقات اس لیے ضروری تھی کہ شنکر کا تعلق باشا گینگ سے ہو گیا تھا‘ اور میں نے باشا گینگ میں کئی ماہ سے ایک بہروپ بنا رکھا تھا۔ یہ بہروپ شنکر کی وجہ سے شدید خطرے میں آ گیا تھا۔

میں نے ناشتا بھی صفدر زریں اور کلثوم کے ساتھ کیا۔ مجھے ریواز گارڈن سے نکلے بہت دیر ہو چکی تھی‘ اور میں بتا کے بھی نہیں آیا تھا۔ تسلی صرف اتنی تھی کہ وحدت علی فلمی یونٹ کے ساتھ کاغان گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں میری ”غیر موجودگی“ پر زیادہ غور کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ناشتے کے دوران میں زریں گل نے انکشاف کرتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر میں غزالہ بی بی بھی یہاں پہنچ جائے۔ ام نے اسے فون کیا ہے‘ کلثوم نے بھی اس پر آنے کے لیے بہت زور دیا ہے۔“

میرے سینے میں ایک میٹھی سی لہر اٹھی لیکن تاثرات میں نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”غزالہ سے ملنے کو تو میرا بھی دل چاہتا ہے لیکن مجھے ریواز گارڈن سے نکلے بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں اب مجھے واپس چلنا چاہیے۔“

کلثوم نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ معصومیت سے بولی ”نہیں استاد صیب! اماری خاطر آپ غزالہ بی بی سے ضرور ملیں۔ ام جانتا کہ آپ ایک دوسرے کو

بہت پسند کرتا لیکن ایک دوسرے سے دور دور رہتا۔ امارا دل بہت چاہتا کہ ام آپ دونوں کو پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دے۔ اس کمرے میں بس ایک ہی بستر ہو۔ ام باہر سے تالا لگا دے۔ آپ دونوں کو دو چار دن اس کمرے کے اندر ہی رکھے۔“

زریں نے مڑ کر میری طرف دیکھا‘ پھر کلثوم سے مخاطب ہو کر بولا ”ارے بے وقوف یہ تم کیسا باتیں کرتا۔ استاد صیب ایسا باتیں بالکل پسند نہیں کرتا۔“

کلثوم نے فوراً کہا ”استاد صیب! ام کو ڈنڈا مارے گا تو بھی کوئی بات نہیں۔ ام اپنے دل کا بات ضرور کہے گا۔ ام کو غزالہ بی بی بہت اچھا لگتا۔ اگر ام لڑکا ہوتا تو غزالہ بی بی کے ساتھ سونے کے لیے اس سے ضرور شادی بناتا۔“

”ارے! کلثوم کا بچی! تم جنگلی کا جنگلی ہی رہے گا۔ بدبخت! ایسی باتیں نہیں کرتا‘ یہ بری باتیں ہوتا۔“ زریں نے اسے ڈانٹا۔ شاید وہ مزید بھی ڈانٹتا لیکن میرے اور صفدر کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔

زریں اور کلثوم میں پھر نوک جھوک شروع ہو گئی۔ اس لڑائی میں میٹھا میٹھا پیار بھی تھا۔ اتنے میں ننھے اسد نے رونا شروع کر دیا۔ صفدر نے کہا ”اچھا چھوڑو اپنی تکرار۔ جاؤ جا کر اسے چپ کراؤ۔“

زریں اٹھتے ہوئے بولا ”اسے ام کیا چپ کرائے گا۔ اسے تو میڈم نور جہاں ہی چپ کرائے گا۔“

واقعی جب زریں نے ٹیپ ریکارڈر پر گانا بجایا تو ننھا زریں ایک دم چپ ہو گیا اور بڑے انہماک سے موسیقی سننے لگا۔ میں نے کلثوم سے کہا ”دیکھو کلثوم! تم لڑکی ہو۔ تمہیں لڑکیوں کی طرح ہی بات کرنی چاہیے۔ تم مجھے استاد صیب مت کہا کرو۔ یہ اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن ام کو اچھا لگتا۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”جو باتیں تم کو اچھی لگتی ہیں‘ ضروری نہیں کہ دوسروں کو بھی اچھی لگیں۔“

”ٹھیک ہے استاد صیب۔۔۔ جیسا آپ کہتا ہے۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”پھر وہی استاد صیب!“

”او! ام سے غلطا ہو گیا۔“

اس کے جملے پر میں اور صفدر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

کچھ دیر بعد گیٹ سے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ زریں نے خوش ہو کر کہا ”امارا خیال ہے کہ غزالہ بی بی آ گیا ہے۔“

میرے دل کی دھڑکن زیر و زبر ہونے لگی۔ کافی عرصے سے میں نے غزالہ کو دیکھا نہیں تھا۔ دو تین منٹ بعد وہ کامن روم میں داخل ہوئی۔ یوں لگا جیسے کمرا اس کی دلکشی سے جگمگا اٹھا ہے۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اسی رنگ کے جوتے تھے۔ اسی رنگ کا شولڈر بیگ اس کے کندھے پر جھول رہا تھا۔ ننھا تابی اس کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ”السلام علیکم۔“ اس نے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ سب نے کورس کی شکل میں جواب دیا۔ کلثوم کی آواز سب سے بلند تھی۔

”کیسے ہیں آپ؟“ غزالہ نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔“ میں نے تابی کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

تابی نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ میں نے اس کے رخسار چومے۔ وہ کافی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے بھی جواباً میرے رخسار چومے۔

ہم سب بیٹھ گئے‘ گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ میرے لیے یہ گفتگو اہم نہیں تھی‘ میرے لیے غزالہ کی خاموشی اہم تھی۔ گفتگو کے دوران‘ خاموشی کے ان لمحات میں ہم جیسے ایک دوسرے سے ہم کلام ہو جاتے تھے۔ یہ احساس میرے لیے بڑا جاں افزا تھا کہ غزالہ کی نگاہوں میں بھی جدائی کا ملال اور ملن کی خواہش تھی۔ یہ نگاہیں بتاتی تھیں کہ اس نے ہر گھڑی مجھے یاد رکھا ہے‘ ہر پل میری راہ دیکھی ہے۔

میں نے غزالہ سے پوچھا ”چچا اور چچی کیسے ہیں؟“

وہ بولی ”امی کچھ بیمار رہی تھیں لیکن اب بہتر ہیں۔ وہی کبھی کبھی سینے کی تکلیف ہو جاتی ہے۔“

”اور چچا۔“

”وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

کلثوم فوراً بولی ”سب ٹھیک ہیں۔ بس یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس کا اشارہ غزالہ کی طرف تھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ ام اچھی طرح جانتا ہے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی پھر غزالہ نے غالباً اس کو گھور کر دیکھا تھا۔ وہ بولی ”ام کو گھور کر مت دیکھو۔ ام سچی بات کرے گا چاہے بعد میں آپ ام کو ڈنڈے سے مارے۔ یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے استاد صیب! یہ کچھ دن بیمار بھی رہا ہے۔ یہ ہر دوسرے تیسرے دن ام کو ادھر گھنٹی (فون) کرتا تھا اور آپ کے بارے میں پوچھتا تھا کہ آپ کا کوئی خبر ملا ہے کہ نہیں۔ یہ ام سے بھی کہتا تھا کہ ام آپ کے لیے دعا فرمائے۔ اس کو ہر

گھڑی آپ کا فکر رہتا تھا استاد صیب۔ یہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے استاد صیب' آپ اس کی باتوں پر بالکل مت جائیں۔"

غزالہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولی "تم اپنی بکواس بند کرتی ہو یا میں واقعی ڈنڈا لے کر آؤں۔"

صفدر بولا "ہم سب کو اس کی عادت کا پتا ہے غزالہ! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

زریں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ کلثوم ضرورت سے زیادہ بول رہی ہے۔ اس نے کلثوم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ چمک کر بولی "ام کو جتنا مرضی ڈراؤ' ام نہیں ڈرنے والا۔ امارا باپ بڑا ظالم تھا لیکن اماری ماں نے اس کے سامنے ہمیشہ سچ ہی بولا تھا۔ ام بھی تمہارے سامنے سچ ہی بولے گا۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ام بھی ظالم ہے؟" زریں نے غرا کر کہا۔

"آپ ظالم نہیں ہے لیکن آپ استاد صیب کے سامنے بھی یہی بات کیوں نہیں کہتا ہے۔ آپ نے ام سے کہا نہیں تھا کہ غزالہ بی بی اور استاد صیب کے بارے میں سوچ سوچ کر آپ کا دل روتا ہے۔ آپ چاہتا ہے کہ ان دونوں کا شادی جلد سے جلد ہو جائے' وہ ایک ساتھ سوئے اور جلدی سے بچہ دے۔ بالکل امارے بچے کی طرح۔"

زریں چیخ کر بولا "بچہ دے۔ ام نے کب کہا تھا۔ ام نے تو کہا تھا کہ اللہ ان کو بھی بچہ دے۔ بے وقوف عورت! تم کو اردو بولنا نہیں آتا تو کیوں بک بک کرتا رہتا ہے۔"

"ام کو سارا لفظ نہیں آتا' لیکن ام بات تو سچی کرتا ہے نا۔"

"چپ کرو ورنہ تمہارے سر پہ یہ ریڈیو دے مارے گا۔" زریں نے قریب پڑا ٹرانسسٹر اٹھا لیا۔

صفدر نے ٹرانسسٹر چھین کر نیچے رکھا۔ غزالہ شرم سے "بیر بہوٹی" بن گئی تھی۔ وہ نابی کو پیشاب کرانے کے بہانے اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

صفدر نے کلثوم کو سمجھایا کہ وہ سارے کا سارا سچ آج ہی نہ بول ڈالے تھوڑا سا پھر کسی دن کے لیے بچا کر رکھے۔ اس نے کلثوم سے یہ بھی کہا کہ وہ اسی طرح سچ بولتی رہی تو غزالہ بی بی ابھی واپس چلی جائیں گی۔ کلثوم نیم رضامند نظر آنے لگی۔ میں نے اس سے کہا "دیکھو کلثوم! ایک بات اور بھی ہے۔ میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ مجھے استاد صیب نہیں کہنا۔"

وہ چونک کر بولی "اوہ' ام سے پھر غلطی ہو گیا استاد صیب!"

"پھر استاد صیب" میں نے کہا۔

"اوہو' ام بہت بڑا بے وقوف ہے۔ بالکل نکما ہے۔" کلثوم نے اعتراف کیا۔

"اور تھوڑا سا پاگل بھی ہے۔" زریں گل نے لقمہ دیا "ام تو استاد صیب! اس وقت کو پچھتا رہا ہے جب ام نے اسے اردو سکھانے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ امارا یہ خطا معاف فرمائے۔"

کچھ دیر بعد غزالہ واپس آ گئی۔ اس کی پلکیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔ میرے غزالہ اور صفدر کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ شیخ عاصم ابھی تک امارات میں ہے' وہ اپنے معاملات میں بری طرح الجھا ہوا ہے' یہی وجہ ہے کہ غزالہ کے ساتھ اپنی مخاصمت کو اس نے فی الحال یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ چچا جلیس اور چچی فاخرہ اب پوری طرح غزالہ کے ساتھ تھے اور اب اپنے "بھتیجے" زلمے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ شیخ عاصم کا اصل جوہر ان کے سامنے بھی آ چکا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اس شخص سے جلد از جلد ان کا اور ان کی بیٹی کا چھٹکارا ہو جائے۔ غزالہ نے آج کل میڈیسن کے ایک ایڈوانس کورس میں داخلہ لیا ہوا تھا اور نابی کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ انگلینڈ سے C.T.U.S کرنے کا بھی پختہ ارادہ رکھتی تھی۔

نابی بہت دیر میری گود میں بیٹھا رہا تھا' اب وہ غزالہ کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ وہ اسے بڑے پیارے لہجے میں "ماما" کہتا تھا۔ اب اس نے چھوٹی چھوٹی توتلی باتیں شروع کر دی تھیں۔ اس کی باتیں کانوں میں رس گھولتی تھیں۔ وہ ایک ایسا پھول تھا جو عرب کے صحراؤں میں کھلا تھا۔ دست ستم نے اسے ٹہنی سے جدا کر دیا تھا۔ ہم نے اسے اپنی محبت کے گملے میں رکھ کر نئی زندگی دی تھی۔ اب اس کی خوشبو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ نابی کبھی کبھی میری اور غزالہ کی محبت کے درمیان ایک پل کا کام بھی دیتا تھا۔ اس وقت کامن روم میں بیٹھے ہوئے بھی ایسا ہی ہوا۔ نابی جب میری گود میں بیٹھا تھا میں نے اس کا رخسار چوما تھا' تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ غزالہ نے بھی نابی کو اسی رخسار پر اسی جگہ سے چوما ہے۔ وہ اکثر بڑی خوب صورتی سے ایسا ہی کوئی دل نواز اشارہ دے دیا کرتی تھی۔

اس روز کی ملاقات بہت حسین اور پر لطف رہی۔ زریں

کلثوم' صفدر' غزالہ سب نے انجوائے کیا' اس کے ساتھ ساتھ ان دوستوں کا تذکرہ بھی ہوا جو فی الوقت ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ساتھی عالی' پروفیسر' سروج' مسٹر جی کلارک' ناشا سب کی باتیں ہوئیں۔ زریں گل افریقا میں گزرے ہوئے شب و روز کی باتیں کرتا رہا۔ اس گفتگو نے جہاں یادوں کو تازہ کیا وہاں صفدر کے چہرے پر درد کی لکیر بھی کھینچ دی۔ اس لکیر کا تعلق ویرا کے کبھی نہ مٹنے والے دکھ سے تھا اور یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے تھے۔ ویرا کی ذات پر تو وہ شعر صادق آتا تھا۔

مجھے رنوں کا سراغ لے کر کہاں سے آیا کدھر گیا وہ عجیب مانوس اجنبی تھا' مجھے تو حیران کر گیا وہ

میں نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے پروفیسر اللہ رکھا اور شائستہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

زریں گل اور غزالہ کی باتوں سے پتا چلا کہ شنکر نے باپ بیٹی کو وحشیانہ انداز میں زدوکوب کیا تھا۔ دونوں کی کئی ہڈیاں فریکچر ہوئی تھیں' شائستہ کا تو ایک بازو ٹوٹ کر لٹک ہی گیا تھا۔ تاہم بروقت اور بہترین طبی امداد ملنے سے ان کی زندگیاں بچ گئیں۔ شائستہ تو اسپتال سے فارغ ہو کر گھر جا چکی تھی' تاہم پروفیسر اپنی پیرانہ سالی کے سبب ابھی تک اسپتال میں زیر علاج تھا۔

اس واقعے کے تذکرے نے میرے سینے میں شنکر کے دیے ہوئے زخموں کو پھر تازہ کر دیا۔ آج کل شنکر کی صورت مسلسل میری نگاہوں میں گھومتی رہتی تھی' اور جب بھی اس کی صورت گھومتی تھی ایک میٹھے میٹھے درد کی لہریں پورے بدن میں پھیل جاتی تھیں۔ میری انگلیوں کی پوروں میں وہی سنسناہٹ جاگتی تھی جو مجھے جنگ و جدل پر آمادہ کرتی تھی۔ اپنے ازلی دشمن کے خلاف برسرپیکار ہونے اور اسے نیچا دکھانے کی خواہش ایک سیلابی ریلے کی طرح میرے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ یہاں زریں گل کے ہاں آ کر جہاں میں نے اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی صورتیں دیکھی تھیں وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ مجھے شنکر شترا کے ایک امکانی ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب غزالہ ہم سے رخصت ہو کر واپس چلی گئی' میں بھی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جانے سے پہلے میں نے زریں گل کے ملازم آزاد خان کو ایک علیحدہ کمرے میں بلایا۔ آزاد خان اچھے قد کاٹھ کا ایک ہوشیار پٹھان نظر آتا تھا۔ وہ زریں گل کو "ملک جی" کہہ کر بلاتا تھا' حالانکہ وہ زریں گل کے ساتھ کھڑا ہوتا تو خود "ملک جی" نظر آتا۔ سب دولت کی کرامات تھی۔ زریں چاہتا تو اپنے لیے ایسے بیسیوں ملازم رکھ سکتا تھا۔ میں نے آزاد خان سے ملھو کاکا کے قحبہ خانے کے بارے میں پوچھا۔ آزاد خان نے زریں کی ہدایت کے مطابق مجھے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ یہ قحبہ خانہ اسی رہائشی علاقے میں چند (LANES) چھوڑ کر واقع تھا۔ زریں کے اس ملازم نے قحبہ خانے میں داخلے کا طریقہ بھی مجھے سمجھا دیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں پاس ہی گلزار اسٹیٹ ایجنسی ہے۔ ایجنسی کا مالک پولیس کا ایک اعلیٰ ریٹائرڈ افسر ہے۔ وہی جارج کالے اور ملھو کاکا کی سرپرستی کر رہا ہے۔ قحبہ خانے میں جانے کے لیے پہلے اس اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں جا کر اپنا میل تعارف کرانا پڑتا ہے۔ اسٹیٹ ایجنسی کا ملازم اشرف تین قسم کے ٹوکن دیتا ہے۔ سفید ٹوکن قحبہ خانے میں جا کر جوا کھیلنے کے لیے ہوتا ہے' زرد ٹوکن شراب پینے کے لیے اور سرخ لڑکی حاصل کرنے کے لیے۔

میں نے آزاد خان سے ساری تفصیل معلوم کر لی اور پھر زریں اور صفدر سے رخصت ہو کر واپس ریواز گارڈن آ گیا۔

○☆○

یہ تیسرے دن کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میں آزاد خان کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق گلزار اسٹیٹ ایجنسی پہنچا۔ ٹوکن حاصل کرنے کے لیے میں ذہن میں ایک کہانی ترتیب دے چکا تھا۔ میں نے میز پر بیٹھے ایک شخص سے کہا "گلزار صاحب سے ملنا ہے۔"

"وہ تو نہیں ہیں۔"

"اشرف صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جائیں۔" اس نے قالین پوش سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ یہ کافی بڑا دفتر تھا۔ میں پلائی وڈ کا ایک نہایت خوب صورت دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہاں ایک مدقوق سا شخص موجود تھا۔ میں نے کہا "آپ ہی اشرف صاحب ہیں؟"

اس نے کہا "اشرف صاحب پچھلے کمرے میں موجود ہیں۔ آپ اپنا نام وغیرہ اس چٹ پر لکھ دیں۔"

میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ چٹ اندر پہنچی اور چند لمحے بعد مجھے بلا لیا گیا۔ دفتر کی شان و شوکت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یہ گلزار صاحب کے ملازم کا نہیں کسی وزیر مشیر کا آفس لگتا تھا۔ اشرف صاحب میرا استقبال کرنے کے لیے اٹھے اور پھر اٹھے ہی رہ گئے۔ ان کی آنکھیں زرد ہو کر پھیل سی گئیں۔

یہ شخص مجھے جہانی استاد کی حیثیت سے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ آج سے چھ سات سال پہلے یہ شخص مجھے گنگا رام اسپتال کے زچہ و بچہ وارڈ میں ملا تھا۔ زریں گل بھی میرے ساتھ تھا۔ یہ آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھا مسلسل رو رہا تھا۔ زریں اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ زریں کا خیال تھا کہ شاید اس کا نومولود بچہ مرگیا ہے مگر پوچھنے پر پتا چلا کہ ایسی بات نہیں۔ زریں نے پوچھا کہ کیا تمہاری بیوی کو کچھ ہوا ہے' اس بات کا جواب بھی نفی میں آیا۔ آخر یہ راز کھلا یہ بندہ جواری ہے۔ دو مہینے پہلے اپنا "مکان" بیوی سمیت جوئے میں ہار چکا ہے۔ مکان تو جیتنے والوں نے لے لیا تھا مگر بیوی کے پیٹ میں بچہ تھا۔ اس نے ان لوگوں سے اتنی مہلت مانگی تھی کہ بچہ پیدا ہوجائے۔ پھر بے شک وہ لوگ اس کی بیوی کو ہانک کر لے جائیں۔ اب بچہ دنیا میں آگیا تھا اور "قرض خواہ" اسپتال کے دروازے پر ٹیکسی لیے کھڑے تھے۔ یہ روداد سننے کے بعد میں نے ان قرض خواہوں سے پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو میں نے ایک دو کے ہاتھ بازو توڑ دیے۔ بعد میں صلح صفائی ہوئی اور چند ہزار روپے کے عوض اس اشرف نامی بندے کی بیوی بچ گئی۔ بعد میں اس شخص سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ آج یہ شخص یہاں قمار خانے کے بکنگ کاؤنٹر پر نظر آرہا تھا۔ (یہ بات مجھے چند سال پہلے ہی معلوم ہوچکی تھی کہ اشرف کی بیوی اس سے طلاق لے چکی ہے اور وہ بدستور جوئے کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے)

یہ ساری باتیں ایک سیکنڈ کے اندر میرے ذہن سے گزر گئیں۔ اشرف نے ہکلا کر کہا "جہانی صاحب! آپ؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔"

"لیکن مجھے یقین آگیا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم جب بھی ملو گے کسی ایسی ہی جگہ پر ملو گے۔"

اشرف کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور وہ حواس باختہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ ٹوکن حاصل کرنے کے لیے میں جو کہانی ذہن میں ترتیب دے کر آیا تھا وہ تو اب بیکار ہوگئی تھی' میں نے سیدھے سیدھے اشرف سے ٹوکن طلب کیے۔ اس نے بلا حیل و حجت آٹھ دس ٹوکن میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ ان میں تینوں رنگوں کے ٹوکن موجود تھے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

میں نے کہا "خدمت تو ہے اور تم کر بھی سکتے ہو اور تم کرو گے بھی' اگر نہیں کرو گے تو پھر مجھے تمہارے نٹ بولٹ کسنے پڑیں گے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اس عمر میں ہڈی وغیرہ ٹوٹ جائے تو آسانی سے جڑتی نہیں۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں جی۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑے۔ اس کے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی دمک رہی تھی۔

میں نے آفس کے ادھ کھلے دروازے کو ٹانگ کی مدد سے بند کرتے ہوئے کہا "شنکر کہاں ملے گا؟"

میرے سوال نے اسے بوکھلا دیا۔ چند لمحے بعد حیرت سے بولا "میں نے تو شنکر صاحب کو نہیں دیکھا جی۔ کیا وہ پاکستان میں ہیں؟"

"وہ لاہور میں ہے اور تم انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔" وہ بڑی عاجزی سے بولا۔

میں نے اس کے تاثرات دیکھے' پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ شنکر یہاں اپنے اصل حلیے .... میں موجود نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اشرف اس کے بہروپ سے بے خبر ہو۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اچھا۔ اس حرامی کو چھوڑو' یہ بتاؤ' اروش نام کا کوئی بندہ تمہارے اڈے پر آتا ہے۔"

"اروش۔" اشرف نے زیر لب دہرایا "وہی نا۔ جو تھوڑا سا لنگڑاتا ہے بال کچھ کچھ سفید ہیں۔"

"بالکل وہی۔" میں نے اپنے ہیجانی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ میں ہفتے کے روز وہاں گیا تھا۔ میں نے انہیں مٹھو صاحب کے پاس دیکھا تھا۔ دراصل میری ڈیوٹی زیادہ تر یہیں ہوتی ہے۔"

"ظاہر ہے' دلالوں کی ڈیوٹی دروازے پر ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

میرے ریمارکس نے اس کا چہرہ مزید زرد کردیا۔ تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

میں نے پوچھا "تم نے کتنی بار دیکھا ہے اسے وہاں؟"

"شاید تین چار بار۔ وہ غالباً ویک اینڈ پر ہی آتے ہیں۔"

"آج ہفتہ ہے' اس کا مطلب ہے کہ وہ آئے گا۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جی۔ وہ بڑے صاحب اور مٹھو صاحب کے خاص بندے ہیں۔ انہیں ٹوکنوں وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

میں نے ایک دم موضوع بدلتے ہوئے کہا "لڑکیاں کہاں

سے لاتے ہو تم لوگ؟"

اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے "میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں جہانی صاحب۔ یہ سب بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کا بکھیڑا ہے۔ میں تو بس ادھر ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا "گنگا رام اسپتال میں تمہاری جو بیٹی پیدا ہوئی تھی' وہ اب چھ سات سال کی تو ہو ہی گئی ہوگی۔ سنا ہے کہ جارج اور "مٹھو کاکا" ڈھونڈ ڈھونڈ کر چھوٹی عمر کی لڑکیاں اپنے اڈے پر لاتے ہیں۔"

اشرف کا رنگ ایک بار پھر ہلدی ہوگیا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ میں نے سگریٹ پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا "میں تمہارے اڈے پر جا رہا ہوں' میرے پہنچنے سے پہلے وہاں میرے آنے کی خبر ہوئی تو میں تیری توند پھاڑ دوں گا۔"

"میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا جہانی صاحب۔" وہ بولا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جم ہوا تھا۔ غالباً اسے اپنی نوکری چلے جانے کا اندیشہ بھی لاحق تھا۔ ٹوکنوں کی صورت میں اس کا نقصان علیحدہ ہوا تھا۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد میں اس وسیع کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا جس کی پیشانی پر "نوبل کلب" کے الفاظ لکھے تھے۔ میں زریں کے ساتھ آیا تھا۔ زریں ایک نئی ٹویوٹا کار میں تھا۔ یہ کار اس نے پارکنگ لاٹ میں ہی روک لی اور فرمائشی نغمے سننے میں مصروف ہوگیا۔ نوبل کلب کے اندر بظاہر بڑا صاف ستھرا ماحول تھا۔ ایک طرف نیلے پانی کا سوئمنگ پول تھا۔ ٹینس کورٹ باسکٹ بال کورٹ وغیرہ نظر آرہے تھے۔ میں اندر پہنچا۔ یہاں ٹیبل ٹینس اور اسنوکر وغیرہ کھیلنے کے انتظامات موجود تھے۔ ایک طرف منی سنیما تھا۔ بڑی عمر کے کئی امیر صورت افراد یہاں موجود تھے اور کافی وغیرہ پینے کے ساتھ ساتھ فلم دیکھ رہے تھے مگر یہ اس کلب کا صرف ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ اس تہ خانے میں تھا جس کی سیڑھیاں فقط خاص ٹوکن کے ذریعے اتری جاسکتی تھیں۔ اشرف کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے ٹوکن ایک ادھیڑ عمر شخص کو دکھائے۔ یہ شخص بھی کوئی ریٹائرڈ پولیس والا ہی نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے سرتاپا گھورا' پھر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم وسیع و عریض کوٹھی کے مرکز کی طرف چلے گئے۔ یہاں ایک جہازی سائز کے بند دروازے کے پیچھے قالین پوش سیڑھیاں تھیں۔ یہ سیڑھیاں اتر کر میں ایک تہ خانے میں داخل ہوا اور حسب توقع حیران رہ گیا۔ یہاں درجنوں افراد موجود تھے۔ ان میں زیادہ تر بڑی عمر کے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ایک نہایت شاندار ڈائننگ ہال میں دیدہ زیب کرسیوں پر بیٹھے خورد و نوش میں مصروف تھے۔ اکثر میزوں پر شراب کے جام چمک رہے تھے۔ کئی افراد کی بغل میں لڑکیاں تھیں۔ یہ سب نو عمر لڑکیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں سے زیادہ تر کرسچین تھیں۔ یہ سارا دھندا ایک اعلیٰ ریٹائرڈ پولیس افسر کی زیر نگرانی ہو رہا تھا لہٰذا کسی کو کوئی ڈر خطرہ نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا اس جگہ یعنی نوبل کلب میں ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بھی قائم کی گئی تھی۔ کلب کے ممبران اور دیگر لوگ ڈرامے اسٹیج کرتے تھے اور انہوں نے ایک دو آرٹ فلمیں بھی تیار کی تھیں۔ یہ دھندا دراصل فحاشی اور بدکاری کے لیے بہانے کا کام دے رہا تھا۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کی آڑ میں نت نئی لڑکیاں یہاں پہنچتی تھیں اور ہوس کاروں کے لیے عیاشی کا سامان مہیا کرتی تھیں۔

میں بارونق ہال کی ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی پندرہ سولہ سال کی ایک دبلی پتلی لڑکی حاضر ہوگئی "جی فرمایئے۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

"فی الحال ایک کافی لے آؤ۔" وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ کر مڑی اور کمر کو لچکاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ گندمی رنگ کے باوجود وہ پرکشش لڑکی تھی۔ اگر جسم تھوڑا سا بھرا ہوتا تو وہ راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی تھی۔ یہاں کا ماحول بڑا آزادانہ تھا۔ پانی شراب کے نشے میں چور ادھیڑ عمر افراد نو خیز لڑکیوں کو بغلوں میں دبوچے بیٹھے تھے۔ کچھ سرعام فحش حرکات کرنے میں مصروف تھے۔ کوئی کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایک جواں سال شخص نے ایک لڑکی کو گود میں اٹھایا اور جھومتا ہوا میرے قریب سے گزر کر اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ میں نے ایک شریر لڑکی کو دیکھا اس نے اپنے موٹے پارٹنر کے سر پر برف والا پانی انڈیل دیا تھا۔ اب وہ اسے دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اس کے آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ اسی طرح آگے پیچھے بھاگتے وہ اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔

اچانک میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ میری نگاہ اپنے ازلی دشمن پر پڑی تھی۔ وہ شیشے کے ایک دروازے کے پیچھے سے نکلا۔ وہ اروش کے بھیس میں تھا۔ اس کے ساتھ سانولی رنگت والا ایک نوجوان تھا۔ اس نے صرف نیکر اور بنیان پہن رکھی تھی۔ یقیناً وہ باڈی بلڈنگ کرتا تھا کیونکہ اس کے جسم کا ایک ایک مسل نمایاں تھا۔ میں پہلی نظر میں پہچان گیا یہی حبشی نما شخص مٹھو کاکا تھا۔ اپنے باپ کا صحیح

جانشین۔ اس عمارت سے باہر سخت سردی تھی اور کوئی کوٹ اور جیکٹ وغیرہ کے بغیر باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن یہاں کی خوشگوار حرارت میں مٹھو کاکا نے صرف بنیان زیب تن کر رکھی تھی اور یہ بات کوئی مٹھو کاکا پر ہی موقوف نہیں تھی، اکثر نوخیز لڑکیاں جو تتلیوں کی طرح ادھر ادھر اڑتی پھرتی تھیں مختصر لباس ہی پہنے ہوئے تھیں۔ مٹھو کاکا کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی جس میں نہایت قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اروش یعنی شنکر اور مٹھو کاکا آپس میں باتیں کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرے لیکن میری صورت نہیں دیکھ سکے۔

شنکر کو دیکھ کر میرے تن بدن میں برق سی دوڑ گئی تھی۔ ایک عجیب مزیدار سا درد تھا جو رگ و پے میں پھیل گیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس شخص کو دیکھ کر مجھے کیا ہو جاتا تھا۔ میں اس سے لڑنا چاہتا تھا۔ اسے کچلنا اور مسلنا چاہتا تھا، اسے اپنے سامنے بے بس دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے مزید اذیت دینے کے لیے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ مارنا تو کوئی سزا نہیں۔ بار بار مارنا اور پھر زندگی کی طرف کھینچ لینا سزا ہے اور میرا دل شنکر کو ایسی ہی سزا دینے کو چاہتا تھا۔

شنکر اور مٹھو کاکا میرے قریب سے گزر کر ایک کمرے میں چلے گئے۔ میں نے انگریزی اخبار اپنے چہرے کے سامنے کر رکھا تھا۔ اخبار کی اوٹ سے میں شنکر اور مٹھو کاکا کی نقل و حرکت بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے جس لڑکی کو کافی کا آرڈر دیا تھا وہ ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں موجود ہر لڑکی کے کندھے یا سینے پر ایک بیج لگا ہوا تھا۔ اس چمکیلے بیج پر نمبر لکھا ہوا تھا۔ جو لڑکی مجھ سے آرڈر لے کر گئی تھی اس کا نمبر بے تھا۔

میں دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ وہ کافی لائی تھی۔ کافی سرو کرنے کے بعد وہ بولی "کچھ اور چاہیے جناب؟"

"اور کیا ہے؟"

"اور میں ہوں۔ اس کے علاوہ یہ ہے۔" اس نے ایک البم اس طرح میرے سامنے رکھ دیا جیسے کھانے کا "مینیو" رکھا جاتا ہے۔ اس البم میں نوخیز لڑکیوں کی ڈھائی تین درجن تصویریں تھیں۔

میں نے دیکھا کچھ تصویریں اس البم میں سے نکال لی گئی تھیں۔ میں سمجھ گیا، یہ ان لڑکیوں کی تصویریں تھیں جو آج رات گاہکوں نے چن لی تھیں۔ میں نے البم لڑکی کو واپس تھماتے ہوئے کہا "میں ابھی کچھ دیر میں بتاؤں گا۔"

وہ مسکراتی اور بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ وہ میزوں کے درمیان سے گزری تو ایک شرابی نے بڑے زور سے اس کی کمر پر چپت رسید کیا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ شرابی پر پل پڑے گی، لیکن پھر اس نے خود پر ضبط کیا اور آگے بڑھ گئی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی یہ ضبط و تحمل زمانے کی ستم گری نے اسے سکھایا تھا۔

کچھ دیر بعد شنکر اور کاکا اس دروازے میں سے باہر نکل آئے جس کے پیچھے اوجھل ہوئے تھے۔ شنکر کے ہاتھ میں شراب کی ایک نہایت قیمتی بوتل نظر آ رہی تھی۔ شنکر اور کاکا اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے اور تبصرہ کر رہے تھے۔ شنکر تو نارمل نظر آ رہا تھا مگر مٹھو کاکا سخت نشے میں تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور حرکات و سکنات میں بے ترتیبی تھی۔ میں اخبار کی اوٹ سے اس کے تاثرات غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک دم کاکا کے چہرے پر چمک ابھری۔ اس کے ذہن میں جیسے کوئی نیا نیا خیال آیا تھا۔

اس نے ہال نما کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تب ایک بار پھر شنکر سے باتیں کرنے لگا۔ شنکر کے ہاتھ میں جو قیمتی شراب تھی اس پر ایک عارضی سا ریپر بھی تھا۔ ریپر کے کاغذ پر سرخ مارکر سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔ یہ (15 YEARS) کے الفاظ تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اس شراب کی عمر ہے۔ اسے تیار ہوئے پندرہ سال گزر گئے تھے۔ شنکر سے مشورہ کرنے کے بعد مٹھو کاکا نے ایک بار پھر ہال کمرے میں نگاہ دوڑائی، پھر بہکے ہوئے لہجے میں بولا "ففٹین کون کون ہے... ففٹین ادھر آ... ففٹین۔"

میں نے دیکھا چند سیکنڈ بعد دو لڑکیاں آ کر مٹھو کاکا کے پاس کھڑی ہو گئیں پھر ایک اور اپنے پارٹنر کے پاس سے اٹھی اور مٹھو کاکا کے پاس چلی گئی۔ ان تینوں لڑکیوں کے لباس پر جو چمکیلا بیج لگا ہوا تھا اس پر "15" نمبر لکھا تھا۔ اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بیج پر لڑکیوں کے نمبر نہیں بلکہ ان کی عمر لکھی ہوئی ہے۔ اپنی اپنی عمر کا لیبل اپنے جسموں پر لگائے یہ لڑکیاں ہوس کار شرابیوں کے درمیان گھوم رہی تھیں۔

تینوں لڑکیوں میں سے ایک زیادہ خوب صورت تھی۔ مٹھو کاکا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کیا اور شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھما دی پھر وہ بہکے ہوئے انداز میں بولا "ووٹ اِن انڈیا کبھی میچنگ ہے، ففٹین کے ہاتھ میں ففٹین۔ شراب کی عمر پندرہ شباب کی بھی پندرہ۔" اس کے فقرے پر کئی شرابیوں نے تالیاں بجائیں اور ہو ہا کی آوازیں بلند کیں۔

مٹھو کاکا نے شراب اور شباب دونوں کو شنکر کی طرف دھکیل دیا۔ شنکر نے لڑکی کے گلے میں اپنا ایک بازو ڈال دیا۔

اسی دوران میں ایک شرابی اٹھ کھڑا ہوا اور واویلا کرنے لگا۔ دراصل یہ وہی شخص تھا جس کے پہلو سے اٹھ کر لڑکی کاکا کے پاس پہنچی تھی۔ اب یہ شخص سخت اعتراض کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ لہرا کر بولا "میں ایسا کھوتا ہوں... جس پہ کوئی سواری نہیں کر سکتا۔ یہ چھوکری... میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ ہی رہے گی... کوئی پھنے خاں ہوگا... تو اپنے گھر ہوگا۔ اگر وہ میرے گھر میں پھنے خانی کرے گا تو میں... تو میں... تو میں... دولتیاں مار مار کر اس کا ناریل توڑ دوں گا۔ میں بہت برا... کھوتا ہوں۔"

پھر وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا مٹھو کاکا کی طرف بڑھا۔ ایک نوکر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے ایسا دھکا دیا کہ نوکر اڑتا ہوا شیشے کی ایک میز پر گرا اور اسے چکنا چور کر گیا۔ شراب کی وجہ سے شاید اس شخص میں جناتی طاقت آئی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ بہت بڑے پھنے خاں ہیں لیکن میں بھی... ایرا غیرا نہیں ہوں۔" اس نے پھر ڈائیلاگ مارا اور اپنا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھایا۔ لڑکی شنکر کی بغل میں تھی۔ شنکر نے اطمینان سے کھڑے کھڑے ایک زور کا مکا اپنے "رقیب" کے جبڑے پر رسید کیا۔ جبڑا چٹخنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ شخص الٹ کر کرسیوں پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی مکا نہیں تھا کہ مدِمقابل "ایک مزید" کی طلب کرتا۔

ہال کمرے میں قہقہے گونجے۔ تین ملازم بے ہوش شرابی کو جلدی سے اٹھا کر باہر لے گئے۔ حاضرین چند سیکنڈ بعد پھر اپنے اپنے مشاغل میں معروف ہو گئے۔ اس قسم کے واقعات غالباً یہاں روز مرہ کا معمول تھے۔ شنکر کو دیکھ کر اور اس کے طور اطوار کو دیکھ کر میرے اندر کی ہلچل بڑھ گئی تھی۔ انگلیاں شنکر کی گردن دبوچنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں۔

شنکر، اپنے توندیل دوست مٹھو کاکا اور شنکر کے ساتھ اس تہ خانے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس اندرونی حصے میں کمرے وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اندرونی حصے کی طرف جانے کے لیے شنکر اور مٹھو کاکا کو میرے قریب سے گزرنا تھا۔ کئی لوگ شنکر کے احترام میں کھڑے ہو گئے تھے۔ شنکر نے جین کی چست پتلون پہن رکھی تھی، اوپر ٹی شرٹ تھی۔ وہ ہلکا سا لنگڑاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ پھر اخبار کی اوٹ میں کر لیا تھا، جب شنکر میرے قریب سے گزرا تو میرے ذہن میں وہی چند منٹ پہلے والا منظر چمکا۔ بدمست شرابی نے لڑکی کی پشت پر زور کا چپت لگایا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ یہی حرکت شنکر شکرا کے ساتھ کر کے اس کی قرار واقعی تذلیل کروں۔

جونہی وہ میرے قریب سے گزر کر آگے بڑھا، میں نے اس کے کولہوں پر زور کا چپت لگایا۔ چپت کی آواز پورے ہال میں گونجی۔ شنکر نے تڑپ کر پیچھے دیکھا۔ مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اپنی جگہ پتھر کا بت بن گیا تھا... اور کچھ یہی کیفیت ان چند افراد کی بھی ہوئی تھی جنہوں نے مجھے چپت مارتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں کے لیے شنکر (اروش) یقیناً کوئی بہت پہنچی ہوئی چیز تھا۔ جارج کالا اور مٹھو کاکا جس کے قدموں میں بیٹھتے تھے یقیناً وہ کوئی پہنچی ہوئی چیز ہی تھا۔ اسے اس طرح مارا جائے گا شاید وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ فوری طور پر ان لوگوں کے ذہن میں دو ہی باتیں آئی ہوں گی۔ میں نے بے انتہا شراب پی رکھی ہے، یا پھر میں دیوانہ ہوں۔ ورنہ میں ایسی جان لیوا حرکت کیوں کرتا۔

مٹھو کاکا غراتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن شنکر نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا "نہیں بچے! تم نے اس کو کچھ نہیں کہنا۔"

مٹھو کاکا طیش آمیز حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گالی نکالتے ہوئے کہا "کون ہے یہ؟"

میں نے کہا "تم ابھی ابھی اپنی ماں کی گود سے نکلے ہو، میرے بارے میں جاننا ہے تو اپنے باپ سے پوچھو۔ اگر وہ واقعی تمہارا باپ ہے تو۔"

کاکا کا سانولا رنگ کچھ اور بھی سنولا گیا۔ شکاری کتے کی طرح اس کی باچھیں پھیل گئی تھیں اور دانت چمک رہے تھے۔ اس نے پھرتی سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور دائیں جانب میز پر بیٹھے شخص کے کوٹ میں سے پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول میری طرف سیدھا کرتا شنکر نے اسے سختی سے روک دیا۔ شنکر کی آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے تھے۔ اس نے پندرہ سالہ شباب اور پندرہ سالہ شراب کو خود سے دور ہٹا دیا اور مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔ اپنی نہایت قیمتی گھڑی اتار کر مٹھو کاکا کی طرف اچھال دی، اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے بھی اتار دیا۔

میں نے بھی جیکٹ اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ شراب

خانے کے طول و عرض میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ لوگ کونوں میں سمٹ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہاں کوئی سنگین قسم کا معرکہ ہونے لگا ہے۔

اتنے میں میں نے مٹھو کاکا کے باپ جارج کالے کو دیکھا' وہ سیڑھیاں اترتا ہوا تیزی سے نیچے آ رہا تھا' میں اسے پانچ چھ برس بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی فربہ ہو چکا تھا۔ پتلون پتہ نہیں کس طرح اس کی توند پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے گلوں کا گوشت نیچے لٹک آیا تھا اور بیشتر بال سفید ہو گئے تھے۔ وہ ہانپتا ہوا میرے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا' اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت آمیز حیرت تھی۔ یقیناً اسے وہ چھوٹے بڑے زخم یاد آ گئے تھے جو میں نے ماضی قریب میں اسے دیے تھے۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "شاید تم اروش صاحب کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہو۔"

"اروش نہیں شنکر۔ باقی تم نے ٹھیک کہا ہے' میں اسی کا پیچھا کرتے ہوئے آیا ہوں۔ مجھے اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑنا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے' اروش صاحب جب تک اس چھت کے نیچے ہیں ہمارے مہمان ہیں' تم ان کی طرف آنکھ بھی اٹھاؤ گے تو ہم آنکھ نکال کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دیں گے۔"

میں نے شنکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "یہ کتا کیا کہہ رہا ہے شنکر! کیا میں واقعی یہاں سے چلا جاؤں؟"

شنکر نے کہا "اب تمہاری قسمت میں یہاں سے اپنے قدموں پر چل کر جانا نہیں ہے۔ واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب تمہیں لڑنا ہوگا۔"

میرے اور شنکر کے درمیان چند زہریلے فقروں کا تبادلہ ہوا' اس دوران میں ہمارے گرد کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو مجھے پہچان گئے تھے اور اس کے علاوہ شنکر کو بھی۔ انہوں نے اس شراب خانے میں ایک سنسنی خیز لڑائی کی بو سونگھ لی تھی۔ ان کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آنے لگا تھا۔

ایک بوڑھا شرابی جو پولو کا سابقہ کھلاڑی بھی تھا' لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میرا کندھا چومتے ہوئے انگریزی میں کہا "میں نے تجھے پہچان لیا ہے جہانی۔ بڑے عرصے بعد تیری صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ پتا نہیں اپنے لاہور کو چھوڑ کر کہاں کہاں بھٹک رہا تھا تو۔" ایک لمحہ توقف کرکے اس نے بوتل سے منہ لگا کر بلیک ڈاگ کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور میرا ہاتھ فضا میں اٹھاتے ہوئے بولا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ نامی گرامی اسٹریٹ فائٹر شاہ جہاں عرف ماسٹر جہانی۔ اور آج کی اس گرما گرم نائٹ میں اس کا مقابلہ ہے انڈیا کے مشہور اسٹریٹ فائٹر شنکر شکرا عرف شنکر بھارتی کے ساتھ۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ آج ہم کو بیٹھے بٹھائے اچانک یہ سنسنی خیز مقابلہ دیکھنے کو مل گیا ہے۔ ماسٹر جہانی کے لیے میرا ریٹ ہے۔ میرا ریٹ ہے... ایک کے بدلے میں تین۔"

"نہیں ایک کے بدلے میں چار۔" ایک اور پرجوش شخص نے کہا۔

"ٹھیک ہے' ایک کے بدلے میں چار۔" کئی آوازیں ابھریں۔

"بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہاں کوئی جوا نہیں ہوگا۔" میں نے سختی سے کہا۔

لیکن شور اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ میری آواز دب کر رہ گئی۔ حاضرین بڑے جوش کے عالم میں تھے۔ کئی افراد شنکر کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے۔ ایک بدمست شرابی نے پہلے شنکر کا ہاتھ اٹھا کر فضا میں بلند کیا' پھر جیب سے پانچ سو کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر ہوا میں لہرانا شروع کر دیں۔

جارج کالا کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ اس ڈانسنگ ہال کا فرنیچر اور اندرونی ڈیکوریشن نہایت قیمتی تھا۔ یہاں سارا شیشہ فرانس کا لگا ہوا تھا اور تمام کی تمام میزیں مکمل طور پر شیشے کی تھیں۔ اگر یہیں پر لڑائی شروع ہو جاتی تو سب چکنا چور ہو جاتا۔ جارج کالے نے دھواں دھواں چہرے کے ساتھ کہا "ٹھیک ہے' اگر یہ فائٹ یہیں پر ہونی ہے تو پھر سامنے ڈانسنگ فلور پر ہوگی۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ڈانسنگ فلور کافی بڑا تھا لیکن لڑائی کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ جارج کا ڈانسنگ ہال بچتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔

مجھے شنکر کی آنکھوں میں خون کی پیاس نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور بس دیکھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہم دونوں رقص گاہ کے چوبی فرش پر پہنچ گئے۔ یہ فرش ایک طرف سے چالیس فٹ کے قریب تھا' دوسری طرف اس کی لمبائی ستر اسی فٹ تک چلی گئی تھی۔ درجنوں جوڑے یہاں بآسانی رقص کر سکتے تھے۔

تماشائی کھڑے ہو گئے تھے' کچھ کرسیوں اور میزوں پر چڑھ گئے تھے۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔ اسٹریٹ فائٹس میں آتشیں اسلحہ استعمال نہیں کیا جاتا' اس کے باوجود کچھ لوگوں کو ڈر تھا کہ یہاں اندھا دھند فائرنگ ہو جائے گی۔ ایسے

لوگ خوف زدہ ہو کر یہاں سے باہر چلے گئے تھے۔

جو لوگ شرطیں لگا رہے تھے ان میں سے ایک ادھیڑ عمر نے مٹھو کاکا کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ مٹھو کاکا اس شخص کی بات سننے کے بعد اسٹیج کی طرف بڑھا' اس نے بلند آواز میں کہا "مسئلہ یہ ہے کہ مقابلہ انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جوڑ برابر کا ہو... لیکن یہ برابر کا جوڑ نہیں ہے' وہ اس لیے کہ شنکر صاحب کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی' وہ کچھ ہی دن پہلے اسپتال سے آئے ہیں۔ اپنی ٹانگ کو پوری طاقت کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے۔"

میرے ایک حمایتی نے کہا "یہ کوئی بات نہیں کاکا صاحب۔ کچھ عرصہ پہلے ٹانگ پر چوٹ لگی ہوئی لیکن اب ماسٹر جہانی کا مدمقابل چاروں خانے فٹ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے صرف ایک مکے میں ایک شخص کو چاروں شانے چت کیا ہے۔"

"وہ اور بات تھی' یہ دو فائٹروں کے درمیان ایک زوردار مقابلہ ہے۔" مٹھو کاکا نے کہا۔

"تو آپ چاہتے ہیں کہ ماسٹر جہانی صاحب کی ٹانگ بھی زخمی کر دی جائے۔"

"بکواس بند کرو۔" مٹھو کاکا نے اعتراض کرنے والے کو زور سے دھکا دیا "پہلے میری پوری بات سنو... اور بات یہ ہے کہ ہمیں صحیح مقابلہ کرانے کے لیے یہ جوڑ برابر کرنا ہوگا۔"

"کیسے کرنا ہوگا۔" پولو کے بوڑھے کھلاڑی نے لال پیلا ہو کر کہا۔

"یہ میں آپ لوگوں کو ابھی بتاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک جارج' مٹھو کاکا' شنکرا اور چند دیگر افراد آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر فیصلہ ہوا کہ اس مقابلے کا جوڑ "برابر" کرنے کے لیے میری ایک ٹانگ کو بھی پوری کارکردگی دکھانے سے روکا جائے۔ اسٹریٹ فائٹ کے ایک تجربہ کار تماشائی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میری بائیں ٹانگ کو تین پھٹیوں اور نائیلون کی رسی سے جکڑ دیا گیا۔ ٹخنے سے لے کر ران تک جب ٹانگ سے تین لکڑیاں بندھ گئیں تو ٹانگ آہنی سلاخ کی طرح بالکل سیدھی ہو گئی۔

اس حرکت سے میری نقل و حرکت کافی متاثر ہوئی ہر حال میں نے اس سخت فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں اسی طرح لڑوں گا۔"

لڑائی شروع ہونے سے پہلے جارج کالے نے ایک بار پھر ہم دونوں کو سمجھایا کہ ہم کوئی آتشیں ہتھیار یا تیز دھار آلہ استعمال نہیں کر سکتے۔ دراصل جارج کو اپنی فکر پڑی ہوئی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ یہاں کوئی قتل ہو گا تو اسے مصیبت پڑ جائے گی۔ اسٹریٹ فائٹ کے موقعے پر اکثر اس قسم کے اصول طے کیے جاتے ہیں لیکن لڑائی اکثر اپنے اصول خود ہی طے کرتی ہے "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز" والا مقولہ عموماً درست ثابت ہوتا ہے۔

رقص گاہ کے فرش پر ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ پہل شنکر نے ہی کی۔ اس نے اچانک مکا چلایا' میں نے جھک کر اس کا وار خالی دیا اور ایک زوردار "اپر کٹ" اس کی ٹھوڑی پر جمایا۔ اپر کٹ نیچے سے اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے' اس کا نشانہ عام طور پر پسلی اور ٹھوڑی بنتی ہے۔ شنکر کے سر نے جھٹکا کھایا' اور وہ لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے بھاگ کر اس کے سینے پر ٹانگ رسید کی' وہ پچھلے فرش پر گرا اور الٹ کر دور تک پھسل گیا۔ اس کے سنبھلنے کی رفتار بڑی تیز ہوتی تھی۔ اس مرتبہ بھی وہ حیران کن تیزی سے سنبھلا۔ اپنے پاؤں دیوار کے ساتھ لگا کر کسی پیراک کی طرح اس نے خود کو "پش" کیا اور فرش پر پھسل کر میری ٹانگوں سے آ ٹکرایا۔ میں اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا' دوسرے ٹانگ بھی لکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی' میں اوندھے منہ فرش پر گرا' ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

اگلے دو تین منٹ میں ہمارے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تماشائیوں کے شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شنکر کی ٹھوڑی اور ناک سے خون رس رہا تھا۔ اس کی قمیص تار تار ہو گئی تھی جسے اس نے اتار کر پھینک دیا تھا۔ میرے منہ میں بھی خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ جو لکڑیاں میری ٹانگ سے باندھی گئی تھیں' وہ سخت نقصان پہنچا رہی تھیں۔ ان لکڑیوں نے میری ران کو چھیل کر رکھ دیا تھا۔ لڑتے لڑتے ہم رقص گاہ کے بالکل عقبی حصے میں چلے گئے۔ یہاں لکڑی کے ایک خوب صورت ریک میں شراب کی بہت سی قیمتی بوتلیں رکھی تھیں۔ ریک گر جانے سے یہ بوتلیں چکنا چور ہو گئیں اور ہر طرف الکحل کی تیز بو پھیل گئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' ان بوتلوں کے ٹوٹنے سے "ہوٹل کلب" کو لاکھوں کا نقصان پہنچا۔ ان میں سے کچھ بوتلیں سو سال سے زیادہ پرانی تھیں۔

شنکر سے لڑتے ہوئے یہ بات میرے ذہن میں رہتی تھی کہ مجھے اس کے گھٹنے کی ہلاکت خیز ضرب سے بچنا ہے' اسی طرح شاید وہ بھی میرے مسک دار کی طرف سے چوکس رہتا تھا۔ شنکر سے لڑتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات بھی موجود

تھی کہ جارج کالے اور اس کے بیٹے منھو کاکا کو قرار واقعی سزا دینی ہے اور انھیں سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ میں اپنی اور شنکر کی لڑائی کو ڈائننگ ہال میں پہنچا دیتا' اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ جونہی لڑائی ڈائننگ ہال میں پہنچی ہر طرف شیشے کے چھناکے گونجنے لگے۔ یہ ڈائننگ ہال ایک طرح سے شیشے کا گھر تھا۔ شیشے کی میز' شیشے کے برتن' شیشے کے ستون اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ شیشے کا تھا۔ یہ سب کچھ برباد ہونا شروع ہوگیا۔ شنکر کے ہاتھ میں ہاف میٹر موٹے شیشے کا ایک نوکیلا ٹکڑا آگیا تھا۔ وہ اس خطرناک ٹکڑے کو خنجر کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ جواباً میں نے بھی ایک بلوری میز کا ٹوٹا ہوا بلوری پایہ اٹھالیا۔ جارج کالے کی کم بختی کہ وہ ہمارے قریب آگیا۔ دراصل وہ اپنے ڈائننگ ہال کو بچانے کے لیے ہمیں واپس رقص گاہ کے فلور پر بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ اضطراری حالت میں ایک بالکل احمقانہ حرکت کر رہا تھا۔ میرا ایک وار اچٹتا ہوا سا شنکر کے کندھے پر لگا اور پھر جارج کالے کا پیٹ چاک کر گیا۔ ٹوٹے ہوئے پایے کی نوکیلی دھار نے جارج کی توند پر کوئی ایک فٹ چوڑا کٹ لگا دیا تھا۔ میں نے جارج کی کٹی ہوئی نیلی قمیض کے اندر سے اس کی آنتوں کو باہر نکلتے دیکھا' وہ لڑکھڑا کر کرچیوں بھرے فرش پر گرا' چند ملازم اسے اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگ گئے۔ جس وقت جارج کالا زخمی ہوا صرف ایک لمحے کے لیے شنکر کی توجہ میری طرف سے ہٹی تھی۔ یہ ایک لمحے کی غلطی کافی سنگین غلطی تھی۔ میں نے وزنی بلوری پائے کو ایک ڈنڈے کی طرح شنکر کے منہ پر مارا' پایہ چکنا چور ہوگیا اور شنکر بھی پشت کے بل دو میزوں کے درمیان گرا۔ جب وہ گرا اس کی ایک ٹانگ میز کے اوپر تھی۔ یہ وہی ٹانگ تھی جو دادوالی کے میلے میں میرے ہاتھوں ٹوٹ چکی تھی۔ آج ایک مختصر ترین لمحے میں وہ پھر میرے نشانے پر آگئی تھی۔ میں نے پاؤں کی بھرپور ضرب شنکر کے گھٹنے کے قریب ماری۔ شنکر شکرا عرف شنکر بھارتی کے ہونٹوں سے ایک کرب ناک کراہ نکلی' اس کی ٹانگ پھر ناکارہ ہوگئی تھی۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر میری زد سے نکلا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

شنکر کا یوں لڑھکنا اس کے لیے دو طرح سے فائدہ مند ثابت ہوا۔ ایک تو وہ میری مہلک زد سے دور نکل گیا' دوسرے اس کے ہاتھ میں ٹھوس چاندی اور پیتل کا بنا ہوا ایک وزنی گلدان آگیا۔ شنکر ایک عیار و مد مقابل تھا۔ وہ اوندھا پڑا رہا اور گلدان اس کے نیچے دبا رہا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ میں ذرا سا جھکا ہوا تھا' اچانک شنکر بجلی کی طرح تڑپا' مجھے یوں لگا جیسے میری کنپٹی پر کسی نے ہتھوڑے سے ضرب لگائی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر تن گئی۔ میں تیورا کر ٹوٹے ہوئے شیشوں پر گرا' ایک فٹ لمبے لیکن نہایت وزنی گلدان کا دوسرا وار میں نے اپنی کلائی پر روکا' یہ ضرب بھی میرے سر پر لگتی تو ناریل کی کھوپڑی تڑخ جاتی۔ وار روکنے کے بعد میں پہلو کے بل گرا تھا۔ میں نے شنکر کو چیل کی طرح خود پر جھپٹتے دیکھا۔ بچنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ شنکر نے میرا بازو مروڑ کر پشت سے لگا دیا' میں اوندھے منہ پڑا تھا اور پوری طرح شنکر کے شکنجے میں تھا۔ شنکر جس قدر سفاک تھا اتنا ہی عیار بھی تھا۔ لڑائی کے دوران میں اس کی عیاری دوگنا بڑھ جاتی تھی۔ اس بدبخت کو معلوم تھا کہ دو ڈھائی سال پہلے میرے سینے کا ایک سنگین آپریشن ہوا تھا اور میرے جسم کے اندر سے مواصلاتی آلہ نکالا گیا تھا۔ شنکر نے وحشت کے ان لمحات میں میرے سینے کے اسی حصے کو نشانہ بنایا۔ اس کے گھٹنے کی پے در پے طوفانی ضربات میری بائیں پسلیوں میں لگیں اور مجھے لگا کہ میرا پھیپھڑا پھٹ گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے میری اس ضرب کا فوری جواب تھا جو میں نے شنکر کی ٹانگ پر لگائی تھی۔ یہ ایسی خوفناک ضربات تھیں کہ میں اپنی کراہیں ہونٹوں کے اندر نہ دبا سکا۔

میرا سارا بایاں پہلو شدید تکلیف کے بعد یک لخت بے جان سا ہوگیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میں مزید مقابلہ جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ لیکن یہ کوئی "RING FIGHT" نہیں تھی جس میں ہاتھ اٹھا کر میں مقابلے سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیتا۔ یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔۔۔ موجودہ صورتِ حال میں میں تو شاید شنکر کو معاف کر دیتا لیکن وہ مجھے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری لاش اٹھوا کر بہت خوشی محسوس کرے گا۔ بالفرض میں اس لڑائی میں اپنی شکست کا اعتراف بھی کر لیتا تو تماشائیوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ شنکر کو لڑائی روکنے پر مجبور کر سکتا' بلکہ شاید وہ سارے مل کر بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسٹریٹ فائٹ تھی۔ ایسی لڑائیوں سے پیشتر اصول ضابطے وغیرہ بنائے جاتے ہیں لیکن اکثر ایسی لڑائیاں اپنے اصول خود بناتی ہیں۔ ایسی لڑائی میدان جنگ میں ہونے والی لڑائی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں دشمن کو کسی بھی طرح مارنا اور خود کو کسی بھی طرح بچانا ہی سب سے بڑا اصول ہوتا ہے۔ اکثر موقع محل کے لحاظ سے ایک بہادر سپاہی کو بھی پسپا ہونا پڑتا ہے۔

چند ساعتوں کے اندر دو باتیں بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھیں۔ نمبر ایک یہ کہ میں فی الحال شنکر سے لڑنے کے قابل نہیں رہا' نمبر دو یہ کہ اگر مجھے اپنی جان بچانی ہے تو خود ہی بچانا ہوگی' کوئی اس لڑائی کو روکنے کے لیے آگے نہیں بڑھے گا۔ بے شک مجھے شدید چوٹ آئی تھی لیکن میں بھی شنکر کی ٹانگ توڑ کر اسے شدید نقصان پہنچا چکا تھا۔ اس اعتبار سے پوائنٹس پر یہ لڑائی تقریباً برابر ہی تھی۔

شنکر نے مجھے سیدھا کیا' جونہی اس نے اپنا خطرناک ترین وار کرنے کا ارادہ کیا یعنی میری ٹانگوں کے درمیان اپنے گھٹنے کی مخصوص ضرب لگانا چاہی' میں نے رہی سہی قوت جمع کر کے اسے اپنی ٹانگ پر اچھال کر دور پھینک دیا۔ صرف چند فٹ کے فاصلے پر بجلی کی "ڈی پی" تھی۔ اسی "ڈی پی" میں وہ روانچ چوڑا مین سوئچ بھی نظر آرہا تھا جو اس تہ خانے کو روشنی دے رہا تھا۔ میں نے لوہے کا ایک اسٹول دیکھ لیا تھا۔ یہ اسٹول میں نے پوری قوت سے "ڈی پی" میں دے مارا۔ ضرب دھماکے سے کم نہیں تھی' پہلے ڈی پی کا شیشہ چکنا چور ہوا پھر وسیع بیسمنٹ گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوب گیا۔ سیڑھیاں مجھ سے دو قدم کی دوری پر تھیں۔ میری ایک ٹانگ اکڑی ہوئی تھی۔ دوسری ٹانگ سے سیڑھیاں چڑھتا میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ یہاں قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ صرف تہ خانہ ہی تاریکی میں ڈوبا ہوگا لیکن باہر بھی تاریکی تھی۔ غالباً تار وغیرہ شارٹ ہونے سے پورا سرکٹ ہی خراب ہوگیا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ باہر سے مقفل کیا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ میرا بایاں پہلو بالکل سن تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ حصہ میرے جسم کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ یہ میری قوتِ ارادی ہی تھی جس نے مجھے پارکنگ تک پہنچایا "زرین۔۔۔ زرین" میں نے کراہتے ہوئے زرین گل کو آواز دی۔

تاریکی میں سے ایک سایہ لپک کر میرے پاس آیا۔ یہ زرین تھا۔ اس نے مجھے سہارا دیا اور گاڑی میں بٹھا دیا۔ یہی وقت تھا جب اندر سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ یقیناً شنکر' منھو کاکا وغیرہ مقفل دروازے پر فائرنگ کر رہے تھے (دروازے کی چابی میری جیب میں تھی)

زرین نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کہاں جانا ہے استاد صیب!"

"پہلے اپنے گھر پر چلو۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ بایاں پہلو بالکل سن تھا' شاید اسے درد کی انتہا نے سن کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

○☆○

ہم تقریباً پندرہ منٹ میں گھر پہنچے۔ راستہ تو بالکل مختصر تھا لیکن راستے میں الیکشن کے امیدوار کارنر میٹنگز کرنے میں مصروف تھے۔ ہم گھوم گھما کر پہنچ سکے۔ دوسرے زرین کی ڈرائیونگ بھی بس واجبی سی تھی۔ یہ پندرہ منٹ میں نے جس اذیت میں گزارے کچھ مجھے ہی خبر تھی۔ زرین کی یہ گاڑی بھی تاریک شیشوں والی تھی۔ ویسے بھی میں نشست پر لیٹا ہوا تھا' مجھے باہر سے دیکھے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہم پورچ میں پہنچے' پورچ سے زرین نے مجھے بڑی خاموشی سے انیکسی پہنچا دیا۔ ایسا اس نے میری ہی ہدایت پر کیا تھا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ کلثوم اور ملازمین کو میری آمد اور میری حالت کی خبر ہو۔ انیکسی میں پہنچ کر زرین نے سب سے پہلے میری ٹانگ کو لکڑیوں کی بندش سے آزاد کیا' پھر وہ درد کش گولیاں لے آیا۔ میں نے یہ گولیاں پانی سے نگل لیں۔ پہلو سے شروع ہونے والا درد اب ٹانگ اور بازو تک پھیل گیا تھا۔ میں اذیت کی شدت سے بے حال ہو رہا تھا۔ زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میں اپنے بازو اور ٹانگ کو ٹھیک سے حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔

"ہمارا خیال ہے کہ ام ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔" زرین نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں زرین' ابھی گولیاں کھائی ہیں۔ ان کا اثر دیکھتے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔ یہ سب ہوا کیسے؟" زرین نے اپنے آپ میں الجھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

"ام سب جانتا ہے استاد صیب! آپ کا یہ حالت اسی خنزیر شنکر نے کیا ہے۔ ام اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ خود مرے گا یا اسے مار ڈالے گا۔"

"دیکھو زرین! تم میری تکلیف میں اضافہ کر رہے ہو۔ ابھی کچھ مت کہو۔ میں تمہیں بعد میں سب کچھ بتاؤں گا۔"

میری بات زرین کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے مزید بحث نہیں کی۔۔۔ اور نہ ہی ڈاکٹر کو بلانے پر اصرار کیا۔ مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ میری ایک دو پسلیاں ٹوٹ چکی ہوں۔۔۔ اور اگر ایسا ہو گیا تھا تو پھر پھیپھڑے کا زخمی ہونا بھی بعید از قیاس نہیں تھا۔ یہ بات بھی مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر پھیپھڑے وغیرہ زخمی ہونے سے اندر ہی اندر "بلیڈنگ" ہوتی رہے تو بندے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ تکلیف اتنی زیادہ

تھی کہ میں پسینے سے تر ہو گیا تھا۔

گولیوں سے دو گھنٹے تک قدرے افاقہ رہا لیکن اس کے بعد پھر درد کا عفریت اپنے نوکیلے پنجوں سے میرا پہلو کریدنے لگا۔ میں نے قمیص اٹھا کر اپنے طور پر پسلیوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن اب ٹٹولنے کا وقت گزر گیا تھا۔ سوجن ہو چکی تھی اور سوجن کے سبب کچھ بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

اس طرح دن چڑھ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کو بلائے بغیر چارہ نہیں لیکن ڈاکٹر کو بلانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے زریں سے کہا "اگر تم ڈاکٹر کو بلانا چاہتے ہو تو پھر غزالہ کو بلا لو لیکن اس طرح بلانا کہ چچا چچی وغیرہ کو شبہ نہ ہو۔"

زریں بولا "یہ آپ کے دماغ میں بالکل ٹھیک بات آیا ہے' ام ابھی غزالہ بی بی کو فون کرتا ہے۔ ام تھوڑا سا اشارہ بھی دے دے گا تاکہ وہ اپنا سامان وغیرہ ساتھ لے آئے۔"

"میں پھر کہتا ہوں' چچا چچی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بالکل بھی فکر مت کریں۔" زریں نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد غزالہ میرے سامنے موجود تھی۔ اس کا اجلا شفاف چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اپنی آدھی تکلیف جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا' حسین آنکھوں میں اضطراب کروٹ لے رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جس سے پیار ہو اس کا سب کچھ پیارا ہوتا ہے لیکن میں اس سے ہٹ کر سوچتا تھا تو بھی مجھے غزالہ کی "طبی" صلاحیتوں پر بے حد اعتماد محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایسے معالجوں میں سے تھی جن کے ہاتھوں میں پہنچ کر مریض اپنے سارے آلام و دکھ اپنے معالج کے سامنے بیان کرکے بے فکری سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔

میں نے بھی غزالہ کو ساری صورت حال بتائی اور پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وہی کرے گی جو میرے لیے بہترین ہوگا۔ اگر مجھے اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی تو پھر وہ اپنی شفیق استاد ڈاکٹر رقیہ سے رابطہ کرکے مجھے اسپتال بھی پہنچا سکتی تھی۔ مجھے غزالہ کی ذہانت اور صلاحیت پر پورا بھروسا تھا۔

غزالہ نے زریں کی مدد سے میرا بالائی لباس کاٹ کر اتار دیا اور میرے پہلو کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی مہربان انگلیاں میرا درد چن رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ تسلی آمیز باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ اب یہ بات تو وہی جانتی تھی کہ ان باتوں میں تسلی کتنی ہے اور حقیقت کتنی؟ کچھ دیر بعد جب غزالہ نے میری نس میں انجکشن لگایا تو مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی' لیکن حقیقت میں یہ غنودگی اسی وقت طاری ہونے لگی تھی جب میں نے غزالہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

دوبارہ میری آنکھ تقریباً چھ بجے شام کھلی۔ میں دس گھنٹے گہری نیند سویا رہا تھا۔ اس نیند کے دوران میں درد کا ایک ہلکا سا احساس ضرور رہا تھا لیکن مجموعی طور پر یہ نیند پرسکون ہی تھی۔ میں نے آنکھ کھولی تو غزالہ میرے قریب بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے کوئی نمایاں پریشانی دکھائی نہیں دی۔ ممکن تھا کہ اس نے اپنے تاثرات کو جان بوجھ کر نارمل رکھا ہوا ہو۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میری حالت میں واقعی بہتری پیدا ہوئی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے غزالہ کو دیکھا۔ اس نے بڑی نرمی سے میرا ہاتھ تھاما اور بولی "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی RIBS بالکل محفوظ ہیں۔ انشاءاللہ دو چار دن میں آپ بھلے چنگے ہو جائیں گے۔"

"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"یہ خیال نہیں جناب حقیقت ہے۔ میں آپ کو تسلی دینے کی کوشش نہیں کر رہی۔ آپ کی حالت واقعی تسلی بخش ہے۔"

میں نے اپنے بازو کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ ٹانگ بھی حرکت کر رہی تھی۔ وہ جو ایک اعصاب سن ہو جانے والی کیفیت تھی وہ اب موجود نہیں تھی۔

غزالہ نے کہا "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کی گہری غنودگی کے دوران میں نے اپنے ایک کولیگ کو بلوا کر آپ کے باقاعدہ ایکسرے کروائے ہیں اور الٹرا ساؤنڈ کروایا ہے' آپ کو صرف ضربات آئی ہیں۔ ہماری پسلیاں عقب سے ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ منسلک ہوتی ہیں' ممکن ہے کہ پسلیوں پر ضربات کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی کے اعصاب متاثر ہوئے ہوں جن کے سبب آپ کو وقتی طور پر فالج کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی ہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اب آپ ہاتھ پاؤں با آسانی ہلا رہے ہیں' اگر کچھ دقت ہے بھی تو یہ جلد ہی ختم ہو جائے گی۔"

"دیکھ لو کہیں مروا نہ دینا۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

وہ بولی "سچ کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔"

میں نے کہا "تمہارے اس فقرے میں "گھر" والی بات بڑی اچھی لگی ہے۔"

غزالہ کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے وہ ذرا تحکم سے بولی "چلیں بازو سیدھا کریں' یہ انجکشن لگوائیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "ہاں بھئی! اب تو تمہارے قبضے میں ہیں' کبھی ہمارے بھی دن آئیں گے۔"

"صبح مریض بنے پڑے تھے اب کیسے زبان چل رہی ہے۔" غزالہ نے تبصرہ کیا۔

"تمہیں دیکھ کر تو بھئی! سب کچھ ہی چلنا شروع ہو جاتا ہے' اب دیکھو دل کیسے چل رہا ہے لگتا ہے کہ بھاگ رہا ہے۔ حلق بھی خشک ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ پیاس لگی ہے مگر کس چیز کی لگی ہے یہ پتا نہیں چل رہا۔ ذرا میرا بلڈ پریشر تو دیکھنا۔"

وہ مسکرا کر بولی "بلڈ پریشر آپ کا ٹھیک ہے' ٹمپریچر دیکھ رہی ہوں' اس طرح آپ کا منہ بھی بند ہو جائے گا۔ چلیں منہ کھولیں۔"

اس نے منہ کھلوا کر تھرمامیٹر میرے منہ میں رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی حسین شوخی تھی' جو غم کے بادلوں میں سے سورج کی روپہلی کرن کی طرح پھوٹتی تھی اور مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی تھی۔ میں محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا' وہ بڑے انہماک سے میرے لیے ایک اور انجکشن تیار کرتی رہی۔ بظاہر وہ اپنے کام کی طرف متوجہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنے چہرے پر میری نگاہوں کی تپش بھی محسوس کر رہی ہے۔ اس تپش نے اس کے رخسار ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی کی طرح سرخ کر دیے تھے۔

میری حالت میں واقعی حیران کن تیزی سے بہتری آئی تھی۔ رات مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید میں کئی ہفتوں کے لیے بستر پر لیٹ گیا ہوں لیکن اب میرا دل چاہ رہا تھا کہ جلد سے جلد اٹھ کر بیٹھ جاؤں۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسی صورت حال پیش آ جاتی ہے۔ بندہ سنگین صورت حال کے ساتھ اسپتال پہنچتا ہے لیکن ایک دو گھنٹے میں بھلا چنگا ہو کر آ جاتا ہے' پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ معمولی تکلیف کے ساتھ اسپتال پہنچنے والے شخص پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک سنگین ترین مرض میں مبتلا ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے۔ کل رات میرے ذہن میں بھی ان گنت اندیشے کلبلاتے رہے تھے' سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ میرا زخمی پہلو سن ہو گیا تھا۔

غزالہ نے میرے منہ سے تھرمامیٹر نکالا اور بولی "ٹمپریچر نارمل ہے۔۔۔ ۹۸.۵۔"

"پھر میرا دل کیوں بھاگ رہا ہے۔"

"کوئی نفسیاتی بیماری لگتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک اور انجکشن مجھے ٹھونک دیا۔

میں نے چہرے پر جان بوجھ کر تکلیف کے آثار پیدا کر لیے "یہ مجھ سے کس بات کے بدلے لے رہی ہو۔"

"یہ زمانہ ہی ایسا ہے' جس کا بھلا کرو وہی لال پیلا ہوتا ہے۔"

"تو تم بھلا کر رہی ہو۔ یہ انجکشن ٹھونکنا بھی کوئی بھلا ہے؟"

"تو اور کیا بھلا ہوتا ہے؟"

"تھوڑا سا قریب آؤ تو بتاؤں۔"

وہ شرم سے سرخ ہو گئی "میں جانتی ہوں آپ کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔ آپ کو معاہدہ یاد ہوگا۔"

میں نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "غزالہ! آخر کب تک' اس طرح بھٹکتے رہیں گے آخر کب تک؟"

"جب تک قسمت میں لکھا ہے۔"

"لیکن قسمت تو ہم نے خود بنائی ہے۔"

"میں کیا کروں شاہ جہاں! مجھے بتائیں میں کیا کروں؟"

"تم نے چچا چچی سے کبھی بات کی ہے؟"

وہ چند لمحے توقف کرکے بولی "ابو میری بات سمجھتے ہیں شاہ جہاں۔ وہ میرے دل کی کیفیت بھی جانتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ہم دونوں کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے' لیکن امی۔۔۔ وہ ابھی تک پرانی ڈگر پر ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ اب بھی تمہیں شیخ عاصم کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں۔ وہ بھی ابو کی طرح عاصم کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں۔ لیکن آپ کے حوالے سے شاید ابھی ان کے دل میں نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ بیمار بھی ہیں۔ ابو کسی اختلافی مسئلے پر ان سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ ویسے بھی ابھی امی سے بات کرنا بیکار ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

غزالہ کی پلکیں غم اور شرمندگی کے بوجھ سے جھک گئیں "مطلب آپ جانتے ہی ہیں شاہ جہاں۔ میں ابھی۔ آزاد نہیں ہوں۔ عاصم نے مجھے آزاد نہیں کیا ہے۔۔۔ اور شاید۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"بس خاموش رہو۔ اس سے آگے کچھ مت کہنا غزالہ! عاصم کو وہ سب کچھ کرنا پڑے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم عدالتی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ جنگ ہم انشاءاللہ جیتیں گے ہم نے

یہ جنگ جیتنی ہے۔"

پھر میرے اور غزالہ کے درمیان قانونی کارروائی کے حوالے سے بات ہونے لگی۔ خلع کا کیس کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دو تین طلبیوں کے باوجود شیخ عاصم عدالت میں حاضر نہیں ہوا تھا۔ ایک بار اس کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ اب غزالہ کے وکیل کی طرف سے استدعا کی گئی تھی کہ فریقِ ثانی کی حاضری یقینی بنائی جائے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی زریں بھی انیکسی میں آگیا۔ اس کے آنے سے ہماری گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ زریں کے پیچھے ہی پیچھے کلثوم بھی آرہی تھی۔ میں نے زریں کو منع بھی کیا تھا کہ وہ کلثوم کو میرے بارے میں نہیں بتائے گا لیکن اس سے غالباً رہا نہیں گیا تھا۔ کلثوم کے چہرے پر حقیقی فکرمندی نظر آرہی تھی۔ اس نے بڑی تفصیل سے میرا حال چال پوچھا پھر مرغی کے تین کالے پر میرے سر کے اردگرد گھمانے شروع کردیے اور منہ میں پتا نہیں کیا کیا بدبدانے لگی۔ بعد ازاں اس نے تینوں پر توڑ کر اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ لیے۔ میں اور غزالہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ میں نے زریں سے پوچھا یہ کیا کر رہی ہے۔ وہ جل کر بولا "یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر ایک بیماری کا علاج مرغی کے ان تین پروں میں ہے۔ اب یہ ان ٹوٹے ہوئے پروں کو آگ میں جلاوے گا اور خوش ہو جائے گا۔"

وہ تیزی سے بولی "زریں گل ان باتوں کو مذاق سمجھتا ہے جی۔ لیکن ایک مہینہ پہلے جب یہ خود بیمار ہوا تھا تو بازار سے خود کالے پروں والی مرغی ڈھونڈ کر لایا تھا۔"

زریں گل منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا' پھر کلثوم سے پشتو میں مخاطب ہو کر بولا "اچھا جاؤ۔ ان پروں کو جا کر جلاؤ۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔"

یہ تدبیر کارگر رہی اور کلثوم چلی گئی۔ وہ کچھ چپ چاپ نظر آرہی تھی۔ یہ بات غزالہ نے بھی نوٹ کی۔ اس نے زریں سے پوچھا "تم نے کلثوم سے کچھ کہا تو نہیں۔ وہ روئی روئی لگتی ہے۔"

زریں بولا "رویا رویا تو وہ ہر وقت لگتا ہے۔ پتا نہیں کتنا پانی ہے اس کے سر میں' ذرا سی بات پر آنسو بہانے لگتا ہے۔ ویسے جمعے کے دن سے وہ کچھ زیادہ ہی چپ چپ ہے۔"

"کیوں جمعے کے دن کیا ہوا تھا؟" غزالہ نے پوچھا۔

"دراصل۔ وہ استاد صیب کی وجہ سے چپ ہے غزالہ بی بی۔ بات تو معمولی سا تھا۔ استاد صیب نے بس اتنا کہا تھا کہ وہ انہیں استاد صیب نہ کہا کرے' بس وہ اسی بات کو دل سے لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔"

میں حیران رہ گیا' میں نے وہ بات عام سے انداز میں کہی تھی اور اب بھول بھی چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سخت جان دیہاتی لڑکی اندر سے اتنی حساس بھی ہے۔ میں نے کہا "اگر ایسی بات ہے بھئی تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اس سے کہہ دو کہ وہ مجھے جو جی چاہے کہہ لیا کرے۔"

زریں مسکراتے ہوئے بولا "وہ اس بات پر بہت خوش ہوگا جی۔ وہ کہتا ہے کہ جب وہ آپ کو استاد صیب کہتا ہے تو اس کا منہ بالکل میٹھا میٹھا ہو جاتا ہے۔ بالکل شہد کے مافق۔"

غزالہ نے موضوع بدلتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور کہا "کل رات آپ شنکر سے لڑے ہیں نا؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ زریں تمہیں کافی کچھ بتا چکا ہے۔"

"آپ... کیوں لڑتے ہیں اس سے۔ آپ کو پتا ہے۔ وہ انسان نہیں جانور ہے۔ کوئی... خبیث بدروح گھسی ہوئی ہے اس کے اندر۔ اس کی کمینگی دیکھیں۔ اس نے ایسی ٹھوکر ماری ہے آپ کو جہاں آپ کو چوٹ نہیں لگنی چاہیے تھی۔ تو قسمت اچھی ہے کہ پسلیاں فریکچر ہونے سے بچ گئی ہیں ورنہ..." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا "اس نے پروفیسر اور شائستہ کا جو حال کیا ہے تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ پروفیسر ابھی تک اسپتال میں پڑا ہے۔"

غزالہ نے سر ہلا کر میری بات پر مایوسی کا اظہار کیا۔ زریں نے پوچھا "اب وہ کتے کا بچہ کہاں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کسی اسپتال میں ہی ہوگا۔ اس کی ٹانگ پھر ٹوٹ گئی ہے۔"

"واقعی؟" زریں نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

ایک دم زریں کو کچھ یاد آیا۔ وہ بولا "آج دوپہر کے اخبار میں ایک چھوٹا سا خبر جارج کالے کے بارے میں بھی چھپا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کل رات جارج کو زخمی حالت میں اسپتال داخل کرایا گیا۔ اس پر اس کے کسی دشمن نے چھری سے حملہ فرمایا ہے۔"

میں نے اس خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ غزالہ گھور کر مجھے دیکھ رہی تھی' بولی "کہیں یہ کارِ خیر بھی آپ ہی کے ہاتھوں تو نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "بڑا گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ اسی دوران میں کچھ ہوا ہوگا' اب ٹھیک سے پتا نہیں کہ کس کے ہاتھوں

ہوا ہے۔" میں نے گول مول بات کی۔

"آپ وہاں سے نکل کیسے سکے؟" غزالہ نے پوچھا۔

میں نے کل رات پیش آنے والے واقعے کی تفصیل اسے بتائی۔ یہ تفصیل بتاتے ہوئے کل رات کے سارے مناظر ایک بار پھر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ ان کے ساتھ ہی ان دو جنوبی نوخیز لڑکیوں کے چہرے بھی نگاہوں میں گھوم گئے جو چین کر کے نوبل کلب میں لائی جاتی تھیں اور بھوکے بھیڑیوں کے بستر پر پھینک کر ان کی بھاری قیمت وصول کی جاتی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو اس دھندے میں اسی دھندے کی جھلک تھی جو ماریطانیہ کے ماریا ٹرسٹ میں ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں وہ کام بے حد وسیع پیمانے پر ہوتا تھا یہاں محدود پیمانے پر ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ کس کس گلشن کی کلیاں تھیں۔ ان کی عمریں کالج و اسکول جانے کی تھیں۔ یہ رنگوں سے کھیلنے اور سہانے خواب دیکھنے کا دور تھا۔ یہ چاندنی رات میں مہندی لگانے اور سکھیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گیت گانے کا زمانہ تھا' لیکن ستم گر ہاتھوں نے ان کلیوں کو شاخ سے توڑ کر جنس کی بدبو دار ہوس کی دھوپ میں پھینک دیا تھا۔ اب یہ کلیاں نیم تاریک کمروں کے گھٹے ہوئے ماحول میں پڑی تھیں' ان کے گرد شراب کی سڑاند تھی اور تمباکو کا دھواں تھا۔ یہ سب کچھ ایک رہائشی بستی کے بیچوں بیچ قانون نافذ کرنے والوں کی آنکھوں کے عین سامنے ہو رہا تھا لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وجہ یہی تھی کہ یہ دھندا چلانے والوں کے ہاتھ بڑے لمبے اور شان بڑی اونچی تھی۔

کچھ دیر بعد زریں گل میرے لیے "فش مٹن" کی یخنی بنوانے چلا گیا۔ غزالہ میرے پہلو میں بیٹھی رہی۔ وہ اب جانا نہیں چاہ رہی تھی اور بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اب رات کے ساڑھے آٹھ ہو گئے تھے۔ وہ ایک ٹیوب مجھے دیتے ہوئے بولی "اس میں مرہم ہے۔ میں یہاں میز پر رکھ دیتی ہوں۔ زریں سے کہیں کہ دن میں دو بار پسلیوں پر لگا کر ہلکی سی مالش کر دیا کرے۔ انشاء اللہ تین چار دن میں درد جاتا رہے گا۔"

میں نے کہا "ایک بار تم خود ہی لگا جاؤ نا۔"

وہ ذرا تذبذب میں رہی' پھر اس نے میرے جسم سے چادر ہٹاتے ہوئے میرا بایاں پہلو ننگا کیا اور ٹیوب کا ڈھکن کھولنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے مرہم کا ٹھنڈا سا لمس جلد پر محسوس کیا' اس کے بعد غزالہ کی مہربان انگلیاں ہولے ہولے پہلو پر گردش کرنے لگیں۔ اس کے ہاتھ کی ملائمت اور نرمی ایک حیات بخش لہر کی طرح میرے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ غزالہ کے چہرے کے خوب صورت رنگ اس لہر کو اور بھی جاں فزا بنا رہے تھے پھر غزالہ میرے دائیں ٹخنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ادھر بھی خاصی ضرب آئی تھی اور ورم آیا ہوا تھا۔

"رہنے دو غزالہ۔"

"بس اب چپکے لیٹے رہیں۔" اس نے کہا۔

اس کے ہاتھ بڑی محبت اور نرمی سے میرے پاؤں پر گردش کرنے لگے۔ اچانک اس کی نگاہ میری پنڈلی پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے پتلون کا پائنچہ اوپر کرتے ہوئے کہا "یہ کیا ہوا تھا آپ کو؟"

میں سمجھ گیا کہ غزالہ کی نگاہ ان نشانات پر پڑی ہے جو سانپ کے کاٹنے سے آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرا جھوٹ اسے مطمئن نہیں کر سکے گا۔ میں نے اسے سیدم کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ غزالہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ دل گرفتہ آواز میں بولی "کبھی تو دل چاہتا ہے کہ آپ سے دور ہی رہوں۔"

"کیوں؟"

"جب بھی آپ کے پاس آتی ہوں کوئی نیا دکھ سننے کو ملتا ہے۔"

"یہ دکھ سکھ تو زندگی کا حصہ ہیں۔"

"لیکن دکھ سکھ کے لیے "زندگی" بھی تو شرط ہے۔ آپ تو اپنی زندگی کو ایک بیکار شے سمجھ کر اس سے کھیل رہے ہیں۔ آپ کو کیا پتا... آپ کو کیا پتا یہ زندگی کسی کے لیے کتنی قیمتی ہے۔" اس کے رخسار پر باقاعدہ آنسو ڈھلک آیا تھا۔

میں نے بیٹھے بیٹھے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ میرے سینے پر ڈھے سی گئی۔ اس کا سینہ خاموش سسکیوں سے دہل رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ مجھ سے جدا ہوئی اور آنسو پونچھ کر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"جا رہی ہو؟"

"ہاں' دو دن بعد پھر چکر لگاؤں گی۔ زریں سے فون پر حال پوچھتی رہوں گی۔" وہ میری طرف رخ پھیرے بغیر بولی۔

"پرسوں چھٹی ہے۔ کسی وقت چکر لگا لینا۔"

"بہت مشکل ہے۔ ابو' امی' چچا رحمان سب گھر میں ہوتے ہیں۔ آج بھی بڑی مشکل سے نکل سکی ہوں۔"

وہ خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے کہا "ایسے نہیں۔ ایک بار مسکرا کر دیکھو ورنہ مریض تین دن تک تڑپتا پھڑکتا رہے گا۔"

اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کا یہ منظر بڑا سہانا

تھا۔

○☆○

میں تین دن مزید زریں کی رہائش گاہ پر رہا۔ زریں کی رہائش گاہ سے ہی میں نے وحدت علی کی کوٹھی میں اشرف چھیتا کو فون کردیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ایک عزیز کی مرگ کے سلسلے میں مجھے فوری طور پر ملتان جانا پڑ گیا ہے' میں دو تین دن تک آجاؤں گا۔ وحدت علی ابھی تک کاغان سے شوٹنگ کرکے نہیں لوٹا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں سارے ہی ملازمین کی باگیں ڈھیلی تھیں۔

جس دن میں زریں کی رہائش گاہ سے وحدت علی کی وسیع و عریض کوٹھی میں پہنچا' اسی روز وحدت علی اپنے فلمی یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ سے واپس آیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ دو دن تک اس نے مکمل آرام کیا۔ اس کے گھر کا ماحول عجیب و غریب تھا۔ اس کی دو جوان بیٹیاں تھیں لیکن وہ اپنی جس خوب رو سیکریٹری کے ساتھ شب و روز رہتا تھا وہ بھی اس کی بیٹیوں کی عمر ہی کی تھی۔ اس کا نام ثمینہ تھا۔ غالباً اسے اپنی اگلی فلم میں ہیروئن لانے کا جھانسہ دے کر وحدت نے اسے شب و روز اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

وحدت کی کوٹھی میں اب مجھے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ جس بدبخت کی طرف سے اندیشہ تھا وہ یقیناً کسی اسپتال میں اپنی ٹانگ لیے پڑا تھا۔ اس پہلو سے دیکھا جاتا تو تھنگر سے میری "ملاقات" سو فیصد کامیاب رہی تھی۔

تیسرے دن کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں لیٹے ہوئے اشرف چھیتے نے مجھ سے پوچھا "سچ بتا یار! تم کسی کی مرگ پر گئے تھے یا پھر کوئی اور چکر تھا۔ میرا مطلب ہے وہی بانو بازار کی کڑی والا۔"

"چھیتا صاحب' میں تم سے جھوٹ تو نہیں بول سکتا نا۔"

"تیرے پاؤں پر چوٹ لگی ہے' کہنیوں پر بھی رگڑیں ہیں۔ کسی سے مار ماری تو نہیں ہوئی تیری؟"

"میں نے تم کو بتایا بھی تھا۔ تانگے سے اترتے ہوئے پیر مڑ گیا تھا۔"

"اچھا چلو مان لیتے ہیں۔" چھیتے نے سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "چھیتا صاحب! اس معاملے کا کیا بنا؟ وہی بھائی جی والا معاملہ؟"

چھیتے نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا "وہ معاملہ کچھ ٹھنڈا ہی ہے یار۔"

"کیوں؟ اس وقت تو وہ اروش صاحب بڑی تیزی میں تھے۔"

"بس سمجھو کہ اب اروش صاحب کی وجہ سے ہی معاملہ لیٹ ہے۔ پتا چلا ہے کہ اروش صاحب کے ساتھ کوئی حادثہ شادثہ ہو گیا ہے۔ ان کی ٹانگ پر بڑی چوٹ آئی ہے۔ کسی اسپتال میں ہیں وہ۔"

"اوہو۔" میں نے ہونٹ سکوڑے "یہ واقعہ کب ہوا؟"

"پانچ چھ دن پہلے کی بات ہے۔ اب لگتا ہے کہ چوہدری وحدت صاحب کوئی اور سلسلہ سوچ رہے ہیں۔ ایک اروش صاحب کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' چوہدری وحدت صاحب کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں' جگر!"

میں نے اندازہ لگایا کہ اشرف چھیتا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کوٹھی میں یقیناً کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ چند دن پہلے میں نے پاشا گینگ کے جن ممبروں کو باس کا ٹیلیفونک خطاب سنتے دیکھا تھا ان میں سے چند چہرے پھر کوٹھی میں نظر آرہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ اپنے باس سے صلاح مشوروں میں مصروف تھے۔ وہ باس جو یہاں سے ہزاروں میل دور بیٹھا تھا لیکن یہاں کے ہر ہر معاملے پر اس کی نگاہ تھی۔ اپنے ماتحتوں پر اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ماتحت ہر گھڑی خود کو اس کے روبرو محسوس کرتے تھے۔ مجھے میڈم کا خوف یاد آگیا۔ وہ ایک نہایت دبنگ اور دلیر عورت تھی لیکن ڈوی کے قتل کے بعد وہ باس سے یوں خوف زدہ ہو گئی تھی جیسے اس نے موت کو نحوس شکل میں اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔

باس ایک دفعہ فون پر مجھ سے براہ راست بات کرچکا تھا اور اشرف چھیتا وغیرہ کے لیے یہ بڑے رشک کی بات تھی۔ اشرف چھیتا نے دو تین بار مجھ سے کہا تھا "یار! تم خوش قسمت ہو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہیں آئے ہوئے اور "بڑے باس" سے تمہاری بات ہو گئی ہے ہم کئی سالوں سے جان لڑا رہے ہیں لیکن تمہارے درجے تک نہیں پہنچ سکے۔"

میں چھیتا کی بات پر انکساری سے دانت نکال دیتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تھا "نہیں جو کچھ بھی بنا ہوں آپ لوگوں کے درمیان رہ کر بنا ہوں۔" چھیتا عجیب نظروں سے مجھے گھورتا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ اکثر اس بات پر پریشان رہتا تھا کہ میرے جسم پر زہر اثر کیوں نہیں کرتا ہے اور یہ صرف چھیتے ہی کی بات نہیں تھی' وحدت سمیت اکثر لوگ اس حوالے سے

سخت الجھن میں تھے۔ مجھے تو یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں یہ لوگ خاموشی سے میری آزمائش شروع نہ کردیں۔

یہ ساتویں آٹھویں روز کا ذکر ہے' وحدت علی کو کسی بندے سے ملاقات کے لیے لبرٹی مارکیٹ جانا تھا۔ وحدت کے ذاتی گارڈز چھٹی پر تھے' وحدت نے مجھے اور چھیتے کو حفاظت کی غرض سے اپنے ساتھ لے لیا۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں اور چھیتا پچھلی نشست پر بیٹھے تھے وحدت اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ میرے اور چھیتے کے پاس چھوٹی نال کی آٹومیٹک رائفلیں تھیں جو ہم نے اپنے سامنے پاؤں میں رکھی ہوئی تھیں اور اوپر فلالین کا کپڑا ڈالا ہوا تھا۔

یہ دن کا گیارہ بارہ کا وقت تھا۔ وحدت کی شاندار ٹویوٹا کرولا ایک بینک کے سامنے رکی۔ وحدت غالباً بینک منیجر سے بات کرنے اندر چلا گیا' ڈرائیور بھی بریف کیس تھامے اس کے ساتھ ہی تھا' میں اور چھیتا گاڑی میں بیٹھے رہ گئے۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ میں نے کانوں پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ آج کل چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کے علاوہ میرے بال بھی کافی لمبے ہو گئے تھے' درحقیقت حجام کے پاس جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ٹھیک ہے' لمبے ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں' میرا کیا لیتے ہیں۔

پہلو کا درد اب ۵۰ فیصد ٹھیک ہو چکا تھا۔ یعنی غزالہ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ پھر بھی کسی وقت سردی زیادہ ہوتی تھی تو ٹیس سی اٹھنے لگتی تھی۔ ہوا سے بچنے کے لیے میں نے گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھانا چاہا۔ ابھی میں نے ہینڈل کی طرف ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ ایک لڑکی تیزی سے میری طرف آئی۔ وہ خوب گوری چٹی تھی' لباس بھی قیمتی تھا۔ وہ بے ساختہ میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "آپ۔۔۔ غزالہ کے عزیز ہیں نا؟ آپ کا نام شاہ جہاں ہے نا؟"

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اشرف چھیتا میرے پہلو میں موجود تھا۔ میں یہاں جہاں داد بنا بیٹھا تھا اور یہ آفت زادی میرا بھانڈا پھوڑ رہی تھی۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔ پہلے حیرت سے چھیتے کی طرف دیکھا' پھر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا "کون ہیں جی آپ؟" میں نے پوچھا۔

وہ تیزی سے بولی "آپ بتائیں۔ آپ شاہ جہاں ہی ہیں نا؟"

میں نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا "بی بی جی۔ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ میرا نام جہاں داد ہے۔ میں اپنے مالک کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ ویسے میں رحیم یار خان کا رہنے والا ہوں۔"

خوب رو لڑکی کی آنکھیں حیرت سے مزید کھل گئیں۔ اس نے مجھے سر تا پا گھورا اور بولی "آ۔۔۔ آپ واقعی شاہ جہاں نہیں ہیں؟"

"شاید میری شکل آپ کے کسی جاننے والے سے ملتی ہے۔" میں نے دیہاتی لب و لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے پھر غور سے دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولی "آپ نے تو مجھے بالکل چکرا دیا ہے۔ ایسا تو فلموں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ آپ کا۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارا نام کیا ہے؟"

"ابھی بتایا تو ہے جی آپ کو۔۔۔ جہاں داد۔"

وہ الجھے ہوئے انداز میں بولی "میری ایک کلاس فیلو ڈاکٹر غزالہ تھیں' ایک مرتبہ میں ان سے ملنے ان کے گھر گلبرگ گئی تھی۔ وہاں میں نے ڈاکٹر غزالہ کے ایک عزیز کو دیکھا تھا۔ بس وہ شکل میرے ذہن میں رہ گئی تھی۔"

ممکن تھا کہ یہ لڑکی مجھ سے مزید بات چیت کرتی لیکن اسی دوران میں قریب کھڑی پجارو جیپ کی کھڑکی میں سے ایک ادھیڑ عمر عورت سر باہر نکال کر لڑکی کو آوازیں دینے لگی۔ لڑکی نے پکار کر کہا "جی۔ امی آئی۔" پھر وہ مجھے اور چھیتے کو الجھن سے دیکھتی ہوئی اپنی پجارو کی طرف چلی گئی۔ میں اور چھیتا بھی واپس اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ابھی ہمیں بیٹھے ہوئے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ وحدت علی تیزی سے گاڑی میں داخل ہوا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرکے رنگ دار شیشہ اوپر چڑھایا پھر وہ میری طرف مڑا اور ہیجانی انداز میں بولا "یہ لڑکی۔۔۔ تم سے کیا کہہ رہی تھی؟"

"کک۔۔۔ کچھ نہیں جی۔۔۔ اسے مجھ پر کسی اور بندے کا دھوکا ہو رہا تھا۔"

"کس کا دھوکا ہو رہا تھا؟"

"پتا نہیں جی کوئی شاہ جہاں نام کا بندہ بتا رہی تھی۔"

وحدت کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وحدت بینک کے اندر سے مجھے اور لڑکی کو مکالمہ کرتے دیکھتا رہا ہے۔ اس نے اوپر تلے سگریٹ کے کئی کش لیے اور کار کے اندر سے پجارو کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی اب اپنی والدہ کے ساتھ شاپنگ سینٹر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ایک شخص جو یقیناً سیکورٹی گارڈ تھا جیپ کے قریب ٹہلنے لگا تھا۔ باوردی ڈرائیور پجارو کے اندر ہی بیٹھا تھا۔ شاپنگ سینٹر کی طرف

جاتے ہوئے لڑکی نے ایک بار پھر مڑ کر الجھے ہوئے انداز میں ہماری کار کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی والدہ سے یقیناً ہمارے ہی بارے میں بات کر رہی تھی۔

وحدت علی نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟ یہ بھائی جی کی بیٹی ہے۔ بھائی جی کی سگی بیٹی!"

میرے لیے یہ اطلاع واقعی انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی۔ اشرف چیتا بھی حیران نظر آنے لگا۔ وحدت نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا "تمہارے اور اس لڑکی کے درمیان جو بات ہوئی ہے وہ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

میں نے کہا "بس جی وہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا نام شاہ جہاں تو نہیں ہے' میں نے تمہیں اپنی ایک جاننے والی ڈاکٹر کے گھر میں دیکھا تھا۔ شاید غزالہ نام بتا رہی تھی اس کا۔ گلبرگ کا نام بھی لے رہی تھی۔"

میں نے لڑکی کے ساتھ ہونے والا سارا مکالمہ وحدت علی کو سنا دیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وحدت علی ایک خاص انداز سے سوچ رہا ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز ایک نئی ڈیل کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے کام لینے کا سوچ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک دوبار مجھے شک کی نظروں سے بھی گھورا۔ جیسے اسے خیال آیا ہو کہ کہیں لڑکی ٹھیک ہی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ چند لمحے شدید تذبذب میں رہنے کے بعد وحدت نے میرے خلاف شک کو جھٹک دیا۔ اس کے ساتھ ہی دل کی بات وحدت کی زبان پر آگئی۔ وہ دبے دبے جوش سے بولا "اتفاق سے ہمیں ایک زبردست موقع مل گیا ہے۔ ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بلکہ ضرور اٹھانا چاہیے۔" اس نے سگریٹ کے چند لمبے کش لے کر دھواں گاڑی کے اندر پھینکا اور بولا "تم ایسا کرو جہاں داد! کہ کسی طرح لڑکی کے شک کو ٹھیک ثابت کرو' اس سے کہو کہ تم ہی شاہ جہاں ہو۔ اس طرح تمہیں اس کے ساتھ جانے کا موقع مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ۔۔۔ بلکہ یقینی بات ہے کہ وہ تمہیں اپنے گھر ہی لے جائے گی۔ تمہیں بھائی جی کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھنے کا چانس مل جائے گا۔ اس کے علاوہ بھائی جی کے آنے جانے کے اوقات کا بھی پتا چل جائے گا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی سنہری موقع مل جائے اور تم بھائی جی کو ویسے ہی پار کر سکو۔ یہ کارنامہ تم سے ہو گیا تو سمجھو باس کی نظروں میں تمہارا زبردست مقام بن گیا۔ ساری زندگی عیش کرو گے بچے۔"

وحدت بڑے جوش سے بول رہا تھا' ساتھ ساتھ وہ سوچتا بھی جا رہا تھا۔ میں نے کہا "لیکن ابھی تو میں نے بی بی سے کہا ہے کہ اسے دھوکا ہو رہا ہے۔"

وحدت کش لے کر بولا "اس کا بھی کوئی حل سوچ لیتے ہیں۔"

چیتا کہنے لگا "اس کا حل بالکل آسان ہے یار! ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں تم یہیں رکو۔ وہ ابھی ماں کے ساتھ شاپنگ کر کے واپس آئے گی' تم اس سے کہنا کہ تم ہی شاہ جہاں ہو لیکن پہلے تمہارا دوست تمہارے ساتھ تھا' اس لیے تم نے اقرار نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن وہ اپنی ڈاکٹر دوست کے بارے میں پوچھے گی کہ وہ اب کہاں ہے اور میرے بارے میں بھی سوال کرے گی۔ وہ بڑی ہوشیار لگتی ہے' بڑی جلدی تاڑ جائے گی۔"

چیتا بولا "یار! تم گول مول سے جواب دیتے جانا۔ ہو سکتا ہے کہ بات بن ہی جائے۔"

وحدت نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ کافی عرصے سے اپنی کلاس فیلو سے نہیں ملی۔ اسے کلاس فیلو کے موجودہ حالات کے بارے میں زیادہ پتا نہیں ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جس طرح تم سے ملی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اپنی کلاس فیلو سے زیادہ اسے شاہ جہاں نامی بندے میں دلچسپی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے کوئی کام لینا چاہتی ہو یا پھر کوئی اور چکر شکر ہو۔" وحدت نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "جناب! میں آپ کی بات ٹالنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کی دوست ڈاکٹر تھی۔ اس لیڈی ڈاکٹر کا عزیز بھی تو کوئی پڑھا لکھا ہی ہوگا۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔" وحدت نے کہا "خاندان میں ایک آدھ بندہ پڑھ لکھ کر آگے نکل جاتا ہے اور شہر آ جاتا ہے' باقی کھیتوں میں ہل چلاتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب! آپ کا کہا میرے لیے حکم ہے جی۔ جیسے آپ کہتے ہیں' میں کرتا ہوں۔"

وحدت بولا "تم اس کی باتوں کے گول مول جواب دینا ہو سکتا ہے کہ بھرم رہ جائے۔ فرض کیا بات نہیں بھی بنتی تو اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ تم کوئی بھی بہانا بنا کر معافی مانگ سکتے ہو۔ مثلاً تم کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اچھی نوکری کی ضرورت تھی اس لیے لالچ میں آ گئے یا اس طرح کا کوئی اور بہانا۔"

وحدت علی نے کار کا ایک چور خانہ کھولا۔ یہ خانہ ڈیش بورڈ کے عام باکس کے عقب میں واقع تھا۔ اس خانے میں سے وحدت نے ایک چھوٹا سا لیکن نہایت طاقت ور پسٹل نکالا۔ یہ پسٹل ایک خاص قسم کے نفیس ہولسٹر میں تھا۔ اس ہولسٹر کو پنڈلی کے ساتھ باندھنے کے لیے تسمے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ تاہم اس ننھے سے خوفناک پسٹل کو جراب میں بھی دبایا جا سکتا تھا۔ وحدت کے کہنے پر چیتا نے مجھے اس پسٹل کا میکنزم سمجھایا اور پسٹل میری جراب میں اڑس دیا۔ وحدت نے میرا شانہ دباتے ہوئے کہا "اگر تمہیں کوئی اچھا موقع مل جائے تو بے شک بھائی جی کو اڑا دو لیکن شرط یہی ہے کہ اچھا موقع ملے۔۔۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وحدت نے مزید کہا "فرض محال اگر دھوکا دہی وغیرہ کے معاملے میں پولیس تمہیں پکڑتی ہے تو یہ معمولی کیس ہوگا۔ ہم تمہیں ایک گھنٹے سے زیادہ پولیس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔"

"بہت شکریہ سر جی۔" میں نے "احسان" کے بوجھ سے دب کر کہا "لل۔۔۔ لیکن سر جی۔۔۔" میں بولتے بولتے جان بوجھ کر خاموش ہو گیا۔

"ہاں ہاں کہو کیا بات ہے تمہارے دل میں؟" وحدت کے لہجے سے شہد ٹپک رہا تھا۔

"مم۔۔۔ مجھ پر وہ باکی پنڈ میں فائرنگ اور ۳۰۲ والا کیس بھی ہے۔ اگر تھانے جانا پڑا تو کہیں پولیس شناخت نہ کر لے۔"

وحدت کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں لیکن اس نے اپنے لہجے کو نرم ملائم رکھتے ہوئے کہا "تم بھی قلندری ہو جہاں داد۔ بھئی! میں تو ایک بات فرض کر رہا ہوں۔ اس بات کا چانس روپے میں سے ایک آنہ بھی نہیں کہ تمہیں تھانے جانا پڑے گا۔۔۔ لیکن فرض کرو ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تم نے وہاں اپنا اصل نام پتا تھوڑا ہی بتانا ہے۔۔۔" ایک دم وحدت علی بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ پجارو کا ڈرائیور گاڑی کو ریورس کر کے اس کا رخ بدل رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب لڑکی اور اس کی والدہ شاپنگ سینٹر سے نکلنے ہی والے ہیں۔ وحدت کے منصوبے میں ایک دو سقم بھی تھے لیکن وہ بس ایک ہی رخ پر سوچ رہا تھا۔

اس نے تیزی سے کہا "ٹھیک ہے جہاں داد! اب میں چلتا ہوں۔ اگر تمہاری بات بن جائے تو کوشش کرنا کہ ٹیلی فون پر مجھے رپورٹ دے سکو۔ اس لڑکی کا نام آفرین ہے۔ یہ ڈاکٹر ہے اور اس کا چھوٹا بھائی بھی ڈاکٹری کر رہا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔۔۔ اب تم نکل جاؤ۔"

میں با برق بستہ ہوا میں آیا اور وحدت کی کرینا کار آگے بڑھ گئی۔ میں ذہن میں اپنا پروگرام ترتیب دے چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تھوڑی دیر بعد آفرین نامی وہ سرخ و سپید لڑکی شاپنگ سینٹر سے باہر نکلی تو مجھے اس سے بات کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وہ مجھے اپنی پجارو کے قریب کھڑے دیکھ کر چونکی اور میرے پاس چلی آئی۔ میں نے مسکرا کر اسے ہیلو کہا۔ وہ چونک گئی۔ میں نے کہا "کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟"

وہ جذبات سے لرزتی آواز میں بولی "تو میرا اندازہ درست تھا۔ آپ شاہ جہاں ہی ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی "لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے۔۔۔"

"اس وقت میرے ساتھ جو شخص تھا میں اس کے سامنے سچ نہیں بول سکتا تھا۔"

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بولی "آپ میرے ساتھ گاڑی میں آ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔ وہ خوش نظر آنے لگی۔

کچھ دیر بعد میں آفرین اور اس کی والدہ کے ساتھ پجارو میں سفر کر رہا تھا۔ راستے میں آفرین یا اس کی والدہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ایسا ڈرائیور اور سیکیورٹی گارڈ کی موجودگی کی وجہ سے تھا۔ میں خاموشی سے اخبار دیکھتا رہا اور ماں بیٹی دھیمی آواز میں شاپنگ کی باتیں کرتی رہیں۔

جس طرح شہر میں الیکشن کی گہما گہمی نظر آ رہی تھی' اسی طرح اخبار بھی سیاسی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ بھائی جی اور ان کے سب سے بڑے حریف رائے صاحب کی تصویریں بھی اخبار میں موجود تھیں' وہ بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کر رہے تھے۔ میں ورق گردانی کرتا رہا۔ مجھے جارج کالے کے حوالے سے کسی خبر کی تلاش تھی۔ اس کی خبر تو نہیں ملی تاہم اندرونی صفحے پر انگریزی کا ایک خوب صورت رنگین اشتہار نظر آیا۔ یہ گولڈ ہوٹل کا اشتہار تھا۔ پاکستان کے مانچسٹر فیصل آباد میں ہوٹل کی شان دار عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ درست کہتے ہیں کہ روپے کو روپیہ جمع کرتا ہے۔ سرمائے میں از خود پھلنے پھولنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ اب میں اپنے کاروبار سے بالکل لاتعلق دوسرے معاملوں میں الجھا ہوا تھا لیکن یہاں سنگ بنیاد رکھے جا رہے تھے۔

قریباً دس منٹ بعد ہم ماڈل ٹاؤن میں بھائی جی کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ یہ عام سی کوٹھی تھی۔ تعمیر بھی پرانی تھی۔ بھائی جی جیسے نامور بندے کی یہ معمولی رہائش گاہ دیکھ کر

قدرے حیرت ہوئی۔ رہائش کو جانے والے راستے پر ایک چھوٹا سا خیمہ لگا ہوا تھا یہاں پولیس کی دو موبائلز کھڑی تھیں اور نفری بھی نظر آ رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ بھائی جی کی رہائش گاہ کے ارد گرد دو چار مکانوں کی چھتوں پر بھی پولیس کے رائفل مین موجود ہوں گے۔ یہ حفاظتی انتظامات بھائی جی کے لیے بہت ضروری تھے۔ ان انتظامات کے بارے میں میں نے بھی وقتاً فوقتاً ساہی صاحب سے سفارش کی تھی۔

کوٹھی کے اندر پہنچنے سے پہلے اسپیشل پولیس کے ارکان نے اچھی طرح گاڑی کا معائنہ کیا۔ آئینے کی مدد سے گاڑی کے نیچے بھی جھانکا گیا۔ کوٹھی جس طرح باہر سے معمولی تھی اسی طرح اندر سے بھی زیادہ بجی سنوری نہیں تھی۔ صرف نشست گاہ کی آرائش پر دھیان دیا گیا تھا' یہ نشست گاہ بہت وسیع و عریض بھی تھی۔ ایسی نشست گاہ بھائی جی کی ضرورت بھی تھی کیونکہ یہاں بڑی بڑی میٹنگز ہوتی ہوں گی۔ بھائی جی کی بیٹی آفرین مجھے بڑی احتیاط سے کوٹھی کے اندرونی حصے میں لے گئی۔ یہ ایک ڈرائنگ روم نما کمرا تھا۔ دیواروں پر مختلف "فوٹوگرافس" آویزاں تھے۔ کچھ میں بھائی جی اپنے فیملی ممبران کے ساتھ نظر آ رہے تھے کچھ میں وہ اہم ملکی اور غیر ملکی لیڈروں کے ساتھ دکھائی دیتے تھے۔

مجھے ڈرائنگ روم نما کمرے میں بٹھا کر آفرین چلی گئی۔ چند منٹ بعد ایک ملازم نے میرے سامنے برفی کی پلیٹ لا کر رکھ دی۔ بھائی جی کی برفی کے بارے میں اخباروں میں بھی تذکرہ آتا رہتا تھا۔ بھائی جی کا تعلق ضلع نارووال کے ایک قصبے سے تھا۔ وہاں کی باداموں والی برفی بہت مشہور تھی۔ یہ برفی بھائی جی نے یہاں لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر بھی متعارف کرائی تھی۔ وہ اپنے مہمانوں کی تواضع اکثر اسی اسپیشل برفی سے کرتے تھے۔ موسم کے لحاظ سے برفی کے ساتھ کبھی چائے اور کبھی ٹھنڈا دودھ وغیرہ پیش کیا جاتا تھا۔

برفی واقعی زبردست تھی۔ میں گرما گرم چائے کے گھونٹ لے رہا تھا جب آفرین واپس آ گئی۔ وہ اب ایک نسبتاً ہلکے پھلکے لباس میں تھی۔ اس نے آستین کے بغیر سویٹر پہن رکھا تھا اور بازو اڑسے ہوئے تھے۔ وہ ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ امارت اور خوش حالی نے اس کی شکل و صورت کو نکھار بخشا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور بولی "غزالہ! آج کل کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "لاہور میں ہیں' بلکہ گلبرگ کے علاقے میں ہی ہیں۔ ہاں اب وہ پہلے والی رہائش نہیں ہے۔"

"شادی وغیرہ ہو چکی ہے؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" میں نے حسب توقع جھوٹ بولا۔

"بڑی سخت دل ہے وہ۔ کبھی بھولے سے یاد بھی نہیں کیا ہوگا اس نے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کا پتا چلانے کی کوشش کی پھر ہار کر بیٹھ گئی۔"

اسے غزالہ سے جو شکوے گلے تھے' وہ مجھ سے بیان کرنے لگی۔ میں دل میں سوچتا رہا نجانے کیا پتا آفرین بی بی کن طوفانوں میں گھری رہی ہے۔ ایسے میں تو بندہ خود کو بھول جاتا ہے تم تو اس کی کلاس فیلوز میں سے ایک ہو۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نامور سیاست دان بھائی جی کی بیٹی مجھے یہاں کیوں لے کر آئی ہے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس لڑکی کو اپنی کلاس فیلو سے زیادہ مجھ میں دلچسپی ہے۔ کچھ دیر پہلے یہی قیافہ وحدت علی نے بھی لگایا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ دلچسپی کس حوالے سے ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آفرین کو اصل موضوع پر لانے کی کوشش کرتا' وہ خود ہی آ گئی۔

کہنے لگی "شاہ جہاں صاحب! میں جانتی ہوں' آپ کے ذہن میں کئی سوال کلبلا رہے ہوں گے۔ ان میں سے ایک اہم سوال یہ ہوگا کہ میں آپ کو یہاں کیوں لائی ہوں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جی ہاں! یہ سوال مسلسل ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ پر برس رہا ہے۔"

وہ بولی "پہلے آپ یہ بتائیں کہ ڈاکٹر غزالہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟"

"وہ میری کزن ہیں۔ میرے چچا کی بیٹی ہیں۔"

آفرین نے کہا "میرا اندازہ ہے کہ آپ کی بھی شادی نہیں ہوئی ہوگی۔"

"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟"

"کیونکہ ڈاکٹر غزالہ کی شادی نہیں ہوئی ہے۔" وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔"

"اچھا ابھی اس بات کو سمجھے بغیر ہی رہنے دیں۔ آپ کو یہ بتاتی ہوں کہ میں آپ کو یہاں کیوں لے کر آئی ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور خیالات کو جمع کرتے ہوئے بولی "یہ آج سے کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے یا شاید اس سے زیادہ ہو گئے ہوں گے' میں ڈاکٹر غزالہ سے ملنے ان کے گھر واقع گلبرگ گئی ہوئی تھی۔ اتفاقاً آپ بھی وہاں موجود تھے' اچانک باہر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی' آپ دوڑ کر باہر نکلے تھے' وہاں سفید کار میں سے کچھ افراد ایک ادھیڑ عمر

شخص کو کھینچ کر باہر نکال رہے تھے۔"

مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے کہا "ہاں وہ کراچی کا مشہور جیولر شوکت میاں تھا۔ اسے وہ لوگ یرغمال بنانے کے لیے اغوا کرنا چاہ رہے تھے۔"

آفرین نے بالوں کی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا "آپ نے اس جیولر کو ان بدمعاشوں سے چھڑایا تھا۔ ہم نے وہ ساری لڑائی اوپر کی منزل کی کھڑکیوں سے دیکھی تھی۔ شاہ جہاں صاحب! میں کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں ہوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ میں ایک سنجیدہ مزاج کی ڈاکٹر ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کو عام جذباتی چیزیں متاثر نہیں کر سکتیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اس وقت آپ سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جس طرح نزاکت' نرمی اور حساسیت عورت کی پہچان ہے اسی طرح دلیری' جرات اور سخت جانی مرد کا خاصہ ہے۔ شاید آپ کو یاد ہی ہوگا۔ آپ نے اس دن تن تنہا چار افراد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا پھر فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ آپ کی چلائی ہوئی گولی سے ایک بندہ شدید زخمی ہوا تھا اور بعدازاں اسپتال میں چل بسا تھا۔ بہرحال آپ اس ادھیڑ عمر شخص کو بچانے میں کامیاب رہے تھے۔"

"مجھے وہ واقعہ یاد ہے آفرین صاحبہ۔"

وہ بولی "آپ ایک سمجھدار شخص لگتے ہیں شاہ جہاں صاحب۔ آپ میری اس بات سے کوئی غلط مطلب نہیں لیں گے کہ' میں آپ سے متاثر ہوئی تھی۔" ایک لمحہ توقف کر کے وہ ہنسی اور بولی "میرا متاثر ہونا' خدانخواستہ کوئی فلمی ہیروئنوں جیسا نہیں تھا' بلکہ آپ کی جرات مندی دیکھ کر دل میں ایک اپنائیت بھرا نیک سا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ بعد میں مجھے ڈاکٹر غزالہ ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آپ نے ماضی میں بھی چند بار ایسے ہی رویے کا مظاہرہ کیا ہے۔ غزالہ نے مجھے تفصیل نہیں بتائی لیکن اتنا ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ آپ کی بہن کے بارے میں کوئی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوئی تھی اور آپ نے اس صورت حال کے ذمے دار اماراتی شہزادے کو شوٹ کر دیا تھا۔ خیر یہ باتیں تو ویسے ہی درمیان میں آ گئی ہیں۔ میرا اصل موضوع کچھ اور ہے۔ آج اچانک آپ کو گاڑی میں دیکھ کر جہاں میرے ذہن میں بہت سی یادیں تازہ ہوئیں وہاں اچانک ایک خیال بھی ذہن میں چمکا۔ میں دراصل آپ سے اپنے ڈیڈی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

وہ بولی "ایک بات پوچھوں آپ سے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کہنے لگی "آپ کے ساتھ کون لوگ تھے اور ان کے سامنے آپ نے اپنا نام جہاں داد کیوں بتایا تھا۔"

میں نے آفرین کے اس سوال کا تسلی بخش جواب دیا' یہ جواب میں اپنے ذہن میں پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ آفرین' ساہی صاحب کے بارے میں بھی تھوڑا بہت جانتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل بالواسطہ طور پر پولیس کے لیے کام کر رہا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں میرا کردار "انفارمر" کا ہے۔ میں نے بتایا کہ آج کل تخریب کاری زوروں پر ہے۔ میں ایسے ہی ایک گروہ میں جہاں داد کی حیثیت سے موجود ہوں اور پولیس کو اہم معلومات فراہم کر رہا ہوں۔

میں نے جو کچھ آفرین کو بتایا وہ کافی حد تک درست بھی تھا۔

آفرین نے میری ساری بات توجہ سے سنی اور کافی مطمئن نظر آنے لگی۔ اگر وہ مستقبل قریب میں غزالہ یا ساہی صاحب سے رابطہ بھی کرتی تو میرا بیان غلط ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ چائے ایک بار پھر آ گئی تھی۔ آفرین نے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے مزے دار چائے بنائی۔ ایک گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بولی "پتا نہیں کیا بات ہے شاہ جہاں! ابھی جب آپ کو دیکھا تھا اسی وقت دل چاہا تھا کہ آپ پر بھروسا کروں۔ اب تو آپ نے اپنے بارے میں کافی کچھ بتا بھی دیا ہے۔ دراصل شاہ جہاں! مجھے ڈیڈی کی سلامتی کی طرف سے بڑا خطرہ ہے۔ بے شک پولیس نے ان کی سیکورٹی کا خاص انتظام کر رکھا ہے۔ ایس ایس پی ساہی صاحب بھی ڈیڈی کی سیکورٹی پر ذاتی توجہ دے رہے ہیں لیکن یہ بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ پولیس کے سسٹم میں تسلسل نہیں ہے۔ جب اوپر سے آرڈر آتے ہیں دو چار دن تک گارڈز بالکل چوکس رہتے ہیں لیکن اس کے بعد ایک بار پھر وہی ڈھیلا پن شروع ہو جاتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ تنخواہ دار بندوں کی بجائے کوئی اپنا ہو۔ جو اپنوں کی طرح ڈیڈی کے ساتھ رہے اور ان کی سیکورٹی پر نگاہ رکھے۔ کسی وقت تو سوچتی ہوں کہ کاش میں لڑکا ہوتی اور ہر جگہ ڈیڈی کے ساتھ رہتی۔ لیکن سوچنے سے حقیقتیں بدل تو نہیں جاتیں۔"

میں نے کہا "سب کچھ سوچنے سے ہی ہوتا ہے مس آفرین! جب محبت اور خلوص سے سوچا جاتا ہے تو بہت سی راہیں نکل آتی ہیں۔"

اس کے چہرے پر خوشی کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ بولی

"میرا خیال ہے کہ آپ میرا مطمع نظر سمجھ گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے الیکشن سر پر ہیں۔ ٹینشن عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ ڈیڈی کی مصروفیات بھی دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ آج لاہور، کل کراچی، پرسوں کوئٹہ۔۔۔ کبھی کبھی تو وہ دن بے آرامی میں گزار دیتے ہیں۔ میں اور امی سوچ سوچ کر ہلکان ہوئی رہتی ہیں۔ اکثر گمنام کالیں اور دھمکی آمیز خط آتے ہیں، میں یہ باتیں امی سے چھپا لیتی ہوں پھر بھی وہ میری ماں ہیں، میرے دل کی پریشانی میرے چہرے سے بھانپ لیتی ہیں۔ ایسے میں وہ گھنٹوں گم صم رہتی ہیں۔ آج بھی ان کا بلڈ پریشر سخت لو ہو گیا ہے۔ نے ساتھ ہی دوا کھا کر لیٹ گئی ہیں۔ امی کو ڈیڈی کے حوالے سے ایسے ایسے وہم تنگ کرتے رہتے ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔"

آفرین کی آنکھوں میں اندوہ اور بے چارگی کی پرچھائیاں تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں، جیسے وہ اپنے ہاتھوں کی لرزش کو مجھ سے چھپانا چاہتی ہو۔

میں نے کہا "مس آفرین! کیا میں سگریٹ سلگا سکتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولی۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "مس آفرین! میں آپ کی بات پوری طرح سمجھ گیا ہوں لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پولیس کا انفارمر ہوں اور انفارمر کی حیثیت سے ایک تخریب کار حلقے میں گھسا ہوا ہوں۔ اگر میں ہر وقت بھائی جی کے ساتھ اور ان کے آگے پیچھے نظر آنے لگوں گا تو میری انفارمر والی حیثیت متاثر ہو جائے گی۔ میں جن لوگوں کے درمیان موجود ہوں وہ مجھ سے سوال جواب کریں گے۔ ان لوگوں کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال اٹھے گا وہ یہ ہو گا کہ ان کے ایک عام کارندے کو بھائی جی کی نظروں میں اتنی اہمیت کیسے حاصل ہو گئی۔ ایسے میں انہیں یہ بھی شک ہو سکتا ہے کہ میرا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق پولیس سے ہے۔"

آفرین کے چہرے پر مایوسی پھیلنے لگی۔ میں نے اس کی مایوسی دور کرنے کے لیے کہا "ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ میں اس رہائش گاہ کے اندر بھائی جی کی سیکیورٹی کا خیال رکھوں۔"

آفرین کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا ہو گئی۔ وہ بولی "مجھے یہ بھی منظور ہے۔ آپ اس چار دیواری کے اندر ڈیڈی کا خیال رکھیں۔ میں آپ کو۔۔۔ ان کے بیڈ روم کے بالکل ساتھ ہی کمرا دلا دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ آپ گھریلو ملازمین پر نگاہ رکھیں اور ان لوگوں کا دھیان رکھیں جو ڈیڈی سے ملاقات کے لیے گھر پر آتے ہیں۔ نشست گاہ کے سامنے کوریڈور میں ملنے آنے والے ملاقاتیوں کی تلاشی وغیرہ لی جاتی ہے۔ آپ یہاں رہتے ہوئے اس کام کی نگرانی بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ آپ گھر کے عقبی باغیچے کا جائزہ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے لے لیں۔ مجھے اس طرف سے کوئی پریشانی لاحق رہتی ہے۔"

میں آفرین کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اچانک اسے یاد آیا۔ وہ بولی "آپ کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہے۔"

"ہتھیار کے بغیر کیسے گزارا ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور پتلون کا پائنچہ اٹھا کر اسے ننھا منا طاقت ور پسٹل دکھایا۔ آفرین نے مجھ سے لائسنس کے بارے میں پوچھا، اس کا جواب میں نے اثبات میں دیا۔

وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ ہتھیار اس کے ڈیڈی کو قتل کرنے کے لیے ہی مجھے دیا گیا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ساہی صاحب اس کے ڈیڈی کی سیکیورٹی کے لیے جو خصوصی توجہ دیتے رہے ہیں وہ میرے ہی کہنے پر تھی۔ وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ میں تخریب کاروں کے جس گروہ میں گھسا ہوا ہوں ان کی ہٹ لسٹ پر سب سے اوپر اس کے ڈیڈی کا نام لکھا ہوا ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، اور یہ بے خبری ہی اس کے لیے بہتر تھی۔

اس روز رات کو میں جس آرام دہ کمرے میں سویا، وہ ملک کے نامور سیاست دان بھائی جی کے بیڈ روم کے ساتھ واقع تھا۔ اس روز میں نے پہلی دفعہ بھائی جی کو بھی قریب سے دیکھا۔ ان کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر ہی تھی، قد درمیانہ تھا۔ ان کے بال گھنے تھے تاہم ان میں سفیدی کافی تھی، خاص طور سے کنپٹیوں پر سفیدی زیادہ تھی۔ ان کی گردن کی کھال کچھ ڈھلکی ہوئی تھی۔ چہرہ ذرا لمبوترا تھا، اس چہرے پر بڑی بڑی بارعب آنکھیں اچھی لگتی تھیں۔ میں نے جب بھائی جی کو دیکھا وہ اپنا گھریلو لباس سفید قمیص اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ کندھوں پر قیمتی شال تھی۔ وہ اپنے سیکریٹری اور ایک ملازم کے ساتھ بڑی نرمی سے بات کر رہے تھے۔ ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کی اپنائیت اور بے تکلفی تھی، شاید یہی سبب تھا کہ چھوٹے بڑے انہیں بھائی جی کہتے تھے۔ کچھ دیر بعد جب سیکریٹری اور ملازم چلے گئے تھے تو آفرین نے بھائی جی سے میرا مختصر تعارف کرا دیا تھا (اس نے بھائی جی کو بتایا تھا کہ وہ اپنی ایک دیرینہ دوست کے توسط سے مجھے کئی

سال سے جانتی ہے۔ میں پولیس کے لیے بالواسطہ طور پر کام کر رہا ہوں اور ساہی صاحب بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں) آفرین نے حکمیہ انداز میں بھائی جی کو آگاہ کیا تھا کہ میں اس چار دیواری کے اندر ان کی سیکیورٹی کا خیال رکھوں گا۔

بھائی جی مسکراتے ہوئے بولے تھے "رانی بیٹی! جو تمہارے دل میں آئے کرو۔ یہ تمہارے باپ کا معاملہ ہے، میں خواہ مخواہ دخل نہیں دوں گا۔۔۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، انسان کو قبر والی رات قبر میں ہی آتی ہے۔"

"ڈیڈی۔۔۔ پھر وہی ستانے رلانے والی باتیں۔" آفرین ٹھنک کر بولی تھی۔

بھائی جی اس کی پیشانی چوم کر جلدی سے اسٹڈی کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ واقعی بے حد مصروف نظر آتے تھے۔

آفرین سے مشورے کے بعد میں نے جو پروگرام ترتیب دیا تھا، وہ یہی تھا کہ میں رات جاگ کر گزارا کروں گا۔ صبح بھائی جی کے چلے جانے کے بعد دوپہر ڈیڑھ بجے تک سو لیا کروں گا۔ اگلے دو تین روز روٹین کے مطابق ہی گزرے۔ مجھے بھائی جی کے معمولات کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہوا اور اس کوٹھی کا سارا حدود اربعہ بھی نگاہ سے گزرا۔ کوٹھی کا عقبی باغیچہ واقعی سیکیورٹی رسک تھا۔ میں نے دو درخت فوری طور پر کٹوا دیے۔ اس کے علاوہ ہنگامی بنیاد پر چند کھڑکیوں کی آہنی گرلیں بھی تبدیل کرا دیں۔ یہ کوٹھی دو منزلہ تھی، نیچے والی منزل زیادہ پرانی تھی۔ بہرحال پوری عمارت کو صاف ستھرا رکھا گیا تھا۔ یہی صفائی ستھرائی بھائی جی کی شخصیت کا خاصا بھی تھی۔ وہ زیادہ قیمتی لباس نہیں پہنتے تھے لیکن وہ بالکل بے داغ اور بے شکن ہوتا تھا۔ بھائی جی کے ارد گرد کے لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ میں نے ایک دو بار بھائی جی کو نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ دلوں کے راز تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بہرحال ظاہری طور پر بھائی جی عام سیاست دانوں سے مختلف نظر آتے تھے۔ شروع میں بھائی جی کا مزاج قدرے مختلف تھا لیکن اب وہ طویل عرصہ جیل میں رہ کر باہر نکلے تھے۔ جیل میں ہی ان کے مزاج میں تبدیلی واقع ہوئی تھی، اور اب وہ پہلے سے کافی مختلف انسان محسوس ہونے لگے تھے۔ بھائی جی کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی انگلینڈ میں تھی اور وہیں اس کی شادی ہوئی تھی۔ آفرین چھوٹی تھی اور اسی سے بھائی جی کو زیادہ پیار بھی تھا۔ آفرین کو بھی ہمہ وقت اپنے ڈیڈی کی فکر لاحق رہتی تھی۔ وہ ایک طرح سے اپنے ڈیڈی کی ذاتی ڈاکٹر بھی تھی۔ وہ ایم بی بی ایس تھی مگر اسپتال جاتی تھی اور نہ پرائیویٹ پریکٹس کرتی تھی۔ ہاں اپنی فیملی کی اور خاص طور سے ڈیڈی کی صحت و دیکھ بھال وہ بڑی توجہ سے کرتی تھی۔ بھائی جی کی کوٹھی میں قیام کے دوران میں میرا پہلو کا درد بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ تاہم پاؤں پر جو شدید چوٹ آئی تھی اس کے اثرات باقی تھے۔ ٹھنڈ میں پاؤں اینٹھا سا جاتا تھا۔ شنکر کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

تیسرے دن دوپہر کے بعد میں سو کر اٹھا تو کھانا کھانے کے بعد بازار چلا گیا۔ ایک پی سی او سے میں نے وحدت علی کی کوٹھی میں رابطہ کیا۔ یہ وحدت علی کی ڈائریکٹ فون لائن تھی۔ کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی پھر وحدت علی کی خمار میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "ہیلو۔ کون بول رہا ہے۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ چوہدری وحدت صاحب اپنے بیڈ روم سے ارشاد فرما رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ ان کی اگلی فلم کی "متوقع ہیروئن" بھی ان کے پہلو میں استراحت فرما رہی ہو۔ میں نے کہا "میں آپ کا خادم جہاں داد بول رہا ہوں جی۔"

چوہدری وحدت کی آواز سے خمار غائب ہو گیا، وہ ہوشیار آواز میں بولا "اوئے جہانے! تیرے فون کا انتظار کر کر کے تو میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ کچھ کام بنا ہے تو نے یا نہیں؟"

"جناب سر پر آپ کا ہاتھ ہو تو کام کیوں نہیں بنے گا جی۔ معاملہ فٹ ہو گیا ہے۔ لڑکی ممی ڈیڈی ٹائپ کی ہے۔ بہت زیادہ چھچھوری نہیں ہے۔ میں نے کام سیدھا کیا ہے۔ وہ مجھے کوئی شاہ جہاں نام کا بندہ سمجھ رہی ہے، اس کا خیال ہے کہ میں اس کے ڈیڈی کی حفاظت بڑی اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ابو کا گارڈ بنانا چاہتی ہے۔"

"کہیں وہ کوئی چکر تو نہیں دے رہی؟"

"ابھی تک تو ایسا نہیں لگ رہا جی۔ میرا خیال ہے کہ میری شکل و صورت اس شاہ جہاں نام کے بندے سے بہت زیادہ مل رہی ہے۔ وہ کوئی کمانڈو شمانڈو ٹائپ کا بندہ ہے۔"

"پسٹل تیرے پاس ہی ہے نا؟"

"ہاں جی۔ وہ میں نے اس لڑکی کو دکھا بھی دیا ہے۔ وہ خوش ہوئی ہے کہ گارڈ کے پاس اپنا ہتھیار ہے۔ باقی آپ کی بات مجھے اچھی طرح یاد ہے جی۔ کوئی اچھا موقع مل گیا تو چھوڑوں گا نہیں۔"

وحدت نے مجھے شاباش دی، پھر پوچھا "بھائی جی کے بارے میں اور کیا پتا چلا ہے۔"

"ابھی کوئی خاص پتا نہیں چلا جی، لیکن ایک دو دن میں

آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے اپنی جگہ ڈٹے رہو۔ جب فون کرنے کے لیے آنا تو بہت دیکھ بھال کر آنا اور اسی طرح پی سی او سے کال کرنا۔ اس کے علاوہ اپنے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں رکھنا جس سے تمہارے ساتھیوں پر زد پڑ سکے۔ تم جانتے ہی ہو تنظیم (یاشا گینگ) کے لوگ اپنی جان دے دیتے ہیں لیکن تنظیم کے مفاد کے خلاف کسی کو کچھ بتاتے نہیں ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں جی۔ اللہ زندگی دے تاور جی صاحب کو' انہوں نے مجھے اس بارے میں سب کچھ سمجھا رکھا ہے۔"

وحدت سے بات کرنے کے بعد میں بھائی جی کی رہائش گاہ پر واپس آ گیا۔ ساہی صاحب کو فون کرنے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ میں نے دو دن پہلے ہی پی سی او سے فون کر کے ساہی صاحب کو بتا دیا تھا کہ میں کہاں اور کس حیثیت سے موجود ہوں۔ اب مجھے معلوم تھا کہ اگر آفرین نے میرے بیانات کی تصدیق کے لیے ساہی صاحب سے رابطہ کیا ہو گا تو اسے اطمینان بخش جواب ملا ہو گا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ آفرین نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اتوار کے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ بھائی جی کوٹھی کے لان میں لوگوں کے مسائل سنتے ہیں اور مستحق لوگوں کی مالی مدد بھی کی جاتی ہے۔ مالی مدد کا سلسلہ کوئی نیا شروع نہیں ہوا تھا یہ چار پانچ سال سے جاری تھا بھائی جی اپنی بیگم کے ہاتھوں سے یہ امداد تقسیم کرواتے تھے۔ نقدی کے علاوہ یہ امداد مختلف اشیاء کی شکل میں بھی دی جاتی تھی۔ اس تقریب کی کوئی تشہیر نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی تصویریں وغیرہ کھینچی جاتی تھیں۔ بھائی جی غالباً اس سلسلے کو اپنی سیاست سے بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔

لوگ صبح سویرے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ہر شخص کی تلاشی لی جا رہی تھی اور سیکیورٹی گارڈز معمول کے مطابق پوچھ گچھ بھی کر رہے تھے۔ خواتین کی جامہ تلاشی کے لیے لیڈیز پولیس اہلکار بھی موجود تھی۔ بھائی جی قریباً ساڑھے گیارہ بجے اپنی شریکِ حیات کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ان کی بیگم کو شیریں بی بی کہا جاتا تھا۔ وہ ایک گوری چٹی باوقار خاتون تھیں' تاہم ان کے چہرے سے نقاہت اور بیماری کا تاثر ملتا تھا۔ وہ شکل و صورت سے بے حد مذہبی بھی نظر آتی تھیں۔

بھائی جی سفید براق تہبند قمیص میں ملبوس تھے۔ کندھوں پر شال تھی۔ وہ ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔ شیریں بیگم کچھ دور برآمدے میں رکھے صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ بھائی جی کی ڈاکٹر بیٹی آفرین اور بیٹا سرمد بھی وہیں صوفوں پر چند فیملی ممبران کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بھائی جی سے ملنے لوگ دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے۔ ان میں دوسرے صوبوں کے لوگ بھی تھے پانی اور چائے سے ان لوگوں کی تواضع کی جا چکی تھی۔ ان لوگوں میں کچھ بے حد مفلوک الحال نظر آتے تھے' کچھ سیاہ لب و لہجے میں بولنے والے تھے۔ کسی کا جھگڑا تھا' کسی کا کیس چل رہا تھا' کوئی سرکاری محکمے کا ستایا ہوا تھا۔ ہر طرح کے مسائل تھے۔ بھائی جی ہر مسئلہ ذاتی توجہ سے سن رہے تھے اور ان کا اسسٹنٹ باقاعدہ نوٹس لیتا جا رہا تھا۔ ایک سینئر ایڈووکیٹ بھی بھائی جی کے ساتھ موجود تھا۔ بھائی جی ضروری مسائل پر اس کا مشورہ بھی لیتے جا رہے تھے۔ اچانک گھاس پر بیٹھے ہوئے دیہاتیوں میں سے ایک بندہ چیختا ہوا اٹھا اور بھائی جی پر حملہ آور ہوا۔ میں بھائی جی کے عقب میں کھڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ دراز قد شخص بھائی جی پر جھپٹ کر انہیں نیچے گرا دیتا' میں جست لگا کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر بری طرح لڑکھڑایا' اسی دوران میں میں نے دیکھا کہ ایک اور شخص اپنی بیساکھی سے بھائی جی پر حملہ آور ہوا ہے۔ بیساکھی کے نیچے خنجر کی طرح چار پانچ انچ لمبا نوکیلا سریا لگا ہوا تھا۔ یہ سریا بھائی جی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میں پہلے شخص کو دھکا دے کر اس دوسرے حملہ آور کی طرف بڑھا۔ اس کا مہلک وار میں نے اپنی کلائی پر روکا میری کلائی کی ضرب سے بیساکھی کا رخ بدلا اور وہ ایک شخص کی ٹانگ میں لگی۔ میں نے زوردار گھونسے سے حملہ آور کو کئی فٹ پیچھے اچھال دیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہیں۔ وہ بھائی جی کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ سب دیہاتی تھے' تین چار کو گارڈز نے دبوچ لیا تھا۔ کچھ پر بھائی جی کے پرستار پل پڑے تھے۔ برآمدے میں خواتینِ خانہ کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ میں نے بھائی جی کو بازو سے تھاما اور اپنی آڑ فراہم کرتا ہوا برآمدے کی طرف لے گیا۔ اسی دوران میں آفرین بھی آ کر بھائی جی سے چمٹ گئی۔

حملہ آور تعداد میں سات کے قریب تھے۔ ان سب کو پکڑ کر گارڈز اور لوگوں نے خوب مارا لوگوں کو خاص طور سے اس شخص پر غصہ تھا جو مہلک بیساکھی سے بھائی پر حملہ آور ہوا تھا۔ مشتعل لوگ شاید اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے مگر بھائی جی لوگوں کے درمیان گھس گئے اور بڑی مشکل سے اس شخص کی جان بچائی۔ وہ خبیث لنگڑا بھی نہیں تھا' بس بیساکھی اندر لانے کے لیے لنگڑا بنا ہوا تھا۔

ان افراد کو موقع پر موجود پولیس اہلکاروں نے اپنی حراست میں لے لیا۔

یہ بات رات گئے مجھے آفرین کی زبانی معلوم ہوئی کہ حملہ آور بھائی جی کے سیاسی مخالفین میں سے تھے۔ ان کا تعلق سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں سے تھا۔ الیکشن کے لیے ان لوگوں کا امیدوار کوئی ایک مہینہ پہلے قتل ہو گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مبینہ قاتل کو بچانے کے لیے بھائی جی نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہے اور قاتل کو ملک سے باہر فرار ہونے میں مدد دی ہے۔

آفرین نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! سیاست بڑی ظالم چیز ہے میں تو ڈیڈی کو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ اگر ان کے دل میں خلقِ خدا کی بھلائی کرنے کا جذبہ ہے تو خود کو صرف رفاہی کاموں تک محدود کر لیں۔ چھوڑ دیں اس کیچڑ کو جس میں ہر وقت زہریلے سانپ رینگتے رہتے ہیں مگر وہ کسی کی سنتے کہاں ہیں۔ آج آپ نے دیکھ ہی لیا ہے نا اور یہ پہلی بار نہیں ہے۔ دو مہینے پہلے بھی ایسا ہی ملتا جلتا واقعہ ہو چکا ہے اور پھر وہ شیخوپورہ روڈ والا واقعہ تو آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ اگر وہ قاتل ٹولہ آپس میں ہی نہ جھگڑ پڑتا تو اللہ جانے کیا ہو جاتا۔ اس واقعے میں جس مبینہ مرتابی عورت کا نام آیا تھا وہ اتنی خطرناک تا حد ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔"

میں نے دل میں سوچا اس کی خطرناکی کو مجھ سے بڑھ کر کون جانے گا آفرین بی بی۔ میں اس کی "فلاح و بہبود" کے لیے نہایت زہریلے سانپوں کو اپنا "آب" پیش کرتا رہا ہوں۔

"آپ کس سوچ میں کھو گئے؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں۔ یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔"

وہ بولی "آپ کے اس طرح کھو جانے کا انداز مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ کبھی ڈاکٹر غزالہ کے سامنے بھی اس طرح کھو گئے ہیں کہ نہیں؟"

"یہ ڈاکٹر غزالہ بیچ میں کہاں سے آ گئی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا "کیسے آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی صبح والے واقعے میں؟"

"نہیں۔ بس کہنی پر معمولی سی خراش ہے۔"

اس نے بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھا اور بولی "میرا خیال ہے کہ اب تو آپ نے مجھے عقل مند تسلیم کر لیا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھیں نا' چند دن پہلے میں آپ کو یہاں لے کر آئی اور آج آپ نے "اپنے آنے" کا حق ادا کر دیا۔ شاہ جہاں صاحب! آئی ایم ریئلی۔۔۔ ریئلی۔۔۔ پراؤڈ آف یو۔"

"شکریہ۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "ڈاکٹر غزالہ سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے لیکن آپ بتا رہے ہیں کہ وہ لاہور سے باہر ہے۔ کہیں کسی وجہ سے مجھے ٹرخانے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔"

"جب آپ اس سے ملیں گی تو آپ کو خود پتا چل جائے گا۔"

اگلے دو تین روز بھی کوٹھی کے اندر ہی گزرے۔ بھائی جی پر حملے کی خبر اخباروں تک پہنچ گئی تھی اور اس واقعے پر خاصی لے دے ہوئی تھی۔ ایک دو جگہ مظاہرے بھی ہوئے تھے۔ بھائی جی کی پارٹی کے سرکردہ لیڈروں نے حکومت پر زور دیا تھا کہ وہ بھائی جی کی حفاظت کے خصوصی انتظامات کرے۔ کچھ لوگوں نے اس حملے کا الزام بھائی جی کے بڑے حریف مسز راتے پر لگایا تھا۔

بھائی جی نے ایک دن کے لیے اپنی مصروفیات ترک کر دی تھیں لیکن اگلے دن سے پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ بھائی جی کو اس بات پر بڑا افسوس ہوا تھا کہ ان کے حملے کی خبر ذرائع ابلاغ تک پہنچ گئی ہے۔ وہ اس قسم کی تشہیر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بھائی جی میں ایک ہر دل عزیز سیاسی لیڈر کی کئی خوبیاں موجود ہیں۔ انہوں نے خود پر حملہ آور ہونے والے افراد کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی تھی اور اس کا باقاعدہ اعلان بھی کیا تھا۔

ایک رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ کمروں میں بھی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ رکھوالی کے کتوں کی آوازوں کے سوا کوٹھی میں مکمل خاموشی تھی۔ بھائی جی قریباً ایک گھنٹا پہلے اپنی مصروفیات ختم کر کے خواب گاہ میں جا چکے تھے۔ وہ اکیلے سوتے تھے ان کی بیگم شیریں بی بی جو کچھ بیمار بھی رہتی تھیں آفرین اور سرمد کے ساتھ دوسرے کمرے میں ہوتی تھیں۔ ہاں میری موجودگی میں بیگم صاحب نے ایک دو بار شوہر کے بیڈ روم میں بھی آرام کیا۔ میاں بیوی کا آپس میں سلوک بڑا اچھا تھا۔ میں بات کر رہا تھا اس یخ بستہ رات کی۔ دو بجے تھے' ابھی مجھے چھ سات گھنٹے مزید جاگنا تھا۔ بھائی جی کی خواب گاہ میں نائٹ بلب روشن ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سو گئے ہیں۔

یکایک مجھے سوئی گیس کی تیز بو محسوس ہوئی۔ یہ بو بھائی جی کے بیڈ روم کی طرف سے آرہی تھی۔ میں چونک گیا۔ چپل پہن کر میں اپنے کمرے سے نکلا اور بھائی جی کے بیڈ روم کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ جان کر میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی کہ بو کافی تیز ہے اور کمرے کے اندر سے آرہی ہے۔ بیڈ روم کے دروازے پر بڑی میٹھی سی آواز والی کال بیل موجود تھی۔ میں نے تین چار بار بیل دی پھر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن جواب ندارد۔

یہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ شاید بھائی جی سوئی گیس کا ہیٹر کھلا چھوڑ کر سوگئے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ دیگر ملازمین کو آواز دے کر بلاؤں لیکن یہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ بھائی جی کے حوالے سے چھوٹی سی خبر بھی اخبارات میں ایک دم اچھال دی جاتی تھی۔ میں بھاگ کر کمرے میں گیا، وہاں سے ایک بڑا سا [illegible] نکالا اور اس کی مدد سے کمرے کا بند دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دروازے میں چٹخنی نہیں ہے صرف بڑے سائز کا ڈبل لیور والا تالا لگا ہے۔ میری کوشش تھوڑی سی طویل تو رہی لیکن ناکام نہیں رہی۔ میں نے تالا کھول لیا۔

بھائی جی کو آواز دیتا ہوا، میں اندر داخل ہوا۔ بھائی جی کی اصل خواب گاہ آٹھ دس فٹ آگے تھی۔ خوش قسمتی سے دوسرا دروازہ مقفل نہیں کیا گیا تھا۔ میں دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ بھائی جی بیڈ پر نظر نہیں آرہے تھے۔ نیلگوں بلب کی روشنی میں مجھے سامنے ہی گیس ہیٹر نظر آگیا۔ گیس ہیٹر بجھا ہوا تھا اور گیس تیزی سے خارج ہورہی تھی۔ میں نے ہیٹر بند کیا اور دو کھڑکیاں کھول دیں۔ مجھے شک گزرا کہ بھائی جی باتھ روم میں ہیں۔ باتھ روم کی لائٹ روشن تھی مگر آہٹ وغیرہ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ہولے سے "ناک" کی، دروازہ کھل گیا۔ باتھ روم خالی تھا۔ خواب گاہ بہت بڑی نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بھائی جی بند کمرے میں سے کہاں چلے گئے ہیں۔ وہ قریباً ایک گھنٹا پہلے میرے سامنے خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے اور دروازہ اندر سے مقفل کیا تھا۔ وہ کہاں جاسکتے تھے۔ میں نے احتیاطاً کونے کھدروں میں اور پردوں کے پیچھے دیکھا۔ حیرت کی بات تھی خواب گاہ کا کوئی اور دروازہ بھی نہیں تھا۔ کھڑکیاں وہی تھیں جن میں چند دن پہلے میں نے اپنی نگرانی میں آہنی گرل لگوائی تھی۔ اس گرل میں سے بلی کا بچہ بھی باہر نہیں جاسکتا تھا۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ ایک بار پھر خواب گاہ کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ذہن میں یہ بات آئی کہ شاید میں اپنے کمرے میں کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگ گیا تھا۔ اس دوران میں بھا دروازہ مقفل کرکے باہر چلے گئے۔ ان کی موجودگی گیس چلی گئی تھی جو بعد میں آگئی اور کمرے میں گیس بھر بہرحال ایک بات تو طے تھی کہ بھائی جی خواب گاہ میں نہیں ہیں۔ میں نے جلدی جلدی کمرے کا ایک بار پھر لیا۔ مجھے شک گزرا تھا کہ شاید دیواروں کی PANELING میں یا الماری کے اندر کوئی پوشیدہ دروازہ ہو جو کسی دوسرے کمرے میں کھلتا ہو لیکن یہ خیال بھی پایہ تصدیق کو نہیں پہنچ سکا۔ میں نے کمرے میں اپنی موجودگی کے شواہد ختم جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے باہر نکل آیا۔ بعد ازاں [illegible] کے ساتھ ہی میں نے دروازہ مقفل بھی کردیا۔

باہر آکر میں بیرونی گیٹ پر پہنچا۔ میں نے گارڈز سے [illegible] لی۔ بھائی جی کوٹھی سے باہر نہیں نکلے تھے، ان کی دونوں گاڑیاں بھی پورچ میں موجود تھیں۔ میں واپس کمرے میں آگیا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ میں سوچ رہا تھا اگر صبح حسب معمول بھائی جی اپنی خواب گاہ سے برآمد نہ ہوئے تو کیا ہوگا۔ میں ان کی نگرانی پر مامور تھا اور آج رات میں ایک "خالی کمرے" کی نگرانی کررہا تھا۔ بے چین ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دل چاہ رہا تھا کہ عقبی باغ میں جاؤں اور جو نئی گرلیں میں نے لگوائی ہیں، ان کا جائزہ لوں۔ کہیں ان کھڑکیوں میں ہی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی مگر پھر اپنے اس خیال کو میں نے خود ہی رد کردیا۔ میں نے خواب گاہ سے بھی گرلوں کا جائزہ لیا تھا، وہ اپنی جگہ مضبوطی سے لگی تھیں۔ عقبی جانب سے کسی کا نکل جانا ویسے بھی بعید از قیاس تھا۔ وہاں روزانہ کی طرح آج بھی پولیس گارڈ کے کئی جوان موجود تھے۔ بارہ بجے کے قریب میں خود ان کا جائزہ لے چکا تھا۔ آخر کار یہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ خواب گاہ کے اندر کوئی دروازہ موجود ہے جو ساتھ والے کمرے میں کھلتا ہے۔ بھائی جی اپنے ان گنت دشمنوں کے نشانے پر تھے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے کوئی ایسا انتظام رکھا ہو۔ بظاہر وہ اپنی خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوں لیکن سوتے کسی ساتھ والے کمرے میں ہوں۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ ایک زبردست قسم کی پیش بندی تھی۔ اگر بھائی جی نے ایسا کر رکھا تھا تو پھر یقیناً انہوں نے کال بیل کی آواز دوسرے کمرے تک پہنچائی ہوگی تاکہ اگر کوئی خواب گاہ کی بیل بجائے تو وہ خواب گاہ میں آکر دروازہ کھول سکیں۔ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ میرے بیل بجانے کے باوجود انہوں

نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟ اس سوال کا موزوں جواب تھا کہ شاید وہ بہت تھک کر بہت گہری نیند میں ہوں گے۔

صبح تک ایک شدید تذبذب اور بے قراری نے مجھے گھیرے رکھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میں نے ہر پل گن گن کر گزارا۔ آخر پو پھٹی، صبح کے پانچ بجے اور حسب معمول بھائی جی کی خواب گاہ کا دروازہ کھل گیا۔ وہ نماز اپنے کمرے میں ہی ادا کرتے تھے لیکن ان کی عادت تھی کہ وضو وغیرہ کے لیے "باتھ روم" ساتھ والے کمرے کا استعمال کرتے تھے۔ بھائی جی کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ حسب معمول وضو کرکے وہ اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ خاندانی ملازم عباس ان کے لیے چائے لے آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے اہل خانہ کو جگانے کے لیے اندرونی کمروں میں چلے گئے۔

رات کا واقعہ میرے ذہن پر ثبت تھا لیکن میں نے اس بارے میں کسی سے بات نہیں کی، یہاں تک کہ آفرین سے بھی نہیں۔ سوئی گیس والا معمہ حل ہوگیا تھا۔ صبح ایک گارڈ نے مجھے بتایا تھا کہ رات کو اتفاقاً دو ڈھائی گھنٹے کے لیے سوئی گیس بند ہوگئی تھی۔ دو بجے کے لگ بھگ گیس دوبارہ آئی تھی اور یہ بریک ڈاؤن پورے علاقے میں ہوا تھا۔ اس بریک ڈاؤن کی وجہ سے بھائی جی کے کمرے میں جو "واقعہ" رونما ہوا تھا میں نے اس کے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتایا، نہ ہی کسی نے مجھ سے کوئی سوال کیا۔

دو دن مزید گزر گئے، تیسرے دن پھر مجھے محسوس ہوا کہ بھائی جی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ ایک بجے کے لگ بھگ وہ میرے سامنے خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ خواب گاہ میں نہیں ہیں۔ خدا جانے یہ کیسا طلسم تھا۔ پچھلے دو روز میں میں نے خواب گاہ کے ارد گرد کے کمروں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ ان میں سے صرف ایک کمرا ایسا تھا جس میں بھائی جی رات گزار سکتے تھے لیکن اس وقت وہ کمرا بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، حالانکہ بھائی جی نائٹ بلب کے بغیر سوتے نہیں تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد رات تین بجے کے لگ بھگ میں نے بھائی جی کی خواب گاہ میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔ خواب گاہ میں گھسنے کا بہانا میں نے پہلے ہی ڈھونڈ رکھا تھا۔ بھائی کی خواب گاہ کے بالکل قریب سوئی گیس کا ایک پوائنٹ موجود تھا۔ میں نے اس پوائنٹ کا گیس کاک اس طرح کھول دیا کہ تھوڑی تھوڑی گیس خواب گاہ کے ارد گرد پھیلنے لگی۔ اب اگر کسی کو میرے خواب گاہ میں گھسنے کا علم ہو بھی جاتا تو میں جواز پیش کرسکتا تھا کہ میں بھائی جی کی سیکیورٹی کے حوالے سے اندر داخل ہوا ہوں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گیس خواب گاہ کے ہیٹر سے خارج ہورہی ہے۔ اس حوالے سے مزید LOGICS بھی پیش کی جاسکتی تھیں۔

میں نے حسب سابق دو تین بار بیل دی، پھر ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میری توقع کے عین مطابق کوئی جواب نہیں آیا۔ دو چار منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے [illegible] کی مدد سے دروازے کا قفل کھولنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ میں اندر داخل ہوا۔ خواب گاہ حسب سابق خالی تھی۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ میں نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کیا اور کسی پوشیدہ راستے کی کھوج میں لگ گیا۔ میں باہر کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کر آیا تھا۔ میری موجودگی میں کسی دوسرے گارڈ کو بھائی جی کی آرام گاہ کی طرف آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں ایسے کام میں خود کو کافی ماہر اور تجربہ کار سمجھتا تھا لیکن اس رات مجھے دانتوں پسینہ آگیا۔ کہیں کوئی دراڑ، کوئی درز، کوئی سوراخ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چھت، فرش، دیواریں، میں نے سب ہی کچھ دیکھ ڈالا۔ میں قریباً دو گھنٹے اپنے کام میں لگا رہا۔ اس دوران میں مجھے ایک مرتبہ دس پندرہ منٹ کے لیے خواب گاہ سے باہر بھی آنا پڑا کیونکہ مجھے کوریڈور میں آہٹیں سنائی دی تھیں۔ ان آہٹوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دوبارہ خواب گاہ میں گھس گیا۔ سوئی گیس بدستور کھلی ہوئی تھی اور اس کی ہلکی ہلکی بو خواب گاہ کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔

رات قریباً ساڑھے چار بجے کا وقت ہوگا۔ میں مایوس

ہو چکا تھا جب اچانک میری محنت رنگ لے آئی۔ میں نے خواب گاہ کی ایک دیوار پر ذرا زور سے دباؤ ڈالا تو لکڑی کی دھاری دار "پینل لنگ" کا ایک حصہ ایک دم اندر کی طرف دب گیا۔ اندر دبنے والا حصہ کوئی ڈھائی فٹ چوڑا اور ساڑھے چھ فٹ اونچا تھا۔ مجھے اپنے سامنے سفید پتھر کے شفاف زینے نظر آ رہے تھے۔ یہ چھ سات زینے تھے اور نیچے جا رہے تھے۔ میں نے اپنا ننھا منا لیکن نہایت طاقت ور پسٹل جراب میں سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور ۔۔۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد زینوں پر قدم رکھ دیے۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر سے آواز آ رہی تھی کہ بھائی جی کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے۔ وہ عام سیاست دانوں سے مختلف لگتے تھے' ایسے لوگوں کے لیے مسائل بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

نتائج سے بے پروا ہو کر میں نیچے آ گیا۔ مجھے اپنے سامنے ایک راہداری نظر آئی۔ راہداری کی چھت نیچی تھی اور وہ چالیس پچاس گز تک چلی گئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ راہداری حال ہی میں تعمیر کی گئی ہے۔ پلستر ہو چکا تھا مگر رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔ یہاں دو ٹیوب لائٹس روشن تھیں' تاہم بجلی کی وائرنگ ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ گول سوراخوں میں تاروں کے گچھے لٹکے نظر آ رہے تھے۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ راہداری درحقیقت ایک چھوٹی سی سرنگ ہے' جو بھائی جی کی رہائش گاہ کو پڑوس کی رہائش گاہ سے ملاتی ہے۔ اگر میں سمتوں کا درست اندازہ لگا رہا تھا تو یہ راہداری سڑک کے نیچے سے گزر کر ساتھ والی کوٹھی میں جا رہی تھی۔ میں راہداری کے اختتام پر پہنچا۔ یہاں راہداری دو چھوٹی کوریڈورز میں تقسیم ہو کر دائیں اور بائیں چلی گئی تھی۔ یہ کوریڈورز بھی بالکل نئی تعمیر ہوئی تھیں۔ پتھر کے نئے نوکیلے فرش پر ابھی لکڑی کا برادہ بچھا ہوا تھا۔ بجلی کی وائرنگ بھی ادھوری تھی۔ (دراصل اسی ادھوری وائرنگ میں کسی "فالٹ" کی وجہ سے خواب گاہ کی کال بیل یہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی)

میرے دل نے گواہی دی کہ میں پڑوس کی کوٹھی میں موجود ہوں۔ ایک کمرے کے اندر سے باتوں کی مدھم آواز آئی۔ میں اس کمرے میں جھانکنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک بڑی بڑی مونچھوں والا ایک قوی ہیکل شخص میرے سامنے آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا کرتا میں نے اس کی ٹھوڑی پر مکا رسید کیا' وہ چکرا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن بازو میں دبوچی اور مونچھوں والے اس جن کو انٹا غفیل کر کے فرش پر ڈال دیا۔ اس شخص کی جامہ تلاشی سے مجھے چند اشیا ملیں ان میں چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ اس گچھے میں سے ایک چابی اسٹیل کے ایک جدید دروازے کو لگ گئی۔ میں بے آواز دروازہ کھول کر ایک کمرے کے پہلو میں آ گیا۔ یہ ایک ہال کمرا تھا۔ کھڑکیاں دروازے بالکل بند تھے۔ میں بڑی کوشش اور محنت کے ساتھ ایک ایگزاسٹ فین کے سوراخ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ ایگزاسٹ فین کی ہیوی گرل اٹھا کر میں نے ہال کمرے میں جھانکا اور میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بھائی جی ایک خوب رو عورت کے ساتھ موجود تھے۔ عورت کی عمر اٹھائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ گداز اور دلکش جسمانی خدوخال کی مالک تھی۔ بھائی جو پبلک کے سامنے سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے بڑے دھڑلے سے سگریٹ پی رہے تھے۔ ان کے سامنے گلاس میں تھوڑا سا مشروب پڑا تھا۔ مشروب کا رنگ ڈھنگ یہی بتا رہا تھا کہ وہ بیئر ہے۔ ایک اور شخص بھی کمرے میں موجود تھا لیکن میری طرف اس کی پشت تھی۔ بھائی جی نے جواں سال عورت کو بڑی محبت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "کوکب ڈیئر! صبح کے اخبار تو لانا۔"

عورت نے جی اچھا کہا اور لہراتی بل کھاتی باہر چلی گئی۔ بھائی جی اسے جاتے دیکھتے رہے۔ عورت کے جانے کے بعد کمرے میں موجود دوسرا شخص بولا "بھائی جی! آپ کا انتخاب اچھا ہے لیکن قسم سے میرے پاس ایسی ایسی لڑکیاں ہیں کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔ بالکل نئی نئی کھلی ہوئی کلیاں۔ جس کے ساتھ کہیں گے خاموشی سے "میرج" بھی ہو جائے گی۔ جب جی چاہے چھوڑ دیجیے گا۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور یوں لگا کہ چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ جو شخص میری طرف پشت کیے بیٹھا تھا اس کی آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی' وہ منھو کاکا تھا۔ وہی منھو کاکا جس کا باپ جارج کالا "مٹی لڑکی پرانی شراب" کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھائی جی جیسے شخص کو یہاں اس ماحول میں دیکھ رہا ہوں۔ پچھلے کچھ دنوں میں بھائی جی کے متعلق میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ ریت کے گھروندے کی طرح دھڑام سے نیچے آ گرا۔ خیالات کی پرشکوہ عمارت دھماکے سے مسمار ہو گئی تھی۔

میں ایگزاسٹ فین کے سوراخ میں سے نیچے کمرے میں جھانک رہا تھا اور میری نگاہیں مسلسل بھائی جی پر مرکوز تھیں۔ بھائی جی نے گلاس میں موجود مشروب حلق میں انڈیلا اور دھیمے انداز میں مسکرانا شروع کر دیا۔ منھو کاکا نے رخ تھوڑا سا پھیرا اور مجھے اس کا منحوس چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ رازداری کے لہجے میں بولا۔

"آپ بتا رہے تھے کہ بھائی جی دو ہفتے کے لیے اپنے بھائی کی شادی پر دبئی جا رہی ہیں۔ اس دوران میں آپ ایک دو لڑکی کو یہاں لے آئیں۔ تین ہی تو ملازم ہیں یہاں آپ کے اور تینوں پکے وفادار رہیں۔ جان دے سکتے ہیں' آپ کا راز نہیں کھول سکتے۔"

"مگر کاکا! تمہیں پتا ہے یہ سیاست ہے۔ سیاست دان کا سر ہر وقت نشانے پر رہتا ہے۔ باقی لوگ جو مرضی کرتے رہیں لیکن سیاست دان کی کسی کمزوری کا پتا چل جائے تو دھومیں مچ جاتی ہیں اور یہ تو خاص طور سے الیکشن کا موسم ہے۔ اس ماحول میں کوئی چھوٹی سی بات بھی ہاتھ آ جائے تو بہت بڑا بتنگڑ بن جاتا ہے۔"

لیکن بھائی جی! شادی کرنا تو کوئی گناہ نہیں ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے بڑی بھابی جی نے آپ کو دوسری شادی کرنے کی غیر مشروط اجازت دے رکھی ہے۔"

بھائی جی کا قہقہہ سنائی دیا "اگر اجازت دے رکھی ہے تو ہم نے فائدہ بھی تو اٹھا لیا ہے نا۔ ابھی تم ملے تو ہو اپنی بھابی کوکب سے۔"

منھو کاکا نے ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا "جس طرح اس شادی کا کسی کو پتا نہیں چلا' تیسری شادی کا بھی پتا نہیں چلے گا۔۔۔ اور پھر چوتھی اور پانچویں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

"بس بھئی بس! میں نے سیاست کرنی ہے یار! تم مجھے کس چکر میں ڈال رہے ہو۔"

منھو کاکا نے مچلتے ہوئے کہا "بھائی جی! میری خاطر۔ بس میری خاطر۔ ایک دانہ چکھ لیں' دو سال تک منہ سے ذائقہ نہ جائے تو نام بدل دیں۔ بالکل ایک نمبر چیز ہے۔ خاص طور سے آپ کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ آپ نے ایک بار اس قتالہ زادی کو دیکھ لیا تو آپ کو سمجھ آ جائے گی کہ میں اتنا اصرار کیوں کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ۔۔۔" ایک دم منھو کاکا بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا۔

قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ پہلے سرو قد کوکب دلکش چال چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی پھر ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ ٹرالی میں تازہ تازہ پکوڑے بھی تھے اور صبح کا باسی اخبار بھی تھا۔ یہ اخبار تھوڑی دیر پہلے بھائی جی نے ہی منگوایا تھا۔ بھائی جی انگریزی اخبار کی ورق گردانی کرنے لگے۔ غالباً کوئی مطلوبہ خبر ڈھونڈ رہے تھے۔ منھو کاکا نے اپنے گلاس میں بچی کچی راسکی حلق میں انڈیلی اور ٹرالی میں رکھے گرما گرم پکوڑوں اور کاغذی سموسوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ جس جواں سال حسینہ کو کوکب کہا جا رہا تھا وہ اپنی کامدار ساڑی سنبھالتی ہوئی قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ٹرالی لانے والے ملازم پر بھائی جی نے اچٹتی سی نظر ڈالی اور بولے "وہ بادشاہ خود کہاں ہے؟"

کوکب بولی "میں نے دو تین آوازیں دی ہیں' پتا نہیں کہاں گھسا ہوا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ بادشاہ اس مونچھوں والے قوی ہیکل شخص کا نام ہے جو میرے ہاتھوں بے ہوش ہو کر نیم تاریک کوریڈور میں پڑا ہے۔ غالباً ٹرالی لے کر آنا اس کی ڈیوٹی تھی اور وہ اپنی "ڈیوٹی" پر موجود نہیں تھا۔ ابھی جواں سال عورت کوکب اور بھائی جی میں دو چار باتیں ہی ہوئی تھیں کہ کسی قریبی کمرے میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ کوکب فون سننے کے لیے اٹھ گئی۔ ملازم بھی ٹرالی پہنچا کر باہر جا چکا تھا' بھائی جی اور منھو کاکا میں گفتگو کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

منھو کاکا ایک بار پھر اس فتنہ ساماں کم سن لڑکی کی تعریفیں کرنے لگا جسے وہ ایک نایاب تحفے کے طور پر بھائی جی کی خواب گاہ میں پہنچانا چاہتا تھا۔ ان لمحوں میں وہ بدبخت سگ بندر لال نظر آ رہا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھائی جی پر کچھ نہ کچھ اثر کر رہی تھی۔ شاید بھائی جی نے جیل میں صنفِ نازک سے دور رہ کر جو سال گزارے تھے انہوں نے ان کے اندر صنفِ نازک کے لیے بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔ اور یہی خلا تھا جس سے منھو کاکا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھائی جی کے چہرے پر نیم رضامندی کی مسکراہٹ ابھر آئی۔ یہ مسکراہٹ ایک طرح سے اس حقیقت کا اعتراف تھی کہ منھو کاکا اپنی کوشش میں کامیاب ہو رہا ہے۔

بھائی جی نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "لیکن کاکا! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ الیکشن کا موقع ہے۔ اس وقت کسی طرح کا رسک نہیں لیا جا سکتا۔ "یہ شغل مغل پھر سہی۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔"

"بھائی جی! آپ بھی کمال کی بات کرتے ہیں۔ اس میں رسک ہے کہاں۔ نکاح سے پہلے ہی طلاق کے کاغذ پر دستخط ہو جائیں گے۔ سب کچھ پوری رضامندی سے ہوگا۔ یہ کوئی نیا تجربہ تو نہیں ہے میرے لیے۔ میرے خیال میں زیادہ نہیں تو دو سو ایسے کیس تو ضرور ڈیل کر چکا ہوں۔ ابھی پچھلے مہینے آپ کا پرانا یار خدا بخش قالینوں والا ایسے ہی ایک لڑکی لے کر سوات گیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کاکا۔۔۔ لیکن ابھی یہ الیکشن والا رولا ختم ہو لینے دو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے بھائی جی! لڑکی کا باپ سوتیلا ہے۔ اسے رقم کی سخت ضرورت آن پڑی ہے۔ سمجھیں کہ لاکھوں کا سودا ہزاروں میں دے رہا ہے۔ بالکل ان چھوئی لڑکی ہے۔"

"کتنے مانگ رہا ہے؟" بھائی جی نے اسپیشل برفی کی ڈلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سمجھیں جی مفت میں پھینک رہا ہے۔ ۸۰ ہزار مانگ رہا ہے پاگل کا بچہ۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی اور پاگل پن دکھائے گا۔ ساٹھ پینسٹھ تک آجائے گا۔"

"اچھا تم یوں کرو۔ اسے رقم ایڈوانس دے دو۔ اس معاملے کو الیکشن کے بعد دیکھ لیں گے۔"

"اس کا باپ بڑا سور کا پتر ہے جی۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ایسے بندوں سے ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو والا معاملہ ہونا چاہیے۔"

گفتگو دلچسپ مرحلے میں داخل ہو گئی تھی مگر میں جانتا تھا کہ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اور ایسے نکلنا تھا کہ میرے یہاں آنے کا کوئی فائدہ بھی ہوتا۔ میں نے اپنی جیکٹ کی ایک اندرونی جیب تک ہاتھ پہنچایا اور ایک چھوٹا سا ڈکٹا فون نکال لیا۔ اس طرح کے دو فون مجھے ساہی صاحب نے اس وقت دیے تھے جب میں تاور جگی وغیرہ کی اصلیت جاننے کے لیے دوسری بار روجھان پور گیا تھا۔ یہ فون روجھان پور میں استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بعد ازاں میں نے ایک فون ساہی صاحب کو واپس کر دیا تھا' دوسرا میرے پاس پڑا ہوا تھا۔ آج اچانک جاسوسی کا یہ چھوٹا سا آلہ میرے لیے نہایت قیمتی ہو گیا تھا۔

میں نے یہ فون بڑی احتیاط سے ایگزاسٹ فین کے روزن میں اس طرح چپکا دیا کہ نیچے کمرے سے نظر نہ آسکے۔ یہ نہایت حساس آلہ تھا۔ اس کی اسپیشل سہولت یہ تھی کہ یہ فاصلے سے بھی صوتی لہروں کو کیچ کرتا تھا اور زبردست ریسیپشن دیتا تھا۔ آلہ چپکانے کے بعد میں نے اس پر تھوڑا سا گرد و غبار ڈال دیا۔ یہ گرد و غبار مجھے روزن کے اندرونی حصے سے مل گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب میرے جانے کے بعد نیم تاریک کوریڈور سے بے ہوش بادشاہ برآمد ہوگا تو بھائی جی اور اس کے ساتھی بری طرح چونک جائیں گے۔ بعد ازاں مچھندر بادشاہ ہوش میں آکر جو بیان دے گا وہ بھائی جی کو مزید چونکائے گا۔ جس وقت میں نے بادشاہ پر حملہ کر کے اسے بے ہوش کیا میں نے اپنا منہ سر بڑی اچھی طرح مفلر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ میری شکل و صورت سے بے خبر رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس وقت بادشاہ بے ہوش نہ ہوتا' راہی عدم ہوتا۔ بہرحال ہوش میں آنے کے بعد اس نے جو بیان دینا تھا اس نے بھائی جی کو ریڈ الرٹ کر دینا تھا۔ عین ممکن تھا کہ آس پاس کے کمروں کی بڑی باریک بینی سے تلاشی وغیرہ لی جاتی۔ ایسے میں ڈکٹا فون تبھی بچ سکتا تھا جب اسے اچھی طرح چھپایا جاتا۔

اپنا کام کرنے کے بعد میں آہستگی سے نیچے اترا۔ میں نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام آثار مٹائے اور اسٹیل کے دروازے کو مقفل کر کے باہر آگیا۔ یہاں کوریڈور میں مونچھوں والا جن یعنی بادشاہ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے چابیوں کا گچھا پھر بڑی احتیاط سے اس کی جیب میں ڈال دیا۔ دیگر اشیا بھی واپس اس کے لباس میں رکھ دیں اور طویل راہداری سے (جو دراصل ایک سرنگ تھی) گزر کر بھائی جی کی خواب گاہ میں آگیا۔ یہاں بھی بڑی احتیاط سے میں نے اپنی موجودگی کے آثار ختم کیے اور تار کی مدد سے خواب گاہ کا دروازہ پھر سے مقفل کر کے باہر نکل آیا۔ سوئی گیس کا اخراج اب بھی ہو رہا تھا۔ میں نے یہ اخراج ختم کر دیا اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے سامان میں ڈکٹا فون کے سگنل وصول کرنے والا ریسیور بھی موجود تھا۔ یہ چھوٹا سا خوبصورت ڈوائس ایک عام کیلکولیٹر کی شکل میں تھا۔ یہ کیلکولیٹر یونہی الماری میں پڑا رہتا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک نہایت طاقتور ریسیور ہے۔

کمرے میں آنے کے بعد میں نے دروازہ لاک کیا۔ کھڑکیوں کے پردے احتیاط سے درست کیے اور ساہی صاحب کے دیے ہوئے کیلکولیٹر سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ جلد ہی کیلکولیٹر کے پوشیدہ اسپیکر سے شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بولنے کی آوازیں آئیں۔ آوازیں ذرا فاصلے سے آرہی تھیں اس لیے ان میں گونج تھی اور وہ زیادہ واضح نہیں تھیں' تاہم غور سے سننے پر

الفاظ سمجھ میں آجاتے تھے۔ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مچھندر کا بے ہوش جسم دریافت ہو گیا ہے اور راہل خانہ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

خوبرو کوکب کی مدھم آواز آئی۔ وہ وحشت زدہ لہجے میں بولی "مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ابھی یہیں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔"

بھائی جی کی پاٹ دار آواز سنائی دی "گل باز خان سارے دروازے بند کر دو۔۔۔ اور مولا بخش سے کہو رائفل لے کر آئے۔"

کچھ دیر تک کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرتی رہیں' پھر منظو کاکا کی آواز سنائی دی "میرا خیال ہے کہ چھت پر بھی دیکھنا چاہیے۔ اوئے مولے! تم تو میرے ساتھ۔ چلو جلدی کرو۔" چند سیکنڈ بعد گل باز خان کی ہانپی ہوئی آواز آئی "لگتا ہے جی کہ کوٹھی میں نہیں ہے کوئی بھی۔ اگر کوئی تھا تو نکل گیا ہے۔" بھائی جی کی بلند آواز آئی "اگر کوئی تھا۔۔۔ کے بچے تیرے اس ماے کو جنات نے مارا ہے کیا؟ اگر کوئی تھا' تب ہی بے ہوش ہوا ہے نا یہ۔" چند لمحے توقف کے بعد بھائی جی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا "اچھا کاکا! میں اب چلتا ہوں۔ یہاں کے معاملے کو تم سب سنبھالو۔"

بھائی جی اور منظو کاکا باتیں کرتے ہوئے ڈوائس سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ لہٰذا ان کی آوازیں مدھم ہو گئیں۔

میں کچھ دیر تک غیر واضح آوازیں اور کھٹ پٹ کی آہٹیں سنتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ریسیور بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔

○☆○

علی الصبح جب بھائی جی ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے قریبی باتھ روم میں گئے تو میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر رات والے واقعے کے اثرات صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ ان کی پیشانی پر پریشانی کی سلوٹیں تھیں۔ یہ پریشانی اس وقت بھی ان کے چہرے پر صاف دکھائی دی جب وہ ناشتے کے بعد گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ روز مرہ مصروفیات کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کی بیٹی آفرین میری طرف چلی آئی۔ وہ اب میرے ساتھ کافی بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔ خاص طور سے جب ارد گرد کوئی نہیں ہوتا تھا وہ بڑے دوستانہ انداز میں بات کرتی تھی۔

میں نے کہا "لگتا ہے کہ آپ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی ہیں۔"

وہ بولی "آپ بڑی جلدی بھانپ لیتے ہیں' میں واقعی امی جان کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں۔ اسی مارکیٹ میں جہاں آپ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ دراصل آج ڈیڈی کی سالگرہ ہے۔ ہم ڈیڈی کی سالگرہ ہمیشہ محبت اور جذبے کے ساتھ مناتے ہیں۔ جب وہ قید میں تھے تب بھی ہم جیل پہنچتے تھے اور کیک کاٹتے تھے۔ خاص طور سے میرے لیے ڈیڈی کی سالگرہ تو بے حد خوشی کا موقع ہوتی ہے۔ میں ہفتوں پہلے سالگرہ کا انتظار شروع کر دیتی ہوں۔ میں کوئی بناوٹ کی بات نہیں کر رہی ہوں شاہ جہاں صاحب۔ مجھے ڈیڈی سے واقعی بہت پیار ہے۔"

میری نگاہوں میں کل رات کا منظر گھوم گیا۔ جب بھائی جی اپنی بیٹی سے بھی چھوٹی لڑکی کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس کے "تصور" پر رال ٹپکا رہے تھے۔ بھائی جی کی شخصیت کا یہ دوسرا رخ کتنا مختلف اور حیرت ناک تھا۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بھائی جی کسی چھوٹے موٹے گناہگار کا نام نہیں ہے۔ وہ اس حوالے سے پرانا پاپی اور گھاگ نظر آتا تھا۔ تاہم وہ شاید ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے ہاتھ پاؤں بہت بچا کر رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے راز داں بس گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے ان کا کردار مختلف ہوتا ہے جبکہ اپنے خاص الخاص دوستوں کی محفل میں وہ کسی اور روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے گھر کے نیچے سے سرنگ نکال کر پڑوس کے گھر تک پہنچنا بھائی جی کی تجربہ کاری اور اولوالعزمی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

آفرین نے کہا "آپ کس سوچ میں کھو گئے؟"

میں نے چونک کر کہا "آپ کے ڈیڈی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ واقعی پیار کیے جانے کے قابل ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص یونہی تو لاکھوں دلوں کی دھڑکن نہیں بن جاتا۔"

آفرین کی آنکھوں میں فخر کی چمک ابھری۔ وہ رسان سے بولی "شاہ جہاں! میرے ڈیڈی نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ انہیں راستے سے ہٹانے کے لیے دھمکایا گیا' ڈرایا گیا' سو طرح کے لالچ دیے گئے لیکن وہ اپنے غریب عوام کے سامنے ایک ڈھال بن کر کھڑے رہے۔ کئی برسوں کی ذہنی و جسمانی اذیت اور جیل کی اونچی دیواریں بھی انہیں توڑ نہیں سکیں اور نہ انہیں ان کے چاہنے والوں سے دور کر سکی ہیں۔ وہ آج بھی دلوں پر راج کرتے ہیں اور انشاء اللہ کل بھی کریں گے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے "رائے صاحب" ڈیڈی کے سب سے بڑے حریف ہیں لیکن ڈیڈی میں اور رائے صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

رائے صاحب مراعات یافتہ طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی سیاست دولت کی سیاست ہے جبکہ ہماری سیاست پسے ہوئے مظلوم لوگوں کی سیاست ہے۔ یہ سیاست دراصل ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے حقوق کی جنگ ہے۔ اخلاقی طور پر بھی ڈیڈی اور رائے صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ رائے صاحب اسلام کے علمبردار بنتے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نجی محفلوں میں وہ شراب پینے سے بھی نہیں چوکتے۔ پچھلے دنوں ان کا ایک طوفانی معاشقہ بھی اخباروں کی زینت بن چکا ہے۔ فلمی دنیا کی کوئی اداکارہ تھی جس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ وہ بے چاری راتوں رات شادی کر کے کینیڈا بھاگ گئی۔"

میں نے دل میں سوچا "آفرین بی بی! تمہارے ڈیڈی کے "مخالف" نے تو صرف معاشقہ کیا ہوگا' تمہارے ڈیڈی صاحب تو باقاعدہ خفیہ شادی رچائے بیٹھے ہیں۔ آئندہ کے لیے بھی ان کے حوصلے بڑے بلند اور ارادے بڑے "نیک" ہیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آفرین! ایک نجی قسم کا سوال پوچھ سکتا ہوں ناراض تو نہیں ہوں گی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ یقین سے بولی۔

میں نے کہا "سیاست دان عموماً شادیوں کے معاملے میں بڑے فراخ دل ہوتے ہیں کبھی آپ کے ڈیڈی نے اس انداز میں نہیں سوچا؟"

آفرین نے ایک گہری سانس لی اور ایک بار پھر اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی وہ بولی "آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں آپ کو بتاتی ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ امی کافی عرصے سے بیمار ہیں۔ کچھ دن پہلے امی نے ڈیڈی سے خود کہا تھا کہ وہ شادی کر لیں۔ اپنے لیے کوئی ایسی پڑھی لکھی ساتھی ڈھونڈ لیں جو آپ کے کندھے سے کندھا ملا کر چلے اور سیاسی مصروفیات میں آپ کا بھرپور ساتھ دے۔ اس بات کا ڈیڈی نے اس قدر برا منایا تھا کہ کئی روز کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ امی سے انہیں اتنی محبت ہے شاہ جہاں! کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ درحقیقت وہ دونوں ایک دوجے کے اصل جیون ساتھی ہیں۔" میں تائیدی انداز میں سر ہلاتا رہا۔

کچھ دیر بعد آفرین اپنی والدہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل گئی۔ میں تازہ اخبار دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

دو تین روز مزید اسی طرح گزر گئے۔ یہ میرے لیے بڑی کامیابی کی بات تھی کہ ڈکٹا فون اپنی جگہ موجود تھا اور بڑی اچھی طرح کام کر رہا تھا۔ اس کی بیٹری زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن طاقت ور تھی۔ اس بیٹری کی ایک شاندار خصوصیت یہ تھی کہ یہ ریموٹ کنٹرول تھی۔ میں اپنے ریسیور سے اس بیٹری کو بند کر کے ڈکٹا فون کو آف کر سکتا تھا۔ میں زیادہ تر ڈکٹا فون آف ہی رکھتا تھا۔ اس طرح بیٹری محفوظ رہتی تھی۔ رات کو گیارہ بارہ بجے کے بعد میں ڈکٹا فون آن کرتا تھا۔ عام طور پر کمرے میں خاموشی ہی ہوتی تھی۔ بس ایک دن کوکب کی مختصر گفتگو سنائی دی تھی۔ وہ اپنے ملازم مولا بخش کو اس بات پر ڈانٹ رہی تھی کہ اس نے برساتی سے نیچے آنے والا دروازہ مقفل کیوں نہیں کیا ہے۔ وہ اسے اپنے حواس بحال اور آنکھیں کان کھلے رکھنے کی ہدایت کر رہی تھی۔

ڈکٹا فون کے ذریعے مجھے پتا چل رہا تھا کہ بھائی جی آج کل بے حد محتاط ہے۔ وہ رات اپنی خواب گاہ میں ہی گزارتا تھا اور اپنی خفیہ بیوی کے وصال سے مسلسل محروم تھا۔

ایک دن میں نے چوہدری وحدت علی کو فون کیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ شام کے بعد وحدت اکثر پینے پلانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس کی اگلی فلم کی متوقع ہیروئن بھی اس کی بغل میں موجود ہوتی تھی' لیکن آج وحدت کی آواز میں خمار نہیں تھا۔ شاید کام کی زیادتی کے سبب اس نے مے سے شغل نہیں فرمایا تھا۔ میں نے ایک دن پہلے ہی اخبار میں پڑھا تھا کہ وحدت علی کی نئی فلم کا کیمرا کلوز ہونے والا ہے اور وہ شب و روز شوٹنگ میں مصروف ہے۔

"ہیلو جہانے کیا حال ہے؟" میری آواز پہچانتے ہی چوہدری وحدت کی آواز سے تھکن غائب ہو گئی "میں روزانہ تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "سب ٹھیک جا رہا ہے جناب! میں بھائی کی پوری نگرانی کر رہا ہوں۔"

"رپورٹ کیا ہے؟" وحدت نے پوچھا۔

میں نے اسے تفصیل کے ساتھ بھائی جی کے معمولات سے آگاہ کر دیا۔ بھائی جی کے لیے میں کوڈ ورڈ کے طور پر صرف بھائی کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ وہ دھیان سے سنتا رہا اور بیچ بیچ میں سوالات بھی پوچھتا رہا۔ آخر میں کہنے لگا "تمہارے لیے یہ اچھی خبر ہے کہ تم کوٹھی میں اکیلے نہیں ہو۔ ایک اور بندہ وہاں موجود ہے۔ تم اسے نہیں جانتے لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ تم سے خود ہی رابطہ کرے اور کسی طرح کی مدد طلب کرے۔ وہ تمہیں اپنا نام وکی بتائے گا۔ نام یاد رہے گا نا۔۔۔ وکی۔"

"جی بالکل یاد رہے گا۔ یہ تو رحیم یار خاں میں میرے بھتیجے کا نام بھی تھا۔"

"ہاں۔ جو بات تم سے کہی تھی' وہ بھی ذہن میں رکھنا۔ چھوٹا کھلونا (پستول) تمہارے پاس ہی ہے۔ اگر موقع ملے تو اسے ضرور استعمال کرو۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جی۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

کوٹھی واپس آ کر میں دیر تک سوچتا رہا کہ کوٹھی میں پاشا گینگ کا نیا بندہ کون ہو سکتا ہے۔ میرے خیال کے مطابق کوئی نیا ملازم بھی بھرتی نہیں ہوا تھا' نہ ہی کوئی مہمان وغیرہ آیا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ کوٹھی میں پہلے سے موجود کسی شخص یا ملازم کو پاشا گینگ نے خرید لیا ہو۔ بکاؤ لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور جب مناسب قیمت مل جائے تو وہ جان پر کھیل کر بک بھی جاتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بھائی جی کی زندگی کے لیے خطرہ شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔

دو دن بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے میرے دل میں بھائی جی کی رہی سہی عزت بھی ختم کر ڈالی۔ میں نے رات کو بارہ ایک بجے کے درمیان ایک بار پھر مٹھو کاکا اور بھائی جی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی۔ مٹھو کاکا نے کہا "بھائی جی! بڑا سنہری موقع ہے۔ خدا قسم لڑکی دیکھ کر آپ کے ہوش نہ اڑ گئے تو نام بدل دیجیے گا۔"

بھائی جی نے کہا "کاکا! دیکھو میں تمہیں دس بار کہہ چکا ہوں کہ ابھی میں کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بس الیکشن ہو لینے دو اس کے بعد جیسا کہو گے ویسا کر لیں گے۔"

"لیکن اتنی دیر میں تو چڑیا اڑ جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں یار! اگر اڑ گئی اور چڑیا ڈھونڈ لینا۔"

مٹھو کاکا اصرار کرتا رہا' بھائی جی انکار کرتا رہا۔ بھائی جی کوئی جذباتی نوجوان نہیں تھا' پکی عمر کا ایک گھاگ سیاست دان تھا۔ اسے پتا تھا کہ موجودہ ماحول میں اگر کہیں اس کی بدنامی ہو گئی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ لیکن مٹھو کاکا بھی بڑی اعلیٰ نسل کا دلال تھا۔ وہ بولا "بھائی جی! میں نے ایک چھوٹی سی گستاخی کی ہے' اگر آپ معاف کر دیں تو۔"

"کیا مطلب؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ اگر آپ کو میرا یہ کام پسند نہ بھی آیا تو آپ غصہ نہیں کریں گے۔"

"لیکن کچھ پتا بھی تو چلے۔"

"پہلے آپ وعدہ کریں۔"

"اچھا بابا وعدہ۔ اب کیوں سسپنس بڑھا رہے ہو۔"

مٹھو کاکا نے ذرا توقف سے کہا "میں آپ کی اجازت کے بغیر ہی اس چھوکری کو یہاں لے آیا ہوں۔ آپ بس ایک نظر اس کو دیکھ لیں۔ اس کے بعد جیسے آپ کا پروگرام ہوگا' مجھے بتا دیجیے گا۔"

بھائی جی نے جز بز ہو کر کہا "کاکا! یہ کام ٹھیک نہیں ہوا۔ تمہیں پتا بھی ہے یہ کوٹھی محفوظ نہیں رہی۔ مجھے تو اب یہاں آتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔"

کاکا نے کہا "بھائی جی! آپ نے خوامخواہ اس بات کا خوف ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ وہ کوئی چور اچکا ہوگا جو چوری یا سینہ زوری کرنے آیا ہوگا۔ کوریڈور میں اس کا بادشاہ سے ٹاکرا ہو گیا۔ بادشاہ کو بے ہوش کرنے کے بعد وہ بھاگ گیا۔"

بھائی جی نے کہا "تم میری جگہ ہوتے تو وہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ ایک نظر لڑکی کو تو دیکھیں۔" مٹھو کاکا نے پھر کہا۔

چند سیکنڈ بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ بولنے والی نے دھیمی آواز میں بولا تھا' اس کے علاوہ وہ ڈکٹا فون سے دور بھی تھی۔ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ بھائی جی نے ایک دو باتیں کیں' ان کے الفاظ بھی پوری طرح سنائی نہیں دیے۔ لڑکی کی آواز سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نوخیز ہے۔ یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی میٹرک یا فرسٹ ایئر کی طالبہ ہو گی۔ اس کے لہجے میں بھولپن بھی نمایاں تھا۔ بھائی جی غالباً اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے' اس کے والدین کیا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بھائی جی کچھ دیر لڑکی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کا ایک فقرہ میں نے کافی وضاحت سے سنا۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا "تمہاری عمر ابھی اتنی نہیں ہے۔ تم ماڈلنگ وغیرہ کا خیال چھوڑ دو۔ ویسے بھی یہ خطرناک لائن ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تمہارے والدین کو کوئی مناسب رشتہ ملے تو وہ تمہاری شادی کر دیں۔"

"مگر جی! شادی کے لیے تو میرے باپ کو بھی پیسہ خرچ کرنا پڑے گا۔ وہ مجھ پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتا' مجھ سے پیسہ کمانا چاہتا ہے۔" لڑکی کی باریک نازک سی آواز بھرا گئی تھی۔

بھائی جی نے کہا "تمہارا ایڈریس' مٹھو کاکا کے پاس موجود ہے نا؟"

"جی ہاں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں چند دنوں میں تم باپ بیٹی کے لیے کچھ کروں گا۔"

اسی طرح کی چند باتیں کرنے کے بعد بھائی جی نے لڑکی اور منصو کاکا کو باہر بھیج دیا۔

گلاس اور بوتل کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ غالباً اب بھائی جی کمرے میں تنہا تھا اور مے سے شغل کر رہا تھا۔ شواہد بتا رہے تھے کہ خاتونِ خانہ یعنی کوکب بھی گھر میں موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ اپنے پروگرام کے مطابق شادی اٹینڈ کرنے کے لیے دبئی جا چکی تھی۔

پانچ دس منٹ بعد ایک بار پھر کمرے میں منصو کاکا کی آواز سنائی دی "کہیے جناب! کیسے ہیں مزاج شریف!" کاکا بے تکلفی سے بولا۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا لیکن عیش و طرب کے رشتے نے ان میں بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

جواب میں بھائی جی نے بہت مدھم لہجے میں کچھ کہا میں سمجھ نہیں سکا۔ منصو کاکا کی ہنسی سنائی دی "میں نہ کہتا تھا جناب! آپ دیکھ لیں گے تو پھر آپ کی رائے بدل جائے گی۔"

بھائی جی نے کہا "ویسے تم پکے شکاری بن گئے ہو۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے چہرے ڈھونڈ کر لاتے ہو۔"

"پھر اب کیا ارادے ہیں؟" منصو کاکا نے پوچھا۔ لگتا تھا کہ اس کے منہ میں برفی وغیرہ ہے۔

بھائی جی کی پرسوچ آواز ابھری "کتنی رقم مانگتا ہے اس کا باپ؟"

"مانگتا تو ۸۰ ہزار ہے لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ سودا ہو جائے گا۔"

"تم ایسا کرو کاکا۔ اسے تیس ہزار ایڈوانس میں دے دو۔ اسے بتاؤ کہ ستر ہزار روپیہ تمہیں الیکشن کے بعد دیں گے لیکن اس وقت تک لڑکی ادھر ادھر جانی نہیں چاہیے۔ اگر اس کی وعدہ خلافی کا ڈر ہے تو اسے بتا دو کہ تمہارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

"اپنے ہاتھ کہاں لمبے ہیں سر جی' یہ بھی تو آپ ہی کے ہاتھ ہیں۔" کاکا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تو پھر بات پکی ہو گئی؟" بھائی جی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے جی۔ میں اس کے حرامی باپ سے بات کرتا ہوں' میرا خیال ہے کہ مان جائے گا۔"

"بھئی اس کو منانا ہے' اور میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔" بھائی جی کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ اس سنجیدگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو لڑکی دیکھی ہے وہ واقعی لاکھوں میں ایک ہے۔

منصو کاکا نے پوچھا "کیا ارادہ ہے شادی کریں گے؟"

"ہاں بھئی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ انہی لوگوں میں رہ کر سیاست کرنی ہے ہم نے۔"

"مگر قانونی لحاظ سے لڑکی ابھی بالغ نہیں۔"

"مگر تمہارے لیے اسے بالغ کرنا کون سا مشکل ہو گا۔ نئی جنم پرچی' نیا شناختی کارڈ بنوا لو اس کا۔ تم چاہو تو دودھ پیتی بچی کو دس بچوں کی ماں ثابت کر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے جی۔ اگر آپ کی خواہش ہے تو پھر ہو جائے گا یہ کام بھی۔"

"اور ہاں۔ تمہاری وہ بات مجھے پسند آئی تھی۔ شادی سے پہلے طلاق کے کاغذ پر باہمی رضامندی کے دستخط ہونے چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے سر جی! وہ بھی ہو جائے گا۔"

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں کچھ فاصلے پر چلے گئے' اس لیے ان کی آواز بہت مدھم ہو گئی۔ میں نے ریسیور بند کر دیا۔

بھائی جی کا کردار اب کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ بھی ایک سکہ بند سیاست داں ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے حوالے سے ایک محتاط شخص تھا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ ایسے ہی ایک اور سیاسی بندے سے میں بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ ملک میں وہ بے حد نیک نام شخص تھا۔ اسے بے حد دیانت دار اور شریف النفس جانا جاتا تھا لیکن جب وہ پاکستان سے نکل کر یورپ امریکا وغیرہ میں جاتا تھا تو ساری اخلاقی حدیں پار کر جاتا تھا۔ وہ فرضی ناموں سے کیلیفورنیا اور نیویارک کے ایسے ہوٹلوں میں ٹھہرتا تھا جو اپنے آزاد اور ماحول اور تفریحات کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ میں سوچتا رہا۔ بھائی جی کی شکل بار بار ذہن میں آتی رہی۔ صورتِ حال کو سمجھنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ منصو کاکا درحقیقت چوہدری وحدت اور شکر وغیرہ کی پارٹی کا بندہ ہی تھا۔ وہ عین الیکشن کے موقع پر بھائی جی سے کوئی فاش غلطی کرانے کے موڈ میں نظر آتا تھا لیکن بھائی جی بھی ایک کائیاں تھا۔ کم از کم وقتی طور پر تو اس نے منصو کا وار خالی دے دیا تھا۔ منصو کی سرگرمی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بھائی جی کو دو طرح مارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک جسمانی طور پر دوسرے سیاسی طور پر۔

میرا ذہن بے حد انتشار کا شکار تھا۔ یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا تھا کہ ہم لوگ اتنے سادہ دل کیوں ہیں۔ ہم کیوں بھائی جی جیسے منافقوں کو اپنا رہنما بناتے ہیں اور ان کو اقتدار

کی کرسی تک پہنچانے کے لیے اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ لیتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا ستم یہ ہے کہ جب یہ منافق لوگ حکمران بن کر اپنی اصلیت دکھاتے ہیں تو پھر بھی اکثر ان کے بارے میں ہماری رائے تبدیل نہیں ہوتی۔ ہم اگلی مرتبہ پھر انہی لوگوں کو منتخب کرنے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ شاید ہم فطری طور پر شخصیت پرست ہیں۔ جس کے ساتھ اپنی ہمدردیاں وابستہ کرتے ہیں اسے پوجنا شروع کر دیتے ہیں پھر اس کی کوئی برائی ہمارے لیے برائی نہیں رہتی۔

بھائی جی کے حوالے سے بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی۔ لوگ اسے دیوانہ وار چاہتے تھے۔ اس کی تصویریں' گھروں اور دکانوں میں سجاتے تھے۔ اس کے نام کے بیج سینوں پر سجا کر پرجوش جلوسوں میں شرکت کرتے تھے اور نعروں کی شکل میں عقیدت کے ایسے ایسے پھول بھائی جی پر نچھاور کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ میں دو دن پہلے جب پی سی او سے وحدت علی کو فون کرنے بازار گیا تھا' میں نے ایک خوانچہ فروش کو بھائی جی کے بارے میں ولولہ انگیز گفتگو کرتے سنا تھا۔ وہ "رائے صاحب" کے ایک حامی سے بحث میں مصروف تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتاتے تھے کہ اگر اس بحث نے طول کھینچا اور گرما گرمی میں مخالف شخص کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تو خوانچہ فروش اس کا سر پھاڑ دے گا۔ اس نے رنگ برنگی دھاریوں والی پگڑی پہن رکھی تھی' یہ بھائی جی کی پارٹی کا جھنڈا تھا۔ اس نے ایسے ہی دو تین جھنڈے اپنی چھابڑی سے بھی لٹکا رکھے تھے۔ بھائی جی کی ایک فریم شدہ تصویر بھی خوانچے میں موجود تھی اور یہ کوئی ایک یہی خوانچہ فروش نہیں تھا۔ اس جیسے ہزاروں لاکھوں لوگ تھے جو بھائی جی کو غریبوں کا نمائندہ اور نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ ان کا "عظیم رہنما" ایک کم سن حسینہ کو اپنے بسترِ ہوس پر لانے کے لیے ایڈوانس کی رقمیں جمع کرا رہا ہے۔

ایک اتفاق ہی تھا جس نے مجھے اتنی جلدی بھائی جی کے اصل روپ سے آگاہ کر دیا تھا' ورنہ چند روز پہلے تک تو میرے لیے بھی بھائی جی ایک منفرد اور مخلص لیڈر رہی تھا۔ اگر اتفاقاً اس رات بھائی جی کے بیڈ روم سے سوئی گیس خارج نہ ہوتی تو یہ سب کچھ اندھیرے میں ہی رہتا۔ درحقیقت اس رات دو اتفاق ہوئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ ہیٹر کھلا رہ جانے سے گیس کا اخراج ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ جب میں نے گیس بند کرانے کے لیے بیڈ روم کی کال بیل مسلسل بجائی تو اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس بیل کی گھنٹی بھائی جی کے عشرت کدے میں بجتی تھی لیکن وائرنگ میں نقص کی وجہ سے یہ گھنٹی نہیں بجی اور مجھے بیڈ روم میں داخل ہونا پڑ گیا۔

الیکشن میں اب صرف دو ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ جلسے جلوسوں کا زور تھا۔ عوام الناس کے جذبات خوب بھڑکے ہوئے تھے۔ ایک روز صبح منہ اندھیرے میں نے ٹھنڈے سینڈوچ سے ناشتا کیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ رات بھر بھائی جی کا پہرہ دینے کے بعد علی الصبح آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتی تھیں۔ ابھی تاریکی چھٹی نہیں تھی۔ باغیچے کی طرف سے پرندوں کے چہچہانے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں ٹوتھ پیسٹ کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف آیا' باتھ روم کی ادھ کھلی کھڑکی سے میری نگاہ اچانک چھت کی طرف چلی گئی۔ مجھے چھت پر ایک سائے کی مشکوک حرکت نظر آئی۔ یہ سایہ بھائی جی کی خواب گاہ کے عین اوپر موجود تھا۔ وہ رکوع کے بل جھکا کچھ کر رہا تھا' پھر اس نے ایک نگاہ صحن کی طرف ڈالی اور اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے ننھا کھلونا یعنی چھوٹا سا پسٹل جراب میں ٹھیسا اور ٹینس شوز پہن کر باہر نکل آیا۔

چھت تک پہنچنے میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ چھت بالکل خالی تھی۔ وہ شخص کہیں چھپ گیا تھا' یا میرے پہنچنے سے پہلے ہی اتر گیا تھا۔ میں نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ مجھے ایک طرف چھوٹی سی سیاہ شے پڑی نظر آئی۔ یہ بجلی کے تار کا دو انچ لمبا سیاہ خول تھا۔ یہ خول تار کو چھیلنے سے علیحدہ ہوتا ہے۔ میں نے خول اٹھا لیا اور اس مقام پر پہنچا جہاں مشکوک شخص کو دیکھا تھا۔ یہاں پلاسٹک کا ایک چھوٹا واٹر ٹینک موجود تھا۔ اس ٹینک سے پائپ نچلے حصے میں گئے تھے۔

میں نے سگریٹ لائٹر کی روشنی میں جائزہ لیا اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پانی کی ٹنکی سے نکلنے والا جستی پائپ ایک خطرناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس پائپ کے ساتھ بجلی کا ایک موٹا تار جڑا ہوا تھا۔ یہ دراصل مین لائن سے آنے والا تار تھا۔ اس تار کا ایک جوڑ بڑی ہوشیاری سے کھولا گیا تھا اور تار کا ایک سرا جستی پائپ سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اب اس پائپ میں "فاتل کرنٹ" دوڑ رہا تھا۔ اگر میرے پاس ٹیسٹر ہوتا اور میں اسے جستی پائپ سے لگاتا تو یقیناً وہ پورا روشن ہو جاتا۔

میں نے جستی پائپ کا تعاقب کیا اور مجھے فوراً پتا چل گیا کہ یہ پائپ اس باتھ روم میں جاتا ہے جسے بھائی جی صبح

سویرے استعمال کرتا ہے۔ دراصل یہ علیحدہ ٹنکی صرف اسی باتھ روم کے لیے یہاں لگائی گئی تھی۔ یہ چھت بالکل ویران رہتی تھی یہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ جستی پائپ جس باتھ روم میں جاتا تھا وہ بھی فقط بھائی جی کے استعمال میں ہی آتا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ پھندا بھائی جی کے لیے بچھایا گیا ہے۔ بھائی جی نے آج سویرے تو وہ باتھ روم استعمال کرلیا تھا' اب اس نے کل صبح استعمال کرنا تھا' اس کا مطلب تھا کہ آنے والی رات بھائی جی کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوسکتی ہے۔

میں کچھ دیر تک سناٹے کی کیفیت میں کھڑا سوچتا رہا پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا آیا۔ میں اس باتھ روم کے سامنے سے گزرا جہاں موت کا پھندا بچھایا گیا تھا۔ میں نے ابھی تک اس باتھ روم میں بھائی جی کے سوا کسی اور کو جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس باتھ روم نے کل صبح تک بند رہنا تھا اور پھر صبح سویرے بھائی جی کو خوش آمدید کہنا تھا... لیکن نہیں۔ اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ باتھ روم کی صفائی کے لیے بھی تو کسی کو آنا تھا۔ یہ صفائی معمول کے مطابق ہر روز ہوتی تھی۔ میری نگاہ میں جمعدار عاشق مسیح کی صورت گھوم گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ "کام" عاشق مسیح نے ہی کیا ہو اور اگر یہ کام عاشق مسیح نے کیا تھا تو پھر وہی دوسرا آدمی تھا جو اس کوٹھی میں میرے ساتھ موجود تھا اور جس کا ذکر فون پر وحدت علی نے کیا تھا۔

میں نے تھوڑی سی مزید سوچ بچار کی تو یہ بات یقینی لگنے لگی کہ اس "کام" میں عاشق مسیح کا ہاتھ ضرور ہوگا۔ وہ صبح دس بجے کے لگ بھگ روزانہ باتھ رومز کی صفائی کرتا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہوسکتا تھا کہ باتھ روم کے نلکوں میں بڑا ہیوی کرنٹ دوڑ رہا ہے اور اگر وہ بے خبر تھا تو پھر بھائی جی کے بجائے اس کو مرنا تھا۔

اب مجھے صبح دس بجے کا انتظار تھا' میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ جمعدار عاشق باتھ روم میں صفائی کے لیے جاتا ہے یا نہیں۔ صبح نو بجے کے قریب مجھے عاشق مسیح کی جھلک نظر آئی۔ اس کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ خاصا صحت مند اور باتونی ملازم تھا۔ وہ یہاں صفائی کے علاوہ مالی کا کام بھی کرتا تھا۔ آفرین نے بتایا تھا کہ یہ ہمارے پرانے نوکروں میں سے ہے۔ میں نے عاشق مسیح پر نگاہ رکھی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ عاشق مسیح اس خوفناک سازش میں شریک تھا۔ اس نے باتھ روم کی صفائی نہیں کی۔

دوپہر کے فوراً بعد مجھے کوٹھی سے باہر جانے کا موقع ملا تو میں نے فون پر وحدت علی سے بات کی۔ فون پر وحدت سے میری بات ڈھکے چھپے انداز میں ہوتی تھی۔ میں نے وحدت کو بتایا کہ میں نے چھت پر ہونے والی کارروائی دیکھی ہے۔ کیا یہ اسی بندے کا کام ہے جس کے بارے میں اس نے ذکر کیا تھا۔

وحدت نے کہا "ہاں' یہی وہ بندہ ہے۔ یہ اسی کی کارروائی ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹے ہمارے لیے بڑے اہم ہیں۔ تم بھی الرٹ رہو' اور اپنے ساتھی کی مدد کے لیے تیار رہو۔"

"مدد؟ میں کیا مدد کرسکتا ہوں جی؟"

"تم مدد کرسکتے ہو۔" وحدت نے معنی خیز لہجے میں کہا "اگر وہ کہیں پھنس گیا تو تم اسے کوٹھی سے نکالنے کی کوشش کرسکتے ہو اور نہ نکال سکو تو اس پر اپنا ننھا کھلونا استعمال کرسکتے ہو۔"

وحدت علی مجھے ہدایت دے رہا تھا کہ میں عاشق مسیح کو زندہ حالت میں سیکیورٹی گارڈز کے ہاتھ نہ آنے دوں... اور اگر معاملہ گڑبڑ ہوجائے تو اسے شوٹ کردوں۔ مجھے کچھ مزید ہدایات دے کر وحدت علی نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں کوٹھی واپس پہنچا تو گیٹ پر گاڑیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ نظر آیا۔ بھائی جی کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ میں اندر پہنچا تو اپنے کمرے کے سامنے ہی آفرین سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہلکے عنابی لباس میں بڑی اسمارٹ نظر آرہی تھی' کہنے لگی "شاد جہاں! کبھی کبھی کسی کی بات مان بھی لینی چاہیے۔ آج آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ڈیڈی ایک جلسے سے خطاب کرنے شیخوپورہ جارہے ہیں۔ اس کے بعد وہ دیہاتی علاقے میں ایک انتخابی دفتر کا افتتاح کریں گے۔ انشاء اللہ شام تک ہم واپس آجائیں گے۔"

"یعنی آپ بھی ساتھ جارہی ہیں؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"ہاں میں بھی جارہی ہوں۔ پتا نہیں کیا بات ہے شاد جہاں! میرا دل نہیں چاہتا کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی ڈیڈی کو اکیلا چھوڑوں۔ عجیب عجیب وہم ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ دو چار دنوں سے یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو۔ ڈیڈی جوتش وغیرہ پر بھی کافی یقین رکھتے ہیں۔ ان کے ایک گہرے دوست پروفیسر امتیاز ہیں۔ وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ ان کے تیار کیے ہوئے زائچوں کو امی اور ڈیڈی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ پروفیسر امتیاز کہا کرتے ہیں کہ

ڈیڈی کے لیے اتوار کا روز بڑا اہم ہے۔ اس دن انہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ انہیں جانی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ جب سے یہ بات ہوئی ہے اتوار کا دن میرے لیے خاص طور سے پریشان کن ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ ایسی باتوں پر کافی یقین رکھتی ہیں؟"

"پہلے پہل نہیں رکھتی تھی لیکن اب رکھنے لگی ہوں۔ آپ کو یاد ہے نا کہ کچھ روز پہلے ایک بندے نے ڈیڈی پر نوک دار بیساکھی سے حملہ کیا تھا۔ اس روز بھی اتوار ہی تھا۔"

آفرین کی نزدیک اتوار کی اہمیت بہت زیادہ تھی لیکن میرے نزدیک زیادہ اہمیت سوموار کی تھی۔ بھائی جی کے خلاف جو جان لیوا منصوبہ تیار ہوا تھا اس کا ڈراپ سین سوموار کی صبح ہوسکتا تھا۔ بہرحال اس کے باوجود اتوار کی نحوست کو تسلیم کرنے کا جواز بھی موجود تھا۔ اس منصوبے کا آغاز اتوار کی صبح یعنی آج صبح ہی ہوا تھا۔ شاید اسی طرح عقیدے بنتے ہیں اور پختہ تر ہوتے ہیں۔ اب اگر بھائی جی کے ساتھ کل صبح کچھ ہوجاتا تو بھی اس اعتبار سے پروفیسر کی پیش گوئی کو سچا کہا جاسکتا تھا کہ بھائی جی کے خلاف سازش کی شروعات ایک دن پہلے یعنی اتوار کی صبح کو ہوئی تھی۔ آفرین دل نشیں انداز میں مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔ باتوں کے دوران میں ہی اس نے مجھ سے کہا "کل صبح میں آپ جناب کو ایک زبردست سرپرائز بھی دینے والی ہوں۔"

"کیسا سرپرائز؟" میں نے پوچھا۔

"سرپرائز کے بارے میں بتا دیا جائے تو پھر بات ہی ختم ہوجاتی ہے جناب من۔" اس نے ادا سے کہا۔

آفرین سے باتیں کرتے ہوئے میری نگاہ گراسی لان کی طرف اٹھی تو وہاں چھوٹا سا مجمع نظر آیا۔ وہ لوگ کسی شے کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ یہاں مجھے ایک دو موٹے تازے بکرے بھی دکھائی دیے "یہ کیا ہو رہا ہے آفرین؟"

"امی نے کالے بکروں کا صدقہ دیا ہے۔ وہ بھی کئی دنوں سے پریشان ہیں۔"

"یعنی بھائی جی کی سیکیورٹی کا معاملہ؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر ذرا توقف سے بولی "چلیں اٹھ جائیں' آج ہم دونوں ڈیڈی کے ساتھ ہی جائیں گے۔"

"لیکن' میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا پبلک میں جانا ٹھیک نہیں۔ اس سے میرے لیے مسئلے پیدا ہوں گے۔"

"اوہو تو آپ گاڑی میں بیٹھے رہیے گا۔ شیشے رنگ دار ہیں' آپ بالکل "باپردہ" رہیں گے۔"

اس نے اصرار کرکے مجھے ساتھ چلنے پر مجبور کرلیا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ اس کے ڈیڈی کا شیخوپورہ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔ اس حلقے میں دو تین دفعہ پہلے بھی تشدد کارروائیاں ہوچکی تھیں۔ ویسے بھی اس علاقے میں بھائی جی کے بڑے حریف "رائے صاحب" کی پارٹی کا بڑا زور تھا۔

وہ بے چاری جانتی نہیں تھی کہ بھائی جی کی جان کو جو خطرہ ہے وہ کوٹھی سے باہر نہیں کوٹھی کے اندر ہے۔ بھائی جی کی موت اس چار دیواری کے اندر ہی چھپی ہوئی تھی اور اس کا انتظار کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم کوٹھی سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھے۔ لان کے ایک گوشے میں ان آٹھ عدد کالے بکروں کی کھالیں اتاری جارہی تھیں جنہیں بھائی جی کے قدموں میں ذبح کیا گیا تھا۔ بھائی جی کی شریک حیات نے ان جانوروں کی قربانی سے شوہر کے سر سے بلا میں اتارنے کی کوشش کی تھی' لیکن بھائی جی کو جو بلائیں چمٹی ہوئی تھیں وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں اور سب سے بڑی بلا تو بھائی جی خود تھا' جو منافقت کا کمبل لپیٹ کر خود اپنے آپ کو ہی چمٹا ہوا تھا۔ حرص ہوس اور لالچ کے پنجے اس نے اپنے سینے میں خود ہی گاڑ رکھے تھے۔

بھائی جی کے قافلے میں کل سات گاڑیاں تھیں' تین آگے تین پیچھے۔ بھائی جی اور اس کی بیٹی آفرین بلٹ پروف پجارو میں سفر کررہے تھے۔ میں بھائی جی کی پارٹی کے دو اہم عہدے داروں کے ساتھ ایک دوسری گاڑی میں تھا۔ جب سے شیخوپورہ روڈ والا واقعہ ہوا تھا۔ بھائی جی بے حد احتیاط سے سفر کرتا تھا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے میں شیخوپورہ پہنچ گئے۔ جلسہ گاہ میں بھائی جی کا والہانہ استقبال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگ دیوانہ وار اس کی گاڑی کے گرد رقص کررہے تھے اور منوں کے حساب سے گلاب کی پتیاں نچھاور کی جارہی تھیں۔

بھائی جی جیپ کے اندر سے ہاتھ ہلا ہلا کر والہانہ نعروں کا جواب دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے تمتمانے لگا تھا۔ جلسہ گاہ میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بھائی جی سے پہلے اس کی پارٹی کے دیگر عہدے داروں نے شعلہ بیانی کی' پھر بھائی جی کی باری آئی۔ بھائی جی نے اپنی تند و تیز تقریر سے لوگوں میں آگ بھڑکا دی۔ اس نے رائے صاحب کی پارٹی پر اور رائے صاحب کے کردار پر شدید حملے کیے۔ بھائی

جی کی تقریر میں طاہرہ رخشندہ کی بے حرمتی اور قتل کے مشہور واقعے کا ذکر بھی آیا۔ بھائی جی نے اس جرم کا اصل ذمے دار بھی ظلیب رائے کو ہی قرار دیا۔ بھائی جی نے ہوا میں مکا لہراتے ہوئے کہا ''ہم اس ملک میں خواتین کو وہ تحفظ' عزت اور مان دیں گے جس کے لیے وہ آج تک ترستی رہی ہیں۔ چادر اور چار دیواری کا تحفظ ہماری اولین ترجیح ہوگا۔ ہم ایسا نظام لائیں گے جس میں اس ملک کی کسی رخشندہ پر پھر کبھی ایسا ظلم نہ ہو سکے۔ ہماری بیٹیاں حفاظت کے ساتھ گھروں سے نکلیں اور سلامتی کے ساتھ واپس آئیں۔ ان کو ترقی کے پورے مواقع ملیں۔ وہ زندگی میں آگے بڑھیں' اپنے لیے اور اپنے کنبے کے لیے خوش حالی کا سامان کریں۔ میرے ہم وطنوں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری حکومت کی سب سے پہلی ترجیح چادر اور چار دیواری کا تحفظ ہوگا۔

بھائی جی اپنی پہلی ترجیح کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کی پہلی ترجیح کیا ہوگی' یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس ترجیح کے لیے منصوبے کا کو ایڈوانس بھی جمع کرا چکا تھا۔ بھائی جی کے آئندہ پروگرام میری نگاہ سے اوجھل تھے لیکن اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ چادر اور چار دیواری کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنے والا ہے۔ اس جلسے کے دوران میں' میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا تھا۔ یہاں کافی تعداد میں پولیس موجود تھی اور میں باہر نکل کر کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میرا دھیان رہ رہ کر موت کے اس پھندے کی طرف چلا جاتا تھا جو بھائی جی کی رہائش گاہ میں اس کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ مجھے بھائی جی کی ''سلامتی'' کی طرف سے اب کوئی زیادہ فکر نہیں رہی تھی۔ کسی وقت تو ذہن میں آتا تھا کہ اس شخص کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہو جانے دوں۔ خس کم جہاں پاک۔۔۔ لیکن پھر عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ یہ لوگ بھائی جی کو چاہتے تھے' بلکہ اسے پوجتے تھے۔ اگر کل صبح بھائی جی کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو ان عقیدت مندوں کا کیا حال ہوتا۔ گلی کوچوں میں تہلکہ مچ جاتا۔ عین ممکن تھا کہ پورے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ بھائی جی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی زندگی کے لیے کوشش کرنا میری مجبوری تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ جن لوگوں نے بھائی جی کو قتل کر کے ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کی ہے انھیں ناکام بنا دوں۔

گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے میں نے ساہی صاحب کو بھی دیکھا۔ وہ جلسہ گاہ کے اسٹیج کے قریب اپنی سرکاری جیپ کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے سامنے تین موءب انسپکٹر موجود تھے۔ ساہی صاحب انھیں ہدایات دے رہے تھے' ساتھ ساتھ وہ وائرلیس پر کسی سے بات بھی کرتے جا رہے تھے۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ اسٹیج کے ارد گرد کا جائزہ لینے کے لیے آگے چلے گئے۔ ذمے داری کے بوجھ نے ساہی صاحب کے شانوں کو جھکا رکھا تھا۔ ویسے بھی اب وہ ریٹائرمنٹ کی عمر کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ اکثر ان کے چہرے پر تھکان کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ آج کل اپنی طرف سے تو بھائی جی کی سیکیورٹی کو یقینی بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔

میں سوچنے لگا کہ اگر کل بھائی جی اپنے باتھ روم میں مردہ پایا جاتا ہے تو اس تہلکہ خیز واقعے کے اثرات ساہی صاحب پر کیا پڑیں گے اور بات فقط اکیلے ساہی صاحب کی ہی نہیں تھی پورے ملک کی تھی۔ میں فارغ بیٹھا تھا اس لیے مختلف موضوعات پر سوچ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے ایک دم آفرین کی بات یاد آگئی۔ پتا نہیں وہ مجھے کون سا سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔

شیخوپورہ اور دیہی علاقے میں اپنا دورہ مکمل کرنے کے بعد بھائی جی اپنے قافلے کے ہمراہ رات نو بجے کے لگ بھگ لاہور واپس پہنچ گیا۔ وہ اپنے شیڈول سے دو گھنٹے لیٹ تھا۔ درحقیقت راستے میں جگہ جگہ بھائی جی کی گاڑی کو روکا گیا تھا اور اس کے حق میں پرجوش نعرے لگائے گئے تھے۔ بھائی جی کے حامی مقتولہ رخشندہ والے ایشو کو بہت زیادہ نمایاں کر رہے تھے۔ وہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ظلیب رائے خود بھی اخلاق باختہ شخص ہے اور اس کے ساتھی بھی کمزور کردار کے مالک ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنے ''بھائی جی'' کو ایک پارسا اور بے داغ شخص ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھائی جی کے لیے جو بینرز اور ہورڈنگ وغیرہ لکھے گئے تھے' ان میں بھائی جی کے لیے باکردار' بے داغ اسلام پسند جیسے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد بھائی جی کی دو تین میٹنگز گھر کے اندر ہی تھیں۔ وہ بارہ بجے تک مصروف رہا' پھر سونے کے لیے چلا گیا۔ اس دوران میں' میں نے اس پر مسلسل نگاہ رکھی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ خلافِ معمول اس باتھ روم کی طرف نہ چلا جائے جسے وہ علی الصبح استعمال کرتا تھا۔

اس دوران میں میں ایک بار بڑی خاموشی سے چھت پر بھی گیا تھا۔ میرے پاس ایک ٹیسٹر بھی تھا۔ بجلی کا تار عزرائیل کے روپ میں ابھی تک جستی پائپ سے چمٹا ہوا

تھا۔ دراصل یہ پائپ لائن بالکل علیحدہ تھی اور اس کا تعلق صرف نیچے والے باتھ روم سے تھا یا ایک واش بیسن سے تھا جو ایک اندرونی کمرے میں واقع تھا اور مہینوں سے استعمال نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹیسٹر کی مدد سے جستی پائپ کو چیک کیا۔ ٹیسٹر جگمگا اٹھا۔ بجلی کے تار کو جستی پائپ سے علیحدہ کرنے کے لیے ابھی مجھے کچھ انتظار کرنا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ بھائی جی کے بیدار ہونے سے ایک گھنٹا پہلے دوبارہ چھت پر آؤں گا اور اسی وقت تار علیحدہ کروں گا۔ اگر میں یہ کام ابھی کر گزرتا تو گڑبڑ ہو سکتی تھی کیونکہ عاشق مسیح بھی کوٹھی کے اندر ہی موجود تھا۔ لیکن میں دوبارہ چھت پر نہیں جاسکا اور گیا بھی تو اس وقت جب ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں' حالات میں غیر معمولی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں۔ میں آج دن کے وقت بالکل نہیں سو سکا تھا اس لیے ارادہ تھا کہ رات کو تھوڑی دیر کے لیے آرام کرلوں گا' لیکن پھر یونہی دھیان ڈکٹا فون کی طرف چلا گیا۔ میں نے الماری میں سے ریسیور نکالا جو بظاہر بالکل کیلکولیٹر نظر آتا تھا۔ کیلکولیٹر پر میں نے ایک مخصوص آپشن منتخب کیا اور اسے ریسیور کا روپ دے دیا۔ کچھ نہایت باریک آوازیں اسپیکر میں سے ابھرنے لگیں۔ میں یہ جان کر چونکا کہ بھائی جی آج پھر اپنے ''دوسرے گھر'' میں موجود ہے۔ اس کی خفیہ بیوی یقیناً ابھی تک وہیں میں ہی تھی۔ آج بھائی جی اپنے ایک ملاقاتی کے ساتھ بڑی خاص الخاص قسم کی گفتگو کر رہا تھا۔ اس گفتگو کا لب و لہجہ اور متن چونکا دینے والا تھا۔ بھائی جی اپنے مہمان سے کہہ رہا تھا ''تمہیں ابھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ الیکشن تک انتظار کرلو۔ ہر بندے کی مجبوریاں ہوتی ہیں اور ہم جیسے بندوں کی مجبوریاں تو مت زیادہ ہوتی ہیں۔''

''میں اس بات پر شا چاہتا ہوں بھائی جی! لیکن اب اگر آہی گیا ہوں تو کچھ نہ کچھ کر دیجیے۔''

''دیکھو تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ الیکشن کے موسم میں مخالف پارٹیاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنا دیتی ہیں اور یہ تو مت بڑی بات ہے۔''

''پرنتو! آپ کے لیے تو بالکل بڑی نہیں ہے۔ آپ کے کیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر بھائی جی کی آواز آئی ''اچھا بات میں نے تم سے کہی تھی' اس کا کیا بنا؟''

مخاطب نے پرجوش لہجے میں کہا ''میں نے وہ بات دلی میں منتری صاحب سے کہی تھی۔ وہ تو خود بھی یہ چاہتے ہیں کہ دونوں ملک تجارت کو بڑھوتی دیں۔ ان کا رشواس ہے جی کہ تجارت کے ذریعے سے ہی دونوں دیشوں کے معاملات سدھریں گے۔ میل ملاقات شروع ہو جائے گی تو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا' کیول ایک ہی مسئلے کو لے کر بیٹھے رہیں گے تو معاملہ چوپٹ رہے گا اور پھر پرنتو! تجارت میں آپ کا فائدہ بھی کتنا ہے۔ انڈیا کوئی چھوٹی منڈی نہیں ہے۔ سمجھیں جس نے انڈیا سے ناتا جوڑا اس نے جگ کے پانچویں حصے سے ناتا جوڑ لیا۔ بھگوان بھلا کرے آپ نے اپنے کارخانے کی کتنی پیداوار بتائی تھی؟''

''کوئی تیس ہزار ٹن شیخوپورہ والے کی ہے۔ فیصل آباد والے کی نصف لاکھ ٹن کے لگ بھگ پہنچ جاتی ہے۔''

''آپ کوئی چنتا ہی نہ کریں۔ سمجھیں آپ کا یہ سب کچھ چٹکیوں میں بک گیا اور اس کے علاوہ آپ کے جو بھائی بند ہیں ان کا بھی بک گیا۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ ہم نے آپ سے ڈیمانڈ کرنا ہے اور آپ نے ہاتھ اٹھا دینے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر بھائی جی کی مدھم آواز ابھری ''اچھا تم بیٹھو' میں ابھی ایک فون کر کے آیا۔''

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ بھائی جی غالباً ساتھ والے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً ایک منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں میں سکتے کی سی کیفیت میں ریسیور کان سے لگائے بیٹھا رہا تھا۔ واپس آکر بھائی جی نے ایک بار پھر اپنے انڈین مہمان سے بات چیت شروع کر دی۔ اس مبہم بات چیت سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ بھائی جی کے مہمان کا نام وشوا پرشاد ہے۔ وہ ایک ایسے کشمیری جانباز کے سلسلے میں بھائی جی سے بات کرنے آیا ہے جو اس کے خیال کے مطابق لاہور میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ وحید نامی وہ جانباز کسی طور بھارتی ایجنسی را کو مطلوب ہے۔ بھائی جی ''وحید'' کی WHERE ABOUTS سے آگاہ ہے اور اس کی مکمل نشان دہی کر سکتا ہے۔ پرشاد اسی مقصد سے بھائی جی سے ملنے تشریف لایا ہے۔

میرے ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ یہی ''بھائی جی'' وہ شخص تھا جو الیکشن کے نتیجے میں ملک کی باگ ڈور سنبھال سکتا تھا۔ یہی وہ ملک کا مسیحا تھا' لوگ جسے دیوانہ وار چاہتے تھے اور جسے اقتدار کی کرسی تک پہنچانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ وہ عظیم قومی رہنما اس رات کے اندھیرے میں ایسے گھٹیا ترین انداز میں سوچ رہا تھا۔ وہ ایک سرفروش کے سر کا سودا کرنے میں مصروف تھا اور بدلے میں تجارت مانگ رہا

تھا۔ وہ ایسے کارخانوں کی پیداوار کے لیے منڈی ڈھونڈ رہا تھا جن کے بارے میں عوام تو کیا شاید اس کے اپنے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ کارخانے کہاں تھے' کس کے نام تھے' کیا بناتے تھے یہ بھائی جی ہی جانتا تھا۔ بھائی جی کے لاکھوں سادہ لوح ووٹر تو بس یہی جانتے تھے کہ بھائی عظیم الشان ہے۔ اس کے دل میں اپنے غریب عوام کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اپنے غریب عوام کی خاطر اس نے لاٹھیاں کھائی ہیں اور جیلیں کاٹی ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا لیڈر ہونے کے باوجود شلوار کے پائنچے چڑھا کر سیلاب زدہ علاقوں میں جاتا ہے' بدبودار بوڑھوں کو اپنے سینے سے لگاتا ہے اور غریب صورت عورتوں کے سروں پر سلائی مشینیں دھرتا ہے۔ وہ عظیم الشان ہے کیونکہ اپنے غریب عوام کی خاطر ماڈل ٹاؤن کی ایک عام سی کوٹھی میں رہتا ہے اور عام سی گاڑی استعمال کرتا ہے اور سادہ سے کپڑے پہنتا ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔ اگر بھائی جی کا سارا کچا چٹھا ان لوگوں کے سامنے آجاتا تو بھی وہ بھائی جی کی محبت سے منہ موڑنے والے نہیں تھے۔

پتا نہیں کیوں اس موقعے پر مجھے اپنے آپ پر اور اپنے لوگوں پر بھی غصہ آنے لگا۔ آخر ہم اتنا سادہ لوح کیوں تھے کہ جو آتا تھا ہمیں با آسانی بے وقوف بنا کر چلتا بنتا تھا۔ لٹ پٹ کر ہم کچھ عرصے بعد پھر اسی کو اپنا رہنما اور نجات دہندہ تسلیم کر لیتے تھے۔ ممکن تھا کہ سیاست کے اس گندے کیچڑ میں کچھ پھول بھی ہوں' لیکن ابھی تک مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

گفتگو سن کر میرے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ ان لمحوں میں' اس نیم تاریک کمرے کے اندر بیٹھے بیٹھے۔ میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں تھا۔ اس فیصلے کے پیچھے گہری سوچ بچار موجود تھی۔ اور فیصلہ یہ تھا کہ۔۔۔ آج کی رات میں کچھ نہیں کروں گا۔ ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں یہ رات بھی اسی طرح گزاروں گا جس طرح پہلی راتیں گزاری تھیں۔ ہاں میں کچھ نہیں کروں گا۔

میں جانتا تھا کہ میرے "کچھ نہ کرنے" سے ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے' لیکن یہ واقعہ شاید ہو ہی جاتا تو بہتر تھا کیونکہ یہ واقعہ نہ ہوتا تو بھی مستقبل قریب میں بہت سے ایسے "واقعات" ہونے والے تھے جو اس واقعے سے کہیں زیادہ سنگین تھے' اور ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں جو خاکم بدہن نقشوں سے ممالک کو ملیامیٹ کرتے ہیں۔ لیکن پھر آنکھوں کے سامنے آفرین کی صورت آنے لگی۔ وہ کتنا بھروسا کر رہی تھی مجھ پر۔ کتنا اعتبار تھا اسے یہاں میری موجودگی پر۔ وہ اپنے ڈیڈی سے والہانہ محبت کرتی تھی اور اس کے لیے ہر وقت اس کے ہونٹوں پر دعائیں رہتی تھیں۔ آج رات بھی وہ اس بھروسے پر چین کی نیند سوئی ہوئی تھی کہ میں اس کوٹھی میں موجود ہوں اور اس کے ڈیڈی کی سیکیورٹی کی ذمے داری سنبھالے ہوئے ہوں۔۔۔ پھر ذہن ایک دوسرے زاویے سے سوچنے لگا۔ بھائی جی کے مر جانے سے بھائی جی کی پالیسیوں اور اس کی پارٹی نے تو نہیں مر جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بھائی جی کے مرنے سے اس کی پارٹی مزید مضبوط ہو جاتی۔ بھائی جی کا کوئی اور سیاہ باطن ساتھی ابھر کر سامنے آجاتا اور بھائی جی والا کام سنبھال لیتا۔ ممکن تھا کہ بھائی جی کو سادہ لوح عوام حسب دستور "شہید" کا درجہ دے دیتے اور ہمدردی کا سارا ووٹ بھائی جی کی پارٹی کے پاس چلا جاتا۔ ایسے ہی ان گنت سوال ذہن میں اودھم مچا رہے تھے۔

سوچتے سوچتے چند دن پہلے کا اخبار میں پڑھا ہوا ایک تبصرہ ذہن میں آنے لگا۔ ایک سیاسی مبصر نے لکھا تھا کہ بھائی جی کی پارٹی ایک طرح سے ون مین شو ہے۔ اگر اس میں سے بھائی جی کو نکال دیا جائے تو شاید کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بھائی جی اس پارٹی کا جسم ہے اور روح بھی روح۔۔۔ کچھ لوگوں نے آج رات اس روح کو نکالنے کا انتظام کر دیا تھا۔ بے شک وہ برے لوگ تھے لیکن نادانستگی میں ان سے ایک بھلا کام ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ یا شاید گینگ حقیقت میں ایک اچھا کام کر رہا تھا' لیکن اس کی نیت چونکہ جرم کی تھی لہٰذا ان کے نامہ اعمال میں جرم ہی لکھا جاتا تھا۔

جوں جوں صبح صادق کا وقت قریب آ رہا تھا میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ قدرت نے اس وقت مجھے فیصلے کی قوت بخش رکھی تھی۔ دوسرے لفظوں میں قدرت کی منشا میرے عمل سے ظاہر ہوتا تھی۔ میں چھت پر جا کر بجلی کا تار جستی پائپ سے جدا کر سکتا تھا اور اس کے برعکس ان نتیجہ خیز لمحوں میں اپنے کمرے کے اندر بھی محدود رہ سکتا تھا۔ گھڑی کی سوئی ٹک ٹک کی آوازیں پیدا کرتی رہی اور رات کے سناٹے میں یہ آواز کسی ہتھوڑے کی صدا کی طرح میرے سر پر ضربیں لگاتی رہی۔ آخر رات کی تاریکی میں اجالے نے نقب لگا دی۔ بھائی جی کی خواب گاہ کی روشنی جلی۔ کھٹ پٹ کی مدھم آوازیں آئیں اور پھر دروازہ کھل گیا۔

میں آنکھیں بند کیے اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔ میرے کانوں میں وہ آوازیں گونج رہی تھیں جو آج نصف شب میں نے ڈکٹا فون پر سنی تھیں۔ ان آوازوں نے بھائی جی کی

زندگی کا بھیانک ترین رخ میرے سامنے کیا تھا۔ اس کے کردار کی ایک ایسی تصویر مجھے دکھائی تھی کہ میں لرز گیا تھا۔ مجھے کوئی سیاسی مبصر یا دانشور ہونے کا دعویٰ نہیں تھا' نہ ہی اس میدان میں میرا کوئی گہرا تجربہ تھا' بہرحال میں نے قانون پڑھ رکھا تھا۔ حالات حاضرہ کی ضروری خبر بھی رہتی تھی۔ اپنی اس معمولی سوجھ بوجھ کے ساتھ بھی میں یہ نتیجہ با آسانی اخذ کر سکتا تھا کہ بھائی جی ایک بہت بڑا سیکیورٹی رسک بننے والا ہے۔ یہ الیکشن ایک ایسے شخص کو اقتدار کی کرسی پر پہنچانے والے ہیں جو کسی طور اس کرسی کا اہل نہیں۔۔۔ اور اگر وہ واقعی اس کرسی تک پہنچ گیا تو وہ سب کچھ کر گزرے گا جو ایک بدترین دشمن کرتا ہے۔

ایک عجیب سی بے حسی میرے دل و دماغ پر طاری ہونے لگی۔ میرے کانوں میں آفرین کی تصوراتی چیخیں گونج رہی تھیں لیکن میں نے ان چیخوں کی طرف سے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ اپنے بندھے ٹکے معمول کے مطابق بھائی جی خواب گاہ سے باہر نکل آیا تھا۔ حسب معمول اس نے پختہ روش پر چند چکر لگائے۔ باتھ روم میں گھسنے سے پہلے وہ تازہ پانی پی کر روش کے چند چکر ضرور لگاتا تھا۔ میں اس کے سلیپروں کی چیڑ چیڑ سن رہا تھا۔ میں کھڑکی میں سے اسے دیکھ سکتا تھا لیکن دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید مجھے اندیشہ تھا کہ بھائی جی کو دیکھنے سے میرا ارادہ ڈانواں ڈول نہ ہو جائے۔ بھائی جی نے ایک دو بار کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر باتھ روم کی طرف چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ "موت" کی طرف جا رہا ہے۔ میں نے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔ بھائی جی نے باتھ روم کے دروازے کی چٹخنی ہٹائی اور اندر چلا گیا۔

دس منٹ گزرے۔ بیس منٹ گزرے اور پھر پون گھنٹا گزر گیا۔ بھائی جی مر چکا تھا یا ایسی حالت میں تھا جو موت جیسی ہی تھی۔

میں نے ڈکٹا فون کا ریسیور رات کو ہی توڑ پھوڑ کر گٹر میں بہا دیا تھا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چھت پر سے بھی میں اپنی موجودگی کی ہر نشانی مٹا چکا تھا۔ آنے والے حالات کے لیے میں پھر بھی پوری طرح تیار تھا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ صبح ساڑھے سات بجے کے لگ بھگ مجھے آفرین آتی دکھائی دی۔ وہ سو کر اٹھی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے اور لباس بھی بے ترتیب تھا۔ وہ اپنی قمیص کو کھینچ کھینچ کر نیچے کرتی ہوئی اپنے ڈیڈی کے بیڈ روم تک پہنچی۔ پہلے اس نے بیڈ روم کی کال بیل بجانے کا ارادہ کیا لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ تو کھلا ہے۔ وہ اندر گئی اور پھر جلد ہی باہر آگئی۔

اب وہ سیدھا میرے کمرے کی طرف آئی۔ اس نے بڑی شائستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آفرین نے عام سے لہجے میں پوچھا "شاہ جہاں! ڈیڈی آج ہمیں جگانے نہیں آئے۔"

"وہ تو خود جاگ گئے تھے۔ میں نے چھ بجے کے قریب انہیں باتھ روم کی طرف جاتے بھی دیکھا تھا۔"

"کہیں۔ جلدی میں کہیں چلے تو نہیں گئے؟"

میں نے کہا "اگر جاتے تو میرے کمرے کے سامنے سے گزر کر جاتے۔ میں جاگ رہا تھا۔"

"پھر شاید اسٹڈی میں چلے گئے ہوں گے۔" وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا لہجہ زیادہ دیر نارمل نہیں رہے گا پھر اچانک اس کی نظر کوریڈور میں سے گزری اور اس باتھ روم پر پڑی جو بھائی جی کے لیے پھانسی کا پھندا ثابت ہو چکا تھا۔ وہ بولی "یہ باتھ روم کی لائٹ کیوں جل رہی ہے۔ ڈیڈی تو کبھی لائٹ بجھانا نہیں بھولتے۔"

پھر وہ خود ہی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ نازک مرحلہ آگیا تھا۔ یہاں میری مداخلت کی ضرورت تھی' ورنہ بھائی جی کی طرح آفرین بھی برقی رو کا شکار ہو سکتی تھی۔ میں آفرین کے پیچھے ہی پیچھے باتھ روم تک پہنچ گیا۔ آفرین نے دروازے کو دھکیلا وہ اندر سے بند تھا۔ پانی گرنے کی مدھم آواز بھی آرہی تھی۔

آفرین ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ڈیڈی کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ انتظار بہت طویل ثابت ہوگا۔۔۔ اور پھر بھی رائیگاں جائے گا۔ اس دروازے کے پیچھے ایک بہت بڑی BREAKING NEWS موجود تھی۔ ایک ایسی خبر جو آج اور بعد کے آنے والے دنوں میں بھی تہلکہ خیز ثابت ہونے والی تھی۔

میں نے آفرین کو انتظار سے بچانے کے لیے کہا "آفرین! ابھی بجلی روشنی ہے لیکن۔۔۔ بھائی جی نے لائٹ کیوں جلائی ہوئی ہے۔"

حسب توقع آفرین کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ چند لمحے متذبذب رہی پھر اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود جب کوئی جواب نہیں ملا تو آفرین کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بے تاب ہو کر بولی "ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ آپ بولتے کیوں نہیں؟"

پھر نجانے اسے کیا ہوا' وہ دوڑ کر دوبارہ باپ کے بیڈ روم

میں گئی۔ چند لمحے بعد وہ قریباً چیختی ہوئی واپس آئی "شاہ جہاں! باتھ روم میں ڈیڈی ہی ہیں۔ وہ نائٹ گاؤن پہنے ہوئے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے دھڑ دھڑ دروازہ بجانا شروع کردیا۔ ساتھ ساتھ وہ چیخ رہی تھی "ڈیڈی۔ دروازہ کھولیں۔ ڈیڈی۔۔۔ پلیز مجھے آواز دیں۔ ڈیڈی۔"

چیخ و پکار سن کر کئی نوکر دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں عاشق مسیح نہیں تھا۔ وہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ صبح سویرے ہی کسی طرح کوٹھی سے نکل گیا تھا۔ آفرین نے ایک ڈرائیور سے چیخ کر کہا "محمد حسین، دروازہ توڑ دو۔ ڈیڈی کو کچھ ہو گیا ہے۔"

محمد حسین دروازہ توڑنے کے لیے کوئی وزنی شے ڈھونڈنے لگا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر دو بھرپور ٹھوکریں دروازے کو ماریں۔ اس کا اندرونی کھٹکا ٹوٹ گیا اور دروازہ پرشور آواز سے کھل گیا۔ سامنے ہی گرین ٹائلوں کے خوب صورت فرش پر بھائی جی مردہ حالت میں پڑا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور نیم عریاں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی چادر اس کے جسم پر ڈال دی۔

آفرین نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اپنے باپ کی طرف بڑھی۔ یہ اس کی زندگی کا خطرناک ترین لمحہ تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ وہ چیخ رہی تھی "چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو پیچھے ہٹ جاؤ۔"

وہ پورا زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے بری طرح جھنجوڑا "ہوش کرو آفرین۔ پائپ میں کرنٹ ہے' دیکھو بھائی جی چپکے ہوئے ہیں۔"

دروازے پر موجود نوکروں نے بھی یہ بات نوٹ کرلی تھی کہ بھائی جی کا ایک بازو باتھ روم کے زریں نلکے کے اوپر ہے۔ ڈرائیور محمد حسین باہر کو دوڑا۔ چند سیکنڈ بعد باتھ روم کی لائٹ آف ہوگئی۔ محمد حسین نے آکر بتایا کہ اس نے مین سوئچ آف کرا دیا ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر بھائی جی کو اٹھایا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا۔ رنگ نیلگوں دکھائی دینے لگا تھا۔ آفرین ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی اور دہائی دے رہی تھی "کوئی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ خدا کے لیے انہیں اسپتال لے چلو۔ انہیں اسپتال لے چلو۔"

وہ نہیں جانتی تھی بھائی جی کو اب اسپتال کی نہیں قبرستان کی ضرورت ہے۔ اسے مرے ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ یقیناً باتھ روم میں گھسنے کے بعد جونہی اس نے نلکے کو ہاتھ لگایا تھا وہ اس سے چمٹ گیا تھا اور نلکے میں دوڑتا ہوا ہائی وولٹیج کا کرنٹ اس کی جان لے گیا تھا۔

اسی اثنا میں بھائی جی کی بیوی کی دھاڑیں سنائی دیں' وہ روتی ہوئی جائے وقوعہ کی طرف آرہی تھی۔ ابھی وہ باتھ روم سے دس پندرہ قدم دور رہی تھی کہ غش کھا کر گر پڑی۔ اسے اہلِ خانہ نے بمشکل پختہ فرش پر گرنے سے بچایا۔ اچانک ہر گھر میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ درجنوں افراد لان اور برآمدے میں جمع ہو گئے۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ ہجوم بڑھنے لگا پھر میں نے ایک منظر دیکھا اور چونک گیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں غزالہ کو یہاں دیکھوں گا۔ وہ آفرین کے بھائی کے ساتھ تقریباً دوڑتی ہوئی جائے وقوعہ کی طرف آرہی تھی۔ میں نے بھائی جی کا جسم اچھی طرح ڈھانپ کر اسے برآمدے کے ایک صوفے پر لٹا دیا تھا۔ غزالہ سیدھی بھائی جی کی طرف آئی۔ اس نے بھائی جی کی نبض دیکھی' سانس کی آمد و رفت محسوس کی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چیک کیں پھر اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اس کے چہرے پر درج تھا کہ بھائی جی زندہ نہیں ہے۔

بھائی جی کے پاس سے اٹھ کر وہ بھائی جی کی اہلیہ کی طرف گئی۔ اہلیہ شیریں بی بی فرش پر ہی لیٹی تھی۔ غزالہ نے بڑی تیزی سے اسے ابتدائی طبی امداد دی۔ اس کے سینے پر بار بار دباؤ ڈال کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ بے ہوش عورت کی حالت ذرا بہتر ہوئی تو غزالہ نے بڑی تیزی سے کاغذ پر چند الفاظ گھسیٹ کر آفرین کے بھائی کے سپرد کردیے۔ یہ دو انجکشن تھے۔ سعد غزالہ کی مطلوبہ دوا لینے کے لیے فوراً مین گیٹ کی طرف لپک گیا۔ غزالہ کے چہرے پر وہی سنجیدگی اور تمکنت نظر آرہی تھی جو اسے نازک حالات میں بے حد باعتماد اور ہنرمند بنا دیتی تھی۔ مجھے وہ مناظر یاد آگئے جب غزالہ نے بحری جہاز "ہرکولیس" پر ایک مریض کی جان بچانے کے لیے ایک طویل اور ناقابلِ یقین جدوجہد کی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا' غزالہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے مریض اور اس کی موت کے درمیان ایک دیوار کی طرح کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ ایک نرم و نازک لڑکی نہیں رہتی تھی حوصلے کی چٹان بن جاتی تھی۔ ایسے لمحوں میں وہ بڑے بڑے مشکل فیصلے بھی ایک وجدانہ کیفیت میں کر گزرتی تھی۔

میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ غزالہ یہاں کیسے اور کیونکر پہنچی۔ شاید وہ رات سے ہی یہاں تھی۔ تین چار روز پہلے خاص فون لائن پر ساہی صاحب سے میری بات ہوئی تھی اس وقت انہوں نے بتایا تھا کہ آفرین ان سے

غزالہ کا پتا پوچھنا چاہ رہی ہے۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں تو بتا دیں لیکن اس سے پہلے غزالہ کو بھی پوری بات سمجھا دیں۔ (یعنی ساہی صاحب کی طرح غزالہ بھی آفرین کو یہی بتائے کہ میں پولیس کے لیے اسپیشل انفارمر کے طور پر کام کر رہا ہوں) اب غزالہ کو یہاں بھائی جی کی کوٹھی میں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ساہی صاحب نے آفرین کو غزالہ کا اتا پتا بتا دیا تھا۔ پھر میرا دھیان اس سرپرائز کی طرف چلا گیا جو آفرین مجھے دینا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ سرپرائز یہی تھا کہ غزالہ کل رات سے یہاں آفرین کے ساتھ موجود تھی۔

غزالہ' بھائی جی کی نیم بے ہوش اہلیہ کو برآمدے سے اٹھوا کر کمرے میں لے گئی اور اس کی تیمارداری میں مصروف ہوگئی۔ کوٹھی کے اردگرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کسی اندرونی کمرے سے بھائی جی کا بیٹا سعد دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بھائی جی کے منیجر سے کوئی بات کہی۔ منیجر صاحب کا رنگ متغیر ہوگیا۔ ڈرائیور محمد حسین بھی ان کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد جب منیجر اور سعد اندر دوڑ گئے تو میں نے ڈرائیور محمد حسین سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا "بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور ری ڈی بلاک میں شکیب رائے صاحب کے بہنوئی کی کوٹھی ہے۔ کچھ ورکروں نے کوٹھی پر حملہ کرکے اسے آگ لگا دی ہے سر۔۔۔ سنا ہے کہ رائے صاحب کا بہنوئی کوٹھی کے اندر ہی رہ گیا ہے۔"

میں ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ میں نے وہ کوٹھی دیکھی تھی۔ وہاں رائے صاحب کا بہت بڑا انتخابی دفتر بھی تھا اور ان کی پارٹی کے بڑے بڑے جھنڈے لہراتے رہتے تھے۔

ابھی میں اس صورتِ حال پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک دم مین گیٹ کی طرف سے شور و غوغا سنائی دیا۔ میں نے کچھ افراد کو خوف زدہ انداز میں دائیں بائیں بھاگتے دیکھا۔ اچانک زوردار فائرنگ ہونے لگی۔ وہ تین چار جیپیں تھیں۔ ان پر مسلح افراد لدے ہوئے تھے۔ وہ خودکار رائفلوں اور سب مشین گنوں سے اندھا دھند فائرنگ کرتے کوٹھی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بھائی جی کے کم از کم تین گارڈز کو گولیاں کھا کر مین گیٹ کے قریب گرتے دیکھا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ شکیب رائے کے بہنوئی کی کوٹھی کو نذرِ آتش کرنے کا ردِعمل ہے۔ یہ ردِعمل اتنا شدید اور فوری تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں بھی متحیر رہ گیا۔ بھائی جی کی اچانک موت کا سن کر جو سیکڑوں افراد کوٹھی کے سامنے جمع ہو گئے تھے' وہ وحشیانہ للکاروں اور فائرنگ سے دہشت زدہ ہو کر سرپٹ بھاگ اٹھے تھے۔ میں نے مسلح افراد کی ایک ٹولی کو دیکھا۔ ٹولی کے ارکان زبردست بڑھکیں مارتے ہوئے رہائش گاہ کے اندرونی حصے کی طرف لپک رہے تھے۔ ادھر ہی وہ کمرا تھا جہاں بھائی جی کی بیوی اور بچی موجود تھیں اور غزالہ بھی وہیں موجود تھی۔ حملہ آوروں کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ وہ بھائی جی کے خونی رشتے داروں کو شدید جانی نقصان پہنچائیں گے۔

یہ میرے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں بھائی جی کو تو نہیں بچا سکا تھا' یا یوں کہہ لیں کہ بچانے کی ہمت نہیں کرسکا تھا لیکن اب آفرین کو بھی کوئی نقصان پہنچ جاتا یہ مجھے کسی طور منظور نہیں تھا۔۔۔ اور وہاں کمرے میں صرف آفرین ہی نہیں تھی' غزالہ بھی تھی۔ میں نے اپنا ننھا کھلونا جراب کے اندر سے نکال لیا۔ کھلونا چھوٹا تھا لیکن اس کی طاقت سے میں بخوبی آگاہ تھا۔ پسٹل کی اضافی گولیاں اور دو بھرے ہوئے میگزین میرے کمرے میں پڑے تھے۔ مزاحمت شروع کرنے سے پہلے یہ چیزیں میرے پاس ہونا چاہئیں تھیں۔ میں دوڑتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ الماری میں سے اضافی گولیاں اور میگزین نکال کر میں نے جیکٹ کی جیبوں میں رکھے۔ ابھی میں واپس مڑا ہی تھا کہ میں نے غزالہ اور آفرین کو دیکھا۔ وہ چیختی ہوئی میرے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے تین حملہ آور تھے۔

میرے کمرے سے غزالہ اور آفرین کا فاصلہ پچاس میٹر کے قریب تھا۔ توقع نہیں تھی کہ وہ حملہ آوروں سے بچ کر مجھ تک پہنچ سکیں گی۔ میں نے کھڑکی کے قریب بیٹھ کر پوزیشن لے لی۔ اوپر تلے پانچ فائر میں نے کیے۔ دو حملہ آوروں کی ٹانگوں میں گولیاں لگیں اور وہ پختہ فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ اسی دوران میں آفرین خوف زدہ ہو کر لڑکھڑائی اور گر گئی۔ تیسرے حملہ آور نے اسے بازو سے پکڑا۔ آفرین نے مڑ کر اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیے۔ اسی دوران میں میرا ایک فائر حملہ آور کے کندھے پر لگا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے کو گیا' آفرین خود کو چھڑا کر غزالہ کے پیچھے لپکی۔ دو ہی لمحوں بعد وہ دونوں میرے کمرے میں تھیں۔

"شاہ جہاں۔۔۔ شاہ جہاں!" غزالہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

غالباً ابھی تک غزالہ اور آفرین کو معلوم نہیں تھا کہ غضب ناک حملہ آوروں سے ان کا پیچھا میری فائرنگ کے

سبب چھوٹا ہے۔

میں نے ان دونوں کو اپنے عقب میں کرتے ہوئے کہا "نیچے بیٹھ جاؤ۔ اپنے سر جھکا کر رکھو۔"

انہوں نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور ایک گوشے میں سمٹ گئیں۔ حملہ آوروں نے اپنے تین ساتھیوں کو یکے بعد دیگرے زخمی ہوتے دیکھ لیا تھا۔ انھیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ فائرنگ کہاں سے ہوئی ہے۔ انہوں نے بڑی تیزی سے میرے کمرے کے سامنے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ کچھ باغیچے کی دیوار کی اوٹ میں تھے۔ دو افراد ایک جیپ کی آڑ لیے ہوئے تھے۔ مین گیٹ کے قریب بھی کچھ افراد نے پوزیشن لے لی تھی۔

اگلے دو تین منٹ میں دونوں طرف سے مسلسل فائرنگ ہوئی۔ میرے کمرے کی ساری کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ دروازے میں چھید ہو گئے اور اندرونی دیواروں پر بھی گولیوں کے ان گنت نشان پڑ گئے۔ غزالہ اور آفرین پہلے تو بیٹھی رہیں، پھر انہوں نے خود کو اس پوزیشن میں بھی غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا۔ میرے کہنے پر وہ دونوں فرش پر لیٹ گئیں۔ غزالہ قدرے حوصلے میں تھی لیکن آفرین کی گاہے گاہے چیخ نکل جاتی تھی۔

میں اس امید پر حملہ آوروں کو روکے ہوئے تھا کہ پولیس کی وہ نفری جو بھائی جی کی حفاظت پر مامور ہے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے پہنچ جائے گی اور حملہ آوروں کا زور ٹوٹ جائے گا' لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ کارروائی بڑے غلط وقت پر ہوئی تھی۔ رات کی شفٹ والا عملہ جا چکا تھا۔ صبح کی شفٹ والے ابھی تھوڑے سے لوگ آئے تھے۔ وہ بھی اس اچانک یورش سے گھبرا کر تتر بتر ہو گئے تھے۔

اگلے دو تین منٹ میں حالات بڑی تیزی سے خراب ہوئے۔ قریباً تین درجن مزید حملہ آور کوٹھی میں گھس آئے۔ ان کے درجنوں ساتھی باہر بھی موجود تھے۔ ایک طرح سے مشتعل افراد کے مسلح گروہوں نے کوٹھی کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ ہر طرف توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور ان کی دھاڑوں سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ میرے پاس موجود چھوٹے پسٹل کی گولیاں ختم ہونے کے قریب تھیں۔ ویسے بھی اس ننھے کھلونے سے خود کار رائفلوں کا سامنا کہاں تک کیا جا سکتا تھا۔ حملہ آور پوزیشنیں بدلتے ہوئے اب کمرے کے کافی قریب آ گئے تھے۔ جو لوگ جیپ کے عقب میں تھے انہوں نے کافی ہوشیاری دکھائی تھی۔ وہ جیپ کو دھکیلتے ہوئے اور اس کی آڑ لیتے ہوئے بس پندرہ بیس گز کی دوری پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی فائرنگ کا ''زاویہ'' اب زیادہ موثر ہو گیا تھا اور گولیاں فرش تک پہنچ رہی تھیں۔ ہم تینوں میں سے کسی کو کسی بھی وقت گولی لگ سکتی تھی۔ ایک برسٹ ڈبل بیڈ کے فوم میں لگا تو آفرین کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں۔

غزالہ بولی "شاہ جہاں! کچھ کریں۔"

ہمارے کمرے کا رخ مین گیٹ کی طرف تھا۔ بھائی جی کا بیڈ روم ہمارے بائیں ہاتھ پر تھا۔ ہمارا اور بیڈ روم کا درمیانی فاصلہ بمشکل بیس فٹ رہا ہو گا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہے۔ ہم تھوڑا سا رسک لے کر بیڈ روم میں گھس جاتے تو بہت بہتر تھا۔ ہم اگلے پانچ دس منٹ کے لیے محفوظ ہو سکتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ بیڈ روم میں بھائی جی کی رائفل اور اس کا ایمونیشن بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ٹیلی فون بھی تھا۔ ٹیلی فون کے ذریعے ساہی صاحب سے ہنگامی مدد طلب کی جا سکتی تھی۔

میں نے غزالہ کی طرف دیکھے بغیر کہا "غزالہ! تم اور آفرین بھائی جی کے بیڈ روم میں گھس جاؤ۔ میں بھی تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"

"لیکن ادھر تو فائرنگ ہو رہی ہے۔" آفرین نے کراہ کر کہا۔

"معمولی سا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا "میں جیپ پر فائرنگ کرتا ہوں۔ جب میں کہوں تم دونوں دوڑ کر بیڈ روم کے دروازے سے اندر چلی جاؤ۔ سر جھکا کر دوڑنا اور رکنا نہیں۔ چلو شاباش۔ دونوں دروازے کے قریب ہو جاؤ۔"

غزالہ تو فوراً جھک کر دروازے کے پاس چلی گئی مگر آفرین شدید تذبذب میں تھی۔ وہ لرزاں آواز میں بولی "کہیں۔ بیڈ روم میں ہم اور زیادہ نہ پھنس جائیں۔ وہاں تو کھڑکیوں پر بھی گرلیں ہیں، ہم دوسری طرف بھی نہیں نکل سکیں گے اور پھر....."

آفرین کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک گولی نے کھڑکی کا آخری شیشہ توڑا تھا اور اس کے سر کو تقریباً چھوتی ہوئی الماری کے دروازے میں لگی تھی۔

میں نے کہا "پلیز آفرین! جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اگر دیر ہو گئی تو یہ آپشن بھی ختم ہو جائے گا۔ چلو شاباش جلدی کرو۔"

وہ منمنائی "ایک بار پھر سوچ لیں۔ ہم کہیں گھیرے میں نہ آ جائیں۔"

غزالہ بولی "آفرین! کوئی بات نہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

غزالہ کو مجھ پر جو بے انتہا بھروسا تھا وہ اس کے لہجے میں چھلک رہا تھا۔

کچھ ہچکچاہٹ دکھانے کے بعد آفرین بھی غزالہ کے پہلو میں دروازے کے پاس چلی گئی۔

میں نے جیپ پر اوپر تلے چار پانچ فائر کیے۔ جیپ کا ایک ٹائر دھماکے سے برسٹ ہو گیا۔ اسی دوران میں میں نے چیخ کر غزالہ اور آفرین کو حرکت میں آنے کا حکم دیا۔ وہ اٹھیں اور جھک کر دوڑتی ہوئی بیڈ روم میں گھس گئیں۔ اس کے چند سیکنڈ بعد میں بھی اٹھا اور پسٹل سے فائر کرتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔ یہ سارا عمل بمشکل پندرہ بیس سیکنڈ میں مکمل ہو گیا تھا۔

حملہ آوروں نے ہمیں بیڈ روم میں گھستے دیکھ لیا تھا اور ان کی ساری توجہ اسی طرف ہو گئی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازے پر تابڑ توڑ فائر آ رہے تھے۔ آفرین کو معلوم تھا کہ اس کے ڈیڈی مرحوم کی رائفل الماری کے کس خانے میں پڑی ہے۔ اس نے تکیے کے نیچے سے چابیاں نکالیں اور رائفل برآمد کر لی لیکن وہ رائفل کی اضافی گولیاں نہیں ڈھونڈ سکی۔ بس رائفل کے ساتھ اٹیچ میگزین میں بیس پچیس گولیاں موجود تھیں۔ بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔

جونہی پسٹل کی گولیاں ختم ہوئیں میں نے آفرین کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ میں کھڑکی کے پاس بڑی اچھی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ احتیاط سے فائرنگ کرتا تو سات آٹھ منٹ مزید حملہ آوروں کو روک سکتا تھا۔

میں نے ستون کی اوٹ سے جھانکنے والے ایک مشتعل حملہ آور پر فائر کیا اور وہ زخمی ہو کر گر گیا' پھر فرش پر رینگتا ہوا ایک دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ایک ساتھی نے بلند آواز میں کئی غلیظ گالیاں دیں' پھر للکار کر دعویٰ کیا کہ وہ بھائی جی کی بیٹی کو پکڑ کر ساتھ لے جائیں گے اور اسے باپ کے کرتوتوں کی یادگار سزا دیں گے۔

وہ مجھے نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں لیکن یہ بات تو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ میں ہی ہوں جو ان کے اور دونوں لڑکیوں کے درمیان دیوار بنا ہوا ہوں۔ وہ مجھے مسلسل دھمکیاں سنا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ان کے راستے سے ہٹ جاؤں ورنہ کتے کی موت مارا جاؤں گا۔

میں نے جواب میں اس شخص کی طرف دو گولیاں بھیجیں۔ ان میں سے ایک نے ضرور اسے نقصان پہنچایا تھا کیونکہ اس کی ہلکی سی کراہ سنائی دی اور وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

میں نے غزالہ سے کہا "غزالہ! تم ساہی صاحب سے رابطہ کرو۔ وہ اتنی دیر کیوں کر رہے ہیں۔"

غزالہ جھک کر چلتی ہوئی ٹیلی فون سیٹ کے پاس پہنچی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مایوسی کچھ اور گہری ہو گئی "شاید لائن کاٹ دی گئی ہے۔" غزالہ نے اطلاع دی۔

ابھی بمشکل غزالہ کا جملہ ہی مکمل ہوا تھا کہ آفرین کی چیخ نکل گئی "وہ دیکھیں۔" اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے بیڈ روم کی داہنی کھڑکیوں کی طرف آگ کے شعلے نظر آئے۔ مشتعل حملہ آوروں نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے کوٹھی کے اس حصے کو آگ لگا دی تھی۔ یہ نئی افتاد تھی جو ہمارے سر پر پڑی تھی۔ میں اپنے اندر ہی ابل کر رہ گیا۔ پولیس کے شیر جوان جب کسی شخص کی سیکورٹی پر مقرر ہوتے ہیں تو ہفتوں بیٹھ کر مرغ پٹاڑ اڑاتے ہیں لیکن جب کبھی اتفاقاً فرض کی ادائیگی کا وقت آ ہی جاتا ہے تو عین موقعے پر ان کی صورتیں گم ہو جاتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

میں نے چند فائر مزید کیے اور رائفل میں بس سات آٹھ گولیاں رہ گئیں۔ ایمونیشن میری توقع سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ شعلے جھوم کر ایک کھڑکی سے اندر آ گئے تھے۔ پہلے کھڑکی کے پردوں نے آگ پکڑی پھر "چین لنگ" جلنا شروع ہو گئی۔ یہ بیڈ روم ہمارے لیے چوہے دان کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔

آفرین نے جھنجلا کر کہا "میں کہتی تھی نا کہ بیڈ روم کی طرف نہ آئیں۔ اب کوئی رستہ بھی نہیں ہے۔"

"حوصلہ کرو آفرین۔"

"کیا حوصلہ کروں۔" وہ مزید جھنجلا کر بولی "نہ ہم ڈیڈی کی حفاظت کر سکے نہ اپنی کر سکے۔ اچھے بھلے اس کمرے میں تھے۔ کھڑکی کے رستے کوریڈور کی طرف نکل سکتے تھے۔"

وہ حالات کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی سخت مایوس نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ غزالہ کی طرح وہ بھی یہی دیکھ رہی تھی کہ یہ بیڈ روم ہمارے لیے چوہے دان بن گیا ہے' لیکن ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس بیڈ روم کے اندر ایک خفیہ راستہ بھی موجود ہے' جو ہمیں بہ حفاظت یہاں

سے نکال سکتا ہے۔ درحقیقت اسی راستے کے سبب میں غزالہ اور آفرین کو اس بیڈ روم میں لایا تھا۔

جب گاڑھا سیاہ دھواں بیڈ روم میں آنے لگا اور سانس لینا مشکل ہو گیا تو میں نے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا۔ میرے اس عمل نے آفرین اور غزالہ کو مزید حیران کیا۔ خاص طور سے آفرین حیران تھی "یہ آپ کیوں خودکشی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" وہ دہشت سے پھٹی آواز میں بولی۔

میں نے اس کا بازو تھاما اور پہلو کی دیوار کی طرف آ گیا۔ لکڑی کی "ہینگنگ" کے مخصوص حصے پر خاص انداز سے دباؤ ڈالا تو در کھل گیا اور سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ غزالہ بھی حیران ہوئی تھی لیکن آفرین کا منہ تو کھلا ہی رہ گیا تھا۔ میں ان دونوں کو لے کر سیڑھیوں پر پہنچا اور پوشیدہ دروازہ اپنی جانب سے بند کر دیا۔ وہ دونوں حیرت سے گنگ میرے پیچھے ہی پیچھے سیڑھیاں اترتی چلی گئیں۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی اور انگلی لبلبی پر۔ درمیانی فاصلہ طے کر کے ہم اسی نیم تاریک کوریڈور میں پہنچے جہاں میں نے چند روز پہلے چھچھوندر بادشاہ کو بے ہوش کر کے فرش پر ڈالا تھا۔ کوریڈور خالی نظر آ رہا تھا۔ اسٹیل کا دروازہ مقفل تھا۔ ایک لکڑی کا دروازہ تھا' اسے بھی دوسری طرف سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں نے یہ دروازہ دو تین بار زور سے کھٹکھٹایا۔ ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر حیرت پہلے سے ہی سایہ فگن تھی۔ یہ وہی چھچھوندر بادشاہ تھا۔ اب یہ دوسری مرتبہ میرے ہاتھوں بے ہوش ہونے جا رہا تھا۔ میں تاریکی میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ چھچھوندر مجھے دیکھ سکتا' میں نے رائفل کے کندے سے ایک نسلی بخش ضرب اس کی کنپٹی پر لگائی۔ وہ تیورا کر میرے قدموں میں گرا۔ میں نے "تاکید مزید" کے طور پر ایک اور ضرب اس کی گردن پر لگا کر اسے بالکل لمبا لٹا دیا۔ اتنے میں پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ مردانہ چاپ تھی۔ کوئی اس دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں آفرین اور غزالہ کے ساتھ دروازے کے عقب میں سمٹ گیا۔ کھلا ہوا دروازہ ہماری آڑ بن گیا تھا۔ مختصر سی جگہ تھی۔ غزالہ میرے ساتھ تقریباً چپکی ہوئی تھی۔ آفرین' غزالہ کے ساتھ پیوست تھی۔ ان تشویش ناک لمحوں میں بھی میں غزالہ کی دل آویز قربت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا گرم گداز جسم میرے جسم سے ہمکلام تھا۔ جی چاہا یہ لمحے کچھ طویل ہو جائیں لیکن پھر قدموں کی چاپ ہمیں ڈسٹرب کیے بغیر بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔

دروازے سے گزر کر ہم نے چند سیڑھیاں چڑھیں اور کوٹھی کے کامن روم میں آ گئے۔ کامن روم خالی پڑا تھا۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ کرکٹ میچ آ رہا تھا۔ اردگرد کے حالات سے بے خبر عمران خان تیزی سے اسٹارٹ لے کر بال پھینکنے چلا آ رہا تھا۔ کامن روم کے علاوہ آس پاس کے کمرے بھی خالی ہی نظر آ رہے تھے۔ مکین باہر گلی میں نکلے یا چھت پر موجود تھے اور پڑوس میں ہونے والے خون ریز ہنگامے کے مناظر LIVE دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ اور چیخ و پکار کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یہ۔ ہم کہاں آ گئے۔ یہ تو شاید خواجہ صاحب کا گھر ہے۔" آفرین منمنائی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان دونوں کو لے کر پورچ کی طرف آ گیا۔ یہاں ایک اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانکا اور جھانک کر خوشی ہوئی۔ ویگن کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ غالباً اس کا ڈرائیور بھی ہنگامہ دیکھنے کے لیے افراتفری میں سڑک کی طرف چلا گیا تھا۔ میں نے ویگن میں گھس کر دروازے کھولے اور غزالہ اور آفرین کو اندر داخل ہونے کا کہا۔ آفرین اب میری ہدایات پر بے چون و چرا عمل کر رہی تھی۔ بیڈ روم میں پہنچ کر جو بے یقینی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ اب ڈور ہو گئی تھی۔

میں نے رائفل گود میں رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ (غالباً یہ اسٹیشن ویگن ابھی ابھی اندر آئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ بھی بند نہیں کیا تھا کہ ہنگامہ شروع ہو گیا تھا) گیٹ پر موجود دو افراد نے مجھے دیکھا بھی لیکن کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کر سکے۔ میں اطمینان سے نکلا اور سڑک پر آ کر دائیں طرف مڑ گیا۔ عقب نما آئینے میں میں نے دیکھا۔ بھائی جی کی کوٹھی میں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ سڑکوں کے کناروں پر اور اردگرد کی چھتوں پر بے شمار افراد سکتے کی کیفیت میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ میں اب شدت آ گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کی مزید نفری موقعے پر پہنچ گئی ہے اور اس نے حملہ آوروں سے مزاحمت شروع کر دی ہے۔ تاہم ابھی بھی یہ مزاحمت زیادہ زوردار نہیں تھی۔

میں مختلف سڑکوں سے ہو کر ماڈل ٹاؤن سے باہر نکل آیا۔ آفرین مسلسل رو رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ اپنے ڈیڈی کو پکارتی تھی اور اس کی ہچکیاں بلند ہو جاتی تھیں۔ آفرین کا

والدہ کو کوٹھی کے سیکیورٹی گارڈز ایک عقبی راستے سے نکال کر لے گئے تھے اس کے باوجود آفرین والدہ کی طرف سے بھی سخت پریشان تھی۔

شیشے کی بے شمار چھوٹی چھوٹی کرچیاں آفرین کے سر کے بالوں پر چمک رہی تھیں۔ غزالہ نے آفرین کو دلاسا دینے کے لیے اپنے گلے سے لگایا پھر اس کے سر سے کرچیاں ہٹانے لگی۔

مجھے احساس تھا کہ کتنا برا واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ میں اب اس واقعے کو مزید سنگین بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر آفرین جلد ہی اپنے لواحقین میں واپس نہ پہنچ جاتی تو یقیناً یہ واقعہ مزید سنگین ہو جاتا۔ بھائی جی کے لیے ہمدردیاں رکھنے والے یہی سمجھتے کہ بھائی جی کو قتل کرنے کے بعد اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں آفرین کو جلد از جلد اس کے ٹھکانے تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ میں نے آفرین سے پوچھا "آپ ذرا جلدی سے بتائیں کہ کہاں جانا چاہیں گی۔"

وہ روتے ہوئے بولے "اب کہاں جاؤں گی' اب کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے سب کچھ۔"

وہ زبردست شاک میں تھی۔ غزالہ اسے گلے سے لگا کر دلاسا دینے لگی۔ میں نے غزالہ کو اشارہ کیا کہ وہ آفرین سے پوچھے کہ وہ فی الوقت کہاں جانا چاہتی ہے۔ غزالہ نے کوشش کی۔ کوشش ذرا طویل تو ثابت ہوئی لیکن رائیگاں نہیں گئی۔ آفرین نے کہا کہ ہم اسے کینٹ کی طرف لے چلیں۔ وہاں اس کی ایک خالہ رہتی تھیں۔ آفرین کا خیال تھا کہ وہ اپنی خالہ کے ہاں محفوظ رہے گی اور وہاں سے اپنے چچاؤں کے ساتھ بھی رابطہ کر سکے گی۔

میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا کینٹ پہنچا۔ ایک کوٹھی کے مین گیٹ کے عین سامنے پہنچ کر ہم نے روتی دھوتی آفرین کو نیچے اتار دیا۔ آفرین کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ بے شمار سوال بھی مچل رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے فی الوقت تو اسے کسی کونے کھدرے میں چھپ کر اپنی جان بچانا تھی اور آفرین کا خیال تھا کہ سیکیورٹی کے نقطہ نظر سے یہ چار دیواری اس کے لیے بہترین رہے گی۔ وقتِ رخصت میں نے آفرین کو پرزور تاکید کی کہ وہ پولیس کو جو بیانات دے گی ان میں میرا ذکر مطلق نہیں کرے گی۔

آفرین کو اتار کر میں گلبرگ کی سمت روانہ ہوا تاکہ اب غزالہ کو اس کے گھر ڈراپ کر سکوں۔ شہر میں بظاہر امن و سکون نظر آتا تھا لیکن اسے طوفان سے پہلے کی خاموشی کہا جا سکتا تھا۔ بھائی جی کے مرنے کی خبر ابھی شہر میں پھیلا نہیں تھی۔ امید تھی کہ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں شہر کے گلی کوچوں میں بھائی جی کے قتل کا ضمیمہ فروخت ہونے لگے گا۔

میں تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گلبرگ پہنچا' راستے میں جگہ جگہ بھائی جی کی جہازی سائز تصویریں لگی ہوئی تھیں' بڑے بڑے پوسٹرز اور بینرز بھی تھے۔ ان پر جوشیلے کلمات لکھے تھے "بھائی جی آ گیا۔ بھائی جی چھا گیا۔ بھائی جی ہماری آن۔ بھائی جی ہماری شان۔ ہر ہر بچے کی پکار۔ بھائی ہے مستقبل کا معمار۔" اس قسم کے ان گنت سلوگن تھے۔ سلوگن موجود تھے لیکن بھائی جی موجود نہیں تھا۔ میں جانتا تھا اس کی موت بہت سے لوگوں کے لیے غم انگیز ثابت ہو گی لیکن اس وقتی رکھ کے بدلے وہ ایک مستقل نقصان سے بچنے والے تھے۔ یہ عارضی صدمہ انہیں ایک لامتناہی اذیت سے چھٹکارا دلا رہا تھا۔

میں نے غزالہ سے پوچھا "یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم آفرین کے گھر کیسے پہنچیں؟"

"اسے انکل ساحی سے میرا ایڈریس معلوم ہوا تھا۔ وہ دو بار مجھے گھر آ کر مل چکی ہے۔ کل مجھے زبردستی اپنے گھر لے آئی۔ دراصل۔۔۔" غزالہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ بات تو پوری کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی "آپ کے سینے کا درد اب کیسا ہے۔"

"اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"دوا لے رہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے جھوٹ بولا' پھر ذرا توقف سے کہا "ہاں کیا بات کہنے جا رہی تھیں تم؟"

وہ سنجیدگی سے بولی "شاید آپ کے ذہن میں نہیں ہے' آج آپ کی سالگرہ ہے۔ آفرین اور میں آپ کو سرپرائز دینا چاہ رہی تھیں لیکن کیا پتا تھا کہ سرپرائز ہمیں ملنے والا ہے اور سرپرائز بھی ایسا جو دل خون کر دے۔" اس کی خوب صورت آنکھوں سے چھم چھم آنسو چھلک آئے۔

اس نے ڈیش بورڈ پر سے ٹشو پیپر اٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے بولی "میں کل رات نو بجے سے آفرین کے گھر موجود تھی۔ ہم نے آپ کے لیے تحفے بھی خریدے تھے۔ میرا تحفہ ہینڈ بیگ میں تھا' وہ بیگ بھی ادھر ہی رہ گیا ہے۔" غزالہ افسردگی سے بولی۔

میں نے کہا "بس' سمجھو' مجھے سب کچھ مل گیا۔ تمہاری زندگی سے بڑھ کر تحفہ اور کیا ہو گا اور تمہاری زندگی بچ گئی ہے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "یہ سب کیا ہو گیا ہے شاہ جہاں۔ آفرین کے والد بہت اچھے آدمی تھے۔ وہ عام سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے۔ ہر کوئی ان کے اچھے کردار کی تعریف کرتا تھا۔"

"ہاں۔ ہر کوئی ان کے اچھے کردار کی تعریف کرتا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"ایسے شخص کا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ ان کے سیاسی دشمن رائے صاحب کے لوگوں کا ہی کام ہے۔ وہ لوگ بڑے دنوں سے بھائی جی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آفرین اس بارے میں بڑی پریشان تھی۔ آپ کو کوٹھی میں لے آنے سے اسے کچھ تسلی تو ہو گئی تھی مگر اندر سے وہ اب بھی خوف زدہ تھی۔ کل رات ہی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ والدہ کے ساتھ عمرے پر جانا چاہ رہی ہے۔ وہاں وہ دونوں بھائی جی کی سلامتی اور کامیابی کے لیے دعا مانگیں گی۔" آخری الفاظ کہتے کہتے غزالہ کا گلا رندھ گیا۔

چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولی "لیکن ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ باتھ روم میں کرنٹ کیسے آ گیا؟"

"میرا اندازہ ہے کہ بجلی کا تار نلکے کے پائپ سے جوڑ دیا گیا تھا۔ باتھ روم کی تمام ٹونٹیوں میں نہایت شدید کرنٹ موجود تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ گھر کے اندر کا ہی کوئی بندہ اس قتل میں ملوث ہے؟"

"بظاہر تو یہی لگ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ہم غزالہ کے گھر تک پہنچ گئے۔ یہی گھر تھا جس میں چچا جلیس اور چچی فاخرہ موجود تھے۔ میں ان کے قریب ہوتے ہوئے بھی ان سے بہت دور تھا۔ غزالہ نے کہا "چند منٹ کے لیے آ جائیں۔ امی کا حال ہی پوچھ لیں۔"

"مجھے دیکھ کر ان کی طبیعت کہیں اور ناساز نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"نہیں ہو گی۔ آپ آئیں تو سہی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں آؤں گا لیکن ابھی نہیں۔ تم دیکھ ہی رہی ہو' اس وقت کتنی افراتفری مچی ہوئی ہے۔"

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔" غزالہ نے کہا پھر ذرا توقف سے بولی "آپ آفرین کی طرف سے باخبر رہیں۔ اسے اس وقت سہارے کی بڑی ضرورت ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا "وہ مشکل ترین مرحلے سے گزر گئی ہے۔ اب اسے کچھ نہیں ہو گا۔" غزالہ کو ڈراپ کر کے میں ریواز گارڈن کی طرف روانہ ہو گیا۔

جس وقت میں مین مارکیٹ گلبرگ کے پاس پہنچا مجھے سڑک پر جلتے ہوئے ٹائر نظر آئے۔ لڑکوں کی چند ٹولیاں دکانوں میں توڑ پھوڑ کر رہی تھیں۔ دکان دار جلدی جلدی شٹر نیچے گرا رہے تھے' شٹر گرنے کی آوازیں پوری مارکیٹ میں گونج رہی تھیں۔ مطلب تھا کہ بھائی جی کی موت کی خبر منظرِ عام پر آ گئی ہے۔

میں مین بلیوارڈ سے جیل روڈ کی طرف مڑا تو عقب نما آئینے میں دیکھ کر اچانک چونک گیا۔ ایک سرخ مزدا کار میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر اشرف چیتا موجود تھا۔ سرخ رنگ کی یہ پرانی کار اکثر چوہدری وحدت علی کی کوٹھی میں ہی کھڑی رہتی تھی۔ وحدت کے کارندے اسے حسب ضرورت استعمال کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے یہ گاڑی لے کر گیا تھا۔ اپنے پیچھے اشرف چیتے کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اتفاقاً ہی میرے پیچھے لگ گیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر لہرایا تو اس نے بھی جواباً ہاتھ لہرایا۔

میں نے دل ہی دل میں چیتے کو دو چار موٹی گالیاں دیں۔ اس نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ کب سے میرے پیچھے تھا۔ اگر اس حرامی نے مجھے غزالہ یا آفرین کو ڈراپ کرتے دیکھ لیا تھا تو یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔ آفرین کی حد تک تو مجھے یقین تھا کہ یہ سرخ کار میرے پیچھے نہیں تھی لیکن غزالہ کے بارے میں میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

بہرحال میں گاڑی کو درمیانی رفتار سے چلاتا ریواز گارڈن کی طرف رواں رہا۔ مزنگ چونگی کے علاقے میں بھی کشیدگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک مشتعل ہجوم کو دیکھا۔ یہ لوگ رائے صاحب کی پارٹی کے پرچم اور بینرز مختلف جگہوں سے اتار اتار کر نیچے پھینک رہے تھے۔

میں نے قبرستان کے قریب اسٹیشن وین روک دی۔ وین کے اندر سے انگلیوں وغیرہ کے نشان صاف کیے اور باہر آ گیا۔ اشرف چیتا نے بھی سرخ گاڑی کچھ فاصلے پر روک دی تھی۔ میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی چیتے نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"بھائی جی کا پتا صاف ہونے کی مبارک!" چیتے نے کہا۔

"تمہیں بھی مبارک۔" میں نے کہا۔

"سنا ہے وہاں کوئی زبردست ہنگامہ شنگامہ بھی ہوا ہے۔ پہلے بھائی کے کارندوں نے رائے کے بہنوئی کو قتل کیا ہے' پھر رائے کے لوگوں نے بھائی کی کوٹھی کو آگ لگائی ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تم کب نکلے وہاں سے۔"

"جس وقت آگ لگی۔ دراصل وحدت صاحب نے مجھ سے کہا ہوا تھا کہ میں آخر وقت تک وہیں رہوں۔ ہو سکتا ہے کہ عاشق مسیح کو میری مدد کی ضرورت پڑے لیکن میرا تو اندازہ ہے کہ وہ اپنا "کام" ڈال کر رات کو ہی کوٹھی سے نکل گیا تھا۔"

"یہ گاڑی کہاں سے لی تم نے۔" اشرف چیتا نے پوچھا۔

"بس رستے میں کھڑی مل گئی۔ جس وقت کوٹھی میں آگ لگی اور میں وہاں سے دوڑا تو مجھے شک پڑا کہ کچھ بندے میرے پیچھے آرہے ہیں۔ اچانک میری نظر اس گاڑی پر پڑ گئی۔ یہ اسٹارٹ تھی اور اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آنکھیں بند کرکے گھس گیا۔"

"اب ریواز گارڈن ہی جانا ہے نا؟" اشرف چیتا نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ چیتا کی باتوں سے مجھے قدرے تسلی ہوئی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے غزالہ کے ساتھ نہیں دیکھا۔ غالباً وہ مین مارکیٹ کے آس پاس سے میرے پیچھے لگا تھا۔

ہم ریواز گارڈن وحدت علی کی کوٹھی پر پہنچے۔ اس وقت تک بھائی جی کے قتل کا ضمیمہ بکنا شروع ہو گیا تھا۔

O☆O

اگلے چار پانچ روز بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے جلوس نکلے اور زبردست ہنگامے ہوئے' نجی و سرکاری املاک کو نقصان پہنچا اور کئی جگہ جانی نقصان بھی ہوا۔ بہرحال قانون نافذ کرنے والے اداروں نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت زیادہ سخت رویہ اختیار نہیں کیا اور یوں جلاؤ گھیراؤ کے سلسلے نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ بھائی جی کی میت کو پولیس کی زبردست نگرانی میں اس کے آبائی گاؤں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ چوتھے پانچویں روز امن و امان کی صورت حال بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ دونوں پارٹیوں کے جن سیکڑوں کارکنوں کو نقص امن کے اندیشے کے تحت حراست میں لیا گیا تھا ان کی ضمانتیں ہونا شروع

ہو گئیں۔ بھائی جی کی موت نے ملک کی سیاسی صورت حال میں دور رس تبدیلیاں کی تھیں اور ابھی بہت سی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ پولیس نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور بھائی جی کی موت کو معمہ بنانے کی کوشش کی تھی' اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی تھی۔ اس صورت حال کا نتیجہ مثبت ہی نکلا تھا۔ اگر بھائی جی کی موت فوراً ہی "قتل" ڈکلیئر ہو جاتی تو نتیجے میں پھوٹنے والے ہنگامے کہیں زیادہ شدید ہوتے۔ اب ذرائع ابلاغ میں دو طرح کی خبریں آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ اسے صریحاً قتل قرار دے رہے تھے' کچھ لوگوں کے نزدیک اس واقعے میں اتفاقی حادثے کی جھلک تھی۔

بھائی جی کے قتل کے فوراً بعد بھائی جی کے مشتعل ورکروں نے رائے کے بہنوئی کی کوٹھی کو آگ لگا دی تھی۔ اس سنگین واقعے میں رائے صاحب کا بہنوئی شدید زخمی ہوا تھا اور اسپتال پہنچ کر چل بسا تھا۔ جوابی کارروائی کے طور پر رائے صاحب کے پرستاروں نے ایک بڑے ہجوم کی صورت بھائی جی کی رہائش گاہ پر مسلح حملہ کیا تھا۔ اس شدید حملے میں چار سیکیورٹی گارڈ لقمہ اجل بنے تھے اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔ بھائی جی کی رہائش گاہ کا ایک حصہ بھی آتش زدگی سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اس واقعے میں آفرین کا بچ جانا غنیمت تھا۔ اگر ان سنگین لمحات میں آفرین مشتعل لوگوں کے قبضے میں آجاتی تو اس کی عزت اور جان کو شدید خطرات لاحق ہو جاتے۔

اس واقعے کا اصل کردار عاشق مسیح بھائی جی کی موت سے بارہ گھنٹے پہلے ہی کوٹھی سے نکل گیا تھا۔ لہٰذا بھائی جی کی موت کے فوراً بعد بھائی جی کی رہائش گاہ میں جو خونی ہنگامہ ہوا تھا اس کا چشم دید گواہ میں ہی تھا۔ یہ پانچویں روز کی بات ہے۔ وحدت علی بنفس نفیس بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ "باس" مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں ساؤنڈ پروف کمرے میں مخصوص ٹیلی فون کے سامنے پہنچا۔ باس سے میری بات شروع ہوئی۔ باس مجھ سے بھائی جی کی کوٹھی میں پیش آنے والے حالات کے بارے میں سننا چاہتا تھا۔

میں نے بڑے مودب لہجے میں سب کچھ بڑی وضاحت سے بتایا۔ بہرحال ان ساری وضاحتوں کے باوجود میں نے آفرین اور غزالہ کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ اس خفیہ راستے کے بارے میں جہاں سے میں بمشکل ان دونوں کو نکال سکا تھا۔ باس اپنی بارعب آواز میں مجھ سے مختلف

سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگا "اخباری خبروں اور مختلف اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک موقعے پر رائے کے بندوں نے بھائی کی بیٹی کو تقریباً گھیر لیا تھا' وہ اسے زبردستی اٹھا لے جانا چاہتے تھے لیکن پھر پتا نہیں وہ کس طرح بچ گئی۔"

میں نے کہا "جناب! ہنگامہ جب زوروں پر تھا تو میں نے بھائی جی کی بیٹی اور اس کی ایک سہیلی کو بھائی کے بیڈ روم کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ دو سیکیورٹی گارڈ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بعد میں ان سیکیورٹی گارڈز نے بیڈ روم کے اندر سے رائے صاحب کے کارندوں پر زبردست فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ میرا خیال ہے جی کہ بھائی جی کی بیٹی ان دونوں گارڈز کی کوششوں سے ہی بچی ہے۔"

باس نے کہا "یہ بھی سنا ہے کہ بھائی کے بیڈ روم کو تین طرف سے آگ نے گھیر لیا تھا؟"

"جی ہاں۔ جب میں وہاں سے نکلا ہوں تو آگ بیڈ روم کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔"

"اور سامنے سے فائرنگ ہو رہی تھی۔"

"جی جناب۔"

"تو پھر وہ لڑکی بچ کر نکل کیسے گئی؟" باس نے قدرے تاسف سے کہا۔

"بس جی۔ اس کے بعد کا تو مجھے معلوم نہیں۔ مجھے اپنے پھنس جانے کا ڈر بھی تھا' اس لیے میں فوراً وہاں سے نکل آیا تھا۔"

باس نے مجھ سے چند مزید سوالات پوچھے' اس کے بعد مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میرے بعد وحدت علی باس سے گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا۔

بگ باس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بھائی جی کی موت اور اس کے بعد ہونے والے ملک گیر ہنگاموں سے مطمئن تو ہے لیکن اس کی تمام توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ غالباً اس کی خواہش تھی کہ بدامنی کی لہر زیادہ شدید اور دیرپا ہوتی۔ اس حوالے سے شاید باس کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ بھائی جی کی بیٹی مشتعل لوگوں میں پوری طرح گھر جانے کے باوجود بچ کیوں گئی۔

باس سے بات کرنے کے بعد میں واپس اپنے سرونٹ کوارٹر میں پہنچ گیا۔ کہنے کو تو یہ سرونٹ کوارٹر ہی تھا لیکن خاصا آرام دہ اور صاف ستھرا تھا۔ اشرف چیتا بھی میرے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ شہر میں جو توڑ پھوڑ ہوئی تھی وہ اس کی خبروں میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ اس توڑ پھوڑ سے خوش تھا۔

اگر اسے افسوس تھا تو صرف ایک ہی بات کا۔ گڑبڑ کی وجہ سے وحدت صاحب کی نئی فلم وقت پر نمائش کے لیے پیش نہیں ہو سکی تھی۔ اس فلم میں ناشا کے ساتھ ساتھ اشرف چیتے پر بھی کچھ سین فلمائے گئے تھے۔ اشرف چیتے نے اس سے پہلے خود کو پردہ اسکرین پر نہیں دیکھا تھا۔

اشرف چیتا شام کے بعد کوارٹر میں آیا۔ شام کے فوراً بعد وہ ایک دو پیگ ضرور لگا لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ نشے میں تھا۔ آتے ساتھ ہی اس نے پلنگ پر نیم دراز ہو کر ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور سگریٹ کا دھواں چھوڑنے لگا۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تو بڑا قسمت والا ہے جہانداد' سنا ہے آج پھر "باس صاحب" سے تیری بات ہوئی ہے۔"

"بس یہ ساری آپ ہی کی دین ہے چیتا صاحب۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"کیا پوچھ رہے تھے باس؟" چیتے نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ اس دن بھائی جی کی کوٹھی پر کیا دنگا فساد ہوا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا باس کو بتا دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب آگ بھڑک اٹھی تو میں فوراً وہاں سے نکل آیا تھا۔"

اشرف چیتا نے چونک کر کہا "یار! تمہارے "نکلنے" سے ایک بات یاد آگئی۔"

"کون سی بات؟"

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا "واقعے کے روز تم اسٹیشن وین پر سوار تھے۔ میں نے تمہیں گلبرگ مین مارکیٹ کے قریب دیکھا تھا۔ ماڈل ٹاؤن سے ریواز گارڈن آنے کے لیے تمہیں فیروز پور روڈ پر جانا تھا' یا سولہ سوا کیز کی طرف سے ہو کر ملتان روڈ پر آنا تھا۔ تم ادھر کیا لینے چلے گئے؟"

میں اس سوال کا جواب پانچ روز پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ میں نے کہا "مجھے شک پڑ گیا تھا کہ ماڈل ٹاؤن سے کوئی میرے پیچھے آرہا ہے۔ میں نے یہ شک نکالنے کے لیے گاڑی گلبرگ کی طرف موڑ دی تھی۔ اسکوٹر پر سوار دو لڑکے مسلسل میرے پیچھے آرہے تھے لیکن مین مارکیٹ کے پاس سے وہ نہر کی طرف نکل گئے۔"

چیتا عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا تھا جیسے وہ میری طرف سے مطمئن نہیں ہے یا شاید وہ حسد کر رہا تھا کہ میں وحدت علی اور بگ باس کی نظروں میں اہمیت اختیار کر رہا ہوں۔ وہ میری اس صلاحیت کے بارے میں بھی الجھن میں رہتا تھا کہ مجھ پر زہر کا اثر نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے وہ کئی مرتبہ مجھ سے سوالات بھی پوچھ چکا تھا۔

اگلے روز میں نے وقت نکال کر بازار سے زریں گل کو فون کیا۔ میری آواز کے جواب میں کلثوم بولی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا "شکریہ استاد صیب۔ بہت بہت مہربانی۔"

"کس بات کی مہربانی؟"

"آپ نے ام کو اس بات کا اجازت دے دیا کہ ام آپ کو استاد صیب کہہ لیا کرے۔"

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ اسد کیسا ہے؟"

"وہ جی زریں گل کے پاس ہے۔ زریں گل اس کا حجامت بنا رہا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ٹنڈ کر رہا ہے۔"

"یعنی اتنا امیر ہو کر بھی وہ خبیث حجامت کے پیسے بچا رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ وہ کہتا ہے کہ امارا ٹنڈ امارے ابا نے کیا تھا اور امارے ابا کا ٹنڈ امارے دادا نے کیا تھا۔ ام بھی اپنے بیٹے کا ٹنڈ خود کرے گا۔"

"لیکن زریں کے ابا نے تو اس کا ٹنڈ اس لیے کیا تھا کہ اس نے اپنے محلے کی ایک لڑکی کو چھیڑا تھا۔ اس معصوم نے بھلا کیا کیا ہے۔"

کلثوم چیخ کر بولی "یہ آپ کیا کہہ رہا ہے استاد صیب! زریں گل تو کہتا ہے کہ اس نے پوری زندگی میں ایک لڑکی کو نہیں چھیڑا۔"

"وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ اس نے بس ایک لڑکی کو نہیں چھیڑا ہوگا۔ وہ بے چاری شکل سے کچھ زیادہ ہی گئی گزری ہوگی۔"

اتنے زریں گل نے کلثوم سے ریسیور جھپٹ لیا۔ اس کی خوشی میں لرزتی ہوئی آواز سنائی دی "استاد صیب! یہ آپ ہے۔ ام تو دن رات آپ کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کا طبیعت اب کیسا ہے۔ سینے میں زیادہ درد تو نہیں ہوتا ہے اور آپ اتنے دن کہاں غائب رہا ہے۔ ام ایک دن فلم پر بات کرنے کے بہانے چوہدری وحدت کی کوٹھی پر بھی گیا تھا۔ وہاں بھی کہیں آپ کا صورت نظر نہیں آیا۔ الٹا مصیبت گلے پڑ گیا۔ وہ چوہدری وحدت ام کو ہر صورت فلمساز بنانے پر تلا ہوا ہے اور نواور، وہ کہتا ہے کہ وہ سدھیر صیب کو بھی اماری فلم میں لا سکتا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے استاد صیب کہ سدھیر صیب اور بدر منیر صیب امارا کمزوری ہے۔ اماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ام کیا کرے۔"

میں نے کہا "اپنی میری کمزوری کا ذکر تم نے شاید کلثوم کے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا ہوں تم چند سال پہلے مسرت شاہین کی تصویر تکیے کے نیچے رکھ کر سوتے رہے ہو۔"

وہ گھبرا کر بولا "خدا کا نام لو استاد صیب! کیوں کلثوم کے سامنے امارا عزت خراب کرنا چاہتا ہے آپ۔"

"ارے باندر! ابھی تو میں نے دیبا کا نام نہیں لیا۔ میں جانتا ہوں جب تو پشاور میں موٹر مکینکی سیکھتا تھا تو نے دیبا کی خاطر پلا تھوتھا کھانے کی کوشش کی تھی، اس کے علاوہ۔"

"خدا کے لیے چپ ہو جائیں استاد صیب! کلثوم بس بڈلہ سنج ہے۔"

"شاید تم بذلہ سنج کہنا چاہتے ہو۔"

"جی ہاں وہی۔ وہی۔"

اتنے میں کسی قریبی کمرے سے ننھے اسد کے رونے کی آواز آئی پھر یہ آواز ریسیور کے قریب چلی آئی۔ کلثوم مجھے سنانے کے لیے زور سے بولی "دیکھیں استاد صیب! زریں گل کتنا ظالم ہے۔ چھوٹے سے بچے کا سر لہولہان کر دیا ہے۔"

"اس خبیث کے ساتھ ام ایسا ہی کرے گا۔ یہ ام میاں بیوی کے درمیان دیوار بن گیا ہے۔ رات کو دو بجے بھی دیکھو تو ہاں کا پہرہ دیتا نظر آتا ہے۔" زریں مصنوعی غصے سے بولا۔

میں نے کہا "رات کو دو بجے تو چور ڈاکو نکلتے ہیں کیونکہ یہ ان کا پرائم ٹائم ہوتا ہے۔ تم تو شوہر ہو بھئی۔"

"آپ سمجھیں استاد صیب کہ اس شتونگڑے نے ام کو چور ڈاکو ہی بنا دیا ہے۔ ام اپنے ہی مال اسباب کو رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح ہاتھ لگاتا ہے۔"

"صفدر کا کیا حال ہے؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"صیدر بھائی امارا دوست ہے اور دوست کے لیے امارا جان مال سب قربان ہے۔ آپ کے لیے یہ خوش خبری ہے استاد صیب کہ صیدر بھائی دو چار دن میں آسٹریلیا جا رہا ہے۔ اپنے علاج کے لیے۔"

میں نے کہا "آسٹریلیا نہیں آسٹریا۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں وہی۔ ویسے آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج فون کر لیا۔ صیدر صیب خود بھی آپ سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ آپ ذرا ہولڈر (ہولڈ) رکھیں۔ ام ابھی صیدر کو بلاتا ہے۔"

زریں صفدر کو بلانے گیا تو کلثوم نے موقع تاک کر ریسیور اٹھا لیا۔ تیزی سے بولی "استاد صیب! یہ زریں بالکل غلط کہتا ہے۔ اسد تو رات کو جلدی سو جاتا ہے، وہ تو ام اس کو چٹکیاں کاٹ کاٹ کر جگاتا ہے۔ یہ زریں ام کو بہت تنگ کرتا، یہ امارے پاس آتا۔ اور اگر یہ امارے پاس آتا تو ام کو ایک اور بچہ ہوتا اور ام کو ابھی اور بچہ کا ضرورت نہیں ہوتا۔ ام کو زریں بہت اچھا لگتا۔ لیکن ام کو ابھی دوسرا بچہ اچھا نہیں لگتا۔"

وہ جنگلی لڑکی تھی۔ بڑے کھلے ڈلے انداز میں بات کرتی تھی۔ نئے ماحول کے ادب آداب اس نے سیکھے نہیں تھے۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے، اب یہ باتیں کسی اور سے نہ کہنا۔ میں زریں کو سمجھاؤں گا۔ بلکہ میں کوئی ایسا حل نکالوں گا کہ زریں بھی تمہارے پاس رہے اور تمہیں دوسرے بچے کا مسئلہ بھی درپیش نہ ہو۔"

"کیا یہ کوئی جادو ہوتا؟"

"ہاں ہاں جادو ہوتا۔ تم صفدر کو بلا کر لاؤ۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

اتنے میں صفدر خود ہی پہنچ گیا۔ سلام دعا کے بعد ہم نے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ صفدر نے تصدیق کی کہ مسٹر جی کلارک نے اس کے سارے کاغذات تیار کروا دیے ہیں۔ وہ دو چار دن تک آسٹریا جا رہا ہے جہاں اس کا فائنل چیک اپ ہوگا اور کورنیا ٹرانسپلانٹیشن کا فیصلہ کیا جائے گا۔

میں نے صفدر سے پوچھا "یہاں کے ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہماری آنکھ کے ڈیلے کے پیچھے ایک نس ہوتی ہے۔ اسے بصری عصب کہتے ہیں یعنی (OPTIC NERVE) ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ یہ نس درست کام کر رہی ہے۔ اس نس کے پیچھے RETINA یعنی پردہ بصارت بھی محفوظ ہے۔ آنکھوں کے ڈیلوں کا کچھ مسئلہ ہے کیونکہ دونوں ڈیلے خاصے زخمی ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ آسٹریا میں ان کو سرجری کے ذریعے ٹھیک کیا جا سکے گا۔ بہرحال آپ دعا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے لیے آپ کی نیک خواہشات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "صفدر! میرے بس میں ہو تو تمہارے ساتھ آسٹریا جاؤں لیکن تم جانتے ہی ہو یہاں کتنی خطرناک گیم ہو رہی ہے۔"

"یہ تو تکلف کی باتیں ہیں شاہ جہاں صاحب! آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ آپ کا فی لوقت یہاں موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ زریں گل، ماہی صاحب اور مسٹر کلارک کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہو کے آؤ گے نا؟" میں نے زرا لاڈ سے پوچھا۔

"انشاء اللہ۔" اس نے جواب دیا "باقی ہونا تو وہی ہے جو خدا کو منظور ہے۔ ویسے میں سچے دل سے کہتا ہوں جی کہ ہر حال میں راضی ہوں۔"

بھائی جی کے قتل سے صفدر بھی لاعلم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ میں نے اس سنگین واقعے کو بڑے قریب سے دیکھا ہوگا اور وہ باتیں بھی مجھے معلوم ہوں گی جو کسی اور کو معلوم نہیں۔ بہرحال فون پر اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں تھی۔ دیگر احباب کا حال احوال پوچھ کر میں نے بات ختم کر دی۔

جب میں واپس چوہدری وحدت کی کوٹھی پر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ آج پھر کوٹھی کے میٹنگ ہال میں کچھ پراسرار چہرے موجود تھے۔ شاید "بگ باس" یعنی ہارون بانسا آج پھر ٹیلیفونک خطاب کرنے والا تھا۔ یہ ٹیلیفونک خطاب ہی تھے جو تخریب کاری کی نئی نئی لہریں پیدا کر رہے تھے۔ گلی کوچوں میں کشیدگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک دو مزید بڑے واقعات ہو جاتے تو ہر جگہ آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے اور بدخواہ عناصر یہی کچھ چاہتے تھے۔

رات کے دس بجے تک میٹنگ جاری رہی پھر گینگ کے "معزز" ارکان بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہونے لگے۔ میٹنگ میں یقیناً اہم نوعیت کے فیصلے ہوئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ ان فیصلوں کی کچھ ٹوہ مجھے بھی ملے۔ اس سلسلے میں اشرف چیا اور ڈرائیور رشید مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اشرف چیا ابھی تک کوارٹر میں واپس نہیں آیا تھا۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دیکھا تو چوہدری وحدت کا ایک گارڈ یوسف کھڑا تھا "چوہدری صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" وہ فوجی لہجے میں بولا۔

میں کوٹھی کی نشست گاہ میں پہنچا۔ وہاں چوہدری وحدت اپنی اگلی فلم کی متوقع ہیروئن کے ساتھ موجود تھا۔ ہیروئن چوہدری وحدت کی اطاعت یوں کرتی تھی جیسے وہ کوئی پہنچا ہوا فقیر ہو اور وہ اس کی ادنیٰ مریدنی۔ وحدت کے کسی بھی کام کے لیے وہ ایک اشارے کی منتظر رہتی تھی۔ میرے سامنے اس نے فلاسک میں سے پانی نکال کر چوہدری وحدت کو پیش کیا اور خاموشی سے ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔

وحدت فون پر کسی فلمی ڈسٹری بیوٹر سے بات کر رہا تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ میں ہاتھ ناف پر باندھے ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا۔ وحدت نے ہیروئن یا متوقع ہیروئن کو بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "سویٹی۔ تم اب جاؤ۔ مجھے تھوڑا سا کام ہے" میں ایک دو

گھنٹے میں فارغ ہوں گا۔"

"او کے۔ گڈ نائٹ!" ہیروئن ثمینہ نے شہد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے ساڑی سنبھالی اور اپنی نہایت پتلی کمر کو بل دیتی ہوئی باہر چلی گئی۔

وحدت مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم آؤ میرے ساتھ۔"

یوں لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہ رہا ہے۔ ہم ایک طویل راہداری سے گزرے جہاں ایک دو جگہ نہایت قیمتی فریموں والی تصویریں لگی تھیں۔ ان میں وحدت علی ملک کے ساتھ نامور اداکاروں وحید مراد، محمد علی، اعجاز اور دیگر فنکاروں کے ساتھ نظر آتا تھا۔ دراصل یہ شخص فلم انڈسٹری میں ایک کالی بھیڑ تھا۔ اس کا اصل کاروبار تو بانساگینگ کے ساتھ وابستہ تھا۔ جس ملک میں اس کی بنائی ہوئی فلمیں لاکھوں کروڑوں کا بزنس کرتی تھیں وہ اسی ملک کی جڑیں کاٹنے میں.... مصروف تھا۔ ہم ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ کمرے کے دروازے کھڑکیاں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹیلیفونک خطاب والے کمرے کی طرح یہ بھی مکمل ساؤنڈ پروف ہے۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا لیکن یہ اندازہ درست نہیں نکلا کہ اس کمرے میں جا کر وحدت علی سے میری کوئی اہم نوعیت کی تخریبی گفتگو ہو گی۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میں چونک گیا۔ یہ ایک ٹارچر سیل تھا۔ چھت سے لٹکانے کی کنڈیاں، رسے، شکنجے، شکنجی، کرنٹ لگانے کی مشین۔ سبھی کچھ یہاں موجود تھا۔

وحدت علی نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے یہاں لایا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سارا سامان دیکھ لو اور ان کا استعمال بھی اچھی طرح جان لو۔ دراصل میں ایک اہم بندے کو یہاں لانے والا ہوں۔"

"جو آپ کا حکم جناب!" میں نے کہا۔

وہ بولا "جوں جوں تشدد کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں توں توں لوگوں کی برداشت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب کسی سخت جان بندے سے کچھ اگلوانا بھی سائنس ہی بنتا جا رہا ہے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں جی۔"

کرنٹ لگانے والی مشین کے ساتھ ہی ایک اسٹریچر سا پڑا تھا۔ وحدت علی نے وضاحت کی کہ یہ "اسٹریچنگ مشین" ہے۔ بندے کے ہاتھ پاؤں کس کر اسے بتدریج کے ساتھ کھینچا جاتا ہے۔ اسے اپنے جسم کے جوڑ ٹوٹتے اور کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بندے کی برداشت کے مطابق کھینچنے کی قوت گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے۔ وحدت علی نے مجھے اس کا طریقہ کار سمجھایا جو خاصا لرزہ خیز تھا۔

پھر وہ ایک اور مشین کے پاس لے آیا۔ یہ کرسی کی طرز تھی۔ اس میں بھی بندے کے ہاتھ پاؤں کس دیے جاتے تھے۔ ربڑ اور اسٹیل کا بنا ہوا ایک حلقہ سا تھا جو بدنصیب شخص کی گردن میں فٹ آ جاتا تھا۔ ایک دستی چرخی کے ذریعے اس حلقے کے دونوں ٹکڑے حرکت کرتے تھے اور گردن پر دباؤ بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ بندے کی سانس مکمل طور پر رک جاتی تھی اور وہ تڑپنا پھڑکنا شروع کر دیتا تھا۔ اگر اسے زندگی درکار ہوتی تھی اور وہ اپنی سانس بحال کرانا چاہتا تھا تو کرسی کے ہتھے پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبا سکتا تھا۔ اس طرح کے دو چار مزید فنکشن بھی اس مشین میں موجود تھے۔ وحدت علی نے مجھے مشین کی تکنیک سے مکمل طور پر آگاہ کرنے کے لیے مجھے اس پر بٹھایا اور پاؤں کے "کلپ" کسنے کی ہدایت کی۔ میں نے وحدت علی کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرے ہاتھ مقررہ جگہ پر دیکھنے کے بعد اس نے ہاتھ بھی کس دیے پھر بولا "یہ دیکھو۔ یہ چرخی ہے اس کو حرکت دینے سے گردن پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا "اب بتاؤ۔ تم کون ہو اور کس کے لیے کام کر رہے ہو؟"

میں نے چونک کر وحدت علی کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے، آنکھوں میں آگ سی جل رہی تھی "مم۔ میں سمجھا نہیں جناب؟" میں نے کہا۔

"تم سب کچھ سمجھتے ہو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی سمجھ جاؤ گے۔ اس کرسی پر مرنے سے پہلے بہت سوں کے کپڑے پلید ہوئے ہیں، تمہارے بھی ہو جائیں گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو ابھی سب کچھ بتا دو۔"

"مم۔ میں کیا بتاؤں جی؟"

"تمہارا اصل نام کیا ہے اور تمہیں نادر جٹی کی طرف کس نے بھیجا تھا۔"

میں نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کیونکہ میں جس لمحے کا انتظار کر رہا تھا، وہ آ گیا تھا۔ چوہدری وحدت ایک قدم بڑھا کر میری کرسی کے بالکل سامنے آ گیا تھا۔ چوہدری کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کیونکہ میں نے تیزی سے اپنے پاؤں اٹھائے تھے اور میری دونوں ٹانگوں کی قینچی وحدت کی گردن میں پڑ گئی تھی۔ میری ٹانگوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ دو لمحوں میں وحدت کی آنکھیں حلقوں سے ابل

پڑیں۔ چیخنے کی کوشش میں اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ درحقیقت اس ٹارچر سیل میں پہنچتے ہی مجھے وحدت کی بات درست ہونے پر شک ہو گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے مجھے پاؤں کے "کلپ" بند کرنے کی ہدایت کی تو میں نے اس ہدایت پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ میں نے اپنی انگلی کے ناخن سے "کلک" کی آواز پیدا کی اور وحدت کو یہ تاثر دیا کہ پاؤں کلپ کے کھٹکے بند ہو گئے ہیں۔

اب وحدت کی فربہ گردن میری دونوں رانوں کے درمیان اس بری طرح پھنسی ہوئی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بدحواسی میں اس نے ایک دوبار ہاتھ چرخی کی طرف بڑھانے کی کوشش کی لیکن میں چونکہ اس کی اس حرکت کی طرف سے چوکس تھا لہٰذا یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

وحدت نے کئی بار اپنا منہ کھولا شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا یا چیخنا چاہتا تھا لیکن اگر وہ چیخنا چاہتا تھا تو یہ بھی ایک اضطراری حرکت ہی تھی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔

میں نے اس کمرے میں داخل ہونے کے فوراً بعد ہی اندازہ لگایا تھا کہ وحدت کے لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ موجود نہیں۔ غالباً اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ٹارچر سیل میں جاتے ہی اس قسم کے حالات پیش آ جائیں گے۔

چند سیکنڈ کے اندر وحدت کے حلق سے گیں گیں کی خوفناک آواز نکلنے لگی اور اس کے ہونٹ نیلے ہونے لگے۔ میں نے کہا "چوہدری وحدت! جان بچنے کی ایک ہی صورت ہے میرے ہینڈ کف کھول دو۔ میں اپنی ٹانگیں ذرا نیچے لاتا ہوں۔ تمہارے منحوس ہاتھ آسانی سے کرسی کے ہتھے تک پہنچ جائیں گے۔ کیا خیال ہے؟"

چوہدری وحدت کے نیلگوں چہرے پر رضامندی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔

میں اپنی ٹانگوں کو تھوڑا سا نیچے لے آیا، تاہم گرفت میں نے کوئی کمی نہیں کی تھی۔ یہ ذرا نازک لمحے تھے کیونکہ وحدت کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں تک پہنچ سکتے تھے اور چرخی تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ تاہم مجھے ہجانوے فیصد امید تھی کہ وحدت چرخی کی طرف ہاتھ بڑھانے کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کی گردن کا "نرخرا" بس میری ایک جنبش کا محتاج تھا۔ وحدت نے ہاتھ آگے بڑھائے اور میرے ہینڈ کف کھول دیے۔ میں نے آگے کو جھک کر وحدت کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور ٹانگیں اس کی گردن سے ہٹا لیں۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا اور بری طرح کھانسنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اپنی ہیروئن ثمینہ کی بغل میں بیٹھ کر اس نے جو ٹھٹھے لگائے تھے وہ ایک ایکائی کے ساتھ باہر نکل آئے۔ وہ بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے دبوچا اور اٹھا کر کرسی پر پھینک دیا۔ خوف اور اذیت کے سبب وحدت کا عظیم جسم کانپنے لگا۔ میں نے ایک زوردار مکا اس کی ٹھوڑی پر رسید کیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اس کے دونوں پاؤں "کلپوں" میں جکڑے اور پھر ہاتھ بھی جکڑ دیے۔ آخری لمحوں میں وحدت نے کچھ مزاحمت کی لیکن میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گردن کو دبانے والا حلقہ وحدت کی موٹی تازی گردن کے گرد بیٹھ گیا۔ میں نے آہنی چرخی کو دستے سے پکڑ کر ذرا حرکت دی تو وحدت کی گردن کے گرد دباؤ بڑھنے لگا۔

وہ پھٹی ہوئی آواز میں چیخا "تم جانتے نہیں، تم کیا کر رہے ہو۔ اس کا بہت برا نتیجہ نکلے گا۔ میں ... میں تمہیں اب بھی معاف کر سکتا ہوں، تم میرے ہاتھ پاؤں کھول دو۔"

میں نے وحدت علی کی بات دہراتے ہوئے کہا "وحدت صاحب! جوں جوں تشدد کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں توں توں لوگوں کی برداشت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب کسی سخت جان بندے سے کچھ اگلوانا بھی سائنس ہی بن گیا ہے۔ میں سائنس دان بننا نہیں چاہتا ہوں لیکن تم مجھے مجبور کرو گے تو میں بن بھی جاؤں گا۔"

"تم کیا بک رہے ہو۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"میرا دماغ صحیح ہے اور تم بھی صحیح کر لو۔ تمہیں اپنے اور بانساگینگ کے بارے میں سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت۔ آج رات کی صبح تم تب ہی دیکھ سکتے ہو اگر میری ہدایت پر عمل کرو گے۔"

"تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

میں نے جواب میں بھی وحدت کی بات ہی دہرائی "تم سب کچھ سمجھتے ہو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی سمجھ جاؤ گے۔ اس کرسی پر مرنے سے پہلے بہت سوں کے کپڑے پلید ہوئے ہیں۔ تمہارے بھی ہو جائیں گے۔"

اس نے اٹھنے کے لیے زور مارا مگر یہ صرف اضطراری

کت تھی۔ ورنہ یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ اس کرسی سے چھٹکارا اتنا آسان نہیں۔ میں نے چرخی کو حرکت دی۔ وحدت کی بولتی بند ہوگئی۔ اس کی گردن دبتی جا رہی تھی اور آنکھیں باہر ابلتی آ رہی تھیں۔ پہلے اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلتی رہی پھر وہ بھی بند ہوگئی۔ وحدت کے ہونٹ ایک بار پھر نیلے ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اچانک ٹارچر سیل میں گھنٹی کی تیز آواز ابھری۔ میں چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وحدت علی نے ہتھے پر لگا ہوا بٹن دبایا ہے۔ وہ اس "ظالم کرسی" کے سارے قواعد و ضوابط سے واقف تھا۔

میں نے چرخی کو مخالف سمت میں حرکت دی۔ گردن پر شکنجے کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ گئی۔ وحدت ایک بار پھر بری طرح کھانسنے لگا۔ اس کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔

ثمینہ جیسی نجانے کتنی نادان لڑکیوں کے جسمانی قرب نے وحدت کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ بظاہر جاندار اور لحیم شحیم ہونے کے باوجود وہ ایک دم گائے کی لید بن گیا تھا۔

میں نے کہا "دیکھیں وحدت صاحب! اگر آپ واقعی کل صبح کا سورج دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ مجھے اپنے باس ہارون پاشا کے بارے میں اور اس کے آئندہ پروگرام کے بارے میں ہر بات ٹھیک ٹھیک بتا دیں۔"

"میں باس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ان کے پروگرام کا کسی کو علم ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ ان کا رابطہ بس فون کال کے ذریعے ہوتا ہے۔"

"لیکن آپ تو گینگ کے سینئر ترین ممبر ہیں۔ آپ سے تو باس نے خود کو نہیں چھپایا ہوگا۔ کسی فوری فیصلے کے لیے آپ کو یقیناً ہنگامی طور پر باس سے رابطہ کرنا پڑتا ہوگا۔ آپ کیسے رابطہ فرماتے تھے؟"

"ایسی صورت میں بھی ہمیں باس کی کال ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں! مجھے باس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ تم مجھ سے کچھ معلوم نہیں کرسکو گے۔ مجھ پر تشدد کرنے سے تمہیں اس کے سوا کچھ نہیں ملے گا کہ تمہارا انجام مزید دردناک ہو جائے گا۔ دیکھو! تم جو کوئی بھی ہو میری بات دھیان سے سنو۔ تمہارے لیے اب بھی وقت ہے۔ ہم میں تم سے کچھ بھی پوچھے بغیر تمہیں یہاں سے جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز پھر حلق میں پھنس گئی کیونکہ میں نے چرخی گھمانا شروع کردی تھی۔ اس کے گلے اور ماتھے کی رگیں پھول گئیں۔ آنکھیں باہر ابل پڑیں۔

وہ بار بار گھنٹی کا بٹن دبانے لگا مگر میں اب اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جب اس کی حالت غیر ہونے لگی میں نے گرفت ذرا ڈھیلی کردی۔ پندرہ بیس سیکنڈ کا وقفہ کر میں نے چرخی پھر گھمانا شروع کردی۔ یہ عمل میں نے چھ مرتبہ دہرایا۔ یہ بالکل کسی مجرم کو پانی میں غوطے دینے [والا] عمل تھا۔ فرق یہ تھا کہ یہاں پانی کی جگہ پھندا استعمال ہو تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے وحدت نے مجھے اس منحوس کرسی کا استعمال بڑی تفصیل سے سمجھایا تھا، اب وہ خود اس کی زد میں تھا۔ شاید کسی ایسے ہی موقعے کے لیے شاعر نے کہا ہے۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔

چار پانچ منٹ کی ورزش کے بعد وحدت کی حالت ہوگئی۔ میں نے اس کے گلے کا شکنجہ ڈھیلا کرتے ہوئے کہا "ہاں چوہدری وحدت صاحب۔ آپ اس بندہ ناچیز کو کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟"

اس نے جنونی انداز میں مجھے گالی دی اور کراہ کر بولا "میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں جانتا۔"

اچانک اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ بالکل جیسے نکسیر پھوٹتی ہے، لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ نکسیر نہیں ہے۔ کوئی سنگین معاملہ تھا۔ آدھے منٹ کے اندر اندر وحدت کا سر پینڈولم کی طرح جھولنے لگا پھر ایک دم گردن آگے کی طرف جھک گئی۔ اس کے حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اس کی بندشیں کھولیں۔ میرے بندشیں کھولنے تک ناک سے بہنے والے خون نے وحدت کی گود سرخ کردی تھی۔ میں نے اسے کرسی سے اٹھا کر اسٹریچر نما مشین پر لٹایا۔ وحدت کی سانس جھٹکوں سے آرہی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔

ایک منٹ کے اندر اندر وحدت کی سانس رک گئی اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ مرچکا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے وحدت کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ وہ تو ایک ایسا غدار تھا کہ دس بار بھی سزائے موت کے عمل سے گزرتا تو غلط نہیں تھا لیکن وہ مجھے بغیر کچھ بتائے یکایک ہی راہی عدم ہوگیا تھا۔ لوگوں کے لیے تشدد کے بدترین طریقوں کا اہتمام کرنے والا چند منٹ بھی ان طریقوں کی اذیت نہیں سہہ سکا تھا۔ میں نے اس کے اسٹریچر کو ٹھوکر رسید کی اور ایک جانب تھوک دیا۔

دل کے کسی گوشے میں یہ بات موجود تھی کہ ش

ت ابھی زندہ ہو۔ میں نے ایک بار پھر اس کی مکمل جانچ پڑتال کی۔ اس کی نبض ٹٹولی۔ سینے پر کان رکھ کر دھڑکن کرنے کی کوشش کی۔ پتلیاں دیکھیں.... لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ مشہور فلم ساز کی فلم کا کیمرہ چند روز پہلے ہوا تھا، آج اس کی زندگی کا کیمرہ کلوز ہوگیا تھا۔

میں نے ایک الماری میں سے ایک موٹی سوتی چادر نکالی۔ وحدت کی لاش کو اس میں لپیٹا اور ایک گوشے میں رکھ کر اس کے سامنے ایک صوفہ رکھ دیا۔ اب اگر کوئی اس اذیت خانے میں آبھی جاتا تو فوری طور پر لاش پر اس کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

وحدت علی، دولت مند فلم ساز، مستقبل کے بڑے بڑے منصوبے بنانے والا سرمایہ دار، آج گٹھڑی کی طرح پڑا تھا اور بالکل حقیر نظر آرہا تھا۔ دنیا کی ساری رنگینیوں [illegible] اور لذتوں سے اس کا ناتا ایک دم ہی ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے ٹارچر سیل میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ یہاں ایک الماری ہی ایسی تھی جس کی تلاشی لی جاسکتی تھی۔ الماری کے تین دروازے تھے۔ دو لاک تھے اور ایک کھلا تھا۔ پہلے میں نے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ یہاں پانچ خانے تھے ان میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی، سوائے لباس کے۔ یہ کسی عورت یا لڑکی کا لباس تھا۔ اس پر خون کے دھبے تھے۔ پتا نہیں یہ کون بدنصیب تھی۔ یقیناً اس ٹارچر سیل میں تشدد کیا گیا تھا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے اس کمرے میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہے تھے۔ پاشا گینگ کے قہر نے ان کا خون نچوڑ کر انہیں موت کے حوالے کردیا تھا۔

میں نے الماری کے باقی دروازوں کے تالے توڑ دیے۔ یہاں بھی مختلف چیزیں تھیں۔ اذیت رسانی کے آلات، ٹیپ ریکارڈر، کیسٹس، کیمرے، البم، دو رائفلیں اور ان کا ایمونیشن اور پتا نہیں کیا کچھ۔

یہیں پر مجھے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ بھی ملا۔ اس بیگ کو مقفل کیا گیا تھا۔ شاید میں اسے نہ کھولتا لیکن تالا دیکھ کر تجسس بڑھ گیا۔ میں نے تالا توڑ کر اندر جھانکا۔ اس میں مختلف کاغذات تھے۔ میں انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔ کچھ یوٹیلٹی بل تھے، کچھ کیش میمو، اخباروں کی نقول وغیرہ بھی تھیں۔ یہیں پر مجھے اخبار کا ایک تراشا بھی نظر آیا۔ یہ ایک عام سی خبر تھی۔ گارڈن ٹاؤن کے رہائشیوں نے احتجاج کیا تھا کہ علاقے کا ایک نیا رہائشی ایم اے خان اپنی کوٹھی نمبر سی۔18 کے احاطے میں خونخوار کتے کھلے چھوڑ دیتا ہے۔ کسی وقت یہ کتے باہر سڑک پر بھی ٹہلنے نکلتے ہیں۔ دو روز پہلے ان کتوں نے ایک بچے کو شدید زخمی کیا ہے۔ علاقے کے مکینوں نے کہا تھا کہ ایم اے خان نامی یہ شخص بہت بااثر ہے اور کسی کی بات نہیں سنتا۔ مقامی تھانے دار بھی اس کی طرف داری کرتا ہے۔ خبر میں متعلقہ حکام سے درخواست کی گئی تھی کہ ایم اے خان نامی اس شخص کو علاقے کے مکینوں کا سکون حرام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

خبر میں ایک کوٹھی کے بڑے گیٹ کے پاس گھومتے ہوئے دو کتوں کی تصویر بھی تھی۔ یہ گدھے کے سائز کے کتے دیکھنے میں بھی خوفناک نظر آتے تھے۔ کتوں کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مجھے بھی حاصل تھیں۔ یہ بڑے قیمتی کتے تھے۔ رکھوالی کے یہ نہایت قیمتی کتے کسی نہایت قیمتی شے کے لیے ہی رکھے گئے ہوں گے۔ اخبار کا تراشا اس بات کو ظاہر کرتا تھا کہ اس خبر کا تعلق پاشا گینگ سے ہی ہے۔

پتا نہیں میرے دل میں کیا بات آئی کہ میں نے گارڈن ٹاؤن کی اس کوٹھی کا نمبر اپنے پاس نوٹ کرلیا اور فیصلہ کیا کہ میں جلد سے جلد اس کوٹھی کو دیکھوں گا۔

وحدت کی موت زیادہ دیر راز نہیں رہ سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ صبح تک یہاں ٹارچر سیل میں ہونے والے واقعے کا علم سب کو ہوجاتا تھا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ اب فوراً سے پہلے میں یہ کوٹھی چھوڑ دوں۔ جو بہروپ میں نے کئی مہینوں سے بنا رکھا تھا وہ اب برقرار رہتا نظر نہیں آتا تھا۔ یہ سوچ بار بار میرے ذہن میں آرہی تھی کہ وحدت علی کو مجھ پر شک کیونکر ہوا ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ذہن میں آتا تھا اور وہ یہ کہ اس روز جب میں آفرین اور غزالہ کو لے کر ماڈل ٹاؤن سے نکلا تھا تو بدبخت اشرف چیتا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ شاید جب میں غزالہ کو اس کے گھر کے قریب ڈراپ کررہا تھا اشرف چیتا اس وقت وہاں موجود تھا لیکن یہاں پھر ایک اور سوال ذہن میں آتا تھا۔ اگر چیتے نے مجھے غزالہ کو ڈراپ کرتے دیکھا تھا تو پھر غزالہ اب تک محفوظ کیوں تھی۔ ابھی کل میری بات زریں اور صفدر سے ہوئی تھی، انہوں نے غزالہ کے حوالے سے کوئی تشویش ناک خبر نہیں سنائی تھی، پھر ایک اور پوائنٹ بھی تھا۔ اگر یہ لوگ غزالہ کے ساتھ میرے تعلق سے آگاہ ہوگئے تھے تو پھر ابھی تک مجھے شناخت کیوں نہیں کرپائے تھے۔ غزالہ تک پہنچنے کے بعد پاشا گینگ کے لوگوں کے لیے یہ پتا چلانا بالکل مشکل نہیں تھا کہ میں جہاں داد نہیں شاہ جہاں ہوں۔ جبکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے

وحدت علی مرحوم و مغفور مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ 'میں کون ہوں۔' اس نے جرم کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا ورنہ وہ استاد جہانی کی شکل و شباہت سے واقف ضرور ہوتا۔

میرے لیے یہ سوال ابھی تک جواب طلب تھا کہ میں پاشا گینگ کی نظروں میں کس طرح مشکوک ٹھہرا ہوں۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ جس رات میں زریں گل کے ساتھ نوبل کلب گیا اور وہاں شنکر ٹنکرا کی ٹانگ کا کڑا کا کر دو نکالا کسی ایسے شخص نے مجھے دیکھ لیا ہو جس نے وحدت کی کوٹھی میں بھی مجھے دیکھ رکھا تھا۔

بہرحال میرے پاس وقت کم تھا۔ اس اہم سوال کا جواب بعد میں بھی ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے وحدت کی لاش کو کسی نہ کسی طرح الماری میں ٹھونس کر مقفل کر دیا۔ خون کے جو چھینٹے فرش پر گرے تھے وہ بھی صاف کر ڈالے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے باہر نکل آیا۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اشرف چیتا ابھی تک کوارٹر میں واپس نہیں آیا تھا۔ میں کوٹھی سے نکلا اور ٹیکسی پکڑ کر زریں گل کی طرف روانہ ہو گیا۔ زریں گل کی کوٹھی میں وکٹ پر جانا کچھ مناسب نہیں لگا۔ راستے میں میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ کوٹھی ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ یہاں کی فون لائن بھی ہر قسم کے خطرے سے آزاد تھی۔

حسب توقع ساہی صاحب اس کوٹھی میں موجود نہیں تھے۔ بہرحال ملازم نے مجھے خوش آمدید کہا اور ایک کمرا میرے لیے کھول دیا۔ میں نے رات کے اس پہر ساہی صاحب کو بذریعہ فون بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ میں نے ملازم کے ذریعے ساہی صاحب کو فون کرایا اور انہیں ڈھکے چھپے الفاظ میں کہا کہ وہ "موقعے" پر پہنچ جائیں۔ دراصل مسلم ٹاؤن والی اس کوٹھی کے لیے "موقعے" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ کوٹھی کے لیے کوڈ ورڈ تھا۔

ساہی صاحب اپنی پرائیویٹ گاڑی میں آدھ گھنٹے کے اندر اندر مسلم ٹاؤن پہنچ گئے۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی مجھے وحدت علی کی موت کی خبر سنائی۔ اخبار بھی ساہی صاحب کے پاس تھا لیکن یہ خبر اخبار میں موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وحدت علی کی لاش صبح ہی دریافت ہو سکی ہے "کیا ہوا ہے وحدت کو؟" میں نے انجان بنتے ہوئے ساہی صاحب سے پوچھا۔

وہ بولے "تم سے زیادہ کون جانتا ہو گا؟"

"آپ کو کیا معلوم ہوا ہے۔" میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

وہ بولے "کوئی چھ بجے کے لگ بھگ جیل ملک صاحب کا فون آیا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ میرے عزیز دوست چوہدری وحدت علی کو ان کی رہائش گاہ پر بے دردی سے مار دیا گیا ہے۔ انسپکٹر وجاہت سب انسپکٹر شجاعت رضوی کے ساتھ موقعے پر پہنچا۔ وحدت کی لاش برآمدے میں پڑی تھی۔ وحدت کی فلم ایسوسی ایٹ ارمان نے بتایا ہے کہ رات کے بجے کے قریب اچانک گھر کی روشنیاں بجھ گئیں۔ اردگرد کے گھروں میں روشنی موجود تھی اس لیے پاپا مین سوئچ دیکھنے کے لیے باہر نکلے۔ کسی نے اندھیرے سے نکل کر ان پر حملہ کیا اور ان کا گلا دبا دیا۔ شاید قاتل ایک سے زیادہ تھے۔ ارمان کے بیانات کے مطابق شدید کشمکش کے دوران وحدت کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور ان کا سارا جسم لہولہان ہو گیا۔"

"یہ اخبار سو فیصد جھوٹ ہے۔ بہرحال ان لوگوں نے شبہ کس پر کیا ہے۔"

فی الحال تو کسی پر نہیں کیا۔" ساہی صاحب نے کہا۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ وہ لوگ کسی پر شبہ ظاہر نہیں کریں گے۔ بے شک وہ جانتے تھے کہ اس قتل کا ذمے دار میں ہوں اور قتل کے بعد غائب ہو گیا ہوں لیکن وہ میرا نام لے کر اپنے لیے مزید الجھنیں پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے اپنے ہاتھ شاید پولیس سے زیادہ لمبے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ان قتل کا بدلہ خود لینے کی کوشش کریں گے۔

ساہی صاحب نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "بھائی جی کی سنسنی خیز موت کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ ہے۔"

"بالکل جی۔ واقعہ تو واقعی بڑا ہے۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟"

انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا اندازہ یہی ہے کہ وحدت تمہارے ہاتھوں مرا ہے۔ شاید ان لوگوں کو تم پر شک ہو گیا تھا۔"

"میرے خیال میں جناب! یہ بہت بڑا نقصان ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وحدت علی کی موت؟"

"نہیں جناب! میرے بہروپ کی موت۔ اس بہروپ کو بچانے کے لیے میں نے پچھلے چند مہینے میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ ان ساری مشکلات کے بدلے جب کسی نتیجے پر پہنچنے کا وقت آیا تو وہ الو کا پٹھا فاقت عزرا ٹکا سے بغل گیر ہو گیا۔"

"تمہارا اشارہ وحدت کی طرف ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ساہی صاحب نے پوچھا "اس کے ساتھ ہوا کیا ہے؟"

میں نے ساہی صاحب کو ٹارچر سیل میں پیش آنے والے سارے واقعے سے آگاہ کر دیا۔ میں نے ساہی صاحب کو بتایا کہ وحدت نے کس طرح مجھے اس منحوس کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی اور کس طرح خود اس کرسی کے شکنجے میں آیا۔ وحدت کی آنا فاناً موت کے بارے میں بھی میں نے وضاحت سے ساہی صاحب کو بتایا۔

ساہی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تو پھر کیا خیال ہے گینگ پر کریک ڈاؤن کیا جائے۔"

"یہ کارروائی رات کو ہو تو بہتر ہے۔ اس وقت زیادہ گرفتاریاں نہیں ہو سکیں گی۔ ویسے جن لوگوں کو پکڑنا ہے ان کی مکمل فہرست میرے پاس موجود ہے۔"

ساہی صاحب میرے خیال سے پوری طرح متفق نہیں لگتے تھے' تاہم انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے کہا "دراصل جناب! میں فی الوقت ایک اور کام کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ گرفتاریوں سے پہلے ہمیں بگ باس پاشا کے بارے میں تھوڑا بہت "کلیو" مل جائے۔"

"کیسا کام کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے اخباری تراشا نکال کر ساہی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے گارڈن ٹاؤن کی اس کوٹھی کے بارے میں معلومات چاہئیں۔

"کس طرح کی معلومات؟" ساہی صاحب نے پوچھا۔

"اس کوٹھی کا محل وقوع کیا ہے۔ یہ کس کے نام ہے؟ یہاں کون رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

ساہی صاحب نے تراشا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر تک وہ خبر پڑھتے رہے۔ یہ کوئی ڈیڑھ سال پرانی خبر تھی۔ خبر پڑھنے کے بعد ساہی صاحب ٹیلی فون کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

واپس آکر انہوں نے مجھے بتایا کہ ابھی ایک گھنٹے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ انہوں نے اس کام پر ایک بڑے ہوشیار بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ ہم پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ بات ساہی صاحب بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ میں نے اب تک جو جدوجہد کی ہے اس کا مقصد پاشا گینگ کے سرغنہ تک پہنچنا تھا۔ نادو بھی 'میڈم شہزادی' 'زیبی' وحدت یہ سب اسی منزل تک پہنچنے کے زینے تھے۔ اب جبکہ یہ منزل بالکل نزدیک آگئی تھی اچانک میرا وہ بہروپ ختم ہو گیا تھا جس کی بدولت میں پاشا گینگ کے اندر رہ کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ٹارچر سیل میں اچانک وحدت کی موت واقع نہ ہو جاتی تو مجھے اس سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔ بالفرض وہ اپنے باس ہارون پاشا کے بارے میں نہ بھی بتا سکتا تو بھی گروہ کے بارے میں گراں قدر معلومات فراہم کر سکتا تھا۔

ایک سوال یہ بھی بار بار ہتھوڑے کی طرح ذہن پر برس رہا تھا کہ میری کون سی غلطی نے میرے بنے بنائے بہروپ کو متاثر کیا ہے۔ ساہی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ غزالہ اور آفرین دونوں بالکل خیریت سے ہیں۔ غزالہ کا خیر خیریت سے ہونا اس امر کا ثبوت تھا کہ اشرف چیتے نے اس روز مجھے غزالہ کو ڈراپ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ساہی صاحب کے اسپیشل فون کی گھنٹی بجی۔ ساہی صاحب نے دوسرے کمرے میں جا کر فون سنا۔ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر آکر انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ غزالہ کا فون ہے۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کے لیے "ہولڈ" کر رکھا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر ریسیور اٹھایا۔ غزالہ کی آواز ہمیشہ ہی میرے تن بدن میں نئی روح پھونک دیتی تھی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی سہیلی آفرین کا کیا حال ہے۔

وہ بولی "زیبی! ابھی تک شاک میں ہے۔ وہ اپنے والد سے بڑی محبت کرتی تھی۔ صدمے کے باعث ایک دو دن تو اسے اسپتال میں رہنا پڑا ہے۔ اب وہ واپس ماڈل ٹاؤن اپنے گھر میں آگئی ہے۔ اس کے بڑے چچا شکیل بھائی اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ پرسوں میں نے فون پر اس سے تھوڑی سی بات کی تھی۔"

میں نے کہا "فی الوقت تمہارا اس سے رابطہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی اس کے حالات ذرا بہتر ہو جانے دو۔"

غزالہ نے کہا "دراصل میں اس کے والد کے افسوس کے لیے بھی نہیں جا سکی تھی' اس لیے سوچا کہ فون پر دو باتیں کر لوں۔"

"کیا کہہ رہی تھی وہ؟"

"آپ کے بارے میں بھی بات کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی' قتل کے روز شدید خوف اور غم کی حالت تھی۔ اسی حالت میں اس کے منہ سے آپ کے لیے کچھ سخت باتیں نکل

گئی تھیں' اس پر معذرت چاہ رہی تھی۔ آپ نے جس طرح اس کی جان بچانے کی کامیاب کوشش کی اس پر وہ آپ کی بہت شکر گزار ہے۔"

"اور تم؟"

"میں بالکل شکر گزار نہیں ہوں۔" وہ رسان سے بولی "یہ سب آپ ہی کا شروع کیا ہوا بکھیڑا ہے۔ میں تو سکون سے بیٹھی تھی۔ آپ نے ہی ڈھونڈا ہے آفرین کو۔"

"اچھا اس نے کوئی اور بات تو نہیں کی؟"

"آپ سے ملنا چاہ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ کیوں ملنا چاہ رہی ہے۔"

"کیوں ملنا چاہ رہی ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے بھولے نہیں ہیں آپ۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے آپ نے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"بھئی! وہ تمہاری دوست ہے تو میرے لیے تو بہنوں جیسی ہے۔"

وہ ذرا سا ہنسی' پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "میں مذاق کر رہی تھی۔ دراصل اس کے ذہن میں بھی وہی سوال کلبلا رہا ہے جو میرے ذہن میں ہے اور اس سوال کے بارے میں آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"کہیں تم اس خفیہ راستے کی بات تو نہیں کر رہی ہو۔"

"بالکل۔" غزالہ گہری سنجیدگی سے بولی "اپنے ڈیڈی کے بارے میں آفرین کے خیالات بڑے اونچے ہیں۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ اس کے والد کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف تھی۔ خاص طور پر اس سے تو وہ کچھ بھی نہیں چھپاتے تھے لیکن اس راستے کے بارے میں وہ شدید الجھن میں گرفتار ہے۔ بیڈ روم کے اندر سے اچانک اس رستے کا نکلنا اور پھر ایک سرنگ سے گزر کر ہمارا ایڈوس کے گھر میں پہنچنا اور وہاں سے نکلنا۔ آفرین کو یہ سب کچھ خواب جیسا لگتا ہے۔ اس نے ابھی تک کسی کو اس راستے کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیے ہیں ان میں بھی رستے کا اور "آپ کا" کوئی ذکر نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھا ہی ہے۔ بھائی جی کے لیے بھی اور آفرین کے لیے بھی۔ بہرحال اس بارے میں میں پھر تم سے بات کروں گا۔"

غزالہ بولی "اگر ہو سکے تو ایک بار آفرین سے رابطہ کر لیں۔ اسے کچھ تسلی ہو جائے گی۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

غزالہ سے بات ختم کرنے کے بعد میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ ایک بار پھر گھنٹی بج اٹھی۔ اس مرتبہ لائن پر ساہی صاحب کا خاص ماتحت شجاعت تھا۔ میں نے اس کی بات ساہی صاحب سے کرا دی۔ یہ فون ان "معلومات" کے بارے میں ہی تھا جن کا میں انتظار کر رہا تھا۔ ساہی صاحب فون سننے کے ساتھ ساتھ کاغذ پر کچھ نوٹ بھی کرتے رہے۔ سب انسپکٹر سے بات ختم کرنے کے بعد ساہی صاحب نے مجھے بتایا "یہ کوٹھی قریباً ایک سال پہلے تک چوہدری وحدت کے بھانجے کے نام تھی۔ بعد میں وحدت نے اسے بیچ دیا۔ دو کینال کی اس کوٹھی کی قیمت قریباً اسی لاکھ روپیہ ادا کی گئی۔ کوٹھی کا سارا ساز و سامان حتیٰ کہ برتن تک کوٹھی کے ساتھ ہی فروخت کر دیے گئے تھے۔ اب یہ کوٹھی مرزا نذیر بیگ نامی ایک شخص کے پاس ہے۔ وہ فی الحال کینیڈا میں ہے۔ تاہم جلد ہی وہ اپنے بیوی بچوں سمیت یہاں آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آج کل کوٹھی میں نذیر بیگ کے بس دو ملازم رہتے ہیں۔ ایک چوکیدار ہے' دوسرا کوئی منشی ٹائپ شخص ہے۔"

میں ساہی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کوٹھی کو ایک نظر دیکھوں۔ شاید یہ چھٹی حس ہی کا کرشمہ تھا۔ ساہی صاحب تو کچھ دیر بعد ڈیوٹی پر چلے گئے اور میں صوفے پر نیم دراز ہو کر منصوبہ بندی کرتا رہا۔ شام کے فوراً بعد میں اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ سردی کافی تھی۔ ہلکے بادل بھی چھائے ہوئے تھے۔ میں نے جیکٹ پہنی۔ اپنے پرانے ٹینس شوز مجھے کوٹھی کے اندر سے ہی مل گئے۔ اسی طرح میرا وہ ریوالور بھی موجود تھا جو میں پہلے استعمال کرتا رہا تھا۔ مزید فائدہ یہ ہوا کہ ایک الماری سے ریوالور کا سائیلنسر بھی دستیاب ہو گیا۔ یہ بڑا شاندار سا سائیلنسر تھا۔ ایسا ہی سائیلنسر میڈم شہزادہ بھی استعمال کرتی تھی۔

میں نے کوٹھی سے نکلتے ہی ایک ٹیکسی رکوائی۔ گارڈن ٹاؤن کا علاقہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ راستے میں مجھے ایک بڑا جلوس نظر آیا۔ اس جلوس کی کچھ ٹولیاں توڑ پھوڑ کی کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا "صاحب! یہ بھائی جی کے حامیوں کا جلوس ہے۔ ویسے آج دوپہر بھی ان لوگوں نے شہر میں بڑا لفڑا کیا ہے۔ دو پٹرول پمپوں کو آگ لگائی ہے اور کئی دکانوں میں لوٹ مار کی ہے۔"

"یہ توڑ پھوڑ کا کام تو کافی ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جی لیکن اپن کا خیال ہے کہ کل

سے شہر میں تشدد کا یہ نیا دور شروع ہوا ہے۔ دراصل مظاہروں میں بھائی جی کی پارٹی کی کچھ لیڈیز پکڑی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک ٹیچر صاحبہ نے الزام لگایا ہے کہ حوالات میں ایک چھوٹے تھانے دار نے اس کے کپڑے پھاڑے ہیں اور اس سے دست درازی کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس پولیس اہلکار نے رائے صاحب کے سیکرٹری کے کہنے پر ایسا کچھ کیا ہے۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ درحقیقت بدامنی کا ایک اپنا ہی مزاج ہوتا ہے۔ یہ ایک بار شروع ہو جائے تو اپنے راستے خود بنانے لگتی ہے۔ الیکشن کی تاریخ آگے بڑھا دی گئی تھی اس کے باوجود فضا میں کشیدگی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس بدامنی کے اصل ذمے داروں کو کوستا رہا۔

جب میں گارڈن ٹاؤن کی مطلوبہ کوٹھی کے سامنے پہنچا' گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کوٹھی سے کچھ آگے جانے کے بعد میں نے گاڑی ایک طرف رکوا دی اور کرایہ دے کر اسے فارغ کر دیا۔ مفلر میں نے کانوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا' دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں چہل قدمی کے انداز سے چلتا ہوا ایک بار پھر کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ کے قریب روشنی تھی۔ وہاں چوکیدار کی موجودگی کے آثار بھی تھے۔ کوٹھی کی بیرونی دیوار کافی اونچی تھی اس پر خاردار باڑ بھی لگی ہوئی تھی۔ میں ایک طویل چکر کاٹ کر کوٹھی کے عقب میں پہنچ گیا۔ ہلکی ہلکی ہوا جو شام سے ہی چل رہی تھی اب تیز آندھی میں بدل گئی تھی۔ گھروں کے کھلے کھڑکیاں دروازے کھٹاکھٹ بج رہے تھے۔ کوٹھی کے اندر سفیدے کے چند بلند درخت شدت سے جھومتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی موٹی چرمی جیکٹ اتار کر خاردار تاروں پر پھینکی اور پھر تاروں کے اوپر سے گزر کر احاطے میں اتر گیا۔ بھرا ہوا ریوالور میری جیکٹ میں تھا' اس کے علاوہ کافی فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ کل وحدت کے جنم واصل ہونے کے بعد سر پر خون سا سوار ہو گیا تھا۔

اچانک میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے ہوا میں ایک خاص قسم کی غراہٹ سنائی دی تھی۔ یہ غراہٹ جیسے ایک بہت بڑے سینے کے اندر سے برآمد ہو رہی تھی اور اس میں ایک خاص قسم کی وحشت اور سفاکی تھی۔ یہ کسی لحیم شحیم کتے کی آواز تھی۔ میں نے ساہی صاحب سے یہ تو سنا تھا کہ پرانے مالکوں نے یہ کوٹھی سارے ساز و سامان سمیت نئے مالکوں کو دے دی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سارے ساز و سامان میں وہ گدھے کے سائز کے کتے بھی شامل تھے جن کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔

میں نے آنکھیں سکوڑیں۔ تاریکی میں مجھ سے صرف سات آٹھ گز کی دوری پر ایک خوفناک کتا موجود تھا' اس کی سفاک آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ریوالور لانا نہیں بھولا تھا' اور مزید یہ کہ ریوالور پر سائیلنسر بھی موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ کتے کی غراہٹ خوفناک شور میں بدلتی اور وہ تیر کی طرح مجھ پر جھپٹتا' میں نے عین اس کی پیشانی پر فائر کیا۔ سائیلنسر سے ٹھک کی مدھم آواز آئی اور کتا ایک کراہ کے ساتھ کچی زمین پر گرا۔ میں نے اس کے جسم کو بس ایک جھٹکا کھاتے دیکھا پھر وہ ساکت ہو گیا۔ اسی دوران میں مجھے وہ مخصوص آواز سنائی دی جو کسی جانور کے بہت تیز بھاگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا کتا پہلو سے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ میں نے خود کو پشت کے بل زمین پر گرا کر خود کو کتے کی مہلک جھپٹ سے بچایا۔ کتا اپنی جھونک میں چند قدم آگے گیا۔ اسی دوران میں میرے ریوالور نے دو خاموش شعلے اگلے اور یہ جانور بھی لوٹ پوٹ ہو گیا۔ یہ دونوں بڑے قیمتی کتے تھے۔ پندرہ روپے کی تین گولیاں انہیں زندگی سے محروم کر گئی تھیں۔ دوسرے کتے کو جب گولیاں لگیں تو اس کے حلق سے کچھ آوازیں نکلی تھیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ آوازیں گیٹ پر موجود چوکیدار کو کوٹھی کے اس حصے کی طرف کھینچ سکتی ہیں۔ میں دوڑ کر اس کونے میں چلا گیا جہاں سے چوکیدار برآمد ہو سکتا تھا۔ میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا۔ دو سیکنڈ بعد تیز قدموں کی آواز آئی پھر کسی نے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں کہا "اوے جیکی۔ کی ہویا اے۔ اوے جیکی۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک لحیم شحیم سایہ دیوار کی اوٹ سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں وزنی رائفل صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ دیوار کی طرف بڑھا۔ وہ عقبی حصے میں روشنی کے لیے غالباً ٹیوب لائٹ جلانا چاہ رہا تھا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچی۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھا۔ اس نے اپنی گردن چھڑانے کے لیے بے پناہ زور مارا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہڈی ٹوٹنے کی وہی مخصوص آواز آئی جو اعلان کرتی ہے کہ ایک اور زندگی نے اپنا رشتہ موت سے جوڑ لیا ہے۔ لحیم شحیم شخص کا جسم بوری کی طرح میرے بازوؤں میں لٹک گیا۔ اس کی گرتی ہوئی وزنی رائفل کو میں نے اپنے پاؤں کے پشت پر روکا پھر فرش پر

لڑھکا دیا۔

مرنے والے کے منہ سے الائچی سپاری پان کی خوشبو آرہی تھی۔ پان کا لعاب خون کی طرح اس کے گلے پر بہنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے اسے آرام سے فرش پر لٹایا اور پھر گھسیٹ کر گہری تاریکی میں کردیا۔ چند سیکنڈ تک میں نے سن گن لی۔ ساہی صاحب کی اطلاع کے مطابق کوٹھی میں صرف دو ملازم موجود تھے لیکن یہ تعداد زیادہ بھی ہوسکتی تھی۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں بہت کچھ "پراسرار" ہے۔ ساہی صاحب کی معلومات کے مطابق "اس کوٹھی میں فی الحال فرنیچر اور کراکری وغیرہ کے سوا کچھ نہیں تھا مگر مجھے اس بات پر یقین نہیں تھا۔ مسلح افراد اور نہایت قیمتی ریوالور عام اشیاء کی حفاظت کے لیے نہیں رکھے جاتے۔

اتفاقاً مجھے "مین انٹرینس" کھلی ہوئی مل گئی۔ میں اس کشادہ دروازے سے اندر داخل ہوا۔ کوٹھی کے دروازے بلند و بالا تھے۔ فرش پر قالین تھے۔ میں نے ایک شخص کو سامنے ایک کمرے میں صوفے پر بیٹھے دیکھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا یہ بھی ایک کرخت چہرہ شخص تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا ضرور، لیکن اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں گیٹ پر موجود شخص کی اجازت سے اندر داخل ہوا ہوں۔ وہ اپنی بڑی بڑی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا چلا جا رہا تھا' جیسے مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے زبان ہلانا بھی شان کے خلاف سمجھتا ہو۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا تب بھی وہ متکبرانہ انداز میں میری طرف دیکھتا ہی رہا۔ میرے سر میں آگ سی دہک رہی تھی۔ میں نے ایک دم اس کی گردن یوں دبوچی کہ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔ اس کا کڑیل جسم زور سے تڑپا پھڑکا لیکن میری گرفت سے نہ نکل سکا۔ وہ میری طرف پھٹی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ مجھے اسٹار جانانی کی حیثیت سے جانتا ہے۔ ایسا شخص میرے لیے کارآمد ہوسکتا تھا لیکن اگلے چند لمحوں میں مجھے اس سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ کسی اندرونی کمرے سے چاپ کی آواز ابھری اور میری طرف بڑھنے لگی۔ میں نے اپنی گرفت میں آئے ہوئے شخص کو بے ہوش کر کے صوفے کے پیچھے ڈال دیا اور نئے آنے والے کے لیے تیار ہوگیا لیکن یہ جو کوئی بھی تھا میرے سامنے آنے کی بجائے اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ اس کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز میں نے صاف سنی۔

میں نے قریباً پانچ منٹ تک اسی کمرے میں قیام کیا اور اردگرد کی سن گن لی پھر محتاط قدموں سے میں بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سائیلنسر لگا ریوالور بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ بلند دروازوں والی اس کوٹھی کے اندر سے مجھے ایک اسرار کی خوشبو آرہی تھی۔ میں اوپری منزل پر پہنچا۔ گراؤنڈ فلور کی طرح یہ بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی' فقط ایک کمرے میں روشنی کے آثار تھے۔ اس کمرے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک اور کمرے کے اندر سے گزرنا پڑا۔ مجھے گفتگو کی مدھم آواز آئی مگر آواز صاف نہیں تھی۔ بولنے والا شخص اس کمرے کے دوسرے گوشے میں بیٹھا تھا۔ آواز کو صاف سننے کی کوشش میں مجھے ایک راہداری سے گزر کر کمرے کے پہلو میں آنا پڑا۔ یہ کوٹھی کا خاص الخاص حصہ تھا۔ کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ راہداریوں میں مکمل تاریکی تھی۔ میں نے ایک کھڑکی سے کان لگائے۔ بس ایک شخص کی آواز ہی مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ فون پر بول رہا ہے۔ میں نے ذرا دھیان سے آواز کے زیر و بم پر غور کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر میرے سر میں آگیا ہے۔ میں اپنی جگہ ششدر بیٹھا رہ گیا۔ یہ بگ باس ہارون پاشا کی آواز تھی۔ یہ آواز میں نے کئی مرتبہ چوہدری وحدت کی کوٹھی میں ٹیلی فون پر سنی تھی۔ میں اس آواز کو پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ الفاظ مکمل طور پر میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ ہارون پاشا ویسا ہی ٹیلیفونک خطاب کر رہا ہے جیسا میں سن چکا تھا۔

یہ کیا اسرار تھا۔ پاشا گینگ کے لوگ اپنی تمام تر ہوشیاری اور عیاری کے باوجود یہی سمجھتے تھے کہ باس پاکستان میں موجود نہیں' وہ امریکا سے بات کرتا ہے۔ کم از کم چوہدری وحدت اور اشرف چیتا وغیرہ تو یہی سمجھتے تھے۔ باس کی فون کال آتی تھی تو وحدت وغیرہ کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ باس سے گفتگو کرتے ہوئے ان کا انداز ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کہیں دور دراز بیٹھے ہوئے شخص سے بات کی جاتی ہے۔ شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دور دراز بیٹھا ہوا شخص چند کلومیٹر دور گارڈن ٹاؤن میں موجود ہے (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کال کے سلسلے میں باس واقعی بے حد احتیاط کرتا تھا۔ یہ کال پہلے امریکا پہنچتی تھی وہاں سے خصوصی تکنیک کے ساتھ دوبارہ پاکستان آتی تھی۔ اس مواصلاتی شعبدہ بازی پر یقیناً کافی خرچہ اٹھتا تھا لیکن گینگ کے کروڑپتی سرغنہ کو اس خرچے کی بھلا کیا پروا ہوسکتی تھی)

کمرے میں ہونے والی گفتگو کے چیدہ چیدہ الفاظ میری سمجھ میں آرہے تھے۔ باس یقیناً چوہدری وحدت کی ناگہانی

موت پر بات کر رہا تھا۔ ایک دو بار اس کی زبان سے میں نے وحدت کا نام سنا' پھر "جہاں داد" کا لفظ بھی کانوں میں پڑا۔ اس کی زبان سے جہاں داد کا نام سن کر انجانی سی خوشی ہوئی۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ غالباً ساتھیوں کو یقین دلا رہا تھا کہ چوہدری وحدت کا خون رائیگاں نہیں جائے گا' اور اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا' وغیرہ وغیرہ۔

میرا اندازہ تھا کہ "باس" کی یہ آواز اسی ساؤنڈ پروف کمرے میں سنی جا رہی ہے جہاں اس سے پہلے میں نے گینگ کے "معزز" ارکان کو یکبار دیکھا تھا۔

میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ جسم میں پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک جوش کی ایک بے پایاں لہر دوڑنے لگی تھی۔ بالآخر میں اس پاشا گینگ یا تنظیم کے سرغنہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی اور یکے بعد دیگرے تین کھڑکیوں پر دباؤ ڈالا۔ ایک کھڑکی کو اندر سے چٹخنی نہیں چڑھائی گئی تھی۔ کھڑکی بے آواز کھلتی چلی گئی۔ کمرے میں صرف ایک ہی شخص موجود تھا اور وہ ایک جدید ٹیلی فون سیٹ کے سامنے بیٹھا بات کر رہا تھا۔ کھڑکی کھلنے کے منظر نے اسے چونکا دیا۔ وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگا' میں ذرا تاریکی میں تھا لیکن وہ تاریکی میں نہیں تھا۔ وہ پوری روشنی میں تھا۔ میں اسے دیکھ کر سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ اشرف چیتا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نادر جتّی کے کارندے سے یہاں اس کمرے میں اس طرح ملاقات ہوگی۔ اشرف چیتا بھی پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر ہم دونوں ہوش میں آئے لیکن پہلے میں ہوش میں آیا تھا۔ میں جست لگا کر کھڑکی کے راستے کمرے میں آیا۔ اس سے پہلے کہ اشرف چیتا ریسیور میں کچھ کہتا میں نے کریڈل کا لیور دبا کر سلسلہ منقطع کردیا۔ میرے ریوالور کی نال اتنی تیزی سے چیتے کی کنپٹی پر آئی تھی کہ اسے جنبش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اشرف چیتا نے ریسیور واپس رکھنے میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں نے اسے نشانے پر رکھا اور اس سے چند فٹ دور ہٹ گیا۔ چند لمحے تک اس کمرے میں ایک سنسنی خیز خاموشی طاری رہی' پھر میں نے کہا "تو تم ہو پاشا گینگ کے بگ باس۔"

وہ عجیب لہجے میں بولا "چوہدری وحدت کا قتل ہی کوئی معمولی کام نہیں تھا' لیکن تم نے یہاں تک پہنچ کر ایک ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ ہوگی۔"

اشرف چیتا کا لب و لہجہ حیران کن حد تک بدلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ دیہاتی انداز میں بات کرتا تھا اور الفاظ بھی دیہاتی طرز کے ہوتے تھے لیکن آج اسے سن کر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت پڑھا لکھا بندہ بات کر رہا ہے اور لب و لہجہ ہی نہیں اشرف چیتا کی پوری شخصیت ہی بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے بارے میں تصور ایک بیمار اور بھدے چیتے کا تھا۔ ایک ایسا معمولی غنڈا جو اپنا بہترین وقت گزار چکا تھا اور اب صرف تجربے کے زور پر چند ماتحتوں پر حکم چلاتا تھا لیکن آج جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا مجھے اس کے بدن میں برق سی کوندتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ وہ "چیتا" تو ہرگز نہیں تھا۔

میں نے کہا "تو تم تسلیم کرتے ہو کہ تم ہی بگ باس ہو۔"

وہ درندگی سے بھرپور لہجے میں بولا "میں کچھ بھی تسلیم نہیں کر رہا۔ آج جو کچھ تسلیم کرنا ہے' تم کو ہی کرنا ہے۔"

اس کے لب و لہجے نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ ایک بھڑکتی ہوئی آگ تھی اس کے لفظوں میں۔ ہاں ــــ یہ وہ "چیتا" ہرگز نہیں تھا لیکن اگر یہ وہ چیتا نہیں تھا تو میں بھی وہ جہاں داد نہیں تھا۔

میں نے ریوالور اس کے سینے کی طرف سیدھا رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں شوٹ کرسکتا ہوں۔ تمہارے سینے پر گولی ماروں گا تو راہئ عدم ہو جاؤ گے۔ ٹانگوں پر چلاؤں گا تو زخمی ہو کر گر پڑو گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم ہلاک یا زخمی ہوئے بغیر خود کو میرے حوالے کردو۔"

وہ اطمینان سے قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "گولی چلاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔"

یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ اشرف چیتا بلاوجہ صوفے پر نہیں بیٹھا۔ غالباً صوفے کے بائیں ہتھے میں کوئی "چمتکار" موجود تھا۔ کوئی خاص بٹن یا کھٹکا وغیرہ "خبردار!" میں نے بھڑک کر کہا "اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ۔"

اس نے ہاتھ اوپر تو نہیں اٹھائے لیکن گود میں ضرور رکھ لیے۔ اتنے میں مجھے کہیں پاس سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی عورت خراماں خراماں چلتی اس خاص کمرے کی طرف آرہی تھی۔ اس کی اونچی ایڑی' فرش پر کھٹ کھٹ بج رہی تھی۔ میں نے اپنی پشت اس طرح دیوار کے ساتھ لگالی کہ دروازہ میرے بائیں ہاتھ رہ گیا۔ اگر کوئی اندر داخل ہوتا

تو فوری طور پر مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا پھر مقفل دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور ایک دراز قد عورت اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی۔ ٹرے میں کافی کے دو کپ بھاپ دے رہے تھے "لو جناب! گرم گرم کافی۔" جواں سال عورت نے بڑی ادا سے کہا۔

نجانے کیوں اسے دیکھ کر ہی مجھے لگا کہ وہ کوئی ہندو عورت ہے۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ وہ بڑی چست شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ یکایک عورت کو اندازہ ہوا کہ کمرے میں کوئی گڑ بڑ ہے۔ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ ٹرے اس کے ہاتھ میں ڈگمگائی اور گر گئی۔ پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ کافی قالین پر بکھر گئی۔ عورت کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ وہ کبھی اشرف چیتا کو دیکھ رہی تھی کبھی مجھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس عورت کو میں نے کہیں نہ کہیں دیکھا ہے۔ جب شروع میں ہم نے دفینے کا مال اسباب ایک ٹرک میں لادا تھا اور ٹرک بھٹک کر انڈین علاقے میں گھس گیا تھا تو شاید انہی دنوں کہیں اس عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔

عورت کے تاثرات نے گواہی دی کہ وہ مجھے شاہ جہاں کی حیثیت سے پہچان گئی ہے اور اب ازحد پریشان دکھائی دیتی ہے۔

عورت کے تاثرات کو اشرف چیتا نے بھی نوٹ کیا۔ وہ چند سیکنڈ تک عورت کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے بولا "تم اس کو پہچانتی ہو؟"

وہ کھنکھناک سے بولی "یہی تو شاہ جہاں ہے اس کا ذکر شنکر صاحب نے کیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" اشرف چیتا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں۔ یہی ہے استاد جہانی۔" وہ ہکلا کر بولی۔

اشرف چیتا کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ سناٹے کے عالم میں تھا اور میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ جس طرح تھوڑی دیر پہلے اشرف چیتا نے مجھے ششدر کر دیا تھا اب وہ سکتے کی کیفیت میں تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی عام غنڈہ نہیں ہے۔"

"اب اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ خود کو میرے حوالے کر دو۔" میں نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ وہ بولا "میں تم سے متاثر ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ تمہاری خواہش پوری کر دوں۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کڑک کر پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو یہ چھوٹا ٹی وی سیٹ آن کر دوں۔" اس نے ٹی وی سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میری انگلی لبلبی پر تھی۔ اس نے ٹی وی سیٹ آن کیا۔ اس کے چند بٹن دبائے اسکرین پر جو منظر ابھرا اس نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ اسی نوبل کلب کا منظر تھا جہاں میں نے کم سن لڑکیوں کو شراب کے جاموں کے ساتھ گردش میں دیکھا تھا۔ پہلے کلب کے باہر کا منظر اسکرین پر آیا۔ یہاں شریفانہ ... جتنا شریفانہ طریقے سے ہوتا تھا۔ اس کے بعد اشرف چیتا نے مزید بٹن دبائے تو نوبل کلب کے اندرونی مناظر اسکرین پر ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ میری اور شنکر کی زوردار لڑائی سے نوبل کلب کے ہال کمرے کا جو نقصان ہوا تھا وہ پورا کر دیا گیا تھا۔ شیشے کی بنی ہوئی میزیں ایک بار بھرپوری آب و تاب سے چمک رہی تھیں۔ ان میزوں کے گرد نوخیز لڑکیاں تتلیوں کی طرح چکرا رہی تھیں اور شرابی نگاہیں انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان مناظر میں میں نے منو کالا کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ وہ کیمرے کی طرف پشت کیے ایک فربہ اندام شخص سے بات کر رہا تھا۔ دونوں سیمنٹ کی ایک تنگ سے کوریڈور میں کھڑے تھے۔ تب اچانک اسکرین پر ایک کمرے کا منظر ابھرا بظاہر یہ کسی اسپتال کا کمرا لگتا تھا لیکن کھڑکیوں دروازوں اور ان کے رنگ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ نوبل کلب کا ہی کوئی حصہ ہے جسے اسپتال کے کمرے کی شکل دے دی گئی ہے۔ ایک بیڈ پر مجھے شنکر پڑا نظر آیا۔ اس کی ٹانگ پلاسٹر میں جکڑی ایک تکیے کے اوپر رکھی تھی۔ وہ واکی ٹاکی پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ایک خوب رو نرس اس کے سرہانے چوکس کھڑی تھی۔

واکی ٹاکی پر بات ختم کرنے کے بعد شنکر شنکرا نے کیمرے کی طرف دیکھا۔ اشرف چیتا بولا "شنکر بھائی! یہ دیکھو تمہارے لیے کیسا تحفہ ہے میرے پاس۔ کیا یہی ہے شاہ جہاں؟"

شنکر نے غور سے اس ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہمیں یہی لگ رہا تھا کہ شنکر ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر وحشت کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ وہ چند سیکنڈ تک مجھے دیکھتا رہا پھر اوپر نیچے سر ہلا کر بولا "ہاں یہی ہے۔" پھر شنکر شنکرا براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا "اگر تھوڑی بہت شرم بھی تمہارے اندر ہے تو اپنی مونچھیں صاف کرا دو یا کم از کم ان کو نیچی کر لو۔"

"میں نے تمہارے پریوار کی عورتوں کے ساتھ بلادکار کیا ہے کہ شرم سے مونچھیں نیچی کر لوں۔"

وہ گالی بکتے ہوئے بولا "تم نے اپنی غیرت کے ساتھ بلادکار کیا ہے۔ اس طرح دھوتی اٹھا کر تو ہیجڑے بھی نہیں بھاگتے جس طرح تم یہاں سے بھاگے تھے۔ کاش کوئی کیمرا مین ہوتا تو وہ تمہارے دم دبا کر بھاگنے کی تصویر کھینچ سکتا۔ جن گدھوں نے اس لڑائی میں تم پر شرطیں لگائی تھیں۔ وہ آج بھی بیٹھے تمہاری جان کو رو رہے ہیں۔ کیا بھاگنا تھا تمہارا۔ بھگوان کی سوگند کمال کر دیا۔"

میں نے کہا "تمہارے کردار کی طرح تمہارا حافظہ بھی بہت کمزور ہو چکا ہے شنکر بھارتی۔ تمہیں اپنا بھاگنا بھول گیا ہے۔ انارات کا صحرا تمہیں یاد ہو گا اور الماجد کی محبوبہ نے جو مقابلہ کرایا تھا وہ بھی یاد ہو گا۔ وہ زندگی موت کا مقابلہ تھا، اس میں بھاگنے کا آپشن موجود ہی نہیں تھا لیکن تم۔ جنٹ بھاگے تھے۔" شنکر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ اس نے کچھ کہا لیکن ٹی وی اسکرین پر آواز مجھے صاف سنائی نہیں دے سکی۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اور اگر پھر بھی تمہارا اصرار ہے کہ میں نے بھاگ کر بزدلی دکھائی ہے تو اب فیصلہ کر لو۔ میں پھر حاضر ہوں۔ تم نے یا تمہارے کسی یار دوست نے دل کے ارمان نکالنے ہوں تو ابھی اسی وقت نکال سکتا ہے۔"

اشرف چیتا بولا "ارمان بھی نکالیں گے اور ضرور نکالیں گے لیکن پہلے تمہاری تھوڑی سی بے عزتی تو کر لیں۔"

حالانکہ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا لیکن وہ ایسے اعتماد سے بول رہا تھا جیسے اس نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہو۔ میں نے کہا "تم نے جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔"

وہ گفتگو کے دوران میں ہی پھر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے اسے وارننگ دی "اپنے ہاتھ صوفے سے دور رکھو۔"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ صوفے کے ہتھے پر رکھا اور بٹن دبا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں فائر کرنے کا فیصلہ کرتا زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی تھی۔ میں ایک سیکنڈ ہوا میں معلق رہنے کے بعد کسی نہایت نرم گداز چیز پر گرا۔ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ قریباً آٹھ فٹ مربع کے جس خلا سے میں نیچے گرا تھا وہ اتنی ہی تیزی سے بند ہو گیا، جتنی تیزی سے نمودار ہوا تھا۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ دیواروں پر ہیجان خیز تصویریں تھیں۔ جس نرم گداز چیز پر میں گرا تھا وہ ایک شاندار بیڈ ہی تھا۔ یہ جہازی سائز بیڈ لمبائی میں قریباً نو فٹ اور چوڑائی میں سات فٹ سے کم نہیں تھا۔ اسے ایک لگژری سائز بیڈ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کی موٹائی چار فٹ کے قریب تھی اور اس میں خاص تکنیک سے پرندوں کے پر بھرے گئے تھے۔ بڑے بڑے نرم گدیلوں اور گدیوں نے اسے مزید آرام دہ اور خواب ناک بنا دیا تھا۔

میں نے بلند آواز میں پہلے شنکر شنکرا اور پھر اشرف چیتا کو پکارا۔ میری آواز کمرے میں ہی چکرا کر رہ گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازے پر زور آزمائی کی لیکن وہ باہر سے مقفل تھا۔

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا ندر کنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

میں نے شنکر اور اشرف کو بلند آواز سے گالیاں دیں پھر میں خواب گاہ کے دروازے پر فائر کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ پہلو سے چھن کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ جس وقت میں خواب گاہ کے بڑے دروازے کی طرف متوجہ تھا ایک بغلی دروازہ بے آواز کھلا تھا اور ایک چلتی پھرتی قیامت اندر آ گئی تھی۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بلا کی خوب صورت تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ برس رہی ہوگی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ دلہن کے لباس میں تھی۔ نہایت قیمتی جھلملاتا ہوا سرخ جوڑا، ہاتھوں میں مہندی، کلائیوں میں چوڑیاں اور گجرے۔ اس نے سولہ سنگھار کر رکھے تھے اور گہنوں میں بھی کوئی کسر نہیں تھی۔ "بندی سلام عرض کرتی ہے۔" اس نے اپنا جھلملاتا ہاتھ ماتھے پر لے جا کر کہا۔

اس کی آواز نے میری کھوپڑی میں ہزار پاور کا بلب روشن کر دیا۔ یہ آواز میں نے پہلے بھی سنی تھی۔ لیکن کہاں؟ دفعتاً مجھے یاد آ گیا۔ بھائی جی کے پڑوس میں ڈکٹا فون کے ذریعے یہ آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔ منھو کاکا نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ "شہ پارہ" بھائی جی کو دکھایا تھا اور واقعی بھائی جی کی رال ٹپک پڑی تھی۔ منھو کاکا نے بھائی جی کو بتایا تھا کہ لڑکی کا باپ سوتیلا ہے اور اپنی ضرورت کے تحت اس حسین شاہکار کو چند ہیلی راتوں کے لیے اونے پونے بیچ رہا ہے۔ بعد ازاں بھائی نے اس شاہکار کی ایڈوانس قیمت بھی منھو کاکا کو دے ڈالی تھی۔

اس وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ حسین و جمیل لڑکی جسے دیکھ کر بھائی جی جیسے محتاط شخص کے بھی ہوش اڑ گئے ہیں۔ ایک روز میرے روبرو ہوگی اور سراپا دعوت ہوگی۔

میں نے لڑکی سے پوچھا "کون ہو تم۔ کیا لینے آئی ہو؟"

وہ ایک دلہن ہی کی طرح پلکیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ اس کا معصوم حسن ایک آگ کی طرح دیکھنے والے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سدھائے ہوئے جانور جیسی لڑکی یہاں کیوں آئی ہے۔ یا کیوں بھیجی گئی ہے؟

بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود لڑکی کو تنہا یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑکی کی چیتا وغیرہ کے نزدیک بہت اہمیت نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر بھی ان لوگوں سے کوئی بات منوا نہیں سکتا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے میں لگے ہوئے کسی خفیہ مائیک سے اشرف چیتا کی زہریلی آواز ابھری "شاہ جہاں! تمہارے بارے میں بہت سنا تھا، آج تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس مہمان خانے تک پہنچنے پر تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہوگی۔"

میں نے مائیک کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا "مطلب کی بات کرو۔ کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "فی الوقت تو یہی چاہتا ہوں کہ تم یہاں شرافت سے رہو۔ لڑکی پر گولی وغیرہ چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بس تم اپنی سزا کو مزید سخت کرو گے اور ہاں دروازوں پر بھی قسمت آزمائی نہ کرنا۔ یہ دھاتی دروازے ہیں، نہ تم ان دروازوں کو توڑ سکتے ہو نہ ان کے تالوں کو۔ بس ایک دو دن سکون سے یہاں گزار لو، پھر ہم تمہیں نکال لیں گے۔"

"ان دو دنوں میں مجھے تمہارے گھر والوں کے ساتھ کیا "کرنا" ہوگا؟" میں نے بھنا کر پوچھا۔

جواب میں خاموشی رہی۔ مائیک بند ہو چکا تھا۔ لڑکی چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے اپنے حنائی ہاتھ میں میرا بازو پکڑا اور خوب صورت بیڈ کی طرف لے آئی۔ اس کے لباس اور میک اپ سے اٹھنے والی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ اس نے بڑی نرمی کے ساتھ میرے ہاتھ سے سائیلنسر لگا ریوالور پکڑا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا "کیا آپ کی جیکٹ اتار دوں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی اپنے ہاتھ جیکٹ کی طرف بڑھا دیے۔ خاردار تاروں پر پھینکنے کی وجہ سے جیکٹ کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

مجھے گرمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے جیکٹ اتارنے دی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کمرے میں ہونے والی حرکات و سکنات کو کہیں اور دیکھا جا رہا ہوگا اور جہاں تک سننے کی بات ہے اس کا ثبوت تو ابھی تھوڑی دیر پہلے مل ہی گیا تھا۔ یہ بات تو یقیناً شنکر اور چیتا بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ میں اس کمرے میں ان کی مرضی و خواہش کے مطابق کوئی حرکت کروں گا اور نہ کچھ بولوں گا پھر اس حسین قیامت کو دلہن کے ترنگ آمیز لباس میں یہاں بھیجنے کا مقصد کیا تھا۔ وہ لوگ کیا چاہتے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی بے چاری بھی چیتا وغیرہ کے اصل منصوبے سے بے خبر ہی ہے۔ وہ دعوت انگیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات "رجھانے" والی تھیں۔ شاید وہ نوخیز حسینہ سمجھ رہی تھی کہ مجھے رجھانا اور جسمانی قربت پر مائل کرنا ہی اس کا فرضِ منصبی ہے۔

اس نے کچھ کہے سنے بغیر میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے شروع کر دیے۔ میرے روکتے روکتے وہ میرے بوٹ اتار چکی تھی۔ اس کا ہر انداز قیامت تھا۔ میں نے اسے پانی لانے کے لیے کہا۔ اس نے گلاس نکالنے کے لیے الماری کھولی اور جان بوجھ کر کھلی رہنے دی۔ اس الماری میں وسکی کی نئی بوتلیں بڑی پرکشش نظر آ رہی تھیں۔ غالباً وہ مجھے رجھانے کے لیے اپنے شباب کی بے پناہ طاقت کے ساتھ ساتھ شراب کی طاقت بھی استعمال کرنا چاہتی تھی۔

وہ پانی لے کر آئی اور بڑی نزاکت سے گلاس مجھے تھما دیا۔ اس کے ہاتھ بھی سونے دلہن کے ہاتھ تھے۔ مہندی لگی ہوئی تھی، چوڑیاں، انگوٹھیاں، پنجانگلا سب کچھ موجود تھا۔ وہ قاتل دلآویز حسن کی مالک تھی۔ نہایت غیر یقینی حالات کے باوجود میں اس کی خطرناک قربت کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

وہ مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ پانچ دس منٹ تک مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ پہلے اس کا انداز جھکا چھپا تھا پھر بالکل واشگاف ہونے لگا۔ وہ از خود الماری سے بوتل نکال لائی اور اپنی نازک بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں نے اسے جھڑک کر دور ہٹایا تو ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ منہ پھیر کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اپنے نوخیز حسن کی چکا چوند سے جسمانی قربت پر مائل کرنا اس بے چاری کی مجبوری ہے۔ میں نے اپنا رویہ اس کے ساتھ قدرے نرم کر لیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ عام سی تعارفی بات چیت تھی۔ یعنی وہ کہاں کی رہنے والی ہے، کہاں تک پڑھی ہے۔ اس کا والد کیا کرتا ہے، اسے ماڈلنگ کا شوق تھا۔ وہ اس شوق کے بارے میں بتانے لگی۔

میں نے اس سے کہا "تم جانتی ہو کہ ہماری یہ باتیں مائیکروفون کے ذریعے اس کمرے سے باہر سنی جا رہی ہیں۔"

"نہیں سنی جا رہی ہیں۔" وہ یقین سے بولی "یہ دیکھیں۔ میں نے یہ بٹن آف کر دیا ہے۔" اس نے سائیڈ ٹیبل کے پاس ایک بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں مانتا۔ ہماری باتیں ضرور سنی جا رہی ہیں بلکہ ہو سکتا ہے ریکارڈ بھی کی جا رہی ہوں۔"

وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ ایسا نہیں ہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا پھر شاید وہ محسوس کرنے لگی کہ میں تھوڑا بہت قائل ہو گیا ہوں۔

وہ کہنے لگی "شش۔ شاید آپ کو یہ ذہنی بوگ۔ یہاں کوئی خفیہ کیمرا وغیرہ موجود ہوگا۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کوئی ایسا نیشہ نظر نہیں آئے گا جسے کیمرے کا لینز سمجھا جا سکے۔"

میں لڑکی کے کہنے سے پہلے ہی طائرانہ نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لے چکا تھا۔ بظاہر تو واقعی کوئی ایسی نشانی دکھائی نہیں دے رہی تھی پھر غالباً میری مزید تسلی کے لیے اس نوخیز حسینہ نے لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسی تاریکی جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ایسی تاریکی جس میں بندے کے بھٹکنے کا احتمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ بے چاری اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مجھے بھٹکانے کی پوری کوشش کرنے لگی۔ وہ تاریکی میں کھلی ہوئی تھی لیکن اس کا "دلہن والا روپ" اتنا طاقت ور تھا کہ وہ اوجھل ہونے کے باوجود دکھائی دے رہی تھی۔

جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ناکام کوشش کر رہی ہے۔ اس نے کمرے کی لائٹ پھر سے جلا دی۔ اپنے بال سمیٹے اور افسردہ سی ایک جانب بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں اچانک مجھے محسوس ہوا کہ نتھنوں میں کوئی ناگوار سی بو گھس رہی ہے۔ میں نے شکیلہ یا اس لڑکی کو دیکھا، وہ بھی پریشان سی ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بو کا ماخذ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ایک دم ہی ہوا۔ میرا سر تیزی سے چکرایا اور ٹانگوں میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یکایک آنکھوں کے سامنے ایک سفید دھند پھیل گئی۔ میں نے شکیلہ کی ہلکی سی چیخ سنی۔ میرے منہ سے اشرف چیتے کے لیے ایک گالی نکلی پھر سہارے کی تلاش میں ہاتھ لہراتا ہوا میں قالین بوس ہو گیا۔

○☆○

دوبارہ ہوش آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں جہازی سائز کے اسی نہایت نرم و دبیز بستر پر ہوں جہاں بے ہوش ہونے سے پہلے تھا۔ یہ بستر اتنا گداز اور دبیز تھا کہ بندہ اس میں دھنستا ہوا محسوس کرتا تھا۔ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہوا۔ ایک عجیب سی نقاہت رگ و پے میں اتری ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے مجھے بے ہوش ہونے سے پیشتر کے واقعات یاد آنے لگے۔ میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کافی دیر بے ہوش رہا ہوں۔ مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہو رہی تھی اور بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔

رابس آیا تو کمرے میں اشرف چیتا کی منحوس آواز گونجی "سنار' استاد جانی۔ کیا حال چال ہیں؟"

"حال تو ٹھیک ہے۔ چال تمہاری ہمشیرہ نے بگاڑنے کی کوشش کی تھی' میں نے یہ کوشش ناکام بنادی۔"

"اچھا یار! اب غصہ تھوک دو اور ہمارے ساتھ کچھ تعاون فرماؤ۔"

"کیسا تعاون؟"

"یہاں تمہاری آمد کے بارے میں اور کس کس کو معلوم ہے۔"

"پولیس اس بارے میں جانتی ہے۔ ساہی صاحب اور ان کے ماتحت میرا زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"

"پولیس کو یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ پولیس کے علاوہ بتاؤ۔ یہاں کون تمہارے پیچھے آکر اپنی عاقبت خراب کرسکتا ہے؟"

"اگر میں نہ بتاؤں تو؟"

اشرف چیتا نے قہقہہ لگایا "جہاں تم پہنچ گئے ہو جانی! یہاں میری حکم عدولی دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ آئندہ ایک دو روز میں میرے الفاظ کی سچائی کا علم تمہیں خود ہی ہوجائے گا۔ یہاں تمہارا ناطقہ سرصرف "ہاں" میں ہلے گا۔ نہ چاہو گے تو بھی بس ہلتا ہی رہے گا۔" اشرف کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ یہ کسی معمولی شخص کا لہجہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسے بگ باس کا لہجہ تھا جو ملک میں تخریب کاری کا وسیع و عریض نیٹ ورک چلا رہا تھا اور درجنوں گھاگ مجرموں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

اشرف چیتا کی صورت میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور مجھے وہ سارے واقعات یاد آرہے تھے جن میں اشرف چیتا' بلدرجگی کے معمولی کارندے کی حیثیت سے میرے اردگرد موجود رہا تھا۔ درحقیقت چیتے میں چیتے جیسی عیاری ہی موجود تھی۔ وہ ایک معمولی کارکن کی حیثیت سے ہمہ وقت پاشا تنظیم کے ممبروں کے درمیان رہتا تھا اور ان پر بے مثال گرفت رکھتا تھا۔ وہ ایک زبردست اداکار بھی تھا۔ میں نے ماضی پر نگاہ دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ ایک دو واقعات کے سوا مجھے کبھی چیتے پر کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ چیتا سرونٹ کوارٹر میں میرے ساتھ ڈھیروں باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ اس بات پر رشک کا اظہار کرتا رہتا تھا کہ میں بگ باس سے بات کرنے کا اعزاز حاصل کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھے یہ اعزاز دینے والا وہ خود ہی تھا۔ مجھے پہلی دفعہ چیتے پر موہوم سا شک اس وقت ہوا تھا جب چیتا میرے پیچھے ہی پیچھے بہاولپور سے لاہور آگیا تھا اور ریواز گارڈن والی کوٹھی میں میرے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں ہی مقیم ہوگیا تھا۔

حالانکہ وہ گینگ میں مجھ سے سینئر تھا اور چاہتا تو سرونٹ کوارٹر کے بجائے کسی کمرے میں رہ سکتا تھا۔ آخری مرتبہ یہ شک بھائی جی کے قتل کے بعد اس کی رہائش گاہ سے واپسی کے موقعے پر ہوا تھا۔ گلبرگ کے قریب اشرف چیتا اپنا سرخ مزدا گاڑی پر اچانک ہی میرے پیچھے لگ گیا تھا۔

یہ سارے خیالات چند سیکنڈ کے اندر میرے ذہن میں سے گزر گئے۔ کمرے میں لگے ہوئے اسپیکر خاموش ہوچکے تھے۔ گفتگو درمیان میں چھوڑ کر اشرف چیتا نے سلسلہ منقطع کردیا تھا۔

مجھے عجیب سی نقاہت محسوس ہورہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جسم میں سے کسی نے آدھی جان کشید کرلی ہے۔ میں نے اپنا بازو موڑا تو کندھے پر دکھن سی محسوس ہوئی۔ وہی دکھن جو انجکشن لگنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شاید بے ہوشی کے دوران میں مجھے انجکشن وغیرہ لگایا گیا تھا۔ میں نے قمیص کی آستین اٹھا کر بازو کا بغور جائزہ لیا تو تین انجکشنوں کے نشانات دکھائی دیئے۔ مجھے ابھی تک ٹھیک سے یہ اندازہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں۔ میرا سائلنسر لگا ریوالور کمرے میں موجود نہیں تھا۔ نہ ہی وہ نوخیز حسینہ تھی جو میری بے ہوشی سے پہلے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں جلوہ افروز تھی۔ اچانک میرے ذہن میں یہ اندیشہ جاگا کہ کہیں میری بے ہوشی کے دوران میں اس آفتِ جاں کے ساتھ میری تصاویر وغیرہ تو نہیں بنائی گئیں۔

یکایک مجھے اپنے آس پاس ایک عجیب سی گونج محسوس ہوئی۔ جیسے کہیں آس پاس دھماکا ہوا ہو یا شدید قسم کی صوتی لہریں پیدا ہوئی ہوں۔ یہ کمرا جو میرے اندازے کے مطابق ایک تہ خانہ تھا مکمل طور پر سیل بند تھا۔ اس میں دھات کا بنا ہوا فقط ایک ہی سلائیڈنگ ڈور تھا۔ چھت بالکل سپاٹ تھی۔ چھت کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس میں آٹھ ضرب آٹھ فٹ کا ایک خلا بالکل اچانک نمودار ہوسکتا ہے۔ ابھی میں صورتِ حال کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سلائیڈنگ ڈور میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اشرف چیتا ہاتھ میں پسٹل لیے اندر داخل ہوا ہے۔ اس کے ایک کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اشرف چیتے کے ساتھ ایک رائفل بردار گارڈ بھی تھا۔ گارڈ کی انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے شکیلہ بھی اندر آگئی۔

سلائیڈنگ دروازہ کھلتے ہی مجھے وہ مخصوص بو محسوس

نی جو بارود کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا یہ قیافہ درست کہ اس تہ خانے سے باہر کوئی بڑا دھماکا ہوا ہے۔ کمرے میں نے کے بعد اشرف چیتا نے دیوار پر لگے بٹنوں میں سے ایک دبایا اور دروازہ سلائیڈنگ ڈور بند ہوگیا۔ گارڈ کی رائفل کا خ میری طرف تھا اور وہ بالکل چوکس تھا۔ شاید اشرف چیتا نے یہاں گھسنے سے پہلے ہی گارڈ کو بتا دیا تھا کہ وہ میری طرف سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی غافل نہ ہو۔ اشرف چیتا خود وار سے لگا کھڑا تھا۔ پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے پنے زخمی کندھے کو دوسرے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔ اشرف یتا اور گارڈ بار بار چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں سوس ہوتا تھا کہ ان کے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہیں مگر باہر سے تو کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ بس کبھی بھی مدھم گونج سی پیدا ہوتی تھی' جیسے کوئی بڑا دھماکا ہوا ہو ور اس کی لہریں اس زیر زمین جگہ تک پہنچی ہوں۔

قریباً پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس طرح کے دھماکے تو محاذِ جنگ پر رتے ہیں۔ یہ تو ایک ویران سی عمارت تھی۔ جب میں یہاں یا تھا تو صرف تین چار افراد کی موجودگی کا اندازہ ہوا تھا یا پھر و عدد دیو ہیکل کتے تھے جنہیں میں نے پہلی فرصت میں ہی وت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

کچھ دیر بعد اشرف چیتا اور اس کے قوی ہیکل گارڈ کے ہرے قدرے پرسکون نظر آنے لگے۔ در و دیوار میں گاہے گاہے جو گونج محسوس ہوتی تھی وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔

اشرف چیتا نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا' پھر اس کا ہاتھ بالکل اچانک گھوما' میرے جبڑے پر شدید چوٹ لگی۔ دراصل یہ اس وزنی پسٹل کی چوٹ تھی جو چیتے نے تھام رکھا تھا۔ میں دیوار سے جا ٹکرایا اور میرے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔ ایک سیکنڈ کے لیے محسوس ہوا کہ چیتا جنونی انداز میں مجھ پر پل پڑے گا لیکن پھر اس نے اپنے جذبات کی نکیلیں کھینچیں اور قدموں کو روک لیا۔ یقیناً اس کے دماغ نے کام کیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے قریب آنا اس کے لیے خطرناک ہوگا۔ میں اسے اپنے اور گارڈ کے درمیان آڑ بنا کر جوابی حملہ کرسکتا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولا "تیری وجہ سے میرا بہت نقصان ہوا ہے کتے! میں تجھے چیر ڈالوں گا۔ بڑی اذیت دوں گا تجھے۔"

اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ میرے ہونٹوں سے بہنے والا خون قطروں کی صورت قالین پر گر رہا تھا۔

اس کے بعد اشرف چیتا اور اس کے گارڈ کے درمیان جو باتیں ہوئیں ان سے معلوم ہوا کہ ابھی کچھ دیر پہلے پولیس اس عمارت میں آدھمکی تھی اور غالباً اب بھی عمارت میں ہی موجود تھی۔ تلخ کلامی کے بعد پولیس سے باقاعدہ لڑائی ہوگئی۔ فائرنگ اور جوابی فائرنگ ہوئی۔ اس عمارت کے ایک کمرے میں کچھ گولہ بارود چھپایا گیا تھا (یقیناً یہ وہی سامان تھا جو تخریب کاری کے لیے استعمال ہوتا تھا) فائرنگ کے دوران میں اس گولہ بارود میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ نتیجے میں اشرف چیتا اور گارڈز وغیرہ کو بھاگ کر یہاں پناہ لینی پڑی تھی۔

اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اس عمارت پر یہ چھاپا ساہی صاحب نے ہی پڑوایا ہوگا۔ اس چھاپے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا تھا کہ مجھے اس جگہ قید ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے۔ شاید ایک دن سے زیادہ۔ میں اپنی بے ہوشی کے بارے میں ابھی تک یہ اندازہ قائم نہیں کرسکا تھا کہ اس کا دورانیہ کیا رہا ہے۔ تاہم جو بھوک محسوس ہو رہی تھی' اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کافی وقت گزرا ہے۔ میں نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ میں ساہی صاحب کی کوٹھی سے شیو کرکے نکلا تھا لیکن اب رخساروں اور ٹھوڑی پر زیادہ ملائمت نہیں رہی تھی (یہی محسوس ہوا کہ میری بے ہوشی کا دورانیہ بیس چوبیس گھنٹے سے کم نہیں تھا)

گارڈ کی انگلی بدستور رائفل کی لبلبی پر تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ شاید شنکر شکرا نے اشرف چیتا کو میرے بارے میں ساری احتیاطی تدابیر ازبر کروا رکھی تھیں۔ خود اشرف چیتا نے بھی اپنے پسٹل کا رخ میرے سینے کی طرف کر رکھا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے واقعی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر وہ اپنی برداشت کھو کر مجھ پر حملہ کردیتا تو میں اس کے علاوہ اس کے گارڈ کو بھی تارے دکھا دیتا۔

شکیلہ ڈری سہمی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ سکڑ سمٹ کر وہ کچھ اور بھی کم سن دکھائی دے رہی تھی۔ آج بھی وہ دلہن کے لباس میں ہی تھی۔ اس کا بھنوا خوب صورت تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ بس وہ سوالیہ نظروں سے اپنے باس یعنی اشرف چیتا اور گارڈ کی طرف دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اب ان دونوں کے چہروں پر قدرے اطمینان نظر آیا تھا تو وہ بھی کچھ کم خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔

اشرف چیتا قریباً پون گھنٹا اسی پناہ گاہ میں موجود رہا۔ اس پون گھنٹے میں گارڈ عقابی نظر سے مجھے دیکھتا رہا تھا' یوں لگتا تھا جیسے اس نے پلک تک نہیں جھپکی۔ آخر اشرف چیتا

سلائیڈنگ دروازے کی طرف بڑھا۔۔۔ اور یہیں سے ایک نئے بحران کا آغاز ہوگیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے چیتا نے بٹنوں کے پینل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے تین بٹنوں کو خاص ترتیب سے تین چار مرتبہ پش کیا لیکن دروازے نے کھلنے سے انکار کردیا۔ اشرف چیتا کا چہرہ متغیر نظر آنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر افراتفری کے عالم میں کوشش کی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

"یہ کیا ہوگیا ہے؟" اس نے گارڈ سے پوچھا۔

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا جناب!"

"دیکھو تم ٹرائی کرو لیکن نہیں تم رہنے دو۔" بے وقوفی کرتے کرتے چیتا ایک بار پھر عقل مندی کا ثبوت دے گیا۔

اگر گارڈ دروازے کی طرف متوجہ ہوجاتا تو میں حملے کا یہ موقع یقیناً ضائع نہ کرتا۔ چیتا نے خود ہی بار بار کئی بٹنوں کو دبایا پھر جھلا کر اس نے دروازے کو دو تین دھکے دیے اور ٹھوکریں رسید کیں۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اگر دروازے کے میکینزم میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تو وہ ٹھوکروں سے درست ہوجائے گی لیکن یہ بھاری بھرکم دروازہ ایسے بھوت کی طرح نظر آتا تھا جو لاتوں سے بھی نہیں مانتے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اشرف چیتا، گارڈ اور شکیلہ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کمرے کا بس یہی دروازہ تھا، دوسرا دروازہ اس آہنی سلائیڈنگ کو شمار کیا جاسکتا تھا جس نے چھت میں خلا پیدا کر کے مجھے اس نرم و گداز بستر پر گرایا تھا۔ اب اس سلائیڈنگ میں کوئی درز وغیرہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اشرف چیتا اور اس کا گارڈ جلال خان قریباً آدھ گھنٹا دروازے کے ساتھ باری باری کوشش کرتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اشرف چیتا کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ اب یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ عمارت کے بیرونی حصے میں جو زوردار بارود کی دھماکے ہوئے ہیں انہوں نے خاصے پیمانے پر تباہی پھیلائی ہے اور اسی تباہی کے نتیجے میں اس آہنی دروازے کا میکینزم بھی خراب ہوگیا ہے۔ دروازے پر ناکام کوشش کرنے کے بعد اشرف چیتا نے ایک بٹن دبا کر وہ ساؤنڈ سسٹم چیک کیا جس کے ذریعے تہ خانے سے باہر آواز بھیجی جاسکتی تھی۔ یہ سسٹم بھی آؤٹ آف آرڈر تھا۔

اشرف چیتا نے بڑے جھلائے ہوئے انداز میں میری طرف خودکار رائفل سیدھی کی اور بولا "ہم چاہتے ہیں کہ تم تھوڑی دیر کے لیے باتھ روم میں بند ہوجاؤ۔ ہم تمہاری طرف سے بے فکر ہو کر دروازے پر کوشش کرنا چاہتے ہیں۔"

میں خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ شکیلہ نے آگے بڑھ کر باتھ روم کا دروازہ باہر سے بولٹ کردیا۔

اشرف چیتا، گارڈ جلال خان اور شکیلہ کی باتوں کی مدھم آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ وہ خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسی آوازیں آئیں جن سے پتا چلا کہ کمرے کی ایک دیوار گیر الماری کو اس کی جگہ سے گھسیٹا جا رہا ہے۔

الماری کے گھسیٹے جانے کا مقصد بھی کچھ دیر بعد عیاں ہوگیا۔ ان لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ الماری کے عقب میں دروازے کا ہنگامی میکینزم موجود ہے۔ یعنی اگر کسی وجہ سے دروازہ نہ کھل سکے تو اس کا متبادل انتظام یہاں موجود تھا۔

دو چار منٹ خاموشی رہی پھر جلال گارڈ کی اندیشوں میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "نہیں جناب! یہ بھی کام نہیں کررہا۔"

"او مائی گاڈ!" اشرف چیتا کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔ پھر شاید وہ خود ہنگامی بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ چند لمحے بعد اس کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی "تم میرے سر پر کھڑی ہو کر کیوں رو رہی ہو۔ جاؤ بیٹھو آرام جا کر۔"

اشرف چیتا نے یہ جھاڑ یقیناً شکیلہ کو پلائی تھی۔

آنے والے دو گھنٹوں میں میں مسلسل اس باتھ روم میں بند رہا۔ کمرے کے اندر سے مجھے مختلف آوازیں آتی رہیں۔ ابھی تک چیتا وغیرہ نے سلائیڈنگ ڈور کو کھٹکھٹا کر کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یقیناً انہیں خطرہ تھا کہ پولیس بھی ارد گرد موجود ہوگی۔ یہ بات اب پوری طرح عیاں ہوگئی تھی کہ فی الوقت ہم اس کمرے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ مجھے اس کمرے میں پہنچانے کے بعد اشرف چیتا نے بڑے فخریہ انداز میں دعویٰ کیا تھا کہ میں اس کمرے کے در و دیوار سے سر ٹکرانے کی کوشش نہ کروں کیونکہ یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ اب اس کمرے کے ناقابلِ شکست در و دیوار اشرف چیتے کے لیے بھی مصیبت بن گئے تھے۔

باتھ روم سے باہر اشرف چیتا اور گارڈ جلال میں جو بات چیت ہو رہی تھی اس سے پتا چلا کہ اب رات ہونے والی ہے۔ اب خبر نہیں کہ یہ اس تہ خانے میں میری دوسری رات تھی یا تیسری۔ اپنی شیو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ دوسری رات ہے۔ مجھے بہت زوروں کی بھوک لگی ہوئی

تھی۔ پانی پی پی کر میں نے اپنا پیٹ بھر لیا تھا لیکن کھانے کی کمی پانی سے تو پوری نہیں ہوسکتی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کمرے میں کھانے کو کچھ موجود تھا بھی یا نہیں۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بھی فی الحال کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اب کمرے سے باہر نکلنے کی دو ہی صورتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ پولیس اس تہ خانے کا کھوج لگاتی ہوئی یہاں پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ پولیس کی نگاہ سے بچ کر اشرف چیتا کا کوئی ساتھی باہر سے اس دروازے کو یا چھت والی سلائیڈنگ کو کھول دیتا۔

وہ رات عجیب کیفیت میں گزر گئی۔ باتھ روم کافی بڑا تھا۔ ایک طرف کا فرش اصل باتھ روم سے قریباً ڈیڑھ فٹ اونچا تھا۔ اس پر چھوٹا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ میں اس قالین پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ ایک تہائی رات جاگ کر، ایک تہائی اونگھ کر اور باقی سو کر گزار دی۔ ذہن بس اشرف چیتا ہی کے ارد گرد گھومتا رہا تھا۔ یہ شخص کون تھا۔ اس کے اصل ارادے کیا تھے؟ کیا اشرف چیتا اس کا اصل نام تھا یا اس کے بہروپ کی طرح نام بھی نقلی تھا۔ (میرے بہروپ کی طرح میرا نام بھی تو نقلی ہی تھا۔ میں شاپنگ میں کئی ماہ شاہ راؤ کے نام سے رہا تھا۔ اس سارے عرصے میں چار پانچ افراد کے سوا کوئی مجھے شاہ جہاں کے طور پر نہیں پہچان سکتا تھا۔

ساری رات میں سردی سے پریشان رہا تھا۔ بھوک کی وجہ سے سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ بدن میں تل سے پڑ گئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں چھت کے اچانک نمودار ہونے والے خلا میں سے نیچے نرم گداز بستر پر گرا تھا تو کمرے میں خاطر خواہ حرارت موجود تھی لیکن اب یہ تہ خانہ برف خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ممکن تھا کہ اس تہ خانے سے باہر ہونے والی اتھل پتھل میں جہاں "بہت کچھ" گڑبڑ ہوا تھا وہاں اس تہ خانے کا حرارت کا نظام بھی درہم برہم ہوگیا ہو۔ یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے زیادہ دیر باتھ روم میں نہیں رکھ سکتے۔ اس کمرے میں صرف یہی ایک باتھ روم تھا اور یہ باتھ روم ان کو بھی استعمال کرنا تھا۔

مجھے ڈھائی تین گھنٹے مزید باتھ روم کے اندر ہی گزر گئے تو میں نے دروازہ بجانا شروع کردیا "کیا تکلیف ہے؟" باہر سے اشرف چیتا کی غراتی ہوئی آواز آئی۔

"مجھے باہر نکالو یا میں یہ دروازہ توڑ رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"دروازہ توڑو گے تو جسم میں دس پندرہ سوراخ کروا دوں گا۔"

"لیکن میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے باہر نکالو۔"

"اگر نہ نکالوں تو؟"

"پھر جو کچھ ہوگا اس کی ساری ذمے داری تم پر ہوگی۔ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں ہم چاروں پہلے ہی ایک مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن اگر تم ہٹ دھرمی دکھاؤ گے تو پھر مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔"

باہر چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر اشرف چیتا کی آواز آئی "اچھا میں تمہیں باہر نکال لیتا ہوں لیکن۔۔۔ اس کی ایک شرط ہوگی۔ تمہیں اپنے دونوں پاؤں باندھنے ہوں گے۔"

"کس طرح؟"

"نائیلون کی رسی سے۔ رسی ہمارے پاس موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دروازہ کھولو۔"

چند سیکنڈ بعد شکیلہ نے دروازہ کھول دیا۔ میرے عین سامنے گارڈ جلال خاں دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ اس کی خودکار رائفل کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اشرف چیتا کے ہاتھ میں بھی حسب سابق پسٹل نظر آرہا تھا۔ میرے قدموں کے پاس نائیلون کی سرخ رسی پڑی تھی۔ اشرف چیتا نے پسٹل کے اشارے سے مجھے ہدایت کی کہ میں رسی باندھ لوں۔ دل ہی دل میں اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ذہنی طور پر یہ لوگ مجھ سے بے حد خوف زدہ تھے۔ دو ہتھیاروں کی موجودگی میں بھی انہیں ہر لحظہ یہ خطرہ تھا کہ میں کسی وقت ان پر جھپٹ پڑوں گا۔

اشرف چیتا کی ہدایت کے مطابق میں نے اپنے پاؤں نائیلون کی رسی میں کس لیے۔ اشرف چیتا کی خواہش تھی کہ دونوں پاؤں بندھے ہوئے ہوں لیکن ان کے درمیان آٹھ نو انچ کا فاصلہ بھی رہے تاکہ میں بوقت ضرورت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اپنی جگہ سے حرکت کرسکوں۔ یہ "بیڑی" کی سی شکل تھی۔ یہ بیڑی اپنے پاؤں میں ڈالنے سے پہلے میں نے چند لمحے کے لیے یہ سوچا تھا کہ کیوں نہ اشرف چیتا اور اس کے گارڈ سے بھڑ جاؤں لیکن پھر یہ سوچ کر یہ خطرہ مول نہیں لیا تھا کہ ابھی تیل کی دھار دیکھنی چاہیے۔ میں پاؤں باندھ چکا تو اشرف چیتا نے شکیلہ کو آگے بڑھایا تاکہ وہ میرے ہاتھ بھی باندھ سکے۔

میں نے کہا "رائفل اور پسٹل کی موجودگی میں بھی تم لوگ ڈرے ہوئے ہو کیا؟ پاؤں باندھنا کافی نہیں؟"

اشرف زہریلے لہجے میں بولا "تم نے کھلے پاؤں سے وحدت علی کو قتل کردیا تھا، ہاتھ کھلے ہوں گے تو نہ جانے کیا کرو گے۔"

گزر رہا ہے۔"

شکیلہ نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ باندھنا شروع کیے۔ وہ میرے اور رائفل کے درمیان حائل تھی۔ اگر میرے پاؤں آزاد ہوتے تو یہ حملہ کرنے کا مناسب وقت تھا لیکن اب ایسا سوچنا محال تھا۔ دوسرے یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ شکیلہ کی اشرف چیتا کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ وہ شکیلہ کو گولی لگنے کی پروا کیے بغیر مجھ پر بے تحاشا فائرنگ کروا سکتا تھا۔

اشرف چیتا کی ہدایت کے عین مطابق شکیلہ نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور نائیلون کی رسی کو مضبوط گرہیں لگادیں۔ بعد ازاں اشرف چیتا نے خود ان گرہوں کو چیک کیا۔ میں ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں افراتفری کا منظر تھا۔ دیوار گیر الماری کو گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کردیا گیا تھا۔ الماری کے گھسٹنے سے قالین بھی اکٹھا ہوگیا تھا اور بدنما نظر آرہا تھا۔ دروازہ کھولنے کا ہنگامی میکینزم اس دیوار میں تھا جہاں پہلے الماری موجود تھی۔ جلال خان اور اشرف چیتا نے اس میکنزم کو چالو کرنے کی کوشش میں ادھیڑ اکھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ دیوار میں سے کئی تار باہر نکلے ہوئے تھے اور چھوٹے موٹے پرزے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ تاہم ابھی بٹنوں کے اس پینل کو نہیں چھیڑا گیا تھا جو دروازے کے ساتھ ہی موجود تھا۔ کمرے میں موجود میز پر ایک پلیٹ رکھی تھی جس میں آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا کاجو پڑا تھا۔ اس کے علاوہ بیئر کی ایک خالی بوتل بھی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس کمرے کے تینوں مکینوں نے کچھ کھایا پیا ہے۔

میں نے اشرف چیتا سے کہا "مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے کو کچھ دو۔"

وہ بولا "یہاں تمہاری دادی نے قیمے والے پراٹھے تیار نہیں کر رکھے۔ دروازہ کھلنے تک تمہیں صبر کرنا پڑے گا۔"

"کیا ہوا ہے دروازے کو؟"

"تیرے کی ماں کا سر ہوا ہے۔" وہ چیخ کر بولا "یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے اصل ذمے دار تم ہو۔ تمہیں اس کے لیے بھگتنا پڑے گا۔"

"بھگتوں گا تو تب ہی جب زندہ رہوں گا۔ میں بھوک سے فوت ہونے کے قریب ہوں۔"

"اتنی جلدی مرنے والے نہیں ہو تم۔ تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے میں نے۔"

"کسی نے تمہیں غلط بتایا ہوگا کہ میں بیٹری سیلوں سے جلتا ہوں۔"

میرے طنز کو سمجھتے ہوئے اشرف چیتا نے شکیلہ کو اشارہ کیا۔ وہ الماری کی طرف گئی اور بسکٹ کا ایک ڈبا اٹھا لائی۔ اشرف چیتا نے شکیلہ سے مخاطب ہو کر کہا "اپنے ہاتھ سے کھلاؤ اس لاڈلے لنگڑے فاتح کو۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور ایک ایک بسکٹ نکال کر میرے منہ میں رکھنے لگی۔ میں نے چھ سات بسکٹ ہی کھائے تھے کہ اشرف چیتا کی ہدایت پر شکیلہ نے ہاتھ روک لیا اور پانی کا گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ پانی پینے کے بعد میں نے پھر امید بھری نظر سے بسکٹوں کی طرف دیکھا لیکن شکیلہ نے ڈبا واپس الماری میں رکھ دیا۔ یہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہوئی تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔

میں نے دیکھا چیتا کے زخمی کندھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی کے اندر سے بھی خون رس رہا تھا اور بازو ہلاتے وقت چیتا سخت تکلیف محسوس کرتا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جو گولی چیتے کو لگی ہے وہ جسم کے اندر ہی موجود ہے۔ اگر گولی اندر ہی تھی تو پھر مستقبل قریب میں چیتے کو سخت مشکل پیش آسکتی تھی۔ ضروری تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر تہ خانے کا دروازہ کھل جاتا اور چیتے کو مناسب طبی امداد مل جاتی۔

چیتا اور گارڈ مسلسل دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے مگر یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ سارا دن بھی اسی طور گزر گیا۔ گارڈ جلال خان تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی تھا۔ وہ بڑی باریک بینی سے ہنگامی میکنزم کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ پینل کے اندر سے کئی طرح کے تار نکلے ہوئے تھے۔ وہ ایک سرخ اور سبز تار کو جوڑتا تھا تو دروازے کی طرف سے "ٹیں گیں" کی طویل آواز سنائی دیتی تھی لیکن دروازہ کھلتا نہیں تھا، نہ ہی اس میں کوئی جنبش پیدا ہوتی تھی۔

اشرف چیتا اور گارڈ جلال کے چہروں پر مردنی نظر آنے لگی تھی۔ شام سے کچھ دیر پہلے اشرف چیتا باتھ روم استعمال کرنے کے لیے گیا تو میں نے گارڈ جلال خان سے پوچھا "تمہارے بگ باس کی حالت مجھے کچھ اچھی نہیں لگتی۔ میرا اندازہ ہے کہ گولی اس کے کندھے کے اندر ہی ہے۔"

جلال خان نے میری بات کا جواب اثبات میں دیا۔

میں نے کہا "اگر تم لوگ چاہو تو میں یہ گولی نکال سکتا ہوں۔ مجھے بس ایک تیز دھار چھری یا بلیڈ وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔"

گارڈ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "باس! ایک دشمن

سے مدد لینے کی بجائے کچھ دیر تکلیف سہنا مناسب سمجھیں گے۔"

"شاید تیرے جیسے لوگوں کے بارے میں ہی کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔"

"اچھا تم اپنا منہ بند رکھو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری اس بات سے مجھے ایک عمر رسیدہ شاعر کا بڑا لوفر سا شعر یاد آگیا ہے۔ اگر یہ خوب صورت بی بی یہاں نہ ہوتی تو میں تمہیں یہ شعر ضرور سناتا۔"

اسی دوران میں باتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ اشرف چیتا باہر نکلا تو بے دھیانی میں اس کا زخمی کندھا اس الماری سے ٹکرایا جو کمرے کے بیچ پڑی تھی۔ تکلیف کی شدت سے اس کا رنگ متغیر ہوگیا پھر ایک دم نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ مجھ پر پل پڑا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے چند زوردار گھونسے میرے منہ پر مارے پھر سینے پر کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ میں نے اس کی یہ ضربات خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ شاید وہ مزید مار ماری بھی کرتا لیکن اس کے کندھے کی تکلیف اسے زیادہ حرکت کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر اور گالیاں بک کر رہ گیا۔

میں نے کہا "اس صورت حال کے لیے پنجابی میں ایک مشہور محاورہ ہے۔ ڈگ کھوتے توں غصہ کمہار تے۔ یعنی قصور کسی کا ہو اور غصہ کسی پر اتارا جائے۔"

اشرف چیتا غرا کر بولا "کچھ دیر صبر کرو۔ اگر سارے محاورے اور ضرب المثل تمہیں بھلا نہ دوں تو نام بدل دینا۔"

اس نہایت سرد تہ خانے میں ایک طویل رات بسر ہو چکی تھی۔ اشرف چیتا کو بس اب یہی موہوم امید رہ گئی تھی کہ شاید باہر سے اس کا کوئی ساتھی "جام دروازے" کو کھول دے۔ میں قالین ہی پر ایک طرف سمٹ کر لیٹ گیا۔ شکیلہ صوفے پر دراز ہوگئی۔ اشرف چیتا نرم و گداز بیڈ پر تھا جبکہ گارڈ اشرف چیتا کے پاؤں کی طرف بیٹھا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ سو رہا ہوں۔ اشرف چیتا اور گارڈ باتیں کر رہے تھے۔ اشرف چیتا کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی تکلیف بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ وہ گارڈ سے کہہ رہا تھا "صبح تک دیکھتے ہیں۔ اگر باہر سے دروازہ نہیں کھلا تو پھر دروازے کے درمیان والے حصے پر فائرنگ کر کے دیکھیں گے۔"

"جناب! گستاخی معاف۔ اگر پولیس والے باہر ہوئے تو پھر؟"

اشرف چیتا نے پہلے پولیس والوں کو ایک گالی دی پھر غصے میں گارڈ کی ماں بہن بھی ایک کردی۔ غرا کر بولا "یہ بات تمہارے کھوپڑے میں کیوں نہیں آرہی۔ اس کمرے میں بند ہو کر مر جانے سے تو یہی اچھا ہے کہ پولیس ہمیں یہاں سے نکال لے۔ مجھے تو یہی شبہ ہو رہا ہے کہ نجیب اور نواز دونوں مارے جا چکے ہیں۔ اس صورت میں اگر پولیس بھی یہاں سے چلی گئی تو ہمیں یہاں سے نکالے گا کون۔"

"ہم۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں جناب!"

"تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہاں کھانے پینے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ خود کو گرم رکھنے کا بھی زیادہ انتظام نہیں۔ ایسی صورت میں کب تک گزارا ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں صبح تک بھی انتظار نہیں کرنا چاہیے۔"

جلال خان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے۔ فائرنگ کی آواز باہر تک پہنچ جائے گی؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" اشرف چیتا بولا "ممکن ہے کہ دھماکوں کی وجہ سے ساری بلڈنگ ملبے کا ڈھیر بن گئی ہو۔ اگر یہ تہ خانہ ایک بڑے ڈھیر کے نیچے دبا ہوا ہے تو پھر بہت زیادہ امکان ہے کہ فائرنگ کی آواز بھی باہر تک نہ پہنچے۔"

اشرف چیتا اور گارڈ جلال خان میں کچھ دیر تک بات ہوتی رہی۔ دونوں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گارڈ خاصا سمجھ دار شخص لگتا تھا پھر بھی اس کو جو اہمیت مل رہی تھی وہ اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ اہمیت صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ اپنے بگ باس کے ساتھ اس تہ خانے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر مشورہ کرنے کے لیے بگ باس کے ساتھ میڈم شہریار اور چوہدری وحدت علی جیسے لوگ ہوتے تو وہ شاید اس گارڈ کو مخاطب بھی نہ کرتا۔ سب زمان و مکان کی بات تھی۔

دس پندرہ منٹ کے تبادلۂ خیال کے بعد اشرف چیتا نے فیصلہ کیا کہ اب مزید انتظار نہ کیا جائے اور آہنی دروازے پر خودکار رائفل سے برسٹ مار کر اسے توڑنے کی کوشش کی جائے۔ گارڈ کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ اس کی رائفل میں چوبیس کے قریب گولیاں موجود ہیں۔ ان گولیوں سے تین چار بھرپور برسٹ دروازے پر مارے جاسکتے تھے۔

جب فائرنگ کرنے کی بات شروع ہوئی تو شکیلہ نے اپنے جسم سے کمبل ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلال خان نے ٹھوکر مار کر مجھے بھی اٹھنے پر مجبور کردیا۔ سردی کافی زیادہ تھی۔ تہ خانے کی دیواریں بالکل یخ ہو رہی تھیں۔ پچھلے دو دنوں سے چند بسکٹوں کے سوا میرے معدے میں کچھ نہیں گیا تھا۔ دل

چاہ رہا تھا کہ اس وقت میرا خوش خوراک لاہوری یار عالم قریشی میرے ساتھ ہو۔ دو تین گرم چرغے اور روغنی نان ہمارے سامنے پڑے ہوں۔ ساتھ میں گاجر کا حلوہ اور گرم گرم چائے ہو لیکن یہ "ایں خیال است و محال است جنوں" والی بات تھی۔ عالم قریشی لاہور میں موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے ساہی صاحب سے اس کا پتا کروایا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہ دبئی میں گاڑیوں کا شوروم کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے اور آج کل اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔

جلال خان نے آہنی دروازے کے درمیانی جوڑ پر برسٹ مارنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ سخت سطح پر گولی کے لگ کر پھسل جانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ ایسے میں بعض اوقات وہ لوگ بھی زد میں آجاتے ہیں جو کسی طور پر نشانے کے قریب نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ اشرف چیتا نے مجھے اور شکیلہ کو باتھ روم میں گھسنے کا حکم دیا۔ وہ خود بھی باتھ روم کے دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ جلال خان نے دیوار گیر الماری کے عقب میں کھڑے ہو کر سیون ایم ایم رائفل سے یکے بعد دیگرے تین برسٹ مارے۔ خوفناک آوازوں سے یہ تہ خانہ لرز اٹھا اور بارود کی بو والا دھواں ہمارے نتھنوں میں قرآنے مار کر گھس گیا۔

میں دروازے کی صورت حال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ دروازہ ٹھوس لوہے کا بنا ہوا ہے۔ دروازے پر وہی اثر ہوا تھا جو کسی بکتربند گاڑی پر رائفل کی فائرنگ سے ہو سکتا ہے۔ بس گولیوں کے معمولی نشان نمودار ہوئے تھے اور فائرنگ کی زد میں آنے والی سطح نے رنگ تبدیل کیا تھا۔

جلال خان اور اشرف چیتا نے ایک بار پھر ان بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی جو دروازہ کھلنے کا موجب بن سکتے تھے۔ اس چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ وہی رہا جو پہلے رہا تھا۔ جلال خان ہنگامی میکنزم کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ جبکہ اشرف چیتا کے نزدیک اس سوئچ بورڈ کی زیادہ اہمیت تھی جو دروازے کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ دونوں اپنی اپنی ترجیح کے مطابق ٹاک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کان باہر سے آنے والی آوازوں کو بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ اس بات کا امکان یا اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ تہ خانے میں ہونے والی زوردار فائرنگ کی تھوڑی بہت آواز باہر تک پہنچی ہو۔ ایسے میں اگر پولیس اردگرد موجود تھی تو وہ تہ خانے کی طرف متوجہ ہو سکتی تھی۔

تقریباً بندرہ بیس منٹ شدید قسم کے تذبذب میں گزر گئے۔ دھیرے دھیرے یہ بات واضح ہونے لگی کہ چند درجن گولیاں ضائع کرنے کے باوجود صورت حال جوں کی توں ہے۔ یہ فائرنگ دروازہ کھول سکی تھی اور نہ باہر کے لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر سکی تھی۔ مایوسی کے عالم میں اشرف چیتا نے لوہے کا ایک راڈ اٹھایا اور اس کی مدد سے آہنی دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے کا شور ہمارے کانوں کے پردے پھاڑنے لگا لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ یہ شور تہ خانے سے باہر بھی کچھ حقیقت رکھتا ہے یا نہیں۔ اشرف چیتا تھک گیا تو اس نے غصے کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کر دی۔ آہنی راڈ کی کئی ضربیں اس نے میرے بازوؤں اور ٹانگوں پر لگائیں۔

گالیاں بکتے ہوئے بولا "یہ سارا تیرا کیا دھرا ہے۔ تیری نحوست کی وجہ سے ہم سب اس ٹھنڈی قبر میں دفن ہوئے ہیں۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالوں گا۔" اس کی آنکھوں میں دیوانگی چمکنے لگی تھی۔

میں بندھا ہوا تھا مزاحمت نہیں کر سکتا تھا مگر اشرف چیتے کو الجھا تو سکتا تھا۔ میں نے کہا "مجھے مار دو گے تو اپنی موت بھی مہنگا دو گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہوں۔"

اشرف چیتا کا بے رحم ہاتھ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر گالی بک کر بولا "کیا کر سکتے ہو تم؟"

"میرا خیال ہے کہ میں یہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔"

اشرف چیتا نے راڈ ایک طرف پھینک دیا اور سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری توقع کے باوجود وہ سخت مایوس نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر بولا "کیا کرو گے تم دروازے کے ساتھ؟"

"وہی کچھ جو ایک لڑکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"لڑکی بھی تو اپنی ذات میں ایک بند دروازے کی طرح ہوتی ہے۔ اگر عاشق کے جذبے میں گرمی ہو اور طلب صادق ہو تو حجاب خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں اور دیواریں در بن جاتی ہیں۔"

"شاعری مت بگھارو۔ میں سخت سٹپٹایا ہوا ہوں۔ وار کے طور پر تم پر ڈنڈے برسانا شروع کر دوں گا۔ تم دیکھ ہی چکے ہو ڈنڈا بھی لکڑی کا نہیں لوہے کا ہے۔ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بننے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"ٹھیک ہے بنا دو سرمہ۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے دن پورے ہیں۔ اس چوہے دان میں بھوک پیاس اور سردی کی سختیاں سہہ کر چوہے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ سرمہ بن جاؤں۔ کسی حسین کی آنکھوں میں رہنے کا چانس تو ہوگا۔"

وہ میری "ظرافت" کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "اگر تم دروازہ کھولنے کی کوشش کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے مجھے تمہارے ہاتھ کھولنے پڑیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہارے سلسلے میں کم سے کم رسک لینا چاہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا ہے میں نے۔ تم ایک عیار اور خطرناک دشمن ہو۔"

"سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن آنکھوں دیکھی بات پر تو یقین کرتے ہی ہیں۔ تم نے نہایت عیاری سے ہماری تنظیم میں جگہ بنائی۔ میڈم نغزہ اور بابو جیسے ہوشیار لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم ان کے درمیان گھسے رہے۔ تم نے تنظیم کے اندرونی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میڈم اور وحدت علی کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کیا اور میڈم کو ایک "مقتول بائی" بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ بے شک میڈم نے ایک بالو نامی کے ہاتھوں ہلاک ہو کر گھڑا ہے مگر اسے ہلاکت کے کنارے تک پہنچانے والے تم ہی ہو۔ تم نے میڈم کی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو وحدت علی کے قریب کر لیا اور تنظیم کی سرگرمیوں کی ٹوہ لگاتے رہے۔ آخر تم نے وحدت علی کو بھی مار دیا اور یہاں تک آ پہنچے۔ کیا تمہیں خطرناک ثابت کرنے کے لیے یہ ثبوت کافی ہیں یا کچھ اور پیش کروں۔"

"ثبوت پیش کرنے سے بہتر ہے کہ تم میرے ہاتھ کھول دو۔ ان معاملات پر ہم بعد میں ڈسکس کر لیں گے۔ پہلے اس مشترکہ مصیبت سے تو نبٹ لیں۔"

اشرف چیتا نے شکیلہ کو اشارہ کیا کہ وہ میرے ہاتھ کھول دے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جلال خان کو بھی اشارہ کر دیا کہ وہ اب اپنی رائفل سمیت چوکس ہو جائے۔ پشت پر بندھے بندھے میرے ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ میں نے کئی بار مٹھیاں بند کیں اور کھولیں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس دیوار کے پاس پہنچا جہاں سے الماری ہٹائی گئی تھی۔ دیوار کے نچلے حصے میں فرش سے تقریباً ڈیڑھ فٹ کی بلندی پر وہ سوئچ بورڈ موجود تھا جس سے دروازے کا ہنگامی میکنزم حرکت کر سکتا تھا۔ میں نے تمام تاروں کا بغور جائزہ لیا۔ کرنٹ کی تقسیم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ تاروں میں کرنٹ پورا تھا۔ خرابی آگے جا کر کہیں اس موڑ میں تھی جو دروازے کو حرکت دیتی تھی۔ دو تاروں کو جوڑنے سے دروازے کی طرف سے جو طویل آواز آتی تھی وہ یہی بتاتی تھی کہ کرنٹ موٹر تک تو پہنچتا ہے لیکن اسے حرکت دینے میں ناکام رہتا ہے۔

میں دیر تک تاروں سے الجھتا رہا۔ شکیلہ بڑی امید بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ غالباً میرے اور اشرف چیتا کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے شکیلہ نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ میں "ہرفن مولا" قسم کا شخص ہوں اور مشکل سے مشکل کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی اور میری طرف سے کسی اچھی خبر کی توقع کر رہی تھی لیکن اچھی خبریں نہیں تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ٹھنڈا ہوا تہ خانہ ہر قسم کی اچھی خبر اور اچھی تبدیلی کے لیے اپنے دروازے بند کر چکا ہے۔

دس پندرہ منٹ کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کمرے کے اندر سے دروازے کو کھول لینا ایک معجزہ ہی ہوگا۔ میں مایوسی سے سر ہلا کر کھڑا ہوا تو اشرف نے فوراً شکیلہ کو اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پشت پر باندھ دے۔

میں نے اشرف چیتا سے کہا "دیکھو تم بے وقوفی کر رہے ہو۔ تم نے میرے پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ رائفل نے مجھے نشانے پر رکھا ہوا ہے پھر تمہیں خطرہ کس بات کا ہے۔ میرے ہاتھ کھلے رہنے دو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا زخم دیکھوں۔ اگر تم مجھے کوئی تیز دھار چیز فراہم کر سکو تو میں تمہارے اندر سے گولی نکال سکتا ہوں۔"

"بہت خوب تمہارا مطلب یہی ہے کہ میں ایک چاقو تمہارے ہاتھ میں دے کر تمہارے سامنے لیٹ جاؤں تاکہ تم آسانی سے میری گردن پر تکبیر پڑھ سکو۔"

اس کے ساتھ ہی دو تین گالیاں بکنے کے بعد اس نے شکیلہ کو اشارہ کیا۔ شکیلہ نے پہلے کی طرح میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

○☆○

اگلے دو گھنٹے بھی ہم نے اسی تہ خانے میں سردی اور بھوک سے ٹھٹھرتے ہوئے گزار دیے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم ایک بھرے پرے شہر میں نہیں کسی ویرانے میں پھنس گئے ہیں۔ شاید جلال اور اشرف چیتا کا یہ اندازہ درست تھا کہ بارودی دھماکوں کے سبب بیرونی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی

اور یہ تہ خانہ اس ڈھیر کے نیچے دفن ہو گیا تھا۔ کوئی آواز، کوئی صدا، کسی طرح کی آہٹ ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جب لوگ اس طرح ملبے میں دفن ہو جاتے ہیں تو انہیں نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمیں تو غالباً نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی کو علم ہی نہ ہو کہ ہم یہاں موجود ہیں۔

تہ خانے میں کھانے پینے کا سامان بہت محدود مقدار میں تھا۔ یہ سامان کچھ اس طرح تھا۔ تقریباً ایک کلو کے قریب کاجو۔ جس میں سے نصف کلو پچھلے پانچ روز میں کھایا جا چکا تھا۔ بسکٹس کے پانچ ڈبے تھے۔ ان میں سے دو تو کھائے جا چکے تھے۔ باقی تین ڈبوں میں اندازاً سو بسکٹ ہوں گے۔ ہم کل چار افراد تھے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص چھ بسکٹ روزانہ کھاتا، تو بھی یہ راشن صرف تین چار دن مزید چل سکتا تھا۔ اشرف چیتا بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا لہٰذا وہ اپنے ہاتھ سے ہر ایک کو حصے کے مطابق بسکٹ دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے اپنے حصے سے نصف بسکٹ مل رہے تھے۔ یعنی کبھی تین کبھی چار۔ ایک قیدی کی حیثیت سے میں اسی سلوک کے لائق تھا۔ ایک دن اشرف چیتا بہت جھلایا ہوا تھا۔ اس دن اس نے مجھے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں دیا۔ بعد ازاں جب وہ باتھ روم میں تھا، شکیلہ نے جلال کی نگاہ بچا کر ایک بسکٹ میرے منہ میں رکھ دیا تھا۔ کاجو پر صرف جلال اور اشرف چیتا کا حق تھا۔ اس کے علاوہ الماری میں وہسکی کی ڈھائی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ ان بوتلوں کو مقفل کر کے چابی اشرف چیتا نے اپنی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔

سردی اور کم خوراکی کی وجہ سے ہمارا وزن کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اگر کسی کو زیادہ فرق نہیں پڑا تھا تو وہ شکیلہ تھی۔ وہ پہلے ہی بہت دبلی پتلی تھی اور کھانا بھی شاید نہ ہونے کے برابر کھاتی تھی۔ تاہم اس سرد قبر میں زندہ دفن ہو جانے کا جانکاہ غم اس کے حسین چہرے سے بھی عیاں تھا۔ چار پانچ روز کے اندر وہ کملائے ہوئے پھول کی طرح ہو گئی تھی۔

سب سے پتلی حالت اس شخص کی تھی جو اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ ذمے دار تھا۔ یعنی اشرف چیتا خود۔ اس کا زخم ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ گولی کا زہر اس کے جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ چھٹے روز کی بات ہے۔ رات نو دس بجے کے لگ بھگ اس نے عاجز ہو کر جلال سے کہا "وہسکی نکالو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے الماری کی چابی جلال کی طرف اچھال دی۔

جلال نے الماری کھولی۔ اوپر والے خانے میں بسکٹ رکھے تھے۔ نچلے خانے میں شراب اور کاجو وغیرہ پڑا تھا۔ جلال نے وہسکی نکالی پھر اشرف کے حکم پر وہ شیشے کے جگ میں پانی لے آیا۔ اشرف نے وہسکی پینا شروع کر دی۔ صرف پانچ دس منٹ کے اندر وہ نصف بوتل چڑھا گیا۔ اثر تو ہونا ہی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مدہوش نظر آنے لگا۔ اس کی ہدایت پر جلال نے الماری میں سے پھل کاٹنے والی چھری نکالی اور فرش پر رگڑ رگڑ کر اسے بہت تیز کر دیا۔

اشرف چیتا نے ایک تکیہ پھاڑ کر اس میں سے بہت سی روئی نکالی۔ باتھ روم میں شیو وغیرہ کرنے کے لیے جراثیم کش دوا موجود تھی۔ یہ دوا شیشے کے جگ میں ڈال کر اور تھوڑا سا پانی ملا کر اشرف نے محلول تیار کر لیا۔ اس کے بعد وہ قالین پر چت لیٹ گیا اور اس نے جلال کو ہدایت کی کہ وہ گولی نکالنے کے لیے اس کے کندھے پر چیرا دے۔

آپریشن کا یہ سارا عمل ہماری آنکھوں کے سامنے ہی ہو رہا تھا۔ شکیلہ نے اس منظر کی طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لی تھیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک دلہن کے لباس میں ہی تھی۔ ہاں بناؤ سنگھار ختم ہو چکا تھا اور زیورات بھی اس نے اتار دیے تھے۔

اشرف نے قالین پر چت لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ قمیص اور سویٹر اتار دینے سے اس کا بالائی جسم عریاں ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا جسم قدرے سانولا تھا لیکن مضبوط نظر آتا تھا۔ جلال نے اس کے کندھے پر چیرا دیا۔ اس کے زخم سے بہت سی "پیپ" نکلی۔ اس کے علاوہ خون بھی برآمد ہوا۔ یہ سارا مواد پلاسٹک کے ایک ڈونگے میں جمع ہو گیا۔ تھوڑا بہت جو ادھر ادھر گرا، جلال نے روئی سے صاف کر دیا۔ اس کے بعد گولی کی تلاش شروع ہوئی۔ یقیناً اشرف کے لیے یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ اس نے اپنا منہ اتنی زور سے بھینچ رکھا تھا کہ جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ جلال نے کئی مرتبہ کٹ لگائے۔ ہر مرتبہ جب وہ کٹ لگاتا تھا خون زیادہ تیزی سے نکلنے لگتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اشرف کے کندھے کا گوشت لوتھڑوں کی سی شکل اختیار کر گیا ہے۔

"گولی مل نہیں رہی۔" جلال نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"تو پھر اب کیا کرو گے؟ قیمہ بنا دیا کندھے کا۔" اشرف نے کراہتے ہوئے کہا۔

"بس تھوڑی سی کوشش اور کرنے دیں جناب!" جلال نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک اور گہرا کٹ لگایا۔ مدہوش ہونے کے باوجود اشرف کے چہرے پر تکلیف کے نمایاں آثار ابھرے۔ خون مزید تیزی سے بہنے لگا تھا۔ تکیے میں سے جو روئی نکالی گئی تھی اس میں سے آدھے سے زیادہ خون آلود ہو چکی تھی۔ دو تین منٹ مزید گزرے۔ آخر جلال نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ میں نے اشرف چیتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اگر تم مجھے بھی تھوڑی سی کوشش کرنے دو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہو۔"

اشرف اور جلال دونوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ جلال نے بھونڈے طریقوں سے خون بند کرنے کی کوشش کی۔ جب خون کا اخراج کسی حد تک کم ہو گیا تو اس نے زخم پر روئی کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھنے کے بعد کس کر پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں اشرف کا نشہ کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ایک چوتھائی بوتل مزید چڑھائی اور بے دم ہو کر لیٹ گیا۔

بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ صبح مجھے صرف دو بسکٹ دیے گئے تھے۔ باقی سب نے تین تین لیے تھے۔ آثار نظر آ رہے تھے کہ باقی کی رات بھی مجھے ان ہی دو بسکٹس کے سہارے گزارنا پڑے گی۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ کچھ دیر بعد جب اشرف نے اپنی جیب سے الماری کی چابی نکال کر جلال کو دی اور اس نے الماری میں سے "راشن" نکالا تو مجھے کچھ نہیں دیا گیا۔ فاقہ زدہ شخص کی حس شامہ بڑی تیز ہو جاتی ہے۔ مجھے بھی کاجو کی خوشبو کافی فاصلے سے آ رہی تھی۔ اگر مجھے تھوڑا سا کاجو مل جاتا تو میرے ٹھٹھرے ہوئے بدن میں کچھ گرمی آ جاتی لیکن میں کاجو سے اتنا ہی دور تھا جتنا قطب شمالی سے صحرائے سینا۔

صبح تک اشرف چیتا کی طبیعت مزید بگڑ چکی تھی۔ اس کا چہرہ بخار کے سبب بری طرح تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ اس میں اب کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ ستم یہ ہوا کہ کندھے سے خون کا اخراج بھی رکا نہیں تھا۔ رات رات میں اس کی ساری پٹی اور قمیص لہو سے تر ہو گئی تھی۔ سویٹر اس نے پہنا نہیں تھا ورنہ یقیناً وہ بھی تر ہو جاتا۔ اشرف اپنی جگہ سے بمشکل اٹھا اور ڈگمگاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے ایک بار پھر سوئچ بورڈ سے الجھنا شروع کر دیا۔ چار پانچ منٹ بعد اس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے جیب سے اپنا پستول نکالا اور اندھا دھند کئی فائر سوئچ بورڈ پر کر دیے۔ دھماکوں کی آواز سے تہ خانہ لرز اٹھا اور سوئچ بورڈ کے پرزے اڑ گئے۔

اکثر انگریزی اور غیر ملکی فلموں میں اس قسم کی سچوئیشن دکھائی جاتی ہے۔ کسی الیکٹرانک ڈیوائس کو چالو کرنے میں مسلسل ناکام ہونے کے بعد ہیرو جھلا کر اس ڈیوائس کو ٹھوکریں مارتا ہے یا اس پر فائرنگ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد نہایت خوشگوار اتفاق یہ ہوتا ہے کہ ڈیوائس کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شاید اشرف کے ذہن میں بھی کوئی ایسا ہی خیال رہا ہو۔ بہرحال اشرف نے جو فائرنگ کی اس کے نتیجے میں مجموعی صورتِ حال میں ذرہ بھر تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ دروازہ جوں کا توں ہمارے لیے دیوار بنا رہا۔ سوئچ بورڈ کو توڑنے پھوڑنے کے بعد اشرف نے جنونی کیفیت میں آہنی راڈ اٹھایا اور پے در پے دروازے پر زوردار ضربیں لگانے لگا۔

لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں تہ خانے میں گونجنے لگیں۔ ساتھ ساتھ اشرف ہیجانی انداز میں چلا بھی رہا تھا "دروازہ کھولو۔ حرام زادو کہاں مر گئے ہو۔ دروازہ کھولو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔"

پھر ایک دم وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ جلال نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا ورنہ شاید وہ منہ کے بل نیچے گرتا۔ جلال نے آہستگی سے اسے قالین پر لٹا دیا۔ اس کا زخم تیزی سے خون اگلنے لگا تھا۔ پٹی اس قدر گیلی ہو گئی تھی کہ باقاعدہ خون کے قطرے گر رہے تھے۔ جلال نے پٹی اتار کر نئی روئی رکھی اور نئے سرے سے پٹی باندھ دی لیکن یہ کام اس نے بڑی بے دلی سے کیا تھا۔ غالباً وہ بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ ٹانکوں وغیرہ کے بغیر یہ خون رستا ہی رہے گا۔ اشرف کے کہنے پر جلال نے اسے چند بسکٹ کھلائے اور تھوڑی سی مزید شراب پلائی۔ دس پندرہ منٹ بعد اشرف نے بے سدھ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس کیفیت کو نیم بے ہوشی کی کیفیت کہا جا سکتا تھا۔

شکیلہ نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا "جلال! کچھ کھانے کو دو۔"

جلال نے الماری کھولی اور کل چار پانچ بسکٹ نکالے۔ اس نے صرف ایک شکیلہ کو دیا اور باقی اپنے کھاتے میں رکھ لیے۔ میری طرف آنے کی اس نے زحمت ہی نہیں کی۔

میں نے معترض ہوتے ہوئے کہا "مجھے شام کو بھی کچھ نہیں دیا گیا تھا۔"

"تمہارے جسم میں کافی چربی موجود ہے۔ یہ چربی پگھلے گی تو بسکٹ کا کام کرے گی۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم نے مجھے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر واقعی یہی بات ہے تو پھر بھوکا پیاسا مارنے سے

بہتر ہے کہ اپنی رائفل کی ایک گولی مجھ پر ضائع کر دو۔"

"اتنی آسان موت کی توقع ہم سے نہ رکھو۔" وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

دوپہر تک واقعی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں قالین پر نیم دراز تھا۔ شکیلہ سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اشرف چیتا نرم و گداز بیڈ پر تھا۔ اس کے کندھے سے بہنے والے خون نے نہایت قیمتی بیڈ کا سوا ستیاناس کر ڈالا تھا۔ اشرف غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ بس کبھی کبھی آنکھیں کھول کر اردگرد کا طائرانہ جائزہ لیتا تھا اور پھر سر تکیے پر ڈال دیتا تھا۔

یوں تو بھوک نے میرا بھی حشر کر رکھا تھا لیکن مجھے شکیلہ پر ترس آ رہا تھا۔ وہ نو خیز حسینہ بڑی نازک مزاج تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور چہرہ ایک دو دن میں ہی سرسوں کا پھول نظر آنے لگا تھا۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر الماری کی طرف دیکھتی تھی اور پھر جلال کی صورت تکنے لگتی تھی۔ جلال اس وقت مختار کل بنا بیٹھا تھا۔ آخر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے کہا "دیکھو جلال! تم بہت زیادتی کر رہے ہو۔ چلو میں تو تمہارا مجرم ہوں لیکن اس لڑکی کا کیا قصور ہے۔ اسے کھانے کے لیے کچھ دو۔"

"تم اپنے نمبر بنانے کی کوشش نہ ہی فرماؤ تو بہتر ہے۔ مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے۔"

شکیلہ تیزی سے بولی "باس کے ہوتے یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔ تم نے ابھی صرف میری نرمی دیکھی ہے۔"

شکیلہ بھڑک کر بولی "یہ نرمی ہے تو پھر سختی کیا ہو گی۔ تم... شاید ہم دونوں کو مارنے کا ارادہ رکھتے ہو۔" شکیلہ کا اشارہ اپنے علاوہ میری طرف بھی تھا۔

شکیلہ اور جلال میں تکرار بڑھی تو شکیلہ اٹھ کر جلال کے سر پر پہنچ گئی "تم ایک گارڈ ہو اور گارڈ بن کر ہی رہو۔ الماری کی چابی مجھے دے دو۔"

شکیلہ اور جلال کی بلند آوازیں سن کر اشرف چیتا نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ شکیلہ اب زار و قطار رونے لگی تھی "کیا بات ہے؟" اشرف نے بڑی نحیف آواز میں شکیلہ سے دریافت کیا۔

اس نے ساری صورت حال اشرف کے گوش گزار کر دی۔

جب وہ بات کر رہی تھی جلال نے ایک دو بار اس کی بات کاٹنے کی کوشش کی لیکن اشرف نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش کر دیا۔

شکیلہ بات ختم کر چکی تو اشرف نے کمزور آواز میں جلال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہمارے پاس کھانے کو نہیں رہا۔ جو کچھ بھی ہے اسے احتیاط سے استعمال کرو تب ہی دو تین دن اور نکال سکیں گے۔"

"لیکن جناب! یہ خود تو..." شکیلہ دہائی دیتی ہوئی بات مکمل نہ کر سکی۔

یقیناً وہ یہی کہنے جا رہی تھی کہ جلال خود تو کوئی پرہیز [illegible] کر رہا۔

اشرف نے بمشکل سر گھما کر جلال کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں بولا "جلال! چابی مجھے دے دو۔"

جلال کے چہرے پر عجیب سا رنگ ابھرا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر بند کر لیا۔ اس نے [illegible] پھر اٹھ کر صوفے کی گدیاں الٹ پلٹ کرنے لگا وہ دھیمی آواز میں بولا "یہیں کہیں رکھی تھی چابی۔ مل نہیں رہی۔"

اور اس لمحے مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ [illegible] باغی ہو چکا ہے۔ ابھی اس کی "بغاوت" کھل کر سامنے نہیں آئی تھی لیکن عن قریب آنے والی تھی۔ میری طرح اشرف نے بھی غور سے جلال کی طرف دیکھا۔ چند لمحے کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر اشرف نے آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اس دبی ہوئی بغاوت کو کھلی بغاوت میں تبدیل کرنے کا رسک لیتا۔ اس نے درحقیقت حالات کی طرف سے آنکھیں بند کی تھیں۔ امید کے ساتھ کہ شاید اس نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط ہو۔

شام کو الماری کی گمشدہ چابی تو نہیں ملی لیکن [illegible] ایک ڈبا جلال کے ہاتھ میں نظر آنے لگا۔ غالباً یہ ڈبا اس نے کل رات ہی الماری میں سے نکال کر کہیں چھپایا ہوا تھا۔ اس مرتبہ جلال نے ہم دونوں سے تھوڑی سی رعایت کی۔ اس نے مجھے اور شکیلہ کو تین تین بسکٹ کھانے کے لیے دیے۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ صرف اس وقت آدھ پون گھنٹے کے لیے "یہ ہاتھ" جلال کھول دیتا۔ جب تک ہاتھ کھلے رہتے تھے جلال کی انگلی اپنی رائفل کے ٹریگر پر رہتی تھی۔ بعد ازاں شکیلہ میرے ہاتھ باندھ دیتی۔ اشرف چیتا اور جلال اس تہ خانے میں مجھ سے اتنے ہی خوف زدہ نظر آتے تھے جتنا کوئی کم آموز شکاری درندوں

سے بھرے ہوئے جنگل میں نظر آتا ہے۔ ان کی احتیاط اور خوف زدگی سے میں کسی وقت لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ بہرحال یوں جوں وقت گزر رہا تھا لطف اندوزی کم اور پریشانی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ تیسرے جلال نے مجھے اپنے ہاتھ سے بسکٹ کھلائے اور بعد میں چند گھونٹ پانی بھی پلایا۔ مرتے ہوئے معدے نے ان تین عدد بسکٹ کو بڑی تیزی سے قبول کیا اور یوں لگا کہ چند منٹوں میں یہ خوراک جزو بدن بن کر بجلی سی حرارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ جلال [illegible] اور چار بسکٹ لیے۔ اشرف چونکہ گہری غنودگی میں تھا لہٰذا اس کو جگانے کی جلال نے کوشش ہی نہیں کی۔ اشرف کا خون مسلسل رس رہا تھا اور مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ اگر جلدی اسے مناسب ٹریٹمنٹ نہ مل سکی تو وہ سیدھا سیدھا "کومے" میں چلا جائے گا۔

رات کو کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں کچھ آوازوں کی وجہ سے جاگا تھا۔ یہ جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ کمرے میں اندھیرا ہے پھر میرے کانوں میں شکیلہ کی دبی دبی چیخ گونجی وہ جیسے کسی بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔

"خدا کے لیے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ چھوڑ دو مجھے۔" وہ کراہ کر بولی۔

میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ وہ سخت مشکل میں تھی۔ جلال شیطانیت پر اتر آیا تھا۔ میں نے جلال کو للکارا "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ جلال لائٹ جلاؤ۔"

وہ بولا تو یہی لگا جیسے کوئی درندہ غرا رہا ہو "خاموش رہو۔ ورنہ ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ میرے ہاتھ میں رائفل ہے۔"

"اور اس رائفل کے زور پر تم اس لڑکی کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہو؟"

"میں وہی کروں گا' جو چاہوں گا' تم روک سکتے ہو تو روک لو۔"

اس کے ساتھ ہی جلال کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ دراصل شکیلہ نے خود کو چھڑانے کے لیے اس کی کلائی پر کاٹ کھایا تھا۔ جواب میں دو طمانچوں کی آواز گونجی اور شکیلہ کی دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

"جلال! میں کہتا ہوں اس لڑکی کو چھوڑ دو۔ ورنہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

اسی دوران میں اشرف بھی اپنی گہری غنودگی سے جاگ گیا تھا۔ اس کی نحیف آواز تاریکی میں گونجی "یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

میں نے کہا "تیرا پالتو کتا لڑکی کو جھنجھوڑ رہا ہے۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر اشرف نے ذرا تحکمانہ انداز میں کہا "جلال! روشنی کرو۔"

"روشنی نہیں ہوتی جناب۔ شاید بجلی کٹ گئی ہے۔"

اس کا لہجہ گواہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

شکیلہ نے پھر چیخنا شروع کر دیا "مجھے بچائیں جناب... اس نے میرے کپڑے پھاڑ دیے ہیں۔ اس نے مجھے پکڑا ہوا ہے۔"

"یہ بکواس کر رہی ہے جی۔ یہ میری جیب سے چابی نکال رہی تھی۔ میں نے پکڑا ہے تو دھینگا مشتی پر اتر آئی ہے۔"

"اچھا۔ تم اسے چھوڑ کر میرے پاس آؤ۔" ایک بار پھر اشرف کی کمزور آواز تاریکی میں گونجی۔

وہ ہٹ دھرمی سے بولا "میں تو اسے چھوڑ رہا ہوں۔ یہ مجھے نہیں چھوڑ رہی۔"

اس گفتگو کے دوران میں تھوڑا تھوڑا دروازے کی طرف کھسک رہا تھا۔ کمرے میں روشنی کرنے والی ٹیوب لائٹ کا سوئچ دروازے کے پاس ہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے سر کی مدد سے ٹیوب لائٹ آن کر سکوں گا لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب جلال نے ٹیوب لائٹ اتار ہی نہ دی ہو۔ اشرف اور اس کے گارڈ کی تکرار کے دوران ہی میں سوئچ تک پہنچ گیا۔ میں نے اپنے کندھے کی مدد سے سوئچ دبایا تو تہ خانہ روشن ہو گیا۔

منظر چونکا دینے والا تھا۔ جلال کا زیریں بدن عریاں تھا۔ اس نے حسین شکیلہ کو صوفے پر گرایا ہوا تھا۔ وہ کسی چڑیا کی طرح اس شکرے کی گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ اشرف بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں "یہ... یہ کیا ہو رہا ہے جلال؟" اشرف نے کراہ کر کہا۔

جلال نے اضطراب میں اپنے ہونٹ بھینچے پھر ایک دم چیخ کر بولا "جو کچھ ہو رہا ہے تیرے سامنے ہے۔ تجھے نظر نہیں آ رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب لیٹ جا کروٹ بدل کے۔ لیٹ جا۔"

بغاوت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اشرف چیتا یک ٹک اپنے باغی گارڈ کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ پسٹل کی تلاش میں اپنے تکیے کی طرف بڑھایا۔ تکیے کے نیچے پسٹل نہیں تھا۔ جلال نے ڈھٹائی سے اشرف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "وہاں کچھ نہیں ہے۔ پسٹل یہاں میری پاکٹ میں ہے۔ اب چپکے سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ' ورنہ مجھے بالکل بے شرم بننا پڑے گا۔" جلال کی آواز میں شراب کا خمار تھا۔

میں نے دیکھا سائیڈ ٹیبل پر وہسکی کی بوتل کھلی پڑی تھی'

اس میں سے آدھی شراب غائب تھی۔ بوتل کے پاس ہی بسکٹ کا ڈبا تھا۔ یہ ڈبا بالکل خالی تھا۔ یہ نیا ڈبا جلال نے ہمارے سونے کے بعد ہی الماری سے نکالا تھا اور سارے کا سارا کھا گیا تھا۔ پورے بیس بسکٹ جو ہمیں کئی دن کے لیے زندگی کی حرارت فراہم کر سکتے تھے۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ پچھلے دو تین منٹ سے میں یہی سوچ رہا تھا کہ شدید بھوک پیاس کے ایسے عالم میں تو "جنس" سمیت ہر جذبہ گہری نیند سو جاتا ہے پھر جلال پر یہ شیطانیت کیسے سوار ہوئی تھی۔ اب اصل صورتِ حال سامنے آ رہی تھی۔ اس نے پہلے بسکٹ اور شراب سے اپنی ایک جبلت کی تسکین کی تھی۔ اس تسکین سے ایک دوسری جبلت بیدار ہوئی تھی اور اب وہ اس نئی تسکین پر کمربستہ ہو گیا تھا۔

یکایک اشرف جیا میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی۔ اس نے قریب رکھی ہوئی شیشے کی وزنی ایش ٹرے اٹھائی اور جلال پر کھینچ ماری۔ ایش ٹرے جلال کے سر پر لگی اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ابھی راڈ اشرف کے قریب ہی پڑا تھا۔ اس نے پکڑا اور طیش کے عالم میں اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اس دوران جلال نے شکیلہ کو چھوڑ دیا اور رائفل سمیت اشرف کی طرف بڑھا۔ اس نے اشرف سے راڈ چھین کر باتھ روم میں پھینک دیا اور پوری دلیری سے رائفل کی نال اپنے باس کے سینے سے لگا دی۔ "لیٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں لیٹ جاؤ!" وہ خمار آلود آواز میں دھاڑا۔

"کتے حرامی کمینے۔ میں تجھے زندہ درگور کر دوں گا۔" اشرف کی کمزور آواز کپکپا رہی تھی۔

"زندہ درگور تو تم ہو ہی چکے ہو... اور میرے ساتھ خود بھی ہو چکے ہو۔ اب زندگی کی جو چند گھڑیاں رہ گئی ہیں ان سے لطف اندوز تو ہو لینے دو۔ دیکھو اس لڑکی کو کیسا قصبے کی ملائی جیسا بدن ہے اس کا۔ یہ سب چند دنوں میں بدبو ہونے والا ہے اور یہ بوتل میں چھلکتی ہوئی شراب... یہ بھی ہمارے کسی کام نہیں آنے والی۔ اگر میں ان چیزوں کو بیکار ہونے سے پہلے استعمال کر لینا چاہتا ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

اس نے نشے سے بھرپور قہقہہ لگایا اور اشرف کو اپنی رائفل کی نال سے باقاعدہ دھکیل کر بستر پر لٹانا چاہا۔ اسی دوران اشرف جیا نے ایک زخمی چیتے جیسی پھرتی دکھائی۔ اس نے رائفل کی نال پکڑی اور اس کا رخ بستر کی طرف کر دیا۔ اس نے یوں سوچ لی تھی کہ رائفل اس کے نیچے دب کر رہ گئی تھی لیکن کچھ بھی تھا یہ ناکافی پھرتی تھی۔ اپنے نحیف اور زخمی جسم کے ساتھ اشرف وہ مزاحمت پیش کر ہی نہیں سکتا تھا جس کی اس موقعے پر ضرورت تھی۔ بہرحال اشرف کی اس حرکت سے اتنا ضرور ہوا کہ شکیلہ تیزی سے جلال پر جھپٹ پڑی۔ باتھ روم کے دروازے پر پڑا ہوا راڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ راڈ اس نے خاصی طاقت سے جلال کے سر پر مارا لیکن وہ اس کی گردن پر لگا۔ جلال نے بے دردی سے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی۔ وہ اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ راڈ اس کے ہاتھ سے نکل کر پھر باتھ روم کی طرف پھسل گیا تھا۔

جلال نے رائفل چھڑانے کے لیے اشرف کے زخمی کندھے پر گھٹنا رسید کیا۔ اشرف کے حلق سے اذیت ناک چیخ نکل گئی۔ جلال نے رائفل کھینچ لی اور رائفل کے چوبی دستے کی ضرب اشرف کے سر پر لگائی۔ اشرف بستر سے نیچے گر پڑا اور وہیں پڑا رہ گیا۔ اس میں اب اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ سر اٹھا سکتا۔ جلال نے شکیلہ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین طمانچے اس کے منہ پر جڑ دیے۔ وہ اب رونے اور چیخنے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہی تھی۔ اس کی سرخ مخملی قمیص کندھے سے پھٹ کر نیچے لٹک گئی تھی اور اس کے سیمیں بدن کو عریاں کر رہی تھی۔

میں اپنی جگہ دانت پیسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ درحقیقت جلال نے اس مختصر سے تہ خانے میں مطلق العنان حکمران کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اسلحہ اس کے پاس تھا۔ خوراک کے "ذخیرے" پر اس کا قبضہ تھا۔ پانی، بجلی، مواصلات سب کچھ اس کی دسترس میں تھا۔ اور وہ وہی کچھ کر رہا تھا جو وسائل پر قابض لوگ کیا کرتے ہیں۔

میں نے اشرف جیا کو دیکھا۔ وہ قالین پر زخمی حالت میں پڑا تھا۔ دھینگا مشتی کے بعد اس کے کندھے نے مزید تیزی سے خون اگلنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خون کی کمی کے سبب اس کو سانس بھی کھینچ کھینچ کر آ رہی ہے۔ وہ ہوش میں تھا لیکن آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ غالباً اب اتنی سکت ہی نہیں تھی اس میں۔

ایک "جہاں بان" کے لیے یہ صورتِ حال عبرت ناک تھی۔ اپنے ایک معمولی گارڈ کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر وہ قالین پر پڑا تھا اور اب خود میں اتنی ہمت بھی نہیں پا رہا تھا کہ اپنے حالات کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر سکے۔ اشرف جیا (یا جو بھی اس کا اصل نام تھا) کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ نہایت عیار جرائم پیشہ لوگوں کا سرغنہ تھا۔ وہ پس پردہ رہ کر بڑی ہوشیاری سے ان فتنہ ساماں لوگوں کی کمان کر رہا تھا جو

ملک کے طول و عرض میں خطرناک تخریبی کارروائیاں کر رہے تھے۔ آج یہ تخریب کار نشانِ عبرت بن کر اس تہ خانے میں مقید تھا اور اس کا ایک معمولی نوکر اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔

جلال جو کام پہلے ڈھکے چھپے انداز میں کر رہا تھا اب دھڑلے سے کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اب اسے میری پروا تھی اور نہ اشرف جیا کی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں نہ ہوتی تب بھی ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں تھا کہ اس کے ارادوں کے سامنے دیوار بن سکتا۔ صورتِ حال کلی طور پر جلال کے حق میں تھی۔ اس نے شراب کی بوتل بڑے دھڑلے سے سامنے میز پر رکھی۔ تھوڑا سا کاجو نکال کر پلیٹ میں ڈالا اور پینی شروع کر دی۔ شکیلہ ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور سسکیاں لے رہی تھی۔

جلال کو شاید اس پر تھوڑا سا ترس آیا۔ اس نے الماری میں سے بسکٹس کا وہ ڈبا نکالا جس میں سے آج صبح بسکٹ نکالے گئے تھے۔ تین بسکٹ اس نے پلیٹ میں رکھے اور پلیٹ شکیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لے رانی کھا لے۔ مجھ سے تیرا کملایا ہوا روپ نہیں دیکھا جاتا۔"

"میں نے نہیں کھانے۔" شکیلہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کھائے گی ضرور۔ آج نہیں تو کل کھائے گی۔ اس وقت تجھے بغیر کسی شرط کے کھلا رہا ہوں۔ بعد میں میں نے شرطیں لگانا شروع کر دیں تو پچھتائے گی۔ کھا لے شاباش۔"

جلال نے پلیٹ اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے کر دی۔

اس مرتبہ شکیلہ نے زیادہ شد و مد سے انکار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی کو نیم رضامندی جانتے ہوئے جلال نے بسکٹ اس کے پاس ہی رکھ دیے اور بڑے ندیدے انداز میں اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

میں اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر سے شراب کے سامنے آ بیٹھا۔ دو گھونٹ لینے کے بعد اس کے جی میں نجانے کیا آئی کہ اس نے اٹھ کر میرے ہاتھوں اور پاؤں کی بندشیں اچھی طرح چیک کیں اور بڑے جھکے انداز میں ایک بار پھر میری جامہ تلاشی لی۔ میں اب تک بندھا ہوا تھا لیکن وہ اشرف سے زیادہ مجھ سے خطرہ محسوس کر رہا تھا۔

میری طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ پھر بوتل اور جام کے سامنے آ بیٹھا۔ وہ دھیرے دھیرے چسکیاں لیتا رہا اور اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کھجاتا رہا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جام اور دوسرے میں رائفل تھی۔ اس نے ابھی تک اپنی قمیص ڈھانپنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے زیریں جسم پر صرف ایک انڈرویئر تھا۔ یہ انڈرویئر بھی اس کی صورت کی طرح سخت میلا کچیلا تھا۔ یوں تو سات آٹھ روز اس تہ خانے میں بند رہنے کے بعد ہم سب ہی میلے کچیلے نظر آ رہے تھے لیکن جلال پر سب سے زیادہ "روپ" چڑھا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، بال الجھے ہوئے اور ہونٹ بالکل سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے قریباً ایک گھنٹے تک شراب نوشی کی پھر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

شکیلہ نے ابھی تک بسکٹ نہیں کھائے تھے۔ جلال رائفل بدست اس کے سر پر پہنچا۔ اس کے بدن کو رائفل کی نال سے سہلاتے ہوئے بولا "اے رانی! کھا لے۔ دیکھ تجھے کتنے پیار سے کھلا رہا ہوں۔ اتنے پیار سے تو کوئی زہر بھی کھلائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں نے کہا ہے نا۔ مجھے نہیں کھانے۔ مجھے مر جانے دو۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"تمہیں مرنے سے کون روک رہا ہے شہزادی۔ جب وقت آئے گا تو مر جانا۔ بلکہ ہم چاروں مر جائیں گے لیکن ابھی تو زندہ ہیں۔ اور جو زندہ ہو اسے بسکٹ کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور ان دوسری چیزوں کی بھی جو بسکٹ کی طرح خستہ اور مزے دار ہوتی ہیں۔ کیا سمجھی ہو۔" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔" وہ بولی۔

"دیکھو۔ تم اپنا بہت زیادہ نقصان کر رہی ہو۔ اگر تم کھاؤ گی نہیں تو مر جاؤ گی۔ ایسی صورت میں آج، کل یا پرسوں یہ دروازہ کھل بھی گیا تو تمہیں اس کے کھلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیا تم پھر سے سورج کی دھوپ اور نیلا آسمان دیکھنا نہیں چاہتی ہو۔"

شکیلہ نے اپنا سر بدستور گھٹنوں میں چھپائے رکھا۔

جلال نے رائفل کی نال زور سے اس کی پسلیوں میں چبھوئی اور گرج کر بولا "کھاؤ یہ بسکٹ۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا اور انگلی لبلبی پر رکھ دی۔ اس کے تیور دیکھ کر شکیلہ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ وہ بھوکا رہ کر مرنے کی بات کر رہی تھی۔ بھوکا رہ کر مرنے کی بات کرنا اور چیز ہے گولی کھا کر فوری طور پر مر جانا اور چیز ہے۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنا لرزتا ہوا

ہاتھ بسکٹ کی طرف بڑھا دیا۔

گلے تین گھنٹے بھی اسی طرح گزر گئے۔ اشرف اب تقریباً بے ہوش ہی تھا۔ وہ کل رات سے قالین پر پڑا تھا۔ اس کے کندھے کا خون رس رس کر خود ہی بند ہو گیا تھا۔ قالین کا دو تین مربع فٹ حصہ اس کے خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اشرف کسی وقت کچھ بڑبڑاتا تھا لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ پاشا گینگ کے گینگ باس کا یہ حسرت ناک انجام دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے ایک پوشیدہ زندان میں اپنے قدموں سے چل کر آیا تھا اور پھنس گیا تھا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں اس کے کندھے کا زخم خوفناک حد تک بگڑا تھا اور اسے لب مرگ لے آیا تھا۔

آج مجھے دوپہر کے بعد سے پیشاب کی حاجت تھی لیکن میرے بار بار کہنے کے باوجود جلال نے میرے ہاتھ نہیں کھولے تھے۔ وہ کل ساری رات جاگتا رہا تھا تاہم دوپہر کے بعد تین چار گھنٹے کے لیے سو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس نے مجھے اور شکیلہ کو باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ اشرف کی طرف سے اسے خطرہ نہیں تھا۔ اشرف بے ہوش تھا۔ میں باتھ روم میں کوئی ایسی شے ڈھونڈ رہا تھا جس سے میں اپنے ہاتھوں کی رسی کاٹنے کی کوشش کر سکوں لیکن جلال نے اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی تھی اور باتھ روم یا کمرے میں کوئی ایسی شے رہنے نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ ایک شاور کا تیز دھار ابھی اس نے اپنی راڈ کی ضربوں سے موڑ دیا تھا تاکہ وہ رسی کاٹنے کے کام نہ آسکے۔ میں نے شکیلہ سے درخواست کی کہ وہ میرے ہاتھ کھول دے۔ نتیجہ وہی نکلا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ شکیلہ کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا۔ وہ بولی "خدا کے لیے مجھے کسی اور امتحان میں نہ ڈالو۔ وہ بڑا بے رحم ہے۔ اس نے مجھے تمہارے سامنے ہی تاکید کی تھی کہ میں اسے دھوکا دینے کی کوشش نہ کروں۔"

"دیکھو شکیلہ! ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ ویسے بھی یہ خبیث ہمیں مار ہی ڈالے گا۔ رات کو اس نے بسکٹوں کا پورا ڈبا خالی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ڈبا آج خالی کر دے۔ بعد میں یہ ہمیں بھی گولی مار دے گا۔ ایسے لوگ تو زندہ رہنے کے لیے اپنے ساتھیوں کا گوشت بھی بلا جھجک نوچ لیتے ہیں۔"

شکیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ شاید اس کے کانوں میں جلال کا وہ جملہ گونجا تھا جو رات اس نے شکیلہ سے کہا تھا "ابھی تو ہم زندہ ہیں رانی! اور جو زندہ ہو اسے بسکٹ کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور ان دوسری چیزوں کی بھی جو بسکٹ کی طرح خستہ اور مزے دار ہوتی ہیں۔"

پتا نہیں کہ یہ جملہ جلال نے کس حوالے سے کہا تھا لیکن یہ اس کی سفاکی اور دہشت کو ظاہر کرتا تھا۔

شکیلہ کی حسین آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں نے کہا "تم میرے ہاتھ کھول دو اس کے بعد یہی رسی اسی ڈھالے طریقے سے دوبارہ میرے ہاتھوں پر لپیٹ دو....."

"نہیں۔ نہیں۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "وہ بہت چالاک ہے۔ اسے پتا چل جائے گا۔ وہ مجھے گولی مار ڈالے گا۔ میں یہ نہیں کروں گی۔"

"اچھا بولو تو آہستہ۔" میں نے اسے جھڑکا "یہ نہ ہو کہ کچھ کیے بغیر ہی وہ ہمیں سولی پر ٹکا دے۔"

وہ سہم کر رہ گئی۔ جلال نے ہمیں شام سات بجے کے بعد باتھ روم سے نکالا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے لگژری بستر پر سویا رہا تھا اور اس کا مالک یعنی پاشا گینگ کا باس نیم مردہ حالت میں قالین پر پڑا رہا تھا۔ شکیلہ نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کو کندھے کے قریب گرہ دے لی تھی۔ یہ جسم چھپانے کی ادھوری سی کوشش تھی۔ وہ جن ہوسناک نگاہوں سے خود کو چھپانا چاہتی تھی ان سے چھپنا آسان نہیں تھا۔ ایک ختم نہ ہونے والی چار دیواری تھی۔ وہی چھت، وہی دیواریں، وہی بند دروازہ، وہی لکڑی کی دیوار گیر الماری جو تہہ خانے کے وسط میں کھڑی کر دی گئی تھی۔ یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ گرد و پیش کو دیکھ دیکھ کر نگاہیں اکتا سی گئی تھیں۔ یہ عجیب ماحول تھا۔ میں نے جیسا کی کال کوٹھڑیوں میں بھی دن گزارے تھے لیکن ایسی وحشت وہاں بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو پتا ہوتا تھا کہ آج یا کل یا ایک سال بعد یا دس سال بعد مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ یہاں تو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کب نکلنا ہے اور نکلنا بھی ہے یا نہیں پھر کال کوٹھڑی کتنی بھی بری ہو اس میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کو ایندھن تو ملتا ہے۔ یہاں تو ایندھن بھی نہیں تھا اور اگر تھوڑا بہت تھا بھی تو اب ختم ہوتا جا رہا تھا۔

میں اب سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا واقعی ہم یہاں سے نکل نہیں سکیں گے؟ کوئی آہٹ، کوئی آواز، امید کی کوئی کرن۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس وہی سناٹا تھا جو قبر میں ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس گھڑیاں نہ ہوتیں تو ہمیں دن اور رات کی بھی کچھ خبر نہ ہوتی۔ ہم گھڑیوں کے حساب سے ہی سورج ڈھالتے تھے اور اسی حساب سے اندھیرا کر لیتے تھے۔ اگر اس تہہ خانے میں موجود دو ٹیوب لائٹس بجھا دی جاتیں تو تاریک رات تھی ورنہ دن تھا۔ ایک بات سوچنے کی تھی۔ اگر یہاں ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں تو یہیں

کہیں بجلی کا میٹر بھی چل رہا ہوگا۔ اگر اس تہہ خانے کے اوپر بنی عمارت بہت پہلے کھنڈر بن چکی تھی یا ملبے کا بہت بڑا ڈھیر بن چکی تھی تو بھی بجلی کے ان تاروں کا سراغ لگ جانا چاہیے جو اس تہہ خانے تک پہنچ رہے تھے اور پانی کے ان پائپوں کا سراغ بھی لگنا چاہیے تھا جو یہاں باتھ روم تک آ رہے تھے۔ ان چیزوں کا سراغ کیوں نہیں لگایا جا سکا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کچھ لوگ جان بوجھ کر ہمیں اس قبر میں زندہ دفن رکھنا چاہتے ہوں۔ جس طرح ایک معمولی گارڈ اپنے گینگ باس کی غداری پر اتر آیا تھا اسی طرح کچھ اور لوگ بھی اطلاعاتی گھڑی میں گینگ باس سے غداری پر آمادہ ہو سکتے تھے۔

میرے ذہن میں بار بار ساہی صاحب کی شبیہ ابھر رہی تھی۔ صرف انہی کو معلوم تھا کہ میں پاشا گینگ کے سرغنہ کی کھوج میں یہاں گارون ٹاؤن کی کوٹھی میں آیا ہوں۔ یقیناً اس کوٹھی پر پولیس نے جو چھاپہ مارا تھا اس کا انتظام ساہی صاحب نے ہی کیا تھا مگر یہ بات ساہی صاحب کو بھی معلوم نہیں ہوئی کہ یہ تمام سا چھاپہ نہایت مہیب قسم کے بارودی دھماکوں میں بدل جائے گا اور پوری عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے گی۔

رات کو جلال نے چار بسکٹ لیے اور چار ہی شکیلہ کو دیے۔ میرے حصے میں صرف دو بسکٹ آئے۔ بھوک بھی کیا غضب کی غیر مہذب اور جنس کتنی ہم ہو جاتی ہے۔ میں وہ ٹھنڈی ایک بڑی "چین" کا مالک بن چکا تھا۔ اس وقت بھی میرے ہونٹوں میں سیکڑوں افراد ہر دوسرے قسم کے ناز کرنے والے مصروف تھے۔ باربی کیو، چائنیز ہوٹل۔ ان گنت ڈشز، غذا و مشروبات اور میرے حصے میں صرف دو بسکٹ آئے تھے۔ یہ دو بسکٹ بھی میں اپنی مرضی سے اپنے ہونٹوں تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے مددگار کی ضرورت تھی۔

بے بسی کی موت مجھے پسند نہیں تھی۔ نہ ہی میں نے کبھی ایسی موت مرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ ان نہایت مایوس کن لمحات میں بھی مجھے یقین تھا کہ میں اس ٹھٹھرتے ہوئے تہہ خانے میں بھوک سے سسک کر نہیں مروں گا۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ کوئی نہ کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے گا۔ دو تین روز پہلے تک میں نے اس معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لیکن اب ایک وہم بے حد گہری سنجیدگی سے میرے دل و دماغ کو گھیر رہا تھا۔ ایسا جلال کی "بغاوت" کے بعد ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کی چاپ سن کر جنونی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ محسوس ہوتا

تھا کہ اگلے ایک دو دن میں یہ شخص یہاں موجود خوراک ختم کر دے گا اور پھر اس کے ساتھ ہی ہماری سانسیں بھی اکھڑنے لگیں گی۔ ابھی تو جسم میں "اسٹور" توانائی کام آ رہی تھی، جب یہ توانائی بھی ختم ہو جاتی تو پھر جسم نے ارادوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دینا تھا۔ ضروری تھا کہ ایسا منحوس وقت آنے سے پہلے ہی یہاں سے نکلنے کی بھرپور کوششیں کر لی جاتیں۔

اچانک اشرف چیخا کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں کچھ کہہ رہا تھا۔ شکیلہ اس کے نزدیک تھی۔ اس نے جھکتے ہوئے جلال سے کہا "یہ شاید پانی مانگ رہے ہیں۔"

جلال نشے میں ہاتھ نرا کر بولا "پانی پلا پلا کر اس کی زندگی لمبی مت کرو۔ جتنی جلدی اس کی خلاصی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"پھر گولی کیوں نہیں مار دیتے انہیں؟" شکیلہ روہانسی ہو کر بولی۔

"چلو گولی ہی مار دیتے ہیں۔" جلال نے لاپروائی سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل اپنے گینگ باس کی طرف سیدھی کر لی۔

"نہیں نہیں ایسا مت کرو۔" شکیلہ اس کے سامنے آ گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

غالباً وہ کسی انسان کو اپنے سامنے مرتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جلال نے مسکرا کر رائفل کی نال جھکا لی۔ شکیلہ ایک گوشے میں سمٹ گئی اور اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلال نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اس چھت کے نیچے رونا دھونا بالکل پسند نہیں کرے گا۔ کل شام شکیلہ نے آنسو بہائے تھے تو اس نے لات مار کر شیشے کی اکلوتی پیالی چکنا چور کر دی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کے شدید غصے کا اظہار تھا۔

کچھ دیر بعد شاید جلال کے دل میں تھوڑی سی نرمی پیدا ہوئی۔ وہ شکیلہ سے مخاطب ہو کر بولا "اچھا جاؤ۔ اپنے ہمسیر کو پلا دو تھوڑا سا پانی۔"

شکیلہ اٹھی۔ ایک گلاس میں پانی لائی اور چمچ کی مدد سے اشرف کے سیاہ ہونٹوں کی درز میں ٹپکانے لگی۔ اس کے بال بار بار ڈھلک کر اشرف کے چہرے کو چھونے لگتے تھے۔ وہ انہیں سمیٹ کر اپنے کانوں کے عقب میں اڑس لیتی تھی۔ وہ کوئی بہت صاف گو بیوٹی کوئین نہیں تھی لیکن انوکھی تھی۔ اس کے سینے میں ایک نرم دل موجود تھا۔ معلوم نہیں اس کے بارے

میں بھائی جی کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کنواری ہے۔ اس دعوے کی حقیقت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بہرحال لڑکی کی کم سنی اور نو آموزی تو سامنے کی بات تھی۔

کھانے کے بعد معدے کو قدرے سکون ملا تو غنودگی سی محسوس ہونے لگی (میرا پر تکلف کھانا بس دو عدد بسکٹوں اور دو گھونٹ پانی پر مشتمل تھا) دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ اندھیرا بے معنی نہیں ہے۔ جلال شکیلہ کے ساتھ مصروف تھا۔ مدھم آہٹوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں نرم و گداز بیڈ پر ہیں۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شکیلہ کوئی احتجاجی آواز بلند کرے گی لیکن احتجاج کہیں نہیں تھا۔ غالباً یونہی گھٹنے کی سوچ بچار نے شکیلہ کو مزاحمت کی بجائے مفاہمت پر آمادہ کر دیا تھا۔ وہ کوئی پارسا لڑکی تو نہیں تھی۔ وہ اپنا خوب صورت جسم بیچنے کے لیے اس چار دیواری میں آئی تھی۔ خریدار کے بدلنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن یہاں طرفہ تماشا یہ تھا کہ خریدار کے ساتھ ساتھ قیمت بھی بدل گئی تھی۔ اس کے ان چھوئے شباب کی قیمت ستر اسی ہزار سے کم ہو کر چند بسکٹوں پر آ گئی تھی۔ چند دنوں تک عافیت اور سہولت سے زندہ رہنے کے لیے اس نے خود کو ایک گارڈ کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ یہ ایک خاموش سمجھوتا تھا جس پر اس تاریکی میں عمل درآمد ہو رہا تھا۔ حالات نے ایک معمولی گارڈ جلال کو اس چار دیواری کا حکمران بنا دیا تھا۔ ایک ایسا حکمران جو اپنے قول و فعل کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں تھا اور جب انسان کسی کو جواب دہ نہ ہو تو پھر وہ انسان کہاں رہتا ہے۔

میں اس موقعے پر خاموشی سے قالین پر نیم دراز رہا۔ قالین ہی کے ایک حصے کو میں نے لحاف کے انداز سے جسم پر ڈال رکھا تھا۔ مجھ سے صرف دس بارہ فٹ کے فاصلے پر وہ کنگ سائز بستر تھا جس پر جلال خان موجود تھا۔ میں نے اس موقعے پر کسی طرح کی دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ اگر میں دخل اندازی کرتا تو یہ قطعاً بیکار و لاحاصل ہوتی۔ اس دخل اندازی سے مجھے اور شکیلہ کو شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ تاریکی میں ایک "تلخ سمجھوتے" پر عمل درآمد جاری رہا۔ آخر خاموشی چھا گئی۔ لگتا تھا کہ جلال سو گیا ہے اور شاید شکیلہ بھی لیکن میں اب جاگ رہا تھا۔ میرے سینے میں ایک آگ روشن تھی۔ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ جلال کا وجود میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں صبح تک سخت بے چین رہا۔

صبح دم یہ دیکھ کر میری بے چینی مزید بڑھ گئی کہ پلیٹ بالکل خالی تھی۔ اس خالی پلیٹ کے ساتھ ہی شراب کی نصف خالی بوتل بھی پڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رات جلال نے کم از کم ڈیڑھ پاؤ کاجو اور آدھی بوتل شراب صاف کیا ہے۔ اس نے جس تیسری چیز پر ہاتھ صاف کیا وہ شکیلہ تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ رات والی کارستانی سے پہلے جلال نے اسے تھوڑی بہت شراب بھی پلائی ہے۔ وہ مدہوشی کی حالت میں بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میری جلتی ہوئی آنکھیں مزید جل اٹھیں کہ میری طرح شکیلہ کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ یہ کام جلال نے رات سونے سے پہلے کیا تھا۔ دراصل اس سے پہلے جلال کو جب بھی سونا ہوتا تھا وہ باتھ روم میں چلا جاتا تھا اور اندر سے کنڈی چڑھا لیتا تھا یا پھر مجھے اور شکیلہ کو باتھ روم میں بند کر دیتا تھا لیکن رات کو وہ ہمارے درمیان ہی سویا تھا اس لیے اس نے محو خواب ہونے سے پہلے شکیلہ کی مشکیں بھی اسی طرح کس دی تھیں۔

پتا نہیں کیوں اس کم سن لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں پتھر کے زمانے میں ہوں جہاں انسان جانوروں کے طور طریقوں سے ہی زندگی بسر کرتا ہے۔ میں نے جلتی نظروں سے جلال کی طرف دیکھا۔ اس نے میرے انداز کو نوٹ کیا۔ وہ پیگ میں سے ایک گھونٹ لے کر بولا "اس طرح آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو میری طرف۔"

میں نے کہا "سوچ رہا ہوں کہ تمہیں کسی عورت نے جنا تھا یا کسی تجربے کی پیداوار ہو تم۔ عورت کے پیٹ سے جنم لینے والا شخص ایک عورت سے تو ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔"

جواب میں اس نے ایک غلیظ سی بات کی اور تند و تیز فقرے بولے۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

شور سن کر شکیلہ بھی جاگ گئی۔ وہ کچلے ہوئے پھول کی طرح بڑی پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ جلال کے علاوہ مجھ سے بھی نظریں چرا رہی تھی۔ اب بھی اس کے جسم پر سرخ لباس تھا لیکن اس سلوٹ سلوٹ لباس کی آب و تاب اب ماند ہو چکی تھی۔ اس لباس کے ساتھ جو قیمتی گہنے شکیلہ نے رات پہنے تھے وہ اب ایک دراز میں پڑے تھے۔ یہ لاکھوں کا زیور تھا۔ کم از کم تین لاکھ کا۔ تاہم اس قید خانے میں تین لاکھ سے تین بسکٹوں کی قیمت زیادہ تھی۔ جلال مسکراتی ہوئی شیطانی نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھتا تو میرا خون پھر کھولنے لگا۔

میں نے جلال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "پہلے مجھے شک تھا لیکن اب اس لڑکی کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ تمہاری رگوں میں بہت گندا خون ہے۔"

"گندا نہیں زہریلا۔ زہریلا۔ بچو اس خون کے زہر سے۔"

میں نے کہا "کچھ دن پہلے میں نے اتفاقاً ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں بھی ایک غنڈے نے یہی کہا تھا کہ اس کی رگوں میں بہت زہریلا خون ہے۔ اس غنڈے کی ماں کے ساتھ گینگ ریپ ہوا تھا اور وہ غنڈا اس گینگ ریپ کا نتیجہ تھا۔"

"تم بکواس بند کرتے ہو یا میں تمہارا سر توڑ دوں۔" اس نے اپنا ہاتھ شراب کی خالی بوتل کی طرف بڑھایا۔

"تم بس پاگل کتے کی طرح شور مچا سکتے ہو۔ کر کچھ نہیں سکتے۔ اس رائفل سمیت تمہیں زمین میں نہ دھنسا دوں تو..."

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ جلال نے بے دریغ وزنی بوتل مجھ پر کھینچ ماری۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے سر جھکایا۔ بوتل میرے سر کو چھوتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور چکنا چور ہو گئی۔ جلال نشے میں چور ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کئی گھونسے رسید کیے اور ٹھوکریں ماریں۔ میں بندھا ہوا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے صرف یہی کر سکتا تھا کہ اپنا چہرہ بچانے کی کوشش کروں۔

چند سیکنڈ بعد جلال کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہوا تو وہ مغلظات بکتا ہوا پھر سے صوفے پر جا بیٹھا۔ میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا "بس تیرا دانا پانی ختم ہو گیا ہے اس دنیا سے۔ تو نے جو کھانا پینا تھا کھا پی لیا ہے۔"

بین السطور اس کا مطلب یہی تھا کہ اب وہ مجھے کھانے کے لیے کچھ نہیں دے گا اور رات کو جو دو بسکٹ میں نے کھائے تھے وہ آخری تھے۔ وہ میرا دانا پانی ختم کر رہا تھا لیکن دانا پانی تو اوپر سے ختم ہوتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جلال نشے کے عالم میں ایک سنگین غلطی کر چکا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ کمرے اور باتھ روم میں سے ہر ایسی شے غائب کر رکھی تھی جسے تیز دھار کہا جا سکے اور جو میری بندشوں کو کاٹنے میں معاون ثابت ہو لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ پر پھینک کر جو بوتل توڑی تھی اس کے ٹکڑے میرے ارد گرد بکھرے ہوئے تھے۔ درحقیقت یہ غلطی میں نے ہی اس سے کروائی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر اسے طیش دلایا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق دو چار منٹ بعد جلال رائفل سمیت باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ موقع میرے لیے غنیمت تھا۔ میں نے شکیلہ کی نگاہ بچا کر شیشے کا ایک مناسب ٹکڑا اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے اٹھا لیا۔ درحقیقت میں اپنی یہ کارروائی شکیلہ سے بھی چھپانا چاہتا تھا۔ وہ جلال سے اتنی خوف زدہ تھی کہ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ خون خرابے کے ڈر سے جلال کو بتا دیتی کہ میں اپنے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

دس پندرہ منٹ بعد جلال نہا دھو کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر وہ سب سے پہلے میرے ہاتھوں کی بندش ہی چیک کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے شیشے کا ٹکڑا قالین کے نیچے کر دیا تھا۔ وہ چیکنگ کے بعد فارغ ہوا تو میں نے ٹکڑا پھر اپنی مٹھی میں لے لیا۔

جلال نے بھونڈے انداز میں شکیلہ کے دو تین بوسے لیے پھر اس کی بندشیں کھول دیں۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ ابھی اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کہ جلال کی نگاہ قالین پر بکھرے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں پر پڑ گئی۔ اس نے شکیلہ کو آواز دے کر واپس بلایا اور کہا کہ پہلے وہ ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ شکیلہ نے اس ہدایت پر عمل کیا اور برش کے ذریعے تمام ٹکڑے سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالے۔ جلال نے ڈسٹ بن اٹھا کر الماری میں مقفل کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں جلال کا ذہن میری جامہ تلاشی کی طرف منتقل نہ ہو جائے لیکن اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے شیشے کے ٹکڑے کی مدد سے نائیلون کی رسی کو کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ کام بڑا صبر آزما تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ جلال مجھ سے صرف آٹھ دس فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ گارڈ ہونے کی حیثیت سے وہ چوکس تو بہت تھا لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا کہ صورت حال کی باریکیوں پر اس کی زیادہ گہری نگاہ نہیں ہے۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ باتھ روم اب خالی تھا۔ جلال نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا "ہاں۔ تم نے جانا ہے باتھ روم میں؟"

"نہیں۔" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ بولا "کل تو بڑے زوروں کا پیشاب لگ رہا تھا تجھے۔ کہیں پتلون تو گیلی نہیں کر لی۔"

"اگر کر بھی لی ہے تو تیری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔"

اس نے قہقہہ لگایا اور پھیل کر لگژری بیڈ پر لیٹ گیا۔ عام حالات میں یہ شخص اس بیڈ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا لیکن اب وہ اس شکوہ بیڈ کا "بہترین" استعمال کر رہا تھا اور جو اس بیڈ کا مالک تھا وہ جاں کنی کے عالم میں داغ دار قالین پر پڑا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں، میں اپنے ہاتھوں کی مضبوط رسی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ابھی ایک اور مرحلہ باقی تھا۔ مجھے پاؤں کی بندش بھی کاٹنا تھی۔

اس مرحلے کے لیے مجھے قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ یہ انتظار دو طرح سے صبر آزما تھا۔ ایک تو اس لیے کہ جلال کی طرف سے خطرہ تھا۔ وہ کسی بھی وقت میرے ہاتھوں کی بندش چیک کر سکتا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ مجھے پچھلی رات سے پیشاب آیا ہوا تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد جلال غالباً پیشاب کے لیے ہی باتھ روم میں گیا۔ (وہ بلانوشی کر رہا تھا اور بار بار باتھ روم کی طرف بھی جا رہا تھا) یہ سنہری موقع کھونا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کھول کر پاؤں کی بندشیں کمزور کرنا شروع کیں تو شکیلہ کی آنکھیں خوف اور حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے حلق سے سریلی چیخ نکل جائے گی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور شیشے کے ٹکڑے سے رسی کاٹ کر بند تسمے فضول ہیں۔ نائیلون کی دونوں رسیاں میں نے صوفے کے نیچے کھسکا دیں اور پہلے کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شکیلہ کا جسم خوف سے بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب اس کمرے میں کشمکش ہوگی۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ جلال اسے بھی قصوروار ٹھہرا کر گولی نہ مار دے۔

میں نے اپنے ہاتھ پہلے کی طرح پشت پر کر لیے تھے۔ پاؤں چھپانے کے لیے میں نے قالین کا ایک کونا کمبل کی طرح پنڈلیوں پر ڈال لیا تھا۔ باتھ روم کے دروازے کے بالائی حصے میں قریباً ایک فٹ ضرب دو فٹ کا بلائنڈ شیشہ لگا ہوا تھا۔ اشرف جینا نے اس شیشے میں جلال کے ہاتھوں سوراخ کروا دیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ باتھ روم سے کمرے میں اور کمرے سے باتھ روم میں نظر رکھی جا سکے۔ اب جلال اس وقت باتھ روم سے باہر آنے لگتا تھا شیشے کے سوراخ سے کمرے کا بھرپور جائزہ لے لیتا تھا۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ باتھ روم سے باہر قدم رکھتا تھا۔ اب بھی اس نے سوراخ میں سے جائزہ لیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے پاؤں سے قالین ہٹانے کا نہ کہہ دے۔

چند منٹ بعد جلال باہر آ گیا۔ شکیلہ کا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا پھر اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا "کیا بات ہے؟" اس نے کھٹکے ہوئے انداز میں پوچھا۔

وہ مجھ سے چھ سات فٹ کی دوری پر تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی لیکن بیرل کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ اس کی نظر میرے ڈھکے ہوئے پاؤں کی طرف گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے تک پہنچتا میں نے اپنی جگہ سے جست کی اور جلال کو اپنے نیچے لیتا ہوا شکیلہ کے قریب گرا۔ شکیلہ کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ جلال نے گرتے ہوئے فائر کیا۔ دھماکا ہوا تھا گولی چھت میں جا لگی تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے رائفل چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے چھیننے کی کوشش میں میرا دھیان ایک سیکنڈ کے لیے جلال کے زیریں جسم سے ہٹا۔ اس نے غیر متوقع طور پر ایک بھرپور ضرب میرے پیٹ میں لگائی۔ کئی دنوں کے فاقوں سے پیٹ پہلے ہی خالی تھا۔ یوں لگا جیسے انتڑیاں تڑخ کر رہ گئی ہیں۔ جلال نے زور لگا کر میرے اوپر آنا چاہا لیکن اب ایسی بھی بات نہیں تھی کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا۔ رائفل ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسی کے دستے سے اس کے جبڑے پر ضرب لگائی۔ وہ تلملا گیا۔ یہی وقت تھا جب میں اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کا بدن مردہ مچھلی کی طرح ڈھیلا پڑ گیا۔ یہ سارا عمل بمشکل پانچ چھ سیکنڈ میں مکمل ہوا۔ شکیلہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جلال اتنی جلدی چت ہو جائے گا۔ وہ "دلیری" کا مظاہرہ کرتے ہوئے آہنی راڈ سمیت جلال پر جھپٹی اور کھناک سے ایک ضرب اس کی کھوپڑی پر لگائی۔ وہ پہلے ہی بے ہوش تھا اس نے مزید بے ہوش کیا ہونا تھا۔ شدید ہیجانی کیفیت میں دوسری اور تیسری ضرب بھی لگائی لیکن میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"یہ شیر کوہ قاف کی سیاحت کرنے چلا گیا ہے۔" میں نے شکیلہ کو سمجھایا۔

"کک... کیا ہوا ہے اسے؟"

"یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے چھٹی ہو گئی ہے اس کی۔"

"نن... نہیں۔ یہ مکر کر رہا ہو گا۔ یہ بڑا خنزیر ہے۔" شکیلہ کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

میں نے پہلے جلال کی مونچھیں کھینچیں، پھر اس کے گالوں پر چپت لگا کر شکیلہ کو بتایا کہ "پہلوان" واقعی سردائی پی کر سو گیا ہے۔

نجانے شکیلہ کو کیا ہوا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاید اسے اپنی وہ بے بسی اور بے عزتی یاد آ گئی تھی جو وہ کل رات سے جھیل رہی تھی۔ میں نے اسے دلاسا دے کر چپ کرایا۔ اس کی نہایت حسین آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ اس نے نفرت انگیز انداز میں جلال کی طرف تھوک دیا۔

"یہ اسی لائق ہے۔" میں نے شکیلہ کی تائید کی۔

وہ بولی "آپ باس جی کو دیکھیں۔ وہ زندہ بھی ہیں یا۔"

میں نے جلال کی رائفل قبضے میں لی اور اشرف کے سرہانے پہنچ گیا۔ اس کی بے ہوشی برقرار تھی۔ رنگ زرد اور جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ پلکیں اٹھا کر اس کی پتلیاں دیکھیں۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن طبی امداد ہم سے بہت دور تھی۔ شاید ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر۔ حالانکہ اس تہ خانے سے باہر جو بڑی سڑک فیروز پور روڈ کی طرف جاتی تھی وہاں ایک پرائیویٹ اسپتال کا بورڈ میں نے خود پڑھا تھا۔ اس تہ خانے اور اس اسپتال میں شاید ایک فرلانگ کا فاصلہ بھی نہیں ہوگا۔

جلال کی بے ہوشی کے بعد ہم کو سب کچھ نیا نیا لگنے لگا تھا۔ بے شک ہم اب بھی اس ٹھنڈی قبر میں دفن تھے اور کہیں تازہ ہوا کا گزر نہیں تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ تازہ ہوا آ رہی ہے۔ شاید یہ ہوا ہمارے اپنے اندر چل رہی تھی۔

شکیلہ نے رو دینے والے لہجے میں کہا "پہلے اسے باندھ تو دیں، کہیں پھر نہ اٹھ بیٹھے۔"

"تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔" میں نے کہا۔

"لیکن دیکھیں..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات ذرا سختی سے کاٹی "جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرو۔ اب تم کافی انکار کر چکی ہو۔ میں تم سے کتنا کہتا رہا کہ میرے ہاتھ کھول دو لیکن جلال کے خوف سے تمہارا خون خشک ہو جاتا تھا۔ اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یہ کتنا بڑا سورما ہے۔"

"مم۔ میں اپنی غلطی مانتی ہوں جی۔ میں کم ہمتی کی وجہ سے آپ کی بات نہ مان سکی۔ مم۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ اس جنگلی پر قابو نہیں پا سکیں گے۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم ذرا اس کی جیب سے چابی نکال کر الماری کھولو۔ میں اشرف کا زخم دیکھتا ہوں۔"

"چچ... چابی۔ میں نہیں نکال سکوں گی۔" وہ جلال پر ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

"پھر وہی انکار۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"اچھا نکالتی ہوں۔" اس نے خشک گلا تر کرنے کے لیے تھوک نگلا۔

وہ کافی کمزور ہو گئی تھی لیکن اس کی خوب صورتی زیادہ کمزور نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے کی فرد تھی۔ اگر اس کا تعلق کسی خوش حال فیملی سے ہوتا، وہ تعلیم یافتہ ہوتی۔ بھائی جی کی بیٹی آذرین کی طرح کسی لمبی سی گاڑی پر شاپنگ کے لیے نکلتی تو امیرزادے نقد دل لے کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتے لیکن وہ بے چاری اپنی مجبوری کی زنجیر سے بندھی ہوئی چند ہزار روپوں کی خاطر اپنا آپ بیچنے نکلی تھی اور اس تہ خانے میں زندہ چن دی گئی تھی۔

شکیلہ نے چابی سے الماری کھولی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ شیشے کا جگ نکالے اور اس میں جراثیم کش دوا ڈال کر پانی بھر لے۔ شکیلہ نے ہدایت پر عمل کیا۔ پھل کاٹنے والی جس چھری سے جلال نے اشرف کا کندھا چیرا پھاڑا تھا وہ بھی الماری میں موجود تھی۔ میں نے وہ تیز دھار چھری نکال کر مزید تیز کی، پھر اسے جراثیم کش دوا سے صاف کیا۔ ایک دوسرا تکیہ پھاڑ کر اس میں سے روئی میں پہلے ہی نکال چکا تھا۔ میرے کہنے پر شکیلہ نے تکیے کے غلاف کی لمبی لمبی دھجیاں پھاڑ لیں تاکہ آپریشن کے بعد زخم کو اچھی طرح باندھا جا سکے۔ اب ہم آپریشن کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ سردی بے انتہا تھی اس کے باوجود شکیلہ کی حسین پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا۔

ان لمحوں میں مجھے غزالہ یاد آئی۔ ایسے موقعوں پر وہ سراپا "مسیحا صفت" ہو جاتی تھی۔ مریض کے لیے موت سے دیوانہ وار لڑنا غزالہ کی فطرت میں شامل تھا۔ شاید اسی کی ذات کا تھوڑا بہت عکس مجھ میں بھی آ گیا تھا۔ میں نے اشرف کے کندھے سے پٹی اتاری اور اس کے گوشت میں نشتر لگانے کے لیے اس پر جھک گیا۔ میں ہر صورت گولی اس کے جسم سے نکال لینا چاہتا تھا، چاہے مجھے کتنا ہی گہرا جانا پڑتا۔ میں نے تیز دھار چھری کی نوک اشرف کے کٹے پھٹے ٹشوز پر رکھی۔ پہلے ایک چھوٹا کٹ لگایا، پھر ایک خشک سوتی کپڑے سے اس کا خون صاف کیا۔ اس منظر سے نظر بچانے کے لیے شکیلہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی تھی۔ جونہی میں نے خون صاف کیا، بری طرح چونک گیا۔ جس گولی تک پہنچنے کے لیے میں نیچے گہرائی میں جانا چاہتا تھا وہ تو بالکل اوپر ہی نظر آ رہی تھی۔ جلد سے صرف ایک ڈیڑھ انچ نیچے گولی ایک سخت پٹھے میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ اگر جلال اندھا نہیں تھا تو یقیناً یہ گولی اسے بھی نظر آئی تھی۔ اس بدبخت نے جان بوجھ کر گولی کو نظر انداز کیا تھا۔ اب یہ بات صاف سمجھ میں آ رہی

تھی کہ جلال نے اپنے گیگ باس کے کندھے میں گہرے کٹ صرف اس لیے لگائے تھے کہ اس کے جسم سے مسلسل خون رستا رہے اور وہ خراماں خراماں موت کے دہانے تک پہنچ جائے۔

جلال کی کمینگی اور بدفطرتی اب پوری طرح عیاں ہوگئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ اشرف کو قتل کروا ڈالتا لیکن اسے قتل کرنے میں اس نے کوئی خاص کسر بھی نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد گولی اس کے جسم سے نکال لی۔ گولی کے ساتھ ہی پیپ اور خون کا فوارہ سا نکلا۔ میں نے کراہت کھائے بغیر زخم کو جراثیم کش دوا کی مدد سے اچھی طرح صاف کیا۔ اس کے بعد وہسکی میں موجود اسپرٹ سے دوا کا کام لیا اور زخم کو اچھی طرح دھونے کے بعد مناسب طریقے سے روئی وغیرہ رکھ کر پٹی باندھ دی۔

اس کے بعد میں جلال کی طرف متوجہ ہوا۔ نائیلون کی جو رسیاں مجھے باندھنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں ان کی مدد سے میں نے جلال کی مشکیں کس دیں۔ شگفتہ کے ساتھ مل کر میں نے الماری کی اچھی طرح تلاشی لی تو ایک اور انکشاف ہوا۔ ایک اندرونی دراز کا تالا کھولا گیا تو اس میں سے خشک دودھ کا ایک بڑا ڈبا، گلیکسوز ڈی، چائے کی پتی اور اس قسم کی چھوٹی موٹی اشیا برآمد ہوئیں۔ جلال یقیناً ان اشیا کی موجودگی سے آگاہ تھا لیکن یہ اشیا اس نے بدترین وقت کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔

دودھ کی مدد سے اشرف کے نحیف و نزار بدن کو تھوڑی بہت توانائی فراہم کی جاسکتی تھی۔ میں نے ایک گلاس میں پانی ڈال کر تھوڑا سا دودھ بنایا۔ اس میں گلوکوز ڈالا اور شگفتہ سے کہا کہ وہ چمچ کی مدد سے قطرہ قطرہ اشرف کے ہونٹوں پر ٹپکاتی رہے۔ شگفتہ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اگلے چوبیس گھنٹے میں میں نے ایک بار اشرف کی پٹی بھی بدلی۔ شگفتہ نے اس کے جسم میں خوراک پہنچانے کا عمل جاری رکھا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ اشرف جو نقاہت کے سبب بالکل گم صم ہوچکا تھا، ہولے ہولے کراہنے لگا۔ کسی وقت وہ اپنے ہونٹوں اور پلکوں کو بھی جنبش دے لیتا تھا۔ جسم سے گولی کا نکل جانا اس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا تھا۔

جلال بھی ہوش میں آچکا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے بڑا گلا پھاڑا تھا۔ گندی گالیاں اس کے منہ سے یوں ابل رہی تھیں جیسے گٹر سے گندگی ابلتی ہے۔ درحقیقت وہ مایوسی کی انتہا پر پہنچ چکا تھا اور اس تہ خانے میں زندہ دفن ہونے کے احساس نے اسے نیم دیوانہ کر ڈالا تھا۔

کسی وقت وہ چیخ چیخ کر مجھ سے مطالبہ کرتا کہ میں اسے گولی مار کر ٹھنڈا کردوں وہ مزید زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کسی وقت وہ اپنی رسیاں تڑانے کی کوشش کرتا اور مجھے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتا۔ چودہ پندرہ گھنٹے اس کے منہ میں کچھ نہیں گیا تو اس نے مجھ سے بسکٹ اور شراب کا مطالبہ شروع کردیا۔ کہنے لگا "میرے حصے میں جو کچھ بھی آتا ہے مجھے دے دو اور ایک رات کے لیے اس رانی کو بھی میرے حوالے کردو پھر میں اپنے آپ کو خود ہی گولی مار لوں گا۔"

اس کی ذہنی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ رات پچھلے پہر جب شگفتہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ کھسکتا ہوا میرے قریب آیا۔ کہنے لگا "مجھے الہام ہوا ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"الہام ہوا ہے۔ الہام۔ ہم اگر ڈیڑھ ماہ اور زندہ رہ گئے تو اس تہ خانے میں سے زندہ سلامت نکل آئیں گے لیکن ہم چاروں نہیں نکلیں گے۔ ہم میں سے صرف دو نکلیں گے۔ اب یہ پتا نہیں کہ وہ کون سے دو ہوں گے۔ میرے خیال میں وہی دو ہوں گے، جو زیادہ صحت مند اور طاقتور ہوں گے۔ جیسے تم اور میں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مل کر چالیس پینتالیس دن مزید زندہ رہنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈ لیں۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔"

اس نے ایک نظر خوابیدہ شگفتہ کی طرف اور دوسری نیم بے ہوش اشرف کی طرف ڈالی اور بولا "ہمارے تین چار دن تو دودھ بسکٹ پر گزر جائیں گے۔ اس کے بعد کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ شاید دو تین دن مزید ہم بھوکے رہ کر گزار لیں، اس کے بعد ہمارا دل چاہے گا کہ اپنی ہی بوٹیاں نوچ لیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ بھوک کتنی ظالم شے ہے۔"

"مجھے بہت کچھ پتا ہے تم آگے بولو۔"

وہ سرگوشی کے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہوسکتا ہے کہ ابھی تمہیں میری یہ بات عجیب لگے لیکن بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ تمہیں عجیب نہیں لگے گی۔" ایک لمحہ توقف کرکے اس نے اپنی آواز کچھ اور دھیمی کرلی اور بولا "ہوسکتا ہے کہ ہمیں گوشت کھانا پڑے۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ اس تہ خانے میں کس کا گوشت مل سکتا ہے۔"

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "تمہارا خیال ہے کہ تین چار دن بعد ہم شگفتہ اور گیگ باس میں سے

کسی ایک کو مار ڈالیں اور اس کے گوشت پر زندہ رہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ عقل اور تعلیم وغیرہ ہو لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی سچائی تم کو جلد ہی ماننا پڑے گی۔"

میں نے اپنے چہرے پر سوچ کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا "اگر ہمیں واقعی ایسا کرنا پڑ گیا تو پھر... سوچ لیں گے۔"

وہ بولا "جو سوچنا ہے سوچ لو۔ کیونکہ ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہی ہے۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ تمہارے دماغ میں یہ بات آئے کہ شگفتہ اور ہم میں سے کسی کو مارنے کی بجائے کیوں نہ مجھے ہی مار ڈالا جائے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ حماقت نہ کرنا۔ مجھے جو الہام ہوا ہے اس کے مطابق ہوسکتا ہے کہ ہمیں اس تہ خانے کی کسی دیوار یا فرش وغیرہ کو توڑ کر چھوٹی سی سرنگ لگانی پڑے۔ ایسے کام میں آخری ہچکیاں لیتا ہوا گیگ باس تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہے اور نہ یہ کالج کی پڑھی ہوئی لڑکی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم۔ اسے مذاق نہ سمجھنا۔

میرے کانوں میں کبھی کبھی غائب کی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ آج کل یہ آوازیں بہت زیادہ آرہی ہیں۔"

"میرے خیال میں جب تمہیں شراب نہیں ملتی تو یہ آوازیں کچھ زیادہ ہی آنے لگتی ہوں گی۔"

"دیکھو تم۔ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو نا۔"

"نہیں نہیں، میں یہ جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنا مستقبل تو تاریک نہیں کرنا ہے۔"

اسی دوران میں اشرف چیخا پانی پانی بڑبڑانے لگا۔ میں نے جلدی سے گلوکوز ملے دودھ والا گلاس اٹھایا اور اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

شگفتہ، جلال سے بے حد ڈری ہوئی رہتی تھی۔ وہ بالکل وہمی ہوگئی تھی۔ بار بار جلال کے ہاتھوں اور پاؤں کی بندشیں چیک کرتی تھی۔ اسے فکر لگی رہتی تھی کہ یہ خبیث کسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں کھول لے گا اور ایک بار پھر اس تہ خانے میں وحشت اور درندگی کی حکمرانی ہوجائے گی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سولہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

ثنا جہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل
16

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ـــــــــ ۲۰۰۳ء
مطبع ـــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ـــــــ الحرم کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ـــــــــ ۶۰ روپے

ISBN 969-517-158-3

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنادیا تھا۔ وہ پیدا ہوا تو اس کا نام شاد جہاں رکھا گیا۔ مگر دنیا نے اسے جہانی استاد کے نام سے سمجھا تھا۔ اکثر ہولی گورنر اس کے روبرو خم ہوتی چلی گئیں۔ دنیا کے بڑے بڑے نام اس کے سامنے بجھ گئے۔ قانون کے محافظوں نے ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اس نے قانون کے حوالے کردیا۔ لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں اٹھانا منظور تھیں۔ مگر گردش حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ زندگی استاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی خرتلی کووہ جسمانی کے راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادل ناخواستہ اس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے پیچ اور انوکھے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک ہنگامہ خیز سرگزشت

اگلی رات ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے وحشت زدہ شکیلہ کو مزید وحشت زدہ کردیا۔ شکیلہ صوفے پر سوتی تھی۔ اشرف بیڈ پر ہوتا تھا۔ میں قالین پر شکیلہ اور جلال کے درمیان لیٹتا تھا۔ رات کو کسی وقت جلال رینگتا ہوا آیا اور خاموشی سے شکیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ شکیلہ سو رہی تھی۔ وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتا تھا کیونکہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے اچانک شکیلہ کے ملائم بازو پر دانت گاڑ دیئے۔ یہ عمل اس نے اتنی وحشت سے کیا کہ دانت گوشت میں کھب گئے اور خون نکل آیا۔ شکیلہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اور مسلسل چیختی چلی گئی۔

وہ جلال کے سر پر تھپڑ مار مار کر اور اس کے بال کھینچ کھینچ کر اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ تو کسی جونک کی طرح اس سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر رائفل کے دستے سے اس کی پسلیوں میں بھرپور ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے اوغ کی آواز نکلی اور شکیلہ کا بازو اس کے دانتوں سے چھوٹ گیا۔ شکیلہ چیختی ہوئی میرے پیچھے آن کھڑی ہوئی وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔

جلال کے ہونٹ اور دانت خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے کچھ خون اپنے حلق سے نیچے بھی اتارا ہے۔ ان لمحوں میں وہ مجھے افریقا کا کوئی مینائی آدم خور نظر آیا۔ وہی "مینائی" جو انسانی خون دل پسند مشروب کی حیثیت سے پیتے تھے اور اپنے ہونٹ چاٹتے تھے۔ شاید جلال بھی اپنے حواس کھو کر انسانوں سے دور اور درندوں سے قریب ہوگیا تھا۔

"یہ کیا کیا ہے تم نے؟" میں نے اس کے سر پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے شکیلہ کا بازو چبا ڈالا ہے۔"

"یہ بازو تو نہیں تھا۔ یہ تو گویا لذیذ تھی بلکہ گویا ملائی بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ذرا چکھ کر تو دیکھو شہزادے۔"

"تیرے دماغ کو کرنٹ لگنے والا ہوگیا ہے۔" میں نے کہا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر تین چار بار بند دروازے سے ٹکرایا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا "مارو۔ مارو۔ خوب شور پیدا کرو۔ ہوسکتا ہے کہ باہر والوں میں سے کسی کو ہم پر رحم آہی جائے۔"

شکیلہ اب ضرورت سے زیادہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہیں مسلسل جلال پر جمی تھیں اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے عقب سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ میں اسے اپنے سامنے لانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ چیخیں مارنے لگتی تھی۔

میں نے جلال کو بندوق کے زور پر باتھ روم میں بند ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے ہاتھوں کی طرح پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے لیکن پاؤں کی بندش ایسی تھی کہ وہ آٹھ نو انچ کا قدم اٹھا سکتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ مضحکہ خیز انداز میں حرکت کرتا باتھ روم میں چلا گیا تو میں نے دروازہ باہر سے بند کردیا۔

اب شکیلہ کی جان میں کچھ جان آئی۔ میں نے اس کا بازو دیکھا۔ ظالم نے گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مسلسل روتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے خون بند کر کے اس کے بازو پر پٹی باندھی اور تسلی تشفی دی۔ جلال اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں اب بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ رائفل کی ایک گولی ضائع کر کے اس نیم پاگل سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے مگر اس سلسلے میں کچھ قباحتیں بھی تھیں۔ میں اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کر سکتا تھا۔

سہ پہر کے وقت جب وہ بسکٹ کھا کر اور تھوڑا سا دودھ پی کر شکیلہ سو گئی تو میں اشرف کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی حالت معجزانہ طور پر پہلے سے بہتر تھی۔ پہلے ہم اس کے منہ میں دودھ ٹپکاتے تھے اب وہ خود پینے لگا تھا۔ کسی وقت چند لمحوں کے لیے وہ زرد زرد آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھتا بھی تھا۔ میں نے چمچ کی مدد سے دودھ میں گھولے ہوئے بسکٹ اسے کھلانا شروع کیے۔ اس نے صرف دو تین چمچ لینے کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گہری سانسیں لینے لگا' اس کا مطلب تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ شکیلہ بھی سو رہی تھی۔ جلال کو باتھ روم میں بند ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی' میں نے اسے نکال لیا۔

بدبخت کے ہونٹوں پر ابھی تک شکیلہ کا خون لگا ہوا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ وہ خود سے تو خون پونچھ نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے گیلے رومال سے اس کے ہونٹ صاف کیے۔

اس کی آنکھوں میں ندامت کی بجائے ایک طرح کی جنونی چمک تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا "میری بات یاد رکھنا۔ ہم چاروں میں سے بس دو ہی بچیں گے اور وہ "دو" میں اور تم ہوں گے۔"

میں خاموش رہا۔ مجھے اس کی صورت زہر لگ رہی تھی۔

اس نے ایک نگاہ خوابیدہ اشرف اور شکیلہ پر ڈالی' پھر سرگوشی میں بولا "تو کیا سوچا ہے تم نے؟"

"کس بارے میں؟" میں نے روکھے لہجے میں پوچھا۔

"جب کھانے کو کچھ نہ رہے گا تو پھر زندہ رہنے کے لیے کس کو مرنا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ وہ کبھی اشرف کی طرف دیکھتا تھا کبھی شکیلہ کی جانب... آخر بولا "یہ لڑکی بڑی نازک ہے۔ پہلی دھار کی شراب جیسی۔ اسے ابھی نہیں مارتے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"لیکن کب تک... آخر تو اسے بھی مارنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "شہزادے! ہم تو اس بات کو مانتے ہیں کہ جو بھی "سواد" ملے اسے لے لو۔ کل کی فکروں میں خود کو ہلاکت کرو۔ کل کا کیا پتا۔ کل کسی نے نہیں دیکھا۔"

واقعی کل کسی نے نہیں دیکھا۔ جلال نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ رات کو شکیلہ دیر تک سکڑی سمٹی ایک گوشے میں بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی جلال کی طرف سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ وہ سرگوشیوں میں کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ جلال پاگل ہو چکا ہے' میں اسے گولی مار دوں... اور اگر اسے نہیں مار سکتا تو پھر اسے مار دوں' وہ جلال کے ساتھ ایک چھت تلے رہنے پر موت کو ترجیح دے رہی تھی۔ میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ میں نے سرگوشیوں میں اسے سمجھایا کہ ایک آدھ دن مزید کسی معجزے کا انتظار کرتے ہیں' پھر جلال سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ وہ بولی "یہ وحشی ہے۔ اس نے مجھے دکھ دیا ہے۔" شکیلہ کا اشارہ اپنے بازو کے زخم کی طرف تھا' اور غالباً تین دن پہلے کی اس رات کی طرف بھی تھا۔ جو اسے جلال کے ساتھ گزارنا پڑی تھی۔ وہ صبح تک اس کی دسترس میں رہی تھی اور وہ اپنی بالادستی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

بڑی کوشش سے میں شکیلہ کا خوف کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ سونے کے لیے میرے بالکل قریب ہی لیٹ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھ سے لپٹ کر سوتی۔ میں نے لوڈڈ رائفل اپنے سینے پر رکھی ہوئی تھی۔ رات کے پرفسوں لمحوں میں شکیلہ جیسی حسین و جمیل دوشیزہ کا قرب کسی بھی شخص کے لیے باعث کرب ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے جبکہ وہ اتنے کم فاصلے پر ہو کر ایک ہی بستر پر محسوس ہوتی ہو لیکن جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے تھے دل و دماغ میں محبت و جنس سے متعلق خیالات کا پیدا ہونا محال تھا۔ موت کے بڑھتے ہوئے سایوں میں عیش و نشاط کا طلب گار کون ہو سکتا ہے۔ مجھے تو جلال کے رویے پر حیرانی تھی۔ یقیناً اس کے دماغ میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر اسے اس بات پر پختہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس تہ خانے سے اپنی زندگی میں باہر نہیں نکل سکے گا۔ وہ جب بھی شکیلہ کی طرف دیکھتا تھا' یوں لگتا تھا کہ اپنی نگاہوں سے شکیلہ کے بدن میں سوراخ کرنا چاہتا ہے۔

شکیلہ کا دھیان بٹانے کے لیے میں اس سے مدھم آواز میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تمہاری ماں

نے دوسری شادی کر لی تھی؟"

اس نے اپنی چھوٹی سی ناک سے شوں کی آواز نکالی اور اثبات میں سر ہلایا "آج سے کوئی پچیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میری ماں لائل پور سے بیاہ کر لاہور آئی تھی۔ میرا باپ عام سی شکل و صورت کا تھا لیکن ماں بہت خوب صورت تھی۔ باپ کراچی میں کام کرتا تھا اور مہینے میں پچیس چھبیس دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ جس محلے میں ہمارا گھر تھا وہاں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرائیویٹ ڈیلر کی دکان تھی۔ وہاں بشیر نامی ایک شخص بیٹھتا تھا۔ بشیر نے میری ماں سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ پہلے یہ تعلق بس دیکھنے اور بات کرنے تک تھا' پھر آہستہ آہستہ یہ بڑھنے لگا۔ میرے باپ کی غیر موجودگی میں دونوں چوری چھپے ملتے رہے' نوبت یہاں تک آئی کہ میری ماں نے بشیر سے کہا کہ یا تو وہ دونوں ملنا چھوڑ دیں یا ایک دوسرے سے شادی کر لیں۔ بشیر نے میری ماں سے کہا کہ وہ میرے باپ سے طلاق لے لے۔ ماں جانتی تھی کہ میرا باپ کسی صورت بھی طلاق دینے پر تیار نہیں ہوگا۔ بشیر نے میری ماں سے کہا کہ وہ اپنے خاوند کو زہر دے دے۔ بشیر کی شکل جتنی خوب صورت تھی' اس کا دل اندر سے اتنا ہی بدصورت تھا۔ اس نے میری ماں کو اتنا مجبور کیا کہ اس نے میرے باپ کو زہر دے دیا۔ لوگوں کو یہی پتا چلا کہ میرا باپ دل کے دورے سے مر گیا ہے۔ میرے باپ کو مار دینے کے باوجود بشیر نے میری ماں سے شادی نہیں کی۔ وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ میری ماں کے دو بچے تھے' ایک میں تھی' دوسرا میرا بھائی۔ میری عمر صرف ڈھائی سال اور میرے بھائی کی چار پانچ مہینے تھی۔ اس خبیث نے میری ماں سے کہا کہ پہلے وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی ٹھکانے لگائے پھر وہ شادی کرے گا۔ یہ میری ماں کے لیے بہت سخت امتحان تھا۔ انہی دنوں میرے چھوٹے بھائی کو بڑا سخت ٹائیفائیڈ ہو گیا اور وہ مر گیا۔ اللہ جانے وہ مرا تھا یا اسے بھی بشیر نے کسی طرح مار دیا تھا۔ بہرحال میرے بھائی کے مرنے کے بعد بشیر کو میری ماں پر کچھ ترس آ گیا۔ اس نے میری جاں بخشی کر کے میری ماں سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ ٹھیک رہا' پھر اس کمینے نے اپنا اصلی چہرہ دکھانا شروع کر دیا۔ اس نے میری ماں کو اپنے دوستوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور اسے روزگار کا ذریعہ بنا لیا۔ ماں کی پتا نہیں کیا کیا کمزوریاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ ماں اس کے سامنے چوں نہیں کر سکتی تھی اور نہ اب کر سکتی ہے۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا' دو تین سال پہلے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے بچپن میں میرے سوتیلے باپ نے میری جاں بخشی نہیں کی تھی' اس نے اپنی آنے والی زندگی کے لیے منافع کا بندوبست کیا تھا۔ میرا باپ مجھے بھی اس راہ پر چلانا چاہتا تھا جس پر میری ماں چلتی رہی تھی۔"

شکیلہ کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ اس نے ایک ایسی کہانی سنائی تھی جو تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ میں کئی مرتبہ سن چکا تھا۔ وہی مرد کی ہوس اور عورت کی بے بسی کی روداد۔

اچانک اشرف کے بڑبڑانے کی آواز نے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ ٹھنڈا پانی مانگ رہا تھا۔ شکیلہ اٹھی اور گلاس میں پانی لے کر اسے پلانے میں مصروف ہو گئی۔ کچھ پانی اشرف کے ہونٹوں سے بہہ کر اس کے رخساروں اور گردن کو گیلا کر گیا۔ شکیلہ نے بڑی نرمی کے ساتھ اپنی سرخ اوڑھنی سے اس کے رخساروں اور گردن کو پونچھ دیا۔

جلال نے ہانک لگائی "ہائے اوئے شہزادی! کبھی ہمارا منہ بھی اتنے پیار سے صاف کر دو نا۔ تمہارے قدموں میں دل نکال کر نہ رکھ دوں تو نام نہیں۔ سوئے بچے کا منہ چومنے سے کوئی فائدہ نہیں' جاگتے بچے کا منہ چومو تو بات بھی ہے۔"

شکیلہ کا رنگ زرد ہو گیا لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

میں نے کہا "دیکھو جلال! اپنی زبان قابو میں رکھو ورنہ جو جو چیز تمہیں تنگ کر رہی ہے نا' وہ میں کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

اس نے ایک دیوانہ سا قہقہہ لگایا اور اپنا سر پیچھے کی طرف پھینک کر ایک بے ہودہ پنجابی گانا گنگنانے لگا۔

میں اٹھ کر اس کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ خود بخود چپ ہو گیا۔ گانے کے لیے بھی تو توانائی درکار ہوتی ہے اور توانائی کی کمی اب اسے بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

شکیلہ بالکل میرے ساتھ لگ کر لیٹ گئی۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں وہ مجھے ایک حسین دوشیزہ کے بجائے ایک مصیبت زدہ بچی لگ رہی تھی۔ نجانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ گھڑی کے مطابق رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن ہمارے لیے دن رات برابر ہی تھے۔ وہی ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی تھی جس نے دن اور رات کے فرق کو مٹا رکھا تھا۔ میں دل ہی دل میں بچے کھچے چند بسکٹوں اور باقی ماندہ خشک دودھ کا حساب لگا رہا تھا۔ یہ خوراک بس تین دن تک ہمارا ساتھ دے سکتی تھی۔ اس کے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا... پھر میرا دھیان جلال کی بات کی طرف چلا گیا۔ اس نے تہ خانے کی دیوار توڑنے اور چھوٹی سی سرنگ نکالنے کی بڑ

ہانکی تھی۔ اب پتا نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ انہی خیالوں کے گرداب میں چکراتے چکراتے کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ غنودگی کے عالم میں یہ موہوم سا خیال میرے ذہن میں موجود تھا کہ شکیلہ میرے پہلو میں موجود ہے اور بے قراری کی حالت میں جاگ رہی ہے۔

دوبارہ میری آنکھ اوپر تلے ہونے والے تین دھماکوں کی آواز سے کھلی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' خلاف معمول کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ میں نے دیکھا سینے پر رائفل موجود نہیں تھی۔ جو تین گولیاں چلی تھیں وہ اسی رائفل کی تھیں "شکیلہ۔ شکیلہ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ کوئی جواب نہیں ملا پھر میں نے جلال کو پکارا۔ اس مرتبہ بھی جواب نہیں آیا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بےساختہ ذہن میں یہی آیا کہ شکیلہ نے جلال کو یا پھر کسی طرح جلال نے شکیلہ کو گولی مار دی ہے۔ میں تیزی سے سوئچ بورڈ تک پہنچا۔ بٹن دبایا تو ایک سیکنڈ بعد کمرا روشن ہوگیا۔ شکیلہ سکتے کی سی حالت میں کھڑی تھی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جلال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رائفل ابھی تک شکیلہ کے ہاتھوں میں تھی۔ کمرے میں بارود کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ دھماکوں کے سبب زخمی اشرف بھی بیدار ہو کر جاگ گیا تھا اور اب اٹھ کر بیٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ایک گولی جلال کے سینے میں لگی تھی' دوسری اس کی ناک کو توڑتی ہوئی اس کے دماغ کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ قالین پر پڑا تھا اور پڑا رہ گیا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون تیزی سے قالین کو داغ دار کر رہا تھا۔ تیسری گولی خطا گئی تھی۔ اس گولی نے سامنے دیوار پر قریباً چھ مربع انچ جگہ سے پلاسٹر اکھاڑ دیا تھا۔

جلال کا جسم چند بار لرز کر ساکت ہوگیا۔ شکیلہ نے رائفل نیچے قالین پر پھینک دی۔ میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا "شکیلہ! یہ تم نے کیا کیا؟"

"مم۔ میں نے اسے مار دیا ہے۔ نہیں تو یہ مجھے مار دیتا۔"

"بے وقوفی کی ہے تم نے۔ پاگل پن دکھایا ہے۔" میں نے جھلا کر کہا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

شکیلہ اپنی جگہ گم صم کھڑی رہی' پھر ڈھیلے ڈھیلے انداز میں چلتی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ ایسے رخ سے بیٹھی تھی کہ اس کی نگاہ براہ راست جلال کی خونچکاں لاش پر نہ پڑ سکے۔ کتنی ہی دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ میری اور شکیلہ کی طرح اشرف بھی بالکل خاموش تھا۔

پھر شکیلہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا "اگر مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دیں' لیکن... ہم دونوں میں سے ہر ایک کو ہی زندہ رہنا تھا۔ اس شخص نے بڑی تکلیف دی ہے مجھے۔ میں اس کو دیکھتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ کوئی میرے اندر آرے چلا رہا ہے۔ اس کی نظر مجھ پر پڑتی تھی تو میرے اندر سے میرا خون جونے لگتی تھی۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "چلو' اب جو ہوگیا' ٹھیک ہے۔ لیکن۔"

"لیکن کیا؟" وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

"تم نے ایک دو باتوں پر غور نہیں کیا ہے۔ مثلاً یہی بات کہ ہم اس پختہ تہ خانے میں بند ہیں۔ اس کی لاش کو نہیں باہر پھینک سکتے ہیں' نہ دفن کر سکتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے بعد یہ لاش پھولنا اور گلنا سڑنا شروع ہو جائے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔"

شکیلہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے کمرے میں اندھیرا کرکے اور اندھا دھند گولیاں چلا کر جلال کو ہلاک تو کر دیا تھا مگر اس کے نتیجے کا نہیں سوچا تھا۔

"اب... اب کیا ہوگا؟" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ تم حوصلہ رکھو۔"

"پلیز۔ آپ اس کی لاش کو باتھ روم میں بند کرکے باہر سے کنڈی چڑھا دیں۔ مجھ سے یہاں بالکل بیٹھا نہیں جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "باتھ روم کے بغیر ہم میں سے کسی کا گزارا نہیں ہے۔ اسے باتھ روم میں پھینک دیں گے تو تم کیسے جا سکو گی باتھ روم میں۔"

اس نے اپنے خوب صورت ریشمی بال مٹھیوں میں جکڑے اور بالکل عاجز نظر آنے لگی۔

میں نے جلال کی لاش کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹا اور دیوار گیر الماری کے عقب میں ڈال کر اس پر ایک موٹی چادر ڈال دی۔ یہ چادر بھی دیکھتے ہی دیکھتے خون سے تر ہوگئی۔ مجھے جلال کی موت کا ذرہ بھر بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ ایک شیطانی صفت شخص تھا۔ اشرف جیسا جو بھی تھا اور جیسا بھی تھا بہرحال اس کا باس تھا۔ جب جلال نے دیکھا کہ وہ زخمی ہو کر بے بس ہوگیا ہے تو فوراً نمک حرامی پر اتر آیا۔ گولی نکالنے کے بہانے اس کا کندھا چیر پھاڑ کر اس نے اشرف کو موت کے دہانے پہنچا دیا۔ خوراک پر کنٹرول حاصل ہونے کے بعد اس نے مجھے بھوکا مارنے کا اعلان کرنے کی جوت پر لیا۔ آخر میں وہ شکیلہ کی عزت سے بھی کھیل گیا۔

صبح تک میں یہی سوچتا رہا کہ جلال کی لاش کا اب کیا

کروں؟ سردی کے سبب ممکن تھا کہ لاش ۲۰-۲۶ گھنٹے گزار جاتی لیکن اس کے بعد وہی ہونا تھا جو لاشوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس تہ خانے میں کمرے اور باتھ روم کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں لاش کو سنبھالا جا سکتا۔ میں اسی پریشانی میں تھا جب اچانک میرا دھیان الماری کے ایک اندرونی خانے کی طرف چلا گیا۔ یہ خانہ دو بڑی درازوں پر مشتمل تھا۔ اگر دونوں بڑی درازوں کا درمیانی تختہ نکال دیا جاتا تو الماری کا یہ حصہ ایک درمیانی سائز کے تابوت کی شکل اختیار کر جاتا۔ کم از کم اتنا تو کیا ہی جا سکتا تھا کہ جلال کی لاش کو کسی طرح اس میں سمو دیا جاتا۔ یہ خیال ذہن میں آنے کے فوراً بعد میں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ آہنی راڈ کی مدد سے میں نے دونوں بڑی درازوں کا درمیانی تختہ اکھاڑ دیا۔ یہ دراز نما خانے ڈیڑھ فٹ کے قریب گہرے دو فٹ چوڑے اور تین فٹ کے قریب لمبے تھے۔ دونوں خانوں کی لمبائی ملائی جاتی تو چھ فٹ کے لگ بھگ ہو جاتی تھی۔

لاش کو الماری کے اندر پہنچانے میں شکیلہ میری مدد کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اسے تو لاش کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ حالانکہ یہ لاش اسی کی "تخلیق" کی ہوئی تھی۔ مجھے پولیتھین کی ایک بڑی شیٹ بیڈ کے نیچے سے مل گئی۔ میں نے جلال کی لاش کو مناسب طریقے سے اس پولیتھین میں لپیٹا اور نائیلون کی رسیوں سے باندھ کر الماری کے اس طویل خانے میں ٹھونس دیا۔ جو تختہ میں نے اکھاڑا تھا اس میں سے میں نے چند چپٹیاں بنائیں۔ تختہ اکھاڑنے سے کچھ کیل بھی نکل آئے تھے۔ ہتھوڑی کے طور پر میں نے آہنی راڈ استعمال کیا۔ میں نے دس پندرہ منٹ کے اندر الماری کے خانے کی درزیں بالکل بند کرکے اسے ائر ٹائٹ کر دیا۔ مجھے توقع تھی کہ اب لاش کی بو جلد ہی ہمیں متاثر نہیں کرے گی۔

اس کام سے فارغ ہو کر جہاں مجھے سکون محسوس ہوا وہاں شکیلہ کی جان میں بھی جان آئی۔ وہ باتھ روم سے ایک کپڑا پانی میں بھگو بھگو کر لائی اور اس کی مدد سے قالین کا خون صاف کیا۔ خون صاف تو کیا ہونا تھا بہرحال داغ کچھ نہ کچھ مدھم پڑ گئے۔ میں نے اشرف کے کندھے کی پٹی بدلی۔ اس کا زخم اب پہلے سے قدرے بہتر تھا۔ انسان جب کمزور ہوتا ہے تو اکثر اس کے زخم بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ دم خم باقی نہیں رہتا۔ اشرف کی طرف سے فارغ ہو کر میں دیوار سے ٹیک لگا کر قالین پر نیم دراز ہوگیا اور پوری یکسوئی سے سوچنے لگا کہ اس ... قید سے ہمیں نجات کیسے مل سکتی

ہے۔ چار دن پہلے جلال نے دیوار توڑنے اور سرنگ نکالنے کی بات کی تھی۔ مجھے یہ سب اس کے دماغ کا خلل ہی لگ رہا تھا۔ ان سنگلاخ دیواروں میں شگاف کیونکر ہو سکتا تھا' یہاں کے تو دروازے راہ نہیں دیتے تھے' دیواریں کیسے دے سکتی تھیں اور پھر مسئلہ اوزاروں کا تھا۔ ایک آہنی راڈ کے سوا اس تہ خانے میں کوئی ایسی شے نہیں تھی جسے یہاں کنکریٹ توڑنے کے لیے استعمال کیا جا سکے پھر بھی آزمائش کے طور پر میں آہنی راڈ تھام کر اٹھا اور اس کی مدد سے دیواروں کو ٹھونکنا بجانا شروع کر دیا۔ دس منٹ میں میں نے ایک ایک چپے کو ٹھونک کر دیکھ لیا۔ کہیں کسی خلا یا کھوکھلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ قالین کو سمیٹ کر میں نے فرش کا بھی ایک ایک انچ دیکھا۔ ہر طرف موت کی طرح ٹھوس اور بدنما کنکریٹ تھا۔ یا پھر وہ آہنی دروازہ تھا جس نے پچھلے تین ہفتوں سے مصمم ارادے کے ساتھ ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تھا' سرکا تھا' نہ لرزا تھا۔ جس وقت ہم تہ خانے میں بند ہوئے تھے ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ قید اتنی طویل اور بے رحم ثابت ہوگی۔

سہ پہر کے وقت میں نے اور شکیلہ نے ایک ایک کپ دودھ پیا' ساتھ میں آدھا آدھا بسکٹ کھایا۔ اب ہمارے پاس کل آٹھ بسکٹ تھے۔ میں یہ بسکٹ اشرف کے لیے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اسے ہم سے زیادہ توانائی کی ضرورت تھی۔ بدن میں نقاہت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹھنے کو یا پھر لیٹنے کو دل چاہتا تھا۔ ویسے بھی ضروری تھا کہ ہم اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ آرام دیں۔ یوں کم سے کم توانائی خرچ ہو۔ میں اور شکیلہ پاس پاس لیٹ گئے۔ وہ بے خیالی میں چھت کو گھورتی جا رہی تھی۔ جیسے چھت سے پار اور ملبے کے بست بڑے ڈھیر سے پار نیلے آسمان کو دیکھ رہی ہو۔ سہ پہر کے اس سورج کو دیکھ رہی ہو جس نے شہر لاہور کے طول و عرض میں اپنی نرم سنہری دھوپ پھیلا رکھی ہوگی۔ ان رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھ رہی ہو جو عموماً سہ پہر کے بعد لاہور کے آسمان پر اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں اور ان سفید براق کبوتروں کو دیکھ رہی ہو جو نیلے آسمان کے حسین منظر میں سنسناتے ہوئے گزرتے ہیں۔

وہ کھوئی کھوئی دیگر آواز میں بولی "کیا ہم کبھی باہر کی روشنی دیکھ سکیں گے؟"

"اگر ارادہ پختہ ہوگا اور ہمت نہ ہاریں گے تو ضرور دیکھیں گے۔"

"آپ شاید دیکھ لیں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ دیکھ سکوں گی۔ بس انہی پتھریلی دیواروں کو دیکھتے دیکھتے ایک دن

میری آنکھیں پتھرا جائیں گی۔" وہ بڑی نحیف آواز میں بولی۔
"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ہم جلد ہی باہر نکلیں گے۔"
"ہو سکتا ہے کہ ہمارے اوپر سے ملبہ اٹھانے کی کوشش ہی نہ کی جا رہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو چھت کی طرف سے ہمیں تھوڑی بہت آوازیں ضرور آتیں۔"
"ہو سکتا ہے کہ تہ خانے کے اوپر کا کمرا سلامت ہو اس لیے آوازیں نہ آ رہی ہوں۔"
"یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ یہاں تہ خانہ موجود ہے۔" شکیلہ نے پُراندیش آواز میں کہا۔
یہ اندیشہ تو میرے ذہن میں بھی موجود تھا۔ ممکن تھا کہ یہاں موجود اشرف کے باقی ساتھی مارے گئے ہوں یا پھر بھاگ گئے ہوں۔ جو لوگ یہاں سے ملبہ ہٹانے کے ذمے دار تھے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ یہاں ایک تہ خانہ پایا جاتا ہے۔ عموماً عمارتوں کے اندر موجود ایسی جگہوں کو بالکل کیموفلاج کر دیا جاتا ہے۔ بھائی جی کی ماڈل ٹاؤن والی رہائش گاہ کی مثال میرے سامنے تھی۔ بھائی جی نے اپنے بیڈ روم سے اپنی منظورِ نظر کے گھر تک جانے کے لیے ایک چھوٹی سی سرنگ نکال رکھی تھی، اور اس سرنگ کو یوں چھپایا تھا کہ بس کمال کر دیا تھا۔
"کس سوچ میں کھو گئے ہیں؟" شکیلہ نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا۔
"تم خواہ مخواہ نئے نئے اندیشے دماغ میں لا رہی ہو۔ اپنے ذہن کو سکون میں رکھو۔ اس سے میرا ذہن بھی سکون میں رہے گا اور میں بہتر طریقے سے سوچ سکوں گا۔"
"معافی چاہتی ہوں۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔
اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور نہایت خوب صورت آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی، میں بھی خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا "تم اس گندگی میں کیوں دھنس رہی ہو۔ کیا تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ تمہارا چھوٹا سا گھر ہو، شوہر ہو، بچے ہوں۔"
وہ ذرا سا شرمائی۔ اگر وہ فاقوں کی ماری ہوئی نہ ہوتی تو شاید اس کے چہرے پر شرم کی سرخی بھی نمودار ہوتی۔ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے چھت کو دیکھتی رہی پھر بولی "ہر لڑکی کی سوچ یہی ہوتی ہے۔ میری بھی یہی تھی۔ ہمارے گھر کے قریب ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور ہے۔ جنرل اسٹور پر بیٹھنے والا لڑکا مجھے اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اس نے ایک دو بار ٹیلی فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ بھی کیا۔ وہ مجھے چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی مجھے اچھا لگنے لگا لیکن میں ڈرتی تھی۔ میری ماں کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ محلے کے ایک دکان دار نے اسے پسند کیا اور پھر بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس جاوید نامی لڑکے سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ جاوید اب بھی ہمارے محلے میں ہی جنرل اسٹور چلاتا ہے۔ اب بھی وہ مجھے دیکھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے مگر اب تو بات ختم ہو گئی ہے۔ اب میں اس کے لائق کہاں رہی ہوں۔"
اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
میں نے پوچھا "کیا جلال تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے؟"
اس نے کرب ناک انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔
کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم اپنے سوتیلے باپ کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ تم چاہو تو اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ تمہاری حقیقی ماں بھی اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے۔"
وہ ایک آہ بھر کر بولی "اصل میں وہ باپ کی وجہ سے خاموش ہے۔ بشیرا بڑا ظالم شخص ہے جی۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ دوسری طرف میری ماں مجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ میں اس کی اکلوتی اولاد ہوں۔ وہ بس مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی ہے۔ اسے پتا ہے کہ جس دن اس نے بشیرے کا حکم ماننے سے انکار کیا میری زندگی شدید خطرے میں پڑ جائے گی۔ بشیرا سوتیلے باپ کا چولا اتار کر سفاک قاتل بن جائے گا یا بردہ فروش بن جائے گا۔ درحقیقت میں ہی ہوں جس کی وجہ سے میری ماں بشیرے کی ہر اچھی بری بات برداشت کر رہی ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولی "میں نے کبھی کبھی تو سوچتی ہوں کہ اس قید خانے میں مر ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ جس دن میں مر جاؤں گی میری ماں کے پاؤں سے زنجیر نکل جائے گی اور میں آپ کو بتاتی ہوں میری ماں کے دل میں بشیرے کے خلاف بڑی دیر سے بہت بڑی آگ بھڑک رہی ہے اور میری ماں بزدل بھی نہیں ہے۔ اس کے پاؤں کی زنجیر نکل گئی تو وہ اپنی زندگی کو عذاب بنانے والے شخص سے عبرت ناک انتقام لے گی۔ مجھے یقین ہے وہ ایسا ضرور کرے گی۔"
شکیلہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی گفتگو سے واضح ہوا کہ اس کی ماں سے جوانی میں کچھ سنگین غلطیاں ضرور ہوئی تھیں لیکن ان غلطیوں کی اس نے بشیرے کے ہاتھوں ایسی لرزہ خیز سزائیں بھگتی ہیں کہ اب وہ بشیرے کے

لیے سراپا زہر بن چکی ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنی پیاری بچی کی زندگی کے خوف سے چپ ہے ورنہ وہ بشیرے کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے شکیلہ کا اتا پتا بھی پوچھا جو اس نے کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بتا دیا۔
رات دن کا کوئی اور ثبوت تو ہمیں نہیں ملتا تھا بس اتنا ہوتا تھا کہ جب رات ہوتی تھی تو تہ خانے کا ٹمپریچر مزید نیچے گر جاتا تھا۔ یہ سردی رات کے آخری پہر انتہا کو پہنچ جاتی تھی پھر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتی تھی۔ اب سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ میں نے اشرف کو گلوکوز ملا دودھ پلانے کے بعد اس کے گرد اچھی طرح لحاف لپیٹ دیا تھا۔ جو کمبل اس سے پہلے جلال کے استعمال میں تھا وہ اب فارغ ہو چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ خون آلود تھا۔ اس کی ایک جانب گولی کے دو سوراخ بھی واضح نظر آتے تھے۔ قالین بھی خون آلود ہو چکا تھا لہٰذا اسے بھی کمبل کے طور پر اوڑھتے ہوئے کراہت سی محسوس ہوتی تھی۔ شکیلہ اور میں ایک ہی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ رات کو کسی وقت سردی محسوس ہوئی تو وہ میرے ساتھ لگ گئی۔
عجیب بات تھی اپنی نہایت حسین نسوانیت کے باوجود شکیلہ کا قرب میرے لیے بے معنی ہی رہا۔ اس کے حوالے سے کوئی مخصوص تصور تو میرے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ اس کے جسم کا لمس بھی ایک بے حقیقت شے کی طرح لگ رہا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلسل فاقہ کشی نے دل و دماغ کو لطیف تر کر دیا تھا اور ان میں کسی کثیف خیال کی جگہ ہی نہیں تھی۔ ان لمحوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ روحانیت میں منزلیں طے کرنے کے خواہش مند لوگ کم خوراکی پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ نیند کی حالت میں شکیلہ کا دبلا پتلا بازو میرے سینے پر آ گیا۔ وہ پہلو کے بل لیٹی تھی، میں چت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی آہستگی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ پتا نہیں کہ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی یا غنودگی کی حالت میں تھی، بہرحال وہ خاموش لیٹی رہی۔ میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ دوران بے رحم حالات کے بارے میں سوچتا رہا جو حسین خواب دیکھنے والی معصوم لڑکیوں کو عصمت فروشی کے جہنم زار میں پھینکتے ہیں۔
اگلے روز پھر میں نے تہ خانے کا چپا چپا دیکھنا شروع کیا۔ یہ ایک دیوانی سی کوشش تھی لیکن کچھ بھی نہ کرنے سے دیوانی سی کوشش کرنا بہتر تھا۔ وہ دن بھی ایسے ہی گزر گیا۔

داستان گوئی میں ایک نئی طرز کا آغاز
مداری
◉ اس شہید کا قصہ جس نے اپنی لاش اپنے ہاتھوں دفن کی تھی۔
◉ اسے اس ملک کی اعلیٰ ترین کرسی کی خواہش تھی اور اسے حاصل کرنے کیلئے وہ کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار تھا۔
◉ خواہشوں کا مداری ڈگڈگی بجا رہا تھا اور وہ اس کی تال پر بندر کی طرح ناچ رہا تھا۔
◉ چہرے پر چہرہ چڑھائے اور بیک وقت کئی کئی زندگیاں گزارنے والوں کے فسانے۔
◉ دنیا کے سٹیج پر آتے جاتے رہنے والے کرداروں کی داستان ہوشربا۔
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

اس سے اگلا دن بھی گزر گیا اور پھر اس سے اگلا بھی۔ ہمارے جسم و جاں کو دن بدن نقاہت کی دیمک چاٹ رہی تھی۔ خوراک اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں نے پچھلے دو روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تیسرے روز شام کو جب میں دودھ میں بھیگا ہوا بسکٹ چھوٹے چمچ کے ذریعے اشرف کو کھلانے لگا تو اس کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اس نے نیچے لیٹے لیٹے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے ہونٹ مضبوطی سے بھینچے ہوئے تھے "کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور اس کے ہونٹ دو تین بار لرز کر رہ گئے۔ وہ مجھے بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں بھی کھاؤں۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ پچھلے ۴۸ گھنٹے سے خوراک کا ذرہ میرے منہ میں نہیں گیا۔

میں نے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دیکھو اشرف! میں تو چل پھر رہا ہوں۔ تم زخمی اور بیمار ہو۔ تمہیں خوراک کی ضرورت مجھ سے زیادہ ہے۔ چلو یہ کھاؤ۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ پاشا گینگ کا بے رحم سرغنہ تھا۔ وہ ایک خطرناک تخریب کار تھا۔ اور وہ رو رہا تھا۔ قدرت انسان کو کس طرح حالات کے عجیب و غریب سانچوں میں ڈھالتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدترین دشمن کسی مشترکہ مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں اور یوں شیر و شکر ہو جاتے ہیں جیسے انہیں ایک ہی ماں نے جنم دیا ہو اور وہ ایک ہی آنگن میں کھیل کر پروان چڑھے ہوں۔

یہ کوئی بہت عرصہ پہلے کی بات تو نہیں تھی۔ کچھ ہی دن ہوئے تھے جب اسی تہ خانے میں اشرف نے میری مشکیں کسی تھیں اور جھکا کر مجھے بے دردی سے پیٹا تھا۔ آج وہی اشرف ایک بالکل مختلف رنگ میں نظر آ رہا تھا۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے ہونٹ نہیں کھولے تو میں نے ایک چمچ اپنے منہ میں ڈالا اور دوسرا پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس مرتبہ میرے اصرار کرنے پر اس نے منہ کھول دیا۔ میں نے چار پانچ چمچ اسے کھلائے پھر اپنے رومال سے اس کا منہ اور اس کی آنکھیں صاف کر دیں۔

اب میرے پاس کل تین بسکٹ تھے۔ ملک پاؤڈر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو کپ دودھ بنایا جا سکتا تھا۔ اور اگر صبح دودھ بنایا جاتا تو وہ شاید ایک کپ ہی بنتا۔ شگفتہ رات کو روز میرے ساتھ لگ کر سوتی تھی اور ہر روز مجھے اس کے خوب صورت جسم کی ہڈیاں پہلے سے نمایاں محسوس ہوتی تھیں۔ وہ اب بڑی بے تکلفی سے میرے سینے میں چہرہ چھپا لیتی تھی۔ کسی وقت مجھے اپنے سینے پر گرم گرم نمی کا احساس ہوتا۔ میں سمجھ جاتا کہ وہ خاموشی سے آنسو بہا رہی ہے۔ ایک رات نیم غنودگی کی حالت میں بولی "میں مر گئی تو آپ میری ماں سے ملنے ضرور جانا۔ اس سے کہنا کہ وہ بشیرے کو چھوڑ کر کہیں بہت دور چلی جائے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے اسے جھڑکا "نہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم یہاں سے ضرور نکلیں گے۔"

"نہیں، میں نے نہیں نکلنا۔ میں نے مر جانا ہے۔ اب میں نکل کر کروں گی بھی کیا۔ اب کیا رکھا ہے دنیا میں۔"

ان لمحوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے محلے دار لڑکے سے واقعی گہری محبت رکھتی ہے۔ یہ خاموش محبت تھی اور خاموش محبت اکثر گہری ہوتی ہے۔ جلال کے ہاتھوں لٹ پٹ کر اب شگفتہ خود کو کسی قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔

میں نے کہا "یہ مت کہو کہ دنیا میں کچھ نہیں رکھا۔ وہاں سب کچھ ہے۔ اور یہ سب کچھ تمہارے لیے بھی ہے کیونکہ تم خطاکار نہیں ہو۔"

"کچھ نہیں ہے؟" وہ بڑے دکھ سے بولی۔

"سب کچھ ہے۔ وہ نیلا آسمان ہے جس کو تم ہر وقت یاد کرتی ہو، سورج کی روشنی ہے، پھول ہیں، درختوں کے اوپر اڑتے پرندے ہیں اور ہوا میں تیرتی پتنگیں ہیں، اور تمہارا گھر ہے، اور اس کے سامنے گلی ہے، اور اس گلی میں جنرل اسٹور ہے، اور وہاں کالی سیاہ آنکھوں والا وہ لڑکا ہے جو تمہیں بہت چاہتا ہے۔"

"لیکن مجھے پتا ہے۔ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکوں گی۔ بس ان ہی چار دیواروں اور اس چھت کے اندر مجھے مر جانا ہے۔"

میں نے اس کے نیم گرم ہونٹوں پر اپنی ٹھنڈی ہتھیلی رکھ دی۔ وہ خاموش ہو گئی اسی طرح لیٹے لیٹے وہ سو گئی۔ نیند میں بھی اس کی آنکھیں ذرا سی کھلی رہتی تھیں۔ شاید ایسا دن بدن بڑھتی ہوئی کمزوری کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ کسی وقت اسے ہچکی سی لگ جاتی تھی۔ یہ بڑی شدید ہچکی ہوتی تھی۔ ہچکی کے دوران میں اس سے پانی بھی نہیں پیا جاتا تھا۔ بمشکل جب تھوڑا بہت پانی اس کے حلق سے نیچے اترتا تھا تو ہچکی ختم ہوتی تھی۔ وہ معدے میں درد کی شکایت بھی کرتی تھی۔

اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ میں نرم و گداز بیڈ کے عین سامنے واقع ایک سائیڈ بورڈ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سائیڈ بورڈ الماری نما بورڈز کی بنی ہوئی تھی۔ تہ خانے میں لکڑی کا جو بھی

کام تھا وہ سارا شیشم کا تھا۔ اس سارے کام کا ڈیزائن دوسری طرح کا تھا لیکن یہ "سائیڈ بورڈ" ڈیزائن میں بھی باقی کام سے مختلف تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سائیڈ بورڈ یہاں بعد میں نصب کیا گیا ہو۔ میرے دل میں یونہی یہ خیال آیا کہ اس سائیڈ بورڈ کو یہاں سے ہٹا کر دیکھوں۔ اوزار کے طور پر میرے پاس صرف آہنی راڈ تھا یا الماری میں سے بس درمیانے سائز کا ایک پیچ کس ملا تھا۔ میں نے ان دونوں اشیا کی مدد سے سائیڈ بورڈ کو اکھاڑنا شروع کیا۔ ایک گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن اگر میرا خیال تھا کہ سائیڈ بورڈ کے عقب میں کوئی خفیہ راستہ ہوگا یا کسی کھڑکی وغیرہ کے آثار ہوں گے تو یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ یہاں فقط ایک آتش دان تھا۔ غالباً یہ آتش دان اس وقت بنایا گیا تھا جب تہ خانہ بنا تھا۔ بعد میں الیکٹرک ہیٹر کی وجہ سے آتش دان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس بے نشان سی چیز کو ختم کرنے کے لیے اس کے آگے سائیڈ بورڈ بنا دیا گیا تھا۔ آتش دان میں جالے لگے ہوئے تھے۔ سائیڈ بورڈ کی عقبی بلائی پر کچھ دیمک موجود تھی۔ اس کے علاوہ کیڑے اور تنکے وغیرہ تھے۔ میں نے نیچے لیٹ کر آتش دان کے اندر اور اوپر کی طرف جھانکا۔ بعض آتش دانوں کی چمنیاں کچھ کشادہ ہوتی ہیں اور اکثر بڑے آتش دانوں کی چمنیوں میں سے تو بندہ بھی گزرنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن یہ ایک چھوٹا سا آتش دان تھا۔ دھوئیں کے اخراج کے لیے اس میں بس دو انچ قطر کا پائپ ڈالا گیا تھا۔ یہ پائپ بھی آگے سے بند لگتا تھا۔

پھر بھی ایک موہوم امید کے سہارے، میں پشت کے بل فرش پر لیٹ گیا، میرا سر آتش دان کے پتھر کے اوپر تھا۔ میں نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ کوئی ہے۔ کوئی ہے۔ کوئی سن رہا ہے۔ ہماری مدد کرو۔ کوئی سن رہا ہے؟"

وقفے وقفے سے میں نے کئی بار یہ فقرے دہرائے۔ جواب میں اتھاہ خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میری آواز اس سرد تہ خانے کے اندر ہی گونج کر رہ جاتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پائپ اوپر تک جاتا ہو لیکن عمارت منہدم ہو جانے سے یہ بھی بند ہو گیا ہو۔

میں تھک گیا تو میری جگہ شگفتہ نے لے لی۔ وہ اپنا چہرہ آتش دان کے خلا میں رکھ کر پشت کے بل لیٹ گئی اور آوازیں دینے لگی۔ اس کی آواز کمزور تھی۔ ابھی اس نے دو تین آوازیں ہی دی تھیں کہ اسے کھانسی ہوئی پھر اسے شدید ہچکی لگ گئی۔ میں نے اسے جلدی سے اٹھایا اور اس کا سر گود میں لے کر اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ہر بار ہچکی کے ساتھ اس کو معدے میں شدید ٹیس محسوس ہوتی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے خوش نما پھول کی طرح لگ رہی تھی جس کی پتیاں تیز ہوا کے سبب جھڑ رہی ہوں۔ میں نے اسے بمشکل پانی پلایا۔ دو تین منٹ بعد اسے قدرے افاقہ ہو گیا۔ وہ بے دم سی ہو کر قالین پر لیٹ گئی۔ اس کی حالت افسوس ناک تھی۔

رات تک مجھے شگفتہ کی پریشانی اور اذیت عروج پر نظر آنے لگی۔ غالباً وہ بھی اب مایوسی کے شکنجے میں پوری طرح جکڑی جا چکی تھی۔ وہ تہ خانے کی دیواروں کو دیکھتی تھی، پھر چھت پر نگاہ ڈالتی تھی اور اس کا سانس پھولنے لگتا تھا، جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ رات کسی وقت میرے قریب لیٹے لیٹے وہ غنودگی کے عالم میں بڑبڑائی "کھڑکی کھول دو۔ تازہ ہوا آنے دو۔ ساری کھڑکیاں کھول دو۔"

پھر کچھ دیر بعد وہ بولی "شام کو چکن پلاؤ پکائیں گے۔ عبدل سے تھوڑا سا دہی لے آنے۔ عبدل۔ عبدل۔" وہ عبدل کو آوازیں دینے لگی۔ عبدل پتا نہیں کون تھا لیکن جو کوئی بھی تھا یہاں نہیں تھا۔

اگلے دن بھی میرا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ سہ پہر کے وقت میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ یہ دھواں ایک ایسی شے ہے جو تنگ سوراخوں اور درزوں وغیرہ سے بھی گزر جاتا ہے اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اگر اس آتش دان میں دھواں پیدا کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ اوپر جا کر کہیں نہ کہیں سے اپنا راستہ ڈھونڈ ہی لیتا لیکن اس سلسلے میں پہلا سوال یہ تھا کہ دھواں پیدا کیسے کیا جائے۔

شگفتہ نے بیڈ شیٹس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیتے ہیں پھر ان کو معمولی سا نم کرنے کے بعد سلگا دیتے ہیں۔ یہ دیر تک دھواں دیتے رہیں گے۔"

"لیکن ایک مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "یہ جگہ بالکل بند ہے۔ یہاں تھوڑا سا بھی دھواں جمع ہو گیا تو ہماری سانس اکھڑنے لگے گی۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اچھا، میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ایک بڑی پینٹنگ تہ خانے میں موجود تھی۔ اسے شیشے کے فریم میں جڑا گیا تھا۔ میں نے یہ موٹا شیشہ فریم سے علیحدہ کر دیا اور اسے آتش دان کے سامنے لکڑی کے ساتھ یوں

فکس کردیا کہ آتش دان کے اندر سے دھواں تہ خانے میں نہ آسکے۔ اشرف چیتا نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ میرے کام کو سراہ رہا تھا۔ میں نے شکیلہ کے مشورے کے مطابق کچھ کپڑے کو نم کیا اور ماچس کے ذریعے سلگا کر آتش دان میں رکھ دیا۔ شیشے کو احتیاط سے دوبارہ آتش دان کے سامنے فکس کردیا۔ آتش دان میں دھواں بھرنا شروع ہوگیا۔ شیشے کے پیچھے دھوئیں کی حرکات و سکنات صاف نظر آرہی تھی۔ بظاہر تو یہی لگ رہا تھا کہ دھواں اندر ہی اندر چکرا رہا ہے لیکن پھر دھیرے دھیرے یہ خوش کن احساس ہونے لگا کہ کچھ نہ کچھ دھواں اوپر بھی جا رہا ہے۔ کپڑے کے ٹکڑے سے سلگ سلگ کر ختم ہوگئے تو میں نے شیشہ ہٹا کر چند مزید ٹکڑے اندر پھینک دیے۔

"کیا اس کا کوئی فائدہ ہوسکے گا؟" شکیلہ نے امید و بیم کے درمیان ڈوبتے ابھرتے کہا۔

"اگر دھواں باہر نکلتا ہے تو پھر فائدہ تو ہونا چاہیے۔ یہ کوئی ویران علاقہ تو ہے نہیں۔ رہائشی مکانات ہیں۔ کسی نہ کسی کی نظر تو اس اچانک نکلنے والے دھوئیں پر پڑے گی۔ آج نہ پڑی تو کل پڑے گی۔ صبح نہ پڑی تو شام کو پڑ جائے گی۔"

"لیکن اگر ہم ملبے کے بڑے ڈھیر کے نیچے ہیں تو پھر؟"

"پھر بھی دھوئیں کا اخراج تو نوٹس میں آنے والی چیز ہے۔"

"مجھے نہیں امید کہ کچھ ہوگا۔" شکیلہ نے بے پناہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہم بس اپنی سانسیں پوری کر رہے ہیں۔"

"اچھی بات کہا کرو یا چپ رہا کرو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اپنی مسکراہٹ مجھے خود بھی بے حد پھیکی اور کمزور محسوس ہوئی۔

اشرف کی طرح میری شیو بھی اچھی خاصی بڑھ چکی تھی۔ میں خود کو باتھ روم کے آئینے میں دیکھتا تھا تو آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آتے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں بھی ابھر آئی تھیں۔ اگر زریں گل مجھے اس حال میں دیکھتا تو یقیناً اسے کوئی ایسی پرانی فلم یاد آجاتی جس میں کسی ستم رسیدہ کردار پر آفات کی یلغار ہوئی ہو اور اسے کسی جان لیوا بیماری نے بھی گھیر رکھا ہو پھر اسے سیکڑوں مجرب نسخے بھی یاد آجاتے۔ اسے بہت سے قبائلی نسخے یاد تھے۔ اب تو ان معاملات میں اس کی دسترس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ یعنی کلثوم بھی موجود تھی۔ یک نہ شد دو شد۔

پھر میرا خیال صفدر اور غزالہ کی طرف چلا گیا۔ جن دنوں ہم اس چوہے دان میں پھنسے، صفدر آسٹریا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہاں اس کا کورنا ٹرانسپلانٹیشن کا آپریشن متوقع تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب تک یہ آپریشن ہوچکا ہوگا۔ اس آپریشن کے نتیجے کا مجھے بے انتہا شدت سے انتظار تھا۔ ڈاکٹروں نے بہت زیادہ توقع تو نہیں دلائی تھی' بہرحال امید کی کرنیں موجود تھیں۔ غزالہ اور شیخ عاصم کے معاملات بھی اہم موڑ پر تھے۔ عدالت میں خلع کا کیس چل رہا تھا اور کسی بھی وقت ڈرامائی صورت حال متوقع تھی۔ پچھلے چار پانچ ماہ میں میں نے جب بھی غزالہ کو دیکھا تھا یہ سوال ایک تیغ کی طرح ذہن میں ابھرا تھا' کیا غزالہ آزاد ہوجائے گی؟ لیکن اب اس سوال کے ساتھ ساتھ ایک اور سوال ذہن میں ابھرا تھا' کیا میں آزاد ہوجاؤں گا؟

غزالہ سے میری آخری ملاقات ماڈل ٹاؤن میں ہی ہوئی تھی۔ مجھے وہ ہنگامہ خیز لمحے یاد تھے جب بھائی جی کی رہائش گاہ پر زبردست فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم بھائی جی کے بتائے ہوئے خفیہ راستے سے بھاگے تھے۔ ایک مختصری جگہ میں فائرنگ سے بچنے کے لیے غزالہ مجھ سے تقریباً لپٹ ہی گئی تھی۔ اس کے قرب کے وہ سنگین و رنگین لمحے اس تہ خانے کی یخ بستہ تنہائی میں میری سوچوں کو گرماتے رہتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ کیا ہر چاہنے والے کے لیے اپنی محبوبہ کا لمس ایسا ہی راحت افزا ہوتا ہے یا میرے ساتھ یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ غزالہ کو چھو لیتا تھا تو اس کے بدن کی مہک ہفتوں تک دل و دماغ سے جدا نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہ طویل جدائیوں کا کرشمہ ہو تھا۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے۔ میں نے صبح سویرے اشرف کو اٹھا کر بٹھایا۔ پرندوں کے پروں والا ایک نہایت گداز تکیہ میں نے اس کی کمر کے پیچھے رکھا اور آخری چار بسکٹوں میں سے دو کو دودھ میں ڈبو کر ایک آمیزہ سا بنا لیا۔ سینے میں اور جسم میں ایک آگ سی مسلسل سلگ رہی تھی۔ بھوک بلکہ ناقابلِ برداشت بھوک کی آگ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہی بھوک زیادہ شدت سے اشرف کے اندر بھی موجود ہے۔ وہ زیادہ کمزور تھا۔ میں نے اسے کھلانا چاہا تو ایک بار پھر اس نے اصرار شروع کردیا کہ وہ نہیں کھائے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی یہ ضد ختم کی۔ جب میں آخری چمچ اشرف کے منہ میں ڈال رہا تھا' میری نگاہ خوابیدہ شکیلہ پر پڑی۔ سوتے میں وہ اور بھی کمزور نظر آرہی تھی۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی سانس ناہموار ہے۔ اشرف کو چھوڑ کر میں تیزی سے شکیلہ کی طرف

گیا اور اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہے۔ غالباً رات کو کسی وقت اسے شدید ہچکی لگی تھی اور اسی کیفیت میں وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

میں نے شکیلہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ تاہم اس کی پلکوں میں لرزش نمودار ہوئی۔ میں اسے پکارنے لگا "شکیلہ! ہوش کرو۔ آنکھیں کھولو۔"

یوں لگا کہ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی ہے مگر پلکوں کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کی سانس سینے میں الجھ رہی تھی۔ ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی جلال کی طرح رخصت ہو رہی ہے۔ میں نے اسے جھنجوڑ دیا "آنکھیں کھولو شکیلہ ہوش میں آؤ۔"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ یقیناً وہ ان چار دیواروں اور ایک چھت کو دیکھ دیکھ کر مرنے کی حد تک بیزار ہوچکی تھی۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ نیلا آسمان' سورج کی روشنی' پھول' پرندے شاید وہ سب ہی سے بیزار ہوچکی تھی۔ اس نے اپنی ساری امیدیں توڑ دی تھیں۔ کپ میں بس تھوڑا سا دودھ بچا رہ گیا تھا۔ میں نے چمچ کی مدد سے یہ دودھ اس کے ہونٹوں پر ٹپکانا شروع کردیا۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دودھ اطراف میں بہنے لگا۔

یہ اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ اس جیسی لڑکیاں کالجوں میں جاتی تھیں۔ پکنکیں مناتی تھیں۔ راتوں کو سانے سپنے دیکھتی تھیں اور دن میں حسین سرگوشیاں کرتی تھیں' لیکن یہ بے چاری اپنے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی قیمتی ترین متاع فروخت کرنے کے لیے نکلی تھی۔ اپنا آپ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر وہ ساٹھ ستر ہزار روپے کی خاطر اس راہِ پرخار پر آگئی تھی۔ اس راہ پر چلنے والی لڑکیوں کا مقدر ایسا تہ خانہ ہی ہوتا ہے۔ کہیں یہ تہ خانہ سیمنٹ کی اینٹوں کا ہوتا ہے کہیں معاشرتی نفرت کی دیواروں کا۔ ان لڑکیوں کا مقدر اس تہ خانے میں گھٹ گھٹ کر جینا اور گھٹ گھٹ کر مرنا ہی ہوتا ہے۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ ملامت اور پردہ پوشی کے سارے سلائیڈنگ ڈور اپنی جگہ سے جنبش کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔

وہ لحہ بہ لحہ موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کا دایاں ہاتھ دیکھا۔ یہ ہاتھ قالین پر پڑا تھا اور ادھ کھلا تھا۔ چھت کی طرف اٹھی ہوئی ہتھیلی جیسے سوال کر رہی تھی۔ اے عزت کے سوداگرو! میں نے اپنا سودا بیچ دیا لیکن میرا ہاتھ اب بھی خالی ہے۔ کہاں ہے میرے سودے کی قیمت؟"

میں اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ اس کے تلووں کی مالش کرنے لگا۔ میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ کوئی دشمن ہوتا تو میں اس پر جھپٹ پڑتا' کوئی دیوار ہوتی تو اس سے ٹکرا جاتا لیکن یہ تو وقت تھا جس کے ہاتھ میں حکم الٰہی کا پروانہ ہوتا ہے اور جو اپنا کام کیے بغیر واپس نہیں جاتا۔ یہی وقت تھا جب "ساڑھے چار" ہفتوں میں پہلی بار چھت کی طرف سے کچھ بہت مدھم آوازیں سنائی دیں۔ جیسے کوئی وزنی شے اپنی جگہ سے ہلی ہو یا گری ہو۔ چند لمحے بعد ایسی ہی ایک اور آواز آئی۔ میری حسیات سمٹ کر کانوں میں آگئیں۔ میں نے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں بھی ایک کرن ستارے کی طرح چمکی۔

میں نے آتش دان کی طرف دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے بیڈ شیٹ کے جو نئے ٹکڑے وہاں سلگائے تھے' وہ تیزی سے دھواں پیدا کر رہے تھے۔ شاید یہ دھواں ہی تھا جس نے ٹھہرے ہوئے ماحول میں جنبش پیدا کی تھی۔

میں نے شکیلہ کو ایک بار پھر جھنجوڑا "شکیلہ اٹھو۔ دیکھو۔ سنو۔ یہ آوازیں آرہی ہیں۔"

لیکن وہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب جسم میں پانی کی کمی ہوجاتی ہے تو جسم کی نالیاں اندر سے جڑنے لگتی ہے۔ شاید خوراک کی شدید کمی کے سبب بھی کوئی اس قسم کی خرابی اندرونی جسم پیدا ہوجاتی ہو۔ شکیلہ کو جو شدید ہچکی لگی تھی اس کا تعلق یقیناً معدے کے مصائب سے ہی تھا۔

بیس تیس منٹ تک چھت کی طرف سے مدھم آوازیں آتی رہیں اس کے بعد یہ آوازیں معدوم ہوگئیں۔ ہمارے دلوں میں امید کی جو لہریں لحہ بہ لحہ بلند ہوتی جارہی تھیں' وہ ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ جلال کو مرے اب تقریباً ۲۴ گھنٹے ہوچکے تھے۔ الماری کے اندر سے ہلکی ہلکی بو آتی تھی' تاہم یہ بو ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ شام تک ہم اس امید میں رہے کہ شاید چھت کی طرف سے آنے والی آوازیں ایک بار پھر ابھرنے لگیں' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ آتش دان میں دھوئیں کا "تسلسل" میں نے برقرار رکھا ہوا تھا۔ اب یہ بات ثابت ہوچکی تھی کہ دھواں نکاسی کے سوراخ سے باہر نکل رہا ہے۔

رات تک شکیلہ کی حالت کبھی بگڑتی اور کبھی سنبھلتی رہی۔ رات بارہ ایک بجے کے قریب اس نے دم توڑ دیا۔ وہ

مرگئی۔ وہ خود تو اس منحوس تہ خانے سے نہ نکل سکی لیکن اس کی روح پرواز کرگئی۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ وہ نہایت خاموشی اور بڑے ہی دھیرج سے مری تھی۔ وہ ماڈل بننا چاہتی تھی۔ ماڈل میں جہاں اور بہت سی خوبیاں دیکھی جاتی ہیں وہاں اس کی چال کو بھی بے حد اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ماڈل کی چال نہایت ہموار اور سہل ہونی چاہیے۔ وہ ایسی ہی ہموار اور پرسکون چال چل کر زندگی سے موت میں داخل ہوگئی تھی۔ وہ واقعی ایک اچھی اور کامیاب ماڈل بن سکتی تھی۔

شکیلہ کی موت نے مجھے اور اشرف کو بے حد آزردہ کردیا۔ شروع میں تو میں نے شکیلہ کی موت کو اشرف سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور اس کے سامنے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ بے ہوش ہے لیکن یہ سچائی بمشکل ایک گھنٹا ہی چھپی رہ سکی تھی۔ اشرف جان گیا تھا کہ اس منحوس تہ خانے کے چار مکینوں میں سے اب دو ہی رہ گئے ہیں۔ وہ بدحال اور فاقہ زدہ مکین۔

میں نے شکیلہ کی ہلکی پھلکی لاش کسی بچے کی لاش کی طرح ہاتھوں میں اٹھائی اور دیوار گیر الماری کے عقب میں پہنچا کر اس پر کپڑا ڈال دیا۔ بہت دیر تک ہم خاموش اور گم صم بیٹھے رہے۔ اس چار دیواری میں جیسے ابھی تک شکیلہ کی باتیں گونج رہی تھیں۔ شکیلہ نے کہا تھا کہ اس کی ماں ایک دلیر عورت ہے وہ اپنی زندگی برباد کرنے والے بشیرے سے عبرت ناک انتقام لے سکتی ہے لیکن اس کی مجبوری بس یہ ہے کہ اس کے پاؤں میں اپنی اکلوتی بیٹی کی زنجیر ہے۔ آج جیسے شکیلہ نے خاموشی کی زبان میں اپنی ماں سے کہہ دیا تھا ”لے ماں! میں نے تیرے پاؤں سے تیری بیٹی کی زنجیر نکال دی ہے۔“

یعنی۔ اب بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔

شکیلہ کی موت کے بعد اشرف کی آنکھیں بھی بجھ سی گئی تھیں۔ درحقیقت اس کی جسمانی حالت شکیلہ سے بھی زیادہ کمزور تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے حلقوں کی بجائے دو کنوؤں میں اتری ہوئی تھیں۔ شاید اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا جارہا تھا کہ اس جگہ سے زندہ نکلنا ہم میں سے کسی کے نصیب میں نہیں ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر لیٹ گیا تھا اور اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار اپنی خشک زبان پھیرنے لگا تھا۔ میرا خود بھی بھوک اور نقاہت کے سبب برا حال تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ بے حس و حرکت لیٹے رہو۔ ہماری بے پناہ افسردگی میں قریباً ایک گھنٹے بعد کچھ دراڑیں پڑیں۔ ایک بار پھر چھت کی طرف سے وہی آوازیں آنے لگی تھیں جو کل آئی تھیں۔ اس مرتبہ یہ آوازیں پہلے سے کچھ واضح تھیں۔ آدھ پون گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد یہ آوازیں مزید واضح ہوگئیں پھر یوں ہوا کہ تہ خانے میں ایک دم گہری تاریکی چھاگئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس تاریکی کا تعلق اوپر سے آنے والی آوازوں سے ہی ہے۔ میں اشرف کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ اشرف کا پسٹل میرے قریب ہی رکھا تھا۔ اس پسٹل کی ہم دونوں میں سے کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ کتنی جلدی یہ پسٹل ہم دونوں کے لیے بے معنی ہوچکا تھا۔ بظاہر یہ ایک معمولی بات تھی لیکن ایک بہت بڑی ”کایا پلٹ“ تھی جو اس تہ خانے میں ہوئی تھی۔ گھپ اندھیرے میں میں آہستہ آہستہ اشرف کا کمزور ہاتھ سہلاتا رہا اور اوپر سے آنے والی آوازوں کو سنتا رہا۔ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس تہ خانے کی چھت کے آس پاس حرکت موجود ہے۔ کچھ بھاری بھرکم چیزوں کو ہٹایا جارہا ہے لڑھکایا جارہا ہے۔ بتدریج یہ حرکت واضح ہوتی چلی جارہی تھی۔ جوں جوں یہ واضح ہورہی تھی ہمارے اندر زندگی کی رمق بھی بڑھ رہی تھی۔

ساری رات یہ آوازیں آتی رہیں۔ ہم دونوں بالکل نہیں سوسکے تھے۔ میں نے اس دوران میں دو تین بار آتش دان کے قریب لیٹ کر باہر والوں کو پکارا بھی تھا۔ بہرحال جواب میں کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ہم باہر سے ابھرنے والی کسی انسانی آواز کے لیے بالکل ترس گئے تھے۔

رات کسی وقت تھوڑی دیر کے لیے مجھے اونگھ سی آئی۔ غنودگی میں ایک عجیب آواز کانوں میں گونجی۔ مجھے لگا جیسے سائیں عالی میرے بالکل آس پاس موجود ہے۔ وہ کہہ رہا ہے ”تیرا رقیب اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔ اگر وہ واقعی مرگیا تو تیری غزالہ کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ تیری طرح وہ بھی آزاد ہوجائے گی۔ وہ بھی آزاد ہوجائے گی۔ دل دھڑکا آزاد... دل دھڑکا۔ ہا ہا دل دھڑکا۔“

میں نے یقیناً کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ یہ آواز حقیقتاً میرے کانوں میں گونجی تھی لیکن میرے اردگرد کوئی نہیں تھا۔ میں گہری تاریکی کے باوجود جانتا تھا کہ اردگرد کوئی نہیں ہے۔ میں دیر تک اس آواز کی ماہیت پر غور کرتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ جو الفاظ میرے کانوں میں گونجے تھے ان میں رقیب کا ذکر تھا۔ یہ رقیب شیخ عاصم کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ میں نے سائیں کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا لیکن اب بھی کبھی نہ کبھی کوئی ایسی بات ضرور ہوجاتی تھی جو حیران

کردیتی تھی۔ اس واقعے کے قریباً ایک گھنٹے بعد اس تہ خانے کے بالکل قریب بھاری بھرکم ہتھوڑے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارے مددگار ہمارے قریب پہنچ رہے تھے۔

○☆○

تہ خانے کی گھڑیوں کے مطابق اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے جب تہ خانے کا منحوس دروازہ جو پورے ۳۵ دن تک ایک چٹان کی طرح ہمارے سامنے کھڑا تھا ایک طویل آواز کے ساتھ حرکت میں آگیا۔ دروازے کے پار سے روشنی کی لکیر اندر آئی۔ میں نے جو پہلا چہرہ دیکھا وہ ایک باوردی فورمین کا تھا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ تھی۔ اس کے پیچھے ہیلمٹوں والے تین چار مزید چہرے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک پولیس آفیسر نظر آتا تھا۔ اپنے مددگاروں کو دیکھ کر ایک دم ہی جسم میں بے پناہ نقاہت اتر گئی تھی لیکن میں بیٹھا رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پسٹل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ تاہم آنے والوں میں پولیس آفیسر کو دیکھ کر مجھے تسلی ہوگئی تھی۔ میں نے پسٹل ایک طرف رکھ دیا۔ ان لمحوں میں میرے ذہن میں جلال کی بات آئی۔ اس نے کہا تھا کہ اس تہ خانے میں سے بس دو بچ کر نکلیں گے۔ اس کی بات نجانے کیسے پوری ہوگئی تھی۔

دو افراد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اشرف کو سہارا دیا اور اٹھایا۔ ان لمحوں میں انڈر ورلڈ کی خوفناک تنظیم ”پانما گینگ“ کا سرغنہ ایک نحیف و ناتواں شخص نظر آرہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایک طرح سے زندہ بچ نکلنے کی مبارک باد تھی۔ تاہم دوسرے ہی لمحے میرا دل رنج سے بھر گیا۔ میں نے شکیلہ کی لاش کو دیکھا۔ تین چار افراد لاش کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر دروازے کے پاس لے آئے تھے۔ دروازہ کھل گیا تھا، باہر سے تازہ ہوا آرہی تھی لیکن اس میں سانس لینے کے لیے شکیلہ موجود نہیں تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا۔ نجانے کیوں اس وقت ایک مشہور شعر کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے ”تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم، دار کی خشک ٹہنی پے وارے گئے، تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم نیم تاریک راہوں میں مارے گئے۔“

ہمارے اردگرد درجنوں لوگ موجود تھے۔ ان میں فائر بریگیڈ والے تھے، پولیس والے تھے، ڈاکٹر حضرات تھے۔ ایک ہجوم سا تھا۔ اس ہجوم میں میری نگاہیں سائیں صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک ٹوٹی پھوٹی راہداری سے گزر کر ہم چند سیڑھیاں چڑھے۔ ایک تباہ حال دیوار کی اینٹوں کا ایک بڑا ڈھیر مجھے اپنے سامنے نظر آیا۔ اس ڈھیر کے اوپر نیلا آسمان تھا اور سرما کی سنہری دھوپ تھی۔ میری نگاہوں نے بے ساختہ اس منظر کو چوم لیا۔ ایک شخص نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”تہ خانے سے ہلکی سی بو آرہی ہے۔ کیا کوئی اور بھی وہاں موجود ہے؟“

”ہاں ایک لاش الماری کے نیچے والے حصے میں پڑی ہے۔“ میں نے نفرت سے جواب دیا۔

وہ شخص اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے واپس پلٹ گیا۔ یوں تو میرے ذہن میں سیکڑوں سوال کلبلا رہے تھے لیکن سب سے اہم سوال یہی تھا کہ صفدر کے آپریشن کا کیا بنا ہے۔ میں اپنے اردگرد کوئی ایسا شخص ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے اس اہم ترین سوال کا جواب دے سکے۔

عبدالستار آکاش کے قلم سے ایک سحر انگیز اور پراسرار ناول

صدیوں بعد

چڑیلوں کی ملکہ اور خونی راکھشس کی خونی ٹکر۔
ایک بہادر انسان جو روحوں کو قید کرنے کا گُر جانتا تھا۔
ایک شخص کی داستان جسے انسانی خون چاہیے ہوتا تھا۔
کیا راگا بن ملیان اپنے بلیدانی جسم کو بچا سکا؟

قیمت 150 روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر علی میاں پبلی کیشنز

اسٹاکسٹ علی بک اسٹال

ہم اپنی یخ بستہ قبر سے باہر آ گئے۔ اشرف کو دو افراد نے سہارا دے رکھا تھا اور اس کے پاؤں اپنے جسم کا بہت تھوڑا وزن سہار رہے تھے۔ میں نے باہر آنے کے بعد اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا اور ششدر رہ گیا۔ یہ وہ جگہ ہی نہیں لگتی تھی جہاں میں پانچ ہفتے پہلے رات کی تاریکی میں داخل ہوا تھا۔ جس چاردیواری کو پھاند کر میں احاطے میں آیا تھا اس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ سفیدے کے کئی درخت جلے ہوئے تھے۔ عمارت کی جگہ ملبے کا ایک "عظیم الشان" ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ یہ ملبہ صرف اسی عمارت کا نہیں تھا جس میں میں گھسا تھا' ایک چار منزلہ قریبی عمارت بھی منہدم ہوئی تھی اور اس کے ملبے کا بہت سا حصہ بھی اس عمارت پر آن گرا تھا۔ یہ چار منزلہ عمارت ایک سرکاری دفتر کی تھی۔

ملبے کو دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ساری تباہی زوردار بارودی دھماکوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میری نگاہیں اپنے اردگرد کسی شناسا کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن شناسا کوئی نہیں تھا۔ تاویر زمین دوز "قید خانے" میں بند رہنے کی وجہ سے میرا اپنا حلیہ بھی بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ داڑھی مونچھیں بڑھ گئی تھیں اور بال بھی معمول سے لمبے نظر آ رہے تھے۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ابھی تک مجھے کسی نے پہچانا نہیں ہے۔

اسی دوران میں جلال کی لاش بھی الماری میں سے نکال لی گئی۔ فائر بریگیڈ اور پولیس کے کچھ اہلکاروں نے لاش کو اسٹریچر پر ڈالا اور باہر لے آئے۔ ہجوم میں ہلچل پیدا ہوئی۔ لوگ لاش کو دیکھنے کے لیے امڈ پڑے۔ اسی دوران میں میرے بائیں کندھے پر کسی کا ہاتھ آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ سب انسپکٹر شجاعت تھا' ساہی صاحب کا خاص ماتحت۔ وہ باقاعدہ وردی میں تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا "شاہ جہاں صاحب آپ کے دائیں ہاتھ جو سوزوکی کار کھڑی ہے اس میں بیٹھ جائیں۔ جلدی کریں۔"

میں نے ایک سیکنڈ کے لیے سوچا پھر شجاعت کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔ سوزوکی سے میرا فاصلہ بمشکل پانچ چھ قدم تھا۔ میں بائیں جانب کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سول کپڑوں میں پولیس والا ہے۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ زیادہ تر لوگ شکیلہ اور جلال کی لاشوں کی طرف متوجہ تھے۔ اگر کسی نے ہمیں دیکھا بھی تھا تو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ سوزوکی کار نے تیزی سے یوٹرن لیا اور بڑی سڑک پر آ گئی۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا "کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

"ابھی مجھے خود بھی پتا نہیں جناب۔"

اس سے پہلے کہ ڈرائیور مزید کچھ کہتا اس کا واکی ٹاکی جاگ اٹھا۔ ڈرائیور نے گاڑی چلاتے چلاتے واکی ٹاکی کان سے لگایا' پھر ایک دو باتیں کرنے کے بعد میری طرف بڑھا "سب انسپکٹر شجاعت صاحب ہیں۔" اس نے مجھے بتایا۔

"ہیلو شجاعت کیا بات ہے؟"

شجاعت نے جذباتی لہجے میں کہا "پہلے تو نئی زندگی مبارک باد قبول فرمایئے۔"

"بہت شکریہ۔"

شجاعت بولا "ڈرائیور اکرم نوید آپ کو ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں لے کر جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں میں بھی وہاں آ رہا ہوں۔ ساہی صاحب وہاں پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں گے۔ باقی باتیں وہاں چل کر ہوں گی۔"

"تمہیں صفدر کے آپریشن کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" میں یہ سوال پوچھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔

"جی نہیں۔ اس بارے میں آپ کو ساہی صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔"

مجھے شک گزرا کہ شجاعت مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سینے میں جوار بھاٹا سا شروع ہو گیا۔ اپنی آزادی کی خوشی ایک دم ہی کہیں پس منظر میں چلی گئی۔ لاہور کی چمکیلی دوپہر' خوب صورت سڑکیں باغیچے ہر شے دھندلانے لگی۔ کار مختلف سڑکوں پر سفر کرتی ہوئی مسلم ٹاؤن پہنچی اور ساہی صاحب کی پرائیویٹ رہائش گاہ کے پورچ میں داخل ہو گئی۔ میں گاڑی سے اتر کر اندر پہنچا۔ آئینے میں شکل دیکھی تو لگا کہ کوئی اور شخص کھڑا ہے فاقہ زدہ اور پریشان حال۔ پانچ ہفتوں میں میرا وزن بھی خاصا کم ہو گیا تھا۔

ساہی صاحب ابھی نہیں پہنچے تھے۔ میں نشست گاہ میں پہنچا۔ یہی جگہ تھی جہاں سے میں پانچ ہفتے پہلے پاشا گینگ کے بگ باس کی تلاش میں روانہ ہوا تھا۔

میں نے شجاعت سے پوچھا "مجھے یہاں لانے کی ہدایت تمہیں ساہی صاحب کی طرف سے ملی تھی؟"

"جی نہیں۔ مجھے صرف یہ ہدایت ملی تھی کہ جب ملبہ ہٹایا جا رہا ہو تو میں آس پاس موجود رہوں۔ ہمیں یہ ہلکا سا شک تھا کہ اگر ملبے کے نیچے کچھ لوگ زندہ موجود ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان میں آپ بھی موجود ہوں۔ اس کے بعد کا فیصلہ میں نے خود ہی کیا۔ آپ کو خاموشی سے یہاں لے آیا۔"

"کیوں؟"

"وجہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ پولیس کو مطلوب ہیں۔ اگر کسی اعلیٰ افسر کی نظر آپ پر پڑ جاتی اور وہ آپ کو پہچان لیتا تو فوراً آپ کی گرفتاری کا حکم دے دیتا۔"

اتنے میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ ساہی صاحب تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پتا نہیں تھا کہ صفدر کے حوالے سے مجھے کیا خبر ملنے والی ہے۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی خیریت کی اطلاع بھی مجھے ساہی صاحب سے ہی مل سکتی تھی۔ چند لمحے بعد ساہی صاحب اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے بے تابی سے مجھے گلے لگا لیا۔ ان کا محبت بھرا مہربان ہاتھ دھیرے دھیرے میری پشت سہلاتا رہا پھر ہم علیحدہ ہو کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔

"جناب... صفدر کیسا ہے؟" میں نے چھوٹتے ساتھ ہی پوچھا۔

ساہی صاحب کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا "صفدر کے بارے میں بھی بتاتا ہوں پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ قریباً چالیس دن تک تم نے ہمیں سولی پر لٹکائے رکھا ہے۔"

"پلیز ساہی صاحب۔ مجھے بتائیں صفدر ٹھیک تو ہے نا؟ اس کے آپریشن کا کیا بنا ہے۔"

ساہی صاحب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی' ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے "شاہ جہاں! صفدر آسٹریلیا سے واپس آ گیا ہے۔"

"اور... اس کی آنکھیں؟"

"ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا آپریشن ممکن نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ... ڈاکٹروں نے تو سارے ٹیسٹ دیکھے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ..."

"میں جانتا ہوں۔ انہوں نے کیا کہا تھا۔" ساہی صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "ٹیسٹ دیکھنے کی بات اور ہوتی ہے۔ مریض کا بنفس نفیس معائنہ کرنے کی بات اور۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ کتنی ہی دیر تک کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں' میں دن رات صفدر کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ میرے ذہن میں آپریشن کامیاب یا ناکام ہونے کی باتیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ یہ تو میرے خیال میں ہی نہیں تھا کہ آپریشن سرے سے ہو گا ہی نہیں۔

کتنی ہی دیر میں اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کیا کہا ہے ڈاکٹروں نے؟"

"وہ کہتے ہیں کہ صفدر کے دونوں "آئی بالز" بری طرح زخمی ہو چکے ہیں' اس کے علاوہ OPTIC NERVE اور اس کے پیچھے بھی پیچیدگیاں موجود ہیں۔"

میں نے اپنا حوصلہ جمع کرتے ہوئے پوچھا "کیا ڈاکٹروں نے بالکل جواب دے دیا ہے۔"

"فی الحال تو جواب والی بات ہی ہے۔" ساہی صاحب نے کہا۔

مجھے اپنے سامنے ایک تاریک خلا نظر آنے لگا۔ اگر آسٹریلیا جیسے ملک میں ماہرین آئی اسپیشلسٹس نے جواب دے دیا تھا تو پھر اور کہاں سر پھوڑا جا سکتا تھا۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو چمکنے لگے۔ صفدر کی بینائی کسی طاقت ور دشمن کے قبضے میں ہوتی تو میں اس دشمن کے چیتھڑے اڑا دیتا۔ اگر وہ دولت سے خریدی جا سکتی تو میں اپنی دولت کے ساتھ ساتھ اپنا آپ بھی بیچ ڈالتا لیکن یہ سب کچھ تو دستِ قدرت کے قبضے میں تھا۔ جو اپنے فیصلوں میں کلی طور پر خود مختار ہے اور ہر طرح کی جواب دہی سے آزاد بھی ہے۔ ہم حقیر سنگریزوں کی طرح اس کی منشا کے طوفانی بہاؤ میں بہا کرتے ہیں۔

ساہی صاحب نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر میرا شانہ تھپکا اور بولے "شاہ جہاں! مایوسی گناہ ہے۔ جب ہم مایوس ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی قدرتِ کاملہ پر شک کرتے ہیں۔ سویانا کے ڈاکٹروں نے جواب ضرور دیا ہے لیکن کوشش کے راستے تو بند نہیں ہوئے۔ ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ مسٹر جی کلارک نے اسٹیٹس میں کچھ لوگوں سے رابطہ کیا ہے۔"

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ساہی صاحب اپنی باتوں سے اپنی غم ناک اطلاع کی شدت کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ شاید اندر سے وہ بھی بری طرح دکھی اور مایوس تھے۔

کتنی ہی دیر تک کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی کو ساہی صاحب نے ہی توڑا وہ بولے "چلو اٹھ کر شیو وغیرہ کر لو اور نہا لو پھر بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔"

میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا "صفدر اب کہاں ہے؟"

"وہ ابھی زریں گل کے گھر میں ہی ہے۔ اس کی والدہ اور اباجی بھی گجرات سے آئے ہوئے تھے۔ صفدر کی بہن اور بھائی بھی تھیں۔ یہ لوگ صفدر کو واپس گجرات لے جانا

چاہتے تھے مگر زریں گل نے ان سب کو اپنے گھر ہی ٹھہرالیا ہے۔ آج کل وہ لوگ بھی صفدر کے ساتھ زریں کے گھر ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"صفدر کا رویہ کیسا ہے؟"

"سنا ہے کہ چند دن تو وہ گم صم رہا ہے لیکن اب بہن بھائیوں کے آنے سے ہنسنے بولنے لگا ہے۔ ویسے وہ بڑی ہمت والا شخص ہے۔ ابھی پرسوں ہی میں اس سے ملا تھا۔ وہ بار بار تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا، میں اسے کیا بتاتا۔ وہی بات کہہ دی جو پہلے کہتا رہا ہوں۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تم جہاں داد کی حیثیت سے پاشا گینگ کے لوگوں میں گھسے ہوئے ہو اور لاہور سے دور ہو۔ تم سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔"

"میرے بارے میں آپ کا کیا اندازہ تھا؟"

ساہی صاحب نے پیشانی کو مسل کر گہری سانس لی اور بولے "یہ تو ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک مہینہ اور پانچ دن بعد تم اس ملبے کے اندر سے نکلو گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کا زندہ بچ جانا ایک کرشمہ ہے۔ جو کچھ یہاں ہوا ہے وہ ناقابلِ یقین ہے۔"

"مجھے تو کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا ہے۔ تہ خانے سے نکلنے کے بعد میں جس پہلے شخص سے اس بارے میں بات کر رہا ہوں وہ آپ ہیں۔"

ساہی صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تمہاری اطلاع سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم پاشا گینگ کے باس کا کھوج لگا رہے ہو اور اسی سلسلے میں گارڈن ٹاؤن والی کوٹھی میں جا رہے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ صبح تک لوٹ آؤں گا لیکن جب تم تیسرے روز تین چار بجے تک نہیں آئے تو میں نے حرکت میں آنا ضروری سمجھا۔ میں نے سب انسپکٹر شجاعت کو سادہ لباس میں کوٹھی پر بھیجا اور اس سے کہا کہ وہ معلومات حاصل کر کے آئے۔ سب انسپکٹر شجاعت نے جو ٹوہ لگائی اس سے پتا چلا کہ ایک دن پہلے رات کے اندھیرے میں کوٹھی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ یہ فائرنگ غالباً کوٹھی کے احاطے میں ہوئی تھی (یہ فائرنگ دراصل میں نے ان دو تیم تحیم کتوں پر کی تھی جو احاطے میں مجھ پر جھپٹے تھے) پڑوسیوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوٹھی کے مکین پُراسرار قسم کے لوگ ہیں۔ اردگرد کے لوگوں سے ان کا ملنا جلنا نہیں۔ گیٹ پر اکثر مسلح پہرے دار اور کتے وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ شجاعت کا اندازہ تھا کہ کوٹھی میں تین چار افراد موجود ہیں اور ان پر قابو پانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ سوچ بچار کے بعد میں نے شجاعت کو مقامی ایس ایچ او کے ساتھ کوٹھی میں بھیجا۔ پانچ چھ مسلح اہلکار ایک کار میں کوٹھی کے قریب ہی موجود رہے۔ شجاعت اور ایس ایچ او کوٹھی میں گئے۔ وہاں ایک شخص سے ان کی تلخ کلامی ہوگئی۔ اس نے شجاعت سے تلاشی کا وارنٹ مانگا تھا۔ اسی دوران میں ایک گارڈ نے شجاعت اور ایس ایچ او پر رائفل تان لی۔ پہلے تھوڑی سی دھینگا مشتی ہوئی پھر باقاعدہ پولیس مقابلے کی فضا بن گئی۔ اوپر کی منزل پر مسلح افراد موجود تھے انہوں نے پولیس پارٹی پر باقاعدہ فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے فوری طور پر مزید نفری وہاں بھیج دی۔ پولیس اہلکار فائرنگ کرتے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔ یہاں یہ واقعہ ہوا کہ کوٹھی کے ایک بڑے ہال کمرے میں ڈائنا میٹ اور بم وغیرہ اسٹور کیے گئے تھے۔ دستی بم اور رائفل ایمونیشن کی کئی پیٹیاں بھی یہاں موجود تھیں۔ کوئی گولی ان پیٹیوں میں لگ گئی۔ دو زوردار دھماکے ہوئے۔ دھماکوں سے ڈر کر پولیس اہلکار عمارت میں سے نکل آئے۔ ایسا کرنا ان کے لیے بہت اچھا ثابت ہوا۔ ابھی یہ لوگ بمشکل احاطے میں ہی پہنچے تھے کہ خوفناک دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ دھماکے پہلے ہونے والے دو دھماکوں سے آٹھ دس گنا زیادہ طاقت ور تھے۔ ان دھماکوں نے پوری عمارت کے پرخچے اڑا دیے۔ ایک بار یہ دھماکے شروع ہوئے تو پھر ہوتے چلے گئے۔ قریبی کمرے میں رکھا ہوا بارود بھی بھڑک اٹھا۔ اس بارود کے پھٹنے سے اتنا زوردار دھماکا ہوا کہ ساتھ والے آفس کی عمارت بھی ڈھے گئی۔ آس پاس کی کئی کوٹھیوں کو نقصان پہنچا اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ملبے کا جو پہاڑ جیسا ڈھیر بنا وہ تم نے بھی دیکھا ہوگا۔"

"ہاں۔ یہ سب کچھ میری توقع سے بڑھ کر ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا شام [illegible] تھی۔ اگر دفتر میں ملازمین موجود ہوتے تو پتا نہیں کتنا نقصان ہوتا۔ دفتر میں صرف ایک چوکیدار تھا۔ اس کی لاش ملبے میں سے تیسرے دن ملی۔ کوٹھی کے ملبے میں سے کل تین لاشیں ملیں، ان میں سے ایک جواں سال عورت تھی (یہ وہ عورت تھی جسے اشرف چیتا کے کمرے میں دیکھ کر مجھے شک ہوا تھا کہ وہ کوئی سکھ ہے اور میں اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ اس عورت کا ذکر کچھ آگے جا کر پھر آئے گا)

ساہی صاحب نے سگریٹ سلگایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے "بلڈوزروں اور کرینوں کے ذریعے ہم نے

ملبے کو اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ کہیں کسی زندہ شخص کے آثار نہیں تھے۔ ہمارا اندازہ تھا کہ گینگ کے کم از کم تین افراد تاریکی اور افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار ہوگئے ہیں۔ یہ بات تو کسی کے گمان میں نہیں تھی کہ ملبے کے نیچے کوئی پوشیدہ تہ خانہ ہوگا اور وہاں تمہارے علاوہ اور لوگ بھی زندہ حالت میں موجود ہوں گے۔ اگر پاشا گینگ کے لوگوں میں سے کوئی بندہ زندہ ہاتھ آگیا ہوتا تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔ مسلسل چار دن تک فائر بریگیڈ اور پولیس کے اہلکار ملبے میں کسی زندہ شخص کی موجودگی کا سراغ لگاتے رہے آخر تھک کر خاموش ہوگئے۔ اس کے بعد یہ تصور کر لیا گیا کہ اگر پاشا گینگ کے مزید افراد یہاں موجود بھی تھے تو وہ پولیس مقابلے کے وقت موقع سے فرار ہوگئے ہیں۔"

"مگر اس کے بعد ملبے کو ہٹانے کا کام تو ہونا چاہیے تھا۔"

ساہی صاحب نے کہا "تم نے شاید وقوعہ کو دھیان سے نہیں دیکھا۔ آفس کی جو عمارت گری ہے اس کا ایک حصہ بالکل سلامت ہے۔ اگر ضروری احتیاط کے بغیر ملبے کو صاف کرنے کی کوشش کی جاتی تو باقی عمارت بھی زمیں بوس ہو جاتی۔ اسی سلسلے میں پلاننگ ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ قانونی کارروائی ہونا بھی باقی تھی۔ اب تہ خانے تک پہنچنے کے لیے سارے ملبے کو نہیں چھیڑا گیا۔ صرف ایک طرف سے آہنی سریوں کے جال کو کاٹا گیا ہے اور ملبہ ہٹایا گیا ہے۔"

"اتنی تاخیر کے بعد آپ لوگوں کو ملبہ ہٹانے کا خیال دوبارہ کیسے آگیا؟" میں نے پوچھا۔

ساہی صاحب بولے "یہ منگل کی شام کی بات ہے، موقع پر موجود پولیس گارڈ کے انچارج چوہدری امین نے مجھے اطلاع دی کہ ملبے کے نیچے سے مسلسل دھواں نکل رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں آگ بھڑک اٹھے۔ میں نے خود جا کر معائنہ کیا۔ شجاعت بھی اس وقت موجود تھا۔ کبھی کبھی شجاعت بڑی دور کی کوڑی لاتا ہے۔ کہنے لگا 'کل تو اتنی موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔ اگر کہیں کوئی آگ تھی بھی تو اسے بجھ جانا چاہیے تھا۔ اس تر بتر گیلے ملبے میں سے دھوئیں کا نکلنا کچھ انوکھی بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی اب بھی نیچے موجود ہو۔' شجاعت کے اس خیال کو موقع پر موجود دو تین افسران نے رد کیا بلکہ اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی لیکن مجھے شجاعت کی بات اتنی بے وزن محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے رات نو بجے فائر بریگیڈ کے ذمہ دار آفیسر شاہ جی صاحب سے رابطہ کیا، اور اس بارے میں ڈسکس کی۔ شاہ جی نے کہا کہ اچھا میں خود جا کر موقع دیکھتا ہوں۔ صبح مجھے پتا چلا کہ شاہ جی نے موقع پر باقاعدہ کام شروع کر دیا ہے۔ پچھلے چار پانچ ہفتوں میں تمہاری طرف سے بالکل کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا، یہ بات مجھے بہت پریشان کر رہی تھی۔ پہلی بار میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں تم اس ملبے کے اندر ہی تو قید نہیں ہوگئے ہو۔ میری ہدایت پر ملبہ ہٹانے کا کام تیز رفتاری سے ہوا اور اس کام کے دوران میں شجاعت بھی موقع پر ہی موجود رہا۔ بخدا مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ ہوگیا ہے اور تم واقعی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پانچ ہفتے ملبے کے نیچے مدد کا انتظار کرتے رہے ہو......"

ساہی صاحب نے آخری الفاظ ادا کرتے کرتے ایک بار پھر جذباتی انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔

کچھ دیر کمرے میں ایک نمناک خاموشی طاری رہی، پھر ساہی صاحب نے کہا "میں یہ سننے کے لیے بے تاب ہوں کہ تم اس تہ خانے تک کیسے پہنچے اور پانچ ہفتے تم نے وہاں کیسے گزارے؟"

میں نے کہا "بس جناب! خدا کے آسرے پر ہی گزارے۔ گزرنے والا ہر دن ہمیں موت سے قریب لے جا رہا تھا اور کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔"

ساہی صاحب نے کہا "میں یہ سب کچھ تفصیل سے سننا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے چاہتا ہوں کہ تم ذرا نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ خانساماں تمہارے لیے کھانا تیار کر رہا ہے۔ تم خاصے کمزور ہو گئے ہو۔ یک دم بھاری خوراک بھی تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہوگی۔ میں نے خانساماں کو فون پر ہی بتا دیا تھا۔ وہ چکن سوپ بنا رہا ہے۔ ساتھ میں چاول وغیرہ ہیں۔"

ایک دم میری نگاہوں میں شکیلہ کی صورت گھوم گئی۔ وہ ایک ایک دانے کے لیے ترس کر مری تھی۔ اس کے خشک ہونٹ پھول کی کملائی ہوئی پتیوں جیسے ہو گئے تھے اور پھر میرا دھیان اشرف چیتا کی طرف چلا گیا۔ میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "وہ جو دوسرا بندہ میرے ساتھ تہ خانے سے نکلا ہے وہ کہاں ہے؟"

ساہی صاحب نے بتایا "اسے فی الحال اسپتال لے جایا گیا ہے۔ ویسے وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔"

میں نے کہا "وہ بہت خاص آدمی ہے جناب! بلکہ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کے بارے میں آپ کو بتا ہی دینا چاہیے۔ یہ بات نوے فیصد ثابت ہو چکی ہے کہ یہ شخص پاشا گینگ کا کرتا دھرتا ہے۔"

ساہی صاحب کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

میں نے کہا "میں اس سلسلے میں ابھی آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ فی الحال آپ پولیس کی کچھ اور نفری اس کی حفاظت کے لیے بھیج دیں۔"

ساہی صاحب اسی وقت ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے باتھ روم کا رخ کیا کچن کی طرف سے ایک فرائڈ رائس کی خوشبو آرہی تھی اور میرے معدے میں ہلچل مچا رہی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد میں نہا دھو کر باہر آیا تو کھانا میز پر سجا ہوا تھا۔ اس دوران میں شجاعت بھی جو تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا واپس آگیا۔ اس نے میرے اور ساہی صاحب کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ بعد ازاں شجاعت اسپتال روانہ ہوگیا جبکہ میں ساہی صاحب کو خود پر بیتنے والے واقعات تفصیل سے سنانے لگا۔ جوں جوں میری گفتگو آگے بڑھتی گئی۔ ساہی صاحب کی آنکھوں میں موجود حیرت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس یخ بستہ قبرے سے نکلنے کے لیے ہم نے جو جو جتن کیے اور جسم سے زندگی کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے جیسے جیسے کوششیں کیں وہ سب کچھ میں نے ساہی صاحب کے گوش گزار کردیا۔ اس طویل گفتگو کے اختتام پر میں نے ساہی صاحب کو یہ بھی بتایا کہ اشرف چیتا اب ایک بدلا ہوا شخص ہے۔ ۔ خانے میں ہم نے جو بدترین وقت ایک ساتھ گزارا ہے اس نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کردیا ہے۔ کم از کم محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ وہ بدل چکا ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ایک فون آیا۔ ساہی صاحب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے اور بات کرنے لگے۔ مجھے لگا کہ ان کی گفتگو میں شیخ عاصم کا ذکر بھی آیا ہے۔ جب ساہی صاحب گفتگو کے بعد کمرے میں واپس آئے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ شیخ عاصم بھی پاکستان میں موجود ہے۔ پانچ چھ روز پہلے وہ کورٹ میں پیش بھی ہوا تھا۔

میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "غزالہ کی طرف سے خلع کا کیس کس اسٹیج پر ہے؟"

ساہی صاحب بولے "گواہیوں پر جرح مکمل ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کہ فیصلہ نزدیک ہے اور یہ امید بھی ہے کہ فیصلہ مثبت ہوگا لیکن۔۔۔" ساہی صاحب کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئے پھر خود ہی سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولے "شیخ عاصم جیسا شخص اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں ہے۔ وہ عدالتی کارروائی کو مزید طول دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ عدالت سے باہر بھی وہ ہاتھ پاؤں مار سکتا ہے۔"

"اس کی طرف سے کوئی حرکت ہوئی ہے؟"

"حرکت ہوئی تو نہیں لیکن اس طرح کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"غزالہ کہاں ہے؟"

"وہ گلبرگ میں ہی اپنے امی ابو کے ساتھ ہے۔"

اسی دوران میں ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ساہی صاحب نے اٹھ کر فون ریسیو کیا اور مجھے بتایا کہ لائن پر زریں گل ہے۔ اگر میں اس سے بات کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں۔ میں نے زریں گل سے بات کی۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "استاد صیب' آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ایک دم بتائے بغیر ہی آپ غائب ہوجاتا ہے اور ایسا غائب ہوتا ہے کہ بس کمال کرتا ہے۔ کہاں گئے ہوئے تھے آپ؟"

"نتھیا گلی اور مری وغیرہ میں سیر سپاٹا کر رہا تھا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لیکن وہاں تو آج کل بہت ٹھنڈ ہوتا ہے اور اگر تم نے سیر ہی فرمانا تھا تو پھر ام کو بھی ساتھ لے جاتا۔" وہ سمجھے بغیر بولا۔

"ٹھیک ہے اگلی دفعہ جب جاؤں گا تو تمہیں تو ضرور لے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ویسے استاد صیب! آج کل ام بہت اداس ہے۔ کسی وقت تو امارا دل رونے کو چاہتا ہے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ تمہارا دل رونے کو چاہتا ہے حالانکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو تم سے ملتا ہے اس کا دل رونے کو چاہتا ہے۔"

"ام مذاق نہیں کررہا استاد صیب۔ ام آج کل واقعی بہت غم زدہ ہے۔ امارا خیال ہے کہ تھوڑی بہت بات کا پتا آپ کو ساہی صیب سے بھی چل گیا ہوگا۔ امارا اشارہ صفدر بھائی کی طرف ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بتایا ہے ساہی صاحب نے۔" میرا لہجہ خود بخود بوجھل ہوگیا۔

زریں گل "استاد صیب! کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے نہیں آسکتا۔ ام کو لگتا ہے کہ صفدر کو اس وقت آپ کا بڑا سخت ضرورت ہے۔ آپ جب اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے تو وہ ایک دم پھر سے جی اٹھتا ہے۔ ام نے کئی بار ایسا دیکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ صفدر اس وقت کہاں ہے۔"

"اپنے کمرے میں ہے۔ کسی وقت تو بالکل گم صم ہوجاتا ہے۔ ام کہتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو ریڈیو ہی سن لیا کرو۔ وہ

بھی نہیں سنتا۔ آپریشن کے لیے جانے سے پہلے ایک ملازمہ اس کو اخبار وغیرہ پڑھ کر سناتا تھا' اب اخبار میں بھی اس کا دلچسپی نہیں رہا۔ گجرات سے اس کا والدین اور بہن بھائی آیا ہوا ہے۔ بس ان سے کسی وقت تھوڑا بہت بات کرلیتا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں کہ آج ہی آسکوں۔"

رات کو تو میں نہ جاسکا' تاہم اگلے روز شام آٹھ بجے کے بعد میں زریں گل کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ حسب سابق میں تاریک شیشوں والی ایک پرائیویٹ کار میں تھا۔ کار اور کار کا ڈرائیور ساہی صاحب نے ہی فراہم کیا تھا۔ میں پورچ میں جاکر گاڑی سے نکلا اور فوراً ہی رہائشی حصے میں داخل ہوگیا۔

زریں گل مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا "استاد صیب! یہ آپ کو کیا ہوگیا۔ آپ تو ایک دم کمزور ہوگیا ہے۔ ام کو تو یقین ہی نہیں آرہا۔"

اتنے میں کلثوم بھی وارد ہوگئی "ہائے استاد صیب! آپ کو تو لگتا ہے کہ کسی کا نظر لگ گیا ہے۔ آپ تو آدھا رہ گیا ہے۔"

ان دونوں کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ پچھلا ایک ڈیڑھ مہینہ میں نے کس "آفت" میں گرفتار ہوکر گزارا ہے۔

"بس کچھ بیمار ہوگیا تھا میں۔" میں نے کلثوم کے سامنے بات بنائی۔

"کچھ نہیں' آپ تو سارے کا سارا بیمار ہوگیا ہے۔" کلثوم نے دہائی دی "آپ کو تو سوکھڑا ہوگیا ہے۔ اسی طرح امارے بھائی کو ہوا تھا۔ امارے باپ نے اسے کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر دو دن تک ایک کنویں میں لٹکائے رکھا تھا۔ آپ بھی۔۔۔"

"ہمارے ہاں ادھر آس پاس کوئی کنواں نہیں ہے اور نہ ہی مجھے سوکھڑا ہے۔" پھر میں نے زریں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "صفدر کدھر ہے؟"

"اسے آپ کے آنے کا کچھ پتا نہیں تھا' وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ آپ اتنی دیر میں صفدر کے والدین سے مل لیں۔"

زریں مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ زریں کی مستقل رہائش گاہ نہیں تھی (کیونکہ اس کی اپنی کوٹھی تیزی سے تیار ہورہی تھی) پھر بھی اس نے اس جگہ کو خوب سجا سنوار رکھا تھا۔ ہر در و دیوار سے زریں کی زبردست امارت کا اظہار ہورہا تھا۔ ایک گیلری نما کمرے میں اس نے اپنے پسندیدہ فلمی اداکاروں کی تصویریں بھی قیمتی فریموں میں لگاکر سجائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں نمایاں تصویریں سدھیر اور بدر منیر ہی کی تھیں۔ میں صفدر کے والدین سے ملا۔ یہ ہماری تیسری ملاقات تھی بلکہ صفدر کی والدہ سے تو میں بس ایک دفعہ ہی مل سکا تھا۔ وہ دیہاتی طرز کی بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ بڑے دھیمے اور سادہ لہجے میں بولتی تھیں۔ صفدر کے والد کھلے ہاتھ پیر کے جفاکش شخص نظر آتے تھے۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور چہرے کی جھریوں میں دانائی اور زمانہ شناسی چھپی ہوئی تھی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی تھی۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ میری تازہ معلومات کے مطابق وہ پیشے کے لحاظ سے فارمر تھے اور ایک عرصہ جدید زراعت سے وابستہ رہے تھے۔

میں ان دونوں کے پاس بیٹھا تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایک گھنٹا جیسے ایک منٹ میں گزر گیا۔ دونوں بزرگ بیٹے کی حالت پر غمزدہ تھے۔ میں انہیں تسلی تشفی دیتا رہا۔ صفدر کی والدہ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "شاہ جہان پتر! وہ تیری بات بہت مانتا ہے۔ میں تو کہوں گی کہ وہ دنیا میں اگر کسی کی بات مانتا ہے تو وہ تو ہی ہے۔ وہ کسی پیر کی طرح تیری عزت کرتا ہے۔ تو اس سے ہر بات منوا سکتا ہے۔ تو اس سے کہہ کہ وہ ہمارے ساتھ گجرات چلا جائے۔ وہاں سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کی شادی بھی ہوجائے گی۔ تو اسے کسی طرح شادی پر راضی کرلے۔ میں دو دن میں اس کے لیے بڑی اچھی لڑکی ڈھونڈ لوں گی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئیں۔

صفدر کا باپ بولا "صفدر کی ماں ٹھیک کہتی ہے پتر! صفدر تیری اتنی عزت کرتا ہے کہ تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ تیری کوئی بات بھی ٹالے گا نہیں۔" پھر وہ اپنی آواز کو ذرا دھیما کرتے ہوئے بولا "ویسے میں ایک بتادوں' صفدر کی ماں نے صفدر کے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ بھی رکھی ہے۔"

میں صفدر کے والدین سے باتیں کررہا تھا جب زریں نے آکر بتایا کہ صفدر جاگ گیا ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ صفدر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالیا "آپ کیسے ہیں شاہ جہاں صاحب!" اس نے بڑی گرم جوشی سے کہا۔

وہ میرے سامنے بالکل مطمئن اور خوش نظر آنے کی کوشش کررہا تھا' لیکن مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کی حالت کیا ہے۔ وہ جیسے ریزہ ریزہ ہوچکا تھا۔ ساری امیدیں' آسیں دم توڑ چکی تھیں۔ دعائیں اور تمنائیں

و ر فیولیت کھوجنے میں ناکام رہی تھیں۔

میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ ہماری باتیں ایک بار شروع ہوئیں تو پھر ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ ہم تقریباً تمام شب مصروف گفتگو رہے۔ ہر موضوع پر بات ہوئی۔ میں نے صفدر کو تفصیل سے بتایا کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ مہینے میں مجھ پر کیا بیتتی رہی ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں شیخ عاصم کا ذکر بھی آیا۔ یہ بات صفدر کو بھی معلوم تھی کہ عاصم ایک بار پھر پاکستان میں موجود ہے' اور وہ اپنے کیس کے سلسلے میں کورٹ میں بھی پیش ہوا ہے۔ صفدر کی باتوں سے مجھے یوں لگا کہ وہ عاصم کے حوالے سے کچھ چھپا رہا ہے۔ کوئی اہم بات جو وہ مجھے بتانا نہیں چاہتا۔

ناشتا میں نے صفدر اور زریں گل کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد میں ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں واپس آگیا۔ واپسی کا سفر بھی میں نے بڑی رازداری سے کیا تھا۔ میری واپسی کے تھوڑی ہی دیر بعد زریں گل کا فون آگیا۔ کہنے لگا "استاد صیب! اگر ام آپ سے کوئی بات چھپاتا ہے تو ام کو یوں لگتا ہے کہ امارے اندر گیس جمع ہو گیا ہے اور امارا پیٹ بری طرح پھول گیا ہے۔"

"کیا اب بھی تم کو ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے؟"

"جی ہاں۔" زریں گل صاف گوئی سے بولا "ام ساہی صیب کی دل سے عزت کرتا ہے اور ان کی بات ماننا اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے لیکن آپ تو امارا استاد صیب ہے۔ آپ سے بڑھ کر ام کو کوئی بھی عزیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ام آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہے' حالانکہ ساہی صیب نے ام کو منع کر رکھا ہے۔" چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ بولا "شاید آپ بھی جانتا ہو گا کہ شیخ عاصم "کتے کا بچہ" یہاں موجود ہے لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہیں ہو گا کہ اس حرامی کا ارادہ بہت خطرناک ہے۔ اس کو پتا چل چکا ہے کہ وہ عدالت میں ہار جائے گا اور اسے غزالہ بی بی کو "آزاد" کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غلط ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔"

"غلط ہتھکنڈے؟"

"جی ہاں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ غزالہ بی بی کو زبردستی پاکستان سے لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ساہی صیب کو پتا چلا ہے کہ لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں ابو ظہبی کا ایک نامی گرامی بدمعاش سرموب ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ یہ شخص شیخ عاصم کے ساتھ ہی امارات سے یہاں پہنچا ہے۔ سرموب کے ساتھ تین چار مسلح افراد بھی ہیں۔ ان میں سے دو امارات کے ہیں اور ایک پاکستانی ہے۔ پاکستانی کو گلبرگ میں غزالہ بی بی کے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ ساہی صیب نے ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہی بھی لیکن شیخ عاصم کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ سرموب خود بھی بہت لمبے ہاتھوں والا بدمعاش ہے۔"

زریں خاموش ہوا تو میں نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے ساہی صاحب نے یہ بات مجھ سے چھپائی کیوں ہے؟"

"امارا خیال یہی ہے جناب کہ وہ آپ کو اس نئے معاملے میں گھسیٹنا نہیں چاہتا۔ ساہی صیب کو ڈر ہے کہ آپ ایک دم غصے میں آکر اس چکر میں کود پڑے گا اور پولیس کا جو افسر لوگ پہلے ہی آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے وہ اور بھی پیچھے پڑ جائے گا۔"

زریں گل کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ ساہی صاحب نے صفدر اور زریں گل وغیرہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مجھے اس معاملے کی اصل سنگینی سے آگاہ نہ کریں۔ اپنی جگہ ساہی صاحب ٹھیک تھے لیکن مجھے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ ساہی صاحب میں اب وہ دم خم نہیں جو آج سے سات آٹھ سال پہلے تھا۔ شاید یہ بھی عمر کا تقاضا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ معاملات پر بندے کی گرفت کم ہوتی جاتی ہے۔

زریں سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے اپنے پرانے دوست عالم قریشی کے برادر نسبتی رشید احمد سے بات کی (عالم قریشی المعروف کھابہ گیر پاکستان میں نہیں تھا) رشید احمد بھی ابو ظہبی میں کاروبار کرتا تھا اور وہاں اس کے کافی تعلقات بھی تھے۔ اس نے تین چار گھنٹے میں مجھے ابو ظہبی کے بدنام قاتل سرموب کے بارے میں اہم معلومات فراہم کر دیں۔ سرموب دراصل دو لفظوں کا مرکب تھا۔ یعنی "سر اور موب" اس بدمعاش کا نام موب تھا اور اسے جرائم کی دنیا کے سرکردہ لوگوں نے "سر" کا خطاب دے رکھا تھا۔ عمر [illegible] سال کے قریب تھی۔ مارشل آرٹ کا ماہر تھا اور ذہنی بدمعاشی کے ساتھ ساتھ "جسمانی بدمعاشی" بھی مہارت کے ساتھ کرتا تھا۔ یعنی ماسٹر مائنڈ ہونے کے علاوہ بے حد پھرتیلا اور چست بھی تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ شیخ عاصم نے ٹنکر شکرا کے ان فٹ ہونے سے یہ نیا کھلاڑی بھرتی کیا ہے۔ ٹنکر اپنی ٹانگ تڑوانے کے بعد نوبل کلب کے ایک ایسے کمرے میں قیام پذیر تھا' جسے اسپتال کے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ میں نے یہ منظر گارڈن ٹاؤن کی منہدم ہو جانے والی

کوٹھی میں ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ (یقینی بات تھی کہ اب ٹنکر شکرا اس کوٹھی میں موجود نہیں ہو گا' اسے کہیں اور منتقل کیا جا چکا ہو گا)

سرموب کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا اس سے پتا چلا کہ اس کے ساتھ امارات کی دو مزید جرائم پیشہ "ہستیاں" بھی ہیں اور یہ لوگ مال روڈ کے سب سے مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

اگلے روز ساہی صاحب کی رہائش گاہ پر ہی میں نے اپنے چہرے کو ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے تھوڑا سا تبدیل کیا اور سرموب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل میں پہنچ کر میں نے سرموب کا کمرا نمبر معلوم کیا اور بذریعہ لفٹ وہاں پہنچ گیا۔ راہداری میں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ سرموب اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ وہاں باقاعدہ مسلح گارڈز موجود تھے اور پولیس کے بندے بھی سادہ کپڑوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ میں نے ایک ایسے ہی شخص کو دیکھا کہ وہ مجھے بری طرح گھور رہا ہے۔ میرے چہرے پر تبدیلیاں تو آئی تھیں لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کہ میری صورت ہی تبدیل ہو کر رہ گئی ہو۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں نے سرموب کے کمرے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو پولیس نے سادہ پوش مجھ سے فوراً سوال جواب شروع کر دیں گے۔ بہتری تھا کہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرتا۔

میں ہوٹل سے واپس آگیا اور ایک ٹیکسی کرائے پر لے کر یونہی ادھر ادھر گھومنے لگا۔ لاہور میں بے مقصد گھومنا بھی اچھا ہی لگ رہا تھا۔ گھومتے گھومتے اچانک نگاہ گولڈ ہوٹل کی بلند و بالا شاندار عمارت پر پڑی۔ عمارت بالکل نئی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ نجانے دل میں کیا آئی کہ میں نے ٹیکسی ہوٹل کی شاندار پارکنگ میں رکوائی اور ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ میں ڈائننگ ہال میں پہنچا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر "ہائی ٹی" کا آرڈر دیا۔ ہائی ٹی میں چائے کے ساتھ کافی لمبے چوڑے لوازمات بھی ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ڈائننگ ہال میں کافی رش ہے اور ہائی جینٹری کے لوگ کافی تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ میں ہوٹل کی ڈیکوریشن' کھانے کے معیار اور سروس وغیرہ کا جائزہ بڑی خاموشی سے لیتا رہا۔ یہ احساس بڑا دلچسپ تھا کہ میں اس عظیم الشان ہوٹل کا بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔ شاید ہر انسان کے اندر ملکیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ کسی میں یہ خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے' کسی میں کم۔ ہوٹل کا منیجر تیس بتیس سال کا نہایت خوش پوش شخص تھا۔ وہ کافی گرانڈیل بھی تھا۔ میں تفریحی موڈ میں تھا' اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے خوشدلی سے مصافحہ کیا اور مجھے بیٹھنے کے لیے کہا "فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں آپ لوگوں کی سروس سے متاثر ہوا ہوں۔ کیا میں ہوٹل اونر سے مل سکتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ وہ تو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

"لیکن پاکستان میں تو ہوں گے نا؟"

"نن نہیں۔ باہر گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں۔؟"

"یورپ۔" منیجر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"وہاں کیا کرنے گئے ہیں؟" میں نے پوچھا "سیر و سیاحت کے لیے تو جا نہیں سکتے کیونکہ آج کل وہاں بہت سردی ہے۔"

"دراصل۔ ہم پاکستان سے باہر بھی فرنچائزز گولڈ ہوٹل بنا رہے ہیں۔" اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے منیجر نے بڑھا ری۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ پاکستان سے باہر گولڈ ہوٹل کہیں نہیں بن رہا۔"

"کک۔ کیا مطلب جی؟"

"اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہوٹل اونر پاکستان سے باہر نہیں ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" منیجر نے جزبز ہو کر کہا۔

"اور میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ اس ہوٹل کی اونر شپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"یہ آپ۔ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" منیجر نے بڑی محنت سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس ہوٹل کی ملکیت اتفاقاً میرے پاس ہی ہے۔"

منیجر نے بڑے دھیان سے میری طرف دیکھا پھر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے بعد وہ لرزاں لہجے میں بولا "او گاڈ! مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا۔ آپ۔ آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ آپ۔ شاہ جہاں صاحب ہیں نا؟"

"آہستہ بولیں منیجر صاحب۔ اگر آپ کو پتا ہے کہ میں شاہ جہاں ہوں تو پھر یہ بھی پتا ہو گا کہ محکمہ پولیس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

منیجر کا چہرہ چند سیکنڈ میں کئی رنگ بدل گیا پھر وہ بولا "معذرت چاہتا ہوں اگر میرے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہو۔ دراصل سر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس

طرح یہاں تشریف لا سکتے ہیں۔" (منیجر سمجھ گیا تھا کہ میں نے اپنے چہرے پر تھوڑی بہت تبدیلی بھی کر رکھی ہے)

ان لمحوں میں میں نے خود کو کسی ایسے اعلیٰ حکومتی عہدے دار کی طرح محسوس کیا جو اچانک کسی چوراہے میں نمودار ہو کر عام لوگوں سے ہاتھ ملانے لگتا ہے اور ان کی حیرت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کی کہ میں نے منیجر سے یہ شرارت کیوں کی۔

میں نے منیجر سے باقاعدہ معذرت کی پھر ہم دونوں ایک اندرونی کمرے میں آ بیٹھے۔ میں منیجر سے ہوٹل کے بارے اور ہوٹل کی کارکردگی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ منیجر نے مجھ سے اجازت لیتے ہوئے فون ریسیو کیا اور بات کرنے لگا۔ اس نے فون پر جو گفتگو کی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ منیجر سلطان آغا اپنے کچھ ایسے دوستوں کو کھانے پر مدعو کر رہا ہے جو امارات سے تعلق رکھتے ہیں اور مال روڈ کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ شیخ عاصم کے کرائے کے بدمعاش بھی تو امارات سے آئے تھے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطان آغا اپنے مہمانوں کو اپنی نئی تعمیر شدہ کوٹھی میں کل رات ڈنر دے رہا تھا۔ آغا نے بات ختم کی تو میں نے اس سے پوچھا "یہ کون دوست ہیں؟"

وہ بولا "میرے ایک پرانے دوست اسحاق رفاہی ہیں۔ راس الخیمہ میں ان کا ہوٹلنگ کا وسیع کام ہے۔ آج کل اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہاں وہ کسی کاروباری تنازع کے سلسلے میں بات چیت کرنے آئے ہیں۔"

"ان میں سرموب نام کا کوئی شخص بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

آغا بولا "ان کے دوستوں کے نام تو مجھے معلوم نہیں۔ وہ کانٹی نینٹل کے دوسرے فلور پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔" آغا نے مجھے ان کے کمروں کے نمبر بھی بتائے۔

میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ وہی نمبر تھے جن میں موب وغیرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ آغا نے جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا "کیا آپ اسحاق رفاہی وغیرہ کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"تھوڑا بہت جانتا ہوں۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"تو آپ بھی آئیں نا کھانے پر۔ میری بہت عزت افزائی ہوگی جناب!"

"میں کچھ مصروف ہوں لیکن اگر وقت ملا تو بتاؤں گا لیکن تم فی الحال میرے بارے میں اپنے دوستو کچھ نہیں کہو گے۔"

"جو آپ کا حکم جناب!"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ مجھے اپنے گھر کا حدود اربعہ سمجھانے لگا۔ یہ گھ نے نیا نیا بنایا تھا اور بڑی چاہت سے بنایا تھا۔ اس مر اور سرامکس کا نفیس ترین کام کیا گیا تھا۔ دراصل سلطا اور اس کی خوب رو بیوی دونوں کو [illegible] اور تعمیراتی کام میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ ان منفرد اسٹائل کے خوب صورت گھر کا ذکر چند دن پہلے ا میں بھی آیا تھا مجھے یاد آیا کہ میں نے اس گھر کی تصو اخبار میں دیکھی تھی۔

اسی دوران میں ایک ویٹر گولڈ ہوٹل کی نفیس تری ہمارے لیے لے آیا۔ کافی پیتے ہوئے بھی گفتگو ہوتی ر آغا میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ شنکر شنکرا ساتھ میری پرانی چپقلش سے بھی آگاہ تھا اور اس نے لا کے رائل پارک میں شنکر کے ساتھ میری ایک دھواں لڑائی بھی دیکھی تھی۔ آغا کی باتوں سے پتا چلا کہ آغا کی بھتیجی آغا سے بھی زیادہ میری مداح ہے اور مجھ سے ملے بہت خواہش مند بھی ہے۔ آغا بولا "اگر آپ نے آنا ہو میں اپنی بھتیجی کو ضرور بلاؤں گا وہ آپ سے مل کر بے حد ہوگی۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے اگر مجھے آنا ہوا تو میں فو تمہیں بتا دوں گا۔"

آغا مجھ سے مزید باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے جل تھی۔ میں اپنے ہوٹل کی بہترین کافی پینے کے بعد مسلم ٹا واپس آ گیا۔

○☆○

اگلے روز سہ پہر کے وقت ہی میں سلطان آغا کی رہا گاہ پر پہنچ گیا۔ رہائش گاہ واقعی منفرد تھی۔ یہ کوٹھی قریباً کینال کے رقبے پر واقع تھی اور دل کی شکل میں بنائی تھی۔ کوٹھی میں بے شمار خوب صورت گولائیاں اور قو وغیرہ تھیں۔ شیشے اور سرامکس کا کام کثرت سے کیا گیا تھا۔ سلطان آغا نے مجھے اپنی بھتیجی سے بھی ملایا۔ میں اسے دیکھ دنگ رہ گیا۔ وہ بھائی جی کی بیٹی آفرین تھی۔ میں نے ا آخری مرتبہ بھائی جی کے قتل کے روز دیکھا تھا۔ اس آفرین کی خوب صورت آنکھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں۔

آج یہ آنکھیں آنسو تو نہیں بہا رہی تھیں لیکن ان میں ایک گداز سی سوگواری ٹھہری ہوئی تھی۔ والد کی موت کا غم آج بھی اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ وہ اپنے والد کی لاڈلی بیٹی تھی اور اپنے والد کو شاید آج بھی عزت و پارسائی کے اعلیٰ درجے پر فائز سمجھتی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوا لیکن اسے تو پہلے سے معلوم تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ وہ بولی "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ میں دعا کرتی تھی کہ مجھے اس بات کا موقع مل جائے۔"

"کس بات کا شکریہ بھئی؟" میں نے پوچھا۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے۔

"برستی ہوئی گولیوں میں میری جان بچانے کا شکریہ۔"

"شکریے کی بات تو تب تھی جب میں بھائی جی کی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مجھے ان کی ناگہانی موت کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔"

وہ افسردگی سے سر جھکا کر بولی "جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ ڈیڈی کا اور ہمارا اتنا ہی ساتھ لکھا تھا۔ لیکن۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کچھ سوال ذہن میں کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔"

"کیسے سوال؟"

"مثلاً یہ کہ۔ ڈیڈی کے قتل کے روز آپ ہمیں ڈیڈی کی خوابگاہ میں لے گئے تھے۔ وہاں سے آپ ہمیں ایک پوشیدہ راستے کے ذریعے پڑوس کی کوٹھی میں لے گئے تھے۔ اب وہ کوٹھی بالکل ویران پڑی ہے۔ وہاں جو لوگ رہتے تھے وہ جا چکے ہیں۔ میں اکثر اس پوشیدہ راستے کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ ڈیڈی مجھ سے اپنی کوئی بات چھپاتے نہیں تھے۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے مجھ سے کبھی اس راستے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میں سیکڑوں مرتبہ ان کی خواب گاہ میں گئی ہوں لیکن اس راستے کی موجودگی سے بے خبر رہی۔"

میں نے کہا "آفرین! میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کی کوئی اہم مجبوری رہی ہو۔"

"آپ کو اس راستے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟"

"بس یہ ایک اتفاق ہی تھا۔ ایک رات بھائی جی کی خواب گاہ میں گیس ہیٹر سے گیس نکل رہی تھی۔ میں ان کی خواب گاہ میں گیا تھا۔ اس روز میں نے یہ دروازہ دیکھا تھا۔"

آفرین اس بارے میں مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ذہن میں بسے ڈیڈی کا خوب صورت امیج برقرار رہے۔ حالانکہ ایسا ہونے کی امید کم ہی تھی۔ بھائی جی ایک سیاسی لیڈر تھا اور سیاسی لیڈروں کی زندگی کے تاریک گوشے تادیر چھپے نہیں رہتے۔ میں نے آفرین سے سلطان آغا کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ آغا رشتے میں آفرین کا چچا ہے۔ آغا نے بچپن میں اسے گود کھلایا ہے اور بیٹوں سے بڑھ کر اسے چاہتا ہے کیونکہ اس کی اپنی بیٹی نہیں ہے۔

آفرین اور میں گفتگو کر رہے تھے جب بات چیت کا رخ ایک دم بدل گیا۔ اپنے چچا سلطان آغا سے آفرین کو علم ہو چکا تھا کہ میں گولڈ ہوٹلز کے سلسلے کا مالک ہوں۔ یہ اطلاع آفرین کے لیے خاصی حیران کن تھی۔ اس اطلاع سے آفرین نے اندازہ لگایا تھا کہ مجھے بالآخر ان بیش قیمت نوادرات سے اپنا حصہ مل گیا ہے جس کا شہرہ وہ تین چار سال سے سن رہی ہے۔ وہ اس سلسلے میں دلچسپی لے رہی تھی اور کرید کرید کر سوالات پوچھ رہی تھی۔ ہماری گفتگو جاری تھی جب سلطان آغا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مجھے بتایا کہ مہمان ہوٹل سے روانہ ہو گئے ہیں اور پندرہ بیس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔

میں نے سلطان آغا کو بتا دیا تھا کہ میں اس کے مہمانوں کو سرپرائز دینا چاہتا ہوں لہٰذا وہ ابھی انہیں میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔

میرے رویے سے سلطان آغا کچھ چونک سا گیا تھا۔ بہرحال اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

میں ایک قریبی کمرے میں چلا گیا اور ان لوگوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا جو میری غزالو کے لیے بری نیتوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد میرے ہاتھ میں سخت کھجلی ہو رہی تھی۔ میں مارپیٹ کے زبردست موڈ میں تھا۔ خاص طور سے میں اس شخص کی ناک توڑنا چاہتا تھا جسے جرم پیشہ لوگوں نے امارات میں سر کا خطاب دے رکھا تھا۔ سیاست، تعلیم، کھیل اور سائنس وغیرہ کے میدان میں تو "سر" کا خطاب سننے میں آیا تھا لیکن یہ انوکھی فیلڈ تھی جس میں سر کا خطاب عنایت کیا گیا تھا۔

قریباً پندرہ منٹ بعد دو شاندار پجارو گاڑیاں سلطان آغا کے خوب صورت ولا کے سامنے رکیں۔ ایک گاڑی میں چار مہمان تھے۔ جبکہ دوسری گاڑی صرف مسلح گارڈز کو لے کر آئی تھی۔ مہمانوں میں سے ایک تو یقیناً مقامی بدمعاش تھا۔ اس کا تعلق صوبہ سرحد سے لگتا تھا۔ اس نے بوسکی کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں وغیرہ تھیں۔ باقی تینوں افراد غیر ملکی تھے۔ ان میں

سے ایک شخص خاص طور سے مضبوط جسم کا مالک تھا اور اسٹین لیس اسٹیل کی طرح سخت اور بے لچک نظر آتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بال گھونگریالے تھے۔ گردن باقی جسم کی نسبت بہت موٹی تھی۔ اتنی موٹی کہ اس کے لیے گھوم کر دیکھنا مشکل تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی سرموب ہوگا۔ رشید احمد نے اس کی عمر تیس سال بتائی تھی لیکن مجھے پینتیس کے لگ بھگ نظر آرہی تھی۔

یہ مہمان اندر چلے گئے اور سلطان آغا کے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ میرے خوش پوش میزبان اور اس کی خوب رو بیوی نے مہمانوں کے ساتھ باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت شروع کی۔ جلد ہی میں نے پہچان لیا کہ ان میں سے آغا کا ذاتی دوست اسحاق رفاہی کون ہے۔ یہ واقعی ایک کاروباری شخص نظر آتا تھا لیکن اس کے چہرے پر بھی زخموں کے تین چار پرانے نشان موجود تھے جس سے اندازہ ہورہا تھا کہ میں نے اسحاق رفاہی نامی اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔ یہ لوگ بڑی شائستگی سے بیٹھے تھے اور مسکرا مسکرا کر آغا سے باتیں کررہے تھے۔ حالانکہ یہ ساری شائستگی بس دکھاوے کی چیز تھی۔ میں ان لوگوں کی صورت دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ یہ بڑے درجے کے بد اخلاق اور سفاک لوگ ہیں۔ یہ چاروں افراد بہترین لباس میں تھے۔ سرموب نے تو باقاعدہ سرخ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ یہ بدمعاشوں کی یونی نسل کے لوگ تھے۔ اعلیٰ سوسائٹی میں گھومنے والے اور بندے کو قتل کرنے سے پہلے منہ ٹیڑھا کرکے انگریزی بولنے والے۔

اسی دوران میں آفرین میرے پاس آبیٹھی "آپ کیا سرپرائز دینا چاہ رہے ہیں ان لوگوں کو؟"

"بھئی سرپرائز کے بارے میں بتا دیا جائے تو پھر وہ سرپرائز نہیں رہتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ ہمارے لیے بھی سرپرائز ہوگا؟"

"بالکل ہوگا۔ بلکہ آپ کے چچا محترم آغا کے لیے تو ٹھیک ٹھاک سرپرائز ہوگا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"آپ کے چچا نے یہ گھر بڑے شوق سے بنوایا ہے۔ وہ آج کل مہمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہاں لارہے ہیں تاکہ اپنے گھر کے حوالے سے تعریف کے بول سن سکیں۔ میں ان کے لیے ایسا انتظام کرنے والا ہوں کہ لوگ ان کا گھر دیکھنے کے لیے خود کھنچے چلے آئیں گے۔"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ آغا نے اٹھ کر دوسرے کمرے میں فون سنا پھر وہ واپس آیا اور اس نے اپنے دوست اسحاق کو بتایا کہ اس کا فون ہے۔ اسحاق فون سننے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا تو میں آفرین کے پاس سے اٹھ کر نشست گاہ میں چلا گیا۔ سرموب سمیت سب میری طرف دیکھنے لگے "کیا میں آپ کا تعارف کروا سکتا ہوں؟" آغا مجھ سے مخاطب ہوکر اردو میں کہا۔

"ضرور ضرور۔" میں نے جواب دیا "لیکن میرا پورا نہیں بتانا۔" میں نے بھی اردو میں کہا۔

آغا سرموب سے مخاطب ہوکر بولا "یہ مسٹر شاہ صاحب ہیں۔ میرے پرانے دوست اور کرم فرما ہیں۔ اور مسٹر شاہ سرموب ہیں۔ یہ ناصر مشہدی ہیں یہ احمد حسنات ہیں۔"

سرموب نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور مصنوعی شائستگی سے بولا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

میں نے کہا "مجھے بھی بہت خوشی ہوئی لیکن میرا خیال ہے کہ آپ میری خوشی سے خوش نہیں ہوں گے۔"

"کیا کہا آپ نے؟" سرموب نے انگلش میں ہی پوچھا۔

"دراصل جب میں خوش ہوتا ہوں تو کسی قریبی شخص کے سر پر پانی کا گلاس انڈیل کر بہت سکون محسوس کرتا ہوں۔"

سرموب اور اس کے ساتھی ذرا تعجب سے میری طرف دیکھنے لگے۔ آغا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ آغا نے خود کو سنبھالا اور مسکراتے ہوئے بولا "دراصل مسٹر شاہ بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔"

"اور میں اکثر اپنی دلچسپ شخصیت کا عملی اظہار بھی کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور پانی کا بھرا ہوا گلاس سرموب کے سر پر انڈیل دیا۔

سخت سردی میں ٹھنڈا پانی سرموب کے گریبان میں داخل ہوا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ غرا کر بولا اور اس کے چوزے تھنے پھول گئے۔

میں نے کہا "اس سے پہلے تم مصنوعی لہجے میں بات کررہے تھے۔ اب تم نے اپنی اصلی ٹون میں بکواس کی ہے اور امید ہے کہ مستقبل قریب میں تمہاری یہ ٹون اور بھی اصلی ہوجائے گی۔"

سرموب نے گھوم کر حیران پریشان آغا کی طرف دیکھا اور انگریزی میں دہاڑا "یہ انسان ہے یا جانور۔ یہ کون سی زبان سمجھے گا۔"

"گدھوں کا ارادہ بھانپنے کے لیے ان کی زبان سمجھنے کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ان کے کانوں اور دم کی حرکت سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ وہ لید کرنے والے ہیں۔"

ایک دم سرموب کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں کے تیور بھی بگڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ سرموب کچھ کر گزرتا اسحاق فون اٹینڈ کرنے کے بعد نشست گاہ میں واپس آگیا۔

"کیا ہوا۔ کیا مسئلہ ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ چونک سا گیا۔ وہ بڑی تیز نگاہ رکھتا تھا۔ میرے قریب آکر اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور میری طرف انگلی اٹھا کر بولا "کہیں۔ تم میرا مطلب ہے کہیں آپ شاہ جہاں تو نہیں ہیں؟"

"اگر میں نہیں ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے اور اگر ہوں تو تمہارا کیا جاتا ہے۔" میں جارحانہ موڈ میں تھا۔

اسحاق ایک دم سر ہلا کر بولا "ہم۔ میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ آپ شاہ جہاں ہی ہیں۔" پھر وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کی طرف گھوما اور سرموب سے بولا "کیا بات ہوئی ہے۔ کیوں جھگڑا کررہے ہو۔"

سرموب کا پارہ اب ساتویں آسمان کو چھو چکا تھا اور اس کے واپس آنے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ دہاڑا "اس نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اسے چیر کر پھینک دوں گا۔"

"شٹ اپ۔ شٹ اپ!" اسحاق تیزی سے بولا "یہاں دنگا لڑائی نہیں ہوگی۔ خود کو کول ڈاؤن کرو۔ کول ڈاؤن (ٹھنڈا) کرو۔" وہ میرے اور سرموب کے درمیان آگیا تھا۔ سرموب اصلح صفائی کی کارروائی سے فائدہ اٹھاتا تو شاید اس کے حق میں بہتر ہوجاتا لیکن اس نے اپنی بدقسمتی پر خود مہر لگائی۔ اسحاق کی بائیں جانب سے جگہ بناتے ہوئے اس نے ٹانگ کرانے کے انداز میں سیدھی ٹانگ چلائی جو میرے گھٹنے پر لگی۔ میں لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اس سجی سجائی شاندار نشست گاہ میں ایک خوفناک ہنگامہ شروع ہوگیا۔ سرموب اور اس کا ایک ساتھی بجلی کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اسحاق ابھی تک ہمارے درمیان تھا اور چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ لڑائی میں میری مہارت سے اچھی طرح آگاہ ہے اور اپنے ساتھیوں کو برے انجام سے بچانے کی کوشش کررہا ہے۔ سرموب کا ایک ساتھی تو لڑائی کے پہلے ہی راؤنڈ میں لمبا لیٹ گیا۔ وہ تیر کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں جھکائی دے کر اس کی زد سے نکلا اور اس کا بازو تھام کر پورے زور سے اسے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا۔ وہ جھینگے کی طرح دوہرا ہوکر زمین بوس ہوگیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا سر پر آنے والی شدید چوٹ کے علاوہ اس کی ناک کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی' حالانکہ یہ ہڈی سرموب کی ٹوٹنی چاہیے تھی۔

میری توقع کے عین مطابق سرموب اپنے ساتھی سے کہیں زیادہ خطرناک لڑاکا تھا۔ اس کے انداز میں تھنگر شکرا کے اسٹائل کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس نے پہلے تو مجھ پر پستول تاننے کی کوشش کی لیکن میری ایک ہی تیکھی ٹھوکر نے اس کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا۔ یہ پستول کھڑکی کا ڈیزائن دار شیشہ توڑتا ہوا باہر جاگرا۔ اس کے بعد سرموب نے مجھ پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ یہ بڑے جاندار حملے تھے' مجھے سرموب کی ضربوں سے بچنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی' پھر میرا داؤ چل گیا۔ میں نے ایک میز کا سہارا لیتے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھائیں اور بھرپور طاقت سے سرموب کے سینے پر دے ماریں۔ وہ اڑتا ہوا ایک قد آدم گلدان سے ٹکرایا اور اسے توڑتا ہوا خود بھی نیچے گرگیا۔ سرموب کے ساتھی نے مجھے عقب سے دبوچ لیا اور مجھے اٹھا کر پٹخنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنے سر کے پچھلے حصے کی ضرب اس کے چہرے پر لگائی اور خود کو چھڑانے میں کامیاب رہا۔ اس دھینگا مشتی میں آغا کی سجی سجائی نشست گاہ بری طرح برباد ہورہی تھی اور وہ سکتہ زدہ ایک طرف کھڑا تھا۔ سرموب کا ساتھی اسحاق رفاہی اب بھی اس لڑائی کو روکنے کی خواہش رکھتا تھا مگر اب بات اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لڑائی کے دوران میں ہی میں نے دیکھا کہ آفرین بھی سکتہ زدہ سی برآمدے میں کھڑی تھی اور یہ ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے "ایکشن" میں دیکھنا چاہتی ہے' آج اس کی یہ خواہش اتفاقاً ہی پوری ہوگئی تھی مگر وہ اس ہنگامے کے اس قدر قریب موجود تھی کہ مجھے ڈر لگا۔ اگر یہاں گولی وغیرہ چل جاتی' اردگرد موجود افراد کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اچانک آفرین کا سکتہ ٹوٹا اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس چیخ کی وجہ مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ سرموب کے ہاتھ میں خوفناک پھل کا چاقو نظر آرہا تھا۔ سرموب نے پینترے بدل بدل کر مجھ پر تین چار وار کیے۔ ہر بار میں نے بڑے اعتماد سے اس کا وار بچایا۔ اس پر شدید جھلاہٹ سوار ہوگئی۔ یہ بات طے ہے کہ جھلاہٹ حملہ آور کے لیے اکثر نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ سرموب کے لیے بھی ہوئی۔ مجھ پر زوردار حملہ کرتے ہوئے وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کی پیٹھ پر زوردار ٹانگ جمائی تو وہ اڑتا ہوا دروازے سے

ٹکرایا اور ٹی وی لاؤنج میں جاگرا۔ ٹی وی لاؤنج میں شیشے اور سرامکس کا بہت سا کام تھا۔ اس کے علاوہ تقریباً پانچ فٹ اونچا اور چھ ساڑھے چھ فٹ لمبا ایک دیوہیکل ٹی وی سیٹ بھی وہاں پڑا تھا۔ اگلے دو تین منٹ میں یہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ سرموب اور اس کے ساتھی کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور ان کی کئی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں۔ سرموب کے اگلے کئی دانت حلق میں گر چکے تھے اور اس کے دونوں بازو بھی کلائیوں کے قریب سے ٹوٹ چکے تھے۔ میں نے سرموب کو اس کی سرخ ٹائی سے پکڑا' دوسرا ہاتھ میں نے اس کے ٹوٹے ہوئے بازو پر ڈالا اور اسے فرش پر گھسیٹ کر پھر نشست گاہ میں لے آیا۔ سرموب کے دوسرے ساتھی کا ٹخنہ ٹوٹ گیا تھا اور اس کی پسلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ قالین پر پڑا ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی میز اس کے اوپر پڑی تھی یہ وہ میز تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے وہ ایک نہایت معزز مہمان کی حیثیت سے بیٹھا منہ ٹیڑھا کرکے انگریزی بگھار رہا تھا۔

میں نے آغا سے کہا "نائیلون کی رسی لاؤ۔"

خون ریز لڑائی دیکھنے کے بعد آغا میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ مجھ سے کسی طرح کا سوال کر سکتا۔ وہ رسی لے آیا تو میں نے تینوں مضروب افراد کی ایک ایک ٹانگ رسی کی مدد سے باندھ دی۔ پھر جس طرح مردہ کتے کو گھسیٹ کر کارپوریشن کے ٹرک میں لادا جاتا ہے' میں ان تینوں کو باری باری باہر گراسی لان میں لے آیا۔ مجھ پر وحشت سوار تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں اور نہ کسی میں پوچھنے کی ہمت تھی۔ میں نے سرموب کے تیز دھار چاقو سے اس کے کپڑے پھاڑ دیے اور پھر باقی دونوں حملہ آوروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ سخت سردی میں ان تینوں کے جسموں پر بس بنیان انڈرویئر ہی رہ گئے۔ سرموب کے طاقت ور جسم پر تو بنیان بھی نہیں تھی۔

آغا کی کوٹھی کارنر پر واقع تھی یعنی اس کی دو جانب سڑک تھی۔ جو سڑک پہلو کی طرف تھی وہاں ایک کافی اونچا درخت تھا' اس کی کئی توانا شاخیں سڑک تک پہنچی ہوئی تھیں۔ میں نے آغا کے دو صحت مند ملازموں کو درخت پر چڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے بلا چوں چرا اس حکم پر عمل کیا۔ میری وحشت نے ان سب کو سکتہ زدہ کر رکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے موب کے پاؤں سے بندھی ہوئی رسی ان ملازمین کی طرف پھینکی۔

آغا سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار زبان کھولی اور بولا "جناب! مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے ان لوگوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ بہرحال آپ نے کیا ہے تو ٹھیک ہی کیا ہوگا لیکن اب میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"ان کے ساتھ بہت ہو چکی ہے۔ اب اگر آپ انہیں معاف کر دیں تو۔ مم۔ میرا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے لیے میں' میں ان کی دشمنی سہنے کا اہل نہیں ہوں۔"

"تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بالکل شانت رہو۔"

آغا خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اگلے پانچ منٹ میں میں نے تینوں نیم برہنہ افراد کو درخت سے الٹا لٹکوا دیا۔ ان کی صرف ایک ایک ٹانگ بندھی ہوئی تھی۔ ان میں ایک تو بے ہوش تھا۔ دوسرے دونوں ہوش میں تھے اور اپنی چوٹوں اور تکلیف کے "حساب" سے کراہ رہے تھے۔ میں نے ان کے چوتھے ساتھی اسحاق رکابی سے کہا "ادھر میرے پاس آؤ۔"

وہ ڈرا سہما ایک طرف کھڑا تھا' لڑکھڑاتا ہوا میرے پاس چلا آیا۔ میں نے کہا "میں ابھی تھوڑی دیر میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد اپنے گرو گھنٹال کو فون کرنا اسے میری طرف سے کہنا کہ یہ صرف ٹریلر ہے' فلم پھر اسے دن میں تارے نظر آئیں گے۔"

اسحاق نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسحاق کو اپنا فون نمبر بھی دے دیا اور اس سے کہا کہ تمہارا گرو (شیخ عاصم) چاہے تو مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتا ہے۔

میں نے آغا کو ایک طرف بلایا اور اس سے پوچھا کہ یہاں کوٹھی میں اگر اس کا کوئی قیمتی سامان یا نقدی وغیرہ ہے تو نکال لے۔

آغا بولا "بس تھوڑی سی جیولری ہے۔"

"ٹھیک ہے' وہ لے لو اور میرے ساتھ چلو۔ تمہاری وائف اور آفرین بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گی۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم آغا کی شیورلیٹ کار میں کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ اس وقت تک کوٹھی کے سامنے ڈیڑھ سو افراد اکٹھے ہو چکے تھے اور سڑک پر سے "الٹا لٹکے ہوئے افراد کا تماشا" دیکھ رہے تھے۔ ہجوم میں سے کچھ لوگ افراد کو اتارنے کی باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں ہجوم کے نزدیک پہنچ کر کار سے نکلا اور با آواز بلند کہا کہ یہ لوگ

کے مجرم ہیں' کوئی انہیں اتارنے کی کوشش نہ کرے ورنہ عدالتی کارروائی میں پھنسے گا۔ پولیس آکر خود ہی اتارے گی۔"

ہجوم میں سے کھسر پسر کی آوازیں آنے لگیں اور چند افراد جو درخت پر چڑھنے کے لیے پر تول رہے تھے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک دو نوجوانوں نے اعتراض کرنا چاہا تو میری ہدایت پر آغا گاڑی سے باہر نکل آیا اور اس نے بھی اپنے محلے داروں سے وہی بات کہی جو میں نے کہی تھی۔ اس کے بعد ہم مسلم ٹاؤن والی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں میں نے آغا' اس کی بیوی اور آفرین کو ایک فور اسٹار ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں نے آفرین سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے گھر جا سکتی ہے لیکن آغا کو میں نے سختی سے ہدایت کی کہ وہ میری دوسری اطلاع تک اس ہوٹل میں ہی قیام کرے گا۔ میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اپنے اصل نام سے کمرا حاصل نہ کرے۔

میں واپس مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں آ گیا۔ ابھی میری جسمانی حالت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ مسلسل ناتوانی نے رگ و پے میں نقاہت بھر چھوڑی تھی۔ شیخ عاصم کے گماشتوں کے ساتھ ہونے والی دھینگا مشتی کے سبب جسم میں ابھی تک خفیف لرزش موجود تھی۔ سرموب اور ہمنواؤں کے ساتھ لڑائی میں میرا ریڈی میڈ میک اپ خراب ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اتار پھینکا اور اصل صورت میں آ گیا۔ رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے جب میری توقع کے عین مطابق شیخ عاصم کا فون آ گیا۔ اس کے لہجے میں شعلے رقص کر رہے تھے۔ میری آواز پہچاننے کے بعد وہ دہاڑا "شاہ جہاں یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس کی بڑی سخت سزا بھگتنا پڑے گی تمہیں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں نے اچھا نہیں کیا لیکن تم جو کچھ کرنے والے تھے کیا وہ اچھا تھا؟ غزالہ کو پاکستان سے اغوا کروانے کے لیے تم نے یہ کرائے کے قاتل یہاں بلوا رکھے تھے۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ لوگ اپنے ذاتی کام کے سلسلے میں یہاں موجود تھے۔"

"تبت لے کر شریف لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اغوا کرنا ان لوگوں کا ذاتی کام ہی تو ہونا ہے۔ اور اگر یہ ان کا ذاتی کام ہی تھا تو پھر تمہیں ان کے الٹا لٹکنے سے مروڑ کیوں اٹھ رہا ہے۔"

شیخ عاصم نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تم ٹکراؤ چاہتے ہو۔"

"ٹکراؤ کی خواہش تمہارے دل میں تڑپ رہی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ عدالتی کارروائی میں تمہارا منہ کالا ہو رہا ہے۔"

وہ ایک دم مغلظات بکنے لگا۔ میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

شاہی صاحب کا یہ خاص "فون نمبر" ٹریس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اس نمبر کے ذریعے عاصم یا اس کے گماشتے اس کوٹھی تک پہنچ سکتے ہیں۔

وہ رات میں نے بے چینی کے عالم میں ہی گزاری۔ عاصم کا لہجہ بار بار یاد آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے اندر میرے خلاف ایک آتش فشاں دہک رہا ہے۔ پرانی عداوت اپنی خوفناک سنگینی کے ساتھ ایک بار پھر عاصم کے اندر تازہ ہو گئی تھی۔ مجھے زیادہ خطرہ غزالہ اور اس کے اہل خانہ کی سلامتی کی طرف سے تھا۔ رات آخری پہر پانچ بجے کے قریب میں نے غزالہ کے گھر فون کیا۔ میں جانتا تھا کہ چچا جلیس بہت صبح جاگ جاتے ہیں۔ میں ان سے بات کرکے انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دینا چاہتا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی اور پھر بجتی چلی گئی۔ کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ میں نے دوسری بار پھر تیسری بار ٹرائی کیا لیکن جواب ندارد۔ میرے اندیشے کئی گنا بڑھ گئے۔

میں نے پورچ میں کھڑی گاڑی کی چابی لی اور گلبرگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں چچا جلیس کے گھر کے سامنے پہنچا اندھیرا ابھی چھٹا نہیں تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ کوٹھی تقریباً ایک کینال کے رقبے پر واقع تھی۔ بیرونی دروازہ بند تھا۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ اندر کہیں بیل کی آواز آئی۔ ایک بار۔ دو بار۔ چوتھی پانچویں مرتبہ بیل دی تو قدموں کی چاپ ابھری۔ میرا دل نئے انداز سے دھڑک اٹھا۔ یہ غزالہ کے قدموں کی آواز تھی۔ میں اس آواز کو ہزار ہا آوازوں میں سے پہچان سکتا تھا۔ جل کوٹ میں یہی آواز تو تھی جس کے انتظار میں میں نے صدیاں گزار دی تھیں اور بات صرف جل کوٹ کی ہی نہیں تھی میری تو پوری زندگی اسی آواز کی چاہ میں گزری تھی۔ سخت موسموں میں' سرما کی طویل راتوں میں' گرما کی سنسناتی دوپہروں میں' پت جھڑ کی اداس شاموں میں' میری سماعت بس اسی چاپ کی منتظر رہی تھی۔ میں اس چاپ کو کیوں نہ پہچانتا۔

غزالہ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی "کون؟"

"شاہ جہاں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا "آپ یہاں؟" وہ سینے پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ کم از کم ایک بار تو گھر آؤ۔" میں ہولے سے مسکرایا۔

"لیکن۔۔۔ اس وقت؟"

"اوہ سوری۔ مجھے وقت کا دھیان نہیں رہا۔ ٹھیک ہے' میں واپس چلا جاتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک دم غزالہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولی "آپ۔۔۔ اندر آجائیے نا۔"

میں اندر لان میں آگیا "چچا کہاں ہیں؟" میں نے غزالہ سے پوچھا۔

"وہ تو سیر کے لیے نکلے ہیں۔"

"اور چچی؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ اتفاقاً کل رات سے ان کا موڈ بہت خراب ہے۔ بس یونہی چھوٹی سی بات پر ابو سے جھگڑا ہوگیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے لیے تو ان کا موڈ کبھی بھی ٹھیک نہیں رہا۔"

"در۔۔۔ اصل۔۔۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے امی کی ملاقات بڑے اچھے ماحول میں ہو۔ چلیں خیر کوئی بات نہیں۔ آپ آگئے ہیں تو آجائیں۔ ابھی کچھ دیر میں ابو بھی واپس آجاتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ اگر ایسی بات ہے تو میں چلا جاتا ہوں پھر آجاؤں گا۔ مجھے بھی اس طرح منہ اندھیرے آنے کا شوق نہیں تھا۔ بس ایک خاص وجہ سے آنا پڑا۔"

"خیریت تو ہے نا۔" وہ ڈر کر بولی۔ اس کے لمبے بال کھلے تھے اور خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔

"چچا جلیس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے نہیں بتائیں گے۔"

"بس عاصم کے حوالے سے کوئی بات ہے۔"

"اچھا اندر تو آجائیں نا۔" وہ اپنے گرم ہاتھ میں میرا سرد ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

یہی وقت تھا جب برآمدے کی طرف سے چچی فاخرہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرا جسم جھٹکا کھا کر رہ گیا "کون ہے؟" چچی نے پوچھا تھا۔

آواز سنتے ہی غزالہ نے ٹھٹک کر میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ چچی نے ہاتھ بڑھا کر صحن کی لائٹ جلادی پھر مجھے اور غزالہ کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ د
سے میری طرف دیکھتی رہیں۔ ان چند لمحوں میں ہی ا
چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے۔ غزالہ لرزاں آواز م

"امی! یہ شاہ جہاں ہیں۔ ابو جی سے ملنے آئے ہیں۔"

چچی فاخرہ نے کچھ نہیں کہا۔ بس پتھریلے چہر
ساتھ میری طرف دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد ایک جھٹکے
کمرے میں واپس چلی گئیں۔ میرے سلام کا جواب انہوں نے نہیں دیا تھا۔

ان کے اس طرح جانے سے غزالہ اور بھی گھبرا
میرا ہاتھ تھام کر بولی "شاہ جہاں' بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت چلے جائیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بھئی! میں
جرم تو نہیں کیا' جو اس طرح چوروں کی طرح چلا جاؤں۔"

"آپ امی کی طبیعت جانتے ہی ہیں۔ وہ بڑی بدگمان ہوجاتی ہیں۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ اب وہ کافی بدلی ہوئی ہیں"

"بدلی ہوئی تو ہیں' لیکن ابھی جو کچھ ہوا ہے یہ
نہیں ہوا۔ پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھو' میرے اس طرح چلے جانے سے تو وہ ا
بدگمان ہوں گی۔ اب میں چچا سے بات کرکے ہی جاؤں گا"
میں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

غزالہ چند لمحے تذبذب میں رہی پھر مین گیٹ بند
وہ بھی میرے پیچھے پیچھے ہی اندر آگئی۔ اس نے مجھے ڈ
روم میں بٹھا دیا' اور گھبرائی ہوئی سی اندر چلی گئی۔ میں
لگا کہ اتنے عرصے بعد چچا چچی سے ملاقات ہوئی بھی ہے
طرح ہوئی ہے۔ اسی دوران میں کال بیل کی آواز
غزالہ نے جاکر دروازہ کھولا۔ ان کا ملازم غالباً چھٹی
حسبِ توقع آنے والے چچا جلیس ہی تھے۔ میں نے
ہلکے نیلے ٹریک سوٹ میں برآمدے کی طرف آتے دیکھ
سے پہلے کہ وہ نشست گاہ کے سامنے آتے اور میں ان
کا استقبال کرتا' کچن کی طرف سے چچی فاخرہ کی تیز تیکھی
آئی "جلیس! ادھر آکر میری بات سنو۔"

وہ چچا کو اکثر ایسے ہی تحکمیہ انداز میں مخاطب
تھیں۔

چچا جلیس کچن کی طرف چلے گئے۔ میں سمجھ گیا
نے کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میرے تن بدن میں آگ سی
تھی۔ چچی فاخرہ کے حوالے سے وہ تمام زخم یاد آ
میرے جسم اور روح پر لگے تھے۔ مجھے لگا جیسے برسوں!

چچی نے پھر وہی گرم چمٹا ہاتھ میں لے لیا ہے جس سے میرے جسم کو داغا تھا۔ میں تین چار منٹ تک اسی طرح اپنے آپ میں الجھا رہا۔

ایک دم میرا دماغ گھوم گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے اس سمت بڑھا جدھر چچا گئے تھے۔ میں کچن کے سامنے پہنچا تو وہاں غزالہ کھڑی تھی۔ میرے تیور دیکھ کر وہ میرے راستے میں آگئی "نہیں شاہ جہاں! پلیز آپ کوئی بات نہ کریں۔ ابھی امی غصے میں ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے تیز سرگوشی کی۔

میں اسے ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا ہوا اس بڑے کمرے میں داخل ہوگیا جہاں چچا اور چچی آمنے سامنے کھڑے تھے۔ چچی نے مجھے دیکھ کر ایک دم منہ پھیرا' پھر غصے سے لرزتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ بہرحال جاتے جاتے وہ اپنا کام کرگئی تھیں۔ چچا کی آنکھوں میں میرے لیے طیش نظر آرہا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے بعد مجھ سے ملے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے گلے لگاتے وہ پتھریلے مجسمے کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ ان کے چہرے پر بھی پتھر کی سی سختی تھی۔

"السلام علیکم چچا۔"

"وعلیکم السلام!" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

چند سیکنڈ تک ایک تلخ خاموشی طاری رہی' پھر میں نے کہا "چچا! میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ پہلے فون کرتا رہا لیکن آپ کا فون شاید خراب ہے۔"

چچا نے کانپتے لہجے میں کہا "میرا نہیں خیال کہ تم مجھ سے بات کرنے آئے تھے۔"

میرے اوپر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

میں نے کہا "تو آپ کا کیا خیال ہے۔ میں کسی کالجیٹ لڑکے کی طرح دیوار پھاند کر غزالہ سے ملنے آیا تھا؟ کیا آپ کی نگاہ میں اب بھی میری یہی حیثیت ہے؟"

"حیثیت کا پتا بندے کے کردار سے لگتا ہے' اس کی باتوں سے نہیں۔" یہ فقرہ چچی فاخرہ نے ادا کیا تھا جو بڑے تیکھے انداز میں دروازے پر نمودار ہوئی تھیں۔

چچی کے لب و لہجے نے میرے اندر سلگتی چنگاری کو بھڑکتا شعلہ بنا دیا۔ میں نے چچی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کون سی گندگی دیکھی ہے میرے کردار میں۔"

"میں پوچھتی ہوں' تم نے کون سا کام نہیں کیا ہے؟"

"ہاں میں نے سب کچھ کیا ہے لیکن آپ کی عزت کو ہمیشہ اپنی عزت سمجھا ہے۔ آپ کی یادداشت کمزور ہے شاید۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ چند ماہ پہلے غزالہ کہاں تھی؟ چند ماہ پہلے وہ میرے ساتھ افریقا میں تھی۔ وہاں آپ نہیں تھیں' نہ چچا جان تھے' نہ وہ ابلیس شیخ عاصم تھا۔ وہاں غزالہ میرے ساتھ ہفتوں تک ایک ہی کمرے میں اکیلی سوتی رہی ہے۔ اور گستاخی معاف کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ہمیں ایک ساتھ سونا پڑا ہے۔ آپ اپنی بیٹی کو بلائیں اور اس سے پوچھیں کہ میرا کردار کیسا ہے اور اگر اپنی بیٹی پر بھی یقین نہیں ہے آپ کو تو پھر ان لوگوں سے پوچھ لیں جو افریقا اور سری لنکا میں ہمارے ساتھ تھے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ اگر میرا کردار گندا تھا تو پھر مجھے صبح کے اندھیرے میں یہاں آپ کے گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے ہزار گنا "بہتر" مواقع مجھے طویل عرصے تک صبح شام میسر رہے ہیں۔ خدا کی قسم' مجھے آپ کی سوچ اور سوچ کے معیار پر افسوس ہو رہا ہے۔"

چچی تڑخ کر بولیں "تم جو کچھ بھی کہو لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم شاہ جہاں نہیں استاد جہانی ہو۔ اس وقت بھی تمہارے اندر کا استاد جہانی ہی بول رہا ہے۔"

میں نے چچی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "استاد جہانی سے کیا نقصان پہنچا ہے آپ کو؟"

وہ ایک دم بھڑک کر بولیں "تم نقصان کی بات کرتے ہو؟ تم نے میری بیٹی کی پوری زندگی برباد کردی ہے۔ ایسے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہو کہ پھر چھوڑنے کا نام نہیں لیا۔ اس کے سہاگ کو آگ لگا دی' اسے طلاق کے لیے عدالت میں کھڑا کروا دیا' اس کو اخباروں میں رسوا کروایا۔ اب بھی تمہیں چین نہیں ہے۔ اب کیا اسے مار کر ہی چھوڑو گے۔ خدا کے لیے۔ اس کی جان چھوڑ دو۔ خدا کے لیے اسے اپنی زندگی آپ جی لینے دو۔"

"تو جی لیں آپ۔۔۔ کسی نے منع کیا ہے آپ کو۔ وہ شیطان عاصم آپ کو بڑی اچھی زندگی دینے والا ہے۔"

چچی نے بڑے طیش کے عالم میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی غزالہ بولی۔

"خدا کے لیے امی جان آپ چپ ہوجائیں۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔"

"خراب ہوجانے دو میری طبیعت' مجھے مرجانے دو۔ شاید اسی طرح اس بے رحم کو ہمارے اوپر رحم آجائے۔ مرجانے دو مجھے۔" وہ چیختی ہوئی بولیں۔ اس کے ساتھ ہی

انھوں نے اپنا سینہ پکڑ لیا۔

"امی جان۔" غزالہ نے بے قرار ہو کر ماں کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ چچی فاخرہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

غزالہ نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ میں فی الوقت یہاں سے چلا جاؤں۔ میں نے چچا جلیس کی طرف دیکھا "دیکھیں چچا! میں آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے یہاں آیا تھا کہ اپنے سابقہ داماد سے ہوشیار رہیں۔ وہ اس وقت لاہور میں ہے اور آپ لوگوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

چچا جلیس کا جواب سنے بغیر میں نے رخ پھیرا اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

جس وقت میں واپس مسلم ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچا۔ دن کے آٹھ بج رہے تھے۔ ملازم نے ناشتا لا کر میرے سامنے رکھا لیکن میرا دل ناشتے کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہا۔ دماغ میں انگارے سے دہک رہے تھے۔ چچی فاخرہ نے ہمیشہ کی طرح ایک اور چرکا میرے دل پر لگایا تھا۔ وہ جب بھی ملتی تھیں چرکا لگانے کے لیے ملتی تھیں یا کسی پرانے چرکے پر نمک ڈالنے کے لیے ملتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ عاصم نچلا نہیں بیٹھے گا۔ وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا' اس کوشش میں ناکام ہوگا اور پھر عین ممکن ہے کہ اس کا سارا نزلہ غزالہ اور اس کے گھرانے پر گر جائے۔

میں نے ساہی صاحب کو فون کیا اور ان سے درخواست کی کہ سادہ لباس میں کچھ ہوشیار پولیس اہلکاروں کو چچا جلیس کے گھر پر متعین کر دیں۔

ساہی صاحب نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ بولے "میرے سامنے آج کا تازہ اخبار ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امارات سے تعلق رکھنے والے ایک شخص مبین اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔ ایک اخبار میں ایک دھندلی سی تصویر بھی شائع ہوئی ہے جس میں مبین اور اس کے ساتھیوں کو ایک درخت کے ساتھ الٹا لٹکے دکھایا گیا ہے۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ موب کا اصل نام مبین تھا۔ یعنی سر مبین۔ میں نے اس "سر" کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے اسے سیکڑوں لوگوں کے سامنے تماشا بنا دیا تھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" ساہی صاحب کی آواز ٹیلی فون پر ابھری۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب آپ بہت سی باتیں مجھ سے چھپانے لگے ہیں۔" میرا اشارہ سر موب اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی تھا۔

ساہی صاحب نے کہا "اور میں سوچ رہا ہوں کہ اب اکثر معاملوں میں اپنی من مانی کرنے لگے ہو۔ بندۂ خدا عاصم کے ساتھ تمہاری ٹینشن پہلے ہی کم نہیں تھی' اس کے کارندوں کی ہڈیاں توڑ کر تم نے اس معاملے کو مزید بگا ہے۔ شیخ عاصم اس وقت پاگل ہو رہا ہوگا۔ وہ کاروباری ط بھی بہت نقصان میں جا رہا ہے۔ ایسا مایوس شخص کسی د بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"اگر اس نے خطرناک ثابت ہونا ہے تو پھر ہو کر رہے۔ ہماری خاموشی سے وہ ٹل نہیں جائے گا۔"

ساہی صاحب سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میں ب لیٹ گیا۔ میں قریباً ساری رات ہی سو نہیں سکا تھا۔ ب لیٹ کر بھی ذہن گھن چکر ہی بنا رہا۔ سہ پہر دو بجے کے بھگ میں نے ایک بار پھر چچا جلیس کو فون کیا۔ اتفاق سے چچا نے ہی اٹھایا۔ میری آواز پہچان کر وہ بولے "میں تم ہی انتظار کر رہا تھا' مجھے تم سے کچھ بہت ضروری بات ہے۔"

"جی فرمائیے؟"

"کیا ہم کہیں مل نہیں سکتے۔ یہ بہت ضروری بات فون پر کسی طرح مناسب نہیں ہوگی۔" چچا کا لہجہ گمبھیر تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ چچا سے ملنے میں خطرات تھے۔ بہت ممکن تھا کہ چچا کے گھر کے آس پاس بھی عاصم کے بندے موجود ہوں۔ وہ چچا کا تعاقب کریں اس کی مدد سے مجھ تک پہنچ جائیں۔ بہر طور اب میں ہر کا رسک لینے کے لیے تیار تھا۔ میں چچا کی بات رد نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چچی کی غیر موجودگی میں مجھ سے اہم بات کرنا چاہتے ہوں۔ چچا ساری زندگی ہی چچی کے میں رہے تھے اور اب کچھ زیادہ ہی اثر میں آ گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب چچی دل کی مریضہ بھی تھیں۔ ا سی بات پر اپنا دل پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور غزالہ س سارے گھر کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

میں نے چچا سے پوچھا "آپ کہاں آ سکتے ہیں۔"

"میں مال روڈ کے سیزن ریسٹورنٹ میں پہنچ جاتا ہوں"

"ٹھیک ہے میں بھی حاضر ہو جاتا ہوں۔"

ہمارے درمیان وقت طے ہو گیا۔ بات چیت ختم ہونے سے پہلے میں نے چچی کا احوال پوچھا۔ چچا نے مختصر جوا

کہ وہ ٹھیک ہے۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں چچا جلیس کے سامنے ریسٹورنٹ کے نیم تاریک ماحول میں بیٹھا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر ایک خوش رنگ شام شاہراہِ قائداعظم کے پیچ و خم کو چوم رہی تھی' لیکن ہمارے دلوں کا موسم کچھ ابر آلود تھا۔ مجھے چچا کے چہرے پر نرمی اور ملائمت کی بجائے برہمی نظر آ رہی تھی۔ مختصر تمہید کے بعد وہ بولے "شاہ جہاں تم میرے بھتیجے ہو۔ میرے دل میں تمہارے لیے ہمیشہ جگہ رہی ہے اور اب بھی ہے لیکن حالات کبھی ہمارے حق میں نہیں رہے اور نہ اب ہیں۔ میرے خیال میں اس میں بہت سا دخل تمہاری کوتاہیوں کا بھی ہے۔ اب بھی تم نے اپنی جلد بازی سے ہم سب کے لیے ایک بہت بڑی مشکل کھڑی کر دی ہے۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ تمہاری وجہ سے ہماری رہی سہی زندگی بالکل ناقابلِ قبول ہوتی جا رہی ہے۔"

غصے کی وجہ سے چچا جلیس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔

"میری نئی خطا کون سی ہے؟"

"اس کا پتا تمہیں زیادہ ہوگا۔ مجھے بس یہ معلوم ہے کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو آج کی رات ہماری زندگی کی شاید آخری رات ہوگی۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں نہیں جانتا کہ تم نے شیخ عاصم کے ساتھ کیا کیا ہے اور کیوں؟ لیکن وہ اس قدر غضب ناک ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس نے مجھے فون پر اتنا بے عزت کیا ہے کہ تم خیال بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے ہم سب کو ایسی ننگی گالیاں دی ہیں کہ ان کے بارے میں سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے ہمیں ہمارے گھر سمیت زندہ جلانے کی دھمکی دی ہے اور قسم کھائی ہے کہ ہم کل کا سورج نہیں دیکھیں گے۔ وہ بالکل پاگل لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا' عاصم لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو' وہ بولا' ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں اور مجھے پاگل کرنے والا تیرا بھتیجا ہے جو تیری بیٹی کا۔۔۔"

آواز چچا کے گلے میں پھنس گئی۔ یقیناً اس کے آگے کوئی گندی گالی ہی تھی جو عاصم نے مجھے اور غزالہ کو دی ہوگی۔

میں نے کہا "چچا! جب کتا پاگل ہو جائے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عاصم کو گولی مارنے کا وقت بھی آ گیا ہے۔"

"دیکھو شاہ جہاں' یہ دیکھو' میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہیں اپنے مرے ہوئے بھائی کا واسطہ دیتا ہوں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ تمہارا وجود ایک کانٹوں بھری جھاڑی کی طرح ہو گیا ہے جو ہماری زندگی کو تار تار کر دے گا۔ ہمیں تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

میں نے کہا "شاید آپ کا خیال ہے کہ عاصم نے کچھ دیر پہلے آپ کو جو دھمکی دی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے عاصم کے خلاف کوئی کارروائی کی ہے۔"

"میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوا ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتے چچا۔ آپ کا خیال ہے کہ میری کارروائی کی وجہ سے عاصم کپڑوں سے باہر ہوا ہے' حالانکہ بات الٹ ہے۔ یہ کارروائی اس لیے ہوئی تھی کہ عاصم کپڑوں سے باہر ہو چکا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق آپ نے امارات کے کچھ لوگوں کی تصویریں تو اخبار میں دیکھ لی ہیں لیکن آپ کو یہ پتا نہیں کہ جن کی یہ تصویریں تھیں وہ اس حال کو کیونکر پہنچے۔"

چچا کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے تصویریں واقعی اخبار میں دیکھی ہیں۔ میں نے کہا "چچا! وہ لوگ شیخ عاصم کے کارندے تھے اور اسی نے انہیں کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرا رکھا تھا۔ وہ غزالہ کو آپ کے گھر سے اٹھانے کے مشن پر تھے۔ اگر آپ کو میری بات پر بھروسا نہیں تو ابھی فون اٹھا کر ساہی صاحب سے بات کر لیجیے۔ انھوں نے آپ کو آگاہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی مجھے بتایا تھا لیکن خود وہ کئی دن سے پریشان حال پھر رہے تھے۔ آپ کی بے خبری میں آپ کے گھر کے گرد ایک ٹھیک ٹھاک گیم ہوتی رہی ہے۔"

چچا جلیس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "عاصم نے عدالتی کارروائی میں اپنی ہار دیکھ لی ہے۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہے اور وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ آج صبح میں یہی کچھ بتانے کے لیے آپ کی طرف آیا تھا کیونکہ آپ کا فون کام نہیں کر رہا تھا لیکن میری موجودگی کو چچی نے جس نظر سے دیکھا ہے اور جس طرح برہم ہوئی ہیں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری خوش فہمی تھی چچا! کہ شاید بہت سا وقت گزر جانے کے بعد چچی کے دل میں کچھ نرمی پیدا ہو گئی ہو مگر وہ تو آج بھی اس جگہ کھڑی ہیں جہاں میرے اور شفقا کے بچپن میں تھیں۔"

پتا نہیں کیوں میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں نے کہا "چچا! میں نے آپ کے گھر میں بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ کچھ آپ کو بتائے ہیں' کچھ نہیں بتائے۔ ان دکھوں نے مجھے پتھر کر دیا ہے لیکن میری رگوں میں خون تو وہی دوڑ تا ہے جو آپ کی رگوں میں ہے۔ میں خود کو آپ سے الگ کیسے کر لوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا جیسے چچا کا دل کچھ پسیجا ہے۔ ان کے چہرے کی بیگانگی میں شناسائی کا رنگ نمودار ہوا ہے لیکن اگلے ہی لمحے ان کی خانگی مجبوریوں نے انہیں پھر مجھ سے دور کر دیا۔ اپنے یتیم بھتیجے سے سیکڑوں ہزاروں میل کی دوری پر۔ وہ بولے "شاہ جہاں! میں تمہارے دل کی بات سمجھتا ہوں لیکن ضروری نہیں کہ انسان جو کچھ چاہے اسے مل بھی جائے۔ ہمیں اکثر تقدیر کے فیصلوں پر ہی چلنا ہوتا ہے۔"

"لیکن چچا! یہ بھی تو کہتے ہیں کہ انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے اور میں اب اس قابل ہوں کہ خدا کی منشا سے اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہوں۔ بس مجھے آپ کا تھوڑا سا سہارا چاہیے چچا۔ بس تھوڑا سا۔ پھر آپ دیکھیے گا کہ حالات کا لوہا کس طرح میرے ہاتھوں میں موم ہوتا ہے۔"

"دیکھو شاہ جہاں! تم جانتے ہو کہ تمہاری چچی سخت بیمار ہیں۔ میں اس کی زندگی کے لیے کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اور مجھے یقین ہے کہ غزالہ بھی نہیں لے گی۔"

ابھی چچا جلیس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میری نگاہ ہال کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ میرے جسم کی ساری قوت سمٹ کر میری آنکھوں میں چلی آئی۔ میں نے ایک ہٹے کٹے شخص کو دیکھا' وہ ماؤزر کے ذریعے میرا نشانہ لے رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی کھلونا ماؤزر نہیں تھا۔ اس میں سے گولیوں کی بوچھار نکل کر میرا اور چچا کا مزاج پوچھنے والی تھی۔ یہ نہایت سنگین لمحے تھے۔ اضطراری طور پر میرا ہاتھ چچا کی گردن کی طرف بڑھا۔ چچا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بظاہر ان کو یہی لگا ہو گا کہ میں ان پر حملہ آور ہو رہا ہوں۔ میں نے چچا کو دھکا دیا اور انہیں اپنے ساتھ لیتا ہوا قالین پر گرا۔ یہی وقت تھا' جب فائرنگ ہوئی اور گولیاں ہمارے اوپر سے گزرتی ہوئی ایک وردی پوش ویٹر کے سینے میں لگیں۔ میں نے اسے ٹرے سمیت ایک میز پر گرتے اور پھر نیچے لڑھکتے دیکھا۔

میں نے لوہے کی ایک میز الٹائی اور اس کی آڑ لیتا ہوا منیجر کے کمرے کی طرف گیا۔ چچا جلیس کو بھی میں اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ نیچے گرنے سے زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے بالائی دانت مصنوعی تھے۔ وہ گئے تھے اور ناک میں سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا جونہی ہم منیجر کے کمرے کے سامنے پہنچے۔ ایک اور برسٹ چلا۔ بدقسمتی سے یہی وقت تھا جب ریسٹورنٹ کا ایک بوکھلایا ہوا باہر نکلا۔ وہ فائرنگ کی زد میں آیا اور زخمی ہو اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے دفتری کاغذ دور تک بکھر گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" چچا کی ڈری ہوئی آواز میرے کا میں پڑی۔

میں نے چچا کو دھکیل کر منیجر کے کمرے میں پہنچا دیا دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا۔ میں فائرنگ کی سمت اندازہ لگا چکا تھا۔ میں نے اس موٹے تازے گنجے کو بھی لیا تھا جو اپنی دونوں کہنیاں ایک میز پر ٹکائے فائرنگ کر تھا۔ میں نے لوہے کی وزنی میز کو بدستور ڈھال بنائے رکھا تیزی سے دوڑ کر اس گنجے کے اوپر گرا۔ چند گولیاں میز کی سے ٹکرائیں لیکن میں محفوظ رہا۔ دیوار اور آہنی میز درمیان آ جانے سے گنجے کو خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس کی مسکور کن کراہ میرے کانوں میں گونجی اور میں نے ماؤزر گرنے کی آواز بھی سنی۔ میں نے میز ایک طرف پھینک کر مقابل پر حملہ کیا۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آ مجھ پر دہشت سوار تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں میں نے اس منکا توڑ دیا۔ اب اس کا ماؤزر میرے قبضے میں تھا۔ ماؤزر وزن بتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ بھرا ہوا میگزین اٹیچ کیا ہے۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہی وقت تھا جب دروازے طرف سے بھی مجھ پر گولیاں چلائی گئیں۔ گولیاں عین نشا پر لگیں یعنی میرے سینے پر۔ تاہم میرے سینے اور گولیوں درمیان گنجے ماؤزر بردار کا بے جان جسم بھی تھا۔ اس گردن ابھی تک میرے بازو کے شکنجے میں تھی اور جسم تو کی طرح لٹک رہا تھا۔ کم از کم تین گولیاں اس کے بے جا جسم میں پیوست ہوئیں اور میں نے ان گولیوں سے ہونے والا ارتعاش بڑی وضاحت سے محسوس کیا۔

میں نے فوراً جوابی فائر کیے۔ ایک حملہ آور زخمی ہو عین دروازے کے قریب ہی گر گیا۔ ایک دوسرا حملہ آور دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نا کی رائفل تھی۔ وہ غالباً بالکونی میں سے مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر گولیاں ماریں۔ وہ رائفل سمیت سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ ایک نوجوان لڑ

جو جان بچانے کے لیے ایک میز کے قریب اوندھی لیٹی تھی بری طرح چیخ اٹھی۔ رائفل بردار اس کے اوپر ہی آن گرا تھا۔

میں نے کاؤنٹر کے عقب میں ریسٹورنٹ کے منیجر کو دیکھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ غالباً شیشے کے اڑتے ہوئے ٹکڑے اسے لگے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر چیخ چیخ کر پولیس کو اس خونی ہنگامے کی اطلاع دے رہا تھا۔ اچانک قدموں کی چاپ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کوئی عقب سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا میرے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی پھر بھی وہ مجھے لیتا ہوا نیچے گرا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ چاقو کی نوک میرے ایک بازو کو چھو کر گئی۔ میں نے پورے زور سے اس کی کنپٹی پر ماؤزر کا دستہ مارا۔ اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو میں نے ایک اور ضرب لگائی۔ وہ لم لیٹ ہو گیا۔ میں نے سیڑھیوں کی طرف چند فائر مزید کیے۔ اسی دوران میں ماؤزر سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر کوئی عقب سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہ وہی عقب تھا جہاں اکثر میرا یار غار صفدر موجود رہا کرتا تھا لیکن آج یہ عقب خالی تھا۔ میں نے نیچے بیٹھے بیٹھے اس حملہ آور کا چاقو فرش سے اٹھالیا تھا جس نے میرے ہاتھوں کنپٹی پر دو شدید چوٹیں کھائی تھیں۔ جس وقت عقب سے آنے والا حملہ آور مجھ سے ٹکرایا میرے دائیں ہاتھ میں چاقو موجود تھا۔ میں نے فوراً محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں بھی چاقو ہے۔ میں نے اس کا وار اپنی کلائی پر روکا اور اپنا چاقو بے دریغ اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ان لمحوں میں مجھ پر وحشت سوار تھی۔ جب میں نے چاقو حملہ آور کے پیٹ سے نکالا تو اس کا پیٹ ناف تک کھلتا چلا گیا۔ گرم خون کا فوارہ میرے ہاتھ کی پشت پر گرا۔

یہ آخری منظر تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔ اس کے فوراً بعد منظر پر گہری تاریکی چھا گئی۔ دراصل انتظامیہ میں سے کسی نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بجلی کے مین سوئچ آف کر دیے تھے۔ تاریکی ہوتے ہی میں منیجر کے آفس کی طرف بڑھا تاکہ چچا کی خبر لے سکوں۔ راستے میں مجھے اس ویٹر کے مردہ جسم سے ٹھوکر لگی جو ہنگامے کے آغاز میں ہی راہی عدم ہوا تھا۔ میں آفس کے دروازے کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں پولیس کی گاڑیاں پہنچنے کی آوازیں آئیں۔ یہ کئی گاڑیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ چچا جلیس کو اب حملہ آوروں کی طرف سے معمولی سا خطرہ بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی میں نے ان میں سے ایک دو افراد کو راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب میرے لیے بہتر یہی تھا کہ یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے خون آلود چاقو بند کر کے اپنی جراب میں اڑسا اور ریسٹورنٹ کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

○☆○

وہ رات بھی میں نے مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں ہی گزاری۔ میرے بازو پر چاقو کا ہلکا سا چرکا لگا تھا۔ میں نے خود ہی پٹی وغیرہ کر لی۔ رات گیارہ بجے کے قریب میں نے چچا کے گھر فون کیا۔ میری خواہش تھی کہ فون فرزانہ اٹینڈ کرے اور میں اس سے حال احوال پوچھ سکوں لیکن اس بار بھی ایسا نہیں ہو سکا۔ تاہم فون کرنے سے میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ فون چچا جلیس نے اٹھایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر میں ہیں۔ میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ سے بخیریت گھر پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ چچا اس وقت بہت "اپ سیٹ" ہوں گے۔ ان کی آواز سننے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

اگلے روز صبح اخبار دیکھا۔ ریسٹورنٹ میں ہونے والے خونی ہنگامے کی خبریں موجود تھیں۔ قتل ہونے والے ویٹر کی لاش کی تصویر بھی موجود تھی۔ وہ موقعے پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ تین افراد مزید ہلاک ہوئے تھے۔ ان سب کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا۔ قتل اور ڈکیتی کے مختلف مقدمات میں وہ پولیس کو مطلوب تھے۔ ان میں سے جو گنجا شخص میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا وہ اشتہاری تھا اور اس کے سر کی قیمت مقرر تھی۔

اخباری خبر میں اس امکان کا اظہار کیا گیا تھا کہ اس ہنگامے کا اہم کردار استاد جہانی ہے۔ چشم دید گواہوں نے ہنگامے میں شریک شخص کا جو حلیہ اور ڈیل ڈول بیان کیا تھا وہ "استاد جہانی" سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات تھی کہ مرنے والوں میں سے ایک شخص کو گردن توڑ کر قتل کیا گیا تھا۔ رپورٹرز کے مطابق یہ استاد جہانی کا خاص اسٹائل تھا۔

اخبار وغیرہ پڑھنے کے بعد اور ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد میں نے اس فور اسٹار ہوٹل میں فون کیا جہاں سلطان آغا اور اس کی اہلیہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ دونوں خیرو عافیت سے تھے۔ آغا اپنے اصل نام سے نہیں ٹھہرا تھا لہٰذا اس سے رابطہ کرنے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی۔ بہرحال میں اس سے بات کرنے میں کامیاب ہوا۔ اخباری خبریں ان کی نظر سے بھی گزر رہی تھیں اور وہ حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ آغا نے بتایا کہ آفرین اسی روز اپنے گھر چلی گئی تھی۔

ابھی میں نے فون بند کیا ہی تھا کہ ساہی صاحب کی کال آئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اسپتال میں اشرف چیتا کی حالت اب بہتر ہے۔ ساہی صاحب نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اشرف چیتا کا اصل نام ہارون پاشا ہی ہے۔ وہ اشرف چیتا کے فرضی نام سے اپنے ہی گینگ میں شامل تھا۔ ساہی صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹرز کل یا پرسوں تک اشرف (یعنی ہارون پاشا) سے بات چیت کی اجازت دے دیں گے۔

میں نے ساہی صاحب سے پوچھا "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہی شخص ہارون پاشا ہے۔"

ساہی صاحب بولے "ہمارے پاس اس کی ایک فائل فوٹو موجود ہے۔ یہ شخص تقریباً پانچ سال پہلے پاکستان سے بھاگ کر امریکا چلا گیا تھا اور وہاں سیاسی پناہ لے لی تھی۔ پاکستان میں اس شخص پر کئی سنگین مقدمات تھے۔ بعد ازاں اس شخص نے امریکا میں رہتے ہوئے اپنی تنظیم کی بنیاد پاکستان میں رکھی اور ملک میں تخریبی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ کم و بیش دو برس تک یہ شخص بیرون ملک سے ہی بڑی چابک دستی سے اپنی تنظیم کے معاملات کنٹرول کرتا رہا' پھر یہ بڑی خاموشی سے پاکستان آگیا۔"

میں نے کہا "جناب! میں اشرف چیتا۔ یا یہ کہہ لیں کہ ہارون پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"یہ بڑی مناسب بات ہے' لیکن یہ مسئلہ بھی ذہن میں رکھو کہ پولیس میں سے ہی کچھ لوگ تمہیں مسلسل ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"اس کا بھی کوئی انتظام میں کر لوں گا۔"

ساہی صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! میں دل سے سمجھتا ہوں کہ ہارون پاشا کی گرفتاری تمہارا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کا سہرا اگر کسی پولیس آفیسر کے سر ہوتا تو یقیناً اسے آؤٹ آف ٹرن ترقی ملتی اور تمغوں سے نوازا جاتا لیکن تمہارے سلسلے میں معاملہ الٹ ہے۔ تم اپنے ملک کے لیے ایک اہم کام انجام دے کر بھی چھپتے پھر رہے ہو۔"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ اہم ہے؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ تخریب کاری کی کارروائیاں پچھلے دو مہینے کے اندر نمایاں طور پر کم ہوئی ہیں۔ ان میں بتدریج مزید کمی آرہی ہے۔ ہارون پاشا اس تنظیم کا دل اور دماغ تھا۔ جب دل اور دماغ ہی معطل ہو گیا ہو تو جسم کی کارکردگی کیا رہ جائے گی۔"

میں نے کہا "جناب! میں سمجھتا ہوں کہ دل و دماغ معطل ہی نہیں ہوا بہت حد تک بدل بھی گیا ہے۔ میرا اشارہ ہارون پاشا کی طرف ہی ہے۔ تہ خانے میں پانچ ہفتے بھوکا پیاسا بند رہنے کے دوران میں اس کا کتھارسس ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک نیا شخص نمودار ہونے والا ہے۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ پولیس کی پوچھ گچھ شروع ہونے سے پہلے اس سے ملو؟"

"جی سر! میں یہی چاہتا ہوں۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ دو گھنٹے کے اندر اندر اسپتال چلے آؤ۔ ڈیوٹی پر جو بندے موجود ہیں وہ اپنے اعتماد کے ہیں' لیکن سہ پہر دو بجے کے بعد جو اہلکار پاشا کی نگرانی کے لیے اسپتال آئیں گے وہ ہیڈ کوارٹر سے آئیں گے۔ ان میں سے ایک اے ایس آئی تو ایک دم خطرناک شخص ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب! آپ کہتے ہیں تو میں ابھی حاضر ہو جاتا ہوں۔ کیا آپ وہیں ہوں گے۔ میرا مطلب ہے اسپتال میں؟"

"میں ٹھیک ایک گھنٹے بعد اسپتال پہنچ جاؤں گا' تم بھی ایک گھنٹے تک آجاؤ۔"

"او کے سر۔" میں نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد میں اسپتال پہنچا لیکن ہارون پاشا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اسپتال کی پارکنگ میں داخل ہونے سے پہلے ہی سب انسپکٹر شجاعت سے ملاقات ہو گئی۔ وہ وردی کی بجائے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے میری گاڑی کو روکا اور کھڑکی کے قریب جھک کر بولا "آپ واپس چلے جائیے جناب؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"پروگرام بدل گیا ہے جی' آپ اسپتال نہیں جا سکتے۔ وہاں آئی جی صاحب خود تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ساہی صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ کو فوراً واپس بھیج دوں۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اسپتال کے سامنے سے میں نے اپنی کار کو یوٹرن دیا اور لوئر مال روڈ کی طرف مڑ گیا۔ یہ ایک شاندار چمکیلی سہ پہر تھی۔ سال کے آخری دنوں کا سورج شہر کے نشیب و فراز پر ..... خوشگوار دھوپ بکھیر رہا تھا۔ میں گاڑی آہستہ روی سے چلاتا رہا اور شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی' مجھے یوں گھومنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دل چاہا کہ کاش صفدر بھی میرے ساتھ

ہوتا۔ ہم شہر کے پیچ و خم پر اور آتے جاتے لوگوں پر تبصرے کرتے، کہیں سرراہ کسی پھڈے میں کود جاتے، کہیں کسی سر پھرے ویگن ڈرائیور کو سبق سکھانے کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لیتے۔ کہیں کسی بددماغ ٹریفک سارجنٹ کو کھری کھری سناتے۔ شہر میں اکٹھے گھومنے پھرنے کے دوران میں ہمارے یہی مشغلے ہوا کرتے تھے۔ صفدر کا خیال آیا تو دل سے ایک ہوک نکل کر رہ گئی۔ ایک سوال چیخ بن کر ذہن سے ابھرا۔ کیا میرا یار کبھی نہیں دیکھ سکے گا؟ اس سوال کا جواب ایک گہرے اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بھائی جی کی ناگہانی موت کے بعد جو زبردست ہنگامے پھوٹے تھے ان کا نتیجہ الیکشن کے التوا کی صورت میں نکلا تھا۔ دو تین ہفتوں کے لیے انتخابی سرگرمیاں بالکل ماند پڑ گئی تھیں لیکن اب ایک بار پھر گلی کوچوں میں انتخابی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک میں اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گیا۔ کسی نے میری کار کے عقبی شیشے پر زور زور سے ہاتھ مارا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ وہ آفرین تھی۔ وہ بھی کار میں تھی۔ وہ پچھلی نشست پر تھی۔ اگلی نشست پر ڈرائیور تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ مسلح گن مین موجود تھا۔ آفرین نے اپنی کار کے اندر سے ہاتھ نکال کر میری گاڑی کا شیشہ بجایا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔

میں نے چند گز آگے جا کر اپنی کار سڑک کے کنارے روک دی۔ آفرین کی شان دار مرسیڈیز بھی چند قدم آگے جا کر رک گئی۔ میں کار سے اتر کر آفرین کے قریب جانا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی اتر کر میری طرف چلی آئی۔ شان دار شلوار قمیص اور کیتھی رنگ کی جرسی میں وہ اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بڑے سلیقے سے میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولی "کہاں جا رہے ہیں؟"

"ضروری تو نہیں کہ انسان چل رہا ہو تو وہ واقعی کہیں جا رہا ہو۔"

واہ بھئی! بڑا فلسفیانہ موڈ طاری ہے۔"

"آپ کو دیکھ کر فلسفی ہو جاتا ہوں۔"

"او گاڈ۔ کیا میں واقعی اتنی بورنگ نظر آتی ہوں؟"

"آپ بہت خوب صورت نظر آتی ہیں۔"

مشرقی لڑکی اپنی تعریف پر شرما جاتی ہے اور وہ بہرحال ایک مشرقی لڑکی تھی پھر اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ اپنی قیمتی رسٹ واچ دیکھ کر بولی "کیا آپ میرے ساتھ ایک جگہ چل سکتے ہیں؟"

"کب؟"

"ابھی' بلکہ اسی وقت۔ اب یہ نہ پوچھیے گا کہ کہاں ہے۔ اس طرح تو سارا سرپرائز ختم ہو جائے گا۔"

"کتنی دیر لگے گی؟"

"زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹا۔ میں اپنے ڈرائیور اور گارڈ کو واپس بھیج دیتی ہوں' میں گاڑی خود ڈرائیو کروں گی آپ میرے پیچھے چلے آیئے گا۔"

"آپ کے چچا گارڈ کو آپ کی حفاظت کے لیے سا بھیجتے ہیں۔ اسے واپس کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"آپ کی صورت میں جو گارڈ میرے ساتھ ہوگا' ایسے سو گارڈز پر بھاری ہے۔" وہ مسکرائی۔

"میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرتا' اس کے علا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ گارڈ اور ڈرائیور واپس چلے جا گے تو آپ کے گھر والوں کو پریشانی ہوگی۔"

"یہ سارا میرا سردرد ہے۔ میں اس کا انتظام کرا ہوں۔ آپ بس یہ بتائیں کہ میرے ساتھ چل رہے ہیں؟"

"اگر آپ کا اصرار ہے تو چل پڑتا ہوں۔"

"بالکل اصرار ہے اور شدید اصرار ہے۔" اس نے اور اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے ایک سو نوٹ نکال ڈرائیور اور گارڈ کو دے دیے ان دونوں نے جھک کر سلام کی ڈرائیور نے گاڑی کی چابی آفرین کی طرف بڑھائی اور گارڈ کے ہمراہ فٹ پاتھ کی طرف بڑھ گیا۔ آفرین بڑے ناز لہراتی ہوئی کار میں بیٹھی اور کار آگے بڑھا دی۔ میں بھی ا کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دو تین سڑکوں سے گزرنے کے بعد شاہ جمال کی طرف آ گئے۔

میرے ذہن میں کئی سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ آفر مجھے کہاں لے جا رہی تھی اور کیوں؟ میرے ساتھ اس کا ر ہمیشہ لگاوٹ کا رہا تھا۔ میرے خیال میں اس لگاوٹ کی وجہ تھی کہ وہ ماضی میں غزالہ کی قریبی سہیلی رہی تھی۔ غزالہ حوالے سے وہ میرے ساتھ بھی ایک طرح کی وابستگی محسو کرتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن وہ اب مجھے اپنے پیچھے لگا کر کہاں لے جا رہی تھی؟ دو منٹ بعد ہم ایک کوٹھی کے سامنے رکے چوکیدار چھوٹے گیٹ میں سے دیکھا۔ آفرین کو پہچان کر اس نے سلا کیا اور فوراً دروازہ کھول دیا۔

آفرین نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کو میں داخل ہو گئی۔ میں بھی چاروناچار اندر چلا گیا۔ زیادہ

کوٹھی نہیں تھی لیکن اچھی طرح ڈیکوریٹ تھی۔ ایک خاتون نے آفرین کا استقبال کیا۔ خاتون جواں سال ہی تھی۔ وہ کسی محکمے کی افسر وغیرہ لگتی تھی۔ بوائے کٹ بال تھے۔ نفیس عینک تھی' اس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ آفرین نے تعارف کراتے ہوئے کہا "شاہ جہاں یہ ہیں میری کالج کے زمانے کی دوست آمنہ شیخ۔ حال ہی میں ان کی شادی ہوئی ہے۔ خاوند صاحب ہنی مون منانے کے بعد پھر سے انگلینڈ تشریف لے گئے ہیں اور ہماری پیاری سہیلی کو آہیں بھرنا چھوڑ گئے ہیں۔ خاوند صاحب کی طرح آمنہ بھی گورنمنٹ سرونٹ ہیں۔ یہ بہبود آبادی کے ڈیپارٹمنٹ میں سینئر آفیسر ہیں۔"

میں نے کہا "مجھ سے بہبود آبادی کے حوالے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو آپ مجھے یہاں لے آئی ہیں۔"

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا پھر آفرین نے مسکراتے ہوئے کہا "بہبود آبادی کے سلسلے میں کچھ غلطیاں تو اب سے واقعی ہو رہی ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں ہوں۔"

"ابھی آپ کو سمجھا بھی دیتے ہیں۔ ذرا چھری تلے سانس تو لیں آپ!" آفرین نے کہا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

آمنہ نے ملازمہ کو کافی کا آرڈر دیا۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں آفرین ایک بار پھر اٹھ کر باہر چلی گئی۔ کافی بہت اچھی بنی تھی۔ ساتھ میں کچھ لوازمات بھی تھے۔ مجھے ابھی تک آفرین کی یہاں آمد کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اچانک کال بیل بجی۔ آفرین اٹھ کر باہر گئی۔ اس کی چال بڑی شاہانہ قسم کی تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ اس کا تعلق ایک ایسی فیملی سے تھا جو آگے چل کر ملک کی حکمران بن سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا' انسان کتنی جلدی اپنے حالات سے سمجھوتا کرتا ہے۔ ابھی بہت دن ہوئے تھے جب میں نے آفرین کو اپنے پیارے ڈیڈی کی لاش پر نوحہ کناں دیکھا تھا' اس وقت آفرین کا زرد چہرہ دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ شاید یہ جی نہیں سکے گی مگر اب وہ بہت کچھ بھول کر پہلے کی طرح نظر آ رہی تھی۔

قریباً پانچ دس منٹ مزید گزر گئے۔ آمنہ شیخ بھی اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ مجھے کسی گڑبڑ کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سامنے دروازے میں غزالہ کو دیکھ کر مجھے شدید جھٹکا لگا تھا۔ غزالہ بھی ایک دم ہی حیران و پریشان نظر آئی تھی ایک سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ واپس پلٹ جائے گی لیکن پھر وہ سنبھلی اور حیرت سے بولی

"آپ یہاں؟"

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہ رہا تھا۔"

"او گاڈ! یہ ساری آفرین کی بچی کی شرارت ہے۔" غزالہ نے کہا اور دروازے کی طرف مڑی۔

دروازے پر اب آفرین کھڑی تھی۔ مسکرا کر بولی "آپ دونوں آسانی سے قابو آنے والے نہیں تھے اس لیے تھوڑا سا ڈراما کرنا پڑا۔ اس کے لیے آپ دونوں سے معافی چاہتی ہوں۔"

میں گہری سانس لے کر پھر سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ غزالہ کھڑی رہی۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ آپ کا پہلا ڈراما نہیں ہے۔ اس سے پہلے اپنی رہائش گاہ پر بھی آپ نے ایسا ہی ڈراما کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے بتائے بغیر آپ نے غزالہ کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔"

"اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں آپ دونوں کے ملاپ کی کتنی خواہش رکھتی ہوں۔ میں دروازہ باہر سے بند کر کے جا رہی ہوں۔ اسی وقت کھولوں گی جب آپ دونوں کچھ طے کر لیں گے۔"

"او آفرین کی بچی۔" غزالہ' آفرین کی طرف بڑھی' لیکن وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ بند کر کے چابی گھما دی۔

غزالہ سپٹا کر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کھڑی ہونٹ بھینچتی رہی' پھر گہری سانس لے کر اس نے شولڈر بیگ میز پر رکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی "کیسے ہیں آپ؟" اس نے ریشمی بالوں کی لٹیں اپنے اجلے چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"بس جی رہا ہوں۔ ایک کام سے نکلا تھا' آفرین صاحبہ کچھ بتائے بغیر یہاں لے آئی ہیں۔"

"میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا ہے چڑیل نے۔ مجھے فوری طور پر بلایا کہ آمنہ شیخ کی طبیعت بہت خراب ہے اس کے گھر پہنچو۔ میں میڈیکل باکس اٹھا کر دوڑی آئی۔ آمنہ شیخ میری بھی کلاس فیلو رہی ہے۔"

"چچی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئیں۔ کل تک تو بلڈ پریشر ہی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ سینے میں درد کی شکایت بھی ہے۔"

"سارا میری وجہ سے ہوا ہے نا؟" میں نے غزالہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں میری وجہ سے ہوا ہے۔" وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی پھر اس کی حسین آنکھوں سے ایک دم آنسو ڈھلک گئے۔

وہ منہ پھیر کر رونے لگی "سارا میرا ہی قصور ہے شاہ جہاں۔ میری وجہ سے ہی آپ کی زندگی بھی تباہ ہو رہی ہے۔ پتا نہیں کیسی قسمت لے کر آئی ہوں میں اس دنیا میں۔ ہمارا کچھ نہیں ہو سکتا شاہ جہاں۔ ہمارا کچھ نہیں ہو سکے گا۔ اگر عاصم نے میرا پیچھا چھوڑ بھی دیا تو شاید ہم پھر بھی نہیں مل سکیں گے۔ ہماری قسمت میں بس یہی جدائی لکھی ہے۔"

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔ ان لمحوں میں وہ ایک مسیحا صفت ڈاکٹر کی بجائے ایک عام سی لڑکی لگ رہی تھی۔ حالات کے پنجے میں جکڑی ہوئی اور غموں سے نڈھال۔ یوں لگتا تھا کہ کئی مہینوں سے جو آنسو اس کی پلکوں کے پیچھے جمع ہو رہے تھے وہ ایک دم ضبط کا بند توڑ کر بہہ نکلے ہیں۔

میں بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب چلا گیا۔ ہم دونوں صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں کے اوپر سے گزارا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اضطراری کیفیت میں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے آنسوؤں میں اور شدت آ گئی تھی۔ وہ روتے ہوئے ہی بولی "شاہ جہاں! آپ مجھے بھول کیوں نہیں جاتے۔ کہیں اور شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کیوں میرے لیے خود کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیا دیکھا ہے مجھ میں۔ بھول جائیں مجھے۔ اس ملاقات کو میری اور اپنی آخری ملاقات بنا دیں۔ پلیز شاہ جہاں۔ پلیز!"

میں نے اسے خود سے جدا کر کے دیکھا۔ اس کی بند آنکھیں تربتر تھیں۔ میں چند لمحے تک اس کا حسین چہرہ دیکھتا رہا' پھر میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے غزالہ۔ ہم اس ملاقات کو آخری ملاقات بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہماری جو ملاقات ہو گی وہ اس طرح نہیں ہو گی۔ اس ملاقات میں ہم ایک ہی رشتے میں بندھے ہوئے ہوں گے۔"

اس نے کرب کے عالم میں اپنے ہونٹ بھینچے اور آنکھیں بند کر لیں "آپ نہیں سمجھیں گے شاہ جہاں! آپ کبھی نہیں سمجھیں گے اگر آپ نے۔" ایک دم اسے خاموش ہونا پڑا۔ میں نے اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں سے بند کر دیے تھے۔

وہ کسمسا کر رہ گئی۔ موریطانیہ کے ماریا زسٹ میں قیام کے دوران میرے اور غزالہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ جذبات کے تیز ریلے میں خود بخود بہہ گیا تھا۔ ایک بار حد عبور ہوئی تو پھر میرے قدم کچھ اور آگے بڑھ گئے۔ میں اسے چومنے لگا۔ اس کے آنسوؤں کا نمکین پانی میرے ہونٹوں کو تر کرنے لگا۔ اس کے بال۔ رخسار۔ گردن سب کچھ میرے ہونٹوں کی زد میں آیا۔ اس کا چہرہ جذبات کی حدت سے ہو گیا تھا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی' پھر میں نے کہا "غزالہ میں نے اب پیچھے نہیں ہٹنا ہے۔ حالات سے لڑ کر تمہیں حاصل کرنا ہے یا پھر ختم ہو جانا ہے۔ میں تمہاری خاطر چچی کے پاؤں پکڑ لوں گا۔ ان سے اپنے سارے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ لوں گا۔ میں چچا سے بھی تفصیل کے ساتھ بات کروں گا۔ کیا تم بھی اپنا وزن میرے پلڑے میں ڈالو گی؟"

"میرا وزن تو آپ ہی کے پلڑے میں ہے لیکن جب اپنے حالات کو دیکھتی ہوں تو میرا وزن تنکے سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ امی کی تکلیف کو دیکھ کر اور بھی کم وزن ہونے لگتی ہوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا شاہ جہاں۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ سب کچھ بھول کر آپ کو سینے سے لگا لوں اور آپ کے سہارے زندگی گزار دوں۔ کہیں دور چلی جاؤں تم سے۔"

"پھر وہی مایوسی کی باتیں۔" میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر تھوڑا سا جھنجوڑا۔

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ اس کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ایک روشن مستقبل کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر ہم ڈگمگا گئے تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہو گی۔ وہ میرے کندھے سے لگ کر بیٹھی رہی۔ اس کا ہاتھ بے خیالی میں میرے سینے پر رہا۔

دس پندرہ منٹ بعد جب آفرین نے دروازے پر ہولے سے دستک دی' تو غزالہ کے دل و دماغ پر سے غم اور مایوسی کے بادل کافی حد تک چھٹ چکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عزم نو کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے میری آنکھ میں ارادے کا پیار دیکھ لیا تھا۔ اس ارادے نے غزالہ کی مایوسیوں پر کاری ضرب لگائی تھی۔ آفرین نے ایک بار دستک دیتے ہوئے کہا "واپس آ جائیں۔ آپ دونوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ انعام شنام دیا جائے گا۔"

غالباً امینہ نے شرارت کے طور پر کیسٹ پلیئر پر لگا دیا "ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے۔"

غزالہ کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ میں نے غزالہ سے وعدہ کیا تھا کہ کل سہ پہر کو میں ان کے گھر آؤں گا۔ غزالہ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے آٹھ پہر میں اپنی پوری پوری کوشش کرے گی کہ والدہ کے رویے کی شدت کم ہو جائے۔ وہ ان کو باور کرائے گی کہ اس کی اجڑی ہوئی زندگی

ایک ہی طریقے سے آباد ہو سکتی ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ اس کا تایا زاد اس کی زندگی میں آ جائے۔

اس دن ایک نئے ارادے اور ولولے کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ وہ رات میں نے سخت بے چینی میں ہی گزاری تھی۔ اگلا روز بھی بے قرار گزرا۔ میں آج اپنا دل کھول کر چچا چچی کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔ اتنی باتیں میرے ذہن میں جمع ہو چکی تھیں کہ سر پھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور آنکھیں دکھ کے بوجھ سے جل رہی تھیں۔

پروگرام کے مطابق پانچ بجے کے قریب میں غزالہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی میں نے کمرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ساہی صاحب تھے۔ انہوں نے کہا "شاہ جہاں! یہ بڑا اچھا موقع ہے اگر تم اسپتال میں ہارون پاشا سے بات کرنا چاہتے ہو تو فوراً آ جاؤ۔ میں بھی اسپتال میں ہی موجود ہوں۔"

میں نے رسٹ واچ دیکھی "لیکن سر! میں تو ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

"دیکھ لو۔ ممکن ہے کہ ایسا اچھا موقع پھر نہ ملے۔ کل اسپیشل برانچ کے لوگ پاشا کو تفتیش کے لیے لے جائیں گے۔"

میں چند سیکنڈ شدید تذبذب میں رہا۔ میں نے ایک زمانہ اسی بھاگ دوڑ' مارا ماری اور پکڑ دھکڑ میں گزار دیا تھا۔ ان لمحوں میں میں نے اپنی زندگی کے بے شمار قیمتی اور سنہری لمحے ضائع کیے تھے۔ میری اور شفقا کی کتنی "سالگرہیں" تھیں جو یونہی گزر گئی تھیں۔ کتنے میٹھے تہوار تھے جو میں نے ویرانوں میں اپنے دشمنوں کے پیچھے بھٹکتے گزار دیے تھے۔ کتنے پیارے دوستوں کی شادیاں' کتنی حسین شامیں' کتنے سہانے دن' کتنے یادگار تفریحی موڑ اس بھاگ دوڑ کی نذر ہوئے تھے۔ آج میں اپنی زندگی کے ایک اہم موڑ پر کھڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے حالات سے دو تین گھنٹوں کی رخصت لے لی اور ساہی صاحب سے کہا کہ میں فی الوقت آنے سے مجبور ہوں۔ تاہم فارغ ہوتے ہی میں اسپتال پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

تین بجے کے لگ بھگ میں گھر سے روانہ ہوا۔ ساہی صاحب کی پرائیویٹ گاڑی میرے زیر استعمال تھی۔ میں گلبرگ میں واقع چچا جلیس کے گھر پہنچا تو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ کئی بار بیل بجائی لیکن گیٹ نہیں کھلا۔ میں نے گیٹ کے نیچے سے جھانکا۔ چچا کی گاڑی بھی موجود نہیں تھی۔ کہیں کوئی آہٹ ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔

اسی دوران میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ مین گیٹ مقفل ہے۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" ایک آواز نے عقب سے کہا۔

یہ چچا کا ایک محلے دار تھا۔ "میں جلیس صاحب کا بھتیجا ہوں۔ کیا وہ کہیں گئے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ویسے میں خود بھی پریشان ہوں۔ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ مجھے بتائے بغیر وہ کہیں نہیں جاتے لیکن آج صبح دیکھا تو گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ رات میں ہی کہیں نکلے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کہیں فوتگی وغیرہ ہو گئی ہے جس کی وجہ سے انہیں آناً فاناً نکلنا پڑا ہے۔"

میرے سینے میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ شواہد سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں' بہرحال دیگر امکانات کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شیخ عاصم بڑے خطرناک موڈ میں تھا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ابھی میں تذبذب کے عالم میں کھڑا تھا کہ ایک کار قریب آ کر رکی۔ میں نے دیکھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر سب انسپکٹر شجاعت بیٹھا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ شجاعت نے کہا "ساہی صاحب کی ہدایت پر پولیس اہلکار یہاں سادہ لباس میں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ جلیس صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔ وہ لوگ رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب یہاں سے روانہ ہوئے۔ ایک ملازم بھی ان کے ساتھ تھا۔ ملازم نے ہی گیٹ کو مقفل بھی کیا۔"

"کیا اہلکاروں میں سے کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔"

"بس یہی غلطی ہوئی ہے۔ اہلکاروں کو اس طرح کی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔ ان کے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی' ورنہ شاید وہ اپنے طور پر پیچھا کرنے کی کوشش کرتے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سب انسپکٹر شجاعت خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "میں گارڈ کے انچارج سے ملنا چاہتا ہوں۔"

شجاعت نے تین چار منٹ کے اندر انچارج کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اے ایس آئی تھا۔ کچھ ڈرا ہوا بھی تھا۔ میں نے اسے گاڑی میں ہی بٹھا لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اہل خانہ کب اور کیسے گئے؟

اے ایس آئی نے بتایا "گیارہ بجے کے قریب ایک اسٹیشن ویگن یہاں آئی تھی۔ ملازم نے دروازہ کھولا تھا مگر ویگن کو اندر نہیں جانے دیا تھا۔ ویگن میں سے جو شخص نکلا تھا اس نے دو تین منٹ تک ملازم سے تکرار کی۔ اس کے بعد ویگن تو باہر ہی کھڑی رہی لیکن وہ شخص اندر کوٹھی میں چلا گیا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اندر رہا۔ ویگن میں دو بندے اور موجود تھے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور تھا۔ دوسرا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ تھوڑا سا نشے میں بھی لگتا تھا۔ اگر میں اسے دوبارہ دیکھوں تو بآسانی پہچان سکتا ہوں۔ اندر جانے والا شخص جب باہر آیا تو وہ اکیلا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ملازم گیٹ پر آیا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد میں بھی اپنی پوزیشن پر واپس آگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد کوٹھی کی فالتو لائٹس بند ہونے لگیں پھر جلیس صاحب کی گاڑی نظر آئی سب لوگ اس میں موجود تھے۔ ملازم نے بیرونی گیٹ کو تالا لگایا اور صاحب کے ساتھ ہی بیٹھ کر چلا گیا۔"

"تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ لوگ گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور تمہیں ان کا پیچھا کرنا چاہیے۔"

اے ایس آئی تھوک نگل کر بولا "یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا جی کہ میں کچھ نہیں کرسکا۔ میرے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی۔"

"سواری کی پولیس والوں کو تو کوئی کمی نہیں ہوتی۔ تم لوگ کسی بھی راہ چلتی گاڑی کو روک کر سوار ہو جاتے ہو۔"

اے ایس آئی سر جھکا کر رہ گیا۔ غالباً شجاعت نے اسے کافی لتاڑا تھا۔ وہ جتنا قصوروار تھا، خود کو اس سے زیادہ محسوس کر رہا تھا۔

اے ایس آئی سے بات کرنے کے بعد میرا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال آنے لگا کہ کہیں اس معاملے میں شیخ عاصم کا ہاتھ تو نہیں۔ وہ نہایت شاطر اور عیار شخص تھا۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے اس کے پاس درجنوں راستے ہوتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ چچا جلیس کے مکان کے گرد پولیس کے مسلح اہلکار موجود ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کے اندر بھی لوگ چوکس ہیں۔ کسی طرح کی جارحانہ کارروائی آسان نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے کوئی چال چلی ہو اور غزالہ وغیرہ کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔

دوسری صورت یہ تھی کہ چچا جلیس خود ہی گھر چھوڑ کر کہیں روپوش ہوگئے ہوں۔ اگر ایسی بات تھی تو بھی اس کا اصل ذمے دار تو عاصم ہی تھا۔ وہ چچا اور اس کے اہل کے گرد گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ درحقیقت پچھلے آٹھ روز سے یہ لوگ گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

عجیب دکھ اور مایوسی کے عالم میں میں مسلم ٹاؤن گیا۔ جاتے ہوئے ذہن میں کیسی کیسی امید افزا تھیں لیکن واپسی پر اپنے سامنے ایک تاریک خلا کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہن میں کھلبلی سی مچی تھی۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا تھا کہ اپنے کام سے ہو کر میں اسپتال، اشرف چچا یعنی ہارون پاشا سے ملنے گا لیکن اب کسی کام کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں بند میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا۔ کئی ہفتوں کی خوفناک فاقہ کشی کے بعد ابھی میری جسمانی حالت بہتر نہیں ہوئی تھی، اوپر سے ایک دم شدید قسم کی پریشانیوں نے گھیر لیا تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ کہیں سے شیخ عاصم کا فون آ جائے۔

صبح رجال ساہی صاحب کے ملازم نے میرے ناشتا لا کر رکھا، لیکن کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا۔ میں روٹی کا ایک ٹکڑا منہ میں گھماتا رہا اور چائے کے دو گھونٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس وقت میرا دوست اور ہمدم صفدر میرے ساتھ ہوتا۔ وہ غم بانٹتا، مجھے مشورے دیتا۔

ہاتھ بے اختیار فون کی طرف بڑھ گیا۔ میں اسے کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سب انسپکٹر شجاعت تھا۔ اس نے کہا "جناب شیخ عاصم کا کھوج لگ گیا ہے۔ وہ گلبرگ II کی ایک کوٹھی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ کوٹھی اس کے ایریا میجر شاہنواز خان کی ہے۔"

"یہ اطلاع کنفرم ہے؟"

"سو فیصد جناب! میں نے صرف پندرہ منٹ پہلے عاصم کو خود کوٹھی کی ایک بالکونی میں کھڑے دیکھا ہے۔"

"بہت خوب۔ تم نے ایک اہم کام کیا ہے۔ ویل ڈن۔"

"بہت شکریہ جناب! لیکن۔۔۔ ساہی صاحب کو پتا چلا کہ میں نے ان کو بتائے بغیر یہ کام کیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ یقین کریں میری سروس میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے ان سے کوئی بات چھپائی ہے۔"

"یہ بات تم نے نہیں میں نے چھپائی ہے اور میں ساہی صاحب کے سامنے ساری بات کلیئر بھی کردوں گا۔ اس بارے میں بالکل بے فکر رہو۔"

شجاعت نے مجھے کوٹھی کے نمبر سے آگاہ کیا اور سارا حدود اربعہ بھی سمجھا دیا۔

شجاعت سے بات ختم کرنے کے بعد میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری انگلیوں کی پوروں میں آتشیں سنسناہٹ جاگ گئی تھی۔ میں شیخ عاصم سے دوٹوک اور فیصلہ کن بات کرنا چاہتا تھا۔ درحقیقت میں ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا تھا کہ اب مجھے کسی خوف خطرے کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں نے شیخ عاصم کو کھوجنے کی ذمے داری سب انسپکٹر شجاعت کو سونپی تھی، اور یہ بات ساہی صاحب سے خفیہ رکھی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ساہی صاحب مجھے شیخ عاصم سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت وہ مجھے ان سنگین خطرات سے دور رکھنا چاہتے تھے جو شیخ عاصم کی صورت میں مجھے درپیش تھے۔ وہ ان معاملات کو قانونی طور پر حل کرنے کے خواہاں تھے لیکن مجھے اب یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں۔ قانونی کارروائی کو تو عاصم بس ایک آپشن کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اگر عدالتی فیصلہ اس کے حق میں ہوتا تو ہی وہ اسے منظور ہو سکتا تھا۔

میں نے تقریباً آدھ گھنٹا مزید سوچ بچار میں صرف کیا پھر جیکٹ کے نیچے پسٹل لگا کر اور پانچ چھ بھرے ہوئے میگزین جیبوں میں ڈال کر شیخ عاصم کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں برق رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا صرف چھ سات منٹ میں گلبرگ II کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میرے ذہن میں ایک سرخ آندھی چلنے لگی تھی۔ ویسی ہی آندھی جیسی عاصم کے بھائی راشد بن ارشد کے قتل کے موقع پر چلی تھی۔ اپنے جذبات کی حدت سے خود مجھے ہی پسینہ آنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ عاصم کا چہرہ دیکھنے کے بعد میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ ایک کار میرا تعاقب کر رہی ہے۔ یہ سفید فیاٹ تھی اور مسلسل عقب نما آئینے میں نظر آرہی تھی۔ مجھے اس تعاقب کا اندازہ عین اس وقت ہوا تھا جب میں عاصم کی قیام گاہ کے قریب پہنچنے والا تھا۔

ابھی میں اس تعاقب کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ عاصم کی قیام گاہ آگئی۔ میں نے دیکھا نیلے رنگ کی کوٹھی سے بلیک مرسیڈیز کار نکل کر اسی طرف جا رہی ہے جس طرف میں جا رہا ہوں۔ بس اتفاقاً ہی مرسیڈیز میں مجھے شیخ عاصم کی جھلک نظر آگئی۔ میں نے گاڑی نیلی کوٹھی کے سامنے روکنے کی بجائے مرسیڈیز کے پیچھے لگا دی۔ مرسیڈیز نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی اسپیڈ پکڑلی تھی۔ میں نے بھی رفتار بڑھا دی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں مرسیڈیز کے پیچھے تھا اور سفید فیاٹ میرے پیچھے تھی۔ جلد ہی میں نے مرسیڈیز کو جالیا۔

میں اپنی کار مرسیڈیز کے برابر لایا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے شیخ عاصم کو رکنے کا کہا۔ شیخ عاصم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے تعاقب سے بے خبر تھا۔ وہ چند سیکنڈ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے اپنے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی حرکت سے اندازہ ہوا کہ وہ ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ مرسیڈیز کی رفتار آہستہ ہوئی اور پھر وہ سڑک کے کنارے رک گئی۔

میں نے اپنی کار مرسیڈیز کے قریب ہی کھڑی کردی۔ میرے سر میں انگارے رینگ رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ آج اپنی اور شیخ عاصم کی جان ایک کردوں۔ میں گاڑی سے نکل کر شیخ عاصم کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اسی طرح رعونت سے گاڑی میں بیٹھا رہا۔ بس بٹن دبا کر اس نے کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے کردیا تھا۔ اگلی سیٹ پر عاصم کا لمبا تڑنگا گن مین بھی موجود تھا۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورنا شروع کردیا تھا۔

عاصم نے مجھ سے کہا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "نیچے اتر کر بات کرو۔"

گن مین حقِ نمک ادا کرتے ہوئے تڑپ کر نیچے اترا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

اس سے پہلے کہ کشیدگی مزید بڑھتی، سفید فیاٹ کار میرے بالکل قریب آن رکی۔ اس میں دو سفید پوش پولیس والے تھے۔ میں انہیں شکلوں سے پہچانتا تھا کیونکہ انہیں کئی بار ساہی صاحب کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ پولیس والوں میں سے ایک نیچے اترا۔ پتا نہیں اس نے کیا سمجھ کر مجھے سلیوٹ کیا پھر ادب سے بولا "ایس ایس پی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ نیچے جھکا اور وائرلیس سیٹ کا مائیک اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ دوسری طرف واقعی ساہی صاحب تھے۔ وہ بلا تمہید بولے "شاہ جہاں! تم شیخ عاصم سے جھگڑا نہیں کرو گے۔" ساہی صاحب کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ یہاں کی ساری سچویشن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یقیناً ان کے ماتحت راستے میں ان کے لیے مسلسل کمنٹری کرتے رہے تھے۔

میں نے کہا "میں اس سے کوئی جھگڑا مول نہیں لے رہا۔ بس دو باتیں کرنا چاہتا ہوں اس سے۔"

وہ بولے "میں جانتا ہوں تم کون سی باتیں کرنا چاہتے ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جلیس اور غزالہ

وغیرہ کا پتا چل گیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا "کیا آپ یقین سے کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل یقین سے کہہ رہا ہوں۔ میرے پاس جلیس کی کال آئی ہے۔ غزالہ نے بھی بات کی ہے۔ وہ لوگ اپنی مرضی سے گئے ہیں۔"

"کہاں سے آئی ہے کال؟"

"لاہور کے باہر سے آئی ہے۔ بہرحال تم آتے ہو تو میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

وائرلیس پر بات ختم کرکے میں نے عاصم کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل تیز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میری کھوپڑی میں دہکنے والے انگارے اب قدرے سرد پڑ گئے تھے تاہم سینے میں بھرا ہوا دھواں بدستور موجود تھا۔

"کیوں روکا ہے مجھے؟" عاصم زہرناک لہجے میں بولا۔

"کسی کام سے روکا تھا۔ اب وہ کام تو نہیں ہے لیکن دو تین اور کام تم سے ہیں۔"

"کیا کام ہیں؟"

"کیا یہیں سڑک پر کھڑے کھڑے بات کرنا چاہتے ہو۔"

وہ زہرخند لہجے میں بولا "تم اس قابل تو نہیں ہو کہ تم سے کہیں بیٹھ کر بات کی جائے لیکن اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں پوری کر دیتا ہوں۔"

"بہت شکریہ۔ ذرہ نوازی ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کی اس عنایت کے لیے مشکور ہو سکوں۔ میری آنے والی نسلوں پر یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔"

شیخ عاصم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سگار کا ایک طویل کش لے کر خود کو پرسکون کیا اور بولا "کب اور کہاں ملنا چاہتے ہو؟"

"جہاں تم کہو۔"

"تمہارے عالی شان ہوٹل میں ہی مل لیتے ہیں۔ تمہارا چائے پانی کا خرچا بھی بچ جائے گا۔"

"تم چائے پانی کی بات کر رہے ہو' اگر تم انسان بننے کی بات کرو تو میں وہ ہوٹل ہی تمہارے نام لکھ سکتا ہوں۔"

"غالباً تم اپنے حق سے دستبردار ہونے کو انسان بننا کہتے ہو۔ بہرحال میں سڑک پر ایسی باتیں کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ تم میرے سیکیورٹی گارڈ کو وقت اور جگہ بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا وہ پھر سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے کل شام سات بجے۔ گولڈ ہوٹل۔ سویٹ نمبر 9۔ اپنے ساتھ یہ رائفلوں والے کرایے کے ٹٹو مت لانا۔ میں وہاں اکیلا ہوں گا تم بھی اکیلے آ جانا۔"

شیخ عاصم نے بٹن دبا کر شیشہ اوپر چڑھا دیا۔

شیخ عاصم سے فارغ ہونے کے بعد میں سید عامر صاحب کے پاس ان کے آفس پہنچا۔ ساہی صاحب اس بات پر خوش تھے کہ ان کے کہنے پر میں نے شیخ عاصم سے جھگڑا نہیں لیا۔ انہوں نے کہا "مجھے تمہاری طرف سے اس اندیشہ پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دو اہلکار میں تمہاری نگرانی پر لگا رکھے تھے۔ میری یہ احتیاطی تدبیر آج سودمند ثابت ہوئی ہے۔"

"کیا چچا جلیس کے بارے میں آپ کی اطلاع درست تھی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں تو یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ آپ نے لڑائی ٹالنے کے لیے یہ فرضی اطلاع مجھے دی ہو۔"

"نہیں یہ اطلاع فرضی نہیں۔ جلیس کا فون واقعی آیا ہے' جلیس کے علاوہ غزالہ نے بھی بات کی ہے۔ لیکن یہ نہیں چل سکا کہ جلیس نے فون کہاں سے کیا ہے۔ میرے بار بار کہنے کے باوجود جلیس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنی لوکیشن چھپانا چاہتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیخ عاصم کے ساتھ ساتھ تم سے بھی دور رہ جانا چاہتے ہیں۔ خود کو تمام قسم کے خطرات سے بالکل الگ تھلگ کر لینا چاہتے ہیں۔"

"کیا مجھ سے بھی انہیں کوئی خطرہ ہے؟"

"تم سے خطرہ جلیس اور غزالہ بی بی کو تو نہیں لیکن تمہاری بھابی تم سے خطرہ محسوس کرتی ہو۔ تمہیں اس کے تیز مزاج کا پتا ہی ہے۔"

"کیا انہوں نے دوبارہ فون کرنے کے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"میں نے اس سے وعدہ تو لیا ہے کہ وہ دوبارہ فون کرے گا' لیکن اس وعدے کے ایفا ہونے کی امید کم ہی نظر آتی ہے۔"

ساہی صاحب سے کافی دیر تک بات ہوتی رہی۔ انہوں نے بتایا کہ جلیس نے مجھ سے بڑے ایزی موڈ میں بات کی ہے۔ ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف یہ بات کر رہے ہوں۔

میں نے جانے کی اجازت چاہی تو ساہی صاحب نے کہا "کیا اسپتال جا کر ہارون پاشا سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں جناب! اس وقت میرا دل کچھ کرنے کو نہیں کر رہا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ساہی صاحب بولے "ایک اخباری رپورٹر نے پتا نہیں کس طرح ٹوہ لگائی ہے کہ ہارون پاشا کی گرفتاری میں تمہارا ہاتھ ہے۔ وہ اس حوالے سے ایک سنسنی خیز آرٹیکل لکھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ مجھ سے بھی ملنے آیا تھا لیکن میں پاشا کے پاس اسپتال گیا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پھر اس کا فون آیا ہے۔"

"یہ لوگ ہر وقت اپنا کاروبار چمکانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ خبر چھپنے سے کسی کو زندگی ملتی ہے یا جان جاتی ہے' انہیں کچھ غرض نہیں ہوتی۔"

ساہی صاحب نے پوچھا "عاصم سے کوئی تلخ بات تو نہیں ہوئی؟"

"بس یوں سمجھیں کہ ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے ساہی صاحب کو اس میٹنگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو کل شام میرے اور شیخ عاصم کے درمیان گولڈ ہوٹل میں ہونے والی تھی۔

اگلے دن تک میں نے بڑی مشکل سے وقت گزارا۔ مقررہ وقت پر میں گولڈ ہوٹل پہنچ گیا۔ منیجر سلطان آغا تو میری ہدایت پر روپوش تھا' اس کی جگہ ایک خوب رو لیڈی منیجر خدمات انجام دے رہی تھی۔ اس نے بڑے تزک و احتشام سے مجھے لابی میں بٹھایا۔ چند منٹ بعد شیخ عاصم بھی وہاں پہنچ گیا۔ آج میں نے اسے روشنی میں ذرا غور سے دیکھا۔ پچھلے تین ماہ میں اس کا وزن کافی کم ہوا تھا۔ چہرے پر بھی پہلے جیسی لالیاں باقی نہیں رہی تھیں۔ یہ سب اس معاشی بحران کا نتیجہ تھا جو شیخ عاصم کے کاروبار کو درپیش تھا۔ کاروباری خسارے اور لین دین کی الجھنوں نے اسے آدھا کر دیا تھا۔ مرزا جی کلارک کی کاروباری مار شیخ عاصم کے لیے بڑی تباہ کن ثابت ہوئی تھی۔

رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم ہوٹل کے سویٹ نمبر 9 میں آ گئے۔ یہ ہوٹل کا بہترین سویٹ تھا۔ خوب صورت نشست گاہ میں ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے اور رنگین پانی کا ایک نہایت دیدہ زیب فوارہ نشست گاہ کے عین وسط میں نصب تھا۔ عاصم نے اپنے لیے وائن منگوائی' میں نے سافٹ ڈرنک پر اکتفا کیا۔

عاصم بولا "میں اپنے ساتھ کوئی مسلح شخص نہیں لایا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ بھی نہیں ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک پرامن گفتگو کریں۔ بے شک ہم دشمن ہیں اور اس دشمنی سے ہاتھ کھینچ لینا اب ہمارے بس میں نہیں لیکن دشمنی کی بات بھی میز پر بیٹھ کر شائستہ طریقے سے کی جا سکتی ہے۔"

"بالکل کی جا سکتی ہے۔" میں نے کہا "تم اس وقت میرے ہوٹل میں ہو۔ میری خواہش ہوگی کہ تم جس طرح یہاں آئے ہو اسی طرح سلامتی سے واپس جاؤ۔"

"گڈ۔ مجھے امید تھی کہ تمہاری سوچ یہی ہوگی۔" شیخ عاصم نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے اندر جو کچھ موجود ہے اسے دیکھ کر شاید تمہیں تکلیف ہو لیکن یہ بات مت بھولو کہ دشمن ہونے کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے کا کوئی کمزور پہلو اختیار نظرانداز نہیں کر سکتے۔"

"لیکن اس میں ہے کیا؟" میں نے بیزاری سے پوچھا۔

"اس میں کچھ تصویریں ہیں۔ میں تم سے حلفاً کہتا ہوں کہ یہ تصویریں میری خواہش پر نہیں کھینچی گئیں اور نہ اس واقعے میں میرا کوئی عمل دخل ہے۔ یہ تصویریں مجھے کسی نے فروخت کی ہیں۔ میں نے انہیں منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیا ہے۔ تم جو کچھ بھی سمجھو لیکن میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ اس قسم کی خطرناک تصویریں کسی اور کے ہاتھ میں رہیں۔

انسانی عقل سے ماورا ایک اعصاب شکن داستان
سیاہ راکھ کے ٹکڑے کا قصہ جس میں پیتلاواں خبیث قوتیں پلڑا رہی تھیں۔
وجیہہ سحر
راکھ
قیمت 100 روپے
دھواں آسیب کا حسین پروفا سے کیا تعلق تھا؟
ویران حویلی میں خون سے بھرے چراغ کون جلاتا تھا؟
کشیا جی کون تھا؟ اماوس کی رات وہ کیا عمل کرنے والا تھا؟
تین چراغوں میں اس کی ماں، بہن اور بھائی کا خون جل رہا تھا۔
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
علی میاں پبلیکیشنز
7247414

ان تصویروں کے اوریجنل نیگیٹو بھی میرے پاس موجود ہیں۔"

"کس کی تصویریں ہیں؟"

"تمہاری۔" شیخ عاصم نے کہا اور مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرے سر پر بم کا دھماکا کر دیا ہے۔

"کیا میں دیکھ سکتا ہوں۔"

"تمہیں دکھانے کے لیے ہی تو لایا ہوں لیکن دیکھنے سے پہلے ایک بات ضرور ذہن میں رکھنا۔ یہ تصویریں کھینچے جانے میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔"

شیخ عاصم نے لفافہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے لفافہ کھولا اور دنگ رہ گیا۔ یہ میری تصویریں تھیں اور میں نازیبا حالت میں شکیلہ کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ وہی نوخیز حسینہ جو پانچ ہفتے تک میرے ساتھ ایک یخ بستہ قبر میں دفن رہی تھی اور پھر سسک سسک کر دم توڑ گئی تھی۔ وہ جب مری تھی تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکی تھی۔ اس کے خوب رو چہرے کو بھوک کی دھوپ چاٹ گئی تھی لیکن اس وقت جو تصویریں میرے سامنے بکھری پڑی تھیں ان میں شکیلہ ایک حسین گڑیا کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ دلہن کے لباس میں تھی۔ کسی تصویر میں لباس پورا تھا۔ کسی میں آدھا' کسی میں چوتھائی اور کسی میں ناپید۔

یہ تصویریں اسی منحوس تہ خانے میں کھینچی گئی تھیں جس میں میں نے اپنی زندگی کے بدترین دن گزارے تھے۔ بہت سی تصویروں میں میرے جسم پر بھی لباس کا تار نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو ایک عجیب بات میں دیکھ رہا تھا وہ یہ تھی کہ میں ہوش میں تھا۔ میرے چہرے پر ایک طرح کی خواب ناکی ضرور تھی لیکن میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔ یہ بالکل زندہ تصویریں تھیں۔ ان میں کسی طرح کا کیمرا ٹرک وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے بے اختیار سر تھام لیا۔ یہ سب کچھ کب ہوا تھا اور کیسے؟ پتا نہیں کیوں میرے ذہن کے اندر کہیں گہرائی میں پراسرار جنبش سی ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جو مناظر میں تصویروں میں دیکھ رہا ہوں وہ کہیں دیکھے ہوئے ہیں۔ بہت دھندلے دھندلے سے نقش پردہ تصویر پر بن بن کر مٹ رہے تھے۔ اگر میں نے یہ مناظر یا ان سے ملتے جلتے مناظر کہیں دیکھے تھے تو پھر مجھے یاد کیوں نہیں رہے تھے۔ میرا دماغ پنگھوڑے کی طرح گول گول گھوم رہا تھا۔ کسی تصویر میں شکیلہ کو چومتا نظر آتا تھا۔ کسی میں وہ میری بانہوں کے گھیرے میں تھی۔ ایک تصویر میں' میں اس کی عریاں گود میں سر رکھے لیٹا تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ پس منظر میں شکیلہ کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے اور اس دن کا اخبار بھی نظر آ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ میں کسی خواب آور دوا کے اثر میں نہیں تھا' نہ ہی نشے میں تھا۔ اگر نشے میں ہوتا بھی تو یہ ہو سکتا تھا کہ اس رات کے واقعات میرے ذہن سے یوں ہوتے کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہتا۔

"کیا سوچ رہے ہو شاہ جہاں۔" عاصم نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سخت سردی میں بھی میری پیشانی پر پسینہ موجود ہے۔ عاصم نے کہا "زیادہ حیران ہونے کی بات نہیں۔ تم نے ایسی کیمیکل گیس کے بارے میں تو سنا ہو گا جو اعصاب کو مفلوج کر دیتی ہے۔ بندہ ہوش میں رہتا ہے لیکن اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور جسم بھی۔ اب کیمیائی گیس کو ایسے سیال کی شکل بھی دی جا چکی ہے جسے انجیکٹ کیا جا سکتا ہے۔"

میری نگاہوں میں تہ خانے کے مناظر گھومنے لگے۔ یاد آیا کہ میں تہ خانے میں بے ہوش ہوا تھا۔ ایک تیز بو تھی جو مجھ سے ٹکرائی تھی اور میں نے ہوش کھو دیے تھے۔ اس کے بعد جب میں ہوش میں آیا تھا تو کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کتنی دیر تک اپنے حواس میں نہیں رہا ہوں۔ اپنی بڑھی ہوئی شیو سے میں نے قیافہ لگایا تھا کہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں ایک دن سے زائد گزرا ہے۔ مجھے اپنے بازو پر ایک دو انجیکشن کی دکھن بھی محسوس ہوئی تھی۔

تو کیا عاصم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اشرف چچا یعنی بارونق نے مجھے اعصابی طور پر یکسر مفلوج کر کے میرے ساتھ شکیلہ کو لٹایا تھا اور یہ تصویر کشی کی تھی؟ یہ سب کچھ میرے لیے حد تکلیف دہ اور سنسنی خیز تھا۔ آج دو ڈھائی ماہ بعد مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تھا جو تہ خانے میں بار بار میرے ذہن میں ابھرا تھا اور وہ سوال یہ تھا کہ مجھے چوبیس گھنٹے یا اس سے بھی زائد وقت کے لیے بے ہوش کیوں کیا گیا تھا۔ شیخ عاصم کی منحوس آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ بولا "شاہ جہاں! تم اچھی طرح جان سکتے ہو کہ تمہاری یہ بدترین تصویریں کس طرح تمہارے کردار کے چیتھڑے اڑا سکتی ہیں۔ اگر یہ تصویریں تمہارے چچا اور چچی کی بیٹی (غزالہ) تک پہنچ جائیں تو وہ تمہارے بارے میں ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ وہ انداز تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہو گا۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور طویل کش لے کر بولا "اب میں تم سے وہ سوال کرتا ہوں جو تمام بلیک میلروں سے کیا جاتا ہے۔ مجھے تم سے یہ تصویریں واپس حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہو گا؟"

"میں پھر اپنی بات دہراؤں گا۔ تم مجھے بلیک میلر نہیں کہہ سکتے کہ میں نے یہ تصویریں کھینچنے کا منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ یہ کسی اور کا منصوبہ تھا۔ اس نے کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنی اس کامیابی کو کھلی مارکیٹ میں کسی سے بھی کیش کرا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ تصویریں کسی ایسے شخص یا ایسی پارٹی کے ہاتھ لگ جاتیں جس سے تمہیں کہیں زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ تصویریں خرید کر اور اس کے ذریعے مجھے دباؤ میں لانے کی کوشش کر کے تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔"

"میں اسے نیک نہیں کہہ رہا۔ لیکن ممکن ہے کہ اس برے کام کا نتیجہ نیک نکل آئے۔ ویسے دنیا تو یہ بھی کہتی ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔"

"ہاں محبت اور جنگ میں تو سب کچھ جائز ہوتا ہے۔" میں نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو شیخ عاصم۔"

اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا "میرا اولین مطالبہ تو یہی ہے کہ میرے اور غزالہ کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔"

"تمہارا یہ پہلا مطالبہ ہی میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔"

"حالانکہ تمہیں اور بھی بہت کچھ حلق سے اتارنا پڑے گا۔"

"مثلاً۔"

"تمہاری بہن کی برات کی واپسی کا مسئلہ بھی ابھی تک حل طلب ہے۔ ہم لوگ اپنی منگ چھوڑتے نہیں ہیں اور اس کے لیے اکثر خون کی ندیاں بھی بہہ جاتی ہیں۔ بہرحال اگر پہلا مطالبہ قبول کر لیتے ہو تو پھر اس دوسرے مسئلے پر کھلے دل سے بات چیت کی جا سکتی ہے۔ ہمارے رواج کے مطابق ایسے تنازعے کے تصفیے کے لیے متاثرہ پارٹی کو ہرجانہ دیا جاتا ہے یا پھر رشتے وغیرہ دے کر دشمنی کی بنیاد ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

"اس کے علاوہ کیا مطالبے ہیں؟"

"باقی تو بس ایک دو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔" شیخ عاصم نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"ان مطالبوں پر بات کرنے کے لیے وقت چاہیے۔ کیا ہم کسی اور دن کی نشست رکھ لیں۔" میں نے جان بوجھ کر کہا۔

"کیا اب تمہیں کوئی جلدی ہے؟"

"نہیں مجھے تو کوئی ایسی خاص جلدی نہیں' میں تمہاری بات کر رہا تھا۔"

"میں بھی وقت نکال کر آیا ہوں۔" شیخ عاصم نے کہا "دو۔ تین۔ چار گھنٹے۔ جتنی دیر چاہو' بات کر سکتے ہو۔"

"کوئی ڈسٹرب تو نہیں کرے گا ہمیں؟"

شیخ عاصم نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔ میں بس یہی کنفرم کرنا چاہتا تھا۔ میرے جسم میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں لیکن چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے ایک دم اپنی جگہ سے حرکت کی اور شیخ عاصم کے اوپر گرا۔ اسے میرے رد عمل کی بالکل توقع نہیں تھی اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ میرا بازو اس کی توانا گردن کے گرد کسا جا چکا تھا۔ اس نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کی لیکن ہلکی سی "گیں گیں" کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ میں نے کہا "ایک بھولی ہوئی کوٹیشن یاد کرانے کا بہت شکریہ۔ واقعی محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ بے شک تم میری چھت کے نیچے ہو لیکن ہم حالت جنگ میں ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے عاصم کی چربیلی گردن پر اپنا دباؤ بڑھایا۔ وہ ذرا سا مچلا اور ساکت ہو گیا۔ کچھ دیر کے لیے اس کے ذہن سے اس کے حواس کے تار کٹ گئے تھے میں نے اس کی گردن چھوڑی تو وہ پہلو کے بل صوفے پر لڑھک گیا۔ عاصم کا جسم کافی ٹھوس اور گٹھا ہوا تھا۔ جبڑے چوڑے اور گردن غیر معمولی طور پر موٹی تھی۔ اس کی صورت میں کچھ ایسی کرختگی اور نخوت تھی کہ نظر میں فوراً کھٹک جاتی تھی۔ میں تو خیر تھا ہی اس کا دشمن و رقیب۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ عام شخص بھی اسے دیکھ کر کوئی اچھی رائے قائم نہیں کرتا ہو گا۔

اس کے گرانڈیل جسم کو دیکھ کر یہ خیال فوراً ذہن میں کچوکے لگاتا تھا کہ یہی وہ جسم ہے جو غزالہ کو بے بس کرتا رہا ہے۔ اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہے۔ اسے روندتا رہا ہے۔ اپنی طاقت اور حیثیت کا خراج اس سے وصول کرتا رہا ہے۔ آج بھی میں نے عاصم کو صوفے پر لڑھکے دیکھا تو ذہن میں انگارے دہک اٹھے۔ میں نے بے اختیار اس کے جسم پر کئی ٹھوکریں برسا دیں۔

انٹرکام پر میں نے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر رضوان احمد کو بلایا۔ وہ ایک جواں سال شخص تھا۔ اندر کی صورتِ حال دیکھ کر پہلے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اسے سمجھانے بجھانے میں تین چار منٹ صرف کیے اور نارمل کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے کیا کیا کرنا ہے اور کیسے؟

رضوان نے مجھے نائیلون کی ایک رسی بھی لا دی جس کے ذریعے میں نے عارضی طور پر شیخ عاصم کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے شجاعت کو فون کیا "ٹبی تھانے میں آج کل کون ہے؟" میں نے شجاعت سے پوچھا۔

"کوئی بھی ہو جناب! آپ کام بتائیں۔"

"دو زبردست قسم کی پیشہ ور لڑکیاں درکار ہیں۔"

"کیا کام لینا ہے جناب؟"

میں نے اسے کام کی تفصیل بتائی تو وہ بولا "میرے خیال میں اس کام کے لیے فلم اسٹوڈیو جانا زیادہ مناسب رہے گا۔ ایک ایکسٹرا سپلائر سے علیک سلیک ہے۔ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں۔"

"رابطہ نہیں کرنا، ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑکیوں کو یہاں پہنچانا ہے۔"

"بس جناب! آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں ہو گیا۔"

رضوان کے ذمے میں نے جو کام لگائے تھے اس نے میری توقع سے بھی زیادہ تیزی سے انجام دیے۔ سچ کہتے ہیں کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ اگر ایک ہوشیار شخص کے پاس پیسہ موجود ہو تو وہ اس سے ناممکن کو ممکن کر ڈالتا ہے۔ میں نے رضوان کو فری ہینڈ دیا تھا اور وہ ایک ہوشیار شخص تھا۔ ایک نہایت قابل نیورو فزیشن ہاتھ باندھے میرے روبرو کھڑا تھا۔ میں نے اس سے رضوان کے آفس میں ہی ملاقات کی اور پھر اس سے منہ مانگے معاوضے پر معاملہ طے کر لیا۔ نیورو فزیشن نے شیخ عاصم کو اعصاب شل کرنے والی دوا کی ڈوز مقررہ مقدار میں دینا تھی۔ دوا بھی فزیشن نے خود ہی فراہم کرنا تھی۔ اس سلسلے میں نتائج کی ساری ذمے داری اسی کی تھی۔

ایک ماہر کیمرہ مین بھی بوتل کے جن کی طرح آن حاضر ہوا تھا اور ایک ملحقہ کمرے میں بیٹھا ہمارے اگلے حکم کا منتظر تھا۔

معمولی سی تاخیر کے ساتھ سب انسپکٹر شجاعت بھی دو خوش شکل لڑکیوں کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔ لڑکیاں ذرا ڈری ہوئی تھیں۔ تاہم چرب زبان رضوان نے ان پر پانچ دس منٹ صرف کیے اور انہیں کافی حد تک نارمل کر دیا۔ گھنٹے کے اندر اندر پورا اسٹیج تیار ہو گیا۔ نیورو فزیشن نے شیخ عاصم کے تمام وائٹل سائنز چیک کرنے کے بعد ا منٹ کے وقفے سے دوا انجکشن لگائے پھر اسے ہوش میں کے لیے دوا سونگھائی۔ عاصم نے پہلے ہی کسمسانا کر دیا۔ دوا سونگھانے کے چند منٹ بعد وہ ہوش میں آ

اس کا ہوش میں آنا ایک نارمل انسان جیسا نہیں وہ صوفے پر چت پڑا تھا آنکھ جھپک رہا تھا نہ ہاتھ پاؤں تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری تھی۔ ڈاکٹر فہ ایک بار پھر اس کا بلڈ پریشر وغیرہ چیک کیا۔ ہمیں دکھا لیے ڈاکٹر فہیم نے عاصم کا بازو موڑ کر اس کے سر پر رکھ بازو وہیں کا وہیں پڑا رہا۔ لگتا تھا کہ عاصم اپنی کیفیت ہماری موجودگی سے آگاہ ہے لیکن کسی بھی طرح کا ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ یہاں تک کہ اپنے چہرے پر یا غصے وغیرہ کے تاثرات بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ غالباً اپنے لعاب دہن پر بھی کنٹرول نہیں تھا۔ اس کی باچھوں پر چمک نظر آ رہی تھی۔

میں نے شیخ عاصم کے عین سامنے آ کر اس کی آ میں جھانکا۔ لگتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے لیکن پھر بھی دیکھ رہا۔ میں نے سوچا، یقیناً ایک دن ایسی ہی حالت میر بھی۔ ہارون پاشا اور دیگر لوگ ایسے ہی میرے ارد گر رہے ہوں گے اور میں انہیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھ ر گا۔ میڈیکل سائنس جہاں انسان کے لیے بہترین سہ پیدا کرتی ہے وہاں اسے بدترین مشکلات سے بھی دوچار ہے۔

رضوان کو شیخ عاصم کے سلسلے میں ضروری ہدایات کے بعد میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے باہر آ کچھ ہی دیر بعد رضوان نے دونوں لڑکیوں کو اندر آ اشارہ کر دیا۔

○☆○

تقریباً دو گھنٹے بعد جب میں کمرے میں دوبارہ داخل بہت کچھ بدل چکا تھا۔ شیخ عاصم ایک مرتبہ بے لباس کے بعد پھر لباس میں آ گیا تھا۔ اس دوران میں وہ قا بچھے ہوئے گداز گدے پر لیٹا رہا تھا۔ دونوں رنگین بھی اس کے ساتھ رہی تھیں۔ ان سارے مناظر کی گئی تھی۔

درحقیقت میں نے شیخ عاصم کو اسی کے سکوا جواب دیا تھا۔ یہ بڑا منہ توڑ جواب اور فوری جواب تھا

نے دیکھا، شیخ عاصم ابھی تک نارمل نہیں تھا۔ نیورو فزیشن فہیم ریاض نے اسے جلد نارمل کرنے کے لیے اوپر تلے تین انجکشن دیے تھے، پھر بھی اس کی حرکات و سکنات میں ابھی باقاعدگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ فہیم کی ہدایت پر شیخ عاصم کو تیز قسم کی کافی پلائی گئی۔ اس کافی نے مثبت اثر کیا اور عاصم کا ذہن بہتر طور پر کام کرنے لگا۔ عاصم کی پیشانی اور ہونٹوں پر ابھی تک لپ اسٹک کے سرخ اور نسواری داغ موجود تھے۔

میں نے ٹشو پیپر سے یہ داغ پونچھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو عاصم! اب میرے پاس بھی ایک لفافہ ہے۔ اگر تم چاہو تو اس لفافے کی تصویریں دیکھ سکتے ہو۔ اور اس کے بعد اگر چاہو تو ہم دونوں لفافوں کا تبادلہ بھی کر سکتے ہیں۔"

عاصم کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ میں نے کہا "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ شاہ جہاں تمہاری زبردستی کو آسانی سے قبول کر لے گا۔ میری ساری عمر بلیک میلروں سے ٹکراتے ہوئے گزری ہے عاصم۔ قدرت کی مہربانی سے ان گنت لوگوں کو بلیک میلروں کے چنگل سے نکالا ہے۔ خود کو تمہارے پنجے میں کیسے پھنسوا سکتا تھا۔"

میں نے لفافے میں سے کچھ تصویریں نکال کر عاصم کے سامنے کیں۔ یہ ویسی ہی تصویریں تھیں جیسی ہونی چاہئیں تھیں۔ دونوں پیشہ ور لڑکیوں نے کیمرہ مین کی ہدایت پر عاصم سے خوب اٹکھیلیاں کی تھیں۔ عاصم کے جسم کا کوئی حصہ نہیں تھا جو ایکسپوز ہونے سے رہ گیا ہو۔ عاصم دشمنی کرتے کرتے بہت نچلی سطح پر چلا گیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس سطح پر اترنا پڑا تھا ورنہ مجھے دشمنی کا یہ انداز کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب میں استاد جمالی کی حیثیت سے کراچی اور بمبئی کے گلی کوچوں میں دنگے کیا کرتا تھا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے شیخ عاصم سے پوچھا۔

عاصم کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا۔ اس نے کچھ کہا بھی لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔

میں نے کہا "تمہاری طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جا کر آرام کرو۔ کل یا پرسوں پھر میٹنگ کا وقت طے کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" عاصم کے حلق سے مدھم آواز نکلی۔

وہ اٹھنے کی کوشش میں ایک بار ذرا سا لڑکھڑایا، پھر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا "کیا تم میرا سہارا لینا پسند کرو گے۔"

طاہر جاوید مغل کے طلسم ہوشربا قلم سے ایک اور خوبصورت ناول
آندھی
ایک آپ بیتی، خونچکاں اور ولولہ انگیز داستان۔ ایک نہ رکنے والا ایڈونچر جس میں آپ بہتے چلے جائیں گے۔
قیمت:
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور۔ فون ۷۲۳۸۵۰۳

اس نے میرے طنز کو سمجھتے ہوئے بڑی نفرت سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے پہنے، تسمے بند کیے اور پھر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی لیکن اس لڑکھڑاہٹ کو نشے پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ وہ راہداری میں پہنچا۔ لابی میں اس کا ڈرائیور موجود تھا۔ باوردی ڈرائیور نے اٹھ کر شیخ عاصم کو سلیوٹ کیا، پھر وہ لوگ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

غزالہ کی گمشدگی میرے لیے مسلسل سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ میں نے شجاعت کو ذمے داری سونپی تھی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی کھوج لگائے۔ یہی ذمے داری شجاعت پر ساہی صاحب کی طرف سے بھی تھی۔ وہ پوری تگ و دو کر رہا تھا۔ میں کالی رات تک جاگتا رہا۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟

اچانک میرا دھیان آفرین کی طرف چلا گیا۔ وہ غزالہ کی سہیلی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اسے کچھ خبر ہو۔ میں نے آفرین کو فون کیا۔ گھر کے کسی بزرگ نے فون اٹھایا، بہرحال میری درخواست پر اور میرے لہجے کی بے پناہ سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے آفرین سے میری بات کرا دی۔

مجھے محسوس ہوا کہ آفرین کی آواز کچھ بھاری بھاری ہے۔ اس کا لہجہ بھی گمبھیر تھا۔ وہ بولی "شاہ جہاں صاحب! پرسوں کسی نامعلوم جگہ سے غزالہ نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ بے حد مضطرب تھی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ مایوسی کے عالم میں کہیں پاکستان چھوڑ کر ہی نہ چلی جائے۔ اگر اس پر نانی کی ذمے داری نہ ہوتی تو پتا نہیں وہ کیا کر گزرتی۔"

"اس نے کہا کیا ہے؟"

"شاہ جہاں صاحب! وہ ہم سب سے مایوس ہے اور شاید آپ سے بھی۔"

"مجھ سے کیوں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی لیکن پہلی بار میں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ وہ آپ کی طرف سے بھی دکھی ہے۔"

"میں تو اس کے دکھوں سے لڑتے ہوئے خود سراپا دکھ بن گیا ہوں۔ میں اسے کیا دکھ دے سکتا ہوں۔"

آفرین بولی "اس کی والدہ کی طبیعت بھی مسلسل خراب ہے۔ جس دن آپ ان کے گھر گئے تھے ان کے سینے میں درد شروع ہوا تھا۔ اب تک وہ ٹھیک نہیں ہوا۔"

"وہ مکاری کر رہی ہے۔" میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"کیا کہا آپ نے؟" آفرین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے بات بدل دی۔ پھر آفرین سے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے ان دو چار دنوں میں میری طرف سے غزالہ کو کیا دکھ پہنچا ہوگا۔"

اس نے ٹھیک سے کچھ بتایا نہیں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ جس رات انکل جلیس اور بابا گھروالے گھر پہنچے تھے کوئی شخص ان کے گھر آیا تھا۔ اس کا تعلق غزالہ کے سابق شوہر شیخ عاصم سے تھا۔ اس نے ہی کوئی بات کہی جس کی وجہ سے غزالہ اس حد تک اپ سیٹ ہوئی ہے۔ چھوڑنے کی بات تو بدھ کی دوپہر سے ہی گھر میں چل رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد وہ لوگ فوری طور پر ایک نتیجے پر پہنچ گئے، اور وہ نتیجہ یہ تھا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

ایک دم میرے ذہن میں برق سی کوندی۔ چند لمحوں کے اندر میری سمجھ میں آ گیا کہ غزالہ کی حد درجہ مایوسی اور دکھ کی وجہ کیا ہے۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ آج شام جن تصویروں نے میری آنکھوں میں خنجر اتارے تھے وہی تصویریں غزالہ کی آنکھوں میں بھی شعلے بن کر اتری ہوں۔ شیخ عاصم جیسے رذیل دشمن سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

میں نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپاتے ہوئے آفرین سے بات جاری رکھی۔ آخر میں میں نے اسے کہا کہ اگر غزالہ کی طرف سے پھر رابطہ ہو تو وہ اس کا پتا ٹھکانا یا فون نمبر پوچھنے کی کوشش کرے اور غزالہ کو بتائے کہ اگر اسے میرے خلاف کوئی اطلاع دی گئی ہے تو یہ سراسر اسے بھٹکانے کی ایک گھناؤنی کوشش ہے۔

فون بند کرنے کے بعد میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میرے سینے میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری اور شیخ عاصم کی دشمنی نقطہ عروج پر پہنچ گئی ہے اور اب بھرپور قوت سے ٹکراؤ ہو کر رہے گا۔ میری انگلیوں کی پوروں میں ایک عجیب سی سنسناہٹ جاگ اٹھی تھی۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو کون؟"

دوسری طرف سے جواب بھی نہیں آیا۔ "کون ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔ اس مرتبہ بھی فقط سانسوں کی بھاری آواز سنائی دیتی رہی۔ دھیان فوراً غزالہ کی طرف چلا گیا لیکن اسے تو شاید یہ فون نمبر معلوم ہی نہیں تھا۔ کون ہو سکتا ہے؟ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ دوسری طرف مسلسل خاموشی طاری تھی۔ یکایک میرا دھیان ان آوازوں کی طرف چلا گیا جو پس منظر سے ابھر رہی تھیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش ایک دم انتہا کو چھو گئی۔

یہ ایک بچے کی آوازیں تھیں۔ اس نے دو تین بار زور سے پکار کر ماما کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فون کرنے والے نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچے کی آواز معدوم ہو گئی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ پس منظر سے ابھرنے والی آواز تابش کی تھی۔ چند سیکنڈ بعد فون بند ہو گیا۔ میں ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ فون غزالہ نے کیا ہے۔ فون کا دورانیہ قریباً ایک منٹ تھا۔ اس ایک منٹ میں میں نے دو باتیں بڑی وضاحت سے نوٹ کی تھیں۔ ایک تو بچے کی آواز جو پس منظر میں ابھری تھی۔ اس آواز کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ یہ تابش کی آواز تھی۔ دوسرا یہ کہ جس جگہ سے فون کیا گیا تھا وہ بڑی سڑک کے قریب تھی کیونکہ وہاں سے بھاری ٹریفک گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ تیسری آواز کسی مشین کے چلنے کی تھی۔ یہ مشین زوردار آواز سے مسلسل چل رہی تھی۔ آواز بہت تیز تھی۔

ریسیور واپس کریڈل پر رکھ کر میں بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دماغ میں انگارے دہک رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفرین سے میری جو بات ہوئی تھی وہ ایک آتشیں بگولے کی طرح مسلسل میرے دماغ میں چکرا رہی تھی۔ میرا ذہن رہ رہ کر شیخ عاصم کی طرف جا رہا تھا۔ اس شیطان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے بدترین خدشات درست ہوں۔ شیخ عاصم نے کسی طرح میری وہ تصویریں غزالہ تک پہنچا دی ہوں جو بقول شیخ عاصم کے اس نے بھاری قیمت دے کر خریدی تھیں۔ غزالہ اتنی نادان نہیں تھی کہ فوری طور پر ان تصویروں کا اثر قبول کر لیتی لیکن حالات ایسے ہو رہے تھے جن میں ذرا سی ٹھوکر بھی اس کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہو کر اس کے حوصلے کو توڑ سکتی تھی۔ میرا جی چاہا شیخ عاصم میرے سامنے ہو اور میں نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر اپنے پسٹل کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں۔ اپنی شکست سامنے دیکھ کر وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹیلی فون کو دیکھنے لگا۔ دل کہہ رہا تھا کہ غزالہ پھر فون کرے گی۔ وہ یقیناً دل نہیں کہ ایسے بدترین حالات میں مجھے بے خبری کی آگ میں جھلساتی رہے۔ میں بیٹھا رہا اور فون کو گھورتا رہا۔ بہت سوچتا رہا کہ غزالہ جہاں کہیں بھی ہے، اپنی ان بچگانہ حرکتوں کے ساتھ مجھ سے رابطہ کر سکتی ہے۔ اگر وہ کرتا ہے تو... مگر پتا نہیں تھا کہ وہ دیر کیوں کر رہی ہے۔ کیوں مسلسل میرے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔ کیا اتنا طویل امتحان لے کر بھی اس کا دل بھرا نہیں تھا؟ کئی برس بیت گئے تھے، میں دن رات آزمائش کی سولی پر تھا۔ اب خدا خدا کر کے کہیں منزل دکھائی دی تھی تو وہ مجھے بغیر کچھ بتائے اچانک کہیں اوجھل ہو گئی تھی۔ کیوں اسے میری تڑپ کا احساس نہیں تھا۔ کیوں وہ میرے سینے کے جلتے ہوئے زخموں سے بیگانہ تھی۔

تھوڑی دیر ہی دیر بعد پھر فون کی گھنٹی بجی۔ میں تڑپ کر ریسیور تک پہنچا۔ دل سے آواز آئی کہ یہ غزالہ کی کال ہوگی۔ میں نے لرزتی آواز میں "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف آفرین تھی۔

"ہیلو شاہ جہاں! کیا کر رہے ہیں؟"

"بس بیٹھا سگریٹ پھونک رہا ہوں۔"

"سونے کا پروگرام نہیں؟"

"نیند آئے گی تو سو بھی جاؤں گا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر کہنے لگی "ابھی کچھ دیر پہلے غزالہ کا فون پھر آیا تھا؟"

میں ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "کیا کہا اس نے؟"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ آفرین نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ آپ کے خلاف کوئی سازش ہوئی ہے۔ آپ کی بے خبری میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ آپ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں اور یہ تصویریں غزالہ کے ڈیڈی کو دکھائی گئی ہیں۔ وہ بالکل تازہ تصویریں ہیں، زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے کی ہوں گی۔"

"یہ باتیں آپ کو غزالہ نے بتائی ہیں؟"

"ہاں۔ وہ بے حد آزردہ ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے لیکن وہ تصویریں دیکھنے کے بعد سے غزالہ کے ڈیڈی بے حد غضب ناک ہیں۔ وہ آپ کے حوالے سے غزالہ کی کوئی بھی بات سننا نہیں چاہتے۔ وہ فون پر رو رہی تھی۔ بڑی مایوسی اور دکھ کی باتیں کر رہی تھی۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"بس رہنے دیں۔ میں آپ کا دل برا کرنا نہیں چاہتی۔ وہ غم اور پریشانی کے شدید حملے کے اثر میں ہے۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے اس کی۔"

"کیا آپ نے پوچھا نہیں کہ کہاں سے بول رہی ہے۔"

"بہت پوچھا لیکن نہیں بتایا۔ کہہ رہی تھی کہ میں بہت بڑی قسم کھا چکی ہوں۔ نہیں بتا سکتی۔ میں نے کہا اپنے ابو سے ہی بات کرا دو۔ کہنے لگی۔ ابھی حالات بڑے خراب

ہیں۔ ابھی ان سے بات بھی نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا کہ اس کو تو فون کر لو، جو ہر گھڑی تمہاری آواز کا انتظار کر رہا ہے۔ پہلے خاموش ہو گئی، پھر کہنے لگی "میں ابھی یہ بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے مجھے فون کیا ہے۔ ریسیور پکڑے بیٹھی رہی ہے لیکن بولی کچھ نہیں۔ مجھے پس منظر میں بھاری ٹریفک گزرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔"

"بالکل۔ بالکل ایسی آواز مجھے بھی آ رہی تھی۔" آفرین نے جلدی سے کہا "ساتھ ہی کہیں کوئی مشین بھی چل رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بولی، پڑوس کے مکان سے آ رہی ہے۔ ٹھیک سے پتا نہیں کہ کیا چیز ہے۔"

کچھ دیر تک آفرین سے باتیں کرکے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب یہ بات سو فیصد ثابت ہو گئی تھی کہ شیخ عاصم نے بدترین قسم کی کمینگی دکھائی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ غزالہ کے والدین مجھ سے بدگمان ہیں۔ اس بدگمانی کو عروج تک پہنچانے کے لیے اس نے میری اور شکیلہ کی تصاویر انکل جلیس تک پہنچائی تھیں۔ اپنے مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا تھا۔ غزالہ جو رفتہ رفتہ میرے قریب آئی تھی ایک ہی جھٹکے میں لامتناہی فاصلے پر چلی گئی تھی۔

اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شیخ عاصم اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ہر حد پار کر گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرے اندر غیظ و غضب کی آگ برساتا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر تک سخت بے قراری سے کمرے میں چکراتا رہا، پھر میں نے اپنے ہاتھ اس خودکار رائفل کی طرف بڑھا دیے جو ساہی صاحب نے اچھے برے وقت کے لیے الماری میں رکھی ہوئی تھی۔ ایک اوور کوٹ بھی مجھے الماری میں سے ہی مل گیا۔ رائفل چھپانے کے لیے چادر کی بکل اور اوور کوٹ دونوں بڑے مناسب لباس ہوتے ہیں۔ میں نے اوور کوٹ پہنا اور اس کی بڑی بڑی گہری جیبوں میں بہت سی گولیاں بھر لیں۔ پسٹل میرے پاس پہلے سے موجود تھا۔ اس کے تین بھرے ہوئے میگزین بھی میں نے جیبوں میں ڈال لیے۔ پتا نہیں کہ میں کیا کرنے جا رہا تھا لیکن جو بھی کرنے جا رہا تھا وہ عاصم کے لیے سخت اذیت ناک ثابت ہونے والا تھا۔

عاصم کی رہائش گاہ کا کھوج سب انسپکٹر شجاعت لگا ہی چکا تھا۔ میں نے کوٹھی میں موجود ڈاٹسن گاڑی نکالی اور تھوڑی ہی دیر میں ویران سڑکوں پر برق رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا شیخ عاصم کی رہائش گاہ کے نزدیک پہنچ گیا۔ عاصم نے حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کر رکھا تھا۔ خاص طور پر دو روز سے یہاں سخت پہرہ موجود تھا۔ میں ابھی کوٹھی کے گیٹ سے بیس پچیس قدم دور ہی تھا کہ دو ہٹے کٹے گارڈز نے میرا راستہ روک لیا۔

"میں شیخ عاصم سے ملنا چاہتا ہوں، اس تک یہ پہنچا دو۔" میں نے آتشیں لہجے میں کہا۔

"اس وقت وہ سو رہے ہیں۔ ان تک پیغام نہیں جا سکتا۔"

"وہ حرامی مجھے جگا کر خود سو نہیں سکتا۔" میں ... کے انداز میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا آپ نے؟" گارڈ نے کھڑکی میں جھک کر ...

"تمہارا انچارج کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

چند سیکنڈ بعد ایک اور شخص سامنے آ گیا۔ اس ... غور سے دیکھا اور فوراً پہچان لیا "کیا بات ہے۔ ... آپ کو شیخ صاحب سے کیا کام ہے؟"

"تم بس اس تک میرا پیغام پہنچا دو۔" میں نے غرا ...

"اتنی رات گئے کچھ نہیں ہو سکتا ... اگر ..."

ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی کہ میں نے گاڑی کا دروازہ پوری قوت سے کھولا۔ انچارج چوٹ کھا کر لڑھک گیا۔

میں نے کلچ چھوڑ کر زور سے ایکسی لیٹر دبایا۔ جیپ ... لے کر آگے بڑھی۔ سامنے کھڑے ہوئے گارڈ کے گھٹنے پر بمپر سے چوٹ لگی اور وہ بھی اچھل کر دور ... میرے دل و دماغ پر وحشت سوار تھی۔ ایک سرخ ... تن گئی تھی آنکھوں کے سامنے۔ میں جانتا تھا کہ میں ... کے شدید ترین ردعمل میں بہہ رہا ہوں لیکن اس ... میں خود کو روکنا نہیں چاہتا تھا۔ گاڑی خاصی ... ساتھ گیٹ سے ٹکرائی۔ گیٹ مضبوط تھا، گاڑی ... تھی، میں نے پھر اسے آگے بڑھایا۔ اس دوسری ٹکر ... کی ایک جانب کا بلا اکھڑ گیا اور گیٹ ایک دم ٹیڑھا ... درواز ہو گیا۔

اسی دوران میں عقب سے گارڈز نے گاڑی پر ... میں نیچے جھکا ہوا تھا۔ ایک فائر نے بیک اسکرین تو ... دوسری گولیاں پچھلے ٹائروں میں لگیں اور وہ برسٹ ... دھماکوں سے ہر طرف سنسنی پھیل گئی تھی۔ کوٹھی کے اند ... تین گارڈز موجود تھے۔ وہ بلند و بالا گیٹ کے ا...

...تیں لگاتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے خودکار ... سے ان کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں۔ ان میں سے دو ... منہ گیٹ کے قریب گرے۔ اسی اثنا میں ... درختوں کے اندر سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ میں ... گیا۔ یہ فائرنگ یقیناً میرے "حق" میں ہوئی تھی اور ... کرنے والے پولیس کے سادہ پوش اہلکار تھے۔ جیسا کہ بعد ... پتا چلا "شیر دل" سب انسپکٹر شجاعت بھی یہاں موجود تھا ... اس نے ساہی صاحب کی گاڑی کی وجہ سے مجھے پہچان لیا۔

میں گیٹ پھلانگ کر کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ میں ... بلند آواز میں شیخ عاصم کو للکارا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت ... بھی میرے اور شیخ عاصم کے درمیان نہیں آ سکتا لیکن ... مجھے رک جانا پڑا۔ کوئی عقب سے آیا تھا اور اس نے ... بڑی مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ ساہی ... تھے "نہیں شاہ جہاں! میں تمہیں یہ سب نہیں کرنے ... گا۔"

"مجھے چھوڑ دیں جناب! میں نہیں رک سکتا۔" میں نے ... جنون سے بے قابو ہو کر کہا۔ ساہی صاحب نے ... باقاعدہ مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ساہی صاحب ... سے نمودار ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ وہ ... تھے اور گلبرگ ہی کے علاقے میں ہی موجود تھے۔ ... میری موجودگی کا احساس ہوتے ہی شجاعت نے انہیں ... یہاں بلا لیا تھا۔ پولیس کے سادہ پوش اہلکاروں نے شیخ کی کوٹھی کو تین اطراف سے گھیرے میں لے لیا ... شیخ کے گارڈز میں سے تین چار افراد شدید زخمی ہوئے ... ایک پولیس والے کی ٹانگوں میں بھی گولیاں لگی تھیں۔

ساہی صاحب نے مجھے یوں جکڑ لیا تھا کہ چھوڑنے کا نام ... لے رہے تھے۔ میں ان سے زور آزمائی نہیں کر سکتا تھا ... لیے مجبور تھا ورنہ میرے سینے میں جو آتش فشاں دہک رہا ... وہ اس چار دیواری میں موجود ہر شے کو جلا کر بھسم کر دیتا۔ ... ساہی صاحب مجھے کھینچتے ہوئے اپنی جیپ تک لے آئے۔ ... انہوں نے میرے ہاتھوں سے رائفل بھی چھین کر شجاعت کو ... تھما دی تھی۔

وہ بار بار ایک ہی فقرہ کہہ رہے تھے "شاہ جہاں! یہ ... ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ میں ... تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"میں نے اس کتے کو زندہ نہیں چھوڑنا جناب۔" میں نے تہ دل سے کہا۔

"تمہیں ساری بات معلوم نہیں شاہ جہاں۔ چلو آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں۔" انہوں نے مجھے باقاعدہ دھکیل کر گاڑی میں بٹھا دیا۔

اردگرد کی کوٹھیوں میں روشنی ہو گئی تھی۔ کوٹھیوں کے چوکیدار اور گارڈز وغیرہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ کوٹھیوں کی بالکونیوں سے جھانک رہے تھے۔ افراتفری کا سماں تھا۔ ساہی صاحب نے موبائل کے ڈرائیور کو حکم دیا اور اس نے موبائل تیزی سے آگے بڑھا دی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں ساہی صاحب کے ساتھ زریں گل کی وسیع و عریض کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں یوں بلا جھجک کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اب رات کے ڈھائی بج چکے تھے لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کوٹھی کے سب ہی مکین جاگ رہے ہیں۔ دراصل سب انسپکٹر شجاعت فون پر زریں اور صفدر کو اطلاع دے چکا تھا کہ ساہی صاحب مجھے لے کر کوٹھی پر آ رہے ہیں۔

میں نے ساہی صاحب سے پوچھا بھی کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی پتا چل جاتا ہے۔

زریں گل نے مالدار سیٹھوں کے سے انداز میں قیمتی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ پچھلی ملاقات میں صفدر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ انگریزی سیکھنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے انگریزی کا ایک پروفیسر روزانہ زریں کی کوٹھی پر حاضری دے رہا تھا۔ فی الوقت زریں پریشان نظر آ رہا تھا۔ اسے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ غزالہ اپنے اہل خانہ سمیت غائب ہے یا پھر غائب کر دی گئی ہے۔

رسمی گفتگو کے بعد صفدر اور ساہی صاحب مجھے لے کر نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ ساہی صاحب نے باقاعدہ مانگ کر اپنا پسٹل مجھ سے لے لیا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ میرے دماغ میں انگارے دہک رہے ہیں اور یہ کسی بھی وقت بھڑک کر شعلے بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میرے جذبات کو معمول پر لانے کے لیے ادھر ادھر کی گفتگو شروع کر دی۔ صفدر بھی اس عمل میں شریک رہا۔ آخر ساہی صاحب اصل موضوع پر آ گئے۔

انہوں نے کہا "شاہ جہاں۔ پرسوں شام امریکا سے مسٹر جی کلارک کا فون آیا تھا۔ وہ نیویارک سٹی سے بول رہے تھے۔ انہوں نے قریباً ایک گھنٹے تک مجھ سے شیخ عاصم کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس گفتگو میں غزالہ کی طرف سے دائر ہونے والا خلع کا کیس بھی ڈسکس ہوا ہے۔ مسٹر کلارک

نے اس سلسلے میں کچھ قیمتی مشورے دیے ہیں۔"

میں نے بیزاری سے کہا "جناب! میں نے بھی اس بارے میں بہت غور و خوض کرلیا ہے۔ شیخ عاصم لاتوں کا بھوت ہے' یہ باتوں سے نہیں مانے گا۔ اس نے خون خرابے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے اگر یہ ایسے چاہتا ہے تو ایسے ہی سہی۔ میں نے بھی تہیہ کیا ہے کہ اس کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ میری پوری زندگی اس کتے کی وجہ سے برباد ہوئی ہے۔ میں اب "اسے" بھی آباد نہیں رہنے دوں گا۔ یہ لڑائی اب اس کے گھر تک اور گھر والوں تک پہنچے گی۔"

"اس میں شیخ کے گھر والوں کا کوئی قصور نہیں۔"

"اس میں میرے گھر والوں کا بھی کوئی قصور نہیں تھا جناب۔ لیکن ہم نے یہ سب کچھ بھگتا ہے۔ میں نے جیلیں کاٹی ہیں' پولیس کی ماریں کھائی ہیں۔ میری معصوم بہن روپوشی کی زندگی گزار رہی ہے۔ میرے چچا کی فیملی ظلم و ستم سہہ رہی ہے۔ اگر یہ لوگ اذیت سہہ رہے ہیں تو پھر شیخ کے اہلِ خانہ دبئی اور ابو ظہبی میں عیش اور مستی میں کیوں ڈوبے رہیں۔ اب تک ایسا ہوتا رہا ہے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"شاہ جہاں! مجھے تم سے ایسے رویّے کی امید نہیں تھی۔ تم تو دوسروں کو برداشت اور تحمل کا درس دیتے ہو۔ آج خود ایک سرپھرے شخص کی طرح ایکٹ کررہے ہو۔"

"اس شخص نے مجھے ایسا بننے پر مجبور کردیا ہے۔ میں نے بڑے صبر و تحمل سے کئی سال انتظار کیا ہے۔ غزالہ کے لیے قانونی اور اصولی لڑائی لڑی ہے۔ اب اس لڑائی کا نتیجہ نکلنے والا ہے تو یہ شخص اپنی اصلیت پر آگیا ہے۔"

صفدر نے کہا "شاہ جہاں! آپ اپنی بات کرتے جارہے ہیں' ساہی صاحب کی بھی تو سنیں۔ جو کچھ مسٹر جی کلارک نے بتایا ہے کم از کم وہ تو جان لیں۔"

"کیا کہا ہے انہوں نے؟"

ساہی صاحب نے کہا "مسٹر کلارک نے بتایا ہے کہ شیخ عاصم اور اس کی برادری کے کچھ معزز لوگوں نے ایک انگلش لیگل ایڈوائزری سے رابطہ کیا ہے۔ اس ایڈوائزری کے سربراہ مسٹر تھامس رائٹ نامی وکیل ہیں اور اپنی مہارت کے سبب ساری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ مسٹر تھامس عائلی قوانین کے ماہر تصور کیے جاتے ہیں۔ شیخ عاصم دراصل خلع کے اس کیس کو لٹکانا چاہتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے پاس کچھ ایسے نکتے موجود ہیں جن کے سبب کیس کو لمبی مدت کے لیے لٹکایا جاسکتا ہے۔ بے شک آخری فیصلہ عاصم کے حق میں نہ ہو لیکن غیر یقینی کیفیت کا برقرار رہنا ہی ہم سب کے لیے اذیت ناک ہوگا۔"

میں نے زچ ہو کر کہا "آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ وہ کیا ہیں۔ غزالہ کا بیان عدالت میں جج کے روبرو ریکارڈ ہے۔ اس نے وہ ساری وجوہ کھول کر بیان کی ہیں جن سبب وہ عاصم کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس کے علاوہ"

"میں جانتا ہوں کہ تم نے قانون پڑھ رکھا ہے۔" صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن حالات توقع سے زیادہ پیچیدہ ہیں۔ شیخ عاصم ایک خرانٹ شخص ہم جانتے ہیں کہ غزالہ کے ساتھ اس کی شادی صرف ڈھونگ تھا۔ وہ درحقیقت تم کو نیچا دکھانا چاہتا تھا اور بھائی کے قتل کے بدلے نہیں مسلسل اذیت میں مبتلا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک غزالہ بیوی نہیں تھی صرف یرغمالی تھی۔ جس طرح یرغمالی کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں' شیخ نے بھی غزالہ کو قابو رکھنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے تھے۔ اس کچھ کاغذوں پر غزالہ سے دستخط کرا رکھے ہیں۔ ممکن ہے پہلے یہ کاغذ سادہ ہوں بعد میں ان پر من مرضی کی تحریر لکھی گئی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک نیورو فزیشن کے ہوئے کچھ نسخہ جات اور ٹیسٹ وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں ذریعے عدالت میں یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ غزالہ کسی ایک خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہوجاتی تھی کیفیت SPLIT PERSONALITY سے ملتی جلتی یہ کیفیت خاصی طویل ہوتی تھی اور اس حالت میں غزا قول و فعل اس کی منشا کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ وغیرہ۔"

اس موضوع پر کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ساہی صا نے مجھے بتایا کہ نچلی عدالت میں فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا تو بڑی عدالت میں اس فیصلے کو بدلنے کے لیے شیخ اور کے حواری ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے پھر ساہی صاحب ایک فائل نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

انہوں نے کہا "یہ کچھ اہم کاغذات کے فوٹو اسٹیٹ جو مسٹر جی کلارک نے نیوآرک سے مجھے ارسال کیے ہیں! ان کاغذات سے شیخ عاصم کے کاروباری اور مالی حالات بڑی تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ لو تم بھی دیکھو۔" انہوں نے فائل میری طرف بڑھادی۔

میں نے سرسری انداز میں فائل دیکھی۔ اس میں کے اس کاروبار کا احوال تھا جو امارات کے علاوہ یورپ ایشیا کے مختلف ممالک میں پھیلا ہوا تھا' خاص طور

تھائی لینڈ۔ فرانس۔ سری لنکا۔ جاپان اور پاکستان وغیرہ میں۔ ن کی شپنگ کمپنی کے بارے میں کچھ معلومات بھی فائل میں موجود تھیں۔ ان تازہ ترین معلومات کا جائزہ سرسری انداز میں لینے سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ شیخ عاصم کی کاروباری حالت دگرگوں ہے اور اس کی دولت کا "ٹائی ٹینک" بڑی تیزی سے پر نیلے پانی میں ڈوب رہا ہے۔ دراصل شیخ کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں مسٹر جی کلارک کی کاروباری ذہانت کا بہت عمل دخل تھا۔ مسٹر کلارک نے بڑی چابک دستی اور صفائی سے شیخ عاصم سے کاروباری مسابقت کی تھی اور اسے ہر جگہ پچھاڑ دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں مہنگے داموں خام مال خریدا گیا تھا اور خام مال دینے والی پارٹیوں کو بے شمار ایڈوانس دے دیا گیا تھا۔ بنی ہوئی اشیا شیخ عاصم کے مقابلے میں کم منافع پر بیچی گئی تھیں اور ہر جگہ عاصم کی مارکیٹ پر قبضہ کیا گیا تھا۔ ایسی جگہیں جہاں مارکیٹ پر قبضہ کرنا ممکن نہیں تھا عاصم اینڈ کمپنی کے خریداروں میں بریکنگ کردی گئی تھی اور وہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں مصروف ہوگئے تھے۔ سری لنکا سے شیخ عاصم کی کمپنی بہت بڑی مقدار میں سرخ مسالہ خریدتی تھی' اس کمپنی کا دیوالیہ نکل گیا تھا اور وہ مالیاتی کیسوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ جہاز رانی میں بھی شیخ عاصم کی کمپنی کو مسٹر کلارک کے ایک عربی جہاز راں دوست کی وجہ سے زبردست خسارے کا سامنا تھا۔

میں فائل کا سرسری جائزہ لے چکا تو ساہی صاحب نے کہا "شاہ جہاں! مسٹر کلارک نے مجھے یہ رائے دی ہے کہ ہم عدالت سے باہر شیخ عاصم سے معاملات طے کرنے کی کوشش کریں۔ شاید عام حالات میں شیخ عاصم اس قسم کی ڈیلنگ کے لیے تیار نہ ہوتا لیکن اب اس کی مالی حالت نے اس کا "دم خم" ختم کر رکھا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ یہ بات عین ممکن ہے کہ اگر اسے پیشکش کی جائے تو وہ رقم کے عوض اپنے کیس واپس لینے پر تیار ہوجائے۔ شیخ عاصم جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس کا ایک سال پہلے بھی دو تین قتل خون بہا کی ادائیگی سے معاف ہوئے ہیں۔ شیخ عاصم کا تمہارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ اس کے بھائی راشد بن ارشد کا قتل ہے اس کے علاوہ اس کے قبیلے کے لوگ شتو کے رشتے کے معاملے کو بھی اپنی بہت بڑی توہین قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لاہور سے شیخ کی بارات واپس کرکے ان کی پیشانیوں پر بدنامی کا بدنما داغ لگا دیا گیا ہے۔ تیسرا مسئلہ غزالہ کا ہے۔ مسٹر کلارک کا خیال ہے کہ یہ تینوں مسئلے شیخ عاصم سے ڈیلنگ کے ذریعے باآسانی حل ہوسکتے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "جناب! مجھے مسٹر کلارک اور آپ کی دانائی پر کوئی شبہ نہیں لیکن جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہ میرے خیال میں قابلِ عمل نہیں۔ اوّل تو میں اس طرح کی سودے بازی کے حق میں ہی نہیں ہوں۔ یوں تو ہم بالواسطہ عاصم اور اس کے قبیلے کی چیرہ دستیوں کو قبول کریں گے۔ اگر بفرضِ محال مجھے کبھی کسی شخص سے کوئی ڈیلنگ کرنی بھی ہوگی تو ایسے شخص سے کروں گا جس پر ذرہ بھر اعتبار کرسکوں۔ شیخ عاصم اور شکر شکرا دنیا میں دو ایسے افراد ہیں جن پر میں کسی بھی حالت میں بھروسا نہیں کرسکتا۔ یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے جناب!"

صفدر بولا "مسٹر کلارک نے اس سلسلے میں بھی وضاحت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ ڈیلنگ ہوتی ہے تو اس میں نہایت بارسوخ اور بااختیار لوگوں کی ضمانتیں شامل ہوں گی۔ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کو ہر طرح پابند کیا جائے گا۔"

ساہی صاحب اور صفدر تادیر اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان دونوں کی رائے یہی تھی کہ پُرامن طریقے سے اس معاملے کو حل کرنے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ وہ دونوں مسلسل مجھے کول ڈاؤن کرنے کی کوشش بھی کررہے تھے۔ ہماری یہ گفتگو رات بھر جاری رہی۔ مختلف پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ حتمی نتیجہ کوئی بھی نہیں نکلا۔ میں نے ساہی صاحب سے کہا کہ وہ مجھے اس سلسلے میں ایک دو روز سوچنے کا موقع دیں۔ غالباً ناشتے پر بھی ہماری یہ گفتگو جاری ہی رہتی کیونکہ ساہی صاحب نے ایک معروف قانون دان امتیاز پراچہ کو بھی ناشتے پر بلالیا تھا لیکن اچانک ساہی صاحب کو وائرلیس پر ایک ایسی اطلاع موصول ہوئی کہ پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ اطلاع کافی سنسنی خیز تھی۔ ہارون پاشا (اشرف چیتا) ایک لیڈی ڈاکٹر کو یرغمال بنا کر اسپتال سے فرار ہوگیا تھا۔

ساہی صاحب فوراً اپنے عملے کے ساتھ اسپتال کی طرف چلے گئے۔ اطلاع یقیناً بڑی غیر متوقع تھی۔ ہارون پاشا پچھلے کئی روز سے اسپتال میں تھا اور وفاقی پولیس اس سے پوچھ گچھ کررہی تھی۔ پاشا کی حفاظت اور نگرانی کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا لیکن وہ ان انتظامات کو ناکام کرکے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے ساہی صاحب مسلسل مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں ہارون پاشا عرف اشرف چیتا سے ملاقات کرلوں' لیکن میں اپنے معاملات میں

اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ ساہی صاحب کی ہدایت پر عمل نہیں کر سکا تھا اور اب ایک بالکل مختلف نوعیت کی خبر سننے کو مل رہی تھی۔ یہ خبر میرے لیے یوں بھی حیرت کا باعث تھی کہ میں نے تہ خانے کے اندر گزارے ہوئے آخری ایام میں ہارون پاشا عرف چیتا کے رویے میں خاطر خواہ تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ پانچ اذیت ناک ترین ہفتے گزارنے کے بعد یہ شخص اپنی بنیادوں سے ہل گیا ہے اور اس کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہو رہا ہے لیکن اس کے بارے میں ملنے والی تازہ ترین خبر نے میرے اندازوں کا شیشہ دھندلا دیا تھا۔

○☆○

اگلے چھ سات روز بھی سخت ٹینشن میں گزرے۔ میں رات دن ٹیلی فون سیٹ کو گھورتا رہا لیکن وہ کال نہیں آئی جس کا انتظار تھا۔ غزالہ نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس نے کہیں بھی فون نہیں کیا۔ میں تقریباً روزانہ ہی آفرین اور صفدر وغیرہ سے غزالہ کے فون کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ہر بار جواب نفی میں ہی ملا۔ وہ سنگ دل جیسے ایک دم ہی سارے ناتے توڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا تھا کہ میرے اور غزالہ کے درمیان مکمل جدائی حائل ہو گئی تھی لیکن اب کی بار یہ عمل زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اب کی بار تو بالکل ایسے لگ رہا تھا کہ بالکل کنارے پر پہنچ کر کسی نے میرے خشک ہونٹوں سے پانی چھین لیا ہو۔ سینے کے اندر ایک صحرا پھیل گیا تھا اور جھلسا دینے والی زہریلی ہوا چل رہی تھی۔

پورے پنجاب کی پولیس حرکت میں تھی لیکن ہارون پاشا عرف چیتا کا کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ وہ اسپتال کے پرائیویٹ کمرے سے رات کے آخری پہر بڑی صفائی سے فرار ہوا تھا۔ اس کے ایکشن سے اس کی ذہانت اور خطرناکی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر کی گردن پر تیز دھار نشتر رکھا تھا اور ایک آپریشن تھیٹر کے متبادل دروازے میں سے نکل گیا تھا۔ فرار ہونے سے قبل اس نے نہ صرف فون کا تار کاٹ ڈالا تھا بلکہ موقعے پر موجود دو گاڑیوں کا ایک ایک ٹائر بھی بیکار کر دیا تھا۔ وہ میری گاڑی میں ڈاکٹر سمیت بیٹھ کر نکل گیا تھا۔ دراصل فرار ہونے سے پہلے کئی دن تک وہ خود کو بہت کمزور اور بیمار ظاہر کرتا رہا تھا' جبکہ حقیقت میں وہ اتنا کمزور اور بیمار نہیں تھا۔ اس کے فرار ہونے کے بعد ۲۴ گھنٹے تک تو لیڈی ڈاکٹر شبانہ کے بارے میں ہر ایک کو سخت تشویش محسوس ہوتی رہی۔ ایک خوب رو لڑکی کا ایک خطرناک مجرم کے قبضے میں چلے جانا ہر لحاظ سے تشویش ناک ہی تھا۔ بہرحال بعد میں یہ تشویش ایک دم ختم ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر بخیر و عافیت واپس آ گئی تھی۔ اس نے پاشا کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے پتا چلتا کہ اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک ہوا ہے۔ ظاہری طور پر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ لاہور کی ایک مضافاتی سڑک پر پہنچنے کے بعد پاشا نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی پھر تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ ایک گاؤں میں پہنچے تھے۔ یہاں ایک عورت نے شبانہ کو کھانا دیا تھا اور مسلسل تسلی کی باتیں کرتی رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس نے شبانہ کو ڈرایا بھی تھا کہ اسے اغوا کرنے والا ایک نہایت خطرناک شخص ہے۔ وہ اس کے خلاف کسی طرح کی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ بہت نقصان اٹھائے گی۔ اگلے روز ایک شخص مسروقہ گاڑی میں شبانہ کو بٹھا کر والٹن کے علاقے میں چھوڑ گیا تھا۔

شیخ عاصم والا معاملہ کچھ آگے بڑھا تھا۔ ساہی صاحب' صفدر اور کچھ دیگر لوگوں نے مجھے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ شیخ عاصم کے ساتھ بیٹھ کر معاملات طے کر لیے جائیں۔ ایک مرتبہ مسٹر جی کلارک نے بھی نیویارک سے فون پر آدھ پون گھنٹا مجھ سے بات کی تھی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنے نکتۂ نظر سے روشنی ڈالی تھی۔

صفدر اس معاملے میں بے حد جذباتی تھا۔ بیٹھے بیٹھے کہنے لگا "شاہ جہاں صاحب' آپ اس معاملے میں کسی طرح کی کوئی فکر ہی نہ کریں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا ہے۔ شیخ عاصم اپنے منہ کا گٹر بند کرنے کے لیے کچھ بھی مانگے گا ہم اس میں ٹھونس دیں گے۔ خدا نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس میں ہماری محنت اور کوشش کا دخل تو ہے' یہ سب اس کی نوازش اور مہربانی ہے۔ وہ ہمیں اور دے گا۔"

اس نے عجیب وجد کے عالم میں تین سادے چیک اپنے سائن کر کے میرے سامنے رکھ دیے تھے۔

میں نے یہ چیک نہیں لیے تھے لیکن اس نے بھی واپس نہیں لیے تھے۔ اس نے یہ چیک زریں کو دے دیے تھے اور کہا یہ شاہ جہاں صاحب کی امانت ہیں۔

آج کے دور میں جہاں مادی وسائل کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ چالیس پچاس روپے کے لیے بندہ قتل ہو جاتا ہے' بے لوث دوست کہاں ملتے ہیں۔ کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس تھا جو صفدر کاغذ کے تین پرزوں کے ذریعے اور

دستخطوں کے ذریعے میرے حوالے کر رہا تھا۔

ساہی صاحب نے اس سلسلے میں شیخ عاصم سے بھی رابطہ کیا تھا۔ اس کی طرف سے بھی نیم رضامندی ظاہر ہوئی تھی۔ تاہم مسٹر کلارک کا کہنا تھا کہ یہ نیم رضامندی نہیں پوری رضامندی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دو روز کے اندر شیخ عاصم بات چیت کی میز پر "تشریف" لے آئے گا۔ ساہی صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔

ساہی صاحب اس مسئلے کے حل کے لیے زبردست کوششیں کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ شیخ عاصم کی زبردست معاشی مجبوریوں کے اندر سے اس سنگین مسئلے کا حل برآمد ہو سکتا ہے۔ ساہی صاحب نے اس سلسلے میں دو تین اہم شخصیات کا تعاون بھی حاصل کر رکھا تھا۔ پاکستان کے ایک سفارت کار بھی اس سلسلے میں سرگرم تھے۔

ان تمام کوششوں کا نتیجہ آٹھ دس روز بعد اس وقت نکلا جب شیخ عاصم اور اس کے قبیلے کے معزز افراد نے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ شیخ عاصم کی طرف سے بات چیت کے دوران اپنے مطالبات پیش کیے جائیں گے اور جواب میں ہم اپنے مطالبات اور تحفظات کا اظہار کریں گے لیکن بعد میں یہ پروگرام تبدیل کر دیا گیا۔ شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے کہا گیا کہ وہ اپنے مطالبات پیش کریں گے۔ ان مطالبات پر بات چیت کے لیے اگر ہم آمادگی ظاہر کریں تو پھر بات چیت کی تاریخ طے کرا دی جائے گی اور ضمانتیں دینے والے افراد کو بھی مدعو کر لیا جائے گا۔

شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے جو مطالبے سامنے لائے گئے وہ کافی سخت تھے۔ پہلا مطالبہ ۸۰ لاکھ امریکی ڈالر تاوان کا تھا۔ اس کے بعد یہ مطالبہ تھا کہ شیخ ایاز کی برات لاہور سے واپس جانے پر شیخ عاصم اور اس کے رشتے داروں کی جو توہین ہوئی ہے۔ اس کے لیے تحریری معافی مانگی جائے۔ تیسرے مطالبے کا تعلق مسٹر جی کلارک سے تھا۔ شیخ عاصم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں اس کے کاروباری مفادات کو جو نقصان پہنچا ہے اس میں براہ راست یا بالواسطہ مسٹر جی کلارک کا ہاتھ ہے۔ شیخ عاصم اور اس کی برادری کے لوگوں کا مطالبہ تھا کہ اس نقصان کا ازالہ کیا جائے اور آئندہ کے لیے اس قسم کی صورت حال سامنے نہ آئے۔ چوتھا مطالبہ غزالہ کے حق مہر کے حوالے سے تھا۔ شیخ عاصم نے شادی کے وقت اپنی امارت کے اظہار کے لیے بھاری بھرکم حق مہر لکھا تھا۔ وہ یہ حق مہر بھی ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی دو تین مطالبات موجود تھے۔ تاہم ان سارے مطالبات میں سے جو مطالبہ مجھے سب سے تلخ لگا' وہ یہ تھا۔ مطالبات کی فہرست میں لکھا تھا۔ "شیخ ایاز کا رشتے دار بن جانا' شاہ جہاں اور اس کی فیملی کے لیے ایک بڑے اعزاز کی بات تھی اور اب بھی ہے۔ یہ بہت مناسب ہوگا' اگر شاہ جہاں کی بہن کی شادی ہمارے بیٹے سے ہو جائے اور ہم شاہ جہاں کی بہن کو عزت کے ساتھ بیاہنے کے لیے یہاں آ سکیں۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر خیر سگالی کے اظہار کے لیے' شاہ جہاں کو اپنی برادری میں سے کم از کم دو لڑکیوں کے رشتے شیخ ایاز کی فیملی میں دینے ہوں گے۔"

اس آخری مطالبے نے میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ بات تو پھر وہیں کی وہیں تھی۔ غزالہ اور شفقت کو شیخ عاصم کی فیملی کے چنگل سے چھڑانے کے لیے دو اور معصوم لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دیا جاتا۔ خیر سگالی پیدا کرنے کا بڑا اچھا طریقہ تھا یہ۔ اس طریقے کے بارے میں میں نے پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ پاکستان کے کچھ علاقوں خصوصاً صوبہ سرحد میں اس قسم کی قبیح رسمیں پائی جاتی ہیں۔ پنجاب کے پس ماندہ علاقوں سے بھی اس نوع کی خبریں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔ مردوں کی پیدا کی ہوئی دشمنیوں کو ختم کرنے کے لیے معصوم عورتوں کو شادی کے نام پر ظلم اور نفرت کی سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ کہیں اس رسم کو ونی کہا جاتا ہے' کہیں سوارہ اور کہیں کچھ اور۔ ایسے رشتوں کے حق میں دلیل دی جاتی ہے کہ رشتے دار بن جانے والے خاندانوں میں دشمنی کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ حالانکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ یہ توقع اکثر و بیشتر پوری بھی نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو کس قیمت پر؟ ایک عورت کا جسم زندگی بھر کے لیے نفرت اور انتقام کے تیروں سے چھلنی ہوتا رہتا ہے۔ وہ جس گھر میں رہتی ہے اس گھر میں اسے بیوی' بہو' یا ماں نہیں سمجھا جاتا۔ اپنے دشمن کی بیٹی یا بہن سمجھا جاتا ہے۔

یہ آخری مطالبہ میرے لیے ہی نہیں صفدر اور ساہی صاحب کے لیے بھی ناقابل قبول تھا۔ ساہی صاحب نے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! بات چیت ہمیشہ ایسے ہی شروع ہوتی ہے۔ ابتدائی مطالبات سخت ہوتے ہیں پھر دھیرے دھیرے دونوں پارٹیاں اپنے موقف میں لچک پیدا کرتی ہیں۔ فیصلے تک پہنچتے پہنچتے مطالبات کی فہرست بہت سکڑ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "ساہی صاحب! میں آپ کی بات کو رد کرنے کی جرات نہیں کر سکتا لیکن ان مطالبات کو دیکھ کر ہی

مجھے شیخ عاصم کے برے ارادوں کی بو آئی ہے۔ وہ اس دشمنی کو ختم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اپنے معاشی مسئلوں کے حل کے لیے ساٹھ سترلاکھ ڈالر حاصل کرنا چاہتا ہو۔"

ہم کچھ دیر تک ان مطالبات پر غور و خوض کرتے رہے' بعد ازاں ساہی صاحب نے قانونی مشیر امتیاز پراچہ کو بھی اپنے دفتر میں بلالیا۔ میں نے صاف لہجے میں کہہ دیا "ساہی صاحب! میں سارے مطالبات پر غور کرسکتا ہوں' لیکن دو مطالبات پر کسی صورت نہیں۔ ایک تو برات واپس بھیجنے کے مسئلے پر شیخ عاصم سے معافی مانگنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا' دوسرے دو رشتے دینے والی بات ہمارے لیے کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے۔ رشتے دینا تو دور کی بات ہے اگر شیخ عاصم دشمنی کی بنیاد ختم کرنے کے لیے اپنی لڑکیوں کے رشتے دینے کی بات بھی کرے تو ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔"

صفدر نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "یہ مطالبہ تو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔"

ساہی صاحب نے کہا "زیادہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔ تم بات چیت تو شروع ہونے دو۔ ان کے مطالبے سامنے آئیں گے اور ہمارے بھی آئیں گے۔ اس کے بعد ہی کچھ لو اور دو کی بنیاد پر مسئلہ حل ہوگا۔"

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ میں ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی پر تھا۔ غزالہ کا تصور ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں لیکن یوں لگتا تھا کہ اس کی صورت دیکھے ہوئے برسوں بیت گئے ہیں۔ مجھے یاد آرہا تھا جب نوبل کلب میں شنکر کے ہاتھوں چوٹ کھانے کے بعد میں زریں کے گھر پناہ گزیں ہوا تھا تو غزالہ نے کس طرح میری تیمارداری کی تھی۔ اس کا ایک ایک انداز ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ بے شک میں اس وقت تکلیف میں تھا لیکن کوئی میرے دل سے پوچھتا تو وہ یہی کہتا کہ بے شک وہ تکلیف برقرار رہتی لیکن غزالہ ہمیشہ میرے اردگرد موجود ہوتی۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر میرا حال پوچھتی رہتی' میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہتی۔ میری نبض ٹٹولتی رہتی۔ اس کی سانسیں میری سانسوں میں مہکتی رہتیں اور مہکتی رہتیں۔

وہ کہاں چلی گئی تھی؟ ایک دم میری ساری امیدیں توڑ کر سارے سہارے ختم کرکے کہاں روپوش ہوگئی تھی۔ اس نے تو میرا ہاتھ تھامے رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے تو میرے برسوں پرانے زخموں پر اپنی مسیحا صفت مسکراہٹ کا مرہم رکھنے کا عندیہ دیا تھا۔ اس نے تو میرے شانے سے شا[...]

حالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ میں افریقا کے صحراؤں میں [...] بالکل قریب رہا تھا لیکن پھر بھی بہت دور رہا تھا اس [...] ایک دن وہ میری دلہن بن کر میرے قریب آئے گی۔ [...] ساری آسیں اپنی اوڑھنی کے پلو سے باندھ کر اپنے سا[...] گئی تھی۔

رات کے نو بج چکے تھے' آج سردی معمول سے [...] تھی۔ ساہی صاحب کا وفادار گھریلو ملازم جسے وہ پیا[ر سے] "میاں" کہا کرتے تھے اندر آیا اور بولا "صاحب! کوئ[ی] سے ملنے آیا ہے۔ باہر گاڑی میں ہے۔"

ایک دم میرا دل اچھل گیا۔ کہیں وہ غزالہ تو تھی۔ یا غزالہ کا کوئی پیامبر؟ آج کل میرا یہی حال تھا۔ [...] گھنٹی بجتی تھی' دروازے پر آہٹ ہوتی تھی یا ایسی ہی کو[ئی] آواز سنائی دیتی تھی تو دھیان سیدھا غزالہ کی طرف جا[تا]

"کون ہے؟" میں نے میاں سے پوچھا۔

"ایک آدمی ہے جی' چادر کی بکل مار رکھی ہے۔ چہرہ بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا' پرانی سی کھٹارا گاڑی [...] بیٹھا ہے۔"

"کوئی نام نہیں بتایا۔"

"نہیں جی۔ بس کہہ رہا ہے کہ آپ سے اس کا ملنا ضروری ہے۔"

میں نے پسٹل لباس کے نیچے لگایا اور باہر آگیا۔ [...] کے آخری سرے پر نیم تاریک حصے میں ایک اسکوڈا کار [...] تھی۔ شیشے سردی کے سبب دھندلائے ہوئے تھے۔ کوئی [...] فرنٹ سیٹ پر موجود نظر آرہا تھا۔

میں محتاط انداز میں قریب گیا۔ اس شخص نے کھڑ[کی کا] شیشہ نیچے اتارا اور بولا "اندر آجاؤ شاہ جہاں۔"

میں بری طرح چونک گیا۔ وہ ہارون پاشا تھا۔ اس [...] اپنا چہرہ گرم چادر میں تقریباً چھپا ہی رکھا تھا۔ اس کی آنکھ[یں] بھیڑیے کی طرح اندھیرے میں دمک رہی تھیں۔

میں دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا "میں تمھ[یں] دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "شاہ جہاں! میں تم سے بس دو چار باتیں کرنا چ[اہتا] ہوں۔ تھوڑا آگے چل کر گاڑی کھڑی کرتے ہیں' میں تمہا[را] زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

کچھ آگے جاکر اس نے گاڑی ایک نیم تاریک سڑک [پر] کھڑی کردی۔ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا پھر اس [نے] عجیب جذباتی انداز میں میرے ہاتھ تھام لیے "شاہ جہاں! [...]

تمہارا احسان مند ہوں۔ تم نے میری زندگی بچانے کے لیے کئی ہفتے تک اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے رکھا ہے۔ سچ کہتے ہیں انسان کی پہچان برے وقت میں ہوتی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی بھول نہیں سکوں گا۔"

میں نے کہا "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری مہربانی ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولا' میں بھی خاموش رہا۔ یہ ایک بوجھل خاموشی تھی پھر اسے ہارون پاشا نے ہی توڑا "کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں شاہ جہاں جو اپنی بے پناہ طاقت کے ساتھ انسانوں کی زندگیاں بدل دیتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ مجھے تم سے غلط بیانی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس سے میرا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں صرف اپنے ضمیر کی آواز کی وجہ سے بتا رہا ہوں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں شاہ جہاں' میری زندگی بدل گئی ہے اور اتنی خاموشی اور ایسے دھیج سے بدلی ہے کہ مجھے خود بھی یقین نہیں ہو پا رہا۔"

وہ عجیب انداز سے میری طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی پادری ہوں اور وہ اعتراف گناہ کے لیے میرے قریب دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہے۔ وہ کہنے لگا "شاہ جہاں! میں نے بڑے جرم کیے ہیں۔ عورتوں کو تاراج کیا ہے' قتل کیے ہیں' اسمگلنگ کی ہے' گینگ بنا کر لوٹ مار کی ہے۔ خطرناک تنظیمیں بنا کر پاکستان میں اور پاکستان سے باہر تخریب کاری کی ہے۔ ان گنت انسانوں کا خون میرے سر پر ہے شاہ جہاں۔ مجھے سو بار بھی پھانسی دی جائے تو شاید کم ہو۔ اسپتال میں علاج معالجے کے دوران میں ان گنت مرتبہ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے میرے گناہوں کی قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔"

"لیکن سزا کے بارے میں سوچنے کے بجائے تم نے برعکس کام کیا اور اسپتال سے فرار ہوگئے۔" میں نے کہا۔

"سزا کے بارے میں سوچ کر ہی تو فرار ہوا ہوں۔ مجھے زیادہ سے زیادہ پھانسی کی سزا ہی ہوگی لیکن یہ میرے لیے کوئی سزا نہیں۔ میری اس سزا سے ان گناہوں کا مداوا نہیں ہوسکتا جو میں نے کیے ہیں۔ ان کی فہرست بہت لمبی ہے جب کہ یہ سزا بہت معمولی ہے۔" ہارون پاشا عرف چیپا کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے واقعی ایک بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا۔

"تو تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی ٹھیک سے مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ کیا چاہتا ہوں۔ بس ایک دھندلا دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہے۔ جب تک یہ خاکہ مکمل نہ ہو میں تمہیں کچھ بتا نہیں سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے اسی طرح جرم کی دنیا میں رہتے ہوئے جرائم سے جنگ کرنا زیادہ کارگر ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جو تم نے بھی اختیار کیے رکھا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم کئی ماہ تک جہاں داد کی حیثیت سے پاشا گینگ میں شامل رہے ہو اور ایسی اندرونی ضربیں لگائی ہیں کہ پورا گینگ مٹی کا ڈھیر ہوگیا ہے۔ ایسا ہوا ہے یا نہیں؟"

"اس بارے میں تم زیادہ بہتر بتا سکتے ہو۔"

ہارون پاشا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پاشا گینگ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ میڈم شہزاد' ڈیوی اور وحدت علی جیسے اہم ممبر مارے جاچکے ہیں۔ کچھ لوگ گرفتاری کے ڈر سے ملک چھوڑ گئے ہیں۔ گارڈن ٹاؤن والی کوٹھی میں موجود تخریب کاری کا تمام تر سامان تباہ ہوچکا ہے اور قیمتی آلات اسکریپ بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے نقصانات ہیں جو تمہاری نظر سے اوجھل ہیں لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ گینگ کا وجود مرنے سے ہی ختم ہوگیا ہو۔ ابھی اتنا چانس ہے کہ تنظیم کے نیم مردہ جسم میں پھر سے جان ڈالی جاسکے۔ اور میں ایسا کروں گا بھی۔ لیکن ایسا کرکے میں جو مقصد حاصل کروں گا وہ پہلے مقاصد سے بالکل مختلف ہوگا۔"

اچانک "بیپ۔ بیپ" کی مخصوص آواز آئی۔ ہارون پاشا نے اپنی کمبل نما کیلی چادر کے اندر سے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی۔ یہ بڑی قیمتی رسٹ واچ تھی۔ نیلے ڈائل پر ایک روشنی تیزی سے اسپارک کررہی تھی۔ پاشا نے گھڑی پر کوئی بٹن دبانے کے بعد روشنی کو بند کیا پھر ڈیش بورڈ سے ایک کاغذ نکال کر اس پر ایک فون نمبر گھسیٹا اور مجھے تھماتے ہوئے بولا "اس نمبر پر ناظر نامی ایک شخص موجود رہتا ہے۔ تم میرے لیے جہاں سے جو پیغام بھی دوگے وہ اس شخص کے ذریعے مجھ تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت مجھے جلدی میں جانا پڑ رہا ہے۔ باقی باتیں بعد میں۔"

میں گاڑی سے اتر آیا۔ پاشا نے میری طرف متشکر نگاہوں سے دیکھ کر خدا حافظ کہا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ وہ تاریکی سے برآمد ہوا تھا اور پھر تاریکی میں کھو گیا تھا۔

میں ایک فرلانگ فاصلہ طے کرکے گھر واپس آگیا۔

ساہی صاحب موجود تھے اور بڑے چپ چپ بیٹھے تھے "کیا بات ہے جناب؟" میں نے انہیں کریدنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں۔ تم کہاں گئے تھے؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"ہارون پاشا ملنے آیا تھا۔" میں نے ان پر انکشاف کیا۔

ساہی صاحب بری طرح چونک گئے۔ ہارون پاشا کو پولیس پورے ملک میں تلاش کرتی پھر رہی تھی اور وہ یہاں اس کوٹھی پر چلا آیا تھا۔ میں نے ساہی صاحب کو پاشا سے ہونے والی ملاقات کا مختصراً احوال بتایا۔ آخر میں میں نے ساہی صاحب سے کہا "مجھے امید ہے جناب کہ یہ شخص ہمارے لیے بڑا مفید ثابت ہونے والا ہے۔"

ساہی صاحب نے میرے خیال کی تردید نہیں کی۔ ساہی صاحب قریباً ایک گھنٹا میرے ساتھ رہے لیکن بجھے بجھے سے نظر آئے۔ میرے استفسار کے باوجود انہوں نے اپنی خاموشی کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کی خاموشی کا راز مجھے اگلے دن معلوم ہوا جب میں صفدر سے ملنے زویں گل کی کوٹھی پر پہنچا۔ صفدر نے کہا "مجھے لگتا ہے شاہ جہاں صاحب! کہ ہمارے مذاکرات شروع ہونے سے پہلے ہی تعطل کا شکار ہونے والے ہیں۔"

"کیا بات ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کل شیخ عاصم کا نمائندہ یہاں پہنچا تھا‘ اس نے ساہی صاحب کے ساتھ وقت مقرر کر رکھا تھا۔ طے شدہ وقت پر ساہی صاحب اور قانونی مشیر امتیاز صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان کے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں‘ وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ کمرے کے اندر سے بلند آوازمیں بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ تلخ کلامی کا ماحول تھا۔ بعد میں شیخ عاصم کا نمائندہ بھناتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ ساہی صاحب نے غالباً اسی لیے آپ کو اس ملاقات سے لاعلم رکھا ہے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے ساہی صاحب پر غصہ آنے لگا۔ وہ مجھ سے اکثر باتیں چھپانے لگے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا میری ہمدردی میں کرتے ہیں لیکن یہ بات مجھے الجھن میں مبتلا کرتی تھی۔ شروع میں انہوں نے مجھ سے یہ بات چھپائی تھی کہ شیخ عاصم کے کچھ خطرناک ہرکارے مال روڈ کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور غزالہ کے بارے میں ان کے ارادے خطرناک ہیں۔ اب وہ شیخ عاصم کے ساتھ ہونے والی بات چیت چھپا رہے تھے۔ ان کا مقصد تو بالکل عیاں تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے کہ میری پریشانیوں اور تکلیفوں میں مزید اضافہ نہ ہو۔ وہ شیخ عاصم کے ساتھ میرے ٹکراؤ کو روکنا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے دن رات ایک کر رکھا تھا۔ مسٹر کلارک بھی اس کام میں ساہی صاحب کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ میری اطلاع کے مطابق دو چار روز تک مسٹر کلارک بھی لاہور آنے والے تھے تاکہ اس بات چیت کو کامیاب بنا سکیں۔

میں نے صفدر سے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا عاصم کی طرف سے کوئی اور مطالبہ پیش ہوا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پہلے سے پیش شدہ کسی مطالبے پر بے لچک رویہ رکھا ہو۔"

"بات چیت کے لیے تاریخ کون سی طے ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ بارہ یا تیرہ تاریخ ہوگی۔ اس وقت تک یقیناً مسٹر کلارک بھی پاکستان میں موجود ہوں گے اور وہ لوگ بھی جن کا کردار اس معاملے میں ضامن کا ہے۔"

"جگہ کون سی ہے؟"

"اس کام کے لیے گلبرگ کی ایک کوٹھی منتخب کی ہے۔ وہاں سیکیورٹی کا مکمل انتظام کیا جا رہا ہے۔" پھر صفدر نے مجھے اس کوٹھی کا پتا بتایا۔ آخر میں صفدر نے کہا "اس میٹنگ سے پہلے بھی ایک میٹنگ کل یا پرسوں ہوگی۔ اس میٹنگ میں شیخ عاصم کے بھتیجے کے علاوہ دونوں طرف کے قانونی مشیر شرکت کریں گے۔ ساہی صاحب بھی شریک ہوں گے۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ کال بیل بجی۔ زریں ملازم نے جاکر دیکھا اور پھر ساہی صاحب کے قانونی معاون امتیاز پراچہ کو لے کر اندر آگیا۔ امتیاز پراچہ کے ساتھ ایک جواں سال اسسٹنٹ ایڈووکیٹ عارفہ قاسم بھی تھی۔ دراصل وہ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہی یہاں تک آئے تھے۔ وہ دونوں مجھ سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے آئے تھے کہ شیخ عاصم اور غزالہ کی شادی کن حالات میں ہوئی تھی اور اس شادی کے بعد شیخ عاصم غزالہ کو سرگودھا میں شدید بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کیوں آیا تھا۔ یہ معلومات بات چیت میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔

میں نے امتیاز پراچہ اور اس کی جواں سال اسسٹنٹ کو ان کے سوالوں کے تفصیلی جوابات دیے۔ اس گفتگو کے دوران میں ایڈووکیٹ عارفہ نے مجھ سے پوچھا کہ اگر خون بہا کی بات چلی اور اس حوالے سے کوئی رقم طے ہوئی تو میں وہ رقم کتنی مدت میں دے پاؤں گا۔

صفدر نے کہا "شیخ عاصم نے ایک خطیر رقم کا ذکر کیا ہے۔ غالباً وہ یہی چاہتا ہے کہ وظیفے کے حوالے سے جو کچھ بھی ہمیں ملا ہے وہ اس کے اکاؤنٹس میں منتقل ہو جائے۔ بہرحال ہم اس کے لیے بخوشی تیار ہیں۔ ہم شیخ عاصم کا منہ بند کرنے کے لیے ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگائیں گے۔ ہم نے خود کو اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار کیا ہوا ہے۔"

امتیاز نے مسکراتے ہوئے کہا "فرش سے عرش پر پہنچ کر آپ پھر عرش سے فرش پر آنے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے‘ اس کے ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ اللہ کرے ایسی صورتِ حال پیدا نہ ہو کہ آپ کو اپنا سب کچھ دینا پڑے۔"

میں نے امتیاز صاحب کو بھی کریدنے کی کوشش کی اور ان سے پوچھا کہ مذاکرات کے سلسلے میں ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ ساہی صاحب گم صم ہیں۔

میرے سوال پر عارفہ قاسم کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ تاہم مسٹر امتیاز نے اپنے تاثرات قابو میں رکھے اور گول مول جواب دے کر بات ٹال گیا۔

عارفہ قاسم سے میری تھوڑی بہت جان پہچان بھی نکل آئی۔ جن دنوں میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر رہا تھا‘ ہمارے "بیچ" میں نسرین قاسم نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ باتوں باتوں میں بات نکل آئی کہ یہ عارفہ قاسم‘ اسی نسرین قاسم کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ یہ کل چار بہنیں تھیں اور چاروں نے لاء کی تعلیم حاصل کی تھی۔

گھر واپس جانے کے بعد بھی میں فکرمندی کا شکار رہا۔ ذہن میں مسلسل یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ آخر وہ کیا بات ہے جس نے بات چیت شروع ہونے سے پہلے ہی "مذاکرات" کی فضا خراب کر دی ہے۔ رات گیارہ بارہ بجے تک بے چین رہنے کے بعد اچانک میرے ذہن میں بات آئی اور میں نے عارفہ قاسم کو فون کر دیا۔ عارفہ کا فون نمبر میں نے آج ہی لیا تھا۔

دو چار گھنٹیوں کے بعد عارفہ کی آواز سنائی دی۔ آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پس منظر میں میوزک سنائی دے رہا تھا۔ غلام علی کی غزل لگی ہوئی تھی "ہیلو کون؟" عارفہ نے پوچھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں نے عارفہ سے اپنی پریشانی بیان کر دی۔ مجھے شک تھا کہ عارفہ کے پاس میرے سوال کا جواب موجود ہے۔ وہ تھوڑی دیر تو یہ جواب دینے سے کتراتی رہی‘ لیکن میں نے اصرار کیا تو وہ بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ عارفہ سے معلوم ہوا کہ کل شیخ عاصم کے قانونی مشیر نے امتیاز صاحب اور ساہی صاحب سے زویں گل کی رہائش گاہ پر ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات میں انہوں نے شیخ عاصم کی طرف سے یہ بات بالکل واضح کی ہے کہ مطالبات کی فہرست میں مطالبہ نمبر چھ کی حیثیت لازمی ہے اور اس مطالبے کے سلسلے میں کسی طرح کی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ عارفہ نے بتایا کہ یہ مطالبہ "دو رشتوں" کے حوالے سے ہے۔ شیخ عاصم کی طرف سے کہا گیا ہے کہ خیرسگالی کے اظہار کے طور پر کم از کم دو لڑکیوں کی شادیاں شیخ عاصم کی فیملی میں کر دی جائیں۔

عارفہ کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔ شیخ عاصم کے مطالبات میں سے یہی مطالبہ مجھے سب سے برا لگا تھا اور ناقابلِ قبول محسوس ہوا تھا۔ میرے ذہن نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے شیخ عاصم کی طرف سے کیے گئے دو مطالبات نہیں مانوں گا۔ ایک معافی مانگنے والا مطالبہ دوسرا رشتوں والا۔ اس حتمی فیصلے پر پہنچ کر سکون کی ایک لہر سی میرے رگ و پے میں اتر گئی۔

عارفہ نے کہا "پلیز شاہ جہاں صاحب! آپ نے مجھ سے بات اگلوائی ہے لیکن اس فون کال کا پتہ امتیاز صاحب کو نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے۔"

"نہیں چلے گا بھئی۔ تم اطمینان رکھو۔"

"کیا اب میں سو سکتی ہوں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بہت جلدی ہے؟"

"جی ہاں۔ کل شیخ عاصم کے قانونی مشیروں سے ملاقات کا وقت طے ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایس ایس پی (ساہی صاحب) بھی شریک ہوں گے۔ صبح گیارہ بجے کا وقت ہے۔ جانے سے پہلے مجھے دو پیپر بھی تیار کرنے ہیں۔"

"اوکے۔ تھینک یو۔ تو پھر تم آرام کرو۔" میں نے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

فون کرنے کے بعد مجھے سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کوئی کچھ بھی کہے‘ مجھے مخالف پارٹی کے ایسے مطالبات پر ہرگز سر نہیں جھکانا جن میں ہماری توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ مجھے ساہی صاحب پر غصہ آ رہا تھا اور کسی وقت دل ان کے لیے ہمدردی سے بھر بھی جاتا تھا۔ وہ میری پُرآشوب زندگی کو کنارے پر لانے کے لیے دل و جان سے کوشش کر رہے تھے۔ وہ کئی برس سے میرے راستے کے کانٹے اپنی انگلیوں سے چن رہے تھے اور انگلیوں کے زخمی

ہونے کی پروا بھی نہیں کر رہے تھے۔ میرے نزدیک مجھ پر ان کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ انہوں نے ایک عرصے سے میری بہن شفتا کو محفوظ پناہ گاہ فراہم کر رکھی تھی اور اس کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے۔ صفدر کی منگیتر انجم بھی شفتا کے ساتھ ہی ساہی صاحب کی تحویل میں تھی۔ ساہی صاحب نے شفتا اور انجم کا ٹھکانا مجھے نہیں بتایا تھا' وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی وقت میرے دشمن مجھے تشدد کی چکی میں پیس کر مجھ سے کچھ اگلوا لیں۔ صرف ایک مرتبہ جب زریں اور عاصم قریشی بری طرح شنکر کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ مجھے شفتا سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ اس واقعے کے بعد ساہی صاحب نے ایک بار پھر شفتا اور انجم کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور مجھے ان کے ٹھکانے سے لاعلم کر دیا تھا۔ ساہی صاحب کی حیثیت میرے لیے ایک دانا بزرگ کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک باہمت دوست کی بھی تھی۔ ان کے اکثر و بیشتر مشورے میرے لیے نہایت قیمتی ثابت ہوئے تھے۔

صبح گیارہ بجے گلبرگ کی ایک کوٹھی میں مذاکرات کی ابتدائی میٹنگ تھی۔ میں اس میٹنگ کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ مجھے صفدر کا فون موصول ہوا وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے مجھے گلبرگ والی کوٹھی کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب! جلدی وہاں پہنچیں۔ لگتا ہے کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پلیز جلدی کریں۔"

میں صفدر سے پوچھتا ہی رہا لیکن اسے بھی زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے گاڑی نکالی اور تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گلبرگ پہنچ گیا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنے چہرے میں تھوڑی سی "ریڈی میڈ" تبدیلی کر لی تھی۔ ابھی میں مطلوبہ کوٹھی سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے دو ایمبولینس گاڑیاں دکھائی دیں جو تیزی سے میرے ہی رُخ پر جا رہی تھیں پھر ایک پولیس موبائل پر بھی نظر پڑی۔ مطلوبہ کوٹھی شاندار رہائشی علاقے میں تھی۔ کوٹھی کے اردگرد مجھے پولیس کی کئی گاڑیاں نظر آئیں۔ کافی افراد بھی جمع تھے' افراتفری کا منظر نظر آ رہا تھا۔ میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا مین گیٹ تک پہنچا اور پھر کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔

بھاری بھرکم ہتھوڑا چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اچانک میری نگاہ ایس پی برکت پر پڑ گئی۔ یہ ریساتی طرز کا پولیس افسر مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا اور ساہی صاحب کے خاص ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کی تھانے دارانہ گفتگو گالیوں سے لبریز ہوتی اور وہ بات بات پر اپنے مخاطب کو چھترول کرنے اور مونچھ اکھاڑنے کی دھمکی دیتا تھا لیکن اس وقت ایس پی برکت کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ میں اسے پہچان کر ایک طرف لے گیا۔

"کیا ہوا ہے برکت صاحب؟ اور ساہی صاحب کہاں ہیں؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں یار۔ میں تو خود دو منٹ پہلے آیا ہوں۔ اس بھوتنی دے اے ایس آئی اکبر نے وائرلیس کی تھی۔"

"کیا اندر کوئی گولی وغیرہ چلی ہے؟"

"ہاں۔ پتا چلا ہے کہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ کسی بات پر گرما گرمی ہو گئی ہو گی بس فائرنگ ہو گئی۔"

"کیا سب لوگ اندر ہی ہیں۔"

"نہیں یار! وہ سور دا پتر راکفل میں شو کا بتا رہا تھا کہ بندے دو گاڑیوں میں نکل گئے ہیں۔ بلکہ شاید نس (دوڑ) گئے ہیں۔ ہماری دو موبائلیں ان کے پیچھے گئی ہیں' ابھی تک کوئی اطلاع شطلاع نہیں آئی ہے۔"

وزنی ہتھوڑے کے دھماکے مسلسل ہو رہے تھے، دروازہ ٹوٹنے کے بالکل قریب تھا۔ ایس پی برکت اور میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ اندرونی عمارت کا دروازہ تھا' اور خاصا مضبوط بنا ہوا تھا۔ ہتھوڑا آزمانے سے پہلے اس دروازے کے تالوں پر فائرنگ بھی کی گئی تھی جو ناکام رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ ٹوٹ گیا۔ ایس پی برکت کے علاوہ اسی رینک کا ایک اور پولیس افسر بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے اندر داخل ہونے والے پولیس اہلکاروں کو آواز سے حکم دیا کہ وہ رائفلیں بالکل تیار رکھیں اور احتیاط سے آگے بڑھیں۔ میں بھی ایس پی برکت کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔ افراتفری میں کسی نے مجھ پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ شاید مجھے بھی سادہ لباس میں پولیس والا سمجھ لیا گیا تھا۔

ایک طویل راہداری سے گزر کر ہم ایک لاؤنج میں آئے اور پھر میٹنگ ہال کے دروازے کے سامنے آ گئے۔ دروازے کے سامنے پہنچتے ہی نجانے کیوں میرے ذہن میں ان گنت اندیشے جاگ اٹھے۔ ساہی صاحب اور نجاو وغیرہ کی سلامتی کے بارے میں فکرمندی ایک دم عروج پر پہنچ گئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ جونہی ایس پی برکت نے ہاتھ بڑھا کر میٹنگ ہال کا دروازہ کھولا ایک خوفناک منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ میٹنگ ہال میں خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ چھت کے تین پنکھوں سے تین

لاشیں الٹی لٹک رہی تھیں اور دو لاشیں الٹی سیدھی صوفوں پر پڑی تھیں۔

میں دیکھ کر کانپ گیا۔ پنکھوں سے لٹکی ہوئی لاشوں میں سے ایک ساہی صاحب کے قانونی مشیر امتیاز وڑائچ کی تھی۔ دوسری سب انسپکٹر شجاعت کی۔ اور تیسری وڑائچ کی جواں سال اسسٹنٹ عارفہ قاسم کی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں سب سے پہلے لپک کر عارفہ قاسم کی لاش تک پہنچا۔ وہ برہنہ تھی۔ اس کے جسم کے نازک حصوں پر تشدد کے واضح نشان موجود تھے۔ اس کی ایک ٹانگ سے رسی باندھ کر اسے پنکھے سے الٹا لٹکایا گیا تھا اور بعد ازاں سر میں گولی ماردی گئی تھی۔ میں نے پنڈلی سے اپنا خنجر نکال کر بدقسمت عارفہ کی ٹانگ کی رسی کاٹی اور پھر اسے آرام سے قالین پر رکھ کر اس پر اپنی گرم چادر ڈال دی۔

یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی جواں سال قانون داں ہے جس سے صرف بارہ تیرہ گھنٹے پہلے میں نے فون پر بات کی تھی۔ وہ خونچکاں حالت میں بے حس و حرکت قالین پر پڑی تھی۔

اسی دوران میں پولیس کے اہلکار سب انسپکٹر شجاعت کی لاش کو پنکھے سے اتار چکے تھے۔ اس کا چوڑا سینہ سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بالوں کے درمیان ایک سرخ پھول کھلا تھا۔ شجاعت کے سینے پر گولی ماری گئی تھی۔ ایک دوسری گولی کا نشان اس کی پیشانی پر تھا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں بے اختیار اس کی لاش سے لپٹ گیا۔

شجاعت کا اور میرا ساتھ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن پچھلے چند مہینوں میں ہی اس دلیر اور متحرک نوجوان نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ کسی وقت تو مجھے ایسا لگنے لگتا تھا کہ صفدر کی غیرحاضری کے سبب جو وسیع خلا میرے اردگرد پیدا ہوا ہے شجاعت کے سبب اس کی وسعت کم ہوئی ہے۔ آج اس خوش رو نوجوان کے کپڑے پھاڑ کر اسے الٹا لٹکایا گیا تھا اور گولی مار دی گئی تھی۔ ایڈووکیٹ امتیاز وڑائچ کا انجام بھی مختلف نہیں ہوا تھا۔ ان کی نیم عریاں لاش ابھی تک پنکھے سے جھول رہی تھی۔ ایک ٹانگ سے رسی باندھی گئی تھی دوسری ٹانگ عجیب بے ڈھنگے طریقے سے چہرے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

میری نگاہوں میں چند دن پہلے کا منظر گھوم رہا تھا۔ سلطان آغا کی رہائش گاہ پر میں نے شیخ کے سرسوب وغیرہ کو اسی طرح ایک درخت سے لٹکایا تھا۔ وہ لوگ خطرناک قاتل تھے پھر بھی میں نے ان میں سے کسی کی جان نہیں لی تھی۔ یہاں تو بے گناہ لوگوں کو دردناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ [illegible]

میں سے ایک پولیس والے کی تھی۔ دوسرا ایک [illegible] تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ بھی ساہی صاحب [illegible] سخاوت کا دوست تھا۔ ان دونوں افراد کے ساتھ سلوک کرنے کی کوشش کی گئی تھی جو باقی تینوں ا[illegible] ساتھ ہوا تھا۔ سفید فام شخص کی ٹانگ میں باقاعدہ باندھ دی گئی تھی غالباً وقت کی کمی کے سبب ان کو یہ الٹا نہیں لٹکایا جاسکا تھا۔ یہ دونوں افراد بھی خودکار [illegible] فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے۔

شیشے کی دو بڑی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک [illegible] پڑا تھا اور قالین پر ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ [illegible] لاشوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ اس [illegible] گزرے چالیس پینتالیس منٹ سے زیادہ نہیں ہو[illegible] نے ساہی صاحب کی تلاش میں چاروں طرف دوڑائیں پھر انہیں دیوانہ وار کمروں اور دالانوں میں ڈھونڈنے لگا۔ اس عمل میں پولیس والے بھی میرے شریک تھے۔ میں گاہے گاہے ساہی صاحب کو پکار بھی [illegible] میں ایک تاریک کمرے سے نکلا تو ایس پی بر[illegible] میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "شاہ جہاں صاحب یہاں نہیں ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"آؤ میرے ساتھ میں بتاتا ہوں۔"

برکت کے لہجے نے مجھے لرزا دیا۔ میں جھنجوڑتے ہوئے پوچھا "وہ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں ٹھیک ہیں۔ انہیں وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" برکت نے بیرونی دروازے کی طرف قدم ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا "لوگوں" سے برکت کی مراد وہی ہے جنھوں نے میٹنگ ہال میں خون کی ہولی کھیلی تھی۔ ہم ہوتے کوٹھی سے باہر آئے۔ جہاں ایک پولیس کار کھڑی تھی۔ جونہی ہم کار میں داخل ہوئے اس کے [illegible] چرائے اور وہ تیزی سے روانہ ہوگئی "کیا پتا چلا [illegible] صاحب کے بارے میں؟" میں نے برکت سے پوچھا۔

برکت کے ایک ماتحت نے بتایا "جن لوگوں نے شجاعت اور ایڈووکیٹ صاحب کو قتل کیا ہے وہ [illegible] صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ساہی صاحب کو [illegible] ہی موقعے پر موجود پولیس نے فرار ہونے والوں پر [illegible] چلائی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ انہیں یرغمال بنا لیا گیا؟"

"بالکل جی۔ حالات تو یہی بتا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ ساہی صاحب زخمی بھی ہیں۔"

"اب کہاں ہیں ساہی صاحب؟"

"چھانگا مانگا کے قریب جنگل میں پولیس پارٹیوں نے مجرموں کو گھیر لیا ہے۔ وہ لوگ ساہی صاحب کو لے کر ایک پرانے بنگلے کے اندر چلے گئے ہیں۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

میرے سینے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ سب انسپکٹر شجاعت اور ایڈووکیٹ عارفہ وغیرہ کی لاشیں جیسے ابھی تک میرے سامنے پڑی تھیں اور بہ زبانِ خاموشی خود پر ٹوٹنے والی قیامت کی روداد سنا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا جائے وقوع پر بہت سے پھٹے ہوئے کاغذ بھی بکھرے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کاغذ بھی اس شدید تلخ کلامی کی نشانی تھے جو بات چیت کے دوران میں شروع ہوئی تھی۔ امتیاز وڑائچ ساہی صاحب کے بہت گہرے دوست تھے۔ وہ اس مسئلے کو ایک قانونی مشیر کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہے تھے اپنے ذاتی مسئلے کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمیں ان کی لاش بھی پنکھے سے جھولتی ہوئی ملی تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے ملتان روڈ پر دوڑتی ہوئی چھانگا مانگا کی طرف بڑھتی رہی اور میرا ذہن بھی گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہی بھاگتا رہا۔ مجھے پہلے دن سے اندیشہ تھا کہ جو کچھ مسٹر کلارک اور ساہی صاحب چاہ رہے ہیں وہ ہوگا نہیں۔ شیخ ناصم کا مسئلہ خون خرابے کے بغیر حل ہونے والا نہیں۔

گاڑی چھانگا مانگا کی سرگاہ سے چند کلومیٹر پہلے ہی ایک کچے پکے راستے پر مڑگئی۔ یہ راستہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جنگل کی طرف جاتا تھا۔ اونچے نیچے راستے پر ٹائروں کے نشانات کثرت سے نظر آرہے تھے۔ ان تازہ نشانات سے پتا چلتا تھا کہ ہم سے پہلے کئی گاڑیاں موقعے پر پہنچ چکی ہیں۔ ہم کچھ آگے گئے تو "وی ہیڈز" کے کئی فائر سنائی دیے۔ اس کے فوراً بعد خودکار رائفل کی "برسٹ فیٹ" گونجی۔ میرا خون جسم میں کھول رہا تھا۔ اگر ساہی صاحب کو کچھ ہوجاتا تو پتا نہیں میں کیا کر گزرتا۔ اس وقت میرے نزدیک اہم ترین مسئلہ ساہی صاحب کی حفاظت اور بازیابی تھا۔

ہم دفعے پر پہنچے تو ہر طرف پولیس نظر آئی۔ سادہ پوش اور باوردی اہلکار جگہ جگہ درختوں اور گاڑیوں کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر اینٹوں کا خستہ حال مکان نظر آرہا تھا۔ بنگلے کے اردگرد چند نیچی چھتوں والے کمرے تھے اور گودام سا بنا ہوا تھا۔ موقعے پر موجود ایک سب انسپکٹر نے بتایا کہ مجرمان کی تعداد چھ کے قریب ہے وہ ایس ایس پی صاحب کو لے کر گودام میں گھس گئے ہیں اور کھڑکیوں سے پولیس پر گولی چلا رہے ہیں ساتھ ساتھ دھمکا بھی رہے ہیں کہ وہ ایس ایس پی کی جان لے لیں گے۔

میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا "کیا تم گلبرگ والی کوٹھی میں موجود تھے؟"

"جی ہاں۔" سب انسپکٹر نے جواب دیا "وہاں جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا ہمیں اس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اندرونی کمروں کے دروازے بند تھے ہم لوگ باہر پہرے پر کھڑے تھے۔ ہم کسی باہر کے خطرے سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھے ہمیں پتا نہیں تھا کہ خطرہ اندر موجود ہے اور گڑبڑ بھی اندر ہی ہونی ہے۔ بارہ بجے کے قریب اندر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ اس کے چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور چند افراد ایس ایس پی صاحب کو گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ انہوں نے پستول ایس ایس پی صاحب کے سر سے لگا رکھا تھا۔ ایک شخص نے ان کے عقب میں رائفل تان رکھی تھی۔ ایس ایس پی صاحب کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا لگتا تھا کہ انہیں گولی لگی ہے۔ ایس ایس پی صاحب کی وجہ سے ہم بالکل مجبور ہوگئے۔ وہ لوگ انہیں لے کر لینڈ کروزر میں آ بیٹھے اور بھاگ نکلے۔ یہ وہی لینڈ کروزر ہے جو سامنے درختوں میں پھنسی ہوئی ہے۔" سب انسپکٹر نے خنجر کی گھنی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

لینڈ کروزر کا اگلا پہیہ ایک گڑھے میں چلا گیا تھا وہ خطرناک زاویے سے دائیں طرف جھک گئی تھی۔ اس کے پچھلے دونوں ٹائر بھی گولیاں لگنے سے فلیٹ ہوچکے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے بات کرنے والے سب انسپکٹر کی آنکھیں سرخ اور لہجہ آنسوؤں سے بوجھل ہے۔ یقیناً اسے اپنے ساتھی سب انسپکٹر شجاعت کی ہلاکت کی خبر مل چکی تھی۔ میں نے اس رضا نامی سب انسپکٹر سے پوچھا "گلبرگ کی کوٹھی سے بھاگنے والے کیا یہ چھ لوگ ہی تھے؟"

"نہیں جی۔ وہاں سے یہ دو گاڑیوں میں نکلے تھے اور بارہ کے قریب بندے تھے۔ بعد میں ایک گاڑی "وناناتھ" کے قریب دوسرے رخ پر چلی گئی۔ پولیس کی ایک پارٹی اس کے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے۔"

"جو لوگ ساہی صاحب کو لے کر بنگلے میں گھسے ہیں وہ کون ہیں؟ اور تمہارے خیال میں ان کے پاس کتنا اسلحہ ہے؟"

"ان میں سے تین چار بندے تو مقامی نہیں ہیں۔ وہ چہرے مہرے سے شیخ عاصم کے ساتھی نظر آتے ہیں۔ باقی دو یا تین بندے مقامی ہیں۔ گودام کے اندر سے یہی لوگ بات کر رہے ہیں۔ یہ سارے افراد مسلح ہیں۔ ایک بندے کے شخص کے پاس جی تھری گن بھی ہے۔ شاید یہ وہی بدمعاش ہے جسے "سرموب" کہا جاتا ہے۔"

"سرموب!" میں نے زیر لب دہرایا اور میری رگوں میں آگ دوڑنے لگی لیکن یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سب انسپکٹر نے جو شخص دیکھا ہے وہ سرموب نہیں ہوگا۔ سلطان آغا کے مکان پر "محترم سرموب صاحب" کو جس طرح کی شدید ضربات آئی تھیں وہ اتنی جلدی اپنے منحوس قدموں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سرموب کے ڈیل ڈول والا کوئی اور شخص تھا۔ (بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

"ساہی صاحب کا زخم کس طرح کا ہے؟" میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

"انہیں بائیں کندھے پر گولی لگی ہے۔ جس وقت ہم نے دیکھا کافی خون نکل رہا تھا۔ انہوں نے کندھا دوسرے ہاتھ سے دبا رکھا تھا۔"

میں نے محلِ وقوع کا جائزہ لیا۔ بھٹہ اور گودام ذرا بلندی پر واقع تھے۔ ان کے عقب میں چالیس پچاس گز تک صاف قطعہ زمین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عقب سے گودام تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔ دائیں جانب کیکر، بیری اور شہتوت وغیرہ کے کافی گھنے درخت موجود تھے۔ درختوں کا یہ سلسلہ گودام کی دیواروں تک چلا گیا تھا۔ ان درختوں میں گھس کر گودام کے نزدیک پہنچا جا سکتا تھا۔ ابھی میں جائزہ ہی لے رہا تھا کہ گودام کی طرف سے چیختی ہوئی زوردار آواز آئی۔ یہ آواز ان افراد میں سے ایک کی تھی جنہوں نے ساہی صاحب کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہ پشتو لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ پکار کر بولا "خبردار! ہمارے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہم نے ایس پی کے جسم سے ریموٹ کنٹرول بم باندھ دیا ہے۔ کوئی نزدیک آیا تو اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔"

جواب میں ایس پی برکت نے پکار کر کہا "کچھ بھی ہو جائے تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں نکل سکتے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ایس ایس پی صاحب کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہماری طرف سے وعدہ ہے کہ تمہیں گولی نہیں ماری جائے گی۔"

"ہمیں تمہاری گارنٹی کی ضرورت نہیں اور نہ ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ بس تم ہمارے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہم نتیجے کا خیال دل سے نکال کر بٹن دبا دیں۔" اس کے ساتھ ہی زوردار آواز سے گودام کی کھ ہوگئی۔

اگلے آدھے گھنٹے میں پولیس اور مجرموں کے درمیان اسی نوعیت کی گفتگو دو بار مزید ہوئی۔ مجرموں کا رویہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ساہی صاحب کی مرہم پٹی کے لیے کسی ڈاکٹر کے اندر جانے کا امکان بھی بالکل رد کر دیا۔ اس آدھے گھنٹے میں پولیس کی دو مزید گاڑیاں پہنچ گئی تھیں۔ جائے وقوع کو پوری طرح گھیر لیا گیا۔ سردیوں کا مختصر دن بڑی تیزی سے اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ہوا میں خنکی آ گئی تھی اور درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ ساہی صاحب کو اغوا کرنے والے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے سے ان کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ نمبر ایک، تاریکی کا انتظار کر رہے تھے تاکہ پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کر سکیں۔ نمبر دو، انہیں باہر سے مدد ملنے کی توقع تھی۔ باہر کی مدد دو طرح کی ہو سکتی تھی۔ مسلح مداخلت یا سفارتی کوشش۔ مسلح مداخلت کا امکان تو اب نہیں تھا کیونکہ چھ سات تھانوں کی پولیس یہاں جمع ہو چکی تھی۔ انہوں نے اس جگہ کا پورا گھیراؤ کر لیا تھا۔ زیادہ امکان سفارتی مدد کا تھا۔ شیخ عاصم کے ہاتھ بہت لمبے اور جڑیں گہری تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو اس گھیرے سے نکالنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ بات بھی ممکن تھی کہ شیخ کے ساتھی اس وقت گرفتاری دینا چاہتے ہوں جب ان کے حامی پولیس افسر موقع پر موجود ہوں۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا اس چکر میں جس شخص کا سب سے زیادہ نقصان ہو رہا تھا وہ ساہی صاحب تھے۔ انہیں زخم آیا تھا اور انہیں فوری طبی امداد درکار تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کس حال میں ہیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ صورتحال جوں کی توں رہی تو ساہی صاحب کو اس چنگل سے نکالنا مشکل تر ہو جائے گا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک بار فائرنگ شروع ہوئی۔ ایس پی برکت کی ہدایت پر تین پولیس اہلکار ایک گاڑی کی اوٹ لے کر گودام کے قریب گئے لیکن گودام میں موجود افراد نے بغیر کسی وارننگ کے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ لوگ فوراً پیچھے ہٹ آئے۔

جونہی اندھیرا گہرا ہوا، میں اپنے پروگرام کے مطابق حرکت میں آ گیا۔ میرے جسم میں برقی رو دوڑ رہی تھی اور ذ

ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ میں نے چھوٹی نال کی رائفل اپنے اوور کوٹ میں بڑے اچھے طریقے سے چھپا رکھی تھی۔ گھنے درختوں میں جھک کر چلتا ہوا میں گودام سے قریب تر چلا گیا۔ سری لنکا کے گھنے جنگلوں میں ایسی چھاپہ مار کارروائیوں کے بعد مجھے خاصا تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ درختوں اور خشک پتوں پر سے بے آواز گزر جانا ایک آرٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ خاص طور سے پرسکون موسم میں جب ہوا وغیرہ بھی نہ چل رہی ہو۔ گودام کے قریب پہنچ کر چند درجن گز کا فاصلہ مجھے زمین پر لیٹ کر طے کرنا تھا اور یہی سب سے دشوار مرحلہ تھا۔ سردی ایک دم ہی ہڈیوں میں سرایت کرنے لگی تھی۔ ہلکا سا کہرا بھی جنگل کو گھیر رہا تھا۔ میں نیم زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور کمانڈوز کے انداز میں "بے آواز" گودام کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی میں نے نصف یا چوتھائی فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ گودام کا دروازہ کھلا اور ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے سر اور جسم پر گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ یہ منافی "بابی بیکرز" میں سے ایک تھا۔ اس کے کندھے سے لٹکی ہوئی سیون ایم ایم رائفل میں دیکھ سکتا تھا۔ میں اپنی کھوہ کے اندر تھا، بالکل بے حرکت ہو گیا۔ اپنی سانس تک روک لی تھی میں نے۔ رائفل کی نال کو اوور کوٹ کے اندر ہی میں نے اس طرح حرکت دی تھی کہ اس کا رخ چادر پوش کی طرف ہو گیا تھا۔

پہلے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ پیشاب کرنے کے لیے جھاڑیوں کی طرف آ رہا ہے لیکن پھر یہ اندازہ غلط نکلا۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا لیکن اس نے اپنی شلوار کا ازار بند وغیرہ نہیں کھولا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں سے سو سو کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے بھانپ لیا کہ وہ شدید بخار میں ہے۔ شاید اسی لیے اس نے گرم چادر بڑے اہتمام سے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ وہ مجھ سے صرف چار پانچ گز کی دوری پر بیٹھ کر قے کرنے لگا۔

گودام کے کھلے دروازے میں سے باتوں کی مدھم آواز باہر تک آ رہی تھی۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ بس ایک مدھم سی روشنی لکیر دکھائی دے رہی تھی جو یقیناً کسی ایسی ٹارچ کی تھی جسے زمین پر رکھا گیا تھا۔ میں نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ بالکل بے آواز رینگتا ہوا میں چادر پوش کے سر پر پہنچ گیا۔ جھپٹ کر میں نے اس کی توانا گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی۔ اس کے حلق سے "اوغ" کی آواز نکلی تھی۔ اگر یہ آواز گودام تک پہنچی بھی تھی تو کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ یقیناً یہی سمجھا گیا ہوگا کہ وہ قے کر رہا ہے۔ میں نے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے شخص کی گردن کو مخصوص جھٹکا دیا اور اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے یخ بستہ زمین پر لٹا دیا۔ بے ہوش ہو جانے والے شخص کی شلوار میں نے پتلون کے اوپر سے ہی پہن لی تھی اور اوور کوٹ جھاڑیوں میں پھینک کر گرم چادر کی بکل اس طرح ماری کہ سر اور چہرے کا کچھ حصہ بھی چھپ گیا۔ اس سارے عمل میں مجھے بمشکل دو منٹ ہی لگے تھے۔ چادر پوش کے بے ہوش اور نیم عریاں جسم کو جھاڑیوں میں ڈال کر میں گودام کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور رائفل پر گرفت مضبوط تھی۔

جونہی میں گودام میں داخل ہوا۔ ایک شخص نے پوچھا "ہاں بھئی! الٹی کر کے طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھ ہی حلق سے "ہوں" کی آواز بھی نکالی۔

"چلو تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔" اسی شخص نے کہا۔

گودام میں سی سیلن کی بو آ رہی تھی۔ وہ بدبو جو اکثر دیر تک بند اور سیلن زدہ رہنے والی عمارتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک نیم روشن ٹارچ فرش پر پڑی تھی۔ اس کی روشنی میں گودام کے اندر پانچ افراد کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ چھٹا فرد فرش پر لیٹا تھا۔ یقیناً یہ ساہی صاحب تھے۔ شجاعت اور امتیاز پراچہ وغیرہ کی لاشیں دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک نیلی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دل پتھر کی طرح سخت ہو گیا ہے۔ میری انگلی رائفل کی لبلبی پر تھی اور رائفل میں پوری بیس گولیاں موجود تھیں۔ یہ پانچ افراد تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے حصے میں قریباً پانچ گولیاں آتی تھیں۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھ سے سرزد ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کا مطلب ساہی صاحب کی اور میری موت ہوگا۔ میں نے چند سیکنڈ کے اندر سارا حساب جوڑ لیا تھا۔ اپنے پہلے برسٹ میں مجھے تین افراد کو نشانہ بنانا تھا۔ ان میں سے کسی کو زندہ نہیں بچنا چاہیے تھا۔ دوسرے برسٹ میں باقی دو افراد کو نشانہ بنانا ضروری تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف آیا۔ غالباً وہ پاس آ کر میرا حال دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اب مزید انتظار کی گنجائش بالکل نہیں تھی۔ میں نے طے شدہ زاویے کے مطابق پہلا برسٹ مارا۔ خوفناک تڑتڑ سے گودام کا خلا گونج اٹھا۔ مسلسل شعلے لپکے اور ایک سیدھ میں بیٹھے ہوئے تین افراد اچھل اچھل کر زمین پر گرے۔ یقیناً ان کے جسم چھلنی ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے

رُخ پھیر کر دوسرا برسٹ مارا۔ میری طرف آتا ہوا شخص تڑپ کر دروازے سے ٹکرایا اور گر گیا لیکن دوسرا شخص صرف زخمی ہوا تھا۔ میں نے اسے بدحواسی میں گھومنے اور پھر جھک کر تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھا۔ میں نے اندازے سے تاریکی میں چند مزید فائر کیے پھر میں دوڑ کر ساہی صاحب کی طرف آیا۔ ساہی صاحب کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ کروٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے جسم کے ساتھ واقعی ریموٹ کنٹرول بم موجود تھا۔ یہ جدید طرز کا بم ایک موٹی اور وزنی ہتھکڑی جیسا تھا۔ اس پر چھوٹا سا ڈائل بنا ہوا تھا اور ایک سرخ بلب جل رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے خنجر کے ذریعے ساہی صاحب کے ہاتھوں کی بندشیں کاٹیں پھر ٹارچ کی روشنی میں میں نے بم کے ریموٹ کنٹرول کی تلاش شروع کی۔ میرے ذہن میں جو سب سے بدترین خدشہ تھا وہ ریموٹ کنٹرول کے بارے میں ہی تھا۔ اگر ریموٹ کنٹرول' باقی جنگیوں کے زندہ بچ جانے والے شخص کے پاس تھا تو کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے فرش سے ٹارچ اٹھائی اور اس کا نیم روشن دائرہ فرش پر پھینکا۔ سیمنٹ کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا۔ میری نگاہ ایک تنومند افغانی کی لاش پر پڑی۔ اس کے خون آلود ہاتھ کے قریب ہی سلور کلر کا ریموٹ کنٹرول موجود تھا' جو ایک لمحے میں ساہی صاحب کی زندگی کو موت میں بدل سکتا تھا۔ ریموٹ کنٹرول کے اوپر بھی ایک سرخ بلب روشن تھا۔ اس کے علاوہ مختلف رنگوں کے تین چار بٹن لگے ہوئے تھے' ان بٹنوں میں سے کسی کو بھی چھیڑنا خطرناک تھا۔

ریموٹ کنٹرول ڈھونڈ کر مجھے اطمینان ہوا تھا لیکن ساہی صاحب کی کراہتی ہوئی کمزور آواز نے اگلے ہی لمحے یہ اطمینان غارت کردیا۔ وہ بولے "اس کے دو کنٹرول ہیں شاہ جان! دوسرا بھی یہیں کہیں ہوگا۔"

میں نے دوسرے کنٹرول کی تلاش میں ٹارچ کو گھمانا شروع کیا۔ ٹارچ کی روشنی اب اور بھی کمزور ہو چکی تھی۔ ٹارچ کا نیم روشن دائرہ خون سے بھیگی ہوئی پرالی پر لاشوں کے درمیان حرکت کر رہا تھا' لیکن دوسرا کنٹرول مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ساہی صاحب بھی میرے ساتھ کنٹرول ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں دوسرا کنٹرول فرار ہونے والے شخص کے پاس ہی تو نہیں۔ چند لمحوں کے اندر میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔

گودام سے باہر پولیس اپنا گھیرا تنگ کر رہی تھی' لیکن ابھی گودام تک پہنچنے کی جرأت کسی نے نہیں کی تھی۔ تیس چالیس گز کی دوری سے ایس پی برکت کی بھاری بھر آواز آئی۔ وہ پکار کر بولا "ہم تمہیں پھر وارننگ دے رہے ہیں۔ ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔ تم پر گولی نہیں چلائی جا گی۔"

پولیس والے ابھی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو تھے کہ گودام کے اندر پانسا پلٹ چکا ہے اور ساہی صاحب اغوا کرنے والے چھ افراد میں سے ایک بے ہوش ہے او چار لاشوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں نے کھڑکی کھو اور ایس پی برکت کو پکار کر مخاطب کیا۔ میں نے اسے بتا کی کوشش کی کہ میں گودام کے اندر پہنچ چکا ہوں اور باقی جر ہلاک ہو گئے ہیں۔

پتا نہیں کہ میری آواز ایس پی برکت اور دیگر افراد تک پہنچی یا نہیں۔ لیکن اسی دوران میں' میں نے ایک دم سا صاحب کو ٹھٹکتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ساہی صاحب کے یو ٹھٹکنے کی وجہ میری سمجھ میں آئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چونکہ دوسرا ریموٹ کنٹرول نہیں م رہا تھا لہٰذا ساہی صاحب نے ہتھکڑی نما بم کو اپنے جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جونہی انہوں نے ہتھکڑی کا کھٹکا کھولنا چاہا تھا' ڈائل پر لگا ہوا سرخ بلب بڑی تیزی سے جلنے بجھنے شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی بم کے اند سے ایک باریک سی خوفناک آواز آنے لگی تھی۔ جو دھما خیز واقعات میں ایسی آواز ریڈ الرٹ سگنل کے طور پر موجو ہوتی ہے۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے چلا کر پوچھا۔

ساہی صاحب نے ایک بار پھر کھٹکا کھولنے کی ناکا کوشش کی۔ بم کے اندر سے برآمد ہونے والی باریک آوا مزید تیز ہو گئی اور سرخ بلب کی اسپارکنگ میں بھی شدت آ گئی۔ یہ بڑی خوفناک صورت حال تھی۔ میں نے کھٹکا کھو میں ساہی صاحب کی مدد کرنا چاہی۔ ایک دم ساہی صاحب ک پتا نہیں کیا ہوا۔ انہوں نے مجھے دھکا دیا۔ یہ دھکا قطعی غیر متوقع تھا' میں لڑکھڑا کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ ساہی صاحب نے دفعتاً دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"ساہی صاحب!" میں نے چیخ کر کہا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دو ہتڑ رسید کیا۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں میں سماعت شکن دھماکا ہوا "ساہی صاحب۔ ساہی صاحب۔!" میں چیختا چلا گیا پھر میں نے دروازے کے بالائی حصے پر پورا نقل کا برسٹ مارا دروازے کا چٹخنی والا حصہ ٹوٹ

کر جا گرا۔ میں دروازے کو دھکا دیتا ہوا دیوانہ وار اندر گھسا۔ اندر تاریکی تھی اور بارود کا دھواں تھا جس میں خون کی بُو شامل تھی۔

"ساہی صاحب۔ ساہی صاحب۔!" میں دیوانہ وار ہاتھ چلا کر انہیں ڈھونڈنے لگا اور چیخنے لگا۔

گودام میں روشنی کا واحد ذریعہ ٹارچ تھی۔ ریموٹ کنٹرول بم کا دھماکا ہوتے ہی بہت سی اشیاء ٹوٹ گئی تھیں جن میں ٹارچ بھی شامل تھی۔ مجھے کسی ہائی جیکر کی لاش سے ٹھوکر لگی اور میں گھٹنوں کے بل گرا۔ میرے ہاتھ کسی شے سے ٹکرائے۔ یہ ساہی صاحب کا سر تھا۔ میں نے انہیں' ان کے بالوں کی ساخت سے پہچانا۔ میں نے انہیں ٹٹولا۔ وہ قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ ساہی صاحب کا جسم گرم خون سے تر بتر تھا۔ ان کا ایک بازو کندھے پر سے غائب تھا۔ سینے پر بھی گہرا گھاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم ان کے جسم میں لرزش موجود تھی اور وہ سانس لے رہے تھے۔

میں نے کھڑکی کھول کر زور زور سے پولیس والوں کو پکارا' پھر میں نے ساہی صاحب کا زخموں سے چور جسم گود میں اٹھایا اور ایمبولینس گاڑیوں کی طرف بڑھا۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ساہی صاحب کے جسم کو ٹٹول کر دیکھوں۔ میں جانتا تھا کہ انہیں ٹٹولنا میرے لیے بے حد اذیت ناک ثابت ہو گا۔ ابھی میں بیس پچیس قدم دور ہی گیا تھا کہ پولیس والوں کی طاقتور ٹارچوں کی روشنی مجھ پر پڑنے لگی۔ میں نے ساہی صاحب کو دیکھا اور پوری جان سے لرز گیا۔ وہ ختم ہو چکے تھے۔ بس چند سانسیں ہی جسم میں اٹکی رہ گئی تھیں۔ میں ان کے سینے کے گھاؤ کو رو رہا تھا' ان کے پیٹ پر اس سے تین گنا بڑا گھاؤ موجود تھا۔ ساہی صاحب کی دم توڑتی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں کیچڑ آلود زمین پر یوں بیٹھ گیا جیسے نماز کے دوران التحیات میں بیٹھتے ہیں۔ ساہی صاحب کا خون آلود سر بدستور میری گود میں تھا۔

میں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا "ساہی صاحب۔ شفقت۔؟"

ان کے لب تھرائے۔ میں نے اپنا کان ان کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیا۔ ساہی صاحب نے دو بار یہ الفاظ دہرائے "ملتان۔ بابر شاہ۔" ساہی صاحب کے ان دو الفاظ نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ بابر شاہ' ساہی صاحب کے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے پاک فضائیہ میں انجینئر کی حیثیت سے ایک عرصے تک خدمات انجام دی تھیں۔ کچھ عرصے تک ان کی دوستی میں زبردست تعطل بھی آیا تھا' تاہم بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ دونوں اب پھر دوست ہیں۔ بابر شاہ آج کل ملتان میں مقیم تھے۔

پولیس والوں نے ایک اسٹریچر ساہی صاحب کے قریب رکھ دیا تھا۔ انہیں اسٹریچر پر لٹا کر ایمبولینس میں پہنچایا گیا۔ ایمبولینس میں پہنچنے سے پہلے ہی ان کی سانس اکھڑ گئی تھی۔ وہ جا رہے تھے۔ میری مصیبتوں کا ساتھی' میرے دکھوں کا دردی' میری راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے والا جا رہا تھا۔ ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جہاں سے اسے واپس نہیں آنا تھا۔ میرا دل چاہا۔ میں اپنے بازو پھیلا کر ان کے راستے میں کھڑا ہو جاؤں ان سے کہوں۔ "آپ نہیں جا سکتے سر! اٹ از ٹو ارلی سر! آپ نے برسہا برس مجھے انگلی تھما کر چلایا ہے۔ اب مجھے آپ کی عادت پڑ چکی ہے سر! میں آپ کے بغیر نہیں چل سکتا سر! میں اور شفقت یتیم نہیں تھے' لیکن آج ہم یتیم ہو جائیں گے۔ آپ نے جانے کے لیے یہ کیا وقت چنا ہے جناب؟ دکھوں کی منجدھار اتنی جان لیوا کبھی نہیں تھی جتنی اب ہے۔ غم کبھی اتنا ٹوٹ کر نہیں برسا تھا جتنا آج ہے۔ آپ مجھے یوں بے آسرا کر کے نہیں جا سکتے سر!"

لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس انہیں پتھرائی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور وہ چلے گئے۔ جانے والے رکتے بھی کہاں ہیں۔ جب وہ رختِ سفر باندھ لیتے ہیں تو کوئی التجا کوئی درخواست ان کا ارادہ ملتوی نہیں کر سکتی۔

وہ جا چکے تھے۔ ان کا جسدِ خاکی میرے بازوؤں میں پڑا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل رات ہی میں نے انہیں زندہ دیکھا تھا' ان سے باتیں کی تھیں اور آئندہ چار پانچ دنوں کے حوالے سے ان کے پروگراموں کی تفصیل سنی تھی۔ کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

O☆O

بعد کے چار پانچ دن میرے لیے ایک بے ترتیب اور تکلیف دہ خواب کی طرح تھے۔ میں ایک بے جان لاشے کی طرح سب انسپکٹر شجاعت اور ساہی صاحب کے جنازوں میں شریک ہوا تھا۔ اس سے چند گھنٹے پہلے میں نے دو اور جنازوں میں شرکت کی تھی۔ یہ ایڈووکیٹ امتیاز پراچہ اور عارفہ قاسم کے جنازے تھے۔ ساہی صاحب کے جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے میری آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ ایک طرف سے زریں گل نے مجھے سہارا دے رکھا تھا' دوسری طرف میرے پرانے دوست عالم قریشی نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ عالم قریشی ساہی صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے

چند گھنٹے پہلے ہی ابو ظہبی سے پاکستان واپس آیا تھا۔ ساہی صاحب کی لاڈلی بیٹی فریال انگلینڈ میں تھی۔ اسے بڑی مشکل سے واپسی کا ٹکٹ ملا تھا۔ اس کی وجہ سے ساہی صاحب کی آخری رسومات میں تقریباً چوبیس گھنٹے کی تاخیر ہوئی تھی۔ فریال کی حالت مجھ سے اور صفدر سے دیکھی نہیں گئی تھی۔ ساہی صاحب کی میت کے سرہانے وہ میرے گلے لگ کر اتنا روئی تھی کہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ مسز جی کلارک بھی ساہی صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے نیویارک سے یہاں پہنچے تھے۔ میں نے انہیں غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے ہوئے دیکھا۔

ہم میانی صاحب کے قبرستان میں ساہی صاحب کی قبر بنا کر واپس لوٹ آئے تھے۔ میری نگاہ میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا جب ریموٹ کنٹرول بم کے ALIVE ہونے پر ساہی صاحب نے مجھے دھکا دے کر گودام سے باہر کردیا تھا اور دروازے کو چٹخنی چڑھادی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے قریب رہوں گا تو آخری وقت تک بم کو ان کے جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ساری زندگی میری جانب آنے والی تکلیفوں کا رخ اپنی طرف موڑتے رہے تھے' اب اپنی جانب آنے والی تکلیف کا رخ میری طرف کیسے موڑ سکتے تھے اور دیکھا جائے تو یہ تکلیف بھی تو میری ہی تھی۔ وہ پچھلے کئی ہفتوں سے میری خاطر ہی تو بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ بیماری کے بعد پہلے جیسی ہمت ان میں نہیں رہی تھی پھر بھی میرے مفادات کے لیے وہ اپنے اندر شیر جیسا حوصلہ پیدا کرلیتے تھے۔ یہ عجیب تعلق تھا' یہ انوکھا ناتا تھا۔ بے لوث۔ بے غرض اور قطعی لازوال۔

شیخ عاصم اور اس کے ساتھیوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ لوگ یوں غائب ہوگئے تھے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ ایس ایس پی ساہی صاحب کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پولیس جگہ جگہ ملزمان کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ان گنت پولیس پارٹیاں مختلف سمتوں میں محوِ تلاش تھیں۔

گلبرگ کی کوٹھی میں رونما ہونے والے خونی واقعے کی جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں ان کے مطابق تو یہی پتا چلتا تھا کہ بات چیت کے دوران جب ہی تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ جس کے بعد نوبت اچانک ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شیخ ایاز کا جوان خون ابل پڑا۔ اس نے گالیاں دیں اور کہا کہ اس کی برات کو لاہور سے خالی ہاتھ لوٹایا گیا تھا وہ اس بے عزتی کو مرتے دم تک برداشت نہیں کرسکتا۔ جب وہ گالیاں بک رہا تھا' سب انسپکٹر شجاعت اس پر جھپٹ پڑا۔ اس کے بعد اچانک ہی سب کچھ قابو سے باہر ہوگیا۔ کئی افراد آپس میں دست و گریباں ہوگئے۔ ایک شخص نے ساہی صاحب کو دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔

نشست گاہ سے ملحقہ کمرے میں چند مسلح افراد بالکل تیار حالت میں موجود تھے' شاید وہ کسی ایسے ہی موقعے کا انتظار کررہے تھے۔ وہ دندناتے ہوئے ہال کمرے میں گھس آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے شجاعت کو گولی ماری' پھر اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو رائفلوں کے بٹ مار مار کر شدید زخمی کردیا۔ عارفہ قاسم نے جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایک گرانڈیل شرابی نے اسے دبوچ لیا اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ وحشیانہ دست درازی سے وہ بے ہوش ہوگئی تو اسے بھی باقی افراد کے ساتھ چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ بعد ازاں صوفوں پر گرے ہوئے۔ اور چھت سے لٹکے ہوئے پانچوں افراد کو گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ ساہی صاحب آخری وقت تک حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کی ہر درخواست بے رحمی سے ٹھکرا دی گئی۔ واردات کے دوران میں دو افراد نے ساہی صاحب کو بری طرح جکڑے رکھا اور کچھ دیر کے لیے انہیں ایک باتھ روم میں بھی بند کردیا گیا۔

یہ سارے واقعات میں اب تک کئی بار سن چکا تھا۔ ہر بار ان واقعات کو سن کر ذہن نئے سرے سے زخموں کی شدت کو محسوس کرتا تھا۔ پتا نہیں کہ کیا بات تھی' اب میں کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے کان اور اپنی آنکھیں ہر طرف سے بند کرلینا چاہتا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا' یہاں تک کہ زریں گل اور صفدر بھی نہیں۔ دل چاہتا تھا کہ خاموشی سے کسی طرف نکل جاؤں۔ جہاں کوئی شناسا نہ ہو۔ کوئی جانی پہچانی آواز کانوں میں پڑے اور نہ کوئی جانا پہچانا منظر نگاہوں کے سامنے آئے۔

ان خوفناک واقعات کی خبریں اخباروں میں بھی آئی تھیں۔ ایس ایس پی ساہی صاحب اور سب انسپکٹر شجاعت کے قتل کی خبریں شہ سرخیوں میں شائع ہوئی تھیں۔ ساہی صاحب کی تجہیز و تکفین کے موقعے پر میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ ہلکی سی امید موجود تھی کہ شاید چچا جلیس اور غزالہ' ساہی صاحب کے آخری دیدار کے لیے کہیں سے آجائیں۔ ساہی صاحب کے رسم قل کے بعد تک بھی یہ امید ذہن میں موجود رہی تھی۔ لیکن پھر دوسری امیدوں کی طرح یہ بھی آہستہ آہستہ دم توڑ گئی تھی۔ پچھلے تین چار دنوں سے

میرا دل یہ گواہی دینے لگا تھا کہ چچا اور غزالہ اب نہیں آئے تو پھر بھی نہیں آئیں گے۔ وہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گئے ہیں۔ درحقیقت وہ شیخ عاصم اور اس کے حواریوں کی بربریت سے ڈر کر بھاگے تھے۔ ان کے جانے کے بعد جو خونی واقعات رونما ہوئے تھے انہوں نے ایک طرح سے چچا جلیس کی روپوشی کے فیصلے کو درست ثابت کردیا تھا۔ ممکن تھا کہ ان خونی واقعات کی خبریں ملنے کے بعد چچا جلیس نے اپنی روپوشی کو دائمی بنانے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ اس روپوشی کا سب سے زیادہ قلق تو غزالہ کو ہی ہونا تھا لیکن موجودہ صورت حال ایسی تھی کہ چچا جلیس کے لیے غزالہ کو قائل کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں تھا۔

میں آج کل بے تحاشا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں نے چھوڑ دی تھی اور گولڈ ہوٹل کے ایک "سویٹ" میں منتقل ہوگیا تھا۔ میں رات کو ہوٹل کی بلند و بالا چھت پر چلا جاتا۔ اپنے اردگرد روشنیوں کا سمندر دیکھتا اور سوچتا' کیا پتا ان ہزاروں روشنیوں میں سے کوئی ایک روشنی اس چار دیواری کی بھی ہو جہاں غزالہ رہتی ہو۔ پھر کسی وقت ذہن میں خیال آتا کہ یہ بس میری خام خیالی ہی ہے۔ غزالہ اس شہر میں نہیں ہے بلکہ شاید وہ اس ملک میں ہی نہیں ہے۔ وہ مجھے ہجر کی جدائی دے کر نامعلوم منزلوں کی طرف چلی گئی ہے۔ اب میری قسمت میں ساری زندگی اس کے لیے تڑپنا اور رونا لکھا ہے۔ دل غم سے پھٹنے لگتا' سگریٹ کے کش طویل تر ہونے لگتے۔

ساہی صاحب کے آخری الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ انہوں نے ملتان اور رابعہ شاہ کا ذکر کیا تھا۔ ان الفاظ نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ مجھے علم ہوگیا تھا کہ میری بہن شفتا اور انجم کہاں ہیں۔ ایک روز گولڈ ہوٹل کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے میرے جسم میں شفتا کی محبت نے اتنا جوش مارا کہ شفتا سے دور رہنا میرے بس سے باہر ہوگیا لیکن شفتا کے قریب جانا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میری زندگی جو پہلے ہی طغیانی کا شکار تھی اب ایک دم ہی بہت بڑے جان لیوا گرداب میں پھنس گئی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ آئندہ چند روز میں میرے شب و روز نے کیا رخ اختیار کرنا ہے۔ مستقبل کا کوئی نقشہ میرے ذہن میں نہیں تھا۔ ہاں میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ زندگی جو پہلے ہی تکلیف دہ تھی' اب مزید دردناک ہونے جارہی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شفتا سے بس فون پر بات کروں گا۔

ملتان میں شفتا سے فون پر رابطہ کرنے میں مجھے چند کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑا' بہرحال آخر میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ پہلے میری بات بابر شاہ سے ہوئی پھر کچھ دیر تذبذب کا شکار رہنے کے بعد وہ میری بات شفتا سے کرانے پر آمادہ ہوگئے۔ میں بس شفتا کی آواز سننا چاہتا تھا۔ یہ آواز میرے کانوں میں پہنچی تو جیسے برسوں کی پیاس بجھ گئی۔ میری آواز سن کر شفتا بھی سسک پڑی تھی۔ ہمیں ایک دوجے سے ہزاروں ہی شکوے تھے' ہزاروں ہی شکایتیں تھیں۔ دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے کئی گھنٹوں کی لگاتار گفتگو بھی کم تھی مگر میں زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا' نہ وہ زیادہ کچھ سن سکتی تھی۔ اس نے اپنے حالات سے کافی حد تک سمجھوتہ کرلیا تھا۔ وہ ایم اے کی تیاری کررہی تھی۔ اس کے ساتھ انجم بھی ایم اے کا نصاب پڑھ رہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں سہولت سے رہ رہی ہے' کسی طرح کی پریشانی نہیں ہے بس ایک ہی پریشانی تھی' وہ مجھ سے دور تھی۔ وہ ہر پل میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ بہت جلد حالات بدلنے والے ہیں۔ حالات واقعی بدلنے والے تھے لیکن یہ تبدیلی کس قسم کی تھی۔ اس کے بارے میں خود مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔

انجم نے بھی مجھ سے گفتگو کی۔ وہ صفدر کے حالات سے آگاہ تھی اور جلد از جلد اس سے ملنا چاہتی تھی۔ صفدر اپنی آنکھیں کھو چکا تھا لیکن انجم کے نزدیک صفدر کی اہمیت ذرہ بھر کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک مشرقی لڑکی کی طرح وہ آج بھی اس کا نام لے کر جینی تھی۔ آج بھی اس کی سوچوں پر صفدر ہی کی حکمرانی تھی۔ وہ جلد از جلد اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس کا انتظار کرے گی۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی طرح صفدر کے والدین سے بھی مل چکی ہے اور یہ ملاقات یا ملاقاتیں ماضی قریب میں ہی ہوئی ہیں۔ نجانے کیوں مجھے صفدر کی والدہ کی بات یاد آنے لگی۔ چند روز پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انہیں صفدر کی دلہن ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں' وہ دلہن ڈھونڈ چکی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ انجم کی بات ہی کررہی ہوں؟ ذہن میں ابھرنے والے بہت سے "جواب طلب" سوالوں کی طرح یہ بھی ایک "جواب طلب" سوال تھا۔

شفتا اور انجم دونوں ہی ساہی صاحب کی ناگہانی موت سے آگاہ تھیں۔ ساہی صاحب کی موت کا غم ایک بھاری بوجھ کی طرح ان کے سینوں پر موجود تھا اور میں ان کی

تو آوازوں کے زیر و بم سے اس بوجھ کو محسوس کر سکتا تھا۔ ہماری باتوں کے دوران میں ہی کسی وجہ سے لائن کٹ گئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گفتگو کو کس طرح ختم کروں' اور ان پریشان کن سوالوں سے کیسے بچوں جو شفقت اس گفتگو کے آخر میں پوچھنے والی تھی۔ میں نے گفتگو کے دوران میں تو اپنی دلی کیفیت چھپائے رکھی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ گفتگو کے آخر میں شفقت اس بے پناہ درد سے آگاہ ہو جائے گی جس نے میرے دل کو کسی عفریت کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ میں نے شفقت سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور ٹیلی فون سیٹ کے سامنے سے اٹھ گیا۔

ایک عجیب سی اکھل پتھل میرے اندر جاری تھی۔ غزالہ نے مجھ سے دور ہو کر مجھے ایک ایسی عارضی کن ذہنی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا جس کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ رہی سہی کسر ساہی صاحب کی اچانک جدائی نے پوری کر دی تھی۔ میں اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اگر منصور میرے شانے سے شانہ ملا کر چل رہا ہوتا تو شاید میں کسی طور اس کیفیت سے نکل آتا لیکن اب تو وہ بھی میرا ہم قدم نہیں تھا۔ زریں گل اور عالم قریشی مجھے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن میں ان کا سامنا ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں بدستور گولڈ ہوٹل میں مقیم تھا۔ میرے سوئٹ سے باہر PLEASE DO NOT DISTURBE کا اسٹیکر آویزاں رہتا تھا۔ اکثر میں فون کا ریسیور کریڈل پر سے ہٹا دیتا تھا۔ ایک دو بار تو میں اتنا مضطرب تھا کہ زریں گل یا عالم قریشی کی آواز سن کر میں نے فون بند کر دیا۔ ان دنوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ میرے روز و شب میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ ایک دن جب زریں گل مجھ سے مل کر واپس گیا میں نے منیجر سلطان آغا کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ میرا کمرا تبدیل کر دے۔

"کیا یہاں کسی طرح کی بے آرامی ہوئی ہے سر؟"

"نہیں' بے حد آرام ہے' لیکن میں چاہتا ہوں کہ کوئی میری تنہائی میں مداخلت نہ کرے۔ تم مجھے ٹاپ فلور پر کوئی الگ تھلگ کمرا دے دو۔ تاکید یہ ہے کہ کسی کو میری موجودگی کے بارے میں علم نہیں ہونا چاہیے۔ میرے قریبی دوستوں کو بھی نہیں۔"

"جو آپ کا حکم سر۔" سلطان آغا نے کہا۔

"جو میرے بارے میں پوچھے اسے بتا دینا کہ میں کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلا گیا ہوں۔"

ٹھیک ایک گھنٹے بعد سلطان آغا نے مجھے پانچویں فلور کے ایک عقبی سوئٹ میں منتقل کر دیا۔

تقریباً تین چار دن میں یہاں بالکل الگ تھلگ رہا۔ بے تحاشا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ ڈرنک کرنا میں تقریباً چھوڑ چکا تھا لیکن ان دنوں دل و دماغ کی کیفیت کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ میری کیمسٹری ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ ایک روز میں نے بوتل منہ سے لگائی اور آدھی سے زیادہ خالی کر گیا۔ نڈھال ہو کر میں بستر پر گر پڑا اور رات گئے دن بھی دوپہر تک سویا رہا۔ اور جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ سلطان آغا نے میری منشاء سمجھتے ہوئے اعلیٰ شراب کی نئی بوتلیں میرے کمرے کے فریج میں پہنچا دیں۔

ایک شام نشے میں چور ہو کر میں نے سوچا' جب کہا جاتا ہے اور فلسفوں میں کوئی غم کا مارا درد سے بے تاب ہو کر پیتا ہے اور رنگین کوچوں میں ڈگمگانے لگتا ہے تو اسے چاہنے والا اس کا ہاتھ روکنے کے لیے نمودار ہو جاتی ہے۔ اپنے محبوب کا ساغر توڑ کر ساغر کی جگہ خود سنبھال لیتی ہے۔ کیا میرا ساغر توڑنے کے لیے بھی وہ آئے گی؟ یہ ایک بے معنی سوال تھا' میں جانتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ اسے نہیں آنا۔ اپنا ساغر مجھے خود ہی توڑنا تھا' یا نہیں توڑنا تھا۔ میں خود کو بار بار سنبھالنے کی کوشش کرتا تھا' لیکن سنبھلا نہیں جا رہا تھا۔ دو قوتیں تھیں جو مجھے سنبھلنے نہیں دے رہی تھیں۔ ایک غزالہ کے غم کی قوت۔ دوسرے شیخ عاصم سے نفرت کی قوت۔

ایک روز پتا نہیں کیسے عالم قریشی میرا کھوج لگاتا ہوا دوسرے کمرے میں بھی آن پہنچا۔ میری حالت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چیخ کر بولا "ارے اللہ کی رحم! یہ کیا ڈرامہ کر رہا ہے تم بڑا شوق چڑھا ہوا ہے دیوداس بننے کا۔ ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ لگتا ہے کہ پاگل خانے میں رہ کر بس ابھی ابھی باہر نکلا ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے بھئی۔ جو کچھ ہوا ہے کیا اس کا ہمیں دکھ نہیں ہے؟ لیکن دکھ کو سنبھالنا بھی تو ہوتا ہے۔ تم تو دوسروں کو سمجھایا کرتے ہو۔ اب تمہیں خود سمجھائے جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

میں نے عالم قریشی کی باتوں کا جواب دینا چاہا لیکن اس نے میری ایک نہیں چلنے دی' بس بولتا چلا گیا۔ بے تکلف دوستوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔

عالم قریشی کے نزدیک بہت سے مسئلوں کا حل اچھا کھانا تھا۔ کاروبار کرنا ہو تو کھانے پر کرو۔ صلح صفائی کرنی ہو تو کھانے کی میز پر کرو' پیار کرنا ہو تو کھانے کی میز پر۔ غصہ کرنا ہو تو کھانے کی میز پر۔ حتیٰ کہ بحث بھی کرنی ہو تو کھانے کی میز پر۔ مجھے دیکھ کر تو اسے یقین ہو گیا کہ میں کھانے کی میز سے دور رہنے کے سبب گوناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہوں۔ "چلو سب سے پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر باتیں کریں گے۔"

"مجھے نہ کھانا کھانا ہے اور نہ باتیں کرنی ہیں۔ میں صرف سونا چاہتا ہوں۔"

"سونے کے لیے بھی ضروری ہے کہ پیٹ میں کچھ ہو۔" اس نے فوراً دلیل پیش کی۔

عالم قریشی ان لوگوں میں سے تھا جن کے نزدیک کھانے میں دو خصوصیات کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ نمبر ایک' کھانا اچھا ہو' نمبر دو بہت سارا ہو۔

عالم قریشی نے روم سروس کو کال کرنے کے بعد ایک لمبا چوڑا آرڈر دیا "یار! یہ تو تم نے پانچ آدمیوں کا کھانا منگوا لیا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے نا۔ ایک آدمی کا تم کھا لینا۔ دو آدمیوں کا میں کھا لوں گا۔"

"اور باقی دو آدمیوں کا؟"

"زریں گل آ رہا ہے۔ میں نے اسے کال کی ہے۔"

"تم ایسا کیوں کر رہے ہو قریشی۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں' جو تم مجھے اس طرح کی حرکتوں سے بہلانا چاہتے ہو۔"

"سیانے کہتے ہیں ہر آدمی کے اندر ایک بچہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ وہ موقع دیکھ کر باہر نکل آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر کا بچہ بھی آج کل باہر نکلا ہوا ہے۔ اگر غزالہ یہاں ہوتی تو اس بچے کو گود میں اٹھا کر اور لوری شوری سنا کر سلا دیتی' لیکن وہ نہیں ہے' لہٰذا یہ روندو بچہ رو رہا ہے اور غصے میں آ کر ٹانگیں چلا رہا ہے۔"

"تمہاری غیر سنجیدہ باتوں سے میرا کچھ بھلا نہیں ہونے والا۔ بہتر یہ ہے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں کمرے کے دروازے پر زریں گل نمودار ہو گیا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور سراپا پر جنبھ نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں کلثوم بھی چلی آ رہی تھی۔ کلثوم نے ڈری ڈری نظروں سے زریں گل کے کندھے کے پیچھے سے مجھے دیکھا پھر ہاتھ فوراً ماتھے پر لے جا کر کہا "سلام استاد صیب!"

میں نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ کلثوم اندر آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی گود میں ننھا اسد بھی ہے۔ زریں گل نے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ بکھیر رکھی تھی۔ جب بھی وہ ایسا کرتا تھا اس کا چہرہ عجیب سے ڈھنگی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی شکل بے ڈھنگی ہو رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور بولا "استاد صیب! کیا آپ چاہتا ہے کہ کلثوم بیوہ ہو جائے اور یہ بچہ جو اس کی گود میں ہے یتیم کہلائے؟"

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"حیدر بھائی کا حالت دیکھ کر ہمارا دل پہلے ہی ویران ہو رہا ہے استاد صیب! اب آپ کو دیکھتا ہے تو ہمارا دل ایک دم مر جانے کو چاہتا ہے۔"

"تو کیا خودکشی کر لو گے؟" میں نے پوچھا۔

کلثوم بولی "نہیں استاد صیب! یہ فرماتا ہے کہ ام سیر کرنے کے بہانے واگہ بارڈر جائے گا۔ وہاں دانتل لے کر سیدھا انڈیا کے اندر گھس جائے گا۔ بس جو بھی سامنے آئے گا اسے ٹھا سے گولی مارے گا اور پھر خود بھی مر جائے گا۔ یہ بہت پریشان ہے استاد صیب! نہ کچھ کھاتا نہ ہنستا' نہ ہمارے ساتھ گندا گندا باتیں کرتا۔"

عالم قریشی جھینپ سا گیا۔ مجھے زریں پر غصہ آنے لگا کہ وہ خواہ مخواہ کلثوم کو یہاں لے آیا ہے۔ میں نے زریں سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے جلدی سے ننھے اسد کو میری گود میں ڈال دیا۔ ایک طرح سے یہ میرے غصے سے بچنے کا طریقہ تھا۔ میں نے بچے کو پیار کیا۔ اس نے میری انگلی تھام لی۔ زریں بولا "دیکھیں استاد صیب! یہ آپ کو واپس لانا چاہتا ہے۔ یہ نہیں چاہتا کہ آپ ہم سے دور چلا جائے۔ اسی طرح ایک فلم میں محمد علی صاحب کا انگلی ایک بچے نے تھاما تھا' جراب میں محمد علی صاحب نے جو قربانی دیا تھا وہ لوگوں کو کبھی بھولے گا نہیں۔ محمد علی صاحب نے زیبا کو چھوڑ دیا تھا اور بچے کی خاطر رباب صورت ایک دور دراز گاؤں میں چلے گئے تھے۔ حالانکہ آپ اچھی طرح جانتا ہے کہ محمد علی' زیبا صاحب سے کتنا محبت فرماتا ہے۔"

عالم قریشی' زریں کی بات پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' کلثوم چپکے چپکے منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ شاید اپنے عقیدے کے مطابق کچھ پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو اس نے ایک دم ہونٹ بند کر لیے۔ بچہ اپنی بھولی بھولی معصوم آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے سچ مچ مجھے زندگی کی طرف واپس بلا رہا تھا' لیکن یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ میں زندگی سے دور جا چکا ہوں۔ میرے اردگرد جو میرے پیاروں کے چہرے تھے' لیکن یہ چہرے مجھے جیسے کسی دھند میں لپٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ چہرے' یہ آوازیں' یہ مناظر سب میرے قریب ہونے کے باوجود مجھ سے بہت دور تھے۔ ہر شے اجنبی اجنبی اور پرائی پرائی لگ رہی تھی۔

کلثوم میرے پاس آتے ہوئے بولی "استاد صیب! آپ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ام کو مالوم ہے آپ کو غزالہ بی بی کا بہت غم ہے۔ وہ آپ کے بالکل پاس آ کر ایک دم آپ سے بہت دور چلا گیا ہے۔ ام ایک عورت ہے، دوسری عورت کے دل کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔ امارا دل گواہی دیتا ہے کہ غزالہ بی بی آپ کے لیے بہت بری طرح تڑپ رہا ہوگا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ وہ آپ کو ضرور ملے گا۔ بس آپ حوصلہ رکھیں اور کسی طرح اپنا کمزوری دور کریں۔ امارا مطلب ہے کہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ پھر اپنے قبیلے کی رسم کا ذکر کرنے لگی تھی۔ یعنی کمزور شخص کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر کنویں میں الٹا لٹکایا جائے تو وہ صحت مند ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اسی اثناء میں کھانا آ گیا۔ زریں اور عالم قریشی کو کھانے کے لیے میں نے بڑی مشکل سے چند لقمے زہر مار کیے اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ زریں نے بتایا کہ اس کی کوٹھی کی تیاری بالکل آخری مرحلے میں ہے۔ شروع میں اس کا پروگرام تھا کہ وہ اپنی کوٹھی میں ایک زبردست دعوت کرے گا جس میں شہر کے معززین خاص طور سے فلمی معززین شامل ہوں گے۔ سدھیر صاحب کو مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے گا لیکن ساہی صاحب کی موت کے بعد یہ پروگرام اور اس جیسے سارے دوسرے پروگرام سوگواری کے گہرے سمندر میں ڈوب چکے تھے۔

زریں پرسوں اپنی نئی رہائش گاہ میں شفٹ ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے نئے گھر کا دروازہ میں اپنے ہاتھوں سے کھولوں۔ میں نے زریں کے سامنے حامی بھر لی کہ میں اس کی خواہش پوری کروں گا۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ پرسوں میں یہاں نہیں ہوں گا بلکہ شاید پاکستان میں ہی نہیں ہوں گا۔ عالم قریشی، زریں، کلثوم کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے آخری ملاقات کر رہے ہیں۔ آج کے بعد نجانے کب تک انہیں میری صورت نہیں دیکھنی اور شاید کبھی نہیں دیکھنی۔ زریں اور کلثوم کے پرزور اصرار پر میں نے ان سے "وعدہ" کیا کہ میں ہوٹل کا یہ کمرا چھوڑ دوں گا اور پرسوں سے ان کے ساتھ ان کے نئے گھر میں ہی رہوں گا۔ قریباً تین گھنٹے میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ لوگ ہوٹل سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے بھی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

O☆O

یہ ٹھیک پانچ روز بعد کی بات ہے، میں ابوظہبی میں تھا۔

میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ جسم پر لباس بھی کوئی خاص ڈ کا نہیں تھا۔ بہرحال قیمت کے لحاظ سے وہ اعلیٰ تھا۔ اپ اور باطن کی طرف سے ایک عجیب طرح کی بے حس طاری ہو چکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے غ کے اوجھل ہونے اور ساہی صاحب کے دنیا سے جانے بعد میں بہت سی پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ یہ غزالہ تھی جو میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر توڑ دیتی تھی اور شراب نوشی کو ناراضی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ یہ صاحب ہی تو تھے جو مجھے خطرات میں آنکھیں بند کر کے جانے سے روکتے تھے۔ یہ صفدر ہی تو تھا جو بدترین حالات مجھے سہارا دیتا تھا۔ آج ان میں سے کوئی میرے پاس نہیں تھا۔ بس شیخ عاصم تھا اور اس کی بھڑکتی ہوئی عدا تھی۔ میرا اپنا دل بھی چاہ رہا تھا کہ میں اس عداوت میں بڑھوں۔ میں اس عداوت کی آگ اب شیخ عاصم کے اپنے تک پہنچانا چاہتا تھا۔ جس آگ میں میرے اپنے جل تھے اس آگ کی تپش شیخ عاصم کے اپنوں تک بھی چاہیے تھی۔ شاید اسی طرح شیخ عاصم کے ہوش ٹھکا آتے۔

پچھلے دو تین روز میں میں نے اپنے مطلب کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت بے پناہ طاقت ہے، اور میرے پاس روپیہ تھا۔ میں اپنی دو چیک جیب میں ڈال کر لے آیا تھا۔ ان چیک بکس کے ہونے مجھے دنیا کے کسی بھی ملک میں رقم کی کمی نہیں ہو سکتی میں جب اور جہاں چاہتا بس اپنے سائن کر کے ڈالرز پاؤنڈز وغیرہ کے ڈھیر لگا سکتا تھا۔ غربی شہر سے آگے مضاف میں شیخ عاصم کا ایک وسیع و عریض بنگلا تھا۔ یہ وہی منحوس تھا جہاں میں ایک دفعہ خوب رو سلطانہ اور غزالہ کے ساتھ قید ہوا تھا۔ شیطان ابن شیطان شنکر شکرا نے جس سلاسل کروایا تھا پھر شنکر سے غزالہ کی آبرو بچانے کے جرأت مند سلطانہ نے اپنی آبرو اور جان کی قربانی دے تھی۔ وہ آخری وقت تک غزالہ کو شنکر سے بچانے کی کو کرتی رہی تھی۔ نتیجے کے طور پر شنکر نے غزالہ کو چھوڑ دیا اور سلطانہ کو کھینچ کر اپنی خواب گاہ میں لے گیا تھا۔ میں نے سلطانہ کی لاش چھت سے لٹکی دیکھی تھی۔ اپنی کم بچی کو روتا چھوڑ کر وہ عدم آباد کی مسافر ہوئی تھی۔ سلطا موت کا زخم میرے لیے ایک ان مٹ نقش کی طرح ابوظہبی کے مضافات میں شیخ عاصم کا وہ بنگلا دیکھ کر میر اور بھی بہت سے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

شیخ عاصم کا وہ بنگلا میں شوقیہ دیکھنے کے لیے نہیں گیا تھا۔ اصل مجھے اطلاع ملی تھی کہ آج کل اس بنگلے میں عاصم کی ب نئی اور نہایت لاڈلی گرل فرینڈ رہ رہی ہے۔ اس گرل نڈ کے بارے میں بھی مجھے کئی گراں قدر معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اس خوب رو لڑکی کا نام لیونا ربیچ تھا۔ وہ انسیسی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ لڑکی مس پیرس ٹائٹل جیت چکی تھی اور ماڈلنگ بھی کرتی رہی تھی۔ اپنی لاڈلی محبوبہ کے لیے شیخ عاصم نے اپنے اس بنگلے کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب میں بنگلے میں آیا تھا تو یہ خاصا ویران اور بدحال نظر آتا تھا ن اب اس کے در و دیوار میں چمک دمک دکھائی دیتی تھی۔ ی معلومات کے مطابق شیخ عاصم آج کل اس لیونا نامی لڑکی س بری طرح فدا تھا کہ باقی سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ اپنے پناہ معاشی مسائل کے باوجود اس نے لیونا کے آرام و ائش کے لیے ایک بھاری بجٹ علیحدہ کر رکھا تھا۔ شیخ م کے کچھ بے تکلف دوستوں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ ونا" اس کے لیے خوش قسمت ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ی کی دوستی کے فوراً بعد سے شیخ عاصم کے مالی حالات لوں ہونے لگے تھے۔ جوں جوں دوستی بڑھتی گئی حالات ب ہوتے گئے اور پھر یہ خرابی انتہا کو پہنچ گئی۔ شیخ عاصم پر باتوں کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ چند ہفتے پہلے لیونا شیخ ڈشی سے واپس فرانس چلی گئی تھی۔ شیخ عاصم ساری ونیات چھوڑ کر جھٹ اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ کئی دن اسے ڈھونڈتا رہا تھا اور اپنے ساتھ لے کر واپس ات آیا تھا۔ اسے واپس لانے کے فوراً بعد عاصم نے یہ اور اس کے اردگرد کی وسیع اراضی لیونا کے نام کر دی اور بنگلے کی پیشانی پر "لیونا لاج" کا نیون سائن سجا دیا گیا

پچھلے دو تین روز میں میں نے بنگلے کے مکینوں اور ان معمولات کے بارے میں بھی گراں قدر معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ ساری معلومات مجھے عزیز نامی ایک ڈرائیور سے حاصل ہوئی تھیں۔ دو روز پہلے میں نے عزیز کو ایک بار میں سستی سی شراب پیتے دیکھا تھا اور اس کے پاس جا بیٹھا یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ عزیز "لیونا لاج" میں رہنے والے تین عدد ڈرائیوروں میں سے ایک ہے۔ کوشش میں اسے رام کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے عزیز کو بار کی مہنگی ترین شراب پلائی تھی کا ایک پیگ تقریباً ساٹھ امریکن ڈالرز میں پڑتا تھا پھر

میں نے نشے میں چور عزیز کو اپنے ساتھ ایک شاہانہ ڈنر کروایا تھا اور اپنی امارت کا خوب خوب رعب اس پر گانٹھا تھا۔ میں عزیز کے سامنے ایک ایسے انڈین رئیس زادے کے طور پر ظاہر ہوا تھا جس کی دولت سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور خوب صورت چہروں پر دولت لٹانے کے بہانے ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے ڈرائیور عزیز سے لیونا لاج کے بارے میں گراں قدر معلومات حاصل کر لی تھیں اور اب میں ایکشن میں آنے کے لیے تیار تھا۔

پچھلے دو روز میں میں نے "لیونا لاج" کے حفاظتی انتظامات کا بغور جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ خون خرابے کے بغیر بنگلے میں گھسنا ممکن نہیں ہے۔ اور خون خرابہ میں فی الحال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں جو پلاننگ تھی اس کے لیے فی الحال خون خرابہ مناسب نہیں تھا۔

اب ذہن میں یہی صورت آتی تھی کہ ڈرائیور عزیز کے ذریعے حکمتِ عملی کے تحت بنگلے میں داخل ہوا جائے۔ میری بے بہا نوازشوں کے بعد ڈرائیور عزیز بھی یہ سمجھ چکا تھا کہ میں اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہوں، تاہم کام کی نوعیت کے بارے میں ابھی اسے کوئی جانکاری نہیں تھی۔ ابوظہبی کی وہ شام بھی بہت اجلی اور نکھری ہوئی تھی۔ یہ جمعرات کی شام تھی۔ ویک اینڈ کی وجہ سے سڑکوں اور بازاروں میں ضرورت سے زیادہ چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ڈرائیور عزیز کے ساتھ "ٹوئنکل کلب" میں میری ملاقات طے تھی۔ میری رہائش پرنس ہوٹل میں تھی۔ نسان اور لگژری گاڑیاں ابوظہبی میں کوڑیوں کے مول بکتی ہیں۔ میں نے بھی ایک شناسا کے تعاون سے شان دار "جیگوار" گاڑی خرید لی تھی۔ اس کے علاوہ ڈھائی لاکھ پاکستانی روپوں میں ایک رسٹ واچ، قیمتی ڈائمنڈ کی دو انگوٹھیاں اور ایک نہایت زبردست قسم کا سگریٹ لائٹر بھی میری شاپنگ میں شامل تھا۔ اس قیمتی لائٹر کی دو حیران کن خوبیاں یہ تھیں کہ یہ تصویر اتارتا تھا اور بوقتِ ضرورت ٹیپ ریکارڈر کا کام بھی دیتا تھا۔ دو درجن نہایت قیمتی لباس اور جوتوں کے نصف درجن جوڑے بھی میں نے کل ہی خرید لیے تھے۔ شارک اسکن کا ایک انگلش سوٹ میں نے قریباً پچاس ہزار پاکستانی روپوں میں خریدا تھا۔ یہی سوٹ پہن کر میں عزیز سے ملاقات کے لیے وقتِ مقررہ پر ٹوئنکل کلب پہنچا۔

ٹوئنکل کلب میں اونچے طبقے کے لوگ ہی آتے تھے۔

کلب کے ساتھ ہی ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ بھی تھا۔ یہ نچلے درجے کا ریسٹورنٹ تھا۔ اس میں کلب ممبران کے سیکریٹری۔ معاون اور ڈرائیور وغیرہ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے۔ میں نے ڈرائیور عزیز کو سب سے پہلے اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ڈرنک کرتے دیکھا تھا۔ حالانکہ یہ نچلے درجے کا ریسٹورنٹ تھا پھر بھی لوگ اچھا کھانا کھاتے تھے اور اچھی قسم کی شراب پیتے تھے لیکن میں نے دیکھا تھا کہ عزیز سستی قسم کی شراب پی رہا ہے اور دیگر لوازمات بھی واجبی سے ہیں۔ اس کے بعد میں عزیز کے پاس چلا گیا تھا اور اسے شیشے میں اتارنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اب ہماری دوستی کو تین دن ہو چکے تھے اور ان تین دنوں میں ہی عزیز میرے کافی قریب آگیا تھا۔ لوکل کلب کے بار میں میری میز روبرو تھی۔ میں پہنچا تو عزیز وہاں پہلے سے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے۔ خوب صاف ستھرا بھی نظر آرہا تھا۔ اس کے حلیے میں یہ تبدیلی میری ہی وجہ سے تھی۔ میں نے کل اسے پانچ سو ڈالر دیے تھے۔ اس میں کچھ رقم عزیز نے یقیناً اپنے آپ پر خرچ کی تھی۔ باقی رقم کے بارے میں میں جانتا تھا کہ اس نے جوئے میں ہار دی ہوگی۔ عزیز کی مفلسی کی بڑی وجہ جوئے کی لعنت ہی تھی۔ ڈرائیور کے طور پر اسے جو تنخواہ ملتی تھی وہ خاصی معقول تھی لیکن اس تنخواہ کا زیادہ تر حصہ اس کم بخت کے گھر پہنچتا ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں' بیوی اور بچہ پریشان حالی کا شکار تھے۔

میں عزیز کے قریب پہنچا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑے ادب سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے میرے بیٹھنے کا انتظار کیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد وہ بیٹھا اور بتیسی نکال کر انگریزی میں بولا "آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے جناب۔ یقین نہیں آتا کہ دنیا میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں۔ ہم جیسے غریبوں کو اپنے برابر بٹھاتے ہیں۔ ان سے مسکرا کر بات کرتے ہیں' اور ان کے دکھ درد جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"مجھے تکلف سے نفرت ہے عزیز۔ اس لیے تم بھی تکلف نہ کیا کرو۔"

"میں کیسے تکلف نہ کروں جناب! آپ کے سامنے تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔" وہ شکستہ انگریزی میں بولا۔

"اگر شرم کرو گے تو پھر ہماری دوستی ختم ہو جائے گی۔"

"اگر آپ میری شرم دور کرنا چاہتے ہیں تو پھر میری ایک بات مانیں۔" وہ ہوشیاری سے بولا۔

"کیسی بات؟"

"آپ مجھ سے کوئی کام لیں۔ مجھے بھی احساس ہو کہ میں نے آپ کے لیے کچھ کیا ہے۔"

"ایک کام تو ہے تمہارے لائق۔ لیکن چلو چھوڑ دو۔ کہیں تم یہ نہ سمجھ لو کہ میں نے اس کام کے لیے تم سے دوستی کی ہے۔"

"نہیں جناب! آپ حکم کریں' مجھے بہت خوشی ہو۔ آپ جیسے قدر دان کے لیے تو مجھ جیسا نوکر جان دینے کے لیے بھی تیار ہو سکتا ہے۔" میں پھر بھی خاموش رہا۔ بس یا دھیان کے انداز میں اپنا قیمتی لائٹر اپنی ہیرے کی انگوٹھی سے ٹھونکتا رہا۔ عزیز نے خود ہی بات آگے بڑھاتے ہوئے "کوئی لڑکی وڑکی کا معاملہ تو نہیں جناب؟"

میں نے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے "ہاں' بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

عزیز کا چہرہ ایک چالاک مسکراہٹ کے زیر اثر ہو گیا۔ بولا "مجھے پہلے ہی اندازہ تھا جناب بندہ نوجوان صحت مند ہو' دولت کی ریل پیل ہو' خود مختاری اور آزادی تو پھر اس طرح کے شغل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ بلکہ گر معاف' میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا بندہ اگر شغل وغیرہ نہ کرے تو وہ عشق کا پکا نہیں ہوتا۔" پھر وہ ایک دم لہجہ بدل کر "آپ فرمایئے سرکار' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے تھوڑی سی حلق میں انڈیلی اور عزیز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے "ہیلیوٹا لاج میں ایک لبنانی لڑکی سعدیہ ملازمت کرتی ہے۔ وہ خاتون خانہ کے بناؤ سنگھار کی ذمے دار ہے۔"

ڈرائیور عزیز کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ بہرحال اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "اس لڑکی سے میرا پرانا دوستانہ ہے۔ ان دنوں وہ بیروت میں تھی بعد میں ہمارے درمیان کسی بات پر ناراضی ہو گئی۔ اب قریباً دو سال ہماری بول چال بند ہے لیکن میں جانتا ہوں جب بھی اس سے آمنا سامنا ہو گیا اور دو چار باتیں ہو گئیں' وہ پھر بالکل موم ہو جائے گی۔ کیا تم کسی طرح مجھ سے اس کی ملاقات کا اہتمام نہیں کرا سکتے ہو؟"

عزیز کچھ خاموش سا ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد گہری سانس لے کر بولا "آپ شاید شیخ عاصم بن ارشد صاحب کے بارے میں کچھ جانتے ہی ہوں گے۔ وہ بے حد اصول پسند اور سخت مزاج کے مالک ہیں۔ خاص طور سے اپنی چار دیواری میں کسی طرح کی گڑبڑ پسند نہیں کرتے۔ گھر کی تمام ملازمائیں کے اندر رہنے کی پابندی ہے۔ وہ سخت ضرورت کے تحت

صاحب کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکل سکتیں۔"

میں نے کہا "یہ بات میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ رہے باہر نہیں نکل سکتی' اسی لیے تو تم سے مدد چاہ رہا ہے۔"

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں جناب! آپ ہی بتایئے۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے پُر خیال لہجے میں "میں نے دیکھا ہے' جو گاڑی تم چلاتے ہو اس کی ڈگی کافی ہے۔ میں اس ڈگی میں با آسانی لیٹ سکتا ہوں۔"

عزیز کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر کے چہرے پر تحیر اور پریشانی کے آثار ساتھ ساتھ ہے۔ وہ بولا "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو ڈگی میں کریلوٹا لاج کے اندر لے جاؤں؟"

"اگر تم چاہو تو ایسا ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے اپنی جگہ اٹھتے ہوئے کہا۔ عزیز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن نہ سکا۔ میں نے کہا "میں ایک ٹیلی فون کر کے ابھی آرہا ہوں تم ذرا سوچ لو۔"

میں لابی کی طرف چلا گیا اور یوں ہی گھوم پھر کر دو تین منٹ میں واپس آگیا۔ عزیز گہری سوچ میں غرق تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے کہا "راس الخیمہ میں جو اونٹ ریس ہو رہی ہے اس میں برق (اونٹ کا نام) دوڑ جا رہا ہے۔ میں نے برق پر تمہاری اور اپنی طرف سے ایک لاکھ درہم لگا دیے ہیں۔" میں نے ایک لاکھ کا کوپن جس پر عزیز کا نام پتا بھی لکھا تھا' عزیز کی طرف بڑھا دیا۔

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے کہا "کانپتے کیوں ہو۔ ہارنے سے مت ڈرو۔ جو ہارنے سے ڈرتا ہے وہ جیت نہیں سکتا۔ دس بار ہارو گے تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح کھلاؤں گا۔ ہم ایک بار جس کا ہاتھ پکڑتے ہیں پھر چھوڑتے نہیں۔"

کچھ دیر ہمارے درمیان گمبیھر خاموشی طاری رہی پھر اس نے لرزتے لہجے میں پوچھا "اگر میں آپ کو وہاں لے بھی جاؤں تو اس لڑکی سے آپ کی بات کیسے ہو گی؟"

"یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میرا یہ وعدہ ہے کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گا اور حرف آنے والی کوئی بات بھی نہیں ہوگی۔ میرے پکڑے جانے کا چانس ہزار میں سے ایک بھی نہیں لیکن اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تم پر زیادہ سے زیادہ بے پروائی کا الزام ہی آئے گا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ڈگی لاک تھی لیکن یہ شخص تالا کھولنے کا ماہر ہے۔ پارکنگ میں کھڑی گاڑی کی ڈگی کھول کر اندر چھپ گیا ہو گا۔"

"کیا آپ واقعی بند ڈگی کا تالا کھول سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر آپ ایسا ہی کیوں نہیں کرتے۔ گاڑی پارکنگ میں موجود ہے۔ آپ اپنے طریقے سے تالا کھول کر ڈگی میں چلے جائیں۔"

"تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو۔ تمہیں کہا ہے نا کہ یہ ساری صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

وہ پُر سوچ لہجے میں بولا "لیکن آپ کی واپسی کا کیا ہو گا؟"

"واپسی بھی اسی طریقے سے ہو گی۔ تمہاری گاڑی کی ڈگی میں آکر لیٹ جاؤں گا۔ تم صبح آٹھ بجے کے قریب گاڑی لے کر نکلتے ہو' مجھے بھی ساتھ ہی نکال لینا۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی گارڈز مین گیٹ پر گاڑی چیک بھی کرتے ہیں۔" عزیز نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیر۔۔۔ کبھی کا رسک تو لیا ہی جا سکتا ہے۔"

"لیکن جناب! میرے خیال میں سب سے بڑا رسک اس بات میں ہے کہ آپ نے گھر کے اندر سعدیہ نام کی اس لڑکی سے ملاقات کرنی ہے۔ میری ناقص سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ آپ یہ ملاقات کیسے کریں گے؟"

"جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کے لیے اپنے ذہن کو زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" اس نے مری مری آواز میں کہا۔

"آج ویک اینڈ ہے' اگر تم کسی حسین چہرے پر کچھ خرچ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔" میں نے قریب سے گزرتی ویٹرس کی عریاں ٹانگوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا پھر اس کا جواب سننے سے پہلے ہی میں نے روم سروس کے انچارج کو مخصوص اشارہ کیا' وہ تھوڑا سا مسکرایا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند منٹ بعد اس نے بڑے ادب سے ایک کمرے کی چابی مجھے پیش کر دی۔ میں نے چابی لے کر عزیز کی طرف بڑھا دی۔ اس کے گول چہرے کی پژمردگی رونق میں بدل گئی۔ شراب نوشی نے اور ویٹرس لڑکیوں کے نیم عریاں جسموں نے عزیز کو گرما رکھا تھا۔ میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا "ابھی آٹھ بجے ہیں۔ تم دس بجے تک سوچ سمجھ لو۔ اتنی دیر میں میں تھوڑی سی شاپنگ کر آؤں۔ پھر چلیں گے۔"

وہ نیم رضامند نظر آنے لگا تھا' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے ٹونکل کلب کی پارکنگ سے اپنی شان دار جیگوار گاڑی نکالی اور ابوظہبی کی جگمگاتی سڑکوں پر آہستہ روی سے چلنے لگا۔ میرا ذہن مسلسل اپنی پلاننگ میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے ڈرائیور عزیز احمد کو یہی بتایا تھا کہ میں اپنی محبوبہ سعدیہ سے ملنے بنگلے میں جانا چاہتا ہوں۔ اسے علم نہیں تھا کہ میرا اصل نشانہ اس کی مالکن یعنی خاتون خانہ لیونا ہے۔ اگر عزیز کو اس بات کی بھنک بھی پڑ جاتی تو شاید وہ اپنے تمام تر "لالچ" کے باوجود اس خوفناک پنگے میں ملوث ہونے سے انکار کر دیتا۔ آج رات میں اس فرانسیسی حسینہ لیونا کو اغوا کر لینا چاہتا تھا۔

چند دن پہلے جب میں ابوظہبی پہنچا تھا تو میرا پروگرام شیخ عاصم کے کسی قریبی عزیز پر ہاتھ ڈالنے کا تھا۔ کوئی ایسا شخص جس کے اغوا سے عاصم کو اتنی ہی تکلیف پہنچ سکے جتنی مجھے ساہی صاحب کی موت سے پہنچی تھی لیکن یہاں آ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شیخ عاصم کے نزدیک خونی رشتوں کی بجائے جسمانی رشتوں کی زیادہ اہمیت ہے (ویسے کسی حد تک مجھے یہ اندازہ پہلے بھی تھا) شیخ عاصم کی تازہ ترین "جسمانی رشتے دار" یہ لیونا نامی فرانسیسی لڑکی تھی۔ مجھے جو اطلاعات ملی تھیں ان سے یہی پتا چلا تھا کہ عاصم پچھلے قریباً ایک سال سے اس فرنچ حسینہ پر سو جان سے فدا ہے اور اس کی خاطر سب کچھ بھولا ہوا ہے۔

ان اطلاعات کی تصدیق کے بعد میں نے اسی حرافہ کی مزاج پرسی کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے سینے میں ایک وحشی دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کیا کروں گا۔ ممکن تھا کہ میں اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا، ممکن تھا کہ اس کی صورت بگاڑ دیتا یا پھر ویسے ہی اسے قتل کر ڈالتا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔

گاہے گاہے میں اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ میں خود احتسابی کے انداز میں اپنے آپ سے کہتا تھا "شاہ جہاں! تم ایسے تو نہیں تھے۔ تم نے زندگی کے بدترین دور میں بھی صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے اس قسم کی صورت حال میں تم صفدر کے سامنے نصیحتوں کے انبار لگاتے تھے۔ اب خود کیوں ہر اخلاقی قدر کی دھجیاں اڑانے پر تل گئے ہو؟"

میں کچھ دیر کے لیے سنبھل بھی جاتا تھا لیکن پھر جب شیخ عاصم کے اوچھے ہتھکنڈے اور گھناؤنی چالیں یاد آتی تھیں تو ذہن کے افق پر ایک سرخ غبار سا پھیل جاتا تھا۔ میری انگلیوں کی پوریں جلنے لگتی تھیں اور دل کے اندر سے صدا آتی تھی کہ شیخ کو مزید مہلت دینا اب خودکشی کے مترادف ہے۔ قریباً دو گھنٹے بعد میں واپس اپنے ہوٹل دو گھنٹوں کے دوران میں میں نے جو شاپنگ کی تھی ا ایک چست سیاہ سوٹ کے علاوہ ایک کولٹ پسٹل ا پانچ سو کے قریب راؤنڈ اور کچھ دیگر اشیا شامل چست سیاہ سوٹ میں نے اپنے چینٹ کوٹ کے نیچے پ پسٹل اور فالتو راؤنڈ بھی اسی چست لباس میں رکھ لیے پوری خنجر جو کچھ عرصہ مجھ سے جدا رہا تھا اب ایک بار میرے پاس تھا۔ میں نے یہ خنجر پنڈلی سے باندھ رکھا پوری طرح تیار ہو کر میں ٹونکل کلب پہنچ گیا۔

ڈرائیور عزیز اپنی "رنگین مصروفیت" سے فار تھا اور اب میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ معمول جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کچھ تھیں۔ میں نے عزیز کے ساتھ بیٹھ کر ایک ڈرنک لیا بعد ہم کلب کے پارکنگ لاٹ میں پہنچ گئے۔ لیموزین کی عریض ڈگی میں میرے لیے کافی سے زیادہ گنجائش موج میں ڈگی میں داخل ہو گیا اور عزیز مجھے لے کر غربی شہر روانہ ہو گیا۔ جلد ہی ہم شہر کے مضافات میں پہنچ گئے تاریکی میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، تاہم میں تصو سے دیکھ سکتا تھا کہ ہم ایک وسیع و عریض سڑک پر رہے ہیں۔ اس سڑک کی دونوں اطراف تیل صاف والے کارخانوں کی دور افتادہ روشنیوں کے سوا نہیں۔ میں نے فاصلے اور سمتوں کو ذہن میں رکھا ہو راستے میں کہیں عزیز گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتا تو علم ہو جاتا۔

قریباً ۲۵ منٹ کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم اس نما جگہ پر پہنچ گئے جہاں بنگلا واقع تھا۔ یہ مرحلہ خطر ہمیں مین گیٹ سے اندر داخل ہونا تھا۔ کولٹ پسٹل ہاتھ میں تھا اور میں ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے پوری طرح تیار تھا۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی بخوبی پروگرام کے مطابق ڈرائیور عزیز نے لیموزین گیراج کھڑی کر دی۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ گیراج کا بغلی د چھوڑ کر چلا جائے گا تاکہ میں باآسانی گیراج سے نکل ڈرائیور عزیز کے جانے کے بعد میں بڑی آ ساتھ ڈگی میں سے نکل آیا۔ گیراج میں تاریکی تھی تھا۔ میں نے بغلی دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر دیکھ ہوا تھا۔ ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک ہی جا رہا تھا۔ گیراج کے ایک تاریک گوشے میں جا کر اپنا با

تبدیل کرنا چاہا۔ میرا ارادہ تھا کہ شارک اسکن کا قیمتی سوٹ اتار کر کار کی ڈگی میں رکھ دوں گا اور چست سیاہ لباس کے ساتھ باہر نکل جاؤں گا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سیاہ لباس تاریکی میں تاریکی ہی کا حصہ نظر آئے گا۔ مگر ابھی میں نے کوٹ کے بٹن ہی کھولے تھے کہ بغلی دروازے کے بالکل قریب کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میں لپک کر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ دروازہ کھلا ایک گارڈ نے گیراج میں جھانکا اور بڑبڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا میں تیزی سے باہر نکل گیا۔

بیرونی دیوار کے بالکل ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں رہائشی حصے کی طرف آ گیا۔ مجھے ہر قدم احتیاط سے اٹھانا پڑ رہا تھا، کسی بھی وقت کسی گارڈ یا نائٹ واچ مین کی نگاہ مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ اگر ان میں سے کوئی مجھے دیکھ لیتا تو یقیناً بدقسمت ہی قرار پاتا۔ میں اس وقت بڑے ہی قاتل موڈ میں تھا۔ کولٹ پسٹل کا ٹرائیگر دبانے کے لیے میری انگلی بالکل تیار تھی۔ میں ایک درخت پر چڑھ کر بنگلے کی نیم تاریک چھت پر آ گیا۔ چھت پر آنے کے بعد مجھے وہ منحوس کمرا نما بیرک نظر آئی جہاں کچھ عرصہ پہلے مجھے قید کیا گیا تھا۔ اس بیرک کے ساتھ ہی وہ دوسرا کمرا تھا جہاں غزالہ اور سلطانہ وغیرہ کو رکھا گیا تھا۔ بعد میں یہیں پر شیخ عاصم کی بڑی زوجہ جمیلہ نور کی لاش ننکر شکرا کے ہاتھوں سے گری تھی۔ وہ سارے مناظر ایک فلم کی طرح میرے ذہن میں چل گئے۔ سینہ جو پہلے ہی شعلہ فشاں تھا مزید بھڑک اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ عاصم کی چہیتی محبوبہ کو آڑے ہاتھوں لینے کے لیے میں نے لیونا لاج میں گھس کر ایک نہایت خطرناک کام کیا ہے لیکن اپنے رنج و غم کے پس منظر میں یہ "خطرناکی" مجھے ہیچ محسوس ہو رہی تھی۔

جلد ہی مجھے سیڑھیوں کا دروازہ نظر آ گیا۔ میں نے دروازے کا قفل ایک مڑے تڑے تار سے کھولا اور عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ میں عمارت کے اس حصے میں اترا جو خاص الخاص تھا اور لیونا کے استعمال میں تھا۔ یہاں مجھے نہایت بیش قیمت قالین اور غالیچے نظر آئے۔ سلک اور مخمل کے نہایت نفیس پردوں نے ماحول کو خواب ناک بنا رکھا تھا۔ میں کامن روم میں سیڑھیوں کے قریب کھڑا تھا۔ مجھے دیواروں پر شیخ عاصم اور خوب رو لیونا کی تصویریں نظر آئیں۔ وہ پرجوش پریمیوں کی طرح ایک دوجے کی بانہوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک تصویر یونانی جزیرے کی تھی، ایک سوئزرلینڈ کی تھی۔ ایک دوسری تصویر میں لیونا اور عاصم ایفل ٹاور کے سامنے بغل گیر نظر آتے تھے۔ ایک تصویر میں نیاگرا کی آبشار ان کی "سچی" محبت کی گواہی دے رہی تھی۔

مجھے ایک دیوار کے پاس ایک نہایت خوب صورت مجسمہ نظر آیا۔ سنگ مرمر سے تراشا گیا یہ شان دار مجسمہ لیونا کا تھا۔ وہ محبت کی دیوی وینس کے انداز میں ایک چبوترے پر ننگا خوب صورت پاؤں نکالے کھڑی تھی۔ اس بنگلے کی ہر دیوار اور ہر اینٹ پر لیونا کے اثر و رسوخ کی چھاپ نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک حسین فاتح کی حیثیت سے اس لڑکی نے شیخ عاصم کے ناقابل تسخیر دماغ کو فتح کر لیا ہے۔

راہداری میں میں ایک ملازمہ کی نگاہوں میں آتے آتے بچا۔ میں پردے کی اوٹ میں ہو گیا اور وہ ایک ٹرے میں کچھ لیے مجھ سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ کسی کمرے سے نسوانی ہنسی کی آواز آئی پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ میں دس پندرہ منٹ تک اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ کوریڈور کی روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ مکین سونے کے لیے بستروں پر لیٹ چکے ہیں۔ دل پر جبر کر کے میں نے آٹھ دس منٹ مزید گزارے اور پھر پردے کی اوٹ سے نکل آیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ لیونا کا بیڈ روم کدھر ہے۔ میرا رخ اس کے بیڈ روم کی طرف ہی تھا۔ در و دیوار میں بھینی بھینی خوشبو تھی اور میرے قدم قالین میں دھنسے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ میں بنگلے میں نہیں کسی عالیشان محل میں موجود ہوں اور جس خواب گاہ کی طرف بڑھ رہا ہوں وہ کسی ذی شان شہنشاہ کی ملکہ کی خواب گاہ ہے۔ خواب گاہ کے بالکل نزدیک پہنچ کر میں چند لمحے کے لیے رکا۔ میرا یہ رکنا بڑا مفید ثابت ہوا۔ مجھے قدموں کی دھیمی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ قدموں کی چاپ نزدیک آئی اور تب مجھے ایک سایہ دکھائی دیا۔ ایک شخص بڑے محتاط انداز میں خواب گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس شخص نے عربی انداز کا لمبا چغہ پہن رکھا تھا، تاہم سر ننگا تھا۔ اس نے ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے سے پہلے اس شخص نے پھر محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ اتنے میں دروازہ کھل گیا اور وہ اندر چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ اندر کا منظر سنسنی خیز تھا۔ میں نے ایک حسین لڑکی کو دیکھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور ایک آبشار کی طرح اس کی پشت پر بکھر رہے تھے۔ وہ ایک مختصر اور ہیجان خیز لباس پہنے ہوئے تھی۔ اندر داخل ہونے والا شخص جھکی جھکی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی یقیناً لیونا ہی تھی۔ چغے والے شخص

کو میں عربی سمجھا تھا لیکن وہ کوئی انگریز تھا۔

پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ یہ شخص لیونا سے کوئی خاص تعلق رکھتا ہے جو اس طرح رات کے اس پہر خاموشی سے اس کے بیڈ روم میں داخل ہوا ہے لیکن اس شخص کی واجبی سی صورت اور روز ڈھلکے ہوئے جسم کو دیکھ کر یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے لیونا نے اپنا جسم سلیپنگ گاؤن سے ڈھانپ لیا' اور درمیانی عمر کے اس شخص سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ درمیانی عمر کے شخص نے اپنے لبادے کے اندر سے کچھ نکالا اور لیونا کی طرف کرتے ہوئے بڑی ملجاجت سے بولا "یہ ملاحظہ کریں۔ اس ایک نمونے سے ہی آپ کو باقی سامان کا پتا چل جائے گا۔"

لیونا نے آگے جھک کر غور سے کسی چیز پر نگاہ جمائی اور انگریزی میں بولی "ونڈر فل مجھے یہ چیز پسند آئی ہے۔"

وہ آئینے کی طرف گھومی اور اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گلے میں ایک لاکٹ سجا کر دیکھ رہی تھی۔ یہ شاندار ڈائمنڈ کا لاکٹ تھا اور اس کا بڑے سائز کا ہیرا دور ہی سے جگمگاتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ لاکٹ دیکھنے کے بعد لیونا نے ایک دو مزید زیور دیکھے۔ یہ سب نہایت قیمتی ڈائمنڈز کے گہنے تھے۔ ان زیورات کو دیکھ کر لیونا کی آنکھوں میں ایک حریص چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے ہر زیور اپنے جسم سے لگا کر آئینے میں دیکھا اور خود کو آئینے کے سامنے گھما پھرا کر اپنا جائزہ لیا۔

"کیا قیمت ہوگی ان کی جیکی؟" لیونا نے اپنے مقابل کھڑے شخص سے پوچھا۔

جیکی نامی اس شخص نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اس میں پانچ پیس اور ہیں مادام۔ ہمیں مکمل سیٹ ہی خریدنا پڑے گا۔"

"پھر تو بہت زیادہ قیمت ہو جائے گی۔"

"آپ کے لیے کیا زیادہ ہوگی مادام۔؟ اور یہ بھی تو دیکھیں کہ ملکہ وکٹوریہ کے دور کی چیز ہے۔"

"پھر بھی کیا اندازہ ہوگی ہے پورے سیٹ کی؟"

"عزال ڈھائی لاکھ یو ایس ڈالر مانگ رہا ہے لیکن امید ہے کہ دو لاکھ کے اندر اندر سودا ہو جائے گا۔"

"او گاڈ۔ یہ تو کافی زیادہ ہیں۔ عاصم اتنے خرچ نہیں کریں گے۔ آج کل وہ ٹائٹ جا رہے ہیں۔"

"آپ ان سے مشورہ فرما کر دیکھ لیں پھر جیسے آپ کا حکم ہوگا ویسے کر لیں گے۔"

"نہیں جیکی۔" لیونا قدرے مایوسی سے بولی "تم اس سے آدھے سیٹ کی بات کرو۔ میں اپنی پسند کی چیزیں لے کر اسے اس کی پسند کی رقم دے رہی ہوں۔"

"میں نے بڑی کوشش کی ہے میڈم لیکن وہ اس پر نہیں آتا ہے۔ وہ پورا سیٹ بیچے گا۔ ہاں وہ اس میں زیادہ سے زیادہ رعایت کرنے کو تیار ہو جائے گا۔"

لیونا نے ایک بار پھر جڑاؤ زیورات کو بے حد للچائی نگاہوں سے دیکھا اور ایک سرد آہ بھری پھر زیورات واپس لوٹاتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ ان کا پتا کسی بھی طور بڑی مادام کو نہیں لگنا چاہیے۔ پرسوں عاصم واپس آ رہے ہیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔"

"او ہو میڈم! آپ یہ زیورات پاس ہی رکھیں نا۔"

"تم بہت چالاک ہو جیکی۔" لیونا نے جیکی کو تبسم سے دیکھ کر کہا۔

جیکی کی چالاکی میری سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ ایک سیلز مین کی طرح اس کی خواہش تھی کہ لیونا یہ زیورات شوہر نامدار کو پہن کر دکھائے تاکہ زیورات کی خوب صورتی اور زیورات پہننے والی کی خوب صورتی ایک دوسرے سے ضرب کھائیں اور شوہر صاحب کی مت ماری جائے۔

کچھ تذبذب میں رہنے کے بعد لیونا نے زیورات لے لیے اور جیکی کو تین چار روز بعد رابطہ کرنے کو کہا۔ ان لمحوں میں جیکی اور لیونا کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ جڑاؤ زیورات ابو ظہبی کے ایک جوہری عزال مالک کے ہیں اور وہی انہیں فروخت کر رہا ہے۔ جیکی باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ جلدی سے میں ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ پانچ دس منٹ میں وہیں موجود رہا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ یہاں کسی اور نیت سے آیا تھا۔ میں عاصم کی اس "ازل" چھلے چھڑانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ اسے یہاں سے اغوا کر لے جانے کا تھا لیکن اب میرا ذہن ایک دوسرے انداز سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک پلان بن رہا تھا۔ پالا گیا تو میں اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے کولٹ ہاتھ میں لے لیا اور دروازے پر قدھم دستک دی۔ لیونا کا خیال یہی تھا کہ شاید جیکی کوئی بات کہنا بھول گیا ہے اور واپس آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا' میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچی اور ساتھ ہی پسٹل کی نال اس کی خوب صورت پیشانی سے لگا دی۔ اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ پیچھے ہوتی دیوار کے ساتھ جا لگی۔ میرے ہونٹ مضبوطی سے اس کے ہونٹوں پر جم گئے۔ میری اس حرکت پر وہ بھونچکا رہ گئی۔ میں نے کہا "اگر تم وعدہ کرو کہ چیخو چلاؤ گی نہیں تو میں تمہارا

گردن چھوڑ دیتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرے گی۔ شاید اس میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ کوئی چال چل سکتی۔

میں نے اس کی خوب صورت گردن پر دباؤ بتدریج کم کیا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے پسٹل کا رخ مسلسل اس کے سر کی طرف تھا۔ وہ بری طرح کھانستے اور اپنی گردن مسلتے کے بعد بے دم سی ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کرسی کے پیچھے میں یا آس پاس گھنٹی یا الارم وغیرہ کا بٹن ہو۔ میں نے لیونا کو کرسی سے اٹھنے کا حکم دیا۔ اسے اپنے سامنے قالین پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔ میری ایک ٹانگ سیدھی تھی۔ دوسری میں نے گھٹنے پر سے موڑ رکھی تھی۔

لیونا بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر پا رہی۔ میرے جسم پر شارک اسکن کا نہایت قیمتی سوٹ تھا اور ہاتھوں میں ڈائمنڈ کی انگشتریاں تھیں لیکن میرے بال الجھے ہوئے تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں اپنی شکل و صورت سے ایک اوباش اور سرمایہ دار کمیں زادہ نظر آتا ہوں اور میں ایسا ہی نظر آنا بھی چاہتا تھا۔

"کون ہو تم؟" لیونا کے پتلے ہونٹوں سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"تمہارا سچا عاشق۔ جنم جنم سے تمہارے ملن کی پیاس آنکھوں میں سجائے بھٹک رہا ہوں۔"

"آئی ایم سوری۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔"

"لیکن میں تو جانتا ہوں۔ میں نے آج سے دو سال پہلے دبئی میں تمہیں کولڈ کریم کے ایک اشتہار میں دیکھا تھا۔ وہی اشتہار جس میں تمہاری ٹانگیں بہت اوپر تک ننگی ہیں اور تم کیمرے کی طرف دیکھ کر آنکھ بھی مارتی ہو۔ تمہاری وہ آنکھ میرے دل پر لگی تھی اور ایسی لگی تھی کہ برسوں گزر گئے اس چوٹ کی تکلیف کم نہیں ہوئی۔"

"دیکھو' تم جو کوئی بھی ہو' میں تمہیں نہیں جانتی اور دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک عرصہ پہلے شوبز چھوڑ چکی ہوں۔ اب میں کسی کی بیوی ہوں' ایک گھریلو عورت ہوں۔"

"تم بیوی نہیں ہو' داشتہ ہو اور داشتہ بھی ایک ایسے شخص کی جس کا بستر زیادہ دیر کسی ساتھی کو قبول نہیں کرتا۔"

"شٹ۔ تم بکواس بند کرتے ہو یا میں۔؟"

"تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو اور نہ میں تمہیں کرنے دوں گا۔ ایک بات یاد رکھنا میرا دماغ گھوما ہوا ہے' میں تمہیں قتل کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ میری آنکھوں میں وحشت ناچ رہی ہے۔ اس وحشت نے لیونا کو بالکل سہما دیا۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "لیکن اگر تم کوئی چالاکی نہیں دکھاؤ گی تو میں بھی تمہارے ساتھ بڑی تہذیب اور محبت سے پیش آؤں گا۔ تمہیں پتا چلے گا کہ پیار کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ جس شخص کو تم اپنا محبوب سمجھتی ہو وہ تو ایک بوچڑ ہے ایسے لوگ بس خوب صورت لڑکیوں کی کھال سے پیار کرتے ہیں۔ دل اور دل کے تاروں تک ان کی انگلیاں نہیں پہنچتیں اور نہ پہنچ سکتی ہیں۔"

"دیکھو۔ میں ایک مختلف قسم کی لڑکی ہوں۔"

"میں بھی ایک مختلف قسم کا شخص ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی "میرا نام جہاں دار ہے۔ میرا شمار انڈیا کے امیر لوگوں میں ہوتا ہے۔ نوجوان ہوں' شکل بھی تمہارے سامنے ہے اور ایسی بری نہیں ہے۔ اس کے باوجود آج سے دو ڈھائی سال پہلے تک کوئی لڑکی میری نگاہوں میں جچی نہیں تھی' پھر تمہیں ٹی وی کے ایک ایڈ میں دیکھا اور مجھے لگا کہ میری آنکھیں جس کے انتظار میں بھٹک رہی تھیں وہ تم ہو۔"

وہ غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں میں پسٹل تھا اور ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے تھے۔ وہ

جناب ایم اے راحت
کا ناقابل فراموش ناول
احساس

سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان پھولوں کو حقیقت سمجھے یا کولٹ پسٹل کو۔ میں نے ناگنیں پسار کر سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور لیونا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم پر عاشق ہو کر میں نے کوئی کمال نہیں کیا۔ اور جس طریقے سے عاشق ہوا ہوں وہ بھی کوئی کمال کی بات نہیں۔ ہزاروں نوجوان تمہیں کولڈ کریم کے اس ایڈ میں دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے ہوں گے لیکن مجھ میں اور ان نوجوانوں میں فرق یہ ہے کہ وہ صرف آہیں بھر سکتے ہیں جبکہ میں اپنی آہوں سے آگ لگا سکتا ہوں۔ قدرت نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ شاید اتنا کہ مجھے خود بھی اس کے حساب کتاب کا پتا نہیں ہے۔ دولت کے ساتھ ساتھ میرے پاس ایک ایسا دل بھی ہے جس میں آگے بڑھ کر اپنی محبت کو حاصل کرنے کا حوصلہ موجود ہے۔ اس حوصلے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں تمہارے شیخ عاصم کی کھڑی کی ہوئی تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے یہاں تمہارے پاس موجود ہوں۔"

"مجھے تم پر ترس آ رہا ہے" وہ شستہ انگلش میں بولی "تمہیں غالباً ٹھیک سے اندازہ نہیں کہ تم کس شخص سے پنجہ لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ شیر کی کچھار میں گھسنے والی بات ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "سویٹ ہارٹ! مجھے اس بات میں شبہ ہے کہ عاصم ایک شیر ہے لیکن بالفرض محال ایسا ہے بھی تو مجھے اس خارش زدہ شیر کی دم پر پاؤں رکھ کر بہت لطف آئے گا۔"

اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں غصے کے علاوہ ایک طرح کی پوشیدہ ستائش بھی تھی۔ جیسے وہ دل ہی دل میں میری بے جگری کی معترف بھی ہو رہی ہو۔ میں نے کوٹ کی جیب سے اپنا نہایت قیمتی لائٹر نکال کر سگریٹ سلگایا اور کش لیتے ہوئے کہا "مجھ سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں آج تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے لیونا لاج میں گھسا ہوں کہ تمہارے لیے میری چاہت کتنی شدید اور واشگاف ہے۔ میں چاہوں تو اس وقت اس پسٹل کے زور پر تمہارا یہ خوب صورت جسم بھی حاصل کر سکتا ہوں' لیکن مجھے اس کام کی کوئی جلدی نہیں۔ مجھے اپنی چاہت کی طاقت پر بھروسا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک روز اپنا یہ پھول بدن تم خود میرے سپرد کرو گی۔"

"میں تمہاری بکواس میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی۔ تم میرے صبر کا زیادہ امتحان لو گے تو میں نتیجے سے بے پروا ہو کر شور مچا دوں گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ تمہارے لیے بہت برا ہو گا۔"

"خود سر گھوڑے کو قابو کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ مجھے تمہارا یہ تیز تیکھا انداز پسند آیا۔" میں نے ایک ... کر کہا۔

میری آنکھ میچنے کی ادا نے اسے مزید آگ بگولا ... اس کا رنگ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ ضبط کے ... نے اپنے پتلے پتلے ہونٹ زور سے بھینچ لیے۔ اس ... عقب میں دیوار پر شیخ عاصم کی جہازی سائز تصویر لگی ... عاصم اپنے کتے کو گود میں لیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ لیونا ... آستین کی ڈھیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے عقب ... کے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں اور اس پر تنفر ... ہوئی تھی۔ ایک دوسری قد آدم پورٹریٹ میں وہ سر ... پیرس کا تاج پہنے کھڑی تھی اور کوئی اپسرا نظر آ رہی تھی ... میں نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہو ... "سوچا تھا کہ اس پہلی ملاقات میں تمہیں کوئی شاندار تحفہ دوں گا۔ یہاں کا مشہور جوہری عزرال ہے ... مالک سنا تھا کہ وہ کوئی قیمتی ڈائمنڈ سیٹ بیچ رہا ہے ... وکٹوریہ کے زمانے کے زیورات ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ... کی طرف گیا تھا لیکن مجھے وہ چیزیں تمہارے لیے بیچ ... ہوئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لیے میرا پہلا تحفہ شان دار ہو کہ تمہیں مدتوں یاد رہے۔ بس مجھے ایک ... مہلت اور دے دو۔ پرسوں تمہاری خدمت میں اپنا پہلا ... پیش کروں گا۔"

میں نے لیونا کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات ... اور مجھے یقین ہو گیا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ وہ ذرا دھیان سے ... میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "کیا دیکھ رہی ہو؟" ... خاموش رہی۔

میں نے کہا "شاید سوچ رہی ہو کہ مجھے عزرال مالک ... جوہری کے پاس بھی تمہاری شان کے مطابق کوئی چیز کیوں نہیں آئی؟ تمہاری حیرت بجا ہے لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ تم اپنی اصل شان سے آگاہ نہیں ہو۔ یار لوگ آسمان سے تارے توڑنے کی باتیں کرتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک ایسا ہوتا بھی ہے جو کسی کے ... آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں مائی ڈارلنگ!"

تیر واقعی نشانے پر لگا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ... کے تنے ہوئے نقوش کچھ نرم پڑ گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ... عزرال مالک کے جن زیورات کو دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی ... اب "اتفاقاً" میں نے ان ہی زیورات کا ذکر ایسے انداز ...

... تھا کہ لیونا کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔ اس کے نزدیک تو ... ایک "اتفاق" ہی تھا۔

... وہ ذرا بدلے ہوئے انداز میں بولی "مسٹر جہاں دار کیا ... تمہارا حدود اربعہ جان سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "میرا سب سے بڑا تعارف تو یہ ہے کہ میں ... تمہارا سچا عاشق ہوں۔ باقی سب ادھر ادھر کی باتیں ہیں جان ...

... وہ بولی "ہو سکتا ہے کہ میری منشا وہ "ادھر ادھر" کی ... جاننا ہی ہو۔"

میں نے پہلے سے سوچے سمجھے انداز میں اپنا تعارف کرا ... اس تعارف کے مطابق میں انڈین تھا اور ماضی میں ... میرے بزرگ ایک ریاست کے مالک تھے۔ اب نئے انڈیا ... میں ریاست تو ختم ہو چکی تھی تاہم اب بھی اتر پردیش میں ... بڑی بڑی جاگیریں میرے قبضے میں تھیں۔ والدین کی وفات ... کے بعد میری حیثیت ایک خود مختار اور آزاد منش رئیس ... کی سی تھی۔ سوئٹزر لینڈ کے بینکوں میں میری بڑی بڑی ... رقوم جمع تھیں اور لندن میں بھی وسیع و عریض کاروبار میری ... نگرانی میں تھا۔

میں نے جو کچھ بتایا بڑے ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ بتایا۔ ... اس کے رویے میں خاطر خواہ تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ یوں ... تو وہ اب بھی رکھائی سے بول رہی تھی لیکن اس رکھائی میں ... اس امر کے واضح اشارے موجود تھے کہ مستقبل قریب میں ... اس کے لہجے میں تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔

وہ ناصحانہ انداز میں بولی "مسٹر جہاں دار! مجھے نہیں ... معلوم کہ تم نے جو کچھ بتایا ہے اس میں سچ کتنا ہے' بہرحال ... یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہارا رویہ نہایت ... عجیب اور طیش دلانے والا ہے۔ جہاں تک کسی کو چاہنے ... اور پسند کرنے کا تعلق ہے' کوئی کسی پر پابندیاں نہیں لگا سکتا۔ ... مجھ سے تعلق رکھنے والے افراد کو ایسے حالات کا سامنا کرنا ... پڑتا ہے مگر پسندیدگی کے اظہار کا جو طریقہ تم نے اپنایا ہے ... وہ بے حد خطرناک ہے۔"

"یہ انداز میں نے جان بوجھ کر اپنایا ہے جان! میں ... تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے رویے میں کتنی شدت ہے۔ ... میں تمہارے ان سیکڑوں ہزاروں پرستاروں میں سے نہیں ... ہوں جو تمہیں اسکرین پر دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں۔ میں ہر ... رکاوٹ کو توڑ کر تمہارے سامنے آ سکتا ہوں اور تمہیں ... تمہارے منہ پر اپنی محبوبہ کہہ سکتا ہوں۔ اگر تم کہو تو میں ایک ... بار پھر تمہارا منہ چوم کر تمہیں اپنی والہانہ محبت کا یقین ... دلاؤں؟"

"نن... نہیں... پلیز۔ اب کوئی ایسی حرکت مت کرنا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' آج کی ملاقات میں اتنا ہی کافی ہے' لیکن جب میں اگلی مرتبہ یہاں آؤں گا تو تم مجھے یہ عمل دہرانے سے روکو گی نہیں۔"

"کک... کیا مطلب؟ کہاں آؤ گے؟"

"یہیں آؤں گا اور کہاں آؤں گا؟" میں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ عاصم کے کارندے تمہیں پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ تمہاری لاش کا نام و نشان نہیں ملے گا۔"

"کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں کہ جہاں دار کا بال بھی بیکا کر سکے۔ اگر تمہیں اس امر میں کوئی شک ہے تو پھر تمہارا یہ شک میں کل ہی دور کر دوں گا۔ کل میں پھر آؤں گا۔"

"خدا کے لیے نہیں۔ تم مجھے اچھے آدمی لگے ہو۔ میں اپنی اور تمہاری جان کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ ... تم یہاں نہیں آؤ گے۔" اس کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

"میں یہاں نہیں آؤں گا تو پھر ملاقات کیسے ہو گی؟" میں نے فوراً سوال کیا۔

"کوئی ملاقات نہیں ہو گی۔" اس نے کہا۔ اس مرتبہ بھی اس کے انداز میں لچک موجود تھی۔

وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے اتنی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں لیا کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ میرے ہونٹ اس کے حسین ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد میں پیچھے ہٹا تو اس کا چہرہ سرخ تھا۔ تاثرات میں احتجاج کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی مسکراتی حیرت بھی چھپی ہوئی تھی۔ اپنا بھرم رکھنے کے لیے وہ کرخت لہجے میں بولی "تم مجھے جنونی محسوس ہوتے ہو۔"

"ہوں نہیں لیکن تمہاری محبت نے ایسا کر دیا ہے۔ میں تمہیں زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری ادائیں دیکھ کر خود کو تم سے دور رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ آئی ریئلی مین اٹ!"

"دیکھو! مسٹر! تم دوبارہ یہاں نہیں آؤ گے۔"

"تو پھر ملاقات کیسے ہو گی؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ کچھ دیر گہری سوچ میں رہی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی پھر وہ ہراساں لہجے میں بولی "تم فی الحال یہاں سے جاؤ۔ اگر تمہارا کوئی فون نمبر ہے تو مجھے دے دو میں... تم

سے... رابطہ کروں گی۔"

"صرف رابطہ نہیں کرنا۔ ملنے کا وقت اور مقام طے کرنا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی "ٹھیک ہے' میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں گی' لیکن یہ ملاقات کسی اور مقصد سے نہیں ہوگی۔ صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے ہوگی کہ تم اپنے لیے کتنی خوفناک مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں نے سن رکھا ہے کہ جب دو پیار کرنے والے ملتے ہیں تو ملاقات کا ایجنڈا موقع محل کے لحاظ سے خود ہی طے ہوتا ہے۔ ملاقات کرنے والے نہیں ملاقات کرنے والوں کے "جذبات" فیصلہ کرتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کس انداز میں کرنا ہے اور کتنی دیر تک کرنا ہے وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔"

"سچ پوچھو تو مجھے ابھی تک تمہاری کچھ سمجھ نہیں آسکی مسٹر جہاں دار۔"

"آنے والی ملاقاتوں میں تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرنا' میں تمہارے لیے کھلی کتاب بن جاؤں گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا لیکن وہ چپ رہی۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "کب فون کرو گی؟"

"بس ایک دو دن تک!"

میں نے کہا "تمہاری سنجیدگی اس بات سے ظاہر ہے ابی کہ تم نے مجھ سے ابھی تک فون نمبر ہی نہیں لیا۔"

"اوہ سوری۔ میں بھول گئی۔ کیا نمبر ہے تمہارا؟"

میں نے اسے پرنس ہوٹل میں اپنے کمرے کا نمبر نوٹ کراتے ہوئے کہا "ایک بات یاد رکھنا ابی! میں پرسوں رات تک تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ فون نہیں آیا تو اتوار کے روز خود یہاں آجاؤں گا۔"

"یہ تو بلیک میلنگ ہے۔"

"محبت میں سب جائز ہے۔"

"میں جس کے پاس ہوں' وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اس..." ایک دم وہ چپ ہو گئی۔ کہیں پاس ہی قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی تھی۔ وہ غور سے آواز کو سنتی رہی۔ آواز کچھ فاصلے پر چلی گئی تو وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "مسٹر جہاں دار! اب تم واپس چلے جاؤ۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔ لیکن..." ایک بار پھر وہ چپ ہو گئی۔ اس کی چمکیلی پیشانی پر فکر مندی کی سلوٹ تھی۔ چند لمحے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "واپس جاؤ گے کیسے۔ آٹھ دس گارڈز یہاں ہر وقت رہتے ہیں۔"

"آٹھ دس گارڈز کی کوئی بات نہیں' آٹھ سو بھی ہوں گے تو میں جب چاہوں گا تم سے ملنے پہنچ اور جیسے آؤں گا ویسے ہی چلا بھی جاؤں گا۔"

حیران پریشان لیونا کو گنگ چھوڑ کر میں اس کے سے نکلنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ بیڈ روم کے فون کی اٹھی۔ لیونا یوں لرزی جیسے اسے سانپ نے ڈنک ما، وہ چند لمحے ٹیلی فون کو گھورتی رہی پھر اس نے ریسیو "ہیلو کون؟" اس نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔ دوسری' آواز سن کر اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا اس۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "ہیلو عاصم! کیسے آپ؟"

میں لیونا کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ ہاتھ آگے بڑھ نے ٹیلی فون سیٹ پر ہینڈ فری کا بٹن دبا دیا۔ مائیک م عاصم کی آواز بیڈ روم میں سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہا تھ! میں تمہیں بری طرح مس کر رہا ہوں۔ کل بھی سارا دن تمہاری طرف لگا رہا لیکن مصروفیت اتنی تھی کہ ا کے باوجود تمہیں فون نہ کرسکا۔ سچ کہتا ہوں لیونی! تم سے مجھے ایک کالج بوائے کی طرح بنا دیا ہے۔"

عاصم بول رہا تھا اور لیونا احتجاجی نظروں سے مجھ رہی تھی۔ یقیناً اسے میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی اس کی اور عاصم کی نجی باتیں سن رہا ہوں۔ شاید لیو نزدیک یہ اخلاقی جرم ہو۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں جو کچھ ہوں' وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو شیخ عا طرف سے میرے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ ہاں یہ تو اس کا بھی نہیں تھا۔

مجھے سری لنکا میں گزارے ہوئے وہ خوفناک دن یاد تھے جب میرے ہاتھوں میں الیکٹرانک گھڑی کی تھی۔ میں شیخ عاصم کے ہاتھ بندھے غلام کی حیثیت سے کے شان دار ولا میں موجود تھا۔ رہی "ولا" جہاں "میری" غزالہ کے ساتھ ہنی مون منا رہا تھا۔ اپنی پلاننگ کے تحت میری نگاہ کو ایسے ایسے عذابوں سے تھا کہ میں دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا کہ میری پھوٹ جائیں۔ ان شب و روز کا خیال ذہن میں آیا تو تن میں آگ سی بھڑکنے لگی۔

لیونا نے ہاتھ آگے بڑھا کر ہینڈ فری کا سوئچ آف کیا

میں نے بے تکلفی سے اس کی کلائی تھام لی اور آنکھوں اشارے سے اسے منع کر دیا۔ وہ سہم کر رہ گئی۔ شیخ عاصم جھونک میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ غالباً اس نے ایک دو بھی لگا رکھے تھے۔ اس کی رومانی گفتگو سے اندازہ تا تھا کہ یہ لڑکی یقیناً اس کے دل پر گہری لگی ہے۔ اپنی تمام مداری پریشانیوں کے باوجود عاصم اگر اس لڑکی کو لمبی لمبی کالیں کر رہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اس کے میں بہت سنجیدہ ہے۔ فون پر ہی عاصم نے لیونا کو زور KISS کیا اور کہنے لگا "پوچھو کہاں؟"

لیونا خاموش رہی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ نے پھر کہا "بھئی پوچھو ناں کہاں کیا ہے؟" وہ پھر بھی رہی۔ عاصم بولا "لگتا ہے آج ہماری جان ضرور سے شرما رہی ہے۔ اچھا... میں خود ہی بتاتا چلا جاتا ہوں اس KISS کیا اور بولا "تمہاری پیشانی پر۔" پھر KISS کیا اور "تمہاری نیلی آنکھوں پر۔" پھر کیا اور بولا "تمہاری ننھی ناک پر۔" پھر بولا "تمہارے ہونٹوں پر۔" پھر بولا "تمہاری تھوڑی پر۔ تمہاری گردن پر۔" پھر وہ اور نیچے یا۔ لیونا شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی سے بات کا رخ موڑا اور جھکتے ہوئے عاصم سے اس کی کے بارے میں پوچھنے لگی۔ عاصم نے کہا "سویٹ ہارٹ میں نے پچھلے ویک اینڈ پر ہی جانا تھا' لیکن تمہیں بتایا تھا کہ یہاں لاہور میں ایک بڑا پولیس افسر قتل ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ہمارے کچھ بندے بھی پولیس تفتیش کی زد گئے تھے۔ بس اسی سلسلے میں الجھا رہا۔"

عاصم یقیناً (مرحوم) ساہی صاحب کا ذکر ہی کر رہا تھا۔ صاحب کے ساتھ مرحوم کا لفظ سوچتے ہوئے دل ٹکڑے تھا۔ لیونا اور عاصم کی گفتگو ایک موضوع سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ لیونا بہت کم بول رہی تھی۔ یقیناً اس کی خواہش تھی کہ بات چیت جلد ختم ہو جائے شیخ عاصم تو جیسے زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنی بلبل (محبوبہ) چہکار سننے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس وقت اس کے بیڈ روم میں اس کی "جانِ جگر" کے اس کا سب سے بڑا دشمن موجود ہے اور وہ بند بیڈ روم اندر "جانِ جگر" سے اتنا قریب ہے کہ دونوں کے بدن رہے ہیں اور سانسیں ٹکرا رہی ہیں۔

شیخ وہ ہر ہر زخم یاد آ رہا تھا جو "سری لنکا" میں مجھے شیخ کے ہاتھوں سے لگا تھا۔ میرے بدن میں چنگاریاں سی سنسنا رہی تھیں۔

محی الدین نواب کی نایاب کتابیں

شارٹ کٹ
ان لوگوں کی کہانی جو کم سے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں
قیمت: ۱۲۵ روپے

دل پارہ پارہ
جذبات کی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے والی داستان اس داستان میں آپ کو محبت کا صحیح فلسفہ ملے گا
قیمت: ۱۲۵ روپے

اجازت
محی الدین نواب کا ایک بہترین ناول' دل میں اترنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی
قیمت: ۱۵۰ روپے

پتھر دو جلدیں
محبت کی کھلتی کلیوں اور انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی کہانی
قیمت ۱۵۰ روپے فی جلد

جرم وفا
محی الدین نواب کے قلم سے انگڑائیاں لیتی' مہکتی اور پھول کھلاتی ہوئی ایک رومانی داستان
قیمت: ۲۰۰ روپے

کمبل
محی الدین نواب صاحب کے قلم سے چار بہترین اور شاہکار کہانیوں کا گلدستہ
قیمت: ۱۸۰ روپے

اجل نامہ
محی الدین نواب کے قلم سے اجل نواب کے مختلف چار روپ' ایک منفرد تخلیق
قیمت: ۲۰۰ روپے

ایمان والے
محی الدین نواب کے قلم سے پانچ بہترین طویل کہانیاں
قیمت: ۲۰۰ روپے

ڈاک خرچ فی کتاب ۳۰ روپے
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں۔

علی میاں پبلیکیشنز
20۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ Ph: 7247414

میرا جی چاہ رہا تھا کہ شیخ عاصم اس وقت میرے سامنے یہاں بیڈ روم میں موجود ہو۔ میں اس کی جان سے پیاری محبوبہ کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کے دل پر ویسے ہی آرے چلاؤں جیسے وہ میرے دل پر چلا چکا ہے۔ شیخ عاصم کے خلاف میرے دل میں انتقام کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی جس کی تپش خود میری توقع سے بھی زیادہ تھی۔ لاتعداد بھولے ہوئے زخم یاد آگئے تھے اور بہت سی دبی ہوئی ٹیسیں شدت سے ابھر آئی تھیں۔

کچھ دیر بعد لیونا اور شیخ عاصم کے درمیان ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو ختم ہوگئی۔ لیونا نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر ایک گہری سانس لی اور شکایتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ایک بار پھر والہانہ انداز میں اسے اپنے قریب کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''تمہاری یاد دہانی کے لیے میں اپنی بات دہرا دوں ہنی! میں پرسوں رات تک تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ فون نہیں آیا تو اتوار کے روز خود یہاں آجاؤں گا۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ میرا ارادہ دیکھ کر بولی ''دیکھو! یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش میں کوئی مصیبت کھڑی نہ کرلینا۔ زیادہ نہیں تو آٹھ دس گارڈز یہاں ضرور موجود ہوں گے۔''

میں نے بے پروائی سے اسے آنکھ ماری ''تمہارا دیوانہ ہوا کی طرح ان اندھوں کے درمیان سے گزر جائے گا۔ یقین نہیں تو باہر نکل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ میں دروازے تک پہنچ کر ذرا رکا اور لیونا کی طرف مڑتے ہوئے کہا ''اس بدبخت (عاصم) کی باتوں میں نہ آنا۔ ابھی فون پر اس نے جو کچھ تمہاری شان میں کہا ہے اس سے پہلے پتا نہیں کتنی لڑکیوں سے کہہ چکا ہے۔ یہ بھونرا صفت شخص ہے۔ اپنے حرم کو وسیع سے وسیع کرنے کا بھوت اس پر سال میں بارہ مہینے سوار رہتا ہے۔ یہ عاشق نہیں ہے بس حسن پرست ہے۔ عاشق تو ہم جیسے ہوتے ہیں۔ ایک بار جس کے ہوگئے بس ہوگئے۔ اچھا گڈ بائے۔'' ہاتھ لہرا کر میں باہر نکل آیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر میں چھت پر آیا اور درخت کے ذریعے نیچے آگیا۔ پہلے والے راستے پر چلتا ہوا میں بڑی احتیاط سے واپس گیراج میں پہنچ گیا حسب توقع دروازہ کھلا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ تاریکی میں دیوہیکل لیموزین کار خاموش کھڑی تھی جیسے وہ بھی اس منصوبے میں میرے اور عزیز کے ساتھ برابر کی شریک تھی اور یہاں دم سادھے میرا انتظار کررہی تھی۔ ڈگی بھی مقفل نہیں تھی۔ میں ڈگی کا ڈھکن اٹھا کر بہت آہستگی سے اندر گھس گیا۔ میری ناٹلیر ہونے میں بس تھوڑی ہی کسر رہ گئی تھی۔ میں نے پسٹل اپنے سینے پر رکھا اور آرام سے لیٹ گیا۔

کچھ گرمی تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی کہ پریشان ہوتا۔ میں لیٹا رہا اور میرا ذہن مس پیرس لیونا کے بارے میں سوچتا رہا۔ کچھ دیر پہلے لیونا کے بیڈ روم میں لیونا اور جیکی تا میں جو بات چیت ہوئی تھی، اس سے پتا چلا تھا کہ لیونا مطلب پرست اور حریص لڑکی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی شیخ عاصم کے ساتھ بھی وابستگی ہو لیکن اس کی اصل وابستگی مال اور اپنے عیش و آرام کے ساتھ تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ لڑکی کے قدموں کو مال و زر کی چمک سے کسی بھی رخ پر جا سکتا ہے۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھوم رہا تھا، جیکی کے ہاتھ میں جڑاؤ زیورات دیکھ کر لیونا کی آنکھوں میں طمع کی چمک ابھری تھی اور اس کے حسین ہونٹ ? انداز میں سکڑ گئے تھے۔

باقی کے واقعات بھی پروگرام کے مطابق ہی ہوئے۔ سویرے ڈرائیور عزیز نے گاڑی گیراج سے باہر نکالی، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں لیونا لاج سے باہر تھے۔ لاج سے دس بارہ کلومیٹر دور ایک ریسٹورنٹ کے کھجوروں کے جھنڈ میں عزیز نے اپنی لیموزین روکی، میں ڈگی میں سے نکل آیا۔ سورج نکلتے ساتھ ہی گرمی بڑھ گئی تھی اور میں پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ عزیز نے ماتھے پر ہاتھ لے جاکر مجھے سلام کیا اور بولا ''آپ کی کوشش کیسی رہی جناب؟''

''تقریباً کامیاب۔ سعدیہ سے ملاقات ہوگئی ہے۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکا ہوں۔''

''وش یو گڈ لک!'' میں نے کہا ''کل کی ریس دیکھنے جانا۔ امید ہے کہ تمہارا برق (اونٹ کا نام) جیتے گا۔''

عزیز نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے قریب سے گزرتی ٹیکسی کو روکا اور سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔ راستے میں نوٹکل کلب سے میں نے جیگوار گاڑی لی اور ہوٹل پہنچ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر کے بعد سے میں نے حسینہ لیونا کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ یہ جاں گسل انتظار ? بجے تک اپنی انتہا کو پہنچ گیا پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتظار کی شدت کم ہونے لگی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آج تو لیونا فون نہیں کرے گی۔ رات دیر تک میں

کروٹیں بدلتا رہا۔ سوچتے سوچتے جب بھی ساہی صاحب کا خیال ذہن میں آتا تھا دل پر گھونسا سا لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ساہی صاحب کہاں مر سکتے ہیں؟ ابھی میرا خواب ٹوٹ جائے گا اور مجھے علم ہوگا کہ ساہی صاحب تو زندہ سلامت پاکستان میں موجود ہیں اور اپنے روز مرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ساہی صاحب کی موت کا خیال آتے ہی ذہن میں شیخ عاصم اور شنکر کے چہرے گھومنے لگتے تھے اور رگ جاں میں نفرت آگ بن کر دوڑنے لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی غزالہ کی دوری کا خیال مزید بڑھتا تھا اور پورا جسم جلنا شروع ہوجاتا تھا۔

اگلے روز بھی سہ پہر کے فوراً بعد میں نے لیونا کے فون کا انتظار شروع کردیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری بے چینی بڑھتی گئی۔ میں تہیہ کرچکا تھا کہ اگر آج لیونا نے رابطہ نہیں کیا تو کل میں پھر لیونا لاج میں جا گھسوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے مجھے عزیز کو مزید ''رشوت'' دینے کی ضرورت تھی اور میں اس کے لیے تیار تھا۔

بہرحال خیریت گزری۔ رات آٹھ بجے کے لگ بھگ فون آگیا۔ لیونا نے کہا ''میں ایک سہیلی کے ہاں سے بول رہی ہوں۔ وہیں سے تمہیں ملنے آؤں گی۔ میں نے کریم رنگ کا گاؤن پہن رکھا ہے۔ گاؤن کا رنگ ہلکا براؤن ہے۔''

''اکیلی کیسے آؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے ساتھ میری لبنانی سہیلی ہوگی۔ وہ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہے گی۔ میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی اور ایک بات میں تمہیں ابھی بتا دوں مجھ سے کوئی غلط توقع وابستہ نہ کرنا۔ میں تمہیں صرف سمجھانے کی غرض سے آرہی ہوں۔''

''میں بھی تمہیں سمجھانے کی غرض سے ہی مل رہا ہوں۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی ''میں ٹھیک ساڑھے نو بجے شیریں ہوٹل پہنچوں گی۔ تم کہاں ملو گے؟''

''اپنے کمرے میں۔'' میں نے تیزی سے کمرے کا نمبر بتایا۔

''زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں ڈائننگ ہال میں پہنچوں گی۔ اگر تم وہاں ہوئے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ دو منٹ سے زیادہ تمہارا انتظار نہیں کروں گی۔ اچھا خدا حافظ!'' اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

وعدے کے مطابق ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ پرنس ہوٹل کے عالی شان ڈائننگ ہال میں داخل ہوگئی۔ اس کی فقط آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ دل ربا چال چلتی وہ میری میز کی طرف بڑھی۔ یہ ہوٹل کا پرائم ٹائم تھا اس کے باوجود ''تاج'' نامی اس ڈائننگ ہال میں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آرہا تھا۔ اور آتا بھی کیسے۔ یہ ہال میں ریزرو کرا چکا تھا۔ ہال کی ریزرویشن کا خیال کل رات ہی بیٹھے بٹھائے میرے ذہن میں آیا تھا۔ اس کام کے لیے مجھے پچیس ہزار درہم خرچ کرنا پڑے تھے لیکن میرے لیے اب یہ ایک معمولی رقم تھی۔

اپنے ارد گرد ذرا حیرت سے دیکھتے ہوئے لیونا میری میز کے قریب پہنچی تو اچانک اطراف کے دروازوں سے باوردی ویٹرز نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں منقش تھال تھے اور ان تھالوں میں گلاب کی تازہ پتیاں تھیں۔ چند سیکنڈ میں کئی کلو پتیاں انہوں نے لیونا کے قدموں میں نچھاور کردیں۔ لیونا کچھ گھبراتی اور کچھ لڑکھڑاتی ہوئی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ''یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کیوں تماشا بنا رہے ہو۔'' وہ ریشمی نقاب کے پیچھے سے سرسراتی آواز میں بولی۔

''یہ تو شروعات ہے۔ آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میرا بس چلے تو اپنا آپ بھی تمہارے قدموں میں نچھاور کردوں۔''

''مجھے شاعری نہیں چاہیے۔'' وہ خشک انداز میں بولی۔

''میں شاعری نہیں کر رہا لیونا! حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ لوگ اپنی محبوباؤں کے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی بات کرتے ہیں۔ میں سچ مچ تمہارے لیے تارے توڑ کر لے آؤں گا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ نزاکت سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مریخ کا ایک خوب صورت ٹکڑا... انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ سری لنکا کے ایک نوادرات کے پاس موجود ہے۔ تمہاری بائیسویں سالگرہ پر وہ انگوٹھی میں تمہیں تحفے میں پیش کروں گا۔ ہوگئی ناں تارے توڑ کر لانے والی بات!''

اس کی آنکھوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ شاید وہ نقاب کے پیچھے تھوڑا سا مسکرائی بھی تھی ''مجھے تو دیوانے لگتے ہو۔'' وہ بولی۔

''مرحبا۔ بس میں یہی بات تمہارے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ میں دیوانہ ہوں اور تمہارا دیوانہ ہوں۔ موسمی پرندے میں اور دیوانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تمہارا پہلا عاشق موسمی پرندہ ہے۔ سردی گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔ ذرا سی سختی آئے گی تو اڑ جائے گا۔''

''تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو۔ ان کا شمار امارات کے امیر ترین صنعت کاروں میں ہوتا ہے۔''

''ایسے دو چار صنعت کار ہر وقت تمہارے اس دیوانے کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔'' میں نے شان بے اعتنائی

سے کہا۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اردگرد دیکھ کر بولی۔ "یہ سب میزیں خالی کیوں ہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"یہ میزیں تمہارے احترام میں خالی ہیں۔ تمہاری خوب صورت آواز جو آج شام صرف میرے لیے ہے' کسی اور کے کانوں میں کیوں پہنچے۔"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی جارہی تھی۔ اس کی نگاہیں میرے بے شکن شارک اسکن سوٹ سے پھسلتی ہوئی میری بیش قیمت رسٹ واچ پر ٹھہر گئیں۔

"کیا کھانا پسند کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے بس دو چار باتیں کرنے کے لیے آئی ہوں۔"

میں نے ہیڈ ویٹر کو قریب بلا کر ڈنر کا آرڈر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈنر آدھ گھنٹے بعد سرو کیا جائے اور اس دوران میں ہم مکمل تخلیہ چاہتے ہیں۔

دیواروں کے ساتھ کھڑے مئودب ویٹرز پری زادوں کی طرح اوجھل ہوگئے۔

دبیز قالینوں اور حریری پردوں والے اس خواب ناک ڈائننگ ہال میں ہم مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ لیونا نے کہا "سچی بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری کچھ بھی سمجھ نہیں آئی۔ تم خود کو امیر کبیر شخص بتاتے ہو۔ نہایت قیمتی لباس بھی پہنتے ہو لیکن تمہارا حلیہ ابتر نظر آتا ہے۔ شیو بڑھی رہتی ہے۔ بال بکھرے رہتے ہیں۔"

"اس سوال کا جواب ابھی تھوڑی دیر پہلے خود ہی تم نے دیا ہے۔ میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ دیوانے شاید تم نے دیکھے نہیں وہ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔"

"دیکھو' میں تم سے بیکار کی بحث کرنے یہاں نہیں آئی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ عاصم مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں اور میں بھی ان کے بغیر ایک لمحہ نہیں رہ سکتی۔ تم کسی قسم کی بیکار ریکنس میں الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ اس میں سوائے تکلیف اور ذلت کے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ عاصم میرے حوالے سے کتنے انتہا پسند ہیں۔ مجھ سے کسی کا پیار جتانا تو بہت دور کی بات ہے انہیں تو اتنا بھی گوارا نہیں ہوتا کہ کسی کی نگاہ مجھ پر پڑے۔ وہ اس وقت امارات میں نہیں ہیں اس لیے میں نے کسی طرح "گلاج" سے نکلنے کی ہمت کرلی ہے۔ ان کی موجودگی میں "گلاج" کا کوئی مکین ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری تو بات ہی چھوڑو کوئی ملازمہ بھی اس چار دیواری سے نہیں نکلتی۔"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "تم آئی ہو... میری چاہت میں طاقت ہوئی تو آئندہ بھی آؤ گی۔"

"بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ زور دے کر بولی "سمجھو کہ یہ پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ تم آئندہ کسی بھی صورت کسی بھی حال میں "گلاج" کی چار دیواری میں نہیں گھسو گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "پھر ... کے لیے میری 'دو چھوٹی چھوٹی شرطیں ہیں۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے سانس کی آمدورفت سے نقاب میں جنبش پیدا ہورہی تھی۔ میں نے "پہلی شرط تو یہ ہے کہ جب تک تمہارا وہ جھوٹا عاشق شیخ عا... واپس نہیں آتا تم دو تین بار مجھ سے ملنے کے لیے "گلاج" سے نکلو۔"

"اور دوسری شرط؟" وہ ذرا لچک کا مظاہرہ کرتے ہو... بولی۔

"دوسری شرط میری جیب میں ہے۔" میں نے کوٹ... جیب میں ہاتھ ڈالا۔

وہ تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی خوب صورت ڈبیا نکالی' اس میں ایک انگوٹھی تھی ایک نہایت شان دار فیروزہ اس میں جڑا ہوا تھا۔ پرسو... رات جیکی نامی شخص نے لیونا کو اس کے بیڈ روم میں... زیورات دکھائے تھے' ان میں سے ایک بھی اس جیسا نہ... تھا۔ ان زیورات کی مجموعی قیمت اس اکیلی انگوٹھی کے... بھگ تھی۔

فانوس کی روشنی انگوٹھی پر پڑی تو اس کا نادر فیروزہ... مختلف رخوں سے دمک اٹھا۔ لیونا کی آنکھیں کھلی رہ... تھیں۔ اس نے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی کوشش کی... کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کے ہونٹ یقیناً نقاب کے اندر... گئے تھے۔

"یہ۔ یہ تو بہت قیمتی ہے۔" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"اور یہ تمہارے لیے ہے ڈارلنگ!" میں نے ڈبیا... کی طرف بڑھائی۔

اس نے ہاتھ یوں پیچھے کھینچا جیسے میں نے دہکتی ہوئی سلاخ اس کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی ہو "نہیں نہیں۔ یہ میں تم سے نہیں لے سکتی۔" وہ انکار کررہی... لیکن اس کی آنکھیں اس انکار کا ساتھ نہیں دے ر... تھیں۔ اس کی نگاہیں بدستور انگوٹھی پر جمی تھیں۔

میں نے کہا "سنی! اگر تم چاہتی ہو کہ میں پھر لیونا کا...

چار دیواری نہ پھلانگوں تو تمہیں یہ شرط قبول کرنا پڑے گی ورنہ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

لیونا کچھ دیر تک شدید تذبذب کے عالم میں میری صورت دیکھتی رہی۔ شاید اس کے تصور میں اپنے عاشق عاصم کا غضب ناک چہرہ ابھر رہا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے اپنی انگلی نقاب کے اوپر سے اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش کردیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی' اس کی نازک کلائی میرے ہاتھ میں آئی اور نہایت بیش قیمت انگوٹھی اس کی انگلی میں پھسل گئی۔ اس نے غالباً انگوٹھی اتارنے کے لیے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن میں نے اس ہاتھ کو روک دیا۔

"دیکھو ڈارلنگ! تم نے مجھے منع کیا تھا لیکن اب خود اپنے آپ کو تماشا بنا رہی ہو۔ میں تمہیں یہ انگوٹھی اتارنے نہیں دوں گا چاہے اس کے لیے مجھے تم سے کشتی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔"

وہ کسمسا کر ڈھیلی پڑگئی۔ اسی دوران میں ڈنر بھی سرو کیا جانے لگا۔ موم بتیوں کی روشنی میں یہ ایک شان دار ڈنر تھا۔ ڈنر کے دوران میں لیونا کا رویہ مزید نرم محسوس ہونے لگا۔ کھانے کے لیے ضروری تھا کہ لیونا اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیتی۔ میرے اشارے پر ویٹرز نے ہمارے گرد پردے کھینچ کر ہماری میز کو ایک فیملی کیبن کی شکل دے دی تھی۔

کھانے کے دوران میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے لیونا سے اس کی پسند ناپسند کے بارے میں باتیں کیں۔ اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ ٹینس' پیراکی اور سیاحت کی شوقین ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک انوکھا شوق ہیلی کاپٹر کی سیر تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مستقبل قریب میں ہیلی کاپٹر اڑانا بھی سیکھے گی۔ ہیلی کاپٹر کے حوالے سے اس کا شوق دیکھتے ہوئے میں نے کہا "اگر ہیلی کاپٹر کی سیر کرنی ہے تو میرا ہیلی حاضر ہے۔ امارات کی حدود میں جہاں چاہو جاسکتی ہو۔"

"تو تمہارے پاس اپنا ہیلی ہے۔" وہ حیران ہوکر بولی۔

"ہاں اپنا ہی سمجھو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تم۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارا اپنا ذاتی ہیلی ہے۔"

"بھئی! کہا ہے ناں کہ اپنا ہی ہے۔ تم بتاؤ کب اڑنا چاہتی ہو۔ اگر کل کوئی خاص مصروفیت نہیں تو دوپہر کے بعد ہمارے ہاں پہنچ جاؤ۔ ہم فلائی کریں گے اور ساری شام اڑتے ہوئے گزاریں گے۔"

لیونا کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی میں کل نکل نہیں سکوں گی۔"

"تو پرسوں کا رکھ لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں تک مطلع بھی بالکل صاف ہوجائے گا۔"

وہ انکار میں سر ہلاتی رہی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے انکار میں اقرار بھی پوشیدہ ہے۔ تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد وہ بولی "میں وعدہ نہیں کرتی لیکن اگر نکل سکی تو تمہیں فون کروں گی لیکن ایک بات تمہیں بتا دوں یہ جو "پرجوش استقبال" والی حرکت تم نے آج کی ہے پھر نہیں ہونی چاہیے۔"

لیونا کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ ہیلی کاپٹر کی بات تو میں نے لیونا کے سامنے کردی تھی لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اگر پرسوں واقعی لیونا کا فون آگیا تو ہیلی کاپٹر کا کیا بنے گا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہاں سے پرائیویٹ کمپنی کا ہیلی کاپٹر کرائے پر لیا جاسکتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ ہیلی کاپٹر کس کنڈیشن کا ہوگا۔ ماڈل پرانا تو نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

اگلے روز علی الصبح میں نے "رینٹ اے ہیلی کاپٹر" کمپنی کو فون کیا اور معلومات حاصل کیں۔ کمپنی کے پاس کل دو ہیلی کاپٹر تھے۔ ایک ہیلی کاپٹر جو قدرے نیا اور بہتر تھا ایک فلمی یونٹ نے بک کر رکھا تھا۔ دوسرا ہیلی کاپٹر پرانا تھا۔ میں ابھی سوچ بچار کررہا تھا کہ اچانک میرا دھیان مسٹر کلارک کی طرف چلا گیا۔ ایک لمحے میں مجھے یقین ہوگیا کہ میرا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ پچھلی مرتبہ جب میں امارات آیا تھا تو مسٹر جی کلارک کی ایک ملٹی نیشن کمپنی کے ریجنل آفس میں میرا جانا ہوا تھا۔ آفس کے عقب میں ایک وسیع احاطہ تھا۔ وہاں ایک شان دار سی نوفاتیو ہیلی کاپٹر موجود تھا اور جدید ہیلی پیڈ بھی بنا ہوا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر ان تین عدد جدید ہیلی کاپٹرز میں سے تھا جو مسٹر کلارک کے زیر استعمال رہتے تھے۔ میں نے فوراً مسٹر کلارک سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوپہر تک کلارک صاحب سے میرا رابطہ بذریعہ فون ہوگیا۔ وہ ابھی تک نیویارک سٹی میں ہی تھے۔ مسٹر جی کلارک سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ مسٹر کلارک نے ساہی صاحب کی وفات پر بڑے دکھ کے ساتھ تعزیت کی اور میری مشکلات کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پاکستان میں صفدر اور زریں گل وغیرہ میرے لیے بے حد پریشان ہیں۔ مسٹر جی کلارک مجھ سے جاننا چاہتے تھے کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں۔ میں نے کہا "جناب! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ اسے میری گستاخی نہ سمجھیں۔ لیکن میں ایک

شرط پر آپ کو اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں کہ جب تک میں نہ چاہوں آپ کسی کو میرے بارے میں نہیں بتائیں گے۔"

"اگر کوئی بہت خاص مجبوری ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن بہتر ہے کہ جس طرح تم نے مجھے فون کیا ہے اسی طرح ایک دفعہ زریں اور صفدر کو بھی کر لو۔ انہیں تسلی تو ہو جائے گی۔"

میں نے مسٹر کلارک کو یقین دلایا کہ انہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا اور جلد ہی انہیں اپنی WHERE ABOUT کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے مسٹر کلارک کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا اور انہیں بتایا کہ میں ابو ظہبی میں کسی شخص کو امپریس کرنا چاہ رہا ہوں اور اس کے لیے مجھے ان کا ہیلی کاپٹر درکار ہے۔

مسٹر کلارک نے ہیلی کاپٹر میرے حوالے کرنے کی حامی بھرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کی۔ انہوں نے کہا "میں ابھی اپنے ریجنل آفس فون کرتا ہوں اور ارجنٹ ٹیلی گرام بھی بھیج دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تین چار گھنٹوں کے اندر تم ہیلی کاپٹر حاصل کر سکو گے۔ ہیلی کاپٹر اور اس کا عملہ مکمل طور پر تمہاری ڈیوٹی انجام دے گا۔"

میں نے مسٹر کلارک کو بتا دیا کہ ایک فرانسیسی لڑکی اس وقت ابو ظہبی میں موجود ہے اور اس کی حیثیت شیخ عاصم کی چہیتی داشتہ کی ہے۔ میں اسی لڑکی کو شیشے میں اتارنا چاہ رہا ہوں۔

مسٹر کلارک نے کہا "اگر اس مقصد کے لیے کسی اور سہولت کی ضرورت ہو تو فوراً بتا دو۔ یہاں دبئی میں میرے پاس ایک اچھی رہائشی عمارت موجود ہے۔ ڈھائی تین ایکڑ رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں بھی ہیلی پیڈ موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو اس عمارت کو اپنے تصرف میں لا سکتے ہو بلکہ بہتر ہے کہ تم اسے تصرف میں لے آؤ۔ وہاں کے امور کی تھوڑی سی نگرانی بھی ہو جائے گی۔ وہ عمارت غربی شہر میں واقع ہے اور ایم اے ولاز کہلاتی ہے۔ میں ابھی وہاں کے انچارج کو بھی تمہارے بارے میں ساری معلومات فراہم کر دیتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ولاز کی انتظامیہ تمہیں اونر کے طور پر ریسیو کرے گی اور مستقل طور پر تمہیں مالک کا اسٹیٹس دے گی۔ کیا خیال ہے؟"

"میں اس سلسلے میں آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔ فی الحال تو آپ کی یہ ہیلی کاپٹر والی عنایت ہی کافی ہے۔"

"یہ کوئی ایسی عنایت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر تم چاہو تو اپنا ہیلی کاپٹر بھی خرید سکتے ہو۔" انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولے "میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

میں نے کہا "اگر ایسا ہے بھی تو یہ آپ ہی کی عنایت ہے۔ میں، صفدر اور زریں آپ کے احسانات کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ خاص طور سے میرے لیے تو آپ کی کوششیں بہت زیادہ رہی ہیں۔ پاکستان میں گولڈ ہوٹلز کا بزنس بہت اچھا جا رہا ہے۔"

مسٹر کلارک نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "صفدر سے تو مل چکے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا اور صفدر کے سلسلے میں اپنے اندرونی دکھ کا اظہار بھی کیا۔ مسٹر کلارک مجھ سے تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا "صفدر کے سلسلے میں ہم وقتی طور پر ناکام ضرور ہوئے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ ہم نے اپنی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ تم جانتے ہی ہو، میڈیکل سائنس میں ہر آنے والے دن نئی نئی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ مایوس ترین مریضوں کے لیے بھی امید کی کرنیں پھوٹتی ہی رہتی ہیں۔"

ہم کچھ دیر تک صفدر کے حوالے سے بات کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ غزالہ اور اس کے اہل خانہ کی اچانک گمشدگی کی طرف مڑ گیا۔ مسٹر جی کلارک کو بھی یقین تھا کہ اس گمشدگی یا روپوشی کے پیچھے براہ راست یا بالواسطہ شیخ عاصم کا ہاتھ ہے۔ تصویروں والے معاملے کی خبر بھی مسٹر کلارک تک پہنچ چکی تھی اور عاصم کے اس اوچھے ہتھکنڈے سے بھی سخت نالاں تھے۔ مسٹر کلارک نے گفتگو کے آخر میں تاکید کی کہ میں ہر روز کم از کم ایک بار ان سے رابطہ ضرور کروں۔

اگلے روز سہ پہر کو میں لیونا کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ فون ضرور آئے گا۔ لیونا ایک بکاؤ تھی۔ بے شک اس کے دام بہت اونچے تھے اور اس کے خریدار کو لاکھوں میں ایک ہونا چاہیے تھا لیکن بکنے والا چیز بہرحال بکنا ہوتا ہے۔ دو چار دن پہلے تک وہ خود کو خوش قسمتی کے ساتویں آسمان پر سمجھتی تھی۔ اس کے خیال میں شیخ عاصم کی صورت اسے ایک ایسا قدر داں ملا تھا جو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا تھا مگر اب مجھ سے ملنے کے بعد اسے اپنے خیالات بدلے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ آئندہ چند دنوں میں، میں ان خیالات کو مزید بدلنا چاہتا تھا۔ میں لیونا کو شیخ عاصم سے چھین لینا چاہتا تھا۔ اگر میں لیونا کو اغوا کر لیتا تو یہ شاید عاصم کے لیے اتنی تکلیف دہ بات نہ ہوتی مگر اب جس طرح لیونا میری طرف آ رہی تھی، یہ عاصم کے لیے بے حد صدمے کی بات ثابت ہونے والی تھی۔ میں جانتا

تھا کہ وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔

لیونا کا فون نہیں آیا۔ وہ خود آ گئی۔ سچ کہتے ہیں کہ عورت ایک ناقابل فہم پہیلی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ایک انکار کے پیچھے سیکڑوں اقرار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیونا نے مجھ سے پہلی ملاقات اس بہانے سے کی تھی کہ وہ مجھے سمجھانا چاہتی ہے۔ اب یہ پہلی ملاقات دوسری ملاقات کا سبب بن رہی تھی۔ مجھے اپنے کمرے میں انٹرکام پر اطلاع ملی کہ میرا کوئی گیسٹ نیچے لابی میں موجود ہے۔ میں لابی میں پہنچا تو حسب توقع لیونا وہاں موجود تھی۔ وہ ایک دن پہلے کی طرح کھلے لبادے اور نقاب میں تھی۔ اس کے باوجود اس کی جسمانی خوب صورتی و موزونیت لباس میں سے جھلک رہی تھی۔

"شکریہ۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں نے بتایا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ ہم دونوں آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بولی "مجھے اندیشہ تھا کہ تم انتظار کرتے رہو گے۔ میں نے فون کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ "لاج" سے میرا نکلنا اب بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لاج کی ایک پرانی خادمہ جو چھٹی پر تھی، واپس آ گئی ہے۔ وہ بہت کھاگ اور چوکس عورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے مسٹر جہاں داد کہ میں اپنے موجودہ حالات سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ میں اس جمی جمائی زندگی کو خراب نہیں کر سکتی اور نہ عاصم کے پیار کو دھوکا دے سکتی ہوں۔ وہ مجھ سے اتنا پیار۔"

"پلیز، کچھ اور مت کہنا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "تمہارا یہ فقرہ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔

"کہاں آؤں؟"

"جہاں کا پروگرام ہے۔ آج ہم ہیلی کاپٹر پر سیر کریں گے۔"

"نہیں جہاں داد، یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں تذبذب تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میری طرف سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں جیسے تمہیں لے جاؤں گا ویسے ہی چھوڑ بھی جاؤں گا۔ یہ ایک سچے عاشق کا وعدہ ہے تم سے۔"

وہ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "پھر میری بھی ایک شرط ہوگی۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ اس کے بعد تم مجھے مجبور نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے اپنی۔ جیسے تم کہتی ہو۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بس اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے پاؤں پھسل گئے ہیں اب پھسلتے ہی چلے جائیں گے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم شان دار جیگوار گاڑی میں سوار مسٹر جی کلارک کے ریجنل آفس کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ اس آفس کے عقب میں واقع شان دار گراسی میدان میں مسٹر کلارک کا "سی کوفائیو" ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ ریجنل آفس کے ہیڈ انچارج مسٹر لوسکی سے کل رات ہی میری بات ہو گئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ سب انتظام مکمل ہے۔ صبح تک ہیلی کاپٹر اپنے پائلٹ سمیت بالکل تیار حالت میں ہوگا۔ میں نو بجے کے بعد جب چاہوں اسے استعمال کر سکتا ہوں۔ ہم قریباً پندرہ منٹ میں ہیلی پیڈ پر پہنچ گئے۔ ہیلی کاپٹر دیکھ کر لیونا کی آنکھوں میں خوشی ستاروں کی طرح چمکنے لگی "کیا یہ تمہارا اپنا ہے؟" وہ لرزاں آواز میں بولی۔

"اپنا ہی سمجھو۔" میں نے کہا "تم مسٹر جی کلارک کو جانتی ہو۔"

وہ بولی "نام تو کچھ سنا سنا لگتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ امریکی عرب جی ہیں لیکن اتنے اچھے اخلاق کے مالک ہیں کہ نہ امریکی لگتے ہیں اور نہ عرب جی۔ کاروبار کے کچھ شعبوں میں میری اور ان کی ساجھے داری ہے۔ یہ ہیلی بھی ہمارے کاروباری اسٹیٹس میں شامل ہے۔"

ہیلی پیڈ کے سامنے ہیڈ انچارج نے اپنے عملے سمیت بڑے مؤدبانہ طریقے سے ہمارا استقبال کیا۔ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ ہم ہیلی تک پہنچے۔ باوردی پائلٹ نے ہمارے لیے کیبن کا دروازہ کھولا۔ میں نے لیونا کا ہاتھ تھام کر اسے سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دی پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ میری توقع کے عین مطابق ہیلی اندر سے بھی بے حد آراستہ و آرام دہ تھا۔ پائلٹ کے عقبی کیبن میں چار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش موجود تھی۔ آمنے سامنے دو نشستیں تھیں۔ درمیان میں المونیم اور شیشے کی بیش قیمت تپائی تھی۔ ایک سلائیڈنگ شیشے کی مدد سے اس کیبن کو پائلٹ کے کیبن سے بالکل علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔

پائلٹ انگلش تھا۔ اس کا نام ہیری تھا۔ اس نے بڑے ادب سے اپنے لیے ہدایات طلب کیں۔ میں نے اسے بتایا۔ "ہمیں کہیں جانا نہیں ہے۔ بس کچھ دیر پرواز کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے تفصیلی انداز میں

کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے سلائیڈنگ شیشے کو حرکت دے کر تخلیہ فراہم کرلیا۔ کچھ ہی دیر بعد آرام دہ ہیلی.....اے ای کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ ابوظہبی کا فضائی نظارہ کرنے کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔ میں نے کہا "ڈارلنگ! اب تو رخ زیبا سے یہ نقاب ہٹا دو۔ تمہاری صورت کو ترس گیا ہوں۔"

اس نے ایک ادا سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ واقعی حسین تھی۔ میں نے ایک دم اسے اپنے قریب کرکے چوم لیا۔ وہ بھونچکی رہ گئی پھر اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی "تم بڑے ڈھیٹ ہو۔"

"عشق ہمیشہ ڈھیٹ ہی ہوتا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "پچھلے چند دنوں میں تم نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تمہیں کس طرح ہینڈل کروں۔ کسی وقت تم مجھے بہت خطرناک لگتے ہو اور کسی وقت پیارے لگتے ہو۔"

اس نے آخری تین الفاظ ایک دم ادا کردیے تھے۔

"یعنی خطرناک پیارا۔" میں نے اس کے خیالات کو دو لفظوں میں سموتے ہوئے کہا۔

"ہاں خطرناک پیارا۔" وہ مسکرائی۔

"یہ تو کسی کہانی کا عنوان لگتا ہے۔" میں نے ایک بار پھر اسے قریب کرنے کی کوشش کی۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔

میری توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کے لیے وہ اپنی انگلی سے نیچے اشارہ کرنے لگی۔ ہم باغات کے ایک خوب صورت سلسلے کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ریتیلے ٹیلوں کے درمیان یہ خوش نما باغات نخلستانوں کا منظر پیش کررہے تھے۔

میں نے اس کی خالی انگلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ انگوٹھی کہاں ہے جو تمہیں دی تھی؟"

"رکھ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"پہن نہیں سکتی۔"

"ٹھیک ہے نہ پہنو۔ میں نے بھی تمہیں اس انگوٹھی کے ساتھ کا پورا سیٹ نہ پہنایا تو میرا نام جہاں داد نہیں۔"

میرا جارحانہ انداز اسے برا نہیں لگا۔ ہاں وہ تھوڑا سا چونک ضرور گئی۔ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ہیلی کاپٹر راس الخیمہ، العین، شارجہ، اجمان وغیرہ کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا دبئی کی طرف گیا۔ ہمارے مشرق میں سورج کا سرخ تھال دھیرے دھیرے اپنے غروب کے مقام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک خوب صورت سرخی نے مشرق افق کو حد نگاہ تک ڈھانپ رکھا تھا۔ ہمارے نیچے دبئی کا وسیع و عریض شہر تھا۔ بلند عمارتیں، سڑکیں، باغات، اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھتی ہوئی چمکیلی گاڑیاں۔ کافی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ہم نے شہر کا ایک راؤنڈ لگایا اور پھر مضافات کی طرف نکل گئے۔ میں نے سلائیڈنگ شیشہ ہٹا کر پائلٹ کو ہدایت دی اور اس نے ہیلی ایک جگہ معلق کردیا۔ نیچے ایک شان دار منظر تھا۔ ایک وسیع رہائشی عمارت تھی۔ عمارت کی سرخ چھتیں سورج کی الوداعی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ خوب صورتی سے تراشے گئے گراسی لانوں کی سبزی نظروں کو بھا رہی تھی۔ ان لانوں میں جا بجا رنگین چھتریاں لگی تھیں اور عین درمیان میں سوئمنگ پول کا نیلگوں پانی جھلملا رہا تھا۔ بلندی سے یہ سوئمنگ پول چھوٹے سے نیلے شیشے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ سوئمنگ پول سے کچھ فاصلے پر لانگ ٹینس کے کورٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف پولو گراؤنڈ تھا۔

لیونا دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولی "کیا آئیڈیل جگہ ہے۔ کسی بہت بڑے شیخ کی جگہ ہوگی یا پھر شاہی خاندان کے کسی فرد کی ملکیت!"

"ہرگز نہیں۔ اس جگہ کی نسبت تمہارے اس خاکسار سے ہے۔"

وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی "کیوں مذاق کرتے ہو جہاں داد۔"

"اگر ایسی بات ہے تو ابھی ثبوت فراہم کردیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پائلٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میری ہیلی کوپٹر کو "ولا" میں اتار دو۔"

پیری نے فرماں برداری سے اثبات میں سرہلایا۔ لیونا کی کھلی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی کھل گئیں۔ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی "کیا یہ جگہ واقعی تمہاری ہے؟"

میں نے کہا "میرا جو کچھ ہے وہ میری جانِ جگر کا ہے۔ اور میری جانِ جگر ایک ایسی نادان حسینہ ہے جو ایک لٹیرے کو اپنا راہبر سمجھ کر اس کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ وہ کنوئیں کی مینڈک بنی ہوئی ہے۔ تھوڑے سے آسمان کو ساری کائنات سمجھ رہی ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ آسمان کتنا وسیع ہے اور جب اس پر منہ زور عشق کے ہزار ستارے جھلملاتے ہیں تو منظر کتنا حسین ہوتا ہے۔"

ہیلی کاپٹر کی بلندی تیزی سے کم ہورہی تھی۔ ہمارے نیچے مناظر واضح ہو رہے تھے۔ درخت تیز ہوا سے جھومنے لگے پھر سوئمنگ پول کے ساکت نیلے پانی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ ہم ہیلی پیڈ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ لیونا نے جیسے ایک

دم ہوش میں آکر کہا "نہیں جہاں داد۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔ پھر کسی وقت آئیں گے۔"

وہ بے خیالی میں اپنے اس اعلان کی نفی کر رہی تھی کہ وہ میرے ساتھ آخری بار آئی ہے۔ میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما "دیکھو اب آ ہی گئے ہیں تو پانچ دس منٹ رکنے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ پر اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ پلیز! مجھے اپنے اعتماد سے محروم مت کرنا۔ اگر چند دن پہلے تم اپنی بند خواب گاہ میں مجھ سے محفوظ رہی ہو۔ اس کیبن میں محفوظ ہو تو میرے گھر میں بھی محفوظ رہو گی۔ کوئی آنچ نہیں آئے گی تم پر۔"

وہ پگھل رہی تھی۔ میں نے تھوڑی سی مزید کوشش کی تو وہ نیم رضامند ہوگئی۔ درحقیقت جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی وہ اسے بنیادوں سے ہلانے کے لیے کافی تھا۔ یہ ٹھاٹ باٹ، یہ ہیلی کاپٹر، یہ محل نما رہائش گاہ۔ یہ سب کچھ اس کے مزاج کے عین مطابق تھا اور ان باتوں کے علاوہ یقیناً وہ میری دلیری، بے جگری سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ میں جس طرح دندناتا ہوا لیونا لاج میں گھسا تھا اور پھر بحفاظت واپس بھی آگیا تھا وہ یقیناً اس کے لیے متاثر کن تھا۔ ان پانچ چھ روز میں اس پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ میں ایک ایسا شخص ہوں جو شیخ عاصم جیسے طاقت ور گروپ سے بہ آسانی ٹکر لے سکتا ہے۔ اور ٹکر لے کر اسے نیچا بھی دکھا سکتا ہے۔

چند سیکنڈ بعد ہم ہیلی پیڈ پر اتر گئے۔ لیونا نے اپنا چہرہ پھر نقاب میں چھپالیا تھا۔ کل رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے مسز کلارک سے بجریات کی تھی۔ اس بات چیت میں ایم اے ولاز کے بارے میں بھی دوبارہ بات ہوئی تھی۔ میں نے مسز کلارک کی رائے سے اتفاق کیا تھا کہ لڑکی کو امپریس کرنے کے لیے اسے ایم اے ولاز کا دورہ بھی کرادیا جائے۔ مسز کلارک نے رات ہی کو ولاز کی انتظامیہ کو ضروری ہدایات جاری کردی تھیں اور یہ بھی بتادیا تھا کہ میں کل کسی وقت اپنی ساتھی خاتون کے ساتھ ولاز میں آسکتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد ولا کے نوجوان منیجر صالح باری نے مجھ سے ہوٹل کے فون پر رابطہ کیا تھا اور مجھے آگاہ کیا تھا کہ اس کی تمام سروسز میرے لیے حاضر ہیں۔ اس نے کہا تھا "سر آپ جب بھی تشریف لائیں گے آپ کا استقبال ایک اونر کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ ولاز کے مین گیٹ پر سرجی کلارک کے ساتھ ساتھ آپ کی "نیم پلیٹ" بھی لگا دی گئی ہے۔ خدمت گار عملے کو بھی ہدایات دے دی گئی ہیں کہ وہ آپ کو ویلکم کرتے ہوئے آپ کو "اونر" کی حیثیت دیں۔"

احتیاطاً میں نے صالح باری سے پوچھا تھا کہ مین گیٹ پر لگائی جانے والی نیم پلیٹ پر کیا لکھا ہے۔ اس نے مستعدی سے جواب دیا تھا کہ جہاں داد۔

اور اب میں جہاں داد کی حیثیت سے ایم اے ولاز کے ہیلی پیڈ پر موجود تھا۔ خوش رو ملازمین کی ایک قطار نے نہایت عزت و احترام سے ہمارا استقبال کیا۔ یہاں میں نے باری کو پہلی بار دیکھا۔ وہ کھڑی ناک اور ذرا گھنگریالے بالوں والا ایک خوبصورت مقامی نوجوان تھا۔ اس کی ٹھوڑی میں نمایاں گڑھا تھا۔ جیسے چاند پر داغ ہوتا ہے ایسے ہی باری کی ٹھوڑی پر بائیں رخسار کے قریب ایک چھوٹی سی لکیر تھی۔ جیسے پتلی چھڑی نے یہاں سے جلد کو نقصان پہنچایا ہو۔ اگر یہ نشان نہ ہوتا تو شاید باری کا شمار نہایت وجیہہ نوجوانوں میں ہوتا۔

ہمیں وسیع و عریض عمارت کے رہائشی حصے میں پہنچایا گیا۔ پورچ میں اور اس سے آگے ڈرائیو وے پر شیورلیٹ اور مرسڈیز جیسی کئی شان دار گاڑیاں کھڑی تھیں جو ولاز کی شان و شوکت میں اضافہ کررہی تھیں۔ خادموں اور خادماؤں میں مقامی کے علاوہ یورپین اور امریکی افراد بھی شامل تھے۔ دو اسکرٹ پوش سفید فام خادماؤں نے ہمیں بڑی شائستگی کے ساتھ نشست گاہ میں پہنچایا۔ ہم تنزری صوفوں پر بیٹھ گئے۔ جہازی سائز کے شیشوں سے لان کے پرکشش مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ فوارے، روشنیاں، آبشار اور چھوٹی سی مصنوعی جھیل کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے مور۔ پس منظر میں وسیع و عریض سرسبز لان تھے اور سیکڑوں اقسام کے پھول تھے جو دھیرے دھیرے سرخ شام کے رنگ میں ڈوبتے جارہے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے روشنیاں جگمگا اٹھیں اور ان کے خوب صورت عکس مصنوعی جھیل میں جھلملانے لگے۔ یہ جنت ارضی کا نمونہ تھا۔

ولاز کی اندرونی آرائش اپنی مثال آپ تھی۔ بے انتہا قیمتی قالین، جہازی سائز کے غالیچے۔ ریشم و کمخواب کے پردے۔ نادر پینٹنگز۔ لیونا جدھر نگاہ اٹھاتی تھی اسے شان و شوکت کے ناقابل یقین مظاہر نظر آتے تھے اور کیوں نظر نہ آتے، وہ جس شخص کی رہائش گاہ پر موجود تھی اس کا شمار دنیا کے چند امیر ترین کاروباری افراد میں ہوتا تھا۔

میں نے کسی جنونی عاشق کے لہجے میں کہا "لیونا! میں تمہاری ایک تصویر اتارنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کرو گے؟" وہ نقاب کے پیچھے مسکرائی۔

"اس کی سیکڑوں کاپیاں کروں گا اور اس عمارت کی ہر دیوار پر لگا دوں گا۔ تاکہ جدھر دیکھوں بس تم ہی دکھائی دو۔"

صرف تم!"

"عاصم مجھے قتل کر کے گوشت چیل کوؤں کے لیے پھینک دیں گے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

"وہ ایسا سوچے گا بھی تو میں اس کا بھیجا اس کے کھوپڑے سے نکال کر پاؤں تلے مسل دوں گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"خبردار۔ خبردار۔" اس نے مسکراتے ہوئے انگلی اٹھائی "میرے ہی سامنے میرے جیون ساتھی کے بارے میں ایسے سخت الفاظ استعمال کر رہے ہو۔"

"وہ حرامی نہیں ہے جیون ساتھی۔ وہ پھولوں کا رس چوسنے والا بدشکل اور بدآواز بھونرا ہے۔ آج تمہارے اوپر منڈلا رہا ہے کل "بھیں بھیں" کرتا ہوا کسی دوسرے پھول کا رخ کرے گا۔ مت لو میرے سامنے اس کا نام۔"

اس نے انگلی اٹھائی "دیکھو۔ دیکھو مسٹر! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" لہجے میں مصنوعی غصہ تھا اور ایک حوصلہ افزا لچک بھی تھی۔

میں نے ایک قیمتی فرانسیسی شراب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "خیر چھوڑو اس موضوع کو۔ ہم اپنا یہ خوب صورت وقت اس منحوس کے ذکر میں ضائع کیوں کریں۔"

"تم تو مجھے بڑے اونچے لیول کے رقیب نظر آتے ہو۔"

وہ ہنسی۔

اس کی ہر ہر حرکت اور ادا میں حوصلہ افزائی کے اشارے تھے۔ دراصل پچھلے ایک گھنٹے میں میرے اردگرد کی شان و شوکت نے اسے مبہوت کر دیا تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ میرے من پسند سانچے میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ "لیونا راج" شان دار ہونے کے باوجود اس عمارت کا عشر عشیر بھی نہیں تھا اور بات صرف اس عمارت کی نہیں تھی' یہ پورا لائف اسٹائل ہی اعلیٰ ترین درجے کا تھا۔

لیونا نے نقاب بدستور چہرے پر چڑھا رکھا تھا۔ میں نے کہا "اچھا بھئی' نہیں اتارتے تمہاری تصویر لیکن یہ کپڑا تو رخِ زیبا سے ہٹاؤ۔"

"جی نہیں۔ اس میں خطرات ہیں۔"

"کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔ ہم مکمل تخلیے میں رہیں گے۔"

"یہ تو اور بھی خطرناک ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"پھر وہی بے اعتباریاں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کی کلائی کے کنگن جھنجنا اٹھے۔

میں نے بٹن دبا کر کسی ملازم کو بلانا چاہا تو صالح باری خود دست بستہ حاضر ہو گیا۔

"جی سر۔" اس نے ناف پر ہاتھ باندھ کر کمر کو خم دیا۔

"کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے' ہم دس پندرہ منٹ یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں۔"

"اوکے سر۔" اس نے کہا اور الٹے قدموں چلتا دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔

"اب تم اپنا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکال سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

لیونا نے نقاب ہٹا دیا' لیکن اس کے چہرے پر تعجب اور پریشانی کے آثار نظر آتے تھے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی "جہاں داد! یہ شخص کون ہے؟"

"یہاں کا منیجر ہے۔ تم اسے ہیڈ انچارج بھی کہہ سکتی ہو۔"

"یہ شخص کب سے ہے تمہارے پاس۔"

میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر ذرا سنبھل کر بولا "اس کی اپائنٹ منٹ مسٹر جی کلارک نے کی تھی۔ غالباً ڈیڑھ دو سال تو ہو ہی گئے ہیں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"یہ تو بہت خطرناک شخص ہے۔ اور لوفر بھی۔ کچھ عرصہ پہلے شیخ ایاز نے اسے بہت مارا تھا۔ اس کے کپڑے اتروا کر اسے درخت سے الٹا لٹکوا دیا تھا۔"

"کیا کر دیا تھا اس نے؟"

"اس نے قوسیہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

"قوسیہ؟ یہ کون ہے؟"

"قوسیہ' عاصم کی چھوٹی بہن ہیں' کیمبرج کی پڑھی ہوئی ہیں۔ زبردست گھڑسوار ہیں۔ انہوں نے گھڑسواری کے مقابلوں میں بہت سے انعامات جیت رکھے ہیں۔ اگر تم اخبار وغیرہ پڑھتے ہو تو تم نے قوسیہ کی تصویر ضرور دیکھی ہوگی۔"

"گھڑسواری کرتے ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کرکٹ کھیلتے ہوئے۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ قوسیہ کرکٹ بھی کھیلتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ انگلینڈ میں خواتین کی کرکٹ ٹیمیں بھی ہیں۔ وہ ایک کاؤنٹی کی ٹیم کی کپتان رہ چکی ہیں۔"

"لیکن باری سے اس کا ٹانکا کیسے ہوا؟"

"کرکٹ کے حوالے سے ہی ہوا۔ یہ باری بھی کرکٹ کا اچھا کھلاڑی ہے۔ غالباً تم لوگوں کی ملازمت میں آنے سے پہلے یہ بھی انگلینڈ میں تھا' وہیں پر کہیں اس نے قوسیہ کو دیکھا تھا۔ بعد میں یہ قوسیہ کے پیچھے ہی انگلینڈ سے امارات آ گیا۔

یہ بہت چالاک اور موقع پرست بندہ ہے' حیرانی کی بات ہے کہ تم لوگوں نے اسے اتنی بڑی ذمے داری سونپ رکھی ہے۔"

میں نے جام سے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "اچھا بی بی! اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنے بڑے گھر میں روشنی کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"روشنی؟" وہ انجان بن کر بولی "روشنی بجلی سے ہوگی اور کیسے ہوگی؟"

"میں مصنوعی روشنی کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس روشنی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے وجود سے پھوٹے گی اور میرے اس غریب خانے کو منور کرے گی۔"

"یہ بڑا مشکل کام ہے جہاں داد۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ عاصم میرے بارے میں کتنے کریزی ہیں۔ خدا نہ کرے انہیں اس طرح ہماری ملاقاتوں کا پتا چل جائے تو اتنا بڑا طوفان کھڑا ہوگا کہ تم تصور نہیں کر سکتے۔"

"لیکن میرا کیا بنے گا لیونی! جب تک میرا عشق فاصلے پر تھا تب تک تو پھر بھی قابلِ برداشت تھا' اب تمہارے قریب آنے کے بعد تمہاری دوری کا درد بالکل برداشت نہیں ہوگا۔"

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میں بے شمار زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

میں نے اپنے لہجے کو غم ناک بناتے ہوئے کہا "پتا نہیں آنے والے دنوں میں قدرت کو کیا منظور ہے لیکن جتنے دن تک تمہارا وہ جھوٹا پرستار یہاں موجود نہیں ہے کم از کم اتنے دنوں تک تو مجھے اپنے دیدار سے محروم مت رکھو۔"

"دیکھو آج صبح ہی عاصم کا فون آیا ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ چار پانچ دن تک وہ واپس پہنچ جائیں گے اور ممکن ہے کہ اس سے بھی پہلے آ جائیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیسے نکل سکوں گی۔"

میں نے سکہ بند عاشق کی طرح کہا "ڈارلنگ! سیانے کہتے ہیں کہ جب عورت محبت کے راستے پر قدم آگے بڑھانا چاہتی ہے تو پھر وہ اس کے لیے ہزار بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔"

"لیکن میں قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"بالکل غلط... تم چاہتی ہو۔ صرف مجھے ستا رہی ہو بلکہ ہلکان کر رہی ہو۔"

وہ شوخ نظروں سے میری صورت تکتی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی "اچھا میں فون پر کنفرم کرنے کی کوشش کروں گی۔ اگر عاصم نے واقعی چار پانچ دن بعد آنا ہوا تو میں ایک بار مزید تم سے مل لوں گی۔"

میرے دماغ میں قمقمہ سا روشن ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لیونا پاکستان میں شیخ عاصم کے فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ سے آگاہ ہے۔ اگر مجھے صرف عاصم کے فون کا پتا ہی لگ جاتا تو میں اس بدبخت کو اس کے بل میں سے نکال سکتا تھا۔ میں نے کہا "دیکھو سویٹی! تم مجھے بے یقینی کا شکار بنا رہی ہو۔ تم ابھی یہیں سے عاصم کو فون کر لو' اس سے پوچھ لو کہ اسے کب نکلنا ہے۔"

"میں فون کیسے کروں' مجھے معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ خود ہی مجھ سے رابطہ کرتے ہیں۔ دراصل ادھر پاکستان میں کوئی بڑا پولیس افسر قتل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عاصم کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ وہ اپنی "موجودگی" کے سلسلے میں آج کل بڑے محتاط ہیں۔"

میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ درحقیقت اب مجھ سے شیخ عاصم کی دوری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں جلد سے جلد اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی گردن پر ساہی صاحب کا خون تھا اور میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ لیونا بتا رہی تھی کہ وہ چار پانچ روز تک امارات پہنچ جائے گا۔ مجھے یہ چار پانچ روز بھی چار پانچ برسوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ پچھلے دو تین ہفتوں میں یہ سوال کئی بار میرے ذہن میں آیا تھا کہ شیخ عاصم سے سامنا ہوا تو میں کیا کروں گا؟ کیا میں اسے قتل کر ڈالوں گا؟ لیکن بات تو پھر وہی آ جاتی تھی۔ مار دینا تو کوئی سزا نہیں تھی۔ شیخ عاصم نے بھی مجھے مارا نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے شکنجے میں آنے کے بعد میں نے کئی بار مرنے کی تمنا کی تھی۔ اس نے مجھے موت سے بدتر زندگی دی تھی۔ میں اسے آسان موت کیسے دے سکتا تھا۔ درحقیقت عاصم اور شکر دو ایسی ہستیاں تھیں جن کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ان دونوں کے بارے میں سوچتے ہوئے میں سرتاپا پتھر بن جاتا ہوں اور میری رگوں میں سیال تیزاب دوڑنے لگتا ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نے شان دار کافی لی اور پھر ہیلی پیڈ پر پہنچ گئے۔ ہیلی کے ذریعے ہم نے رات کے اندھیرے میں امارات کا شان دار فضائی نظارہ کیا۔ صحرا کے تاریک سمندر میں روشنی کے چھوٹے بڑے جزیرے تھے جنہیں کہیں کہیں سڑکوں کی روشن لڑیاں آپس میں ملاتی تھیں۔ یہ روشن جزیرے راس الخیمہ' شارجہ' اجمان' العین' ابو ظہبی وغیرہ تھے۔ بڑا خوب صورت نظارہ تھا۔ لیونا پرواز کے دوران میں

بھی مجھ سے مسلسل باتیں کرتی رہی۔ یہ باتیں میری نجی زندگی کے حوالے سے تھیں۔

جب ہم بذریعہ کار پرنس ہوٹل پہنچے تو رات کے ٹھ بج چکے تھے۔ وقتِ رخصت میں نے لبونا سے وعدہ لیا کہ پرسوں وہ میرے ساتھ پھر ایم اے ولاز چلے گی۔ اس نے چند محبوبانہ ادائیں دکھانے کے بعد نیم رضامندی ظاہر کردی۔ وقتِ رخصت اس نے ایک بار پھر مجھ سے صالح باری کا ذکر کیا اور مجھے اس کے حوالے سے محتاط رہنے کی تلقین کی۔ اس نے مجھے بتایا "یہ شخص شکرے کی آنکھ رکھتا ہے۔ اس نے مجھے بھی کئی مرتبہ دیکھا ہوا ہے۔ بے شک میں مکمل طور پر پردے میں تھی لیکن ایسے لوگ تو چال ڈھال اور قد کاٹھ سے بھی عورت کو پہچان لیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا ہے۔ تم اس کا کوئی بندوبست کرو مجھے وہ شخص دوبارہ اپنے آس پاس نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"تمہارا حکم ہو تو وہ صبح تک تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر پہنچ جائے گا۔"

"جو چاہے کرو لیکن وہ مجھے دکھائی نہ دے۔"

لبونا کے جانے کے بعد میں پرنس ہوٹل میں اپنے کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے فوراً رہنی میں ایم اے ولاز فون کیا اور باری کو پرنس ہوٹل میں بلالیا۔ رہنی سے ابوظہبی کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ کار کے ذریعے یہ فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوجاتا ہے۔

باری جب پرنس ہوٹل پہنچا تو سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا۔ لبونا نے باری کا ذکر جس انداز میں کیا تھا، اس نے مجھے تجسس میں مبتلا کردیا تھا۔ لبونا کی باتوں سے یہ چیز عیاں ہوتی تھی کہ باری کی حیثیت شیخ عاصم کے دشمن کی ہے۔ اور دشمن کا دشمن 'دوست' ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے میں باری کو بھی دوست سمجھ سکتا تھا۔

باری بے حد مؤدب انداز میں میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ہماری "وزٹ" کے دوران میں اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کے سبب میں نے اسے یہاں طلب کرلیا ہے۔ میں نے اس کے لیے کولڈ ڈرنکس منگوائے تاکہ وہ کچھ ریلیکس ہوسکے۔ اس کے بعد میں نے گفتگو شروع کی۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا میں تمہاری نجی زندگی کے بارے میں کچھ دریافت کرسکتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔" وہ انکساری سے بولا۔

"یہ مس قوسیہ کون ہے؟"

اس کے خوب صورت چہرے پر سایہ سا لہرا گیا "کون؟"

"مس قوسیہ۔ جس کے ساتھ تمہاری ملاقات انگلینڈ میں ہوئی تھی۔"

چند ہی سیکنڈ میں باری کی پیشانی پر پسینہ تیکنے لگا تو ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "آپ شاید قوسیہ خلیل کی کررہے ہیں۔ میرے اور اس کے درمیان صرف دوستی تھا۔ وہ کرکٹ کی شیدائی تھی، میں بھی چار پانچ سال پہلے کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ بس اسی حوالے سے جان پہچان تھی۔"

میں نے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہو۔ "یہ تمہارا نجی معاملہ ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ بات نہیں جتنی تم بتا رہے ہو۔ قوسیہ سے تمہارا ناتا صرف دو حد تک نہیں تھا۔" وہ بے چارگی سے انگلیاں چٹخا کر رہ میں نے کہا "اچھا یہ بتاؤ کہ شیخ ایاز سے تمہارا کیا تنازعہ تو"

"کچھ۔ نہیں۔ جناب! وہ بڑے لوگ ہیں۔ ان سے میرا کیا تنازعہ ہوسکتا ہے۔ تنازعے تو برابری کی بنیاد پر ہیں۔ ہم تو ان کے لحاظ سے کسی گنتی میں ہی نہیں آتے۔"

"پھر بھی کیا بات ہوئی تھی؟"

"ان لوگوں کو قوسیہ سے میری دوستی پسند نہیں تھی میں نے اسے مزید ریلیکس کرنے کے لیے ڈرنک کی۔ اس نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ میں نے ٹھ ہوئے انداز میں کہا "دیکھو مسٹر باری! مجھے کسی ذریعے چلا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے شیخ عاصم کی فیملی کی طرف سے کافی سختی ہوئی ہے۔ تمہاری بے عزتی کی کوشش کی گئی تمہیں بے دردی سے مارا پیٹا بھی گیا ہے۔ یہ کوئی باتیں نہیں ہیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ ہر فرعون را مو مطلب یہ کہ خدا نے ہر جابر و ظالم شخص کے لیے کوئی مقابل پیدا کیا ہوتا ہے۔ سمجھو کہ میں ایک ایسا شخص ہو شیخ عاصم کی طرف سے پھینکی گئی ہر اینٹ کا جواب پتھ دے سکتا ہے۔"

باری نے ذرا غور سے میری طرف دیکھا۔ اس کی ذری الجھن زدہ آنکھوں میں مجھے پہلی بار حوصلے اور ا چمک نظر آئی۔

وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم رہا۔ اس کا سر جھکا اور کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں پھر اس اٹھایا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا "شاید آپ کو یہ حیرانی ہو کہ قانونی طور پر قوسیہ میری بیوی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی سر! ہماری باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ میں آپ کو نکاح کے کاغذات دکھا سکتا ہوں۔ اس شادی کی زیادہ تشہیر نہیں کی گئی تھی۔ شیخ عاصم کی فیملی کے بس گنے چنے افراد کو اس شادی کا علم تھا۔"

"کیا تم مجھے یہ ساری بات شروع سے بتانا پسند کرو گے؟"

"میری کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں ہے جناب' میرے والد فوت ہوچکے ہیں۔ صرف والدہ ہیں اور میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہوں نے اپنی ساری جائداد مجھے پڑھانے لکھانے اور کسی قابل بنانے میں صرف کردی۔ وہ جواں سالی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ اپنے بچوں کی خاطر انہوں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ انہیں بس ایک ہی تمنا تھی۔ وہ میرے لیے چاند سی دلہن لانا چاہتی تھیں۔ جب میں انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا کئی انگریز اور یورپین لڑکیاں میرے آس پاس موجود تھیں' لیکن ماں کی شرط تھی کہ میری بیوی کا تعلق آبائی وطن امارات یا اردگرد کے علاقے سے ہونا چاہیے۔ پھر انہی دنوں قوسیہ میری زندگی میں آئی۔ میں اسے اپنی بدقسمتی ہی کہوں گا کہ میں بھی قوسیہ کو چاہنے لگا۔ وہ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ بلکہ دیکھنے میں وہ ایک خوبصورت چنچل سا لڑکا ہی لگتی تھی۔۔۔ کیا آپ نے قوسیہ کو دیکھا ہے۔۔۔" باری نے اچانک سوال کیا۔

"نہیں' میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھا۔"

باری بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کا رہن سہن بالکل لڑکوں جیسا ہے۔ بوائے کٹ بال' مردانہ لباس۔۔۔ مردانہ کھیل۔۔۔ وہ انگلینڈ میں کاؤنٹی کرکٹ کھیلتی رہی ہے اور ٹیم کی کپتان رہتی ہے۔ اس سے میری دوستی کرکٹ کے حوالے سے ہی ہوئی تھی۔ پھر بڑھتے بڑھتے بات محبت اور آخر میں شادی تک پہنچ گئی۔ قوسیہ کے گھر والے یعنی شیخ عاصم وغیرہ اس شادی کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔۔۔ لیکن قوسیہ بھی اپنی ضد کی پکی تھی وہ اپنی بات منوا کر رہی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس وقت میری آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا تھا' ورنہ مجھے اسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا کہ قوسیہ جیسی ایکسٹرا ماڈرن اور تند مزاج لڑکی میرے ماحول میں رچ بس نہیں سکے گی۔ وہ تو ایک ایسی سرکش گھوڑی کی طرح تھی جو پیٹھ پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ اس کا مزاج صحرائی آندھی کا سا تھا۔ وہ میری ماں کو وہ محبت اور توجہ کیسے دے سکتی تھی جس کی وہ آرزومند تھی۔ یہ میری ماں کا ظرف اور ایثار تھا کہ اس نے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی امیدوں کے آسرے پر مجھے شادی کی اجازت دے دی۔" باری نے ایک دم سانس لے کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے بولا "قوسیہ نے شادی سے پہلے ہی یہ شرط رکھ دی تھی کہ شادی کے بعد مجھے گھر داماد بننا ہوگا اور میری والدہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔ میں نے جب اس سلسلے میں اعتراض کیا تو قوسیہ نے درمیانی راستہ نکالتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' ہم ایک تیسری جگہ رہیں گے۔ ابوظہبی کے مضافات میں ایک شاندار محل نما کوٹھی قوسیہ نے میرے نام الاٹ کرا دی۔ شادی انگلینڈ میں بڑی خاموشی سے ہوئی۔ ہم ایک ماہ انگلینڈ میں رہنے کے بعد امارات آگئے۔ امارات آنے کے فوراً بعد ہی مجھے یہ احساس ہونا شروع ہوگیا کہ میری حیثیت قوسیہ کے زرخرید غلام کی سی ہے۔ وہ ایک فرماں روا کی طرح مجھ پر حکم چلاتی تھی اور میری والدہ سے بھی اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ شوہروں کی طرح گھر سے باہر رہے اور بیرونی معاملات کو ہینڈل کرے جبکہ میں بیویوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر اس کی راہ دیکھا کروں۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اس نے معلوم نہیں کہ مجھ سے کن باتوں کا بدلہ لینا شروع کردیا تھا۔ اکثر اپنی سہیلیوں کے روبرو وہ میری بے عزتی کرتی تھی۔۔۔ میں اپنی مرضی سے کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ عام تقریبات میں بھی نہیں لے جاتی تھی۔ میں جب بہت بور ہونے لگتا تھا تو وہ مجھے مشورہ دیتی تھی کہ میں کوکنگ کیا کروں۔ گھر کی اندرونی ڈیکوریشن پر توجہ دوں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کی کوشش کررہی تھی۔ جلد ہی یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوگیا اور ہمارے درمیان تلخ کلامی ہونے لگی۔ کچھ دن بعد جب میری والدہ بیمار ہوئیں اور قوسیہ نے انہیں غیر ضروری طور پر اسپتال شفٹ کرنے کا آرڈر دیا تو سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوگیا۔ بات کرتے کرتے باری کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمک گئی۔

چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "میں نے گھر سے چلے جانے کی دھمکی دی تو قوسیہ پھٹ پڑی۔ وہ چیخنے چلانے لگی اور پھر اس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔ اس نے بے دریغ مجھ پر گھوڑے والے چابک برسانے شروع کردیے۔ میرے چہرے پر یہ بدنما نشان اسی واقعے کی یادگار ہے۔۔۔ جب اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو پھر میری برداشت بھی جواب دے گئی۔ میں نے اس سے چابک چھین لیا اور اسے دو تین تھپڑ مارے۔ قوسیہ کے حکم پر گارڈز نے مجھے اور میری بیمار والدہ کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ صرف چار پانچ روز بعد چند

کار سوار افراد نے مجھے مدینہ زاہد کے علاقے سے اغوا کرلیا اور جبل گھر کے قریب ایک ویران عمارت میں لے گئے۔ یہاں شیخ عاصم کے بھتیجے شیخ ایاز نے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میرے کپڑے پھاڑ کر مجھے چلچلاتی دھوپ میں الٹا لٹکا دیا گیا اور کئی سادے کاغذات پر دستخط کرا لیے گئے۔ مجھے چھوڑتے وقت دھمکی دی گئی کہ اگر میں نے کسی قانونی چارہ جوئی کی کوشش کی تو زندہ درگور کردیا جاؤں گا۔ مجھے اپنی جان کی تو اتنی پروا نہیں تھی لیکن بیمار والدہ کے لیے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے ابوظہبی چھوڑ دیا اور دبئی چلا گیا۔ یہاں میری قابلیت کی بنیاد پر ایم اے ولاز میں ملازمت مل گئی۔ صرف دو ماہ بعد آؤٹ آف ٹرن شاندار ترقی بھی ہوئی ہے اور مجھے وہاں کے منیجر کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب کہ میرا دل اب یہاں سے اچاٹ ہوچکا ہے۔ میں مستقل طور پر انگلینڈ یا امریکہ چلا جانا چاہتا ہوں۔ وہاں والدہ کا علاج بہتر طور پر ہو سکے گا اور میں بھی آس پاس کے خطرات سے محفوظ رہوں گا۔"

پوری رُوداد سنانے کے بعد باری نے یاس انگیز انداز میں سر جھکا لیا۔ میں نے اس سے پوچھا "اب کہاں ہے تمہاری بیوی؟"

"ابوظہبی میں ہی ہے' اپنے بھائی کے گھر میں۔"

"اسے بھی معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ سب جانتی ہے لیکن اس نے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی۔ بس ایک بار اس کا فون آیا تھا اور وہ بھی سخت طنزیہ قسم کا۔ کوئی دو مہینے پہلے جب والدہ زیادہ بیمار ہوگئیں تو میں نے انہیں دبئی کے اسپتال میں داخل کرایا۔ اس روز مجھے توسیہ کا فون ملا۔ چھوٹتے ہی بولی "جب میں نے کہا تھا کہ والدہ کو اسپتال میں داخل کرا دو تو تم نے میری نیت پر شک کیا تھا اور بڑی تکلیف ہوئی تھی تمہیں۔ اب کیوں لے کر آئے ہو اسپتال؟" میں اگر جواب دیتا تو وہ اور زیادہ بولتی' میں نے کچھ کہے بغیر فون بند کردیا تھا۔

اس نے اپنا پرس نکالا اور اندر لگی ہوئی ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ تصویر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ شیخ عاصم کی بہن ہے۔ تصویر میں تو وہ بس درمیانی شکل صورت کی نظر آتی تھی۔ ناک ذرا سی موٹی تھی۔ اس کی عمر بھی کوئی بائیس تیئس سال رہی ہوگی۔ اس کے بال بوائے کٹ تھے۔ وہ گھڑسواری کا لباس پہنے ایک سفید تازی گھوڑے کی لگام تھامے بڑی بے باکی سے کھڑی تھی۔ اس پر پہلی نگاہ ڈالنے سے یہی لگتا تھا کہ کوئی پندرہ سولہ سالہ لڑکا ہے۔

مجھے اس کے بائیں ہاتھ میں چابک نظر آیا۔ شاید یہی چابک تھا جس سے اس نے ایک روز اپنے مجازی کھال اُدھیڑی تھی اور اس کے خوبصورت چہرے کو نمایاں داغ دیا تھا۔ وہ چابک سے گھوڑے کو مارتی تھی چابک سے اپنے شوہر کو مار کر اس نے اپنے مزاج کے میں تھوڑا سا عندیہ دیا تھا۔ غالباً باری اس کے لیے خوبصورت برق رفتار گھوڑے جیسا ہی تھا جس پر کاٹھی اس نے اپنی انا کی تسکین کی تھی۔

اس مزاج کے ایک اور کردار سے کچھ عرصہ پہلے میری ملاقات ہوچکی تھی۔ میرا مطلب میڈم شہزادا ہے۔ لیکن شہزادا اور توسیہ میں بنیادی فرق یہ تھا کہ اپنی جسمانی کج روی کا شکار تھی' جبکہ توسیہ کا سارا نفسیاتی محسوس ہوتا تھا۔ توسیہ ایک مکمل عورت تھی خود کو مرد پر غالب دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ بنیادی فرق دونوں کرداروں کو ایک دوسرے سے بہت مختلف کرتا

میں نے کمرے کی کھڑکیوں سے پردے کھینچ دیے۔ ہوٹل کی بلندی سے شہر... کا ایک حصہ دور تک دکھائی رہا تھا۔ جھلملاتی روشنیاں ایک چمکیلے لینڈ اسکیپ کی بہت فاصلے تک دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کھڑکی کی طرف رُخ کرکے کھڑا ہوگیا۔ سات ہم شکل عمارات سے تجاریہ روڈ تک کا سارا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ بڑی خوبصورت رات تھی۔ میں نے اپنی بچھڑی غزالہ کو یاد کرکے آہ بھری اور باری کی طرف گھومتے ہوئے کہا "کیا تم توسیہ میں بسانا چاہتے ہو؟"

"نہیں سر..... نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اس سے بہت دور چلے جانا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم غلط کہہ رہے ہو۔ اس کا ثبوت تھوڑی دیر پہلے ہی تم نے دیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں سر۔"

"تمہارے پاس اس کی تصویر رہتی ہے اور یہ غالباً تمہارے دل میں بھی ہے۔ تم اگر توسیہ سے دور جا بات کر رہے ہو تو صرف اس لیے کہ تمہیں شیخ عاصم کا خوف ہے۔ تم بیرون ملک چلے جانے کی بات بھی ان کی وجہ سے ہی کر رہے ہو۔"

"نن..... نہیں سر..... جو کچھ توسیہ میرے ساتھ ہے اس کے بعد میرا دل اس کی طرف سے اچاٹ ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک نہیں کہہ رہے ہو۔ بہرحال اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے..... اب اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔"

"بہت شکریہ سر۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اپنی والدہ کو میری طرف سے سلام کہنا۔" اس نے ایک بار پھر انکساری سے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے کہا "تم مجھے ایک خالص عربی نوجوان لگتے ہو اور عرب بہادر ہوتے ہیں۔"

وہ سر جھکا کر مسکرایا۔ مسکراتے وقت اس کی ٹھوڑی پر نظر آنے والا سیاہ نشان پھیل کر اس کے نصف رخسار تک پہنچ جاتا تھا اور نسبتاً زیادہ بدنما لگنے لگا تھا۔ شاید باری بھی اپنی اس کجی کو سمجھتا تھا اور کم کم ہی مسکراتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ان لمحوں میں مجھے باری پر ترس آیا۔ وہ سلام کہہ کر جانے کے لیے واپس مڑا تو ایکدم مجھے یاد آگیا۔ میں نے کہا "ہاں باری! ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں ہم دونوں پھر ولاز پر آئیں۔ ہماری موجودگی کے دوران میں تم ہمارے سامنے نہ آنا' اس کی وجہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ اپنی جگہ تم کوئی دوسرا انچارج مقرر کر دینا..... باقی باتیں تو تمہیں مسٹر جی کلارک صاحب کی طرف سے سمجھا ہی دی گئی ہوں گی۔"

"جی سر' اس نے مستعدی سے کہا "آپ کی حیثیت ولاز میں مالک کی سی ہوگی۔ ملازمین کو یہی ظاہر کرنا ہوگا کہ آپ ولاز میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ چند ذاتی ملازموں کے علاوہ کوئی ملازم آپ سے رابطہ نہیں کرے گا۔"

"اوکے۔ تم یہ باتیں اس شخص کو سمجھا دینا جو تمہاری جگہ لے گا۔"

باری نے اطاعت مندی سے سر جھکایا اور واپس چلا گیا۔

باری کی باتیں میرے دل و دماغ میں چکرا رہی تھیں۔ توسیہ کے بارے میں مجھے لیونا نے بتایا تھا کہ وہ شیخ عاصم کی بہن ہے۔ اب صالح باری کی باتیں سن کر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ عاصم کی بہن ہی ہے۔ وہی خود پسندی' وہی خود سری۔ وہی انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنے کا رویہ۔ شیخ راشد اور شیخ عاصم نے میری بہن کو نشانہ بنایا تھا۔ اس کی ساری زندگی تباہ کردی تھی۔ وہ بے چارگی روپوشی کے شب و روز گزار رہی تھی اور شیخ عاصم کی اپنی بہن؟ وہ رنگینیوں اور مستیوں میں غوطہ زن تھی۔ میں اس توسیہ نامی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس بے چارگی کا اندازہ لگاتا رہا جو توسیہ کے واسطے سے باری کے حصے میں آئی تھی۔

ایک دن چھوڑ کر لیونا پھر حسب وعدہ پرنس ہوٹل چلی آئی۔ ہم حسب سابق بذریعہ ہیلی کاپٹر دبئی پہنچے اور پھر ایم اے ولاز پہنچ گئے۔ اس مرتبہ لیونا کے انداز میں زیادہ لچک اور بے تکلفی تھی۔ ہم ولاز کی وسیع و عریض چھت پر تھا گھومتے رہے اور شام کا لطف اٹھاتے رہے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے دو دن میں لیونا نے میرے بارے میں کافی سوچا ہے۔ میری شان و شوکت و امارت نے اسے متاثر کیا ہے اور شاید وہ چپکے چپکے میری حیثیت کا موازنہ شیخ عاصم کی حیثیت سے بھی کرتی رہی ہے۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شیخ عاصم کا مرتبہ اور کاروبار روبہ زوال ہے۔ وہ اپنی گوناگوں مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور ابھی ان مشکلات سے چھٹکارے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف میری جاہ و حشمت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ اس جاہ و حشمت کے علاوہ لیونا میری دلیری اور وارفتگی بھی ملاحظہ کرچکی تھی۔

میں نے لیونا کے سامنے خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے ساتھ اس کی چند تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد وہ مان گئی۔ آٹومیٹک کیمرے کے ذریعے میں نے عمارت کی سرسبز چھت پر فواروں اور پھولدار بیلوں کے درمیان اپنی اور اس کی چند تصویریں بنائیں۔ وہ ماڈل رہ چکی تھی۔ اسے تصویریں بنوانے کا فن آتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم نشست گاہ میں آ بیٹھے۔ لیونا نے پہلی بار میرے ساتھ بیٹھ کر ڈرنک کیا اور پھر میرے اصرار پر ڈنر کے لیے بھی رک گئی۔ ڈرنک کے بعد وہ زیادہ بے تکلف اور بے باک محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے میرے کندھے سے ٹیک لگالی اور خوشگوار موڈ میں گنگنانے لگی۔ مجھے لیونا میں دلچسپی نہیں تھی لیکن عاصم کو نیچا دکھانے اور اس کی چھاتی پر مونگ دلنے میں بہت دلچسپی تھی۔ میں نے لیونا کو بانہوں میں لے لیا۔ میری ہدایت کے مطابق نشست گاہ میں مکمل تخلیہ تھا۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے اور دروازے سے باہر دربان موجود تھا۔ ہم کتنی ہی دیر ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ اچانک لیونا بے حد جذباتی آواز میں بولی "مجھے ڈر ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو تو....." وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

"چپ کیوں ہوگئی ہو۔ اگر تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تو..... مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

وہ بولی "تو مجھے کہیں دور لے جاؤ..... ایک دو دن کے اندر..... عاصم کے آنے سے پہلے پہلے۔"

میں نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور غور سے دیکھنے لگا۔

اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں خواب ناک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا ”تو ٹھیک ہے چلتے ہیں..... کل ہی چلتے ہیں۔“

وہ خاموش رہی۔ میں نے کہا ”یہ نہیں پوچھو گی کہ کہاں؟“

”بس جب چلنا ہی ہے تو پھر منزل کوئی بھی ہو..... بس تمہارا ساتھ ہونا چاہیے..... لیکن ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو۔“ اس کے لہجے میں ہیجانی لرزش تھی۔

”کیا سوچ لوں؟“

”میں اور تم دونوں بہت بڑا رسک لیں گے..... اور ایک بار یہ رسک لے لیا تو پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ ہمیں ہر صورت میں ساتھ نبھانا پڑے گا۔“

میں نے ٹھیٹ عاشقانہ لہجے میں کہا ”میں تمہارا ہاتھ تھام کر دنیا کے آخری کنارے تک چلوں گا اور آخری سانس تک تمہاری طرف آنے والے خطرات کا دفاع کروں گا۔“

”وعدہ؟“ وہ لہجے کو مزید خواب ناک بنا کر بولی۔

”ہاں وعدہ۔“

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

پروگرام طے یہ ہوا کہ کل وہ حسب سابق سہ پہر کے وقت مجھ سے ملنے پرنس ہوٹل پہنچے گی اور پھر واپس نہیں جائے گی۔ میں اسے رازداری کے ساتھ یہیں ایم اے ولاز میں لے آؤں گا اور پھر یہیں پر ہم آئندہ کے پروگرام طے کریں گے۔

پوری پلاننگ کے بعد ہم رات گیارہ بجے ایک زبردست ڈنر کے بعد بذریعہ ہیلی کاپٹر واپس ابو ظہبی پہنچے اور وہاں سے پرنس ہوٹل آ گئے۔ لیونا نے اپنی رازدار سہیلی کو دبئی سے ہی فون کر دیا تھا۔ وہ لیونا کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی گاڑی سمیت پرنس ہوٹل کی پارکنگ میں موجود تھی۔ وہ لیونا کو لے کر واپس چلی گئی۔

مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ لیونا اتنی جلدی شیشے میں اتر جائے گی۔ درحقیقت شیخ عاصم سے اس کا بندھن فقط ضرورت کا بندھن تھا۔ بلکہ اسے لالچ کا بندھن کہنا چاہیے۔ لیونا کو دولت اور عیش و آرام کا لالچ تھا۔ شیخ عاصم کو لیونا کے خیرہ کن حسن کا لالچ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ مگر اب یوں محسوس ہوتا تھا کہ عیش پرست لیونا کی ضرورتیں پہلے جیسی شان و شوکت کے ساتھ پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ وہ چالاک عورت دیکھ رہی تھی کہ عاصم دن بدن اپنے کاروباری معاملات میں الجھتا جا رہا ہے اور اس کے معاشی حالات تیزی سے روبہ زوال ہیں۔ دوسری طرف اس نے میری امارت کے مبہوت کر دینے والے نظارے دیکھے تھے۔ اس امارت کے ساتھ ساتھ اس نے میری وارفتگی اور میری دیدہ دلیری بھی ملاحظہ کی تھی۔ مجھے یہ شک ہو رہا تھا کہ اس نے میرے بارے میں اپنے طور پر بھی تحقیقات کی ہیں اور کسی خاص نتیجے پر پہنچ چکی ہے۔ آج کی ملاقات میں اس نے چند ایک معنی خیز باتیں کی تھیں۔ ان باتوں سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں اس سے زیادہ جانتی ہے جتنا میں نے اسے بتایا ہے۔ (میرے اس شبے کی تصدیق آنے والے دنوں میں ہو گئی۔) ہوشیار لیونا نے میرے بارے میں اپنے طور پر بھی کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش سے اسے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوا تھا تاہم دو اہم باتوں کا اسے پتہ چلا تھا۔ دونوں باتیں کلی طور پر میرے حق میں گئی تھیں۔ پہلی بات لیونا کو یہ معلوم ہوئی تھی کہ امریکی ارب پتی مسٹر جی کلارک کے ساتھ میرا قریبی تعلق ہے۔ کاروبار کے کچھ شعبوں میں ہمارا اشتراک ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مسٹر کلارک نے گوا ہوٹلز کی جو ”چین“ شروع کی تھی اس میں تمام سرمایہ میرا ہے۔ دوسری بات لیونا کو یہ معلوم ہوئی تھی کہ ڈیڑھ دو سال پہلے جن نہایت قیمتی نوادرات کا شہرہ ہوا تھا اور جن کی قیمت کروڑوں ڈالر لگائی گئی تھی وہ فروخت ہو چکے ہیں اور نوادرات کی کل قیمت کا تیسرا حصہ میرا ہے۔ ممکن ہے لیونا مزید تحقیق کرتی تو اسے کچھ مزید گہری باتیں بھی معلوم ہو جاتیں۔ مثلاً یہ کہ میرے اور شیخ عاصم کے درمیان دشمنی چل رہی ہے اور شیخ عاصم کو جن کاروباری مشکلات کا سامنا ہے ان کا ایک سبب میں بھی ہوں وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس کی تحقیق اس اسٹیج تک نہیں پہنچ سکی اور اس سے پہلے ہی وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گئی۔

اگلا روز بڑا اہم تھا۔ طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ تاخیر کے ساتھ لیونا اپنے یار شیخ عاصم پر لعنت بھیج کر پرنس ہوٹل پہنچ گئی۔ اس کی سہیلی ساتھ نہیں تھی تاہم لیونا نے گاڑی اپنی سہیلی ہی کی استعمال کی تھی۔ وہ سامان سے بھرے ہوئے تین اٹیچی کیس اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو ایک کوہ پیما کی آنکھوں میں ایک بلند چوٹی سے بلند ترین چوٹی کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ حرص و طمع لیونا کے خوبصورت چہرے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں بڑی رازداری کے ساتھ ایم اے ولاز میں پہنچنا تھا۔ رازداری کی خواہش لیونا کی

بھی نہیں تھی۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ میں شیخ عاصم کی ”سوئیٹ ہارٹ“ کو اس کی آنکھوں کے سامنے اڑا کر لے جاؤں اور اسے دن میں تارے دیکھنے کا تجربہ کرواؤں۔ افسوس کہ شیخ عاصم اس وقت پاکستان میں تھا۔

اپنی سہیلی کی گاڑی لیونا نے وہیں پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دی۔ ہوٹل کے دو ملازموں نے لیونا کا سامان میری گاڑی میں منتقل کر دیا۔ آج میرے پاس جیگوار نہیں تھی ایک ہنڈا تھی۔ سامان منتقل ہو گیا تو ہم ہنڈا میں آ بیٹھے۔ میں نے بڑے جذباتی انداز میں لیونا کو ان تصویروں کے پرنٹ دکھائے جو کل ہم نے ولاز میں اتاری تھیں۔ جدید ترین کیمرے نے بڑی زبردست عکاسی کی تھی۔ لیونا کا فرانسیسی حسن پورے کا پورا قلم پر منتقل کر دیا تھا۔ کہیں وہ میرا ہاتھ تھامے کھڑی تھی، کہیں پھولوں کے پیش منظر میں میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں ہم قریباً بغلگیر نظر آ رہے تھے۔ لیونا ذرا شرمائی شرمائی نظروں سے ان تصویروں کو دیکھتی رہی۔ پھر میں نے تصویریں ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دیں اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہماری منزل مسٹر کلارک کا ریجنل آفس تھا جہاں سے ہمیں ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر دبئی پہنچنا تھا (لیونا ہیلی کاپٹر کو بڑے اسٹائل سے صرف ہیلی کہتی تھی لہٰذا اس کے سامنے میں بھی ہیلی کاپٹر کو ہیلی ہی پکارتا تھا۔)

میں ابو ظہبی کی چکنی سڑکوں پر گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اور میرا ذہن لیونا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ عورت کو پہیلی کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ بات اب زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ لیونا نے میرا اسٹیٹس دیکھنے کے بعد اور میرے جذبات پرکھنے کے بعد بڑی تیزی سے میری طرف رجوع کیا تھا۔ اب وہ کچے دھاگے سے بندھی میرے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ درحقیقت وہ چار پانچ دن پیشتر ہی اس اہم فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کل اتنی بے تکلفی کے ساتھ میرے ہمراہ تصویریں نہ بنواتی.....

”اس وقت ہم ”کلفا تجاریہ“ روڈ سے گزر رہے تھے جب ایک ٹریفک کنٹرول پولیس کی موبائل نے ہمیں روک لیا۔ ہمیں گاڑی سڑک کے کنارے لگانے کے لیے کہا گیا۔ ”یہ کیا مصیبت ہے؟“ لیونا نے ذرا گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے گاڑی کنارے پر لگا دی۔ کرخت چہرہ پولیس آفیسر نے کھڑکی پر جھک کر مجھ سے کاغذات طلب کیے۔ میں نے کاغذات اسے دکھا دیے۔ اس کے چہرے پر درشتی پھیل گئی۔ اس نے مجھے گاڑی سے باہر آنے کے لیے کہا۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا ”کیا بات ہے آفیسر؟ تم کسی عام آدمی سے بات نہیں کر رہے ہو۔“

”آپ جعلی نمبر پلیٹ سے گاڑی چلا رہے ہو۔ یہ نہایت سنگین جرم ہے آپ کو گاڑی کی تلاشی دینا ہوگی اور ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ براہ مہربانی آپ اپنی ساتھی خاتون سے کہیے کہ وہ بھی باہر تشریف لے آئیں۔“

میں نے باہر نکل کر اماراتی پولیس افسر سے جھگڑا شروع کر دیا۔ دو تین منٹ کے اندر ہی جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ ایک پولیس مین نے مجھے بازو سے پکڑنا چاہا تو میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ اپنے کرخت چہرے آفیسر سے ٹکراتا ہوا سڑک پر گرا۔ آفیسر نے بھنا کر اپنے ہولسٹر سے پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی میرا بھرپور مکا اس کے جبڑے پر پڑا۔ اس کی عینک اچھل کر دور جا گری اور وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں نے اس کا سر پنڈولم کی طرح جھولتے ہوئے دیکھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھولا۔ دروازہ آفیسر کے منہ پر لگا اور وہ ڈکرا کر سڑک پر الٹ گیا۔

یہی وقت تھا جب کہیں پاس ہی پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دینے لگا۔ گاڑی کے عین سامنے پولیس کی موبائل کھڑی تھی۔ پیچھے پولیس کی بھاری بھرکم موٹر سائیکل تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر لیونا کا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا..... ایک پولیس مین اور ایک راہ گیر نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پسٹل نکال کر ان کے پاؤں پر گولیاں چلائیں۔ وہ خوفزدہ ہو کر دائیں بائیں چھپ گئے۔ میں حیران و پریشان لیونا کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ایک پرہجوم پلازہ میں گھسا اور دوسری جانب کے ایک دروازے سے نکل کر عقبی سڑک پر آ گیا۔ یہ شام کے بعد کا وقت تھا۔ جو کچھ ہوا اتنی جلدی ہوا کہ لیونا کچھ سمجھ نہیں سکی۔ وہ نقاب میں تھی۔ اس کے منہ سے بار بار یہ نکل رہا تھا۔ ”او گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے۔“

میں لیونا سمیت ایک کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کار رکی تو میں..... دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ایک موٹا تازہ ترکی سیٹھ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے بلا توقف پستول نکال کر اس کی سرخ و سپید گردن سے لگا دی اور حکم صادر کیا کہ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا رہے۔ ورنہ یہ شام اس کی ”شام زندگی“ میں بدل جائے گی۔

ترکی سیٹھ موٹا تھا لیکن عقل موٹی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ ہدایت پر عمل نہیں کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اس نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔ میرے پہلو میں

بیٹھی لیونا کانپ رہی تھی اور اس کے بدن کی جنبش میں باآسانی محسوس کر سکتا تھا۔

میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ترکی سیٹھ ہمیں مسٹر کلارک کے ریجنل آفس کے قریب لے آیا۔ سات ہم شکل بلڈنگوں کے سامنے پہنچ کر میں نے ترکی سیٹھ کو گاڑی سے اتار دیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ اپنی جان کی سلامتی کی خاطر شور نہیں مچائے گا۔ اس کی گاڑی صرف ایک گھنٹے بعد اسے صحیح سالم حالت میں مل جائے گی۔ ترکی سیٹھ اقرار میں سرہلا کر اتر گیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

دو چار سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم ہیلی پیڈ پر پہنچ گئے۔ میں نے انچارج کو ہدایت کی گاڑی کو بڑی احتیاط کے ساتھ آس پاس کے کسی ویران سڑک پر چھوڑ دیا جائے۔

ہیلی بالکل تیار حالت میں تھا۔ پائلٹ ہیری کی زبان میں اسٹینڈ بائی تھا۔ ہم ہیلی پر سوار ہوئے اور دبئی کی طرف پرواز کر گئے۔

"اب کیا ہوگا جہاں! میں اس معاملے کو جتنا چھپانا چاہ رہی تھی یہ اتنا ہی مشہور ہو گیا ہے۔ اوہ خدایا۔۔۔ اب کیا بنے گا۔۔۔ میرا تو سارا سامان بھی اس گاڑی میں رہ گیا۔"

"اور میری اور تمہاری تصویریں بھی تھیں۔"

لیونا نے سرپکڑتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ آدھ پون گھنٹے میں یہ خبر سارے ابو ظہبی میں پھیل جائے گی کہ میں تمہارے ساتھ چلی گئی ہوں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "خیر یہ خبر تو پھیلنا ہی تھی آج نہیں تو کل پھیل جاتی۔"

"نہیں پھیلنی تھی نا جی!" وہ بڑی روہانسی آواز میں بولی "میں بڑی پلاننگ کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔"

"کیا پلاننگ تھی؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "عاصم کو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے یا پھر اسی طرح کی کوئی اور گڑبڑ ہو گئی ہے میرے ساتھ۔"

"لیکن تمہارے ساتھ تو سامان بھی تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ سامان میں گھر سے نہیں لائی ہوں۔ یہ تو ایک عرصے سے میری دوست مارتھا کے گھر پڑا تھا۔ یہ۔۔۔ یہ میرا ذاتی سامان تھا جو میں پیرس سے لائی تھی۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ لیونا کے بہت سے "جھوٹوں" کی طرح شاید یہ بھی ایک جھوٹ ہو۔ میرا خیال تھا کہ جس سامان کو وہ ذاتی کہہ رہی ہے وہ بھی شیخ عاصم کا مال ہی ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ سامان تھوڑا تھوڑا کر کے لیونا لاج میں اپنی دوست مارتھا کے گھر منتقل کرتی رہی ہو۔ جس طرح بعض عورتیں سسرال میں رہتے ہوئے بھی میکے کی فکر میں دبلی ہوتی رہتی ہیں اور قیمتی اشیاء چپکے چپکے میکے پہنچایا کرتی ہیں۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لیونا ایک بار پھر مایوسی سے سرہلانے لگی۔ "بہت برا ہوا' جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔ ساری پلاننگ دھری رہ گئی۔ عاصم کو ایک ایک بات کا پتہ چل جائے گا وہ تو پاگل ہو جائے گا۔"

"اس کے پاگل پن کو ٹھیک کرنے کے لیے میرے پاس ایک سو ایک طریقے ہیں۔" میں نے ہیلی کاپٹر کی کھڑکی سے نیچے دیکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن۔۔۔ ایسا ہوا ہی کیوں۔ کیا۔۔۔ کیا تمہاری گاڑی کی نمبر پلیٹ واقعی جعلی تھی۔"

"اس الو کے پٹھے کو دھوکا ہوا تھا۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں شریر لڑکے کی طرح جعلی نمبر لگا کر گھوموں گا۔"

وہ ماتھا پکڑ کر خاموش ہو گئی۔ حالانکہ اسے خاموش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے مزید سوال پوچھنا چاہیے تھے۔ مثلاً یہ کہ میں ایکدم تیخ پا کیوں ہو گیا؟ پولیس آفیسر کے ساتھ جھگڑے کو اتنا کیوں بڑھایا کہ مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی؟ میں نے فائرنگ کر کے معاملے کو مزید سنگین کیوں بنا دیا وغیرہ وغیرہ۔ مگر وہ یہ سارے سوال تو تب پوچھتی جب اسے شک ہوتا کہ میں جان بوجھ کر پکڑا گیا ہوں۔۔۔ اور یہ کہ میں نے جعلی نمبر پلیٹ بھی جان بوجھ کر لگا رکھی تھی۔

حقیقت یہی تھی کہ میں نے وہ غلط سلط اور ادھوری نمبر پلیٹ جان بوجھ کر لگائی تھی مجھے یقین تھا کہ ریجنل آفس کی طرف جاتے ہوئے راستے میں یقیناً کہیں نہ کہیں ہمیں روک لیا جائے گا۔ حالات سنگین بنا کر گاڑی چھوڑ کر چلے جانا بھی میری پلاننگ ہی کا حصہ تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں توقع سے زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ وہ گاڑی پولیس کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ میں نے اپنا جو ڈرائیونگ لائسنس دکھایا تھا وہ اصلی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس پر میری تصویر وغیرہ بھی موجود تھی۔ شیخ عاصم پر اب یہ بات ہر صورت عیاں ہو جانا تھی کہ لیونا میرے ساتھ اڑن چھو ہوئی ہے اور اپنی رضا و رغبت سے ہوئی ہے۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ شیخ عاصم پر کیا گزرنے والی ہے۔ کوئی اس کی چہیتی محبوبہ کو اغوا کر لیتا یہ بھی اس کے لیے قیامت سے کم نہیں تھا۔ کہاں یہ کہ محبوبہ اس کے منہ پر طمانچہ مار کر اپنی مرضی سے راہ فرار اختیار کر لیتی۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا' غیظ و غضب سے پھٹ پڑے گا! اور اس کی وحشت انتہا کو پہنچ کر اسے تماشا بنا دے گی۔۔۔ اور میں اسے ایسی ہی حالت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

جلد ہی ہم ایم اے ولاز کے ہیلی پیڈ پر اتر گئے۔ اس سے پہلے بھی میں اور لیونا یہاں آتے رہے تھے لیکن اب کی بار ہمارا آنا مختلف تھا۔ لیونا یہاں سیر کرنے کے لیے نہیں مستقل قیام کرنے کے لیے آئی تھی۔ عمارت کے خاص رہائشی حصے میں پہنچ کر اس نے اپنی قبا اور حجاب وغیرہ اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ وہ سخت پریشان اور غم زدہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ گئی تھی اور اس کا کردار شیخ عاصم کے سامنے بالکل ننگا ہونے والا تھا۔

وہ رات گئے تک وسیع و عریض خواب گاہ میں ٹہلتی رہی۔ ڈرنک کرتی رہی اور کبھی کبھی سگریٹ بھی ہونٹوں سے لگائی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ زچ ہو کر بولی "جہاں! تم کہتے ہو کہ پولیس یہاں تک نہیں پہنچے گی لیکن گاڑی اور گاڑی کے کاغذات تمہاری نشاندہی کریں گے اس کے بعد۔"

"اپنے چھوٹے سے ذہن کو تکلیف مت دو سوئیٹ ہارٹ" میں نے اس کی بات کاٹی "تمہیں بتایا ہے ناں کہ پولیس اس ولا کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔ اگر اگلے ایک ماہ تک تمہیں یہاں کسی پولیس والے کی جھلک بھی دکھائی دی تو جو جرمانہ کہوگی' ادا کروں گا۔"

"لیکن پولیس نہ بھی آئے تو شیخ عاصم تو آ سکتا ہے۔ تمہیں یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ پولیس کو آج ہمارے بارے میں جو معلومات ملی ہیں وہ یقیناً چند گھنٹے کے اندر شیخ عاصم تک منتقل ہو جائیں گی۔"

"میری جان! تمہیں کہا ناں کہ کچھ نہیں ہوگا۔" سمجھو کہ وہ معلومات ان چار پانچ یا آٹھ دس پولیس اہلکاروں کے سینے میں دفن ہو جائیں گی' دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے میری جان!"

"دولت تو عاصم کے پاس بھی بے شمار ہے۔ تمہارے بقول جو معلومات تم نے دولت کے زور پر دفن کی ہیں وہ معلومات عاصم دولت کے زور پر اکھاڑ بھی سکتا ہے۔"

میں نے اسے بانہوں میں بھر کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا "وہم کا کوئی علاج نہیں اے حسینہ پیرس! تم اپنے ننھے سے ذہن کو پریشان کرنے کے بجائے آرام سے سو جاؤ۔ میری اس بات پر یقین رکھو کہ تم یہاں بالکل محفوظ و مامون ہو۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ وہ اب مجھ پر کچھ کچھ اعتماد کرنے لگی تھی۔ وہ مجھے نام کے آخری حرف سے مخاطب کرتی تھی یعنی صرف "جہاں" کہتی تھی۔ اس نے اپنے طور پر میرے بارے میں جو تحقیق کرائی تھی اس میں میرا نام اسے جہاں داد کے بجائے شاہ جہاں معلوم ہوا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ میرے والد نے میرا نام شاہ جہاں جبکہ والدہ نے جہاں داد رکھا تھا۔ وہ اس وضاحت سے کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔

آدھی رات کے بعد وہ سو گئی۔ میں خاموشی کے ساتھ خواب گاہ سے نکل آیا۔ نشست گاہ کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ وسیع و عریض کھڑکیوں میں سے خوبصورت پھلواریاں نظر آ رہی تھیں۔ فوارے خاموشی سے چھوٹ رہے تھے اور ہوا میں رات کے پھولوں کی مہک تھی۔ میں ننگے پاؤں دبیز قالین پر ٹہلنے لگا۔ نجانے کیوں رات کے اس پہر ساہی صاحب کا محبوب چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ان کی آواز میری سماعت میں گونجنے لگی۔ وہ صورت اور آواز جو ہواؤں میں تحلیل ہو چکی تھی۔ جس نے اب کبھی حقیقت کے لباس میں میرے سامنے نہیں آنا تھا۔ ایک دل نگار منظر پھر میری نگاہوں کے روبرو جم کر رہ گیا۔ چھانگا مانگا کا نواحی علاقہ۔۔۔ وہ پرانا خشت بھٹہ۔ ساہی صاحب اپنی کلائی سے بندھے ہوئے "ریموٹ کنٹرول بم" سے الجھ رہے تھے۔ بم کے اندر سے ایک لرزہ خیز منحوس آواز برآمد ہو رہی تھی۔ میں ساہی صاحب کی طرف بڑھا تھا۔ انہوں نے دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔۔۔ اور ایک دھماکے نے میری سماعت کو مفلوج کر دیا۔۔۔ وہ دیوار ڈھے گئی جو میرے اور دنیا بھر کے خطرات کے درمیان حائل تھی اور آسمان تک بلند تھی۔ میرے ساہی صاحب چلے گئے۔۔۔ میں ایک بار پھر باپ کے سائے سے محروم ہو گیا۔

ساہی صاحب تجربہ کار پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست اسلحہ شناس بھی تھے۔ بم پر ہونے والی اسپارکنگ اور اس کی منحوس سیٹی نما آواز سننے کے بعد انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکے گا۔ بس ایک اضطراری حرکت کے تحت انہوں نے مجھے پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ جیسے ایک باپ اپنے بچے کو تیز رفتار گاڑی کے سامنے سے دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور اس کوشش میں خود گاڑی کے نیچے آ جائے۔۔۔ پھر میری نگاہوں کے سامنے جواں سال شجاعت اور ایڈووکیٹ امتیاز کے چہرے آئے۔ ان کی خونچکاں لاشوں نے تصور کے پردے میں آگ لگا دی۔ میرا سینہ جلتا رہا اور کھڑکیوں سے باہر قطرہ قطرہ شبنم پتوں پر سرکتی رہی۔ پچھلی بار جب میں دبئی میں تھا تو غزالہ بھی میرے ساتھ موجود تھی۔ دبئی اور ابو ظہبی وغیرہ کے مناظر

دوبارہ دیکھ کر وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ ہر اس مقام کو دیکھ کر میرے دل سے ہوک اٹھی تھی جہاں سے میں اور غزالہ اکٹھے گزرے تھے۔۔۔ اب کہاں تھی غزالہ؟ کیا کر رہی تھی؟ کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اب تو یوں لگتا تھا کہ اس کا چہرہ بھی تصور میں دھندلا رہا تھا۔ یہ سوال بار بار ایک نیزے کی طرح ذہن میں پیوست ہو جاتا تھا کہ وہ مجھ سے اور میرے درد سے اتنی بے خبر کیوں ہے؟ کیوں اسے میری حالت کا خیال نہیں آتا۔ کیوں وہ اتنی پتھر دل ہو جاتی ہے؟

اس نے اپنی سہیلی آذرین کو بتایا تھا کہ میرے ساتھ شکیلہ کی تصویریں دیکھ کر انکل جلیس آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اب مزید ذلت اور رسوائی برداشت نہیں کر سکتے۔ غزالہ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ اس کے بعد وہ غزالہ اور دیگر اہل خانہ کو لے کر روپوش ہو گئے تھے۔۔۔ یہ سب بجا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غزالہ ایک بار مجھ سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو معلوم تھا کہ یہ تصویریں کسی سازش کا حصہ ہیں پھر اس نے مجھے کس قصور کی سزا دی۔۔۔ اس نے میری زندگی مسلسل سزا بنا دی تھی۔ پتہ نہیں اسے ابھی میری محبت کا اور کتنا امتحان مقصود تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے میری نگاہ کھڑکی سے باہر گئی اور میں نے باری کو دیکھا۔ وہ ابھی جاگ رہا تھا۔ میں نے ایک ملازم سے کہہ کر اسے نشست گاہ میں ہی بلا لیا۔ "جی سر" اس نے ہاتھ ناف پر باندھے ہوئے کہا۔

"صبح کوئی اخبار بیگم صاحب تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ ایسی خبریں ہوں جو میں انہیں دکھانا نہیں چاہتا۔" باری نے فرمانبرداری سے سر ہلایا۔ میں نے کہا "اگلے چند دن بیگم صاحب مکمل تخلیے میں رہیں گی۔ صرف ایک چوکس ملازمہ کو ان کی خدمت کے لیے بھیج دینا۔ اس ملازمہ پر پابندی ہو گی کہ وہ عمارت کے اس حصے میں مقیم رہے گی۔"

"جو آپ کا حکم سر! میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"نہیں ابھی تو ضرورت نہیں۔ وہ سو رہی ہیں۔ ہاں صبح وہی ملازمہ ناشتہ لے کر آئے جس نے مستقل طور پر ان کو سروس دینی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ تمہیں کل ایک اور کام کرنا ہے۔ کل تم ابو ظہبی جاؤ گے۔ وہاں تمہیں لیونا لاج کے بارے میں تو معلوم ہی ہو گا؟"

"جی ہاں سر۔ عاصم کی فرنچ منظور نظر آج کل اس بنگلے میں مقیم ہے۔"

"تم کسی طرح جاننے کی کوشش کرو کہ لیونا لاج کے اندر کیا ہو رہا ہے۔۔۔ اور کیا شیخ عاصم پاکستان سے واپس امارات پہنچا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ کام تم نے خود نہیں کرنا کسی سے کروانا ہے۔ میں تمہارے لیے کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"یہ کام میرے لیے بہت آسان ہے سر!" وہ مسکرایا "لیونا لاج کے اندر میرا ایک بہت خاص بندہ موجود ہے۔ وہ لیونا کے لیے ڈرائیور کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"عزیز۔"

"اوہ اس بندے کو تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہرحال ابھی تم اس سے میرا کوئی ذکر نہیں کرنا۔ تم صرف معلومات حاصل کرو۔"

"آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ عزیز نہ بھی ملا تو آپ کی مطلوبہ معلومات آپ کو ضرور مل جائیں گی۔"

اگلے روز یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ کل ابو ظہبی میں "تجاریہ روڈ" پر پیش آنے والے واقعے کی خبر اخبارات میں نہیں ہے۔ صرف ایک اخبار میں چھوٹی سی ادھوری خبر موجود تھی۔ خبر کا متن کچھ اس طرح تھا۔ "تجاریہ روڈ پر کار سوار جوڑے کا پولیس آفیسر سے جھگڑا۔ مرد نے ہوائی فائرنگ کی۔ پولیس آفیسر کو زخمی کرنے کے بعد جوڑا فرار۔"

خبر میں میرے کاغذات کا کوئی ذکر تھا اور نہ اس بیش قیمت سامان کا جو لیونا کار میں چھوڑ آئی تھی۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں پولیس والے مالِ غنیمت کی خاطر اس خبر کو دبا ہی نہ جائیں۔ دوپہر سے تھوڑی دیر قبل مجھے باری کی طرف سے رپورٹ مل گئی اور یہ کافی تسلی بخش رپورٹ تھی۔ باری کو معلوم ہوا تھا کہ لیونا لاج میں کھلبلی مچی ہوئی ہے اور شیخ عاصم کی فرانسیسی منظور نظر لیونا گھر سے غائب ہے۔ اس نے کہا "کل نصف شب تک "عاصم فیملی" کا خیال یہی تھا کہ لیونا کو کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہو۔ دراصل گھر والوں کو یہی معلوم تھا کہ لیونا کو اس کی اطالوی سہیلی مارتھا کی طرف سے کوئی ایمرجنسی کال آئی ہے اور وہ پریشانی کے عالم میں بغیر کسی حفاظتی انتظام کے اکیلے ہی مارتھا کی طرف چلی گئی ہے۔ بعد ازاں جب رات نو بجے تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تو مارتھا سے رابطہ کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ لیونا تو اس کی طرف آئی ہی نہیں۔۔۔ اس نے سرے سے انکار کیا کہ اس نے لیونا کو کوئی ہنگامی کال کی تھی۔ اس کے بعد چپکے چپکے لیونا کی تلاش شروع ہوئی۔ لیونا کی مرسیڈیز کار ایک ویران سڑک پر کھڑی مل گئی۔ گاڑی کی اندرونی اور بیرونی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لیونا کو زبردستی روک کر اغوا کیا گیا ہے۔" (گاڑی کا ویران سڑک پر پایا جانا لیونا کے ڈرامے کا حصہ تھا۔)

باری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن جناب رات کو گیارہ بجے شیخ عاصم کی فیملی کے اندر یہ خبر پھیل گئی کہ لیونا کو اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنی مرضی کے ساتھ گئی ہے۔ اس کے بعد لیونا لاج میں پولیس کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ صبح تک یہ اطلاع کنفرم ہو گئی کہ لیونا اپنی مرضی سے کسی شخص کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ اس کے ہمراہ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے تین اٹیچی کیس بھی تھے۔"

باری نے اس کے علاوہ بھی کئی باتیں اپنی رپورٹ میں بتائیں۔ میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اس کا چہرہ دھیان سے دیکھتا رہا۔ آخر میں میں نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے باری؟ شیخ عاصم کی محبوبہ کس کے ساتھ فرار ہوئی ہو گی؟"

اس نے گڑبڑا کر میری جانب دیکھا اور بولا "میں کیا کہہ سکتا ہوں سر۔"

میں نے دنیا کے بہترین سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے باری! تم اتنے کند ذہن نہیں ہو۔ تم بتا سکتے ہو کہ شیخ کی محبوبہ کس کے ساتھ نکلی ہے۔"

وہ نظر جھکا کر بیٹھا رہا۔ میں نے کہا "بولتے کیوں نہیں ہو؟"

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "گستاخی معاف سر! مس لیونا۔۔۔ ہمارے "ولا" میں ہی تو موجود نہیں ہے۔"

میں نے مسکراتے لہجے میں کہا "تمہارا جواب درست ہے۔"

○☆○

آئندہ دو روز کے اندر صورت حال میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں۔ شیخ عاصم اپنے پروگرام کو مختصر کر کے امارات واپس پہنچ گیا۔ باری کے ذریعے مجھے شیخ عاصم کی پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ وقتی طور پر تو شیخ عاصم کے اہل خانہ نے لیونا کے فرار کی خبر دبا لی تھی اور پولیس میں بھی اس خبر کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ہوا تھا لیکن یہ صورت حال تادیر برقرار نہیں رہ سکی۔ جلد ہی یہ بات منظر عام پر آ گئی۔ ایک دو مقامی اخباروں نے تو واضح طور پر لکھا کہ لیونا کا "لیونا لاج" سے فرار دیرینہ عداوت کا شاخسانہ ہے۔ شیخ عاصم کے پرانے حریف شاہ جہاں نے عاصم کی گرل فرینڈ کو انتقاماً اپنے شیشے میں اتارا ہے۔ بہرحال ابھی تک میں نے لیونا کو ان خبروں سے دور رکھا ہوا تھا۔

ایک روز دوپہر گیارہ بجے کے لگ بھگ جب میں اور لیونا بیڈ روم میں ٹی وی دیکھ رہے تھے 'انٹر کام' پر باری نے اطلاع دی کہ ڈرائیور عزیز مجھ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔

عزیز کو درحقیقت میں نے ہی بلایا تھا۔ وہ اب تک بڑے کام کا شخص ثابت ہوا تھا۔ پہلے وہ میرے ساتھ تعاون کرتا رہا تھا۔ اب میرے کام کے لیے باری سے تعاون کر رہا تھا۔

میں عزیز سے ملنے نشست گاہ میں پہنچا تو وہ حسب معمول فوجی انداز میں اٹین شن کھڑا ہو گیا۔ میں نے باری کو اشارہ دیا کہ میں عزیز سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ باری عام سے انداز میں باہر چلا گیا۔ عزیز کی ظاہری حالت پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی "خدمات" کے عوض جو کچھ ہم سے حاصل کر رہا ہے وہ سارا جوئے میں نہیں اڑا رہا بلکہ اس کا کچھ حصہ اپنی ذات پر بھی خرچ کر رہا ہے۔

وہ بڑی عاجزی سے بولا "جناب! چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن دو سوال میرے دماغ میں مسلسل کلبلا رہے ہیں۔ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کو ناگوار نہ گزریں۔"

"چلو۔۔۔ نہیں گزریں گے ناگوار۔۔۔ تم پوچھو۔"

وہ کچھ دیر تک ہچکچانے کے بعد بولا "نوخکل کلب میں آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کا نام جہاں داد ہے لیکن اب اخباروں سے پتا چل رہا ہے کہ آپ کا نام شاہ جہاں ہے اور شیخ عاصم صاحب کے ساتھ آپ کے تنازعات کافی پرانے ہیں۔۔۔ نوخکل کلب میں آپ نے کہا تھا کہ آپ لیونا لاج کی ایک "لبنانی" ملازمہ سعدیہ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن آپ تو۔۔۔ آپ تو۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ تو لیونا لاج کی مالکن کو ہی لے اڑے ہیں۔

میں نے عزیز سے کہا "تمہاری حیرت بجا ہے لیکن کسی وقت حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ باتیں پوشیدہ رکھنا پڑتی ہیں۔"

عزیز نے رازداری کے انداز میں کہا "میں آپ کے لیے اہم خبر لایا ہوں۔ ابھی اس خبر کا پتا کسی کو بھی نہیں ہو گا۔۔۔ شیخ عاصم صاحب نے آج "لیونا لاج" کے چھ ملازموں کو بہت سخت سزائیں دی ہیں۔ ان میں سے چار مرد ملازم تھے

اور دو عورتیں تھیں۔ ان سات ملازمین پر الزام ہے کہ انہوں نے اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں غفلت برتی جس کے سبب بیگم صاحب والا واقعہ پیش آیا۔"

"کیا سزائیں دی گئیں انہیں؟"

شیخ عاصم صاحب کی ہدایت پر چھوٹے شیخ ایاز صاحب نے مرد ملازموں کو الٹا کر کے چھت سے لٹکا دیا۔ ان کے سارے کپڑے سوائے زیر جامہ کے پھاڑ ڈالے تھے اور اس وقت تک ہنٹروں سے مارا تھا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہوگئے۔ ہوش میں لانے کے بعد انہیں پھر مارا گیا یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ ایک چوکیدار اور گارڈ کی حالت بہت نازک ہے۔ پتا نہیں کہ وہ بچیں گے بھی یا نہیں۔"

"عورتوں کے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

"انہیں بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں سے ان کی لاشیں ہی نکلیں گی۔" ان میں سینئر ملازمہ عاطفہ عرف بے جی بھی شامل ہے۔ ان پر لیونا کی نگہداشت کی ذمے داری سب سے زیادہ تھی۔ وقوعہ کے روز بے جی عاصم صاحب کی اجازت کے بغیر "لاج" سے باہر گئی ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ اسے میڈم لیونا نے ہی بہلا پھسلا کر باہر بھیجا تھا۔"

میں نے کہا "تمہیں اپنی طرف سے تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

وہ بولا "خطرہ تو ہے سر لیکن اب آپ کا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے تو نبھانا بھی پڑے گا۔"

میں نے جیب سے پانچ ہزار درہم کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ معمولی انکار کے بعد اس نے نوٹ رکھ لیے۔ میں نے کہا "حالات پر نظر رکھو اور ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ لیکن سب کچھ ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا ہوگا۔"

اس نے شد و مد سے اقرار میں سر ہلایا۔ کہنے لگا میرے اندازے کے مطابق میڈم لیونا اور آپ کی تلاش بڑے زور و شور سے ہو رہی ہے۔ کل سے پولیس کئی بڑے افسر عاصم صاحب کے بڑے محل کا دورہ کر چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا یہ محل ابو ظہبی کے علاقے میں ہے۔ وہاں پر چپکے چپکے جو کارروائیاں ہو رہی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ شروع میں عاصم صاحب نے تلاش کے سلسلے میں اپنی ذاتی فورس کو حرکت دی تھی لیکن اب چونکہ بات بالکل کھل گئی ہے اس لیے باقاعدہ ایف آئی آر درج کرا کے پولیس سے مدد بھی لی جا رہی ہے۔

عزیز کے واپس چلے جانے کے بعد میں دیر تک عاصم کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ بری طرح تلملا رہا تھا۔ اس کی کیفیت مجھے خوشی دے رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کار سے والی رومانی تصویروں نے عاصم کو خاص طور سے بہت ج ہوگا۔ میں تصور میں اس کی وحشت کا نظارہ کرنے لگا اپنے چہیتے ملازمین کی کھال اُدھیڑ رہا تھا۔ اپنے قریبی عزیز پر برس رہا تھا۔ امارات کے طول و عرض میں دیوانوں کی ط بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔

میری معلومات کے مطابق امارات کی مختلف ریاست میں مسٹر جی کلارک کی کم از کم تین رہائش گاہیں مو تھیں۔ اس کے علاوہ چند آفس اور ریسٹ ہاؤس وغیرہ ت میں جانتا تھا کہ میری تلاش کرتے ہوئے عاصم ان جگہوں طرف خاص توجہ دے گا۔ بہرحال میری تلاش کے دوران ان جگہوں میں داخل ہونا شیخ اور اس کے حواریوں کے آسان نہیں تھا۔ مسٹر جی کلارک ایک مشہور معروف بین الاقوامی صنعت کار کا نام تھا۔ اس کی پہنچ بہت دور تک تھ عین ممکن تھا کہ یہاں ایم اے ولاز کے ارد گرد بھی شیخ عا کے لوگ موجود ہوں لیکن یہ لوگ ولاز کی چار دیواری کے باہر ہی پھڑپھڑا سکتے تھے۔ بہرحال یہ بات میرے ذہن میں موجود تھی کہ مجھے اور لیونا کو جلد ہی یہ ٹھکانا بدل لینا ہے نے اس بات کا ذکر لیونا سے بھی کر دیا تھا۔

لیونا شروع کے دو دن تو پریشان رہی تھی۔ وہ ٹھیک سوئی تھی اور نہ ٹھیک سے کچھ کھایا پیا تھا۔ ایک تو اسے اپ قیمتی سامان کے چھٹ جانے کا افسوس تھا۔ دوسرا افسوس اس بات کا تھا کہ اس کا فرار جسے وہ بڑی منصوبہ بندی سے چھپا جا رہی تھی، اظہر من الشمس ہو گیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اب جب بھی شیخ عاصم اسے دیکھے گا "صفائی بیانی" کے بغیر اسے شوٹ کر دے گا۔ اکثر شیوخ کا وتیرہ یہی تھا۔ بے شک بہت سے اچھے لوگ بھی تھے لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جو نئی نئی خواتین سے اپنا حرم سجاتے ہیں۔ اپنی خواب گاہ کی آرائش کے لیے درجنوں حسینائیں جمع کر لیتے ہیں پھر جوں ان کی طرف سے جی بھرتا ہے انہیں نظرانداز کر جاتے ہیں۔ یہ نظرانداز ہونے والی صنف نازک عورتیں اگر کسی مرد کی طرف متوجہ ہو جائیں یا کسی مرد کو اپنی طرف متوجہ کریں تو قیامت کھڑی ہو جاتی ہے۔ کوڑوں سے چھلنی کر دیے جاتے ہیں۔ آنکھیں نکال دی جاتی ہیں۔ گردنیں مار دی جاتی ہیں۔ یہ عجیب و غریب معیار ہیں جو محلات اور عشرت کدوں میں رائج ہیں۔ بہرحال میرے سمجھانے بجھانے اور حوصلہ دینے سے لیونا نے تھوڑی گا

بہت کھلی تھی۔ اب وہ میرے بارے میں کافی کچھ جان چکی تھی۔ میرا اصل نام اسے میرے ساتھ یہاں آنے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ میرے اور شیخ عاصم کے درمیان پرانی مخاصمت چلی آرہی ہے۔ میں اسے زیادہ دیر اخبارات سے دور نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا آج میں نے اسے وہ اخبارات بھی دکھا دیے تھے جن میں میرے اور عاصم کے بارے میں خبریں وغیرہ چھپی تھیں۔ لیونا پر اب یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ میں نے دوستی کے لیے لیونا کو جان بوجھ کر منتخب کیا ہے۔ اس انتخاب کے ذریعے میں شیخ عاصم کو چوٹ دینا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں شیخ کی چہیتی محبوبہ چھین کر اسے دھوبی پٹکا دیا تھا۔ شروع میں میں نے لیونا کو بتایا تھا کہ میرا تعلق انڈیا سے ہے۔ کئی کم علم یورپین لوگوں کی طرح وہ بھی پاکستان اور انڈیا کو ایک ہی شے سمجھتی تھی لہٰذا یہ جان کر بھی کہ میں پاکستانی ہوں اسے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ بہرحال ان حوالوں سے لیونا نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس بارے میں بات نہ کرنے کا ہمارے درمیان معاہدہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر لیونا نے مجھ سے اس بارے میں بات کرنی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھنا ہے کہ میں واقعی اس سے محبت کرتا ہوں یا یہ سب کچھ بس شیخ عاصم کی دشمنی کا شاخسانہ ہے۔ میں نے اس حوالے سے ایک مناسب سا جواب سوچ رکھا تھا۔

غزالہ کے حوالے سے میری بے چینی میں بھی دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا۔ شاید ہی کوئی پل ایسا ہوتا ہو جب اس کا غم میرے سینے کو سلگا نہ رہا ہو۔ وہ بات بے بات یاد آجاتی تھی اور پھر پہروں میرے تصور کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس رات غزالہ کی یاد نے بری طرح بے کل کیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے پاکستان میں رابطہ کرنا چاہیے۔ مسٹر جی کلارک کی بات بھی ذہن میں تھی۔ انہوں نے زور دے کر کہا تھا کہ مجھے پاکستان میں صفدر یا زریں کو فون کرنا چاہیے۔ کچھ دیر سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے ہاتھ فون سیٹ کی طرف بڑھا دیے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد پاکستان میں زریں کی رہائش گاہ پر رابطہ ہو گیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ "زریں خاں صاحب" اپنی ذاتی رہائش گاہ پر منتقل ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بولنے والے نے رہائش گاہ کے قریب نصف درجن فون نمبر مجھے لکھوا دیے۔ جلد ہی ان میں سے ایک فون نمبر پر مجھے صفدر کی آواز سنائی دے گئی۔ وہ بے حد حیران ہو کر بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ ایک دم کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ سب کو پریشان کر ڈالتے ہیں۔"

مسٹر کلارک نے میرے بارے میں بتایا نہیں تمہیں؟"

"بس اتنا بتایا تھا کہ امارات سے آپ کا فون آیا۔ آپ خیریت سے ہیں لیکن یہ پتا نہیں کہ امارات میں کس ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں بتا سکتا۔ صورتِ حال ہی کچھ ہے۔ جب بھی ممکن ہوا سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گا۔"

"سائیں صاحب کے چلے جانے کا ہم سب کو غم ہے جہاں صاحب۔ لیکن آپ نے اس حادثے کو کچھ زیادہ دل سے لگایا ہوا ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی رو سے ہم سب کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے اور تو اور کلثوم بھی رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا "غز کچھ پتا چلا؟"

جواب میں ایک دو سیکنڈ خاموشی رہی۔ اس ایک سیکنڈ میں ہی میں امید و بیم کے کئی ادوار سے گزر گیا۔ صفدر کی آواز سماعت سے ٹکرائی "نہیں شاہ جہاں صا ۔۔۔ آپ ہی کی طرح ہم بھی دن رات اس کی کال یا اس کی کے منتظر ہیں۔ اس کا آخری فون پچھلے ماہ کی بارہ میں تاجر آفرین کے گھر آیا تھا۔ اس کے بعد سے مکمل خاموشی ہے نجانے کیوں صفدر کی بات سن کر مجھے صفدر اور تا جدائی کا وقت یاد آ گیا۔ موریطانیہ میں تارا بھی تو ایک ایسے ہی اچانک غائب ہو گئی تھی۔ کبھی واپس نہ آنے لیے۔ اب تو شاید صفدر کا "انتظار" بھی مر چکا تھا۔ شاید طرح ایک دن میرے انتظار نے بھی مر جانا تھا۔ ایک سی دل میں اٹھی اور نگاہیں دھندلا گئیں۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے صفدر سے پوچھا "زریں گل کہاں ہے؟"

"گاڑی لے کر کہیں نکلا ہوا ہے۔ سارا دن غزالہ کی تلاش میں شہر میں چکرا تا رہتا ہے۔ اس نے انکل جلیل کے لیے اخبارات میں بڑے بڑے اشتہار بھی شائع کروا ہیں۔ بس اس پر ان لوگوں کو تلاش کرنے کا خبط سوار ہے"

"اسے میری طرف سے تسلی دو اور کلثوم کو بھی دوسرے تم لوگوں کو تاکید کرتا تھی کہ اپنی سیکیورٹی کا بہت سخت رکھو۔ جہاں گارڈز وغیرہ تو ہوں گے؟"

"اس بارے میں آپ بالکل بے فکر رہیں۔ زریں اس کوٹھی کو قلعہ بنا رکھا ہے۔ بیرونی دیوار تیرہ چودہ فٹ ہے۔ کوئی دو درجن گارڈز بھی اس نے بھرتی کیے ہیں۔

سب پٹھان ہیں اور زبردست نشانے باز۔ پولیس کے گارڈ کے علاوہ ہیں لیکن آپ ہماری سیکیورٹی کی طرف سے فکر مند کیوں ہیں؟"

"بس یونہی۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا توقف سے بولا "شاہ جہاں صاحب! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ شیخ عاصم کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے والے ہیں۔"

وہ بڑی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ میں نے اس کے اندیشوں کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں کہ مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی اور ہوئی بھی کہ نہیں۔ دوبارہ فون کرنے کا وعدہ کر کے میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایک عجیب سی یاس رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ غزالہ کسی دھند میں غائب ہو گئی ہے اور میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ میں نے گلاس کی منتخی زرین شراب اپنے اندر انڈیلنی شروع کر دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایک عجیب سی بے حسی اور لاتعلقی میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ میرے اندر آگ تھی اور میں مزید آگ پی رہا تھا۔ میں ایک ایسی غنودگی میں کھو جانا چاہتا تھا جو گرد و پیش کے ہر آلام سے مجھے بے گانہ کر دے۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ کھڑکیوں کے باہر مست ہوا کی حرکت تھی اور شاخوں کا رقص تھا۔ الکحل کی مدہوشی نے ان مناظر کو اور بھی کیف آور بنا دیا تھا۔ اچانک میں نے لیونا کو دیکھا۔ وہ شب خوابی کے نہایت مہین لباس میں نمودار ہوئی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے تھے۔ کندھے عریاں تھے اور گردن سے نیچے اس کا شفاف بدن لبادے کے اندر سے جھلملا رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک جام بنایا اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر پینے لگی۔ ہم دونوں کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے اور قریب آ گئی۔ میرے لیے اس کی قربت اتنی دل آویز نہیں تھی جتنا یہ تصور دل آویز تھا کہ وہ شیخ عاصم کی لاڈلی محبوبہ ہے اور وہ اس کی جدائی میں ہلکان ہو کر کوچہ کوچہ پھر رہا ہے۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچا اور بانہوں میں بھر لیا۔ اس کے بال میرے چہرے پر بکھر گئے۔ کھڑکیوں سے باہر مجبور اور زیتون کے درختوں پر، پھولوں کی کیاریوں پر اور گھاس کے فرش پر ٹھنڈی سیاہ رات رینگتی رہی اور کمرے کے اندر میں مدہوشی کے ایک گداز سمندر میں ڈوبتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ میں نہیں ہوں، کوئی ٹوٹا پھوٹا ۔۔۔ بکھرا بھٹکا ہوا شخص ہے جو میرے جسم میں داخل ہو گیا ہے۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ اخبار دیکھتے دیکھتے اچانک میری نگاہ ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ خلیج کا سب سے معروف انگریزی اخبار تھا۔ پچھلے صفحے پر جو اشتہار میں نے دیکھا وہ جائداد کی فروخت کے بارے میں تھا۔ ایک انٹرنیشنل اسٹیٹ ایجنسی سری لنکا اور ملائیشیا میں کچھ ESSETS فروخت کر رہی تھی۔ ان میں سے ایک ESSET پر میری نظر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ یہ "کولمبو" کے نواح میں ایک زبردست رہائشی عمارت تھی۔ اشتہار میں عمارت کے بیڈ رومز، لاؤنجز اور دیگر رہائشی سہولتوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس اشتہار کو غور سے پڑھا اور تب مجھے اپنے ذہن پر یقین کرنا پڑا۔ یہ عمارت شیخ عاصم کا وہی شاندار رہائشی محل تھا جس میں چند سال پہلے عاصم نے غزالہ کے ساتھ ہنی مون منایا تھا اور مجھے اس ہنی مون کے دوران ایک گھریلو خادم کی حیثیت سے محل میں قیام کرنا پڑا تھا۔

میں نے اشتہار پڑھنے کے بعد صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اشتہار شیخ عاصم کی گرتی ہوئی معاشی حالت کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ اس اشتہار میں جن اثاثہ جات کا ذکر تھا میرے اندازے کے مطابق وہ عاصم ہی کے تھے۔ بہرحال ان میں سے اہم ترین اثاثہ یہ محل تھا جسے عاصم نے ریسٹ ہاؤس کا نام دے رکھا تھا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب خیال سر اٹھانے لگا۔ میں کچھ دیر تک اس خیال کی سنسنی خیزی کو محسوس کرتا رہا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ انٹرکام کی طرف بڑھایا اور صالح باری کو طلب کر لیا۔

دو منٹ بعد باری میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشتہار دکھایا۔ وہ پڑھ چکا تو میں نے کہا "جانتے ہو اس اشتہار میں ایک ایکڑ کی جس عمارت کا ذکر ہے وہ کس کی ہے؟"

باری نے پُرسوچ انداز میں کہا "میری معلومات کے مطابق سری لنکا میں بھی شیخ عاصم کی کافی پراپرٹی موجود ہے۔ کہیں یہ عمارت بھی تو اسی کی نہیں ہے؟"

"تم ٹھیک نتیجے پر پہنچے ہو۔ یہ شیخ کی عمارت ہے اور کچھ دیگر پراپرٹی کے ساتھ فروخت ہو رہی ہے۔ مجھے یہ عمارت خریدنی ہے صالح باری ۔۔۔ ہر قیمت پر۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

باری نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "آج شام تک اس اشتہار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو اور مجھے رپورٹ دو۔ عمارت میں خریدوں گا لیکن اس سودے میں میرا نام نہیں آنے گا نہ ہی کوئی اور ایسی بات ہو گی جس سے کسی کو شک ہو کہ اس

سورے میں ہم موجود ہیں۔"

"او کے سر' وہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں" باری نے احترام سے کہا۔

میں نے اسے ضروری ہدایات دے کر بھیج دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ میں اس ریسٹ ہاؤس میں حسینۂ بیرس لیونا کے ساتھ جا رہوں۔ کوئی ایسا کرشمہ ہو کہ شیخ عاصم بھی وہیں ہو لیکن آزاد و خود مختار نہیں۔ مجبور و بے کس۔ اسی طرح جس طرح چند سال پہلے میں تھا۔ وہ لیونا کو میری بانہوں میں دیکھے اور بے بسی کی وہی کیفیت محسوس کرے جو مجھے اندر سے سو ٹکڑے کردیا کرتی تھی۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ شاید نہیں ہو سکتا' میرے اندر سے ہی جواب آیا۔ بے شک لیونا شیخ عاصم کی چہیتی محبوبہ تھی لیکن اس محبوبہ کے لیے عاصم کے دل میں وہ تڑپ ہو ہی نہیں سکتی تھی جو میرے دل میں غزالہ کے لیے تھی۔ بہرحال ایسا ہو جاتا تو میری اذیتوں کا تھوڑا بہت احساس تو عاصم کو ہو ہی جاتا۔ وہ دیوانہ نہ ہوتا تو بھی نیم دیوانہ تو میں اسے کر ہی سکتا تھا۔ میں سوچتا رہا اور میرے ذہن میں ایک خاکہ سا بنتا رہا۔

اچانک لیونا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ لہراتی بل کھاتی ہوئی خواب گاہ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے فیروزی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ ساتھ میں فیروزے کا وہ بیش قیمت جیولری سیٹ تھا جو میں نے کل رات ہی اسے تحفے میں دیا تھا۔ اس سیٹ کی قیمت ان زیورات سے کم از کم آٹھ گنا زیادہ تھی جو چند روز پہلے حسینۂ بیرس نے شیخ عاصم کی خواب گاہ میں رکھے تھے اور جیکی سے جن کی قیمت سن کر سرد آہیں بھری تھیں۔ اس سیٹ کو پاکر لیونا بالکل نہال ہو گئی تھی۔ (میں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ چند روز پہلے پہنائی جانے والی انگوٹھی کے ساتھ کا پورا سیٹ میں نے اسے پہنا دیا تھا)

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے ہار کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ پوچھو کہ تمہارے طفیل یہ زیورات کیسے لگ رہے ہیں" میں نے عاشقانہ لہجہ اپنایا۔

"تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔"

"صرف باتیں ہی تو نہیں بناتا" میری نگاہیں فیروزے کے انتہائی بیش قیمت سیٹ پر تھیں۔

وہ مسکرا کر رہ گئی۔ انگریزی میں دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے YOU کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مجھے YOU ہی کہہ رہی تھی۔ اگر انگریزی میں "آپ" کوئی لفظ ہوتا تو یقیناً وہ میرے لیے استعمال کرنے لگ… وتکریم کا یہ احساس لیونا میں فیروزے کا سیٹ لینے … ہوا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر جذبہ دولت میں تولا جاتا ہے' وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ملازمہ نے بڑھ کر فو… ریسیور کریڈل پر رکھ کر میری طرف آ گئی۔ کہنے لگی" کیپر کا فون تھا۔ کہتا تھا کوئی ننگ دھڑنگ فقیر زبرد… سے اندر آ گیا تھا۔ پہرے داروں نے اسے کوٹھری… کردیا ہے۔"

"ٹھیک ہے' تم باہر جاؤ" لیونا نے ملازمہ کی مدا… بیزار ہو کر کہا۔

غالباً اس کا موڈ رومانی ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے فیرو… سیٹ کی اور اپنے حسن کی داد چاہ رہی تھی۔ ملازمہ… گئی۔ لیونا بلند و بالا آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دائم… گھومتی رہی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے … نشیب و فراز بلا خیز تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات… ایم اے ولاز کا گیٹ کیپر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے تعظیم پیش کی پھر بولا "آقا۔ بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ایک… دھڑنگ شخص جو شکل سے درویش لگتا ہے' اندر گھس…

"اوہو تو اس میں فوت ہو جانے والی کیا بات… نے چڑ کر کہا "پہرے داروں نے اسے کوٹھری میں… ہے نا؟"

گیٹ کیپر نے حیرت سے آنکھیں گھمائیں اور ا… آپ سے کس نے کہا ہے؟"

"ابھی' ملازمہ بتا رہی تھی۔"

"اس نے غلط سنا ہے مالکن! پہرے داروں… شخص کو بند نہیں کیا۔ اس نے پہرے داروں کو… ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں آقا!" وہ عجیب شخص ہے… نے پہرے داروں کو خوف زدہ کردیا ہے۔ وہ تو ا… لگاتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔ ایک پہرے دار نے ا… طرف رائفل سیدھی کرنا چاہی۔ اس نے پہلے چیخ مارا… پہرے دار کو اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ بے ہوش ہو… کوئی بہت خطرناک شخص ہے آقا!"

گیٹ کیپر کی آواز کانپ رہی تھی۔

اچانک میرے دماغ میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ میں …ی سے اٹھ کھڑا ہوا "کہاں ہے وہ؟" میں نے گیٹ کیپر سے پوچھا۔

گیٹ کیپر مجھے لے کر برآمدے کی طرف آ گیا۔ میرے …ن میں سائیں عالی کا نام گونج رہا تھا اور سینے میں دھڑکن …ے گونے پھٹ رہے تھے۔ ہم قریباً بھاگتے ہوئے ولاز کے …یچ لان میں پہنچے۔ قریباً ڈیڑھ سو گز دور مجھے ایچل نظر آئی۔ …ے ننگ دھڑنگ جنگلی جس نے اپنی ستر پوشی کے لیے کیلے …ے بڑے بڑے پتے باندھ رکھے تھے' ہاتھ میں نیزہ لیے محو …ص تھا۔ اس کے چہرے اور جسم کے بیشتر حصے پر سفید اور …خ دھاریاں بنی ہوئی تھیں بالکل جیسے افریقی قبائلیوں کے …ہوں میں ہوتی ہیں۔ رقص کے دوران میں نیزہ بردار کے …ے عجیب و غریب الفاظ نکل رہے تھے۔ "رمبا ہو… باہو۔ ڈمباڈیگا ڈاڈا ہو… دل دھڑکا ہو… دل دھڑکا ہو۔"

ایکدم میری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ وہ …یں عالی ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر سائیں کا رقص اور تیز ہو گیا۔ …ا نے نیزے کو بڑے خطرناک طریقے سے اپنے چاروں …ے گھمایا پھر آکر مجھ سے لپٹ گیا۔

اس نے کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا …لو شفیع محمد! میں نے ان سارے نالائق سپاہیوں کو اس …ے میں بند کردیا ہے۔ بڑے جاہل ہیں یہ۔ ان کو معلوم ہی …ا کہ جب کسی دوسرے ملک کا فرمانروا دورے پر آتا ہے …ے گارڈ آف آنر کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ان کو بتاؤ …یں کون ہوں اور تمہارے ملک میں میرے دورے کی …ا اہمیت ہے۔ بتاؤ ان کو" سائیں نے مجھے کوٹھری کی …ے دکھلایا۔

میں نے دیکھا کہ کوٹھری میں ایم اے ولاز کے پانچ مسلح …ے دار بند تھے۔ وہ کھڑکی کی آہنی گرل میں سے بڑی بے …ا سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

لیونا بھی میرے پیچھے ہی پیچھے بھاگتی موقعے پر پہنچ گئی …وہ کبھی حیرت سے کوٹھری کی طرف اور کبھی میری طرف …رہی تھی۔ "کون ہے یہ پاگل!" اس نے سائیں کی طرف …ہ کہا۔

…نے ہونٹوں سے "شی" کی آواز نکال کر اسے …ش کیا اور انگلی کے اشارے سے سمجھایا کہ یہ بڑی …ی ہستی ہے۔ کہیں تمہارے لیے قیامتِ صغریٰ برپا نہ …سکے لہٰذا بہتر ہے کہ ہونٹ بند رکھو۔"

ذرا ذرا سا گیٹ کیپر بھی میرے پہلو میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اور مجو رقص عالی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بتایا "پہرے دار جمشید کے بے ہوش ہونے سے سب خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اس فقیر نے عربی زبان میں سب کو ڈرایا کہ اگر کسی نے اسے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔ پہرے دار یکدم اس سے مرعوب ہو گئے۔ اس نے نیزے کی انی سے ڈرا ڈرا کر انہیں کوٹھری میں بند کروایا۔"

سائیں نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا "فافٹ سات سو بندوں کا کھانا پکاؤ۔"

"کون سے سات سو بندے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی' میرے ساتھ وفد بھی تو آیا ہے۔ پورے چودہ جن ہیں۔ ایک جن' پچاس بندوں کا کھانا باآسانی کھا جاتا ہے۔ لہٰذا چودہ جنات کے لیے سات سو بندوں کا کھانا درکار ہے۔"

"گویا تمہارے ساتھ چودہ جن بھی افریقہ سے آئے ہیں' بہت خوب!"

"چلو' اب باتیں نہ بناؤ۔ دیگیں چڑھوا دو۔ اور ہاں… میں تو بالکل سادہ سا کھانا کھاؤں گا۔ میرے لیے فالسے کی کھچڑی بنوالو یا آلو کھجور ہی پکالو۔"

میرا جواب سنے بغیر سائیں عالی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندرونی حصے کی طرف چل دیا۔ اس نے ہاتھ سے کچھ اشارے بھی دیے تھے جیسے اپنے وفد میں شامل جنات کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا ہو۔

"یہ کیا شے ہے؟" لیونا نے حیرت سے آنکھیں نچائیں۔

"یہ بڑی مختلف شے ہے۔ سمجھو یہاں بڑی ترتھلی مچنے والی ہے۔"

"میں جادو وغیرہ کو نہیں مانتی۔ کیا یہ کوئی افریقی جادوگر ہے؟"

میں نے کہا "تم جادو کو نہیں مانتی ہو لیکن جادو وہ ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ یہ تمہارے سر چڑھ کر بھی بولے گا۔"

تھوڑی دیر بعد پہرے داروں کو کوٹھری سے نکالنے کے بعد ہم اندر پہنچے تو سائیں عالی حسبِ معمول سر پیچھے ٹانگیں اوپر کیے کھڑا تھا۔ کیلے کے پتے اس کے جسم کو بڑی مشکل سے ڈھانپے ہوئے تھے۔ لیونا کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی' وہ بولی "یہ کیا تماشا ہے جہاں' اس شخص کو کیا حق ہے ہماری پرائیویسی میں دخل دینے کا۔ اس کو نکالو یہاں سے باہر۔"

لیونا نے یہ فقرے انگلش میں ادا کیے تھے۔ اس کا خیال

تھا کہ یہ اول جلول شخص اس کی اسٹائلش انگریزی کہاں سمجھے گا لیکن وہ سائیں عالی تھا' ہر شخص کو ہر موقعے پر ہر طریقے سے حیران کر سکتا تھا۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا اور براہِ راست لیونا کی طرف آیا۔ لیونا چیخ کر میرے عقب میں ہوگئی۔ سائیں نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہوئے لیونا کے بال پکڑ لیے اور غرا کر بولا "کیا تمہارا خیال ہے کہ میں انگریزی نہیں سمجھ سکتا۔ ناوان کھوتی' میں تو تیری فرانسیسی بھی سمجھ سکتا ہوں۔ تم نے مجھے تماشا کہا ہے۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ.... میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ایسا جن تمہارے پیچھے لگا سکتا ہوں جو ساری رات جاگتا رہے اور تمہیں بھی بس تھوڑا سا ہی سونے دے۔ ایسے جن عورت کو بس دو چار راتوں میں ہی نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے' پلیز جہاں! اس پاگل کو پیچھے ہٹاؤ مجھ سے" لیونا روہانسی ہو رہی تھی۔

پاگل کا خطاب ملنے پر شاید سائیں بالکل ہی آپے سے باہر ہو جاتا مگر اسی دوران میں ایک ملازم اجازت لے کر اندر آیا اور اس نے دست بستہ عرض کیا کہ ایک عمر رسیدہ خاتون لیموزین گاڑی میں آئی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انہیں سائیں عالی سے ملنا ہے۔

سائیں عالی نے چونک کر ملازم کی طرف دیکھا پھر بولا "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو' اس خاتون کو اندر بھیجو۔ جلدی کرو۔"

ملازم میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سائیں سے پوچھا "کون خاتون ہیں یہ؟"

سائیں بگڑ کر بولا "ایک اکیلی عمر رسیدہ عورت ہے۔ تمہیں یا تمہاری اس جھک چھلو کو اغوا کر کے نہیں لے جائے گی' اسے اندر آنے دو۔"

میں ملازم کے ساتھ خود باہر گیا اور گیٹ پر پہنچ کر عورت کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ اکیلی تھی۔ شکل و صورت سے ایک بھلی مانس عرب عورت نظر آتی تھی۔ میں نے ڈرائیور اور گاڑی کو باہر رہنے دیا جبکہ عورت کو اندر بلا لیا۔

عورت نے عربی بولنا شروع کر دی۔ ایک سینئر ملازم اس عربی کا ترجمہ اردو میں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ خاتون سائیں عالی سے ملنا چاہتی ہیں۔ سائیں عالی نے انہیں ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔ وہ سائیں جی سے اپنی بیٹی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔ اس کی اپنے خاوند سے سخت ناچاقی ہے اور وہ طلاق لینا چاہتی ہے۔ خاتون کا خیال ہے کہ سائیں جی اپنے روحانی علاج کے ذریعے میاں بیوی کا اختلاف دور کر سکتے ہیں یا کوئی ایسا راستہ دکھا سکتے ہ معاملہ آخری حد تک بگڑ جانے سے بچ جائے۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی لیکن خوش عقیدہ عورت کچھ نہیں کہا۔ میں اگر اسے سائیں سے نہ ملاتا تو سائیں ایک طوفان کھڑا کر دیتا تھا۔ میں نے عورت سے اس کوائف پوچھے۔ اس نے اپنا نام بنتِ رضوان بتایا اور کہ وہ ابو ظہبی سے آئی ہے۔ باقی سوالوں کے اس نے مول سے جواب دیے۔ بہرحال میں اسے سائیں عالی پاس لے گیا۔ سائیں عالی اس وقت زمین پر آلتی پالتی بیٹھا تھا اور آم کے تازہ جوس میں کوکا کولا ملا کر پی ر عورت کو دیکھ کر سائیں عالی نے اسے سر کے اشارے قریب بلا لیا۔ عورت نے بڑی عقیدت سے سائیں کو س اور سر جھکا کر دو زانو بیٹھ گئی۔ سائیں نے مجھے حکمیہ میں باہر چلے جانے اور دروازہ بند کرنے کا کہا۔

بیس پچیس منٹ کے اندر ہی ایسے لگنے لگا تھا کہ اس گھر کا مالک ہے اور ہماری حیثیت معمولی ملازمو ہے۔ میں دروازہ بند کر کے باہر آگیا۔ میرا دماغ چکرا ر میری معلومات کے مطابق سائیں عالی یہاں سے ہز مبل دور موریطانیہ کے قصبے "کالوبی" کے آس پاس مو اور بے آسرا افریقیوں کے لیے نئی بستیاں بسا رہا تھا۔ وہ اچانک جیسے آسمان سے ٹپک کر میرے سر پر آن کو میں زیادہ حیران اس لیے نہیں تھا کیونکہ مجھے معلوم تھ جب بھی آئے گا' اسی طرح آئے گا۔ سردی بھی اس ساتھ موریطانیہ میں رہ گئی تھی لیکن اب وہ سائیں کے نظر نہیں آ رہی تھی۔ ویسے میرا اندازہ تھا کہ وہ بھ پاکستان پہنچ چکی ہوگی۔ اپنی چیلی کے بغیر سائیں نے بہت سفر کیا تھا۔

عمر رسیدہ عورت قریباً ایک گھنٹے کے بعد کمرے سے آئی۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر چلی گ

اگلے دو روز سائیں عالی نے ایم اے ولاز میں ایسے گزارے جیسے وہ اس کا اپنا گھر ہو۔ وہ ایسا کر بھی سکتا جی کلارک صاحب کی رہائش گاہ تھی اور جی کلارک بھی سائیں کے پرستاروں میں ہوتا تھا۔ اس دوران کئی مرتبہ سائیں عالی کی مسٹر کلارک سے فون پر بات بھی سائیں نے ولاز کے ملازمین میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ جو ان پر چیخ چیخ کر حکم چلاتا رہتا تھا۔ کچن میں کام کرنے وا خاص طور سے کم بختی آئی ہوئی تھی۔ وہ ان سے اوٹ فرمائشیں کر رہا تھا۔ کبھی آدھی رات کو اٹھ کر ناشتے ک

دے دیتا تھا۔ کبھی سہ پہر تین بجے اسے ڈنر کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایک روز اس نے ناشتا' لنچ اور ڈنر تینوں اکٹھے ہی نوش کر لیے اس کے بعد رات گیارہ بجے تک ولا کی چھت پر دوڑیں لگاتا رہا اور لمبی لمبی ڈکاریں لیتا رہا۔ اس کے کھانے بھی عجیب و غریب ہوتے تھے۔ ہیڈ خانساماں کی عقل دنگ ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا جس کے لیے وہ ہر وقت گولیاں کھاتا رہتا تھا۔ اس بے چارے نے ساری زندگی اس قسم کی ڈشز بنائی تھیں اور نہ چکھی تھیں۔ مثلاً چینی والا میٹھا قیمہ۔ سفید مولی کی کھیر۔ شوربے میں تیرتے ہوئے رس گلے' میدے کے کوفتے' ہری مرچوں والی آئس کریم اور پتا نہیں کیا کچھ۔

اسی دوران میں ایک مرتبہ پھر عمر رسیدہ عورت نے بھی سائیں عالی کے حضور حاضری دی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے مسئلے کے لیے سائیں کے پاس آ رہی تھی لیکن بیٹی اس کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔ کولمبو کی رہائش گاہ خریدنے والا معاملہ بڑی تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ میری اجازت سے باری کولمبو پہنچ گیا تھا۔ وہاں سے اس نے میرے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی کے منیجر سے اس کی بات ہو چکی تھی۔ امید تھی کہ آئندہ دو چار دن میں کوئی نتیجہ خیز صورت حال سامنے آ جائے گی۔ خریدار کے طور پر میں نے مسٹر جی کلارک کے ایک کاروباری دوست شیخ حفیظ کو آگے کر دیا تھا۔ شیخ حفیظ امارات کا رہائشی ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس سلسلے میں میں نے جی کلارک سے اور شیخ حفیظ سے بھی بات کر لی تھی۔

○☆○

ایک ہفتے کے اندر اندر کولمبو کے پُرفضا مقام پر واقع عظیم الشان ریسٹ ہاؤس کا سودا طے ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے ساتھ گولف کلب وغیرہ بھی سودے میں شامل تھے۔ کاغذات میں تو شیخ حفیظ باتین کا نام ہی تھا لیکن اصل ملکیت میری تھی۔ اس حوالے سے شیخ حفیظ نے پہلے ہی ضروری کاغذات پر سائن وغیرہ کر دیے تھے۔

ریسٹ ہاؤس کو حاصل کر کے مجھے ایک ایسی خوشی محسوس ہوئی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ شیخ عاصم سے اپنا برا حساب چکانے کے لیے قدرت بھی میری مدد کر رہی ہے۔ میں ابھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' جس عمارت میں شیخ عاصم نے مجھے اپنی زندگی کے بدترین شب و روز گزارنے پر مجبور کیا ہے وہ ایک دن میری ملکیت ہوگی۔ نہ صرف عمارت میری ملکیت ہوگی بلکہ جس خوبصورت فرانسیسی طوطی میں شیخ کی جان ہے وہ بھی میرے پاس ہوگی۔ لیونا کا میرے پاس ہونا شیخ کے لیے اس لحاظ سے بھی بے حد تکلیف دہ تھا کہ میں نے اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں رکھا ہوا تھا۔ وہ شیخ عاصم کے منہ پر جوتا مار کر اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ بے شک اس میں دولت کا لالچ کارفرما تھا لیکن "زبردستی" تو کارفرما نہیں تھی۔ لیونا کے ساتھ معاملات بڑی اچھی طرح چل رہے تھے۔ یقیناً وہ بھی یہ بات سمجھ چکی تھی کہ مجھے اس کے خوبصورت سراپے میں اتنی دلچسپی نہیں جتنی دلچسپی شیخ عاصم کو منہ چڑھانے میں ہے۔ پھر بھی جو قدم وہ اٹھا چکی تھی' اب پیچھے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس پر بڑے کھلے دل سے درہم اور دینار خرچ کیے تھے اور اس بات نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔

وہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام کے فوراً بعد وہ بن ٹھن کر شعلہ جوالا کا روپ دھار لیتی تھی۔ سرخ رنگ کا لباس اس پر خوب جچتا تھا۔ ایک بار میرے منہ سے اس حوالے سے تعریف نکل گئی تھی۔ اس کے بعد لیونا کے ہر لباس میں سرخ رنگ غالب نظر آنے لگا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے پلاتی بھی اور مدہوش کر دیتی تھی۔ کسی وقت میں مزاحمت کرتا تھا' کسی وقت میرا اپنا دل بھی مدہوش ہونے کو چاہنے لگتا تھا۔ صفدر کی معذوری' زریں کی بے چارگی' ساجی صاحب کی جدائی اور غزالہ کی دوری کا جانکاہ خیال ذہن میں آتا تھا اور خواہش ابھرتی تھی کہ مجھے کچھ بھی یاد نہ رہے۔ ہر غم ایک سرخ غبار میں چھپ جائے۔ بس انگور کی بیٹی کا خمار ہو اور ایک ریشمی نسوانی جسم کی قربت ہو۔ یہ قربت مجھے ہر طرف سے ڈھانپ لے۔ اردگرد کی دنیا سے کچھ دیر کے لیے میرا رابطہ بالکل منقطع کر دے۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ غموں سے عہدہ برآ ہونے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے لیکن پتا نہیں کیا تھا' ان دنوں میری کیمسٹری' نفسیات یکسر بدلی ہوئی تھی۔ شاید صبر برداشت اور انتظار کی انتہا کو چھونے کے بعد جب غزالہ کی طرف سے بھی "جدائی" ہی انعام میں ملی تھی تو اندر سے زبردست ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا نقصان ہو گیا تھا جس کی سمجھ خود مجھے بھی نہیں آ رہی تھی۔ اب میری بس ایک ہی خواہش تھی' کوئی ایسا چمتکار ہو کہ میں شیخ عاصم کو اپنے ساتھ سری لنکا لے جا سکوں۔ اپنی پراپرٹی پر۔ اپنے ریسٹ ہاؤس میں' جہاں حسینۂ پیرس میرے ساتھ ہو اور میرے ساتھ اس کی قربت شیخ عاصم کا جگر چھلنی کرے۔ ہاں دشمن کو مارنا تو کوئی سزا نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کے ہر پل کو موت میں بدل دینا سزا ہوتی ہے۔ یہ عاصم ہی کے الفاظ تھے جو ایک مرتبہ اس نے مجھ سے

کہے تھے۔ میں یہ الفاظ ان کے ذہن منقسم کے ماخذ اسی کی طرف لوٹا دینا چاہتا تھا۔ مگر شیخ عاصم پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ڈرائیور عزیز کی رپورٹس سے پتا چلا تھا کہ وہ آج کل بے حد چوکس سا ہے۔ خطرناک گارڈز کا ایک دستہ ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے بھتیجے کے ہاتھ وہ پورے امارات میں میری تلاش جاری رکھے ہوئے ہے۔ میری تلاش کے کام میں عاصم کا بھتیجا شیخ ایاز عاصم دست راست کا کام کر رہا تھا۔ شیخ ایاز کی غیر معمولی سرگرمی کی رپورٹ مجھے ایک اور ذریعے سے بھی مل چکی تھی۔

جس روز صالح باری سری لنکا میں اپنا کام انجام دے کر دبئی واپس آیا' میرے ساتھ اس کی ملاقات ولاز میں ہوئی۔ اتفاقاً اسی روز وہ عمر رسیدہ عورت بھی سائیں عالی سے ملنے ولاز میں پہنچی۔ اسے دیکھ کر باری بری طرح چونک گیا۔ اس نے کوشش کی کہ عورت کی نگاہ اس پر نہ پڑ جائے۔ عورت جب سائیں عالی کے پاس کمرے میں چلی گئی تو میں نے باری سے پوچھا "تم اس عورت کو جانتے ہو؟"

وہ بولا "کیوں نہ جانوں گا سر! یہ میری ساس ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"یہ تو پچھلے کئی روز سے آ رہی ہیں۔ جن سائیں صاحب کے بارے میں' میں نے تمہیں بتایا ہے' یہ ان کی عقیدت مند ہیں۔"

"یہ کیا کرنے آتی ہیں سائیں صاحب کے پاس؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "پہلے تو ٹھیک سے پتا نہیں تھا لیکن اب چل گیا ہے۔ یہ اپنی بیٹی کی گھریلو پریشانیوں کے لیے یہاں آ رہی ہیں۔۔۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ بیٹی' تمہاری بیوی ہی ہے۔"

باری کے چہرے پر سوچ بچار کی گہری لکیریں نظر آنے لگیں۔ وہ بولا "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ یہ توسیہ کی سگی والدہ نہیں' یہ اس کی خالہ ہیں۔ توسیہ کی اصل والدہ کافی عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھیں' غالباً اس وقت جب توسیہ کا بڑا بھائی شیخ راشد بن ارشد پاکستان میں قتل ہوا تھا۔ دراصل وہ پہلے ہی بیمار تھیں۔ اس واقعے سے انہیں مزید دھچکا لگا اور وہ چل بسیں۔ توسیہ کی خالہ بنتِ رضوان نے اسے ماں کا پیار دیا ہے اور پالا پوسا ہے۔ وہ توسیہ کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی اور اس کی من مانیوں پر بے حد کڑھتی رہتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اس پوری شیخ فیملی میں یہ واحد عورت ہیں جن کے اندر دوسروں کی ہمدردی اور خدا خوفی نظر آتی ہے۔ ان کی مانتا تو کوئی نہیں لیکن اولاد کی حیثیت سے وہ شیخ عاصم وغیرہ کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ توسیہ کی طرح شیخ عاصم کی من مانیاں بھی انہیں بہت دکھ دیتی ہیں۔ میرے والے معاملے میں انہوں نے توسیہ اور شیخ عاصم وغیرہ کو سمجھانے کی اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی تھی اور شاید اب بھی کر رہی ہوں۔ جس روز توسیہ نے مجھ پر چابک برسائے اور جواب میں میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا' اس روز اتفاق سے یہ بھی وہیں موجود تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو شاید توسیہ گارڈز سے کہہ کر موقع پر ہی میری ہڈیاں پسلیاں تڑوا دیتی۔"

باری کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ ان باتوں سے پتا چلتا تھا کہ بنتِ رضوان توسیہ اور باری کی ازدواجی زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔

باری نے کہا "آپ کی موجودگی میں یہ کتنی بار یہاں آ چکی ہیں؟"

"تیسری چوتھی بار آئی ہیں آج۔"

"شاید میڈم لیونا سے ان کا سامنا نہیں ہوا ورنہ انہیں فوراً پہچان لیتیں۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا ہے۔" میں نے کہا' چند لمحے توقف کے بعد میں نے باری کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمیں تیل اور تیل کی دھار دیکھنی چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ بنتِ رضوان کسی دن تمہاری بیوی کو اپنے ساتھ یہاں بھی لے آئیں۔"

باری بولا "اول تو وہ آئے گی نہیں اور اگر آ بھی گئی تو اس کا فائدہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ماننے والی شے نہیں ہے سر!"

"منوانے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر سائیں عالی کے ساتھ رہ کر غمزدہ چہرے والی عمر رسیدہ عورت واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سائیں عالی بڑے اسٹائل سے کچھ پیتا ہوا باہر آ گیا۔ تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ وہ کانجی پی رہا ہے۔ کانجی میں وہ چھوٹی مکھی کا شہد ملاتا تھا۔ آتے ساتھ ہی مجھ پر بگڑنے لگا "دیکھو! لوگ اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہے ہو۔ تم لوگوں کو سفارتی رکھ رکھاؤ کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ میرے ساتھ چھوٹا سا وفد آیا ہے صرف چھ جن ہیں اس میں' تم ان کی بھی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں لوگ جب غیر ملکی دوروں پر جاتے ہیں تو ساتھ میں دو دو سو لوگوں کا وفد ہوتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن وہ تو انسان ہوتے ہیں۔"

"بالکل نہیں وہ بھی جن ہی ہوتے ہیں۔ کھانے میں جن' پینے میں جن' عیش عشرت کرنے میں جن۔ تم باتوں میں الجھا کر اصل بات سے میری توجہ مت ہٹاؤ اور اصل بات یہ ہے کہ میرے ساتھ آنے والے وفد کی صحیح دیکھ بھال نہیں ہو رہی۔ شاید تمہیں پتا نہیں کہ میں ہر روز پرستان سے ان کے لیے پکا پکایا کھانا منگواتا ہوں۔ کچھ کھانا وہ لوگ ٹن پیک میں ساتھ بھی لائے ہوئے ہیں۔ بالکل جیسے امریکا اور یورپ وغیرہ سے آنے والے سرکاری وفد تیسری دنیا میں آتے ہوئے اپنا کھانا ساتھ لے کر آتے ہیں۔"

"اچھا کوئی کام کی بات بھی کرنی ہے یا۔۔۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ میرے وفد میں چار صحافی بھی ہیں۔ اب تم خود ہی سوچو ایک تو صحافی اوپر سے جن۔ وہ کتنا خطرناک ہو گا۔ واپس پرستان جا کر وہ تم لوگوں کے خلاف کالموں کے کالم سیاہ کر دے گا۔"

"دیکھو سائیں! تم کوئی کام کی بات نہیں کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سروج کے بارے میں کچھ بتایا ہے اور نہ "کالونی" کے حالات کے بارے میں۔ جب ہم موریطانیہ سے یہاں آئے تھے تو تمہارے گرد لوگ پروانوں کی طرح اکٹھے ہو رہے تھے۔ علاقے میں خوش حالی لانے کے لیے ان کے ارادے بہت بلند تھے اور تمہارے بھی۔ اب تم اکیلے یہاں پہنچ گئے ہو۔۔۔"

"اوئے! میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ میں یہاں دورے پر آیا ہوں' چند دن میں واپس چلا جاؤں گا۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ تم واپس جاؤ گے۔ بس تم باتیں بنا رہے ہو' پچھلی دفعہ جب تم پاکستان آئے تھے' اس وقت بھی یہی کہہ رہے تھے کہ میں چند دن کے دورے پر آیا ہوں' پھر وہاں چپک کر رہ گئے تھے۔"

"یہ تمہارا اندیشہ ہے یا خواہش۔ میرا مطلب ہے' کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں رہوں۔"

"مجھے آج تک تمہاری سمجھ ہی نہیں آ سکی ہے۔ میری رائے بھلا کیا ہو گی۔"

"ٹھیک ہے' آنے والا "وقت" خود فیصلہ کر دے گا۔ بالکل جس طرح "وقت" نے کالونی کے آس پاس رہنے والے غریب مسکین لوگوں کا فیصلہ کیا ہے۔ جس طرح افریقی شکاری کتوں کا فیصلہ ہوا ہے۔ جس طرح ٹرسٹ کے بڑے کتے کنگ برزون کا فیصلہ ہوا ہے۔"

باتیں کرتے کرتے ایک دم سائیں نے اپنی قلابازی لگائی اور بولا "اوہو۔ باتوں میں' میں تو بھول ہی گیا۔ ابھی جو بوڑھی عورت یہاں آئی تھی تمہیں اس کا ایک کام کرنا ہے۔"

"کیسا کام؟"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ یہ کام بس تم ہی کر سکتے ہو۔"

"اوہو' کچھ اشارہ تو دو۔"

"اشارے بازی اچھی بات نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک نیکی کا کام تمہارے سپرد کرنے والا ہوں۔"

میں نے دکھی لہجے میں کہا "سائیں عالی' صفدر اندھا ہو گیا۔ شاہی صاحب چلے گئے۔ غزالہ مجھے چھوڑ گئی۔"

سائیں نے دھیان سے میری طرف دیکھا' ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ مجھے کوئی دلاسا دینے لگا ہے' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے سر کو گول گول گھمانے لگا۔ اس پر وہی موڈ طاری ہو گیا تھا جو کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور زور سے بولا "دل دھڑکا بے صبرے کا۔ بابا دل دھڑکا۔ بابا دل دھڑکا۔ دل دھڑکا بے صبرے کا۔"

اس نے شہادت کی دونوں انگلیاں اوپر اٹھائیں اور ہولے ہولے ناچنے لگا۔ ایک پردے کے پیچھے سے حسینہ بیگم حیرت آمیز خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں بیزار ہو کر باہر چلا گیا۔

تیسرے دن تک کولمبو کے ریسٹ ہاؤس کے مکمل کاغذات مجھے مل گئے۔ ساتھ میں عمارت کی چابیاں وغیرہ بھی تھیں۔ اسی دوران میں مسٹری کلارک کے ایک "جن" قسم کے منیجر نے میرے اور لیونا کے سفری کاغذات بھی تیار کروا دیے تھے۔ ہم جب چاہتے امارات سے سری لنکا روانہ ہو سکتے تھے۔ اس شفق رنگ نیم گرم شام میں لیونا اور میں ایم اے ولاز کی بلند و بالا چھت پر بیٹھے تھے اور دبئی کا نظارہ کر رہے تھے۔ دبئی کا شان دار تحفہ' حرکت کرنے والا جدید پل' نمیں' پینتیس منزل اونچی سن لائٹ بلڈنگ۔۔۔ اور اس کے علاوہ بھی بے شمار مناظر ہمیں چھت سے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد لیونا شاور لینے کے لیے نیچے چلی گئی۔ میں وہیں چھت پر بیٹھا رہا۔ اچانک میری نگاہ ولاز کی طرف آنے والے کشادہ راستے پر پڑی۔ بنتِ رضوان کی لیموزین آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ گئی۔ ولاز کے باوردی ملازمین نے دروازے کھولے۔ آج بنتِ رضوان اکیلی نہیں تھی' اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا۔ وہ توسیہ ہی ہو سکتی تھی اس نے نہایت چست پتلون قمیص پہن

رکھی تھی۔ بال لڑکوں کی طرح تھے۔ وہ دور سے دیکھنے پر بالکل نوجوان لڑکا ہی نظر آتی تھی۔ بالکل لڑکوں کے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ اپنی ماں کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ میں بھی جلدی سے نیچے چلا آیا۔ میرے نیچے تک دونوں خواتین سائیں عالی کے کمرے میں جاچکی تھیں اور دروازہ بند ہوچکا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آرہا تھا کہ اس لڑکا نما لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ شاید اس وقت جب شیخ عاصم اپنے بھتیجے شیخ اباذر کی بارات لے کر دھوم دھام سے لاہور پہنچا تھا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ ایک طاقت ور خیال میرے ذہن میں پرورش پا رہا تھا۔ یہ بڑا سنسنی خیز اور انقلابی خیال تھا۔ میرے ذہن میں یہ ارادہ پختہ ہو رہا تھا کہ اب توسیہ کو یہاں سے واپس نہیں جانا چاہیے۔ وہ ایک شادی شدہ لڑکی تھی جو اپنی خودسری کے تحت اپنی شادی کے مقدس بندھن کو توڑنا چاہتی تھی۔ آج اتفاقاً وہ اس چار دیواری میں آگئی تھی جہاں اس کا شوہر بھی موجود تھا۔ میں اس امر کی تصدیق کرچکا تھا کہ بنت رضوان یہاں مکمل رازداری کے ساتھ آئی ہے۔ صرف لیموزین کے ڈرائیور کو پتا ہوتا تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے اور یہ ڈرائیور بنت رضوان کا رازداں تھا۔ یقیناً آج بھی وہ توسیہ کو لے کر گھر سے نکلی تھی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں جارہی ہے۔ اگر وہ ڈرائیور اور توسیہ سمیت کہیں غائب ہوجاتی تو کسی کو پتا نہیں چلنا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔

پانچ دس منٹ کے اندر میں ایک آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ ابھی جب توسیہ اور بنت رضوان سائیں عالی کے کمرے سے نکلیں گی تو میں کوریڈور میں ان کا سامنا کروں گا۔ عین اس وقت رہائش گاہ کے اس حصے کی لائٹ چلی جائے گی۔ میں تاریکی میں توسیہ کی گردن مسل کر اسے بے ہوش کروں گا اور منظر سے اوجھل کردوں گا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے بعد بنت رضوان پر پریشانی کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ بہرحال یہ پریشانی انہیں کسی نہ کسی طور برداشت کرنا ہی تھی۔ بہتری کے لیے تکلیف تو جھیلنا پڑتی ہی ہے۔

میں نے باری کو بتایا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیوی اس چار دیواری میں موجود ہے۔ میرے انکشاف پر وہ حیران رہ گیا۔

میں نے کہا "باری! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ توسیہ اب واپس نہیں جائے گی۔"

"یہ۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔ میں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ایسا سوچیے بھی مت۔ وہ تو قیامت کھڑی کردے گی۔ آپ اس لڑکی کو جانتے نہیں۔"

"تم بھی مجھے پوری طرح نہیں جانتے ہو۔" میں نے کہا "جیسا میں کہہ رہا ہوں تم ویسا ہی کرو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

باری کے ہونٹ پھڑک کر رہ گئے۔ اس کے خوب صورت چہرے کا داغ کچھ زیادہ گہرا نظر آنے لگا۔ دو تین منٹ کے اندر میں نے اسے پوری بات سمجھادی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ جونہی توسیہ اور بنت رضوان کوریڈور میں پہنچیں گی' وہ اس حصے کی لائٹ آف کردے گا۔ وہ شدید تذبذب کے عالم میں میری ہدایات سنتا رہا اور اثبات میں سرہلاتا رہا۔ آخر میں وہ مری مری آواز میں بولا "توسیہ! سخت مزاحمت کرنے والی لڑکی ہے۔ شاید میں نے آپ کو بتایا بھی تھا' وہ ہاتھ پاؤں چلانا بھی خوب جانتی ہے۔ آپ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے احتیاط کریں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"اور سر۔ وہ۔ وہ بنت رضوان کا کیا ہوگا۔"

"وہ ہماری محترم بزرگ ہیں۔ ہماری بہت مدد کریں گی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بھی توسیہ کے ساتھ ہی رہیں گی۔ توسیہ کو راہ راست پر لانے میں ان کا کردار اہم ثابت ہوگا۔"

"لیکن وہ بہت بوڑھی ہیں جناب! گستاخی معاف کہیں یہ صدمہ۔"

"میں نے کہا ہے ناں۔ یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

"اور۔ جناب۔ ڈرائیور کا کیا کریں گے؟"

"وہ بھی یہیں رہے گا۔ بس لیموزین واپس جائے گی۔ آج رات یا کل صبح وہ پولیس کو کسی ویران سڑک پر کھڑی مل جائے گی۔ اوکے۔ اب تم اپنی جگہ پر پہنچ جاؤ میرا خیال ہے کہ وہ دونوں کمرے سے نکلنے والی ہیں۔"

چند سیکنڈ بعد ہی سائیں عالی کے کمرے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ توسیہ اور بزرگ خاتون باہر آرہی تھیں۔ وہ کوریڈور کے وسط میں پہنچیں تو ایک دم سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں دروازے کے پیچھے سے نکلا اور میرے دائیں بازو کی گرفت توسیہ کی گردن پر مضبوط ہوگئی۔ اس کے حلق سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ باری نے بتایا تھا کہ وہ ہاتھ پاؤں چلانا خوب جانتی ہے' واقعی اس کے دبلے پتلے اسمارٹ جسم میں لچک اور توانائی موجود تھی۔ میں نے اس کی گردن پر جچا تلا دباؤ ڈالا اور اس کا جسم میری بانہوں میں جھول گیا۔ بزرگ خاتون کو احساس تک نہیں ہوا کہ اس کے پہلو میں کیا واقعہ ہوگیا ہے۔ وہ توسیہ کو مخاطب

کرکے باتیں کررہی تھی۔ غالباً بجلی گل ہونے کے متعلق تبصرہ کررہی تھی۔ میں نے توسیہ کو آرام سے اٹھایا اور کمرے کے اندر ایک صوفے پر پہنچادیا۔ بزرگ خاتون بنت رضوان اب بلند آواز سے ملازمین کو پکار رہی تھی۔ اسی دوران میں بجلی کی رو بحال ہوگئی۔ بزرگ خاتون نے اپنے قریب توسیہ کو موجود نہیں پایا تو سراسیمہ ہوگئی۔ وہ اسے پکارنے لگی۔ وہ بڑی تیزی سے عربی بول رہی تھی۔

میں نے اسے اشاروں کنایوں میں تسلی دینے کی کوشش کی اور خیال ظاہر کیا کہ لڑکی ادھر ہی کہیں ہوگی۔ بزرگ خاتون کو ایک سینئر ملازم کے سپرد کرکے میں اب لیموزین کے ڈرائیور کی طرف جانا چاہ رہا تھا لیکن اسی دوران میں سائیں عالی وہاں آن موجود ہوا۔

بزرگ عورت بنت رضوان نے عربی میں سائیں کو بتایا کہ اس کی بیٹی یہاں نہیں ہے۔ جواب میں سائیں نے بھی کچھ کہا پھر وہ میری طرف اشارہ کرکے عورت سے اسی کی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ عورت حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ سائیں کیا بات کررہا ہے۔

عورت پریشانی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھی' جیسے بیٹی کو ڈھونڈ رہی ہو۔ سائیں خاموش ہوا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے معمر خاتون سے کیا کہا ہے؟

وہ بڑے اطمینان سے بولا "میں نے اسے بتایا ہے کہ لڑکی تمہارے پاس ہے' تم نے اسے بے ہوش کیا ہوا ہے لیکن یہ بے ہوشی جلد ہی ختم ہوجائے گی' پریشانی کی بات نہیں۔"

میں سٹپٹا گیا "یہ کیا اول فول بول رہے ہو تم؟"

"جھوٹ نہیں بول رہا۔ حقیقت بتا رہا ہوں۔"

پھر سائیں نے بڑے سکون سے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا جہاں توسیہ صوفے پر بے ہوش لیٹی تھی۔ عورت چیخ مار کر لپکی اور بے ہوش بیٹی کا منہ سر چومنے لگی۔

سائیں نے میرا سارا پروگرام درہم برہم کردیا تھا۔ اب معمر عورت کو سنبھالنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش آسکتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میرے پاس کوئی اینٹ قسم کی شے ہو جو میں سائیں کے سر میں دے ماروں۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ سائیں کو ساری صورت حال کا علم ہوگیا تھا۔ اس کے پراسرار کردار کے ساتھ اتنی انہونیاں وابستہ تھیں کہ میں نے اب نئی انہونیوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ دھیرے دھیرے میں اس کی روحانی صلاحیتوں کو تسلیم کرچکا تھا حالانکہ ایسی اکثر صلاحیتوں کے نتائج میں نے اوٹ پٹانگ نکلتے دیکھے تھے۔

سائیں معمر عورت سے مسلسل گفتگو کررہا تھا۔ اس دوران میں وہ کبھی بے ہوش لڑکی کی طرف اشارہ کرتا تھا کبھی میری طرف۔۔۔ میں نے دیکھا کہ معمر عورت دھیرے دھیرے پرسکون ہوتی جارہی ہے۔ وہ مسلسل اثبات میں سرہلا رہی تھی پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہوں میں میرے لیے احسان مندی کے جذبات ابھرنا شروع ہوگئے ہیں۔ پتا نہیں تھا کہ سائیں اسے کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد عورت میری طرف آئی۔ اس نے بڑی عقیدت سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور عربی میں میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو تھپتھپایا اور تسلی آمیز کلمات ادا کیے۔ عورت دوبارہ اپنی بے ہوش بیٹی کی طرف متوجہ ہوئی تو میں نے سائیں سے پوچھا "یہ کیا گڑبڑ گھٹالا کررہے ہو۔ کیا کہا ہے تم نے اس عورت سے؟"

"تمہارا پردہ رکھا ہے اور کیا کیا ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تم میرے اسسٹنٹ ہو' اس چھوکری کو ٹھیک کرنے کی ذمے داری میں نے تم پر لگائی ہے۔ تم نے لڑکی کو میری مرضی سے بے ہوش کیا ہے اور یہ بے ہوشی ایک طرح سے اس کے علاج کا حصہ ہے۔"

"عورت کیا کہہ رہی ہے؟"

"اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ بس کسی طرح یہ بگڑا تگڑا ماہی منڈا ٹھیک ہوجائے۔ اس کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ اس لڑکی کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔"

سائیں نے کہا "ستارے تو یہی کہتے ہیں کہ یہ لڑکی تمہارے ہاتھوں ٹھیک ہوسکتی ہے اور ستارے یہ بھی کہتے ہیں کہ تم اس لڑکی کو ٹھیک کرنا چاہتے ہو۔"

میں حیرت سے سائیں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسی حیرتیں' سائیں سے ملنے والوں کے حصے میں اکثر آتی تھیں۔ وہ اچانک کوئی غیر متوقع بات کہہ دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے دل کے اندر جھانک لیا ہے۔ اب بھی مجھے یہی لگا کہ میرے دل کی بات سائیں کے دل میں منتقل ہوگئی ہے۔

سائیں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "کس سوچ میں پڑگئے ہو؟ یہ بتاؤ اس لڑکی کو کتنی دیر میں ٹھیک کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "جہاں اتنا کچھ بتایا ہے یہ بھی بتادو کہ کتنی

دیر میں ٹھیک ہوگی۔"

وہ بولا "لمبی بیماری ہے اور پرانی بھی ہے۔ ذرا ٹائم تو لگے گا۔ کیا خیال ہے دو ڈھائی مہینے کافی ہوں گے۔"

"اگر تم کافی سمجھتے ہو تو پھر کافی ہوں گے لیکن لڑکی اتنا عرصہ گھر سے دور کیسے رہے گی۔"

سائیں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ تم لڑکی کو مستقل اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو۔"

"جس قسم کی یہ بیماری ہے اسی طرح ٹھیک ہوگی۔ اسے اس کے ماحول سے بالکل کاٹنا پڑے گا۔ ایک نئے سانچے میں ڈھالنا پڑے گا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا شوہر بھی اس وقت یہیں اس چار دیواری میں موجود ہے۔ یہ شوہر کو زر خرید غلام سمجھتی ہے۔ اسے بتانا پڑے گا کہ شوہر کا کیا مقام ہے۔ شوہر کی عزت اور محبت کا احساس اس کے باغی دل میں گہرائی تک اتارنا ہوگا۔"

"ویری گڈ۔" سائیں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہاری سوچ صحیح راستے پر ہے۔"

"لیکن میرا سوال وہیں ہے۔ عورت اور ڈرائیور کا کیا ہوگا؟"

سائیں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور چند لمحے تک آگے پیچھے جھولتا رہا پھر آنکھیں کھول کر بولا "اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عورت اور ڈرائیور کو واپس بھیج دیا جائے اور وہ اہل خانہ سے یہی کہیں کہ انہیں چھوکری کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ لڑکی کو رازداری سے لائے تھے اس لیے ذمے داری سے بچ سکتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ بھی لڑکی کے ساتھ یہیں رہیں۔ بس خالی گاڑی دبئی کی کسی سڑک پر کھڑی کر دی جائے۔"

"جیسا تم بہتر سمجھتے ہو ویسا کرلو۔" میں نے کہا۔

سائیں چند سیکنڈ مراقبے میں رہا پھر بولا "ٹھیک ہے اس کا فیصلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ لڑکی اب تمہارے حوالے ہے۔ تم نے اس کے کس بل نکالنے ہیں اور ایک دم ٹھیک کرنا ہے۔ میں تم کو فری ہینڈ دے رہا ہوں۔"

میں نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا "سائیں عالی! میں ایک دو دن تک سری لنکا جا رہا ہوں۔ میں اس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے تمہارے ارادوں کے بارے میں پہلے ہی شک تھا۔" سائیں نے اوپر نیچے سر ہلایا پھر آنکھیں نچا کر بولا "غالباً وہ چھمک چھلو بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"ان کی... جس کے لیے شیخ عاصم بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تم نے شیخ سے سارے پرانے بدلے ایک ہی چکانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تم ہمیشہ درست ہی کہتے ہو۔ اب تم اس محترم عورت کو یہاں سے لے جاؤ اور معاملے کو اپنے طریقے سے نپٹا لو۔"

"اوکے... اوکے۔" سائیں نے کہا، پھر اس نے نا شروع کر دیا اور بار بار دہرانے لگا "دل دھڑکا... ارکے کار دھڑکا... دل دھڑکا ارکے کا... یا پارل دھڑکا۔" اس کی ذہنی بھٹک کر کسی بھی طرف چلی جاتی تھی۔ تب اس رونے بھٹک کر "ارکے" "کارل دھڑکا دیا تھا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی تھی کہ سائیں نے چند دن پہلے میرے ذمے جو کام لگانے کی بات کی تھی وہ یہی کام تھا۔ یعنی قوسیہ کو راہ راست پر لانے کا کام۔

اگلے روز صبح کو یہ معلوم ہوا کہ سائیں عالی نے بزرگ عورت بنت رضوان اور اس کے ڈرائیور کو بمع گاڑی ابو ظہبی واپس بھیج دیا ہے۔ باری اور عزیز نے "ملبو لاج" کے حالات کی مکمل خبر رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بتا کہ بنت رضوان ابو ظہبی واپس پہنچ گئی ہیں اور بظاہر حالات میں کسی طرح کی ہلچل نظر نہیں آ رہی۔ تعجب کی بات تھی کہ اگلے روز بھی حالات بالکل نارمل ہی رہے۔ کسی اخبار میں بھی قوسیہ کے حوالے سے کوئی خبر نہیں تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شیخ عاصم کی فیملی نے یہ خبر بڑی سختی کے ساتھ چھپائی ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، قوسیہ اس سے پہلے بھی اہل خانہ کو بتائے بغیر کئی کئی دن اپنی سہیلیوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اہل خانہ فوری طور پر کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہے تھے۔

میں قوسیہ کو جلد از جلد سری لنکا پہنچانا چاہ رہا تھا۔ اس سلسلے میں مسٹر جی کلارک سے میرا مکمل رابطہ تھا۔ مسٹر جی کلارک کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ صرف ۲۴ گھنٹے کے بعد قوسیہ اپنے شوہر باری سمیت سری لنکا پہنچ گئی۔ مجھے اور لیونا کو بھی قوسیہ کے ساتھ جانا تھا لیکن سفری کاغذات میں کچھ پیچیدگی کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ قوسیہ کو خواب آور انجکشن لگا کر ایک مریضہ کی حیثیت سے جہاز پر سوار کیا گیا تھا۔ اس کا شوہر باری "تیمارداری" کے لیے قوسیہ کے ساتھ تھا۔ ایک ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہ سارے انتظامات مسٹر کلارک کے تھے۔ قوسیہ اور باری نے فرضی ناموں سے سفر کیا تھا۔ سائیں عالی کو قوسیہ اور باری کی روانگی کا علم تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ صورت حال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ حسینہ پیرس لیونا کے بارے میں بھی وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ اسے یہ بات پسند آئی تھی کہ میں شیخ عاصم کو اس کے مظالم کی قرار واقعی سزا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرا یہ بھی خیال تھا کہ سائیں بھی ہمارے پیچھے سری لنکا جانے کے لیے پَر تول رہا ہے۔

دو دن بعد میں اور لیونا بھی مسٹر کلارک کے پرائیویٹ طیارے کے ذریعے سفر کے لیے تیار تھے۔ اس سفر میں کچھ دشواریاں پیش آئیں۔ بہرحال ہم تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ کراچی پہنچے اور وہاں سے پی آئی اے کی ایک پرواز کے ذریعے کولمبو پہنچ گئے۔ کولمبو سے ریسٹ ہاؤس کا فاصلہ چالیس میل کے لگ بھگ تھا۔ یوں تو پورے سری لنکا میں ہی ہریالی نہایت کثرت سے نظر آتی ہے لیکن کولمبو ائیرپورٹ سے ریسٹ ہاؤس تک کا فاصلہ تو جیسے سبزے کی سرنگ میں سے گزرتے ہوئے طے ہوا تھا۔ حسینہ پیرس لیونا پہلی بار سری لنکا آئی تھی۔ وہ اس قدر ہریالی دیکھ کر ششدر تھی۔ ناریل، تاڑ اور کیلے کے درختوں نے سڑک کے دونوں طرف ناقابل فراموش نظارے بنا رکھے ہیں۔ غالباً چند گھنٹے بارش ہوئی تھی جس کے سبب ہر شے نکھری ہوئی تھی اور سہ پہر کی نیم گرم دھوپ میں چمک رہی تھی۔ رنگدار لباس والی سنہالی اور تامل عورتوں کو دیکھ کر ساری بھولی بسری یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ وہ سارے آنسو اور قہقہے یاد آ رہے تھے جن کا تعلق سری لنکا کی جواں جواں فضا سے تھا۔ میں مناظر میں کھویا ہوا تھا اور مسٹر کلارک کی فراہم کردہ شیورلیٹ گاڑی بل کھاتی سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی طرف رواں دواں تھی۔ ایک موڑ... پر آہستہ ہوئی تو رجنی گندھا کے پھولوں کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں نے گھوم کر دیکھا سنہالی لڑکیاں سڑک کے کنارے گل فروشی کر رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی خوانچہ فروش لڑکے پام کے بڑے بڑے پتوں میں بھنی ہوئی مچھلی فروخت کر رہے تھے۔ ناریل کے تیل میں تلی ہوئی مچھلی یہاں کی خاص ڈش تھی۔ اس ڈش کے ساتھ بھی میری کئی یادیں وابستہ تھیں۔

گالف گراؤنڈ کے قریب سے گزرتی ہوئی ہماری گاڑی ریسٹ ہاؤس میں پہنچی تو پہلے سے موجود ملازمین نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ یہ باوردی خدمت گار پچھلے کئی گھنٹوں سے دھوپ میں کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارا استقبال کرنے والوں میں باری سب سے نمایاں تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی تھا جسے ہم نے قوسیہ کے ہمراہ دبئی سے بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ ریسٹ ہاؤس کا نیا منیجر سنہالی بے سنہا تھا۔ مجھے باری کچھ بجھا بجھا سا نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا "ہاں ینگ مین، تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"ادھر کمرے میں ہی ہے سر۔" باری نے جواب دیا۔

"اس کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے ہیں یا نہیں؟"

"آپ خود ہی دیکھ لیں سر۔"

"کچھ کھا پی بھی رہی ہے؟"

"ابھی تک تو بس ڈرا دھمکا ہی رہی ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

میں نے لیونا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باری سے کہا۔ "میڈم کو ان کا کمرہ دکھاؤ۔"

باری نے تعظیمی انداز میں سر جھکایا اور لیونا کے آگے آگے چل دیا۔ لیونا نے فرانسیسی ڈیزائن کا شاندار اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ رنگ کے اس چست اسکرٹ نے اس کے قیامت بدن کو اور بھی قیامت کر دیا تھا۔ دیکھنے والے کی آنکھیں اس کی خوبصورتی سے چندھیا سی جاتی تھیں۔ ظاہری خوبصورتی کے اعتبار سے تو شیخ عاصم کا انتخاب بالکل درست تھا۔ لیکن باطنی خوبصورتی کا معاملہ برعکس تھا۔ اس سلسلے میں میرا تجربہ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ میں نے لیونا کو عیش و آرام کے رلدادہ ایک ایسی تتلی کی طرح سمجھا جو کسی ایک جگہ ٹھکانا نہیں کرتی۔ پورے گلشن میں چکرانے کی خواہش رکھتی ہے۔ بس فریق ثانی میں اتنا دم ہونا چاہیے کہ اسے اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ جیسے میں نے کیا تھا۔

باری لیونا کے ساتھ اندرونی حصے کی طرف چلا گیا تو میں نے سنہالی منیجر بے سنہا سے پوچھا "ہاں بھئی، جو لڑکا لڑکی یہاں پہنچی ہے، اس کی کیا پوزیشن ہے؟"

بے سنہا کی زردی مائل آنکھوں میں تشویش اور پریشانی کی لہر ابھری۔ وہ دھیمی آواز میں بولا "جناب، وہ بیگم تو بہت خطرناک ہیں۔ پورے ریسٹ ہاؤس کو سر پر اٹھا رکھا ہے انہوں نے۔ ایکدم شدید غصے میں آ جاتی ہیں۔ جس کمرے میں انہیں رکھا گیا ہے اس کے سارے شیشے اور قیمتی چیزیں انہوں نے توڑ ڈالی ہیں۔ اگر کمرے کی کھڑکیوں میں لوہے کی گریلیں نہ ہوتیں تو وہ کب کی توڑ پھوڑ کر کے یہاں سے نکل چکی ہوتیں۔"

میں نے پوچھا "صالح باری نے لڑکی سے ملاقات کی ہے؟"

"وہ بس ایک مرتبہ کمرے کی طرف گئے تھے۔ غالباً ان کو سمجھانا بجھانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے باری صاحب کو دیکھتے

ہی چیخنا شروع کر دیا اور چیزیں اٹھا اٹھا کر انہیں مارنے لگیں۔ باری صاحب کان لپیٹ کر واپس آ گئے۔ مم۔ میرا مطلب ہے جی کہ خاموشی سے واپس آ گئے۔"

"اسے کھانا وغیرہ کون پہنچاتا ہے؟"

"کل تک تو کچن سے ملازم ہی پہنچا رہے تھے لیکن اب مجھے خود پہنچانا پڑ رہا ہے۔ دراصل۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟"

"وہ دراصل... انہوں نے ایک ملازم کو زخمی کر دیا ہے۔ وہ کھانا وغیرہ تو کمرے میں پہنچانے نہیں دیتی تھیں۔ ملازم نے گرل کے اندر سے بسکٹ کا ڈبا اور چکن رول وغیرہ اندر پہنچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک دم جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اتنی زور سے اندر کی طرف کھینچا کہ ملازم کا چہرہ گرل سے ٹکرا کر بری طرح زخمی ہو گیا۔ انہوں نے اس پر بس نہیں کیا۔ ان کے لباس میں پھل کاٹنے والی چھری بھی تھی۔ یہ چھری انہوں نے بے دریغ ملازم کی ران میں اتار دی۔ ملازم کی چیخیں سن کر دو اور ملازم وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کھینچ کر اپنے ساتھی کی جان چھڑائی۔ اس وقت تک زخمی ملازم کی پتلون خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ بیگم صاحب نے خون آلودہ چھری سے دیگر ملازموں پر حملہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بچ گئے۔ آج میں نے بڑی مشکل سے دو چکن رول اور کوک کی دو بوتلیں اندر کمرے میں پھینکی ہیں۔ وہ سخت غصے میں ہیں اور بہت خطرناک نظر آ رہی ہیں۔ سچ پوچھیں جناب! تو سب لوگ ہی ان کی وجہ سے سہمے ہوئے ہیں۔"

توبیہ کی شعلہ مزاجی اور تیزی طراری کے کئی واقعات میں پہلے بھی باری اور لیونا سے سن چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جے سنہا جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہو گا۔ میں... جے سنہا کی رہنمائی میں اس کمرے کی طرف چل دیا جہاں توبیہ قیام پذیر تھی۔ بون بیلوں سے ڈھکی ہوئی طویل روش سے گزر کر ہم ریسٹ ہاؤس کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ یہاں کی ہر ہر اینٹ سے میری ان گنت تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ یہی وہ در و دیوار تھے جہاں شیخ عاصم نے اپنا ہنی مون منایا تھا اور یہی بے رحم چھت تھی جس کے نیچے میں الیکٹرونک ڈوائس کی زنجیر سے بندھا ہوا آبلہ پا پھرتا تھا۔ ہم راہداری کے دبیز قالین پر چلتے ہوئے ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ مجھے کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور نظر آئے۔ کھڑکی کی آہنی گرل میں سے کمرے کا منظر دکھائی دیا۔ توبیہ دبیز قالین پر نیم دراز تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی اور لڑکوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی ہوئی تھی۔ دور سے دیکھنے پر وہ ایک قبول صورت گم چتا لڑکا ہی نظر آ رہی تھی۔ اس سے پہلے میرا اور اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ بس ایک دفعہ میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ میرے ہی ہاتھوں بے ہوش ہو کر بے خبر پڑی تھی۔

توبیہ نے بھی مجھے گرل کے اندر سے دیکھا لیکن اپنی جگہ ساکت لیٹی رہی۔ میں نے جے سے کہا "دروازہ کھولو۔"

جے نے میری طرف دیکھا پھر مقفل دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ دروازہ کھولو۔" میں نے کہا۔

"جناب! بیگم صاحب بڑے خطرناک موڈ میں ہیں۔ ان کے پاس چھری بھی ہے۔"

"میں تمہیں اندر گھسنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بس دروازے کا تالا کھولو اور چلے جاؤ۔"

جے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ایک بار پھر پتلون قمیص والی لڑکی کو دیکھا اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھول دیا۔ "اب تم جاؤ۔" میں نے کہا "کسی کو اس طرف آنے مت دینا اور نہ خود آنا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

جے نے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔ میں دروازہ کھول کر اندر گیا۔ توبیہ نے مجھے بہت سخت نظروں سے گھورا پھر بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ گئی۔ ابو ظہبی کی یہ بگڑی امیرزادی شیخ عاصم کی بہن تھی۔ وہی شیخ عاصم جو عام انسانوں کو کبڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس لڑکی کی رگوں میں بھی وہی فرعونی خون تھا جو شیخ عاصم کی رگوں میں تھا۔ وہی رعونیت، وہی خود سری، وہی کرختگی جو اس خانوادے کا طرۂ امتیاز تھی۔ "کون ہو تم؟" وہ غرا کر بولی۔

"تمہارا ایک ہمدرد۔"

"مجھے یہاں کون لایا ہے؟" وہ پھر غرائی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے نگاہوں میں تول بھی رہی تھی۔

"یہ نیک کام مجھ سے ہی سرزد ہوا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیوں... میں پوچھتی ہوں کیوں۔" وہ چیخی "تم مجھے جانتے نہیں ہو میں کون ہوں۔ مجھے جانتے نہیں ہو۔" اس کے ساتھ ہی وہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹی۔

میں ایسی کسی کارروائی کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں نے تیزی سے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ دبوچا اور زور سے موڑ دیا۔ وہ گھوم گئی اور اس کی پشت مجھ سے آ لگی۔ بڑی دیدہ

دلیری سے اس نے مجھے کہنی مارنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ اس کی کہنی ہوا میں گھوم کر رہ گئی اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی ایک الماری سے جا ٹکرائی۔ وحشی جانور کی طرح وہ پلٹی۔ توقع کے عین مطابق مجھے اس کے بائیں ہاتھ میں چھری نظر آئی۔

میں نے بڑے سکون سے اسے خود پر حملہ کرنے کا موقع دیا۔ ملازم کی طرح اس نے مجھے بھی ران پر زخم لگانا چاہا۔ غالباً اتنی ہمت اس میں نہیں تھی کہ میرے پیٹ یا سینے کو نشانہ بنا کر "قاتلہ" کہلانے کا خطرہ مول لیتی۔ اپنے وار خالی جاتے دیکھ کر وہ جھنا گئی اور کچھ خوفزدہ بھی ہوئی۔ کچھ بھی تھا آخر کو وہ ایک لڑکی ہی تو تھی۔ میں نے اس کی چھری والی کلائی پکڑ لی تھی۔ اس نے مجھے دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اس کی ٹھوڑی اوپر کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے اس کی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس دی۔ وہ اکڑ کر رہ گئی۔ اس کے حلق سے چیخ تک نہیں نکل رہی تھی۔ میں ذرا دباؤ بڑھاتا تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ لیکن میں اسے بے ہوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جسے کچھ سمجھانا ہو وہ بے ہوش ہو جائے تو پھر سیکھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے تھوڑی سی سزا ہی کافی ہوتی ہے۔

میں نے اس کی گردن پر ذرا سا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چھری پھینک دو۔"

اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ وہ چھری پھینکنا بھی چاہتی تھی اور نہیں بھی۔ میں نے دباؤ معمولی سا اور بڑھایا اور تحکم سے سرگوشی کی۔ "چھری پھینکو۔"

ناچار ہو کر اس نے چھری پھینک دی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹائی اتاری اور ایک ہی ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس کام میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن کسی نہ کسی طور پر یہ کام کر گزرا۔ اس کے بعد میں نے اسے دھکیل کر صوفے پر گرا دیا۔

وہ گردن کی تکلیف سے کراہ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنی شعلہ بار نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے کہا "تم کھانا کیوں نہیں کھاتی ہو؟"

وہ چیخ کر بولی "مر جاؤں گی لیکن کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

میں نے کہا "اگر ہمارا کھانا نہیں کھاتی ہو تو پھر ہمارا اے سی کیوں لگایا ہوا ہے۔ یہ پنکھا کیوں چل رہا ہے۔ یہ سب بھی بند کرو۔"

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور راہداری سے مین سوئچ تک کر کے کمرے میں جانے والی بجلی کی رو منقطع کر دی۔

اس کے بعد میں نے کمرے کے قالین پر پڑے ہوئے دونوں چکن رول اٹھائے، ایک کوک اس نے پی لی تھی، دوسری میں نے اٹھا لی۔ چھری بھی میں نے پتلون کی جیب میں ڈال لی پھر اطمینان سے باہر آ کر دروازہ مقفل کر دیا۔ وہ خونی نظروں سے مجھے گھورتی چلی جا رہی تھی۔

میں جانے لگا تو وہ چیخ کر بولی "میں جانتی ہوں یہ سب کس کا کیا دھرا ہے۔ میں اس کتے پر ہزار بار لعنت بھیجتی ہوں۔ لعنت بھیجتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی لیکن اس کے منہ پر تھوکوں گی بھی نہیں۔ اور تم۔ تمہیں تو میں زندہ دفن کرا دوں گی۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں۔ کس فیملی سے تعلق ہے میرا۔"

میں نے سوچا "مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ تم کون ہو اور تمہاری فیملی کیا ہے۔ اب تعارف حاصل کرنے کی باری میری نہیں تمہاری ہے۔"

میں اپنے ساتھ اس ریسٹ ہاؤس میں شیخ عاصم کو لانا چاہتا تھا۔ شیخ تو نہیں آ سکا تھا لیکن اس کی آفت زادی بہن آ گئی تھی۔ میں نے سوچا چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اپنی جان سے پیاری محبوبہ اور بہن کی کشش شیخ کو بھی یہاں لا سکتی تھی۔ اور اگر یہ کشش نہ بھی لاتی تو بھی میں نے کھینچ کر لے آنا تھا۔ میں نے لیونا کو شیخ عاصم سے چھین کر اسے شکستِ فاش دی تھی۔ اب میری خواہش تھی کہ وہ اس شکست کا نظارہ بھی کرے۔ لیونا کو ہوا بھی چھو کر گزر جاتی تو شیخ عاصم کو ناگوار گزرنا تھا۔ اب لیونا میری بانہوں میں تھی اور میں چاہتا تھا کہ عاصم اس منظر سے لطف اندوز ہو۔

قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

میں کمرے سے کافی دور چلا آیا تھا لیکن توسیہ اب بھی چیخ و پکار کر رہی تھی "میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ تمہیں زندہ دفن کرا دوں گی۔ تم کو پتا نہیں ہے تم نے کس پر ہاتھ ڈالا ہے۔"

میں اطمینان سے کامن روم میں چلا آیا۔ یہاں توسیہ کا شوہر باری موجود تھا۔ توسیہ کی چیخ و پکار اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ وہ ڈرا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں نے کہا "گھبراؤ مت! یہ سب کچھ وقتی ہے۔"

وہ بولا "گستاخی معاف جناب! لیکن توسیہ کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں اپنے آپ کو ہی نقصان نہ پہنچا لے۔ غصے میں وہ نیم پاگل ہو جاتی ہے۔"

"اپنے آپ کو نقصان پہنچانا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ تم زیادہ فکر نہ کرو۔"

توسیہ اب بند دروازے پر لاتیں چلا رہی تھی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھی۔ چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ باری کے چہرے پر اضطراب ہی اضطراب تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "توسیہ نے آپ پر حملہ تو نہیں کیا؟"

"کیا تھا لیکن اب نہیں کرے گی۔" میں نے جیب سے چھری نکال کر اسے دکھائی۔

اسی دوران میں حسینہ پیرس لیونا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بھی خوف کروٹ لے رہا تھا۔ کہنے لگی "جہاں! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہ پاگل لڑکی کہیں کچھ کر ہی نہ بیٹھے۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ وہ خود کو زخمی نہ کر لے۔ سنا ہے کہ اس کے پاس چھری بھی ہے۔"

"چھری تو میں اس سے لے آیا ہوں۔ اس کے کپڑوں کی تلاشی تم لے لو۔"

"نہ بابا نہ۔ میں تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گی۔"

اسی اثنا میں توسیہ تھک کر خاموش ہو گئی اور لیونا، باری وغیرہ کے چہرے قدرے پرسکون ہو گئے۔

اگلے روز میں نے ریسٹ ہاؤس کے منیجر جے سنہا کو بلایا اور اسے پھول لانے کو کہا۔ یہ کوئی عام پھول نہیں تھے۔ یہ ایک نایاب قسم کا خود رو پھول تھا اور اگر اسے نرسری میں لگایا جاتا تھا تو بے حد محنت و مشقت سے پروان چڑھتا تھا۔ ابوظہبی کے "لیونا لاج" میں بھی میں نے لیونا کی خواب گاہ میں ان پھولوں کا گلدستہ دیکھا تھا۔ وہ گلدستہ یقیناً سری لنکا یا مدراس وغیرہ سے منگوایا گیا ہو گا کیونکہ یہ یہاں کا مقامی تھا۔ پونجا کی خوشبو اپنی مثال آپ تھی۔ لیونا لاج میں یہ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لیونا کے فیورٹ پھول ہیں جو گراں قیمت پر باہر سے منگوائے گئے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق امارات میں ان پھولوں کا ایک گلدستہ شیخ عاصم کو کم و بیش پانچ ہزار درہم میں پڑا تھا۔ سری لنکا میں بھی پھولوں کی قیمت کم نہیں تھی۔ میں نے جے سنہا کو جو آرڈر دیا وہ ایک گلدستے کے لیے نہیں تھا، ایک پورے کمرے کی ڈیکوریشن کے لیے تھا۔ اس کے لیے پونجا کے دو ڈھائی ہزار پھول درکار تھے۔ جے نے ایک بار حیران نظروں سے دیکھا پھر تعظیم سے سر جھکا کر چلا گیا۔

سہ پہر کو ہی آرڈر کی تکمیل ہو گئی۔ پونجا کے قریباً ہزار پھول میری خواب گاہ میں پہنچ گئے (اس خواب گاہ کے انٹیریئر میں میں نے تھوڑی سی تبدیلیاں بھی کروائی تھیں)۔ پھولوں کے ساتھ جے سنہا ڈیکوریٹر بھی لے آیا تھا۔ اس کاریگر نے ایک گھنٹے میں کمرے کو شان دار طریقے سے آراستہ کر دیا۔ لیونا حسینۂ پیرس تھی اور پیرس و فرانس کے لوگوں سے زیادہ خوشبوؤں اور شرابوں کو کون جانتا ہے۔

شام کو میں بیڈ روم میں چلا آیا۔ میں لیونا کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ میں نے بند کمرے کی دو کھڑکیاں کھول دیں۔ میرا خیال تھا کہ اب پھولوں کی مہک لیونا تک پہنچے گی اور ہو سکتا ہے وہ بیڈ روم کی طرف کھنچی چلی آئے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کھڑکیاں کھلنے کے صرف دو منٹ بعد مجھے کوریڈور میں اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ اندر آ گئی۔

ہلکے سرخ رنگ کے فرانسیسی اسکرٹ میں وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کمرے کا منظر دیکھا اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ حیرت کی چیخ روکنے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ شاید اس نے کبھی تصور میں بھی پونجا کے اتنے پھولوں کو یک جا نہیں دیکھا تھا۔ شیخ عاصم اس کے لیے گلدستے فراہم کر کے اس پر احسان کرتا تھا۔ آج وہ ہزاروں پھولوں کے درمیان کھڑی تھی۔

میں بڑے اطمینان سے بیڈ پر نیم دراز تھا اور دل میں اتر جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ آگے بڑھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"اوہ... جہاں۔ تم کیا چیز ہو۔ تم نے تو مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ تم... میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہے ہو۔"

"یہ کچھ بھی نہیں ہے ڈارلنگ! میرے بس میں ہو تو جان نکال کر بھی تمہارے حوالے کر دوں۔"

وہ مسحور کن قاتلانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہی۔ پھولوں کی من پسند خوشبو نے اسے مست کر دیا تھا۔ اس نے دیواروں پر سجے پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرا اور آنکھیں موند کر سانس اندر کی طرف کھینچا، جیسے وہ ساری خوشبو ایک ہی بار اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہو۔ میں کشن سے ٹیک لگائے لیٹا رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی نرمی سے میرے بوٹوں کے تسمے کھولے اور انہیں اتار دیا پھر میری جرابیں اتاریں۔ میرے پیروں کو سکون پہنچانے کے لیے نرمی سے ان پر ہاتھ پھیرا وہ مجسم حسن تھی۔ اور میرے لیے "ریشہ خطمی" ہو رہی تھی۔ یہ ساری دولت کی کرشمہ کاری تھی۔ اگر اس کا فرادا کو کوئی کالا بھجنگ حبشی بھی یہ ساری آسائش و آرام مہیا کرتا تو شاید یہ اس کے قدموں میں بھی ایسے ہی لوٹنا شروع کر دیتی۔

وہ مجھ پر صدقے واری جا رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کمرے کی ایک الماری کے اوپر چھوٹا سا وڈیو کیمرا نصب ہے جو اس کی ساری حرکتوں کو نوٹ کر رہا ہے۔ اس نے بڑی نزاکت سے میری ٹائی کھولی اور قمیص کے چند بٹن کھول کر میرا سینہ عریاں کر دیا۔ اس کا چہرہ میرے سینے میں گھسا جا رہا تھا۔ اور وہ رومان انگیز سرگوشیاں کر رہی تھی۔

میں نے کہا "بھئی! ابھی تو رات بھی ہونی ہے۔ چلو آؤ پہلے کچھ چہل قدمی کر لیں۔ ڈنر کے لیے بھوک بھی تو پیدا کرنی ہے۔"

"نہیں۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

میں نے اسے بمشکل پیچھے ہٹایا۔ اسی دوران میں ادھر سے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ توسیہ پر ایک بار پھر غیظ و غضب کا دورہ پڑا تھا۔

"اوہ گاڈ۔" لیونا نے سر پکڑا "پھر تماشا شروع ہو گیا۔"

میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ لیونا بھی باہر آ گئی۔ میں توسیہ کے کمرے تک پہنچا وہ ہذیان بک رہی تھی۔ اس کا لباس شرابور تھا اور چہرہ گرد آلود اور غصے سے بگڑا ہوا تھا۔ پچھلے تقریباً چوبیس گھنٹے اس نے اسی طرح چیختے ہوئے گزارے تھے اور اب اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھر دشنام طرازی پر اتر آئی۔ میں کچھ دیر اس کی بے بسی کا نظارہ کرتا رہا پھر میں نے ملازموں کو ہدایت کی کہ اسے کھانا پہنچا دیا جائے۔

اسی رات باری نے میری اور لیونا کی وڈیو کیسٹ شیخ عاصم کے ایڈریس پر ابوظہبی ارسال کر دی۔ کیسٹ کو پہلے کویت پہنچنا تھا، پھر وہاں سے نئی پیکنگ میں ابوظہبی جانا تھا۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ عاصم کو میرے ٹھکانے کا علم نہ ہو سکے۔ اس کیسٹ کی ریکارڈنگ بیڈ روم میں ہوئی تھی۔ یہ وہی بیڈ روم تھا جو اس سے پہلے شیخ عاصم کے استعمال میں بھی رہا تھا، لیکن میں نے اس میں فوری طور پر ایسی تبدیلیاں کروائی تھیں کہ در و دیوار کو شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی سب کچھ پونجا کے پھولوں میں چھپا ہوا تھا۔

اس کیسٹ میں میں نے عاصم کو مخاطب کر کے تھوڑی سی گفتگو بھی کی تھی۔ اپنی اور لیونا کی محبت کا منظر دکھانے کے بعد میں نے عاصم سے کہا تھا "تم نے غزالہ کو مجھ سے زبردستی چھینا تھا عاصم۔ لیکن میں نے لیونا کو چھینا نہیں۔ وہ تمہارے منہ پر تھوک کر اپنی خوشی سے میرے ساتھ آئی ہے۔ ہم جہاں بھی ہیں، بہت خوش ہیں۔ ہم تمہارا منحوس سایہ بھی اپنے آس پاس دیکھنا نہیں چاہتے۔ چند دن بعد میں ایسی ہی ایک اور کیسٹ تمہیں ارسال کروں گا۔ اس میں تمہیں ایک اور خوش خبری سناؤں گا۔"

اگلے روز شام کو مجھے پتا چل گیا کہ کیسٹ عاصم کو مل گئی ہے اور اس نے ملاحظہ کر لیا ہے۔ مجھے مسٹر جی کلارک کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا "کہ آج سہ پہر شیخ عاصم کو سینے میں درد کی شکایت ہوئی تھی۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے لیکن اب اس کی حالت بہتر ہے اور شاید آج رات یا کل صبح گھر واپس چلا جائے گا۔"

مسٹر جی کلارک کو کیسٹ والی بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ کہنے لگے "معاشی بدحالی نے اب عاصم پر اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔ درحقیقت اس کے کاروبار کی بنیاد ہی جھوٹ پر تھی۔ اس جھوٹ کی ایک دو اینٹیں ہلی ہیں تو پوری دیوار ہی ہلنا شروع ہو گئی ہے۔ شاید تمہارے لیے یہ نئی خبر ہو کہ شپنگ کمپنی میں شیخ عاصم کے پارٹنر اور بہت قریبی دوست 'طالوی سرمایہ کار بڈسن فیلڈ' نے بھی عاصم کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ عملی طور پر یہ کمپنی بھی اب قریباً ٹوٹ ہی گئی ہے۔"

میں نے پوچھا "سری لنکا میں شیخ کی کیا پوزیشن ہے۔"

"درحقیقت سری لنکا ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں شیخ کے پاؤں ابھی تک جمے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہاں اس کا سیٹ اپ کافی پرانا اور مضبوط تھا۔ کولمبو کے مضافات میں اس کے کئی بڑے گودام پچاس ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں "فرسٹ اسٹورز" کہا جاتا ہے۔"

"یہاں کیا اسٹور ہوتا ہے؟"

"وہ سب کچھ جس میں رحیم اینڈ کمپنی ڈیل کرتی ہے۔ مسالہ جات، ہیوری، چائے، کوکونٹ آئل۔ اس کے علاوہ کوکونٹ آئل صاف اور پیک کرنے کی ایک بہت بڑی فیکٹری بھی "بٹی کالوا" کے قریب موجود ہے۔ اس فیکٹری کا شمار ایشیا کی سب سے بڑی فیکٹریوں میں ہوتا ہے۔ BATTICALOA کی اس فیکٹری میں تیل کی بہترین پیکنگ کا انتظام بھی موجود ہے۔ یہاں بوتل پیک اور ٹن پیک کا جدید ترین پلانٹ لگایا گیا ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق اس پلانٹ کی خرید میں بھی عاصم نے بہت گھپلے کیے تھے۔ پچھلے دنوں میں نے اس آئل فیکٹری کو خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن عاصم کا یہ یونٹ چونکہ خاصے منافع میں جارہا ہے لہٰذا وہ بیچنے پر آمادہ نہیں ہے۔"

کچھ دیر تک ہم سری لنکا میں عاصم کے کاروبار کے حوالے سے بات کرتے رہے پھر گفتگو اختتام کو پہنچ گئی۔

○☆○

تین دن اسی طرح گزر گئے۔ قوسیہ کی بھوک ہڑتال ابھی جاری تھی۔ وہ خاصی ڈھیٹ ثابت ہوئی تھی لیکن میں اندازہ لگا رہا تھا کہ اب اس کا دم خم کم ہو رہا ہے۔ تیسرے دن شام کے بعد میں اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے نظر آنے لگے تھے، رنگت بھی پھیکی پڑ گئی تھی مگر تن فن قائم تھی۔ میں اندر گیا تو وہ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر چیخ مار کر مجھ پر جھپٹی۔ اس نے مجھ پر چند مکے چلائے جنہیں میں نے با آسانی دائیں بائیں ہٹ کر اپنے چہرے سے دور رکھا۔ پھر وہ پاگل بلی کی طرح پنجے نکال کر مجھ پر جھپٹی۔ وہ میرا چہرہ نوچنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں پھر ان دونوں کلائیوں کو ایک ہی ہاتھ میں جکڑ لیا۔ وہ مجھ پر ٹانگیں چلانے لگی۔ وہ بڑے خوفناک انداز میں میری ناف کو نشانہ بنانا چاہ رہی تھی۔ میں اپنے خالی ہاتھ سے اس کی ککس کو بلاک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بری طرح ہانپ گئی اور نڈھال نظر آنے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر ذرا فاصلے پر پھینک دیا۔

وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھے خطرناک ترین نتائج کی دھمکیاں دینے لگی۔ جب اس کا غبار نکل گیا تو میں اس کے قریب چلا گیا "کیا خیال ہے، کھانا منگواؤں۔"

وہ بولی کچھ نہیں بس خشمگیں نظروں سے گھورتی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب اس میں بھوک برداشت کرنے کی سکت نہیں رہی۔ میں نے باہر نکل کر ایک ملازم کو بلایا اور اسے کھانا لانے کے لیے کہا۔ چند منٹ بعد دو ملازم کھانے کی ٹرے لیے دروازے پر آگئے۔ وہ اندر گھستے ڈر رہے تھے۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا تو وہ لڑکھڑاتے اندر آئے اور کھانا رکھ کر فوراً پرے ہٹ گئے۔ میں نے انہیں جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو میں نے قوسیہ سے کہا "چلو کھاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے اور ناز نخرے نہیں کرتے۔"

وہ ٹرے کی طرف سرکی۔ مجھے یہی لگا کہ وہ کھانا کھانے پر آمادہ ہوگئی ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ قوسیہ نے شیشے کا جگ پکڑا اور چیخ مار کر اسے قالین پر دے مارا۔ جگ کے چار پانچ ٹکڑے ہوگئے۔ اس نے ایک لمبا نوکیلا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اس کے بعد اس نے ٹرے کو ٹھوکر ماری اور وہ برتنوں سمیت اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی۔

قوسیہ نے شیشے کا نوکیلا ٹکڑا اپنی شہ رگ پر رکھا اور وحشی بلی کی طرح غرائی "مجھے یہاں سے جانے دو۔ ورنہ میں اپنا گلا کاٹ لوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں میں گلا کاٹ لوں گی۔ پیچھے ہٹ جاؤ، مجھے نکلنے دو یہاں سے۔"

"اگر میں نہ ہٹوں تو؟" میں نے سکون سے کہا۔

"اسے مذاق مت سمجھو احمق۔ ابھی دو سیکنڈ میں میری لاش تڑپتی نظر آئے گی۔ میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔" وہ بپھری ہوئی آواز میں چلائی۔ اس نے ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور شیشے کا ٹکڑا دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

میں خاموش رہا تو وہ اور بھی شیر نظر آنے لگی۔ میں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہی چھری نکالی جو میں نے اس سے چھینی تھی۔ میں نے چھری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "حرام زادی! اس شیشے کو پھینک دے۔ لے اس سے تیرا کام آسان ہو جائے گا۔ یہ لے چھری۔"

قوسیہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کا جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چھری زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دی "لے مار چھری۔ مجھے مار یا پھر اپنے آپ کو مار۔ اگر اپنے باپ کی ہے تو مار چھری۔ میں بھی دیکھوں لوگ خودکشی کیسے کرتے ہیں۔"

وہ سکتہ زدہ کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ میرے اندر غصہ لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ میں نے چلا کر کہا "اب رک کیوں گئی؟ گردن کیوں نہیں کاٹتی۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، دوسرا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اچھا! اگر تجھ میں ہمت نہیں تو میں یہ کام کر دیتا ہوں۔"

میں نے اڑنگا لگا کر اسے قالین پر گرا دیا اور وحشیانہ انداز میں چھری اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس کے حلق سے ویسی ہی آواز نکلی جو ذبح ہونے والی بکری کے حلق سے نکلتی ہے۔ میں نے ابھی چھری چلائی نہیں تھی لیکن وہ میرے گھٹنے کے نیچے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ یہی لمحہ تھا جب قدموں کی آواز آئی اور باری نے پکار کر کہا "نہیں صاحب نہیں۔"

وہ دروازے میں آن کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔ غالباً اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں سچ مچ قوسیہ کو زخمی یا ہلاک کر دوں گا۔

میں نے قوسیہ کو دیکھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ لرزتی جا رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر ہٹ گیا۔ چھری ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا "مرنا اتنا آسان نہیں ہوتا بے بی! اور تجھ جیسی شیخ زادیوں کے لیے تو بالکل نہیں۔ تو نے ساری زندگی آرام آسائش کے جھولے جھولتے ہوئے گزاری ہے۔ تجھے کیا پتا موت کی سختی کیا ہوتی ہے۔"

میں نے چھری کھلے دروازے سے باہر پھینک دی۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ایک دم ہی ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے باری کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کر میں نے اس سے کہا "اس کے لیے کھانا بھجواؤ۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ کھائے گی۔"

باری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شب باری سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا "ہاں۔ ہڑتال ختم ہوئی ہے یا نہیں؟"

باری "ہو گئی ہے جناب۔ بلکہ بہت خوب ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے مزید کھانا بھجوایا تھا۔ وہ اس کے سامنے پڑا رہا۔ ہاتھ نہیں لگایا۔ بس گھٹنوں میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا تو میں ہمت کر کے اندر گیا۔ میں نے کہا قوسیہ! تمہیں میرے ساتھ دشمنی ہے، اپنے ساتھ تو دشمنی نہ کرو۔ کھانا کھا لو۔" وہ آنسوؤں بھری ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ مجھے تھوڑی ہمت ہوئی۔ میں نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھی اور اس کے سامنے کھسکا دی۔ اس کے لیے پلیٹ میں چاول اور سالن ڈالا۔ میں نے چمچ پکڑایا تو اس نے پکڑ لیا۔

اگر میں غلط نہیں ہوں جناب! تو اس میں خاصی تبدیلی نظر آرہی ہے۔"

"بہرحال ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تمہیں محتاط رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ تمہارا اس کی طرف زیادہ جھکاؤ نہیں ہونا چاہیے۔ آخر تم شوہر ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یا قوسیہ نے جو کچھ کرایا ہے اس کے لیے قوسیہ معافی بھی مانگے تو یہ ایک معمولی سی بات ہوگی۔"

"میں اس حقیقت کو سمجھتا ہوں جناب!"

"یہ لو۔ یہ ایک اور کیسٹ ہے۔ اسے بھی پہلے کی طرح اپنے سالے جی کی طرف پارسل کر دو۔" میں نے ایک کیسٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

باری میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے اس کیسٹ کے بارے میں پوچھتا کہ اس میں کیا ہے۔ میں بھی فی الحال اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کیسٹ میں بھی شیخ عاصم کی "دلچسپی" کا کچھ سامان تھا۔ کل جو کچھ قوسیہ کے ساتھ ہوا تھا وہ سب کچھ اس وڈیو کیسٹ میں ریکارڈ تھا۔ قوسیہ کی چیخ و پکار، اس کی دھمکیاں۔ خودکشی کا اعلان اور پھر موت کو اصل صورت میں اپنے سامنے دیکھ کر تھر تھر کانپنا۔ یہ سب کچھ میں نے کل ہی ریکارڈ کر لیا تھا۔ وسیع کمرے میں کیمرے کا زاویہ کچھ ایسا رکھا گیا تھا کہ فرش کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور کمرے کی شناخت بہت مشکل تھی۔ باری نے یہ کیسٹ بھی میجر جے سنہا کے ذریعے شیخ عاصم کو پارسل کر دی۔ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے باری خود ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں جاتا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جے سنہا ہر کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ میں نے جے کو ہر طرح اعتماد میں لے لیا تھا۔ بالفاظ دیگر جے ہر راز میں شریک تھا۔ دوپہر کو معلوم ہوا کہ کیسٹ شیخ کو پارسل ہو گئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ پہلی کیسٹ کی طرح یہ کیسٹ بھی شیخ عاصم کو "خوشی" سے ناچنے پر مجبور کر دے گی اور اس کا دل جو پہلے ہی باغ باغ ہے اور بھی باغ و بہار ہو جائے گا۔ ہو سکتا تھا کہ اسے پھر اسپتال کا چھوٹا سا چکر لگانا پڑ جاتا۔

اگلے روز پھر مسٹر جی کلارک کا فون آیا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ ابوظہبی میں ایک نیا واقعہ ہوا ہے۔ شیخ عاصم کی رہائش گاہ پر ایک گارڈ کے ہاتھوں اچانک ٹامی گن چل جانے سے پانچ افراد مارے گئے ہیں۔ ان میں فیملی کی پرانی ملازمہ "بے جی" بھی شامل ہے۔

عاطف بے جی کے نام پر میں چونکا۔ میں نے کہا "کیا واقعی ایسا ہوا ہے جناب؟"

"بالکل نہیں۔" مسٹر کلارک نے جواب دیا "نہایت خاص ذرائع سے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق ان پانچ افراد کو شیخ عاصم نے خود فائرنگ کرکے ہلاک کیا ہے۔ وہ ان دنوں اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ ہوا پر بھی تلواریں چلا رہا ہے۔ ذرا سی بات پر اس بری طرح بھڑکتا ہے کہ دیکھنے والے سہم جاتے ہیں۔ یقیناً لیونا کی جدائی بھی اسے بہت شاک گزری ہے۔"

میں مسٹر کلارک کو بتانا چاہتا تھا کہ لیونا کی جدائی تو اسے شاک گزری ہی ہے لیکن آج شیخ کا آتش فشاں پھٹنے کی ایک اور وجہ ہے۔ اسے اپنی بہن کے حالات کا پتا چلا ہے۔ بہرحال یہ ساری تفصیل ٹیلی فون پر مناسب نہیں تھی۔

مسٹر کلارک فی الوقت میرے لیے معلومات کا بے حد اہم ذریعہ تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے میں ان سے نہ صرف سری لنکا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا بلکہ امارات اور پاکستان کی خبریں بھی وہ مجھے بہم پہنچا رہے تھے۔ پاکستان کے حوالے سے میں ان کے منہ سے کوئی اچھی خبر سننا چاہتا تھا لیکن اس خبر کا دور دور نشان نہیں تھا۔ پاکستان میں غزالہ اور چچا چچی کا ابھی تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ کسی وقت تو میرے دل میں ہول سا اٹھتا تھا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کہیں شیخ عاصم نے چچا اور ان کی فیملی کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان تو نہیں پہنچا دیا۔ خدانخواستہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سب۔ اس سے آگے سوچنا بھی میرے لیے محال تھا۔ کوئی دل کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگتا تھا۔ سینے کی گہرائیوں سے کہیں آواز آتی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ قدرت میرے ساتھ اتنی بڑی ناانصافی نہیں کر سکتی۔

میں فون بند کرکے مڑا تو میرے عقب میں حسینہ پیرس کھڑی تھی۔ کھڑکی سے آنے والی ہوا میں اس کے سنہری بال ہولے ہولے جنبش کر رہے تھے۔ وہ سراپا شباب تھی اور اس کی ملکوتی حسن پر ان دنوں میرا تصرف تھا۔ مجھے اس کی حسین آنکھوں میں پریشانی نظر آئی۔ اس پریشانی کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس نے فون پر میری اور مسٹر کلارک کی گفتگو کے کچھ حصے سن لیے تھے۔

وہ اداسی سے بولی "جہاں! وہی ہو رہا ہے ناں جس کا خدشہ تھا۔ عاصم غصے سے دیوانہ ہو گیا ہے۔ میں یہاں بیٹھ کر اندازہ لگا سکتی ہوں کہ اس کے تیور اور ارادے کتنے خطرناک ہوں گے۔ مجھے تو کسی وقت خوف آنے لگتا ہے۔ اگر وہ خدانخواستہ مجھ تک پہنچ گیا تو میرے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا جہاں۔"

میں نے بڑی آہستگی سے اسے بانہوں میں لے لیا "ان بانہوں کے گھیرے میں عاصم کی طرف سے آنے والا ہاتھ تمہیں نہیں چھو سکتی۔" میں نے کہا۔

"کسی وقت تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں مان کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب آگے کی سوچو ڈارلنگ۔"

"میں حیران ہوں کہ تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ جانتے بوجھتے بھی میں تمہاری باتوں کے دھارے میں تنکے کی طرح بہتی چلی جاتی ہوں۔"

"یہ سب میری والہانہ محبت کا نتیجہ ہے۔" حالانکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ 'یہ سب میری دولت اور دولت و ملک کا نتیجہ ہے۔ ورنہ تمہارا شمار دنیا کی خوب صورت عورتوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی خرانٹ عورتوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔'

وہ میرے ساتھ لگ گئی اور منمناتی آواز میں بولی "میں نے سنا ہے، یہ شیخ لوگ اپنا انتقام نہیں بھولتے۔ اپنے گھر سے بھاگنے والی عورت کا پیچھا قبر کی دیواروں تک کرتے ہیں۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"کہو کہو۔" میں نے اس کے خوشبودار بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی ہمت بندھائی۔

"اگر کل کلاں تمہارا دل مجھ سے بھر گیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔"

"خبردار! ایسا خیال بھی دماغ میں مت لانا۔ میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

وہ میرے ساتھ چپک گئی "کبھی کبھی تو اپنے آپ سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے جہاں۔ یوں لگتا ہے کہ کسی بھی روز عاصم سے میرا آمنا سامنا ہو جائے گا اور وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ غصے سے پاگل ہو چکا ہوگا۔ میں نے ابھی فون پر تمہاری بات سنی ہے۔ ہلاک ہونے والے پانچ بندوں میں بے جی بھی شامل ہے۔ بے جی کئی پہلوؤں سے بڑی اچھی عورت تھی۔ اس کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔"

لیونا کا دھیان بٹانے کے لیے میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ جلد ہی وہ سنبھل گئی۔ اس رات قریباً دو بجے اچانک ایک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا لیونا میرے ساتھ لیٹی ہوئی ہے اور کانپ رہی ہے۔

بمشکل اسے خود سے جدا کیا "کیا ہوا؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

اس نے خواب گاہ کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا اور بولی "وہاں کوئی ہے۔ میں نے ابھی ایک سایہ دیکھا ہے۔ وہ کھڑکی کے شیڈ کے ساتھ لٹک کر اوپر چھت پر گیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ چھت پر گیا ہے۔"

میں نے گاؤن کی ڈوری باندھ کر لائٹ آن کی اور کال بیل بجائی۔ چند سیکنڈ میں ایک سینئر ملازم حاضر ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ انچارج گارڈ کو بلائے۔ انچارج آیا تو میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور حکم دیا کہ فوراً اپنے ساتھیوں کو الرٹ کرو اور چھت وغیرہ کا معائنہ کرو۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر ریسٹ ہاؤس کی بیشتر روشنیاں جل گئیں۔ گارڈز کے بھاری بوٹوں سے دھڑ دھڑ کی آواز گونجنے لگی۔ لیونا نے میرا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ بولی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ عاصم ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہو گیا ہے۔"

"وہم مت کرو۔ جو کچھ بھی ہے، ابھی سامنے آ جائے گا۔"

دس پندرہ منٹ کی بھاگ دوڑ کے باوجود گارڈز کو کچھ نہیں ملا تو لیونا کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آنے لگا۔ وہ اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی "جو کچھ بھی ہے جہاں! تمہیں یہاں کی سیکیورٹی بہتر بنانا ہوگی۔ ایک بار پھر چھان بین کر لو کہ یہاں کے ملازموں میں کوئی پرانا ملازم تو نہیں ہے۔"

"میں اس بات کا اطمینان کر چکا ہوں سویٹی۔" میں نے اس کا گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کل شام بھی شک ہوا تھا کہ کوئی ہمارے بیڈ روم کے آس پاس موجود ہے۔"

رات کے کھانے سے پہلے لیونا اکثر پیراکی کا شوق پورا کرتی تھی۔ جس وقت وہ پیراکی کر رہی ہوتی تھی دو خاتون ملازموں کے سوا کسی کو سوئمنگ پول کی طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ حسینہ پیرس کو پیراکی کے لباس میں دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اگلی شام وہ پیراکی میں مصروف تھی۔ میں پول کے کنارے ایزی چیئر پر بیٹھا شام کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں فون سننے کے لیے چند منٹ کے لیے دور گیا۔ اسی دوران میں اتفاقاً لائٹ چلی گئی۔ لائٹ گئے بمشکل ایک دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ پول کی طرف سے لیونا کی تیز چیخیں سنائی دیں۔ میں بات ادھوری چھوڑ کر پول کی طرف دوڑا۔

میں نے دیکھا تاریکی میں لیونا میری طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔ میں نے اسے آواز دی۔ وہ دوڑتی ہوئی میری بانہوں میں آ گئی۔ اسی دوران میں جنریٹر آن ہو گئے۔ ریسٹ ہاؤس جگمگا اٹھا۔ لیونا کا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ اس نے انگلی سے سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا اور بولی "وہاں کوئی ہے جہاں۔ اس نے مجھے پکڑا ہے۔ پانی کے اندر سے میرا پاؤں کھینچا ہے۔"

ایک ملازمہ نے لیونا کے جسم پر تولیہ ڈالا اور لیونا کو اندر لے گئی۔ ہم بھاگتے ہوئے پول پہنچے۔ پول اب روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ گارڈز نے چند سیکنڈ کے اندر پول کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ پول کے اندر انسان تو کجا کوئی تنکا تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ منیجر صاحب کے اشارے پر گارڈز نے پول کے اردگرد کی پھولدار جھاڑیوں اور باڑوں کی اچھی طرح تلاشی لی۔ حسبِ توقع کچھ نہیں ملا۔ اس کے بعد اگلے تین روز میں کم از کم دو مزید ایسے واقعات ہوئے جن میں لیونا کو شدید خوف کا شکار ہونا پڑا۔ ایک واقعے میں لیونا کو اپنے باتھ روم کی چھت پر کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ دوسرے واقعے میں ایک خاتون ملازمہ کے سر پر کسی نامعلوم شخص نے اس وقت ڈنڈا مارا جب وہ لیونا کے لیے بیڈ ٹی لے کر جا رہی تھی۔ ملازمہ تیورا کر گر پڑی اور چائے کے برتن ٹوٹ گئے۔

لیونا بڑی ہوشیار و جہاں دیدہ لڑکی تھی لیکن پے در پے واقعات نے اسے جیسے بوکھلا دیا تھا۔ شام کی چائے پر میں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتا رہا تاکہ اس کا بے جا خوف دور ہو۔ میں نے مذاق کے لہجے میں کہا "یہ عاصم وغیرہ کا چکر نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم پر وہم کا حملہ ہو گیا ہے۔ شاید تم نے دبئی میں جس سائیں صاحب کا مذاق اڑایا تھا اسی نے تم پر کچھ پھونک دیا ہے۔"

وہ چونک کر بولی "تم نے یہ بات مذاق میں کی ہے لیکن مجھے سچ مچ ایسے ہی لگ رہا ہے کہ کسی نے میرے دماغ کو کچھ کر دیا ہے۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز میں وہ سائیں صاحب بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ آئیں تو ان سے معافی تلافی مانگ لینا۔"

"بس ٹھیک ہے جناب! آپ سب کچھ سائیں صاحب کے کھاتے میں ڈال کر بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں۔ یہاں کوئی خاموشی سے میرا یا آپ کا گلا کاٹ جائے گا۔"

"سویٹ ہارٹ! آج دوپہر تم نے خود دیکھ لیا ہے، یہاں کی سیکیورٹی میں کہیں ذرا سی کمی بھی نہیں ہے۔ فی الحال تو

میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کہ کیا چکر ہے۔"

شروع میں میں نے لیونا کے واویلے واس کا وہم خیال کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شیخ عاصم سے بری طرح خوف زدہ تھی اور اپنی بے وفائی کا احساس... ڈر بن کر اس کے اندر جم گیا تھا لیکن لیونا کی ذاتی ملازمہ کے سر پر چوٹ لگنے کے بعد میں بھی تھوڑا سا چونکا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ کوئی گڑبڑ موجود ہے۔

اگلا دن بڑا چمکیلا اور خوشگوار تھا۔ رات کی بارش کے بعد نرم دھوپ نکلی تھی۔ اس دھوپ میں ناریل، ناڑ اور پام کے درخت چمک رہے تھے اور ہر طرح کی ہریالی میں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کبھی میں ایسے مناظر سے لطف اندوز ہوتا تھا، مگر اب یوں لگتا تھا کہ میں ہر قسم کی خوب صورتی سے (جس میں لیونا بھی شامل تھی) بہت دور چلا گیا ہوں۔ میرے ارد گرد حسن مختلف شکلوں میں موجود تھا لیکن میرے اندر آگ روشن تھی۔ میں ٹہلتا ہوا اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں نوسیہ رہائش پذیر تھی۔ نوسیہ والا معاملہ کافی اچھا جا رہا تھا۔ وہ نہ صرف کھانا کھانے لگی تھی بلکہ کسی وقت بارک سے تھوڑی بہت بات بھی کر لیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ غرور اور ہٹ دھرمی کی انتہا کو چھونے کے بعد اسے اپنی حقیقت کا احساس ہوا ہے اور اس کا رویہ تبدیل ہو رہا ہے۔

ابھی میں نوسیہ کے کمرے تک پہنچا نہیں تھا کہ ریسٹ ہاؤس کے مین گیٹ کی طرف ہلچل نظر آئی۔ گارڈز کسی شخص سے الجھ رہے تھے۔ اچانک مجھے چڑھتے سورج کی روشنی میں نیزے کی چمکتی ہوئی انی نظر آئی۔ میں ٹھٹک گیا اور مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ میرا اندازہ درست نکلا وہ سائیں عالی ہی تھا۔ ابھی کل ہی میں لیونا سے اس کے بارے میں بات کر رہا تھا، آج وہ بلائے ناگہانی کی طرح آدھمکا تھا۔ وہ حسب سابق جنگلی لباس میں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جب وہ دبئی کے ایم اے ولاز میں نمودار ہوا تھا تو اس نے ستر پوشی کے لیے کیلے کے پتے استعمال کیے تھے، آج اس نے کپڑے کا جانگیہ پہن رکھا تھا۔ اس نے سر پر افریقیوں کی طرح مرغی کے پر اڑسے ہوئے تھے اور چہرے پر سفید چونے سے دھاریاں بنا رکھی تھیں۔ وہ فر فر انگریزی بول رہا تھا اور پہرے داروں سے الجھ رہا تھا۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ وہ کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ افریقہ کے ایک ملک کا حکمران ہے اور مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے سرکاری دورے پر نکلا ہوا ہے۔ امارات کے بعد وہ سری لنکا آیا ہے اور اس کے بعد کئی دوسرے ملکوں کا دورہ بھی اس نے کرنا تھا۔ مجھے دیکھ کر گارڈز پیچھے ہٹ گئے۔

سائیں مجھ سے مخاطب ہوا اور پھنکار کر بولا۔

"شفیع محمد! تم نے مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ امارات میں تمہاری وجہ سے میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس نے میرا دل غرق کر دیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میری کتنی بے عزتی ہوئی ہے۔"

"کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ چودہ جنات کا وفد بھی آیا ہوا تھا۔ ان میں میری کابینہ کے وزیر بھی تھے۔ وزیروں کے قیام و طعام کا ٹھیک بندوبست چونکہ نہیں تھا اس لیے وہ میرے خلاف ہو گئے۔ ان میں ایک فارورڈ بلاک بن گیا۔ وزیر تجارت سمیت پانچ وزیر فوراً ازکر افریقہ پہنچ گئے اور انہوں نے میرے خلاف شدید قسم کے الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک "صحافی جن" کو بھی چونکہ اپنی بیگم کے لیے اچھی شاپنگ کا موقع نہیں مل سکا تھا لہٰذا وہ بھی فارورڈ بلاک کے حق میں زور و شور سے بولنے لگا۔ اس سارے ہنگامے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کل میری حکومت کا تختہ الٹ گیا ہے اور اب میں ایک معزول حکمران کی صورت میں یہاں تمہارے پاس موجود ہوں۔ مجھے اور میرے وفادار تین وزیروں کو یہاں سیاسی پناہ کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم تمہیں پناہ دیتے ہیں۔ اندر آجاؤ اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو۔"

"یہ کام اتنا آسان نہیں ہے بچے! اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ تمہارے ملک کے تعلقات میرے ملک سے سخت خراب ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں بیٹھ کر ہم نے سیاسی بیان جو دینے ہیں۔ سیاسی چالیں بھی چلنی ہیں پھر ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ وزیر خارجہ بھی میرے ساتھ ہے۔ آخر ملکوں کے وزرائے خارجہ کی طرح موصوف بھی ذرا رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اس کے لیے روزانہ کم از کم چھ سو گیلن شراب درکار ہوگی۔ دیگر لوازمات بھی ضروری ہیں۔"

"اچھا تم اندر تو آؤ۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

سائیں اندر آ گیا۔ وہ بڑی شان سے زمین پر نیزہ ٹیک کر چل رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزر کر آگے گیا تو میری نگاہ اس کی پشت پر پڑی تو میں دنگ رہ گیا۔ اس کے جانگیے میں پشت پر ایک کافی بڑا سوراخ تھا جس کی وجہ سے وہ عریاں ہو رہا تھا۔ پہرے داروں کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ سائیں کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ اخبار میں ناریل کے تیل میں تلے ہوئے مچھلی کے پکوڑے تھے۔ سائیں منہ جھکا جھکا کر بکری کی طرح پکوڑے بھی کھا

رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی دفعہ میں نے اسے کوئی ڈھنگ کی شے کھاتے دیکھا تھا۔ اخبار پر میری نظر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ یہ تازہ اخبار نہیں تھا۔ اس اخبار کی وجہ سے مجھے ایک اہم سوال کا جواب مل گیا۔

میں نے منیجر جے سے کہا کہ وہ سائیں عالی کو بالائی منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دے۔ سائیں کا جانگیہ دیکھ دیکھ کر جے کو بھی ہنسی روکنا دشوار لگ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں کمرے میں پہنچا تو لیونا بڑی حیران نظر آ رہی تھی۔ بولی "دیکھو جہاں! کتنی عجیب بات ہے۔ ہم ابھی کل ہی سینٹ (سائیں) کی بات کر رہے تھے اور سینٹ یہاں آموجود ہوا ہے۔ کیا واقعی یہ کسی روحانی طاقت کا مالک ہے۔"

"یہ ایک ایسا معما ہے جو میں بھی ابھی تک پوری طرح حل نہیں کر سکا۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ اس سے معذرت کر لوں۔ میں نے دبئی میں غصے سے اسے پاگل کہہ دیا تھا۔ آج کل مجھے ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود پاگل پن کا شکار ہو رہی ہوں۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہیں ایسا کرنے سے سکون ملے گا تو ضرور کرو لیکن ایک بات یاد رکھنا، تمہاری معذرت قبول کرنے کے لیے سائیں کوئی بھی شرط عائد کر سکتا ہے۔"

"کیا مطلب!" وہ چونک کر بولی۔

"نہیں کوئی ایسی ویسی شرط نہیں۔ سائیں بالکل تنہا زندگی گزارتا ہے۔ عورت اس کے لیے اتنی ہی بے معنی ہے جتنا کسی جلتے ہوئے صحرا میں کسی کے لیے اوورکوٹ بے معنی ہو سکتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد لیونا سائیں سے ملنے کے لیے گئی۔ واپس آئی تو اس سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ کہنے لگی "جہاں! سینٹ تو واقعی پہنچی ہوئی چیز ہے۔ مجھے ایسی باتوں پر بالکل یقین نہیں تھا اور نہ اب ہے لیکن سینٹ جی نے مجھے ششدر کر دیا ہے۔ پچھلے تین چار دن سے میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں سے کئی باتیں سینٹ نے مجھے بتائی ہیں... وہ اشاروں کنایوں میں بات کرتا ہے لیکن بات فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ سائیں کو سب پتا تھا کہ پچھلے چار پانچ دن میں حسینہ پریس کے ساتھ یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ سائیں عالی نے ہی کیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سائیں کو مچھلی کے پکوڑے کھاتے دیکھا تھا۔ وہ جس اخبار میں پکوڑے نوش کر رہا تھا وہ تین روز پرانا تھا۔ یہ اخبار میں نے بھی پڑھا تھا اور اس میں امارات کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر پر بال پوائنٹ سے نشان لگایا تھا۔ یہ وہی نشان والا اخبار تھا اور سائیں نے ریسٹ ہاؤس سے حاصل کیا تھا۔ اس اخبار کو دیکھنے کے بعد مجھے شک گزرا تھا کہ سائیں آج ہی ریسٹ ہاؤس میں وارد نہیں ہوا بلکہ پچھلے تین چار روز سے یہاں موجود ہے۔ اس کے فوراً بعد میں نے ریسٹ ہاؤس کے منیجر جے سنہا کو بلا کر اکیلے میں اس سے پوچھ گچھ کی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا پھر اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ سائیں پچھلے پانچ دن سے یہاں موجود ہے۔ جے سنہا لرزاں لہجے میں بولا "میں سائیں جی سے ایک دو مرتبہ پہلے بھی مل چکا ہوں۔ مجھے انڈیا کی فلم انڈسٹری دیکھنے کا جنون تھا کیونکہ ہم یہاں سری لنکا میں اکثر انڈیا کی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ وہاں بمبئی میں مجھے سائیں جی سے ملنے کا اور ان کی کرامتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انڈین فلم نگری کے بڑے بڑے ستارے اور دولت مند فلم ساز اور ہدایت کار سائیں صاحب کے قدموں میں بیٹھنا فخر سمجھتے تھے۔ وہاں یہ مشہور تھا کہ سائیں جی جس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں وہ اپنی مراد پا لیتا ہے۔ میں ازار کی شب سائیں جی کو یہاں ریسٹ ہاؤس میں دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ ایک چوکیدار نے سائیں جی کو عقبی دیوار سے احاطے میں کودتے دیکھا تھا اور مجھے بتایا تھا۔ میں سائیں جی کو پہچان کر سکتے کی حالت میں رہ گیا۔ سائیں جی نے مجھ سے کہا کہ وہ یہاں دو تین دن رازداری سے رہنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ دو تین دن تک ان کی آمد کے بارے میں کسی کو نہ بتایا جائے۔ میں معافی چاہتا ہوں سر! مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سائیں جی کی بات ٹال سکتا۔"

ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ سائیں نے ہمیشہ کی طرح اپنی آمد کو حیران کن اور اوٹ پٹانگ بنایا تھا۔ یوں اس نے لیونا کو بھی تھوڑا سا مزہ چکھایا تھا کیونکہ وہ اسے ایم اے ولاز میں "پاگل" کہہ بیٹھی تھی۔ بعد ازاں یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ سائیں ہی یہاں ریسٹ ہاؤس میں لیونا کو خوف زدہ کرتا رہا تھا۔ سوئمنگ پول میں گھس کر لیونا کا پاؤں کھینچنے والا بھی سائیں عالی ہی تھا۔ ملازمہ کو ڈنڈا مار کر نیم بے ہوش بھی سائیں نے ہی کیا تھا۔ تاہم اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی۔ سائیں کے کئی کام بالکل ہی ناقابل فہم ہوتے تھے۔

منیجر جے نے ایک بات اور بھی بتائی تھی اور یہ خاصی اہم بات تھی۔ جے کے مطابق سائیں کے پاس ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی بھی تھا جو اکثر وہ اپنے پہنے ہوئے جانگیے میں چھپا لیتا تھا۔ جے نے پچھلے تین دنوں میں دو بار سائیں کو اس واکی ٹاکی پر بات کرتے سنا تھا (پچھلے چار پانچ دن سائیں نے ریسٹ ہاؤس کے ایک بالائی کمرے میں قیام کیا تھا۔ اس کا علم فقط منیجر جے سنہا کو تھا)

جے سنہا کے بیان کے مطابق سائیں جی نے یہ واکی ٹاکی اس سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور غالباً اردو میں اس کے سامنے ہی واکی ٹاکی پر بات کرتا رہا تھا۔

میں لیونا کے ساتھ رات کا کھانا کھانے کے بعد بالائی منزل پر سائیں کے کمرے میں پہنچا تو وہ ابھی کھانے میں مشغول تھا۔ کھانا حسب معمول اوٹ پٹانگ تھا۔ وہ پلاؤ اور کھیر کو آپس میں ملا کر کھا رہا تھا۔ اتفاقاً واکی ٹاکی بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کھانے کے ساتھ ساتھ بات بھی کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو اردو میں تھی پھر وہ انگریزی میں بات کرنے لگا۔ وہ کسی مدن لال نامی مقامی شخص سے کہہ رہا تھا کہ وعدہ کرنے کے باوجود وہ اس سے ملنے کیوں نہیں آیا۔ مدن لال غالباً اپنی مصروفیت کا ذکر کر رہا تھا اور وعدہ خلافی پر سائیں سے معذرت خواہ تھا۔ بات کرنے کے بعد سائیں نے واکی ٹاکی بند کر کے اپنے جانگیے میں ڈال لیا۔ بس اس کا انٹینا ہی جانگیے سے باہر تھا۔ سائیں چاہتا تو یہ انٹینا بھی جانگیے کے اندر کر سکتا تھا کیونکہ واکی ٹاکی کا سائز ماچس کی ڈبیا سے کچھ ہی بڑا تھا۔ لگتا تھا کہ انٹینا جانگیے سے باہر رکھ کر وہ اسٹائل مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا "یہ کس سے بات کر رہے تھے؟"

بولا "حکومت ہاتھ سے نکل گئی ہے' اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ جب حکمران جلاوطن ہوتے ہیں تو انہیں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے چھوٹا موٹا کاروبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ یہاں سری لنکا میں گاڑیوں کا بزنس شروع کر دوں۔ تمہارے پرانے یار شیخ عاصم کا یہاں کافی کاروبار ہے۔ ایک انٹرنیشنل کمپنی کے ساتھ مل کر اس نے یہاں سری لنکا میں چھوٹے سائز کی جیپ بنانے کا کام شروع کیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو وہ یہ چلا چلایا کام بیچ سکتا ہے کیونکہ اسے اپنے کاروبار کے کچھ دوسرے شعبوں میں سرمایے کی ضرورت ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ سائیں کی اس اوٹ پٹانگ بات کے پیچھے ایک سنجیدہ حقیقت موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ سائیں یہ سب کچھ مسٹر جی کلارک کے مشورے سے ہی کر رہا مسٹر جی کلارک کا بھی یہی خیال تھا کہ شیخ عاصم کو کاروباری طور پر نیچا دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ سری لنکا میں اس کے منافع بخش یونٹ خرید لیے جائیں۔ شیخ یہ یونٹ فروخت کرنے پر کسی طور آمادہ نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے بیماریونٹ فروخت کر رہا تھا اور اپنی ساری کاروباری قوت سری لنکا جمع کر کے یہاں سے COME BACK کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے سائیں سے پوچھا "پھر تمہیں اس سلسلے میں کامیابی ہوئی ہے یا نہیں۔"

وہ بولا "ایک الو کے چرخے سے میری بات چل رہی ہے۔ اس کا نام مدن لال ہے۔ یہاں کولمبو کے مضافات میں شیخ عاصم کے بہت بڑے اسٹورز ہیں' انہیں فرسٹ اسٹورز کہا جاتا ہے۔ مدن لال ان اسٹورز کا ہیڈ انچارج ہے! پالیسی میکر بھی۔ مدن لال سے میری ملاقات طے ہوئی تھی وہ آ نہیں سکا۔"

"کوئی خاص وجہ ہے؟"

"ہاں جیپ کی مینوفیکچرنگ کینڈی میں بھی ہو رہی تھی وہاں چونکہ کام بند کر دیا گیا ہے اس لیے وہاں کی ساری پروڈکشن اور خام مال بھی فرسٹ اسٹورز میں آ رہا ہے۔ پاس کے قریب تیار شدہ جیپیں فرسٹ اسٹورز میں منتقل ہو چکی ہیں۔ اب خام مال سے بھرے ہوئے ٹریلر آ رہے ہیں۔ مدن لال نے کہا ہے کہ جونہی اسے فرصت ملتی ہے وہ حاضر ہوتا ہے۔ میں ایک دو روز انتظار کروں گا' اگر وہ حاضر ہو گیا ٹھیک ہے ورنہ کسی جن کو بھیج کر اسے اغوا کروا لوں گا۔"

سائیں عالی کی گفتگو نے میری سوچ کا رخ ایک نئی سمت میں موڑ دیا۔ میں شیخ عاصم کو سری لنکا میں رکھنا چاہتا تھا اسے سری لنکا بلانے کا ایک بڑا موزوں طریقہ میری سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اس طریقے پر عمل کرنے میں مجھے کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ پہلے میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سائیں عالی کیا کرتا ہے۔

میں نے سائیں سے ایک بار پھر سورج کے بارے میں پوچھنا چاہا' اس کے علاوہ میری خواہش تھی کہ وہ مجھے کالونی کے حالات کے متعلق کچھ بتائے۔ سائیں نے بس یہ کہہ کر بات لپیٹ دی کہ کالونی اور سورج دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ گفتگو کا رخ موڑ کر فوسیہ کی طرف لے گیا۔ پوچھنے لگا "وہ ماہی منڈا کچھ ٹھیک ہوا ہے یا نہیں؟ اسے جلد سے جلد ٹھیک کرنا ہے میں اس کی ماں سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"تم نے دو ڈھائی مہینے کا ٹائم دیا تھا' ابھی تو دس بارہ دن ہی ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ کبھی بیماری ہے جاتے جاتے ہی جائے گی۔ شوہر کے ساتھ اس کے کافی اختلاف ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے بات کرنے لگیں۔"

"بس یہ ساری ذمے داری تمہاری ہے۔ اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس کے لیے تمہیں ہی جواب دینا ہوگا۔"

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا۔ سائیں نے "وعلیکم السلام" کہا اور ہوا میں اشارے کر کر کے کسی "جن" سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کمال کا اداکار بھی تھا۔ لگتا تھا کہ سچ مچ اس کے سامنے کوئی چہرہ موجود ہے اور وہ اس سے ہم کلام ہے۔ وہ کوئی افریقی زبان بول رہا تھا۔ خدا جانے وہ "زبان" تھی بھی یا نہیں۔

اگلی رات نو بجے کے لگ بھگ عجیب تماشا ہوا۔ میں ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک گارڈ کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی رائفل کا فائر ہوا۔ کوئی بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول پھینکا ورا اپنا پستول لے کر تیزی سے برآمدے میں آیا۔ یہاں میں نے ایک گارڈ کو گلاب کے پودوں پر گرے دیکھا۔ گارڈ کے دو ساتھی اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گارڈ کے کولہے پر رائفل کی گولی لگی تھی اور اس کا ایک پہلو خون سے سرخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ منیجر جے سنہا میرے پاس آیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا "فوسیہ صاحبہ نے اپنے شوہر کو زخمی کر دیا ہے اور ایک گارڈ سے رائفل چھین کر اوپر بھاگ گئی ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ پانچ چھ گارڈز نے پورچ کے قریب پوزیشنز سنبھالے رکھی تھیں اور بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں دوسری منزل کے کمروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں میری نگاہ صالح باری پر بھی پڑی۔ اس کے جبڑے سے خون بہہ رہا تھا۔ دو افراد اسے سہارا دے کر اندر لے جا رہے تھے۔ اس کا ایک پاؤں بھی وزن برداشت نہیں کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دوسری منزل سے رائفل کے دو مزید فائر ہوئے اور گارڈز اپنی اپنی پوزیشن پر کچھ اور بھی دبک گئے۔

سینئر گارڈ نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ مس صاحبہ پر جوابی فائرنگ کی جائے یا نہیں۔ میں نے گارڈ کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ منیجر جے سنہا نے مجھے بتایا "فوسیہ صاحبہ کو باری صاحب نے ہی کمرے سے نکالا تھا۔ وہ انہیں باغیچے کے سامنے چہل قدمی کرا رہے تھے۔ فوسیہ صاحبہ نے اچانک ایک گارڈ سے رائفل چھینی اور اسے زخمی کرنے کے بعد مین گیٹ کی طرف دوڑیں۔ شکر ہے کہ وہاں گارڈ چندرا اور اس کے ساتھی نے فوسیہ صاحبہ کا راستہ روک لیا۔ وہ پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف آئیں اور دوسری منزل پر چلی گئیں۔"

میں نے جے سنہا سے کہا "تم گارڈز کو باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ پھیلا دو۔ فوسیہ کو یہاں سے نکلنا نہیں چاہیے۔ باقی میں خود سنبھال لیتا ہوں۔"

"لیکن جناب! اگر گولی چلانا پڑی تو؟"

"نہیں گولی بالکل نہیں چلانی۔ اگر کوئی چارہ نہ رہے تو چھوٹے کیلیبر کی گولی سے ٹانگ وغیرہ زخمی کر دو۔"

جے کو ہدایات دے کر میں کامن روم میں آ گیا۔ یہاں سے چھوٹے سائز کی قالین پوش سیڑھیاں بالائی منزل تک جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں اسی کمرے کے سامنے ختم ہوتی تھیں جہاں فوسیہ گھسی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر اسے پکارا تو وہ زور زور سے چیخنے لگی "خبردار اگر کوئی میرے پاس آیا تو میں گولیوں سے چھلنی کر دوں گی۔"

اس کی آواز میں دیوانگی کی جھلک تھی۔ لگتا تھا کہ اب وہ "مرویا مار دو" پر عمل پیرا ہو گئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ خدانخواستہ ریسٹ ہاؤس سے نکل گئی تو پھر اسے ڈھونڈنا آسان نہیں ہوگا۔ ایک تو رات تھی' دوسرے یہ ریسٹ ہاؤس چاروں طرف سے گھنے درختوں اور ہریالی سے گھرا ہوا تھا۔

جب فوسیہ بلند آواز سے واویلا کر رہی تھی' لیونا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ بولی "مجھے پہلے ہی شبہ تھا جہاں۔ یہ لڑکی بن رہی ہے اور موقع کی تلاش میں ہے۔ یہ کتے کی دم اتنی آسانی سے سیدھی ہونے والی نہیں تھی۔"

میں نے لیونا کو موقع سے ہٹا دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ فوسیہ مزید گولیاں نہ چلائے۔ بہرحال میں اندر سے بالکل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فوسیہ پر قابو پانا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوگا۔ وہ بہت زیادہ مضبوط اور خطرناک لڑکی نہیں تھی۔ اس کا حوصلہ میں نے چار پانچ دن پہلے چیک کر ہی لیا تھا۔ اس کی خودکشی کی دھمکیاں بالکل جھوٹ ثابت ہوئی تھیں۔ اب بھی وہ بھڑکیں تو مار رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ایک حد سے

آگے نہیں بڑھے گی۔

میں ستون کی آڑ میں رہا اور چند منٹ تک بات چیت کے ذریعے توسیہ کو رائفل پھینکنے اور باہر آنے پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ بدستور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ اسے یہاں سے باہر نکلنے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ماننا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ کمرے میں بند ہے اور اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے وہ مجھے اوپر آنے دے یا خود کمرے سے نکل کر بات کرے۔

یہاں اس کا اناڑی پن کام دکھا گیا۔ وہ کمرے سے نکل آئی۔ غالباً اسے یقین تھا کہ ہم اس پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کریں گے۔ وہ ایسی جگہ کھڑی تھی جہاں سے اسے اچانک دبوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی لیکن ایک بات بھول رہی تھی۔ وہ جن سیڑھیوں کے بالائی سرے پر کھڑی تھی وہ قالین پوش تھیں۔ قریباً تین فٹ چوڑائی کا ایک طویل قالین پوری سیڑھیوں پر بچھا ہوا تھا۔ وہ اس طویل قالین کے بالائی سرے پر کھڑی تھی۔

اس نے رائفل بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور بڑی نڈر دکھائی دینے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اسے اپنے دونوں خالی ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

اس نے قہرناک نظروں سے میرا جائزہ لیا اور تھوڑا سا مزید آگے آگئی۔ اب وہ پوری طرح قالین پر تھی۔ میں نے اچانک نیچے جھک کر قالین کو ایک طوفانی جھٹکا دیا۔ توسیہ کے حلق سے چیخ نکلی۔ میں نے اس کی رائفل کو ہوا میں اڑتے اور شیشے کی ایک بڑی تپائی پر گرتے دیکھا — قالین کے ساتھ ہی توسیہ لڑھکتی ہوئی عین میرے قدموں میں آن گری۔ گرتے ساتھ ہی وہ اٹھ کر بھاگی' میں نے پیچھے سے اس کے کالر پر ہاتھ ڈالا اور الٹا کر ایک صوفے پر پھینک دیا۔ وہ مزاحمت پر آمادہ تھی۔ میں نے تھپڑوں سے اس کی تواضع کی۔ اسی اثنا میں گارڈز بھی دوڑتے ہوئے اندر پہنچ گئے۔ وہ میرے ہاتھوں سے نکل نکل جارہی تھی۔ میں نے اسے دو تین بار اٹھا کر صوفے پر پٹخا۔ اس کی مزاحمت قدرے نرم ہوگئی۔ اس کے ناک منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا اور قالین پر گھسیٹتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ غالباً کئی دن یہاں گزارنے کے باوجود اسے اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ عالی مرتبت شیخ عاصم کی بلند مقام ہمشیرہ سے کوئی اس قسم کا ناروا سلوک کرسکتا ہے۔

میں نے نگران ملازمین کو حکم دیتے ہوئے کہا "اسے بند کردو صرف پنکھا چلتا رہنے دو۔ اس کا کھانا پینا بالکل بند۔ جب یہ مرجائے تو اس کی لاش نکال کر پچھواڑے کے احاطے میں دفن کردو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے دروازے کو تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں منتقل کرلی۔

باری کی خبرگیری کے لیے میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ اس کی پنڈلی پر توسیہ نے بڑے زور سے رائفل کا بٹ مارا تھا۔ بعد ازاں اسے دھکا دے کر سیمنٹ کے گملوں پر گرایا تھا۔ باری کے جبڑے پر گرنے سے ہی چوٹ آئی تھی۔ یہ گومڑ سا ابھر آیا تھا اور تھوڑی سی جلد بھی پھٹ گئی تھی۔ کا اسسٹنٹ اس کے جبڑے پر برف سے ٹکور کررہا تھا۔ میں نے کہا "باری تمہیں بتایا بھی تھا کہ اس کی طرف سے محتاط رہو۔"

باری کے چہرے پر پشیمانی تھی۔ بولا "بس جناب! غلطی ہوگئی۔ وہ مجھ پر یہی ظاہر کررہی تھی کہ اس کا رویہ بدل رہا ہے۔ پرسوں سے مجھے کہہ رہی تھی کہ کمرے میں بند رہ رہ کر اس کا دل گھبرا رہا ہے۔ میں نے کہا' چلو تمہیں تھوڑی واک کرا دوں۔ کچھ غلطی گارڈ ڈیوٹی کی بھی تھی۔ وہ توسیہ کو پھول دینے کے لیے اس کے بالکل قریب چلا آیا۔ توسیہ نے جھپٹ کر رائفل چھینی اور اس کی ٹانگ میں گولی ماردی۔ اس نے مجھے زخمی کیا اور گیٹ کی طرف بھاگی گارڈ چنو وغیرہ نے اسے روکا تو وہ باہر والی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔"

باری پشیمان ہونے کے علاوہ سخت آزردہ بھی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ بات اب اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی کہ توسیہ لاتوں کی بھوت ہے باتوں سے نہیں مانے گی۔

دوسرا دن قدرے سکون سے گزرا۔ توسیہ کو کچھ کھانے کو نہیں دیا گیا۔ تاہم باری نے ترس کھا کر ٹھنڈے پانی کی بوتل بھجوا دی تھی۔ رات کو بیڈ روم میں باری اور میں دیر تک توسیہ کے بارے میں بات کرتے رہے۔ باری نے بتایا کہ ابو ظہبی میں بھی توسیہ کے یہی طور اطوار تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر ملازمین کو بری طرح ڈانٹ دیتی تھی۔ ہر کسی کی عزت اس کے جوتے کی نوک پر رہتی تھی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ لیونا سوگئی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میرے ذہن کی بے قراریاں مجھے دیر تک جگاتی رہیں۔ میں کچھ دیر

سوچتے رہنے کے بعد بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے اپنے لیے ڈرنک بنایا اور سگریٹ پھونکتے ہوئے دبیز قالین پر ٹہلنے لگا۔ رات کے سناٹے میں سارے غم بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کررہے تھے اور ایک جتھے کی طرح دل و دماغ پر یورش کررہے تھے۔

اچانک میرے دل میں آئی کہ توسیہ کے کمرے کا جائزہ لینا چاہیے۔ میں سلیپر پہن کر نکلا اور خاموشی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر دروازہ تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ اگر رات کا سناٹا نہ ہوتا تو شاید یہ ہلکی سی بھنبھناہٹ بھی میرے کانوں تک نہ پہنچتی۔ میرے اندر تجسس بڑھ گیا۔ میں نے تھوڑا سا چکر کاٹا۔ سیڑھیوں کی طرف سے میں پہلے بالائی منزل پر گیا۔ وہاں سے اندرونی سیڑھیاں اتر کر توسیہ والے کمرے کے بالکل پاس پہنچ گیا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ باری کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔ کمرے کے اندر توسیہ کرسی پر منہ بنائے بیٹھی ہے۔ باری کے چہرے پر پٹی بندھی تھی اور وہ بڑے لجاجت آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ عربی میں بات کررہا تھا لہٰذا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ گفتگو کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ عاجزی اور منت سماجت کے ذریعے توسیہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک دو بار توسیہ نے بھی عربی میں کچھ کہا۔ اس کے لہجے میں ناراضگی اور کرختگی نمایاں تھی۔ ان کی گفتگو میں "نکاح" اور "طلاق" وغیرہ کے الفاظ بھی آئے۔ باری غالباً توسیہ کو سمجھا رہا تھا کہ وہ اب بھی میاں بیوی ہیں اور وہ اب بھی اسے بیوی کی حیثیت سے پانے کا شدید خواہش مند ہے۔ جبکہ توسیہ کہہ رہی تھی کہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے (باری نے بتایا تھا کہ اس سے سادے کاغذات پر دستخط کرائے گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان دستخطوں کو بدترین طریقے سے استعمال کیا گیا ہو)

بات کرتے کرتے ایک دم باری کی آواز بھرا گئی۔ اس پر رقت طاری ہورہی تھی۔ وہ توسیہ کے دل کی سختی کو دور کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کررہا تھا۔ اچانک ایک چھنا کا سنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ توسیہ نے آہنی گرل کے خلا میں سے ہاتھ نکال کر ایک زور کا گھونسا باری کے منہ پر مارا اور نفرت سے اس کی جانب تھوک دیا پھر وہ چیختی ہوئی اٹھی اس نے کمرے کے اندر سے ایک لمبی چھڑی اٹھائی اور اسے گرل کے اندر سے گزار کر نیزے کی طرح باری کو ضرب لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں جھپٹ کر آگے بڑھا اور چھڑی توسیہ کے ہاتھ سے چھین لی۔ باری اپنا منہ ہاتھوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا اور کراہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے جبڑے سے پھر خون رسنا شروع ہوگیا تھا۔

"تم بے وقوف ہو۔ یہ حرام زادی ایسے نہیں مانے گی۔" میں نے باری کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

توسیہ کے واویلے کو نظر انداز کرتے ہوئے میں باری کو اس کے کمرے میں لے آیا۔ شور شرابا سن کر گھبرائے ہوئے ملازم بھی کوریڈور کے سامنے جمع ہوگئے تھے۔ میں نے انہیں واپس بھیج دیا۔

میرے سینے میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ توسیہ کی رعونت اور ہٹ دھرمی دیکھ کر مجھے شیخ عاصم یاد آرہا تھا۔ توسیہ میں اپنے سنگ دل بھائی کے مزاج کی بے شمار جھلکیاں موجود تھیں۔ علی الصباح میں نے ریسٹ ہاؤس کی پانچوں ملازماؤں کو بلایا اور ان میں سے ایک صحت مند اور مضبوط تامل ملازمہ کو علیحدہ کیا۔ میں نے اس سے کہا "تمہیں اپنا دل تھوڑا سا سخت کرکے ایک کام کرنا ہے۔"

"جی مالک!" وہ شکستہ انگریزی میں بولی۔

میں نے اسے وہ چھڑی تھمائی جو رات کو توسیہ سے چھینی تھی۔ نہایت مضبوط اور لچک دار بید کی بنی ہوئی یہ ایک چار فٹ لمبی چھڑی تھی۔ میں نے کہا "وہ لڑکی جو کمرے میں بند ہے' اس کا مزاج درست کرنا ہے۔ اسے اتنی مار لگاؤ کہ وہ منت سماجت پر اتر آئے۔"

ملازمہ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس نے اثبات میں سر تو ہلا دیا لیکن ساتھ ہی خشک ہونٹوں پر زبان بھی پھیرنے لگی۔ میں نے کہا "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ میں بھی تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ اگر وہ مزاحمت کرے گی تو اور بھی تکلیف اٹھائے گی۔"

ملازمہ نے پھر اثبات میں سر ہلایا' تاہم اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شدید ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ اس ہچکچاہٹ کی وجہ توسیہ کا خوف بھی ہوسکتا تھا' اور یہ احساس بھی کہ وہ ایک ادنیٰ ملازمہ ہوکر اتنے اونچے مرتبے کی لڑکی پر کیسے ہاتھ اٹھائے گی۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں مالک۔ جو آپ کا حکم۔" وہ مرے مرے انداز میں بولی۔

اچانک ملازماؤں میں سے ایک عورت آگے بڑھی۔ وہ

خود اعتمادی سے بولی "مالک۔ اگر آپ کا حکم ہو تو یہ کام میں کروں گی۔"

وہ بھی مضبوط جسم کی مالک صحت مند تاہل تھی۔ میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ یہ اسی گارڈ کی بیوی ہے جو پرسوں رات قوسیہ کے فائر سے زخمی ہوا ہے۔ ذو ہ نامی اس گارڈ کے کولہے پر گولی لگی تھی۔ وہ اسپتال میں تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر وہ معذور نہ بھی ہوا تو اسے ایک طویل عرصے تک بستر پر رہنا ہوگا۔ اٹھائیس تیس سالہ یہ "للینا" نامی عورت ریسٹ ہاؤس کی سیکیورٹی میں بھی ہاتھ بٹاتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہونے والی کسی عورت کی تلاشی مقصود ہوتی تھی تو "للینا" ہی یہ کام کرتی تھی۔ مجھے اس کی سنجیدہ آنکھوں میں دکھ اور طیش کا ایسا امتزاج نظر آیا کہ میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کام کرسکتی ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور بید مجنوں کی مضبوط چھڑی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

کچھ ہی دیر بعد بدو ماغ قوسیہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی حیرت سے دوچار ہو چکی تھی۔ اس حیرت میں بے پناہ تکلیف کا عنصر بھی شامل تھا۔ للینا میری مرضی کے عین مطابق قوسیہ کو تسلی بخش مار لگا رہی تھی۔

قوسیہ نے پہلے تو للینا کی بھرپور مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی وہ چھڑی کی بھرپور ضربیں کھا کر بڑبڑا گئی۔ اب وہ قالین پر لوٹ رہی تھی اور بری طرح بلبلا رہی تھی۔ جلد ہی اس کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے جسم کو چھڑی کی بے رحم ضربوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ناکام ہو رہی تھی۔ کبھی وہ الٹی ہو جاتی تھی لیکن جب پشت پر ضربیں برداشت سے باہر ہو جاتیں تو سیدھی ہو جاتی تھی۔ للینا نے ایک دو بار سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ بس کروں یا ابھی مزید چیخیں نکلواؤں۔

میرے دل میں اس سرکش شیخ زادی کے لیے رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ میں نے للینا کو اس کا کام جاری رکھنے دیا۔ دو تین منٹ کے اندر قوسیہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ اب اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی کیونکہ چیخ چیخ کر اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ یہ وہی امیرزادی تھی جو للینا کے بقول ذرا ذرا سی بات پر اپنے خادمین کا حشر خراب کر دیتی تھی۔ آج وہ قالین پر اوندھے منہ بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے للینا کو باہر آنے کا کہا اور دروازہ مقفل کر دیا۔

دوپہر کو جب باری مرہم پٹی کے لیے کولمبو گیا ہوا تھا اور میں لان میں بیٹھا سائیں عالی کی خرمستیاں دیکھ رہا تھا، للینا میرے پاس آئی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر غصے اور پریشانی کے آثار تھے۔ میرے قریب جھکی اور ادب سے بولی "مالک حضور۔ وہ ہوش میں آگئی۔ آپ کے حکم کے مطابق میں اسے پانی دینے گئی تھی۔ اس نے پانی مجھ پر پھینک دیا ہے اور بڑی گندی گالیاں دی ہے۔"

میرا میٹر پہلے ہی گھوما ہوا تھا۔ میں نے کہا "جاؤ۔ پھر مار لگاؤ اور تب تک مارتی رہو جب تک اس کے ٹھکانے نہ آجائیں۔"

"لیکن مالک۔"

"بس جاؤ!" میں نے جھنجھلا کر کہا "جو بنتا ہے وہ کرو۔"

للینا نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور مستحکم قدموں سے اندر چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد اندرونی حصے سے دبی دبی چیخیں آنے لگیں۔ سائیں عالی کسی بندر کی طرح ایک بلند ٹہنی پر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا اور ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جنات کی ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہا ہے۔ اس میں وہ "جن صحافیوں" کو بتا رہا ہے کہ اس کے دور کے بعد پیچھے سے کس طرح اس کا تختہ الٹا گیا ہے۔ دبی دبی چیخیں سائیں کے کانوں تک بھی پہنچیں۔

وہ تو بدو جنات کو مخاطب کر کے بولا "یہ سن رہے ہو تم۔ چیخوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ میرے بعد ملک میں کے واقعات شروع ہو گئے۔ لوگ ایک ایسی لڑکی کو مار رہے ہیں جو نئی حکومت کے حق میں نعرے لگا رہی تھی۔ کوئی سننے والوں کو پسند نہیں کر رہا۔ سارا ملک مجھے واپس لانے کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔ عوام الناس کی نیندیں اڑ گئیں۔ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ میرے غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ آپ صحافی جناتی قدروں کے علمبردار ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ پرستان کے سارے اخباروں میں اس واقعے کے متعلق لکھیں۔"

اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "لڑکی کی چیخیں مجھے بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ جو بھی میرا ہو اس کی چیخیں نکلنی ہی چاہئیں۔ یہی اچھی جمہوریت کا اصول ہے۔"

سائیں اشارے کنائے میں اہم بات کہہ جاتا تھا۔ اس کی بات کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ قوسیہ کے حوالے سے کر رہا ہوں یہ ٹھیک ہے اور سائیں اس پر مطمئن ہے۔

قوسیہ کی چیخیں سن کر ملازم ہراساں نظر آرہے تھے۔ ایک بوڑھا مالی درخواستی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ کافی ہو گئی ہے اب للینا کا ہاتھ رکوا دیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ آج کل میں بالکل بے حس ہو رہا تھا۔ ایک نامانوس سی کرختگی میرے اندر آ گئی تھی یا شاید یہ مانوس کرختگی تھی۔ وہی جو استاد جمالی کے روپ میں میرے اندر پھیل جایا کرتی تھی۔ کیا حالات مجھے پھر بتدریج استاد جمالی کے روپ میں ڈھال رہے تھے؟ یہ سوال کئی بار میرے ذہن میں کلبلا کر ختم ہو چکا تھا۔

وسکی کا آخری پیگ لے کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر قوسیہ کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔

قوسیہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کی قمیص ایک دو جگہ سے پھٹ گئی تھی اور وہاں اس کی دودھیا جلد پر سرخ نشان نظر آرہے تھے۔ بہرحال میری ہدایت کے مطابق للینا نے اسے مارتے ہوئے یہ دھیان رکھا تھا کہ اسے کوئی زخم وغیرہ نہ آجائے۔ قوسیہ کے بے ہوش ہو جانے سے للینا اب قدرے گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی اور چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قوسیہ کی آنکھوں میں جنبش نمودار ہونے لگی۔

میں نے للینا کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی دروازہ مقفل کر کے باہر آ گیا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے صالح باری کولمبو سے واپس آیا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے تین ٹانکے لگے تھے۔ صالح باری کے آنے تک قوسیہ مکمل ہوش میں آچکی تھی۔ باری کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا کچھ ہوا ہے۔ وہ قوسیہ کے حالات پر آزردہ نظر آتا تھا۔ دکھی لہجے میں بولا "جناب! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں تھوڑی سی لچک کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اس پاگل (قوسیہ) نے پچھلے ۴۸ گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ڈی ہائیڈریشن کا شکار نہ ہو جائے۔"

میں نے کہا "اس سے پہلے تم بھی اسی کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ بڑے اصیل قسم کے شوہر ہو۔"

وہ مرجھا کر بولا "وہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کا فعل ہے۔ میں تو اپنے فعل کا ذمہ دار ہوں جناب!"

"ٹھیک ہے تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میں اسے کھانا کھلا دوں گا۔"

"لیکن جناب۔"

"تمہیں کہا ہے نا۔ آج وہ کھانا کھالے گی۔ تم بالکل مطمئن رہو۔"

وہ اٹھا اور سلام کر کے چلا گیا۔ میں نے قوسیہ کو کھانا کھلانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ میں نے ایک ملازمہ کو کھانا تیار کرنے اور ٹرے میں رکھنے کے لیے کہا اور خود قوسیہ کی طرف چلا گیا۔ تین چار منٹ بعد ملازمہ بھی ٹرے سمیت پہنچ گئی۔ میں نے تالا کھولا اور ملازمہ سے کہا کہ ٹرے قوسیہ کے سامنے میز پر رکھ دے۔ ملازمہ ٹرے رکھ کر دور کھڑی ہو گئی۔ میں نے تحکمیہ لہجے میں کہا "چلو کھانا کھاؤ۔" اس نے لال انگارہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مردانہ لب و لہجے میں بولی "میں نے نہیں کھانا۔"

"کیوں نہیں کھانا۔" میں نے اس کے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس نہیں کھانا۔"

"تیرا تو باپ بھی کھائے گا۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ملازمہ سے کہا کہ للینا کو بلاؤ۔ قوسیہ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد لمبی تڑنگی کالی سیاہ للینا چھڑی بدست آن موجود ہوئی۔ اسے دیکھ کر قوسیہ کے چہرے پر ہسٹریائی آثار نظر آئے۔ وہ چیختے ہوئے بولی "اس کو دور ہٹاؤ مجھ سے۔ اس خبیث کو دور ہٹاؤ۔ خدا کے لیے۔"

للینا کمرے کے اندر آن کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا "اگر اسے باہر بھیجنا چاہتی ہو تو چلو کھانا کھاؤ۔ شاباش۔ شروع ہو جاؤ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"خدا کے لیے اسے باہر نکالو۔ خدا کے لیے نکالو۔" وہ چیخی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سمٹ گئی تھی۔

"شور مچانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر خیریت چاہتی ہو تو کھانا کھاؤ۔"

قوسیہ نے نہایت خوف زدہ نظروں سے للینا کی طرف دیکھا۔ وہ بید کی چھڑی سونت کر بالکل تیار کھڑی تھی۔ وہ اشک بار لہجے میں بولی "اچھا میں کھاتی ہوں لیکن تم اس کتیا کو باہر بھیجو۔"

میں نے للینا کو اشارہ کیا کہ وہ دروازے سے باہر نکل کر کھڑی ہو جائے۔ للینا باہر نکلی تو قوسیہ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ خوف اور غصے کے سبب کانپ رہا تھا۔ قوسیہ کو راہ راست پر لانے کا ایک مشکل مرحلہ طے ہو گیا تھا۔

قوسیہ کھانا کھا چکی تو میں نے برتن خود اٹھا کر باہر پہنچا

دیے۔ اس کے بعد میں نے توسیہ سے کہا کہ وہ کمرے کے دوسرے بیڈ کی "بیڈ شیٹ" اچھی طرح بچھائے اور تکیہ چادر وغیرہ رکھے۔

"کیوں؟" وہ تنک کر بولی "میں نوکر نہیں ہوں۔"

"یہ نوکری کی بات نہیں۔ یہ تمہارا اپنا کمرا ہے۔ تمہیں اسے صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔ اگر نہیں مانتی ہو تو میں للیتا کو بلا لیتا ہوں۔ وہ سامنے ہی کھڑی ہے۔"

توسیہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ وہ کراہتی ہوئی اٹھی۔ اس کے چہرے پر شدید ترین جھلاہٹ تھی۔ وہ قریباً پانچ منٹ میں بیڈ شیٹ بچھا سکی۔ شاید یہ کام اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ بیڈ شیٹ بچھا کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی۔ میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا کہ اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جسے توسیہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ اس کے بعد میں دروازہ مقفل کر کے باہر آ گیا۔

میں نے دوسرا بستر اس کے لیے بچھوایا تھا جو وہاں سونے کا حق دار تھا۔ میں نے منیجر کو بلوایا اور اسے کہا کہ وہ جا کر توسیہ کو اچھی طرح سمجھا دے کہ آج اس کے کمرے میں دوسرے بستر پر اس کا شوہر سوئے گا۔ اگر وہ کسی طرح کا اعتراض کرے تو میری طرف سے پوری اجازت ہے۔ للیتا اس کی چٹنی اڑا سکتی ہے۔ اس کے بعد میں نے باری کو بلایا اور اسے بھی سمجھا دیا کہ آج اسے اپنی بیوی کے کمرے میں سونا ہے۔ باری شدید تذبذب اور بے یقینی کا شکار تھا' بہرحال میں نے کسی نہ کسی طرح اسے ہینڈل کر لیا۔

اس رات واقعی کرشمہ ہوا۔ کسی شدید ہنگامے کے بغیر پروگرام کے مطابق عمل ہوا۔ باری اپنی بیوی کے کمرے میں سویا۔ یقیناً وہ اس سے کوسوں دور رہا ہوگا لیکن چھت تو ایک ہی تھی۔ اگلی صبح میں نے توسیہ سے کہا کہ وہ نہائے دھوئے۔ اس نے ابھی تک پندرہ بیس روز پرانی پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ دیکھنے میں بالکل لڑکا تھی۔ نہ بال' نہ زنانہ لباس' نہ کوئی زیور۔ میں نے اس کے لیے خوب صورت ٹاپس اور فیشن ایبل لنگن کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نہایت دیدہ زیب لمبا فراک تھا' جو نصف پنڈلیوں سے بھی نیچے چلا جاتا تھا۔ میں نے اسے نہانے اور کپڑے بدلنے کے لیے کہا تو وہ بری طرح اڑ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ مر جائے گی لیکن یہ کپڑے وغیرہ نہیں پہنے گی۔ کافی دیر تکرار ہوئی پھر میں نے اپنی شرط تھوڑی سی نرم کر دی۔ میں نے کہا "اچھا یہ کپڑے نہ پہنو لیکن نہا دھو لو اور یہ ٹاپس وغیرہ پہن لو۔" میں نے اس کے لیے ایک پتلون قمیص بھی منگوا رکھی۔ اس نے پھر بھی

انکار کا راستہ اختیار کیا تو میرا میٹر بھی گھوم گیا۔ ساتھ والے کمرے میں للیتا اپنے ہتھیار سے لیس موجود تھی۔ میرے ایک اشارے پر وہ آن موجود ہوئی اور توسیہ پر جھپٹ پڑی۔ بس تین چار زوردار جھڑیاں کھا کر ہی توسیہ کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ وہ چیخنے لگی "اسے باہر بھیجو۔ خدا کے لیے اسے باہر بھیجو۔ ہائے میں مر گئی۔"

میں نے للیتا کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ توسیہ نے آنسو بہاتے ہوئے للیتا کو بدترین بددعائیں دیں اور کپڑے تولیہ وغیرہ لے کر جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ آدھ پون گھنٹے بعد میں نے اسے دیکھا تو کافی نکھری ہوئی تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس نے ایک اجلی پتلون قمیص پہن لی تھی۔ آستینیں اُڑسی ہوئی تھیں۔ مردوں کی طرح گریبان کے دو بالائی بٹن کھلے تھے۔ دیکھ کر میری تسلی ہوئی کہ اس نے کسی حد تک شکست قبول کر لی تھی۔ یعنی لنگن اور ٹاپس پہن لیے تھے۔ کم از کم اب دھوکا تو نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک لڑکا ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ ایک اور وڈیو کیسٹ ریکارڈ کر کے عاصم کو بھیجوں اور اسے بتاؤں کہ اس کی بہن کس طرح ایک آفت زاری سے بندے کی چتر بن رہی ہے لیکن پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے اس نئی کیسٹ کا ملبہ بھی شیخ کے بے گناہ ملازمین پر ہی گرے اور وہ دو تین اور بے قصوروں کو پھڑکا ڈالے۔ میں نے سائیں سے پوچھا تھا وہ ابھی تک "فرسٹ اسٹورز" کے کرتا دھرتا مسٹر مدن سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ مدن ابھی تک شدید مصروفیت کا بہانہ بنا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا اور یقیناً سائیں کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ تنی کترانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ویسے میں ٹیکسی کے ذریعے ایک چکر کولمبو کا لگا چکا تھا۔ میں نے فرسٹ اسٹورز کا محل وقوع بھی دیکھا تھا۔ یہ اسٹورز انڈسٹریل ایریا کے بڑے علاقے میں پھیلے تھے۔ یہاں سخت چیکنگ کے بعد ہی آمد و رفت ممکن تھی۔

باری کے پاؤں کی تکلیف شروع میں تو معمولی لگتی تھی لیکن پھر اس سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ اس کی ہڈی میں معمولی سا بال تھا جس کی وجہ سے قدم اٹھانے میں دشواری ہوتی تھی۔ میں نے ناشتے کے بعد توسیہ اور باری کے کمرے کا چکر لگایا۔ میں نے دیکھا کہ باری نے اپنا پاؤں نیم گرم پانی کے برتن میں رکھا ہوا تھا اور اس پر نمک ڈالے پانی سے ٹکور کر رہا تھا۔ اس کی چہرے پر اذیت کے آثار تھے کیونکہ جھکانے سے اس کے جبڑے میں تکلیف ہوتی تھی۔

میں نے توسیہ کا شانہ جھنجوڑ کر اسے اٹھایا "اٹھ جاؤ بے بی! دیکھو دس بجنے والے ہیں۔"

وہ بسورتے ہوئے بولی "جاؤ' میں سونا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "نیک بیبیاں صبح سویرے اٹھ کر کھانا پکاتی ہیں' شوہر کو کام پر جانے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اب پرانے اپنے چونچلے چھوڑ دو۔ تمہیں نئے طریقے سے رہنا ہوگا' دیکھو تمہارا شوہر کتنی تکلیف میں ہے۔ اور تکلیف بھی تمہاری ہی دی ہوئی ہے۔ چلو اس کی مدد کرو۔"

"میں کیا کروں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"پہلے منہ ہاتھ دھوؤ' پھر ہو سکے تو اس کے پاؤں پر ٹکور ہی کر دو۔"

"میں نہیں کروں گی ٹکور شکور۔ میں اس کی باندی نہیں ہوں اور نہ تم باندی بنانے کی کوشش کرنا۔"

"شوہر کی خدمت کرنے والی باندی نہیں ہوتی' بیوی ہوتی ہے اور وہ اس میں فخر محسوس کرتی ہے۔"

"مجھے نہیں چاہیے یہ فخر۔" وہ چلائی۔

باری نے گھبراتے ہوئے کہا "جناب! رہنے دیں۔ ٹکور سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔"

"تم چپکے بیٹھے رہو۔ میں جانتا ہوں تمہیں کس بات سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔" پھر میں نے گرج کر توسیہ سے کہا "تم یہاں قالین پر بیٹھنی ہو یا میں بلاؤں تمہاری اسنانی کو۔"

توسیہ ایک جھٹکے سے مڑی اور پاؤں پٹختی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔ چار پانچ منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو خود پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ اس نے اپنی اشک بار آنکھیں پونچھیں اور خاموشی سے بیٹھ کر باری کے پاؤں پر گرم پانی کی ٹکور کرنے لگی "دیکھو کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ پتا چلتا ہے کہ دونوں میاں بیوی ہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے ٹکور کرتے کرتے جھنجلاہٹ سے باری کے پاؤں کو ہاتھ لگایا۔ اس کے ہونٹوں سے تکلیف کے سبب سسکاری نکل گئی "کیا کر رہی ہو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "اگر میرے سامنے ایسے کرتی ہو تو بعد میں کیا کرو گی۔"

اس کا چہرہ سرخ ہو کر پھر نارمل ہو گیا۔ غالباً وہ کوئی نخوانہ بات کہتے کہتے سنبھل گئی تھی۔ بعد ازاں وہ بڑی احتیاط اور نرمی سے باری کے پاؤں پر بھیگی ہوئی روئی پھیرنے لگی۔

○☆○

عاصم کی بہن کا دماغ قدرے ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ اب میری توجہ عاصم کی طرف مبذول ہو رہی تھی۔ مجھ پر یہ دلچسپ انکشاف ہوا تھا کہ فرسٹ اسٹورز کے دو "جڑواں گوداموں" میں عاصم اینڈ کمپنی کی ملکیت قریباً پانچ سو نئی جیپیں موجود ہیں۔ میرے ذہن میں موجود ایک چنگاری شعلہ بنتی جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ عاصم پر ایک شدید "کاروباری ضرب" لگاؤں گا۔ کہا جاتا ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ میں بھی عاصم کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھا میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں فرسٹ اسٹورز میں گھسوں گا اور عاصم کو یادگار نقصان پہنچاؤں گا۔ میرا ٹارگٹ وہ دو بڑے گودام تھے جہاں کمپنی کی تیار شدہ جیپیں کھڑی کی گئی تھیں۔

دشمنی کے اس انداز کو غیر اخلاقی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن عاصم نے اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے میرے اندر نفرت کا ایک ایسا الاؤ بھڑکا دیا تھا کہ اب میرے اندر "اخلاقی اور غیر اخلاقی" کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ (خاص طور سے عاصم کے حوالے سے) مجھے معلوم تھا کہ یہ کروڑوں کا نقصان ہوگا لیکن یہ ایک ایسے دشمن کا نقصان تھا جس کا ہر فائدہ اس کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا اور اس کی طاقت۔ اس کی طاقت میرے جیسے بے ضرر لوگوں کو مجرم بناتی تھی۔ شفتا جیسی لڑکیوں کی زندگیاں اجیرن کرتی تھی۔ غزالہ جیسی دوشیزاؤں کو حرم کی زینت بناتی تھی اور ساقی صاحب جیسے لوگوں کا خون پیتی تھی۔ یہ طاقت ایک کالی شکتی تھی۔ یہ کسی بھی حالت میں ہوتی' اسے تباہ کرنا میرے نزدیک نیکی تھا۔

اپنے پروگرام کے مطابق میں ہفتے کی رات قریباً دس بجے ایک تاریک شیشوں والی کار میں ریسٹ ہاؤس سے نکلا اور اس شخص کی کوٹھی پر پہنچ گیا جو یہاں کولمبو میں "فرسٹ اسٹورز" کا کرتا دھرتا تھا۔ یہ وہی مدن لال تھا جو پچھلے ایک ہفتے سے سائیں عالی کے ساتھ ٹال مٹول کرنے میں مصروف تھا۔

وہ سائیں کا زبردست عقیدت مند تو تھا اور اس نے سائیں سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اگر شیخ عاصم سری لنکا کا کوئی کاروباری یونٹ فروخت کرنا چاہے گا تو وہ یہ سودا کرنے میں سائیں سے تعاون کرے گا' لیکن اب وہ تنی کترا رہا تھا۔ یعنی وہ پاگل تو تھا لیکن اتنا پاگل بھی نہیں تھا۔ میں سیدھا مدن لال کی کوٹھی پر پہنچا۔ میرے پاس پسٹل موجود تھا جس پر نہایت جدید سائلنسر لگا ہوا تھا۔ میری شاندار مرسیڈیز کار دیکھ کر مدن لال کے سری لنکن گارڈ تعظیم سے پیش آئے۔ میں نے مدن لال کو پیغام بھجوایا کہ میں ایک ابھرتا ہوا پاکستانی صنعت

کار ہوں اور کاروباری حوالے سے میرا مدن صاحب سے فوری ملنا اشد ضروری ہے۔ میں نے ایک فرضی کارڈ بھی اندر بھجوایا۔

تھوڑی سی تحقیق کے بعد مدن لال کے کارندے مجھے میرے ارجنٹ کام کے لیے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ چند منٹ بعد مدن بھی وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے شکل سے پہچانتا نہ ہو لیکن یہ اندیشہ غلط نکلا۔ وہ سانولی رنگت اور چست جسم والا چونتیس پینتیس سالہ شخص تھا۔ اس کے ساتھ ایک جواں سال میم بھی تھی۔ خوش شکل لڑکی نے جذبات بھڑکانے والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خمار تھا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ نہایت "اونچے درجے کے گاہک" پھانسنے والی سوسائٹی گرل ہے۔ آج ہفتے کی رات تھی اور غیر شادی شدہ مدن غالباً ویک اینڈ منانے کے موڈ میں تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ ویک اینڈ اس کے سر پر کیا قیامت توڑنے والا ہے۔ میرے دل کا موسم عجیب ہو رہا تھا۔ عاصم اور اس سے متعلقہ کسی بھی فرد کے لیے میرے دل میں رحم کی رمق تک نہیں تھی۔

شراب کا جام مدن کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے کہنے پر باوردی ملازم نے میرے لیے بھی ڈرنک تیار کیا اور باہر چلا گیا۔ میں نے مدن لال سے پوچھا "کیا ہم یہاں پورے تحفظ کے ساتھ بات کر سکتے ہیں۔" دوسرے لفظوں میں میرا... مدعا یہ تھا کہ کیا ہماری گفتگو کے دوران میں یہ میم یہیں رہے گی؟

مدن نے کہا "ہاں آپ پورے اعتماد سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ کمرا ہر طرح محفوظ ہے۔ میری اجازت کے بغیر کوئی یہاں نہیں آئے گا۔" وہ میرے قیمتی لباس سے خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

میں نے سائیلنسر لگا پستول نکالا تو مدن اور اس کی معشوقہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مدن نے پہلے تو ایک دم اٹھنے کی کوشش کی پھر پستول کا رخ اپنی طرف دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟" اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کے اندیشے سمٹ آئے تھے۔

"میں تمہارا باپ ہوں۔ میرا نام شاہ جہاں ہے۔ میرا موڈ ہو تو میں بندے کو بلاوجہ بھی گولی مار دیا کرتا ہوں۔"

ایک دم مدن کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس کے تاثرات نے بتایا کہ وہ مجھ سے غائبانہ تعارف رکھتا ہے۔ اس نے اپنا لرزتا ہوا جام تپائی پر رکھا اور خود کو سنبھال کر بولا "مم۔ میں کسی شاہ جہاں کو نہیں جانتا۔ تم جو کوئی بھی ہو میں تمہیں بتا دوں کہ یہاں چھ مسلح گارڈز موجود ہیں۔ تم کسی بات سے آئے ہو تو بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

میں نے سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا "میرے اس پسٹل پر بڑا خاص قسم کا سائیلنسر لگا ہے۔ تمہیں شوٹ کروں گا تو شاید ساتھ والے کمرے میں بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ یہ دیکھو۔"

میں نے گولی چلائی جو سیدھی میم کی پیشانی پر لگی۔ وہ مدن کے پہلو میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک دم جھکی اور اوندھے منہ قالین پر گر گئی۔ اس کے خون سے سرخ قالین سرخ تر ہونے لگا۔ گولی کی آواز بہت کم تھی۔ مدن جیسے سکتے کی سی حالت میں رہ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے جا رہے تھے مگر آواز ندارد تھی۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا "دیکھا، آواز بالکل نہیں ہے۔" پانچ دس سیکنڈ تک قیامت سناٹا طاری رہا۔

"کک۔ کیا چاہتے ہو تم؟" مدن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"میں تو بہت کچھ چاہتا ہوں، لیکن فی الحال تم میرے ساتھ فرسٹ اسٹورز چلو گے۔ گودام نمبر ایک فوادر بی تھری میں۔ جہاں شیخ اینڈ کمپنی کی مینوفیکچرڈ جیپیں موجود ہیں۔"

سوسائٹی گرل کی لاش تھوڑی دیر جنبش کرتی رہی پھر ساکت ہو گئی۔ مدن لال نے ایک نہایت وحشت زدہ نظر لاش پر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے مدن کو نشانے پر رکھتے ہوئے پستول جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم فرسٹ اسٹورز میں اس طرح داخل ہو رہے تھے کہ مدن لال اپنی ٹویوٹا جیپ ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے پہلو میں اس طرح بیٹھا تھا کہ پسٹل کی نال مدن کی طرف تھی۔ اسٹورز کے اندر داخل ہوتے وقت میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم شاہ جہاں کو بہت اچھی طرح جانتے ہو اور اب اس کی کارکردگی بھی دیکھ چکے ہو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔"

سیکورٹی کے ایک دو مراحل سے گزر کر ہم بی تھری والی عمارتوں کے قریب پہنچ گئے۔ یہ گودام چھ عدد وسیع عریض شیڈز پر مشتمل تھے۔ یہاں تیار شدہ جیپیں فضا اندر تک جا کر بلاک کی گئی تھیں۔ مدن لال کو ابھی تک کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ ہم گاڑی سے اتر کر ایک وسیع و عریض شیڈ میں داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا کہ کسی اسٹیڈیم پر چھت ڈال دی گئی ہے۔ اس شیڈ میں کم و بیش ڈیڑھ سو گاڑیاں موجود تھیں۔ دوسرے تین شیڈ بھی بالکل ساتھ

ساتھ ہی واقع تھے۔

یہ ہفتے کی رات تھی۔ گودام پر صرف ایک نمائشی عملہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میں نے مدن کو ہدایت کی کہ وہ کسی مناسب بہانے سے عملے کے ارکان کو پندرہ بیس منٹ کے لیے کسی دوسرے شیڈ کی طرف بھیج دے۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد مدن نے میری ہدایت پر عمل کیا، تاہم میں نے محسوس کیا کہ عملے کے انچارج کو مدن کی یہ ہدایات کچھ پسند نہیں آئیں۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور وہ میری طرف سے شک کا شکار بھی دکھائی دیتا تھا۔

بہرحال اس نے عملے کے تین چار افراد کو شیڈ سے باہر بھیج دیا تھا۔ میں اور مدن شیڈ کے آفس میں کھڑے تھے جب سفید فام برطانوی انچارج اندر آ گیا۔ اس نے مدن سے کہا "کیا میں آپ سے اکیلے میں بات کر سکتا ہوں؟"

"تم نے جو کہنا ہے یہیں کہہ دو۔" مدن نے مری مری آواز میں کہا۔

انچارج بولا "گستاخی معاف سر! یہ رولز کے خلاف ہے کہ ہم سب دوسرے شیڈ میں چلے جائیں۔ اس کے علاوہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ..." ابھی الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ میرے بے آواز پسٹل سے گولی نکلی اور برطانوی انچارج کی ٹھوڑی توڑ کر نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین کی طرف آیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے سنبھالا اور آہستگی سے فرش پر لٹا دیا۔ گولی چلنے کی جو مدھم سی آواز ابھری تھی اس نے ایک بدقسمت پہرے دار کو اندر کھینچ لیا۔ وہ اس موت سے بے خبر تھا جو آفس کے دروازے کے پاس ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

جونہی وہ اندر آیا اور اس نے اندر کا نقشہ دیکھ کر اپنی رائفل سیدھی کرنا چاہی، میں نے اس کی گردن دبوچی اور منہ کا "آواز" کا نکال دیا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح میری بانہوں میں جھول گیا۔ گردن ٹوٹنے کی آواز اتنی نمایاں تھی کہ اس کی موت میں کسی طرح کا شبہ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ قالین پر گر کر پہرے دار کا جسم تھوڑا سا اینٹھا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ مدن لال کا انتہائی زرد رنگ کچھ اور بھی زرد ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی گر کر بے ہوش ہو جائے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مدن لال عملے کے باقی دکان کو بھی کچھ دیر باہر بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اب میری ہر ہدایت پر بلا چون و چرا عمل کر رہا تھا۔ آفس میں بس ایک نیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ تار بھی کاٹ دیا۔ اس کے بعد میں نے مدن کو آفس میں بند کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ شیڈ میں موجود جیپوں کے اندر تھوڑا!

طاہر جاوید مغل کے دل گداز
قلم سے ایک خوبصورت ناول
پرستش
قیمت: ۱۵۰ روپے
محبت کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک پُراثر کہانی
بہترین گردوپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ
براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۳۲۷۲۱۴
اسٹاکسٹ: علی بُک سٹال
نسبت روڈ چوک میو ہسپتال لاہور
فون: ۷۲۲۳۹۵۳
اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

بہت پٹرول موجود ہوگا۔ یہ پٹرول گاڑیوں کو آگے پیچھے حرکت دینے کے لیے ان کے اندر ٹینکی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے۔ میں نے ایک طویل قطار میں سے چند گاڑیوں کے بونٹ اٹھائے اور ان کی فیول لائنیں ایک بڑے پلاس کی مدد سے کاٹ دیں۔ جونہی میں فیول لائن کاٹتا تھا پٹرول ایک باریک دھار کی صورت فرش پر بہنے لگتا تھا۔ اگلے دس منٹ میں میں نے شیڈ میں موجود ڈیڑھ سو جیپوں میں سے کم از کم پندرہ بیس جیپوں کی فیول لائنز کاٹ دیں۔ پٹرول تیزی سے فرش پر بہنے لگا۔ پٹرول کی بو یقیناً مدن تک بھی پہنچ رہی ہوگی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھ سے اس بارے میں سوال کر سکتا۔

آفس کے قریب ہی مجھے موبل آئل سے بھرے ہوئے چند ڈرم بھی نظر آ گئے۔ میں نے ان ڈرمز کے کیپ ہٹائے اور انہیں بھی فرش پر لڑھکا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ موبل آئل بھی فرش پر بھیلتا چلا گیا۔ اب فقط ایک دیا سلائی کی ضرورت تھی۔

میں نے آفس کا دروازہ کھولا۔ مدن کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے پسٹل مدن کی طرف سیدھا کرتے ہوئے کہا "سوری مدن! تم نے مجھ سے تعاون کیا ہے لیکن میں تمہیں زندہ نہیں رکھ سکتا۔"

"ہیپ۔ پلیز۔ فار گاڈ سیک..... مجھے معاف کر دو۔ میں بھگوان کی قسم کھاتا ہوں۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ وعدے توڑنے کے لیے کیے جاتے ہیں اور جو وعدہ تم کر رہے ہو یہ تو ویسے ہی بڑا ناپائیدار ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں سائیں عالی کی بددعا لگ چکی ہے۔ خدا حافظ۔" میں نے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کی شہ رگ چیرتی ہوئی سر کے عقب سے نکل گئی۔ وہ الٹ کر ریوالونگ چیئر پر گرا اور پھر زمیں بوس ہو گیا۔

اسے گولی مار کر میں نے اس کی موت کو آسان بنا دیا تھا۔ ورنہ اسے بھی اسے وسیع شیڈ اور اس میں موجود گاڑیوں سمیت نذر آتش ہو جانا تھا۔ شیڈ کے مین دروازے کے بالکل قریب کھڑے ہو کر میں نے دیا سلائی روشن کی۔ پٹرول کی ایک لکیر بہتی ہوئی میرے بالکل قریب چلی آئی تھی۔ میں نے دیا سلائی اس لکیر پر پھینک دی۔ آگ بڑی تیزی سے اپنے سفر پر روانہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے قطار در قطار کھڑی جیپوں کے نیچے پھیل گئی۔ شعلے تیزی سے بلند ہوئے تو میں گیٹ میں سے سلپ ہو کر باہر نکل آیا۔ ایک دم ہی ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی تھی میں نے درجنوں باوردی کارکنوں کو آگ کی جانب بھاگتے دیکھا۔ یہ افراتفری فرار ہونے کے لیے بے حد موزوں تھی۔ میں احتیاط سے پیچھے ہٹتا گیا۔ چند منٹ میں میں آتشزدگی کے مقام سے محفوظ فاصلے تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے ان گنت دھماکوں کی آوازیں سنیں۔ یہ ٹائر برسٹ ہونے کی آوازیں تھیں۔ شیڈ میں بھڑکنے والے شعلے دیکھتے ہی دیکھتے چالیس پچاس منٹ کی بلندی تک چلے گئے تھے۔ مدن لال کی ٹویوٹا جیپ کی چابی اس کے اگنیشن میں لگی موجود تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور بھاگتے دوڑتے لوگوں کے درمیان سے ڈرائیو کرتا ہوا بڑی سڑک کی طرف نکل گیا۔

○☆○

اگلے روز کے اخبارات میں "فرسٹ اسٹورز" میں ہونے والی آتشزدگی کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ موجود تھیں۔ گودام نمبر بی نو اور بی تھری کے چار شیڈ جل کر بالکل راکھ ہو گئے تھے۔ ان میں موجود اشیا بھی راکھ میں بدل گئی تھیں۔ اس آگ نے کم و بیش چار سو گاڑیوں کو اسکریپ میں بدل دیا تھا۔ بی تھری کے ایک گیراج سے یہ آگ قریبی گودام میں داخل ہو گئی تھی۔ اس گودام میں اندازاً ڈیڑھ کروڑ روپے مالیت کی آئیوری، آرائشی اشیاء اور ساگوان کی لکڑی کا سامان موجود تھا۔ یہ سب کچھ بھی خاکستر ہو گیا تھا۔ تیز ہوا کے سبب یہ آگ مزید پھیل سکتی تھی۔ کولمبو انتظامیہ نے آگ پر قابو پانے کی بھرپور کوششیں کی تھیں۔ آخری خبریں آنے تک کئی جگہوں پر ملبے سے ابھی تک شعلے اٹھ رہے تھے۔ ان خبروں کے ساتھ ساتھ تین ہلاکتوں کی خبر بھی شائع ہوئی تھی۔ پہلی ہلاکت ایک لڑکی کی تھی۔ یہ انگریز لڑکی مدن لال کی رکھیل بتائی جا رہی تھی۔ اسے مدن لال کی رہائش گاہ پر ہلاک کیا گیا تھا۔ دوسری ہلاکت خود مدن لال کی تھی۔ وہ فرسٹ اسٹورز کا نیجرانچارج تھا۔ شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بی نو گودام میں ہونے والی خوفناک آتشزدگی میں ہلاک ہوا ہے لیکن بعد ازاں ڈاکٹری معائنے میں پتا چلا تھا کہ اس کی موت بھی گولی لگنے سے واقع ہوئی ہے۔ تیسری ہلاکت گودام انچارج مسٹر اینڈرسن کی تھی۔

اس آتشزدگی کو مجرمانہ فعل قرار دیا جا رہا تھا۔ بی نو گودام کے عملے نے بیان دیا تھا کہ کوئی شخص مدن لال صاحب کے ساتھ رات گئے فرسٹ اسٹورز میں آیا تھا۔ اس کے طور اطوار مشکوک تھے۔ غالب امکان ہے کہ وہی شخص ان ہلاکتوں کے لیے ذمے دار ہے۔ ایک باخبر اخبار نے اس حوالے سے

مسز کلارک اور شیخ عاصم کی کاروباری دشمنی کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ جب مسز کلارک کا ذکر آیا تھا تو پھر اس کے ساتھ میرا اور مندرو وغیرہ کا تذکرہ بھی ہوا۔

مجھے کامل یقین تھا کہ اس واقعے کے بعد شیخ عاصم اور ات میں اپنی مصروفیات چھوڑ کر سری لنکا کا رخ کرے گا اور یہی میں چاہتا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اگلے روز صبح سویرے شیخ عاصم سری لنکا میں تھا۔ شیخ کے ساتھ اس کے تین قریبی منیجر بھی تھے۔ وہ بھی نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے پہنچے تھے۔ مزے کی بات تھی کہ شیخ کے ان اثاثہ جات کی انشورنس ایک ایسی کمپنی نے کر رکھی تھی جسے شیخ کا ایک قریبی دوست چلاتا تھا۔ اس کمپنی میں بھی عاصم کے پینتیس فیصد شیئرز تھے۔ گاڑیوں وغیرہ کی انشورنس ابھی نہیں ملی تھی اور گاڑیوں کا نقصان شیخ عاصم کا خالص نقصان تھا۔

میں نے اپنے منیجر جے کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ کولمبو میں شیخ کی آمد اور اس کی نقل و حرکت کا مکمل حساب رکھے اور مجھے صورت حال سے آگاہ کرتا رہے۔ شیخ کے کولمبو پہنچتے ہی جے نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دینا شروع کر دیا۔

اس روز صبح سویرے سائیں عالی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ڈوچڑے ڈرائیو وے پر دوڑیں لگا رہا تھا۔ میں نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ بولا "حکیموں اور داناؤں نے کہا ہے کہ رات کو سونے سے پہلے تھوڑی سی چہل قدمی ضرور کر لینی چاہیے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تو دن چڑھ رہا ہے۔"

"دراصل میں نے ناشتا شام کو کیا تھا۔ اس کی وجہ سے سارا ٹائم ٹیبل خراب ہو گیا۔ مجھے دوپہر کا کھانا رات ایک بجے کھانا پڑا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ڈنر کیا ہے۔ ڈنر میں نہار منہ بھی گاجریں کھائی ہیں اور اوپر سے کچا دودھ پیا ہے سرسوں کا تیل ڈال کر۔ یہ ذرا بھاری ڈنر ہو گیا ہے اس لیے چہل قدمی کر رہا ہوں۔ یہ دیکھو یہ آئی ڈکار۔"

اس نے سچ مچ غرغوں کر کے ایک لمبی ڈکار لی اور خوش ہو کر بولا۔ مجھ سے کہنے لگا "شیخ عاصم کے بارے میں تیرا کیا ارادہ ہے۔"

"اب میں اس کے ہاتھوں مروں گا یا وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"لیکن تم کچھ اور بھی تو سوچ رہے ہو۔" سائیں نے کہا۔

"کیا سوچ رہا ہوں؟"

"یہی کہ قتل کر دینا تو کوئی سزا نہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ دشمن زندہ رہے اور دشمنی کا مزہ چکھے۔"

سائیں ایسے ہی حیران کرتا تھا۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ اس نے کوئی خاص شیشہ لگا کر بندے کے دل میں جھانک لیا ہے۔ میں نے کہا "اگر ایسا ہے بھی تو کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے۔"

"بالکل نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ شیخ عاصم ان لوگوں میں سے ہے جن کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے تو وہ ظلم کی انتہا کو چھو جاتے ہیں لیکن کیا تم اسے قتل کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی گردن پر ان گنت خون ہیں اور ان میں ساہی صاحب کا خون بھی ہے۔ اب وہ رہے گا یا میں رہوں گا۔"

سائیں سے مل کر میں قوسیہ اور باری کے کمرے کی طرف گیا۔ قوسیہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں باری ہاتھوں میں چائے کے دو کپ لیے آیا۔ اس نے ایک کپ قوسیہ کی طرف بڑھایا۔ اس نے پہلے تو بڑی غلط نگاہ سے باری کی طرف دیکھا، پھر چائے لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ چائے قوسیہ کو تھماتے ہوئے باری سے تھوڑی سی چائے قوسیہ کی جبین پر گر گئی۔ قوسیہ کے چہرے پر یک لخت بیزاری کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے ناک چڑھا کر باری سے کچھ کہا، پھر چائے جھٹکے سے تپائی پر رکھی اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ باری افسردہ انداز میں کھڑا رہ گیا تھا۔ میں نے یہ سارا منظر کمرے کے اندر سے ہی دیکھا۔

کچھ دیر بعد میں نے باری کو بڑی مایوسی کے عالم میں چھت پر بیٹھے دیکھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے ہلکی سی حرارت ہے۔ میں جانتا تھا کہ حرارت وغیرہ کچھ نہیں۔ بس قوسیہ کے رویے نے اسے مضمحل کر رکھا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے ترس آ رہا تھا۔ تھوڑی پر ابھی تک پٹی چپکی ہوئی تھی۔ چھری کی ضرب کا پرانا نشان ماضی قریب کی تلخیوں کی یاد دلا رہا تھا۔ کسی وقت یہ نشان اتنے نمایاں دکھائی دیتا تھا کہ باری کی وجاہت مکمل طور پر اس کے پیچھے چھپ جاتی تھی۔ وہ پچھلے چند دن سے قوسیہ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سو رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے اتنا ہی دور ہے جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی۔

سہ پہر کو جب باری اپنے زخم کی پٹی بدلوانے کولمبو گیا میں نے قوسیہ کے کمرے سے دونوں سنگل بیڈ اٹھوا کر وہاں ایک ڈبل بیڈ رکھوا دیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟" قوسیہ نے مجھے دیکھا

تو تنک کر بولی۔

میں نے کہا "میاں بیوی کے کمرے میں الگ الگ بستر ہوں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔"

"دیکھو تم لوگ مجھے دیوار سے مت لگاؤ۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرسکتی ہوں۔"

"یہ تمہیں برداشت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اپنے اوپر سے مردانہ پن کا یہ مصنوعی خول اتار پھینکو۔ خدا نے تمہیں عورت پیدا کیا ہے۔ اپنا مقام پہچانو۔ یہ قابلِ فخر مقام ہے۔ اپنے شوہر کی عزت کرو گی تو سمجھو کہ تم اپنی عزت کررہی ہو۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری ناقابلِ برداشت زیادتیوں کے باوجود اب بھی تم سے اس کا رویّہ محبت اور مہربانی کا ہے۔ اگر تم سچ پوچھتی ہو تو یہاں تم مکمل طور پر اس کے رحم وکرم پر ہو۔ وہ تم سے جیسا رویہ چاہے اپنا سکتا ہے۔"

"میرے لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔" وہ تڑخ کر بولی "میں لعنت بھیجتی ہوں ان مردوں پر جو عورت کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھتے ہیں۔ عورت ایک آزاد انسان ہے۔ وہ کوئی بکاؤ جنس نہیں اور نہ کسی کی باندی ہے۔"

میں نے کہا "اگر لعنت بھیجنی ہے تو پھر سب سے پہلے اپنے بھائی پر بھیجو۔ جس قسم کا رویّہ تم اپنا رہی ہو وہ عاصم جیسے لوگ ہی اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے حرم سجا رکھے ہیں۔ باری تو تم سے پیار کرتا ہے، تمہیں دل کی رانی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ یہ تم ہو جو قدم قدم پر اسے ٹھکرا رہی ہو اور زخم دے رہی ہو۔ میں نے آج صبح بھی تمہاری ایک ذلیل حرکت دیکھی ہے اور میں تمہیں بتاتا ہوں اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔ تم نے ابھی سختی کی بس ایک جھلک دیکھی ہے، مکمل سختی نہیں دیکھی۔ میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں۔ مجھے اس پر مجبور مت کرو۔"

میری آنکھوں میں جھانک کر اس کے چہرے پر سایہ لہرا گیا "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے شوہر کو تم سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے اسے مزید دکھ نہیں ملنا چاہیے۔ اگر ملے گا تو پھر تم بھی خیریت سے نہیں رہو گی۔"

میں اس کا جواب سنے بغیر تیزی سے باہر نکل آیا۔

رات کو باری اپنے کمرے میں جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ یقیناً اس کا خیال تھا کہ ثوبیہ اس کے ساتھ ایک ہی بیڈ پر سونے کے لیے تیار نہیں ہوگی اور کوئی ایسی ویسی بات دے گی۔ میں نے باری کو تھوڑا سا سمجھایا، تھوڑا سا میں نے اس سے کہا کہ اگر ثوبیہ نادان ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ نادان کیوں بن رہا ہے۔ ثوبیہ کو راہِ راست پر لانا چاہیے نہ کہ خود راہ سے بھٹک جانا چاہیے۔

وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات خیریت سے گزری۔ اگلے روز بھی حالات نارمل ہی نظر آتے رہے لیکن رات کو گڑبڑ ہوگئی۔ مجھے ثوبیہ والے کمرے سے اونچی آواز میں باتوں کی صدا آئی۔ اندازہ ہوا کہ ثوبیہ اور باری میں کسی بات پر تلخ کلامی ہوئی ہے۔ میں باہر نکلا تو باری جھلائے ہوئے انداز میں اپنے گاؤن کی ڈوریاں باندھتا کمرے سے برآمد ہو رہا تھا پھر وہ تیزی سے چلتا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ ثوبیہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ باری نے نہیں دیکھا تھا، شاید ثوبیہ نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل سچ مچ رنج گیا۔ میں ثوبیہ کے پاس پہنچا۔ بغیر کسی تمہید میں نے پوچھا "کیا بات ہوئی ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا ہے، تم نے ضرور اسے کچھ کہا ہے جو وہ اتنا سٹپٹایا ہوا نکلا ہے۔ بتاؤ۔ کیا کہا ہے تم نے؟"

"کچھ نہیں کہا۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔ اس کا انداز گواہ تھا کہ حسبِ عادت اس نے باری کو بے عزت کرنے کے لیے کوئی الٹی سیدھی بات کہی ہے۔

"دیکھو ثوبیہ۔" میں نے اس کے بوائے کٹ بال کھینچ کر اس کا سر اونچا کیا "اگر باری آج رات اپنے کمرے میں نہ سویا تو تم بھی سو نہیں سکو گی۔ تم مجھے بدترین طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کررہی ہو۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ باری کو اس کمرے میں واپس آنا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت!" میں نے خطرناک انداز میں کہا اور تیزی سے گھوم کر واپس چلا گیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دیکھا تو وہ دونوں اپنے کمرے میں موجود تھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ ثوبیہ، باری کو کسی طرح منا کر واپس لے آئی تھی۔

اگلے چھتیس گھنٹے میں میاں بیوی کے تعلقات میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ مثبت تبدیلی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے درمیان غیریت کی بلند و بالا دیوار ڈھے گئی اور وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے ہیں۔ مجھے بار‘‘...

چہرے پر اطمینان کی چمک نظر آرہی تھی۔ ثوبیہ کے ماتھے کی تیوریاں بھی ناپید تھیں۔ اس کے انداز اور طور اطوار تو ظاہر ہے اب بھی لڑکوں جیسے ہی تھے لیکن رویے میں نرمی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے سہ پہر کے وقت دیکھا تو وہ چائے پی رہے تھے۔ ثوبیہ نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر باری کو دی۔ اسی دوران میں ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ثوبیہ کے چہرے پر بڑی ہلکی سی سرخی نمودار ہو کر اوجھل ہوگئی۔

میں ان کے قریب بیٹھ گیا اور ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ ثوبیہ نے اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیا۔ وہ ٹی وی پر دکھایا جانے والا ایک کرکٹ میچ دیکھتی رہی۔ باری کے بقول وہ خود بھی کرکٹ اور گھڑ سواری میں بہت مہارت رکھتی تھی بلکہ اب بھی یہ دونوں کھیل کھیلتی تھی۔ ثوبیہ کچھ دیر بعد اٹھ کر اندر چلی گئی تو میں نے باری سے پوچھا "کیسے حالات جارہے ہیں؟"

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا "کافی ٹھیک ہیں جناب۔ وہ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔"

"لیکن اس دفعہ دھوکا نہیں کھانا۔ بڑی احتیاط سے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہو ممکن ہے کہ وہ پھر کوئی کام دکھانے کی کوشش کرے۔"

"دلوں کے راز تو اللہ ہی جانتا ہے جی لیکن لگتا ہے کہ اس کی عقل نے کام کرنا شروع کردیا ہے۔ اپنے پچھلے رویّے پر تھوڑی سی شرمندہ بھی نظر آتی ہے۔ آج صبح میری غیر موجودگی میں اس نے میرے کپڑے بھی پریس کیے ہیں۔ پہلے تو میں اس قسم کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اس امکان کو ذہن سے مت نکالنا کہ یہ سب اداکاری بھی ہوسکتی ہے۔"

"آپ کے ہر مشورے کی میرے نزدیک بے حد قیمت ہے جناب!"

"ہمیں ثوبیہ کی پہرے داری میں کسی طرح کی غفلت نہیں کرنی ہے۔ خیال رکھو کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے بس اندرونی حصے تک محدود رہے۔ کسی بھی وجہ اور کسی بھی کام سے اسے ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں لے جانا ہے۔ رات کو کمرے کا دروازہ مقفل رکھا کرو اور چابی احتیاط سے جیب میں ڈالا کرو۔"

"ایسا ہی ہوگا جناب!"

"اس نے ریسٹ ہاؤس سے باہر جانے کی خواہش تو ظاہر نہیں کی؟"

"نہیں سر! باہر جانے کی بات تو نہیں کی۔ کل رات آنکھوں میں آنسو بھرے بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے۔" کہنے لگی امی اور بھائی جان سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "اسے تسلی دو۔ اسے کہو کہ امی تو نہیں لیکن بھائی جان (عاصم) سے ایک آدھ دن میں تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔"

باری نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کا سایہ لہرا گیا۔ کہنے لگا "گستاخی معاف جناب! کیا عاصم صاحب یہاں آئیں گے؟"

"خود کہاں آئیں گے۔ انہیں لانا پڑے گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ باری کے چہرے پر خوف آمیز تحیر تھا۔

○☆○

پورا پروگرام طے ہوچکا تھا۔ میں نے کولمبو سے ایک بہترین شخص کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ یہ مسلمان تھا اور اس کا نام علی احمد تھا۔ یہ ایک نڈر اور دلیر شخص تھا۔ پچھلی مرتبہ جب میں سری لنکا آیا تھا تو اس جواں سال سنہالی سے تعارف ہوا تھا۔ میں نے علی احمد کو ایک شاندار جیگوار کار مہیا کی تھی۔ اس بلٹ پروف کار میں چند ایک اہم خصوصیات موجود تھیں۔ ان خصوصیات کو اپ ڈیٹ کرنے میں کافی رقم خرچ ہوئی تھی۔ بہرحال عاصم جیسے شخص پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یہ اہتمام ضروری تھا۔

میری معلومات کے مطابق عاصم کو آج دوپہر پھر تباہ حال گوداموں کا معائنہ کرنے کے لیے فرسٹ اسٹورز آنا تھا۔ وہ دو یا تین گاڑیوں کے قافلے میں آتا تھا۔ عاصم کی بلٹ پروف جیپ درمیان میں ہوتی تھی۔ مسلح گارڈز کی ایک گاڑی آگے اور دوسری پیچھے ہوتی تھی۔ تاہم کسی وقت جیپ کے ساتھ صرف ایک گاڑی ہوتی تھی جو بلٹ پروف جیپ کے آگے آگے چلتی تھی۔ آج اپنے پروگرام کے مطابق عاصم کو فرسٹ اسٹورز کے معائنے کے بعد مضافات کی طرف جانا تھا اور ساحل کے قریب تعمیر ہونے والے اپنے ایک ہوٹل کا معائنہ کرنا تھا۔ یہ کولمبو کے جنوب کی طرف تیس چالیس میل کا سفر تھا۔ اس سفر کے دوران میں "رت زیلا" نامی مقام پر ایک جگہ دشوار موڑ تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہاں گاڑیوں کی رفتار سست ہوگی۔ دو تین بار ریکی کرنے کے بعد میں نے اپنی کارروائی کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میں دوپہر قریباً بارہ بجے اپنی کار کے ذریعے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ یہ سڑک سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ایک پرانی عمارت تھی۔ اس کا ایک حصہ شدید بارشوں کے سبب

مسمار ہو چکا تھا۔ باقی حصے میں جنگلی کبوتروں اور چمگادڑوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں اپنی رائفل سمیت دوسری منزل پر چلا گیا اور ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں والے ایک گرد آلود کمرے میں پوزیشن لے لی۔ اس رائفل کی رینج تقریباً ایک ہزار میٹر تک تھی۔ رائفل پر ٹیلی اسکوپ اور دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور شیخ عاصم کا انتظار کرنے لگا۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس رائفل کی پہلی گولی عاصم کے مغز میں اتار دوں مگر اس کام کے لیے مجھے ابھی تھوڑا سا انتظار کرنا تھا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ ہلکی ہوا سمندر کی طرف سے چل رہی تھی۔ جس سڑک سے عاصم کو گزرنا تھا اس پر ٹریفک خاصا کم تھا۔ بس کسی وقت پھلوں یا سبزیوں سے لدا ہوا کوئی ٹرک دھواں چھوڑتا ہوا گزر جاتا تھا یا کسی کار کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ سری لنکا کی ٹریفک میں پاکستانی ٹریفک کی جھلکیاں ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سری لنکا بھی برٹش گورنمنٹ کے زیر نگیں رہا ہے۔

دفعتاً میں چونک گیا۔ مجھے شیخ عاصم کی جیپ کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس کے آگے ایک کھلی جیپ تھی جس پر چھ مسلح گارڈز سوار تھے۔ تین گارڈز عاصم کی جیپ کے اندر بھی موجود رہتے تھے۔ یعنی یہ کل نو گارڈز تھے۔ آج تیسری گاڑی عاصم کے ساتھ موجود نہیں تھی اور ایک طرح سے یہ میرے لیے پلس پوائنٹ ہی تھا۔

میں نے نشانہ لے لیا۔ نشانہ لیتے وقت میرے ذہن میں صفدر کا خیال آیا۔ وہ ماہر نشانے باز میرے ساتھ ہوتا تو اس وقت رائفل میرے بجائے اس کے ہاتھ میں نظر آتی۔ دل سے ایک ہوک نکل کر رہ گئی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں سے اگلی جیپ کو دیکھا اور اس کے ٹائر کا نشانہ لے لیا۔ میرا دوسرا فائر نشانے پر لگا۔ تیزی سے دوڑتی ہوئی جیپ بری طرح ڈگمگائی اور سڑک سے کچے میں اتر گئی۔ اسی دوران میں میں نے عاصم کی جیپ کا نشانہ لے لیا تھا۔ اس مرتبہ بھی مجھے دو فائر کرنے پڑے۔ جیپ کے بائیں جانب کے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے اور وہ دور تک ڈگمگاتی چلی گئی۔ گارڈز والی جیپ کچے میں اترنے کے بعد پہلو کے بل الٹ گئی تھی اور اس کے چاروں طرف گرد و غبار نظر آ رہا تھا۔ میں نے گارڈز کو بھاگ بھاگ کر درختوں کے پیچھے پوزیشنز لیتے دیکھا۔ عاصم والی جیپ میں سے بھی گارڈز چھلانگیں لگا کر نکلے اور جیپ کی آڑ لے لی۔ انہیں ابھی تک ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا تھا کہ فائر کہاں سے آ رہا ہے۔ میں نے گاڑیوں پر تابڑ توڑ گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ فائرنگ کے لیے میں رائفل کے ساتھ ساتھ اپنا طاقت ور پسٹل بھی استعمال کر رہا تھا۔ عاصم اور اس کے ساتھیوں کو یقیناً یہی تاثر مل رہا تھا کہ چار پانچ افراد نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا ہے۔

یہی وقت تھا جب ایک سفید گاڑی موقعے پر پہنچی اور رک گئی۔ عاصم کے سیکیورٹی گارڈز نے اس موقعے کو غنیمت جانا۔ انہوں نے پہلی طرف کا دروازہ کھول کر عاصم کو جیپ سے نکالا اور اس سفید گاڑی میں سوار کرا دیا۔ دو مسلح گارڈ بھی عاصم کے ساتھ گاڑی میں گھس گئے۔ عاصم کے گارڈز نے سفید گاڑی کے ڈرائیور کو یوٹرن لینے کا حکم دیا۔ گاڑی مڑی۔ اس کے پہیے چرچرائے اور وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح درختوں کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

اب میرا یہاں رکنا بیکار تھا۔ میں بھی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور عمارت کے عقب میں واقع گھنے درختوں میں روپوش ہو گیا۔ میری گاڑی تقریباً ایک کلومیٹر دور کھیتوں کے درمیان ایک ذیلی سڑک پر کھڑی تھی۔ میں جب تک گاڑی سے دور تھا خطرے میں تھا۔ گاڑی تک پہنچ کر میں خود کو محفوظ تصور کرنے لگا۔ میں نے رائفل ڈگی میں پھینکی اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ریسٹ ہاؤس واپس پہنچنے میں مجھے تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ میری گاڑی ریسٹ ہاؤس کے پورچ میں داخل ہوئی تو یہاں وہ سفید کار پہلے سے موجود تھی جس میں عاصم اور اس کے گارڈز سوار ہوئے تھے۔ عاصم کے گارڈز نے اس کار کی آمد کو ایک خوشگوار اتفاق سمجھا تھا لیکن یہ اتفاق نہیں تھا، سب کچھ طے شدہ تھا۔ اس سفید جیگوار کو علی احمد چلا رہا تھا۔

یہ کار میری آمد سے تقریباً دو تین منٹ پہلے ہی ریسٹ ہاؤس میں پہنچی تھی۔ اس کی سواریاں ابھی اندر ہی موجود تھیں۔ وہ بڑے سکون سے بیٹھی تھیں۔ انہیں باہر نکلنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اگر ہم انہیں ایک گھنٹا بھی باہر نہ نکالتے تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں فرمانا تھا۔ میں نے گاڑی کے رنگ دار شیشے کے اندر جھانکا۔ عاصم اور اس کے دونوں گارڈز نشستوں پر لڑھکے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ عاصم پچھلی نشست پر تھا۔ اس کے ساتھ ایک گارڈ موجود تھا۔ ایک گارڈ اگلی نشست پر تھا۔ جو گارڈ عاصم کے ساتھ بیٹھا تھا وہ بے ہوشی کی حالت میں عاصم پر اس طرح گرا ہوا تھا کہ اس کا سر عاصم کی گود میں چلا گیا تھا۔ عام حالت میں وہ شیخ عاصم سے اس طرح کی بے تکلفی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ شیخ عاصم صاحب خود بھی تھالی کے

طرح دائیں جانب لڑھکے ہوئے تھے۔ ان کے منحوس چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔ جیسے بے ہوش ہونے سے چند سیکنڈ پہلے انہوں نے اپنے دشمنوں پر بے تحاشا دانت پیسے ہوں۔ اگلا گارڈ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نیچے کو کھسک گیا تھا اور بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ ڈرائیور علی یعنی احمد نے بے ہوشی سے بچنے کے لیے جو چھوٹا سا گیس ماسک استعمال کیا تھا وہ ڈیش بورڈ پر دھرا تھا۔ احمد خود گاڑی میں نہیں تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد علی احمد سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر کامرانی کی خوشی تھی۔ اس نے مجھے فوجی انداز میں سیلوٹ کیا اور بولا "سر ہم کامیاب رہے۔"

"اور بغیر کسی خون خرابے کے۔" میں نے اضافہ کیا۔

"یس سر۔" وہ بولا "سب کچھ پلان کے مطابق ہوا۔ میں نے گاڑی آہستہ کی ہی تھی کہ ایک گارڈ نے سامنے کھڑے ہو کر مجھے روک لیا۔ میرے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی یہ لوگ اندر گھس آئے۔"

اس کے بعد احمد نے تفصیل کے ساتھ مجھے سب کچھ بتایا۔ موقع واردات سے آٹھ دس کلومیٹر آگے آنے کے بعد احمد نے ڈرائیونگ کے دوران میں خاموشی سے وہ بٹن دبایا تھا جس نے گاڑی کے چاروں دروازوں کو مکمل سیل کر دیا تھا۔ دوسرا بٹن پش کرتے ہی بے ہوش کرنے والی نہایت زود اثر گیس بڑے پریشر سے گاڑی میں داخل ہوئی تھی اور اس نے چند سیکنڈ میں تینوں سواریوں کو لمبا لٹا دیا تھا۔ گیس نے اتنی تیزی سے اثر کیا تھا کہ علی احمد کو گیس ماسک استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس نے بس ایک آدھ منٹ کے لیے اپنی سانس روک لی تھی۔ اس کے بعد گاڑی کی دو کھڑکیاں کچھ دیر کے لیے کھول دی تھیں۔

شیخ عاصم۔ مانا ہوا انٹرنیشنل سرمایہ دار جو درحقیقت انٹرنیشنل مفاد پرست بھی تھا، سفید جیگوار میں بے حقیقت کیچوے کی طرح پڑا تھا اور پوری طرح میری دسترس میں تھا۔ یہی در و دیوار تھے جہاں وہ کبھی فرعون بن کر رہتا تھا اور میرے سامنے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اس نے لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کیے تھے۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ میں اس کا مفتوح دشمن تھا اور غزالہ اس کے لیے مال غنیمت تھی۔ مجھے آج بھی ان در و دیوار میں عاصم کے مکروہ قہقہے گونجتے سنائی دیتے تھے۔ اس زمین میں آج بھی میرے اور غزالہ کے بے بس آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔ ان در و دیوار میں ہم ایک دوسرے کے قریب تھے پھر بھی سیکڑوں میل دور تھے۔ ہمارے درمیان شیخ عاصم تھا اور وہ غزالہ کا دولھا تھا۔ ان دنوں بھی یہ ریسٹ ہاؤس ایسے ہی پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان دنوں بھی یہاں کی فضاؤں میں سری لنکا کی میٹھی موسیقی گونجا کرتی تھی۔ موسیقی۔ جس میں چائے کی خوشبو تھی، گھنے جنگلوں میں برستی بارشوں کا شور تھا، اور سانولی حسیناؤں کی آنکھوں کا زعفرانی رنگ تھا لیکن یہ سب کچھ شیخ عاصم کی جارحیت نے زہر آلود کر رکھا تھا۔ شاید فضاؤں کی یہ زہرناکی ہی تھی جس نے غزالہ کو دیمک کی طرح چاٹا تھا اور وہ ایک حادثے کا شکار ہو کر قریب المرگ ہو گئی تھی۔ ان شب و روز کا ہر ہر لمحہ میرے دل و دماغ پر نقش تھا۔

اسی دوران میں لیونا بھی ٹہلتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ آج وہ مشرقی لباس میں تھی۔ سرخ اور سفید رنگ کی شلوار قمیص اس نے یقیناً مجھے متاثر کرنے کے لیے پہن رکھی تھی اور وہ واقعی متاثر کن نظر آتی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر اپنے جسم کو اپنے ہی بازوؤں میں بھینچ لینا اور ذرا لہرا کر چلنا اس کی خاص ادا تھا۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی اور بولی "اس گاڑی میں کون آیا ہے جہاں؟"

"خود آگے جا کر دیکھ لو۔"

"نہیں۔ آپ بتائیں نا۔" اس نے ٹھنک کر کہا۔

"ایک بہت بڑا چالباز ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک بھولی بھالی لڑکی کو اپنی ہوس کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ اس بے چاری کو باور کرا رکھا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ پیار اور آرام سائنس اسے کوئی نہیں دے سکتا۔"

"پہیلیاں کیوں بجھواتے ہیں۔ پلیز سیدھی طرح بتائیں نا کون ہے؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

میں نے کندھے کے قریب سے اس کا نرم بازو اپنی گرفت میں لیا اور اسے کھینچ کر گاڑی کے بالکل قریب لے گیا۔ لیونا نے گاڑی کی کھڑکی پر جھک کر اندر جھانکا اور اس کی حسین آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ "او گاڈ" اس کے ہونٹوں سے نکلا پھر وہ چہرے پر زلزلے کے آثار لیے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "یہ۔ آپ نے کیا کیا ہے جہاں؟ یہ لوگ۔ زندہ تو ہیں نا؟"

"ابھی تک تو زندہ ہیں موہنی! اگر تم اشارہ کرو تو چند منٹ میں اوپر پہنچا دیتا ہوں۔"

"نن نہیں جہاں۔ یہ بہت بڑا قدم ہو گا قیامت کھڑی ہو جائے گی۔ ہمیں۔ اس معاملے کو سمیٹنا چاہیے اور نہیں بگاڑنا چاہیے۔ او مائی گاڈ۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عاصم کو اس حال میں دیکھوں گی۔"

"ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا جان جہاں۔ ابھی تو یہ نامراد ہوس پرست یہاں تشریف ہی لایا ہے۔"

"نہیں جہاں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس معاملے کو مزید مت بگاڑیں۔ بہت زیادہ آگ بھڑک اٹھے گی۔ بہت کچھ جل جائے گا۔"

"یہ آگ اسی حرام زادے نے بھڑکائی ہے ڈارلنگ! اور جلے گا بھی یہ خود ہی۔" میں نے عاصم پر قہرناک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

میری ہدایت پر منیجر نے اپنے تین کارندوں کے ذریعے عاصم کو اس کے دونوں گارڈز سمیت اٹھا کر اندرونی کمروں میں پہنچا دیا۔ سفید جیگوار کو گیراج میں بند کروا دیا گیا۔ عاصم کے لیے ایک کمرا میں نے پہلے سے تیار کروا رکھا تھا۔ اس میں ایک بڑی کھڑکی بھی تھی۔ کھڑکی میں اندر کی طرف اسٹیل کی دیدہ زیب گرل تھی۔ باہر رنگ دار شیشہ لگا ہوا تھا۔ یہ شیشہ باہر کی طرف سے بالکل بلائنڈ تھا تاہم عاصم اس میں سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کمرے میں کوئی ایسی شے نہیں رہنے دی گئی تھی جسے عاصم ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ اس کمرے میں ایک آرام کرسی ایسی بھی تھی جو عاصم کے شایانِ شان تھی۔ اس کرسی پر ہینڈ کف اور فٹ کف لگے ہوئے تھے۔ ان کے ذریعے بیٹھنے والے کو مکمل طور پر جکڑا جا سکتا تھا۔

شام کے اخبار میں شیخ عاصم کے اغوا کی تفصیلی خبر موجود تھی۔ یہ اخبار سنہالی زبان میں تھا۔ منیجر نے مجھے یہ خبر پڑھ کر سنائی۔ وہ بولا "آج دوپہر معروف اماراتی بزنس مین مسٹر شیخ عاصم بن ارشد کو نامعلوم مسلح افراد نے اغوا کر لیا۔ مسٹر عاصم اپنے گوداموں کا جائزہ لینے کے بعد بذریعہ سڑک کولمبو سے "بوجان" کی طرف جا رہے تھے۔ "رت ڈیلا" کے نزدیک ان کی گاڑیوں پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ اس فائرنگ سے گارڈز کی گاڑی الٹ گئی اور اس میں سوار ایک شخص شدید زخمی ہو گیا۔ فائرنگ کے دوران میں ہی ایک سفید جیگوار کار موقعے پر پہنچی۔ کار سواروں نے مسٹر عاصم کو ان کے دو گارڈز سمیت زبردستی کار میں بٹھایا اور لے گئے۔ ابھی تک تینوں افراد کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ یاد رہے کہ ہفتے کی شب مسٹر عاصم کے فرسٹ اسٹورز میں پراسرار طور پر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس واقعے میں کروڑوں روپے کی گاڑیاں اور دیگر سامان خاکستر ہو گیا تھا۔ مسٹر عاصم اسی نقصان کا تخمینہ لگانے کے لیے کولمبو آئے ہوئے تھے۔ آج ہونے والی اس واردات نے عوام الناس کے مختلف طبقوں میں سنسنی پھیلا دی ہے۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ "فرسٹ اسٹورز" میں ہونے والی آتشزدگی اور آج کی واردات ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس حوالے سے مسٹر شیخ کے پرانے حریف شاہ جہاں اور استاد جہانی اور اس کے ساتھیوں کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ عرصہ پہلے پاکستان میں ایک بڑا پولیس آفیسر قتل ہو گیا تھا۔ اس آفیسر سے شاہ جہاں کے نہایت قریبی مراسم تھے۔ آفیسر کے قتل کے بعد سے شاہ جہاں منظر سے غائب ہے۔ ہفتے پہلے تک اطلاع یہ تھی کہ شاہ جہاں امارات میں ہے۔ اس بات کے ثبوت بھی ملے تھے کہ مسٹر شیخ کی فرانسیسی گرل فرینڈ مس لیونا کو ابو ظہبی کے "لیونا لاج" سے اپنے ساتھ لے جانے والا بھی شاہ جہاں ہی تھا۔

ایک دوسرے اخبار میں بھی یہ ساری خبریں موجود تھیں۔ اس اخبار میں تھوڑا سا ذکر مسٹر کلارک کا بھی آیا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ مسٹر کلارک کو شاہ جہاں کے پشت پناہ کی حیثیت حاصل ہے اور مسٹر کلارک کئی طریقوں سے شاہ جہاں اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر رہے ہیں۔

یہ خبریں پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوا۔ رگ و پے میں ایک میٹھے میٹھے احساس کی لہر دوڑ گئی۔ سجے کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میں چہل قدمی کے لیے باغیچے کی طرف آیا۔ مجھے ٹہلتے دیکھ کر لیونا بھی وہاں چلی آئی اور میرے قدم سے قدم ملانے لگی۔ حسبِ عادت اس نے اپنے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے۔ لمبے سنہری بال خوشگوار ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بولی "جہاں! میں بہت پریشان ہوں۔ آپ نے یہ کیوں کیا ہے۔ ابھی ٹی وی پر بھی یہ ساری خبر چل رہی تھی۔ اس میں آپ کا نام بھی بار بار آ رہا تھا۔"

میں نے اس کے بالوں کو چومتے ہوئے کہا "میری جان! یہ سب کچھ تمہاری خاطر ہی تو ہے۔ عاصم تمہارے لیے ڈراؤنا خواب بنا ہوا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر تم ڈر جاتی تھیں۔ میں نے سوچا جس کی آمد کا ڈر میری ڈارلنگ کو پریشان کر رہا ہے کیوں نہ اسے خود ہی یہاں لے آؤں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

وہ سنجیدگی سے بولی "میں اپنی حیثیت اچھی طرح جانتی ہوں جہاں! مجھے معلوم ہے کہ آپ کے نزدیک میری محبت سے زیادہ شیخ عاصم کی دشمنی اہم ہے۔"

میں نے سوچا۔ اور میں بھی اپنی حیثیت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے نزدیک مجھ سے زیادہ میری دولت اہم ہے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میرا تو دل چاہتا ہے کہ ہم سب عداوتیں اور دشمنیاں بھلا کر کسی دور دراز جگہ چلے جائیں۔ یورپ کے کسی خوب صورت جزیرے میں عرصہ ایک دوسرے میں گم ہو کر سکون سے گزاریں لیکن میں

جانتی ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ آپ آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں اور مجھے بھی اپنے ساتھ اس کھیل میں شامل کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ آگ اور خون کا کھیل نہیں ہے لیکن اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ نہ اس آگ کی تپش تم تک پہنچے گی نہ اس خون کا داغ تمہارے دامن پر آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ تم بالکل محفوظ ہو اور محفوظ رہو گی۔ بس اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دو۔" میں نے اس کی نازک کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

لیونا نے ایسا ہی کیا مگر اس کے لہجے میں بدستور اندیشے تھے بولی "کبھی کبھی تو مجھے آپ سے بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کے اندر کچھ بھڑک رہا ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔"

"اپنے نازک سے دماغ کو تکلیف مت دو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر یقین رکھو۔"

وہ خاموش رہی۔ لگتا تھا کہ اس کے ذہن پر کبھی کبھی پچھتاوے کا سایہ پھیل جاتا ہے وہ اس وقت کو کوسنے لگتی ہے جب اس نے میرے ساتھ قدم بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ یہ صورتِ حال اس قدر دھماکا خیز ہو جائے گی۔

شیخ عاصم سہ پہر تین بجے کے قریب ہوش میں آیا تھا لیکن میں رات نو بجے تک اس کے پاس نہیں گیا۔ اس دوران میں عاصم نے خوب شور شرابہ کیا۔ اچھلا کودا۔ خوفناک دھمکیاں دیں۔ دروازوں کھڑکیوں پر لاتیں برسائیں لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ورنہ ہی شیخ عاصم کے لیے کوئی راستہ کھلا۔ یہ کمرا کافی حد تک ساؤنڈ پروف تھا۔ اس کے علاوہ میں نے منیجر سجے کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی صورت میں عاصم کے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ مر بھی جائے تو اس کی بات نہیں سنی جائے گی۔ عاصم کے دونوں گارڈز کو ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میں نو بجے کے لگ بھگ عاصم کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا رکھی تھی اور اس کا پاؤں تیزی سے ہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوفناک انداز میں غرایا "مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ مجھے یہاں جلد یا بدیر تمہاری لعنتی صورت دیکھنے کو ملے گی۔"

"تم نجومی ہوتے جا رہے ہو۔ دراصل ہر ظالم شخص اس حوالے سے نجومی ہوتا ہے کہ اسے اپنے ظلم کا صلہ ملنے کا

ایم اے راحت
کی
ایک خوبصورت تحریر
★
ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی — ایک نوجوان جس کے اندازِ زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا
سمندر کا بیٹا
سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں ان گنت راز۔ داستانیں اور خزانے چھپائے بیٹھا ہے
نئی جلدوں میں مکمل
قیمت -/180
ڈاک خرچ -/30
ناشر علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون - 7247414

پورا یقین ہوتا ہے۔"

"مجھے کیوں لائے ہو یہاں؟" وہ حلق کے بل چیخا۔ اس کا چہرہ انگارہ ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "سوال تو میرے پاس بھی بہت ہیں پیارے' ان میں سے کچھ نمکین ہیں لیکن کچھ بہت ہی تیز ہیں۔ تمہاری ٹانگوں میں مرچیں لگ جائیں گی۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"تمہیں بتا رہا ہوں کہ سوال میرے پاس بھی بہت ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ جب تم نے اپنی روایتی بدمعاشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عدالتی فیصلوں کو قبول ہی نہیں کرنا تھا تو غزالہ کو عرصے تک عدالتوں کے پھیرے کیوں لگوائے اور جیسے ایک سوال یہ ہے کہ غزالہ اور اس کے والدین اب کہاں ہیں' اور جیسے ایک سوال یہ ہے کہ وہ سرموب نامی بدمعاش کہاں ہے جس کی ٹھکائی سے بچ کر تم نے ساہی صاحب جیسے انسان دوست شخص کے پرخچے اڑائے اور اس طرح کے درجنوں سوال ہیں جن کے جواب اب تمہیں دینا پڑیں گے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ بالآخر تم نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اگر ظالم کو اس کے انجام تک پہنچانے کا فیصلہ خودکشی کا فیصلہ ہے تو پھر میں یہ واقعی کر چکا ہوں۔"

"فی الحال تم مجھ سے کیا چاہ رہے ہو؟"

"فی الحال تو میں بس تمہارا ذہن صاف کرنا چاہ رہا ہوں۔ جو بات تم نے ابھی تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہنی ہے وہ میں ابھی تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں تمہیں باندھ کر نہیں ماروں گا اور نہ اپنے کارندوں اور گارڈز کے زور سے تمہیں محصور رکھنا چاہتا ہوں۔ جس طرح تم نے مجھے اس جگہ رکھا تھا۔ دیکھو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے' تم چاہو تو میرے ساتھ دو دو ہاتھ کر سکتے ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہیں آئے گا اور اگر تم جیت گئے تو بلا روک ٹوک یہاں سے واپس چلے جانا۔"

"مجھے یہ فلمی انداز پسند نہیں ہیں۔ تم سیدھی طرح بکواس کرو کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"لیکن مجھے کچھ دنوں سے فلمی انداز بہت اچھے لگنے لگے ہیں اور سارے کے سارے فلمی انداز بھی تو بوگس نہیں ہوتے۔ ان میں سے کچھ حقیقت کے بہت نزدیک ہوتے ہیں۔ ہم عام زندگی میں کبھی نہ کبھی ان کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ چلو اٹھو۔ اگر کر سکتے ہو تو مجھ پر حملہ کرو۔ اٹھو شاباش۔" میں نے اس کے کندھے کو چھوتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں نے جب اس میں کسی طرح کا جوش و خروش نہیں دیکھا تو اسے ایک اور آفر کی۔ میں نے اپنی پتلون کا پائنچہ اٹھا کر اپنا مخصوص رام پوری خنجر پنڈلی سے جدا کیا اور عاصم کی گود میں پھینک دیا "لو۔ اپنی مردانگی کو اس خنجر کا سہارا دے لو۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ اس کمرے کا دروازہ بھی میں "ان لاک" کر دیتا ہوں۔ اٹھو قسمت آزمائی کر لو۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ میں نے اسے غیرت دلانے کے لیے ایک دو فقرے کہے لیکن یہ حربہ بھی بے اثر رہا۔ شیخ عاصم کسی طرح کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے کم از کم تین بار نہایت جوش و خروش کے ساتھ مجھ سے دو دو ہاتھ کر چکا تھا اور ہر مرتبہ اس نے شدید نقصان اٹھایا تھا۔ ایک دفعہ تو اس کی کمر کا کڑا نکلتے نکلتے رہ گیا تھا۔

ایک طرح سے شیخ نے تحمل کا مظاہرہ کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ میرے سینے میں اس کے خلاف الاؤ بھڑک رہا تھا۔ اگر وہ جوش کھا کر اٹھ جاتا تو میں نے اسے بوگر مار لگا دینی تھی۔

وہ ٹھنڈا ٹھار بیٹھا رہا تو میں نے خنجر اس کی گود سے اٹھا کر دوبارہ پنڈلی سے باندھ لیا۔ وہ بولا "لیونا کہاں ہے؟"

"تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ تم نے اسے اسی ریسٹ ہاؤس میں رکھا ہوا ہے اور توبیہ بھی یہیں ہے لیکن۔ تم نے جو دو فلمیں بھیجی تھیں وہ شاید اس ریسٹ ہاؤس کی نہیں تھیں۔"

"وہ اسی ریسٹ ہاؤس کی تھیں اور جو آئندہ بننے والی ہیں وہ بھی اسی ریسٹ ہاؤس کی ہوں گی۔"

وہ میرے دھمکی آمیز لہجے پر غور کرتا رہا پھر بولا "اگر میں لیونا اور توبیہ سے ملنا چاہوں تو؟"

"جب میں غزالہ اور شفتا سے نہیں مل سکتا تو تم لیونا اور توبیہ سے کیسے مل سکتے ہو۔ مجھے دشمنی کا یہ انداز پسند نہیں تھا لیکن بالآخر تم نے مجھے اس پر مجبور کر دیا۔ اب تو مجھے لگتا ہے کہ میں بھی اسی سطح پر از آیا ہوں جس پر تم ہو۔"

میں تیزی سے باہر نکلا اور دروازہ مقفل کر کے کامن روم کی طرف آ گیا۔ اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مجھے سیال آگ کی ضرورت تھی۔ میں نے آگ و بسکی کی صورت اپنے اندر انڈیلنے لگا اور انڈیلتا چلا گیا۔ میرے تن بدن میں چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔ عاصم کی منحوس صورت دیکھ کر اپنے بچھڑے ہم سفر انتہائی شدت سے یاد آ گئے

تھے کہ رواں رواں جل اٹھا تھا۔ ساہی صاحب' غزالہ' صفدر' دریا نہیں کون کون اور کیا کیا۔

"کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے پانچ پیگ لے لیے ہیں۔" لیونا نے میرا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے آج نئی نئی پینا شروع کی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بمبئی کے شراب خانوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ میں پیگ کے حساب سے نہیں بوتل کے حساب سے پیتا تھا۔ ان دنوں بھی جدائی کا ایسا ہی صحرا میرے سینے میں پھیلا ہوا تھا۔ ان دنوں بھی غزالہ کے حوالے سے ایسی ہی مایوسی میرے اندر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں مرجانا چاہتا تھا اور مار دینا چاہتا تھا۔ ان دنوں شفتا نے مجھے سنبھالا دیا تھا لیکن آج تو مجھے سنبھالنے کے لیے شفتا بھی موجود نہیں تھی۔ عاصم اور خنجر جیسے شیطانوں نے اسے بھی مجھ سے دور کر دیا تھا۔ تو ٹھیک ہی تھا۔ اسے دور ہی رہنا چاہیے تھا۔ ظالموں کو ان کے انجام کی طرف کھینچنے کے لیے یہ دوری مناسب تھی۔

ساتواں پیگ لیونا نے مجھ سے چھین کر ایک طرف رکھ دیا اور مجھے خود میں الجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ مجھے مدہوش خیال کر رہی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں نے حسینہ پیرس کو خود سے دور ہٹایا اور صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ آج غزالہ بھی بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ یہ تو حسینہ پیرس تھی شاید حسینہ عالم بھی ہوتی تو غزالہ کے تصور پر میں اسے قربان کر ڈالتا۔ میں سگریٹ پھونکنے لگا۔ ذہن بے حد منتشر تھا۔ لیونا نے میرے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں پھر میرے رخسار پر بوسہ دے کر میری ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سارا منظر شیخ عاصم اپنے کمرے میں بیٹھ کر دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کمروں کے درمیان استنبل کی "گرل" تھی۔ جالی تھی اور بلائنڈ شیشہ تھا۔ یہ شیشہ ہماری طرف بلائنڈ تھا لیکن عاصم کی طرف سے بلائنڈ نہیں تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ چیخ سکتا تھا لیکن اس کی آواز اس کمرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہاں اگر میرا اور لیونا کا ساتھ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو وہ آنکھیں ضرور بند کر سکتا تھا۔ میں اور لیونا بالکل پاس پاس بیٹھے تھے اور میں تصور میں شیخ کو اپنے بال نوچتے دیکھ رہا تھا۔ لیونا کو بھی معلوم نہیں تھا کہ شیخ ساتھ والے کمرے سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔

لیونا نے بڑے لاڈ سے میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا اور بولی "کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے۔ پتا نہیں کتنے دن سے شیو نہیں کی۔ ٹھہریں' میں خود آپ کی شیو بناتی ہوں۔"

اس نے مجھے دھکیل کر دوبارہ نیم دراز کر دیا اور چھپاک سے لگژری باتھ روم میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد وہ ایک چھوٹی سی نرالی رکھیلتی ہوئی باہر نکلی۔ اس نرالی پر شیو کا مکمل سامان تھا۔ وہ بڑی ادا کے ساتھ میرے پہلو میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور میری ٹھوڑی پر شیونگ کریم کے ساتھ جھاگ بنانے لگی۔

دل نہ چاہنے کے باوجود میں نے اسے یہ سب کچھ کرنے دیا۔ اس نے ریزر نکالا اور بڑی نرمی و ملائمت سے شیو کرنے لگی۔ جو جگہ وہ جھاگ سے صاف کرتی وہاں بڑی ادا سے بوسہ دیتی۔ شیو کرنے کے بعد وہ میرے سر کے بالوں کے پیچھے پڑ گئی۔ اس نے بالوں میں ایک آئل لگایا اور اپنے ہاتھوں سے سر کا مساج کرنے لگی۔ عام حالات میں شاید میں اسے یہ سب کچھ نہ کرنے دیتا لیکن آج میں اس کا ہاتھ روکنا نہیں چاہتا تھا۔ آج برسوں بعد وہ موقع آیا تھا جب اس ریسٹ ہاؤس میں شیخ عاصم نے میری جگہ سنبھالی تھی اور میں نے اس کی۔ شیخ عاصم مجھے اپنی جان سے پیاری محبوبہ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت جس کی طرف کسی کا نگاہ اٹھانا بھی شیخ عاصم کو گوارا نہیں تھا آج میری خدمت گزاری میں مصروف تھی اور وہ یہ سب کچھ مجبوری و بے بسی کی حالت میں نہیں اپنی مرضی سے کر رہی تھی۔

میرے سر کا مساج کرتے کرتے لیونا نے توبیہ کی بات چھیڑ دی۔ کہنے لگی "توبیہ بہت بدلی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ میں تو آج دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ اس نے پینٹ قمیص اتار کر سلک کا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں جوگرز کی جگہ زنانہ جوتی تھی۔ لگتا ہے کہ اس کی بول چال کا انداز بھی دھیرے دھیرے بدل رہا ہے۔"

"یہ تو واقعی خوشگوار تبدیلی ہے لیکن ایک خدشہ یہ بھی تو ہے کہ یہ سب اداکاری ہی ہو۔"

"ویسے مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے اندر تبدیلی آئی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں تو ان کے جذبات بھی دھیرے دھیرے سرد ہو کر مرجاتے ہیں۔ جب کسی اتفاق کے تحت وہ دوبارہ ملتے ہیں تو بہت کچھ واپس پلٹ آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی یادیں چھوٹی چھوٹی باتیں۔"

"لیکن ایک بار پہلے بھی تو توبیہ ہمیں دھوکا دے چکی ہے اور سیانے کہتے ہیں کہ جو ایک دھوکا دیتا ہے وہ دوسری اور تیسری بار بھی دے سکتا ہے۔"

رات خیریت سے گزر گئی۔ توبیہ کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ اس کا نہایت بااثر اور شہ زور بھائی پابند سلاسل ہو کر

یہاں پہنچ چکا ہے اور میں ابھی اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اگر قوسیہ کے مزاج میں واقعی تبدیلی رونما ہو رہی تھی تو پھر ابھی اسے عاصم کے بارے میں بتانا مناسب نہیں تھا۔

اگلے روز میں نے بھی اسے زنانہ لباس میں دیکھا۔ وہ بڑے اہتمام سے باری کو چائے بنا کر دے رہی تھی۔ اس دن میں نے اکیلے میں باری سے بھی بات کی۔ وہ بولا "قوسیہ اپنے پہلے رویے پر نادم ہے۔ اس نے مجھ سے معذرت بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ وہ آپ سے بھی شرمندہ ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ غالباً اپنے رویے پر معافی مانگنا چاہتی ہے۔"

میں نے کہا "معافی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم دونوں آپس میں ٹھیک رہو بس یہی بہت ہے۔ میری طرف سے اسے کہہ دینا کہ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ اگر اسے کوئی شکوہ ہے تو میں اس کے لیے معذرت کرلوں گا۔"

باری چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا "آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں جناب!"

"ہاں ہاں کہو۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ ہم دونوں کو کچھ دن انیکسی میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ دراصل قوسیہ کی بھی خواہش ہے کہ ہم ایسے رہیں جیسے ایک گھر میں رہا جاتا ہے۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ حفاظتی نقطۂ نظر سے یہ ٹھیک ہے تو ایسا کرسکتے ہو لیکن ایک بار پھر تمہیں بتا دوں کہ ابھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کی بات بالکل سمجھ رہا ہوں جناب! آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

"ویسے اگر میری بات مانو تو میرا مشورہ یہی ہے کہ فی الحال اس معاملے کو ایسے ہی چلنے دو۔ تم جو کچھ بھی کہو لیکن میں اس لڑکی کی طرف سے ابھی مطمئن نہیں ہوں۔ کچھ بھی ہے قوسیہ شیخ عاصم کی بہن ہے اور شیخ عاصم کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اس کے پیدا کرنے والے بھی نہیں جانتے ہوں گے۔"

باری نے کہا "آپ کا مشورہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے جناب!"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ قوسیہ کی محبت کا جواب بھرپور محبت سے دو لیکن اس کی طرف سے ابھی کسی طرح کی غفلت نہ برتو۔ تمہارے رہائشی کمرے میں کسی طرح کا کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی کوئی ایسی شے جو ہتھیار کے طور پر استعمال ہوسکے۔ کمرے کا دروازہ رات کو مقفل رکھو اور چابی قوسیہ کی پہنچ سے بہت دور رہنی چاہیے۔ کمرے سے باہر میں نے رات کی شفٹ میں دو گارڈز تعینات کر رکھے ہیں۔ ان کی تعداد میں کمی کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ ان احتیاطی تدابیر کا سارا "الزام" تم مجھ پر دھر سکتے ہو۔ قوسیہ سے کہہ سکتے ہو کہ یہ تدابیر میرے ایما پر ہیں۔"

باری اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

اگلے دو روز تک میں شیخ عاصم کے پاس نہیں گیا۔ اس کی خیر خبر مجھے بس منیجر جے کے ذریعے ہی مل رہی تھی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ شیخ عاصم بے حد پریشان ہے۔ کچھ نہیں رہا۔ بس پینے کے لیے اس نے ایک مہنگی شراب منگوائی تھی جو اسے مہیا کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ صرف بلیک کافی پی رہا ہے۔ کثرتِ مے نوشی سے عاصم کا چہرہ اور آنکھیں سوج گئی تھیں اور سگریٹ نوشی سے ہونٹ سیاہی مائل ہوگئے تھے۔ جے نے کہا تھا "مجھے ڈر لگ رہا ہے سر! کہیں وہ خود کو کچھ کر ہی نہ لے۔"

"بہت ڈھیٹ شخص ہے وہ۔ پتھر کا کلیجہ رکھتا ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا تھا۔

پچھلے دو تین دن میں قوسیہ اور باری کے حالات بتدریج بہتر ہوتے رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں میاں بیوی والی قربت پیدا ہوچکی ہے۔ ایک دن میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ قوسیہ اپنی مرضی سے باری کے زخمی پاؤں پر مرہم رکھنے میں مصروف ہے۔ ایک بار میں نے اسے باری کے کپڑے استری کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ باری کے جبڑے کی چوٹ اب کافی حد تک ٹھیک تھی۔

یہ تیسرے دن کی بات ہے میں سائیں عالی کی طرف گیا۔ وہ اپنے کمرے میں ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا اور اطمینان سے گاجر کا مربہ کھا رہا تھا۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ مربے والے پیالے میں سائیں کی رالیں بھی گر رہی ہیں۔ اسی دوران میں سیل فون آگیا۔ سائیں باتیں کرنے لگا "ہاں بس۔ پریشانی کی بات نہیں۔ بچی کا علاج شروع ہوچکا ہے نہیں نہیں۔ میں خود نہیں کر رہا میرا ایک دوست کر رہا ہے لیکن میں نے پوری نگرانی رکھی ہوئی ہے۔ بس کچھ وقت لگے گا۔ بالکل صحیح ہے۔ وہ خود بھی یہاں موجود ہے۔ اس سے بات کرنی ہے تو کرلو۔" اس کے بعد سائیں نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی "میں محترمہ بنت رضوان کا مترجم بول رہا ہوں۔ اگر آپ محترمہ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو بتائیے لیکن وہ صرف عربی میں بات کرسکیں گی۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ بس آپ ہی ان کی ترجمانی کردیں۔" میں نے کہا۔

ابھی مترجم نے عربی نما انگریزی میں ایک دو فقرے ہی بولے تھے کہ لائن خراب ہوگئی۔ میں نے ریسیور رکھ کر سائیں سے پوچھا "خاتون کیا کہہ رہی ہے۔"

"اپنی بچی کے بارے میں فکر مند ہے۔ وہ اسے جلد از جلد راہِ راست پر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ گھر بسائے اور جلدی سے اپنی ماں کو ایک نواسے کا منہ دکھائے لیکن اتنی جلدی تو نواسہ نہیں ہوسکتا ناں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟ کیا آج کل ہوجاتا ہے اتنی جلدی؟"

"نہیں آج کل بھی پرانی ہی روٹین سے ہوتا ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"پرستان میں جنات نے تو آج کل نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ خاص قسم کی دوائیں کھاتے ہیں جن سے صرف چار پانچ مہینے میں بچہ پیدا ہوجاتا ہے اور پیدا ہوتے ہی چلنا بھی شروع کردیتا ہے۔ دو ڈھائی ماہ میں وہ تھوڑا تھوڑا اڑنے بھی لگتا ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے پرستان کی خاتونِ اول کے ہاں بالارجنٹ بچہ پیدا ہوا ہے۔ بالکل صحت مند پورے اٹھارہ پاؤنڈ وزن تھا اس کا۔ پانچ چھ دن کے اندر ہی اتنا ہوشیار ہوگیا ہے کہ سارے پرائم منسٹر ہاؤس میں بھاگا پھرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال میں وہ سیاست بھی کرنے لگے گا اور سب اسے تخت و تاج کا صحیح جانشین بھی مان لیں گے۔ کہنے کو پرستان میں جمہوریت ہے لیکن حقیقت میں وہاں اب بھی موروثی حکمرانی ہی چلتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں۔۔۔"

اچانک سائیں کی زبان کو بریک لگ گئی۔ ریسٹ ہاؤس کا ہنر خانساماں منہ لٹکائے دروازے پر نمودار ہوا اور سائیں سے اجازت لے کر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ بظاہر اس میں کڑاہی گوشت نظر آرہا تھا لیکن کوئی سرخ سرخ شے بھی موجود تھی۔ خانساماں نے پلیٹ سائیں کو پیش کی۔ سائیں نے سالن سونگھا پھر چکھا اور مطمئن انداز میں کہا "ویری گڈ گونگلو۔ ویری گڈ گونگلو۔" اس نے تعریف کی۔

سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی تھی۔ سائیں فون سننے لگا۔ مجھے اس کا کوئی عقیدت مند ہی تھا۔

پتا نہیں کہ اس نے کس کس کو یہاں کا فون نمبر دے رکھا تھا۔ اس کی یہ بے پروائی میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی تھی لیکن سائیں کو ٹوٹنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ میں صرف یہ توقع ہی کرسکتا تھا کہ سائیں کی یہ حرکت ہمارے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوگی۔

میں نے خانساماں سے پوچھا "یہ کڑاہی گوشت میں سرخ سرخ کیا ہے؟"

"یہ گاجر کا مربہ ہے سر۔" خانساماں نے کہا "سائیں صاحب نے ڈلوایا ہے۔"

"یہ ایسی چیزیں شوق سے کھا لیتے ہیں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن سرباقی لوگ تو نہیں کھائیں گے ناں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کڑاہی گوشت سب کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہی مین ڈش تھی۔ اب اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ دوسری ڈش تیار کرسکوں۔"

سائیں کی ایسی بے ڈھنگی حرکتیں کسی وقت بہت بری بھی لگتی تھیں۔ میں نے خانساماں سے کہا "چلو کوئی بات نہیں۔ کھانا تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ کھالیں گے۔ تم کچھ اور بنالو۔"

خانساماں ادب سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ فون سننے کے بعد سائیں عالی اپنی خاص ورزش میں مصروف ہوگیا تھا۔ یعنی سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ اس کے جانگیے میں چھپنی طرف بدستور روشن دان موجود تھا۔ اب تو سب لوگ دیکھ دیکھ کر عادی ہوچکے تھے۔ یہ معمول کی بات لگتی تھی۔ سائیں کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور وہ گہرے مراقبے میں چلا گیا تھا۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ سائیں کو اس کی وجدانی کیفیت میں چھوڑ کر میں ٹی وی لاؤنج میں آگیا۔ یہاں ایک ہارس شو دکھایا جا رہا تھا۔ یہ ریکارڈنگ تھی۔ لیونا نے بتایا کہ ابھی اس ہارس شو میں قوسیہ کا مختصر انٹرویو بھی آیا ہے۔ قوسیہ کے گھوڑے نے اس شو میں دوسرا انعام حاصل کیا تھا۔ یہ شو تین چار مہینے پہلے ابوظہبی میں منعقد ہوا تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے مجھے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ منیجر جے گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ رکھوالی کے دونوں جرمن شیفرڈ کتے بے ہوش پڑے ہیں۔ انہیں کسی نے کچھ کھلا دیا ہے۔

یہ تشویش ناک اطلاع تھی۔ میں جے کے ساتھ دوڑتا ہوا مین گیٹ پر پہنچا۔ دونوں کتے مردوں کی طرح پڑے تھے۔ ایک کتے کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ انہیں کوئی بہت تیز نشہ آور دوا دی گئی ہے۔

میں نے گارڈز کو الرٹ کردیا اور انہیں کہا کہ وہ ریسٹ ہاؤس کی چاروں جانب پھیل جائیں۔

کتوں کی دیکھ بھال کرنے والے سنہالی ملازم کو بلایا گیا۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کچن کے ملازمین نے کچھ پکا ہوا گوشت ضائع کیا تھا۔ بدقسمتی سے کتوں کے رکھوالے نے اس میں سے کچھ گوشت کتوں کے آگے ڈال دیا۔ اس کے پانچ دس منٹ بعد ہی کتوں کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی (وہ اسی گوشت کی بات کررہا تھا جس میں سائیں نے گاجر کا مربہ ڈلوا دیا تھا)

یہ تو اور بھی تشویش ناک بات تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بے ہوشی کی دوا اس کھانے میں شامل تھی جو ہم سب کو کھانا تھا "یہ گہری سازش لگ رہی ہے سجے۔" میں نے سجے کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے سر!" سجے کی آواز میں لرزش تھی۔

"ریسٹ ہاؤس کا مین گیٹ مقفل کرا دو۔ کوئی یہاں سے باہر جائے گا اور نہ اندر آئے گا۔"

"اوکے سر۔" سجے نے مستعدی سے کہا اور تیزی سے گارڈز کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے انچارج گارڈ کو حکم دیا اور اس نے تین چار منٹ میں ریسٹ ہاؤس کے سارے ٹیلی فون بھی ڈیڈ کردیے۔ اس بھاگ دوڑ کے سبب ریسٹ ہاؤس میں موجود ہر شخص کے چہرے پر خوف و ہراس پایا جانے لگا تھا۔ خاص طور سے کچن کے ملازم خوف زدہ تھے۔ ان کی کل تعداد پانچ تھی۔ دو کک انگریز تھے' باقی مقامی تھے جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ میں نے ان سب کو ایک کمرے میں جمع کیا۔ ان میں عورت شامل نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ باتھ روم میں ہے۔ ہم اس کا انتظار کررہے تھے' جب عمارت کے عقبی احاطے سے شور سنائی دیا۔ سجے نے باہر جاکر پتا کیا اور معلوم ہوا کہ کچن کی ملازمہ فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔ اسے دو گارڈز گھسیٹتے ہوئے اندر لائے۔ اس کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ کچن کے اکثر ملازمین کی طرح وہ صحت مند تھی اور کافی ہوشیار بھی نظر آتی تھی۔ وہ ڈری ہوئی تھی اور مسلسل روتی چلی جارہی تھی۔

ایک گارڈ نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بتایا "یہ باغیچے میں ایک اسٹول رکھ کر پچھلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ ہم نے دیکھ لیا تو مین گیٹ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہم نے پچھلے احاطے میں ہی پکڑ لیا۔"

میں عورت کو علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ منیجر سجے میرے ساتھ تھا۔ ملازمین کا تقرر سجے نے ہی کیا تھا اور وہ اس کے کافی دیکھ بھال کر کیا تھا۔ اب وہ خاصا متفکر دکھائی تھا۔ یہ عورت صرف سنہالی زبان جانتی تھی لیکن اتفاق یہ کہ وہ تھوڑی بہت عربی سمجھتی تھی۔ وہ کچھ عرصہ ایک عرب ملک میں "آیا" کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھی۔ سجے ذریعے اس سے جو گفتگو ہوئی وہ یوں تھی۔

"تم نے کھانے میں کیا ملایا ہے اور کس کے کہنے پر کیا ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا مالک۔ میں تو بس اس ڈر سے بھاگ رہی تھی کہ کہیں مجھ غریب پر کوئی الزام نہ آجائے۔ مجھے پتا تھا کہ سب سے غریب میں ہی ہوں۔ شامت بھی مجھ ہی پر آئے گی۔"

"تم بکواس کررہی ہو۔ بے قصور ڈرا ہوا بھی ہو تو بھاگتا نہیں ہے۔"

"لیکن میں تو....."

میرے زوردار تھپڑ نے اسے اچھال کر دور پھینک دیا۔ میرا دماغ گھوما ہوا تھا۔ میں نے تین چار تھپڑ مزید رسید کیے اور اسے اٹھا کر صوفے پر پٹخ دیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک روتی رہی اور مقامی زبان میں بڑبڑاتی رہی پھر اس نے کہا کہ وہ باتھ روم میں جانا چاہ رہی ہے۔

جو لوگ تفتیش کی زد میں ہوتے ہیں وہ اکثر باتھ روم ٹوائلٹ میں جاکر خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے ایک دوسری ملازمہ کو اندر بلایا اور اس سے کہا کہ ملزمہ کے لباس کی اچھی طرح تلاشی لے۔ میں نے خود باتھ روم کا جائزہ لیا' پھر اسے اندر بھیج دیا۔ وہ کچھ دیر بعد آئی تو اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں اس نے بہت کچھ صاف صاف اگل دیا۔ اس کا نام باندرا تھا۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "میں للیتا کی دیورانی ہوں۔"

للیتا وہی عورت تھی جس کا زخمی شوہر اسپتال میں پڑا تھا۔ میں نے قوسیہ کو "مولا بخش" کے ذریعے سیدھا کرنے کے لیے للیتا کی ڈیوٹی لگائی تھی اور اس نے واقعی مولا بخش (ڈنڈے) کا بہترین استعمال کیا تھا۔

میں نے باندرا سے پوچھا "کھانے میں دوا کس کے کہنے پر ملائی تھی؟"

اس کے جواب سے میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وہ ہچکی لے کر بولی "مجھے ایسا کرنے کے لیے چھوٹی میڈم (قوسیہ) نے کہا تھا۔"

ایک لمحے میں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ باندرا نامی عورت جو کہہ رہی ہے درست کہہ رہی ہے۔ میرے ذہن میں جاگنے والے بدترین خدشے حقیقت تھے۔ شیخ عاصم کی بہن اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"کھانے میں کیا ملایا تھا تم نے؟"

اس نے ایک ہربل دوا کا نام لیا۔ یہ مقامی طریقے سے تیار کی جاتی تھی۔ سجے سنہا نے کہا "یہ بڑی تیز اثر دوا ہوتی ہے جناب! اس کا کشتہ مارا جاتا ہے۔ چائے کا آدھا چمچ کشتہ دو درجن افراد کو دو تین گھنٹے کے لیے بے ہوش کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس بدبخت نے قریباً ایک چمچ دوا ملائی ہے۔ یہ ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ ابھی ملازم نے بتایا ہے کہ دونوں کتوں میں سے ایک کی حالت نازک ہے۔"

میں نے سجے کے ساتھ مل کر باندرا نامی اس عورت سے پوچھ گچھ کی اس سے پتا چلا کہ باندرا اور للیتا میں دیورانی جٹھانی والی دشمنی موجود تھی۔ جب میں نے قوسیہ کو سیدھا کرنے کی ذمے داری للیتا کو سونپی اور اسے کچھ اہمیت حاصل ہوئی تو باندرا جل گئی۔ اس کا یہی جلاپا اسے قوسیہ کے قریب لے گیا۔ وہ قوسیہ کے لیے کھانا وغیرہ لے کر جاتی تھی۔ چونکہ اسے عربی کی شدبد بھی تھی' اس لیے وہ قوسیہ سے تھوڑی بہت بات بھی کرلیتی تھی۔ قوسیہ کے گلے میں پلاٹینم کی ایک نہایت قیمتی "چین" موجود تھی۔ یہ چین اس نے باندرا کو رشوت میں دے دی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر وہ اس کا کام کردے تو دو چار لاکھ درہم حاصل کرنا اس کے لیے معمولی بات ہوگی۔

باندرا اس چکر میں آگئی۔ اس کا ایک بھائی غلط طور پر ایک قتل کیس میں ملوث ہوگیا تھا اور اسے عمر قید کا خطرہ لاحق تھا۔ مقتول کے لواحقین سے صلح صفائی کے لیے ملزم کے اہل خانہ کو خطیر رقم درکار تھی۔ باندرا نے اس انداز سے سوچا تو اسے شیخ زادی کی پیشکش بڑی مناسب اور بروقت محسوس ہوئی۔ قوسیہ نے باندرا سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ عرب امارات لے جائے گی۔ پروگرام کے مطابق باندرا نے بے ہوشی کی دوا نہ صرف ہمارے کھانے میں ملائی تھی بلکہ ملازمین اور گارڈز وغیرہ کے لیے جو کھانا پکنا تھا وہ بھی اس سے متاثر تھا۔ مزید پوچھ گچھ پر انکشاف ہوا کہ باندرا کے علاوہ اس سازش میں ایک اور گارڈ بھی شریک تھا۔ یہ گارڈ روپوش ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا (بعد ازاں اسے گرفتار کرلیا گیا)

اس رات قوسیہ کی زبردست کم بختی آئی۔ میں نے اسے للیتا کے حوالے کردیا اور للیتا کو اس کی چمڑی ادھیڑنے کے مکمل اختیارات دے دیے۔ جب للیتا نے اس پر چھڑیوں کی بارش کی تو قوسیہ پاگلوں کی طرح چلاتی ہوئی اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ زخمی کردیا اور اسے دانتوں سے کاٹنے کی کوشش بھی کی۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے للیتا کی مدد کی اور قوسیہ کو کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ قوسیہ کے کپڑے اس زبردست دھینگا مشتی میں پھٹ گئے تھے۔ رہے سہے کپڑے للیتا نے میرے جانے کے بعد پھاڑ دیے۔

رات کے سناٹے میں وقفے وقفے سے چھڑی کی شائیں شائیں گونجتی رہی اور قوسیہ کی چنگھاڑیں سنائی دیتی رہیں۔ پہلے ان چنگھاڑوں میں غصہ غالب تھا پھر غصہ دبتا گیا اور درد نمایاں ہوتا گیا۔ رات کے آخری پہر صرف درد رہ گیا۔

دو ڈھائی بجے کا وقت ہوگا جب منیجر سجے نے انٹرکام پر مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ بولا "جناب! شیخ صاحب اپنے کمرے میں بہت اودھم مچا رہے ہیں۔ چیخ چیخ کر ان کی آواز بالکل بیٹھ گئی ہے۔ کبھی وہ فرش سے سر ٹکراتے ہیں' کبھی اپنے چہرے پر دو ہتڑ مارتے ہیں۔ انہوں نے دروازے کو لاتیں مار مار کر اس کا ستیاناس کردیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں اس کا بھی ستیاناس ہوجائے گا۔" میں نے کہا۔

"اگر ہوسکے تو آپ ایک دفعہ جاکر انہیں دیکھ لیں۔ مجھے ڈر ہے کہ انہیں کہیں "اٹیک" وغیرہ نہ ہوجائے۔"

سجے کی بات درست تھی۔ عاصم کو چند دن پہلے ابوظہبی میں دل کی شکایت ہوچکی تھی۔ سجے سے بات کرنے کے بعد میں بستر سے نکلا اور گاؤن باندھنے لگا۔ لبنا کے چہرے پر ڈرا ڈرا تاثر تھا "پلیز جہان! آپ بار بار عاصم کے پاس مت جائیں۔ وہ آپ کو نقصان پہنچائے گا۔"

"میں پاس نہیں جاؤں گا' باہر ہی رہوں گا۔"

"کیا کہا آپ نے؟" وہ آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

میں نے زور سے کہا "پہلے اپنے کانوں سے ڈاکس تو نکالو۔"

اس نے جھینپ کر کانوں سے ڈاکس نکال دیں۔ قوسیہ کی چیخوں نے اسے حواس باختہ کررکھا تھا۔ اسی لیے یہ ڈاکس لگا کر اس نے کان بند کیے تھے۔ میں اسے تسلی دے کر شیخ عاصم کی طرف چلا گیا۔

اس کی حالت واقعی ناگفتہ بہ تھی۔ کثرت شراب نوشی اور بڑھی ہوئی شیو نے اس کا حلیہ ابتر کر رکھا تھا۔ میں نے تالا کھول کر اس کے کمرے میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ باہر کھڑا ہو کر کھڑکی کی گرل میں سے ہی اسے دیکھتا رہا۔ شیخ عاصم مجھے دیکھ کر غرایا "میں توبیہ کی چیخیں سن رہا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے اس کے ساتھ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ اپنی طرف سے بہت بلند آواز میں بولا تھا مگر آواز اتنی بیٹھ چکی تھی کہ بمشکل میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

میں نے کہا "اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو رہا جیسا تم دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ کرتے رہے ہو۔ وہ کسی کے ساتھ زبردستی شادی کے بندھن میں نہیں باندھی گئی۔ نہ وہ کسی شرابی مرد کے بستر پر روندی جا رہی ہے' نہ اسے عریاں رقص پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ بس ایک عورت تھوڑا سا سبق سکھا رہی ہے اسے۔ بگڑے تگڑے بچوں کا علاج "مولا بخش" ہوتا ہے۔ اسے بھی تھوڑی سی رعایت کے ساتھ بگڑی تگڑی بچی کہا جا سکتا ہے۔"

عاصم غرایا "یہ چیخیں بند کرا دو۔ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ میری موت کے ذمے دار تم ہو گے۔"

"تم بڑے ڈھیٹ ہو عاصم! اتنی آسانی سے تمہاری جان نکلنے والی نہیں ہے۔ باقی میں تمہاری موت کے سلسلے میں ہر قسم کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔"

اتنے میں توبیہ ایک بار پھر درد سے بے تاب ہو کر چیخی۔ اس کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ عاصم کے چہرے پر تشنج کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ جذبات سے لرزتے لہجے میں بولا "مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ یہ چیخیں بند کراؤ۔"

"میں نے بھی تو اس چھت کے نیچے غزالہ کی بے شمار چیخیں سنی تھیں۔ بے شک وہ خاموش چیخیں تھیں لیکن چیخیں تو تھیں۔ تم میرے سامنے اسے اپنے ہوس زدہ بازوؤں میں جکڑتے رہے تھے۔ تم نے ڈکٹا فون کے ذریعے مجھے اپنی اور غزالہ کی خلوت کی سرگوشیاں سنائی تھیں۔ تمہیں وہ سب کچھ یاد ہے ناں۔ شاہی صاحب کی بیٹی وحشی مردوں کے چنگل میں رحم کی بھیک مانگتی تھی اور تم ٹیلی فون پر اس کی فریادیں سنا کر مجھ سے سودے بازی کرتے تھے۔ اسی چھت کے نیچے چند کمرے چھوڑ کر وہ کمرا موجود ہے جہاں تم نے مجھے مجبور کر کے مجھ سے غزالہ پر مجرمانہ حملہ کروایا تھا اور پھر اس حملے کی کوشش کو "ناکام" بناتے ہوئے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ یہیں سامنے والے باغیچے میں وہ درخت آج بھی موجود ہے جہاں تمہارے پالے ہوئے بھیڑیے شاہی اور اس کے ساتھیو نے مجھے الٹا لٹکایا تھا اور موٹے لکڑ والی بیلٹوں سے مار مار میری کمر کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ تم نے میرے ہاتھوں کو دستانوں میں بند کر رکھا تھا جن کے اندر میری انگلیاں سما رہ گئی تھیں اور میں بے چارگی کی تصویر بن گیا تھا۔ انہیں منڈ ہاتھوں کے ساتھ میں نے تمہارے لیے ٹوکری ڈھو تھی۔ تمہارے کچن کے برتن صاف کیے تھے پھر انہی ہاتھ کے ساتھ میں تمہارے اور غزالہ کے سامنے جوس ا شراب سرو کیا کرتا تھا۔ تمہیں یاد ہے ناں....."

وہ خاموش رہا اور خونی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ نے کہا "میں نے اس چار دیواری میں اپنی اور اپنے پیار کی بہت سی چیخیں سنی ہیں۔ اب اگر تم کچھ چیخیں سن لو تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔"

توبیہ کی سریلی چیخ ایک بار پھر در و دیوار میں گونجی۔ ا کی چیخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مضمحل ہو گئی ہے اور ہوش ہونے کے قریب ہے۔ عاصم بولا "توبیہ نے کیا کیا جو تم اتنی بے رحمی سے اسے تشدد کا نشانہ بنا رہے ہو۔ وہ گناہ ہے۔ وہ ایک گھریلو لڑکی ہے۔"

"کاش وہ گھریلو لڑکی ہوتی۔ گھریلو لڑکیاں اپنے شو کا نقش ذہن کرا انہیں گھوڑے کی طرح نہیں بھگاتیں' نہ تو اپنے رشتے داروں سے درخواست کر کے انہیں بوڑھی ہیں ان کے چہروں کو بدنما داغ بے کرار ٹھوکریں مار مار کر زندگی سے نکالتی ہیں۔ تمہاری بہن گھریلو لڑکی نہیں تھی اسے تو کسی گینگ کی سرغنہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید تمہ معلوم نہیں اس نے یہاں آنے کے بعد بھی کیا کیا گل کھلا ہیں۔ اس نے گارڈز سے خودکار رائفل چھینی ہے اور اندھا دھند فائرنگ کی ہے۔ اس نے گولی مار کر ایک گارڈ کو مو اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا کیا ہے اور کل تو اس نے کمال کیا ہے۔ ایک عربی بولنے والی خادمہ کے ساتھ سازش کر اس نے ریسٹ ہاؤس کے سارے رہائشیوں کو موت کی سلانے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو تمہ ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے یہ سازش پکڑ لی ہو سکتا تھا کہ تمہارا نام تاریخ کے ان بدقسمت زمین بھا میں شامل ہو جاتا جو اپنی بہنوں کے ہاتھوں زہر کھا کر مر ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس حوالے سے تاریخ میں شاید ایک دو نام موجود ہوں۔"

عاصم ہیجانی لہجے میں بولا "شہ جہاں! اگر توبیہ ساتھ کچھ ہوا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا نام بھی تاریخ

بے ضمیر لوگوں میں لکھ دوں گا۔"

"توبیہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔ اس خود سری کو تو بس سا سبق سکھایا جا رہا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے تمہارے ساتھ ہے۔ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کر لو۔"

توبیہ کی چیخیں اب بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے ہوش یا نیم وش ہو چکی تھی۔

○☆○

میرے اندیشے کے عین مطابق تیسرے دن پولیس کی تفتیشی ٹیم ریسٹ ہاؤس میں آن موجود ہوئی۔ میں اس صورتحال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ آج کل ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر "شیخ حفیظ" کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ صاحب تھے جنہوں نے FACE پر رو کر یہ پراپرٹی خریدی۔ منیجر سنہا نے شیخ حفیظ کے منیجر کی حیثیت سے پولیس سے ملاقات کی اور ان کے سوالوں کے جواب دیے۔ یہ پارٹی شیخ عاصم اور اس کے دو گارڈز کے اغوا کی رہی تھی۔ اس پارٹی میں دو تفتیشی افسر ایسے بھی فرسٹ اسٹورز میں ہونے والی آتشزدگی کے معاملے کو رہے تھے۔ پولیس پارٹی ریسٹ ہاؤس میں قریباً ایک گھنٹا اس کے جانے کے بعد میں نے جج سے بات چیت کی معلوم کی۔

جج کی باتوں سے پتا چلا کہ پولیس ایک موہوم سے کے تحت یہاں آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید شاہ ابھی اس بات کا علم نہ ہوا ہو کہ شیخ عاصم یہ ریسٹ فروخت کر چکا ہے۔ وہ فرسٹ اسٹورز کی طرح اس ہاؤس کو بھی ابھی شیخ کی پراپرٹی ہی سمجھ رہا ہو۔ جس نے فرسٹ اسٹورز میں آگ لگائی ہے اسی طرح ہاؤس کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ پولیس نے اس حوالے سے جج سنہا کو کچھ ضروری ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ فی الحال کچھ لیے شیخ حفیظ کے نام کی پلیٹ مین گیٹ سے اتار دی شیخ عاصم کے نام کی لگا دی جائے۔ جج سنہا نے مجھے دکھاتے ہوئے کہا "پولیس آفیسر نے آپ کی یہ مجھے دی ہے تاکہ مجھے آپ کی شناخت میں آسانی

بہت پرانی تصویر تھی۔ غالباً اس وقت کی جب ہم لاہور آئے تھے۔ کیلے کے ایک باغ میں کھڑے تھے۔ زرین گل قہقہہ لگا کر اس نے ادا سے صفدر کے شانے پر سر رکھا

آسیب

آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب' ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۱۲۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ' چوک میو ہسپتال' لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

ہوا تھا۔ یہ اچھے دنوں کی یادیں تھیں۔

میں نے پوچھا "میرے ساتھ تصویر میں موجود باقی دو افراد کے بارے میں آفیسر نے کیا بتایا؟"

جے بولا "اس نے کہا کہ یہ دونوں بھی بے حد خطرناک افراد ہیں۔ بندے کو قتل کرنا ان کے لیے مکھی مارنے کے برابر ہے۔ آپ کے ساتھ کھڑے شخص کا نام انہوں نے صفدر بتایا اور کہا کہ یہ شخص بلا کا نشانے باز اور پھرتیلا ہے۔ تین چار افراد مل کر بھی اسے سنبھالنا چاہیں تو سنبھال نہیں سکتے۔ آپ کے حوالے سے بتایا گیا کہ۔۔۔ گستاخی معاف۔۔۔ آپ ان کے سرغنہ ہیں اور سفاک ترین شخص ہیں۔ صفدر کی طرح آپ کا شمار بھی مارشل آرٹ کے ماہروں میں ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی شخص کی گردن دبوچ کر اسے لمحوں میں بے ہوش یا قتل کر سکتے ہیں۔" چند لمحے توقف کر کے جے بولا "پولیس والوں نے تصدیق تو نہیں کی جناب! لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے ریسٹ ہاؤس کے اردگرد ایک دو سادہ پوش پولیس والے ضرور مقرر کر دیے گئے ہوں۔"

"اس کے علاوہ کوئی بات ہوئی؟"

"انہوں نے مجھے شیخ عاصم صاحب کی تصویر بھی دکھائی اور پوچھا کہ کیا پچھلے دس بارہ روز میں میں نے ان صاحب کو کہیں آس پاس دیکھا ہے۔ میں نے مکمل لاعلمی ظاہر کی۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ تلاشی وغیرہ کی بات نہ کریں لیکن شکر ہے کہ اس حوالے سے خیریت ہی گزری۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دو بار پھر آئیں۔ تمہیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا اور جو کچھ بتا رکھا ہے اسے یاد رکھنا ہوگا۔ ریسٹ ہاؤس کے ملازمین میں سے کسی کو میرا اور باری کا اصل نام معلوم نہیں ہونا چاہیے۔" جے نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں انیکسی کی طرف چل دیا۔ قوسیہ کی خواہش کے عین مطابق میں نے اسے انیکسی میں منتقل کر دیا تھا۔

چند روز پہلے قوسیہ نے ہمیں الو بنانے کے لیے اپنے رویے میں تبدیلی کا ڈراما رچایا تھا۔ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اس نے باری کے سامنے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ انیکسی میں قیام کرنا چاہتی ہے تاکہ اسے احساس ہو کہ وہ ایک "گھر" میں رہ رہی ہے۔ وہ باری کے لیے اپنے ہاتھ سے کوکنگ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے کپڑے پریس کرنا چاہتی ہے اور وہ سب کچھ چاہتی ہے جو ایک گھریلو گرہستن کی خواہش ہوتی ہے۔

اب اس کی اپنی ہی تمنا اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔

میں نے اسے انیکسی میں منتقل کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ملازمہ باندرا بھی جو سازش میں قوسیہ کے ساتھ شریک تھی۔ ساتھ میں وہ گارڈ تھا جو ریسٹ ہاؤس کے باہر زخمی ہوا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ٹوٹ گئے تھے۔ دونوں اعضا پلاستر میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ بیساکھی کے ذریعے حرکت کرتا تھا۔ ان تینوں کے لیے ایک انیکسی کو ہم نے سب جیل بنا دیا تھا۔ میری ہدایت پر انیکسی چاروں طرف سے بند کر دی تھی۔ بس ایک دروازہ رہنے دیا گیا تھا۔ اس دروازے پر ہمہ وقت ایک تالا لگا رہتا تھا۔ بس ضرورت کے تحت ہی یہ قفل گارڈ کی موجودگی میں کھولا جاتا تھا۔

باندرا، قوسیہ اور گارڈ پرشوتم کی قید ایک طرح سے بامشقت تھی۔ خاص طور سے قوسیہ اور باندرا کا تو رنگ نکل جاتا تھا۔ ان دونوں کی ذمے داری تھی کہ پورے ریسٹ ہاؤس کے لیے کھانا پکائیں۔ لانڈرنگ اور برتن دھونا وغیرہ کرنا بھی ان دونوں کی ذمے داری تھی۔ پرشوتم ان کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتا تھا لیکن اصل بوجھ ان دونوں پر تھا۔ باندرا تو خیر اس مشقت کی عادی تھی لیکن قوسیہ کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ للیتا ایک بے رحم داروغہ کی طرح ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتی تھی۔ وہ جب بھی انیکسی کا چکر لگاتی تھی بید کی چھڑی اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ چھڑی کل قوسیہ پر وہی اثر کر رہی تھی جو سرکس کے خونخوار جانوروں پر "رنگ ماسٹر" کا کوڑا کرتا ہے۔

واردات کی رات لگنے والی دو کراری اور زنّاٹے دار چھڑیوں کے بعد قوسیہ نے للیتا کی برتری و اتھارٹی تسلیم کر لی تھی۔ اس کے ایک اشارے پر حرکت میں آجاتی تھی۔ وہ جانتی تھی للیتا دوسرا اشارہ نہیں کرے گی بلکہ چھڑی استعمال کرے گی۔ درحقیقت قوسیہ اور باندرا نے ایک گھناؤنی حرکت کر کے خود کو ہر قسم کی رعایت سے محروم کر لیا تھا۔

میں انیکسی کے سامنے پہنچا تو للیتا زخمی شیرنی کی طرح انیکسی کے سامنے ٹہل رہی تھی۔ انیکسی کی بناوٹ اس طرح کی تھی کہ شیشے کی کھڑکیوں اور جالی دار دروازوں سے اندر کی زیادہ تر نقل و حرکت باہر ہی سے نظر آتی تھی۔ للیتا باہر ہی سے قوسیہ اور اس کی معاون کو دیکھتی رہتی تھی۔ اگر اسے اندر جانا ہوتا تو پھر دوسرا گارڈ ساتھ جاتی تھی۔

میں نے جالی دار دروازے سے دیکھا۔ قوسیہ بے ڈھنگے طریقے سے آلو چھیل رہی تھی۔ آلو بار بار اس کے ہاتھ سے

چھوٹ کر فرش پر لڑھک جاتا تھا۔ باندرا آگے بڑھی اور اسے آلو چھیلنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔ باندرا کی یہ ذمے داری بھی تھی کہ وہ قوسیہ کو امور خانہ داری میں مشاق کرے۔

دو تین منٹ بعد قوسیہ کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کی پیشانی پر بے ساختہ ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں اور اس نے فوراً ہی پلکیں جھکا لیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ آلو چھوڑ کر اندر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ ناخنوں کی بھوت تھی لیکن کسی طریقے سے بھی یہ آسانی نہیں مان رہی تھی۔ اس کے رویے میں تبدیلی پیدا تو ہو رہی تھی لیکن بہت آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقے سے۔ قوسیہ اور باندرا جو کھانا پکاتی تھیں وہ سب سے پہلے انہیں ہی کھلایا جاتا تھا۔ لہٰذا کسی نئے حادثے کا امکان بالکل نہیں تھا۔ سخت "شرمندگیاں" اٹھانے کے بعد قوسیہ نے دوبارہ خودکشی کی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس کا تجربہ ہی غالباً اتنا خوفناک تھا کہ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا۔

زہریلے کھانے والا حادثہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھا۔ شیفرڈ کتوں میں سے ایک اسی رات مرگیا تھا دوسرا ابھی تک پوری طرح نارمل نہیں ہوا تھا۔ اس حادثے کے حوالے سے سائیں عالی کا کردار بھی قابل غور تھا۔ اس کی پراسرار شخصیت اس واقعے میں بھی جھلک دکھاتی نظر آتی تھی۔ اسی کی وجہ سے وہ کھانا ضائع کرنا پڑا تھا اور پھر شیفرڈ تک پہنچا تھا۔ میں نے سائیں سے اس حوالے سے بات نہیں کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ بات کروں گا تو وہ بات ہی اڑانا شروع کر دے گا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ ایک مرتبہ زریں نے کسی بات پر سائیں کی تعریف کی تھی۔ سائیں نے زریں کو ٹوپی اتارنے کا کہا تھا۔ زریں نے فوراً ٹوپی اتاری تھی۔ سائیں نے ایک چپل اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری تھی اور بولا تھا "جو تعریف کرتا ہے میں اس کا شکریہ اسی انداز میں ادا کیا کرتا ہوں۔"

سائیں بابا کے مشکور ہونے کے انداز نے زریں کو کئی دن تک شرمندہ رکھا تھا۔

شیخ عاصم کی حالت ابتر تھی۔ اس کے برے دن آئے تھے اور دھوم دھام سے آئے تھے۔ اس کا کاروبار پہلے ہی زبوں حالی کا شکار ہو رہا تھا، رہی سہی کسر فرسٹ اسٹورز میں ہونے والی ڈکیتی نے پوری کر دی تھی۔ کروڑوں روپے کے نقصان نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دوسرا بڑا دھچکا اسے لبوتا کی بے وفائی سے پہنچا تھا۔ وہ آج تک پتا نہیں کتنی حسیناؤں سے بے وفائی کر چکا تھا اب اس سے بے وفائی ہوئی تھی تو وہ سراپا زخم نظر آنے لگا تھا۔ وہ قوسیہ کا رونا رو تا رہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ قوسیہ سے کہیں زیادہ دکھ اسے لبوتا کی جدائی کا ہے۔ اس کا ہر ہر پل انگاروں پر کٹ رہا تھا۔

بلائنڈ شیشے نے عاصم کی تکالیف میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ میں اکثر لبوتا کے ساتھ اس شیشے کے سامنے جا بیٹھتا تھا۔ لبوتا کو بھی علم نہیں تھا کہ اس شیشے کے عقب میں کیا ہے۔ ہم دونوں باتیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے تھے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کو چوم بھی لیتے تھے۔ کمرے میں اکثر پونجا کے نایاب پھول گلدانوں میں مہکتے رہتے تھے۔ یہ کمرا ہمارے بیڈ روم سے ملحق تھا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھنے اور ایک دو ڈرنک لینے کے بعد میں لبوتا کی کمر میں بازو ڈال کر بیڈ روم میں چلا جاتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ یہ مناظر عاصم کے دل پر آرے چلاتے ہوں گے۔ وہ چیخ کر ہمیں متوجہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ عاصم کا کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ وہ بلائنڈ شیشے کو توڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ راستے میں اسٹیل کی گنجان گرل حائل تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی آنکھیں ہی بند کر سکتا تھا۔ عاصم کی شیو بڑھ چکی تھی۔ اسے نہ لباس کا ہوش تھا اور نہ کھانے پینے کا۔ رات کو وہ اکثر مجھے گالیاں دینے لگتا تھا اور خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیا کرتا تھا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی تھی کیونکہ آواز کمرے کے اندر ہی گونج کر رہ جاتی تھی۔ وہ قوسیہ سے ملنے کا تقاضا کرتا رہتا تھا لیکن لبوتا سے ملنے کا تقاضا اس نے ایک بار بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ جان جگر کی دید کے لیے وہ بے حد بے تاب ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے، مجھے صفدر کے سلسلے میں کولمبو کے ایک آئی اسپیشلسٹ سے ملنا تھا۔ میں ایک بند گاڑی میں کولمبو پہنچا۔ سری لنکا کا یہ آئی اسپیشلسٹ نامور ڈاکٹروں میں شمار ہوتا تھا۔ آنکھوں کے عطیات اکٹھے کرنے میں بھی اس اسپیشلسٹ کا بہت کردار تھا۔ اسپیشلسٹ سے ملاقات میں مجھے کئی ضروری تفصیلات معلوم ہوئیں۔ واپسی میں مجھے تھوڑی سی تاخیر ہوگئی۔ میں ریسٹ ہاؤس واپس پہنچا تو دس بجنے والے تھے۔ ابھی میری گاڑی ریسٹ ہاؤس سے ایک کلومیٹر دور ہی تھی کہ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ مجھے آگ کی روشنی اور دھواں دکھائی دیا۔ گاڑی کے ایکسی لریٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ درختوں سے گھری ہوئی سڑک پر گاڑی برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی ریسٹ ہاؤس پہنچی۔ یہ دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ آگ ریسٹ ہاؤس کے اندرونی

نی ہوئی ہے۔ میں نے دور ہی سے ہارن دینا شروع کردیا تھا۔ میرے پہنچتے پہنچتے گیٹ کھل گیا۔ میں نے گاڑی سیدھی پورچ میں روکی۔

آگ انیکسی میں لگی تھی۔ شعلے اوپر تک اٹھ رہے تھے۔ پورا ریسٹ ہاؤس گاڑھے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ چاروں طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' آگ توسیہ ہی کی غلطی کی وجہ سے لگی تھی۔ تیز ہوا کے سبب تھوڑی دیر کے لیے بجلی فیل ہوئی تھی۔ توسیہ نے موم بتی جلائی اور بے وقوفی سے ایک ایسی جگہ پر رکھ دی جہاں قریب ہی نائیلون کا پردہ موجود تھا۔ نائیلون کے پردے نے آگ پکڑی اور جس ٹرولی بیڈ پر گر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فوم اور لکڑی نے بھی آگ پکڑ لی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں' تیز ہوا کے سبب یہ آگ سیکنڈوں میں پھیلی اور انیکسی کے کئی حصے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ ہوا چونکہ ریسٹ ہاؤس کے رہائشی حصے کی طرف تھی' سارا گاڑھا دھواں ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوگیا۔ ملازمائیں دم گھٹنے سے بے ہوش ہوگئیں اور باقی لوگ کسی نہ کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

جب میں گاڑی سے نکل کر انیکسی کی طرف دوڑا' دو گارڈز نیم بے ہوش باندرا کو اٹھا کر باہر لا رہے تھے' وہ دم گھٹنے سے بے ہوش ہوئی تھی۔ گارڈ پرشوتم کو پہلے ہی باہر لایا جا چکا تھا لیکن... توسیہ ابھی اندر ہی تھی۔ میں نے دیکھا اور میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ آگ سے بچنے کی کوشش میں انیکسی کی بالائی منزل پر چلی گئی تھی' وہ جس بالکونی سے جھانک رہی تھی اور چیخ رہی تھی وہ مکمل طور پر آگ میں گھری ہوئی تھی۔ وہ چیخ کر ایک قدم آگے بڑھاتی تھی پھر چیخ کر ایک قدم پیچھے ہٹا لیتی تھی۔ یہی وقت تھا جب میری نگاہ شیخ عاصم پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ ہتھکڑی کی زنجیر کا دوسرا سرا دو گارڈز کے ہاتھوں میں تھا (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' شدید دھوئیں کے باعث جج کی ہدایت پر عاصم کو ہتھکڑی لگا کر اس کے کمرے سے نکال لیا گیا تھا) اب عاصم آگ سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا اپنی بہن توسیہ کو دیکھ رہا تھا اور آوازیں دے رہا تھا۔ توسیہ نے بھی عاصم کو دیکھ لیا تھا' وہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ صورت حال بڑی مخدوش تھی' لگتا تھا کہ مدد کا وقت گزر چکا ہے۔

عاصم کے خون نے جوش مارا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ گارڈز سے اپنی زنجیر کا سرا چھڑایا اور انیکسی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ سب سکتے کی سی حالت میں دیکھ رہے تھے۔ عاصم نے ایک جلتی ہوئی لکڑی کو پھلانگا اور اندر داخل ہوگیا۔ اندر شعلوں کی بے رحم زبانیں تھیں' دھوئیں کے جان لیوا مرغولے تھے۔ عاصم نے زینہ چڑھ جانے کی کوشش کی اور تین بار پیچھے ہٹا پھر اس کی آستین نے آگ پکڑ لی۔ وہ ڈگمگاتا ہوا باہر آگیا۔ اس کی حسرت ناک نظریں اپنی بہن پر جمی ہوئی تھیں' وہ فریادی سی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جلنے والی تھی' آنکھوں کے سامنے جلنے والی تھی۔ وہ ایک شیخ زادی تھی' اس کے کردار میں بے شمار غلطیاں تلاش کی جاسکتی تھیں' اس کی چارج شیٹ پر بہت سے جرم لکھے جاسکتے تھے۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ توسیہ جل رہی ہے... شگفتہ جل رہی ہے یہ شیخ عاصم کی بہن نہیں جل رہی۔ صرف بہن جل رہی ہے۔ بہن جو معصوم ہے جو بے بس ہے جسے مدد کی ضرورت ہے۔ ہاں ان لمحوں میں وہ ایک لڑکی تھی اور میں اسے جلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے خاندان سے تمام تر عداوت کے باوجود میرے لیے یہ منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

ایک شخص کہیں سے ایک کمبل لے آیا تھا۔ کمبل اس کے ہاتھ سے چھینا۔ ایک گارڈ پانی کی بالٹیاں آگے کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک کر کمبل پانی میں بھگویا۔ اسے اوڑھا اور آگ اور دھوئیں میں گھستا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں زندگی سے دور اور موت کے قریب جا رہا ہوں لیکن اب رکنا یا سوچنا ممکن نہیں تھا' دوڑتا چلا گیا۔ گیلا کمبل چند لمحوں میں خشک ہوگیا۔ مجھے آگ کی بے پناہ حرارت محسوس ہوئی۔ میرے پاؤں زینوں پر تھے اور میری دونوں جانب سیڑھیوں کی ریلنگ اور پلائی وڈ جل رہے تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ کمبل کسی بھی لمحے آگ پکڑ سکتا تھا۔ میں آگ کے عین وسط میں تھا۔ آگ جو جلانا جانتی ہے۔ وہ "بزدلی" کو بھی جلاتی ہے اور "بہادری" کو بھی' خود غرضی کو بھی جلاتی ہے اور قربانی و ایثار کو بھی۔ کوئی شخص سپرمین بن کر آگ میں گھستا ہے یا کسی کا دھکا کھا کر آگ میں گرتا ہے' آگ اس سے ایک جیسا سلوک کرتی ہے۔ میں نے سیڑھیاں طے کیں۔ سامنے ہی بالکونی میں مجھے توسیہ نظر آئی۔ وہ دوڑ کر میری طرف آئی۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی مگر دھوئیں کے سبب اس کے حلق سے بس آواز نکل رہی تھی۔

میں نے اسے کمبل میں چھپایا اور واپس زینوں کی طرف بڑھا۔ زیریں زینوں کی طرف جانے کا اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ زینے بھی آگ ہو رہے تھے۔ میرے جوتے زینوں سے چپک رہے تھے' اپنے جھلستے ہوئے بالوں کی بو میں اپنے نتھنوں میں محسوس کر رہا تھا۔ کانوں میں شعلوں کا دھاڑنا اور فلک شگاف شور تھا اور چیخ و پکار تھی۔ ابھی ہم نے تین چار زینے ہی طے کیے تھے کہ کمبل نے بھک کی آواز سے آگ پکڑ لی۔ توسیہ کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ کمبل اتار کر پھینکنا چاہتی تھی لیکن میں اسے اسی طرح کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا انیکسی کی چھت پر لے گیا۔ چھت بھی آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں تھی۔

چھت کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ہمارے کپڑوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان بس ایک دو سیکنڈ کا فاصلہ تھا۔ یہ خیال برق آسمانی کی طرح میرے ذہن میں کوندا کہ ہم انیکسی کی چھت سے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ دھوئیں کے سبب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس میرا تخمینہ تھا کہ سوئمنگ پول انیکسی کی عقبی دیوار سے چھ سات فٹ کی دوری پر واقع ہے۔ دوری کم بھی ہوسکتی تھی اور زیادہ بھی لیکن ہمارے پاس وقت بس دو سیکنڈ ہی کا تھا۔ نو چوائس۔ نو آپشن۔ میں نے توسیہ کو اپنے بازوؤں میں بھرا اور اسے دوڑاتا ہوا چھت کے آخری کنارے تک لے گیا۔ وہ وحشت ناک انداز میں چیخ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ چھت ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی تھی۔ ایک سیکنڈ ہوا میں معلق رہنے کے بعد ہم پرشور انداز سے پانی میں گرے۔ بے پناہ حرارت کو یک دم ایک حیات بخش ٹھنڈک نے ڈھانپ لیا۔ ہم پانی میں گہرائی تک اتر گئے۔ میں نے توسیہ کو بدستور اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم سطح آب پر ابھرے۔ ایک دم میرے سینے میں ہلکی سی سرد لہر آگئی۔ توسیہ کا جسم میرے بازوؤں میں بے جان لاش کی طرح جھول رہا تھا۔ اس کی گردن پیچھے کو مڑ گئی تھی اور منہ کھل گیا تھا۔ میں نے اس کا سر پانی کی سطح سے اونچا رکھا اور تیرتا ہوا کنارے پر آگیا۔ ریسٹ ہاؤس کے سارے مکینوں نے ہمیں آگ کے گولے کی طرح سوئمنگ پول میں گرتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ بھاگتے ہوئے ہمارے گرد جمع ہوگئے۔ باری نے ایک چادر توسیہ کے جسم پر ڈال دی تاکہ اس کے جلے ہوئے لباس سے جھانکنے والی عریانی چھپ جائے۔

"توسیہ... توسیہ۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔ وہ بے ہوش تھی۔

میں نے زور زور سے اس کے گال تھپتھپائے۔ دل کے مقام پر اس کے سینے کو بار بار دبایا لیکن وہ بے حرکت رہی۔ وہ مجھے بہت دور نظر آ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے بال جھلس کر پیشانی سے چپک گئے تھے اور آنکھیں بالکل بند تھیں۔ باری بھی بے پناہ بے تابی سے اسے جھنجوڑنے لگا۔ پکارنے لگا۔

میں نے توسیہ کو الٹا کیا اور وہ طبی امداد دی جو ڈوبنے والوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ جلد ہی توسیہ کے حلق سے پانی کا فوارہ نکلا اور اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔

"توسیہ... توسیہ۔" باری کی آواز خوشی سے لرزنے لگی۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ رات دن توسیہ کی رٹ لگانے والا عاصم توسیہ کے آس پاس موجود نہیں ہے۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہوکر چاروں طرف دیکھا' عاصم کہیں دکھائی نہیں دیا۔ انیکسی پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی' ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ خدشہ تھا کہ تیز ہوا کی وجہ سے انگارے اڑ کر ریسٹ ہاؤس کی اصل عمارت کی طرف نہ چلے جائیں۔ اچانک میری نظر ایک کار پر پڑی' اس نے بڑے خطرناک انداز میں یوٹرن لیا اور مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ کھلا تھا اور وہاں صرف ایک گارڈ موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ گارڈ کچھ کرتا یا سوچتا' کار زناٹے کے ساتھ گیٹ میں سے گزر گئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عاصم فرار ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ شک بھی گزرا کہ وہ کار میں اکیلا نہیں تھا۔ وہ یہاں سے کسی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا' ایک دم میرے ذہن میں ان گنت اندیشے چنگھاڑنے لگے۔

میں سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں ایک سوال چیخ بن کر ابھر رہا تھا "کہیں شیخ عاصم اپنے ساتھ لیونا کو تو نہیں لے گیا۔" اگر ایسا ہوا تھا تو بہت برا ہوا تھا۔ عاصم اپنی سابقہ گرل فرینڈ لیونا کے لیے درندے سے بڑھ کر خوں خوار اور سفاک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ جلتی ہوئی انیکسی کے شعلے مدھم پڑنا شروع ہو گئے تھے' تاہم اب بھی ان کی روشنی اردگرد کی بہت سی چیزوں کو منور کر رہی تھی۔ ہراساں چہروں والے لوگ چاروں طرف بھاگ دوڑ کر کے آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ منیجر چیخ چیخ کر ملازمین اور گارڈز کو ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے بلند آواز سے دو تین بار لیونا کو پکارا۔ وہ آس پاس کہیں نہیں تھی۔ میں نے اپنی بھیگی ہوتی پتلون کی جیب میں گاڑی کی چابی ٹٹولی' اور دوڑتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف گیا۔ چند لمحے بعد میں گاڑی کے اندر تھا۔ میں نے گاڑی کو یوٹرن دیا۔ گاڑی کے پہیے بری طرح چرچرائے اور وہ ہوا کے تند و تیز جھونکے کی طرح مین گیٹ سے گزر کر سڑک پر آ گئی۔

یہ سڑک قریباً دو کلو میٹر تک بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔ میں نے ہاتھ ہارن پر رکھ دیا اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ قریباً تین منٹ کی نہایت سخت ڈرائیونگ کے بعد مجھے اس گاڑی کی نیل لائٹ نظر آ گئی جس پر عاصم فرار ہوا تھا۔ نیل لائٹ پہچاننے کے بعد مجھے تسلی ہو گئی کہ اب میں عاصم کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی عاصم بے حد جنون کے عالم میں میرے ساتھ کار دوڑا کر دیکھ چکا تھا اور اسے ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ اگلے تین چار منٹ میں دونوں گاڑیوں کا فاصلہ مزید کم ہو کر سوڈیڑھ سو میٹر رہ گیا۔ درختوں اور نہایت گھنے سبزے سے گھری ہوئی یہ ایک بل کھاتی سڑک تھی۔ دونوں کناروں پر ناریل کے بلند درخت پہرے داروں کی طرح چوکس کھڑے تھے۔ کہیں کہیں تاڑ اور پام کی دیگر اقسام بھی نظر آتی تھیں۔ دن کے وقت بھی اس سڑک پر ٹریفک کم ہی ہوتا تھا' یہ تو پھر رات تھی۔ ہم پوری رفتار سے آگے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ موڑوں پر میری جیگوار کے پہیے بری طرح چرچراتے تھے اور اندازہ ہوتا تھا کہ اگر میں تھوڑی سی رفتار بھی بڑھاؤں گا تو گاڑی آٹھ دس قلابازیاں کھا جائے گی۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی جب مجھے محسوس ہوا کہ اس انتہائی رفتار کے باوجود بھی عاصم سے میرا فاصلہ جوں کا توں ہے۔ لگ رہا تھا کہ وہ زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر لیونا اس کے ساتھ ہے تو کس حال میں ہے۔ اسے اغوا کیا جا رہا تھا۔ کیا وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عاصم نے اسے بے ہوش یا کر دیا ہو۔ یا پھر وہ اس کے ساتھ تھی ہی نہیں؟ اس قسم کئی سوال ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

ایک موڑ پر اچانک عاصم کی گاڑی پھسلی' مجھے پہیوں کی طویل چیخ صاف سنائی دی۔ میں نے گاڑی کی عقبی سرخ بتیوں کو خوفناک انداز میں لہراتے اور اوجھل ہوتے دیکھا پھر سرخ بتیوں کے بجائے مجھے ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ایک بعد دوبارہ عقبی بتی کی جھلک دکھائی دی۔ گاڑی پھسل کر گھوم گئی تھی پھر میں نے دیکھا کہ عاصم والی گاڑی سڑک سے اتر کر درختوں میں اوجھل ہو رہی ہے۔ دو تین سیکنڈ بعد بھی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں عاصم کی گاڑی گھومی تھی۔ سڑک پر ٹائروں کی رگڑ کے طویل سیاہ نشان تھے۔ میں نے بائیں جانب دیکھا۔ عاصم والی گاڑی کی عقبی روشنیاں راستے پر اچھلتی کودتی نظر آئیں۔ میں نے بھی گاڑی پیچھے ڈال دی۔ یہاں سے سبزی اور پھل لانے والے ٹریکٹر ٹرک وغیرہ گزرتے تھے۔ راستہ ناہموار تھا۔ جہاں سے پہیے گزرتے تھے وہاں دو گہرے ٹریک بن گئے تھے۔ گاڑی کا فرش زیادہ اونچا نہیں تھا لہٰذا بار بار نیچے سے ٹکرا رہا تھا۔ فاصلہ اب کم رہ گیا تھا۔ اتنے فاصلے سے میرے پسٹل کا فائر کارگر ہو سکتا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا پسٹل والا ہاتھ باہر نکالا اور اوپر تلے تین چار فائر کیے۔ عاصم کی گاڑی کی ایک نیل لائٹ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ سات گولیوں والا پسٹل تھا۔ میں مزید گولیاں ضائع کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا' لہٰذا پسٹل والا ہاتھ اندر کر لیا۔ دونوں گاڑیاں اسی طرح قریباً تین کلو میٹر تک گئیں۔

اچانک میری رگوں میں خون اچھل گیا۔ اگلی گاڑی رک گئی تھی اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مجھے گاڑی روک لینی چاہیے تھی لیکن میں روک نہیں سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا عاصم اس جنگل کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تو میں اسے قیامت تک ڈھونڈ نہیں سکوں گا۔ خود کو عاصم کی طرف سے کی جانے والی کسی کارروائی سے بچانے کے لیے میں نے خود کو ممکنہ حد تک نیچے جھکا لیا اور گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اس والی کار کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ عاصم' ریسٹ ہاؤس سے گاڑی لے کر بھاگا تھا وہ ڈاٹسن تھی۔ ڈاٹسن کے اگلے دو دروازے کھلے تھے۔ میری چلائی ہوئی ایک گولی کا نشان

ے پر دکھائی دے رہا تھا' دوسری گولی نے نیل لائٹ توڑ دی ے اپنی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس میں مجھے ایک ایسی شے نظر ئے جسے دیکھ کر مجھے فوراً یقین ہو گیا کہ بدبخت شیخ عاصم لیونا کو ے ساتھ لے آیا ہے۔ یہ لیونا کا ایک سفید سینڈل تھا جو لے ہوئے دروازے کے بالکل پاس پہلو کے بل پڑا تھا۔ میں چند سیکنڈ تک گاڑی میں ہی رہ کر اطراف کا جائزہ لیا پھر یاط سے باہر نکل آیا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن نے دی تھیں۔

یقیناً مجھے یہ جاننے میں سخت دشواری پیش آتی کہ شیخ م لیونا کو لے کر کس طرف گیا ہے مگر کچھ آوازوں نے ری مدد کی۔ یہ آوازیں گرجنے برسنے کی تھیں۔ دبے دبے ے میں شیخ عاصم لیونا کو دھمکا رہا تھا۔ ان آوازوں نے مجھے بتا دیا کہ مجھے شیخ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت ہیں۔ شیخ عاصم لیونا کے ساتھ گاڑی کے بالکل پاس ہی موجود ہے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ شیخ عاصم ڈاٹسن کار سے قریباً پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر کسی پناہ گاہ میں موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس پناہ گاہ کے بارے میں پہلے سے جانتا ہے اور اس نے ڈاٹسن پروگرام کے مطابق پناہ گاہ کے بالکل سامنے جا کر روکی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ر چھوڑتے ہی عاصم کو چھپنے کے لیے ایک اچھی جگہ میسر نی تھی۔ عاصم لیونا سمیت وہاں موجود تھا۔

میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھتا ہوا عاصم کی چھوڑی ہوئی ڈاٹسن کے پاس پہنچ گیا۔ اچانک عاصم کی بلند آواز سنائی دی۔ یہ آواز فرطِ غضب کی وجہ سے پھٹی ہوئی تھی اور ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ وہ دہاڑا "جانی! میرے قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

میں چونکا۔ مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ عاصم کے ساتھ ایک نہیں دو یرغمالی ہیں۔ ایک تو یقیناً لیونا ہی تھی۔ دوسرا کون ہو سکتا تھا؟ یا ہو سکتی تھی؟ بہرحال اس موقعے پر خاموش رہنا بہتر تھا۔

میں نے کہا "عاصم! یہ خیال بھی دماغ میں نہ لانا کہ تم یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔"

"میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ یہاں سے تمہیں لاشوں کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔"

"تمہاری یہ دھمکی مجھ پر بالکل کارگر نہیں۔ اپنی معشوقہ کے ساتھ تم جو چاہو سلوک کر سکتے ہو۔"

"میں جانتا ہوں کہ کیا کارگر ہے اور کیا نہیں ہے۔" شیخ نے عجیب سے لہجے میں کہا پھر مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے بولا کہ میں اپنا منحوس سراپا لے کر اس سے دور ہٹ جاؤں ورنہ وہ دونوں یرغمالیوں میں سے ایک کی لاش گرا دے گا۔

میں پیچھے ہٹ گیا اور اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ میں واپس جانے کے لیے گاڑی میں نہیں آیا تھا' بس اس کا رخ ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گاڑی کو تھوڑی سی حرکت دے کر اس طرح کھڑا کر دیا کہ ہیڈ لائٹس اس پناہ گاہ پر پڑنے لگیں جہاں عاصم چھپا ہوا تھا۔ یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ ایک درخت دہانے کے سامنے گرا ہوا تھا اور اس پر بھی سبزے کی تہ چڑھی تھی۔ سبزہ یہاں اتنی کثرت سے تھا کہ ہرے رنگ کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا زاویہ ذرا بدلا تو مجھے پتا چلا کہ میری چلائی ہوئی تیسری گولی ڈاٹسن کے پچھلے دروازے میں لگی تھی۔

میں نے کار کا انجن اسٹارٹ رہنے دیا۔ مقصد یہی تھا کہ ہیڈ لائٹس مسلسل آن رہنے کی وجہ سے بیٹری ڈاؤن نہ ہو جائے۔ کار میں بیس پچیس لٹر پیٹرول موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ گاڑی چوبیس گھنٹے بھی اسٹارٹ رہے تو کام چلتا رہے گا۔ بہرحال ایک خدشہ موجود تھا' اور وہ یہ کہ شیخ عاصم فائر مار کر ہیڈ لائٹس توڑنے کی کوشش کرے گا۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ شیخ عاصم اور میں اپنی اپنی پوزیشن پر موجود رہے۔ میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ میں ریسٹ ہاؤس میں رابطہ کر کے اپنے گارڈز کو یہاں بلا سکتا۔ بس ایک ہی توقع تھی اور وہ یہ کہ ریسٹ ہاؤس میں موجود منیجر اور باری وغیرہ میری تلاش میں نکلیں اور یہاں تک پہنچ جائیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے ہم ایک بل کھاتی سڑک پر بڑی تیزی سے گاڑیاں دوڑاتے ہوئے آئے تھے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے جگہ جگہ سڑک پر ٹائروں کے نشانات ثبت ہوئے تھے۔ جہاں شیخ عاصم والی ڈاٹسن پھسلی تھی وہاں بھی سڑک پر گہرے نشانات پڑے تھے۔ وہاں سے ڈاٹسن کچے میں اتر گئی تھی اور مجھے بھی ڈاٹسن کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ ان نشانات کی مدد سے ہمارے پیچھے آنے والے اس مقام تک پہنچ سکتے تھے۔ تاہم مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کام رات میں نہیں ہو سکے گا' اس کے لیے مجھے دن کا انتظار کرنا ہو گا۔ دن بھی اب زیادہ دور نہیں تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔

کچھ دیر بعد کھوہ کی طرف سے عاصم کے گرجنے برسنے کی

آوازیں پھر آنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے اپنے دونوں "یرغمالیوں" کو باندھ کر قابو میں کرلیا ہے اور اب وحشت کے عالم میں لیونا کے ساتھ مار پیٹ کر رہا ہے۔ غالباً وہ لیونا کو کسی لکڑی وغیرہ کے ساتھ مار رہا تھا۔ لیونا کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں اور وہ منت سماجت بھی کر رہی تھی۔ شیخ کی آواز سے شعلے لپک رہے تھے۔ جذبات کی تیزی کے سبب اس کی آواز گاہے گاہے پھٹ جاتی تھی۔ اس کی آتش فشاں گفتگو کا کوئی کوئی لفظ میری سمجھ میں بھی آجاتا تھا۔ مثلاً ایک اڑتا اڑتا سا جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ انگلش میں بولا گیا یہ جملہ کچھ یوں تھا "حرام زادی۔ کیا نہیں دیا تھا میں نے تجھے۔ کیا نہیں تھا میرے پاس۔" اس سے آگے ایک نہایت غلیظ گالی تھی۔ ایک جملہ کچھ اس طرح تھا "تیری ماں کی فطرت طوائف تھی، تیری بھی طوائف کی ہے۔ تو عورت نہیں کتیا ہے۔ میں تیرا انجام بھی کتیا والا کروں گا۔"

لیونا گڑگڑا رہی تھی۔ اس سے رحم کی درخواستیں کر رہی تھی۔ وہ اسے کسی مضبوط لکڑی سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ہر ضرب کے بعد لیونا کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل چیک کیا۔ میگزین میں اب صرف تین گولیاں موجود تھیں۔ ان میں سے کم از کم ایک گولی مجھے شیخ عاصم کے مغز میں اتارنا تھی۔ میں پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور کہنیوں کے بل حرکت کرتا ہوا بڑی احتیاط سے دہانے کی طرف بڑھا۔ میں تھوڑا سا چکر کاٹ کر جا رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ میں اپنی گاڑی کی روشنیوں کی زد میں نہ آجاؤں۔ دہانے کے بالکل قریب پہنچ کر میں دوڑ کر اندر داخل ہو سکتا تھا۔ میرے پاس ایک ٹارچ موجود تھی۔ یہ ٹارچ میں نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں کمر کی طرف اڑس رکھی تھی۔ مرطوب ہوا اور خنکی کی وجہ سے میرا لباس ابھی تک گیلا تھا۔ میں اس قدرتی کھوہ کے دہانے سے قریباً پندرہ فٹ کی دوری پر پہنچ چکا تھا۔ جب جھاڑیوں میں دبکا ہوا کوئی جنگلی بلا میرے بالکل قریب سے چیخا۔ اور میرے قریب سے لڑھکنیاں کھاتا ہوا گھاس میں روپوش ہوگیا۔ اس اچانک افتاد کے سبب میں تھوڑا سا گڑبڑایا۔ میرے ہاتھ میں دبا ہوا پسٹل ڈاٹسن کی باڈی سے ٹکرایا اور آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز شیخ کو چونکانے اور ہوشیار کرنے کے لیے کافی تھی۔

وہ لیونا کو چھوڑ کر کھوہ کے دہانے کی طرف آیا، پھر فضا میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ عاصم نے ماؤزر کے تین فائر کیے تھے۔ اس نے بے دریغ گولیاں چلائی تھیں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ میری ٹھیک لوکیشن سے آگاہ نہیں تھا تاہم گولیاں میرے بہت قریب لگیں۔ میں پیچھے ہٹ کر تیزی سے ڈاٹسن کی اوٹ میں ہوگیا۔ عاصم غیظ و غضب کے مارے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوفناک انداز میں چلاتا رہا۔ وہ لیونا کے ساتھ میرے عجیب و غریب رشتے جوڑ رہا تھا اور قسم کھا رہا تھا کہ وہ اسے زندہ چیر کر میرے سامنے پھینک دے گا۔ اس کا پہلا مطالبہ یہی تھا کہ میں کھوہ کے دہانے سے دور ہو جاؤں۔

اس کی آواز کی وحشت اور درندگی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے کچھ پیچھے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ میں پیچھے آگیا تو عاصم نے میرے سامنے دوسرا مطالبہ پیش کیا۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ میں فوراً سے پہلے اپنی گاڑی کی چابی اس کے حوالے کردوں۔ اگر میں نے پانچ منٹ کے اندر ایسا نہیں کیا تو وہ لیونا کو گولی مار دے گا۔

وہ بے حد خرانٹ تھا۔ بے شک میں نے ظاہر کیا تھا کہ مجھے لیونا کی سلامتی سے مطلق دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔ وہ میرا دیرینہ دشمن تھا اور میری فطرت کی اونچ نیچ سے آگاہ بھی تھا۔ اسے علم تھا کہ میں اس سنگین پوزیشن میں لیونا کو تنہا نہیں چھوڑوں گا۔

شیخ عاصم نے گاڑی کی چابی والا مطالبہ کر کے مجھے ایک بات سمجھا دی تھی۔ وہ بے سبب یہاں نہیں رکا تھا۔ گاڑی میں یقیناً کوئی خرابی واقع ہوگئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا ایندھن ہی ختم ہوگیا ہو (بعد ازاں ایندھن والا اندازہ درست نکلا)

میں اس ویرانے میں اپنی گاڑی کی چابی شیخ عاصم کے حوالے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ عاصم کے ساتھ گفتگو ذرا طویل ہو جائے۔ مجھے جتنا وقت ملتا جاتا اتنا ہی اچھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس دوران میں کوئی مجھے اور عاصم کو کھوجتا ہوا یہاں پہنچ جاتا مگر عاصم کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب مجھے زیادہ وقت دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔ اسے پتا تھا کہ جلد ہی صبح کے آثار نمودار ہو جائیں گے اور اس کے لیے مشکلات بڑھ جائیں گی۔

اس نے مجھے دس منٹ کی ڈیڈ لائن دی، پھر پانچ منٹ کی ڈیڈ لائن دی۔ اس کے بعد پھر پانچ منٹ کی مہلت دی۔ اس نے لیونا کو مارنے کی دھمکی دی تھی لیکن اب اس کے نشانے کی زد میں لیونا کی بجائے وہ گارڈ تھا جسے وہ اغوا کر کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس سری لنکن گارڈ کا نام مجید تھا۔ یہ وہی گارڈ

تھا جس نے آتش زدگی کے وقت عاصم کے ہاتھ کی ہتھکڑی تھام رکھی تھی۔ دراصل آتش زدگی کے دوران میں زبردست افراتفری کا فائدہ اٹھا کر شیخ عاصم نے اچانک گارڈ پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ایک وزنی لکڑی اتنی شدت سے گارڈ کے سر پر ماری تھی کہ وہ نیم جان ہو کر گر گیا تھا۔ دوسری ضرب نے اسے بالکل بے ہوش کر ڈالا تھا۔ قریب ہی ڈاٹسن کھڑی تھی عاصم نے لہولہان گارڈ کو ڈاٹسن میں ٹھونس دیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس کی قسمت نے پھر ساتھ دیا تھا۔ وہ ماؤزر کے زور پر لیونا کو بھی ڈاٹسن تک لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ دراصل یہ لمحے ریسٹ ہاؤس میں افراتفری کے عروج کے لمحے تھے۔ یہی لمحے تھے جب میں توسیہ کو بچانے کے لیے کمبل لپیٹ کر انیکسی میں گھسا تھا، پھر انیکسی کی چھت پر ہم دونوں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی اور مجھے توسیہ کو ساتھ لے کر سرکس کے بازیگر کی طرح سوئمنگ پول میں کودنا پڑا تھا۔ موقع پر موجود سب لوگ پول کی طرف بھاگے تھے اور یہی وقت تھا جب شیخ عاصم کو اپنی کارروائی میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ شیخ عاصم یہ سب کچھ کیسے کر گزرا۔

کھوہ کے دہانے میں تاریکی تھی۔ مجھے عاصم دکھائی دے رہا تھا اور نہ مجید۔ تاہم عاصم کی چنگھاڑتی ہوئی آواز مجھے بتا رہی تھی کہ اس نے اپنا ماؤزر گارڈ مجید کی کنپٹی پر رکھا ہوا ہے اور اسے شوٹ کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں آنکھیں سکوڑ کر دھیان سے دیکھتا تو دہانے کے قریب دو پرچھائیوں کی مدھم حرکت نوٹ کر سکتا تھا مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں سے گارڈ مجید کون ہے اور عاصم کون۔ بلکہ ان دونوں کے سراپے بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اچانک گارڈ مجید نے چیخ کر مجھے مخاطب کیا اور مقامی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن اس کا فریادی لہجہ اور لرزتا کانپتا انداز مجھے سمجھا رہا تھا کہ وہ شیخ عاصم سے اپنی جاں بخشی چاہتا ہے اور اس کے لیے مجھ سے درخواست کر رہا ہے کہ میں شیخ کی بات مان لوں۔ وہ سری لنکن تھا اور سنہالی بول رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ شاید وہ مجھے یہ بتا رہا تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور اس کی بیوی کولمبو کے کسی گھر میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ شاید اس کا مدعا یہ تھا کہ اس کے بوڑھے والدین ہیں جن کا واحد کفیل وہ خود ہے یا شاید وہ کوئی اور بات کہہ رہا تھا لیکن مقصد یہی تھا کہ وہ ہر ذی روح کی طرح موت سے خوف زدہ تھا اور ماؤزر کے اس بے رحم دباؤ سے خوف زدہ تھا جو ہر لمحہ اس کی کنپٹی پر بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آئی کہ میں جیگوار کی چابی جیب سے نکالوں اور شیخ عاصم کی ہدایت کے مطابق دہانے کے عین سامنے پہنچ کر کھوہ میں پھینک دوں مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے بعد میرے لیے شیخ عاصم کو روکنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ مجھ سے اپنا مطالبہ منوانے کے باوجود گارڈ مجید کو ہلاک کر دیتا اور لیونا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر راہِ فرار اختیار کر لیتا۔ ابھی میں تذبذب میں ہی تھا کہ ماؤزر کا فائر ہوا پھر میں نے ایک اڑتا ہوا سایہ دیکھا جو پرشور آواز میں ڈاٹسن کے قریب آن گرا۔ اس کے گرنے کی آواز ریت کی بوری گرنے کی آواز سے مشابہ تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ عاصم نے مجید یا لیونا میں سے ایک کو گولی مار کر کھوہ سے باہر پھینک دیا تھا۔ کھوہ ذرا بلندی پر تھی اس لیے محسوس ہوا تھا کہ مقتول اڑتا ہوا زمین پر آگرا ہے۔ مقتول جہاں گرا تھا وہاں گاڑی کی ہیڈ لائٹس نہیں پہنچ رہی تھیں۔ میں نے چند قدم آگے بڑھ کر ایک تناور درخت کی اوٹ لی اور ٹارچ کا روشن دائرہ ایک تاریک گوشے پر پھینکا۔ مجھے گارڈ کا جسم نظر آیا۔ وہ پشت کے بل پڑا تھا۔ ماؤزر کی گولی اس کی پشت سے داخل ہوئی تھی اور دل کے مقام سے سینہ پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں تاڑ کے ایک بلند درخت کی لمبائی ناپتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا سر بھی لہولہان تھا۔ یہ خون اس چوٹ کی نشان دہی کرتا تھا جو ریسٹ ہاؤس میں عاصم نے اس کے سر پر لگائی تھی۔ بلکہ یہ دو چوٹیں تھیں۔ دونوں سر کے پچھلے حصے میں لگی تھیں۔

ابھی میں اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ عاصم کی وحشیانہ دھاڑیں پھر سنائی دینے لگیں۔ وہ ایک بار پھر لیونا پر تشدد کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہے۔ لیونا کی چیخوں میں اب کرب کی جگہ دہشت نمایاں تھی۔ میں نے ایک بار پھر عاصم کو للکارا اور کہا کہ وہ لیونا کو مارنے سے باز آجائے۔ جواب میں عاصم نے ماؤزر لیونا کی کنپٹی پر رکھ دیا اور پکار کر بولا "میں اب پھر تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ صرف پانچ منٹ اس میں ایک سیکنڈ کا اضافہ بھی نہیں کروں گا۔ گارڈ کی طرح اس کتیا کی کمر پر بھی لات ماروں گا اور لاش نیچے پھینک دوں گا۔"

"اس کے بعد کیا کرو گے؟"

"اس کے بعد تمہیں بھی اس کتیا کے پاس پہنچاؤں گا۔" عاصم کی آواز بالکل اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ ایسے شخص سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بے وقوفی کر گزرے۔ وہ لیونا کو مارنے کی بات کر رہا تھا حالانکہ لیونا اس وقت اس کی زندگی کی ضامن بنی ہوئی تھی۔ وہ ذرا تحمل سے کام لیتا تو لیونا کو گن پوائنٹ پر رکھ کر یہاں سے راہِ فرار اختیار کر سکتا تھا، لیکن محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کو غیض و غضب کا تالا لگ گیا ہے۔ غالباً پچھلے دنوں ریسٹ ہاؤس میں میرا اور لیونا کا "رومانس" دیکھ دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو چکا تھا۔ اس سے پہلے یقیناً لیونا اور توبیہ کے حوالے سے وڈیو کلپس نے بھی اس کے دماغ کو خاصا متاثر کیا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے لیونا کی دبی دبی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ دو منٹ گزر گئے تو عاصم نے با آواز بلند کہا "تین منٹ رہ گئے ہیں جانی۔"

کہتے ہیں کہ جب بندریا کے پاؤں جلنے لگتے ہیں تو وہ اپنے بچے بھی پاؤں کے نیچے لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی شیخ عاصم تھا جو کچھ عرصہ پہلے تک لیونا پر جان و دل نچھاور کرتا تھا لیکن اب اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے اور اپنی جان بچانے کی خاطر وہ اپنی جان سے پیاری محبوبہ کو گن پوائنٹ پر رکھے ہوئے تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں توبیہ کی بات آئی۔ میں نے شیخ عاصم سے کہا "یاد رکھو توبیہ میرے پاس ہے۔ اگر لیونا کو کچھ ہوا تو پھر توبیہ کے ساتھ بھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

عاصم نے مغلظات بکتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ اب کیا ہونا ہے۔ اسے تو جلا کر راکھ کر چکے ہو تم۔"

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ شیخ عاصم نے آتش زدگی والے واقعے کا کلائمکس نہیں دیکھا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ میں توبیہ کو انیکسی سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شاید اس کے شدید ترین غیض و غضب کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ توبیہ کو مردہ سمجھ رہا تھا۔

میں نے کہا "شیخ عاصم تم تو اپنے پیدا کرنے والوں پر بھی اعتبار نہیں کرتے ہو لیکن حقیقت وہی ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ تمہاری بے وقوف ضدی بہن کو میں نے آگ میں سے نکال لیا ہے۔ وہ اس وقت صحیح سالم ریسٹ ہاؤس میں موجود ہے لیکن اب میں اس کی سلامتی لیونا کی سلامتی سے مشروط کر رہا ہوں۔"

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر شیخ عاصم گرجا "میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں جانی! تم بڑے شاطر ہو لیکن اب تمہاری کوئی چال کامیاب ہونے والی نہیں ہے۔ تم خود کو بدترین سلوک کا مستحق ٹھہرا چکے ہو۔ توبیہ کی آخری چیخیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔"

"تم بہرے ہو عاصم! اگر تمہارے کانوں نے چیخیں سنی ہوتیں تو تم آگے بڑھ کر اسے بچا لیتے۔ میں نے اس کی چیخیں سنی تھیں اور میں نے اسے بچایا بھی ہے۔ لیکن اب وہ اسی صورت بچے گی جب لیونا تمہارے ہاتھوں سے بچے گی۔ عورتوں کے ذریعے دشمنیاں چکانا میرے لیے قابل نفرت ہے مگر تم نے بد اخلاقی کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد مجھے مجبور کر دیا ہے کہ تمہارے ہی سکوں میں تمہیں ادائیگی کروں۔ ہاں میں نے بچایا ہے توبیہ کو لیکن اب میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر لیونا کو کچھ ہوا تو توبیہ بھی مرے گی۔"

میرے لب و لہجے نے عاصم کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "میں جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں، یقین نہیں کر سکتا کہ توبیہ زندہ ہے۔"

"توبیہ زندہ ہے اور میں تمہیں دکھا بھی سکتا ہوں لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"میں انتظار نہیں کر سکتا۔ یہاں حبس ہے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ تم اپنی گاڑی کی چابی میرے حوالے کر دو۔ اگر توبیہ زندہ ہے تو پھر تمہیں یہ فکر نہیں ہونا چاہیے کہ میں روپوش ہو جاؤں گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں جانے دوں۔ اور وہ ہونے سے پہلے پہلے ریسٹ ہاؤس سری لنکن پولیس کے گھیرے میں ہو۔"

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔"

"تم مجھ سے کوئی وعدہ نہ کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹی "تمہیں جو بھی سودا کرنا ہے یہیں پر کرنا ہوگا۔"

"میں ابھی پاگل نہیں ہوا ہوں۔" اس نے ایک بہت اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز ایک بار پھر پھٹ گئی۔

"تم پاگل نہیں ہوئے ہو۔ بلکہ دوسروں کو پاگل بنانے کی کوشش کرتے ہو۔"

چند سیکنڈ تک خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی میں بس گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دیتی رہی یا پھر کسی وقت لیونا کی دبی دبی کراہ ابھرتی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شیخ نے لیونا کو بڑی مضبوطی سے باندھ رکھا ہے۔ سخت بندشوں کی وجہ سے وہ بہت تکلیف محسوس کر رہی ہے۔ آخر عاصم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم اس کتیا کی جان بچانا چاہتے ہو تو سب سے پہلے مجھے ثبوت فراہم کرو کہ توبیہ زندہ ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو پھر اسے میرے حوالے کرنا ہوگا۔ میں تمہاری گاڑی پر توبیہ کو لے کر چلا جاؤں گا۔ یہ کتیا بھی میرے

ساتھ جائے گی۔ تم سے محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد میں اسے گاڑی سے اتار دوں گا۔"

"تمہاری اس سادگی پر مر جانے کو دل چاہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ تمہیں دینے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

شیخ عاصم کو یقین ہو گیا تھا کہ میں لیونا کی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کر گزروں گا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں بھی اس کی طرح لیونا کے چکنے مکھڑے کا عاشق ہو گیا ہوں اور ان لمحوں میں لیونا کی زندگی بچانا میرا مقصدِ حیات بنا ہوا ہے۔ شیخ عاصم کا خیال درست نہیں تھا۔ بے شک میں لیونا کو بچانا چاہتا تھا مگر اس کا "بچاؤ" میرے لیے اتنا اہم نہیں تھا کہ میں اس چکر میں عاصم کے ساتھ ساتھ توبیہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ لیونا سے عشق و محبت تو دور کی بات ہے مجھے اس سے زیادہ وابستگی بھی نہیں تھی۔ وہ ایک "لالچی حسینہ" تھی اور مال و دولت ہی اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ اگر کل کوئی شخص لیونا کو مجھ سے زیادہ قیمتی تحائف دے سکتا تو وہ مجھ سے منہ پھیر کر اس کی طرف چلی جاتی۔ پھر بھی میں تہِ دل سے چاہتا تھا کہ اس کی جان بچ جائے۔ وہ اس چکر میں میری وجہ سے پڑی تھی اور میں نے اسے کئی بار تسلی بھی دی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے عاصم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ درحقیقت آج رات ریسٹ ہاؤس میں جو کچھ ہوا تھا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ آگ آناً فاناً بھڑکی تھی اور انیکسی سے اٹھنے والے گہرے سیاہ دھوئیں نے پورے ریسٹ ہاؤس کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگر میں موقع پر موجود ہوتا تو شاید عاصم کو اتنی ڈھیل نہ ملتی کہ وہ اتنی آزادی سے اپنی کارروائی کر سکتا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی یہ سب کچھ ہو چکا ہے، نہ صرف عاصم ریسٹ ہاؤس سے باہر ہے بلکہ وہ اپنی سابقہ جانِ جگر کو بھی وہاں سے لے اڑا ہے۔

میرا پختہ ارادہ تھا کہ توبیہ کو نہیں چھوڑنا، نہ ہی عاصم کو یہاں سے جانے دینا ہے۔ اس سلسلے میں اگر مجھے لیونا کی قربانی دینا پڑی تو میں اس کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار تھا۔ فی الوقت میری اولین خواہش یہی تھی کہ کسی طرح ریسٹ ہاؤس سے گارڈز میرا کھوج لگاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں۔ تقریباً ایک گھنٹا مزید اسی کھینچا تانی میں گزر گیا پھر مجھے جیپوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ مجھے آواز سے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ ریسٹ ہاؤس کی جیپیں ہیں۔ یہ کم از کم دو گاڑیاں تھیں اور اسی رخ پر آ رہی تھیں۔ حتمی نتیجہ تو گاڑیوں کے پہنچنے کے بعد ہی نکل سکتا تھا، تاہم مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ یہ ریسٹ ہاؤس کے ہی لوگ ہیں۔ وہ بہت آہستہ روی سے آ رہے تھے، ظاہر ہے کہ انہیں پہیوں کے نشانات دیکھ دیکھ کر آگے بڑھنا تھا اور اردگرد کے جنگل پر بھی نگاہ رکھنا تھی۔ دو چار منٹ بعد یہ آواز شیخ عاصم کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

وہ بلند آواز سے بولا "یہ جیپوں کی آواز کیسی ہے؟"

میں نے کہا "لگتا ہے کہ تمہیں کمک پہنچ گئی ہے۔ غالباً یہ پولیس والے ہیں۔"

شیخ عاصم بولا "دیکھو۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھائی تو اس کتیا کی لاش ابھی ایک منٹ میں تڑپتی نظر آئے گی۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں نے کوئی چالاکی نہیں دکھائی اور نہ اس وقت میں دکھا سکتا ہوں۔ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکوں۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ جائے تو اور بات ہے۔"

تقریباً آدھ گھنٹا اسی شش و پنج میں گزرا، آخر گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں۔ آخری نصف کلومیٹر کا فاصلہ انہوں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا تھا۔ انہیں جیگوار کی ہیڈ لائٹس نظر آ گئی تھیں۔ جیپیں رکیں اور ان میں سے مسلح گارڈز چھلانگیں لگا کر اتر آئے "یہاں کون ہے؟" ایک سینئر گارڈ نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

"یہ میں ہوں۔ ادھر قریب آ جاؤ۔" میں نے ٹارچ کی مدد سے اشارہ دیا۔

چند لمحے بعد چار پانچ سائے میرے اردگرد آن کھڑے ہوئے۔ ان میں سب سے آگے منیجر جے تھا "او خدایا شکر ہے۔ ہم آپ کے لیے سخت پریشان تھے۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

میں نے دیکھا کہ جے کا ایک ہاتھ پشت سے جلا ہوا ہے۔ وہاں اس نے کوئی مرہم وغیرہ لگا رکھی تھی "کیسے پہنچے یہاں؟" میں نے جے سے پوچھا۔

"بس سڑک کو دیکھتے دیکھتے پہنچ گئے۔ راستے میں ایک سنتری نے بتایا کہ دو گاڑیاں بڑی تیزی سے درختوں میں مڑی تھیں اور کچے راستے پر آگے نکل گئی ہیں۔ ہم کچے راستے پر آئے تو یہاں ٹائروں کے نشان بڑے واضح تھے۔"

"آگ کا کیا بنا؟" میں نے پوچھا۔

"آگ بجھ گئی ہے۔ لیکن انیکسی میں کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ پالتو شیفرڈ تک جل گیا ہے۔ شکر ہے کہ کوئی انسانی جان

صائع نہیں ہوئی۔ بس دو بندے دھوئیں کی وجہ سے بے ہوش ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ملازمہ باندرا ہے۔ فائر بریگیڈ والے بھی آئے تھے لیکن اس وقت جب ہم اپنے طور پر آگ بجھا چکے تھے۔" جے نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا "جناب، اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو اس سامنے والی ڈانسن میں شیخ صاحب فرار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔"

جے کی بات کا جواب شیخ عاصم کی بلند دھاڑ نے دے دیا' وہ چیخ کر بولا "جہانی' میں پھر کہتا ہوں کوئی ہوشیاری نہ دکھانا۔ میرا ماؤزر لیونا کے سر پر ہے۔"

"پاگل جانور کی طرح چیخنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے کوئی گیم نہیں کھیل رہا۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟" عاصم پھر گرجا۔

"یہ ریسٹ ہاؤس کے گارڈز ہی ہیں لیکن انہیں میں نے نہیں بلایا اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"تم مجھے نقصان پہنچا بھی نہیں سکتے ہو۔ اگر یقین نہیں تو آگے بڑھ کر دیکھو۔ لیونا کی لاش تمہیں اپنے قدموں میں تڑپتی نظر آئے گی۔" اس نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی بار لیونا کی لاش کا ذکر کیا تھا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لیونا کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں لیونا کی جان بچانے کے لیے اس کے اشاروں پر ناچتا نظر آؤں گا۔

میں نے انچارج گارڈ کو سرگوشیوں میں سمجھا دیا کہ عاصم کہاں ہے اور انہیں کس طرح عاصم کی پناہ گاہ کو گھیرنا ہے۔ گارڈز کی کل تعداد دس تھی۔ وہ دو جیپوں میں یہاں پہنچے تھے۔ میری ہدایت پر وہ ماہرانہ انداز میں کھوہ کے تین اطراف میں بکھر گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس خود کار رائفل اور اس کا ایمونیشن موجود تھا۔ چار پانچ افراد کے پاس ٹارچیں بھی تھیں۔ دو افراد کے پاس درمیانی رینج کے وائی ٹاکی موجود تھے۔

میں نے جے سے پوچھا "توسیہ کا اب کیا حال ہے؟"

جے نے کہا "ان کی حالت بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے انہیں خواب آور دوا دی ہے جس کے بعد وہ سو رہی ہیں۔ ان کے سر کے کچھ بال اور بھنویں وغیرہ جل گئی ہیں۔ تاہم چہرہ محفوظ رہا ہے۔ پاؤں کے تلوے بھی زخمی ہوئے ہیں۔"

میں نے جے سے آگ لگنے کی وجہ پوچھی اور دیگر تفصیلات معلوم کیں۔ اس گفتگو میں میں نے جے کو یہ بھی بتایا کہ لیونا کے علاوہ گارڈ مجید بھی مغوی کی حیثیت سے شیخ عاصم کے ساتھ تھا اور اب وہ مارا گیا ہے۔ اس دوران میں ایک دم کھوہ کی طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ موقع دیکھ کر لیونا نے جان بچانے کی کوئی کوشش کی ہے' جو ناکام رہی ہے۔ شیخ عاصم اسے بری طرح پیٹ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ وحشت کے عالم میں اپنی جان سے پیاری محبوبہ پر چیخ بھی رہا تھا "حرام زادی۔ کتیا۔ طوائف کی بچی۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میں تیرے پلید جسم کی بوٹی بوٹی کر دوں گا۔"

لیونا کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے عاصم کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔ مجھے ان لمحات میں لیونا کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ ہیلی کاپٹر کی شیدائی تھی۔ آج اچانک اسے موت کا "ہیلی کاپٹر" اچک کر لے گیا تھا۔ اب یہ ہیلی کاپٹر زندگی کے "ہیلی پیڈ" سے دور بہت دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جلد ہی دن کے آثار نمودار ہونے لگے... پھر دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو گئی۔ کھوہ کے خدوخال نظر آنے لگے تھے۔ میں نے کار کا انجن بند کر کے ہیڈ لائٹس آف کر دیں۔ شیخ عاصم پچھلے آدھ گھنٹے سے خاموش تھا۔ بس کبھی کبھی لیونا کے رونے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس کی روتی بلکتی آواز میں فریاد کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

روشنی بڑھ گئی تو ڈانسن کار کے قریب پڑی ہوئی گارڈ مجید کی لاش بھی دکھائی دینے لگی۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی لاش کے منظر نے جے اور گارڈز وغیرہ کو افسردہ کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش کو موقع سے ہٹانا چاہتے تھے لیکن اس کام کے لیے یہ وقت مناسب نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد شیخ عاصم نے پھر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور کہہ رہا تھا "تو نے مجھے برباد کر دیا ہے جہانی۔ اب میں تجھے آباد نہیں رہنے دوں گا۔ میں تجھے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ دنیا بڑی مدت تک یاد رکھے گی۔"

میں نے پرسکون لہجے میں کہا "وقت تیرے ہاتھ سے نکل چکا ہے عاصم۔ میرے خیال میں تو تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ باہر نکل کر خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ میں تجھے ایک بار پھر بتا دیتا ہوں' لیونا کی میرے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ میں اس کی زندگی بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن کوئی ایسا رسک نہیں لے سکتا کہ اس کی زندگی تو بچ جائے لیکن وہ تیرے پنجے میں چلی جائے اور تجھ سے موت کی بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اسے یہیں پر ختم کر

دوں۔"

وہ بولا "مجھے باتوں کے چڑیا طوطے مت دکھا جہانی! اگر اس کی زندگی بچانا چاہتا ہے تو پھر توسیہ کو یہاں لے آ۔ میں تجھ سے ڈیل کر رہا ہوں۔ میں توسیہ اور لیونا کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور محفوظ جگہ پہنچ کر اس کتیا کو گاڑی سے اتار دوں گا' لیکن یہ ڈیل بس یہیں تک ہو گی۔ اس کے بعد جو تجھ سے بن پڑے کرنا اور جو مجھ سے بن پڑے گا میں کروں گا۔"

عاصم اور شنکرا دو ایسے وعدہ خلاف شیطان تھے جن کی باتوں پر میں کسی صورت اعتبار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اب تو پوزیشن بھی ایسی تھی کہ مجھے اعتبار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس تھوڑا سا مسئلہ لیونا کی سلامتی کا تھا' امید تھی کہ وہ بھی حل ہو جائے گا۔ جب تک ریسٹ ہاؤس سے [illegible] نہیں پہنچے تھے مجھے کچھ پریشانی ضرور تھی مگر اب صورت حال مکمل طور پر میرے قابو میں تھی۔

عاصم کی آواز پھر گونجی "تم نے منہ کو تالا کیوں لگا لیا ہے۔ اگر توسیہ زندہ ہے تو پھر اسے یہاں لاتے کیوں نہیں ہو؟"

میں نے کہا "میں اسے یہاں لے آتا ہوں' لیکن لیونا کے ساتھ اس کا تبادلہ اسی جگہ پر ہو گا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں یہاں سے نکل جانے کا موقع دے دوں گا۔ تم مجھے اعتبار کرنے کو کہتے ہو۔ کیا تم مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتے ہو۔"

"میرا تو خیال یہی ہے کہ تم کسی کارروائی کے لیے وقت حاصل کرنا چاہتے ہو۔ ورنہ توسیہ زندہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہارا شک دور کرنے کے لیے میں اسے یہاں بلوا لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی انچارج گارڈ سے کہا کہ وہ ریسٹ ہاؤس جائے اور اگر توسیہ کی طبیعت بحال ہے تو اسے گاڑی کے ذریعے یہاں لے آئے۔

انچارج گارڈ سر جھکا کر روانہ ہو گیا۔ بہرحال مجھے معلوم تھا کہ وہ جائے گا نہیں۔ میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ صرف "ہاں" کرے۔ عمل نہیں کرے۔ انچارج گارڈ نے جیپ اسٹارٹ کی اور موقع سے چلا گیا۔

گرمی بہت زیادہ تھی پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ مجھے بس سورج اوپر آنے کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عاصم جس کھوہ میں گھسا ہوا ہے وہاں حبس اور گرمی کے سبب اس کا دم گھٹنے لگے گا۔ اب آٹھ بجنے والے تھے۔ اس جگہ پر پہنچے ہوئے مجھے تقریباً نو گھنٹے ہونے والے تھے۔ میں نے دہانے سے دس پندرہ فٹ پیچھے تناور درختوں کے ایک جھنڈ میں پوزیشن لے رکھی تھی۔ یہ بڑا محفوظ فاصلہ تھا۔ اگر دیوانگی کے عالم میں عاصم ماؤزر سے فائر کرتا بھی تو اتنی دور سے یہ فائر کارگر نہیں تھا۔ میرا اور جے کا قیافہ درست تھا۔ جوں جوں سورج اوپر آیا حبس میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ سری لنکا کی یہ مخصوص گرمی بڑی عجیب خاصیت رکھتی تھی۔ پورے بدن پر سوئیاں سی چبھتی تھیں اور ہوا کے بھاری پن کے سبب سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ شیخ عاصم کی برداشت ہماری توقع سے پہلے ہی جواب دے گئی۔ وہ دہانے کے قریب پہنچا اور بلند آواز سے بولا "کہاں مر گیا ہے' وہ تمہارا اجرائی گارڈ۔ اگر وہ مزید دس منٹ تک یہاں نہیں آیا تو میں اس کتیا کو لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔ میری بات سن رہے ہو نا' میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے اور نہ کر سکتے ہو۔ اور اگر کرو گے تو اپنی موت کو ایک دم قریب لے آؤ گے۔"

کچھ دیر تک ہمارے درمیان مکالمے بازی چلتی رہی پھر میں نے دیکھا کہ تین گارڈز ایک مقامی شخص کو لے کر میری طرف آ رہے ہیں۔ یہ زرد رنگت والا ایک ذرا سہما سنہالی تھا۔ اس نے ایک ایسی دھوتی باندھ رکھی تھی جس میں سے اس کی نصف پنڈلیاں عریاں نظر آتی تھیں۔ بالائی جسم پر فقط ایک بنیان تھی۔ "کون ہے یہ؟" میں نے گارڈز سے پوچھا۔

ایک انگریزی دان گارڈ نے بتایا "یہ اپنا نام آنند بتاتا ہے۔ ہمیں رات کو پتا نہیں چل سکا۔ یہاں کھوہ کے بالکل پاس ہی پچھواڑے میں اس کا جھونپڑا ہے۔ وہاں یہ اپنی پتنی اور بچی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ لوگ فائرنگ کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اور جھونپڑے میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔"

گارڈ کی باتوں کے دوران میں سنہالی مسلسل تائیدی انداز میں سر ہلاتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ ساری انگریزی سمجھ رہا ہو' حالانکہ وہ صرف سنہالی سمجھ سکتا تھا۔ گارڈ کی باتوں سے پتا چلا کہ سنہالی آنند کا روزگار عجیب و غریب ہے۔ وہ یہاں سے جونکیں پکڑتا ہے اور کولمبو جا کر دیسی معالجوں کے پاس فروخت کرتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں پتا چلا آنند کے جھونپڑے کے پاس ہی ایک کافی بڑا دلدلی رقبہ تھا۔ وہاں جونکیں کثرت سے موجود تھیں۔ آنند کا کردار سنیاسیوں جیسا تھا اور خود بھی علاج معالجے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

میں نے مترجم کے ذریعے آنند کو سمجھایا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن جب تک ہم اپنے مطلوبہ بندے کو پکڑ نہیں لیتے اسے یہیں پر رہنا ہو گا۔

آنند نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلا کر اطاعت مندی ظاہر کی۔ اس کی زردی مائل آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس نے کہا "ہم ساری رات سو نہیں سکا ہے صاحب جی۔ جو بندہ کھوہ میں چھپا ہوا ہے اس کی آواز بڑی بھیانک ہے۔ ہم کو لگتا تھا کہ کوئی بد روح چیخ رہی ہے۔"

میں نے کہا "ہے تو وہ انسان ہی لیکن بد روح جیسا ہے۔"

آنند بولا "وہ اس عورت پر بہت ظلم توڑ رہا ہے جو اس کے ساتھ کھوہ میں بند ہے کیا وہ اسے اغوا کر کے لایا ہے؟"

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔ لیکن اب وہ مزید ظلم نہیں توڑ سکے گا۔ اس کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔"

ایک دم میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے کہا "کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اپنا جھونپڑا ہمیں دے سکتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں صاب جی۔"

میں نے مترجم گارڈ کے ذریعے کہا "ہم کچھ دیر کے لیے تمہارا جھونپڑا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی بیوی اور بچی کو لے کر پیچھے چلے جاؤ۔ وہاں جیپ کھڑی ہے۔ اس میں بیٹھو اور کھاؤ پیو۔ کیا خیال ہے؟"

آنند نے رضامندی ظاہر کر دی تو میں نے گارڈ کو ہدایت دی اور اگلے دس پندرہ منٹ میں آنند کا جھونپڑا خالی ہو گیا۔ اس دوران میں گرمی کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پسینہ ہمارے جسموں سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ کھوہ میں شیخ عاصم اور لیونا کا کیا حال ہو گا۔ میں نے دس پندرہ قدم آگے جا کر ایک درخت کی آڑ لے لی اور عاصم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "توسیہ کے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے۔ وہ دھوئیں کے سبب بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید اس کی طبیعت بحال ہونے میں تھوڑا سا ٹائم لگ جائے بہرحال میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ زندہ سلامت ہے۔"

"لیکن میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔" وہ کھوہ کے اندر سے ہی دھاڑا۔ مجھے اس کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی نہ ہی کھوہ میں کوئی حرکت نظر آتی تھی۔

میں نے کہا "اگر تم گرمی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو تو تم اپنا ٹھکانا بدل سکتے ہو۔ جس جگہ تم چھپے بیٹھے ہو اس کے بالکل عقب میں بچاس ساٹھ میٹر دور ایک جھونپڑا موجود ہے۔ ہوا دار ہے اور تمہارے نقطۂ نظر سے محفوظ بھی ہے۔ اگر تم چاہو تو وہاں منتقل ہو سکتے ہو۔ ہماری طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو گی۔"

مجھے توقع نہیں تھی کہ شیخ عاصم اتنی جلدی مان جائے گا۔ لگتا تھا کہ کھوہ میں اس کا برا حال ہو رہا ہے۔ کھوہ کا تنگ تھا اور ہوا کی آمد و رفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد شیخ عاصم باہر آنے پر رضا مند ہو گیا۔ اس کی رضامندی سے مثبت نتائج کی توقع کی جا سکتی تھی۔ کھوہ کے بجائے جھونپڑے میں شیخ کے خلاف کارروائی کرنا زیادہ آسان تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منتقلی کے دوران ہی مجھے کوئی موقع مل جاتا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ لیونا کے لیے کم سے کم رسک لوں گا۔

عاصم کی خواہش کے مطابق ہم کھوہ کے دہانے سے اور پیچھے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد عاصم نمودار ہوا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ گرمی کے سبب اس نے پتلون کے سوا سب کچھ اتار رکھا تھا۔ اس کا بالوں سے بھرا جسم ریچھ سے مشابہ تھا۔ اس کی آنکھیں آج کل ہر وقت سوجی رہتی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے موٹے ابھار مزید موٹے ہو گئے اور گوشت لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ عاصم کی شکل پہلے بھی وا... سی تھی' اب مالی پریشانیوں اور غیظ و غضب میں گھرنے کے بعد اس کی وضع قطع اور بھی خستہ ہو گئی تھی۔ بال منتشر' بڑھی ہوئی' نقوش بے ڈھنگے۔ اس نے لیونا کو اپنے سا... دبوچ رکھا تھا۔ لیونا کی حالت بھی بڑی پتلی تھی۔ وہ برہنہ تھی صرف زیریں جسم کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے ... ہوئے اسکرٹ کا ایک بڑا ٹکڑا لنگی کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ ... کے اسکارف کو عاصم نے لیونا کی گردن میں ڈال کر اس طرح بل دے رکھے تھے کہ اس بے چاری کے حلق سے آواز برآمد نہیں ہو سکتی تھی۔ ماؤزر عاصم کے دائیں ہاتھ میں اور اس کی لمبی سیاہ نال لیونا کے سر سے لگی ہوئی تھی۔ لیونا کا چہرہ سوجا ہوا تھا' نتھنوں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ عاصم نے چھڑی سے مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی تھی۔

عاصم نے ڈھال کی طرح لیونا کو اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈھلوان سے اتر کے نیچے آ گیا۔ گارڈ مجید کی لاش پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ عاصم قریب سے گزرا تو مکھیاں فضا میں چکرانے لگیں۔ لیونا نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ شاید وہ اردگرد کے ہر منظر کو نگاہ سے اوجھل رکھنا چاہتی تھی۔ وہ عاصم کے ساتھ یوں کھنچی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی بے جان چیز ہو۔ عاصم بڑے چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ دیوانگی کی حد کو چھو رہا ہے۔ وہ کسی فوری شک کی بنا پر بھی لیونا کو گولی ...

... سکتا تھا۔

میں نے کوئی مداخلت نہیں کی یہاں تک کہ عاصم لیونا کو ... ساتھ چلاتا ہوا آنند کے جھونپڑے تک پہنچ گیا۔ یہ ... دھوپ اور گرمی سے کافی حد تک محفوظ نظر آتا تھا۔ ... کی دیواریں گارے مٹی سے بنی ہوئی تھیں' اور ... مضبوط اور موٹی تھیں۔ جھونپڑے میں داخل ہونے ... پہلے عاصم نے خصوصی احتیاط کی اور دیکھ بھال کے بعد ... داخل ہوا۔ اس کے داخل ہونے کے بعد گارڈز نے ... کو گھیر لیا۔

لیونا کی قابلِ رحم حالت نے دل پر اثر کیا تھا۔ وہ شیخ کی ... وحشتوں کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے حسن کو مالِ ... کے طور پر استعمال کرتی تھی اور اس سے زیادہ منافع ... چاہتی تھی۔ منافع کمانے کی اس تگ و دو میں وہ کہاں ... کہاں نکل گئی تھی۔ اب اس کا حسن اس کی زندگی سمیت ... ترین خطرے کی زد میں تھا۔ شاید ان بد ترین لمحات میں ... کے ذہن میں مختلف قسم کے خیالات پرورش پا رہے ... وہ سوچ رہی ہو کہ کتنا اچھا ہوتا وہ پیرس میں ہوتی۔ ... لاوڈ قسم کے قدر دان سے شادی رچا کر کسی محل نما ... میں سکون کی نیند سو رہی ہوتی۔

عاصم نے ٹھنڈے پانی کا مطالبہ کیا۔ گارڈز کی جیبوں ... پانی کی بوتلیں موجود تھیں۔ میں نے دو بوتلیں اسے ... کر دیں۔ اس نے سگریٹ اور وہسکی کا مطالبہ کیا۔ ... اسے فراہم کر دیے گئے۔ گارڈز میں سے ایک کے ... وہسکی موجود تھی مگر عاصم کو وہسکی فراہم کرنا خطرناک ... اس کی ذہنی حالت پہلے ہی ابتر تھی۔ کچھ دیر عاصم نے پھر ... برسنا شروع کر دیا۔ وہ اس بات پر سیخ پا تھا کہ توسیہ ابھی ... یہاں پہنچی کیوں نہیں۔

میں نے اسے بتایا "توسیہ کولمبو کے ایک اسپتال میں ... اس کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں۔ اس کے سنبھلنے میں کم ... چار پانچ گھنٹے لگیں گے۔ جونہی وہ اسپتال سے فارغ ہوئی ... سیدھا یہاں لے آئیں گے۔"

اس اطلاع پر شیخ عاصم بہت سٹپٹایا۔ اس نے غضب ... عالم میں لیونا کو ایک بار پھر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لیونا کی ... آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے کہا "شیخ عاصم! دیکھو تم زیادتی کرو گے تو پھر ... ساتھ بھی زیادتی ہو سکتی ہے۔ اگر لیونا تمہاری ... میں ہے تو توسیہ میری تحویل میں ہے۔ میں نے تمہیں ... نہیں دی کہ توسیہ کو قتل کر دوں گا لیکن تم مجھے لیونا کو قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ تم اپنے حواس کو ٹھکانے پر لانے کی کوشش کرو اور صورتِ حال کو سمجھو۔"

"میرے حواس اب ٹھکانے پر نہیں آ سکتے۔" عاصم چنگھاڑا "تم نے اور تمہارے اس حرامی کلارک نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ جو میرے سامنے آئے گا میں اسے چیر کر رکھ دوں گا۔"

عالمِ وحشت میں وہ جھونپڑے میں موجود اشیاء کو اٹھا اٹھا کر پٹخنے لگا۔ شیشے اور مٹی کے برتن ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ شاید کچھ اشیا اس نے لیونا کو بھی ماری تھیں' کیونکہ وہ تین چار مرتبہ کربناک انداز میں چیخی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ صرف خوف کے سبب ایسا کر رہی ہو۔

میں نے شیخ عاصم کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دیکھو۔ ہمارے درمیان اب کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ تم توسیہ کو حاصل کرنا چاہتے ہو' میں لیونا کو واپس لینا چاہتا ہوں۔ اس تبادلے پر ہم دونوں راضی ہیں۔ اختلاف صرف تبادلے کے طریقے پر ہے۔ طریقہ ہم طے کر لیتے ہیں۔"

بات کرتے کرتے میں جھونپڑے کے کچھ نزدیک چلا گیا تھا۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ عاصم مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ میں درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ (درخت کی اوٹ میں ہونا میرے لیے سود مند ثابت ہوا۔ کیونکہ اس واقعے کے صرف دو منٹ بعد عاصم نے اسی مقام پر ایک گارڈ کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا) وہ بہت خطرناک ہو رہا تھا۔ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ میں جان بوجھ کر تاخیر کر رہا ہوں۔ اور میرا ارادہ اس پر اچانک حملہ کرنے کا ہے۔

عاصم کا اندیشہ کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ توسیہ کو یہاں لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا ارادہ تو عاصم کو توسیہ کے پاس لے جانے کا تھا۔ بس بیچ میں یہ لیونا والا مسئلہ اٹک گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی نقصان کے بغیر یہ معاملہ سدھر جائے۔ مجھے یہ بھی بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ عاصم' لیونا کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ فرضِ محال میں توسیہ کو یہاں لے آتا اور اسے صحیح سالم حالت میں شیخ کے حوالے بھی کر دیتا تو وہ لیونا کو چھوڑنے والا نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم دونوں ہی ایک دوجے کو طفل تسلی دے رہے تھے۔ میں توسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اور شیخ لیونا کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ معاملہ بس زور آزمائی سے ہی حل ہونا ہے۔

زور آزمائی' یعنی کسی بھی کارروائی کے لیے رات کا

وقت مناسب تھا اور رات ہونے میں ابھی کئی گھنٹے پڑے تھے۔ میں جانتا تھا کہ رات کو ہونے والی اس زور آزمائی میں کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔ عاصم کی بھی جاسکتی ہے۔ چند دن پہلے تک میں عاصم کی موت کو "افورڈ" نہیں کرسکتا تھا' کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ شیخ عاصم کو اس مقام کا علم ہے جہاں غزالہ اور اس کے اہلِ خانہ موجود ہیں مگر پچھلے آٹھ دس روز میں بتدریج اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ عاصم ان لوگوں کے بارے میں ٹھوس معلومات نہیں رکھتا۔ خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اچانک میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ اس جانب کوئی گارڈ نہیں تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا' اور میرا ہاتھ خود بخود پستول کے دستے پر پہنچ گیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے سے خبردار کیا تھا۔ میں نے جے کا ہاتھ تھاما اور لپک کر ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کئی افراد ہمارے اردگرد موجود ہیں اور احتیاط سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہی وقت تھا جب ایک تناور ناریل کے عقب سے تابڑ توڑ فائر ہوئے۔ میں نے اپنے ایک گارڈ کو اوندھے منہ کیچڑ میں گرتے دیکھا "پوزیشن لو۔" میں نے چیخ کر گارڈز کو حکم دیا۔ تربیت یافتہ گارڈز چند ثانیوں میں درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔ عین اس وقت خودکار رائفلوں سے کئی برسٹ چلے۔ چند گولیاں اس درخت کے تنے میں پیوست ہوگئیں جس کے پیچھے میں اور جے موجود تھے۔

"کہیں یہ پولیس تو نہیں؟" جے نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری توجہ سامنے درختوں کی طرف تھی۔ دو مسلح افراد دوڑ کر جھاڑیوں کے عقب میں اوجھل ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ پولیس کی وردی میں ہے۔ چند سیکنڈ کے اندر دو طرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ میرے ساتھ تقریباً دس گارڈز تھے۔ لیکن دوسری طرف نفری بہت زیادہ نظر آ رہی تھی۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر انچارج گارڈ موجود تھا۔ وہ اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کے لیے جھک کر دوڑتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ رائفل کا ایک پورا برسٹ اس کے سر میں لگا' اس کی کھوپڑی کا ایک حصہ صاف اڑ گیا اور وہ بھی اوندھے منہ دلدلی زمین کے کنارے پر گرا۔ تیس چالیس سیکنڈ تک فائرنگ شدت سے ہوئی پھر ایک دم سکون ہوگیا۔

میگا فون پر ایک رعب دار آواز نے انگریزی میں "مسٹر جہانی! تم چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو۔ اپنی اور ساتھیوں کی جان گنوانے سے بہتر ہے کہ پھینک کر گرفتاری پیش کردو۔"

یہ بڑی تشویش ناک اور تعجب خیز صورتِ حال تھی۔ اس دوردراز مقام پر پولیس کا اچانک پہنچنا اور مجھے ناقابلِ فہم تھا۔ یہ تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ عاصم کے کے بعد سے مقامی پولیس ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے لیکن اس ویرانے میں اچانک پولیس کی بھاری نفری ملاقات ہوجائے گی یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔

میں نے ایک گارڈ سے اس کی سیون ایم ایم را لے لی' اور کچھ پیچھے ہٹ کر جیپوں کے قریب پوزیشن۔ جے بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اپنا پستول اسے د تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے جیپوں کی طرف بڑ کوشش کریں گے تاکہ سب سے پہلے انہیں قبضے میں میں نے جیپوں کے اردگرد تین گارڈز کو کھڑا کردیا۔ جیپ کچھ فاصلے پر تھی (یہ جیپ بعد میں آئی تھی) اس تک پہنچنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میگا فون پر للکارتی ہوئی آواز پھر سنائی دی "مسٹر جہا خود کو پولیس کے حوالے کرتے ہو یا ہم گولی چلائیں۔"

میں نے زبانی جواب دینے کی بجائے رائفل است کی۔ ایک سادہ پوش پولیس اہلکار جو ایک گاڑی دروازے کے عقب میں سمٹنے کی کوشش کررہا تھا' کند زخم کھا کر پشت کے بل گر گیا۔ یک لخت ہی پھر تابڑتوڑ فا شروع ہوگئی۔ میدانِ جنگ کا سا منظر نظر آیا شاخیں گ کے کٹ رہی تھیں۔ درختوں کے تنے چھلنی ہورہے۔ کسی کو گولی لگتی تھی تو اس کی کراہ یا چیخ گونج کر رہ جاتی ہرے کیلے کا ایک پھاٹک کر میرے سامنے عین اس جگ جہاں رات سے گارڈ مجید کی لاش پڑی تھی۔ لاش اب سے اٹھائی جاچکی تھی لیکن خون موجود تھا۔

دفعتاً میری نگاہ درختوں کی گھنی شاخوں میں سے گ ہوئی مینگو شین کے ایک بلند درخت پر پڑی۔ مجھے لگا کہ کوئی شخص پتوں میں لپٹا کھڑا ہے۔ میں اسے واضح طور دیکھنے کے لیے پیٹ کے بل رینگ کر کچھ بلندی پر چلا گیا نے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ یہ وہی لنگوٹی پوش آنند جس نے ہمیں اپنا جھونپڑا عنایت کیا تھا۔ اس کے کند سے رائفل لٹکی ہوئی تھی اور ہاتھ میں واکی ٹاکی نظر آرہا وہ تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ

ی پر بات کررہا تھا اس کے قریب ہی ایک دوسری شاخ پر ایک پولیس والا بھی موجود تھا۔ فوراً ہی بات میری سمجھ ئی۔ یہ بدبخت لنگوٹی پوش جس نے اپنا نام آنند بتایا تھا کا انفارمر تھا یا براہِ راست پولیس سے تعلق رکھتا تھا۔ کے یہاں پہنچنے کی وجہ اس کے سوا کوئی اور ہو ہی تی تھی کہ اس شخص نے پولیس کو کال کیا تھا۔

شخص اب "اولی" کے فرائض انجام دے رہا تھا اور کی پوزیشنوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا سر پہلے ہی گھوما انگلیوں کی پوروں میں ایک جارح سنسناہٹ دوڑ رہی میں نے رائفل لنگوٹی پوش کی طرف سیدھی کی۔ مگر بون کے سانس ابھی باقی تھے۔ اچانک میری نگاہ دائیں قب میں اٹھ گئی۔ دل اچھل کر رہ گیا۔ اندھا دھند دو فائرنگ اور افراتفری کا فائدہ اٹھا کر عاصم فرار ہو رہا جھونپڑے سے نکلا تھا اور لیونا کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا تک لے آیا تھا۔ اس کا سیاہ ماؤزر سورج کی تیز دھوپ ک رہا تھا۔ لیونا کے پاؤں زمین پر گھسٹتے چلے جارہے مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بے ہوش ہے۔ عاصم نے اسے ی سے جیپ کے پچھلے حصے میں پھینکا اور تڑپ کر نگ سیٹ پر آگیا۔

اگلے ہی لمحے جیپ حرکت میں آئی اور اتنی تیزی سے کہ اس کے ایک جانب کے پہیے ہوا میں اٹھ گئے۔ نے جے سے اس جیپ کی چابی لی جو ہمارے قریب ہی تھی۔ ہم دونوں جھک کر دوڑتے ہوئے جیپ میں گھس لے جھٹکے میں نے جیپ اسٹارٹ کی۔ جے نے بھی حتی الامکان حد تک نیچے جھکا رکھا تھا۔ کلچ چھوڑ کر نے ریس کا پیڈل دبایا اور جیپ کمان سے نکلے تیر کی طرح بڑھی۔

ہم پندرہ بیس گز آگے گئے تھے کہ میری توقع کے عین ہم پر فائرنگ ہوئی۔ تین چار گولیاں جیپ کی باڈی میں خوش قسمتی سے ٹائر محفوظ رہے۔ دوسری بار گولیاں سے پہلے ہی ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ تقریباً نصف ک کے طوفانی سفر کے بعد مجھے وہ دوسری جیپ دکھائی دے پر عاصم فرار ہو رہا تھا۔ وہ واقعی نیم پاگل ہو رہا تھا۔ جیپ کی رفتار اس قدر بڑھائی تھی کہ وہ کسی بھی وقت کسی درخت سے ٹکرا سکتی تھی۔ چلا تو میں بھی رہا تھا مگر مجھے گاڑی پر پورا کنٹرول تھا۔ اگلی جیپ کی ت دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ چلانے والے کنٹرول نہیں ہے۔

یہ ایک بار پھر رات والا واقعہ ہی دہرایا جارہا تھا۔ وہی اندھا دھند تعاقب تھا' وہی وحشت تھی۔ ہم دو ڈھائی کلومیٹر آگے آئے تھے جب عقب میں دور کہیں پولیس موبائلز کے سائرن سنائی دینے لگے۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ گاڑی بھگاتے بھگاتے میں نے جے سے کہا "جے! عاصم میرے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں نے اس کا پیچھا چھوڑنا نہیں ہے لیکن تم یہاں کسی موڑ پر اتر جاؤ اور درختوں میں گھس کر محفوظ دوری پر چلے جاؤ۔ جتنی جلدی بھی ہوسکے تم ریسٹ ہاؤس پہنچو اور باری فوسیہ اور سائیں عالی کو لے کر وہاں سے نکل جاؤ۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں تم؟"

جے نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا۔ مجھے لگتا ہے کہ پولیس ایک گھنٹے کے اندر اندر ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جائے گی۔"

"آپ فکرمند نہ ہوں جناب۔ میں اس نازک وقت کو سمجھ رہا ہوں۔"

"فوسیہ کا خاص دھیان رکھنا ہے۔ وہ اسی حرامی کی بہن ہے جو ہمیں تگنی کا ناچ نچا رہا ہے۔" میں نے عاصم والی اچھلتی کودتی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا جناب!"

"ٹھیک ہے۔ میں اگلے موڑ پر جیپ کی رفتار آہستہ کروں گا تم چلتی جیپ سے اتر جاؤ گے؟"

"بالکل جناب۔ میں اتر جاؤں گا۔"

چند سیکنڈ بعد جے جیپ سے اتر گیا اور دوڑتا ہوا درختوں میں گھس گیا۔ جے کو اتارنے کے لیے میں نے جیپ کی رفتار ذرا سی دیر کے لیے کم کی تھی' اس مختصر وقت میں ہی عاصم کافی دور نکل گیا اور پولیس موبائلز کے سائرن نزدیک سے سنائی دینے لگے۔ عاصم کے دوبارہ فرار ہونے سے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے اندر عاصم کے خون کی پیاس پیدا ہوگئی ہے۔ وہی پیاس جو ساہی صاحب کے قتل کے وقت جاگی تھی' اب تشنہ لبی کے سبب بڑھتے بڑھتے پورے بدن میں پھیل گئی تھی۔ نتائج سے بے پروا ہوکر میں بھی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ سخت ناہموار راستے پر جیپ دو دو فٹ اچھل رہی تھی۔ میرا سر بار بار چھت سے جا ٹکراتا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر میرے ہاتھ اتنی مضبوطی سے جمے ہوئے تھے کہ ہتھیلیوں پر پسینہ آگیا تھا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہتھیلیاں تر بتر تھیں۔

جلد ہی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی، پختہ سڑک کے قریب پہنچ گئیں۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے عاصم نے چلتی گاڑی میں سے کسی کو نیچے پھینکا ہے۔ نیچے گرنے والا لاش کی طرح اسی جگہ پڑا رہ گیا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے گل بدن لیونا کو شوٹ کر کے پھینک دیا ہو۔ وہ اس سے پہلے رات کو بھی ایک ایسی حرکت کر چکا تھا۔ اس نے غضب ناک ہو کر گارڈ مجید کو شوٹ کیا تھا۔

دو تین سیکنڈ کے اندر میں اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں انسانی جسم گرا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا۔ وہ لیونا نہیں تھی۔ وہ ریسٹ ہاؤس کا ایک گارڈ تھا۔ گولی اس کی چھاتی میں لگی تھی، وہ گھاس پر آڑھا ترچھا پڑا ہوا تھا، یہ گارڈ ڈرائیونگ بھی کرتا تھا۔ گارڈ کو دیکھنے کے بعد میں نے جیپ کی رفتار پھر تیز کردی۔ گارڈ کی لاش دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اسے دو طرفہ فائرنگ میں گولی لگی ہے۔ ہلاکت کے وقت وہ یقیناً ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔

جیسا کہ بعد میں میرے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی "ڈرائیور گارڈ" جیپ کو موقع سے ہٹانے کے لیے اس میں سوار ہوا تھا۔ عین اس وقت پولیس والوں نے اسے شوٹ کردیا تھا۔ یہ منظر شیخ عاصم نے جھونپڑے میں سے دیکھا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جیپ اسٹارٹ ہے۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا تھا اور بے ہوش لیونا کو گھسیٹ کر جیپ میں لے آیا تھا۔ لاش کو ایک طرف کھسکا کر اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ بنالی تھی۔ اب یہاں آکر اس نے چلتی گاڑی سے لاش کو باہر دھکیل دیا تھا۔

سڑک ہموار تھی لیکن موڑ بہت زیادہ تھے۔ دونوں گاڑیاں انتہائی ممکنہ رفتار سے بھاگی جارہی تھیں۔ کئی جگہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ ایک جگہ عاصم نے ایک پک اپ کو سائیڈ ماری اور وہ سڑک سے اتر کر کچے میں چلی گئی۔ ایک جگہ اس نے ایک سائیکل سوار کو گرایا۔ ہم کولمبو کے مضافات میں پہنچ چکے تھے۔ رش بڑھتا جارہا تھا۔ جوں جوں رش بڑھ رہا تھا ڈرائیونگ خطرناک ہورہی تھی۔ ایک ٹھیلے والا میری جیپ کے بمپر سے "ٹکرایا"، ٹھیلے پر لدے ہوئے اناناس دور تک لڑھک گئے۔ عاصم ٹریفک سگنل کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا، مجبوراً مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ بالکل فلمی سی سچویشن تھی۔ گاڑیوں کے بریک لگ رہے تھے اور ان کے ٹائرز احتجاجی چیخیں مار رہے تھے۔ راہ گیر اچھل اچھل کر جان بچا رہے تھے۔ ایک عورت کو بچاتے ہوئے جیپ فٹ پاتھ پر چڑھ گئی اور تقریباً پچاس گز تک فٹ پاتھ پر دوڑتی چلی گئی۔ میں اسے بمشکل سڑک پر لایا۔ کار چیزنگ میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حریف ڈرائیور اردگرد کی ہر چیز کو نظرانداز کر کے ایک دوسرے کو زیر کرنے کے چکر میں لگ جاتے ہیں۔ صرف تعاقب ذہن میں رہتا ہے یا فرار ذہن پر حاوی ہوتا ہے باقی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی تھی، میں عاصم کو کسی صورت نگاہوں سے اوجھل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات مجھے بڑی اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو پھر لیونا کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہوگا اور اس کی موت کتنی اذیت ناک ہو سکتی ہے یہ میں بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ بے شک تو یہ میری تحویل میں تھی لیکن میں عاصم کی فطرت کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو یہ کا خیال عاصم کو لیونا کے ساتھ درندگی کرنے سے باز نہیں رکھ سکے گا۔ درحقیقت عاصم ان لوگوں میں سے تھا جن کے نزدیک سب سے اہم رشتہ اپنے "نفس" سے رشتہ ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ فضولیات کے زمرے میں آتا ہے۔

جونہی ہم کولمبو کی حدود میں داخل ہوئے سڑکوں کا رش کم سا ہو گیا۔ لگتا تھا کہ عاصم بھی ضد کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ وہ اس دوڑ میں کسی صورت ہارنا نہیں چاہتا۔ چاہے اس کے لیے اسے درجنوں لوگوں کو کچلنا پڑے۔ اس کی گاڑی کئی گاڑیوں سے ٹکرا رہی تھی، احتجاجی چیخیں مار رہی تھی اور روشنیوں سے بھرے شہر میں اسے ہلاکت خیز رفتار سے بھگائے چلا جارہا تھا۔ اس کی نسبت میری ڈرائیونگ کہیں بہتر تھی۔ رفتار بھی ہلکی ضرور تھی مگر ابھی تک کوئی شخص میری وجہ سے زخمی نہیں ہوا تھا۔ میرے جبڑے مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ ہاتھوں نے اسٹیئرنگ کو بے حد سختی سے تھام رکھا تھا اور نگاہیں سامنے سڑک پر جم کر رہ گئی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں لیکن وہ کافی فاصلے پر تھیں۔ ایک موٹر سائیکل سوار سارجنٹ بھی مجھے عقبی آئینے میں دکھائی دیا تھا مگر اب وہ بھی فاصلے پر رہ گیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر ہونے کے باوجود اس ہلاکت خیز رفتار کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ ایک چوراہے پر ٹریفک پولیس کی ایک گاڑی نے سڑک پر ترچھا ہو کر عاصم کو روکنے کی کوشش کی عاصم نے گاڑی کو ٹکر مار کر راستہ بنایا اور نکل گیا۔ مجھے بھی اسی انداز سے ٹکرا کر راستہ بنانا پڑا۔ میں نے ایک سارجنٹ کو ہولسٹر سے ریوالور کھینچتے دیکھا لیکن اتنی دیر میں میں قریباً ایک فرلانگ آگے نکل چکا تھا۔

شیخ عاصم کا رخ جنوب کی طرف تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ کی

طرف نہیں جارہا تھا۔ اس کا رخ اپنے فرسٹ اسٹورز کی طرف تھا۔ یہ وہی اسٹورز تھے جہاں چند دن پہلے خوفناک آگ لگی تھی اور شیخ عاصم کی کمپنی کی تیار کردہ قریباً چار سو چپس جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔ آج کل یہاں سخت حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ شیخ نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ ایک بنئے یا ساہوکار کے سے انداز میں وہ خود کو بچانے کے لیے پولیس کے حصار میں پناہ لے رہا تھا۔

اگلے چند سیکنڈ میں میرا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ شیخ عاصم فرسٹ اسٹورز کو جانے والی سڑک پر مڑ گیا تھا۔ یہاں ٹریفک رو رو یہ نہیں تھی۔ ٹریفک کے سبب عاصم کی جیپ کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ میں نے دو تین "رسکی" اوورٹیک کیے اور عاصم کے کافی قریب پہنچ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عاصم اسٹورز کی حدود میں داخل ہو گیا تو میرے لیے مشکل بڑھ جائے گی۔ عاصم تک پہنچنے کے لیے میں نے ایک جگہ شارٹ کٹ لگایا۔ جیپ کو سڑک سے اتار کر میں نے ایک کرکٹ گراؤنڈ میں داخل کردیا۔ یہ وسیع و عریض گراؤنڈ تھا۔ عین میدان میں میچ تھی اور میچ ہو رہا تھا۔ صاف ستھرے سفید لباسوں میں جواں سال لڑکے کھیل رہے تھے۔ پویلین کی برف رنگ دار چھتریوں تلے خوب صورت کرسیوں پر بہت سے مرد و زن بیٹھے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ سب طبقۂ امرا کے لوگ تھے۔ نوجوان کھلاڑیوں نے جب جیپ کو برق رفتاری سے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ بری طرح ٹھٹکے۔ جو جہاں تھا وہیں رک گیا اور منہ پھاڑے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں فراٹے کے ساتھ ان کے قریب سے گزرا۔ اب میرا رخ تماشائیوں کی طرف تھا۔ جہاں سے گزر کر مجھے ہموار سڑک پر پہنچنا تھا وہاں کرسیوں کی طویل قطار نظر آرہی تھی۔ ان کرسیوں پر غالباً کسی کالج کے بہت سے لڑکے لڑکیاں بیٹھے تھے۔ وہ پہلے تو سکتے کے عالم میں جیپ کو اپنی طرف لپکتے دیکھتے رہے پھر جان بچانے کے لیے اٹھ کر بھاگے۔ لڑکیوں کی سریلی چیخیں دور تک گونجیں۔ جیپ کرسیوں سے ٹکراتی ہوئی اور ان کے بیچ سے راستہ بناتی ہوئی نکلتی چلی گئی۔ ایک چار پانچ فٹ اونچی ڈھلوان کو پار کرتا ہوا میں پھر سڑک پر آگیا۔ عاصم والی جیپ اب مجھ سے صرف پچاس ساٹھ گز کی دوری پر تھی۔ میرا پستول جے کے پاس رہ گیا تھا۔ اب میرے پاس رائفل تھی اور وہ جیپ کے فرش پر پڑی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی لیکن دوبارہ فرش پر رکھ دی۔ میں جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بناتا اور وہ الٹ جاتی، تو اس کی انتہائی رفتار کے سبب دونوں سواروں کو شدید نقصان پہنچتا اور دونوں سواروں میں لیونا بھی شامل تھی۔

میری نظر سامنے گئی اور مجھے سڑک کے عین درمیان زبردست پولیس ناکہ نظر آیا۔ سڑک پر رکاوٹیں بھی موجود تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا میرے پیچھے آنے والی موبائلز نے وائرلیس پر اطلاع پہنچا دی تھی کہ خطرناک مجرم جہانی عزت مآب شیخ عاصم بن ارشد صاحب کا تعاقب کرتا ہوا فرسٹ اسٹورز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب یہاں میرے سواگت کی تیاری مکمل تھی۔ میں نے شیخ پر دانت پیسے اور جیپ کی رفتار کچھ مزید بڑھا دی عاصم والی جیپ توڑتا نے کے ساتھ ناکے پر سے گزر گئی لیکن میرے پہنچنے تک رکاوٹیں پھر سڑک کے درمیان رکھ دی گئیں اور مسلح پولیس والوں نے گاڑیوں کے پیچھے پوزیشن لے لی۔ ایک تیم شحیم پولیس آفیسر نے STOP کا سائن ہوا میں لہرایا اور مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی مجھے رکنا تھا۔ میں نے رکاوٹوں کے قریب پہنچتے ہی سر حتی الامکان حد تک نیچے جھکا لیا اور رکاوٹوں سے ٹکرایا۔ فائرنگ کی آواز آئی۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی، کئی گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں لیکن ٹائر محفوظ رہے۔ جونہی میں ناکہ توڑ کر نکلا، دو اور موبائلز پیچھے لگ گئیں۔ میں نے کبھی جذبات کو "غور و فکر" پر حاوی نہیں ہونے دیا لیکن آج کل دل و دماغ کی کیمسٹری ہی بدلی ہوئی تھی۔ شیخ عاصم کے رویے نے میرے جسم میں آگ بھری ہوئی تھی اور مجھے اپنے سامنے بس سرخ چنگاریاں سی اڑتی نظر آرہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج شیخ عاصم میرے ہتھے چڑھ گیا تو اگلی پچھلی ساری کسریں نکل جائیں گی۔ ہم دونوں میں سے بس ایک ہی زندہ رہے گا۔

اسٹورز کی حدود بس اب تین چار کلو میٹر دور تھیں۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک اور پولیس ناکہ دکھائی دیا۔ یہاں پولیس والوں نے پہلے ہی پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ میں اب شیخ عاصم کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ بس دس پندرہ گز کا فاصلہ رہ گیا ہوگا۔ مجھے عاصم کے بالوں بھرے عریاں کندھے نظر آرہے تھے اور عقبی نشست پر بے ہوش لیونا کا ایک بازو بھی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے تیس چالیس سیکنڈ اور مل جاتے تو شاید میں اس قابل ہو جاتا کہ اپنی جیپ کی سائیڈ سے دبا کر عاصم کو سڑک سے اترنے اور رفتار کم کرنے پر مجبور کردیتا۔ رفتار کم ہونے پر میں نے اسے شوٹ بھی کرسکتا تھا کیونکہ پھر مجھے لیونا کی زندگی کی طرف سے زیادہ خطرہ نہیں رہنا تھا۔ لیکن اس دوسرے پولیس ناکے نے یہ امکانات ایک دم ختم کردیے تھے۔ اس ناکے میں سڑک پر کوئی رکاوٹ

لغزش نہیں کی گئی تھی۔ رکاوٹ کے نہ ہونے سے اشارہ ملتا تھا کہ مجھ پر بلا وارننگ... فائرنگ کی جائے گی اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جونہی میری جیپ عین ناکے پر پہنچی اس پر تابڑ توڑ فائر ہوئے۔ اس مرتبہ پچھلی اسکرین بھی ریزہ ریزہ ہوگئی۔ دھماکے سے بائیں جانب کا پچھلا ٹائر برسٹ ہوگیا اور جیپ ایک طرف جھک گئی۔ میں جیپ کو اسی طرح دوڑاتا چلا گیا' لیکن اب یہ لنگڑی جیپ' عاصم کی برق رفتار جیپ کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ عاصم سے میرا فاصلہ تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ ایک موڑ پر بالکل غیر متوقع طور پر جیپ پھسلی اور ایک درخت سے ٹکراتی ہوئی نیچے میں اترتی چلی گئی۔ یہ ڈھلوان جگہ تھی۔ جیپ کے اگلے پہیے گڑھے میں گئے اور وہ پہلو کے بل الٹ گئی۔ میرے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ پیشانی پر فوراً ہی خون کی نمی کا احساس ہونے لگا۔ عقب میں آنے والی موبائلز نے الٹی ہوئی جیپ پر تابڑ توڑ فائر کیے۔ ایک گولی میرے کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے رائفل کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ گھمایا۔ جب تک رائفل میرے ہاتھ میں آتی اور میں کچھ کرنے یا نہ کرنے کا سوچتا' ایک درجن پولیس والے میرے آس پاس درختوں کے پیچھے پوزیشن لے چکے تھے۔ وہ پولیس موبائلز جو جنگل سے میرے پیچھے لگی تھیں' ان کے سائرن بھی سنائی دینے لگے تھے۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتی تھیں۔ اس صورت حال میں مزاحمت جاری رکھنا بے وقوفی ہی تھی۔ ایک پولیس والے نے سری لنکن لہجے میں انگریزی بولی اور کڑک کر کہا "رائفل گاڑی سے باہر پھینک کر ہاتھ کھڑے کردو مسٹر جمالی۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

میں نے رائفل باہر پھینک کر ہاتھ کھڑے کردیے لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ کوئی میرے قریب نہیں آرہا تھا۔ یقیناً ان پولیس اہلکاروں سے میرا ٹھیک ٹھاک تعارف کرایا گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ ان میں سے کئی مجھے پہلے سے جانتے بھی ہوں۔

جیپ پہلو کے بل الٹی ہوئی تھی۔ ضروری تھا کہ پولیس والے باہر نکلنے میں میری مدد کرتے لیکن وہ یہ رسک نہیں لے رہے تھے۔ بس گرج رہے تھے اور مجھے خود ہی باہر آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ زخمی کندھے کے ساتھ میں کسی نہ کسی طرح جیپ سے باہر آگیا۔ اس دوران میں پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ ان گاڑیوں سے اترنے والے پولیس اہلکاروں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ انہیں میرے پیچھے ایک لمبی دوڑ لگانا پڑی تھی۔ اور اس دوڑ سے پہلے بھی وہ بیس پچیس روز سے میرے پیچھے مارے مارے رہے تھے۔

اسپیشل پولیس کے تین کمانڈوز نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ایک سینئر پولیس افسر نے آگے بڑھ کر جامہ تلاشی لی اور پھر مجھے الٹی ہتھکڑی لگانے کے لیے بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار ہتھکڑی لگ گئی تو پھر بات دور چلی جائے گی۔ میری نگاہوں میں لبونا کی مظلوم صورت تھی اور شیخ عاصم کا قہر برساتا ہوا جاہ و جلال تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اسے زندہ چھوڑے گا۔ جونہی پولیس افسر میرے نزدیک آیا' میں نے جھپٹ کر اسے دھکا دیا' وہ ایک رائفل بردار ماتحت پر گرا۔ رائفل بردار کی انگلی ٹریگر پر دب گئی تھی۔ پورا برسٹ آفیسر کی کمر پر لگا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور سڑک کے کنارے سے قریباً دس فٹ نیچے جھاڑیوں میں گرا۔ ان جھاڑیوں سے آگے سیوریج کے بڑے بڑے پائپ پڑے تھے۔ یہ بیسیوں پائپ تھے۔ ان کا قطر بارہ فٹ سے کم نہیں تھا۔ میں ایک لمبے پائپ میں ذرا سا جھک کر چالیس پچاس گز دور چلا گیا۔ جہاں سے میں نکلا وہاں کولمبو کی ایک گنجان آبادی "ڈوسے اسٹریٹ" شروع ہوتی تھی۔ یہاں زیادہ تر ہندو آباد تھے۔ یہ تنگ گلیوں والی آبادی تھی۔ اکثر مکانات دو یا تین منزلہ تھے۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی اس علاقے میں آچکا تھا۔ میں ان پیچ در پیچ گلیوں میں دوڑتا چلا گیا۔ مجھے اپنے عقب میں پولیس والوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ انہوں نے دو چار ہوائی فائر بھی کیے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا' گلیوں میں چہل پہل تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے زخمی کندھے کو دبا رکھا تھا۔ راہ گیر مرد و زن خوف آمیز حیرت سے میری طرف دیکھتے اور پھر جلدی سے میرے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ میرے اور پولیس والوں کے درمیان یہ دوڑ مختلف گلیوں میں قریباً تین منٹ جاری رہی۔ ایک جگہ میرے عقب میں پولیس کی سیٹیاں سن کر دو نوجوانوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ میں جس کیفیت میں تھا' وہ دو کی بجائے چھ سات بھی ہوتے تو شاید مجھے نہ روک سکتے۔ ایک نوجوان نے مجھ پر ایک آہنی راڈ گھمایا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے جھک کر اس کا وار بچایا۔ دوسرے نوجوان کی ٹھوڑی پر ٹکر رسید کیا وہ اچھل کر ایک بند دروازے سے ٹکرایا اور ساکت ہوگیا۔ ایک پھرتیلا سا تامل انسپکٹر بھاگ رہا تھا اور میرے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں تیزی سے گلیاں نہ بدل رہا ہوتا تو شاید وہ مجھ پر فائر بھی کر گزرتا۔ موڑ مڑنے کے بعد مجھے ایک ادھ کھلا دروازہ نظر آیا' میں

میں گھس گیا۔ یہ گھر ایک پرانی حویلی جیسا تھا۔ سامنے ہی پوجا کا کمرا نظر آیا۔ وہاں موجود بتوں کو دیکھ کر فوراً اندازہ ہوگیا کہ میں ایک ہندو گھرانے میں گھسا ہوں۔ برآمدے میں دو بچے جھولا جھول رہے تھے' مجھے دیکھ کر ان کے منہ کھلے رہ گئے۔ ایک جواں سال لڑکی رنگ دار ساڑی پہنے جسم کو ہلکورے دیتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بلوری چیخ ماری اور لڑکھڑا کر رہ گئی گھر کے اندر سے پکوانوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں حویلی کے ایک دروازے سے داخل ہوا تھا' دوسرے سے نکل گیا اور ایک دوسری گلی میں پہنچ گیا۔ اس دوسری گلی میں داخل ہوتے ہی ایک موٹی برہمن زادی سے میری ٹکر ہوئی اور اس کے ہاتھ سے مٹھائی کا تھال پھسل کر دور تک لڑھک گیا۔ موٹی برہمن زادی کی اسٹیریو ٹائپ چیخوں کو نظر انداز کرتا میں دوڑتا چلا گیا۔ کہیں پاس سے ہی شور سنائی دے رہا تھا اور باجے گاجے کی آوازیں آرہی تھیں' یوں لگتا تھا کہ بہت سے لوگ ایک جگہ جمع ہیں۔ اچانک مجھے اپنے سامنے ایک پتلی گلی سے وہی بدبخت پھرتیلا تامل انسپکٹر دوڑ کر اپنی طرف آتا دکھائی دیا' میں فوراً ایک بغلی گلی میں گھس گیا۔ مجھے ڈر بس یہی تھا کہ "بند گلی" میرا راستہ نہ روک لے۔ یہ بغلی گلی بل کھاتی ہوئی قریباً نصف فرلانگ تک گئی اور پھر ایک ایسی جگہ کھلی کہ میں حیران رہ گیا۔ باجے گاجے کا شور کانوں میں دھماکے کررہا تھا۔ ایک کشادہ سڑک پر دور تک سر ہی سر نظر آرہے تھے۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں ہولی کے ایک بڑے جلوس کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ سیکڑوں لوگ تھے۔ ان کے کپڑوں پر رنگوں کی بوچھاریں تھیں۔ چہروں پر بھی رنگ ملے ہوئے تھے۔ عورتوں کی ساڑیاں رنگ دار پچکاریوں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ کچھ ٹولیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر ہولی کھیلنے والے اندھا دھند ناچ رہے تھے۔ میں بھی اس ناچتے گاتے خرمستیاں کرتے ہجوم میں گھس گیا۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میرا چہرہ خون آلود تھا اور ایک پہلو بھی لہو سے رنگین ہورہا تھا لیکن کسی نے مجھ پر توجہ مرکوز نہیں کی۔ میرے لہو کو بھی ہولی کا رنگ ہی سمجھا گیا ہوگا۔ ایک شخص سر پر رنگوں سے بھرا ہوا تھال اٹھائے گزر رہا تھا۔ یہ رنگ پاؤڈر کی شکل میں تھے اور ان کی ڈھیریاں سی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے رنگوں سے مٹھیاں بھریں اور انہیں چہرے اور کپڑوں پر مل لیا۔ پیچھے سے دو لڑکے آئے اور انہوں نے مجھ پر بہت سا رنگ انڈیل دیا۔ میں جلوس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور جلوس کا حصہ بن گیا۔ کچھ آگے جاکر میں نے اپنی قمیص بھی اتار پھینکی اور نیلی پتلون پر خوب رنگ مل لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کوئی مجھے بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی پہچان سکے گا۔ ایک سنجیدہ مزاج ادھیڑ عمر شخص میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور نئے زمانے میں ہولی کے رنگ ڈھنگ پر تبصرے کرنے لگا۔ میں اس کی باتوں کا جواب اثبات میں دیتا رہا۔ ساتھ ساتھ میری نگاہ اپنے اردگرد پولیس والوں کو بھی تلاش کررہی تھی۔ مجھے کوئی باوردی پولیس والا تو جلوس میں دکھائی نہیں دیا' تاہم یکے بعد دیگرے میں نے دو سفید پوش پولیس والوں کو دیکھا۔ وہ عقابی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے' یقیناً ان کے کپڑوں میں ریوالور وغیرہ موجود ہوں گے۔ میں سر جھکا کر چلتا رہا۔

قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد ایک اور جلوس بڑے جلوس میں شامل ہوگیا اور اژدحام مزید بڑھ گیا۔ جلوس جی پی او کے مرکزی دفتر کی طرف جانے کے لیے مڑا تو اتفاقاً میری نگاہ ایک منظر پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں نے ایک رکشا سے ایک عورت اور اس کی بچی کو اترتے دیکھا۔ گندمی رنگت والی یہ دبلی پتلی عورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے آج صبح سویرے کولمبو سے پندرہ بیس میل دور گھنے جنگل میں اسے دیکھا تھا۔ یہی عورت تھی جسے لنگوٹی پوش آنند نے اپنی بیوی بتایا تھا۔ آنند بعد ازاں پولیس کا مخبر ثابت ہوا تھا۔ اگر شیخ عاصم میرے ہاتھ سے نکلا تھا تو اس میں آنند کا اہم کردار تھا۔

رکشا سے اترنے والی عورت کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک اہم خیال آیا۔ میں نے عورت کو بچی سمیت "ڈوسے اسٹریٹ" کی ایک گلی میں مڑتے دیکھا۔ میں جلوس سے علیحدہ ہوا اور عورت کے پیچھے تنگ گلی میں گھس گیا۔ ایک جگہ پپیتے بیچنے والا گلی کے درمیان پپیتوں کا ڈھیر لگائے بیٹھا تھا۔ ہم اس کے قریب سے ہوکر گزرے۔ عورت تیز تیز چلی جارہی تھی اس نے کرتے کے نیچے کاٹن کی رنگین سی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ دھوتی خوب کسی ہوئی تھی اور عورت کے جسمانی خدوخال نمایاں ہورہے تھے۔ میں نے ایک بات نوٹ کی یہ وہ میلا کچیلا لباس نہیں تھا جو عورت نے جھونپڑے میں پہن رکھا تھا۔ بچی بھی اب مناسب لباس میں تھی بچی کی عمر چار سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے انگریزی طرز کا اسکرٹ اور سر پر نگوں کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ بچی نے عورت کی انگلی تھامی ہوئی تھی کبھی چلنے لگتی تھی کبھی عورت کا ساتھ دینے کے لیے بھاگنے لگتی تھی۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد وہ دونوں ایک دروازے کے سامنے رکیں۔ عورت

میں رکھے ہوئے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری یہ خوش شکل بیوی بھی اپنے "غلط سلط کاغذات" کی وجہ سے ہی تمہارے قبضے میں آئی ہو اور یہ مکان جس میں تم رہ رہے ہو' یہ بھی کوئی متنازعہ پراپرٹی ہی ہوگا۔ میں تم لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں انسپکٹر آنند۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا تمہاری ذاتی کار کی۔ ظاہر ہے کہ اب سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تم اپنی ڈیوٹی پر فرسٹ اسٹورز جانے کے لیے روانہ ہوگے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تم اپنی کار پر جاؤ گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

انسپکٹر نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ایک دم اس پر تاؤ آگیا۔ میں نے اس کی گدی پر ہاتھ رسید کیا اور زور سے کہا "بولتے کیوں نہیں۔ زبان کٹ گئی ہے تمہاری!"

وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ اپنی پتنی کے سامنے یہ بے عزتی یقیناً اس پر بہت گراں گزر رہی تھی۔ میں نے پسٹل کی نال سے اس کی گردن کو ٹہوکا دیتے ہوئے کہا "میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میرا ساتھی یہیں تمہاری بیوی اور بچی کے ساتھ رہے گا۔ ہم دونوں واکی ٹاکی پر آپس میں رابطہ رکھیں گے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کوئی انسپکٹری دکھانے کی کوشش کی تو یہاں ان دونوں کا حشر نشر ہو جائے گا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟" میں نے بدستور بلند آواز سے کہا۔

"ہاں۔ مم۔ میں سمجھ رہا ہوں۔" آنند نے پسٹل کی نال کو خوف زدہ نظر سے دیکھ کر کہا۔

آنند کے ڈیوٹی پر روانہ ہونے میں اب قریباً ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ اس ڈیڑھ گھنٹے میں مجھے ایک دو اہم کام کرنے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے علی احمد سے ٹیلی فون کا تار کٹوایا تاکہ کوئی یہاں پر غیر ضروری رابطہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد واکی ٹاکی کو چارج پر لگایا تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک پولیس وردی کی ضرورت بھی تھی۔ یہ وردی مجھے انسپکٹر آنند ہی فراہم کر سکتا تھا۔

انسپکٹر آنند پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا اور دونوں میاں بیوی میری ہر بات بے چوں چراں مان رہے تھے لیکن میں آنند کی طرف سے سو فیصد مطمئن نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ارادے کا پیشگی اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ فطری طور پر مہم جو ہوتے ہیں اور اپنی اندرونی تپش کے زیر اثر کسی وقت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آنند پر سو فیصد کنٹرول حاصل کرنے کے لیے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے ساتھ ساتھ کچھ لالچ بھی دیا جائے۔ یعنی دو طرفہ دباؤ ڈال کر مطلوب نتیجہ حاصل کیا جائے۔ میں نے آنند کو ذرا ریلیکس کرنے کے لیے اپنا پسٹل قمیص کے اندر رکھ لیا پھر میں خود ہی الماری میں سے جانی واکر کی بوتل اور دو گلاس نکال لایا۔ میرا ارادہ بھانپ کر اروناً فریج میں سے برف اور سوڈا وغیرہ لے آئی۔

میں آنند سے ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا۔ اس گفتگو میں میں نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر وہ دل سے میرے ساتھ تعاون کرے گا تو نہ صرف وہ اور اس کا گھرانا محفوظ رہے گا بلکہ وہ پرکشش مالی فائدہ بھی حاصل کر سکے گا۔ میں نے کہا "دیکھو آنند! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جتنے بھی غیر قانونی کام ہوتے ہیں وہ بڑی اصول پسندی کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ اسی اصول پسندی کے ساتھ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم آئندہ چار پانچ گھنٹوں میرے کہنے پر چلے تو تمہارے بینک بیلنس میں زیادہ نہیں تو پانچ چھ لاکھ کا اضافہ ضرور کر دوں گا پھر بے شک اس پرخطر نوکری کو لات مار کر اپنی پتنی کے شہر کلکتہ میں جا بسنا۔ یقیناً دو چار لاکھ تو تم نے بھی پہلے انداز کر رکھا ہوگا۔ کوئی اچھا سا کاروبار کر لینا۔"

مجھے انسپکٹر آنند کی زرد آنکھوں میں ایک چمک سی نظر آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ایک دو چوٹیں مزید لگائیں اور انسپکٹر آنند کے چہرے پر ایک دوسری طرح کا رنگ نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے وہ صرف جان کے خوف سے میری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا لیکن اب اس کی رضامندی میں ذاتی مفاد کا عنصر بھی شامل ہوگیا تھا۔

یہ بات تو میں نے اس چار دیواری میں آنے کے فوراً بعد ہی محسوس کر لی تھی کہ انسپکٹر آنند کا معیار زندگی اس کی آمدن سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ مجھے گھر کی ایک الماری میں اروناً کے بیش قیمت زیور اور کپڑے بھی نظر آئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ سب کچھ حلال کی کمائی سے نہیں ہے۔ اب آنند کے چہرے پر حرص کی چمک دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ وہی کچھ کرے گا جو میں چاہوں گا۔

آنند کی روانگی میں اب ایک گھنٹا باقی تھا۔ میں نے اس سے کہا "مجھے ایک وردی کی ضرورت ہے۔ تمہارا اور میرا ناپ مختلف ہے' ورنہ یہیں گھر سے کام بن سکتا تھا۔"

وہ بولا "گھر سے اب بھی کام بن جائے گا جی۔ میرا ایک بہنوئی بھی پولیس میں ہے۔ اس کے کپڑے یہیں پڑے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کے ناپ کے ہوں گے۔"

آنند کے اشارے پر اروناً اندرونی کمرے میں گئی اور دو استری شدہ وردیاں نکال لائی۔ میں نے ناپ دیکھا۔ قمیص کے بازو تھوڑے چھوٹے تھے لیکن انہیں اڑسا جاسکتا تھا۔

پتلون کی لمبائی کم تھی۔ آنند کی ہدایت پر اروناً نے پائنچوں کی فولڈنگ کھول دی اور یوں پتلون لمبی ہوگئی۔ میں نے وردی پہن لی۔ سر کی پٹی ٹوپی میں چھپ گئی۔ یہ اے ایس آئی کے رینک کی وردی تھی۔ میرا کام اس سے بھی چل سکتا تھا۔ اب وقت تھوڑا تھا۔ میں اور آنند علیحدہ کمرے میں چلے گئے اور تفصیلات طے کرنے لگے۔ علی احمد مرکزی کمرے میں اروناً کے پاس موجود رہا۔ مکمل تفصیلات طے ہوگئیں تو ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اروناً کے چہرے پر اندیشے ہی اندیشے تھے۔ وہ بار بار ہونٹوں میں کچھ بڑبڑانے لگتی تھی۔ غالباً اپنے عقیدے کے مطابق دعا وغیرہ مانگ رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ رحم طلب نظروں سے میری طرف بھی دیکھنے لگتی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ اگر تم دونوں تعاون کرو گے تو تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔"

اروناً نے تھوک نگل کر جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے ایک کاغذ پر چند الفاظ لکھے اور کاغذ علی احمد کو تھما دیا۔ میں نے لکھا تھا "علی احمد! عورت اور بچی کو کسی بھی صورت تمہاری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو ہی جائے تو ان دونوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے یہاں سے فرار اختیار کر لینا۔"

مجھے یقین تھا کہ میری اس تحریر پر علی احمد کو سخت حیرانی ہوگی۔ اس کی معلومات کے مطابق جمانی ایک نہایت خطرناک اور سفاک شخص کا نام تھا جو کسی انسان کو معمولی بات پر چیونٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ سفاک انسان کیسی کیسی سفاکیوں کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا اور اب بھی اس کے اندر کہیں گہرائی میں مہر و وفا کے کیسے موسم پائے جاتے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہم دونوں گھر سے باہر نکلے اور چالیس پچاس قدم دور اس کشادہ جگہ پر پہنچ گئے جہاں آم کے ایک پیڑ تلے انسپکٹر آنند کی سفید گاڑی کھڑی تھی۔ یہ کوئی پرانا ماڈل تھا جسے آنند نے ٹھیک ٹھاک کروا رکھا تھا۔ گاڑی کا نمبر کولمبو کا نہیں تھا۔ آنند نے میرے لیے گاڑی کی ڈگی کھول دی۔ میں نے ڈگی میں گھسنے سے پہلے آنند کو ایک بار پھر اپنا ڈ کی ٹاکی دکھایا اور اسے جتایا کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ مسلسل رابطے میں ہوں۔ میں نے اسے ایک نیلا بٹن دکھاتے ہوئے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو۔ یہ موت کا بٹن ہے۔ اس کے دبتے ہی تمہاری پتنی اور بچی کی زندگی ختم ہو جائے گی۔"

آنند نے ڈری ڈری نظروں سے نیلے بٹن کو دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے درخواست کر رہا تھا کہ میں اس سلسلے میں احتیاط رکھوں' کہیں غلطی سے میرے پرِوار کی موت کا پروانہ جاری نہ ہو جائے۔ میں ڈگی میں سمٹ کر بند ہوگیا اور آنند گاڑی لے کر اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوگیا۔ یہ سفر قریباً ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ فرسٹ اسٹورز کی حدود میں پہنچنے کے بعد دو جگہ گاڑی رکی۔ یقیناً یہاں نگرانی کے انتظامات تھے۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور آثار سے پتا چلا کہ گاڑی کسی وسیع پورچ میں داخل ہوئی ہے۔

گاڑی رک گئی اور میرے انتظار کا مرحلہ شروع ہوا۔ ڈگی میں گرمی تھی۔ اس کے علاوہ گریس اور موبل آئل وغیرہ کی بو بھی نتھنوں میں متواتر گھس رہی تھی۔ باہر سے مختلف آوازیں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ آوازیں گارڈز اور ملازمین وغیرہ کی تھیں۔ دو تین بار آنند کی بلند آواز بھی سنائی دی۔ وہ اپنے عملے کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ وہ کچھ لوگوں کو گشت کے لیے چھت پر بھیج رہا تھا۔ دراصل وہ میرے نکلنے کے لیے موقع پیدا کر رہا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد وہ لمحہ آن پہنچا جس کا مجھے انتظار تھا۔ ڈگی کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی میرے ہاتھ میں سائلنسر لگا پسٹل بالکل تیار حالت میں تھا۔ بہرحال اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ڈگی کھولنے والا آنند خود ہی تھا۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں تیزی سے باہر نکلا۔ آنند نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی ایک نیم تاریک گوشے میں رجنی گندھا کے پودوں کے پاس کھڑی کی تھی۔ یہاں پولیس کے علاوہ شیخ عاقلم کے ذاتی گارڈز بھی موجود تھے۔ ان کی طرف سے آنند کو خطرہ تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے ٹوپی اپنے چہرے پر آگے تک جھکائی تھی اور سر جھکا کر آنند کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ آنند کی طرح میرے ہولسٹر میں بھی پسٹل موجود تھا لیکن یہ سرکاری پسٹل نہیں تھا' میرا ذاتی پسٹل تھا اور اس کا سائلنسر میں نے بڑی احتیاط سے اپنی دائیں پنڈلی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

ہم شیخ کے چوکس گارڈز کے درمیان سے گزرے۔ ان گارڈز کے درمیان سے گزرتے ہوئے مجھے ایک ایسی صورت نظر آئی جس نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ میری جانی پہچانی صورت تھی اور مجھے کافی دنوں سے اس کی بھی تلاش تھی۔ یہ وہی امارانی غنڈا سرموب تھا جو لاہور میں میرے ہاتھوں

شدید زخمی ہوا تھا۔ درحقیقت سرموب کا زخمی ہونا ہی بعد میں ساہی صاحب کے بہیمانہ قتل کی وجہ بنا تھا۔ پچھلے روز ھائی ماہ میں اس بدبخت کی صورت ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے نکلی نہیں تھی۔ سرموب کا رخ دوسری طرف تھا اور یہ بات میرے حق میں بہتر تھی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آگئے۔ یہ وسیع و عریض رہائشی عمارت تھی اور شیخ جیسے رئیس کے شایان شان تھی۔ مخملی پردے، دبیز قالین، غرض کہ سبھی کچھ یہاں موجود تھا۔ "شیخ کدھر ہے؟" میں نے چلتے چلتے آنند سے پوچھا۔

"ابھی مجھے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔" آنند نے انگریزی میں جواب دیا۔

ہم دونوں ایک قالین پوش راہداری میں آگے بڑھتے رہے۔ آنند نے مجھے ایک چھوٹی سی سیڑھی کے نیچے واقع خلا میں چھپا دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنی پنڈلی سے سائیلنسر اتار کر پسٹل پر چڑھا لیا۔ دو نارنجی وردیوں والے گارڈز میرے قریب سے گزرے۔ ایک تو سیدھا نکل گیا لیکن دوسرے کو کچھ شک پڑا۔ وہ رکا اور جھک کر سیڑھی کے نیچے دیکھنے لگا۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔

یقیناً اس نے مجھے پولیس والا سمجھا تھا اور یہی پوچھا تھا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔

اس کے سوال کا جواب مجھے گولی کی شکل میں دینا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ عاصم کے اس قدر نزدیک پہنچنے کے بعد میں کسی طرح کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ گولی گارڈ کے چہرے پر لگی۔ وہ میری طرف جھکا ہوا تھا میرے اوپر ہی آن گرا۔ میں نے اسے ہاتھوں پر سہارا اور سیڑھیوں کے نیچے ہی کھینچ لیا۔ شاندار سائیلنسر کی وجہ سے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔

عین اس وقت آنند تیزی سے میرے قریب پہنچا۔ اس نے کہا "دائیں ہاتھ کے دوسرے کوریڈور میں داخل ہو جائیں۔ بائیں جانب ساتویں کمرے کے اندر سے کسی عورت کے رونے کی مدھم آوازیں آرہی ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی فرانسیسی لڑکی ہے جو کل رات جنگل میں شیخ کے عتاب کا شکار تھی۔"

"وہاں گارڈ ہیں؟"

"بس ایک بندہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس پر آسانی سے قابو پا سکتے ہیں۔"

میں اپنی جگہ سے نکل آیا اور تیزی سے کوریڈور کی طرف بڑھا۔ کوریڈور میں داخل ہوتے ہی گارڈ سے میرا سامنا ہو گیا۔ میری وردی کے سبب اس نے مجھ پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ جونہی وہ میرے پاس سے گزرا، میں نے اس کی گردن دبوچی اور اسے بے ہوش کر کے ایک صوفے کے پیچھے ڈال دیا۔ میں اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا جب مدھم آہٹ ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دوسرا گارڈ اپنے ہولسٹر سے ریوالور برآمد کر رہا تھا۔ میرے پسٹل نے ایک بار پھر خاموش شعلہ اگلا اور یہ گارڈ بھی ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس دوسرے گارڈ کی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا ایک بڑا گچھا موجود ہے۔

میں نے چابیوں کا گچھا مقتول گارڈ کی بیلٹ سے اتارا اور اس کی لرزتی ہوئی لاش کو گھسیٹ کر دوسرے گارڈ کے پہلو میں صوفے کے پیچھے لٹا دیا۔ خون کی ایک لکیر کوریڈور کے وسط سے صوفے کے پیچھے تک چلی گئی تھی لیکن قالین بھی چونکہ گہرا سرخ تھا لہٰذا دور سے دیکھنے والے کو یہ خون آسانی سے نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ چابیوں پر نمبر لگے ہوئے ہیں لیکن پھر فوراً ہی یہ جان کر افسوس بھی ہوا کہ سات نمبر کمرے کی چابی گچھے میں موجود نہیں۔ رونے کی مدھم آواز میرے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھی اور یہ یقیناً لیونا ہی کی تھی۔ وہی منت سماجت کا آہنگ تھا، وہی فریادی لہجہ تھا۔ میرے دل پر چرکا سا لگ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک میری نگاہ آنند پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف چلا آرہا تھا۔ اس نے قالین پر خون کی سرخ لکیر دیکھی اور تیزی سے بولا "مسٹر جہانی! آپ نے جو کرنا ہے، جلدی کریں۔ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ٹیگور صاحب حفاظتی انتظامات کے معائنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ وہ گاڑی سے اتر چکے ہیں۔ اگلے دو تین منٹ میں وہ یہاں ہوں گے۔"

میں نے کہا "ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

میں اس کا بازو پکڑ کر کمرا نمبر سات کے سامنے لے گیا "دستک دو۔ اگر کوئی اندر سے جواب دے، تو اس سے دروازہ کھلواؤ۔" میں نے سرگوشی کی۔

"لیکن۔ لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میری ذمے داری صرف یہ ہے کہ آپ کو اس کوٹھی کے اندر پہنچا دوں۔" آنند نے جوابی سرگوشی کی۔

"دیکھو۔ یہ سوال جواب کا وقت نہیں۔ میں تمہیں خوش کر دوں گا انسپکٹر آنند۔ دوسری صورت میں جو بھیانک نتیجہ نکلے گا وہ بھی تم جانتے ہو۔ چلو شاباش جلدی کرو۔ یہ

سوچنے کا وقت نہیں۔" میرا بایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور آنند جانتا تھا کہ وہاں کیا شے ہے۔

آنند چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر آگے بڑھ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر اندر سے غراتی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟"

میں اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتا تھا۔ یہ درندہ نما انسان کی آواز تھی، یہ شیخ عاصم کی آواز تھی۔

"میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں جناب۔ لیکن پلیز ذرا دروازہ کھولیے۔" آنند نے تیزی سے کہا۔

میں ایک سائیڈ پر ہو گیا تاکہ اگر شیخ دروازے میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کرے تو میں اسے دکھائی نہ دوں۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ میں نے وہی کیا جو اس سے پہلے آنند کے گھر میں داخل ہوتے وقت کیا تھا۔ میں نے برق رفتاری سے حرکت کی اور شیخ عاصم کو دھکیلتا ہوا اندر گھس گیا۔ یہ بات غالباً شیخ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میں اس کی حفاظت کے لیے بنائے گئے کئی حصار توڑنے کے بعد اس کے خاص کمرے تک پہنچ جاؤں گا۔ میرا دھکا کھانے کے بعد وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط تک چلا گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔ میں نے پسٹل دونوں ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور اس کا رخ سیدھا شیخ عاصم کے سینے کی طرف تھا۔ اپنے عقب میں کمرے کا دروازہ میں اندر سے مقفل کر چکا تھا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا، یہ کمرا اندر سے بالکل کسی ہیلی کاپٹر کے اندرونی حصے جیسا تھا۔ بالکل یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی بہت بڑے ہیلی کاپٹر کے اندر کھڑا ہوں۔ ویسی ہی کھڑکیاں، ویسی ہی ونڈ اسکرین، وہی کنٹرول پینل، چھت، فرش، آگے پیچھے دو لگژری نشستیں بھی موجود تھیں، لیکن انہیں ایسی شکل دی گئی تھی کہ اگر دونوں نشستوں کو کھولا جاتا تو ایک بہت شاندار قسم کا بیڈ بھی بن سکتا تھا۔ اس وقت دونوں نشستیں بیڈ کی شکل میں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے تک شیخ اس شاندار بیڈ پر نیم دراز تھا۔ ایک کشن سرہانے کی طرف رکھا تھا اور بیڈ شیٹ پر سلوٹیں بھی دکھائی دے رہی تھیں لیکن لیونا یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے ایک مجہول سی عجیب و غریب شکل نظر آئی۔ پھٹے پرانے کپڑوں والی یہ عورت فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ میں نے اسے دھیان سے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ خدا کی پناہ! وہ لیونا ہی تھی۔ اس کا سر کسی کند استرے کے ساتھ مونڈھ دیا گیا تھا۔ یہی حال بھنوؤں کا ہوا تھا۔ اس کا جسم اور چہرہ زخم زخم تھا۔

میری نظریں بس ایک ساعت کے لیے ہی لیونا پر مرکوز ہوئی تھیں۔ اس نہایت مختصر مہلت سے شیخ عاصم نے فائدہ اٹھایا۔ وہ تیر کی طرح تپائی کی طرف گیا۔ یہاں اس کا لوڈڈ کولٹ پسٹل رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ شیخ کا ہاتھ پسٹل تک پہنچتا، میرے سائیلنسر لگے پسٹل نے شعلہ اگلا۔ عاصم کا پسٹل تپائی پر سے صاف اڑ گیا۔ وہ "ہیلی کاپٹر" کے کنٹرول پینل سے ٹکرایا اور پھر لڑھکتا ہوا میرے قریب آن گرا۔ میں نے دو قدم بڑھا کر پسٹل اٹھا لیا اور اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ شیخ دانت کچکچا کر رہ گیا تھا۔

"بس شیخ عاصم، تمہاری مہلت ختم ہو چکی ہے۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

شیخ عاصم بس خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ وہ ہولے ہولے لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور آنکھوں کے نیچے ابھار نمایاں ہو کر بدنما لگ رہے تھے۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ تپائی پر رکھی ہوئی بوتل سے اندازہ ہوتا تھا کہ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس نے تین چوتھائی بوتل خالی کی ہے۔

اپنے پسٹل سے ہاتھ دھونے کے بعد وہ بڑے ڈھیلے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے صورت حال کی کوئی پروا نہیں رہی۔ اس نے تپائی سے اپنا سگریٹ کیس اٹھایا اور سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر لیونا کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ اس کے گلے میں ایک زنجیر تھی جس کا دوسرا سرا شاندار رانگزری بیڈ کے ایک پائے سے باندھا گیا تھا۔ لیونا فرش کے قالین پر بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر بس دو چار دھجیاں ہی تھیں۔ یہ دھجیاں بھی اس نے شاید خود ہی اپنے جسم کے گرد لپیٹی تھیں۔ اس کے جسم پر چھڑیوں کی ضربات کے اتنے نشان تھے کہ انہیں شمار کرنا دشوار تھا۔ کئی نشانات نے اس کی کھال ادھیڑ دی تھی اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کر گہری نیلی ہو چکی تھی۔ نچلا ہونٹ بھی پھٹ کر لٹک گیا تھا۔ حسینۂ پیرس کی یہ تصویر عبرت ناک تھی۔ وہ ایک مشہور و محبوب ماڈل گرل بھی رہ چکی تھی۔ صابن کے مقبول اشتہار میں اسے کرۂ ارض کے کروڑوں لوگوں نے دیکھ رکھا تھا۔ نجانے وہ کتنے دلوں کی دھڑکن تھی۔ خدا جانے کتنی آنکھوں میں اس کے سپنے سجے ہوئے تھے۔ لیکن آج وہ ایک زخم زخم جسم اور بے ڈھنگی شکل لیے اس عجیب وضع کے کمرے میں کسی جانور کی طرح بندھی ہوئی تھی۔

اس نے ایک بے چارگی بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور پلکیں گرالیں۔ اس کا جسم ہچکیوں سے ہلنے لگا تھا۔ شیخ عاصم عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں چلتا بیڈ کے سرہانے پہنچ گیا۔ یہاں ایک بڑے گلدستے میں پونجا کے تازہ پھول موجود تھے۔ ایسے ہی دو گلدستے اس کمرے میں اور بھی موجود تھے۔ یہی پھول تھے جن پر حسینۂ پیرس جان چھڑکتی تھی۔ عاصم نے گلدستے میں سے ایک پھول نکالا اور اس کی پتیاں نوچ نوچ کر قالین پر پھینکنے لگا پھر شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولا "تو بھی دیکھ لے جہانی! یہ تھی وہ عورت جس کے لیے میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے پیار محسوس کیا تھا۔ یہ تھی وہ عورت جس کے لیے میں نے پہلی بار آنکھوں میں خواب سجائے تھے۔ میں نے بہت کچھ سوچا تھا اس کتیا کے لیے۔ بہت کچھ سوچا تھا۔ یہ۔ یہ کمرا اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ تم یہ کمرا دیکھ رہے ہو ناں؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔"

"اس کتیا کے شوق رئیس زادیوں اور شہزادیوں جیسے تھے حالانکہ یہ بدبخت پیرس کے ایک غریب محلے سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کی ماں کلبوں میں تھرڈ کلاس کلبوں میں گٹار بجا کر اور اپنا جسم بیچ کر روٹی کماتی تھی اور یہ خود بھی تین چار سال پہلے تک معمولی پاپ سنگروں اور کیمرہ مینوں کے بستر گرم کرتی رہی ہے۔ حرام زادی کتیا۔" اس نے بے پناہ نفرت سے لیونا کی طرف تھوک دیا۔ وہ اس کے لیے بڑے تواتر سے کتیا کا لقب استعمال کر رہا تھا۔

"عاصم! تم نے جو بھی کہنا ہے مختصر لفظوں میں کہو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔

عاصم نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ مسلسل شعلہ بار نظروں سے لیونا کو گھور رہا تھا۔ دانت پیستے ہوئے بولا "یہ ذات کی بھک منگی ہے لیکن اس کے شوق رئیس زادیوں کے سے ہیں۔ اس کتیا کا ایک شوق ہیلی کاپٹر بھی تھا۔ چوبیس گھنٹے ہیلی کاپٹر میں رہنا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو شادی بھی کسی ہیلی کاپٹر کے ساتھ کرلیتی اور بچوں کی بجائے چھوٹے چھوٹے ہیلی کاپٹر پیدا کرتی۔ یہ کمرا اس کوٹھی میں' میں نے اسی کی خوشی کے لیے بنوایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کسی روز اچانک اسے یہاں لاؤں گا اور حیران کروں گا۔ اس کمرے کو میں نے بہترین سہولتوں سے سجایا ہے۔ یہ کمرا ہیلی کاپٹر ہی کے انداز میں تھرتھرا سکتا ہے' گھوم سکتا ہے' ہیلی کاپٹر کی مدھم گونج بھی اس میں سنائی دیتی ہے۔ اس کی کھڑکیوں پر ایسے منظر نظر آتے ہیں کہ یہی لگتا ہے' یہ اونچی ہواؤں میں پرواز کررہا ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ اس کو یہاں لاکر اسے اور آج یہ یہاں آگئی ہے لیکن کیسے آئی ہے؟ کیسے آئی ہے؟"

عاصم نے زہرناک لہجے میں کہا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس لیونا پر کھینچ مارا۔

گلاس یقیناً لیونا کے سراپا چہرے سے ٹکراتا اور اسے مزید لہولہان کردیتا۔ میں نے ٹانگ چلائی اور ہوائی گلاس کا رخ تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔ گلاس اڑتا ہوا باتھ روم کے آبنوسی دروازے سے ٹکرایا اور ٹوٹ گیا۔

عاصم چلایا "یہ عورت نہیں 'ڈائن' ہے' اس نے میرا خون پیا ہے۔ میں بھی اس کا لعنتی جسم خون سے خالی کرکے رہوں گا۔ میں اسے عبرت ناک موت ماروں گا۔"

شیخ نے جنونی انداز میں لیونا کی طرف بڑھنا چاہا "خبردار!" میں نے چیخ کر کہا اور پسٹل کا رخ عاصم کے سینے کی طرف کردیا۔ میرے لہجے نے عاصم کو چونکا دیا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

میں نے کہا "عاصم! تم لیونا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ اب تمہاری اپنی باری ہے۔ لیونا کے ساتھ تم نے جو کچھ کرنا تھا وہ کرچکے ہو۔"

اچانک عاصم نے ایک ایسی حرکت کی جس کی مجھے اس سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ دیوار کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ دیوار میں ایسا دروازہ موجود تھا جو بظاہر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عاصم نے یکایک ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھولا اور اوجھل ہوگیا۔ میں نے گولی چلائی لیکن وہ دروازے میں لگی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں کچھ بھی نہیں کرسکا لیونا کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں شیخ کے پیچھے لپکا۔ سامنے ایک نیم تاریک راہداری تھی جو بالکل خالی تھی۔ مجھے عاصم کے دوڑتے قدموں کی آواز آئی میں آواز کی طرف لپکا۔ راہداری آگے جاکر دو چھوٹی راہداریوں میں تقسیم ہوگئی پھر ایک چھوٹی راہداری میں سے دو مزید راہداریاں نکل آئیں۔ عاصم آس پاس ہی موجود تھا۔ میری انگلی ٹرائیگر پر تھی اور نگاہیں عاصم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جونہی میں ایک موڑ پر گھوما وہ دس پندرہ گز دور دکھائی دیا۔ وہ ایک کمرے کے دروازے میں چابی گھما کر اسے کھولنا چاہ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس کمرے سے عاصم کو ریوالور مل سکتا تھا۔ مجھے اپنے عقب میں دیکھ کر عاصم نے کمرے میں گھسنے کا ارادہ ترک کیا اور دوسری جانب اوجھل ہوگیا۔ میں نے عاصم کی ٹانگوں پر فائر کیا لیکن یہ فائر بھی رائیگاں گیا۔

جگہ بھول بھلیوں جیسی تھی۔ لگتا تھا کہ عمارت کا یہ حصہ پہلے کا بنا ہوا ہے اور غیر آباد ہے۔ اچانک مجھے دائیں جانب سے لیونا کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس پر کند چھری چلا دی ہو۔ میں آواز کی سمت دوڑا۔ دو منٹ بعد میں نے خود کو اسی درمیانی راہداری میں پایا جو مجھے ہیلی کاپٹر نما کمرے سے باہر لائی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اس شمع کے کمرے میں داخل ہوا' میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ لیونا قالین پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر تھے پھر اس نے قریب پڑا ہوا تولیہ اٹھایا اور اس سے چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی۔ بڑا بھیانک منظر تھا۔ میری آنکھوں کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ جہاں جہاں تولیے نے لیونا کے چہرے پر رگڑ کھائی وہیں سے اس کی کھال اتر کر لٹک گئی۔ کئی جگہ گہرے گھاؤ بن گئے اور نیچے سے سرخ گوشت جھانکنے لگا۔ میں نے لپک کر اس کے دونوں بازو کلائیوں سے پکڑے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے چہرے کو تھوڑا سا مزید رگڑا تو اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں گی۔

وہ منظر وحشت ناک تھا۔ حسینۂ پیرس' خوشبوؤں اور رنگینیوں کے شہر کی ملکہ ایک بھیانک عفریت کی مانند دکھائی دے رہی تھی' اس کا بالائی ہونٹ گل کر گر گیا تھا اور دانت جھلک دکھا رہے تھے۔ یہ دانت اور مسوڑھے اب بھی کلیوں کی طرح خوب صورت تھے لیکن اب چونکہ ان پر پردہ نہیں رہا تھا لہٰذا ان کی ساری دلکشی خوفناک کراہت میں بدل گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دانتوں کی کلیاں اس وقت تک حسین تھیں جب تک ہونٹ اپنی مقررہ جگہ پر موجود تھا۔ آنکھوں کی جھیلیں اس وقت تک خوب صورت تھیں جب تک بھنوؤں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ ناک کی اٹھان اس وقت تک دل نشیں تھی جب تک پیشانی اپنی مقررہ جگہ پر موجود تھی۔ سو ثابت ہوا کہ کوئی عضو علیحدہ سے خوب صورت نہیں ہوتا' خوب صورتی اجتماعی ہوتی ہے انفرادی نہیں۔ یہ گہرا فلسفہ تھا لیکن اس پر سوچنے کا یہ وقت نہیں تھا۔ میرے سینے میں آگ کا دریا ابل نکلا تھا اور آنکھوں کے سامنے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ یہ بات عیاں تھی کہ میرے یہاں پہنچنے سے فقط دو تین منٹ پہلے عاصم یہاں موجود تھا۔ اس نے لیونا کے حسین چہرے پر تیزاب پھینکا تھا اور دائیں جانب والے دروازے سے نکل گیا تھا۔ اب وہ دروازہ بند تھا۔ جس دروازے سے میں اندر داخل ہوا تھا وہ بھی بند ہو چکا تھا۔

لیونا چیخ رہی تھی' ہذیان بول رہی تھی۔ اس نے لپک کر آئینے کی طرف جانا چاہا۔ مجھے لگا کہ اس نے آئینہ دیکھ لیا تو مر جائے گی۔ میں نے اس کی کلائیاں چھوڑنے سے انکار کردیا۔ وہ چیخی "مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میرے چہرے کو کیا ہوگیا؟"

میں نے اسے کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔ اس کا ایک کندھا بھی عقب سے جل گیا تھا۔ کچھ تیزاب نیچے قالین پر پڑا تھا اور اس کا ستیاناس کر گیا تھا۔ ایک عجیب ناگوار بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس شدید بو کے نیچے پونجا کے پھولوں کی خوب صورت بو دب کر رہ گئی تھی۔

"مجھے کیا ہوا ہے جہاں۔ مجھے کیا ہوا ہے۔" وہ مسلسل چیخ رہی تھی اور مجھ سے دریافت کر رہی تھی۔

"تمہارے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا ہے۔ ایک دو جگہوں سے کھال اتر گئی ہے۔" میں نے اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے کہا۔

وہ مچلنے لگی وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر اپنے چہرے پر پھیرنا چاہتی تھی۔ اس خوفناک بدصورتی کو محسوس کرنا چاہتی تھی جو چند لمحوں کے اندر اس کا مقدر بن گئی تھی۔ درد اور خوف کے سبب وہ اس بری طرح تڑپ رہی تھی کہ میرے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ یہی لیونا تھی جس نے صرف چند دن پہلے میرے سینے پر سر رکھ کر کہا تھا "جہاں! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے عاصم سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ شیخ لوگ اپنے حرم سے بھاگنے والی عورتوں کو عبرت کا نشان بنا دیتے ہیں۔" جواباً میں نے اسے تھپکتے ہوئے دلاسا دیا تھا۔

"میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اور آج وہ اپنے جلے ہوئے بھیانک چہرے کے ساتھ ماہیٔ بے آب کی طرح میرے ہاتھوں میں تڑپ رہی تھی۔ شیخ نے آج تک میرے جسم پر جو گھاؤ لگائے تھے ان میں ایک اور گھاؤ کا اضافہ ہوگیا تھا۔

لیونا ایک بدترین سانحے سے دوچار ہو چکی تھی اور یہ اختتام نہیں تھا۔ ابھی تو اس کی زندگی باقی تھی اور یہ زندگی بھی شیخ عاصم کے ہاتھوں جانی تھی۔ لیونا کی چیخ و پکار کا کوئی اور حل تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اس کی گردن کے مخصوص حصے پر دباؤ ڈال کر اسے شدید اذیت اور خوف سے آزاد کردیا۔ وہ ایک دو گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس میں سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا محال تھا۔ زنجیر ابھی تک اس کے گلے میں تھی اور اس کی بے چارگی کے منظر کو مزید حسرت

ناک بنا رہی تھی۔ میں نے اسے آہستگی کے ساتھ ادھ جلے قالین پر لٹا دیا۔

اس ہیلی کاپٹر نما کمرے کے تین دروازے تھے۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا جو ونگ کی طرف تھا۔ یہ تینوں دروازے بند ہو چکے تھے۔ میں نے کوشش کی لیکن ان میں سے کوئی دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں کنٹرول پینل پر مختلف بٹنوں اور لیورز کو حرکت دینے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک بٹن کو دبایا' تو کمرے میں دبی دبی گھرگھراہٹ اور گونج محسوس ہونے لگی جو ہیلی کاپٹر میں پرواز کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ پھر نجانے کیسے اچانک کمرے کی کھڑکیوں اور ونڈ اسکرین پر مختلف مناظر پروجیکٹ ہونے لگے۔ بالکل یہی محسوس ہوا جیسے آدھی رات کے بجائے ایک روشن چمکتا ہوا دن ہے اور ہیلی کاپٹر (جسے لبوتا بڑی ادا سے ہیلی کہتی تھی) فضاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔

میں نے ایک لیور کھینچا تو کمرا آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ یہ حرکت بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی ہیلی کاپٹر فضا میں گھومتے ہوئے کرتا ہے پھر یکایک نجانے کیا ہوا کہ کمرا بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔ گھومتے گھومتے وہ ایک جھٹکے سے رک گیا اور اس کے تینوں دروازے خود بخود کھل گئے۔ یقیناً میں نے اتفاقاً درست بٹن پش کر دیا تھا۔ میں جس دروازے سے اس کمرے میں پہلی بار داخل ہوا تھا وہ میرے عین سامنے تھا' لیکن اب وہاں راہداری کی بجائے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ تبدیلی کمرے کے گھوم جانے کے سبب ہوتی ہے۔ عین اسی طرح باقی دونوں دروازوں کے سامنے بھی منظر بدلے ہوئے تھے۔ میں پسٹل سنبھالتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ تین تین سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگتا ہوا میں ایک چھت پر آ گیا۔ چھت پر اوندھے لیٹ کر میں نے نیچے دیکھا اور رگ و پے میں آگ بھڑک گئی۔ میرے سامنے عمارت کے پورچ کا منظر تھا۔ ایک طرف رجنی گندھا کے پودوں کے پاس وہ سفید کار بھی نظر آ رہی تھی جس میں کچھ دیر پہلے میں اور انسپکٹر آنند اس عمارت میں پہنچے تھے۔ میں نے دیکھا۔ کم از کم تین گارڈز اور پولیس والے مین دروازے کے عین سامنے موجود تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ آٹھ دس افراد کے جسم پر بلٹ پروف جیکٹس بھی نظر آئیں یہ لوگ کوٹھی کے اندر گھسنے کے لیے بالکل تیار نظر آتے تھے۔ ان کے درمیان ہی مجھے شیخ عاصم کی منحوس صورت بھی دکھائی دی۔ شیخ کا پالتو غنڈہ سرموب ہاتھ میں پسٹل لیے عین اس کے عقب میں کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں سانپ کے دیدوں کی طرح تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ یہ جس کی وجہ سے ساہی صاحب کی جان گئی تھی۔ زخموں نے وہ غیض و غضب بھڑکایا تھا جس کے صاحب کو اپنی زندگی کی قربانی دینا پڑی تھی۔ میں بھینچے' نشانہ لیا اور سائیلنسر لگے پسٹل کی گولی پیشانی پر لگی۔ میں نے چھت سے کوئی اٹھارہ فٹ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرتے دیکھا۔ شاید سرموب نہیں چلا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس سرموب کا جسم زمین پر گرتا' میرے پاؤں بھی چھت تھے۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر چھت پر جست لگائی تھی۔ یہ قریباً اٹھارہ فٹ کی بلندی تھی بارہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہ بالکل ویسی ہی چھلانگ سوئمنگ پول میں لگائی جاتی ہے لیکن میرے نیچے تھا۔ میرے نیچے ایک پتھریلا انسان تھا' اس کے کی طرح اس کی فطرت بھی بے گداز تھی۔ آج صفت شخص کے لیے میری نفرت عروج پر پہنچ گئی عاصم پر گرا۔ اپنی چھاتی اور پیٹ تلے میں نے عاصم ہونے والے تصادم کو محسوس کیا۔ مجھے اس کی کڑکڑانے کی آواز آئی۔ میرے دونوں ہاتھ سامنے اٹھے ہوئے تھے تاکہ میں اپنا چہرہ سڑک پر ٹکرا بچا سکوں۔ عاصم کا سر بڑے زور سے پختہ سڑک پر لگا کے ساتھ ہی اس کے حلق سے "اوغ" کی عجیب و غ بھی برآمد ہوئی تھی۔ جو اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس گمان میں بھی نہیں تھا۔ شاید اس نے یہی سمجھا تھا بداعمالیوں کے نتیجے میں آسمان اس کے سر پر ٹوٹ اس کے سر اور پشت پر جو قیامت کی ضرب لگی تھی اس کی ذاتی مزاحمت ایک دم ختم کر دی تھی۔ جو ہاتھ اور میری کہنیاں سڑک سے ٹکرائیں اور بلندی سے پیدا ہونے والا "مومینٹم" ختم ہوا' کروٹ بدلی۔ میرا بازو عاصم کی گردن کے گرد کروٹ مکمل ہوئی تو میں نیچے تھا اور عاصم میرے اس کا منہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا' بلکہ ہم دونوں آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بے رحمی سے عاصم کی گردن میں گھسیڑ دی اور اپنی ذریعے عاصم کی ٹانگوں کو جکڑ لیا۔ اب وہ میرے ٹانگوں کے ناقابلِ شکست شکنجے میں تھا۔ اگر گارڈ برساتے تو وہ پہلے عاصم کو چھلنی کرتیں۔

"عاصم! اپنے کتوں سے کہو' ہم سے دور ہ

ری منحوس گردن میں روشن دان کھول دوں گا۔" صم کے حلق سے بس خرر خرر کی آواز نکلتی جا رہی نے اس کی گردن پر گرفت ذرا نرم کر دی۔ وہ پھر بھی ہی بولا۔

ے چاروں طرف گارڈز تھے اور پولیس کے مسلح۔ بہت سی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کا بے حرکت جسم مجھ سے کوئی دس فٹ کی دوری پر اس کی پیشانی سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا اور اس سے گزر کر سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف پکار مچی ہوئی تھی۔

نے بلند آواز سے کہا "خبردار' اگر کوئی آیا تو شیخ کی ے گی۔"

ری آواز بے حد مؤثر تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ رہا تھا وہ کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اگر مجھ پر حملہ ں عاصم کو شوٹ کر دیتا' اس کے بعد میرے ساتھ جو ا وہ بعد میں دیکھ لیا جاتا۔ گارڈز کے آگے بڑھتے دم رک گئے۔ وہ شدید تذبذب کے عالم میں کھڑے یرے لب و لہجے اور انداز نے انہیں باور کرا دیا تھا کہ ندگی حقیقتاً موت کے منہ میں ہے اور ان کی کوئی بھی ی جان لے جائے گی۔

خ بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی ہر سانس کے ا ایک بھبکا سا اٹھتا تھا۔ یہ الکحل کی بو تھی' اس کے کی اپنی بو بھی اس میں شامل تھی۔ وہ پسینوں سے نہایا ا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور سخت کھردری کانٹوں کی طرح میرے بازو پر چبھ رہی تھی۔ یہ وہاں کی تھے جن سے وہ میری نازک سی غزالو کو چھیدتا رہا تھا۔ تھی جو اس کے پھول بدن کی مہک کو تہس نہس کرتی آج یہ بے رحم شخص اپنی ساری حیوانی طاقت اور ی کے ساتھ میرے شکنجے میں تھا اور میں اسے چھوڑنے رادہ نہیں رکھتا تھا۔

نے عاصم کے کان میں زہریلی سرگوشی کرتے ہوئے صم! میں پھر کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے کہو پیچھے ہٹ۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

صم کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ اس آواز میں بے پناہ خوف بھی تھا اور نفرت کی پھنکار بھی ہوئی آگ ہ بولا "تم نے مجھے مار دینا ہے' میں اچھی طرح جانتا نے مجھے مار دینا ہے لیکن اس کے بعد تم نے بھی مرنا تمہیں مرنے سے کیوں بچاؤں۔ بہتر ہے کہ ہم دونوں ہی پار ہو جائیں۔"

"دیکھو۔ اگر تم ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا کہہ دو تو تمہارے لیے بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں تم مجھے زندگی نہیں دو گے صرف زندگی کا لالچ دو گے۔ تم مجھے مار کر خود زندہ رہنے کا خواب دیکھ رہے ہو۔" وہ جنونی لہجے میں بولا۔

بولتے بولتے اچانک اس نے بے پناہ زور لگایا۔ اگر میں ذرا بھی غافل ہوتا تو وہ میری گرفت سے نکل جاتا یا کم از کم اپنی ٹانگیں ضرور چھڑا لیتا' لیکن میں نے اسے ٹس سے مس نہیں ہونے دیا۔

وہ ایک بار پھر بھینسے کی طرح ہانپنے لگا۔ میں نے کہا "اس گرفت سے نکل نہیں سکو گے عاصم' تب ہی نکلو گے جب میں چاہوں گا۔ دیکھو وہ پولیس والے پھر آگے آ رہے ہیں۔ وہ تمہاری موت کو تمہارے بالکل قریب لا رہے ہیں۔ انہیں کہو پیچھے ہٹ جائیں۔"

"انہیں پیچھے ہٹانے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ صرف تمہارا فائدہ ہوگا۔ اور میں تمہیں ساتھ لے کر مرنا چاہتا ہوں۔" شیخ کی آواز کسی مردے کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔

ایک دیوہیکل پولیس افسر چند قدم آگے آیا اور کڑک کر بولا "تم شناخت کر لیے گئے ہو جہانی! خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔" یقیناً یہی وہ ٹیگور نامی افسر تھا' جس کا ذکر کچھ دیر پہلے انسپکٹر آنند نے کیا تھا۔

میں نے اس افسر کی گیدڑ بھبکی کو نظرانداز کرتے ہوئے عاصم سے بات جاری رکھی۔ میں نے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہاری جان نہیں لوں گا تو۔"

"تم ایسا ضرور کرو گے۔" عاصم کے لہجے میں امید کی ہلکی سی کرن نمودار ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

عاصم نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموش تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ پسٹل کی نال اس کی گردن پر تھی' رخ اوپر کی جانب تھا' میں ٹرائیگر دباتا تو ۳۸ بور کی گولی اس کی شہ رگ چیر کر اور تالو پھاڑ کر دماغ میں گھس جاتی۔ عاصم کی بھاری سانس کا زیر و بم مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی کمر میری چھاتی سے لگی ہوئی تھی اور اس کا سارا بوجھ میرے اوپر تھا۔

تین چار سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ یہ بڑی بوجھل خاموشی تھی اور بوجھل تر ہو رہی تھی پھر عاصم کی ٹھہری ہوئی آواز آئی "میں تمہاری بات پر صرف ایک صورت میں اعتبار

کر سکتا ہوں۔ تم قسم کھاؤ۔ تم غزالہ کی قسم کھاؤ۔'' میں اس کی فرمائش پر دنگ رہ گیا۔

وہ ایک طرح سے اس بے پناہ جذبے کا اعتراف کر رہا تھا جو میرے دل میں غزالہ کے لیے اور غزالہ کے دل میں میرے لیے موجود تھا۔ اپنی زندگی کی ان بدترین گھڑیوں میں۔ اپنی جان بچانے کے لیے اسے وہ مظلوم محبت یاد آئی تھی جسے اس نے برسوں خون کے آنسو رلایا تھا۔

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور کہا ''ٹھیک ہے میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہاری جان نہیں لوں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''نہیں۔ اس کا نام لے کر کہو۔''

''میں غزالہ کی قسم کھاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

شیخ عاصم چند لمحے خاموش رہا پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کے تنے ہوئے رگ و پٹھے ذرا ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس امر کی نشانی تھی کہ اس کا مزاحمتی رویہ دھیما پڑ گیا ہے۔

''میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں ایسے ہی بات کرو۔ تم بول سکتے ہو۔''

میں نے اس کی گردن پر گرفت مزید نرم کر دی۔

وہ پولیس آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں بولا ''ٹیگور! تم لوگ پیچھے چلے جاؤ اور گارڈز کو بھی لے جاؤ۔'' پھر اس نے گارڈز کے انچارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''پیچھے چلے جاؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔''

میں نے عاصم کو کھڑے ہونے میں مدد دی۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل گئیں۔ گرتے ہوئے اس کی پیٹھ پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ میرے عقب میں پورچ کی دیوار تھی۔ وہاں سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے چوڑے چکلے عاصم کو ڈھال کی طرح اپنے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ٹرائیگر پر میری انگلی پوری طرح چوکس تھی۔ گارڈز نے عاصم کے حکم پر عمل کیا تھا' وہ کچھ پیچھے چلے گئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی پولیس والوں نے بھی اپنا گھیرا ذرا کھلا کر دیا تھا۔

میں نے پسٹل کی نال عاصم کی فربہ گردن میں چبھوتے ہوئے کہا ''ان لوگوں کو مزید پیچھے ہٹاؤ اگر ان میں سے کسی نے غلطی سے فائرنگ کر دی تو بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔''

عاصم نے ذرا بلند آواز میں گارڈز کو مزید پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی پولیس والوں سے بھی ایسی ہی درخواست کی۔ پولیس والے تذبذب میں نظر آ رہے تھے مگر عاصم کا اٹل رویہ دیکھ کر آفیسر ٹیگور نے انہیں مزید آٹھ دس گز پیچھے

ہٹا دیا۔

میں نے عاصم کے کان میں تیز سرگوشی کی ''اب ان لوگوں کو بتاؤ کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہمارا پیچھا نہیں کرے۔''

''کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟''

''میں نے تمہیں چھوڑ دینے کا وعدہ کیا ہے ایسے بیکار سوال مت کرو۔''

عاصم کے جسم میں ایک بار پھر مزاحمت کے آ[ثار پیدا] ہوئے لیکن جلد ہی معدوم ہو گئے اس نے بلند آ[واز میں کہا] ''میں شاہ جہاں کے ساتھ یہاں سے جا رہا ہوں۔ [یاد رکھو یہ] ہے کہ اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔ کوئی ہمارا [پیچھا نہ] کرے۔''

کہنے کو تو عاصم میرے دباؤ پر پیچھا نہ کرنے کی [ہدایت دے رہا] تھا لیکن امید نہیں تھی کہ اس کی اس ہدایت پر خاص طور سے پولیس والے تو اتنی آسانی سے پیچھا [چھوڑنے] والے نہیں تھے۔ میں نے عاصم پر اپنی گرفت م[ضبوط کی] اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ایک چھوٹی سوزو[کی کار] عین سامنے پہنچ کر میں نے عاصم سے اس کا دروازہ [کھلوایا اور] عاصم سمیت اندر گھس گیا۔ میں نے عاصم کو ڈرائ[یونگ سیٹ] پر بٹھایا تھا اور خود اس کے پہلو میں جگہ سنبھال لی ''گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' میں نے عاصم کو حکم دیا۔

وہ ہچکچایا لیکن پسٹل کی نال اس کے پہلو م[یں نازک] مقام پر تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ری[ورس] گیئر لگا دیا۔ عاصم کے چہرے پر بے پناہ تکلیف [کے آثار] تھے۔ اس تکلیف کا ماخذ اس کی پشت ہی تھی جہا[ں اسے] چوٹ آئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ [جو تکلیف] میں نے عاصم پر جو چھلانگ لگائی تھی اس نے اس [کو] دی تھی۔

چھوٹی سوزوکی گاڑی پورچ سے نکل کر ذرا [پیچھے] آئی اور پھر عمارت سے باہر نکل آئی۔ میرے خد[شے کے] مطابق فوراً ہی دو تین کاریں حرکت میں آئیں او[ر ہمارے] پیچھے چل دیں۔ اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ سڑکوں [پر ٹریفک] بہت کم تھا۔ دن بھر کے حبس کے بعد ایک خوشگوا[ر ہوا چلنے] لگی تھی۔ ہم ساحل کی مخالف سمت یعنی شہر کی طرف [جا رہے] تھے۔ فرسٹ اسٹورز کی حدود سے نکلنے سے پہلے [ہمیں دو] ناکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان ناکوں پر بھی یہ اطلاع [پہنچ چکی تھی] کہ فرسٹ اسٹورز کا مالک گن پوائنٹ پر ہے اور ا[سے روکنے] کی کوشش سخت خطرناک ثابت ہو گی۔ ہمیں ان [ناکوں سے]

[...]ں میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔

[...]دی ہم کھلی سڑک پر آ گئے اور میری ہدایت پر عاصم کو [...]فتار سو کلومیٹر فی گھنٹا تک کرنا پڑی۔ گاڑی چھوٹی تھی [...] سڑک کے باوجود بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ [...]ول کے سبب عاصم کی کمر چیخ رہی تھی۔ ہر جھٹکے پر اس [...]ے صلواتیں نکل جاتی تھیں۔ یہ صلواتیں عربی میں [...] پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور انگریزی کی [...] میری سمجھ میں آ سکتی تھیں ''کہاں لے جا رہے ہو [...] ایک بار پھر گرجا۔

[...]و جگہ بھی ہو گی جہنم سے بہتر ہی ہو گی۔ بس چپکے سے [...] کرتے رہو۔'' میں نے کہا۔

[...]دہی ہم کولمبو کی گنجان حدود میں داخل ہو گئے۔ مجھے [...]ک پر بہت سی روشنیاں اور رونق کے آثار دکھائی [...] کوئی فوڈ اسٹریٹ قسم کی جگہ تھی۔ صنعتی نمائش کے [...] دکھائی دے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اتنی رات [...] یہاں لوگ موجود تھے۔ میں نے عاصم کو گاڑی اس [...] ڈالنے کی ہدایت کی۔ یہ ایک چھوٹی گاڑی تھی۔ جبکہ [...] پیچھے جو گاڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ شیورلیٹ اور [...] قسم کی تھیں۔ اس گنجان سڑک پر اپنی مختصر اور سبک [...]ڑی کے سبب ہم تیزی سے نکل سکتے تھے۔

[...]ا یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس گنجان سڑک پر ہمارا اور [...] گاڑیوں کا فاصلہ کافی بڑھ گیا میرا رخ ''ٹمپل روڈ'' کی [...]ف۔ یہاں میرا ایک پرانا شناسا موجود تھا۔ اس شخص کا [...]سلہ ہوتا۔ یہ مذہب کے اعتبار سے پارسی تھا۔ کلکتے [...]ر کر یہاں آباد ہوا تھا۔ اسے کولمبو کے بھک منگوں کا [...] بھی کہا جاتا تھا۔

[...]پچھلی مرتبہ جب میں سری لنکا آیا تھا تو پاشا سے بھی [...] ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس مشکل وقت میں مجھے [...] وہاں پناہ مل سکتی ہے۔ لیکن پاشا کے کوٹھی نما مکان [...] پہنچنے کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ابھی میں ٹمپل روڈ [...] ہو دو کلومیٹر دور ہی تھا کہ ایک موڑ پر اچانک میں بری [...] ٹھٹک گیا۔ سڑک کے عین درمیان ایک کار ترچھی کھڑی [...] میری نگاہ مرد عجیب سائیں عالی پر پڑی۔ وہ گاڑی کے [...] طرف کھڑا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کی تیز دودھیا روشنی [...] سائیں کی شکل صاف دکھائی دیتی تھی اور اس کی سیاہ گدڑی [...] تند سے پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بالکل کسی ٹریفک پولیس [...] کے انداز میں سائیں نے دایاں ہاتھ کھڑا کر کے مجھے [...] بائیں ہاتھ کو افقی رخ پر مسلسل حرکت دے کر ایک

کھلے ہوئے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

سائیں کا اشارہ بہت واضح تھا' وہ ہمیں کھلے ہوئے گیٹ میں داخل ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں حیرت کے فوری جھٹکے سے سنبھل گیا تھا اور اب میرا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ سائیں کی ''دعوت'' بڑی بروقت اور مفید تھی۔ میں نے عاصم سے کہا کہ وہ گاڑی کو کھلے ہوئے گیٹ میں گھسا دے۔

عاصم اس ہنگامی صورت حال کو نہیں سمجھ سکا۔ اس نے رفتار آہستہ تو کر دی لیکن گاڑی کا رخ نہیں بدلا۔ مجبوراً یہ رخ مجھے بدلنا پڑا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی لہراتی ہوئی ایک وسیع کوٹھی کے ڈرائیو وے میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ہی وہ گاڑی بھی اندر آ گئی جس نے سڑک روک رکھی تھی۔ دو چوکیداروں نے تیزی سے گیٹ بند کر دیا۔ یہ سارا عمل بمشکل سات آٹھ سیکنڈ میں انجام پا گیا۔ ہمارا پیچھا کرنے والی گاڑیاں فاصلے پر تھیں۔ وہ جب تک موڑ پر پہنچتیں گیٹ بند ہو چکا تھا۔ عاصم اس صورت حال پر ہکا بکا نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت سے فائدہ اٹھایا۔ اچانک میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ یہ وہی گردن تھی جو اکثر میری پہنچ سے بہت دور رہی تھی۔ آج ان لمحوں میں چاہتا تو اس گردن کو توڑ سکتا تھا لیکن میں نے عاصم کو فقط بے ہوش کرنے پر اکتفا کیا۔ عاصم کے حلق سے ناراض جنگلی درندے جیسی غراہٹ نکلی اور وہ ہینڈ بریک کی طرف لڑھک گیا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک اسٹیئرنگ پر دھرا تھا۔

شیخ کی طرف سے مطمئن ہو کر میں سوزوکی کار سے باہر نکلا۔ سائیں عالی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے کان سڑک سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ یقیناً میری طرح وہ بھی یہی جاننا چاہ رہا تھا کہ تعاقب میں آنے والی گاڑیاں کوٹھی کے آس پاس رکی تو نہیں ہیں۔ ایک دو منٹ میں یہ بات صاف ہو گئی کہ وہ لوگ اپنی رفتار میں سیدھے نکل گئے ہیں۔

سائیں عالی کا یوں نمودار ہونا ایک بار پھر حیران کر گیا تھا۔ مجھے انسپکٹر آنند کے گھر میں علی احمد سے جو اطلاعات ملی تھیں ان کے مطابق سائیں نے ریسٹ ہاؤس چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور یقیناً وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا لیکن اب ایک دن بعد میں اسے یہاں اس عالیشان کوٹھی میں آزاد دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے خود ہی اپنی پیٹھ تھپکی اور بولا ''بڑی ہمت ہے میری۔ کیسا کام دکھایا ہے۔ ویری گڈ گونگلو۔ ویری گڈ گونگلو۔''

پھر اس نے آگے بڑھ کر گاڑی میں پڑے بے ہوش

عاصم کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں بھی میری ہی طرح نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "شفیع محمد! سانپ کو پہلی فرصت میں مار دینا چاہیے یہ نکل جائے تو پھر لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ ہو نا۔ ختم کر دو اسے۔ خلاص کر دو۔ بالکل خلاص کر دو۔"

آخری الفاظ سائیں نے میرے بالکل قریب آکر ایک زہرناک سرگوشی کی شکل میں کہے تھے۔ سائیں کے لہجے میں انتہا درجے کی سنجیدگی اور سنگینی تھی۔

میں نے کہا "اس بارے میں اندر چل کر بات کرتے ہیں۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہاں اس کوٹھی میں کیسے پائے جا رہے ہو؟"

مجھے دس فیصد بھی امید نہیں تھی کہ سائیں میری بات کا جواب سنجیدگی سے دے گا۔ اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب خلافِ توقع سائیں نے آئیں بائیں شائیں نہیں کی اور دو ہیں کھڑے کھڑے سب کچھ بتا دیا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ کوٹھی اس کے ایک سری لنکن مداح کی ہے اس کا نام ڈاکٹر رودی داس ہے۔ وہ ایک ماہر آرتھوپیڈک سرجن ہے۔ اس نے سائیں عالی کو کل ایک مقامی پولیس اسٹیشن میں دیکھا اور فوراً بھاگ دوڑ کر کے اس کی ضمانت کرائی۔ یہ ڈاکٹر رودی داس کے غیر معمولی اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ سائیں عالی اس وقت پولیس اسٹیشن کی بجائے اس کوٹھی میں نظر آ رہا تھا۔ سائیں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "میرے جنات نے تمہیں اسی وقت دیکھ لیا تھا جب تم انسپکٹر آنند کے گھر سے نکلے تھے۔ بعد کی ساری کارروائی بھی ایک سینئر جن نے دیکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے گی، لہٰذا میں تمہارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی سڑک پر کھڑا ہو گیا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اب سائیں بے پر کی اڑانے لگے گا۔ لہٰذا میں نے اس کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "اگر تمہیں انسپکٹر آنند کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ آنند کی بیوی اور بچی کس حال میں ہیں۔ انہیں خطرے سے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ میں علی احمد کو ایک کال کر لوں۔"

میں نے واکی ٹاکی نکالا اور اس کے ذریعے علی احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی سی دشواری کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ علی احمد اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ وہاں مکمل خیریت ہے۔ آنند کی بیوی اسے بھائی کہہ کر مخاطب کر رہی ہے اور اس نے بچا بھی کھلایا ہے۔

میں نے کہا "اس کھانے کے شکریے کے طور سے نکل آؤ۔ لیکن اپنے دفاع کے لیے احتیاط ضرور۔ آنند کی بیوی اور بچی کو اپنے ساتھ لے لو۔ بچی اپنے ساتھ رکھو اور محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد ا... دو۔"

علی احمد نے کہا "شاید آنند کی بیوی اس طر ساتھ جانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرے۔ ویسے خیال ہے جناب! کہ آنند یا اس کی بیوی ہمیں دھو کوشش نہیں کریں گے۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آنند کی بیوی اور بچ لینے کی ضرورت نہیں؟" علی احمد نے میری بات اثبات میں ہلا۔ میں نے کہا "تو ٹھیک ہے۔ تم موقع پ اور صورتِ حال کو مجھ سے بہتر سمجھ رہے ہو۔"

"مجھے یہاں سے نکل کر کہاں جانا ہو گا جناب؟"

"فی الحال تو اپنے ڈیرے پر چلے جاؤ۔ صبح کھوج کوشش کرو کہ نیجر جے اور گازی وغیرہ تو سیہ کو ا شفٹ ہوئے ہیں لیکن یہ کام ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جناب!" علی احمد نے کہا

علی احمد سے بات ختم کرنے کے بعد میں سائیں ساتھ اندر کمرے میں آ گیا۔ میں شیخ عاصم کو بھی کند کر اندر لے آیا تھا۔ میں نے اسے سائیں کی نشست گاہ کے قالین پر لٹا دیا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز ر عاصم کی ایک آستین پر چند بڑے سوراخ نظر آئے تیزاب کے چھینٹوں سے ہوا تھا۔ میری نگاہ میں ... کے چہرے سے کھال اترنے کا منظر گھوم گیا۔ او سنگینی ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ ذہن میں سوا لیونا کہاں اور کس حال میں ہو گی۔ میں نے اسے کر کے اس کے حق میں بہتر ہی کیا تھا۔ ورنہ کیا معلوم اپنی بھیانک شبیہ دیکھ کر اپنی جان ہی لے لیتی۔

اسی دوران میں مضبوط جسم کا مالک ایک ما تامل اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ وہ قالین پر عاصم کے ساکت جسم کو دیکھ کر قدر ہوا۔ میری موجودگی نے بھی اسے متفکر کیا تھا۔ میں یونیفارم تھی اور وہ مجھے کوئی پولیس والا ہی سمجھ سائیں اسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور دلاسا کھسر پھسر کرتا رہا۔ بعد ازاں جب وہ شخص واپس آیا

کافی بدلا ہوا تھا۔ اس نے احترام اور عزت کے ساتھ ہمیں سلام کیا اور اپنا تعارف بھی کرایا۔ یہی سائیں عالی کا پرجوش عقیدت مند رودی داس تھا۔ اس گھر کا مالک بھی وہی تھا۔ رودی داس اور اس کی بیوی سائیں عالی کے لیے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔

کچھ دیر بعد رودی داس چلا گیا تو سائیں عالی نے قالین پر بے ہوش پڑے عاصم پر ایک شعلہ بار نگاہ ڈالی "بہتر تھا کہ تم ابھی اس سانپ کا سر کچل دیتے۔ خس کم جہاں پاک۔"

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے کہا "سائیں میں اسے موت سے کئی گنا بدتر زندگی دوں گا۔ تم دیکھتے رہو کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔"

"کئی درختوں کو جڑ سے اکھاڑنا پڑتا ہے ورنہ وہ پھر بوٹ نکلتے ہیں۔"

"میں اسے ایسا کاٹوں گا کہ یہ پھر نہیں پھوٹ سکے گا۔"

سائیں خاموش رہا۔ اس کی میلی کچیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

میں نے کہا "سائیں! تم نے بھی تو یہی بات کہی تھی ناں کہ دشمن کو مار دینا کوئی سزا نہیں، دشمن کو اس طرح زندہ رکھنا سزا ہے کہ وہ موت کی دعا مانگتا رہے۔"

"لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو اس کے ساتھ؟"

"شاید ابھی مجھے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔" میں نے عاصم کے بے ہوش جسم کے گرد ٹہلتے ہوئے کہا۔

وہ بے ہوش تھا لیکن پھر بھی اس کے چہرے پر دنیا جہان کی خباثت اور نخوت جمع تھی۔ اچانک میری نگاہ ڈاکٹر رودی داس کی اس تصویر کی طرف اٹھ گئی جو نشست گاہ کے مین دروازے کے عین سامنے آویزاں تھی۔ میں کچھ دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ایک نیا خیال بالکل ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا تھا۔

میں نے سائیں عالی سے پوچھا "ڈاکٹر داس تمہاری ہر بات مانتا ہے ناں؟"

"تم کیا منوانا چاہتے ہو؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ وہ تمہاری ہر بات مانے گا ناں؟"

"شاید مان لے گا۔ اسے معلوم ہے کہ میں اس سے کوئی غلط فرمائش نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے تم اسے یہاں بلاؤ۔ میں اس سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

سائیں نے چند لمحے سوچا، پھر جیسے اچانک وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر رضامندی کے آثار نظر آنے لگے۔ قریباً دو منٹ بعد سائیں کی ہدایت پر سرجن ڈاکٹر رودی داس ہمارے پاس نشست گاہ میں موجود تھا۔

○☆○

یہ آٹھ دس روز بعد کی بات ہے، ڈاکٹر داس کی رہائش گاہ پر علی احمد کا فون آیا۔ وہ یہاں تین چار بار فون کر چکا تھا۔ جب سے میں نے اسے ڈاکٹر داس کا فون نمبر دیا تھا، واکی ٹاکی کا استعمال خود بخود ترک ہو گیا تھا۔ علی احمد کے اس تازہ فون کے ذریعے ایک اہم اطلاع ملی۔ وہ بالآخر نیجر جے اور رباری وغیرہ کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا تھا۔ تو سیہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ لوگ قریباً ڈیڑھ ہفتہ پہلے ریسٹ ہاؤس سے نکل کر کولمبو کے شمالی علاقے میں سفر کرتے ہوئے پونگا ویلا پہنچے تھے۔ "پونگا ویلا" سری لنکا کے شمال مغربی صوبے کا بہت اہم شہر ہے۔ یہاں نیجر جے کا ایک قریبی دوست چائے کا کاروبار کرتا تھا اور اس کی دو تین رہائش گاہیں بھی موجود تھیں۔ ان لوگوں نے "پونگا ویلا" میں چار پانچ روز قیام کیا تھا اور پھر واپس کولمبو آ گئے تھے۔ اب وہ لوگ کولمبو شہر کے ایک وسطی محلے پیٹا (PATTA) میں مقیم تھے۔ میں ایک دو دفعہ پہلے بھی پیٹا جا چکا تھا۔ یہ کافی گنجان علاقہ تھا۔ یہاں زیادہ تر مدراسی یعنی تامل نژاد باشندے آباد تھے۔ پٹھان بھی اکثر دکھائی دیتے تھے۔ جے کے کوئی دور کے رشتے دار پیٹا میں رہتے تھے۔ آج کل وہ جافنا گئے ہوئے تھے اور ان کا گھر خالی تھا۔ جے نے پندرہ روز قیام کرنے کے لیے اس جگہ کو محفوظ خیال کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ جے کی حکمتِ عملی بھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کولمبو کی پولیس انہیں صاف ستھرے پوش علاقوں میں تلاش کرے گی۔ پیٹا ایک گنجان اور کسی حد تک آلودہ علاقہ تھا۔ یہاں غریب اور متوسط طبقے کے لوگ رہائش رکھتے تھے۔

میں نے علی احمد سے اس جگہ کا مکمل ایڈریس معلوم کر لیا جہاں جے اور رباری وغیرہ مقیم تھے۔

رات قریباً نو بجے کے لگ بھگ میں ڈاکٹر داس کی کوٹھی کے پاس سے ٹیکسی پر سوار ہو کر نکلا اور پیٹا کی طرف روانہ ہو گیا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ کولمبو کی سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ چائے خانوں میں رونق تھی۔ موسیقی بج رہی تھی۔ ناریل کے تیل میں پکے ہوئے پکوانوں کی خوشبو چار سو پھیلی تھی۔ ہم ساحل کے قریب سے ہو کر نکلے پھر گال روڈ پر پہنچے اور وہاں سے شہر کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے چہرے اور حلیے میں معمولی سی تبدیلیاں کی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ آسانی سے

پہچانا نہیں جاسکوں گا۔ پچھلے چھ سات روز تک مقامی پولیس نے مجھے اور عاصم کو پاگلوں کی طرح کولمبو کے طول و عرض میں ڈھونڈا تھا مگر اب ان کی تلاش کچھ ماند پڑگئی تھی۔ یہ ویسے بھی اتوار کا روز تھا۔ اتوار کے روز کولمبو میں پولیس کم کم ہی دکھائی دیتی تھی' ٹریفک پولیس کا بھی زیادہ اثر و رسوخ نظر نہیں آتا تھا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے میں پیٹہ تک پہنچ سکے۔ میں کرایہ دے کر ٹیکسی سے اتر گیا اور اپنی چھتری کھول لی۔ پیٹہ کا ماحول ذہن میں لانے کے لیے لاہور کی اکبری منڈی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ تاہم کئی لحاظ سے یہ دونوں علاقے مختلف بھی ہیں۔ پیٹہ میں اجناس کی بڑی بڑی دکانیں اور گودام وغیرہ ہیں مگر رات کے اس پہر یہ سارے بازار بند تھے۔ میں نے ایک دکان سے سگریٹ خریدے اور اپنی مطلوبہ گلی کے بارے میں پوچھا۔ دکان دار پنجابی تھا اور سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔ اس کی جوان سال بیوی بھی دکان داری میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ اپنی بھیگی ہوئی ساڑھی کے ساتھ تیزی سے ادھر ادھر حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دو گاہک تو شاید اسے ہی دیکھنے کے لیے سگریٹ خریدنے پر مجبور ہوگئے تھے۔

رم جھم برستی بارش میں چھتری تانے میں اس مکان کے سامنے پہنچ گیا جہاں میری معلومات کے مطابق۔ جے اور باری وغیرہ موجود تھے اور ان کے ساتھ شیخ کی شعلہ مزاج۔ فتنہ سامان بہن توسیہ بھی پائی جاتی تھی۔ مکان کے اندر سے موسیقی کا بلند شور سنائی دے رہا تھا۔ غالباً ٹیپ ریکارڈر پر انڈین گانے بجائے جارہے تھے۔ میرے اندازے کے برخلاف یہ ایک کافی بڑا حویلی نما مکان تھا۔ گنجان علاقوں میں ایسے بڑے مکان شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس حویلی نما مکان کا بہت بڑا دروازہ منقش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ میں نے دستک دی تو ایک سنہالی باہر آیا۔ اس نے بڑی تفتیشی نظروں سے سرتاپا میرا جائزہ لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں گھر کے سربراہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ پہلے تو اس نے کہا کہ وہی گھر کا سربراہ ہے اور گھر میں اس کی بیوی اور بچے کے سوا اور کوئی نہیں' لیکن جب میں نے جے اور ریسٹ ہاؤس کا اشارہ دیا تو وہ چونک گیا اور جلدی سے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک اور شخص باہر آیا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کے ملازمین میں شامل تھا۔ اس کا نام سنگھاشی تھا۔ وہ مجھے تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ میرے چہرے پر مونچھیں تھیں' آنکھوں پر سادہ شیشوں کی عینک تھی اور بالوں کا رنگ بھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے ایک دو باتیں کیں تو وہ میری آواز پہچان گیا اور یہ بھی جان گ نے اپنے چہرے میں تبدیلی کر رکھی ہے۔ اس کے سا ایک دم بہت مئودب نظر آنے لگا۔ مجھ سے معذرت تیزی سے اندر چلا گیا۔

پانچ منٹ بعد میں اس کشادہ عمارت کے ایک میں جے اور باری کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں کے چہ دبا جوش نظر آرہا تھا اور وہ مجھے پھر سے اپنے درمی خوش بھی تھے۔

جے نے کہا "پچھلے دس بارہ روز ہم نے بڑی پر گزارے ہیں جناب! اپنا دھڑکا لگا ہوا تھا اور آپ کی سے بھی فکر تھی۔ اخباری خبریں مزید پریشان کر رہی تھ

"یہی کیفیت میری بھی رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کو یہاں کا پتا کیسے چلا؟" باری نے پوچھا۔

"یہ علی احمد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ ٹھکانا بھی بہت زیادہ محفو ہے۔"

"یہی میں سوچ رہا ہوں جناب!" باری نے کہا۔

"توسیہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ میرے سوا دونوں ایک دم خاموش ہوگئے۔ میرا ذہن اندیشوں کی بن گیا "تم بولتے کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔

"توسیہ یہیں ہے جناب۔ اور خیریت سے ہے۔ نے کہا "بس اس کے رویے نے پریشان کر رکھا ہے۔"

"کیا کرتی ہے؟"

"وہی سب کچھ جو اب تک کرتی رہی ہے۔ اس بات کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو بالکل چھ ہے اس نے برتن اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ چیختی چلاتی کبھی کھانا کھانے سے انکار کردیتی ہے' کبھی مارنے کو ہے۔ ہم نے ایک بالکل اندرونی کمرے میں رکھا ہ اسے پھر بھی کسی وقت اتنا غل مچاتی ہے کہ آواز باہر تک لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں بڑے زور سے میوزک لگانا پڑتا ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب تھوڑی دیر پہلے میں مکا دروازے پر پہنچا تھا تو پرشور موسیقی سنائی دے رہی تھی

میں نے باری کو تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ مت ٹھیک ہوجائے گا۔ جو کام آرام سے ہوتا ہے وہ اچ ہے۔"

میں نے باری اور جے سے وہ حالات پوچھے جو بعد پیش آئے تھے' اس کے بعد میں نے انہیں اپنے

بتائے۔ کچھ خبریں تو اخباروں کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ باقی تفصیلات میں نے بتادیں۔ جے لیونا کے بارے میں فکرمند تھا۔ پوچھنے لگا "میڈم کا کیا بنا ہے جناب؟"

میں نے کہا "تمہیں اس بارے میں کتنا معلوم ہے؟"

وہ بولا "اخباری خبریں تو یہ ہیں کہ شیخ عاصم رقابت میں اندھا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی سابق فرانسیسی گرل فرینڈ کو ریسٹ ہاؤس سے اغوا کرکے لے گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک گارڈ کو بھی اغوا کرلیا تھا۔ آپ نے اپنی گاڑی پر اس کا پیچھا کیا اور جنگل میں کئی گھنٹے آپ کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ اس دوران میں آپ کی یا شیخ کی گولی سے گارڈ مجید ہلاک ہوگیا۔ پولیس نے موقعۂ واردات کا کھوج لگایا اور آپ کو گھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ پولیس آپ تک پہنچ کر آپ کو پکڑتی' شیخ عاصم میڈم لیونا کو لے کر موقع سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تب بار پھر آپ نے اس کا پیچھا کیا۔ آپ شیخ کے تعاقب میں تھے اور پولیس آپ کے تعاقب میں تھی۔ اسی دوران میں آپ کی گاڑی الٹ گئی۔ آپ اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی روز رات کو آپ نے شیخ عاصم تک رسائی حاصل کرلی۔ آپ فرسٹ اسٹورز کے اندر گھسے اور کڑے پہرے کے باوجود شیخ عاصم کو جالیا۔ شیخ عاصم نے مایوسی کے عالم میں لیونا پر تیزاب پھینک دیا۔ آپ شیخ کی گردن پر پستول رکھ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد آپ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ پولیس آفیسر ٹیلور نے لیونا کو شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ وہاں وہ اب تک زیر علاج ہے۔ اس کا چہرہ بالکل برباد ہوچکا ہے۔"

میں نے کہا "لیونا کے بارے میں جو کچھ تمہیں معلوم ہے مجھے بھی وہی معلوم ہے۔ اس میں بس تم اتنا اضافہ کرسکتے ہو کہ لیونا شاید دو چار روز میں فرانس منتقل ہو رہی ہے۔ اس کے والدین اسے لینے کے لیے یہاں پہنچ رہے ہیں۔" میں نے ایک لمحہ توقف کرکے سگریٹ سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے جو باقی باتیں بتائی ہیں وہ بھی کافی حد تک درست ہیں۔ سوائے اس کے کہ گارڈ مجید فائرنگ میں ہلاک نہیں ہوا بلکہ شیخ نے اس کی کمر میں گولی مار کر اسے قتل کیا تھا۔ اس کے علاوہ گاڑی الٹنے کے بعد جب میں فرار ہوا تو میں اکیلا تھا۔ میرے "دو ساتھیوں" والی بات بھی غلط ہے۔ شاید پولیس نے غالباً اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے کہا ہے۔"

شاید ابھی ہماری گفتگو جاری رہتی' لیکن اچانک حویلی نما مکان کے کسی اندرونی حصے سے مدھم چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یقیناً یہ توسیہ کی آوازیں ہی تھیں۔ باری نے جے کو اشارہ کیا۔ اس نے اٹھ کر کیسٹ پلیئر آن کردیا۔ ایک مدراسی گانا زور و شور سے بجنے لگا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش مسلسل برس رہی تھی۔

ہم اٹھ کر مکان کے اندرونی حصے میں پہنچے۔ در و دیوار میں الائچی' کالی مرچ اور دار چینی وغیرہ کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر جے نے بتایا کہ پڑوس میں مسالہ جات کا بہت بڑا اسٹور ہے۔ ایک تنگ راہداری سے گزر کر ہم ایک بند دروازے کے سامنے پہنچے۔ مکان کے اکثر دروازوں کی طرح یہ بھی منقش تھا۔ ایک کھڑکی میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کو باہر سے کنڈی چڑھائی جاسکتی تھی۔ جے نے کنڈی اتار کر کھڑکی کھولی۔ سامنے توسیہ نظر آرہی تھی۔ وہ ایک بار پھر جلون قمیص میں تھی۔ بوائے کٹ بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ ایک پاؤں پر جلنے کا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں جے کی اوٹ میں تھا وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ جونہی کھڑکی کھلی اور جے پر اس کی نظر پڑی' وہ انگلش میں اسے صلواتیں سنانے لگی۔ وہ اس کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکیاں دے رہی تھی اور یہ دھمکیاں صرف جے کے لیے ہی نہیں تھیں اس کے پورے خاندان اور عزیز و اقارب کے لیے تھیں۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اپنے لیے بیئر طلب کر رہی ہے۔ چند دن پہلے جے نے غلطی سے اس کی یہ فرمائش پوری کردی تھی' اب وہ بضد تھی کہ اسے بیئر کی بڑی بوتل فراہم کی جائے۔ جے نے کہا "یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں آپ کو ہر جائز سہولت فراہم کر رہا ہوں اور آئندہ بھی کروں گا لیکن۔۔۔"

اچانک توسیہ نے شیشے کی ایک ایش ٹرے کھڑکی پر کھینچ ماری۔ ایش ٹرے آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر چور چور ہوگئی۔ کچھ کرچیاں یقیناً جے کو بھی لگی تھیں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ توسیہ ایک بار پھر گالیاں بکنے لگی۔ اس کے انداز میں نسوانیت کی کوئی جھلک نہیں ملتی تھی۔ آج بھی وہ وہی کھڑی تھی جہاں میں نے اسے سری لنکا آنے کے بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ وہی غرور' وہی ہٹ دھرمی' وہی پھاڑ کھانے والے اطوار۔ وہ چند قدم آگے آئی تو دفعتاً اس کی نگاہ مجھ پر پڑگئی۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس کے چہرے نے رنگ بدلا اور غیظ و غضب کی جگہ خوف آمیز حیرانی نے لے لی پھر حیرانی اور خوف دونوں اوجھل ہوگئے اور ان کی جگہ ایک شعلہ فشاں نفرت چہرے کو ڈھانپنے لگی۔ اس نے رخ پھیرا اور بڑبڑاتی ہوئی ایک گوشے میں صوفے پر جا بیٹھی۔ وہ مجھے دیکھنے کی زحمت بھی

نہیں کر رہی تھی۔

چند دن پہلے ریسٹ ہاؤس میں میں نے اپنی جان شدید خطرے میں ڈال کر قوسیہ کی جان بچائی تھی۔ ایسے لمحات میں اس کی مدد کی تھی جب اس کا سگا بھائی بھی چیخ چلا کر اور تصویر حسرت بن کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ شاید میرے اس عمل نے قوسیہ کے دل میں کوئی گداز پیدا کیا ہو۔ اس کی سنگلاخ فطرت میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہو لیکن آج قوسیہ کے چہرے پر وہی کم عقلی دیکھ کر دل پر چوٹ پڑی تھی۔ کیا لوگ ایسے بے حس بھی ہوتے ہیں؟ دل سے فوراً آواز آئی یقیناً ہوتے ہیں۔ تبھی تو پھانسی گھاٹ تعمیر ہوتے ہیں' تبھی تو مہلک ترین ہتھیار بنتے ہیں' تبھی خوں ریز جنگیں ہوتی ہیں اور اخباروں کی خوں رنگ شہ سرخیاں وجود پاتی ہیں۔

مجھے دیکھ کر اتنا ضرور ہوا تھا کہ قوسیہ کا جاہ و جلال ایک دم ماند پڑ گیا تھا اور وہ بجھی بجھی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "دیکھو! تم ایسی شاخ نہ بنو جو ذرا سی لچک بھی نہیں رکھتی اور تڑاخ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ مجھے تمہارا انجام کچھ اچھا نظر نہیں آرہا۔"

اس نے میری طرف نہیں دیکھا' لیکن زہریلے انداز میں پھنکار کر بولی "چلے جاؤ۔ تم سب چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں کہتی ہوں اکیلا چھوڑ دو۔"

وہ ایک دم اٹھی اور اس نے زور دار آواز سے کھڑکی بند کر دی۔ میں نے باری اور بے کو اشارہ کیا اور ہم نشست گاہ میں واپس آ گئے۔

میں نے رات وہیں گزاری۔ اگلے روز باری نے مجھے وہ قیمتی سامان دکھایا جو وہ لوگ ریسٹ ہاؤس سے نکلتے وقت ساتھ لے آئے تھے۔ اس سامان میں میری نہایت قیمتی گھڑی بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ ڈھائی تین لاکھ کے کرنسی نوٹ تھے۔ لیونا کے کچھ قیمتی زیورات اور اسی قسم کی دوسری اشیاء شامل تھیں۔ لیونا کے زیورات میں فیروزے کا وہ نہایت بیش قیمت سیٹ بھی شامل تھا جس پر لیونا لٹو ہوئی تھی اور پھر شیشے میں اترتی چلی گئی تھی۔ فیروزے کا سیٹ دیکھ کر لیونا کا بگڑا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ انسان کو لالچ کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اشیاء موجود ہوتی ہیں مگر انہیں استعمال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا' یا اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اشیا استعمال کر سکے۔

میں نے لیونا کا سارا قیمتی سامان ایک پارسل کی شکل میں پیک کروا دیا۔ اسی دوران میں ڈاکی ٹاکی پر علی احمد سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں نے علی احمد کو پیٹہ کے اس مکان میں بلوا لیا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ تاہم اسے ہدایت کی کہ وہ آ... ہوئے اپنے تعاقب سے باخبر رہے اور خصوصی احتیاط کرے۔ ایک گھنٹے بعد علی احمد پہنچ گیا۔ میں نے اس سے لیونا کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ علی احمد نے بتایا' لیونا' کولمبو کے سب سے مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں زیر علاج ہے اور اس کے زخموں کا علاج ہو رہا ہے۔ میں نے علی احمد کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کسی طرح یہ پارسل لیونا تک پہنچائے گا۔ علی احمد نے یہ ذمے داری بخوشی قبول کر لی۔ میں نے ایک مختصر خط بھی لکھ کر پارسل میں رکھ دیا تھا۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

"لیونا ڈیئر! یہی زندگی ہے۔ انسان جی جی کر مرتا ہے اور مر مر کر جیتا ہے۔ جن لوگوں کی خواہشات زیادہ ہوتی ہیں انہیں مصائب بھی زیادہ برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ تم پر ایک بہت بڑی مصیبت آئی ہے۔ امید ہے کہ تم اس مصیبت کا حوصلے اور جرأت سے مقابلہ کرو گی۔ تمہارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ اس دولت میں تھوڑے سے مزید اضافے کے لیے یہ پارسل بھی حاضر ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم دنیا میں موجود بہترین طبی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہو۔ پلاسٹک سرجری سے تمہارے کھوئی ہوئی خوب صورتی لوٹ آئے گی۔ تم امریکا یا یورپ کے کسی ایسے شہر میں جا کر پرسکون اور پرعیش زندگی گزار سکتی ہو جہاں کسی کو تم پر گزرنے والے سانحے کا علم نہ ہو۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں تمہاری "قدرتی خوب صورتی" کو شیخ عاصم کے غضب سے بچا نہ سکا۔ تاہم مجھے اتنی تسلی بھی ہے کہ میں تمہاری زندگی بچانے میں کامیاب رہا۔ تم ایک بے چین روح کی مالک ہو خدا سے دعا ہے کہ تمہاری بے چینی کو قرار ملے اور تم مختصر خواہشوں کے ساتھ طویل زندگی گزار سکو۔ شیخ عاصم تمہارا مجرم ہے۔ تمہارا ہی نہیں وہ بہت سے دوسرے لوگوں کا مجرم بھی ہے۔ شیخ کو اس کے گناہوں کی قرار واقعی سزا ملے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

تمہارا خیر اندیش شاہ زیب

اگلے روز شام تک علی احمد نے یہ پارسل لیونا تک پہنچا دیا۔

○☆○

یہ تین ہفتے بعد کا ذکر ہے۔ میرے کندھے کا زخم اب ٹھیک تھا۔ میں باری اور قوسیہ وغیرہ کے ساتھ پیٹہ کے اسی حویلی نما مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ابھی حالات ایسے نہیں تھے کہ ہم اس گنجان علاقے سے کہیں اور منتقل ہو سکتے۔ باری کی رائے بھی یہی تھی کہ ہمیں کہیں اور منتقل ہونے کے لیے ایک ہفتہ مزید انتظار کرنا ہوگا۔

باری کے آجانے سے قوسیہ کا جارحانہ رویہ کسی حد تک کم ہو گیا تھا لیکن باری کا سایہ بھی وہ اپنے نزدیک برداشت نہیں کرتی تھی۔ وہ جلد از جلد آزادی چاہتی تھی لیکن میں نے اسے واضح الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ جب تک وہ اپنے شوہر کی فرماں بردار نہیں ہو جاتی آزادی کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ قوسیہ ریسٹ ہاؤس میں لگنے والی آگ میں اپنے باپ شیخ عاصم کو دیکھ چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ عاصم اب میری تحویل میں ہے یا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کئی بار عاصم کے بارے میں مجھ سے پوچھ چکی تھی میں نے ہر بار اسے ٹال دیا تھا اور کہا تھا کہ آتش زدگی کی رات کے بعد سے مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

وہ کولمبو کا ایک چمکیلا اور روشن دن تھا۔ میں گھر سے نکلا اور پیدل ہی گال روڈ کی جانب چل دیا۔ میں پیٹہ کے گنجان علاقے سے گزر رہا تھا۔ اجناس کا کاروبار زوروں پر تھا۔ مختلف قسم کے اناج اور دالوں وغیرہ کی بوریاں چڑھائی اور اتاری جا رہی تھیں۔ ہر طرف مسالہ جات کی خوشبو تھی۔ سری لنکا کو ویسے بھی مسالہ جات کا گھر کہا جاتا ہے۔ میں نے پنجابی اور ذیل آڑھتیوں کو دیکھا جو بڑی محویت سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھے۔ میں نے چہرے میں جو تھوڑی بہت تبدیلیاں کی تھیں وہ ابھی تک برقرار تھیں۔ مجھے امید تھی کہ اب لوگ مجھے بآسانی پہچان نہیں سکیں گے۔ اس کا ثبوت مجھے جلد ہی مل گیا۔ میں ایک فروٹ مارکیٹ میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ انسپکٹر آنند پر پڑ گئی۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ ہاتھ میں ایک فائل لیے وہ اپنے باوردی ماتحت کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزر گیا تو میں نے عقب سے اسے آواز دی۔ وہ ایک دم گھوم کر دیکھنے لگا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ میری ہلکی سی مسکراہٹ نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ اچانک اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ اس کا ماتحت چند گز دور کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیسے ہو دوست؟"

"سب۔ بالکل ٹھیک ہوں جی۔" وہ ہکلا کر بولا۔

میں نے کہا "اپنے ماتحت کو بھیج دو۔ ہم کچھ باتیں کریں گے۔ میں تم سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ یہ ایک اچھا اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات ہو گئی۔"

میری ہدایت پر آنند نے اپنی فائل اپنے باوردی ماتحت کو دی اور اسے آگے بھیج دیا۔ ہم پہلو بہ پہلو اس بھرے ہوئے بازار میں چلنے لگے۔ میرے یوں اچانک مل جانے نے آنند کو ششدر کر دیا تھا اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنند کو میں نے آخری بار قریباً ۳۳ دن پہلے اس وقت دیکھا تھا جب شیخ عاصم اپنی رہائش گاہ سے باہر میری گرفت میں تھا اور کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پندرہ بیس گز آگے گئے پھر میں ایک جگہ پر رک گیا۔ یہ نچلے درجے کا ایک چائے خانہ تھا۔ بہت سے میلے کچیلے لوگ خستہ حال کرسیوں پر بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ایک فربہ اندام ادھیڑ عمر شخص نے اٹھ کر بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ اس کی سفید داڑھی بالکل چھوٹی چھوٹی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لمبا چوغہ پہن رکھا تھا۔ یہی باٹھا سیادھو تھا۔ اس کے اردگرد ہر وقت بھک منگوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ اس وقت بھی باٹھا کے چائے خانے

قیمت 125 روپے
راکھشس
راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

پر ان گنت بھک منگے موجود تھے اور سستے واموں' چائے بسکٹ اور رس وغیرہ اڑا رہے تھے۔

میں نے بالھا سے ایک دو باتیں کیں۔ میرے منع کرتے کرتے بھی بالھا نے کوک کی بوتلیں منگوالیں۔ بوتلیں پی کر ہم واپس چل دیے۔ انسپکٹر آنند کچھ خاموش نظر آرہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "اس بندے کو جانتے ہو؟"

آنند نے اثبات میں سر ہلایا "اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ بالھا ہے۔ بالھا ساؤ ھو' اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"

"اسے بھک منگوں کا چیئرمین بھی کہا جاتا ہے۔ شروع شروع میں یہ شخص جرائم میں بھی ملوث تھا۔ سنا ہے کہ جب یہ "کلکتے" میں تھا تو وہاں اس پر سنگین قسم کے کیس بھی بنے تھے۔ اس پر الزام تھا کہ یہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر انہیں معذور بناتا ہے اور پھر ان سے بھیک منگواتا ہے۔ اس کیس میں اسے پانچ چھ سال کی قید بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ بہت بدل چکا ہے۔ بھکاری اسے اپنا لیڈر سمجھتے ہیں۔ یہ اب بھی معذور افراد سے دیہاڑی پر بھیک منگواتا ہے' لیکن اب یہ لوگوں کو معذور بناتا نہیں ہے۔ جن بھکاریوں کے جسموں میں کوئی معذوری ہوتی ہے' وہ اس کے پاس آتے ہیں اور اپنی معذوری کے حساب سے یہ ان کی دیہاڑی مقرر کردیتا ہے۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بالھا کے بارے میں تمہاری معلومات درست ہیں۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ایک تنگ گلی سے گزرے۔ یہاں آڑھتیوں' بیوپاریوں اور تھوک و پرچون کے خریداروں کا رش تھا۔ بھاؤ تاؤ ہو رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دھوپ تیز ہوگئی تھی اور گرمی بڑھتی جارہی تھی۔ سری لنکا کی مخصوص حبس کے سبب پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ ہم جس گلی سے گزرے وہاں دیواروں کے ساتھ ساتھ کئی بھکاری بیٹھے تھے۔ کوئی اندھا تھا' کوئی پاؤں سے معذور تھا۔ ایک نہایت دبلا پتلا سنہالی ایک ہتھ ریڑھی پر بیٹھا تھا۔ اس کا آدھا جسم صحیح تھا اور آدھا سوکھ کر کانٹا ہوچکا تھا۔ ٹیپہ محلے کی اس گلی کو بھکاریوں والی گلی بھی کہا جاتا تھا۔ ایک جگہ گلے سڑے فروٹ کا بڑا ڈھیر لگا تھا' معذور بھکاری اس میں سے مطلب کا فروٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ قریب ایک بوڑھا سنہالی ایک ہتھ ریڑھی لیے کھڑا تھا۔ اس ریڑھی پر بھی ایک بھکاری موجود تھا۔ اس کے دونوں بازو کندھوں پر سے اور دونوں ٹانگیں ناف کے بالکل پاس سے غائب تھیں۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر ٹیڑھا ہوچکا تھا اور منہ سے مسلسل رال رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر حلق سے غوں غاں آوازیں نکالیں تو معلوم ہوا کہ اس کی زبان بھی کٹی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا اور چہرے کے باقی بال جھنکاڑ کی شکل اختیار کررہے تھے۔ بازو اور ٹانگیں کٹ سے اس کا جسم بہت مختصر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کی ریڑھی پر چند سکے ڈالے اور باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں آنند سے وعدہ کرچکا تھا کہ اگر وہ عاصم تک پہنچنے میں میری مدد کرے گا تو میں انعام میں ایک معقول رقم دوں گا۔ میں جانتا تھا کہ آنز اس کی پتنی اروناکو اس رقم کا انتظار ہوگا۔ میں نے آ مسٹر کلارک کے ایک برانچ آفس کا پتا سمجھایا اور وہ بھی بتایا جس پر چل کر اسے رقم حاصل کرنا تھی۔ آنند وم خوش نظر آنے لگا۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ جیسے اچانک آنند کو کوئی بات یاد آئی۔ وہ ذرا جھجکتے ہو۔ "آپ نے ابھی تک شیخ عاصم کے بارے میں نہیں بتایا کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ابھی مجھے خود بھی اس کے بارے میں سے معلوم نہیں۔"

میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ کچھ دیر پہلے وہ عاصم کو دیکھ چکا ہے۔ بالھا کے انہی وفا داروں میں جو "بھکاریوں والی گلی" میں کلبلا رہے تھے سوا تین فٹ لمبا گوشت کا لوتھڑا عاصم ہی تو تھا جس کے سے رال بہہ رہی تھی اور جو حلق سے غوں غاں کی آوا نکال رہا تھا۔ چند روز پہلے تک وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا آج اپنے جسم سے کھیاں تک نہیں اڑا سکتا تھا۔ ہاں! بھیانک چہرے والی لیونا کا مجرم۔ ایسی نہ جانے کتنی لیونا کتنی فزالائیں اور کتنے ساہی صاحب اور کتنے شاہ جہاں کے ظلم کی چکی میں گندم کے دانوں کی طرح پسے تھے! کتنے مرچکے تھے اور کتنے زندہ درگور تھے۔ ہاں میں آ نہیں بتا سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ آنند کوئی مزید سوال پوچھتا' ہم گئے۔ مجھے جے دکھائی دے دیا۔ وہ تیزی سے ہماری' آرہا تھا۔ یقیناً کوئی تشویش ناک بات تھی ورنہ پچھلے بائیس دن میں وہ ایک بار بھی اس حویلی نما مکان سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کے قدموں تیزی آگئی۔

جے میرے قریب پہنچا تو میں نے کہا "کیا بات ہے۔ تم کیوں ہانپ رہے ہو؟"

خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "مس توبیہ نے بہت ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اب تو پڑوس پڑوس والے بھی پوچھ رہے ہیں کیا ہو رہا ہے۔"

"کیا کیا ہے اس نے؟"

"باتھ روم سے پانی کی نکاسی کا راستہ بند کرکے سارے نل کھول دیے ہیں۔ پانی سارے گھر میں پھیل رہا ہے۔ باہر پہنچ رہا ہے۔ سامنے والے مندر سنگھ صاحب پوچھ رہے ہیں کیا مسئلہ ہے۔ وہ مسلسل چیخ و پکار بھی کررہی ہیں۔ وہ رکی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا شاید مطالبہ پورا ہوجائے ان کا۔ میں نے ایک چھوٹی بوتل ملازم سنگھاشی کے ہاتھ بھیجی۔ مس توبیہ نے بوتل کھینچ کر کھڑکی کی سلاخوں پر ماری۔ سنگھاشی کا اوپر والا ہونٹ کٹ گیا ہے اور ایک دانت ٹوٹ گیا ہے۔"

میں نے آنند کو وہیں خدا حافظ کہا اور جے کے ساتھ رہائش گاہ پر پہنچا۔ حویلی نما مکان کے مین دروازے کے نیچے سے پانی بہہ بہہ کر گلی میں آرہا تھا۔ حسب معمول رہائشی کمرے میں ٹیپ ریکارڈر زور و شور سے بج رہا تھا۔ سیگل کی آواز گلی کے آخری سرے تک پہنچ رہی تھی۔ میں جے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ راہداری میں بھی پانی تھا۔ نشست گاہ کا قالین پانی سے بھیگ چکا تھا۔ ہم نے شارٹ کٹ راہداری اور کمروں کے اندر سے گزر کر اس اندرونی کمرے میں پہنچ گئے جہاں توبیہ کو رکھا گیا تھا۔

وہ خوں خوار جانور کی طرح بھڑکی ہوئی تھی۔ اس کے کمرے میں دو دو انچ پانی کھڑا تھا۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ کچھ دیر پہلے بیئر کی جس بوتل نے سنگھاشی کو زخمی کیا تھا اس کی کرچیاں سلاخ دار کھڑکی کے قریب بکھری ہوئی تھیں۔ جے کو دیکھتے ہی توبیہ چیخنے لگی "دفع ہوجا یہاں سے۔ اپنی منحوس صورت لے کر' چلا جا میرے سامنے سے' میں کہتی ہوں چلا جا حرام زادے۔"

وہ اسے مارنے کے لیے کمرے میں کوئی چیز ڈھونڈنے لگی لیکن ایسی کوئی چیز اسے دکھائی نہیں دی۔ میں نے کہا "دیکھو توبیہ! تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ یہ نلکے بند کردو اور نکاسی کھول دو۔"

"ورنہ کیا ہوگا۔" وہ چیخی "کیا کرو گے تم؟ مجھے جان سے مار دو گے۔ مار دو مجھے جان سے۔"

"تم جانتی ہو توبیہ' مرنا کسی شخص کے لیے بھی اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کا تجربہ تم کچھ عرصہ پہلے کرچکی ہو۔ وہ تمہاری چھری ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔ اگر تم اسے خودکشی وغیرہ کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہو تو میں ابھی پیش کرسکتا ہوں۔"

توبیہ چیخی "لاؤ چھری۔ دو مجھے۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔"

"تم بکواس کررہی ہو۔"

"تم بکواس کررہے ہو۔ تمہارے منہ میں کتے کی زبان ہے۔" وہ چنگھاڑی اور پھر ایک دم گالیوں پر اتر آئی۔

پچھلے چند دنوں میں جو تھوڑی سی نرمی میرے لیے اس کے رویے میں نظر آئی تھی۔ وہ یکسر غائب ہوچکی تھی۔ میں نے بھڑکتے شعلوں میں کود کر اسے بچایا تھا۔ اگر کوئی یاد رکھنے والا ہوتا تو یہ بات ساری عمر یاد رکھ سکتا تھا لیکن وہ بدفطرت چند دنوں میں بھول گئی تھی۔

میں نے جے سے کہا "چابی مجھے دو۔"

جے کے چہرے پر ہراس نظر آیا' بہرحال وہ بولا کچھ نہیں۔ اس حوالے سے وہ ایک دفعہ پہلے بھی مجھ سے ڈانٹ کھا چکا تھا۔ اس نے جیبیں ٹٹولیں اور بند دروازے کی چابی میرے حوالے کردی۔ یہ دروازہ ہمہ وقت بند رہتا تھا۔ توبیہ کو جو اشیاء کمرے میں پہنچائی جاتی تھیں ان کے لیے سلاخ دار کھڑکی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ میں نے یہاں بیضوی شکل کی ایک دو رکابیاں دیکھی تھیں جو بآسانی سلاخوں میں سے گزر سکتی تھیں۔

جے سے چابی لے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ توبیہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور بالکل بے حرکت نظر آتی تھی۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ہتھیار کے نام پر توبیہ کے پاس کوئی شے نہیں۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ شیشے کا کوئی ٹکڑا یا اس طرح کی نوک دار شے اس کے پاس موجود ہو۔ میں نزدیک پہنچا تو حسب توقع وہ خوں خوار بلی کی طرح چیخ کر مجھ پر جھپٹی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنے ناخنوں سے میری آنکھیں نوچ لینا چاہتی ہو۔ میں نے تیزی سے حرکت کرکے اس کی دونوں کلائیاں دبوچ لیں۔ اب یقینی بات تھی کہ وہ ٹانگیں چلائے گی۔ میں نے ایک گھٹنا موڑ کر اپنی ناف کے سامنے کرلیا اور اس کی ساری ضربیں پنڈلی اور گھٹنے پر روکیں۔ پانچ دس سیکنڈ کی شدید کشمکش کے بعد وہ بری طرح ہانپ گئی۔ اپنی اس کوشش کے دوران میں وہ ایک بار گری بھی۔ فرش پر پانی کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے بالکل ہی بھیگ

گھنے اس کا ہانپتا ہوا بدن' باریک لباس کے اندر سے صاف نظر آ رہا تھا وہ اپنے تن من سے بے خبر اپنے منہ سے نفرت کے شعلے نکال رہی تھی۔

اچانک اس کی ایک کلائی میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ وہ کسی پاگل جانور کی طرح مجھ پر جھپٹی اور اپنے دانتوں سے میرے کندھے کا گوشت ادھیڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے بوائے کٹ بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور لگا کر اس کا سر پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ایک بار پھر میرے بازو پر کاٹنے کی اندھا دھند کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ بھیگ گئی تھی اور چکنی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل پھسل جا رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح دروازے تک پہنچ جائے اور پھر دوڑتی ہوئی باہر نکل جائے۔ میں نے اسے ایک دو تھپڑ رسید کیے۔ جب وہ بالکل بے قابو ہونے لگی تو میں نے اس کی گردن پکڑی اور دباؤ ڈال کر اسے بے ہوش کر دیا۔

اس کے بے ہوش ہوتے ہی سجے بھی اندر آ گیا۔ وہ ڈرے ڈرے انداز میں بولا "جناب کہیں ان کو..."

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔" میں نے اس کی بات کاٹی "ابھی آدھ دو گھنٹے تک ہوش میں آ جائے گی' لیکن اس سے پہلے بھی آ سکتی ہے۔ تم نائیلون کی رسی لاؤ۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں۔"

دس منٹ میں ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ توسیہ نے باتھ روم کے نکاسی کے سوراخوں میں کپڑے وغیرہ ٹھونس رکھے تھے۔ وہ نکالے گئے اور پانی کی نکاسی بحال کی گئی۔ میں نے دو ملازماؤں کو بلایا اور انہوں نے توسیہ کو بیڈ پر لٹایا۔ ان ملازماؤں میں سے ایک وہی لبنیٰ تھی جو ریسٹ ہاؤس میں توسیہ کے مزاج ٹھیک کرتی رہی تھی۔ سجے کی ہدایت پر دونوں ملازماؤں نے کمرے کی اچھی طرح صفائی کی۔ بھیگی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر باہر نکالا اور فرش خشک کر دیا۔ بعد ازاں ایک مرد ملازم بھی اس کام میں شریک ہو گیا۔ بھیگے ہوئے قالین اور دیگر اشیا نکالی گئیں۔ فرش خشک کیے گئے۔ اس کارروائی میں شام ہو گئی۔

شام سے پہلے ہی توسیہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اس پر جیسے دماغی دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہی تھی۔ گاہے گاہے گالیاں بھی بکنے لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے ایک بار پھر "مولا بخش" کی ضرورت ہے۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی اس کے ساتھ نرمی سے ہی بات کی جا رہی تھی لیکن وہ لاتوں کی بھوت تھی' اسے باتوں سے نہیں ماننا تھا۔

شام کے فوراً بعد میں نے "للیتا" کو اپنے پاس بلایا' اسے ہدایت کی کہ وہ آج رات پھر توسیہ کی طبیعت صاف کرے۔

یہ کام "للیتا" کا پسندیدہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ توسیہ کو دیکھتے ہی "للیتا" کی آنکھوں میں طیش ابھر آتا ہے۔ اس کا شوہر توسیہ ہی کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا اور اب وائی مرہ بن کر اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے زخم سے مسلسل پیپ آتی رہتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ساؤنڈ پروف کمرے میں للیتا نے توسیہ کی ٹھکائی شروع کرائی۔ ریکارڈر زور و شور سے بج رہا تھا۔ اندیشہ نہیں تھا کہ توسیہ کی چیخ و پکار باہر تک جا سکے گی پھر بھی میں نے احتیاطاً کھڑکیاں دروازے بند کروا دیے تھے۔ حسب سابق شروع میں مار کھانے کے باوجود توسیہ کا لب و لہجہ جارحانہ رہا۔ وہ روتی رہی ساتھ ساتھ للیتا کو بھی نت نئی صلواتیں سناتی رہی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کی جھنجھلاہٹ چیخوں میں بدل گئی اور وہ رونے دھونے لگی۔ آخر میں اس کی آواز میں بس التجا اور منت رہ گئی۔ جب میں نے اس کی آوازوں سے اندازہ لگایا کہ اس کا دم خم ختم ہو گیا ہے تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی دوران میں ہاری بھی نروس ہو کر اپنے اندر سمٹا۔ میں جانتا تھا وہ کیا کہے گا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ بولا "جناب! کہیں اسے کچھ ہو ہی نہ جائے۔ میرے خیال میں آج کے لیے اتنا کافی ہے۔"

میں نے کہا "توسیہ کے بارے میں تمہارے اکثر اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ شاید یہ بھی غلط ہو گا۔ بہرحال تم کہتے ہو تو دیکھ لیتے ہیں۔"

وہ دکھ گرفتہ لہجے میں بولا "جناب۔ مجھے میرا تو خیال ہے' آپ توسیہ کو جانتے ہی نہیں۔ یہ سیدھی ہونے والی نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں ہم اس کی موت کے ذمے دار بن جائیں۔"

"قربانی دینا چاہتے ہو؟"

"نہیں سر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ توسیہ اپنی ہٹ دھرمی کے سبب میرے دل سے اترتی جا رہی ہے۔"

"تو پھر اپنی چونچ بند رکھو تو بہتر ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم اب بھی اس کے لیے آہیں بھرتے ہو اور ہمیشہ بھرتے رہو گے۔ آئندہ مجھ سے اس موضوع پر بات مت کرنا۔ چلو تماشا ختم۔ اب جاؤ اپنے کمرے میں۔"

ہاری نے کرب کے عالم میں اپنے ہونٹ بھینچے اور وہاں

سے چلا گیا۔ میں اس کمرے کے سامنے پہنچا جہاں "للیتا" دو گھنٹے سے توسیہ کی ٹھکائی کر رہی تھی۔ کسی ملازم کو اس جانب آنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ آج شام کے لیے میں نے سجے کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ رہائش گاہ کے اس حصے کی طرف نہیں آئے گا۔ میں ساؤنڈ پروف کوٹھڑی کے سامنے پہنچا۔ توسیہ کے ہاتھ پاؤں تو ہم نے پہلے ہی باندھ دیے تھے' للیتا نے ہاتھوں اور پاؤں کو آپس میں بھی باندھ دیا تھا۔ جیسے گائے وغیرہ کو ذبح کرتے ہوئے باندھا جاتا ہے۔ پنجابی میں اسے جوڑ بنانا کہتے ہیں۔ وہ توسیہ کو بانس کی ایک پتلی چھڑی سے مار رہی تھی۔ بانس کی پتلی کی مار بڑی ظالم ہوتی ہے۔ توسیہ کا حشر نشر ہو گیا تھا' ایک دو جگہوں سے اس کا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ بہرحال باوجود اس کے للیتا نے احتیاط رکھی تھی کہ توسیہ کو زخم وغیرہ نہ لگے۔

توسیہ نے کھڑکی میں سے مجھے دیکھا مگر گالم گلوچ نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ مولا بخش کی خوراک نے اثر کیا ہے۔ توسیہ کے سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا اور چیخ چیخ کر اس کے گلے کی رگیں مستقل طور پر ابھر گئی تھیں۔ وہ ایک ایسی متکبر شیخ زادی تھی جو چند ہفتے پہلے تک امارات میں اپنی ناک پر کبھی مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ للیتا جیسی ملازمائیں تو غالباً اپنی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھیں کہ توسیہ کے جوتوں کو بھی ہاتھ لگا سکیں لیکن آج ایک ایسی ہی ملازمہ شیخ زادی کو اپنی ضربات سے چیخنے چلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر یہ مار پیٹ چند منٹ مزید جاری رہی تو شاید توسیہ بے ہوش ہو جائے۔ میں نے ہاتھ ہلا کر للیتا کو رک جانے کا اشارہ کیا۔

دوسرے روز صبح میں نے دیکھا۔ توسیہ کی طبیعت کافی "بحال" تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے' تاہم للیتا نے اس کے پاؤں کھول دیے تھے۔ اس کے قریب پڑے ہوئے برتنوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ہلکا پھلکا ناشتا بھی کیا ہے۔ یقیناً یہ ناشتا کسی ملازمہ نے ہی اسے کرایا تھا۔ توسیہ نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ میں نے بھی اسے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آ گیا۔ میں نے "للیتا" کو اپنے کمرے میں بلا کر ہدایت کی کہ اب وہ ایک دو روز تک توسیہ کے سامنے نہیں جائے۔

میں چاہتا تھا کہ توسیہ کو اطمینان سے کچھ سوچنے کا موقع ملے۔ اگر "للیتا" اس کے ارد گرد موجود رہتی تو توسیہ مسلسل ذہنی تناؤ اور بے چینی کے احساس میں گرفتار رہتی' اور مثبت انداز میں نہ سوچ سکتی۔ میں نے سجے کو بھی چند ہدایات دیں اور اسے تاکید کی کہ توسیہ کی سابقہ مراعات برقرار رہنی چاہئیں۔

اسی روز شام کو میں "PATTA" کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلتا ہوا فروٹ مارکیٹ پہنچا اور پھر وہاں سے بابا سادھو کے چائے خانے پر گیا۔ اس محلے کے پیچھے چائے خانے کے عقب میں بابا سادھو کا کافی بڑا ڈیرہ بھی تھا۔ یہ نیم پختہ سے دو بڑے بڑے ہال کمرے تھے۔ یہاں بھی بڑی بڑی چٹائیاں بچھی رہتی تھیں۔ بھکاری اور بھکارنیں بالکل معمولی معاوضے پر یہاں قیام کر سکتے تھے ان ہال کمروں کے اوپر بھی دو ایسے ہی ہال کمرے تھے۔ وہاں ایسے بھکاری قیام کرتے تھے جو بابا کے دیہاڑی دار تھے اور مستقل طور پر بابا سے بندھے ہوئے تھے۔ ان ہال کمروں میں اکثر مکھیاں بھنبھناتی رہتی تھیں اور گول ستونوں کے ساتھ کھونٹیوں پر بھکاریوں کی گٹھڑیاں' گدڑیاں اور کشکول وغیرہ لٹکے رہتے تھے۔ چرس اور گانجے وغیرہ کے نشے میں مدہوش "بھکاری حضرات" ادھر ادھر چٹائیوں پر چت پڑے دیکھے جا سکتے تھے۔ ان میں بوڑھی بھکارنیں بھی نظر آتی تھیں۔ تاہم جوان بھکارنوں اور بچیوں وغیرہ کے لیے اس سرائے کا ایک علیحدہ پورشن مخصوص تھا۔

میں چائے خانے پہنچا تو معلوم ہوا کہ بابا پیچھے ڈیرے میں ہے' اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں چائے خانے میں سے گزر کر بدبودار ڈیرے پر پہنچا اور سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر آ گیا۔ بالائی منزل ذرا ہوادار تھی اور یہاں نسبتاً مچھر بھی کم تھے' شاید یہی وجہ تھی کہ بابا نے اپنے "نفس" کے لیے بالائی منزل کا انتخاب کر رکھا تھا۔ اس کے دیہاڑی دار بھکاری بھی اسی منزل پر قیام فرماتے تھے۔

میں بالائی منزل پر پہنچا تو چٹائیوں پر کئی درجن بھکاری نظر آئے۔ ان میں سے کچھ دن بھر کی محنت کے بعد سستا رہے تھے' کچھ ستونوں سے ٹیک لگائے کش وغیرہ لگانے میں مصروف تھے۔ کئی ایک کی امید بھری نظریں میری طرف اٹھیں۔ میں جب بھی یہاں آتا تھا میری جیب میں تھوڑی بہت ریزگاری موجود ہوتی تھی جو میں بانٹ دیتا تھا لیکن آج اتفاقاً جیب خالی تھی۔

میں ٹہلنے والے انداز میں اس ستون کے قریب پہنچا جہاں میلی کچیلی چٹائی پر شیخ عاصم بن ارشد موجود تھا۔ وہ سوا تین فٹ کا گوشت کا لوتھڑا جس کے منہ سے رال بہتی رہتی تھی۔ شیخ عاصم کی ریڑھی کھینچنے والا ادھیڑ عمر شخص بھی اس کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے شیخ کے سر کے نیچے ایک چکنائی زدہ تکیہ رکھ رہا تھا۔ اس سے شیخ کا سر تھوڑا سا اونچا

ہو گیا تھا اور یہ اونچائی اسے ارد گرد دیکھنے کے قابل بنا رہی تھی۔

ادھیڑ عمر شخص نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے ایک بار پھر جیبیں ٹٹولیں تو ایک جیب سے ایک سکہ نکل ہی آیا۔ میں نے سکہ ادھیڑ عمر شخص کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ ادھیڑ عمر شخص کا نام رام لال تھا۔ اس کے ساتھی اسے لالے کہتے تھے۔

میں نے کہا "لالے! کیا حال ہے اس کا؟" میرا اشارہ شیخ عاصم کی طرف تھا۔

وہ ہندی میں بولا "صاحب! دو چار دن تو سخت مصیبت رہی ہے۔ اس کا پیٹ کھراب ہو گیا تھا۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد کپڑے کھراب کر لیتا تھا۔ دھو دھو کر برا حال ہو گیا تھا میرا۔ اب بھگوان کی کرپا سے کچھ ٹھیک ہے۔"

"چلو اچھی بات ہے۔ ایک دو روز اسے ذرا نرم کھانا کھلاؤ۔"

"نرم بھوجن کہاں سے آئے گا سرکار۔ جو کچھ ڈربے پر بکتا ہے وہی کھانا ہوتا ہے۔"

"اچھا، میں پاتھا صاحب سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ اس کا خیال رکھیں گے۔"

"آپ کی جرا نوازی ہے سرکار۔ ایک دو روز بھاجی روٹی کی بجائے چاول مل جائیں تو اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے۔"

شیخ عاصم کی کھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بجھ بجھی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس سوا تین فٹ کے لوتھڑے میں بس آنکھیں ہی حرکت کر سکتی ہیں۔ میری نگاہیں اس سے چار ہوئیں تو اس کے منہ سے غوں غاں کی مخصوص آوازیں نکلیں۔ ان آوازوں میں موجود غیظ و غضب کی فکف بوس لہروں کو دنیا میں صرف ایک شخص محسوس کر سکتا تھا اور وہ میں تھا۔

ادھیڑ عمر لالے نے شیخ عاصم کو غوں غاں کرتے دیکھا تو حسب عادت بتیسی نکال کر بولا "سرکار کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔ آپ پر نجر پڑتے ہی اس کے دیدوں میں چمک آ جاتی ہے۔"

"کتنا کما رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

لالے بولا "آپ کو بتایا تھا نا سرکار کہ بارشوں کے کارن مندا پڑا ہوا ہے۔ اب تھوڑا سا اچھا ہوا ہے پھر بھی اتنا اچھا نہیں ہے۔ آج کل دو سو روپے ملے ہیں۔ ان میں سے سو روپے پاتھا صاحب کو دیہاڑی کے دے دیے ہیں۔

تین ٹائم کے بھوجن پر پچاس روپے اٹھ جائیں گے۔ باقی چالیس پچاس ہی بچیں گے۔ ان میں سے بھی بیس تیس اس کی دوا دارو پر کھرچ ہو جائیں گے۔"

شیخ عاصم کے ایک کندھے پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ دوسرے کندھے اور دونوں ٹانگوں کی طرح یہ کندھا بھی سرجن روی داس نے بالکل جڑ سے کاٹا تھا۔ اس زخم کو بھی بڑی مہارت سے "فٹ" کیا گیا تھا لیکن روی داس کی رہائش گاہ پر ہی ایک روز عاصم بستر سے گر گیا تھا اور اس کے زخم سے خون بہہ نکلا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی تک یہ زخم مکمل ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر زخم دیکھنا چاہا۔ جونہی میری انگلیوں نے نرمی سے پٹی کو چھوا عاصم نے اپنے ٹنڈ منڈ کندھے کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کندھے کا کٹا ہوا حصہ عجیب انداز میں تھرتھرا گیا۔ شیخ کے حلق سے غوں غاں کی آوازیں بھی نکلی تھیں۔ میں نے لالے سے کہا "لگتا ہے کہ درد محسوس کرتا ہے۔"

وہ بولا "نہیں سرکار! اب تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ بس جرا سی کسر ہے۔ میں نے یونہی پٹی لپیٹ دی تھی کہ مکھیاں نہ بیٹھیں۔"

لالے سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد میں پاتھا ساد ھو کے "آفس" کی طرف بڑھ گیا۔

پاتھا کا "آفس" بھی پاتھا ہی کی طرح میلا کچیلا تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے جو زیادہ صاف نہیں تھے۔ ایک طرف دیوار گیر الماری تھی۔ الماری کے سامنے ہی پاتھا کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور ساگوان کی وو فٹ اونچا ڈیسک تھا۔ اسی ڈیسک میں بھک منگوں کے بہی کھاتے رکھے رہتے تھے۔ کس نے کتنا ایڈوانس لے رکھا ہے۔ کس کی کتنی دیہاڑیاں لگی ہیں۔ کس کماؤ پوت نے کتنا بس انداز کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے پاتھا کا حافظہ بھی بے حد تیز تھا۔ میں نے اسی کمرے میں اسے بھکاریوں کے ساتھ زبانی حساب کتاب کرتے دیکھا تھا اور اس کی "یادداشت" سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

میں کمرے میں پہنچا تو پاتھا ساگوان کی چوکی کے قریب ہی دری پر توم بچھائے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بھنگ کا نشہ کرتا تھا اور زیادہ وقت بھی بھنگ کے نشے میں ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ وغیرہ ملانے کے بعد ہم آمنے سامنے چٹائی پر بیٹھ گئے۔ کمر جھکا کر بیٹھنے سے فربہ اندام پاتھا کی توند نمایاں ہو گئی اور نیلے چغے کے اندر سے

جھلک دکھانے لگی۔

میں نے کہا "کیا بات ہے پاتھا! مجھے تمہارا بندہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"بس جہانی صاحب! جرا سا الجھا ہوا ہوں۔"

"کیا بات ہوئی ہے۔ کیا کوئی لمبا ایڈوانس لے کر بھاگ گیا ہے؟"

"نہیں جی۔ وہی معاملہ ہے جو ایک دن آپ کو پہلے بھی بتایا تھا۔ وہ سالا حرامی ہمارا کاروباری رقیب بن گیا ہے۔ ہر جگہ ٹکر لے رہا ہے۔ ہر معاملے میں اپنی گندی ٹانگ اڑا رہا ہے۔"

"رتنا کی بات کر رہے ہو۔"

"نہیں جناب! رتنے میں اتنا دم خم کہاں کہ اپن سے ٹکر لے سکے۔ یہ ساری اسی حرامی کی کارستانی ہے۔ وہی کنجر کا تخم گونگا۔ وہ بڑی تیزی سے ہاتھ پاؤں پھیلا رہا ہے۔ آج گال روڈ کے دوسرے چوک پر اس کے غنڈوں نے اپن کے دو کاریگر اٹھائے ہیں۔ رقم چھین لی ہے اور مارا پیٹا بھی ہے۔"

"کاریگر" کا لفظ پاتھا سادھو اپنے دیہاڑی دار بھک منگوں کے لیے استعمال کرتا تھا۔

پاتھا کی گفتگو سے صورت حال کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ دراصل استاد رتنا نامی ایک مقامی شخص پاتھا کا پرانا حریف تھا۔ پاتھا کی طرح رتنا کو بھی بھک منگوں کی لیڈری کرتا تھا۔ کولمبو کا شمال مشرقی حصہ رتنا کو کے اثر میں تھا جبکہ مغربی حصے پر پاتھا کا کنٹرول تھا۔ جہاں دونوں بھکاری لیڈروں کی حدود ملتی تھیں وہاں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ خاص طور سے گال روڈ کے کچھ علاقے میں اکثر دونوں گروہوں کے درمیان جھڑپیں اور کھینچا تانی ہوتی تھی۔ اس کھینچا تانی میں عموماً پاتھا سادھو کے گروہ کا پلڑا بھاری رہتا تھا۔ پاتھا کی گروہی طاقت زیادہ تھی اس کے علاوہ وہ رتنا کو سے زیادہ تجربے کار بھی تھا لیکن پچھلے چند ہفتوں سے اچانک ہی صورت حال بدل گئی تھی۔ پاتھا کے مطابق رتنا کو کا ایک انڈین دوست کولمبو آیا تھا۔ گونگا نامی یہ شخص بھی "بھیک" کے کاروبار سے تعلق رکھتا تھا۔ گونگا کے کولمبو آتے ہی کاروباری کشمکش میں رتنا کو کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ گونگے نے پاتھا کے کئی کارندوں کی بار بار پھینٹی لگائی تھی اور ایک دو کو تو کئی روز حبس بے جا میں بھی رکھا تھا۔ اس نے پاتھا کے کارندوں سے گنجان علاقے کے کئی اہم اڈے بھی چھین لیے تھے۔ پچھلی ملاقات میں پاتھا نے مجھے خبر دی تھی کہ پاتھا کا ایک اہم کاریگر اپنی وفاداری بدل کر رتنا کو کے گروہ میں چلا گیا ہے (یہ اہم کاریگر جزوی طور

پر ریڑھ کی ہڈی سے محروم تھا اور اس کا نچلا دھڑ بالکل مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھوں کے زور سے عجیب خوفناک انداز میں گھسٹ گھسٹ کر چلتا تھا اور اس کے کشکول میں ہر وقت سکے گرتے تھے۔ وہ پاتھو کے "کماؤ ترین" کاریگروں میں سے تھا۔ پاتھو کو اس کے جانے کا بہت قلق تھا)

میں نے پاتھو سے پوچھا "کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

وہ بولا "جہانی صاحب! روزانہ ہی کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔ جب سے بیجی گیا ہے دو تین اور کاریگر بھی جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔" (بیجی اسی معذور بھک منگے کا نام تھا جو زمین پر گھسٹ کر چلتا تھا)

"کیا وہ خود جا رہے ہیں یا انہیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ حرامی سالا "رتنا کو" سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ ڈرا بھی رہا ہے لالچ بھی دیتا ہے۔ اس بدتخم گونگے کے آنے سے رتنا کو بجرت سے مرد بن گیا ہے۔ سالا بہروپیا۔"

میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "کیا میں اس سلسلے میں تیری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"نہیں جہانی صاحب!" اس نے جلدی سے میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی "اپن چھوٹا آدمی ہے۔ اپن کے کام بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ بڑے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے اپن آپ کو جحمت (زحمت) دینے کی کوشش کیسے کر سکتا ہے۔ یہ کام آپ کے لائق تھوڑے ہی ہیں۔ اپن کھد ہی اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لے گا۔"

"میں نے اپنے دوستوں کو کبھی چھوٹا نہیں سمجھا اور وقت پر کام آنے والے دوست تو بیش قدر کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے بتاؤ میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"نہیں جہانی صاحب! اپن کو شرمندہ مت کرو۔ اپن اس قابل کہاں کہ آپ کے کسی کام آ سکے۔ یہ تو آپ کا احسان ہے کہ آپ اس وقت دری پر اپن کے برابر بیٹھا ہوا ہے۔"

"یار تکلف کو چھوڑو! بتاؤ کیا کرنا ہے "رتنا کو" کا اور گونگے کا؟"

پاتھا کے چہرے پر دبی دبی مسرت نظر آئی۔ تاہم وہ اس کوشش میں تھا کہ یہ مسرت اس کے چہرے سے عیاں نہ ہو۔ وہ ایک بار پھر بڑی لجاجت سے انکار کرنے لگا۔ میں نے

تھوڑی سی کوشش کرکے اس کی جھجک دور کردی۔ وہ میری مدد لینے پر بہر رضامند ہوگیا۔

بے شک بانھا ایک اچھے پیشے سے منسلک نہیں تھا۔ اس کے ڈیرے پر بھکاری نشہ وغیرہ بھی کرلیتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ رضا کو اور گوگے جیسے لوگوں سے بہتر ہے۔ وہ اپنے ڈیرے پر کسی ایسی بھکارن کو رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا جو بھیک کے علاوہ "کچھ اور" بھی لیتی ہو۔ وہ چور اچکے بھکاریوں کی سخت حوصلہ شکنی کرتا تھا اور بعض کو از خود تھانے میں جمع کرا دیتا تھا۔ اس کے اڈے پر جو نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ معذور بھکاریوں کو نوکری ضرور دیتا تھا لیکن اچھے بھلے لوگوں کو معذور کرکے بھکاری بنانے سے تائب ہوچکا تھا۔ اس کے کاروباری رقیب اس برائی سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ رضا کو کے بارے میں اطلاع بھی کہ وہ کاریگروں کو زور دہ "ہنرمند" بنانے کے لیے انہیں اپاہج بنانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ یہ کام بھی کاریگر کی رضامندی سے ہوتا تھا اور کبھی رضامندی کے بغیر۔

ابھی میرے اور بانھا کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بانھا نے ڈیسک کے کسی خفیہ خانے میں ہاتھ ڈالا۔ فون کا ریسیور اٹھایا اور سرائیکی میں چند باتیں کیں۔ فون رکھنے کے بعد اس نے معذرت سے میری طرف دیکھا اور بولا "بائی جانا ہوں۔ اپن بس نیچے کاؤنٹر سے ہوکر ایک سنٹ میں آتا ہے۔ آپ نے جانا نہیں۔ میں نے اسپیشل قہوہ منگوایا ہے۔"

وہ اٹھا اور لونڈ پاٹا ہوا جلدی جلدی نیچے چلا گیا۔ میں بانھا کے کمرے میں بیٹھا رہا۔ میرے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ دھنکی کی طلب ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے نیچے لگ کر میں ہال کمرے کا منظر دیکھنے لگا۔ اندھیرا اب گہرا ہوچکا تھا۔ بھکاری بس وہاں ٹانگیں پسار کر لیٹ گئے تھے۔ کچھ گپیں لگا رہے تھے اور نشے میں اونگھ رہے تھے۔ چھت پر پرانی طرز کے پنکھے جھوم جھوم کر چل رہے تھے۔ یہ ہوا کم دیتے تھے شور زیادہ مچاتے تھے۔

اچانک میری نظر اس ستون کی طرف اٹھی جہاں میں نے شیخ عاصم کو دیکھا تھا۔ وہ اب اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ اس کا نگران اوجھڑ عمر والا ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا میں نے شیخ عاصم کی تلاش میں تیزی سے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ یکایک میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے شیخ عاصم کو دیکھ لیا

کو حرکت دیتا ہوا اپنی سابقہ جگہ سے کوئی پانچ گز آگے آ گیا تھا۔ وہ اب بھی حرکت میں تھا۔ میں محویت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی حرکت کا انداز عجیب سا تھا۔ وہ جیسے کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تھا۔ کروٹ تو نہیں بدلی جاتی تھی لیکن اس کا مختصر جسم کھسک کر چند انچ آگے چلا جاتا تھا۔ وہ اس حرکت کو دوبارہ دہراتا تھا اور دو تین انچ یا چند سینٹی میٹر کا فاصلہ مزید طے کرلیتا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ دفعتاً مجھ پر ایک غیر متوقع انکشاف ہوا۔ بے ڈھنگے طریقے سے کھسک کھسک کر شیخ عاصم ارشد ایک بالکونی کی طرف جا رہا تھا۔ بالکونی کے تین فٹ اونچے آہنی جنگلے کا کچھ حصہ موجود نہیں تھا۔ یہاں سے آسانی سے نیچے کودا جا سکتا تھا۔ یہ اونچائی سولہ سترہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ نیچے پختہ سڑک تھی۔ پلک جھپکنے میں صورت حال میری سمجھ میں آگئی اور اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ شیخ عاصم غالباً اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے سوا کیا وجہ ہوسکتی تھی اس حرکت کی۔ یہ ایک لرزہ خیز انکشاف تھا۔

میں آفس سے باہر نکلا اور خوابیدہ و نیم خوابیدہ بھکاریوں کے درمیان سے راستہ بناتا عاصم کے قریب پہنچ گیا۔ میں اس سے تقریباً پندرہ فٹ کی دوری پر تھا جب وہ ... ہوگیا۔ عاصم اب بالکل بالکونی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا عجیب و غریب جسم مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ میں لپکا اور تب میں نے محسوس کیا کہ گویا ... جس کا نام شیخ عاصم ارشد ہے بالکونی سے پھسل کر پختہ سڑک پر جا گرے گا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے پکڑ لیا۔

عاصم کی نظر مجھ پر پڑی۔ بھاری بھرکم بازوؤں میں بھینچا اس کا چہرہ بھیانک نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ہیولی کا ... جیسی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ... کچھ مزید ابل آئیں۔ اس کے جسم میں عجیب سی ہلچل پیدا ہوئی۔ وہ جیسے خود کو میری گرفت سے چھڑانا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں دو تین بھکاری بھی اٹھ کر ہماری طرف آئے۔ ایک شیخ عاصم کا نگران ... بھی تھا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹا اور سمجھایا کہ اس کی غفلت کی وجہ سے کیا ہونے جا رہا تھا۔ میں چونکہ اردو بول رہا تھا لہٰذا دوسرے بھکاریوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

"لیکن یہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟" ...

"شاید نیچے سڑک کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔

"سڑک کا نظارہ تو یہ سارا دن کرتا رہا ہے۔ اگر بھگوان کرے یہ ذرا سا آگے چلا جاتا تو نیچے بھی گر سکتا تھا۔"

میں لالے کو کیسے بتاتا کہ یہ نیچے گرنے کے لیے ہی جا رہا تھا۔ میری یہ بات لالے کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ اس کا "کاریگر" خودکشی کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات کم فہم لالے کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ لالے بے چارے نے تو کبھی دبئی کے شاندار محلات نہیں دیکھے تھے۔ اس نے اپنے "کاریگر" (شیخ عاصم) کے اردگرد حسینوں کے جھرمٹ ملاحظہ نہیں کیے تھے۔ اس نے دنیا میں جنت کے نمونے نہیں دیکھے تھے اور ان نمونوں کے مالک کو نہیں دیکھا تھا۔ اس بے چارے کو کیا پتا تھا کہ گم گشتہ جنت کا کرب کیا ہوتا ہے۔ حسین ترین زندگی سے محرومی کا عذاب کتنا شدید ہوتا ہے۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا اپنے "کاریگر" کے بارے میں۔

ہم نے عزت آب شیخ عاصم کو پھر سے اس کے نہایت نفرت انگیز ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا۔ شیخ عاصم نامی اس لوتھڑے کے منہ سے ہوں ہاں کی شدید آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے ۳۹ انچ کے جسم پر شدید جھنجھلاہٹ کی کیفیت طاری تھی۔

شیخ کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں۔ اس نے حلق سے عجیب آواز نکالی پھر اپنے ہونٹوں کو سکوڑ کر "کچھ کہنے" کی کوشش کی۔ لالے کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں سمجھ گیا۔ وہ میری طرف تھوکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کوشش اس کے ٹیڑھے جبڑے کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوئی۔ اس کا لعاب دہن اس کے تفوہ زدہ ہونٹوں سے نکل کر اس کی اپنی ہی گردن پر بہہ گیا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر رومال سے اس کے ہونٹ صاف کیے اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"شاید یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے؟" لالے نے خیال ظاہر کیا "اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہو۔"

"ایسے شخص کے بارے میں تو بس اندازے ہی لگائے جاسکتے ہیں۔" میں نے تاسف سے کہا۔

لالہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا "اسے بستر پر لٹا دو اور اسے تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔"

لالہ پانی لینے کے لیے دوڑ گیا۔ میں چند ثانیے بوجھل دل کے ساتھ شیخ عاصم کے قریب بیٹھا رہا اور انگلش میں کہا "عاصم! تمہارے ساتھ بہت برا ہوا۔ تمہیں شریفانہ طریقے سے قتل ہو کر رہنا تھا لیکن تم نے

مجھے قسم ہی ایسی دے دی تھی۔ ٹی ایم سارہ بی۔ بہرحال یہ سزا بھی تیری سفاکیوں کے سامنے ہیچ ہے۔ تیرے صرف آخری تین جرائم کا حساب کیا جائے تو بھی یہ سزا ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے آخری تین جرائم تو تو جانتا ہی ہے ناں؟ ساہی صاحب کا قتل۔ بے گناہ گارڈ مجید کا قتل۔ لبونا پر تیزاب پھینک کر اسے عبرت مثال بنانے کا جرم۔ میں نے غلط نہیں کہا۔ اچھا جہاں ...... رہو خوش رہو۔" شاید میں اور بھی کچھ کہتا لیکن اسی دوران میں لالہ پانی لے کر آگیا۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے بانھا بھی چلا آیا تھا۔ وہ یہاں ہونے والے واقعے سے بے خبر تھا۔

میں نے آفس میں پہنچ کر بانھا کو ساری تفصیل بتائی اور اسے تاکید کی کہ وہ "اس شخص" کی طرف سے کافی ہوشیار رہے اور اگر لالہ ٹھیک سے اس کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا تو کوئی اور بندہ اس پر مقرر کرے۔

بانھا نے کہا "اب آپ بالکل بے فکر رہیں جمالی صاحب! اپن کی طرف سے اب آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اپن اس بندے کے لیے اب بہت کھن انتظام کرے گا۔"

بانھا کو بھی عاصم کے اصل کوائف معلوم نہیں تھے۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ میرا کوئی معتوب ہے۔ کوئی ایسا شخص جس نے بہت طویل عرصے تک مجھے بہت شدید دکھ پہنچائے ہیں۔

قہوہ آگیا تھا۔ یہ کوئٹہ کا بڑا خاص قسم کا روایتی قہوہ تھا۔ قہوہ پینے کے دوران میں میں نے بانھا سے رضا کو اور پیجی وغیرہ کے بارے میں کچھ اہم معلومات بھی حاصل کیں۔ تاہم میرے ذہن میں مسلسل شیخ عاصم کی "خودکشی" کا منظر گھومتا رہا۔

✪✪✪

یہ شہر کا ایک بارونق علاقہ تھا۔ ایک طویل بازار تھا جس میں صبح دس بجے سے رات دس بجے تک زبردست رونق رہتی تھی۔ بالکل جیسے ہمارے لاہور میں انارکلی اور راولپنڈی میں راجا بازار وغیرہ ہیں۔ میں نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ ایک مدراسی جس کا زیریں دھڑ سوکھا ہوا تھا اور کمر رینگتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ ساتھ طویل ٹانگے لگے ہوئے تھے گھسٹ گھسٹ کر سڑک پر چل رہا تھا۔ وہ بازوؤں اور ہتھیلیوں کے زور سے چلتا تھا۔ اس کے ساتھ اپنی ٹانگیں بھی استعمال کرتا تھا۔ ... نے دیکھے سڑک ... لکھانے ... کے لیے ... مختصر ...

وہاں کئی ہوئی ٹیوب کے ربڑ وغیرہ لپیٹ رکھے تھے۔ یہی شخص منشور ہنگنا سیٹھی تھا۔ اس کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لوگوں کے پاؤں میں حقیر کیچوے کی طرح رینگنے کے ساتھ ساتھ وہ منہ سے دردناک قسم کی فریاد بھی بلند کرتا تھا۔ جب وہ بولتا تھا تو اس کی آواز دو حصوں میں بٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی' جیسے دو افراد ایک ساتھ بول رہے ہوں۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ابھی بازار کی بھرپور رونق شروع نہیں ہوئی تھی' پھر بھی شاپنگ کرنے والے سیکڑوں مرد و زن یہاں موجود تھے۔ میں اس ہجوم میں رہا اور سیٹھی کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھتا رہا۔ سیٹھی جب اپنے جسم کو ترس ناک انداز میں حرکت دے کر تھوڑا سا آگے کو کھسکتا تو اس کے ساتھ ہی اپنا ٹین کا چھوٹا سا ڈبا بھی آگے کھسکا دیتا تھا۔ یہ ڈبا سکوں اور نوٹوں سے وزنی ہو رہا تھا۔

میری موجودگی میں سیٹھی نے دو فرلانگ کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے کیا اور اس دوران میں اس کا کشکول یعنی ٹین کا ڈبا دو بار بھر کر خالی ہوا۔ دونوں مرتبہ سیٹھی کے پیچھے پیچھے چلنے والے ایک شخص نے ڈبا اپنے جھولے میں خالی کر کے سیٹھی کو واپس دے دیا۔

میں سیٹھی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کی آمدن کا حساب جوڑ رہا۔ اس ڈبے میں کم و بیش پانچ سو روپے تو جمع ہوئے ہی ہوں گے۔ ایک گھنٹے میں یہ ڈبا دو مرتبہ بھرا تھا۔ اگر دیہاڑی میں سیٹھی بازار کے آٹھ چکر بھی لگاتا ہو تو آٹھ گھنٹے میں یہ ڈبا کم از کم سولہ مرتبہ بھرتا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس شخص کی روزانہ آمدنی کسی طرح بھی آٹھ ہزار سے کم نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ شخص واقعی سونے کی چڑیا تھی۔ اب یہ چڑیا رتناکو کے پاس تھی۔

میری گاڑی بازار کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ سیٹھی کے آخری سرے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ آخر وہ لمحے آئے جب سیٹھی پھدک پھدک کر رینگتا اور شور مچاتا ہوا میری گاڑی کے عین سامنے آ پہنچا۔ میں نے دروازہ کھول کر پچاس روپے کا ایک نوٹ اس کے ڈبے میں ڈال دیا۔ اس نے حسب عادت دعاؤں کی بارش کی۔ نوٹ بڑا تھا اس لیے بارش ہوئی ورنہ وہ ایک دو قطرے ڈال کر آگے بڑھ جاتا۔

میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پوچھا "تمہاری کمر کو کیا ہوا؟"

وہ مدراسی لہجے میں ہندی بولتے ہوئے کہنے لگا "میں معمار کا کام کرتا تھا۔ کوٹھے سے گر گیا تھا جی بادشاہ۔ ریڑھ کی ہڈی کے کئی آپریشن ہوئے' اب نیچے سے بیکار ہو کر رہ گیا ہوں۔"

میں نے کہا "میں ہڈیوں کا مشہور ڈاکٹر ہوں۔ تمہارا علاج کر سکتا ہوں۔ تم بالکل ٹھیک ہو سکتے ہو اگر تم چاہو تو ابھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

اس کے کالے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ وہ مدراسی لہجے میں بولا "نہیں جی بادشاہ' زیادہ گزر گئی ہے' تھوڑی رہ گئی ہے یہ بھی آپ جیسے دیالو مہربانوں کے طفیل گزر جائے گی۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔" اس نے آگے بڑھنا چاہا۔

میں نے اس کا کالر پکڑ کر اسے روک لیا "دیکھو بھائی' میں تمہیں مفت علاج کی پیشکش کر رہا ہوں۔ ایسے علاج پر ہزاروں لاکھوں خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم عام لوگوں کی طرح زندگی گزارو' چلو پھرو۔"

"نن' نہیں صاحب جی۔ یہ آپ کیسی بات کر رہے جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھگوان کی کرپا سے تین وقت کی روٹی مل رہی ہے۔" سیٹھی نے ایسے کہا جیسے وہ بھلا چنگا ہو اور میں اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے بے روزگار بنانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔

میں نے کہا "روٹی تو مل رہی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اچھی روٹی ملے۔ چلو آؤ میرے ساتھ' تمہاری مدد کروں۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اٹھا کر اسے گاڑی میں ڈال لیا۔ وہ ایک دم تڑپا' پھڑکا اور چیخیں مارنے لگا۔ ایک جانب سے دو افراد بھاگتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک وہی شخص تھا جو سیٹھی کا بھرا ہوا ڈبا اپنے جھولے میں خالی کر رہا تھا "کیا ہے بابو صاحب' کیا کر رہے ہو۔" وہ چیخ کر بولا۔

میں نے اس کی ناک پر مکا رسید کیا۔ وہ اپنے جھولے سمیت الٹ کر پیچھے گرا۔ دوسرا شخص یہ منظر دیکھ کر مجھ پر جھپٹا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ زور سے کھولا۔ اس شخص کا تصادم دروازے کے ساتھ ہوا اور وہ ڈکراتا ہوا ایک "تاری پانی" والے خوانچہ فروش کے اوپر گرا۔ سیٹھی بدستور میری گرفت میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا جسم پوری طرح مفلوج نہیں ہے۔ تھوڑی بہت سکت اس کی ٹانگوں میں موجود تھی۔ خود کو چھڑانے کے لیے اس نے مجھے دانتوں سے کاٹنے کی کوشش بھی کی۔ میں نے گاڑی پہلے ہی گیئر میں ڈال رکھی تھی۔ ایکسی لریٹر دباتے ہی پہیے چرچرائے اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں نے سیٹھی کی دبلی پتلی گردن پر خاص انداز سے دباؤ ڈالا' اس

کی جدوجہد ایک دم بے ہوشی میں بدل گئی۔ اتنا کچھ ہوا تھا لیکن سیٹھی نے ابھی تک اپنے کیش باکس یعنی ڈبے پر سے گرفت ختم نہیں کی تھی۔

میں اپنی سوزوکی کار پر ایک فرلانگ ہی آگے گیا تھا کہ میری توقع کے عین مطابق ایک ٹیکسی کار میرے پیچھے لگ گئی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میرا پیچھا کیا جائے۔ دراصل میں ابھی سیٹھی کو بافضا کے ڈیرے پر لے جا رہا تھا کو اس معاملے میں براہ راست ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اپنے طور پر میری ملاقات المعروف گونگے سے ہو جائے اور مجھے اس کے دم خم کا پتا چل جائے۔ میرا اندازہ تھا کہ میں ایک ہی ملاقات میں اسے سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی گال روڈ پر پہنچیں اور پھر وہاں سے ایک ذیلی سڑک پر مڑ کر کھلے علاقے میں چلی آئیں۔ ایک پرانے پگوڈا کے عقب میں واقع ایک میدان میں میں نے گاڑی روک دی۔ یہاں بدھ مت کے لوگ اپنے مردے وغیرہ جلاتے تھے۔ اس شمشان گھاٹ کے ساتھ ہی ایک قبرستان بھی تھا۔ یہ عیسائی اقلیت کا قبرستان تھا۔ سنگ مرمر کی قبروں کے درمیان چوڑے راستے تھے جو ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ پر قطع کرتے تھے۔ خوب صورت لیکن بالکل سنسان جگہ تھی۔ میں نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ٹیکسی کار بھی دھول اڑاتی موقعے پر پہنچ گئی۔ ٹیکسی کار میں سے تین مشتعل افراد نکلے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس کے منہ پر کار کا دروازہ لگا تھا۔ اس کا بالائی ہونٹ سوج کر کپا ہو چکا تھا اور اس میں سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

ایک شخص کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ یہ شکل و صورت سے بھکشو نظر آتا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں گاڑی کا جیک تھا۔ تیسرا خالی ہاتھ تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ سب سے خطرناک یہی ہے۔ اس کی جیکٹ کی ایک جیب بہت بھاری تھی۔ یقیناً اس میں ریوالور وغیرہ موجود تھا۔

پھٹے ہوئے ہونٹ والا آگے بڑھا۔ اس کی نگاہ گاڑی میں بے ہوش پڑے سیٹھی سے ٹکرائی۔ اس کے چہرے پر ہراس نظر آنے لگا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور چیخ کر بولا "تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ وہ تو مردے کی طرح پڑا ہے۔"

میں نے اطمینان سے کہا "ایک دن سب کو مرنا ہے۔ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر بعد تم بھی اسی طرح پڑے نظر آؤ۔"

"بابو صاحب' ہم تو بھکاری لوگ ہیں' ہمارے ساتھ متھا نہ لگائیں ورنہ نقصان آپ ہی کا ہونا ہے۔"

میں نے کہا "اگر چاہتے ہو کہ متھا نہ لگے تو اپنے گرو گھنشال گونگے کو بلاؤ۔ میں تم جیسے پلوں سے بات کرنے کی بجائے اس بڑے کتے سے بات کرنا مناسب سمجھوں گا۔"

"دیکھو صاحب جی' منہ سنبھال کر بات کرو ورنہ..."

میں نے دیکھا خالی ہاتھ شخص نے اپنے بھکشو نما ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میرے سر پر لٹھ سے وار کرنا چاہا۔ اس نے بے دریغ میرے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ میں نے جھک کر یہ وار خالی دیا اور بھکشو کے پیٹ میں ایسی ٹانگ جمائی کہ وہ ڈکراتا ہوا ٹیکسی کی سائیڈ سے ٹکرایا اور اس کی کھڑکی چکنا چور کر دی۔

یہ منظر دیکھ کر جیک بردار نے حلق سے ایک چنگھاڑ برآمد کی اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ جتنے زور سے آیا تھا اتنے ہی زور سے میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا ایک بینچ پر گرا اور چیخ کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا خالی ہاتھ شخص نے اپنے لباس کے نیچے سے کچھ نکالنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ میں پہلے سے توقع کر رہا تھا کہ وہ اب یہ کرے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا اور میرے لیے کوئی خطرہ پیدا کرتا میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے مروڑ دیا۔ اس کا بازو درمیانی حصے سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچلنے لگا۔ میں نے اس کی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر دیسی ساخت کا ریوالور نکال لیا۔

جونہی ریوالور میرے ہاتھ میں آیا تینوں افراد بری طرح ٹھٹک گئے۔ جس شخص کا ہونٹ پہلے ہی پھٹا ہوا تھا وہ بینچ پر گرنے کے بعد مزید زخمی ہو گیا تھا۔ وہ اپنی آستین سے بار بار منہ سے بہنے والا خون صاف کر رہا تھا۔ میں نے کہا "اب بھی وقت ہے' مان جاؤ ورنہ زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ اپنے گرو گونگے صاحب کو یہاں بلاؤ۔ میں صرف اسی سے بات کرنا پسند کروں گا۔"

بھکشو نما شخص نے اپنے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا اور بغیر کچھ کہے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے پکار کر مخاطب کرتے ہوئے کہا "بس اپنے گرو کو لانا۔ اگر پولیس وغیرہ کو لانے کی کوشش کی تو زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔"

بھکشو نما بھکاری نے بڑی مہارت سے ٹیکسی کار کو یو ٹرن دیا اور سڑک کی طرف چلا گیا۔

جس شخص کا بازو ٹوٹا تھا' وہ ابھی تک میری گرفت میں تھا۔ اس کے حلق سے کربناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ غالب

وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ بیٹھے بٹھائے میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

میں نے اس کے بازو پر سے گرفت ختم کی تو وہ مجھ سے دور جا کھڑا ہوا۔ میں نے ریوالور کے اشارے سے اسے حکم دیا کہ وہ سامنے والے درخت کے نیچے بیٹھ جائے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سر پر رکھ لے۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اس شخص نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے زخمی چہرے والے کو بھی اسی طرح درخت کے نیچے بٹھا دیا اور خود ان سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر اپنی سوزوکی کار میں آ بیٹھا۔ میرا رخ دونوں افراد کی طرف ہی تھا۔ پانچ دس منٹ گزر گئے۔

میں نے زخمی چہرے والے سے پوچھا "تیرا کیا خیال ہے۔ تیرا گرو گونگا صاحب کتنی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے مدراسی لہجے میں ہندی بولی پھر ایک لمحہ توقف کر کے کہنے لگا "ویسے ہو سکتا ہے کہ وہ آئیں ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"شاید وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آج سویرے تک تو وہ یہاں نہیں تھے اب کا پتا نہیں ہے۔" (گونگے کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ صرف نام کا گونگا ہے ورنہ وہ بول سکتا ہے)

"اور وہ تمہارا دوسرا گرو رتناگو؟" میں نے پوچھا۔

ابھی یہ فقرہ میری زبان سے ادا ہوا ہی تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے سے خبردار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قبرستان کے سبزے پر درختوں میں کوئی موجود ہے۔ میں گاڑی میں بیٹھا بیٹھا تھوڑا سا نیچے کو جھک گیا۔ یہی وقت تھا جب سنسناہٹ کی آواز آئی۔ تین چھرے سوزوکی کار کی سائیڈ میں لگے اور دو تین میرے بالکل پاس سے ہو کر کھڑکی توڑتے ہوئے گزر گئے۔ میں سیٹ پر نیم دراز ہو گیا اور وہیں سے میں نے درختوں میں دو تین فائر کیے۔ ایک ہلکی سی کراہ گونجی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ کوئی زخمی ہوا ہے۔ درختوں سے مزید فائر ہوئے۔ میں نے بھی ہوائی فائر کیے۔

اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر سنگ مرمر کی قبریں موجود تھیں۔ ایک قبر کے تین چار فٹ اونچے کتبے کے پیچھے سے کوئی شخص برآمد ہوا اور بڑی رفتاری سے مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے کوئی چمک دار شے نظر آئی تھی۔ اس نے یہ چیز سیدھا میرے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی۔ میں نے پہلو بچایا۔ یہ نوک دار شے گاڑی کی نشست میں گھستی چلی گئی۔ میں نے حملہ آور کے منہ پر لات مار کر اسے پیچھے کی طرف گرایا اور پھر اس پر فائر کیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا تھا لیکن ریوالور سے بس ٹرچ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ خالی ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا پسٹل برآمد کرتا حملہ آور پھر مجھ پر جھپٹ چکا تھا۔ اب میں نے وضاحت سے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پرانی طرز کی تلوار تھی۔ اس ڈھائی تین فٹ لمبی تلوار کا لوہا چمک رہا تھا اور چوڑائی اور بری مست اٹھی ہوئی تھی۔ تلوار کے دوسرے وار سے بچنے کے لیے مجھے ایک بار پھر پھرتی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ تلوار گاڑی کے دروازے سے ٹکرائی۔ اسی پھرتی سے حملہ آور نے تیسرا وار میرے سر پر کیا۔ تلوار کا تیز بلیڈ میرے سر کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ تیسرے وار کے خالی جاتے ہی میں نے مدمقابل کا تلوار والا ہاتھ جکڑ لیا۔ تھوڑی سی زور آزمائی کے بعد میں نے تلوار اس کے ہاتھ سے چھڑا لی اور سرائی گھما کر اسے دور پھینک دیا۔

درخت کے نیچے بیٹھے دونوں افراد ابھی تک اس تذبذب میں تھے کہ مجھ پر حملہ آور ہوں یا پھر بھاگ نکلیں۔ جب انہوں نے تلوار بردار کو میری ٹکر کھا کر گرتے دیکھا تو انہوں نے بھاگ نکلنے میں عافیت جانی۔ میں بھی انہیں روکنے میں زیادہ سنجیدہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا پسٹل نکالا اور بھاگتے ہوئے دونوں افراد کے قدموں میں تین چار فائر کیے وہ بھاگے اور اچھلتے ہوئے درختوں میں غائب ہو گئے۔

تلوار بردار شخص قبروں کے درمیان اکڑوں بیٹھا تھا اور ناک آؤٹ ہو جانے والے باکسر کی طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس کی موٹی ناک خونچکاں تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی شخص رتناگو ہے۔ بعد میں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اچانک مجھے درختوں کی جانب سے ہلکی کراہ سنائی دی۔ مجھے یاد آیا کہ کوئی بندہ میری گولی سے زخمی بھی ہوا تھا۔ میں نے اسے بلند آواز سے پکارا اور درختوں سے نکلنے کا حکم دیا۔ اسے حکم کی تعمیل پر مجبور کرنے کے لیے مجھے دو ہوائی فائر بھی کرنا پڑے۔ وہ گھسٹتا ہوا درختوں سے برآمد ہو گیا۔ یہ وہی بھکنو تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے چیف گونگے کو لانے کے لیے ٹیکسی پر روانہ ہوا تھا۔

ریوالور کی گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی اور اس کی گیروے رنگ کی دھوتی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ وہ بے دم سا ہو کر تمام بھکشوؤں کے انداز میں اس نے گیروے (سرخی مائل)

رنگ کے تین کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک دھوتی، ایک کرتہ اور ایک میلی کچیلی چادر جس میں سے اس کا ایک کندھا باہر نظر آتا تھا۔ اس کا سر منڈھا ہوا تھا۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی سنہالی زبان میں اس سے پوچھا "تم تو بڑے گرو گونگے کو لینے گئے تھے؟"

"وہ ادھر نہیں ہے۔"

"یہ کس کو ساتھ لے کر آئے ہو؟"

"یہ رتناگو صاحب ہے۔" وہ ذرا جھجک کر بولا۔

میں نے بھکشو سے دو تین مزید سوال کیے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رتناگو سے راستے ہی میں ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ بھکشو نما شخص ٹیکسی پر شہر کی طرف جا رہا تھا کہ یہاں سے دو کلومیٹر دور اس نے رتناگو کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھا۔ (وہ بھی ہماری ہی تلاش میں آ رہا تھا) ٹیکسی کار کو دیکھ کر رتناگو رک گیا پھر وہ دونوں بذریعہ موٹر سائیکل صرف چار پانچ منٹ کے اندر قبرستان پہنچ گئے۔ وہ گھوم کر قبرستان کی دوسری جانب سے آئے تھے اور موٹر سائیکل انہوں نے کافی فاصلے پر ہی بند کر دی تھی۔

میں نے رتناگو سے پوچھا "بتاؤ کہاں ہے تمہارا یار گونگا؟"

"تم نے اس سے کیا کہنا ہے؟" رتناگو ہندی میں بولا۔

"بس کچھ کہنا ہی ہے۔"

"جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔ میں تمہیں جواب دوں گا۔"

"میں اس کی بہن سے شادی رچانا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری کوئی بہن شادی کے قابل ہے تو تم بتا دو۔"

وہ غصے سے چیخ "ضرور ہے لیکن ہونا کچھ نہیں۔ وہ تھوڑی دیر پہلے میری کار زندگی بڑی اچھی طرح ملاحظہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کی گری ہوئی تلوار اٹھائی اور اس کے سر پر کھڑے ہو کر کہا "ہاں گونگے کے بارے میں بتاؤ گے یا خود میرا مسئلہ حل کرو گے؟"

"گونگا صاحب یہاں نہیں ہیں۔ وہ کولمبو سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم ضمانت کے طور پر میرے ساتھ چلو۔ جب گونگا آ جائے گا تو تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

رتناگو نے اپنے سیاہی مائل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "جس کے کہنے پر تم یہ سب کچھ کر رہے ہو۔ اسے بری طرح پچھتانا پڑے گا اور ساتھ ساتھ تمہیں بھی۔"

میں نے ایک زوردار ٹھوکر رتناگو کی پسلیوں پر لگائی۔ وہ ایک قبر پر اوندھا ہو گیا اور ہائے وائے کرنے لگا۔ اس کی آواز میں غصیلے بھکاریوں جیسی کرختگی تھی اور لہجے میں بددعاؤں جیسا آہنگ تھا۔ میں نے تلوار کی نوک اس کی گردن میں چبھوتے ہوئے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار پھر تڑپ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے خود کو اچھالا تھا اور ایک طوفانی ٹکر میری ناف میں رسید کرنے کی دلیرانہ کوشش کی تھی۔ یہ وار میں نے بمشکل بچایا۔ رتناگو اپنے زور میں اوندھے منہ گرا۔ میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ چیخنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ پانچا کا نام لے لے کر اسے کوس رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میرا تعلق پانچا سے ہی ہے۔

میں نے اس کے سر پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہو! یہ پانچا کون ہے؟"

وہ دہاڑا "تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تم اس حرامی (پانچا) کے ذریعے یہاں آئے ہو۔ میں سب جانتا ہوں۔"

مجھے پہلے ہی اس بات کا اندیشہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ پانچا کے ذریعے رتناگو کا کوئی مخبر موجود ہو یا ایک سے زیادہ مخبر ہوں۔ ان میں سے کوئی مجھے شناخت کر سکتا تھا۔ اب یہی ہوا تھا۔ رتناگو نے مجھے شناخت کرنے کا اعلان کیا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ رتناگو یہ دعویٰ فقط اپنے اندازے کی بنیاد پر کر رہا ہو۔

بھکشو نما نوجوان پنساری درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ شدید تکلیف کے سبب اس کا زرد رنگ گہرا زرد دکھائی دینے لگا تھا۔ کئی لوگوں میں تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی زخمی پنڈلی کو تھام رکھا تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔ اچانک میں نے اسے پہلو کے بل لڑھکتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ وہ ڈراما تو نہیں کر رہا لیکن جلد ہی اپنا یہ خیال مجھے رد کرنا پڑا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ انہی چند لمحات سے فائدہ اٹھا کر رتناگو بھاگ نکلا۔ اس کے بھاگتے قدموں کی چاپ سن کر میں تیزی سے مڑا۔ وہ بس درختوں میں اوجھل ہونے ہی والا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس کی رنگ دار لنگی ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ میں نے پسٹل اس کی طرف سیدھا کیا۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ میں اسے نشانہ بنا سکتا تھا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ اندھا دھند دوڑتا ہوا درختوں میں اوجھل ہو گیا۔

بالفاظ دیگر میرے مقابل آنے والے تینوں افراد دوڑ

گئے تھے۔ بھکشو اس لیے نہیں بھاگ سکا تھا کہ اس کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا تھا یعنی ٹانگ زخمی تھی۔ میں نے بھکشو کو ہلایا جلایا' وہ بے ہوش ہو چکا تھا لیکن بظاہر خطرے کی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے بھکشو کو اٹھایا اور سوزوکی کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ اگلی نشست پر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ سیپی بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور سڑک کی طرف موڑ لیا۔ رتناکو کی چھوڑی ہوئی تلوار اور شاٹ گن بھی میں نے گاڑی میں رکھ لی تھی۔ اس ہنگامے کے دوران میں چند تماشائی بھی قبرستان میں آپہنچے تھے لیکن ان بے چاروں نے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی وہ چھوٹی سی ٹولی کی شکل میں ناریل کے ایک جھنڈ کے پیچھے موجود تھے اور میری گاڑی کو حرکت میں آتے دیکھ رہے تھے۔

✪✲✪

سیپی اور زخمی بھکشو کو لے کر میں سیدھا بٹبہ پہنچا اور اپنی رہائش گاہ یعنی حویلی نما مکان میں آ گیا۔ سیپی اور بھکشو کو بڑی احتیاط سے حویلی کے اندرونی کمرے میں پہنچایا گیا۔ بھکشو کی بے ہوشی تو راستے میں ہی گہری غنودگی میں بدل چکی تھی' تاہم سیپی ابھی تک بے ہوش تھا۔ مجھے اس کی طرف سے زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ ہمارے ملازمین میں سے دو نے فوراً سیپی کو پہچان لیا۔ اسی طرح جے بھی فوراً پہچان گیا کہ یہ مشہور سنگتا سیپی ہے۔

بھکشو کی ٹانگ میں گولی موجود تھی۔ جے نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے فوراً گھر میں ہی اس کی گولی نکلوانے کا انتظام کر لیا۔

رات کو سیپی ہوش میں آ چکا تھا۔ شروع میں اس نے خوب غل مچایا۔ میری ہدایت پر جے نے حسب معمول اونچی آواز میں ٹیپ ریکارڈر لگا دیا۔ کچھ دیر میں (دو چار طمانچے) کھانے کے بعد جب سیپی کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ پانھا کا ڈیرہ چھوڑ کر رتناکو کے پاس کیوں چلا گیا تھا؟

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولا "سخی بادشاہ! میں تو غریب دیہاڑی دار ہوں جی۔ پانھا اور "رتناکو" صاحب بڑے لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کے جھگڑے میں ہم جیسے مینڈک یونہی کچلے جاتے ہیں۔ رتناکو اور گونگا صاحب مجھے زبردستی دھکا کر وہاں سے لے گئے تھے جی۔ اگر میں نہ جاتا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالتے۔"

"تم نے پانھا کو بتایا تھا کہ رتناکو وغیرہ تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

"کتنی بار بتایا تھا جی' مگر میں نے دیکھا تھا کہ اب بڑے صاحب' رتناکو سے کچھ ڈرنے لگے تھے' دراصل جب سے گونگا صاحب آئے تھے' پانھا صاحب کا پلڑا کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔"

"لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایک لالچی اور سب سے کمینے بھکاری ہو۔ تم صرف بارہ ہزار کے لالچ میں رتناکو کی طرف گئے ہو' اور جاتے جاتے پانھا کا وی سی آر بندر روڈ اڈے والا بھی لے گئے ہو۔"

"یہ۔ یہ بالکل غلط ہے سخی بادشاہ! پتا نہیں آپ کو کس نے یہ سب کچھ بتایا ہے۔ میں بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں جی کہ۔"

میں نے کہا "ابھی کچھ دن پہلے مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تم نے رتناکو کے پاس جانے کے بعد ایک بالکل جوان بھکارن سے شادی کی ہے' اور اسے گال روڈ پر ایک کوٹھی بھی لے دی ہے۔ اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ تم کچھ ایسے معذور بھی نہیں ہو۔"

سیپی تھوک نگل کر رہ گیا۔ بولا "شاید سخی بادشاہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں نے جو شادی کی ہے' یہ ایک طرح سے رشوت لی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے صاحب جی! اس شادی کا پروگرام تو پہلے سے بنا ہوا تھا۔ میری پہلی بیوی ایک سال سے جھگڑا کر کے اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

"ماشاء اللہ تو یہ دوسری شادی تھی؟"

وہ سر جھکا کر رہ گیا۔ ہمارا ایک ملازم سنگھا شی نے ذرا مؤدب لہجے میں بولا "گستاخی کی معافی چاہتا ہوں جی! چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ یہ عام مشہور ہے کہ سیپی کی دو بیویاں پہلے سے موجود تھیں۔ یہ آخری شادی اس کی دوسری نہیں تیسری شادی ہے۔"

"یہ تو سونے پہ سہاگے والی بات ہے۔" میں نے کہا "خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی کچھ دیر میں سب پتا چل جائے گا۔"

میں نے سیپی سے پوچھا کہ اس کے کرو خیال "رتناکو" یا گونگے سے کیسے رابطہ کیا جا سکتا ہے؟ اس نے فوراً مجھے "رتناکو" کے دو نیلی فون نمبر دے دیے۔ سیپی کے اپنے گھر میں بھی فون وغیرہ کی سہولت موجود تھی۔ میں نے فوری طور پر بذریعہ فون رتناکو سے رابطہ قائم کیا۔

رتناکو کی نتھنے میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ وہ پہلے سنہالی میں بولا لیکن پھر مدراسی لہجے کی ہندی میں بات کرنے لگا "کون بول رہا ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"تمہارا بابا۔ کہو کیا حال چال ہے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ یوں محسوس ہوا جیسے رتناکو ٹیلی فون چھوڑ کر ہی چلا گیا ہے۔ بالآخر وہ گمبھیر لہجے میں بولا "تم جو کوئی بھی ہو' پانھے کے حق میں بہت برا کر رہے ہو۔ وہ زندہ درگور ہو جائے گا۔ تمہارے اور پانھے کے لیے بہتر ہے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے دونوں کاریگروں کو چھوڑ دو۔"

میں نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا "تم پانھا کو بار بار درمیان میں کیوں گھسیٹ لیتے ہو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ میری اور تمہاری گیم ہے۔"

"نت۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس جھوٹ کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تمہیں۔ یاد رکھنا اگر آج تم نے ہمارے بندوں کو نہیں چھوڑا تو کل پانھا کے بندے کسی چوک کسی گلی میں دھندا نہیں کر سکیں گے۔"

"کیا کرو گے ان کے ساتھ؟"

"بس سمجھو' کل کا دن ان کے لیے قیامت کا دن ہو گا۔"

میں نے کہا "اگر ایسی بات ہے تو کل کا دن شروع ہو لینے دو۔ تمہیں اور تمہارے گونگے کو اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔ میں دیکھوں گا تمہارے چمچے کڑچھے کس طرح اپنے اڈوں پر بیٹھتے ہیں۔ آج تم اپنے دو چمچوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہو' کل دو فیصد جن کی واپسی کا مطالبہ کرتے نظر آؤ گے۔"

میرے لب و لہجے نے "رتناکو" کو کچھ دبا دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں مرعوب ہو جاؤں گا لیکن اسے اینٹ کا جواب پتھر سے مل رہا تھا۔ وہ لہجے کو قدرے نرم کرتے ہوئے بولا "اگر دنگا فساد کرو گے تو یہ مت سمجھو کہ تمہارا نقصان نہیں ہو گا۔"

"اسی لیے تو گزارش کر رہا ہوں بیٹا جی۔ کہ اپنے اس حرامی یار گونگے کو بلاؤ۔ تاکہ میں اس سے بات کر سکوں۔"

"لیکن تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کس بات کی پریشانی ہے تمہیں؟"

"یہ بھی میں اس بڑے کتے کو ہی بتاؤں گا۔"

چند سیکنڈ پھر خاموشی طاری رہی۔ غالباً "رتناکو" میرے توہین آمیز لہجے کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ کرخت لہجے میں بولا "کہاں ملنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "کوئی بھی ایسی جگہ منتخب کر لو' جہاں کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر سکے۔ بس ایک بات ذہن میں رکھنا' اگر دھوکا دہی کی کوشش ہوئی تو تم دونوں یاروں کو بہت رونا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے میں مشورے کے بعد تمہیں ایک دو گھنٹے میں فون کرتا ہوں۔" رتناکو نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فوراً پانھا کے ڈیرے پر اس سے رابطہ قائم کیا۔ بھنگ کے نشے نے پانھا کی آواز بھاری کر رکھی تھی۔ میں نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا (اس بات کی اطلاع میں اسے پہلے ہی دے چکا تھا کہ میں اس کے اہم کاریگر سیپی کو رتناکو وغیرہ سے چھڑا لایا ہوں اور اب وہ میرے پاس موجود ہے) میں نے پانھا سے کہا "تم نے ظاہری طور پر اس سارے معاملے سے الگ تھلگ رہنا ہے۔ اگر مخالف پارٹی میں سے کوئی تم سے رابطہ کرے تو تم یکسر بے خبر بن جاؤ گے۔"

"جیسے آپ کا حکم جانی صاحب!" پانھا نے کہا۔

"تمہارا کوئی مخبر "رتناکو" وغیرہ کے ہاں موجود ہے۔"

"ہاں جی ایک بندہ ہے۔"

"بس کسی طرح اس کو ہوشیار کر دو۔ اسے کہہ دو کہ وہ رتناکو اور گونگے کی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔"

"اپن نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی یہ ہدایت اسے کر دی ہے۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ جانکاری دی ہے کہ گونگا ابھی تک کولمبو واپس نہیں پہنچا ہے۔"

"ٹھیک ہے کوئی نئی اطلاع آئے تو مجھے آگاہ کرو۔"

"جیسے آپ کا حکم۔" پانھا نے کہا۔

رات بارہ بجے کے بعد میں نے "رتناکو" کو پھر فون کیا۔ رتناکو نے کہا "ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ ابھی گونگا صاحب "کولمبو واپس نہیں آئے۔ میرا وچار ہے کہ اب صبح ہی بات ہو سکے گی۔"

"ٹھیک ہے صبح تک انتظار کر لیتے ہیں لیکن میں پھر بتا دوں کوئی چالاکی نہیں چلے گی۔"

اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔ اس کا رویہ کچھ بدلا بدلا محسوس ہوتا تھا۔ وہ سخت جھلایا ہوا بھی تھا۔

صبح دس بجے کے لگ بھگ جب میں رتناکو کو دوبارہ فون کرنے کا ارادہ کر رہا تھا' پانھا کا فون آ گیا۔ اس کی آواز سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔ جب پانھا جیسا شخص گھبرا جائے تو پھر واقعی کوئی پریشانی کی بات ہوتی ہے۔

"کیا بات ہے پانھا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سخت گڑبڑ ہو گئی ہے جناب! وہ حرامی رتناکو اپنی اصلیت دکھانے پر اتر آیا ہے۔ آج صبح سویرے پولیس کی نفری نے اپن کے بندوں کے خلاف ایکشن لیا ہے۔ بڑے

جو بوست چھاپے مارے گئے ہیں۔ نئی جگہوں سے اپن کے اندازے میں بیس کاریگروں کو اٹھالیا گیا ہے۔"

خبر واقعی دہلا دینے والی تھی۔ میں نے کہا "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

وہ بولا "اپن کو ایک گھنٹا پہلے اپنا اڈا چھوڑنا پڑا ہے۔ نہیں تو اپنا کے پکڑے جانے کا بھی کھترہ تھا۔"

میرے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ آج کل ویسے بھی مجھے ہر شے سے بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔ پے در پے ایسے صدمے آئے تھے کہ اندر سے میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ان صدموں میں ایک صدمہ غزالہ سے دور جانے کا بھی تھا۔ یہ دوری اس لیے بھی تشویشناک گزری تھی کہ بہت قریب آنے کے بعد بہت فاصلہ پیدا ہوا تھا۔ اب یہ فاصلہ مجھے زندگی سے اور زندگی کی خوب صورتیوں سے بھی دور لیے جا رہا تھا۔ اپنی نئی بے اصولیاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اکثر خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کرتا تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ اب خود کو سنبھالنے کی طاقت بھی ناتوانی میں بدلتی جا رہی ہے۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ خود کو بے مہار چھوڑ دوں۔ دنیا میرے ساتھ جو کر سکتی ہے کر گزرے، اور میرے ہاتھوں بھی دنیا پر جو گزر سکتا ہے گزر جائے۔ اب میں کیوں سنبھلوں؟ کس کے لیے سنبھلوں؟ جب ان حسین بانہوں کا سہارا نہیں تو پھر کوئی سہارا کیوں رہے، جب ان حسین آنکھوں کی روشنی نہیں تو پھر ڈوب جائے سب کچھ اندھیروں میں... غرق ہو جائے۔

میں نے پاشا سے پوچھا "تمہارا مخبر کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکا؟"

پاشا نے کہا "لگتا ہے کہ یہ ساری کارروائی بڑی رازداری سے کی گئی ہے۔ اپن کا کھبر (مخبر) اس بارے میں بالکل بے کھبر رہا ہے لیکن اس نے ابھی ابھی ایک بہت کھاص کھبر دے کر اپن کی شکایت کو دور کر دیا ہے۔"

"کیسی خبر؟"

"اس نے اپن کو ابھی فون پر جانکاری دی ہے کہ گونگا کولمبو واپس آگیا ہے۔ اس سے گونگا اور "رتناکو" اپنے دو چار کھاص کارندوں کے ساتھ شیل روڈ کے ایک کوارٹر میں موجود ہیں۔ پولیس کا ایک بڑا افسر بھی جو گونگے کا نیا نیا یار بنا ہے کوارٹر میں موجود ہے۔"

"وری گڈ۔ یہ اچھی خبر ہے۔ تم مجھے کوارٹر کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔"

پاشا نے پریشان ہو کر کہا "جہانی صاحب، آپ اپن کے لیے بہت ٹینشن اٹھا رہا ہے۔ اپن آپ کو مجبور (مزید) کچھ نہ کرنے دے گا۔ اگر آپ کے دماغ میں یہ وچار آگیا ہے کہ آپ اکیلا گونگے وغیرہ سے بھڑنے چلا جائے گا تو یہ کھترناک ہے اپن کی کھاطر۔"

"دیکھو پاشا! میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا، وہ نہ تم مشورہ دینے کی کوشش کرنا۔ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں بس اس کا جواب دو۔ وہ کوارٹر کہاں پر ہے؟"

"مگر جہانی صاحب..."

"اگر مگر کچھ نہیں۔" میں نے پھر اس کی بات کاٹی "مجھے کوارٹر کا پتا بتاؤ، پھر میں فون بند کر رہا ہوں، پھر مجھ سے جو ہو اپنے طور پر ہو سکے گا کروں گا۔"

کچھ ہی دیر کے بعد پاشا نے مجھے کوارٹر کا پتا بتا دیا۔ تاہم ساتھ ہی اس نے شرط رکھی کہ وہ میرے ساتھ جائے گا اور اپنے دو چار خاص بندے بھی اپنے ساتھ رکھے گا۔

پاشا کی یہ شرط ماننا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میری خواہش تھی کہ پاشا اس معاملے میں کم سے کم ملوث ہو۔ بہرحال پاشا کے پرزور اصرار پر میں اس کے دو ایسے کارندوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گیا جن کا براہ راست تعلق پاشا سے ثابت نہیں ہوتا تھا۔

آخر میں پاشا نے عاجز آکر کہا "لیکن جہانی صاحب، اپن نہیں چاہتا کہ اپن کی کھاطر آپ کوئی کھون کھرابہ کریں۔"

"کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ بے شک بھنگ کا ایک پیالہ پی کر سو جاؤ۔"

رات کو میں نے بیچو سے جو پوچھ گچھ کی تھی اس سے گونگے کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ گونگے کا اصل نام امرناتھ معلوم ہوا تھا لیکن یہ نام بہت کم لوگ جانتے تھے اور اسے گونگا، گونگا صاحب یا عرف صاحب کہا جاتا تھا۔ گونگا ہندوستانی تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً سری لنکا آتا رہتا تھا اور اس کا قیام آٹھ دس روز سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس مرتبہ وہ سری لنکا میں قیام کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ اس کی آمد قریباً چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔ وہ مستقل طور پر رتناکو کے ڈیرے پر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ اس نے بھکاریوں کی انجمنوں میں خاص دلچسپی لی تھی اور ان انجمنوں کے عہدے داروں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ دو تین ہفتوں میں پولیس کے اندر بھی اس کے کئی واقف پیدا ہو گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ علاقے میں چھا گیا تھا۔ اسے رتناکو کے قریبی دوست کی حیثیت سے پہچانا جا رہا تھا اور اس کی وجہ سے رتناکو کا اثر و رسوخ بھی دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا

تھا۔ جونہی "رتناکو" کو گونگے کا سہارا ملا تھا اس نے اپنے پرانے کاروباری رقیب پاشا سارھو کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ ٹکر لے رہا تھا اور اسے نیچا دکھا کر پسپا کرنے کے چکر میں تھا۔

گونگا خود بھی ہاتھ پاؤں کا مضبوط شخص تھا اور مار کٹائی کے فن میں طاق تھا۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ میں اس نے گال روڈ کے کئی ٹھکانوں پر اپنا قبضہ جمالیا تھا اور پاشا کے مزاحمت کرنے والے کارندوں کو یادگار پھینٹی لگائی تھی۔ پولیس میں بھی چونکہ اس نے زبردست تعلقات بنا لیے تھے لہٰذا گونگے کی زیادتی کا نشانہ بننے والوں کو پولیس کی زیادتی کا شکار بھی ہونا پڑ رہا تھا۔

میں نے اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں وہسکی کی آدھی بوتل خالی کر لی تھی۔ سگریٹ سے سگریٹ بھی سلگا رہا تھا۔ آخر پاشا کے دونوں کارندے حویلی پہنچ گئے۔ یہ دونوں لڑائی بھڑائی کے ماہر افراد تھے۔ ان کے جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ دونوں مل کر چھ سات بندوں کے ہاتھ پاؤں باآسانی توڑ سکتے ہیں۔

میں نے ان دونوں کے مختصر انٹرویو لیے اور پھر انہیں اپنے ساتھ سیجی کی فراہم کردہ چھوٹی سوزوکی کار میں بٹھا لیا۔ "چیپ" کا علاقہ ہی ایسا تھا جہاں بڑی گاڑی لائی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ میرے پاس ماؤزر تھا، اس کے علاوہ ٹرپل ٹو میں نے نشست کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ میرے دونوں ساتھی بھی رائفلوں اور خنجروں سے مسلح تھے۔ ان کے طور اطوار دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر کوارٹر پر ہنگامے کی نوبت آئی تو یہ دونوں افراد میرا بھرپور ساتھ دیں گے۔ میں اس وقت خطرناک موڈ میں تھا۔ رتناکو اور گونگا میرے ہاتھوں قتل ہو سکتے تھے، تاہم میں نے سوچ رکھا تھا کہ خون خرابہ آخری حل ہوگا۔ مجھے تو یہاں سے چلے جانا تھا لیکن پاشا کو یہیں اپنی جنم بھومی میں رہنا تھا اور اپنا نسلوں پرانا دھندا کرنا تھا۔ میں اس کے لیے دشمنی کے ایسے کانٹے بکھیرنا نہیں چاہتا تھا جنہیں چننا اس کے لیے مشکل ہو جائے۔

ہم چھوٹی سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے قریباً پون گھنٹے میں اپنی منزل کے نزدیک پہنچ گئے۔ اب دن کے بارہ بج چکے تھے۔ گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر اور بازاروں میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ پولیس کے آپریشن کلین اپ کی وجہ سے ہمیں راستے میں کہیں بھکاری بلکہ بھکاری کا بچہ بھی نظر نہیں آیا۔ ہم ایک گول چکر پر گھوم کر سیدھے ہوئے تو سڑک کے کنارے ہجوم نظر آیا۔ ایک جگہ تھوڑا سا خون بھی بکھرا ہوا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ میں نے گاڑی آہستہ کی۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کیا ہوا ہے؟

ایک نوجوان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "پولیس بھکاریوں کے خلاف ایکشن کر رہی ہے۔ ابھی پولیس والے ایک اپاہج بھکاری کو پکڑنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ یہ بھکاری پچھلے دس سال سے یہاں بھیک مانگ رہا ہے اور خود کو ٹانگ سے معذور بتاتا ہے لیکن پولیس کا چھاپہ پڑا تو اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا مگر یہاں سڑک کراس کرتے ہوئے بس سے ٹکرا گیا۔ اب ٹانگوں پر ہی چوٹیں آئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سچ مچ معذور ہو جائے۔"

شہر کی صورت حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ پاشا کے کارندوں کے ساتھ واقعی بے رحمی کا سلوک کیا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ صرف اس لیے تھا کہ میری وجہ سے رتناکو اور گونگے کے اثر و رسوخ کو نقصان پہنچا تھا۔ میرا ذہن مسلسل سوچ بچار میں مصروف تھا۔ کسی وقت تو دل چاہتا تھا کہ رتناکو، گونگے اور اس کے دو چار اہم ساتھیوں کو واقعی پھڑکا دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

ہم کوارٹر کے سامنے پہنچ گئے۔ جسے کوارٹر کہا جا رہا تھا، یہ دراصل ایک فلیٹ تھا۔ یہ ایک کمرشل پلازہ کی تیسری منزل پر واقع تھا۔ فلیٹ پر ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس پر "انجمن بہبود نوجوانان" کے الفاظ لکھے تھے۔ عمارت کے سامنے جو گاڑیاں کھڑی تھیں، ان میں ایک گاڑی پر پولیس کے رنگوں کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ یہ اسی پولیس آفیسر کی گاڑی ہے جو مخبر کے بقول فلیٹ میں گونگے وغیرہ کے ساتھ موجود تھا۔

میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو گاڑی میں ہی رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جب تک کوئی فائر نہ ہو وہ گاڑی کے اندر ہی رہیں۔ پھر میں نے ایک اٹیچی کیس اٹھایا اور اطمینان سے کمرشل پلازہ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس اٹیچی کیس میں فقط ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ میں یہ رائفل ہاتھ میں لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ رائفل کے علاوہ جو دوسرا ہتھیار میرے پاس موجود تھا، وہ بھرا ہوا ماؤزر تھا۔ یہ ماؤزر میں نے اپنی قمیص کے اندر رکھا ہوا تھا۔ تیزی کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر خطرناک صورت والا ایک نگران کھڑا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے اطمینان سے اٹیچی کیس نیچے رکھا اور نگران سے کہا "میں رتناکو صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کون رتناکو؟ یہاں کوئی رتناکو نہیں ہے۔"

نگران کے لب و لہجے نے مجھے سمجھا دیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ میں نے اٹیچی کیس کھولا اور اس میں سے زیل نو رائفل برآمد کر لی۔ میرے اطمینان نے نگران کو چکرا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کرنے جارہا ہوں۔ میں نے رائفل نکالی اور گھما کر نگران کی گردن پر رسید کی۔ وزنی لٹھ کی طرح رائفل کی ضرب خاصی زوردار تھی۔ نگران اوندھے منہ فرش پر گرا۔ اسے گرتے دیکھ کر دو افراد دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ انہیں اتنی سخت مزاحمت ملنے والی ہے۔ ایک شخص کے منہ پر میری لات پڑی اور وہ تیورا کر رہ گیا۔ دوسرے نے اپنے لباس میں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے رائفل کے کندے سے اس کے جبڑے پر ضرب لگائی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔

یہی وقت تھا جب فلیٹ کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ سامنے مجھے ایک بھکشو ٹائپ شخص دکھائی دیا۔ بھکشو اپنی نرم دلی اور امن پسندی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں لیکن اس جعلی بھکشو کے ہاتھ میں سیاہ ریوالور صاف نظر آرہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو وہ مجھ پر گولی چلا دیتا۔ میں نے فائر کیا اور بھکشو کا ریوالور والا ہاتھ زخمی ہوگیا۔ میں نے ٹانگ رسید کرکے اسے دور پھینک دیا۔ اندرونی کمرے سے ایک اور ہٹا کٹا شخص تلوار لیے برآمد ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے آیا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میرا رائفل والا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے گا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری اور وہ اپنے زور میں لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔

میرے بالکل سامنے ایک دروازہ تیزی سے کھلا۔ مجھے دروازے میں ایک پولیس آفیسر دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک اور بندہ بھی تھا۔ پولیس آفیسر کا ہاتھ اپنے سرکاری ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا "خبردار!" میں نے چیخ کر کہا۔

پولیس آفیسر اپنی جگہ جامد کھڑا رہ گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ میں خالی خولی دھمکی نہیں دے رہا اور اس سے پہلے میں دو تین بندوں کو لمبا لٹا چکا ہوں۔ پولیس آفیسر کے ساتھ والا شخص بھی ساکت ہوگیا تھا۔ مجھے سیڑھیوں کی طرف سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ میرے دونوں ساتھی ہیں۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ بھی میدان میں کود پڑے تھے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ پولیس آفیسر کے ساتھ کھڑا شخص ہی سرغنہ گونگا ہے۔ اچانک میں نے غور سے اسے دیکھا اور میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ یہ شخص میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ بس حلیہ تھوڑا سا بدلا ہوا تھا۔ پہلے میں نے اس شخص کو داڑھی مونچھوں میں دیکھا تھا اب یہ کلین شیو تھا۔ میرا ذہن ہزاروں میل کا فاصلہ برق رفتاری سے طے کرکے لاہور میں پہنچ گیا تھا۔ میرے سامنے کوئی اور نہیں ہارون پاشا کھڑا تھا۔ ہارون پاشا المعروف چیتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں پاشا گینگ کے سرغنہ کو یہاں کولمبو میں دیکھوں گا۔ اور وہ بھی ایسے روپ میں۔

میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی اور نظریں پاشا کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک شناسائی کی چمک نہیں ابھری تھی۔ اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے اس وقت اپنے چہرے میں ہلکی پھلکی تبدیلی کر رکھی تھی۔ بال، مونچھیں، جلد کا رنگ، ناک کی ساخت کافی کچھ بدلا ہوا تھا۔

میرے دونوں ساتھی بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ مارو ماری کے لیے پوری طرح تیار نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

میں نے پاشا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں ہی گونگا کہا جاتا ہے۔ میں مزید خون خرابے سے بچنا چاہتا ہوں اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ تم مجھے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دو۔"

"تم ہو کون اور تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں گھسنے کی؟"

"دیکھو! میں نے جرأت کرلی ہے اور اس سے بڑی بڑی جرأتیں بھی کرسکتا ہوں۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ میرا بس یہ مطالبہ ہے کہ میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اب رتناکو بھی وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔ دیگر افراد کی طرح رتناکو کے چہرے پر بھی کشیدگی کے زبردست آثار پائے جارہے تھے۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ فلیٹ کے مختصر سے صحن میں کم و بیش ایک درجن افراد موجود تھے اور دونوں طرف رائفلیں تنی ہوئی تھیں۔ جو بھکشو نما شخص میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بے آسرا پڑا ہوا تھا اور مسلسل کراہ رہا تھا۔

گونگے یعنی پاشا نے ایک نظر اپنے ساتھی پولیس افسر کی طرف دیکھا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی۔ پھر پاشا نے اپنے ساتھیوں کو رائفلیں نیچی کرنے کے لیے کہا۔ میں نے بھی اپنے دونوں ساتھیوں کو یہی ہدایت کی۔ میری

رائفل بدستور میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کوئی چالاکی نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ جو خون خرابہ ہوگا اس کا تم لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

گونگے یعنی پاشا نے مجھے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ ظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک مجھے پہچان نہیں سکا۔ اس کے نہ پہچاننے پر مجھے تھوڑی سی حیرت بھی تھی۔ میرا میک اپ ایسا نہیں تھا کہ مجھے قریب سے جاننے والا مجھے بغور دیکھنے کے باوجود پہچان نہ سکے پھر میں آواز بھی بنا نہیں رہا تھا۔ اپنی نارمل ٹون میں ہی بول رہا تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ایک عقبی کمرے میں پہنچے۔ یہاں فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے وغیرہ رکھے تھے۔ منظر وہی تھا جو عام طور سے مقامی انجمنوں کے دفتروں کا ہوتا ہے۔

"کیا ہم یہاں رازداری سے بات کرسکتے ہیں؟" میں نے پاشا سے پوچھا۔

"یقیناً۔" وہ بولا اور اس نے دروازہ بند کرنے کے بعد کھڑکیوں کے پردے درست کردیے۔

"کچھ اندازہ ہے کہ میں تم سے کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل۔ آپ مجھے بتانا چاہ رہے ہیں کہ آپ کا نام شاہ جہاں ہے اور آپ مجھے پاکستان سے اتنی دور یہاں دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔"

پاشا کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور حیرت آمیز خوشی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور ہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔ وہ بولا "میں نے آپ کو تھوڑی دیر بعد ہی پہچان لیا تھا۔ آپ کو پہچاننے میں آپ کی آواز نے بہت مدد کی۔"

"میں واقعی تمہیں یہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا ہوں۔"

"کچھ یہی کیفیت میری بھی ہے۔ آپ کو پہچاننے کے بعد میں نے اپنے تاثرات پر بمشکل قابو پایا تھا۔ درحقیقت ان لوگوں کے سامنے ہماری شناسائی ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔"

"پھر تو ہمیں یہاں بہت مختصر بات کرنا ہوگی۔"

"بالکل ایسے ہی ہے۔ آپ میرا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ نوٹ کریں اور مجھے اپنا نمبر وغیرہ نوٹ کرائیں۔"

ہم نے فوری طور پر نمبروں اور ایڈریس کا تبادلہ کرلیا۔ پاشا نے کہا "شاہ جہاں صاحب! آپ بس خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ یہاں کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا۔"

"اوکے۔" میں نے کہا۔ ہم نے ایک بار پھر گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور باہر آگئے۔

ہم دونوں نے چہروں پر گہری سنجیدگی طاری کرلی تھی۔ باہر نکل کر میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ہم فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب سنہالی پولیس آفیسر تڑپ کر ہمارے راستے میں آگیا "کہاں جارہے ہو تم لوگ۔۔۔؟ اس طرح تم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے۔"

پولیس آفیسر کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس سے پہلے کہ پولیس آفیسر اپنا ریوالور برآمد کرتا یا تلملا کر کوئی اور ایسی ویسی حرکت کرتا۔ پاشا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر اجنبی لہجے میں بولا "جاؤ۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اب یہاں رکو گے تو مصیبت اٹھاؤ گے۔"

میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ زینے کی طرف بڑھا۔ فائرنگ اور مار کٹائی نے اردگرد کے رہائشیوں کو ہراساں کردیا تھا۔ لوگ یہاں وہاں ٹولیوں کی شکل میں کھڑے چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ کھڑکیوں سے خواتین جھانک رہی تھیں۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں اترتے نیچے آئے اور سوزوکی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اپنی رائفل میں نے ایک بار پھر اٹیچی میں رکھ لی تھی۔

شام سے پہلے پاشا کا ٹیلی فون آگیا۔ وہ بولا "اس بارے میں تو بعد میں بات ہوگی کہ پانگا وغیرہ سے آپ کا کیا تعلق ہے، بہرحال اب پانگا کے کارندوں کے بارے میں بتا دیجیے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو ایک دو گھنٹے تک، میں انہیں پولیس کی حراست سے رہائی دلا سکتا ہوں۔"

"یہ بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں اس بارے میں فون کرنے ہی والا تھا۔ میری خواہش ہے کہ پانگا کے سارے کارندے رات حوالات سے باہر گزاریں۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ وہی ہوگا جو آپ کہہ رہے ہیں۔ اگر کوئی ایک آدھ بندہ کسی جرم میں ملوث ہونے کی وجہ سے رہ بھی گیا تو کل عدالت سے اس کی ضمانت کرالیں گے۔"

میں نے کہا "آج کے چھاپوں میں ایک بندہ سخت زخمی بھی ہوا ہے۔ پولیس سے بھاگ رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ کرا بیٹھا۔ اس کے بارے میں معلوم کرکے بتاؤ کہ کس اسپتال میں ہے؟ اس کی ٹھیک طرح دیکھ بھال ہونی چاہیے۔"

پاشا بولا "میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی اس کا پتا کرا چکا ہوں۔ میں نے اسے سرکاری اسپتال سے ایک پرائیویٹ کلینک میں منتقل کرا دیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہیں۔ بہرحال اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں رہے گی۔"

"تمہارے زخمیوں کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بندے کو پاؤں پر اور دوسرے کو ٹانگ پر گولی لگی ہے۔ ٹانگ والے کی حالت ذرا سیریس ہے۔ بہرحال جان کا خطرہ نہیں۔"

"اس کا بھی مناسب علاج ہونا چاہیے۔ باقی 'بیبی' میرے پاس موجود ہے۔ ساتھ میں اس کا ایک بھکشو نما ساتھی بھی ہے۔ دونوں بالکل خیریت سے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں بھکشو کو ابھی تمہارے پاس پہنچا سکتا ہوں۔"

"نہیں، ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ بس ان کی خیریت کا پتا چل گیا ہے' یہی بہت ہے۔"

میں نے کہا "پاشا! تم مجھے بڑے تکلف سے مخاطب کررہے ہو۔ پہلے تم کہتے تھے اب "آپ" کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک ہے آئندہ احتیاط کروں گا۔" وہ ہنس کر بولا۔

چند منٹ مزید گفتگو کرتے کے بعد ہم نے بات ختم کردی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہی پاشا کا فون آگیا۔ اس کے لہجے میں خوشی کی جھلک تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا "آپ نے چمتکار کردیا ہے جمالی صاحب! اپن کا بندا شہر کے تھانوں سے واپس آرہا ہے۔ وہاں سے وہ لوگ نکل چکے ہیں' مجید (مرید) آرہے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ رات گیارہ بجے تک سارے ہی آجائیں گے۔"

"آپ واقعی باکمال انسان ہیں جمالی صاحب! آپ نے وہ کام کر دکھایا ہے جو بہت کھوچ کھرانے اور لڑائی جھگڑے کے بعد بھی نہیں ہوسکتا تھا۔"

میں نے کہا "دوسری خوش خبری تمہارے لیے یہ ہے کہ بیبی اب تمہارے پاس واپس آجائے گا' اور رتنا کو سے تمہاری روز کی کل کل بھی ختم ہوجائے گی۔"

بہت خوب جمالی صاحب' آپ نے واقعی کایا پلٹ دی ہے۔ "رتنا کو سے روز کی کل کل نے اپن کو بیمار کرڈالا ہے۔ یہ تنازعہ ختم ہوجائے تو اپن پھر سے سنسار میں آجائے گا۔ یہ دیکھیں... اپن کو وہ مجید (مرید) کا زندہ درویش ہے میں نظر آرہا ہے۔ یہ بھی تھانے سے چھوٹ کر آیا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا "پاشا! تمہارے ان تین قت کے کاریگر کا کیا حال ہے۔ اس نے پھر تو تماشا دکھانے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں جی! اب تو وہ ٹھیک جا رہا ہے۔ اپن نے اس کے کان بھی خوب اچھی طرح کھینچے ہیں' اب وہ اس کا زیادہ دھیان رکھتا ہے۔ وہ ابھی روحانی علاج دے رہا ہے۔ اب اس کاریگر کی تکلیف بھی ٹھیک ہے۔"

پاشا کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں نے فون بند کردیا۔

اندرونی کمرے سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ للیتا کی آوازیں تھیں۔ وہ کسی بات پر توسیہ کو ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی۔ میں دیکھنے کے لیے موقعے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ توسیہ نے جھلاہٹ میں کھانے کے برتن الٹ دیے ہیں۔ اب للیتا نے دوسرے برتنوں میں اسے اور کھانا لاکر دیا تھا۔ توسیہ یہ کھانا کھانے سے بھی انکار کررہی تھی۔ للیتا چھڑی لیے توسیہ کے سر پر کھڑی تھی اور اسے کھانے پر مجبور کررہی تھی۔ مجھے کھڑکی میں دیکھ کر توسیہ نے میرے سامنے مزید بے عزت ہونا مناسب نہیں سمجھا۔

اس نے چیخ کر للیتا سے کہا "اچھا چھوڑ دے میری جان! کھالیتی ہوں' کھالیتی ہوں لیکن اپنی شکل میرے سامنے سے گم کردے۔ نکل جا اس کمرے سے۔"

للیتا کمرے سے تو نہیں نکلی مگر دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ توسیہ نے زہرناک نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جلدی جلدی لقمے لینے لگی۔ للیتا اب توسیہ کے معاملے میں ماسٹر ہوگئی تھی۔ توسیہ کی شعلہ مزاجی پر قابو پانے کے کئی ڈھنگ اسے آگئے تھے۔ اچانک میری نگاہ کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں میں سے ایک پر "کٹ" سا نظر آیا۔ میں نے توسیہ کو احساس دلائے بغیر ذرا دھیان سے "کٹ" کی طرف دیکھا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ کٹ تازہ ہے اور آری وغیرہ سے لگایا گیا ہے۔

میں نے خاموشی اختیار کی اور واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں نے للیتا کو اپنے پاس بلایا۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ ذرا نروس نظر آنے لگی۔ میں نے پوچھا "رات کو تم کتنے بجے سوتی ہو؟"

"ن... نہیں سوتی جی۔" وہ ہکلائی "میں دن میں سوتی ہوں۔"

"تم غلط بیانی کررہی ہو۔ اگر تم رات کو نہ سوتی تو توسیہ کی نگرانی میں یہ کوتاہی نہ ہوتی۔"

"کیا ہوا ہے' صاحب جی؟" وہ سخت نروس ہوگئی۔

"تمہاری غفلت کا فائدہ اٹھا کر توسیہ فرار ہونے کی کوشش کررہی ہے۔ اب جاکر ذرا کھڑکی کو دیکھنا اس کی ایک سلاخ کسی دندانے دار شے سے کاٹی جارہی ہے۔ اگر ہمیں ایک دو دن مزید پتا نہ چلتا تو وہ سلاخ کٹ جاتی اور ایک [illegible] کٹنے سے ہی توسیہ باہر نکل سکتی تھی۔ تمہیں شاید پتا نہیں۔

وہ باہر نکل کر کتنی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ کوئی ہتھیار وغیرہ لگ جائے تو وہ تین چار بندوں کی جان بھی لے سکتی ہے۔ تمہارے شوہر کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اگر وہ بے چارا معذور ہوکر اسپتال میں پڑا ہوا ہے تو اس کی وجہ فقط یہی ہے کہ توسیہ اپنے کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔"

للیتا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا "میں معافی چاہتی ہوں صاحب جی۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"چلو جاؤ' اور کھڑکی کو دیکھو لیکن توسیہ کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس بارے میں تمہیں میں نے بتایا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

"بس دیا لے کے توسیہ کو مارنا پیٹنا نہیں' ایسی ڈانٹ ڈپٹ کافی ہوگی لیکن آئندہ کے لیے بہت خیال رکھو۔ جو شے اس نے سلاخ کاٹنے کے لیے استعمال کی ہے وہ اس نے اپنے لباس میں ہی کہیں چھپا رکھی ہوگی یا پھر باتھ روم میں کہیں ہوگی۔ وہ حاصل کرلو۔"

"جو آپ کا حکم۔"

"یہ پتا چلانے کی کوشش بھی کرنی ہے کہ وہ چیز توسیہ تک کیسے پہنچی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ ضروری کام یہی ہے۔"

للیتا مسلسل اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ میں کوشش کررہا تھا کہ توسیہ سے میرے تعلقات مزید بگڑنے نہ پائیں۔ جب سے آتش زدگی والا واقعہ ہوا تھا اور میں نے اسے آگ سے نکالا تھا اس کے رویے میں ایک موہوم سی تبدیلی تو آئی تھی۔ کسی وقت یہ تبدیلی ایک کرن بن جاتی تھی اور کسی وقت محض نقطے کی طرح رہ جاتی تھی۔ بہرحال اس کا وجود ختم نہیں ہوا تھا۔ میرا یقین تھا کہ برے سے برے شخص میں بھی اچھائی کی رمق موجود ہوتی ہے۔ اپنے اسی یقین کے سہارے میں نے بدنام شیخ عاصم سے بھی سر پھوڑا تھا۔ بے شمار موقعے ایسے آئے تھے جب میں اسے قتل کرسکتا تھا یا ناقابل تلافی جسمانی نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن میں نے اسے رعایتیں دی تھیں۔ میں مسلسل کئی برس تک اسے وارننگ دیتا رہا تھا۔ وہ مجھ سے دھکیلے گئے انگاروں کی بارش تو کرے لیکن گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ عاصم کا رویہ میرے ساتھ بدتر ہوا تھا۔ آخر میں [illegible] اسٹیج پر پہنچ گیا تھا۔ اس کھیل میں کسی کی بھی شکست ہوسکتی تھی۔ عاصم کو ہوئی تھی۔ اب وہ ایک لوتھڑے کی صورت دنیا میں موجود تھا۔ [illegible] زندوں میں تھا نہ مردوں میں۔

رات گئے ایک بار پھر فون پر بابا دین پاشا سے بات ہوئی۔ اس نے کہا "شاہ جہاں! تازہ اطلاع کے مطابق صبح پکڑے جانے والے پاشا کے تمام بندے رہا ہوچکے ہیں۔"

"چلو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری کوشش قابل تعریف ہے۔"

وہ بولا "اور کوئی خدمت؟"

میں نے کہا "ابھی تک اصل موضوع پر تو ہم نے بات کی ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ... اور گونگے کا روپ اور رتنا کو دیکھو کا بکھیڑا؟"

"اس بارے میں تو بڑی تفصیل سے بات ہونی ہے شاہ جہاں بھائی' کچھ بہت خاص قسم کی خبریں میرے پاس موجود ہیں۔ ان کے بارے میں فون پر بات نہیں کی جاسکتی۔ ایک دو دن تک میں ٹائم کسی اور جگہ سیٹ کروں گا' پھر آرام سے بات ہوگی۔"

"تم سسپنس بڑھا رہے ہو۔"

"یہ باتیں ہی سسپنس والی ہیں۔" اس نے کہا' پھر ذرا توقف سے بولا "میں نے "رتنا کو" سے صلاح مشورے کے بعد ایک پروگرام بنایا ہے۔ امید ہے کہ اس پروگرام کے بارے میں جان کر تمہیں اور خاص طور سے پاشا کو خوشی ہوگی۔"

"کیسا پروگرام؟"

"ان دونوں گروپوں میں صلح صفائی کا پروگرام۔ درحقیقت زیادتی کی شرح رتنا کو کی طرف سے زیادہ ہی ہے۔ میں نے "رتنا کو" کو اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ صلح صفائی کی بات چیت کے لیے وہ خود چل کر پاشا کے ڈیرے پر جائے گا۔ اگلے ایک دو دن میں رتنا کو اپنے ساتھیوں سے مشورے کرلے گا' پھر ہم ان لوگوں کو آپس میں ملا دیں گے۔"

میں نے کہا "اس کے بعد ہم ان لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ یہ اچھے بھکاریوں کی طرح آپس میں مل جل کر رہیں۔ محنت اور دیانت داری کے ساتھ لوگوں کی جیبیں خالی کریں اور اپنے دھندے کی ترقی کا سوچیں۔"

پاشا ہنسنے لگا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے کہنے سننے سے تو یہ لوگ اپنا باعزت پیشہ ترک نہیں کریں گے۔"

میں نے کہا "وہ بھکشو میری تحویل میں تھا میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ میرا ایک بندہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے نیلی روڈ کے دوسرے چوراہے پر چھوڑ آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گھر تک پہنچ چکا ہوگا۔"

"سپی کا کیا حال ہے؟" پاشا نے پوچھا۔

"تم لوگوں نے اس کی تیسری شادی کرا کے اس کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ وہ کل سے بھوں بھوں کر کے رو رہا ہے اور اپنی زیبا ہنا بھکارن کو یاد کر رہا ہے۔"

"تیسری نہیں' دوسری شادی تھی۔" پاشا نے کہا۔

"یہی تو مزے کی بات ہے۔ اس کی دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں اور اس کی ٹانگیں بھی اتنی بے جان نہیں جتنی ہم سمجھتے ہیں۔"

پاشا نے کہا "پچھلے تین چار ماہ میں نے ان لوگوں کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان کے طور اطوار حیران کرنے والے ہیں۔ کئی محتاج ایسے ہیں جو ذاتی کار پر بھیک مانگنے کے لیے آتے ہیں اور ویک اینڈ پر کولمبو کے فائیو اسٹار ہوٹلز میں کھانا کھاتے ہیں۔ ساٹھ ستر فیصد معذوروں کی "معذوریاں" جعلی یا نیم جعلی ہیں۔ ان میں سے کئی عیش و عشرت کے دلدادہ ہیں۔ جیسے یہ سپی۔ عورتوں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکتی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بھرے بھرے بازار میں زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چلتا ہے' اس کا سر بھی زمین سے رگڑ رہا ہوتا ہے۔ یہاں اکثر عورتیں لنگیاں وغیرہ پہنتی ہیں۔ یہ ان کے لباس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ عورتوں کے بازو چھونا' سخت رش میں ان کی پنڈلیوں پر بوسے دینا اس کے عام مشغل ہیں۔"

میں نے اور پاشا نے دونوں "بھکاری گروہوں" کی مصالحتی ملاقات کے بارے میں کچھ بات چیت کی پھر فون بند کر دیا۔

اگلے روز دوپہر کو مجھے پاتھا سے معلوم ہوا کہ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ پاتھا کے سارے کارندے پولیس کے چنگل سے چھوٹ گئے تھے بلکہ پاتھا اور رتناکو کے درمیان ٹیلی فون پر ہیلو ہیلو بھی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ "ہیلو ہیلو" کرانے میں پاشا ہی کا ہاتھ تھا۔

پاتھا خوش اور مطمئن لگ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ مسئلہ اتنی جلدی اور آسانی سے کیونکر حل ہوا ہے؟ اسے پاشا کی اصلیت کے بارے میں معلوم تھا اور نہ یہ پتا تھا کہ ہمارے درمیان پہلے سے تعلقات موجود ہیں۔

پاشا کے ساتھ میرے تعلقات ایسے نہیں تھے جو با آسانی ذہن سے مٹائے جا سکتے۔ پاشا شروع میں اشرف چیتا کے نام سے میرے سامنے آیا تھا۔ میں نے اسے روچھا پور میں ملدر گنگی کے ساتھی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ وہ ڈھلی ہوئی عمر کا ایک ڈھیلا سا غنڈہ نظر آتا تھا جو دیہاتی لہجے میں گفتگو کرتا تھا لیکن پھر چند ماہ بعد وہ لاہور کی ایک کوٹھی میں اشرف چیتا کے بالکل نئے روپ میں سامنے آیا تھا۔ نہایت تیز رفتار اور خطرناک شخص۔ جو پاشا گینگ کا سرغنہ تھا۔ اب یہ پاشا جو اپنے ساتھیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان کی نگاہوں اور سوچوں سے بہت دور تھا۔ اس کے گینگ نے ماہ تک پاکستان کے طول و عرض میں وحشت اور تخریب کاری کا بازار گرم کیے رکھا تھا اور اس کی مار فقط پاکستان تک نہیں تھی پاکستان سے باہر تک بھی تھی۔ پھر کچھ ایسے ناقابل فراموش شب و روز آئے تھے جب یہ انتہائی خطرناک شخص میرے ساتھ ایک قید خانے میں بند ہو گیا تھا۔ اس قید خانے میں ہم نے ایک ساتھ تقریباً پانچ ہفتے گزارے تھے۔ ان ہفتوں نے جہاں اور بہت کچھ کیا تھا وہاں زخمی پاشا کی کایا بھی پلٹ دی تھی۔ پاشا کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہوا تھا۔ قید خانے سے رہا ہونے کے بعد ایک رات اس "نئے انسان" نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ مجھے وہ رات بہت بھولی نہیں تھی جب ساہی صاحب کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی پر ایک شخص مجھ سے ملنے آیا تھا۔ چادر میں لپٹا ہوا یہ شخص باہرن پاشا ہی تھا۔ پاشا نے اس رات جو الفاظ کہے تھے وہ ابھی تک میری سماعت میں گونج رہے تھے۔ پاشا نے کہا تھا۔ "شاہ جہاں! میں نے بڑے جرم کیے ہیں۔ عورتوں کو کیا ہے' قتل کیے ہیں' اسمگلنگ کی ہے' گینگ بنا کر لوٹ مار کی ہے' خطرناک تنظیمیں بنا کر پاکستان میں اور پاکستان سے باہر تخریب کاری کی ہے۔ ان گنت انسانوں کا خون میرے سر پر ہے شاہ جہاں' مجھے سو بار بھی پھانسی دی جائے تو شاید کم ہو۔ لیکن پھانسی میرے لیے کوئی سزا نہیں۔ میری اس سزا سے ان گناہوں کا مداوا نہیں ہو سکتا جو میں نے کیے ہیں۔"

آخر میں پاشا نے کہا تھا۔ "ابھی مجھے ٹھیک سے خود بھی معلوم نہیں کہ میں کس طرح کی سزا چاہتا ہوں۔ بس ایک دھندلا دھندلا سا خاکہ ذہن میں ہے۔ جب تک یہ خاکہ واضح نہ ہو میں تمہیں کچھ بتا نہیں سکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے' اسی طرح جرم کی دنیا میں رہتے ہوئے جرائم سے جنگ کرنا زیادہ کارگر ہے۔"

بعد ازاں پاشا مجھے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ناگرزی شخص کا نام بتایا تھا اور بتایا تھا کہ میں اس شخص کے ذریعے اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔

میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا جب فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ یہ پھر پاتھا سادھو کا ہی فون تھا۔ اس نے کہا "جناب صاحب! ساتھیوں کی رہائی کی خوشی میں آج رات اپنے

اڈے پر موج میلے کا انتظام کیا ہے۔ بس ..... یار دوست مل بیٹھیں گے۔ اگر آپ کو کوئی ضروری کام نہ ہو تو شام کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آ جائیں۔ اپن کا دل رہ جائے گا۔"

"اچھا۔ میں آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

رات کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں اپنی حویلی نما رہائش سے نکل کر پیدل ہی پاتھا کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بھکاریوں کا یہ موج میلہ میرے لیے بھی ایک نئی چیز تھا۔ قریباً گھنٹے بعد میں اڈے پر پاتھا کے ساتھ موجود تھا۔ آج اڈے کا رنگ ڈھنگ کافی حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہاں صفائی ستھرائی کی گئی تھی۔ اندر کی طرف جھنڈیاں اور آرائشی بتیاں (قمقمے) وغیرہ لگی تھیں۔ چائے خانے میں تو بھکاری اور حضرات اپنے روزانہ کے کپڑوں میں ہی تشریف فرما تھے اڈے کی بالائی منزل پر موجود بھکاریوں نے نئے کپڑے رکھے تھے۔ رجنی گندھا' موتیا اور گلاب کے پھولوں کے ہار ستونوں سے آویزاں تھے .... اگربتیاں وغیرہ سلگائی گئی تھیں۔ بھنگ کھلے عام رگڑی جا رہی تھی اور پلائی جا رہی تھی۔ ساتھ میں گرم گرم پکوڑے اور چاٹ وغیرہ بھی رہی تھی۔ چرس گانجے کے کش بھی تھے اور مقامی شراب کی چسکیاں بھی۔

پاتھا نے اڈے کے دروازے پر ہی میرا استقبال کیا اور بڑے احترام سے اپنے آفس میں لے گیا۔ آج آفس میں کھاتوں اور حساب کتاب کا شور نہیں تھا۔ بس ایک بڑے ل میں مٹھائی رکھی تھی اور مہمان گرامی گاہے گاہے ٹکیاں اٹھا کر منہ میں رکھ رہے تھے۔ یہ سارے خصوصی مہمان تھے۔ اور یہ سب بھکاری ہی نہیں تھے بلکہ ان میں نمایاں طور پر ایک لامہ صاحب' چند عمر رسیدہ بھکشو' دو پولیس افسر' کارپوریشن کے ایک عہدے دار بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ گلی محلے کی سطح پر قائم ہونے والی فلاحی تنظیموں کے دو چار چیئرمین بھی یہاں پائے جاتے تھے۔

پولیس والے سادہ کپڑوں میں تھے۔ ان میں سے ایک ایس پی رینک کا بندہ تھا' دوسرا انسپکٹر تھا۔ یہ پاتھا کے کے بندے تھے لہٰذا مجھے ان کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا' ویسے بھی میں نے اپنے چہرے مہرے میں تبدیلیاں رکھی تھیں۔ ان دو اہلکاروں سے پہلے بھی سرسری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کی موجودگی میں پاتھا نے مجھے میرے نام سے بلایا تھا۔

ہم نے سن رکھا تھا کہ دلائی لامہ بڑے پرہیزگار لوگ ہوتے ہیں لیکن اڈے پر موجود لامہ کو میں نے گوشت کھاتے بھی دیکھا اور بھنگ پیتے بھی۔ لامہ کے سر پر بڑی سختی سے استرا پھیرا گیا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس ادھیڑ عمر لامہ کا سر ہنڈولے کی طرح چمک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد لامہ کی موجودگی میں ہی ناچ گانا بھی شروع ہو گیا۔ پہلے بھک منگوں کی ایک ٹولی نے ڈھولک بجا بجا کر ایک سنہالی گیت گایا پھر رقص کے لیے ایک آفت زادی سامنے آ گئی۔ یہ ایک مدراسی رقاصہ مالا بائی تھی۔ پاتھا سادھو کے نیاز مندوں میں سے تھی۔ پاتھا کی خوشی میں وہ بغیر معاوضے کے ناچنے آئی تھی۔ اس نے ہندی اور مدراسی فلموں کے دو چار گانے سنائے اور خوب رنگ جمایا۔ ایک نابینا بھکاری خوب مستی میں تھا۔ وہ تماشائیوں میں سے اٹھ کر آگے آ گیا اور مالا بائی کے ساتھ ناچ ناچ کر چمٹا بجانے لگا۔ مالا بائی نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو یکے بعد دیگرے چند اور بھک منگے بھی اس رقص و سرور میں شامل ہو گئے۔ کچھ لنگڑا رہے تھے' کچھ رینگ رہے تھے۔ ہر "بھکشو صورت" بھکاری بھی محو رقص تھے۔ یہ لوگ بھیک مانگنے والا ٹھیکرا یعنی کشکول ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ ناچتے ہوئے بھی یہ کشکول ان کے ساتھ تھے اور ناچ رہے تھے۔

بھکاریوں کو معزز مہمانوں سے کچھ فاصلے پر ہال کے ایک گوشے میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ وہیں پر بیٹھے بیٹھے سر دھن رہے تھے۔ میری نگاہ ان لوگوں میں عزت مآب شیخ عاصم بن ارشد کو ڈھونڈ رہی تھی' وہ اپنے نگران لالے کے ساتھ غالباً پچھلی قطاروں میں تھا لہٰذا مجھے دکھائی نہیں دیا۔ اسی دوران میں نیچے سڑک پر گاڑی رکنے کی آواز آئی اور منتظمین میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ پتا چلا کہ کوئی فنکار آ رہا ہے۔

یہ تین گلوکارائیں تھیں۔ شکلوں سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ تینوں بہنیں ہیں۔ ان کے جوڑوں میں رجنی گندھا کے پھول تھے' اور آنکھوں میں کاجل چمک رہا تھا۔ تینوں کے چہروں پر بلا کی معصومیت تھی۔ پاتھا نے بتایا "یہ بڑی مشہور گلوکارائیں ہیں۔ ٹی وی پر بھی گاتی ہیں۔ اپن کی خاطر ٹائم نکال کر آئی ہیں۔ ہم مل کر کوڑھی لوگوں کے لیے پروگرام کرتے رہتے ہیں۔"

تینوں بہنوں نے مل کر گایا اور واقعی سماں باندھ دیا۔ شکلوں کی طرح ان کی آواز میں بھی بہت سادگی اور معصومیت تھی۔

ان کے پاس وقت تھوڑا تھا اس لیے وہ جلدی سے واپس چلی گئیں۔ جاتے جاتے وہ بھکاریوں کی طرف گئیں اور ان پر اپنے پرس خالی کر گئیں۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بھی آیا تھا' وہ وہیں رہا۔ وہ بھی ایک زبردست گلوکار

تھا۔ اس کے ایک لوک گیت کو خاص طور سے پسند کیا گیا۔ آہستہ آہستہ محفل جوبن پر آگئی۔ پاٹھا سمیت کئی افراد اٹھ کر ناچنے لگے۔ ہال کمرے کے سارے دروازے بند کردیے گئے تھے لہٰذا اس ہنگامے کی آواز باہر کم ہی جارہی تھی۔

رقص و سرور کے بعد کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمان جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ بھکاریوں والے پورشن میں چلے گئے اور ان میں خیرات وغیرہ بانٹی۔ پاٹھا نے بھی اپنے دیہاڑی داروں میں کھلے دل سے نوٹ تقسیم کیے۔ خیرات دینے والوں میں سنہالی پولیس آفیسر بھی شامل تھا۔ میں نے عاصم کو دیکھا۔ وہ ایک پچھلی قطار میں موجود تھا۔ وہ ہتھ ریڑھی پر بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ لالہ ہتھ ریڑھی کے پیچھے موجود تھا۔ دوسرے بھکاریوں کی طرح لالے نے بھی نئے کپڑے پہنے تھے۔ اس کے علاوہ عاصم کو بھی نئے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ عاصم کے جسم کی طرح اس کے "کپڑے" بھی مختصر ترین تھے بلکہ یہ صرف ایک "کپڑا" تھا۔ سفید کاٹن کا ایک غلاف سا تھا جس کے نچلی طرف زپ لگادی گئی تھی۔ میں نے چور نظروں سے دیکھا عاصم کی خونی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاید تصور ہی تصور میں مجھے درجنوں مرتبہ قتل کرچکا تھا۔

مہمان باتیں کرتے ہوئے بھکاریوں کے درمیان سے گزرے۔ عاصم کی ریڑھی پر بھی کئی نوٹ رکھے گئے۔ کچھ نوٹ لالے نے شکریے کے ساتھ اپنی مٹھی میں دبا لیے۔ میں نے بھی دس روپے کا ایک نوٹ ریڑھی پر پھینکا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ عاصم نے پولیس آفیسر کو دیکھا ہے اور اس کی آنکھوں میں ایک دم چمک ابھر آئی ہے۔ یقیناً وہ اس پولیس آفیسر کو پہچانتا تھا۔ عاصم کے جسم میں عجیب طرح کی جنبش پیدا ہوئی۔ وہ حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ پولیس آفیسر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کولمبو کے ایسے ہی پولیس آفیسر تھے جن کے ذریعے شیخ عاصم نے ریسٹ ہاؤس کو عشرت کدہ بنا رکھا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں شیخ کا شاندار "سیکسی بیڈ" میں نے درجنوں مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بیڈ اور بیڈ روم ایسے ہی "فرض شناس" پولیس افسروں کے دم سے آباد تھا۔ آج شیخ عاصم اپنے ایک ایسے ہی "دوست" کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن قطعی ناکام تھا۔ منڈھے ہوئے سر، جھاڑ جھنکار بالوں اور ٹوٹے ہوئے جبڑے کے سبب شیخ کا حلیہ اس قدر بدل چکا تھا کہ شیخ کے قریبی عزیزوں کے لیے بھی اسے پہچاننا محال تھا۔

اور پھر سوال تو ... کا جسم ... کے تصور میں آسکتا تھا؟

عاصم کی بے چینی دیکھ کر ایک مہمان نے پولیس آفیسر سے کہا "شاید یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

پولیس آفیسر شاہانہ انداز سے عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ عاصم نے منہ سے آوازیں نکالیں، جسم کو بے ڈھنگی حرکت دی لیکن وہ کچھ بھی ظاہر نہ کرسکا اور نہ ہی کوئی اظہار ... پولیس آفیسر نے مشفقانہ انداز میں اس کا شانہ تھپکا اور جیب سے ایک مزید نوٹ نکال کر عاصم کے سینے پر رکھ دیا۔ ... بدانی سے دعائیں دینے لگا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ عاصم کی غصیلی غوں غاں "گڑ گڑ" خو خو میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ سرجن روڈی داس نے اس کے جبڑے کی پوزیشن ایسی کر دی تھی کہ وہ چیخ بھی نہیں سکتا تھا۔ عاصم کی غصیلی آوازیں ... میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ غلیظ قسم کی گالیاں بک رہا ہے۔ لیکن جس طرح عاصم کی کوئی شکل نہیں تھی اس طرح ان گالیوں کی بھی کوئی شکل نہیں تھی۔

شرابی پولیس آفیسر مجھ سے دو قدم آگے چلا جارہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ امارات کے مشہور شہزادے کو "کولمبو پولیس" قریہ قریہ ڈھونڈ رہی ہے، چند سیکنڈ پہلے اس کے سامنے تھا۔ اور اس نے اسے ... روپے جیب میں عنایت کیے ہیں۔ پولیس آفیسر کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس سے صرف دو قدم پیچھے چلنے والا شخص ... جہانی ہے، جس کی کولمبو میں "موجودگی" ایک عذاب بن کر پولیس اہلکاروں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہے۔

ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئے اور پھر چائے خانے سے گزر کر سڑک پر پہنچ گئے۔ پاٹھا نے ہر ایک کو گرمجوشی سے رخصت کیا۔ آخر میں پاٹھا اور میں رہ گئے۔ پاٹھا نے ...

"جہانی صاحب! اس حرامی بچی کا کیا حال ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دو دن تک وہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا لیکن اس کے ساتھ تمہارا رویہ پہلے جیسا ہی ہونا چاہیے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"آپ بالکل چنتا نہ کریں۔ میں اس کو کچھ بھی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ آپ بے شک اسے سویرے ہی میرے پاس بھیج دیں۔"

"نہیں۔ ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔ دراصل وہ سخت اپ سیٹ ہے۔ اسے اپنی تیسری بیوی کا رونا ہے۔ وہ ابھی تک رتنا کو نے واپس نہیں بھیجی ہے۔ ایک آدھ دن تک واپس آجائے گی تو میں میاں بیوی کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

صبح سویرے للیتا مجھے چائے دینے آئی تو میں نے اس سے توسیہ کے بارے میں پوچھا۔

للیتا نے بتایا "میں نے جے صاحب سے کہہ کر کھڑکی کی کٹی ہوئی سلاخ کی جگہ نئی سلاخ ڈلوا دی ہے۔ توسیہ کے پاس سے لوہا کاٹنے والی آری کا ٹکڑا بھی برآمد ہوا ہے۔ پتا نہیں یہ ٹکڑا اسے کہاں سے ملا تھا؟"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس کا پتا چلاؤ۔"

"وہ مار پیٹ کے بغیر ماننے والی نہیں ہے جناب... میں نے ایک دو جھڑکیاں ہی لگائی تھیں کہ انہوں نے روک دیا۔"

"کس نے روک دیا؟"

"ان کے شوہر باری صاحب نے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹا بھی کہ میں بات بات پر مار پیٹ کرنے لگتی ہوں۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین بار مجھے اسی طرح منع کر چکے ہیں۔"

"اپنی جگہ وہ صحیح ہے اور تم بھی صحیح ہو۔ بہرحال میری ہدایت کے مطابق تم اپنا کام جاری رکھو۔ جب باری صاحب باہر ہوں گے تو تم توسیہ سے پوچھ گچھ کر لینا لیکن ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھنا ہے۔"

"جو حکم صاحب جی۔"

"کیا اور کچھ کہنا ہے؟"

"وہ جی۔ وہ جو نیا آدمی آیا ہے۔ وہ صبح سے بہت واویلا کر رہا ہے۔ کبھی ایک دم رونے لگتا ہے۔ بڑا پاکھنڈی لگتا ہے۔"

"تم اس بھکاری بیپی کی بات تو نہیں کر رہی ہو؟"

"جی صاحب جی۔ اسی کی بات ہے۔"

"اچھا' میں اسے دیکھتا ہوں۔ تم جاؤ' توسیہ کا دھیان رکھو۔"

میں اس کمرے میں پہنچا جہاں بیپی کو رکھا گیا تھا۔ وہ دبلا پتلا کیکڑا صفت شخص تھا۔ اس کی ٹانگیں سوکھ چکی تھیں۔ وہ ان پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ بالکل بے جان بھی نہیں تھیں جیسا کہ بھیک مانگتے وقت بیپی ظاہر کرتا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو بیپی نے بھکاریوں کے مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑ دیے اور بتیسی نکال کر بولا "سخی بادشاہ! مجھ پر کرپا کریں۔ میں دل کا مریض بھی ہوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میرا چل چلاؤ ہو جائے۔ مجھے یہاں سے جانے دیں۔"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں' تمہیں یہاں سے جانے کی اتنی جلدی نہیں' جتنی اپنی دلہن کا دیدار کرنے کی ہے۔ میں تمہاری تکلیف رفع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آج شام تک تمہاری چھمک چھلو یہاں پہنچ جائے۔"

بیپی کی آنکھوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی حد تک ہو گیا ہے۔ تاہم اس نے چہرے پر جیسی مسکینی کے برقرار رکھے اور بولا "میں تو ذلیل کمینہ بھک منگا ہو میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ مجھے تو جی بس دو بھوجن اور اس کی جندگی چاہیے۔ اگر یہ دونوں سانجھ کر دو پاٹھارے سکتے ہیں تو میں سارا جیون ان کے پاؤں کر پہنچوں گا۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ میں تمہارے دھونے اور پینے کا انتظام کر دوں گا۔ بس ایک دو کر لو۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بتیسی نکال کر بولا "او مم۔ میری پتنی کب پہنچے گی؟" دل کی بات اس کی زبان گئی تھی۔ اس کی میلی آنکھوں میں ندیدوں کی سی چمک

میں نے کہا "کون سی پتنی کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ جی۔ اس وقت تو میری ایک ہی پتنی ہے ...

"اور جو پہلی دو ہیں۔"

"اس کے علاوہ... مم... میری ایک ہی پتنی بادشاہو اور وہ بھی ایک سال سے جھگڑ کر میکے میں ہے۔"

"میں جانتا ہوں تم ذلیل اور کمینے ہونے کے جھوٹے بھی ہو۔ بہرحال اس بارے میں پھر بات کریں گے تم یہ بتاؤ کہ نئی بتی سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟"

"بس سرکار! میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھگوان ہے۔ اس نے مجھ جیسے نیچ بندے پر کرپا کی ہے۔ بڑی اچھی پتنی ملی ہے جی۔ بالکل سادہ۔ بچے من کی' ... مجھ سے پریم بھی کرتی ہے جی۔ مجھے وشواس ہے جی اس کے ساتھ رہا تو میرے بہت سے پاپ چھوٹ جائیں ہو سکتا ہے جی کہ میں بھیک مانگنا بھی چھوڑ دوں۔"

میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا' پاپ تو چھوڑ دو گے ہیں لیکن تم تو خود ہی سراپا پاپ ہو۔ تم کہاں سدھرو گے ابھی "عجب الفطرت" بیپی کے ساتھ میری ... ہی تھی کہ باتھا کا فون آ گیا' اور میں فون سننے چلا گیا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ پاشا نے حسب وعدہ بیوی کو بھیج دیا میں اس وقت باتھا کی طرف گیا ہوا تھا آیا تو باری نے بتایا کہ بیپی کی بیوی آ گئی ہے اور وہ ساتھ کمرے میں ہے۔ للیتا ان دونوں کے لیے چائے بسکٹ وغیرہ لے کر گئی تھی۔

باری نے کہا "یہ بیپی واقعی پاکھنڈی لگتا ہے۔ بڑا

بلند آواز سے رونے لگا اور سب کے سامنے ہی اسے پیار لگانے لگا۔ وہ بھی بڑی تیز طرار نظر آتی ہے شکل کی بھی ہے۔ سینہ تان تان کر چل رہی تھی۔"

مقامی ہے؟"

"نہیں جی مقامی تو نہیں لگتی۔ شاید انڈین ہو۔ کنڈی ہے۔"

"کس کے ساتھ آئی ہے؟"

"دو بندے ٹیکسی کار پر چھوڑ کر گئے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ پاشا صاحب نے کارندے ہیں۔"

میں بیپی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس اندر سے نسوانی آواز آئی کوئی بہت ہولے سے ہنسا میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحے کے لیے اندر مکمل رہا پھر کسی نے چٹخنی گرا کے دروازہ کھولا۔ مجھے اپنے جو نسوانی صورت نظر آئی اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ مجھے آنکھوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی کی پتلی پر پڑ رہی تھی۔ بیپی کی پتنی میرے لیے اجنبی نہ تھی۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ روجھا پور میں اشرف چیتا اور نادر جگی وغیرہ کے ساتھ میں اسے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ رانو تھی۔ میں اسے شناخت میں دھوکا کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ نادر جگی کے ڈیرے پر زرق برق لباس میں پنجابی فلموں کی ہیروئن بنی پھرتی تھی اور ہر ہا کٹ کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی تھی۔ اس کی حیثیت مشترکہ جائیداد کی سی تھی۔ ہر کوئی "حق" جتانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ جب میں پہلی بار جگی کے ڈیرے پر آیا تھا تو رانو اپنی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس کی ادائیگیوں اور فدا ہو جانے والی اداؤں نے میرے ذہن میں ایک بار تازہ کر دی تھی۔ پھر میں روجھا پور سے واپس آ گیا۔ اشرف چیتا یعنی ہارون پاشا بھی لاہور پہنچ گیا تھا۔ اس کی زبانی مجھے رانو کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ کافی دن اسپتال میں بھی رہی ہے۔ بعد میں مجھے رانو کے بارے میں معلوم ہوتا رہا تھا اور ایک مرحلے پر مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید کسی دن رانو کے مرنے کی خبر آ جائے گی مگر وہ ڈھیٹ ثابت ہوئی تھی۔ مضحکہ خیز واقعے میں زخمی ہوئی تھی مگر اب اس کے اثرات رانو پر بالکل نظر نہیں آتے تھے۔

میں اس آفت جاں پنجابی ہیروئن کو پنجاب سے کالا اور کولمبو کے اس گھر میں دیکھ رہا تھا اور وہ بھی بیپی جیسے بھک منگے کی پتنی کے روپ میں۔

میں نیم تاریکی میں تھا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی براہ راست رانو کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ مجھے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی۔ ویسے بھی میں ہلکے پھلکے میک اپ میں تھا۔ وہ مجھے شناخت کرنے میں ناکام رہی۔ میں اس سے کوئی بات کیے بغیر واپس مڑا اور کوریڈور سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

رانو کو دیکھ کر ذہن میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ بہرحال میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ رانو اپنے بگ باس پاشا کے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔ رانو کی حیثیت پاشا کی ایک ادنیٰ ملازمہ کی تھی۔ پاشا اگر اسے یہاں لایا تھا تو کسی خاص مقصد کے تحت ہی لایا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پاشا گینگ سے تعلق رکھنے والے کچھ مزید افراد بھی پاشا کے ساتھ ہی کولمبو میں موجود ہوں۔ مجھے یہ کوئی گہرا چکر نظر آ رہا تھا۔ پاشا نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ آئندہ ایک دو روز میں وہ مجھ پر سب کچھ واضح کر دے گا اور کچھ اہم نوعیت کی اطلاعات مجھے دے گا۔ اب پتا نہیں یہ کیسی اطلاعات تھیں جنہیں حاصل کرنے کے لیے پاشا کو رتنا کو جیسے جرائم پیشہ بھک منگوں کے ساتھ رہنا پڑ رہا تھا۔

عین ممکن تھا کہ پاشا نے رانو کو بھی کسی خاص مقصد کے تحت بیپی کے ساتھ لگا رکھا ہو۔ بیپی عورت کا بھوکا تھا اور رانو ایک ایسی لڑکی تھی جو مردوں کی خواہش اور بھوک کو سمجھنے اور اسے استعمال کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتی تھی۔

میں کافی دیر تک یہاں رانو کی موجودگی کے بارے میں سوچتا رہا اور اس کے مضمرات پر غور کرتا رہا۔ میں بیپی کی نوبیاہتا پتنی کے بارے میں کئی دن سے سن رہا تھا لیکن یہ بات تو گمان میں بھی نہیں تھی کہ یہ پتنی نادر جگی کے ڈیرے کی تتلی ہو گی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ رانو سے تنہائی میں ملاقات کروں اور اس گورکھ دھندے کے بارے میں جاننے کی کوشش کروں جو "بھکاری مافیا" کے حوالے سے یہاں موجود تھا۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہارون پاشا کا فون آ گیا۔

"ہیلو شاہ جہاں! کیسے ہو۔ بیپی کی بنی پہنچ گئی ہے؟" اس نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔

"بالکل پہنچ گئی ہے اور میں اسے دیکھ کر ابھی تک حیران پریشان بیٹھا ہوں۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا "مجھے پتا تھا کہ اسے دیکھ کر تمہیں حیرانی ہو گی۔ اس جلتی پھرتی آفت کو تم جگی کے

ذیرے پر بڑی اچھی طرح دیکھ چکے ہو۔ وہاں اسے بہتی گنگا کہا جاتا تھا جس میں ضرورت پڑنے پر ہر کوئی ہاتھ دھو سکتا تھا۔"

"لگتا ہے کہ یہاں بھی تم اسے خاص ضرورت کے تحت ہی لائے ہو۔"

"نہیں خاص ضرورت تو نہیں۔ بس عام ضرورت تھی۔"

"تم پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے یا یہاں اپنی شانِ نزول کے بارے میں کچھ بتاؤ گے بھی۔"

وہ بولا "تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا؟ تم جانتے نہیں ہو' میرے نزدیک تمہاری کیا اہمیت ہے۔" اس کے لہجے سے آپوں آپ ایک طرح کی عقیدت مندی جھلکنے لگی تھی۔

"پھر کب مل رہے ہو؟"

"اسی لیے فون کیا ہے تمہیں۔ کل دوپہر تمہیں کوئی مصروفیت تو نہیں؟"

"اگر ہوگی بھی تو میں ایڈجسٹ کرلوں گا۔ تم بتاؤ کہاں ملنا ہے؟"

وہ بولا "کولمبو ہوٹل۔ روم نمبر ۲۸۔ سیکنڈ فلور۔ ہم لنچ اکٹھے کریں گے۔"

"اوکے۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ اپنے تعاقب وغیرہ سے باخبر رہنا۔"

"تم بے فکر رہو۔" میں نے کہا۔

"میری طرف سے پروگرام فائنل ہے۔ اگر تمہاری طرف سے کوئی مسئلہ ہوا تو مجھے فون کر دینا۔ ہم کم از کم تین چار گھنٹے وہاں بیٹھیں گے اور ہائی ٹی لے کر اٹھیں گے۔"

"اوکے۔" میں نے کہا۔

فون بند کرنے کے بعد میں پاشا کے لب ولہجے پر غور کرنے لگا۔ لب ولہجے سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کچھ اہم نوعیت کی اطلاعات موجود ہیں۔ بہرحال ابھی تک یہ اسٹیج نہیں آئی تھی کہ میں کلی طور پر پاشا پر اعتماد کر سکتا۔ ابھی ہمارے تعلق میں پختگی آئی تھی اور نہ یہ کسی بڑی آزمائش سے گزرا تھا۔ لاہور میں پاشا اسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے ذہنی دھچکا لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ پاشا کی "کایا" پلٹ جانے کے بارے میں جو اندازے میں نے لگائے ہیں' وہ شاید غلط ہیں۔ تاہم بعد ازاں پاشا نے کوشش کر کے مجھ سے ملاقات کی تھی اور مجھے اعتماد میں لینا چاہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہماری ملاقات یہاں کولمبو میں ہوئی تھی۔

ہارون پاشا کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا۔ یہاں کولمبو میں موجود تھا اور بنفسِ نفیس کچھ معاملات لے رہا تھا تو پھر یقیناً کوئی اہم چکر ہی تھا۔ میں سوچتا الجھتا رہا۔ سوچ کے گھوڑے دوڑتے رہے اور مختلف میں سفر کرتے رہے۔ سائیں عالی کا خیال ذہن میں آفت کا پرکالا ابھی تک سرجن روی داس کی کوٹھی پر جاتا تھا۔ پتا نہیں کیا جادو تھا اس کی شخصیت میں۔ اس کے گرویدہ ہوتے تھے اور پھر تن من دھن سے ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر روی داس نے نہ صرف سائیں وغیرہ کرائی تھی بلکہ اس کے ہر اشارے پر آنکھ بند کر بھی کر رہا تھا۔ میں نے شیخ عاصم کے جسم میں جو زہر برید کروائی تھی وہ سرجن داس نے سائیں عالی کی ہدایت کی تھی۔ میری بات تو شاید روی داس بھی نہ مانتا۔ تین ہفتے سے سائیں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ تھا کہ وہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پکا رہا ہے۔ اس نے سوروج کے بارے میں بھی مجھے کوئی ڈھنگ کی بات نہ تھی۔ کسی وقت میرے ذہن میں اندیشہ جاگتا تھا کہ کسی چکر میں سورگ باشی ہی نہ ہو گئی ہو۔ زریں گل او پاکستان میں ہی تھے اور مسٹر کلارک کے ذریعے ان خیریت مجھے وقتاً فوقتاً معلوم ہو رہی تھی۔ اگر کسی کی خبر نہیں معلوم ہو رہی تھی تو وہ غزالہ تھی۔ شیخ عاصم سے میرے اور غزالہ کے تعلق پر جو آخری سنگین وہ یہی تھا کہ غزالہ پارسائی کی انتہا کو چھونے کے بعد سے اوجھل ہو گئی تھی۔ شیخ عاصم نے رقابت کا نہا اور بھونڈا معیار پیش کیا تھا۔ اپنے ذریعے سے اس تصاویر غزالہ کے والدین تک پہنچائی تھیں۔ غزالہ کے گھر میں ایک طوفان اٹھا تھا۔ اس طوفان کے سارے تنکے بکھیر دیے تھے۔ حالات جو پہلے سے تھے خوں خوار تماثیل کا روپ دھار گئے تھے اور ہمارا جیسے قتل ہو گئی تھی۔

دل میں ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں لگتا تھا کہ۔ شاید میری اور صفدر کی قسمت ایک جیسی جس طرح تارا' صفدر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی وہ کبھی اس کا سراغ نہیں پا سکا تھا' اسی طرح شاید اب کبھی غزالہ کو نہ دیکھ سکوں گا لیکن ایسا سوچتے کے کسی دور افتادہ گوشے میں امید کی کرن بھی موجود تھی۔ کہیں میرے اندر سے ایک آواز آتی تھی۔

غزالہ کتنی بھی سنگ دل سہی' کتنی بھی بے رحم سہی میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتی۔ اسے واپس آنا ہوگا۔ میرے جسم میں ٹوٹنے والے ہزار ہا کانٹوں کا حساب دینے کے لیے واپس آنا ہوگا۔ دکھ اور انتظار کا جو طویل زہر میں نے پیا ہے' وہ رائیگاں نہیں جا سکتا۔ اگر وہ رائیگاں جا سکتا ہے تو اس کائنات پر اور کائنات کی کسی سچائی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

اگلے روز پروگرام کے مطابق کولمبو ہوٹل میں میری اور ہارون پاشا کی ملاقات ہوئی۔ ہارون پاشا سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے ہلکی نیلی قمیص پر نفیس ٹائی لگا رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص چند دن پہلے "رنگو" جیسے بھکاری کے ذریعے پر موجود تھا اور بھکاریوں کے گروپ کا سرغنہ نظر آتا تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد ہم کچھ دیر تک ان ناقابلِ فراموش شب و روز کو یاد کرتے رہے جو ہم نے گارڈ جلال خاں اور شکیلہ کے ساتھ یخ بستہ قبر میں گزارے تھے۔ بھوک اور ہت کے ہاتھوں شکیلہ کا سسک سسک کر مرنا ہمیں یاد آیا آزردہ کر گیا۔ اس گفتگو کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ ہارون پاشا نے کہا "شاہ جہاں! میں جو کچھ بھی ہوں لیکن احسان فراموش نہیں ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ تم نے مجھ پر میری زندگی بچانے کا احسان کیا ہے۔ ایسے وقت جب خوراک کے ہر ذرے اور قطرے کی قیمت تھی' تم اپنے حصے کے لقمے میرے منہ میں ڈالے تھے۔ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر میری زندگی کی ڈور سلامت رکھنے کی کوشش کی تھی۔"

"پلیز پاشا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ باربار دہرانے سے فائدہ نہیں۔"

"نہیں شاہ جہاں! مجھے آج دہرانے دو۔ جب میری ڈوب رہی تھیں اور سانسیں اکھڑ رہی تھیں' میں نے سے ایک سوال کیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا' تو نے آج تک زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے۔ تو نے پرستوں کی ہوس دیکھی ہے اور خود بھی ہوس پرستی کا دکھایا ہے۔ تو نے ظالموں کا ظلم دیکھا ہے اور خود بھی بے کے ریکارڈ قائم کیے ہیں' تو نے برائی کی معراج دیکھی ہے خود بھی اس معراج کو چھوا ہے۔ کیا تو نے کبھی دوسری جھانکنے کی کوشش بھی کی ہے' کیا تیرے تصور میں کی خوب صورتی' نرمی' محبت اور قربانی بھی آئی ہے؟ میں خود سے یہ سوال پوچھ رہا تھا' میرا سر تمہاری گود میں تھا اور تم اپنے ناتواں ہاتھوں سے میرے منہ میں دودھ اور بسکٹ کا مکسچر ٹپکانے [?] کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی تھی کہ زندگی کا دوسرا رخ بھی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان لوگوں سے یکسر مختلف ہیں جو میں آج تک دیکھتا رہا ہوں۔ یہ لوگ میرے آس پاس ہی موجود رہے مگر ہمیشہ میری نظروں سے اوجھل رہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے صرف آدھی دنیا دیکھی ہے۔ آدھی دنیا میری نگاہوں سے بالکل اوجھل رہی ہے۔ اس وقت میرے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ مجھے دوسری زندگی ملے۔ اور اس دوسری زندگی میں' میں اس آدھی دنیا میں جیئوں جو میں نے آج تک دیکھی ہی نہیں۔ اس وقت۔ شاہ جہاں۔ اس وقت میرے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہوا تھا۔"

وہ بڑے جذباتی لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ یہ پاشا گینگ کا سرغنہ نہیں تھا' یہ صرف پاشا تھا۔

اس نے سگریٹ نکالا اور قیمتی لائٹر سے سلگاتے ہوئے بولا "ممکن ہے شاہ جہاں کہ تمہارے ذہن میں میرے حوالے سے شکوک موجود رہے ہوں اور اب بھی ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ شکوک باقی نہیں رہیں گے کیونکہ میرے دل میں تمہارے لیے سچائی اور محبت ہے۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

"بہت شکریہ پاشا' میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔"

وہ بولا "اسپتال سے فرار ہو کر میں نے یقیناً تمہیں مایوس کیا تھا لیکن میں نے یہ قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ اس کے بعد میں تم سے مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں ملا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے' تم مجھے اسی ماحول میں رہنے دو جس میں رہ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس وقت بھی تمہیں میری بات میں کچھ زیادہ وزن محسوس نہ ہوا ہو۔ تم نے سوچا ہو کہ میں ہلکی دلیلیں پیش کر رہا ہوں۔"

"نہیں پاشا! میں تم پر تمہارے اندازے سے زیادہ بھروسا کرتا رہا ہوں۔"

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ سجائی اور بولا "بہرحال۔ میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ پورا ہوا ہے۔ میری توقعات غلط نہیں نکلیں۔ اپنی سابقہ حیثیت میں رہتے ہوئے مجھے ایک دو "بڑے اچھے" لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ہے۔" بڑے اچھے کہتے ہوئے اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ سے میرا سگریٹ سلگایا اور بولا "یہ چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔ جب لاہور ہی میں ایک بہت بڑے بدمعاش نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ یہ بدمعاش بد قسمتی سے بہت بڑا فلم پروڈیوسر بھی ہے۔ اس کے ساتھ میری جان پہچان پرانی ہے اور وحدت علی کے ذریعے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اطلاع دی کہ منوہرا دیوی مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔" منوہرا دیوی کا نام سن کر میں بری طرح چونکا "میرا خیال ہے کہ تم بھی اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہی ہو گے۔ وہ دنیا کی جانی پہچانی انٹرنیشنل نائیکہ ہے۔ دنیا کی امیر ترین ہستیوں کو کال گرلز سپلائی کرنے کا شرف اسے حاصل رہا ہے۔"

میں نے تائیدی انداز میں کہا "میں نے نام سنا ہوا ہے۔"

وہ بولا "میں نے بھی اس وقت تک اس کا نام ہی سنا ہوا تھا۔ بہرحال اس اطلاع کے بعد میرے اندر زبردست ہلچل پیدا ہو گئی۔ بدمعاش پروڈیوسر تارو رانجھا نے مجھ سے کہا "پاشا صاحب! آپ کے لیے غیبی مدد آئی ہے۔ آج کل آپ کے حالات پتلے ہیں۔ آپ کی ٹیم کے اہم ممبر ہیوی، میڈم شہزاد، وحدت علی وغیرہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ایسے میں منوہرا دیوی کا بلاوا بس ایک لاٹری ہی ہے۔ یہ لاٹری آپ کے نام نکل گئی تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں نے رانجھا کو باتوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ قریباً ایک ہفتے بعد اسلام آباد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں منوہرا دیوی سے میری ملاقات ہو گئی۔ شاہ جہاں! میں منوہرا کے بارے میں تمہیں کچھ بتاؤں گا تو تم مبالغہ سمجھو گے۔ وہ بے حد عیار اور زمانہ ساز عورت ہے۔ اڑتی چڑیا کے پر گننے والا محاورہ تو تم نے سنا ہی ہو گا۔ بس سمجھو کہ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے۔ اس کی دولت کا اندازہ لگانا خاصا دشوار کام ہے۔ اس روز قریباً ساری رات میرے اور منوہرا کے درمیان اہم گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ جرائم کی دنیا کے ایک بہت بڑے کردار کو میری اور میرے "سیٹ اپ" کی ضرورت تھی۔ اس کردار کا نام کنگ براؤن ہے۔"

میرے سر پر بم کا دھماکا ہوا۔ کان شائیں شائیں کرنے لگے۔ تاہم میں نے اپنے تاثرات پر قابو پا لیا۔ پاشا بولا "میرا اندازہ ہے کہ منوہرا دیوی کی طرح تم کنگ براؤن کے نام سے بھی بے خبر نہیں ہو گے۔"

میں نے کہا "ہاں، یہ نام بھی میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔"

پاشا بولا "پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ کنگ براؤن چند بڑے "انسانی اسمگلروں" میں ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ انسانوں کی اسمگلنگ۔ کچھ عرصہ پہلے تک بعض افریقی ممالک میں کنگ براؤن بے حد سرگرم رہا ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر موریطانیہ میں تھا اور وہاں اس نے ماریا نرسٹ کے نام سے ایک بہت بڑا رفاہی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ادارہ دراصل انسانی اسمگلنگ کے کاروبار کا مرکز تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اور کیا کیا خیال ہے؟" پاشا نے تعجب سے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

وہ بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لب مسکراتے ہوئے بولا "ماریا نرسٹ اور کنگ براؤن کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو، شاید کوئی اور نہیں جانتا۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پچھلے دو تین ماہ میں میں نے اس سلسلے میں تمام تر معلومات حاصل کی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ماریا نرسٹ میں جو کچھ ہوا اور کنگ براؤن پر جو کچھ بیتی سب کچھ مجھے ازبر ہو چکا ہے۔"

"مثلاً کیا کچھ؟"

پاشا نے گہری سانس لی اور نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "اس حوالے سے شروع میں میری معلومات کچھ نہیں تھیں۔ جب موریطانیہ میں واقعات تازہ تازہ ہوئے تھے۔ پاکستانی اخبارات میں بھی چھوٹی موٹی خبریں چھپی تھیں۔ باہر سے آنے والے لوگوں نے بھی اس بارے میں بتایا تھا۔ کچھ معلومات مجھے اس وقت حاصل ہوئیں جب میں اپنے ایک ذاتی کام کے لیے نیو یارک گیا۔ بہرحال یہ سب معلومات سرسری سی تھیں۔ اس طرح کی معلومات بہت سے لوگوں کے پاس بھی موجود تھیں۔ معلومات کے مطابق ماریا نرسٹ کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا ان میں کچھ پاکستانی نوجوان بھی تھے۔ یہ بات بھی کہی جا رہی تھی کہ ماریا نرسٹ میں ہونے والے ہنگامے میں کنگ براؤن کا نوعمر بیٹا مارا گیا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی قریبی ساتھی ہلاک ہوئے تھے۔ بہرحال منوہرا دیوی سے ملاقات کے بعد میں نے ان سارے واقعات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ مجھے پتا چلا کہ ماریا نرسٹ کو تہ و بالا کرنے میں ایک بڑے باغی گروپ کا کردار تھا۔ ماریا نرسٹ میں ہونے والے خون ریز معرکے میں تم نے اور تمہارے ساتھیوں صفدر، زریں اور سائیں عالی نے بھی

نمایاں کردار ادا کیے تھے۔ سائیں عالی کو مقامی لوگ ایک اوتار کی طرح پوجنے لگے تھے اور اس کے گرد غریب اور نادار لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا تھا۔ کنگ براؤن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ دوست میں قتل زدگی کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"

چند لمحے توقف کر کے پاشا نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور بولا "اب مجھے پتا چلا ہے کہ کنگ براؤن برطانیہ میں ہے اور اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو نئے عزم کے ساتھ منظم کر رہا ہے۔ اس مرتبہ کنگ کا مرکز برطانیہ یا ہالینڈ قرار پایا ہے۔ کنگ کے ساتھ منوہرا دیوی اور اس جیسے دو تین مزید لوگ شامل ہیں۔ یہ لوگ کچھ ایسی پلاننگ کر رہے ہیں کہ سب کچھ قانون کی ناک کے عین نیچے ہوتا رہے اور قانون کچھ کر ہی نہ پائے۔ منوہرا دیوی سے پہلی ملاقات کے بعد دو ہفتے تو خاموشی رہی پھر منوہرا سے اوپر تلے میری تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں منوہرا کے ارادے مزید کھل کر سامنے آ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بڑی چابکدستی سے بردہ فروشی کے لیے ایک وسیع جال بچھایا جا رہا ہے۔ ایک ایسی سازش جو دھیرے دھیرے اپنی پرتیں کھول رہی ہے۔"

میں نے کہا "یہاں سری لنکا میں تمہاری موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟"

"منوہرا سے میری جو آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس میں ہمارے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ اس معاہدے کے مطابق مجھے اپنے سارے "سیٹ اپ" کے ساتھ منوہرا کے لیے کام کرنا ہے۔ ایک معقول رقم منوہرا مجھے دے چکی ہے اور اس کے بدلے میں اپنے کام کا آغاز کر چکا ہوں۔"

"کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رتناکر کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟" پاشا نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

"میرے خیال میں رتناکو بھی پاشا سادھو کے انداز میں ایک بھکاری گروہ کا لیڈر ہے اور لوگوں سے دیہاڑی پر بھیک منگواتا ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ رتناکو جرائم پیشہ بھی ہے۔ وہ بچوں اور بڑوں کو "اچھا بھکاری" بنانے کے لیے انہیں اپاہج کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ عین ممکن ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی جرائم کا ارتکاب کرتا ہو۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ بھکاریوں کی لیڈری تو رتناکو کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ رتناکو ایک پرانا بردہ فروش بھی ہے۔ علاقے کے دوسرے کئی بردہ فروشوں سے اس کے گہرے رابطے ہیں۔ منوہرا کو اردگرد کے ملکوں میں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ بظاہر عام دھندے کر رہے ہیں لیکن ان دھندوں کی آڑ میں اصل کام انسانوں کی اسمگلنگ اور بردہ فروشی کا ہے۔"

پاشا کی اطلاعات میرے لیے واقعی بے حد سنسنی خیز تھیں۔ کنگ براؤن اور ماریا نرسٹ کے حوالے سے میرے بہت سے زخم تازہ ہو گئے تھے۔ کئی بھولی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ کنگ براؤن کا فرار ہو جانا واقعی ہمارے لیے دھچکا تھا۔ یہ اندیشہ میرے ذہن میں موجود رہا تھا کہ کنگ خود کو پھر سے منظم کر سکتا ہے۔ میرے اور صفدر کے ذہن میں کئی بار آیا تھا کہ ہم کنگ کا سراغ لگا کر اس کے مشن کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کریں لیکن پاکستان پہنچتے ہی ہم مقامی تخریب کاری کے مسئلے میں الجھ گئے تھے۔ اوپر تلے ہونے والی سنگین وارداتوں نے مجھے اور مرحوم ساہی صاحب کو مجبور کر دیا تھا کہ ہم پوری توجہ کے ساتھ اس مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کریں۔

پاشا نے کہا "پچھلے چند مہینوں سے میں یہاں رتناکو کے ساتھ موجود ہوں۔ اس نے اب مجھ پر بھروسا کرنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے اس کے کئی اندرونی معاملات میں جھانکنے کا موقع ملا ہے۔ رتناکو ایک کھلے بردہ فروش کے طور پر میرے سامنے آیا ہے۔"

"منوہرا سے آخری ملاقات کب ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو پاکستان میں ہی ہوئی تھی، لیکن پانچ چھ دن پہلے فون پر بات ہوئی ہے۔ میں نے منوہرا سے کچھ ضروری ہدایات مانگی تھیں۔ شاید تمہارے لیے یہ بات تعجب کا باعث ہو کہ بیس لڑکے اور لڑکیوں کا ایک گروپ ہالینڈ اسمگل کیے جانے کے لیے بالکل تیار ہے۔ یہ کھیپ مجھے رتناکو نے ہی فراہم کی ہے۔ ٹیلی فون پر منوہرا سے میری جو بات ہوئی ہے وہ اسی گروپ کے حوالے سے تھی۔ ہم نے گروپ کو بھجوانے کا طریقہ کار طے کیا ہے۔ شاید تم سوچ رہے ہو کہ اتنی اہم گفتگو ٹیلی فون پر کیسے ہو گئی۔ اس کے لیے ہم کوڈ ورڈز استعمال کرتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ کام کافی آگے پہنچ چکا ہے۔"

"بالکل۔ منوہرا طوفانی کارروائی کی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ریکارڈ کی کلاک کام کر رہی ہے۔ شاید کنگ براؤن کی طرف سے اسے خاصے میں ڈیڈ لائن دی گئی ہے تب وہ جلد از جلد پورا کرنا چاہتی ہے۔"

میں نے کہا "جو گروپ بھیجا جا رہا ہے، وہ کس حیثیت

سے جارہا ہے؟"

"وہ لوگ ہالینڈ میں اچھی ملازمت کے جھانسے میں جارہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے چند کو اچھی ملازمت دے دی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان سب کو ملازمت دے دی جائے اور وہ سارے وعدے پورے کردیے جائیں جو یہاں ان سے کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ لوگ بعد میں دوسرے لوگوں کو پھانسنے کے لیے چارے کے طور پر استعمال ہوں گے۔ سمجھو کہ ان "بیس" میں سے ہر شخص آٹھ دس مزید افراد کو شکاریوں کے جال میں پھانس سکتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ نیا طریقۂ کار ہے جو بے حد کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔"

"تمہارا اگلا STEP کیا ہوگا؟"

"STEPS تو بہت سے ہیں، بہرحال آج کل ایک مسئلہ کچھ پریشان کررہا ہے۔ دراصل بات یہ ہے شاہ جہاں کہ میں اندر سے بدل چکا ہوں۔ اتنا بدل چکا ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ شاید تم یقین نہ کرو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اب میں جو کچھ بھی کررہا ہوں۔ اپنی طبیعت کے خلاف کررہا ہوں۔ آج کل ایک ایسی ہی کارروائی جو میری طبیعت کے بہت خلاف ہے مجھے پریشان کررہی ہے۔"

"کچھ تفصیل بتانا پسند کرو گے؟" میں نے کہا۔

باشا نے کہا "تم نے SINGING DOLLS گانے والی گڑیوں کا نام سنا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ آج تمہاری زبان سے ہی سن رہا ہوں۔"

"یہ تین سنہالی بہنیں ہیں۔ بہت خوب صورت گاتی ہیں۔ خود بھی خوب صورت ہیں مگر ان کی اصل خوبی ان کے اندر کا حسن ہے۔ یہ میرے پاس ان کی تصویریں بھی ہیں۔"

باشا نے اپنی جیبی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوے میں سے ایک تصویر برآمد کی۔ تصویر دیکھنے سے پہلے ہی مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوچکا تھا۔ تصویر دیکھ کر یقین ہوگیا۔ یہ وہی تین سنگرز تھیں جنہیں میں نے پاشا کے ذریعے دیکھا تھا۔ وہ چہچہاتی چڑیوں جیسی لڑکیاں جو بس تھوڑی دیر کے لیے ڈیرے پر آئی تھیں اور محفل میں رنگ بکھیر کر چلی گئی تھیں۔ ان میں واقعی کوئی بات تھی جو ان کی شکلیں ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھیں۔ ان کی معصومیت، ان کی سادگی، ان کی دل میں اتر جانے والی آوازیں۔ یہ سب مجھے یاد تھا۔

میں نے تصویر پرکھی۔ اس میں باشا صوفے پر نیم دراز تھا۔ تینوں لڑکیاں بڑی بے تکلفی سے اس کے ارد گرد بیٹھی تھیں، بلکہ اس پر لدی پڑی تھیں۔ ان کے انداز میں حد درجے کی سادگی اور اپنائیت تھی۔ وہ تینوں چست جینز پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے نہایت ملائم ریشمی بال تصویر میں بھی چمک رہے تھے۔ ایک لڑکی باشا کو چمچ سے کچھ کھلا رہی تھی۔

باشا نے کہا "یہ تصویر قریباً چھ ہفتے پرانی ہے۔ میرے پاؤں پر شدید چوٹ آئی تھی اور میں پانچ چھ دن تک حرکت نہیں کرسکا تھا۔ یہ تینوں میری تیمارداری کے لیے آتی تھیں۔"

"ان سے رابطہ کیسے ہوا تمہارا؟"

"بس اپنے منحوس کام کے سلسلے میں ہی۔" باشا نے [illegible] تیز لہجے میں کہا۔

"یعنی تم ان کو بھی ہالینڈ پہنچانے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

"رکھتا تھا نہیں۔ رکھتا ہوں۔ یہ کام میرے ذمے منوہرا دیوی کی طرف سے ہی لگایا گیا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک چھوٹی سی تلخ کہانی ہے۔" باشا نے چند لمحے توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا "یہ تینوں بہنیں شوبز میں ہونے کے باوجود بڑی مختلف طبیعت کی مالک ہیں۔ اسٹیج کے علاوہ ٹی وی پر بھی پرفارم کرتی ہیں۔ پورے ملک میں انہیں پسند کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ اسکینڈلز وغیرہ سے بہت دور رہتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ "شوبز" جہاں ہر جوان عورت کو ہوس کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے، ان بہنوں کو عزت و احترام دیا جاتا ہے۔ تم نے ان کی مسکراہٹیں دیکھی ہیں؟ بالکل پھولوں جیسی لگتی ہیں۔ ایسے چہروں کو دیکھ کر اکثر دیکھنے والوں کے ذہن میں کوئی برا خیال ذہن میں نہیں ابھرتا بلکہ مقدس رشتوں کی طرف دھیان جاتا ہے لیکن پھر بھی یہ دنیا ہے شاہ جہاں۔ یہاں ہر قسم کے بدنیت موجود ہیں۔ ان کا ذہن صرف برائی کو ہی دیکھتا ہے۔ جس طرح مکھی سیکڑوں پھولوں کے درمیان بھی کسی گندی چیز پر ہی جاکر بیٹھتی ہے۔ ان "گاتی گڑیوں" پر بھی ایک غلط نظر اٹھی۔ یہ نظر جتنی غلیظ تھی اتنی ہی خطرناک بھی تھی۔ میرا مطلب منوہرا کی نظر سے ہے۔"

سگریٹ کے چند کش لے کر باشا نے بات جاری رکھی "منوہرا ان دنوں کچھ اچھے چہروں کی تلاش میں کولمبو آئی ہوئی تھی۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا منوہرا شوبز کے ساتھ اپنے تعلق کو ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ وہ اکثر اپنے شکار کو ٹی وی یا سلور اسکرین کا جھانسا دیتی ہے۔ وہ فنکاروں کی کمزوریوں کو بڑی اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اس کے وار سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے اور تو اور، وہ انڈیا کی معروف اداکاراؤں کو بالی وڈ میں کام دلوانے کے وعدے پر غیر ملکی عیاشوں کے بیڈرومز میں پہنچا چکی ہے۔ میں ان کی کہانیاں سناؤں گا تو تم دنگ رہ جاؤ گے۔ بہرحال میں بات

کررہا تھا "گاتی گڑیوں" کی۔ منوہرا نے ان تینوں بہنوں پر بھی جال پھینکا۔ اس نے انہیں بالی وڈ یعنی انڈیا کی بہت بڑی مارکیٹ میں متعارف کرانے کا جھانسا دیا اور اپنے ساتھ بمبئی لے جانا چاہا لیکن اس کی دال نہیں گلی۔ قناعت پسند بہنوں نے بمبئی جانے سے انکار کردیا۔ ان کے والد نے منوہرا کو فقط اتنی اجازت دی کہ وہ کولمبو میں تینوں بہنوں کی آڈیو البم ریکارڈ کرلے۔ منوہرا نے اس البم پر کام شروع کرایا لیکن پھر اسے ادھورا چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ البم سری لنکا سے باہر مقبولیت حاصل نہیں کرسکے گا اور مالی نقصان پہنچائے گا۔ حقیقت میں منوہرا کو تینوں بہنوں کے فن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو ان کی جدا قسم کی خوب صورتی پسند آئی تھی اور ان کی جسمانی موزونیت بھائی تھی۔ ان دونوں چیزوں سے جدا ہوکر ان کی آواز منوہرا کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتی تھی۔ اپنی پہلی کوشش میں ناکام ہوکر چند ماہ بعد منوہرا نے دوسری کوشش کی۔ یہ کوشش اس نے ایک ارجن رائے نامی انڈین سے کرائی جو عرصہ پندرہ سال سے امریکا میں مقیم ہے اور اسٹیج شوز کا مشہور پروموٹر ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنے سائیں عالی سے اس کا نام سنا ہوگا۔ وہ سائیں عالی کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور اسے بہت بڑا گرو مانتا ہے۔"

میں نے کہا "سائیں کو انڈین فلم انڈسٹری کے بہت سے لوگ گرو اور مہاگرو مانتے ہیں۔ بہرحال سائیں نے کبھی مجھ سے ایسے موضوعات پر بات نہیں کی۔"

باشا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ارجن رائے سری لنکا آیا اور اس نے تینوں بہنوں کو کئی طرح کے لالچ دے کر امریکا لے جانا چاہا مگر اسے بھی ناکامی ہوئی۔ منوہرا کو ضد سی ہوچکی تھی۔ جب شکار اس کے ہاتھ میں آکر نکل جاتا ہے تو وہ دیوانی سی ہوجاتی ہے۔ کچھ عرصے بعد یعنی آج سے چھ ماہ پہلے اس نے "گاتی گڑیوں" کو پھانسنے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش ایک مقامی شخص کے ذریعے کی گئی اور خیال ہے کہ اس کام کے لیے اسے بھاری معاوضے کی پیشکش کی گئی۔ بہرحال اس شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت وہ کس کے لیے کام کررہا ہے۔ اس شخص کا تعلق تامل ٹائیگرز سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ شخص نامعلوم افراد کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ میں ہلاک ہوگیا اور اس کی لاش جافنا کے ایک جنگل میں پائی گئی۔ یوں منوہرا کی تیسری کوشش بھی غصب ہوئی۔

اب تم اسے چوتھی کوشش کہہ سکتے ہو۔ منوہرا نے یہ کام میرے ذمے لگایا ہے۔ یہ کام میرے لیے یوں بھی اہم ہوگیا ہے کہ ابھی تک میری کوئی ٹھوس کارکردگی منوہرا اور ٹنگ براؤن وغیرہ کے سامنے نہیں آئی ہے۔ منوہرا کی گڈ بک میں اپنا نام لکھوانے کے لیے مجھے ایک "اچھی کارکردگی" کی سخت ضرورت ہے اور یہ "اچھی کارکردگی" تینوں بہنوں کے کامیاب اغوا کی صورت میرے حصے میں آسکتی ہے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں تمہارا مسئلہ کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ ان تینوں بہنوں سے قریب ہونے کی کوشش میں تم ان سے جذباتی طور پر وابستہ ہوگئے ہو۔ اب تمہارے لیے انہیں دھوکا دینا مشکل ہورہا ہے۔"

"یہ تاں مزے کی بات۔" باشا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی "میری کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں اعترافاً کہتا ہوں کہ میں نے بیسیوں قتل کیے ہیں۔ میرے ہاتھوں سے آبروریزیاں ہوئی ہیں، اغوا ہوئے ہیں۔ خون ریز تخریبی کارروائیاں ہوئی ہیں۔ میرے دل و دماغ نے بہت کم ندامت محسوس کی ہے۔ میرے ہاتھوں میں شاید ہی کبھی لرزش آئی ہو لیکن اب میں وہ نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اندر سے مسمار ہوگیا ہوں۔ تم نے مجھے مسمار کردیا ہے شاہ جہاں۔"

"تم تو فلمی ڈائیلاگ بولنا شروع ہوگئے ہو۔"

"نہیں شاہ جہاں! یہ حقیقت ہے۔ میں برائی کے لیے اندر سے بڑا کمزور ہوگیا ہوں۔ اب یہ لڑکیوں والا معاملہ ہی لے لو۔ انہیں شیشے میں اتارنے کے لیے مجھے ان کے سامنے ایک "شو پروموٹر" کا بھیس بھرنا پڑا تھا۔ میں نے انہیں بتا رکھا ہے کہ میں سری لنکا کے طول و عرض میں میوزیکل شو منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس حوالے سے مجھے ان لڑکیوں کے قریب آنے کا موقع ملا۔ ایک اتفاق کے تحت وہ مجھے بڑے بھائی کے طور پر مخاطب کرنے لگیں۔ جب وہ مجھے بھائی جان کہنے لگیں تو ہمارے درمیان تکلف کی کئی دیواریں گر گئیں۔ میں دو چار دفعہ ان کے گھر بھی گیا ہوں۔ ان کی والدہ فوت ہوچکی ہیں۔ ان کے والد سے ملا ہوں۔ وہ بھی بڑے سادہ دل اور سچے انسان ہیں۔ "گاتی گڑیوں" جیسی بیٹیاں ایسے ہی شخص کی ہوسکتی ہیں۔ چند ہفتے پہلے جب میرے پاؤں میں چوٹ آئی تو مجھے حقیقی معنوں میں ان لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ تینوں بہنیں اتنی ہمدرد، غمگسار اور بے لوث ہیں شاہ جہاں کہ میں ششدر رہ گیا ہوں۔ جب ان کے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہوں جس... انداز

سے منوہرا سوچ رہی ہے تو کانپ جاتا ہوں۔ منوہرا کے جال میں پھنسنے کے بعد ان لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا تصور بھی سوہانِ روح ہے۔ وہ بے چاری آنے والے وقت سے بے خبر میرے گرد چڑیوں کی طرح چہکتی رہتی ہیں۔ یہ تصویر جو تم دیکھ رہے ہو انہی دنوں کی ہے جب میرے پاؤں میں چوٹ لگی ہوئی تھی۔ چھوٹی لڑکی مجھے اپنے ہاتھ سے دوا کھلا رہی ہے۔ یہ میری رسٹ واچ دیکھ رہے ہو؟" پاشا نے اپنی کلائی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت خوب صورت گھڑی ہے۔"

"یہ منجھلی لڑکی نے دو دن پہلے زبردستی میری کلائی پر باندھی ہے۔ وہ تینوں اس وقت شہرت کی بلندیوں پر ہیں لیکن غرور نام کو نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ مزید شہرت یا دولت کی تمنا رکھتی ہیں۔ عجیب فطرت ہے ان کی۔ یہ ایسی فطرت ہے جو دل میں گھر کر جاتی ہے۔ بے لوث محبت' ہنسنا کھیلنا' اور کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کی مدد کے لیے کمربستہ ہو جانا' یہ ان لڑکیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے لڑکیوں کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا ہے کہ اب انہیں دوبارہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔"

"کیا مطلب! تم ان سے پہلے بھی مل چکے ہو؟"

"ہاں۔ پٹایا کے ٹرپ پر تھوڑی دیر کے لیے انہیں گاتے سنا تھا۔"

"کیسی لگیں تمہیں؟"

"ہاں معصومیت تو واقعی بہت نظر آتی ہے۔ خوب صورت بھی ہیں۔ بالکل نہیں لگتا کہ شوبز سے تعلق رکھتی ہوں گی۔"

کچھ دیر تک میرے اور پاشا کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ کئی خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی ہوئی اور گینگ کے اداروں کے بارے میں معلوم ہوا۔

بیس عدد بے روزگار نوجوانوں کی پہلی کھیپ صرف چار روز بعد کینڈی سے ہالینڈ کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔ ان سارے نوجوانوں کا تعلق کینڈی اور اس کے گرد و نواح ہی سے تھا۔ ان لوگوں کو تین روز بعد کینڈی سے کولمبو پہنچنا تھا اور یہاں سے ایمسٹرڈیم کے لیے پرواز کرنا تھی۔ شروع میں پاشا کا ارادہ تھا کہ وہ تینوں گلوکارہ بہنوں کو بھی اس کھیپ کے ساتھ ہی ایمسٹرڈیم ارسال کر دے گا' لیکن اب اس نے یہ پروگرام تھوڑا سا آگے کر دیا تھا۔

آخر میں پاشا نے کہا "پس منظر یہ ہے۔ تم سے رابطہ کرنے والا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم سے یہاں سری لنکا میں ہی ملاقات ہو گئی۔ تم سے بات کر کے مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آدھا بوجھ اتر گیا ہے۔ میں نے اپنی تمام تر معلومات بغیر کسی چھان پھٹک کے تم تک پہنچا دی ہیں اور جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بھی تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم ایک دو روز سوچ لو۔ اگر اپنے کسی ساتھی سے مشورے کی خواہش رکھتے ہو تو مشورہ بھی کر لو۔ اس کے بعد جیسا تم کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں شاہ جہاں! کہ تم اس معاملے میں اتھارٹی ہو۔ تم نے گینگ اور اس کے مافیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ نہ صرف دیکھا ہے بلکہ ان سے ٹکر لی ہے' ان کو جھنجھوڑا ہے۔ تمہاری رائے کا احترام کرنا اس معاملے میں بہت لازمی ہے۔ اگر سچ پوچھتے ہو تو میں خود کو بہت خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں کہ آج انسانی اسمگلنگ کے اس بڑے نیٹ ورک کے حوالے سے تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"تم نے اب تک جو کچھ کیا ہے یہ قابلِ تعریف ہے پاشا۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ تمہارے ذریعے اتنی سودمند معلومات مجھ تک پہنچیں گی۔"

"چھوڑو جی' یہ تو لوگوں کا کرشمہ دوں میں شامل ہونے والی بات ہے۔ تم لوگوں نے ماریا ٹرسٹ کو توڑنے کے لیے جو قربانیاں دی ہیں ان کے بارے میں جان کر میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دل پر ایک بھاری بوجھ بھی رکھا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے باصلاحیت لوگوں کی قدر نہیں کرتے وہ ضرور نقصان اٹھاتے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں' لیکن پھر تم کہو گے کہ میں تمہارے منہ پر تمہارے قصیدے پڑھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے شاہ جہاں! کہ تم نے اور تمہاری ٹیم نے موریطانیہ میں جو کچھ کیا ہے وہ کسی مغربی ملک کے افراد نے کیا ہوتا تو میڈیا انہیں اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا۔ رسائل و جرائد میں ٹائٹل اسٹوریاں شائع ہوتیں' ٹی وی چینلز چیخ چیخ کر گلا بٹھا لیتے' مگر تمہارا تعلق چونکہ پس ماندہ ملک سے تھا لہٰذا تمہاری اور تمہارے کام کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ زیادہ تر کریڈٹ اس باغی گروپ کو دے دیا گیا جو آخر میں گینگ براؤن کی انتظامیہ سے برسرِپیکار ہوا تھا۔ اس بات پر دھیان نہیں دیا گیا کہ اس گروپ کو جگانے' پاؤں پر کھڑا کرنے اور ہاتھ میں ہتھیار دینے تک کے مراحل کس کی کوششوں سے طے ہوئے۔ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے باغی عناصر کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی قیادت کی اور انہیں یکجا کر کے گینگ براؤن کے سیکڑوں گارڈز کے لیے "موت" بنا دیا۔ بہرحال یہ اب

طویل موضوع ہے' اس پر بعد میں بھی بات ہوتی رہے گی۔"

ہماری گفتگو ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی تھی۔ میں بھی اب اٹھنے کے موڈ میں تھا۔ آئندہ ملاقات کا پروگرام طے کر کے ہم اٹھ گئے۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے۔ میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی خبر دیکھ کر چونکا۔ لکھا تھا کہ جذام کے مریضوں کے لیے چیریٹی شو "گاتی گڑیاں" فن کا مظاہرہ کریں گی۔ اس کے علاوہ دیگر گلوکاروں کے نام بھی لکھے تھے۔

شو کے لیے شام چھ بجے کا وقت درج تھا۔ میری وہ شام فارغ ہی تھی۔ میں شو دیکھنے پہنچ گیا۔ پاشا سادھو بھی میرے ساتھ تھا۔ پاشا نے انکشاف کیا کہ وہ کوڑھی بھکاریوں کی فلاح کے لیے کام کرنے والی ایک تنظیم کا صدر بھی ہے۔ یہ ایک بڑا سینما ہال تھا۔ اس سینما ہال کو عارضی طور پر تھیٹر کی شکل دے دی گئی تھی۔ شروع میں موسیقی اور ڈانس کے چند آئٹم پیش کیے گئے۔ اس کے بعد تینوں گلوکارہ بہنوں یعنی "گاتی گڑیوں" کی باری آئی۔ وہ بہنیں ایک ساتھ گاتی تھیں اور سماں باندھ دیتی تھیں۔ یہاں بھی انہوں نے محفل لوٹ لی۔ حاضرین کی پُرزور فرمائش پر انہوں نے تقریباً دو گھنٹے تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور لوگوں سے بہت داد وصول کی۔ وہ انڈین گانے بھی گاتی تھیں مگر کوئی لچر گانا سنانے سے انہوں نے صاف انکار کیا۔

پروگرام کے بعد جذام کے کچھ مریض اسٹیج پر پیش کیے گئے اور ان کے لیے خصوصی مدد کی درخواست کی گئی۔ ان میں دو بچے بھی تھے۔ جذام نے ان کے ہاتھوں اور پاؤں کو کھانا شروع کر دیا تھا اور انہیں فوری علاج کی ضرورت تھی۔ بڑی بہن نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک کوڑھی بچے کو گود میں اٹھا لیا اور حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "دوستو! ہمیں مریض سے نہیں مرض سے نفرت کرنی چاہیے۔ یہ لوگ آپ کے گریز کے نہیں آپ کی توجہ کے مستحق ہیں۔ آپ انہیں تنہا نہ چھوڑیں۔ انہیں پیار دیں۔ بیماری سے لڑنے کے لیے ان کا سہارا بنیں۔"

حاضرین میں سے کسی نے پُرزور فرمائش کی کہ کوڑھی مریضوں کے علاج کے لیے جھولی پھیلاؤ مہم چلائی جائے اور اس کا آغاز ابھی سے کیا جائے۔ پاشا نے بھی اٹھ کر اس تجویز کی پُرزور حمایت کی۔ یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ تینوں گلوکارہ بہنیں اس کے لیے فوری تیار ہو گئیں۔ نہ صرف تیار ہو گئیں بلکہ انہوں نے اپنے تین چار ساتھی گلوکاروں کو بھی تیار کر لیا۔ اسی وقت سینما ہال سے جھولی پھیلاؤ مہم کا آغاز ہو گیا۔ گاتی گڑیاں اس کام میں پیش پیش تھیں۔ وہ ساتھی فنکاروں کے ساتھ وسطی شہر کے ایک بھرے پرے بازار میں نکل آئیں۔ یہاں کپڑے' جیولری اور کاسمیٹکس کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ فنکاروں کے پیچھے پیچھے تین چار سو افراد کا جلوس تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ لوگ گاتی گڑیوں یعنی SINGING DOLLS کو اپنے سامنے دیکھتے تھے اور ان کے ہاتھ خود بخود اپنی جیبوں اور اپنے کیش باکسز کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ دیگر فنکاروں کو بھی عزت مل رہی تھی لیکن جو پذیرائی اور والہانہ محبت گاتی گڑیوں کے حصے میں آ رہی تھی وہ منفرد اور قابلِ دید تھی۔

پاشا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج رات جھولی پھیلاؤ مہم کی وجہ سے جو کئی لاکھ روپیہ جمع ہو گا' اس میں سے کچھ نہ کچھ اس کی تنظیم کے حصے میں بھی آئے گا۔ گرمی بہت زیادہ تھی' حبس کے سبب پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ فنکار کملائے ہوئے نظر آتے تھے لیکن تندہی سے اپنے کام میں لگے تھے اور گاتی گڑیاں پیش پیش تھیں۔ ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ ہارون پاشا غالباً ٹھیک ہی سوچ رہا ہے۔ اتنی پیاری لڑکیوں کا منوہرا جیسی بدنامِ زمانہ نائکہ کے قبضے میں چلے جانا بہت بڑا سانحہ تھا۔ میں نے سوچا کہ ان لڑکیوں کے حوالے سے میں پاشا کا ساتھ دوں گا۔ میں پاشا کا مسئلہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ منوہرا کی نگاہوں میں جگہ بنانے کے لیے پاشا کو فوری طور پر کسی نمایاں کارکردگی کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسا کام جس سے پاشا کی افادیت منوہرا کے سامنے ثابت ہو جائے۔ یہ کام کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے "جھولی پھیلاؤ" جلوس کے ساتھ چلتے ہوئے ان لمحوں میں سوچ لیا کہ یہ کا[م] کیا ہو گا۔

اچانک مجھے اپنے بالکل قریب سے آواز آئی "وری گڈ شفیع محمد۔ وری گڈ گونگلو۔"

یہ سائیں عالی کی آواز تھی۔ میں نے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا۔ یہ نیم تاریک جگہ تھی' ہجوم میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا لیکن یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ سائیں میرے آس پاس کہیں موجود ہے اور یہ کوئی ابھی کی بات نہیں تھی۔ آج کل مجھے ہمہ وقت یہی محسوس ہوتا تھا کہ سائیں میرے ارد گرد موجود ہے اور اس کی پُراسرار توانائی لہروں کی شکل میں ڈھل کر میرے دماغ کے اندر تک پہنچ جاتی ہے۔ اس بخت کو وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے' جو میں سوچتا ہوں۔ ایک ایسا احساس تھا جس سے میں چاہنے کے باوجود پیچھا نہیں

جھڑا سکتا تھا۔ میں چاروں طرف نظر گھما کر سامیں کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دکھائی نہیں دیا۔

رات کو بہت بارش ہوئی۔ مرطوب ہوا میں مسالہ جات کی مہک تھی۔ کسی قریبی گودام میں دار چینی کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ دار چینی کی خوشبو درودیوار میں بس گئی تھی۔ بارش اور ہوا نے زور پکڑا تو بجلی بھی چلی گئی۔ حویلی نما عمارت میں گھرا اندھیرا چھا گیا۔ اندرونی کمرے سے نوسیہ کی چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ ہر ایک کو کوس رہی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ جلد از جلد روشنی فراہم کی جائے۔

میں نے باری کو دیکھا۔ وہ ایک چھوٹا لیمپ پکڑے نوسیہ کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ نوسیہ کے لیے باری کے دل میں غیر متزلزل محبت موجود تھی۔ نوسیہ اس سے مسلسل ناروا سلوک کر رہی تھی مگر وہ خدا کا بندہ اس کی دل جوئی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اب بھی وہ لیمپ لے کر نوسیہ کے کمرے میں پہنچا تو نوسیہ کی تلخ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یقیناً وہ باری کو بھی کوس رہی تھی مگر اب چونکہ وہ عربی بول رہی تھی اس لیے اس کے کوسنے میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ باری بھی اس کی کسی کسی بات کا جواب دے رہا تھا۔ تاہم اس کا لہجہ دبا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد یہ چیخ چیخ ختم ہوگئی کیونکہ لمبی چوڑی للینا کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ بھکاری بیپی اپنی بیوی کے ساتھ ابھی تک یہیں پر موجود تھا۔ صبح میں اسے پاشا کے پاس واپس بھیج رہا تھا۔ یعنی آج یہاں حویلی میں بیپی اور رانو صاحبہ کی آخری رات تھی۔ رانو اور بیپی حویلی کے دو کمروں تک محدود تھے۔ پچھلے تین چار دنوں میں رانو سے بس ایک بار میرا سامنا ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ کافی فاصلے پر تھی۔ وہ ابھی تک مجھے پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اگر وہ پہچان لیتی تو اپنے مخصوص انداز میں "وے دلبر جانی" کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ جاتی۔ میں نے سوچا ایک نظر بیپی اور رانو کو دیکھنا چاہیے۔

میں اٹھا اور تاریک کوریڈور سے گزرتا ہوا بیپی والے کمرے میں پہنچ گیا۔ بیپی کی کئی خصوصیات کھل کر سامنے آئی تھیں۔ وہ شراب کا رسیا بھی تھا۔ اس وقت بھی وہ پی رہا تھا۔ مجھے بیپی کے بارے میں پاشا سے تفصیلاً پوچھنا یاد نہیں رہا تھا۔ بہرحال مجھے اندازہ تھا کہ بیپی ایک اہم شخص ہے۔ اگر وہ اہم نہ ہوتا تو پاشا اس کے ساتھ رانو کو بطور بیوی نتھی نہ کرتا۔

کمرے میں تاریکی تھی کیونکہ وہاں کوئی لیمپ موجود نہیں تھا۔ کوریڈور میں ایک ٹمٹماتا لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی مدھم روشنی کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ بیپی نیم دراز تھا۔ رانو اس کے لیے وہسکی میں کوکا کولا ملا رہی تھی۔ دونوں کے بس ہیولے ہی نظر آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بیپی احتراماً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں کمرے کے نسبتاً زیادہ تاریک گوشے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ رانو کھڑی ہوگئی تھی۔

میں نے اسے اردو میں مخاطب کیا اور بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ ایک پائنتی کے اوپر ہی بیٹھ گئی۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" میں نے بدلی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔

"روجھاں پور کی جی۔" وہ روانی سے بولی۔

"روجھاں پور۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

"وہ جی۔ وہ جی۔ میں پاکستان میں رہتی ہوں۔ وہاں لاہور سے آگے ایک قصبہ ہے۔ اس کا نام روجھاں پور ہے۔"

"اچھا۔ اچھا' روجھاں پور۔ یہ جگہ تو میری بھی دیکھی ہوئی ہے۔"

"آپ جانتے ہیں روجھاں پور کو!" وہ بے حد حیرت سے بولی۔

"ہاں۔ میرا ایک ملنے والا تھا جہاں داد۔ اس کے ساتھ ایک بار رحیم یار خان سے روجھاں پور آیا تھا۔" (جہاں داد وہاں میرا ہی نام تھا)

وہ چونک کر بولی "جہاں داد۔ وہی تو نہیں جس کے بال سنہرے ہیں۔ قد لمبا ہے۔ بھاری آواز میں بولتا ہے۔"

"تم جانتی ہو اسے؟"

"کیوں نہیں جی۔ وہ تو چودھری صاحب کے ڈیرے پر دو مہینے رہا ہے میرے ساتھ۔ ہم دونوں میں۔ مم میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں میں بڑی پکی دوستی ہوگئی تھی۔"

"لیکن وہ کوئی اتنا اچھا بندہ تو نہیں ہے۔ سنا ہے کہ عورتوں کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔"

"اوہو۔ آپ نے غلط سنا ہوگا جی۔ بری نظر سے کیا وہ تو اچھی نظر سے بھی نہیں دیکھتا۔ وہاں ڈیرے کی ایک کڑی بیچھو دھو کر اس کے پیچھے پڑگئی تھی جی۔ آٹھوں پہر بن ٹھن کر اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی تھی۔ بڑا زور لگایا تھا جی اس نے۔ مگر وہ اس کے قابو نہیں آیا۔"

کسی کڑی کی آڑ میں "رانو" اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھی۔ شاید ابھی میں تھوڑی دیر مزید رانو کی باتوں کو انجوائے کرتا لیکن اسی دوران میں ایک ملازم گیس لیمپ لے کر بیپی کے کمرے کی طرف آگیا۔ میں روشنی میں رانو کے سامنے رہنا

میں چاہتا تھا لہٰذا اٹھ کر باہر نکل آیا۔

بارش رات آخری پہر تک برستی رہی۔ میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے پاشا اور "گاتی گڑیوں" کے حوالے سے کیا کرنا ہے۔ ذہن میں ایک چھوٹا سا منصوبہ بن رہا تھا۔ اس منصوبے کی تجسیم یہ تھی کہ گلوکارہ بہنوں کو کسی سانحے کا سامنا کرنا پڑے اور منوہرا دیوی کی نگاہوں میں پاشا کا فوری "ولن" بھی بن جائے۔ ایک دو گھنٹے میں میں نے پوری پلاننگ کرلی۔ جے کی ایک رہائش گاہ کولمبو کے مضافاتی علاقے میں موجود تھی۔ یہ ایک طرح کا ڈاک بنگلہ تھا۔ جے کے والد کو شکار اور کرکٹ کا بے پناہ شوق تھا۔ وہ جب شکار کے لیے جاتا تھا تو اس ڈاک بنگلے میں قیام کرتا تھا۔ یہ بنگلہ میرے منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ میں نے رات کو ہی علی احمد کو بھی فون کردیا اور اسے بتا دیا کہ ایک چھوٹے سے مشن کے لیے مجھے پھر اس کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ یہ علی احمد ہی تھا جس نے عاصم کو پھانسنے اور ریسٹ ہاؤس میں لانے میں میری مدد کی تھی۔

لڑکے لڑکیوں کا وہ گروپ جسے رنجنا کو اور پاشا "روزگار" کے سلسلے میں ہالینڈ بھجوا رہے تھے دن کے ایک بجے کینڈی سے بذریعہ کوسٹر کولمبو پہنچ رہا تھا۔ کولمبو سے رات دس بجے ان کی فلائٹ ایمسٹرڈیم کے لیے روانہ ہونا تھی۔

میں صبح تقریباً دس بجے اپنی قیام گاہ سے نکلا۔ بیپی اپنے کمرے میں بستر پر مدہوش پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی رانو بھی بے سدھ و بے ترتیب لیٹی ہوئی تھی۔ کھلے کھلے سے گیسو برسات کی رات کا فسانہ سنا رہے تھے۔ رانو کی حیثیت واقعی بہتی گنگا جیسی تھی۔ میں ان دونوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتا رہائش گاہ سے باہر آگیا۔ پٹیہ کا گنجان بازار میرے سامنے تھا۔ رات بھر کی بارش کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا اور بازار میں خوب بھاؤ تاؤ ہو رہے تھے۔ اجناس کی بوریاں ہر طرف حرکت کر رہی تھیں۔ ویڑھی بانوں' خریداروں اور دکان داروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کئی لوگ اب ہمیں پہچاننے لگے تھے۔ ایک دو دکان داروں نے مجھے سلام کیا۔ میں جواب دیتا ہوا چوک کی طرف آگیا۔ دن کافی ہوگیا تھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچتے پہنچتے میری نگاہ خود بخود بائیں طرف اٹھ گئی۔ یہاں شیخ عاصم بن راشد لکڑی کی چھوٹی سی ریڑھی پر موجود تھا۔ قریب ہی آم کے کچھ چھلکے پڑے تھے۔ ان پر دو چار موٹی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ایسی ہی کچھ مکھیاں عاصم پر بھی چکرا رہی تھیں۔ لالہ ہاتھ میں پکڑا ہوا کپڑا کبھی کبھی بے دھیانی میں ہلا دیتا تھا۔ میں نے حسب معمول آگے بڑھ کر ایک سکہ ریڑھی پر اچھال دیا۔ لالے نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ وہ عاصم کے قریب ہی زمین پر بیٹھا تھا اور ایک اخبار پر چاول رکھ کر کھا رہا تھا۔ یہ سارا منظر "بھکاریوں والی گلی" کا تھا۔

اتفاقاً اخبار کے اس ٹکڑے پر میری نگاہ پڑی اور میں چونک گیا۔ یہ دو روز پہلے کا اخبار تھا۔ اس پر عاصم کی تصویر موجود تھی۔ اس تصویر میں عاصم نے ٹائی لگا رکھی تھی اور وہ بڑی شان سے ایک کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیچے خبر بھی موجود تھی' جس میں بتایا گیا تھا کہ سر توڑ کوشش کے باوجود سری لنکن پولیس ابھی تک شیخ عاصم کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ محترم شیخ عاصم کے بارے میں کارآمد اطلاع دینے والے کو پچاس ہزار ڈالر نقد انعام دیا جائے گا۔ میں یہ خبر دو روز پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔

اخبار کا ٹکڑا شیخ عاصم سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ شیخ عاصم تھوڑا سا سر اٹھا کر اسے دیکھ سکتا تھا اور یقیناً اس نے دیکھا بھی ہوگا۔ مقام عبرت تھا کہ شیخ اس بارے میں کسی کو کچھ بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ صرف مچل سکتا تھا اور منہ سے بے معنی آوازیں نکال سکتا تھا' ریڑھ کی ہڈی پر ضربات آجانے کے سبب وہ اپنی گردن بھی ٹھیک سے نہیں ہلا پاتا تھا۔ شیخ عاصم کا نگران لالہ بھی یقیناً اس ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ عاصم کی طرح بے دست و پا نہیں تھا لیکن وہ اس ٹکڑے کی اہمیت سے بے خبر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عاصم کی اہمیت سے بھی بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جس نیم جان لاشے پر کھڑا ہو کر دو پے اور دو دو روپے کے سکے جمع کر رہا ہے' اس لاشے کو اگر شناخت کرلے تو دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتی بن سکتا ہے۔ کچھ مکھیاں عاصم کے ادھ کھلے منہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے مکھیوں کو ہاتھ کی حرکت سے ہٹایا اور ٹھنڈی سانس بھر کر خود کلامی کے انداز میں کہا "دیکھ لے عاصم! میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ تجھے مارا نہیں ہے۔ اب بھی تو خوش نہ ہو تو یہ تیری مرضی ہے۔" میں نے یہ الفاظ انگریزی میں کہے تھے لہٰذا لالے کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ عاصم کی آنکھوں سے میرے لیے شعلے نکل رہے تھے۔ میں اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔

جونہی میں بڑی سڑک کے پہلے چوراہے پر پہنچا۔ ایک طرف سے ایک خاکی ویگن آئی اور میرے قریب رک گئی۔ میں کار میں بیٹھ گیا۔ کار کو علی احمد ڈرائیو کر رہا تھا۔

"کیسے ہو علی احمد؟" میں نے پوچھا "ہتھیار لے آئے ہو؟"

"بس سر۔" اس نے چابک دستی سے کہا۔

"اور ماسک؟"

"وہ بھی موجود ہیں سر۔"

"جگہ کا انتخاب ہوگیا ہے؟" علی احمد نے ایک بار پھر ادب سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کینڈی میں رابطہ کیا ہے۔ کوسٹر چار بجے وہاں سے روانہ ہوگئی ہے۔ یعنی مقررہ وقت سے آدھ گھنٹا لیٹ ہے۔ سترہ لڑکے لڑکیاں موجود ہیں جن نے راستے میں سوار ہونا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ ایک بجے تک گھات والے مقام پر پہنچ جائیں گے۔"

"اوکے سر۔"

باقی کا سفر ہم نے قریباً خاموشی سے ہی طے کیا تھا۔ ایک گھنٹے میں ہم کولمبو سے نکل کر قریباً بیس بچیس کلومیٹر آگے مضافات میں پہنچ گئے۔ بائی دے پر ایک موڑ کے نزدیک ہم نے ٹوکسی کو درختوں میں روک دیا۔ ٹوکسی کی ڈگی میں پلاسٹک کے بنے ہوئے کچھ مخروطی ڈبے رکھے تھے۔ یہ ڈبے ٹریفک پولیس والے ٹریفک سائن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ایک قطار میں سڑک پر رکھ کر گاڑیوں کا رخ موڑا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کے یہ مخروطی ڈبے ہمارے لیے اہم کام انجام دینے والے تھے۔

قریباً ایک بجے علی احمد کے واکی ٹاکی پر سگنل موصول ہوا۔ اس نے واکی ٹاکی پر بات کی۔ دوسری طرف علی احمد کا ایک ساتھی تھا۔ وہ ہم سے صرف دو فرلانگ آگے اسی سڑک پر موجود تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ براؤن رنگ کی کوسٹر آ چکی ہے اور اب ہماری جانب بڑھ رہی ہے۔ اس نے کوسٹر کا نمبر بھی بتایا۔

ہم الرٹ ہوگئے۔ میں نے ماسک چہرے پر چڑھا لیا۔ اب میری آنکھیں ہی دیکھی جا سکتی تھیں۔ خودکار رائفل میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جونہی ہمیں کوسٹر کی جھلک نظر آئی۔ علی احمد تیزی سے درختوں کی اوٹ سے نکلا اور اس نے سڑک پر سرخ کون رکھ کر راستہ مسدود کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے کوسٹر کو رکنے کا اشارہ کیا۔

کوسٹر رک گئی۔ مجھے کھڑکیوں میں نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے چہرے نظر آئے۔ وہ جیسے کسی کالج کی کوسٹر لگتی تھی۔ جونہی علی احمد نے کوسٹر کا دروازہ کھلوایا۔ میں درختوں سے نکل کر تیزی سے کوسٹر میں گھس گیا۔ میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر سب مسافر سکتے میں رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھتا میں ڈرائیور کے پہلو میں نسبتاً کشادہ جگہ پر پہنچ چکا تھا "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔" میں نے واشگاف دھمکی دی۔

ہر چہرہ خوف کی آماجگاہ نظر آنے لگا۔ اس افتاد نے زندگی کے ان نوآموز مسافروں کو غم زدہ کر دیا تھا۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ ابھی تو مصیبتوں اور جدائیوں کے سفر کا آغاز ہی ہوا ہے۔ ابھی تو انہیں بہت دور جانا ہے۔ ہم تو ان کے پاؤں میں ان گنت زہریلے کانٹے ٹوٹنے ہیں۔ وہ ایک اچھے مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے کینڈی سے ایمسٹرڈیم روانہ ہو رہے تھے' وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑے مافیا کے خونی جبڑوں میں جا رہے ہیں۔

جب تک میں نے کوسٹر میں اپنی پوزیشن سنبھالی علی احمد بھی کوسٹر کے عقبی حصے میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا لمبی نال والا ماؤزر تھا۔ میں نے چند سیکنڈ میں ڈرائیور کو مجبور کر دیا کہ وہ کوسٹر کو آگے بڑھائے۔ ڈرائیور نے میری ہدایت پر کوسٹر کو پہلے کچے میں اتارا پھر سڑک پر لایا۔ ابھی تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر شخص نے اچانک اٹھ کر چلانا شروع کر دیا۔ وہ سامنے سے آنے والی ایک بس کے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رائفل کا کندا گھما کر اس کی موٹی گردن پر مارا۔ وہ چھپکلی کی طرح اوندھے منہ کوسٹر کے فرش پر گرا۔ کوسٹر میں ایک ساتھ کئی نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ یہ چہرہ تاریک ہو گیا۔ چند نوجوان لڑکیوں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ علی احمد نے ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں چپ کرایا۔

ایک دو منٹ بعد سکون ہو گیا۔ کوسٹر درمیانی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہم نے اپنی فاکس ویگن کار وہیں درختوں میں چھوڑ دی تھی۔ اس کی چابی بھی اگنیشن میں موجود تھی۔ یہ کار علی احمد کے ساتھی کو موقعے سے ہٹانی تھی۔

قریباً تین کلومیٹر آگے جانے کے بعد ڈرائیور نے میرے حکم پر کوسٹر کو ایک ذیلی سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک تھی جو پانچ چھ کلومیٹر آگے جاکر ایک ڈاک بنگلے کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔ ادھیڑ عمر شخص فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنی مضروب گردن پر تھے۔ میں نے اسے محسوس کر رہا تھا کہ وہ آئی بائی ورکر ہے' فرش پر بیٹھ رہنے کی وجہ سے یہ شخص مجھے نہیں پہچان سکا تھا لیکن میرے لیے اسے پہچاننا ہرگز مشکل نہیں تھا۔ اس شخص سے میری رانا کے فلیٹ پر ملاقات ہو چکی تھی۔ لڑائی کے دوران میں میری ٹانگ اس کے منہ پر پڑی تھی اور یہ اپنی تلوار سمیت

سیڑھیوں سے لڑھکتا چلا گیا تھا۔ اس واقعے کی ایک دو نشانیاں ابھی تک اس کے بھاری بھرکم چہرے پر موجود تھیں۔

پانچ منٹ میں بس درختوں سے گھرے ہوئے اس پرانے ڈاک بنگلے کے سامنے پہنچ گئی۔ کہنے کو تو یہ عمارت ڈاک بنگلے جیسی تھی لیکن رقبے کے اعتبار سے کافی وسیع تھی۔ یہ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے احاطے میں ناریل' پام اور مینگوسٹین کے کئی پرانے درخت موجود تھے۔ عمارت کا زنگ آلود گیٹ کھلا تھا۔ میری ہدایت پر ڈرائیور کوسٹر کو سیدھا احاطے میں لے گیا۔

کئی لڑکیوں نے ایک بار پھر ڈرے ڈرے انداز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ ہم بڑی احتیاط کے ساتھ کوسٹر سے اترے اور دروازے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ اس عمارت میں سجے کے دو قابل اعتماد ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ ان دونوں کے پاس شکاری رائفلیں موجود تھیں۔ وہ صورتوں سے ہی چوکس اور نڈر محسوس ہوتے تھے۔ ہم نے چار چار کی ٹولیوں میں مسافروں کو نیچے اتارنا شروع کیا۔ ایک ٹولی کی تلاشی وغیرہ لے کر اسے کمرے میں پہنچا دیا جاتا' پھر دوسری ٹولی کو اتار لیا جاتا۔ اس عمل کے دوران میں بھی بعض یرغمالی بدستور گریہ و زاری منت سماجت میں مصروف تھے۔

انہیں دیکھ دیکھ کر ترس آرہا تھا۔ اپنی مجبوریوں کی زنجیر سے بندھ کر یہ لوگ رتنا کو جیسے شاطر کے جال میں پھنسے تھے اور شاید ہمیشہ کے لیے اپنوں سے دور ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسی گھناؤنی سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ اپنے وطن کی فضاؤں میں وہ آخری بار سانس لے رہے تھے۔ اس دھرتی کو ان کے پاؤں آخری بار چھو رہے تھے۔ ایک نیلے آسمان کے نیچے یہ ان کے آخری شب و روز تھے۔ انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ ان ہواؤں' ان چہروں اور ان موسموں کو یاد کر کر کے انہیں کتنا رونا ہے۔ ان بچھڑ جانے والے مناظر کی یادوں نے انہیں کس کس طرح تڑپانا ہے۔ نہ ہی انہیں یہ خبر تھی کہ وہ اپنے پیاروں کی شکلیں آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اب وہ کبھی ان کے ماتھے چوم سکیں گے نہ کبھی ان کے گلے لگ سکیں گے اور جن پیاروں نے آج انہیں الوداع کہا تھا اور آج سے ان کا انتظار امیدوں اور دعاؤں کے ساتھ شروع کیا تھا' انہیں بھی پتا نہیں تھا کہ وہ آج ایک ایسا انتظار شروع کر رہے ہیں جس کا اختتام کبھی نہیں ہوگا۔

میرا دل جیسے اندر سے رونے لگا۔ مجھے وہ سارے دردناک احساسات یاد آگئے اور وہ سارے روح فرسا واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے جن سے ماریا ٹرسٹ میں میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے سامنے کوسٹر سے ٹولیوں کی صورت میں اترتے ہوئے مسافر انسان نہیں' یہ معصوم صورتوں والے بھولے پنچھی ہیں' جنھوں نے دانہ دیکھا تھا دام نہیں دیکھا تھا۔ اپنے پیٹ سے مجبور ہو کر وہ ڈرتے ڈرتے دانے پر آئے تھے اور اسیر ہو گئے تھے۔

میرے بس میں ہوتا تو ان نوجوانوں میں سے ہر ایک کو گلے سے لگا لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا اور پھر اپنی مٹھی کھول کر اسے ہواؤں میں اڑا دیتا۔ اسے اس کے آشیانے کی طرف لوٹا دیتا لیکن یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی یہ میرے پروگرام کا حصہ تھا۔ میں ان گنت لوگوں کی بہتری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس سوچ نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ ان چند نوجوانوں کی حالت زار کی طرف سے آنکھیں بند کرلوں۔ بڑے مقاصد تک پہنچنے کے لیے بے شمار چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ میں نوجوانوں کو بس سے اترتے دیکھتا رہا۔

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

قیمت فی جلد
150
روپے

اندھیر نگری

ہارا ہوا جواری کو فرار   تحریر: محی الدین نواب

الیکشن اور پنچایت کا ندر نے والا سلسلہ آپ کی نظروں میں ابھر آئے گا۔
سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال۔
پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال۔
بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان۔
پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان
سندھ کے وڈیروں کی "مذاقی" کی ناقابل یقین داستان۔

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

ناشر | الرفاعی پبلشرز اینڈ بکسیلرز، لاہور
اسٹاکسٹ | علی میاں پبلیکیشنز 7247434

ہم نے تمام لڑکے لڑکیوں کو "کوسٹر" سے اتار کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچا دیا۔ بعد ازاں انہیں دو کمروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سب کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ ان کی کل تعداد بیس تھی۔ بارہ لڑکے تھے اور آٹھ لڑکیاں۔ یہ سب غریب اور متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ نوجوانوں میں سے پانچ اسٹوڈنٹ تھے' باقی چھوٹی موٹی جاب کرتے تھے۔ لڑکیوں میں سے دو نیپال نہیں باقی تانیسٹ وغیرہ تھیں اور نوکری تلاش کر رہی تھیں۔ ان سے کافی رقمیں اینٹھی گئی تھیں اور مستقبل کے سنہرے خواب دکھائے گئے تھے۔

اب یہ سب کے سب سہمی ہوئی مرغیوں کی طرح دو کمروں میں بیٹھے تھے اور رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ رو رہے تھے کچھ ہماری منت سماجت کر رہے تھے۔

ایک نسبتاً دلیر نوجوان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "تم ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو۔ کیوں لایا گیا ہے ہمیں یہاں؟"

میں نے کہا "ذرا گہری لمبی سانس لو۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں سارا پتا چل جائے گا تمہیں۔"

"یہاں بہت حبس ہے۔ کیا تم ہمیں بند کر کے مارنا چاہتے ہو؟"

"یہاں حبس نہیں ہے۔ حبس تو اس کنٹینر میں ہوگا جس میں بند کر کے تمہیں یہاں سے لے جایا جائے گا۔ ہاں... جہاں تم پہنچو گے وہاں حبس نہیں ہوگا۔ وہاں باقاعدہ "اے سی" لگے ہوئے ہیں۔"

"تم کہاں لے جانا چاہتے ہو ہمیں؟" نوجوان کی آنکھوں میں ہراس نظر آیا۔ نئی اور چہرے بھی زرد دکھائی دینے لگے تھے۔

"بہت اچھی جگہ ہے۔ تمہیں پسند آئے گی۔ ہاں۔ ہو سکتا ہے کہ ان چھوکریوں کو پسند نہ آئے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میرا چہرہ ابھی تک ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ ایسا ہی ماسک علی احمد کے چہرے پر بھی تھا۔

اس مختصر گفتگو نے نوجوانوں کے خوف و ہراس میں اضافہ کیا اور میں یہی چاہتا تھا۔ یہ نوجوان یقیناً یہی سمجھ رہے تھے کہ بدقسمتی سے ان کی کمند لب بام ٹوٹ گئی ہے۔ وہ کولمبو سے ایمسٹرڈیم پرواز کرنے سے قبل ہی بدمعاشوں کے کسی گروہ کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ اب انہیں ہائی جیک کر کے کہیں اور لے جایا جا رہا ہے۔

قریباً آدھ پون گھنٹا اسی طرح گزرا پھر اچانک چار عدد کاریں آگے پیچھے ڈاک بنگلے کے سامنے پہنچ گئیں۔ ان ساری کاروں پر مسلح افراد لدے ہوئے تھے۔ یہ کل کوئی بیس عدد افراد تھے۔ انہوں نے بڑی پھرتی سے ڈاک بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دو تین افراد نے کاروں کے عقب میں پوزیشنیں لے لیں۔ علی احمد کی سیاہ آنکھوں میں عقابی چمک نظر آنے لگی تھی۔ یہی چمک جو اسے خطرے سے بے نیاز کر کے ایک نڈر لڑاکا بناتی تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"رتنا کوا اور گونگے کے آدمی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

ہم نے کھڑکیوں کے قریب پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جے کے وہ دونوں کارندے جو پہلے ڈاک بنگلے میں موجود تھے میرے قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کے پاس شکاری رائفلیں تھیں۔

میں نے ان سے کہا "تم لوگ لڑائی میں حصہ نہیں لو گے۔ تمہاری ڈیوٹی صرف یرغمالیوں کی نگرانی ہے۔"

انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور ان دو کمروں کی طرف چلے گئے جہاں بیس عدد لڑکے لڑکیاں سہمی ہوئی مرغیوں کی طرح موجود تھے۔

کاروں کے عقب سے کسی نے للکار کر کہا۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ پاشا کی آواز تھی جو یہاں گونگا کے نام سے موجود تھا اور پورے کولمبو میں جس کی موجودگی محسوس کی جا رہی تھی۔ پاشا کی آواز مجھ تک پہنچی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ یقیناً اس نے یہی کہا تھا کہ ہم اس کے بندوں کو "کوسٹر" سمیت چھوڑ دیں ورنہ بری طرح پچھتائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

پندرہ بیس سیکنڈ بعد کاروں کے عقب سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس فائرنگ میں شرپل گن کے علاوہ ماؤزر بھی استعمال کیے جا رہے تھے۔ ہم نے بھی کھڑکیوں میں سے فائرنگ شروع کر دی۔ دو تین منٹ کے اندر ڈاک بنگلے کی دیواروں اور دروازوں میں ان گنت سوراخ ہو گئے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور فضا میں بارود کا دھواں پھیل گیا۔ لڑکے اور لڑکیاں اندرونی کمروں میں تھے لہٰذا فائرنگ سے قطعی محفوظ تھے۔

علی احمد کے پاس ماؤزر کے فالتو راؤنڈ ختم ہونے والے تھے لہٰذا وہ رک رک کر فائر کر رہا تھا۔ اس نے کہا "سر! خیال ہے کہ مجھے پچھلی طرف چلے جانا چاہیے۔ یہ لوگ ادھر سے اندر گھسنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ میرے خیال میں وہ اتنی ہمت نہیں کریں گے۔ پچھلی طرف دیواریں بالکل سپاٹ ہیں۔" علی احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

حملہ آوروں کا پلہ بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ ان میں سے دو تین نے مین گیٹ کے ستونوں کے پیچھے پوزیشن لے لی تھی اور یوں ان کی فائرنگ زیادہ مؤثر ہو گئی تھی۔ اچانک بالائی منزل پر قدموں کی دھمک سنائی دی اور علی احمد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ حملہ آوروں میں سے تین چار بندے پچھلی طرف سے عمارت میں داخل ہو کر بالائی منزل پر پہنچ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت وہ نیچے پہنچ سکتے ہیں۔ نیچے آنے والی سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا لیکن اسے توڑنا زیادہ دشوار کام نہیں تھا۔

"اب کیا ہوگا سر؟" علی احمد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"جے کے دونوں بندوں کو بلاؤ۔"

علی احمد نے حکم کی تعمیل کی اور جے کے دونوں کارندوں کو لے آیا۔ ان دونوں کے رنگ بھی اڑے ہوئے تھے۔ میں نے علی احمد سمیت تینوں افراد کو ساتھ لیا اور ڈاک بنگلے کے عقبی احاطے میں پہنچ گیا۔ یہاں خستہ حال گیراج کے سامنے جے کے ساتھیوں کی اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ ہم اسٹیشن ویگن میں سوار ہو گئے۔ میرے اشارے پر جے کے ساتھی نے عقبی دروازہ کھولا اور بھاگتا ہوا ویگن میں آ بیٹھا۔ اسٹیئرنگ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ویگن کو تیزی سے آگے بڑھایا اور ہم ایک نیم پختہ سڑک پر دوڑتے چلے گئے۔ ہم پر فائرنگ ہوئی جواب میں علی احمد نے بھی اپنے ماؤزر کے آخری راؤنڈ چلا دیے۔

اچانک ویگن کو جھٹکا لگا' دائیں جانب کا پچھلا ٹائر گولی لگنے سے فلیٹ ہو گیا تھا۔ ویگن بری طرح ڈگمگانے لگی۔ بہرحال میں اسے ویسے ہی بھگاتا چلا گیا۔ جلد ہی ہم فائرنگ کی زد سے دور نکل آئے۔ علی احمد کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے مجھے رائے دی تھی کہ ہم عمارت کا عقب خالی نہ چھوڑیں۔ اس کی رائے بالکل درست تھی۔ علی احمد کو میری صلاحیتوں پر بہت بھروسا تھا جس پر بہت بھروسا ہو وہ بھروسے پر پورا نہ اترے تو ذہن کو جھٹکا تو لگتا ہے۔ ہم ایک کامیاب کارروائی کر کے کوسٹر کو ڈاک بنگلے تک لانے میں کامیاب ہوئے تھے' لیکن یہ کارروائی ہماری پسپائی کی وجہ سے بے سود ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے علی احمد' تم چپ چپ ہو۔"

"کچھ نہیں سر! ویسے ہی سوچ رہا ہوں' ہماری نفری ذرا سی زیادہ ہوتی تو..." اس نے یونہی بات بنائی۔

"ہوتا ہے کبھی کبھی' ایسا بھی ہوتا ہے۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

"اگر پہلے سے علم ہوتا کہ یہ لوگ اتنی طاقت سے آئیں گے تو ہم بھی انتظام کر کے آتے۔" علی احمد خود کلامی کے انداز میں بولا۔

میں اسے کیسے بتاتا کہ ہمیں پہلے سے علم تھا۔ اور یہ بھی علم تھا کہ ہمیں پسپا ہونا ہے۔ دراصل یہ سارا سوچا سمجھا ڈراما تھا۔ میں اور پاشا اس کے اہم کردار تھے۔ یہ ساری کارروائی دراصل پاشا کی اہمیت اور مرتبے کو بڑھانے کی ایک کوشش تھی۔ منوہرا دیوی کی نظروں میں فوری مقام حاصل کرنا پاشا کی اہم ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ "گمشدہ گڑیوں" کو ہالینڈ اسمگل کرنے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا۔ تاہم اس حوالے سے اس کا ذہن بری طرح تقسیم بھی تھا۔ وہ ان دلکش و معصوم لڑکیوں کو اس سانحے سے بچانا بھی چاہ رہا تھا۔ کوسٹر کے اغوا اور پھر بازیابی کا یہ واقعہ پاشا کی اہمیت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتا تھا۔

ڈاک بنگلے سے چار پانچ کلومیٹر آگے آنے کے بعد میں اور علی احمد اسٹیشن ویگن سے اتر گئے۔ ہم نے اپنا اسلحہ ویگن میں ہی رہنے دیا تھا۔ میں نے بس ایک لوڈڈ ریوالور جے کے کارندے سے لے لیا تھا۔

ہماری یہ کارروائی کافی مؤثر رہی تھی۔ پاشا سے اگلے روز فون پر اس سلسلے میں مختصر سی بات ہوئی۔ باقی حالات ٹھیک جا رہے تھے۔ ثوبیہ کا رویہ کبھی تھوڑا سا بہتر ہو جاتا تھا' کبھی پھر ویسے کا ویسا۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے "بندے کی پتر" بنا کر چھوڑنا ہے۔ للیتا بڑی ہوشیاری سے اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ جب سے ثوبیہ نے کھڑکی کی سلاخ کاٹنے کی ناکام کوشش کی تھی للیتا اس کی طرف سے بے حد محتاط ہو گئی تھی۔ وہ رات کو کھڑکی کے سامنے جو کسی بیٹھی ریڈیو سیلون سنتی رہتی تھی۔ دن کے وقت اس دوران میں آرام کر لیتی تھی جب سنگھاشی ڈیوٹی پر موجود ہوتا تھا۔ سنگھاشی کے کٹے ہوئے ہونٹ پر ٹانکے لگے تھے اور زخم ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

سری لنکا اور انگلینڈ کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ ہاری کرکٹ کا شیدائی تھا' وہ خوب میچ دیکھ رہا تھا اور فارغ وقت میں مطالعہ کرتا تھا۔ ثوبیہ کے لیے اس کے دل میں ہر وقت کُد بُد ہوتی رہتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ہاری اس بدقسمت لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ وہ اسے ازدواجی رشتے کا

سارا پیار اور عزت دینا چاہتا تھا لیکن توسیہ کے نزدیک باری کی حیثیت بس ایک من پسند گھوڑے کی تھی۔ اس نے یہ سرکش گھوڑا قابو کیا تھا۔ اب وہ اس کی لگام تھام کر اسے اپنی مرضی سے نچانا چاہتی تھی یا پھر مار مار کر اسے اپنے تھان سے بھگا دینا چاہتی تھی۔

توسیہ کو تکلیف میں دیکھ کر باری بے چین ہو جاتا تھا۔ میرے ڈر کی وجہ سے وہ کوئی بات نہیں کرتا تھا لیکن میں اس کی اندرونی کیفیت بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک صبح میرا اچھا موڈ دیکھ کر وہ میرے پاس آ بیٹھا۔ آدھی آستین کی سرخ شرٹ اور سیاہ پتلون میں وہ بے حد اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نشان کو نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ لاکھوں میں ایک تھا۔ ہم دونوں چائے پینے لگے۔ سری لنکا کی تازہ خوشبودار چائے۔ باری گہری سانس لیتے ہوئے بولا "رات کیا ہوا تھا جناب! توسیہ چیخ رہی تھی۔"

"للیتا نے دو چار چھڑیاں لگائی تھیں اسے۔"

"کیا پھر کوئی۔؟"

"ہاں۔ ڈنر کے لیے شور مچا رہی تھی۔ للیتا نے منع کیا تو اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اپنے غصے پر قابو پانا کچھ کچھ تو آ گیا ہے اسے لیکن اب بھی کبھی کبھی بے قابو ہو جاتی ہے۔"

"یہ نہیں سدھرے گی سر! ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں واپس امارات چھوڑ آئیں۔"

باری نے گہری سانس لے کر کہا "ایک دفعہ کہیں کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ کتے کی ٹیڑھی دُم کو تو سیدھا کیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو زبردستی پیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ میں اسے تم سے پیار سکھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ ایسی بات نہیں ہے باری۔ میں تو بس اس کے اندر کی خباثت اور ڈھٹائی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بڑی اچھی طرح پہچان لیا ہے باری۔ اس کی خصلت کو شناخت کر لیا ہے۔ لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں باری' ایک جن کو پیار اور ہمدردی سے بدلا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ جو پیار اور سختی کے امتزاج سے بدلتے ہیں۔ تیسرے وہ جن کا علاج صرف اور صرف سختی ہوتی ہے۔ یہ اتنے بد خصلت ہوتے ہیں کہ "مولا بخش" کے سوا ان پر کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ یہی وہ تیسری قسم ہے جس کے لیے محاورہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

"لیکن گستاخی معاف جناب۔ یہ ہماری ہی ذمے داری تو نہیں کہ اسے ٹھیک کرنے کے لیے اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتے رہیں۔"

"کچھ کاموں کو ادھورا چھوڑنے سے بہتر ہوتا ہے انہیں شروع ہی نہ کیا جائے۔ ہم یہ کام شروع کر چکے اب جیسے تیسے اسے انجام تک پہنچانا ہوگا۔ اس میں تھوڑا وقت ضرور لگ سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔ باقی تمہاری یہ بات درست ہے توسیہ سے مار پیٹ نہیں ہونی چاہیے۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ بتدریج ایسا ہو بھی رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کل رات للیتا کو سات آٹھ روز بعد توسیہ پر ہاتھ اٹھانا پڑا ہے۔ ورنہ تم جانتے ہی ہو کوئی دن مشقت کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔"

باری جواب میں خاموش رہا۔ میں نے کہا "میں فوراً تمہاری اچھی بیوی بنانے کی کوشش نہیں کر رہا' میں اسے صرف نارمل لڑکی بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ نارمل ہو جائے گی تو اچھی بیوی خود بخود بن جائے گی۔ تم دیکھ لینا۔"

باری نے تھوڑی گھبراتے ہوئے کہا "شیخ عاصم کو بھی بڑی اچھی طرح جانتے ہیں جناب' وہ بڑے جگرے والا شخص ہے۔ میں یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں کہ توسیہ کے حوالے سے اس کا ردعمل کتنا سخت ہوگا۔"

باری کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ عاصم پر کیا گزری ہے۔ وہ بے خبر تھا کہ امارات کا وہ جابر شہزادہ یہاں سے فرلانگ کی دوری پر بھکاریوں کے ڈیرے میں ایک جھونپڑی میں پڑا ہے۔ میں نے کہا "عاصم کے حوالے سے تم اپنے آپ کو کسی طرح کی تکلیف مت دو۔ یہ میرا مسئلہ ہے' میں ہی حل کروں گا۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی فون آ گیا۔ یہ پاشا کا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں آج دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاؤں۔ اس نے مجھے کولمبو کے مغربی علاقے کا ایڈریس دیا اور بتایا کہ ملنے کے لیے یہ بالکل محفوظ جگہ ہے۔ یہ کولمبو کا فیشن ایبل رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں سے ساحل نزدیک تھا۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں جا چکا تھا۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب میں بذریعہ ٹیکسی کار کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اپنے بدلے ہوئے حلیے کے سبب آمدورفت میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ویسے عاصم کی گمشدگی کے حوالے سے پولیس کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ یہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ سبزہ زار درختوں اور پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ پاشا (عرف گونگا) نے یہیں گیٹ پر

میرا استقبال کیا اور اندر لے گیا۔

رسمی گفتگو کے بعد ہم سنجیدہ گفتگو کی طرف آ گئے۔ پاشا نے کہا "گوسنر والی کارروائی توقع سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔ میں بہت خوش ہوں شاہ جہاں۔ آئی ایم ریئلی ہیپی۔ کارروائی کے وقت منوہرا کا ایک آدمی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے اور منوہرا کو بتایا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی منوہرا کا فون آیا ہے۔ وہ اس بات پر میری تعریف کر رہی تھی کہ میں نے خود کو خطرے میں ڈال کر گوسنر کو چھڑوایا ہے اور بروقت کارروائی کی ہے۔"

"گوسنر والا گروپ اب کہاں ہے؟"

"جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔" پاشا قدرے اداسی سے بولا "وہ لوگ ایمسٹرڈیم پہنچ گئے ہیں۔ ایک دو لڑکیوں کو نروس بریک ڈاؤن کی شکایت ہو گئی تھی۔ بہرحال پرواز کے وقت تک وہ بہتر ہو گئیں۔"

"اب ان کے ساتھ کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو وہ موج کریں گے لیکن آہستہ آہستہ پتا چلے گا کہ جال میں جکڑے گئے ہیں۔" پاشا کے لہجے میں پھر اداسی عود کر آئی۔

کچھ دیر تک ہم اس حوالے سے بات کرتے رہے پھر پاشا بولا "یہاں تمہارے لیے ایک سرپرائز بھی ہے۔"

"تمہارا مطلب بہت مزے دار یا بہت بدمزہ کھانے سے تو نہیں؟"

"نہیں۔ یہ واقعی سرپرائز ہے۔" پاشا نے کہا' پھر کسی کو آواز دی۔

"چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور مجھے واقعی حیرانی ہوئی SINGING DOLLS میں سے دو بہنیں مسکراتی ہوئی اندر آ گئیں۔ اس سے پہلے میں انہیں دو مرتبہ دور سے دیکھ چکا تھا۔ آج قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ وہ واقعی دلکش اور معصوم صورت تھیں۔ ان کی صاف شفاف مسکراہٹیں بالکل بچوں جیسی تھیں۔ وہ شرٹ پتلون میں ملبوس تھیں۔ آدھی آستینوں میں سے ان کی دودھیا ملائم بانہیں نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور سامنے ہی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

ایک لڑکی پاشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "بھائی جان سے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔"

میں نے کہا "ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ بلکہ میں تو آپ بہنوں کی کارکردگی خود بھی دیکھ چکا ہوں۔ خدا نے بہت اچھی آواز دی ہے آپ کو اور اس سے بھی بڑھ کر اچھا دل دیا ہے۔ جذام کے مریضوں کے لیے آپ لوگوں نے جس طرح جھولی پھیلائی تھی وہ میرے لیے یادگار تھا۔ میں بھی اس ہجوم میں تھا جو آپ فنکاروں کی اعانت کے لیے آپ کے ساتھ چل رہا تھا۔"

"تعریف کے لیے بہت شکریہ۔" دونوں بہنوں نے تقریباً ایک ساتھ کہا۔

"لیکن۔ آپ کچھ ادھوری سی لگ رہی ہیں۔ آپ کی بہن؟"

"وہ ذرا بیمار ہیں۔ فوڈ پوائزنگ ہو گئی تھی لیکن اب ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر نے فی الحال آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

"وہ آپ سے چھوٹی ہیں یا بڑی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سب سے بڑی ہیں۔ ان کا نام نینا ہے۔ میں منجھلی ہوں میرا نام روپ ہے اور اس کا نام پنکی ہے۔"

پاشا بولا "جہاں داد! تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی ان کو دیکھے اور اسے ان پر پیار نہ آئے۔"

پاشا نے مجھے جلدی سے جہاں داد کہہ کر مخاطب کیا تھا اور یوں سمجھا دیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے میرا نام جہاں داد ہی ہے۔ پاشا کی یہ احتیاط مناسب تھی۔

"ہاں واقعی یہ پیاری ہیں۔" میں نے پاشا کی تائید کی۔

"یہ آپ دیکھنے والوں کی نظر کا حسن اور پیار ہے۔" منجھلی روپ نے انکساری سے کہا۔

چھوٹی پنکی بولی "بھائی جان بتا رہے تھے کہ پاکستان میں آپ کا کافی بڑا کاروبار ہے۔ کوئی ہوٹلز وغیرہ کا سلسلہ بھی ہے۔"

"بس خدا کی دین ہے۔ اپنی کوشش کے بل بوتے پر تو بندا اپنے منہ تک لقمہ بھی نہیں پہنچا سکتا۔ سب سے زیادہ بے بس بچہ انسان کا ہوتا ہے۔ یہ قدرت ہی ہے جو اس کی ماں کے دل میں اس بچے کا پیار ڈالتی ہے۔"

"آپ کے خیالات بڑے اچھے ہیں۔" روپ بولی "قدرت نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور شاید وہ اشرف المخلوقات اسی لیے ہے کہ وہ صرف اپنے لیے نہیں جیتا۔ دوسروں کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ دونوں "گاتی گڑیاں" گفتگو کا رخ کس طرف موڑ رہی ہیں۔ وہ سنگرز ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست سوشل ورکرز بھی تھیں۔ شاید وہ مجھ سے توقع کر رہی تھیں کہ میں ان کے "کاز" میں ان سے مالی تعاون کروں گا۔ ان کا "کاز" واقعی قابل قدر تھا۔ وہ کوڑھ کے

مریضوں کی بہتری اور مرض کے خاتمے کے لیے کام کرتی تھیں۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا پاشا صاحب بھی انہی کی کوششوں سے اس کام میں شریک ہوا تھا۔

کچھ دیر تک ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ روپ اور چنکی نے مجھ سے براہِ راست عطیہ وغیرہ نہیں مانگا لیکن اپنی گفتگو کے ذریعے انہوں نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ مجھے اس سلسلے میں دلچسپی لینی چاہیے۔

ان بہنوں کے رویّے اور لب و لہجے میں بڑی دلکشی اور اپنائیت تھی۔ وہ بندے کو لمحوں میں اپنا کر لیتی تھیں۔ باتوں کے دوران میں، میں نے کہا "آپ سے ایک ذاتی سا سوال پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ آپ برا تو نہیں منائیں گی۔"

روپ بے ساختگی سے بولی "آپ اتنے اچھے ہیں کہ آپ کی بات کا برا منایا ہی نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "آپ میں سے کسی کی شادی وغیرہ بھی ہوئی کہ نہیں؟"

دونوں کے گندمی چہروں پر شرم کا حسین رنگ لہرا گیا پھر روپ بولی "نہیں۔ ابھی تو ہماری ساری توجہ SINGING پر ہی ہے۔ ویسے جب بھی شادی ہوگی ہمارے والدین کی مرضی اور پسند کے مطابق ہوگی۔"

"بہت خوب، بڑی اچھی بات ہے۔"

چھوٹی چنکی ذرا شوخی سے بولی "آپ خود اچھے ہیں اس لیے آپ کو ہماری ہر بات اچھی لگ رہی ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور دل میں سوچا۔ تمہیں کیا پتا لڑکیو! کہ ہم دونوں کتنے اچھے ہیں۔ جسے وہ دونوں بے چاری بھائی جان کہتی تھیں اور جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ میوزیکل شوز کا بین الاقوامی پروموٹر ہے۔ وہ ایک خوفناک گینگ کا بگ باس تھا۔ بیسیوں افراد کا قاتل۔ ماضی کا بدنامِ زمانہ دہشت گرد اور کرائم کنگ پاشا۔ جسے وہ دونوں بے چاری اپنے بھائی جان کا دوست سمجھ رہی تھیں اور جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ دردِ دل رکھنے والا ایک پاکستانی صاحبِ ثروت ہے، وہ استاد جہانی تھا۔ جس کے کھاتے میں ان گنت "ناکردہ اور کردہ" جرائم جلی حروف میں لکھے تھے۔

وہ دونوں کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں۔ چنکی نے ہمیں اپنے ہاتھ سے زبردست کافی بنا کر پلائی پھر وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئیں۔ وہ پاشا سے ملنے ہی یہاں آئی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے پاشا سے پوچھا "بڑی لڑکی واقعی بیمار ہے؟"

"بس سمجھو کہ بیمار کی گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اسے جو "فوڈ پوائزننگ" ہوئی ہے، اس کا سبب میں ہوں۔ جس رات وہ بیمار ہوئی، اس رات تینوں بہنوں نے میرے ساتھ ہی ڈنر کیا تھا۔" پاشا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں کسی حد تک سمجھ گیا ہوں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تم نے بڑی لڑکی کی "بیماری" کو منوہرا دیوی سے کچھ مزید مہلت لینے کے لیے بہانا بنایا ہے۔"

"ہاں۔" پاشا نے سرہلا کر میری تائید کی "پندرہ تاریخ دوپہر ایک بجے ان تینوں بہنوں کو ایک لانچ کے ذریعے "بمبئی" پہنچایا جانا تھا اور وہاں سے ایک کارگو شپ کے ذریعے ہالینڈ روانہ ہوجانا تھا۔ صرف پانچ دن پہلے یعنی [illegible] تاریخ کو نینا سخت بیمار ہوگئی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب یہ پروگرام ملتوی ہے؟"

"بالکل۔ جب تک نیا انتظام نہیں ہوجاتا، تینوں بہنیں خیریت سے ہیں۔"

"تمہاری اس منوہرا دیوی کو کسی قسم کا شک تو نہیں ہوا؟"

"ابھی تک تو نہیں۔ بلکہ ابھی تک تو دونوں ذرائع کامیاب ہی محسوس ہوتے ہیں۔"

"دوسرے ذرائع سے تمہاری مراد کوسٹر کے اغوا والا واقعہ؟"

پاشا نے تائیدی انداز میں سرہلایا۔ میں نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ پاشا نے گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی وہسکی انڈیلی۔ میں نے کہا "واقعی ان لڑکیوں سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ کئی لوگ نظر آتے ہیں جو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو پہنچنے والی تکلیف کے بارے میں سوچ کر خود کو بھی تکلیف ہونے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے میں اس سلسلے میں تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔ ہم منوہرا کو ان لڑکیوں سے دور رکھیں گے۔"

"میں تمہیں مسلسل رپورٹ دیتا رہوں گا۔ اگر بیچ میں دو چار روز کا وقفہ آجائے تو پریشان نہیں ہونا۔ ایسا احتیاط کی وجہ سے ہوگا۔"

"پاشا! سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے اندر بہت توانائی محسوس ہو رہی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ جب پچھلی دفعہ کنگ براؤن سے ٹکر ہوئی تھی تو صفدر جیسا دوست

میرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ اب وہ آنکھوں سے معذور ہو کر ایک چار دیواری تک محدود ہے۔ ایسے میں مجھے ایک ہم خیال اور نڈر ساتھی کی اشد ضرورت ہے۔"

"میں لفظوں کا نہیں، عمل کا قائل ہوں شاہ جہاں۔ اور میں یہ ثابت بھی کروں گا۔"

گفتگو کا رخ صفدر کی طرف مڑ گیا۔ میں نے پاشا کو اس واقعے کے متعلق بتایا جس میں صفدر کی آنکھیں گئی تھیں۔ کنگ براؤن کے ساتھ وہی خون ریز معرکہ۔ جو آج تک ہمارے دل و دماغ پر نقش تھا۔ ماریا نرسٹ کے اہم ترین حصے میں آگ اور بارود کا طوفان۔ وہ سنگین ترین لمحے جب اس لڑائی کا فیصلہ ہونا تھا۔ ہمیں شکست ہونا تھی اور کنگ کے پانچوں کے کٹے ہوئے سر نرسٹ کی چھتوں سے لٹکے ہوئے نظر آنے تھے، یا کنگ کو اپنے ظلم کی تلوار چھوڑ کر بھاگنا تھا۔ ان فیصلہ کن لمحوں میں میرے یار صفدر کی وہ دلیرانہ جھپٹ آج تک میرے ذہن پر نقش تھی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا آگ پر سے گزرا تھا اور کنگ کے ہرکاروں کے لیے پیامِ اجل بن گیا تھا۔ ہاں ان واقعات کا ہر ہر پل ہم سب کے ذہنوں پر نقش تھا۔

میں شام سے تھوڑی دیر پہلے اپنی رہائش گاہ پر واپس پہنچا۔ ابھی میں رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ کسی ہنگامے کے آثار نظر آئے۔ حویلی نما مکان کے دروازے کے عین سامنے جمگھٹا سا لگا تھا۔ یوں لگا جیسے کسی کو پکڑا گیا ہے اور اب اس پر قابو پانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا موقع پر پہنچا۔ میرے ذہن میں آیا کہ شاید سائیں حال وارد ہوگیا ہے۔ اس کی آمد کا انداز ایسا ہی تہلکہ خیز ہوتا تھا۔ اس سے پہلے امارات میں بھی اس نے دو دفعہ ایسا ہی ہنگامہ مچایا تھا لیکن جب میں قریب پہنچا تو ایک اور ہی منظر دکھائی دیا۔ اس منظر نے مجھے ششدر کر دیا۔ جس شخص کو زمین پر گرا کر زدوکوب کیا جارہا تھا وہ باری تھا۔

باری۔ توسیہ کا شوہر۔ وہ نوجوان جس نے امارات میں میرا بھرپور ساتھ دیا تھا اور مشکل اوقات میں مدد کی تھی۔ باری کو جے کے کارندوں نے دبوچ رکھا تھا۔ بازار کے کئی لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوگئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر باری کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ چھوڑ دو اسے۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

میری آواز پہچان کر جے کے کارندے ایک دم ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئے۔ جے خود بھی وہیں موجود تھا۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے سب؟"

میں نے جے اور باری کی طرف ایک ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

باری کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر زیادہ چوٹیں آئی تھیں۔ وہ اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جے نے کہا "یہ بھاگ رہا ہے جناب۔ آپ اس کو لے کر اندر آئیں، میں سب کچھ آپ کو بتاتا ہوں۔"

باری خاموش تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جے کے لب و لہجے میں سچائی ہے۔

میں نے باری کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ چند لمحے تذبذب میں رہا، پھر میرے ساتھ چل کر اندر آگیا۔ اندرونی کمرے میں پہنچ کر میں نے سنگھاشی سے کہا کہ وہ باری کے ناک، منہ سے بہتا ہوا خون صاف کرے۔ سنگھاشی نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں باری کی سانسیں بھی ذرا قابو میں آگئیں۔

"ہاں بتاؤ، اب۔ کیا بات ہوئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

جے بولا "میں معافی چاہتا ہوں جناب۔ ہم آپ کے حکم کے مطابق چلتے ہیں۔ آپ کا حکم ہے کہ للیتا کو مس توسیہ کے سلسلے میں اختیار ہے۔ للیتا انہیں اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے جو چاہے کر سکتی ہے۔ ابھی کوئی آدھ گھنٹا پہلے مس توسیہ نے للیتا کا سر پھاڑ دیا ہے اور بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ وہ تو سنگھاشی نے بروقت کوشش کرکے برآمدے والا دروازہ بند کر دیا ورنہ مس توسیہ نے نکل جانا تھا۔ مس توسیہ نے سنگھاشی کے علاوہ دوسرے ملازموں کے ساتھ بھی مارپیٹ کی ہے۔ آپ ان کی چوٹیں دیکھ سکتے ہیں۔"

"تم بکواس کر رہے ہو۔" باری گرجا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میں نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ پہلے جے کو بات مکمل کرنے دے۔

باری کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

جے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "مس توسیہ کو بڑی مشکل سے قابو کرکے دوبارہ کمرے میں بند کیا گیا۔ وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھیں۔ بس اسی بات پر باری صاحب للیتا پر برس پڑے۔ انہوں نے ہمارے سامنے للیتا کو دھکے دیے اور مس توسیہ کے منہ سے کپڑا نکالنے کے لیے زبردستی کمرے میں گھسنا چاہا۔ میں نے منع کیا تو انہوں نے میرے منہ پر بھی تھپڑ مارا اور میرا گریبان پھاڑ دیا۔"

"یہ بکواس ہے۔" باری پھر غصے سے بے قابو ہو کر چیخا

"یہ خود بھی للیتا کے ساتھ مل کر توسیہ کو مار رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"نہیں مار نہیں رہا تھا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں میں نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ میں صرف مس توسیہ کو قابو کرنے کے لیے للیتا کی مدد کر رہا تھا۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے جناب" اس نے ۔۔۔

"باری آہستہ بولو۔" میں نے ڈانٹا "تمہاری آواز باہر تک پہنچ رہی ہے۔"

باری کا چہرہ ایک بار پھر سرخ انگارہ ہو گیا لیکن وہ میرے سامنے بولا نہیں۔ اس کا فقرہ بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ اب بات پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے جے کو باہر بھیج دیا اور باری کو بھی تھوڑا سا جھڑک کر اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ باری کو بے حد طیش تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے غضب پر بمشکل قابو پا رکھا ہے۔ باری مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے مڑا بھی مگر میں نے اسے روک دیا۔ میں نے کہا "باری! اس وقت تم غصے میں ہو۔ ذرا دماغ ٹھنڈا کر لو پھر میں تم سے بات کروں گا۔"

وہ تیزی سے گھوما اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

میں اس کمرے میں پہنچا جہاں توسیہ کو رکھا گیا تھا۔ یہاں کئی آرائشی چیزیں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ ایک شوکیس کا جہازی سائز شیشہ بھی چکنا چور تھا۔ للیتا کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ کمرے کی سلاخ دار کھڑکی سے جھانکا تو وہاں توسیہ نظر آئی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے رومال باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے' وہ بڑے سکون سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن پر بھی معمولی چوٹیں اور خراشیں تھیں۔

للیتا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا "یہ پیٹ درد کی شکایت کر رہی تھی۔ میں اندر گئی لیکن اس سے پہلے کہ میں تالا لگاتی یہ بھاگ کر میری طرف آئی اور پورے زور سے مجھے دھکا دیا میرا سر کھڑکی کے کنارے سے ٹکرایا۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں یہ دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ اگر سنگھاشی اسے روک نہ لیتا تو یہ نکل گئی تھی۔"

"تمہیں کہا بھی تھا کہ سخت ضرورت کے وقت ہی اندر جاؤ' اور اس کے بہانوں کو بھی ذہن میں رکھو۔"

للیتا روہانسی ہو کر بولی "جناب! مجھے باری صاحب کی طرف سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اگر میں اس (توسیہ) کی دیکھ بھال میں ذرا بھی کوتاہی کروں تو مجھے جھڑکنے لگ جاتے ہیں۔ میں نے سوچا بے درد سے ہائے ہائے کر رہی ہے۔ اگر باری صاحب نے دیکھ لیا تو غصے میں آ جائیں گے۔"

میں نے توسیہ کی طرف دیکھا' بے شک اس سے مار پیٹ ہوئی تھی اور اس کا منہ بھی بندھا ہوا تھا' پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک نظر آ رہی تھی۔ اس فاتحانہ چمک کا مطلب میں بخوبی سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے تن بدن میں شعلہ سا لپکتا محسوس ہوا۔ توسیہ کی آنکھوں میں یہ تاؤ دلانے والی چمک باری کے حوالے سے تھی۔ آج باری اس کی محبت میں مجبور نظر آیا تھا۔ اس نے توسیہ کی خاطر جے وغیرہ سے سنگین جھگڑا مول لیا تھا۔ مار کھا رہی تھی اور چیخا چلایا تھا۔ بلکہ چند لمحوں کے لیے وہ میرے سامنے بھی سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ بات بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی کہ اب توسیہ ایک نئی طرح کا کھیل کھیل رہی ہے۔ اور اگر نہیں کھیل رہی تو کھیلنا شروع کر دے گی۔ وہ بد خصلت تھی۔ اس کے اندر گہرائی میں برائی اور شر کی جڑیں تھیں۔ میرے اس نے گواہی دی کہ اب مجھے توسیہ کے سلسلے میں پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ باری کو شیشے میں اتار کر یہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ محبت بندے کی مت مار دیتی ہے۔ باری اچھا بھلا معقول اور سمجھ دار شخص تھا۔ وہ توسیہ کی عشوہ طرازیوں اور حیلہ سازیوں سے بھی آگاہ تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں پھر بھی وہ مختلف انداز سے سوچنے لگا تھا۔

سائیں عالی ابھی تک ڈاکٹر رزی وا کی رہائش گاہ پر تھا۔ وہاں اس کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ اگلے روز میں اس سے ملنے کے لیے پہنچا۔ وہ اندرونی کمرے میں ایرانی قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور آم چوس رہا تھا۔ اس کے آم چوسنے کا انداز یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں آم تھا اور دوسرے میں گڑک چائے۔ وہ ایک چوسا آم کا لیتا تھا اور ایک چسکی چائے کی۔

لوگ آم کے ساتھ دودھ کی پتلی کسی یعنی کچی لسی پیتے ہیں' لیکن اگر میں یہ بات سائیں عالی سے کہتا تو وہ جواب میں ایک لمبی تقریر شروع کر دیتا' لہٰذا میں خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا "کیسے ہو شفیع محمد؟" اس نے آنکھیں نچا کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں اور تم؟"

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ ٹھیک ہوں۔ اچھی خبر یہ ہے کہ جن خبیثوں نے میری غیر

موجودگی میں میرا تختہ اُلٹایا تھا' ان کا اپنا تختہ بھی اُلٹ گیا ہے۔ ابھی نیل فون پر میری بات ہوئی ہے۔ ان کا سوا ستیا ناس ہو گیا ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"تمہاری سمجھ میں آنے کا بھی کچھ نہیں۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ کانجی میں چھوٹی مکھی کا شہد ملا کر پیا کرو۔ عقل کھل جاتی ہے" اچھا الٹا "ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ خاص طور پر پاکستانیوں کے لیے تو یہ بالکل مشکل بات نہیں۔ تختہ الٹنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بس تمہاری باری ختم' میری باری شروع۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا جب میں اپنی ابوحالی سے دس ملکوں کے طوفانی دورے پر نکلا' تو میرے پیچھے بھی ایک طوفان آ گیا۔ اپوزیشن لیڈر جو ایک نمبر کا نوسر باز ہے موقع تاڑ کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا ۔۔۔"

"میں نے یہ ساری کتھا تم سے سن رکھی ہے۔" میں نے سائیں کی بات کاٹی "نئی بات بتاؤ کہ کیا ہے؟"

"نئی بات ہی تو تمہیں بتا رہا ہوں۔ جس طرح میرا تختہ الٹ گیا تھا بالکل اسی طرح میرے مخالفوں کا تختہ الٹ گیا ہے۔ اور ان کا تو دھڑن تختہ ہو گیا ہے۔ لوگوں نے جوتے مار مار کر ان دو لیڈروں کو تو جان سے ہی مار ڈالا ہے۔ باقی تتر بتر ہو گئے ہیں۔ در اصل کوئی شخص بھی اپنے تخت یا تختے سے ہٹ کر تو بیٹھ نہیں سکتا' اسے تمہیں نہ ہمیں تو جانا ہی پڑتا ہے اور کچھ نہیں تو اپنی حاجتیں پوری کرنے کے لیے تو وہ جائے گا۔ بس ایسے ہی کسی موقع پر میرا مخالف دس پندرہ منٹ کے لیے تختے سے اترا تھا' میرے حمایتیوں نے تختہ الٹ دیا۔ اس طرح تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اس طرح تختے بھی اپنے آپ کو الٹاتے ہیں۔ جو تختہ الٹتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔"

"چلو' تمہیں مبارک ہو کہ تم پھر سے حکمران بن گئے۔"

"خیر مبارک۔ ٹھہرو میں تمہیں لڈو کھلاتا ہوں۔"

سائیں نے سنجیدگی سے کہا اور الماری کھول کر اس میں سے پلاسٹک میں تلے ہوئے نمکین لڈو نکال لیے۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ لڈو کراری ٹکیوں والے ہیں۔ مقصد تو لڈو کھانا ہے ناں۔ آج کل شوگر عام ہے اس لیے میٹھا کھانے سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ ہاں اگر چاہو تو تم اس نمکین لڈو کو بھی میٹھا کر سکتے ہو۔ سائیں نے فوراً ایک لڈو کو چائے میں ڈبو کر نکالا' پھر اسے چینی میں گول گول گھما دیا۔ لڈو کے چاروں طرف چینی لگ گئی "لو کھاؤ۔" سائیں نے مجھے "میٹھا لڈو" پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا کہ لڈو نہ کھایا تو سائیں پتے سے اکھڑ جائے گا اور اس سے کچھ پوچھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے ثابت لڈو منہ میں رکھ کر نگلتے ہوئے کہا "ڈاکٹر روی کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں ہے۔ اب تمہیں اس سے کیا کام پڑ گیا ہے۔ کیا شیخ عاصم میں کچھ اور کانٹ چھانٹ کروانی ہے۔"

"اور کانٹ چھانٹ کی گنجائش اس میں کہاں ہے۔"

"گنجائش تو ہر کام میں موجود رہتی ہے۔" سائیں نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو اس کے کان کاٹے جا سکتے ہیں۔ ناک پر طبع آزمائی کی جا سکتی ہے۔ کئی چیزیں کاٹی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر روی کی مہارت اس سلسلے میں بہت کام آ سکتی ہے۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنا کافی ہے۔"

سائیں عالی نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور آگے پیچھے جھولنے لگا۔ میں نے پوچھا "پاکستان میں زریں وغیرہ سے بات ہوئی؟" سائیں نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے یہی بات مسٹر کلارک کے حوالے سے پوچھی۔ سائیں نے اس بار بھی انکار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "پتا نہیں پاکستان میں کیا حالات ہیں؟"

سائیں بولا "وہاں بڑے اچھے حالات ہیں۔ ابھی ایک "جن رپورٹر" کے حوالے سے مجھے خبر ملی ہے کہ میری حکومت دوبارہ آ جانے کی اطلاع پر پاکستان میں بھی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ بہت سے منچلوں نے اپنے سر منڈھا کر اس پر زندہ باد لکھ لیا ہے اور پٹرول پی کر ناہرا ہوں پر ناچ رہے ہیں۔ بڑی جوشیلی قوم ہے۔"

"میں دوسرے حالات کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ غزالہ اور اس کے اہلِ خانہ کی گمشدگی کے بعد وہاں کیا پوزیشن ہے۔"

"ہاں اس بارے میں تو میں بھی سوچ رہا تھا۔ تم ایسا کرو کہ ابھی پاکستان فون کر لو مجھے بھی حالات کا پتا چل جائے گا۔"

سائیں مجھے لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سائیں کی اوٹ پٹانگ باتیں اکثر میرے دماغ کی گولیں ہلا دیتی تھیں۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ سائیں کی باتوں میں اکثر معنی پوشیدہ ہوتے تھے۔ ان معنوں کو ڈھونڈنا مزید دردِ سری کا باعث بنتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک سائیں جو کچھ بولتا رہا تھا اس میں تختہ الٹنے اور حکومت بحال ہونے کی

باتیں تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ سائیں کی یہ ساری گفتگو موریطانیہ کے حوالے سے ہے۔ وہاں نزسٹ کے نواح میں "کالونی" کے آس پاس سائیں نے مسٹر کلارک کے ساتھ مل کر ہزاروں مفلس لوگوں کو آباد کیا تھا اور ان کی بہتری کے لیے وسیع اسکیمیں شروع کی تھیں۔ ان وسیع و عریض خیمہ بستیوں میں سائیں کو اوتار کا درجہ دیا جا رہا تھا۔ سائیں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہیں پر کوئی گڑبڑ ہوئی تھی جسے سائیں تختہ الٹنے کا نام دے رہا تھا۔ اب وہاں صورتِ حال میں پھر کوئی تبدیلی آئی تھی اور سائیں اسے حکومت بحال ہونے کا نام دینے لگا تھا۔

میں سائیں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل تک پہنچا۔ یہاں ایک کمرے میں فون رکھا تھا۔ میں نے پاکستان میں زریں گل کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری تیسری کوشش میں زریں کی عالی شان رہائش گاہ پر رابطہ ہو گیا۔ کلثوم کی آواز آئی "ہیں۔ ام مسز زریں بولتا۔"

اس کے لہجے نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا "ام شاہ جہاں بولتا۔ سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔"

کلثوم کی چیخ نکل گئی "اوہو۔ یہ آپ ہے استاد صیب! ام کو تو آپ کے فون کا بہت سخت انتظار تھا۔ زریں بھی آپ کو فون کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو کوشش کر کر کے ہلاک ہو گیا ہے۔"

غالباً وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ "ہلکان" ہو گیا ہے۔ اسی دوران میں زریں گل نے اس سے ریسیور جھپٹ لیا "استاد صیب! آپ کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ آپ نے تو امارا دماغ خراب کر دیا ہے۔"

"یہ نقص تم میں پہلے سے موجود تھا۔" میں نے خشک لہجے میں کہا "غزالہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے یا نہیں؟"

زریں چند لمحوں کے لیے چپ ہو گیا پھر ڈھیلے لہجے میں بولا "کاش ام آپ کو اس بارے میں کوئی اچھا خبر سنا سکتا۔ غزالہ بی بی کا ابھی کوئی پتا نہیں ہے جی۔ ام نے لاہور میں اور لاہور سے باہر ان کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈا ہے اور اب بھی کوشش کر رہا ہے۔ خدا کی قسم' یہ امارے دل کا آواز ہے' کوئی ام سے امارا سارا دولت لے لے' ام کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر دے لیکن ام کو غزالہ بی بی واپس لوٹا دے۔۔۔ ام کو ایک بار پھر سائیں صیب کا صورت دکھا دے۔ ام اتنا دکھی ہے استاد صیب کہ آپ کو بتا نہیں سکتا۔ امارا دولت امارے کسی کام کا نہیں۔ ام آپ سے ہاتھ جوڑ کر فرماتا ہے ام سے امارا سب کچھ لے لو لیکن امارا گزرا ہوا وقت امارا لوٹا دو۔" زریں کی آواز بھرا گئی' وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک خوش محسوس ہو رہا تھا' کرب کے سمندر میں ڈوب گیا۔

"شاید تم مجھ سے توقع کر رہے ہو کہ میں تمہیں وہ دوں۔ یہ شے تو اب میرے پاس بھی نہیں رہی' تمہیں کیا دوں گا۔"

زریں نے کراہتے ہوئے کہا "استاد صیب' ام جانتا ہے۔ اماری سب مصیبتوں کا ذمے دار وہ سور کا بچہ عاصم ہے۔ ام نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ام اس کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ام اس کو عبرت کا مثال بنا دے گا۔ ام نے آپ کا حکم کبھی نہیں ٹالا لیکن شیخ کے بارے میں ام آپ کا بھی نہیں مانے گا۔ ام نہیں مانے گا آپ کا بات!"

زریں کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ میں خاموش رہا۔ میں نے زریں کو نہیں بتایا کہ عاصم عبرت کا مثال بن چکا ہے۔

پس منظر میں زریں کے بیٹے اسد کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے زریں سے اس کی خیر خیریت دریافت کی اور یوں گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ میں نے زریں سے [illegible] صفدر کے بارے میں بھی پوچھا۔ زریں نے بتایا کہ آج کل ایک بہت بڑا انگلش ڈاکٹر پاکستان آیا ہوا ہے۔ وہ پرسوں لاہور پہنچے گا۔ مسز جی کلارک کی گزارش پر وہ لاہور کے پرائیویٹ کلینک میں صفدر کی آنکھوں کا معائنہ بھی کرے گا اور اپنی رائے دے گا۔ زریں نے کہا "یہ کلثوم دن رات سیدو بھائی کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ وہ خیرات بھی کرتا ہے۔ خیر خیرات کرنے کا اس کا اپنا انداز ہے۔ کل اس نے مجھ سے گائے کا بہت سارا گوشت منگوایا۔ اپنے قبائلی رواج کے مطابق اس گوشت پر اس نے بہت گرم پانی ڈلوایا۔ بعد میں اس گوشت کا بڑا بڑا ٹکڑا کروایا اور ام سے کہا کہ ام یہ گوشت کہیں جنگل میں پھینک آئے۔ ام نے اسے سمجھایا کہ لاہور کے ارد گرد کہیں بھی کوئی ایسا جنگل نہیں ہے اور اگر کہیں کوئی جنگل ہے بھی تو وہاں گوشت کھانے والا اتنا بڑا بڑا جانور نہیں ملے گا۔ بعد میں ام نے گوشت ضرورت مندوں میں بانٹا۔ اب بھی وہ دو گھنٹے سے مصلے پر بیٹھا ہے اور صفدر بھائی کے لیے دعا کر رہا ہے۔ تم کو اسد کے رونے کا آواز آ رہا ہے ناں۔ وہ اس لیے رو رہا ہے کہ کلثوم مصلے پر بیٹھا ہے۔ کلثوم نے ام کو بھی منع رکھا ہے کہ ام اسد کو نہ اٹھائے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ روتا ہے تو اللہ کو اس پر ترس آتا ہے۔"

سیدھی سادی عورت کی کتنی سیدھی سادی دلیلیں تھیں۔ میں نے کہا "زریں! سچی بات یہ ہے کہ جب تم جیسے لوگوں کو صفدر کے لیے دعائیں کرتے دیکھتا ہوں تو دل میں امید پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایک دن ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خدا آپ کا کہنا مبارک کرے۔" زریں نے تہہ دل سے کہا۔

میں نے کہا "کتنے گارڈز ہیں تمہارے ساتھ؟"

وہ بولا "پہلے چار تھے۔ اب آپ کے کہنے پر دو اور بھرتی کر لیے ہیں۔"

"ان میں دو چار کا مزید اضافہ کرو۔ اپنی اور صفدر کی طرف سے بے حد ہوشیار رہو۔ صفدر آج کل کہاں ہے؟"

"یہیں امارے ساتھ رہ رہا ہے۔ شاید کچھ دیر کے لیے وہ چھت پر گیا ہے۔ اگر آپ چاہتا ہے تو ام اس کو بلا لیتا ہے۔"

"نہیں۔ اس سے پھر بات کروں گا۔ تم اپنے چوکیدار اور گارڈز میں اضافہ کرو۔ یہ بہت ضروری ہے۔" زریں کو کچھ مزید ہدایات دے کر اور کلثوم سے ایک دو باتیں کر کے میں نے فون بند کر دیا۔

سائیں عالی میرے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا تھا اور فون پر ہونے والی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔ غزالہ کی مسلسل گمشدگی غالباً سائیں کو بھی ٹھیس پہنچاتی تھی۔ بہرحال سائیں کے چہرے سے کسی بھی بات کا اندازہ لگانا بے حد دشوار تھا۔

میں نے سائیں سے کہا "سائیں! تم اِدھر اُدھر کی ہزاروں باتیں کرتے ہو لیکن سروج کے بارے میں کوئی ٹھوس بات ابھی تک تم نے نہیں بتائی۔ اب تو مجھے فکر ناحق ہونے لگی ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ہو ہی نہ گیا ہو۔"

"نہیں اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ ہاں اس نے بہت کچھ کیا ہے دوسروں کے ساتھ پھر کسی وقت تمہیں بتاؤں گا۔ اس وقت جنوں کے ایک کونسلر سے میری ملاقات ہے۔"

"سروج اب ہے کہاں؟"

"میں اسے راجدھانی میں چھوڑ کر آیا تھا لیکن وہ ٹھیک طرح سے انتظام نہیں سنبھال سکی۔ اسی وجہ سے تو میرے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ اب جا کر اچھی طرح اس کی خبر لوں گا۔"

مجھے پتا تھا کہ میں نے مزید سوال کیا تو سائیں بے پر کی اڑانا شروع کر دے گا' لہٰذا خاموش ہو گیا۔ بہرحال اتنا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا کہ سروج موریطانیہ میں ہے۔

ڈاکٹر روی داس سے ملنے کے بعد میں شام کو پٹنہ واپس آ جانا چاہتا تھا مگر نہایت تیز بارش شروع ہو گئی۔ یہ سری لنکا کی جانی پہچانی بارش تھی۔ آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ ڈاکٹر روی نے مجھے روک لیا۔ وہ بڑی اچھی گفتگو کرنے والا شخص تھا۔ اچھا سگریٹ' اچھی چائے اور بارش ڈاکٹر روی کی کمزوریاں تھیں۔

میں رات وہیں ٹھہر گیا۔ اگلے روز اتوار تھا۔ ڈاکٹر روی کے ساتھ برنچ کرنے کے بعد میں بذریعہ ٹیکسی کار واپس پٹنہ پہنچ گیا۔ رات کی بارش کے بعد موسم خوشگوار تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پٹنہ کے گنجان علاقے میں رونق تھی۔ حالانکہ چھٹی کی وجہ سے بازار بند تھے پھر بھی لوگ آ جا رہے تھے۔ ابھی میں اپنی حویلی نما رہائش گاہ سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور تھا' ایک کشادہ گلی میں سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک گیا۔ ایک جنازہ جا رہا تھا۔ بیس تیس افراد ہوں گے۔ میت کسی بچے کی لگتی تھی۔ ایسی میت عموماً ہاتھوں میں اٹھائی جاتی ہے لیکن یہ میت چارپائی پر رکھی تھی۔ جنازے میں زیادہ تر بھکاری ہی دکھائی دیتے تھے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک جانے پہچانے بھکاری لالے پر پڑی۔ وہی لالے جو شیخ عاصم کی ہتھ ریڑھی کھینچتا تھا۔ میں نے لالے کے پاس پہنچ کر پوچھا "کس کا جنازہ ہے؟"

لالے نے بیٹھی ہوئی سی آواز میں کہا "وہ مر گیا صاحب جی۔ کل رات وہ مر گیا۔"

میرا جسم سنسنا کر رہ گیا۔ لالے مجھے شیخ عاصم کی موت کی خبر سنا رہا تھا۔ چارپائی پر موجود مختصر سی نعش امارات کے "عیاش ترین امیرزادے" کی تھی۔ یہ شیخ عاصم بن ارشد کی لاش تھی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی۔ جو مر گیا سو مر گیا۔ اب کیا پوچھتے ہیں۔"

"بھئی کوئی بہانا تو بنتا ہے ناں؟" میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں ہلچل تھی۔

ایک دوسرے شخص نے میرے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا "صبح سویرے لاش سڑک پر سے ملی ہے۔ اب پتا نہیں کہ خود گرا ہے یا کسی نے گرایا ہے۔ ویسے بھی یہ کوئی زندگی تو نہیں تھی ناں۔ زندوں میں نہ مردوں میں۔ اچھا ہوا دکھوں سے نجات پا گیا۔ پتہ نہیں کتنے عرصے سے بھگت رہا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ یہ خودکشی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس مغموم صورت والے شخص نے "رازدارانہ

انداز میں مسکرا کر اثبات میں جواب دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے کچھ دن پہلے دیکھا ہوا منظر گھوم گیا۔ بانھا کے اڈے پر میں نے شیخ عاصم کو کچھوے کی رفتار سے بالکونی کی طرف رینگتے دیکھا تھا۔ میں اسے پکڑ نہ لیتا تو وہ جنگلے کے ٹوٹے ہوئے حصے سے خود کو نیچے گرا لیتا۔ کل رات بھی وہ اسی بالکونی سے نیچے گرا تھا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ شیخ عاصم نے اپنی جان خود لی تھی۔ وہ سراپا ہنگامہ آج بڑی خاموشی سے مر گیا تھا۔

میں لوگوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ جنازہ پڑھا جا چکا تھا' اب لوگ اس سوا تین فٹ کے لاشے کو قریبی قبرستان میں دفنانے جا رہے تھے۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں یہ ساری کارروائی مکمل ہو گئی۔ قبرستان میں ایک اور قبر نمودار ہو گئی۔ شیخ عاصم اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

لالے دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک اچھے "کاریگر" سے محروم ہوا تھا۔ اس کی آمدنی میں کمی یقینی بات تھی۔ میں نے اس کا شانہ سہلایا۔ وہ بولا "بانھا صاحب صبح سے آپ کو پھون (فون) کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ آپ کو اس حادثے کی کھبر دینا چاہتے تھے لیکن آپ سے بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔"

"میں کہیں کام سے گیا ہوا تھا۔"

لالے اپنے مخصوص انداز میں بولا "بس جی جو بھگوان کو منجور تھا۔ شاید اچھا ہی ہوا ہے کہ مصیبتوں کی جندگی سے اس کے پران چھوٹ گئے۔"

"بیمار تو نہیں تھا؟"

"نہیں جی۔ اب تو پہلے سے کافی اچھا تھا لیکن بڑا بے چین سا نجر آتا تھا۔ ہر سمے منہ سے تو اجیب نکالتا رہتا تھا۔"

کچھ دیر میں لالے سے اس بارے میں بات کرتا رہا۔ دو چار اور بھکاری بھی ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان کی گفتگو سے بھی پتا چلتا تھا کہ شیخ عاصم نے خودکشی کی ہے۔ بھکاری کھل کر تو بات نہیں کر رہے تھے تاہم ڈھکے چھپے انداز میں ان کی رائے یہی تھی کہ "کاریگر" خود بالکونی سے نیچے لڑھکا ہے۔

میں وہاں سے بانھا سادھو کے ڈیرے پر پہنچا۔ وہ بھنگ کا پیالہ پی کر اپنے "دفتر" کی چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنی چادر کے پلو سے کرسی صاف کر کے اس نے مجھ سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ بانھا کے چہرے پر بھی غم کی پرچھائیں موجود تھی۔ کہنے لگا "اپن صبح سویرے سے کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح آپ سے رابطہ ہو جائے لیکن کچھ نہیں کیوں بات نہیں بن سکا۔ اپن کو اس دو گھنٹا؟ اتنا افسوس ہوا ہے کہ اپن بتا نہیں سکتا۔"

"میں نے تم سے کہا بھی تھا بانھے کہ اب اس بندے کا خاص خیال رکھنا۔"

"اپن بھگوان کا سوگند کھاتا ہے جمالی صاحب! اپن نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی پھر بھی پتا نہیں یہ کیسے ہو گیا۔"

میں جانتا تھا کہ بانھا اپنی صفائی پیش کرنے کی کمزور کوشش کر رہا ہے۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جنگلہ بھی مرمت نہیں کروایا تھا جہاں سے عاصم نے ایک بار پہلے بھی سڑک پر لڑھکنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا۔ آج نہ ہوتا تو کل ہو جاتا۔ شیخ عاصم کی "زندگی" ایسی نہیں تھی کہ اس میں زیادہ دیر جینے کی خواہش باقی رہتی۔ اگر شیخ کے وارث اسے کسی طرح ڈھونڈ بھی لیتے تو بھی شیخ کی زندگی میں کوئی خاص بہتری رونما ہونے والی نہیں تھی۔ اس کا جسمانی نظام بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ بازوؤں اور ٹانگوں سے محرومی کوئی قابل تلافی محرومی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ شیخ عاصم کی ریڑھ کی ہڈی پر بھی شدید ضربات آچکی تھیں۔ یہ ضربات اس وقت آئی تھیں جب میں نے سرسوب کو گولی مارنے کے بعد چھت پر سے شیخ پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ میرے نیچے پختہ سڑک سے ٹکرایا تھا اور عقب سے بری طرح زخمی ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی متاثر ہونے کے سبب اس کے اعصاب نے بھی ٹھیک سے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

بانھا نے کہا "وہ کئی روز سے بہت پریشان لگتا تھا۔ نیند میں چیخنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ وہ غصے میں آ کر لالے کے منہ پر تھوکنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ اپن آپ کو ایک شے دکھاتا ہے۔" بانھا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے لکڑی کی الماری کھولی اور اس میں سے ایک گتا نکال لیا۔ یہ دیکھنے میں پلے کارڈ کی طرح لگتا تھا۔ میں نے بھکاریوں والی گلی میں ایک دو بھکاریوں کو دیکھا تھا' وہ صدا لگانے کے بجائے اپنے سامنے اس طرح کے "پلے کارڈ" رکھ لیتے تھے۔ ان پلے کارڈز پر بھکاری نے اپنی معذوریاں اور مجبوریاں لکھ رکھی ہوتی تھیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی پلے کارڈ تھا لیکن اس پر کچھ لکھا نہیں گیا تھا بلکہ سیاہ روشنائی سے آڑا ترچھا ڈیزائن سا بنا ہوا تھا۔ جیسے کسی بچے نے روشنائی میں انگوٹھا ڈبو کر پلے کارڈ پر گھما دیا ہو۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے بانھا سے پوچھا۔

وہ بولا "یہ تو اپن کو بھی معلوم نہیں۔ یہ پرسوں رات کی بات ہے۔ یہ پلے کارڈ اور روشنائی کی بوتل لالے کے کاریگر (عاصم) کے پاس پڑے تھے۔ وہ اپنے آپ کو لڑھکاتا ہوا بوتل کے پاس پہنچا اور اپنا سر مار کر اسے گرا دیا پھر وہ کوشش کر کے ٹیڑھا ہو گیا۔ اس نے کوشش کر کے اپنی ناک فرش پر پھیلی سیاہی میں ڈبوئی اور اسے کارڈ پر رگڑنے لگا۔ پہلے تو پتا نہیں ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے پھر پتا چلا کہ شاید وہ کچھ لکھنا چاہ رہا ہے۔ وہ کافی دیر تک جتن کرتا رہا۔ اسے پسینہ آگیا اور گلے سے عجیب آواج نکلتی رہی لیکن وہ کچھ لکھ پایا نہ ہی کچھ بتا پایا۔"

میں نے پلے کارڈ غور سے دیکھا۔ بس آڑی ترچھی لکیریں تھیں۔ عاصم نے ناک ڈبو ڈبو کر لکھنا چاہا تھا مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ کچھ لکیریں انگریزی کے لفظ I سے مشابہ تھیں۔ کچھ لکیروں پر M کا گمان ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ (I AM) لکھنے کی کوشش کی گئی۔ شاید عاصم ASIM I AM SHAIKH یا اس قسم کا کوئی اور فقرہ لکھنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اگر کچھ اور جدوجہد کرتا یا اسے پریکٹس کے لیے مزید وقت ملتا تو وہ کچھ لکھنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن یہ بھی امکان تھا کہ کوشش کے باوجود وہ بس ایسی ہی ناقابل فہم لکیریں کھینچتا رہتا۔ لکیریں جن میں طیش تھا' جھنجلاہٹ تھی' نفرت کی آگ تھی اور بے بسی تھی۔

میں نے پلے کارڈ کو تین چار بار تہہ کر کے کتاب کی طرح اپنے پاس رکھ لیا۔ بانھا بولا "ابھی کچھ دیر پہلے علاقے کا ایس ایچ او اپن کے پاس آیا تھا۔ بولتا تھا کہ اپن کوئی ایف آئی آر درج کرانا چاہتا ہے یا نہیں۔ اپن نے کہا' یہ ایک حادثہ ہے' اس کا ایف آئی آر کیا درج ہوگا۔ باقی اگر آپ کی مرجی ہے تو اپن ایس ایچ او کو پھر بلا لیتا ہے۔"

"نہیں اس پھڈے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

میں اس ٹوٹے جنگلے کو دیکھتا رہا جس میں سے گزر کر شیخ عاصم کل رات اپنے دردناک انجام کو پہنچا تھا۔ اپنی تمام تر سفاکیوں' وحشتوں اور کدورتوں کے ساتھ اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے پچھواڑے پٹیہ کے قبرستان میں اس کی قبر موجود تھی۔ میں نے سوچا... کاش میرے سامنے غزالہ ہوتی۔ میں اسے گلے سے لگاتا۔ اس کی پشت کو اپنے ہاتھ سے سہلاتا اور کہتا "غزالہ! تیرے کومل' ان چھوئے جسم میں اپنی وحشتوں کے کانٹے توڑنے والا آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں نے اس سے تیرا بدلہ لے لیا ہے۔ آج تو ہمیشہ کے لیے اس کے خوف سے آزاد ہے۔"

لیکن غزالہ میرے سامنے نہیں تھی۔ وہ میرے آس پاس بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کہاں تھی۔ تھی بھی یا نہیں۔ میری آنکھیں نمی کے سبب دھندلا گئیں۔ میں بانھا کے پاس سے اٹھا اور سیڑھیاں اترنے کے بعد بوجھل قدموں سے اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دیا۔ ایک ایسی تیز شراب کی طلب محسوس ہو رہی تھی جو میرے حلق کو چیرتی ہوئی میرے سینے تک پہنچ جائے اور میرے اردگرد کے ہر دکھ کو ایک گہری دھند میں چھپا لے۔ میں چلتا رہا اور چلتے چلتے رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی' آج غزالہ کی دوری ہمیشہ سے زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ اس کی باتیں' اس کی مسکراہٹیں' اس کی حیا آمیز خاموشی سبھی کچھ یاد آ رہا تھا اور وہ آخری لمحے بھی یاد آ رہے تھے جب میں آخری بار اس سے ملا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اب وہ کھو جائے گی۔ مجھ سے بہت دور نکل جائے گی' تو میں ان لمحوں کو روک لیتا۔ اس وقت کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتا۔ غزالہ کو اپنے سینے میں یوں چھپاتا کہ وہ ہر نگاہ بد سے محفوظ ہو جاتی۔

لیلیٰ' ثوبیہ کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ باری اپنے کمرے میں موجود تھا اور کچھ پڑھ رہا تھا' وہ کچھ کچھ خاموش تھا۔ ثوبیہ کسی ملازمہ کے ساتھ جھگڑ رہی تھی۔ وہ انگریزی میں بلاجھجک گالیاں دیتی تھی۔ ان میں ایسی گالیاں بھی ہوتی تھیں جو ایک لڑکی کو ہرگز زیب نہیں دیتی تھیں۔ میں بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا دروازہ بند کر لیا اور وسکی کے کئی پیگ اوپر تلے چڑھا لیے۔ جلد ہی دماغ میں دھند سی بھر گئی۔ اس دھند میں کچھ بھولی بسری صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ میری پیاری بہن شفتا... انجم... مرحوم ساہی صاحب۔ حنیف اور پھر غزالہ... غزالہ کے ساتھ تابی۔ تابی کی معصوم باتیں۔ اس کی دلکش ہنسی غزالہ کی بانہوں میں وہ کچھ اور بھی پیارا لگنے لگتا تھا۔ کہاں تھے وہ سب؟ کیوں مجھ سے دور ہو گئے تھے۔ کیا وہ بھی میرے متعلق اس انداز میں سوچ رہے تھے' کیا انہیں بھی میری کمی محسوس ہوتی تھی... میں اپنے اردگرد پھیلی ہوئی تاریک دھند میں بھاگنے لگا۔ غزالہ کو آوازیں دینے لگا۔

"کہاں ہو غزالو! کیا انسان اتنا سنگ دل بھی ہو سکتا ہے۔ کیا کسی کے اندر بے رحمی کی اتنی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں میرے تڑپنے کا احساس کیوں نہیں غزالو... میرے دکھوں کی آنچ تم تک کیوں نہیں پہنچی۔ کیا کوئی کسی

کے صبر کا اتنا طویل امتحان بھی لے سکتا ہے۔ کیا کوئی کسی کو اتنا لامتناہی انتظار بھی کرا سکتا ہے۔ میرے اتنا قریب آنے کے بعد اتنا دور جانے کا حوصلہ تم نے اپنے اندر کیسے پیدا کر لیا۔"

مجھے لگا جیسے غزالہ کہیں دور آم کے بلند پیڑوں کے نیچے کھڑی ہے۔ شاید جل کوٹ کا ہی کوئی منظر تھا۔ میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ غنودگی کے عالم میں میرے تصور نے دیکھا کہ غزالہ سراپا زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کے خوب صورت ہونٹوں نے حرکت کی "میں آپ کے دکھ کی شدت سے آگاہ ہوں شاہ جہاں۔ گزرے ہوئے سال جدائیوں کے پہاڑ تھے۔ یہ پہاڑ آپ ہی کو نہیں مجھے بھی روندتے ہوئے گزرے ہیں.... لیکن میں کیا کروں ایک کے بعد دوسری مجبوری ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ اس بار جو مجبوری میرے سامنے ہے وہ پہلی مجبوریوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس مجبوری کا نام ماں ہے۔ میری امی! وہ دل کی مریضہ ہیں۔ آپ کو حاصل کرتے ہوئے میں نے انہیں کھو دیا تو میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین بیٹی سمجھوں گی۔ میرے بس میں کچھ نہیں شاہ جہاں! بس آنسو ہیں جو بہاتی ہوں۔ اور موت کا انتظار ہے جو کرتی ہوں۔"

"جب تم اپنی موت کی بات کرتی ہو تو میری موت کی بات کرتی ہو۔ ٹھیک ہے اگر تم مجھے مارنا ہی چاہتی ہو تو میں تمہارے سامنے مروں گا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ شدید نشے کی حالت میں میں مزید نشہ اپنے اندر انڈیل رہا ہوں۔ یہ خالص شراب تھی لیکن اس کی کڑواہٹ جیسے میرے لیے بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ میں جیسے پانی پی رہا تھا۔ مختلف چہرے نگاہوں کے سامنے آ کر اوجھل ہو رہے تھے۔ مختلف مناظر تھے میں نے تصور میں شیخ عاصم کی قبر دیکھی۔ اس قبر کے سرہانے لیونا بال کھولے کھڑی تھی۔ حسینہ جیرس جو اب ایک مکروہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے حسین چہرے کا گوشت گل کر لٹک رہا تھا۔ وہ شیخ عاصم کی قبر پر دو ہتڑ برسا رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ "میرا چہرہ مجھے واپس دو۔ مجھے واپس دو" وہ شیخ کی قبر کی مٹی اڑانے لگی پھر چند معزز شکلوں والے افراد میری نگاہ تصور کے روبرو آئے۔ انہوں نے لیونا کو کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا لیکن ایسا انہوں نے قبر کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے نہیں کیا تھا۔ وہ سب مل کر شیخ عاصم کی قبر پر چلانے لگے اور اسے صلواتیں سنانے لگے۔ یہ شیخ کے قرض خواہ تھے۔ پچھلے چند ماہ میں شیخ خود تو ڈوبا ہی تھا اپنے ان کاروباری ساتھیوں کو بھی لے ڈوبا تھا۔ کچھ

دیر بعد ان لوگوں میں درجنوں مزید افراد شامل ہو گئے۔ یہ سب کے سب شیخ عاصم کے ڈسے ہوئے تھے۔ عزت و آبرو تھیں جن کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا گیا تھا۔ بھکاری نما لوگ تھے جنہیں عاصم نے محلات سے فٹ پاتھوں تک پہنچایا تھا۔ جوان بوڑھے اور کم سن لاشے تھے کسی کے ماتھے پر گولی تھی کسی کے سینے پر خون کا پھول کھلا ہوا تھا۔ شاید سائی صاحب بھی انہی لوگوں میں کہیں تھے۔ یہ سب لوگ چیخ رہے تھے "تم اتنی خاموشی سے کیوں مر گئے شیخ عاصم۔ تم اتنی خاموشی سے نہیں مر سکتے۔ تم اتنی آسانی سے نہیں جا سکتے۔" کچھ دیر تصورات کا کھیل جاری رہا پھر ذہن حقائق کی طرف لوٹنے لگا۔ اندرونی کمرے میں ہنگامہ ہنوز جاری تھا۔

قوسیہ کی چیخیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھی اور واویلا کر رہی تھی۔ دراصل پرسوں ہونے والے جھگڑے کے بعد اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب یقیناً اس کے ساتھ آزارانہ مار پیٹ نہیں کر سکتی۔ اگر کرے گی تو باری آڑے آئے گا اور ایک بار پھر جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

یہ لڑکی مصیبت بنتی جا رہی تھی۔ یہ گھر گنجان علاقے میں تھا۔ اس کی چیخ و پکار کو چار دیواری کے اندر تک محدود رکھنے کے لیے اندرونی دروازے بند رکھے جاتے تھے۔ اکثر جب ملازم بلند آواز میں ٹیپ ریکارڈر لگا دیتے تھے۔ مقصد یہی ہوتا تھا کہ گھر کی اندرونی تفصیل سے محلے دار آگاہ نہ ہوں لیکن رات کے وقت شور مچاتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کی آواز بھی بہت عجیب لگتی تھی۔

قوسیہ کی مسلسل چیخ و پکار سے میرا دماغ بھنا گیا۔ میرا دل چاہا کہ ساری احتیاط کو ایک طرف رکھ دوں اور مار مار کر اس خبیث کی ہڈیاں توڑ دوں۔ یہ چند روز کے لیے اس قابل ہی نہ رہے کہ ہنگامہ مچا سکے۔ میرے قدم کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔ میں نے خود کو سمجھایا "شاہ جہاں! تم نشے میں ہو تمہارا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ کچھ بھی ہے قوسیہ ایک کمزور عورت ہے۔ وہ تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اپنے طیش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک عورت پر ہاتھ اٹھانا تمہیں کسی طور بھی زیب نہیں دیتا۔ اگر ایسا کرو گے تو پھر تم میں اور شیخ عاصم میں اور ٹنکر شنکرا اور کنگ براؤن میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

میں دروازے کے عین سامنے رک گیا۔ قوسیہ نے اشتعال انگیز للکاروں سے اپنے کان محفوظ رکھنے کے لیے میں بغلی دروازہ کھول کر باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے شاور

کھولا اور کپڑوں سمیت شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ پانی کی پھواریں میرے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے لگیں۔ دل و دماغ میں لپکتے ہوئے شعلے بتدریج سرد ہونے لگے۔

اگلے روز میں دوپہر تک سوتا رہا۔ سر بھاری ہو رہا تھا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کل پیش آنے والے واقعات کو ذہن میں دہرانے لگا۔ عاصم کے جنازے کا منظر ایک بار پھر پوری جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ پاتھا نے اپنے ڈیرے پر مجھے جو عجیب و غریب لیے کارڈ رکھایا تھا وہ اب میرے سامنے سائیڈ بورڈ پر رکھا تھا۔ یہ شیخ عاصم کے برے انجام کی یادگار نشانی تھی اور میں اسے اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ کل شیخ عاصم مر گیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہی شیخ عاصم ابوظہبی میں مرا ہوتا تو ہر طرف تہلکہ مچ جاتا۔ اخباروں میں سرخیاں لگ جاتیں۔ پتا نہیں کہ کیا کچھ ہو جاتا۔

رات کو قوسیہ نے جو شدید ہنگامہ مچایا تھا وہ ایک بار پھر ذہن میں تازہ ہونے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اس ہنگامے کا شور باہر گلی تک بھی پہنچا ہو گا۔ اردگرد کے لوگ ہمیں شبے کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور یقینی بات تھی کہ دبی زبان میں ہمارے متعلق باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اب ہم یہ رہائش گاہ بدل لیں۔ شیخ عاصم کی تلاش کا کام اب کافی حد تک سرد پڑ گیا تھا۔ میری تلاش کی سرگرمی بھی اب ماند پڑتی محسوس ہوتی تھی۔ اب ہم کسی بہتر علاقے میں منتقل ہو سکتے تھے۔ نئی رہائش گاہ کا انتظام کرنا منیجر جے سنہا کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جے خود بھی کئی بار مجھ سے کہہ چکا تھا کہ ہمیں اپنا ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔ دو تین روز پیشتر اس نے کچھ مشکوک افراد کو گھر کے اردگرد منڈلاتے بھی دیکھا تھا۔

میں نے چند منٹ تک سوچ بچار کی اور پھر اس حتمی فیصلے پر پہنچ گیا کہ ہمیں ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔ میں نے جے کو آواز دی اور وہ چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

○☆○

یہ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ ہم گال روڈ کے علاقے میں نئی رہائش گاہ پر منتقل ہو چکے تھے۔ یہ بالکل مختلف جگہ تھی۔ ساحل کے ساتھ ساتھ وسیع کوٹھیوں کی ایک طویل قطار تھی۔ کوٹھیوں کے درمیان گھاس کے خالی قطعات تھے کوٹھیوں کے عقبی احاطے سمندر کے اس قدر نزدیک تھے کہ لہریں وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہماری رہائش گاہ بھی پانچ چھ کنال پر محیط تھی۔ ناریل، ناڑ اور پام کے درختوں سے

گھری ہوئی یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ ہر وقت خوشگوار ہوا چلتی رہتی تھی اور بلند قامت درخت جھوم جھوم کر ایک دوسرے کو چومتے تھے۔ عمارت میں درجنوں کمرے تھے۔ میں نے گراؤنڈ فلور پر چار پانچ اندرونی کمرے قوسیہ کے لیے مخصوص کر دیے تھے اور اسے کہا تھا کہ وہ گھومے پھرے اور جتنا چاہے شور مچائے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ان اندرونی کمروں کو باقی عمارت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ دروازے مقفل کر دیے گئے تھے۔ کھڑکیوں پر پہلے ہی آہنی گرلیں اور جالیاں وغیرہ موجود تھیں۔ اس کشادہ جگہ پر پہنچ کر قوسیہ کے اندر کا ابال بھی کچھ کم ہوا تھا۔

ایک دن شام کو ساحل پر جاگنگ کرنے کے بعد باری واپس آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے امارات میں اپنی والدہ سے رابطہ کیا ہے۔ وہ بہت اداس ہیں اور فوری طور پر پاکستان آ رہی ہیں۔"

"میری تو رائے ہے کہ تم انہیں روکنے کی کوشش کرو۔"

"نہیں شاہ جہاں صاحب! وہ نہیں رکیں گی۔ وہ میرے بغیر بہت بے چین ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔ انہوں نے تو اب تک سامان بھی باندھ لیا ہو گا۔"

"وہاں ٹھہریں گی وہ؟"

"یہاں کینڈی میں ہمارے ایک رشتے دار ہیں۔ اماں پہلے بھی دو تین دفعہ یہاں آ چکی ہیں۔ وہ انہی کے پاس ٹھہری ہیں۔"

"ظاہر ہے کہ تم ان سے ملنے بھی جاؤ گے۔ لیکن میں ایک بار پھر تمہیں احتیاط کا مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ کولمبو میں نقل و حرکت کرتے ہوئے ہم جیسی احتیاط کرتے ہیں دیگر شہروں میں بھی ایسی ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"اس بارے میں آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

غالباً وہ لبنا اور قوسیہ کے حوالے سے بھی کوئی بات کہنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران میں میرا فون آ گیا اور یوں یہ بات ٹل گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے باری کینڈی روانہ ہو گیا۔ کولمبو سے کینڈی کی مسافت تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ہے۔ یہ ایک پُر فضا پہاڑی مقام ہے۔ باری کی والدہ کل رات ہی یہاں پہنچ گئی تھیں۔ باری والدہ کے پاس جا رہا تھا۔ اسے چار پانچ روز وہیں رہنا تھا ممکن تھا کہ اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا۔ باری کا جانا اس لحاظ سے اچھا ہی تھا کہ اب قوسیہ کو

باری کی سپورٹ میسّر نہیں تھی۔ جب میں نے للیتا کو بلایا۔ میں نے کہا "تمہیں یاد ہے ناں کہ ریسٹ ہاؤس کی انیکسی میں قوسیہ بڑی حد تک سدھر گئی تھی۔ وہ باندرا کے ساتھ مل کر خانہ داری کے سارے امور انجام دینے لگی تھی لیکن پھر آگ لگنے والا واقعہ ہوا اور سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔"

للیتا نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "مجھے توقع ہے کہ باری اگلے ڈیڑھ دو ہفتے تک واپس نہیں آئے گا۔ اس دوران میں تم قوسیہ کے لیے وہی انیکسی والی للیتا بن جاؤ۔ اگر سختی کرنی پڑے تو وہ بھی کرو لیکن اسے سیدھا ہونا چاہیے۔ جب باری آئے تو دیکھے کہ قوسیہ گھر کا سارا کام کاج انجام دے رہی ہے۔"

للیتا نے کہا "مالک! آپ فکر ہی نہ کریں۔ جو دیر ہو رہی ہے' وہ صرف باری صاحب کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ ورنہ میں اس کو کب کا سدھائی ہوئی بکری جیسا کر دیتی۔"

"بس میں چاہتا ہوں کہ یہ کم از کم اتنی ٹھیک تو ہو جائے جتنی انیکسی میں تھی۔"

"یہ اس سے زیادہ ٹھیک ہو جائے گی۔ بس آٹھ دس دن مجھے مل جائیں تو یہ بھی بہت ہیں۔"

"لیکن ایک بات کا دھیان رہے۔ سختی بس ایک حد تک ہونی چاہیے۔ قوسیہ کو کوئی شدید چوٹ یا زخم وغیرہ نہیں لگنا چاہیے اور اگر مار پیٹ کے بغیر کام ہو جائے تو پھر بہت ہی اچھی بات ہے۔"

کہنے کو تو میں یہ بات کہہ رہا تھا' مگر دلی طور پر میں بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ قوسیہ کی سرکشیوں کا علاج صرف اور صرف سختی ہے۔

اسی رات جب کھانے کے موقع پر قوسیہ نے چیخنا چلّانا شروع کیا تو للیتا نے اسے ٹھیک ٹھاک مار لگا دی۔ دراصل قوسیہ کو معلوم نہیں تھا کہ باری کینیڈا جا چکا ہے اور اس کے جانے سے للیتا کو فری ہینڈ ملا ہوا ہے۔ یقیناً وہ للیتا کی "کارکردگی" دیکھ کر حیران ہوئی ہو گی پہلے تو اس نے خوب واویلا مچایا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ باری کسی دور کے کمرے میں ہے اور اس تک آواز نہیں پہنچ رہی لیکن جب کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور للیتا کی چھڑی اس پر برستی رہی تو وہ ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی۔

اگلے روز للیتا اور قوسیہ میں پھر تھوڑی سی تلخ کلامی ہوئی لیکن مار پیٹ تک نوبت نہیں آئی۔ تیسرے دن میں نے قوسیہ میں زبردست تبدیلی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ وہ بڑی حد تک مطیع نظر آ رہی تھی۔ میرے ذہن میں انیکسی کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہاں بھی آخری دنوں میں وہ ایسے ہی خاموشی سے للیتا کی ہدایت کے مطابق چلتی تھی اور کام میں جتی رہتی تھی۔

مجھے جے کی زبانی معلوم ہوا کہ قوسیہ کچن میں مصروف ہے اور کچھ پکا رہی ہے۔ میں نے کہا "یہ تو واقعی "کایا پلٹ" ہوئی ہے۔ امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے یہ دوبارہ کچن پر چلی جائے گی۔"

"دراصل ان کو پتا چل گیا ہے کہ باری صاحب بڑے عرصے کے لیے گھر سے باہر ہیں۔"

"تم نے بتایا تھا؟"

"جی سر۔ میں نے سوچا خواہ مخواہ مار پیٹ ہو گی۔ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے ہمیں بعد میں افسوس ہو۔" پھر جے تھوڑا سا مسکرایا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا بات ہے' کچھ کہنے لگے تھے تم؟"

وہ بولا "عورتوں پر بعض فوبیاز بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مس قوسیہ کے سدھرنے میں تھوڑا بہت ہاتھ ایک "فوبیا" کا بھی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"شاید آپ کو یاد ہو۔ جن دنوں ہم ریسٹ ہاؤس میں تھے ایک رات مس قوسیہ نے اتنی چیخیں ماری تھیں کہ مین گیٹ پر کھڑے گارڈ بھی چونک گئے تھے۔ تب مس قوسیہ کے ساتھ کوئی مار پیٹ بھی نہیں ہو رہی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ وہ باتھ روم میں چند لال بیگ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔"

"جی ہاں۔ یہی مس قوسیہ کا فوبیا ہے۔ لال بیگ کا لفظ ہی ان کو ڈرا دیتا ہے۔ جو باتھ روم یہاں مس قوسیہ کے زیرِ استعمال ہے اس میں کبھی کبھی لال بیگ آ جاتے ہیں۔ للیتا صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے باتھ روم کو چیک کرتی ہے۔ اگر کوئی کیڑا ہو تو اسے مار کر باہر پھینکتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں کہ اگر وہ یہ "خدمت" سرانجام نہ دے تو مس قوسیہ کا کیا حال ہو اور اگر وہ دو چار "کوک روچ" ادھر ادھر سے پکڑ کر مس قوسیہ کے کمرے میں ڈال دے تو مس قوسیہ کے خوف کا کیا عالم ہو جائے۔"

"یہ تو پھر بڑا "دوست فوبیا" ہے جو ہمارے کام میں اتنا معاون ثابت ہو رہا ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

اگلے چار پانچ روز خیریت سے ہی گزرے۔ پاشا سادھو

خوش تھا۔ اپنے بڑے حریف رتناکو کے ساتھ اس کی صلح ہو چکی تھی اور دونوں گروپ "امن وسکون" سے اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ رتناکو کی سرگرمیوں کی رپورٹ مجھے پاشا کے ذریعے ملتی رہتی تھی۔ رتناکو اور پاشا مل کر ہیں لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کو تو ہالینڈ بارسل کر چکے تھے' اب وہ دوسری کھیپ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ یہ کھیپ پہلے سے بڑی تھی اور یہ ساری کی ساری کولمبو سے ہی تیار ہونا تھی۔ رتناکو اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر بیروزگار افراد کو پھانس رہا تھا۔ رتناکو کا یہ دوست ریکروٹنگ ایجنٹ تھا۔ وہ بدنصیب افراد کو شکار بھی کر رہا تھا اور ان سے رقمیں بھی بٹور رہا تھا۔

پاشا کی ملاقات منوہرا دیوی سے دوبارہ نہیں ہوئی تھی۔ تاہم فون پر منوہرا اس سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ منوہرا کے بارے میں کئی غیر معمولی باتیں مجھے پاشا کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں۔ وہ بڑی دبنگ عورت تھی اور حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ میرے ذہن میں اسے دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

میکی اور رانو اب پاشا کے پاس تھے۔ ان کی رہائش فی الحال پاشا کے ڈیرے پر ہی تھی۔ میکی کا کردار بڑا وکھری ٹائپ کا تھا۔ اس کے چہرے سے کمینگی جھلکتی تھی لیکن وہ بڑا ہاندار بھکاری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عورتوں کا رسیا بھی تھا۔ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ پُرہجوم بازار میں سڑک پر گھسٹ گھسٹ کر چلتے ہوئے میکی عورتوں کے لباس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتا تھا اور خوب صورت عورتوں کے پاؤں کو والہانہ بوسے بھی دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسی خباثت ٹپکتی تھی جو تاؤ تو دلاتی ہی تھی' کسی وقت مسکرانے پر بھی مجبور کر دیتی تھی۔ آج کل یہ خبیث جونک بن کر رانو جیسی بااخلاق لڑکی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ دونوں اپنے اپنے مفاد کے لیے ایک دوسرے سے محبت جتا رہے تھے۔

قوسیہ کی حوالے سے میں آج کل کافی مطمئن تھا۔ اس کی چیخ و پکار اب ایک "رضامند خاموشی" میں بدل چکی تھی۔ وہ اپنا کھانا خود پکاتی تھی۔ ایک دن میں نے اسے واشنگ مشین میں کپڑے ڈالتے بھی دیکھا۔ پھر ایک روز میں نے یہ نظارہ بھی کیا کہ للیتا ہاتھ میں بانس کی چھڑی لیے قوسیہ کے سر پر کھڑی تھی اور وہ بستر کی چادریں وغیرہ درست کر رہی تھی۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات ہے للیتا میرے پاس آئی۔ اس کا سانولا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ بولی "مالک! وہ پھر اڑی کر رہی ہے۔"

"کس بات پر اڑ رہی ہے؟"

"آپ نے کہا تھا کہ گھر کا سارا کام کاج اسے اپنے ہاتھ سے کرنا ہو گا لیکن وہ اپنے ہی جھوٹے برتن مانجھنے سے انکار کرتی ہے۔"

"چلو۔ آج کا دن اسے زبانی کلامی سمجھانے کی کوشش کرو۔ کل تک نہ مانے تو پھر سختی کرو۔ اس کے اندر کی تن فن ہر حال میں ختم ہونی چاہیے۔"

میری ہدایت کے مطابق للیتا نے ایک دن مزید انتظار کیا۔ اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب قوسیہ کی چیخوں کی آواز آئی۔ وہ للیتا کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہی تھی۔ حسبِ معمول پہلے اس کی چیخوں میں ترخملی اور غصہ نمایاں تھا پھر کچھ دیر بعد غصہ ختم ہو گیا اور صرف درد و کرب رہ گیا قوسیہ کے لہجے میں عاجزی اور التجا کا رنگ شامل ہو گیا۔ للیتا کی دھمکی آمیز آواز بار بار ابھر رہی تھی اور در و دیوار میں گونج رہی تھی۔ وہ قوسیہ کو کچن میں گھسنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

میں نے جے کو بھیجا کہ وہ جا کر للیتا سے قوسیہ کی جان چھڑائے۔ جے گیا اور کچھ دیر بعد قوسیہ کی آواز آنا بند ہو گئی۔ جے نے آ کر مجھے بتایا کہ للیتا بہت بپھری ہوئی تھی وہ ایک ملازمہ کے ساتھ مل کر قوسیہ کو چھت سے الٹا لٹکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور جے راہداری سے گزر کر قوسیہ کے پورشن کی طرف گئے تو قوسیہ کچن میں تھی اور خاموشی سے برتن صاف کر رہی تھی۔

میرے اب تک کے تجربے کے مطابق قوسیہ میں ایک نہایت ذہین قسم کا بچپنا تھا۔ وہ بے تحاشا لاڈ پیار سے بگڑی ہوئی ایک مغرور امیرزادی تھی۔ محبت' نرمی' حسنِ سلوک' مفاہمت جیسے الفاظ شاید اس کی ڈکشنری میں ہی نہیں تھے۔ اس کے دماغ کو ٹھکانے پر لانے کے لیے دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ طاقت کا استعمال بھی لازم تھا۔

اسی روز رات کو غیر متوقع طور پر باری کا فون آ گیا۔ وہ کینیڈا سے بول رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے قوسیہ کا حال احوال ہی پوچھا۔ میں نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کھانا کھا کر آرام کر رہی ہے۔ باری نے کہا "میں کل دوپہر تک واپس آ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "والدہ صاحبہ چلی گئی ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی یہیں ہیں۔"

"تو پھر اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ کینیڈا اچھی جگہ ہے' دو چار دن مزید رہ لو۔"

"نہیں۔ والدہ کا ہی اصرار ہے۔ وہ ایک بار قوسیہ کو

دیکھنا چاہتی ہیں۔"

باری کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی والدہ ایک نیک دل اور ہمدرد خاتون ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کافی حساس بھی ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بہو کو اس ماحول میں دیکھیں۔ ابھی ان کی بہو "تربیت" کے مراحل میں تھی اور اس تربیت میں کبھی کبھی سخت مقام بھی آتے رہتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دو تین ماہ بعد ان کی بہو واقعی بہو بن جائے گی اور تب اسے دیکھ کر وہ خوش ہوں گی۔

میں نے باری کو سمجھانا چاہا کہ وہ ابھی والدہ کو یہاں نہ لائے تو اچھا ہے لیکن باری کا خیال تھا کہ والدہ کو مزید روکا گیا تو وہ بیمار پڑ جائیں گی۔ انہوں نے بہو سے دوری کو اپنا نفسیاتی مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ اگلے روز باری بمع والدہ کے کولمبو پہنچ گیا۔ میں نے ان دونوں کی آمد کو توسیہ سے چھپائے رکھا۔ باری کو بھی ایک طرف لے جا کر میں نے سمجھا دیا کہ فی الحال توسیہ کو اس کی آمد کا پتا نہیں لگنا چاہیے اور نہ ہی اس کی والدہ کو۔

"لیکن جناب! ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟"

"بات یہ ہوئی ہے کہ تمہارے جانے کے بعد توسیہ میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ سب کچھ پھر ضائع ہو جائے۔"

باری نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ہم نے توسیہ کو مار پیٹ کر اس میں یہ تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ میں نے کہا "باری! تم یہ بات ذہن سے بالکل نکال دو کہ میں توسیہ کا دشمن ہوں۔ شاید میں تم سے بڑھ کر اس کی بھلائی چاہتا ہوں۔ بس ہمارے طریقۂ کار میں فرق ہے۔ تم مجھے بس کر پانچ چھ ہفتے دے دو۔ میں تمہیں ایک ایسی توسیہ لوٹاؤں گا جسے دیکھ کر تم اور تمہاری والدہ واقعی خوش ہوں گے۔ اور سب سے بڑھ کر توسیہ کی والدہ خوش ہوں گی۔"

باری خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ آخر میں بولا "لیکن والدہ تو یہاں آئی ہی توسیہ کو دیکھنے کے لیے ہیں۔"

"تو وہ دیکھ لیں۔ ہم انہیں دکھا دیتے ہیں لیکن وہ ابھی اس سے ملیں نہیں۔ بس دور سے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔"

تھوڑی سی دشواری ضرور ہوئی لیکن میں نے باری کو ساری بات سمجھا دی۔ آخر میں وہ نیم رضامند نظر آنے لگا۔

شام کو میری ہدایت کے مطابق باری نے اپنی والدہ کو توسیہ کے درشن کرا دیے۔ ایک کھڑکی میں سے انہوں نے توسیہ کو اپنے پورشن کے اندر چلتے پھرتے دیکھا اور دور سے اس کی بلائیں وغیرہ لے لیں۔ باری کی والدہ کا نام ریاض تھا۔ وہ شکل و صورت اور حلیے سے ایک خاص خاتون نظر آتی تھیں۔ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ ہلکی پھلکی انگلش بھی بول لیتی تھیں۔ وہ فطری طور پر نیک دل خاتون تھیں۔ بہو جیسی بھی تھی وہ انہیں پیاری تھی کیونکہ وہ ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ یہی وہ بہو تھی جس نے ساس کو بیماری کی حالت میں گھر سے نکالا۔ بیٹے پر اصرار کیا اور اس طرح کے اور کئی دکھ دیے تھے لیکن امِ ریاض سب کچھ بھول چکی تھیں۔ وہ تو اس بات پر بھی رضامند تھیں کہ اگر بیٹا اور بہو خوش رہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے ان سے دور چلی جائیں گی۔

یہ دوسرے دن کی بات ہے امِ ریاض ٹی وی لاؤنج میں میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔ دیوار گیر شیشے میں سے ساحل نظر آ رہا تھا۔ سمندر کا نیلگوں پانی درختوں کے پس منظر میں بلوریں دکھائی دیتا تھا۔ امِ ریاض نے اداس لہجے میں "مجھے بڑا چاؤ تھا بیٹے کا اور بہو کا۔ میری آنکھوں کا بڑا خواب تھا کہ میں اپنی بہو کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں تک باتیں کروں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جائے اور میرے لیے سوٹ پسند کرے۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ مجھے بہو نہیں بیٹی چاہیے تھی۔ لیکن مجھے تو بہو بھی نہ ملی۔" امِ ریاض کی عمر رسیدہ آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔

میں نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میرا وعدہ ہے جی! آپ کی خواہشیں ضرور پوری ہوں گی۔ بلکہ آپ کی خواہش تو میں اور باری ابھی پوری کر دیتے ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "آج توسیہ آپ کو اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلائے گی۔"

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہ کرنا۔"

"آپ تو گھبرا گئی ہیں۔ توسیہ اتنا برا بھی نہیں پکاتی۔"

"مم۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ تم اس پر کوئی سختی نہ کرنا۔"

"نہیں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ بس یہ بتائیں کہ کیا کھائیں گی۔"

انہوں نے کچھ نہیں بتایا، بس سوچتی رہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ دال اور قیمہ ان کی پسندیدہ ڈش ہے۔ میں نے کہا "اچھا آپ نہ بتائیں۔ میں خود ہی آپ کے لیے کچھ تیار کرواتا ہوں۔"

تقریباً آدھ گھنٹے بعد توسیہ کچن میں موجود تھی اور اپنی ساس ماں کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ امِ ریاض نے اسے کھڑکی میں سے دیکھا۔ وہ قیمہ دھو رہی تھی۔ اس نے اپنی آستینیں اڑس رکھی تھیں۔ ہوا سے کٹ بالوں کی چند لٹیں اس کی پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ کام کرتے ہوئے وہ گاہے گاہے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے ان لٹوں کو پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ امِ ریاض بڑی محبت بھری نظروں سے بہو کو دیکھتی رہیں پھر ان کی نگاہ لمبی تڑنگی سیاہ فام لیتا پر پڑی جو توسیہ کے آس پاس ہی ٹہل رہی تھی۔

امِ ریاض نے مجھ سے پوچھا "یہ لمبی عورت کون ہے؟"

میں نے دل میں سوچا کہ یہ توسیہ کی ڈاکٹر ہے لیکن یہ بات میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا "یہ توسیہ کو گھر کا کام کاج سکھاتی ہے اور اس کا ہاتھ بھی بٹاتی ہے۔"

پتا نہیں کہ میرے جواب سے امِ ریاض کی تسلی ہوئی یا نہیں لیکن انہوں نے مزید کچھ نہیں کہا۔

جب کھانا پکنا شروع ہو گیا تو لیتا کھانے کی دیکھ بھال کرنے لگی جبکہ توسیہ دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے پریس کرنے لگی۔ میں نے امِ ریاض کو یہ منظر بھی دکھایا۔ توسیہ کے ہاتھ میں استری دیکھ کر امِ ریاض کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ ان کی بہو ان کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ شاید چند دن پہلے تک وہ کسی ایسے منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

میں نے کہا "آپ کو یہ منظر اچھا لگا؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن پھر فوراً ہی ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ بولیں "بیٹا! مجھے باری سے پتا چلا تھا کہ یہاں چند مرتبہ توسیہ سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔"

"یہ کافی پرانی بات ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولیں "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو باری اور توسیہ کی بہتری کے لیے کر رہے ہو۔ لیکن بیٹا! یہ کام سختی سے نہیں پیار اور نرمی سے ہونا چاہیے۔ تبدیلی وہی اچھی ہے جو پیار اور نرمی سے آئے۔"

میں محترمہ خاتون کو کیسے بتاتا کہ "پیار اور نرمی" کا فارمولا ہر انسان پر یکساں لاگو نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کتے کی دم کی طرح ہوتے ہیں۔ سو سال بھی نلکی میں بند رہنے کے بعد ٹیڑھے ہی رہتے ہیں۔

دوپہر کا کھانا ہمارے سامنے آیا تو اس میں توسیہ کے ہاتھ کا پکا ہوا دال قیمہ بھی شامل تھا۔ امِ ریاض کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بار بار اپنے حجاب کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی رہیں۔ وہ توسیہ سے ملنا چاہتی تھیں، اس سے باتیں کرنا چاہتی تھیں لیکن باری نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ یہ ابھی ممکن نہیں ہے۔

دو روز مزید وہاں رک کر امِ ریاض واپس امارات روانہ ہو گئیں۔ جس وقت باری انہیں ائیرپورٹ چھوڑنے گیا ہوا تھا، لیتا میرے پاس آئی۔ وہ بولی "مالک! مجھے شک ہے کہ چھوٹے مالک (باری) نے توسیہ سے ملاقات کی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے سختی سے منع کیا تھا۔"

وہ بولی "کل رات ایک بجے کے قریب چھوٹے مالک نے مجھ سے کہا کہ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ باقی ملازم سو رہے ہیں اس لیے تم مجھے چائے بنا دو۔ چائے بنانے کے دوران میں جب توسیہ کی طرف آئی تو میں نے چھوٹے مالک اور ان کی والدہ صاحبہ کو راہداری کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ توسیہ بھی تب جالی دار دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ مجھے یہی لگا کہ چائے کا صرف بہانا تھا۔ بس چھوٹے مالک اپنی والدہ کو توسیہ سے ملانا چاہتے تھے۔"

مجھے لیتا کی بات میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ آج امِ ریاض واپس امارات چلی گئی تھیں۔ شاید جانے سے پہلے انہوں نے باری سے اصرار کیا تھا اور وہ انہیں توسیہ کے پاس لے گیا تھا۔ اگر باری نے ایسا کیا تھا تو یقیناً سخت غلطی کی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ باری ائیرپورٹ سے واپس آئے تو اس سے بازپرس کروں لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اس بارے میں باری کو خود ہی سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

رات کو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ باری کی یہاں موجودگی سے شہ پا کر توسیہ نے تنازع کھڑا کر دیا۔ وہ رات کو کچن سنبھال کر سوتی تھی لیکن آج اس نے انکار کر دیا۔ لیتا ذرا سختی سے بولی تو توسیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیے اور پھر اسے باقاعدہ تھپڑ جڑ دیا۔ لیتا میرے پاس آئی اور اس نے ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کے گال پر تھپڑوں کے نشان تھے اور ایک آنکھ سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ ویسے بھی توسیہ کو سبق سکھانا ضروری تھا۔ میں نے لیتا کو اجازت دے دی کہ وہ توسیہ کو تھوڑی سی مار لگائے۔

توسیہ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد توسیہ کے پورشن کی طرف سے چیخ و پکار اور مار دھاڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ حسبِ معمول توسیہ نے پہلے لیتا کی

مزاحمت کرنا چاہتی لیکن پھر اس سے پٹنے لگی۔ اس کی چیخوں میں غضب اور کرب یکجا تھے۔ اپنی توقع کے عین مطابق تھوڑی ہی دیر بعد میں نے باری کو کمرے سے نکلتے اور قوسیہ والے پورشن کی طرف بڑھتے دیکھا۔

میں نے اسے راستے میں روک لیا "نہیں باری! تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اس کی تکلیف تم سے زیادہ ہے لیکن زیادہ خرابی سے بچنے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔"

باری سر جھکا کر رہ گیا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے کہا "چلو جاؤ اپنے کمرے میں۔ میں للیتا کو روکتا ہوں۔"

وہ سرخ چہرے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں قوسیہ والے پورشن کے سامنے پہنچا۔ قوسیہ پہلو کے بل قالین پر گری ہوئی تھی۔ وہ دہری ہو کر گٹھڑی سی بن گئی تھی۔ اس نے اپنا سر اور چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا اور کرخت آواز میں چیخ رہی تھی۔ للیتا اس کی پشت اور ٹانگوں پر بانس کی چھڑی سے ضربیں لگا رہی تھی۔ لمبی تڑنگی نہایت مضبوط للیتا کے سامنے قوسیہ بچہ گٹھڑی سی نظر آئی تھی۔

"رک جاؤ للیتا۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔

للیتا ایک طرف ہٹ گئی اور بولی "اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے مالک اور کچن کا کام بھی نہیں کر رہی۔"

"چلو آج کام تم خود کر لو۔ یہ کل کرے گی۔"

للیتا کچن کی طرف چل گئی۔ قوسیہ اسی پوزیشن میں رہی اور چیختی رہی۔ جیسے اس پر ابھی تک تشدد ہو رہا ہو۔ وہ اپنی آواز باری کے کانوں تک پہنچانا چاہ رہی تھی۔

وہ اپنی کوشش میں ناکام رہی اور چار پانچ منٹ بعد خاموش ہو گئی۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ ڈھائی تین بجے کا عمل تھا۔ اچانک کسی نے میرے بیڈ روم کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا' سامنے ٹیوب لائٹ میں للیتا نظر آئی لیکن ایسی حالت میں کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا اور لہو میں سے صرف آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں الٹ گئیں اور وہ چکرا کر گری۔ فرش پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے بازوؤں پر سہارا لیا اور آرام سے نیچے لٹا دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے سر پر گہرا زخم تھا۔ یہ زخم کسی کند آلے کا تھا۔ میں نے دو ایک بار جھنجوڑ کر للیتا کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

"جے۔ سنگھاشی۔ عبدل۔ کہاں ہو تم لوگ!" میں نے چیخ کر کہا۔

پھر للیتا کا سر فرش پر رکھ کر میں قوسیہ والے پورشن کی طرف بڑھا۔ میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ پورشن کا ایک دروازہ کھلا تھا اور قوسیہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی دوران میں جے بھی سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آ گیا۔ لہولہان اور بے ہوش للیتا کو دیکھ کر اس کے بھی اوسان خطا ہو گئے۔

"کیا ہوا ہے سر؟"

"قوسیہ دروازہ کھول کر نکل گئی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ باری بھی یہاں نہیں ہے۔"

جے نے قمیص کے نیچے سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ میں نے جے سے کہا "قوسیہ کو میں دیکھتا ہوں۔ تم للیتا کو فوراً اسپتال پہنچاؤ۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں۔"

تکیے کے نیچے سے اپنا ہولسٹر لیتا ہوا میں پورچ کی طرف دوڑا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے باری کے کمرے میں جھانکا۔ زیرو بلب کی روشنی میں کمرا خالی نظر آ رہا تھا۔ عمارت کی انٹرنس پر مجھے ایک گارڈ نظر آیا۔ اس کے سر یا گردن پر وزنی شے مار کر اسے نیم بے ہوش کیا گیا تھا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے۔

سفید ٹویوٹا کار کمپاؤنڈ میں موجود نہیں تھی۔ اس کار کی غیر موجودگی کا یقینی مطلب یہی تھا کہ باری قوسیہ کو لے کر کوٹھی سے نکل گیا ہے پھر بھی میں نے احتیاطاً کوٹھی کے ملازمین سے کہا کہ وہ عمارت کے اندر قوسیہ اور باری کو تلاش کریں۔ خود میں سنگھاشی کے ساتھ لینڈ روور جیپ میں بیٹھا۔ چند سیکنڈ بعد جیپ فراٹے بھرتی ہوئی کوٹھی کے مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ مین گیٹ سے نکلتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ مسلح پٹھان گیٹ کیپر بھی اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ رہا یا تو باری وغیرہ کے ساتھ ملا ہوا تھا یا پھر باری اسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ مجھے گیٹ کے ارد گرد کہیں بھی گیٹ کیپر کی موجودگی نظر نہیں آئی۔

میں نے سب سے پہلے ایئرپورٹ کی طرف رخ کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں قوسیہ کولمبو سے ہی فرار نہ ہو جائے۔ ایئرپورٹ کے راستے میں ہی میرا واکی ٹاکی پر جے سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ للیتا کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے' وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

میں نے جے سے کہا "تمہارے جتنے کارندے ہیں

انہیں مختلف اطراف میں پھیلا دو۔ خاص طور سے بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ کی طرف۔ قوسیہ اور باری کو کولمبو سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

"میں اپنی پوری کوشش کرتا ہوں سر۔" جے کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

جے کے بعد میں نے پاشا سے واکی ٹاکی پر رابطہ کیا۔ پاشا بھی ابھی بیدار ہوا تھا اس کی آواز بہت بوجھل ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ قوسیہ اور باری کی تلاش میں ہماری مدد کرے۔

پاشا ایک دم الرٹ نظر آنے لگا۔ اس نے کہا "تم بے فکر رہو شاہ جہاں۔ ابھی آدھ گھنٹے میں ہمارے بندے پورے شہر میں پھیل جاتے ہیں۔"

میں نے پاشا کو قوسیہ اور باری کا مکمل حلیہ بتایا اور گاڑی کی ساخت اور نمبر وغیرہ سے بھی آگاہ کیا۔

صبح تک مفرور جوڑے کی تلاش جاری رہی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے باری پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ سمجھ دار بندے سے بھی زندگی میں چند سنگین غلطیاں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک سنگین ترین غلطی تھی۔ قوسیہ اور باری کا اتنا تعلق تھا۔ باری نے قوسیہ سے محبت کی تھی۔ اس سے شادی کی تھی' وہ اس کی بیوی تھی لیکن مجھے لگتا تھا کہ میں قوسیہ کے مزاج کو باری سے زیادہ جانتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ قوسیہ شیخ عاصم بن ارشد کی بہن تھی۔ اور عاصم کو جتنا میں نے بھگتا تھا' دنیا میں کسی اور نے نہیں بھگتا تھا۔ میں شیخ کی فطرت کی ہر ہر کجی سے آگاہ تھا اور انہی کجیوں کی جھلک شیخ کی بہن میں بھی موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ قوسیہ ہرگز باری سے مخلص نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں باری اس کے ہاتھوں جان ہی نہ گنوا بیٹھے۔

میں نے پاتھا کو بھی مطلوبہ گاڑی کے بارے میں تفصیلات بتا دی تھیں اور اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے کارندوں کو اس حوالے سے چوکس کر دے۔ دوپہر قریباً ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ' جے نے مجھ سے وائرلیس پر رابطہ کیا۔ اس نے کہا کہ میں پاتھا سے فون پر بات کروں۔ وہ مجھے کوئی اطلاع دینا چاہتا ہے۔

میں نے ایک پبلک فون بوتھ سے پاتھا کو زیرو پر رنگ کیا۔ پاتھا بولا "شاہ جہاں صاحب۔ اپن کے ایک کاریگر نے سفید کار کا کھوج لگا لیا ہے۔ سفید کار اس وقت کینڈی جانے والے روڈ پر اٹھارہویں میل سے ذرا آگے "درختوں" میں کھڑی ہے۔ اور وہ کھالی بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کار کے پاس ایک بندہ بھی موجود ہے۔ اپن کا اندازہ ہے کہ یہ وہی بندا ہے جو چھوکری کے ساتھ کار لے کر بھاگا تھا۔ وہ ایک گھنٹے پہلے تک بے ہوش پڑا ہوا تھا لیکن اب ہوش میں آ گیا ہے۔ اس کے سر اور گردن پر چار پانچ چوٹیں آیا ہے اور کافی کھون بھی نکل گیا ہے۔ آپ کہیں تو اپن اس کو فوری طور پر اسپتال پہنچائے؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ اگر تم کر سکتے ہو تو اسے گال روڈ پر میری رہائش گاہ تک پہنچانے کی کوشش کرو۔"

"یہ تو کوئی پرابلم ہی نہیں ہے شاہ جہاں صاحب۔ وڈی اپن کا ایک گاڑی موقع پر موجود ہے۔ اپن ابھی انتجام کرتا ہے۔"

پاتھا کو فون کرنے کے بعد میں نے واکی ٹاکی پر جے سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ باری زخمی حالت میں کوٹھی پہنچ رہا ہے۔ وہ فوری طور پر اس کے لیے کسی اچھے ڈاکٹر اور طبی امداد کا انتظام کرے۔

باری کا گاڑی کے قریب زخمی حالت میں ملنا ایک چونکا دینے والی خبر تھی لیکن میں کسی ایسی خبر کی توقع پہلے سے ہی کر رہا تھا۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ باری کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں قوسیہ کا ہاتھ ہو گا۔

میں فوراً "گال روڈ" اپنی رہائش گاہ پر پہنچا۔ میرے پہنچنے کے دو تین منٹ بعد ہی ایک ویگن وہاں پہنچ گئی۔ اس میں باری موجود تھا۔ ساتھ میں پاتھا کے چار کارندے بھی تھے۔ کچھ کارندے درختوں کے جھنڈ میں ملنے والی سفید کار کے پاس ہی موجود رہے تھے اور قوسیہ کو آس پاس کے علاقے میں تلاش کر رہے تھے۔

باری کا سر دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا' گردن پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔ سر کی چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ بری طرح سوج گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں ویگن کی سیٹ پر پڑا تھا اور کراہ رہا تھا۔ ہم اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر اندر لائے۔ یہاں ڈاکٹر اپنے ضروری ساز و سامان کے ساتھ موجود تھا۔ ڈاکٹر کا ایک ہیلپر بھی ساتھ تھا۔ یہ لوگ فوری طور پر باری کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔

پاتھا کے کارندوں میں سے ایک نے مقامی زبان میں بتایا "میرا نام مینڈس ہے جی۔ میں کولمبو سے باہر شوان بستی کا رہنے والا ہوں۔ پاتھا صاحب کا آرڈر مجھ تک بھی پہنچا تھا۔

س آرڈر میں کہا گیا تھا کہ اس نمبر کی سفید گاڑی پر نظر رکھی جائے۔ گاڑی میں ایک لڑکا اور لڑکی سوار ہیں۔ میں بائی پاس سڑک تک جانے کے لیے درختوں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر اس گاڑی پر پڑ گئی۔ میں نے نمبر دیکھا' نمبر بھی وہی تھا۔ گاڑی کا ایک اگلا پہیہ پنکچر تھا۔ پہیہ بدلنے کا سامان بھی گاڑی کے قریب ہی پڑا تھا لیکن ابھی پہیہ بدلا نہیں گیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر دیکھا تو گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کے پاس ہی یہ صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے سر سے بہنے والا خون گھاس پر لگا ہوا تھا۔"

یانگا کے کارندے کی بات چیت کے دوران ہی جے میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا "جناب! باری صاحب ہوش میں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان سے کچھ پوچھ سکتے ہیں۔"

میں جے کے ساتھ کمرے میں پہنچا۔ ڈاکٹر نے ٹانکے وغیرہ لگا کر باری کے سر اور چہرے پر سفید پٹیاں باندھ دی تھیں۔ اسے ڈرپ بھی لگائی گئی تھی۔ باری کا رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کو غالباً جے نے اشارہ کر دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا گیا۔ باری نے بس ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر پلکیں جھکا لیں۔ اس کے انداز سے پشیمانی عیاں تھی۔ چہرے پر گہرے کرب کے آثار تھے۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ کچھ دیر اس کا چہرہ تکتا رہا پھر آہستگی کے ساتھ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس موقع پر باری سے کوئی بھی اختلافی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے باری سے پوچھا "یہ سب کیا ہوا ہے؟"

وہ خاموش رہا' بس اس کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی نظر آنے لگی۔

"کیسے بے ہوش ہوئے تم؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بہت دھیمے لہجے میں بولا "میں گاڑی کا پہیہ بدلنے کے لیے باہر نکلا تھا۔ ایک دم سر پر چوٹ لگی۔ میں گر گیا۔ پھر کچھ پتا نہیں۔"

"توسیہ کی کچھ خبر ہے؟"

باری خاموش رہا' چند سیکنڈ بعد اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر پھر اندر آ گیا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں باری سے زیادہ باتیں کروں۔ میری اپنی رائے بھی یہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔

اب سہ پہر ہو گئی تھی۔ بادل گھر کر آئے تھے اور بارش شروع ہو چکی تھی۔ میں اور جے موقع دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یانگا کے کارندے مینڈس وغیرہ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم بذریعہ جیپ ہائی وے کے اٹھارہویں میل پر پہنچے اور پھر مینڈس کی رہنمائی میں گھنے درختوں میں داخل ہو گئے۔ بارش بدستور جاری تھی۔ ہم چھتریاں وغیرہ ساتھ لے گئے تھے۔ جلد ہی ہمیں سفید ٹویوٹا گاڑی نظر آ گئی۔ گاڑی کا پہیہ پنکچر تھا۔ اوزار وغیرہ بھی قریب ہی پڑے تھے۔ بارش کی وجہ سے خون دھل گیا تھا' پھر بھی گھاس پر کچھ دھبے نظر آ رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ جلد ہی مجھے زمین کی گواہی نظر آ گئی۔ یہ توسیہ کے سینڈل کے نشانات تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ باری کے بے ہوش ہو کر گرنے کے بعد وہ جنوب کی سمت گئی ہے۔ اس کا انداز دوڑنے والا تھا۔ دوڑنے والے شخص کے نقش پا کا اگلا حصہ زیادہ گہرا ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس میں گھسٹنے کے نشانات ہوتے ہیں۔ میں نے غور کیا لیکن توسیہ کے قدموں کے نشانات کے ساتھ یا نشانات کے پیچھے مجھے کوئی اور نشان نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جب وہ یہاں سے بھاگی تو اکیلی تھی۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت تھا کہ باری پر حملہ کرنے والی توسیہ ہی تھی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک ان نشانات پر غور کرتے رہے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا لیکن گھنے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بارش بھی جاری تھی۔ بارش کے سبب توسیہ کے قدموں کے نشان معدوم ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں نشان موجود تو تھے لیکن بہت مدھم تھے۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ وہ جنوب کی سمت گئی ہے۔ ہم گاڑی کی طرف واپس آ گئے۔ یہاں یانگا کے تین کارندے مسلسل پہرہ دے رہے تھے۔ گاڑی کی چابی ابھی تک اگنیشن میں موجود تھی۔ گاڑی کے اندر ایک خاص چیز بھی موجود تھی اور یہ چیز تھی پٹھان گیٹ کیپر کا ایک جوڑا چپل۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ کوٹھی سے فرار ہوتے وقت باری اور توسیہ نے پٹھان چوکیدار کو گن پوائنٹ [illegible] کر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب پٹھان چوکیدار کہاں ہے۔ توسیہ کے پاؤں کے نشانات کے ارد گرد کوئی اور نشان نظر نہیں آیا تھا' اس کا واضح مطلب تو یہی تھا کہ جب باری بے ہوش ہوا تو توسیہ یہاں اکیلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان دونوں نے پٹھان چوکیدار کو راستے میں کہیں اتار دیا تھا مگر ایسی بات تھی تو پھر چوکیدار کو آزاد ہونے کے بعد فوراً ہم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ ایسا بزدل تو ہرگز نہیں تھا کہ باری کے ریوالور سے خوف زدہ ہونے کے سبب دوبارہ کوٹھی کا رخ ہی نہ کرتا۔ توسیہ نے جس وزنی شے سے باری کے

ضربیں لگائی تھیں وہ بھی موقع پر موجود تھی۔ اور وہ شے ٹویوٹا کار کا رنگی جیک ہی تھا۔ یہ جیک توسیہ نے بھاگتے ہوئے گھاس میں پھینک دیا تھا۔ (اس صورت حال سے ایک بات بہرحال واضح ہوتی تھی اور وہ یہ کہ توسیہ نے باری پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کی تھی حالانکہ باری کا ریوالور اس کے پاس موجود تھا)۔

شام تک میں اور جے واپس رہائش گاہ پر پہنچ چکے تھے۔ اب ہماری مجبوری تھی کہ ہم جلد از جلد یہ رہائش گاہ چھوڑ دیں۔ توسیہ ایک نہایت ہوشیار لڑکی تھی' اس کے لیے یہاں کا حدود اربعہ یاد رکھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔

اتفاقاً جے کے پاس اسی علاقے میں قریباً دو فرلانگ دور ایک اور عمارت بھی موجود تھی یہ عمارت سائز میں اس رہائش گاہ سے قدرے چھوٹی تھی اور وہاں زیادہ رونق بھی نہیں تھی تاہم موجودہ حالات میں ہمارے قیام کے لیے وہ جگہ بہترین تھی۔ رات دس بجے تک ہم اپنے ضروری ساز و سامان سمیت اس دوسری عمارت میں منتقل ہو چکے تھے۔ جے اور سنگھاشی وغیرہ نے تیزی سے کارروائی کر کے پہلی عمارت میں سے توسیہ کی موجودگی کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ اگلے روز پوری کر لی گئی۔

باری کی حالت اب بہتر تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی گردن پر پلاسٹک کا مخصوص کالر چڑھا دیا تھا اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ باری کے سر پر کافی ٹانکے بھی لگے تھے۔ میں نے باری سے کوئی سخت بات نہیں کی تھی بس دو تین دفعہ اس کا حال احوال ہی پوچھا تھا لیکن اب مجھے لگ رہا تھا کہ باری خود مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ دوپہر کے بعد میں اس کے پاس جا کر بیٹھا تو وہ خود ہی دھیمے لہجے میں اپنی روئیداد سنانے لگا۔ اس نے اعتراف کرنے والے لہجے میں کہا "میں... اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں شاہ جہاں صاحب۔ میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ سے معافی ہی مانگ سکوں۔" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک آئے۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی اور کہا "جو ہوا ہے اسے بھول جاؤ باری۔ شاید میں تم سے کچھ کہنا بھی نہ چاہوں لیکن توسیہ کو ڈھونڈنے کے لیے ضروری ہے کہ مجھے حالات معلوم ہوں۔"

باری نے تر بتر آنکھوں کے ساتھ کہا "لیلینا کہاں ہے؟"

"اسے سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

"اور گارڈ کرن کمار؟"

"وہ ٹھیک ہے۔ مرہم پٹی کے بعد آرام کر رہا ہے۔"

"میں... ان دونوں کا بھی... مجرم ہوں۔" باری نے کہا اور اس کی آنکھوں میں مزید آنسو امڈ آئے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "میں اور توسیہ ٹویوٹا میں نکلے تھے۔ میرا دماغ بالکل آؤٹ ہو رہا تھا۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ میں نے پٹھان چوکیدار کو ریوالور دکھایا اور اسے گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ گاڑی میں خود چلا رہا تھا۔ توسیہ میرے ساتھ والی سیٹ پر تھی۔ میں نے ریوالور اسے پکڑا دیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اگر پٹھان کوئی گڑبڑ کرے تو اس کی ٹانگ پر گولی مار کر اسے زخمی کر دینا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ آگے جا کر ہم پٹھان کو کسی ویران جگہ پر اتار دیں گے۔ لیکن ہمارے اترنے سے پہلے پٹھان خود ہی اتر گیا۔ ہمیں... بالکل پتا ہی نہیں چلا۔ توسیہ کا دھیان سامنے سڑک کی طرف چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی مدھم آواز آئی' مڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اس نے چلتی گاڑی میں سے چھلانگ لگائی تھی اور یقیناً زخمی ہوا تھا۔ سڑک پر گہرا اندھیرا تھا۔ کنارے پر جھاڑیاں بھی تھیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلا وہ کدھر گیا ہے۔"

باری نے چند لمحے توقف کر کے اپنی سانسیں درست کیں' پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "میرا ارادہ کینیڈی کی طرف جانے کا تھا۔ لیکن وہ اصرار کر رہی تھی کہ ہم فرسٹ اسٹورز کی طرف جائیں۔ وہ فوری طور پر شیخ عاصم یا اس کے کسی اہم ملازم سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ سڑک کے ایک موڑ پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ یہ ایک دوراہا ہے۔ ایک سڑک شیخ عاصم کے فرسٹ اسٹورز کی طرف جاتی ہے اور دوسری کینیڈی کی طرف... ہم کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ اپنے ارادے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فرسٹ اسٹورز کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہم بالکل محفوظ ہو جائیں گے' دوسری طرف میں اتنی جلدی شیخ عاصم کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ بلکہ شاید میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خاصی بحث کے بعد توسیہ خاموش ہو گئی' میں نے گاڑی کینیڈی کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھا دی۔ کچھ آگے جانے کے بعد اچانک مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کے دائیں اگلے پہیے میں ہوا نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ پہیہ پنکچر ہو چکا تھا لیکن میں اس مصروف سڑک کے کنارے گاڑی روک کر پہیہ بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک نیم پختہ راستہ دیکھ کر میں گاڑی کو درختوں میں لے گیا۔ اس کے بعد... جو کچھ ہوا

آپ کو معلوم ہی ہے۔"

باری خاموش ہوگیا۔ بعد کے واقعات یاد کر کے اس کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ میں نے اس کا شانہ سہلاتے ہوئے کہا "مجھے معلوم تو ہے لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔"

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور پشیمان لہجے میں بولا "مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔ ہم۔ میں گاڑی سے باہر نکلا۔ توسیہ نے ڈگی کھولنے اور پہیہ وغیرہ نکالنے میں میری مدد کی۔ میں اگلے پہیے کے قریب بیٹھ گیا اور جیک لگانے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔ اچانک میرے سر پر شدید چوٹ لگی پھر دوسری لگی۔ تیسری چوٹ نے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا دیا۔ ان چوٹوں کے دوران میرے کانوں میں توسیہ کی آوازیں بھی پڑیں وہ بڑے غصیلے لہجے میں مجھ پر چیخ رہی تھی۔ تیسری چوٹ کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"جب دوبارہ ہوش آیا تو تم نے کیا دیکھا؟"

"مجھے درختوں کے درمیان آسمان نظر آیا۔ ایک چہرہ بھی دکھائی دیا جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ یہ میلی سی صورت والا ایک مقامی شخص تھا اور اس کا لباس بھکاریوں جیسا تھا۔ ایک دو منٹ تک تو میرا ذہن بالکل خالی رہا پھر آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن میرے سر اور گردن میں درد کی اتنی شدید ٹیسیں اٹھیں کہ میں ادھ موا ہوگیا۔"

باری کی "پشیمان روئیداد" ختم ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیں تھیں اور وہ بسر مایوس تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "انسان کو حد سے زیادہ پُر امید ہونا چاہیے اور نہ حد سے زیادہ مایوس۔ انتہا پسندی کسی بھی شکل میں ٹھیک نہیں ہوتی۔"

"میں واقعی بے حد شرمندہ اور مایوس ہوں سر۔"

"یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں بہت اندھیرا ہوتا ہے وہاں کہیں پاس ہی روشنی بھی طلوع ہونے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ مایوس لوگ طویل رات کا دکھ جھیلنے کے باوجود سویرا دیکھنے سے محروم رہتے ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولا' بس آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ آنکھوں کے گوشوں میں نمی جھلکتی رہی۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ توسیہ کہاں گئی ہوگی؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بارے میں میرا ہر اندازہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔"

"پھر بھی ایک قیافہ تو ہوتا ہے۔"

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا "وہ فرسٹ اسٹورز جانے کا کہہ رہی تھی۔ اسی طرف گئی ہوگی۔ یا پھر اپنے بھائی کے کسی مقامی آفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہوگا۔"

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ایک بات عجیب ہے باری! توسیہ کو فرار ہوئے اب تقریباً ۳۶ گھنٹے ہو چکے ہیں ابھی تک کوئی ایسا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا جس سے پتا چلے کہ وہ اپنے بھائی کے کسی آفس میں یا پولیس کے پاس پہنچی ہو ہے۔"

"میں سمجھا نہیں جناب؟" باری نحیف آواز میں بولا۔

"کوئی ری ایکشن ظاہر نہیں ہوا ہے۔" میں نے کہا "یہاں تک کہ اس رہائش گاہ کی طرف بھی کسی نے رخ نہیں کیا جہاں سے وہ فرار ہوئی ہے۔ پولیس کی طرف سے بھی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ کسی اخبار میں کوئی نیوز چھپی ہے۔ یہ خاموشی کچھ پُراسرار ہے۔"

بات باری کی سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ بولا "کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے کسی ہمدرد تک پہنچ ہی نہ پائی ہو۔"

"موجودہ صورت حال میں تو یہی لگ رہا ہے۔ بہرحال اگلے دس بارہ گھنٹے تک پوزیشن واضح ہو جائے گی۔"

میں اور باری کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے پھر باری کو آرام کرنے کا مشورہ دے کر میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے بجے سے کہا کہ وہ اسپتال میں فون کرکے للیتا کی خیر خیریت دریافت کرے۔ بجے نے بتایا کہ وہ میرے کہنے سے پہلے ہی فون کر چکا ہے۔ للیتا کا سی ٹی اسکین کیا گیا ہے اور دو بوتلیں خون بھی چڑھایا گیا ہے۔ اس کی حالت کل رات سے کافی اچھی ہے۔ میں نے بجے کو ہدایت کی کہ للیتا کے علاج پر پوری توجہ دی جائے اور اس سلسلے میں کسی مالی مشکل کو آڑے نہ آنے دیا جائے۔

للینا سے پہلے للیتا کا شوہر بھی توسیہ کی ستمگری کا نشانہ ہو کر اسپتال کا مستقل مکین بن چکا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب للیتا کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو۔ میں جلد از جلد اسے اسپتال سے باہر دیکھنا چاہتا تھا۔

اگلے دو روز بھی توسیہ کی تلاش جاری رہی لیکن نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ پاشا اور پانچا سادھو بھی اپنے اپنے کارندوں کے ذریعے اس تلاش میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ پانچا کے جس کارندے نے سفید گاڑی اور باری کا کھوج لگایا تھا اس کا نام مینڈس تھا۔ مینڈس سے ایک دن پہلے پانچا کے ڈیرے پر دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بھکاری ہی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ مجھ سے انعام و اکرام کی توقع کر رہا ہے۔ میں نے اسے کچھ روپے

دیے تھے مگر ابھی اسے مزید کی تمنا تھی۔

آج پھر ڈیرے کی سیڑھیاں چڑھتے ہی مینڈس سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بتیسی نکال دی اور شاہدی انداز میں ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ وہ مقامی زبان میں کچھ کہہ بھی رہا تھا' الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن لب و لہجہ یہی بتا رہا تھا کہ وہ میری تعریفیں کر رہا ہے۔ مطلب واضح تھا۔ وہ مزید "تعاون" چاہ رہا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ ہاتھ میں آیا مینڈس کو تھما دیا۔ یہ تقریباً سات آٹھ سو سری لنکن روپے تھے۔ مینڈس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر روپے مجھ سے وصول کیے۔ ایسا کرتے ہوئے ایک آستین اس کے بازو پر سے سرک گئی۔ مینڈس کی میلی کچیلی جلد پر مجھے ایک تازہ زخم کا نشان نظر آیا۔ بالکل ایسا جیسے کسی نے اسے دانتوں سے کاٹا ہو۔

میری نظر مینڈس کے زخم پر پڑی تو مینڈس نے فوراً محسوس کر لیا' اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ نے غیر ارادی طور پر آستین کو بازو پر برابر کر دیا۔ مینڈس کا انداز شے میں ڈالنے والا تھا۔ پہلے بھی مجھے اس کی باتوں میں ایک دو تضاد محسوس ہوئے تھے۔

مینڈس فرشی سلام کرنے کے بعد نیچے اتر گیا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر ڈیرے کی بالائی منزل پر آگیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ دن بھر "محنت" کرنے والے بھکاری یہاں وہاں ستونوں کے ساتھ بیٹھے تھے' کچھ نیم دراز تھے' کچھ بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ چرس کی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ لا مے بھی یہاں موجود تھا لیکن آج اس کی چھ ریڈمی پر امارات کا متکبر پیرزادہ نہیں تھا ایک ناچتا سنہالی تھا۔ لا مے سے چند فقروں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں پانچا کے آفس کی طرف چلا گیا۔ پانچا کسی کام سے نیچے بازار تک گیا تھا۔ دو تین منٹ میں وہ آگیا اور حسب معمول بڑے تپاک سے ملا۔ پانچا نے مجھے توسیہ کی تلاش کے حوالے سے اپنی رپورٹ دی۔ اس نے بتایا کہ مطلوبہ لڑکی کی تلاش کے لیے اس کے کارندے کہاں کہاں موجود ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

پانچا کی بات ختم ہوئی تو میں نے اس سے مینڈس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا "پانچا! یہ تمہارا کاریگر مینڈس کس ٹائپ کا شخص ہے؟"

"ٹھیک ہی ہے جی۔ بس تھوڑا سا لالچی ہے۔ نشے پانی کی وجہ سے ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ ڈھائی تین ہزار ایڈوانس بھی لیا ہوا ہے' بس تھوڑا تھوڑا کر کے کٹانا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارے اس "کاریگر" پر تھوڑا سا شک ہو رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ذرا اس کی نگرانی کرواؤ۔"

"آپ کو کس قسم کا شک ہے جناب؟" پانچا نے چونک کر پوچھا۔

"محسوس ہوتا ہے کہ اس نے باری کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے کچھ باتیں ہم سے چھپائی ہیں۔ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم دو تین دن اس پر نظر رکھنے کا انتظام کرو' پتا چلے کہ اس کی مصروفیات کیا ہیں۔"

پانچا نے چند لمحے توقف کیا' پھر بولا "آپ کا کہا اپن کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے جناب۔ اپن ابھی کسی کھاص بندے کو اس کام پر لگاتا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ کام بڑی ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔"

"آپ کوئی چنتا ہی نہ کریں جی۔"

ہم کچھ دیر اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ پانچا کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا کہ مینڈس 'مشہور منگتے' المعروف سیپی کا چھوٹا بھائی ہے۔ سیپی کی کمینگی کو میں بڑی اچھی طرح جان گیا تھا۔ اگر مینڈس اس کا بھائی تھا تو پھر اس کے بدخصلت ہونے میں تھوڑا ہی شبہ باقی رہ جاتا تھا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ پانچا کے ساتھ میری بات چیت کا نتیجہ اتنی جلدی نکلے گا اور اس قدر دہشت بھی ہوگا۔ اگلے روز صبح سویرے ہی ہماری رہائش گاہ پر پانچا کا فون آگیا۔ اس نے کہا "شاہ جہاں صاحب! اپن کے پاس ایک بہت کھاص اطلاع ہے۔ اگر آپ کسی طرح ڈیرے پر آسکیں تو بہت اچھا ہے۔"

"کوئی اشارہ نہیں دو گے؟" میں نے کہا۔

"مینڈس کے بارے میں کچھ باتوں کا پتا چلا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ آہی جائیں۔"

ناشتے کے فوراً بعد میں بذریعہ ٹیکسی کار پیٹیہ پہنچ گیا۔ جس وقت میں پانچا کے ڈیرے پر پہنچا ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ بازار میں رونق تھی۔ تاہم ڈیرا ویران نظر آرہا تھا۔ زیادہ تر بھکاری مرد و عورت اپنی ڈیوٹیوں پر جا چکے تھے۔ چائے خانے میں اکا دکا لوگ بیٹھے چائے رس کھا رہے تھے۔ پانچا چائے خانے کے کاؤنٹر پر کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔

میرا استقبال کرنے کے فوراً بعد وہ مجھے بالائی منزل پر لے گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے آفس میں لے جانے گا لیکن

وہ اس سے بھی اوپر چھت پر چلا گیا۔ یہاں ایک گوشے میں آگے پیچھے دو کمرے موجود تھے۔ کمروں کے ارد گرد پانھا کے دو چار تنے کسے کارندے بھی کھڑے تھے۔ کارندوں کے چہروں پر سنسنی کی کیفیت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

پانھا مجھے چھت کے ایک تنہا گوشے میں لے گیا اور بولا "شاہ جہاں صاحب! ہم نے مینڈس کو پکڑ لیا ہے۔ وہ سامنے والے کمرے میں بند ہے اس کے ساتھ ایک چھوکری بھی ہے۔ بازار کی ناچنے گانے والی ہے۔"

"مینڈس کو کیوں پکڑا ہے؟"

"آپ کا اندازہ درست نکلا ہے۔ مینڈس کے معاملے میں جبر دست گڑبڑ ہے۔ اپن کو پتا چلا ہے کہ یہ کمبخت۔ حرامی اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کر خرچ کر رہا ہے۔ کل رات ہی رات میں اس کتے کے پلے نے ایک کنجری پر پورا دو ہجار روپیہ لٹایا ہے۔ اس کے پاس سے کچھ اور کرنسی بھی نکلا ہے۔ ایک دو رسیدیں بھی ہیں جن سے جانکاری ہوتی ہے کہ اس نے اپنی رکھیل کے لیے اعلیٰ کوالٹی کے تحفے تحائف کھریدے ہیں۔"

"کچھ بتایا ہے اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ سالا۔ حرامی بڑا ڈھیٹ ہے۔ بالکل کتے کی دُم کے مافق۔ ہاں اس کی رکھیل نے دو چار جوتے کھانے کے بعد بتایا ہے کہ مینڈس کا کھفیہ (خفیہ) رابطہ ایک بڑے بدمعاش بجرنگ سے ہے 'یہ ڈھیر سارا روپیہ مینڈس کو بجرنگ سے ہی ملا ہے۔ شاید ابھی چھوکری کچھ اور بھی بتاتی۔ وہ خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے۔"

میں پانھا کے ساتھ عقبی کمرے میں پہنچا۔ یہاں کا منظر چونکانے والا تھا۔ مینڈس مادر زاد برہنہ چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کی سانولی پیٹھ پر ڈنڈوں اور جوتوں کے بہت سے نشانات تھے۔ اس کی ناک سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

ایک تامل لڑکی سُکڑی سی بنی ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ رقاصہ ہے۔ اس کا لباس بہت مختصر تھا۔ کلائیوں میں رات والے گجرے ابھی تک موجود تھے لیکن ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ بالوں کے پھول بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے گندمی رخساروں پر پانھا کے طمانچوں کے نشان تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

پانھا نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور چند گندی گالیاں دیں۔ وہ پانھا کے پاؤں کو ہاتھ لگانے لگی "آپ اپن کے مائی باپ ہیں۔ اپن کو ماف کر دیں۔ اپن کچھ نہیں چھپائے گا۔"

پانھا نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ طوائف ہانک کر دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں آ کر ساوھنا یہ لڑکی پھر منت سماجت کرنے لگی۔ پانھا کی صورت دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ پانھا نے کہا "ہاں بتا کہ بہن کو بجرنگ کے پاس بھیج کر مینڈس نے اتنے روپے ر تھے۔"

"میں بھگوان کی سوگند کھاتی ہوں مجھے اس بارے کچھ پتا نہیں ہے۔ کیول اتنا جانتی ہوں کہ مینڈس نے بجرنگ پاس کچھ بیچا ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ کوئی سامان ہے با وغیرہ کی چیز ہے۔"

"تمہیں سب پتا ہے لیکن تم اس وقت بتاؤ گی جب تمہاری یہ کومل چمڑی ادھڑ جائے گی۔" پانھا غصے سے پھنکا

پانچ دس منٹ تک یہ سخت کشمکش چلتی رہی۔ پانھا کا طبقے کے لوگوں سے عام واسطہ پڑتا تھا' وہ ان کی رگ رگ سے واقف تھا۔ کسی نہایت گھاگ تھانے دار کی طرح نے ساوھنا نامی اس لڑکی کی کسی بات پر اعتبار نہیں کیا اسے مسلسل پریشر میں لاتا رہا۔ آخر لڑکی ایک دم زور زور سے رونے لگی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اپن کو سب کچھ بتائے گا تو اپن کا جان چلا جائے گا۔ اپن مینڈس جندا نہیں چھوڑے گا۔"

"بکواس بند کر۔" پانھا دھاڑا "مینڈس جیسے میر موت کی دھار میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ لیکن اگر تم چپ رہو گی تو پھر حشر کھراب ہو جائے تمہارا۔"

کچھ دیر تک شدید تذبذب میں رہنے کے بعد اور پانھا کی سنگین دھمکیاں سننے کے بعد ساوھنا کی زبان کھل گئی۔ جو کچھ معلوم تھا اس نے ہمارے گوش گزار کر دیا۔ اس رات کو مینڈس اور اس کے ایک یار کی گفتگو کا کچھ حصہ تھا۔ اس گفتگو سے اسے معلوم ہوا تھا کہ بجرنگ بدمعاش بندوں کی اسمگلنگ وغیرہ بھی کرتا ہے۔ پانچ دن پہلے مینڈس کے ہاتھ کوئی آوارہ لڑکی آئی تھی۔ اس نے یہ لڑکی بجرنگ کے ہاتھ بیچ دی۔

ساوھنا کے مطابق یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ لڑکی تھی اور مینڈس کے ہاتھ کیسے لگی۔ بس اسے اتنا معلوم تھا مینڈس سال بھر بھی بھیک مانگتا رہتا تو اتنے روپے اکٹھے نہیں کر سکتا۔ جتنے اس نے لڑکی بیچ کر فقط ایک دن میں کما لیے تھے۔

ساوھنا نامی اس لڑکی نے دونوں بھکاری بھائیوں یعنی بیپی اور مینڈس کے بارے میں اور کئی باتیں بھی بتائیں۔ اس نے بتایا کہ بیپی اور مینڈس ایک نمبر کے تماش بین اور رنگ باز ہیں۔ خاص طور سے بیپی تو اس معاملے میں بہت بدنام ہے۔ طوائفوں کے بازار میں کئی عورتوں سے بیپی کے تعلقات رہے ہیں۔ اکثر عورتیں بیپی سے کراہیت کھاتی ہیں لیکن جو عورت جتنی کراہیت کھاتی ہے بیپی اسے حاصل کرنا اتنا ہی ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ بے دریغ رقم لٹاتا ہے اور بار بار بے عزت ہونے کے باوجود عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتا' یہاں تک کہ وہ لالچ میں آ کر' ترس کھا کر یا جھنجلا کر اپنا آپ اس لنگڑے کے حوالے کر دیتی ہے۔

ساوھنا کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی ایک دو بار اس لنگڑے کو بھگت چکی ہے۔ ساوھنا نے جو کچھ بتایا تھا اس کے بعد شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ مینڈس نے دھوکا دہی کی اعلیٰ مثال قائم کی تھی۔ اس نے ایک طرف ہم سے شاباش اور انعام و اکرام وصول کیا تھا اور دوسری طرف توسیہ کے روپے کھرے کیے تھے۔

توسیہ کے بارے میں سوچ کر میرے دماغ میں انگارے بھر گئے۔ اگر وہ واقعی کسی بجرنگ نامی بدمعاش کے پاس پہنچ چکی تھی تو اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ قبول صورت اور نوجوان تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں بھی تھی بے بسی کی حالت میں تھی۔

میرے خیال میں اس کی عزت محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ اپنے خریداروں پر اپنی حیثیت واضح کرتی۔ انہیں بتاتی کہ وہ امارات کے ارب پتی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اسے رہا کرنے کے عوض وہ لوگ لاکھوں کما سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ لوگ اسے عزت و احترام سے رکھ کر اس کے نوٹ کھرے کرنے کی کوشش کرتے۔

ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ میں پانھا کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں ڈھیٹ مینڈس ابھی تک الٹا لٹک رہا تھا اور ابکائیاں لے لے کر اپنا کھایا پیا الٹ رہا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور پانھا سمیت باقی افراد کو باہر نکال دیا۔ میرے ہاتھ میں میرا رام پوری خنجر تھا۔

صرف پانچ منٹ کے اندر اندر مینڈس کی ساری ہٹ دھرمی اس کی ناک کے راستے بہہ گئی اور وہ میرے سوالوں کے جواب میں ٹیپ ریکارڈر کی طرح فر فر بولنے لگا۔ مینڈس کو اس فرماں برداری پر آمادہ کرنے کے لیے مجھے تھوڑی سی بے رحمی کرنا پڑی تھی۔ مینڈس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں درمیان سے کٹ کر فرش پر گر چکی تھیں اور باقی انگلیاں ہاتھ سمیت مسلسل کانپ رہی تھیں۔ وہ بدستور الٹا لٹکا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا "توسیہ تمہیں کہاں ملی تھی؟"

وہ کراہتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا "میں اپنے ساتھی موتی کے ساتھ بڑی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ہماری نظر اس پر پڑی۔ وہ ہمیں ایک نو عمر لڑکے کی طرح لگی۔ ہمیں دیکھ کر وہ ایک دم بدکی اور اس نے راستہ بدل لیا۔ ہم درختوں کے درمیان اس کے پیچھے بھاگے۔ تھوڑا آگے جا کر وہ کیچڑ میں پھسل کر گر گئی۔ ہم نے اسے جا لیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور دکھا دکھا کر ہمیں دھمکانا شروع کیا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف دھمکا رہی ہے' ہم پر گولی چلانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ میں نے اسے باتوں میں لگایا۔ میرے اشارے پر موتی پیچھے سے گیا اور اس نے لڑکی کا ریوالور چھین کر اسے قابو میں کر لیا۔ وہ زور زور سے چیخنے لگی تھی۔ اس نے ہمیں دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی۔ میری کلائی پر اس کے دانتوں کے زخم بھی آئے۔ ہم دونوں نے مل کر اس کا گلا دبا دیا۔ اس کا سانس گھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ ہم اسے اپنے جھونپڑے میں لے گئے اور اس کے ہاتھ پیر سن کی رسّی سے باندھ دیے۔"

اتنی روداد سنانے کے بعد مینڈس بری طرح ہانپ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ میں نے اسے الٹی پوزیشن میں ہی پانی پلایا۔ اس کی انگلیوں سے خون بہنے کے بعد خود ہی رک گیا تھا۔

میں نے کہا "تم باری تک اور اس کی سفید گاڑی تک کیسے پہنچے؟"

مینڈس نے کہا "ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو رہے تھے کہ یہ لڑکا نما لڑکی کہاں سے دوڑتی ہوئی آئی ہے۔ میں نے اپنے ساتھی کو وہیں لڑکی کے پاس چھوڑا اور خود شمال کی طرف چلنے لگا۔ جلد ہی مجھے سفید گاڑی اور اس کے قریب پڑا شخص نظر آ گئے۔"

"لڑکی بجرنگ کے پاس کب پہنچی اور کیسے؟"

"مجھے پتا تھا کہ بجرنگ آج کل بودھ مندروں کے آس پاس گھومتا رہتا ہے اور وہاں سے ایسے لڑکے لڑکیوں کا شکار کرتا ہے جو گھروں سے بھاگ کر وہاں پہنچتے ہیں۔ وہ ایسے لاوارث لوگوں کو دوسرے شکاریوں سے خریدتا بھی ہے۔ ہم

نے بجرنگ سے رابطہ کیا اور اس سے لڑکی کا سودا کرلیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اب وہ بجرنگ کے ڈیرے پر ہوگی؟"

"نہیں وہ بجرنگ کے ڈیرے پر نہیں ہے۔ بجرنگ اسے۔ بجرنگ اسے اپنے گھر لے گیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"مم۔ مجھے نہیں پتا۔ مجھے نہیں خبر۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر رام پوری خنجر اپنی پنڈلی سے کھینچ لیا۔ خنجر دیکھتے ہی اس کی گھگی بندھ گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ میں اس کی انگلی جکڑی تو وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخنے لگا "بتاتا ہوں بتاتا ہوں۔" اس نے دہائی دی۔

اس نے چند گہری سانسیں لیں اور بتانے لگا "بجرنگ کو وہ لڑکی بڑی پسند آئی ہے۔ اسے عام لڑکیاں اور عورتیں پسند نہیں ہیں۔ پہلے بھی بجرنگ کے پاس ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ وہ کھیلوں میں حصہ لیتی تھی' دوڑتی تھی اور چھلانگیں وغیرہ لگاتی تھی۔ اس کے بال بھی ایسے ہی کٹے ہوئے تھے۔ بجرنگ کو ایسی ہی لڑکیاں پسند ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ اسے بری نیت کے ساتھ لے کر گیا ہے۔"

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال یہی ہے۔"

میں نے اگلے پانچ منٹ میں مینڈس سے بجرنگ کی رہائش گاہ کا پورا حدود اربعہ دریافت کیا اور یہ بھی معلوم کیا کہ اگر ہم رہائش گاہ میں زبردستی گھسنے کی کوشش کریں تو ہمیں وہاں کیا مزاحمت پیش آسکتی ہے۔

اس کے بعد میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے پاٹھا کے کارندوں کو ہدایت کی کہ وہ مینڈس کو چھت سے اتار لیں اور اپنی کڑی حفاظت میں رکھیں۔ میں نے پاٹھا کو بتایا کہ لڑکی بجرنگ کی رہائش گاہ پر ہے اور اسے وہاں سے فوراً نکالے جانے کی ضرورت ہے۔

پاٹھا کے چہرے پر ہلکا سا تذبذب اور الجھاؤ نظر آرہا تھا "کیا بات ہے؟" میں نے پاٹھا سے پوچھا۔

وہ بولا "یہ حرامی بجرنگ بہت کریک دماغ بندہ ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب کیا کرجائے۔ پاگل خانے میں بھی رہ کر آیا ہے۔ کافی روز وہاں اس حرامی کا علاج ہوتا رہا ہے۔ اب بھی پاگل خانے کا سرٹیفکیٹ جیب میں لیے پھرتا تھا۔ لوگوں کو دھمکاتا پھرتا ہے کہ میں پاگل خانے سے نکلا ہوا ہوں۔ کسی کی ہتھیا بھی کرڈالوں گا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"کبھی کوئی پاگلوں والا کام بھی کیا ہے اس نے؟"

"کرتا ہی رہتا ہے جناب۔ پتا نہیں کہ اب جان بوجھ کر کرتا ہے یا واقعی دماغ میں کوئی کھلل ہے۔" بات کرتے کرتے ایک دم پاٹھا کو جیسے کچھ یاد آیا۔ بولا "اپن کا خیال ہے کہ یہ رنتاکو سے بھی ملتا جلتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی کاروباری "لنک" بھی ہے۔ کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ رنتاکو سے رابطہ کریں اور اس سے کہیں کہ وہ لڑکی کو چھڑانے میں ہماری مدد کرے۔"

"تمہاری رائے میں وزن محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

پاٹھا نے کہا "چلیں آئیں نیچے آفس میں چلتے ہیں' وہیں سے رنتاکو کو فون کھڑکاتے ہیں۔"

میں نے کہا "رنتاکو اور پاشا ایک ہی ہیں۔ رنتاکو سے براہ راست بات کرنے کے بجائے ہم پاشا سے کیوں نہ بات کریں۔"

پاٹھا نے میری تائید کی۔ چند منٹ بعد پاشا سے ہمارا رابطہ ہوگیا۔ یہ باتیں فون پر کرنے والی تو نہیں تھیں' بہرحال میں نے تھوڑا سا رسک لیتے ہوئے فون پر ہی پاشا کو سب کچھ بتادیا۔ پاشا بڑی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ ایک دو منٹ کے اندر ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اس نے کہا "میں ابھی رنتاکو سے بات کرتا ہوں' پھر تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔ ویسے میں نے بھی اس بجرنگ نامی بدمعاش کے بارے میں سن رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ بہت سرپھرا ہے۔ ایک عرصہ پاگل خانے میں بھی رہا ہے۔"

میں نے کہا "پاگل پن کو ٹھیک کرنے کے کئی نسخے میرے پاس موجود ہیں۔ تم گھی سیدھی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ اگر نہ نکلا تو دیکھ لیں گے۔"

مینڈس سے بجرنگ کی رہائش گاہ کا جو پتا معلوم ہوا تھا وہ بھی عجیب و غریب تھا۔ اس پتے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بجرنگ واقعی صحیح الدماغ نہیں ہے۔ اس کی رہائش گاہ زمین پر نہیں پانی کے اندر تھی۔ اس نے ایک چھوٹے سے تفریحی بجرے کو رہائش گاہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔ یہ بجرا جو ایک بڑی لانچ سے بھی دو تین گنا بڑا تھا' ساحل سے قریباً نصف کلومیٹر کے فاصلے پر سمندر میں کھڑا رہتا تھا۔ بجرے تک آنے جانے کے لیے بجرنگ ایک چھوٹی سی لانچ استعمال کرتا تھا۔

قریباً تین گھنٹے بعد پاشا کا فون آیا۔ اس نے بتایا "ہم نے پتا چلالیا ہے۔ لڑکی اس بجرے میں ہی ہے۔ رنتاکو اس بدمعاش کے ساتھ بات چیت کررہا ہے۔ امید ہے کہ ایک دو گھنٹے تک صورتِ حال سامنے آجائے گی۔"

ایک گھنٹا ہم نے سخت بے چینی میں کاٹا۔ میں ابھی تک پاٹھا کے ڈیرے پر ہی تھا۔ بیبی اور رانو بھی ڈیرے پر ہی تھے لیکن میں ان کے سامنے نہیں آیا۔ بالآخر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پاشا ہی تھا۔ اس کے لہجے میں مایوسی کی جھلک نے مجھے بھی مایوس کردیا' وہ بولا "میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ یہ بہت سرپھرا شخص ہے۔ ایسے بندے کو دلیل اور منطق وغیرہ سے قائل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"بس الٹی سیدھی ہانک رہا ہے۔ لڑکی دینے پر تیار نہیں' رنتاکو نے رقم کی آفر بھی کی ہے لیکن کہتا ہے کہ بجرنگ ایسے پیسے پر پیشاب کرتا ہے جس کے لیے اپنا من مارنا پڑے۔"

"من مارنے سے کیا مراد ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کا دل لڑکی پر آیا ہوا ہے۔ وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔"

میرا دماغ کھولنے لگا تھا۔ میں نے پاشا سے پوچھا "اب تمہاری کیا رائے ہے؟"

"بہتر ہے کہ تم یہاں آجاؤ۔ مل بیٹھ کر کچھ سوچتے ہیں۔"

"رنتاکو تمہارے پاس تو نہیں ہے؟"

"نہیں میں اکیلا ہوں۔"

آدھ گھنٹے بعد میں پاشا کے پاس اس کی کوٹھی میں موجود تھا۔ یہ وہی پُرفضا جگہ تھی جہاں اس سے پہلے میری ملاقات پاشا کی پرستار SINGING DOLLS سے بھی ہوئی تھی۔ پاشا فون سیٹ کے پاس ہی موجود تھا اور خاصا متفکر نظر آرہا تھا۔ اب تک رنتاکو اور بجرنگ کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل سے مجھے پاشا نے آگاہ کیا۔ اس تفصیل میں ایک پہلو قدرے تسلی کا بھی تھا۔ معلوم ہوا کہ توسیہ کچھ علیل ہے اور بجرنگ اس کے لیے کچھ میڈیسن وغیرہ لے کر بجرے میں گیا تھا۔ دراصل جب جنگل میں بھکاری مینڈس اور اس کے ساتھی نے توسیہ کا گلا گھونٹا تو اس کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ بعد ازاں وہ ہوش میں تو آگئی لیکن گلے کی رگیں وغیرہ مسلے جانے سے وہ تکلیف میں تھی۔ عین ممکن تھا کہ اپنی اس تکلیف کی وجہ سے وہ بجرنگ کی دست درازی کا شکار ہونے سے بچی ہوئی ہو۔

میں نے کہا "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ رنتاکو کی بجائے ہم خود بجرنگ سے بات کریں۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" پاشا نے کہا اور رنتاکو کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

پاشا نے رنتاکو سے کہا کہ وہ خود بجرنگ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ رنتاکو نے کہا "ٹھیک ہے میں بجرنگ کو آپ کا فون نمبر دیتا ہوں وہ آپ کو RING کرے گا۔"

قریباً دس منٹ بعد RING ہوئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فون کا "ہینڈ فری بٹن" آن کردیا۔ لائن پر دوسری طرف بجرنگ ہی تھا۔ اس کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ وہ عجیب ڈھیلے ڈھالے مستانے انداز میں بول رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ انگلش بھی آسانی سے بول سکتا تھا۔

پاشا نے اس سے کہا "دیکھو بجرنگ' تم نے لڑکی کی جو قیمت ادا کی ہے ہم اس سے دس گنا تمہیں دے دیں گے لیکن لڑکی بغیر کسی تکلیف کے ہمارے پاس پہنچنی چاہیے۔ لڑکی کی قیمت کے علاوہ بھی تم فائدے میں رہو گے' ہم کام آنے والے بندے ہیں۔ تمہارے کام آئیں گے۔"

بجرنگ نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا "کوئی کسی کے کام نہیں آتا کامریڈ۔ ہر کوئی اپنے کام ہی آتا ہے۔ باقی ایک بات میں پھر تم سے کہتا ہوں۔ مجھ سے روپے کی بات نہ کرو اس سے مجھے چڑ ہے۔"

"تو بتاؤ پھر لڑکی کو کب واپس پہنچا رہے ہو؟"

"ذرا دھیرج رکھو کامریڈ! اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو وہ ویسے بھی بیمار شمار ہے۔"

"بیمار شمار ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اسے جلدی چھوڑ دو۔"

"یہ کیا بات ہوئی کہ بیمار شمار ہمارے پاس اور تندرست تمہارے پاس۔ میں پاگل تو ہوں لیکن اتنا پاگل بھی نہیں ہوں۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

میں نے بات چیت میں حصہ لیتے ہوئے کہا "مسٹر بجرنگ! مجھے لگتا ہے کہ تم گھاٹے کا سودا کرنے والے ہو۔ یہ کوئی حسینۂ عالم نہیں ہے' عام سی لڑکی ہے جس پر تم خوامخواہ نیت خراب کررہے ہو لیکن ایک لحاظ سے یہ لڑکی "خاص" بھی ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا تعلق امارات کی ایک اہم فیملی سے ہے۔ دیکھو بجرنگ! میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں' اگر تم اس لڑکی کو بحفاظت ہمارے پاس پہنچا دو تو تمہیں منہ مانگی قیمت مل سکتی ہے۔"

"مجھے اور پاگل مت بناؤ۔ میں جتنا ہوں اتنا ہی ٹھیک

ہوں۔" پھر ذرا توقف سے بولا "بجرنگ کو اوّل تو کوئی شے پسند نہیں آتی اور اگر آ جائے تو وہ اسے چھوڑتا نہیں۔ کیا سمجھے میرے کبوتر؟" بجرنگ کا انداز تاؤ دلانے والا تھا۔

"تم بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔"

"میں سمجھا سمجھایا ہوں۔ تمہاری بکواس سے پہلے ہی مجھے معلوم تھا کہ یہ چھوکری ابو ظہبی کی کوئی شیخ زادی ہے۔ اس کا بھائی کوئی بہت بڑا سرمایہ دار ہے لیکن۔ مجھ پر ایسی باتیں اثر نہیں کرتیں۔ دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے ہیں ناں۔ جہاں جہاں سے پیچ ڈھیلے ہیں وہاں وہاں سے دماغ سُن ہو گیا ہے۔ اثر کیسے ہو گا؟ باقی اگر یہ پیاری چھوکری امارات کی کوئی شہزادی بھی ہوتی تو میں اپنی مرضی کے بغیر اسے نہ چھوڑتا۔"

اس حرامی کے بارے میں ٹھیک ہی رپورٹ ملی تھی۔ اس کا دماغ چلا ہوا تھا۔ ایسے لوگ کوئی بات ماننے پر آئیں تو بلاوجہ مان جاتے ہیں۔ اگر نہ ماننی ہو تو دلیلوں کے انبار بھی انہیں ٹس سے مس نہیں کر سکتے۔

باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم اپنے کسی ملازم پر چیخنے لگا اور بغیر کچھ کہے سنے فون بند کر دیا۔ "یہ گھی واقعی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔" میں نے پاشا سے کہا۔

"لیکن مسئلہ تو لڑکی کی زندگی کا ہے۔" پاشا نے کہا اور جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا۔

اس کاغذ پر پاشا نے پنسل سے اس جگہ کا نقشہ بنایا تھا جہاں تفریحی بجرا لنگر انداز تھا اور بجرنگ کی رہائش گاہ کا کام دے رہا تھا۔ پاشا کی معلومات کے مطابق بجرے میں بجرنگ کے کم از کم دو مسلح ساتھی ہر وقت موجود رہتے تھے۔ بجرنگ نامی یہ بدمعاش خود بھی ہر وقت مسلح رہتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ کسی ریوالور وغیرہ سے مسلح نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ہتھیار خود کار رائفل تھی۔ یہ چھوٹی نال والی روسی رائفل تھی اور بجرنگ کا دعویٰ تھا کہ رائفل روس کے ایک اہم سرکاری عہدے دار نے اسے انعام میں دی تھی۔

اب سہ پہر کے چار بجنے والے تھے۔ پاشا کی شاندار رہائش گاہ سے باہر پام درختوں کے طویل سائے طویل تر ہوتے جا رہے تھے۔ شام کی پرچھائیاں در و دیوار پر لہرانے والی تھیں۔ شام کے بعد رات آتی ہے۔ اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ توسیہ کو آج کی رات بھی اس بجرے پر گزارنی پڑے جہاں اس کی عزت اور زندگی کو ہر وقت خطرہ لاحق تھا۔ توسیہ جیسی بھی تھی جو بھی تھی میری اس کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میری دشمنی اس کی ہٹ دھرمی اور بد دماغی کے ساتھ تھی۔ میں اسے بدلنا چاہتا تھا۔ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بے وقوف میری دسترس سے نکلتی نکلتی ایک نہایت خوفناک "دسترس" میں پہنچ گئی تھی۔ ایک جنونی بدمعاش کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ یقینی بات تھی کہ اب وہ خود بھی پچھتا رہی ہو گی اور اس وقت کو یاد کر رہی ہو گی جب وہ باری کے ساتھ "کال روز" والی رہائش گاہ سے نکلی تھی۔ جو کچھ اس نے اپنے شوہر کے ساتھ کیا تھا یقیناً اس پر بھی اسے پچھتانا چاہیے تھا' پتا نہیں وہ پچھتا رہی تھی یا نہیں۔

"تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟" پاشا نے مجھ سے پوچھا۔

"میری رائے ہے کہ بجرنگ کے خلاف کوئی ڈائریکٹ ایکشن لینے سے پہلے ہمیں اس کے ساتھ مزید مذاکرات کرنے چاہئیں۔"

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔" پاشا بولا "کسی طرح کی کارروائی کرکے توسیہ کو چھڑانا ہمارا آخری آپشن ہونا چاہیے۔"

شام کے فوراً بعد ہم بجرنگ سے ایک بار پھر رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس خبیث نے کوئی ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ بجرے پر بھی ہمارا فون سن سکتا تھا۔ تاہم بجرے پر آواز صاف نہیں آتی تھی۔

اس مرتبہ بجرنگ ہلکے سے نشے میں محسوس ہوتا تھا۔ پس منظر میں میوزک کا شور بھی سنائی دے رہا تھا یا شاید ریکارڈر پر گانوں کی وڈیو لگی ہوئی تھی۔ سری لنکا میں انڈین میوزک اور فلموں کا بہت رواج ہے۔ انڈین گانوں کی طرز پر مقامی زبان میں گانے بنائے جاتے ہیں اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔

اس مرتبہ ہم نے بجرنگ سے قریباً آدھا گھنٹا بات کی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہم توسیہ کے حوالے سے جتنی کوشش کر رہے ہیں بجرنگ اتنا ہی سخت ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بھی اس کی الٹی کھوپڑی کی ایک نشانی تھی۔ اس نے ایک دو باتیں ایسی کیں جن کو سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ ایسے واہیات بندے سے بات چیت کرنا بالکل فضول ہے۔

O☆O

رات ابر آلود تھی۔ بارش کبھی تیز ہو جاتی تھی کبھی بوندا باندی میں بدل جاتی تھی۔ میں اور پاشا آمنے سامنے بیٹھے تھے' ہمارے درمیان ناریل کے تیل میں پکی ہوئی بریانی تھی اور چائے کی بھاپ دیتی پیالیاں تھیں۔ ناریل کے تیل میں پکا ہوا کھانا حلق سے نیچے اتارنا' شروع میں تو بے حد دشوار محسوس ہوتا تھا لیکن اب تیز بو کے باوجود دھیرے دھیرے ہم

سب کچھ کھانے لگے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے بچے کو فون کیا تھا اور فون پر ہی باری کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ اب پہلے سے بہتر تھا۔ گردن کے درد میں بھی افاقہ تھا۔ توسیہ نے وزنی جگ کے ذریعے اس کی گردن پر کم و بیش تین ضربات لگائی تھیں اور اس واقعے کے کچھ ہی دیر بعد وہ خود بھی بینڈز وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

میں نے بچے سے لیلتا کی خیریت بھی دریافت کی تھی۔ وہ میری خواہش پر کولمبو کے بہترین پرائیویٹ اسپتال ہی میں تھی اور اس کا بہترین علاج ہو رہا تھا۔ حیران کن طور پر اس پٹھان چوکیدار کا ابھی کچھ پتا نہیں چلا تھا جس نے توسیہ اور باری سے بچنے کے لیے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ وہ کہیں زخمی ہو کر پڑا ہوا ہے' یا کسی کی تحویل میں ہے۔

پاشا نے کہا "پھر کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"میرا خیال ہے کہ کارروائی کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔"

"اگر تم چاہو تو اس کام کے لیے دو چار بہت ہوشیار بندے میرے پاس موجود ہیں' ہم ان پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔"

"نہیں پاشا! میرے نزدیک توسیہ کی بہت اہمیت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کام ہم خود کریں۔"

"اگر ایسی بات ہے۔ تو پھر تم اس کام کے لیے مجھے جانے دو۔"

"شاید تم اپنے تئیں کسی پرانے احسان کا بوجھ اتارنا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تمہاری سوچ ٹھیک نہیں ہے۔ جب دوستی کا رشتہ استوار ہوتا ہے تو پھر احسان چڑھانے اور اتارنے والا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔"

"اگر دوست سمجھتے ہو' تو پھر میری بات مانو۔ بجرنگ کا دماغ درست کرنے کے لیے مجھے جانے دو۔"

"چلو۔ نہ تمہاری نہ میری' ہم دونوں چلیں گے۔ ویسے بھی جس کارروائی کے بارے میں ہم سوچ رہے ہیں اس میں دو تین بندوں کی ضرورت تو ہو گی۔"

پاشا ایک بہت بڑے گینگ کا سرخیل تھا۔ میڈم شہزاد' ڈیوی اور وحدت جیسے خطرناک لوگ اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ وہ مار دھاڑ کے کام خود کہاں کرتا تھا؟ لیکن آج وہ ایک ایسے کام کے لیے میرے ساتھ جانے کا خواہش مند نظر آتا تھا جو اس کے "معمول" سے خاصا ہٹ کر تھا۔ جب اس نے دیکھا تھا کہ میں اس کارروائی کے لیے آمادہ ہوں تو وہ بھی میرے شانے سے شانہ ملانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

رات کے دس بجے تھے جب ہم منڈالی کے نزدیک ساحل پر پہنچے۔ ہلکی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ گاہے گاہے بجلی چمک کر قرب و جوار کو روشن کر جاتی تھی۔ ہمیں دتاکو کے ذریعے گراں قدر معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ ان معلومات کے مطابق وہ چھوٹی لانچ کھاڑی میں تھی جس کے ذریعے بجرنگ اپنے بجرے تک آمد و رفت رکھتا تھا۔ لانچ کا ڈرائیور لانچ میں ہی سوتا تھا۔ بجرنگ کے ساتھ اس کا رابطہ بذریعہ وائرلیس برقرار رہتا تھا۔ ہم لانچ سے کچھ فاصلے پر ہی ناریل کے درختوں میں کار سے اتر گئے۔ کار ڈرائیور جو دتاکو کا ہی کارندہ تھا' کار واپس لے گیا۔ ہم نے لانچ دور ہی سے دیکھ لی۔ وہاں ایک موٹر بوٹ کے علاوہ بس یہ چھوٹی لانچ ہی موجود تھی۔ لانچ کے اندر ایک بتی جل رہی تھی۔ ایک مضبوط رسّے نے لانچ کو کنارے کے ایک پام کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ لہروں کی جنبش سے وہ ہلکورے لے رہی تھی۔

ہم بڑی خاموشی کے ساتھ لانچ کے برابر پہنچ گئے۔ اندر سے لہک لہک کر گانے کی آواز آ رہی تھی' کوئی اپنی بھاری لیکن سریلی آواز میں ایک انڈین گانا گا رہا تھا۔ گانے میں اپنی محبوبہ کی متوالی چال کا ذکر تھا اور چلتے ہوئے اس کی پتلی کمر جو ہلکورے لیتی تھی اس کا ذکر تھا۔ محبوبہ کے جسمانی نشیب و فراز کی رعنائیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا اور اس کے جسم کو پھولوں کی ڈالی سے تشبیہ دی گئی تھی۔

اچانک ایک سایہ نظر آیا۔ وہ جھومتا ہوا سا لانچ سے اترا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اس کے قد کاٹھ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لانچ کا ڈرائیور نہیں بلکہ ڈرائیور کا ہیلپر ہے۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے سر پر چھتری تان رکھی تھی۔ ہم دونوں لانچ کی اوٹ میں ہو گئے' جونہی وہ پاس سے گزرا میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچی اور ایک ہی سیکنڈ میں اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے اس کی ٹارچ سنبھال لی تھی' پاشا نے اس کی چھتری لپک لی۔ میری کارکردگی پر پاشا چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "زبردست" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ابھی اس نے بمشکل اپنا مختصر تعریفی جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ ہم بھونچکے رہ گئے۔ کوئی تاریکی سے نکل کر ہم پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار شے تھی۔ اس کا وار پاشا کے دائیں بازو پر لگا' پاشا لڑکھڑا کر لانچ کے پہلو سے ٹکرایا لیکن پھر فوراً سنبھل گیا۔ اگلے ہی لمحے پاشا اور حملہ آور گتھم گتھا ہو چکے تھے۔

ٹارچ کی روشنی میں مجھے حملہ آور کی پشت نظر آئی۔ وہ ایک اچھے قد کاٹھ کا شخص تھا۔ اس نے جینز کی پتلون اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جو چاقو تھا' وہ چاقو سے زیادہ قصائی کا چاپر نظر آتا تھا۔ غالباً یہ مچھلی کا گوشت وغیرہ کاٹنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کا پھل تقریباً ڈھائی انچ چوڑا اور ایک فٹ لمبا تھا۔ چاقو بردار کے انداز میں بلا کی وحشت تھی لیکن دوسری طرف بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ وہ پاشا گینگ کا سرغنہ تھا۔ وہ اشرف چینے کے روپ میں سست الوجود اور قدرے بھدا نظر آیا کرتا تھا' لیکن پاشا کے روپ میں وہ ایک نہایت سخت جان اور چوکس شخص تھا۔

آٹھ دس سیکنڈ تک گھٹنے گھٹنے پانی میں ان دونوں کے درمیان شدید کشمکش ہوئی' پھر میں نے حملہ آور کا چاپر نما چاقو ہوا میں اچھل کر پانی میں گرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر بڑی شدت سے لانچ کے پہلو سے ٹکرایا۔ یہ بڑی شدید ضرب تھی۔ حملہ آور گھٹنوں کے بل پاشا کے قدموں میں گر گیا۔ خوش قسمتی سے قریب کھڑی موٹر بوٹ میں کوئی شخص موجود نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اتنی گہری نیند سو رہا تھا کہ اسے یہاں ہونے والی دھینگا مشتی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔

چاقو بردار شخص کا ڈیل ڈول ہمیں یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ یہی لانچ کا ڈرائیور ہے۔ پاشا نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور ہاتھ سر سے اونچے کرنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں تھا۔

ہم اسے جلد از جلد کرا کے اندر لانچ میں لے آئے۔ لانچ مختصر تھی پھر بھی اتنی گنجائش اس میں موجود تھی کہ دو بندے ٹانگیں پھیلا کر سو سکتے تھے اور عقبی حصے میں تھوڑا بہت سامان بھی آسکتا تھا۔ لانچ کا اندرونی حصہ دیکھنے کے بعد میں پھریا ہر گیا۔ ڈرائیور کا ہیلپر جو شکل و صورت سے نائل نظر آتا تھا' ریت پر اوندھے منہ بے ہوش پڑا تھا۔ یہی شخص تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹیک لگا کر بھارتی فلم کا گانا گا رہا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ ایک جیب سے چھوٹے سائز کا لوڈڈ پسٹل برآمد ہوا۔ میں اسے گیلی ریت پر گھسیٹتا ہوا درختوں میں لے گیا۔ لانچ میں سے ایک چھوٹی سی رسی میں لے آیا تھا۔ رسی سے میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم لانچ کے کیبن میں ڈرائیور پال سے بات چیت کر رہے تھے۔ پال اب پوری طرح پاشا کا مطیع نظر آ رہا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا پالا مشکل لوگوں سے پڑ گیا ہے اور اگر اس نے پس و پیش کی تو یہ برستی رات اس کی زندگی کی آخری رات بن جائے گی۔ شراب' عورت اور سگریٹ سمیت ہر دل پسند شے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ پال مدراسی لب و لہجے میں ہندی بول سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی کی شد بد بھی رکھتا تھا۔

اس کے ساتھ جو بات چیت ہوئی وہ اس نوعیت کی تھی۔ پاشا نے پوچھا "ہم لانچ کے ذریعے اس وقت بجرے پر پہنچیں گے تو بجرنگ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

ڈرائیور پال بولا "وہ اور اس کے دونوں گارڈز ضرور ہوشیار ہو جائیں گے۔ میں یوں بن بلائے کبھی بجرے پر نہیں گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ جب تک اس حرامی بجرنگ بلاوا نہیں آئے گا تم یہیں انڈوں پر بیٹھے رہو گے؟"

"نہیں سویرے تو مجھے ہر صورت جانا ہوگا۔ جنریٹر کے لیے تیل کا ڈرم وہاں پہنچانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی ہے۔ یہ ساری اشیا ادھر لانچ میں ہی رکھی ہیں۔"

میں نے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم یہ سامان ابھی وہاں پہنچا دو۔ تم گارڈز سے کوئی بہانہ کر سکتے ہو۔ یہ کہہ سکتے ہو کہ صبح تمہیں کسی لازمی کام سے جانا تھا اس لیے صبح کا پھیرا ابھی لگا لیا ہے۔"

پال نے پہلے تو آئیں بائیں شائیں کی' لیکن جب ہمارا رویہ سخت دیکھا تو مان گیا۔ ہم نے اس سے بجرے کے بارے میں کئی اہم معلومات حاصل کیں اور اسے سمجھا دیا کہ اپنی پیاری جان بچانے کے لیے اسے ہمارے ساتھ کس طرح تعاون کرنا ہے۔

پال کی باتوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نوبہ بجرے میں کس مقام پر ہے اور کس حال میں ہے۔ پال کو اس بارے میں سب پتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا مالک بجرنگ اس لڑکی کو عیاشی کے لیے بجرے میں لایا ہے اور اس کے تندرست ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ پال نے بتایا کہ اس کا مالک دیہاتی ہے لیکن اسے ماڈرن لڑکیاں پسند ہیں۔ کوئی لڑکی جتنی فیشن ایبل اور بے باک ہوتی ہے اتنی ہی مالک کو بھاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ساڑی اور لنگی وغیرہ پہننے والی لمبے لمبے بالوں والی چھوٹی موٹی عورتیں مالک کو پسند نہیں آتیں چاہے وہ کتنی بھی خوب صورت ہوں۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے بجرنگ نے ایک ماڈرن تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کی تھی لیکن یہ شادی ایک سال ہی برقرار رہ سکی تھی۔ کہ

بات پر طیش میں آکر بجرنگ نے اس لڑکی کو اتنا مارا تھا کہ اس کی آنکھ پھوٹ گئی تھی اور چہرے کا بھی نقشہ بگڑ گیا تھا۔ اس ظلم کے سبب اسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی لیکن پھر پتا نہیں کس طرح وہ حوالات سے ہی ایک بار پھر پاگل خانے پہنچ گیا تھا اور چھ سات مہینے بعد پاگل خانے سے بھی نکل آیا تھا۔

ہم رات تقریباً گیارہ بجے منڈالی سے روانہ ہوئے۔ پال لانچ چلا رہا تھا۔ بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ لانچ کی ہیڈ لائٹس میں پانی کی بوچھاڑیں سمندر کی سطح سے ٹکراتی نظر آتی تھیں۔ تیل کا چھوٹا ڈرم اور کھانے پینے کا سامان لانچ میں موجود تھا۔ پال یہی سامان پہنچانے کے لیے بجرے کی طرف جا رہا تھا۔ فوراً ہی ہمیں بجرے کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ وہ ساحل سے زیادہ دور نہیں تھا اور کم گہرے پانی میں کھڑا تھا۔ میں اپنے اہم آپریشن کے لیے تیار ہو گیا۔ ہمارا واسطہ ایک پاگل شخص سے تھا' اس لیے غیر معمولی احتیاط کی ضرورت تھی' اس کے علاوہ ہمیں بالکل غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بھی تیار رہنا تھا۔

پروگرام کے مطابق میں نے لانچ ڈرائیور پال کی برساتی اوڑھ لی۔ پال کا قد کاٹھ میرے جتنا ہی تھا۔ برساتی کی ٹوپی کی وجہ سے میں سراپا چھپ گیا تھا۔ میرے پاس بھرا ہوا پسٹل تھا۔ فالتو راؤنڈ میں نے پتلون اور برساتی کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔ جونہی ہماری لانچ بجرے کے نزدیک پہنچی اوپر عرشے پر ایک سایہ نظر آنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لانچ کا انجن بند ہوا تو فضا میں جیسے سکوت سا پیدا ہو گیا۔ اس سکوت میں بس دھڑا دھڑ برستی بارش کی صدا تھی۔

"کیا بات ہے پالے؟" اوپر سے مسلح سائے نے ہندی میں پکار کر کہا۔

ادھر پسٹل کی نال پال یا "پالے" کی کنپٹی پر تھی۔ اس نے وہی جواب دینا تھا جو ہم چاہتے تھے وہ زور سے بولا "معذرت مت کرنا' میں تم کو پریشان کر رہا ہوں۔ دراصل میری سالی اسپتال میں ہے۔ اس کی طرف جانا ہے۔ شاید سویرے وقت پہ واپس نہ پہنچ سکوں۔ ڈیزل اور دوسرا سامان لایا ہوں۔ اگر ہو سکے تو ذرا اتروا دو۔"

اوپر سے بڑے بیزار لہجے میں جواب ملا "اگر لے ہی آئے ہو تو اب اتار بھی خود لو۔" اس کے ساتھ ہی ہیولا چند قدم پیچھے ہٹ کر سائبان تلے کھڑا ہو گیا۔

یہ صورتِ حال بھی بری نہیں تھی۔ میں نے پاشا کے ساتھ مل کر ڈرم کندھے پر اٹھایا اور لانچ کے اوپر سے بجرے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ وزن کافی تھا۔ بجرے کے چکنے فرش پر پھسلن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال میں نے ڈرم مقررہ جگہ پر رکھ دیا اور واپس پلٹ آیا۔ اگلے پھیرے میں میں نے سامان سے لدے ہوئے دو بڑے تھیلے بجرے پر پہنچا دیئے۔

"وہ تمہارا ہیلپر کدھر مر گیا ہے آج؟" مسلح شخص نے عرشے پر سے بلند آواز میں پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ جواب دینے سے پول کھلتا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ رائفل مین میرے نزدیک آئے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے دوبارہ مجھ سے ہیلپر کے بارے میں پوچھا۔ شاید اس نے خیال کر لیا تھا کہ تیز بارش کے سبب اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی۔ اسی دوران میں ایک اور مسلح شخص بھی عرشے پر دکھائی دینے لگا۔ دونوں شاید آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔ سارا معاملہ گڑبڑ ہو رہا تھا۔ جب تک وہ میرے نزدیک نہ آتے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میں مزید وہیں کھڑا رہتا تو زیادہ مشکوک ہو جاتا۔ ایسے میں دونوں گارڈز مجھے دور ہی سے نشانہ بنا سکتے تھے۔ میں نے گارڈز کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور لانچ میں سوار ہو گیا۔ میری ہدایت پر ڈرائیور پال نے لانچ دوبارہ اسٹارٹ کرنے میں تھوڑی سی دیر لگائی۔ میرا خیال تھا کہ اس دوران میں شاید گارڈز واپس چلے جائیں اور مجھے پھر سے بجرے پر اترنے کا موقع مل جائے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

میں نے بڑی تیزی سے اپنا پسٹل اور اس کے فالتو راؤنڈ پولیتھین کے ایک لفافے میں لپیٹے اور قمیص کے اندر رکھ لیے۔ جب لانچ بجرے سے کوئی چالیس پچاس گز دور آ گئی تو میں نے پاشا کا ہاتھ دبایا اور خاموشی سے پانی میں اتر گیا۔ لانچ ساحل کی طرف نکل گئی اور میں بڑی احتیاط سے تیرتا ہوا واپس بجرے تک پہنچ گیا۔ بہت عرصے بعد تیرنا پڑا تھا اور وہ بھی حرکت کرتے ہوئے سمندر میں۔ ہاتھ پاؤں بری طرح شل ہو گئے۔ بجرے پر چڑھنے سے پہلے ہی میں نے کافی دیر تک سانسیں درست کیں' پھر ایک جنگلے کے سہارے اوپر پہنچ گیا۔ عرشہ اب خالی تھا۔ دونوں مسلح گارڈز لانچ کو رخصت کرنے کے بعد پھر کسی کیبن میں گھس چکے تھے۔

میں نے برساتی اتار کر ایک تاریک گوشے میں پھینک دی۔ موٹی لفافے سے پسٹل نکال کر میں نے جیب میں رکھ لیا۔ اب میں کسی بھی صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔

ایک گول روشن دان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر جھانکا۔ اندر سرخ پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا جو

منظر مجھے دکھائی دیا وہ خالی کمرے کا تھا۔ اس کیبن نما کمرے میں بہت سی فلمی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ زیادہ تر انڈین ایکٹریسوں کے نیم عریاں پوسٹر تھے۔ ایک الماری میں شراب کی بوتلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ایک اگلا روشن دان بالکل تاریک تھا۔ تیسرے روشن دان میں پھر بجلی روشنی تھی۔ میں نے ایک لحیم شحیم شخص کو دیکھا۔ اس کا سر منڈھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ذہن میں کسی حبشی پہلوان کا تصور ابھرتا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی گرانڈیل شخص بجرنگ ہے۔ بجرنگ جھک کر کوئی چیز دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر ایک روسی رائفل پڑی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ بجرنگ ہمہ وقت روسی رائفل سے مسلح رہتا ہے۔ اس سے چھوٹا ہتھیار اس کے پاس کبھی نہیں دیکھا گیا۔ آج میں یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں قدموں کی بہت مدھم چاپ سنائی دی۔ میں نے جھک کر اپنی پنڈلی میں سے رام پوری خنجر کھینچ لیا۔ صرف دو سیکنڈ بعد میں نے اپنے روبرو بجرنگ کے ایک گارڈ کو پایا۔ وہ برساتی میں تھا۔ اس کی رائفل ایک چوڑے اسٹریپ کے ذریعے اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ گارڈ رائفل سیدھی کرتا یا حلق سے کوئی آواز نکالتا' میں اسے دبوچ چکا تھا میرا بایاں ہاتھ اس کے منہ پر آیا۔ ممکن تھا کہ میں اس کی گردن مسل کر اسے بے ہوش کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی پھرتی نے اس کی موت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس نے چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکلنا چاہا اور میں نے بے رحمی سے رام پوری خنجر دستے تک اس کے سینے میں اتار دیا۔ وہ زور سے مچلا اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

میں اس کا جسم آہستہ سے فرش پر رکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے پیچھے سے لگنے والا دھکا اتنا شدید تھا کہ میں اوندھے منہ لہولہان گارڈ کے اوپر گرا اور وہاں سے پھسلتا ہوا کیبنوں کی چوبی دیوار سے ٹکرایا۔ مجھ پر حملہ آور ہونے والا گارڈ نمبر دو تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس کی رائفل دیکھ لی تھی لیکن اس نے میرے ہاتھ میں جان لیوا خنجر نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری طرف بڑھا تو اس کا پیٹ چاک ہو گیا اور انتڑیاں لٹک گئیں' ایک کریہہ آواز حلق سے نکال کر وہ میرے سامنے ہی گرا۔

یہی وقت تھا جب ایک گرج دار آواز بلند ہوئی۔ کسی نے سنہالی زبان میں مجھے ہینڈز اپ کرایا تھا۔ میں نے دیکھا لمبا تڑنگا یا گل بدمعاش مجھ سے فقط دس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس کی معروف رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل اسے کسی اپنے ہی جیسے فاتر العقل روسی عہدے دار سے انعام میں ملی ہوئی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان اس کے دو کارندوں کی لاشیں تھیں اور بارش کی بوچھاڑ تھی۔ کارندوں کی تڑپتی لاشیں دیکھ کر بجرنگ کے سارے جسم کا خون اس کے دماغ کو چڑھ گیا تھا اور اس کی آنکھیں واقعی کسی جنونی کی آنکھیں نظر آنے لگی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرا نام پتا پوچھے بغیر مجھے گولی مار دے گا لیکن پھر وہ تھوڑا سا سنبھل کر کرخت آواز میں بولا "اگر میں غلطی نہیں کر رہا کامریڈ! تو تم وہی ہو جس سے آج ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ تم ایک سمجھ دار شخص ہو لیکن تم تو ایک نمبر کے بے وقوف نکلے۔ سمجھو کہ تم اپنی موت کے پروانے پر اپنے ہاتھوں سے دستخط کر چکے ہو۔" اس نے جنونی نظروں سے اپنے گارڈز کی لاشوں کو دیکھا۔ ایک لاش میں ابھی تک تھرتھراہٹ موجود تھی۔ عرشے پر بہنے والا خون بارش کے پانی میں شامل ہو کر دور تک پھیل گیا تھا۔

بجرنگ بڑے دھیان سے مجھے دیکھتا رہا پھر منہ سے چچ چچ کی آواز نکالتے ہوئے بولا "اس لونڈیا کو چھڑانے آئے ہو ناں۔ بڑے بہادر ہو۔ بالکل انڈین فلموں کے ہیرو کی طرح۔ بھیگے ہوئے کپڑے' ماتھے سے چپکے ہوئے بال' ہاتھ میں سرخ خنجر۔ تمہاری تصویر تو اخبار میں چھپنی چاہیے۔ ضرور چھپنی چاہیے۔ چلو ٹھیک ہے' نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کل ہی تمہاری تصویر اخبار میں چھپوا دیتے ہیں۔ ہاں کل ہی چھپوا دیتے ہیں۔ فرنٹ پیج ٹھیک رہے گا ناں۔" اس کی آواز میں ہیجان نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی رائفل کو بار بار عجیب انداز سے حرکت بھی دے رہا تھا۔ جیسے رائفل کوئی جانور ہو جو بار بار اس کے ہاتھ سے نکل جانا چاہ رہا ہو۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں سوئچ بورڈ کے بالکل قریب کھڑا ہوں۔ ایک کندھا سوئچ بورڈ سے تقریباً چھو رہا تھا۔ یہ بڑی موزوں صورت حال تھی۔ ایسی صورتِ حال سے میں ایک مرتبہ پہلے بھی فائدہ اٹھا چکا تھا۔ بجرنگ نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظر ادھر ادھر گھمائی۔ شاید وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ میرا کوئی ساتھی تو آس پاس موجود نہیں۔ میرے لیے یہ مہلت "کافی سے بھی زیادہ" تھی۔ میں نے کندھے کے دباؤ سے وہ اکلوتا بٹن آف کر دیا جو سوئچ بورڈ پر آن نظر آ رہا تھا۔ یہی ایک لائٹ تھی جو عرشے کو روشن کر رہی تھی۔ تاریکی ہوتے ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ دھماکوں کے ساتھ عرشے پر انگارے سے بکھرے۔ بجرنگ نے برسٹ چلایا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا برسٹ چلاتا' میں اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے خنجر سے اس کی چھاتی پر وار کیا تھا مگر یہ وار وچھاپڑا اور بجرنگ کے کندھے اور گردن کے درمیان کہیں لگا۔ خنجر کے ساتھ میرا بڑا پرانا واسطہ تھا۔ یہ اس وقت میرا ساتھی بنا تھا جب معصوم شگفتہ پر راشد بن ارشد نے بری نگاہ ڈالی تھی۔ اب میں اس خنجر کا مزاج آشنا بن چکا تھا۔ اس کا لمس' اس کی چمک' اس کی حرکت' ہر چیز میرے لیے ایک خاص معنی رکھتی تھی۔ شب و روز کے جان لیوا ہنگاموں میں بڑے بڑے سورما اس خنجر کی دھار تلے آئے تھے۔ میرے اس بے زبان رام پوری ساتھی نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ میرا دوست عالم قریشی کہا کرتا تھا' جس طرح لاکھوں روپے سے تیار کیا گیا کھانا بھی دو چار روپے کے نمک کے بغیر بیکار ہے' اسی طرح استاد جہانی بھی اس ایک فٹ لمبے چاقو کے بغیر بے معنی ہے۔

خنجر بجرنگ کے گوشت سے ٹکرایا تو مجھے اس کے گوشت کی سختی اور زبردست قوت کا اندازہ ہوا۔ ایک چنگھاڑ کے ساتھ بجرنگ نے اپنی وزنی رائفل کو لٹھ کی طرح گھمایا۔ میں نے بروقت جھک کر یہ وار بچایا میری زوردار لات بجرنگ کے پیٹ پر پڑی۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میں نے زیریں عرشے پر رائفل کے گرنے کی تسلی بخش آواز سنی۔ خود کو سنبھالتا ہوا میں بجرنگ کی طرف لپکا۔ بجرنگ نے عرشے کے نیچے لگژری کیبن کی طرف دوڑ لگائی۔ میں نے سیڑھیاں اترتے اترتے اس پر جست لگا دی۔ ہم ایک دروازہ توڑتے ہوئے نرم و گداز قالین پر گرے۔ میرے کانوں میں ایک سریلی چیخ گونجی۔ یہ یقیناً توسیہ ہی کی تھی لیکن اس وقت میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ توسیہ کو دیکھ سکوں۔ میں نے بجرنگ پر خنجر کا وار کیا' اس نے دونوں ہاتھوں سے میری کلائی دبوچ لی اور بازو موڑنے لگا۔ اس کے وحشیانہ جنون نے اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے سر کی دو بھرپور ضربیں اس کے چہرے پر لگائیں' اس کی گرفت پھر بھی ڈھیلی نہیں پڑی' اس کے حلق سے غضب ناک چنگھاڑیں برآمد ہو رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں کسی انسان سے نہیں' بپھرے ہوئے جانور سے لڑ رہا ہوں۔ بہرحال میرے سر کی تیسری ضرب نے اسے نڈھال کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی چھڑائی اور پھر خنجر کا وار کیا۔ میں نے اس کے پیٹ کو نشانہ بنایا تھا لیکن خنجر کا خون آلود دستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ یکایک مجھے اندازہ ہوا کہ میں مصیبت میں ہوں۔ بجرنگ نے یکایک مجھے عقب سے دبوچ لیا تھا۔ یہ خالص پہلوانی قسم کا داؤ تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں نے میری کمر جکڑ لی تھی اور بازوؤں نے گردن کو اس طرح شکنجے میں لیا تھا کہ میں زیادہ زور لگانے کی صورت میں اپنی ہی گردن کو نقصان پہنچاتا۔ وہ عقب سے جونک کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ میں نے کیبن کا جائزہ لیا۔ توسیہ ایک اسٹریچر نما بستر پر بیٹھی تھی۔ اس نے لڑکوں کی طرح نیکر اور بنیان پہن رکھی تھی۔ چہرہ خوف کی تصویر تھا۔ اس نے اپنی شفاف گردن پر زرد رنگ کی کوئی مرہم لگا رکھی تھی۔

مجھے بجرنگ کے خوفناک شکنجے میں دیکھ کر اس نے میری مدد کرنے کی کوشش کی۔ میرا خون آلود خنجر بجرنگ نے ران سے نکال کر پھینک دیا تھا یا شاید وہ خود ہی نکل گیا تھا۔ اب یہ خنجر توسیہ کے بستر کے پاس ہی پڑا تھا۔ توسیہ نے خنجر تک پہنچنا چاہا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس کی ایک کلائی اسٹیل کی چمک دار ہتھکڑی میں جکڑی ہوئی ہے۔ توسیہ نے پاؤں کی مدد سے بار بار خنجر کو میری جانب دھکیلنے کی کوشش کی لیکن بس جزوی کامیابی ہی حاصل کر سکی۔ بجرنگ میری گردن پر وحشیانہ دباؤ ڈال رہا تھا اور ساتھ ساتھ پھنکار رہا تھا "نہیں دوں گا لونڈیا۔ نہیں دوں گا۔ اب مر کر بھی نہیں دوں گا۔" اس کے لہجے میں جنونی کیفیت تھی۔

اگلے ایک منٹ میں زبردست کشمکش ہوئی اور میں خود کو بجرنگ کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب رہا پھر خنجر بھی میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے بجرنگ کو خنجر سے کم از کم چھ زخم لگائے۔ ان چھ میں سے دو گہرے زخم پیٹ پر تھے۔ ہر زخم پر بجرنگ نے چیخنے کے بجائے ایک وحشیانہ قسم کی چنگھاڑ بلند کی۔ اس کے اندر روح کے بجائے جیسے کوئی بدروح تھی جو جسم میں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ خود کو مجھ سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا بجرنگ عرشے کے جنگلے سے ٹکرایا اور پھر قلابازی کھا کر تقریباً پندرہ فٹ نیچے پختہ فرش پر جا گرا۔ اس کے جسم سے خون فواروں کی صورت میں نکل رہا تھا۔

اس نے عرشے کی طرف دیکھ کر مجھے گالی دی اور جنونی انداز میں چیخا "نہیں دوں گا لونڈیا۔ نہیں دوں گا۔" یہ ایک مرتے ہوئے شخص کی آواز تھی۔

میں نے اسے شوٹ کرنے کے لیے پستول نکالا لیکن اس سے پہلے ہی وہ انجن روم کی طرف رینگ گیا۔ میں پستول کا سیفٹی کیچ ہٹاتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اترا۔ انجن روم تک پہنچنے کے لیے مجھے زیریں عرشے کے گرد چھوٹا سا چکر کاٹنا تھا۔ درحقیقت یہ چھوٹا سا چکر ہی میری زندگی کا وسیلہ بن گیا۔ اگر مجھے اس چھوٹے سے چکر کی وجہ سے دو سیکنڈ کی تاخیر نہ ہوتی تو

بجرنگ کے ساتھ ہی میرا جسم بھی سیکڑوں ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔ وہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انجن روم کی طرف سے شعلے نکلے اور چند لمحوں کے لیے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ دھماکے کے ساتھ ہی میں نے خود کو اوندھے منہ فرش پر گرا لیا تھا۔ میرے عین سامنے میرے مقتول گارڈ کی لاش پڑی تھی۔

دھواں سیاہ بادل کی طرح بجرے کو ڈھانپنے لگا تھا۔ میں اٹھ کر دھماکے والی جگہ کی طرف بھاگا۔ انجن روم سے دو چار میٹر کے فاصلے پر مجھے بجرنگ کی کٹی ہوئی ٹانگ نظر آئی اور کھوپڑی کا ٹوٹا ہوا حصہ دکھائی دیا۔ جیسے کسی نے سڑا ہوا تربوز پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ڈائنا مائٹ کے چند ٹکڑوں پر بھی نظر پڑی۔ یقیناً یہ وہی ڈائنا مائٹ تھے جنہیں مچھلیوں کے بعض شکاری ناجائز شکار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے اندر یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ بجرنگ نے اسٹور روم میں گھس کر دو چار ڈائنا مائٹ ایک ساتھ اڑا دیے ہیں۔ دھوئیں کے مرغولوں میں رستہ بناتا ہوا اور کھانستا ہوا میں اسٹور روم سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس سے آگے جانا بہت خطرناک تھا۔ عین ممکن تھا کہ ابھی کچھ دھماکا خیز مواد باقی ہو۔ ہر طرف بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے عجیب سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی آبشار گرتا ہے۔ میں نے دو قدم مزید بڑھ کر اسٹور روم میں جھانکا اور میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ سمندر کا پانی واقعی ایک آبشار کی طرح بجرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دھماکا خیز مواد نے قریباً چھ مربع فٹ جگہ سے فرش اڑا کر رکھ دیا تھا اور اب یہ جگہ پانی کی گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ ایک دم مجھے اپنے پاؤں کے قریب ہی پانی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بجرا تیزی سے پانی کے اندر جا رہا تھا۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنے کی ضرورت تھی۔ میں دوڑتا ہوا اپنی لگژری کیبن میں پہنچا۔ توسیہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ پورا کیبن بلکہ بجرا ہی ایک طرف کو جھکتا چلا جا رہا ہے۔ ہم ڈوب رہے تھے۔

میں توسیہ کی طرف بڑھا اور یکایک مجھے خطرے کی سنگینی کا پتا چلا۔ اس تیزی سے ڈوبتے ہوئے بجرے میں توسیہ ایک ہتھکڑی میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا ایک مضبوط آہنی بار سے منسلک تھا۔

"ہتھکڑی کی چابی کدھر ہوگی؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بے حد مہین اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی "وہ اس کی جیب میں رہتی ہے۔" توسیہ کا اشارہ یقیناً بجرنگ کی طرف تھا۔

میں نے ہتھکڑی کو جھنجوڑ کر دیکھا پھر میرا دھیان اپنے پسٹل کی طرف گیا۔ فائر کر کے زنجیر کو توڑنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن پسٹل... پسٹل کہاں تھا؟ مجھے یاد آیا کہ وہ میں نے اسٹور روم کے سامنے لکڑی کے تختے پر رکھ دیا تھا۔ میں پسٹل لینے کے لیے دوبارہ اسٹور روم کی طرف دوڑا۔ یوں لگا جیسے میں دوڑنا بھول گیا ہوں۔ میرا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا اور میں نے دیوار کو تھام لیا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ بجرا خطرناک زاویے سے اپنے دائیں پہلو پر جھک چکا ہے۔ توسیہ بیٹھی ہوئی آواز میں مسلسل چیخ رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات سترھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

شاہجہان عرف جہانی اُستاد کی ہنگامہ خیز سرگزشت
تاوان
طاہر جاوید مغل

حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنادیا تھا

اس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنادیا تھا۔ وہ پیدا ہوا تو اس کا نام شاہ جہاں رکھا گیا۔ مگر دُنیا نے اسے جہانی اُستاد کے نام سے پہچانا۔ اکڑی ہوئی گردنیں اس کے رُوبرو خم ہوتی چلی گئیں۔ جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے نام اس کے سامنے بُجھ گئے۔ قانون کے محافظوں کے لئے وہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اس نے خود کو قانون کے حوالے کردیا۔ لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں اس کا مقدر بنیں مگر گردش حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ زندگی جہانی اُستاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی ہر نئی کروٹ اُسے ان جانے راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادلِ ناخواستہ اس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے پیچ اور نوکے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک تیز رفتار سرگزشت

میں نے سیڑھیاں اتر کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کا پسٹل مجھے دکھائی دے گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں پسٹل تک پہنچتا' وہ تختے کے اوپر سے پھسلا اور میری آنکھوں کے سامنے جنگلے سے گزر کر پانی میں جاگرا۔ میرے سینے میں مایوسی کی ایک تیز لہر ابھری اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

بجرا بڑی تیزی سے اپنے پہلو پر جھکتا چلا جارہا تھا۔ پانی زیریں عرشے سے اوپر آگیا تھا اور مزید اوپر آرہا تھا۔ بجرے کا توازن خراب ہوجانے سے کئی اشیا میرے سامنے پھسلتی ہوئی پانی میں گریں۔ لگژری کیبن سے قوسیہ کی چیخیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ یہ بڑے سنگین لمحے تھے میں اپنی جان تو بچا سکتا تھا' لیکن قوسیہ کی جان بچانے کے لیے مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت تھی۔ ہتھیار کے بغیر اس کے بازو کو ہتھکڑی سے چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ دفعتاً میرا دھیان اس روسی رائفل کی طرف چلا گیا جو کچھ دیر پہلے بجرنگ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زیریں عرشے پر گری تھی۔ زیریں عرشے کی ایک روشنی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نیچے اترنے والی سیڑھی کے قریب پہنچ رہا تھا۔ چند قدم آگے گیا تو بجرنگ کی روسی رائفل مجھے نظر آگئی۔ وہ ایک الٹی ہوئی میز پر ترچھی پڑی تھی۔ اس کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ پسٹل کی طرح وہ بھی کسی وقت سمندر میں گر سکتی ہے۔

میں رائفل تک پہنچا اور پھر سیڑھیاں چڑھتا ہوا واپس لگژری کیبن میں آگیا۔ قوسیہ ہیجانی انداز میں بار بار اپنی ہتھکڑی کو جھٹکے دے رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب اچانک در و دیوار گھوم گئے۔ پورے کا پورا بجرا اپنے بائیں پہلو پر الٹا تھا اور پانی میں اوجھل ہونے لگا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سمندر کا نمکین پانی فراٹے بھرتا ہوا کیبن میں داخل ہونے لگا۔ کیبن کی ایک جانب کے شیشے چھناکوں سے ٹوٹ گئے تھے۔ قوسیہ کی پوزیشن عجیب ہوگئی تھی۔ وہ پہلے بستر پر بیٹھی تھی اب بجرا الٹنے سے وہ ہوا میں معلق ہوگئی تھی۔ ہتھکڑی والا ہاتھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر پانی کی سطح خطرناک حد تک اونچی ہوگئی۔ کیبن کا فرش اب میرے لیے دیوار کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ میں اس دیوار پر چڑھتا ہوا قوسیہ کے نزدیک پہنچا۔ وہ گھرا کر بولی "جلدی کرو۔ میں ڈوب رہی ہوں۔"

میں نے کہا "تم اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرو۔ میں ہتھکڑی پر فائر کرتا ہوں۔"

"لیکن۔" وہ منمنائی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ گھبراؤ مت۔"

اس نے اپنا چہرہ اور جسم ہتھکڑی کے زیریں سرے سے دور ہٹا لیا۔ بجرنگ نے اس رائفل سے مجھ پر برسٹ چلایا تھا۔ رائفل ابھی تک برسٹ پر ہی سیٹ تھی۔ میں نے اسے سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور اوپر تلے دو فائر ہتھکڑی کی زنجیر پر کیے۔ اسٹیل کی زنجیر ٹوٹ گئی۔

پانی اب ہمارے سروں کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ یہ لگژری کیبن پورے کا پورا پانی سے بھر گیا تھا۔ سمندری پانی کا ایک خاص ذائقہ اور بو باس ہوتی ہے۔ یہ نمکین پانی ہماری آنکھوں اور نتھنوں میں گھس رہا تھا۔ ایک طرح سے یہ پانی کی قبر تھی جس میں ہم کچھ دیر کے لیے دفن ہو گئے تھے۔

توسیہ کے ہاتھ پاؤں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بڑی اچھی تیراک ہے، لیکن جس جگہ ہم پھنس گئے تھے وہاں سے زندہ بچنے کے لیے فن تیراکی سے زیادہ قسمت کا اچھا ہونا ضروری تھا۔ کیبن کی جس دیوار نے چھت کی شکل اختیار کی تھی اس میں کوئی کھڑکی موجود نہیں تھی ورنہ ہم اوپر کی طرف نکل جاتے۔ اب ہمیں اس دیوار کی طرف جانا تھا جس نے فرش کی جگہ لی تھی۔ اس دیوار میں وہ دروازہ تھا جس میں سے تھوڑی دیر پہلے گزر کر میں اندر آیا تھا۔ میں نے توسیہ کا بازو تھاما اور غوطہ خوری کے انداز میں مزید نیچے کی طرف گیا۔ کیبن کے پانی میں تیرتی ہوئی ان گنت چیزیں ہم سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہم کیبن کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے توسیہ کی آنکھوں کو شدید خوف کے عالم میں کھلتے ہوئے دیکھا، ہم سے صرف چند فٹ کی دوری پر ایک گارڈ کی لاش پانی میں تیر رہی تھی۔ اس کی قمیض ملبے کے ایک حصے میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کا پیٹ میرے خنجر سے چاک ہوا تھا۔ اس کی انتڑیاں پانی میں معلق تھیں۔

ہم اس لاش سے پہلو بچاتے ہوئے اوپر کی طرف اٹھے۔ ہم کوئی تجربہ کار غوطہ خور نہیں تھے۔ تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ہی دم سینے میں گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ توسیہ کی بہت بری حالت تھی، یوں لگتا تھا کہ ابھی دو چار سیکنڈ میں اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ میں نے اس کا بازو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور حتی الامکان تیزی سے اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک نہایت سخت اور کٹھن کوشش ثابت ہوئی۔ توسیہ کا دم راستے میں ہی ٹوٹ گیا۔ خود میرے منہ میں بھی نمکین پانی چلا گیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طور میں توسیہ کو سطح آب پر لانے میں کامیاب ہوا۔ وہ بری طرح کھانس رہی تھی اور ابکائیاں لے رہی تھی۔

سطح آب پر آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ بجرا پورے کا پورا پانی میں نہیں ڈوبا تھا۔ اس کے دائیں پہلو کا کچھ حصہ اب بھی پانی سے باہر تھا۔ دراصل یہاں سمندر بہت زیادہ گہرا نہیں تھا۔ بجرے کا زیریں حصہ کہیں تہ میں ٹک گیا تھا۔ یہ صورت حال ہمارے حق میں تھی۔ میں نے کوشش کی اور بدحال توسیہ کے ساتھ بجرے کے پہلو کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم جس حصے پر تھے اس کا رقبہ بمشکل پندرہ فٹ ضرب دس فٹ ہو گا۔ باقی تمام بجرا پانی کے اندر تھا۔

میں نے توسیہ کو ہموار سطح پر لٹا دیا۔ وہ اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی نیکر اور شرٹ جسم کے ساتھ چپک گئی تھیں اور جسم ہی کا حصہ نظر آتی تھیں۔ الفاظ اس کی زبان سے ٹکڑوں کی شکل میں ادا ہو رہے تھے۔ وہ سراپا لرز رہی تھی "یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اس طرح اسے پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھامتے ہوئے کہا "یہ رونے کا نہیں شکر کرنے کا مقام ہے۔ تم دوسری دفعہ موت کے منہ سے بچی ہو اور اس دفعہ جو کچھ ہوا ہے اس میں سراسر تمہارا اپنا قصور تھا۔ شاید تمہیں ٹھیک سے اندازہ نہیں کہ تم یہاں کتنے خطرناک بندے کے چنگل میں آ پھنسی تھیں۔"

"ہاں۔ مم۔ میں جانتی ہوں، وہ بڑا خطرناک تھا، وہ پاگل خانے سے چھوٹا ہوا تھا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اس نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"اس سے بڑا میرا اور کیا نقصان ہو گا کہ میں اب تک زندہ ہوں۔ میں مر کیوں نہیں گئی، میں مر کیوں نہیں جاتی۔ اس ذلت کی زندگی سے میری جان چھوٹ کیوں نہیں جاتی۔"

وہ ایک بار پھر مرنے کی باتیں کر رہی تھیں۔ حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے زندہ رہنے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلاتے دیکھا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں کہا "توسیہ! زندگی اتنی بری نہیں۔ تم اپنی ضد کی وجہ سے اسے اتنا برا بنا رہی ہو۔ جو کچھ تمہاری بھلائی کے لیے کیا جانا ہے تم اسے اپنے

نقصان میں سمجھتی ہو۔ یہ تمہارے نقصان میں نہیں ہے۔ خدا گواہ ہے کہ یہ تمہارے نقصان میں نہیں ہے۔"

وہ چپ رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ایک کلائی میں ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی جھول رہی تھی۔ ایسے میں وہ بے چارگی کی تصویر نظر آئی۔ میرے دل کی عجب کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "توسیہ۔" میں نے بڑی اپنائیت سے مخاطب کیا "میں جانتا ہوں تمہارے سلسلے میں مجھ سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ مایوسی کے عالم میں مجھے سختی کرنی پڑی ہے، قید و بند میں رکھنا پڑا ہے۔ کبھی کبھی یہ سب کچھ حد سے تجاوز بھی کر گیا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس پر شرمندہ ہوں۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اب چاہتا ہوں۔ میرے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے تمہاری بھلائی۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں نے تمہاری بھلائی کا ٹھیکا کیوں لے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی تم کئی اعتراضات مجھ پر کر سکتی ہو لیکن تم میری نیت پر شک نہیں کر سکتی ہو اور اگر کرو گی تو وہ بالکل غلط ہو گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی "میں تمہاری کسی بات کو جھٹلاتی نہیں ہوں۔ لیکن تم بھی یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں کوئی ناداں بچی نہیں ہوں۔ ایک بالغ اور پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ برا اچھا پرکھ سکتی ہوں۔ تم جس شخص کے ساتھ مجھے نتھی کرنا چاہتے ہو، میں اس کا سایہ بھی اپنے قریب پسند نہیں کرتی۔"

"تم نے کہا ہے کہ تم ناداں بچی نہیں ہو، لیکن تمہاری بات تمہارے عمل سے غلط ثابت ہوتی ہے۔ دیکھو توسیہ! کسی بھی شخص کے لیے اس کی ماں سے بہتر اور کوئی نہیں سوچ سکتا۔ تمہاری والدہ بھی تمہارے بارے میں جو کچھ سوچتی ہیں وہ بہترین ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہاری والدہ کیا سوچتی ہیں۔ وہ تمہیں بدلنے کے لیے دن رات اپنی جان ہلکان کر رہی ہیں۔ وہ باؤلی سی ہو گئی ہیں۔ تمہاری خاطر سائیں عالی کے سامنے رو رو کر وہ نیم بے ہوش ہو گئی تھیں اور اس سے پہلے بھی وہ پتا نہیں کتنے پیروں فقیروں کی چوکھٹوں پر گریہ زاری کر چکی ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ان کی گریہ زاری اور ان کا دکھ کوئی دکھاوے کی چیز ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس سر جھکائے بارش کے ان قطروں کو دیکھتی رہی جو ہمارے اردگرد سمندر کی چادر سے ٹکرا رہے تھے۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے توسیہ کو موت کے منہ سے واپس کھینچا تھا۔ ہاں ایسا دوسری بار ہوا تھا کہ میں نے اس کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالی تھی۔ شاید اب تھوڑا بہت اثر اس پر بھی ہو رہا تھا۔ مجھے اس کے دل میں کچھ نرمی محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس سے دو چار باتیں کروں۔ شاید ماحول گرم ہونے کی وجہ سے میری کوئی چوٹ کارگر ہو جاتی لیکن مسئلہ اپنے اردگرد ہلکورے لیتے ہوئے سمندر کا تھا۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ الٹا ہوا بجرا کتنی دیر سطح آب پر رہے گا اور رہ بھی سکے گا یا نہیں۔

ہمیں جلد از جلد محفوظ مقام تک پہنچنے کی ضرورت تھی۔ بارش مسلسل برس رہی تھی اور سمندر کے پانی میں بھی ہلچل موجود تھی۔

"یہ دیکھو۔ میرا خیال ہے کہ یہ کشتی ہے۔" توسیہ نے اپنی کانپتی انگلی سے بجرے کے اندرونی حصے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں یہ ہے تو کشتی ہی لیکن اسے بجرے سے اتارنا کافی مشکل ہو گا۔" میں نے کہا۔

تفریحی بجروں اور اسٹیمرز وغیرہ میں اس طرح کی چھوٹی کشتیاں موجود ہوتی ہیں۔ انہیں ہنگامی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے یا پھر جب کنارے پر جلدی اترنا ہو تو ایسی چھوٹی کشتیوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسی ہی یہ کشتی بجرے میں بھی تھی۔ اسے رسے سے باندھا گیا تھا۔

میں پانی میں اتر کر کشتی کی طرف بڑھا اور اسے بجرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ روسی رائفل بدستور میرے گلے سے جھول رہی تھی۔ یہ جدید طرز کی مہنگی رائفل تھی۔ پانی میں بھیگنے بلکہ بری طرح بھیگنے کے باوجود یہ استعمال کے قابل تھی۔ ایسی رائفلیں عام طور پر نیوی کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ کشتی ربڑ کی تھی۔ اس کے ساتھ سخت پلاسٹک کے دو عدد چپو تھے۔ بجرا الٹنے کی وجہ سے یہ کشتی بھی الٹ گئی تھی اور رسوں میں الجھی ہوئی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی سخت کوشش کے بعد میں اسے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ بجرے سے علیحدہ ہوتے ہی سرخ رنگ کی کشتی ابھر کر سطح آب پر آ گئی۔ میں نے کشتی سے منسلک نائیلون کی رسی کو ایک آہنی راڈ سے باندھ دیا۔ پھر توسیہ کے پاس آ گیا۔

"چلو آؤ چلیں۔" میں نے اس کا شانہ سہلاتے ہوئے کہا۔

"کہاں جائیں گے؟"

"کنارے کی طرف اور کہاں؟ زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

مشکل سے نصف کلو میٹر کی دوری ہو گی۔"
"لیکن۔ کنارے پر اگر پھر اسی بدمعاش کے بندے نکل آئے تو؟"
"یہاں بھی تو اس کے بندے تھے۔ انہوں نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے۔"

توبیہ نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں کچھ مختلف کیفیت تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ آج مجھے ایک دشمن کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہی۔ آج تک بہت کچھ ہو چکا تھا۔ توبیہ نے کئی بار اپنے سخت ترین رویے کا اظہار کیا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور خلوص کے جذبات موجود تھے۔ کسی وقت اس کی طرف دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ ثنا بھی تو اتنی ہی عمر کی ہے۔ وہ بھی تو قد کاٹھ میں ایسی ہی ہے۔ توبیہ کو دیکھ کر مجھے ثنا کا خیال آتا تھا تو یہ میرے اندر کے خلوص کا ہی کرشمہ تھا، ورنہ جو کچھ توبیہ اب تک کر چکی تھی اس کے بعد ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

میں توبیہ کو سہارا دیتا ہوا اٹھا۔ بجرے کی بیرونی دیوار کی سطح چکنی تھی۔ اس پر پاؤں جما کر چلنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے ابھی ایک دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ اچانک بجرے میں پھر حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اپنے بائیں پہلو پر مزید جھک گیا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے پیندے کا کچھ حصہ دکھائی دینے لگا تھا۔ ہم دونوں بھی اس حرکت کے سبب لڑکھڑا کر گر گئے۔ توبیہ میرے اوپر گری تھی۔ وہ پھسل کر پھر سے سمندر کے پانی میں جا سکتی تھی۔ اسے پھسلنے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے میری دائیں ٹانگ پیندے کے ایک کھوکھلے حصے میں گھس گئی۔ پاؤں ٹخنے تک نہ جانے کہاں الجھ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پنڈلی کے قریب کھال میں انگارہ سا گھس گیا ہے۔ دراصل ڈائنامیٹ کے دھماکوں کے بعد یہاں سے پیندے کی چادر ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ میرے اپنے ہی وزن سے میری ٹانگ نیچے چلی گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" توبیہ کے حلق سے چیخ سی نکل گئی۔
"کچھ نہیں خیریت ہے۔ بس ٹانگ ذرا پھنس گئی ہے۔"

میں نے ٹانگ نکالنے کے لیے زور لگایا تو ٹخنے کے قریب اٹھنے والی ٹیسیں مزید تیز ہو گئیں۔
"کیا بات ہے ٹانگ نکل نہیں رہی۔" توبیہ نے پوچھا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ بس پاؤں کو گھما پھرا کر آزاد کرانے کی کوشش کرتا رہا۔

توبیہ میری طرف بڑھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور گیلی چادر پر خوب جما جما کر پاؤں رکھ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ میری مدد کرنا چاہ رہی ہے لیکن اگلے سیکنڈ میں یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ توبیہ کے ہاتھ میں بجرے کا ایک ٹوٹا ہوا آہنی راڈ تھا۔ اس نے ایک چیخ بلند کی اور نہایت بے دردی سے میرے سر پر وار کیا۔

توبیہ کا وار اچٹتا ہوا میری کلائی پر پڑا اور دوسری ہلکی ضرب سر پر لگی۔ آنکھوں میں جگنو چمک گئے۔ توبیہ کا دوسرا وار میں نے ہاتھوں پر روکا۔ تیسرا وار پھر میرے سر پر لگا۔ چوتھا وار کندھے کو سن کر گیا۔ وہ وحشیانہ وار مجھ پر راڈ چلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی زنجیر ہوا کے ساتھ لہراتی ہوئی میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی تھی پھر شاید میری قسمت ہی اچھی تھی۔ گیلا راڈ توبیہ کے ہاتھ سے پھسل کر آہنی چادر سے ٹکرایا اور پانی میں جا گرا۔ توبیہ پلٹ کر کشتی کی طرف گئی۔ تیراکوں کے انداز میں اس نے پانی میں چھلانگ لگائی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ سب کچھ چند سیکنڈ کے اندر ہوا اور مجھے بھیانک سپنے کی طرح لگا۔

توبیہ اور کشتی دونوں مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میرا زاویہ ہی کچھ ایسا تھا۔ میں نے توبیہ کو چند بار پکارا مگر جواب ندارد پھر مجھے چپو چلنے کی مدھم آوازیں آئیں۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ ٹانگ بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔ اگر میں زیادہ زور لگاتا تو ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔ سینہ دکھ سے بھر گیا تھا۔ توبیہ نے یہ رویہ چند دن یا چند ہفتے بعد اپنایا ہوتا تو بھی بات تھی لیکن ابھی تو اس کی زندگی کی خاطر اپنی جان کو ہلکان کیے ہوئے مجھے ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا۔ بلکہ شاید آدھ گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ انتہائی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے پرانے راستے پر چل پڑی تھی۔ وہ واقعی شیخ عاصم کی بہن تھی۔

قریباً تین چار منٹ کے بعد مجھے اپنی پوزیشن سے توبیہ کی جھلک دکھائی دی۔ بجلی زور سے چمکی۔ مجھے سرخ کشتی میں تیکھے تیوروں والی توبیہ دکھائی دی۔ وہ تیزی سے چپو چلاتی ہوئی بہاؤ کے ساتھ کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ ایک دم سینے میں انگارے سے دہک اٹھے۔ روسی رائفل ابھی تک میری گردن سے جھول رہی تھی۔

میں نے رائفل اتاری اور کشتی کا نشانہ لے لیا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ایک برسٹ چلا کر اسے شوٹ

دوں لیکن یہ خیال صرف چند سیکنڈ کے لیے آیا۔ اس کے بعد آنکھوں میں پھوٹتی ہوئی چنگاریاں سرد پڑ گئیں۔ رائفل کا رخ کشتی کی طرف ہی رہا مگر میری شست "لبھی" سے بہت دور ہٹ گئی۔ میں کشتی کے ہیولے کو شور سے دور جاتے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی رہی اور اس چمک میں بارش کی بوچھاروں کے درمیان کشتی کا رنگ نمایاں ہوتا رہا۔

میں اپنے پھنسے ہوئے پاؤں کی پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اچانک پتا نہیں کس طرح پاؤں نکل آیا۔ اس سے پہلے میں زیادہ زور لگا چکا تھا لیکن پاؤں آزاد نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹخنے پر ہاتھ پھیرا۔ کھال چھل گئی تھی اور خون بھی رس رہا تھا۔ جوڑ بھٹ گیا تھا۔ میں نے رائفل سیدھی اور ادھر ادھر دیکھا تب دھیان آنے لگا۔ دور مغرب کی سمت کچھ فاصلے پر ساحل کی مدھم روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں پھر مجھے ایک لانچ کا ہیولا نظر آیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ وہی لانچ ہے جس پر میں اور ریاشا یہاں پہنچے تھے۔ لانچ کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ بارش میں لانچ کے انجن کا شور بہت مدھم سنائی دیتا تھا۔ جب لانچ چالیس پچاس میٹر کی دوری پر رہ گئی تو اس کی ہیڈ لائٹس آن ہو گئیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لانچ تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ لائٹ میرے جسم پر پڑنے لگی پھر ریاشا کی بلند آواز سنائی دی "یہ کیا۔ واشک جہاں! بجرا کہاں گیا؟"

"بجرا پانی پی رہا ہے۔" میں نے بھی بلند آواز سے کہا۔
"اور وہ حرامی پاگل؟" ریاشا نے پوچھا۔
"اس کی وجہ سے مچھلیاں پاگل ہونے والی ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مچھلیاں اس کا گوشت کھائیں گی تو پاگل ہی ہوں گی ناں۔ وہ مر چکا ہے۔"
"اور لڑکی؟"

میں نے سینے میں اٹھنے والی درد کی لہر دباتے ہوئے کہا "وہ چلی گئی ہے۔ تمہیں راستے میں نہیں ملی؟"
"شک تو ہوا تھا۔ کوئی چھوٹی کشتی گزری ہے۔"
"یہ وہی تھی۔ اب تو کنارے پر اتر کر غائب بھی ہو چکی ہو گی۔"
"لیکن اسے تو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔" ریاشا نے اچرج سے ہانک لگائی۔
"یار سب کچھ ادھر ہی پوچھو گے کہ مجھے یہاں سے [illegible] گے بھی؟"

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زندان میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت
300
روپے
بہترین کتابت،
خوبصورت گرد پوش
اور عمدہ طباعت کے ساتھ
محصول ڈاک 30 روپے
ناشر

پاشا کی ہدایت پر ڈرائیور لانچ کو ڈوبتے ہوئے بجرے کے بالکل قریب لے آیا۔ لانچ کی لائٹس میں نظر آ رہا تھا کہ پانی میں بڑے بڑے بلبلے بن رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ بجرا اب بھی دھیرے دھیرے ڈوب رہا ہے۔ پاشا نے ہاتھ بڑھایا اور مجھے لانچ پر کھینچ لیا۔ ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جاتے اتنا ہی اچھا تھا۔ بجرے کی غرقابی اور تین افراد کی ہلاکت کی صورت میں یہاں ایک سنگین واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ کوسٹ گارڈز کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔

لانچ کی اندرونی روشنی میں میں نے اپنے زخموں کا معائنہ کیا۔ سارا بازو لہولہان ہو رہا تھا۔ پنڈلی پر سے کھال بھی چھلی ہوئی تھی۔ بہرحال کوئی سنگین چوٹ نہیں آئی تھی۔ لانچ کا ڈرائیور ابھی تک پاشا کے گن پوائنٹ پر تھا۔ پاشا کی ہدایت پر ڈرائیور تیزی سے منڈالی کے ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ساحل پر پہنچ کر ہم نے اس سرخ کشتی کی تلاش شروع کی جس پر توسبہ فرار ہوئی تھی۔ جلد ہی لانچ کی روشنی میں ہمیں وہ کشتی کنارے سے قریب پچاس میٹر دور لہروں پر ڈگمگاتی نظر آئی۔ وہ خالی تھی۔ چپو غائب تھے۔

"کہیں وہ ڈوب تو نہیں گئی؟" پاشا نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں! اتنی کچی نہیں وہ۔ لگتا ہے کہ زبردست قسم کی تیراک بھی ہے۔"

"مگر تیرنے والے ہی ڈوبتے ہیں۔"

"وہ تیری نہیں ہے۔ کنارے پر پہنچ کر اتری ہے اور کشتی کو کھلا چھوڑ دیا ہے، جو لہروں کے زور سے واپس چلی گئی ہے۔"

جلد ہی ہمیں کنارے کی ریت میں توسبہ کے پاؤں کے نشانات مل گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں ننگے نسوانی پاؤں کے نقوش صاف پہچانے جا سکتے تھے۔

پاشا نے لانچ کے ڈرائیور کی مشکیں اچھی طرح کس دی تھیں اور اس کے منہ میں انجن صاف کرنے والا بدبودار کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ اب ڈرائیور کی طرف سے ہمیں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ہم نے رم جھم برستی بارش میں ٹارچوں کی مدد سے قریباً ایک گھنٹے تک توسبہ کی تلاش جاری رکھی۔ ساحل سے پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے سے ہی گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر کسی بھی شخص کا خود کو غائب کر لینا بہت آسان کام تھا۔ صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اب ہمارا یہاں مزید ٹھہرنا خطرناک تھا۔

○*○

اگلے دو تین روز بے حد ہنگامہ خیز تھے۔ جرگنگ کی موت اور نفرجی بجرا ڈوبنے کی خبر اخباروں میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ ہمیں ایک بار پھر اپنی رہائش گاہ تبدیل کرنا پڑی۔ پچھلی مرتبہ بھی توسبہ کے غائب ہو جانے کے بعد ہمیں ایسا کرنا پڑا تھا لیکن تب اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس مرتبہ یہ احتیاط بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ ہمیں گال روڈ والی رہائش گاہ تبدیل کیے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ وہاں کولمبو پولیس کی طرف سے زبردست دھاوا بولا گیا۔ نہ صرف یہ کہ ہماری رہائش گاہ کو تہ و بالا کر دیا گیا بلکہ آس پاس کے مکینوں کی بھی بہت کم بختی آئی۔ درجنوں معزز شہریوں کو گرفتار کیا گیا اور ان گنت "ملازم پیشہ" زیر حراست آئے۔

اس واقعے کے صرف چند گھنٹے بعد ایک اور نہایت سنگین واقعہ ہوا۔ رات دس گیارہ بجے کے لگ بھگ کچھ افراد جیپوں پر سوار پیٹے کے اس حویلی نما مکان تک پہنچے جہاں ہم نے ریسٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد کئی ہفتے گزارے تھے۔ اس مکان میں میجر جے کے کچھ دور کے رشتے دار رہائش پذیر تھے۔ اس کے علاوہ ہمارا ملازم سنگھاشی بھی بدقسمتی سے وہیں موجود تھا۔ مکان میں گھسنے والوں میں چند ایسے افراد بھی شامل تھے جن پر عرب ہونے کا شبہ تھا۔ ان لوگوں نے نہایت وحشت کے عالم میں اپنے سامنے آنے والے ہر فرد پر فائرنگ کی تھی۔ اس اندھا دھند فائرنگ میں تین افراد ہلاک اور نصف درجن کے قریب شدید زخمی ہوئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں سنگھاشی بھی شامل تھا۔ اس کی موت کی اطلاع میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ کچھ روز پہلے توسبہ نے گلاس سنگھاشی کے چہرے پر دے مارا تھا۔ اس چوٹ سے سنگھاشی کا ایک ہونٹ بری طرح کٹ گیا تھا اور اس پر ٹانکے وغیرہ لگوانا پڑے تھے۔ وہ اپنے کٹے ہوئے ہونٹ کے بارے میں بڑا فکرمند رہتا تھا۔ آج وہ ہونٹ نہیں رہا تھا اور نہ سنگھاشی خود رہا تھا۔

جے کو اس وحشیانہ فائرنگ کے واقعے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ دو روز اس کی آنکھیں سرخ رہی تھیں۔ میں اور پاشا کافی دیر اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتے رہے۔

پاشا نے کہا "شاہ جہاں! اس واقعے سے ایک بات پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔ توسبہ اپنے وارثوں کے پاس

پہنچ گئی ہے۔"

"ہاں۔ اس مرتبہ وہ اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔"

"سنا ہے اس کا بھائی بے حد سخت مزاج شخص ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ تمہارے ساتھ سنگین ٹکر لے چکا ہے۔"

"بے شک ایسا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن آج کل تو وہ منظر سے غائب ہے۔ تم نے خود بھی بتایا تھا کہ مقامی پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر "پٹیہ" میں ہونے والی کارروائی میں کس کا ہاتھ ہے؟"

"میرا دھیان شیخ عاصم کے بھتیجے شیخ اباز کی طرف جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے انکل کی خصلت رکھتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل سری لنکا میں ہے۔"

"شیخ اباز۔" پاشا نے زیر لب دہرایا "یہ نام کچھ سنا ہوا لگ رہا ہے۔ بلکہ بہت اچھی طرح سنا ہوا ہے۔ اب یاد نہیں آ رہا۔"

پاشا کچھ دیر تک اپنے ذہن پر زور دیتا رہا، پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اسے یاد آ گیا تھا۔ وہ پرتشویش لہجے میں بولا "یہ تو بڑا خطرناک شخص ہے۔ غصے میں ہو تو بندے کو بلاوجہ بھی گولی مار سکتا ہے۔ لڑکیوں کو بھنبھوڑنے اور انہیں خراب کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اوہ مائی گاڈ۔ مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ اس نے دو برس پہلے امارات کے ایک مشہور فٹ بالر کو صرف اس لیے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ وہ ایک اہم میچ میں اچھا کھیل نہیں دکھا سکا۔ اسی سال لندن میں اباز کا ایک رقیب روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا۔ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ ایک "طے شدہ" ایکسیڈنٹ تھا۔ ایک ٹی وی اداکارہ کے چکر میں یہ خون شیخ اباز کے ہاتھوں ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے درجنوں واقعات ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ شیخ اباز، شیخ عاصم ہی کا رشتے دار ہے۔"

ہماری یہ گفتگو ٹیمپل روڈ کی ایک کوٹھی میں ہو رہی تھی۔ اس کوٹھی میں ہم ایک روز پہلے ہی منتقل ہوئے تھے۔ پاشا بڑی رازداری سے یہاں پہنچا تھا۔ ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ جے کا ایک ملازم ہانپتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے نئی اطلاع دیتے ہوئے بتایا "پٹیہ والے مکان میں کسی نے دو دستی بم پھینکے ہیں۔ دو تین کمروں کی چھتیں گر گئی ہیں اور آگ لگ گئی ہے۔"

"کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شام کے فوراً بعد۔ یہی کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔"

"کوئی ہلاکت تو نہیں ہوئی؟"

"ابھی کچھ خبر نہیں ہے جی۔ لگتا ہے کہ مالی نقصان کافی ہو گا۔ آگ ساتھ والے گھروں تک بھی چلی گئی ہے۔ پچھواڑے میں حاجی زماں خاں کا مسالے کا گودام بھی لپیٹ میں آ گیا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد یانا کا فون بھی آ گیا۔ اس نے بھی آتشزدگی کی اطلاع دی۔ اس نے بتایا کہ آگ کئی گھروں تک پھیل گئی ہے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن فون پر بھی سنائی دے رہے تھے۔ یانا نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا "اپن کو یقین ہے جی کہ یہ کل والے لوگوں کا ہی کام ہے۔"

میں نے کہا "حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کل والے واقعے کے بعد وہاں پولیس کے گارڈ بھی موجود تھے پھر بھی دستی بم پھینکنے والا اپنا کام کر گیا۔"

یانا بولا "کیا پتہ جی کہ پولیس والوں میں ہی کوئی کالی بھیڑ موجود ہو۔ یہ امارات کا بہت امیر لوگ ہے، ہر طرح کے لوگوں کو خرید سکتا ہے۔"

یانا کی بات بھی صحیح تھی۔ مقامی پولیس میں شیخ عاصم اینڈ کمپنی کا بہت اثر و رسوخ نظر آتا تھا۔

یہ نیا واقعہ ہماری تشویش میں زبردست اضافہ کر گیا۔ اس واقعے سے اس غیر معمولی غیض و غضب کا اندازہ بھی ہوتا تھا جو اماراتی شہزادوں کے دلوں میں میرے خلاف موجود تھا۔ انہوں نے وہ بستی ہی خاکستر کر دینا چاہی تھی جہاں میرے قدم پڑے تھے اور جہاں میں نے توسبہ کے ساتھ قیام کیا تھا۔

یوں لگتا تھا کہ توسبہ نے اپنے لواحقین کو بس تصویر کا ایک رخ ہی دکھایا ہے۔ انہیں بس ان سختیوں کے بارے میں ہی بتایا ہے جو اس پر ہوئی تھیں۔ یہ نہیں بتایا کہ ان "سختیوں" کی وجہ کیا تھی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ اسے ہر مرتبہ موت کے منہ سے کس نے کھینچا اور کیسے کھینچا۔ اور نہ ہی اس شریفانہ رویے کے بارے میں کچھ بتایا ہے جو اس کے ساتھ ایک "دشمن" چار دیواری میں روا رکھا گیا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہمیں "پنڈولی" کی مکمل رپورٹ مل گئی۔ گنجان آبادی میں نہایت تیزی سے پھیل جانے والی اس آگ میں دو افراد ہلاک اور چار کے قریب

بھی دی جاتی تھی۔ تب ایک قطار میں واقع کم و بیش چھ مکانوں کو جا لگی تھی۔ خاکستر ہو جانے والی اشیا میں کمروں کی لیٹا ہی اور سال جات وغیرہ تھے۔

پاشا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں نے فرسٹ اسٹور والا بدلہ لینے کی کوشش کی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اگر وہ لوگ بدلے اور بدلے کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم بھی انہیں ان ہی کے سکوں میں جواب دیں گے۔" پاشا نے کہا۔ اس کا چہرہ اندرونی حرارت سے تمتما رہا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کش لیتا رہا۔ شیخ عاصم کی ہلاکت کے بعد ایک دو بار میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ کہیں میری طرف سے شیخ کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟ لیکن اب رفتہ رفتہ میرے یہ احساس ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے شیخ کے دیے ہوئے زخم یاد آتے تھے اور میں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بڑی سے بڑی سزا کا مستحق قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ بدترین خصلت کا شخص تھا۔ اس خصلت کی ایک ادنیٰ مثال ذرینہ کی تھی۔ میری بھرپور کوشش کے باوجود وہ کسی طور سیدھی ہوتے میں نہیں آئی تھی۔ اب وہ آزاد تھی اور اس کی آزادی کے تحت تک نکل جانے شروع ہو گئے تھے۔ دو دن پہلے اس نے بے کی ثمان ... مثال قائم کی تھی۔ میں نے اسے بچانے کے لیے اپنی زندگی کو ششیں کی تھیں۔ ابھی میرے زخموں سے خون رسنا بھی بند نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے وحشیانہ ضربیں لگا کر نکل بھاگی تھی۔ میں بار بار اس کی اس رات والی کی سرخ کشتی کو دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں آخر تک دل میں امید رہی تھی کہ شاید وہ پلٹ آئے۔ شاید اس کے دل میں کوئی بات آ جائے۔

اب بھی دل ایک ضد ہو گئی تھی۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں "ہاشم اینڈ کمپنی" سے اپنی جنگ جاری رکھوں۔ میرا بدترین دشمن شیخ عاصم تھا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو شہزادے؟" پاشا نے کہا۔
"کچھ نہیں۔ یونہی بس ... تم یاد آ رہے ہیں۔"

ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ باری اندر آ گیا۔ اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے وہ خاصی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ "باری! تم آج کہیں نہ کہیں مکمل آرام کرو۔ اس طرح تم اپنی تکلیف بڑھا لو گے۔"

"ہم۔ میں سخت پریشان ہوں شاہ جہاں صاحب!" اس نے ہونٹوں کو ہولے سے دانتوں میں دباتے ہوئے کہا "قوسیہ شیخ عاصم وغیرہ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ جس کے ساتھ یہاں ہم بحث کرتے رہے ہیں۔ وہ اس بحث کو کئی گنا بڑھا کر اپنے وارثوں کے سامنے پیش کرے گی بلکہ کر چکی ہے۔ میری والدہ امارات میں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو قریبی عزیز وہاں موجود ہیں۔"

باری کی تشویش بے جا نہیں تھی۔ میں بھی تھوڑی دیر پہلے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہرحال ایک بات تو ظاہر تھی۔ قوسیہ کی یہاں موجودگی کے دوران میں باری کا رویہ اس کے ساتھ بے حد نرمی کا ہی رہا تھا۔ بلکہ آخر میں تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ وہ بندوں کو ترجیح کر کے قوسیہ کو میری تحویل سے نکال لے گیا تھا۔ ممکن تھا کہ قوسیہ اس پہلو سے سوچتی اور باری کے متعلقین کے خلاف کسی جارحانہ کارروائی سے باز رہتی۔ بہرحال وہ جس فطرت کی مالک تھی اس سے بری ہی توقع رکھنا عین عقلمندی تھی۔

رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز صبح سویرے ہمیں یہ خبر ملی دو یہ تھی کہ شیخ ایاز بنفس نفیس کولیو میں موجود ہے اور اس کے عزائم خطرناک ہیں۔ جیم نے بتایا "ان لوگوں کو یقین ہو چکا ہے جناب! کہ شیخ عاصم آپ کی تحویل میں ہے۔ وہ زندہ ہے یا مردہ دونوں صورتوں میں صرف آپ ہی اس کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"شیخ ایاز کا پتا ٹھکانہ معلوم ہوا؟"

"نہیں جناب! شیخ عاصم کے اغوا کے بعد سے وہ لوگ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بے حد محتاط ہیں۔ شیخ ایاز اور اس کے قریبی ساتھیوں کا کچھ پتا نہیں۔ ہاں اس کے چند ساتھیوں کے متعلق خبر ملی ہے کہ وہ ہوٹل ڈی لارنس میں موجود ہیں۔"

"یہ مصدقہ اطلاع ہے؟" پاشا نے پوچھا۔

"تقریباً مصدقہ ہی سمجھیں جی۔ ابھی پانچ دس منٹ میں مزید تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ وائرلیس پر میرا رابطہ اپنے ساتھیوں سے قائم ہے۔"

قریباً ایک گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ تب ایک ایسی اطلاع آئی جس نے ہمیں مبہوت کر کے رکھ دیا۔ جیمے نے آ کر بتایا کہ باری صاحب بے حد پریشان ہیں اور رو رہے ہیں۔

میں اور پاشا فوراً باری کے کمرے میں پہنچے۔ جب سے باری اپنی ناقابل اصلاح بیوی کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا وہ سخت دکھی اور پریشان نظر آتا تھا۔ میں نے باری پر کوئی الزام دھرا تھا اور نہ کوئی بات دہرائی تھی پھر بھی وہ اپنے طور پر بے حد شرمسار رہتا تھا۔ بات کرتے ہوئے بھی وہ شاذ و نادر ہی مجھ سے آنکھ ملاتا تھا۔ ہم کمرے میں پہنچے تو باری فون سیٹ کے پاس بیٹھا تھا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسک رہا تھا۔ ہماری آمد کو محسوس کر کے وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔

"کیا ہوا باری؟" میں نے پوچھا۔

وہ سر جھکا کر بولا "وہی ہوا جناب! جس کا خطرہ تھا۔ شیخ عاصم نے والدہ کو اغوا کرا دیا ہے۔ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔ نہ ہی انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اطلاع چھوڑی ہے۔ مجھے یقین ہے سر! والدہ شیخ عاصم کے پاس ہی ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا "اللہ نہ کرے تمہاری والدہ شیخ عاصم کے پاس ہوں (وہ تو دوسرے جہان میں تھا)۔"

باری کی آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگ گئی تھی۔ وہ والدہ سے بے حد پیار کرتا تھا۔ ان کے سوا اس کا دنیا میں تھا بھی کون۔ پاشا کے چہرے پر بھی اس خبر نے تفکر کے آثار پیدا کر دیے تھے۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ شیخ عاصم تو اس معاملے میں "ملوث" نہیں تھا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔ یقیناً یہ بھی شیخ کے لواحقین ہی کی کارستانی تھی۔ اگر باری کی والدہ کو واقعی زبردستی کہیں لے جایا گیا تھا تو پھر اس میں سراسر شیخ ایاز اور عشاریب وغیرہ ہی کا ہاتھ تھا۔

ہماری موجودگی میں ہی باری نے ابو ظہبی فون کیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ امی جان لاپتا ہیں۔

حالات میں ایک دم سنگین قسم کی تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ قوسیہ کے جانے کے فوراً بعد قوسیہ کے ہمدردوں کی طرف سے جارحانہ کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ پاکستان میں میرا کوئی ایسا قریبی منظر عام پر نہیں تھا جسے شیخ ایاز اور اس کے حواری نقصان پہنچا سکتے۔ جہاں تک زریں اور صفدر کا معاملہ تھا مجھے ان کی طرف سے زیادہ تشویش نہیں تھی۔ میں نے زریں کو مکمل ہدایات جاری کر رکھی تھیں اور وہ اپنی و صفدر کی سیکیورٹی کی طرف سے ریڈ الرٹ تھا۔

ہم کامن روم میں واپس پہنچے تو جیمے وائرلیس پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ دراصل اسی کال کا جیمے کو انتظار تھا۔ اس گفتگو کے نتیجے میں جیمے کو ان لوگوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں جن کا تعلق شیخ ایاز سے تھا اور جو ہوٹل ڈی لارنس میں کسی جارحانہ مقصد کے تحت جمع تھے۔

وائرلیس پر بات ختم کرنے کے بعد جیمے نے بتایا "یہ کل چھ بندے ہیں جناب! دو مقامی ہیں۔ تین کا تعلق امارات سے ہے اور ایک کوئی سفید فام ہے۔ شکل و صورت سے وہ یہودی نظر آتا ہے۔ یہ تمام افراد کسی قسم کے دہشت گرد ہیں۔ ان کے پاس خطرناک اسلحہ بھی دیکھا گیا ہے۔ ان لوگوں کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی فوری نوعیت کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ اس گروپ میں سے دو مقامی افراد کو شناخت کر لیا گیا ہے۔ یہ دونوں بندے اس ٹولے میں شامل تھے جس نے پرسوں پٹیہ والے مکان میں گھس کر اندھا دھند فائرنگ کی تھی۔"

پاشا کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے جیمے سے پوچھا "کیا وہ لوگ ہوٹل کے کمرے میں ہیں؟"

"نہیں جناب! دو گھنٹے پہلے تک وہ ہوٹل میں ہی تھے۔ اب وہ ایک قریبی کوٹھی میں موجود ہیں۔"

پاشا نے جیمے سے کہا "اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو ہم دو منٹ علیحدگی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

جیمے اپنے دو ساتھیوں سمیت فوراً باہر چلا گیا۔ پاشا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے ہی کافی بے گناہ مارے جا چکے ہیں۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟"

پاشا نے منہ سے ایک گالی نکالی اور بولا "یار اب بھی پوچھ رہے ہو کہ کیا کرنا چاہتے ہو؟ سارے حرام زادے ایک ہی جگہ جمع ہیں۔ بھون ڈالتے ہیں سالوں کو۔"

میرے اپنے ذہن میں بھی غیض و غضب نے جنبش کرنا شروع کر دی تھی۔ واقعی اگر ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تو قوسیہ کے لواحقین کی وحشت مزید گل کھلاتی۔ وہ لوگ ہم تک تو شاید اتنی آسانی سے نہ پہنچ سکتے لیکن کچھ مزید بے گناہ ان کی درندگی کا شکار ہوتے۔ میرا دھیان بار بار ریا تھا وغیرہ کی طرف بھی جا رہا تھا۔ یقین تھا کہ یہ جس میرے اور ریا تھا کے درمیان تعلق ڈھونڈ لیا اور بپھرے ہوئے شیخ زادے کے ہاتھوں دشمنی کا نم بخش بھی جاتی۔

میں اور پاشا قریباً دس منٹ تک سر جوڑے بیٹھے رہے پھر ہم نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ پاشا کسی معمولی

شخص کا نام نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے اور جڑیں گہری تھیں۔ یہاں کولمبو میں بھی اس کے "دوست" موجود تھے۔ وہ بولا "شاہ جہاں! ان چھ حرام زادوں کا بندوبست تو سمجھو ہو گیا۔ سمجھو یہ لڑاکا طیارے رن وے پر ہی تباہ ہو گئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔۔۔ تم کیا کرو گے ان کا؟"

"تم اس کو چھوڑو۔ یہ میری دردسری ہے۔"

"لیکن باشا۔۔۔"

"لیکن ویکن کو چھوڑو۔ اس دن بجرے والی کارروائی میں میں نے تمہاری بات مان لی تھی۔ اب تمہیں میری ماننا پڑے گی۔ تم یہاں بیٹھ کر دو چار سگریٹ پیو۔ میں ان سالوں کا بھرتا بنا کر ابھی آتا ہوں۔" باشا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا تو میں بھی اٹھ گیا "کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔" وہ اپنا واکی ٹاکی آن کرتے ہوئے بولا۔

"نہیں باشا! ایسے ٹھیک نہیں۔ دیکھو بجرنگ والی کارروائی میں میں نے تمہیں ساتھ تو رکھا تھا ناں۔ اب تم بھی مجھے ساتھ تو رکھو۔"

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد باشا راضی ہو گیا۔ اب دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ بادل چھائے تھے گاہے گاہے چھینٹے بھی پڑنے لگتے تھے۔ باشا اور میں پورچ میں پہنچے۔ یہاں باشا کی ٹویوٹا اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ کھڑکیوں پر براؤن پردے کھنچے ہوئے تھے۔ ایک خطرناک صورت والا ڈرائیور وین کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہمارے لیے دروازہ سلائیڈ کیا۔ گاڑی اندر سے بھی بے حد آرام دہ اور "ڈیکوریٹڈ" تھی۔ گاڑی کے عقبی حصے میں پردہ سا کھنچا ہوا تھا۔ میں نے غور نہیں کیا۔ ہمیں وین میں قریباً پانچ منٹ بیٹھنا پڑا۔ اسی دوران میں وہ شخص بھی آگیا جسے باشا نے واکی ٹاکی پر بلوایا تھا۔ یہ بھی ایک تجیم شحیم سخت جان شخص تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی ریٹائرڈ تامل چھاپہ مار ہے۔ اس کی سیاہ تامل گردن سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ ہم ایئرکنڈیشنڈ گاڑی میں آتے ہی اس کا پسینہ سوکھنا شروع ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے سرگوشی میں باشا سے پوچھا۔

"بڑا کارندہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تمہیں اس کی کارکردگی کا پتا چل جائے۔"

اسی دوران میں جے بھی گاڑی میں آگیا۔ شیخ اباز نے غنڈوں کا درست پتا ٹھکانا جے کو ہی معلوم تھا۔ اسٹیشن ویگن روانہ ہوئی۔ باشا کی عقابی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا "باشا! ہمیں اس بات کو ذہن سے نہیں نکالنا چاہیے کہ باری کی والدہ شیخ اباز کی تحویل میں ہو سکتی ہے۔ ہماری کسی سخت کارروائی کے جواب میں وہ لوگ باری کی والدہ کی جان لے سکتے ہیں۔"

"میرے خیال میں شیخ اباز اتنی جلدی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھائے گا۔ وہ اس بزرگ خاتون کو سودے بازی کے لیے استعمال کرنا چاہے گا۔ ویسے بھی جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں وہ جارحانہ کارروائی نہیں ہے، بلکہ اس جارحانہ کارروائی کا جواب ہے جو شیخ اباز کے کارندوں نے پٹنہ میں کی ہے۔"

اچانک جے کا واکی ٹاکی سگنل دینے لگا۔ اس کے دو کارندے ہوٹل ڈی لارنس کے قریب اس کوٹھی کے سامنے موجود تھے جہاں وہ چھ افراد میٹنگ کر رہے تھے۔ جے نے اپنے کارندوں کے ساتھ بات کی۔ جے کو معلوم ہوا کہ چھ افراد میں سے ابھی ایک شخص کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں آیا ہے اور چھوٹی سوزوکی کار میں وہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔

جے نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا، پھر میرا اشارہ پا کر بولا "تم دونوں میں سے ایک سوزوکی کار کا تعاقب کرے۔ ہم بھی بس پانچ منٹ میں موقعے پر پہنچ رہے ہیں۔"

ہمیں کوٹھی تک پہنچنے میں واقعی پانچ منٹ لگے۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی۔ عین سامنے ایک چلڈرن پارک تھا۔ بارش کے سبب سڑک اور پارک دونوں سنسان نظر آرہے تھے۔ کوٹھیوں کے در و دیوار اور سبزہ وغیرہ بارش کے سبب دھل کر خوب چمک گیا تھا۔

ہماری وین پارک کے سامنے پہنچی تو ایک "برساتی والا شخص" تیزی سے اندر آگیا۔ اس نے مقامی لہجے میں انگلش بولتے ہوئے ہمیں بتایا کہ پانچوں افراد ابھی تک کوٹھی میں موجود ہیں۔ اس نے پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ یہ چار گاڑیاں تھیں۔

ہمیں وہاں پہنچے بمشکل آٹھ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ میٹنگ ختم ہونے کے آثار نظر آئے۔ پہلے کوٹھی کا مین گیٹ تھوڑا سا کھلا۔ گیٹ کے اندر کچھ لوگ حرکت کرتے دکھائی دیے پھر چند سیکنڈ بعد گیٹ پورا کھل گیا۔ ہم نے پانچ افراد کو دیکھا وہ ایک اسٹیشن ویگن میں سوار ہو رہے تھے۔ جے کی اطلاع کے عین مطابق ان میں ایک سفید فام بھی تھا۔

باشا نے کہا "یقیناً یہی وہ پانچوں حرام زادے ہیں۔ ان میں سے ایک موالی کو تو میں بھی پہچانتا ہوں۔" باشا کی

آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ دوسری طرف جے بھی سخت جذباتی نظر آ رہا تھا۔ ان افراد میں ہی وہ ایسے بندے بھی تھے جنہوں نے دو دن پہلے پٹنہ میں جے کے تین عزیزوں کو قتل کیا تھا۔

باشا نے ادھیڑ عمر تامل سے کہا کہ وہ وین کے عقبی حصے سے اسلحہ نکالے۔ تامل نے عقبی حصے کا پردہ کھینچا اور میں دنگ رہ گیا۔ وہاں کم و بیش دس عدد خودکار رائفلیں اور لائٹ مشین گنیں موجود تھیں۔ ان کے علاوہ دستی بم تھے اور ریوالور تھے لیکن جس شے نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ دو عدد راکٹ لانچر تھے۔ دونوں لانچرز پر سرخ ہیڈ والے قریباً تین فٹ لمبے فرنچ راکٹ نصب تھے۔ لوہے کے ان بے جان مخروطی سانڈوں کو دیکھ کر عجیب سی وحشت کا احساس ہوتا تھا۔

باشا کے اشارے پر تامل شخص نے ایک لانچر ماہرانہ انداز میں اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔

"یہ۔۔۔ کیا کرنے جا رہے ہو باشا؟" میں نے پوچھا۔

"جوابی حملہ۔ اس قسم کے حملے میں اگر بھرپور طاقت کا مظاہرہ کیا جائے تو دشمن کے دل و دماغ میں دہشت بیٹھ جاتی ہے۔ مجھے ایک سے زائد مرتبہ اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔"

میں خاموش رہا۔

باشا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ان پانچ حرامیوں کی جان تو جانی ہی ہے۔ اگر جان اس طرح جائے کہ دشمن کا حوصلہ پست ہو اور مزید خون خرابے کا امکان کم ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے۔"

وہ پانچوں افراد اسٹیشن ویگن میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ یہاں علیحدہ علیحدہ گاڑیوں میں آئے تھے لیکن اب ایک ہی گاڑی میں جا رہے تھے۔ اس سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ کسی کارروائی پر جا رہے ہیں۔ کسی خونی کارروائی سے پہلے ہی انہیں روک لیا جاتا تو یہ بڑی اچھی بات تھی۔ بہرحال باشا کا طریقۂ کار ذرا چونکا دینے والا تھا۔

باشا سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کارروائی کے لیے میری رضامندی حاصل کرنا چاہ رہا ہو۔ میں نے ان پانچ افراد کو دیکھا۔ وہ سرخ وین میں بیٹھ چکے تھے ان میں سے ایک شاید کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ وہ اس موت سے بے خبر تھے جو ایک طاقتور راکٹ لانچر کی صورت ان کے سروں پر پہنچ چکی تھی۔

میں نے جے سے پوچھا "کیا یہ پوری طرح کنفرم ہے کہ یہ شیخ اباز کے کارندے ہیں۔"

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں سر! ان میں سے دو کو تو پٹنہ کے روز والی کارروائی میں بھی دیکھا گیا ہے۔" جے نے اٹل بار لہجے میں کہا۔

باشا کا تامل ساتھی راکٹ لانچر کو سرخ اسٹیشن وین کی طرف پوزیشن کر چکا تھا۔ اس کے انداز میں مہارت اور خوداعتمادی تھی۔

سرخ اسٹیشن وین کے نزدیک ایک مسلح گارڈ بھی کھڑا تھا۔ اس نے تھوڑے مشکوک انداز میں ہماری گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے خیال میں اب زیادہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر باشا کی طرف دیکھا اور یوں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

باشا نے تامل نشانہ باز کو فائر کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک کھڑکی کا رنگدار شیشہ تیزی سے پیچھے ہٹا دیا۔ سرخ ہیڈ والے راکٹ اور سرخ وین کے درمیان قریباً پچاس میٹر کا فاصلہ تھا۔ تامل نے راکٹ فائر کیا۔ ایک زوردار جھٹکے سے شعلہ سا لپکا اور سرخ اسٹیشن وین کی طرف گیا پھر دھماکے سے آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ میں نے سرخ گاڑی کا ایک دروازہ قریباً تیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے دیکھا۔ جہاں دو سیکنڈ پہلے اسٹیشن وین تھی وہاں آگ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈرائیور سمیت وین میں کل چھ افراد تھے۔ وین کے ساتھ ان کے بھی پرخچے اڑ گئے تھے۔

ہماری اسٹیشن ویگن کے پہیے چرچرائے اور وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح "مجسمہ چوک" کی طرف بڑھ گئی۔ چند ذیلی سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم مین روڈ پر آگئے۔ کچھ آگے جا کر اسی سڑک پر ہماری رہائش گاہ تھی۔

تین بجے کی ریڈیو نیوز میں اس راکٹ اٹیک کی خبر موجود تھی۔ سہ پہر کو چھپنے والے اخبار میں بھی خبر نمایاں سرخی میں شائع ہوئی تھی "نامعلوم حملہ آوروں نے راکٹ کے ذریعے محکمۂ سیاحت کی اسٹیشن ویگن اڑا دی۔ چار افراد موقع پر ہی ہلاک۔ ڈرائیور سمیت دو افراد شدید زخمی۔ وقوعہ پر ہر طرف انسانی جسموں کے ٹکڑے۔"

اس خبر کے نیچے ایک باکس میں نیوز رپورٹر نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ واقعہ پٹنہ میں ہونے والے تہرے قتل کا ردعمل ہے۔ جو سلسلہ فرسٹ اسٹورز میں خوفناک آتش زدگی اور شیخ عاصم بن ارشد کے اغوا سے شروع ہوا تھا وہ تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ اس تناظر میں رپورٹر نے یہ بھی

بنایا تھا کہ آج دوپہر ہوٹل ڈی لارنس کے قریب مرنے والوں میں دو اماراتی باشندے بھی شامل ہیں۔

سب کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔ شاید اس کی بہتر کارکردگی کا ایک سبب پب میں ہونے والی خون ریزی کا دکھ بھی تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بڑی تیزی سے شیخ ایاز کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں باشا بھی اپنے وسائل استعمال کر رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ شیخ ایاز کولمبو میں ہی موجود ہے۔ عین ممکن تھا کہ قوسیہ واپس امارات جا چکی ہو لیکن شیخ ایاز اور عشارب وغیرہ سے اس کا رابطہ ضرور رہا ہوگا۔

شام کے وقت میرے لیے ایک فون آیا۔ دوسری طرف سائیں عالی تھا۔ وہ حسب معمول خوب چہک رہا تھا۔ ابھی تک میرے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شیخ عاصم اس دنیا سے کوچ کر چکا ہے لیکن سائیں عالی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر روی داس کے کلینک میں شیخ کی جو کاٹ چھانٹ ہوئی تھی وہ سائیں کے علم میں تھی۔ عین ممکن تھا کہ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ پندرہ دن پہلے باغبا کے ڈیرے پر کسی معذور بھکاری نے خودکشی کی ہے۔ بہرحال اس حوالے سے سائیں نے کوئی بات کی تھی اور نہ میں نے اسے کچھ بتایا تھا۔ ہاں سائیں کی گفتگو میں ایک دو اشارے ایسے ملے تھے جن کے سبب سوچا جا سکتا تھا کہ سائیں شیخ کی "رخصتی" کے بارے میں جانتا ہے۔

سائیں نے فون پر بتایا "میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا ایڈریس سمجھاؤ۔"

"لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم نہیں بتاؤ گے تو بھی میں پہنچ تو جاؤں گا ہی۔ بس تھوڑا سا وقت ضائع ہوگا اور میرے ڈرائیور کو تھوڑی سی تھکاوٹ ہو جائے گی۔"

"مگر یہاں آ کر تم کرو گے کیا؟"

"جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بہتر ہی کروں گا۔ ایک تو تم سوال بہت پوچھتے ہو۔ بادشاہوں سے زیادہ سوال نہیں پوچھا کرتے۔ تمہیں پتا ہے کہ محمود بادشاہ اپنے غلام ایاز سے اتنی محبت کیوں کرتا تھا۔ اس لیے کہ وہ زیادہ سوال نہیں پوچھتا تھا۔"

سائیں اپنی بات میں ایاز کا اشارہ دے رہا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اس سلسلے میں مجھے کچھ بتانا چاہتا ہو۔ میں نے اسے فیصل روڈ کا ایڈریس بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ وہ ذرا احتیاط سے آئے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد سائیں عالی وہاں آن موجود ہوا۔ اس کی آمد میری توقع اور اندیشے کے عین مطابق تعجب خیز تھی۔ اس کے علاوہ سائیں کی آمد نے مجھے ایک زبردست سرپرائز بھی دیا۔ سائیں عالی صاحب ایک بائیسکل پر تشریف لائے تھے۔ وہ سائیکل کے کیریئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سائیکل چلانے والے کا چہرہ جانا پہچانا تھا بلکہ "چلانے والی" کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں آفت کی پرکالہ سروج تھی۔ پیڈل گھما گھما کر وہ ہانپی ہوئی تھی اور پسینہ اس کی گردن سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ وہ جین اور شرٹ میں تھی۔ اس کا توبہ شکن جسم اس لباس میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی تھی فتنہ ساماں لڑکی! جس طرح SINGING DOLLS جیسی لڑکیوں کو دیکھ کر برا خیال ذہن میں نہیں آتا اس طرح سروج جیسی لڑکیوں کو دیکھ کر اچھا خیال ذہن میں نہیں آ سکتا۔ مجھے زریں کی ایک بات بڑی اچھی طرح یاد تھی۔ شروع شروع میں جب سروج کے ساتھ زریں کا سامنا ہوا تھا تو ایک دن وہ کہنے لگا تھا۔ استاد صیب! ام مفت میں گناہگار ہو رہا ہے۔ یہ لڑکی جب بھی امارے سامنے سے گزرتا ہے ام ایک دم اس کے ساتھ دست درازی شروع کر دیتا ہے۔ اس خیالی دست درازی کی وجہ سے امارا نامۂ اعمال ہر روز دس مرتبہ کالا ہوتا ہے۔"

سائیکل پورچ میں پہنچی تو سائیں اچھل کر کیریئر سے نیچے اترا۔ اس نے خود کو ایک بوسیدہ چادر میں کیموفلاج کر رکھا تھا۔ اس کی پنڈلیاں حسب معمول ننگی تھیں اور گلے میں درجنوں گھنٹیاں اور مالائیں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ سائیکل اسٹینڈ پر لگا کر سروج ایک طرف مؤدب کھڑی ہو گئی تھی۔ کولمبو میں میں نے کئی خواتین کو سائیکل چلاتے دیکھا تھا لیکن کسی خاتون کے پیچھے سائیں جیسا عجوبہ بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً اس کوٹھی کے ملازمین نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چہروں پر حیرت سجائے سائیں عالی کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ سائیں عالی ان حیرت زدہ ملازمین کے ساتھ کوئی جھگڑا شروع کر دیتا میں باہر نکل آیا۔

میں ہلکے سے میک اپ میں تھا اس کے باوجود سروج نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ سائیں عالی نے اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ اگر یہاں سائیں عالی نہ ہوتا تو سروج دیگر افراد کو خاطر میں لائے بغیر یقیناً مجھ سے لپٹ جاتی بلکہ وفور مسرت میں اس سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی لیکن اب سائیں موجود تھا لہٰذا اس نے

صرف یہی کلمات ہی ادا کیے اور وہ بھی دھیمے لہجے میں۔ اس کی آنکھوں میں رنگین ادائیں مچل رہی تھیں۔

سائیں نے اپنی چادر اتار کر کندھے پر ڈال لی تھی اور بے حیائی بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سائیکل کے ہینڈل سے ایک مومی لفافہ جھول رہا تھا۔ سائیں نے سروج کو حکم دیتے ہوئے کہا "چلو یہ لفافہ اتارو اور اندر لے جاؤ۔"

سروج نے ہدایت پر عمل کیا۔ ہم سائیں کے ساتھ اندر آ گئے۔ سائیں نے کہا "اپنی حکومت بحال ہونے کی خوشی میں میں لڈو بانٹ رہا تھا۔ سوچا یہاں بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ انہیں بھی پہنچا دوں۔"

اس نے لفافے میں سے نمکین لڈو (لڈو پیٹھیاں والے) نکالے اور بانٹنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ وہ لیکچر بھی دے رہا تھا "یہ شوگر کا زمانہ ہے۔ ہر پانچویں چھٹے بندے کو یہ شکایت موجود ہے۔ اس لیے ہمیں لڈو بانٹتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے۔ بلکہ میرا تو ارادہ ہے کہ میں اپنے ملک میں چینی بھی بالکل پھیکی تیار کرواؤں گا۔ اس کے علاوہ میری کوشش ہوگی کہ نمک بھی زیادہ نمکین نہ ہو۔ اس سے بلڈ پریشر کی تکلیف عام ہو رہی ہے۔"

وہ سب کو لڈو دیتا جا رہا تھا۔ سروج مؤدب انداز میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر سائیں عالی نے کہا تھا کہ میں اپنا ٹھیک ٹھیک ایڈریس بتاؤں ورنہ اس کا ڈرائیور تھک جائے گا۔ اس وقت بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب پتا چلا تھا کہ اس کا "ڈرائیور" سروج ہے جو پیڈل چلا چلا کر واقعی ہانپا ہوا ہے۔

لڈو بانٹنے کے بعد سائیں عالی سر نیچے ٹانگیں اوپر کر کے کھڑا ہو گیا اور پانی طلب کیا۔ جب ملازم پانی لینے کے لیے جانے لگا تو سائیں نے ہانک لگائی "شربت لے آؤ لیکن اس میں میٹھا نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی برف۔"

ملازم ہونقوں کی طرح ہمارا منہ تکنے لگا۔ میں نے ملازم سے کہا کہ وہ سادہ پانی لے آئے۔ ملازم پانی لایا تو سائیں نے کہا "اسے تھوڑا سا پتلا کرو۔ میں پتلا پانی پیتا ہوں۔"

ملازم کی شکل رونی ہو گئی۔ میں نے ملازم کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا "اس میں تھوڑا سا اور پانی ملا دو۔"

ملازم پانی لے آیا۔ سائیں نے الٹی پوزیشن میں ہی پانی پیا پھر سیدھا ہو گیا۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں بولا "دو چار گھر رہ گئے ہیں، سوچا ہے وہاں بھی بانٹ ہی دوں۔ حکومت تو آنی جانی شے ہے۔ اصل چیز تو تعلقات ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کرسی پر نہیں ہوتے لیکن کرسی نشینوں سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ اب دیکھو پاکستان میں ہی کئی لوگ بیٹھے ہیں جن کو اگر ملک کا سربراہ بنا دیا جائے تو وہ ایسے ہی محسوس کریں گے جیسے پولیس کے ایس پی کو ہیڈ کانسٹیبل بنا دیا جائے۔ ہو ہو۔ کتنی مزاحیہ بات کی ہے میں نے۔ ویسے میں ہوں بہت کھولیے۔"

"یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔" میں نے اثبات میں کہا۔

"بس اللہ کی دین ہے۔ میں اپنی باتوں پر تکبر نہیں کرتا۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"تم کہہ رہے تھے کہ دو چار گھر رہ گئے ہیں جہاں لڈو نہیں دیئے۔"

"ہاں ایک وہ اپنا حافظ الاسد ہے شام والا۔ دوسرا اپنا پرانا لنگوٹیا کرنل قذافی ایک شاہ حسین بھائی ہے۔ اور وہ ہاں مارگریٹ تھیچر کو تو میں بھول ہی گیا۔ بڑی اچھی دوست ہے۔ میں اسے بے تکلفی سے گریٹی کہتا ہوں۔"

"اچھا۔ تو اب تم سائیکل پر ان بندوں کو لڈو بانٹنے جا رہے ہو؟"

"نہیں سائیکل پر تو بس میں گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ ڈی تک جاؤں گا۔ وہاں سے ایک جن پر بیٹھ کر مڈل ایسٹ کا چکر لگاؤں گا۔ باقی رہ جائے گی مارگریٹ تھیچر تو اس کے لڈو امریکی صدر کو دے دوں گا وہ خود ہی پہنچا دے گا۔ ویسے بھی امریکی صدر ہو یا برطانوی وزیراعظم بات تو ایک ہی ہے۔"

"اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ یہ گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ ڈی میں کون ہے؟"

"ہے ایک دوست۔ بہت کڑوے مزاج کا ہے۔ آج کل تو کچھ زیادہ ہی کڑوا ہو رہا ہے پھر بھی دوست تو دوست ہی ہوتا ہے ناں۔ اس کے کڑوے پن کا اندازہ تم اس بات سے کر سکتے ہو کہ گریٹی جیسی کڑوی خشک عورت کے لیے بھی میں نے لڈو پیٹھیاں والے ہی رکھے ہیں لیکن اس دوست کے لیے میٹھے لڈو رکھے ہوئے ہیں۔ یہ سمجھو یہ ہیں وہ تین میٹھے لڈو۔۔" اس نے باقاعدہ لفافہ کھول کر مجھے بوندی کے لڈو دکھائے۔

"ان لڈوؤں سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوگا تو کچھ نہیں۔ لیکن تم بھی سوچو کہ ایک بندہ تو پہلے ہی اوپر نیچے مرچیں تلی ہوئی ہیں اسے لڈو میٹھے

لے کھلا کر پاگل تو نہیں کرنا ناں۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ امارات کے بندے پہلے ہی بہت سخت ہوتے ہیں' اوپر سے کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہو جائے تو سونے پر سہاگا ہے۔"

میں چونک تو پہلے ہی گیا تھا۔ سائیں نے امارات کا ذکر بھی کر دیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ سائیں عالی شیخ ایاز کی بات کر رہا تھا' میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ اگر سائیں رافعی درست اطلاع دے رہا تھا تو پھر یہ بہت اہم اطلاع تھی۔ شیخ ایاز گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ ڈی میں موجود ہو سکتا تھا۔

میں نے اس حوالے سے سائیں کو کچھ مزید کریدنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ازلی منو تھا۔ چلتا رہے تو چلتا رہے' جہاں جم گیا بس جم گیا۔ اب وہ اپنے "خوبرو ڈرائیور" کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔ سروج نے سائیں کی نگاہ بچا کر ایک دو بار میری طرف دیکھا تھا اور نگاہوں میں پیغام دیا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ مجھ سے ملاقات کرے گی۔

سائیں نے نوٹوں والا لفافہ پھر سے ہینڈل پر لٹکایا اور سروج سے کہا "چلو بھئی! سائیکل اسٹارٹ کرو۔"

سروج گدی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "یہ کیا تماشا ہے سائیں۔ تمہیں گال روڈ جانا ہے تو یہاں تین چار گاڑیاں موجود ہیں۔"

"تم تین چار گاڑیوں کی بات کر رہے ہو' میرے پاس تین چار سو جن موجود ہیں' لیکن میں فی الحال سائیکل کی سواری کو ہی پسند کر رہا ہوں۔ ویسے بھی میں چاہ رہا ہوں کہ پیڈل وغیرہ چلا کر اس لڑکی کا دماغ تھوڑا سا ٹھکانے پر آ جائے۔ یہ ایک طرح سے اس کی سزا بھی ہے۔ میں اس کھوتی کو بڑے اعتماد سے اپنے پیچھے اپنا قائم مقام بنا کر آیا تھا۔ یہ الو کی پٹھی اس چرخے سوٹل کے چکر میں پڑی رہی اور میرے خلاف بغاوت ہو گئی۔ پتا نہیں کرسی چیز ہی ایسی ہے' اچھے بھلے بندے کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اب منوج کمار ہی کو لو' اچھا بھلا ایکٹر تھا۔ سیاست اور کرسی کے چکر میں پڑا تو بس شرابی ہو کر رہ گیا۔ دلیپ کمار کو دیکھو۔ اپنے محمد علی اور مصطفیٰ قریشی کو دیکھو۔ مصطفیٰ قریشی ہی نام ہے ناں اس موٹی تھوڑی والے کا؟"

"مجھے نہیں پتا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تمہیں سب پتا ہے شفیع محمد۔ بس تم میری بات کو اہمیت نہیں دیتے۔ ان باتوں پر غور کرو گے تو بڑے فائدے میں رہو گے۔"

پھر سائیں نے اپنی میلی کچیلی چادر سر پر اوڑھی اور اچک کر سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ گیا۔ سروج نے پیڈل پر زور ڈالا اور سائیکل حرکت میں آ گئی۔ ملازمین چور نگاہوں سے سروج کے سراپے کو تک رہے تھے۔

میں نے جے سے کہا "ایک گاڑی نکالو اور کسی ہوشیار بندے کو سائیں کے پیچھے روانہ کرو فوراً۔ اور ہاں بندے کے پاس واکی ٹاکی ہونا چاہیے۔"

جے نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور ایک سفید سوزوکی دھیمی رفتار سے سائیں کے عقب میں روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد میں اور پاشا منیجر جے کے ہمراہ گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ ڈی کی طرف چل دیے۔ ہمارے ساتھ وہ نامی نشانہ باز بھی تھا جس نے آج صبح شیخ ایاز کے چھ ساتھیوں کو راکٹ سے اڑایا تھا۔ اس ادھیڑ عمر شخص کا نام ولپٹ معلوم ہوا۔

ہم پوری طرح مسلح تھے۔ میرے پاس ماؤزر تھا۔ پاشا ایل ایم جی سے لیس تھا۔ اسی طرح ولپٹ کے پاس بھی ریوالور اور خود کار رائفل تھی۔ میں اب شیخ ایاز کے خلاف کسی بھی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ درحقیقت باری کی والدہ پر ہاتھ ڈال کر عاصم کے لواحقین نے حالات کو ایک بار پھر خطرناک رخ پر موڑ دیا تھا۔ شیخ کی موت کے بعد میرے اندر جو تھوڑا سا ٹھہراؤ پیدا ہوا تھا وہ مخالفوں کے رویے کی وجہ سے ایک دو دن میں ہی ناپید ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب پاشا نے ایاز کے چھ خطرناک ساتھیوں کو راکٹ سے اڑانے کا فیصلہ کیا تھا تو چند سیکنڈ کے لیے میرے اندر کشمکش نمودار ہوئی تھی لیکن اب جبکہ وہ چھ بندے مارے جا چکے تھے میرے اندر کسی طرح کا پچھتاوا یا افسوس نہیں تھا' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ ہمیں وہی کرنا چاہیے تھا جو ہم نے کیا۔

اب ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ باری کی عمر رسیدہ والدہ کا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ اس مہربان چہرے والی خاتون کا تصور کر کے میرے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ وہ جس بہو کے ناز اٹھانے کے لیے ترس رہی تھیں اسی بہو کے طفیل وہ ایک "بے رحم شکنجے" میں جکڑی گئی تھیں۔ ان کی غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ بھی تھی کہ انہوں نے کولمبو جا کر اپنی بہو سے ملاقات کی تھی۔ شاید فوسیہ نے اس امر کو بھی اپنی توہین سمجھا تھا کہ اس کی ساس نے اسے "حالت اسیری" میں دیکھا ہے۔ اب وہ ساس کو حالت اسیری میں لے آئی

تھی تاکہ اس کے بیٹے کو اپنے پاؤں چلنے پر مجبور کر سکے۔

"کیا ارادے ہیں؟" پاشا نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

"اٹھا لیتے ہیں حرام زادے کو۔" میں نے کہا۔

"کیا اتنا آسانی سے ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ ایاز نے اپنی حفاظت کا زبردست انتظام کر رکھا ہو گا۔"

"زبردست انتظامات کو ناکارہ بنانے میں ہی تو مزہ آتا ہے۔"

میرے جوشیلے انداز نے پاشا کی آنکھوں کی چمک بڑھا دی۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی ایل ایم جی کی شفاف سطح پر ہاتھ پھیرا اور بولا "تم مجھے کہیں بھی پیچھے نہیں پاؤ گے شاہ جہاں۔"

میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آج یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی ہارون پاشا ہے جو کسی وقت میرے لیے سراپا موت بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ایک تہ خانے میں بند کیا تھا اور ایک اذیت ناک موت میرے لیے تیار کر رکھی تھی۔ ہاں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے کئی ماہ تک پاکستان کے طول و عرض میں دہشت گردی کا بازار گرم کیے رکھا تھا اور ان گنت بے گناہوں کا خون بہا کر اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش کیا تھا۔ یہ شخص درندگی اور سفاکی کی علامت تھا لیکن آج وہ میرے شانے سے شانہ ملائے اس گاڑی میں بیٹھا تھا اور میرے دشمن کو اپنا دشمن جان کر اس سے ٹکرانے کے لیے بے قرار تھا۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں' شاید یہی ماہیت قلب ہوتی ہے۔ قدرت انسانوں کے دلوں کو بدلتی ہے اور انہیں کیا سے کیا بنا دیتی ہے لیکن "دلوں کا یوں بدلنا" ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تمام تر مواقع میسر ہونے کے باوجود اپنی ڈگر پر قائم رہتے ہیں اور ہر اچھی تبدیلی کے لیے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ شاید شیخ عاصم کی بہن بھی ان میں سے ایک تھی۔

پاشا نے چلتی گاڑی سے باہر کے منظر پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا "تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے شاہ جہاں! اگر ہم شیخ ایاز پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں تو باری کی والدہ کے لیے کامیاب سودے بازی کی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کی مجبوری ہو گی کہ وہ محترم خاتون کو رہا کر دیں۔"

"ہاں۔ موجودہ حالات میں تو خاتون کی مدد کی یہی صورت نظر آتی ہے۔"

"لیکن اس کے لیے پٹاخے وغیرہ چلانے پڑیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ چار پانچ بندے پھڑکائے بغیر شیخ ایاز پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو۔ میں نے سنا ہوا ہے کہ ایاز کے ذاتی محافظ اس کے لیے انسانی ڈھال بن جاتے ہیں۔"

"اس طرح کی بہت سی ڈھالیں گرائی ہوئی ہیں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔۔۔ دھماکا؟"

"بالکل دھماکا!"

پاشا نے اپنی ایل ایم جی کے ساتھ نیا میگزین اٹیچ کر لیا۔ اس نے ماؤزر کے دو فالتو میگزین میری جیب میں بھی اڑس دیے۔ نال ٹائیگر ولپٹ بھی پوری طرح چوکس ہو گیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر لیکن حرکات و سکنات میں نوجوان کی سی چستی تھی۔ اس کے چہرے پر زخموں کے کئی پرانے نشانات تھے جو اس کی جنگجویانہ طبع کے غماز تھے۔ ہمارے ارادے بھانپنے کے بعد منیجر جے کچھ مضطرب دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ ڈی میں واقعی شیخ ایاز موجود ہے تو پھر ایک زبردست ہنگامہ یعنی "فل دھماکا" ضرور ہو گا۔ منیجر جے یوں تو اب تک ایک جیدار اور باصلاحیت شخص ثابت ہوا تھا لیکن اس کا مزاج مار دھاڑ اور خون ریزی کا نہیں تھا۔

میں نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا "جے! سب سے پہلے ہم اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مطلوبہ بندہ کوٹھی پندرہ ڈی میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ وہاں موجود ہو گا تو پھر ایکشن ضروری ہے۔ ایسی صورت میں تم ڈرائیور کے ساتھ گاڑی سمیت کچھ فاصلے پر موجود رہو گے اور ہماری واپسی کا انتظار کرو گے۔ واکی ٹاکی پر تم سے ہمارا رابطہ قائم رہے گا۔"

جے نے اطاعت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے کچھ طمانیت جھلکنے لگی تھی۔

برسوں کی ہنگامہ آرائی نے میرے اندر یہ صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ میں دور ہی سے ہنگامے کی بو سونگھ لیتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے خون اور بارود کی بو باس محسوس ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں' کیا بات تھی کہ آج کل یہ بو مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔ میں اس بو میں رہنا چاہتا تھا۔ خون ریزی کے لیے وہی برسوں پرانی بھوک میرے اندر چمک اٹھی تھی' جو بمبئی اور کراچی وغیرہ میں میرے مزاج کا خاصا رہی تھی۔ کچھ برداشت نہ کرو۔ کچھ بھی کل پر نہ ڈالو۔ بس

مرجاؤ یا مار دو۔ لاش بنا دو یا لاش بن جاؤ۔ ہاں کسی وقت لاش بن جانا بھی تو اچھا لگتا ہے۔ زندگی اتنی زہرناک ہو گئی تھی کہ کسی وقت لاش بن جانے کا تصور دل کو بھاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کسی ہنگامے کی نذر ہو کر میں خونچکاں لاش بن گیا ہوں۔ یہ لاش ماتم کناں رشتے داروں کے درمیان چارپائی پر پڑی ہے۔ کسی ایک گوشے میں سے غزالہ بھی اس لاش کو دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھوں سے لہو کے آنسو گر رہے ہیں۔ اس کی نگاہیں میرے پیاسے ہونٹوں پر ہیں۔ وہی پیاس جو زندگی بھر میرے ساتھ رہی ہے۔ میرے حلق میں کانٹے توڑتی رہی ہے۔ پچھتاوے کے تیر غزالہ کے سینے میں پیوست ہو رہے ہیں۔ وہ سوچتی ہے ان پیاسے ہونٹوں کی محرومی کی ذمے دار وہی تو ہے۔ اس رائیگاں زندگی کو حسرت ناک موت میں بدلنے والی وہی تو ہے۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو شاہ جہاں۔ منزل آ گئی ہے۔" پاشا نے مجھے ٹہوکا دیا۔

ہماری گاڑی ایک کشادہ سڑک کے موڑ پر کھڑی تھی۔ اب اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ ساڑھے آٹھ کا وقت ہو گا۔ یہ ایک پوش رہائشی علاقہ تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں' ان کے سامنے پھلواریاں تھیں اور کیلے' ناریل وغیرہ کے درخت تھے۔ کوٹھی نمبر ہنڈرڈ ٹو قریباً سو میٹر کی دوری پر نظر آ رہی تھی۔

"اب کیا پروگرام ہے۔ کیسے پتا چلے کہ وہ حرامی اندر ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"یار! تم فکر مت کرو۔ اب کی مرتبہ یہ ساری ذمے داری میری ہے۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔"

"کچھ پتا ہمیں بھی تو چلنا چاہیے۔"

پاشا بولا "میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ اس بندے کو میں جانتا ہوں۔ کچھ علیک سلیک بھی ہے۔ لندن میں اپنے جس رقیب کو اس نے پھڑکایا تھا وہ کچھ کچھ مجھے بھی جانتا تھا۔ درحقیقت اس کو پھڑکانے میں میں نے ہی اس کی مدد کی تھی۔"

"یعنی اب تم اس پرانی حیثیت سے اس سے ملنے جاؤ گے؟"

"بالکل۔" پاشا نے ایک آنکھ دبا کر کہا "اس سے پوچھوں گا کہ جس لڑکی کی خاطر بندہ مارا تھا' اسے بچے کی ماں بھی بنایا ہے یا نہیں۔"

"واکی ٹاکی آن رکھو گے؟"

"ہاں۔ بلکہ کوشش کروں گا کہ واش روم جانے کے بہانے تم سے بات بھی کر لوں۔ اگر نہ کر سکا تو تمہیں سگنل بھیج کر رابطہ منقطع کر دوں گا۔ یہ تم لوگوں کے لیے اندر گھسنے کا اشارہ ہو گا۔ اگر یہ اشارہ نہ ملا تو پھر خود باہر آؤں گا اور تمہیں صورت حال کی خبر دوں گا۔"

دو چار منٹ کے اندر اندر ہمارے درمیان ساری تفصیل طے ہو گئی۔ جب ہم گفتگو کر رہے تھے ایک ادھیڑ عمر شخص گرین بیلٹ پر سیرگشت کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب رو لڑکی تھی' وہ دیکھنے میں اس کی بیٹی یا بہو نظر آتی تھی۔ چہل قدمی کرتے ہوئے وہ دونوں دو مرتبہ ہماری وین کے قریب سے گزرے۔ گھونگریالے بالوں والے ادھیڑ عمر شخص نے ذرا غور سے ہماری گاڑی کی طرف دیکھا تھا۔ اب جبکہ پاشا گاڑی سے اترنے کی تیاری کر رہا تھا ایک دم اسے اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ ایک نہایت لحیم شحیم باوردی گارڈ ہماری گاڑی کی طرف آیا۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ گارڈ کو ہماری طرف بھیجنے والا وہی ادھیڑ عمر شخص ہے۔

گارڈ نے تفتیشی نظروں سے ہمیں گھورا۔ ہم نے اسلحہ چھپا لیا تھا لیکن نال تانیگری کی رائفل کی نال نشست کے نیچے سے جھانک رہی تھی۔ تیز نگاہ والے گارڈ نے اس نال کو دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

اس سے پہلے کہ وہ حلق سے کوئی آواز نکالتا یا اپنی رائفل سیدھی کرنے کی جرأت کرتا' میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نازک موقع پر ہم کسی طرح کی ہنگامہ آرائی افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ گارڈ نے مچھلی کی طرح تڑپ کر گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میرا بازو اس کی گردن پر بالکل فٹ بیٹھ چکا تھا۔ بے شک۔ گارڈ طاقت ور تھا لیکن وہ اس سے پانچ گنا طاقت ور بھی ہوتا تو اب خود کو چھڑا نہ سکتا۔ میں نے مخصوص انداز میں دباؤ ڈالا اور وہ تولیے کی طرح میرے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ پاشا نے جلدی سے اس کی رائفل تھام لی تھی۔ تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے گارڈ کو گاڑی میں کھینچ لیا۔

پاشا نے سرسراتی آواز میں کہا "میرا خیال ہے کہ اس بڈھے کو شک ہو گیا ہے۔ وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔"

"آتا ہے تو آنے دو۔" میں نے بے ہوش گارڈ کو مزید اندر کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

چند سیکنڈ بعد گھونگریالے بالوں والا ادھیڑ عمر شخص موڑ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ شاید حیران تھا کہ اس کا گارڈ کہاں گیا ہے۔ ادھیڑ عمر نے نصف بازو کی شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ مجھے شک گزرا کہ شاید اس کا تعلق بھی امارات وغیرہ سے ہے۔

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں گاڑی کے اندر جھانکا۔ میں نے ماؤزر کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کر دیا "خبردار! آواز نکالی تو ڈھیر ہو جاؤ گے۔"

بوڑھے نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا' پھر چند سیکنڈ بعد اچانک اس کا خوف وحشت میں بدل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اسے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا اور وہ یہیں لہرا کر سڑک پر گر پڑے گا۔ تاہم وحشت کے شدید ریلے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور میری طرف انگلی اٹھا کر بولا "تم۔۔۔ تم۔۔۔ شاہ جہاں ہو۔۔۔ شاہ جہاں جہانی۔"

میرے حلیے میں میک اپ کے باوجود اس نے مجھے پہچانا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میری شکل و صورت سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے ماؤزر کو اس کی کھوپڑی سے کچھ اور قریب کر دیا۔

بوڑھا بولنا چاہ رہا تھا لیکن وحشت کی فراوانی سے بول نہیں پا رہا تھا' اب اس نے اپنے تنومند گارڈ کا بے حرکت جسم بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ وہ جیسے بڑی تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے گاڑی کے دروازے کو تھامتے ہوئے کہا "میں۔۔۔ میں شیخ واحد ہوں۔ ایاز میرا۔۔۔ پوتا ہے۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ یہ درمیانے جسم کا بوڑھا امارات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ خود کو ایاز کا دادا بتا رہا تھا اور عربی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ اس لہجے میں P اور T وغیرہ کو بالترتیب ب اور ت میں بدل دیا جاتا ہے۔ بوڑھے کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اب مجھے بھی کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ میں نے یہ صورت دیکھی ہوئی ہے۔ شاید انہی منحوس دنوں میں دیکھی تھی جب میری بہن شفا کے لیے امارات سے براتیوں کے نام پر اٹھائی گیروں کا ٹولا اتر آیا تھا۔ وہ بھیانک سازش غزالہ کی وجہ سے ناکام تو ہو گئی تھی لیکن اس کے زخم ابھی تک میرے دل پر موجود تھے۔ یہ شخص ایاز کا دادا تھا اور ایاز نے اس گھناؤنی سازش میں دولہا کا روپ دھارا تھا۔ وہی ایاز جو اپنے مرحوم باپ کی طرح "وائٹ مین" کہلاتا تھا لیکن اصل میں "بلیک مین" تھا۔

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ بوڑھے کو مخاطب کیا "کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔"

"میں۔۔۔ میں اس خون خرابے کو روکنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں۔۔۔ کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔" آخری الفاظ بولتے بولتے بوڑھے کا گلا رندھ گیا۔

میں نے چند لمحوں تک اس کا جائزہ لیا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو۔"

بوڑھے شیخ نے خشک لبوں پر زبان پھیری "میں۔۔۔ تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہوں گا۔ کیا تم مجھے دس منٹ دے سکتے ہو؟"

"اگر تمہارے ذہن میں کوئی ہیر پھیر ہے تو وہ نکال دو۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔"

"میں خدا کی قسم کھاتا ہوں' میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تم مجھے صرف دس منٹ دے دو' میں تمہیں پوری طرح مطمئن کر دوں گا۔ یہ۔۔۔ سامنے ہی ہماری کوٹھی کا گیٹ ہے۔ ہم انیکسی میں یا لان میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر تمہیں کوئی بات کہنی ہے تو یہیں کہو۔ اگر تنہائی چاہتے ہو تو میرے یہ ساتھی کچھ دیر کے لیے باہر چلے جاتے ہیں۔"

بوڑھا شیخ واحد نیم رضامند نظر آنے لگا۔ میں نے دیکھا شیخ واحد کے ساتھ چہل قدمی کرنے والی خوب رو لڑکی کچھ فاصلے پر اسٹریٹ لائٹ کے نیچے کھڑی تھی۔ غالباً اسے ابھی تک صورت حال کی اصل سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے ماؤزر کا رخ ابھی تک شیخ واحد کی طرف رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا "وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے' اسے بھی یہاں بلا لو۔"

"لیکن وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میرا مطلب ہے کہ وہ واپس گھر میں چلی جائے اور ابھی تمہارے پوتے کے دو درجن گارڈ یہاں پہنچ کر ہمیں گھیر لیں۔"

بوڑھے نے ایک بار پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پاشا نے تحکم سے کہا "سوچتا کیا ہے۔ اگر بات کرنا چاہتا ہے تو پھر اس لڑکی کو بلا یہاں۔۔۔ ورنہ ہم گھس رہے ہیں تیرے حرامی پوتے کی کوٹھی میں۔۔۔"

بوڑھا پہلے ہی دہشت زدہ تھا۔ پاشا کے لہجے نے اس

کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ وہ چند قدم آگے گیا اور اس نے مری مری آواز میں لڑکی کو پکار کر گاڑی کے قریب بلالیا۔ اس کے پکارنے کے انداز سے ہی ہمیں پتا چل گیا کہ لڑکی اس کی بیوی ہے۔ بیٹی نہیں۔۔۔ بیوی ہے۔۔۔ شیوخ کے لیے یہ ایک نارمل سی بات تھی۔ ہم نے امارات میں پچھتر فیصد شیوخ کے بازو میں ایسی ہی نوخیز کلیاں دیکھی تھیں۔ ان حسیناؤں میں سے زیادہ تر غیر ملکی ہوتی تھیں۔ وہ اپنے سے دوگنی اور کبھی کبھی سہ گنی عمر کے شوہروں کے پہلو میں بیٹھی تصویرِ حسرت نظر آتی تھیں۔

دو منٹ بعد ہی شیخ واحد اور اس کی بیوی اسٹیشن ویگن میں تھے جبکہ پاشا اور ہجے وغیرہ گاڑی سے باہر نکل کر کچھ فاصلے پر موجود ایک بیکری میں چلے گئے تھے۔

نوخیز کلی کا نام انیلا تھا۔ وہ لبنانی تھی۔ خوب گوری چٹی اور بلوری آنکھوں والی۔ اس کے مقابلے میں شیخ واحد بوڑھا ہونے کے علاوہ بھدا اور سانولا بھی تھا۔ انیلا نامی یہ لڑکی بے ہوش گارڈز کو دیکھ کر پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ صحیح معنوں میں اس کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ شیخ واحد نے لرزاں آواز میں پوچھا "کیا۔۔۔ یہ۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ یہ مرا نہیں ہے۔ تم مکمل تسلی رکھو۔ یہ دیکھو سانس چل رہی ہے۔" میں نے گارڈ کے پیٹ کے زیر و بم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک کوٹھی کا گارڈ ہم سے بیس پچیس قدم کی دوری پر ٹہل رہا تھا لیکن اسے مطلق خبر نہیں ہوئی تھی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ پاشا وغیرہ نے بیکری کے اندر سے اسٹیشن ویگن پر مکمل نگاہ رکھی ہوئی تھی اور کسی بھی خطرے کی صورت میں میدان میں آنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں نے شیخ واحد سے کہا "ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

شیخ واحد بولا "میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں بس اپنے پوتے کو بچانا چاہتا ہوں۔ وہ میری زندگی کا واحد سہارا ہے۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ لڑے گا اور مارا جائے گا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ مارا جائے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے مار دے۔ اور تم سب کے سینے ٹھنڈے ہو جائیں۔"

"نہیں شاہ جہاں۔ ایسی باتیں مت کرو۔ میں تمہارے بارے میں بہت معلومات رکھتا ہوں۔ تمہارے سامنے وہ کل کا بچہ ہے۔ وہ تمہارے ساتھ دشمنی مول لینے کا اہل نہیں۔ وہ نادان ہے۔ پاگل پن کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یقین کرو شاہ جہاں! میں اسے کئی ماہ سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دن رات اس کے ساتھ مغز مار رہا ہوں۔ میں اس کے دماغ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہمیں عاصم کی دشمنی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہر بندے کے اپنے مفاد ہوتے ہیں، عاصم کے بھی ہیں۔ ہمیں اس کی آگ میں نہیں جلنا چاہیے۔ یقین کرو شاہ جہاں! میرے خیالات امارات کے ان شیخوں سے بہت مختلف ہیں جو تمہارے ساتھ ٹکر لے رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں تمہارا دوست ہوں یا مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے بارے میں میرے خیال وہ نہیں جو میرے عزیز و اقارب کے ہیں اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ میں اپنے بچے کی جان بچانا چاہتا ہوں۔"

"اس کی جان بچانے کے لیے تم کیا کر سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم جو بھی کہو گے، اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"یہ وعدے وعید کی بات نہیں۔ جو کچھ ہونا ہے، ابھی ہونا ہے۔ تمہارا اندازہ درست ہے کہ ہم یہاں لڑنے مرنے کے ارادے سے پہنچے ہیں۔ اگلے ایک آدھ گھنٹے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہم۔۔۔ میں جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے۔" شیخ واحد بن گوہر نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ابھی تک آج صبح کا منظر گھوم رہا تھا جب ایک ویگن میں موجود ایاز کے کارندوں کے پرخچے اڑے تھے۔ شاید وہ تصور کی نگاہ سے اپنے پوتے کو بھی ایسے ہی ہوا میں بکھرتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو شیخ واحد! میں لمبی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں اور مختصریات یہ ہے کہ میں تمہارے پوتے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔ اس کے لیے مجھے آٹھ دس بندوں کا خون کرنا پڑا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں اور اگر اپنی جان دینی پڑی تو وہ بھی ہتھیلی پر ہے۔ تمہارے پوتے پر جو مصیبت آ رہی ہے وہ اسی صورت میں ٹل سکتی ہے کہ اسے میرے سامنے سے ہٹا لو۔ اور اس سے بھی پہلے اس محترم خاتون کو بحفاظت سری لنکا پہنچاؤ جسے تمہارے پوتے نے حبسِ بے جا میں رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ میں صالح باری کی والدہ ام ریاض کی بات کر رہا ہوں۔"

شیخ واحد کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ اس کے چہرے نے گواہی دی کہ ہمارا اندازہ درست ہے۔ باری کی

والدہ ایاز کی تحویل میں ہی ہے۔ شیخ واحد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو میں نے فوراً اسے ٹوک دیا "نہیں شیخ جی! کوئی عذر تراشنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے پاس تمہیں قائل کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے بس ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے۔"

"لیکن اگر۔۔۔"

"میں کہتا ہوں منہ بند رکھو۔" میں نے جھنجلا کر ماؤزر کی نال شیخ کے چہرے کی طرف کر دی۔

لڑکی کی آنکھیں خوف سے کچھ اور پھیل گئیں "پلیز نہیں۔" وہ مری مری آواز میں بولی "شیخ صاحب! وہی کریں گے جو آپ کہیں گے۔۔۔"

"مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ کرے گا۔"

"نہیں یہ کریں گے۔" لڑکی نے ڈری ڈری نظروں سے اپنے بزرگ شوہر کی طرف دیکھا۔

شیخ تھوک نگل کر بولا "او کے۔ او کے شاہ جہاں۔ باری کی والدہ اگلے چوبیس گھنٹے میں تمہارے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ جائے گی۔ یہ میری طرف سے گارنٹی ہے۔ اور یہ بھی گارنٹی ہے کہ امارات میں باری کے کسی عزیز کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور یہ بھی گارنٹی ہے کہ ایاز اب تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ آج کے بعد تم نہیں دیکھو گے اسے۔"

بوڑھے شیخ کی آواز لرز رہی تھی اور جسم بھی لرزاں تھا۔ اگر اس کی خاندانی شان اور رعونت اسے اجازت دیتی تو یقیناً ممکن تھا کہ وہ میرے پاؤں کو بھی ہاتھ لگا دیتا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے میری آنکھوں میں اپنے بیٹے کی "موت" جلی حروف میں پڑھ لی ہے۔

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بوڑھے شیخ کی آنکھوں میں جھانکا "میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"میں۔۔۔ تمہاری ہر شرط بغیر سنے ماننے کو تیار ہوں۔"

"جب تک ام ریاض بحفاظت میرے پاس پہنچ نہیں جاتیں، تم میرے پاس رہو گے۔"

"یہ۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے شاہ جہاں۔ میں تمہارے پاس رہوں گا تو کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ مجھے اگلے چند گھنٹوں میں کافی بھاگ دوڑ کرنی ہو گی۔ تب ہی میں تمہاری شرطیں پوری کر سکوں گا۔ سب سے پہلے تو مجھے ایاز کو یہاں سے لے جانا ہے اور کسی ایسی جگہ پہنچانا ہے جہاں وہ تمہارے لیے کسی طرح کا کوئی مسئلہ پیدا نہ کر سکے پھر ام ریاض کو تم تک پہنچانے کے لیے بھی مجھے انتظام کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"یہ تمہاری بیوی ہے؟" میں نے شیخ کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

شیخ نے اثبات میں سر ہلایا۔ لڑکی شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "سنا ہے کہ شیوخ اپنی کم عمر بیویوں سے خاص محبت رکھتے ہیں۔ یقیناً تمہیں بھی اپنی پوتی کی عمر کی یہ بیوی بہت پسند ہو گی۔ اگر تم ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو پھر اسے یہاں چھوڑ دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ اسی حالت میں تمہیں ملے گی جس حالت میں چھوڑ کر جاؤ گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ تو ڈر سے مر جائے گی۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں میری ہر شرط بغیر سنے منظور ہے۔"

اچانک شیخ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری بات پر بھروسا کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔ تم نے جو شرطیں عائد کی ہیں وہ میں کل تک ہر صورت پوری کروں گا۔"

میں نے زندگی میں پہلی بار کسی شیخ کو عاجزی کی حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا کا رنگ بہت گہرا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شیخ واحد! میں تیرے سفید بالوں کی حیا کر رہا ہوں۔ میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں لیکن یہ مہلت بھی اس شکل میں ہو گی کہ ہمارے خلاف ایاز یا پولیس کی طرف سے کوئی کارروائی نہ ہو۔ اگر کہیں کوئی کارروائی ہوئی تو پھر یہ معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔"

شیخ گڑگڑایا "میں ایاز کی طرف سے پوری ضمانت دیتا ہوں لیکن اگر پولیس نے کسی پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام کے تحت کوئی کارروائی کی تو اس میں میرا قصور نہیں ہو گا۔ ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی طرف سے کوشش کروں گا کہ پولیس مہم جوئی نہ کرے۔"

میں نے کہا "تم ایاز کی طرف سے تو بار بار ضمانت دے رہے ہو مگر اپنی غنڈہ صفت پوتی کی طرف سے کوئی وعدہ نہیں کر رہے۔ فساد کی اصل جڑ تو وہی ہے۔"

"مم۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔" وہ بولا۔

"میں تو صبا کی بات کر رہا ہوں۔ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ معاملات کو بھڑکانے والی وہی ہے۔"

شیخ نے سر جھکاتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! میں تم سے بالکل کھری بات کر رہا ہوں اور وہی وعدہ کر رہا ہوں جسے پورا کرنا میرے بس میں ہے۔ تو یہ کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس سے بات کرتے ہوئے تو اس کا بھائی (عاصم) بھی جھجکتا ہے۔ وہ کسی کے کہے میں نہیں ہے۔ وہ بالکل باغی اور خود سر لڑکی ہے۔"

مجھے شیخ کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس حوالے سے اس پر فی الحال زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ہمارے درمیان قریباً پندرہ منٹ تک مزید بات چیت ہوئی پھر میں نے کچھ شرائط کے تحت شیخ اور اس کی نوخیز بیوی کو گاڑی سے اترنے کی اجازت دے دی۔ بے ہوش گارڈ ابھی تک نشستوں کے درمیان اوندھا پڑا تھا۔ اس کی طرف میاں بیوی میں سے کسی نے توجہ نہیں دی۔ درحقیقت دونوں کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی، خاص طور سے لڑکی کو۔ اس نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ وہ غالباً اپنی ضرورتوں کی زنجیر سے بندھ کر اس بڈھے کھوسٹ کے پلے بندھ گئی تھی۔ اور اب ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے بڈھے کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے ذریعے مخصوص اشارہ کیا۔ پاشا اور سجے وغیرہ ائر کنڈیشنڈ بیکری میں سے برآمد ہو گئے۔ میں نے نامل ٹائیگر کے ساتھ مل کر بے ہوش گارڈ کو گاڑی سے اتار کر کنارے کے درختوں میں پہنچا دیا۔

چند ہی سیکنڈ بعد ہم واپس روانہ ہو رہے تھے۔ جب ہم نے یوٹرن لے کر اپنا رخ موڑا، مجھے ہیڈ لائٹس میں سائیں عالی اور سروج نظر آئے۔ سروج سائیکل چلا رہی تھی جبکہ سائیں مضحکہ خیز انداز میں اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اب کوٹھی نمبر پندرہ وی تک پہنچے تھے۔ میں نے ہیڈ لائٹس میں دیکھا سروج پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ اس کی پیاز کے چھلکے جیسی شرٹ اس کے بارہ صفت بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر سیدھی نکل گئی۔ غالباً اس کے لیے سائیں عالی کا یہی حکم تھا۔

ہماری اسٹیشن ویگن واپس ہماری رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم ائرپورٹ جانے والی سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ ایک ٹریفک سگنل پر ہماری گاڑی رکی۔ ہماری گاڑی کے ساتھ ہی ایک نئے ماڈل کی مرسیڈیز کھڑی ہوئی۔ اچانک میں نے پاشا کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھے۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ میں نے پاشا کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر ایک جواں سال عورت براجمان تھی۔ وہ ساڑی میں تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا تھی اور وہ بڑے ٹھاٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

یہی وقت تھا جب اس عورت کی نظر بھی اسٹیشن ویگن کی کھڑکی سے گزر کر پاشا پر پڑ گئی۔ میں نے اس کے خوب رو چہرے کے تاثرات بھی تیزی سے بدلتے دیکھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ مسکرائی اور اس نے پاشا کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ اس کی انگلیوں میں نہایت قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اسی دوران میں گاڑیاں حرکت میں آ گئیں۔

پاشا نے ڈرائیور سے کہا "سگنل کراس کر کے گاڑی ایک سائیڈ پر لگا دو۔"

ڈرائیور نے بائیں طرف کا اشارہ لگا دیا۔ میں نے پاشا سے پوچھا "خاتون کون ہے؟"

وہ ذرا پریشان لہجے میں بولا "منوہرا دیوی۔"

میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ اب تک منوہرا دیوی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ وہ زبردست اثر و رسوخ اور تعلقات کی مالک تھی۔ اس کا کہا پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ دنیا کے عیاش ترین دولت مند اس کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ وہ حیران کن صلاحیتوں کی مالک تھی وغیرہ وغیرہ۔ توقع تھی کہ عنقریب اس معروف آفت سے ملاقات ہوگی لیکن اتنی جلدی ہوگی یہ معلوم نہیں تھا۔ پاشا بھی کچھ سٹپٹایا ہوا سا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں منوہرا دیوی مجھے یا سجے وغیرہ کو پہچان نہ لے۔

گاڑی رکنے سے پہلے ہی پاشا نے مجھے مخاطب کر کے تیزی سے کہا "تمہارا نام دیوی کے سامنے جہاں دار ہے۔ میں تمہارا باس ہوں۔ تم میرے ساتھ ہی پاکستان سے یہاں آئے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں گاڑیاں رک چکی تھیں۔ پاشا اسٹیشن ویگن سے اتر کر منوہرا دیوی والی مرسیڈیز کے قریب پہنچا۔ مرسیڈیز کی اگلی نشست پر گھنی مونچھوں والا ایک مسلح گارڈ چوکس بیٹھا تھا۔ گاڑیاں رکنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ گارڈز سے بھری ہوئی ایک بند جیپ مرسیڈیز کے عقب میں موجود ہے۔

پاشا نے مرسیڈیز کا دروازہ کھولا اور مئودب انداز میں منوہرا کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ منوہرا کا چہرہ پُر گوشت اور رعب دار تھا۔ بھوری آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ منوہرا نامی اس عورت سے کبھی میرا تعلق واسطہ نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی میں میک اپ میں تھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ عورت مجھے پہچان پائے گی۔

گفتگو کے دوران میں منوہرا دیوی نے دو تین بار ہماری گاڑی کی کھڑکیوں کی طرف بھی دیکھا۔ چار پانچ منٹ بعد پاشا گاڑی میں واپس آ گیا۔ زیر لب بولا "اب تو پھنس گئے ہیں شہزادے۔ دیوی کے ساتھ ہی جانا پڑے گا۔"

پھر وہ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا "چلو ڈرائیور۔ مرسیڈیز کے پیچھے چلو۔"

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ "یہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑی ہے؟!" میں نے پوچھا۔

"سیدھا بمبئی سے آ رہی ہے۔ ائرپورٹ سے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ ہم پر نظر پڑ گئی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

گارڈز کی جیپ ہماری اسٹیشن ویگن کے پیچھے تھی۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہم دو تین معروف سڑکوں سے گزر کر کولمبو کے ساحل کی طرف آ گئے۔ یہاں ایک شاندار کوٹھی کے اندر پہنچ کر تینوں گاڑیاں آگے پیچھے رک گئیں۔ کوٹھی کے مکینوں کو منوہرا کی آمد کی خبر پہلے سے تھی لہٰذا وہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ منوہرا کا استقبال کسی ریاست کی رانی مہارانی کی طرح کیا گیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی ہم نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں کی ہر شے سے عیش و عشرت کا رنگ جھلکتا ہے۔ باغیچے کا فوارہ ایک بڑے جام کی شکل میں تھا اور اس میں سے جھاگ اڑاتی شراب باہر ابلتی محسوس ہوتی تھی۔ ہم مہمان خانے میں داخل ہوئے تو وہاں آرائشی چیزوں میں حسیناؤں کے بالکل عریاں مجسمے نظر آئے۔ ایک بڑے ہال کمرے پر بالکل کسی بالا خانے کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں کھڑکیوں پر رنگین پردے تھے اور بیش قیمت قالینوں پر گاؤ تکیے رکھے تھے بالکل انڈین فلموں کا سا ماحول تھا۔

ہم کچھ دیر تذبذب میں کھڑے رہے پھر ہمیں نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ سجے کے علاوہ ٹامل رپست بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پاشا نے یہ کہہ کر منوہرا کو مطمئن کر دیا تھا کہ ہم تینوں اس کے قریبی ساتھی ہیں۔ کوٹھی میں موجود ملازماؤں کے لباس بھی حشر ساماں تھے۔ وہ اپنے کولہے مٹکاتی اور قہقہے بکھیرتی تتلیوں کی طرح یہاں سے وہاں آ جا رہی تھیں۔

پاشا نے رپست کو ڈرائیور کے پاس باہر کمپاؤنڈ میں بھیج دیا۔ ہم تینوں نشست گاہ میں ہی رہے اور حسین لڑکیاں ہماری ساقی گری کرتی رہیں۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد منوہرا بھی چینج کر کے وہاں پہنچ گئی۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی لیکن وہ اپنی عمر سے کم از کم پانچ سال چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس کا جسم بھرپور تھا اور ساڑی میں خطرناک طریقے سے کسا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بہت کھلے گلے کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ یقیناً وہ اب بھی شوقین مزاج مردوں کے دل بھڑکا سکتی تھی۔

اس نے بس ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ مجھے کسی بھی حوالے سے شناخت نہیں کر سکی۔ کرسی پر بڑے شاہانہ طریقے سے بیٹھنے کے بعد اس نے اطراف کا جائزہ لیا اور پاشا سے مخاطب ہو کر بولی "پاشا! کیا ہم یہاں آزادی سے بات کر سکتے ہیں؟"

"بالکل دیوی! یہ سب قریبی ساتھی ہیں۔"

دیوی کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ وہ ذرا تلخی سے بولی "کام کی رفتار بہت سست ہے پاشا۔ اس طرح تو ہم ٹارگٹ سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ میں واقعی بہت مایوس ہوئی ہوں۔"

"مجھے احساس ہے دیوی۔ ہم بڑی تیزی سے کام شروع کر رہے ہیں۔ بہت جلد آپ کی شکایت دور کر دیں گے۔"

"کیا شکایت دور ہوگی پاشا! ابھی تک وہ تین چھوٹی چھپکلیاں تو تمہارے ہاتھ نہیں آ سکیں۔"

منوہرا کا اشارہ یقیناً "گالی گڑیوں" کی طرف تھا۔ پاشا بولا "ان کی طرف سے تو آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ سمجھیں وہ "کام" بس ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک عین موقع پر بیمار ہو گئی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اب تک پارسل ہو چکی ہوتیں۔"

"ارکے۔ اس کام کو اب جلد ہونا چاہیے۔ بہت دیر سے لٹکا ہوا ہے یہ مسئلہ۔ کسی وقت تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔"

"اب یہ الجھن باقی نہیں رہے گی۔" پاشا نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

منوہرا دیوی کھڑی ہو گئی اور دبیز قالین پر ٹہلنے لگی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور سینہ تنا ہوا تھا۔ ساڑی اس کے جسم کے ساتھ یوں پیوست تھی کہ جسم ہی کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ وہ بولی "ہمیں کام کی رفتار بڑھانا ہوگی۔ اس کے لیے تم میں سے کسی کے ذہن میں کوئی تجویز ہو تو بتاؤ۔"

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کے اپنے ذہن میں کوئی تجویز موجود ہے لیکن اس سے پہلے وہ ہماری رائے بھی جاننا چاہتی ہے۔ اس موقع پر پاشا نے کوئی رائے دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ چند سیکنڈ تک پُرسوچ انداز میں ہمارے چہرے دیکھتی رہی پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا "پاشا تم نے اپنے ان ساتھیوں کا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔" وہ بولی۔

پاشا نے کہا "اس کا نام بے سہارا ہے ریوی! یہ کولمبو کا شناور ہے۔ مختلف لوگوں اور محکموں سے اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ انتظامی کاموں کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے اور یہ جہاں دار ہے۔ پاکستان سے میرے ساتھ ہی آیا ہے۔ سو فیصد بھروسے کا آدمی ہے۔ ہر قسم کے لوگوں کو ہینڈل کر سکتا ہے۔ اسلحے کا استعمال بہت اچھی طرح جانتا ہے۔"

منوہرا نے تنقیدی نظروں سے میرا سراپا دیکھا اور بولی "یہ میک اپ میں ہے؟"

"جی ریوی۔" پاشا نے اثبات میں جواب دیا "مقامی پولیس کو ایک کیس کے سلسلے میں اس کی تلاش تھی لہٰذا میک اپ ضروری ہو گیا تھا۔"

"اوکے۔" منوہرا نے کہا اور ایک بار پھر اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔ اس کے کٹے ہوئے بال اس کے شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ قریباً ایک منٹ بعد اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی توجہ ہم پر مرکوز کی اور بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی خاص تجویز نہیں ہے۔ لیکن میرے پاس ایک تجویز ہے جس پر فوری عمل کیا جا سکتا ہے۔"

"جی آپ فرمائیں۔" پاشا نے نیازمندی سے کہا۔

وہ بولی "ہم انڈین فلم انڈسٹری کی ایک جانی پہچانی شخصیت کو اپنے کام میں شریک کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا اداکار ہے جو ہدایت کار ہونے کے علاوہ فلم ساز بھی ہے۔ یہ شخص ایک بڑے بجٹ کی فلم بنا رہا ہے۔ اس فلم کی کہانی انگلینڈ میں موجود سری لنکن تارکین وطن کے گرد گھومتی ہے۔ اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ بھی انگلینڈ میں ہی ہوگی۔ اس فلم میں کام کرنے کے لیے بہت سے اداکاروں اور اداکاراؤں کی ضرورت ہوگی۔ ان لوگوں کے انتخاب کے لیے انٹرویوز ہوں گے اور آڈیشن وغیرہ لیے جائیں گے۔ جو لوگ منتخب ہوں گے انہیں کمپنی اپنے خرچ پر انگلینڈ لے جائے گی اور اصل لوکیشنز پر شوٹ کرے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہوں ناں؟"

"بالکل سمجھ رہے ہیں ریوی جی۔" پاشا نے کہا۔

منوہرا نے اس حوالے سے ہمیں کچھ مزید تفصیلات بتائیں اور بولی "اس سلسلے میں کوئی سوال؟"

پاشا نے کہا "اس فلم کے حوالے سے آپ سامنے آئیں گی یا پس منظر میں رہیں گی۔"

"میرا پس منظر میں رہنا ضروری ہے کیونکہ یہ "آخری" کام نہیں ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ یہ تو ایک طرح سے شروعات ہے۔"

پاشا بولا "کیا آپ اس معروف فلمی شخصیت کے بارے میں بتانا پسند فرمائیں گی جو اس سارے معاملے کو ہینڈل کرے گا۔"

منوہرا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری "ابھی اسے سربستہ راز ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔"

"کیا اس معروف شخصیت کو معلوم ہے کہ یہ سارا پروجیکٹ "ڈمی" ہے؟"

"ہاں اسے بھی معلوم ہے۔" منوہرا نے کہا۔

○☆○

ہماری رہائش کا انتظام اس وسیع کوٹھی کے ایک پورشن میں کر دیا گیا تھا۔ منوہرا کو پاشا نے بتایا بھی تھا کہ ٹمپل روڈ پر ہماری اپنی رہائش گاہ موجود ہے لیکن منوہرا کی ہدایت تھی کہ اس رہائش گاہ کو چھوڑ دیا جائے اور ہم اسی کوٹھی میں آ جائیں۔ اس نے کہا تھا "میں کام کی رفتار بڑھا رہی ہوں۔ اب ساتھیوں سے میرا فوری اور یقینی رابطہ ضروری ہے۔"

پاری اسی رہائش گاہ پر موجود تھا اگلے روز دو بجے کے لگ بھگ اس کی والدہ ام ریاض اس کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ انہیں جو لوگ چھوڑنے آئے تھے وہ یقیناً شیخ واحد ہی کے آدمی تھے۔ ام ریاض نے بتایا تھا کہ انہیں ابو ظہبی میں ان کے گھر کے اندر کیمیکل اسپرے کے ذریعے بے ہوش کیا گیا تھا جب وہ ہوش میں آئیں تو کسی اجنبی جگہ پر موجود تھیں۔ بہرحال انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی گئی اور احترام کے ساتھ یہاں تک پہنچایا گیا ہے۔

شیخ کے کارندوں نے رپورٹ دی تھی کہ کل رات سے گال روڈ کی کوٹھی نمبر پندرہ خالی پڑی ہے۔ فقط دو چوکیدار اور دو تین گھریلو ملازم ہی وہاں موجود ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈرے ہوئے عمر رسیدہ شیخ نے اپنا دوسرا وعدہ بھی پورا کیا ہے اور اپنے پوتے ایاز کو میرے راستے سے ہٹا

لے گیا ہے لیکن ابھی اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ "جناب جی" مستقل طور پر میرے راستے سے ہٹے رہیں گے یا یہ عارضی تبدیلی ہے۔

توسیہ کے بارے میں ابھی تک کچھ واضح نہیں تھا۔ کچھ اشارے ایسے ضرور ملے تھے جن سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید کولمبو میں ہی موجود ہو۔ توسیہ کے دونوں مضروبین ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ لطیفا اسپتال سے فارغ ہو کر ٹمپل روڈ والی رہائش گاہ پر پاری کے پاس پہنچ گئی تھی تاہم ابھی اسے مزید آرام اور ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پاری کی گردن میں بھی کالر موجود تھا۔ میرے ذہن میں وہ منظر رہ رہ کر گھومتا تھا جب توسیہ مجھے بے بسی کی حالت میں بجرے پر چھوڑ گئی تھی۔ اس کی وہ بے حسی میرے لیے یادگار رہی۔

یہ دوسری شام کا واقعہ تھا۔ میں اور پاشا اپنے کمرے میں موجود تھے۔ بالائی منزل سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ منوہرا کی بھتیجی تھی۔ وہ باقاعدہ ڈانسر تھی اور گانا بھی سیکھ رہی تھی۔ لباس پہننے اور ادائیں دکھانے میں وہ کسی بھی انڈین ہیروئن سے کم نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پورچ کی طرف دیکھا اور یکے بعد دیگرے دو زبردست سرپرائز مجھے ملے۔ دونوں سرپرائزز میں چند منٹ کا وقفہ تھا۔ پہلا سرپرائز سروج کی شکل میں تھا۔ میں نے اسے پورچ میں منوہرا کے ساتھ دیکھا۔ وہ ایک نہایت بھڑکیلی ساڑی میں تھی۔ پیٹ نیچے سے بہت اوپر تک عریاں نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور جوڑے میں موتیے کے گجرے تھے۔ وہ سوچ رہے تھی کہ گرج کو جانے والی بلی کی طرح وہ ستی ساوتری نظر آتی تھی۔

اس کی یہاں موجودگی میرے لیے حیران کن تو تھی لیکن بہت زیادہ حیران کن بھی نہیں تھی۔ سروج کا تعلق انڈین فلم لائن سے تھا اور منوہرا بھی اس میدان کی پرانی کھلاڑی تھی۔ منوہرا کے سامنے سروج بڑی مودب اور باملاحظہ نظر آ رہی تھی۔ ابھی تین دن پہلے میں نے اسے سائیں عالی کے ساتھ سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔ اس کا موجودہ روپ پہلے روپ سے بہت مختلف تھا۔ بہرحال ایک سائیں تھا اور ایک اس کی چیلی تھی دونوں کسی وقت کوئی بھی گل کھلا سکتے تھے۔

منوہرا کچھ سمجھانے والے انداز میں سروج سے محو گفتگو تھی۔ اچانک ایک کار پورچ میں آکر رکی۔ اس کی کھڑکیوں میں رنگدار شیشہ تھا۔ جو شخص باہر نکلا اسے دیکھ کر میرا اور پاشا کا چونکنا لازمی تھا۔ پاشا بولا "شاہ جہان! کیا تم بھی وہی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے والا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ واقعی دیو آنند ہے یا کسی پر میک اپ کر کے اسے ایسا بنایا گیا ہے۔"

"اتنی دور سے دیکھ کر تو کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے کہا "بہرحال دیکھنے میں تو ہوبہو وہی لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے پرسوں منوہرا ریوی نے "دیو آنند" کا ہی ذکر کیا تھا۔"

"لیکن یار! یہ اتنا مشہور اور کامیاب اسٹار ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا ہے۔ اسے کالے دھندے میں پڑ کر ہاتھ منہ کالا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

پاشا بولا "یار! اس طرح تو منوہرا ریوی کو بھی دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ دنیا بھر کے عیاش اس کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھولنے کے لیے تیار رہتے ہیں پھر بھی وہ انسانی اسمگلنگ میں ملوث ہو رہی ہے۔"

"مگر مجھے اس شخص کے بارے میں یقین نہیں آ رہا۔ سنا ہے کہ یہ پنجابی ہے پڑھا لکھا شخص ہے بلکہ اپنے لاہور میں پڑھتا رہا ہے۔ اخلاقی طور پر اتنا برا بھی نہیں ہے۔"

"پھر ہو سکتا ہے اس کی کوئی ناگزیر مجبوری اسے منوہرا کے حلقۂ احباب میں لے آئی ہو۔"

مجھے فلم وغیرہ کا شوق بچپن سے ہی نہیں تھا۔ ہاں پاکستان ہندوستان کے مشہور اداکاروں کی شکل و صورت سے کچھ شناسائی تھی۔ بعد میں جب زریں گل اور سروج وغیرہ سے پالا پڑا تو اس حوالے سے "گراں قدر" اور تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔

سروج بھی اکثر ہندوستانی اداکاروں کے قصے مزے لے لے کر بیان کرتی تھی۔ یہ اداکاروں کی نہیں بلکہ راجے مہاراجوں کی کہانیاں محسوس ہوتی تھیں۔ انڈین فلم انڈسٹری میں واقعی بہت دولت ہے۔ یہ ایک غریب ملک کا امیر ترین طبقہ ہے۔ بڑے اداکار شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ ایک طرف ان کے رابطے انڈر ورلڈ کے بدمعاشوں سے ہوتے ہیں دوسری طرف وہ گاہے بگاہے پولیٹکس میں بھی منہ مارتے رہتے ہیں۔ بمبئی میں جو زمانہ میں نے گزارا تھا وہ اس حوالے سے یادگار رہا تھا۔ مجھے انڈین فلم انڈسٹری اور مختلف مافیاز کے سلسلے میں بہت معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

رات گئے تک ہم اس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

میرے علاوہ پاشا نے بھی معروف اداکار دیو آنند کو پہچانا تھا' اُن کے علاوہ وہ سروج کو بھی فلمی ڈانسر کی حیثیت سے پہچان گیا تھا۔ پاشا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سروج کا میرے ساتھ کنکشن ہے اور یہی سائیں غالی کی وہ چیلی ہے جس کا ذکر وہ کئی بار سن چکا ہے۔ سروج کا یہاں نظر آنا بھی میرے لیے مسلسل حیرت کا سبب بنا ہوا تھا۔ اگر سروج یہاں تھی تو اس کا مطلب تھا کہ سائیں غالی بھی کہیں آس پاس ہی ہوگا۔

اگلے روز جے کی ایک اطلاع کی وجہ سے ہمارے شکوک دور ہوگئے۔ جے نے بتایا "مجھے معلوم ہوا ہے جناب کہ آج کل کچھ بھارتی اداکار ایک یونٹ کے ساتھ کولمبو آئے ہوئے ہیں اور ساحل پر شوٹنگ کر رہے ہیں۔ ان میں معروف انڈین اداکار دیو آنند بھی شامل ہے۔"

پاشا نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ کل جو بندہ گاڑی سے اترا وہ واقعی دیو آنند تھا۔"

"یہ کافی دلچسپ معاملہ محسوس ہوتا ہے۔" پاشا نے کہا۔

جے نے اطلاع دی "آج اخبار میں ایک اشتہار بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں "ایم اے سی" ایک فلم کمپنی نے اپنی نئی فلم کے لیے نئے چہروں کی ضرورت ظاہر کی ہے۔ امیدواروں کو اپنی نام، تصاویر اور دیگر کوائف کے ساتھ رابطہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔"

میں نے جے سے کہا کہ وہ اشتہار لے کر آئے۔ چند منٹ بعد اشتہار ہمارے سامنے تھا۔ اشتہار انگلش میں پہلے صفحے پر شائع ہوا تھا اور اس کی عبارت سے سنجیدگی جھلکتی تھی۔ امیدواروں کو رابطے کے لیے جو ایڈریس دیا گیا تھا وہ اسی علاقے کا تھا جس میں ہم رہ رہے تھے' تاہم یہ کوٹھی کوئی اور تھی۔

پاشا نے اشتہار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میرے خیال میں یہ ہمارے عین سامنے والی کوٹھی ہے۔ یہ اس کا نمبر دیکھو 208 ۔۔۔"

نمبر واقعی ہماری سامنے والی لین کا تھا۔ اس اشتہار میں جو نام دیا گیا تھا وہ میرے لیے ایک بار پھر حیرت کا باعث بنا۔ وہ سروج کا نام تھا۔ اے ایم اے سی نامی فلم کمپنی کی مقامی ایگزیکٹیو ظاہر کیا گیا تھا۔ اور مس سروج راج لکھا گیا تھا۔ اشتہار کی عبارت میں منوہرا دیوی کا کہیں نام نہیں تھا۔ نہ ہی دیو آنند وغیرہ کا ذکر تھا۔ ہاں عبارت سے اتنا پتا ضرور چل جاتا تھا کہ ایم اے سی (میگھا آرٹ کمپنی) انڈین فلم انڈسٹری کا ایک با اعتماد ادارہ ہے۔

منصوبے کا تانا بانا اب کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ منوہرا دیوی خود پس منظر میں رہ کر فلم کے شائق نوجوانوں کے لیے ایک جال بچھا رہی تھی۔ بظاہر یہ لگ رہا تھا کہ ایک معروف اداکار بھی کسی وجہ سے اس کام میں اعانت کر رہا ہے۔

اگلے روز اس اشتہار کے اثرات نظر آنے شروع ہوگئے۔ جس کوٹھی کا ایڈریس اشتہار میں دیا گیا تھا وہ ہماری رہائش گاہ کے عین سامنے تو نہیں تھی لیکن زیادہ فاصلے پر بھی نہیں تھی۔ وہاں کی سرگرمیاں ہم اپنی رہائش گاہ کی بالائی منزل سے با آسانی ملاحظہ کرسکتے تھے۔ صبح دس بجے کے بعد وہاں آمدورفت شروع ہوگئی۔ وقفے وقفے سے نوجوان لڑکے لڑکیاں عمارت میں داخل ہو رہے تھے جب وہ باہر آتے تھے تو اکثر کے ہاتھ میں ایک فارم ہوتا تھا۔ کچھ وہیں کھڑے ہو کر فارم پُر کرنے لگتے تھے کچھ فارم اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

ایک گاڑی سے ہم نے انڈین فلموں کی ایک جانی پہچانی کریکٹر ایکٹرس کو اترتے دیکھا وہ مسکراتی ہوئی عمارت میں داخل ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور ادھیڑ عمر ایکٹر نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک گلوکارہ بھی تھی۔ گلوکارہ کے بارے میں مجھے جے نے بتایا۔ وہ بولا "ان محترمہ کو یہاں دیتا کہا جاتا ہے۔ کولمبو میں ان کے ہندی اور سنہالی گانے بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی ہمیں دو تین فلمی اداکاروں کے چہرے دکھائی دیئے۔ امیدواروں کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ان امیدواروں میں کالجوں کی فیشن ایبل لڑکیاں اور لڑکے نمایاں تھے۔ کچھ کھاتے پیتے نوجوان گاڑیوں پر آئے تھے۔ وہ اپنے فارم گاڑیوں کے اوپر رکھ کر پُر کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی۔

آج بھی اخبار میں "ایم اے سی" کا اشتہار چھپا تھا' اس کے علاوہ اخبار میں خبر بھی آئی تھی۔ یہ خبر ایم اے سی کی ایگزیکٹیو مس سروج راج کی طرف سے تھی۔ سروج کا بیان تھا کہ کمپنی کو اپنے بڑے بجٹ کی بین الاقوامی فلم کے لیے کم و بیش دو ہزار ایکسٹرا اداکار درکار ہیں۔ ان اداکاروں کی عمریں بیس سے پینتیس سال کے درمیان ہونی چاہئیں۔ ان کا تامل یا سنہالی ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ وہ صحت مند اور چاق و چوبند ہوں۔ پڑھے لکھے لڑکے لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔

سروج نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ان دو ہزار ایکسٹرا اداکاروں میں سے قریباً دو سو افراد کو کمپنی کے خرچ پر انگلینڈ بھی لے جایا جائے گا۔ اس کے علاوہ تمام ایکسٹراز کو ان کے وقت کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔

انڈین انڈسٹری کے ایک دو مزید اداکاروں کی اسٹیٹمنٹ بھی اس خبر میں شامل تھی۔ بہرحال یہ زیادہ مشہور اداکار نہیں تھے۔

خبر پڑھ کر پاشا بولا "یہ لمبا چکر لگ رہا ہے اور پوری تیاری کے ساتھ چلایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "یوں لگ رہا ہے کہ اس میں سروج کا مرکزی کردار ہے۔ سروج ایک ڈانسر کے طور پر مشہور رہی ہے اور اسکرین کا ایک جانا پہچانا چہرہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ منوہرا دیوی اپنی بندوق سروج اور کچھ دیگر افراد کے کندھوں پر رکھ کر چلا رہی ہے۔"

"پھر اب کیا ارادے ہیں؟" پاشا نے پوچھا۔

"فی الوقت تو ہم تیل اور تیل کی دھار دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے۔"

ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ منوہرا دیوی کی ایک نیم عریاں ملازمہ وہاں پہنچ گئی اور اس نے پاشا کو بتایا کہ "دیوی جی" انہیں یاد کر رہی ہیں۔

یہ بلاوا صرف پاشا کے لیے تھا لہٰذا پاشا اٹھ کر دیوی کے پاس چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک دو منٹ بعد ہی ہوگئی۔ کہنے لگا "شاہ جہاں! وہاں تو لمبی میٹنگ ہے شاید مجھے دو تین گھنٹے بیٹھنا پڑے گا۔ بہرحال تمہارے لیے ایک اچھی اطلاع ہے۔"

"کیسی اطلاع؟"

"منوہرا کو ایک ایسے بندے کی ضرورت تھی جو کوٹھی 208 میں چوبیس گھنٹے موجود رہے اور وہاں سروج راج کی مدد کرے۔ میں نے اس سلسلے میں فوراً تمہارا نام لے دیا۔ منوہرا مان گئی ہے۔ تم جہاں داد کی حیثیت سے وہاں چلے جاؤ اور سروج کی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ سروج کو بھی یہ سمجھا دینا کہ تم دونوں کی شناسائی کسی پر ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ سروج کو تاکید کر دینا کہ وہ تمہیں جہاں داد ہی کی حیثیت سے بلائے۔"

یہ تو واقعی اچھی اطلاع ہے لیکن۔ میرے لیے ایک لحاظ سے بری بھی ہے۔ یہ سروج میرے لیے اکثر پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ میرا مزاج میل نہیں کھاتا۔ بہرحال جو ہوگا دیکھ لیں گے۔"

اسی روز میں سڑک کے پار کوٹھی نمبر 208 میں چلا گیا۔ یہاں کے ملازمین کو میری آمد کے متعلق پہلے سے معلوم تھا۔ ان کے خیال میں میری حیثیت ایگزیکٹیو سروج راج کے ماتحت کی تھی۔ میرا کام سروج کی حفاظت کے علاوہ دیگر امور کی نگرانی کرنا تھا۔ میری آمد کی اطلاع سروج کو دی گئی اس نے فوراً مجھے بلا لیا۔ وہ اپنے وسیع و عریض آفس میں بیٹھی تھی۔ دیواروں پر خوب صورت فریموں میں فلموں کے سنسنی خیز مناظر فوٹو گرافز کی شکل میں چمک رہے تھے۔ الماری میں ایوارڈز کی مورتیاں رکھی تھیں۔ فلم میکنگ کے موضوع پر درجنوں کتابیں ایک بک شیلف میں بڑی خوب صورتی سے چنی گئی تھیں۔ بڑا رعب دار سا ماحول بنایا گیا تھا۔ میں جانتا تھا اس ماحول سے سروج کا کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے۔ دو تین گنجے حضرات میری آمد سے قبل سروج کے آفس میں موجود تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اٹھے اور ادب سے سلام کرکے رخصت ہوگئے۔

سروج نے آستین کے بغیر قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی پتلون اتنی باریک اور چست تھی کہ بس جسم ہی کا حصہ نظر آتی تھی۔ اس نے ٹھنڈے ٹھار ائرکنڈیشنڈ کمرے میں ایک گہری سانس لے کر اپنے جسم کو نمایاں کیا اور چپراسی سے بولی "دروازہ بند کردو۔ مجھے ابھی ڈسٹرب نہ کیا جائے اور نہ کوئی کال دی جائے۔" چپراسی تقریباً جھک کر باہر نکل گیا۔

سروج نے بڑی شان کے ساتھ میرے گرد ایک چکر لگایا اور بولی "کہا نہیں تم نے یاد بھی کیا ہے یا نہیں۔ تمہاری شکل سے تو نہیں لگتا کہ تم نے یاد کیا ہوگا۔ تم بڑے سنگ دل ہو شاہ جہاں۔ تمہاری پیدائش سے پہلے تمہاری والدہ ضرور کھانے میں پتھر کھاتی رہی ہوں گی۔"

"مجھے بکواس نہیں چاہیے۔ صرف کام کی بات کرو۔"

وہ مسکرائی "کام کی بات کیا ہے؟ یہ تمہیں نہیں صرف مجھے معلوم ہے کیونکہ یہاں میں تمہاری باس ہوں۔"

"تمہارے جیسے باس ہی اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب اپنے ماتحتوں سے جوتے کھاتے ہیں۔"

"تم مجھے جوتے مارو گے؟" وہ مجھے گھور کر گہری سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں ماروں گا۔"

وہ ایک دم مسکرائی "تو مارو ناں۔ کچھ تو کرو۔ تمہاری ہر بدتمیزی اور ادا ہی تو سر آنکھوں پر۔"

"دیکھو سروج! میرا دماغ پہلے ہی پھٹا ہوا ہے" اس

مزید مت جلاؤ۔ تمہیں کچھ خبر نہیں مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں میرے راجا جانی۔" وہ اٹھلا کر میرے عین سامنے آگئی اور بولی "جو کچھ تم پر گزر رہی ہے اس کا غم شاید تم سے زیادہ مجھے ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارا جیون تم سے روٹھا ہوا ہے۔ وہ شخص تم سے دور چلا گیا ہے جس کے بغیر تمہارے سنسار میں اندھیارے کے سوا اور کچھ نہیں۔ غزالہ کے لیے تم نے جو آنسو بہائے ہیں ان کی بنائی ہوئی لکیریں میں تمہارے سندر رخساروں پر دیکھ سکتی ہوں۔ آئی ایم ریئلی سوری شاہ جہاں۔"

"دیکھو یہ مسکہ بازی چھوڑو۔ صرف کام کی بات کرو۔"

"یہ مسکہ بازی نہیں ہے ڈارلنگ۔ میں تمہارے دکھ کو اپنے من کی گہرائی سے محسوس کر رہی ہوں۔ اس دکھ کو کم کرنے کے لیے ہی تو میں یہاں تمہارے پاس آئی ہوں۔ میں تمہارا دھیان بٹانا چاہتی ہوں۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتی ہوں۔ رام قسم میرا من چاہتا ہے کہ تمہارے جسم پر اپنے ہونٹ رکھوں اور تمہارے اندر کا سارا دکھ چوس لوں۔"

"تم میرے زخموں پر مرہم رکھنے نہیں ان پر نمک چھڑکنے آئی ہو۔ میں تمہاری خصلت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کاش تم جان سکتے لیکن تمہیں تو بس ایک غزالہ کو کھوجنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں رہا۔ پچھلے کچھ برسوں میں تم بس یہی تو کرتے رہے ہو۔"

"سروج مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرو۔"

"میں اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔ اس موضوع پر کچھ کر کے دکھاؤں گی۔" وہ نشیلی نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "اور یہ مت سمجھنا کہ میں کچھ کر نہیں سکتی۔ سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ "کالونی" کے وہ روز و شب تمہیں بھولے تو نہیں ہوں گے۔ ایک رات تم پر "جوانی" یوں ٹوٹ کر برسی تھی کہ تم چیخ پڑے تھے اور مجھ سے اپنی "پارسائی" بچانے کے لیے منت سماجت پر اتر آئے تھے۔"

"بکواس بند کرو۔ میں نے کبھی تمہاری منت سماجت نہیں کی۔" میں نے کہا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تو اس کا سارا جسم ہنستا اور بلتا ہوا محسوس ہوا۔

۔۔۔ جس واقعے کی طرف سروج نے اشارہ کیا تھا وہ مجھے یاد آ گیا تھا۔ یہ موریطانیہ کا واقعہ تھا۔ جن دنوں ہم "کالونی" میں تھے۔ سروج نے ایک شب مجھے جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ کوئی خطرناک مشروب پلا دیا تھا۔ اس مشروب نے میرے اندر ایک خوفناک الاؤ بھڑکا دیا تھا۔ سروج نے اپنی قاتل اداؤں سے اور اپنی قربت سے مجھے مزید اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ ان دنوں وہ جواں سال قبائلی موبل پر فریفتہ ہو رہی تھی۔ بپھری ہوئی سروج کو ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے واکی ٹاکی پر کال کر کے موبل کو وہاں بلا لیا تھا اور سروج مجھے نظرانداز کر کے موبل کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

سروج سے ملنے کے بعد موریطانیہ اور ٹرسٹ کے کئی بھولے بسرے چہرے یاد آ گئے تھے۔ روحانی پیشوا سردار بوکارلو' سوار ردا نے 'پراسرار لڑکی موتا بہ جس کی لاش گیھا کے اندر پھول کر پھٹ گئی تھی۔ نوجوان موبل جو حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اردو زبان دو تین ہفتوں کے اندر یوں سیکھی تھی کہ شاید کوئی دو تین برسوں میں بھی نہ سیکھ سکتا۔ مجھے سائیں عالی کا وہ روپ یاد آیا جب وہ گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے صحرائی درویش کی حیثیت سے کالونی میں دندناتا پھرتا تھا۔ اسے آزادی کا دیوتا "ڈورے" سمجھا جانے لگا تھا۔ اور وہ ہزاروں پُرجوش لارسی جو سائیں کو نجات دہندہ سمجھنے تھے۔

"کس سوچ میں کھو گئے شاہ جہاں۔" اس نے انگلی سے میری ٹھوڑی کو چھوا۔ اس کی سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "میں تو تمہیں جھیل زار پر چھوڑ کر آیا تھا تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں اپنی مرضی سے تھوڑا آئی ہوں۔ یہ تو سائیں جی کا حکم ہے۔"

"اگر تم سائیں کا حکم ماننے والی ہوتیں تو وہ اٹھتے بیٹھتے تمہیں ماں بہن کی گالیاں نہ دیتا۔ وہ تو کہتا ہے کہ اس کے یہاں آنے کے بعد تم نے "کالونی" میں اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔"

"سائیں جی جو بھی کہتے ہیں وہ ٹھیک ہوتا ہے۔ ہمارے اندر اتنی شکتی نہیں کہ ہم سائیں جی کی باتوں کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ جہاں تک کالونی میں ہونے والی گڑبڑ کا تعلق ہے' اس میں واقعی تھوڑا بہت روٹ میرا بھی تھا۔ سائیں جی اپنی واسی "سماجے" کی حیثیت سے مجھے اپنا قائم مقام بنا کر آئے تھے۔ مجھ سے ایک دو غلطیاں ایسی ہوئیں

جن کی وجہ سے لارسیوں کے ایک مخالف قبیلے کو یورش کا موقع مل گیا۔ یہ کٹر قسم کے لوگ تھے اور پرانی رسموں کے خاتمے کو بری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے کئی یوپ لڑکیوں کو قتل کر دیا اور کالونی کے ایک حصے پر قابض ہو گئے۔ بہرحال بھگوان کی کرپا ہوئی اور جلد ہی یہ گڑبڑ ختم ہو گئی۔ اب وہاں بالکل سکون ہے۔ لوگ کام کر رہے ہیں اور ان کے جیون میں اچھی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ میرا من چاہتا ہے کہ تم بھی وہاں جا کر دیکھ سکو۔ جن بھلے مسکے ناوار لوگوں نے سائیں کو نجات دہندہ مانا تھا وہ اب پہلے سے کہیں بہتر جیون گزار رہے ہیں۔"

"لیکن مجھے تمہارے اپنے جیون میں تو کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ جس قسم کا لعنتی رویہ تمہارا پہلے تھا وہی اب ہے۔ وہی عیش و عشرت کی بھوک' وہی خودنمائی' وہی دھوکا دہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ عیش کی زندگی گزار چکی ہو اور گزار رہی ہو لیکن تمہاری آنکھوں کی بھوک کسی طور کم نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھوک تمہیں جگہ جگہ ذلیل و رسوا کرتی ہے۔ تمہاری نسوانیت کی توہین کرتی ہے لیکن تم اتنا گر چکی ہو کہ جوتوں کے ہار پہن کر بھی تمہیں ہتک محسوس نہیں ہوتی۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ تم میری طرف دیکھتے ہی سرخ عینک لگا لیتے ہو جس سے تمہیں ہر طرف آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔ بلکہ غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے تم سبز عینک لگاتے ہو جس کی وجہ سے ہر طرف ہریالی اور پھول کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اپنے حالات کی طرف سے بہت خوش ہوں' تمہیں میری چنتا میں دبلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اپنے حالات کی طرف سے تم کبھی کبھی واقعی بہت خوش ہوتی ہو۔ ایسا ایک منظر تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے۔" میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔

"کب کی بات کر رہے ہو؟"

"جب کالونی میں تمہارے لالچ کی وجہ سے لارسیوں کے ہاتھوں تمہاری شامت آئی تھی۔ سائیں کی "سماجے" نامی واسی کی حیثیت سے لارسی تمہیں پھانسی دینے لگے تھے۔ ابھی زیادہ پرانی بات تو نہیں ہوئی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں رو رو کر کیسے گلا پھاڑا تھا تم نے۔ اگر تم اس طرح اپنی مٹی پلید ہونے پر خوش ہوتی ہو تو پھر واقعی تم بہت خوش ہو۔"

سروج کھسیانی سی ہو گئی لیکن ایک نمبر کی ڈھیٹ بھی تھی' جلد ہی سنبھل گئی۔ اپنے خوبصورت بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولی "تم پرانی باتیں کرو گے تو یہ باتیں بہت لمبی ہو جائیں گی۔ بہتر ہے کہ ہم نئی باتیں کریں۔"

"اور نئی باتیں کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم ذرا اپنے ماتھے کی تیوری کم کرو تو کچھ گزارش کروں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"میرا ماتھا ایسا ہے اور میں بھی ایسا ہی ہوں۔ تم نے جو بکنا ہے بکو۔"

اس نے رخ موڑا اور قاتلانہ چال چلتی ہوئی الماری کی طرف گئی۔ الماری کھول کر اس نے وہسکی کی ایک نفیس بوتل اور دو خوبصورت گلاس نکال لیے۔ "سنا ہے' ان دنوں تم پھر وہی پرانے جہانگیر بن گئے ہو۔ خون بہا رہے ہو اور شراب پی رہے ہو۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ مجھے زیادہ ناراض نہ کرو۔ میں اس آفس میں تمہارا گلا بھی کاٹ سکتا ہوں۔"

وہ ہونٹوں کو شوخی سے حرکت دے کر بولی "پہلے تھوڑی سی پی لو پھر چاہے گلا کاٹ دینا۔"

میں نے ہاتھ مارا۔ دونوں گلاس نیچے گر کر ٹوٹ گئے "تمہارے پاس بیٹھنے سے بہتر ہے کہ بندہ کسی خارش زدہ کتیا کے پاس بیٹھ جائے۔"

"میں تیزی سے گھوما اور باہر نکل گیا۔ ایک گوشے میں وہ سائیکل نظر آئی جو سائیں عالی سروج سے چلوا رہا تھا۔ اس لیڈیز سائیکل کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ سائیں عالی بھی کہیں آس پاس موجود ہے۔

۔۔۔ اگلے روز ایم اے سی کی طرف سے امیدواروں کے انٹرویوز اور آڈیشن وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ انٹرویو لینے والوں میں سروج کے علاوہ ایک کیمرا مین' ایک ہدایت کار اور ڈانس ڈائریکٹر شامل تھے۔ ہدایت کار چھوٹے قد اور چھوٹے جسم کا ایک مخنث تھا۔ بالوں میں سفیدی تھی وہ بظاہر شریف بندہ لگتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ وہ گمنام ہدایت کار تھا۔ سروج نے اس ہدایت کار کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ وہ پہلے مصنف تھا۔ اب ہدایت کاری کرتا ہے اور اس کے کریڈٹ پر بس دو تین فلمیں ہی ہیں۔ فوٹوگرافر اور ڈانس ڈائریکٹر بھی دوسرے درجے کے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ چرب زبان سروج نے انہیں بہلا پھسلا کر اس فراڈ پروجیکٹ میں شامل کیا ہے۔

سروج نے آج صبح ہی مجھے بتا دیا تھا کہ جس "بڑی اور

"بین الاقوامی" فلم کا ذکر ذرائع ابلاغ میں آ رہا ہے۔ وہ صرف کاغذوں میں بنے گی اور کاغذوں میں ہی نصیب ہو جائے گی۔ ایسی کوئی فلم بنائے جانے کا ارادہ دور دور تک کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ یہ صرف ایک جال ہے جو کچھ نادیدہ ہاتھوں نے بچھایا ہے۔

انٹرویو کے لیے پیش ہونے والے لڑکے لڑکیوں کی صورتیں دیکھ کر ترس آ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں پتا نہیں کیا کیا خواب سجے ہوئے تھے۔ جن امیدواروں کا انٹرویو کچھ اچھا ہوتا تھا وہ باہر آ کر خدا کا شکر ادا کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے مبارکباد وصول کرتے تھے۔ جن کا خیال تھا کہ ان کا انٹرویو اچھا نہیں ہوا ان کے چہرے مرجھائے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم مجھے امید تھی کہ یہاں آنے والے بیشتر امیدواروں کو کامیاب قرار دے دیا جائے گا۔

انٹرویوز کے بعد آڈیشن وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں مووی کیمرا، ساؤنڈ سسٹم اور ویڈیو لائٹس موجود تھے۔ مخنی بسم کے ہدایت کار صاحب امیدواروں کو اسکرپٹ دیتے تھے اور چند مکالمے یاد کرنے کو کہتے تھے۔ بعد ازاں یہ مکالمے کیمرے کے سامنے ادا کروائے جاتے تھے۔ امیدواروں کی بدحواسیاں اور بے چارگیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ دل ہی دل میں سروج بھی اس صورت حال سے محظوظ ہو رہی ہو گی۔

یہ سلسلہ شام تک جاری رہا۔ میرا خیال تھا کہ معروف اداکار دیو آنند بھی اس گہما گہمی میں دکھائی دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اگلے روز صرف لڑکیوں کے آڈیشن ہونا تھے۔ انہیں ڈانس کی پرفارمنس دینا تھی۔ شام کو جب سروج آڈیشنز وغیرہ سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا "اس چکر میں اداکار دیو آنند کا کیا کردار ہے؟"

وہ بولی "مجھے بس اتنا پتا ہے کہ کوئی کردار ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیا کردار ہے۔"

"تم چھپا رہی ہو۔"

"تمہاری غلط فہمی ہے۔ منوہرا دیوی مجھ پر وشواس تو کرتی ہیں لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ سب کچھ ہی بتا دیں۔ انتظام کے کاموں میں وہ بڑی سخت ہیں۔ اتنی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور شاید یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ تم بھی ٹیم کے ممبر بن گئے ہو اس لیے میں نے کچھ باتیں تمہیں بتا دی ہیں پھر بھی ڈر رہی ہوں کہ کہیں میری کم بختی نہ آ جائے..."

"انڈسٹری کے جو لوگ اس کام میں تمہارے ساتھ شریک ہیں کیا انہیں معلوم ہے کہ یہ سب فراڈ ہے اور اس کا تعلق بردہ فروشی سے ہے۔"

"نہیں۔ وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ کو اندازہ ہو کہ یہ فلم نہیں بن سکے گی لیکن بردہ فروشی والی بات کسی کے گمان میں نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ جب تم فراڈ کے بعد اپنی جعلی فلم کمپنی سمیت غائب ہو جاؤ گی تو یہ فلمی لوگ مقدموں میں پھنس جائیں گے۔"

"کل کیا ہو گا۔ یہ تو بھگوان ہی جانتا ہے۔ کیوں نہ کل کی باتیں چھوڑ کر ہم آج کی باتیں کریں۔" اس نے اپنی آنکھوں کو نشیلا کیا لیکن جونہی میرے تاثرات دیکھے فوراً بات بدل کر بولی "او ہاں... مجھے یاد آیا۔ ساہی صاحب کی ناگہانی موت کا سن کر ہم سب کو بہت افسوس ہوا۔ میں اس وقت موریطانیہ میں ہی تھی۔ مسٹر کلارک نے فون پر سائیں جی کو اطلاع دی تھی۔ سائیں جی سے مجھے پتا چلا تھا۔"

میں خاموش رہا۔ کچھ دیر تک وہ بھی خاموش رہی پھر بولی "مسٹر کلارک کی دلی خواہش ہے کہ صفدر کسی طرح واپس آ جائے۔ شاید تمہیں جانکاری نہ ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ اس سلسلے میں بہت کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساہی صاحب کے ذکر نے دل ملول کر دیا تھا۔ وہ خاموشی کو توڑنے کے لیے بولی "اور ہاں... اپنے اس رقیب روسیاہ کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے۔ سنا ہے اسے روز پر سے اغوا کیا تھا اور اب تک اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ کہیں اس کا جھٹکا ہی تو نہیں کر دیا تم نے..."

"مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ ریسٹ ہاؤس میں ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔"

"اور اس کی بہن قوسیہ؟"

"وہ بھی نکل گئی۔"

"یعنی دونوں بہن بھائی تمہیں الو بنا گئے۔ لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ تمہارے اندر کا شاہ جہاں کچھ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔"

"لیکن تمہارے اندر کی بے رحم دھوکے باز ابھی کمزور نہیں پڑی بلکہ کچھ اور نکھر گئی ہے۔"

"شکریہ۔" اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے

ہوئے توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس کی آنکھوں میں نشے میں ڈوبی ڈوبی رات کے رنگ تھے۔ میری طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتی وہ پھر روہانسی آواز میں بولی "اتنے اجنبی کیوں لگتے ہو مجھے؟"

"موبل سے دل بھر گیا تمہارا؟" میں نے بھی فوراً جوابی اٹیک کیا۔

جن دنوں میں موریطانیہ سے واپس آیا تھا۔ موبل اور سروج کے تعلقات جوبن پر تھے۔

سروج کچھ دیر خفا نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر کیوں مارتے ہو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو، پریم کی بات کیوں نہیں کرتے.... تمہیں معلوم ہے میں کہیں بھی جاؤں... رہتی تو تمہارے پاس ہی ہوں ناں۔"

"تم... کتیا ہو اور نسل کی بھی اچھی نہیں ہو۔" میں نے بلا جھجک کہا۔

ذرا دیر کے لیے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یوں لگا کہ وہ غصے سے چیخ اٹھے گی لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو نارمل کر لیا۔ بیئر کا ایک گھونٹ لیتی ہوئی بولی "اس بارے میں تم سے پھر بات کروں گی۔ فی الحال یہ کہنا چاہتی ہوں کہ منگل کے روز دیو آنند صاحب یہاں تشریف لائیں گے... کامیاب ہونے والے امیدوار بھی یہاں موجود ہوں گے۔ خاصا رش رہے گا۔ تمہارا سیکیورٹی کا انتظام درست ہونا چاہیے۔ دیو آنند صاحب یہاں ایک گھنٹا سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ وہ جتنی دیر موجود رہیں تمہیں ان کے قریب رہنا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی اور سروج جلدی سے ادھر چلی گئی۔ آفس کی الماری کا ایک خانہ کھلا ہوا تھا۔ اس میں دو موٹی فائلیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھنے کے بعد ایک فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ فائل "ایم اے سی" نامی فلمی ادارے کے بارے میں تھی۔ یہ ادارہ یا کمپنی صرف تین مہینے پہلے وجود میں آیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کے فاؤنڈر اور ایم ڈی کے طور پر دو مشہور فلمی شخصیات کے نام درج تھے۔ ان میں ایک دیو آنند تھا۔ یقیناً یہ فلم اسٹار دیو آنند ہی تھا۔ اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ جعلی تھے یا اصلی اس کا پتا نہیں تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں فلمی شخصیات کو کسی وجہ سے اس معاملے میں پھنسانے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان دونوں معروف شخصیات کے دستخط بھی جعلی ہوں۔ ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں نے فائل بند کر دی۔

اگلے روز صبح سویرے سروج نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ ورزش سے فارغ ہوئی تھی۔ اس نے فقط ایک نیکر اور ہلکی پھلکی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے مجھے ایک وزیٹنگ کارڈ تھمایا اور بولی "یہ کلچر منسٹری کا انسپکٹر ہے۔ انسپکشن وغیرہ کرتا ہے۔ نام بلراج مہتا ہے۔ ذرا ٹیڑھا بندہ ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے کوشش کر رہے ہیں لیکن قابو میں نہیں آ رہا۔ آج تم اس کی طرف ایک چکر لگا آؤ۔"

"مجھے کیا کرنا ہے وہاں؟"

سروج نے ایک موٹا سا لفافہ میرے حوالے کر دیا "اس میں ساٹھ ہزار سری لنکن روپے ہیں۔ اس کمینے کو ہڈی چاہیے.... یہ ہڈی اسے دے دو۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو تھوڑی سی آنکھیں دکھاؤ... میرا خیال ہے تمہاری آنکھیں دیکھنے کے بعد وہ اڑیل ٹٹو والی ضد چھوڑ دے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے فیلڈ کے کاموں میں زیادہ نہ ہی بھیجو تو اچھا ہے۔ جب سے عاصم غائب ہوا ہے۔ پولیس میری تلاش میں غیر معمولی سرگرمی دکھا رہی ہے۔"

"یہاں کی پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ بات میں بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔"

دوپہر کے وقت میں دفتر پہنچا اور بلراج نامی انسپکٹر سے ملاقات کی۔ وہ سیاہ رو شخص تھا۔ شکل سے ہی حرام خور اور کرخت نظر آتا تھا۔ ایسے لالچی لوگوں کی خصلت مجھے بڑی اچھی طرح معلوم تھی۔ میں بلراج کی شکل دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی سیدھا سادا شخص ہے جو مال بنانے اور ٹھگنے کے چکر میں اس محکمے میں آ گیا ہے۔ [illegible] لیے دکھانا [illegible] مضبوط ہے۔ سمجھتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے [illegible] بھی ہو گئی تو کیا فرق پڑے گا۔

اس کی میز کے قریب تین چار سائل بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ دوسروں کے ساتھ میں نے بھی چائے پی۔ وہی ہیرا پھیری، رشوت و سفارش کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ملاقاتی چلے گئے تو میں نے بلراج سے انگریزی میں درخواست کی کہ وہ دو چار منٹ کے لیے گاڑی میں آ کر میری بات سن لے۔ اس نے اکڑی ہوئی گردن کو تھوڑی سی جنبش دے کر میری یہ درخواست قبول کر لی۔ ہم پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں آ بیٹھے۔

میں نے کہا "بلراج صاحب! یہ بالکل نیا کام ہے۔ ابھی تو صرف اخراجات ہی اخراجات ہیں۔ آپ تھوڑی سی نرمی فرمائیں تاکہ یہاں کمپنی کا کام ذرا سا اسٹیبلش ہو جائے۔۔۔ یہ تو سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہے۔"

بلراج بولا "میڈم نے اپنا کام خود خراب کیا ہے۔ میں تین دفعہ سوتیج پر گیا ہوں لیکن وہاں کسی نے مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ اب یہ بات اوپر کے لیول تک چلی گئی ہے۔ میرے بس کی بات نہیں رہی۔" وہ افسر شاہی کے مخصوص اسٹائل میں اپنا ریٹ بڑھا رہا تھا۔ میں نے بے ادب عوام کے مخصوص اسٹائل میں کہا "آپ کرنا چاہیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں جی۔۔۔"

"یہ بات تم لوگوں نے پہلے کی ہوتی تو معاملہ خراب نہ ہوتا۔ اوپر سے سفارش بھی شروع کرا دی میڈم "سروج" نے۔ اس سفارش کی وجہ سے تمہارے کام میں دو تین بندے اور شامل ہو گئے ہیں۔ جو کام پہلے لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں ہو سکتا تھا۔ وہ اب چار پانچ میں بھی ہوتا نظر نہیں آتا۔ میرے خیال میں اب تمہاری میڈم کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ تھرو پراپر چینل آئیں۔۔۔"

میں نے دل میں سوچا۔ ابھی تیری کنپٹی پر ریوالور رکھ دوں تو ساری افسری ناک کے راستے بہنا شروع ہو جائے۔۔۔ اور ہر چینل پراپر ہو جائے۔ میرا دھیان لفافے کی طرف گیا لیکن افسر صاحب کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ساٹھ ستر ہزار دے کر یہ کام چلنے والا نہیں۔ میں نے لہجہ تھوڑا سا بدلتے ہوئے کہا "اب تم کیا چاہتے ہو۔ کیا میڈم تمہیں رشوت دینے کے ساتھ ساتھ تمہارے سامنے ناک بھی رگڑے۔"

اس کا کالا چہرہ کچھ اور کالا ہو گیا۔ طیش کو دباتے ہوئے بولا "مجھے ناک رگڑوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا جو کام تھا وہ میں نے کر کے آگے بھیج دیا ہے۔ اب تو مجھ سے رابطہ نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔" اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے کہا "بلراج صاحب! تم جن لوگوں کو تنگ کر رہے ہو وہ تمہیں تنگ کرنے پر آئیں تو بہت پریشانی ہو گی تمہیں۔ اس لیے۔۔۔"

"تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔۔۔" وہ ایک دم میری بات کاٹ کر بلند آواز میں بولا۔ "تم کیا سمجھتے ہو میں کوئی۔۔۔ ہیجڑا افسر ہوں جو تمہاری دھمکی سے ڈر جاؤں گا۔ یہ نوکری اپنی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ایسی دس نوکریاں عزت کے لیے قربان کر سکتا ہوں۔ بارہ سال سروس ہو گئی ہے۔ ان بارہ سالوں میں ایک لفظ کسی سے سنا ہے اور نہ سنا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ضروری تو نہیں جو پچھلے بارہ برسوں میں ہوتا رہا ہے وہ اب بھی ہو رہا ہے۔"

فرطِ غضب سے وہ تھرتھر کانپنے لگا۔ اس نے ایک زہرناک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا "اچھا تو یہ بات ہے۔ تم کوئی بدمعاشی وغیرہ دکھانے کے لیے یہاں آئے ہو۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اگر اس طرح تمہارا کام نکل سکتا ہے تو نکال لو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم گورنمنٹ کے خزانے کو کیسے نقصان پہنچاتے ہو۔۔۔"

"شاید اب تم ہتھکڑیوں وغیرہ کی بات کرو گے۔"

"او۔۔۔ یو شٹ اپ۔" وہ چیخ کر بولا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔

بندہ واقعی ٹیڑھا تھا۔ مجھے سروج نے بتایا ہی نہیں تھا کہ مجھے کس حد تک جانا ہے۔ ورنہ وہ اس گاڑی کے اندر ہی اچھی خاصی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

۔۔۔ منگل کے روز کوٹھی نمبر دو سو آٹھ میں گہما گہمی کا سماں تھا۔ قریباً چار سو کامیاب امیدواروں کی پہلی کھیپ کو خصوصی لیکچر دیا جانا تھا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں امیدواروں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ سامنے ایک اسٹیج تھا۔ جہاں مختصر دورانیے کا ورائٹی شو ہونا تھا۔ اور بعد میں انڈین فلم اسکرین کی ایک مشہور شخصیت نے کامیاب امیدواروں سے خطاب کرنا تھا۔ یہ شخصیت یقیناً دیو آنند ہی تھا۔

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ اس تقریب میں ذرائع ابلاغ کے کسی نمائندے کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ نہ ہی فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والا کوئی اور فرد آیا تھا۔ بس ایم اے سی ہی کے کچھ فوٹوگرافر موجود تھے۔ رات نو بجے تک وسیع لان کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ورائٹی شو شروع ہو گیا۔

قریباً دس بجے مہمانِ خصوصی بھی تشریف لے آئے۔ سیاہ مرسیڈیز کمپاؤنڈ میں آ کر رکی اور انڈین اسکرین کا جگمگاتا ستارہ دیو آنند پتلون کوٹ میں ملبوس گاڑی سے اترا۔ وہ برسوں پرانا ہیرو تھا لیکن اب بھی گریس فل نظر آتا تھا۔ شاید اسی لیے اسے سدا بہار ہیرو کہا جاتا تھا۔

میں اس سے قریباً دس فٹ کی دوری پر تھا۔ سروج اس سے بات کر رہی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ یہ

اصلی دیو آنند نہیں ہے۔ میری آنکھ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ جس طرح میرے چہرے پر ہلکا پھلکا میک اپ موجود تھا۔ اسی طرح اس شخص کے چہرے پر بھی میک اپ کے آثار تھے۔

یقیناً یہ معروف فلم اسٹار کا کوئی ہم شکل تھا۔ جس کے چہرے پر پلاسٹک سرجری کے ذریعے تھوڑی بہت مزید تبدیلی کرتے اسے دیو آنند کے نقوش دے دیے گئے تھے۔ اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ فلم لائن کی دو معروف شخصیات کو کسی عناد کے سبب "ایم اے سی" والے معاملے میں پھنسایا جا رہا ہے۔ ایم اے سی کے ذریعے بہت سے افراد کو انگلینڈ اسمگل کیا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک سنگین معاملہ تھا۔ انڈیا میں انڈر ورلڈ کے لوگ معروف فلمسازوں کے خلاف اس قسم کی چھیڑ چھاڑ اکثر کرتے رہتے تھے اور منوہرا دیوی کا تعلق بھی انڈر ورلڈ سے ہی تھا۔

"ڈی" دیو آنند کو پہلے سے بنائے گئے راستے کے ذریعے عقب اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔ سروج اور ایم اے سی کے معزز عہدیدار اس کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے طور اطوار اور انداز سے بالکل دیو آنند ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا لہٰذا میں اس کی آواز کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مشہور اداکاروں کی آواز کی نقل باآسانی کر لی جاتی ہے۔

دس پندرہ منٹ بعد اسٹیج سے اناؤنسمنٹ کر دی گئی کہ انڈین اسکرین کے معروف ترین اسٹار، سدا بہار ہیرو دیو آنند صاحب آپ لوگوں کے سامنے تشریف لا رہے ہیں۔ وسیع لان تالیوں سے گونج اٹھا۔ "دیو آنند" اسٹیج پر پہنچا۔ کچھ دیر تو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرستاروں کی بے پناہ تالیوں کا جواب دیتا رہا پھر اس نے تقریر شروع کر دی۔

اسے قریب سے دیکھنے کے بعد اس کی شکل کے بارے میں تو شاید کوئی شبہے کا شکار ہو جاتا لیکن اس کی آواز سو فیصد دیو آنند ہی کی آواز تھی۔ اسٹیج پر لائٹنگ اس طرح کی گئی تھی کہ "ڈی" دیو آنند کے چہرے پر براہِ راست روشنی نہیں پڑ رہی تھی۔ یوں دیو آنند کا روپ اور بھی مؤثر ہو گیا تھا۔

دیو آنند نے اعلان کیا کہ "ایم اے سی" اس کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ہے اور اس ادارے کی طرف سے بنائی جانے والی پہلی انٹرنیشنل فلم ہندوستان بلکہ ایشیا کی فلمی تاریخ کی یادگار فلم ہو گی۔۔۔ اس نے فلم ایکسٹراز کے لیے منتخب ہونے والے امیدواروں کو مبارکباد دی اور انہیں بتایا کہ اس فلم کے ثانوی اداکار بھی عام فلموں کے اہم اداکاروں کی طرح اہمیت حاصل کریں گے۔ دیو آنند نے پُرجوش تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ قریباً دو ہزار منتخب ایکسٹراز میں سے دو سو اداکاروں کو شوٹنگ کے لیے بیرونِ ملک بھی لے جایا جائے گا۔

اپنی تقریر کے بعد ڈی دیو آنند تقریباً پندرہ بیس منٹ وہاں رہا اور پھر چائے وغیرہ پی کر واپس چلا گیا۔۔۔

اگلا روز کافی ہنگامہ خیز تھا۔ دس بجے کے لگ بھگ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے افسران کی ایک ٹیم موٹی موٹی فائلوں کے ساتھ کوٹھی نمبر دو سو آٹھ پر پہنچ گئی۔ ٹیم کو دیکھتے ہی سروج نے مجھ سے کہا "یہ کلچر منسٹری والوں کی سازش ہے۔۔۔ بلکہ اسی کتے بلراج کا کیا دھرا ہے۔"

"اب کیا کرنا ہے۔۔۔ کہو تو مار بھگاؤں۔۔۔ اگر کہتی ہو تو یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ تم اپنی دلربا ادائیں دکھا کر انہیں رام کر لو۔"

"مذاق نہیں چاہیے۔" وہ بھنکارتی سرگوشی میں بولی "ان لوگوں کو آفس میں بٹھاؤ اور ٹھنڈا وغیرہ پلاؤ۔ میں ذرا فون پر دیوی جی سے بات کر لوں۔"

ٹیم کے آفس تک پہنچنے سے پہلے سروج اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں موٹی فائلوں اور موٹی توندوں والے "آئی ٹی اوز" (انکم ٹیکس افسران) کو آفس میں لے گیا۔ ان میں سے ایک کرخت چہرہ انکم ٹیکس انسپکٹر کو میں نے غالباً پانچا کے ڈیرے پر ہونے والے فنکشن میں بھی دیکھا تھا۔

انکم ٹیکس کے شکرا صفت ملازمین ہر شے کو عقابی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور غور کر رہے تھے۔ "مالک کون ہے؟" ایک افسر نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

میں نے کہا "مالکن ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہے۔"

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جو بھی یہاں موجود ہے اسے فوراً بلاؤ۔" ایک منحنی افسر نے کرخت لہجے میں کہا۔

کولڈ ڈرنکس کے آتے آتے سروج بھی پہنچ گئی۔ اسے ایسے کاموں کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے کچھ نروس نظر آتی تھی۔ ادارے کا مقامی منیجر بھی اس کے ساتھ تھا۔

وہ دونوں آفس میں آ گئے تو میں باہر نکل آیا۔ اندر گفت و شنید شروع ہوئی۔ دس پندرہ منٹ بعد منیجر باہر نکلا

اور پندرہ منٹ بعد ایک چپڑاسی کے ہمراہ دو تین فائلیں لے کر اندر چلا گیا۔ اندر میٹنگ طویل ہوتی جا رہی تھی۔ آدھا پون گھنٹے بعد بلند لہجے میں بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اندر کا منظر ہیجان خیز ہو رہا تھا۔ سروج نے محکمے کی ایک فائل پھاڑ کر پھینک دی تھی اور وہ طیش کے عالم میں چیخ رہی تھی۔ ایک افسر بھی گلا پھاڑ رہا تھا پھر میرے پہنچتے ہی دیکھتے سروج کے منیجر نے گلا پھاڑنے والے کو تھپڑ مار دیا۔ اچانک تین چار افراد منیجر سے گتھم گتھا ہو گئے۔

میں آگے بڑھا اور منیجر کو محکمے کے بندوں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو بندے مجھ پر بھی جھپٹ پڑے۔ میں نے انہیں ذرا ہلکے پھلکے ہاتھ رسید کیے۔ ان کا معیار ایسا نہیں تھا کہ وہ بھرپور ہاتھ سہہ سکتے۔ میرا مکا لگنے سے ایک اسسٹنٹ کا ہونٹ پھٹ گیا اور انسپکٹر صاحب بہت بکواس کرتے قالین پر ڈھیر ہو گئے۔

سروج چیخ رہی تھی "ان حرامزادوں کو پکڑ کر کمرے میں بند کرو۔ انہوں نے مجھے قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے نائزز کی چابیاں چھینی ہیں۔"

"ایم اے سی" کے پانچ چھ اور اہلکار بھی اندر آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک گارڈ کے ہاتھ میں باقاعدہ رائفل تھی۔ صورت حال دیکھ کر تبھی رشوت خور افسران نے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔

وہ خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے پورچ کی طرف گئے اور افراتفری میں سرکاری جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گئے۔ سروج انہیں مسلسل گالیاں دے رہی تھی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سروج کو مشورہ دیا۔ "تمہیں یہاں سے دائیں بائیں ہو جانا چاہیے۔۔۔ اور ممکن ہے تو ضمانت قبل از گرفتاری کرا لینی چاہیے۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ کے چند گھونٹ لیے اور بے پروائی سے بولی "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں ایسے کتوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔"

"پھر بھی منوہرا سے مشورہ کر لو۔ اس کے لیے تمہاری ضمانت وغیرہ کرانا مشکل نہیں ہو گا۔"

سروج چند گہرے سانس لینے کے بعد ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ باہر نکلی تو اس کی پریشانی کچھ کم نظر آتی تھی۔ ہم نے لنچ وغیرہ کیا لیکن لنچ کے فوراً بعد پھر پریشانی کا دورہ ہو گیا۔ اس مرتبہ ٹوپیاں پہنے اور رجسٹر پکڑے ہوئے جن شکاریوں نے "چھاپا مارا" ان کا تعلق کلچر منسٹری سے تھا۔ منحوس صورت بلراج سونا بھی اس ٹیم کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی چڑھی ہوئی تیوری کچھ اور چڑھ گئی۔

یہ لوگ مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ سروج کا موڈ سخت خراب ہو رہا تھا۔ اس نے محکمے والوں سے صاف کہہ دیا کہ اپنے ایک ذاتی مسئلے کی وجہ سے وہ بہت مصروف ہے اور فی الحال انہیں کسی طرح کی معلومات فراہم نہیں کر سکتی۔

ایک افسر نے تھوڑی سی بحث کی پھر ایک کاغذ سروج کے سامنے رکھ دیا۔ "اس پر لکھ دیں کہ محکمے کے اہلکار آپ کے پاس آئے تھے لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ ان سے تعاون نہیں کر سکیں۔"

"میں کچھ لکھ کر نہیں دوں گی۔" سروج دانت پیس کر بولی اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

اہلکاروں نے چند سرگوشیاں کیں پھر وہ بھی باہر نکل گئے۔ ایسے لوگوں سے نمٹنے کا تجربہ سروج کو نہیں تھا۔ بہرحال میں نے قانون پڑھ رکھا تھا۔ زیادہ نہیں لیکن تھوڑی بہت سوجھ بوجھ مجھے ان معاملات کی تھی۔ اب میں خود بھی ایک کاروباری شخص تھا۔ گولڈ ہوٹل کی چین کا مالک تھا۔ جب میں چند ماہ پہلے لاہور میں تھا۔ میں نے مسٹر کلارک کی ہدایت پر ایک دو اپنے معاملے ہینڈل بھی کیے تھے۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی ناتجربہ کاری اور تیزی کی وجہ سے سروج نے معاملات کو کافی بگاڑ دیا ہے۔

رات کو میں نے پاشا کو فون کیا۔ پاشا صرف ایک سو گز دور ایک دوسری کوٹھی میں موجود تھا لیکن منوہرا دیوی کی ہدایت تھی کہ دونوں کوٹھیوں کے مکین کسی بھی صورت ایک دوسرے سے رابطہ نہیں کریں گے۔ پاشا نے مجھ سے کہا تھا اگر کوئی بہت ضروری بات ہو تو میں اسے فون کر لوں۔

میں نے فون پر پاشا سے کہا "شاید تمہیں اور منوہرا کو پتا چل ہی گیا ہو گا۔ سروج نے یہاں معاملات کسی حد تک بگاڑ لیے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اگلے دس بیس گھنٹوں میں پولیس وغیرہ بھی نظر آ سکتی ہے۔"

پاشا نے مطمئن لہجے میں کہا "تمہیں ان فکروں میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے منوہرا دیوی سے بات کی ہے۔ انہیں بہت پہلے سے معلوم تھا کہ یہ چکر چلے گا۔ انہوں نے پہلے سے کوئی انتظام وغیرہ کر رکھا ہے اور اگر نہیں بھی کیا ہو گا تو وہ کر لیں گی۔"

میں نے کہا "کلچر منسٹری کا افسر بلراج تو رانی بہت کی

ئے ہے۔"

"ہاں یہ بندہ واقعی ٹیڑھا ہے۔ اور ٹیڑھا اس لیے ہے کہ یہ اکیلا نہیں ہے۔ پورا ایک مافیا ہے ایسے ٹیڑھے بندوں کا۔۔۔ یہ لوگ باجماعت کسی کمپنی یا فرد کے پیچھے پڑتے ہیں اور ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں۔ اگر بالفرض منوہرا دیوی ان کا کچھ نہ کر سکیں تو اگلے ایک دو روز میں اور کئی محکمے کالی بھیڑوں کی طرح سروج کو چمٹ جائیں گے اور زندگی اجیرن کر دیں گے۔"

"ہاں انکم ٹیکس والے تو آج صبح اوپننگ میچ کھیل چکے ہیں۔"

"مجھے اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ سنا ہے تم نے بھی ایک دو افسروں کو ہلکے پھلکے ہاتھ لگائے ہیں۔ چلو اچھا کیا ہے۔ فرض کی ادائیگی میں یہ ضروری تھا۔" پاشا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

کچھ ضروری باتوں کے بعد ہم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ویسے بھی فون پر کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ پاشا نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے باری کی خیر خیریت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ٹیمپل روڈ والی رہائش گاہ پر بالکل سیٹ تھا۔ لبنا بھی تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ داور ایف پونا نظر سے بالکل غائب تھے۔۔۔

توبیہ کے حوالے سے ایک مبہم سی خبر مجھے آج صبح ہی ملی تھی۔ یہ ایک اخباری خبر تھی۔ اس کے مطابق پتا چلا کہ امارات کے شیخ عاصم بن ارشد کی ایک نہایت قریبی عزیزہ آج رات کی فلائٹ سے ابوظہبی چلی گئی ہیں۔۔۔ لیکن وہ ایک دو روز بعد پھر لوٹ آئیں گی۔ وہ شیخ عاصم کی بازیابی تک یہیں سری لنکا میں قیام کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ شیخ عاصم کے اغوا اور گمشدگی کا ذمے دار سراسر شاہ جہاں المعروف جہانی ہے اور وہ ابھی تک سری لنکا میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے چھ روز پہلے ہونے والے رائفٹ کے ٹیلے اور دیگر اموات کا ذمے دار شاہ جہاں کو ٹھہرایا ہے۔

میں توبیہ کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ دشمن تھی اور ہر کوشش کے باوجود دشمن ہی رہی تھی۔ اب میری دلی تمنا تھی کہ اس کے ساتھ میرا ٹکراؤ نہ ہی ہو۔ یہ دوسرے روز کی بات ہے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک بڑی گاڑی آ کر پورچ میں رکی۔ گاڑی میں سے جو تین افراد اترے انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کا تعلق فلم لائن سے ہے۔ ان میں ایک پری پیکر حسینہ بھی تھی۔ اس نے فلمی انداز میں ساڑی باندھ رکھی تھی اور ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔ اس کا سراپا حیران کن حد تک پُرکشش تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ابھرتی ہوئی نوخیز ڈانسر تھی۔

یہ لوگ سروج سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی اپائنٹمنٹ پہلے سے طے تھی۔ میں انہیں لے کر آفس میں پہنچا۔ سروج نے اٹھ کر ان کو خوش آمدید کہا۔ یہ لوگ سروج سے خاصے مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل وہی پوزیشن تھی جو کل سروج کی انکم ٹیکس کے اہلکاروں کے روبرو تھی۔ سروج ان میں سے دو افراد کو پہلے سے جانتی تھی۔ خوبصورت لڑکی کو اس نے ہیلوئینا کہہ کر مخاطب کیا۔ جب کہ ایک موٹے گنجے کو امرجی کہہ کر بلایا۔ ہیلوئینا ڈانسر تھی اور امرجی فلمساز تھے۔ تیسرے شخص کا نام کرشن لال تھا اور وہ فلم لائن والوں کا پسندیدہ ایڈووکیٹ تھا۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے امرجی نے میری طرف دیکھا۔ سروج بولی "آپ ان کی چنتا نہ کریں۔ یہ یہیں رہیں گے۔ آپ نے جو کہنا ہے بلا جھجک کہیں۔"

امرجی نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا "سروج! بہتر تھا کہ آپ منوہرا دیوی کو بھی یہاں بلا لیتیں۔"

سروج چڑ کر بولی "امرجی! میں آپ کو پہلے بھی کوئی پانچ دفعہ بتا چکی ہوں کہ منوہرا دیوی کا اس سارے معاملے سے دور کا تعلق واسطہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ دیوی جی آج کل سری لنکا میں موجود ہیں یا نہیں۔ پلیز آپ ایک بات کو بار بار مت دہرائیں۔"

امرجی خجل سے ہو گئے لیکن انہوں نے چہرے پر مسکراہٹ بہرحال برقرار رکھی۔ وہ بولے "ٹھیک ہے ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں جو بات بھی کرنا ہو گی اب آپ سے کرنا ہو گی۔"

"جی ہاں' میں اسی لیے یہاں آپ کی سیوا میں موجود ہوں۔" سروج نے تیکھے لہجے میں کہا۔

امرجی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولے "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پرسوں رات یہاں ایک فنکشن ہوا ہے جس میں دیو آنند صاحب کے ہم شکل ہرناس کمار نے دیو صاحب کے طور پر خطاب کیا اور آپ کے کامیاب امیدواروں کے ساتھ وعدے وعید کیے ہیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا۔" سروج نے ایک بار پھر ڈنکے کی چوٹ پر جھوٹ بولا "ہم نے برتھ ڈے کو تو ضرور منایا تھا۔ اس نے مختصر تقریر بھی کی تھی۔ اس تقریر کی ویڈیو اور آڈیو

ریکارڈنگ ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ دیکھ کر یا سن کر تصدیق کر سکتے ہیں کہ اپنی گفتگو میں اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ وہ دیو آنند ہے۔"

"بات ثابت کرنے کی نہیں مس سروج! ہم آپس میں بیٹھے ہیں۔ میں یہ جانتا ہوں اور آپ بھی یہ جانتی ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔"

"کیا ہے حقیقت؟" سروج کا لہجہ بدستور کرخت تھا۔

ایڈووکیٹ کرشن لال نے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ سجائی اور گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا "مس سروج! یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ ہرجنس کمار میرے کلائنٹ کو دو تین بار نقصان پہنچا چکا ہے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کو اس کا ثبوت دے دوں گا۔ میرے کلائنٹ دیو صاحب نے پروڈیوسر سے ساڑھے پانچ لاکھ روپے لینا تھے۔ ابھی فلم میں ان کے کچھ شاٹس باقی تھے لہٰذا انہیں بقیہ معاوضے کی فکر نہیں تھی۔ اس دوران میں یوں ہوا کہ پروڈیوسر نے سازباز کی اور ہرجنس کے ذریعے لانگ شاٹس میں ڈمی دکھا کر فلم سنسر کے لیے بھیج دی۔ اب وہ ساڑھے پانچ لاکھ روپے کی رقم متنازعہ بنی ہوئی ہے۔ ایک فلم میں ہرجنس نے میرے کلائنٹ کی جگہ ڈبنگ کی ہے اور وہاں بھی میرے کلائنٹ کی شہرت کو نقصان پہنچایا اور مالی خسارہ بھی دیا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"دیکھیں وکیل صاحب! میرے پاس فالتو وقت نہیں۔ آپ تقریر نہ فرمائیں۔ جو کہنا ہے دو حرفی کہیں۔" سروج نے بیزاری سے کہا۔

وکیل کا رنگ لال پیلا ہو گیا۔ امرجی نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور بولے "سروج جی! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ منوہرا دیوی ہم سے ناراض ہیں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی ناراضی کے کارن ہی ہو رہا ہے اور ان کی ناراضی کا کارن کیا ہے، یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔" انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوئے "اگر آپ کی آگیا ہو سروج جی تو میں کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمایئے۔" سروج نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

امرجی بولے "آج سے کوئی چھ ماہ پہلے منوہرا دیوی کے ایک عزیز مسٹر پال امریکا سے بمبئی آئے تھے۔ انہوں نے اسٹوڈیو میں شوٹنگز وغیرہ بھی دیکھیں۔ انہوں نے ایک ڈانسر لڑکی ایک ہفتے کے لیے مجھ سے مانگی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ شملہ لے جانا چاہتے تھے۔ اتفاقاً وہ لڑکی دیو صاحب کی فلم میں بھی رول کر رہی تھی۔ آئندہ ڈیڑھ دو ہفتوں تک اس کا فلم کے "سیٹ" پر ہونا بہت ضروری تھا۔ دیو صاحب کی وجہ سے مجھے مسٹر پال کو انکار کرنا پڑا۔ بعد میں منوہرا دیوی نے خود بھی فون کیا لیکن میں دیو صاحب کی وجہ سے مجبور تھا۔ سروج جی! آپ کا اپنا تعلق بھی فلم لائن سے رہا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ڈانسر لڑکیوں کا دو چار راتوں کے لیے کسی پرستار کے ساتھ جانا معمول کی بات ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی شوٹنگ کے شیڈول کے کارن ناگزیر مجبوری سامنے آ جاتی ہے۔ ان دنوں بھی یہی صورتِ حال بنی ہوئی تھی۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" سروج نے ایک بار پھر بے رخی کے ساتھ امرجی کی بات کاٹی۔

امر صاحب بولے "میں اپنی اور دیو صاحب کی طرف سے منوہرا دیوی کی شکایت دور کرنا چاہتا ہوں اور خواہش رکھتا ہوں کہ ہمارے سمبندھ پھر پہلے جیسے ہو جائیں۔ میں اس لڑکی کو ساتھ لے کر آیا ہوں جو دیوی جی کی ناراضگی کا کارن بنی۔ یہی وہ لڑکی ہے۔" امر صاحب نے اپنے پہلو میں بیٹھی پری پیکر رقاصہ کی طرف اشارہ کیا۔

سروج خاموش رہی۔ اس کے انداز میں تکبر تھا۔

امر صاحب بولے "مجھے پتا چلا تھا کہ منوہرا دیوی کے وہ عزیز مسٹر پال ابھی تک امریکا واپس نہیں گئے اور بمبئی میں ہی ہیں۔ میں لڑکی کا ٹکٹ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔۔۔ یہ ابھی یہاں سے روانہ ہو جائے گی اور کل شام تک مسٹر پال کی خدمت میں پیش ہو جائے گی۔ آپ فقط مجھے مسٹر پال کا ایڈریس بتا دیں اور ان کی طرف سے گرین سگنل لے دیں۔ وہ ایک دو۔۔۔ یا تین چار جتنے ہفتے چاہیں اسے رکھ سکتے ہیں۔"

سروج نے شانِ بے اعتنائی سے سگریٹ سلگایا اور بولی "مجھے آپ کی باتوں میں سے اکثر کی سمجھ نہیں آئی۔ بہرحال آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مسٹر پال تین دن پہلے امریکا واپس جا چکے ہیں۔ اب آپ اس لڑکی کو لے جایئے اور جی بھر کر شوٹنگز کروایئے۔ میرے اندازے کے مطابق اب دیوی جی کو یا ان کے عزیز کو اس لڑکی کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔"

امرجی اور ایڈووکیٹ کرشن لال کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔

کچھ دیر تک آفس میں گمبھیر خاموشی طاری رہی پھر سروج نے کہا "میرے خیال میں آپ کا وقت میرے وقت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔۔۔ اور ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

امرجی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "سروج! حقیقت یہ ہے کہ ہم منوہرا دیوی سے بگاڑنا نہیں چاہتے اور نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو ہم سے کوئی شکوہ ہو۔۔۔ دیکھیں آپ ہمارے۔۔۔۔۔ ہی قبیلے سے ہیں۔ ہم نے اس فیلڈ میں اکٹھے وقت گزارا ہے۔ ہمیں ایک دوجے کا درد سمجھنا چاہیے۔۔۔ میں لمبی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ آپ ہمیں بتائیں کہ ہمارے تعلقات کیسے بہتر ہو سکتے ہیں۔"

"میں اب کیا بتاؤں۔ آپ نے بہت وقت ضائع کیا ہے۔" سروج نے کہا "وہ بین السطور یہ بات مان گئی تھی کہ اس چپقلش کا تعلق منوہرا دیوی کی ناراضی سے ہے۔"

مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ امر صاحب نے سروج کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے اور بولے "سروج! اب ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم بڑے وشواس سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی راستہ دکھائیں۔"

یہ انڈر ورلڈ کی طاقت کا خوف تھا جو ایک بڑے فلمساز کو ایک ناکام اداکارہ کے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ ناکام اداکارہ بھی شاید اپنی محرومیوں کا بدلہ آج ہی لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی بیزاری ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ فلمساز امر صاحب نے عاجزی اور لجاجت کی دو چار باتیں مزید کہیں۔ آخر سروج نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور امرجی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی "اچھا آپ کل آیئے گا۔ میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں گی۔"

"کل نہیں مس سروج! آج ہی۔۔۔ ورنہ پورے چوبیس گھنٹے میں سولی پر لٹکا رہوں گا۔ میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتا کہ دیو صاحب اور ہم کتنی ٹینشن میں ہیں۔"

سروج کچھ دیر تک ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ جب امر صاحب اور وکیل کرشن لال کی بے تابی بڑھ گئی تو وہ اپنے مطلوبہ موضوع کی طرف آ گئی۔ اس نے امر صاحب سے کہا "لڑکی کو باہر بھیج دیں۔"

امرجی نے فوراً لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے توبہ شکن بدن کا لباس درست کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ سروج نے گہری سانس لیتے ہوئے فلمساز امرجی کو مخاطب کیا اور بولی "جہاں تک میری جانکاری ہے آپ کا چھوٹا بھائی سریش آپ کا بہت فرمانبردار ہے اور۔۔۔ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے۔"

"ہاں ایسا ہی ہے لیکن میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"آپ نے سریش کی شادی ایک سری لنکن لڑکی سے کر رکھی ہے اور وہ لڑکی کلچر منسٹری کے چیف سیکریٹری کی بیٹی ہے۔ بلکہ اکلوتی بیٹی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ایسا تو ہے۔" امر صاحب نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر منوہرا دیوی سے آپ کے تعلقات بحال ہونے کا راستہ نکل سکتا ہے۔"

امر صاحب نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور پُرسوچ لہجے میں بولے "کہیں۔۔۔ آپ کو یا منوہرا دیوی کو کلچر ڈیپارٹمنٹ سے کوئی کام تو نہیں آن پڑا۔۔۔؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" سروج نے کہا۔

"کیا آپ کچھ وضاحت فرمائیں گی؟" امر صاحب نے کہا۔

سروج نے سگریٹ کے ٹکڑے کو ایش ٹرے میں مسلا اور مختصر الفاظ میں وہ ساری صورتِ حال امر صاحب کے گوش گزار کر دی جو پچھلے چند روز سے یہاں موجود تھی۔

امر صاحب سنتے رہے اور اپنے گنجے سر سے پسینہ پونچھتے رہے۔ جب وہ سب کچھ بتا چکی تو امر صاحب نے اس سے اجازت لے کر لرزاں ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور بولے "آپ نے مجھے سخت کٹھنائی میں ڈال دیا ہے۔ آپ کی بات ٹالنا بھی آسان نہیں، دوسری طرف سریش کے مزاج سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بالکل اور ٹائپ کا بندہ ہے۔ آج کل وہ بیمار بھی ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے چیف سیکریٹری پر دباؤ ڈلوانا آسان نہیں ہو گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔" سروج نے خشک لہجے میں کہا۔

"نن۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ اب آپ نے کہہ دیا ہے۔۔۔ تو یہ کام کرنا ہی ہے۔ چاہے جیسے بھی کرنا پڑے۔"

"اچھی طرح سوچ کر بات کریں۔ میں اس کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔۔۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو معاملہ اور سنگین ہو جائے گا۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے کیوں گڑبڑ ہو گی جی۔۔۔ بس اب جیسے بھی ہو گا یہ کام کریں گے۔ منوہرا دیوی کے لیے ہمارے دل میں جو عزت ہے آپ اس کا تصور بھی نہیں کر

مشغلہ ہیں۔"

"بالکل جی..... بالکل۔" وکیل کرشن لال نے پھر جنبی نکالی۔

میں نے سنا تھا کہ انڈر ورلڈ کے ڈان اور جرائم پیشہ لوگ فلم انڈسٹری والوں کو انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آج اس کا جیتا جاگتا نمونہ بھی دیکھ رہا تھا۔ دولت مند شخص اکثر بزدل ہوتا ہے۔ اور انڈسٹری میں دولت بہت تھی۔ ان دولت مندوں کو ان کی اخلاقی اور دیگر کمزوریوں کی وجہ سے اپنے چنگل میں پھنسانا جرائم پیشہ لوگوں کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ان کے لیے سازشوں کے تانے بانے بنے جاتے تھے پھر انہیں جلد کر ان سے بھتے وصول کیے جاتے تھے اور دیگر بہترین مراعات حاصل کی جاتی تھیں۔ یہ ایک عجیب سی شطرنج تھی۔

سروج اور انڈسٹری کے دونوں افراد کے درمیان یہ "مفاہمت کی گفتگو" آدھا پون گھنٹا مزید جاری رہی۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔

صرف دو دن بعد اسی آفس میں میں نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا۔ حبس بہت زیادہ تھی۔ میں بالائی منزل سے زیریں منزل پر آیا۔ ایک بڑے کمرے میں قریباً ایک سو کاسٹ امیدوار جمع تھے۔ فلم لائن کے ایک عمر رسیدہ اداکار ان کی کلاس لے رہے تھے۔ نوخیز لڑکیوں کے جھرمٹ میں موصوف خوب چہک رہے تھے۔ انہیں اداکاری کے مختلف گر بتا رہے تھے اور ساتھ ساتھ انہیں بھی سینک رہے تھے۔ میں کمرے کے سامنے سے گزرتا ہوا آفس میں پہنچا۔ آفس سے باہر ایک شخص ویٹنگ روم میں بیٹھا اندر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ کلچر منسٹری کا بلراج مہتا تھا۔

ویٹنگ روم میں فقط ایک پنکھا چل رہا تھا۔ گرمی کے سبب بلراج کا پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ غالباً وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر سروج کی طرف چلا گیا۔ استقبالیہ پر ایک ادھیڑ عمر پارسی دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے بلراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا "یہ بندہ کہاں کیا کر رہا ہے؟"

وہ بولی "یہ وزارت ثقافت والے ہیں۔ سروج میڈم سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ مصروف ہیں اس لیے باہر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔"

میں بلراج سے نظریں ملائے بغیر آفس میں داخل ہو گیا۔ سروج آفس میں ہی موجود تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر نیم دراز ٹانگیں میز پر چڑھائے بیٹھی تھی۔ دفتر میں کوئی ملاقاتی موجود نہیں تھا۔ میں نے کہا "یہ کیا چکر ہے بھئی! تم یہاں سیب چھیل چھیل کر کھا رہی ہو اور باہر وہ بلراج مہتا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"کرنے دو انتظار اسی لیے تو میں نے جان بوجھ کر باہر بٹھایا ہے۔"

"کل تک تو وہ شیر بنا ہوا تھا۔"

"آج کتے کا بچہ بنا ہوا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہمارے پاؤں بھی چاٹے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہاری منوا ہردوبی نے شکنجہ کس دیا ہے۔"

"ایسے کئی شکنجے ان کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔" سروج بولی۔

ہم ائرکنڈیشنڈ آفس میں بیٹھے تقریباً آدھا گھنٹا باتیں کرتے رہے پھر سروج نے چپڑاسی کو بلایا اور اس سے کہہ کر آفس میں موجود تین کرسیاں اٹھوا دیں۔ اب صرف ایک کرسی تھی جس پر میں بیٹھا ہوا تھا یا ایک صوفہ تھا۔ اتفاق سے اس صوفے پر کئی فائلیں وغیرہ دھری تھیں۔

چپڑاسی سے کہہ کر سروج نے بلراج کو اندر بلا لیا۔ وہ اپنا پسینہ پونچھتا اور ٹائی کی ناٹ درست کرتا ہوا اندر آگیا۔ آج اس کے اندر کا کرخت افسر نجانے کہاں جا چھپا تھا۔ اس کی جگہ ایک خجل سے خوشامدی شخص نے لے لی تھی۔ یہی لمبا تڑنگا خشک مزاج بلراج تھا جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جو اپنے وسیع تعلقات کی وجہ سے اپنے عہدے سے کہیں زیادہ حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بات بات پر اپنی زمینداری کا رعب یوں گانٹھتا تھا جیسے "زمینداری" نہ ہو کوئی "توپ" ہو جو وہ اپنے مخالف پر پلک جھپکنے میں چلا دے گا۔ آج اس کی طرح اس کی توپ بھی ٹھنڈی ٹھار تھی۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد بیٹھنے کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی جگہ نہ ملی۔ ذرا سا ڈگمگا کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

سروج نے خشک انداز میں پوچھا "ہاں کیسے آئے ہو؟"

"مہندر صاحب نے بھیجا تھا۔ جو کچھ ہوا اس پر انہیں بہت افسوس ہے اور میں بھی شرمندہ ہوں۔ دراصل یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے ہوا....."

اس تمہید کے بعد بلراج نے اپنی صفائی میں لمبی چوڑی تقریر کر دی۔ اس تقریر کا لب لباب یہی تھا کہ وہ اتنا برا

نہیں جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں اور وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے....."

میں نے کہا "میری بات کا برا نہ ماننا۔ میرے خیال میں تمہارے نزدیک دشمن وہی ہوتے ہیں جو تمہاری گردن پر پاؤں رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جو تمہارے جال میں پھنس کر پھڑپھڑاتے ہیں اور ترلا منت ڈالتے ہیں کہ تم انہیں کند چھری سے ذبح کرتے ہو۔"

ایک لمحے کے لیے بلراج کے چہرے پر دباؤ بڑھا اور یوں لگا کہ وہ حسب عادت آپے سے باہر ہو جائے گا لیکن پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور کھسیانے انداز میں بولا "بس جی آپ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔ میں نے اپنی غلطی کی معافی مانگ لی ہے۔ آئندہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے جنابا بھی ادھر نہیں جھانکے گی۔ میرے لائق کوئی بھی سیوا ہو۔ مجھے حکم دیجیے میں ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

اچانک آفس کا بغلی دروازہ دھماکے سے کھلا اور سائیں عالی ایک چیخ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ میرے ساتھ سروج بھی گھبرا گئی تھی اور بلراج کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ سائیں نے ایک نعرہ بلند کیا اور اچھل کر بلراج کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس کی دبلی پتلی ٹانگوں نے بلراج کی کمر کس لی تھی اور بازو بلراج کی گردن سے لپٹ گئے تھے۔

بلراج کے حلق سے ڈری ڈری آواز نکل گئی۔ وہ وحشت زدہ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے ایک اور نعرہ بلند کیا "چل دھڑکا گھوڑی کا.... چل دھڑکا.... بابارل دھڑکا....." نعرے نے بلراج کو کچھ اور بھی حواس باختہ کر دیا۔ ہماری طرف سے بوس ہو کر اس نے از خود سائیں کو اپنی پشت سے اتارنے کی کوشش کی لیکن وہ تو دائمی جونک ہو گیا تھا۔

میں نے کہا "سائیں! یہ ٹھیک بات نہیں..... نیچے اتر جاؤ۔"

"نہیں اتروں گا..... نہیں اتروں گا۔ نہیں اتروں گا۔ گھٹ بڑا مزہ آرہا ہے۔"

"دیکھو سائیں! یہ افسر اکڑ بند پرنٹر کے مریض دوست ہیں۔ ان کا پارہ بول گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"نہیں ہوئے گا پارہ..... کبھی گھوڑی کا بھی پارہ بولتا

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت

اباقہ

طاہر جاوید مغل

دو جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 250 روپے

- خونخوار منگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک
- کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک وحشی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر منگول بھی کانپ اٹھتے تھے
- پہاڑوں سے ٹکرانے والے، چٹانوں سے لڑنے والے اور طوفانوں سے الجھنے والے وحشی دیوانے کی داستان حیرت

تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے کشید کیا ہوا ناقابل فراموش ناول

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

ہے۔"

مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ سائیں عالی سروج کے ساتھ اس عمارت میں ہی کہیں موجود ہے۔ آج تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ سائیں کی موجودگی میں سروج بالکل مئودب کھڑی تھی۔ اس نے سگریٹ خاموشی سے قالین پر گرا کر سینڈل سے مسل دیا تھا۔

گردن پر دباؤ کی وجہ سے بلراج کا سانولا چہرہ مزید سانولا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ چند لمحے بعد سائیں نے منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکالنا شروع کر دی اور جسم کو یوں حرکت دینے لگا جیسے گھوڑے کو ایڑ لگائی جاتی ہے۔

"سائیں اس کو کہاں لے جانا چاہتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "زیادہ دور نہیں۔۔۔ مجھے پتا ہے یہ حاملہ گھوڑی ہے اسے زیادہ نہیں بھگانا چاہیے۔" سائیں کا اشارہ بلراج کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف تھا۔

بلراج بے چارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ٹائی اب سائیں کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے بلراج سے کہا "یہ سائیں جی ہیں۔۔۔ جذب کی حالت میں رہتے ہیں۔ ان کی بات ہمیں بھی ماننا پڑتی ہے۔ تم بھی مان لو۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔"

بلراج کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ ایک طرف افسری کا وقار تھا دوسری طرف سروج اور منوہرا دیوی کی ناراضی کا ڈر تھا۔ اوپر سے سائیں عالی ایڑ پر ایڑ لگائے جا رہا تھا۔

"کک۔۔۔ کہاں جانا ہے۔" بلراج نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

سروج بولی "سائیں جی کا کمرا اوپر ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر دائیں طرف والے برآمدے میں" قریباً ایک منٹ تک بلراج سخت تذبذب میں رہا۔ میں نے آفس کا دروازہ کھول دیا۔ سائیں پر تسمہ پا کی طرح بلراج سے چمٹا ہوا تھا۔ بلراج ڈگمگاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ملازمین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ شاید کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس بارعب قسم کے افسر کو اس حالت میں دیکھیں گے۔ مزید گڑبڑ یہ ہوئی کہ اداکاری کی کلاس جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے جاری تھی ختم ہو گئی۔ درجنوں لڑکے لڑکیاں بلراج کی پشت پر ایک عجیب الخلقت شخص کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ پہلے تو حیران تھے پھر شوخ ہو گئے۔ ان کے چنچل فقرے اور قہقہے فضا میں بکھرنے لگے۔ بلراج نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں تو لڑکے لڑکیاں ایک جلوس کی صورت میں اس کے پیچھے تھے۔

شاید میں اس دلچسپ منظر سے کچھ دیر مزید لطف اندوز ہوتا لیکن اسی دوران میں چپڑاسی نے آکر بتایا کہ مجھے میڈم بلا رہی ہیں۔ میڈم کا خطاب یہاں سروج کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ میں آفس میں پہنچا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سروج لپک کر آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا قیامت بدن پورے کا پورا مجھ سے چپک گیا تھا۔ اس نے جھپٹ سے میرے رخسار کا بوسہ لیا اور خوشی سے بھرپور آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ دھکا ذرا زوردار تھا وہ صوفے پر رکھی فائلوں کے اوپر گری۔۔۔ اس گرنے سے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک مستانہ قہقہہ لگایا اور سر کو جھٹک کر پیشانی کے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔

"کیا دماغ چل گیا ہے تمہارا۔" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"بس سمجھو دماغ ہی چل گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ سمجھو کہ خوشی سے پھٹ رہی ہوں۔ پتا ہے تمہیں ابھی کیا ہوا ہے؟۔۔۔ ابھی منوہرا دیوی کا فون آیا ہے۔ ایم اے سی کی طرف سے لڑکے لڑکیوں کا پہلا گروپ اٹھائیس تاریخ کو انگلینڈ جا رہا ہے۔۔۔ اور پتا ہے اس پہلے گروپ کے ساتھ کون کون انگلینڈ جا رہا ہے؟"

"کون جا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے اپنے سینے کے درمیان انگلی رکھی "اور تم جا رہے ہو۔" اس مرتبہ اس نے میرے سینے پر انگلی رکھی۔ "او گاڈ! کیسا ونڈر فل ٹور ہو گا۔ تم اور میں۔۔۔ اور انگلینڈ کی رنگین فضائیں۔ ہمارا کام تو بس دو چار دن میں ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر پندرہ دن کے لیے تفریح ہی تفریح ہو گی۔ اوہ جانی! آئی ایم ریئلی ہیپی۔" اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

سروج رنگین فضاؤں کی بات کر رہی تھی۔۔۔ اور میرے تصور میں زہریلی فضائیں آ رہی تھیں۔ زہریلی فضائیں اور زہریلا شخص کنگ براؤن۔۔۔

سروج کی آنکھوں میں شوخی تھی اور اس کا پورا جسم جیسے پکار پکار کر دعوت گناہ دے رہا تھا۔ وہ اٹھلا کر بولی "ہمارے پاس تیاری کے لیے صرف چار دن ہیں۔ منوہرا دیوی نے بتایا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کا گروپ بھی اسی جہاز میں لندن جائے گا جس میں ہم سوار ہوں گے۔ ہمارے کاغذات ہمیں پرسوں یعنی 26 تاریخ کو مل جائیں گے۔ تمہاری حیثیت فلمی یونٹ کے پروڈکشن کنٹرولر کی ہو گی۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو ایک فلم یونٹ میں یہ بڑی اہم پوسٹ ہوتی ہے۔"

"میں اس سارے معاملے پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"تم نہیں بھیج سکتے میرے شہزادے! تمہیں لندن جانا ہی پڑے گا۔ اگر نہ جاؤ گے تو اپنے دوست کنگ براؤن سے ملاقات نہیں کر سکو گے۔۔۔ اور کنگ براؤن کا دیدار کرنے کے لیے تم سر کے بل چل کر بھی انگلینڈ پہنچ سکتے ہو۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ کنگ براؤن وہیں انگلینڈ میں ہو گا؟"

"یہ میرے اندر کی آواز ہے۔" وہ شوخی سے بولی "سائیں جی کے ساتھ رہ رہ کر میرے اندر کی آنکھ بھی کھل گئی ہے۔"

"سائیں کے ساتھ رہ رہ کر تم کچھ اور پاگل بھی ہو گئی ہو۔"

"سائیں کے ساتھ رہ رہ کر پاگل نہیں ہوئی۔ تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر ہوئی ہوں۔" اس نے بالوں کو سیدھا اوپر اٹھا کر جوڑا باندھنا شروع کیا۔ یوں اس کا شعلہ صفت بدن کچھ اور نمایاں ہو گیا۔

میں نے بیزاری سے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا۔ وہ مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو شاہ جہاں! غزالہ میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ کیا میں سندر نہیں ہوں؟ کیا تم میرے قرب سے لطف اندوز نہیں ہوتے ہو؟ کیا ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک خوب صورت جوڑے کی طرح نہیں لگتے؟" وہ میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور قد آدم آئینے میں اپنا آپ دیکھنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے ایک بار پھر دھکیل دیا۔ دھکا زوردار نہیں تھا لیکن وہ جان بوجھ کر لہرائی اور میز پر یوں جا گری کہ اس کا بالائی دھڑ میز پر تھا اور ٹانگیں قالین پر۔ وہ انگڑائی لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو کر کئی جگہ سے کھسک گیا تھا اور ڈھیلا بندھا ہوا جوڑا بھی بکھر گیا تھا۔ میز پر گرنے سے اس کی دودھیا کہنی تھوڑی سی چھل گئی اور وہاں سے خون رسنے لگا۔

سروج نے اس خون کو اپنی شہادت کی انگلی پر لگایا اور ناک کے بالکل قریب لے گئی جیسے اپنے بھڑکیلے خون کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اپنے خون کو سونگھ کر اس کی آنکھیں کچھ اور بھی مخمور ہو گئیں۔ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "شاہ جہاں! تم نے ساری دنیا کا ٹھیکہ کیوں لے رکھا ہے۔ تم اپنا جیون کیوں نہیں جیتے ہو۔ کیوں سرابوں کے پیچھے بھاگتے ہو؟ حقیقتوں کی طرف کب آؤ گے تم؟"

"اور حقیقت کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ اسی ترنگ بھرے انداز میں بولتی رہی "حقیقت یہ ہے ڈارلنگ! کہ دنیا اچھائی اور برائی سے مکمل ہوتی ہے۔ تم برائی ختم کرنا چاہتے ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ برائی ختم ہو گی تو پھر دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ تم شیخ عاصم، شنکر ٹنکرا اور کنگ براؤن جیسے لوگوں کو ختم کرو گے تو ان جیسے درجنوں اور پیدا ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم انگلینڈ پہنچ کر کنگ براؤن کو مار ڈالو گے تو یہ دنیا بردہ فروشی کی لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گی۔ نہیں میرے ہیرو! ایسا نہیں ہو گا۔ یہ سلسلے چلتے ہی رہیں گے اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم کنگ کو مار ہی لو۔ اس کا الٹ بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کا جیون لینا آج کل کون سا مشکل ہے۔ پانچ دس روپے کی صرف ایک گولی تمہارے اس سندر شریر کو بے جان کر سکتی ہے۔" اس نے میرے سینے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری منطق تمہاری ہی طرح ڈرتے مارے جانے کے قابل ہے۔" میں نے کہا "اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ اگر ابھی کوئی غنڈا یہاں گھس آئے اور تمہاری بوٹیاں نوچنے لگے تو اسے بھی روکنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ وہ برائی کر رہا ہے اور دنیا کے نظام کے لیے برائی اور اچھائی دونوں ضروری ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم دنیا کا نظام چلانے کے لیے غنڈے کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہونا پسند کرو گی۔"

"تم بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہو۔"

"میں تمہاری ہی بات کی وضاحت کر رہا ہوں۔ اگر انسانی کوشش سے دنیا طاعون اور چیچک جیسی لعنتوں سے محفوظ ہو سکتی ہے تو پھر دوسری لعنتوں سے بھی دنیا والوں کی جان چھوٹ سکتی ہے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے اور ہمیں کوشش کرتے رہنا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا اور جسم کو بے ترتیب کرتے ہوئے بولی "تمہاری اس بات سے تو

نے بھی اعتراف کرلی ہوں۔ ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ کبھی نہ کبھی تو بھگوان کرونا آہی جاتا ہے۔"

"تم جس کوشش کی بات کر رہی ہو۔ وہ ہٹ دھرمی اور بے شرمی ہے۔ تمہاری اس کوشش نے تمہیں عورت نہیں رہنے دیا۔ ایک کرنی کی بلا وشے بنا دیا ہے۔"

"دیکھو تم ایک بار پھر تصوراتی باتیں کر رہے ہو۔ میرے راجا! ذرا حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تم غزالہ کو کھو چکے ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ تم سے پریم نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کا پریم کبھی بھی ان حدوں کو نہیں چھو سکا جہاں تیاگ کرنا پڑے قربانیاں دینا ہے۔ بڑے بڑے فیصلے کرنا ہے۔ آج تک اب کسی پر نچھاور کرنا ہے۔ وہ پہلے اپنی ذات کو اور اپنے پریوار کو تم پر ترجیح دیتی رہی ہے... اور اب اسی پریوار کی خاطر وہ تمہیں چھوڑ گئی ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ اپنی بیمار ماں کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دیکھنے کی خاطر تمہاری محبت کو کند چھری سے ذبح کر سکتی ہے۔ میرے راجا جانی! تم صرف اور صرف سپنوں کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ غزالہ کبھی تمہاری نہیں تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب تمہیں دوبارہ نظر آئے گی۔ لیکن کبھی ایسا ہوا بھی تو تب اس کے پاؤں میں کسی نہ کسی مجبوری کی زنجیر ضرور ہوگی۔ بالکل جیسے اب اس کے پاؤں میں اپنی ماں کی زنجیر ہے۔"

"میں جانتا ہوں تمہارے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ اگر تمہیں موقع دیا جائے تو تم اپنی آخری سانس تک اسی طرح اپنی گندی زبان کو حرکت دے سکتی ہو۔"

"زہریلی میں نہیں ہوں۔ زہریلی وہ ہے۔ وہ ناگن جس نے تمہیں سر سے پاؤں تک لپیٹ رکھا ہے۔ اس کے زہر نے تمہیں اندھا اور بہرا کر رکھا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے کہا۔

"میں جو بھی کہوں تو تمہیں مرچیں لگتی ہیں وہ بکتی بھی تھی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ میرا گلا بھی کاٹ دو تو میں یہی کہوں گی۔ وہ ناگن ہے۔ اس نے تمہارے سارے بدن میں زہر بھرا ہے۔ اور وہ زہر اس کے جانے کے بعد بھی بھر رہی ہے۔"

میں نے سروج کو تھپڑ مارا، وہ لڑکھڑا کر پھر بیڈ پر جا گری۔ اس کے لمبے بال پلٹ کر اس کے چہرے پر آ گئے تھے۔ وہ ان بالوں کے اندر سے ہی مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے سر جھٹک کر بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ اس کا ایک گال سرخ ہو رہا تھا۔ وہ عجیب ہیجانی انداز میں مسکرائی۔ پھر دوسرا گال میرے سامنے کرتے ہوئے بولی "اس گال کو بھی سرخ کر دو جیوا۔ ایک جیسا ہو جائے گا۔"

میں جھنجھلایا ہوا دفتر سے باہر نکل آیا۔ موٹے افسر بلراج کی جان ابھی تک سانپ والی سے چھوٹی نہیں تھی۔ سانپ والی مسلسل اس کے کندھے پر سوار تھا۔ وہ اسے اوپر چھت والے لے گیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولیاں نیچے سے ہی سانپ اور بلراج کی کشمکش کا نظارہ کر رہی تھیں۔ سانپ منہ سے مسلسل پھنکارنے کی آوازیں نکال رہا تھا اور اپنی کھوپڑی یعنی بلراج کو منہ زور کے ساتھ ساتھ چلنے قدمی پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک لڑکے کی زبانی پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سانپ جی نے موٹے افسر کو ہری ہری گھاس کھانے پر بھی مجبور کیا ہے۔ اب وہ اس سے آخری فرمائش کر رہا ہے اور وہ فرمائش یہ ہے کہ افسر صاحب گھوڑی کے انداز میں دولتی جھاڑ کر دکھائیں۔

میں نے بلراج کا چہرہ دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ بس بے ہوش ہونے کے قریب ہے۔ پسینہ اس کے چہرے سے دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ وہ بھی خود سانپ کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی مدد طلب نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ سانپ اس کے لیے صحیح معنوں میں بھی بلا ثابت ہو رہا تھا۔ جیسے بوتل کے جن نے اس نے افسر صاحب کو مسلسل اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ چھت پر جا کر کسی طرح بلراج کی جان سانپ سے چھڑوا دوں لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ یہ رشوت خور افسر بھی تو اسی طرح عوام کی گردن پر سوار رہ جاتے ہیں اور عوام کا خون چوستے ہیں۔ وہ جونک کی طرح چمٹتے ہیں اور چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ مکافات عمل کے تحت یہ افسر بھی اگر چند منٹ مزید سانپ کے شکنجے میں رہ جاتا تو کون سی قیامت آ جاتی۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے کئی سگریٹ پھونکے پھر بوتل کا منہ کھولا اور سیال آگ اپنے اندر انڈیلنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں لیکن ایسا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب غزالہ کا غم آرے کی طرح دل کو کاٹتا تھا اور یادوں کی سوئیاں ایک ایک کرکے دماغ میں اترتی تھیں تو اذیت برداشت سے باہر ہو جاتی تھی۔ ایسے میں الکوحل ایک دوا بن جاتا تھا اور اس کے اندر پہنچتے ہی مدہوشی میرے حواس کو ڈھانپ کر مجھے اذیت سے دور لے جاتی تھی۔

اس سے پہلے میں نے سروج کی باتوں کو کبھی اہمیت

نہیں دی تھی لیکن پتا نہیں کیوں آج اس کی کہی ہوئی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ غزالہ کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے بہت برا لگا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس میں تھوڑی بہت سچائی ضرور موجود ہے۔ سروج نے میرے رستے زخموں کو کھرچا تھا۔ اس نے دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ غزالہ نے بچی فاخرہ کی خاطر مجھ سے منہ موڑا تھا۔ اس نے اپنی بیمار ماں کے ماتھے پر شکن برداشت نہیں کی تھی اور برسوں سے روتی سسکتی محبت کی گردن پر پاؤں رکھ کر مجھ سے دور چلی گئی تھی۔ شاید سروج نے یہ بھی ٹھیک ہی کہا تھا کہ غزالہ اب اتنی آسانی سے دوبارہ نظر نہیں آئے گی اور اگر آئے گی تو اس کے پاؤں میں کسی نئی مجبوری کی زنجیر ہوگی۔

میرے اندر ایک سوال بار بار ابھر رہا "غزالہ! تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم سے ایسی سنگدلی کیونکر ہوئی؟ کیا اس پوری دنیا میں تمہیں میری محبت کے سوا قربان کرنے کے لیے کچھ اور نظر نہیں آیا؟"

پتا نہیں کب مدہوشی حد سے بڑھی اور میں اوندھے منہ بستر پر لیٹ گیا۔

O*O

انگلینڈ روانگی میں اب بس دو روز باقی تھے۔ اگلے دن انگلینڈ جانے والے گروپ کو کوٹھی نمبر 208 میں بلایا گیا تھا۔ شروع میں گروپ کو بتایا گیا تھا کہ ان کے سفری کاغذات دیو آنند صاحب خود آ کر تقسیم کریں گے، اس کے علاوہ انہیں آخری ہدایات بھی دیں گے۔ لیکن اب چونکہ صورت حال بدل گئی تھی اور کچھ لوگوں کی "نظر میں" معتوف ہو گئی تھیں اس لیے دیو آنند کی جگہ کوئی صنعت کار اس کام کے لیے تشریف لا رہا تھا۔

منتخب نوجوانوں کی ٹولیاں سہ پہر کے وقت کوٹھی میں داخل ہونے لگیں۔ یہ کل چالیس ممبران تھے۔ لڑکیوں کا انتخاب کرتے ہوئے خوب صورتی اور جسمانی موزونیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ ان کی عمریں اٹھارہ اور بائیس سال کے درمیان تھیں۔ وہ تقریباً سب کی سب گریجویٹ کرلو تھیں۔ لڑکے بھی صحت مند اور قبول صورت تھے۔

یہ سارے نوجوان اپنی خوش بختی پر نازاں تھے۔ انہیں سینکڑوں امیدواروں میں سے سلیکٹ کیا گیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی انٹرنیشنل فلم میں ثانوی کردار ادا کرنے والے تھے۔ انہیں اس کا معقول معاوضہ ملنا تھا۔ انگلینڈ کا سیر سپاٹا اس کے علاوہ تھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھ کر دل کٹتا تھا۔ وہ ناداں اس بدقسمتی سے لاعلم تھے جس کا سایہ ان کے پورے مستقبل پر پھیل رہا تھا۔ خدا نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا لیکن وہ معصوم بچوں کی طرح تتلیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک خوفناک گڑھے میں گرنے والے تھے۔

یہ غریب الوطنی اور غلامی کا گڑھا تھا۔ اپنے پیاروں سے ہزاروں میل دور یہ نوجوان ظلم و جبر کی چکی میں پسنے والے تھے۔ انہیں یورپین آقاؤں کی جوتیاں صاف کرنا تھیں۔ انہیں نائٹ کلبز اور ڈانسرز کی خواہشات کا ایندھن بننا تھا۔ اور یہ سب کچھ کہاں ہونا تھا۔ کسی دور دراز پسماندہ ملک میں نہیں ہونا تھا۔ یہ یورپ میں ہونا تھا۔ یورپ جو روشن خیالی میں سب سے آگے ہے، جو تہذیب، جدت اور انسانی حقوق کی سربلندی کا ٹھیکے دار ہے۔

میں نے ایک خوش باش نوجوان سے کہا "تم انگلینڈ جاتے ہوئے خوش ہو؟"

"بہت زیادہ خوش اور جذباتی۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ میں انگلینڈ کی شوٹنگ کے لیے منتخب ہو جاؤں گا۔"

"یہاں تم کیا کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں گریجویٹ ہوں۔ میری چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ سب ہی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میری بیوہ ماں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر مجھے پڑھایا ہے۔ اس نے مجھ سے اتنی امیدیں لگائی ہوئی ہیں کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں اپنی ماں کی امیدوں پر پورا اترنا چاہتا ہوں سر! میں دن رات نوکری تلاش کرتا ہوں۔ ساتھ ساتھ ٹی وی پر چھوٹے موٹے رول بھی تلاش کرتا ہوں۔ مجھے موقع ملے تو میں ایک بہت اچھا اداکار بن سکتا ہوں سر۔"

میں نے سوچا "تم سے کہیں زیادہ اچھے اداکار اس دنیا میں موجود ہیں دوست! اور وہ بہت اچھی اداکاری بھی کر رہے ہیں۔ ان کے ڈرامے بہت کامیاب جا رہے ہیں اور ان میں سے ایک ڈراما یہ بھی ہے کہ جس کا "شکار" ہو کر تم اپنا وطن چھوڑ رہے ہو۔"

میں نے ایک لڑکی سے بات کی۔ اس نے کہا "مجھے انگلینڈ کی سیر کا بہت شوق ہے۔ اس کے علاوہ بہت بڑی فلم میں کام کرنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرا رول ثانوی ہوگا۔ زیادہ نہیں تو ایک دو فقرے مجھے بولنے کو ضرور ملیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فلم میرے لیے کامیابی کے مزید دروازے کھول دے۔ میں اپنے بیمار والد کا علاج کسی اچھے اسپتال میں کرانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے بہت

روپے کی ضرورت ہے۔ بہت روپیہ نوکریوں میں کہاں ملتا ہے۔"

میں نے دو تین مزید نوجوانوں سے بات کی۔ ہر ایک کی آنکھوں میں سہانے سپنے دکھائی دیے۔ یہ سب نوجوان انڈین اور مدراسی فلموں سے بہت متاثر تھے۔ کوئی خود کو مستقبل کا ششی کپور سمجھ رہا تھا، کسی کو اپنے نصیب شتروگھن اور دھرمیندر سے ملتے دکھائی دیتے تھے اور کوئی قسمت کی ماری خود کو آنے والے وقت کی ہیما مالنی سمجھ رہی تھی۔ یہ ان کی معصومیت تھی اور یہ معصومیت ہی انہیں بے رحم شکاریوں کے جال میں لائی تھی۔ مجھے زیادہ افسوس ان نوجوانوں کے والدین اور سرپرستوں پر ہو رہا تھا۔ وہ لوگ بالغ نظر اور پختہ کار ہونے کے باوجود اپنے جگر گوشوں کو تاریکیوں میں دھکیل رہے تھے۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، شدید مفلسی انسان سے جہاں اور بہت کچھ چھینتی ہے، وہاں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لیتی ہے۔

ثوبیہ کے بارے میں کوئی تازہ خبر ابھی تک نہیں ملی تھی۔ نہ ہی راوا پونا دوبارہ منظر عام پر آئے تھے۔ درحقیقت شیخ ابا کے ساتھیوں پر راکٹ کا حملہ اتنا خوفناک اور کرتوز تھا کہ اس نے دشمن کے دل میں ہیبت بٹھا دی تھی۔ پاشا کا نظریہ تھا کہ حریف مقابل کو ایسی ضرب لگانی چاہیے کہ اس کے دل میں دہشت بیٹھ جائے اور وہ جوابی وار کرنے سے پہلے سو بار سوچے اور یہ نظریہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

بہرحال ثوبیہ کے حوالے سے مجھے یقین تھا کہ وہ نچلی نہیں بیٹھے گی۔ وہ پچھلے دو تین مہینوں میں اپنے مشہور و معروف بھائی ہی کی طرح سرکش اور ہٹ کی پکی ثابت ہوئی تھی۔ اس میں ایک نہایت جابر قسم کا مرد چھپا ہوا تھا اور یہ مرد میرے ہاتھوں مار کھانے کے بعد کچھ اور بھی شعلہ فشاں ہو گیا تھا۔

لندن روانگی سے ایک رات پہلے پاشا سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ منوہرا دیوی ابھی تک اس پر پوری طرح بھروسا کر رہی ہے۔ منوہرا دیوی نے انگلینڈ میں کنگ براؤن سے بھی مکمل رابطہ رکھا ہوا ہے۔ کنگ براؤن کی خواہش ہے کہ سری لنکا، انڈیا اور پاکستان وغیرہ میں کام تیز رفتاری سے انجام پائے۔"

"تیز رفتاری کا لفظ منوہرا بھی کئی بار استعمال کر چکی ہے۔" میں نے کہا "اور اس کے علاوہ سروج بھی تیز رفتاری کی رٹ لگاتی ہے۔ ایسی کیا ایمرجنسی پڑ گئی ہے ان لوگوں کو؟"

"میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ لوگ موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔" پاشا نے جواب دیا "وہ جانتے ہیں کہ جلد یا بدیر مذکورہ ملکوں کی حکومتیں ہوشیار ہو جائیں گی اور پھر وہاں پر سرگرمیاں اتنی آسانی سے جاری نہیں رکھی جا سکیں گی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کان کھڑے ہونے سے پہلے ہی یہ لوگ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔"

میں نے پاشا سے پوچھا "تم نہیں جا رہے ہو؟"

"نہیں۔ میری ڈیوٹی یہیں کولمبو میں لگائی گئی ہے۔ رتنا کو جیسے دو تین مزید افراد میرے ساتھ کام کریں گے اور باقاعدہ سپلائی کرنے کے لیے "مال" مہیا کریں گے۔ میرے اندازے کے مطابق اس مال کی ایک اور کھیپ اگلے دو تین ہفتوں میں روانہ کر دی جائے گی۔"

"اور میرا خیال ہے کہ اس "کھیپ" میں "گاتی گڑیاں" بھی شامل ہوں گی۔"

"منوہرا دیوی کی تو یہی خواہش ہوگی لیکن میں اس خواہش کے رستے میں رکاوٹ بننے کی پوری کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ تین معصوم بہنوں کے لیے ایک گناہگار بھائی کی یہ کوشش کامیاب رہے گی۔"

پاشا سے میری یہ ملاقات کولمبو کے ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ یہ بڑی سہانی شام تھی، بارش کے بعد ہر شے خوب نکھری ہوئی تھی۔ فضا میں چائے کی مہک تھی اور ناریل کے تیل میں ملتے ہوئے پکوانوں کی مخصوص خوشبو تھی۔ مقامی عورتیں رنگ برنگی لنگی کرتے پہنے بالوں میں رجنی گندھا اور موتیے کے پھول سجائے مستانی چال چلتی ہمارے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ اچانک میں نے لولے لنگڑے اپاہج سیپی کو دیکھا۔ وہ سڑک پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ حسب دستور کشکول اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ سیپی جب کہنی اور گھٹنے کے بل آگے کو سرکتا تھا اس کا سر زمین سے گھسٹتا ہوا جاتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ زمین پر اس طرح گھسٹ گھسٹ کر چلتے ہوئے مکار سیپی عورتوں کے لباس کے اندر جھانکتا ہے اور بعض اوقات عورتوں کی پنڈلیوں پر بوسے دیتا ہے۔ آج سیپی کو یوں سڑک سے گزرنے اور عورتوں کو تاڑتے دیکھا تو یقین ہو گیا کہ وہ خبیث ایسا کرتا ہو گا۔

پاشا نے بھی سیپی کو دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگا "سیپی! ایک بار پھر رتنا کو کے پاس واپس آگیا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مرتبہ یہ کام پاشا کی رضامندی اور خوشی سے ہوا ہے۔ رتنا کو نے اس کے لیے پاشا کو باقاعدہ معاوضہ دیا ہے جو اس نے قبول کیا ہے۔"

مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ ایسا ہوگا۔ میں نے پاشا سے پوچھا "اور وہ پنجابی بہروپن راٹو؟"

"وہ بھی سیپی کے ساتھ ہی رتنا کو کے پاس پہنچ گئی ہے۔ دونوں ایک ہی جیسے خبیث ہیں اس لیے ان کی اچھی گزر رہی ہے۔"

"کیا سیپی سے بھی کوئی کام لیا جا رہا ہے؟"

"بالکل۔ سیپی اور اس کا بھائی ہمارے موجودہ کام میں بڑے کارآمد ثابت ہونے والے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ منوہرا دیوی والے کام میں؟"

پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم قریباً ایک گھنٹا اس ریستوران میں بیٹھے اور مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔

اگلے روز ہم لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ہماری قومی ائرلائن پی آئی اے کا جہاز تھا۔ وہ لاہور سے آیا تھا اور کولمبو سے ہوتا ہوا جا رہا تھا۔ ایکسٹرا اداکاروں کے طور پر کام کرنے والا لڑکے لڑکیوں کا گروپ بھی ہمارے ساتھ تھا۔

میرے سفری کاغذات دو دن پہلے ہی میرے حوالے کر دیے گئے تھے۔ پاسپورٹ پر میرا نام جہاں داد تھا اور وہی تصویر لگی تھی جس میں میرا چہرہ جزوی طور پر تبدیل شدہ تھا۔ ہم روانگی کے وقت سے قریباً چار گھنٹے پہلے ائرپورٹ پہنچ گئے۔ انتی پر کالہ سروج بھی میرے ہمراہ تھی۔ سامان کی چیکنگ اور امیگریشن کی کارروائیوں میں کافی وقت لگا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ مکمل ہوا اور ہم بورڈنگ کارڈز کے ہمراہ پی آئی اے کے بوئنگ کی طرف بڑھے۔

میری نشست جہاز کے عقب میں تھی۔ ابھی جہاز رن وے پر ٹیکسی ہی کر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑی اور میں چونک گیا۔ یہ آفرین تھی۔ بھائی جی کی بیٹی آفرین۔ بھائی جی کی موت ایک بڑے سیاست دان کی موت تھی اور اس موت نے لاہور میں کئی روز تہلکہ مچائے رکھا تھا۔ بھائی جی کو باتھ روم میں کرنٹ کے ذریعے قتل کیا گیا تھا اور میں اس قتل کا چشم دید گواہ بھی تھا۔ میں چاہتا تو بھائی جی کو مرنے سے بچانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن بھائی جی کا مکمل کردار دیکھنے کے بعد میں نے یہ کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال اپنے اس تجاہل عارفانہ کا مداوا میں نے یوں کیا تھا۔ بھائی جی کی موت کے فوراً بعد جب بھائی جی کے سیاسی مخالفوں نے ان کی کوٹھی پر خوفناک حملہ کیا تھا تو میں آفرین کو موت کے منہ سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس وقت غزالہ بھی میرے ساتھ تھی۔

غزالہ اور آفرین کی دوستی بہت پرانی اور گہری تھی۔ اس تعلق کی گہرائی کا اندازہ مجھے انہی دنوں میں ہوا تھا جب بھائی جی والا واقعہ پیش آیا تھا۔ غزالہ کی گمشدگی کے بعد مجھ پر تو قیامت ٹوٹی ہی تھی، آفرین بھی دکھ کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ غزالہ نے کسی نامعلوم مقام سے جو آخری فون کیا تھا وہ بھی آفرین نے ہی وصول کیا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد آفرین کو یوں اچانک اس فلائٹ میں دیکھ کر میں خاصا حیران ہوا تھا۔

آفرین نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جونہی آفرین کی نظر مجھ پر پڑی وہ چونک جائے گی اور ممکن ہے کہ سیدھی میری طرف چلی آئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موقعے پر ایسا ہو۔ میں نے اخبار اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور اخبار کی اوٹ سے آفرین کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور اسمارٹ سی لڑکی بھی تھی۔ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ گاہے گاہے مسکرا بھی دیتی تھیں۔

میں آفرین کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے آفرین کے سامنے آنا چاہیے یا نہیں۔ قریباً پندرہ منٹ اسی طرح گزرے، پھر میری مشکل آسان ہو گئی۔ میں نے آفرین کو اٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ جہاز کے عقبی حصے میں واقع ٹوائلٹ کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے اخبار بدستور اپنے چہرے کے سامنے رکھا۔ دو تین منٹ بعد ٹوائلٹ سے باہر نکلی تو میں اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس گوشے میں کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آفرین کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ وہ مجھے شاید اب پہچان نہیں سکی تھی۔

میں نے ہولے سے کہا "تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

میری آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے کہا "میں شاہ جہاں ہوں۔"

"او مائی گاڈ۔" اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرت کا دریا بہہ گیا۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا "نہیں آفرین! ہم یہاں کوئی بات نہیں کر سکتے۔ تم لندن میں کہاں ٹھہرو گی؟"

"میں... مجھے ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔"

"آل رائٹ... ائرپورٹ سے نکلنے کے بعد میں تمہارے پیچھے پیچھے آؤں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نن۔ نہیں۔" وہ منمنائی۔

"اگر کسی وجہ سے میں نے تمہیں کھو دیا۔ تو تم ہل بورن

کے علاقے میں برج مینشن اگر مجھے مل سکتی ہو۔ میں وہاں ٹھہروں گا۔ آرچ مینشن۔"

آفرین نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔ اسی دوران میں ایک بوڑھا نوا کٹ کی طرف آگیا۔ آفرین آگے بڑھ گئی میں واپس آکر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

آفرین کے یوں اچانک نظر آنے سے میرے سینے کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک چھوٹی سی کرن جاگی تھی۔ دل میں آس پیدا ہوئی تھی کہ شاید مجھے آفرین سے غزالہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے۔ اس کا کوئی سراغ۔ اس کی کوئی خبر۔

جہاز نیلی فضاؤں میں محو پرواز رہا اور میں خیالوں کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ لڑکے لڑکیوں کا گروپ اپنے حال میں مست تھا۔ کچھ کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے میوزک سن رہے تھے۔ کچھ فلم دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی ہیڈ فون چڑھالیا اور سننے لگا۔ کان آواز پر تھے لیکن دماغ کہیں اور تھا۔ رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ لندن میں مجھ پر کیا گزرنے والی ہے اور میرے ہاتھوں لندن پر کیا گزرنے والی ہے۔ کنگ براؤن لندن کا تھا۔ وہ یقیناً میرے خون کا پیاسا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ کنگ براؤن کی جڑیں انگلینڈ اور ہالینڈ میں ایک بار پھر مضبوط ہوگئی ہیں۔ کاش ہم برطانیہ میں ہی اس کا قصہ تمام کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔

میں اس سے پہلے تین مرتبہ لندن میں اتر چکا تھا لیکن اس مرتبہ لندن اترتے ہوئے دل کی جو کیفیت تھی وہ پہلے کبھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سی سنسنی کا احساس تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ جہاز وسیع و عریض فضا میں محو پرواز رہا اور میرا ذہن خیال کے گھوڑے دوڑاتا رہا۔ نوا کٹ کے سامنے ملاقات کے بعد آفرین نے بس ایک دو مرتبہ ہی مڑ کر دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آفرین نے اپنی ساتھی لڑکی کو میرے بارے میں بالکل بے خبر رکھا ہے۔

سروج مجھ سے اگلی نشست پر موجود تھی۔ وہ جہاز میں سوار ہوتے ہی گہری نیند سوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب لندن پہنچ کر ہی اٹھے گی۔ خدا خدا کرکے یہ سفر اختتام کو پہنچا۔ خوب صورت ائرہوسٹس نے خوب صورت آواز میں اعلان کیا کہ لندن آگیا ہے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ خوابوں کا شہر لندن اپنی تمام تر رونقوں سمیت ڈوبے۔ افق تا افق پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے ٹیمز تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ میں ان گنت کشتیاں متحرک تھیں۔ اس طرح سڑکوں پر بھی ہزار ہا گاڑیاں رینگتی نظر آتی تھیں۔ اس عظیم الشان بستی میں کہیں وہ بدنام زمانہ بردہ فروش موجود تھا جسے کنگ براؤن کے نام سے پکارا جاتا تھا اور جو یہاں کسی نئے انسانیت سوز منصوبے کے تانے بانے بن رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" سروج نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"ہم نے کیا سوچنا ہے۔ سوچنا تو منوہرا دیوی اور کنگ براؤن وغیرہ نے ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بہتر یہی ہے کہ تم کچھ مت سوچو۔ جو کچھ منوہرا دیوی کہتی ہیں وہ کرتے رہو۔"

"اور منوہرا دیوی کیا کہتی ہیں؟"

"یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بس تم میرے کہنے پر عمل کرتے رہنا۔" اس نے چپکے سے آنکھ ماری۔ اس کا انداز لوفرانہ تھا۔

یہاں میری حیثیت سروج کے ماتحت کی تھی ورنہ میں اسے کوئی تسلی بخش جواب ضرور دیتا۔ جہاز سے اترنے اور ضروری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد ہم ہیتھرو ائرپورٹ سے باہر آئے۔ میری نظریں مسلسل آفرین کا تعاقب کررہی تھیں۔ میں اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تم اس لڑکی کو بڑی دیر سے تاڑ رہے ہو؟" سروج نے دبے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"میرے تاڑنے کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ میں اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تم چلو۔ میں بھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا اور اگر تمہارے کسی کارندے نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو میں واپس آکر تمہارا ناریل توڑ دوں گا۔" میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا لیکن چہرے کے تاثرات مودبانہ ہی رکھے۔

میں آفرین کے پیچھے ہی پیچھے انڈر گراؤنڈ ٹرین کے پلیٹ فارم پر آگیا۔ آفرین کو اندازہ ہوچکا تھا کہ میں اس کے پیچھے آرہا ہوں۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید ایسا ساتھی لڑکی کی وجہ سے ہے۔

ہم ٹرین پر سوار ہوئے۔ ٹرین برق رفتار تھی۔ تین چار اسٹیشن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ آخر ایک اسٹیشن پر آفرین اپنی ساتھی لڑکی کے ساتھ ٹرین سے اتر گئی۔ میں بھی ان کے پیچھے ہی پیچھے باہر آگیا۔ یہاں رش کافی تھا۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ لندن کی مشہور سردی آج شدت میں کچھ کم تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ آفرین سرخ سویٹر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہے۔ میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے تیزی سے آفرین

کے قریب پہنچنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ وہ کہیں دکھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آفرین اتفاقاً میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ اس نے جان بوجھ کر خود کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ میں قریباً دو منٹ تک ادھر ادھر چکراتا رہا پھر میری نگاہ ایک زینے پر پڑی۔ میں زینے پر چڑھتا ہوا پندرہ بیس فٹ کی بلندی پر آگیا۔ یہ اسٹیشن سے باہر ایک اوپن ائر ریسٹورانٹ تھا۔ یہاں سے میں کافی دور تک دیکھ سکتا تھا۔ ایک طرف مین روڈ تھی اور اطراف میں ذیلی سڑکیں تھیں۔ اچانک میں نے سرخ سویٹر کی جھلک دیکھ لی۔ وہ آفرین ہی تھی۔ مجھ سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر وہ لوگوں کے درمیان تیزی سے راستہ بناتی جارہی تھی۔ وہ ایک ذیلی سڑک پر تھی اور ساتھی لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے غچا دے کر نکلنے کی کوشش کررہی ہے۔

میں تیزی سے زینے اترا اور ذیلی سڑک کی طرف لپکا۔ میرا انداز بھاگنے والا تھا۔ لوگ مجھ سے ٹکرا رہے تھے اور کچھ انگریزی میں برا بھی منا رہے تھے۔ جلد ہی میں آفرین کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں اب بھی اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کا تعاقب کروں لیکن جب میں نے اسے ایک اونچی چھت والی ٹیکسی کے قریب جھکتے دیکھا تو میرے لیے مداخلت کرنا ضروری ہوگیا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھنے جارہی تھی اور ارد گرد دور تک کوئی ایسی سواری نظر نہیں آرہی تھی جس پر میں اس کا تعاقب جاری رکھ سکوں۔

آفرین کی ساتھی لڑکی اپنا بیگ ٹیکسی میں رکھ چکی تھی جبکہ آفرین بیٹھنے والی تھی۔ "ٹھہرو آفرین" میں نے کہا۔

آفرین نے ٹھٹک کر دیکھا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"تم۔ کیا بات ہے؟" وہ اجنبی سے لہجے میں بولی۔

"کہاں جارہی ہو تم؟"

"آپ کو کیا کہنا ہے مجھ سے؟" وہ بدستور اجنبی لہجے میں بولی۔

"دیکھو آفرین! تم اس طرح جان چھڑا کر نہیں جاسکتی ہو اور کچھ نہیں تو مجھے اپنا ایڈریس ہی دیتی جاؤ۔"

"پلیز شاہ جہاں صاحب!" وہ التجا سے بولی "میں یہاں اپنے ایک نجی کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔ میں ابھی کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔"

"مجھے نہیں لگ رہا کہ تم ایسا کرو گی۔"

"پھر میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"کیا ہم صرف دس پندرہ منٹ کے لیے یہاں کسی کیفے میں نہیں بیٹھ سکتے۔"

"ویری سوری شاہ جہاں۔ مم۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں۔"

"میں بہت پریشان ہوں آفرین! اگر تمہارے پاس غزالہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے تو پلیز مجھے بے خبر نہ رکھو۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتی ہو کہ میری زندگی کتنے بڑے عذاب سے گزر رہی ہے۔"

آفرین کے چہرے پر ایک مدھم سا سایہ سا لہرایا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "آپ غلط رخ پر سوچ رہے ہیں۔ میں یہاں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔ آپ کی مداخلت سے میرے لیے مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ جہاں تک غزالہ کی بات ہے اس کے بارے میں اگر کوئی خبر ملے گی تو میں سب سے پہلے آپ ہی کو بتاؤں گی۔"

آفرین کے چہرے پر لہرانے والے سائے نے مجھے شبے میں ڈال دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ میرے دل پر بھی غزالہ کی جدائی کا زخم اتنا گہرا تھا کہ مجھے ہر نئے واقعے کے رونما ہونے پر یہی شک ہوتا تھا کہ یہ واقعہ مجھے غزالہ کی کھوج کی طرف لے جائے گا۔ میں نے آفرین کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اچھا تم دو چار منٹ تو مجھے دے ہی سکو گی۔ میں تم سے بس ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

آفرین کی ساتھی لڑکی نے اب تک بڑی مشکل سے برداشت کر رکھا تھا۔ وہ مجھے کوئی صحافی ٹائپ کی خاتون نظر آتی تھی۔ اس کے گلے میں نظر کی عینک جھول رہی تھی۔ وہ تڑخ کر بولی "دیکھو مسٹر! بہت ہوگیا ہے۔ آپ زبردستی ہمارا راستہ روک رہے ہیں۔ مہربانی کرکے آپ پیچھے ہٹ جائیں۔"

ابھی بمشکل لڑکی کا فقرہ مکمل ہوا تھا کہ سنڈے ہوئے سر والا ایک ہٹا کٹا انگریز میرے سامنے آگیا۔ اس کے کان میں بالی چمک رہی تھی۔ وہ اکھڑے لہجے میں بولا "یہ کیا بے ہودگی ہے تم لڑکیوں سے زبردستی کیوں کررہے ہو؟"

ابھی میں جواب نہیں دے پایا تھا کہ ایک دوسرے شخص نے عقب سے میرا کالر پکڑ لیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ مجھے غلیظ گالی دے دی۔ یہ شخص بھی سامنے والے شخص کی کاربن کاپی نظر

آرہا تھا۔ قد کاٹھ میں بھی وہ پہلے انگریز جیسا تھا۔

آفرین کی آنکھوں میں بے پناہ ہراس نظر آیا۔ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی اسے معلوم تھا کہ میں ایسے پانچ چھ مشٹنڈوں کے ہاتھ پاؤں باآسانی توڑ سکتا ہوں۔ اس کے یہ نامعلوم ہمدرد میرے ہاتھوں شدید نقصان اٹھا سکتے تھے۔ وہ لپک کر میرے اور ان دونوں افراد کے درمیان آگئی لیکن اس وقت تک سامنے والا شخص میری ٹھوڑی پر مکا مار کر اپنی مصیبت کو دعوت دے چکا تھا۔ میں نے جواباً اس شخص کے پیٹ پر لات رسید کی وہ ڈکراتا ہوا آفرین کی ساتھی لڑکی پر جا گرا۔

یکایک ارد گرد سے تین چار افراد مزید برآمد ہوگئے۔ ان میں سے ایک اور شخص کا سر منڈھا ہوا تھا اور کان میں بالی چمک رہی تھی۔ ان سب نے ایک ساتھ ہی مجھ سے لپٹ جانا چاہا لیکن گوروں کے اس شہر میں اپنی پہلی فائٹ میں صاف ستھرے طریقے سے لڑنا چاہتا تھا۔ یعنی انگریزی کا وہی محاورہ IS THE LAST IMPRESSION FIRST IMPRESSION۔ میں نے خود کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ایک شخص کی پسلیوں پر ٹانگ رسید کی اور دوسرے کو اپنے کندھے کے اوپر سے گزار کر پختہ سڑک پر پٹخ دیا۔ اس کے بعد ایک زوردار لڑائی شروع ہوگئی۔ میں نے اپنے حریفوں کو کاری ضربیں لگائیں۔ نصف منٹ کے اندر ایک شخص کا بازو ٹوٹ گیا اور دو افراد کے سر بری طرح پھٹ گئے۔ یہ معروف زمانہ پکاڈلی سرکس کا علاقہ تھا۔ کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ نچلے درجے کے تماش بین آوارہ گرد شرابی اور سیاح کافی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ تاہم دور دور تک کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ لوگوں نے یہ طوفانی فائٹ بڑی دلچسپی سے دیکھی۔

آفرین بھی میری "مار ا ماری" کی بڑی پرستار تھی۔ لاہور میں وہ ہر وقت اس تاک میں رہا کرتی تھی کہ کہیں کسی سے میرے دو دو ہاتھ ہوں اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ دل پسند مناظر دیکھے۔ آج یہ دل پسند مناظر عین اس کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوئے تھے لیکن وہ موقع چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ وہ مجھے اپنے اردگرد کہیں دکھائی نہیں دی۔ اسے اوجھل پاکر میرا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ اس کیفیت کا سارا خمیازہ میرے مدمقابل مشٹنڈے حضرات کو بھگتنا پڑا۔ ایک کے جبڑے پر مکا پڑا اور اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز صاف سنی گئی۔ ایک شخص نے چاقو نکالنے کی کوشش کی۔ ہجوم میں سے میرا ایک نامعلوم ہمدرد نکلا اور اس نے چاقو بردار کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اس کا چاقو گرا دیا۔ یہ ایک سردار صاحب تھے۔ پتا نہیں کہ

وہ کون تھا۔ اس کا کیا نام تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ ان لمحوں میں، میں نے اسے پہلی اور آخری بار دیکھا۔ بہرحال اس مہربان شخص کی مہربانی ذہن پر نقش ہوگئی۔ زندگی کے سفر میں ایسے ان گنت لوگوں سے ہماری پہلی اور آخری ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ہم انہیں راہ چلتے دیکھتے ہیں وہ ہمارے تصور میں جگہ بنا لیتے ہیں لیکن ہم اپنی آنکھوں سے انہیں دوبارہ نہیں دیکھ سکتے۔

کاری ضربیں کھانے کے بعد میرے تین حریف مقابل مختلف سمتوں میں بھاگ اٹھے۔ میں نے ان میں سے ایک نسبتاً موٹے شخص کا انتخاب کیا اور اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ پکاڈلی سرکس کے بھرے بھرے چوک سے گزرتے ہوئے ہم ایک ذیلی گلی میں داخل ہوگئے۔ چند سیکنڈ میں ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ مجھ سے "انتخاب" میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نسبتاً موٹے شخص کے پیچھے لگا تھا لیکن وہ اپنے اسمارٹ ساتھیوں سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہو رہا تھا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے! لوگوں سے ٹکراتے، رکاوٹوں کو پھلانگتے ایک شاپنگ پلازہ میں داخل ہوئے اور اس کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک دوسری سڑک پر نکل آئے۔

میں جانتا تھا کہ منڈھے ہوئے سر والا یہ موٹا میری نگاہ سے اوجھل ہوگیا تو پھر لاکھوں انسانوں کے اس شہر میں، میں آفرین کا سراغ نہ پاسکوں گا۔ میں پوری شدت سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ مجھے یہ امید بھی تھی کہ شاید کوئی پولیس والا یا سیکورٹی گارڈ موٹے کو پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے آگے آگے بھاگ رہا تھا اور شکل سے بھی جرائم پیشہ ہی نظر آتا تھا مگر یہ امید بر نہیں آئی۔ موٹا ایک اور بلڈنگ میں داخل ہوگیا۔ پہلے وہ لفٹ کی طرف گیا پھر میں نے اسے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ میں بھی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ سخت خوف زدہ نظر آتا تھا، اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ اب تک وہ یقیناً مجھ پر فائر جھونک چکا ہوتا۔ ہم قریباً چار منزل اوپر بلڈنگ کی چھت پر پہنچ گئے۔ موٹے نے اب بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ غیر متوقع پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساتھ والی بلڈنگ کی چھت پر کود گیا۔ دونوں چھتوں کے درمیان ایک لمبی جست کا فاصلہ موجود تھا، میں نے بھی کودنے میں دیر نہیں لگائی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ لندن میں قدم رنجہ فرماتے ہی مجھے اس طرح "کبڈی کبڈی" کھیلنا پڑے گی۔ یہ دوسری بلڈنگ بالکل ویران تھی۔ غالباً اسے گرا کر یہاں کوئی جدید طرز کا پلازہ کھڑا کیا جانے والا تھا۔ چھت پر بھی دھول پڑی ہوئی تھی۔ میرا مدمقابل زینے

پر بڑھنے لگا۔ بہرحال ابھی اس نے آٹھ دس زینے ہی طے کیے تھے کہ اس کا ہانپتا کانپتا ہوا سفر ختم ہوگیا۔ میں نے اسے جا لیا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری سی آوازیں نکلیں۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں فرط غضب سے اس کے پیٹ میں کوئی چاقو وغیرہ گھونپ دوں گا۔

میں نے اسے گردن سے پکڑ کر دو چار شدید جھٹکے دیے پھر کھینچ کر ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ اسٹور روم لگتا تھا۔ ایک حصے میں فرش سے چھت تک کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ میں نے فربہ اندام گورے کو اڑنگا لگا کر اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ اس نے خود ہی ٹانگیں چوڑی کردیں اور دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیے۔ لگتا تھا کہ وہ پکڑے جانے اور تلاشی دینے کے "فن" میں طاق ہے۔ دریں گل یہاں ہوتا تو گورے کی اس حرکت پر بہت خوش ہوتا۔

میں نے تلاشی لی۔ اس کی جیکٹ سے وہسکی کا کوارٹر برآمد ہوا۔ اس کے علاوہ ایک بٹوا اور ایک چاقو بھی نکلا۔ میں نے گورے کے دونوں بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کم از کم دو منٹ تک اسی پوزیشن میں رہا۔ دراصل میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہماری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں کوئی یہاں تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ جلد ہی میں مطمئن ہوگیا۔ گورے سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے یہ جگہ خاصی محفوظ تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹائی کھولی اور اس سے گورے کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس کے بعد اسے دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے یقین تھا کہ چاقو کی موجودگی میں یہ "شہرے آنے کے بڑے" جیسا گورا چپ چاپ بیٹھا رہے گا۔

میں نے سب سے پہلے بٹوا دیکھا۔ گورے کا نام جارج وڈز تھا۔ وہ ہائیڈ پارک کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس لندن گورے کے بٹوے میں تین چار گوریوں کے نادر و نایاب فوٹو موجود تھے۔ ان کے علاوہ کرنسی وغیرہ تھی۔ میں نے چاقو کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جارج صاحب! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر تم میرے وقت کی بچت نہیں کرو گے تو پھر تمہاری بچت بھی ممکن نہیں ہوگی۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" وہ ابھی تک ہانپا ہوا تھا۔

"کچھ سب کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ بہتر ہے کہ جو وقت ضائع کرنے میں ضائع ہوگا وہ بھی تم بچالو۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ سرخ سویٹر والی لڑکی سے تمہارے ٹولے کا کیا

تعلق ہے؟" ٹولے کا لفظ استعمال کرتے ہوئے میں نے چاقو کی دھار ہولے سے جارج کے منڈھے ہوئے سر پر پھیری۔

موٹے جارج نے گہری سانس لی اور بولا "مائی گاڈ مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں لیکن جو بھی معلوم ہے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ میاں جان نے بتایا تھا کہ آج ایک بجے کی فلائٹ سے جو دو لڑکیاں پاکستان سے یہاں پہنچ رہی ہیں، ان پر نگاہ رکھنی ہے اور دھیان رکھنا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی اور شخص تو لندن نہیں پہنچا ہے۔"

"یہ میاں جان کون ذات شریف ہیں؟"

جارج نے چونک کر ایک گہری سانس لی اور بولا "میاں جان ہمارے بڑے گرو ہیں۔ یہاں انگلینڈ، پاکستان اور انڈیا میں ان کے بہت سے مرید ہیں، جو ان کے اشارے پر ہر قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔"

"تم لوگوں نے یہ سر وغیرہ ان کے حکم سے ہی منڈوا رکھے ہیں؟"

"ہاں یہ انہی کا حکم ہے کہ سر منڈوایا جائے اور کان میں بالی ڈالی جائے۔"

"کیا وہ خود بھی سر منڈوا ہے؟"

"نہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے۔ میرے بٹوے میں ان کی تصویر موجود ہے۔" جارج نے بٹوے کے ایک خانے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تصویر نکالی اور حیران رہ گیا۔ یہ بمشکل 35 سال کا ایک جوان سال شخص تھا۔ داڑھی مونچھ بالکل صاف تھی۔ اس نے باقاعدہ ٹائی لگا رکھی تھی "یہ ہے تمہارا میاں جی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں یہی ہیں۔" جارج نے جواب دیا "یہ یوگا کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی گاڈ نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔"

میں نے کہا "میاں جی کا ایڈریس؟"

جارج تھوڑی دیر تذبذب میں رہا پھر اس نے ایڈریس مجھے بتا دیا اور فون نمبر بھی۔

"میاں جان ان دونوں لڑکیوں کے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائی گاڈ! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم تو بس حکم کے بندے ہیں۔"

میں نے جارج سے میاں جان اور اس کی مصروفیات کے بارے میں چند مزید سوال کیے۔ جارج ڈرے ڈرے انداز میں جواب دیتا رہا۔ آخر میں وہ بولا "کیا ہمارے

"میاں ایک بات طے ہو سکتی ہے؟"

"کیسی بات؟"

اس نے تھوک نگلا "میں تمہیں وہ سب کچھ بتا دیتا ہوں جو مجھے میاں جان کے بارے میں معلوم ہے۔ اس کے بدلے ذرا ایک کام کرو۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے، بس تم اپنے تک ہی محدود رکھو۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ تم نے اس طرح بھاگ کر مجھے پکڑا تھا اور یوچھ گچھ کی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "مجھے منظور ہے۔"

جارج نے جواباً مجھے میاں جان کے بارے میں تفصیلی باتیں بتانا شروع کیں۔ اس کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ میاں جان کی باتوں میں خاص قسم کا اثر ہے۔ جو سنتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ عورتوں میں بھی خاصے مقبول ہیں۔ انہوں نے انگلینڈ اور پاکستان میں دو تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ وہ عام لوگوں کی طرح زندگی کی ٹینشن سے دور نہیں ہیں۔ ان کا یہاں اپنا بزنس بھی ہے۔ ریجنٹ پارک کے علاقے میں ان کی شاندار ذاتی رہائش گاہ ہے۔

یہ سب کچھ بتانے کے بعد جارج نے ایک بار پھر التجا کی کہ میں کسی بھی موقعے پر موجودہ واقعے کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ جارج کو تھوڑا سا کریدنے پر انکشاف ہوا کہ وہ چند سال پہلے ایک مشہور ایتھلیٹ تھا۔ 400 میٹر کی دوڑ میں وہ کئی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ اپنے حلقۂ احباب میں جارج کو اب بھی ایک تیز رفتار شخص کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے بارے میں مانا جاتا تھا کہ کسی پولیس والے یا سیکیورٹی گارڈ کے لیے جارج کو بھاگ کر پکڑنا بہت مشکل ہے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ قدرے فربہ اندام ہونے کے باوجود جارج اتنی تیز رفتاری سے اور اتنے فاصلے تک کیوں بھاگا تھا۔ اس طویل دوڑ کے دوران میں ایک دوبار تو مجھے یہی لگا تھا کہ وہ لندن کی بھول بھلیوں میں میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اب میں جارج کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں اپنی عزت بچانے کا خواہاں تھا اور اس کے لیے اس نے غیر مشروط طور پر سب کچھ میرے گوش گزار کر دیا تھا۔

بہرحال میں اب بھی جارج پر حتمی یقین نہیں کر سکتا تھا۔ میں جارج کو چھوڑنے سے پہلے تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ اس نے میاں جان کا پتا ٹھکانا درست بتایا ہے یا نہیں۔ اسٹور روم میں نائیلون کی ایک رسی موجود تھی۔ میں نے اسی کے ساتھ جارج کو دروازے کے ہینڈل سے باندھ دیا۔ اس کے بعد منہ کھلوا کر منہ میں کپڑا وغیرہ بھی ٹھونس دیا۔

میں نے کہا "دیکھو جارج! ٹکیے بیٹھے رہو۔ میرا اندازہ ہے کہ تم پندرہ بیس منٹ کے اندر کسی نہ کسی طرح رسی کاٹنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو۔"

جارج کو اسی حال پر چھوڑ کر میں اسٹور روم سے نکل آیا اور تیز تیز بلڈنگ کی کہنہ سال سیڑھیاں طے کرتا بلڈنگ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے پاس قریباً پندرہ منٹ تھے۔ ان پندرہ منٹوں میں ہی مجھے جارج کے پتا کی تصدیق کرنا تھی۔ اگر بیان غلط ہوتا تو میں دوبارہ فوراً بلڈنگ میں پہنچ کر جارج کو جا لے سکتا تھا۔

میں نے ایک پی سی او سے جارج کا دیا ہوا ٹیلی فون نمبر ملایا۔ یہ میاں جان کا نمبر تھا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر ایک سنجیدہ مردانہ آواز نے "ہیلو... کون؟" کہا۔

"میاں جان سے بات ہو سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مسٹر! یہ تو ان کے آرام کا ٹائم ہے۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ان کی پھوپھی خالہ کا لڑکا ہوں۔ وہی جو ایک حبشی ڈرائیور کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔"

"لُف... کیا بکواس ہے۔"

"یہ تو بکواس ہی ہے... بس میری زبان میں کھجلی ہو رہی ہے۔ کسی کو گالیاں دینے کو دل چاہ رہا ہے۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو تمہیں چند صلواتیں سناؤں۔"

دوسری طرف سے کھٹاک سے فون بند کر دیا گیا۔ میں نے بھی مسکرا کر ریسیور رکھ دیا۔

✪☆✪

ہل بورن کے علاقے کے ایک شاندار مکان میں سروج عرف الوکی بچی میرا انتظار کر رہی تھی۔ خوب صورت علاقے میں واقع یہ مکان جدید و قدیم طرز کا شاندار امتزاج تھا۔ چاروں طرف سرسبز لان تھے۔ اصل عمارت تین منزلوں پر مشتمل تھی۔ صرف نچلی منزل میں کم و بیش چالیس کمرے تھے۔ وال ٹو وال قالین بچھے ہوئے تھے۔ جہازی بلند چھتیں دروازے چودہ پندرہ فٹ اونچے تھے اور بیشتر ستون سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے۔ سروج کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ بلڈنگ حقیقت میں ایک ہوٹل کی ملکیت ہے لیکن ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ اسے فلم کمپنی نے یہ عمارت اس کام کے لیے کسی مقامی شخص سے کرائے پر حاصل کی ہے۔

سروج کا قیام گراؤنڈ فلور پر تھا۔ اسی فلور پر اس کے لیے ایک عارضی دفتر بھی قائم کیا گیا تھا۔ جو چالیس عدد نوجوان ہمارے ساتھ لندن پہنچے تھے وہ فرسٹ فلور پر قیام پذیر تھے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ رکھا گیا تھا۔ ان

کے کھانے پینے اور سونے کا انتظام اوپر ہی تھا۔ وہ خوب ہلا گلا مچا رہے تھے اور لندن پہنچ کر بہت خوش تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ فلم کی شوٹنگ دو دن تک شروع ہو جائیں گی۔ ابتدائی دو دن وہ فارغ ہیں اس لیے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گھوم پھر سکتے ہیں۔

سروج مجھے مسلسل تفتیشی نظروں سے گھور رہی تھی آخر دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ کہنے لگی "مجھے لگتا ہے کہ تم کہیں مارا ماری کر کے بھی آئے ہو۔ کہیں اس لڑکی کے بھائیوں نے تو کوئی کام تمام نہیں دکھایا؟"

میں نے کہا "نہ وہ لڑکی تمہارے جیسی تھی اور نہ اس کا کوئی بھائی یہاں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا بھی ہے کہ وہ ایک نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔ تم اپنی گندی ناک خواہ مخواہ اس میں نہ گھسیڑو۔"

وہ میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ غالباً اس "ٹور" کے آغاز میں ہی وہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا "مجھے یہاں کیا کرنا ہے۔ میری جو بھی ڈیوٹی ہے وہ ابھی اور اسی وقت تفصیل سے بتا دو۔ تمہارے سامنے بار بار ماتحت کی حیثیت سے کھڑے ہونا مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ میٹھی شراب کی چسکی لیتے ہوئے بولی "تم ماتحت کہاں ہو۔ تم تو میرے (جسم) اور جان کے مالک ہو۔ ایک آقا کی طرح اس باندی کو جو چاہو حکم دے سکتے ہو۔"

"شرافت کی اوقات میں رہو اور مجھے بھی میری اوقات میں رہنے دو۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟"

"تمہاری حیثیت پروڈکشن کنٹرولر کے علاوہ منیجر کی بھی ہے۔ بدھ کے روز سے کام شروع ہو جائے گا۔ تم کام کی نگرانی کرو گے۔"

"کام سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"شوٹنگز... اور کیا۔ فرسٹ فلور کا ایک مکمل پورشن عکس بندی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ خوب چہل پہل ہوگی۔ لڑکیوں کے ایکشن ڈانس ہوں گے تمہارا دل لگا رہے گا۔ آج کل ضرورت بھی ہے کہ تمہارا دل لگا رہے۔" وہ ایک بار پھر غزالہ کی دوری کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "شوٹنگز کے ناٹک کی کیا ضرورت ہے۔ تم بتا ہی چکی ہو کہ یہ فلم بھی نہیں بنے گی۔"

"فلم تو نہیں بنے گی لیکن ان باقی ایک سو ساٹھ بے وقوفوں کو تو یہاں لانا ہے نا۔ جو ابھی تک کولمبو میں بیٹھے ہیں۔ وہ جب تک یہاں نہیں پہنچ جاتے ہمیں اپنا بھرم قائم رکھنا ہے۔"

"میرا کمرا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کمرے کے بالکل ساتھ... لیکن۔ اس سے کوئی غلط سلط مطلب مت لینا۔ یہ احتیاط صرف اس لیے کی ہے کہ مجھے کام کے سلسلے میں کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

دن قدرے گرم تھا لیکن رات کو سردی بڑھ گئی۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ملازم نے دستک دی اور مجھے بتایا کہ میڈم مجھے یاد فرما رہی ہیں۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ اس قسم کے پیغام کی مجھے پہلے سے توقع تھی۔ سروج کی سوچ مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ غزالہ کی دوری سے میرے اندر ایک وسیع خلا پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی "شعلہ بدنی" اور فتنہ سامانی سے یہ خلا پر کر سکتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میں اندر سے ٹوٹ کر شراب سے دل بہلا رہا ہوں۔ اگر شراب میری زندگی میں آ سکتی ہے تو اس کی "شعلہ بدنی" کیوں نہیں آ سکتی۔ وہ میرے لیے غزالہ کا متبادل بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ غزالہ کی جوتی کے تلوے جیسی بھی نہیں تھی۔ غزالہ نے مجھے بڑی بے رحمی کے ساتھ زخموں سے چور کیا تھا لیکن مجھ پر ابھی اتنی نقاہت طاری نہیں ہوئی تھی کہ میں نہ چاہنے کے باوجود گندگی کے گڑھے میں گر جاتا۔

میں سروج کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ بلند و بالا آبنوسی دروازے پر مدھم دستک دی۔ ریموٹ کنٹرول سے حرکت کرنے والا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وسیع و عریض خواب گاہ کا منظر خواب ناک تھا۔ دروازہ کھلتے ہی نہایت قیمتی خوشبو کا ایک بھبکا نتھنوں سے ٹکرایا۔ سروج میرے سامنے تھی اور میرے اندیشوں کے عین مطابق ہوش ربا لباس میں تھی۔ پیاز کے چھلکے جیسا گاؤن تھا اور وہ بھی کہیں تھا۔ کہیں نہیں۔ اس نے نشیلی نظروں سے مجھے دیکھا اور کمرے کے وسط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "دیکھو! کتنا پیارا بستر ہے تمہارے لیے۔"

"بہت پیارا بستر ہے۔ شاید اس لیے کہ تم اس پر موجود نہیں ہو۔" میں نے کہا اور گہری سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں جانتی ہوں بستر کے ساتھ ہی تمہارے ذہن میں کس کا تصور آتا ہے۔ وہی تصور ہے جس نے تمہارے جیون میں زہر گھولا ہے اور تمہیں دھیرے دھیرے مار رہا ہے۔"

وہ مڑی اور اپنے لیے وہسکی انڈیلنے لگی۔ وہ وہسکی صرف اس وقت پیتی تھی جب جذباتی طور پر شدید ہیجان کا شکار ہوتی تھی۔ میں نے بستر کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا دعوتِ گناہ تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر شراب اور لوازمات تھے۔ ایک طرف پھول مہک رہے تھے۔ ایلوس پریسلے کا ایک ہیجان خیز نغمہ دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔ ملبوسات کا عریاں شمار شیشے کی نہایت خوب صورت میز پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ سروج نے خود کو بھی مشرقی اور مغربی انداز میں سجا رکھا تھا۔ اس کا گاؤن انگلش تھا لیکن اس نے چمکیلے بالوں کا جوڑا مشرقی انداز کا بنا رکھا تھا اور اس میں پھول بھی مشرقی انداز سے سجائے گئے تھے۔ سروج نے ہاتھوں میں موتیے اور گلاب کے گجرے بھی کلاسیکل مشرقی انداز لیے ہوئے تھے۔

میں نے اس تباہ کن "مشرق اور مغرب" سے منہ موڑتے ہوئے شام کا اخبار دیکھنا شروع کر دیا "کیوں بلایا تھا مجھے؟" میں نے سروج سے پوچھا۔

"تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو راجا جانی۔"

"اور تم بھی بڑی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہاری سوچ پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"تم پہلے تو ایسے کٹھور نہیں تھے۔ یہ کوئی بہت عرصہ پہلے کی بات نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں۔ اتنا قریب... جتنا کوئی تصور کر سکتا ہے۔"

"وہ اور بات تھی۔ مقصد تمہاری جان بچانا تھا۔ گلگت کے راستے پر تمہیں دماغی دورے پڑ رہے تھے۔ اگر سچ پوچھتی ہو تو اس وقت بھی وہ قربت مجبوری کے تحت تھی۔"

"یہ مجبوری دوبارہ بھی تو پیش آسکتی ہے۔" وہ عجیب انداز میں بولی "میں اب بھی تو بیمار ہو سکتی ہوں۔"

"میں اس بیماری کے علاج کے طور پر تمہیں دو چار جوتے لگا کر چلتا بنوں گا۔ کیونکہ مجھے اس بیماری کی حقیقت معلوم ہو گی۔" میرا لہجہ اٹل اور ٹھوس تھا۔

وہ چند لمحے تک بغور مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی پھر اس نے ایک طویل آہ بھری اور اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ ایک کٹھن مرحلہ گزر گیا ہے۔ وہ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت گہری بھی تھی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو بار بار بے عزت ہونے کے بعد اس سارے معاملے پر دو حرف بھیجتی اور چلتی بنتی لیکن وہ تو میرے ساتھ جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔

شراب کا ایک تلخ گھونٹ لیتے ہوئے بولی "اچھا اب آ ہی گئے ہو تو تھوڑی سی بزنس کی بات ہو جائے۔"

"اگر واقعی بزنس کی بات ہے تو میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔ میں سائیں جی کے کہنے پر منوہرا دیوی کے گروپ میں شامل ہوئی ہوں۔ موریطانیہ میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد سائیں جی اور کنگ براؤن کے درمیان زبردست کھینچا تانی موجود ہے۔ پچھلے دنوں سائیں جی کے سری لنکا آنے کے بعد "کالونی" میں جو بغاوت ہوئی تھی وہ بھی کنگ براؤن کے حمائتیوں کا ہی کام تھا۔ اب سائیں جی کی خواہش پر میں منوہرا دیوی کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہوں۔ سائیں جی چاہتے ہیں کہ منوہرا اور کنگ براؤن جو بھی پیش رفت کریں ہم اس سے پوری طرح باخبر ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اگر کوئی نئی بات ہے تو بتاؤ۔"

"ہاں۔ ایک نئی بات بھی ہے۔" سروج نے کہا "آنے والے دنوں میں ہم اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بہت محتاط رہیں گے۔ خاص طور سے اس بلڈنگ کے اندر ایسی ڈسکشن بالکل نہیں ہو گی۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"بالکل خاص وجہ۔" سروج نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی "آؤ میں تمہیں دکھاؤں" ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ایک بغلی دروازے کے سامنے پہنچے۔ سروج نے چابی گھما کر دروازے کا لاک کھولا اور ایک چھوٹی سی قالین پوش راہداری میں لے آئی۔ وہ ابھی تک باریک گاؤن میں تھی۔ گاؤن کے نیچے اس کا گلابی بدن جلمن کی شمع کی طرح تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک ہال نما کمرا تھا۔ ایک طویل میز پر کچھ آلات پڑے تھے اور دیوار پر آٹھ دس اسکرینیں نظر آرہی تھیں۔ سروج نے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے۔ ٹی وی کے سائز کی اسکرینیں ایک ایک کر کے روشن ہونے لگیں۔ ان پر جو مختلف مناظر ابھر رہے تھے وہ یقیناً اسی بلڈنگ کے ہی تھے۔ نگران کیمروں کے ذریعے بلڈنگ کے مختلف حصوں کو محفوظ کیا گیا تھا۔

ایک اسکرین پر کمپاؤنڈ نظر آرہا تھا اور وہاں رکھوالی کے بڑے بڑے کتے گھوم رہے تھے۔ ایک منظر چھت کا تھا۔ جہاں دو گارڈز ٹہل رہے تھے۔ دو تین مناظر میں نوجوان ایکسٹرا اداکاروں کا وہ گروپ نظر آرہا تھا جو ایک "بہت بڑی انٹرنیشنل فلم" میں کام کرنے کے لیے اپنا گھربار چھوڑ کر یہاں

پہنچا تھا۔ کچھ نوجوان اپنے بستروں پر سو رہے تھے۔ کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ وی سی آر دیکھ رہے تھے۔

اچانک ایک کمرے کے منظر نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ میں چند لمحے کے لیے خالی خالی نظروں سے اسکرین کو گھورتا رہا پھر میں نے سروج کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ میں نے پھر اسکرین کو دیکھا' کیمرا آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا' اور بار بار کمرے کے ایک جیسے مناظر دکھا رہا تھا۔ میرے دماغ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ میرے سامنے اسکرین پر گانی گڑیاں نظر آرہی تھیں۔ وہی DOLLS SINGING جنہیں منوہرا دیوی ہر صورت انگلینڈ لانا چاہتی تھی اور جنہیں سری لنکا میں روکنے کا پاشا نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ پاشا کا خیال تھا کہ ابھی اس کے پاس کافی وقت ہے۔ اس دوران میں وہ کسی نہ کسی طرح گانی گڑیوں کو اس "دلدل" سے نکال لے گا لیکن وہ سارے مثبت امکانات یکدم ختم ہو گئے تھے اور میں تینوں گانی گڑیوں کو سری لنکا سے ہزاروں میل دور یہاں لندن میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے سروج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "یہ تو وہی گلوکار لڑکیاں ہیں جو کولمبو میں دیکھی تھیں۔"

"اب تم انہیں لندن میں دیکھ رہے ہو۔ کل پتا نہیں کہاں دیکھو گے اور دیکھو گے بھی یا نہیں؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ بھی کولمبو سے یہاں پارسل ہو گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ایسا ہی ہے۔ منوہرا دیوی ان کے پارسل ہونے میں خصوصی دلچسپی لے رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آرڈر کا مال ہو۔ نہ بھی ہو گا تو یہ اچھی خاصی قیمت پر بکے گا" منوہرا ایک تلخ ہنسی بولی۔

میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ ماہیا بسٹ میں غلاموں اور لونڈیوں کے دلدوز مناظر میری نظروں کے سامنے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان معصوم صورت لڑکیوں پر کیا بیتنے والی ہے۔ کچھ علم نہیں تھا کہ منوہرا انہیں یہاں پہنچانے میں اس قدر سنجیدہ کیوں تھی۔ نہ ہی یہ پتا تھا کہ اس نے ان تینوں لڑکیوں کو یہاں کیسے پہنچایا ہے؟ شاید اس نے پاشا کو بائی پاس کرتے کوئی اور راستہ اختیار کیا تھا۔ میرا دل غم سے بھر گیا۔ ان لڑکیوں کے اندر کی نیکی اور معصومیت کا میں دل سے معترف ہوا تھا۔ انہیں اپنی خوفناک حیثیت میں دیکھ کر روح لرز اٹھی۔

سروج غور سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی "لگتا ہے کہ منوہرا دیوی کی طرح تم بھی ان لڑکیوں میں خصوصی دلچسپی لے رہے ہو۔"

"میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے" میں نے ہولے سے کہا "یہ بہت ہمدرد لڑکیاں ہیں' میں ایک دوبار ملا ہوں ان سے۔"

"کس کس کا نوحہ پڑھو گے شاہ جہاں... اس جال میں ایسی بہت سی پھڑپھڑانے والی ہیں۔ اگر کنگ براؤن تک پہنچنا چاہتے ہو تو پھر دل پر پتھر رکھ کر خاموشی سے چلنا ہو گا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولی "تو آج سے یہ بات طے ہے کہ ہم بات چیت میں بہت محتاط رہیں گے... لیکن اگر... تمہیں... جو منظر ابھی دکھایا ہے' وہ اچھا لگے تو بلا جھجک چلے آنا۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کیمرے اور ٹیلی فون کی نگرانی گراؤنڈ فلور پر نہیں ہے کیا سمجھے؟"

میں بغیر کوئی جواب دیے واپس مڑ گیا۔ میرا ذہن الجھ گیا تھا کہ سروج کی آواز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کبھی گانی گڑیوں کا خیال ذہن میں آتا تھا کبھی سوچ کے گھوڑوں کا رخ پاشا کی طرف مڑ جاتا تھا۔ بار بار یہ اندیشہ ذہن میں جاگ رہا تھا کہ کہیں منوہرا دیوی کے سامنے پاشا کا اصلی روپ کھل تو نہیں گیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ حقیقت جان گئی ہو۔ اسے معلوم ہو گیا ہو کہ پاشا گانی گڑیوں کو جان بوجھ کر "پارسل" نہیں کر رہا۔ اور وہ مخلص بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ پاشا سری لنکا میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہو۔ بہرحال یہ تسلی تھی کہ پاشا تر نوالہ نہیں۔ لوہے کا چنا ہے جسے چبانا کسی بہت بڑے گینگسٹر کے لیے بھی آسان نہیں ہو گا۔

پھر میرا دھیان کل پیش آنے والے واقعات کی طرف چلا گیا۔ میاں جان اور اس کے منڈے ہوئے سروں والے چیلوں کے ساتھ "فرزند کا ندھا بانیا نخن تھا؟" میں نے فیصلہ کیا کہ کل لندن میں گھوڑوں پھوں گا اور میاں جان کا "جغرافیہ" بھی جاننے کی کوشش کروں گا۔ اس کام کے لیے مجھے سہرج کا ایک کارندہ بھی درکار تھا۔ کارندے کا انتخاب میں نے سونے سے پہلے ہی کر لیا۔

اس ہوشیار سنہالی کارندے کا نام نجدار تھا۔ یہ مسلمان اور بہت ذہین شخص تھا۔ میں نے اسے صبح سویرے میاں جان کے اڈے پر بھیجا اور اسے کہا کہ وہ خاموشی سے میاں جان کے معمولات کا پتا چلائے۔ بارہ بجے کے قریب واپس آکر نجدار نے مجھے رپورٹ دی۔

نجدار نے بتایا "میاں جان' ریجنٹ پارک کے [illegible]

میں ایک شاندار بلڈنگ میں رہتا ہے۔ وہاں اس نے ایک اسکول بھی قائم کر رکھا ہے جہاں یوگا وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔ میاں جان کہنے کو تو مسلمان ہے لیکن اس کے مذہب کے بارے میں تعین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے عقیدت مندوں میں پاکستانیوں اور انڈین کے علاوہ بہت سے انگریز بھی شامل ہیں اور اسے باقاعدہ استاد کا درجہ دیتے ہیں۔"

"میاں جان سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟"

"ان سے ملاقات کی فیس ۲۰ پاؤنڈ ہے۔ اگر کوئی ارجنٹ ملنا چاہے تو اس کے لیے چالیس پاؤنڈ ادا کرنے ہوتے ہیں۔ میں چالیس پاؤنڈ دے کر آپ کے لیے نمبر لے آیا ہوں۔ آپ شام سات بجے کے قریب ریجنٹ پارک پہنچ جائیں تو دس پندرہ منٹ کے اندر میاں جان سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"بہت خوب" میں نے تعریفی نظروں سے تاجدار کو دیکھا۔

مجھے تاجدار میں یہ خوبی نظر آتی تھی کہ وہ کام کرتے ہوئے اپنی عقل بھی استعمال کرتا تھا۔ عقل استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے چالیس پاؤنڈ خرچ کیے تھے اور میرے لیے میاں جان سے ملاقات کا وقت لے آیا تھا لیکن میں خود میاں جان کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ کل میاں جان کے چیلوں کے ساتھ پکاڈلی سرکس کے چوک میں میری زبردست فائٹ ہوئی تھی۔ جن کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے تھے، وہ اگلے دو چار سال میں تو میری صورت نہیں بھول سکتے تھے۔

میں نے تاجدار سے کہا "شام کی اپائنٹمنٹ پر تم ہی میاں جان سے ملو گے۔ پھر جو کچھ بھی وہاں دیکھو گے، مجھے بتاؤ گے۔ بہرحال میں تمہارے ساتھ جاؤں گا اور تمہارے آس پاس ہی موجود رہوں گا۔"

ہم شام سے کافی پہلے ہی اپنی رہائش گاہ سے نکل آئے۔ گروپ کے لڑکے لڑکیاں بھی چھوٹی بڑی ٹولیوں میں سیر کے لیے نکل رہے تھے۔ یہ ان کی آزادی کے آخری دن تھے۔ میں تاجدار کے ساتھ ایک اونچی چھت والی ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنی منزل ریجنٹ پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔ جوں جوں سائے ڈھل رہے تھے، لندن بارونق ہو رہا تھا۔ اونچی چھت والی ٹیکسیاں، سرخ رنگ کی دومنزلہ بسیں اور انڈر گراؤنڈ ٹیوب کے اسٹیشن، لندن کی خاص پہچان ہیں۔ ہمارے اردگرد سے نکھرے سیاحوں کی ٹولیاں تھیں۔ ہنستے مسکراتے انگریز بچے تھے اور سنجیدہ صورت بوڑھے جو ضرور کچھ نہ کچھ ڈھونڈتے دکھائی دیتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس روشنیوں کے شہر میں، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کے درمیان کہیں وہ درندہ بھی چھپا ہوا ہے جس کا نام کنگ براؤن ہے اور جو کسی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔

جلد ہی ہم ریجنٹ پارک پہنچ گئے۔ لوگوں کی صورتوں اور لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس علاقے میں مسلمان بڑی تعداد میں ہیں۔ میاں جان کا آستانہ رہائشی علاقے میں تھا۔ کافی بڑی کوٹھی تھی۔ سڑک کے کنارے بہت سی بڑی بڑی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر ہی تاجدار کو اتارا اور گاڑی ایک سائڈ پر اس طرح کھڑی کردی کہ میں قریباً سو گز دور رہائش گاہ کے بہت بڑے گیٹ پر نظر رکھ سکوں۔

میں نے تاجدار سے کہا "تم میاں جان کے پاس جاؤ۔ یوگا سیکھنے کی خواہش ظاہر کرو۔ بتاؤ کہ تم اپنا جسم سڈول اور پرکشش دیکھنا چاہتے ہو۔ داخلے کی جو بھی شرائط وہ بتائے ان پر آمادگی ظاہر کرو۔"

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا جناب!" تاجدار نے معاملہ فہمی کے انداز میں سر ہلایا۔

اس نے میاں جان کی رہائش گاہ (آستانے) کی طرف قدم بڑھانے لیکن ابھی وہ دو چار قدم ہی گیا تھا کہ مجھے ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں کچھ دیر کے لیے سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔ میری نگاہیں سامنے ایک سرخ گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس گاڑی میں ایک بڑی عمر کی عورت داخل ہو رہی تھی۔ میں اس عورت کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ گاڑی میں جھک کر داخل ہوتے ہوئے مجھے بس ایک مختصر سی جھلک ہی دکھائی دی تھی۔ یہ ایک جھلک ہی مجھے اس کی شناخت کرا گئی تھی۔ یہ چچی فاخرہ تھیں۔

"ٹھہرو تاجدار!" میں نے آواز دی۔

وہ پلٹ کر میری طرف دیکھنے لگا "واپس آؤ" میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھتا ہوا واپس آیا۔ "گاڑی میں بیٹھو" میں نے دوسری ہدایت جاری کی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں سرخ شیورلیٹ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ جسم میں ایک ایسی سنسناہٹ جاگی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ پاکستان سے دور یہاں لندن کی اس سڑک پر میری ملاقات چچی فاخرہ سے ہو سکتی ہے۔ میں، زریں گل، بشنا اور دوسرے افراد اتنے عرصے سے دیوانوں کی طرح غزالہ اور اس کے اہلِ خانہ کو ڈھونڈتے رہے تھے۔ اس وقت پتا چلا

تھا کہ غزالہ کا "کھوج" لاہور سے کتنی دور ہے۔

جونہی سرخ گاڑی حرکت میں آئی، میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں بغیر لائسنس کے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ لندن میں یہ حرکت ایک بڑے جرم میں شمار ہوتی تھی لیکن ان لمحات میں، میں شاید اس سے دس گنا بڑا جرم بھی بغیر کسی تردد کے کر سکتا تھا۔ گاڑی میں صرف چچی فاخرہ داخل ہوئی تھیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوردی ڈرائیور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے تاجدار کو گاڑی کا نمبر نوٹ کروایا۔ لندن کے رش میں اس سے پہلے میں آفرین کو کھو چکا تھا اب "چچی فاخرہ" کو ہرگز کھونا نہیں چاہتا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی وکٹوریہ اسٹیشن کے قریب سے گزریں اور پھر بڑی سڑک کی طرف سیدھی نکلتی چلی گئیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ تعاقب دیر تک جاری رہے گا۔ گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور اسی رفتار سے میرا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ آفرین کا تعلق میاں جان سے تھا۔ اگر نہ ہوتا تو میاں جان کو آفرین کی نگرانی کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب میاں جان کا تعلق غزالہ کی فیملی سے ثابت ہو رہا تھا۔ چچی فاخرہ کو میں نے سرخ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا اور مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ وہ میاں جان کی کوٹھی سے نکل کر آئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

یہ تعاقب واقعی بہت طویل ثابت ہوا۔ گاڑیاں مسلسل دوڑتی رہیں اور لندن کے مضافاتی علاقے میں نکل آئیں۔ مجھے لندن آئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ کئی علاقے اور ان کے نام ذہن سے نکل گئے تھے۔ تاہم تاجدار ابھی کچھ ہی عرصے پہلے لندن سے ہو کر گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا "ہم ٹون برج سے آگے نکل آئے تھے۔ میرا خیال ہے جناب کہ ہم کینٹ کی طرف جا رہے ہیں۔"

مجھے بھی کچھ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ پہلے میں یہاں آیا تھا۔ یہ علاقہ میووں کے باغات کے لیے مشہور ہے۔ جلد ہی ہمیں باغات دکھائی دینے لگے۔ درمیان میں سرسبز گھاس کے وسیع میدان تھے۔ بہت خوبصورت مناظر تھے لیکن میری نگاہیں سرخ کار پر جم کر رہ گئی تھیں۔ دل مسلسل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ جو بات دو گھنٹے پہلے تک ناممکن نظر آتی تھی، وہ بالکل اچانک ممکن نظر آنے لگی تھی۔ مجھ سے ہزاروں میل دور چلے جانے کے بعد غزالہ یکایک مجھے اپنے قریب محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اس کے قدموں کی آہٹ سن رہا تھا۔ اس کے سانسوں کی سرسراہٹ۔ اس کے بدن کی خوشبو۔ لیکن کہیں یہ سب کچھ وہم ہی تو نہیں تھا۔ کیا یہ خواب حقیقت کا روپ دھار سکتا تھا؟

ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سفر کے اختتام پر غزالہ ملے گی یا نہیں۔ اور اگر ملے گی تو کس حال میں ہوگی؟

"اب ہم کینٹ کے علاقے میں ہیں جناب!" تاجدار کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

"ہاں، میں پہلے یہاں آ چکا ہوں۔ گاڑی اب رہائشی حصے کی طرف جا رہی ہے۔"

سگنل پر سرخ گاڑی گزر گئی لیکن ہمارے پہنچتے پہنچتے سگنل سرخ ہو گیا "سگنل ریڈ ہو گیا سر!" تاجدار نے چیخ کر کہا۔

یہ تو صرف ایک سگنل تھا۔ آگ کا دریا بھی ہوتا تو میں اسے پھلانگ کر گزر جاتا۔ میں نے غزالہ کی تلاش میں بہت ٹھوکریں کھائی تھیں۔ آج اس کا کھوج ملا تھا۔ میں اس کھوج کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔ جونہی ہم سگنل کراس کر کے آگے بڑھے، ایک ٹریفک سارجنٹ نے سڑک کے درمیان پہنچ کر ہمارا راستہ روکنا چاہا۔ میں اس قدر ہیجان میں تھا کہ شاید اسے روند ڈالتا لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موقع پر پیٹرولنگ پولیس کی دو چار گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ جائیں اور اپنی منحوس چیختی ہوئی آوازوں سے کہرام برپا کر دیں۔

میں نے گاڑی ٹریفک سارجنٹ کے نزدیک روکی۔ یہ "فارمی مرغے" کی طرح پلا ہوا سارجنٹ بڑے اسٹائل سے چلتا گاڑی کی کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اس کی کمر سے سرکاری پستول جھول رہا تھا۔ سارجنٹ کے پہنچنے سے پہلے ہی میں نے تاجدار کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ نشست پر نیم دراز ہو جائے اور آنکھیں بند کر لے۔ تاجدار نے ایسا ہی کیا تھا۔

سارجنٹ نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولی "میں کاغذات چیک کرسکتا ہوں۔"

میں نے تاجدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ایمرجنسی ہے۔ اس کی حالت خطرے میں ہے۔"

سارجنٹ تاجدار کو دیکھنے کے لیے جھکا۔ اس کا بالائی دھڑ گاڑی کے اندر آ گیا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پسٹل کا آہنی دستہ اتنی زور سے مارا کہ ایک ہی ضرب کافی شافی ثابت ہوئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر گاڑی کے اندر کر لیا۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ کے اندر ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے یہ ڈراما ہوتے دیکھ بھی لیا ہو لیکن مجھے اس کی

پرواہ نہیں تھی۔ مجھے سرخ گاڑی کی پرواہ تھی جو لمحہ بہ لمحہ دور جا رہی تھی اور چند سیکنڈ مزید گزر جاتے تو میری نگاہ سے اوجھل ہو جاتی۔ میں نے کلچ چھوڑا اور گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح آگے بڑھ گئی۔ موٹے سارجنٹ کا واکی ٹاکی تاجدار کی گود میں پڑا تھا۔ اس میں سے مسلسل آواز آ رہی تھی "سارجنٹ جیک... ہیلو سارجنٹ جیک...!"

میں نے واکی ٹاکی پکڑا اور گھما کر کنارے کے ایک درخت سے دے مارا۔ منحوس ڈوائس پرزے پرزے ہو کر بکھر گیا۔ سارجنٹ کی کنپٹی پر ایک گومڑا ابھر آیا تھا اور اس میں سے مسلسل خون بہ رہا تھا۔ سارجنٹ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔

جلد ہی میں نے سرخ کار کو پھر سے جا لیا۔ سرخ کار رہائشی علاقے کی اندرونی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک بڑی عمارت کے سامنے رکی۔ رکنے کے ساتھ ہی گیٹ کھلا اور گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ ہم کوٹھی کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ میں نے کوٹھی کا نمبر ذہن نشین کر لیا۔ کمپاؤنڈ کی فقط ایک جھلک دکھائی دی۔ مجھے رکھوالی کے دو کتے اور یونیفارم والا ایک گارڈ نظر آیا۔

کافی آگے جا کر میں نے گاڑی روک دی۔ تاجدار ذرا ڈرے ڈرے انداز میں میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ لندن میں ایک ٹریفک سارجنٹ کو شدید زخمی کر کے گاڑی میں ڈال لینا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا... اور وہ بھی صرف اتنی سی بات پر کہ اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تھی۔

میرے دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میں نے عقبی آئینے میں اس سفید مائل چاردیواری کو دیکھا جس میں پجیرو قاترہ داخل ہوئی تھی۔ کیا اسی چاردیواری میں میری غزالہ بھی موجود تھی۔ میرے دل کا سب سے پرانا زخم... میری حیات کا سب سے حسین خواب۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ کہیں مجھ سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس کے سبب امید کی نمودار ہونے والی کرن پھر سے گہری تاریکی میں ڈوب جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ غزالہ حالات سے ڈری ہوئی ہے اور اس سے بھی زیادہ اپنی والدہ کی بیماری سے... یہ اس ڈر کی جھجک ہی تو تھی کہ وہ لاہور سے ہزاروں میل دور لندن کے مضافات میں کینٹ کے اس علاقے میں موجود تھی۔ لیکن کیا وہ واقعی موجود تھی؟ یہ سوال ابھی جواب طلب تھا۔

"سر! اس کا کیا کرنا ہے؟" تاجدار نے سارجنٹ کے بے ہوش جسم کی طرف اشارہ کر کے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

اسے یقیناً اپنی آنکھوں کے سامنے جیل کی سلاخیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے کہا "چلو یہاں آس پاس کوئی باغیچہ دیکھتے ہیں، وہاں ڈال دیں گے اسے... ویسے ڈالنا تو اسے ہمیں کوڑے کے ڈھیر پر چاہیے۔ ایسے بچے کچے برطانوی سارجنٹوں سے سخت چڑ ہے مجھے۔ ایک دفعہ ان سارجنٹوں کی وجہ سے ایک مشہور مقامی قاتل میرے ہاتھ میں آتے آتے نکل گیا تھا۔ اس واقعے کا مجھے آج تک افسوس ہے۔"

میں نے گاڑی ریوین کی طرف سے ایک سائڈ کی سڑک پر موڑ دیا۔ جب ہم لندن کے وسطی حصے سے چلے تھے تو موسم خوشگوار تھا لیکن اب ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اس پھوار کے سبب سڑک قدرے سنسان نظر آ رہی تھی۔ کسی پارک یا قبرستان کی تلاش میں ہم تقریباً ایک فرلانگ آگے گئے۔ ایک دوراہے پر میں نے گاڑی روکی۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ دائیں طرف جاؤں یا بائیں طرف۔ اچانک میری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ یہ آج کے دن کا دوسرا شدید ترین جھٹکا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا۔ ہاں یہ وہی تھی، وہی جس کی یادوں نے میری راتوں کو سجایا تھا اور جس کے خیالوں سے میرے دن روشن تھے۔ وہ دوپہر عمر میں، ہر جگہ، ہر موسم میں مجھ سے دور رہی تھی لیکن پھر بھی میرے ساتھ رہتی تھی۔ وہ میری سانسوں میں خوشبو بن کر رچی ہوئی تھی اور رگوں میں زندگی بن کر دوڑتی تھی۔ میں نے اپنے شب و روز کے بدترین لمحوں میں اسے یاد رکھا تھا اور خوبصورت ترین لمحوں میں بھی وہ میرے ساتھ تھی۔ آگ اور پانی کی یلغار میں بھی اس کی یادوں کا ہاتھ میرے کندھے پر رہا تھا اور حسن و شباب کے جھرمٹوں میں بھی مجھے بس وہی دکھائی دی تھی۔

ہاں وہ آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رنگین چھتری تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ وہ کسی بہت گہری سوچ میں کھوئی۔ دھیرے دھیرے پاؤں رکھتی گاڑی کے قریب آ رہی تھی۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ اپنا چہرہ اس سے چھپانے کے لیے میں نے ایک پرانا اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اخبار کے بالائی کنارے پر سے میری نگاہیں اس چہرے کا طواف کر رہی تھیں جو میرے سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت میرے سامنے رہتا تھا۔ آج وہ میرے سامنے سے گزر رہا تھا۔ صرف چند گز دوری سے... پھر چند فٹ کی دوری سے... پھر صرف چند قدم کی دوری

سے۔ وہ اتنے پاس سے گزری کہ میں نے اس کی ناک کا باریک سا تل بھی دیکھا۔

وہ یہاں سے گزر گئی تو میں مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی ٹوکری میں شاپنگ کے دو چار لفافے تھے۔ میری نگاہ غزالہ کا پیچھا کرتی رہی یہاں تک کہ وہ اسی گیٹ میں داخل ہو گئی جس میں کچھ دیر پہلے پجیرو قاترہ داخل ہوئی تھی۔

"میں آپ کی کچھ مدد کروں جناب!" تاجدار نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں... شکریہ۔ اب ہم واپس چلیں گے" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

دو تین منٹ کے اندر اندر میں نے چپ چاپ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دراصل فی الوقت میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے... مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس کے نتیجے میں غزالہ اور اس کی فیملی مجھ سے دوبارہ بدک جائے۔ دوسرے میں خود کو اس قدر جذباتی محسوس کر رہا تھا کہ اس کیفیت میں کوئی بھی درست فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے گاڑی ایک چلڈرن پارک کے قریب کھڑی کی۔ یہاں رکی ہلکی پھوار کی وجہ سے سڑک بالکل ہی سنسان نظر آ رہی تھی۔ بے ہوش سارجنٹ کے جسم میں ایک حرکت نمودار ہونے لگی تھی۔ میں اور تاجدار نے اسے نکال کر گارڈنیا کی باڑھ کے پیچھے ڈال دیا۔ اور گاڑی فوراً بڑی سڑک کی طرف بڑھا دی۔

لندن روشن ہو چکا تھا۔ قدیم اور جدید طرز کی ساری عمارتیں اور کھڑکیاں روشن تھیں۔ دیکھنے کے لیے ہزار ہا منظر تھے۔ مگر ایک چہرہ دیکھنے کے بعد کوئی اور منظر دیکھنے کی خواہش ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی سپنا دیکھا ہے۔ ایک بہت دور کا سپنا جو ایک دم حقیقت بن کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے ششدر کر ڈالا۔

کار لندن کی چمکتی سڑکوں پر بھاگتی رہی اور میرا ذہن غزالہ کی یاد میں الجھا رہا۔ اس کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ آنکھیں دکھ کی کسی گہری جھیل میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ شاید یہ میرا ہی دکھ تھا۔ کیا وہ میری جدائی میں اداس تھی؟ دل کہہ رہا تھا کہ ایسا ہی ہے۔ اگر میں چھ ماہ تک کانٹوں پہ لوٹتا رہا ہوں تو وہ بھی چین کی نیند نہیں سوئی۔ اگر مجھ پر اس سے دور ہو کر قیامت گزری ہے تو اس کی زندگی بھی یقیناً تہ و بالا ہوئی ہے۔ اس کے جسم کے گرد زنجیریں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن اسے سڑک پر چلتے دیکھ کر مجھے یہی لگا تھا۔ وہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور خود کو گھسیٹ کر چل رہی ہے۔

جس وقت ہم واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچے، رات کے ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ مجھے سہ منزلہ رہائش گاہ کے سامنے ایک شاندار رولز رائس گاڑی کھڑی نظر آئی۔ اس کے علاوہ بھی تین چار بڑی گاڑیاں موجود تھیں۔ وردیوں والے ڈرائیور اور دو تین گارڈز گاڑیوں کے قریب چوکس کھڑے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی اہم شخصیت اندر موجود ہے۔ میرے ذہن میں یہ سنسنی خیز خیال جاگا کہ کہیں میری ملاقات کنگ براؤن سے تو نہیں ہونے والی۔ میں اندر پہنچا۔ تاجدار بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے بھیجا کہ وہ صورتحال کا جائزہ لے کر آئے۔ یوں تو میں خود بھی جا سکتا تھا۔ میں میک اپ میں تھا۔ کنگ براؤن اور اس کے کارندوں نے مجھے اصل شکل و صورت میں دیکھ رکھا تھا (لیکن اس میں خطرہ موجود تھا۔ میرا میک اپ ایسا نہیں تھا کہ شکل و صورت مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی) تاجدار تقریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا "یہ صاحب برونائی سے آئے ہیں۔ کوئی بہت بڑے تاجر ہیں۔ کہا گیا ہے ان کا تعلق برونائی کے شاہی خاندان سے ہے۔ وہ میڈم سروج کے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ باہر گارڈز کا پہرہ ہے۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے، یہ کیا چکر ہوگا؟" میں نے تاجدار سے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا جی! لیکن خیال یہی ہے کہ میڈم سروج نے ان صاحب کو خود یہاں بلایا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جب ہم یہاں سے جا رہے تھے۔ میڈم سروج خادموں کو حکم دے رہی تھیں کہ آفس اور سٹنگ روم کو بالکل ٹھیک کر دیا جائے، کچھ لوگ یہاں آ رہے ہیں۔"

برونائی اور شاہی خاندان کا ذکر سن کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ برونائی میں دولت بہت ہے اور جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے، وہاں عیش و عشرت کی ہوس بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ عیش و عشرت کے دلدادہ لوگوں کے واسطے اکثر فلم انڈسٹری والوں سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ حسن چاروں طرف سے اکٹھا ہو کر ادھر کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ سو ہیرا دیوی تو اس کام کے لیے خاص طور سے مشہور تھی۔ وہ ایک انٹرنیشنل دلالہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ برونائی کے یہ امیر کبیر مہمان بھی کسی ایسے ہی مقصد کے لیے یہاں تشریف لائے ہوں۔

میں اپنے کمرے میں تھا۔ نشست گاہ میں مہمانوں کے

ساتھ سروج کی میٹنگ جاری تھی۔ وی آئی پی مہمان کے لیے رہائش گاہ کے اس حصے کو بالکل خالی کروا دیا گیا تھا۔ ایکسٹرا لڑکے لڑکیوں کے لیے ہدایت تھی کہ وہ اس جانب نہیں بھٹکیں گے اور مکمل خاموشی اختیار کریں گے۔ کچھ دیر بعد تاجدار آیا اور اس نے بتایا "جناب! لگتا ہے کہ مہمان جا رہے ہیں۔ گاڑیاں ریورس کر کے پورچ میں لگا دی گئی ہیں۔ گارڈز وغیرہ بھی چوکس ہو گئے ہیں۔"

"کیا ہم ان لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے جناب کہ ہم چھوٹے برآمدے میں کھڑے ہو جائیں تو ان کی جھلک نظر آ سکتی ہے۔"

میں تاجدار کے ساتھ برآمدے کی طرف گیا لیکن راستے میں ہی پتا چلا کہ مہمان پورچ کی طرف جانے کے بجائے لفٹ کی طرف جا رہے ہیں "یہ کیا چکر ہے بھئی!" میں نے تاجدار سے پوچھا۔

"شاید وہ اوپر کی منزل پر کسی سے ملنا چاہتے ہیں؟" تاجدار نے جواب دیا۔

اچانک میرا دھیان سروج کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ بیڈ روم کے ساتھ ہی ایک کمرے میں مانیٹرنگ سسٹم موجود ہے۔ میں بیڈ روم کے سامنے پہنچا۔ یہاں حسب دستور گارڈ موجود تھا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ وہ مجھے روکے گا نہیں۔ سروج نے میرے سامنے ہی اسے ہدایت جاری کی تھی کہ میں جس وقت چاہوں بلا روک ٹوک یہاں آ سکتا ہوں۔ اب اگر بیڈ روم لاک نہیں تھا تو میں با آسانی اندر جا سکتا تھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا، وہ گھومتا چلا گیا۔ بیڈ روم کھلا تھا۔ میں اندر چلا گیا اور پھر چھوٹی سی قالین پوش راہداری سے گزر کر کنٹرول روم میں پہنچا۔ کنٹرول پینل کو تھوڑی دیر تک بغور دیکھنے کے بعد میں نے چند بٹن دبائے اور اسکرینیں روشن ہو گئیں۔ یہ اسی عمارت کے مختلف مناظر تھے۔ ایک منظر دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ مجھے سروج نظر آئی۔ اس کے ساتھ بھاری تن و توش کا ایک شخص تھا۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال رہی ہو گی۔ اس کا لباس اور حلیہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ بردنائی یا آس پاس کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے سروج نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ بہت دھیرے سے کھولا، یہ ایک بیڈ روم تھا۔ سامنے بیڈ پر لڑکی گہری نیند سو رہی تھی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں کیمرے نے اس کے چہرے کی جھلک دکھائی۔ میں پہچان گیا۔ یہ گاتی گڑیوں میں سے ایک تھی۔ غالباً منجھلی بہن تھی۔

چند سیکنڈ بعد سروج نے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا اور دائیں طرف مڑ گئی۔ بردنائی کا امیرزادہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ عقب میں گھنی مونچھوں والا ایک باوردی گارڈ جو بدحال سے مسلح تھا چوکس چلا آ رہا تھا۔ وہ تینوں اسکرین سے اوجھل ہو گئے۔ مگر چند سیکنڈ بعد ایک دوسری اسکرین پر ان کی تصویر ابھری۔ سروج رکوع کے بل جھکی ہوئی تھی اور دروازے میں بہت دھیرے سے چابی گھما رہی تھی۔ پھر اس نے ہینڈل کو حرکت دے کر بہت آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سروج کے ساتھ ساتھ بردنائی کے امیرزادے نے بھی اندر جھانکا۔ بستر پر ایک لڑکی محو خواب تھی۔ اس مرتبہ کیمرا لڑکی کی صورت ٹھیک سے نہیں دکھا سکا۔ بہرحال لڑکی کے لباس اور قد و قامت سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ گاتی گڑیوں میں سے ایک ہے۔ لڑکی دکھانے کے بعد سروج نے دروازہ پھر ہولے سے بند کر دیا۔ دونوں نے آپس میں ایک دو فقرے کا تبادلہ کیا۔ اس دوران میں آٹومیٹک کیمرا پین کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

سروج اور بردنائی مہمان کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب وہ تیسری بہن کے بیڈ روم کی طرف جائیں گے۔ میں اسکرینوں پر دیکھتا رہا لیکن شاید اس طرف کا کیمرا ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا۔ دو تین منٹ بعد ایک کیمرے نے لفٹ کے سامنے کا منظر دکھایا۔ سروج اپنے مہمان کے ساتھ واپس نیچے آ رہی تھی۔ مہمان کا چہرہ بھرا بھرا تھا۔ پھولے بھاری تھے اور صحت عمدہ دکھائی دیتی تھی۔ وہ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے گلے کی زنجیر میں قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔ کیمرے کے ذریعے جو کچھ بھی دکھائی دے رہا تھا، وہ نہایت مرعوب کن تھا۔

چار پانچ منٹ بعد جب میں سروج کے بیڈ روم سے باہر آیا۔ مہمانوں کی تین گاڑیاں عمارت کے وسیع کمپاؤنڈ سے رخصت ہو رہی تھیں۔

بردنائی مہمان کی آمد پُراسرار تھی۔ وہ جس طرح گاتی گڑیوں کو دیکھ کر گیا تھا، یہی لگتا تھا کہ وہ تینوں اس کے لیے بے حد دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ اس مہمان کی آمد نے عارضی طور پر میرا دھیان غزالہ کی طرف سے ہٹا دیا تھا۔ لیکن خوشی اور سنسنی کی وہ لہر ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے رخصت نہیں ہوئی تھی جو غزالہ کو دیکھنے کے بعد سے موجود تھی۔

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی سروج اپنے کمرے میں پہنچی تو میں وہاں جا دھمکا۔ "زہے نصیب... خوش آمدید" اس نے خاص طوائفانہ انداز میں اپنے کولہے مٹکائے۔

میں اس کی طرف دیکھے بغیر صوفے پر بیٹھ گیا "کون لوگ تھے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ اکیلے ہی اکیلے لندن میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟ اگر گوریوں کو ناپنے کا شوق ہے تو یہ کام تم میری موجودگی میں بھی کر سکتے ہو۔ بھگوان جانتا ہے میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو مردوں پر دفعہ ۱۴۴ لگا لیتی ہیں۔"

"تم بکواس بند کرو تو بہتر ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ابھی آنے والے یہ لوگ کون تھے؟"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری "سوال تو تم نے بالکل شوہروں کے انداز میں کیا ہے لیکن تمہارا یہ ناز شوہروں والا نہیں ہے۔ آدھی رات کو میرے بیڈ روم میں ہونے ہوئے بھی تمہارا دماغ پتا نہیں کس جنجال میں پھنسا ہوتا ہے.... یہ میری توہین نہیں تو کیا ہے؟"

"تمہاری اس سے زیادہ توہین بھی ہو سکتی ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا تمہیں تکلیف کیا ہے؟" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"تکلیف نہیں.... بس الجھن سی ہے۔ اگر رفع کر دو گی تو سکون آ جائے گا.... یہ بندے کون تھے؟"

اس نے اپنے لیے سویٹ وائن گلاس میں انڈیلی اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا اسکرٹ خاصا مختصر تھا، کہنے لگی "میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ بس بردنائی کا کوئی عاشق مزاج شخص ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ منوہرا دیوی سے اس کا ملنا جلنا ہے۔ منوہرا دیوی نے ہی اسے بھیجا تھا۔ مال دیکھنے آیا تھا۔"

"صرف دیکھنے آیا تھا یا کچھ اور؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ ان تین لڑکیوں کو دیکھنے آیا تھا جو تمہاری منوہرا دیوی نے تیسری منزل پر بند کروا رکھی ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"بس میرا اندازہ ہے۔ تیسری منزل پر وہی خاص مال ہے جو تم نے چھپا کر رکھا ہوا ہے.... اور تم اس امیرزادے کے ساتھ تیسری منزل پر گئی تھیں۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ لڑکیاں دراصل... آرڈر کا مال ہیں... آرڈر کا مال سمجھتے ہو نا تم۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بات آگے بڑھاتی ہوئی بولی "یہ آرڈر بھی کافی پرانا ہے۔ منوہرا دیوی کے بارے میں مشہور ہے کہ جو آرڈر وہ بک کرتی ہے، اس آرڈر کا مال خریدار تک ضرور پہنچتا ہے۔ سمجھو کہ جو منوہرا دیوی نے بک کر لیا، وہ مل گیا۔ چاہے حسینۂ عالم ہی کیوں نہ ہو۔ منوہرا دیوی نے ان تینوں گائیک کلاکاروں کا آرڈر بھی بک کیا تھا اور اسے نبھانے کے لیے وہ کئی ماہ سے سرتوڑ کوشش کر رہی تھیں۔"

"شاید تم کہنا چاہتی ہو کہ آج جو لمبا تڑنگا بردنائی کا امیرزادہ یہاں آیا ہے، وہی ان لڑکیوں کا خریدار ہے؟"

"ہاں ایسا ہی ہے" وہ پھر مسکرائی "اس بے چارے کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے اپنی پسندیدہ کار کا آرڈر بک کروایا ہو۔ کمپنی کئی ماہ تک اسے وعدوں پر ٹرخاتی رہی۔ آخر ایک بہت طویل انتظار کے بعد وہ کار شو روم تک پہنچی اور خریدار اسے دیکھنے کے لیے بھاگا چلا آئے۔"

"تم مثال ایک کار کی دے رہی ہو لیکن یہاں تو تین ہیں۔"

"کچھ لوگ تین تین کاریں بھی تو ایک ساتھ رکھتے ہیں اور تین سے زیادہ بھی رکھتے ہیں۔ بس اپنا اپنا شوق ہے" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ امیرزادہ ان تینوں لڑکیوں کو ایک ساتھ اپنے پاس رکھے گا؟"

"تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ مڈل ایسٹ میں ہی نہیں، مغربی ملکوں میں بھی بہت سے قدامت پسند لوگوں نے حرم قائم کر رکھے ہیں۔ تم سب کو اپنے جیسا بے ضرر مت جانو۔ سندر ناریوں سے بھرے ہوئے اس شہر میں بھی تم ایسے ویسے پھر رہے ہو۔ میں تو سوچ سوچ کر حیران ہوتی ہوں۔"

"تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ لگتا تو یہی ہے کہ یہ بندہ ان لڑکیوں کو کہیں اور پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہو گا۔ شاید ان میں سے ایک آدھ کو وہ اپنے پاس بھی رکھ لے۔"

"نہیں ڈیئر! تمہارا اندازہ غلط ہے۔ دراصل یہ متوالا تین لڑکیوں پر ایک ساتھ ہی عاشق ہوا ہے۔ وہ ان تینوں کو ایک ساتھ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ یہ موسیقی کا بھی زبردست قدردان ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان تینوں لڑکیوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دراصل ان کی گائیکی اور کلا پر ظلم کرنا ہے اور یہ بات ہے بھی سچ۔ یہ تینوں دراصل ایک

اکائی کی شکل میں گاتی ہیں اور انہیں سننے کا مزہ بھی اس وقت آتا ہے جب وہ ایک ساتھ ہوں۔"

"انہیں ایک ساتھ سننے کے لیے کیا یہ ضروری ہے کہ انہیں اغوا کر کے ان کے وطن سے ہزاروں میل دور پہنچایا جائے اور انہیں زبردستی رکھیل بنا کر رکھا جائے۔"

"بات کیول ان کی آواز کی نہیں ہے۔ ان کی سندرتا اور ان کے جسم کی بھی ہے۔ یہ مسٹر واراب گاتی گڑیوں کی آواز کے ہی نہیں ان کی سندرتا کے بھی عاشق ہیں۔ وہ بڑے عرصے سے نین نگینوں والی اس انگوٹھی کو اپنی انگلی میں سجانا چاہتے تھے۔"

"اچھا تو منوہرا کے اس ہوس پرست شناسا کا نام واراب ہے؟"

"مجھے تو یہی پتا چلا ہے۔ بھاتی بھگوان جانے۔"

"اب آئندہ کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ لڑکیوں کو واراب کے حوالے کب کیا جائے گا؟"

"میں سچ کہتی ہوں شاہ جہاں! مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں۔ مجھے صرف منوہرا دیوی کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ بھونانی نے بزنس واراب تشریف لا رہے ہیں۔ میں سری لنکا سے آنے والی تینوں گلوکار لڑکیاں انہیں دکھا دوں۔"

"لیکن تم تو قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس امیرزادے سے گپ شپ لگاتی رہی ہو۔"

"وہ بس رسمی بات چیت تھی۔ ان نازنینوں سے کوئی سمبندھ نہیں تھا۔ واراب صاحب! فلم نگری کے کام میں دلچسپی لے رہے تھے اور انڈین فلم انڈسٹری کے بارے میں بات کر رہے تھے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ لیکن لڑکیوں کے بارے میں جب بھی کوئی نئی پیش رفت ہو تم نے مجھے بتانا ہے۔"

"او کے۔ مگر تمہیں بھی خیال رکھنا ہو گا کہ ہماری گفتگو صرف گراؤنڈ فلور پر ہو اور وہ بھی میرے یا تمہارے بیڈ روم میں۔ باقی جگہوں کے بارے میں وشواس سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ہماری گفتگو ڈکٹا فون وغیرہ سے محفوظ ہو گی یا نہیں۔"

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ گاتی گڑیوں والا معاملہ تو کافی اہم تھا۔ مگر غزالہ کو دیکھنے کے بعد میرے دل و دماغ میں جو طوفانی اتھل پتھل مچی تھی اس کے سبب باقی ہر مسئلہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی ایک بار پھر غزالہ کی صورت میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی اور میں خود کو بہلانے کی کوشش کرنے لگا کہ میں نے کھلی آنکھوں سے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ وہ واقعی غزالہ ہی تھی اور وہ مجھ سے فقط چند قدم کی دوری سے گزری تھی۔

کسی صورت چین نہیں آ رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ پلک جھپکنے میں صبح ہو جائے اور میں ایک بار پھر کوچہ جاناں میں پہنچ جاؤں۔ شاید کل کی طرح وہ پھر باہر نکلے۔ شاپنگ کے دوران میں کسی دکان کے اندر یا بازار کے کسی گوشے میں میں اس سے دو باتیں کر سکتا تھا۔ اس کا فون نمبر لے سکتا تھا یا رابطے کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ حالات کی مجبوری تھی کہ مجھے کسی کالج کے لڑکے کی طرح سوچنا پڑ رہا تھا۔ غزالہ کئی ماہ تک میرے بہت قریب رہنے کے بعد پھر مجھ سے بہت دور ہو گئی تھی۔

میرے لیے ایک بات امید افزا تھی اور وہ یہ کہ مجھے فاخرہ مجھے پہلے سے صحت مند دکھائی دی تھیں۔ اس کا صحت مند ہونا میرے لیے بہتر تھا کیونکہ اس کی بیماری بھی غزالہ کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ ابھی تک مجھے چچا جعفر کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی اور نہ ہی تائی کا کچھ پتا تھا۔ بیٹے کے بارے میں مجھے خبر تھی کہ وہ پڑھائی کے سلسلے میں اسلام آباد میں ہے اور وہاں ہوسٹل میں رہ رہا ہے۔

اگلے روز بارہ بجے کے لگ بھگ میں اور ناجد ارپھر کینٹ کے علاقے میں تھے۔ آج ہم ایک دوسری گاڑی میں آئے تھے۔ ساتھ میں لائسنس یافتہ ڈرائیور بھی تھا۔ کل والے واقعے کے بعد میں کسی طرح کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ زخمی ہونے والے سارجنٹ کی خبر اخبار میں بھی آئی تھی۔

ہم نے گاڑی کل والی جگہ پر کھڑی کی اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اگر کوئی پوچھتا تو گاڑی خراب ہونے کا بہانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ویسے یہ ایسی جگہ نہیں تھی کہ کوئی ہم سے گاڑی کی پارکنگ کے بارے میں سوال کرتا۔ یہاں ایک کوٹھی تھی، ایک معروف ڈاکٹر صاحب نے اپنا کلینک بھی قائم رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے مریضوں کو طویل انتظار کرواتے ہیں کیونکہ کل بھی ہم نے یہاں گاڑیوں کو دیر تک کھڑے دیکھا تھا۔

ہم نے اس جگہ دو تین گھنٹے انتظار کیا لیکن کوٹھی سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ بی بی فاخرہ نہ غزالہ نہ چچا جعفر۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھے یا وقت بے وقت کتوں کی آواز آتی تھی۔ ہم بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ میں نے سارا اخبار دیکھ ڈالا ہتی ریڈیو بھی سن لیا۔ لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ذہن میں اندیشہ جاگنے لگا کہ کہیں میں نے غزالہ کو بالکل ہی تو نہیں کھو دیا۔ چند ماہ پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ میں دل میں کئی خواہشیں اور سوچیں لیے غزالہ کے گھر پہنچا تھا۔ وہاں بروں ڈالوں پر تالوں نے میرا منہ چڑایا تھا۔

سائے طویل ہوتے گئے۔ اس کے ساتھ انتظار کی کوفت بھی بڑھتی چلی گئی۔ شام ہونے والی تھی جب میں نے چھوٹی سی نیلی کار میں کسی کو کوٹھی سے نکلتے دیکھا۔ وہ بچی فاخرہ تو ہرگز نہیں تھیں۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ کار ہماری طرف آ رہی تھی۔ میں نشست پر کچھ نیچے کو کھسک گیا۔ کار قریب سے گزری تو میں چونک گیا۔ وہ آفرین تھی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی ڈرائیور تھا۔

میں نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور نیلی کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ دماغ میں ہلچل تھی۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ آفرین یہاں غزالہ کے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

ہماری کار نے ننھی نیلی کار کا پیچھا شروع کر دیا۔ یہ تعاقب کچھ دیر بعد نون برج میں ختم ہوا۔ سیبوں کے بڑے بڑے باغات سے گزرنے کے بعد ہم قصبے کے بارونق علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں چہل پہل تھی۔ بازار تھے اور شاپنگ پلازہ تھے۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ مختلف بارونق سڑکوں سے گزرنے کے بعد آفرین کی گاڑی ایک شاپنگ پلازہ کی پارکنگ میں جا رکی۔ آفرین گاڑی سے اتری اور شولڈر بیگ سنبھالتی ہوئی پلازہ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میں نے محفوظ دوری سے اس کا پیچھا جاری رکھا۔ وہ برقی زینے کے ذریعے سیکنڈ فلور پر پہنچی۔ یہاں زیادہ تر دکانیں جیولری اور جنرل اسٹورز کی تھیں۔ آفرین نے چند دکانوں کا جائزہ لیا پھر ایک جگہ سے اس نے دو تین زیورات خریدے اور واپس آ گئی۔ اپنی شاپنگ گاڑی میں رکھنے کے بعد وہ پھر ادھر ادھر گھومنے لگی۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ ناجدار کو میں نے گاڑی کے قریب رہنے کی ہدایت کی۔

چھوٹی موٹی چیزیں خریدتی ہوئی آفرین کافی دور چلی گئی۔ واپسی کے لیے اس نے مارکیٹ کی عقبی سڑک استعمال کی۔ شاید وہ شارٹ کٹ لگانا چاہ رہی تھی۔ وہ جس گلی میں داخل ہوئی وہ قدرے تاریک اور سنسان تھی۔ میرا اور آفرین کا درمیانی فاصلہ کوئی پچاس گز تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک کالا تیزی سے نمودار ہوا۔ اس نے آفرین کے شولڈر بیگ پر جھپٹا مارا اور دوڑ لگا دی۔ آفرین لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔ سیاہ فام اچکا شولڈر بیگ جھپٹنے کے بعد تیزی سے میری جانب آ رہا تھا۔ آفرین نے مدد کے لیے چیخ بلند کی۔ میں گلی کے وسط میں کھڑا تھا اور سیاہ فام برق رفتاری سے میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اچانک اس کے سامنے آیا تو وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور قلابازی کھا کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ بیگ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بیگ اس کے ہاتھ سے کھینچنا چاہا "چھوڑو اسے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں وارننگ دی۔

"تم چھوڑ دو۔ ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گا۔" وہ غرایا۔

اس کے ساتھ ہی اس حرامی نے سیٹی بجائی۔ قریبی گلیوں سے دو اور غنڈے نکل کر میری طرف بھاگے۔ اس دوران میں پہلا والا غنڈا اپنی جیکٹ سے چاقو برآمد کر چکا تھا۔ اس نے پہلا وار میرے چہرے پر بڑی بے رحمی سے کیا۔ میں نے جھک کر وار بچایا اور ایک سچے تلے مکے سے خطرناک صورت والے حبشی کا جبڑا توڑ دیا۔

اس دوران میں دوسرا حملہ آور مجھ پر جھپٹ چکا تھا۔ وہ توپ کے گولے کی طرح میری طرف آیا تھا۔ میں نے اپنی کمر کو تھوڑا سا خم دے کر اسے اپنے سر کے اوپر سے گزار دیا۔ وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا اور سر کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اسی دوران میں دو اور غنڈے موقعے پر پہنچ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی تاریک گلیوں میں گھومنے والے یہ بدمعاش اسٹریٹ فائٹنگ میں مہارت رکھتے ہیں۔ لندن نیویارک وغیرہ میں ایسے لوگوں سے میرا کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ ان کے لڑائی کے انداز اور ان کے ہتھیاروں سے بھی مجھے بخوبی آگاہی تھی۔

اگلے دو تین منٹ تک اس نیم تاریک سڑک کے ایک گوشے میں میرے اور ان غنڈوں کے درمیان شدید جھڑپ ہوئی۔ چاقوؤں کا آزادانہ استعمال ہوا اور زبردست مار دھاڑ بھی ہوئی۔ لندن جیسے شہروں میں رواج ہے کہ ایسی مار دھاڑ کے وقت آس پاس موجود افراد مداخلت نہیں کرتے موقعے سے نکل جاتے ہیں یا کونے کھدروں میں چھپ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ مداخلت اکثر موبائل پولیس ہی کرتی ہے۔

میں نے ایک حملہ آور کے پیٹ میں چاقو گھونپا تھا اور دوسرے کے گلے پر گہرا کٹ لگایا تھا جس کے بعد وہ خوف زدہ تھا اور عملی طور پر لڑائی سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ ایک غنڈا بہت خطرناک تھا۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں مشین کی طرح چل رہے تھے۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس طرف سے وار کرنے لگا۔ اس شخص نے مجھے تھوڑا سا مشکل میں

ڈالا۔ لیکن جلد ہی اس کی ناک پر میرے سر کی طوفانی ٹکر لگی اور وہ تیورا کر اوندھے منہ گر گیا۔ کنپٹی پر لگنے والی میرے پاؤں کی ٹھوکر نے اس سیاہ فام فائٹر کو بالکل بے سدھ کر دیا۔ اس شخص کے گرنے کے بعد باقی ایک غنڈا ہمت ہار گیا۔ اس نے شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے میرے چہرے پر وار کیا۔ میں نے یہ ڈھیلا ڈھالا وار آسانی سے بچایا اور زور دار دھکے سے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گرا اور لڑکھڑاتا ہوا دور چلا گیا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا گلی کے وسط میں لے آیا۔

اچانک ایک چیختی ہوئی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ بالکل نزدیک گوشے میں ایک حملہ آور نے آفرین کو عقب سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کا چاقو آفرین کی شہ رگ پر تھا۔ وہ سیاہ فام حملہ آور خوفناک انداز میں بولا "چھوڑ دو اسے ورنہ اس کتیا کا گلا کاٹ دوں گا۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ اس کالے کی گرفت میں آنے کے بعد آفرین نے مجھے مدد کے لیے پکارا ہوگا۔ اس پکار کی وجہ سے کالے نے سمجھ لیا تھا کہ یہ لڑکی میری شناسا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ مجھے اس کی گردن کاٹنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

میں کالے کے کالے ساتھی کو چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آفرین کا شولڈر بیگ میں نے گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔ کالا پھنکار کر بولا "بیگ میری طرف پھینکو۔"

آفرین مصیبت میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے بیگ کالے کی طرف پھینک دیا۔ وہ اس نے ایک ہاتھ سے ہوا میں ہی دبوچ لیا پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا "رچی! گاڑی ریورس کر کے یہاں لاؤ۔ یہ سوہنی ہمارے ساتھ جائے گی اور زن ہمارے ساتھ ناچے گی۔" اس کا اشارہ یقیناً آفرین کی طرف تھا۔

بڑی ڈرامائی اور کسی حد تک فلمی سچویشن تھی۔ ایک شدید زخمی ہونے والا حبشی اور سڑک پر بے سدھ پڑا تھا، دوسرا تکلیف سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ آفرین کالے کی گرفت میں تھی اور کالے کا رچی نامی ساتھی گاڑی لانے کے لیے دوڑ گیا تھا۔

"چاقو پھینک دو۔" کالا غرایا "اور دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن تم بھی اس کو چھوڑ دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ لڑائی تمہاری اور میری ہے۔"

"ہم اس سے لڑائی نہیں کریں گے۔ اس سے منہ کالا پیار کریں گے۔ یہ ویک اینڈ کی رات ہے ناں۔ پیار و محبت کی رات۔" وہ خباثت سے بولا۔

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر درشت لہجے میں کہا کہ میں چاقو پھینک دوں اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاؤں۔

میں نے چاقو پھینک دیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔

وہ چیخا "ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور اپنا منحوس منہ دیوار کی طرف کرو۔"

"میرے کندھوں پر سخت چوٹ لگی ہے، میں ہاتھ اوپر نہیں اٹھا سکتا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"دیکھو! تم مسخری کر رہے ہو۔ میں قتل کرنے کی حد تک سنجیدہ ہوں۔"

"میں بھی قتل ہونے کی حد تک سنجیدہ ہوں۔ لیکن میں اپنے کندھوں کا کیا کروں۔ اف خدایا۔"

اس گفتگو کے دوران میں ہی میں جیب میں موجود چھوٹے سائز کے پسٹل کا رخ کالے کی پیشانی کی طرف کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک مشکل نشانہ ہے۔ نشانہ چوکنے کی صورت میں کالا آفرین کا گلا کاٹ سکتا تھا، پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ گولی آفرین کو ہی لگ جاتی۔ کسی قریبی گلی سے پولیس کی موبائل کا سائرن بھی سنائی دینے لگا تھا۔ یہ سب کچھ ایک دو سیکنڈ کے اندر اندر میرے ذہن سے گزر گیا۔

آفرین خوف زدہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ غزالہ کی گہری سہیلی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میری مداح بھی تھی۔ اس نے میری مہم جوئی کے ان گنت واقعات غزالہ وغیرہ سے سن رکھے تھے اور لاہور میں اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے مجھے مار دھاڑ کرتے دیکھنا چاہتی ہے۔ آج اس نے مار دھاڑ سے بھرپور ایک طویل سین دیکھا تھا لیکن اس سین کے لپیٹے میں وہ خود زبردست مصیبت کا شکار تھی۔ جیکٹ کی جیب کے اندر ہی میرے پسٹل کا رخ کالے کی پیشانی کی طرف ہو چکا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا اور گولی آفرین کے سر کو چھوتی ہوئی کالے کے ذہن میں اتر گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا اور مردہ چھپکلی کی طرح پھڑکتے ہوئے فٹ پاتھ پر گرا۔ وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔

آفرین چیخ کر میری طرف آئی اور لپٹ گئی۔ لڑائی شروع ہونے سے کالے کے مرنے تک کا سارا واقعہ بمشکل تین چار منٹ میں مکمل ہو گیا تھا۔ پولیس موبائل کا سائرن اب قریب

سے سنائی دے رہا تھا۔ شاید کسی شریف برطانوی شہری نے اس دنگا فساد کے بارے میں موبائل پولیس کو فون کر دیا تھا یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس والے اپنی روٹین میں ہی اس جانب آ رہے ہوں۔

میں نے آفرین کا ہاتھ پکڑا اور ایک تنگ سڑک کی طرف مڑا۔ اچانک خیال آیا کہ جس شولڈر بیگ کے لیے سارا فساد ہوا ہے وہ تو آفرین کالے کی لاش کے پاس ہی بھول گئی ہے۔ میں نے بھاگ کر وہ بیگ اٹھایا اور آفرین کے ساتھ تنگ سڑک پر آ گیا۔ یہ تنگ سڑک ایک شارٹ کٹ کی شکل میں تھی اور کچھ آگے جا کر انڈر گراؤنڈ ٹرین کے اسٹیشن میں داخل ہو جاتی تھی۔

ہم دو تین ذیلی سڑکوں کا چکر کاٹ کر انڈر گراؤنڈ اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔ آفرین نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور اس پر ایک لمبا برساتی نما کوٹ تھا۔ بھاگنے سے اس کے بال کھل گئے تھے اور گاہے گاہے چہرے کو ڈھانپ لیتے تھے۔ اس کا ہاتھ بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے ساتھ بھاگتے ہوئے وہ ہانپ گئی تھی اور دبی دبی کراہ اس کے ہونٹوں سے نکل جاتی تھی۔ انگلش پولیس کا خوف یقیناً اس کے دماغ پر بری طرح سوار تھا۔

ہم اسٹیشن میں داخل ہوئے تو سامنے سائن بورڈ پر ایک اعشاریہ بیس کے ہندسے چمک رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ٹرین کے پہنچنے میں ایک منٹ بیس سیکنڈ باقی ہیں۔ مجھے وطن عزیز کا خیال آیا جہاں ٹرینوں کے اوقات میں سیکنڈوں اور منٹوں کا کوئی عمل دخل ہی نہیں ہوتا۔ وہاں تو دنوں کی بات ہوتی ہے۔ یہ ایک منٹ بیس سیکنڈ ہم نے سخت بے قراری میں گزارے جب ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی تو انگریزی کی "پابندی وقت" پر بہت پیار آیا۔ ٹرین میں داخل ہونے کے بعد ہم خود کو کافی محفوظ محسوس کرنے لگے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم نون برج کے وسطی علاقے میں ایک ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ اس چھوٹے سے ہال میں کینڈل ڈنر کا اہتمام تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اس نیم تاریک ہال کا انتخاب کیا تھا۔ دراصل کچھ دیر پہلے کالوں سے ہونے والی مارا ماری میں میرے چہرے پر کچھ خراشیں آئی تھیں اور ایک ہاتھ سے بھی خون رس رہا تھا۔ میں زیادہ روشنی والی جگہ میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ آفرین بھی فی الوقت کسی کونے کھدرے میں چھپنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ مجھے دیدار کے بارے میں تھوڑی سی پریشانی تھی لیکن اتنا اندازہ مجھے تھا کہ کچھ دیر تک میرا انتظار کرنے کے بعد وہ واپس چلا جائے گا۔

ہمارے ساتھ والی میز پر ایک جوڑا موجود تھا۔ وہ اپنے آپ میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔ لڑکا لڑکی ایک دوجے سے بری طرح پٹ چپک رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس جگہ کو باقاعدہ بیڈ روم کی شکل دے دیتے۔

"میں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکوں گی شاہ جہاں۔ بہتر ہے کہ ہم نے ایک دوسرے سے جو بھی کہنا ہے جلدی جلدی کہہ لیں۔" آفرین منمنائی۔

"بالکل نہیں۔" میں نے زور دے کر کہا "تم نے اب گھر ٹیلی فون کر دیا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ابھی صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔ یہ ویک اینڈ کی رات ہے۔ ہم گیارہ بجے تک با آسانی یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"لیکن شاہ جہاں۔"

"دیکھو آفرین، لیکن ویکن میں وقت ضائع مت کرو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور قدرے ریلیکس نظر آنے لگی۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "مجھے لگتا ہے کہ آپ نے جہاز میں نظر آنے کے بعد سے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اگر یہاں لندن میں موجود ہو تو اس کے پیچھے کوئی اہم وجہ ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں تمہارا رویہ بہت مایوس کن رہا ہے۔ پکاڈلی سرکس کے چوراہے میں میاں جان کے کارندوں سے ہونے والی لڑائی میں تم فوراً موقعے سے کھسک گئیں اور پھر صورت نہیں دکھائی، حالانکہ تمہارے پاس میرا ایڈریس بھی موجود تھا۔"

"چلو کچھ بھی ہے۔ اب تو میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس میں تمہاری کوئی مہربانی نہیں۔ میرے خیال میں مجھے اس آنجہانی کالے کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے تمہیں موقعے پر دبوچ لیا تھا، ورنہ پکاڈلی سرکس کی طرح تم نے یہاں بھی نو دو گیارہ ہو جانا تھا۔"

ایک بار پھر نیم تاریک گلی میں ہونے والے معرکے کے اثرات آفرین کے چہرے پر نظر آنے لگے۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "شاہ جہاں! یہ انگلش پولیس قاتل کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی پولیس والے پستولیں تان کر یہاں داخل ہو جائیں گے۔"

"اس گوری پولیس کو بہت دیکھا ہوا ہے میں نے اور ویسے بھی بندہ میں نے مارا ہے تم نے نہیں۔ تم سوچ سوچ کر

اپنا ہاضمہ خراب مت کرو۔"

آفرین نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر کرسی کی طویل پشت سے ٹکا دیا۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں گہری سرخی تھی اور ہلکی سی نمی محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی "شاہ جہاں! غزالہ یہاں سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"یہ کوئی کہنے کی بات نہیں آفرین۔ وہ جب سے اپنی ماں سے ملی ہے اسی وقت سے مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"لیکن اب یہ مصیبت کچھ اور نوعیت کی ہو گئی ہے۔ غزالہ کو فوری طور پر ایک فیصلے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل نامناسب بلکہ مضحکہ خیز فیصلہ ہے۔"

"کیا تم مجھے شروع سے نہیں بتا سکتی ہو؟"

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے ذہن میں الفاظ جوڑتی رہی پھر گویا ہوئی "میرا خیال ہے کہ آپ روحانیات پر تھوڑا بہت یقین رکھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ سائیں عالی کے ساتھ رہے ہیں اس کے علاوہ غزالہ نے بتایا تھا کہ گلگت میں بھی آپ کو کچھ ناقابلِ یقین واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ آپ کا ذہن یقیناً ایسی باتوں کو تسلیم کرتا ہوگا جن کی جڑیں روحانی قوت میں ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا "تم اپنی بات مکمل کر لو گی تو میں پھر کوئی جواب دوں گا۔"

"یہاں لندن میں یوگی میاں جان کو ماننے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ میاں جان پہلے پاکستان میں رہتا تھا۔ اندرونِ سندھ اس کے گوٹھ کا نام ہی میاں کی گوٹھ پڑ گیا تھا۔ میاں جان کے مذہب کے بارے میں یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کچھ کے خیال میں وہ مسلمان اور کچھ کے خیال میں ابھی تک ہندو ہے۔ انڈیا اور پاکستان میں اسے ماننے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اب پچھلے چار پانچ سال سے میاں جان انگلینڈ میں ہے۔ یہاں وہ انگریزوں اور ان کے بچوں کو یوگا سکھاتا ہے اور اسے کافی مانا جاتا ہے۔"

"شاید چچی فاخرہ بھی اس کے عقیدت مندوں میں شامل ہیں؟"

"میں اسی طرف آ رہی تھی۔ آنٹی میاں جان کو بہت مانتی ہیں۔ جب میاں جان پاکستان میں تھا آنٹی اکثر اس کے پاس جاتی رہتی تھیں۔ انہوں نے گھر میں اس کی تصویریں بھی لگا رکھی ہیں۔ آپ نے میاں جان کو دیکھا ہے یا نہیں؟"

"چند دن پہلے اس کی تصویر دیکھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے بھی غزالہ کے گھر اس کی تصویر ہی دیکھی تھی۔ مونچھ نہ داڑھی' گلے میں ٹائی باندھی ہوئی۔ میں حیران رہ گئی تھی کہ یہ ہیں آنٹی فاخرہ کے پیر و مرشد۔ اس وقت میاں جان مشکل سے اٹھائیس تیس برس کا ہوگا۔"

آفرین نے چند لمحے توقف کیا اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی "آنٹی میاں جان کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرتی ہیں' خاص طور سے کسی مشکل میں تو ان کا سارا دارومدار میاں جان پر ہی ہوتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ لاہور میں آپ اور عاصم کی لڑائی سے خوف زدہ ہونے کے بعد آنٹی فاخرہ نے میاں جان سے ہی رابطہ کیا تھا اور اسی کے مشورے پر انگلینڈ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج کل کینٹ کی جس کوٹھی میں انکل جلیس اور آنٹی فاخرہ رہ رہے ہیں' اس کا انتظام بھی میاں جان نے ہی کیا تھا۔ آج کل میاں جان' انکل جلیس کے لیے کوئی اچھی جاب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انکل جلیس کی پریشانیوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس فارغ وقت بہت زیادہ ہے۔"

"غزالہ کے بارے میں میاں جان کے خیالات کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان خیالات نے ہی تو ساری مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔" آفرین نے کہا "میاں جان نے آنٹی فاخرہ کے دماغ میں یہ بات ٹھونس دی ہے کہ ان کی ساری مصیبتوں کا حل یہ ہے کہ غزالہ کی شادی ہو جائے اور یہ کام جتنی جلدی ہو اتنا ہی بہتر ہے۔"

"غزالہ کی شادی!" میں نے حیران ہو کر کہا "وہ تو شادی شدہ ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ آنٹی فاخرہ اور کسی حد تک چچا جلیس بھی میاں جان کی غیب دانی پر یقین رکھتے ہیں۔ میاں جان نے یہ شوشا چھوڑا ہے کہ شیخ عاصم اب کبھی واپس نہیں آئے گا' آج سے تقریباً چار مہینے پہلے وہ اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ اس لحاظ سے غزالہ کی عدت بھی پوری ہو چکی ہے۔ اب اصولی طور پر غزالہ کی شادی ہو سکتی ہے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ عاصم کی موت کا علم میرے اور سائیں کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ اس "میاں جان" نے یہ کیسے کہہ دیا تھا کہ شیخ مر چکا ہے۔ وہ جو مہینہ بتا رہا تھا وہ بھی تقریباً درست تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا میاں جان میں واقعی کچھ موجود تھا۔ آفرین کی آواز نے مجھے چونکا دیا "آپ کس سوچ میں کھو گئے؟"

"سوچ رہا ہوں کہ یہ بہروپیے "پیر اور عامل" لوگوں کو کس کس طرح جال میں پھانستے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ میں شیخ عاصم کی موت کا ذکر سن رہا ہوں۔ نہ لاش ملی نہ کوئی گواہ نہ کوئی ثبوت۔ اس دعوے کے بارے میں غزالہ وغیرہ کا کیا ردعمل ہے؟"

"جہاں تک غزالہ کی بات ہے' وہ تو میاں جان کا نام سننے کی بھی روادار نہیں۔ مگر چچی فاخرہ کو کامل یقین ہے کہ اپنے ظالم داماد سے ان کی جان چھوٹ گئی ہے اور اب وہ کبھی ان کے' غزالہ کے سامنے نہیں آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں اس بات پر بھی کامل بھروسا ہے کہ میاں جان نے غزالہ کی شادی کی جو بات کی ہے وہ بہت اہم ہے اور اگر یہ شادی ہو جائے تو ان کے سارے بگڑے کام درست ہو جائیں گے اور نحوستوں کے سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ جہاں تک انکل جلیس کی بات ہے' وہ بیچ درمیان میں ہیں۔ کبھی ان کا ذہن آنٹی کی طرف چلا جاتا ہے کبھی غزالہ کی طرف۔ بہرطور شیخ کی موت اور غزالہ کی فوری شادی کی بات انہیں ہضم نہیں ہے۔ غزالہ کی شادی کی بات وہ کسی طور سننا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف انہیں آنٹی کی بیماری کا بھی خیال ہے۔"

"لیکن وہ تو بھلی چنگی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کل انہیں دیکھا ہے۔ وہ میاں جان کے آستانے سے نکل کر کار میں بیٹھی تھیں اور پھر کینٹ پہنچی تھیں۔"

"ہاں آج کل تو وہ ٹھیک ہیں لیکن دو تین ہفتے پہلے سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ انہی دنوں آنٹی نے پاکستان ٹیلی فون کر کے مجھ سے بات کی تھی اور مجھ سے قسمیں وعدے لینے کے بعد بتایا تھا کہ وہ انگلینڈ میں کہاں رہائش پذیر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں کسی طرح انگلینڈ پہنچوں اور غزالہ کو سمجھاؤں۔ آنٹی کا خیال ہے کہ غزالہ میری ہر بات مانتی ہے۔"

"تمہارے ساتھ جو لڑکی پاکستان سے آئی تھی' وہ کون تھی؟"

"وہ میری پرانی کلاس فیلو ہے۔ اب اس کا تعلق صحافت سے ہو گیا ہے۔ ایک انگلش اخبار کے لیے کام کرتی ہے۔ اس اخبار ہی کی طرف سے وہ انگلینڈ آ رہی تھی۔ میں نے چچا جان سے اجازت لی اور اس کے ساتھ ہی یہاں چلی آئی۔ میرے گھر میں بھی کسی کو معلوم نہیں ہے کہ میں یہاں غزالہ اور آنٹی وغیرہ سے ملنے آئی ہوں۔ میرا یہ دورہ بالکل خفیہ نوعیت کا ہے۔"

"یہاں پہنچ کر تم نے کیا محسوس کیا ہے؟"

"وہی جو آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ آنٹی فاخرہ نامناسب حد تک میاں جان پر بھروسا رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس شخص میں کوئی پیروں فقیروں والی بات ہو لیکن بظاہر تو وہ ایسا نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ اس کی عمر اور حلیہ وغیرہ دیکھا جائے تو "میاں جان" کا خطاب بھی اس پر جچتا نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ اس کے عقیدت مند اسے حضرت صاحب' حضرت میاں اور جناب میاں جیسے خطابوں سے بھی نوازتے ہیں۔ اب وہ شخص شیخ عاصم کی ہلاکت کی بات کر رہا ہے' مجھے تو اس دعوے میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال بھی تم سے ملتا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ شیخ عاصم کچھ عرصے سے لاپتا ہے اور سری لنکا میں اس کی تلاش ہو رہی ہے لیکن اس کی موت کی بات پر یقین کرنا مشکل ہے' بلکہ بہت مشکل ہے۔"

آفرین کچھ دیر تک گہری سوچ میں کھوئی رہی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کے کانوں کی بالیاں چمک رہی تھیں۔ اس کی گردن پر ایک سرخ خراش بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ خراش اس کھینچا تانی کا نتیجہ تھی جو چاقو بردار کالے نے آفرین کے ساتھ کی تھی۔

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی "شاہ جہاں' میں یہاں آ کر بہت پریشان ہوئی ہوں۔ غزالہ اور اس کی والدہ دو انتہاؤں پر نظر آتی ہیں۔ والدہ میاں جان کے کہے کو پتھر کی لکیر سمجھتی ہیں جبکہ غزالہ اپنے غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں شاہ جہاں آپ سے وہ بے حد محبت کرتی ہے۔ یہ محبت آپ کی توقع سے بھی بڑھ کر ہے لیکن اس نے اپنے دل پر صبر اور برداشت کا بہت بھاری پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس وزنی پتھر کے نیچے اس کا اپنا آپ پس کر رہ گیا ہے۔ وہ دن رات کراہتی ہے لیکن اپنی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتی۔۔۔ ابھی شام سے کچھ دیر پہلے جب میں گھر سے چلی تھی تو وہ اپنے کمرے میں تھی۔ تانی کو سینے سے چمٹا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا' اس کے رخساروں پر نیند کی حالت میں بھی آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔"

"مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں۔ اگر یہ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہے تو وہ برداشت کیوں کر رہی ہے۔ وہ اب بھی آواز بلند نہیں کرے گی تو کب کرے گی؟ اس سے پہلے وہ اپنی ماں کی مان کر دیکھ چکی ہے۔ اس کی ماں نے شیخ

عاصم کی صورت میں جو وار ماو چنا تھا اس نے غزالہ کی زندگی کو کیسے کیسے برباد نہیں کیا ہے۔ اب وہ پھر ماں کی خاطر آگ کے ایک اور گڑھے میں کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"نہیں شاہ جہاں! ایسا نہیں ہے۔ اب تو وہ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ شادی کا جوڑا پہننے سے ہزار درجے بہتر سمجھتی ہے کہ کفن پہن لے۔۔ لیکن آنٹی فاخرہ بڑی بے رحمی سے اسے کڑی آزمائش کی آخری حد تک لے جا رہی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ بیٹی نے ان کی خاطر کیا کچھ قربان نہیں کیا۔ وہ بس میاں جان کے کہے پر اندھا اعتماد کر رہی ہیں اور سمجھ رہی ہیں کہ ان کے خاندان کی ہر پریشانی کا حل غزالہ کی شادی میں پوشیدہ ہے۔ غزالہ چکی کے دو پاٹوں میں پس گئی ہے۔ ایک طرف آپ ہیں دوسری طرف اس کی والدہ ہیں۔۔ غزالہ نے آپ سے دور رہ کر ایک بہت بڑا اور بہت ہی مشکل قدم اٹھایا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ماں کے سارے شکوک دور کر کے اس کے سارے آنسو پونچھ دیے ہیں۔ اب وہ ہستی اس سے راضی ہو جائے گی۔ جس کے قدموں میں جنت رکھی گئی ہے۔ اس نے یہاں آکر تابی کو سینے سے لگا لیا تھا اور اس کے پیار کے سہارے آپ کے غم سے لڑنے کی کوشش کرنے لگی تھی لیکن یہاں آکر اسے پتا چلا کہ ماں بھی اس سے اور بہت کچھ چاہتی ہے۔۔۔ آنٹی فاخرہ کی یہ بات غزالہ پر بجلی بن کر گری کہ 'غزالہ کو شادی کر لینی چاہیے۔ ماں کا بے حد احترام کرنے کے باوجود اور اس کے سامنے کبھی اف نہ کہنے کے باوجود غزالہ اس نئی آزمائش کی سختی نہ سہ سکی۔ اس نے زار و قطار روتے ہوئے والدہ سے کہہ دیا کہ وہ اب تنہا زندگی گزارے گی۔ اس سلسلے میں اسے مجبور نہ کیا جائے۔

اس سے اگلے ہی روز آنٹی فاخرہ پر دل کا دورہ پڑا اور وہ لندن کے لائٹ اسپتال میں پہنچ گئیں۔ پتا نہیں کہ آنٹی کی بیماری کس قسم کی ہے اور وہ خود کس قسم کی ہیں۔ اپنی مرضی کے خلاف ہونے والی کسی بھی بات کا اثر وہ براہ راست دل پر لیتی ہیں اور فوراً ہی خود کو کچھ نہ کچھ کر بیٹھتی ہیں پھر یہ بھی ان کی سخت جان ہے کہ دل کے نو دس پانچ شدید دوروں کے باوجود خدا کے فضل سے ابھی تک حیات ہیں۔"

"اس آخری دورے نے غزالہ کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت پریشان تھی شاہ جہاں! جب میں یہاں پہنچی تو وہ میرے گلے سے لگ کر اتنا روئی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے تو لگتا تھا کہ وہ رو رو کر اپنی جان دے دے گی۔ اس نے ایک ایک کے بارے میں پوچھا۔ شاہ جہاں۔۔۔ آپ کے بارے میں۔۔۔ زریں گل اور صفدر کے بارے میں۔ ساہی صاحب اور شفتا کے بارے میں۔ ساہی صاحب کی اچانک موت کا اسے بھی بے حد دکھ ہے اور سب سے بڑا دکھ اسے آپ سے اچانک جدا ہو جانے کا ہے۔ وہ بہت دیر تک آپ کی باتیں کرتی رہی۔ آپ کی ایک ایک بات پوچھتی رہی۔ ہر ہر تفصیل معلوم کرتی رہی۔ اس گفتگو کے دوران میں وہ کئی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔"

"اب وہ کیا کہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے کیا کہنا ہے۔ وہ دو سمتوں میں اس بری طرح کھینچی جا رہی ہے کہ اس کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ ماں کو بستر مرگ پر نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ اور ایک نئی شادی کا تصور کرنا بھی اس کے بس سے باہر ہے۔ شادی کی بات سنتے ہی اس کے جسم پر ایسا لرزہ طاری ہوتا ہے کہ سر تا پا کانپنے لگتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ برداشت کی آخری حد کو چھو رہی ہے۔"

"آنٹی فاخرہ اب کیا کہتی ہیں؟"

"وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ انہیں سو فیصد یقین ہے کہ شیخ عاصم کی موت واقع ہو چکی ہے اور اب میاں جان کے فرمان کے مطابق فتنوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے غزالہ کو شادی کر لینی چاہیے۔ شادی کے لیے ایک شخص بھی آنٹی فاخرہ نے چن لیا ہے۔ یہ میاں جان کا ہی کوئی مرید ہے۔ پینتیس چالیس سال عمر ہے۔ گارمنٹس اور لیدر جینز وغیرہ کا کام کرتا ہے۔ یورپ کے دو تین ملکوں کے علاوہ امریکا اور کینیڈا میں بھی اس کی شاپس ہیں۔۔۔"

میرے تن بدن میں آگ سلگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چچی فاخرہ نے بیٹی کی خوشیوں کو اپنی انا کی قربان گاہ پر لٹا کر ذبح کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ کئی برسوں تک وہ شیخ عاصم کے چنگل میں رہی تھی اور دن رات سینکڑوں خار اس کے بدن میں ٹوٹتے رہے تھے۔۔۔ اب اگر وہ کسی طرح اس زہریلے خار زار سے نکل ہی آئی تھی تو بھی چچی کو اس پر رحم نہیں آ رہا تھا۔۔۔ وہ اسے ایک اور جان لیوا امتحان میں ڈالنا چاہ رہی تھیں۔

وہ کیوں کر رہی تھیں ایسا؟ شاید سب کچھ میری دشمنی میں کر رہی تھیں۔ میاں جان قسم کے لوگ اپنے مریدوں کی خواہشات ان کی گفتگو سے بھانپ لیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق رد عمل ظاہر کرتے ہیں ممکن تھا کہ میاں جان نے بھی ایسے ہی چچی کی نفسیات کے مطابق رد عمل ظاہر کیا ہو اور

اسے فوراً غزالہ کی شادی کا مشورہ دیا ہو۔ غزالہ کی شادی کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ شیخ عاصم ہی تھا۔ میاں جان نے اس کے مردہ ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا تھا۔

"تمہارے خیال میں اس مسئلے کا حل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"حل تو ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بس یہی خیال ہے کہ کسی طرح کچھ وقت حاصل کر لیا جائے شاید اس دوران میں کوئی سبب بن جائے۔۔۔ وقت حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک راستہ نکالا تھا۔ چچی فاخرہ نوے فیصد اس پر راضی ہو گئی ہیں۔۔۔ امید ہے کہ وقت کو ٹالنے کے لیے شاید غزالہ بھی راضی ہو جائے۔۔۔ میں نے آنٹی کے سامنے ایک تجویز پیش کی ہے۔"

"کیسی تجویز؟"

"یہ بات تو طے ہے کہ آنٹی فاخرہ فوری طور پر غزالہ کی شادی کر دینا چاہتی ہیں اور انکل جلیس بھی مختلف وجوہ کی بنا پر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ میں نے آنٹی کو اس بات پر آمادہ کر لیا ہے کہ غزالہ کی "منگنی" کر دی جائے۔۔۔ تاکہ وہ اگلے چار چھ مہینے میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر لے۔ یوں میاں جان کی حکم عدولی بھی نہیں ہوگی اور غزالہ کو شدید ذہنی شاک بھی نہیں پہنچے گا۔ غزالہ ابھی اس پر آمادہ نہیں ہو سکی۔ میں نے اسے سمجھایا بھی ہے کہ یہ آنٹی کے فوری دباؤ سے نکلنے کا ایک راستہ ہے۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن وہ بس روتی چلی جاتی ہے۔ کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ دونوں بار کہہ چکی ہے کہ اگر اپنی جان لینا حرام نہ ہوتا تو وہ جان دے دیتی۔"

میرے دل و دماغ میں الجھن ہی الجھن تھی۔ میں نے کہا "چچا جلیس اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کیوں نہیں کرتے۔ اگر عمر کے آخری حصے میں چچی کا ذہن ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے تو وہ تو ہوش مند ہیں۔۔۔ وہ بیوی کے ساتھ مل کر بیٹی کو بار بار سولی پر کیوں چڑھا رہے ہیں۔"

"شاہ جہاں! میں نے انکل سے بھی تفصیلی بات کی ہے۔ اپنی جگہ وہ بھی بہت دکھی ہیں۔ انہیں بھی حالات نے خاصا بے بس کر رکھا ہے۔ انہیں پتا ہے کہ غزالہ کی والدہ کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ عمر کے اس بالکل آخری حصے میں ہیں اور انہیں اور کوئی بھی جان لیوا دکھ دینا نہیں چاہتے۔ ایک طرف بیٹی جو زخموں سے چور ہے۔ دوسری طرف بیوی ہے جس کی زندگی کا چراغ بری طرح ٹمٹما رہا ہے۔"

"تم نے جو منگنی والی بات کی ہے اس کے بارے میں چچا کا کیا رد عمل ہے؟"

"وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کچھ وقت حاصل کر لیا جائے۔ میاں جان اور آنٹی کے بے پناہ دباؤ سے نکلنے کے لیے انہیں بھی واحد راستہ یہی نظر آتا ہے۔"

آفرین نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولی "آج در اصل میں آنٹی فاخرہ کے کہنے پر ہی گھر سے نکلی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں منگنی کی تقریب کے لیے چھوٹی موٹی جیولری لے آؤں۔ انہیں مطمئن کرنے کے لیے میں نے کچھ چیزیں لی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتی رہی ہوں کہ خدا کرے ان چیزوں کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے۔"

"مجھے تو اب شبہ ہو رہا ہے کہ چچی نفسیاتی طور پر بھی نارمل نہیں رہی ہیں۔ وہ اپنی بیماری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں اور شاید اپنی زندگی میں ہی اپنی آنکھوں کے سامنے غزالہ کو پوری طرح برباد دیکھنا چاہتی ہیں۔۔۔ آج سے ایک دن پہلے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ روتی بلکتی غزالہ سے اس طرح کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ قطعی طور پر میری سمجھ سے باہر ہے۔"

میں اور آفرین تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مصروف گفتگو رہے۔ اس دوران میں ہم نے اس سنگین معاملے پر کئی پہلوؤں سے غور کیا۔ طے یہ ہوا کہ آفرین اب مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ رکھے گی۔ میں غزالہ سے ملنے کا خواہش مند تھا مگر آفرین نے بتایا کہ فی الحال یہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہنے لگی "آپ سے میرا وعدہ ہے شاہ جہاں! میں آپ دونوں کو جلد از جلد ملانے کی کوشش کروں گی۔ جونہی کوئی مناسب موقع ہاتھ لگا میں آپ کو فون کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہاری بات کا اعتبار کرتا ہوں۔ حالانکہ اس سے پہلے تم جہاز میں کیا گیا وعدہ توڑ چکی ہو۔"

"میں بہت مجبور تھی شاہ جہاں' آنٹی فاخرہ بہت ہوشیار اور جہاندیدہ خاتون ہیں۔ اپنے راز میں شریک کرنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کئی طرح کے وعدے اور قسمیں لی تھیں۔ ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ لندن میں ان کی موجودگی کے بارے میں کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ میرے گھر والوں کو بھی نہیں۔ اب بھی میں خوفزدہ ہوں کہ میری قسموں کا کیا ہوگا اور اگر آنٹی کو پتا چل گیا تو وہ میرا کیا حشر کریں گی۔"

"خیر۔۔۔ اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ غزالہ کا پتا ٹھکانہ مجھے تم نے نہیں بتایا' میں

نے خود ڈھونڈا ہے۔"

"مجھے ایک دوسرا خوف بھی ہے۔ اور یہ ابھی ابھی لاحق ہوا ہے۔ یہاں کی پولیس آسانی سے مجرم کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے تو پوری دنیا میں مشہور ہیں۔"

"تمہارا مطلب ابھی کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے سے ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا معاملہ ہے اس سے مجھے ہی نمٹنا ہے۔ اگر مجھے کوئی پکڑتا بھی ہے تو یہ بات تم تک نہیں پہنچے گی۔ صرف مجھ تک ہی رہے گی۔ اب اچھے بچوں کی طرح بالکل پرسکون ہو جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔ ویسے برا نہ منانا' یہ سب کچھ بھی اس لیے ہوا کہ تم نے جہاز سے اتر کر اپنا وعدہ بھلا دیا تھا۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ کچھ دیر میز کی سطح کو گھورتی رہی پھر بولی "دل تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی جا کر غزالہ کو گلے سے لگاؤں اور اسے ایک ایک بات صاف صاف بتا دوں۔ کچھ بھی چھپا کر نہ رکھوں۔ لیکن یہ میں بھی جانتی ہوں کہ ابھی اسے اس بارے میں بتانا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری یہاں موجودگی اسے مزید بے قرار کر دے گی۔"

کچھ ضروری تفصیلات طے کرنے کے بعد ہم اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

دو دن گزر گئے۔ ہماری رہائش گاہ پر فلم کمپنی والا ڈراما کامیابی سے چل رہا تھا۔ اس ڈرامے کو چلانے والی سروج ہی تھی۔ ایک دن میں صبح اٹھا تو فرسٹ فلور پر ہلچل کے آثار تھے۔ اوپر جا کر دیکھا تو پھر سے شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس ان ڈور شوٹنگ کے لیے سارا ساز و سامان موجود تھا۔ روشنیاں' ساؤنڈ سسٹم' پلے بیک سنگنگ' کیمرے اور دیگر لوازمات' دو جنوبی لڑکوں نے دو جنوبی لڑکیوں کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھے تھے اور میوزک پر تھرک رہے تھے۔ لڑکیوں کے لباس ایسے مختصر تھے کہ ان کا بیشتر فیصد جسم عریاں نظر آ رہا تھا۔ یا اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

ڈانس ڈائریکٹر' اسسٹنٹ ڈائریکٹر' کیمرا مین' سب لوگ موجود تھے۔ ایک فلمی گیت بار بار بجایا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ایکسٹرا اداکار حرکت کرتے تھے اور اپنے ہونٹ ہلاتے تھے۔ سروج اس سارے تماشے کا مرکزی کردار تھی۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور نظارہ کرنے کے علاوہ مختلف مشورے بھی دے رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اِدھر دیکھو رائیش صاحب! یہ تمہارا پروڈکشن کنٹرولر بھی پہنچ گیا ہے۔ اب جو کچھ بھی کہنا ہے اس سے کہو۔"

اسسٹنٹ اپنے بہت لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا میرے سامنے پہنچ گیا اور ان اشیا کی ایک لسٹ مجھے تھما دی جن کی شوٹنگ کے دوران میں اسے ضرورت تھی۔ پانچ سو رنگین غبارے' دس عدد جنگل کے باجے' دو سو ٹوپیاں' پچاس سفید چھتریاں' جھمکوں کے تیس جوڑے اور جانے کیا کچھ۔

میں کچھ دیر تک منحوس حلیے والے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ہدایات سنتا رہا پھر اشیا کی لسٹ جیب میں ڈال لی۔ اسسٹنٹ دوسری طرف گیا تو میں نے سروج کو سرگوشی کے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں تمہارے اسسٹنٹ ڈائریکٹر پر اور اس کی لسٹ پر سو بار لعنت بھیجتا ہوں اور ساتھ ساتھ تم پر بھی۔"

"کاش تم کسی اور وجہ سے لعنت بھیجتے۔ میں ایک باندی کی طرح تمہاری سیوا کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں چھوٹی سے چھوٹی شکایت کا موقع بھی دینا نہیں چاہتی لیکن آزمائے بغیر میرے لیے اپنے سندر ہونٹوں سے آگ نکال رہے ہو۔ دیکھو اس حسین شہر کی یہ حسین راتیں یہ حسین گھڑیاں پھر نہیں آئیں گی۔ نہ یہ جوانی پھر ہو گی' نہ یہ امنگ ساتھ رہے گی۔ یہ انمول لمحے ہیں مائی ڈارلنگ۔ انہیں یوں نہ ضائع کرو۔"

"تمہارے منہ میں کس کی زبان ہے' میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔۔۔۔ یہ شوٹنگ وغیرہ کا جھمیلا ڈالنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔ کیوں ان بیوقوفوں کو نچا رہی ہو۔ یہ تو بدنصیبوں کی بدقسمتی کا تماشا دیکھنے والی بات ہے۔"

"یہ تمہاری دردسری نہیں ہے مائی ڈارلنگ۔ تم بس اپنے کام سے کام رکھو اور اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو۔۔۔۔"

اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور بڑی ادا سے میری جانب دیکھنے لگی۔

اس دوران میں ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ میرا فون ہے۔

میں فون سننے کے لیے نچلی منزل میں آیا۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ یہ فون آفرین کی طرف سے ہو گا۔ یہ آفرین کی طرف سے ہی تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ جب بھی ایک دوسرے کو فون کریں گے اصل ناموں سے نہیں پکاریں گے۔ آفرین نے مجھے جہاں داد کہا تھا جبکہ میں اسے سائرہ کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔

"ہیلو سائرہ کیسی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک اور آپ؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ منہ (غزالہ) کیسی ہے؟"

"اس کا حال تو آپ جانتے ہیں۔ اس کی منگنی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔ پرسوں شام کے بعد منگنی کی تقریب ہے۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے منایا ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے جہاں داد کہ مجھے اس کے ساتھ کس طرح جنگ کرنا پڑی ہے۔ وہ خود بھی ہلکان ہوئی ہے اور مجھے بھی کیا ہے۔ وہ جانتی بھی تھی کہ یہ سب کچھ وقت ٹالنے کے لیے کیا جا رہا ہے پھر بھی وہ اس طرف آنے پر آمادہ نہیں تھی۔"

"کہاں ہو گی یہ رسم؟"

"گھر میں ہی۔ بس چھوٹی سی تقریب ہے۔ گھر کے افراد ہوں گے۔ ان لوگوں کی طرف سے بھی چند بندے ہی آئیں گے۔ اس کے دو دن بعد سوموار کے روز تائی فاخرہ دل کے آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل ہو جائیں گی۔ پرسوں تو غزالہ کی حالت دیکھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کم از کم ایک ہفتے کے لیے ملتوی کر دیا جائے لیکن تائی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر منگنی ملتوی ہوئی تو وہ بھی اسپتال داخل نہیں ہوں گی۔ ان کی بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر مجبوراً غزالہ کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔"

آفرین سے دو چار منٹ بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ میں کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ دل پر بھاری' بہت بھاری بوجھ تھا۔ یہ میری اور غزالہ کی زندگی کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ ہم تماشا بن کر رہ گئے تھے۔ غزالہ پر جو بیت رہی تھی وہ زیادہ تکلیف دہ تھی۔ وہ عورت تھی۔۔۔ اور عورت کا دم ناک میں کرنے کے لیے ہمارے معاشرے نے ہزاروں طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ کوئی بدنصیب اس چکر میں پھنس جائے تو پھر اس کے لیے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ کبھی خون کے رشتے اس کے پاؤں کی زنجیر بنتے ہیں۔ کبھی مجازی خدا۔۔۔ "باقاعدہ" خدا بن جاتا ہے۔۔۔ کبھی عدالتیں اور قانون کی شقیں اس کے لیے سد راہ ہو جاتی ہیں۔

مجھے معلوم تھا۔ ہمیشہ سے معلوم تھا کہ چچی فاخرہ مجھے غزالہ سے دور رکھنے کے لیے پوری کوشش کریں گی لیکن وہ اس حد تک چلی جائیں گی کہ ان کی ضد نفسیاتی مرض بن جائے گی اور وہ ہر معقول اور ہر سچائی کو اپنی خود پسندی کی پامالی گردان کر ذہن سے نکال دیں گی۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کس قدر بھونڈی دلیلوں اور بے سروپا مفروضوں کا سہارا لے رہی تھیں وہ۔۔۔ میاں جان کے کہنے پر وہ یہ مان رہی تھیں کہ شیخ اس دنیا میں نہیں ہے اور غزالہ کی سلامتی اور پورے خاندان کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ پھر سے دلہن بن جائے۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں نے سخت عذاب میں گزارے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا تھا کہ میں کہیں غزالہ کو پھر کھو نہ دوں۔ کوئی ایسی انہونی نہ ہو جائے کہ صفدر کی ویرا کی طرح وہ بھی دائمی جدائی کے غار میں اتر جائے۔ میرے دل میں مسلسل ایک کھدبد جاری تھی۔ مسلسل اندیشے کا خارپشت تھا جو اپنے نوکیلے پنجوں سے میرے سینے کو کھرچ رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر غزالہ کی رہائش گاہ (کینٹ) چلا جاؤں اور وہیں اس کے گھر پر نظریں گاڑ کر بیٹھا رہوں۔ اس امکان کو ختم کر دوں کہ میرے دل کا چراغ لاکھوں انسانوں کے اس شہر رنگ و نور میں گم ہو جائے گا اور پھر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔

یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ ہفتے کا دن تھا۔ شام کے چھ بجے تھے۔ سروج بن سنور کر قیامت نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی اس میں۔ وہ ایک "شاملاٹ" گاڑی کی طرح کئی ہاتھوں میں استعمال ہوئی تھی۔ بہت سوں نے اسے بے احتیاطی سے برتا تھا۔۔۔ پھر بھی اس کی چمک دمک برقرار تھی۔ یوں لگتا تھا کہ عیش و عشرت میں گزاری گئی ان گنت راتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی ہیں۔ بلاؤز کا گریبان خطرناک حد تک کشادہ تھا۔ اس نے اپنے بھرے بھرے جسم کو اسکرٹ میں یوں پھنسایا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ گڑ کر رہ جاتی تھی اور نوکر اور ملازمین بھی اسے چور نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ سب کے دل کا حال جانتی تھی۔ ہر سینے سے نکلنے والی آہ اس کے لیے تحسین کا نام رکھتی تھی۔

اس کے اسکرٹ میں چھلکتے ہوئے جسم کو دیکھ کر میں نے سوچا' کتنا اچھا ہو کہ ابھی کسی طرف سے سامی علی یہاں آ نکلے اور اسے دو چار جوتے لگا کر اپنی اوقات میں لے آئے لیکن سامی علی غائب تھا۔ غالب گمان یہی تھا کہ وہ ابھی تک سری لنکا میں ہے یا پھر وہاں سے برطانیہ پہنچ گیا ہے۔

سروج اب چاہ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ بازار جاؤں اور شوٹنگ کے لیے جو اشیا ضروری درکار ہیں وہ باہم مشورے سے خریدیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب بے کار کی پریکٹس ہے۔ سروج صرف میرے ساتھ لندن میں گھومنا پھرنا چاہ رہی ہے اور دل میں یہ بھٹکی ہوئی خواہش پل رہی ہے۔

شاید لندن کے اس خوشبو دار کیچڑ میں میں بھی پھسل جاؤں اور اس کی بانہوں میں آگروں۔

اس نے کہا "دیکھو شاہ جہاں! تم وعدہ خلافی کر رہے ہو۔ کولمبو میں ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ تم ماتحت کی حیثیت سے میری ہدایات پر عمل کرو گے۔"

"میرا یہ وعدہ مشروط تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شاپنگ کی تم بات کر رہی ہو اس کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو میں تمہارے اس واہیات لباس کے ساتھ باہر کے دروازے تک جانا بھی پسند نہ کرتا۔"

"اگر تمہارے انکار کا یہ کارن ہے تو میں لباس بدل لیتی ہوں۔"

"بہتر ہے کہ تم اپنا ارادہ بدل لو۔ بلکہ اپنی نیت ہی بدل لو۔"

شاید یہ بحث طول پکڑتی لیکن اسی دوران میں میرا فون آگیا۔ میں نے کمرے میں جا کر فون سنا' دوسری طرف لندن میں مقیم میرا ایک پرانا دوست عشرت رحمانی تھا۔ اس سے میں نے پرسوں رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بچوں کو لے کر لندن سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا تھا۔ آج اس کا فون آگیا۔ وہ میری آمد سے بہت خوش تھا اور فوری طور پر ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی۔ رحمانی کے ذریعے مجھے ایک زبردست خبر بھی ملی اور وہ یہ کہ میرا بے تکلف دوست کھاریہ گیرا اور کلاسیکل لاہوریہ عالم قریشی بھی لندن میں موجود تھا۔ رحمانی نے کہا کہ وہ عالم قریشی سے رابطے کی کوشش کر رہا ہے جونہی رابطہ ہوا وہ مجھے فون پر اطلاع دے گا۔

رحمانی سے بات ختم کرنے کے بعد میں وہیں کمرے میں لیٹ گیا۔ دروازہ میں نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سروج جس کا جسمانی درجہ حرارت بہت اونچا جا رہا ہے کسی بھی وقت بلائے ناگہانی کی طرح کمرے میں داخل ہو سکتی ہے۔ بہرحال غنیمت گزری کہ اس نے دستک نہیں دی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ آج کی شام اسے کسی اور کے نام کرنی ہوگی۔ یہ ویک اینڈ کی شام تھی ہنگاموں سے بھرپور۔

میں ان ہنگاموں کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ میں ایک تقریب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تقریب جو کینٹ کی ایک شاندار کوٹھی میں شروع ہونے والی تھی یا شروع ہو چکی تھی۔ اس تقریب کا تعلق میری غزالہ سے تھا۔ میں نے ان تھک کوششوں کے بعد اور ناقابلِ بیان مصیبتیں اٹھا کر اسے ایک زنجیر سے آزاد کرایا تھا اب اس کی ناعاقبت اندیش ماں ایک اور ایسی ہی زنجیر اس کے گلے میں ڈالنے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس صورتِ حال کے بارے میں سوچ کر میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ ایسی جانبلب' ابھی تو ہم پر سی' میرا جی چاہ رہا تھا کہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر یہاں سے نکل کھڑا ہوں۔ سب سے پہلے تو ماں جان کا ٹینٹوا دباؤں' جو اپنے نجانے کس مقصد کی خاطر اپنے ایک مالدار رنڈوے مرید سے غزالہ کا سمبندھ جڑوا رہا تھا۔ اس کے بعد غزالہ کے سامنے جاؤں' اس سے کہوں "غزالہ! اس لنی پٹی محبت کو اور تماشا نہ بناؤ' دیکھو۔ میں تمہاری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ اس ہاتھ کو تھام لو یا ہمیشہ کے لیے جھٹک دو......

پتا نہیں میں کب تک سوچتا رہا اور خیالوں ہی خیالوں میں غزالہ کے گھر کا منظر دیکھتا رہا۔ میں آئندہ کالائحہ عمل بھی تیار کر رہا تھا اور پلان بھی کر رہا تھا کہ مجھے کس طرح غزالہ کو اس نفسیاتی جنگل سے نکالنا ہے جس میں چچی فاخرہ نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ غیر متوقع طور پر دوسری طرف آفرین تھی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ آواز میں بھی لرزش نمایاں تھی۔ پس منظر میں سمانوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے یقیناً گھر سے ہی رنگ کیا تھا۔

"کیا بات ہے سائرہ؟ تم کچھ پریشان ہو؟"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر بولی "یہاں..... بہت گڑبڑ ہو گئی ہے جہاں دار..... مم..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"آنٹی فاخرہ..... آنٹی فاخرہ نے..... ہم سے اصل بات چھپائی ہے۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بول رہی تھی۔

"تم پہیلیاں بجھوا رہی ہو سائرہ۔"

"جہاں دار..... میں آپ کو کیسے بتاؤں....." آفرین کی آواز بھرا گئی پھر وہ حوصلہ جمع کرتے ہوئے دوبارہ بولی "جہاں دار' یہ منگنی کی تقریب نہیں۔..... لیکن چچی فاخرہ..... اسے نکاح کی تقریب میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چچا جلیس کو بھی اس بات کا پہلے سے پتا تھا۔"

میرے سر پر جیسے بم پھٹ گیا تھا۔ یہ انتہا تھی۔ یہ بدعہدی اور بدنیتی کا آخری زینہ تھا۔ یہ ضد..... ہٹ دھرمی اور عداوت کی بدترین مثال تھی۔ یوں لگتا تھا کہ چچی کا دماغ چل گیا ہے اور ساتھ ساتھ انہوں نے چچا جلیس کو بھی مخبوط

الحواس کر دیا ہے۔ اس ساری صورتِ حال کی بہت سی ذمے داری بیر فرنوت میاں جان پر بھی آتی تھی۔

"آمنہ کہاں ہے سائرہ؟" یہ الفاظ میرے سینے کی گہرائی سے نکلے اور میرے ہونٹوں کو جھلساتے چلے گئے۔

"وہ..... وہ اپنے کمرے میں ہے۔ میں جہاں سے ٹیلیفون کر رہی ہوں۔ وہاں سے آمنہ (غزالہ) کے کمرے کا منظر نظر آ رہا ہے۔ چچی فاخرہ اس کے سامنے بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ ان کا رنگ ہلدی ہو رہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ انہیں نہیں ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ میں' میں آپ کو بتا نہیں سکتی جہاں دار وہ کس طرح آمنہ (غزالہ) کے دل و دماغ پر سوار ہو رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے بیٹی کے پاؤں پر سر رکھ دیا تھا اور سر اٹھانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مم..... میں جانتی ہوں جہاں دار! آج کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ یا آنٹی کی جان چلی جائے گی یا آمنہ مٹی کا ڈھیر بن کر ماں کے قدموں میں بکھر جائے گی۔ وہ مان لے گی جو کچھ اس کی ماں کہہ رہی ہے۔"

"یہ نہیں ہو گا۔ نہ میں ایسا ہونے دوں گا۔" اور فون بند کر دیا۔

میں نے گاڑی نکالی اور برق رفتاری سے کینٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا لیکن جس وقت میں نون برج پہنچا صرف سوا گیارہ ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں آندھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری اور غزالہ کی زندگی میں یہ اہم ترین موقع ہے۔ آج میں پیچھے ہٹ گیا تو پھر زندگی ایک گالی بن کر رہ جائے گی۔ میں کینٹ جانے والی سڑک کی طرف مڑ رہا تھا جب ایک چھوٹی سی نیلی کار کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ یہ وہی کار تھی جس میں چند روز پہلے آفرین گھر سے نکلی تھی اور میں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ نمبر پلیٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی کار ہے۔ یہ کار ایک پارکنگ لاٹ میں مڑ رہی تھی۔ میں نے بھی بنا لے کر اپنی کار پارکنگ لاٹ میں داخل کر دی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ چھوٹی نیلی کار میں آفرین ہی ہے۔ وہ جھلملاتے سوٹ میں تھی۔ یقیناً وہ سوٹ اس تقریب کی نشانی تھا جو آج کینٹ میں چچا جلیس کے گھر منعقد ہوئی تھی اور عین موقع پر جسے نکاح کی تقریب میں بدلنے کی کوشش کی گئی تھی۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس تقریب کا کیا انجام ہوا ہے۔ غزالہ کہاں ہے اور باقی لوگ کہاں ہیں۔ میں نے تو صرف آفرین کو یہاں دیکھا تھا اور حیران ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کار آفرین کی کار سے کچھ فاصلے پر پارک کر دی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آفرین اکیلی ہی یہاں آئی ہے۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ میں نے سامنے نگاہ دوڑائی اور بری طرح چونک گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک عمارت نظر آئی تھی' اس کی پیشانی پر وکٹوریہ اسپتال کے الفاظ چمک رہے تھے۔

اسپتال میں کون پہنچا ہے؟ کیا چچی فاخرہ اسپتال پہنچ گئی ہیں؟ کیا غزالہ کو کچھ ہو گیا ہے؟ ایک ہی سیکنڈ میں کئی سوالات برقی کوندوں کی طرح میرے ذہن میں لپک گئے۔ میں نے آفرین کے نزدیک ہو کر آہستہ سے اسے پکارا۔ وہ میری آواز سن کر چند سیکنڈ تک نیم تاریکی میں مجھے پہچاننے کی کوشش کرتی رہی پھر ادھر ادھر دیکھ کر تیزی سے میرے قریب چلی آئی۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولی "آنٹی کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ وہ ابھی آدھا گھنٹا پہلے اسپتال میں پہنچی ہیں۔ چچا جلیس' غزالہ سب یہیں ہیں۔"

مزید گفتگو کا موقع ہی نہیں تھا۔ آفرین تیز تیز قدموں سے اسپتال کی عمارت کی طرف مڑی۔ وہ سوال جو آہنی میخ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا زبان پر آگیا۔ میں نے آفرین کو روکتے ہوئے پوچھا "منگنی کا کیا بنا؟"

"کچھ بھی نہیں ہو سکا ہے۔" آفرین نے جواب دیا "غزالہ اور آنٹی کمرے میں تھیں' اچانک غزالہ نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ پتا چلا کہ آنٹی کو سخت دورہ پڑ گیا ہے۔ غزالہ نے پہلے اپنے طور پر طبی امداد دی' ان کی زبان کے نیچے کوئی ٹکیہ رکھی اور انجکشن وغیرہ لگایا پھر فوراً آنٹی کو اسپتال کی طرف دوڑایا گیا۔ وہ بالکل بے ہوش تھیں اور ابھی تک بے ہوش ہیں۔"

آفرین تیز تیز قدموں سے اسپتال کی طرف چلی گئی۔ میں وہیں گاڑیوں کی قطاروں کے درمیان کھڑا رہ گیا۔ چچی زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ اپنے ارادوں کو عملی شکل دینے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ اس اسٹیج پر ان کے لیے زندگی موت کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ کم از کم چھ مرتبہ موت کے منہ سے واپس آچکی تھیں' اب تو جو سانس بھی وہ لے رہی تھیں وہ منافع کا سانس تھا۔ وہ ان سانسوں کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی فتح کے لیے استعمال کر رہی تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اوپر والا بھی ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں اس اوپر والے کے لیے میرا دل آنسوؤں اور شکوؤں سے بھر گیا۔

آفرین کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ میں نے بزرگ کا میک اپ کر رکھا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ چچا اور غزالہ وغیرہ مجھے اتنی جلدی پہچان سکیں گے۔ ہاں سباس جان کے سر منڈے کارندوں کی طرف سے اندیشہ ضرور تھا۔ پکاڈلی سرکس کی لڑائی میں انہوں نے مجھے اچھی طرح دیکھا تھا اور امید تھی کہ وہ عرصے تک مجھے بھول نہیں سکیں گے۔ ان لوگوں کی خاطر میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اونچے کر لیے اور سر پر ٹوپی پہن کر نیچے تک کھینچ لی۔ بہرحال اسپتال کے کارڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہونے تک مجھے منڈے ہوئے سر اور کانوں میں بالی والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔

توقع کے مطابق چچی فاخرہ سی سی یو میں تھیں۔ سی سی یو سے کچھ فاصلے پر کرسیوں کی ایک قطار تھی۔ اس قطار میں مجھے آفرین، چچا جلیس اور نانی وغیرہ نظر آئے۔ ننھے نانی کو چچا نے گود میں اٹھا رکھا تھا۔ غزالہ کہیں نہیں تھی۔ میں چچا کے بالکل سامنے سے گزرا لیکن وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہے۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ سی سی یو میں لیٹے ہوئے انسان قابلِ رحم ہوتے ہیں لیکن مجھے سی سی یو کے باہر بیٹھا ہوا یہ شخص قابلِ رحم لگا۔ اس کی اس خستہ حالی کا ذمے دار کون تھا۔ وہی جو سی سی یو میں تھی۔

ایک بڑے شیشے میں سے مریضوں کے لواحقین اپنے مریضوں کو دیکھتے تھے اور خاموشی سے واپس پلٹ آتے تھے۔ میں نے بھی شفاف شیشے میں سے دیکھا۔ جدید ترین سہولتوں سے آراستہ نہایت صاف ستھرے اور خاموش "کیئر یونٹ" میں تین دوسرے مریضوں کے ساتھ چچی فاخرہ بھی موجود تھیں۔ ہر مریض کے بیڈ کے ساتھ ایک کرسی تھی۔ اس کرسی پر ایک اٹینڈنٹ بیٹھا تھا۔ چچی فاخرہ کے پاس غزالہ تھی۔ اس نے سبز رنگ کا وہ خاص گاؤن پہن رکھا تھا جو سی سی یو میں داخل ہونے والے اٹینڈنٹ کے لیے پہننا ضروری تھا۔ یہ کھلا سا بے وضع لبادہ بھی اس کے جسم پر سج کر خوبصورت ہو گیا تھا۔ وہ چچی کے پاؤں کی طرف بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے اس کے ہاتھ چچی کے پاؤں کو چھو لیتے تھے اور سر خم ہو جاتا تھا۔ میں اتنی دور سے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن یقیناً اس کی آنکھوں سے آنسو بھی چچی کے پاؤں پر گر رہے تھے۔ وہ ایک مشغول دل کی نرم زمین تھی۔ ہزار ستم سہہ کر بھی وہ نمی ہی تھی اور ایک بیٹی کی طرح سراپا آنسو نظر آ رہی تھی۔

میرے دل کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! غزالہ کو اس گورکھ دھندے سے نکال لو۔ اگر نہ نکالو گے تو اس گورکھ دھندے کا حصہ بن کر تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی اور پھر کبھی اسے ڈھونڈ نہیں پاؤ گے۔"

زندگی میں کبھی احباب کے بارے میں برا نہیں سوچا لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں ان لمحوں میں کسی اور انداز سے سوچ رہا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود ایک خواہش دل میں سر اٹھا رہی تھی۔ چچی اس بستر سے ایک "اچھی ماں" کے روپ میں اٹھیں یا پھر کبھی اٹھ نہ سکیں لیکن میری چھٹی حس یہ بھی کہہ رہی تھی کہ یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ چچی اب تک بہت سخت جان ثابت ہوئی تھیں۔ بعض لوگوں کے اندر کی ضد اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ وہ ان کی زندگی کے لیے توانائی بن جاتی ہے۔ وہ لوگ موت کا لمس پانے کے باوجود پھر زندگی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اپنی ادھوری جنگ مکمل کرنے کے لیے اور اپنے نامکمل کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ چچی کے گرد موجود ڈاکٹر بھی پُر امید نظر آ رہے ہیں۔ وہ بار بار چچی کا بلڈ پریشر چیک کر رہے تھے اور ان کے لیے کوئی انجکشن تیار کر رہے تھے۔ شاید چچی پھر زندہ ہو رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کو پھر سے انا کی سولی پر لٹکانے کے لیے۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ انگاروں کے بوجھ سے میں [illegible] جانب اٹھی۔

میں چپ چاپ گرد و پیش سے بے نیاز کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں طوفان چل رہا تھا اور مجھے کسی بہتر موقع کی تلاش تھی۔ یہ موقع تقریباً آدھے گھنٹے کی تاخیر سے مل سکا لیکن مل گیا۔ چچا گاؤن پہن کر سی سی یو میں داخل ہوئے اور غزالہ کو باہر لے آئے۔ غزالہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ چچا اور آفرین وغیرہ اس سے باتیں کرنے لگے۔ ایک واقف کار ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ چچی کی حالت اب قدرے بہتر ہے اور وہ لوگ غزالہ کو گھر واپس جانے کے لیے کہہ رہے ہیں لیکن غزالہ یہاں رہنے پر بضد ہے۔

آخر سمجھا بجھا کر وہ لوگ غزالہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے پھر بھی غزالہ تقریباً آدھا گھنٹہ مزید وہاں رکی رہی۔ اس دوران اس نے دو تین بار سی سی یو کی طرف جا کر شیشے سے منہ لگا کر ماں کو دیکھا۔ وہ شدید صدمے میں تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ غزالہ موم ہو رہی ہے۔ اس کے اندر کا لوہا ماں کی تکلیف سے پگھل کر پانی بن رہا ہے۔ اب وہ سنگ دل عورت بد قسمتی سے ماں بھی ہے۔ غزالہ کو اپنی من پسند شکل میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کر سکتی

ہے۔ ہاں یہ بہت اہم وقت تھا۔

رات کے ایک بجے کے لگ بھگ غزالہ روتے ہوئے زینی کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک درمیانی عمر کا سفید فام ڈرائیور جو چوکیدار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، غزالہ کے ساتھ تھا۔ غزالہ نانی اور ڈرائیور سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے تو میں بھی اٹھ گیا۔

زینی کو میری موجودگی کا علم تھا اور اب وہ مجھے غزالہ کے پیچھے جاتے بھی دیکھ رہی تھی۔ بہرحال اس نے کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ہم پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ ایک بج چکا تھا لیکن لندن ہر دن سے زیادہ بارونق تھا۔ منچلوں کی ٹولیاں قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ ریستورانوں اور شراب خانوں کے اندر سے تیز موسیقی "خارج" ہو کر باہر تک آ رہی تھی۔ سڑکوں پر شراب کی خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں۔ ہم پارکنگ لاٹ کے قریب جوا کھلانے والی مشینوں کے قریب سے گزرے۔ یہاں ورد... کئی منچلے ان مشینوں میں پونڈ وغیرہ اتار رہے تھے۔ غزالہ اور زینی اس چھوٹی نیلی کار میں بیٹھے جس پر وہ مجھ سے پہلے آفرین یہاں لائی تھی۔ ڈرائیور نے فوراً پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور غزالہ زینی سمیت بیٹھ گئی۔ میں بھی تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں غزالہ کے قریب سے گزرا لیکن وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہی۔

میں نے پچاس ساٹھ قدم چل کے جا کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ساتھ والی کار کی نیم تاریکی میں ایک انگریز جوڑا جنگ و جدل میں مصروف تھا۔ انہوں نے ایک اگلی نشست اسٹیئرنگ کی ہوئی تھی اور [illegible] تھے۔ یہ یہاں ایک عام سی بات تھی۔ جب غزالہ والی گاڑی پارکنگ سے نکلی میں اس کے پیچھے تھا۔

میری توقع کے مطابق چھوٹی نیلی گاڑی کا رخ کینٹ کے علاقے کی طرف ہی تھا۔ میں نے کیا کرنا ہے۔ اس کا فیصلہ میں اسپتال میں ہی کر چکا تھا۔ جلد ہی گاڑی بارونق علاقے سے نکل گئی۔ جونہی وہ نسبتاً سنسان سڑک پر پہنچی۔ میں نے اسے اوورٹیک کیا اور روک لیا۔ ڈرائیور قدرے حیران ہو رہا تھا۔ غزالہ کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ریوالور نکال کر آہستہ سے ڈرائیور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ "مسٹر ڈرائیور! کیا تم خاموش رہنا پسند کرو گے؟"

ڈرائیور تنومند اور مضبوط شخص تھا لیکن فوری صدمے سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے مڑ کر غزالہ کی طرف دیکھا۔ غزالہ غیر معمولی طور پر پُرسکون رہی۔ اس

آسیب

آسیب، خوف، دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

براہِ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: ۷۲۴۷۴۱۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

نے کہا "ہمارے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں ہے۔ یہی کوئی سو پاؤنڈ ہوں گے۔ اگر تم گاڑی لے جانا چاہتے ہو تو لے جا سکتے ہو۔"

"میں گاڑی تو لے جانا چاہوں گا لیکن اسی حالت میں جس میں یہ ہے۔" میں نے آواز بدل کر کہا تھا۔

اسی دوران میں، میں چھوٹا سا چکر کاٹ کر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تت... کون ہو تم؟" اب غزالہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں پتا چل جائے گا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہارا یہ موٹی گردن والا ڈرائیور اس رنگ رنگیلی میٹھی رات کو اپنی بے وقوفی سے زہر آلود نہ کر دے۔"

"نن... نہیں یہ کچھ نہیں کرے گا۔ تم اپنا مطلب بتاؤ۔" وہ مجھے لندن کا کوئی روایتی رہزن سمجھ رہی تھی۔

اچانک وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انگریز ڈرائیور نے اپنی طاقت اور ڈیل ڈول کے گھمنڈ میں پستول پر جھپٹنا مارا۔ وہ سے کتنا پھرتی کا مظاہرہ بھی کرتا تو شاید پستول کو چھو نہ سکتا۔ میں نے پستول کے دستے سے اس کی پیشانی پر چوٹ لگائی وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی صحت مند گردن اپنے بازو میں دبوچ لی۔ اس دوران میں غزالہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا تھا۔ شاید اس نے باہر نکلنے کے بارے میں سوچا تھا مگر ڈرائیور کی مزاحمت اس کی توقع سے بہت پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے پستول لہرایا تو غزالہ نے اپنا ہاتھ ہینڈل سے دور ہٹا لیا۔ ڈرائیور نے اپنی گردن چھڑانے کے لیے زور لگایا تو میں نے گردن کے مخصوص حصے پر دباؤ بڑھا کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

ڈرائیور کو ایک طرف لڑھکتے دیکھ کر غزالہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اتنا کڑیل شخص اور یوں اچانک ڈھیر ہو جائے۔ ایسا کب ہوتا ہے؟ وہ جانتی تھی ایسا کب ہوتا ہے۔ میں نے اپنی اصل آواز میں بولتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔"

کار کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ وہ آنکھیں پھاڑنے کے باوجود مجھے دیکھ نہ سکتی۔ "تت... آپ... مم... میرا مطلب ہے آپ ہ..." وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"ہاں، میں ہی بدنصیب شاہ جہاں ہوں۔ میری ہی قسمت میں کاتب تقدیر نے دنیا بھر کی سیاہی بھر رکھی ہے۔" میرا لہجہ یوں آپ ہی آپ بے حد زہر آلود ہو گیا تھا۔

نیم تیرگی میں ننھے نابال کی گول گول حیران آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ انتہائی معصوم آنکھیں جن میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ میں اسے گود میں لے کر چومنا چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میری بدلی ہوئی صورت کے سبب وہ میرے پاس نہیں آئے گا۔"

غزالہ حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ اب اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ہونٹ لرزتے جا رہے تھے۔ میں نے بھاری بھرکم ڈرائیور کو کھینچ کر اپنی پشت پر کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اس موقع پر غزالہ دروازہ کھول کر نیچے اتر سکتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اسے پتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کر چکی ہے اور میں کس قدر خفا ہوں۔ وہ مجھے مزید خفا کرنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔ جب کار حرکت میں آئی تو اس نے صرف اتنا کہا "امی پر دل کا بہت سخت اٹیک ہوا ہے۔ وہ کوئنز ہسپتال میں ہیں۔"

"مجھے سب پتا ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ یقیناً اس کے ہونٹوں پر یہ سوال مچل رہا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں لیکن وہ یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ میں نے گاڑی واپس موڑی اور شہر کے وسطی حصے کی طرف چل دیا۔ کار کے اندر ایک گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ میں نے بے ہوش ڈرائیور کو نشست پر اس طرح لٹا دیا تھا کہ وہ سویا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اسے گرنے سے بچانے کے لیے میں نے سیٹ بیلٹ سے باندھ دیا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔

"میں ایک فون کر لوں۔" غزالہ نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

"فون بھی کروا دیتا ہوں۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

گاڑی تیز رفتاری سے بھاگتی رہی۔ ہم دونوں خاموش رہے، یکسر خاموش۔ اس خاموشی میں بس کبھی کبھی نابی کے توتلے الفاظ ابھرتے رہے۔

O☆O

یہ میرے لندنی دوست عشرت رحمانی کا گھر تھا۔ یہ گھر ایک فلیٹ کی شکل میں تھا اور آکسفورڈ اسٹریٹ کے علاقے میں واقع تھا۔ عشرت رحمانی یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا

تھا۔ اتفاقاً فیملی کچھ دنوں کے لیے لندن سے باہر کسی سیاحتی دورے پر گئی ہوئی تھی۔ عشرت گھر میں اکیلا تھا۔ وہ رات کے اس پہر میری آمد پر خوش تھا اور کچھ حیران بھی تھا۔ وہ غزالہ کو بھی جانتا تھا اور اس کی حیرانی کا اصل سبب غزالہ ہی تھی۔ رحمانی نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ معاملہ گمبھیر ہے پھر جب میں نے اسے بتایا کہ کار میں ایک بے ہوش شخص بھی موجود ہے جسے پیشانی پر مرہم پٹی کی ضرورت ہے تو وہ جان گیا کہ میں اسی "سچ رنج" سے اسی کے فلیٹ پر آیا ہوں جیسے آیا کرتا ہوں۔

رحمانی خود تو نیچے گیراجوں میں چلا گیا تاکہ ڈرائیور کو سنبھال سکے۔ ہمارے لیے وہ گرم کافی اور چپس وغیرہ نشست گاہ میں چھوڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور یہ نہایت سنجیدہ قسم کی گفتگو ہے۔ غزالہ نے تھوڑا سا پانی پیا اس نے کافی یا چپس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نے بھی کچھ نہیں لیا۔ بس ننھا نابی ادھر ادھر گھومتا رہا اور چپس وغیرہ اٹھاتا رہا۔ غزالہ کی آنکھیں متورم تھیں اور گاہے گاہے پلکوں پر ستارے چمک جاتے تھے۔

بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے غزالہ نے درخواست کے لہجے میں کہا "میں گھر میں ایک فون کر لوں۔"

"کیا ہو گی۔"

"یہی کہ... بس کچھ دیر میں آؤں گی۔"

"کتنی دیر میں؟"

"یہ... یہ تو آپ بتائیں۔"

"ان سے کہہ دو کہ تم اب نہیں آؤ گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں میری طرف دیکھتی رہی پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جہاں۔"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو۔ تم اب فوراً یہاں سے نہیں جاؤ گی۔ کم از کم کچھ دن تمہیں یہاں رہنا پڑے گا۔"

"شش... شاہ جہاں! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے۔ امی ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہیں۔ ہم سب کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ کسی بھی وقت امی کی حالت بگڑ سکتی ہے۔"

"تم نے بارہا کہا کہ تم تقدیر پر یقین رکھتی ہو۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس بات پر بھی تمہیں بھروسا ہے۔ چچی کی جتنی بھی سانسیں ہیں وہ ضرور پوری ہوں گی۔ ہم تم اس بارے میں حساب کتاب جوڑنے والے کون ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ کل تک ان کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ پرسوں تک وہ تم سے فون پر بات کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے بیماری کے خلاف بڑی قوتِ مدافعت رکھی ہوئی ہے۔"

"شاہ جہاں، آپ سمجھنے کی کوشش کریں، یہ نہیں ہو سکتا۔" مسلسل رونے کی وجہ سے وہ زکام زدہ آواز میں بول رہی تھی۔

"یہ کرنا پڑے گا غزالہ ورنہ پھر آج کی رات سب کچھ ختم ہو جائے گا۔" میرے لہجے میں دکھ اور آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔

میرے لہجے نے اسے چونکا دیا۔ وہ تھوک نگل کر بولی "مم... کیا مطلب؟"

میں نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا "دروازہ کھلا ہے۔ اگر تم جانا چاہو گی تو میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن اس کے بعد..."

میں دو لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ ڈری ڈری سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا "غزالہ! اگر تم جانا چاہو گی تو میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن میں تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے تمہاری ہی قسم ہے غزالہ! میں جب تک زندہ رہوں گا تمہاری صورت نہیں دیکھوں گا۔"

میرا لہجہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ خود مجھے بھی حیرت ہوئی۔ اس لہجے میں تمام درد و کرب اور بے مہر جدائیوں کا وہ سارا غم سمٹ آیا تھا جو میں نے پچھلے برسوں میں جھیلا تھا۔ یہ چند الفاظ نہیں تھے یہ چند پہاڑ تھے جو اپنی اپنی جگہوں پر بے حد مضبوطی سے کھڑے تھے اور غزالہ انہیں سن ہی نہیں رہی تھی، دیکھ بھی رہی تھی۔ اس طرح ایک دوراہا پہلے بھی ہماری زندگی میں آیا تھا لیکن آج جو دوراہا سامنے تھا وہ اہم ترین تھا۔ غزالہ نے میری طرح دیکھا اور اس کا وجود خشک پتے کی طرح لرز گیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

اس کی حسین آنکھیں آنسوؤں کی چمک سے جھلملا رہی تھیں۔ اس نے اپنی ہچکی روکنے کی کوشش کی اور اس کی گردن میں ہنسلی کی ہڈیوں کے درمیان گڑھا سا پیدا ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر نابی کے سر پر تھا۔ وہ بولی "میں

باتیں ہوں شاہ جہاں! آپ اس قدر سخت کیوں ہو رہے ہیں۔ میں نے اور ہم سب نے پاکستان سے اچانک یہاں آکر آپ کو بہت دکھ پہنچایا ہے۔ آپ کو نہیں پتا کہ آپ کو دکھ پہنچا کر مجھ پر کیا بیتی ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں میرا کیا حال ہے لیکن وہ سب کیوں ہوا؟ یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ میں حالات کو بڑی حد تک بہتر کر چکی تھی اور امید تھی کہ یہ اور بہتر ہو جائیں گے مگر عاصم کی چال نے سب کچھ الٹ دیا۔ تہ خانے میں آپ کی جو تصویریں اتاری گئی تھیں وہ امی ابو کے سامنے گئیں اور ان کی وجہ سے ایسی آگ بھڑکی کہ۔۔۔۔"

"غزالہ! یہ ساری کتھا سنانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میں سننے کے موڈ میں ہوں۔ جو کچھ ہوا تم بھول جاؤ اور میں بھی بھول جاتا ہوں۔ سمجھو کہ آج کی اس رات سے پہلے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ جو کچھ ہے آج کی رات ہے اور آج کی رات کے بعد۔۔۔۔ بس فنش۔۔۔۔"

میں نے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ یہ فلیٹ چودھویں منزل پر تھا۔ لندن کی روشنیاں' حرکت کرتی ہوئی سڑکیں اور جلتے بجھتے سائن بورڈ دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ یہ ویک اینڈ کی رات تھی لیکن میرے لیے یہ اینڈ کی رات تھی یا Beginning کی رات تھی۔ آغاز ہوتا تھا یا انجام ہوتا تھا۔ محبت نے جیتنا تھا یا مصلحت نے۔۔۔۔ دل کی جیت ہوتا تھی یا دماغ کی۔ وفا کا بول بالا ہوتا تھا یا جفا کا۔ ہاں یہ ایک دوراہا تھا۔ لندن کی اس "روشن ٹھنڈی" رات میں ایک فلیٹ کی کھڑکی کے سامنے میں اور غزالہ ساکت کھڑے تھے۔

غزالہ نے سسکی لیتے ہوئے کہا "مجھے اتنے بڑے امتحان میں مت ڈالیں شاہ جہاں۔۔۔۔ پلیز میری مجبوری دیکھیں' مجھے اس وقت جانے دیں۔ ہم دو چار دن بعد پھر ملیں گے۔ ہم اس سارے مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔ میں جانتی ہوں۔۔۔۔ میں جانتی ہوں شاہ جہاں! آپ الجھے ہیں۔ آپ میرے اور اپنے لیے' اچھا ہی سوچیں گے لیکن اس وقت ہم دونوں کی حالت ایسی ہے کہ ہم کوئی درست فیصلہ نہیں کر سکتے۔"

"یہی حالت تو فیصلہ کرنے والی ہے۔ جب تم اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ گی تو پھر تمہاری ذہنی حالت کچھ اور ہو گی۔ اس حالت میں جو فیصلہ ہو گا وہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ سنو غزالہ میرے لیے آج کی رات ہی سب کچھ ہے۔ آج تم کہہ دو کہ میں تمہاری ہوں یا کہہ دو کہ میں تمہاری نہیں ہوں۔"

"لیکن آپ۔۔۔۔ مجھ پر یہاں سے نہ جانے کی شرط کیوں لگا رہے ہیں؟"

"اسی شرط پر تو سارا دارومدار ہے۔ اسی شرط کو مان کر تم ثابت کرو گی کہ تم میری ہو۔"

وہ سسکی "ماں کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

"تمہیں صرف چچی کی زندگی ہی خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کی زندگی بھی خطرے میں ہو۔ کوئی اور بھی موت کی سرحد پر کھڑا ہو۔"

"مجھے معاف کر دو شاہ جہاں۔۔۔۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ آج تم مجھے معاف کر دو۔ مجھے جدائی کی چھری سے ذبح کر دو یا پھر اس چھری کو ہمیشہ کے لیے کہیں دور پھینک دو۔ میں نیم بسمل رہ کر اب اور نہیں تڑپ سکتا۔"

میرا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا ہاتھ مضبوطی سے نانی کے سر پر جما ہوا تھا۔ میں خاموش رہا وہ بھی خاموش رہی۔ اس کی خاموشی طویل ہو رہی تھی۔ یہ خاموشی ایک زہریلے بچھو کی طرح میرے دل میں ڈنک مارنے لگی۔ میرے دل کے اندر سے ایک آواز ابھرنے لگی۔ تم ہار رہے ہو شاہ جہاں۔۔۔۔ تمہاری محبت' تمہاری ساری تڑپ اور گریہ زاری۔۔۔۔ غزالہ کے ارادوں کی آہنی دیوار میں سوراخ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھنے والی ہے۔ وہ تمہاری محبت کو ہمیشہ کے لیے قربان کر کے اپنے ہوم سویٹ ہوم کی طرف بڑھنے والی ہے۔ دل میں ایک تاریکی' بہت گہری تاریکی پھیلنے لگی۔ دنیا کے سفاک ترین مجرموں کے سامنے میں زمین میں پاؤں گاڑھ کر کھڑا رہا تھا۔ آگ اور خون کے مہلک ترین طوفانوں کے سامنے بھی میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی تھی لیکن آج محبت کی اس عدالت میں اپنے محبوب منصف کے سامنے میں نے خود کو ڈگمگاتا ہوا محسوس کیا۔ یوں لگا میرا جسم حلق تک آنسوؤں سے بھر گیا ہے۔ غزالہ کی خاموشی مجھے چیر رہی تھی میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ فیصلہ واپس لے لوں۔ اپنی غزالہ کو ایک ایسی کٹھن ترین آزمائش میں نہ ڈالوں جس میں سے نکلنا اس کے بس میں ہی نہ ہو لیکن پھر فوراً میں نے اپنی اس کمزوری کو اپنے

دامان سینے میں انگاروں اور زخموں کے نیچے دفن کر دیا۔

میں نے کہا "غزالہ' شاید تمہیں میرے سامنے فیصلہ کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ یہ تمہاری گاڑی کی چابی ہے۔ تمہارا ڈرائیور بھی پارکنگ میں آ چکا ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ اگر رکنا ہے تو رک جاؤ' اگر جانا ہے تو بھی جاؤ۔۔۔۔ میں پانچ دس منٹ بعد دوبارہ یہاں آ کر اپنی قسمت کا حال دیکھ لوں گا مگر جانے سے پہلے میں ایک بار اپنا ہاتھ تمہارے سر پر رکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ پتھر کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ میں نے ہاتھ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا "غزالہ! میں پھر کہتا ہوں۔ اگر تم نے جانا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن مجھے تمہارے سر کی قسم ہے کہ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میں جب تک زندہ رہوں گا' نہ تمہاری صورت دیکھوں گا اور نہ ہی اپنی صورت دکھاؤں گا۔"

نانی حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری آواز پہچان رہا تھا لیکن صورت اس کے لیے اجنبی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر بے تحاشا چوما' وہ گھبرا کر رونے لگا۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے اسے غزالہ کی گود میں ڈالا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے جو آخری آواز سنی وہ غزالہ کی ہچکی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔

دوسرے کمرے میں آ کر میں بستر پر مردے کی طرح گر گیا۔ میرے سینے میں آگ تھی اور دھواں تھا۔ اس دھوئیں سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے بے قرار ہو کر ایک کھڑکی کھول دی۔ جگمگاتا لندن آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ دور کہیں مشہور فلم میکناز گولڈ کا تھیم سانگ بج رہا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ساری کائنات کے صحرا ایک ساتھ میرے جسم میں اتر گئے ہیں۔ دھوئیں کی گھٹن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یہ موت و حیات کا کھیل تھا۔ اگلے دس منٹ بلاشبہ میری زندگی کے مشکل ترین لمحے تھے۔ یہ دس منٹ ازل بے سرحد بیاباں تھیں جو مجھے روندتی اور کچلتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سینے میں دل کسی وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

"غزالہ' میرے ساتھ ایسا مت کرنا۔" یہ خاموش التجا بار بار میرے سینے سے اٹھ رہی تھی اور ایک درد بن کر رگ و پے میں پھیل رہی تھی۔

میں ڈگمگاتے قدموں سے اس دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں میں غزالہ کو چھوڑ کر آیا تھا۔ جہاں میں نے اسے اپنی محبت کے بھروسے ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈالا تھا۔۔۔۔ محبت جتنی گہری اور جتنی بڑی ہو اس کی آزمائش بھی تو اتنی بڑی ہوتی ہے۔ لاہور میں غزالہ نے میرے لیے کتنی بڑی آزمائش ختب کی تھی۔ اس نے سب بام کند توڑی تھی۔ اس نے میری صحرا صحرا بھٹکنے والی پیاس کو دریا کے کنارے پر لا کر ناکام لوٹایا تھا۔ میں اس آزمائش میں سرخرو ہوا تھا۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرا تھا اور پھر جڑ گیا تھا اور جب بھی جڑا تھا وہی شاہ جہاں بنا تھا جس کے روئیں روئیں میں جل کوٹ کر غزالہ بسی ہوئی تھی۔ آج میں نے اس کا امتحان لیا تھا۔ ہاں محبت جتنی شدید ہوتی ہے' اس کی آزمائش بھی اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔

دروازے سے چند قدم دور میں رک گیا۔ سینے میں اٹھتا ہوا دھواں کچھ اور بھی گاڑھا ہو گیا۔ میں نے سوچا۔۔۔۔ میں نے دروازہ کھولا۔۔۔۔ اور سامنے غزالہ اور نانی نہ ہوئے تو پھر کیا ہو گا؟ کیا میں یہ صدمہ برداشت کر جاؤں گا؟ یہ پوائنٹ آف نو ریٹرن تھا۔ یہ ون وے ٹکٹ تھا۔ یہ کمان سے نکلا ہوا تیر تھا۔ یہ لمحے دریا کے پانی جیسے تھے۔ ایک بار اس مقام سے گزر جاتے تو پھر انہیں واپس نہیں آنا تھا۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔۔۔۔ ان لمحات میں کائنات کی گردش میرے لیے جیسے تھم گئی تھی۔

داستان گوئی میں ایک نئی طرز کا آغاز
مداری
10 حصے شائع ہو گئے ہیں
قیمت فی حصہ 60 روپے
احمد اقبال کے شعلہ بار قلم سے وطن کے پرآشوب حالات
کے پس منظر میں لکھی جانے والی ہوشربا داستان

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے سامنے ایک بند دروازہ تھا۔ اس دروازے کی دوسری سمت میری تقدیر میری منتظر تھی۔ یہ ابھی تک باہر کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی..... میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ غزالہ وہاں موجود ہو گی یا نہیں۔ اگر وہ موجود نہیں تھی تو پھر میرے لیے یقیناً زندگی کی ساری خوب صورتیاں آج ہی ختم ہو جاتیں۔ آخری سانس تک ایک تاریک خلا اور اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکا تھا۔ ایک بہت بڑی قسم کھا چکا تھا۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پوائنٹ آف نو ریٹرن۔

دروازے کے بالکل سامنے پہنچ کر میری ہمت جواب دے گئی۔ میرے دل میں آئی کیوں نہ اس سنگین ترین کھیل کو اسی جگہ اسی موڑ پر چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں..... مجھے معلوم ہی نہ ہو کہ دروازے کے پیچھے کیا ہے! کہیں بہت دور نکل جاؤں... کئی مہینوں یا برسوں تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھوں۔ مجھے کبھی علم ہی نہ ہو کہ غزالہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور نہ ہی میں کبھی یہ جاننے کی کوشش کروں۔ اگر پھر کبھی غزالہ سے ملوں تو اس خوفناک آزمائش والی رات کا ذکر اس کی زبان پر آئے اور نہ میری زبان پر..... اب تو بس یہی رات تھا اس "طلسم" سے چھٹکارا دے گا۔

میں چند سیکنڈ دروازے کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا تھا پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔ میرے دل سے آواز آئی۔ شاہ جہاں آج جو ہو رہا ہے۔ اسے ہو جانے دو۔ جو زندگی تم جی رہے ہو یہ زندگی کہاں ہے؟ آج حقیقی معنوں میں زندہ ہو جاؤ..... یا پھر خود کو پورے کا پورا مر جانے دو۔ اب بہت ہو چکی۔ اب بہت سہہ چکے۔ اب اپنی مٹی اور خراب مت کرو۔ مجھے لگا جیسے میرا سینہ حلق تک آنسوؤں سے بھر گیا ہے۔

میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر آیا۔ چند ساعتوں کے لیے میں نے دروازے کی دوسری جانب سے ابھرنے والی کسی آواز کو سننے کی کوشش کی۔ ایسی کوئی آواز کانوں تک نہیں پہنچی۔

میں نے ہینڈل گھمایا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ مجھے لگا جیسے میری آنکھوں کے ساتھ ساتھ میرا جسم بھی پتھرا گیا ہے۔ غزالہ وہاں موجود نہیں تھی۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ میں ڈگمگا سا گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر دروازے کی چوکھٹ کو تھام لیا تھا۔

تو کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟

تو کیا زندگی فقط ایک ویرانہ رہ گئی۔

تو کیا یہی ہوتی ہے محبت..... یہی ہوتا ہے عشق..... یہی ہے برسوں کے جاں گسل انتظار اور ہزار ہا زخموں کا صلہ۔

تو کیا ہم ہارتے ہارتے ہمیشہ کے لیے ہار گئے۔

تو کیا وقت جیتتے جیتتے ہمیشہ کے لیے جیت گیا۔

میں کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ فلیٹ کی کھڑکیوں سے باہر جگمگاتا لندن اپنی تمام تر چمک اور زندگی سمیت مجھ سے بہت دور چلا گیا تھا۔

غزالہ میری طاقت تھی۔ وہ میرے جسم کے اندر سے نکل گئی تھی۔ میں مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں نے بڑے بڑے زورآوروں کو سرنگوں کیا تھا۔ آج اس بے مہر شب کے تاریک ترین لمحوں میں میرا کوئی ادنیٰ سا دشمن بھی میرے مقابل آ جاتا تو مجھے بھسم خاک کر دیتا۔

اچانک سامنے والا دروازہ کھلا۔ میری حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ یوں لگا جیسے میں تحت الثریٰ سے اٹھا ہوں اور یکایک فضاؤں میں پرواز کرنے لگا ہوں۔ میرے سامنے غزالہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ایک بازو پر تابی تھا۔ اسی ہاتھ میں تابی کے دودھ کی بوتل تھی۔ دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ اس ٹوکری میں تابی ہی کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ غزالہ کا شولڈر بیگ غزالہ کے کندھے پر نظر آ رہا تھا۔ غالباً یہ ساری چیزیں وہ نیچے کھڑی گاڑی میں سے لے کر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں اور چہرہ سفید گلاب کے اس پھول کی طرح تھا جسے شبنم نے رات بھر دھویا ہو۔

اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے بس ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر چیزیں الماری میں رکھنے لگی۔

مجھے بالکل یہی محسوس ہو رہا تھا کہ میں کھلی آنکھوں سے ایک حسین و جمیل..... سنہرا خواب دیکھ رہا ہوں۔ چند لمحے پہلے اردگرد کی ہر شے جو اپنے بدترین روپ میں تھی اب خوب صورت ترین روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ کوئی اسمِ اعظم تھا کوئی جادو تھا جس نے آس پاس کی ہر مردہ شے میں زندگی اور چمک بھر دی تھی۔ فلیٹ کی کھڑکی سے باہر جگمگاتا ہوا دلکش لندن ایک دم سے میرے قریب آ گیا تھا۔ اس کے سارے رنگ، قہقہے اور نغمے میرے دل و دماغ کو اپنے حصار میں لینے لگے تھے۔

میرے دل نے پکار کر کہا "شاہ جہاں! یہ لمحے تمہاری زندگی کا حاصل ہیں۔ آج تمہاری محبت جیت گئی ہے۔ آج وہ نفرت ہار گئی ہے جس نے تمہیں برسوں خون کے آنسو رلایا ہے..... یہ تمہاری حیات کی معراج ہے۔ اب کچھ اور بھی ملے تو کوئی دکھ نہیں۔ آج اسی جگہ اسی گھڑی موت بھی آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دل چاہ رہا تھا میں دوڑتا ہوا دروازے سے نکلتا ہوا اس عمارت کی بلند چھت پر پہنچ جاؤں۔ وہاں سے لندن کی ہزار ہا روشن کھڑکیوں اور سڑکوں پر رینگتی ہوئی روشنیوں کو مخاطب کروں اور چیخ چیخ کر کہوں "میں نے حاصل کر لیا۔ میں نے پا لیا۔ میں نہیں جانتا آج کے بعد کیا ہوگا..... لیکن آج میری محبت فاتح ہے اور یہ فتح ابدی رہے گی۔"

غزالہ نے تابی کو فیڈ دے کر اسے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ خود وہ باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ واش بیسن میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔ وہ بار بار منہ ہاتھ دھوئے گی۔ آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارے گی۔ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرے گی۔

میں نے باتھ روم کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ وہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اندر کا منظر میری توقع کے عین مطابق تھا۔ غزالہ نہایت آراستہ باتھ روم میں واش بیسن کے سامنے کھڑی منہ دھو رہی تھی۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ایک برق سی فضا میں کوندی۔ ایک نہایت توانا میکانکی عمل کے تحت میرے قدم اٹھے اور میں واش بیسن کے سامنے پہنچ گیا۔ میرے بازو متحرک ہوئے۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں اور غزالہ ایک دوسرے کی بانہوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ غزالہ کا چہرہ میری گردن میں دھنسا ہوا تھا اور میرے ہونٹ اس کے بالوں پر تھے۔ اس کے نازک جسم میں تلاطم تھا۔ وہ رو رہی تھی اور روئی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو بمشکل اپنے سینے کی دیواروں میں روک رکھا تھا۔ میرا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں اس کی پشت کو سہلا رہا تھا۔ واش بیسن بھر گیا تھا اور اس کا پانی کناروں سے چھلک چھلک کر ہمارے پاؤں کو بھگو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی، بس میرے سینے سے چمٹی ہوئی تھی۔

کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ میں نے اسے خود سے پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ نہیں ہٹی۔ شاید ہم کچھ دیر تک مزید اسی طرح یک جان دو قالب کی صورت کھڑے رہتے مگر اچانک مدھم آہٹ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ سامنے ننھا تابی کھڑا تھا۔ فیڈر اس کے منہ میں تھا اور وہ حیرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تابی کو دیکھ کر غزالہ بھی جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

تابی نے فیڈر منہ سے نکالا اور اپنی ننھی سی انگلی کے ساتھ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "انی! یے ٹون ہیں؟" (انی! یہ کون ہیں؟)

غزالہ نے کوئی جواب دیے بغیر تابی کو گود میں اٹھا لیا اور اسے کار خسار چومتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

رحمانی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ تکلف میں پڑ گیا ہے۔ کچھ کھانے پینے کا انتظام کر رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں رحمانی واپس آ گیا۔ پیزے کے دو بڑے ڈبے اس کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ بار بی کیو تھا اور چکن کے نصف درجن تکے۔ لگتا تھا کہ کھانا کے عالم قریشی کے ساتھ رہ رہ کر اس کی بھوک بھی مستقل طور پر چمک گئی ہے۔

میں نے اشیائے خورونوش دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری مہمان نوازی سر آنکھوں پر لیکن فی الوقت ہمیں طعام سے زیادہ قیام کی ضرورت ہے۔"

"شاید قیام سے آپ کی مراد سونا ہے..... لیکن مجھے خدشہ ہے کہ سونا آپ کی قسمت میں نہیں ہے۔ قریشی صاحب کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ آپ کی یہاں موجودگی نے انہیں بے حد پرجوش کر دیا ہے۔ وہ اگلی پچھلی ساری باتیں آپ سے آج ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ میں بہت سنجیدہ موڈ میں تھا۔ غزالہ پر بھی بے حد سنجیدگی طاری تھی۔ ہمیں آج کی رات ایک دو اہم فیصلے کرنا تھے۔ اہم اور کٹھن..... ایسے ماحول میں ہنگامہ پسند عالم قریشی کی آمد ہمیں ڈسٹرب کر سکتی تھی۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ عالم قریشی نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ شاید یہ وقت قبولیت تھا۔ قریباً آدھا گھنٹے بعد عالم قریشی کے ملازم کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ قریشی صاحب کی چھوٹی بیگم کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ اسے لے کر اسپتال تک گئے ہیں۔ اب وہ صبح ہی آ سکیں گے۔

میرے کہنے پر رحمانی نے خورونوش کی ساری اشیا فریج میں رکھ دیں صرف پیپسی کے دو ٹن باہر رہنے دیے۔ رحمانی میری اور غزالہ کی گہری سنجیدگی اور پریشانی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! مجھے جتا ئیں گے نہیں، یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ کا رات کے اس پہر اچانک یہاں آنا میرے لیے بہت تعجب کا باعث ہے۔"

"یار! اتکوائری کیوں کر رہے ہو۔ اگر تمہیں کوئی اندیشہ ہے تو میں ابھی یہاں سے روانہ ہو جاتا ہوں۔"

اس نے فوراً دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے "آپ کیسی بات کر رہے ہیں شاہ جہاں! آپ کے نیاز مند ہیں، جان بھی حاضر

ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کو کسی طرح میری مدد کی ضرورت ہو تو آگاہ کریں۔"

"مدد کی ضرورت تو ہوگی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو مجھے اور غزالہ کو کچھ دیر کے لیے تنہائی کی ضرورت ہے۔"

"آپ مکمل اطمینان سے ساتھ بات چیت کریں۔ میں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف آواز دے لیجیے گا۔"

کچھ ہی دیر بعد میں اور غزالہ کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ تانی کو غزالہ نے سلا دیا تھا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ اس کا یہ ردعمل اس کی اندرونی بے قراری کو ظاہر کرتا تھا۔ میں نے کہا "تم نے کچھ سوچا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو کب سوچو گی؟"

"سوچنے کا کام آپ کریں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟" وہ دکھناک آواز میں بولی۔

"میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے ناراض ہو۔ تمہاری امی اسپتال میں ہیں اور میں نے تمہیں یہاں رکنے پر مجبور کر رکھا ہے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ اس بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے بولی "خدا کی قسم میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں ان حالات سے ناراض ہوں جنہوں نے مجھے جکڑ لیا ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک ہے۔ شاید آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ مگر....." وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"مگر..... کیا؟" میں نے استفسار کیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں دو اطراف میں کھنچی جا رہی ہوں شاہ جہاں! میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف امی ہیں۔ اگر انہیں میری وجہ سے کچھ ہو گیا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرسکوں گی۔ مجھے بتائیں..... میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "کتنا اچھا ہوتا..... اگر تم لاہور چھوڑنے سے پہلے بھی یہ سوال مجھ سے کرلیتیں۔ ہم مل کر اپنی مشکل کا کوئی حل ڈھونڈتے لیکن تم تو اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں جیسے خدانخواستہ میں کوئی ڈاکو ہوں اور تمہاری عزت یا جان کو مجھ سے شدید خطرہ ہے۔ کوئی ایک پیغام ہی تم میرے لیے چھوڑ جاتیں..... کوئی ایک فون..... کوئی ایک خط..... تمہیں کیا پتا ہے غزالہ..... میں نے یہ چند مہینے کن عذابوں میں گزارے ہیں۔ کسی وقت تو جی چاہتا تھا کہ اپنے اندر اتنی شراب انڈیلوں کہ کچھ ہوش نہ رہے..... پھر اسی حالت میں اپنی جان پر کھیل جاؤں۔"

"میں اپنی غلطی مانتی ہوں شاہ جہاں اور اس کے لیے آپ سے معافی بھی چاہتی ہوں۔ بس حالات ایک دم ایسے ہوگئے تھے کہ میں مرنے کی حد تک مایوس ہوگئی تھی۔ اس مایوسی میں مجھے یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ میں آپ کو بتائے بغیر اچانک چلی گئی تو آپ پر کیا گزرے گی۔ لندن پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑا قدم اٹھا چکی ہوں۔ اگلے ایک دو ہفتوں میں..... میں نے کئی بار کوشش کی کہ آپ کو فون کروں۔ میں دیر تک فون کے سامنے بیٹھی رہتی تھی..... لیکن آپ کو RING کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بار تو میں نے آپ کے نمبر ملا بھی دیئے تھے..... لیکن پھر آپ کی آواز سننے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔ اس دن میں اتنا روئی تھی کہ آپ کو بتا نہیں سکتی پھر کئی دن تک شدید بخار میں نیم بے ہوش پڑی رہی تھی۔ میں آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کر رہی ہوں شاہ جہاں..... صرف یہ بتا رہی ہوں کہ آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی اپنی زندگی کے مشکل ترین وقت سے گزری ہوں لیکن اس میں غلطی سراسر میری ہی ہے اور میں اسے مانتی بھی ہوں۔"

"خیر..... پچھلی ساری باتوں کو بھول جاتے ہیں غزالہ..... آئندہ کا سوچتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ پچھلی غلطیوں سے سبق حاصل کرکے ہم کس طرح بہتری کی صورت پیدا کرسکتے ہیں۔"

"میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے شاہ جہاں..... میں کچھ نہیں سوچ سکتی۔ جو کچھ سوچنا ہے پلیز..... آپ خود سوچیں۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے امی کو کچھ نہ ہو۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "غزالہ! عاصم کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ اس کا جینا مرنا میرے لیے ایک برابر ہے۔"

"ایک برابر تو نہیں ہوسکتا غزالہ..... وہ زندہ ہونے کی صورت میں تمہارے لیے ایک خوفناک دھمکی ہے۔ خوفناک اور مسلسل دھمکی۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"لیکن تمہیں ایک اور بات معلوم نہیں۔ وہ دھمکی اپنا وجود کھو چکی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں شاہ جہاں!"

"تمہارے مرشد میاں جان کا دعویٰ ہے کہ شیخ عاصم اس دنیا میں نہیں..... کیا تم اس بات پر یقین نہیں رکھتی ہو۔"

غزالہ نے اپنا سر نفی میں ہلایا "میں جب میاں جان پر یقین نہیں رکھتی تو اس کے دعوؤں پر کیسے رکھ سکتی ہوں۔ وہ ایک مطلب پرست اور دھوکے باز شخص ہے۔ اس کا کام اپنے عقیدت مندوں سے بڑی بڑی رقمیں بٹورنا ہے۔ وہ بے ربط پیش گوئیاں کرتا ہے اور ان پیش گوئیوں کے لیے بھی بھاری رقمیں وصول کرتا ہے۔"

"میں اس کی پیش گوئیوں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال اس کی ایک پیش گوئی کم از کم ایسی ہے جسے ہم غلط قرار نہیں دے سکتے اور میں اس وجہ سے حیران بھی ہوں۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" غزالہ کھلی کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"شیخ عاصم مر چکا ہے..... غزالہ..... اور میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔"

غزالہ بس میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ غمی کا..... نہ خوشی کا..... نہ شدید حیرت کا..... یوں لگا جیسے وہ عاصم کی موت کی خبر نہیں سن رہی کسی اجنبی کی خبر سن رہی ہے۔ ایک ایسا اجنبی جس کے جینے مرنے سے اسے کوئی سروکار ہی نہیں۔ وہ غزالہ کا شوہر رہا تھا۔ وہ ایک عرصے تک ساتھ رہے تھے..... لیکن پھر بھی وہ اجنبی ہی تھا۔ اس لیے کہ وہ شوہر نہیں تھا، وہ دشمن تھا۔ وہ غزالہ کے ساتھ ہی نہیں رہا تھا اس سے اپنی اور میری دشمنی بھی نکال رہا تھا۔ آخری دنوں میں اس کے اندر کی ساری خباثتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ جب ہم سری لنکا سے واپس آرہے تھے۔ اس بدبخت نے ایک اجنبی ہی کی طرح غزالہ پر بے راہ روی کا الزام لگا دیا تھا۔ اس الزام میں مجھے گرفتار کرلیا گیا تھا اور میرے ساتھ زریں گل اور صفدر بھی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔ میں وہ دلدوز واقعات کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی واقعات تھے جنہوں نے بالآخر غزالہ کے ساتھ ساتھ غزالہ کے اہل خانہ کو بھی شیخ عاصم سے متنفر کیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تمہیں شیخ کی موت کا دکھ نہیں ہوا؟"

"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟" وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کیسے مرا..... کہاں مرا..... میں نے اسے کیوں کر دیکھا؟"

"بس جو ہوگیا سو ہوگیا۔ اب سانپ کی لکیر پیٹنے سے فائدہ۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ اس انداز میں موجود "بے پروائی" اس نفرت کو ظاہر کرتی تھی جو شیخ کے لیے غزالہ کے دل میں جگہ بنا چکی تھی۔

غزالہ کی بے پروائی دیکھتے ہوئے اطمینان کی ایک لہر میرے سینے میں دوڑ گئی۔ میرے اندر سے کسی نے گواہی دی کہ میں نے جو کچھ کیا تھا صحیح کیا تھا۔ شیخ ایسے ہی انجام کا مستحق تھا۔

وہ پورا خانزادہ ہی کسی خاص مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی رگوں میں خون کی جگہ ہٹ دھرمی اور رعونت دوڑتی تھی۔ ان کی کھوپڑیوں میں دماغ کی جگہ کوئی بہت بڑا انگارہ دہکتا رہتا تھا۔

اس خانزادے کی ایک رکن فوزیہ بھی تھی۔ کولمبو کے ساحل پر کھڑے بجرے میں اس نے میرے ساتھ جو سفاکانہ سلوک کیا تھا اس کے زخم ابھی تک میرے جسم پر موجود تھے۔ یہ نشانیاں اور یہ زخم مجھے یاد دلاتے رہتے تھے کہ شیخ کی بہن میرے آس پاس موجود ہے اور اس کی سفاک عیاری کسی بھی وقت میرے لیے سنگین مشکلات کھڑی کرسکتی ہے۔ درحقیقت تو یہ میری توقع سے کہیں زیادہ مشکل لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اس پر سختی..... نرمی..... محبت..... پیار سب کچھ آزما کر دیکھ لیا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا کہ یہ لڑکی بدل جائے..... لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ اندر سے چٹان کی طرح سخت اور فولاد کی طرح بے لچک تھی۔ اس کا شوہر باری اسے عشق کی حد تک چاہتا تھا مگر آخری موقعے پر وہ اسے بھی بے دردی سے زخمی کرگئی تھی۔

میں نے غزالہ کی سرخ متورم آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ نہیں پوچھو گی کہ شیخ عاصم کی موت کیسے واقع ہوئی؟"

"پلیز شاہ جہاں..... یہ نام بار بار میرے سامنے مت لو۔ میں اس کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"اگر تم اس کے بارے میں سننا نہیں چاہتیں تو پھر..... کسی اور کے بارے میں سن لو۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا مگر لندن ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دور کہیں دریائے ٹیمز کے پانیوں پر تیرنے کسی بجرے نے دو سے وسل بجائی۔ یہ آواز ہوا کے دوش پر تیرتی بلند عمارتوں سے ٹکرائی شمالاً جنوباً بکھر گئی۔ چاند جو لندن کے آسمان پر کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا ہے

دو بلند عمارتوں کے درمیان اٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے غزالہ کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "غزالہ..... ! میں جو بات تم سے کہنے جا رہا ہوں یہ برسوں سے میرے سینے میں موجود ہے لیکن آج پہلی بار ہونٹوں پر آ رہی ہے۔"

"کون سی بات..... "غزالہ نے پوچھا۔

"میں..... تم سے..... شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ رونے لگی۔ آنسو موتیوں کی لڑیوں کی طرح اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ یہ غم کے آنسو نہیں تھے۔ اس کا سر خود بخود جھک گیا تھا۔

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ میں بھی دو قدم چل کر اس کے سامنے پہنچ گیا "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے غزالہ؟"

وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا چہرہ میرے سینے میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ یہ اس کے اقرار کا ایک انداز تھا۔ اس اقرار کے ساتھ آنسو بھی تھے اور یہ آنسو شاید ان مشکلات کی نمائندگی کر رہے تھے جو اب بھی ہمارے راستے میں موجود تھیں۔

"یہ کیسے ہوگا شاہ جہاں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"جب ہم کریں گے تو یہ ہو جائے گا....."

"لیکن امی....."

"امی کی حالت ایسی نہیں کہ ہم انہیں ان معاملات میں گھسیٹیں۔ انہیں بعد میں خبر دی جا سکتی ہے جب وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا "ہم چچا جلیس سے بات کرتے ہیں ہم انہیں بتاتے ہیں کہ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم چچا کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"نہیں شاہ جہاں..... ہم انہیں قائل نہیں کر سکیں گے۔"

"تم ہمت ہار دو گی تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا اور اگر ہمت کرو گی تو پھر کچھ بھی ناممکن نہیں رہے گا۔ غزالو! آج تک تم اپنے دل کی مانتی رہی ہو۔ آج میری مان کر دیکھ لو۔ ایک بار..... صرف ایک بار اپنا وزن محبت کے پلڑے میں ڈال دو۔ مجھے یقین ہے دوسری طرف نفرت کے پہاڑ بھی ہوں گے تو ہلکے ہو جائیں گے۔ بس ایک بار غزالہ..... جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ چچا کے سامنے بیان کر دو..... وہ تمہارے باپ ہیں تو میرے بھی چچا ہیں۔ میں جانتا ہوں ان کا لو پگھل جائے گا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہیں ہمت کرنا ہوگی۔"

غزالہ کا سر بدستور میرے سینے کے ساتھ پیوست تھا ہماری گفتگو اسی پوزیشن میں جاری تھی۔ دو چار منٹ بعد ہم ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم چچا جلیس کو ساری صورت حال سے آگاہ کریں گے۔

قریباً دو گھنٹے بعد جب صبح کا اجالا لندن کے خیبب وفراز کو روشن کر چکا تھا اور اپنے اپنے کاموں کو جانے والے سڑکوں پر رواں دواں دکھائی دیتے تھے۔ چچا جلیس عشرت رحمانی کے فلیٹ میں غزالہ کے ساتھ موجود تھے۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھے تھے، میں ساتھ والے بیڈ روم میں موجود تھا۔ میرے کان دروازے کی دوسری جانب سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ چچا جلیس کی کانپتی ہوئی آواز ابھری "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا غزالہ..... تم کیا کر رہی ہو..... کیسے آ گئی ہو تم یہاں..... تم بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا، پھر غزالہ کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی "ابو! شاہ جہاں یہاں لندن میں موجود ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی یہاں آئی ہوں۔"

جواب میں خاموشی رہی۔ شاید اس انکشاف نے چچا پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں بولے "تو وہ بدمعاش تمہارے پیچھے یہاں بھی آ گیا ہے۔ میں اسے..... قتل کر دوں گا..... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔"

"پلیز ابو!"

"میں سب سمجھ گیا ہوں۔" وہ تیزی سے غزالہ کی بات کاٹتے ہوئے بولے "تم یہاں آئی نہیں ہو..... زبردستی لائی گئی ہو۔ وہ تمہیں لے کر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پولیس کو فون کرنا چاہیے۔"

"نہیں ابو! ایسا نہیں ہے، میں یہاں خود آئی ہوں۔ آپ میری پوری بات تو سنیں۔ شاہ جہاں ایسے نہیں ہیں۔ کچھ غلط فہمیاں ہیں جنہوں نے ہمیں دور کر رکھا ہے۔ شاہ جہاں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ایک بار ان کی بات سن لیں پھر آپ جو کہیں گے مجھے منظور ہوگا۔ صرف ایک بار ابو..... پلیز ایک بار..... میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا ابو..... آپ کو بھی گلہ رہا ہے کہ میں کچھ مانگتی نہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار میں آپ سے کچھ مانگ رہی ہوں..... اور شاید آخری بار بھی۔ پلیز مجھے مایوس نہ کریں ابو۔"

غزالہ کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ اثر تو چچا جلیس پر بھی ہوا ہوگا۔

چند لمحے بعد ان کی کرخت آواز ابھری "مجھے معلوم ہے وہ کیا کہے گا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے اس کے منہ نہ لگواؤ۔ وہ ایک..... وہ ایک انٹرنیشنل غنڈہ بن چکا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کی لسٹ میں اس کا نام بہت اوپر لکھا ہے۔ میں اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔"

"پلیز ابو! میری خاطر صرف ایک بار....." وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ ایک بچی کی طرح۔ جو اپنے باپ کا دامن پکڑ لیتی ہے اور رو رو کر اپنی بات منوا لیتی ہے..... لیکن وہ کوئی عام باپ نہیں تھا۔ وہ چچی فاخرہ جیسی بیوی کا شوہر تھا۔ اس عورت نے برس ہا برس کی محنت سے اپنے شوہر کے اندر اپنی بیشتر صفات منتقل کر دی تھیں۔ وہ نفرت، ضد..... اور عداوت کا ایک آگ برساتا سورج تھا۔ اس سورج کی کچھ نہ کچھ حدت تو چچا جلیس میں بھی منتقل ہو تا تھی۔

ایک حیا دار بیٹی اور ایک سخت گیر باپ کی یہ دل سوز کشمکش تھی۔ آخر چچا جلیس کی کرخت آواز ابھری "وہ کہاں ہے؟"

"میں انہیں بلاتی ہوں..... "غزالہ نے اشک بار لہجے میں کہا "لیکن آپ وعدہ کریں کہ ان کی اور میری بات تحمل سے سنیں گے۔"

"میں سنوں گا۔ تم اس کو بلاؤ۔" چچا نے گمبھیر آواز میں کہا۔

میں کچھ دور جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور غزالہ دھیرے سے اندر آ گئی۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیا تھا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی "چلیں..... ڈیڈی آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے ہیں اور آپ کے سامنے بھی جوڑتی ہوں کہ تحمل سے بات کریں....."

میں اٹھا اور غزالہ کے پیچھے پیچھے چلتا نشست گاہ میں آ گیا۔ میں نے چچا جلیس کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ انہوں نے سرد مہری سے مصافحہ کیا۔ وہ صوفے پر دونوں بازو پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہماری ملاقات سے پہلے ہی غزالہ نے چچا کو بتا دیا تھا کہ میں بدلے ہوئے حلیے میں ہوں۔ لہٰذا میری صورت دیکھ کر انہیں زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔

وہ اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولے "اب تم کیا چاہتے ہو مجھ سے اور میری بیٹی سے؟....."

میں نے کہا "جو میں چاہتا ہوں وہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور اب سے نہیں، برسوں سے جانتے ہیں۔ میں بالکل تسلیم کرتا ہوں، مجھ میں خامیاں کوتاہیاں موجود ہیں۔ میں ان خامیوں کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا اور یہ کوشش کروں گا کہ میری وجہ سے آپ کی عزت اور آن پر کوئی حرف نہ آئے۔"

"یہ بہت پرانا ڈائیلاگ بولا ہے تم نے..... فلموں ڈراموں میں جب کوئی بدمعاش کسی شریف آدمی سے اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگتا ہے تو تمہاری ہی طرح مسکین صورت بناتا ہے اور ایسے ہی ارادے ظاہر کرتا ہے لیکن یہ سب کچھ وقتی ہوتا ہے۔ جب اسے جواب انکار کی صورت میں ملتا ہے تو وہ اسلحہ نکال لیتا ہے اور اپنی اصل زبان میں بولنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی عن قریب یہی کرنے والے ہو۔"

"آپ مجھے بدمعاش کہہ رہے ہیں۔ اس سے آپ کی اس اندرونی نفرت کا اظہار ہوتا ہے جو آپ کے دل میں میرے لیے موجود ہے..... لیکن میں جانتا ہوں یہ نفرت آپ کو کہیں سے ملی ہے اور یہ دھیرے دھیرے آپ کے اندر پروان چڑھی ہے..... ورنہ آپ تو میرے وہی چچا ہیں جو مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ میرے ناز دیکھتے تھے۔ جنہوں نے اباجی کی وفات کے بعد میرے سر پر اپنا محبت بھرا ہاتھ رکھا تھا۔ ہاں چچا میں کچھ بھی بھولا نہیں ہوں آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ کے سامنے نرمی اور عاجزی کا سوانگ رچا رکھا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ کتنے برس گزر گئے ہیں۔ بتائیں کبھی کسی ایک موقع پر بھی میں نے آپ کے ساتھ زبان درازی کی ہے۔ نگاہ اٹھائی ہے۔ کیسے کیسے سخت مرحلے گزرے ہیں لیکن میں نے اپنے اور آپ کے درمیان احترام کا رشتہ برقرار رکھا ہے..... اور یہ ہمیشہ رہے گا۔ آپ کا بھتیجا بہت بڑا بدمعاش سہی..... دنیا کا بدترین شخص سہی لیکن چچا! وہ آپ کے سامنے ایسا ہی رہے گا جیسا اب نظر آ رہا ہے۔"

"تم لمبی تقریر نہ کرو۔ صرف اصل بات بیان کرو۔"

"میرا بڑا کوئی نہیں ہے چچا! آپ ہی میرے بڑے ہیں۔ میں آپ کے سامنے غزالہ کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہوں۔ غزالہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں اسے ہمیشہ خوش رکھوں گا چچا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا شاہ جہاں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے چچا..... ہم نے بہت دکھ جھیل لیے ہیں۔ بہت سزائیں کاٹ لی ہیں۔ اب ہمارے حال پر رحم کریں۔''

''تم یہ 'ہم' کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزالہ کے خیالات وہ نہیں ہیں جو تمہارے ہیں۔ غزالہ اس وقت تمہارے اثر اور دباؤ میں ہے۔ وہ یہاں جو کچھ کہے گی وہ اس کی اصل رائے نہیں ہو گی۔ میں اسے گھر لے جا رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جا رہی ہے۔ میں اکیلے میں اس سے بات کروں گا۔'' انہوں نے ایک لحظہ توقف کیا اور پھر بولے ''چلو غزالہ اٹھو۔''

انہوں نے آگے بڑھ کر غزالہ کا بازو تھام لیا۔ غزالہ نے بے چارگی سے میری جانب دیکھا۔ میری آنکھوں میں اٹل ارادے کی جھلک دیکھ کر وہ رک گئی۔ اس نے کہا ''ابو آپ شاہ جہاں کی بات کیوں نہیں سنتے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کی ساری بات سنیں گے۔ یہ آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کچھ کہنا نہیں چاہتا..... صرف تمہاری ماں کو مارنا چاہتا ہے۔ تم اس کی دلہن بن کر بیٹھ جاؤ یہاں۔ میں کل اس کا جنازہ اٹھا لوں گا۔''

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں ابو۔'' غزالہ نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں ایسی باتیں کیوں نہ کروں۔ جب تم لوگ یہی چاہتے ہو تو پھر یہی ہو گا۔''

''لیکن میں نے تو ابو.....''

''تم بھی تقریر مت کرو۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟''

غزالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے دھارے رخساروں پر رواں تھے۔

چچا جلیس نے ایک قہرناک نظر ہم دونوں پر ڈالی..... پھر ایک گہری سانس لی اور سر ہلاتے ہوئے بولے ''بہت خوب بیٹی! بہت خوب..... تم نے فرماں برداری کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ ایک جھٹکے سے دروازے کی طرف بڑھے۔ غزالہ نے لپک کر ان کا بازو تھام لیا ''خدا کے لیے ایسا مت کریں ابو.....'' وہ ساتھ ساتھ فریادی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو..... ''شاہ جہاں انہیں روکو۔''

میں آگے بڑھا تو چچا نے مجھے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا ''چھوڑ دو مجھے..... دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔'' وہ گرجے۔

انہوں نے اپنے قدم پھر فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھانے۔ رحمانی بھی ایک کھڑکی میں حیران کھڑا تھا اور یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ غزالہ بدستور چچا جلیس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی ''نہیں ابو! میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔'' وہ مسلسل کراہ رہی تھی۔

چچا جلیس اسے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے تو وہ ایک دم گری اور بے ہوش ہو گئی۔ یہ بڑا دلدوز منظر تھا۔ میں غزالہ کو زندگی میں پہلی بار اتنی شدید بے چارگی کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلو کے بل قالین پر گری تھی اور وہیں ساکت ہو گئی تھی۔ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ایک باہمت لڑکی تھی۔ وہ ڈاکٹر تھی۔ میں نے اسے سنگین ترین حالات میں بڑے دل گردے کے ساتھ اپنے مریضوں کی بیماری سے جنگ کرتے دیکھا تھا۔ آج اگر وہ یوں بے ہوش ہو کر گری تھی تو یقیناً کوئی قیامت ہی تھی جو اس پر گزر رہی تھی۔

اس کے یوں گرنے سے چچا جلیس بھی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔ ہم اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ رحمانی دوڑ کر گیا اور ایک قریبی فلیٹ میں موجود ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ اس انگلش ڈاکٹر نے فوری طور پر غزالہ کو طبی امداد دی۔ ایک انجکشن بھی لگایا۔ غزالہ کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور سانس بہت دھیما چل رہا تھا۔

چچا جلیس غزالہ کا سرد ہاتھ تھامے ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور ان کے چہرے کا غیظ و غضب شدید قسم کی پریشانی میں ڈھل گیا تھا۔ وہ غزالہ کی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے اسے بار بار آوازیں دے رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد غزالہ کی سانس ہموار ہو گئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی بے ہوشی گہری غنودگی میں بدل گئی ہے۔ اسی غنودگی کی حالت میں اس کے خشک ہونٹوں نے دو تین بار حرکت کی۔ اس نے پانی مانگا۔ ہم نے اسے چمچ کے ذریعے تھوڑا سا پانی پلایا۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ پھر متحرک ہوئے۔ شروع میں تو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے کان اس کے ہونٹوں سے قریب کیے تو پتا چلا کہ وہ چچا جلیس سے بات کر رہی ہے۔ غنودگی کے عالم میں بھی وہ التجا کر رہی تھی ''ابو آپ نہ جائیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے ابو.....''

ننھا تابی نجانے کیسے بیدار ہو گیا تھا اور اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا غزالہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی توتلی زبان میں ''امی'' کہہ کر غزالہ کو پکارا اور پھر رونا

شروع کر دیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں تکرار کر رہا تھا ''میں نے امی کے پاس جانا ہے۔''

میں اسے بہلانے میں لگ گیا۔ اگر میں اپنی اصل شکل و صورت میں ہوتا تو اسے بہلانے میں آسانی رہتی لیکن وہ صرف میری آواز ہی پہچان سکتا تھا اور یہ چیز اسے مزید الجھن میں ڈال رہی تھی۔ وہ روتے روتے بار بار میری شکل دیکھنے لگتا تھا۔ اس کا فیڈر تیار رکھا تھا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ میں اس فیڈر کے ذریعے اسے وقتی طور پر چپ کرانے میں کامیاب رہا۔

میرا دل و دماغ شدید کرب کی زد میں تھا۔ مجھے چچا پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی اپنی غرض کی خاطر ہم غزالہ کی کھینچا تانی میں مصروف ہیں اور یہ دیکھے بغیر کہ مختلف اطراف میں کھینچے جانے سے وہ نازک لڑکی تار تار ہو سکتی ہے۔ ہم اپنے اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے تھے۔

میں تابی کے قریب خاموش بیٹھا رہا لیکن میرے دل و دماغ میں شدید قسم کی ہلچل تھی۔ دوسرے کمرے میں عشرت رحمانی، چچا جلیس اور ڈاکٹر وغیرہ غزالہ کے گرد موجود تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ اس کی ہدایت تھی کہ مریضہ کو صدمے سے بچایا جائے اور جسمانی آرام دیا جائے۔

دو پانچ منٹ بعد فلیٹ کا بیرونی دروازہ جھٹکے سے کھلا اور عالم قریشی دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ میں اسے قریباً ایک سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ نسبتاً چوڑا تو پہلے ہی تھا اب تھوڑا سا اور بھی پھیل گیا تھا۔ اس نے سفید کلف دار شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں کچھ پیکٹ وغیرہ تھے۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے ہانک لگائی ''او شاہ جہاں کے بچے کدھر ہے تو..... تیری تلاش میں میں نے دنیا کے چھ چکر لگا لیے ہیں.....''

اپنی ترنگ میں بولتا ہوا وہ آگے آیا تو اس کی نگاہ کمرے کے گمبھیر منظر پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گیا اور اس کی برق رفتار زبان کو اسپیڈ پکڑنے سے پہلے ہی بریک لگ گئے۔ پلک ایک طرف رکھتے ہوئے وہ مجھ سے بغل گیر ہوا۔ اس کی نگاہ ہونقوں کی طرح بے ہوش غزالہ پر جمی ہوئی تھی۔ (میرے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود وہ مجھے پہچان گیا تھا)

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں یار.....'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔ بس غش سا آ گیا تھا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔''

''لیکن غزالہ یہاں..... اور انکل آپ بھی.....؟''

میں عالم قریشی سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن عشرت رحمانی نے قریشی کو اشارہ کیا اور اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا۔

چچا جلیس بدستور غزالہ کے سرہانے بیٹھے تھے۔ انہوں نے غزالہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ جیسے وہ اب بھی غیر ارادی طور پر غزالہ پر اپنی ملکیت ظاہر کر رہے ہوں۔ وہ گاہے گاہے غزالہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اسے پکار بھی لیتے تھے۔ پانچ دس منٹ بعد عالم قریشی بھی ہمارے قریب آن کھڑا ہوا۔ رحمانی نے جو کچھ اسے بتایا تھا، اس کے بعد عالم قریشی کے چہرے پر بھی الم کے گہرے سائے منڈلانے لگے تھے۔ وہ یکسر خاموش تھا۔

میں کمرے میں آیا ہی تھا کہ تابی پھر بدکتا ہوا غزالہ کے سرہانے پہنچ گیا۔ وہ غزالہ کا شانہ جھنجوڑنے لگا اور اسے پکارنے لگا پھر اس نے بڑے معصومانہ انداز میں جھک کر غزالہ کے رخسار پر پیار کیا۔ جیسے وہ اس سے روٹھی ہوئی ہو اور وہ اسے منانے کی کوشش کر رہا ہو۔

دل سے ہوک اٹھی۔ غزالہ کے لیے بھی اور تابی کے لیے بھی۔ کچھ دیر بعد رحمانی اور عالم قریشی باہر چلے گئے تو غزالہ کے پاس صرف میں اور چچا رہ گئے۔ تابی غزالہ کے پاس ہی اس کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا تھا اور فیڈر سے دودھ پی رہا تھا۔

میں نے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چچا! یہ بات آپ بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر میں غزالہ کو عاصم جیسے مگرمچھ کے جبڑے سے نکالنے کی طاقت رکھتا ہوں تو اسے یہاں سے لے جانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں لیکن میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔ چچا! میری آنکھوں میں ہمیشہ بس ایک ہی خواب رہا ہے۔ میں غزالہ کو آپ کی مرضی اور آپ کی دعاؤں کے ساتھ اپنے ساتھ لے جاؤں..... اور اسے اتنی محبت دوں کہ وہ آپ کی نوازشات سے بھی بڑھ کر ہو۔ بس یہی ایک خواب لیے میں برسوں کانٹوں پر چلتا رہا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں۔ اس سفر میں ایسے موقع بھی آئے ہیں چچا جب میں اور غزالہ آپ لوگوں سے ہزاروں میل دور تھے۔ میرے اور غزالہ کے درمیان خدا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایسے موقعوں پر بھی اپنی اور آپ کی عزت کا خیال رکھا ہے اور غزالہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی غزالہ کو آپ سے چھیننا نہیں چاہا۔ میں نے اسے

آپ کی مرضی سے آپ سے مانگنا چاہا ہے اور اب بھی میں یہی چاہتا ہوں۔ وہ جو کچھ ہے پہلے آپ کی بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے آپ کو کرنا ہے۔ میں تو آپ کا وہ بھتیجا ہوں جس کے سر سے بچپن میں ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ شاید ماں باپ کے نہ ہونے سے میرے اندر زندگی کا وہ سلیقہ نہ آیا ہو جو آنا چاہیے تھا۔ میرے اندر کوتاہیاں اور خامیاں رہ گئی ہوں لیکن چچا...... میرے خلوص اور محبت سے آپ انکار نہیں کر سکتے اور نہ غزالہ کر سکتی ہے......"

چچا خاموشی سے میری باتیں سن رہے تھے۔ ان کی ساکت نگاہیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے کہا "آپ غزالہ اور تابی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو میں روکوں گا نہیں۔ بس یہ کہوں گا کہ میں جو کچھ بھی ہوں آپ کے لیے وہی چھوٹا سا جہانی ہوں جسے آپ کان سے پکڑ کر اپنی زندگی سے نکال سکتے ہیں اور اپنی زندگی میں لا بھی سکتے ہیں۔ یہ میرا وعدہ ہے چچا! کہ غزالہ جب بھی میری زندگی میں آئے گی آپ کی مرضی و منشا سے آئے گی۔ میں چچی کی بات نہیں کرتا، ان کا مزاج بہت مختلف ہے۔ میں آپ کی بات کرتا ہوں اور آپ کی بات یہ ہے کہ مجھے وہ غزالہ قبول نہیں جس کے ساتھ آپ کی دعائیں اور آپ کی منشا نہ ہو۔"

ایک دم چچا کو نجانے کیا ہوا۔ وہ اٹھے اور مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر پڑا...... پھر دوسرا...... پھر تیسرا...... پھر انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا، اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ میں نے چچا کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"جہانی! تو نے مجھے ہرا دیا ہے...... میں آج ہار گیا ہوں جہانی۔" وہ بار بار یہ الفاظ دہراتے چلے جا رہے تھے۔

یہ ایسے جذباتی مناظر تھے جنہوں نے رحمانی اور عالم قریشی کی آنکھیں بھی نم کر دیں۔ میں چچا کو سہارا دیتا ہوا صوفے پر لے آیا، اور ان کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرا سر پکڑ کر گود میں رکھ لیا اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ ان لمحوں میں، میں نے واقعی خود کو نوعمر کھلنڈرا جہانی محسوس کیا۔ مجھے لگا جیسے چچا کے ان محبت بھرے ہاتھوں کے لیے میرا سر ایک زمانے سے ترس رہا تھا پھر یہ ہاتھ میرے سر تک کیوں نہیں پہنچ سکے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرے سر اور ان ہاتھوں کے درمیان چچی فاخرہ کا آنچل آ گیا تھا۔ اس آنچل نے چچا اور بے آسرا بھتیجے کے درمیان ایک

ایسی دیوار کھڑی کی تھی جس نے مہر و وفا کے لیے ہر راستہ بند کر دیا تھا۔ چچی فاخرہ کی کھڑی کی ہوئی یہ دیوار اب اتنی بلند ہو گئی تھی کہ اس کی بلندی ہی اس کی شکست کا سبب بننے لگی تھی۔ یہ دیوار لرزنے لگی تھی...... گرنے لگی تھی۔ یہ اس دیوار کا گرنا ہی تو تھا کہ موت کے دہانے پر کھڑی چچی سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہو رہی تھیں۔ وہ میاں جان جیسے لوگوں کے کہنے پر سوگوار بیٹی کے ہاتھوں پر پھر سے مہندی رچا رہی تھیں۔ وہ اندھے یقین کے ساتھ یہ اعلان کر رہی تھیں کہ غزالہ کی فوری شادی ہی ساری نحوستوں بیماریوں اور پریشانیوں کا واحد حل ہے۔ حالانکہ یہ ساری آفتیں اس اندرونی نفرت کا شاخسانہ تھیں جو ازل سے چچی کے دل میں موجود تھی اور اب یہ نفرت ہی میاں جان کی عقیدت کا روپ دھار کر چچی کے اندر سے بول رہی تھی۔ وہ مرنے سے پہلے غزالہ کی بربادی کا "اہم فریضہ" بہرصورت انجام دے دینا چاہتی تھیں۔ جوں جوں ان کی حالت بگڑ رہی تھی اور وہ موت کو نزدیک محسوس کر رہی تھیں توں توں ان کی "عجلت" بڑھتی جا رہی تھی۔ دشمنی اور نفرت کو انجام تک پہنچانے کا یہ انداز بے مثال تھا۔

وہ بڑی عجیب صبح تھی۔ اس انداز سے طلوع ہوئی تھی کہ میری زندگی پر چھائی ہوئی تاریک اور طویل رات بھی اپنی جگہ سے کھسکنے لگی تھی۔ میں آج چچا کا وہ روپ دیکھ رہا تھا جسے دیکھنے کی تمنا میرے دل میں برسوں سے تھی۔ اس روپ کے لیے میں بہت ترسا تھا، بہت تڑپا تھا۔ پتا نہیں کیوں، یہ یقین میرے دل میں ہمیشہ موجود رہا تھا کہ چچا اپنے اوپر بیگانگی کی جتنی بھی تہیں چڑھا لیں ان کے اندر اپنائیت کا چشمہ موجود ہے اور وہ ایک دن ضرور پھوٹے گا۔ کوئی نہ کوئی دن ایسا آئے گا جب میں اس چشمے کو سنگلاخ پتھروں کے اندر سے پھوٹنے پر مجبور کر دوں گا۔ درحقیقت پچھلے دس بارہ برسوں میں مجھے صرف چار پانچ ہی ایسے مواقع ملے تھے جب میں چچا کے ساتھ یکسوئی سے بات کر سکا تھا اور چچی بھی موجود نہیں تھیں۔ وہ ہمیشہ چچا کا سایہ بنی رہتی تھیں...... اور جب وہ نہیں ہوتی تھیں تب بھی ان کا خوف کہیں آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔

لاہور میں غزالہ اور اس کی فیملی کے روپوش ہونے سے چند روز پہلے مجھے ایک موقع ایسا ملا تھا کہ میں تنہائی میں چچا سے دل کی باتیں کہہ سکوں اور اس موقعے پر میں نے گفتگو کے دوران میں چچا کے رویے میں کچھ لچک بھی محسوس کی تھی مگر پھر اچانک یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ریستوران میں چچا کے ساتھ گزارا ہوا وہ تھوڑا سا وقت مجھے آج بھی اچھی

طرح یاد تھا۔

چچا کی آواز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکا دیا۔ انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولے "شفقتا کہاں ہے؟"

آج برسوں بعد چچا کی زبان سے شفقتا کا نام سنا تو یوں لگا جیسے کوئی بہت پیاری گمشدہ شے مل گئی ہو۔ میں نے کہا "چچا! وہ ہم سے بہت دور ہے لیکن جہاں بھی ہے وہ آپ سب کو یاد کرتی ہے اور آپ کی صورتوں کو ترستی ہے۔"

"آہ...... ایک زمانہ ہو گیا اسے دیکھے ہوئے۔ اس کی دو تصویریں آج بھی میری الماری میں پڑی ہیں۔ وہ ایک گڑیا کی طرح ہمارے لان میں کھیل رہی ہے۔ ایک تصویر میں تم بھی ہو۔ تم نے اسے کندھے پر اٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس سے ملاؤ جہانی...... میں اسے چھونا چاہتا ہوں، اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ ضرور ملے گی چچا...... اور وہ سب کچھ ملے گا جو ہم سے چھن گیا تھا۔ جو "جل کوٹ" کے گلی کوچوں میں بکھر گیا تھا۔ اگر آپ میرے ساتھ ہیں چچا تو میں وعدہ کرتا ہوں، میں وہ سب کچھ واپس لے کر دوں گا۔"

غزالہ اب کسمسا رہی تھی۔ اس کی پلکوں میں جنبش ہو رہی تھی۔ ہم اس کے اردگرد جا بیٹھے۔ چچا نے اس کے گال تھپتھپائے۔ میں نے اسے پکارا "غزالہ آنکھیں کھولو۔"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ان آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہمارے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیں پہچان رہی تھی نہ اردگرد کے ماحول کو۔ یوں لگا جیسے اس کی یادداشت کام نہیں کر رہی پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے حواس میں آ گئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے پہلو کی طرف دیکھا۔ تابی اس کے کولہے سے لگا بے خبر سو رہا تھا۔ فیڈر اس کے منہ میں تھا۔ تابی کو اپنے قریب دیکھ کر غزالہ کو اطمینان ہو گیا پھر اس کی نگاہ چچا کے چہرے پر پڑی۔ غم و اندوہ کا تاثر اس کی حسین آنکھوں میں بہت نمایاں دکھائی دیا۔ اس نے ایک دم اٹھنے کی کوشش کی۔ چچا نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا "نہیں بیٹا۔ جی رہو...... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ابو آپ...... ابو آپ......!" وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ آواز گلے میں اٹک گئی۔

چچا نے اس کی پیشانی چومی "تمہیں میرے بچے۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ میں یہیں تیرے پاس ہوں۔ جہانی بھی تیرے پاس ہے۔"

غزالہ کی نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ وہ میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میرے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی کہ میں خوش ہوں یا غزدہ۔ میں نے اس کے سرد ملائم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "غزالہ! تم ٹھیک ہو نا؟"

جواباً اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو ابل پڑے۔ اس کے ایک ہاتھ میں چچا جلیس کی کلائی تھی اور دوسرے ہاتھ کی غیر محسوس گرفت میرے ہاتھ پر تھی۔ اس نے جیسے ایک طرف اپنے باپ کو تھام رکھا تھا اور دوسری طرف اپنے محبوب کو۔ یہ بڑا علامتی سا منظر تھا۔ وہ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی عاجزانہ گرفت ہم دونوں کو اسی چار دیواری کے اندر رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

اب دن کے نو بجنے والے تھے۔ ہم میں سے کسی نے بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ رحمانی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "میں آپ لوگوں کے ناشتے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"نہیں۔ یہ کام تم میرے ذمے رہنے دو۔" عالم قریشی نے کہا "آج میں بڑا خوش ہوں اور جب میں زیادہ خوش ہوتا ہوں تو مجھے بھوک بھی زیادہ لگتی ہے۔ میں اپنے حساب سے ناشتا لاؤں گا۔" اس نے عجیب جذباتی انداز میں کہا اور اپنے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

باپ بیٹی کو تنہائی فراہم کرنے کے لیے میں اور رحمانی بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ غزالہ اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ چچا جلیس اس سے مسلسل تسلی تشفی کی باتیں کر رہے تھے۔ اس دوران میں چچا نے اسپتال فون بھی کیا اور چچی فاخرہ کی خیریت دریافت کرنے کے بعد غزالہ کو اس سے آگاہ کیا۔

کچھ دیر بعد ہم نے بڑے خوشگوار ماحول میں ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران میں عالم قریشی مسلسل بولتا رہا۔ اس کے لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے خوش ہے۔ وہ میرا بے تکلف دوست اور ہمراز بھی تھا۔ میرے اور غزالہ کے مسائل نے عالم قریشی کو بھی برسوں پریشان رکھا تھا۔ ہم دونوں کی خاطر اس نے اپنے انداز میں بڑی منتیں مانی تھیں۔ نیازیں دی تھیں اور پتا نہیں کیا کچھ کیا تھا۔ آج عالم کو دو خوشیاں ایک ساتھ مل رہی تھیں۔ ایک تو یہاں لندن میں میرے ساتھ اس کی اچانک ملاقات ہوئی تھی، دوسرے اس نے چچا جلیس کو بڑے اچھے موڈ میں دیکھ لیا تھا۔

وہ بولا "پچھلے سات آٹھ روز سے میری بائیں آنکھ بری طرح پھڑک رہی تھی۔ میری جھوٹی (بیوی) کا خیال تھا کہ میں لسی کی بجائے اب کافی شافی پینے لگا ہوں اس لیے آنکھ

بھڑک رہی ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ بات کچھ اور ہے یا تو کچھ بہت اچھا ہو جائے گا یا بہت برا ہو جانے گا اور اس اوپر والے کا بڑا کرم ہے کہ بہت اچھا ہو گیا۔"

ناشتے کے بعد چچا جلیس ایک بار پھر غزالہ کو لے کر کمرے میں چلے گئے۔ باپ بیٹی میں طویل بات چیت ہوتی رہی۔ رحمانی کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ شاید چچا جلیس ایک باپ کی حیثیت سے غزالہ کے خیالات بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن میں اس سلسلے میں بالکل مطمئن تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ جو کچھ بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد چچا جلیس غزالہ کے پاس سے اٹھے اور مجھے لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ چچا نے جذباتی انداز میں کہا "شاہ جہاں! تم کیا چاہتے ہو؟"

"چچا! میں وہی چاہوں گا جو آپ چاہیں گے اور غزالہ چاہے گی۔"

"دیکھو جہانی۔ تمہارے اور شفقت کے حوالے سے میرے دل پر ہمیشہ بوجھ رہا ہے لیکن آج یہ بوجھ ایک دم بہت بڑھ گیا ہے۔ میں اس بوجھ کو ہمیشہ کے لیے اتار دینا چاہتا ہوں۔ آج میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جو کچھ تم کہو گے.... مانوں گا۔ بولو تم کیا چاہتے ہو جہانی؟"

"ہم دونوں آپ کے بچے ہیں چچا آپ جو ہمارے لیے سوچیں گے وہ بہتر ہی ہوگا۔"

وہ چند لمحے کھوئی کھوئی نظروں سے میری جانب دیکھتے رہے "کیا تم غزالہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" ان کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

"یہ میری زندگی کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کب کرنا چاہو گے شادی؟"

"مجھے اس کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہو بہتر طریقے سے ہو میرا خواب ہے چچا کہ ہم اپنی جھل کوٹ والی حویلی کو پھر سے آباد کریں۔ اس گھر کی دیواریں ایک مدت سے ہمارا اور ہماری خوشیوں کا رستہ دیکھ رہی ہیں۔ ان دیواروں میں چراغاں ہونا چاہیے، وہاں خوشیوں کی ڈھولک بجنی چاہیے۔ وہ سب کچھ یاد آتا ہے چچا... بہت یاد آتا ہے۔"

"اس کے لیے تو انتظار کرنا پڑے گا جہانی لیکن میں چاہتا ہوں کہ جو بوجھ میرے سینے کو مسل رہا ہے اسے جلد اتار دوں۔ کل کا کوئی بھروسا نہیں ہے جہانی۔ حالات انسان کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی کمزور لمحے میں میرا دماغ پھر ماؤف ہو سکتا ہے۔ میں بہت کمزور شخص ہوں جہانی۔ میری یہی کمزوری ہے جس کے سبب میں آج اپنے بھائی کی روح کے سامنے خود کو شرمندہ محسوس کرتا ہوں۔ میں اس شرمندگی کو اور طول دینا نہیں چاہتا۔ میں آج ہر بوجھ اتار دینا چاہتا ہوں۔"

میں خاموش کھڑا چچا کو دیکھتا رہا۔ وہ ہانپتے ہوئے سے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید انہیں واقعی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا بوجھ ان کے سینے پر دھرا ہے۔ وہ بولے "اگر ہم فوری طور پر یہ شادی نہیں کر سکتے تو پھر ایک اور کام کرتے ہیں، بلکہ.... ہمیں یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔"

"میں سمجھا نہیں چچا۔"

"بس تمہیں سمجھنے کی ضرورت نہیں اور نہ کچھ بولنے کی ضرورت ہے۔ بڑوں کے کاموں میں چھوٹے بولتے نہیں ہیں۔" وہ اپنے ذہن میں خود ہی کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بولے۔

انہوں نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں میں امڈنے والے آنسو پونچھے۔ چند لمحے تک عجیب انداز میں میرا چہرہ دیکھتے رہے.... پھر بولے "شاہ جہاں! میں کل شام تمہیں اور غزالہ کو رشتۂ ازدواج میں باندھ رہا ہوں۔ کل تمہارا نکاح ہو جائے گا۔ رخصتی کی تاریخ ہم بعد میں باہمی مشورے سے طے کر لیں گے۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو چچا یا چچی کی زبان سے سننے کے لیے میرے کان کئی برس تک ترسے تھے۔ ایک جادوئی نغمے کی طرح یہ الفاظ میری سماعت کے راستے میرے پورے بدن میں پھیل گئے اور مجھے اندر سے سرسبز کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چچا کی اس بات کا کیا جواب دوں۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو وہ مجھے ٹوکتے ہوئے بولے "نہیں جہانی.... یہ میرا حکم ہے، اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ تم نے ابھی کہا تھا نا.... کہ تمہاری حیثیت اب بھی ایک بچے کی ہے، میں تمہیں کان سے پکڑ کر جہاں چاہے کھڑا کر سکتا ہوں۔ سمجھو کہ میں نے زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار اپنا حق استعمال کیا ہے۔"

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے چچا.... آپ جیسا کہتے ہیں.... لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ شیخ عاصم واقعی مر چکا ہے۔"

"ہاں جہانی! مجھے یقین ہے۔ کیونکہ تم نے اس کتے کو مردہ حالت میں دیکھا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ غزالہ نے اس سلسلے میں چچا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔

چچا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "بس میں تم سے ایک بات کہوں گا جہانی بیٹا! تم شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہو لیکن تمہاری اور غزالہ کی زندگیاں، عام زندگیوں سے بہت مختلف ہیں۔ وجہ کوئی بھی ہو بہرحال تمہاری بہت سی دشمنیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پولیس کو بھی تمہاری تلاش رہتی ہے۔ دوسری طرف غزالہ کو بھی شدید مشکلات درپیش ہیں۔ شیخ عاصم کے لواحقین اس کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں تمہیں کوئی حکم نہیں دے سکتا بس مشورہ دوں گا۔ تم لوگ کسی دوسرے ملک چلے جاؤ اور چند سال خاموشی سے وہاں گزار دو۔ تابی تو ظاہر ہے تم دونوں کے ساتھ ہی جائے گا۔ اگر ہو سکے تو شفقا اور اس کے منگیتر حمزہ کو بھی ساتھ لے جاؤ...."

میں نے کہا "چچا! میں آپ کی ان باتوں کے جواب میں صرف اور صرف ایک بات کہوں گا اور وہ یہ کہ میری اور غزالہ کی طرف سے آپ کو آئندہ کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اور چچی کو ہماری طرف سے خوشی ہی ملے گی۔"

چچی کے ذکر پر چچا کا چہرہ ملول ہو گیا "وہ اب شاید خوشی اور غم کے مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ کل اسے پانچواں اٹیک ہوا ہے اور میرے خیال میں یہ چھٹا یا ساتواں ہے۔ اس کے دل کا آدھا حصہ بالکل مردہ ہو چکا ہے۔ واحد حل دل کی تبدیلی ہے.... لیکن یہ کام بھی اس کی جسمانی حالت کی وجہ سے آسان نہیں۔ کل رات ڈاکٹروں نے اس کی صحت کی طرف سے خاصی مایوسی ظاہر کی ہے۔"

"کیا ہماری شادی کا ذکر ان کی صحت تو مزید نہیں بگاڑ دے گا؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے جہانی! کہ اب یہ سارے معاملات فائزہ سے پوشیدہ رکھے جائیں گے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت ایسی نہیں کہ وہ اس قسم کے معاملات سے نمٹ سکے۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی تابی بھی ٹہلتا ہوا وہاں آ گیا۔ وہ چچا سے کافی بے تکلف نظر آتا تھا۔ چچا نے اسے تھوڑا سا پیار کر کے گود میں بٹھاتے ہوئے بولے "تابی! غزالہ کو تمہاری ماں کی حیثیت دیتا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کرو گے؟"

"مگر آپ کو معلوم نہیں کہ تابی مجھے بھی غزالہ ہی کی طرح چاہتا ہے۔ میرے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے یہ مجھے پہچان نہیں پا رہا ورنہ آپ اس کی بے تکلفی اچھی طرح دیکھ لیتے۔ تنزانیہ اور موریطانیہ کے طویل سفر میں ہم تینوں ساتھ رہے ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرے ہی ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔" چچا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد چچا غزالہ اور تابی واپس کینٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ کل شام آٹھ بجے کے بعد میں اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ چچا کے گھر پہنچوں گا اور وہاں گواہوں کی موجودگی میں ہم نکاح ادا ہو جائے گی۔ غزالہ کا ڈرائیور رات آخری پہر ہی ہوش میں آ گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ تاریکی میں ایک شخص جیپ گاڑی میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی تکرار ہوئی تھی اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا.... مزے کی بات تھی کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد مجھے پہچاننے میں بھی ناکام رہا۔ اس کی گردن ایک طرف سے سوج گئی تھی اور رہ رہ کر اسے چکر آتے تھے۔ اس کی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ گاڑی ڈرائیو کر سکتا۔ اس کی گاڑی عالم قریشی نے اپنے ڈرائیور کے سپرد کر دی۔ غزالہ، چچا اور تابی دوسری گاڑی میں روانہ ہوئے۔

☆☆☆

عالم قریشی اس صورت حال پر بے حد خوش تھا۔ وہ بار بار مجھ سے معانقہ کر کے میرا منہ چوم رہا تھا۔ کہنے لگا "یار! میں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ تم سے کہیں دور چلا جاؤں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"یار! مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں خوشی سے پاٹ (پھٹ) ہی نہ جاؤں۔ اگر میں پاٹ گیا تو میرے ٹکڑے تمہیں بھی لگیں اور تم دونوں کو بھی نقصان پہنچے گا۔"

رحمانی بولا "بے فکر رہو.... تم نہیں پاٹو گے۔ جو بندہ ایک وقت میں دس کلو لڈو کھا کر نہیں پاٹا، وہ خوشی سے بھی نہیں پاٹ سکتا۔"

عالم قریشی نے رحمانی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "شاہ جہاں! مجھے پتا ہے تم بہت امیر کبیر بن گئے ہو۔ گولڈ ہول پاکستان سے باہر بھی بن رہے ہیں اور آمدنیاں دھڑا دھڑ تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہو رہی ہیں لیکن تمہارا غریب کاروباری دوست بھی اس قابل تو ضرور ہے کہ دس بار...

نروز تمہاری شادی پر خرچ کر سکے۔ خدا کی قسم دونوں کن کھول کر سن لو میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں اس شادی پر میں تمہیں ایک دمڑی بھی اپنی طرف سے خرچ نہیں کرنے دوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دلی ہنوز دور است۔"

"یار! مجھ سے ۔ فارسی زکی مت بولا کر۔ مجھے بس سیدھی سادی زبان میں سمجھا۔"

"میرا مطلب ہے کہ شادی کا مرحلہ ابھی دور ہے اور اگر یہ شادی ہوئی تب بھی میں تمہیں اس دس بارہ کروڑ ہرگز خرچ کرنے نہیں دوں گا۔ دس بارہ کروڑ میں تو سینکڑوں گھروں کے ٹھنڈے چولہے روشن ہو سکتے ہیں۔"

"یار میرے! تم یہ اخباری نمائندوں جیسی باتیں مت کرو۔ آخر ہمیں بھی تو خوشی منانے کا حق حاصل ہے اور یہ خوشی آ بھی تو کتنے انتظار کے بعد رہی ہے پھر یہ بھی مت بھولو کہ میں پکا لاہوری ہوں۔ لاہوری کے تو بچے کا بخار بھی اترے تو وہ تین چار دیگیں چڑھا دیتا ہے۔"

"اگر خدا نے یہ خوشی دکھائی تو ہم بھی منائیں گے مگر اپنے انداز سے۔" میں نے کہا۔

"چلو ایک چھوٹی سی خوشی تو ابھی منائیں۔" عالم قریشی نے کہا "آج دوپہر کا کھانا ریجنٹ پارک میں کھاتے ہیں۔ ایک پاکستانی حاجی قربان علی کا ہوٹل ہے۔ بس اس کے کھانے پر قربان ہونے کو دل چاہتا ہے۔ خدا کی قسم کریلے گوشت تو ایسا پکاتا ہے کہ بندہ دیوانہ ہو جاتا ہے۔ ساتھ میں دہی کی نمکین لسی ہوتی ہے۔ سونے پر سہاگہ تندوری روٹی اور پودینے کی چٹنی..... تمہارے گولڈ ہوٹل کے خانساموں کے خواب وخیال میں بھی ایسی چٹنی نہیں آئی ہوگی۔ بعد میں ٹھنڈا گجریلا کھلاؤں گا۔ یقین کرو تمہارے ڈھڈ (پیٹ) میں روشنی نہ ہو جائے تو مجھے کہنا۔"

میں نے کہا "میں تمہارے ساتھ جا کر ڈھڈ میں روشنی ضرور کراؤں گا...... لیکن اس وقت مجھے بہت جلدی ہے۔ میں جہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہاں کل رات سے میں نے کوئی خیر خبر نہیں پہنچائی ہے۔ سائیں کی چیلی سروج بھی میرے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ میرے بارے میں بہت پریشان ہوگی۔"

"خدا کا واسطہ ہے۔ خدا کا واسطہ ہے۔" عالم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اب اس آوارہ ندرنی کا پیچھا چھوڑ دو۔ اب اگر خدا خدا کر کے تمہاری بات بننے ہی لگی ہے تو اس سائیں کی چیلی کی نحوست اپنے اوپر مت ڈالو...... وہ تمہارے حق میں ہمیشہ بری ثابت ہوئی ہے۔ اس کی نیت ہی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ جب بھی تمہاری طرف دیکھتی ہے ایسے دیکھتی ہے جیسے بھوکی بلی چھچھڑے کو......"

"یا جیسے عالم قریشی کریلے گوشت کو۔" رحمانی نے لقمہ دیا۔

"یار تم بات کو مذاق میں مت ڈالو۔" عالم قریشی نے سٹپٹا کر کہا "میں واقعی پریشان ہو گیا ہوں۔"

عالم قریشی کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر میں دوپہر ڈیڑھ بجے کے قریب واپس آرچ مینشن پہنچ گیا۔ حسب توقع سروج میری روپوشی سے سخت پریشان تھی۔ اس نے تلاش کے لیے کئی طرف گھوڑے دوڑا رکھے تھے۔ ایک گھوڑے کی زیادہ کم بختی آئی ہوئی تھی اور وہ تاجدار تھا۔ تاجدار پچھلے تین چار دن سے میرے ساتھ ساتھ تھا۔ سروج کا خیال تھا کہ اسے میرے بارے میں کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا۔ مجھے دیکھ کر سروج کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی، تاہم اس نے اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات سجائے رکھے۔

تنہائی ملتے ہی وہ پھنکاری "آوارہ بیل کی طرح منہ اٹھا کر کہاں نکل جاتے ہو تم۔ کم از کم بندہ ایک فون ہی کر دیتا ہے۔ ہم نے یہاں آدھا لندن چھان مارا ہے۔"

"میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ گم ہو جاؤں گا۔"

"بات گم ہونے کی نہیں۔ تمہیں پتا بھی تھا کہ یہاں شوٹنگ ہو رہی ہے۔ تمہاری حیثیت یہاں پروڈکشن کنٹرولر کی ہے۔ تمہیں ان اشیاء کی لسٹ دی گئی تھی جو شوٹنگ کے لیے درکار ہیں اور تم کل سے اس لسٹ سمیت غائب ہو۔"

"میں وہ چیزیں ڈھونڈنے ہی نکلا ہوا تھا۔ چیل کے باجے اور رنگ دار غبارے کہیں سے نہیں مل رہے۔ یہاں کے بچے کچھ اور طرح کے غباروں سے کھیلتے ہیں۔" میں نے سڑے لہجے میں کہا۔

"دیکھو یہ مذاق نہیں ہے شاہ جہاں..... اگر منوہرا دیوی اور ان کے کارندوں کو کسی طرح کا شبہ ہو گیا تو ہمارا بھرکس نکل جائے گا۔ کم از کم میرے اور اپنے بہروپ کا ہی خیال رکھو یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ پرسوں ایکسٹراز کے لڑکیوں کی ایک اور کھیپ یہاں پہنچ رہی ہے۔ تیسری کھیپ نے ایک دن بعد پہنچنا تھا لیکن وہ کچھ لیٹ ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ہمیں اس شیڈول سے کچھ زیادہ یہاں رکنا پڑے گا۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

اس نے لمبی آہ کھینچی "چاہتی تو بہت کچھ ہوں...... لیکن کبول میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم تو پتا نہیں کہ

سوکنوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہو۔ رات رات بھر غائب رہتے ہو۔"

"شکر کرو میں دن کو آ جاتا ہوں۔ اگر ایسے ہی بک بک کروگی تو بالکل غائب ہو جاؤں گا۔ مجھ سے کوئی کام کی بات کرو۔ ورنہ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

"ایک کام کی بات بھی ہے۔" وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

"کیا؟"

"کچھ دیر پہلے غزالہ یہاں آئی تھی۔" وہ شرارت سے بولی۔

میں جان گیا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ میں اٹھ کر چل دیا

"اررر...... تم تو ناراض ہی ہو گئے ڈارلنگ! میں شما چاہتی ہوں۔" وہ میرا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

"دیکھو۔ یہ آخری وارننگ ہے۔ اگر تم نے سنجیدہ نہیں ہونا تو میں تم سے بات کرنا بند کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے، اب کام کی بات کرتی ہوں۔" وہ صوفے پر اس طرح بیٹھتے ہوئے بولی کہ جسم کے سارے ہوشربا زاویے نمایاں ہو گئے۔

وہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، اپنی طرف سے غزالہ کا ذکر اس نے شرارتاً کیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ غزالہ واقعی یہاں لندن میں موجود ہے، اور میں اس سے مل بھی چکا ہوں۔ آج کل سروج کی ساری تیزی طراری اس وجہ سے تھی کہ وہ غزالہ کو "گمشدہ" تصور کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ غزالہ نے مجھے ہمیشہ کے لیے سرخ جھنڈی دکھا دی ہے۔ اب میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہوں۔ وہ اپنی دانست میں اپنی ہوشربا جوانی کی گوند سے مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے جام میں اپنے لیے تھوڑی سی بیئر انڈیلی اور بولی "آج صبح دس بجے کولمبو سے منوہرا دیوی کا فون آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ پرسوں شام تک لڑکیاں پرنس داراب کے حوالے کر دی جائیں۔ پرنس داراب سے منوہرا دیوی کے معاملات طے ہو چکے ہیں۔ اس ڈیل کی ایک فوٹو کاپی پرنس داراب کے پاس موجود ہے۔ وہ فوٹو کاپی پرنس داراب اپنے ساتھ لائیں گے...... اور اس کی پشت پر لڑکیوں کی وصولی سائن کر دیں گے۔"

"یہ تو واقعی سنجیدہ معاملہ ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہوگی، لیکن میری تجویز تو یہی ہے کہ اس مرحلے میں ہمیں کسی طرح کی مہم جوئی کر کے خود کو مشکوک نہیں ٹھہرانا چاہیے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ گاتی گڑیوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے ہو جانے دیں۔"

"یہ ہماری مجبوری ہے شاہ جہاں۔ ہمیں اپنا بہروپ ہر صورت قائم رکھنا ہے کیونکہ یہ بہت قیمتی ہے۔ آشا ہے کہ یہ بہروپ ہمیں بغیر کسی خون خرابے کے کنگ براؤن تک پہنچا دے گا اور کنگ براؤن تک پہنچنا جتنا کٹھن ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن یہ بات بہت دکھ دینے والی ہے۔ پتا نہیں پاشا ان لڑکیوں کو بچانے میں کیوں کامیاب نہیں رہا۔"

"وہ کیا کہتے ہیں ڈارلنگ..... ہونی ہو کر رہتی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ پرنس داراب ان لڑکیوں کو کہاں لے جائے گا؟"

"بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ لندن کے مضافات میں بھی اس کا کوئی عشرت کدہ موجود ہے۔ ویسے سنا ہے کہ وہ برونائی واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ لڑکیوں کو یہاں سے بحفاظت لے جانے کے لیے داراب کیا طریقہ استعمال کرے گا لیکن سروج کو فی الحال اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ بولی "ہماری ذمے داری لڑکیوں کو بس "ہینڈ اوور" کرنے تک ہے۔ یعنی مال کی ڈلیوری ہمارے فرائض میں شامل نہیں۔"

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں دیر تک بے چین رہا۔ SINGING DOLLS کی من موہنی صورتیں بار بار نگاہوں میں گھوم جاتی تھیں۔ ان کا ہنسنا بولنا گانا سب کچھ اپنے اندر ایک بے پناہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔ اب یہ دلنواز معصومیت خطرناک شیطانیت کی زد میں تھی۔ رات کافی دیر تک جاگنے کے بعد میں سو گیا۔ صبح سویرے جو پہلا ٹیلی فون آیا وہ عالم قریشی کا تھا۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان بے تکلف جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر عالم نے نادرشاہی حکم جاری کیا کہ میں فوراً سے پہلے ہوٹل نیو مون پہنچوں۔ عالم قریشی نے قسم کھاتے ہوئے کہا کہ ہوٹل نیو مون کا ناشتا پورے لندن میں بہترین ہے اور اگر لندن آنے والا اس شاہی ناشتے سے محروم رہے تو اس سے بڑا بدقسمت اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا "قریشی! ابھی میں لندن میں ہی ہوں۔ اس "بدقسمتی" سے خود کو پھر کسی اور دن بچا لوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا "دیکھو شاہ جہاں! تم نے کل بھی حاجی قربان والی پیشکش کو ٹھکرایا ہے اگر آج بھی اسکی بیٹی کی نوچ بچ پھندا ہو جائے گا۔ میں تمہاری رہائش گاہ پر آ کر بقلم خود تم سے کشتی کروں گا۔ تم لڑائی کنائی میں بے شک مجھ سے بہت تیز ہو لیکن میرے روکلو کے مُکے کا بھی تمہیں پتا ہی ہے۔ ایک بھی پڑ گیا تو تمہاری ناک پکوڑا بن جائے گی اور شام کو نکاح پر کھینچی جانے والی ساری تصویروں میں یہ پکوڑا نظر آئے گا۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ یہاں پہنچ جاؤ۔ تمہاری رہائش گاہ سے بس دو کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ٹیکسی پانچ منٹ میں پہنچا دے گی۔"

میں نے صبح سویرے نازل ہونے والی اس آفت کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن یہ ٹلنے والی نہیں تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق نہا کر کپڑے گھسیٹے اور آرچ مینشن سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔ اونچی چھت والی ٹیکسی کے ایک مہذب ڈرائیور نے دس منٹ میں مجھے ہوٹل نیوموون پہنچا دیا۔ عالم قریشی سے بیرونی دروازے پر ہی ملاقات ہوئی۔ وہ کھڑکھڑاتی سفید شلوار قمیص پہنے، پاؤں میں لاہوری گرگابی چڑھائے، میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہو گیا "آج بڑا مبارک دن ہے شاہ جہاں! مجھے لگتا ہے کہ ہر شے گا رہی ہے ناچ رہی ہے۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آج کے اس مبارک دن میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے لندن کے بہترین پاکستانی حلوائی کو مٹھائی کا آرڈر دے دیا ہے اور اپنے منیجر کو چھوہاروں کا انتظام کرنے کو بھی کہہ دیا ہے۔ چھوہارے یہاں مشکل سے ملیں گے لہٰذا میں نے احتیاطاً اسے دھمکی دے دی ہے کہ اگر وہ چھوہارے نہ ڈھونڈ سکا تو شام تک وہ نوکری سے فارغ ہو جائے گا۔"

"تم نے بڑا نیک کام کیا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ان سنی کرتا ہوا مجھے اندر لے گیا۔ یہاں لابی میں ایک نہایت معقول صورت ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اس کے قریب ہی گنجے سر والا ایک انگریز بھی بیٹھا تھا۔ دونوں ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ادھیڑ عمر گندمی شخص نے مجھ سے مصافحہ کیا پھر انگریز نے ہاتھ ملایا۔

عالم قریشی ادھیڑ عمر شخص کا تعارف کراتے ہوئے بولا "یہ یہاں کے سب سے پرانے اور ہنرمند ڈریس ڈیزائنر علی بھائی ہیں۔ ان سے کوٹ اور شیروانیاں سلوانے کے لیے لوگ مہینوں انتظار کرتے ہیں۔" پھر وہ ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "علی بھائی! آپ اپنا کام کریں۔"

علی بھائی نے اپنی واسکٹ کی جیب میں سے ایک فیتہ نکالا اور بڑی شائستگی سے میرا ناپ لینا شروع کر دیا۔ وہ بڑی ملائم آواز میں بولتے گئے اور گنجا انگریز ایک نوٹ بک پر سائز لکھتا گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر علی بھائی کی پُروقار شخصیت کو دیکھتے ہوئے ہونٹ سی لیے۔

وہ ناپ لے چکے تو عالم قریشی نے معنی خیز انداز میں کہا "علی بھائی! شام پانچ بجے۔"

"ان شاء اللہ۔" شائستگی سے جواب دیا گیا۔

علی بھائی اور گنجے انگریز نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور لابی سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد عالم قریشی نے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک انڈین کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر آیا۔ مجھے نمستے کی اور پھر بغیر کچھ کہے سنے میرے پاؤں کا ناپ لینا شروع کر دیا۔ اس نے پاؤں کے نیچے ایک دھاتی پلیٹ رکھی اور لمبائی چوڑائی نوٹ کر لی۔

"قریشی! یہ کیا بکھیڑا ہے یار۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"خاموش۔ ایسے موقعوں پر اچھے بچے بولتے نہیں۔" اس نے ڈانٹا۔

انڈین جو غالباً ہندو تھا، عالم قریشی سے مخاطب ہو کر بولا "میں دو تین جوڑے ڈھونڈ چھوڑوں گا پھر ان میں سے آپ کو پسند آ جائے۔"

"کوئی نام نقلی نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ اس کی چنتا ہی نہ کریں جناب!" انڈین نے انکساری سے کہا۔

عالم قریشی نے انڈین کو ایک طرف لے جا کر اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی پھر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے روانہ کر دیا۔

میں سمجھ گیا کہ ناشتے کا تو صرف بہانہ ہی تھا، عالم قریشی کچھ چاؤ چونچلے کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو اسے لاہوریا کون کہتا۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر ہم ناشتے کی طرف بڑھے۔ ناشتا واقعی شہنشاہی تھا۔ درجنوں قسم کے جوس۔ آملیٹ..... جام..... اور..... سویٹ ڈشز اور پتا نہیں کیا کچھ۔ سب کچھ بڑی بڑی رکابیوں اور ڈونگوں میں رکھا تھا بوفے ٹائپ انتظام تھا۔

ہم اس عظیم الشان ناشتے سے فارغ ہو کر لابی میں بیٹھے۔ عالم قریشی کی زبان ایک بار رواں ہوئی تو پھر [illegible] چلی گئی۔ بہت سی باتیں تھیں۔ بہت سے سوال تھے..... بہت

سی وضاحتیں تھیں۔ بہت سی تلخ اور شیریں یادوں کا تبادلہ ہوا۔ اس گفتگو میں صفدر کی معذوری اور ساہی صاحب کی موت کا ذکر سب سے گمبھیر تھا۔ عاصم کا ذکر بھی ہوا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ عالم قریشی کو فی الوقت عاصم کی موت کے متعلق نہ بتاؤں۔ ہم باتوں میں یوں کھوئے کہ وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ایک بجنے والا تھا۔ ابھی ابھی ناشتا معدے سے نیچے نہیں کھسکا تھا کہ لنچ کا وقت ہو گیا تھا۔ عالم قریشی کی باتوں سے پتا چلا کہ آج کل اس کی کاروباری بہت اچھی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ عالم قریشی نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر سکیورٹی گارڈز کی فراہمی کا کام بھی شروع کیا تھا۔ اس کام میں عالم قریشی کی حیثیت شروع میں سلیپنگ پارٹنر کی تھی لیکن اب وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔ مذکورہ ایجنسی گراں معاوضے پر معروف اور دولت مند لوگوں کو تربیت یافتہ گارڈز فراہم کرتی تھی اور اس فیلڈ میں ایجنسی کو کافی تجربہ تھا۔

عالم قریشی مجھے اپنے اس نئے کام کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے کہا "پچھلے ایک مہینے سے ہم نے لیڈی گارڈز کی فراہمی بھی شروع کر دی ہے۔ دراصل شاہ جہاں! مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں ہر بندہ اندر سے ڈرپوک ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انگریز بہت پڑھا لکھا اور تہذیب والا ہے۔ یار! یہ کیسی تہذیب اور کیسی پڑھائی لکھائی ہے، دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ لوگ گھروں کے دروازے بند کیے خرگوشوں کی طرح سہمے بیٹھے رہتے ہیں۔ گاڑی پارک کرو تو اس کو سو سو زنجیریں ڈالنی پڑتی ہیں۔ جیب میں کیش رکھ کر بازار جاتے ہوئے بندہ سوچتا ہے کہ یہ میرے کام آئے گا یا کسی اچکے کی ضرورت پوری کرے گا۔"

"چلو ٹھیک ہی ہے۔ تمہارا کام تو صحیح چل رہا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"چل کیا رہا ہے، بھاگ رہا ہے شہزادے۔ پرسوں ایک پرنس کے لیے کلکتے سے ایک اسپیشل گارڈ منگوایا ہے ہم نے۔ بہت زبردست قسم کا جی دار گارڈ ہے۔ یو ایس اے میں بہادری کے کئی تمغے جیت چکا ہے۔ ہالی وڈ کے چند ٹاپ اسٹارز کے علاوہ ٹینس کے عالمی چیمپئن کے لیے بھی سروس کر چکا ہے۔ اس کا ایک ہفتے کا معاوضہ قریباً بیس ہزار ہرمیں ڈالر بنتا ہے۔ یعنی قریباً تین ہزار ڈالر روزانہ....."

پرنس کے ذکر کو میں نے عام سے انداز میں لیا لیکن جب اس حوالے سے گفتگو تھوڑی سی آگے بڑھی تو میں چونک گیا۔ اس پرنس کا تعلق برونائی سے تھا اور پھر مجھ پر یہ زبردست انکشاف ہوا کہ عالم قریشی پرنس داراب کی بات کر رہا ہے۔ وہی داراب جو کل شام تک لڑکیوں کی "ڈیلیوری" لینے آ رہا تھا۔ اس معاملے میں میری گہری دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے عالم قریشی نے کہا "لگتا ہے کہ تم اس داراب نامی بندے کو جانتے ہو۔"

"جانتا ہوں اور کسی حد تک پہچانتا بھی ہوں۔ یہ شخص ایک نمبر کا رنگ باز ہے اور آج کل منوہر ارایری کے لیے بہت منافع بخش گاہک بنا ہوا ہے۔"

میں نے عالم قریشی کو منوہر اور گلابی گڑیوں کے حوالے سے مختصراً بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اگلے ایک دو دن میں ان لڑکیوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

عالم قریشی کو پرنس داراب کے بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں۔ اس نے بتایا "پرنس داراب کا "ونچسٹر" میں شاندار محل نما گھر ہے۔ یہ گھر اس نے پچھلے دنوں ہی کئی لاکھ پاؤنڈز میں خریدا ہے۔ لاکھوں پاؤنڈز اس کی آرائش وغیرہ پر خرچ ہوئے ہیں۔ لندن کے امیر طبقے میں پرنس شاہ خرچ کے طور پر مشہور ہو رہا ہے۔"

مجھے اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے عالم قریشی سے پرنس داراب کی مصروفیات، اس کے مشاغل اور حفاظتی انتظامات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں..... عالم قریشی کو جو کچھ معلوم تھا اس نے مجھے بتایا۔

بعد ازاں عالم قریشی مجھے اپنی سیکیورٹی فراہم کرنے والی ایجنسی "ایور ریڈی" کا دفتر دکھانے لے گیا۔ دفتر کے ٹھاٹ باٹ سے نظر آتا تھا کہ عالم اور اس کا پارٹنر واقعی پیسہ کما رہے ہیں۔ "ایور ریڈی" ہی یہ ادارہ بلٹ پروف جیکٹس..... بلٹ پروف شیشے..... کلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم اور اس قسم کی بہت سی اشیاء بھی فراہم کرتا تھا۔ میل اور فی میل گارڈز صحت مند تھے اور خاصے تربیت یافتہ بھی نظر آتے تھے۔ ایجنسی کی بلڈنگ کی سیر کرتے ہوئے مجھے وہ اسپیشل گارڈ یاد آیا جو عالم کے بقول پرنس داراب کے لیے کلکتے سے منگوایا گیا تھا۔

"میں تمہارے اس اسپیشل گارڈ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے عالم قریشی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ ابھی یہیں ہے۔" عالم قریشی نے کہا۔

ہم دونوں ایک اندرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ گارڈ باتھ روم میں گھسا ہوا تھا۔ میں اس کے دیدار سے محروم رہا۔ عالم قریشی کو لنچ کی جلدی تھی۔ وہ مجھے خالص پاکستانی لنچ کرانا چاہ رہا تھا اور اپنے گھر میں کرانا چاہ رہا تھا۔ چار روز

چار مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔ عالم قریشی کی پہلی بیوی جسے وہ بڑی کہتا تھا پاکستان میں ہی تھی، وہ اپنی ''چھوٹی'' کو یہاں لایا ہوا تھا۔ عالم قریشی کا گھر ریجنٹ پارک کے علاقے میں ہی تھا۔ اچھا کشادہ بنگلہ تھا۔ لندن جیسے مہنگے علاقے میں بھی اس نے گھر میں تین چار نوکر رکھے ہوئے تھے۔ عالم قریشی کی ''چھوٹی'' بڑے تپاک سے ملی۔ وہ کھانا پکانے میں ماہر تھی اور کیوں نہ ہوتی آخر کو وہ عالم قریشی کھابہ گیر کی بیوی تھی۔ وہ شکل و صورت میں ''بڑی'' سے بہتر نہیں تھی لیکن ''بڑی'' کی خامی یہی تھی کہ وہ عالم قریشی کے پیٹ کو مزے دار طریقے سے بھرنے کا فن نہیں جانتی تھی۔ جن دنوں میں لاہور گلبرگ میں عالم قریشی کے پڑوس میں قیام پذیر تھا، چھوٹی اور بڑی میں زور دار لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ انہی دنوں یہ دلچسپ واقعہ بھی ہوا تھا کہ عالم قریشی گوجرانوالہ سے چڑے لے کر آیا تھا اور یہ چڑے ''بڑی'' کو پکانے کے لیے دے دیے تھے۔ بڑی نے سالن زیادہ کرنے کے لیے ایک کلو چڑوں میں تین کلو گوشت ڈال دیا تھا اور رات کو کھانے کے وقت عالم کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

ریجنٹ پارک کے اس شاندار گھر میں عالم اور اس کی چھوٹی نے میری خوب آؤ بھگت کی...... دستر خوان کافی لمبا چوڑا تھا۔ کئی قسم کا گوشت...... مچھلی کے کباب...... دیسی گھی کے پراٹھے...... یخنی میں پکے ہوئے چاول اور پتا نہیں کیا کچھ۔ عالم نے حسبِ معمول دو ڈھائی کلو گوشت پیٹ میں اتار لیا تو پہلی ڈکار لی۔ میں جانتا تھا کہ ڈھائی کلو والی کم از کم دو ڈکاریں وہ اور لے گا۔ کھانے کے آخر میں عالم کی پسندیدہ زرین سویٹ ڈش ربڑی بھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ قصہ مختصر عالم کے گھر ہم نے بھرپور کھانا کھا کر بھرپور وقت گزارا اور کئی پرانی شیریں یادیں تازہ کیں۔

☆☆☆

گھر سے نکلتے نکلتے شام کے چار بج گئے۔ عالم قریشی نے مجھے کھینچ کر اپنی شاندار مرسیڈیز میں بٹھایا اور لندن کے وسطی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔

''اب کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟''

''آج کا دن تمہارے بولنے کا نہیں۔ بس سننے کا ہے۔''

''مگر بندۂ خدا، صبح سویرے کا گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ کسی کو کچھ بتایا ہے نہ فون کیا ہے۔''

''اس اُلو کی پٹھی سے تو ایسے ڈرتے ہو جیسے اس کے ساتھ پھیرے لے رکھے ہیں تم نے۔''

''پھیروں کی بات نہیں...... میں یہاں ایک بڑی انٹرنیشنل فلم کے پروڈکشن کنٹرولر کی حیثیت سے موجود ہوں۔ اس بہروپ کا بھرم بھی تو رکھنا ہے۔''

''آج تم کچھ نہیں ہو۔ آج تمہارا کوئی روپ نہیں۔ آج تم صرف دولہا ہو اور تمہارا نکاح ہو رہا ہے۔''

''لیکن اب مجھے لے جا کہاں رہے ہو؟''

''ہم پھر سے ایور ریڈی کے دفتر جا رہے ہیں تمہارے چہرے کا میک اپ اتارنے اور چڑھانے کے لوازمات موجود ہیں۔ تم نے جو یہ سوانگ رچا رکھا ہے اسے میں ختم کرانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ نکاح جیسی اہم رسم کے وقت بھی تمہارے چہرے پر مصنوعی چہرہ سجا ہوا ہو۔''

''نہیں بھئی نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''تمہاری سب باتیں مان رہا ہوں لیکن یہ بات ماننے والی نہیں ہے۔ اس میں میرے لیے بہت خطرات پوشیدہ ہیں۔''

''یار! صرف ایک دن کے لیے اپنا اصل بوتھا دکھا دو۔ میں تو ترس گیا ہوں۔''

''میرا زندہ سلامت ہونا تمہارے لیے زیادہ اہم ہے یا اصل بوتھا؟''

اس سلسلے میں ہمارے درمیان تھوڑی سی تکرار ہوئی۔ آخر عالم کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی تھامتے ہوئے وہ بولا ''اچھا تو پھر میرے ساتھ پرائڈ مارکیٹ چلو۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''وہاں بہت سے بیوٹی پارلر ہیں اور ہیئر ڈریسرز وغیرہ ہیں۔ وہاں چل کر کٹنگ کرواتے ہیں۔ نہاتے دھوتے ہیں اور ذرا فریش ہوتے ہیں۔ ابھی علی بھائی سے فون پر بات ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ شیروانی تیار ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا...... تمہارے لیے خاص قسم کے سلیم شاہی جوتے بھی خریدے جا چکے ہیں۔ مٹھائی تیار ہو چکی ہے۔ دس کلو چھوہارے بھی آ گئے ہیں۔''

''دس کلو چھوہارے؟ وہاں تو دس مہمان بھی شاید نہیں ہوں گے۔''

''وہ چھوہارے اور مٹھائی گھر والوں کے لیے تھوڑی ہے...... وہ تمام عام لوگوں میں بانٹنے کے لیے ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ہائیڈ پارک میں چلا جاؤں۔ پہلے وہاں ''محبت کی شادی'' پر تھوڑی سی تقریر کروں اس کے بعد چھوہارے اور مٹھائی بانٹنا شروع کر دوں۔''

''اب شاید تم چاہتے ہو کہ میں دولھوں کی طرح منہ پر رومال رکھ کر شرمانا شروع کر دوں...... اگر ایسی کوئی غلط فہمی ہے تو دور کر لو...... دوسری بات یہ ہے کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے اور کہیں بھی جانے سے پہلے، میں ایک دو فون کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ مہربانی گاڑی کسی فون بوتھ کے سامنے روکو۔''

عالم قریشی نے میری درخواست مانتے ہوئے گاڑی فون بوتھ کے سامنے روک لی...... میں تاجدار کو کال کرنا چاہتا تھا۔ ایک کال چچا کو کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے میں نے آرچ مینشن کے نمبر ڈائل کیے اور سروج سے بات کی۔ فون سروج نے خود ہی اٹھایا تھا۔ اس نے ''ہیلو'' کہا اس کے اس ایک لفظ سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ پریشان ہے۔

''شاہ جہاں! یہ کیا ناٹک رچا رکھا ہے تم نے۔ تمہارے جانے کا کچھ پتا چلتا ہے نہ آنے کا۔ صبح سویرے سے نکلے ہوئے ہو۔''

''تمہاری دُم پر کیوں پاؤں آ رہا ہے۔ میں تمہاری مرضی کا غلام نہیں ہوں...... اگر طبیعت خراب ہے تو ذرا بن ٹھن کر سڑک پر نکل آؤ...... پاؤں چاٹنے والے بہت سے سفید اور رنگ برنگے کتے یہاں مل جائیں گے۔''

''دیکھو شاہ جہاں...... میں کسی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ یہاں ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ تمہاری SINGING DOLLS کو لے کر چلا گیا ہے۔''

''کون چلا گیا ہے؟''

''وہی پرنس داراب...... وہ کل کے بجائے آج ہی آ گیا ہے۔ منوہرا ریوی کا بھی فون آ گیا تھا کہ پرنس صاحب آج ہی آ رہے ہیں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ لڑکیاں حوالے کر دوں۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے وہ لڑکیوں کو یہاں سے لے گئے ہیں۔ میں اطلاع دینے کے لیے تمہیں ڈھونڈتی رہی ہوں لیکن تم تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتے ہو......''

''یہ تو بڑا برا ہوا ہے۔ کیسے لے کر گیا ہے وہ لڑکیوں کو؟'' میرے لہجے میں گہری سنجیدگی اتر آئی۔

''وہ خود لے کر نہیں گیا۔ اپنے تین چار کارندوں کو وہ یہاں آرچ مینشن چھوڑ گیا تھا۔ ان میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ لڑکیوں کو دوپہر کے کھانے میں خواب آور دوا دی گئی پھر تھوڑی سی دوا کافی میں بھی ملا کر دی گئی۔ وہ جب وہاں سے لے جائی گئیں تو تقریباً بے ہوش تھیں۔ وہ لوگ تاریک شیشوں والی ایک اسٹیشن ویگن لے کر آئے ہوئے تھے۔ تینوں کو اس ایئر کنڈیشنڈ ویگن میں لٹا دیا گیا تھا۔''

مایوسی اور غصے کی ایک لہر پورے بدن میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بدترین واقعہ رونما ہو گیا تھا جس کا اندیشہ تھا...... سروج نے مجھے اسٹیشن ویگن کا نمبر بتایا اور ''رچمنڈ'' کی اس محل نما کوٹھی کے بارے میں بھی بتایا جہاں SINGING DOLLS کو لے جایا جانا تھا۔ اس کوٹھی کے بارے میں کچھ دیر پہلے مجھے عالم قریشی سے بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اچانک میرا ذہن اس انڈین گارڈ کی طرف منتقل ہو گیا۔ جس کا ذکر عالم قریشی نے کیا تھا...... یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ آج میں داراب کے پیچھے جانے کا سوچ رہا تھا اور آج ہی مجھے ایک ایسے گارڈ کے بارے میں معلوم ہوا تھا جو اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کے لیے داراب کی رہائش گاہ پر جا رہا تھا۔ مجھے یہ اتفاق...... تائید غیبی کی طرح محسوس ہوا۔

سروج آرچ مینشن میں اپنے ذاتی فون سے بات کر رہی تھی۔ وہ یہ فون محفوظ تصور کرتی تھی لیکن پھر بھی اس میں رسک موجود تھا۔ میں نے ایک دو ضروری باتیں کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ باقی دو فون کالیں کینسل کرنے کے بعد میں جلدی سے گاڑی میں آ بیٹھا۔

''کیا ہوا؟'' عالم قریشی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ اپنی ایجنسی کے دفتر چلو۔''

''لیکن یار ہم تو ہیئر ڈریسر......''

''ہیئر ڈریسر پر ابھی لعنت بھیجو۔ جو میں بتاتا ہوں وہ کرو۔ فوراً ایجنسی کے دفتر چلو۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ برا سا منہ بنا کر رہ گیا...... قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ''ایور ریڈی'' کے مرکزی آفس میں موجود تھے۔ میرے ہاتھ میں انڈین سیکورٹی گارڈ امریش کا شناختی کارڈ اور لائسنس وغیرہ تھا۔ شناختی کارڈ اور لائسنس پر سے امریش کی تصویر ہٹانے اور میری لگانے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ یہ کام عالم کی ایجنسی کے ہی ایک بندے نے اسپیشلسٹ سے کروایا۔ اب نہایت غور سے دیکھے بغیر اس تبدیلی کو نوٹ کرنا ممکن نہیں تھا۔

عالم قریشی بار بار دانت پیس رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے حرکت میں تھیں۔ ہمیں آٹھ بجے کینٹ میں چچا جلیس کے گھر پہنچنا تھا اور اب چھ بج چکے تھے۔ ''یار صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کر رہے ہو......؟'' وہ جھنجھلا کر

"تم ان کو فون کر دو کہ شاید ہم کچھ لیٹ ہو جائیں۔ لندن تو ساری رات جاگتا ہے۔ ہم دس گیارہ بجے بھی پہنچ جائیں گے تو رسم ادا ہو جائے گی۔ اصل بات تو نکاح کی ہوتی ہے..... اور میرے بڑے بھائی وہ دو چار منٹ میں ہو سکتا ہے۔"

"لیکن مجھے نہیں یقین کہ تم دس گیارہ بجے وہاں پہنچ سکو گے۔"

"اگر نہیں پہنچ سکا تو بھی یہ کام کل ہو جائے گا۔"

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے شاہ جہاں..... اپنی زندگی کے اتنے خاص دن کو بھی تم اس طرح برباد کر رہے ہو۔ غزالہ کیا سوچے گی..... اس کے والدین کیا کہیں گے۔"

"بھائی میرے..... ان سے میرا کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے اور نہ میں چھپانا چاہتا ہوں..... میں جیسا ہوں وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ تم آج تک مار دھاڑ ہی کرتے رہے ہو نا۔ آج کا دن نہیں کرو گے تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ ان لڑکیوں کے ساتھ اتنی جلدی کچھ نہیں ہو جائے گا۔ ابھی ایک دو دن وہ وہاں محفوظ ہی رہیں گی۔"

"کیا تم اس بات کی گارنٹی دے سکتے ہو۔"

"اور کیا تم نے پوری دنیا کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟ دوگانے بجانے والی لڑکیاں ہیں۔ تم انہیں معصوم سمجھ رہے ہو۔ اللہ جانے وہ ہیں بھی یا نہیں۔ تم ان کے لیے اپنے آپ کو اتنے خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو..... اگر ان لڑکیوں کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری ہے تو میں کرتا ہوں۔ اگر مار دھاڑ ہی کرنی ہے تو اس کا بھی پورا انتظام موجود ہے لیکن میں تمہیں جانے نہیں دوں گا..... یہ میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

ہمارے درمیان پانچ دس منٹ تک خوب بحث ہوئی پھر عالم تندرے ڈھیلا نظر آنے لگا۔ آخر میں اسے ہم رضامند کرنے میں کامیاب رہا۔ ہم نے وہیں سے چچا جلیس کو فون کیا..... انہیں پروگرام میں تبدیلی کے بارے میں بتایا۔ وہ مایوس تو ہوئے لیکن اپنی مایوسی انہوں نے کھل کر ظاہر نہیں ہونے دی۔

عالم قریشی نے چچا سے کہا "میں آپ کو نو بجے کے قریب دوبارہ فون کروں گا اگر اس وقت تک ہم فارغ ہو گئے تو بتا دیں گے ورنہ پھر کل شام آٹھ بجے کا وقت رکھ لیں گے۔"

چچا جلیس نے کہا "اس کنفیوژن سے بہتر ہے کہ پھر کل کا وقت ہی رکھ لیا جائے۔"

ہم نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے چچا کو بتایا تھا کہ ایک دوست کی عزیزہ سخت بیمار ہیں اور مجھے ان کے لیے وقت دینا پڑ رہا ہے۔ (فوری طور پر یہی ایک معقول بہانہ میری سمجھ میں آیا تھا)

گفتگو کے آخر میں، میں نے چچا سے چچی فاخرہ کی خیریت بھی دریافت کی۔ چچا نے بتایا کہ وہ اب قدرے بہتر ہیں لیکن ابھی آئی سی یو میں ہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چچا اور غزالہ ان کے پاس سے ہی آئے تھے۔ اب آفرین وہاں موجود تھی۔

چچا سے بات ختم کرنے کے بعد میں "دچسٹر" جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

میں انڈین سیکورٹی گارڈ امریش کی حیثیت سے داراب کی رہائش گاہ پر جا رہا تھا۔ امریش..... عالم قریشی کی حفاظتی تحویل میں تھا۔ امریش اور میرے قد کاٹھ میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ شاید مجھ سے ایک ڈیڑھ انچ چھوٹا ہوگا۔ اس کی نیلی وردی اپنے جسم پر فٹ کرنے میں مجھے کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ امریش کے سارے کوائف اور دیگر باتیں میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھیں۔ وہ ہندی آمیز اردو بولتا تھا اور دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا..... داراب یا اس کے کسی کارندے نے اس سے پہلے امریش کو دیکھا نہیں ہوا تھا۔ توقع تھی کہ وہاں میں امریش کی حیثیت سے "چل" جاؤں گا۔ میں نے ایک ڈکٹافون اور ایک نہایت مختصر جدید کیمرا بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یہ اشیا عالم قریشی نے "ایور ریڈی" کی طرف سے فراہم کی تھیں۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب میں عالم قریشی کی مرسیڈیز گاڑی میں ایور ریڈی کے آفس سے "دچسٹر" کے لیے روانہ ہوا۔ عالم قریشی نے میرے ساتھ ڈرائیور بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ پرنس داراب کے سیکرٹری کو بھی فون کر دیا تھا کہ انڈین گارڈ آ رہا ہے۔

ہم پہلے لندن کے مضافات میں پہنچے اور پھر وہاں سے جنوب مغرب کی سمت روانہ ہو گئے۔ ہماری منزل ونچسٹر تھی..... قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم دچسٹر پہنچ گئے۔ ونچسٹر اور ساؤتھمپٹن میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ پرنس داراب کا محل ان دونوں شہروں کے درمیان واقع تھا۔ پرنس داراب کا محل واقعی کسی لارڈ کا محل نظر آتا تھا۔ یہ کئی ایکڑ میں تھا۔ پورا گراؤنڈ بھی اس کے اندر واقع تھا۔ سوئمنگ پول، ہیلی پیڈ

اور اس قسم کے دیگر لوازمات بھی نظر آ رہے تھے۔ مین گیٹ سے داخل ہونے کے بعد بھی کار قریباً ایک منٹ چلتی رہی۔ ہم وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں پہنچے۔

میں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے سوال و جواب کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ ایک باوردی شخص نے مجھ سے سوال جواب کیے بھی لیکن یہ پوچھ گچھ اتنی سخت نہیں تھی کہ جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ باوردی شخص نے میرے کاغذات پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر انہیں واپس میرے حوالے کر دیا۔ باوردی شخص درحقیقت یہاں کا سیکورٹی انچارج تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ انگریز فوجی تھا۔ اس کے جبڑے بے حد چوڑے تھے اور لباس بھی خوب تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات میں وہ چستی نہیں تھی جو ایک سیکورٹی انچارج میں ہونی چاہیے۔

سیکورٹی انچارج جانسن نے کہا "مسٹر امریش، تمہاری ڈیوٹی کل سمجھا دی جائے گی۔ آج تم آرام کرو..... یہ تمہارا روم میٹ باقر ہے۔ یہ مصری نژاد ہے۔ یہ تمہیں تمہارا کمرا دکھا رہا ہے۔"

جانسن نے موٹی گردن اور درمیانے قد والے ایک نہایت مضبوط شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "باقر امریش کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور دیگر باتیں سمجھا دو۔"

میں باقر نامی اس شخص کے ساتھ عمارت کے پہلو کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں کا کروفر ایک شاہی رہائش گاہ کے شایان شان تھا۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی ایک روش پر سے گزرتے ہوئے میں دفعتاً چونک گیا۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں گانے والیوں میں سے ایک لڑکی کو اتنی جلدی دیکھ پاؤں گا۔ یہ غالباً نجھلی بہن روپ تھی۔ میں نے بس اس کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ دھان پان سی لڑکی ایک لمبا سا سفید گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ پاؤں میں شاید سلیپر تھے۔ ایک دوسری لڑکی نے جو اپنے حلیے سے نرس نظر آتی تھی۔ روپ کو بازو سے تھام رکھا تھا اور ایک سفید دروازے سے نکال کر دوسرے سفید دروازے تک لے جا رہی تھی۔

تیز نگاہ والے باقر نے میرا چونکنا محسوس کر لیا "کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو گئے ہو۔" وہ مجھے بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میں اس نرس کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ کیا یہاں کوئی اسپتال بھی ہے؟"

مسکراتے چہرے والے باقر نے ہنس کر کہا "آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گے۔" اس کی انگلش اردو بھی کام عربیوں والا ہی تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک آرام دہ سوئٹ میں لے آیا۔ اس سوئٹ میں دو کمرے، باتھ روم اور ٹی وی لاؤنج وغیرہ تھا۔ اس محل نما عمارت میں کم و بیش سولہ گارڈز موجود تھے اور انہیں رہائش کی بہترین سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ باقر احمد نے جین اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ خاصا اسمارٹ اور چوکس شخص تھا۔ میں نے اپنا مختصر سامان الماری میں رکھ دیا تو باقر نے الیکٹرک کیتلی میں میرے لیے فوراً چائے تیار کی اور ساتھ ہی بسکٹ اور کیک وغیرہ رکھ دیے۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا۔ اس کے انگ انگ سے زندگی اور توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد وہ مجھ سے یوں گھل مل کر باتیں کر رہا تھا جیسے مجھے برسوں سے جانتا ہو۔ وہ کچھ زیادہ محتاط بھی نہیں تھا۔ پرنس داراب اور اس کے اہل خانہ کے بارے میں بھی جو کچھ میں نے پوچھا اس نے بتا دیا۔ میں نے کہا "وہ نرس اور لڑکی کا کیا چکر تھا؟"

باقر نے بلا تردد جواب دیا "پرنس جیسے لوگ لباس کی طرح عورتیں بدلتے ہیں اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہوتی۔ برونائی میں بھی اکثر دولت مند لوگوں کے پاس بیک وقت کئی کئی عورتیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کے ساتھ نکاح کرتے ہیں اور کچھ اس کو بھی بس تکلف ہی سمجھتے ہیں۔ ہمارے پرنس بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔ ان کے پاس دولت کی اتنی فراوانی ہے کہ حسن چاروں طرف سے سمٹ کر ان کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ بہترین لڑکیاں ان کی نگاہ کرم کی منتظر رہتی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کو پرنس کی خواب گاہ تک پہنچنے سے پہلے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے کریڈینشلز کا پورا پورا کھوج لگایا جاتا ہے۔ ان کو تندرست ہونا چاہیے۔ ہر قسم کی اندرونی و بیرونی بیماری سے محفوظ ہونا چاہیے۔ ایسی لڑکیوں کو ترجیح دی جاتی ہے جن کے پہلے کسی مرد سے جسمانی تعلقات نہ رہے ہوں۔ ان سارے معاملات کو بڑی توجہ سے جانچا جاتا ہے۔ راکیل نامی ایک اطالوی ڈاکٹر اس شعبے کی انچارج ہے۔ اس سے پہلے ایک امریکی خاتون تھی لیکن کوئی تین ماہ پہلے اسے ذلیل و خوار ہو کر نوکری سے بے دخل ہونا پڑا۔"

"اس نے کیا کر دیا تھا؟"

"معمولی سی غلطی تھی۔ تم سن کر حیران ہو گے۔ اس کی غفلت سے ایک ایسی لڑکی پرنس کی خلوت میں پیش ہو گئی تھی جس کے سانسوں سے بو آتی تھی۔ پرنس کی طبیعت اس پر اتنی

مقدر ہوتی۔" انہوں نے اگلے روز بیک بینی و دوگوش امریکی انچارج کو ڈیوٹی سے فارغ کر دیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پرنس سخت مزاج ہیں۔"

"لیکن نرم بھی بہت ہیں۔" باقر نے جواب دیا "جن خواتین سے وہ خوش ہوتے ہیں انہیں تحائف سے لاد دیتے ہیں اور یہ بات کوئی صرف خواتین تک ہی نہیں ہے۔ اچھی کارکردگی دکھانے والے ملازموں کو بھی وہ فراخ دلی سے نوازتے ہیں۔"

"بھئی پرنس جو ہوئے۔" میں نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے باقر سے پوچھا "تمہیں پتہ ہے کہ پرنس کے ساتھ جو لڑکی نظر آئی تھی کون ہے؟"

"یہاں لڑکیاں آتی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ دو اور لڑکیاں بھی یہاں آئی ہیں۔ شاید کوئی سنگرز وغیرہ ہیں ......"

"پرنس کو موسیقی سے بھی دلچسپی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کہ ہو۔" باقر مسکرایا "کئی لوگوں کو پرندے اچھے لگتے ہیں۔ خاص طور سے چہکتے ہوئے پرندے۔ اسی طرح کئی لوگوں کو گلوکار اچھے لگتے ہیں خاص طور سے 'فی میل' اور خوبصورت گلوکار۔"

میں نے باقر کو پرنس کے بارے میں زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس طرح وہ چونک سکتا تھا۔ ہم چائے پیتے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ باقر بھی ایک تجربہ کار سیکورٹی گارڈ تھا۔ اسے باقر کمانڈو بھی کہا جاتا تھا۔ درمیانے قد کے باوجود اس کی شخصیت موثر اور نمایاں تھی۔ وہ کئی اہم شخصیات کی سیکورٹی کے فرائض انجام دے چکا تھا جن میں کیوبا کا ایک نہایت اہم سیاستدان بھی شامل تھا۔ باقر مارشل آرٹ کا ماہر اور زبردست نشانے باز تھا۔ باقر نے امریش کا نام بھی سنا ہوا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ اس کی شکل سے واقف نہیں تھا۔

باقر نے مجھے میری ڈیوٹی سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم میں سے ایک کو رات کے وقت پرنس کی خواب گاہ کے اردگرد موجود رہنا ہو گا۔ دوسرا اس وقت پرنس کے ساتھ رہے گا جب وہ محل سے باہر نکلیں گے لیکن یہ ڈیوٹی تبدیل ہوتی رہے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا خیال ہے ہر ہفتے کو ڈیوٹی تبدیل ہو جائے گی۔ یعنی اندرونی ڈیوٹی دینے والا باہر ڈیوٹی دے گا اور باہر والا اندر۔"

"میری ڈیوٹی اندر سے شروع ہو گی یا باہر سے؟"

"اس کے بارے میں کل تمہیں انچارج صاحب بتا دیں گے۔" باقر نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "تمہیں ڈیوٹی کی نوعیت کے بارے میں بتا دیا گیا ہو گا۔ جو بھی شخص بھی پرنس سے پندرہ فٹ سے کم فاصلے پر آنے کی کوشش کرے۔ اسے وارننگ دی جائے۔ اگر وہ مزید قریب آئے تو دوسری وارننگ دی جائے ...... اور اس کے بعد فوراً ٹانگوں پر گولی مار دی جائے۔ لیکن یہ بھی اس صورت میں جب اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہ ہو۔ ہتھیار کی صورت میں اسے ہلاک کرنے کے لیے گولی چلائی جائے ......"

باقر نے قریباً دس پندرہ منٹ مجھے اسی طرح کی ہدایات دینے میں صرف کیے۔ ان ہدایات سے ظاہر ہوا کہ عزت مآب پرنس کو کچھ لوگوں کی طرف سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ جس قسم کی زندگی پرنس گزار رہا تھا اس میں ایسے خطرات تو لاحق ہوا ہی کرتے ہیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں گانی گڑیوں میں سے ایک اور بہن کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سب سے چھوٹی بہن تھی۔ وہ مجھے فقط ایک لمحے کے لیے برآمدے میں نظر آئی۔ اس کی یہ ایک جھلک ہی مجھے اس کے بارے میں کافی کچھ سمجھا گئی۔ وہ دبلی ہوئی بچی تھی۔ وہ سرسبز باڑ سے نکلی تھی۔ ایک لمبا سا، ڈھیلا لبادہ اس نے پہن رکھا تھا۔ ابھی وہ نکلی ہی تھی کہ ایک عورت لپک کر آئی اور اسے بازو سے تھام لیا۔ عورت نے سمجھانے والے انداز میں بچی سے کچھ کہا اور پھر فوراً اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ عورت کی شکل و صورت سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی راکیل نامی اطالوی خاتون ہے جس کے بارے میں کل مجھے باقر نے بتایا تھا۔

بچی کی یہ ایک جھلک دیکھنے کے بعد میرے اندر اس جذبے نے تقویت پکڑ لی کہ مجھے ان بچیوں کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ بے شک مجھے اس سے تھوڑا بہت اہم کام بھی کرنا تھے لیکن اگر میں جانتے بوجھتے ان معصوم زندگیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا تو میرا ضمیر مجھے معاف نہ کرتا۔ مجھے پتہ تھا کہ بیک وقت ان تینوں لڑکیوں کو یہاں سے بحفاظت نکال لینا آسان نہیں ہو گا لیکن یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ مجھے ایسا کرنا ہے۔ اگر اس کام کے لیے مجھے یہاں موجود افراد میں سے کسی چند ایک کو شوٹ بھی کرنا پڑا تو میں ...... بار بار غزالہ اور چچی کا خیال ذہن میں آ رہا تھا۔ شہ

بے وقت پر انہیں چھوڑ آیا تھا۔ شاید چچا ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میری زندگی ایک مسلسل ہنگامہ ہے۔ اس میں نیک گھرانے، بیوی بچوں کے لیے بہت مشکل ہے جگہ بنے گی ...... عالم قریشی کے دفتر سے روانہ ہونے سے پہلے ایک دو بار میرے ذہن میں آیا تھا کہ اس اہم اور نازک موقع پر میں غزالہ اور چچا کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاؤں اور ان کی خواہش کے مطابق نکاح کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے لینٹ پہنچ جاؤں لیکن صورت حال پر غور کرنے کے بعد مجھے یہی محسوس ہوا کہ یہ منافقت ہو گی اور ناقابل تلافی حرکت ہو گی۔ جو ہو رہا تھا میں جانتا تھا اور اسے چشم پوشی کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ غزالہ کی سلامتی اور خوشیوں کے صدقے میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا تھا۔

میں نے چچا سے آج شام آٹھ بجے تک کی مہلت مانگی تھی لیکن اب محسوس ہو رہا تھا کہ شاید میں آج بھی یہاں سے نہ نکل سکوں۔

مجھے سہ پہر کو ہی محسوس ہونے لگا کہ آج یہاں کسی چھوٹی موٹی تقریب کا اہتمام ہے اور غالب امکان یہی تھا کہ یہ موسیقی کی تقریب ہو گی۔ میں نے ایک شخص کو کار کی ڈگی میں سے گٹار اور ڈرم وغیرہ نکالتے دیکھا۔ ایک لونگ روم میں نشستیں وغیرہ بھی لگائی جا رہی تھیں۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ اس تقریب کا تعلق یقیناً گانی گڑیوں سے ہو گا۔ شام کے فوراً بعد میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ سیکورٹی انچارج جانسن نے مجھے علیحدگی میں بلایا اور بولا "آج سے تمہاری ڈیوٹی شروع ہے۔ میں نے باقر کو ساری تفصیل سمجھا دی ہے وہ تمہیں بتا دے گا۔ آج نو بجے کے بعد یہاں ایک چھوٹی سی تقریب بھی ہے۔ اس میں پرنس کے ایک دو قریبی عزیز اور دو تین دوست شریک ہوں گے۔ تمہیں اور باقر کو شروع سے آخر تک لونگ روم کے باہر موجود رہنا ہے ......"

"اوکے سر۔" میں نے مستعدی سے اکڑتے ہوئے کہا۔

"تقریب کے بعد اگر موقع ملا تو میں تمہارا تعارف پرنس سے کرا دوں گا۔ بہتر ہے کہ پرنس بس مختصر مکالمہ پسند کرتے ہیں۔"

"آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی سر۔"

"آٹھ بجے کے قریب تم اور باقر سیکورٹی کے نقطہ نظر سے لونگ روم اور آس پاس کا جائزہ لے لینا۔"

"آپ بے فکر رہیں سر۔"

پروگرام کے مطابق نو بجے کے بعد میوزیکل پروگرام شروع ہوا۔ یہ عمارت کا اندرونی حصہ تھا۔ آواز بمشکل کیاریوں تک ہی پہنچ سکتی تھی۔ اس سے آگے وسیع و عریض احاطہ تھا۔ لونگ روم میں بس چھ سات افراد موجود تھے۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔ دونوں یورپین دکھائی دیتی تھیں۔ اطالوی نژاد دو آنسز رائنس بھی ایک دو بار دکھائی دی۔ لونگ روم سے میرا اور باقر کا فاصلہ بیس تیس میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ ہم ٹہلتے ہوئے مزید قریب جا سکتے تھے۔ اندر سے موسیقی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ جلد ہی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہاں Singing Dolls نغمہ سرا ہیں۔ وہ آواز جس کی ایک خلقت دیوانی تھی۔ ایک زردار نے اپنے زر کے زور پر ایک چار دیواری میں قید کر لی تھی۔ اب یہ غلام آواز بھی اب اپنی مرضی سے بلند ہو سکتی تھی نہ مرضی سے خاموش ہو سکتی تھی۔ اس کے اتار چڑھاؤ پر اب کسی اور کا تصرف تھا۔ تینوں بہنیں مل کر گا رہی تھیں۔ یہ کوئی سنہالی گیت تھا۔ یہ گیت میں شاید اس سے پہلے کولمبو میں پانچ سال پہلے کے دورے پر سن چکا تھا۔ بڑی دلنشیں طرز تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر بھی ایک سوز ایک گداز دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کی اور ایک کھڑکی میں سے گانی گڑیوں کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہا۔ تینوں بہنیں کندھے سے کندھا ملائے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ سننے والے مست تھے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گانا پیش کیا گیا۔ مجھے پرنس دارات کی بھی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ پھیل کر صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگار اور دوسرے میں گلاس تھا۔ وہ بڑی شائستگی سے چسکیاں لے رہا تھا۔

تینوں بہنیں قریباً ایک گھنٹا نغمہ سرا رہیں۔ سب سے چھوٹی بہن نے گٹار پر بھی کچھ دھنیں سنائیں۔ آخر میں محفل برخاست ہوئی۔ دو انگریز جو اپنی گاڑیوں پر یہاں پہنچے تھے، پرنس سے رخصت ہو کر واپس چلے گئے۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد پرنس ہمارے قریب سے گزرا تو انچارج بھی ہمارے پاس ہی موجود تھا۔ اس کے اشارے پر میں نے سلوٹ کرنے کے انداز میں پرنس کو سلام کیا۔ انچارج جانسن نے ادب سے آگے بڑھ کر میرا تعارف کرایا۔

"ہز ہائی نس! یہ وہ گارڈ امریش ہے جو آپ کی طلبی پر انڈیا سے آیا ہے۔"

پرنس نے شاہانہ انداز میں مجھے سر تا پا گھورا پھر گردن

ہلاتے ہوئے بولا "بہت خوب، اچھے نظر آ رہے ہو۔ ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔ طے شدہ معاوضے سے زیادہ ملے گا۔"

"میں آپ کا خادم ہوں سر، شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"تمہاری سفارش ہوشے نے کی تھی۔ ہمیں ہوشے کی صلاحیتوں پر بھروسا ہے ابھی ہوشے سے تمہاری ملاقات ہوئی نہیں؟"

"نہیں سر۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔

میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ ہوشے کون ذات شریف ہے اور پرنس اس کی کون سی صلاحیتوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اگر یہ سوڈ کی طرح گھنا ہوا پرنس مجھ سے ہوشے کے بارے میں مزید پوچھ لیتا تو یقیناً ابھی بیچ چوراہے پر بھانڈا پھوٹ جاتا تھا۔ بہر طور خیریت گزری۔ پرنس مجھے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا ہوا اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

رات کا ایک بجا تھا۔ میری ڈیوٹی پرنس داراب کی خواب گاہ کے قریب تھی۔ یہ ایک اچھا اتفاق تھا کہ میں پرنس کی خواب گاہ کے قریب تھا۔ میرے دل کی گواہی تھی کہ آج کی رات اہم ہے۔ پرنس کے لیے بھی اور گالی گرلیوں کے لیے بھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ رنگین مزاج شخص گالی گرلیوں کو یہاں صرف نغمہ سرائی کے لیے نہیں لایا۔ وہ ان کا پرانا عاشق تھا۔ وہ ان کی آواز کے ساتھ ساتھ ان کے شباب اور ان کے جسموں کو بھی اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہتا تھا۔

در و دیوار پر شب کا سکوت طاری تھا۔ اس چھت کے نیچے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ہم لندن جیسے جدید شہر سے کچھ ہی فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ کنٹری سائیڈ تھی۔ انگریزی طرز کا دیہی ماحول تھا۔ یہ محل نما عمارت بھی سولہویں سترھویں صدی کی تعمیر لگتی تھی۔ بلند چھتیں، اونچے دروازے، بڑے بڑے منقش کھڑکیاں، موٹی دیواریں..... اور ان موٹی دیواروں کے اندر بند تین کومل کلیاں۔ میں نگاہ تصور سے ان چاند چہرہ پھول بدن لڑکیوں کے مصائب دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

میں خواب گاہ کا نگران تھا..... اور اس کی نگرانی بہت قریب سے کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا، گالی گرلیوں کا تعلق اس خواب گاہ سے بہت نزدیک کا ہے۔ میں نے اس امکان کا جائزہ دو گھنٹے پہلے ہی لے لیا تھا کہ یہ جگہ کلوز سرکٹ کیمروں کی زد میں تو نہیں..... یہاں کیمرے موجود نہیں تھے۔ کیمروں کی غیر موجودگی کا تعین کرنے کے فوراً بعد میں نے ایک اور کام کیا تھا اور وہ یہ کہ خواب گاہ کا جائزہ لینے کے بہانے اندر گیا تھا اور نہایت مختصر لیکن طاقتور ڈکٹا فون ایک گلدان کے اندر چسپاں کر دیا تھا۔ میں بڑی احتیاط سے دبیز قالینوں پر پاؤں دھرتا خواب گاہ کے عین سامنے پہنچ گیا۔ اندر نائٹ بلب کی روشنی تھی۔ دروازے سے کان لگایا تو کھسر پھسر کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ان میں ایک آواز نسوانی تھی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ گالی گرلیوں میں سے ایک کی آواز ہوگی۔ میں پرنس کی خواب گاہ میں جھانکنا چاہتا تھا لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کوئی حل سوچ رہا تھا۔ ہر منزل تک پہنچنے کے لیے کم از کم ایک راستہ تو ہوتا ہی ہے۔ بہر حال مجھے فوری طور پر اندر جھانکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اب میرے پاس بس سماعت کا آپشن رہ جاتا تھا۔ جو ڈکٹا فون میں اندر لگا آیا تھا وہ یقیناً کام کر رہا تھا مگر اس ڈکٹا فون کی کارکردگی ملاحظہ کرنے کے لیے مجھے تنہائی کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسی جگہ جہاں دیکھے جانے کا امکان نہ ہو۔ آخر سوچ بچار کے بعد میں باتھ روم میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔ آخر انسانی تقاضے تو ایک سیکورٹی گارڈ کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔

اندر گھس کر میں نے ٹب میں نلکا کھول دیا تاکہ ریسیور کی آواز اس میں دب جائے۔ میں نے ریسیور آن کر کے اسے کان کے قریب کر لیا۔ پہلے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں پھر ایک نہایت نمایاں آواز سنائی دی۔ یہ گالی گرلیوں میں سے سب سے بڑی بہن نینا کی آواز تھی۔ یقیناً اس کا چہرہ ڈکٹا فون کے بہت قریب تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ بالکل واضح سمجھ میں آ رہا تھا۔ "مجھے سگار سلگانا نہیں آتا۔" نینا نے کہا۔

"سیکھنے سے ہر کام آ جاتا ہے بے بی۔" پرنس داراب کی معنی خیز آواز سنائی دی "ہر نیا کام پہلے پہل مشکل اور بے ڈھنگا لگتا ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو..... اس کو یوں ہونٹوں میں دباؤ۔ اب لائٹر یہاں سے پش کرو۔ کر دو شاباش..... یہ دیکھو شعلہ جل گیا۔ اب اس شعلے کو بائیں ہاتھ سے ڈھانپ کر رکھو اور سگار کے قریب لاؤ۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب سانس اوپر کی طرف کھینچو..... ہاں بالکل صحیح۔"

کھانسی کی تیز آواز آئی۔ سگار سلگاتے ہوئے ناتجربہ کار نینا بری طرح کھانسنے لگی تھی۔ پرنس داراب کی بھاری بھرکم ہنسی سنائی دی۔

کچھ دیر کھانستے رہنے کے بعد نینا نے مدھم آواز میں کہا "پرنس! میں نے..... آپ کی..... ہر بات مانی ہے..... جو مان سکتی تھی وہ بھی..... جو نہیں مان سکتی وہ بھی..... اب آپ بھی اپنا عہد نبھائیں۔"

"نبھا تو رہا ہوں بے بی..... اب اور کیا چاہتی ہو.....؟"

پرنس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی "تمہاری بہنوں کی یہاں وہی حیثیت ہے جو..... گرجا گھر میں راہباؤں کی ہوتی ہے۔"

"لیکن آپ نے کہا تھا کہ انہیں یہاں سے بحفاظت جانے کی اجازت دے دیں گے اور وہ کولمبو پہنچ جائیں گی۔"

"تم واقعی بے بی ہو۔ بالکل بچوں جیسی بات کرتی ہو۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے، بہر حال یہ ہوگا ضرور..... میں انہیں کولمبو ضرور پہنچاؤں گا۔"

"آپ پرنس ہیں۔ آپ کے لیے تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو ایک دن میں میری بہنوں کی واپسی کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"پتا نہیں کیا بات ہے۔ تم تینوں کو اتنی جلدی جدا کرنے کو دل نہیں چاہتا..... دراصل تم تینوں کی آواز ایک اکائی کی طرح ہے۔"

"تو آپ..... اپنے وعدے..... سے پھر رہے ہیں؟" نینا کی سہمی ہوئی آواز میرے ریسیور پر ابھری۔

"ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔" داراب نے زور دے کر کہا "لیکن بے بی..... مجھے استحقاق تو ہے کہ انہیں کولمبو بھیجنے سے پہلے میں دو چار دن ان کی آواز سے لطف اندوز تو ہو سکوں..... میرا جی چاہتا ہے کہ یہیں رہائش گاہ پر انتظام کر کے میں تینوں کے گیتوں کی ایک کیسٹ ریکارڈ کرواؤں....."

ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ بس سرسراہٹ کی مدھم آواز آتی رہی پھر پرنس کی جذبات سے بوجھل آواز ابھری۔

"اپنے چھوٹے سے ذہن کو ان سارے اندیشوں سے بالکل پاک کر دو۔ سمجھو، میں نے جو کہہ دیا ہے وہ ضرور ہوگا۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں لیکن....."

"بس اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کی کوشش کرو۔"

"کیسے.....؟" نینا کی دردناک آواز ابھری۔

داراب نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ایسے....." اور پھر ریسیور پر خاموشی چھا گئی۔ میں نے جھلا کر ریسیور آف کر دیا۔

میرے دماغ میں انگارے دہک رہے تھے۔ یہ بات واضح تھی کہ میں گالی گرلیوں میں سے کم از کم ایک کو تو تاراج ہونے سے نہیں بچا سکا۔ مجھے ابھی پوری صورت حال معلوم نہیں ہوئی تھی۔ تاہم ابھی سنی جانے والی گفتگو سے یہی پتا چلتا تھا کہ اپنی چھوٹی بہنوں کو "مصیبت" سے بچانے کے لیے نینا نے اپنی دانست میں قربانی دی تھی اور خود کو داراب کے حوالے کر کے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اس کی بہنوں کو کولمبو واپس بھیج دیا جائے گا۔ وہ تینوں واقعی بہت معصوم تھیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ چرندے کا گھاس سے اور درندے کا شکار سے کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ ان کا رشتہ بس زبردستی اور زبردستی کا ہوتا ہے۔ نینا جس وعدے کی آس میں داراب کی زبردستی کا شکار ہو رہی تھی وہ تو پانی کے بلبلے سے بھی کم حیثیت رکھتا تھا۔

میرے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل موجود تھی۔ یہ ایک سیکنڈ میں پندرہ گولیاں نکالتی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ رائفل لے کر دندناتا ہوا داراب کی خواب گاہ میں جا گھسوں اور کم از کم پندرہ گولیاں تو اس کے جسم میں ڈال دوں لیکن مجھے کئی پہلوؤں سے سوچنا پڑ رہا تھا۔ میں عالم قریشی اور اس کے پارٹنر کی وساطت سے یہاں پہنچا تھا۔ میری وجہ سے یہاں جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کی ذمے داری براہ راست سیکورٹی ایجنسی پر پڑتی تھی اور اس کے دونوں مالکان پر پڑتی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں خاطر خواہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ مزید براں میں تینوں لڑکیوں سمیت یہاں سے نکلنے کا محفوظ راستہ بھی سوچ رہا تھا اور اس کے علاوہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ نکلنے کے بعد کیا کرنا ہے۔

اگلے روز ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے محل نما عمارت سے نکلا اور ایک قریبی ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک منی مارکیٹ بھی تھی۔ یہاں سے میں نے عالم قریشی کو اس کی رہائش گاہ پر فون کیا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس منٹ گفتگو ہوئی۔ عالم قریشی کے لہجے میں خفگی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے مجھ سے یہی پوچھا کہ میں وعدے کے مطابق کل شام واپس کیوں نہیں آیا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اس سے یہاں کے حالات بیان کیے اور بتایا کہ میں کس قدر اپ سیٹ ہوں۔

وہ بولا "تمہارے اپ سیٹ ہونے سے اور بھی بہت کچھ اپ سیٹ ہو رہا ہے۔ انکل جلیس بے حد پریشان ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اچانک سب کچھ کیوں پلٹ گیا ہے۔ کل رات دس بجے میرے ساتھ ٹیلی فون پر ان کی جو گفتگو ہوئی

ے اس میں وہ بہت مایوس اور الجھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کو شک ہو رہا ہے کہ شاید ان سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔''

''اچھا... میں تم سے بات کرنے کے بعد ان سے رابطہ کروں گا۔ میرے پاس ان کا فون نمبر ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' عالم نے کہا ''میں صبح منہ اندھیرے کا اسی چکر میں پڑا ہوا ہوں۔ دو گھنٹے میں کوئی پچیس تیس دفعہ کوشش کی ہو گی۔ کوئی اٹھا ہی نہیں رہا ہے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے فون کسی صندوق میں رکھ چھوڑا ہے یا پھر وہ گھر میں موجود ہی نہیں ہیں۔''

ایک ٹھنڈی لہر سی سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ نقشہ یاد آ گیا جب غزالہ اور اس کے اہل خانہ اچانک لاہور سے روپوش ہو گئے تھے۔ کہیں اب پھر تو کوئی ایسی صورت حال نہیں بن گئی... مگر پھر ذہن نے فوراً ہی اس خیال کی نفی کر دی۔ میں نے پرسوں ہی چچا سے خود بات کی تھی اور انہیں اپنی ناگزیر مصروفیت کے بارے میں بتایا تھا۔ تیز رفتاری کے اس دور میں ایسا ''اپ سیٹ'' کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندہ کسی ناگزیر مجبوری کے سبب کسی جگہ وعدے پر نہ پہنچ سکے تو زندگی کے اہم ترین فیصلے بدل لیے جائیں۔ مجھے یقین تھا کہ چچا ایسا سطحی کام نہیں کر سکتے۔ یقیناً کوئی اور وجہ تھی جس کے سبب رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

عالم قریشی کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ ''کس سوچ میں کھو گیا ہے شہزادے... اگر کہتا ہے تو میں ابھی خود چلا جاتا ہوں انکل کی طرف۔ انہیں اپنی اور تیری طرف سے تسلی دیتا ہوں... لیکن کچھ پتا بھی تو چلے کہ تو آئے گا کب؟''

''ٹھیک سے تو نہیں بتا سکتا لیکن خیال ہے کہ آج یہ ''کام'' ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب۔ کہیں کوئی بندے شندے مارنے کا تو ارادہ نہیں ہے تیرا؟''

''بندے بھی مر سکتے ہیں... اور میں خود بھی مرحوم و مغفور ہو سکتا ہوں۔''

''دیکھ مذاق نہ کر... ورنہ میں یہاں پہنچ کر تیرا سر توڑ دوں گا۔''

''اچھا یار، نہیں کرتا مذاق لیکن اب تجھے بھی سنجیدگی سے ایک کام کرنا ہو گا۔ آج رات ایک چھوٹا موٹا دھماکا تو پرنس کے محل میں ہونا ہے اور یہ دھماکا میں نے کرنا ہے۔ تیرے کھوپڑے میں یہ بات یقیناً آ گئی ہو گی کہ اس دھماکے کا خمیازہ تجھے اور تیرے پیاری ایجنسی ''ایور ریڈی'' کو بھی بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہم پہلے سے کوئی پلاننگ کر لیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جیسا کہو گے ویسا ہو جائے گا۔ تم بولتے جاؤ میں سن رہا ہوں۔'' عالم قریشی نے کہا۔

''فرض کرو کہ تم نے اپنے طور پر واقعی انڈین کمانڈو امریش کو سیکورٹی گارڈ کے طور پر پرنس داراب کے محل میں بھیجا ہے... آج رات گیارہ بجے کے لگ بھگ تم پر انکشاف ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے جو بندہ تمہاری ایجنسی نے پرنس کے محل میں بھیجا ہے وہ امریش کی بجائے کوئی اور ہے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گے؟''

''میں فوری طور پر اپنے سر پر دو چار جوتے رسید کروں گا کہ اتنا بڑا دھوکا میں نے کیسے کھا لیا۔''

''مذاق نہیں یار... بتاؤ تمہارے ذہن میں فوری طور پر کیا بات آئے گی؟''

''میں پرنس یا اس کے عملے سے رابطہ قائم کروں گا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کروں گا۔''

''پرنس کا محل لندن سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ رابطہ کیسے کرو گے؟''

''ٹیلی فون کے ذریعے۔ اگر کسی وجہ سے ٹیلی فون نہ ہو سکے تو پھر خود بھاگا بھاگا وہاں پہنچوں گا۔''

''بس یہی سمجھو کہ فون پر تمہارا رابطہ نہیں ہو سکا... تم گواہی کے طور پر ایک دو غیر متعلقہ افراد کو یہ بات بتا دو گے اور پھر خود پرنس کے محل کی طرف کار دوڑا دو گے تمہیں یا تمہارے کارندے کو محل تک پہنچنے میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹا لگے گا، اسی دوران میں، میں اپنا کام کر کے وہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ لڑکیوں کو لے کر۔''

''انشاء اللہ۔''

''لیکن ٹیلی فون پر رابطہ کیوں نہیں ہو سکے گا۔ پرنس کی رہائش گاہ پر تو تین چار فون ہیں۔''

''رہائش گاہ میں چھوٹا سا ایکس چینج لگا ہوا ہے۔ میں اس ایکس چینج کو بند کر دوں گا۔ تم ٹھیک گیارہ بجے رہائش گاہ پر فون کرنا، اگر رابطہ نہ ہو سکے تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ میں نے کام شروع کر دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

عالم قریشی سے ضروری تفصیلات طے کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رات تک میں نے چند ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ رہائش گاہ کے کمپاؤنڈ میں دو گارڈز موجود رہتے تھے

لیکن مین گیٹ کی سیکورٹی زیادہ سخت تھی۔ یہاں آٹھ آٹھ گھنٹے کی شفٹ میں تین تین گارڈز چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے تھے اور یہ کافی خطرناک گارڈز تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور سوجے سوجے چہروں والے جاپانی تھے۔ نہ کسی سے بات کرتے تھے نہ کسی کے پاس بیٹھتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کھلے کے کوئی ٹرینڈ پراسنوں کا ڈھیر لگا سکتے ہیں۔

میں نے تینوں Singing Dolls کی لوکیشن دیکھ لی تھی۔ اور یہ بھی جانچ لیا تھا کہ انہیں یہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ سب سے چھوٹی ''پنکی'' سے میرا آمنا سامنا شام چھ بجے کے قریب ہو گیا۔ وہ نہا کر نکلی تھی اور کھڑکی کے قریب اداس بیٹھی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اپنی صورت دکھائی۔ وہ چونک گئی۔ یقیناً اس کا ذہن چند ہفتے پیچھے کی طرف دوڑ گیا تھا۔ کولہو میں پاشا کی رہائش گاہ پر میرا اور پنکی کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پاشا نے میرا تعارف ایک کروڑ پتی بزنس مین کی حیثیت سے کرایا تھا۔ پنکی اور روپ نے کوشش کی تھی کہ وفائی کاموں کے لیے مجھ سے تعاون حاصل کر سکیں۔

قریباً پانچ منٹ بعد میں دوبارہ کوریڈور میں پہنچا اور اس کھڑکی کے سامنے سے گزرا۔ پنکی وہیں بیٹھی تھی۔ شیشے کے پیچھے سے اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں نے تیسری بار کھڑکی کے سامنے پہنچ کر پنکی کو کھڑکی کھولنے کا اشارہ کیا تو معمولی تذبذب کے بعد اس نے کھڑکی کھول دی۔

میں نے تیزی سے کہا ''آج رات گیارہ بجے... تیار رہنا... ہم یہاں سے نکل جائیں گے... روپ اور مینا کو بھی بتا دینا۔''

''لیکن...؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی ''سارا انتظام ہو گیا ہے۔ پاشا بھی میرے ساتھ ہے۔'' پاشا کے نام پر اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔

''کہاں ہیں وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہیں پر ہے۔ فی الحال سامنے نہیں آ سکتا۔''

اس نے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف و ہراس جما ہوا تھا۔ میں نے کہا ''تفصیل سے بات کرنے کا وقت نہیں... بس ٹائم یاد رکھنا۔ آج رات گیارہ بجے کے لگ بھگ۔'' کسی کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ میں فوراً کوریڈور میں آگے بڑھ گیا۔

شام تک میں آزادانہ اس وسیع عمارت میں گھومتا رہا اور حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ پورچ میں تین گاڑیاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ایک شاندار جیپ تھی۔ ایک گاڑی کے اگنیشن میں چابی بھی موجود تھی۔ میں نے اسی گاڑی کو استعمال کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

رات ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ میں اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ اتفاقاً آج رات پرنس عمارت میں موجود نہیں تھا۔ غالباً کسی تقریب میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے رات گئے تک واپس آنا تھا۔ دونوں چھوٹی بہنیں عمارت کے وسطی حصے میں اپنے اپنے کمروں میں موجود تھیں۔ بڑی بہن ان سے علیحدہ تھی۔ وہ عمارت کے اس خاص حصے میں تھی جہاں ایک کونے میں پرنس کی شاندار خواب گاہ بھی واقع تھی۔

میں عمارت کے اس ہال نما کمرے میں پہنچا جہاں منی ایکس چینج واقع تھا۔ ایکس چینج کے اندر تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ فرش پر نیلے رنگ کا دبیز قالین بچھا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا آگے بڑھا اور پلائی ووڈ کے ایک دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ ترکش انچارج ایک خوبرو ہیجڑے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ دونوں مجھے دیکھ کر بوکھلا کر اٹھ بیٹھے۔ یہاں عمارت کی رہائشی حصے میں، میں نے دو تین ہیجڑے اور بھی دیکھے تھے۔ ہیجڑے نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ آواز اس کے حلق سے برآمد ہوتی میرا زوردار مکا اس کی نرم ٹھوڑی پر پڑا۔ یہ چوٹ اس کے لیے کافی تھی۔ وہ تیورا کر ایک کی بورڈ پر گرا اور کئی بٹن توڑتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔

ترکش انچارج کی نیلی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں ''کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

اس کی نگاہیں میری روسی رائفل پر تھیں اور وہ دیکھ رہا تھا کہ میری انگلی ٹریگر پر ہے۔ میں نے کہا ''خیریت چاہتے ہو تو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''

اس نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ اس کے میز کے نیچے ایک الارم کا بٹن تھا۔ اس کا ہاتھ بٹن کی طرف سرکا۔ میں نے اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی۔ وہ جھکا تو اس کی پتلی گردن میرے دائیں بازو کی گرفت میں آ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ہیجڑے کے پہلو میں لیٹا نظر آ رہا تھا۔ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کی طرف تھے اور انچارج کا بازو ہیجڑے کے اوپر تھا۔ میں نے دونوں کو ایک ایک ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا اور ایک بڑے کاؤنٹر کے نیچے پہنچا دیا۔ مجھے امید تھی کہ دونوں ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں

گئے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے توجہ ایکس چینج کے کل پرزوں پر مبذول کی اور دو تین منٹ کے اندر اسے بے کار کر دیا۔ ایکس چینج روم کا بیرونی دروازہ مقفل کر کے میں نے چابی اپنی جیب میں منتقل کر لی۔ اس وقت گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ اب میرا رخ دونوں چھوٹی بہنوں کے کمروں کی طرف تھا۔ یہ ایک خطرناک مرحلہ تھا۔ یہاں باقاعدہ دو گارڈز موجود ہوتے تھے۔ کل رات انچارج گارڈ جانسن بھی اسی جگہ چکراتا نظر آیا تھا۔ میری پنڈلی کے ساتھ میرا دیرینہ ساتھی رام پوری خنجر موجود تھا اور میں کسی بھی مزاحمت کی صورت میں رائفل کے بجائے خنجر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سب سے پہلے میں چھوٹی ہنگی کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے پر انگلی سے ہلکی سی ''ٹاک'' کی۔ وہ شاید کھڑکی کے پاس موجود تھی۔ اندر تاریکی میں سے اس نے جوابی ''ٹاک'' کی اور پھر کھڑکی کھول دی ''تم تیار ہو؟'' میں نے سرسرانی سرگوشی میں کہا۔

''ہاں... لیکن پاشا بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ بھی یہیں ہیں۔ مجھ پر مکمل بھروسا رکھو۔ اگر پاشا تمہارا بھائی ہے تو مجھے بھی غیر مت سمجھو۔''

''ہم... میں نے روپ باجی کو بتا دیا ہے... لیکن بڑی باجی سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہیں۔'' اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، مجھے پتا ہے وہ کہاں ہے... چلو نکلو۔''

چند سیکنڈ بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور ہنگی میرے ساتھ کوریڈور میں تھی۔ ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح وہ لرز رہی تھی۔ وہ ایک گاؤن میں تھی۔ پاؤں میں سلیپر تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے جو سوئیٹر پہنا تھا وہ اس کے دبلے پتلے جسم پر کافی کھلا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی، مڑ کر دیکھا تو اعصاب تن گئے۔ کوئی تیزی سے ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ ابھی وہ دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کی نظر سے بچ سکتے۔ دو سیکنڈ بعد وہ ہمارے سامنے تھا۔ یہ انچارج گارڈ جانسن تھا۔

''تم یہاں کر رہے ہو؟'' وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولا ''پھر اس کی نگاہ ہنگی پر پڑی اور وہ مزید حیران ہو گیا۔

''یہ پتا نہیں کیسے باہر نکل آئی ہے سر... مجھے لگتا ہے اس کا ارادہ ٹھیک نہیں تھا۔''

''لیکن تمہاری ڈیوٹی تو اس حصے میں نہیں تھی۔'' جانسن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ میرے نزدیک آ چکا تھا اور مجھے اسی وقت کا انتظار تھا میں نے اچھل کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی گردن پر گرفت مضبوط کر سکتا اس نے غیر متوقع تیزی سے میرے پیٹ میں کہنی رسید کی اور تڑپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس موقع پر وہ چیخ کر دیگر گارڈز کو بلانے کی کوشش کرتا تو میرے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا لیکن اپنے ڈیل ڈول اور طاقت کے گھمنڈ میں وہ براہ راست مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کا مکا جھک کر بچایا اور سیدھا ہونے سے پہلے پنڈلی سے خنجر برآمد کر لیا۔ وار خالی جانے کے بعد نہایت چوڑے جبڑوں والے توی ہیکل جانسن نے مجھے بازو دار سے دبوچنا چاہا۔ ایک لمحے کے لیے وہی پوزیشن بنی جو عموماً ملتے وقت ہوتی ہے۔ جانسن مجھ سے بغلگیر تھا... مگر یہ موت کا معانقہ تھا۔ میرا خنجر دستے تک جانسن کے پیٹ میں گھس چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے چوڑے چکلے منہ سے موت کی چیخ نکلتی، میری ہتھیلی اس کے ہونٹوں کو ڈھانپ چکی تھی۔

میں نے دوسرا وار بے رحمی سے اس کے سینے پر کیا۔ وہ میری گرفت میں بری طرح پھڑکا اس کے سینے سے اچھلنے والا خون کا فوارہ ڈری سہمی چڑیا (ہنگی) کے پاؤں بھگو گیا۔ اس نے نجانے کس طرح اپنی چیخوں کو سینے میں روک رکھا تھا۔ جونہی جانسن قالین پر گرا میں ہنگی کو لیتا ہوا روپ کے کمرے کی طرف بھاگا۔ دروازے پر دستک ہوتے ہی چاق و چوبند روپ باہر نکل آئی۔ وہ بھی ڈری ہوئی تھی لیکن ہنگی سے کچھ کم... میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تینوں بہنوں میں زیادہ دلیر ہے۔

ہنگی کے پاؤں پر تازہ خون کے چھینٹے دیکھ کر وہ گھبرائی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس سے پہلے کہ ہم نینا کے کمرے کے سامنے پہنچتے ایک گارڈ سے مڈبھیڑ ہو گئی... یہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے خونخوار جاپانی گارڈز میں سے ایک تھا۔ یقیناً وہ شدید بدترین خطرے کی بو سونگھ چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کراٹے کے انداز میں اسٹانس لیا۔ اس کا انداز یہ بتا دینے کے لیے کافی تھا کہ وہ اپنے کام میں بے حد ماہر ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اسے جوہر دکھانے کا ''چانس'' فراہم کرتا مگر یہ زندگی اور موت کی بازی تھی اور یہاں ہر لمحہ قیمتی تھا۔ جونہی وہ مجھے کک مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ میں اسے بے ہوش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے بے پناہ زور لگایا نتیجے

میں اس کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ بے جان شاخ کی طرح میری بانہوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے قالین پر لٹایا اور گھسیٹ کر ایک خالی کمرے کے اندر پہنچا دیا۔

چند سیکنڈ بعد ہم تینوں نینا کے کمرے میں تھے۔ نینا کے کمرے کا دروازہ ہمیں کھلا ہی مل گیا تھا۔ ہم نے عجیب منظر دیکھا۔ نینا کمرے کے وسط میں قالین پر دوزانو بیٹھی تھی اس کے سر پر گیرواں اوڑھنی تھی۔ نینا کی آنکھیں بند تھیں اور یوں لگتا تھا کہ وہ عبادت میں مصروف تھی۔ تب میری نگاہ کچھ دور رکھی مہاتما بدھ کی مورتی پر پڑی۔ نینا کی توجہ اس مورتی پر مرکوز تھی۔ ہم بہت دھیرے سے اندر داخل ہوئے تھے مگر پھر بھی اتنی آہٹ ضرور ہوئی کہ نینا کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ ہم پر مرکوز ہو گئیں۔

وہ ہم تینوں کو یوں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ لپک کر اٹھی اور اس نے دونوں بہنوں کو باری باری سینے سے لگایا۔ دونوں رونے لگیں۔ میں نے کہا ''یہ رونے دھونے کا موقع نہیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

نینا سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ مجھے ٹھیک سے پہچانی نہیں تھی کیونکہ جب چھوٹی دو بہنوں سے میری ملاقات ہوئی تھی نینا ''فوڈ پوائزننگ'' کی وجہ سے بیمار تھی۔ روپ نے میری طرف سے بولتے ہوئے کہا ''نینا آپ کو بتایا تھا ناں کہ پاشا بھائی کے ایک بڑے اچھے دوست کولمبو میں ہیں... یہ وہی ہیں... پاشا بھائی بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے آئے ہیں۔''

روپ کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے جو قتل و خون دیکھا تھا وہ اس نازنین کے حواس مختل کرنے کے لیے کافی تھا۔

نینا بس خالی نظروں سے ہمیں دیکھتی جا رہی تھی۔ ہنگی نے بڑی بہن کی تائید کرتے ہوئے کہا ''ہاں... ہمیں یہاں سے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ پلیز آپ چلیں ہمارے ساتھ۔ وقت بہت کم ہے۔''

تینوں بہنیں آپس میں سنہالی زبان بولتی تھیں لیکن اب شاید موجودگی کے خیال سے وہ انگریزی میں بات کر رہی تھیں۔

نینا کو حرکت میں لانے کے لیے روپ نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نینا نے بازو چھڑا لیا۔ روپ نے حیرت آمیز خوف سے کہا ''نینا! کیا بات ہے آپ چل کیوں نہیں؟''

نینا غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی ''نہیں۔ میں نہیں جا سکتی... اور تم... تم بھی یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ وہ خود ہی تمہیں چھوڑ دے گا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ تم دونوں دو چار دن میں کولمبو پہنچ جاؤ گی... میں سچ کہتی ہوں۔ میرا یقین کرو۔''

روپ اور ہنگی حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہی تھیں پھر ان کی ڈری ہوئی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ''مس نینا، میں سب جانتا ہوں کہ تم سے پرنس نے کیا وعدہ کیا ہے اور اس وعدے کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہے۔ کل یا پرسوں اسی قسم کے وعدے وہ خبیث روپ یا ہنگی سے بھی کرے گا۔ وہ شیطان تمہیں دھوکا دے رہا ہے... اور اس سے پہلے نجانے کتنوں کو دھوکا دے چکا ہے۔ بے وقوف مت بنو۔ یہ سنہری موقع پھر نہیں ملے گا۔ چلو... نکلو ہمارے ساتھ۔'' میں نے باقاعدہ اس کا بازو تھام لیا۔

''نہیں... نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بدھا کی قسم کھائی ہے۔ میں یہ قسم توڑ نہیں سکتی۔ میں یہیں رہوں گی۔ اپنی بہنوں کی زندگی اور سلامتی کی خاطر یہیں رہوں گی۔ تم لوگ... تم لوگ اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ میں اب اپنا راستہ نہیں بدل سکتی۔'' اس نے غیر ارادی طور پر بدھا کی مورتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں جھنجلا گیا ''یہ کیا حماقت کر رہی ہو تم... جو بدمعاش تمہیں لوٹ رہا ہے اسی کو نجات دہندہ سمجھ رہی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں یہاں تم لوگوں کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''کچھ بھی ہے... کچھ بھی ہے لیکن میں اب یہاں سے نہیں جا سکتی۔ میں نے قسم کھا رکھی ہے۔ تم لوگ جاؤ... میں تمہارے لیے... دعا کروں گی۔''

اچانک کہیں قریب سے بلند آواز میں پکارنے کی صدا سنائی دی۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ نینا کو ساتھ لے جانے کی کوشش میں ہم تینوں پھنس سکتے تھے۔ روپ بڑی بہن کا بازو کھینچ رہی تھی۔ ہنگی اس سے التجا کر رہی تھی کہ وہ ساتھ چلے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ بالکل پتھر ہو رہی تھی۔ میں نے بھانپ لیا کہ ہم ''قیمتی'' وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔ میں نے روپ کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

''چلو ہم چلتے ہیں اسے بعد میں آ کر لے جائیں گے۔ یہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔''

"پلیز نینا، ایسا مت کرو... پلیز۔" روپ نے روتے ہوئے کہا۔

نینا جنکی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ اس کا حتمی فیصلہ تھا۔ میں نے روپ کو بازو سے کھینچا اور جنکی کو لیتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ پکارنے کی صدا دوبارہ گونجی۔ محل کے کئی حصوں میں رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ روپ کی دعا میرے گلے میں جھول رہی تھی اور میری انگلی اس کی لبلبی پر تھی۔ دوا اس پر دہشت سی سوار تھی۔ دو چار، پانچ افراد کو بھون دینا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ہم رہائشی حصے میں سے نکلے اور پورچ کے پہلو میں پہنچ گئے۔ جو گاڑی میں نے نکلنے کے لیے منتخب کر رکھی تھی وہ وہیں موجود تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دونوں اگلے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ یہ ایک اسٹیشن ویگن تھی۔ میں نے دونوں لڑکیوں کو گاڑی میں گھسایا اور عقبی حصے میں نشستوں کے درمیان یوں بٹھا دیا کہ انہیں آسانی سے دیکھا جانا ممکن نہیں رہا۔ اس کے بعد میں نے ان پر کمبل کا ایک بڑا ٹکڑا ڈال دیا۔ درحقیقت یہ تاریک شیشوں والی وہی اسٹیشن ویگن تھی جس پر دو دن پہلے ننھوں بچوں کو آرچ مینشن سے لایا گیا تھا۔

اب مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک راستہ موجود تھا۔ یہ راستہ اسی وقت میری سمجھ میں آیا تھا۔ جب میرے خنجر کا پھل انچارج جانسن کے پیٹ میں اترا تھا۔ میں جانتا تھا بلیک جانسن کے "تعاون" سے یہاں سے نکل سکتا تھا۔ میں دوڑتا ہوا واپس کوریڈور میں پہنچا اور پھر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں جانسن میرے ہاتھوں جان لیوا طور پر گھائل ہوا تھا۔ ایک زخم اس کے پیٹ پر آیا تھا جبکہ دوسرا سینے پر دائیں جانب۔ روپ کے کمرے سے ذرا آگے کوریڈور کے قالین پر بلیک جانسن پڑا تھا۔ خون نے قالین کے ایک بڑے حصے کو داغدار کر دیا تھا۔ گہری بے ہوشی کے عالم میں جانسن کے حلق سے خرخر کی مدھم آواز نکل رہی تھی۔ اس کا ایک جوتا اتر چکا تھا۔ اس کے ہولسٹر میں سے پسٹل جھانک رہا تھا۔

میں نے جانسن کو اسی حالت میں کندھے پر اٹھایا اور پورچ کی طرف بھاگا۔ جانسن خاصا بھاری بھرکم تھا۔ اس کا جسم گرم تھا اور سانس کی آمدورفت برقرار تھی۔ میں نے پورچ میں پہنچ کر جانسن کو اسٹیشن ویگن میں ڈالا تو ایک جاپانی گارڈ نے مجھے دیکھ لیا اور دوڑتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔

"کسی نے جانسن کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسے فوراً ہسپتال لے جانا ہوگا۔" میں نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور پھر بڑی تیز رفتاری سے مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ مین گیٹ کافی فاصلے پر واقع تھا۔ حسب توقع دو گارڈز نے ہمیں روک لیا۔

میں نے چیختے ہوئے کہا "گیٹ کھولو۔ مسٹر جانسن مر رہے ہیں... جلدی کرو۔"

جاپانی گارڈز نے اندر جھانکا۔ جانسن بس لمحوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ "کیا ہوا ان کو؟"

میں نے وہی جواب دیا جو چند لمحے پہلے دیا تھا "خو[illegible] کی کوشش کی ہے۔ اس کو فوراً ہسپتال پہنچانا ہوگا۔"

جاپانی گارڈز چند لمحوں کے لیے تذبذب میں نظر آئے پھر ان میں سے ایک سینئر گارڈ دروازہ کھول کر ہمارے ساتھ ہی ویگن میں بیٹھ گیا۔ دوسرے گارڈز نے مین گیٹ کھول دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گارڈز کو زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ملے۔ ابھی گیٹ پورا کھلا بھی نہیں تھا کہ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ذرا ہی دیر بعد ہم بڑی سڑک پر تھے۔ جو گارڈ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ اس نے یقیناً اپنے لیے سخت مصیبت کو دعوت دی تھی۔

اب رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ مضافاتی علاقے کی یہ سڑک خوب چوڑی اور صاف ستھری تھی۔ میں نے دن کے وقت یہ علاقہ دیکھا تھا۔ دور دور تک گھاس کے نہایت خوبصورت و ہموار میدان دکھائی دیتے تھے۔ میدانوں میں کہیں کہیں بچے کھیلتے نظر آتے تھے یا دودھیا گائیاں چر رہی ہوتی تھیں۔ درختوں سے گرنے والے پتے راستے پر ایسے سرخ اور پیلے قالین بچھاتے تھے کہ نگاہ جم کر رہ جاتی تھی لیکن اس وقت سب کچھ شب کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور نگاہوں سے اوجھل تھا۔

ہماری اسٹیشن ویگن نہایت برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی اور چند منٹ میں ہی پرنس داؤد کی رہائش گاہ سے چھ سات کلومیٹر دور آ گئی۔ جاپانی گارڈ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں فراری سے اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھیں۔ شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ گاڑی میں ہم تینوں کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ بعض لوگ خواتین کی موجودگی کو بغیر کسی وجہ کے بھی محسوس کر لیتے ہیں۔ چند لمحے بعد وہ گردن لمبی کر کے عقبی حصے میں جھانکنے لگا۔ وہ اپنی مصیبت کو دعوت دے رہا تھا۔ اب میرے لیے ضروری تھا کہ اس کا کچھ نہ کچھ کروں۔ اس سے پہلے کہ میں جاپانی گارڈ کو کسی مصیبت میں ڈالتا۔ میں خود ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا بلکہ ہم سب کے سب ایک مصیبت

میں گرفتار ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ گاڑی کے عقبی حصے سے جنکی کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ وہ پچھلی نشستوں سے اچھلی اور ہذیانی انداز میں چلاتی ہوئی اگلی نشستوں کی طرف بڑھی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ دھڑام سے روپ کے اوپر گری۔ میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ افراتفری میں گاڑی سڑک سے نیچے اتری اور ایک نیم پختہ ذیلی راستے پر چڑھ گئی۔ میں نے اسے مشکل سے قابو کیا۔ جنکی کی تقلید میں روپ نے بھی چیخنا شروع کر دیا تھا اور وہ بھی پھدکتی ہوئی اگلی نشستوں پر آ گئی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ نیم مردہ جانسن کے اوپر تھا اور بازو میرے کندھوں پر تھے۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے جواب میں کچھ نہیں کہا بس اپنا گلا پھاڑتی رہیں۔ جنکی نے اپنے لبادے کو ران پر سے دبوچ رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے کوئی چیز تھام رکھی ہے۔ میں نے ویگن کو بریک لگائے اور وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں جا رکی۔ اندرونی روشنی میں، میں نے روپ اور جنکی کے عقب میں دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اسٹیشن ویگن میں دو بڑے سائز کے خوفناک چھپکلے نظر آ رہے تھے۔ میرا دھیان ایک لمحے میں ڈسٹ اور کنگ براؤن وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ اس قسم کے چھپکلے ہم نے پہلی بار وہیں دیکھے تھے۔ تقریباً انسانی بازو کے برابر وحشت ناک چھپکلے زہریلے تو نہیں تھے لیکن انسان پر حملہ کر کے اسے جان لیوا طور پر زخمی کر سکتے تھے۔

"ہائے میں مر گئی۔ مجھے بچاؤ۔" جنکی کربناک انداز میں بولی۔

یقیناً اس کے لباس میں چھپکلا موجود تھا اور اس نے گھٹنے سے اوپر جنکی کی ٹانگ میں اپنے دانت پیوست کر رکھے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا۔ میں نے تیز رفتار خنجر سے جنکی کا لبادہ گریبان سے پاؤں تک پھاڑ دیا اور پھر بہت سہولت سے چھپکلا اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ بھی چھپکلا ہی تھا۔ ریشمی کپڑے کے اندر وہ بڑی طرح پھنس رہا تھا۔ وہ سائز میں کچھ چھوٹا تھا۔ شاید ایک فٹ کے قریب ہوگا۔ میں نے چھپکلا اور لباس گاڑی سے باہر تاریکی میں پھینک دیے۔

ایک دوسرا چھپکلا چھوٹی سی جست لگا کر روپ کے سامنے آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ روپ کے گوشت پر دانت گاڑتا، میں نے گن سے فائر کیا۔ گولی عین نشانے پر لگی اور چھپکلے کا سر اس کے دھڑ پر سے اوجھل ہو گیا۔

اندرونی روشنی میں جنکی کے جسم پر اب نہایت مختصر لباس نظر آ رہا تھا۔ اس کی ران پر کاٹے جانے کا زخم تھا۔

"وہ دیکھو۔" وہ ایک طرف انگلی دکھاتے ہوئے چیخی۔

ایک نشست کے نیچے سے بھی ایک اور چھپکلا برآمد ہو رہا تھا۔ چھپکلے کی نشاندہی کرنے کے بعد جنکی چھلانگ لگا کر گاڑی سے اتر گئی۔ روپ اور جاپانی گارڈ نے بھی اس کی تقلید کی۔ یقیناً زخمی جانسن میں سکت ہوتی تو وہ بھی ایسا ہی کرتا لیکن اس میں سکت نہیں تھی اور میرے خیال میں اب اس میں زندگی بھی باقی نہیں تھی۔ اندرونی روشنی میں اس کے چہرے کی جھلک نے مجھے بتا دیا کہ وہ مر چکا ہے۔

میں نے دھیان سے گاڑی کا جائزہ لیا اور اندازہ ہوا کہ اس میں کم و بیش ایسے ہی چھ کریہہ صورت جانور موجود ہیں۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ گاڑی کے عقبی حصے میں ایک مستطیل پنجرہ رکھا تھا۔ یہ جانور اسی پنجرے میں تھے۔ غالباً پنجرے کا دروازہ ٹھیک سے بند نہیں تھا۔ گاڑی چلنے کے دوران میں لگنے والے جھٹکوں کے سبب یا کسی اور وجہ سے یہ دروازہ کھل گیا تھا اور موذی LIZARDS باہر نکل آئے تھے۔ میں نے فائر کر کے دو مزید چھپکلوں کو ہلاک کیا۔ باقی گاڑی سے نکل کر تتر بتر ہو گئے۔ جب میں چھپکلوں پر فائر کر رہا تھا۔ جاپانی گارڈ مجھے مسلسل روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اس سے پتا چلا کہ یہ چھپکلے پالتو ہیں اور پرنس کی فیملی میں سے کسی نے پال رکھے ہیں۔

یہ ہنگامہ ختم ہونے میں تقریباً پانچ منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں جانسن کی زندگی کا ہنگامہ بھی مکمل سکوت میں بدل چکا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے جنکی کو اس کا کٹا پھٹا لباس دیا تاکہ وہ اپنی برہنگی چھپا سکے۔ وہ لباس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ روپ نے اسے بڑی مشکل سے آمادہ کیا کہ وہ لبادے کو چادر کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لے۔

جاپانی گارڈ اب سخت الجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ دونوں لڑکیوں نے پرنس کی رہائش گاہ سے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس کا رویہ یکدم سخت ہو گیا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ مسلسل اپنی رائفل پر نظر آ رہا تھا۔ میرے حوالے سے شاید وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ یعنی یہ بات واضح نہیں تھی کہ وہ مجھے اس "جرم" میں ملوث سمجھ رہا ہے یا نہیں۔

اس نے مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اور ناقابل فہم انگلش میں کہا "یہ دونوں لڑکیاں قصوروار

ہیں۔ انچارج صاحب مر چکے ہیں..... اب ہمیں واپس رہائش گاہ پر چلنا ہے۔" اس کا انداز تجویز یا نہیں بلکہ حکم دینے کا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کوتاہ قد نمک حلال میرے لیے مشکل پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید چوکنا ہو جاتا اور مزاحمت پر اتر آتا میں اس کے قریب چلا گیا۔ جونہی اس کا دھیان ہنگی اور روپ کی طرف گیا میں نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ گرفت بڑی مکمل تھی۔ جاپانی گارڈ رائفل کو جنبش بھی نہیں دے سکا۔ میں اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا..... لیکن یہاں پھر وہی دردناک واقعہ بالکل اسی انداز میں ہوا جو کچھ دیر پہلے ہو چکا تھا۔ جاپانی گارڈ نے حق نمک ادا کرنے کی خاطر اپنے وحشیانہ انداز میں زور لگایا اور یوں اچانک پینترا بدلنے کی کوشش کی کہ اس کی گردن گاجر کی طرح ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ نیم پختہ زمین پر گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔

"اسے کیا ہوا؟" روپ نے چیختے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شبہات تھے۔ اس سے پہلے وہ کوریڈور میں بھی ایک جوشیلے گارڈ کو اسی طرح دم توڑتے دیکھ چکی تھی۔

"کچھ نہیں۔ بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے کہا "اور تم زیادہ انکوائری نہ کرو۔ ہم سخت خطرے میں ہیں۔ فوراً سے پہلے گاڑی میں بیٹھ جاؤ..... اب وہاں کوئی جانو نہیں ہے۔"

میرے لہجے میں سختی محسوس کر کے دونوں بہنیں نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی میں گھس گئیں۔ میں جانتا تھا کہ اب دوبارہ مین روڈ پر جانا ٹھیک نہیں..... بلکہ مین روڈ پر جانا سرے سے ٹھیک ہی نہیں تھا۔ بعض اوقات قدرت مشکل حالات کے ذریعے بھی مسافر کی سمت درست کر دیتی ہے۔ یہ بات اب میرے ذہن میں آ گئی تھی کہ ہمیں اس ذیلی راستے پر آگے بڑھنا چاہیے۔ میں اونچے نیچے راستے پر گاڑی دوڑاتا چلا گیا۔ دور کہیں پولیس کاروں کے منحوس سائرن سنائی دے رہے تھے۔ خبر نہیں کہ یہ کاریں ہمارے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہی تھیں یا کوئی اور معاملہ تھا۔ بہرحال ان کاروں کی آواز بہت بری لگ رہی تھی۔

روپ اور ہنگی بالکل خاموش تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک انہوں نے جو نظارہ دیکھا تھا وہ یقیناً دل و دماغ پر اثر کرنے والی تھی۔ پھر دونوں بہنوں کو یہ بھی دکھ تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن کو ساتھ نہیں لا سکیں۔ اپنے طور پر وہ دونوں نینا کے بارے میں پتا نہیں کیا سوچ رہی تھیں لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ نینا وہاں کیوں رہ گئی ہے۔ دیکھنے میں وہ تینوں ہم عمر ہی لگتی تھیں لیکن پھر بھی عمر کا فرق تو ضرور تھا۔ بڑی بہن ہونے کے ناتے نینا نے قربانی دی تھی۔ خود کو اور بہنوں کو پوری طرح مجبور اور بے بس پا کر اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اس نے پرنس داراب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی منشا و مرضی کے مطابق چلے گی۔ اس کے بدلے میں داراب اس کی دونوں بہنوں کو عزت و سلامتی کے ساتھ ان کے گھر واپس پہنچا دے گا۔

میں نے اس سلسلے میں کل رات داراب اور نینا کی ساری گفتگو سنی تھی۔ اس گفتگو سے یہ بھی واضح ہوا تھا کہ ایک روز پہلے یا اسی دن صبح کے وقت اپنی آبرو پرنس داراب کے ہاتھوں گنوا چکی ہے۔ ہم تیزی سے سفر کرتے رہے۔ اس مسروقہ گاڑی کو زیادہ دیر قبضے میں رکھنا ہرگز ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے ایک ویران ٹیلی فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر گاڑی روکی اور وہاں آر جے سٹیشن میں سروج سے رابطہ کیا۔ وہ رات کے اس پہر جاگنے سے نشے میں محسوس ہوتی تھی۔ میری آواز پہچانتے ہی اس کے لہجے کا خمار دور ہو گیا۔ ترنخ کر بولی "میرے خیال میں تم سے یہ سوال پوچھنا بے کار ہے کہ تم کہاں تھے کیونکہ جواب میں تم نے ایک شاندار بہانہ ضرور گھڑ رکھا ہوگا۔"

"مجھے تمہارے سامنے بہانے بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یہاں بالکل آزاد ہوں۔ بہرحال تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔"

"کہیں غزالہ تو نہیں مل گئی؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"قسمت میں ہوا تو وہ بھی مل جائے گی۔ فی الحال ایک ضروری کام سے لندن کے مضافات میں ہوں۔ میرے لیے کوئی فون تو نہیں تھا۔"

"تمہارے لیے تو نہیں تھا۔ بہرحال ابھی کچھ دیر پہلے ایک فون آیا ہے۔ پرنس داراب کا پرسنل سیکرٹری بول رہا تھا۔ اس نے خبر دی ہے کہ پرنس داراب کی رہائش گاہ میں ڈکیتی کی خونی واردات ہوئی ہے۔ کچھ افراد نے رہائشی عمارت میں گھس کر دو افراد کو قتل کر دیا ہے اور گارڈز میں سے دو بہنوں کو زبردستی اغوا کر لیا ہے۔"

"میرے پاس بھی یہی اطلاع تھی۔" میں نے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر سروج کی تیز طرار آواز دی۔ "شاہ جہاں، تم ایک نمبر کے جھوٹے اور مکار ہو۔ پورا وشواس ہے کہ ابھی جو خبر ملی ہے اس کا کارن تم ہو۔ میں سب سمجھ گئی ہوں۔"

"میرے خیال میں فون پر ایسی گفتگو مناسب نہیں۔ اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا" "شاید"

رابطہ سے مزید بات بھی کرتا لیکن اس دوران میں لائن ڈراپ ہو گئی۔ بہرحال اس گفتگو سے یہ پتا تو چل گیا تھا کہ غزالہ، آفرین وغیرہ کی طرف سے مجھے کوئی فون نہیں کیا گیا۔

سروج سے بات کرنے کے بعد میں نے عشرت رحمانی کا نمبر ملایا۔ عشرت رحمانی نے فون اٹھایا۔ وہ آج رات کے ہنگامے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں نے عشرت رحمانی کو سمجھایا کہ میں کہاں اور کس حال میں کھڑا ہوں۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی کار لے کر فوراً یہاں پہنچ جائے۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد رات کے قریباً ڈھائی بجے تھے اور ہم سخت سردی اور پکڑے جانے کے خطرات کو شکست دینے کے بعد رحمانی کے نیم گرم فلیٹ میں موجود تھے۔ پرنس کی رہائش گاہ سے چرائی جانے والی اسٹیشن ویگن ہم نے وہیں فون بوتھ کے قریب چھوڑ دی تھی اور رحمانی کی گاڑی پر فلیٹ میں پہنچے تھے۔

ہمارے پہنچنے کے پانچ دس منٹ بعد عالم قریشی بھی یہاں آ گیا۔ میرے اور عالم قریشی کے درمیان علیحدگی میں جو گفتگو ہوئی اس سے پتا چلا کہ سب کچھ ہمارے پروگرام کے مطابق ہوا ہے اور آج رات میں نے جو کارروائی کی ہے اس کا اثر عالم اور اس کے دوست کی مشترکہ ایجنسی "ایور ریڈی" پر زیادہ نہیں پڑے گا۔ عالم نے بتایا "میں نے ٹھیک گیارہ بج کر دس منٹ پر پرنس کی رہائش گاہ پر فون کیا اور پھر اس عمل کو چار پانچ مرتبہ دہرایا۔ اس وقت ایسے دو افراد میرے ساتھ موجود تھے جو بعد میں ضرورت پڑنے پر کہیں بھی اس بات کی گواہی دے سکتے تھے۔ اس کے فوراً بعد ہمارا انگریز منیجر ہمارے لیگل ایڈوائزر کے ساتھ ونچسٹر روانہ ہو گیا تھا تاکہ پرنس کو خطرے کے بارے میں براہ راست بتایا جا سکے۔"

میرے اور عالم کے درمیان چار پانچ منٹ تک اس بارے میں گفتگو ہوئی۔ بہرحال اس گفتگو کے دوران میں بھی میرا دھیان مسلسل غزالہ اور چچا کی طرف لگا رہا۔ جونہی یہ گفتگو ختم ہوئی میں نے عالم سے پوچھا "چچا کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

عالم کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے وہ حوصلہ افزا نہیں تھے۔ اس نے کہا "یار، مجھے تو پھر کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔ پتا نہیں کہ تیری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ تو نے کام بھی تو بڑا کیا تھا۔ عین ٹائم پر تجھے اپنی پسوڑی پڑ گئی تھی۔"

میں نے کہا "یہ پسوڑی نہ پڑتی تو..... یہ دونوں لڑکیاں درست سالم واپس نہ آ سکتیں۔ بہرحال، تم بتاؤ کہ انکل کی طرف کیا صورت حال ہے؟"

"کل تمہارا فون آنے کے فوراً بعد میں کار کے ذریعے کینٹ پہنچا۔ ایڈریس ڈھونڈنے میں تھوڑی سی دشواری تو ہوئی لیکن آخر پہنچ گیا۔ گھر پر ایک چوکیدار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے پوچھنے پر بتایا کہ اسے کچھ پتا نہیں۔ گھر والے کہاں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بڑی بیگم کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہو اور وہ اسپتال چلے گئے ہوں..... میں ڈرائیور کے ساتھ فوراً ٹون برج سے وکٹوریہ اسپتال پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آنٹی صاحبہ کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ ان کو سی سی یو سے کمرے میں شفٹ کیا جا چکا تھا۔ وہاں ایک آفرین نام کی لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے ان سے انکل جلیس اور غزالہ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بھی ان کے بارے میں کچھ پریشان تھی۔ اس نے کہا "میں یہاں اسپتال میں تھی، میری جگہ غزالہ نے آنا تھا۔ وہ نہیں آئی نہ ہی انکل کا کچھ پتا ہے۔ مایوس ہو کر میں واپس آ گیا۔"

عالم قریشی کی باتیں سن کر میرے سینے میں دھواں سا بھر گیا..... یہ وہی اندیشے تھے جو دو دن سے میرے ذہن میں رینگ رہے تھے، اب وہ حقیقت بن کر سامنے آ گئے تھے..... سوال یہ تھا کہ غزالہ اور انکل خود کہیں گئے ہیں یا خدانخواستہ انہیں کہیں لے جایا گیا ہے۔ یہ بات تو بظاہر سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ چچی فاخرہ کو اسپتال میں چھوڑ کر وہ لوگ پہلے کی طرح کہیں گم ہو سکتے ہیں۔ کیا وہ بہت ناراض ہو گئے تھے؟ کیا انہیں کوئی ارجنٹ کام پڑ گیا تھا؟ کیا وہ چچی فاخرہ کی بیماری کے سلسلے میں کہیں گئے تھے؟ ان گنت سوچیں تھیں۔

میں نے عالم سے کہا "یار، ایک بار پھر ان کے گھر پر فون کرو۔"

"یہ میرا ایک سو چالیسواں فون ہوگا۔" وہ بیزار ہو کر بولا اور فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے نمبر ملایا۔ ریسیور کان سے لگا ہوا تھا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد اس نے ریسیور رکھ دیا "نو ریپلائی" اس نے مایوس انداز میں کہا۔

سینے میں بھرتا ہوا دھواں گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ ان گنت خیالات تھے کہیں یہ نہ ہو..... کہیں وہ نہ ہو۔ عالم قریشی اور رحمانی مجھ سے گزرنے والی رات کے حالات پوچھنا چاہ رہے تھے۔ میں ان کو جواب بھی دے رہا تھا مگر میرا ذہن کہیں اور تھا..... انکل اور غزالہ میں الجھا ہوا تھا۔ میں ان کے ردعمل کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور شاید اسی وجہ سے میں زیادہ پریشان بھی تھا۔

رات بیت چکی تھی۔ اب دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ فلیٹ کی کھڑکیوں سے باہر ہلکا ہلکا کہرا تھا اور اس کہرے میں لپٹا ہوا لندن جاگنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ کہانیوں کا شہر تھا۔ ان گنت بزم و رزم واقعات اس شہر سے وابستہ تھے۔ مادر ملکہ... ملکہ الزبتھ، شہزادہ فلپ... شہزادی این اور پھر اس سے پہلے چرچل اور اس سے پہلے عظیم وکٹوریہ اور اس سے پہلے کوئی اور... یہ لندن کئی مرتبہ آتش زدگیوں اور بیماریوں سے اجڑا تھا اور آباد ہوا تھا۔ آج یہ لندن ایک فلیٹ کی کھڑکی میں میرے سامنے حد نگاہ پھیلا ہوا تھا... آج ایک بار پھر یہ میرے لیے آباد ہونے والا تھا یا اجڑنے والا تھا۔ غزالہ اور انکل کا ساتھ اسے آباد کر سکتا تھا اور ان کی دوری اسے اجاڑ سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد میں ایک بار پھر خالی خالی ذہن کے ساتھ فون کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ ابھی بس منٹ پہلے عالم قریشی نے ٹرائی کی تھی..... اب پھر میرا ڈائل کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ عالم میری اس حرکت سے ترچ ہوگا لیکن اس کی پروا کیے بغیر میں نے پھر نمبر ڈائل کر دیا..... دور کہیں کینٹ کے اس شاندار گھر میں کسی آراستہ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایک بار..... دو بار..... چار بار... اچانک کسی نے ریسیور اٹھایا... میرے کانوں میں دنیا کی سب سے حسین آواز ٹکرائی "ہیلو... کون؟"

"میں شاہ جہاں ہوں..... کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"اوہ آپ۔" خوشی سے کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ غزالہ کی آواز تھی۔

اس کے ساتھ ہی کسی نے غزالہ کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ یہ انکل جلیس تھے۔ انہوں نے کہا "جیالے کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو تم..... یار تمہارا انتظار کر کر کے تو میری چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں..... بلکہ ہم سب کی چولیں ڈھیلی ہو گئی ہیں۔"

انکل اور غزالہ کے لہجے میں بشاشت نے مجھے احساس دلایا کہ زندگی ابھی اتنی تلخ اور تیرہ و تار نہیں ہوئی ہے... ابھی لندن کی جگمگاتی روشنیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ابھی ماربل آرچ کے بالمقابل گھر میں ایک خوبصورت دوپہر گزاری جا سکتی ہے۔ ابھی کسی شام کو کینٹ میں حد نگاہ تک پھیلے ہوئے گھاس کے خوبصورت میدان اور پھولوں کے تختے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ابھی دریائے ٹیمز کے کنارے حسین ہیں۔ لندن برج، چیئرنگ کراس، ہائیڈ پارک اور واٹرلو وغیرہ میں ابھی کشش باقی ہے..... ہاں ابھی زندگی اتنی بے کار نہیں ہوئی ہے۔

چچا کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا "کل صبح سویرے اچانک ایک مہمان ہمارے اوپر نازل ہو گیا تھا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ پر کچھ مسائل میں الجھا ہوا تھا..... اس سے ملے بغیر اور اس کے مسائل حل کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ بہت دلچسپ مہمان ہے..... تم ہمارے ہاں آؤ گے تو تمہیں ملواؤں گا۔ اس کی باتیں سن کر تم ششدر رہ جاؤ گے۔ ہم شام کے وقت ایئرپورٹ سے فارغ ہو سکے تھے۔ اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہوئے کہ ہمیں مہمان کے ساتھ اچانک بیڈفورڈ جانا پڑ گیا۔ بیڈفورڈ سے ابھی صرف پانچ منٹ پہلے ہم یہاں پہنچے تھے..... ابھی غزالہ نے کمرے کی لائٹ بھی آن نہیں کی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔"

"آپ کی باتیں سن کر مجھے اس اہم مہمان سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

"تو آ جاؤ۔ آج ہی..... عالم اور عشرت رحمانی وغیرہ کو بھی ساتھ لے آؤ۔ دو چار افراد ہماری طرف سے ہو جائیں گے۔ بالکل اپنی سی تقریب ہوگی..... بس جہاں میں چاہتا ہوں کہ اس کام میں اب اور تاخیر نہ ہو۔ میں جلد از جلد تم دونوں کو ایک دیکھنا چاہتا ہوں....." چچا کے لہجے میں عجیب سی بے تابی تھی۔

یوں لگتا تھا کہ چچا کو اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ بیوی کی غیر موجودگی میں وہ جس انداز میں سوچ رہے ہیں، اس کی "موجودگی" میں نہیں سوچ سکیں گے۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کہتے ہیں..... میں بس ذرا مشورہ کر لوں پھر آپ کو فون کرتا ہوں۔"

عالم قریشی بڑے دھیان سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ریسیور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا "چاچا جانی! آپ پرائم ٹائم ضائع مت کریں۔ آپ مجھ سے بات کریں۔ آپ کا یہ بچہ رہا ہے اس وقت میری حیثیت اس کے سرپرست کی ہے۔ جو کچھ طے کرنا ہے مجھ ہی سے کرنا ہے۔ آپ فرمائیں آپ کا کیا حکم ہے؟"

وہ دھیان سے دوسری طرف کی آواز سنتا رہا اور پھر یکا یک اپنے گھڑے جیسے سر کو اثبات میں ہلاتا رہا۔ درمیان میں اس نے ایک دو الفاظ بھی بولے۔ میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی تو اس نے ہلکا دھکا دے کر تیوریاں چڑھا کر مجھے دور بٹھا دیا۔ تین چار منٹ کے اندر اس نے خالص پنجابی انداز میں سب کچھ طے کر لیا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

"اوئے قریشی! یار تو کیسا بندہ ہے۔ مجھے انکل کو یہ بھی نہیں بتانے دیا کہ میں دو دن کہاں غائب رہا ہوں۔"

"انہیں تیری آنیوں جانیوں کا سارا پتا ہے۔ ابھی فون پہ کہہ رہے تھے کہ شاہ جہاں نے نیک کام کیا ہے۔ اگر لڑکیوں کے لیے کوشش نہ کرتا تو پتا نہیں ان پر کیا بیتتی۔"

"ہائیں..... انکل کو کیسے پتا چلا؟"

"انہیں کسی طور معلوم ہو گیا ہوگا۔ چوکس آدمی ہیں..... آخر سسر کس کے ہیں۔"

میں ذہن ہی ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ بات قابل غور کرنے کی تھی کہ انکل کو لڑکیوں کی مصیبت اور ان کی گلوخلاصی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ بہرحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ انکل اور غزالہ صورت حال سے باخبر ہیں۔

فون بند کرنے کے فوراً بعد عالم قریشی کسی جن کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔ وہ اب کسی صورت میرے دائیں بائیں ہو جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے منہ سے بار بار یہی فقرہ ادا ہو رہا تھا "شاہ جہاں، یہ تیری زندگی کا اہم ترین موقع ہے۔ میں اس موقعے کو تیری کسی اوٹ پٹانگ حرکت کی نذر نہیں ہونے دوں گا۔"

دو بجے کے قریب وہ مجھے اپنی نئی مرسیڈیز میں بٹھا کر ایک بڑی شاپ پر لے گیا۔ اس نہایت نفیس شاپ پر نہایت مہذب انور علی بھائی موجود تھے۔ ان کی شخصیت میں عجیب سی وضع داری اور کشش تھی۔ وہ حسب سابق محبت سے ملے اور پھر اپنے انگریز معاون کو اشارہ کیا۔ وہ اندر گیا اور بہترین کپڑے کی ایک زبردست شیروانی لے آیا۔ عالم نے مجھے ٹرائنگ روم میں دھکیل کر شیروانی چیک کرائی۔ وہ بہترین ناپ کی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم چیئرنگ کراس کے علاقے میں شوز کی ایک سہ منزلہ دکان میں پہنچے۔ اس دکان کا نام "مہاراجہ کلاسیکل" تھا۔ یہاں ایک سلیم شاہی جوتا میرے پاؤں میں پہنایا گیا۔ یہ مکمل "چندہ مینڈ" تھا اور اس میں مجھے چند قیمتی پتھر بھی جڑے نظر آ رہے تھے۔ بہرحال یہ عالم قریشی سے بحث مباحثے کا موقع نہیں تھا۔ میں خاموش رہا۔ "مہاراجہ کلاسیکل" سے فارغ ہونے تو عالم قریشی کی گاڑی پھر رواں دواں ہو گئی۔ اب ہم برانڈ مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں عطر اور پرفیوم وغیرہ پائے جاتے تھے۔ یعنی عالم نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے دو دن پہلے ٹوٹ گیا تھا۔

شام کے سات بجے تھے جب ہم عشرت رحمانی کے فلیٹ سے کینٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ روپ اور پنکی کی دیکھ بھال کے لیے رحمانی نے اپنی ایک بہن کو فلیٹ پر بلا لیا تھا۔ دونوں بہنیں ابھی تک پریشان تھیں۔ ان کی پریشانی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک تو میں نے ابھی تک انہیں "بناٹا" سے نہیں ملایا تھا۔ دوسرے ان کی بہن وہاں ومجسٹر میں ہی رہ گئی تھی۔ بہرحال مجھے یقین تھا کہ میں دو چار دن میں ان کو بحال کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس دوران میں تینا کی واپسی کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔

ہم فلیٹ سے نکلے تو میں اصل حلیے میں تھا۔ ومجسٹر کے محل میں مارا ماری کے بعد میرا "گیٹ اپ" میرے اصل حلیے سے زیادہ خطرناک ہو گیا تھا... ایک گھٹا چلنے میں نے

ایم اے راحت

کی

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک بار شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں چھوڑی جا سکتی ۔۔۔ ایک نوجوان جس کے انداز زندگی کا ہر ڈھنگ نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش کی بجائے سمندر کی گود میں پلا تھا

سمندر کا بیٹا

''ایور ریڈی'' کے ایک ''میک اپ مین'' کی مدد سے اپنا میک اپ ختم کرا دیا تھا۔ اپنی مرسیڈیز عالم قریشی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے منہ میں الائچی سپاری پان تھا۔ ڈیش بورڈ پر اس نے تازہ پھول رکھے ہوئے تھے اور عقب نما آئینے کے ساتھ بھی پھولوں کا ہار رکھا تھا۔ میں اس کے ساتھ اگلی نشست پر تھا اور خود کو شیروانی میں قید محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال عالم قریشی کی یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں اور میں اس موقع پر اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عالم قریشی نے آہ بھری اور بولا ''صفدر اور زریں خان کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا ''پچھلے ایک گھنٹے میں تم نے یہ پہلی بات کی ہے، جس کی میں تائید کر سکتا ہوں۔''

''تم بولو گے تو کوئی نہ کوئی تیر ہی چلاؤ گے، بہتر ہے کہ چپ بیٹھے رہو۔'' وہ غصے سے بولا۔

ہم بخیریت کینٹ پہنچ گئے۔ انکل جلیس ان کے ایک برادر ان لا اور دو تین قریبی دوست ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دو خواتین بھی تھیں۔ ان میں سے ایک تو آفرین تھی، دوسری انکل کے برادر ان لا کی وائف تھیں۔ وہ بڑی اچھی خاتون تھیں۔ میں ان سے پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔

وہ بڑی حسین شام تھی۔ وہ بڑے حسین مناظر تھے ... وہ جو کچھ تھا آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والا تھا اور ہمیشہ کے لیے دل میں نقش ہو جانے والا تھا۔ وہ ایک دیرینہ دعا کے اثر جیسا تھا۔ وہ ایک سہانے سپنے کی تعبیر جیسا تھا۔ وہ ایسا تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بس محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے واقعی میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں اس جیتے جاگتے واقعے کا ایک جیتا جاگتا کردار ہوں۔ وہ ایک ستارہ ستارہ شام تھی۔ وہ ایک خوشبو خوشبو عرصہ تھا اور مجھے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میری آنکھوں میں بسا ہوا یہ حسین خواب ابھی ٹوٹ جائے گا اور میں حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاؤں گا۔ میرے آس پاس سنہری لباس میں لپٹی ہوئی غزالہ نہیں ہو گی۔ مسکراتے چہرے والے چچا نہیں ہوں گے۔ شوخ آنکھوں والی آفرین بھی نہیں ہو گی ..... بس میں ہوں گا۔ میرے ہاتھ میں کوئی مہلک اسلحہ ہو گا۔ میرے ارد گرد ناچتی ہوئی وحشتیں ہوں گی۔ مجھے دھڑکا لگا رہا لیکن آنکھوں میں بسا ہوا یہ حسین خواب ٹوٹا نہیں ..... ہاں یہ خواب نہیں تھا۔ یہ مہربان حقیقت تھی جو ان گنت حادثوں کے جبڑوں سے نکلنے کے بعد میری زندگی میں آئی تھی۔

غزالہ ایک خوبصورت سنہری جوڑے میں مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ تابی نے مجھے اصل شکل میں دیکھا تھا اور اصل شکل میں دیکھنے کے بعد میری گود میں ایسا چڑھا تھا کہ اترنے کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں مسلسل میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا ..... اور ساتھ ساتھ اپنا پرانا مشغلہ بھی دہرا رہا تھا۔ اپنی ننھی منی پیاری سی انگلی میری آنکھ میں چبھونے کی کوشش کر رہا تھا ..... زندگی نے مجھ سے ایسی رحم دلی کی تھی کہ خوشی پانے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے خوشی پا لی ہے۔ اب بھی دل میں یہی خدشہ لگا تھا کہ پتا نہیں، آخری لمحوں میں کیا ہو جائے ... لیکن کچھ نہیں ہوا ..... آج کی شام واقعی مہربان اور حسین تھی ... گھڑیاں واقعی میرے لیے ایک مکمل خوشی کی سوغات لے آئی تھیں ..... ایک نورانی چہرے والے مولانا صاحب نے میرا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھ میں تھاما اور شیریں لہجے میں ... شروع کیا ... مجھے میری غزالہ کے ساتھ اٹوٹ رشتے میں باندھا جا رہا تھا .....

سب کچھ ہو گیا لیکن پھر یقین نہیں آیا کہ ہو چکا ہے۔ ... نے مجھے گلے سے لگایا ..... کسی نے میرا منہ میٹھا کرایا۔ آفرین نے کوئی شریر جملہ کہا ..... غم اور بے بہا خوشی! بچھڑے ہوئے اپنے ..... بہت یاد آ رہے تھے۔ مجھے ... رہے تھے ... مسرت و شادمانی کے اس بہاؤ میں دکھ کے چھوٹے بڑے پتھر بھی تھے۔

گہما گہمی کے اس ماحول میں میری نگاہ ایک لمحے کے لیے غزالہ کی نگاہ سے ملی۔ آج یہ خوبصورت آنکھیں میری تھیں ..... آج یہ دلنواز چہرہ میرا تھا ..... اب موت کے سوا ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا تھا۔

ارد گرد موجود سب افراد اپنے حال میں مست تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ قہقہے بکھیر رہے تھے۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ان قہقہوں میں ایک قہقہہ کم ہے ..... اس چار دیواری میں ایک ایسا شخص نہیں ہے جسے ضرور ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پوچھا ''قریشی کہاں ہے انکل؟''

انکل چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ یہی وقت تھا جب میرے کانوں نے ایک مدھم آواز سنی۔ یہ بڑی مانوس آواز تھی۔ یہ پولیس کار کے سائرن کی آواز تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی ہے پھر آواز تھم گئی۔ میرے ذہن میں ہلچل سی پیدا ہوئی تھی۔ میں نے ... موجود افراد کو ان آنکھوں سے دیکھا۔ غالباً ان میں سے کسی نے بھی پولیس کار کی مدھم آواز کو نوٹ نہیں کیا تھا۔

میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو چچا نے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو دولہے میاں؟''

''بس میں ایک منٹ میں آیا۔'' میں گول مول سا جواب دے کر باہر نکل آیا۔

... لان میں کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف آ گیا۔ اچانک مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ میں نے گم شدہ عالم قریشی کو دیکھا۔ وہ مین گیٹ کے عین سامنے اپنی شاندار مرسیڈیز میں موجود تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے برابر کی نشست پر ایک اور گرانڈیل شخص بھی موجود تھا۔ یہ انگریز تھا۔ دونوں کسی نہایت سنجیدہ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ عالم قریشی کی حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ گھبرایا ہوا ہے۔

میں دروازے تک پہنچا تو مجھے عالم قریشی اور اس کے ساتھی کے چہرے بھی دکھائی دینے لگے۔ عالم قریشی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ دوسرے شخص کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ وہ چہرے سے سخت گیر نظر آتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس والا ہے۔ اب عالم قریشی نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کا اترا ہوا چہرہ مزید اتر گیا تھا۔ میں گاڑی کے نزدیک پہنچا تو عالم قریشی نے کھڑکی کا آٹومیٹک شیشہ اتارتے ہوئے کہا۔

''شاہ جہاں! میں بس ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔''

اس نے مجھے سمجھایا تھا کہ فی الحال وہ مجھے اپنی گفتگو سے دور رکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا ''یار! مہمان اندر انتظار کر رہے ہیں۔''

''بس میں ... کر رہا ہوں۔'' اس کی آواز کی لرزش واضح تھی اور ... کسی انجانے خطروں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں واپس آ گیا مگر میری نگاہوں میں مسلسل عالم قریشی کا پژمردہ چہرہ گھوم رہا تھا۔ عالم قریشی بڑا مضبوط شخص تھا۔ چھوٹی موٹی مصیبت کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔ اگر اس کے چہرے پر ... طاری تھا تو پھر یقیناً کوئی بڑی بات ہی تھی۔ انکل جلیس بھی میرے پیچھے ہی پیچھے باہر چلے آئے تھے اور اب ... درمیان کھڑے مین گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں انکل کو عالم قریشی کے بارے میں تسلی دینے کے لیے ان کی طرف بڑھا لیکن ابھی میں مین گیٹ سے آٹھ دس قدم ہی اندر آیا تھا کہ عقب سے عالم قریشی نے آواز دے کر مجھے گاڑی کی طرف بلا لیا۔ وہ گاڑی سے باہر کھڑا تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ بات چیت کرنے والا شخص گاڑی کے اندر ہی بیٹھا تھا۔

میں عالم قریشی کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ ہی گاڑی میں بٹھا لیا۔ باہر کی سردی کے مقابلے میں گاڑی نیم گرم تھی۔ تاہم ماحول بہت سرد اور گمبھیر تھا۔ عالم قریشی اپنے اجنبی ساتھی کے ساتھ اگلی نشستوں پر بیٹھا تھا جبکہ میں عقبی نشست پر تھا۔ مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے ان دونوں نے اپنا رخ میری طرف پھیر لیا۔ عالم ایک گہری سانس لے کر گمبھیر آواز میں بولا ''شاہ جہاں! یہ سارجنٹ ولیم ہیں۔ یہ تمہارے لیے آئے ہیں۔''

عالم قریشی کے الفاظ میرے لیے تہلکہ خیز تھے۔ میرا بدترین اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گیا تھا۔ عالم قریشی کے فقرے کا اصل مطلب یہ تھا کہ یہ شخص میری گرفتاری کے لیے یہاں آیا ہے۔

اس سے پہلے عالم قریشی مزید کچھ کہتا۔ سارجنٹ ولیم بولا ''مسٹر شاہ جہاں! تمہیں شناخت کر لیا گیا ہے اور تم اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہو۔ اگر تمہیں ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ عالم قریشی ہے۔ عالم قریشی میرا اچھا دوست ہے۔''

''یہ شخص کیا کہہ رہا ہے قریشی؟'' میں نے اردو میں پوچھا۔

عالم قریشی مردہ لہجے میں بولا ''یہ ٹھیک کہتا ہے شاہ جہاں۔ ہم اس وقت مکمل طور پر پولیس اور انٹرپول کے گھیرے میں ہیں۔ یہ لوگ شاید آدھا گھنٹا پہلے ہی انکل جلیس کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوتے لیکن میری ایجنسی کے بندوں نے مجھے اس کارروائی کی رپورٹ کر دی۔ میں تمہیں مہمانوں کے درمیان چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ اسے خوش قسمتی کہہ لو کہ پولیس والوں میں میری نظر سارجنٹ ولیم پر پڑ گئی۔ میں نے ولیم کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے کہ وہ ابھی کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کرے۔''

اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ عالم قریشی عین نکاح کے موقع پر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس نے زبردست معاملہ فہمی کا ثبوت دیا تھا اور میری زندگی کے اہم ترین لمحات کو بہت بڑی بدمزگی سے بچایا تھا۔ کم از کم وقتی طور پر تو اس بدمزگی کو روک ہی لیا تھا۔

اب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے عالم قریشی کی تھوڑی

اور گردن پر چند تازہ سرخ خراشیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ "یہ کیا ہوا ہے؟" میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار! بس ایک پولیس والے سے تھوڑی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں ولیم بھی وہاں آ گیا اور اس نے معاملہ سنبھال لیا۔"

چند لمحے تک کار میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ ان گنت اندیشے تھے جو عفریتوں کی طرح دل و دماغ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ سارجنٹ ولیم یقیناً درست کہہ رہا تھا، ہم پولیس کے گھیرے میں تھے۔ ہمارے اردگرد اگرچہ پولیس کاریں نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ موجود ضرور تھیں۔ گاہے بگاہے کسی کار کا منحوس سائرن بھی سنائی دے جاتا تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے اپنا حوصلہ جمع کرتے ہوئے قریشی سے پوچھا۔

"ولیم میرا دوست ہے۔" قریشی بولا "لیکن یہ اتنا ہی ساتھ دے سکتا ہے جتنا اس کے اختیار میں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ اب تک رکا ہوا ہے۔"

"یہ سب کیا ہو گیا ہے شاہ جہاں! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" قریشی بہت دل گرفتہ آواز میں بولا۔

میں نے سارجنٹ ولیم کو انگلش میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"مجھے بہت افسوس ہے مسٹر شاہ جہاں..... لیکن مجھے بہر حال اپنا ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہے۔ عالم قریشی نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں شادی کی اہم تقریب ہے اور مہمان وغیرہ آئے ہوئے ہیں۔ میں عالم کی دوستی کے ناتے آپ کو اتنی مہلت دے رہا ہوں کہ آپ مہمانوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر الوداع کہہ دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ امید بھی کرتا ہوں کہ آپ میری اور عالم کی عزت کا بہت خیال رکھیں گے۔"

"آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے سارجنٹ! لیکن کیا آپ کے پاس کوئی وارنٹ وغیرہ بھی ہیں؟"

"آپ کی ڈیمانڈ پر آپ کو ہر چیز دکھاوی جائے گی۔ اس سلسلے میں بے فکر رہیں۔" ولیم قدرے خشک لہجے میں بولا۔

عالم قریشی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ عجیب ڈرامائی صورت حال تھی۔ ابھی صرف ڈھائی تین گھنٹے پہلے میں میک اپ اتار کر اپنے اصل حلیے میں آیا تھا اور اس مختصر وقت میں انگلش پولیس نے مجھے شناخت کر لیا تھا۔ ذہن میں دسوسے اٹھ رہے تھے۔ کیا میرے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تھا؟ کسی ساتھی نے کسی طرح کی بے وفائی کی تھی؟ کہاں بانس بلیا تھا؟ اور کس جگہ پلٹا تھا؟

ولیم نے سرگوشی کے انداز میں عالم قریشی سے چند باتیں کہیں۔ عالم قریشی کافی عرصے سے یہاں مقیم تھا لہٰذا پنجابی لہجے میں انگلش بول سکتا تھا۔ عالم کو ضروری ہدایات دینے کے بعد سارجنٹ ولیم گاڑی سے اتر گیا۔ عالم قریشی نے کہا "شاہ جہاں! ہم بری طرح پھنس چکے ہیں۔ ہمارے آگے دوا ے (اردگرد) کافی سے زیادہ پولیس موجود ہے۔ پولیس والوں کے ارادے بھی بہت خطرناک ہیں۔ انہیں آرڈر ہے کہ تمہیں ہر صورت میں زندہ یا مردہ گرفتار کریں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے عالم سے پوچھا۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کرو۔ کیونکہ پکڑے گئے تو پھر پھانسی سے کم پر بات ختم ہونے والی نہیں۔" عالم کا لہجہ کربناک تھا۔

"ابھی تم نے کہا ہے کہ پولیس چاروں طرف موجود ہے۔ اس کے علاوہ ولیم والا معاملہ بھی تو ہے۔ ولیم نے تمہارے کہنے پر مجھے رعایت دی ہے۔ اس رعایت کا فائدہ اٹھاؤں گا تو تم دونوں کی مٹی پلید ہو گی۔"

عالم خاموش ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری بات میں وزن ہے۔ اب صورت حال پوری طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ درحقیقت اگر عالم دلیرانہ کوشش نہ کرتا تو شاید میں اور غزالہ "اٹوٹ رشتے" میں نہ بندھ سکتے نکاح کی تقریب شروع ہونے سے پہلے ہی درہم برہم ہو گئی ہوتی۔ عالم نے ولیم کو میری طرف سے گارنٹی دی تھی کہ میں از خود گرفتاری پیش کر دوں گا۔ اسی گارنٹی کی وجہ سے ہم پولیس کے خوفناک چھاپے سے محفوظ رہے تھے۔ یعنی کچھ دیر پہلے جس وقت گھر کے اندر آنچل لہرا رہے تھے، قہقہے بلند ہو رہے تھے اور مٹھائی کی پلیٹیں گردش کر رہی تھیں اس وقت گھر سے باہر عالم قریشی میرے اور چھاپہ مار پولیس کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔

"وہ دیکھو۔" عالم قریشی نے سامنے والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا۔ مکان کی چھت پر دو تین افراد کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ تاریکی میں ان کی شکلیں پہچاننا تو ممکن نہیں تھا۔ تاہم ان کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس والے ہیں۔

مجھے عقب نما آئینے میں بھی ایک پرائیویٹ کار نظر آ رہی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ گاڑی بھی ہماری ناکہ

بندی کرنے والی گاڑیوں میں سے ایک ہے۔ بڑی خاموشی لیکن بڑی طاقت کے ساتھ ہمارا محاصرہ کیا گیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی مزید نفری موقع پر پہنچ رہی ہے۔ میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "چلو آؤ عالم! پہلے اندر کے معاملات تو نمٹیں۔"

"چلو آؤ۔" عالم نے کہا اور مرے مرے انداز میں گاڑی سے باہر نکل آیا۔

ہم کوٹھی کے لان میں پہنچے تو برآمدے کے قریب ایک بڑی میز پر نہایت نفاست سے کھانا سجایا جا چکا تھا۔ انکل جلیس نے ہمارے نزدیک آتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے تم دونوں کچھ پریشان ہو؟"

"نہیں کوئی ایسی خاص بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "عالم کا ایک پرانا دوست مل گیا تھا وہ اپنی پریشانیوں کا ذکر کر رہا تھا۔"

میری دیکھا دیکھی عالم نے بھی اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائی "مجھے افسوس ہے انکل ..... ہمیں تاکم پر مجھے باہر جانا پڑا۔"

"چلو آؤ۔ اب مزید دیر نہ کرو۔ کھانا انتظار کر رہا ہے۔" انکل جلیس نے کہا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو عالم مقناطیس کی طرح کھانے کی طرف کھنچا چلا جاتا لیکن اب وہ قدم گھسیٹ گھسیٹ کر آگے بڑھا۔ غزالہ اور دیگر خواتین بھی میز کے گرد موجود تھیں۔ تیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں غزالہ کا زرنگار لباس چمک رہا تھا اور وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ آنکھ اس کی طرف اٹھتی تھی تو پھر جم کر رہ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دو سال کی گردش نے اس کا کچھ بھی بگاڑا نہیں ہے۔ آفرین مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولی "کیا بات ہے جناب، آپ نے ابھی سے دڑنا بھاگنا شروع کر دیا۔ کہاں چلے گئے تھے؟"

"یونہی ذرا ہوا کھانے۔" میں نے کہا۔

وہ شوخی سے بولی "ہوا کھانے کی ضرورت تو انہیں محسوس ہوتی ہے جن کا دم گھٹ رہا ہو۔ آپ کو ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا تکلیف پہنچی ہے۔" اس کا اشارہ غزالہ کی طرف تھا۔

"اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے تو بھی ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔" آنٹی زیب نے کہا اور ساتھ ہی غزالہ کے حسین چہرے کی بلائیں لیں۔

آنٹی زیب کی بات پر ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ غزالہ کا چہرہ بھی مسکرا اٹھا۔ تابی بغیر سوچے سمجھے حلق سے ہنسنے کی آواز نکال رہا تھا۔ میں اور عالم قریشی ان مسکراہٹوں سے کوسوں دور تھے۔

کھانا شروع ہوا..... کھانا زہر مار کرنے کا محاورہ ہم پر بالکل صادق آ رہا تھا "نصیب دشمناں طبیعت کچھ خراب ہے یہ آج کھانے پر اتنا زس کیوں کھایا جا رہا ہے؟" عشرت رحمانی نے عالم کے کان میں سرگوشی کی۔

"پہلے کھانا کھا لو..... پھر بتاؤں گا۔" عالم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

کھانے کے بعد کافی اور قہوے کا دور چلا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انکل جلیس کچھ تاڑ گئے ہیں۔ ان کے چہرے پر پہلے جیسی مسکراہٹ نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس کوشش میں نظر آ رہے تھے کہ تقریب جلد از جلد اختتام کو پہنچے۔ انکل جلیس نے اپنے جس نہایت دلچسپ دوست کا ذکر کیا تھا وہ بھی تقریب میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ ایک ہنس مکھ اتالین تھا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ اتالین دراصل ٹی وی کا کامیڈین تھا۔ لطیفے سنانے اور ماحول کو خوشگوار بنانے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ غالباً انکل جلیس کی خواہش تھی کہ ان کا یہ دوست اپنی دلچسپ گفتگو سے ماحول کو خوشگوار بنائے ..... لیکن تقریب کے دوران میں ہی انہوں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ انکل کے ذہن میں یقیناً دو وجوہات تھیں۔ ایک تو بیجی فاخرہ ابھی تک گھر نہیں آئی تھیں۔ وہ صحت یاب ہونے کے باوجود ابھی تک اسپتال کے کمرے میں ہی مقیم تھیں۔ دوسرے انکل نے میری اور عالم قریشی کی پریشانی کو بھی بھانپ لیا تھا۔ یہ تقریب متوقع وقت سے ایک گھنٹا پہلے ختم ہو گئی۔

مہمان چلے گئے۔ ان میں عشرت رحمانی بھی شامل تھا۔ عالم نے رحمانی کو مختصر الفاظ میں یہاں کے حالات کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ان حالات کے بارے میں جان کر رحمانی کا خوشگوار موڈ بھی گہری پریشانی کے بادل میں چھپ گیا تھا۔ آفرین حالات سے ابھی تک بے خبر تھی۔ وہ گاہے گاہے غزالہ کے کان میں کوئی شوخ سرگوشی کرتی تھی اور پھر کوئی چنچل فقرہ میری طرف اچھال دیتی تھی۔ میرے قریب آتے ہوئے بولی "سنا ہے آپ شادی کے لیے بڑی لمبی لمبی تاریخیں دے رہے ہیں۔ ایسی تاریخیں تو بہت مصروف اداکار دیتے ہیں۔ کہیں آپ نے بھی تو اداکاری شروع نہیں کر دی؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ایک بات کان کھول کر سن لیں جیجا جی! اب کوئی اداکاری نہیں چلے گی۔ پہلے ہی آپ بہت ڈرامے کرتے رہے ہیں۔ اب تاخیر ڈراپ سین کریں۔ ایک ایسی ہی خوب صورت شام کو ایک نہایت شاندار تقریب..... انکل کہتے ہیں کہ آپ یہ خوشی اپنے آبائی گاؤں کی حویلی میں منانا

چاہتے ہیں۔ یہ آئیڈیا تو بہت اچھا ہے لیکن اس پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔ ویسے یہ آئیڈیا آپ کے ذہن میں آیا کیسے؟“

آفرین کی گفتگو مجھے بیزار کر رہی تھی۔ وہ حقیقت حال سے بے خبر تھی اور حقیقت حال ایک دم بہت سنگین ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں بیزاری کے عالم میں آفرین کو کوئی خشک جواب دیتا، انکل جلیس وہاں آ گئے۔ انہوں نے آفرین سے کہا ”بیٹی! تم ذرا غزالہ کے پاس جاؤ میں جہانی سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

آفرین الجھے الجھے انداز میں واپس چلی گئی۔ کمرے میں میرے اور انکل جلیس کے علاوہ بس عالم قریشی تھا۔ انکل نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ”کیا بات ہے جہانی! تم دونوں مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ابھی گاڑی کے اندر جو بندہ تم دونوں سے باتیں کر رہا تھا وہ پولیس آفیسر ہے......“

عالم قریشی چپ رہا۔ میں نے کہا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل۔ وہ پولیس آفیسر تھا وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آیا ہے لیکن آپ بے فکر رہیں۔ میری وجہ سے آپ کے گھر پر کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔“

انکل کا چہرہ ایک لمحے میں زرد ہو گیا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر جھکا کر خاموشی سے کھڑے رہے۔ میں نے کہا ”انکل! میں جانتا ہوں، میری طرح آپ کے لیے بھی یہ شدید صدمے کا موقع ہے۔ ہم پوری طرح خوش بھی نہیں ہو پائے تھے کہ اس آفت نے آ دبوچا ہے۔ آپ نے تین روز پہلے جو اندیشے بیان کیے تھے، وہ اتنی جلدی سچے ثابت ہو جائیں گے۔ شاید اس کی توقع آپ کو بھی نہیں تھی۔“

انکل خاموش رہے۔ ان کی خاموشی میرے دل کو چیر رہی تھی۔ غزالہ کے حوالے سے انہوں نے بہت صدمے اٹھائے تھے۔ اب اگر ایک خوشی نصیب ہوئی بھی تھی تو اسے فوراً دکھ کے عفریت نے دبوچ لیا تھا۔ پتا نہیں کہ قسمت ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ مایوسی کے ان لمحوں میں میرا دل چاہا کہ میرے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ ہو۔ میں اپنے ارد گرد خون کی ندیاں بہا دوں۔ ختم ہو جاؤں یا پھر سفید چمڑی والے ان منحوس پولیس والوں کو ملیا میٹ کر دوں جو ایک سہانی شب کی ان گھڑیوں میں میرے اور غزالہ کے درمیان آ گئے تھے لیکن یہ جذباتی سوچ تھی۔ یہ میرے اکیلے کا معاملہ ہوتا تو شاید میں یہ سب کر بھی گزرتا لیکن میرے ساتھ کئی زندگیاں منسلک تھیں۔

”انکل! آپ خاموش کیوں ہیں۔ کچھ بولیں ناں انکل۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے ایک عمیق سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے ”میں خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکا ہوں شاہ جہاں..... درحقیقت ذہنی طور پر تیار ہونے کے بعد ہی ہم باپ بیٹی نے خود کو تمہارے ساتھ اس نئے رشتے کے لیے تیار کیا تھا۔ اب اس حوالے سے جو بھی خوشی اور غم ملے گا اس میں، میں برابر کا شریک ہوں۔ ہاں شاہ جہاں! میں تم دونوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔“

انکل جلیس کے لہجے میں ایک ایسا عزم تھا کہ مجھے اپنے اندر حوصلہ جوان ہوتا محسوس ہوا۔ کچھ دیر پہلے اعصاب جو نقاہت کے سمندر میں غرق ہو رہے تھے، نئے سرے سے توانائی پکڑنے لگے۔ انکل کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ان آنسوؤں میں پختہ ارادے کی چمک بھی تھی۔ ان سے میری نگاہیں ملیں تو میں نے انہیں بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ یہ بے اختیاری محبت کے ایک نہایت توانا جذبے سے پھوٹی تھی۔ چچا اور بھتیجے کی وہی محبت جس پر چند روز پہلے تک برسوں پرانی برف جمی ہوئی تھی۔

غزالہ اور آفرین کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے حالات کی سنگینی کو بھانپ لیا تھا۔ شاید پولیس کاروں کے وہ منحوس سائرن بھی ان کے کانوں تک پہنچ گئے ہوں جو قرب و جوار میں مسلسل سنائی دے رہے تھے۔

میں نے کہا ”عالم! میں گرفتاری دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے گارنٹی چاہیے کہ میری گرفتاری کے بعد چچا اور غزالہ وغیرہ کے ساتھ برا سلوک نہیں ہوگا۔ بلکہ میں تمہاری اور عشرت رحمانی کی طرف سے بھی فکر مند ہوں۔“

عالم بولا ”یہ انگلینڈ ہے بھائی، پاکستان نہیں ہے۔ جہاں چور نہ ملے تو اس کے سارے خاندان کو باندھ کر تھانے میں لے جاتے ہیں اور بے شک ان گنت برائیاں ہیں یہاں، لیکن بندے کی آزادی اور اس کے راشٹ کا خیال رکھا جاتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ان گوروں کا پتا بھی نہیں ہوتا کہ کس طرف الٹ جائیں۔ میں اس سلسلے میں تھوڑا سا تحفظ چاہتا ہوں۔ اگر یہ لوگ مجھے پرامن طور پر گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں ایک دو شرطیں ماننا ہوں گی اور یہ کوئی مشکل شرطیں نہیں ہیں۔“

”میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ عالم بولا ”میں نے اس سلسلے میں ولیم سے تھوڑی سی کھل بات کی بھی تھی۔ میں نے اسے کہا ہے کہ وہ تمہارے سوا باقی گھر والوں کو پولیس کے گھیرے سے نکلنے کی اجازت دے..... اور اتنی مہلت دے کہ وہ لوگ اپنی مرضی سے کسی محفوظ مقام پر

جا سکیں۔“

”اس نے کیا جواب دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ خاموش ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں دوبارہ بات کروں گا تو وہ رضامند ہو سکتا ہے۔“ عالم نے جواب دیا۔

چچا نے لرزتی آواز میں کہا ”شاہ جہاں! تم ہمارے بارے میں کچھ مت سوچو۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنی جان بچانے کے بارے میں سوچو۔ تم ایک دفعہ اس چنگل میں پھنس گئے تو آسانی سے نکل نہیں سکو گے۔ تم کسی طرح اس گھیرے سے نکلنے کی کوشش کرو۔ رات کا وقت ہے۔ وہ لوگ زیادہ قریب نہیں ہیں۔ تمہیں پکڑنا ان کے لیے اتنا سہل نہیں ہوگا۔“

”نہیں چچا!“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ عالم نے میری طرف سے اپنے سارجنٹ دوست کو گارنٹی دے رکھی ہے کہ میں بھاگوں گا نہیں۔ عالم نے ہم سب کے لیے بہت کوشش کی ہے۔ یہ دیکھیں اس کے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔ یہ پولیس والوں کو نہ روکتا تو وہ مہمانوں کی موجودگی میں اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے اندر گھس آتے۔ اس صورت میں پتا نہیں کتنا جانی نقصان ہو جاتا۔“

اسی دوران میں آفرین ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ تیسری منزل کی چھت سے لوٹی تھی۔ وہ بولی ”شاہ جہاں! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں دیکھ کر آئی ہوں۔ ہماری کوٹھی کے آس پاس گلیوں میں بہت سی پولیس کاریں نظر آ رہی ہیں۔ ساتھ والے گھروں کی چھتوں پر بھی مسلح بندے موجود ہیں۔ ان سے ابا اور مجھے نہیں لگتے۔“ وہ رو دینے کے قریب تھی۔

میں نے کہا ”آفرین! تم غزالہ کو لے کر کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“

آفرین گھبرائی ہوئی غزالہ کی طرف چلی گئی۔ میں نے عالم قریشی سے کہا ”عالم! تم ولیم کو بلاؤ۔ اس سے کھل کر بات کرو۔ اس سے کہو کہ میں اس جگہ، دیواری کے اندر سے پرامن طور پر گرفتاری دے دوں گا لیکن اس کے لیے صرف ایک شرط ہے۔ اہلِ خانہ کو یہاں سے نکلنے کی اجازت دو۔ وہ اپنی مرضی سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں اور ان کی طرف سے مجھے خیریت کی خبر مل جائے تو میں خود کو پولیس کے سامنے پیش کر دوں گا۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ مان جائیں گے اور انہیں ماننا بھی چاہیے۔ باقی گھر والوں پر کسی طرح کا کوئی چارج نہیں ہے۔“

چچا بولے ”تم ہمیں اس طرح یہاں سے نکالو گے تو پولیس خوامخواہ شک میں پڑے گی۔ وہ سمجھیں گے کہ ان سے کچھ چھپانے کے لیے ہمیں یہاں سے بھیجا گیا ہے۔ مقامی پولیس کا اپنا ایک طریقۂ کار ہے۔ یہ لوگ ملزم کے لواحقین کو زیادہ ڈسٹرب نہیں کرتے۔“

میں نے کہا ”چچا! بات صرف مقامی پولیس کی نہیں ہے۔ اس میں انٹرپول بھی ملوث ہے اور ہو سکتا ہے کہ پاکستانی پولیس کے نمائندے بھی یہاں آ دھمکیں۔ ایک بات آپ کو اور بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ ان لوگوں سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش میں اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب آپ لوگ میرے آس پاس موجود نہیں ہوں گے۔“

”لیکن..... لیکن ہم جائیں گے کہاں؟“

میرے بولنے سے پہلے ہی عالم قریشی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ”میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ہوتے آپ کچھ سوچیں گے تو یہ میری بہت بڑی بدنصیبی ہوگی۔ ہاں اگر میں نہ رہوں تو پھر اور بات ہے۔ اگر ولیم سے بات طے ہو جاتی ہے تو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر آپ کو ایسی محفوظ جگہ پر پہنچا دوں گا کہ آپ کو تتی ہوا (گرم ہوا) بھی نہیں لگ سکے گی۔“

دو تین منٹ تک اس بارے میں میرے اور عالم کے درمیان بات ہوئی، پھر میں غزالہ کی طرف چلا گیا اور عالم سارجنٹ ولیم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپاتے ہوئے خود کو کافی حد تک نارمل کر لیا تھا۔ غزالہ اور آفرین سے میں نے تسلی آمیز انداز میں بات کی اور انہیں سمجھایا کہ یہ پریشانی عارضی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی آفرین باہر نکل گئی۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ ہم تنہائی میں بات کر لیں۔ غزالہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو چہرہ مسکرا رہا تھا اب اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر بولی ”شاہ جہاں۔ آپ یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتے..... ابھی وہ لوگ ہم سے کافی فاصلے پر ہیں۔“

”نہیں غزالہ! وہ لوگ بڑی تیاری سے آئے ہیں۔ ویسے بھی میں تم سب کے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ تو پھر شاید کچھ ہو سکے۔“ میں نے ننھے تابش کو اٹھا کر اس کا منہ چوما۔ اس نے بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

”ہم آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

''ہم سب..... ابو..... امی..... آفرین..... تابی..... اور اگر باقی بچے بھی گئے تو میں اور تابی تو ہرگز نہیں جا میں گے۔ ہمارا جینا مرنا اب..... آپ کے ساتھ ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

میرا ہاتھ ابھی تک غزالہ کے ہاتھ میں تھا۔ ہم پہلی بار ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے چھو رہے تھے۔ یہ بالکل نیا لمس تھا۔ ان تشویش ناک لمحوں میں بھی میں اس لمس کی ندرت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی عالم قریشی واپس آ گیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اس نے کہا ''شاہ جہاں! ولیم سے میری بات ہو گئی ہے اور شرائط بھی طے ہو گئی ہیں۔''

''کیسی شرائط؟'' غزالہ نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''تمام اہلِ خانہ کو یہاں سے بحفاظت نکلنے دیا جائے گا۔ وہ اپنی مرضی سے لندن میں جہاں چاہے جا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں روپوش ہو سکتے ہیں۔ ان کا پیچھا کیا جائے گا اور نہ کھوج لگایا جائے گا۔ وہ اپنے ٹھکانے پر بحفاظت پہنچنے کے بعد فون کے ذریعے ہمیں اطلاع دیں گے اور اس کے بعد ہی گرفتاری عمل میں آئے گی۔''

''کس کی گرفتاری؟'' غزالہ نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''شاہ جہاں کی۔'' عالم قریشی نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

''وہ کیوں کریں گے انہیں گرفتار؟ انہیں کیا حق پہنچتا ہے۔ وہ شیخ، سم کی نیملی کے لوگوں کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟ وہ شنکر، منوہر اور کنگ براؤن جیسے بدمعاشوں کو گرفتار کیوں نہیں کرتے.....''

وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کا شانہ دبایا ''یہ باتیں یہاں کرنے کی نہیں ہیں غزالہ.....''

''تو پھر کہاں کرنے کی ہیں؟'' وہ بلند آواز میں بولی ''یہ لوگ یہاں سے آپ کو لے جائیں گے پھر یہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں سب جانتی ہوں.....''

غزالہ کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ میں پہلی بار اسے ایسے جذباتی انداز میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے عالم قریشی کو اشارہ کیا کہ وہ ذرا دیر کے لیے باہر چلا جائے۔ عالم اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے غزالہ کی طرف رخ پھیرا۔ کھڑکیوں سے باہر اب پولیس کاروں کے سائرن مزید قریب آ گئے تھے۔ میں نے غزالہ کے شانے تھام کر کہا ''تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔ قدرت نے ہمیں اتنے مشکل امتحانوں سے گزارا ہے تو اس امتحان سے بھی گزارے گی..... اور اگر..... خدانخواستہ ہم کامیابی سے نہ گزر سکے تو بھی ہماری محبت کی فتح تو ہو ہی گئی ہے۔ آج ہم ایک ہیں غزالہ..... تم میری ہو صرف میری..... میں تمہارا ہوں صرف تمہارا اور یہ سب کچھ ہماری من مرضی سے نہیں ہوا۔ اس میں بزرگوں کی دعا اور رضا شامل ہے۔ شامل ہے نا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ میں نے ذرا شوخی سے اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اوپر اٹھایا ''اے لڑکی! اب تم صرف ایک روندو ڈاکٹر نہیں ہو۔ اب تم مسز شاہ جہاں ہو۔ یہ آنسو اب تمہاری آنکھوں میں بالکل اچھے نہیں لگتے۔ چلو..... یہ میرا پہلا شوہرانہ حکم ہے۔ ان آنسوؤں کو پونچھ دو۔''

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ چہرہ دکھوں کے گہرے سائے میں رہا۔ وہ بولی ''شاہ جہاں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ ایک بار پکڑے گئے تو یہ چھوڑیں گے نہیں۔ آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔ کسی بھی طرح..... کسی بھی ذریعے یہاں سے نکل جائیں۔''

میں نے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا ''میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں اور میں زندہ رہنے کی کوشش بھی کروں گا لیکن یہ کوشش مجھے کہاں اور کس وقت کرنی ہے اس کا فیصلہ میں نے خود ہی کرنا ہے۔ یہاں پولیس کی بہت زیادہ نفری اکٹھی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں یہاں گرفتاری دے دوں۔ یہ لوگ مجھے یقیناً لندن کے اندرونی حصے میں لے کر جائیں گے۔ کینٹ سے یہ کافی زیادہ فاصلہ ہے۔ مجھے راستے میں کہیں موقع مل سکتا ہے یا پھر بعد میں لاک اپ سے کورٹ وغیرہ جاتے ہوئے۔ بہرحال یہ میرے سوچنے کا کام ہے، تم اس بارے میں اپنے ذہن کو پریشان مت کرو۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگی ''شاہ جہاں..... شاہ جہاں..... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں آج کے بعد آپ کو آزاد نہیں دیکھ سکوں گی۔'' اس کے حنائی ہاتھوں نے میری شیروانی کا کالر تھام رکھا تھا۔

''تمہیں ایسا اس لیے لگ رہا ہے کہ ایک بڑی خوشی کے بعد تم نے اچانک ایک بڑی پریشانی دیکھی ہے اور تم ڈپریشن کا شکار ہو گئی ہو۔ قدرت نے ہمارے ساتھ پہلے جو مہربانیاں کی ہیں انہیں کیوں بھول رہی ہو تم۔ یاد کرو کیسے کیسے جان لیوا مرحلوں سے نکلے ہیں ہم..... کیا وہ سب کچھ ہماری ہمت بندھانے کے لیے کافی نہیں ہے؟''

اس نے میرا بازو تھام لیا ''شاہ جہاں! میں بہت تھک گئی

ہوں۔ اب مجھ میں اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں۔ میں ہار گئی ہوں جہاں۔''

''تم غزالہ جلیس ہو کر نہیں ہاری تھیں اب غزالہ جہاں ہو تو کیسے ہار سکتی ہو۔ میں تمہیں ہارنے نہیں دوں گا۔''

''میرے دل میں کیا ہے شاہ جہاں..... میں نہیں جانتی کہ میں کیوں ڈر رہی ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے شاہ جہاں۔ پلیز آپ نہ جائیں۔ ہم تابی کو لے کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر جو کچھ ہوگا ہمارے ساتھ اکٹھے ہی ہوگا۔ اگر بچ نکلے تو..... سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے۔ کسی چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے گھر میں خاموشی کے ساتھ زندگی گزار دیں گے۔ پلیز شاہ جہاں..... اب آپ کی جدائی مزید نہیں سہی جائے گی۔''

''بے وقوف..... کون کافر تم سے جدا ہونا چاہتا ہے۔ یہ تو وقت کی مجبوری ہے اور یہ مجبوری عارضی ہے۔ بس تم..... آفرین کے ساتھ مل کر لندن سے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کر لو بہت جلد ہم اپنے بچھڑے ہوئے ''جل کوٹ'' سے ملیں گے۔ اسے روشنیوں اور پھولوں سے سجائیں گے.....''

''آپ مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسا مت کریں۔'' وہ روتی ہوئی میرے سینے سے چمٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنے ریشمی بازوؤں میں لے لیا ''میں نہیں چھوڑوں گی آپ کو چھوڑ کر..... نہ آپ کو کہیں جانے دوں گی۔''

اس کا چہرہ میرے سینے میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ میرے جسم سے رگڑ رہی تھی۔ اس کی ایسی وارفتگی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بولتی چلی گئی ''بہت دکھ سہہ لیے ہیں آپ نے..... بہت ماریں کھائی ہیں آپ نے۔ کتنی چوٹیں ہیں آپ کے جسم پر۔ میں اب آپ کو اور زخم نہیں لگنے دوں گی۔ میں آپ کو..... ان درندوں کے حوالے نہیں کروں گی۔ وہ بہت تکلیف دیں گے آپ کو..... وہ آپ پر بڑا ظلم توڑیں گے۔''

اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور لگاتار ان پر بوسے دینے لگی۔ اس کا یہ روپ میرے لیے بالکل نیا تھا۔ شاید یہ ایک بیوی کا روپ تھا۔ وہ بیوی جو اپنے خاوند کا قرب حاصل کرنے سے پہلے ہی اس سے دور کی جا رہی تھی۔ باہر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ عالم قریشی مجھے پکار رہا تھا۔ غزالہ نے مجھے مزید مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے یہاں سے اٹھنے نہیں دے گی۔ میں نے کہا ''غزالہ! تمہارے اس طرح رونے دھونے سے پولیس مجھے چھوڑ کر چلی نہیں جائے گی۔ اگر تم ضد کرو گی تو صرف تماشا بنے گا۔ کیا تم مجھے اور خود کو تماشا بنانا چاہتی ہو۔''

وہ کوئی بھی اثر لیے بغیر بولی ''تماشا تو ہم بن ہی چکے ہیں اب اس سے زیادہ اور کیا بنیں گے۔''

''اچھا مجھے ایک منٹ عالم سے بات کر لینے دو۔ وہ دروازے پر کھڑا ہے۔''

غزالہ سے ہاتھ چھڑا کر میں نے دروازہ کھولا۔ عالم قریشی سرگوشی میں بولا ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے شاہ جہاں! انکل اور غزالہ وغیرہ کو اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

میں نے کہا ''تیری بھابی ابھی کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔ میں اسے تھوڑا سا نارمل کر لوں۔ تم زیادہ نہیں، بس دس پندرہ منٹ مجھے اور دے دو۔''

''ٹھیک ہے تم دس منٹ اور لے لو، میں باقی کی تیاری کرتا ہوں۔'' عالم نے کہا اور چلا گیا۔

میں دروازہ بند کرتے ہوئے واپس غزالہ کے پاس آیا۔ یہ رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ کوٹھی سے چالیس پچاس میٹر دور جو پولیس کاریں ایک قریبی لین میں کھڑی تھیں ان کی جلتی بجھتی روشنیاں کھڑکیوں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اب ایک سامنے والی چھت پر بھی پولیس آ موجود ہوئی تھی۔ ان کے پاس سرچ لائٹس موجود تھیں۔

میں نے غزالہ کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔ وہ سنتی رہی اور بولتی رہی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کی پیشانی، ہونٹوں اور رخساروں پر پیار کیا۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی اور مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ میری باقی کی گفتگو اس نے اسی حال میں سنی۔ میں نے کئی بار اسے خود سے پیچھے ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن ناکام رہا۔

قریباً بیس منٹ بعد جب میں جانے کے لیے اٹھا تو وہ کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ نارمل ہونے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا لیکن اندر سے وہ اسی طرح متلاطم اور پرآشوب تھی۔ میں نے اسے رضامند کر لیا تھا کہ وہ انکل اور آفرین وغیرہ کے ساتھ چلی جائے۔ میں نے دروازہ کھولنے کے لیے چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک بار پھر لپک کر مجھ سے چمٹ گئی اور میرے چہرے اور ہاتھوں پر لگاتار کئی بوسے دیے پھر وہ تیزی سے کمرے کے بغلی دروازے میں اوجھل ہو گئی۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد انکل جلیس، غزالہ، تابی، آفرین اور ان کے دو ملازم ایک بڑی کار میں کینٹ سے اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ کار کی ڈگی میں ان کا ضروری سامان موجود تھا۔ میرے علاوہ عالم قریشی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لندن جا رہے ہیں یا کہیں اور..... اور اگر لندن

جا رہے ہیں تو کہاں؟ رخصت ہونے سے پہلے چچا نے مجھے سینے سے لگایا اور دیر تک پشت پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ ان کے خاموش آنسوؤں کی نمی میں نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔

پولیس فورس اپنی جگہ موجود تھی۔ تاہم سارجنٹ ولیم کے وعدے کے مطابق انہوں نے گھر کے اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کسی پبلک بوتھ سے آفرین کا فون آ گیا۔ اس نے دل گرفتہ آواز میں مجھے بتایا کہ وہ لوگ خیریت سے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ آفرین کا خیال تھا کہ مجھے خاموشی سے گرفتاری دے دینی چاہیے اور پولیس حراست سے نکلنے کی کوشش خطرناک ہوگی۔ آفرین نے پاکستان اور انگلینڈ کے چند بہت بڑے وکیلوں کے نام لیے اور بتایا کہ والد مرحوم کے ناتے ان لوگوں سے اس کی فیملی کے مراسم ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو یہ لوگ قانونی چارہ جوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

فون آنے کے فوراً بعد میں نے عالم قریشی سے کہا کہ وہ اپنے دوست ولیم کو مین گیٹ پر بلا لے، میں گرفتاری دینے کے لیے تیار ہوں۔

عالم قریشی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ میں ٹہلتا ہوا لان میں آ گیا۔ لان میں ابھی تک برآمدے کے پاس وہ طویل میز موجود تھی جہاں ہم سب نے کھانا کھایا تھا۔ گلدانوں میں پھول مرجھائے مرجھائے نظر آتے تھے۔ فرش پر بکھری گلاب کی پتیاں اداس تھیں۔ میرے پاؤں کے بالکل پاس مٹھائی کا ایک خالی ڈبا اوندھا پڑا تھا۔ یہ بڑی بھرپور محفل تھی جس کا اختتام بڑے یاس انگیز طریقے سے ہوا تھا۔

دو تین منٹ بعد مین گیٹ پر عالم قریشی اور سارجنٹ ولیم نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک سینئر پولیس آفیسر تھا۔ سیاہ چشمے والے اس پولیس آفیسر کے ہاتھ میں واکی ٹاکی تھا۔ ولیم کے ہاتھ میں پسٹل تھا جس کی نال اس نے نیچے جھکا رکھی تھی۔ ان کے عقب میں کوئی ایک درجن مسلح پولیس مین موجود تھے۔ وہ میرے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ولیم نے آگے بڑھ کر اچھی طرح میری تلاشی لی۔ میرا رام پوری خنجر ان لوگوں کے لیے کوئی راز نہیں تھا۔ سب سے پہلے میری پنڈلی ٹٹول کر یہ خنجر ہی نکالا گیا۔ اپنا پسٹل میں نے شیروانی کی جیب سے نکال کر خود ہی ولیم کے حوالے کر دیا تھا۔ تلاشی کے بعد ولیم نے اسٹیل کی خوب صورت ہتھکڑی نکالی اور میرے ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے۔ پشت پر ہاتھ جکڑے جانے کے باوجود یہ لوگ خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ خاص طور سے رائفل مین بہت الرٹ تھے۔ یقیناً انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین ''مجرم'' کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔ میں مین گیٹ سے باہر آیا تو اردگرد دور تک پولیس کاروں کی جلتی بجھتی روشنیاں نظر آئیں۔ پولیس آفیسرز واکی ٹاکی منہ سے لگائے تیز تیز باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ ان آفیسرز میں مجھے انٹرپول کے بندے بھی نظر آ رہے تھے۔

مجھے ایک بند گاڑی میں بٹھایا گیا۔ میرے دائیں بائیں چوکس رائفل مین موجود تھے۔ ان کے بڑے بڑے چہرے پسینے سے تر تھے۔ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ولیم خود موجود تھا۔ بند گاڑی کے آگے اور پیچھے پولیس کاریں تھیں۔ یوں بڑی ''شان و شوکت'' کے ساتھ میرا جلوس کینٹ سے لندن کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت تک رات کے تین بج چکے تھے۔

میں نے عالم قریشی کا وعدہ نبھاتے ہوئے برٹش پولیس اور انٹرپول کو گرفتاری دے دی تھی۔ اب میں اس بات کا پابند نہیں تھا کہ اپنی آزادی کے لیے کوشش نہیں کروں گا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید لاک اپ میں جانے سے پہلے پہلے مجھے کوئی موثر کوشش کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن اب یہ خیال بالکل خام نظر آ رہا تھا۔ موجودہ حالات میں کسی قسم کی کوشش خودکشی کے مترادف تھی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی کسی چار دیواری میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ آگے پیچھے سنائی دینے والے کاروں کے سائرن بھی خاموش ہونا شروع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا پولیس اسٹیشن تھا۔ مجھے سخت حفاظت میں پولیس اسٹیشن کے اندرونی حصے میں لے جایا گیا۔

پولیس اسٹیشن میں پہنچنے کے بعد پولیس والوں کا رویہ پہلے سے زیادہ سخت اور جارحانہ ہو گیا۔ مجھے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کیا گیا اور ایک بار پھر بڑی احتیاط سے تلاشی لی گئی۔ یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔ کھڑکیوں پر اسٹیل کی چمک دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک میری نگاہ ان کھڑکیوں میں سے گزر کر ایک ساتھ والے کمرے میں گئی۔ یہ ایک آفس تھا جس کی دو دیواریں موٹے شیشے کی تھیں۔ اس آفس میں سینئر پولیس آفیسر موجود تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس نے رات کے وقت بھی سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ سینئر آفیسر کے ساتھ ایک عورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ وہی تھی جس کی خباثت، ضد اور ہٹ دھرمی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ یہ توسیہ تھی۔ اس نے جین کی پتلون اور جرسی زیب تن کر رکھی تھی۔ جرسی کی آستینیں کہنیوں سے اوپر تک اڑسی ہوئی تھیں۔ وہ مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی اور اپنے جوگر کو مسلسل حرکت دے رہی تھی۔

اس کی جلتی نظریں بس دو سیکنڈ کے لیے مجھ سے ملیں۔ ان دو سیکنڈ میں ہی مجھ پر جیسے دہکتے ہوئے انگاروں کی بارش ہو گئی تھی۔ ان دو سیکنڈ میں اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ نفرت اور عداوت کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی پھر اس نے ایک نفرت آمیز جھٹکے سے اپنی نگاہوں کا رخ پولیس آفیسر کی طرف پھیر لیا۔

توسیہ کی یہاں موجودگی نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ یہ بات تو میں جانتا تھا کہ شیخ کا خانوادہ اتنی جلدی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور توسیہ کو میں بہت جلد اپنے آس پاس ہی کہیں دیکھوں گا لیکن ابھی تک یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ میری گرفتاری میں توسیہ اور شیخ کے رشتے داروں کا ہاتھ ہوگا۔ توسیہ کو یہاں پولیس آفیسر کے پاس دیکھ کر میرے سینے میں ایک الاؤ دہک اٹھا۔ مجھے لگا کہ یہ نیلی آگ میرے پورے جسم کو لپیٹ میں لے لے گی۔ یہ سوال پچھلے کئی گھنٹوں سے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا کہ اچانک اب اتارنے کے فوراً بعد ہی میں پولیس کی نگاہوں میں کیونکر آ گیا۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ پورے انگلینڈ کی پولیس باقی سارے کام چھوڑ کر بس میرا ہی سراغ لگا رہی تھی۔ اب توسیہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ شاید سچ مچ ایسا ہی تھا۔ پولیس کو میرے سلسلے میں ہائی الرٹ کیا گیا تھا۔

☆☆☆

میرے اگلے دو تین روز سخت اذیت میں گزرے۔ جس لاک اپ میں مجھے رکھا گیا تھا وہ بہت اسپیشل قسم کا تھا۔ یہاں تین طرف اسٹیل کے راڈ تھے۔ جبکہ ایک جانب دیوار تھی۔ لیٹنے کے لیے بس ایک چھوٹا سا پلنگ اور بیٹھنے کے لیے کرسی تھی۔ کرسی کے سامنے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی میز بھی رکھی گئی تھی۔ ٹوائلٹ بھی لاک اپ کے ایک گوشے میں واقع تھا۔ چھت پر ہر وقت پانچ سو پاور کا بلب روشن رہتا تھا۔ یہ بلب رات کو بھی بجھایا نہیں جاتا تھا۔ رات کے وقت بھی گارڈ مسلسل لاک اپ کے سامنے گردش کرتے رہتے تھے۔ ان کے بھاری بوٹوں کی دھمک اکثر مجھے نیند سے جگا دیتی تھی۔ اس لاک اپ میں اپنی اسیری کی صورت حال سے مجھے ایک جیل کے شب و روز یاد آ گئے تھے۔ وہی سنگلاخ دیواریں۔ وہی گھورتی نگران نگاہیں…… وہی اپنے اوپر ختم ہوتا ہوا اختیار۔

دو بار مجھ سے پوچھ گچھ بھی ہو چکی تھی۔ لاک اپ کی آہنی دیواروں کے قریب ایک یا دو پولیس آفیسر کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ میں لاک اپ کے اندر ہی رہتا تھا۔ وہ مجھ سے مختلف سوال پوچھتے تھے۔ میں انگلینڈ میں کب اور کیسے داخل ہوا؟ میرے ساتھ اور کون کون یہاں آیا ہے، یہاں پہنچنے کے بعد میری سرگرمیاں کیا رہی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ……

لیکن اس پوچھ گچھ میں وہ جو سب سے اہم سوال پوچھتے تھے وہ شیخ عاصم کے بارے میں ہی ہوتا تھا۔ شیخ عاصم کہاں ہے؟ میں نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟

میں جانتا تھا کہ مجھ سے پوچھ گچھ کے ساتھ ساتھ پولیس نے اپنے طور پر زبردست تفتیش بھی جاری رکھی ہوگی۔ عشرت رحمانی کو تو میں نے پولیس کی آمد سے کچھ دیر بعد ہی انکل کی رہائش گاہ سے نکال دیا تھا۔ رحمانی ایک ہوشیار اور دلیر شخص تھا۔ اس نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ دونوں گاڑی گرز یوں سمیت کچھ عرصے کے لیے بالکل روپوش ہو جائے لیکن عالم قریشی بہرحال پوری طرح پولیس کی نظر میں آ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے ہتھکڑی لگنے کے فوراً بعد وہ بھی پروگرام کے مطابق روپوش ہو گیا ہوگا…… مگر لندن کی پولیس کے لیے اس کا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ تفتیش کے لیے جدید ترین ذرائع استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس اپنے کام کے ماہر ترین افراد موجود تھے۔ میں غزالہ اور انکل وغیرہ کے حوالے سے بھی زیادہ پرامید نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ان لوگوں نے خود کو پولیس کی نظر سے بچانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔ وہ لندن کے کسی گنجان علاقے میں چلے گئے ہوں گے اور روم سادھ لی ہوگی مگر مقامی پولیس نے انہیں ڈھونڈنے کی زبردست کوشش کرنا تھی اور اس کوشش کی کامیابی کے امکان پچاس فیصد سے زیادہ تھے۔

لاک اپ میں مجھ سے تفتیش کرنے والوں کو پختہ یقین تھا کہ شیخ عاصم میری تحویل میں ہے۔ ان کا سارا زور اسی بات پر تھا کہ میں جلد از جلد شیخ عاصم کو بازیاب کرا دوں، دوسری صورت میں میری مشکلات میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ ان کے ہر سوال کے جواب میں میرا بیان یہی تھا کہ میں عاصم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کولمبو میں، میں اسے پکڑ کر ریسٹ ہاؤس میں ضرور لایا تھا لیکن وہ وہاں سے ماڈل گرل لیونا اور بیک گارڈ کو یرغمال بنا کر فرار ہو گیا تھا۔

تفتیش کرنے والوں کا موقف تھا کہ وہ فرار ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا تھا اور گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا کچھ پتا نہیں۔

مجھ سے خطرناک ترین قیدی والا سلوک کیا جا رہا تھا۔ گارڈز کو ہدایت تھی کہ وہ لاک اپ کی سلاخوں کے قریب نہیں

آ نہیں۔ لاک اپ کا تالا صرف انچارج ہی کھول سکتا تھا اور پچھلے چار پانچ روز میں اس نے ایک بار بھی نہیں کھولا تھا۔ صرف پہلے دن ایک بار یہ تالا کھولا گیا تھا جب مجھے کورٹ میں پیش کرنے تفتیش کے لیے وقت لیا گیا تھا۔ مجھے کھانا سرو کرنے کے لیے ''گیٹ ان گیٹ'' کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ایک مستطیل خانہ تھا جس کی چوڑائی بمشکل چھ انچ تھی۔ اس میں سے بس کھانے کی ٹرے ہی اندر آ سکتی تھی۔ سارے برتن کارڈ بورڈ سے بنے ہوئے تھے اور ڈسپوزیبل ہوتے تھے۔ ایک کلوز سرکٹ کیمرے کے ذریعے میرے لاک اپ کو واچ بھی کیا جا رہا تھا۔

پچھلے ساتویں دن تفتیشی افسران کی تفتیش کا رخ ایک دم بدل گیا۔ ان کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ عالم قریشی کو تو شاید نہیں ڈھونڈ پائے لیکن عالم کے سارے کوائف انہیں معلوم ہو گئے ہیں اور اس حوالے سے انہیں کچھ اہم معلومات بھی حاصل ہوئی ہیں۔

تفتیشی افسر جیکب نے مجھ سے کہا ''مسٹر شاہ جہاں! ہمیں پتا چلا ہے کہ عالم قریشی سے تمہارے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ عالم قریشی یہاں ریجنٹ پارک کے علاقے میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ ابو ریڈی کی سکیورٹی سروسز میں اس کے پچاس فیصد شیئرز کا پتا بھی چلا ہے۔ ہم نے ابو ریڈی کے معاملات بھی دیکھے ہیں اور ریکارڈ چیک کیا ہے۔ چند روز پہلے ابو ریڈی کی طرف سے بھیجے جانے والے ایک گارڈ نے ونچسٹر میں پرنس بردوزنی کی رہائش گاہ پر تین قتل کیے ہیں اور دو لڑکیوں کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ تم اس سلسلے میں ہمیں کیا بتا سکتے ہو۔''

''میں نے یہ نیوز ٹی وی پر دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں جانتا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عالم سے تمہارا قریبی تعلق ہے۔''

''لیکن وہ یہاں لندن میں کیا کرتا ہے اس کے بارے میں مجھے بھی زیادہ معلوم نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے۔ تم سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا کہ قاتل گارڈ کون تھا۔'' جیکب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

جیکب نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''تم قتل کرنے کے لیے ایک دو خاص طریقے بھی استعمال کرتے ہو۔ یہ طریقے تمہاری شناخت بن چکے ہیں۔ ونچسٹر کے محل میں ایک جاپانی محافظ قتل ہوا تھا۔ ایک دوسرا جاپانی محافظ سڑک نمبر 18-E پر مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ یہ دونوں افراد گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلاک ہوئے تھے...... اور یہ تمہارا خاص انداز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انڈین سکیورٹی گارڈ امریش کی جگہ جو شخص پرنس کے محل میں گیا وہ تم ہی تھے......''

''تم لوگ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''ہم نہیں ہو رہے، تم کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ ونچسٹر کے محل میں انچارج گارڈ جانسن بھی قتل ہوا ہے۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی تمہاری ہی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے جسم پر تیز دھار آلے کے دو گہرے زخم ہیں اور نوے فیصد امکان یہ زخم تمہارے خنجر سے آئے ہیں۔''

''چلو جہاں دو جنوں ناکردہ گناہ تمہارے کھاتے میں لکھ رہے ہو وہاں دو چار اور سہی۔ پھانسی سے زیادہ اور کیا سزا دے لو گے۔''

آفیسر عجیب انداز میں مسکرایا ''پھانسی سزا نہیں...... بلکہ تمہارے لیے چھٹکارا ثابت ہوگی۔ اس سے پہلے تمہیں بہت کچھ بھگتنا پڑے گا۔''

اس آفیسر کا پورا نام جیکب ہارڈ تھا۔ پیشانی اور ٹھوڑی پر دو پرانے زخم اس کی جارحانہ طبع کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے دوسرے انگلش آفیسرز سے مختلف لگا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں کسی وقت ایک حیوانی سی چمک ابھرتی تھی اور اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس آفیسر نے جو کچھ کہا وہ بہت جلد درست ثابت ہو گیا۔ یہ اگلے روز شام کا واقعہ ہے۔ میں نے ایک باوردی مکینک کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا نفیس سا بکس تھا۔ وہ لاک اپ سے دو تین میٹر دور کھڑا آفیسر جیکب سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کلوز سرکٹ کیمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ کیمرا لاک اپ سے باہر چھت کے ایک کونے میں نصب تھا۔ یوں لگا جیسے کیمرے میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اور وہ دونوں اسے ٹھیک کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

چند منٹ بعد میں نے سرخ وردی والے مکینک کو ٹول بکس میں سے اوزار نکالتے دیکھا۔ ایک گارڈ اسٹیل کی فولڈنگ سیڑھی لے آیا۔ مکینک سیڑھی لگا کر کیمرے کے نزدیک پہنچا۔ کیمرا آہستہ آہستہ پین کر رہا تھا۔ میں نے ایک بات نوٹ کی اور بری طرح چونک گیا۔ مکینک ایسے زاویے سے کیمرے تک پہنچا تھا کہ وہ خود کیمرے کی زد میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے حد احتیاط کے ساتھ کیمرے کے عقب میں کچھ چھیڑ چھاڑ کی۔ نصف دائرے میں حرکت کرتا ہوا (یعنی پین کرتا ہوا) کیمرا رک گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کیمرا خراب نہیں کیا

بلکہ خراب کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال تھا۔ کچھ دیر بعد کیمرا دوبارہ حرکت کرنے لگا۔ تاہم میں نے نوٹ کیا کہ کیمرے کی سائیڈ پر نظر آنے والی دو سرخ لائٹس میں سے ایک لائٹ بجھی ہوئی ہے۔

مکینک نیچے اتر آیا اور آفیسر جیکب سے تھوڑی سی گفتگو کرنے کے بعد باہر چلا گیا۔ بظاہر یہ معمولی واقعہ تھا لیکن میری چھٹی حس نے مجھے وارننگ دینا شروع کر دی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد حسب معمول مجھے کھانا سرو کیا گیا۔ کھانا روزانہ کی طرح پاکستانی طرز کا تھا۔ مرغی کا سالن، چاول اور پڈنگ وغیرہ بھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مجھے کھانے کی طرف سے محتاط رہنا چاہیے۔ باتھ روم میں جانے کے لیے ربڑ کے بند سلیپر بغلی دروازے کے پاس ہی رکھے تھے۔ میں نے اپنا بیشتر کھانا ان سلیپروں میں منتقل کر دیا۔ پیپسی کے دو ٹن بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں نے پی لیا۔ دوسرا ٹیبل پر رکھا رہا۔

یہ ایک پرانا طریقہ ہے کہ جن قیدیوں کو خطرناک سمجھا جاتا ہے ان کے پاس جانے کے لیے خواب آور یا اعصاب کو بہت سست کرنے والی دوا دی جاتی ہے۔ یہ دوا دینے کے لیے آسان طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اسے کھانے میں ملا دیا جائے۔ اس سے پہلے مجھ پر یہ طریقہ استعمال کیا جا چکا تھا اور میں بھی کئی بار یہ طریقہ استعمال کر چکا تھا۔ میرے ذہن میں یہی آ رہا تھا کہ اگر پولیس والوں نے کیمرے کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے تو پھر وہ مزید گڑبڑ بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی سازش جو مجھے نقصان پہنچائے...... یا پھر کوئی چال؟

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ مجھے پیپسی بھی نہیں پینی چاہیے تھی۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ یعنی بند ''ٹن'' کے اندر بھی ''کارگزاری'' دکھائی گئی تھی۔ بہرحال یہ غنودگی ایسی نہیں تھی کہ میں قرب و جوار سے بیگانہ ہو جاتا۔ دس فیصد غنودگی کو میں نے سو فیصد بنا کر پیش کیا اور بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہوگا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہیں اور میں خود کو گہری نیند میں ''ظاہر'' کرتے ہوئے بے حرکت پڑا رہا۔ پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ میں نے لاک اپ کے قریب سرگوشیوں کی آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ دروازے کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا گیا اور قدموں کی آہٹ میں نے بہت نزدیک سنی۔ آنکھوں کی جھری سے میں نے دیکھا، تین سفید پوش اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں ایک ٹب نما بالٹی تھی۔ یہ جہازی سائز کی بالٹی یقیناً پانی سے بھری ہوئی ہے۔ تیسرے شخص کے ہاتھ میں نائیلون کی طویل رسی تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے لاک اپ کی چھت میں ایک آہنی کنڈا دیکھا تھا۔ شاید مجھے اس کنڈے کے ساتھ الٹا لٹکانے کی تیاری کی جا رہی تھی، پھر میرا دھیان پانی سے بھری ہوئی ٹب نما بالٹی کی طرف چلا گیا۔ جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا کہ مجھے الٹا لٹکا کر غوطے وغیرہ دیے جانے کا پروگرام ہے۔ میرا ذہن تیزی سے مصروف عمل تھا۔ میں پچھلے کئی دن سے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہاں سے فرار اتنا آسان نہیں ہوگا، لیکن کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ ویسے بھی ایسے موقعوں پر میں اور صفدر انگریزی کا مقولہ دہرایا کرتے تھے کہ جب تک مشکلات اور تکالیف کا سامنا نہ کیا جائے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو پوری طرح الرٹ کر لیا اور اس انتہائی محفوظ چار دیواری میں ''مزاحمت'' کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تینوں افراد خالی ہاتھ ہیں۔ ایک چوتھا پولیس مین دروازے میں کھڑا تھا اور اس کا سایہ مجھے سامنے دیوار پر نظر آ رہا تھا، اس شخص کے ہاتھ میں رائفل موجود تھی۔ میں سب سے پہلے اس رائفل بردار کو ہی نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

''گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے باسٹرڈ!'' ایک شخص نے میری ٹھوڑی کو ہاتھ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''چلو پہلے ہاتھ باندھو اس کے۔'' ایک دوسری آواز کانوں میں پڑی۔

''میں ہاتھ باندھتا ہوں۔ تم پاؤں باندھو۔'' پہلی آواز نے کہا۔

رائفل بردار میرے سرہانے کی طرف کھڑا تھا۔ میں آنکھوں کی جھری میں سے دیوار پر اس کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سایہ مجھے رائفل مین کی بالکل درست پوزیشن سے آگاہ کر رہا تھا۔ جونہی رائفل مین نے میری طرف سے رخ پھیر کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور سیدھا رائفل بردار پر آیا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا، اس کے حلق سے ڈری ڈری آواز نکل گئی۔ میں نے ایک طوفانی جھٹکے سے رائفل اس سے چھیننا چاہی لیکن اس کی گرفت حیرت انگیز حد تک سخت تھی۔ اسی دوران میں اس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔ گولیاں سامنے الماری کے دروازے میں لگیں۔ مجھے پتا چلا کہ رائفل پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ دھماکوں کی بجائے صرف ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی

تھی۔

رائفل میں نے رائفل نہیں چھوڑی تو میں نے جھکا کر اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ دوہرا ہوا۔ گھٹنے کی دوسری ضرب اس کے منہ پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا دیوار سے جاٹکرایا۔ اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے سیدھا کرتا دو پولیس مین پوری قوت کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئے۔ اس زبردست دھینگا مشتی میں ایک بار پھر رائفل سے دو فائر ہوگئے۔ دونوں گولیاں دیوار میں لگیں، تاہم ایک گولی دیوار لگنے سے پہلے میرے ایک مدمقابل کے ہاتھ کو بھی زخمی کرگئی۔ میری ٹانگ کی ایک بھرپور ضرب نے ایک مدمقابل کو اچھال کر مجھ سے دور پھینک دیا۔ دوسرا میرے کندھے کا دھکا کھا کر ادھ کھلے دروازے سے ٹکرایا اور اسے پورا کھولتا ہوا لاک اپ سے باہر جا گرا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

یہی وقت تھا جب میری نگاہ آفیسر جیکب کے آفس کی طرف اٹھ گئی۔ شیشے کی شفاف دیوار کے پیچھے مجھے آج پھر فوسیہ نظر آئی۔ وہ حیرت زدہ عالم میں کھڑی تھی اور مار دھاڑ کا منظر دیکھ رہی تھی۔ فوسیہ کی جھلک دیکھ کر میرے بازوؤں میں بجلی بھر گئی۔ مجھے لگا کہ میرے سامنے سات آٹھ حریف بھی ہوئے تو ٹک نہیں سکیں گے۔

لاک اپ کے باہر سے ایک شخص دوڑتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں نے اس پر فائر کیا لیکن گولی نہیں چلی۔ وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے سر کو تھوڑا سا جھکایا اور کمر کو اس طرح خم دیا کہ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا کمرے کے وسط میں گرا۔ یہاں پانی سے بھری بالٹی رکھی تھی۔ پانی گرا اور سارے فرش پر پھیل گیا۔ میری نگاہ جیکب پر پڑی، وہ صورت حال کی سنگینی کو بھانپ کر اپنے آفس کی طرف لپکا۔ یقیناً وہاں سے پسٹل وغیرہ لینے جارہا تھا۔ میں نے لاک اپ سے نکل کر اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور آفس کے دروازے سے بس دو قدم کے فاصلے پر اسے جالیا۔ ہم اوپر نیچے آفس کے اندر گرے۔ میں نے جیکب کی وسیع وعریض میز پر پڑا ہوا کولٹ پسٹل دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیکب سنبھلتا میں پسٹل پر قبضہ کر چکا تھا۔ فوسیہ اب آفس میں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ خطرہ دیکھ کر کہیں چھپ گئی تھی۔ یہاں سے نکلنے کا تو کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بس ایک کوریڈور تھا اور کوریڈور کا دروازہ مقفل نظر آرہا تھا "چابیاں نکالو!" میں نے چیخ کر جیکب سے کہا۔

میرے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کی نال جیکب کی کھوپڑی سے جڑی ہوئی تھی۔

جیکب کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ چابیوں کی جگہ کچھ اور بھی نکال سکتا تھا۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی اور پسٹل کی نال عین جیکب کی کھوپڑی سے لگا دی۔ اب اگر وہ چالاکی دکھاتا تو اس کا مرنا یقینی تھا۔ ان لمحوں میں میری ساری توجہ جیکب پر تھی۔ توجہ کا یوں یکسر مرکوز ہو جانا کبھی کبھی خطرناک بھی ثابت ہوا کرتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ خطرناک ثابت ہوا۔ میں اس چوتھے مدمقابل سے بے خبر تھا جو پہلے سے اس آفس میں موجود تھا اور بہتر موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بجلی کی طرح عقب سے آیا۔ میرے سر کے پچھلے حصے پر کسی آہنی چیز سے ضرب لگائی گئی۔ میں لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ دوسری ضرب نے مجھے کچھ دیر کے لیے گرد و پیش سے بے خبر کر دیا۔ دو تین منٹ بعد میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔ اس وقت تک میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے جا چکے تھے اور پاؤں بھی نائیلون کی رسی سے باندھ دیے گئے تھے۔ میں پھر سے لاک اپ کے اندر تھا۔ جیکب خون خوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ یقیناً اس کے بس میں ہوتا تو وہ میری ایک دو ہڈیاں ضرور توڑ دیتا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ میرے جسم پر تشدد کے نشان اس کے لیے مصیبت بن سکتے تھے۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نظر آسکتا تھا۔

اس نے مجھے بے تحاشا گالیاں دیں اور پسلیوں میں دو ٹھوکریں رسید کرنے کے بعد لہو کے گھونٹ پی لیے۔ میرا خیال تھا کہ اب میری اصل مصیبت شروع ہوگی۔ مجھے چھت سے الٹا لٹکا کر ٹھنڈے پانی میں غوطے وغیرہ دیے جائیں گے (تشدد کے ان طریقوں میں سے ایک تھا جن سے جسم پر نشانات نہیں پڑتے۔۔۔ اور پولیس والوں کو کورٹ میں جواب دہ نہیں ہونا پڑتا) بہر حال اگلے پانچ دس منٹ میں میرا اندیشہ درست ثابت نہیں ہوا۔ فوسیہ بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کا شولڈر بیگ آفس کی میز پر پڑا نظر آیا تھا لیکن اب وہ بھی موجود نہیں تھا۔ یقیناً وہ یہاں میری چیخیں وغیرہ سننے کے لیے "تشریف" لائی تھی مگر سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔ مجھے غوطے دیے جانے سے پہلے ہی زبردست مار دھاڑ شروع ہوگئی تھی۔ صورت حال میں آفیسر جیکب نے فوسیہ کو یہاں سے نکال ہی مناسب سمجھا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں پولیس اہلکاروں نے لاک اپ میں بڑی تیزی سے کچھ تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے لکڑی کی الماری کا وہ دروازہ الماری سے علیحدہ کر دیا جس پر دو گولیوں نے سوراخ کر دیے تھے۔ اس دروازے کو وہ لوگ لاک اپ سے باہر لے گئے اور کسی دوسری الماری کا ویسا ہی دروازہ کھول کر لاک اپ کی الماری میں لگا دیا۔ رائفل کی دو گولیاں دیوار میں بھی لگی تھیں۔ وہاں سے بہت سا پلستر اکھڑ کر فرش پر بکھر گیا تھا۔ اس پلستر کو صاف کیا گیا اور گولیوں کے نشانات چھپانے کے لیے ڈیسک نما میز نشانات کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ کام بڑی تیزی سے کیے گئے۔ اس کے بعد مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھولے گئے اور لاک اپ کو پھر سے مقفل کر دیا گیا۔

اسی اثناء میں سرخ وردی والا ٹیکنیشن موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے سیڑھی لگائی اور پھرتی کے ساتھ کلوز سرکٹ کیمرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ کیمرے کی سائیڈ پر نظر آنے والی دوسری سرخ لائٹ پھر سے روشن ہوگئی۔

اب ساری صورت حال سمجھ میں آرہی تھی۔ کلوز سرکٹ کیمرے کو زیادہ دیر تک "خراب" نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ پر تشدد کا پروگرام مؤخر کر دیا گیا تھا۔ کیمرا دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے پہلے پہلے لاک اپ کے نقصان کا ازالہ کیا گیا تھا اور اسے پھر سے پہلے والی حالت میں لانے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ برطانوی پولیس کی اچھی شہرت کے باوجود جیکب اور اس کے چند ہم کاروں کو خرید لیا گیا ہے تاکہ ان سے من مرضی کے کام کرائے جائیں۔ ان لوگوں کو خریدنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شیخ نبیلی جیسی ہٹ پارٹی ہی ایسا مہنگا کام افورڈ کرسکتی تھی۔ وقتی طور پر تو میرے سر سے بلا ٹل گئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ صورت حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ اگلے ایک دو روز میں ایک بار پھر مجھے "میری چیخیں سنانے اور دکھانے" کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ حقیقت میں میں نے ایک نہایت سنہری موقع کھو دیا تھا۔ اگر میں جیکب سے کوریڈور کا دروازہ کھلوانے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے یا فوسیہ کو گن پوائنٹ پر رکھ کر اس چار دیواری سے نکلنے کی کامیاب کوشش کرسکتا تھا۔ کامیابی کے قریب پہنچ کر مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی اور پانسا پلٹ گیا تھا۔ درحقیقت میری توقع کے برعکس یہاں متعین پولیس والے کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ یہ منتخب اشخاص تھے جو بہت تربیت یافتہ دکھائی دیتے تھے۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں سخت چوٹیں آئی تھیں اور دو گومڑ بن گئے تھے۔ مجھے باہر کے حالات کی کچھ خبر نہیں تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا مجھے دوبارہ کورٹ میں کب پیش کیا جاتا ہے۔ کسی وکیل کو بھی مجھ تک پہنچنے نہیں دیا گیا تھا۔

بنیادی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹنے والے لوگوں کے درمیان میں ہر قسم کے حق سے یکسر محروم دکھائی دے رہا تھا۔ رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ میری نگاہوں کے سامنے چند روز پہلے کی حسین شام کے منظر گھومتے رہے۔ وہ کیا شام تھی؟ وہ کیا جادو تھا۔۔۔۔۔۔ وہ کیا لڑکی تھی؟ میں نے اسے سینکڑوں مرتبہ دیکھا تھا، چھوا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن اس شام وہ بالکل ہی جدا نظر آئی تھی۔ میری وہی ان چھوئی غزالہ جو چک کوٹ کے سرسبز کھیتوں میں ننگے پاؤں بھاگتی تھی اور اس کے بال ہوا میں لہرانے چلے جاتے تھے۔ اس کا چہرہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں دمکتا تھا اور گاؤں کے سارے گلاب اس کے سامنے ماند نظر آتے تھے۔ ہاں چند روز پہلے شام کو میں نے اسی غزالہ کو دیکھا تھا۔ وقت کے بے رحم تیر۔۔۔ شب و روز کے تند جھکڑ اور۔۔۔۔۔ شیخ عاصم کا غضب جیسے اسے چھوئے بغیر گزر گئے تھے۔ اس کا کچھ بھی تو نہیں بگڑا تھا وہ کہیں سے بھی تو ادھوری محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میں اسے سوچتا رہا اور اسے پھر سے دیکھنے کی تمناؤں میں پلتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس سے پھر ملوں گا۔ آج نہیں تو کل۔۔۔ کل نہیں تو پرسوں۔۔۔۔۔۔ یا پھر چند سال بعد۔۔۔۔۔۔ مجھے اس سے ایک بار تو ضرور ملنا تھا۔ خبر نہیں کیوں، مجھے یقین تھا کہ میں اس سے ملے بغیر مر نہیں سکتا اور وہ مجھ سے ملے بغیر مر نہیں سکتی۔

ایک دن پہلے والے واقعے کے بعد پولیس والے مزید محتاط ہوگئے تھے۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے روز رات گئے، انٹرپول اور اسکاٹ لینڈ یولیس کے کچھ خاص اہلکار مجھ سے پوچھ گچھ کے لیے لاک اپ میں آئے۔ وہ لاک اپ سے باہر ہی کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔

میں نے کہا "میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہا۔ ملکی قانون کے مطابق خاموش رہنا میرا حق ہے اور یہ بھی میرا حق ہے کہ مجھے میری مرضی کے مطابق قانونی مشاورت کرنے دی جائے۔"

ایک آفیسر بولا "تمہارے جیسے درندہ صفت شخص کے منہ سے قانون کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ بہر حال تمہارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے انہیں اپنے سر کے پچھلے حصے میں آنے والی ضربات دکھائیں "کیا یہ چوٹیں مجھے قانون کے مطابق لگائی

گئی ہیں اور یہ گولیوں کے نشان دیکھو..... کیا یہ بھی قانون کے عین مطابق ہیں؟'' میں نے میز گھسیٹ کر ایک طرف کی اور دیوار کا ادھڑا ہوا پلستر دکھایا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' انٹرپول کا ایک نمائندہ کرخت لہجے میں بولا۔

میں نے سب کچھ ان آفیسرز کے گوش گزار کیا جو یہاں میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ آخر میں نے جیکب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بددیانت شخص ایسے لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جو میرے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہاں مجھ پر تشدد کرانا چاہتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اگلے ایک دو دن میں ایک بار پھر ایسی ہی کوشش کریں گے۔ اگر اس لاک اپ میں مجھے جانی نقصان پہنچا تو اس کے ذمے دار صرف اور صرف جیکب اور اس کے ساتھی ہوں گے۔''

میں نے بالکل حقیقت بیان کی تھی لیکن افسران کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ میرے بیان کو اہمیت نہیں دے رہے۔ ان کے نزدیک شاید یہ معاندانہ الزام تراشی تھی۔ ایک آفیسر نے علیحدہ گوشے میں جا کر آفیسر جیکب سے کچھ بات چیت کی اور اس کے بیان پر مطمئن نظر آنے لگا۔ اب پتا نہیں جیکب نے اپنی صفائی میں کیا جھوٹ بولا تھا، بہرحال وہ ''چٹی چمڑی'' والا تھا۔ اس کا جھوٹ میرے سچ سے کئی گنا زیادہ وزن رکھتا تھا۔

تفتیشی ٹیم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک میرا دماغ کھایا۔ انہوں نے کبھی مجھے رعایتوں کا لالچ دیا، کبھی نہایت سنگین قسم کی دھمکیاں دیں۔ کبھی مجھے میرے لواحقین کی مصیبتوں سے ڈرایا لیکن وہ مجھ سے اپنے مطلب کی کوئی بات نہ اگلوا سکے۔ اس ٹیم میں پنجاب پولیس کا ایک بڑا افسر بھی شامل تھا۔ یہ وہی شاہد گوندل تھا جس سے لاہور میں مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ جب میں صفدر اور زریں برطانیہ سے واپس لوٹے تھے، پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اس منحوس شخص سے پالا پڑ گیا تھا۔ یہ ایس ایس پی اشفاق گوندل کا ماتحت تھا۔ بعد میں میرا تعاقب کرتے ہوئے ایس ایس پی اشفاق گوندل کے ساتھ ہی شدید زخمی بھی ہوا تھا۔ آصف جاہ سے اس شخص کی رشتے داری تھی جس کے سبب یہ خوب منہ چڑھا تھا۔

گوندل نے بھی مجھ سے کئی سوالات پوچھے۔ جواب میں وہ مجھ سے بس گالیاں ہی سن سکا تھا۔ ہاں میں نے اس سے اتنی رعایت ضرور کی کہ یہ گالیاں اردو میں دیں تاکہ اس کے ساتھی اس عزت افزائی کے بارے میں نہ جان سکیں۔ تفتیشی

ٹیم مایوسی کے عالم میں واپس چلی گئی۔ ٹیم کا سب سے بڑا مقصد شیخ عاصم کی گمشدگی کی حقیقت جاننا تھا۔ ان کے 70 فیصد سوالوں کا تعلق کسی نہ کسی طور شیخ عاصم کی گمشدگی سے تھا۔ دس فیصد سوالوں کا تعلق عیسیٰ خان..... قادر زمان، مبارک امین اور ایسے ہی دیگر افراد کے قتل سے تھا۔ دس پندرہ فیصد سوالات دفینے اور نوادرات کے حوالے سے تھا۔ تقریباً پانچ فیصد سوالات میری نجی زندگی کے بارے میں تھے۔ ان میں غزالہ سے میرا تعلق، سامیں عالی اور مسٹر کلارک وغیرہ سے میرا تعلق شامل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ لوگ میری اب تک کی زندگی پر ایک بہت موٹی کتاب مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ان کے جانے کے بعد میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ اب یہ لوگ دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔ یہ دوسرا راستہ ذہنی اور جسمانی تشدد کا تھا۔ تفتیشی ٹیم کے جانے کے بعد مجھے جیکب کے تیور بھی اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ رات بھی میں نے بے چینی میں گزاری اور خود کو ذہنی طور پر آنے والے حالات کے لیے تیار کرتا رہا۔ میری سب سے زیادہ امیدیں مسٹر کلارک کے ساتھ وابستہ تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے لیے جو کچھ ہو سکا کریں گے۔ دوسرے نمبر پر عالم قریشی کا نام تھا۔ عالم قریشی کوئی معمولی شخص نہیں تھا کہ میرے پکڑے جانے کے بعد چوہے کی طرح دبک کر کہیں بیٹھا رہتا۔ وہ عارضی طور پر روپوش ضرور ہو گیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جتنی مصیبت میں میں ہوں، اتنی ہی مصیبت میں وہ بھی ہوگا۔ تیسرے نمبر پر ایک اور نام آتا تھا لیکن وہ نام ذہن میں آتے ہی دل سے ہوک اٹھتی تھی۔ یہ صفدر کا نام تھا۔ وہ میرے مشکل ترین وقتوں کا ساتھی تھا۔ وہ زندگی کے دشوار ترین مرحلوں پر میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا تھا، لیکن اب وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اب میرے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی معذوری ایک ایسی بلند دیوار تھی جسے عبور کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

یہ اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے بریک لگانے نیم دراز تھا۔ آفیسر جیکب اپنے آفس میں کوئی اہم فائل دیکھ رہا تھا۔ یہ بہت موٹی فائل تھی اور میرے اندازے کے مطابق میری ہی تھی۔ فائل دیکھنے کے دوران میں وہ گاہے گاہے فون اٹھاتا تھا اور کسی سے بات چیت کرنے لگتا تھا۔ اس نے ایک دو بار وائرلیس پر بھی کسی سے رابطہ کیا۔ اس کام کے دوران میں جب بھی اس کی نگاہ مجھ سے ٹکراتی تھی ایک بجلی سی کوند جاتی تھی۔ اس کے تیور بتاتے

کہ وہ میرے ساتھ بڑی سختی سے پیش آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اچانک میرے کانوں نے ایک چونکا دینے والی آواز سنی۔ یہ خودکار رائفل کی ''تڑتڑ'' تھی۔ اس کے صرف ایک یا دو سیکنڈ بعد ہی لاک اپ اور آفس وغیرہ گہری تاریکی میں ڈوب گئے۔ میں نے جیکب کی چیختی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے بندوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ خودکار رائفل کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ اس مرتبہ یہ آواز کوریڈور کے قریب سنائی دی تھی۔ اس دوسرے برسٹ کے بعد تو جیسے ایک بھونچال آ گیا۔ آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک ہتھیاروں کی آوازوں سے قرب و جوار گونج اٹھے۔ سیکورٹی کے لحاظ سے یہ محفوظ ترین جگہ تھی۔ یہاں اس طرح اندھادھند فائرنگ کا ہونا بے حد عجیب تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جیکب اور اس کے ماتحت اندھیرے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور ان کی گرجتی ہوئی آوازوں سے چار دیواری گونج رہی تھی۔

اچانک کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ ایک طاقت ور دستی بم کا دھماکا پاس ہی کہیں ہوا تھا۔ جب ایسا دھماکا دیواروں کے اندر کہیں ہو تو اس کی آواز بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بارود کی تیز بو آئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی للکارے سنائی دیے۔ میں نے خود کو الماری کی اوٹ میں کر لیا تھا۔ اندھیرے میں تیرتی ہوئی کوئی بھی اندھی گولی مجھ تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ وقتی طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اندازہ یہی تھا کہ کسی مقامی گروپ نے پولیس اسٹیشن پر ہلہ بول دیا ہے۔ مجھے ٹارچ کی تیز روشنیاں گردش کرتی نظر آ ئیں۔

''ان کو روکو..... ان کو روکو!'' جیکب کی چیختی آواز ابھری۔

''سامنے فائر کرو۔'' ایک اور آواز گونجی۔

ایک ساتھ دو تین چیخیں ابھریں۔ کوئی بھاگتا بھاگتا لاک اپ کے دروازے کے پاس گرا۔ اس کا سر زوردار آواز سے جنگلے کی سلاخوں سے ٹکرایا اور پورا لاک اپ جھنجھنا اٹھا۔ اسی اثنا میں دو مزید افراد لاک اپ کے دروازے کے عین سامنے گرے۔ ان میں سے ایک یقیناً پولیس والا تھا۔ ٹارچ کی متحرک روشنی میں، میں نے اس کی ٹوپی اچھل کر دور گرتے دیکھی تھی۔ اندر گھسنے والوں نے چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ یہ مخصوص نقاب ڈکیتیاں کرنے والے لوگ عام استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ''نقاب پوش'' کی صرف آنکھیں ہی نظر آ سکتی ہیں۔ نقاب پوش تعداد میں نصف درجن سے کم نہیں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مہلک اسلحہ نظر آ رہا تھا۔

وہ مرنے مارنے پر بالکل آمادہ نظر آتے تھے۔

''دروازے پر فائر کرو!'' ایک بھاری آواز نے چیخ کر کہا۔

ایک سیکنڈ بعد سیون ایم ایم کا طویل برسٹ چلا۔ دروازے کے قریب چنگاریاں چھوٹتی محسوس ہوئیں پھر مجھے دروازہ کھلنے کی فرحت بخش آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور جان فزا آواز کانوں میں پڑی ''شاہ جہاں..... شاہ جہاں!''

میرے دماغ میں سینکڑوں قمقمے روشن ہو گئے۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی..... لیکن میں اس بات کی توقع ہرگز نہیں کر سکتا تھا کہ یہ آواز پاکستان سے ہزاروں میل دور مجھے لندن کے اس لاک اپ میں سنائی دے گی۔ یہ پاشا کی آواز تھی۔ میں پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہارون پاشا ہی تھا۔

میں الماری کی آڑ سے نکلا۔ ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی ''شاہ جہاں' یہ لو پسٹل۔'' ایک دراز قد ہیولے نے پسٹل میری طرف بڑھایا۔ یہ ہیولا سو فیصد پاشا ہی کا تھا۔ اس کی آواز صورت حال کے اثر سے لرز رہی تھی۔

ابھی میں نے پسٹل تھاما ہی تھا کہ ہمارے قریب دیوار پر چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ ہم اوندھے منہ فرش پر گر گئے اور رینگتے ہوئے کوریڈور کی طرف بڑھے۔ ایک انگلش ''کوپ'' کو میں نے گولیوں سے چھلنی ہو کر ایک نقاب پوش کی لاش پر گرتے دیکھا۔ ''چلو اٹھو بھاگو!'' کوریڈور میں پہنچتے ہی پاشا نے مجھ سے پکار کر کہا۔

ہم دوڑتے ہوئے کوریڈور سے نکلے۔ کوریڈور کا دروازہ جو ہر وقت لاک رہتا تھا نہ صرف کھلا ہوا تھا بلکہ شکستہ حال بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک آہنی پٹ ٹوٹ کر دوہرا ہو گیا تھا۔ یقیناً دستی بم کا دھماکا اسی دروازے کے لیے کیا گیا تھا۔ ہم تیزی سے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں پہنچے۔ یہاں پہلو کی طرف سے ہم پر فائر ہونے۔ میں نے رائفل کے اسپارک کو نشانہ بنا کر گولی چلائی۔ ایک کراہ سنائی دی اور کوئی شخص سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ احاطے کے ایک حصے میں ابھی تک گولیاں چل رہی تھیں۔ ایک شان دار لینڈ روور احاطے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ جیپ کی دونوں جانب دو نقاب پوش موجود تھے۔ میں پاشا کے ساتھ لپک کر جیپ میں چلا گیا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی تین چار نقاب پوش بھی پچھلی سے اندر داخل ہو گئے۔ جیپ کے پہیے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ اسی اثنا

میں احاطے کے ایک گوشے میں بتی بم کا ایک اور خوفناک دھماکا ہوا۔ میں نے ایک پولیس کار میں سے شعلے نکلتے دیکھے۔ کار کی چھت پر لگی ہوئی سرخ اور نیلی ایمرجنسی لائٹ اڑتی ہوئی ہمارے عین سامنے آن گری۔

جیپ کا مشاق ڈرائیور، جیپ کو تیزی سے بڑی سڑک پر لے آیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ لندن جگمگا رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن میں ہونے والے زوردار دھماکوں نے آس پاس کی ٹریفک کو متوجہ کیا تھا اور بہت سی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ جیپ کا ڈرائیور مین سڑک پر جانے کی بجائے ایک برانچ روڈ پر مڑ گیا۔ وہ چوڑی ناک اور چمکیلی رنگت والا ایک سیاہ فام تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف ایک مشاق ڈرائیور ہے بلکہ یہاں کے چپے چپے سے آگاہ بھی ہے۔ اس نے اندرونی سڑکوں پر جیپ کو تیزی سے تین چار ٹرن دیے اور پھر ایک نیم تاریک عقبی سڑک پر آ گیا۔ یہاں نچلے درجے کے شراب خانے اور کیسینو وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ سردی کی وجہ سے موسم ٹھٹھرا ہوا اور بے رونق تھا۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پاشا سے پوچھا۔

''بس دیکھتے رہو۔'' وہ بولا۔

آس پاس کی سڑکوں پر پولیس کاروں کے کریہہ سائرن گونجنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم اس نیم تاریک سڑک پر دو تین سو میٹر آگے گئے ہوں گے کہ سیاہ فام ڈرائیور نے پھرتی سے ایک اور موڑ لیا۔ یہ ایک وسیع احاطہ تھا جہاں کئی ٹریلر کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ مرمت طلب بھی نظر آ رہے تھے۔ جیپ احاطے میں داخل ہوتے ہی سیدھی سفید رنگ کے ایک بڑے ٹریلر کی طرف بڑھی۔ ٹریلر کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ گاڑیاں ٹریلر میں چڑھانے کے لیے جو مخصوص ریمپ عقبی حصے میں لگایا جاتا ہے، وہ بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ ہماری لینڈ روور جیپ دندناتی ہوئی ٹریلر میں گھس گئی۔ چند سیکنڈ بعد ایک اور کار بھی شور مچاتی ہوئی ٹریلر میں چلی آئی۔ اس میں پاشا کے دیگر ساتھی موجود تھے۔ جونہی دونوں گاڑیاں اندر آئیں، ریمپ ہٹا کر ٹریلر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

چند سیکنڈ گہری تاریکی رہی پھر کنٹینر کی اندرونی لائٹس روشن ہو گئیں۔ گاڑیوں کے دروازے کھلے اور تقریباً ایک درجن افراد باہر نکل آئے۔ انہوں نے اپنے نقاب چہروں سے کھینچ لیے۔ ان میں سے تین کے سوا باقی سب سفید فام تھے۔ جو تین سفید فام نہیں تھے ان میں سے ایک تو پاشا تھا، دوسرا علی احمد تھا۔ (یہ وہی علی احمد ہی تھا جس نے کولمبو میں شیخ عاصم کو اغوا کرنے اور پھر کیفر کردار تک پہنچانے میں میری امداد کی تھی۔ یہ ایک نہایت دلیر اور مارشل آرٹ کا ماہر شخص تھا) تیسرا شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ اس کا تعلق سری لنکا سے لگتا تھا۔ پاشا کے دوست اور جانثار دنیا کے کئی ممالک میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاشا ایک ایسا شخص تھا جسے انٹرنیشنل طور پر جانا پہچانا جاتا تھا۔ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر پاشا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہوا اور دیر تک بغل گیر رہا۔ گروپ کے باقی افراد کے چہرے بھی کامیابی کی چمک لیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ہتھیلی میں گولی لگی تھی اور گوشت پھاڑ کر نکل گئی تھی۔ ایک اور شخص کی پنڈلی میں شاٹ گن کے چھرے لگے تھے۔ گروپ کا ایک شخص گھمسان کے رن میں ہلاک ہوا تھا، اسی کی لاش وہیں پولیس اسٹیشن میں رہ گئی تھی۔ اس خونی جھڑپ میں پولیس والوں کا نقصان کہیں زیادہ ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم سات آٹھ افراد کو گولیاں لگی تھیں۔ اب پتا نہیں کہ ان میں سے کتنے آنجہانی ہونے تھے۔

پاشا نے مجھے سر سے پاؤں تک ٹٹول کر دیکھا، جیسے میری جسمانی سلامتی کے بارے میں تسلی کرنا چاہتا ہو۔ میں نے کہا ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں یہاں تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔''

''بہت سی باتوں پر مجھے بھی یقین نہیں آ رہا۔ اسی لیے تمہیں ٹٹول رہا ہوں کہ تصدیق ہو جائے تم واقعی شاہ جہاں ہو...... اور ہم تمہیں واقعی لندن کے محفوظ ترین پولیس اسٹیشن سے نکال لائے ہیں۔''

''کیا ہم اب خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں؟'' میں نے کنٹینر کی فولادی دیواروں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سو فیصد تو نہیں...... مگر کافی حد تک محفوظ ہو گئے ہیں۔''

اسی دوران میں ایک جھٹکا لگا اور جنبش محسوس ہوئی۔ ٹریلر اپنی جگہ سے حرکت میں آ رہا تھا ''تم کولمبو سے یہاں کب پہنچے؟'' میں نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے پاشا سے پوچھا۔

وہ بولا ''کولمبو سے کیسے پہنچے کا جواب تو میں بعد میں دوں گا، پہلے یہ بتاؤں گا کہ کولمبو سے کون کون یہاں پہنچا؟''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔ میری سوالیہ نظریں پاشا کے چہرے پر تھیں۔

''میرے ساتھ ایک اور جانا پہچانا بندہ بھی یہاں آیا ہے۔ وہ بضد تھا کہ تمہیں چھڑانے کے مشن پر ہمارے ساتھ ہی جائے گا، میں نے بڑی مشکل سے اسے روک کے رکھا ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے ہم اسے اس کنٹینر میں چھوڑ کر گئے تھے، وہ اب بھی یہیں موجود ہے۔''

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پاشا کوئی اہم انکشاف کرنے جا رہا ہے۔ اس نے اپنے ایک فرنچ ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ ٹہلتا ہوا کنٹینر کا ایک بغلی دروازہ کھول کر ٹریلر کے سامنے والے حصے کی طرف چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا اور زریں گل کے ساتھ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

زریں گل کا حلیہ بہت حد تک بدلا ہوا تھا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے چھوٹی سی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور سر کے بال مونڈے ہوئے تھے۔ پہلی نظر میں میرے لیے بھی اسے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ رندھے ہوئے گلے سے بولا ''استاد صیب! آپ ام سے کتنا بھی چھپ جانے، ام آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہو گا ام آپ کو ڈھونڈ نکالے گا۔''

''تو پھر میں دنیا چھوڑ جانے کا پروگرام بنا لیتا ہوں۔''

''جب تک ام اس دنیا میں موجود ہے، آپ یہ دنیا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس بات کا ام کو پکا پکا یقین ہے۔''

''یہ اچھی زبردستی ہے بھائی۔ چلو خیر، اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال کسی محفوظ مقام پر پہنچ لیں۔'' میں نے کہا۔

ٹریلر کی حرکت سے لگتا تھا کہ اب وہ مین روڈ پر آ گیا ہے اور آسانی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ٹریفک کا شور اور دیگر آوازیں اندر تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ ٹریلر اتنا بڑا تھا کہ دونوں گاڑیاں اندر آنے کے باوجود بیٹھنے اور کھڑے ہونے کے لیے معقول جگہ بچی ہوئی تھی۔

''ہم لندن سے باہر جا رہے ہیں؟'' میں نے پاشا سے پوچھا۔

''ہاں۔ تقریباً ساٹھ ستر کلومیٹر دور۔ ڈوجون فارمز کی طرف۔''

''تم یہاں کیسے پہنچے؟'' میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''ٹکٹ لیا۔ جہاز میں بیٹھا اور یوں اڑتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔'' اس نے ہاتھ سے جہاز کے اڑنے کا اشارہ دیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہتا ہے۔ میں نے زریں سے پوچھا ''...... اور تم بھی ایسے ہی پہنچے ہو...... یا تم پیدل سے ہو؟''

وہ بولا ''استاد صیب...... پاکستان میں آپ کے بارے میں سوچ سوچ کر امارا دماغ بالکل پلپلا ہو گیا تھا۔ آپ نے ام کو سری لنکا آنے سے منع کیا ہوا تھا۔ ام نے سوچا ام آپ کا حکم عدولی فرمائے گا چاہے ام کو اس کے لیے آپ سے جوتے ہی کیوں نہ کھانے پڑیں۔ فلم ہیرا تی میں بھی تو اس قسم کا معاملہ ہی ہوا تھا۔ ام نے فوراً پاسپورٹ نکالا۔ سری لنکا کا ویزہ تو ہے ہی نہیں یا پھر شاید انہوں نے اماری خاطر رعایت کیا۔ جونہی ام نے ٹکٹ لیا، انہوں نے ام کو کھٹ سے سری لنکا پہنچا دیا۔ وہاں امارا ملاقات مرد قلندر سائیں عالی سے ہو گیا۔ ان کے ملنے سے امارا کام یک دم آسان ہو گیا اور انہوں نے ام کو پاشا صاحب سے ملا دیا۔ پاشا صاحب آپ سے ملنے کے لیے اور آپ کی مدد کے لیے لندن آنے کی تیاری کر رہا تھا، ام ان کے ساتھ ایسے چمٹ گیا جیسے...... بارش میں ہیروئن کے کپڑے اس کے پنڈے سے چپکتے ہیں۔ بس ام ہیروئن کے ساتھ...... امارا...... امارا مطلب ہے کہ پاشا صاحب کے ساتھ ہی یہاں پہنچ گیا۔''

''...... اور یہاں پہنچتے ہی زریں خان نے امارا ناک میں دم کر دیا۔'' پاشا نے فقرے سے فقرہ جوڑا۔ ''اس کا خیال تھا کہ تمہاری رہائی کے لیے فوری طور پر بڑی سے بڑا قدم اٹھا لیا جائے۔ یہ تو ملکہ الزبتھ اور یادر ملکہ کو اغوا تک کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اسے تم سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے شاہ جہاں! اللہ کرے ایسا دوست ہر کسی کو ملے۔''

''اب یہ اس کنٹینر میں کیسے نظر آ رہا ہے؟'' میں نے پاشا سے پوچھا۔

''یہ ہر صورت تمہاری رہائی کے لیے آپریشن میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ مجبوراً ہم اسے ساتھ تو لے آئے لیکن یہاں کنٹینر میں چھوڑ دیا۔'' پاشا نے انگریزی میں جواب دیا۔

''دیکھو پاشا صیب! یہ زبردست ناانصافی ہے۔ آپ فرنگی کی زبان بول کر ام کو بے خبر رکھنا چاہتا ہے۔ ایک تو فرنگی کا زبان ویسے بھی پلید ہے۔ اوپر سے اسے دھوکا دہی کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ زیادہ برا بات ہے۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو ہم سب کے ہونٹوں پر ضرور ہنسی آتی، لیکن فی الوقت ہم ایک غیر یقینی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ ٹریلر تیزی سے رواں تھا۔ لگتا تھا کہ وہ شہر کی گہما گہمی سے نکل آیا ہے اور اب قدرے کم ٹریفک والی سڑک پر رواں دواں ہے۔ باہر یقیناً سردی تھی تاہم اندر کا درجہ حرارت مناسب تھا۔ کنٹینر مکمل طور پر ایئر ٹائٹ تھا، کہیں ہلکی سی روز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مشاق ڈرائیور اس دیوہیکل گاڑی کو بڑی روانی سے چلا رہا تھا۔ ہم کنٹینر میں موجود آرام دہ گاڑیوں کے اندر ہی بیٹھ گئے تھے۔ ڈرائیونگ کیبن سے ہمارے لیے چائے اور ڈرنکس وغیرہ آ گئے۔ اس دوران میں دونوں زخمی حضرات کی مرہم پٹی بھی کر دی گئی تھی۔ اپنے ایک ہلاک

ہو جانے والے ساتھی کے سوگ میں سفید فاموں کے چہرے بجھے بجھے تھے لیکن کامیاب کارروائی نے اس دکھ کی شدت کم کر دی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم منزل پر پہنچ گئے۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ کنٹینر رک چکا تھا اور سب کے چہروں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کنٹینر کا عقبی دروازہ کھول دیا گیا۔ ہم نے خود کو ایک وسیع شیڈ کے نیچے پایا۔ اس شیڈ کے نیچے دو مزید ٹریلر بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی زرعی مشینیں تھیں۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی زیادہ تیز نہیں تھی۔ چار دیواری سے باہر تاریکی تھی۔ ایک طرف احاطہ تھا۔ احاطے کی دوسری جانب ایک اور شیڈ تھا۔ وہاں بہت سی سفید بوریاں رکھی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کھاد کی بوریاں تھیں۔ ہم شیڈ کے نیچے سے گزرتے ہوئے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہاں ایک طرف شیشے کا بڑا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ اس کیبن میں صوفے اور کرسیاں وغیرہ دھری تھیں۔ کہیں پاس سے ہی مربے اور چٹنیوں وغیرہ کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔

پاشا نے مجھے بتایا کہ ہم بریڈ فورڈ کے علاقے میں ہیں۔ یہ زرعی فارم پاشا کے ایک لبنانی دوست کی ملکیت تھا۔ پاشا سری لنکا سے صرف تین روز پہلے یہاں انگلینڈ پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اسی زرعی فارم کو اپنا بیس کیمپ بنایا تھا۔ پورے انگلینڈ بلکہ یورپ میں پاشا کے رابطے موجود تھے اور وہ اپنے قابلِ اعتماد دوستوں سے ہر طرح کا تعاون حاصل کر سکتا تھا۔ اس تعاون ہی کا کرشمہ تھا کہ نہایت سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ مجھے پولیس کے شکنجے سے نکال لایا تھا۔

میں نے کہا ”پاشا! ہم نے سن رکھا ہے کہ انگلش پولیس آسانی سے اپنے شکار کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہاں تو پولیس کے ساتھ انٹرپول اور دیگر ایجنسیاں بھی مصروفِ کار ہیں۔“

”یہ بھی تو سوچو کہ ان کا مدِ مقابل پاشا ہے۔“ وہ اطمینان سے مسکرایا۔

”ظاہر ہے کہ جو کارروائی تم نے کی ہے، اس میں کئی افراد نے کردار ادا کیا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”بے شک کئی لوگوں نے کردار ادا کیا ہے، لیکن پوری پلاننگ کا علم صرف چند افراد کو ہی ہے۔ ہم اس وقت کہاں ہیں، یہ بات بس ہم چودہ پندرہ افراد کو ہی معلوم ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں؟“

”ایسے معاملوں میں سو فیصد گارنٹی تو کوئی نہیں دے سکتا لیکن فی الحال تو پرسنٹ ہم محفوظ ہیں۔“

”تمہارا لبنانی دوست نظر نہیں آ رہا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ لندن میں ہے۔ شاید کل شام تک آ جائے گا۔ اس کے آنے کے بعد ہی ہم اپنا آئندہ کا لائحہ عمل سوچیں گے۔ فی الحال ہم کھانا کھاتے ہیں اور ٹی وی وغیرہ دیکھتے ہیں۔“ اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے کونے میں دھرا ہوا بڑے سائز کا ٹی وی آن کر دیا۔ درجنوں چینل آ رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں وہ مطلوبہ چینل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک نیوز چینل تھا۔ چینل پر دہائی مچی ہوئی تھی۔ لندن کے پولیس اسٹیشن میں ہونے والی خونی کارروائی کو زبردست مرچ مسالے کے ساتھ بیان کیا جا رہا تھا۔ دستی بموں سے ہونے والے نقصان کو ہائی لائٹ کیا جا رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے فرش پر بکھرے ہوئے خون کی منظرکشی کی جا رہی تھی۔ ایمبولینس گاڑیوں کو تیزی سے حرکت کرتے دکھایا جا رہا تھا۔ پولیس کے چند اعلیٰ افسران کے مختصر انٹرویوز بھی بار بار اسکرین پر نمودار ہو رہے تھے۔

نیوز کاسٹر کی پکار تھی ”ڈیڑھ گھنٹہ پہلے خطرناک آتشیں ہتھیاروں سے مسلح درجن بھر افراد نے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر کے جانے پہچانے گینگسٹر اور خطرناک قاتل شاہ جہاں کو آزاد کرا لیا ہے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئے ہیں۔ اس خونی کارروائی میں ایک حملہ آور سمیت سات افراد ہلاک اور درجن کے قریب زخمی ہوئے ہیں۔ پولیس اسٹیشن کے ایک حصے سے کچھ دیر پہلے تک آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ علاقے میں قانون نافذ کرنے والی تمام ایجنسیاں چوکس ہیں اور فرار ہونے والے ملزمان کی تلاش وسیع پیمانے پر شروع کر دی گئی ہے......“

خبریں سنتے ہوئے پاشا کے چہرے پر چمک تھی اور اس کی چوڑی پیشانی تمتما رہی تھی۔ چند دوسرے چینلز پر بھی اس تازہ ترین خبر کی بازگشت سنائی دی۔ ہم کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتے رہے پھر پتا چلا کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ کھانے میں گریپ فروٹ جوس، مچھلی کے قتلے، چاول، پیزا اور سویٹ ڈش شامل تھے۔ فارم میں بنی ہوئی شراب کی بوتلیں بھی چمک دکھا رہی تھیں۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر ایک بیڈ روم نما کمرے میں جا بیٹھے۔ ڈوبی گل اور علی احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس کمرے میں ایک دبیز کھڑکی تھی۔ پاشا نے پردہ ہٹایا تو سامنے گایوں اور بھینسوں کا خوب صورت باڑہ نظر آیا۔ وہ بڑی ترتیب کے ساتھ دو طویل قطاروں میں کھڑی تھیں اور

جگالی کر رہی تھیں۔ ان کے تھنوں پر دودھ دوہنے والی مشینیں لگائی جاتی تھیں اور یہ مشینیں لگانے سے پہلے ان کے تھنوں کو جراثیم کش دواؤں سے دھویا جاتا تھا۔ ایک ملازم ہمیں اس بارے کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور ہی گم تھا۔ میں پاشا سے گالی گڑیوں کے بارے میں وہ سوال پوچھنا چاہ رہا تھا جو کئی روز سے تیغ کی طرح میرے دماغ میں گڑا ہوا تھا۔ گالی گڑیاں منوہرا کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں......؟ میں ملازم کی بات ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا...... لیکن پھر اس دوران میں ہی پاشا کا ایک کارندہ ایک رائفل اور پسٹل لے کر اندر آیا۔ یہ دونوں چیزیں انہوں نے گھمسان کی لڑائی میں پولیس اہلکاروں سے چھینی تھیں۔ اس اسلحے کو دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ ”سرکاری“ ہے۔ رائفل خاص طور سے بڑی زبردست تھی۔ اس کا کیلیبر آٹھ ایم ایم تھا اور اس کے ساتھ پینتالیس گولی والا میگزین اٹیچ ہوتا تھا۔ اس قسم کی رائفل میں نے کچھ عرصہ پہلے کہیں دیکھی تھی یا کسی انگلش میگزین میں اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ یہ مجھے کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ اس رائفل کے حوالے سے کوئی بات تھی جو بار بار میرے ذہن میں آ کر نکل رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا۔ میں نے رائفل الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کے سیاہ چوبی دستے کو جانچنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی نتیجہ نکالتا یا اپنے شک کی تصدیق کرتا ہیلی کاپٹر کی مخصوص پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اس پھڑپھڑاہٹ نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پاشا دوڑ کر راہداری کی ایک کھڑکی تک گیا اور اس سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آیا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔

”میرا خیال ہے کہ یہ پولیس کا چاپر ہے۔“ وہ بولا۔

”ہو سکتا ہے یہ ویسے ہی چکر لگا رہا ہو۔“ علی احمد نے خیال ظاہر کیا۔

ہمارے کان ہیلی کاپٹر کی آواز پر تھے۔ وہ بس ایک چھوٹا سا چکر لگا کر واپس لندن شہر کی طرف نکل گیا تھا۔ پاشا کے سینے سے اطمینان کی سانس نکلی۔ دوسروں کے چہروں پر بھی تشویش کم ہو گئی لیکن ابھی تشویش پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک دم پھر سب کے چہرے دھواں ہو گئے۔ دو پولیس کاروں کے سائرن فارم ہاؤس کے بالکل سامنے سے سنائی دیے تھے۔ یہ بڑا خطرناک اشارہ تھا۔

میں نے کہا ”پاشا! یہاں سے نکلو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹریس کر لیا گیا ہے۔“

”یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے!“ پاشا کے لہجے میں بے حد حیرت تھی۔

”مجھے شک ہے کہ یہ اس رائفل کی وجہ سے ہوا ہے۔ بہرحال ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال تم یہاں سے نکلنے کی بات کرو۔“

”رائفل...... رائفل کو کیا ہوا ہے؟“ پاشا کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ ایک نوجوان دوڑتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اپنے چہرے پر پھر سے نقاب چڑھا لیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں پاشا کو مخاطب کر کے بولا ”سر، پولیس کی ایک کار فارم کے مین دروازے پر آ گئی ہے۔“

چند سیکنڈ کے اندر سب نے نقاب چڑھائے اور اسلحہ سنبھال لیے۔ جو دو گاڑیاں ٹریلر پر یہاں پہنچی تھیں، وہ اب فارم کے ”بیک یارڈ“ میں نظر آ رہی تھیں۔ پاشا کی ہدایت پر سب گاڑیوں کی طرف دوڑے۔ پاشا کے ایک انگریز ساتھی نے دیگر سامان کے ساتھ وہ رائفل بھی اٹھا لی جو پولیس سے چھینی گئی تھی۔ میں نے رائفل اس سے چھین کر گھاس کے گٹھوں پر پھینک دی۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہم گاڑیوں کے اندر تھے۔ گاڑیوں کا رخ فارم کے عقبی گیٹ کی طرف تھا۔ عقبی گیٹ سے آگے دور تک تاریکی اور درخت نظر آ رہے تھے۔ درخت تیز ہوا میں جھوم رہے تھے اور لگا ہے گاہے بجلی بھی چمک رہی تھی۔ گاڑیاں مین گیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گئیں۔ یہ قریباً چالیس فٹ چوڑی سڑک درختوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ میں اور پاشا لینڈ روور میں تھے۔ ڈوبی اور علی احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ پاشا کے چھ نقاب پوش ساتھی پیچھے آنے والی جیگوار میں لدے ہوئے تھے۔

ہم بل کھاتی سڑک پر قریباً ایک فرلانگ آگے ہی گئے ہوں گے کہ پولیس کاروں کے منحوس سائرن ہمیں عقب میں سنائی دینے لگے اور ان کی جلتی بجھتی ایمرجنسی لائٹس نظر آنے لگیں۔ لینڈ روور کا ڈرائیور، واقعی ایک باکمال شخص تھا۔ وہ پُرپیچ اور شکستہ حال سڑک پر جیپ کو ممکنہ تیز رفتاری اور حفاظت کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اب بارش بھی شروع ہو گئی تھی اور کیچڑ آلود سڑک پر ڈرائیونگ اور بھی دشوار تھی۔

تین چار کلومیٹر تک پولیس کاروں کے ساتھ ہماری دھواں دھار دوڑ جاری رہی۔ کاریں گائیڈڈ میزائلوں کی طرح ہم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ میں نے پاشا سے کہا ”تم سے کہا

تھا..... کہ انگلش پولیس آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رائفل میں کوئی ڈیوائس لگا ہوا تھا؟" پاشا نے پوچھا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی تھا۔ اس رائفل کے بارے میں، میں نے کہیں دیکھا یا پڑھا تھا...... ان رائفلوں کا ٹریکنگ ڈیوائس بیس پچیس کلومیٹر کے علاقے میں سگنل نشر کرتا ہے۔ پولیس چھینی ہوئی رائفل کا تعاقب کر کے مطلوبہ شخص تک پہنچ جاتی ہے۔"

پاشا کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

پولیس کاریں لحظہ بہ لحظہ ہمارے قریب پہنچ رہی تھیں۔ یہ توقع بھی کی جا سکتی تھی کہ اگلے دس پندرہ منٹ میں ان کے ساتھ مزید کاریں بھی شامل ہو جائیں گی۔ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ پولیس کی طرف سے جیگوار پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ جیگوار سے بھی پولیس پارٹی پر جوابی فائرنگ کی گئی۔ دو تین منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر ہماری آنکھوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ ایک پولیس کار نے جیگوار کے بالکل قریب آ کر فائرنگ کی۔ خودکار رائفل کا ایک پورا برسٹ جیگوار کی کھڑکیوں میں لگا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جیگوار بری طرح لہرائی اور صرف دس پندرہ میٹر آگے ایک تناور درخت سے ٹکرا گئی۔ جیگوار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ درخت سے ٹکرا کر اس نے ایک قلابازی کھائی اور نشیب میں لڑھک گئی۔ ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور چمک سے آنکھیں دھندلا گئیں۔ جیگوار یکایک شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ صورت حال سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیگوار میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچ سکا ہو۔

"اوہ گاڈ۔" پاشا کے ہونٹوں سے نکلا۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑی میں رکھے دستی بم پھٹے ہیں۔" ڈرائیور نے تاسف سے کہا۔

زریں گل کی پٹھانی روح بیدار ہو چکی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رائفل پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ تب وہ چیخ کر بولا "امارا تو رائے ہے پاشا صیب، گاڑی رکوا دیں۔ ام کو بھگوڑا نہیں بننا چاہیے۔ ام کو ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان فرنگیوں میں سے دس بیس کو مار کر مر بھی جائیں گے تو کوئی مذاکرہ (مضائقہ) نہیں۔"

لالے سدھیر کا شیدائی سدھیر کی زبان ہی بول رہا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کا منظر دیکھ کر پاشا کی آنکھوں میں بھی خون اترا ہوا تھا۔ اس نے زریں سے دوبارہ رائفل لی اور کھڑکی میں سے پیچھے کی طرف رخ کر کے اگلی پولیس کار کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے پانچ چھ فائر کیے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس رائفل کی بس دو مزید گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔ یہ بھی استعمال ہو جاتیں تو یہ طاقتور رائفل ہمارے لیے لوہے کی لٹھ کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ صفدر کی طرح مجھے زریں گل کے نشانے پر بھی اعتبار تھا۔ زریں نے کئی موقعوں پر صفدر ہی کی طرح حیران کن کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے پاشا سے رائفل لے کر زریں کو تھمائی اور اسے پولیس کار کو نشانہ بنانے کی ہدایت کی۔

کار کافی دور تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس میں سے ہم پر فائر نہیں ہو رہا تھا۔ غالباً پولیس والوں کے پاس دور تک مار کرنے والی رائفل موجود نہیں تھی۔ زریں نے فوری طور پر نشانہ نہیں لیا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ ہموار سڑک آ جائے۔ جونہی ایک شکستہ ٹکڑے کے بعد ہموار سڑک شروع ہوئی۔ زریں نے بڑے اعتماد سے نشانہ لینا شروع کیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہیڈ لائٹ کے نیچے پہیے کو نشانہ بنائے گا۔

زریں کا پہلا فائر ہی کارگر ثابت ہوا۔ ہم نے پولیس کار کی ہیڈ لائٹس کو بری طرح لہراتے اور ہچکولے کھاتے دیکھا پھر وہ نشیب میں لڑھک گئی۔ اس کی ایمرجنسی لائٹ اور ہیڈ لائٹس کی پوزیشن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ الٹ چکی ہے۔

ایک دو منٹ بعد زریں نے اس سے پیچھے آنے والی کار کو بھی نشانہ بنایا لیکن اس مرتبہ وہ ٹائر برسٹ نہیں کر پایا..... ہاں کار کی ایک ہیڈ لائٹ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایک دم چھ ساتھیوں کے کم ہو جانے سے ہماری طاقت نصف..... بلکہ نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ دستی بموں کے علاوہ کم از کم چھ رائفلیں اس دوسری کار میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ فالتو ایمونیشن بھی تھا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ درختوں کے درمیان گاہے بگاہے بجلی کی زبردست چمک بھی دکھائی دیتی تھی۔ غالباً خراب موسم کی وجہ سے پولیس کا ہیلی کاپٹر دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ ہمیں اس وقت "فضائی پروٹوکول" بھی حاصل ہوتا۔

پولیس کاروں نے ایک بار پھر قریب آنا شروع کر دیا تھا۔ جب درمیانی فاصلہ کم ہو گیا تو انہوں نے حسب توقع فائرنگ شروع کر دی۔ ہم بھی جواب دینے لگے۔ جلد ہی ہماری جیپ کی عقبی اسکرین ٹوٹ گئی۔ ایک گولی ڈرائیور کے کندھے میں لگی۔ وہ اب تک حتی الامکان تیزی سے ڈرائیو کرتا رہا تھا لیکن اب اس کے لیے یہ ٹیمپو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا۔ پولیس کاریں مزید نزدیک آ گئیں۔ ہمارا مسئلہ ایمونیشن کا بھی تھا۔ تین رائفلیں اور ایک سرکاری پسٹل تھا۔ کل ملا کر

چاروں ہتھیاروں کے بس چالیس پچاس راؤنڈ ہی باقی بچے تھے۔ دوسری طرف پولیس کاروں کے سوار مکمل طور پر لیس نظر آتے تھے۔ وہ بڑی فراخ دلی سے فائر کر رہے تھے۔

ایک گولی میرے قریب بیٹھے ہوئے نقاب پوش کے سر میں لگی۔ میں نے اس کی کنپٹی کی طرف سے خون کی پچکاری نکلتے ہوئے دیکھی۔ وہ میرے قدموں میں گرا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ یہی شخص تھا جو کچھ دیر پہلے ہمارے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ گریپ فروٹ جوس پی رہا تھا اور مچھلی کے تلے کھا رہا تھا۔ اب وہ ایک دوسری دنیا کا باسی تھا۔ اچانک ہماری جیپ کا ٹائر برسٹ ہو گیا..... جیپ لڑکھڑاتی ہوئی ایک درخت سے ٹکرائی اور رک گئی۔ اس کا ایک اگلا پہیہ بری طرح کیچڑ میں دھنس گیا تھا۔ شدید زخمی ڈرائیور کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ جیپ کو گڑھے سے نکالنے کے لیے زیادہ جدوجہد کر سکتا۔

ہم نے جیپ سے نکل کر آس پاس کے درختوں کے پیچھے پوزیشن لینا بہتر سمجھا۔ جونہی پاشا کی ہدایت پر ایک نقاب پوش نے جیپ کا دروازہ کھولا۔ گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور وہ چھلنی ہو کر گھاس پر گر گیا۔ ہم بڑی بری پوزیشن میں تھے۔ ایک تو ہم نشیب میں تھے دوسرے جس جگہ جیپ رکی تھی وہاں آس پاس کوئی تناور درخت نہیں تھا۔ ہم جیپ سے نکل کر تناور درخت کی طرف دوڑ لگاتے تو بلندی پر موجود پولیس والے ہمیں چھلنی کر ڈالتے۔ اگر جیپ کے اندر ہی رہتے تو جیپ کو آگ لگنے کا خدشہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ ہم جیپ میں رہتے ہوئے اپنے حریفوں کے لیے ایک آسان نشانہ بھی تھے۔

نہایت مایوس کن صورت حال تھی۔ درحقیقت پچھلے دس پندرہ منٹ کی مارا ماری میں پاشا اپنے بیشتر ساتھیوں سے محروم ہو گیا تھا۔ چھ بندے تو جیگوار گاڑی میں ہی کام آ گئے تھے۔ دو جیپ میں ہلاک ہوئے تھے۔ ڈرائیور شدید زخمی تھا۔ گولی اس کے بائیں کندھے میں لگی تھی اور غالباً پسلیوں کے اندر چلی گئی تھی۔ اس لیے گاڑی ڈرائیو کرنا اب بالکل ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے اور پاشا کے علاوہ اب بس زریں گل اور علی احمد ہی جیپ میں رہ گئے تھے۔ ہمارا ایمونیشن اگلے چار پانچ منٹ میں "فنش" ہو سکتا تھا۔

"کیا خیال ہے۔ سلنڈر کر دیا جائے؟" میں نے پاشا سے پوچھا۔

وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ تاہم زریں گل چپ نہیں رہ سکا۔ وہ گرج کر بولا "استاد صیب آپ ام کو حکم صادر کرو۔ ام کو بس ایک دو دستی بم دے دو۔ ام ابھی ان کا بیڑا غرق فرمائے گا۔"

میں نے کہا "دستی بم اسی گاڑی میں تھے جو تباہ ہو گئی ہے۔"

"پھر ام کو باہر نکل کر گولی چلانے کا اجازت دو۔ امارے بس میں نہیں ہے کہ ام ان خنزیروں کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو جائے اور یہ آپ کو یا ام کو الٹا لٹکا کر امارا تلاشی لے۔" زریں گل کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں اسے ہلکا سا اشارہ بھی کر دوں تو وہ جیپ سے باہر نکل کر چار پانچ پولیس والوں کو پار کر دے اور خود بھی ہو جائے..... وہ ایسا ہی دیوانہ تھا۔ میں نے پہلے بھی کئی بار اس کی دیوانگی کو لگام دی تھی اب بھی دی۔ اتنے میں اوپر سے میگا فون کی گونجتی ہوئی آواز آئی "تم پوری طرح نرغے میں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم ہاتھ اوپر اٹھا کر گاڑی سے باہر نکل آؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ہم پر سرچ لائٹس پھینکی جانے لگیں۔

میں نے آنکھوں آنکھوں میں پاشا کو اشارہ کیا کہ اب سلنڈر کر دینا ہی مناسب ہے۔ ہم نے دروازہ کھولا اور یکے بعد دیگرے باہر نکل آئے۔ چند لمحوں میں بارش نے ہمیں بھگو کر رکھ دیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی رائفل سامنے گھاس پر پھینکی پھر دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ "ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ اور گاڑی کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" جیکب کی تحکمانہ آواز نے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔

ہم نے ہدایت پر عمل کیا۔ پاشا نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا "کیا خیال ہے بھڑ جائیں؟"

"بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن کوئی اچھا موقع ملا تو؟"

"اچھا موقع ملا تو فائدہ اٹھائیں گے۔" میں نے کہا۔

میں نے یہ آخری فقرہ انگریزی میں کہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ کہیں لالے سدھیر کا شاگرد نہ سن لے۔

پولیس والے بے حد احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نشیب میں اتر آئے۔ ایک موقع پر علی احمد نے ذرا سا مڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ پولیس والوں نے فوراً اس کے پاؤں کے قریب گولیاں چلائیں اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہ بڑی مشکل اور خطرناک گھڑیاں تھیں۔ ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ کٹھن مرحلہ طے ہوا۔ مسلح پولیس والے ہم سے صرف آٹھ دس فٹ کی دوری پر پہنچ گئے۔ ایک فرد کے سر پر ایک پولیس والا رائفل تانے کھڑا تھا۔ زخمی ڈرائیور کو بھی بے دردی سے گھسیٹ کر جیپ سے باہر لایا گیا اور گھما کر کیچڑ پر پھینک دیا گیا۔ دو پولیس والے اس کی پشت پر بیٹھ گئے اور اس کے شدید زخمی کندھے کی پروا نہ کرتے

ہوئے اس کے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے۔

زخمی ڈرائیور کے بعد علی احمد کی باری آئی۔ اس کے دونوں بازو پشت پر موڑے گئے اور ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے۔ دوسرا نمبر زریں گل کا تھا۔ یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ پٹھانی خون کسی وقت بھی جوش مار سکتا تھا۔ میں زریں گل کو مسلسل پرسکون رہنے کی ہدایت کرتا رہا۔ زریں کے بعد پاشا کو اور پھر مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی گئی۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں جیکب یقیناً کافی فاصلے پر کھڑا رہا تھا۔ اس کی آواز پندرہ بیس میٹر دور سے آرہی تھی۔ ہتھکڑیاں لگائے جانے کے دوران میں پولیس افسران ہمیں مسلسل دھمکاتے بھی رہے تھے۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ ہماری چھوٹی سی حرکت کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ ہمیں چھلنی کر دیا جائے گا۔

ہتھکڑیاں لگ چکیں تو ہمیں رخ پھیرنے کی ہدایت کی گئی۔ مسلح رائفل برداروں نے ہمیں مسلسل نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ہم سزائے موت کے مجرم ہیں اور فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑے ہیں۔

یم تیم آفیسر جیکب ہمارے عین سامنے موجود تھا۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے اندیشہ ہوا جیسے یہ بپھرا ہوا انگلش پولیس افسر ہمیں یہیں مار کر ڈھیر کر دے گا اور قانون کے کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی الٹی سیدھی کہانی لکھ ڈالے گا...... اس بدبخت کے تیور ایسے ہی خطرناک نظر آرہے تھے پھر مجھے اپنی رگوں میں لہو سنسناتا ہوا محسوس ہوا۔ پورے جسم میں ایک تاریک سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ جیکب نے اپنے ایک ماتحت سے خودکار رائفل لے لی ہے اور چند قدم آگے بڑھ آیا ہے۔ یہ ویسی ہی رائفل تھی جو پاشا کے کارندوں نے پولیس والوں سے چھینی تھی اور جس نے بالآخر ہمیں اس صورت حال تک پہنچایا تھا۔ یہ آٹھ ایم ایم تھی۔ اس میں سے پینتالیس گولیاں پانی کی بوچھاڑ کی طرح نکلتی تھیں۔ اس کے ایک یا دو برسٹ ہم چاروں کے لیے کافی تھے۔

یہ بے بسی کے لمحے تھے۔ میں نے سوچا شاہ جہاں، کیا اب تک تم آج کا دن دیکھنے کے لیے ہی زندہ تھے۔ اس دھواں دھواں جنگل میں برستی بارش اور کڑکتی بجلی کے درمیان تمہیں اس سور نما پولیس افسر کی گولیوں کا نشانہ بننا تھا اور صفدر... غزال... شفقا...... اور حمزہ... کیا تم انہیں آخری بار دیکھے بغیر رخصت ہو جاؤ گے؟

جیکب نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا۔ اپنے بچے کھچے ہمدرد ساتھیوں کو اس نے پیچھے ہٹا دیا۔ تھا۔ وہ ایک کوتاہ قد درخت کے نیچے جا کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی کل تعداد دس کے قریب تھی، وہ دو گاڑیوں میں یہاں پہنچے تھے، ان کا ایک ساتھی شاید زخمی تھا وہ پولیس کار کے اندر ہی لیٹا تھا۔

جیکب کے چہرے پر چٹان کی سی سختی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے اپنی سرکاری رائفل نیچے رکھ دی اور پاشا کی رائفل اٹھالی۔ میگزین چیک کرنے کے بعد اس نے رائفل سیدھی کی اور بے دریغ گولیوں کی بوچھاڑ کر دی...... لیکن یہ بوچھاڑ اس نے ہم پر نہیں اپنے ساتھیوں پر کی تھی۔ قریب سے چلائی جانے والی گولیوں نے دو تین سیکنڈ کے اندر پولیس والوں کو خاک و خون میں لوٹا دیا...... شاید وہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں "شکار" ہو گئے تھے۔ ان میں سے بس دو افراد نے زخمی ہو کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن جیکب نے انہیں بھی ڈھیر کر دیا۔

یہ منظر ہمارے لیے بھی اتنا ہی تعجب خیز تھا جتنا مرنے والوں کے لیے تھا۔ جیکب جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ پاشا والی رائفل خالی ہو چکی تھی۔ جیکب نے میری رائفل اٹھالی۔ اپنے ساتھیوں کے خونچکاں جسموں پر اس نے چند مزید فائر کیے اور پوری تسلی کر لی کہ ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ اس کے بعد وہ ہمیں نگاہ میں رکھتے ہوئے پولیس کار کی طرف گیا اور وہاں موجود اپنے زخمی ساتھی کو بھی سر میں گولی مار دی۔ اب فقط جیکب اور اس کا ایک بھورے بالوں والا ماتحت باقی رہ گئے تھے۔ یہ ماتحت یقیناً جیکب کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ ویسے تو یورپین "پولیس" عام طور پر صحت مند ہی ہوتے ہیں لیکن یہ ماتحت خاص طور سے باڈی بلڈر نظر آتا تھا۔ وہ فارمی مرغے کی طرح جھول جھول کر چل رہا تھا۔ اس نے ساری کارروائی کے دوران میں اپنی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی ہماری طرف سے نہیں ہٹائی تھی۔

زریں گل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی گول گول آنکھیں حیرت سے گردش کر رہی تھیں۔ سرگوشی میں بولا "یہ کیا ہو رہا ہے استاد صیب! ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "لگتا ہے کہ یہ دونوں فرنگی مسلمان ہو گئے ہیں۔ اب یہ دونوں ہم سے درخواست کریں گے کہ ہم انہیں کسی مولانا صاحب کے پاس لے جائیں تاکہ وہ ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیں۔"

"ام جانتا ہے آپ یہ بات مذاق میں کر رہا ہے۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔"

"چلو اب اپنی چونچ بند کرو۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ تم پٹھان ہو تو وہ ضرور تم سے پرانا بدلہ لے گا۔"

"کون سا پرانا بدلہ؟"

"لالہ، سدھیر جو کچھ ان فرنگیوں کے ساتھ کرتا رہا ہے، وہ نہیں بھول گیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ زریں کچھ اور کہتا جیکب آگے بڑھا اور اس نے ہمیں گاڑی سے دور ہٹا کر ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا۔ اس کے بعد واکی ٹاکی پر کسی سے رابطہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جیکب نے چند سیکنڈ بات کی اور پھر واکی ٹاکی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بارش اب بند ہو گئی تھی تاہم مطلع بدستور ابر آلود تھا۔

قریباً دس منٹ تک جیکب ادھر ادھر گھومتا رہا اور موقع واردات کا جائزہ لیتا رہا۔ اسی دوران میں سڑک پر کسی گاڑی کے آثار نظر آئے۔ جیکب چوکس ہو گیا۔ آنے والی گاڑی ایک شیورلیٹ کار تھی۔ اس میں ڈرائیور سمیت پانچ افراد سوار تھے۔ وہ مسلح تھے لیکن پولیس والے نہیں لگتے تھے۔ جیکب نے ان کے ساتھ چند سرگوشیاں کیں۔ نئے آنے والوں نے جیکب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہماری لینڈ روور جیپ کو گڑھے میں سے نکالا اور فوراً اس کا پہیہ بدلنے میں مصروف ہو گئے۔

ہماری جیپ کا ڈرائیور ابھی تک شدید زخمی حالت میں درخت تلے پڑا تھا۔ اس کے گلے سے نکلنے والی آواز ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس آواز سے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی حالت نازک ہے۔

میں نے بلند آواز سے جیکب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ڈرائیور زخمی ہے، اس کا کچھ کرو۔"

جیکب نے کہا "تم بہت ہی گرامی شخص ہو۔ تمہاری بات ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے۔"

وہ رائفل سونت کر ڈرائیور کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈرائیور کو شوٹ کرنے جا رہا ہے۔ شیورلیٹ کی ہیڈ لائٹس ڈرائیور کے سراپے پر پڑ رہی تھی۔ ان لائٹس میں وہ حسرت اور خوف کی تصویر نظر آرہا تھا۔ اس نے بے بسی کی کیفیت میں اپنا سر دائیں بائیں ہلا کر اپنے ... حرکت سے اس نے بے رحم قاتل سے التجا کی۔ اسے بتایا تھا کہ وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن قاتل ان درخواستوں پر کان کب دھرتے ہیں۔ جس شخص نے ابھی چند منٹ پہلے اپنے فرنگی ساتھیوں کو گولیوں سے اڑا دیا تھا وہ ایک اجنبی کی اپیل کیسے منظور کرتا۔ اس کی گن نے موت کا قہقہہ لگایا اور ڈرائیور کا خون پی گئی۔

مزاحمت یا احتجاج کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔ ہم خاموش کھڑے تھے۔ ہاں زریں گل پہلو بدلتا رہا۔ چند منٹ میں ہماری جیپ پھر سے سڑک پر دوڑنے کے لیے تیار تھی۔ جیکب اور اس کے ساتھی بھی یہ جگہ چھوڑنے کے لیے تیار دکھائی دیتے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے جیکب نے اپنی ٹوپی اتار کر کیچڑ میں پھینک دی پھر اپنی گھڑی کا اسٹریپ کھینچ کر توڑا اور گھڑی بھی وہاں پھینک دی۔ اپنے راز داں ماتحت کا ایک جوتا بھی جیکب نے موقع واردات پر چھوڑ دیا۔ "حرامی! اسٹیج سیٹ کر رہا ہے۔" پاشا نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ پولیس مقابلے کا اسٹیج ..... جس میں ہم نے پولیس والوں کو بھون دیا اور اس حرامی کو اس کے ماتحت سمیت اٹھا کر لے گئے۔" میں نے کہا۔

"کاش۔ واقعی ایسا ہوتا۔" پاشا نے حسرت سے کہا۔

"مجھے ایک شک ہو رہا ہے۔"

"کیسا شک؟" پاشا نے پوچھا۔

"یہ بندے جو شیورلیٹ میں آئے ہیں کہیں تو سیہ کے کارندے تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔" پاشا نے جواب دیا۔

"آپ لوگ یہ کیا کھسر پھسر کر رہا ہے۔ امارا تو خیال ہے....."

زریں گل کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ جیکب نے گرج کر ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا تھا مجھے اور زریں کو جیپ میں بٹھایا گیا۔ جبکہ پاشا اور علی احمد کو شیورلیٹ میں پہنچا دیا گیا..... مسلح افراد نے ہماری آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھیں اور دھمکانے کے لیے رائفل کی نالیں مستقل طور پر ہمارے جسموں سے لگا دیں۔ بھیگے ہوئے جنگل میں نامعلوم منزل کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جیپ رکی۔ ہمیں گن پوائنٹ پر رکھنے والے افراد میں سے دو بندے جیپ سے اترے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد کسی انگریز لڑکی کی چہکتی ہوئی سی آواز کانوں میں پڑی۔ لڑکی نے اپنے کسی دوست کو بوسہ دیا یا اس کا بوسہ لیا۔ اس کارروائی کا اندازہ بھی ہم نے بس آواز ہی سے لگایا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ لڑکی ہمارے ساتھ کچھ کرنے والی ہے؟ کیا کرنے والی ہے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں

تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی پٹی نے سب کچھ اوجھل کر رکھا تھا۔

قرائن سے پتا چلتا تھا کہ ہم کسی عمارت کے اندر ہیں۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ قریب ہی کوئی گرجا بھی ہے۔ اچانک میرے نتھنوں میں ایک بو گھس آئی۔ یہ استھیسیا ٹائپ گیس تھی۔ اس کے مہلک ہونے کا تجربہ میں ایک بار اس سے پہلے بھی کر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں گہری بے ہوشی کا شکار ہونے والا ہوں۔ سانس روکنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ جتنی گیس پھیپھڑوں میں داخل ہو چکی تھی اتنی ہی کافی تھی۔ میں نے جو آخری آواز سنی وہ زریں گل کی تھی۔ اس نے اپنے قریب کھڑی انگریز لڑکی کو "کتے کی بچی" کا خطاب دیا تھا۔ اس خطاب کے فوراً بعد وہ ریت کی بوری کی طرح جیپ کے فرش پر لڑھک گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد میرا ذہن بھی گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں ایک فوم پر چت لیٹا تھا۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے بے ہوش ہونے سے قبل پہن رکھا تھا۔ سر بھاری تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ میں کم از کم پانچ چھ گھنٹے بے ہوش رہا ہوں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کے واقعات ایک ایک کر کے ذہن میں تازہ ہوتے چلے گئے۔ پولیس اسٹیشن پر پاشا اور اس کے ساتھیوں کی کامیاب کارروائی..... اس کے بعد شعلوں میں لپٹی ہوئی جیکوار اور پاشا کے ساتھیوں کی دردناک موت آنکھوں کے سامنے آئی پھر جیکب کی اندھا دھند فائرنگ اور اپنے ہی ساتھیوں کا قتلِ عام ذہن میں تازہ ہوا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میری نظر زریں گل پر پڑی۔ وہ بھی فوم کے ایک گدے پر چت لیٹا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کسمسانا شروع کر دیا۔ مطلب تھا کہ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ میری طرح زریں کے ہاتھ بھی ہتھکڑی سے آزاد ہو چکے تھے۔ میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ یہی محسوس ہوا کہ میں ایک لاک اپ سے نکل کر دوسرے میں آ گیا ہوں۔ ہاں یہ لاک اپ پہلے والے سے زیادہ کشادہ تھا۔ یہاں دیواروں پر نیا نیا رنگ و روغن کیا گیا تھا۔ پولیس لاک اپ میں تین طرف سلاخیں (اسٹیل کی راڈ) تھیں اور ایک طرف دیوار تھی۔ یہاں تین طرف دیواریں ایک طرف سلاخیں تھیں۔ کچھ ویسا ہی منظر تھا جیسا چڑیا گھر میں جانوروں کے پنجرے کا ہوتا ہے۔ ان سلاخوں کے درمیان قریباً ایک فٹ مربع کا چھوٹا سا دروازہ بھی تھا۔ یہ دروازہ بھی سلاخوں کا ہی بنا ہوا تھا۔ یہ دروازہ یقیناً کھانے اور برتنوں کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

سلاخوں کے عین سامنے ایک راہداری تھی۔ راہداری میں بھی نیا نیا رنگ و روغن ہوا تھا۔ فی الحال راہداری میں کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم یقینی بات تھی کہ اس چار دیواری میں مزید افراد بھی موجود تھے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح یہاں قیدی کی حیثیت سے موجود ہوں۔ اگر وہ قیدی کی حیثیت سے موجود تھے تو پھر قید کرنے والے اور گارڈز وغیرہ بھی موجود ہوں گے۔

زریں گل بھی پانچ دس منٹ بعد ہوش میں آ گیا اور اپنے بھاری سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا دبا کر خود کو سکون پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ام کہاں ہے استاد صیب؟" زریں نے پوچھا۔

میں نے کہا "یہ جہنم تو نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں سردی ہے اور جنت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔"

اسی دوران میں راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دو نوجوان طائرانہ نظروں سے ہماری جانب دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور دونوں کے جسموں پر ایک وردی نما لباس تھا۔ ان کا حلیہ اور لباس وغیرہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایسی وردی اور اس کا ماحول میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔

اچانک ایک جانی پہچانی وحشت ناک آواز میرے کانوں میں گونجی اور نگاہ کے سامنے سے جیسے سارے پردے اٹھتے چلے گئے..... یہ بوکو کی آواز تھی۔ وہی منحوس کوڑا..... وہی جان لیوا شائیں شائیں..... وہی ادھڑی ہوئی کھال اور وہی درد میں ڈوبی ہوئی فریادی چیخیں..... میں اس آواز کو ہزار آوازوں میں سے پہچان سکتا تھا۔ ماریا ٹرسٹ میں اس آواز کے ہزار ہا کرشمے میں نے دیکھے تھے۔ یہ آواز انسان سے اس کی عزت نفس چھینتی تھی۔ یہ اشرف المخلوقات کو اس کی آزادی سے محروم کرتی تھی۔ یہ غلام انسانوں کو جانوروں کے ریوڑ کی طرح ہانکتی تھی اور ان کو "آقاؤں" کے من پسند تماشوں پر مجبور کرتی تھی۔

میرے دل نے پکار کر کہا..... ہم ایک بار پھر اسی انسان نما درندے کے چنگل میں ہیں جسے اس دور کا سب سے بڑا بردہ فروش کہا جاتا ہے..... وہی کنگ براؤن جو تاریک زمانوں کی خباثت لے کر اس جدید دور میں پیدا ہوا تھا اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو پالتو جانوروں کی طرح اپنے پاؤں میں لوٹانا چاہتا تھا۔

کی بوکو کی منحوس شائیں شائیں زریں گل نے بھی سن

لی تھی اور اب وہ حیرت زدہ سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "استاد صیب! ام نے پاشا صیب سے سنا تھا کہ کنگ براؤن یہاں ولایت میں موجود ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

"تمہیں کیا لگ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ام کو تو درست ہی لگ رہا ہے۔ بلکہ..... ام کو تو یہ بھی لگ رہا ہے کہ ام اس وقت اسی حرامی کے قبضے میں ہے۔"

"حیرت ہے کہ نسوار کے بغیر بھی تمہارا دماغ ٹھیک کام کر رہا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

زریں کھوئی کھوئی نظروں سے دیواروں کو دیکھنے لگا۔ یقیناً اس کی نگاہوں میں وہ تمام مناظر گھومنے لگے تھے جو اس نے اور میں نے ماریا ٹرسٹ کی زمینِ دوز دنیا میں دیکھے تھے اور جو ہمیشہ کے لیے ہمارے دل و دماغ پر نقش ہو چکے تھے۔

کہیں پاس سے ہی "بوکو" کی جو شائیں شائیں سنائی دی تھی وہ اب تھم گئی تھی لیکن کسی کے رونے اور سسکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یہ آواز کسی نوعمر لڑکے یا عورت کی تھی۔

زریں گل کا دھیان اپنی کلائی کی طرف گیا۔ وہ وقت دیکھنا چاہ رہا تھا مگر میری کلائی کی طرح اس کی کلائی بھی خالی تھی پھر میں نے زریں کے تاثرات ایک دم بدلتے دیکھے۔ اس نے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کو چھوا اور اس کا چہرہ ایک دم غضب ناک ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے "ہوشیار" ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ دانت پیس کر بولا "امارے ہاتھ کی اس انگلی میں ایک انگوٹھی تھا۔ کتے کے بچوں نے وہ بھی اتار لیا۔ وہ امارا شادی کا انگوٹھی تھا۔"

میں جانتا تھا کہ زریں اس انگوٹھی کو جان سے لگا کر رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ زریں کی شدید پریشانی میری سمجھ میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ زریں کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا میں نے اسے تسلی تشفی دی اور سمجھایا کہ انگوٹھی کہیں نہیں جائے گی۔ ہم اسے دوبارہ حاصل کر لیں گے۔

سامنے سے گزرنے والی راہداری میں اِکا دُکا افراد کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ سب نیلی وردی والے لوگ تھے۔ ان میں جوان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ان میں سے ہر ایک کی کمر کے ساتھ ہولسٹر تھا اور ریوالور جھول رہا تھا۔ ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں کی بوکو تھا اور وہ اسے لہراتا ہوا تیز تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ اب اس امر میں شبے کی ذرہ برابر گنجائش بھی نہیں رہ گئی تھی کہ ہم ایک بار پھر ماریا ٹرسٹ والے ماحول میں ہیں۔ وہاں کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی..... سارے پرانے زخم تازہ ہو رہے تھے۔ آدم خور بائیکل..... رقص..... مباوک امین..... سوزی اور جانے کس کس کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا تھا پھر میرے پردۂ تصور پر نوعمر شیطان اسٹی کا چہرہ ابھرا۔ وہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اب میں اس کے باپ کنگ کی تحویل میں تھا۔ یہ امر ہر شبے سے بالاتر تھا کہ کنگ مجھے بدترین انتقام کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے گا۔ یہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی بات تھی۔ انٹرپول، پولیس اور سی آئی اے کے خوفناک چنگل سے نکل کر کنگ براؤن کے جان لیوا شکنجے میں آ گیا تھا..... مجھے یہاں تک لانے کے معاملے میں ایک اور ہستی بھی ملوث نظر آ رہی تھی۔ وہ تو سیہ تھی۔ میں نے تو سیہ کو پولیس اسٹیشن پر انچارج جیکب کے کمرے میں بیٹھے دیکھا تھا اور اب وہی جیکب تھا جس نے مجھے یہاں پہنچایا تھا۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ میرے یہاں تک پہنچنے میں تو سیہ کا بھی اہم کردار ہے۔ شاید وہ میری جو چیخیں پولیس اسٹیشن میں نہیں سن سکی تھی وہ یہاں سننا چاہتی تھی۔

میں سوچتا رہا اور عقدہ کشا لمحوں کا انتظار کرتا رہا۔ جہاں ہم موجود تھے وہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں گھڑیاں بھی نہیں تھیں۔ یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ کیا وقت ہے..... قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ پھر راہداری میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کھانے کی مہک بھی نتھنوں سے ٹکرائی۔

"لگتا ہے کھانا آ رہا ہے۔" زریں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں..... کھانا ہے..... اور پُرتکلف بھی ہے۔ بھنی ہوئی مرغی اور سبزکاری کا پلاؤ ہے۔ میں نے اندازہ لگایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہ کھانا امارے لیے نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال ہے تم بھول گئے ہو۔ ٹرسٹ میں بردوں (فدیوں) کو بہترین کھانا دیا جاتا تھا۔ جس طرح بکاؤ جانوروں کو کھلا پلا کر موٹا کیا جاتا ہے اس طرح کنگ براؤن بھی اپنے بردوں کو صحت مند و توانا رکھتا ہے۔

"پھر تو ام ایک لقمہ نہیں لے گا۔" زریں نے پُرعزم لہجے میں کہا "ویسے بھی امارے نظر میں ابھی تک پاشا صیب کے وفادار آدمیوں کی موت کا منظر گھوم رہا ہے..... اُف خدایا، یہ کتنا برا ستم ہوا ہے اور پھر ابھی پاشا صیب کا بھی تو کچھ پتا نہیں۔ خدا جانے اسے اور علی احمد کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

میں نے کہا "مرنے والوں کا دکھ تو مجھے بھی ہے لیکن اگر ہم یہ دکھ لے کر بیٹھے رہیں گے تو پھر حالات کا مقابلہ کیسے کریں

گے۔ وہ مضبوط کروا بھی ہمیں پتا نہیں کیا کچھ دیکھنا ہے۔"

اس دوران میں نیلی وردی والے تین افراد کھانے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے ہمارے سامنے پہنچ گئے۔ ان میں ایک سفید فام عورت تھی اور دو حبشی مرد تھے۔ ہم دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ٹرے لاک اپ کے اندر پہنچائی گئی۔

یکا یک عجیب تماشا ہوا۔ زریں گل لپک کر گیا اور اس نے ایک حبشی کا ہاتھ دبوچ لیا۔ وہ بلند آواز سے چیخنے لگا "اتارو اسے...... ام کہتا ہے اتارو اسے، ورنہ ام تمہارا خون پی جائے گا۔"

میں نے دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ حبشی کی انگلی میں وہی زریں گل والی انگوٹھی نظر آ رہی ہے۔ حبشی اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا پھر دوسرے حبشی نے سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر زریں گل کا گریبان پکڑ لیا۔ زریں نے زور لگا کر حبشی کا ہاتھ مروڑ دیا اور انگوٹھی کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔

چند سیکنڈ کے لیے زبردست کشمکش نظر آئی۔ میں زریں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے ایک تیسرے باوردی پہریدار کو دیکھا وہ دوڑتا ہوا ہمارے لاک اپ کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس نما راڈ تھا۔ اس راڈ کے اگلے سرے پر چینل کا حلقہ سا بنا ہوا تھا۔ میں اس منحوس آلے کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ پہلے ہرکولیس جہاز میں اور پھر بار بارٹرسٹ میں، میں نے اس آلے کا خوفناک استعمال بڑی تفصیل سے ملاحظہ کیا تھا۔ بلکہ ایک دفعہ یہ آلہ خود مجھ پر بھی استعمال ہو گیا تھا۔

دراصل آلہ نافرمان قیدیوں کو پنجرے کے باہر سے قابو کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ چینل یا تانبے کی پتری کا حلقہ اچانک قیدی کی گردن میں کسا جاتا ہے اور پھر اسے طویل راڈ کے ذریعے سلاخوں کے قریب کر لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں پنجرے کے باہر سے ہی مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی ہے۔ میں نے پہریدار کو آلے سمیت اپنے پنجرے یعنی لاک اپ کی طرف لپکتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ اب زریں کی خیر نہیں۔ میں نے زریں کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا پھر اسے بے دردی سے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ زریں کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔

سلاخوں کی دوسری جانب باوردی پہریدار سخت مشتعل نظر آ رہے تھے۔ وہ ہر صورت زریں کو سزا دینے پر کمربستہ تھے۔

وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میرا ساتھی ذہنی طور پر بالکل ایب نارمل ہو رہا ہے۔ اور اپنے ردعمل پر قابو نہیں رہا ہے۔ اسے بیمار سمجھ کر معاف کیا جائے۔ میں اس کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ پرسکون رہے گا۔

میرے سمجھانے بجھانے سے پہریدار قدرے ٹھنڈے ہو گئے۔ جس پہریدار کا بازو زریں نے پکڑا تھا وہ دانت پیستے ہوئے بولا "یہ اپنی بیوی کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں دیکھ کر آگ بگولا ہوا ہے دو چار دن یہاں رہے گا تو بالکل سیدھا ہو جائے گا پھر انگوٹھی کی جگہ بیوی بھی ہمارے ہاتھ میں ہو گی اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

شکر کا مقام تھا کہ پہریدار نے یہ جملہ انگریزی میں کہا تھا۔ اگر اردو یا پشتو میں کہا ہوتا تو زریں فرش سے دو دو فٹ اچھلتا اور ایک بار پھر حشر کھڑا کر دیتا۔

پہریدار آگے بڑھ گئے تو میں زریں کو سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران میں اچانک میری نظر راہداری سے گزرنے والے ایک شخص پر پڑی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ آفیسر جیکب تھا۔ آج پہلی بار وہ مجھے وردی کے بجائے عام کپڑوں میں نظر آیا۔ اس نے سرخ جرسی اور جین پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگر اور ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ سگریٹ جیسی ہی ایک دبلی پتلی اور خوشنما لڑکی اس کی بغل میں بھی دبی ہوئی تھی۔ وہ سخت نشے میں تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ ہماری طرف توجہ دیے بغیر اپنے حال میں مست سیدھا نکلتا چلا گیا۔

زریں نے کہا "یہ تو وہی بدبخت ہے استاد صیب، جس نے اپنے ساتھیوں پر بارش کی طرح گولیاں برسایا تھا۔"

"ہاں یہ وہی آستین کا سانپ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اسے یہاں دیکھوں گا اور کسی ایسے ہی "حال" میں دیکھوں گا۔ یہ یہاں شراب اور لڑکیوں کے نشے میں ڈوب کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے، ادھر اخبار اور ٹی وی چینل چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں گے کہ خطرناک مجرموں کا ٹولہ فرض شناس اور دلیر پولیس آفیسر کو اغوا کر کے لے گیا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے عنقریب اپنے مطالبات پیش کرے گا۔"

زریں نے کہا "یہ اس کے ساتھ لڑکی کون تھا استاد صیب؟"

"ہو گی کوئی قسمت کی ماری...... ثنا...... روبی...... یا ڈیزی جیسی۔ یہاں کنگ اور اس کے حواریوں کے لیے زرخرید کنیزوں کی کیا کمی ہے۔"

زریں کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ وہ بولا "استاد صیب

ہو میں پاشا صیب نے تین لڑکیوں کا ذکر فرمایا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ وہ لڑکیاں بالکل گڑیوں کے مافق ہیں اور ان کو انگریزی میں بھی "گڑیاں" کہا جاتا ہے کہیں آپ ان کا نام ہی تو نہیں لے رہا؟"

"ہاں، یہ انہی کے نام ہیں۔"

"وہ اب کہاں ہیں؟"

"دو تو عالم قریشی کی حفاظت میں ہیں۔ ایک بے چاری رہ گئی ہے۔"

"ام سمجھا نہیں۔ پاشا صیب تو بتاتا تھا کہ وہ ہر وقت ایک ساتھ رہتی ہیں۔ دو عالم صیب کے پاس ہیں تو ایک کہاں گم ہو گئی ہے؟"

"یہ سمجھو کہ وہ شیطانوں کی بھیڑ میں گم ہو گئی ہے۔ اس بارے میں تمہیں پھر بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

ایک پہریدار سے استفسار کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ رات کا وقت ہے اور ٹائم دس بجے کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ پہریدار نے کچھ بھی بتانے سے انکار کیا۔ وہ سلاخوں سے تقریباً پندرہ فٹ دور کھڑا ہو کر بات کر رہا تھا اور میری جانب سے بے حد محتاط نظر آتا تھا۔ یقیناً اس کے ساتھ میرا تعارف "خطرناک" قیدی کی حیثیت سے کرایا گیا تھا۔ یہی حال دیگر پہریداروں اور گارڈز کا بھی تھا۔ میں نے پہریداروں سے اپنا اور اقمر کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس نے فقط اتنا بتایا کہ وہ بھی یہیں موجود ہیں۔

وہ رات ہم نے جیسے تیسے گزار دی۔ صبح ناشتے کے کچھ ہی دیر بعد نیلی وردیوں والے دو افراد ہمارے پنجرے کے نزدیک آئے۔ ان کی وردیوں اور حلیے وغیرہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں کی انتظامیہ کے افسران میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک بندے کی صورت جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ شاید میں نے اسے پہلے بار بارٹرسٹ میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے بال سفید تھے اور قومیت کے لحاظ سے وہ ایشیائی لگتا تھا۔ اس نے مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کی اور بتایا کہ وہ لوگ مجھے جیمز کے لیے اس لاک اپ سے باہر لے جانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں جکڑے جائیں۔ اگر میں اس سلسلے میں تعاون نہیں کروں گا تو مجبوراً انہیں دوسرے طریقے اختیار کرنا پڑیں گے۔ مجھے بے ہوش کیا جا سکتا ہے۔ گیس کے ذریعے اعصابی طور پر مفلوج کیا جا سکتا ہے۔ بے بس کیا جا سکتا ہے اور مزید کئی سخت طریقے بھی اپنائے جا سکتے ہیں۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میں تمہارے کسی ذمے دار شخص سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت ہم ہی یہاں کے ذمے دار ہیں۔ ہر معاملے میں ہر طرح کی اتھارٹی رکھتے ہیں۔" دوسرے شخص نے بارعب لہجے میں کہا۔

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد میں رضا مند ہو گیا۔ سفید بالوں والے نے ضمانت دی کہ کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ اسی لاک اپ میں لایا جائے گا...... اس نے یہ بھی بتایا کہ مجھے ایک اہم شخص سے بات کرنے کے لیے ہی لاک اپ سے نکالا جا رہا ہے۔

میں منہ پھیر کر سلاخوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ سفید بالوں والے نے باہر کھڑے کھڑے میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑ دیے۔ بعد ازاں اس نے ایک اسٹیل کی زنجیر نکالی۔ اس کے دونوں سروں پر "کف" لگے ہوئے تھے۔ یہ زنجیر پاؤں میں ڈالنے کے لیے تھی۔ بار بارٹرسٹ میں، میں اس چیز کے درشن کر چکا تھا۔ یہ زنجیر پہننے کے بعد قیدی چل تو سکتا تھا لیکن اسے بہت چھوٹا قدم اٹھانا پڑتا تھا۔ کبھی دو فٹ اور کبھی اس سے بھی کم۔

اس زنجیر کا ذکر سفید بالوں والے نے پہلے نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں مجھے آہستہ آہستہ "صورت حال" کے لیے تیار کر رہا تھا۔ پاؤں میں زنجیر ڈالنے کے بعد مجھے لاک اپ سے باہر نکالا گیا۔ تین مسلح گارڈز نے اس دوران میں زریں کو نشانے پر رکھا۔ ہمیں جنونی اور خطرناک قیدیوں والا "پروٹوکول" دیا جا رہا تھا۔ سفید بالوں والے نے لاک اپ کو اپنے سامنے مقفل کر دیا اور مجھے لے کر راہداری میں آگے بڑھنے لگا۔ زریں میری طرف حسرت ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں بے شمار اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ میں گارڈز کے نرغے میں آہستہ آہستہ چلتا اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ یہ ساری تعمیر نئی تھی۔ رنگ و روغن کی بو بھی آ رہی تھی۔ مجھے یہاں بالکل ویسے ہی بیرک نما بال کمرے نظر آئے جیسے بار بارٹرسٹ میں تھے۔ ان میں سے کچھ تو ابھی خالی تھے لیکن کچھ میں لوگوں کی موجودگی کے آثار نظر آتے تھے۔ ہم صاف شفاف کوریڈور میں آگے بڑھتے رہے۔ تقریباً پچاس میٹر آگے ہم ایک طویل بیرک کے سامنے سے گزرے۔ یہاں کم و بیش تین درجن کے قریب لڑکیاں موجود تھیں۔ ان کی عمریں زیادہ سے زیادہ چودہ اور سولہ کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان میں سے بیشتر ایشیائی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے ایک

ہی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا یہ منی اسکرٹ ٹائپ کی چیز تھی۔ وہ تین قطاروں میں نہایت صاف شفاف فرش پر ننگے پاؤں کھڑی تھیں۔ دو خواتین ٹیچرز ان کے سامنے موجود تھیں اور انہیں ٹریننگ دے رہی تھیں۔ یہ چائے پیش کرنے کی ٹریننگ تھی۔ کئی لڑکیوں کے ہاتھوں میں چائے کے ٹرے برتنوں سمیت نظر آ رہے تھے۔ اپنی ٹرینر کی ہدایت پر وہ نپے تلے قدم اٹھاتیں آگے بڑھتی تھیں اور بڑے اسٹائلش طریقے سے جھک کر چائے کے برتن میز پر سجاتی تھیں پھر وہ پیچھے ہٹ کر مؤدب کھڑی ہو جاتی تھیں۔ برتنوں کے کچھ ٹکڑے فرش پر بھی پڑے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نو آموز لڑکیوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اور نتیجے میں ان سے ڈانٹ ڈپٹ ہوتی رہی ہے۔

میں کنیزیں اور غلام تیار کرنے والی اس قسم کی بہت سی کلاسیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ سب وہی قابلِ نفرت مناظر تھے جو اب ایک نئے روپ میں پھر سامنے آئے تھے۔ ہم سیدھے نکلتے چلے گئے۔ کشادہ راہداری سے گزرنے کے بعد ایک نسبتاً تنگ کوریڈور میں داخل ہوئے۔ یہاں فرش پر قالین بچھے تھے اور دیواروں میں سے دیدہ زیب روشنی پھوٹی تھی۔ یہاں خاموشی تھی جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے اس خاموشی اور نفاست میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ہم ایک اور کوریڈور میں مڑے۔ یہاں جو محافظ نظر آ رہے تھے ان کی نیلی وردیوں میں سینے پر ایک زرد رنگ کی چڑیا بنی دکھائی دیتی تھی۔ یہ ان محافظوں کی خصوصیت کو ظاہر کرتی تھی۔ میں ایک خاص بات نوٹ کر رہا تھا اور وہ یہ کہ یہاں جو کچھ بھی دکھائی دیتا تھا بالکل نیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عمارت بس کوئی چار چھ ماہ پہلے کھڑی کی گئی ہے اور یہاں کی اندرونی آرائش بھی حال میں ہوئی ہے۔ بالآخر ایک خودکار سلائیڈنگ ڈور سے گزر کر ایک نشست گاہ میں پہنچے۔ یہ جگہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھی۔ دیواروں کے ساتھ نہایت آرام دہ صوفے رکھے تھے اور ان پر بڑے بڑے لگژری کشن نظر آ رہے تھے۔ ایک خوبصورت انگریز لڑکی نے مجھے ایک نشست پر بٹھایا اور سفید کنپٹیوں والے کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ہمیں کچھ دیر تک انتظار کرنے کے لیے کہہ رہی ہے۔

مسلح گارڈز باہر چلے گئے۔ بس اب ایک میرے قریب موجود تھا۔ سفید کنپٹیوں والا شخص بھی باہر نکل گیا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں نے اسی نشست گاہ میں گزارے۔ مجھے نشست پر بٹھانے والی انگریز لڑکی کے سوا یہاں کوئی لڑکی اور نظر نہیں آئی۔ ہاں لڑکے تھے۔ ان کی عمریں سولہ سے اٹھارہ سال رہی ہوں گی۔ وہ سب کے سب اسمارٹ اور خوبصورت تھے۔ ایک جیسے چست لباس پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہ خدمت گار لڑکے ہیں۔ وہ بے آواز چلتے ہوئے آبنوسی دروازے کے اندر جاتے تھے یا باہر آتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا ٹرے میں اخبار اور اورنج جوس لیے ہوئے دروازے میں داخل ہوا۔ دوسرا چائے کے برتن لیے ہوئے نکلا۔ کافی انتظار کے بعد وہی انگریز لڑکی آبنوسی دروازے سے باہر آئی اور اس نے گارڈ سے کہا "ان کو لے کر جاؤ۔" لڑکی کا اشارہ میری طرف تھا۔

میں اٹھا اور گارڈ کے ساتھ آبنوسی دروازے کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری ملاقات کس سے ہو رہی ہے۔

آبنوسی دروازے کی دوسری طرف ایک شاندار کمرا تھا۔ اس کمرے میں ایک سنگل صوفے پر جو خوبرو عورت پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی وہ منوہرا دیوی تھی۔ اس نے سلیپنگ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ پنڈلیاں ننگی تھیں۔ اس نے دونوں پاؤں گرم پانی کے برتن میں رکھے ہوئے تھے۔ ایک گورا نوجوان جو غالباً یونانی تھا۔ منوہرا کے عقب میں موجود تھا اس کے سیاہ لمبے بالوں میں ہولے ہولے مساج کر رہا تھا۔ اورنج جوس اور اخبار والی ٹرے ایک شاندار تپائی پر منوہرا کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھنے کے بعد منوہرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑی دلچسپی سے مجھے سر تا پا گھورا پھر قدرے بھاری آواز میں بولی "خوش آمدید...... استار جہانی...... بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

میں نے کہا "مل کر خوشی ہوئی یا مجھے اس حالت میں دیکھ کر؟"

وہ بولی "تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ تم باتیں بھی اچھی کر لیتے ہو۔"

"شکریہ...... اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم بھی دے دیں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔" وہ [illegible] انداز سے بولی۔ اس نے گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھے نشست پر بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر میرے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی نخوت اور حیوانی چمک تھی۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی عجوبے کو دیکھا جاتا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں [illegible] روز تک اس کے آس پاس موجود رہا ہوں۔ جہانا

[illegible] سے وہ کئی بار مجھ سے بات بھی کر چکی تھی۔

"میرے بارے میں جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"شاید کہیں دیکھا ہوا ہے اور...... پڑھا بھی ہوا ہے۔"

وہ اورنج جوس کی چسکی لیتے ہوئے بولی "میرا نام منوہرا ہے۔ لوگ مجھے منوہرا دیوی کہتے ہیں۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی پھر چند لمحے بعد کہا "شاید میں پہچان گیا ہوں۔ تم ایک ایسے پیشے سے منسلک ہو جس کا ذکر میں یہاں کرنا نہیں چاہتا۔ دنیا کے نامی گرامی [illegible] سے تمہارے گہرے تعلقات ہیں۔"

منوہرا کے چہرے پر ملال کے آثار نظر نہیں آئے۔ وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "شاہ جی ہوں۔ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر مارنے کا محاورہ تم پر صادق آتا ہے۔ اگر تم میرے بارے میں کچھ جانکاری رکھتے ہو تو میں بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ خیر اس جگہ یہ تبصرہ مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی میں تم سے تکرار کر کے تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتی۔ جو بندہ ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہا ہو اور آپ سے [illegible] کے مہمان کی طرح ملے اس کو دکھ نہیں پہنچانا چاہیے۔"

"کس لمبے سفر پر روانہ کر رہی ہو مجھے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس بارے میں تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جو کچھ تم کر چکے ہو اس کے بعد تمہیں اپنے انجام کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔"

"شاید تم اس سفر کی بات کر رہی ہو جس پر جا کر کوئی واپس نہیں آتا...... او کے...... اطلاع کا شکریہ۔"

"تمہارے حالات پر افسوس ہو رہا ہے۔ تم نے اپنی [illegible] لگا رکھی ہیں۔"

"کیا تم نے صرف افسوس کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"نہیں تم سے کئی باتیں کرنا ہیں۔ تم سے کچھ سوال پوچھنا ہیں۔ تمہارے بارے میں جو کچھ سن رکھا ہے اس میں بھی مجھے [illegible] ہے۔ میں کئی واقعات کا ذکر تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔"

اس نے خدمت گار لڑکوں کو اشارہ کیا۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ خاموشی سے باہر چلے گئے۔

منوہرا دیوی نے اپنے پاؤں گرم پانی سے نکالے، اپنے سلیپنگ گاؤن کی ڈوری کسی، اور بڑی شان سے چلتی ہوئی میرے سامنے صوفے پر آ بیٹھی۔

میں اب اسے ذرا قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ خوبصورت رخساروں سے اوپر متورم سے سیاہ حلقے بھی نظر آ رہے تھے۔ غالباً یہ اس کی عیاشیوں اور بداعمالیوں کے نشان تھے۔ اس کا جسم بھی "گداز" کی حد سے آگے بڑھ گیا تھا اور فربہ محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ بولی "تم سے ایک بات آف دی ریکارڈ کہنا چاہتی ہوں...... اور وہ یہ کہ تم اپنے رقیب شیخ عاصم بن ارشد کا اتا پتا دو۔ یہ بات میں تم سے صرف ہمدردی کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔ جن لوگوں کے قبضے میں تم آ گئے ہو۔ وہ تم سے شیخ صاحب کا پتا پوچھے بغیر تمہیں مرنے بھی نہیں دیں گے۔ میں سو فیصد وشواس کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں یہ جانکاری دینا ہی پڑے گی۔ کیا یہ بہتر ہے کہ تم اپنے شریر اور آتما پر بے پناہ ظلم سہے بغیر یہ جانکاری دے دو؟"

"ہمدردی کا شکریہ۔ لیکن جو چیز میرے پاس ہے ہی نہیں۔ وہ میں کیسے دے سکتا ہوں۔"

وہ ہونٹ بھینچ کر خاموشی سے میرا چہرہ تکتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے موضوع بدل دیا۔ "پتا چلا ہے کہ یہاں آنے سے پہلے کینٹ کے ایک مکان میں اپنی پریمکا سے تمہارا نکاح ہو گیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"اس ڈاکٹر سے تمہارا نکاح اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ شیخ عاصم نے ڈاکٹر کو طلاق دے دی ہو...... یا پھر شیخ عاصم مر چکا ہو۔ شیخ عاصم نے، میری جانکاری کے مطابق ڈاکٹر کو طلاق نہیں دی تھی۔ اس کے باوجود تم نے اس سے بیاہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے؟" وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شیخ عاصم کے بارے میں وہ کچھ جانتے ہو جو ہم نہیں جانتے......" فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ بدبخت بڑی تیزی سے حقیقت کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"تم جو بھی کہنا چاہتی ہو۔ صاف لفظوں میں کہو۔"

اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "مجھے شک ہے کہ شیخ عاصم تمہارے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔ یا کم از کم ایسا ضرور ہے کہ تم شیخ کی ہلاکت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔"

"تمہاری قیاس آرائی بالکل بے بنیاد ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ جو تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ تم سے ہو جائے گا۔ ہم کچھ اور باتیں کرتے ہیں......" اس نے ایک

گہری سانس لی اور اپنے خیالات جمع کرتے ہوئے بولی ''میں جانتی ہوں تمہاری کہانی شیخ عاصم کے بڑے بھائی راشد بن ارشد سے شروع ہوئی تھی۔ بہرحال پچھلے چند دنوں میں، میں نے تمہارے بارے میں مزید کچھ معلومات اکٹھی کی ہیں۔ ان معلومات کے مطابق تم نے اپنی بہن کی خاطر شیخ راشد کو قتل کیا اور پھر بڑی دھوم دھام سے جرم کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ تم کچھ عرصہ لاہور کی جیل میں رہے اور پھر اٹک بھیج دیے گئے۔ اٹک سے تمہیں فرار ہونے کا موقع ملا اور ایک بڑے جاگیردار قادر زماں سے تمہارا رابطہ ہوا۔ اس کے بعد تمہیں پنجاب کے ایک طاقتور سیاستدان مجتبیٰ کنور سے ملنے کا موقع ملا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ مجتبیٰ کنور میرے کرم فرماؤں میں شامل ہے اور اس کے منہ سے میں نے کئی بار تمہارا ذکر سنا ہے۔ شاید تمہیں جانکاری نہیں ہو کہ مجتبیٰ کنور آج کل شدید بیمار ہے۔''

''کیا ہوا ہے اسے؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔

''وہ جگر کے کینسر میں مبتلا ہے اور یہاں انگلینڈ میں ہی زیر علاج ہے۔ اس کے بچنے کی امید نہیں۔''

منوہرا کی بات سے کم از کم یہ پتا تو چلا کہ میں اور میرے ساتھی تا حال انگلینڈ میں ہی ہیں ورنہ پچھلے پندرہ بیس گھنٹے میں میرے ذہن میں کئی بار آیا تھا کہ ہو سکتا ہے ہمیں انگلینڈ سے باہر لے جایا جا چکا ہے۔ مجتبیٰ کنور کے حالات سے مجھے اب کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ منوہرا نے ایک رومنٹ مجتبیٰ کے بارے میں بات کی پھر کہنے لگی ''تمہاری داستان میں ایک اہم تذکرہ دفینے کا بھی ہے۔ یہ دفینہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جاگیردار قادر زماں کے علاقے سے ہی ملا تھا۔ بعد کے ایک دو سال میں اس دفینے کی وجہ سے انڈیا اور پاکستان میں بہت دھوم مچی رہی تھی۔ بے شمار ہنگامے ہوئے تھے اور ان گنت لوگوں کی جان گئی تھی۔ انہی دنوں تمہاری زندگی میں ایک لڑکی بھی آئی تھی، اس کا نام شاہینہ تھا۔ وہ ایک نواب زادی تھی۔ بھوپال وغیرہ میں تم لوگوں نے کچھ اچھا وقت گزارا تھا پھر نوابزادی کو قتل کروا دیا گیا تھا۔ اس قتل کی خبر انڈیا کے اخباروں میں نمایاں سرخیوں سے شائع ہوئی تھی۔ ہم نے بھی وہ خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھی تھیں...... یہاں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ تم ڈاکٹر غزالہ سے پریم کا دعویٰ کرتے ہو لیکن اس کے باوجود اکا دکا لڑکیاں بھی تمہارے جیون میں آتی رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام تو ہم بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ انڈیا کی ناکام اداکارہ اور دنیا کی کامیاب دھونے باز...... سروج۔ سنا ہے اس سے بھی تمہارے گہرے سمبندھ رہے ہیں؟''

''کیا میرے لیے جوابات دینا ضروری ہیں؟''

وہ بولی ''میں چاہوں تو زبردستی بھی کر سکتی ہوں۔ یہ تمہیں جان سے مارنے کا اختیار میرے پاس نہیں ہے، سامنے اختیارات ہیں۔ لیکن آج ہمارے درمیان جو گفتگو رہی ہے یہ آف دی ریکارڈ ہے۔ میں دوستانہ ماحول میں تم سے اپنی دلچسپی کے معاملات پر بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''اور تمہاری دلچسپی کے معاملات کیا ہیں؟''

''کئی ایک ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً یہ کہ تم اور تمہارے ساتھی کچھ عرصے پہلے پاکستان کے شمالی علاقوں میں بھی پھنس گئے تھے۔ وہاں ایک ایسا علاقہ تھا جسے موت کی وادی کے نام سے یاد رکھا جاتا ہے۔ تمہیں اور تمہاری ٹیم کو وہاں کچھ پُراسرار حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کوئی سانوس نامی شخص تھا جو ہپناٹزم کے ذریعے محیر العقول کام کر گزرتا تھا۔ اس وادی کے علاوہ تم نے سری لنکا میں بھی کچھ ہنگامہ خیز وقت گزارا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں شیخ عاصم نے تمہاری پریمیکا ڈاکٹر غزالہ کے ساتھ اپنی سوتن بنا رکھا تھا اور تمہیں ایک ملازم کی طرح اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے منوہرا کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ بولی ''میری معلومات کے مطابق اس کہانی کا انجام بڑے دردناک طریقے سے ہوا تھا۔ غزالہ زخمی ہو کر شدید بیمار ہو گئی تھی۔ شیخ عاصم اسے سری لنکا میں بے آسرا چھوڑ کر راتوں رات چلا گیا تھا۔ تم نے ایک بچے پر کیل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا اور جان بلب محبوبہ کو ہاتھوں میں اٹھائے پھرتے رہے تھے۔ تمہاری کہانی کا یہ حصہ واقعی متاثر کن ہے۔ میں تم سے ان حالات کے بارے میں کچھ سننا چاہوں گی۔''

''شاید تم میرے مرنے کے بعد مجھ پر کوئی کتاب لکھنا چاہ رہی ہو۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہ وقت بھی آ جائے۔ بہرحال ابھی تو مجھے صرف تمہاری باتوں میں دلچسپی ہے۔ ابھی دو روز پہلے میں تمہاری فائل دیکھ رہی تھی تو کچھ پرانے اخباری تراشوں پر نظر پڑی۔ ان میں ''آدھے دفینے'' کی بازیابی کا ذکر تھا اور گندھارا آرٹ کے نادر نمونوں کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ ان میں امریکن ارب پتی مسٹر کلارک کا ذکر بھی تھا جس کو تم نے دفینے کے نوادرات کا ''گارڈین'' مقرر کیا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ نوادرات کی فروخت کے بعد تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شمار پاکستان کے امیر لوگوں میں ہوتا ہے۔ مسٹر

کلارک نے تمہارے نام سے لگژری ہوٹلز کی ایک چین شروع کر رکھی ہے جو تیزی سے منافع اگل رہی ہے۔ یہ سوچ کر من دکھی ہو جاتا ہے کہ تم کو اس عمر میں اتنا ڈھیر سارا دھن چھوڑ کر مرنا ہو گا...... اور پھر دھیان تمہاری پریمیکا ڈاکٹر غزالہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ ایک بدقسمت عورت رہی ہے۔ تمہاری پتنی بن جانے کے باوجود وہ تم سے محروم رہی ہے اور تم اس سے محروم رہے ہو۔ اٹ از رئیلی سیڈ......'' منوہرا نے تاسف سے سر ہلایا۔

''اگر تم یہ بات دل سے کہہ رہی ہو تو...... شکریہ...... ہمبل اور تھینک یو۔''

وہ کسی ان سی کرتے ہوئے بولی ''تمہاری داستان کا ایک دلچسپ حصہ وہ ہے کہ جب تم افریقا کے سفر پر تھے۔ غزالہ تمہارے ساتھ تھی اور وہ بچہ بھی جسے غزالہ نے گود لے رکھا ہے۔ تم دونوں وہاں ہر گھڑی ایک ساتھ رہے ہو۔ یہ بات وشواس کے قابل نہیں ہے کہ اتنی قربت کے باوجود تم دونوں کے بیچ پتی پتنی والا رشتہ قائم نہیں ہوا ہو گا۔ میرے خیال میں تو ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ برسوں سے ترسے ہوئے دو پریمیوں نے ان گنت راتیں مکمل تنہائی میں ایک ساتھ گزاریں اور ایک دوسرے کو چھوا نہیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال تم سے مختلف ہے منوہرا۔'' میں نے سرد مہری سے کہا ''ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی نظر آتا ہے۔ تم ایک جنس زدہ عورت ہو۔ تمہیں بھی ہر طرف جنس ہی جنس دکھائی دیتی ہے۔ اپنے ارد گرد ہر وقت خوبرو لڑکے جمع رکھنے والی عورت کے ہونٹوں سے ایسی ہی بات نکلنی چاہیے جیسی تمہارے منہ سے نکلی ہے۔ مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا۔''

''چلو میں تو جنس زدہ ہوں لیکن وہ تو جنس زدہ نہیں تھے جنہوں نے افریقا سے واپسی پر تم پر بے راہ روی کے مقدمات دائر کیے۔ لاہور کی عدالتوں میں ابھی تک کم از کم تین مقدمے تمہارے خلاف ہیں۔''

''تمہاری معلومات درست نہیں ہیں۔ شیخ عاصم نے جرگے کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے خلاف ایک ایسا مقدمہ بنایا تھا۔ اس مقدمے کا فیصلہ میرے حق میں ہونے والا تھا۔ دوسرا مقدمہ غزالہ اور اس کے والدین کی طرف سے خلع کا تھا۔ اس میں بھی فیصلہ شیخ عاصم کے خلاف ہونے جا رہا تھا لیکن فیصلے سے پہلے ہی شیخ عاصم او چھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا اور سب کچھ درہم برہم ہو گیا۔''

میری نجی اور عوامی زندگی کے حوالے سے منوہرا کریدکر کر سوالات کرتی رہی۔ میں مناسب جواب دیتا رہا اور کہیں کہیں خاموشی بھی اختیار کرتا رہا۔ وہ کئی واقعات میری زبان سے سننا چاہتی تھی۔ میں نے مختصراً واقعات بیان کیے۔ اس دوران میں وہ بڑے ٹھاٹ سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے میرے سامنے بیٹھی رہی۔ اس نے چار پانچ سگریٹ پیے۔ شیمپین کے دو گلاس اپنے اندر انڈیلے اور بلیک کافی بھی لی۔ خدمت گار نوجوان اس کے ایک ہلکے سے اشارے پر بڑی مستعدی سے حرکت میں آ جاتے تھے۔

میں نے گفتگو کے اختتام پر منوہرا دیوی سے پوچھا ''کنگ براؤن سے کب ملاقات ہو گی؟''

''کنگ براؤن؟ کون کنگ براؤن؟'' وہ انجان بن کر بولی۔

''وہی جس کی تم ملازمت کر رہی ہو...... جس کا نمک کھا رہی ہو۔''

''تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اس جگہ کا کنگ براؤن سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس کا لہجہ گواہ تھا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہی ہے۔

قریباً دو گھنٹے تک منوہرا کے چیمبر میں رہنے کے بعد مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ مسلح گارڈ اندر داخل ہوا اور مجھے اٹھا کر نشست گاہ میں لے آیا۔ جس وقت میں منوہرا کے چیمبر سے باہر نکل رہا تھا، وہ جدید طرز کے انٹرکام پر کسی شخص سے بات کر رہی تھی۔ یہ بات سوئمنگ پول اور کیفے ٹیریا کی تعمیر کے بارے میں تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تعمیر کہیں آس پاس ہی ہو رہی تھی اور اس پر بے تحاشا پاؤنڈز خرچ کیے جا رہے تھے۔

میں نشست گاہ میں پہنچا وہاں باقی کے دو گارڈز بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ سفید کنپٹیوں والا شخص بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے اس کے باوجود یہ حضرات باجماعت میری نگرانی کے لیے موجود تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ انہیں میرے بارے میں خاص الخاص ہدایات دی گئی ہیں۔ نشست گاہ میں اب تین چار مزید افراد نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ منوہرا سے ملاقات کے لیے آئے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کیں۔ شاید ان میں سے ایک آدھ نے مجھے شاہ جہاں کی حیثیت سے پہچان بھی لیا تھا۔

میں اپنے محافظوں کے نرغے میں آہستہ آہستہ چلتا کوریڈور میں آ گیا۔ چھوٹے کوریڈور کی سنسنی خیز خاموشی سے نکل کر ہم بڑے کوریڈور میں آئے اور پھر کشادہ راہداری میں پہنچ گئے۔ یہاں ملی جلی آوازیں آتی تھیں۔ یہ ان بردوں کی

آوازیں تھیں جو اپنی بدقسمتی کے سبب چھوٹی بڑی بیرکوں میں بند تھے اور مختلف طریقوں سے زندگی کا زہر پی رہے تھے۔ نہایت مختصر لباس میں ایک انگریز لڑکی اونچی ایڑی پر کھٹ کھٹ کرتی، مچلتی مٹکتی ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا سفید کتا اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ کتا اپنی سرخ زبان سے اس کی تھوڑی کو چاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک توانا پہریدار جو اپنی شکل و صورت سے امریکن یا کینیڈین دکھائی دیتا تھا چند افراد کو الٹی ہتھکڑیاں لگائے ہانکتا ہوا لے جا رہا تھا۔ ان افراد میں دو نوجوان عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر شخص بھی شامل تھا۔ غالباً یہ لوگ ایک کنبے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق یقیناً انڈیا یا پاکستان سے تھا۔

اس کنبے کو دیکھ کر مجھے ماریا ٹرسٹ کے وہ اترپردیشی قیدی یاد آ گئے جن پر ہماری آنکھوں کے سامنے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ وہ جبر کی اس چکی میں پس کر نیم پاگل ہو گئے تھے اور ذرا سی بات پر خوفزدہ ہو کر جانوروں کی طرح چیخنے چلانے لگے تھے۔ ''کی بوکو'' ان کی آنکھوں کا ڈراؤنا خواب تھا۔ ''کی بوکو'' کی آواز انہیں فرشتۂ اجل کے پروں کی سرسراہٹ کی طرح سنائی دیتی تھی پھر مجھے کم سن کملا یاد آئی۔ پہلا ستم تو اس پر ہوا تھا کہ اسے پوری طرح بالغ ہونے سے پہلے ہی ماں بنا دیا گیا تھا پھر تھوڑے ہی عرصے بعد اس کی زندگی کو دردناک موت میں بدل دیا گیا تھا۔ وہ ماریا ٹرسٹ کی جان لیوا بھول بھلیوں میں اپنے نوخیز بچے کو سینے سے لگائے جان بچانے کے لیے بھاگتی پھرتی تھی...... اور کنگ کے بیٹے آنتی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ آنتی اور اس کے دوست اسی طرح کھیل کھیل میں انسانی زندگی کا شکار کرتے تھے۔ مجھے وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں...... وہ سارے زخم تازہ ہو رہے تھے۔

میں جہاں سے گزرتا تھا نیلی وردیوں والے گارڈز مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے تھے۔ میرا پروٹوکول ان کے لیے تعجب خیز تھا۔ میں جانتا تھا کہ زریں گل بے تابی سے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ خبر نہیں تھی کہ اب تک اس کے ذہن میں کیا کیا وسوسے گزر چکے ہوں گے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اپنے لاک اپ کے قریب پہنچ گیا۔ ابھی میں لاک اپ سے بیس پچیس میٹر دور ہی تھا کہ اچانک ایک بغلی راہداری میں سے شور بلند ہوا۔ لمبے بالوں والا ایک نوجوان چیختا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ساتھ منڈھے ہوئے سر والا ایک صحت مند لڑکا بھی تھا۔

لمبے بالوں والے نے چیختے ہوئے کہا ''میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی نوجوان نے اپنا دایاں ہاتھ لہرایا۔ چاقو کا چمکدار پھل میرے کندھے کو زخمی کرتا نکل گیا۔ منڈھے ہوئے سر والا توپ کے گولے کی مانند مجھ سے ٹکرایا۔ میں پشت کے بل گرا۔ منڈھے ہوئے سر والے کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستول تھا۔ اس نے میرے سر کا نشانہ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتا میری دونوں ٹانگیں بھرپور قوت سے اس کے سینے پر پڑیں وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی چھت میں لگی تھی۔

اسی اثنا میں پہلے والا لڑکا گالیاں بکتا ہوا مجھ پر جھپٹا۔ ایک گارڈ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ دونوں اوندھے منہ میرے قریب گرے۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے لیکن ٹانگیں جزوی طور پر آزاد تھیں۔ میں لڑکے کی گردن اپنی ٹانگوں میں دبا لی۔ لڑکے کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اچھی صحت کی وجہ سے وہ زیادہ عمر کا لگتا تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ آنتی کے دوستوں میں سے تھا۔ تب اس کے چہرے پر ابھی روآں نمودار نہیں ہوا تھا اور جسم بھی پتلا تھا لیکن اب وہ جنگلی گھوڑے کی طرح صحت مند اور سرکش دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گردن میری ٹانگوں میں پھنسی تو اس نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ میری ٹانگوں یا ناف کو نشانہ بناتا ایک گارڈ نے اس کا چاقو والا ہاتھ دبوچ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ دوسری طرف گارڈ نے بھی پورا زور لگا دیا۔ میں لڑکے کی گردن پر اپنی ٹانگوں کا دباؤ حتی الامکان حد تک بڑھا چکا تھا لیکن ٹانگوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ میں ایک حد تک ہی دباؤ ڈال سکتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ گارڈز لڑکے کے ہاتھ سے چاقو چھڑانے میں ناکام رہے ہیں اور لڑکا کسی بھی وقت اپنا ہاتھ چھڑا کر مجھے زخمی کر سکتا ہے تو میں نے تیزی سے کروٹ لی اور لڑکے کا سر پتھریلی دیوار سے ٹکرا دیا۔ تصادم زوردار تھا۔ لڑکے کے حلق سے کراہ نکلی اور ایک دم اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

میں نے اپنی ٹانگوں کی گرفت نرم کر دی۔ گارڈز نیم بے ہوش لڑکے کو کھینچ کر مجھ سے دور لے گئے۔ چاقو اس کی بند مٹھی میں سے نکال لیا گیا۔ دوسرے لڑکے کو بھی دو تین گارڈز نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور اس سے ٹی ٹی پستول واپس لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکا حلق کی پوری قوت سے دھاڑ رہا تھا۔ ''تجھے کتے کی موت ماریں گے۔ تیرے پورے خاندان کو یہاں لائیں گے اور ان کا قیمہ کروائیں گے......''

وہ چکنی مچھلی کی طرح گارڈز کے ہاتھ سے نکل نکل جاتا تھا۔ سفید کنپٹیوں والے نے مستقل طور پر لڑکے کا پستول والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور پستول کی نال فرش کی سمت جھکا رکھی تھی۔

بالکل چند قدم کے فاصلے پر لاک اپ کے اندر سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ انسانے اردو میں شنجیدہ ہی راویلا مچایا ہوا تھا۔ وہ گارڈز کو بے غیرتی کے طعنے دے رہا تھا۔ انہیں للکار رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ ''لالچا بابوں'' کی اولاد نہیں ہیں تو اسے استاد صیب کو آزاد کر کے اس سے مقابلہ کریں۔''

اب تک تو اس کی چیخ و پکار فقرخانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی تھی۔ وہ مزید مشتعل ہو گیا اور اس نے سلاخوں والے دروازے پر دو ہتڑ مارنا شروع کر دیے۔ یہ ہنگامہ قریباً پانچ منٹ تک جاری رہا پھر نیلی وردیوں والے آٹھ دس گارڈز ان شیطان زادوں کو کھینچ کر وہاں سے لے گئے۔ میرا دھا خون نکل رہا تھا۔ چاقو کا زخم گہرا تھا اور ہڈی کو چھو رہا تھا...... مجھ سے آنتی کے قتل کا بدلہ لینے کی یہ پہلی کوشش تھی (حالانکہ وہ میرے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا تھا)۔

لاک اپ میں بند کرنے سے پہلے مجھے ڈریسنگ روم میں لے جایا گیا۔ یہ جدید طرز کا اسپتال اس چار دیواری کے اندر ہی تھا۔ یہاں مجھے ہر طرح کی بہترین طبی سہولتیں نظر آئیں۔ صاف ستھری وردیوں میں ملبوس نرسیں، ڈاکٹرز اور پیرامیڈیکل اسٹاف اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے تھے۔ میرے کندھے کے زخم پر پانچ چھ ٹانکے لگائے گئے اور بینڈیج کر دی گئی۔ اس کے بعد مجھے واپس لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔

غم زدہ زریں گل نے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا اور مجھ پر حملہ کرنے والے لڑکوں کو ''بے غیرت بجوروں'' کا خطاب دیتے ہوئے انہیں بدترین قسم کی بددعائیں دیں...... اگلے چوبیس گھنٹے بغیر کسی اہم واقعے کے گزر گئے۔ ہمیں وقت پر کھانا دیا جاتا تھا۔ نہانے دھونے اور لباس بدلنے کی سہولت بھی حاصل تھی لیکن لباس کا انتخاب کرنے کی سہولت نہیں تھی۔ لاک اپ کی بلڈنگ میں رہنے والے مخصوص لباس تھا جو یہاں کے قیدی (نیلا) پہنتے تھے۔ یہ موٹے لیکن ملائم کپڑے کا ٹراؤزر اور قمیص تھی۔ سردی سے بچاؤ کے لیے ایک جیکٹ بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔ یہ ساری جگہ سینٹرلی ائیرکنڈیشنڈ تھی لہٰذا سردی گرمی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ غزالہ کی صورت ان گنت تصویروں کے پردۂ تصور پر لرز چکی تھی۔ رخصت کے روز خراش نول میں کہے گئے الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا۔ ''بہت دکھ سہہ لیے ہیں آپ نے...... بہت مار بھی کھا لی ہیں آپ نے۔ کتنی چوٹیں ہیں آپ کے جسم پر۔ میں اب آپ کو اور زخم نہیں لگنے دوں گی۔'' اسے کیا پتا تھا کہ ابھی بہت سے زخم لگنے ہیں۔ ابھی بہت کچھ سہنا باقی ہے۔

اب تک میرے ذہن میں یہ سوال متعدد بار آ چکا تھا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ چار دیواری جہاں ہم موجود ہیں کس جگہ واقع ہے۔ ابھی تک میں نے یہاں چھت ہی چھت دیکھی تھی کہیں آسمان نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہریالی دکھائی پڑی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ماریا ٹرسٹ کے کیمپس کی طرح ہم یہاں بھی کسی زمین دوز بستی میں ہیں۔ بہرحال ابھی تک اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اگر یہ ماریا ٹرسٹ جیسی ہی کوئی جگہ تھی تو پھر یہ یقیناً حیرت کی بات تھی۔ ماریا ٹرسٹ افریقی ملک ماریطانیہ میں واقع تھا۔ ایک فلاحی ادارے کی آڑ میں بردہ فروشی کا ''عظیم الشان'' دھندہ وہاں ہوتا تھا لیکن انگلینڈ تو ایک ایسا ملک تھا جس کی قانون پسندی اور ''تہذیب'' کی مثالیں دی جاتی تھیں...... یہاں ماریا ٹرسٹ جیسا سیٹ اپ کیسے تیار ہو گیا تھا؟ یہ سوال میرے لیے بڑا اہم تھا۔

ایک دن صبح سویرے زریں بولا ''استاد صیب! آپ رات کو آہستہ آہستہ کراہتا رہا ہے۔ امارا خیال ہے کہ آپ کے کندھے کا زخم ٹھیک نہیں ہوا اور ہو بھی کیسے۔ کتے کے بچوں نے بس پٹی کر دی ہے نہ کوئی وررکی دواری ہے نہ کوئی اینٹی کرافٹ رہا ہے۔''

''اینٹی کرافٹ نہیں...... اینٹی بائیوٹیک۔'' میں نے تصحیح کی۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا ''ام کو ڈر ہے کہ کہیں آپ کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ ام کو یہ فرنگی زبان نہیں آتا، ورنہ ام ان حرامی پہریداروں کا خبر لیتا......''

''تمہیں فرنگی زبان کے نہ آنے سے فرنگی زبان اور فرنگیوں کا بہت بھلا ہوا ہے۔''

''اس کا بدلہ ام واپس لاہور جاتے ہی ضرور لے گا۔ کم از کم دو درجن فرنگیوں کو بے عزت کرے گا اور کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دے گا۔''

''تمہارا مطلب ہے تم نے کچھ انگریز بھی نوکر رکھے ہوئے ہیں؟''

''رکھے تو نہیں ہوئے لیکن ام رکھ لے گا۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ زریں کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے سمجھا شاید وہ سوچ رہا ہے کہ انگریزوں کو ملازمتیں دینے کے لیے انگلینڈ سے پاکستان کیسے بلائے گا لیکن وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا ''استاد صیب! ام کو یہاں بند ہوئے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ ابھی تک یہ بھی پتا نہیں کہ یہ لوگ ام سے کیا چاہتا

ہے۔ نہ ہی ام کو باشاصیب اور علی احمد کا کچھ اتا پتا معلوم ہوا ہے۔"

"تو اتنے پریشان کیوں ہو۔ کیا ایسا تم نے پہلے کسی فلم میں نہیں دیکھا۔"

"آپ مذاق کر رہا ہے استاد صیب! ام واقعی پریشان ہے۔"

"تمہاری ہر پریشانی کا حل سدھیر یا بدر منیر کی کسی نہ کسی فلم میں موجود ہوتا ہے۔ تھوڑا سا دماغ دوڑاؤ شاید کوئی طریقہ سمجھ میں آ ہی جائے۔"

"دیکھیں آپ کے کندھے پر خون لگا ہوا ہے۔ امارا خیال ہے کہ آپ کے زخم میں...... شاید انفیکشن (انفیکشن) ہو گیا ہے۔ چند مہینے پہلے لاہور میں جب ام نے آپ کے بھتیجے اسد کا مسلمانی کرایا تھا تو اس کی یونی میں بھی انفیکشن ہو گیا تھا۔ بے چارا چھوٹا سا تو ہے ساری رات آپ کی طرح ہائے ہائے کرتا رہتا تھا۔"

"مجھے تو لگتا ہے تمہارے دماغ میں "انفیکشن" ہو گیا ہے۔ انگریزی کی ٹانگ توڑنے سے بہتر ہے کہ تم گلابی اردو ہی بول لیا کرو......"

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ تین گارڈز موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ سفید کنپٹیوں والا سینئر ملازم بھی موجود تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ آج ہم دونوں میں سے پھر کسی کو باہر لے جایا جانے گا۔ میں دعا کرنے لگا کہ باہر جانے والا شخص زریں نہ ہو۔ وہ مشتعل ہو کر کسی بھی وقت اپنے یا دوسروں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ خیریت گزری...... یہ لوگ مجھے باہر لے جانے کے لیے آئے تھے۔ سفید کنپٹیوں والے کا نام اسمتھ مینفز معلوم ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تمہارے کندھے کا زخم ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر والز کے کہنے پر تمہیں دوبارہ کلینک میں لے جایا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ تم پہلے کی طرح تعاون کرو گے۔"

"اور امید ہے کہ دو چار لڑکے بھی پہلے کی طرح میری جان لینے کے لیے حملہ آور ہوں گے۔"

"اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم فول پروف انتظام کر چکے ہیں۔"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تم صرف میرے ہاتھ جکڑنے پر اکتفا کرو۔ تین چار رائفلوں کے ہوتے ہوئے میں مزاحمت کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"سوری مسٹر شاہ جہاں۔" اسمتھ سینئر سرد لہجے میں بولا۔ "قانون...... قانون ہی ہے۔ تمہیں ہمارے کہنے کے مطابق چلنا ہوگا۔"

قریباً دس منٹ بعد میں گارڈز کی موجودگی میں دوسری لاک اپ سے نکل رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ حسب معمول پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان بندھے ہوئے ہاتھوں کے اوپر بھی پلاسٹک کی تھیلی سی چڑھا دی گئی تھی۔ پاؤں میں نماز نجیر بھی موجود تھی۔ قریباً سو میٹر کے قریب مجھے پیدل پڑا۔ آخر ہم ایک قالین پوش راہداری میں داخل ہوئے اسپتال میں پہنچ گئے۔ یہاں دواؤں کی بو تھی اور میڈیکل اسٹاف کی مدہم گھسر پھسر سنائی دے رہی تھی۔ مجھے جدید کے ڈریسنگ روم میں لے جایا گیا اور نشست پر بٹھا دیا گیا۔ میرے ٹانکے کاٹ کر زخم میں سے "پیپ" وغیرہ نکالی گئی۔ اسے نئے سرے سے ٹریٹ کر کے پٹی باندھ دی گئی۔ مرہم پٹی سے مجھے کافی سکون حاصل ہوا۔ جس وقت میری ہو رہی تھی ایک مریضہ کو اسٹریچر پر اندر لایا گیا۔ اسٹریچر کو گوشے میں کھڑا کیا گیا اور میڈیکل اسٹاف نے مریضہ کو لیا۔ وہ تکلیف میں تھی، نیم بے ہوشی کی حالت میں مسلسل رہی تھی اور بول رہی تھی۔ اس کی بڑبڑاہٹ ایک دو مرتبہ بلند ہوئی اور میں نے اس کی آواز واضح طور پر سنی۔ میری سماعت کو جھٹکا محسوس ہوا۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے ذرا دھیان سے سنا اور پہچان لیا یہ تو...... آواز تھی۔ Singing Gilrs میں سے سب سے بہن۔ یہ حیرت ناک بات تھی کہ میں یہ آواز یہاں سن رہا تھا۔ چند روز پہلے میں نے نینا کو وِنچسٹر کے محل میں چھوڑا تھا۔ وہاں وہ بردونائی کے پرنس داراب کی تحویل میں تھی۔ میں دونوں بہنوں کو محل سے نکال لایا تھا مگر نینا نے اپنی مرضی سے اور محل چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مہاتما بدھ کی مورتی سینے سے لگائے دیوار کی طرح کھڑی رہی تھی اور ہم اس کو سر پھوڑ کر بے نیل و مرام واپس آ گئے تھے۔ جو کچھ داراب کی طرف سے نینا کے ساتھ ہوا تھا، اس میں نینا کا قصور نہیں تھا لیکن یوں لگتا تھا کہ وہ لاشعوری طور پر خود کو گنہگار اور ناپاک سمجھتی ہے۔ وہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہتی تھی اور شاید اسی خیال کے تحت شدت سے بدھا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

آج میں نینا کو وِنچسٹر کے محل کے بجائے یہاں نامعلوم چھت تلے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاتی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "آپ کو خدا کا واسطہ ہے پرنس...... میری بہنیں بڑی معصوم ہیں۔ انہیں کچھ نہ کہنا۔ میں قسم کھا سکتی ہوں...... وہ اپنی مرضی سے نہیں گئیں، وہ لے گیا تھا انہیں......"

پھر ایک دم اس کی آواز مدھم ہو گئی وہ کوئی سوتر (دعا)

(دعا) پڑھنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ پھر پرنس کی منت سماجت میں مصروف ہو گئی۔ "آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا...... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا...... اگر میری بہنوں کو کچھ ہوا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔ میں اپنی جان لے لوں گی......"

پھر وہ نیم بے ہوشی اور غنودگی کے عالم میں روپ اور پنکی کو آوازیں دینے لگی۔ ان کو ڈانٹنے لگی کہ وہ تیز آندھی میں گھر سے باہر کیوں نکل رہی ہیں۔ کہاں بھاگی جا رہی ہیں۔

گارڈز مجھے لے کر ڈریسنگ روم سے باہر نکلے تو میں نے اسٹریچر پر نینا کو دیکھا۔ اس کے پھول سے نازک چہرے پر تھپڑوں کے نشان تھے۔ لباس پھٹا ہوا تھا اور گندمی جسم پر تازہ خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹروں نے تیزی سے اس کے وائٹل سائنز چیک کیے تھے اور گلوکوز کی ڈرپ لگا دی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اب اس کا معدہ واش کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ نینا کی حالت سے بھی یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے سخت مایوسی کے عالم میں کوئی زہریلی چیز حلق سے اتار لی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ پچھلے دنوں میں شدید جسمانی و ذہنی تشدد کا شکار رہی ہے۔ غالباً روپ اور پنکی کے محل سے فرار کے بعد پرنس داراب نے نینا کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لیا تھا۔

دل سے ہوک نکلی۔ یہ نازک سی گڑیاں جو کسی کی تکلیف اور مصیبت پر دل کی گہرائیوں سے تڑپ اٹھتی تھیں۔ آج خود کس قدر ہولناک حالات کا شکار تھیں۔ ان پر ترس کھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی اصل مجرم منوہرا تھی جو یہاں سے کچھ فاصلے پر اپنے عالیشان اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ میرے نزدیک بڑا اہم سوال یہ تھا کہ منوہرا تو نینا وغیرہ کو فروخت کر چکی تھی پھر نینا منوہرا کے پاس واپس کیسے آئی؟ کیا پرنس داراب کا دل اتنی جلدی نینا سے بھر گیا تھا؟ یا پھر وہ عیاش پرنس بھی کنگ براؤن کے اسی عشرت کدے میں پایا جاتا تھا؟ اس طرح کے کئی سوالات ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اچانک اسپتال کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ ایک شخص چیختا چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے تیزی سے چاروں طرف دیکھا، پھر سیدھا نینا کے اسٹریچر کی طرف آیا۔ میں دنگ رہ گیا۔ وہ پرنس داراب تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"کہاں ہے وہ؟ کیا کیا ہے اس نے؟" وہ گرجا۔

مجھے چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے وہ نیم بے ہوش نینا کو دبوچ کر جھنجھوڑ دے گا۔

ڈاکٹر نے اس کے راستے میں آتے ہوئے کہا۔

"سر! انہوں نے زہریلی دوا پی ہے یا شاید کسی نے انہیں پلا دی ہے۔ ابھی ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

بھاری بھرکم پرنس ڈاکٹر کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے نینا کے سرہانے پہنچا اور اسے جھنجھوڑ کر بولا "کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی تجھ پر؟ کیوں ایسا کیا تو نے...... دو چار دن صبر نہیں ہو سکا تجھ سے؟"

وہ طیش میں بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے نینا کو انگلش کی کئی بھاری بھرکم گالیوں سے نوازا...... ایک دو منٹ بعد اس کا غصہ قدرے کم ہوا تو اس نے ایک نرس سے پانی لانے کو کہا۔ نرس پانی لائی تو پرنس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا پھر دوسرا گلاس پیا...... اس کے بعد وہ بتدریج "کول ڈاؤن" ہونے لگا۔

وہ سینئر ڈاکٹر کو ایک طرف لے گیا اور غالباً اس سے نینا کے علاج معالجے کے بارے میں بات کرنے لگا۔ دیگر ڈاکٹرز بڑی سرعت سے نینا کا معدہ واش کرنے کی تیاری کر رہے تھے...... میرے گارڈز مجھے لیتے ہوئے ڈریسنگ روم سے باہر آ گئے۔ میں پرنس داراب کے سامنے سے گزرا لیکن وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے کہ اس نے مجھے جہاں داد کے حلیے میں دیکھا تھا پھر بھی جب میں قریب سے گزرا تو اس نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی۔ شاید میری ہتھکڑی، پاؤں کی زنجیر اور گارڈز کے کڑے پہرے نے اسے میری طرف متوجہ کیا تھا...... یا ممکن تھا کہ کوئی اور بات ہو۔ جس وقت میں ڈریسنگ روم سے باہر نکلا۔ نینا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔

پرنس داراب کو یہاں دیکھ کر میری حیرت میں اضافہ ہوا تھا۔ منوہرا بوبی سے پرنس کا تعلق واضح تھا۔ ممکن تھا کہ کنگ براؤن سے بھی اس کا کوئی ناتا ہو۔ وہ ایک امیر کبیر عیاش تھا اور ایسے مالدار عیاشوں، نوابوں، سرداروں اور امراء کی ضرورت کنگ براؤن کو ہمیشہ رہتی تھی۔ اس کا کاروبار ہی ان لوگوں کے دم قدم سے تھا۔

راہداری کے آخری سرے سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر گارڈز کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ میں بھی شور شرابے کی ان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی سنگین نوعیت کا ہنگامہ ہو گیا ہے۔ ایک دم میرا دھیان جوشیلے زریاب گل کی طرف چلا گیا...... کہیں زریاب نے تو کوئی گڑبڑ نہیں کر دی تھی؟ یہ خیال ہی میرے لیے روح فرسا تھا کہ زریاب پہریداروں سے الجھ گیا ہے...... اگر ایسا ہوا تھا تو پھر زریاب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

شور بڑھتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ درجنوں افراد ہم آہنگ ہو کر للکارے مار رہے ہیں۔ ان کی آوازوں میں غیض و غضب نمایاں تھا۔ ہم پندرہ بیس قدم آگے بڑھے تو منظر واضح ہو گیا۔ جس لاک اپ میں مجھے اور زریں کو رکھا گیا تھا اس کے سامنے ایک ہجوم جمع تھا۔ یہ سب لوگ وہی تھے جن کے ہاتھوں میں یہاں کا انتظام و انصرام تھا۔ ان میں اکثریت کنگ براؤن کے عزیز و اقارب کی تھی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو آنکھیں بند کر کے کنگ کی وفاداری کا دم بھرتے تھے اور خود کو کنگ کا کتا کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں نشے میں دھت تھے اور بالکل ناکافی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں نجہانی انجی کی چنڈال چوکڑی کے جانے پہچانے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس ہجوم کا جوش و خروش ایک دم عروج پر پہنچ گیا۔ وہ للکارے مارتے ہوئے میری طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ نیلی وردیوں والے گارڈز کی ایک قطار نے اپنی رائفلوں کو افقی رخ سے پکڑ کر ایک رکاوٹ سی بنالی اور اس رکاوٹ کی مدد سے مظاہرین کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔ جوں جوں میں نزدیک پہنچ رہا تھا مظاہرہ کرنے والوں کی چیخ و پکار بلند ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر مختلف چیزیں پھینک رہے تھے۔ ان میں شراب کی خالی بوتلیں اور مختلف اشیاء کی ٹن پیکنگ شامل تھی۔

”یہ ماسٹر انجی کا قاتل ہے، ہمیں اس کا سر چاہیے!“ ایک زوردار للکار سنائی دی۔

”ہاں ہمیں اس کا سر چاہیے......!“ چند آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

”اسے سرِعام پھانسی پر لٹکایا جائے۔“

”اس کی لاش کو کوڑے مارے جائیں۔“

”اس کو زندہ جلایا جائے...... اس کے سارے ساتھیوں کو پکڑا جائے اور ان کو زندہ جلایا جائے۔“

یکے بعد دیگرے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ان آوازوں کے ساتھ لعنت ملامت بھی اور وحشت ناک گالیاں تھیں۔

اندیشہ تھا کہ بپھرے ہوئے لوگ گارڈز کا گھیرا توڑ کر آگے نہ آ جائیں۔ مزید گارڈز وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے پہلی قطار کے پیچھے ایک اور قطار بنالی۔ جو گارڈز مجھے کلینک تک لے کر گئے تھے انہوں نے مجھے تین اطراف سے کور کر رکھا تھا۔ بڑی تیزی کے ساتھ مجھے لاک اپ میں پہنچایا گیا۔ لاک اپ کے آگے ایک شٹر بھی موجود تھا۔ نیلی وردیوں والے گارڈز نے تیزی سے شٹر گرا کر مجھے اور زریں کو ہجوم کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ لوگوں کی پھینکی ہوئی اشیاء اب شٹر سے ٹکرا رہی تھیں اور سخت شور پیدا کر رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے شور کم ہونے لگا۔ لوگوں کی آوازیں ذرا دور سے آنے لگیں اور مدھم بھی ہو گئیں۔ زریں گل دکھی ہو کر بولا ”یہ سب کیا ہے استاد صیب! کیا ام اور آپ اتنا برا ہے کہ امارے خلاف جلوس نکالا جائے اور ام کو گولیاں لگ جائیں۔“

میں نے کہا ”جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں ان کے نزدیک تو ہم واقعی اتنے برے ہیں۔ ہم نے مارہا ٹرسٹ میں ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑا تھا۔ ان کی بساط الٹی تھی، ان کے دولت کو گل کیا تھا اور انہیں دربدر بھٹکنے پر مجبور کیا تھا۔“

”لیکن استاد صیب! وہ لوگ کدھر ہے۔ جنہوں نے امارا ساتھ دیا تھا اور امارے ساتھ مل کر کنگ کو کباڑا کیا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ نسوار نہ ملنے کے باوجود تمہارا دماغ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ بے وقوف جب مارہا ٹرسٹ ٹوٹ گیا تو وہ لوگ بھی بکھر گئے۔ ان میں سے زیادہ تر تو سائیں عالی کی بسائی ہوئی کالونی میں آباد ہوں گے اور کھا پی کر بچے پیدا کر رہے ہوں گے۔ کچھ گورنمنٹ مار یطانیہ کی طرف سے اپنے اپنے ملک روانہ کر دیے گئے ہوں گے اور کچھ ہماری طرح خود ہی اپنے اپنے وطن پہنچ گئے ہوں گے...... لیکن پریشانی کی بات نہیں۔ مارہا ٹرسٹ جہاں ہوگا، وہاں باغی بھی ہوں گے۔ دنیا میں جہاں بھی ”کی بوکو“ کی آواز گونجے گی وہاں کوئی ”بوکو“ توڑنے والا بھی اٹھے گا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ کنگ کے اس نئے ٹھکانے پر بھی ایسا لوگ موجود ہوگا جو اس کے خلاف اٹھنا چاہتا ہوگا۔“

”ایسے لوگ موجود ہیں۔ تم نے ڈیڑھ دو سو بندوں کو یہاں مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے بیس گنا افراد ان مظاہرہ کرنے والوں کو نفرت اور انتقام کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ وہ سارے خاموش لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ ان سب کے دل ہمارے ساتھ دھڑکتے ہیں۔“

”لیکن ام اپنا کیا کرے استاد صیب۔ ام سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی آپ پر انگلی اٹھائے۔ آنے والے دو چار دنوں میں ام ضرور کسی کو قتل فرما دے گا یا امارے بلڈ کا ”پریشر ککر“ اتنا ہائی ہو جائے گا کہ امارا دل بم کے ماتق پھٹ جائے گا۔“

”میں یہی تو چاہتا ہوں کہ تمہارے بلڈ کا ”پریشر ککر“ اتنا ہائی نہ ہو کہ تم بم کے ماتق پھٹ جاؤ اور ساتھ مجھے بھی اڑا دو۔ بچو زریں! میری پریشانیوں میں اضافہ مت کرو۔“ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”تم نے سنا ہی ہوگا کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ تم ایک اچھے دوست ہو اب دانا دوست بھی بنو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”ام سمجھا نہیں استاد صیب!“

”اپنا ہاتھ آگے لاؤ۔“ میں نے کہا۔ زریں نے ہاتھ آگے کیا ”اب اس ہاتھ کو میرے سر پر رکھو۔“ زریں جھجک گیا۔ میں نے تیسری بار اصرار سے کہا تو اس نے ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا ”اب وعدہ کرو زریں! کہ تم اپنے غصے کو قابو میں رکھو گے۔ میری یا اپنی بے عزتی کو حوصلے سے برداشت کرو گے۔ اگر کوئی جسمانی تکلیف دی گئی تو اسے بھی حوصلے اور جرأت سے سہو گے...... اور میرے ساتھ مل کر اچھے وقت کا انتظار کرو گے۔“

زریں گل دکھی ہو کر بولا ”استاد صیب! ام یہ سب کچھ کرے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ کرے گا لیکن آپ...... آپ اس میں سے اپنی بے عزتی والا بات نکال دیں۔ یہ امارے بس میں ہی نہیں ہے۔ ام نے جب سے ہوش سنبھالا ہے امارے دل میں بس ایک ہی آرزو ہے۔ آپ کو کانٹا چبھنے کی تکلیف کے بدلے میں امارا جان آپ پر نچھاور ہو جائے۔“

”اور میری بات نہ مان کر تم مجھے جو تکلیف دو گے وہ کانٹا چبھنے کی تکلیف سے ہزاروں لاکھوں گنا شدید ہوگی۔“

زریں گل خاموش رہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے لاجواب سا ہو گیا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا ”زریں گل! میری خوشی اسی میں ہے کہ تم یہ بات مان لو۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

زریں میری سنجیدگی دیکھ کر سرتاپا کانپ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ بولا ”ٹھیک ہے استاد صیب! آپ کی خوشی کے لیے تو ام اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹ سکتا ہے۔“

”تو پھر وعدہ کرتے ہو؟“

وہ آنسوؤں کا گھونٹ بھر کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد پہرے داروں نے لاک اپ کا شٹر اٹھا دیا۔ ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔

پہرے دار کی ہدایت کے مطابق میں سلاخوں کے قریب پہنچا۔ میری الٹی ہتھکڑی اور بیڑی کھول دی گئی۔ اسمتھ سینئر نے مجھے بتایا کہ آج رات بالکل کسی وقت ایک اہم شخصیت مجھ سے ملاقات کرے گی۔

میرا دھیان فوراً کنگ براؤن کی طرف چلا گیا۔ جب سے ہم یہاں آئے تھے کنگ براؤن کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے اور مجھے حالتِ اسیری میں دیکھنے کے لیے بے چین ہوگا۔ وہ رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے بتایا گیا کہ اہم شخصیت مجھ سے ملاقات کے لیے آ رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ یہ ملاقات یہیں پر ہوگی۔ مجھے ملاقات کے لیے لاک اپ سے باہر نہیں لے جایا جائے گا۔ میرے ملاقاتی کے لیے ایک آرام دہ کرسی بھی لاک اپ سے باہر سلاخوں کے ساتھ رکھ دی گئی۔ شاندار کرسی دیکھ کر زریں گل بولا ”امارا خیال ہے کہ یہ کوئی خاص بندہ ہی ہوگا۔“

”لیکن میرے اندازے کے مطابق کنگ براؤن نہیں ہوگا۔ وہ کرائی ہوتا تو پھر مجھے خود اس کے پاس لے جایا جاتا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔

دس پندرہ منٹ مزید اسی سسپنس میں گزرے۔ دور کسی بیرک میں بے بس قیدیوں پر کوڑا برس رہا تھا اور ان کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے لاک اپ کے سامنے سے جو راہداری گزر رہی تھی وہاں ہر وقت آمد و رفت رہتی تھی لیکن فی الوقت کوئی آمد و رفت نہیں تھی۔ شاید آنے والے ملاقاتی کے لیے یہ آمد و رفت بند کر دی گئی تھی۔ آخر ملاقاتی نمودار ہوا۔ وہ بروناٹی کا پرنس داراب تھا۔ وہ شاندار تھری پیس سوٹ میں تھا۔ سر پر ایک خاص انداز کی ٹوپی تھی۔ تو بہ شکن جسم رکھنے والی ایک فرانسیسی لڑکی جو نہایت مختصر لباس میں تھی اس کے پیچھے پیچھے نہایت مؤدب انداز میں چلی آ رہی تھی۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ لڑکی کا نیم عریاں بدن اور خیرہ کن حسن دیکھ کر زریں نے بے ساختہ لاحول پڑھا۔

پرنس داراب نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور کرسی کی طرف مڑا۔ نیم عریاں لڑکی نے اپنے جسم کو کمان کی طرح دہرا کر کے پرنس کے لیے کرسی کو تھوڑا سا پیچھے ہٹایا۔ پرنس بیٹھ گیا تو لڑکی اس کے پیچھے مؤدب کھڑی ہو گئی۔ لڑکی نے اخباری رپورٹروں کی طرح ایک چھوٹی سی نوٹ بک اور پنسل ہاتھوں میں لے لی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے بیگ میں چھوٹا سا حساس ٹیپ ریکارڈر بھی موجود ہے۔

پرنس داراب سلاخوں سے قریباً سات آٹھ فٹ کی دوری پر بیٹھا تھا۔ یہ ایک محفوظ فاصلہ تھا۔ ہمارے لاک اپ میں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی جس کی مدد سے ہم سات آٹھ فٹ دور بیٹھے پرنس کو نشانہ بنانے کا سوچ سکتے۔ پرنس زریں کو بالکل قابلِ توجہ نہیں جان رہا تھا اس کی نگاہوں کا مرکز صرف میں تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بھاری آواز میں بولا ”تمہارے

متعلق کچھ عرصہ پہلے اخباروں میں پڑھا تھا۔ تو اوراث کا ایک بڑا ذخیرہ تمہارے ہاتھ لگا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تم ہوٹلوں کی ایک بڑی "چین" کے مالک بن چکے ہو۔ بہت خوب..... ایک قاتل بدمعاش سے بزنس مین تک بڑی تیزی سے ترقی کی ہے تم نے!"

"کیا تم مجھے یہی بتانے کے لیے یہاں آئے ہو؟"

"نہیں...... یہ بات تو میں نے صرف تمہید کے طور پر کی ہے۔ اصل معاملہ کافی سنجیدہ بلکہ سنگین ہے۔"

"میں اس معاملے کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں؟"

"نوعیت وہی ہے جو شیخ عاصم والے معاملے کی ہے۔ شیخ عاصم کہاں ہیں؟ ان کے بارے میں صرف تم جانتے ہو۔ اسی طرح دونوں گانی گڑیوں کے بارے میں بھی صرف تم جانتے ہو۔"

"میں یور ہائی نس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"میرا اور اپنا وقت ضائع کرنے کی کوشش مت کرو۔ پولیس آفیسر بیکب ہارڈ کے ذریعے ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ایورریڈی سیکیورٹی سروسز کی طرف سے جو انڈین گارڈ امرلیش ہماری رہائش گاہ پہ پہنچا تھا...... وہ دراصل تم ہی تھے۔ اس وقت تم نے اپنا حلیہ تبدیل کر رکھا تھا۔ انڈین گارڈ کے شناختی کاغذات پر تم نے جعل سازی سے اپنی تصویر چسپاں کی تھی۔ اس ساری کارروائی میں تمہارا پاکستانی دوست عالم قریشی برابر کا شریک تھا۔"

"میں یہ جھوٹی کہانی پہلے بھی سن چکا ہوں۔"

"بکواس بند کرو!" پرنس داراب گرجا "تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کر سکتا ہوں۔ تم نے ڈیجسٹر میں میری رہائش گاہ سے روپ اور پنکی کو اغوا کیا ہے اور وہ اب تک تمہارے قبضے میں ہیں۔ مجھے وہ دونوں لڑکیاں چاہئیں۔ ابھی اور اسی وقت...... ! دوسری صورت میں بدترین سلوک کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

میں نے اطمینان کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائی اور انگریزی میں کہا "پرنس صاحب مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے۔ ایک قرض خواہ نے قرض دار سے کہا، تم نے میری رقم واپس نہ کی تو قیامت کے دن میں تمہارے سینے پر چڑھ کر لوں گا۔ قرض دار نے کہا، بھئی اور بہت سے لوگوں نے بھی سینے پر چڑھنا ہے، اگر تمہیں جگہ ملی تو تم بھی چڑھ جانا۔ میرا حال بھی اس قرض دار جیسا ہی ہو رہا ہے۔ بہت سے کردہ اور ناکردہ گناہ میرے کھاتے میں ڈالے جا رہے ہیں۔ چلو دو چار تم بھی ڈال لو۔"

"یعنی تم روپ اور پنکی کی WHERE ABOUTS نہیں بتاؤ گے؟" پرنس داراب نے خون خوار لہجے میں کہا۔

"اگر ان کے بارے میں آپ کو معلوم ہو بھی جائے...... تو آپ کیا کریں گے؟"

"ہم انہیں ان کے گھر واپس پہنچانا چاہتے ہیں، کیونکہ ہم نے ان کی بڑی بہن سے ایسا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے...... اور یہ وعدہ ہم ہر صورت پورا کریں گے۔"

"آپ بالکل غلط فرما رہے ہیں۔ آپ ان تینوں کو کھلونا بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ باقی دونوں سے بھی وہی سلوک کرنا چاہتے ہیں جو بڑی بہن سے کر چکے ہیں۔ میں نے آج تک یہی سنا تھا کہ ہوس پرست لوگ جسموں کی عصمت دری کرتے ہیں لیکن آپ تو آوازوں کی عصمت بھی لوٹتے ہیں۔ آپ جیسے عصمت کے لٹیرے کا نام تو گنیز بک میں آنا چاہیے۔"

"اپنی گندی زبان کو لگام دو۔" پرنس گرجا اور جملے کے آخر میں مجھے ایک موٹی گالی سے بھی نواز دیا۔

گالی انگریزی میں تھی، اس کے باوجود زریں کی سمجھ میں آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو محسوس ہوا کہ وہ غصے سے بے قابو ہو کر پرنس پر چیخنا چلانا شروع کر دے گا لیکن پھر شاید اسے اپنی تازہ تازہ کھائی ہوئی قسم یاد آ گئی۔ وہ لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

پرنس کے پیچھے کھڑی نیم عریاں حسینہ اپنی چھوٹی سی نوٹ بک پر تیزی سے کچھ لکھتی جا رہی تھی۔ پرنس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "میں تمہیں آٹھ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس وقت میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کا اچھا برا بہت اچھی طرح سوچ لو۔ صبح میں اپنا سوال پھر دہراؤں گا۔ تب بھی تم جواب نہ دے سکے تو سمجھو کہ توبہ کا دروازہ تمہارے لیے بند ہو جائے گا۔ توبہ کا دروازہ سمجھتے ہو ناں؟"

میں خاموش رہا۔ وہ نگاہوں نگاہوں میں مجھے کھاتا ہوا واپس چلا گیا۔

میں ساری رات اطمینان سے سویا رہا لیکن زریں گل ساری رات جاگتا رہا۔ اس کے اندر ایک بے چینی سی کروٹیں لے رہی تھی۔

صبح دم میں اٹھا تو رت جگے کے آثار زریں کی آنکھوں میں صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑے آزردہ لہجے میں بولا "استاد صیب! ام ساری رات سوچتا رہا ہے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ ام کو برا وقت دیکھنے سے پہلے ہی موت آ جائے۔ آپ نے امارا ہاتھ پاؤں باندھ دیا ہے...... لیکن ام آپ کا بے عزتی بالکل

برداشت نہیں کر سکتا۔"

"برے وقت کو یاد نہ کیا جائے تو وہ زیادہ جلدی آ جاتا ہے۔ تم اپنا دھیان کسی اور طرف لگاؤ......"

"اور دھیان کسی اور طرف لگتا ہی نہیں...... آپ میں جانتے ہیں غزالہ بی بی میں امارے دل میں کتنا ارمان تھا کہ ہم اپنی آنکھوں سے دونوں بہنوں اور غزالہ بی بی کو دلہن...... جب ام کو پتا چلا کہ آپ دونوں ولہا دلہن بن چکا ہے تو ام کو بہت افسوس ہوا کہ ہم آپ کو نہیں دیکھ سکا لیکن اب ام سوچتا ہے شاید اچھا ہی ہوا جو ام نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اگر ام نے غزالہ بی بی کو دلہن بنے دیکھا ہوتا تو اب ان کا روتا ہوا چہرہ بھی خیال میں لا کر ام کو زیادہ افسوس ہوتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہر کام میں قدرت کی طرف سے کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے اس میں بھی کوئی بھلائی ہوگی......"

"لیکن ام کیا کرے...... خو اماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت غزالہ بی بی کا روتا ہوا چہرہ رہتا ہے۔"

"تم اپنے دل کا اسٹیشن بدل کر کوئی اور پروگرام سننا شروع کرو۔ مثلاً تم غزالہ بی بی کی بجائے کلثوم کا روتا ہوا چہرہ آنکھوں کے سامنے لے آؤ۔"

وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھتا ہوا بولا "اماری بات چھوڑیں استاد صیب! ام نے سب کچھ کھا لیا ہے سب کچھ دیکھ لیا ہے لیکن آپ کی قسمت نے اب تک صرف جدائی ہی دیکھا ہے...... آنسو ہی گرائے ہیں۔ آپ ام کو کچھ نہیں بتاتا لیکن ام سب کچھ جانتا ہے استاد صیب۔ آپ کے دل پر جتنا بھی زخم ہے وہ سارے کا سارا ام نے گن رکھا ہے۔ وہ سارے کا سارا زخم امارا اپنے دل پر بھی ہے۔ جو کچھ آپ دونوں پر گزرا ہے کسی پہاڑ پر بھی گزرا ہوتا تو وہ ریت بن گیا ہوتا۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ آپ نے سب کچھ جھیلا ہے......"

"اس میں زرو میں اعجاز اور نیلو کا حوصلہ تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زریں کے چہرے پر بالکل مسکراہٹ نہیں آئی بلکہ وہ کچھ اور رنجیدہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کچھ اور سرخ ہو گئیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "استاد صیب! آپ اتنا اچھا ہے...... پھر آپ کے ساتھ اچھا کیوں نہیں ہوتا، کیوں خوشی آپ کے پاس آ کر واپس چلا جاتا ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں اچھا ہوں اور زیادہ بکواس مت کرو مجھے جذباتی کرنے کی کوشش نہ کر۔ میرا موڈ کچھ اداس رنجیدہ ہونے کا بالکل نہیں ہے۔"

زریں اپنے آنسو چھپانے کے لیے واش روم کی طرف چلا گیا۔ کل دوپہر کے وقت پرنس داراب نے کہا تھا کہ وہ صبح سویرے مجھ سے اپنے سوال کا جواب طلب کرے گا...... لیکن اب دس بجنے والے تھے وہ آیا نہیں تھا۔ شاید اس نے آنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ میرا جواب کیا ہوتا ہے۔ ایک بجے کے لگ بھگ چند گارڈز آئے۔ انہوں نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور ایک ٹی وی سیٹ اندر پہنچا دیا۔ سیاہ رنگ کی ایک موٹی "لیڈ" بھی ٹی وی کے ساتھ ہی اندر تک آئی تھی۔

"یہ کیا چکر ہے استاد صیب؟" زریں گل نے پوچھا۔

"شاید یہ لوگ ہمیں انگریزی کی چتر بار دکھانا چاہتے ہیں یا پھر یہ صرف بار ہوگا بلکہ ہارر ہوگا۔ ہارر سمجھتے ہو ناں تم...... مطلب خوف!"

"آپ کہنا چاہتا ہے کہ یہ لوگ ام کو کوئی خوفناک فلم دکھائیں گے؟"

"ایسا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا...... لیکن کافی دیر کے بعد۔ ہم رات کا کھانا کھا کر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب اچانک ٹی وی کی اسکرین روشن ہوئی اور اس پر اسی عمارت کے مختلف مناظر نظر آنے شروع ہو گئے۔ مناظر خاموش تھے لیکن کچھ کے ساتھ آواز بھی شامل تھی۔ یہ مناظر ہولناک دینے والے تھے۔ ایک منظر میں نیلی وردیوں والے چند گارڈز نے تین مادر زاد برہنہ افراد کو چھت سے الٹا لٹکا رکھا تھا اور کی بوکوکی وحشیانہ ضربوں سے ان کی کھال ادھیڑ رہے تھے۔ فرش پر خون کے قطرے تواتر سے گر رہے تھے اور بدنصیب بردوں کی چیخوں سے در و دیوار لرز رہے تھے۔ ایک منظر میں پہرے داروں کو دکھایا گیا جو ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ اندر ایک مرد و زن کے سوکھے سڑے جسم پڑے تھے۔ یہ دونوں فاقوں سے قریب المرگ تھے پہرے داروں نے انہیں زبردستی کوئی مشروب پلایا اور وہ دونوں چیخے ہی مر گئے۔ مرنے والوں کی گردنوں میں سیاہی مائل سوراخ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انہیں تیزاب پلایا گیا تھا۔ ایک منظر میں چند نیابی حبشیوں کو دکھایا گیا۔ انہوں نے ایک فربہ اندام لڑکے کو قربانی کے جانور کی طرح پختہ فرش پر گرایا اور اسے اپنے گھٹنوں کے نیچے دبوچ لیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس چیختے چلاتے لڑکے کو چھری سے ذبح کر دیا گیا۔ آدم خور حبشیوں نے لڑکے کا گرم خون تانبے کے ایک برتن میں جمع کیا اور بڑی رغبت سے اس کے گھونٹ بھرے۔ اس واقعے کا سب سے

المناک پہلو یہ تھا کہ ایک جواں سال عورت جو لز کے کی ماں یا بڑی بہن تھی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور وہ پہرے داروں کی گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ چند لمحے بعد ایک اور منظر ابھرا اس میں خون سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں والے آدم خور حبشی جواں سال عورت کو ہوس کا نشانہ بنا رہے تھے۔

یہ ایسے مناظر تھے جنہیں دیکھ کر ٹی وی کی اسکرین توڑنے کو دل چاہتا تھا۔ شاید ہم دونوں میں سے کوئی یہ اسکرین توڑ ہی دیتا لیکن ایک منظر نے ہمیں دم بخود کر دیا۔ ہم نے اپنے ساتھی علی احمد کو دیکھا۔ وہی علی احمد جسے پاشا کے ساتھ علیحدہ لاک اپ میں بند کیا گیا تھا اور یہاں آنے کے بعد ہم ابھی تک جس کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ علی احمد ہمارے سامنے تھا لیکن ایک لاش کی صورت میں...... دو خونخوار حبشی اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ایک عقوبت خانے سے باہر لے جا رہے تھے۔ علی احمد کا گلا کٹا ہوا تھا اور اس کے سرخ نرخرے سے بہنے والا خون...... گھسٹتی لاش کے پیچھے فرش پر نشان بنا رہا تھا۔ علی احمد کا بالائی جسم عریاں تھا اور اس پر بدترین تشدد کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ علی احمد کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹی گئی ہیں اور اس کا پیٹ چاک کیا گیا ہے۔

ہم سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ رہے تھے۔ منظر تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ جب زرین گل نے میرے اشارے پر ٹی وی کا تار کھینچا اس وقت چند بدنصیب غلام ایک قطار کی صورت فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کی ٹانگوں کو خاص قسم کے شکنجوں میں کسا گیا تھا۔ انہیں ہیجڑا بنایا جا رہا تھا۔ بدنصیبوں کی فلک شگاف چیخوں سے در و دیوار لرز رہے تھے۔

ٹی وی ٹوٹنے کی آواز سن کر چند پہرے دار لپکتے ہوئے ہمارے لاک اپ کی طرف آئے۔ وہ ہمیں خشمگیں نظروں سے گھورتے رہے لیکن ہم سے کسی طرح کی باز پرس نہیں کی گئی۔

جو کچھ ہمیں دکھایا گیا تھا اس کا مقصد ڈھکا چھپا ہرگز نہیں تھا۔ یہ ایک طرح سے ہم پر ذہنی تشدد تھا۔ ہمیں خوف زدہ کیا جا رہا تھا۔ تاکہ جب ہم سے پوچھ گچھ شروع ہو تو ہم زیادہ مزاحمت نہ کر سکیں۔ ایسی بات نہیں تھی کہ ہم کنگ براؤن کے ظلم و جبر سے آگاہ نہیں تھے لیکن وہ لوگ یہ "ظلم و جبر" پھر سے ہمارے ذہنوں میں تازہ کرنا چاہتے تھے۔

زرین گل نے دلگیر آواز میں کہا "استاد صیب! علی احمد بہت اچھا آدمی تھا۔ ہمارا اور اس کا ساتھ بہت تھوڑا رہا لیکن ہم اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ خاص طور سے اس کی نشانہ بازی نے ہمارے دل میں صدر کی نشانہ بازی کا یاد تازہ کر دیا تھا۔ ان کتوں نے ہمارے علی احمد کو بہت تکلیف دے کر مارا ہے۔"

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا "مجھے تو پاشا کی طرف سے بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" زرین سے دیدے گھمائے۔

"جس ٹارچر سیل میں علی احمد کو قتل کیا گیا، اس کے فرش پر تم نے غور سے نہیں دیکھا۔ وہاں ایک اور شخص کے کپڑے بھی پڑے ہوئے تھے اور یہ بھی لگ رہا تھا کہ کوئی لاش گھسیٹ کر لے جائی گئی ہے کیا پتا وہ پاشا ہی کی لاش ہو۔"

زرین کے چہرے پر گہرے کرب کے آثار نظر آنے لگے "شاید یہ لوگ علی احمد سے بھی شیخ عاصم کا پتا پوچھ رہے تھے؟"

"ہاں...... اس وقت شیخ عاصم کو ڈھونڈنا ان کے لیے دنیا کا اہم ترین کام بنا ہوا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد "موت کے فرشتے" پھر نمودار ہو گئے۔ یہ نیلی وردیوں والے گارڈز تھے۔ ان کے ساتھ حسب معمول سفید کنپٹیوں والا اسمتھ سنیئر بھی ہمراہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آج کی رات بہت بھاری ہے۔ مجھے یا زرین گل کو باہر لے جایا جائے گا۔ دل ہی دل میں...... میں پھر یہ آرزو کرنے لگا کہ زرین کو نہ لے جایا جائے۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ اگر ان لوگوں نے زرین کو لے جانے کی کوشش کی تو میں بھرپور مزاحمت کروں گا۔ یہ بات تو میں بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مجھے فوری طور پر قتل کرنے کے بارے میں یہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پہلے ان لوگوں کو صرف شیخ عاصم کا اتا پتا درکار تھا، اب یہ دونوں گالی گڑیوں کے بارے میں بھی مجھ سے دریافت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی شبہ ہو رہا تھا کہ منو براو غیرہ و دیگر کے معاملے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب کسی "قیدی" کو قتل نہ کیا جا سکتا ہو اور اسے قابو میں بھی رکھنا ہو تو یہ خاصا دشوار کام ہوتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ اسمتھ وغیرہ میرے سلسلے میں بے حد احتیاط کر رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا...... اسمتھ کا تعلق اسکاٹ لینڈ یولیس سے تھا۔ وہ سابق جیلر تھا اور خطرناک ترین قیدیوں کو ہینڈل کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔

میری خواہش پوری ہوئی۔ اسمتھ اور "موت کے دیگر فرشتے" اس مرتبہ بھی مجھے ہی لے جانے کے لیے آئے تھے۔ مختصر مکالمے کے بعد میں حسب سابق سلاخوں سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے میرے ہاتھوں کو آہنی ہتھکڑی لگائی گئی پھر پاؤں کو جکڑ دیا گیا۔ میں رائفلوں کے نرغے میں باہر نکلا۔

زرین گل کا رنگ بلدی ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج مجھ پر سختی کی جائے گی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شاید خود پر قابو نہ رکھ سکتا لیکن اس نے تازہ تازہ قسم کھائی تھی اور اس قسم کا تقاضا تھا کہ وہ کسی طرح کی مزاحمت کر کے اپنی اور میری جان خطرے میں نہ ڈالے۔ وہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا میری طرف دیکھتا رہا اور پہرے دار مجھے آہستہ روی سے چلاتے ہوئے کاریڈور میں لے آئے۔

ہیرکوں میں کنگ براؤن کے قیدی سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ کچھ سو چکے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ یہ غلام وحشیر تھیں۔ ان کی بدقسمتی انہیں نجانے کہاں کہاں سے کھینچ کر اس دہشت ناک زنداں میں لائی تھی۔ اب انہیں ایک نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا تھا۔ انہیں غلامی کے مکمل آداب سکھائے جا رہے تھے۔ بکاؤ مال کی طرح انہیں بنا سنوار کر خریداروں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور خریدار کون تھے؟ زیادہ تر عرب کے امراء...... ڈیوس...... پرنس اور سرمایہ دار۔ یہ لوگ انسانی حقوق اور روشن خیالی کے علمبردار تھے لیکن ان کے اندر گہرائی میں اب بھی کہیں ایک "قدیم آقا" چھپا ہوا تھا۔

مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں خدشے تقویت میں بدل گئے۔ یہ ایک ویسا ہی عقوبت خانہ تھا جیسا میں نے کچھ دیر پہلے ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ کمرہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا اور یہاں ایذا رسانی کی بہترین "سہولتیں" نظر آ رہی تھیں۔ زندگی میں پہلے بھی کئی ایسے وقت آ چکے تھے جب میں اسی طرح بے بس ہوا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس مرتبہ دل کچھ زیادہ ہی دکھی تھا۔ شاید اس لیے کہ ایک بہت بڑی خوشی نے فوراً بعد ہی بے رحم حالات نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میں غزالہ کو پانے کی خوشی کو پوری طرح CELEBRATE بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس جاں فزا اور بہت قیمتی احساس کو پوری طرح اپنے اندر جذب بھی نہیں کر سکا تھا کہ تعاقب کرنے والی آفات نے مجھے آ دبوچا تھا۔ وہ خوشی تو شاید ابھی تک میری آنکھوں میں ٹھہری ہوئی تھی جب میں نے غزالہ کو حاصل کیا تھا۔ اس شام میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک دن کے لیے سب سے الگ تھلگ ہو جاؤں گا۔ کسی بجرے میں بیٹھ کر سمندر میں بہت دور نکل جاؤں گا۔ عرشے پر چت لیٹا رہوں گا اور ان تمام کٹھن مرحلوں کو یاد کروں گا جن سے گزر کر میں غزالہ تک پہنچا ہوں...... کامیابی کے احساس کو اپنے اندر جذب کروں گا اور اس یادگار تقریب کی منصوبہ بندی بھی کروں گا جس نے جس کوٹ کی ویران حویلیوں کو پھر سے آباد کرنا ہے...... لیکن یہ سب کچھ فی الحال بجرے کا بجرا رہ گیا تھا اور میں بجرے کے عرشے کی بجائے ایک عقوبت خانے کے فرش پر کھڑا تھا۔

مجھے لانے والے گارڈز چلے گئے اور ان کی جگہ تین چار جلاد صورت افراد وہاں آ گئے۔ میں جان گیا کہ کھیل شروع ہونے والا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی چند سیکنڈ میں برکس وارا ب نمودار ہو گا اور مجھ پر بے جا برسنا شروع کرے گا لیکن بھاری قدموں کی بجائے زنانہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر فوزیہ پنٹوں نسیفس میں نمودار ہوئی۔ اس کا سینہ بغض و غضب سے تنا ہوا تھا اور پیشانی تمتما رہی تھی۔

اس نے گارڈز کو ایک جارحانہ اشارہ کیا۔ عقب سے ایک گارڈ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے میرے پاؤں کی زنجیر میں ایک کک سی ڈال دی۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور میں اوندھے منہ فرش پر گرا۔ گرتے ہوئے میں نے تیزی سے پہلو بدلا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میرا چہرہ فرش سے ٹکراتا اور کئی دانت حلق میں اتر جاتے پھر بھی جسم کو شدید جھٹکا لگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد میں ٹارچر سیل کی چھت سے الٹا لٹک رہا تھا۔ آخر یانسا پلٹ گیا تھا۔ فوزیہ اس مقام پر نظر آ رہی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے میں تھا...... اور میں فوزیہ کی جگہ نظر آ رہا تھا۔

"اس کے کپڑے اتار دو!" فوزیہ کی کڑک دار آواز ٹارچر سیل میں گونجی۔

گارڈز وحشی کتوں کی طرح جھپٹے اور ذرا سی دیر میں میرا لباس جسم سے علیحدہ کر دیا۔ اب ایک زیر جامہ کے سوا میرے جسم پر کچھ نہیں تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی اور مجھ پر کی بوکوکی بارش کر دی۔ کی بوکو کی ضرب بڑی ظالم ہوتی تھی۔ یہ ایک زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح جسم میں گھستا اور کھال کو چیرتا چلا جاتا تھا۔ دو منٹ کے اندر ہی میرے جلد سے خون کے قطرے فرش پر ٹپکنے لگے۔ میں نے اپنی کراہیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ہونٹوں میں دبا رکھی تھیں۔

آخر فوزیہ ہانپ گئی۔ اس کا بازو شل ہو گیا۔ اس کی ضربوں میں پہلے سی طاقت نہیں رہی۔ اس نے کی بوکو ایک خوفناک گارڈ کے حوالے کر دیا اور اس سے مجھے پٹوانے لگی۔ اسی دوران میں ایک جلاد صورت شخص یخ بستہ پانی سے بھری ہوئی بالٹی لے آیا۔ ایسی ہی بالٹی مجھے لندن کے پولیس اسٹیشن میں بھی نظر آئی تھی۔ غالباً تو یہ سلسلہ وہیں سے شروع ہونا چاہتی تھی جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مجھے یخ بستہ پانی میں ایک ہوئی غوطہ

دیا گیا اور جب میرا دم ٹوٹنے لگا تو باہر کھینچ لیا گیا۔

توسیہ نے بے دریغ میرے سر پر ٹھوکر ماری اور غرا کر بولی

''کہاں ہے میرا بھائی؟''

میں نے کہا ''تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ تم میری جان تو لے سکتی ہو لیکن میری مرضی کے خلاف مجھ سے کچھ نہیں اگلوا سکتی ہو۔''

''تو ٹھیک ہے پھر میں تمہاری جان ہی لے لیتی ہوں۔''

وہ چنگھاڑی اور گارڈ کے ہاتھ سے چھڑی لے کر دیوانہ وار مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ کچھ دیر بعد ان کے حکم پر مجھے پھر سرد پانی میں غوطے دیئے گئے۔ ہر انسان میں تکلیف برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ کسی میں یہ حد جلدی آ جاتی ہے کسی میں ذرا دیر سے۔ جب تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے تو کچھ منت سماجت پر اتر آتے ہیں۔ کچھ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ کچھ بس کراہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ایک خاص درجے پر پہنچ کر کوئی بھی ہوش میں نہیں رہتا۔ بے ہوشی ایک سرکٹ بریکر کی طرح ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ پریشر پڑنے پر سرکٹ بریک ہو جاتا ہے اور مشینری ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ پانی میں بار بار ڈوبنے سے میرے پھیپھڑے پھٹنے کے قریب ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے دھندسی پھیلتی جا رہی تھی پھر ایک دم گہری تاریکی چھا گئی۔ دس پندرہ منٹ بے ہوش رہنے کے بعد جب میں ہوش میں آیا تو ایک سفید فام ڈاکٹر بی پی آپریٹس کے ذریعے میرا بلڈ پریشر چیک کرنے میں مصروف تھا۔ میں بدستور چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور توسیہ بدستور سینہ تانے میرے اردگرد چکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی اور مجھے اس سے ایسی کوئی توقع بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر پیچھے ہٹا اور توسیہ کے اشارے پر باہر نکل گیا۔ اس ڈاکٹر کی صورت مجھے کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ شاید مارہا ٹرسٹ میں کہیں میں نے اسے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر کے باہر جاتے ہی توسیہ نے خاص گارڈز کے ذریعے ایک بار پھر مجھ پر تشدد شروع کرا دیا۔ چیری کوڑے اور ''کی بوکو'' کی ضربیں ایک بار پھر میرے جسم پر پڑنے لگیں۔ میرے منہ سے کسی وقت کراہ نکلتی تھی اور یہ کراہ توسیہ کے کانوں میں امرت کی طرح ٹپکتی تھی۔ اس کا رویہ کچھ اور جارحانہ ہو جاتا تھا۔

مسلسل الٹا لٹکنے سے میری ایک پنڈلی سے خون رسنے لگا تھا۔ اس پنڈلی پر پہلے سے ایک زخم موجود تھا جو ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ یہ زخم ولیو کے ساحل پر بجرنگ والے واقعے کی نشانی تھا..... بجرنگ نے نفر بجی بجرے میں خودکشی کر لی تھی اور اپنے ساتھ بجرے کو بھی لے ڈوبا تھا۔ اس ڈوبتے ہوئے بجرے میں توسیہ ہتھکڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر توسیہ کی جان بچائی تھی۔ اسی کوشش کے سلسلے میں وہ مجھے یہ تکلیف دہ زخم دے کر چلی گئی تھی۔ آج اپنے دیئے ہوئے اس زخم کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی ''بتاؤ..... میرا بھائی کہاں ہے؟ بتاؤ تم نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ..... بتاؤ کیا کیا ہے!''

وہ مجھے مردانہ انداز میں گالیاں دے رہی تھی اور اچھل اچھل کر اپنے جوگرز سے میرے جسم پر ٹھوکریں رسید کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں پر بھی ''کی بوکو'' کی بے تحاشا ضربیں لگی تھیں اور یوں لگتا تھا کہ ایک آدھ انگلی ٹوٹ بھی گئی ہے۔ مجھے رخصت کرنے وقت غزالہ نے انہی ہاتھوں پر بوسے دیئے تھے۔ شاید اسے معلوم تھا کہ یہ ہاتھ سخت اذیت سے گزرنے والے ہیں۔ ایک بار غزالہ کا خیال آیا تو پھر آتا ہی چلا گیا۔ وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ اسے مجھ پر بڑا بھروسا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں سو آفتوں کو جھیل کر نکل سکتا ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے ناقابل شکست ہی سمجھتی ہو۔ شاید اسی لیے وہ زینت کے مکان پر پڑنے والے چھاپے کے دوران مجھے بھاگ جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اس کا گمان تھا کہ میں پولیس کا گھیرا توڑ کر نکل سکتا ہوں لیکن ہر گمان تو حقیقت نہیں بنتا۔ حالات بڑے بڑوں کو بے بس کر دیتے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی۔

وہ سخت اذیت ناک رات تھی۔ رات پچھلے پہر یخ بستہ پانی میں غوطے کھاتے کھاتے مجھ پر ایک بار پھر غشی طاری ہو گئی۔ اس مرتبہ یہ دفعہ کافی طویل تھا۔ میں دوبارہ حواس میں آیا تو میرے سر پر وہ بے پناہ دباؤ نہیں تھا جو مسلسل الٹا لٹکنے سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی شے پر سیدھا لیٹا ہوں۔ پورا جسم جیسے پھوڑا بنا ہوا تھا۔ سر سے پاؤں تک ایک ایسی تیز چبھن اور جلن بھری ہوئی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے کانوں میں توسیہ کی منحوس آواز پڑی۔ وہ کسی گارڈ پر برس رہی تھی ''یو باسٹرڈ..... سن آف بچ..... جب میں تمہیں تاکید کر کے گئی تھی کہ اسے اتارنا نہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں مالکن..... لیکن.....''

''پھر وہی لیکن!'' توسیہ گارڈ کی بات کاٹ کر غرائی اور اس کا زوردار طمانچہ گارڈ کے چہرے پر پڑا۔ توسیہ نے گارڈ کو فوراً دفع ہو جانے کا حکم دیا۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں ابھی تک اسی ساؤنڈ پروف عقوبت خانے میں تھا۔ میری طرف

زہریلی پشت تھی۔ اس کا لباس بدلا ہوا تھا۔ پاؤں میں جوگرز کی جگہ مردانہ بوٹ نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے بڑی شان سے کھڑی تھی۔ ایک دراز قد توسیہ وعقب سے جھانپ لینے کا سنہری موقع تھا۔ مگر اس موقعے سے فائدہ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے ہاتھ اور دونوں پاؤں مسلسل بندھے ہوئے تھے۔ توسیہ میری طرف گھومی۔ میں نے اپنی ادھ کھلی آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔ اس نے میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور کئی جھٹکے دیئے پھر اس کے حکم پر گارڈز آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے پھر چھت سے الٹا لٹکا دیا۔ جسم کا سارا خون ایک مرتبہ پھر سر میں جمع ہو گیا اور کنپٹیاں درد کی شدت سے پھٹنے لگیں۔ سرخ رنگ کی وہ تنگ سی ناند پانی مجھے دو تین فٹ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ یخ بستہ پانی سے بھری ہوئی یہی ٹب نما ٹانکی تھی، جس نے مجھے کل رات زندگی کے نادر تجربے سے گزارا تھا۔ میں نے اس پانی میں کئی بار مرنے کی دعا کی تھی اور اسی آب وہ پانی میں ہی مجھے پھر غوطے دیئے گئے تھے۔ اب پھر یہ پانی اور میں آمنے سامنے تھے۔

توسیہ چیخ کر بولی ''مکر مت کرو شاہ جہاں! میں جانتی ہوں کہ تم ہوش میں ہو آنکھیں کھولو اور میری بات دھیان سے سنو.....'' میں نے آنکھیں نیم وا کیں۔ وہ بولی ''اس ٹارچر سے نکلنے کے لیے تمہارے پاس بس دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ مجھے میرے بھائی کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں..... دوسری صورت میں اس بات کا اعتراف کر لو کہ تم نے ان کی جان لی ہے۔ تمہیں ان کی ''ڈیڈ باڈی'' تک پہنچنا ہو..... تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے ضروری سمجھا تو تمہیں ایک سال تک بھی اسی طرح الٹا لٹکائے رکھوں گی۔ زندگی اور موت کے درمیان جھولتے رہو گے۔''

میں نے آنکھیں ایک بار پھر موند لی تھیں۔ توسیہ نے ایک دراز قد حبشی گارڈ کو اشارہ کیا اور اس نے میرے عریاں جسم پر ایک بار پھر بیدزنی شروع کر دی۔ کی بوکو کی شائیں شائیں کے ساتھ ہی جسم میں آتشیں تیر اترنے لگے۔ رات والے زخم پھر سے رسنا شروع ہو گئے اور خون کے تازہ قطرے ٹپکنے لگے۔ کچھ قطرے پانی سے بھری بالٹی میں بھی گر رہے تھے اور بالٹی کا صاف پانی مٹیالا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ بند رکھے پھر مدھم کراہیں ہونٹوں سے نکلنے لگیں۔ ذہن پر دوبارہ دھند سی چھانے لگی تھی۔ اردگرد کی چیزیں دور جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تکلیف کی شدت کم ہونے لگی تھی۔ میرے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے سرد پانی میں چند غوطے دیئے گئے اور ایک بار پھر کی بوکو کی زہریلی پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ اگرچہ بیل کی سر دی میں کی بوکو کی ضربیں کچھ زیادہ ہی اذیت دے رہی تھیں۔

میں بہت گناہگار بندہ تھا لیکن میری تمام ہزکوتاہیوں کے باوجود قدرت نے اکثر میرا ساتھ دیا تھا۔ جب بھی میں نے بے بسی اور اذیت کی انتہا کو چھوا تھا اور فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں نے اپنے کانوں کے قریب محسوس کی تھی کہیں نہ کہیں سے مدد آئی تھی۔ میں اب بھی کسی ایسی ہی مدد کا منتظر تھا۔ میں توسیہ کے ہاتھوں درد کے دریا میں ڈوبا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا..... میرا طریقہ کار جو بھی ہو مگر میرے مقاصد تو برے نہیں ہیں۔ میرے ارادے تو نیک ہی ہیں۔ میں اور میرے ساتھی برائی کے خلاف لڑ رہے تھے اور بغیر کسی دنیاوی لالچ کے..... نوادرات کی فروخت نے ہمیں کروڑ پتی بنا دیا تھا۔ یہ اتنی دولت تھی جو کئی نسلوں تک بغیر کسی کوشش کے ہمیں دنیا کی بہترین آسائشیں فراہم کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں زخموں سے چور یہاں الٹا لٹکا ہوا تھا۔ زریون گل ایک خطرناک قیدی کی حیثیت سے لاک اپ کی اذیتیں جھیل رہا تھا۔ صفدر اپنی آنکھیں گنوا کر پراندیش تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا..... اور غزالہ..... تابی کو سینے سے لگائے ڈری سہمی کسی گوشے میں دبکی ہوئی تھی۔ ہماری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ ہمیں نام و نمود اور شہرت کی خواہش بھی نہیں تھی۔ ہمیں مادی فائدے بھی درکار نہیں تھے پھر بھی ہم مار پیٹ کھا رہے تھے اور عصر حاضر کے چند بدترین جابروں کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ کوئی اور نہ دیکھ رہا ہو لیکن اوپر والا تو دیکھ رہا تھا اور جب وہ دیکھ رہا تھا تو پھر ہمیں نیوز ایجنسیوں کی رپورٹنگ کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ہی ہمیں دانشوروں کے تعریفی کلمات درکار تھے۔ نہ ہی حکومتی ایوارڈز سے ہماری عزت میں کچھ اضافہ ہو سکتا تھا۔ ہم نے ایک دفعہ پہلے بھی کنگ براؤن کے اس سومنات کو پارہ پارہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کسی نے ہمارے گلے میں پھولوں کے ہار نہیں پہنائے تھے (بلکہ الٹا ہتھکڑیاں پہنائی گئی تھیں) ہمیں اب بھی ہاروں کی ضرورت نہیں تھی۔

حبشی گارڈ کے ''کی بوکو'' کی چند زوردار ضربیں میرے سر اور چہرے پر لگیں۔ ناک سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے بالٹی میں اور فرش پر گرنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ شاید پھر غشی طاری ہونے والی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی چوتھی یا پانچویں دستک پر توسیہ نے دروازہ کھلوایا۔ مجھے منوہرا کی صورت نظر آئی۔ مجھے توسیہ

کے ہاتھوں زیرِ عتاب دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں ابھریں۔

وہ بولی "مس توسیہ! اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اگر یہ مر گیا تو بہت برا ہوگا۔"

"منوہرا صاحب! مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پلیز آپ اس بارے میں فکرمند نہ ہوں۔" توسیہ نے انگلش میں درشتی سے جواب دیا۔

"لیکن صبح سویرے جب میں آئی تو اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ سانس دیر تک بند رہے تو بندے کا دماغ متاثر ہو جاتا ہے۔ اس طرح برین کا ڈیتھ ہو جاتا......"

"منوہرا صاحب پلیز!" توسیہ نے تیزی سے منوہرا کی بات کاٹی "ڈاکٹر والٹر میرے ساتھ مسلسل رابطے میں ہے۔ ہم گاہے گاہے اسے "چیک" کروا رہے ہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے منوہرا کی ہدایت پر ہی مجھے اسٹریچر پر لٹایا گیا تھا۔ غالباً تب توسیہ ٹارچر سیل میں موجود نہیں تھی۔ واپسی پر وہ سخت برہم ہوئی تھی۔

منوہرا کے سینڈل کی ٹھک ٹھک مجھے سنائی دی۔ منوہرا نے قریب آ کر میری گردن پر انگلیاں رکھیں اور میری نبض کو محسوس کیا پھر میرے پپوٹے اٹھا کر پتلیوں کی رنگت وغیرہ دیکھی۔ گہری سانس لے کر بولی "بہتر ہے کہ آپ ڈاکٹر والٹر کو پھر بلا لیں۔"

"آپ...... دخل اندازی کر رہی ہیں۔" اس مرتبہ توسیہ کا لہجہ کافی سخت تھا۔

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں مس توسیہ۔ یہ صرف آپ ہی کا معاملہ نہیں ہے۔ پولیس کو بھی اس شخص سے معلومات حاصل کرنی ہیں اور پھر یہ شخص کنگ براؤن کو بھی درکار ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ساری ذمے داری مجھ پر آئے گی۔ آپ جانتی ہیں کہ کنگ براؤن یہاں موجود نہیں ہیں۔ پرنس بھی کل سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں......"

"دیکھو منوہرا! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ مجھے کیا کرنا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس مرتبہ توسیہ کا لہجہ بہت ہی سخت تھا۔

"اور جو مجھے کرنا ہے وہ میں بھی جانتی ہوں۔ کنگ کی غیر موجودگی میں یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی ذمے دار میں ہوں۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" توسیہ نے دونوں ہاتھ کولہوں پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر والٹر کو یہاں بلا کر اس سے مشورہ لیا جائے۔"

"اور اگر میں ڈاکٹر کو یہاں نہ بلانا چاہوں تو؟" توسیہ نے پوچھا۔

"تو پھر...... مجھے تم سے گستاخی کرنا پڑے گی۔ انچارج کی حیثیت سے میں مداخلت کی حق دار ہوں۔" اس مرتبہ منوہرا کا لہجہ بھی سخت تھا۔

میں ایک نیم جان چمگادڑ کی طرح چھت سے الٹا لٹکا ہوا ان دونوں دبنگ عورتوں کی کشمکش دیکھ رہا تھا اور حالات کی ستم ظریفی کو محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جس مدد کا انتظار میں کر رہا تھا وہ ان شعلہ صفت عورتوں کی کشمکش کی صورت میں آن پہنچی ہے۔

اگلے تین چار منٹ میں کافی تلخ کلامی ہوئی۔ ایک طرف امارات کے ایک بہت بڑے شیخ گھرانے کی نہایت ہٹ دھرم دختر تھی...... دوسری طرف شوبز کی ایک نہایت بارسوخ نائکہ تھی۔ بالآخر منوہرا ڈاکٹر والٹر کو ٹارچر سیل میں بلانے میں کامیاب رہی۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر والٹر کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ میں نے اسے بہت اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔

میں بدستور چھت سے جھول رہا تھا۔ ڈاکٹر والٹر نے تیزی سے میرے وائٹل سائنز چیک کیے۔ پپوٹے اٹھا کر میری پتلیوں کا معائنہ کیا پھر مدھم آواز میں بولا "ہارٹ ریٹ زیادہ ہے۔ بی پی بھی اوپر جا رہا ہے۔ ناک سے خون اگر تو چوٹ کی وجہ سے نکل رہا ہے تو اور بات ہے ورنہ یہ خطرناک ہے۔ شریان پھٹنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔"

منوہرا نے فیصلہ کن لہجے میں گارڈز کو ہدایت کی کہ مجھے چھت سے اتار لیا جائے۔ میری ناک سے خون مسلسل ٹپک رہا تھا اور بات صرف ناک ہی کی نہیں تھی۔ جسم کی کھال کئی جگہوں سے ادھڑ چکی تھی اور وہاں سے رسنے والے خون کی سرسراتی ہوئی حرکت مجھے جا بجا محسوس ہو رہی تھی۔ خون کے بہاؤ کو دیکھ کر توسیہ بھی قدرے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ بہرحال منوہرا کا چیلنج اس نے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کیا تھا۔ وہ بڑبڑاتی اور پاؤں پٹختی ہوئی گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ڈاکٹر والٹر کو ہدایت کی تھی کہ جونہی "میرکی" حالت بہتر ہو اسے فوراً اطلاع دی جائے۔

گارڈز نے مجھے چھت سے اتار کر ایک اسٹریچر نما بستر پر لٹایا۔ منوہرا نے ڈاکٹر والٹر کو ہدایت کی کہ مجھے طبی امداد دی جائے اور زخموں کو ٹریٹ کیا جائے۔ تاہم منوہرا نے ڈاکٹر کو

یہ ہدایت کر دی کہ میرے ہاتھ پاؤں نہیں کھولے جائیں گے اور ایک "خطرناک ترین" قیدی کی حیثیت سے میرا سارا "پروٹوکول" برقرار رکھا جائے گا۔ منوہرا کے جانے کے بعد ڈاکٹر والٹر نے مجھے ڈرپ لگائی۔ چند انجکشن بھی دیئے۔ میرے زخموں پر مرہم لگانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ درحقیقت پورا جسم ہی زخم تھا۔ شیخ زادی نے خود پر ہونے والی تذلیل کا سارا بدلہ مجھ سے ایک ہی رات میں لے لیا تھا۔ کئی کوڑوں نے تو میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا، مجھے زیادہ اذیت یخ بستہ پانی کے غوطوں نے دی تھی۔ کئی بار تو مجھے یہی لگا کہ یہ غوطہ میرا آخری غوطہ ثابت ہوگا۔ میں پانی سے بعد میں نکلوں گا، پہلے میری روح میرے جسم سے نکل جائے گی۔ ان ساری تکلیف کے باوجود مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر والٹر نے اپنے خانے میں مجھے کچھ رعایتی نمبر بھی دیئے ہیں۔ یہ ڈاکٹر والٹر کچھ "اچھا بندہ" لگ رہا تھا۔

میں نے دوپہر تک آرام کیا۔ اس دوران میں توسیہ دو بار آئی اور مجھے دیکھ کر گئی۔ اس کے طور اطوار بتا رہے تھے کہ وہ مجھے زیادہ وقت نہیں دے گی۔ گارڈز اور ڈاکٹر وغیرہ مخمصے میں نظر آتے تھے۔ غالباً وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اس کشمکش میں منوہرا دیدی کے حکم کو ترجیح دیں یا پھر توسیہ کی بات مانیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ منوہرا کی طرح توسیہ بھی کنگ براؤن کے قریب ہے یا ماضی قریب میں قریب ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر والٹر نے غالباً کوئی خواب آور دوا بھی مجھے دی تھی۔ اس سے تکلیف کی شدت میں کمی واقع ہوئی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ ڈاکٹر والٹر نے ایک اور ڈاکٹر کے ساتھ مل کر میرے بائیں ہاتھ کی انگلی کا چھوٹا سا آپریشن بھی کیا تھا اور پٹی باندھ دی تھی۔ میرے ذہن میں بار بار زریں گل کا خیال بھی آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بے حد مضطرب ہوگا۔ میرے واپس نہ جانے سے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں۔ میری مصیبت اسے آتش فشاں کا روپ دے سکتی تھی۔ بہرحال تھوڑی سی تسلی بھی تھی۔ زریں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی۔ اس قسم کی رو سے ضروری تھا کہ وہ بدترین حالات میں بھی اپنے دل و دماغ کو ٹھنڈا رکھے۔

رات آٹھ نو بجے تک میری طبیعت کچھ بہتر رہی لیکن تب ایک بار پھر ناک سے خون رسنا شروع ہو گیا۔ کنپٹیاں درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔ خاص طور سے ایک کنپٹی تو بالکل پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر میری ناک سے رسنے والے خون کو تشویش ناک سمجھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی موجودگی میں ہی منوہرا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ڈاکٹر کے ساتھ تھوڑی سی کھسر پھسر کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔"

منوہرا کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے توسیہ کی طرف سے بھی تشویش ہے۔ عین ممکن تھا کہ رات کو کسی وقت توسیہ پھر یہاں آ دھمکتی اور مجھ سے مار دھاڑ شروع کر دیتی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد میں ایک اسٹریچر پر موجود تھا۔ مجھے کمبل سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اسٹریچر دو تین منٹ تک حرکت میں رہا پھر رک گیا۔ میرے چہرے سے کمبل ہٹایا گیا۔ میں نے خود کو ایک شان دار اپارٹمنٹ میں پایا۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ خوب رو لڑکوں کے ہجوم میں منوہرا سے میری پہلی ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔

یہ بڑا خواب ناک سا ماحول تھا۔ فرش پر دبیز قالین، کھڑکیوں پر حریری پردے...... پوشیدہ روشنیاں اور قرب و جوار میں پھیلی ہوئی بھینی بھینی سی خوشبو۔ نیلی وردیوں والے مجھے اسٹریچر پر چھوڑ کر چلے گئے۔ چند نوجوان لڑکوں نے مجھے بڑی احتیاط اور نرمی کے ساتھ اسٹریچر سے ایک نرم و گداز بستر پر منتقل کیا۔ نیلی آنکھوں والے ایک نہایت خوب صورت نوجوان نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا اور میری پشت پر چند گداز کشن رکھ دیئے تا کہ میں آسانی سے ٹیک لگا کر بیٹھ سکوں۔

کمرے کی چھت پر ایک کافی بڑا چمک دار دائرہ سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے اسٹیل کا ایک بڑا RING چھت میں نصب ہو۔ مجھے اس کی اصلیت سمجھ میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر والٹر نے آدھ گھنٹا پہلے مجھے جو انجکشن لگایا تھا اس نے اچھا اثر کیا تھا۔ ناک سے خون رسنا بند ہو گیا تھا اور کنپٹی کا درد بھی بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میں ابھی تک صرف ایک زیر جامے میں تھا۔

اس آرام دہ اپارٹمنٹ کے نیم گرم ماحول میں پہنچ کر مجھے کافی سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ نوجوان خدمت گاروں نے مجھے مچھلی اور چکن سے تیار کیا گیا مقوی سوپ پلایا۔ سوپ پیتے ہی جسم میں توانائی محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ہلکی نیلی روشنیوں اور مدھر سی خوشبو میں گھرنے کے بعد میں خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ پتا نہیں کس وقت اونگھ آ گئی۔ اس نیم خوابی میں بھی میں ماحول کی نرمی اور گرمی کو محسوس کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو منوہرا کو اپنے قریب پایا۔ وہ شب خوابی کے ہوش ربا لباس میں تھی اور ایک ایزی چیئر پر بہت پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں وسکی کا گلاس تھا اور ایش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔

گلاس خالی ہوا تو ایک لڑکا شتابی سے آگے بڑھا اور بڑے مودب انداز میں کچھ اور وہسکی اور سوڈا منوہرا کے گلاس میں انڈیل دیا۔ وہ گلاس بھرنے کے بعد رکوع کے انداز میں منوہرا کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ منوہرا نے بڑے مستانہ انداز میں لڑکے کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اس کے سرخ ہونٹوں کا ایک طویل بوسہ لیا پھر وہ گلاس سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لینے لگی۔

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ”تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس لیے تمہیں اتنی بے بسی اور تکلیف کی حالت میں دیکھا نہیں گیا۔ کاش تم اس حالت کو نہ پہنچے ہوتے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بھی شاید جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پرسوچ لہجے میں بولی ”میرا خیال ہے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔ تمہیں کچھ عرصہ پہلے یہ سب کچھ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ تم نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ مار دھاڑ کی دنیا میں خوب نام کمالیا تھا۔ نوادرات کی فروخت کے بعد تمہیں بہت سا دھن بھی مل گیا تھا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اس وقت اپنی پریمیکا کو ساتھ لیتے اور خاموشی سے کسی طرف نکل جاتے لیکن شاید تم بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو کمبل کو چھوڑتے ہیں لیکن کمبل انہیں نہیں چھوڑتا.....“

”شاید.....“ میں نے نحیف آواز میں منوہرا کی تائید کی۔

وہ بولی ”جو کچھ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے اس پر افسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اسے روکا نہیں جا سکتا۔ میں بھی نہیں روک سکتی۔ میں صرف اتنا ہی کر سکتی تھی جو میں نے کیا ہے۔ تمہاری تکلیف کو کچھ وقت کے لیے ٹال رہا ہے۔ شاید آج رات کے لیے..... شاید کل شام تک کے لیے۔ یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں اور کسی حد تک وہ ٹھیک بھی ہیں۔ تم نے ان کے ساتھ جو کچھ کر رکھا ہے اس کے بعد وہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے چیتھڑے بھی اڑا دیں تو کم ہے۔“ آخری الفاظ ادا کرتے کرتے منوہرا ایک دم بے پروا نظر آنے لگی تھی۔

”میں سمجھا تھا۔ شاید تمہیں میرے ساتھ ہمدردی ہے؟“

”میں اور تم جس میدان کے کھلاڑی ہیں اسے جرم و سزا کا میدان کہا جاتا ہے۔ یہاں صرف اپنے ساتھ ہی ہمدردی کی جا سکتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ایک نہایت سفاک اور خطرناک شخص ہو۔ میں تمہیں کوئی ڈھیل نہیں دے سکتی۔ میرا اور تمہارا سمبندھ بس اتنا ہے کہ تم ایک یا دو راتوں کے لیے میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ کنگ براؤن کے یہاں واپس آنے تک تمہارے سارے معاملات کنگ کے سپرد ہو جائیں گے۔“

”میرے دونوں پاؤں سخت زخمی ہیں۔ وزنی بیڑی کے سبب تکلیف بھی بہت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میری بیڑی کھلوا دو..... اور اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو رسی وغیرہ سے پاؤں بندھوا دو۔“

”سنا چاہتی ہوں۔“ وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ بولی ”میں تمہارا اس قسم کا کوئی مطالبہ پورا نہیں کر سکتی۔ ہاں اتنا وعدہ ضرور کرتی ہوں کہ یہاں تمہارا وقت اچھا گزرے گا۔ تم جو چاہو کھا سکتے ہو۔ اچھی شراب پی سکتے ہو۔ مجھ سے گپ شپ لڑا سکتے ہو۔ بلکہ میں چاہوں گی کہ تم مجھے اپنے جیون کے دلچسپ واقعات سے آگاہ کرو۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اب وہ سب کچھ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا ”دلچسپ واقعات سنانے کے لیے خوشگوار موڈ کی ضرورت ہوتی ہے اور تم دیکھ رہی ہو کہ موت کی تلوار میرے سر پر لٹک رہی ہے اور میرا جسم زخموں سے چور ہے۔“

وہ ووڈکا کی بوتل ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی ”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ شراب پیو۔ یہ اندر جائے گی تو ساری پریشانی ہوا ہو جائے گی۔ ان زخموں کی تکلیف بھی کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاؤ گے۔“

اس نے خود ہی جام بنا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ سیال آگ اندر گئی تو جلتے ہوئے زخم ٹھنڈک محسوس کرنے لگے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ جسمانی اور ذہنی ٹھنڈک عارضی ہے۔ جب یہ بدبخت خمار اترے گا تو ذہنی اور جسمانی دکھ کئی گنا بڑھ جائیں گے۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ میں چت نہیں لیٹ سکتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی کروٹ لے رکھی تھی۔ منوہرا نے اپنے ہیروں جڑے لائٹر سے دو سگریٹ سلگائے اور ایک میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ منوہرا کے خدمت گار لڑکے ہم سے کافی فاصلے پر بیٹھے تھے۔ وہ ہماری باتیں نہیں سن سکتے تھے۔ منوہرا نے ان میں سے ایک جاپانی لڑکے کو پاس بلایا۔ وہ ادب سے منوہرا کے عقب میں کھڑا ہو گیا اور جھکتے ہوئے اس کی گردن کے پچھلے حصے اور کندھوں کا مساج کرنے لگا۔ منوہرا کے عقب میں دیوار پر جو دیوہیکل تصویر لگی تھی اس میں بھی نہایت چکنی جلد والا یہ خوب رو لڑکا نظر آ رہا تھا۔ اس بڑے سائز کی تصویر میں منوہرا نہایت مختصر لباس پہنے ہوئے ایک سوئمنگ پول میں نظر آ رہی تھی۔ چار خوب صورت نوجوان بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ وہ ایک قطار میں

کھڑے تھے۔ انہوں نے منوہرا کو ایک بڑی مچھلی کی طرح اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ منوہرا کے لباس اور اسٹائل کے لحاظ سے یہ نہایت ہیجان انگیز تصویر تھی۔ اس تصویر سے منوہرا کے ذوق اسٹائل کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جاپانی لڑکا انگلش نہیں جانتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ منوہرا نے اسے مٹھی چاپی کے لیے پاس بلا لیا تھا۔ میں نے کہا ”منوہرا دیوی ٹھیک ہے میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی مناسب مشورہ تو دے سکتی ہو۔“

وہ گہرا کش لیتے ہوئے بولی ”تم نے یہاں آ کر اپنے لیے روئے زمین پر بدترین جگہ چن لی ہے۔ تمہیں سب سے زیادہ خطرہ تین افراد سے ہے۔ پرنس داراب..... جو تم سے بالی وڈ ”گانی گڑیوں“ کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ دوسرا شیخ زادی توسبہ..... جو تم سے اپنے بڑے بھائی کا اتا پتا پوچھنا چاہتی ہے..... اور خود کنگ براؤن..... جن کا تم نے بے حد نقصان کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکلوتی اولاد کی ہتھیا بھی تمہارے کارن ہوئی ہے۔ میری مراد ماسٹر اسمتھ سے ہے۔“ منوہرا نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی ”یہاں کے عام لوگوں میں بھی تمہارے خلاف بہت نفرت پائی جاتی ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ تم پر نظر پڑتے ہی عام لوگ غصے سے دیوانے ہو جاتے ہیں۔“

”انہیں عام لوگ مت کہو۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا ”یہ خاص لوگ ہیں۔ یہ کنگ براؤن کے نمک خوار ہیں۔“

”بہرحال..... میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔“ وہ نشیلے لہجے میں بولی ”تم نے مجھ سے مشورہ مانگا تھا اور میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی موت کو اذیت ناک نہ بناؤ۔ جو کچھ یہ لوگ پوچھتے ہیں انہیں بتا دو۔ کیونکہ یہ تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔ سبینہ..... وہ شیخ زادی اچھی خصلت کی نہیں ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ تم اس کی بات بھی مان لو۔ اگر شیخ عاصم کی ہتھیا تمہارے ہاتھوں ہو چکی ہے تو پھر اس کا اقرار کر لو اور اس واقعے کی تفصیل بتا دو۔ پرنس داراب بھی تم سے دونوں گلوکاراؤں کا پتا جانے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ بڑے لوگوں کے خبط بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پرنس کا خبط ہے کہ وہ اپنے بیڈ روم کو تینوں بہنوں سے سجانا چاہتا ہے۔ وہ ان کی آوازوں کا بھی دیوانہ ہے۔ پر اب مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہ بہنیں ایک دوجے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتیں۔ باقی دونوں بہنوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن جو اب پرنس کے پاس ہے اس کا حال اچھا نہیں ہے۔ وہ اپنی بہنوں کو اس قدر مس کر رہی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ شاید تمہیں جانکاری نہ ہو تین دن پہلے بڑی بہن نے دل برداشتہ ہو کر آتما ہتھیا کرنے کی کوشش کی ہے۔“

میں نے کراہتے ہوئے کہا ”تم کہنا چاہتی ہو کہ بڑی بہن کی مایوسی دور کرنے کے لیے اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو بھی اس دوزخ میں گھسیٹ لیا جائے۔“

”میں نے صرف بڑی بہن کی حالت دیکھی ہے۔ اگر چھوٹی بہنوں نے بھی اس جدائی کو ایسے ہی محسوس کیا ہے تو پھر یہ بڑا گمبھیر معاملہ ہے۔ شاید تم نے ایسے پرندوں کے بارے میں سنا ہو جنہیں جدا کیا جائے تو وہ کچھ کھاتے پیتے نہیں۔ بس بھوکے پیاسے مر جاتے ہیں۔ مجھے تو اس لڑکی کی حالت بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھہرو۔ میں تمہیں دکھانے کی کوشش کرتی ہوں۔“ منوہرا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

ایک لڑکا جلدی سے آیا اور سلیپر منوہرا کے پاؤں کے پاس رکھے۔ اکثر لڑکوں کے جسم کسرتی تھے اور انہوں نے باریک سے کپڑے کے ہیجان خیز لباس پہن رکھے تھے۔ منوہرا ان چلتے پھرتے نوجوانوں کو عجب پرتپش نظروں سے گھورتی تھی۔ منوہرا سلیپر پہن کر ایک جہازی سائز کی الماری کی طرف گئی۔ اس جدید الماری کے کچھ حصوں میں نہایت نفیس شیشہ لگا تھا اور جدید دروازے بٹن دبانے سے خودکار طریقے سے حرکت کرتے تھے۔ ایک دروازہ کھلا تو سامنے ٹی وی سیٹ نظر آیا۔ منوہرا نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے سیٹ آن کیا۔ وہ ریموٹ کا بٹن دبانے لگی اور اسکرین پر مختلف مناظر ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ یہ ہمارے اردگرد کے مناظر ہی تھے۔ کھلا آسمان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس راہداریاں تھیں، ہال کمرے تھے۔ لاک اپ تھے۔ قیدی بھی بردے اپنے مخصوص لباس میں نظر آتے تھے۔ ان میں سے اکثر مردوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کڑا تھا۔ اس دھاتی کڑے پر بردے کا نمبر اور کوائف وغیرہ درج کیے جاتے تھے۔ یہ سارے بردے شکلوں سے ہی مظلوم اور نچلے مسلے نظر آتے تھے۔ ان میں ذرا سا بھی دم خم نہیں تھا۔ کسی بھی حرکت پر وہ بھیڑ بکریوں کی طرح حرکت میں آ جاتے تھے اور جہاں بٹھایا جاتا تھا سر جھکا کر بیٹھ جاتے تھے۔ کچھ نوجوان عورتوں کے ساتھ بچے بھی نظر آتے تھے۔ یہ بچے بھی اپنے والدین کے ساتھ غلامی و رسوائی کے جنگل میں تھے۔

ٹی وی اسکرین پر ایک آرام دہ کمرے کا منظر ابھرا۔ میں نے گالی گزیانیا کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی اور ایک گداز بستر پر موجود تھی لیکن اس کے ہاتھ پاؤں چرمی پٹیوں میں کسے ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ سکتی تھی اور نہ اپنے جسم کو زیادہ حرکت دے سکتی تھی۔ اس کے قریب ہی نیلی وردی والی ایک نہایت چاق و چوبند لیڈی گارڈ موجود تھی۔ اس کی کسی ہوئی پتلون کے ساتھ ہولسٹر موجود تھا۔ نیتا کے قریب ہی خوب صورت تپائی پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی لیکن یہ کھانا کھایا نہیں گیا تھا۔

میں نے نیتا کی صورت دیکھی اور دنگ رہ گیا۔ چند ہی دنوں میں وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ صحرا کی دھوپ میں جھلس جانے والی کلی کی طرح وہ نیم جان تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ منوہرا بولی "اس کی حالت بگڑ رہی ہے ہانا تم ..... پچھلے تین چار دن سے اس نے بھوجن نہیں کیا۔ اسی طرح رہی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس نے آتما ہتھیا کی کوشش بھی کی تھی۔ اب بھی یہ بس اور بے کیا ہے اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو یہ خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ یہ رات دن بھگوان کا نام لے لے کر پانی پی رہی ہے۔"

میں جانتا تھا نیتا اس ہندو لڑکیوں کی بھگتی کھیلتی زندگی کو بتانے میں سب سے زیادہ ہاتھ منوہرا کا ہے پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا "یہ لڑکی سری لنکن ہے۔ یہ کنگ براؤن کے چنگل میں پھنس کیسے گئی؟"

"دھن دولت میں بڑی طاقت ہے۔" منوہرا نے مختصر جواب دیا۔

مجھے نیتا کی حالت زار دکھانے کے بعد منوہرا نے پھر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانا شروع کر دیا۔ اسکرین پر تصویریں ابھر ابھر کر اوجھل ہونے لگیں۔ منوہرا شاید پرنس داراب کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک ایک منظر دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے ایک کمرے کے فرش پر ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی تھی۔ میں اس شکل کو بھول نہیں سکتا تھا۔ یہ موٹل تھا۔ روشن آنکھوں اور چوڑے سینے والا وہی ازرکی نوجوان جو زبردست صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ازرکی قبیلے کے ہر فرد کی طرح موٹل کی آنکھوں میں بھی ایک مقناطیسی کشش تو موجود ہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ کرنا جانتا تھا۔ ہاں یہ موٹل ہی تھا۔ موٹل کے ساتھ ایک نیم برہنہ لڑکی بھی فرش پر بیٹھی تھی۔ لڑکی کے خدوخال اور تاثرات دیکھ کر میں ایک لمحے میں جان گیا کہ یہ "بوب دوشیزہ" ہے۔ بوب دوشیزہ کا لقب ان لڑکیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ازرکی قبیلے کی بستیوں میں دل خراش مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے پالی جاتی تھیں۔ ان سفید فام صحت مند لڑکیوں کی حیثیت بالکل قربانی کے جانوروں کی سی ہوتی تھی۔

اسکرین پر سے منظر چند لمحوں میں بدل گیا لیکن ان چند لمحوں میں ہی میں نے جو کچھ دیکھا وہ ذہن پر نقش ہو گیا۔ با کمال موٹل کی یہاں موجودگی حیران کن تھی اور اسے کسی حد تک خوش آئند بھی کہا جا سکتا تھا۔ ٹی وی آف کرنے کے بعد منوہرا ایک بار پھر میرے قریب آن بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں اب نشے کی وجہ سے سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اس کے کشادہ گریبان کے اندر سے اس کا صحت مند جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی "مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی مر جائے گی ..... کیا پتا دوسری طرف وہ دونوں بھی زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں۔ میری معلومات کے مطابق یہ تینوں بہنیں بچپن سے اب تک کبھی جدا نہیں ہوئیں۔ جدا ہونا ان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ تین جسم اور ایک آتما والی بات ہے۔"

میں نے کہا "اغوا شدہ لڑکیوں کے لیے جس قسم کے حالات یہاں موجود ہیں ان حالات کا شکار ہونے سے تو بہتر ہے کہ یہ تینوں مر ہی جائیں۔"

"تم بہت فوکی ہو رہے ہو شاہ جہاں۔" وہ بولی "یہاں تمام عورتوں کے ساتھ تو بدسلوکی نہیں ہوتی ہے۔ جو لڑکیاں تربیت کے مرحلے میں سیکھنے سے انکار کرتی ہیں یا باغیانہ طبیعت کی ہوتی ہیں ان سے ضرور تھوڑی بہت سختی ہوتی ہے۔ جلد سیکھنے والی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور انہیں انعام بھی دیے جاتے ہیں۔ ابھی تین دن پہلے رقص سیکھنے والے لڑکے لڑکیوں کا ٹیسٹ ہوا تھا۔ ایک انڈین لڑکی کو پہلا انعام ایک ہزار پونڈ دیا گیا ہے۔"

"اس ایک ہزار پاؤنڈ کے بدلے تم اس کے جسم سے کئی ہزار پاؤنڈ وصول کرو گے۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم اسے بیچ دیں گے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ بک کر وہ کسی اچھے گھرانے میں ہی جائے گی۔ اس انڈین لڑکی کا پتا کلکتہ کے ریلوے اسٹیشن پر نان حلیم بیچتا ہے۔ یہ اپنے ماتا پتا کے ساتھ رہتی تو کسی نانبائی جیسے شخص سے بیاہی جاتی اور سارا جیون اٹھنی چونی کا حساب جوڑتے ہوئے گزار دیتی۔ اب یہ کسی یورپی ملک کی لارڈ فیملی میں جائے گی۔ بیوی نہ بنے، رکھیل بنے یا نوکرانی لیکن عیش تو کرے گی۔"

"کلکتے میں روکھی سوکھی کھا کر اور اپنے پیاروں کے

درمیان رہ کر اسے جو سکون ملتا تھا وہ ملکہ الزبتھ کی بہو بن کر بھی نہیں مل سکتا۔" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"یہ بہت لمبی بحث ہے شاہ جہاں! اور میں یہ سندر رات ایسے بیکار کام میں کھونا نہیں چاہتی۔ آج موڈ ذرا رنگ نیلا ..... اور چھیل چھبیلا ہو رہا ہے۔" وہ بے باکی سے بولی۔

میں نے اپنے آپ میں سوچا۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ تمہاری باگیں ڈھیلی ہیں۔ پرنس داراب اور کنگ براؤن میں سے کوئی بھی اس جگہ موجود نہیں۔ آج تم من مانی کرنے کے موڈ میں ہو۔

منوہرا وقفے وقفے سے بیئر اور وہسکی اپنے اندر انڈیل رہی تھی۔ سگریٹ کا شغل بھی جاری تھا۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کہیں پاس ہی انگلش میوزک بجنا شروع ہو گیا تھا۔ منوہرا آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اس کا گاؤن ٹانگ پر سے کھسک کر بہت اوپر چلا گیا تھا۔ شاید نشے کی وجہ سے اسے برہنگی کا احساس نہیں تھا یا وہ جان بوجھ کر بے خبر بنی ہوئی تھی۔ میوزک کے ردھم کے ساتھ منوہرا کے عریاں پاؤں بھی ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ وہ ایک سمت دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ شروع میں تو مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے پھر میں نے سر ذرا سا گھمایا۔ تو عقب میں تین چار جوڑے رقصاں نظر آئے۔ نوجوان لڑکے اپنے جسموں کو ہیجان خیز انداز میں بل دے رہے تھے۔ تراوبے نیچے اور ابھار رہے تھے۔ ان کے لباس بے حد چست اور باریک تھے۔

کچھ دیر تک منوہرا انہیں دیکھتی رہی، پھر یونانی لڑکا ناچتا ناچتا بڑی ادا سے منوہرا کے پاس آیا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ منوہرا کی طرف بڑھائے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے رقص میں اپنے ساتھ شریک کرنا چاہ رہا ہو۔ منوہرا نے دو تین بڑے گھونٹ بھر کر "وات 69" کا گلاس خالی کیا اور ہاتھ کی پشت سے اپنے گداز ہونٹ پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔ چند ہی لمحے بعد وہ یونانی کے ساتھ محو رقص تھی۔ وہ زیادہ تر نیلی آنکھوں والے یونانی لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے اس نے کئی بار سب کے سامنے نوجوان لڑکے کے ہونٹ چومے اور اس کے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ وہ نہایت بھرپور جسم کی عورت تھی۔ اگر اس کا وزن تھوڑا سا کم ہوتا اور آنکھوں کے نقش کچھ بہتر ہوتے تو اسے پرکشش کہا جا سکتا تھا۔ اب بھی وہ بارعب اور جاذب نظر تو کہا ہی جا سکتا تھا۔

کچھ دیر ناچنے کے بعد وہ واپس اپنی بیش قیمت کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کی گردن اور پیشانی پر پسینے کی چمک تھی۔ جوں جوں اس کا نشہ گہرا ہو رہا تھا وہ کچھ بے پروا ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کی یہ بے پروائی میرے کسی کام کی نہیں تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں میں جکڑے تھے، میں کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بڑی تمکنت سے آرام کرسی پر بیٹھی رہی اور کسی مہارانی کی طرح ماحول سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

اسی دوران میں ایک لڑکا آگے آیا اور اس نے منوہرا کے کان میں کھسر پھسر کی۔ اس کھسر پھسر کے بعد لڑکا باہر چلا گیا اور چند سیکنڈ کے بعد سفید کنپٹیوں والے اسمتھ منیجر کو لے کر واپس آ گیا۔ اسمتھ نے بھی مودب انداز میں جھک کر منوہرا کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ ان سرگوشیوں کے نتیجے میں منوہرا کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ ایک دم چیخ کر بولی "جاؤ جا کر کہہ دو اسے ..... وہ میرے اپارٹمنٹ میں ہے۔ میں لے کر آئی ہوں اسے۔ جب تک کنگ واپس نہیں آتے وہ یہیں پر رہے گا۔ اگر وہ دس دن نہیں آئیں گے تو وہ دس دن یہیں رہے گا۔ وہ جو کر سکتی ہے کر لے ....."

اسمتھ نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور پھر الٹے قدموں دروازے کی طرف گیا۔ جب اس نے گھوم کر رخ دروازے کی طرف پھیرا تو منوہرا چیخ کر بولی "رکو ..... میری بات سنو ..... تم دوبارہ یہاں نہیں آؤ گے ..... اور نہ وہ آئے گی ..... اگر وہ آئی تو سخت بے عزت ہو کر جائے گی۔ یہ بات بے شک اسے بتا دینا۔"

اسمتھ منیجر نے گھبرا کر ایک بار پھر اپنا سر اثبات میں ہلایا ..... اور ہلاتا ہوا ہی باہر چلا گیا۔

"حرام زادی ..... الو کی بچی ..... سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو ....." اسمتھ کے جانے کے بعد منوہرا خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگی۔ غصے میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی رعب دار نظر آنے لگا تھا۔ یہ دو نہایت اڑیل و بد دماغ عورتوں کی سرد جنگ تھی جس کا محور میری ذات تھی۔ اس کشمکش کے سبب اس طویل رات کے بطن میں گاہے گاہے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

اسمتھ کے جانے کے بعد منوہرا نے اپنے چٹختے ہوئے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے اوپر تلے کئی پیگ لیے اور اس کا چہرہ لال بھبوکا نظر آنے لگا۔ لڑکے بدستور محو رقص تھے۔ پسینے کے سبب ان کے چست لباس بھیگ گئے تھے اور جسم کی دلکشی نظر آ رہی تھی۔ وہ رقص کرتے کرتے کسی وقت پروانوں کی طرح منوہرا کی کرسی کے گرد چکراتے تھے اور پھر دور چلے جاتے تھے۔ منوہرا نے کہا "پتا نہیں کیوں آج رات

رہی تھی جو گنگنانے کو دل چاہ رہا ہے۔ بکھر بکھنے کو..... کچھ ہنسنے کھیلنے کو.....''

میں نے کہا ''یقین نہیں آتا کہ تم جیسی غصیلی اور دبنگ عورت بھی ہنس کھیل سکتی ہے۔''

''اس سنسار میں اور اس جیون میں سبھی کچھ ممکن ہے اور پھر یہ جیون ہے بھی کتنا۔ وہ مشہور انڈین سانگ تو شاید تم نے بھی سنا ہو۔ بس آج کی رات ہے زندگی..... کل ہم کہاں تم کہاں......''

''تم تو یہیں رہو گی..... ہاں میرا کچھ پتا نہیں کہ میری لاش کس طرح ٹھکانے لگائی جائے گی۔''

''کل کے بارے میں مت سوچو۔ آگے بھی جانے نہ دو..... پیچھے بھی جانے نہ دو..... جو کچھ ہے بس یہی ایک پل ہے......'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ نشے کے زیر اثر وہ ''فلمی شاعری'' بولنے لگی تھی۔

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر کچھ دیر مجھے گھورتی رہی، پھر بولی ''سنا ہے کہ تم بڑے مشہور و معروف لڑاکے ہو۔ فائٹنگ میں تم نے بڑے بڑے جغادریوں کے چھکے چھڑائے ہیں۔ ننگر شنگر اجیبا ورلڈ کلاس فائٹر بھی اب تک تمہیں واضح شکست دینے میں ناکام رہا ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ بھی جواب کی توقع نہیں رکھ رہی تھی۔ بے خیالی میں میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر بولی ''افسوس کی بات یہ ہے کہ اگلے دو چار روز کے اندر تم اپنی تمام تر دلیری اور اپنے تمام تر ہنر سمیت زمین کے نیچے چلے جاؤ گے۔ تمہارا ہر ہنر تمہارے ساتھ ہی بے موت مر جائے گا.....''

''ہمدردی افسوس کے لیے بہت بہت شکریہ...... وحشیہ الی۔''

''کہتے ہیں کہ ہر کلاکار کو اپنی کلا کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ میرے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی ''جیسے مصور کو ''دیکھنے والی نگاہیں'' درکار ہوتی ہیں۔ کوی کو اپنی کویتا کے لیے ''سننے والے کان'' درکار ہوتے ہیں۔ یہی حال موسیقاروں اور اداکاروں وغیرہ کا ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں کو دیر تک اپنی کلا کے اظہار کا موقع نہ ملے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ تم بھی ایک کلاکار ہو اور تمہاری کلا فائٹ ہے۔ میرا وچار ہے کہ تمہیں بھی کافی دنوں سے اپنی کلا کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

منوہرا کچھ دیر تک پرسوچ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے اپنی شاندار کرسی تھوڑا سا پیچھے کر لی۔ کرسی اپنے بے آواز پہیوں پر خاموشی سے سلائیڈ کرتی ہوئی تین چار فٹ پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے منوہرا کی اس حرکت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ تاہم رقص والی لڑکیوں کے چہروں سے اندازہ ہوا کہ انہیں وجہ سمجھ میں آ گئی ہے۔ منوہرا نے شاید کوئی بٹن دبایا تھا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپارٹمنٹ کی چھت مجھ پر آ گری ہے۔ اضطراری طور پر میں نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کی، لیکن بازو تو موٹر کرالی ہتھکڑی میں جکڑ دیے گئے تھے وہ میرے چہرے کو ڈھال کیسے فراہم کرتے۔ میں بس ایک دفعہ تھرا کر رہ گیا۔ چھت تو مجھ پر نہیں گری تھی تاہم ایک گول جنگلے نے مجھے آناً فاناً گھیر لیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اپارٹمنٹ کی جگمگاتی چھت پر اسٹیل کا جو بڑا سا دائرہ نظر آ رہا تھا وہ کیا تھا۔ یہ درحقیقت اسٹیل کا ایک بڑا جنگلا تھا جو چھت میں سے تیزی کے ساتھ فرش تک لایا جا سکتا تھا۔ گول جنگلا قریباً ڈیڑھ سو مربع فٹ جگہ گھیرتا تھا اور اس جنگلے کے اندر آنے والا شخص آناً فاناً باقی اپارٹمنٹ سے علیحدہ ہو جاتا تھا۔ اب میں جنگلے کے اندر تھا اور منوہرا اپنے خدمت گار لڑکوں سمیت جنگلے سے باہر تھی۔ وہ بڑے سکون سے کرسی پھیل کے بیٹھی ہوئی تھی۔ خدمت گارلز کے ہاتھ سے پیگ لیتے ہوئے بولی ''میں تمہاری فائٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تم نے فائٹ میں کامیابی حاصل کی تو تمہیں ایک بہت سندر تحفہ دوں گی۔ کم از کم آج کی رات کے لیے تو تمہارا من خوش ہو جائے گا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں..... تم مجھے کس سے لڑانا چاہ رہی ہو۔''

''کوئی نامی گرامی لڑاکا نہیں، بس عام سا فائٹر ہے۔ بلکہ ایک فائٹر سے کام نہیں چلے گا۔ اسے تو تم روئی کی طرح دھنک کر رکھ دو گے۔ وہ دو فائٹر ہوں گے۔ اس کے علاوہ..... اس کے علاوہ..... ان کے ہاتھ بھی آزاد ہوں گے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ تم میری حالت بھی دیکھ رہی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔''

''لیکن اب نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی ''چند گھنٹوں میں ہی تم بھلے چنگے دکھائی دینے لگے ہو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تمہاری حالت اتنی بری نہیں تھی جتنی ڈاکٹر والٹر نے اس تیخ زادی کے سامنے بیان کی تھی۔ مقصد تمہیں اس ٹارچ سیل سے نکالنا تھا۔''

''مجھے تمہاری کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ تم کن دو فائٹرز کی بات کر رہی ہو اور وہ تحفہ کیا ہے۔ مجھے ایسے کسی تحفے کی ضرورت نہیں۔''

''جلد بازمت ہو..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری آج کی رات بہت اچھی گزرے گی.....''

آخری الفاظ کہتے کہتے وہ اٹھی اور ایک بغلی دروازے میں اوجھل ہو گئی۔ میں حیران حیران سا بستر پر نیم دراز رہا۔ چند منٹ بعد منوہرا دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ دو تنومند افراد نظر آ رہے تھے۔ ایک حبشی تھا..... دوسرا جاپانی۔ عام طور جاپانی کوتاہ قد ہوتے ہیں لیکن یہ جاپانی چھ فٹ سے کچھ ہی کم ہوگا۔ حبشی چھ فٹ سے اوپر تھا۔ کراٹے کے کھلاڑیوں کی طرح انہوں نے سیاہ رنگ کے گاؤن پہن رکھے تھے۔ دو پاؤں سے ننگے تھے۔

منوہرا نے مہارانی کی سی شان سے کرسی سنبھالتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور بولی ''ریفری صاحب بھی ابھی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ کراٹے اسٹائل کی بالکل صاف ستھری فائٹ ہوگی۔ پوائنٹس کی نمبرنگ بھی مروجہ طریقے کے مطابق ہوگی۔ صحیح جگہ پر بازی دینے کے ساتھ ضرب لگانے سے پورا پوائنٹ ملے گا۔ فاؤل پلے پر وارننگ دی جائے گی۔ یہ CONTACT فائٹ چار چار منٹ کے چار راؤنڈز کی ہوگی۔ ناک آؤٹ نہ ہونے کی صورت میں پوائنٹس پر فیصلہ ہوگا۔''

وہ مسلسل بولتی چلی جا رہی تھی۔ ساری تفصیل سمجھانے کے بعد کہنے لگی ''یہ صاف ستھرا دوستانہ مقابلہ ہے۔ آپ دونوں فریقوں کو ریفری کے فیصلے پر عمل کرنا ہوگا۔''

اسی دوران میں درمیانے قد اور نیم گنجے سر والے کورین ریفری صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ اپنے کام کے ماہر دکھائی دیتے تھے اور کافی سنجیدہ بھی نظر آ رہے تھے۔ منوہرا نے میری بیڑی کی چابی نجانے کہاں سے حاصل کر لی تھی۔ اس نے یہ چابی ریفری کو دی۔ ریفری نے شستہ انگریزی میں مجھے سلاخوں کے قریب آنے کی ہدایت کی۔ میں قریب آیا تو ریفری نے باہر ہی سے ہاتھ ڈال کر میرے پاؤں کا لاک کھول دیا۔ لاک کھولے جانے سے پہلے ہی دونوں فائٹرز اندر آ چکے تھے۔ میرے بستر کو گھسیٹ کر ایک گوشے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ لڑائی کے لیے میدان تیار تھا۔

اگر میں تندرست ہوتا اور میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو ان دونوں فائٹرز کے جبڑے وغیرہ توڑنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا، لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ کئی گھنٹے تک ٹارچ سیل کی اذیت سہنے کے بعد میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ایک کنپٹی میں اب بھی کسی وقت شدید ٹیس اٹھتی تھی اور بدن میں پھیل جاتی تھی۔ اصولی طور پر دیکھا جاتا تو مجھے ابھی طبی امداد اور آرام کی ضرورت تھی لیکن مجھے یہاں لڑانے کے میدان میں اتارا جا رہا تھا۔ اپنی شہرت کے عین مطابق منوہرا ایک بے حس اور سفاک عورت تھی۔ اگر وہ مجھے ٹارچ سیل سے نکال کر لائی تھی تو اس کی اہم وجہ صرف یہ تھی کہ وہ تو سیہ پر اپنی برتری اور اختیار ثابت کرنا چاہتی تھی۔ جہاں تک میری ذات سے منوہرا کی دلچسپی کا تعلق تھا، یہ دلچسپی بس واقعات سننے سنانے کی حد تک ہی تھی۔ یہ بڑی سطحی قسم کی دلچسپی تھی اور مجھے اس سے کسی طرح کا فائدہ پہنچنا محال تھا۔

فائٹ شروع ہونے سے پہلے میں نے جو سیال آگ اپنے اندر انڈیلی تھی اس نے میری جسمانی تکلیف کو وقتی طور پر کافی کم کر دیا تھا۔ میں خود سے چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا اور اگر کوشش کرتا تو ان دونوں فائٹرز کو ایک اچھی فائٹ دے سکتا تھا۔ منوہرا کا اشارہ ملتے ہی دونوں فائٹرز بازو پھیلا کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے اور آنکھوں آنکھوں میں مجھے تولنے لگے۔ میں نے بھی انہیں تولا۔ دونوں میں سے جاپانی زیادہ سخت جان اور خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بجلی سی چمکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک دو چوٹوں کے نشان موجود تھے جو اس کے تجربے کو ظاہر کرتے تھے۔ حبشی غیر ارادی طور پر اپنی دائیں ٹانگ آگے کیے کھڑا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی بائیں ٹانگ زیادہ استعمال کرتا ہے۔ حبشی ایک نہایت مضبوط اور جفاکش مدمقابل نظر آتا تھا۔ تاہم ان دونوں افراد سے لڑنے سے پہلے ہی میں بھانپ گیا تھا کہ میرے لیے یہ کوئی بہت دشوار مقابلہ ثابت نہیں ہوگا۔

ریفری کے منہ میں باقاعدہ چھوٹی سی سیٹی تھی۔ ساتھ میں ریفری کا اسسٹنٹ تھا جو نوٹ بک اور قلم لیے کھڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے پوائنٹس وغیرہ لکھنے تھے۔ ہم تینوں آمنے سامنے کھڑے تھے، میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں فقط ایک نیکر نما انڈرویئر میں تھا۔ یہی نیکر تھی جو میں نے پرسوں سے زیب تن کر رکھی تھی۔ میرے جسم پر جگہ جگہ مرہم لگی تھی۔ جہاں زخم گہرے تھے وہاں ڈاکٹر والٹر کے کمپاؤنڈر نے میڈیکل ٹیپ کے ذریعے ڈریسنگ کر دی تھی۔ سب سے بری حالت انگلی کی تھی جس میں فریکچر ہو چکا تھا۔

ریفری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میں اوپر تلے دو مرتبہ سیٹی بجاؤں گا تو راؤنڈ شروع ہو جائے گا۔ دو مرتبہ سیٹی بجانے سے راؤنڈ ختم ہوگا..... فاؤل پلے پر پوائنٹس کٹیں

گے۔ امید ہے آپ تینوں فاؤل پلے نہیں کریں گے۔"

اس نے دو مرتبہ سیٹی بجائی۔ راؤنڈ شروع ہوگیا۔ دونوں فائٹرز نے دو مختلف اطراف سے حملہ کیا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لہٰذا اخلاقی قدر پر عمل کرتے ہوئے جاپانی فائٹر بھی بس اپنی ٹانگیں ہی استعمال کر رہا تھا۔ ہاں حبشی کے ہاتھ بھی حرکت میں تھے۔ کراٹے سمیت ہر قسم کی فائٹ میں مخالف کی ضربات روکنے کے لیے زیادہ تر ہاتھ استعمال کیے جاتے ہیں، مجھے ہاتھوں کا کام بھی ٹانگوں سے لینا پڑ رہا تھا۔ پہلا راؤنڈ بڑا دھواں دھار تھا۔ خاص طور سے حبشی نے بڑے تند و تیز حملے کیے لیکن میرا اندازہ تھا کہ اگر پوائنٹس لکھنے والا درست نمبرنگ کر رہا ہے تو اسے ایک بھی پوائنٹ نہیں ملا ہوگا۔ جاپانی میں جوش و خروش کم تھا مگر اس کے حملے کا انداز زیادہ موثر تھا۔ اس کی ایک کک میرے رخسار پر لگی اور ایک بغل میں پسلیوں پر۔ پسلیوں کی ڈریسنگ سے تازہ خون رسنے لگا۔ میری ایک زوردار کک بھی جاپانی کے پیٹ میں لگی اور وہ چند سیکنڈ تک لڑکھڑایا ہوا دکھائی دیا۔ منوہرا اس مقابلے سے بے حد لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بڑی خرانٹ عورت تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ دونوں فائٹرز اپنے کام میں ماہر ہونے کے باوجود میرے جوڑ کے نہیں ہیں اور میں ان کے حملوں کا جواب پوری شدت سے نہیں دے رہا۔

دوسرے راؤنڈ کے شروع ہوتے ہی حبشی نے اوپر تلے مجھ پر کئی "ککس" چلائیں۔ وہ مجھے کوئی کاری ضرب لگانے کے چکر میں تھا اور اس چکر میں فاؤل پلے بھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے تھوڑی سی ڈھیل دے کر اپنے قریب کیا۔ جب وہ مناسب حد تک نزدیک آگیا تو میری زوردار ٹانگ اس کے جبڑے پر پڑی۔ وہ اچھل کر جنگلے سے ٹکرایا اور ادھر ہی لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے اور ہونٹوں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ ریفری نے اسے ناک آؤٹ قرار دیا اور راؤنڈ ختم ہونے کے بعد اسے جنگلے میں سے نکال لیا گیا۔

جاپانی نے تیسرے راؤنڈ میں بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس راؤنڈ میں میں نے اسے ٹھیک ٹھاک ضربیں لگائیں۔ اس کی ایک آنکھ پر گہری چوٹ آئی اور ٹھوڑی پھٹ گئی۔ جب اس نے خود کو پٹتے دیکھا تو "اخلاقی قدر" کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ہاتھ بھی استعمال کرنے شروع کر دیے لیکن اب وہ اکیلا تھا۔ اسے مارنا میرے لیے آسان تھا۔ میں نے کچھ دیر تک اس سے چوہے بلی کا کھیل کھیلا پھر دو زوردار ککوں سے اسے زمین دکھا دی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر خود ہی اپنی ہار تسلیم کر لی۔

اس پورے مقابلے میں میرے مدمقابل مجھے بس ایک آدھ چوٹیں ہی لگا پائے تھے اور وہ بھی شروع میں جب وہ دو تھے۔ منوہرا اس تماشے پر خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے بڑے شاہانہ انداز میں تالی بجائی اور مجھے داد دی "تم ایک سخت حریف ہو...... تمہاری اور ٹنگ شنگرا کی فائٹ واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہوگی۔"

پھر منوہرا نے ایک خدمت گار لڑکے کو اپنے نزدیک بلایا اور اس کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکا ادب سے سر جھکا کر باہر چلا گیا۔ میرے دونوں پاؤں ایک بار پھر زنجیر سے منسلک کر دیے گئے۔ اس کے بعد اسٹین لیس اسٹیل کا جنگلا اوپر اٹھا دیا گیا۔ باقی اشیاء کو بھی ترتیب کے ساتھ اسی طرح رکھ دیا گیا جیسے وہ مقابلے سے پہلے تھیں۔ میوزک بھی ایک بار پھر بجنے لگا۔ ایک رقاص لڑکے نے ہولے ہولے اپنے پاؤں کو جنبش دینا شروع کر دی۔ باقی لڑکے دیگر کاموں میں مصروف رہے۔ تنومند یونانی لڑکا بڑے عاجزانہ انداز میں منوہرا کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے دونوں گھٹنے تہ کر رکھے تھے۔ وہ بھی وقفے وقفے سے اپنے گلاس میں سے شراب کا گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں خمار ہلکورے لینے لگا تھا لیکن ایک پالتو کتے کی طرح وہ اپنی حدود سے آگاہ تھا۔ منوہرا کے لیے اس کے احترام میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ منوہرا خود ہی کبھی کبھی اپنا بازو لڑکے کی گردن میں ڈالتی تھی اور اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا دیتی تھی۔ وہ قالین پر بیٹھے بیٹھے اپنی مالکن کے جوش و خروش کا جواب "ادب" کے دائرے میں رہتے ہوئے دیتا تھا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں اپنا تحفہ دکھانا چاہتی ہوں۔ مجھے پورا احساس ہے کہ یہ تمہارے جیون کے آخری شب و روز ہیں۔ میں اپنی شکتی کے مطابق تمہیں تھوڑی بہت خوشی دینا چاہتی ہوں لیکن ایک بات کا مجھے افسوس ہے، میں تمہاری یہ بندشیں نہیں کھول سکتی۔"

"کیا میں جان سکتا ہوں کہ یہ خوشی کیا ہوگی؟"

"بس تھوڑا سا صبر کرو......" منوہرا نے کہا پھر ایک گلاس تھامتے ہوئے بولی "لو یہ میری خاطر ایک جام پیو۔"

اس نے ایک عجیب وضع کی بوتل تھامتے ہوئے دو گلاس بنائے۔ ایک گلاس اس نے خادم لڑکے کو تھما دیا تاکہ وہ مجھے پلائے۔ دوسرا اس نے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ سیال آگ سینے کو چیرتی ہوئی پورے جسم میں پھیل گئی۔ یہ نہایت تیز اور پرانی شراب تھی۔ اس نے لمحوں میں اثر کیا۔ سارے ناپسندیدہ احساسات کو دیکھتے ہی دیکھتے مجھ سے دور لے گئی۔ جسمانی

اذیت...... دکھ...... جدائی...... تشویش کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر منوہرا کی ہدایت پر دو خدمت گار لڑکوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے تھاما اور آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے ساگوان کے ایک دروازے کے سامنے لے گئے۔ بٹن دبانے پر دروازے نے بے آواز حرکت کی۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ ایک زبردست لگژری کمرے کا منظر سامنے تھا۔ زمینی جنت کے ایسے نمونے میں اس سے پیشتر ماریا ٹرسٹ کے خاص الخاص حصے میں دیکھ چکا تھا۔ "اے کلب" میں ایسے بے شمار ہوش ربا مناظر سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ دبیز قالین، پردے اور دیواروں کے اندر سے پھوٹتی ہوئی روشنی۔ ایک بہت بڑے گلاس کے پیچھے رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ مچھلیاں جن میں سے رنگ پھوٹتے تھے اور جن کا حسن نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ ایک ایسی ہی مچھلی کمرے کے بستر پر موجود تھی۔ یہ ایک نہایت حسین لڑکی تھی۔ اس کی بلوری آنکھوں میں سہمی ہرنی کی سی وحشت تھی۔ اس کا جسم ایک سرخ مخملی لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔ یہ بوب دوشیزہ تھی...... اور یہ وہی دوشیزہ تھی جسے کچھ دیر پہلے میں نے ٹی وی اسکرین پر "مجوبہ نوجوان" موبل کے ساتھ دیکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین کی تصویر میں بھی وہ خوب شکل نظر آئی تھی لیکن اس کا اصل حسن اور جوبن اس کمرے کی خوب صورت روشنیوں میں کھل رہا تھا۔ لگتا تھا کہ واقعی کوئی جل پری ہے جو جادوئی پانیوں سے نکل کر اس بستر پر آ لیٹی ہے اور اب اپنی یاقوتی آنکھوں میں حسین حیرت اور ہراس لیے میری طرف دیکھ رہی ہے۔

میرے کندھے کی طرف منوہرا اسوار ہوئی۔ خاموش لیٹی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس کا تعلق لارس قبیلے سے ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہی ہوگا، لارس عورتیں اور مرد اپنے مزے میں لاجواب ہوتے ہیں۔ مجھے آشا ہے کہ میرا یہ تحفہ تمہیں پسند آئے گا۔"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ اپنی انگلی میرے کندھے میں چبھوتے ہوئے بولی "دیکھو اس تحفے کی ناقدری نہ کرنا۔ میں ایسی ناقدری بالکل برداشت نہیں کرتی۔ ویسے بھی تمہارے پاس بہت تھوڑا سا جیون باقی بچا ہے۔ وہ کمینی شیخ زادی تمہارے اس تھوڑے سے جیون کو بھی تار تار کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے بالکل الٹ کر رہی ہوں...... میں ٹھیک کر رہی ہوں نا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے خدمت گار لڑکے کو اشارہ کیا اور اس نے مجھے اندر دھکیل کر ساگوان کا سلائیڈنگ دروازہ بند کر دیا۔

میرے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور میں بوب لڑکی کے روبرو کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بوما میں مذہبی رسموں کی ادائیگی کے وقت بوب لڑکیوں کی بلی چڑھائی جاتی ہے...... اور ان کی عصمت دری کو بھی گناہ نہیں سمجھا جاتا لیکن ایسی گھناؤنی رسموں کے موقعے پر یہ بے زبان لڑکیاں شدید ترین مزاحمت کرتی تھیں۔ ان کی چیخ و پکار سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ مجھے ماریطانیہ میں پیش آنے والا وہ دلدوز واقعہ آج بھی یاد تھا جب صفدر نے پراسرار ذہنی کیفیت کے زیر اثر دو بوب دوشیزاؤں کی عصمت دری کی تھی۔ لڑکیوں کی مزاحمت آج بھی میرے ذہن میں تازہ تھی۔

میں کچھ دیر تک لڑکی کو دیکھتا رہا۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ لڑکی کے جسم پر سرخ لبادہ نہیں بلکہ چادر ہے۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور دانتوں کی مدد سے چادر لڑکی کے جسم سے سرکائی۔ نگاہوں میں بجلی سی لپک گئی۔ لڑکی کے جسم پر لباس کا ایک تار نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ویسی ہی چرمی پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے جیسی ٹی وی اسکرین پر نینا کے ہاتھ پاؤں میں نظر آئی تھیں۔

ان پٹیوں (بیلٹوں) کے ہوتے ہوئے لڑکی تڑپ مچل تو سکتی تھی لیکن بستر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے دانتوں ہی کی مدد سے چادر دوبارہ لڑکی کے جسم پر کھینچ دی اور سٹپٹایا ہوا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ منوہرا جیسی نائیکہ سے کسی ایسے ہی تحفے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنے دولت مند کرم فرماؤں میں رات دن ایسے ہی تحفے بانٹتی تھی۔ وہ نشے میں تھی۔ بہت اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ بند دروازے کے باوجود لگتا تھا اس کی آواز اندر تک چلی آتی تھی۔ میوزک کی مدھم آواز بھی اندر تک آ رہی تھی۔

چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے کی دوسری طرف سے منوہرا کی بہکی ہوئی آواز ابھری "فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں شاہ جہاں...... بڑی شانتی سے رات گزارو۔ یہاں کوئی چھپا ہوا کیمرا نہیں اور نہ ہی مائیک وغیرہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی منوہرا کا آوارہ قہقہہ سنائی دیا۔ شراب نوشی کے سبب اس کی آواز بھاری اور کرخت ہو چکی تھی۔

"یہ لارس بڑی ذائقے دار چیز ہوتے ہیں۔" منوہرا نے جاتے جاتے پھر ہانک لگائی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور قہقہہ اس کے حلق سے ابلا۔

میں نے دل ہی دل میں اس انٹرنیشنل نائیکہ کو کئی صلواتیں سنائیں اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر

گئے۔ میں نے لڑکی سے ٹوٹی پھوٹی لارسی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔ مجھے توقع بھی یہی تھی۔ لارسی لڑکیاں چونکہ بستر تنہائی اور علیحدگی میں پرورش پاتی تھیں لہٰذا وہ اظہار مدعا سے معذور ہوتی تھیں۔ اکثر ان کے اندر جذبات اور خواہشات کی نشوونما بھی نہیں ہوتی تھی۔ پالتو جانوروں کی طرح ان کی ضرورت صرف کھانا اور سونا ہوتا تھا۔ اچانک کمرے میں رکھے ہوئے انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ میں بندھے ہاتھوں کی وجہ سے ریسیور نہیں اٹھا سکتا تھا لہٰذا "ہینڈ فری" کا بٹن اپنی ناک سے "پش" کرتے ہوئے میں نے رابطہ کیا۔ دوسری طرف حسب توقع منوہرا ہی تھی۔ اب وہ غالباً کسی کمرے کے اندر سے بول رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید نیلی آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں والا کوئی یونانی لڑکا اس کی خلوت کا ساتھی ہو۔ وہ خمار آلود آواز میں بولی "کیا کر رہے ہو میرے ہیرو؟"

"بیٹھا ہوا اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔"

"میں نے تمہیں اداس ہونے کے لیے نہیں خوش ہونے کے لیے بھیجا ہے اور کم از کم آج کی رات میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اتنی کسی ہوئی مشکوں کے ساتھ میرے لیے خوش ہونا ممکن نہیں ہے۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ اگر تم کسی ہوئی مشکوں کے ساتھ لورڈ نی اور رینارڈ کی ہڈی پسلی ایک کر سکتے ہو تو پھر سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"تم بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔"

"بالکل غلط..... تم بے وقوف بنانے والی باتیں کر رہے ہو..... اور دیکھو..... مجھے طیش مت دلاؤ۔ میں نشے میں ہوں اور ایسے میں مجھ سے کچھ بھی برداشت نہیں ہوتا۔ اپنے تحفے کی توہین تو بالکل بھی برداشت نہیں ہوگی..... چلو شاباش!" اس کے ساتھ ہی انٹرکام خاموش ہو گیا۔

یہ بہرصورت حقیقت تھی۔ منوہرا جیسی بھی تھی، وقتی طور پر اس نے مجھے قوسیہ کی سفاکی سے بچایا تھا۔ کم از کم یہ تو کہا ہی جا سکتا تھا کہ وہ میرے لیے قوسیہ سے کم سفاک ثابت ہوئی ہے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن وہ مجھے قوسیہ کے چنگل سے نکال کر یہاں لے آئی تھی۔ فی الوقت کنگ براؤن اور پرنس داراب وغیرہ بھی یہاں موجود نہیں تھے۔ منوہرا یہاں مختار کل بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ترنگ میں میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ ایسے میں اسے ناراض کرنا کسی طور سود مند نہیں تھا۔ دوسری طرف میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس بے بس بے زبان لڑکی کے ساتھ کسی طرح کا جسمانی تعلق قائم کروں۔

میں نے لڑکی کے جسم سے مخملی چادر سرکائی اور اس کے قریب نیم دراز ہو گیا..... لیکن مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مجھ سے چھونے کے باوجود وہ کسی طرح کی مزاحمت کر رہی تھی اور نہ ہی عام بوب لڑکیوں کی طرح اس نے چیخ و پکار کی۔ اگر وہ چیخ و پکار کرتی تو میرے لیے بہتر ہوتا۔ میں اس کی شدید مزاحمت کو بہانہ بنا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں منوہرا کو یا تو میری بندشوں کے بارے میں سوچنا پڑتا..... یا پھر وہ "باعزت" طریقے سے اپنا "تحفہ" واپس لے لیتی..... مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بوب لڑکی ڈوری سہمی میرے پہلو میں موجود تھی۔ جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرتا ہے وہ بھی آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ پتا نہیں وہ کن پرخوف مراحل سے گزری تھی کہ پانی کی طرح ہر سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار تھی۔ "لعنت ہے تیری خاموشی پر!" میں نے دل ہی دل میں بوب لڑکی کو کوسا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور ترس بھی۔

میں نے اس کی نقصان دہ خاموشی کو توڑنے کی دو تین مزید "ناروا" کوششیں کیں اور ناکام رہا پھر میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس مسئلے کا حل بالکل سادہ سا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکی چیخے چلائے۔ اسے کسی بھی طریقے سے چیخنے چلانے پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ اس پر جنسی تشدد ہی ہو۔ میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کو لڑکی کے بندھے ہوئے ہاتھ تک پہنچایا۔ جونہی لڑکی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میں اس کے ہاتھ کو بری طرح مسل رہا تھا۔ بالکل جیسے بے تکلف دوست مصافحہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کو زور سے دباتے ہیں۔ بے چاری کے ہاتھ کی ہڈیاں میرے ہاتھ کی گرفت میں کڑکڑا رہی تھیں اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب موسیقی کا شور تھم چکا تھا۔ یقیناً لڑکی کی چیخ و پکار باہر تک بھی پہنچ رہی تھی۔

ذرا دیر بعد انٹرکام کی گھنٹی پھر بجی۔ میں نے پہلے والے طریقے سے انٹرکام آن کیا۔ دوسری طرف حسب توقع منوہرا کی بھاری بھرکم آواز تھی۔ وہ مخمور لہجے میں بولی "لگتا ہے کہ تم استادیاں دکھا رہے ہو۔"

"کوئی استادیاں نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن لڑکی تو با آواز بلند تمہیں داد دے رہی ہے۔"

"وہ دکھی ہو رہی ہے۔ میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تمہارا بہت شکریہ۔ مجھے یہاں سے باہر نکالو۔"

"بکواس بند کرو!" وہ نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں بولی "تم جہانی استاد ہو۔ تمہیں یہ بچگانہ دل والی بات زیب نہیں دیتی۔ ڈونٹ یو تھنک!" اس نے انٹرکام پھر بند کر دیا۔

میں نے ایک بار اسے دل ہی دل میں صلواتیں سنائیں۔ چند منٹ بعد آخری کوشش کے طور پر میں نے بوب لڑکی کو ایک بار پھر چیخنے پر مجبور کیا۔ اس کا ہاتھ سرخ ہو رہا تھا اور ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی انٹرکام کی گھنٹی پھر بجے گی..... لیکن اس مرتبہ گھنٹی کی نہیں ایک اور طرح کی آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کہیں پاس ہی بہت بڑا شیشہ ٹوٹا ہو اور لکڑی کی کھڑکی وغیرہ ٹوٹ گئی ہو، پھر ایک چیخ ابھری۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ مردانہ ہے یا عورت کی۔ اس چیخ کے چند سیکنڈ بعد ہی یوں لگا جیسے توپ کا گولا سا گوان نے دروازے سے ٹکرایا ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ کوئی شخص دروازہ توڑتا ہوا اندر گھس آیا تھا۔ وہ غضب ناک انداز میں مجھ سے ٹکرایا۔ میں پشت کے بل اس گلاس پر گرا جس کے عقب میں ان گنت خوب صورت مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ بہت بڑا گلاس زوردار جھٹکے سے ٹوٹ گیا اور پانی قالین پر بہہ نکلا۔ کمرے کا سوئچ بورڈ بھی شوکیس کے پاس ہی تھا۔ بہت سی چنگاریاں چھوٹیں اور کمرے کی رنگ برنگی روشنیاں بھی بجھ گئیں۔ اب کمرے میں صرف وہ روشنی تھی جو ٹوٹے ہوئے دروازے سے آ رہی تھی۔ حملہ آور کے ہاتھ میں رائفل بھی۔ اس نے رائفل کے دستے کو بڑے وحشیانہ انداز میں حرکت دی۔ اگر مجھے سر جھکانے میں ایک ثانیے کی دیر ہوتی تو سر کے تین چار ٹکڑے تو ضرور ہو گئے ہوتے۔ رائفل کا دستہ گھومتے ہوئے شوکیس سے ٹکرایا اور اس کے رہے سہے شیشے بھی فرش پر گر گئے۔

میرے لیے بے بسی کی انتہا تھی۔ میں ایک بپھرے ہوئے حملہ آور کی زد میں تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ جوابی حملے کے طور پر میں فقط اپنا سر استعمال کر سکتا تھا یا ٹانگوں کو فلائنگ کک کے انداز کی حرکت دے سکتا تھا لیکن اس کے لیے وقت درکار تھا اور حملہ آور مجھے وقت دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کا دوسرا وار بچا کر اس کے سینے پر سر کی ضرب لگانا چاہی۔ اس نے کسی بازیگر کی طرح ہوا میں الٹی قلابازی کھائی اور مجھ سے آٹھ دس فٹ دور چلا گیا میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ میرے مقابل کوئی اور نہیں حیرت انگیز بازی نوجوان موبل ہے۔

اس نے رائفل میری طرف سیدھی کی اور گولی چلائی۔ میں نے فرش پر گرتے ہوئے خود کو بچایا اور چیخ کر موبل کو آواز دی۔ وہ ایک ساعت کے لیے ٹھٹکا "یہ میں ہوں موبل۔" میں نے دوبارہ چیخ کر اردو میں کہا۔ چند ساعتوں کے لیے وہ ٹھہرا سا گیا اس کے قدموں میں مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔

وہ لپک کر میری طرف آیا۔ نیم تاریکی میں مجھے ٹٹول کر دیکھا اور پہچان لیا۔ اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے، اور ہر دم چمکتی شریر آنکھیں بجھ اور چمک اٹھیں۔ دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے ایک دیوار گیر الماری کو دھکیلنا شروع کیا۔ میں نے بھی اپنے کندھے کی مدد سے اس کا ساتھ دیا۔ دو ہی سیکنڈ بعد الماری ٹوٹے ہوئے دروازے کے سامنے تھی۔ یہ بڑے خطرناک لمحے تھے لیکن موبل کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو کوئی دلچسپ کھیل کھیلنے والے کھلاڑی کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ میں نے بڑے بڑے مرد میدان دیکھے تھے لیکن ایسی کیفیت مجھے کسی حد تک صفدر کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی یا پھر موسیٰ کی آنکھوں میں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ موبل کے پورے چہرے پر یہ کیفیات ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ موبل شاید اس کمرے میں محصور ہو کر گارڈز کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً بے وقوفی ہوتی اور وہ بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے گارڈز کو دھوکا دینے کے لیے بس چند فائر کیے۔ اس کے بعد جیب سے پھل کاٹنے والی چھری نکالی اور بے حد تیزی سے بوب دوشیزہ کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور اس نے سرخ مخملی چادر اپنے گرد لپیٹ کر سینے کے قریب گرہ باندھ لی۔

موبل نے اشاروں کی زبان میں اس سے بات کی اور اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ لڑکی نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد موبل تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اس نے اپنا سر جھکایا انداز ایسا ہی تھا جیسے میری ناف میں ٹکر مارنا چاہتا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے جھک کر مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر نیچے جاتی ہوئی سیڑھیوں پر آ گیا۔ حواس باختہ بوب لڑکی اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ موبل یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ ہم ایک تہ خانے میں پہنچے تھے۔ اس تہ خانے سے بڑے بڑے پائپ گزر کر اوپر کی طرف جاتے تھے۔ کوئی بڑی مشین بھی گونج دار آواز میں چل رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر موبل نے بڑی پھرتی سے ایک راہداری کا رخ کیا۔ راہداری کے آخری سرے پر فرش پر لوہے کا بڑا سا چوکور ڈھکنا تھا۔ موبل نے مجھے بدستور کندھے پر رکھا اور نیچے جھک کر ڈھکنا اٹھا دیا۔ یہاں لوہے کی عمودی سیڑھیاں نظر

آ رہی تھیں۔ مجھے کندھے پر متوازن رکھتے ہوئے ان عمودی سیڑھیوں سے اترنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا مگر موئل کا فولادی جسم اس قابل تھا کہ ایسا کر گزرے۔ بوب دوشیزہ لرزتی کانپتی ہمارے پیچھے ہی پیچھے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ آخری چند سیڑھیاں رہ گئیں تو وہ پھسلی اور ہمارے اوپر گری۔ ہم تینوں اوپر نیچے فرش بوس ہو گئے تھے۔ بوب لڑکی کے پاؤں پر شدید چوٹ آئی اور باقی کا سفر اسے لنگڑاتے ہوئے ہمارے پیچھے پیچھے طے کرنا پڑا۔ یہ ایک بہت بڑی سرنگ تھی جس میں سے پانی کے بڑے بڑے پائپ گزرتے تھے، اس کے علاوہ سیوریج اور قدرتی گیس کے پائپ بھی تھے۔

موئل بس چلتا ہی چلا جا رہا تھا "کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ کو فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ چہکا۔ اس کی آواز زندگی کی توانائی سے بھرپور تھی۔

"کیا ہم یہاں سے نکل رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نکلنا اتنا آسان نہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ ہم اس گورکھ دھندے کے اندر ہی چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

قریباً ایک سو گز آگے جانے کے بعد ہم نے پھر لوہے کی سیڑھیاں دیکھیں۔ موئل نے میرے سمیت ان سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ ان سیڑھیوں کی تعداد پچاس سے کم ہرگز نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم زمین کے اندر کوئی پچاس فٹ کی گہرائی میں موجود ہیں۔ یہ ساری کی ساری تعمیر بالکل نئی نظر آ رہی تھی۔ پانی اور گیس کے پائپوں پر نیا نیا رنگ روغن کیا گیا تھا۔ کہیں کہیں اب بھی تعمیراتی سامان بکھرا ہوا تھا۔ بہرحال متنفس کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ موئل کی ساری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔ ان میں ایک غیر معمولی حس 'سماعت' کی بھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ موئل دور دور کی آوازیں سن رہا ہے اور ہمیں محفوظ ترین راستے پر چلاتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ موئل تھوڑا سا ہانپ گیا ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی طور یہ مرحلہ بھی مکمل ہوا۔ ہم ایک ویران تہ خانے میں نکلے۔ اس تہ خانے کے ایک گوشے میں دو "مکینک ٹائپ" افراد پائپوں کے اسکرو وغیرہ کسنے میں مصروف تھے۔ وہ ہم سے کافی دوری پر تھے اور اپنے کام میں مگن تھے۔ موئل نے ان کے واپس جانے کا انتظار کیا اور اس دوران میں میرے اور بوب لڑکی کے ہمراہ ایک گول آہنی ٹینکی کے پیچھے چھپا رہا۔ تہ خانہ خالی ہوا تو ہم کنکریٹ کی پندرہ سولہ سیڑھیاں چڑھ کر ایک راہداری میں آ گئے۔

یہ ویسا ہی ماحول تھا جس سے نکل کر ہم بھاگے تھے۔ سب سے خطرناک چیز ایک آواز تھی۔ سائرن سے ملتی جلتی یہ آواز کہیں آس پاس سے ہی ابھر رہی تھی۔ میں نے یہ آواز ہالر ٹرسٹ میں بھی کئی بار سنی تھی۔ یہ آواز نیلی وردیوں والے بے رحم گارڈز کو ریڈ الرٹ کرتی تھی اور انہیں بتاتی تھی کہ ٹرسٹ کے اندر کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

"کہیں مروا نہ دینا موئل۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اپنے اس خادم پر بھروسا کریں جناب۔" وہ شستہ اردو میں بولا۔ اس کی پُراسرار صلاحیتوں کی دھاک ایک بار پھر میرے دل پر بیٹھ گئی۔ وہ اردو دانوں کی طرح اردو بول رہا تھا۔

موئل کی تمام حسیات کسی شکاری درندے کی طرح بیدار تھیں۔ گلے میں جھولتی ہوئی رائفل پر اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ ایک جگہ اس نے مجھے کندھے سے اتار دیا۔ یہ ایک قالین پوش کوریڈور تھا۔ سامنے ہی ساگوان کا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ موئل چند لمحوں تک اپنی سانسیں درست کرتا رہا پھر اس نے آہستہ سے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھمایا۔ ہینڈل گھوما اور دروازہ کھل گیا۔ اندر نیلگوں بلب کی مدھم روشنی تھی اور ٹماٹو کیچپ کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔

اچانک مجھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا سامنے کوریڈور سے ایک سرخ سوئٹر اور نیکر والا چوڑا چکلا شخص برآمد ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی صورت دیکھی اور ذہن میں بجتی ہوئی خطرے کی گھنٹی کی آواز کچھ اور بھی تیز ہو گئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بھگوڑا پولیس آفیسر جیکب ہارڈ تھا۔ اس کی خونخوار کارروائی میں کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے بریڈفورڈ کے نواح میں اپنے درجن بھر ساتھیوں کو پلک جھپکنے میں گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ یہی شخص ہماری یہاں "موجودگی" کا ذمے دار تھا...... مجھے دیکھتے ہی جیکب ہارڈ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ میں جست کر کے اس کے اوپر گرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس سے پہلے ہی موئل تڑپ کر میرے اور جیکب کے درمیان آ گیا۔

"رک جاؤ...... رک جاؤ......" وہ انگریزی میں بولا "یہ

دوست ہے۔" موئل نے دوست کا خطاب جیکب ہارڈ کو دیا تھا۔

اب جیکب نے بھی موئل کو دیکھ لیا تھا اور اس کے تنے ہوئے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ وہ اب ایک نئے انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔ موئل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جیکب اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ہم چاروں یکے بعد دیگرے کمرے میں گھس آئے۔ یہ بھی ایک شاندار اپارٹمنٹ تھا۔ خواب ناک روشنی میں خواب گاہ کا منظر باقی مناظر سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ ریشمی بستر کے سلکی لحاف کے اندر کوئی جسم کلبلا رہا تھا۔ وہ یقیناً نسوانی جسم تھا۔ خوبصورت بلوری تپائی پر بروسٹ چکن پیس، گول منول ڈنر رول، چائنز چاول کی ادھ کھائی پلیٹیں اور کولڈ ڈرنک سے نصف بھرے ہوئے گلاس نظر آ رہے تھے۔ لحاف کے اندر سے ایک سریلی آواز آئی۔ "اب آ بھی جاؤ ناں سویٹی! کیا کرتے پھر رہے ہو۔" اس کے ساتھ ہی ایک گورا چٹا ہاتھ لحاف سے باہر آ گیا۔ غالباً لحاف نشین عورت جیکب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اسے قریب کرنا چاہتی تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ کمرے کا نقشہ بدل چکا ہے۔

جیکب نے بیڈ کے پائے کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اٹھ جاؤ۔"

لحاف نشین پھر بھی نہیں سمجھی۔ لحاف کے اندر ہی سے بولی "کیسے سائرن تھے سویٹی؟"

"تیری ماں کے اسکرٹ میں آگ لگ گئی تھی اس لیے سائرن بجائے جا رہے تھے۔" جیکب ڈپٹ کر بولا اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور ٹھوکر بیڈ کو رسید کی۔

اس مرتبہ وہ اچھل کر بیٹھ گئی۔ لحاف اس نے بڑی مضبوطی سے اپنے سامنے تھام رکھا تھا اور اس سے پتا چلتا تھا کہ لڑکی اور ہماری نظروں کے درمیان سلکی لحاف کے سوا اور کچھ بھی نہیں...... ہاں وہ لڑکی ہی تھی۔ شکل و صورت اچھی تھی۔ بال گھنگھریالے تھے۔ آنکھیں ہلکی سبز تھیں۔ اس کا چہرہ لحاف کی حرارت اور اندرونی "تمازت" سے تمتمایا ہوا تھا۔ جیکب نے اسے فوراً اندرونی کمرے میں بھیج دیا۔ وہ لحاف اپنے گرد لپیٹتی ہوئی حیرانی کے عالم میں چلی گئی۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔" موئل نے انگلش میں جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جیکب کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ دونوں قریباً پانچ منٹ تک کھسر پھسر کرتے رہے۔ اس دوران میں بوب لڑکی ڈری سہمی کھڑی رہی۔ اس نے مخملی چادر کی گرہ کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ پانچ منٹ بعد جب موئل اور جیکب واپس آئے تو جیکب کا انداز دوستانہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ہم تینوں کو ایک چھوٹے سے کوریڈور میں سے گزار کر ایک مستطیل کمرے میں لے گیا۔ "یہ کمرا تم تینوں کے لیے ہر طرح محفوظ ہے۔ تم دروازے اندر سے بند رکھو۔ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ اس دوران میں کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر میکی سے بات کر لینا۔ میکی یہیں پر ہے۔" پھر وہ خاص طور سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں دوست...... امید ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیکب اپنے غیر معمولی طور پر چوڑے جبڑوں کو سہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں حالات کے تغیر پر حیران ہو رہا تھا۔ جیکب ہی وہ شخص تھا جو ہمیں پکڑ کر یہاں لایا تھا۔ اب وہ ہماری حفاظت کی ذمے داری قبول کر رہا تھا اور ہم اس کی پناہ میں تھے۔ یہ بات بالکل عیاں تھی کہ موئل سے جیکب کا گہرا تعلق تھا۔ یہ کیا تعلق تھا؟ ابھی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ موئل میرے عریاں بدن کے زخموں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ بہرحال وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کی بوکو کی کارستانی ہے۔

موئل نے سب سے پہلے تو بوب لڑکی کو لباس فراہم کیا۔ اس نے انٹرکام پر میکی نامی لڑکی کو بلایا اور اپنی ضروریات بیان کی۔ لڑکی شتابی سے ایک زنانہ لباس لے آئی۔ موئل کے کہے بغیر ہی وہ ایک مردانہ لباس بھی لے آئی تھی اور یہ میرے لیے تھا۔ لڑکی ہوشیار اور سمجھدار لگتی تھی۔ موئل نے بوب لڑکی کو باتھ روم میں دھکیل دیا تاکہ وہ لباس پہن سکے۔ اب موئل کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ میری بندشوں کو کھولنا تھا۔ یہ کوئی معمولی بندشیں نہیں تھیں۔ اسٹیل کی نہایت مضبوط زنجیریں تھیں اور جدید لاک تھے۔ وہ ایک مڑے تڑے تار کی مدد سے بہت دیر تک لاک سے الجھتا رہا پھر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔

میں نے کہا "زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ لاک بعد میں کھل جائیں گے۔ فی الحال یہ راز کھولو کہ تم یہاں کیسے پائے جا رہے ہو اور اس پولیس آفیسر سے تمہارا کیا تعلق ہے......؟"

موئل مسکرایا "میں جانتا ہوں کہ آپ کے دماغ میں بہت سے سوال کلبلا رہے ہوں گے۔ میرے دماغ میں بھی بہت سے سوال ہیں......"

"تو چلو...... پہلے تم ہی کچھ بتاؤ۔"

"میں سب کچھ بتاتا ہوں جناب۔ لیکن پہلے باہر والی

پریشانی تو دور ہو جائے۔ جیکب صاحب گئے ہیں۔ دیکھیں کیا خبر لے کر آتے ہیں۔"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ جیکب واپس آ گیا۔ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا "باہر تہلکہ مچا ہوا ہے۔ منوہرا دیوی غصے سے پاگل ہو رہی ہے۔ اس نے لاپروائی برتنے والے دو گارڈز کو شوٹ کر ڈالا ہے۔ بے شمار گارڈز اور رائفل مین چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور تم تینوں کی تلاش ہو رہی ہے۔"

ہمیں صورت حال کی صحیح تصویر دکھانے کے لیے جیکب نے ایک گوشے میں پڑا ہوا ٹی وی سیٹ آن کیا اور اسے کلوز سرکٹ نیوز چینل پر ٹیون کر دیا۔ ایک اناؤنسر اعلان کرنے والے انداز میں بول رہی تھی۔ "تمام یونٹ انچارجز کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے اپنے ایریا میں چپے چپے کی تلاشی لیں اور آپریشن روم سے مسلسل رابطہ رکھیں۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں نئی ہدایات طلب کریں۔ حکم ثانی تک اپنا کام تندہی سے جاری رکھیں...."

اس اناؤنسمنٹ کے فوراً بعد اسکرین پر موٹل اور بوب دوشیزہ کی تصویر دکھائی گئیں اور ساتھ ہی میری ایک پرانی تصویر بھی اسکرین پر ابھری۔ ایک نئے اناؤنسر نے اعلانیہ انداز میں کہا "یہ وہ تین افراد ہیں جو ہوسٹل کی زون نمبر دو سے فرار ہوئے ہیں۔ انتظامیہ کو ان کی فوری زندہ یا مردہ گرفتاری درکار ہے۔ تصویر نمبر ایک میں نظر آنے والے شخص کا نام موٹل ہے اور یہ زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد ہیں اور اس کے قبضے میں بھری ہوئی رائفل بھی ہے۔ تصویر نمبر تین میں نظر آنے والا شخص شاہ جہاں ہے۔ اس کی سفاکی اور خطرناکی کسی سے ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ لیکن فی الوقت اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ تصویر نمبر دو بوب لڑکی روبی کی ہے۔ عام بوب لڑکیوں کی طرح یہ زیادہ ذہین نہیں ہے۔ خود کو خطرے میں محسوس کر کے یہ اچانک حملہ کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ دوسروں کو یا خود کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے...."

اناؤنسمنٹ جاری تھی۔ میں اور موٹل ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ بوب لڑکی کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح بیٹھی تھی اور خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ موٹل نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے ایک کیلا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ چھیل کر کھانے لگی...

"کیا خیال ہے جیکب صاحب، تلاش کرنے والے یہاں بھی تو نہیں آ جائیں گے؟" موٹل نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں ادھر ادھر چلا جاؤں۔ میری غیر موجودگی میں وہ لوگ تلاشی لینے کی ہمت نہیں کریں گے۔"

"لیکن اس کا الٹا اثر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ یہاں موجود ہوں تو انہیں تلاشی سے روک سکیں۔"

"میرے خیال میں دوسرا طریقہ بہتر ہے۔ ہم روشنیاں وغیرہ بجھا جاتے ہیں۔ دروازے لاک کر دیتے ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں ہو گا تو تلاشی لینے والے آگے نکل جائیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟"

جیکب نے موٹل کی اس بات کا جواب اثبات میں دیا اور اسے کچھ ضروری ہدایات دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ بعد ہم کمرے کی تاریکی میں خاموش بیٹھے تھے۔ موٹل نے ایک ریفریجریٹر کا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ ریفریجریٹر کی روشنی میں ہم بس ایک دوسرے کی شکلیں سی دیکھ سکتے تھے۔ بوب لڑکی کے سامنے کھانا رکھا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعات کو یکسر فراموش کر کے کھانے میں جتی ہوئی تھی۔ میں نے اب تک کئی بوب لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن یہ ان میں سب سے خوبصورت تھی۔ اس کا جسم گداز تو تھا لیکن اسے فربہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ عام بردوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی کڑا تھا جس پر اس کا نمبر اور دیگر کوائف لکھے ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہ کس کی اولاد تھی۔ کہاں پیدا ہوئی تھی اور کن ہاتھوں سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ مقامی زبان میں اسے بوب دوشیزہ کہا جاتا تھا۔ کیا پتا وہ "دوشیزہ" تھی بھی یا نہیں۔ مادر پدر آزاد بردہ فروشوں کے درمیان گھری ہوئی دوشیزہ کتنی دیر دوشیزہ رہ سکتی تھی۔ لاری فیملی میں ان سفید فام لڑکیوں کی افزائش خاص مقاصد کے لیے کی جاتی تھی۔ انہیں بالکل تنہائی میں رکھ کر پالا پوسا جاتا تھا۔ ایک خاص ماحول میں رہنے کی وجہ سے ان میں انسانی رویے پرورش نہیں پاتے تھے۔ یہ بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ بس اظہار کے لیے اپنے حلق سے مختلف آوازیں نکالتی تھیں۔ "جنس" کے بارے میں بھی ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ اسی طرح وہ جذبے نفرت، محبت، حسد، ہمدردی وغیرہ بھی ان لڑکیوں سے کوسوں دور ہوتے تھے۔ ایک خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں قربان گاہ میں لٹا کر ذبح کر دیا جاتا تھا پھر دیگر رسوم کی ادائیگی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ رسم کب سے کیسے اور کیوں رائج ہوئی ہے۔

میں نے موٹل سے کہا "آج میری کوئی نیکی کام آئی

ہے۔ ورنہ جس طرح تم نے رائفل کا دستہ گھمایا تھا، میرے سر کے تین چار ٹکڑے تو ضرور ہو جاتے۔"

وہ رنجیدہ لہجے میں بولا "میرے ہاتھوں آپ کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو اپنے ہاتھ کاٹ کر بھی میں ساری عمر روتا ہی رہتا۔ شاید میری بھی کوئی نیکی کام آئی ہے کہ میں اتنے بڑے گناہ سے بچ گیا ہوں۔"

"جہاں تک میرا اندازہ ہے تم اس بوب لڑکی کی چیخیں سن کر بھڑکے تھے اور کمرے میں پہنچے تھے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں اس وقت ایک پاس کے کمرے میں ہی موجود تھا اور بے عزت ہو رہا تھا۔ شاید میں یہ بے عزتی بھی جھیل جاتا مگر روبی کی آہ و بکا نے مجھے حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا۔"

"بے عزت ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"اس نے منوہرا کو ایک موٹی گالی دی اور بولا" وہ بڑی خرانٹ عورت ہے۔ ایک طرح سے میں اور روبی دونوں اس کی حراست میں تھے۔ وہ ہم سے ایک معاملے کی تفتیش کر رہی تھی۔ پچھلے دو دن سے اس نے ہمیں اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ شروع میں تھوڑا سا نارمل رویہ بھی تھا۔ آج رات اس نے ہم دونوں کو ایک اپارٹمنٹ میں بلا لیا۔ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور روبی کو آپ کے پاس بھیج دیا۔ جس وقت روبی چیخیں مار رہی تھی میں اس کتیا کے بیڈروم میں تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے پلا رہی تھی اور کتیا ہی کی طرح منہ کو چاٹ رہی تھی...... سور کی بچی گندی نالی کی چھپکلی...." موٹل نے بے پناہ نفرت سے کہا۔ وہ شاندار اردو بولتا تھا لیکن لہجہ بالکل افریقی تھا۔

"تم کس معاملے میں پکڑے جانے کی بات کر رہے تھے؟"

"اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔"

"میں بالکل سننا چاہوں گا۔" میں نے کہا "لیکن پہلے مجھے ایک بات بتا دو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میرے کمرے میں روبی کی چیخیں کیوں بلند ہو رہی تھیں؟"

"میں جانتا ہوں آپ کس طرز کے شخص ہیں۔ کوئی ایسا برا خیال میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔" موٹل نے پورے یقین سے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے کہا "میں بھی تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں کہ روبی کیوں چیخ رہی تھی لیکن پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

موٹل نے ایک گہری سانس لے کر دیوار سے ٹیک لگائی۔

ہم دونوں قالین پر بیٹھے تھے۔ موٹل نے میرے عقب میں دو بڑے بڑے کشن رکھ دیے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں بدستور جکڑے ہوئے تھے۔ باہر سے کبھی کبھی اناؤنسمنٹ کی مدھم آواز آتی تھی۔ وہ گاہے گاہے سائرن بھی سنائی دیتا تھا۔ یہ آوازیں اس ہلچل کی عکاسی کر رہی تھیں جو ہمارے فرار کے بعد طول و عرض میں برپا تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس اپارٹمنٹ کے ارد گرد کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ نہ ہی بیرونی دروازے پر کوئی آہٹ ہوئی تھی۔ بس کامن روم میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی چند بار بجی تھی اور خاموش ہو گئی تھی۔ بوب لڑکی کھانا کھانے کے بعد صوفے پر بے ترتیب لیٹی تھی۔ جس طرح جانور کا پیٹ بھر جائے تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ لڑکی کی آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جسمانی کشش اور اپنے جوبن سے قطعی بے خبر تھی۔

موٹل نے کہا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کس جگہ موجود ہیں؟"

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ لندن کا قرب و جوار ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ ہم اس وقت لندن سے قریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا خیراتی ادارہ "دی ہوم" ہے۔ یہ بے سہارا افراد خاص طور سے بچوں اور جوانوں کی پناہ گاہ ہے۔"

"دی ہوم تو خاصا مشہور نام ہے۔" میں نے کہا "یہ ایک کمپلکس کی شکل میں ہے جس میں اسپتال...... ورکشاپ اور لنگر خانے وغیرہ موجود ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔" موٹل نے کہا "ہم اس وقت "دی ہوم" کے زیر زمین عمارات میں موجود ہیں۔ یہ سارا محل وقوع اور یہاں کا سارا انداز وہی ہے جو ماریشس میں تھا۔ وہاں بھی ایک بڑے خیراتی ادارے کی آڑ میں ایک گھناؤنا کاروبار چلایا جا رہا تھا۔ یہاں بھی ان لوگوں نے اپنے پنجے گاڑنے کے لیے ایک ایسے ہی رفاہی ادارے کو چنا ہے۔ "دی ہوم" کے کیمپس قریباً پانچ ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سارا رقبہ تو سنگ براؤن استعمال کرے گا ہی اس کے علاوہ بھی وہ ایک وسیع رقبہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ رقبہ زیر زمین ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ "دی ہوم" کے نیچے ایک وسیع و عریض علاقہ تیار کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ دنیا کے چند بڑے بیسمنٹ میں سے ایک ہو۔ اس کا رقبہ یقیناً "دی ہوم" کے بالائی رقبے سے زیادہ ہو گا۔ یہ سارا کام بڑی رازداری سے ہو رہا ہے۔ زمین کھودنے سے جو لاکھوں ٹن مٹی نکل رہی ہے۔ اسے بڑی تکنیک کے ساتھ ایک

سرنگ کے ذریعے سمندر کے پانی میں ملا دیا جاتا ہے۔''

''کیا ہم اب اس بیسمنٹ میں موجود ہیں؟'' میں نے مولی سے پوچھا۔

''نہیں جناب.... وہاں تک رسائی آسان نہیں ہے۔ انتظامیہ کے بہت قابل اعتماد لوگ ہی وہاں تک پہنچ پاتے ہیں۔ وہاں وہ سیکڑوں لوگ مشقت کر رہے ہیں جنہیں ''بردوں'' کی حیثیت سے یہاں پہنچایا جاتا ہے۔ ہم جہاں موجود ہیں یہ جگہ حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے لیکن اس کا تعلق بڑے بیسمنٹ سے نہیں ہے۔ جب بڑا بیسمنٹ مکمل ہو جائے گا تو یہ جگہ دوسرے کاموں کے لیے استعمال ہوگی۔''

''حیرانی کی بات یہ ہے کہ ''وی ہوم'' جیسا نیک نام ادارہ اس کام میں ملوث ہو گیا ہے۔''

''ضرور اس کے پیچھے بھی کوئی سازش ہوگی جناب۔'' مولی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تم یہاں تک کیسے پہنچے ہو.... اور جیکب ہارڈ سے تمہارا تعلق کیسے بنا؟'' میں نے مولی سے دریافت کیا۔

اس سے پہلے کہ مولی جواب دیتا۔ بوب لڑکی چیخ کر اٹھ بیٹھی اور وحشی ہرنی کی طرح خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ مولی نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اڑنگا لگا کر صوفے پر گرا دیا۔ وہ کچھ دیر تک اسی طرح دبوچے بیٹھا رہا۔ لڑکی قدرے پرسکون ہوگئی تو مولی نے پیار سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا بالکل جیسے پالتو جانور کو سہلایا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد مولی نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور کھانے کے لیے ایک کیلا اسے دیا۔ کچھ پس و پیش کے بعد اس نے کیلا مولی کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ لرزتے ہاتھوں سے کیلا چھیلنے لگی۔ اس کی معصومیت قابل دید تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ کچھ ٹیڑھا سا لگ رہا ہے اور ٹھیک سے کام بھی نہیں کر رہا۔ یہی ہاتھ تھا جسے بے رحمی سے دبا کر میں نے اس بوب لڑکی کو چیخنے چلانے پر مجبور کیا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ لڑکی کے چیخنے چلانے کا نتیجہ مولی کی آمد کی صورت میں نکلے گا۔ میں تو لڑکی سے جان چھڑانے کے لیے ایک بہانہ تراش رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ سوتے میں ڈر گئی ہے۔'' مولی نے کہا۔

''سو جائے تو بہتر ہے۔ کہیں چیخنے چلانے لگی تو مصیبت پڑ جائے گی۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

قرب و جوار میں ہلچل کے آثار اب بھی محسوس ہو رہے تھے۔ گاہے گاہے گارڈز کی سیٹیاں سنائی دیتی تھیں۔ اس تشویشناک صورت حال کے باوجود مولی کی آنکھوں کی مسکراتی چمک برقرار تھی۔ بڑی پراسرار آنکھیں تھیں یہ.... اور ان آنکھوں پر ہی کیا موقوف وہ سرتاپا پراسرار تھا۔ وہ جس طرح اردو بول رہا تھا کانوں پر یقین نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ اردو اس نے سالوں یا مہینوں میں نہیں ہفتوں میں سیکھی تھی۔ وہ بہت دور کی آوازیں سن لیتا تھا اور بہت فاصلے سے خوشبوئیں سونگھ لیتا تھا۔ اس کا حافظہ کمپیوٹر کی طرح بے مثال تھا۔ طویل قامت لڑکی مونا کی طرح مولی بھی ''آنکھوں کا جادوگر'' تھا۔ مونا حیوانات کے ذہنوں پر اثر رکھتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہی صلاحیت مولی میں بھی کسی نہ کسی درجے میں موجود تھی۔

بوب لڑکی و دوبی کی پلکیں ایک بار پھر بوجھل ہونے لگی تھیں۔ ہماری گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ میں نے پوچھا ''ہاں.... تو تم یہاں کیسے پہنچے؟ اور جیکب ہارڈ سے تمہارا تعلق کیسے بنا؟''

مولی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''ماریا ٹرسٹ کے خاتمے کے بعد وہاں تفتیش کرنے والی کئی ٹیمیں آئی تھیں۔ یہ ٹیمیں اپنے اپنے ملک کے شہریوں کو وصول کرتی تھیں اور یہ تحقیق بھی کرتی تھیں کہ ان کے شہری ماریا ٹرسٹ کے جال میں کیسے پھنسے۔ یہ آفیسر جیکب بھی ایک ایسی ہی ٹیم کے ساتھ یہاں سے ماریطانیہ پہنچا تھا۔ یہ ماریا ٹرسٹ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ یہ لوگ اردگرد کے علاقے میں دورے لگاتے رہتے تھے اور مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے تھے۔ انہی دنوں جیکب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جیکب ایک بہت سخت دل اور تشدد کرنے والا شخص تھا۔ اس کے علاوہ یہ عیش پرست بھی ہے۔ اس نے شادی نہیں کی اور رنگین عورتوں کے ساتھ رہنا اسے اچھا لگتا ہے۔ ایک موقع پر جیکب نے ایک قبائلی سے مار پیٹ کی۔ قبائلی غصے میں آ گئے اور جیکب کو پکڑ لیا۔ اس موقع پر میں نے جیکب کی جان بھی بچائی لیکن میری اور اس کی دوستی کی وجہ یہ نہیں کہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ یہ ایسے احسانوں کو یاد رکھنے والا بندہ نہیں ہے۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ مجھ میں پیدائشی طور پر کچھ خاص صلاحیتیں موجود ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں کوئی بھی زبان چند دنوں میں سیکھ لیتا ہوں اور بول بھی سکتا ہوں۔ بس یہی میری اور اس کی دوستی کی وجہ ہے۔ شاید یہ کسی خاص وقت میں مجھ سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے۔''

''لیکن تم اس کے ساتھ ماریطانیہ سے یہاں کیسے پہنچے؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں....'' مولی نے کہا

''ان دنوں جیکب ماریا ٹرسٹ میں رہ رہا تھا اس نے مجھے بتایا کہ وہ میری زندگی کو کیا سے کیا بنا سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں دنیا میں جنت کا مزا پانا چاہتا ہوں تو تیار ہو جاؤں۔ عنقریب وہ مجھے انگلینڈ بلا لے گا اور ایک بہت ہی خاص بات ہے گا.... اس کے چند روز بعد جیکب اپنی ٹیم کے ساتھ واپس انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے یہ ساری بات کانوس میں جا کر مرد و ویلیں سائیں عالی کو بتائی تھی۔ سائیں عالی نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اگر مجھے جیکب کی طرف سے بلاوا آئے تو میں جیکب کے ملک چلا جاؤں۔ دو تین مہینے تک تو کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ پھر ایک روز ایک انگریز مجھ سے ملا اس کے پاس چند آدمیوں کی فہرست تھی۔ یہ وہ بندے تھے جنہیں آفیسر جیکب نے اپنے پاس انگلینڈ بلایا تھا۔ ان میں میرا نام بھی تھا۔ قریباً چار مہینے پہلے میں ''انگلینڈ'' جیکب کے پاس پہنچا جیکب نے فوری طور پر مجھے ایک ورکشاپ میں داخل کرا دیا۔ یہاں مجھے پینٹر کا کام سیکھنا تھا۔ میں نے یہ کام صرف ایک مہینے میں ہی بہت اچھی طرح سیکھ لیا۔ انگریزی پہلے بھی مجھے آتی تھی اب میں روانی سے بولنے لگا۔ ایک دن جیکب نے مجھ سے کہا ''دنیا میں جنت کے مزے لینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں جنت میں بھیج رہا ہوں۔ چند دن بعد میں خود بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس سے اگلے روز میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور مجھے چند افراد کے ساتھ ایک بند گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ ان دیگر افراد کی آنکھوں پر بھی سیاہ پٹیاں بندھی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ ہم لندن سے روانہ ہوئے اور ایک لمبے سفر کے بعد یہاں پہنچ گئے۔ پہلے کئی دنوں تک تو مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کہ میں ایک زمین دوز عمارت میں ہوں۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے کاریگروں کی ایک ٹولی میں شامل کر دیا گیا۔ یہاں سے قریباً دو فرلانگ کی دوری پر پانی اور گیس کے دو بڑے پلانٹ بنائے گئے ہیں۔ ان پلانٹس سے نئے بیسمنٹ تک پائپ بچھانے کا کام ہو رہا تھا۔ یہ کام اب بھی جاری ہے۔ بڑی بڑی جدید طرز کی مشینیں یہاں موجود ہیں۔ درجنوں کاریگر بھی کام کر رہے ہیں۔ ہر شفٹ میں کم از کم دو سو کاریگر ہوتے ہیں۔ کام سخت ضرور ہے لیکن رہائش اور کھانے پینے کی بہترین سہولتیں حاصل ہیں۔ یہ سہولتیں تو لندن کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی نہیں ہوں گی۔''

مولی نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولا ''بہترین انگلش اور کرنسی وغیرہ بھی یہاں موجود ہیں.... ہمارے ویلفیئر سینٹر میں ایسی فلمیں بھی چلتی رہتی ہیں جو ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچیں ہوں گی۔ تفریح کے لیے بہترین کلب اور ان ڈور کھیل ہیں۔ یہاں کسی کے لیے بھی خوبصورت عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ٹی وی، سینما، آڈیو وڈیو سسٹم، غرض کوئی ایسی جدید سہولت نہیں جو یہاں موجود نہ ہو۔ چند روز پہلے جیکب بھی وعدے کے مطابق یہاں پہنچ گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کا ایک ماتحت بھی ہے۔ وہ بھی یہاں خوب عیش کر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ اپنے ساتھ کسی اہم شخص کو پکڑ کر لائے ہیں۔''

''وہ اہم شخص تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔'' میں نے مولی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مولی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا ''.... لیکن یہ ہوا کیسے؟'' مولی کی حیرت برقرار تھی۔

میں نے کہا ''یہ تفصیل میں اپنی روداد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنی کتھا جاری رکھو.... ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کس معاملے میں پھنس کر منوہرا دیوی کی حراست میں پہنچے تھے....؟''

''یہ معاملہ تو آپ کے سامنے لیٹا ہوا ہے۔'' مولی صوفے پر دراز بوب لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ لڑکی اس کمپنی کے ڈائریکٹر صاحب کے لیے یہاں لائی گئی تھی جو یہاں کا تعمیراتی کام کروا رہا ہے۔ اس امریکن ڈائریکٹر کو ہم یہاں کمانڈر صاحب کہتے ہیں۔ یہ لڑکی کچھ دن دوز کمانڈر صاحب کے پاس رہی.... پھر ایک ماتحت سول انجینئر مسٹر ہوب کے پاس آ گئی۔ میں نے اسے ایک دو دفعہ مسٹر ہوب کے ساتھ دیکھا۔ وہیں پر اس کے ساتھ میری آنکھیں ملیں یہ مجھے اچھی لگنے لگی۔ شاید میں بھی اسے اچھا لگنے لگا....''

''اس میں ''شاید'' والی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''لڑکی تمہیں دیکھے اور تم پر لٹو نہ ہو، یہ بڑی انوکھی بات ہوگی۔''

مولی نے دانت نکال کر انکساری کا اظہار کیا پھر کھنکار کر بولا ''یہاں کی انتظامیہ نے کچھ اصول وغیرہ بنا رکھے ہیں۔ تعمیراتی کام کرنے والے سارے لوگ ہوسٹل کے ایک ہی حصے میں رہتے ہیں لیکن ماتحتوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے افسروں والے رہائشی حصے کی طرف جائیں۔ میں سول انجینئر ہوب صاحب کا ماتحت تھا۔ مگر روبی کو دیکھنے کی خاطر مجھے بار بار یہاں کے اصول کو توڑنا پڑ رہا تھا۔ دو دن پہلے رات کے وقت میں روبی سے ملنے ہوب صاحب کی رہائش گاہ

پر پہنچا۔ ہوب صاحب کی ڈیوٹی رات کی تھی۔ وہ جاتے ہوئے روحی کو گھر کے اندر لاک کر جاتے تھے۔ میں بیرونی دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گارڈز کے ہاتھوں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ بس وہ رات ہی شاید خراب تھی۔ مجھے اور روحی دونوں کو پکڑ لیا گیا۔ مجھ پر شک بھی کیا گیا کہ میں انجینئر صاحب کے اپارٹمنٹ سے کچھ چرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پہلے زون کا انچارج مجھ سے خود تفتیش کرتا رہا...... وہ حیران تھا کہ میں اتنی اچھی انگریزی کیسے بول لیتا ہوں میری انگریزی کی وجہ سے وہ کچھ اور الجھ گیا تھا۔ اس خبیث نے مجھے مار بارٹسٹ کے آس پاس بھی نہیں دیکھا تھا۔ میری صورت اسے جانی پہچانی لگتی تھی۔ آخر اس نے مجھے مزید تحقیق کے لیے منوہرا دیوی کے حوالے کر دیا۔ روحی بھی میرے ساتھ ہی وہاں گئی۔ وہاں شروع میں تو مجھے کافی مارا پیٹا گیا تھا۔ لیکن پھر ان لوگوں کا رویہ بدل گیا۔"

موبل نے چند لمحے توقف کر کے خوابیدہ روحی کا جائزہ لیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "منوہرا دیوی کل سے ہی مجھے بھید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل آتش فشاں عورت ہے۔ رات کے کھانے کے فوراً بعد مجھے بتا دیا گیا تھا کہ منوہرا دیوی نے مجھے اپنے چیمبر میں طلب کیا ہے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد پتا چلا کہ روحی بھی میرے ساتھ جائے گی۔ روحی کے بلائے جانے سے میری تشویش اور بڑھ گئی...... جس وقت ہم گارڈز کے نرغے میں منوہرا دیوی کے پاس پہنچے وہ کسی ساتھ والے کمرے میں جوڑوں اور لڑکوں کا رقص دیکھ رہی تھی۔ منوہرا دیوی کے چیمبر میں پہنچتے ہی روحی کو مجھ سے علیحدہ کر دیا گیا اور مجھے نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے گئے۔ تھوڑی دیر بعد منوہرا دیوی بھی آ گئی۔ وہ نشے میں بالکل دھت ہو رہی تھی۔ اس کا گاؤن آگے سے کھلا ہوا تھا اور تقریباً سارا جسم نظر آ رہا تھا۔ وہ آتے کے ساتھ ہی میرے ساتھ بستر پر لیٹ گئی وہیں لیٹے لیٹے اس نے دو بار انٹرکام پر کسی سے بات کی۔ وہ بولی "کیا کر رہے ہو میرے ہیرو؟" پھر دوسری طرف سے جواب سن کر بولی "میں نے تمہیں اداس ہونے کے لیے نہیں خوش ہونے کے لیے بھیجا ہے۔ اور کم از کم آج کی رات تو میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس وقت میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ کتیا جس شخص سے بات کر رہی ہے وہ آپ تھے۔"

کچھ ہی دیر بعد روحی کی چیخیں میرے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ہم آپ کے کمرے سے کافی دور ایک بند کمرے میں موجود تھے۔ کمرے میں زور و شور سے میوزک بھی لگا ہوا تھا اس کے باوجود میں روحی کی آہ و بکا سننے میں کامیاب رہا۔ شاید اس وقت روحی ایک میل دور بھی ہوتی تو میں اس کی آواز سن لیتا۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کسی خاص موقعے پر کچھ خاص آوازیں میں بہت دور سے سن لیتا ہوں۔ روحی کی پکار سن کر میرے لیے خود پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ کئی دن سے جو لاوا میرے اندر پک رہا تھا پھوٹ کر باہر نکل آیا۔ میں نے پھل کاٹنے والی چھری کا وار کر کے منوہرا کو زخمی کیا، دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل آیا۔ یہاں میں نے ایک گارڈ کو پوری طاقت کے ساتھ دیوار سے دے مارا اور اس کی رائفل چھین کر اس دروازے کی طرف دوڑا جس کے پیچھے سے روحی کی چیخیں ابھر رہی تھیں۔ بعد کے واقعات آپ کو معلوم ہی ہیں......"

...... موبل کی طویل روئیداد اختتام کو پہنچی تو میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔ میں نے صرف چند واقعات ہی تفصیل سے بیان کیے۔ باقی کو حذف کر دیا یا مختصراً بیان کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے دوست جیکب ہارڈ نے کس طرح ایک درجن ساتھیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے انہیں موت کی نیند سلا دیا اور پھر مجھے میرے تین ساتھیوں سمیت یہاں لے آیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھی علی احمد کی دردناک موت کے بارے میں بھی بتایا۔ آخر میں میں نے اپنا اور بوب لڑکی روحی کا ذکر کیا اور اسے آگاہ کیا کہ میں نے بیڈروم میں روحی کو گولی چلانے پر کیسے اور کیوں مجبور کیا تھا۔

موبل نے تعجب اور دلچسپی کے ساتھ میری ساری کہانی سنی۔ اس نے پرانے ساتھیوں کے بارے میں بھی پوچھا۔ یہ جان کر اسے بھی افسوس ہوا کہ صفدر کی آنکھیں ٹھیک نہیں ہو سکیں۔ موبل نے مجھ سے سائیں عالی اور سروج کے متعلق بھی کچھ سوالات کیے۔ (کالونی میں موبل اور سروج کا عشق زوروں پر رہا تھا)۔ موبل زریں کے بارے میں بھی تفصیل سے جاننا چاہتا تھا۔ موبل کی افریقی لہجے کی اردو "بتانے" کی نہیں سننے کی چیز تھی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہماری فکرمندی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب یہ بات تقریباً یقینی محسوس ہونے لگی تھی کہ تلاشی لینے والے اس اپارٹمنٹ میں نہیں پہنچیں گے اور ہم یہاں محفوظ رہیں گے۔ اپارٹمنٹ سے باہر جو ہلچل ہو رہی تھی وہ بھی اب کچھ کم ہو گئی تھی۔ روحی دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہی تھی۔ موبل نے اس کا نیچے لٹکتا ہوا بازو آرام سے اٹھا کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ روحی کی گردن پر چند روز پرانے زخم کا نشان تھا۔ ایسا ہی ایک نشان اس کی پیشانی پر بھی دکھائی دے رہا

تھا۔ میں نے اس کے عریاں جسم کو غور سے نہیں دیکھا تھا ممکن تھا کہ تشدد کے ایسے ہی نشان مزید بھی ہوں۔ موبل کے بیان کے مطابق وہ یہاں کے سب سے "بڑے ٹھیکیدار" کے پاس تین روز تک رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس شخص نے صرف مہمان نوازی کے لیے تو اسے نہیں بلایا تھا۔ اس نے مطلب برآری کی کوشش کی ہو گی اور بوب روحی نے شدید مزاحمت بھی کی ہو گی۔ نتیجے میں اس کے ساتھ سختی کی گئی تھی اور یقیناً یہ غیر معمولی سختی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روحی سہم سمٹ کر رہ گئی تھی اور تو اور وہ چیخنا چلانا بھی بھول گئی تھی۔ منوہرا کے اپارٹمنٹ میں اسے چیخنے پر مجبور کرنے کے لیے مجھے اس کا ہاتھ بے رحمی سے کچلنا پڑا تھا۔

وال کلاک اب رات تین بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ ابھی تک جیکب اور اس کی گرل فرینڈ میگی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں کئی طرح کے خدشات بھی سر ابھار رہے تھے۔ کم از کم میرے نزدیک تو جیکب ہارڈ ایک قابل بھروسا شخص نہیں تھا۔

میں نے موبل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تمہاری روئیداد میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جیکب کو یہاں کافی اثر و رسوخ حاصل ہے۔ اس نے روحی والے معاملے میں تمہاری مدد کیوں نہیں کی اور کیوں تمہیں منوہرا دیوی کی تحویل میں جانے دیا۔"

"دراصل یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں جیکب ہارڈ کی مدد سے یہاں کے ورکروں میں بھرتی ہوا ہوں۔ جیکب نہیں چاہتا تھا کہ میرا اور اس کا تعلق واضح ہو۔ جیکب کے یہاں آنے کے بعد ایک دو بار اس سے میری ملاقات ہوئی ہے لیکن ہم ایسے ہی ملے ہیں جیسے پہلے ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید جیکب کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہو اور وہ آگے چل کر مجھ سے کوئی کام لینا چاہتا ہو...... حقیقت یہی ہے کہ جیکب ہارڈ بہت گہرا شخص ہے۔ کسی کو دل سے اپنا ماننا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ بس اپنی اسی خواہش سے اس کی وفاداری ہے۔"

ہم دس پندرہ منٹ مزید گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران مجھے بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ دروازے میں آہستگی سے چابی گھمائی گئی اور پھر کوئی اندر آ گیا۔ اپارٹمنٹ کی لائٹس روشن ہو گئیں۔ "یہ جیکب اور میگی ہیں۔" موبل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

میرے کانوں تک کوئی آواز نہیں پہنچی تھی مگر موبل نے آہٹوں اور مدھم آوازوں سے اندازہ لگا لیا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد جیکب اندر آ گیا۔ وہ میری طرف بڑی پرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ انگریزی میں کہنے لگا "شاہ جہاں! تمہاری گمشدگی نے تو تہلکہ مچا دیا ہے۔ منوہرا دیوی پورے ہوسٹل میں تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کرتی پھر رہی ہیں۔ کلوز سرکٹ ٹی وی پر تمہیں خطرناک ترین شخص قرار دیا جا رہا ہے اور تمہیں پکڑنے والے کے لیے بہت بڑے انعام کا اعلان کیا جانے والا ہے...... میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ شاید تم یہاں بھی محفوظ نہ رہ سکو۔ مجھے یقین ہے کہ گارڈز تمہیں چپے چپے پر تلاش کریں گے اور اہم ترین جگہوں کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ابھی کچھ دیر پہلے گارڈز نے سرجن والٹن کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی ہے۔ میری طرح اس کی حیثیت بھی وی آئی پی کی تھی۔"

"اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟" موبل نے جیکب سے پوچھا۔

"مجھے صبح تک سوچنے دو۔ اس دوران میں تم اس کمرے سے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔"

"شاہ جہاں صاحب کے ہاتھ کھولنے کے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے؟" موبل نے جیکب سے پوچھا۔

"ہاں...... یہ دو کٹر میں لایا ہوں۔ ان سے کوشش کرتے رہو۔ شاید بات بن جائے۔" جیکب نے اپنے کوٹ کی جیب سے لوہا کاٹنے والے دو بلیڈ نکالے اور موبل کے حوالے کر دیے۔ بلیڈ اچھی کوالٹی کے تھے لیکن جس لوہے نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ رکھے تھے وہ بھی اچھی... کوالٹی کا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ دو تین دن میں یہ بلیڈ ایک زنجیر کاٹ سکیں گے۔ بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔

موبل کو بلیڈ دے کر جیکب واپسی کے لیے مڑا لیکن پھر رک گیا۔ موبل سے مخاطب ہو کر بولا "میرے بعد کال بیل تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔ دروازے پر کوئی نہیں آیا...... ہاں فون کی گھنٹی دو چار مرتبہ بجی تھی۔"

جیکب نے اپنا بھاری بھرکم سر اثبات میں ہلایا اور باہر نکل گیا۔ وہ واقعی پریشان لگ رہا تھا۔ ابھی تک تو اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ ہم قریباً پانچ گھنٹے سوئے اور دن دس بجے کے قریب اٹھ گئے...... میری آنکھ ایک آواز کی وجہ سے کھلی تھی۔ کوئی میرے

عقب میں موجود تھا اور میری الٹی ہتھکڑی کو حرکت دے رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ سوئل تھا۔ وہ میرے جاگنے سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ اور اس نے بلیڈ کے ذریعے میری ہتھکڑی پر کام شروع کر دیا تھا۔ بلیڈ اور اسٹیل کی رگڑ سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بتا رہی تھی کہ اسٹیل کافی سخت ہے اور اسے کاٹنے کے لیے بہت محنت کرنا پڑے گی۔

بوب لڑکی بھی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ واش روم سے ہو آئی تھی۔ اب اسے بھوک لگی تھی اور وہ کسی بھوکی بکری کی طرح ٹکر ٹکر ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران میں جیکب بھی آ گیا۔ اس نے سوئل کو میری ہتھکڑی کاٹتے دیکھا تو فوراً منع کر دیا۔ سوئل تعجب سے جیکب کی طرف دیکھنے لگا۔ جیکب بولا "میری رائے ہے کہ پہلے پاؤں کی بندش کاٹی جائے۔"

"اس کی وجہ؟" سوئل نے پوچھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے۔" جیکب نے کہا۔ وہ باہر گیا اور باہر کی ایک جنگلہ دار سیڑھی اٹھا لایا۔

"یہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

جیکب نے سیڑھی ایک دیوار کے ساتھ لگائی اور اوپر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار کی "چپن شیٹ" کو ایک جگہ سے حرکت دی اور کمرے کے اندر ہی ایک مستطیل خانہ نظر آنے لگا۔ یہ قریباً دس فٹ ضرب بارہ فٹ کی ایک گیلری تھی اور اپارٹمنٹ کے اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی چھت کی بلندی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں گیلری کا معائنہ کرانے کے بعد جیکب نے گیلری کا راستہ پھر بند کر دیا۔ تاہم سیڑھی وہیں لگی رہنے دی۔ ہم سے مخاطب ہو کر بولا "اگر کسی وقت کوئی نازک صورت حال پیدا ہو تو تم دونوں اس سیڑھی کے ذریعے گیلری میں چلے جانا اور سیڑھی بھی اوپر کھینچ لینا۔ مجھے امید ہے کہ یہ گیلری تمہارے لیے اس کمرے سے زیادہ محفوظ ثابت ہو گی..... ہو سکتا ہے کہ تلاشی لینے والوں کا دھیان ہی گیلری کی طرف نہ جائے۔ یا پھر سیڑھی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اوپر جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیں۔"

"خدا کرے تلاشی کی نوبت ہی نہ آئے....." میں نے کہا۔

"امید پر دنیا قائم ہے۔" جیکب مسکرایا اور اس کے چوڑے جبڑے پیچھے اور بھی چوڑے نظر آنے لگے۔ یہ بات اب سمجھ میں آ رہی تھی کہ جیکب پہلے پاؤں کی بندش کاٹنے کے لیے کیوں کہہ رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ بوقت ضرورت میں تو سیڑھی چڑھ سکوں۔

جیکب کی گرل فرینڈ میگی نے ہمارے لیے پُرتکلف ناشتا تیار کیا تھا۔ وہ خوبصورت اور ذہین تھی لیکن جیکب کی شعلہ مزاجی کی وجہ سے کچھ دبی دبی نظر آتی تھی۔ اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ رائے بعد میں دیتی ہے پہلے اس سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات کافی پرانے ہیں اور وہ ایک دوسرے پر کافی اعتبار کرتے ہیں۔ میگی کے بارے میں ابھی تک بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ دندان ساز ہے اور ہوسٹل میں کام کرنے والے طبی عملے میں شامل ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میگی اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جیکب کو دوپہر کے وقت جانا تھا۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے جیکب کو یہاں کوئی اہم ذمے داری سونپی جانے والی تھی۔ فی الحال وہ سیکورٹی کے دو اعلیٰ افسروں کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ جب جی چاہے آتا تھا جب جی چاہے چلا جاتا تھا۔ میں نے جیکب سے کہا "میں اپنے ساتھی زریں گل اور پاشا کے لیے پریشان ہوں۔ خاص طور سے زریں کے حوالے سے مجھے خوف ہے۔ وہ غصے میں آ کر کسی بھی وقت اپنا اور دوسروں کا نقصان کر سکتا ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اس کا پتا کرواتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔" جیکب نے بھی مجھے تسلی دی۔

ہمیں کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد جیکب نے ہمیں کمرے میں مقفل کیا اور باہر چلا گیا۔

فرصت ملتے ہی سوئل نے بڑی تندہی سے میرے پاؤں کی بیڑی پر بلیڈ چلانا شروع کر دیا..... اگلے دو گھنٹے میں وہ ایک سیکنڈ رکے بغیر کام کرتا رہا۔ وہ تقریباً دو ملی میٹر کا کٹ لگانے میں کامیاب رہا۔ اس کی رفتار اور تندہی دیکھ کر امید پیدا ہوئی کہ وہ شاید آج رات تک میری بیڑی کاٹنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ہم نے دھیمی آواز میں ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ رات والے واقعے کی بازگشت بہت بلند تھی اور ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ سیکورٹی گارڈز کے اعلیٰ افسران کی ایک میٹنگ دکھائی گئی۔ پھر ایک جگہ چند درجن گارڈز کو اپنے افسر سے تلاشی کے بارے میں ہدایات لیتے دکھایا گیا۔ یہ افسر جیکب ہی تھا۔ وہ تلاشی کے سلسلے میں بہت "پُرعزم" نظر آ رہا تھا اور اس یقین کا اظہار کر رہا تھا کہ اگر مفرور افراد ہوسٹل کی حدود میں ہی ہیں تو اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔" گارڈز کے تین گروپس کی تلاشی کے لیے تین ایریاز دیے گئے تھے اور ہر گروپ کا انچارج مقرر کر دیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ

جن لوگوں کو چپے چپے پر تلاش کروانا چاہتا ہے وہ اس کے اپنے ہی گھر کی اپارٹمنٹ میں چھپے ہوئے ہیں۔

جیکب کی گفتگو میں ہم نے ایک اور بات نوٹ کی۔ وہ اس امکان کا اظہار بھی کر رہا تھا کہ مفرور افراد ہوسٹل کی حدود سے باہر جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے اس نے دو تین دلیلیں بھی پیش کیں۔ جیکب کا یہ نکتہ سراسر ہماری "فیور" میں تھا۔ وہ جیسا بھی تھا فی الوقت ہمارے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا اور ہمارے حق میں کام کر رہا تھا..... اور یہ سب کچھ سوئل کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا تھا۔

جیکب کی واپسی شام کے بعد ہوئی۔ وہ آج قدرے مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ غالباً اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ بلا ٹل گئی ہے اور اس کے گھر کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔ میں نے سب سے پہلا سوال اس سے زریں گل کے بارے میں کیا۔ میرے سوال کے جواب میں جیکب بولا "تمہارا دوست ابھی تک تو خیریت سے ہے۔ ہاں اس کی حفاظت کا انتظام بہت سخت کر دیا گیا ہے۔ لاک اپ کے آس پاس کے ایریا کو بھی گارڈز نے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ میں اسے خود دیکھ کر آیا ہوں، مجھے تو وہ نارمل ہی نظر آ رہا تھا۔"

"وہ نارمل نہیں ہو گا۔ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ تم انتظامیہ کا حصہ ہو۔ تم لوگوں کو زریں کی طرف سے بہت محتاط رہنا ہو گا۔ یہ بات میں زریں کے ساتھ ساتھ تمہاری بھلائی کے لیے بھی کہہ رہا ہوں۔"

ہم کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ جیکب نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور میرے زخموں پر لگانے کے لیے ایک اچھی اینٹی بائیوٹیک دوا لے آیا تھا۔ ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہونے کی وجہ سے میں قمیص پہن نہیں سکا تھا۔ یہ ابھی تک ایک چادر کی طرح میرے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ سوئل نے قمیص ہٹا کر دوا میرے جسم پر لگائی اور قمیص پھر پہلے کی طرح لپیٹ دی۔ اس آئنٹمنٹ کے لگانے سے مجھے کافی سکون محسوس ہوا۔ میری زخمی انگلی کی حالت بھی اب قدرے بہتر تھی۔

رات بوب لڑکی روٹی حسب سابق جلد ہی سو گئی۔ میں اور سوئل قالین پر بیٹھے رہے اور باتوں میں مصروف رہے۔ کمرے کی فضا نیم گرم تھی اور سکون دے رہی تھی۔ گفتگو کے دوران میں بھی سوئل کا ایک ہاتھ بدستور میرے پاؤں کی زنجیر پر حرکت کر رہا تھا۔ لوہا کاٹنے والے بلیڈ سے وہ زنجیر کے حلقے کا تین چوتھائی حصہ کاٹ چکا تھا۔ امید تھی کہ وہ آج یہ کام کر کے ہی سوئے گا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھالے سے پڑ گئے تھے لیکن اسے مطلق پروا نہیں تھی۔

وہ بولا "شاہ جہاں صاحب! غزالہ صاحبہ کی صورت آج بھی میری نگاہوں میں گھومتی رہتی ہے۔ بہت اچھی ڈاکٹر ہی نہیں اچھی انسان بھی ہیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ وہ آپ سے بے حد محبت بھی کرتی ہیں۔ کالونی میں، میں جب بھی آپ دونوں کو دیکھتا تھا میرے دل میں خود بخود یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ آپ دونوں کی دوری دور ہو جائے۔ بہت جستجو کے باوجود مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ آپ دونوں کس وجہ سے دور ہیں اور نہ ہی مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کوئی نہ کوئی وجہ ہے ضرور۔"

"وجہ یہی ہے کہ ابھی قدرت کو منظور نہیں ہے۔ قدرت نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کر دکھا ہے۔ شاید ایسا وقت بھی آ جائے..... لیکن یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔ اگر اس حوالے سے کچھ ہے تو بالکل یکطرفہ ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

سوئل بولا "آپ مجھ سے نہیں چھپا سکتے۔ جس طرح میں بہت دور کی صدائیں سنتا ہوں۔ اسی طرح کبھی کبھی مجھے سب چہرے بھی آئینے کی طرح نظر آتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ان کے اندر جھانک رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ بھی غزالہ صاحبہ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی وہ آپ سے کرتی ہیں....."

"اگر تم لوگوں کے اندر جھانک لیتے ہو تو پھر یہ بھی معلوم کر لو کہ ہماری دوری کی کیا وجہ ہے؟"

"میں سب کچھ تو نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی ہر وقت دیکھ سکتا ہوں۔ ایسی کیفیت ہفتوں مہینوں بلکہ برسوں پر بس کبھی کبھی ہی طاری ہوتی ہے۔ کچھ کی کیفیت واضح ہوتی ہے، کچھ کی بالکل موہوم....."

"پچھلے ایک دو دنوں میں ایسی کیفیت تم پر طاری نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" سوئل نے مختصر جواب دیا پھر ہوشیاری سے بولا "آپ بات کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔ میں آپ سے آپ دونوں کی دوری کی وجہ پوچھ رہا تھا۔"

"ضروری تو نہیں ہوتا کہ ہر صورت حال کی کوئی وجہ بھی ہو۔ شاید کچھ محبتیں ایسی ہوتی ہیں جو دور رہ کر ہی مضبوط اور مستحکم رہتی ہیں۔"

"آپ فلسفیوں اور گیانیوں کی طرح الجھاؤ والی بات کر رہے ہیں..... آپ مجھ سے سیدھی بات کریں گے تو ہی میری سمجھ میں آئے گی..... اور اگر اس سلسلے میں، میں ناچیز آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو دیوتاؤں کے لیے مجھے بتائیے۔

میری جان بھی حاضر ہے۔" بات کرتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ مسلسل میری زنجیر پر چل رہا تھا۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو...... یہی میرے لیے بہت ہے۔" میں نے کہا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں اس سلسلے میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے اس نے کہا "غزالہ صاحبہ اور ان کے سلے بالک بچہ اب کہاں ہیں؟"

"لندن میں ہی ہیں شاید...... اگر ہم اس چکر سے نکل سکے تو ہو سکتا ہے کہ ان سے تمہاری ملاقات ہو جائے۔"

موٹل دیر تک بڑی عقیدت اور احترام سے غزالہ کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اسے کسی مہربان اور مسیحا صفت دیوی کا عکس قرار دے رہا تھا۔ پھر ہماری گفتگو کا رخ دھیرے دھیرے جیکب کی طرف مڑ گیا۔ وہ ہماری ہمدردی کر رہا تھا لیکن اصل میں حالات ہماری ہمدردی نہیں کر رہے تھے۔ مجبوراً جیکب کو بھی اپنے کسی مفاد کی خاطر ہمارا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ جیکب کا مفاد کیا ہو سکتا تھا یہ بات ابھی تک صیغۂ راز میں تھی۔ جیکب کے اندر گہرائی میں کیا چھپا ہوا تھا اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا مشکل تھا۔ موٹل بھی بس اتنا ہی بتا سکتا تھا کہ جیکب کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے۔ منصوبے کی حقیقت اسے بھی معلوم نہیں تھی۔

اگلے روز دوپہر سے کچھ دیر پہلے جب جیکب ابھی گھر میں ہی تھا ہمیں زبردست شاک لگا۔ پہلے کال بیل سنائی دی پھر کوئی مہمان اندر داخل ہوا اور ساتھ والے کمرے میں جیکب سے مصروف گفتگو ہو گیا۔ یہ ایک عورت تھی۔ میں نے کی ہول سے آنکھ لگا کر عورت کی شکل دیکھی اور دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ عورت کی میری طرف پشت تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی اور جیکب کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ قوسیہ تھی۔ اس نے جین کی پینٹ کسی ہوئی تھی اور اوپر سرخ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ پر عین سینے کے اوپر فرانسیسی کے کچھ الفاظ پرنٹ تھے۔ یقیناً کوئی بے باک فقرہ ہی رہا ہوگا۔ جیکب اور قوسیہ کا انداز رازدارانہ تھا۔ کسی وقت وہ کرسیوں پر آگے کو جھک جاتے تھے اور ان کے سر آپس میں جڑے ہوئے محسوس ہونے تھے۔ ان کا لہجہ بالکل سرگوشیوں والا ہو جاتا تھا۔

باتیں کرتے کرتے قوسیہ نے اپنی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک تصویر نکالی اور جیکب کو دکھائی۔ جیکب نے دلچسپی سے تصویر دیکھی اور دو تین بار اثبات میں سر ہلایا۔ جیکب دیکھ چکا تو قوسیہ نے تصویر پھر اپنے لباس میں رکھ لی۔

قوسیہ کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا اور اپنے جسم کے سارے زخم مجھے یاد آ گئے تھے۔ ٹارچر سیل میں جو وقت میں نے گزارا تھا۔ وہ ایک بھیانک خواب کی طرح میرے دل و دماغ سے چپکا ہوا تھا۔ کی بوکو کی منحوس شامیں جنکے فرش پر گرتے ہوئے میرے لہو کے قطرے ...... اور پھر وہ سرخ منحوس بالٹی جس کے سرد آلودہ پانی میں مجھے ان گنت جان لیوا غوطے دیے گئے تھے۔ اس بالٹی کا تصور ذہن میں آتے ہی جی متلانے لگا۔ کیا خوفناک رات تھی۔ وہ...... اب قوسیہ کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی تو یوں لگتا تھا کہ کوئی کانوں میں زہر گھول رہا ہے۔ میرے پاؤں آج صبح سویرے آزاد ہو گئے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے بندھے ہاتھوں کے باوجود دروازہ توڑ کر باہر نکل جاؤں اور اپنی ٹانگوں کی گرفت میں اس وقت تک قوسیہ کی مغرور گردن دبائے رکھوں جب تک وہ بے جان نہ ہو جائے۔ لیکن میں نہیں کر سکتا تھا...... میرے "نہ کرنے" کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود شاید اب بھی قوسیہ کو بدترین دشمن کا درجہ نہیں دیا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی جو مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ اس کا عورت ہونا...... اس کا کم عمر ہونا...... یا پھر اس کا شیخ کی بہن ہونا۔ ابھی تک کوئی بھی بات میری سمجھ میں آئی نہیں تھی۔

دونوں کی گفتگو کے دوران میں ہی فون کی گھنٹی بجی۔ جیکب فون سننے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ قوسیہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے وہیں بیٹھی رہی۔ پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا وہ سیدھی اس کمرے کی طرف آئی جہاں ہم تینوں موجود تھے۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ مقفل تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نگاہ تپائی پر رکھی چابی پر جم گئی۔ یہ ہمارے ہی دروازے کی چابی تھی۔ وہ چابی کی طرف بڑھی۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ قوسیہ سے میرا آمنا سامنا ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا...... مگر پھر خیریت گزری۔ قوسیہ نے تپائی سے چابی نہیں اٹھائی اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ غالباً وہ واش روم استعمال کرنا چاہ رہی تھی۔ دو منٹ بعد وہ ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتی ہوئی واپس آ گئی۔ اسی اثنا میں جیکب بھی واپس آ گیا تھا۔ دونوں میں پھر مکالمہ شروع ہو گیا۔ دونوں کے چہروں پر دبا سا جوش بھی نظر آ رہا تھا۔

میں نے موٹل کو بھی کی ہول سے یہ منظر دکھایا۔ وہ قوسیہ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے بولا "میں اس لڑکی کو نمالڑکی کو تین چار دن پہلے بھی جیکب کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔"

"یہ بے حد خطرناک لڑکی ہے۔" میں نے بتایا "میرے جسم پر جو زخم نظر آ رہے ہیں وہ سارے اسی کی مہربانی سے ہیں...... بہرحال یہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ فی الحال ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان دونوں کی رازدارانہ گفتگو کیا معنی رکھتی ہے۔"

دس پندرہ منٹ جیکب کے پاس بیٹھ کر قوسیہ واپس چلی گئی۔ اس دوران میں مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں جیکب اپنی اس بے تکلف دوست کو ہمارے بارے میں نہ بتا دے اور پھر وہ دونوں ہماری اس پناہ گاہ میں چلے آئیں۔ بہرطور اس حوالے سے بھی خیریت ہی گزری۔ میں کی ہول سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قوسیہ کے واپس جانے کے بعد جیکب ہارڈ نے صوفے پر پھیل کر ایک زوردار انگڑائی لی۔ وہ اندر سے بہت خوش اور پرجوش لگ رہا تھا۔ اسی دوران ایک خوبصورت ملازمہ کافی لے کر آ گئی۔ جیکب نے اپنی خوشی اور ترنگ میں ملازمہ کو آغوش میں گرا لیا اور اس کے کئی پرجوش بوسے لیے۔ پھر وہ اٹھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

موٹل کی یہ بات سو فیصد درست نظر آنے لگی تھی کہ جیکب کسی طرح کی منصوبہ سازی کر رہا ہے۔ وہ خواہشات سے بھرپور شخص تھا اور ایسے لوگ ایک مقام پر رکے رہنے کو اپنی بہت بڑی ناکامی سمجھتے ہیں۔ اس کی تمام حرکات و سکنات سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ وہ کسی چکر میں الجھا ہوا ہے۔ موٹل کی آواز نے ایک دم مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں ٹی وی آن تھا۔ اس پر ایک ایسا منظر ابھرا تھا جس نے موٹل کو چونکا دیا تھا۔ میں بھی چونک گیا۔ یہ دو گارڈز کی لاشیں تھیں۔ گارڈز نیلی وردیوں میں تھے لیکن ان کے سروں پر ٹوپیاں نہیں تھیں۔ وہ الٹے لٹک رہے تھے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں الٹا لٹکا کر ان کے پیٹ میں گولی ماری گئی ہے اور مرنے سے پہلے وہ کافی دیر تک تڑپتے رہے ہیں۔

پس منظر سے جو کمنٹری سنائی دے رہی تھی اس سے پتا چلا کہ یہ وہی گارڈز ہیں جن کو منوہرا نے فرائض سے غفلت برتنے پر شوٹ کیا تھا۔ ہمارے فرار کے وقت یہ لوگ موقع پر موجود تھے اور غالباً بوکھلاہٹ کے سبب کوئی موثر کارروائی نہیں کر سکے تھے۔

ان لاشوں کو دکھانے کے کچھ ہی دیر بعد ٹی وی اسکرین پر ایک ایسا چہرہ ابھرا جسے دیکھنا میں ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ وقت کے بدنام ترین بردہ فروش کنگ براؤن کا چہرہ تھا۔ اس کی پیشانی پر سے بال تھوڑے سے مزید کم ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گوشت کچھ اور موٹا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ سخت غیظ و غضب میں ہے۔ بہرحال ٹی وی اسکرین پر وہ کسی حد تک نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ اس میں ڈیڑھ سو کے قریب نیلی وردیوں والے افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب انچارج اور افسران وغیرہ تھے۔ سب منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر بھی تین چار افراد کرسیوں پر موجود تھے۔ ان میں سے منوہرا کو میں پہچان سکتا تھا۔ اس کا ایک بازو پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا اور گلے سے جھول رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی زخم تھا جو موٹل نے فرار کے وقت منوہرا کو دیا تھا۔ منوہرا بھی بے حد سنجیدہ اور کسی حد تک بجھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے فرار کے سنگین واقعے کے سبب اسے کنگ براؤن کے ہاتھوں سخت بے عزت ہونا پڑا ہے۔

کنگ براؤن نے سیکورٹی کے لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا "جو ہوا یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا ہم اس پر جتنا بھی افسوس کریں کم ہے۔ لیکن اگر ہم افسوس ہی کو لے کر بیٹھے رہیں گے تو اپنا اور زیادہ نقصان کریں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ان بھگوڑوں کو جلد سے جلد دوبارہ پکڑا جائے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جائے جب تک یہ کام ہو نہ جائے ہم بھی اپنی تمام دیگر مصروفیات کو وقتی طور پر ختم کر رہے ہیں۔

آپ لوگ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاہ جہاں نامی شخص اور اس کا ٹولہ کس قدر خطرناک ہے۔ یہ ٹولہ اس سے پہلے بھی ہمیں بہت کاری زخم لگا چکا ہے۔ ہم نے یہ زخم دوسری مرتبہ نہیں کھانا ہے۔ ہمیں ننانوے فیصد یقین ہے کہ فیول مفرور افراد ہوسٹل کی حدود سے نکل نہیں پائے ہیں۔ وہ ان ہی دیواروں میں کہیں موجود ہیں۔ اگر ہم انہیں اپنے اندر سے ہی ڈھونڈ نہ سکے تو یہ ہماری بہت بڑی ناکامی ہوگی۔ اور ان سے یہ شبہ بھی پیدا ہوگا کہ شاید ہمارے اندر کچھ کالی بھیڑیں موجود ہیں۔

مفرور افراد کے بارے میں اطلاع دینے والوں کے لیے یا انہیں پکڑنے والوں کے لیے انعام مقرر کیا جا چکا ہے ہم ان انعامی رقم کو تین گنا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مطلوب افراد کو پناہ دینے کا ذمہ دار قرار پایا گیا تو اس کا انجام فوری ہوگا اور بہت عبرت ناک ہوگا...... پچھلے دنوں میں آپ نے مطلوبہ افراد ڈھونڈنے کے لیے جو کاوشیں کی ہیں۔ ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سیکورٹی ڈپارٹمنٹ کے پانچ چھ افراد ہیں جنہوں نے اب تک نمایاں کارکردگی دکھائی ہے۔

انہیں شاباش دیتے ہیں اور انہیں نقد انعامات بھی دیئے جائیں گے۔" گنگ اپنے لیے حسب معمول "ہم" کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔

گنگ براؤن کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پھول اور دوسرے میں ڈنڈا ہے۔ وہ سیکورٹی والوں کو ڈرا رہا ہے اور للچا بھی رہا ہے۔ گنگ براؤن کو دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ ساری پرانی ٹیسیں پھر سے جاگ گئی تھیں۔ ہنستے مسکراتے صفدر کی صورت نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی تھی۔ یہی گنگ براؤن میرے جگری یار صفدر کی موت کا ذمہ دار تھا۔ ان گنت بے گناہ خواتین، بے شمار پامال عصمتیں، لاتعداد برباد زندگیاں گنگ براؤن کے کریڈٹ پر تھیں۔

میں نے ٹی وی اسکرین پر گنگ کو دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "گنگ! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس بار میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔"

میری خاموش آواز کسی نے نہیں سنی.... لیکن یہ آواز میرے پورے جسم میں گونجی اور پھر میرے جسم کے ذرے ذرے میں سرایت کر گئی۔

کچھ دیر بعد گنگ کی بک بک ختم ہو گئی۔ اسکرین پر بین الاقوامی خبریں پیش کی جانے لگیں۔ مولی نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ ایک بار پھر میرے عقب میں آ بیٹھا اور میری آہنی ہتھکڑی کے ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔ اپنے زخمی ہاتھوں کی پروا کیے بغیر وہ مسلسل کٹر کے ساتھ میری ہتھکڑی کا لوہا کاٹنے میں مصروف تھا۔ ایک ہاتھ شل ہو جاتا تو وہ دوسرا ہاتھ استعمال کرنے لگتا۔ اس پر جیسے خبط سا سوار ہو گیا تھا کہ مجھے جلد از جلد اس بندش سے آزاد کرنا ہے۔

میری پشت اور پیٹ کے زخم بھی ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ چھاتی پر ایک دو زخم گہرے تھے۔ انہوں نے یقیناً نشان چھوڑ جانا تھا اور مجھے اس روح فرسا رات کی یاد دلاتے رہنا تھا جب میں شیخ زادی کے چنگل میں پھنسا تھا۔ اس رات قریباً بارہ بجے کے لگ بھگ مولی اپنا کام مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مولی کا حوصلہ جیت گیا اور ہتھکڑی کا نہایت ڈھیٹ لوہا شکست کھا گیا۔ ہتھکڑی کڑکڑاتی ہوئی فرش پر گری اور میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے۔ میں نے اپنے بازوؤں کو آگے پیچھے حرکت دی اور آزادی کا فرحت بخش احساس رگ و پے میں پھیل گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہو چکے تھے تاہم ہتھکڑی کے دونوں حلقے میری کلائیوں میں موجود تھے اسی طرح بیڑی کے دونوں حلقے بھی ٹخنوں کے قریب موجود تھے۔ یہ وزنی لوہا بھی تکلیف دہ تھا مگر پہلے والی تکلیف کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

اگلے روز صبح جب میں سو کر اٹھا تو مولی پہلے سے جاگ رہا تھا۔ وہ اور جیکب باتیں کر رہے تھے۔ مجھے جاگتے دیکھ کر جیکب خاموش ہو گیا۔ پوپ لڑکی روبی بالکل لاتعلق ہو کر ایک طرف بیٹھی تھی۔ وہ ذرا سا کھٹکا ہونے پر چونک جاتی تھی۔ اور کبھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہمیں اس کی طرف سے چوکس رہنا پڑتا تھا۔ وہ بالکل خاموش رہتی تھی تاہم وہ جب بھی مولی کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی معصوم سی چمک ابھرتی تھی۔ یہ ایک عجیب اور انوکھا جذبہ تھا جس کی حقیقت شاید اس بے چاری کو معلوم نہیں تھی۔

جیکب نے ہمارے لیے ناشتا بھجوایا۔ آج کئی روز کے بعد میں مولی کے ہاتھوں کی بجائے اپنے ہاتھوں سے ناشتا کر رہا تھا۔ مولی اس صورت حال پر خوش تھا۔ میں مولی سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ جیکب کے ساتھ کیا باتیں کر رہا تھا۔ لیکن میرے پوچھنے سے پہلے وہ مولی کے خود بتانے کا انتظار کرتا رہا لیکن مولی نے نہیں بتایا۔ کل رات بھی میں نے نوٹ کیا تھا کہ جیکب نے چپکے سے مولی کے ساتھ کوئی بات کی تھی۔

مجھے مولی کے حوالے سے کسی طرح کی بے اعتباری نہیں تھی۔ شاید کوئی ایسی بات تھی جو مولی مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں دوپہر تک اسی الجھن میں رہا۔ آخر ہلکی پھلکی باتوں کے بعد یہ بات میری زبان پر آ ہی گئی۔ میں نے مولی سے کہا "روبی کے ساتھ شادی وادی کا ارادہ تو نہیں ہے۔ تم جیکب کے ساتھ کانوں میں باتیں کرتے رہتے ہو۔"

وہ گڑبڑا گیا "نہیں.... ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "شاید تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔"

"تو پھر اب کیوں چھپا رہے ہو؟"

میں نے تھوڑا سا اصرار کیا تو وہ بول پڑا۔ تیمور بھائی میں بولا "وہ لوگ زرین گل کو لاک اپ سے لے گئے ہیں۔ شاید پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

ایک منحوس سرخ پانی کے اوپر اٹھے ہوئے زرین گل کا تصور میرے ذہن میں آیا اور دماغ سن ہو گیا۔ پھر کہیں گیا نے زرین گل بھی ایسی ہی اذیت جھیلی، زندگی اور موت کی کشمکش جھیلی تھی؟

مولی میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر بولا

"پریشان ہونے کی بات نہیں ہے جناب! جیکب بتا رہا تھا کہ شاید ابھی تھوڑی دیر میں اسے واپس لاک اپ میں پہنچا دیا جائے گا۔"

اگلا آدھ گھنٹا میں نے شدید بے چینی میں گزارا۔ پھر جیکب نے آ کر مولی کے کان میں کھسر پھسر کی۔ جیکب کے جانے کے بعد مولی نے مجھے شگفتہ چہرے کے ساتھ بتایا کہ زرین گل لاک اپ میں واپس آ گئی ہے۔ وہ اپنے قدموں پر چل کر آیا ہے اور ٹھیک ہے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ واپس آ گئی ہو گی؟" میں نے مولی سے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں کہ جیکب مجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔" مولی نے پورے یقین سے کہا۔

رات کے پہلے پہر اونگھتے اونگھتے مولی اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں ابھی سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "مجھے یقین ہے کہ زرین گل صحیح سلامت لاک اپ میں موجود ہے۔"

"تمہیں بتانے پر تمہارا یقین اتنا پختہ کیسے ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا "بات وہی ہے جو آپ پہلے سے جانتے ہیں۔ کسی وقت میں دوسرے لوگوں کی طرح بہت دور کی آوازیں سنتا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے...... کہ زرین گل اپنے لاک اپ میں موجود ہے اور کسی بات پر پہریداروں کو برا بھلا کہہ رہی ہے.....۔"

میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا کہ میں مولی کی بات کو جھٹلا سکوں۔ اس سے پہلے مولی یہ چیز متعدد مرتبہ اپنی ماورائی صلاحیت کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب شیخ زادی توسیہ پھر جیکب کے لگژری اپارٹمنٹ میں نظر آئی۔ وہ چست پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھی۔ بوائے کٹ بالوں کی لٹیں پیشانی پر لہرا رہی تھیں۔ میں نے کی ہول سے دیکھا۔ وہ دونوں ہال کمرے کے ایک گوشے میں موجود تھے اور راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ کولہے مٹکاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد جیکب نے مولی کو اپنے پاس بلا لیا۔ پچھلے تین چار دنوں سے یہ پہلی بار تھی کہ جیکب نے مولی کو کمرے میں بلایا تھا۔

مولی کی واپسی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ وہ قدرے سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جیکب بارڈ سے اس کی گفتگو اہم رہی ہے۔ دوپہر کا کھانا مولی نے خاموش سے عالم میں ہی کھایا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے سب کچھ بتانا چاہتا ہے لیکن کسی وجہ سے مجبور ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے جیکب بارڈ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان معاملات کو اپنے تک ہی رکھے گا۔

کھانے کے کچھ ہی دیر بعد روبی پھر سو گئی۔ مولی اب بھی اندرونی کشمکش کا شکار نظر آتا تھا۔ آخر یہ کشمکش ختم ہوئی اور اس نے کہنا شروع کیا "جیکب نے اپنی سوچوں کو عملی شکل دینا شروع کر دی ہے۔ اور اس کی سوچ یہ ہے کہ وہ مستقبل قریب میں منوہرا دیوی کی جگہ لینا چاہتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ منوہرا کو اس کے عہدے سے ہٹانا چاہتا ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے جناب...... اور شیخ زادی توسیہ بھی اس پلاننگ میں جیکب کے ساتھ شریک ہے۔ آپ جان ہی چکے ہیں کہ توسیہ اور منوہرا دیوی کی آپس میں بنتی نہیں ہے۔ شاید اب والے معاملے کی وجہ سے ان دونوں کی چپقلش مزید بڑھی ہے۔"

"کیا منوہرا کو ہٹانے کی کوئی اسکیم ان کے ذہن میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال یہ لگ رہا ہے کہ ان دونوں نے منوہرا کو نقصان پہنچانے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹے میں منوہرا دیوی غالباً ایک اور مشکل کا شکار ہونے والی ہے۔"

"ایک اور مشکل سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلی مشکل تو آپ والی ہی تھی۔" مولی نے جواب دیا "میرے اور آپ کے فرار نے منوہرا دیوی کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ گنگ براؤن اپنی اس "ریاست" سے ناخوش ہے اور کم از کم جب تک ہم پھر سے پکڑے نہیں جاتے گنگ کی یہ خفگی برقرار رہے گی۔ اگر ان حالات میں منوہرا سے کوئی اور غلطی ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات یقیناً شدید ہوں گے۔ جیکب اور شیخ زادی توسیہ کا خیال یہی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر منوہرا دیوی پر ایک اور وار کر دینا چاہیے۔"

"اس وار کی نوعیت کیا ہو گی؟" میں نے دریافت کیا۔

مولی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ منوہرا کا ایک شوق سانپ پالنا بھی ہے۔ اس کے پاس باقاعدہ ایک سانپ گھر ہے جس میں مختلف قسموں کے تین چار سو سانپ موجود ہیں۔ منوہرا کی خواہش پر گنگ نے منوہرا کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنا سانپ گھر یہاں

منتقل کر لے۔ میں نے یہ سانپ گھر دیکھا ہوا ہے۔ اس میں ننھے منھے زہریلے سانپوں سے لے کر اناکونڈا کی طرز کے بڑے بڑے اژدہے بھی ہیں۔ منوہرا دیوی جب یہاں ہوتی ہے تو ہر روز کم از کم ایک بار سانپ گھر ضرور جاتی ہے۔ وہ کچھ لاڈلے سانپوں کو اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے اور ان کے طور اطوار ملاحظہ کرتی ہے۔ بس یہ اس کا شوق ہے۔ چند ہفتے پہلے نگران کی غلطی سے دو تین کوبرا سانپ پنجرے سے باہر نکل آئے تھے اور ان میں سے ایک نے کچن میں گھس کر خانساماں کو ڈس لیا تھا۔ یہ بات کنگ براؤن تک بھی پہنچی تھی اور انہوں نے اس واقعے کا نوٹس لیا تھا۔ اس واقعے کے بعد منوہرا نے سانپ گھر کا نگران تبدیل کر دیا تھا۔ اب جو نگران سانپ گھر پر مقرر ہے وہ ایک نہایت سخت گیر نامی حبشی ہے۔ اس کا نام جاز ہے۔ جاز کے ساتھ دو معاون بھی کام کرتے ہیں۔ جاز کے پاس رکھوالی کے کتے ہیں۔ یہ خوفناک کتے ہمہ وقت سانپ گھر کے آس پاس موجود رہتے ہیں۔ اب جیکب کا پروگرام ہے کہ کسی طرح رات کے وقت اس سانپ گھر کے کچھ سانپوں کو آزاد کر کے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ یہ کام اس طرح سے ہو کہ اسے نگران جاز یا پھر منوہرا کی غلطی سمجھا جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے؟"

"ہاں...... یہ کوئی ایسی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ جیکب چاہ رہا ہے کہ منوہرا کے ستارے کچھ اور گردش میں آئیں...... لیکن اس سلسلے میں نمبر ۱ کیا کردار ہو سکتا ہے؟"

"جیکب کی نظر میں میرا کردار بہت اہم ہے۔" موول نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں وہی پراسرار چمک تھی جو میں نے ماریطانیہ میں دیکھی تھی۔ تاریک براعظم کے قلب میں واقع وہ نادر قبیلہ جو پراسرار صلاحیتوں کے حوالے سے اپنی مثال آپ تھا۔ اس قبیلے کا تقریباً ہر فرد اپنی آنکھوں میں مقناطیست (آنکھوں کا جادو) لے کر پیدا ہوتا تھا...

موول بھی اسی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "جب جیکب بارز بار ہا ٹرسٹ میں تھا اور میرے ساتھ مضافاتی علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ ہمارا سامنا کئی بار African Hunting Dogs سے ہوا تھا۔ جیکب نے دیکھا تھا کہ میری کوشش سے شکاری کتوں کے غول اپنا راستہ بدل لیتے ہیں اور ان کے مزاج کا جارحانہ پن بھی میں ختم کر سکتا ہوں۔ شروع میں جیکب اسے محض اتفاق سمجھتا تھا اور میری اس صلاحیت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن پھر دو چار بار کے تجربے کے بعد اسے قائل ہونا پڑا تھا۔ اب وہ پوری طرح قائل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں سانپ گھر کے گرد منڈلانے والے تین ہینٹ برنارڈ کتوں کو رام کر سکتا ہوں اور پھر سانپ گھر کے دو تین دروازے کھول کر سانپوں کو باہر نکلنے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں......"

اب ساری بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ بظاہر تو یہ افسانوی سا معاملہ لگتا تھا لیکن موول کو میں جانتا تھا۔ وہ افسانے ہی کی طرح حیرت انگیز اور غیر یقینی تھا۔ میں نے اس کی چمک دار آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم واقعی ایسا کر سکو گے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب...... یہ تو موقعے پر پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔" موول نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "...... ہو سکتا ہے کہ میں کر سکوں۔ ہو سکتا ہے کہ نہ کر سکوں...... اور کتے آپ نے اس سیوک کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ سنا ہے کہ وہ بڑے ظالم کتے ہیں۔ جاز کے سوا کسی کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کر سکو گے۔" میں نے اس کی روشن آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اور اگر نہ کر سکے تو بھی تم ان کتوں کے لیے تر نوالہ نہیں بنو گے۔ مجھے تمہاری پھرتی اور طاقت پر اعتماد ہے۔ ایسے دو چار کتوں کے جبڑے تم خالی ہاتھ سے چیر سکتے ہو۔ اور اگر کوئی تیز دھار ہتھیار تمہارے پاس ہو تو پھر کوئی مشکل نہیں ہو گی۔"

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جیکب یہ کام بڑی راز داری سے کروانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس واقعے کا سارا ملبہ منوہرا دیوی پر گرے۔ یہی محسوس ہو کہ منوہرا دیوی یا نگران کی غلطی کے سبب "سانپ گھر" کے دروازے کھلے رہ گئے اور رات کو سانپ باہر رینگ آئے۔ بہرحال ابھی اس سلسلے میں جیکب اور شیخ زاوی صاحب کی سوچ بچار جاری ہے۔ وہ ایک دو متبادل تجویز پر بھی غور کر رہے ہیں۔ اصل صورت حال شام تک سامنے آئے گی۔"

شام کو جیکب ہارڈ آیا۔ ہمارا احوال دریافت کرنے کے بعد اس نے موول کو اپنے ساتھ لیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جیکب کے ساتھ ایک دیو ہیکل نگران کتا بھی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ موول کو سانپ گھر کی طرف بھیجنے سے پہلے اس امر کی تصدیق کرنا چاہتا ہے کہ موول رکھوالی کے کتوں کو رام کر سکے گا یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ پہلے ایک کتے پر موول کے اثرات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے کی ہول میں سے جھانکا تو ساتھ والے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے چٹخنی گرائی۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میں دوسرے کمرے میں نکل آیا۔ یہاں سے میں نے کامن روم میں جھانکا۔ دیو ہیکل نگران کتا قالین پر گہری نیند سو رہا تھا۔ موول اور جیکب دونوں ہی اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھے۔ جیکب کی خوبرو گرل فرینڈ میگی پیرا کی کے نہایت مختصر لباس میں صوفے پر بیٹھی تھی اور حیران حیران نظروں سے خوابیدہ کتے کو دیکھ رہی تھی۔ میں "عجوبۂ عالم" پر غور کرتا ہوا واپس اپنی پناہ گاہ میں آ گیا۔ یہاں بوب لڑکی روی کے خراٹوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

اس کے خوبصورت نتھنوں میں سے ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی اور جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرتی تھی۔

...... پناہ گاہ میں موول کی واپسی کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ گارڈز کی نیلی وردی میں تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور سیاہ آنکھوں کی چمک بہت نمایاں تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "کام ہو گیا ہے جناب...... دیوتاؤں کی مہربانی ہے۔ کتوں نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ نگران جاز دروازے کے عین سامنے سویا ہوا تھا۔ میں نے پہلے دروازہ کھولا، پھر تین چار چھوٹے دروازے کھول دیے۔ میرا خیال ہے اب تک سانپوں نے راہداری کی طرف رینگنا شروع کر دیا ہو گا۔ راہداری میں قالین بچھے ہیں اور وہ زیادہ گرم ہے۔ اس موسم میں سانپ یقیناً حرارت کی طرف حرکت کریں گے۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ موول باتوں کے دوران میں ایک دم کھو سا جاتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اس بارے میں اسے ٹٹولا تو اس نے بتا دیا۔ گمبھیر آواز میں بولا "وہ لوگ ابھی کچھ دیر پہلے زریں کو پھر پوچھ گچھ کے لیے ٹارچر سیل میں لے گئے ہیں۔"

دکھ اور بے بسی کے احساس نے ایک بار پھر کسی عفریت کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ ہم اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں موول کے تاثرات اچانک بدل گئے۔ وہ بولا "آپ کو چیخیں سنائی دے رہی ہیں؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولا "مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سانپ باہر نکلنے لگے ہیں۔ کام شروع ہو گیا ہے۔"

دو تین منٹ بعد مجھے بھی چیخوں اور بھگدڑ کی آوازیں آئیں...... پھر دو تین فائر بھی سنائی دیے۔ فائر کی آواز سن کر روی اٹھ بیٹھی تھی اور اب ڈری ڈری نظروں سے ہمارے چہرے دیکھ رہی تھی...... بالکل کسی سہمے جانور کا سا انداز تھا۔ چند لمحے بعد جیکب ہارڈ بھی اندر آ گیا۔ وہ بظاہر سنجیدہ تھا لیکن اس کی آنکھوں میں دبی دبی خوشی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
- سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی برہا کی داستان حیرت۔
- سانپوں کا شہزادہ رنسارو ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔
- عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
- سیّد بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنسارو کا طلسم توڑ دیا۔
- سیّد بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔

قیمت 250 روپے
محصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گرد وپیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
چوک میو ہسپتال، لاہور
نسبت روڈ

ہماری طرح اس کے کان بھی باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ آوازیں جن میں خوف اور دہشت کا عنصر شامل تھا ابھی بھی ہر طرف سے آرہی تھیں۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر اچانک گوشے میں بیٹھی ہوئی بوب لڑکی رونے لگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ایک دھاری دار سانپ واش روم کے دروازے کے نیچے سے نکلا تھا اور اس نے لڑکی کے پاؤں پر کاٹا تھا۔ درد اور خوف میں ڈوب کر لڑکی نے دوسری چیخ مارنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی موبل نے لپک کر اس کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ لڑکی کا چیخنا چلانا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے موبل کی بندوق اٹھائی اور اس کے وزنی کندے کی ضرب لگا کے سانپ کا سر کچل دیا۔ لیکن یہی وقت تھا جب میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ واش روم کے دروازے کے نیچے سے کم از کم تین سانپ نکل کر کمرے کے وسط کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اپنے عقب میں جیکب کی آواز سنائی دی "او مائی گاڈ۔"

جیکب جیسے لوگ خدا کو آسانی سے یاد نہیں کرتے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ واقعی یہ آسان صورت حال نہیں تھی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ ساتھ والے کمرے کے قالین پر ایک درجن سے زائد سانپ نظر آرہے تھے۔ ابھی مزید دروازوں کی درزوں سے نکل نکل کر اپارٹمنٹ میں گھس رہے تھے۔ فقط ایک دو منٹ کے بعد ہمیں چاروں طرف سانپ دکھائی دینے لگے۔ دو اژدھا نما سانپ روشندانوں میں سے رینگتے ہوئے نیچے کی طرف آرہے تھے۔

جیکب چیخا "اوپر چلو..... گیلری کی طرف"

اس کی یہ تجویز بروقت تھی۔ اسٹیل کی خوشنما سیڑھی ابھی تک دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے موبل نے سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ اس کے کندھے پر نیم بے ہوش بوب لڑکی تھی۔ اگلے ایک منٹ کے اندر ہم چاروں گیلری کے اندر تھے اور سیڑھی ہم نے اوپر کھینچ لی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف چھوٹے بڑے سانپوں کے پھن لہرا رہے تھے اور ان کی پھنکاریں گردش کر رہی تھیں۔ یہ بالکل غیر متوقع صورت حال تھی۔ یقیناً جیکب کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سانپ گھر کے مکین..... آزاد ہونے کے بعد اس رخ پر چلے آئیں گے۔ یقیناً آس پاس کے اپارٹمنٹ بھی اسی وقت سانپوں کی زد میں تھے۔ ہمیں ملی جلی آوازیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

"تمہاری فرینڈ میگی کہاں ہے؟" میں نے جیکب سے پوچھا۔ "وہ باہر گئی ہوئی ہے شاید۔" جیکب نے کہا۔

جیکب کی معلومات درست نہیں تھیں۔ میگی گھر میں ہی تھی۔ ابھی جیکب کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ایک لرزہ خیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ ہم نے میگی کو دیکھا۔ وہ پیراکی کے مختصر ترین لباس میں دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک اندرونی کمرے میں تھی اور کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے میوزک سن رہی تھی۔ اب وہ باہر آئی تھی اور اپنے اردگرد "قیامت" برپا دیکھ رہی تھی۔

جیکب گیلری سے چیخا "اوپر آجاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے سیڑھی میگی کے لیے نیچے کرنے کی کوشش کی۔

میگی سیڑھی سے دور ہی تھی کہ کربناک انداز میں چیخ کر اوندھے منہ گر پڑی۔ ہم نے دھیان سے دیکھا تو اس کی عریاں ٹانگوں سے ایک اژدھا نما سانپ لپٹا نظر آیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ نے تیزی سے حرکت کی اور میگی کے زیریں جسم کے گرد دو بل ڈال گیا۔ اس نے آکٹوپس کی طرح میگی کو جکڑ لیا تھا۔ میگی کے اردگرد درجنوں زہریلے سانپ موجود تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی..... یہ قیامت خیز لمحے تھے..... جیکب اس کا بوائے فرینڈ تھا اور اس سے محبت بھی کرتا تھا لیکن اس وقت میگی کی مدد کے لیے نیچے اترنا موت کو دعوت دینا تھا۔ ہم گیلری میں کھڑے تماشائی کی حیثیت سے میگی کو موت کے جبڑوں میں دیکھ رہے تھے۔ بوب لڑکی موبل کے ہاتھوں میں آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ موبل کی رائفل گیلری کے فرش پر پڑی تھی..... اچانک میرے جسم میں وہی برق دوڑ گئی جو مجھے..... اور صفدر کو ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا کرتی تھی۔ میں نے رائفل پکڑی اور گیلری سے چھلانگ لگا کر کمرے میں آیا۔ اژدھا نما سانپ نے اب میگی کے تین چوتھائی عریاں جسم کو جکڑ لیا تھا۔ سانپ کا بالائی حصہ میگی کے سینے پر رینگ رہا تھا۔ میگی کی آنکھیں وحشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اس کا بیرل سانپ کے سر سے لگا دیا۔ زاویہ ایسا تھا کہ گولی میگی کو زخمی نہ کرے۔ فائر ہوا اور سانپ کے سر کے چیتھڑے اڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میگی کے جسم کے گرد اس کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے سانپ کو میگی کے جسم سے علیحدہ کیا۔ یہی وقت تھا جب موبل زور سے چیخا۔ اس سے پہلے کہ میں اس چیخ کا مطلب سمجھتا۔ میری پنڈلی میں انگارا سا اتر گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے ڈسنے والا..... بارشی جنگلات کا زہریلا ترین سانپ "ٹنگی کلر" تھا۔

جہاں سانپ کے دانت پیوست ہوئے تھے وہاں سے خون کی دو بڑی بوندیں نکل کر ٹخنے کی طرف پھسلنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے رائفل کا وزنی کندہ سانپ کے سر پر مارا۔ اس کی کھوپڑی پھٹ گئی اور وہ تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ میگی اب تو اژدھا نما سانپ کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی لیکن وہ اتنی وحشت زدہ تھی کہ اپنے بچاؤ کے لیے سیڑھی کی طرف حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور سیدھا کھڑا کرنا چاہا۔ اس کی ٹانگوں میں شاید جان ہی نہیں تھی۔ وہ میرے اوپر ڈھے گئی۔ میں نے اسے کندھے پر لادا۔ گیلری پر سے موبل اور جیکب نے سیڑھی نیچے لٹکا دی تھی۔ فرش پر رینگتے ہوئے درجنوں سانپوں میں سے چند ایک سیڑھی پر چڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ اب سیڑھی پر چڑھنا بھی خطرناک تھا لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

میں میگی کے نیم عریاں بدن کو کندھے پر لاد کر گیلری میں پہنچ گیا۔ جیکب نے میگی کو بانہوں میں لے لیا اور اسے بار بار چومنے لگا۔ وہ موت کے منہ سے واپس آئی تھی۔ اس کا سارا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔ موبل نے سیڑھی پر سے سانپوں کو جھٹک کر سیڑھی اوپر کھینچ لی اور میری پنڈلی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ہی خوف نظر آرہا تھا۔ یقیناً وہ بھی اس موذی سانپ کے زہریلے اثرات سے آگاہ تھا جسے بارشی جنگلات کا خطرناک ترین سانپ کہا جاتا ہے اور جسے بعض لوگ "ٹنگی کلر" بھی کہتے تھا۔ اس سانپ کی کھال پر خوشنما رنگوں والے حلقے سے بنے ہوئے ہیں یہ جتنا خوب صورت ہوتا ہے اس سے کئی گنا بڑھ کر زہریلا ہوتا ہے۔ اس کے زہریلے پن کا ثبوت یہ تھا کہ جس جگہ اس نے کاٹا تھا وہاں سے میری جلد سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔ نیلگوں سیاہی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ درد کی ناقابل بیان ٹیسیں پورے جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔

روایتی طریقے کے مطابق موبل نے زخم سے اوپر کی طرف ایک ڈوری کس کر باندھ دی اور ایک چاقو کی مدد سے زخم کو چیرا بھی دے دیا۔ دوسری طرف بوب لڑکی آخری ہچکیاں لینے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آنکھیں پھیر لیں اور اس کے سینے کا زیر و بم بالکل مدھم ہو گیا۔ ایک طرف تو گیلری میں یہ صورت حال تھی دوسری طرف اپارٹمنٹ سے باہر بھی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ چیخیں ابھر رہی تھیں اور گاہے گاہے فائر بھی سنائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ جیکب کے اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ توڑا جا رہا ہے۔ جیکب کے اشارے پر موبل نے مجھے سہارا دیا اور ہم لمبوتری گیلری کے عقب میں موجود سامان کے پیچھے چھپ گئے۔ جیکب نے بوب لڑکی کے بے حرکت جسم کو گھسیٹا اور اسے بھی ہمارے پاس پہنچا دیا۔ اس نے ہمیں سمجھا دیا کہ ہم یہاں بے حس و حرکت لیٹے رہیں گے اور آخری وقت تک خاموش رہیں گے۔ دو چار منٹ اسی طرح گزر گئے پھر مسلح گارڈز دروازے توڑ کر دندناتے ہوئے اندر چلے آئے۔ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے در و دیوار گونج اٹھے۔ سانپوں کو مارا اور بھگایا جا رہا تھا۔ ایک شخص زور زور سے "مسٹر جیکب" کہہ کر آوازیں دے رہا تھا۔ جیکب نے گیلری میں سے پکار کر بتایا کہ وہ یہاں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سیڑھی نیچے اتار دی۔ دو تین منٹ کے اندر گارڈز جیکب اور اس کی نیم بے ہوش گرل فرینڈ کو گیلری سے نیچے لے جا چکے تھے۔ ہم بے ترتیب سامان کے عقب میں خاموشی سے اپنی جگہ دبکے رہے تھے۔

قرب و جوار سے بلند ہونے والی چیخ و پکار آہستہ آہستہ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ موبل سرگوشی میں بولا "شاہ جہاں صاحب! آپ کو فوری طور پر علاج کی ضرورت ہے۔ اس سانپ کا زہر بڑی تیزی سے اثر کرتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ سانپ کے زہر سے بچنے کے لیے میں منوہرا اور کنگ کے زہر کا شکار ہو جاؤں۔ اس گیلری سے نکلنے کا مطلب تو یہی ہو گا کہ ہم خود کو کنگ کے حوالے کر دیں۔"

"لیکن زیادہ دیر تک یہاں رکا بھی تو نہیں جا سکتا۔" موبل کی آواز اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔ اس کی نگاہ میری پنڈلی کے رنگ بدلتے زخم پر تھی۔

اس دوران میں بوب لڑکی کا جسم زور زور سے اینٹھا اور اسے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ وہ دم توڑ رہی تھی۔ موبل نے بے تاب ہو کر اس کا سر اپنی گود میں لے لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ لڑکی کے منہ سے جھاگ نکلی اور پھر یک لخت اس کی آنکھیں تارا ہو گئیں۔ وہ مر چکی تھی۔ میں نے جب سے موبل کو دیکھا تھا وہ ہمیشہ مسکراتا ہوا ہی نظر آیا تھا۔ آج پہلی بار میں اس کے چہرے پر افسردگی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ اس نے بوب لڑکی (جسے وہ پیار سے روبی کہتا تھا) کا سر آہستہ سے فرش پر رکھا اور ایک کپڑا اس کے جسم پر تان دیا۔ تب وہ ایک بار پھر میری ٹانگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نیلگوں سیاہی میرے گھٹنے تک چلی گئی تھی اور درد ناقابل برداشت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ حلق بالکل خشک ہو گیا تھا اور ذہن پر دھند سی چھا

رہی تھی۔ سول نے میری متاثرہ ٹانگ کو موڑ کر اوپر اٹھا دیا اور پنڈلی کو دبا دبا کر زخم سے زہر آلود خون کے اخراج کی کوشش کرنے لگا۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے پھر گیلری کے عین نیچے کچھ کھٹ پٹ سنائی دی۔ اندازہ ہوا کہ کوئی اوپر آ رہا ہے۔ سول ایک دم چوکس نظر آنے لگا۔ رائفل کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ بہرحال جلد ہی یہ کیفیت ختم ہوگئی۔ اوپر آنے والا جیکب ہارڈ تھا۔ بوب لڑکی کی لاش دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی تاسف کے آثار نظر آئے پھر وہ میری طرف متوجہ ہوگیا۔ میرے حوالے سے جیکب کے رویے میں بڑی نرمی پائی جارہی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں نے کچھ دیر پہلے جیکب کی دوست میگی کو موت کے منہ سے نکالا تھا...... اور وہ ایسے لمحے تھے جب جیکب جیسا شخص بھی بس خاموش تماشائی بن کر رہ گیا تھا اور میگی کو حسرت ناک نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر رہا تھا۔ میری پنڈلی پر جو جان لیوا زخم آیا تھا اس کا سبب بھی جیکب پر بالکل واضح تھا۔

جیکب نے میری پنڈلی پر ہاتھ پھیرا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا "ٹینی گلر کا زہر خطرناک زہروں میں سے ایک ہے۔ ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسپتال......؟" سول نے پوچھا۔

"اس کے سوا چارہ نہیں۔ اسپتال میں سانپ کے زہر کے انجکشن موجود ہیں۔"

"کیا یہ انجکشن یہاں نہیں لائے جاسکتے؟" سول نے پوچھا۔

"یہ ناممکن ہے۔" جیکب نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا "زخم سے کافی خون بہہ گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زہر کا اثر کم ہوگیا ہو۔ کیا یہاں کوئی ایسا ڈاکٹر نہیں جو تمہارے بھروسے کا ہو اور مجھے یہاں آکر دیکھ سکتا ہو۔"

جیکب کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ اٹھا اور تیزی سے نیچے اتر گیا۔

کسی قریبی کوریڈور سے اب بھی کچھ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سول نے کہا "میرا خیال ہے کہ یہ کوئی سولو شخص ہے۔" پھر ذرا توقف سے بولا "سولو ہماری مادری زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے سانپ پکڑنے والا ایکسپرٹ...... شاید اب بچے کھچے سانپوں کو زندہ پکڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

اسی دوران میں ایک چیخ بلند ہوئی اور شور سا مچ گیا۔ غور کرنے سے اندازہ ہوا کہ کسی لیڈی گارڈ کو سانپ نے کاٹا ہے۔

میرے جسم کی اینٹھن بڑھتی چلی جارہی تھی، لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ جیکب کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی۔ اس کے لہجے میں کسی حد تک مایوسی تھی۔ بولا "ایک یونانی ڈاکٹر میرے بھروسے کی ہے لیکن وہ اسپتال میں موجود نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں دفع ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا۔ ان کی رنگت دیکھیں کتنی تیزی سے بدل رہی ہے۔" سول نے غالباً میرے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا، اس کی آواز مجھے جیسے کہیں دور سے آرہی تھی۔

"بڑا خطرناک زہر ہے۔" جیکب نے تاسف سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ انہیں اسپتال لے چلتے ہیں۔" سول کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر جیکب کی آواز جیسے کہیں دور سے میری سماعت تک پہنچی "سول یہ شخص تمہارا دوست ہے۔ تمہارے لیے اس کی ہمدردی سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن تلخ حقیقت کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ یہ اب بچے گا نہیں۔ اسے اسپتال پہنچا کر ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں کریں گے کہ خود کو مصیبت میں ڈال لیں۔"

سول نے فوراً کہا "مجھے آپ کی بات پر افسوس ہوا ہے باس جیکب...... صرف چند منٹ پہلے اس شخص نے آپ کی گرل فرینڈ کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی ہے۔ اور آپ کتنی آسانی سے......"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے سول۔" جیکب نے تیزی سے سول کی بات کاٹی۔ "میرے بس میں ہو تو اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اس کی جان بچاؤں...... لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں بچا...... پھر بھی اگر تم چاہتے ہو تو اس کے لیے پوری کوشش کرتے ہیں۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اسے اسپتال لے جانا چاہیے تو لے جاتے ہیں...... زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ یہی ہوگا کہ ہمیں گرفتار کرلیا جائے گا۔"

جیکب نے بڑی تیزی سے پینترا بدلا تھا۔ وہ بے حد موقع شناس شخص تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت سول کو اپنے ہاتھوں سے کھونا نہیں چاہتا۔

میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند گہری ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی میرے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ میرے جسم میں زہر کے خلاف ایک خاص قسم کی مدافعت موجود ہے۔ ماضی قریب میں کئی موقعے [illegible] تھے جب میرے اندر کی پراسرار قوت نے خطرناک زہر کے اثرات کو زائل کیا تھا۔ ایسا آخری موقع چند ماہ پہلے میڈم زادو کی رہائش گاہ پر آیا تھا۔ میڈم نے اپنے پارہ صفت جسم کو تبدیلی کے عمل سے گزارنے کے لیے مجھے ایک تجربے کا نشانہ بنایا تھا۔ میرے جسم میں سے لہو کشید کرنے سے پہلے مجھے سانپوں سے ڈسوایا گیا تھا۔ میں اس تجربے میں حیران کن طور پر زندہ بچ نکلا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس دفعہ بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہو جائے گا لیکن جو تکلیف میں محسوس کر رہا تھا وہ ناقابل بیان تھی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی مجھے اس امر کا احساس تھا کہ میں اپنی زخمی ٹانگ کو بے قراری کے عالم میں حرکت دے رہا ہوں۔ بالکل جیسے ایڑیاں رگڑی جاتی ہیں۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے سول کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اسپتال جانا نہیں چاہتا۔ معلوم نہیں کہ سول میری بات سمجھا یا نہیں لیکن اس دوران میں ایک اہم تبدیلی ہوئی۔ جیکب کے ہاتھ میں موجود واکی ٹاکی کا بزر سنائی دیا۔ جیکب نے واکی ٹاکی پر چند سیکنڈ گفتگو کی پھر سول سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "اچھی خبر ہے۔ یونانی ڈاکٹر اسپتال آگئی ہے۔ میں اس کے لیے پیغام چھوڑ آیا تھا۔ وہ ابھی یہاں پہنچ رہی ہے۔"

"کیا وہ سانپ کا انجکشن لاسکے گی؟" سول کی آواز آئی۔

"یہ تو بہت مشکل ہے۔ بہرحال وہ کچھ نہ کچھ تو کرے گی۔"

میں اپنی تکلیف سے لڑ رہا تھا۔ اس اذیت کو جھیل رہا تھا جو میرے جسم کے ایک ایک ریشے کو توڑ رہی تھی۔ ان اذیت ناک لمحات میں بھی جیکب ہارڈ کی موقع پرستی کا خیال ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کتنی بے حسی سے سول کو مشورہ دیا تھا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

چند منٹ بعد مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر آگئی ہے اور میرے قریب موجود ہے۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس میں نے اپنی پیشانی پر اور پھر پنڈلی پر محسوس کیا۔ یہ غنودگی آمیز کیفیت تھی۔ آوازیں کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم سے چھونے والے ہاتھ کسی یونانی ڈاکٹر کے نہیں...... غزالہ کے ہیں۔ وہ بھی تکلیف کی حالت میں ایسے ہی مجھ پر جھک جایا کرتی تھی۔ [illegible] نظروں کی مادی مسیحائی میرے جسم میں منتقل کر دیا کرتی تھی۔ جب یہ تصور میرے ذہن میں اجاگر ہوا کہ یہ غزالہ کے ہاتھ ہیں تو درد کی بے پناہ شدت مجھے کچھ کم محسوس ہونے لگی۔

کومل ہاتھ کئی منٹ تک میرے جسم پر گردش کرتے رہے۔ مجھے غالباً ایک دو انجکشن بھی دیے گئے تھے۔ پنڈلی کے زخم کے ساتھ بھی کچھ کیا گیا تھا۔ مجھے لگا کہ غزالہ میرے روبرو ہے۔ وہ دکھی نگاہوں سے میری حالت زار دیکھ رہی ہے پھر مجھے محسوس ہوا کہ میں بڑبڑا رہا ہوں۔ غزالہ سے کہہ رہا ہوں...... غزالہ ہمت نہ ہارنا۔ میں لوٹوں گا۔ میں تمہارے لیے لوٹوں گا۔ ان سارے غموں اور زخموں کا مداوا کروں گا جو میں نے تمہیں دیتے ہیں۔ شاید میں واقعی بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے سول کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ میرے چہرے کو سہلا رہا تھا۔

اذیت اپنے عروج پر پہنچ کر قدرے کم ہونے لگی۔ آوازیں پہلے کی نسبت صاف سنائی دینے لگیں۔ یونانی ڈاکٹر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ جیکب ہارڈ سے مخاطب ہوکر کہہ رہی تھی "اگر یہ انجکشن کے بغیر بچ جاتے ہیں تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ بہرحال اگلے دو گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اس دوران میں ہی اصل صورت حال کا پتا چلے گا۔ میں نے ایک پین کلر انجکشن دیا ہے۔ دوسرا خون کو پتلا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا ہم اور کیا کرسکتے ہیں۔"

یونانی ڈاکٹر نے دو گھنٹے کا کہا تھا۔ تاہم ایک گھنٹے بعد ہی میں خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔ میرے مسوڑھوں سے خون نکل رہا تھا۔ سول مجھے بار بار کلیاں کرانے لگا۔ میری حالت کو بہتر ہوتے دیکھ کر اس کی آواز میں توانائی آگئی تھی۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو میں نے سول سے چند باتیں کیں۔ اس کے بعد گہری نیند سو گیا۔

سانپ گھر سے سانپ نکلنے کا واقعہ رات نو بجے کے قریب پیش آیا تھا۔ میں آدھی رات تک گہری نیند سویا رہا۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ کھلی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی آہٹ کی وجہ سے جاگا ہوں۔ میں نیچی چھت والی اسی گیلری میں موجود تھا۔ سامنے دیوار پر ایک مدھم روشنی والا نیلگوں بلب جل رہا تھا۔ خواب ناک سا ماحول تھا۔ میں نے دیکھا کہ سول مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی نگاہیں ایک خاص نقطے پر مرکوز تھیں۔ وہ یک ٹک اس خاص سمت میں دیکھتا چلا جارہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ مجھے ایک سانپ نظر آیا۔ یہ کنگ کوبرا تھا...... غالباً وہ گیلری میں پڑے بے ترتیب سامان کے پیچھے سے برآمد ہوا تھا اور اب پھن پھیلا کر سامنے آگیا تھا۔

میرے ذہن پر ابھی تک غنودگی طاری تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ سامنے نظر آنے والا منظر واقعی حقیقت ہے یا میرے تخیل کا کرشمہ ہے۔ سول اور

ساحب ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھے جلے جا رہے تھے پھر میں نے دیکھا کہ جیک کوبرا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ اس کے جسم کا پھیلاؤ کم ہونے لگا پھر اچانک اس نے رخ پھیرا اور دوڑنے لگا۔ جونہی سول کی طرف سانپ کی پشت ہوئی سول نے پھرتی سے حرکت کی اور سانپ کو گردن سے دبوچ لیا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے سانپ کو چمڑے کے ایک تھیلے میں بند کر کے دیوار سے لٹکا دیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ اس نے بڑی نرمی سے میرے سینے پر کمبل درست کیا اور پھر اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گیا۔

سول ایک حیرت انگیز نوجوان تھا۔ اس سے پہلے [illegible] میں بھی اس کی حیرت انگیز صلاحیتوں نے مجھے ششدر کیا تھا۔ میرے ساتھ [illegible] آج بے چارگی کے ان لمحات میں مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ قدرت نے مجھے مقدر کا نعم البدل دیا ہے۔ مقدر کی "پوری طرح" تو شاید کوئی بھی [illegible] کر سکتا تھا لیکن [illegible] کا پیدا کیا ہوا خلا کسی حد تک کم ہو سکتا تھا۔

اگلے روز دوپہر تک میری طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی۔ پاؤں اور پنڈلی کی سوجن اب [illegible] رہی تھی۔ سول میری دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس نے دوپہر کے وقت مجھے تھوڑا سا کھانا بھی کھلایا۔ میں نے اس سے پوچھا "[illegible] کا کیا بنا؟"

[illegible] نظر آنے لگا۔ بولا "وہ جیکب صاحب لے گئے ہیں۔ آپ کسی طور اسے لٹکانے [illegible] یہاں اس کام کے لیے کوئی [illegible] وغیرہ [illegible]"

[illegible] خاموش رہے۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر [illegible] محسوس کر رہے تھے۔ "ملکی کا کیا حال ہے؟" میں نے سول سے دریافت کیا۔

"[illegible] ابھی تک اسپتال میں ہے [illegible] اس کا ذہن ابھی پوری طرح [illegible] ہے۔"

"باہر کے حالات کیا ہیں؟"

"باہر کے حالات جیکب کے پروگرام کے مطابق ہیں۔" سول نے [illegible] بتایا۔

[illegible]

[illegible] منوہرا دیوی پر مصیبت آئی ہوئی ہے۔ کل جو کچھ ہوا اس کی ذمے داری منوہرا پر آ رہی ہے۔ کل رات کے واقعات میں چار افراد سانپ کے ڈسنے سے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو کی حالت نازک ہے۔ سانپ [illegible] کے علاوہ دو گارڈز کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تمہارا کیا آئیڈیا ہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین کیا ہوگا؟"

"ممکن ہے کہ منوہرا دیوی کو [illegible] ناوابستگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کو [illegible] سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی تنزلی بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ اس کے خلاف زیادہ سخت کارروائی ہو جس کا مطلب ہے کہ گرفتاری وغیرہ۔"

اچانک سول کو خاموش ہونا پڑا۔ سیڑھی کی جانب سے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی تھی۔ جیکب ہماری طرف آ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سیڑھی چڑھ کر گیلری میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جوس کے ڈبے اور پیک تھے۔ [illegible] بسکٹس کے پیکٹ اور چند دوائیں تھیں۔ یہ ساری اشیاء اس نے پلاسٹک کی ایک خوب صورت باسکٹ میں رکھی ہوئی تھیں۔ جیکب کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں اس کا وہ فقرہ گھومنے لگا جو مجھے بے ہوش جان کر اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس ایک فقرے نے جیکب کا سارا دوغلا پن کھول کر رکھ دیا تھا۔ جیکب نے بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ مجھے نئی زندگی پانے پر مبارک باد دی اور دشمن کی [illegible] ناکامی پر "مسرت آمیز حیرت" کا اظہار کیا۔ اس کے بعد وہ دل سے میرا شکریہ ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ [illegible] اس کی خوب رو منگیتر کی جان بچائی تھی اس کے لیے [illegible] ممنون نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں مسٹر شاہ جہاں؟" جیکب نے فدا ہو جانے والے انداز میں پوچھا۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ کل شام گھر والا معاملہ شروع ہونے سے پہلے سول نے مجھے ایک تکلیف دہ خبر سنائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ زو دین کو لاک اپ سے نکال کر پھر پوچھ گچھ کے لیے لے جایا گیا ہے۔ پوچھ گچھ سے مراد "ٹارچر سیل" میں تشدد تھا اور اس تشدد کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔ وہاں بندے کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیا جاتا تھا۔ میں نے جیکب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم واقعی میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو [illegible] میرے دوست کے لیے کچھ کر دو۔"

"تمہاری مراد اس ساتھی سے ہے جو لاک اپ میں بند ہے؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیکب کی [illegible]

سوچ کی گہری لکیریں پھیل گئیں۔ کچھ لمحے بعد اس نے کہا "تم نے ایک مشکل کام بتایا ہے۔ ان لوگوں کے فرار کے بعد [illegible] کی ساری توجہ تمہارے اس ساتھی پر ہے۔ وہ اسے کبھی [illegible] نہیں جانے دیں گے۔ یہ تو کسی طور ممکن نہیں ہے کہ اس کو حراست سے نکالا جا سکے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی [illegible] میں کچھ کمی کر دی جائے..."

"کیسی کمی؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے ذہن میں کوئی واضح طریقہ تو نہیں ہے لیکن اس بارے میں کچھ سوچا جا سکتا ہے۔ [illegible] مثال ہو کہ تمہارا [illegible] کی وجہ سے بہت بیمار ہو جاتا ہے۔ بیماری کی حالت میں [illegible] اس پر سختی نہیں کی جائے گی۔ وہ لوگ معلومات حاصل [illegible] تک بھی اسے زندہ رکھنا پسند کریں گے... کیا خیال ہے؟"

سول نے کہا "ہاں جیکب آپ اس سلسلے میں بہتر فیصلہ [illegible] سکتے ہیں کیونکہ آپ بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ کریں۔ ہماری درخواست یہی ہے کہ زو دین کو تشدد سے محفوظ رکھنا چاہیے۔"

اس سلسلے میں تھوڑی سی [illegible] کے بعد جیکب واپس چلا گیا۔ اس کے تاثرات سے نظر آتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔ [illegible] میری نظروں میں اور مجھ سے بھی زیادہ سول کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

اگلے روز تک میری طبیعت مزید بحال ہو گئی۔ پچھلے دو [illegible] دنوں میں سول مسلسل میرے ہاتھ پاؤں کی [illegible] کو میرے جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ [illegible] کے دو ٹکڑے میری کلائیوں سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ [illegible] بھی آدھا ہو گیا تھا۔ اب ایک پاؤں کی [illegible] تھی۔ [illegible] میں [illegible] جو کھال [illegible] تھی وہ بھی مندمل ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم [illegible] کا فریکچر [illegible]

دوسری طرف جیکب کی خوب رو دوست ملکی [illegible] اسپتال سے لوٹ آئی تھی۔ اپارٹمنٹ میں واپس [illegible] تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھ سے ملنے کے لیے آ گئی۔ وہ [illegible] گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گھنگھریالے بالوں [illegible] اس کی پیشانی کو ڈھانپے ہوئے تھے، ہلکی سبز [illegible] میرے لیے مشکوریت صاف دکھائی دے رہی [illegible] زیادہ قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی [illegible] جیکب [illegible] جیسے کرخت اور [illegible] شخص کے [illegible] اپنے آپ پر [illegible] میرے [illegible] مشکوریت قابل فہم نہیں تھی۔ میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایسے وقت [illegible] کی جان بچائی تھی جب اس کا پولیس آفیسر محبوب سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پتھر بنا کھڑا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "ایک بار پھر [illegible] شکریہ ادا کر رہی ہوں۔ سانپ کی [illegible] اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہو رہی تھیں پھر مجھے یوں لگا جیسے خدا نے میری مدد کے لیے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔"

"اور اس فرشتے کو بھی سانپ نے ڈس لیا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں... مجھے اسپتال میں جیکب نے بتایا [illegible] کلر سانپ نے کاٹا ہے [illegible] آپ کے لیے بہت پریشان رہی ہوں۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے کہ آپ اپنے [illegible] زہریلے زخم کے باوجود [illegible] ہیں۔"

اس نے میری زخمی پنڈلی دیکھی اور حال احوال پوچھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا گاؤن [illegible] اور مجھے بھی اپنی خوب صورت پنڈلیاں دکھائیں۔ یہاں ابھی تک [illegible] نشان موجود تھے پھر اس نے [illegible] گاؤن [illegible] کر کے سینے کا کچھ حصہ دکھایا۔ [illegible] نشان [illegible] دکھائی دے رہے تھے [illegible] سانپ کی گرفت کا نتیجہ تھے۔

اس دوران میں جیکب بھی [illegible] آ گیا۔ اس نے [illegible] گرل فرینڈ کے ساتھ ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور پھر گرل فرینڈ کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اس نے [illegible] میں میرا ہاتھ تھپتھپایا اور بولا "تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ تمہارا دوست زو دین کل [illegible] ہے۔ میں نے اسے لاک اپ میں [illegible] دیا ہے [illegible] تھوڑی [illegible] بھی میں نے کر دیا ہے۔"

"کیا اسے بہت مارا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... ابھی اس کے [illegible] شروع نہیں ہوا تھا۔ دراصل وہ صرف [illegible] بول سکتا ہے۔ اس کی بات مکمل طور پر سمجھنے کے لیے کسی [illegible] مترجم کا انتظام کیا جا رہا تھا۔"

"کیا کسی طرح میری اس سے بات ہو سکتی ہے؟"

"نہیں مسٹر شاہ جہاں [illegible] کیا تمہارے لیے [illegible] کل [illegible] لاک اپ میں ہے اور مکمل طور پر [illegible] ہے۔"

کچھ دیر بعد جیکب [illegible] یونانی ڈاکٹر [illegible]

کر زخم دیکھا اور دوا بدلی۔ وہ بے حد حیران نظر آتی تھی اور خوش بھی تھی کہ میں نہایت زہریلے اثرات سے محفوظ رہا ہوں "آپ ونڈر فل آدمی ہیں!" وہ میری آنکھیں چیک کرتے ہوئے بولی "آپ کے جسم کے دفاعی نظام نے آپ کے لیے چارہ گری کی ہے۔"

"عجیب بات ہے۔" میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے مسٹر جیکب مجھے فرشتہ قرار دے رہے تھے۔ آپ جادوگر کہہ رہی ہیں۔ میرا یہ دوست موّل مجھے سپرمین کا خطاب دے رہا تھا۔ میں تو الجھن میں پڑ گیا ہوں کہ میں ہوں کون!"

"مجھے زیادہ کا تو پتا نہیں لیکن جس طرح آپ نے "ٹیکنی کلر" کے زہر کے خلاف جنگ کی ہے آپ ونڈر فل آدمی ضرور ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا اس معاملے میں ونڈر فل میں نہیں کوئی اور ہے..... کوئی اور ہے جو اپنے سراپے میں اسرار سمیٹے بگولے کی طرح ہواؤں میں چکرایا کرتا ہے.

جس کی بوسیدہ گدڑی میں کرشمے چھپے رہتے ہیں۔ جو معمولی ہوتے ہوئے بھی بے حد غیر معمولی ہے۔ وہی سائیں عالی جو ایک سوالیہ نشان کی طرح کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے وہ واقعہ آج بھی اچھی طرح یاد تھا جب ماریا ٹرسٹ کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں سائیں عالی اچانک مجھ پر جھپٹا تھا۔ اس نے میرے سینے میں ایک پراسرار کانٹا چبھویا تھا اور بھاگ گیا تھا۔ یہ عقدہ مجھ پر کافی دیر بعد کھلا تھا کہ اس کانٹے نے مجھے غیر معلوم مدت کے لیے "زہر پروف" بنا دیا ہے۔

آج ایک عرصے بعد کنگ براؤن کے اس بندی خانے میں مجھے ایک بار پھر اپنی "قوت مدافعت" کی بے پناہ اہمیت کا احساس ہوا تھا۔

یونانی ڈاکٹر بڑی مہربان اور بااعتبار تھی۔ وہ میرے علاج میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہی تھی۔ وہ اچھی شکل کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ آنکھیں کہیں ریشمی ہوئی ہیں۔ اگلے روز شام کے وقت اپارٹمنٹ میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی لگتا تھا کہ جیکب اور میگی نے کچھ مہمانوں کو مدعو کیا ہے۔ میں اور موّل بدستور اسی کمرے میں پناہ گزین تھے۔ اگر جیکب کو بلانا ہوتا تھا تو انٹر کام استعمال کیا جاتا تھا۔ کمرے سے باہر جھانکنے کا واحد راستہ دروازے کا کی ہول تھا۔ اس ہول میں سے ہمیں ایک مستطیل کمرے کا تین چوتھائی حصہ نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ کامن روم کا دروازہ اور کمرے کا کچھ حصہ بھی دکھائی دیتا تھا۔

آیا۔ یہ پانچ چھ مرد و زن تھے۔ ان میں جیکب اور میگی شامل تھے۔ یونانی ڈاکٹر استاماں بھی نظر آ رہی تھی۔ لڑکیوں نے نہایت مختصر لباس پہن رکھے تھے۔ مردوں کے ساتھ وہ بھی شراب پی رہی تھیں۔ یہاں مجھے قدرے فربہ جسم کا شخص بھی نظر آیا جو جیکب کا ماتحت تھا اور جیکب کے ساتھ اپنے ایک دو جن ساتھیوں کو قتل کر کے کنگ کی اس زمین میں داخل ہوا تھا۔ وہ ایک سفید فام لڑکی کو سینے سے لگائے والہانہ رقص کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ موسیقی کی تیز لہروں نے در و دیوار میں ارتعاش پیدا کر رکھا تھا۔

"یہ کس چیز کا جشن ہے؟" موّل نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہ منوہرا دیوی کے زیر عتاب آنے کا جشن ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ جیکب کو اس کی توقع سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ کنگ براؤن صاحب یقیناً منوہرا بختی لے آئے ہوں گے۔" موّل نے جواب دیا۔

میں نے کی ہول سے آنکھ ہٹائی تو موّل نے لگا دی۔ دیر تک کی ہول سے جھانکتے رہنے کے بعد بولا "یہ پتلون والی لڑکی کون ہے؟"

میں نے موّل کو پیچھے ہٹا کر اپنی آنکھ ہول سے لگائی۔ میری نگاہ قوسیہ پر پڑی۔ وہ ابھی ابھی آ کر لگژری صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں میں حسب معمول جوگر شوز تھے۔ بڑی شان سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی اور وائن کی چسکیاں لے رہی تھی۔ جیکب میگی کے ساتھ والے صوفے پر براجمان تھا۔ مسلسل ناچنے کے بعد اس کو پسینہ آیا ہوا تھا۔ جیکب کا چوڑا چکلا چہرہ شراب کی خمار اور اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا۔

جیکب کا ایک دوست ایک بڑی فریم شدہ تصویر لایا۔ اس میں منوہرا دیوی نظر آ رہی تھی۔ وہ غالباً اپنے آفس میں بیٹھی تھی۔ اس کی گردن رعونت سے اکڑی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں نیلی وردیوں والے گارڈز کھڑے تھے۔ یہ اسی ہاسٹل کی ہی کوئی جگہ تھی۔ جیکب نے تضحیک آمیز انداز سے تصویر کو دیکھا، پھر شراب کا گلاس تصویر پر انڈیل کر جست کیا۔ سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ جیکب کے تصویر ہاتھ سے چھوڑ دی۔ وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ جیکب نے شکستہ تصویر کو پاؤں سے مسل دیا۔ جیسا ہمارا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ یہ جشن ...

سے جھانکنا شروع کر دیا۔ درحقیقت اس کمرے میں بند رہ رہ کر ہم سخت گھٹن کا شکار ہو گئے تھے۔ اگر ساتھ والے کمرے میں کوئی ہلچل نظر آتی تھی تو ہمارے لیے دلچسپی کا سامان پیدا ہو جاتا تھا۔ موّل نے سوراخ سے آنکھ لگائے لگائے سرگوشی کی "شاہ جہاں صاحب! پتلون شرٹ والی کے ساتھ کتا بھی ہے...... کتا نظر نہیں آ رہا لیکن زنجیر دکھائی دے رہی ہے۔"

میں نے سوراخ سے جھانکا، واقعی قوسیہ کے ہاتھ میں زنجیر دکھائی دے رہی تھی لیکن کی ہول کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ کتا نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کی دائیں جانب فرش پر بیٹھا ہے۔

کمرے کے مناظر اب کچھ اور بھی ہوش ربا ہو رہے تھے۔ ایک شخص نے اپنی ساتھی لڑکی کو کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اور اسی حالت میں ناچنے کی بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جوڑا قالین پر ہی دراز ہو گیا تھا اور خرمستیوں میں مصروف تھا۔ باقی افراد پی رہے تھے خوش گپیاں کر رہے تھے اور موسیقی کی لے پر ڈانس بلا رہے تھے۔ قوسیہ بھی ان میں شامل تھی۔ جیکب کی گرل فرینڈ میگی اندر داخل ہوئی۔ اس نے مہمانوں سے کچھ کہا۔ اندازہ ہوا کہ وہ انہیں کھانے کی دعوت دے رہی ہے۔

قالین پر رنگ رلیاں مناتا ہوا جوڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے مہمان بھی قدرے حواس میں آ گئے۔ لڑکیاں اپنے بے ترتیب لباس درست کرنے لگیں۔ میوزک کی آواز مدھم ہوئی۔ سب لوگ ڈنر کرنے کے لیے کسی قریبی کمرے کی طرف بڑھے۔ قوسیہ بھی ان میں شامل تھی۔ زنجیر بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ زنجیر سے بندھا ہوا جانور میری نگاہ کے سامنے آیا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ جانور وہی تھا جسے حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ یہ انسان تھا اور انسان بھی وہ جسے میں بہت اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ یہ شیخ زادی قوسیہ کا مظلوم شوہر صالح باری تھا۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھا۔ جسم پر واجبی سا لباس تھا۔ وہی لباس جو یہاں کے بردوں کے لیے یونیفارم کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے ششدر نظروں سے دیکھا۔ باری کی گردن میں ایک چمڑے کا حلقہ تھا۔ قوسیہ کے ہاتھ میں پکڑی زنجیر اس حلقے سے منسلک تھی۔ باری بڑی مظلومیت کے ساتھ قوسیہ کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ مہمان اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً زیر لب مسکراتے بھی ہوں گے۔

میرا سینہ جل اٹھا...... دل چاہا دروازہ کھول کر نکلوں اور قوسیہ کو دبوچ لوں جس زنجیر سے اس نے اپنے شوہر نامدار کو ذلیل کر رکھا ہے اسی زنجیر کو اس کی نازک گردن کے گرد کس دوں

اور اس وقت تک کھینچتا رہوں جب تک وہ موت کے کنارے نہ پہنچ جائے۔

دو تین سیکنڈ کے اندر منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور قوسیہ اپنے شوہر کو ذلت آمیز انداز میں اپنے پیچھے چلاتی ہوئی کھانے کے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ ذہن میں آندھی چل رہی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ باری کیسے اور کہاں سے قوسیہ کے ہاتھ لگا ہے۔ وہ تو ہزاروں میل دور کولمبو میں تھا۔ کولمبو کے نواح میں قوسیہ نے اس کے سر اور گردن پر ضربیں لگائی تھیں اور اسے کار کے قریب بے ہوش چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ بعد میں کئی ہفتوں تک باری نے اپنی زخمی گردن میں کالر پہنے رکھا تھا۔ آج ایک بار پھر اس کی گردن میں کالر نظر آ رہا تھا لیکن یہ دوسری طرح کا کالر تھا۔ یہ اس کی گردن کو سیدھا رکھنے کے لیے نہیں...... گردن کو خم رہنے کے لیے تھا۔ اسے پاؤں میں جھکانے کے لیے اور ذلیل و رسوا کرنے کے لیے تھا۔

"کیا بات ہے شاہ جہاں صاحب! آپ کچھ پریشان ہو گئے ہیں۔" موّل نے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے ٹال دیا۔

رات کو میں دیر تک جاگتا رہا اور اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ باری کی مظلومیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ صاحب ثروت بھی تھا۔ اچھی سے اچھی لڑکی اس کی شریک حیات بننے کو تیار ہو سکتی تھی مگر اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ قوسیہ سے محبت کرتا تھا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے اسے پرخلوص پیار دینا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی دھوکا کھا رہا تھا اور بار بار اذیت سہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والا نشان اسی زیادتی کا حوالہ تھا جو شیخ زادی نے نجانے کب سے اس پر روا رکھی ہوئی تھی۔

میں بستر پر نیم دراز سوچ رہا تھا اور موّل بھی نیم دراز تھا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں اور گہرے مراقبے میں نظر آتا تھا۔ وہ افریقی تھا لیکن اس کا رنگ سیاہ کی بجائے سانولا تھا۔ اسے کسی حد تک گندمی مائل بھی کہا جا سکتا تھا۔ جب وہ گہری سوچ میں ہوتا تھا۔ اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آتی تھیں اور چہرہ تمتما جاتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ پانچ دس منٹ بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پتلیاں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا "کس سوچ میں تھے؟"

"بس یونہی زریں خاں صاحب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" موّل بولا۔

''کیا نتیجہ نکالا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ زریں صاحب...... لاک اپ میں ہیں اور بڑے سکون کے ساتھ ہیں پرسوں رات آپ نہیں سن رہے تھے لیکن مجھے ان کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ ان آوازوں سے تکلیف اور مصیبت کی نشان دہی ہوتی تھی مگر اب ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ وہ بالکل خیریت سے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف ہے بلکہ میں تم سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہوں گا۔''

''جی فرمائیں۔''

''منوہرا دیوی کے بارے میں تمہارے احساسات کیا کہتے ہیں۔ کیا وہ کہیں اس پاس موجود ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ شاید وہ عارضی طور پر سری لنکا واپس جا چکی ہے۔ کل آدھی رات کے قریب جب ہر طرف سناٹا تھا میرے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنگ براؤن منوہرا دیوی کے ساتھ تلخ کلامی کر رہا ہے۔ منوہرا کے لب و لہجے میں ندامت اور ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ میں الفاظ تو ٹھیک ٹھیک نہیں سن پا رہا تھا تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کنگ براؤن ''دو گمشدہ گانی گڑیوں'' کے حوالے سے کوئی ذمے داری منوہرا کو سونپ رہا ہے۔''

میں نے کہا ''اگر واقعی کوئی ایسی بات ہے تو پھر ہو سکتا ہے کہ منوہرا سری لنکا واپس نہ گئی ہو بلکہ یہیں لندن میں موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ دونوں گانی گڑیوں کو لندن اور قرب و جوار میں ہی تلاش کیا جا رہا ہوگا۔''

''آپ کی بات درست ہے۔'' موہل نے اعتراف کیا ''اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ لندن میں ہی موجود ہو۔''

''کیا تم کنگ براؤن کی آواز ٹھیک سے پہچان سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، پہچانتا ہوں۔'' وہ سوئے سوئے لہجے میں بولا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ پر کیفیت طاری ہوئی تھی تو اس وقت بھی میں نے کنگ کی آواز سنی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور جانی پہچانی آواز بھی سنی تھی۔ یہ پرنس داراب کی آواز تھی۔ یہ آواز بہت واضح طور پر میرے کانوں تک پہنچی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پرنس بھی یہاں واپس آ چکا ہے۔''

''جی ہاں...... وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے جناب...... ہو سکتا ہے کہ سو دو سو میٹر کے اندر موجود ہو۔ میں نے اس کے ساتھ ساتھ لڑکی نینا کی آواز بھی سنی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اس کے ساتھ بیڈ روم میں ہے اور اسے بہلا پھسلا رہا ہے۔''

''بہلا پھسلا رہا ہے؟ کیا مطلب؟''

''ان کی گفتگو کے کچھ الفاظ میری سمجھ میں آئے تھے۔ پرنس داراب نینا کو اس کی بہنوں کے حوالے سے تسلی دے رہا تھا۔ پرنس نے اسے بتایا ہے کہ اس کی بہنیں وعدے کے مطابق کولمبو پہنچا دی گئی ہیں۔ اب وہ وہاں بالکل خیریت سے ہیں۔ وہ ایک دو دن میں فون کے ذریعے نینا سے ان کی بات کرا دے گا۔''

میں حیرت کے عالم میں موہل کا چہرہ دیکھنے پر مجبور تھا۔ وہ اتنے یقین سے بات کر رہا تھا جیسے اس نے پرنس کے بیڈ روم میں ڈکٹا فون چھپا رکھا ہو اور وہاں ہونے والی گفتگو ریسیور کے ذریعے سن رہا ہو۔ اس کی صلاحیتیں کسی وقت ناقابلِ یقین محسوس ہونے لگتی تھیں۔ میں نے اسے آزمانے کے لیے پوچھا ''کیا تم اب بھی پرنس کی آواز سن رہے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا ''میں نہیں سن سکتا لیکن اتنا اندازہ مجھے ضرور ہے کہ پرنس اب بھی نینا کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں موجود ہے۔ نینا کے لیے پرنس کی ''خواہش'' بڑی شدید محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس کی آواز اس کے جسم دونوں کا بھوکا ہے۔''

موہل جو کچھ بتا رہا تھا وہ میرے ذہن میں بھی پہلے سے موجود تھا۔ میرا اپنا قیافہ بھی یہی تھا کہ پرنس اپنے طور پر نینا کی حالت کو سہارا دینے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ وہ نینا کی تسلی کے لیے نینا کی بہنوں کے حوالے سے کوئی بھی مناسب جھوٹ بول سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ نینا کی بہنوں کے کولمبو پہنچنے کے حوالے سے اگر کوئی بات کی گئی ہے تو وہ سراسر جھوٹ ہے۔ وہ دونوں ابھی لندن میں ہی کہیں موجود تھیں اور کنگ براؤن انہیں منوہرا کے ذریعے تلاش کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات مجھے کل جیکب کے ذریعے بھی معلوم ہوئی تھی۔

میں اور موہل اس بارے میں کچھ دیر تک بات کرتے رہے پھر ذہنوں میں کئی سوال لیے سو گئے۔ اگلے روز دس بجے کے لگ بھگ آنکھ کھلی موہل باتھ روم میں تھا۔ پانی گرنے کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نہا رہا ہے۔ میں نے بستر سے اٹھ کر انگڑائی لی۔ پنڈلی میں ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ زخمی انگلی بھی درد کی لہر دماغ تک پہنچائی اور مجھے بتایا کہ میں ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں دروازے کے قریب کھٹ کھٹ سنائی دی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ جیکب ہاوڈ ہوگا لیکن دروازہ کھلا تو صاحب خانہ کے بجائے خاتون خانہ یعنی میگی نظر آئی۔ وہ رہے ہوئے ریشمی لباس پہنتی تھی۔ ان لباسوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بڑے مختصر ہوتے تھے۔ جہاں سے شروع ہوتے تھے بس وہیں پر ختم ہو جاتے تھے۔ یہ لباس میگی کے کندن جیسے چمکتے دمکتے جسم کا بہت تھوڑا سا ''رقبہ'' ہی ڈھانپ پاتے تھے۔

وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور حال احوال دریافت کرنے لگی۔ اس نے انداز میں لگاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ میرے لیے ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو بھی لائی تھی۔ ''یہ کس لیے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سننے کے لیے اور کس لیے...... آپ یہاں ایک طرح سے قیدِ تنہائی کاٹ رہے ہیں۔ بیٹھے بور ہوتے رہتے ہیں۔ ٹی وی پر بھی بس گنے بندھے پروگرام ہی آتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔

''یہ لفظ میں اپنائیت نہیں ہے۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ اس کی ہلکی سبز آنکھوں میں حدت تھی۔

''پھر اور کیا کہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے کچھ کہا ہے۔ حالانکہ آپ نے جان کی بازی لگا کر میری جان بچائی ہے۔ کچھ کہنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ انسان کا عمل سب کچھ کہہ دیتا ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ ہاتھ کے اس لمس میں گرمی اور گرمجوشی کی کیفیت تھی۔

اچانک اپارٹمنٹ کے کسی حصے سے میگی کو جیکب کی آواز سنائی دی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہے اور میگی سے ضرورت کی کوئی چیز مانگ رہا ہے۔ میگی نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا پھر ہولے سے میرا ہاتھ دبایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی چال میں ایک طرح کی دعوتِ نظارہ تھی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رکی، چوروں کے انداز میں مسکرائی اور سرگوشی میں بولی ''میں سہ پہر کے وقت آؤں گی۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ یہ بہت پرانی کہانی تھی۔ کسی نے خوب رو لڑکی کی جان بچائی اور وہ لڑکی اپنے تن من کے سارے ہتھیاروں کو چمکا کر اس شخص پر حملہ آور ہوگئی۔ اسی دوران میں موہل بھی نہا دھو کر نکل آیا۔ وہ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی۔

سہ پہر کو سبز آنکھوں اور گھونگھریالے بالوں والی میگی نے پھر آنا تھا لیکن وہ نہیں آئی۔ اس کا ''شوہر نما عاشق'' جیکب اتفاقاً گھر آ گیا تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آتا تھا۔ گہری سفاک آنکھوں میں خوشی کی چمک بھی تھی۔ وہ پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ میں اور موہل خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ بولا ''دوستو! آج میں نے تم سے دو اہم باتیں کرنی ہیں۔''

''کہیے، ہم ہمہ تن گوش ہیں۔'' موہل نے انگریزی دانوں کی طرح انگریزی بولی۔

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا ''پہلی بات تو یہ ہے کہ بڑے منہ والی منوہرا دیوی سے ہماری جان چھوٹ گئی ہے۔ کم از کم وقتی طور پر تو وہ ہماری نظروں سے دور ہو گئی ہے۔''

''یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔'' موہل نے جیکب کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے آگے بڑھنے میں وہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ پرسوں کنگ کے سامنے اس کیا کی طلبی ہوئی تھی۔ غالب امکان یہی ہے کہ کنگ نے اسے بے نقط سنائی ہیں۔ بعد ازاں اسے موجودہ ذمے داریوں سے سبکدوش کر کے ہاسٹل سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ وہ اب ان دو گلوکار بہنوں کو تلاش کر رہی ہے جو وِنچسٹر میں پرنس کے محل سے شاہ جہاں کے ساتھ فرار ہو گئی تھیں...... اور اب شاید شاہ جہاں کو بھی پتا نہیں کہ کدھر ہیں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' میں نے جیکب کی تائید کی ''میں نے ان دونوں کو عمر فریشی کی تحویل میں دے دیا تھا اور وہ انہیں لے کر کسی نامعلوم جگہ چلا گیا تھا۔''

جیکب ہاوڈ نے سگریٹ کے چند گہرے کش لیے اور صوفے پر پچھلی بار بھی پھیل کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں اور جبڑے معمول سے زیادہ چوڑے اور ابھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ عام حالت میں بھی دھیرے دھیرے دانت چبا رہا ہے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''اب ہم دوسرے موضوع کی طرف آتے ہیں اور یہ ایک بہت اہم موضوع ہے۔ میں اس سلسلے میں تم دونوں کا مشورہ بھی چاہتا ہوں اور تعاون بھی۔''

''ہم اگر کسی لائق ہوئے تو ہرگز پیچھے نہیں رہیں گے۔''

''یہ میرا بھی وعدہ ہے کہ اگر میں کسی مقام پر پہنچ سکا تو تمہارے تعاون کو بھولوں گا نہیں۔ خاص طور سے موہل جس طرح میرا ساتھ دے رہا ہے یہ میرے لیے بھولنے والی بات نہیں ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں جیکب کی احسان شناسی اور

دوست نوازی پر لعنت بھیجی میری نگاہوں میں ایک بار پھر وہ خونی منظر لہرا گیا تھا جب بریڈفورڈ کے نواح میں جیکب نے بڑی لاپرواہی سے اپنے دیرینہ ساتھیوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دیا تھا۔

موبل نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا" جیسا کہ تم لوگ جانتے ہی ہو کہ" بی ہوم" کے نیچے اس زیر زمین سیٹ اپ کو توسیع دی جا رہی ہے اور دن رات تعمیراتی کام ہو رہے ہیں۔ کنگ براؤن کی انتظامیہ کو بہترین انجینئرز اور ہنرمندوں کا تعاون حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جدید مشینی سہولتیں بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ جگہ جہاں ہم موجود ہیں ساحل سے بہت تھوڑی فاصلے پر واقع ہے۔ زیر زمین کھدائی سے جو ملبہ نکل رہا ہے وہ ایک TUNNEL کے ذریعے سمندر میں ڈسپوز کیا جا رہا ہے۔"

"جی ہاں اس بارے میں آپ نے تفصیل سے بتایا تھا۔" موبل نے ہنکارا بھرا۔

جیکب نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا" یہاں میرے ایک دو مہربان اور بھی موجود ہیں۔ وہ اپنی دسترس کے مطابق مجھ تک اہم معلومات پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے ہی میں ایک اہم اطلاع تک پہنچا ہوں اور اب وہ اطلاع تم پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیے!" موبل نے جیکب کی خواہش کے مطابق مکمل دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

جیکب بولا" یہ کوئی تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ مشرقی زون میں تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ کھدائی کے دوران مشین کا چپو کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ کچھ دیر بعد انکشاف ہوا کہ یہ کافی عرصہ پہلے ڈوب جانے والے کسی بحری جہاز کا حصہ ہے۔ جہاز کا یہ ٹکڑا لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کافی پرانا ہے۔ شروع میں خیال تھا کہ یہ زیادہ بڑا ٹکڑا نہیں...... لیکن کئی دن کی مسلسل کھدائی کے بعد یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس کی لمبائی قریباً 120 فٹ اور گہرائی 80 فٹ سے زیادہ تھی۔ یہ حادثے کا شکار ہونے والے جہاز کا اگلا حصہ تھا۔ یہ پہلو کے بل ریتیلی زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ میری گرل فرینڈ میگی کا پسندیدہ ترین مشغلہ آثار قدیمہ پر ریسرچ ہے۔ اس سلسلے میں اس کے پاس یونیورسٹی کا ڈپلومہ بھی ہے۔ میگی کا خیال ہے کہ یہ جہاز شاید سترہویں یا سولہویں صدی میں حادثے کا شکار ہوا۔ شدید طوفان کے سبب وہ بڑی شدت سے کنارے کی ریتیلی زمین سے ٹکرایا اور ڈوب گیا۔ تصادم کی وجہ سے اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا اور دہیں بلدل میں دھنس گیا۔ بعد کے سوڈیڑھ سو برسوں میں وہ جگہ خشکی کا حصہ بن گئی ہوگی۔"

"ہاں اس قسم کی ارضی تبدیلیوں کے بارے میں اکثر سنا ہے۔" میں نے تائید کی۔

وہ نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا" کنگ براؤن کے انجینئر اس پرانے جہاز کے ڈھانچے میں داخل ہوئے تھے میگی بھی ان کے ساتھ تھی۔ ان لوگوں کو وہاں کچھ انسانی پنجر نظر آئے۔ اس کے علاوہ کچھ پرانے برتن اور سونے چاندی کے سکے بھی ملے۔ میگی اور اس کے ساتھی انجینئروں کا خیال ہے کہ جہاز میں کچھ اور قیمتی سامان بھی موجود ہو سکتا ہے۔ اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک تجارتی جہاز ہے اور اس کے اندرونی حصے میں ایک بڑے آہنی سیف کے آثار بھی نظر آئے ہیں۔ پرانے وقتوں میں ایسے سیف صرف ان جہازوں میں بنائے جاتے تھے جو قیمتی سامان کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہوتے تھے۔"

"پھر اس سیف تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی گئی؟" میں نے پوچھا۔

"کی گئی...... لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔"

"وجہ؟" موبل نے پوچھا۔

"وجہ بڑی معمولی ہے لیکن جتنی معمولی ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی ہے۔" جیکب نے اپنی چوڑی تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا" میرا خیال ہے کہ میں یہاں بیٹھ کر تمہیں بتاؤں گا تو شاید تم سمجھ نہیں پاؤ گے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ تمہیں موقعے پر لے جاؤں۔"

"موقعے پر کس طرح جا سکتے ہیں۔ تم خود ہی تو بتا رہے ہو کہ ہماری تلاش کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہے۔"

"اس کا بھی ایک حل سوچ لیا ہے میں نے...... آخر تم دونوں کب تک یوں دبک کر یہاں بیٹھے رہو گے۔" جیکب نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا" یونانی ڈاکٹر استاماں کو تو جانتے ہو ناں تم؟ میں نے اسے یہاں بلایا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آنے ہی ہوگی۔ وہ چہرے کی شکل و شبہات تبدیل کرنے کی بھی ماہر ہے۔ کم از کم اتنی تبدیلی تو ضرور لے آئے گی کہ تم باہر نکل سکو۔ ویسے بھی اس کٹیا سموہا کے چلے جانے کے بعد تمہاری تلاش کی سرگرمی وہ نہیں رہی جو پہلے تھی......"

ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ کال بیل سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد میگی نے دروازے سے منہ لگاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں اطلاع دی" جیکب ڈارلنگ...... ڈاکٹر استاماں آ گئی ہے۔"

☆☆☆

جیکب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شام کے وقت ہم اپنے بندی خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کرا کئی دنوں سے ہمارے بے فکری ہی مسکن فراہم کر رہا تھا۔ ڈاکٹر استاماں نے بڑی چابک دستی سے ریڈی میڈ اشیاء کے ذریعے ہمارے چہروں کی ہیئت تبدیل کی تھی۔ میرا نچلا ہونٹ کافی موٹا دکھائی دینے لگا تھا۔ ناک کچھ پھیل گئی تھی، آنکھیں کچھ چھوٹی دکھائی دینے لگی تھی۔ آنکھوں اور چہرے کی رنگت بھی تبدیل کر دی گئی تھی۔ ایسی ہی کچھ نمایاں تبدیلیاں موبل کے چہرے پر بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ موبل اب ہرگز افریقی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بالوں کے ساتھ بھی ڈاکٹر نے کچھ ایسا کیا تھا کہ وہ کافی حد تک سیدھے دکھائی دینے لگے تھے۔

جیکب ہارڈ نے ہمارے لیے دو نیلی وردیوں کا انتظام بھی کیا تھا اس کے علاوہ ہمارے شناختی کاغذات بھی تیار کروائے تھے اور یہ کاغذات ہماری وردیوں کی جیب میں ہی تھے۔ ہمیں ہمارے کمرے سے نکالنے سے پہلے جیکب نے ہمیں سپاہی محافظوں کے انداز میں چلنے پھرنے کی پریکٹس بھی کرائی تھی اور دیگر قواعد و ضوابط سے بھی آگاہ کیا تھا۔ کسی بھی پریشانی کی صورت میں اس نے ہمیں خاموش رہنے کا مشورہ دیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہے گا اور صورت حال کو سنبھال لے گا۔

جیکب کے اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد ہم ایک صاف ستھری گول سرنگ میں پہنچے یہاں ایک چمکتی ہوئی الیکٹرک گاڑی موجود تھی۔ یہ سبک گام گاڑی اسٹیل کی متوازی لائنوں پر بے آواز چلتی تھی۔ جیکب ہارڈ کے عقب میں چلتے ہوئے ہم اس گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جیکب کی پارٹنر میگی بھی اس کے ساتھ تھی۔ جیکب کی اہمیت یہاں واضح تھی۔ گارڈز اسے باقاعدہ سیلوٹ کرتے تھے اور دیگر افراد بھی تعظیم کے ساتھ اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ جیکب کی وجہ سے ہمارے ساتھ بھی وی آئی پی سلوک ہو رہا تھا۔ دو تین جگہ چیکنگ کے مناظر نظر آئے لیکن ہمیں کہیں روکا نہیں گیا۔

سبک گام گاڑی جو ایک کیپسول کی شکل میں تھی۔ بڑی تیزی سے رواں ہوئی اور اس نے دو تین منٹ میں ہمیں کافی دور پہنچا دیا۔ ہم گاڑی سے اتر کر ایک طویل کاریڈور میں داخل ہو گئے۔ کوریڈور کی دیواروں میں کہیں کہیں شیشے تھے، ان شیشوں میں سے ہمیں اردگرد کے مناظر نظر آئے اور ہماری حیرت میں اضافہ ہوا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ سیکڑوں مزدوروں کے علاوہ بڑی بڑی مشینیں بھی اس کام میں حصہ لے رہی تھیں۔ تمام کے تمام مزدور وہی بدنصیب افراد تھے جو اپنی ضرورتوں کے جال میں پھنس کر کنگ کے شکنجے میں آئے تھے۔ ان میں ہر نسل اور رنگ کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ مسلسل قید رہنے سے پرندے بھی اپنے قفس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اڑانیں بھول جاتے ہیں۔ ان مزدوروں میں سے بھی کچھ ایسے دکھائی دیتے تھے جو اپنے حال میں خوش نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ انہی لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں احساس زیاں باقی نہیں رہتا۔

مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں CLOSED کا بورڈ لگا تھا۔ اس بورڈ کے قریب دو چار چوکس گارڈز بھی موجود تھے۔ اس ناکے سے گزر کر ہم آگے بڑھے۔ چند میٹر دور پھر NOT ALLOWD کا سائن بورڈ دکھائی دیا۔ گارڈز بھی موجود تھے۔ یہ راہداری گرد آلود تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کئی ہفتوں سے یہاں آمد و رفت بند ہے۔

ہم ایک آہنی گیٹ کے سامنے پہنچے۔ جیکب نے مجھے اور موبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" یہ وہ سائٹ ہے۔ اس دروازے کی دوسری جانب جہاز کا ڈھانچہ ہے۔ قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے یہ سائٹ بند کر دی گئی تھی۔"

"بند کرنے کی وجہ؟" موبل نے پوچھا۔

"یہاں اوپر تلے آٹھ اموات ہوئی تھیں۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈھانچے کا پچھلا حصہ بھی پوری طرح مٹی سے نہیں نکالا جا سکتا۔ مزدوروں نے انتظامیہ کی کوشش کے باوجود یہاں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہے، ایسے موقعوں پر اس طرح کا مسئلہ ہو ہی جایا کرتا ہے۔"

"اموات کی وجہ کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"بظاہر تو یہ اوپر تلے ہونے والے دو حادثات ہی تھے، لیکن اکثر لوگوں نے اسے دوسرا رنگ دینا شروع کر دیا۔ میرا مطلب ہے کہ پراسرار رنگ...... تم جانتے ہی ہو کہ مشرقی لوگ اس قسم کی کیفیت کا شکار جلدی ہو جاتے ہیں۔ یہاں کام کرنے والے زیادہ تر ورکرز کا تعلق جنوبی ایشیا اور آس پاس کے علاقوں سے تھا۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی نیلی وردیوں والے گارڈز نے بہت بڑا آہنی گیٹ ان لاک کیا اور کھول دیا۔

ہمارے سامنے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ ایک قدیم چوبی

جہاز کا شکستہ حال ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔ یہ مکمل ڈھانچہ نہیں تھا۔ صرف سامنے والا حصہ تھا۔ جیکب کے بقول اس کی لمبائی 120 فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ تاہم یہ لمبائی بھی ابھی ساری کی ساری مٹی سے باہر نہیں آئی تھی۔ لکڑی گل سڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں جہاز کی بیرونی دیوار میں بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ گیٹ کے کھلتے ہی ایک عجیب سی سڑاند نے دل و دماغ کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہی سڑاند جو بہت پرانے کھنڈروں اور ملبہ جات کا خاصا ہوتی ہے۔ میگی کی سبز آنکھوں میں دلچسپی کی چمک نظر آ رہی تھی۔ جیسے یہ کسی پرانے بیڑے کا شکستہ حال پنجر نہ ہو کوئی شاندار فن پارہ ہو، جس کی خوب صورتی نگاہوں کو جکڑ رہی ہو۔ وہ آگے بڑھی اور محبت سے شکستہ بھربھری لکڑی کو ہاتھوں سے چھونے لگی۔

جیکب کے چہرے پر ایک ساعت کے لیے خوف کا سایہ لہرایا۔ اس نے میگی کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹا لیا پھر وہ ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ”اس خستہ حال ڈھانچے کے ساتھ خوامخواہ میں کچھ ایسی چیزیں جڑ گئی ہیں جو بالکل جڑنا نہیں چاہئیں تھیں۔ تم تو جانتے ہی ہو، افواہوں کے پر نہیں ہوتے۔ … لیکن یہ ازلی ہے اور جوں جوں ازلی ہے اس میں زیادہ طاقت آتی جاتی ہے۔“

”شاید آپ ان حادثات کا ذکر کر رہے ہیں جو کھدائی کے بعد پیش آئے۔“

جیکب نے مول کی بات کا جواب اثبات میں سر ہلا کر دیا ”پہلا حادثہ کھدائی کے دوسرے ہی دن پیش آ گیا تھا۔ ایک امریکی انجینئر جہاز کے مستول کے قریب کھڑا تھا کہ جھٹکا لگنے سے نیچے گر گیا۔ وہ مٹی اور ریت کے ڈھیر پر گرا تھا اس لیے شدید چوٹوں سے محفوظ رہا۔ دوسرا حادثہ کافی اندوہناک تھا۔ یہ چھ سات روز بعد پیش آیا۔ جہاز کی بلندی سے ایک بہت بڑا شہتیر ٹوٹ کر گرا۔ اس وزنی شہتیر کے نیچے آ کر چار مزدور ہلاک اور ایک درجن کے قریب زخمی ہو گئے۔ صرف دو دن بعد تیسرا حادثہ پیش آ گیا۔ جہاز کے عرشے کا سامنے والا حصہ جس پر دس بارہ مزدور کھڑے تھے …… اور جو بظاہر کافی مضبوط نظر آتا تھا اچانک ٹوٹ گیا یہ سارا ملبہ مزدوروں سمیت نیچے کھڑے ایک بلڈوزر پر گرا ”بلڈوزر ڈرائیور“ سمیت تین افراد موقع پر ہلاک ہو گئے اور ایک بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ میرے خیال میں تم عرشے کا وہ ٹوٹا ہوا حصہ یہاں سے بھی دیکھ سکتے ہو۔“ جیکب نے وہیں کھڑے کھڑے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

شکستہ عرشے کے کچھ حصے واقعی دکھائی دے رہے تھے۔ جہاز کا ڈھانچہ ایک بہت ہی خطرناک اور پراسرار نظر آنے لگا تھا۔ مول نے پوچھا ”کیا ان حادثات کی وجہ سے کھدائی بند کر دی گئی۔“

”ہاں۔ ایک دہشت کی سی فضا بن گئی تھی۔ مزدوروں کے علاوہ انجینئرز نے بھی کام سے انکار کر دیا تھا۔ دراصل یہاں ایک اور مسئلہ بھی تھا اور یہ مسئلہ ان دونوں حادثات سے بھی پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ میں اس مسئلے کے بارے میں بتانے کے لیے ہی تمہیں یہاں لایا ہوں۔“ پھر وہ میگی سے مخاطب ہو کر تحکمانہ انداز میں بولا ”میرا خیال ہے میگی! اس بارے میں تم ذرا خود بتاؤ۔“

میگی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ وہ نیکر اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں سرخ اسکارف تھا۔ وہ گھونگھریالے بالوں کو پیشانی سے جھٹکتے ہوئے بولی ”ڈھانچے کے اندر سے کچھ آوازیں آتی ہیں۔ ابھی تک ان آوازوں کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ ہم کچھ دیر تک یہاں رکیں تو ہم بھی یہ آوازیں سن سکیں۔ آوازوں کا آہنگ چیخوں کی طرح کا ہے، جیسے بہت سے افراد مل کر چیخ رہے ہوں لیکن …… یہ چیخوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

میں اور مول سامنے کھڑے جیکب کا چہرہ دیکھنے لگے۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ہاں ایسا ہی ہے۔ سننے والے کو یہ آوازیں چیخوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں لیکن یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں کہ یہ واقعی چیخیں ہی ہوں گی۔ امکان ہے کہ ڈھانچے کے اندر کوئی ایسی ”حرکت“ ہوتی ہے جس کے سبب لوہے کی بڑی بڑی چادریں یا پھر گارڈرز وغیرہ آواز پیدا کرتے ہیں، اور یہ آواز ڈھانچے کے خالی حصوں میں گونجتی ہے۔“

”لیکن…… مٹی میں دبے ہوئے اس ڈھانچے میں حرکت کس چیز کی ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی بات سوچنے والی ہے۔“ میگی نے کہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی طرف سے ہوا وغیرہ آتی ہو۔ بعض اوقات تیز ہوا ملبے وغیرہ میں سے گزرے تو عجیب سا شور پیدا ہوتا ہے۔“ مول نے خیال ظاہر کیا۔

”یہ ڈھانچہ مکمل طور پر مٹی میں دبا ہوا ہے۔ اس امر کا امکان بہت کم ہے کہ یہاں سے ہوا کا گزر ہوتا ہوگا۔“ جیکب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میگی نے ہمیں مستول کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ دکھایا اور بولی ”اس مستول کی بناوٹ ظاہر کرتی ہے کہ یہ جہاز انگلینڈ ہی کا تھا۔ مستول کے عین نیچے جو گودام سے بنے ہوئے ہیں، یہ

صرف تجارتی جہازوں میں ہی ہوا کرتے تھے۔ ہمیں صرف تین چار گودام ہی نظر آ رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس جہاز میں کم و بیش بیس گودام یا کنٹینرز ہوں گے۔ یہ سب کچھ جہاز کے اس حصے میں ہوگا جو سمندر کی تہ میں بیٹھ چکا ہے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر عالمانہ لہجے میں بولی ”لوہے کے جہاز اٹھارہویں صدی کی پانچویں چھٹی دہائی میں بننے شروع ہوئے تھے، اس سے پہلے جہاز مکمل طور پر لکڑی سے بنائے جاتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس جہاز کا تعلق اٹھارہویں صدی کی شروع کی دہائیوں سے ہے…… اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا زمانہ سترہویں صدی کا ہو۔ جس قسم کا سیف اس جہاز میں دیکھا گیا ہے یہ اسی دور میں بنائے جاتے تھے۔“

”کیا آہنی سیف یہاں سے کافی فاصلے پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میگی نے جواب دیا ”جہاز کی چونچ کے پاس ہے جو سوراخ دکھائی دے رہا ہے وہاں سے سیف کا فاصلہ 60 فٹ کے قریب ہوگا۔ مزدوروں نے مٹی کے اندر سرنگ سی بنائی ہے جس میں سے رینگ رینگ کر گزرنا پڑتا ہے۔“

جب ہم یہ باتیں کر رہے تھے میری نگاہ نیلی وردیوں والے گارڈز پر پڑی۔ وہ آہنی گیٹ کی دونوں جانب کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر واضح طور پر ہراس نظر آ رہا تھا۔ شاید انہوں نے بھی دیگر لوگوں کی طرح جہاز کے اس شکستہ ٹکڑے کو ”آسیب“ کا درجہ دے دیا تھا اور اب مستقبل کے اندیشوں میں دبلے ہو رہے تھے۔

اچانک ہم سب بری طرح چونک پڑے۔ ڈھانچے کے اندرونی حصے سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی تھی۔ ایک نامانوس سی گونج تھی پھر یوں لگا جیسے یہ آواز چیخوں میں تبدیل ہو رہی ہے۔

میں نے دیکھا گیٹ کے قریب کھڑے نیلی وردیوں والے ہراساں انداز میں چند قدم پیچھے ہٹ گئے تھے…… آواز مسلسل آ رہی تھی، کبھی مدھم پڑ جاتی تھی کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ میگی پیچھے ہٹنے کی بجائے چند قدم آگے چلی گئی تھی۔ وہ بڑی توجہ سے آواز سن رہی تھی جیکب کی کیفیت بھی یہی تھی۔ میں نے بھی دھیان دیا۔ آواز چیخوں سے مشابہ ضرور تھی لیکن یہ چیخیں نہیں تھیں۔ ہاں اگر کوئی شخص شدید خوف کا شکار ہوتا تو شاید ان کو چیخیں ہی سمجھتا۔

قریباً تین چار منٹ بعد یہ آواز مدھم ہوئی اور پھر ختم ہو گئی۔ جیکب سوالیہ نظروں سے مول کو دیکھنے لگا ”تمہاری سماعت ہم سے کہیں زیادہ تیز ہے مول…… تمہارے خیال میں یہ کیسی آوازیں ہیں۔“

مول کے ماتھے پر شکنیں ابھری ہوئی تھیں اور وہ سر جھکائے بڑی یکسوئی سے بیٹھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد بولا ”یہ انسانی آوازیں تو نہیں ہیں۔“

”تو کیا حیوانی آوازیں ہیں؟“ جیکب نے قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

”نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ مجھے کسی جاندار کی آوازیں نہیں لگتیں۔ کوئی حرکت کرتی ہوئی چیز ہے جو پرانے لوہے کی پرتوں کے درمیان سے گزرتی ہے اور آواز دیتی ہے۔“

”تمہارے اندازے کے مطابق یہ کیا شے ہو سکتی ہے؟“ میگی نے پوچھا۔

”اگر میں آپ کا اندازہ پوچھوں تو؟“ مول نے جوابی سوال کر دیا۔

میگی کے حسین چہرے پر سوچ کے آثار ابھرے۔ وہ بولی ”ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کے قدیم ڈھانچوں میں ہزاروں کی تعداد میں چوہے بسیرا کر لیتے ہیں۔ جب لوہے کی چکنی چادروں پر بے شمار چوہے ایک ساتھ بھاگیں تو اس قسم کا شور پیدا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ گونج کی وجہ سے یہ شور ہمیں اس انداز میں محسوس ہوتا ہو۔“

”لیکن اگر اس ڈھانچے میں اتنی زیادہ تعداد میں چوہے وغیرہ موجود ہیں تو پھر انہیں یہاں سے بھی نظر آنا چاہیے۔“ میں نے نکتہ اٹھایا ”دوسرا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ چوہے وغیرہ ایک خاص وقت میں ہی ایک ساتھ کیوں بھاگتے ہیں۔“

مول کے چہرے پر وجدانی کیفیت کا اثر تھا۔ وہ بولا ”محترمہ! میں آپ کو اس بات کا تو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کسی جاندار کی پیدا کی ہوئی آوازیں نہیں ہیں۔“

”تو پھر کس کی آوازیں ہیں؟“

”اگر میں ایک بار مزید سننے میں کامیاب ہو جاؤں تو شاید مجھے معلوم ہو جائے۔“ مول نے کہا۔

ہم وہاں پندرہ بیس منٹ مزید رکے۔ آوازیں دوبارہ سنائی نہیں دیں۔ جیکب ہارڈ ہمیں ڈھانچے سے دور لے آیا پھر اس نے گارڈز کو اشارہ کیا اور انہوں نے بہت بڑا آہنی گیٹ بند کر کے اس کے قفل چڑھا دیے۔ ہم جس طرح یہاں تک آئے تھے اسی طرح تیز رفتار گاڑی کے ذریعے واپس جیکب کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئے۔ راستے میں کئی بار

میری اور میگی کی نگاہ ملی۔ جب بھی ایسا ہوا مجھے میگی کی آنکھوں میں لگاوٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ جیکب کی موجودگی کے سبب دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی، پھر بھی اس کے اندر کی باچل اپنا عکس دکھا رہی تھی۔ ہم اپارٹمنٹ میں واپس پہنچے تو شام کے سات بج چکے تھے۔ ہم اپنی پناہ گاہ میں دوبارہ مقفل ہوگئے۔

آدھ گھنٹے بعد جیکب ہارڈ ہم دونوں کے پاس پھر آدھمکا۔ وہ ابزی ہو کر بیٹھ گیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا "منوہرا یہاں سے عارضی طور پر دفع ہوگئی ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے یہ میرے پاس سنہری موقع ہے۔ اگر میں اس موقع پر کنگ کے روبرو کوئی اچھی کارکردگی دکھانے میں کامیاب ہو جاؤں تو کامیابی کے راستے کھل سکتے ہیں اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں کہ منوہرا کی ذمے داریاں مجھے سونپ دی جائیں۔ میرا خیال ہے کہ تم دونوں میری بات سمجھ رہے ہو۔"

"شاید تم جہاز کے ڈھانچے میں موجود آہنی سیف کے حوالے سے کوئی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" جیکب بولا "میگی کے علاوہ باقی دو ایکسپرٹس کو بھی یقین ہے کہ آہنی سیف سے "گراں قدر" اشیاء مل سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بڑی خوبی کی بات ہوگی...... لیکن...... فرض محال اگر سیف کے حوالے سے ہماری توقعات پوری نہ بھی ہوئیں تو...... کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ کنگ براؤن کو ہماری "ایفی شینسی" کا پتا چلے گا اور وہ ہماری جرأت کا قائل ہوگا۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ انجینئر حضرات میں سے کوئی بھی ڈھانچے میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس مہم جوئی کو بیکار اور خطرناک قرار دے رہے ہیں۔ میں ان کتے کے بچوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اندر سے وہ بھی واہموں کا شکار ہیں...... ڈیجڑے ہیں سالے!"

"آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ڈھانچے میں داخل ہونے سے ملبے کے نیچے دبنے وغیرہ کا خطرہ شدید نہیں۔" موول نے پوچھا۔

"بالکل...... میرا یہی مطلب ہے۔ تم دونوں سمجھ دار ہو۔ خطرہ تو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ اب ہم یہاں بیٹھے ہیں، اچانک ہی کنگ براؤن کے گارڈ تمہیں پکڑنے کے لیے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بھی تو خطرہ ہی ہے...... لیکن یہ ایسا خطرہ نہیں کہ ہم دہشت زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ نکلیں۔ جو دو حادثات جہاز پر پیش آئے ہیں، وہ اتفاقیہ تھے اور کسی حد تک جلد بازی کا نتیجہ تھے۔ مجھے نوّے فیصد یقین ہے کہ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

جہاں تک آسیب وغیرہ کی بات ہے...... اس پر تو...... تبصرہ کرنا ہی فضول محسوس ہوتا ہے۔ تم دونوں کا کیا خیال ہے؟"

موول نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولا "ہم آپ کے خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔"

جیکب ہارڈ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "شاہ جہاں تم بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ تمہارے بارے میں ہم نے جو کچھ سنا ہے اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ تمہیں بھی نوادرات وغیرہ سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ پاکستان سے دریافت ہونے والے ایک بڑے دفینے کے سلسلے میں بھی تمہارا نام خبروں میں گردش کرتا رہا ہے۔"

"نوادرات سے میری دلچسپی بس ایک اتفاق کے تحت تھی۔" میں نے کہا "بہرحال اگر تم سمجھتے ہو کہ اس سلسلے میں میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو بتاؤ۔"

جیکب نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "اگر ہم اگلے ایک دو روز میں جہاز کے اندر گھسنے کا پروگرام بنائیں تو کیا تم جہاز کے اندر جانے میں میرا ساتھ دو گے؟"

"اگر تمہارے نزدیک میرا جانا سود مند ہے تو میں ضرور جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

جیکب کی آنکھیں اندرونی مسرت سے چمک اٹھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر مجھے اور میری صلاحیتوں کو خاصی اہمیت دے رہا ہے۔

سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ موول سے مخاطب ہوا "میرا خیال تھا کہ تم ڈھانچے کے اندر سے نکلنے والی آواز کے متعلق کوئی ٹھوس رائے دے سکو گے۔"

"میں آپ کی توقع پر پورا اتروں گا لیکن اس کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دیں۔"

"وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"اگر ہو سکے تو کل تھوڑی دیر کے لیے مجھے پھر وہاں لے جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو بار میں نے وہ آواز پھر سن لی تو اس کی اصلیت جان جاؤں گا۔"

"کل تو مجھے چند گھنٹوں کے لیے ہوٹل سے باہر جانا ہے۔ بہرحال میں کسی نہ کسی کی ڈیوٹی لگا جاؤں گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ ڈھانچے تک لے جائے گا۔"

رات کو میں اور موول دیر تک جاگتے رہے اور اس نئے معاملے کے بارے میں بات کرتے رہے۔ زمین کھدائی کے دوران میں کسی پرانے جہاز کے ڈھانچے کا ایک حصہ برآمد ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ہاں یہ بات ضرور بڑی تھی کہ ڈھانچے کے اندر آہنی سیف میں سے کچھ قیمتی ساز و سامان

نکل آتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی دلچسپ تھی کہ کھدائی کے فوراً بعد دو حادثات ہو گئے تھے اور ان حادثات کی وجہ سے لوگوں میں مختلف افواہیں پھیل گئی تھیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میگی کے ساتھ ایک شخص آیا اور اس نے موول سے کہا کہ وہ اسے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہے۔ اس شخص کی ہدایت کے مطابق موول نے نیلی وردی پہن لی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ موول کے جانے کے بعد میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ ٹی وی سے دل بہلانے کی کوشش کی لیکن وہاں بور بت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں بستر پر نیم دراز ہو گیا اور سوچوں کے تانے بانے بننے لگا۔ دور کسی ہال کمرے سے انگلش میوزک کی آواز آرہی تھی۔ یہ میوزک یقیناً کسی ایسے کلاس روم میں بجایا جا رہا تھا جہاں نوجوان لڑکیوں کو ڈانس کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان نوخیز کلیوں کو وہ ناز و انداز سکھائے جاتے تھے جن کے ذریعے وہ اپنے آقاؤں کو خوش کرسکتی تھیں۔ موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے لیکن آداب غلامی سکھانے والی یہ موسیقی مجھے روح کا عذاب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے اکٹھی کی جانے والی یہ لڑکیاں اپنے آقاؤں کے حکم پر ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی تھیں۔ رنگ و نسل اور قوم سے قطع نظر وہ سب کی سب غلام تھیں۔ اپنے اپنے گلستانوں اور اپنی اپنی شاخوں سے جدا ہونے کے بعد ان سب پر ایک جیسی افتاد نازل ہوئی تھی۔ ان سے ہوس پرستوں کے دل بہلائے جانے کا کام لیا جاتا تھا۔

اچانک میں چونک گیا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ قفل میں چابی گھومی اور پھر میگی اندر آگئی۔ اس کا لباس عموماً نکاہوں کو گرمانے والا ہوتا تھا لیکن آج تو وہ کچھ زیادہ ہی ہوش ربا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوئمنگ پول سے سیدھی ادھر آگئی ہے۔ ہیڈ فون اس کے گلے میں جھول رہے تھے اور ایک چھوٹا سا واک مین جسم کے زیریں لباس کے ساتھ اٹیچ تھا۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔" وہ بڑے انداز سے مسکرائی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا نیند آرہی تھی۔"

"کیا بات ہے۔ رات کو جاگتے رہتے ہیں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

وہ اس انداز سے صوفے پر بیٹھی تھی کہ جسم کا ہر ہر عضو نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کی غیر معمولی بے تکلفی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ آج جیکب بھی ہوٹل میں موجود نہیں۔ اس نے کل ہی بتا دیا تھا کہ وہ دن کے وقت ہوٹل سے باہر رہے گا۔

"یہ کیا مصیبت ہے؟" اس نے انگلی سے میری ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے آپ کی پہلے والی شکل ہی اچھی لگتی تھی۔ ڈاکٹر استاماں نے آپ کا پورا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ لفافے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اندر خط کا مضمون اچھا ہونا چاہیے۔" وہ بڑے دلربا انداز میں میرے بدلے ہوئے حلیے پر تبصرہ کر رہی تھی۔

دو تین منٹ کے اندر اس کی بے تکلفی اتنی بڑھی کہ اس نے ہیڈ فون میرے کانوں پر چڑھا دیے اور مجھے کسی امریکی گلوکارہ کا شوخ و شنگ گانا سنانے لگی۔ اس کا سر میرے کندھے سے ٹکا ہوا تھا اور ایک ہاتھ بڑی لاپروائی سے میری ٹانگ کے بالائی حصے پر دھرا تھا پھر وہ تھوڑا سا اور کھسکی۔ اس کی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرانے لگیں اور ہونٹ میری گردن سے چھونے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ جیکب کی غیر موجودگی کا پورا فائدہ اٹھانے پر تلی ہوئی تھی۔ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کی یہ ایک ادنیٰ سی مثال تھی۔ مغرب میں لوگ شادی سے کترانے لگے ہیں۔ وہ اکٹھے رہنے کو ہی "شادی" کا درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ڈھیلا ڈھالا سا بندھن کسی بھی وقت مزید ڈھیلا ہو جاتا ہے اور گناہ پر ایک اور گناہ جنم لے لیتا ہے۔

میں نے اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی "جیکب یہاں نہیں ہے۔ تمہارا ساتھی موول بھی ڈھانچہ دیکھنے گیا ہوا ہے......"

"تو پھر؟"

"مم...... مجھے اپنے قریب رہنے دو...... مجھے یہ اچھا لگ رہا ہے۔" وہ منمنائی۔

"کیوں اچھا لگ رہا ہے؟"

"شاید اس لیے کہ تم نے میری جان بچائی ہے۔"

"یہ تو بہت گھسا پٹا تصور ہے۔ بلکہ اسے تھرڈ کلاس تصور کرنا چاہیے۔ اگر کوئی تمہاری جان بچاتا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ بستر پر لیٹ کر تمہارا انتظار شروع کر دیتا ہے تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بستر پر پہنچ جاؤ۔"

"میں تمہیں کوئی صلہ دینے کی کوشش تو نہیں کر رہی...... اور میں جانتی ہوں تم بھی کسی صلے کی توقع نہیں رکھتے ہو۔ بس میرا دل چاہ رہا تھا تمہارے پاس بیٹھنے کو۔"

"اگر بات صرف بیٹھنے کی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تم اتنے لیے دیئے کیوں ہو۔" وہ میری بڑھی ہوئی شیو کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"اس لیے کہ میں یہاں مہمان ہوں اور جیکب کی حیثیت میزبان کی ہے۔ مہمان اور میزبان کا رشتہ برقرار رہے تو بہتر ہے۔"

"واقعی درست کہتے ہیں۔ تم مشرقی لوگ عجیب ہوتے ہو۔" وہ اب مجھے بے تکلفی سے "تم" کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

اس نے شرارتی انداز میں میرے بالوں میں ہاتھ چلا کر انہیں منتشر کر دیا اور پھر کچھ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے موضوع بدلنا چاہ رہی تھی۔ اس موقعے پر جہاز کے ڈھانچے سے بہتر موضوع اور کیا ہوسکتا تھا "کیا تم جیکب کے ساتھ واقعی جہاز کے اندر جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہاری کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس میں کوئی ہرج نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شدید خطرہ ہے۔ آسیب وغیرہ کے چکر کو تو میں سرے سے مانتی ہی نہیں ہوں۔ جیکب پچھلے تقریباً تین ہفتوں سے ڈھانچے کے اندر جانے کے لیے پر تول رہا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اکیلا تھا اور وہ یہ کام اکیلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب تمہاری اور موئل کی شکل میں اسے دو اچھے ساتھی مل گئے ہیں۔ موئل کی ماورائی صلاحیتوں پر جیکب بہت بھروسا کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ موئل آنے والے دنوں میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اب موئل کے علاوہ اسے تمہارا تعاون بھی حاصل ہوگیا ہے اور وہ اس حوالے سے بہت خوش ہے۔"

"اگر ہم ڈھانچے کے اندر جاتے ہیں اور سیف تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ تو بھی ایسی سیفوں کو کھولنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔"

"یہ تو سیف دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔" میگی نے کہا۔

ہم کافی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ ایک دو بار میگی نے پٹڑی سے اتر کر رومانٹک ہونے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اسی دوران میں موئل واپس آ گیا۔ ساتھ میں وہ شخص بھی تھا جو موئل کو لے کر گیا تھا۔ موئل کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔ میگی نے بے تاب لہجے میں موئل سے پوچھا "کچھ کامیابی ہوئی؟"

"بالکل ہوئی بیگم صاحبہ۔" موئل نے مطمئن انداز میں کہا۔

"کیا نتیجہ نکالا ہے؟"

موئل گہری سانس لے کر بولا "مجھے ننانوے فیصد یقین ہے بیگم صاحبہ کہ یہ پانی کی آواز ہے۔ جہاز کا ڈھانچہ جس جگہ مٹی میں دبا ہوا ہے، وہ ساحل کے بہت قریب ہے۔ میرے اندازے کے مطابق سمندری پانی کا کوئی دھارا ڈھانچے کے پہلو سے ٹکراتا ہے اور وہاں سے تیزی کے ساتھ پیچھے کی سمت جاتا ہے۔ پانی کی اس رگڑ کے سبب یہ طویل چیخ جیسی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ آواز گونجتی ہے تو زیادہ آوازوں کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔"

"کیا اب تمہاری موجودگی میں یہ آواز پیدا ہوئی تھی؟" میں نے موئل سے پوچھا۔

"جی ہاں شاہ جہاں صاحب! ابھی ہم نے گیٹ کھلوایا ہی تھا کہ یہ آواز سنائی دینے لگی پھر وقفے وقفے سے تین بار یہ آواز سنائی دی۔ دراصل سمندری پانی جہاز کے ڈھانچے تک تب ہی پہنچ پاتا ہے جب کوئی بڑی لہر پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً ڈھانچے کی پرلی طرف مٹی میں کچھ ایسے رخنے موجود ہیں جن سے پانی اندر آتا ہے۔"

موئل کی باتوں میں وزن تھا۔ میگی بھی اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو رہی تھی۔

شام کے بعد جیکب بھی واپس آ گیا۔ اس نے اپنا حلیہ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے تھوڑا سا بدل رکھا تھا۔ اس نے ہمیں یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ کسی کام سے لندن گیا تھا. یقیناً یہ جیکب کی دیدہ دلیری تھی۔ وہ اپنے تقریباً ایک درجن ساتھیوں کو قتل کر کے روپوش ہو جانے والا بھگوڑا پولیس افسر تھا۔ پولیس اسے دیکھتے ہی گولی سے اڑا سکتی تھی اور اگر وہ گرفتار ہوتا تو بھی کم از کم سزا موت تھی۔ اس کے باوجود وہ لندن میں دندناتا آ گیا تھا۔

موئل نے جیکب کو بھی وہی کچھ بتایا جو اس سے پہلے ہمیں بتایا تھا۔ جیکب اور میگی نے رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہماری پناہ گاہ میں ہی کھایا۔ کھانے کے دوران میں تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔ جیکب کا خیال تھا کہ ہم پرسوں ڈھانچے میں داخل ہوں اور سیف کھولنے کی کارروائی کریں۔

"لیکن کل بھی تو یہ کام ہوسکتا ہے۔" میگی نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ کل کنگ سے اس بارے میں اجازت طلب کرلوں۔ اس کے علاوہ، سیف توڑنے کے لیے کچھ ضروری سامان بھی درکار ہوگا۔ اس سامان کا انتظام بھی کرلیا جائے گا۔"

"میں ساتھ ضرور جاؤں گی۔" میگی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم اتنی خبطی کیوں ہو رہی ہو؟" جیکب اسے جھڑک کر بولا "ایک دو دن صبر کرلو، سب کچھ سامنے آ جائے گا۔"

میگی خجل ہو کر رہ گئی۔ جیکب قدرے نرم لہجے میں بولا "ہمیں وہاں ہجوم نہیں چاہیے۔ بس ہم تینوں ہوں گے یا سیف کھولنے کے لیے دو بندے ہوں گے۔ اگر بعد میں ضرورت ہوئی تو مزید کمک لے جائیں گے لیکن ابھی ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ سیف توڑنے کے لیے جو دو بندے ساتھ جائیں گے وہ کون ہوں گے۔ یہاں اس کام کے لیے ایسے تین چار انجینئر ہیں جن سے مدد لی جاسکتی ہے لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی ڈرے ڈرے ہیں..... بہرحال میں اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں۔"

اگلے دو روز تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ دوسری شام ایک Live ٹی وی پروگرام میں، میں نے پرنس داراب کو ایک تقریب میں دیکھا۔ اسمتھ سینئر اور جیکب ہارڈ وغیرہ بھی ٹی وی اسکرین پر دکھائی دے رہے تھے۔ میں کنگ براؤن کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ یہاں مجھے پرنس داراب کے ساتھ گاتی گڑیا نینا بھی نظر آئی۔ اس نے ایک پھولدار لمبا گاؤن پہن رکھا تھا۔ کانوں میں بڑے آویزے تھے۔ وہ پرنس داراب کے پہلو میں خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ واقعی نازک سی گڑیا تھی۔ اسے داراب کے پہلو میں دیکھ کر "ریچھ پہلوے حور" کہنے کو دل چاہتا تھا۔ داراب نے نجانے کس طرح بہلا پھسلا کر اسے مطیع کر رکھا تھا۔ وہ اس کے چکروں میں یوں الجھی ہوئی تھی کہ شاید مر کر ہی چھوٹ سکتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق داراب نے نینا کو یہ چکما دیا تھا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بحفاظت کولمبو پہنچ گئی ہیں اور وہ دو تین روز میں فون پر ان سے بات بھی کر سکے گی۔ یہ وعدہ ایفا ہونا تو بہت مشکل تھا۔ اب پتا نہیں کہ اس کے لیے عیار داراب نے کیا بہانہ بنایا تھا۔

تیسرے روز علی الصباح جیکب ہمارے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ تیاری مکمل ہو گئی ہے۔ آج دوپہر کے بعد ہم ڈھانچے میں گھسیں گے۔ ایک سنسنی سی رگ و پے میں دوڑتی محسوس ہوئی۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ہم نے وردیاں زیب تن کرلیں۔ جیکب نے ہمارے لیے دو ہتھیار بھی فراہم کر دیے تھے۔ ان میں سے ایک ریوالور جب کہ دوسرا مشین پسٹل تھا۔ میرے خیال میں ہتھیاروں کی کوئی ایسی ضرورت تو نہیں تھی۔ بہرحال "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" والا محاورہ ہم پر صادق آتا تھا۔

ہم جیکب اور میگی کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ سے روانہ ہو گئے۔ حسب سابق سبک رفتار الیکٹرانک گاڑی نے ہمیں چند منٹ میں منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ طویل کوریڈور میں ہم نے پاپیادہ سفر کیا۔ راستے میں تعمیراتی کام زور و شور سے جاری تھا۔ ایک نوجوان تعمیر ورکر کام کے دوران میں زخمی ہوگیا تھا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک بڑی کرین دلدلی زمین میں پھنس گئی تھی۔ درجنوں مزدور دھکا لگا کر اسے کیچڑ سے نکال رہے تھے۔ ایک جگہ ہم نے ایشیائی عورتوں کو بھی بوجھ ڈھوتے اور مشقت کرتے دیکھا۔ یہ سب لوگ کنگ کی زمینی جنت کو وسیع کرنے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے۔ وہ برائی کی دیواریں کھڑی کر رہے تھے۔ ان دیواروں پر جبر و ستم کی چھت ڈالی جانے والی تھی اور پھر یہاں مکروفریب کا رنگ و روغن کیا جانا تھا..... کرنے والے یہ سب کچھ بحالت مجبوری کر رہے تھے۔ کرانے والا کہیں دور بیٹھا تھا اور اپنی برقی آنکھ سے اپنے غلاموں کو مصروف کار دیکھ رہا تھا۔ جو ہزاروں سالوں سے ہوتا آیا ہے وہ آج بھی ہو رہا تھا..... اور ستم کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ "تہذیب کے گہوارے" انگلستان میں ہو رہا تھا۔ اگر یہی تہذیب کی معراج تھی تو پھر وحشت کی معراج کیا ہوسکتی تھی۔

میں سوچتا رہا اور جیکب اور میگی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میگی کی چال بڑی دلربا تھی۔ وہ گاہے گاہے جیکب کی نظر بچا کر مجھے دیکھ لیتی تھی۔ شاید یہ بھی عورت کی فطرت ہے کہ اگر مرد اس سے دور بھاگتا ہے تو وہ مزید شدت کے ساتھ اس کی طرف کھنچتی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم آہنی گیٹ کھلوا کر ڈھانچے کے روبرو پہنچ چکے تھے۔ گلی سڑی قدیم لکڑی اور زنگ آلود لوہے کی وہی بو ہمارے نتھنوں میں گھس گئی جو تین دن پہلے گھسی تھی۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے دو مزید افراد بھی ڈھانچے کے نزدیک موجود تھے۔ ان کے پاس جدید قسم کا ویلڈنگ پلانٹ تھا۔ یہ پلانٹ انہوں نے ایک بڑے بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ بیگ اٹھانے کے لیے اس کے دونوں جانب مضبوط دستیاں لگی ہوئی تھیں۔

پروگرام کے مطابق سب سے پہلے مجھے، جیکب اور موئل کو ڈھانچے میں داخل ہونا تھا..... اس کے بعد میگی کو دونوں انجینئر حضرات کے ساتھ اندر آنا تھا۔ ان دونوں حضرات میں سے انجینئر دراصل ایک ہی تھا۔ دوسرا فورمین مکینک تھا۔ اس ادھیڑ عمر شخص کا نام واش تھا۔ یہ بے حد ذہین

اور ہر فن مولا قسم کا شخص تھا۔ (میگی نے ڈھانچے میں جانے کے لیے جیکب کو رضامند کر لیا تھا)۔

ہماری گھڑیاں ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں جب ہم ایک ایک کر کے قدیم جہاز کے ڈھانچے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک ڈرامائی سا منظر تھا۔ جو لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے ان کے چہروں پر بھی ہیجانی کیفیت تھی۔ ہم جہاز کی چونچ کی طرف سے اندر داخل ہوئے تھے۔ لکڑی کے فرش پر پاؤں رکھتے ہوئے یہ دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں فرش ٹوٹنے سے پاؤں نیچے نہ چلا جائے۔ جہاں کہیں لوہا نظر آ رہا تھا وہ بری طرح زنگ آلود تھا یا مٹی میں دب کر ویسے ہی ختم ہو چکا تھا۔ ڈھانچے میں داخل ہو کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جہاز ہماری توقعات سے زیادہ پرانا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ٹارچ روشن کر لینی چاہیے۔'' موول نے مشورہ دیا۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' جیکب بولا ''ابھی راستہ دکھائی دے رہا ہے۔''

ہم ایک ٹوٹے ہوئے آہنی جنگلے کے پاس سے گزر رہے تھے جب جیکب کے عقب میں چلتا ہوا موول اچانک ٹھٹک گیا۔ وہ شکاری جانور کے سے انداز میں چوکنا تھا اور بڑے دھیان سے کچھ سن رہا تھا۔ ''کیا آپ کو بھی کچھ سنائی دے رہا ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا لیکن اس کے بعد فوراً ہی میرے کانوں میں بھی گونج کی آواز پڑی۔ یہ کوئی نئی آواز نہیں تھی۔ یہ وہی شور تھا جو اس سے پہلے بھی چیخوں کی شکل میں سنائی دیتا تھا۔ اب چونکہ ہم شور کی جگہ سے زیادہ نزدیک تھے لہٰذا آواز کی شدت بہت زیادہ تھی۔ بالکل یوں لگا جیسے اس ڈھانچے میں مر جانے والے لوگوں کی روحیں ایک ساتھ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی ہوں اور ہمارے کانوں کے پردے پھاڑنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

یہ شور بس ایک آدھ منٹ تک ہی رہا اس کے بعد سکون ہو گیا۔ موول نے انگلی سے اپنے سامنے اشارہ کیا۔ تقریباً چالیس فٹ کی دوری پر جہاز کے برج کے عین نیچے بہت سا پانی پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ پانی ابھی ابھی پھیلا تھا اور اب سمٹ کر واپس کہیں گم ہو رہا تھا۔ اس پانی کا تعلق یقیناً اس آواز ہی سے تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے سنی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ موول کا اندازہ بالکل درست ہے۔ جہاز کے اس ڈھانچے کے اندر کسی سمت سے پانی داخل ہوتا تھا۔ گونجتی ہوئی آواز اور اس پانی میں گہرا تعلق تھا۔

ہم اس صورت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اب تاریکی بڑھ گئی تھی ہمیں ٹارچیں روشن کرنا پڑیں۔ کئی جگہوں پر لکڑی اور مٹی میں بڑے بڑے سوراخ نظر آئے۔ ان سوراخوں کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ یہاں سانپوں اور اس قسم کے دیگر حشرات کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک جگہ موول کی ٹارچ کی روشنی چند انسانی ہڈیوں اور ایک کھوپڑی پر پڑی۔ موول نے بڑی بے تکلفی سے نیچے جھک کر کھوپڑی اٹھا لی۔ کیا خبر یہ کون تھا؟ جوان تھا یا بوڑھا۔ ملاح تھا یا مسافر۔ کہاں جا رہا تھا یا کہاں سے آ رہا تھا۔ اسے رونے والوں نے اسے کیسے کیسے رویا تھا۔ کیسے کیسے اسے یاد کیا تھا۔ اب تو اسے یاد کرنے والے بھی یقیناً یادوں کا حصہ بن چکے تھے۔

جیکب کی ہدایت پر موول نے کھوپڑی کو واپس اسی مقام پر رکھ دیا۔ اب ہم ڈھانچے میں کافی آگے آ گئے تھے۔ یہاں بہت کچھ مٹی میں دبا ہوا تھا۔ مزدور یہاں تک پہنچے ہی نہیں تھے اور اگر پہنچے تھے تو انہوں نے بہت تھوڑا کام کیا تھا۔ اس جگہ کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب ہم کو پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ اچانک مجھے ریتلی مٹی کے نیچے کوئی چمکیلی شے دبی نظر آئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس جگہ پر مرکوز کی اور اکڑوں بیٹھ کر اس چمکیلی شے پر سے مٹی ہٹائی۔ یہ چند سکے تھے۔ چاندی کے ان سکوں پر کسی قدیم یورپی حکمران کی تصویر بنی ہوئی تھی اور کچھ لکھا بھی ہوا تھا۔ یہ جو کچھ بھی لکھا ہوا تھا ہم تینوں کے لیے بالکل نامانوس تھا۔

جیکب نے سکوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا ''ایسے ہی چند سکے کھدائی کے دوسرے روز بھی عرشے کے سامنے والے حصے سے ملے تھے۔ ان سکوں کو دیکھ کر ہی میگی نے کہا تھا کہ یہ جہاز دو تین صدی پرانا ہو سکتا ہے۔''

''سکوں کی شکل شباہت سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔'' میں نے بھی تائید کی۔

جیکب نے یہ سکے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی جیب میں منتقل کر لیے۔ ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ اب راستہ بہت تنگ تھا۔ ہمیں ایک سرنگ نما خلا میں اوندھا لیٹ کر آگے کی طرف کھسکنا پڑ رہا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ریت کے ذرے چمک رہے تھے اور چھوٹے موٹے حشرات الارض بھی حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ جیکب سب سے آگے تھا، اس کے پیچھے میں اور موول تھے۔ گھٹن اور بدبو بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت پرانے قبرستان میں قبر کشائی کی کارروائی کر رہے ہیں۔

بالآخر ہم اس ہال نما کمرے میں پہنچ گئے جہاں آہنی

سیف موجود تھا۔ یہ ہال نما کمرا قدرتی طور پر مٹی سے محفوظ تھا۔ یہاں بہت سی اشیا جوں کی توں موجود تھیں۔ کچھ تلواریں ڈھالیں اور نیزے وغیرہ..... ایک طرف جہازی سائز کا چوبی تخت تھا۔ جس پر ہاتھی دانت سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ چند ملاحوں کے جوتے اور کپڑے بھی یہاں موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر متاثر کن منظر دو انسانی ڈھانچوں کا تھا۔ ان میں سے ایک مرد کا اور دوسرا یقیناً عورت کا تھا۔ ان کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈوب کر ہلاک ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ عورت نے اپنا چہرہ جیسے مرد کے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ ان ڈھانچوں میں کیڑوں نے سوراخ کر رکھے تھے اور مکڑی کے جالے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ نجانے کتنے سو سال سے یہ ابن آدم اور بنت حوا اس آہنی سیف کے قریب یوں ہی بے حرکت پڑے تھے۔

آہنی سیف کی اونچائی پانچ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ گہرائی بھی اتنی ہی ہوگی۔ لمبائی اندازاً دس فٹ تھی۔ سیف بہت موٹی چادر کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں دو ہاضمی قفل تھے۔ جبکہ ایک بڑا قفل سامنے کی طرف جھول رہا تھا۔ پانچ چھ کلو وزنی یہ قفل بھی زنگ اور مٹی سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس قفل کو قفل کے طور پر پہچاننا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس ہال کمرے کا فرش لکڑی کے بجائے فولادی چادروں کا تھا۔ سیف کو فرش پر رکھا نہیں گیا تھا بلکہ فرش میں گاڑ دیا گیا تھا۔

ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں سیف کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سامنے والے حصے پر نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ لکھے گئے تھے۔ زنگ کی وجہ سے یہ الفاظ بھی اتنے مدھم پڑ چکے تھے کہ انہیں ٹھیک سے پڑھا جانا دشوار تھا۔ جیکب نے مسرت کے عالم میں سیف کو تھپتھپایا اور بولا ''لو دوستو! ہم کسی آسیب سے مٹھ بھیڑ کیے بغیر یہاں پہنچ گئے ہیں اور امید ہے کہ اب مزید کامیابی ملے گی۔''

''کیا خیال ہے آپ کا۔ ویلڈنگ پلانٹ والوں کو بلا لیا جائے؟'' موول نے پوچھا۔

''بلا لیتے ہیں ان کو بھی، پہلے تم بھی تو اپنی کچھ کارکردگی دکھاؤ۔'' جیکب نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں جناب۔'' موول نے کہا۔

''تم بہت دور تک دیکھ اور سن لیتے ہو۔ اس لوہے کے اندر بھی جھانک کر دیکھو کہ کیا ہے؟'' جیکب کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔

موول بھی ہلکے پھلکے انداز میں بولا ''اگر مجھے کچھ نظر آیا ہوتا تو سب سے پہلے آپ ہی کو بتاتا۔''

ایک بار پھر وہی پراسرار گونج سنائی دی جس نے کئی ماہ سے ہوٹل کے مکینوں کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ پہلے تھرتھراہٹ ابھری پھر پکی آہنی چادروں سے پانی کے ٹکرانے کی صدا آئی اور یوں محسوس ہوا جیسے ایک طویل چیخ گونج رہی ہے۔ اب چونکہ ہم اس آواز کے قریب تھے لہٰذا اس کا آہنگ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ سمندری پانی کی کارستانی ہے۔ میں نے ٹارچ کا روشن دائرہ ہال کمرے سے باہر پھینکا ایک بار پھر جہاز کے چوبی فرش پر پانی کے آثار نظر آئے۔ یہ جھاگ والا پانی کافی آگے تک آیا پھر واپس چلا گیا۔ اب اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ یہ سب سمندری پانی کی کارستانی ہے۔ جو نامعلوم رخنوں سے جہاز کے ڈھانچے سے ٹکراتا ہے۔ موول نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا......

اچانک میری ٹارچ کا روشن دائرہ ایک چیز پر پڑا اور میں بری طرح چونک گیا۔ یہ فولادی فرش پر خون کے چند قطرے تھے۔ ایک لمحے میں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ تازہ خون ہے۔ ابھی کسی کا دھیان اس خون کی طرف نہیں گیا تھا۔ یہ حیران کن صورت حال تھی۔ ہم تینوں میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا تھا پھر یہ تازہ خون کہاں سے آیا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا۔ ہم تینوں کے علاوہ بھی یہاں کوئی ذی نفس موجود تھا...... عین ممکن تھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر چھپ گیا ہو۔ میرا ہاتھ غیر محسوس طور پر اپنی جیب میں رکھے ریوالور تک پہنچ گیا۔

موول نے میرے ہاتھ کی حرکت کو نوٹ کیا اور پوچھا ''کیا بات ہے جناب؟''

میں نے انگلی کے اشارے سے اسے خون کے قطرے دکھائے۔ موول کے نتھنے ایک دم شکاری جانور کی طرح پھیل گئے۔ وہ بے حد چوکس دکھائی دینے لگا تھا۔ ''ہاں یہاں کوئی موجود ہے۔'' اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''لیکن کہاں ہے؟'' جیکب نے پوچھا۔

ہماری ٹارچوں کے روشن دائرے چاروں طرف گردش کرنے لگے تھے۔ موول نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ''مجھے تیزاب کی بو بھی آ رہی ہے۔ کیا آپ کو آ رہی ہے؟''

''نہیں...... لیکن خطرے کی بو ضرور آ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

یکایک مجھے ایک لکڑی کے عقب سے رائفل کی نال نظر آئی۔ نال کا رخ یقینی طور پر جیکب کی طرف تھا۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور جیکب ہارڈ کو

اپنے ساتھ لیتا ہوا زنگ آلود فولادی فرش پر گرا۔ یہی وقت تھا کہ جب شعلہ سا چمکا اور دھماکے سے ایک گولی سیف سے ٹکراتی ہوئی کسی جانب نکل گئی۔

عین اسی وقت ایک پرچھائیں موبل پر جھپٹی۔ میں نے موبل کو بازی گروں کی طرح ہوا میں الٹی قلابازی کھاتے ہوئے دیکھا۔ حملہ آور کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ جونہی موبل کے پاؤں زمین پر ٹکے حملہ آور کی کلہاڑی کا پھل ایک بار پھر موبل کے سر پر چمکا۔ موبل نے یہ وار جھک کر بچایا اور حملہ آور کو سر سے بلند کر کے سخت فرش پر پٹخ دیا۔ کلہاڑی حملہ آور کے ہاتھ سے نکل کر دور تک لڑھکتی چلی گئی تھی۔ ایک اور کلہاڑی بردار شخص چنگھاڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے فرش پر لوٹ لگا کر خود کو اس کی مہلک زد سے بچایا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکلا تو جیکب کی بھرپور لات اس کے چہرے پر پڑی اور وہ ڈکراتا ہوا الٹ کر میرے قدموں میں گرا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لی۔ یہی وقت تھا جب ایک بار پھر میری نگاہ رائفل کی نال پر پڑی۔ اس مرتبہ رخ میری طرف تھا۔ شعلہ چمکا اور گولی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ پمپ ایکشن گن سے دوسری گولی چلتی میں پوری شدت سے حملہ آور پر جا پڑا۔ کلہاڑی کے ایک زوردار وار سے رائفل بردار کا ایک ہاتھ کہنی سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف گرا۔ کسی جنگلی کی مانند اس کے سر اور چہرے کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ وہ بے حد غلیظ اور مکروہ صورت نظر آتا تھا۔ دوسری طرف موبل بھی بیک وقت دو حملہ آوروں سے برسر پیکار تھا۔ موبل کی پھرتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے پاؤں میں جیسے طاقتور اسپرنگ تھے۔ کسی ماہر جمناسٹر کی طرح وہ ہوا میں اڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

جیکب ایک گوشے میں سمٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے مشین پسٹل نکال لیا تھا۔ بہر حال وہ کسی حملہ آور پر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ شاید وہ فائر کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بس وہ اپنے دفاع کے موڈ میں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا فرش پر گرنے سے جیکب کے گھٹنے پر شدید چوٹ آئی تھی اور اس کی بائیں ٹانگ کچھ دیر کے لیے بے کار ہو کر رہ گئی تھی......

تھوڑی ہی دیر بعد موبل نے اپنے دو مد مقابل افراد سے نبٹ لیا۔ ان میں سے ایک کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ فولادی فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ دوسرا نیم بے ہوش ہو کر اس جوڑے پر گرا تھا... جو ایک دوسرے کی بانہوں میں جکڑا ہوا صدیوں سے فرش پر دراز تھا۔ مرد و زن کے وہی دو ڈھانچے جن پر ہال میں گھستے ہی ہماری نظر پڑی تھی۔ حملہ آور ان ڈھانچوں پر گرا تھا اور بوسیدہ ہڈیوں کو بھوز کر رکھ دیا تھا۔ ہر طرف پسلیاں ہی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔

حملہ آوروں کی کل تعداد چار تھی۔ دو تین منٹ کے اندر وہ چاروں زیر ہو چکے تھے۔ فائرنگ کی آواز یقیناً جہاز کے ڈھانچے سے باہر تک گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آہنی گیٹ کی طرف سے شور و غل سنائی دے رہا تھا۔ یقیناً ڈھانچے سے باہر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور اس سنگین صورتحال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ غالباً اتنی ہمت ان میں نہیں تھی کہ وہ اس "آسیب زدہ" جہاز میں داخل ہو کر صورت حال جاننے کی کوشش کرتے۔ باہر ہی سے چیخ و پکار کر رہے تھے پھر شاید میگی نے ہی ہمت کی تھی۔ ہمیں اپنے بائیں جانب کافی فاصلے سے میگی کی آواز سنائی دی۔ "جیکب...... کہاں ہو جیکب؟" وہ اپنے پارٹنر کو پکار رہی تھی۔

جیکب کی جگہ موبل نے پکار کر جواب دیا۔ "ہم ٹھیک ہیں بیگم صاحبہ...... ہم بالکل ٹھیک ہیں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟" میگی نے بلند آواز سے پوچھا۔

جیکب نے کراہتے ہوئے موبل سے کہا "اسے کہو اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود باہر آ رہے ہیں۔"

موبل نے منہ کے سامنے ہاتھوں سے بھونپو سا بنایا اور جیکب کی کہی ہوئی بات میگی تک پہنچا دی...... جس شخص کا ہاتھ میں نے کلہاڑی کے زوردار وار سے کاٹ دیا تھا وہ چیخ چیخ کر دہائی دے رہا تھا۔ "خدا کے لیے مجھے بچاؤ...... میں مر رہا ہوں۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا خون بڑی تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے موبل کو اشارہ کیا۔ اس نے سب سے پہلے اس شخص کو باہر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ باہر لے جانے سے پہلے، اس شخص کے کٹے ہوئے بازو سے خون روکنے کے لیے اس پر گیلی مٹی تھوپی گئی اور کپڑا پھاڑ کر پٹی باندھی گئی۔ پھر اسے سہارا دیتا ہوا باہر لے گیا۔ تاہم اس نیک کام سے پہلے اس نے زخمی کی اچھی طرح تلاشی لے لی تھی۔ یہ زخمی حملہ آور مجھے کنگ براؤن کا ہی کوئی رشتے دار لگتا تھا۔ دوسرے حملہ آوروں کے بارے میں بھی یہی قیاس تھا کہ وہ کنگ کے خانوادے میں سے ہیں۔ یہ سب سفید فام تھے اور ان کی بناوٹ ویسی ہی تھی جیسی کنگ براؤن اس کے بھائی اور استی وغیرہ کی تھی۔

موول کٹے بازو والے حملہ آور کو سہارا دیتا ہوا باہر لے گیا تو میں نے جیکب کو دیکھا۔ وہ تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر میں بروقت اسے زمین پر نہ گرا دیتا تو سب سے پہلے چلنے والی گولی اس کی جان لے جاتی۔ میں نے قریب جا کر اس کا گھٹنا دیکھا۔ وہ ایک دم سوج گیا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔ جب میں جیکب ہارڈ کا گھٹنا دیکھ رہا تھا۔ جیکب ہارڈ کچھ اور دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور مجھے پتا چلا کہ وہ سیف کے دائیں جانب والے خفیہ قفل کو دیکھ رہا ہے۔ جیکب کا انداز چونکنے والا تھا۔ میں نے بھی دھیان سے قفل کو دیکھا اور پتا چلا کہ قفل کا بالائی حصہ گل چکا ہے اور اس کا سوراخ بھی دوسرے قفل کے سوراخ سے کافی بڑا دکھائی دے رہا ہے۔ جیکب بولا "مجھے لگتا ہے یہ تیزاب سے کیا گیا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ابھی موول کو بھی تیزاب کی بو محسوس ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔

گفتگو کے دوران میں ہم نے دو زخمی حملہ آوروں پر بھی پوری طرح نظر رکھی ہوئی تھی۔ تیسرا بے ہوش ہو چکا تھا۔ صدیوں پرانی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں اور وہ ان کے درمیان بے سدھ پڑا تھا۔ یہ کل چار افراد تھے۔ اب صورت حال کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہ چار افراد بھی اس سیف کے چکر میں یہاں موجود تھے۔ وہ نجانے کتنے دنوں سے یہاں تھے۔ ان کے زنگ آلود حلیے تو یہی بتاتے تھے کہ وہ کافی دنوں سے اس ڈھانچے میں موجود تھے اور آہنی سیف کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔ غالباً وہ کسی تیز اثر تیزاب کے ساتھ سیف کے تالوں کو گلانے یا نرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم چاروں افراد کو ڈھانچے سے باہر لے آئے اور سیکورٹی گارڈز کے سپرد کر دیا۔ ڈھانچے سے باہر ایک جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ اکثر چہروں پر خوف کے سائے تھے۔ اس سے پہلے یہ لوگ دو حادثات میں آٹھ عدد افراد کو زندگی سے ہاتھ دھوتے دیکھ چکے تھے۔ آج پھر ڈھانچے میں شدید زخمی اور نیم مردہ افراد برآمد ہو رہے تھے۔ یہ صورت حال دائمی لوگوں کے واہموں کو پختہ تر کرنے کے لیے کافی تھی۔ پکڑے جانے والے افراد کی مشکیں کسی جا چکی تھیں لیکن وہ چونکہ کنگ براؤن کے رشتے دار کہلاتے تھے لہٰذا سیکورٹی والے مشکیں کسنے کا خطرہ مول نہیں لے رہے تھے۔ بس ان لوگوں کو گن پوائنٹ پر رکھا گیا تھا۔

جیکب نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں جلد از جلد اپارٹمنٹ میں واپس بھیج دیا۔ میگی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ڈھانچے کے اندر ہونے والی زبردست دھینگا مشتی میں میرے ہاتھ کی زخمی انگلی میں پھر درد ہونے لگا تھا۔ غالباً میرے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ ہمدردانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر وہ خوشنما تتلی کی طرح میرے گرد منڈلانے لگی۔ موول معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اپنے ہاتھ سے میری انگلی پر پٹی باندھنے لگی۔ "اتنی زحمت کیوں کر رہی ہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگے گا۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

"جیکب کی بھی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا پھر ذرا سنبھل کر بولی "اب میری طرح جیکب بھی تو تمہارا احسان مند ہے۔ تم نے اسے رائفل کے فائر سے بچایا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ڈھانچے میں گھسنے والے یہ لوگ کون تھے؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

اس نے گہری سانس لے کر اپنے نیم عریاں جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کیا اور بولی "ان کو تم کنگ براؤن کے دور کے رشتے دار کہہ سکتے ہو۔ یہ احسان فراموش لوگ ہیں۔ کنگ نے ان کے لیے کیا کیا نہیں کیا ہے۔ سمجھو کہ زمین جنت بنا کر ان لوگوں کو دے دی ہے۔ دنیا کا ہر آسائش آرام انہیں حاصل ہے لیکن لالچ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ اس زیر زمین آبادی میں ہر آنے والے کا مکمل ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ قریباً ایک ہفتے سے روپوش تھے۔ ریکارڈ میں یقیناً درج ہوگا کہ یہ چاروں افراد ہوٹل سے باہر گئے ہوئے ہیں لیکن وہ جہاز کے ڈھانچے میں موجود تھے اور مختلف طریقوں سے سیف کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید یہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ یہ کوئی آواز پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا ان لوگوں کو سزا ملے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ملنی تو چاہیے۔ بلکہ لوگوں کو بھی نظر آنا چاہیے کہ سزا دی گئی ہے مگر ایسا ہوگا نہیں۔ کوئی عام بندہ ہوتا تو زندہ درگور کر دیا جاتا، کھال کھینچ لی جاتی اور پھر کوڑے مار مار کر مار دیا جاتا۔ مگر وی آئی پی لوگوں کو وی آئی پی سزا ہی ملے گی اور وہ بھی رازداری کے ساتھ۔"

"اس واقعے کے اثرات جیکب پر کیا ہوں گے؟"

"یقیناً اچھے ہی ہوں گے۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولی "میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی تو اسے بالکل بھی برا نہیں لگے گا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں..... کنگ کی نظروں میں جیکب کی عزت بڑھے گی یا نہیں؟"

"یقیناً۔ جیکب کو حوصلہ افزائی اور خوش خطی کے نمبر ملیں گے۔ اب اگر سیف میں سے کچھ قیمتی سامان بھی نکل آتا ہے تو اس سے جیکب کو بہت فائدہ ہوگا..... اس کی وجہ یہ ہے کہ کنگ تو اس معاملے کو بالکل ٹھپ کر چکے تھے۔ تم نے دیکھا ہی ہے انہوں نے سائٹ بند کر کے وہاں آہنی گیٹ لگوا دیا تھا۔ دوبارہ یہ کام جیکب نے ہی شروع کروایا ہے۔"

میری انگلی پر پٹی کرتے کرتے میگی کے خوبصورت ہاتھ ایک دم ٹھہر گئے۔ وہ غیر ارادی طور پر مجھ سے کچھ دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ دراصل جیکب گھر واپس آ گیا تھا۔ کال بیل کی آواز آئی اور پھر ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ جیکب میگی کو آواز دیتا ہوا ہمارے پاس ہی چلا آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھی اور وہ اپنے زخمی گھٹنے پر بڑی مشکل سے زور دے پا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے اڑتالیس گھنٹے خاموشی سے ہی گزرے۔ ڈھانچے کے گرد پہرہ بے حد سخت کر دیا گیا تھا..... جیکب کی زبانی معلوم ہوا کہ قریباً بیس افراد کو کنگ کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب سازش میں شریک تھے۔ ان میں چار سیکورٹی گارڈز بھی تھے۔ انہوں نے نقب زنوں کو جہاز کے ڈھانچے میں داخل ہونے کا راستہ دیا تھا اور بددیانتی کے مرتکب ہوئے تھے۔

ہوٹل میں ہر جگہ اس واقعے کے چرچے تھے۔ زخمیوں میں سے جس بندے کا ہاتھ کہنی پر سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا تھا وہ گفتگو کا خاص موضوع بنا ہوا تھا..... جیکب ان فٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ پھر سے فٹ ہونے کے لیے اپنے گھٹنے پر دن رات ٹکور کر رہا تھا۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت ہم ایک بار پھر جہاز کے ڈھانچے میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ اس مرتبہ ہمارے علاوہ دو انجینئر حضرات اور دو ٹیکنیشن بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے علاوہ سیکورٹی یونٹ کے چند ارکان بھی تھے۔ ڈھانچے کے اندر جانے کے سلسلے میں جو ایک پراسرار خوف سا تھا وہ اب بہت کم رہ گیا تھا۔ اس مرتبہ ہمارے ساتھ روشنی کا بھی معقول انتظام تھا۔ ہمارے ساز و سامان کا سب سے اہم حصہ ویلڈنگ پلانٹ تھا جس کے ذریعے ہم نے سیف کے مضبوط تالے پگھلانے تھے۔ اس پلانٹ کو چلانے کے لیے بجلی کے طویل تار بھی ہمارے ساتھ ہی ڈھانچے کے اندر جا رہے تھے۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹے میں کنگ کے کارکنوں نے جو ایک اہم کام کیا تھا، وہ یہ تھا کہ ہال کمرے تک پہنچنے کے لیے راستہ بہت حد تک صاف کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ہمیں کئی میٹر تک ایک سرنگ نما خلا میں پیٹ کے بل رینگ کر آگے بڑھنا پڑا تھا لیکن اب اس قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم ڈھانچے میں داخل ہوئے۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ روشنی کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہمیں ٹارچیں روشن کرنی پڑیں۔ آخر ہم ہال کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہال کمرے کے فرش پر فولاد کی موٹی چادر تھی۔ یہ چادر کئی جگہوں سے اکھڑی ہوئی تھی۔ ایک سیکورٹی گارڈ کا پاؤں چادر کے ایک نوکیلے حصے سے ٹکرا کر بری طرح زخمی ہو گیا۔

موول بولا "میرا خیال ہے کہ پرسوں ہمیں خون کے جو قطرے نظر آئے تھے وہ کسی ایسے ہی حادثے کا نتیجہ تھے۔"

"تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔" میگی نے پوچھا۔

"اس کھسر پھسر کا تم سے کوئی تعلق نہیں..... ویسے بھی تمہیں ذرا احتیاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جیکب بہت سیریس نظر آ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے تمہاری بے تکلفی اسے مشتعل کر دے اور وہ تم پر بھی کی بوکو کا استعمال شروع کر دے۔" میں نے کہا۔

میگی مجھے بس گھور کر رہ گئی۔ اس نے ایک چھوٹی سی نیکر پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ بغیر آستین کے تھی اور گریبان وسیع و عریض تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے کندنی جسم کی نمائش کر کے دلی طور پر خوشی ہوتی ہے۔ اس قسم کا مزاج کسی حد تک سروج عرف الو کی پٹھی کا بھی تھا۔ سروج ابھی تک فلمی ایکسٹراز کے ہمراہ لندن میں ہی تھی۔ اس کا خیال آیا تو بھر کئی خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں چمکے اور گزر گئے.....

پرسوں یہاں ہونے والی خونی لڑائی کے دوران میں صدیوں سے خوابیدہ ایک مرد و زن کی ہڈیاں ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ اب اس جگہ کو بالکل صاف کیا جا چکا تھا۔ جیکب نے بتایا کہ وہ جوڑا اب ایک تابوت میں بند ہو چکا ہے اور تدفین کے لیے تیار ہے..... کچھ ہی دیر بعد سیف پر کام شروع ہو گیا۔ برقی شعلے تاریکی میں چمکنے لگے اور سیف کا فولاد پگھلانے کی کوشش کرنے لگے۔ ویلڈ کرنے والوں نے اپنے چہرے تاریک شیشوں والے ہیلمٹس میں چھپا رکھے تھے۔

شروع میں ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کام کافی وقت لے گا۔ میگی میرے اور مول کے ساتھ ایک گوشے میں کھڑی تھی اور ہال کمرے کی ہر کہنہ شے کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت ہتھیلی پر وہی سکے تھے جو کل مجھے مٹی کے نیچے سے ملے تھے۔

وہ سکوں کو دیکھتے ہوئے بولی "ہم نے ان کی تحریر پڑھ لی ہے۔ یہ یمنی سکے ہیں۔ ان پر 1654ء کی تاریخ ہے۔ یعنی اس جہاز کو غرقاب ہوئے تین سوا تین سو سال ہو چکے ہیں۔ او مائی گاڈ..... یہ سب کچھ بندے کو کس طرح تصورات کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ سوچو..... ذرا سوچو۔ جس وقت لندن کی تاریخی آتشزدگی ہوئی، اس وقت بھی یہ ڈھانچہ اسی جگہ موجود تھا۔ جہاز کو ڈوبے دس سال بیت چکے تھے۔ جب 1365ء میں انگلینڈ کا مشہور بحری جہاز "لندن" سمندر میں غرق ہوا۔ اس وقت اس ڈھانچے کو یہاں پڑے دو صدیاں اور گیارہ سال گزر چکے تھے پھر جب یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر دریائے ٹیمز میں دو بحری جہاز ٹکرائے اور "رول رنگ" کے تاریخی مقام پر تقریباً ساڑھے چھ سو افراد ہلاک ہوئے اس وقت اس ڈھانچے کو یہاں پڑے 222 سال ہوئے تھے..... جب 1912ء میں ٹائی ٹینک کی غرقابی کا مشہور واقعہ ہوا تو اس وقت بھی یہ ڈھانچہ یہاں دلدلی زمین میں دبا پڑا تھا اور اسے دبے ہوئے تقریباً ڈھائی سو سال گزر چکے تھے پھر جب مشہور جہاز....."

"بس بس..... خدا کے لیے بس۔" میں نے کہا "تمہاری معلومات بہت زبردست ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ تم نے ان سکوں کی تحریر پڑھ لی ہے۔"

وہ مسکرائی اور اس کے گال میں گڑھا نظر آنے لگا۔

ویلڈنگ کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ فولادی چادر جب تالوں کی جگہ سے بالکل سرخ ہو جاتی تھی اس پر وزنی ہتھوڑوں سے ضربیں لگائی جاتی تھیں۔ ان ضربوں کی آواز سے در و دیوار گونج اٹھتے تھے اور ہال کی بوسیدہ چھت سے صدیوں پرانی دھول نیچے گرنے لگتی تھی۔ جیکب بڑی توجہ سے کام کی نگرانی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے لنگڑاتا ہوا سیف کے چاروں جانب گھوم بھی رہا تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی محنت شاقہ کے بعد دونوں بغلی قفل ہتھوڑوں کی ضربوں سے کھل گئے۔ اب صرف باہر کا قفل رہ گیا تھا۔ یہ قفل بہت زیادہ مزاحمت نہیں کر سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ چاروں طالع آزما افراد نے اس کے سوراخ میں تیزاب ڈال ڈال کر اسے کافی کمزور کر رکھا تھا۔ برقی شعلے سے سرخی حاصل کرنے کے بعد ہتھوڑے کی چند زوردار ضربیں لگائی گئیں تو قفل کھل کر لٹک گیا۔ جیکب نے پانی ڈال کر اسے ٹھنڈا کیا اور پھر کپڑے سے پکڑ کر علیحدہ کر دیا۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں دو تین مرتبہ وہ ہولناک گونج سنائی دی تھی جو چیخوں سے مشابہ محسوس ہوتی تھی لیکن اب یہ گونج اپنی غیر معمولی وحشت کھو چکی تھی۔ سب جان چکے تھے کہ اس گونج کا ماخذ کیا ہے..... تالے کھل گئے تو سو سوا تین سو برس سے جمے ہوئے وزنی ڈھکنے کو آہنی سلاخوں اور بازوؤں کی مدد سے کھولا گیا۔ جیکب نے لرزتے ہاتھوں سے ٹارچ کی روشنی کشادہ تجوری میں ڈالی۔ اس میں سونے اور چاندی کے کچھ زیورات نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ سکوں کا ایک ڈھیر تھا۔

ایک دم مایوسی کی ایک لہر سب کے رگ و پے میں پھیل گئی۔ سیف میں جو کچھ نظر آ رہا تھا یہ توقع سے بہت کم تھا۔ شاید ڈیڑھ دو پاؤنڈ چاندی اور آدھ پاؤنڈ سونا ہو گا۔ سکے بھی زیادہ تر تانبے کے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ جیکب نے بے چینی سے اندر ہاتھ گھمانا شروع کیا۔ ان چیزوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

میگی نے بھی آگے بڑھ کر اچھی طرح جائزہ لیا۔ زیورات اور سکے وغیرہ باہر نکال لیے گئے۔ انہیں ایک بڑی سرچ لائٹ کی روشنی میں ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا۔ میگی نے کہا "ہمیں ان کی صرف ظاہری مالیت نہیں دیکھنی چاہیے۔ ایک نوادر کی حیثیت سے ان کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

جیکب نے ذرا تحکم سے کہا "سکوں کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرو۔"

میگی ایک سکے کو روشنی کے بالکل سامنے لے گئی اور پڑھنے لگی۔ سکے پر جس شخص کی تصویر تھی اس کے سر پر عمامہ نظر آ رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان سکوں کا تعلق بھی مشرق وسطیٰ سے ہے۔ میگی نے سکہ دیکھ کر ایک طرف رکھا پھر میرے ہاتھ سے ٹارچ لی اور رکوع کے بل جھک کر سیف کے خلا میں جھانکنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں؟" مول نے پوچھا۔

"شاید سیف کے اندر بھی کوئی تحریر وغیرہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

میگی چند سیکنڈ بعد سیف کے اندر کچھ اور بھی زیادہ جھک گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سیف کے اندر ہی گر پڑے گی۔ اچانک اس کی چیخ نکل گئی۔ یہ خوشی کی چیخ تھی۔ میں اور مول لپک کر سیف کے پاس پہنچے۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک عجب

منظر نظر آیا۔ میگی نے سیف کے نچلے حصے سے نہ جانے کیا چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ سیف کے موٹے پیندے میں تین فٹ مربع کا ایک خانہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی گہرائی چار انچ کے قریب رہی ہوگی۔ یہ سارا خانہ بے موتیوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ یہ ایسے آب دار موتی تھے کہ ان کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ سب لوگ سیف پر جھک گئے اور شدید خوشی اور استعجاب کے عالم میں یہ منظر دیکھنے لگے۔ کوئی اس وقت سیف کا منوں وزنی ڈھکنا گرا دیتا تو سب کے دھڑ باہر رہ جاتے اور سر اندر لڑھک جاتے۔

دس پندرہ منٹ کے اندر تمام موتی بے حد احتیاط سے باہر نکال لیے گئے۔ میں نے یمن کے آب دار موتیوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ سیف کے اندر موتیوں کے نیچے ایک روغنی کاغذ بچھایا گیا تھا۔ اس کاغذ پر سرخ اور نیلے رنگوں سے ایک قدیم تصویر بنی ہوئی تھی۔ میگی اور اس کے ایک ساتھی "ماہر نوادرات" نے اس تصویر کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا۔ دو بندے صرف لنگوٹ پہنے ہوئے پانی میں غوطہ لگانے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ جب کہ پانی کے کنارے پر کھڑے افراد سیپیوں کے ڈھیر سے موتی ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ سیپیوں میں سے کوئی شے کاٹ کاٹ کر علیحدہ ڈھیر کرتے جا رہے تھے، یقیناً یہ گوشت کے وہ ٹکڑے تھے جو سیپیوں میں موجود ہوتے ہیں۔

میگی نے تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے لرزاں لہجے میں کہا "میرے اندازے کے مطابق یہ یمنی سمندر کا کنارہ ہے۔ پرانے زمانے میں موتیوں کے لیے غوطہ خوری کرنے والے لوگ اس مقام کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔"

میگی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے لاکھوں روپے کے موتیوں کی اس کے نزدیک اتنی اہمیت نہیں جتنی اس تصویر کی ہے۔ جیکب اور دیگر لوگوں کی تمام تر توجہ موتیوں کی طرف تھی۔ وہ سب کے سب بڑی حریص نظروں سے ان موتیوں کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن وہ سب کے سب یہ بھی جانتے تھے کہ یہ سب کچھ جو نکلا ہے کنگ براؤن کی ملکیت ہے اور کوئی دوسرا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

جیکب کے وائرلیس پر سگنل آنا شروع ہوا۔ یہ سگنل یقیناً کنگ براؤن کی طرف سے ہی تھا۔ جیکب تیزی سے لنگڑاتا ہوا ہال کے ایک گوشے میں چلا گیا اور باتیں کرنے لگا۔ اس کے انداز سے جوش اور مسرت کا اظہار ہوتا تھا۔ الفاظ میری سماعت تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ بلکہ یہاں موجود کسی کی سماعت تک بھی نہیں پہنچ رہے تھے لیکن ایک شخص ایسا تھا جو یہ الفاظ سن سکتا تھا۔ وہ غیر معمولی سماعت کا مالک تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ میرا سوالیہ انداز دیکھ کر وہ بولا "ہمارا اندازہ درست ہے۔ جیکب کنگ براؤن کو اپنی کامیابی سے آگاہ کر رہا ہے۔ وہ اسے موتیوں کی کوالٹی اور تعداد کے بارے میں بتا رہا ہے۔ خوشی کے سبب اس کے منہ سے بات نہیں نکل پا رہی ہے۔"

موتیوں سے بھری ہوئی ٹرے کے گرد سیکورٹی گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہ موتیوں پر سے نہیں ہٹا رہے تھے۔ جیسے انہیں ڈر ہو کہ موتی دھواں بن کر اڑ جائیں گے۔ سنسنی کی ایک لہر تھی جس نے اردگرد کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا..... اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ سیف میں سے جو چند زیورات اور سکے وغیرہ نکلے تھے۔ وہ صرف دکھاوے کا سامان تھا۔ اصل چیز سیف کے پیندے میں چھپی ہوئی تھی۔ آثار قدیمہ اور نوادرات وغیرہ کے حوالے سے میگی کی سمجھ بوجھ کافی زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دس پندرہ منٹ کے اندر سیف کے اندر کی تکنیک سمجھ گئی تھی اور پوشیدہ خانہ کھول لیا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن ہفتے کا تھا۔ ہفتے کی شام کو جیکب نے یہ خوشخبری سنائی کہ اس کی ترقی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ دو تین دن میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ سوموار کی رات کو میں نے میگی کو خوشی سے چیختے ہوئے سنا۔ دو منٹ بعد جیکب ہماری پناہ گاہ کے دروازے پر تھا۔ وہ مقفل دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس کا "وسیع و عریض" چہرہ اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے پُرجوش انداز میں ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ اسے ہوسٹل کا نائب انچارج مقرر کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ دو تین ہفتے میں اسے مکمل انچارج بنا دیا جائے گا۔

جیکب نے یہ بھی بتایا کہ اس تقرری کے سلسلے میں آج رات "اے کلب" میں چھوٹا سا جشن بھی منایا جا رہا ہے۔ مول نے پوچھا "کیا ہم یہ جشن دیکھ سکیں گے؟"

جیکب نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "ٹھیک ہے میں انتظام کر دیتا ہوں لیکن..... تم جشن میں شریک نہیں ہو سکو گے۔ صرف دیکھ ہی سکو گے۔ تمہاری حیثیت وہاں سیکورٹی گارڈز کی ہوگی۔"

مول نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم جائیں گے۔ تمہاری خوشی ہمیں اپنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ ہم اس میں ضرور شرکت کریں گے۔"

"اے کلب" کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ خوابوں کا عشرت کدہ میں اس سے پہلے ماربا ٹرسٹ میں بھی دیکھ چکا تھا۔ اب یہاں لندن کے اس نواحی "سیٹ اپ" میں بھی اسے کلب بنا دیا گیا تھا۔ اس زیر زمین جگہ کو کنگ براؤن کی ذہنی جنت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ماربا ٹرسٹ والا "اے کلب" بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن یہاں کا اس سے بھی بڑھ کر تھا...... میں تو خیر پہلے بھی یہ نظارے دیکھ چکا تھا لیکن موول کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ یہ زیر زمین جگہ تھی لیکن رنگوں اور روشنیوں کے ذریعے ایسا Illusion قائم کیا گیا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم نیلے آسمان کے نیچے ایک ایسے دلکش مقام پر آ گئے ہیں جہاں آبشاریں گرتی ہیں، جھرنے گنگناتے ہیں اور خوبصورت پھول پودوں پر تتلیاں منڈلاتی ہیں۔ یہاں بہت بڑی تعداد میں "ان ڈور" پودے اور درخت تھے۔ اس سارے سبزے کو بڑی ہی محنت سے پالا پوسا گیا تھا۔

ہم نے دیکھا آسمان پر سفید بدلیاں تیرتی پھرتی تھیں اور ان کے پس منظر میں آسمان کی چمکیلی نیلاہٹ بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی لیکن یہ آسمان بھی ایک واہمہ تھا۔ جیسے فلمی اسٹوڈیوز میں مصور بڑی مشاقی سے ایک مصنوعی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مصنوعی دنیا تھی۔ سامنے دو بڑے کیسینو نظر آ رہے تھے۔ پہلو میں ایک نائٹ کلب تھا۔ مختصر لباسوں والی حسین و جمیل لڑکیاں میزوں کے درمیان منڈلاتی پھر رہی تھیں۔ یہاں موجود ہر شخص نے سرخ جیکٹ ضرور پہن رکھی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ "اے کلب" میں تفریح کے لیے جانے والے ہر شخص کے لیے ضروری تھا کہ وہ سرخ جیکٹ پہنے۔

ہم ایک اصلی آبشار کے قریب سے گزرے اور پھر سوئمنگ پول کے پاس سے ہوتے ہوئے تقریب گاہ کی طرف چلے گئے۔ سوئمنگ پول ہلکی نیلی روشنی کے گھیرے میں تھا۔ یہ خوبصورت روشنی پتا نہیں کہاں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس روشنی میں پول کا پانی گہرے نیلے سمندر کی طرح لگتا تھا۔ اس مصنوعی سمندر میں سمندر ہی کی طرح ہلکی ہلکی لہریں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ ان لہروں پر حسین ترین لڑکیاں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک دو لڑکیاں ایسی بھی نظر آ رہی تھیں جن کے بالائی جسم بالکل عریاں تھے۔ دو خوشنما افریقی طوطے ہمارے سروں پر سے منڈلاتے گزر گئے۔ کہیں پاس ہی مور کی تیز دار ایک آواز سنائی دی اور دور تک گونج گئی۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی آفیسر ہمیں روک کر ہم سے کچھ پوچھ نہ لے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم جیکب کے ایک قریبی ساتھی کے ہمراہ تھے۔ یہ ساتھی بھی ہماری طرح نیلی وردی میں تھا۔ اس کا رینک کافی اوپر کا تھا۔

تقریب گاہ میں پہنچ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ تقریب گاہ ایک گول ہال کی شکل میں تھی۔ یہاں ہزاروں چھوٹے بڑے آئینے لگے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک شیش محل تھا۔ ایک حسین آنچل سیکڑوں آئینوں میں لہراتا تھا اور ایک پری پیکر ان گنت آئینوں میں جھلک دکھاتی تھی۔ یہاں فرش بھی شیشے کا تھا اور اس موٹے شیشے کے نیچے پانی بہتا تھا اور رنگین مچھلیاں رقص کرتی تھیں۔ شیش محل کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا فوارہ تھا۔ جس کا رنگین پانی ایک پیالے جیسے حوض میں گرتا تھا۔ اس حوض کے اردگرد بھی میز اور کرسیاں لگی تھیں۔ سرخ جیکٹوں والے مرد و زن ہنس کھیل رہے تھے اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے...... جوں جوں مہمان آ رہے تھے تقریب گاہ کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ جیکب کے ساتھی نے ہمیں ایک دروازے کے سامنے کھڑا کر دیا اور ضروری ہدایات دے کر آگے بڑھ گیا۔ ہم سیکورٹی گارڈز کی حیثیت سے دائیں بائیں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے رہے۔

پھر جلد ہی موول کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ گردن ہلائے بغیر آنکھوں کے اشارے سے بولا "آپ کے دائیں جانب شیخ زادی توسیہ بھی موجود ہے۔"

میں نے سر کو غیر محسوس طور پر حرکت دی۔ واقعی توسیہ موجود تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح پینٹ بوشرٹ میں تھی اور مردانہ انداز میں بازو پھیلا پھیلا کر چل رہی تھی۔ آج غالباً پہلی بار مجھے اس کے ہونٹوں میں سگریٹ بھی دکھائی دیا۔

"اس کا شوہر شاید اس کے ساتھ نہیں ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں وہ بھی ساتھ تھا لیکن اب دکھائی نہیں دے رہا۔ شاید پیچھے کسی کمرے میں بیٹھ گیا ہے۔ آج اس کے گلے میں زنجیر نہیں ہے۔"

اسی دوران میں میری نگاہ جیکب اور میگی پر بھی پڑی۔ جیکب کی حیثیت اس تقریب کے دولہا کی سی تھی۔ میگی بھی بہت اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔ وہ عجیب و غریب لباس پہنتی تھی اور عجیب و غریب فیشن بھی کرتی تھی۔ آج بھی وہ حسب معمول نہایت تھوڑا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بس یہی لگتا تھا کہ سوئمنگ پول سے سیدھی ادھر آ گئی ہے لیکن آج اس نے جدت یہ کی تھی کہ مختصر ترین لباس کے باوجود سر تا پا گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ ہار، جھمکے، کنگن، انگوٹھیاں، جھومر، پازیب...... پتا نہیں

کیا کچھ پہن رکھا تھا اس نے...... وہ گہنوں کے لحاظ سے کوئی بہت بڑی نواب زادی یا مہارانی نظر آ رہی تھی لیکن لباس کے اعتبار سے کوئی کھلنڈری ٹین ایجر لڑکی...... چوری چوری اس نے کتنی بار مجھ سے نگاہیں ملائیں اور ہر بار موول دیدے گھما کر رہ گیا۔ موسیقی کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پاؤں متحرک رہے تھے۔ بدن رقص کے لیے مچلنے لگے تھے۔ ہیجان خیز لباس پہنے ہوئے کچھ لڑکیاں تقریب کے شرکا کو کھانے پینے کی اشیا فراہم کر رہی تھیں۔ توسیہ بھی آج کافی خوشگوار موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے جیکب اور میگی کے ساتھ مل کر جام اٹھاتے ہوئے بھی دیکھا۔

اچانک میری سماعت کو جھٹکا سا لگا۔ ایک جانی پہچانی آواز کانوں میں پڑی۔ یہ نینا کی آواز تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر اس کا گانا بج رہا تھا۔ لوگوں کے تھرکتے ہوئے پاؤں کچھ اور بھی متحرک ہو گئے۔ نینا گا رہی تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن یہ یقیناً کوئی طربیہ گانا تھا...... گانا بے شک طربیہ تھا لیکن نینا کی آواز المیہ تھی۔ اس آواز میں گرلاہٹ تھی اور اپنوں سے جدائی کا کرب چھپا تھا۔ ایک مسکراتے ہوئے گانے میں بھی اس کے درد کا یہ عالم تھا اگر وہ درد ناک گانا گاتی تو خبر نہیں کہ کیا ستم ڈھاتی۔

نینا کے گانے کے بعد کسی مصری گلوکارہ کا نغمہ فضاؤں میں گونجنے لگا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک تقریب گاہ میں شور بلند ہوا اور پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس صورت حال کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اچانک موول بولا "وہ دیکھیے جناب فوارے کی طرف۔"

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ساری حقیقت سمجھ میں آ گئی۔ فوارے میں سے سفید پانی کی جگہ سرخی مائل شراب برآمد ہو رہی تھی اور حوض میں بھرتی چلی جا رہی تھی...... میں نے سرخ جیکٹ والے ایک ادھیڑ عمر شخص کو دیکھا وہ پیالہ نما حوض میں جھکا اور وہاں سے شراب کا ایک جام بھر لیا۔ اس شخص کو دیکھ کر تقریب کے دوسرے شرکا بھی حوض کے قریب کھسکنے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں جام نظر آ رہا تھا۔ وہ حوض کے اردگرد بیٹھ گئے اور پھر جھک جھک کر اپنے جام بھرنے لگے۔ شراب کا دور چلنے لگا۔ نشے نے دل و دماغ کو مسخر کیا تو محفل رنگ پر آنا شروع ہو گئی۔ جسم مچلنے لگے...... ہاتھ آزاد ہونے لگے۔ موسیقی کی لے بھی تیز ہوتی جا رہی تھی پھر رقص کا دور شروع ہو گیا۔ آرکسٹرا کی آواز قیامت خیز ہو گئی۔ ڈرم کی گونج سے جیسے در و دیوار لرزنے لگے۔ عورتوں اور مردوں نے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالیں اور پورے جوش کے ساتھ محو رقص ہو گئے۔ بھنے ہوئے گوشت اور دیگر لوازمات کی خوشبو سارے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔ کھانا پینا ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ بدمستیاں بھی عروج پر تھیں۔ جوں جوں نشہ تیز ہو رہا تھا۔ بولنے والوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور چہرے تمتماتے چلے جا رہے تھے۔ موول بولا "وہ دیکھیں جناب، ہمارے جیکب صاحب اس نیگرو حسینہ کے ساتھ رقص فرما رہے ہیں۔"

"اور جیکب صاحب کی گرل فرینڈ کو بھی تو دیکھو۔ وہ اس امریکی کے ساتھ چپٹی ہوئی ہے۔" میں نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شیخ زادی توسیہ کہاں ہے؟" موول نے گارڈز کے انداز میں سر کو ایک مقام پر رکھتے ہوئے دائیں بائیں نگاہ گھمائی۔

میں نے بھی ادھر ادھر نظر گھما کر شیخ زادی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ جلد ہی وہ نظر آ گئی۔ وہ ایک گورے چٹے سنجیدہ صورت نوجوان کے ساتھ محو رقص تھی۔ ناک اور آنکھوں کی بناوٹ سے یہ شخص بھی کنگ کے خانوادے میں سے ہی لگتا تھا۔ نوجوان کا چہرہ نشے کی وجہ سے تمتمایا ہوا تھا اور وہ جذباتی انداز میں توسیہ کو تھامے ہوئے تھا۔

موول نے ایک طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔ سرگوشی میں بولا "وہ دیکھیں ان اماں جان کو کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے موول کی نگاہ کا تعاقب کیا اور خود بھی مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ چھریرے بدن کے ساتھ ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ عورت کولہے مٹکا مٹکا کر ناچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے چہرے پر میک اپ تھوپ رکھا تھا لیکن پھر بھی چہرے کی جھریاں اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا، پنڈلیاں گھٹنوں تک ننگی تھیں اور وہ اونچی ایڑی پر ٹھمکے لگاتی ہوئی مضحکہ خیز نظر آتی تھی اور اس قسم کی وہ یہاں اکیلی نہیں تھی۔ ایسے دو چار مرد و زن اور بھی ہوں گے۔

اچانک ایک چیخ نے ہمیں چونکا دیا۔ ہماری گرفت رائفلوں پر مضبوط ہو گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ منظر تعجب خیز تھا۔ کوئی شخص نیچے گرا ہوا تھا اور توسیہ اسے ٹھوکریں رسید کر رہی تھی۔ پہلے تو یہی سمجھ میں آیا کہ شاید توسیہ کے ساتھ رقص کرنے والے نوجوان نے اس کے ساتھ کوئی شدید قسم کی بدتمیزی کی ہے جس کے بعد وہ مشتعل ہو گئی ہے...... لیکن پھر فوراً ہی یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ وہ نوجوان تو توسیہ کے عقب میں کھڑا تھا اور اپنی ٹائی کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا پھر

قوسیہ کے ہاتھوں تماشا بننے والا کون تھا۔ اچانک چلنے والے کے چہرے پر میری نظر پڑی اور میں ششدر رہ گیا۔ وہ ہادی تھا...... صالح ہادی...... قوسیہ کا قانونی شوہر۔ چند سیکنڈ بعد قوسیہ کا "ہم رقص" بھی ہادی کو مارنے میں قوسیہ کے ساتھ شریک ہو گیا۔ قوسیہ تو بالکل شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی۔ شاید اس کے بس میں ہوتا تو وہ خالی ہاتھوں سے ہی ہادی کی بوٹیاں نوچ لیتی۔

سیکورٹی گارڈز کی حیثیت سے ہم دونوں آگے بڑھے اور ہادی کو قوسیہ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ قوسیہ کا الٹے ہاتھ کا تھپڑ موبل کے چہرے پر پڑا اور اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ مجھے بھی قوسیہ نے دھکا دے کر دور ہٹا دیا۔ ایک گارڈ کی حیثیت سے میں مزید مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میری حیثیت اس وقت گارڈ کی نہ ہوتی تو میں یقیناً اس وقت قوسیہ کا گلا گھونٹنا مناسب سمجھتا...... اور اگر قوسیہ مجھے شاہ جہاں کی حیثیت سے پہچان سکتی تو وہ بھی میرے سینے میں گولی اتار کر فرحت محسوس کرتی۔

قوسیہ ہادی پر چیخ رہی تھی "...... حرام زادے...... کتے کے بچے۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو...... تمہاری یہ اوقات ہی نہیں ہے...... تمہارے گلے میں زنجیر ہو تو اچھا ہے۔"

ہادی ضربیں کھا کر اوندھے منہ فرش پر گرا پڑا تھا۔ ایک موٹا تازہ انگریز آیا اور پھدک کر ہادی کی پشت پر بیٹھ گیا تاکہ وہ پھر نہ اٹھ سکے۔ انگریز کی اس حرکت پر قہقہہ پڑا، پھر کسی نے تالی بجا کر داد دی۔ کئی لوگ تالیاں بجانے لگے۔ شراب نے انہیں بدمست کر رکھا تھا۔ قوسیہ نے ہادی کی پسلیوں میں ایک دو ٹھوکریں رسید کیں اور ایک بار پھر چیخ کر بولی "حرامی! تم اس قابل ہی نہیں ہو۔"

کسی طرف سے ایک کھلنڈرے نوجوان نے قوسیہ کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور نائیلون کی ایک رسی اس کی طرف اچھال دی۔ قوسیہ نے رسیں کھڑے کھڑے رسی کا پھندا بنایا اور ہادی کے گلے میں ڈال دیا۔ تب اس نے ایک جھٹکا دے کر ہادی کو فرش سے اٹھایا...... اس کی ایک آنکھ سوج گئی تھی اور ہونٹوں سے خون کی لکیر بہہ کر ٹھوڑی تک آ رہی تھی۔ سیکورٹی گارڈ کے فرائض ادا کرتے ہوئے۔ میں نے اپنی رائفل کا رخ قابل رحم ہادی کی طرف پھیر دیا تھا۔

موقع پر جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے پتا چلا کہ قوسیہ کو سفید فام نوجوان کے ساتھ ناچتے دیکھ کر ہادی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک قریبی کیبن سے نکل کر نوجوان پر حملہ آور ہو گیا...... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہی تھا۔

قوسیہ ہادی کو کھینچتے ہوئے تقریب گاہ سے باہر لے گئی۔ میری رائفل کی نال ہادی کی گردن سے لگی ہوئی تھی۔ تقریب کے بدمست حاضرین ہادی کو مذاق کا نشانہ بنا رہے تھے۔ کسی نے اس کے سر پر چپت رسید کیا کسی نے گالی دی۔ کسی نے کولہوں پر لات رسید کر دی۔ ہم تقریب گاہ سے نکلے تو کچھ اور گارڈز بھی آگے بڑھ آئے اور ہادی کو گھیرے میں لے لیا۔

میری اور موبل کی ڈیوٹی چونکہ صرف تقریب گاہ تک تھی اس لیے ہم واپس آ گئے۔ محفل ایک مختصر سے وقفے کے بعد پھر گرم ہو گئی تھی۔ آرکسٹرا بجنے لگا تھا اور جسم تھرکنے لگے تھے۔ چار پانچ منٹ بعد قوسیہ بھی تقریب گاہ میں لوٹ آئی۔ وہ ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی...... اس کے چہرے پر کسی طرح کا ملال نظر نہیں آ رہا تھا۔ آتے کے ساتھ ہی اس نے اوپر تلے دو جام چڑھائے اور بدمست نظر آنے لگی۔ حوض کے کنارے مے نوشوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور جتنی پی رہے تھے اتنی ہی گرا بھی رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہونے لگے تھے۔ پینے والوں کے ساتھ ساتھ اب پلانے والے بھی پینے لگے تھے۔ میں نے دو تین ویٹروں کو دیکھا وہ بھی ٹن نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ایک طرف شور اٹھا۔ چند نوجوان لڑکے کسی شے کو رسی کے ذریعے کھینچتے ہوئے تقریب گاہ کے وسط میں لے آئے۔ یہ ایک مگرمچھ کی طرح کا جانور تھا۔

موبل نے حیرت سے کہا "یہ مگرمچھ ہے یا چھپکلا؟"

"شاید یہ دونوں کی کوئی بگڑی ہوئی شکل ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

اس پالتو جانور سے بڑے لاڈ کیے جا رہے تھے۔ کوئی اس کی پشت سہلا رہا تھا...... کوئی دم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ایک نوجوان نے بیئر کی پوری بوتل اس جانور پر انڈیل دی۔ دو لڑکیاں برش سے اس کی کھال صاف کرنے لگیں۔ دو تین بوتلیں بیئر مزید ڈال کر اس مگرمچھ نما جانور کو پوری طرح نہلا دیا گیا۔ بعد ازاں اسے تولیے سے خشک کیا گیا۔ دو بدمست شرابیوں نے تھوڑی سی شراب مگرمچھ کے منہ میں بھی انڈیل دی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے جناب؟" موبل نے پوچھا۔

"اس بارے میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔ بس قیاس ہی لگایا جا سکتا ہے۔ شاید یہ ان لوگوں کی کوئی مقامی رسم ہے۔"

اسی دوران میں ایک اور منظر دیکھنے میں آیا۔ چند نوجوان ایک اور مگرمچھ کو رسیوں کی مدد سے کھینچتے ہوئے لے آئے۔ اس نئے مگرمچھ کی جسامت ذرا کم تھی اور دم بھی کچھ

پتلی نظر آتی تھی۔ دونوں مگرمچھ نما جانور کچھ دیر تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور سونگھتے رہے۔ اس کے بعد پہلا والا جانور تڑپ کر دوسرے کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی تفریحی چیخیں سنائی دیں۔ ہم پر انکشاف ہوا کہ پہلا مگرمچھ نر جبکہ دوسری مادہ تھی۔ اب تقریب کے بدمست ارکان ان کے "ملاپ" کا نظارہ کر رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔

"یہ کیا خرافات ہے؟" موبل بڑبڑایا۔

"آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد یہ تماشا ختم ہو گیا۔ دونوں جانور باہر چلے گئے۔ آرکسٹرا کا آہنگ بدل گیا۔ جوڑے ایک بار پھر ڈانسنگ فلور پر متحرک ہو گئے۔ میں نے قوسیہ کو دیکھا۔ وہ ڈھیٹ نمبر ایک...... پھر سے اسی گورے چٹے نوجوان کے ساتھ محو رقص تھی۔ اب تقریب کے "معزز" شرکا کے ساتھ ساتھ ویٹر اور خدمت گار بھی مے نوشی کرنے لگے تھے۔ اچانک میں نے جیکب کو دیکھا وہ لہراتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اس کی ٹائی ڈھیلی ہو کر لٹک رہی تھی۔ سرخ جیکٹ پر چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھری ہوئی چھوٹی بوتل نظر آ رہی تھی۔ جبکہ دوسرے ہاتھ میں دو پیمانے تھے۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے ایک ایک پیمانہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ بوتل میں سے اس نے دونوں پیمانوں میں سنہری شراب انڈیلی۔ باقی کی بوتل اس نے میری جیب میں اڑس دی اور میری ٹھوڑی کو ہلاتے ہوئے چہکا "یہ جشن کی رات ہے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔ پیو...... تم دونوں بھی پیو۔"

بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ "ہررررا" کا نعرہ لگایا اور جیکب کو اس کی اس "انسان دوستی" اور غریب پروری پر داد دی۔ ہم دونوں نے اپنا کردار نبھاتے ہوئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو جیکب تحکمانہ لہجے میں بولا "چلو پیو...... اور پہلا جام...... پہلا جام...... اپنے اس نئے باس کے سامنے...... سامنے...... سامنے پیو۔ چلو شاباش۔"

ہمیں ایک ایک جام جیکب کے سامنے اپنے اندر انڈیلنا پڑا۔ یہ بڑی تیز وسکی تھی۔ جہاں سے گزری آگ لگاتی چلی گئی۔ جیکب ڈگمگاتا اور لہراتا ہوا محفل کے مرکز کی طرف بڑھ گیا لیکن وہاں پہنچ کر بھی وہ گاہے گاہے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ نشے میں ٹن ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کسی طرح کی بکواس کر کے ہمارا بھانڈا بھی پھوڑ سکتا تھا۔ ہم نے ایک ایک اور جام لیا اور پھر سب کے ساتھ ہی محفل کے رنگ میں رنگ گئے۔

"یہ دیکھیں جناب۔ یہ دھواں کیسا اٹھ رہا ہے۔" موبل نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ وہاں سے سرخ مرغولے سے نمودار ہو رہے تھے۔

"یہ اٹھ نہیں رہا۔ اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ آرائشی دھواں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں خوشبو بھی ہوگی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس سرخ دھوئیں نے پورے ہال کمرے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ پانچ منٹ بعد یہ عالم ہوا کہ ہمیں ایک دوسرے کی شکل پہچاننا بھی مشکل ہو گئی۔ اب بس وہی چیز نظر آتی تھی جو فقط ایک دو فٹ کے فاصلے پر ہوتی تھی۔ مرد و زن کی خوشی اور مستی سے بھرپور چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ خرمستیوں میں مصروف تھے۔ کوئی کہیں گرا پڑا تھا۔ کوئی کہیں مصروف کار تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب پاؤں سے کوئی ٹکراتا تو پتا چلتا تھا کہ یہاں کوئی موجود ہے یا آوازوں سے کچھ اندازہ ہوتا تھا۔

"مجھے لگتا ہے جناب...... کہ اس دھوئیں میں بھی کچھ سرور موجود ہے۔ میں دس پیگ لگا کر بھی اتنا مست نہیں ہوتا جتنا آج پانچ پیگ لگا کر ہو رہا ہوں۔" موبل نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"مجھے جیکب کی آواز آ رہی ہے۔ وہ کسی گورے حسینہ کے کان میں رومانی سرگوشیاں کر رہا ہے۔"

"اور قوسیہ کہاں ہے؟"

"وہ بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہے لیکن اس کی آواز مجھ تک نہیں آ رہی...... ہاں میکی کی آواز مجھے سنائی دے رہی ہے۔ وہ مسلسل پی رہی ہے اور گنگنا رہی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی سہیلی بھی ہے۔"

موبل کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور مجھے بھی اپنے ارد گرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک کیف تھا...... جس میں ہر شے ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک انگلش گانا کورس کی صورت میں گونج رہا تھا "مائی پیراڈائز...... یس آئی ایم ان مائی پیراڈائز" میری جنت...... ہاں میں اپنی جنت میں ہوں۔ ہر بول کے بعد درجنوں لڑکیاں ہونٹوں سے ہو ہو کی آوازیں نکالتی تھیں اور ایک خوابناک سا ماحول بن جاتا تھا۔ یہاں مستی تھی، شراب تھی، موسیقی تھی اور حسین جسم تھے۔

چند سیکنڈ بعد میں نے محسوس کیا کہ موبل میرے پہلو میں نہیں ہے۔ میں نے دھیمی آواز میں اسے دو تین بار پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ موبل عورتوں کے لیے ایک مرغوب غذا کی

طرح تھا...... شاید کوئی عورت تھی اسے کھینچ کر لے گئی تھی اور وہ خود بھی کون سا کم تھا۔ وہ بھی تو خوبصورت عورتوں کو مرغوب غذا ہی سمجھتا تھا۔ رائفل میرے کندھے سے جھول رہی تھی۔ میں اپنے قدم احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ کہیں کسی حسینہ کی انگلیاں میرے وزنی بوٹوں تلے نہ کچلی جائیں۔ ایک جگہ میں ٹھوکر کھا کر گھٹنوں کے بل گرا۔ مجھے جس شے سے ٹھوکر لگی تھی وہ دراصل دو جسم تھے۔ دو نیم عریاں جسم۔ ایک سفید فام مرد ایک سانولی عورت۔ بدمست مرد کے جسم نے عورت کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے مجھے عورت کی صورت دکھائی دی۔ میرا دماغ بھنا گیا۔ میں نے اس جواں سال لڑکی کی صورت پہچان لی تھی۔ چند ہفتے پہلے یہ لڑکی یہاں اس عشرت کدے میں نہیں تھی...... یہ کولمبو میں تھی۔ اس سرزمین پر تھی جہاں اونچے ناریل تھے...... بلند بام تھے اور ساحل کی ہوا الہڑ دوشیزاؤں کو رسیلے گیت سناتی تھی...... ہاں اس لڑکی کو میں نے وہیں دیکھا تھا۔ یہ ایکسٹرا لڑکیوں کے گروپ میں تھی۔ اس کا نام میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس کا والد سخت بیمار تھا۔ وہ بہت پیار کرتی تھی اس سے...... وہ اس کا علاج کرانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے اپنے سپنے بھی تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ایک اچھی اداکارہ بن سکتی ہے...... اپنی محنت کے بل بوتے کسی اونچے مقام تک پہنچ سکتی ہے لیکن اپنی ضرورتوں اور آرزوؤں کی زنجیر سے بندھ کر آج یہ لڑکی یہاں ایک زرخرید لونڈی کی حیثیت سے موجود تھی۔

رائفل میرے گلے میں تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس سرخ دھوئیں کے اندر اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دوں۔ یہ شیش محل چکنا چور ہو جائے اور اس کے اندر موجود ہر شے بھی زیست سے خالی ہو جائے لیکن اس خیال کو عملی جامہ پہنانا میرے یا مول کے لیے ممکن نہیں تھا۔

شراب کی حدت نے میرے جسم میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ مدہوش کن دھواں مزید متاثر کر رہا تھا۔ اچانک میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ کوئی عقب سے آیا تھا اور مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میرے کانوں میں طلائی چوڑیوں کی چھن چھن گونجی اور ایک نرم سی گرمی نے مجھے عقب سے ڈھانپ لیا۔ میں نے سرخ دھند میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ میگی تھی۔ وہ سراپا قیامت نظر آ رہی تھی۔ عجیب تضاد تھا۔ نیم عریاں جسم لیکن گہنوں سے لدا ہوا...... یوں لگتا تھا کہ اس کا سرکش بدن۔ نفیس زیورات کی توہین کرنے پر تلا ہوا ہے۔ میں نے اسے کھینچ کر اپنے سامنے کیا۔ میرے ہاتھ کی گرفت اس کے بازو پر کافی سخت تھی، وہ سسکاری لے کر رہ گئی مگر اس نے برا نہیں منایا۔ نیم وا چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ ادھ کھلے تھے پھر جیسے نتائج سے بے پروا ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم پورے کا پورا میرے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ہیجان تھا۔ بہا لے جانے والی قوت تھی۔ وہ بہا لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے صلے میں وہ اپنا جسم و جان مجھ پر نچھاور کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ عجب منطق تھی۔

پتا نہیں کب وہ نیچے بیٹھ گئی اور اس نے سخت سردی میں دستیاب ہونے والے کمبل کی طرح مجھے اوڑھ لیا۔ شراب کے خمار نے میرے جسم میں آتشیں لہریں ابھار رکھی تھیں...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہوتا جا رہا ہے...... وہ عجیب ماحول تھا۔ ہر طرف بدمست قہقہے تھے، لذت آمیز آوازیں تھیں۔ پیمانوں کے ٹکرانے کی صدائیں تھیں۔ میں نے خود کو میگی کے گداز میں ڈوبے ہوئے پایا۔ مجھے اپنے ہونٹوں پر اس کے والہانہ لمس کا احساس ہو رہا تھا۔ میری انگلیاں اس کے سنہری گھونگھریالے بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ میرے حواس اور دل و دماغ پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ اپنی تمام تر نسوانیت کے ساتھ وہ مجھے حصار میں لیتی جا رہی تھی...... میرے بہکے ہوئے احساسات نے میرے ہاتھوں کو متحرک کیا، میں نے اس کے کندن جسم سے لباس کھینچ کر پھینک دیا...... اور اس کا لباس تھا بھی کتنا؟ بس چند بالشت...... یا اس سے بھی تھوڑا...... وہ سرتاپا آگ میرے ہاتھوں میں تھی......

اچانک ایک روتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی

"شاہ جہاں...... نہیں...... خدا کے لیے نہیں......"

یہ کس کی آواز تھی؟ یہ غزالہ کی آواز تھی۔ یہ کہاں سے آئی تھی؟ یہ ارد گرد سے تو نہیں آئی تھی...... یہ تو میرے اندر سے آئی تھی۔ میرے دل میں سے آئی تھی۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ برسوں سے بیٹھی ہوئی تھی...... پتا نہیں کتنے زمانے بیت گئے تھے اسے وہاں بیٹھے ہوئے ہجر کے کتنے موسم...... انتظار کی کتنی رتیں...... اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے کاٹی تھیں...... اب وہ میری ہو چکی تھی لیکن انتظار کی رتیں اب بھی ختم نہیں ہوئی تھیں وہ ہجر کے موسم برقرار تھے...... اور وہ ان موسموں کے اس پار سے مجھے پکار پکار کر کہہ رہی تھی "نہیں شاہ جہاں! یہ ٹھیک نہیں ہے...... یہ ہمارے پیار کی توہین ہے۔ یہ اوپر والے کی "قدرت کاملہ" سے ناامید ہونے کا اعلان ہے۔ یہ گناہ ہی نہیں...... یہ بہت بڑی شکست بھی ہے۔ جدائی کے وقت کیا طے ہوا تھا؟ یہی طے ہوا تھا کہ ہم پاس آنے کے لیے دور جا

رہے ہیں۔ ہم پھر ملنے کے لیے بچھڑ رہے ہیں۔ ہم اس تاریک شب میں اس لیے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے ہیں کہ ایک سہانے دن میں ہم نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہنا ہے...... یہی طے ہوا تھا ناں؟ یہ تو طے نہیں ہوا تھا ناں...... جو ہو رہا ہے یہ تو طے نہیں ہوا تھا ناں......"

میرے ہاتھ حسین و جمیل میگی کے دہکتے ہوئے بدن پر تھے...... اچانک مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ انگاروں پر ہیں۔ ایک جھٹکا مجھے ہوش و خرد کی دنیا میں لے آیا۔ میگی کے چمکتے زیورات اور دہکتے ہوئے اعضا میری آنکھوں کو شعلوں کی طرح جھلسانے لگے۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اس نے میرا پاؤں اپنے ہاتھ میں جکڑ کر مجھے روکنے کی کوشش کی...... مگر طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ سحر بکھر گیا تھا۔ غزالہ میرے پاس تھی اور جو غزالہ نہیں تھی وہ بہت دور چلی گئی تھی۔ میں ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور سر پر ٹوپی رکھتا ہوا شیش محل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ فرش پر کسی شرابی نے قے کر رکھی تھی۔ میرا پاؤں پھسلا اور میں گرتے گرتے بچا۔ سرخ دھوئیں کے مرغولے قدرے کم ہو گئے تھے...... اچانک میری نگاہ ایک منظر پر پڑی اور دماغ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ شدید مدہوشی کی کیفیت میں چند مرد و زن ایک دوجے کی بانہوں میں تھے۔ ان میں مول بھی تھا۔ مول کے ساتھ جو عورت تھی اس کے جسم پر جھریاں نظر آتی تھیں۔ دھوئیں کے مرغولوں میں مول اور اس عورت کی شکلیں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے عورت کی شکل نظر آئی۔ کراہیت کا شدید احساس ہوا۔ یہ وہی فیشن ایبل بڑھیا تھی جسے مول نے ازراہ مذاق اماں جی کہا تھا۔

اس بہکے ہوئے ماحول نے عقلوں کو تو اندھا کیا ہی تھا۔ آنکھوں سے بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سرخ دھند کی دبیز تہوں میں جو عورت مول کے ہاتھ لگی تھی۔ وہ عمر میں اس سے دو تین گنا بڑی تھی مگر نشے میں تو کالی بھجنگ بھی حسینۂ عالم نظر آتی ہے۔ مول کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

میں مول کو ڈسٹرب کیے بغیر آگے بڑھا۔ ایک بالکل ننگ شخص داخلی دروازے کے قریب کھڑا تھا اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے کھڑے پیشاب کر رہا تھا۔ اس کا بدبودار پیشاب سارے فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی میرا دماغ مختلف قسم کی بوؤں سے سڑنے لگا...... مجھے ابکائی آنے لگی...... الکحل...... سگریٹ...... پیشاب...... قے...... پتا نہیں کون کون سی بو اس فضا میں شامل تھی۔ میں نے بمشکل دروازہ کھولا اور شیش محل سے باہر نکل آیا۔ یہ 'اے کلب' کی حدود تھی۔ آبشاریں بہہ رہی تھیں، نیلے آسمان پر سفید بدلیاں تھیں۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بھی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چند گہری سانسیں لیں اور مجھے محسوس ہوا کہ جان میں جان آ رہی ہے۔ بہرحال نشہ ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں بھاری تھے، دماغ میں سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں خود کو سنبھالتا ہوا...... کچھ لڑکھڑاتا اور کچھ ڈولتا ہوا...... الیکٹرک کار میں آ بیٹھا...... ایک دم ہی ارد گرد کی ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا تھا...... میں اپارٹمنٹ میں واپس جانا چاہ رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اپارٹمنٹ میں تھا اور بستر پر چت لیٹا تھا۔ نشے کا اثر کم کرنے کے لیے میں مسلسل سوڈا واٹر پی رہا تھا...... جی چاہ رہا تھا کہ الکحل کی بو جلد از جلد میرے پھیپھڑوں سے نکل جائے اور میری سانسیں پھر سے صاف ہو جائیں...... آج جو غلطی مجھ سے ہونے جا رہی تھی اس پر میں جتنا بھی افسوس کرتا کم تھا۔ میگی کے سنگین قرب نے کچھ دیر کے لیے میرے دل و دماغ کو مفلوج کر ڈالا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لیے ہوا تھا کہ شراب میرے اندر تھی۔ وہ سیال میرے اندر تھا۔ جو انسان سے اس کی 'اصل' چھین لیتا ہے اور سرتاپا 'نقل' بنا دیتا ہے۔

بستر پر چت لیٹے لیٹے اور سفید چھت کو گھورتے گھورتے میں نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا یہ ام الخبائث مجھ سے دوبارہ کیوں چمٹ گئی ہے۔ یہ دوبارہ اس لیے چمٹی تھی کہ چند ماہ پہلے مجھے اپنے چاروں طرف بس اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا تھا۔ مجھے ہر طرف سے گہری مایوسی نے گھیر لیا تھا۔ لاہور میں غزالہ ایک دم میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ میرے قریب آتے آتے وہ لامتناہی فاصلوں پر چلی گئی تھی۔ میں کئی روز تک پاگلوں کی طرح اسے اور اس کے اہل خانہ کو لاہور کی گلی کوچوں میں ڈھونڈتا رہا تھا اور پھر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا...... میں جب بکھرا تھا تو شراب کا ٹوٹا ہوا گلاس بھی جڑ گیا تھا اور میرے ہونٹوں سے جا لگا تھا۔

"لیکن اب کیوں؟ اب کیوں؟ یہ سوال چیخ بن کر میرے ذہن سے ابھرا" اب میں ایسا کیوں کر رہا ہوں...... اب تو غزالہ مجھے مل چکی ہے۔ وہ میری ہو چکی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی خواہش اس حد تک پوری ہو چکی ہے کہ میں غزالہ کو اپنی بیوی کہہ سکتا ہوں...... ہاں وہ میری بیوی ہے۔ آج وہ بیوی کی حیثیت سے ہی تو میرے تصور میں آئی تھی۔ ایک بیوی ہی کی طرح اس نے مجھے نشے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی...... وہی انداز جو مشرقی عورت صدیوں سے اپنائی رہی ہے۔ رات گئے گھر آنے والے شوہر کے ہاتھ سے شراب لے کر توڑتی رہی ہے۔ مار کھاتی رہی ہے...... تکلیف

اٹھاتی رہی ہے۔ اپنے نشے سے بوتل کے نشے کو شکست دینے کی کوشش کرتی رہی ہے..... مجھے لگا جیسے آج غزالہ نے میرے تصور میں آ کر بیوی کی حیثیت سے اپنا حق استعمال کیا ہے۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن وہ کہیں میرے آس پاس ہی تھی۔ اس کی آنکھیں میری نگہبان تھیں۔ اس کا دل میری حالت پر رو رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کے خوبصورت ہاتھ میرے بوٹوں کے تسمے کھولنے کے لیے میرے پاؤں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ تصور اتنا حقیقی اور جاندار تھا کہ میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف پھینکے۔ مجھے اپنی پتلون کی جیب میں کسی سخت چیز کا احساس ہوا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ وہسکی کی وہی چھوٹی بوتل تھی جو جیکب نے مستی کے عالم میں میری جیب میں ٹھونسی تھی۔ اس بوتل میں سے فقط دو پیگ لیے گئے تھے۔ باقی شراب اندر ہی تھی۔

میں نے بوتل نکال لی اور اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اندر سنہری سیال ہلکورے لے رہا تھا۔ اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا اور اپنی طرف بلا رہا تھا۔ جیسے چلچلاتی ہوئی دوپہر میں کسی سنسان کھیت کے اندر کام کرتے ہوئے کسی کسان کو گہنوں سے لدی ہوئی ایک حسین عورت اپنی طرف بلاتی ہے۔ وہ عورت نہیں ہوتی..... چڑیل ہوتی ہے..... خون پی لیتی ہے۔ کھیت میں کسان کی لاش چھوڑ جاتی ہے۔ ہاں یہ سنہری شراب بھی ایک حسین چڑیل ہی تو تھی۔ خون چوسنے والی، زندگی لینے والی۔ ان لمحوں میں مجھے اس سنہری سیال سے اتنی نفرت محسوس ہوئی جتنی زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سیال ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کتنی بڑی خطا کرانے جا رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے غزالہ میری بیوی بنی ہے..... ابھی چند گھنٹے بعد ہماری شب عروسی آنے والی ہے لیکن اس شب عروسی سے پہلے ہی میں میگی کی بانہوں میں گرنے جا رہا تھا۔ پھولوں کی سیج سے پہلے گندگی کے ڈھیر پر گرنے والا تھا..... ہاں کتنا بڑا سانحہ ہونے لگا تھا میرے ساتھ..... اور اس کی وجہ یہی سنہری سیال تھا۔ میری نگاہوں میں وہ مناظر گھومے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کیسل محل میں دیکھے تھے۔ دیوانے قہقہے..... مکروہ ہچکیاں..... قے..... پیشاب..... اماں جی..... میں نے شراب کی بوتل پورے زور سے فرش پر دے ماری۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دنوں میں حالات تیزی سے تبدیل ہوئے۔ جیکب ہارڈ کو ہوسٹل کے زیادہ تر معاملات پر کنٹرول حاصل ہو گیا تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ جلد ہی نائب انچارج سے 'فل انچارج' بنا دیا جائے گا۔ جیکب کو اختیار حاصل ہونے سے مجھے اور موبل کو بھی کافی تحفظ حاصل ہو گیا تھا..... زریں گل ابھی تک لاک اپ میں تھا۔ بہرحال جیکب نے اس پر تشدد کے خطرات کافی حد تک کم کر دیے تھے۔ علی احمد کی موت اب کنفرم ہو چکی تھی۔ اسے منوہرا نے عقوبت خانے میں تشدد کے ذریعے ہلاک کروا دیا تھا۔ لاشیں ٹھکانے لگانے کے لیے یہاں ایک جدید بھٹی بنائی گئی تھی۔ یہ چند سیکنڈوں میں جسم کو راکھ کر دیتی تھی۔ علی احمد بھی اس بھٹی میں راکھ ہو چکا تھا..... یہی انجام اس بوب لڑکی کا ہوا تھا جسے رول بڑے پیار سے روبی کہتا تھا۔ وہ سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہوئی تھی اور بعد ازاں بھٹی کی 'زینت' بنی تھی۔ جس طرح مجھے علی احمد کی موت کا دکھ تھا۔ موبل کو بوب لڑکی کی موت کا غم تھا۔ موبل ایسی باتوں کو دل سے لگانے والا بندہ تو نہیں تھا پھر بھی تھوڑا بہت دکھ تو اسے پہنچا ہی تھا۔

ہم اپنی پناہ گاہ میں بڑی سہولت سے رہ رہے تھے۔ ہمارے بدلتے ہوئے حلیوں نے ہمیں کافی تحفظ فراہم کر دیا تھا۔ جیکب کا خیال تھا کہ انچارج بننے کے بعد وہ ہم دونوں کو اپنے ذاتی گارڈز کی حیثیت سے اپنے اپارٹمنٹ میں رکھ سکے گا۔ تقریب گاہ یعنی کیسل محل میں پیش آنے والے واقعے کے بعد دو تین روز تک میگی مجھ سے خفا خفا نظر آئی تھی لیکن اب نارمل نظر آ رہی تھی..... اس حوالے سے وہ کافی 'پرعزم' ثابت ہوئی تھی۔ جیکب سے وہ ڈرتی تھی۔ اگر اسے جیکب کا غیر معمولی خوف نہ ہوتا تو یقیناً وہ میرا اپارٹمنٹ میں رہنا دشوار کر دیتی۔

کسی وقت بیٹھے بیٹھے، مجھے مسٹر جی کلارک..... سائیں عالی اور بوکارلو وغیرہ کا خیال آیا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے موریطانیہ میں میرے ساتھ مل کر کنگ براؤن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور اس کی ناقابل شکست طاقت کا شیرازہ بکھیرا تھا..... اب جبکہ کنگ یہاں انگلینڈ میں ایک بار پھر غیر معمولی طاقت پکڑ رہا تھا وہ سب لوگ نجانے کہاں تھے..... مجھے خاص طور سے بوکارلو کا خیال آیا تھا۔ بوکارلو..... کنگ براؤن کا بھائی تھا۔ ایک بہت برے شخص کا ایک بہت اچھا بھائی۔ اسے کنگ کا عکس معکوس کہا جائے تو غلط نہ ہو گا..... لارسیوں اور بینا کی قبائل کی بہت بڑی اکثریت بوکارلو کو روحانی پیشوا مانتی تھی..... خاص طور سے لارسی تو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ بوکارلو کی پراسرار صلاحیتوں کو دل و جان سے مانتے تھے اور اس پر اندھا اعتماد

رکھتے تھے۔ مجھے یاد تھا..... جب کنگ براؤن کی وجہ سے بوکارلو کو اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہونا پڑا تو بوکارلو کے عقیدت مندوں میں کیسا طوفان اٹھا تھا۔

جیکب ہارڈ کے نائب انچارج بننے کے بعد یہ چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے۔ میں اور موبل اپنے کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ موبل بالکل گم صم نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی وی کی آواز آہستہ کی اور بولا "شاہ جہاں صاحب..... مجھے..... کچھ شور سنائی دے رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ اپنے مخصوص ڈرامائی لہجے میں بولا "چیخوں کی آوازیں ہیں اور گرجنے برسنے کی آوازیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری..... جانی پہچانی آوازیں ہیں..... میرا خیال ہے کہ..... چیخ زاری توسیہ چیخ رہی ہے..... اسے کوئی مار رہا ہے۔"

"توسیہ کو کوئی مار رہا ہے؟" میں نے حیرت کے عالم میں کہا "وہ تو خود یہاں پھولن دیوی بنی ہوئی ہے۔ شاید تمہیں دھوکا ہو رہا ہے۔"

"نہیں جناب۔ مجھے دھوکا نہیں ہو رہا۔" موبل نے کہا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی اور رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

ابھی ایک دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ تیزی سے کھلا۔ آنے والی میگی تھی۔ وہ شاید کچھ شاپنگ کر کے لائی تھی۔ سامان ایک طرف رکھنے کے بعد وہ سیدھی ہماری طرف چلی آئی۔ اس کی سبز آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی..... تیز لہجے میں بولی "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ توسیہ صاحبہ سخت مشکل میں ہیں....." موبل نے داد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے میگی سے پوچھا "کیوں کیا ہوا ہے اسے؟"

"تم نے وہ اونچی ناک والا بندہ دیکھا تھا ناں، جس نے فنکشن والے دن ڈانسنگ فلور پر توسیہ صاحبہ کے پارٹنر پر حملہ کیا تھا؟"

"ہاں وہی، جس کے چہرے پر کٹ کا نشان ہے؟"

میگی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی "وہ پاگل خود کو توسیہ صاحبہ کا قانونی شوہر کہتا ہے۔ آج پتا نہیں کس طرح وہ بند کمرے سے باہر نکل آیا ہے اور اس نے مار مار کر توسیہ صاحبہ کا حشر کر دیا ہے۔ اس نے اپارٹمنٹ کے دروازے بھی اندر سے بند کر رکھے ہیں..... سیکورٹی گارڈز اپارٹمنٹ کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں....." فقرہ مکمل کرتے کرتے میگی دوڑتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں اور موبل اپنی جگہ بیٹھے رہے "شکر ہے خدا کا" آخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ کوئی شعر ہے؟" موبل نے پوچھا۔

"ہاں یہ شعر کا ایک حصہ ہے۔ جب کوئی صورت حال بہت دیر تک جوں کی توں رہنے کے بعد ایک دم وقوع پذیر ہو جاتی ہے تو شکر کے طور پر یہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ ہارڈی نے توسیہ کی محبت کی خاطر بہت عرصے تک اس کے سامنے سر جھکائے رکھا ہے۔ اس کی غلامی کی ہے اور اس کے پاؤں چاٹے ہیں لیکن اب لگتا ہے کہ اس کی غیرت جاگی ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ ہمیں موقع پر جانا چاہیے؟"

"میرے خیال میں ہرج تو کوئی نہیں۔ ویسے بھی افراتفری میں سب کا دھیان دوسری طرف ہو گا۔"

"تو پھر آئیے نظارہ کرتے ہیں۔" موبل نے کہا اور رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وردی ہم دونوں نے پہلے ہی پہنی ہوئی تھی۔ ٹوپیاں اور بیج وغیرہ درست کرتے ہوئے ہم اپارٹمنٹ سے نکل آئے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہنگامے کا مرکز کس طرف ہے۔ یہ زیادہ دور نہیں تھا۔ کوئی سو گز کا..... فاصلہ طے کر کے ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہاں بہت سے سیکورٹی گارڈز اور تماشائی جمع ہو چکے تھے۔ سیکورٹی گارڈز نے اپنے بچاؤ کے لیے اپنے سامنے بڑی بڑی فولادی شیلڈیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جیکب ہارڈ بھی یہیں موجود ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک میگا فون نظر آ رہا تھا۔ اس کے عقب میں ہوسٹل کے بہترین گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ اچانک اپارٹمنٹ کی بالائی کھڑکیوں میں دو سائے نظر آئے۔ دراصل یہ اندر موجود افراد کی پرچھائیاں تھیں جو کھڑکیوں کے شیشوں پر پڑ رہی تھیں..... ایک پرچھائیں واضح طور پر توسیہ کی تھی، دوسری ہارڈی کی تھی۔ ہارڈی کے ہاتھ میں یقیناً پسٹل وغیرہ تھا۔ اس نے توسیہ کا بازو موڑ کر اس کی پشت پر لگا رکھا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے توسیہ نے منہ موڑ کر ہارڈی کے کندھے پر کاٹنا چاہا۔ ہارڈی نے دو تین زوردار ٹھوکریں توسیہ کے ٹخنوں پر رسید کیں۔ توسیہ کی چیخیں باہر تک سنائی دیں۔ یہ منظر تکلیف دہ ہونے کے باوجود مجھے برا نہیں لگا۔ پچھلے سات آٹھ ماہ میں، میں نے ہارڈی کو سیکڑوں بار سمجھایا تھا کہ وہ توسیہ سے اپنی غیر مشروط محبت پر نظرثانی کرے لیکن وہ نہیں مانتا تھا اور نہ ماننے کی وجہ سے مسلسل ذلیل و رسوا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اسے گلے میں رسی ڈلوا کر پالتو کتے کی طرح

توسیہ کے پیچھے چلنا پڑا تھا۔ آج جو کچھ وہ کر رہا تھا اس میں وہ حق بجانب تھا۔

چند لمحے بعد دونوں سائے کھڑکی سے دور چلے گئے۔ جیکب بارڈ نے میگا فون منہ سے لگایا اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں گرج کر بولا "مسٹر باری! تم اپنی سزا میں اضافہ کر رہے ہو۔ میں تمہیں آخری وارننگ دیتا ہوں۔ میڈم کو چھوڑ دو اور ہاتھ اٹھا کر دروازے پر آ جاؤ۔ میں پھر دہراتا ہوں۔ یہ آخری وارننگ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کے ذمے دار تم ہو گے۔"

اندر سے باری نے چیخ کر کچھ کہا لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اس کے لہجے میں ایک ایسا جنون تھا جس میں سے بارود اور لہو کی بو آتی تھی۔

موبل کو دیکھ کر جیکب نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ موبل سے کھسر پھسر کے انداز میں باتیں کرنے لگا۔ شاید موجودہ صورت حال کے حوالے سے اس کا مشورہ مانگ رہا تھا۔ اچانک اوپر سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی پھر کوئی تیزی سے بھاگتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے نکل گیا۔ یہ یقیناً توسیہ ہی تھی۔ توسیہ کے عقب میں باری کی پرچھائیں لپکی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ توسیہ نے خود کو باری کی گرفت سے چھڑا لیا ہے اور اب سیڑھیوں کی طرف جا رہی ہے۔

صورت حال کے تبدیل ہوتے ہی سیکورٹی گارڈز بھی حرکت میں آ گئے۔ وہ توسیہ کو بچانے کے لیے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ ہم بھی گارڈز کے جتھے کے ساتھ اپارٹمنٹ میں گھس گئے۔ ہر طرف جہنم دھاڑ سی مچ گئی تھی۔ یہ شام سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ بہرحال اس زیر زمین دنیا میں رات اور دن برابر ہی تھے۔

"وہ اس طرف گئے ہیں۔" اچانک ایک گارڈ انگلی اٹھا کر چیخا۔

ایک دم درجنوں گارڈز نے اپارٹمنٹ کی عقبی سڑک کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اور موبل بھی اس دوڑ میں شامل تھے۔ دو تین منٹ بعد ہم نے اچانک خود کو ایک بالکل مختلف جگہ پر پایا۔ دراصل ہم ایک بڑے دروازے میں سے گزر کر ہوسٹل کے زیر تعمیر حصے میں آ گئے تھے۔ یہ وسیع و عریض حصہ کئی سو میٹر تک پھیلا ہوا تھا۔ ملٹی اسٹوری عمارتیں بن رہی تھیں۔ راستے تعمیر ہو رہے تھے۔ رہائشی سہولتیں فراہم کرنے کا کام ہو رہا تھا۔ سیکنڈ شفٹ شروع ہو چکی تھی۔ سیکڑوں لوگ بیگار میں مصروف تھے اور درجنوں بیگار کرنے والوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ بڑی بڑی مشینیں حرکت میں تھیں اور ان کے شور سے کان جھنجھنا رہے تھے۔ گارڈز بڑی سرعت سے ایک زیر تعمیر عمارت میں گھس گئے تھے۔ سیڑھیاں بل کھاتی ہوئی تین چار منزلوں تک جا رہی تھیں۔ گارڈز کے انداز سے یہی پتا چلتا تھا کہ انہوں نے توسیہ یا باری کو عمارت میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔

"ہالٹ...... ہالٹ۔" کسی گارڈ کی زوردار للکار سنائی دی۔

اس کے ساتھ ہی رائفل کی خوفناک تڑتڑ سے فضا گونج اٹھی۔ دفعتاً میری نظر قریباً پچیس میٹر دور بل کھاتے زینوں پر پڑی۔ مجھے باری نظر آیا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں ہم نے اسے تقریب گاہ میں دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باری زینوں پر ساکت کھڑا ہے پھر یکایک وہ لڑکھڑایا اور لڑھکتا ہوا زینوں سے نیچے آیا۔ میرے سینے میں ٹیس اٹھی۔ دل سے آواز آئی کہ باری گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بن گیا ہے...... پھر میری نگاہ توسیہ پر پڑی۔ اس کے پاؤں میں جوگرز تھے۔ وہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی ایک منزل اوپر کے زینوں پر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ وہی توسیہ جو شیخ عاصم کی بہن تھی۔ جو ضد اور ہٹ دھرمی میں اپنی مثال آپ تھی...... میں اپنی جگہ سے حرکت میں آ گیا۔ ٹریبل ٹو رائفل میرے گلے میں جھول رہی تھی۔ میں سیڑھیوں پر پہنچا۔ گارڈز محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا دوسری منزل کی سیڑھیوں پر آ گیا۔ میری بے تاب نگاہیں باری کو تلاش کر رہی تھیں۔ فائرنگ کے بعد وہ جس جگہ گرا تھا وہاں خون نظر آ رہا تھا لیکن وہ خود کہیں نہیں تھا۔ اس کا ریوالور پسٹل بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ زیر تعمیر کمروں میں گیلے سیمنٹ کی باس تھی اور شٹرنگ کا سامان بکھرا تھا۔ عین ممکن تھا کہ باری زخمی ہونے کے بعد اس کاٹھ کباڑ میں ہی کہیں رینگ گیا ہو لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا...... میری حیثیت یہاں صرف ایک گارڈ کی تھی۔

پھر میرا دھیان توسیہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے بھرنی سے چھت کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ باری کی دیوانگی سے دہشت زدہ ہے اور حیرت و خوف کے عالم میں جان بچانے کے لیے بھاگ رہی ہے۔ اس کے بھاگنے کے انداز سے ہی اس کی غیر معمولی دہشت کا پتا چلتا تھا۔ توسیہ بڑے دل گردے کی مالک اور بے حد سفاک لڑکی تھی۔ اس کا یوں خوفزدہ ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ باری کی آنکھوں میں یقیناً اسے موت ہی نظر آئی ہوگی۔

دفعتاً مجھے ایک مدھم چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ عمارت کے پچھلے حصے سے ابھری تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ توسیہ کی چیخ ہے۔ میں دوڑتا ہوا عمارت کی چھت پر پہنچا۔ عمارت کے اندرونی حصے کی طرح چھت پر بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں تعمیر کا کام رکا ہوا ہے۔ عمارت کی چھت کے اوپر نیلا آسمان نہیں تھا بلکہ ایک اور وسیع و عریض چھت نظر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ بھی تھا زمین ہی کے اندر تھا۔ لاکھوں ٹن مٹی کھود کھود کر سمندر میں بہائی گئی تھی اور انڈر گراؤنڈ شہر آباد کیا جا رہا تھا۔ بہترین انجینئرز اور ماہر کاریگر اس کام میں کنگ براؤن کی معاونت کر رہے تھے۔

جونہی میں چھت پر پہنچا تو مجھے توسیہ کی چیخ پھر سنائی دی۔ توسیہ آس پاس ہی موجود تھی لیکن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر نچلی منزل سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کا مطلب تھا کہ باری ابھی زندہ ہے۔ اگر وہ زندہ نہیں تھا تو پھر اس فائرنگ کا کیا مطلب تھا۔ میں زینے پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ چند گارڈز نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ بالکل الرٹ نظر آ رہے تھے۔ جیکب بھی ایک ستون کی آڑ میں دبکا کھڑا تھا۔

میں نے ایک گارڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ زخمی آدمی (باری) سامنے والے دو کمروں میں موجود ہے۔ ابھی اس نے وہاں سے گولی چلائی ہے اور ایک گارڈ کو شدید زخمی کر دیا ہے۔

میں نے دھیان سے دیکھا۔ غیر مکمل فرش پر خون کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ باری اپنے زخمی جسم کو گھسیٹتا ہوا ان کمروں کی طرف گیا ہے۔ میں باری کو بچانا چاہتا تھا لیکن وہ بچتا نظر نہیں آتا تھا۔ میں جھک کر چلتا ہوا اس ستون کی اوٹ میں پہنچا جہاں جیکب موجود تھا۔ جیکب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "مسٹر جیکب! اگر یہ شخص زندہ گرفتار ہو جائے تو ہمارے لیے بہت اچھا ہوگا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں۔ میں ابھی تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ یہ ہمارے لیے کامیابی کا زینہ بن سکتا ہے۔"

جیکب کے چہرے پر کشمکش نظر آئی پھر وہ بولا "کیا تم اسے ٹھہرے کو جانتے ہو؟"

"ہاں ہم جانتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں اسے ہتھیار پھینکنے کے لیے کہہ سکتا ہوں۔ میرا حلیہ بدلا ہوا ہے لیکن وہ میری آواز سے مجھے ضرور پہچان لے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو کوشش کر کے دیکھو لیکن یہ دھیان رکھنا کہ اگر وہ کسی غلط انداز ے کی وجہ سے یہاں سے کھسک گیا تو اسے دوبارہ پکڑنا بہت مشکل ہوگا۔ ایسے میں میری پوزیشن پر بھی برا اثر پڑے گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "ویسے بھی وہ شدید زخمی لگ رہا ہے۔ توقع نہیں ہے کہ وہ یہاں سے بھاگ سکے گا۔"

جیکب نے گارڈز کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور حکم دیا کہ وہ فائر نہیں کریں گے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر زخمی بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی مار دیں۔

خون آلود فرش کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں مایوسی اتر رہی تھی۔ خون کی مقدار دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ باری کو کئی گولیاں لگی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اسی اثنا میں، میں نے موبل کو دیکھا۔ وہ چھت سے زینے اترتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے اور یہ خبر یقیناً توسیہ کے بارے میں ہی تھی۔ مجھے چھت پر توسیہ کی چیخیں سنائی دی تھیں لیکن ان چیخوں کی حقیقت جاننے سے پہلے ہی فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور میں نیچے آ گیا تھا۔

میرے اور جیکب کے قریب پہنچ کر موبل نے اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور بولا "میں آپ کو مس توسیہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

میں اور جیکب سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگے ......

موٹل نے میرے قریب آتے ہوئے کہا "مس توسیہ چھت سے نیچے گر پڑی ہیں لیکن ایک منزل نیچے وہ دیوار سے باہر نکلے ہوئے آہنی سریوں میں اٹک گئی ہیں۔ اب وہ وہاں پر جھول رہی ہیں۔ اگر فوری طور پر ان کی مدد نہ کی گئی تو وہ نیچے گر کر...... ختم ہوسکتی ہیں۔"

یہ بڑی تشویش ناک اطلاع تھی۔ یہی وقت تھا جب ایک بار پھر ہمیں مدھم نسوانی چیخیں سنائی دیں، یہ زیر تعمیر بلڈنگ کے عقبی حصے سے بلند ہو رہی تھیں۔

میں نے جیکب سے کہا "تم یہاں کا معاملہ سنبھالو، میں توسیہ کو دیکھتا ہوں، لیکن ایک بار پھر تمہیں بتا دوں کہ اگر یہ شخص زندہ گرفتار ہوا تو ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔"

ابھی بات میرے منہ ہی میں تھی کہ اچانک سامنے ایک کمرے کے اندر بھگدڑ سی محسوس ہوئی پھر ہالٹ...... ہالٹ کی کئی آوازیں آئیں اور چند گارڈز نے کسی کو دبوچ لیا۔ جیکب نے چیخ کر کہا "گولی نہیں چلانا۔"

اس کے ساتھ ہی ہم دونوں بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔

میں نے ہاری کو شدید زخمی حالت میں دیکھا۔ اس کے سینے پر دو جگہ خون کے بڑے بڑے سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً مزید زخم بھی ہوں گے۔ گارڈز نے ہاری کو اس بری طرح جکڑا تھا کہ وہ جسم کو جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے جیکب کو ہاری کی نگرانی پر چھوڑا اور خود موٹل کے ساتھ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر چلا گیا۔ چند اور گارڈز بھی چھت پر موجود تھے اور صورت حال جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ موٹل مجھے چند فٹ نیچے ایک چھجے پر لے گیا۔ ہم نے اس چھجے سے نیچے جھانکا اور ایک چونکا دینے والا منظر نگاہوں کے سامنے آیا۔ قریباً دس فٹ نیچے توسیہ آہنی سریوں سے جھول رہی تھی۔ یہ سریے نیچے والی چھت سے نکلے ہوئے تھے اور کافی موٹے تھے۔ توسیہ کی شرٹ بھی ان سریوں میں الجھ گئی تھی اور اسے جھولنے میں مدد دے رہی تھی۔ توسیہ کے لیے ہمیں دیکھنا مشکل تھا لیکن ہم سر جھکا کر اسے باآسانی دیکھ سکتے تھے۔ وہ سخت اذیت میں نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جلد ہی اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم ہو جائے گی اور وہ گر پڑے گی۔

"میرا خیال ہے کہ نیچے والی چھت پر چلتے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

موٹل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دوڑتے ہوئے نچلی منزل پر آئے اور پھر اس جگہ پہنچے جہاں توسیہ جھول رہی تھی۔ وہ کھڑکیوں سے کافی دور تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر کوئی گارڈ یا ہم دونوں میں سے کوئی ایک آہنی سریوں سے لٹک کر تو پہنچنے کی کوشش کرتا تو سریے جو پہلے ہی توسیہ کے بوجھ سے ہوئے تھے مزید جھکتے جاتے اور توسیہ یقینی طور پر پینتالیس فٹ نیچے پختہ ملبے کے ڈھیر پر جا گرتی۔ سریوں اوپر چل کر توسیہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی تو بھی یہی نتیجہ نکلتا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ کسی لفٹر یا وغیرہ کے ذریعے توسیہ کو اتارنے کی کوشش کی جاتی۔

ہمارے نقش قدم پر چلتے ہوئے چند مزید گارڈز کھڑکیوں تک پہنچ گئے تھے اور اب اس ہنگامی صورت سے نمٹنے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ موٹل نے بر ہوئے لہجے میں کہا "کرین کے بغیر بات بنتی نظر نہیں جناب!"

اسی دوران میں جیکب بھی ہانپتا ہوا موقع پر پہنچ اس نے تیزی سے صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر وا امدادی ٹیم کو کال کرنے لگا۔ اس نے کسی رچرڈ نامی مخاطب کیا اور اسے فوری طور پر کرین کا انتظام کرنے جس دوران میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، توسیہ نے ایک بار بلند کی۔ سریوں میں اٹکی ہوئی اس کی شرٹ ایک طرف پھٹ گئی تھی۔ شرٹ کے پھٹنے سے وہ جھٹکے کے ساتھ ذرا فٹ نیچے چلی گئی تھی۔

میں نے نیچے ملبے کے ڈھیر کو دیکھ کر جیکب "کرین فوری طور پر پہنچ بھی گئی تو اسے مطلوبہ جگہ پر لا مشکل ہوگا۔"

"مشکل تو ہوگا لیکن ناممکن نہیں۔ رچرڈ کافی شخص ہے۔" جیکب نے کہا۔

"کیا نیچے جال وغیرہ کا انتظام نہیں کیا جا سکتا؟" نے پوچھا۔

"میں نے جال کے لیے کہا تو ہے لیکن اتنی انتظام ہو نہیں سکے گا۔" جیکب نے جواب دیا پھر وہ توسیہ مخاطب ہو کر بلند آواز سے بولا "مس توسیہ! حوصلہ رکھو دو چار منٹ کے اندر تمہیں اتار لیتے ہیں۔"

توسیہ نے جواب میں کچھ کہا لیکن گھٹی گھٹی آواز سے سنائی نہیں دیا۔ جین کی نیلی چست پتلون میں ٹانگیں لرزتی نظر آ رہی تھیں۔ سفید جوگرز بے بسی کے عا لہرا رہے تھے۔ موٹل نے میرے کان میں سرگوشی کرتے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ کرین کے آنے تک توسیہ نیچے گر جائیں گی۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

اس سے پہلے کہ موٹل میری بات کا جواب دیتا، میری نائلون کے ایک موٹے رسے پر پڑی۔ سرخ رنگ کا یہ کمرے کے اندر شفٹنگ کے سامان پر پڑا تھا۔ میں نے فوری طور پر اس رسے کا ایک سرا کھڑکی کی چوکھٹ کے بالائی سے باندھا اور موٹل سے کہا کہ وہ دوسرا سرا مضبوطی کے میری کلائی سے باندھ دے۔ موٹل نے میری ہدایت پر کیا۔ میں نے اپنے پاؤں کھڑکی کی چوکھٹ پر مضبوطی سے اور پھر رسے کے سہارے اپنے جسم کو افقی رخ پر پھیلا میرے ایسا کرنے سے میرا اور توسیہ کا درمیانی فاصلہ کافی ہوگیا۔

اب میں اس کی دبی دبی کراہیں سن سکتا تھا اور اس کی وں میں جما ہوا خوف بھی دیکھ سکتا تھا۔ ہاں شیخ زادی زدہ تھی۔ وہ جو سینے میں پتھر رکھتی تھی اور آنکھوں میں لے کر پھرتی تھی، موت کے روبرو آئی تھی تو خوف زدہ تھی۔ سریے پر اس کے پسینہ ہاتھوں کی گرفت کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔ ایسے میں شرٹ کا سہارا بھی اسے گرنے سے ں سکتا تھا۔ میں نے اپنے جسم کا سارا بوجھ اپنے ایک بازو پر رکھا تھا۔ دوسرا بازو میں نے توسیہ کی طرف پھیلایا۔ بھی میرے اور اس کے ہاتھ کے درمیان دو تین فٹ کا رہا تھا "اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاؤ!" میں نے اپنی اصلی میں کہا "میں شاہ جہاں ہوں۔"

اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی ملیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے نفرت کی جھلک نظر آئی۔ ایک لمحے میں ہی اس کی نگاہوں نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ میری مدد قبول نہیں کرے گی۔ وہ دو بار پہلے بھی میرا ن اٹھا چکی تھی...... اور ان ناقابل فراموش احسانات کے اس نے ٹارچر سیل میں بڑی بے رحمی سے میری چمڑی کی تھی۔ اس کی بے رحمی کے نشانات ابھی تک میرے جسم پر تھے۔ جو ہاتھ میں نے توسیہ کی طرف بڑھایا تھا اس کی انگلی بھی توسیہ کی احسان شناسی اور محبت کی گواہ تھی۔ اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ شاید میرے ساتھ توسیہ کا یہی حسن تھا جو اب توسیہ کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ میری مدد قبول نہ کرے۔

اس نے میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ میں نے ایک جتی سے کہا "توسیہ! بے وقوفی مت کرو۔ تھوڑا سا آگے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔"

اس نے میری آواز جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ اپنے وزن کی سے میرا کندھا اور میری کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ توسیہ میری طرف ہاتھ بڑھانے کی بجائے اس جستی پائپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے جو اس کی سامنے کی طرف پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنے جسم کو بار بار جھلا رہی تھی تاکہ سریے ٹیڑھے ہو جائیں اور وہ اپنا ہاتھ پائپ تک پہنچا سکے۔ اگر وہ پائپ تک پہنچ جاتی تو پھر ایک قریبی کھڑکی میں اتر سکتی تھی، لیکن پائپ تک پہنچنا ہی اصل مسئلہ تھا۔ مجھے اس کی کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اردگرد موجود گارڈز بھی یہ حقیقت سمجھ رہے تھے کہ وہ پائپ کی طرف جانے کی بجائے میری طرف آئے تو اس کے لیے خطرہ کم ہو جائے۔ انچارج گارڈ نے بھی پکار کر توسیہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہٹ کی پکی تھی اور بے حد ضدی رویہ اس کا امتیازی نشان تھا۔

پیچھے دائیں جانب کرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی تھی لیکن یقینی بات تھی کہ ابھی موقع تک پہنچنے میں کرین کو تین چار منٹ مزید لگ جائیں گے۔ اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ توسیہ نے اپنے چھریرے جسم کو خطرناک انداز میں جھلا کر جستی پائپ پکڑنے کی کوشش کی تھی، اس کوشش میں اس کا ہاتھ سریے پر سے بھی چھوٹ گیا تھا۔ وہ ایک قلابازی کھا کر قریباً پینتالیس فٹ نیچے پختہ ملبے پر گری اور ساکت ہوگئی۔ یہ منظر اتنا اندوہناک تھا کہ چند لمحے کے لیے ہر شخص اپنی جگہ ساکت ہوگیا پھر موقع پر موجود گارڈز شور مچاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔ میرے جسم کے سارے رگ ریشے بھی ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ہٹ دھرم توسیہ نے اپنا دھرم نبھایا تھا۔ اپنی انا کی شکست قبول نہیں کی تھی اور زندگی کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا۔ چند ماہ میں یہ تیسرا موقع آیا تھا کہ توسیہ سنگین مصیبت میں گرفتار ہوئی تھی اور میں اس کی مصیبت دیکھنے کے لیے موقع پر موجود تھا۔ بہرحال یہ تیسرا موقع اس لحاظ سے مختلف ثابت ہوا تھا کہ توسیہ نے اپنی مصیبت سے چھٹکارے کے لیے میری مدد قبول نہیں کی تھی۔ شاید اس کی احسان فراموشیوں نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ مدد قبول کرتی۔

موٹل نے مجھے کھینچ کر واپس کھڑکی میں اتارا۔ ہم بھی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ فلور پر پہنچے اور پھر عمارت کے عقبی احاطے میں آ گئے۔ توسیہ کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ نیلی جین کے اندر سے اس کی ایک ران خوفناک انداز میں ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ ایک بازو بھی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح لٹک رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ گارڈز اسے اٹھا کر ایک ایمبولینس میں ڈال رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ

کر اس کے بچنے کا امکان بہت کم نظر آ رہا تھا۔

جیکب کا چہرا اترا ہوا تھا۔ وہ جیکب کی دوست تھی...... اور ان دونوں نے منوہرا کے خلاف مل کر محاذ بنایا تھا۔ ان دونوں کے مفادات ایک تھے اور وہ ایک جیسے مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ میں نے جیکب سے پوچھا "زخمی کدھر ہے۔" میرا اشارہ ہاری کی طرف تھا۔

"اسے بھی اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔" جیکب نے کہا۔

"بچ جائے گا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" جیکب نے جواب دیا۔

اگلے چوبیس گھنٹے سخت تذبذب اور پریشانی کے عالم میں گزرے۔ شیخ زادی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھی اور اسپتال میں تھی۔ اس کا شوہر بھی اسپتال میں تھا۔ وہ شوہر جس نے بیوی کو محبوبہ کی طرح چاہا تھا اور اس کی پرستش کی تھی۔ اس کا ہر ستم بڑے صبر و استقلال سے اپنے سینے پر جھیلا تھا اور بدترین وقت میں بھی اچھے دنوں کی امید رکھی تھی۔ ایک مدت بعد بالآخر یہ امید ٹوٹ گئی تھی۔ دل جلے شوہر نے دیوانگی کے عالم میں بیوی کو موت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا اور خود بھی زندگی سے دور چلا گیا تھا۔

میری نگاہوں میں رہ رہ کر وہ منظر گھوم رہا تھا جب اسے کلب میں توسیہ نے ہاری کو بے دردی سے مارا تھا اور پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اسے جانور کی طرح کھینچتے ہوئے لے گئی تھی۔ وہ ستم کی انتہا تھی اور جب انتہا ہوتی ہے تو انقلاب آتا ہے۔ تہہ و بالا کر دینے والی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہاں بھی ایک ایسی ہی تبدیلی آئی تھی اور توسیہ کی زندگی کو گہنا گئی تھی۔ موقع محل کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ ہاری سے بھاگنے کے چکر میں توسیہ چھت کے آخری کنارے تک چلی گئی تھی۔ یہاں وہ خود کو سنبھالنے میں ناکام ہوئی اور نیچے آہنی سریوں پر جا گری۔ بعد ازاں وہ نیچے پتھریلے ڈھیر پر گری اور شدید زخمی ہوئی۔

اسپتال سے جو اطلاعات آ رہی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ توسیہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کسی بھی وقت بری خبر آ سکتی ہے۔ توسیہ نے میرے ساتھ بہت برا کیا تھا اور آخر وقت تک اپنا بدترین رویہ برقرار رکھا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، میں اس کے ہاتھوں شدید ترین اذیت سہنے کے باوجود اس کے خلاف وہ نفرت محسوس نہیں کر سکا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھی۔

جیکب کو اب میرے اور توسیہ کے بارے میں کئی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ ہاری سے میرے دیرینہ تعلق کے بارے میں بھی جان چکا تھا۔ میں اور توسیہ آپس میں ... رکھنے کے باوجود جیکب کے مشترکہ دوست تھے۔ جیکب ... اب تک عقل مندی کا ثبوت دیا تھا اور توسیہ کو میرے ... میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ توسیہ اب تک اس حقیقت سے بے خبر ... کہ میں جیکب کے پاس پناہ گزیں ہوں۔

رات کوئی آٹھ بجے کا وقت تھا جب مجھے میکی کی زبانی معلوم ہوا کہ توسیہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے جسم ... اندرونی زخموں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جیکب سے کہا کہ میں توسیہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے ... حیثیت سے میکی کے ساتھ اسپتال بھیج دیا۔ توسیہ انتہائی نگہداشت کے کیبن میں تھی۔ میں میکی کے ساتھ گارڈ کی حیثیت سے نگہداشت کے یونٹ میں چلا گیا۔ توسیہ کا چوتھائی جسم سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ کئی نالیاں اس کے ... میں ادویات اور خون وغیرہ پہنچا رہی تھیں اس کا چہرہ ... طرح زرد تھا۔ آکسیجن ماسک کے اندر اس کے ہونٹ ... سے خالی نظر آتے تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، اس کے چہرے ... پتھریلی سختی نمودار ہوئی پھر غیر محسوس طور پر اس کا چہرہ ... طرف گھوم گیا۔ شاید وہ مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ... کی انتہا میں کچھ مرحلے ایسے بھی آتے ہیں۔ نرس کسی کام ... باہر گئی۔ کیبن میں میرے اور میکی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ... نے نرمی سے اپنا ہاتھ توسیہ کے سر پر رکھا۔ اس کے چہرے ... تاثرات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ میں نے ہاتھ کچھ ... وہاں دھرا رہنے دیا پھر میکی کے ساتھ واپس جانے کے ... مڑ گیا۔ اچانک ایک سسکی کی سی آواز سنائی دی۔ میں نے ... دیکھا۔ توسیہ کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ ... رو رہی تھی شاید...... اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ... پھر وہ واقعی رونے لگی۔ اس نے چہرہ میری طرف پھیرا ... اور میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ... ہاتھ پھر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے سینے کا مدوجزر ... گیا۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

میرا خیال تھا کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈھیلا ... رہے گا، لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے بھی میرے ہاتھ کو ... تھا۔ میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا۔ کاش تم یہ ہاتھ ... کل تھام لیتیں۔

اس واقعے کے تقریباً دس پندرہ منٹ بعد توسیہ کی حالت ... مزید بگڑ گئی۔ اگلے پانچ منٹ کے اندر وہ مر گئی۔ اس کا ... جسم اسپتال کے جدید بیڈ پر پڑا رہ گیا اور اس کی بے قرار ...

قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہ شیخ زادی تھی۔ اس کے جینے کا اپنا ایک ڈھنگ تھا۔ اس کی موت بھی اپنے ڈھنگ کی تھی۔ میری نگاہوں میں بار بار وہ منظر گھومنے لگا۔ جب میں اسے تھامنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا رہا تھا اور وہ میرا ہاتھ تھامنے کی بجائے جستی پائپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان لمحوں میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی رگوں میں لہو کی جگہ انا دوڑ رہی ہے۔ اب وہ اپنی ساری انا سمیت مٹی کا ڈھیر تھی۔

اور وہ اکیلی ہی مٹی کا ڈھیر نہیں ہوئی تھی وہ ہاری کو بھی قریباً ڈھیر کر گئی تھی۔ وہ چالیس پچاس قدم دور اسی اسپتال کے ایک اور کمرے میں تھا اور موت و زندگی کی کشمکش جھیل رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں اس دوسرے کمرے میں پہنچا جہاں صالح ہاری پٹیوں میں جکڑا ہوا اپنے بستر پر موجود تھا۔ اس کے جسم میں چار گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بھی مجروح کر گئی تھی۔ ہاری کا یہی زخم سب سے زیادہ تشویش ناک تھا۔ یہ زخم اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ہاری ہوش میں تھا۔ اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں ہاری کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے پہچانتے ہو؟" میں نے اپنی اصل آواز میں پوچھا۔

ہاری کی آنکھوں میں حیرت اور گہری سوچ نظر آئی۔ وہ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا "میں نے ... حلیہ تبدیل کر رکھا ہے۔ میں شاہ جہاں ہوں......"

ہاری کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اس کے لب ... لرزا رہے تھے۔ چند لمحے بعد اس کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکلے اور کنپٹیوں کی طرف چلے گئے۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں آگے کی طرف جھک گیا تاکہ اس کی آواز سن سکوں۔ وہ اپنی بات دہراتے ہوئے بولا "توسیہ نے میرے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ میں اس کو چھوڑوں گا نہیں...... اس کتیا کو......" وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ آواز اس کے گلے میں دب گئی اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ وہ مر چکی ہے۔ اپنے تمام تر ظلم اور ہٹ دھرمی سمیت لقمۂ اجل بن چکی ہے۔ وہ ایک بے لچک شاخ تھی۔ لچک نہیں تھی، ٹوٹ گئی تھی۔ ہاری نہایت کرب کے عالم میں کچھ اور بھی کہہ رہا تھا...... کچھ اور بھی سنا رہا تھا لیکن اس کی آواز اس کے جسم کی طرح اتنی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ کچھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے دل کی کیفیت ظاہر کر رہا تھا۔ یہ اس بدنصیب شوہر کا نصہ تھا جس نے اپنی بیوی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ ایک خوب رو نوجوان تھا اور اس نے عام شکل وصورت والی بیوی کو چاند چہرہ محبوبہ کی طرح پوجا تھا اس کی ہر جفا کو سینے پر جھیلا تھا اور ہر ظلم کو خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا لیکن پھر انتہا ہو گئی تھی اور جب انتہا ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب آتے ہیں۔ حیران کن تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ حیران کن تبدیلی ہی تو تھی کہ ہاری جیسا شوہر...... قاتل بن گیا تھا۔

میں ہاری سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ توسیہ کے پیچھے کیسے چڑھا اور کیونکر اس زیر زمین ہوٹل تک پہنچا...... لیکن فی الحال ہاری کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ یہ تفصیلات بیان کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تو یہ تفصیلات مجھ تک پہنچ جائیں گی ورنہ اس کے ساتھ ہی زمین میں دفن ہو جائیں گی۔ میں شاید کچھ دیر مزید ہاری کے پاس بیٹھتا اور اسے تسلی دیتا لیکن اسی دوران میں میڈیکل اسٹاف کے دو افراد کمرے میں پہنچ گئے اور مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

اگلے روز جیکب نے مجھے بتایا "توسیہ کی لاش نے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ ذمے دار لوگوں میں سے کچھ کا خیال تھا کہ لاش کو یہیں پر تلف کر دیا جائے لیکن کچھ ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کنگ براؤن کی ہدایت پر لاش باہر بھیج دی گئی ہے۔"

"کہاں بھیجی گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اندازہ ہوتا ہے کہ لندن میں توسیہ کے کچھ لواحقین موجود تھے۔ لاش کو اس طریقے سے لواحقین تک پہنچا رہا گیا ہے کہ لاش تو لواحقین تک پہنچ جائے لیکن یہ پتا نہ چلے کہ کون لایا ہے۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور جیکب سے ہاری کے بارے میں پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر توسیہ کا شوہر زندہ بچ گیا تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔"

"اول تو لگ رہا ہے کہ وہ بچے گا نہیں۔ اگر بچ گیا تو یقیناً اچھا سلوک نہیں ہوگا۔ میرے اندازے کے مطابق توسیہ کی موت نے کنگ براؤن کو بھی دکھ پہنچایا ہے اور جس شخص سے کنگ کو دکھ پہنچ جائے، اس کا انجام تو پھر دیوار پر لکھا ہوتا ہے۔"

توسیہ کی موت سے جیکب خود بھی غم زدہ نظر آتا تھا مگر گہرائی سے دیکھا جاتا تو اس کا غم توسیہ کے لیے نہیں، اپنے مفاد کے لیے تھا۔ وہ صرف اپنے مفاد کے لیے جینے مرنے والا شخص تھا۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ جیکب کے دائیں جانب کی پر سکنل نمودار ہوا۔ دوسری طرف کنگ براؤن تھا۔ کنگ کی آواز سن کر جیکب کے چہرے پر ادب و احترام کی بارش ہونے لگی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں باہر چلا جاؤں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنگ براؤن کی نظروں میں جیکب کو تیزی سے اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ وہ ہوسٹل کا نائب انچارج بن چکا تھا...... اور بہت جلد انچارج بھی بننے والا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دو تین بار جیکب کے لیے کنگ کا بلاوا آ چکا تھا۔ جب بھی ایسا بلاوا آتا تھا میں نے جیکب کے چہرے پر بے پایاں خوشی اور جوش محسوس کیا تھا۔ اس کے من میں جیسے لڈو پھوٹنے لگتے تھے۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ زریں کو دیکھنے کے لیے میرا دل مچل رہا تھا۔ ایک گارڈز کی حیثیت سے میں ہوسٹل کے مخصوص علاقے میں گھوم پھر چکا تھا۔ اب اس مخصوص علاقے سے آگے نکلنا چاہتا تھا۔ اتوار کے روز سیکورٹی کے انتظامات قدرے نرم ہوتے تھے۔ خاص طور سے صبح دس گیارہ بجے تک خال خال ہی گارڈز نظر آتے تھے۔ میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا کہ زریں تک پہنچنے کے لیے مجھے کون سا راستہ استعمال کرنا ہوگا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ میں اور موول اپارٹمنٹ سے نکلے اور زریں کے لاک اپ کی طرف روانہ ہو گئے۔

سیکورٹی گارڈز کی اکثریت اب ہماری صورتوں سے آشنا ہو چکی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ہماری حیثیت جیکب ہارڈ کے ذاتی محافظوں کی ہے...... اور ہم صرف جیکب کے سامنے ہی جواب دہ ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم جیکب اور مسز کے ذاتی محافظوں کی حیثیت سے ان کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔

ہم دونوں یونیفارم میں تھے۔ پستول ہمارے ہولسٹرز سے جھول رہے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے ہم ایک طویل کوریڈور سے گزرے اور ہوسٹل کے مغربی رنگ کی طرف بڑھتے رہے بالآخر اس کشادہ راہداری میں پہنچ گئے جس کے ایک جانب طویل قطار میں کوٹھڑیاں اور بیرکیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ وہی بیرکیں تھیں جن میں کنگ کا "مال تجارت" جیتے جاگتے انسانوں کی شکل میں موجود تھا۔ یہ سارے دلدوز مناظر ہمارے دیکھے بھالے تھے۔ ہم اس چھوٹے لاک اپ کے سامنے پہنچے جس میں زریں کے ساتھ میں بھی چند دن گزار چکا تھا۔ یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ لاک اپ کے سامنے ایک ریز پردہ تان دیا گیا تھا۔ اگر زریں گل اس لاک اپ میں موجود تھا بھی تو ہم اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

شاید ہم چار پانچ منٹ تک وہاں گھوم پھر کر واپس چلے جاتے لیکن اتفاق سے ہم زریں گل کی صورت دیکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک گارڈ صبح کا کھانا لے کر زریں کے لاک اپ کے سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور گارڈ بھی تھا۔ اس دوسرے گارڈ نے لاک اپ کے سامنے تنا ہوا پردہ اٹھایا۔ ہمیں زریں کی جھلک نظر آئی۔ وہ بستر پر اوندھا لیٹا تھا۔ اس نے صرف پائجامہ پہن رکھا تھا۔ ایک قیدی خدمت گار زریں گل کی پشت پر کسی تیل وغیرہ سے مالش کر رہا تھا۔ زریں کے چہرے کے بال بڑھ چکے تھے۔ منڈھے ہوئے سر پر بھی بال نظر آنے لگے تھے۔ پتا نہیں کہ زریں کی نگاہ ہم پر پڑی یا نہیں۔ بہرحال نگاہ پڑ بھی جاتی تو ہمیں پہچاننا اس کے لیے ناممکن تھا۔

جیکب ہارڈ نے سچ ہی کہا تھا۔ زریں گل یہاں خاصے آرام میں تھا۔ اس کے لیے اچھا کھانا آیا تھا، اور خدمت گار اس کی مالش کر رہا تھا۔ یہ اچھی خاصی ترقی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب ہم کنگ براؤن کے ہتھے چڑھے تھے تو زریں کو "مالش کروانے" کی بجائے مالش کرنا پڑی تھی۔ ایک مالشیے کی حیثیت سے وہ کنگ کے کئی ساتھیوں کی خدمت پر مجبور ہوا تھا۔ بلکہ ان "خدمت کرنے والوں" میں ایک عورت بھی تھی۔ اس کی مالش کرنا زریں کی غیرت کے لیے ایک امتحان بن گیا تھا۔

اچانک مجھے اور موول کو چونکنا پڑا۔ ایک دراز قد شخص عقب سے نمودار ہوا۔ وہ وردی میں تھا۔ ہم نے حسب دستور اسے سلیوٹ کیا۔ اس کی وردی سے ظاہر تھا کہ وہ اعلیٰ رینک کا آفیسر ہے۔ وہ اپنی تیز نگاہیں میری نگاہوں میں گاڑتے ہوئے بولا "آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟ آپ کی ڈیوٹی تو مسٹر اور مسز جیکب کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے جناب! دراصل ہم ناشتے کے لیے ایک گھنٹے کی چھٹی پر ہیں۔ ناشتے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے گھومنے پھرنے کے لیے ادھر نکل آئے۔"

آفیسر کی نگاہیں بڑی سختی سے ہمارا جائزہ لے رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ہم پر کسی طرح کا شک ہو گیا ہے۔ "کیا تم دونوں کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ آ سکتے ہو؟" آفیسر نے تحکم سے کہا۔

"جو آپ کا حکم ہو جناب؟" میں نے مقامی گارڈ کے انداز میں کہا۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی تھی۔

آفیسر ہم دونوں کو اپنے آگے چلاتا ہوا ایک کمرے میں

لے آیا۔ اس نے کمرے کی روشنیاں جلائیں پھر ایک بڑا ٹیبل لیمپ لے آیا۔ اس نے لیمپ روشن کر کے ہمارے چہروں کے عین سامنے کیا اور تفتیشی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ دل نے گواہی دی کہ آفیسر کو ہمارے تبدیل شدہ حلیوں پر شک ہو چکا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس معاملے میں بہت گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ ایک دم ہی بالکل الرٹ نظر آنے لگا تھا۔ ریڈی میڈ میک اپ میں چونکہ چہرے کی "جلد" میں تبدیلی نہیں کی جاتی لہٰذا اس کے بارے میں جاننا مشکل ہوتا ہے لیکن پلاسٹک میک اپ کو باریک بینی سے دیکھا جائے تو "جلد" میں تبدیلی کا احساس ہو جاتا ہے۔

دراز قد آفیسر کا ہاتھ ایک سوئچ کی طرف بڑھا۔ یہ خطرے کا سوئچ تھا۔ اس امر میں اب شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ آفیسر گارڈز کو بلانا چاہ رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کنگ براؤن کی اس زیرِ زمین دنیا میں ہمارا بہروپ ختم ہونے والا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بالآخر وہ تلاش اختتام کو پہنچنے والی ہے جو پچھلے کئی دنوں سے پورے ہوٹل میں زور و شور سے جاری تھی۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ میں نے جست لگائی اور آفیسر کو اپنے ساتھ لیتا ہوا سرخ قالین پر گرا۔

اس نے ہولسٹر سے پسٹل نکالنے کی کوشش کی لیکن میرے ہاتھ کی گرفت اس کی کلائی پر قائم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی جسمانی طاقت سے تین چار گنا زیادہ زور بھی لگا لیتا تو اپنا ہاتھ اپنے ہتھیار تک نہ پہنچا سکتا۔ دوسری کوشش کے طور پر اس نے میری ناف میں گھٹنا رسید کیا۔ جواباً میں نے اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی۔ یہی وقت تھا جب تیسری کوشش کے طور پر دراز قد آفیسر نے چیخنے کی کوشش کی.... لیکن اب اس کام کے لیے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ مخصوص انداز میں میرے بازو نے دباؤ ڈالا اور یکایک آفیسر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی جناب۔" موٹل نے کہا۔

"ہاں گڑبڑ تو ہو گئی ہے۔ اب اس گڑبڑ کو سنبھالنا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا میری نگاہ آفیسر کے سینے کے زیر و بم پر پڑی اور میں چونک گیا۔ اس کی سانس گلے میں الجھ رہی تھی۔ یہ صورتِ حال غیر متوقع تھی۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ نبض کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔ میں ڈاکٹر نہیں تھا لیکن میڈیکل کی سوجھ بوجھ تو تھی۔ مجھے شک ہوا کہ آفیسر دم توڑ رہا ہے۔ شاید اس کا دل جواب دے رہا تھا۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو منٹ میں جو کچھ ہوا وہ بڑی تیزی سے ہوا۔ پہلے اس کی سانس اکھڑی، پھر منہ کھلا۔ اور پھر ایک جھرجھری کے ساتھ اس میں زندگی کے آثار ختم ہو گئے۔ "یہ مر گیا ہے۔" چند سیکنڈ بعد میں نے اس کی گردن ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"اوہ گاڈ اب کیا ہو گا؟" موٹل کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

مسئلہ واقعی ٹیڑھا تھا۔ اس کمرے سے باہر پانچ چھ گارڈز موجود تھے۔ ہم ان کی موجودگی میں دراز قد آفیسر کے ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ اب کمرے میں آفیسر کی لاش پڑی تھی۔ میری نگاہ مردہ آفیسر کے واکی ٹاکی پر پڑی۔ میں نے واکی ٹاکی اس کی پاکٹ سے نکالا اور ایک دو منٹ کے اندر اس کی تکنیک سمجھ لی۔ میں نے جیکب ہارڈ سے رابطہ کیا۔ پہلے تو وہ حیران ہوا کہ میرے پاس واکی ٹاکی کہاں سے آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ ایک سیکورٹی آفیسر کا واکی ٹاکی ہے۔ میں نے سیکورٹی آفیسر کے بیج پر سے اس کا نام پڑھ کر بھی بتایا۔

"مسئلہ کیا ہے؟" جیکب نے تیزی سے پوچھا۔ غالباً وہ کسی اہم میٹنگ میں تھا۔

"مسئلہ کافی ٹیڑھا ہے۔ بلکہ شاید تمہاری توقع سے زیادہ ٹیڑھا۔ میں واکی ٹاکی پر بتانا نہیں چاہتا۔ ہماری اور اپنی خیریت مطلوب ہے تو فوراً سے پہلے یہاں پہنچ جاؤ۔"

"لیکن...... کہاں؟"

میں نے اسے اپنا پتا بتایا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔

قریباً پانچ منٹ بعد جیکب ہمارے ساتھ سیکورٹی آفیسر ایڈورڈ کی لاش کے سرہانے کھڑا تھا۔ جیکب کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے پوری روداد ہم سے سن لی تھی۔ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "یہ بہت برا ہوا ہے۔ یہ کنگ براؤن کے پرسنل اسٹاف کا بندہ تھا۔ یہ انگریز کرنل ہے۔ اسے کرنل ایڈی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ بہت پھرتیلا اور گھاگ آفیسر تھا۔ سیکرٹ سروس کے لیے بھی کام کرتا رہا ہے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم اس سے بچ نکلے ہو۔ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ کرنل ایڈی جیسا شخص تم دونوں کی مناسب مزاحمت کیوں نہیں کر سکا۔"

"شاید آج اس کا دن ہی برا تھا۔" میں نے انگریزی کا بنا بنایا فقرہ کہا۔

"کیا یہ گلا گھونٹنے سے مرا ہے؟"

"نفی...... نفی۔" میں نے کہا "آدھا گلا گھونٹنے سے فوت ہوا ہے، آدھا طبعی موت مرا ہے۔"

"یہ اہم ترین لوگوں میں سے تھا۔ اس کی موت سے بہت افراتفری پھیلے گی۔ ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا ہو گا۔"

جیکب نے بے قراری سے اس مختصر کمرے کا جائزہ لیا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ کرنل ایڈی کی لاش کو کہاں سے اور کیسے غائب کیا جا سکتا ہے۔ اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کے عیار ذہن میں یقیناً کوئی بات آ گئی تھی۔ اس نے کمرے کے اندر سے ہی ایک قلم اور کاغذ ڈھونڈ لیا۔ اس نے قلم میرے ہاتھ میں پکڑایا اور کاغذ سامنے رکھ دیا "جو میں لکھاتا ہوں اس پر لکھو۔" وہ بولا۔

وہ بولنے لگا اور میں لکھتا گیا۔ یہ آٹھ دس سطریں تھیں۔ ان سطور سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مجھے اور موٹل کو کرنل ایڈی نے اپنے پاس چھپا رکھا ہے اور یوں ہم دونوں پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پتا بھی چلتا تھا کہ ہم دونوں ہوٹل میں موجود ہوتے ہوئے کرنل ایڈی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان چند سطور میں میں نے کرنل ایڈی کو رپورٹ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ میں مقررہ جگہ پر پہنچ گیا ہوں اور کرنل کے اگلے حکم کا انتظار کر رہا ہوں۔

میری تحریر کردہ سطور جیکب نے مردہ کرنل کی ایک اندرونی پاکٹ میں ڈال دیں، اس کے بعد مجھے اور موٹل کو ہدایات دینے میں لگ گیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ بولا "تم دونوں کو ایک چھوٹا سا بیان دینا پڑے گا۔ اس بیان کے مطابق تم دونوں نے اب سے ٹھیک آدھ گھنٹا پہلے کرنل ایڈی کو زون نمبر 3 کے کمرا نمبر ایم۔ 13 میں ایک مشکوک شخص کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ تمہارے خیال میں یہ ان دو اشخاص میں سے ایک تھا جنہیں پچھلے کئی دنوں سے ہوٹل میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ تمہارے اندازے کے مطابق وہ شخص شاہ جہاں تھا، تم نے اس کی تصویریں ٹی وی اور ہینڈبل وغیرہ میں دیکھی ہے۔ تم کمرے میں داخل ہوئے تو کرنل ایڈی تمہیں دیکھ کر چونک گیا۔ بعد ازاں وہ تمہیں بہانے سے یہاں لے آیا۔ وہ تمہیں شوٹ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا جب تم دونوں اس سے الجھ پڑے۔ اس دھینگا مشتی میں کرنل کو دل کا دورہ پڑا اور وہ بے جان ہو کر گر گیا۔ تم دونوں کا بیان بالکل ایک جیسا ہونا چاہیے اور اس میں کسی طرح کا جھول نہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

ہم دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے کرنل کی گردن کی طرف سے پریشانی تھی۔ وہاں میرے بازو کے دباؤ کے مخصوص نشانات موجود تھے۔ ایسے نشانات کے بارے میں کنگ براؤن اور اس کے گماشتے بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان نشانات کی وجہ سے تفتیش کرنے والوں کا ذہن کسی اور طرف منتقل ہو سکتا تھا۔ میں نے جیکب سے کہا "اس بندے کی گردن پر یہ نشانات ہمیں مشکل میں ڈال سکتے ہیں۔ ان کا کوئی حل نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے۔" جیکب نے کہا اور پھر بڑی سفاکی سے مردہ کرنل کی گردن پر کھڑا ہو گیا۔

وہ اسی حالت میں تین چار منٹ تک ہم سے باتیں کرتا رہا۔ جب وہ گردن سے اترا تو گردن کی مخصوص رگ دبائے جانے کے نشانات دوسرے نشانات میں گڈمڈ ہو چکے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد یہ تہلکہ خیز خبر پورے ہوٹل میں پھیل چکی تھی کہ کنگ براؤن کے ذاتی اسٹاف کا ہوشیار ترین آفیسر کرنل ایڈی گارڈز کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا ہے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہمیں پتا چل رہا تھا کہ ہم نے بے خبری میں جس شخص کو چوہے کی طرح مار دیا ہے وہ بڑی بم تھا اور اس کی اہمیت حیران کن حد تک زیادہ تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کوئی بہت بڑا جنگجو لڑائی کے دوران میں چیونٹی کی طرح مسلا جاتا ہے۔ اس کی لاش عام لاشوں کے ڈھیر میں پڑی ملتی ہے اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ کرنل ایڈی نامی اس شخص کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ انگلش سیکرٹ سروس کا ایک نہایت خطرناک شخص ہے تو میں اس پر کچھ اہتمام سے ہاتھ ڈالتا۔ ذرا "کوشش" کر کے اسے مارتا، میں نے تو اسے یونہی روا روی میں پچھاڑ دیا تھا۔ بلکہ آدھا تو وہ خود ہی پھڑک گیا تھا۔ وہ ایک ایسے بلند و بالا درخت کی طرح تھا جو اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔

ہمیں رات گئے تک حفاظتی حراست میں رکھا گیا۔ اس کے بعد سیکورٹی کے اعلیٰ افسران نے ہم سے سوال و جواب کیے۔ اس گفتگو کے دوران میں جیکب ہارڈ بھی کچھ فاصلے پر موجود رہا۔ ایک دو موقع پر جب اس نے دیکھا کہ تفتیشی افسران غیر متعلقہ سوالات پوچھ رہے ہیں، وہ ہمارے قریب چلا آیا اور ہماری مدد کی۔ جلد ہی جیکب ہارڈ اس معاملے سے ہماری جان چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا جیکب کے جوہر ہم پر کھل رہے تھے۔ وہ ایک بے حد شاطر اور موقع شناس فرد تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے وہ ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ ایک قدم آگے بڑھنے کے لیے اگر اسے دس لاشیں بھی گرانا پڑتیں تو شاید وہ اس کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا۔ اکثر موقع شناس لوگوں کی طرح وہ اپنا راستہ نکالنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا تھا۔

کہیں نرمی سے کام لیتا تھا، کہیں سختی سے، کہیں خوشامد اور کہیں دباؤ سے۔

ہم رات پچھلے پہر اپارٹمنٹ میں واپس پہنچے تو تھک کر چور ہو چکے تھے۔ سول بولا "آج تو بال بال بچے ہیں۔"

"ہاں۔ اگر پکڑے جاتے تو زریں سے ملاقات کی یہ بہت بھاری قیمت ہوتی۔"

"جیکب نے ہماری پشت پناہی کا حق ادا کیا ہے۔" سول بولا۔

"مگر سب کچھ اپنے مفاد میں کیا ہے۔ اس کی ہوشیاری کی داد دینا پڑتی ہے۔ کرنل کی موت کی وجہ سے ہم پھنس رہے تھے لیکن اس نے اسی موت کی وجہ سے اپنے نمبر بنا لیے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ واقعہ بھی جیکب کی قدر و قیمت بڑھ جانے کا سبب بنے گا۔"

"اس نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے آپ کی تحریر کرنل کی جیب سے برآمد کروائی ہے۔ لگتا ہے کہ آپ کی ہینڈ رائٹنگ یہاں کچھ لوگوں کے لیے جانی پہچانی ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں مختلف خیالات گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ جیکب جیسے شاطر کی طرف سے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگوں کو سیڑھیوں کی طرح استعمال کرتا تھا۔ ہمیں بھی کر رہا تھا۔ آج جس طرح اس نے کرنل ایڈی کی لاش پر نمبر بنائے تھے، کل ہماری لاشوں پر بھی نمبر بنا سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ کرنل ایڈی کی موت کے بعد ہماری تلاش مزید زور و شور سے شروع ہو جائے گی۔ ایسی صورت میں ہمیں پکڑوا کر یا مار کر وہ اپنے سینے پر ایک اور تمغہ سجا سکتا تھا۔

اگلے دو دنوں میں ہمیں کرنل ایڈی کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوئیں پتا چلا کہ وہ برطانوی سیکرٹ سروس کا ایک اہم رکن تھا اور چند سال پہلے تک بیرون ملک کئی اہم کارنامے انجام دے چکا تھا۔ وہ اپنا حلیہ بدلنے میں بھی زبردست مہارت رکھتا تھا اور ایک خانساماں کے روپ میں ایک عرصے تک ایک بڑی امریکن فلم اسٹار کے گھر میں کام کرتا رہا تھا۔

اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ کرنل ایڈی، وہ جلتے ہم دونوں کے بارے میں شک کا شکار کیوں ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہ ہمارے چہروں پر پڑی اور وہ "میک اپ" کے بارے میں جان گیا۔ اس کی یہی آگاہی بعد ازاں اس کی موت کا سبب بن گئی۔

زریں گل کو ایک بار دیکھنے کے بعد اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ میرے لیے بے حد پریشان ہوگا، اس کے دن انگاروں پر اور راتیں کانٹوں پر گزر رہی ہوں گی۔ وہ ہر پل میری راہ دیکھتا ہوگا لیکن..... وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اور نہ میں کچھ کر سکتا تھا۔ بات صرف زریں گل کی ہی نہیں تھی۔ میرے کئی اپنے مجھ سے جدا تھے۔ ایک آواز دن رات میرا تعاقب کرتی تھی۔ یہ غزالہ کی آواز تھی۔ مجھے بھول نہ جانا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ ہمیں دوبارہ ملنا ہے۔ ایک بار تو ضرور ملنا ہے پھر جو کچھ بھی ہوگا جھیل لیں گے۔ میں آج کل غزالہ کو اپنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ مجھے آس پاس اس کی مہک آتی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن اس کی پائل کی چھن چھن میرے کانوں میں گونجتی تھی۔ کسی وقت میں جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھتا تھا۔ وہ تابی کو گود میں لیے میرے سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ ایک مکمل عورت کی طرح۔ وہ مسکراتی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں بلاوا ہوتا تھا۔ پرسکون ریشمی راتوں کے دلکش لمحوں کی دعوت ہوتی تھی۔ ایسی راتیں جن کے اختتام پر کوئی مضطرب سویرا نہیں ہوتا۔ آنگن میں کھلی ہوئی سرما کی سنہری دھوپ ہوتی ہے۔ لاجونتی اور گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ رسوئی میں کسی کی چوڑیاں کھنکتی ہیں۔ فراغت کے لمحے آرام کرسی پر جھولتے ہیں۔ بقول شاعر بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی۔ میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ ان تاریک تہ خانوں سے باہر نیلے آسمان کے نیچے۔ آپ کو میرے لیے واپس آنا ہے۔ شفقت کے لیے واپس آنا ہے..... اور حمزہ کے لیے۔ ہم سب کے لیے۔ جو آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو پھر سے اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں پھر وہ میری طرف دیکھ کر تابی کو سینے سے بھینچتی تھی۔ اس کا منہ چومتی تھی۔ شاید مجھے بتاتی تھی کہ ایسے چوما جاتا ہے، ایسے پیار کیا جاتا ہے۔ ہاں..... عورت کی وہی ادا جو مرد کے دل میں محبت کے شگوفے کھلاتی ہے۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ سول کو جیکب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ سول کو اکثر اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔ اسے سول کی پراسرار صلاحیتوں پر بے حد اعتبار تھا۔ شاید یہ اعتبار..... اعتقاد کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہم ابھی تک جیکب کے اپارٹمنٹ میں مقیم تھے۔ تاہم اب ہمیں اپنی پناہ گاہ سے چھٹکارا مل چکا تھا۔ جیکب ہمیں اپارٹمنٹ کے اس حصے میں لے آیا تھا جو کبھی محافظوں کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ اس سے پہلے جیکب کے پاس ایک ہی محافظ موجود تھا جسے اس نے چھٹی دے دی تھی۔

ہماری رہائش گاہ ایک کمرے اور ایک باتھ روم پر مشتمل تھی۔ یہ کمرا اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی واقع تھا۔ میں صرف نیکر اور بنیان پہنے بستر پر دراز تھا جب دروازے پر دستک ہوئی، اس سے پہلے کہ میں دستک کا کوئی جواب دیتا میگی اندر آ گئی۔ وہ ایک ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ گھونگھریالے بال شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ ہولے سے مسکرائی تو اس کے گال میں گڑھا پڑ گیا "کیا کر رہے ہو؟" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"فی الحال تو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اگر تمہیں ایسے ہی دندناتے ہوئے اندر آنا تھا تو پھر دستک دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اگر بہت برا لگا ہے تو واپس چلی جاتی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اب آ ہی گئی ہو تو بیٹھ جاؤ..... لیکن اگر تمہارا شوہر نما بوائے فرینڈ اوپر سے آ گیا تو اس کی آنکھیں ضرور خون اگلنے لگیں گی۔"

"کیا صرف اس کے ڈر کی وجہ سے میرے قریب نہیں آتے ہو۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"نہیں کچھ اور ڈر بھی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یعنی ایک نہیں بہت سے ڈر ہیں....." اس نے کہا، پھر گہری سانس لے کر بولی "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ تمہارے اندر خوف کا انبار لگا ہوا ہے۔ ورنہ اتنا نزدیک آنے کے بعد کوئی دور کیسے جا سکتا ہے۔"

وہ تقریب گاہ میں پیش آنے والے واقعے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ کف آور دھند کے مرغولوں میں وہ میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ ایسی قربت کے بعد اکثر واپسی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، لیکن میں واپس چلا آیا تھا۔ آج وہ میری "واپسی" کا شکوہ کر رہی تھی۔ "ہاں اب کیسے آئی ہو۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بڑی نرمی سے میرا ہاتھ تھام لیا "پتا نہیں کیا بات ہے، اکثر تمہارے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ تمہاری خیریت کے بارے میں فکرمند رہتی ہوں۔"

"کیوں میں موت کے کنویں میں کرتب دکھاتا ہوں۔"

"تم بات کو مذاق میں لے رہے ہو..... لیکن یہ حقیقت ہے مسٹر شاہ جہاں کہ تم اور سول ایک بہت بڑے خطرے کے قریب سے گزر رہے ہو۔"

"کیا میں اس خطرے کا نام جان سکتا ہوں۔"

وہ چند لمحے تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولی "اس خطرے کا نام جیکب ہارڈ ہے....."

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی "کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے خوف زدہ نظروں سے در و دیوار کو دیکھا۔ جیسے نادیدہ آنکھوں اور کانوں کا سراغ لگا رہی ہو۔ اس کی خوب صورت سبز آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی "شاید تمہیں ٹھیک سے معلوم نہیں کہ یہ کتنا بے رحم اور سفاک شخص ہے۔ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن یہ محبت بھی زبردستی کی ہے۔ میں اس کی محبت سے انکار نہیں کر سکتی۔ اگر کروں گی تو یہ مجھے نقصان پہنچائے گا یا خود کو نقصان پہنچا لے گا۔ اس معاملے میں یہ بے حد جنونی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو اس سے چھٹکارا حاصل کر لو۔"

"چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتی یا شاید کر ہی نہیں سکتی۔ اگر کبھی بھولے سے بھی ایسی بات میرے منہ سے نکل جائے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ یہ دیکھو کل کیا حال کیا ہے اس نے میرا۔" میگی نے یہ کہتے ہوئے اپنے گاؤن کی ڈوریاں کھول دیں۔ اس کے جسم کا کندن میری نگاہوں کے سامنے دمکنے لگا۔ اس کندن پر بڑے بڑے داغ نظر آ رہے تھے، یہ ضربات کے نیلگوں نشان تھے۔ غالباً جیکب نے نشے کے عالم میں اسے بری طرح پیٹا تھا۔

میگی نے گاؤن کی ڈوریاں باندھ لیں اور گلوگیر آواز میں بولی "آج ایک بات میں تمہیں پوری طرح وضاحت سے بتا رہی ہوں۔ جیکب کسی کا دوست نہیں ہے۔ وہ اپنے مقصد کے لیے گہری سے گہری دوستی کو بھی خطرناک دشمنی میں بدل سکتا ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے بے حد ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے..... بلکہ میری تم سے درخواست ہے..... تم یہاں سے چلے جاؤ..... تم فائدے میں رہو گے۔ تم بہادر شخص ہو..... تمہارا ساتھی بھی ہمت والا ہے۔ تم سامنے سے آنے والے خطرے کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے ہو، لیکن اگر کوئی اندھیرے میں آ کر تمہاری پیٹھ میں چھرا گھونپے گا تو تم کیا کر لو گے۔ پلیز..... تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہاں کوئی بھی جگہ تمہارے لیے اس جگہ سے زیادہ محفوظ ہو گی۔"

"میں تمہاری ہمدردی کی قدر کرتا ہوں..... لیکن..."

"پلیز شاہ جہاں! کوئی عذر پیش نہ کرو۔ دیکھو تم نے میری جان بچائی ہے، مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں کوئی بڑا نقصان اٹھاتے دیکھوں۔"

اچانک باہر کوئی کھٹکا ہوا۔ میگی بدک کر کھڑی ہوگئی۔ چند لمحے تک باہر کی سن گن لیتی رہی۔ مزید کوئی آواز پیدا ہونے سے پہلے ہی اس نے جھک کر والہانہ انداز میں میرے رخسار کو بوسہ دیا اور باہر نکل گئی۔

آنے والا مول تھا۔ وہ اکیلا آیا تھا۔ میں نے پوچھا ''جیکب کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟''

وہ بولا ''جیکب صاحب تو اب بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کل شام کو اے کلب میں ایک بڑی تقریب ہو رہی ہے جس میں جیکب کو ہوسٹل کا کل انچارج بنا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی ذمے داریاں بھی اسے دی جا رہی ہیں۔''

''لیکن آج کہاں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''آج ماریطانیہ سے کچھ لوڈ سامان یہاں پہنچا ہے۔ سامان کا مطلب تو آپ کو پتا ہی ہے ناں...... انسان برائے فروخت... لیکن اس مرتبہ انسانوں کے علاوہ کچھ اور بھی سامان میں شامل ہے۔ یہ بیس کے قریب بڑے بڑے کنٹینر ہیں۔ ان میں ہوا کی آمدورفت کے لیے سوراخ رکھے گئے ہیں۔ ان میں کتے بند ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ خاص قسم کے کتے ہیں۔ یہ کافی جسیم ہیں اور ان کی جلد پر افریقن ہنٹنگ ڈاگز کی طرح دھبے ہیں۔ ان کی آوازیں بالکل مختلف قسم کی ہیں اور کافی بھیانک ہیں۔ انہیں بڑی احتیاط سے یہاں لایا گیا ہے۔''

''اب کہاں رکھا گیا ہے انہیں؟''

''ابھی تک تو کنٹینروں کے اندر ہی ہیں۔ بہرحال ان کی ''رہائش'' کے لیے قریباً بیس کے قریب بڑے بڑے پنجرے بنائے گئے ہیں۔ یہ پنجرے زون 2 میں ہیں۔ ابھی جیکب صاحب میرے ساتھ وہاں ہی گئے تھے۔ انہوں نے نمونے کے طور پر دو کتے ایک کنٹینر میں سے نکال کر دیکھے۔ انہیں گھما پھرا کر دیکھا۔ وہ بڑی خوفناک شکل کے ہیں۔ کتوں کو دوبارہ کنٹینر میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد نئے آنے والے بردوں میں سے تین چار بردوں کا معائنہ کیا گیا اور انہیں بھی واپس لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک انسانوں اور کتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی ''فروخت کا مال'' ہیں..... ایک دو ٹانگوں والا ایک چار ٹانگوں والا۔''

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ جیکب بھی واپس آ گیا۔ حسب معمول اس کی آنکھیں نشے کی وجہ سے سوجی سوجی تھیں۔ وہ بیٹھ گیا اور ہم سے باتیں کرنے لگا۔ مول نے اس سے کتوں کے بارے میں پوچھا۔ جیکب نے بتایا ''یہ بڑی شاندار نسل ہے۔ اسے پٹ بل ٹیریئر اور افریقن ہنٹنگ ڈاگ کے ملاپ سے تیار کیا گیا ہے۔ ماریطانیہ میں ایک مقامی ادارہ کئی سال سے اس ریسرچ میں لگا ہوا تھا۔ وہیں ماریطانیہ میں اس نسل کی افزائش کی گئی ہے اور ٹریننگ بھی دی گئی ہے۔ ہمارے قریباً ایک ہزار جانور تیار کر کے یہاں بھیجے گئے ہیں۔''

''کیا انہیں یہاں سے فروخت کیا جائے گا؟'' مول نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' جیکب نے کہا ''اتنے جانور کوئی اپنی تفریح کے لیے تو نہیں رکھے گا... جس طرح یہاں موجود ''بردے'' یورپ کے بڑے بڑے لینڈ لارڈز اور ڈیلر وغیرہ کو فروخت کیے جاتے ہیں، یہ کتے بھی کیے جائیں گے۔ انسانوں کی طرح ان جانوروں کی فروخت سے بھی بھاری منافع کمایا جائے گا۔'' پھر جیکب نے ذرا توقف کیا اور ازراہ مذاق بولا ''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح بڑی بڑی کمپنیاں اپنے خریداروں کو زیادہ خریداری پر گفٹ وغیرہ دیتی ہیں، گنگ برادرز بھی ''گفٹ'' دے۔ مثلاً جو جاگیردار یہاں سے ایک ساتھ پانچ غلام خریدے اسے ساتھ میں ایک کتا مفت دیا جائے......''

مول مسکرانے لگا۔ میں نے جیکب سے دریافت کیا ''کیا تم واقعی کل ہوسٹل کے انچارج کا عہدہ سنبھال رہے ہو؟''

جیکب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''میری خواہش تھی کہ کل تم بھی اس تقریب میں شرکت کرتے لیکن کرنل ایڈی والے واقعے کے بعد ہمیں کچھ محتاط ہونا پڑے گا۔ تمہارا میک اپ بہت اچھا ہے لیکن اتنا پرفیکٹ نہیں ہے کہ اس پر مکمل بھروسا کیا جا سکے۔ یہاں بڑی بڑی ہنرمند آنکھیں موجود ہیں۔''

کچھ دیر تک ہمارے پاس بیٹھنے کے بعد جیکب چلا گیا۔ جوں جوں یہاں اس کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا تھا اس کی چال ڈھال میں فرق آ رہا تھا اور اکڑ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ کرنل ایڈی کی موت کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ شخص واقعی بے موت مارا گیا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ ہم کون ہیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم دونوں کو اتنا ''ایزی'' نہ لیتا۔ اب اس کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ بہت بہادر شخص تھا اور مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور سنا جا رہا تھا۔ بہرحال ہمیں تو (خوش قسمتی سے)

کا کوئی ایسا جوہر نظر نہیں آ رہا تھا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا نیند لینے کے بعد میں چار بجے کے لگ بھگ اٹھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں اٹھا نہیں بلکہ اٹھایا گیا ہوں۔ مجھے اٹھانے والا مول تھا۔ اس نے ہوسٹل کا کلوز سرکٹ ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ معمول کی نشریات جاری تھیں۔ ان نشریات کو اکثر ہوسٹل کے باسیوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی ایک ایسا ہی پروگرام آن ایئر تھا۔

مول نے کہا ''دیکھیں جناب! یہ وہی کتے ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔''

میں نے دیکھا اسکرین پر تین دیوہیکل کتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی قد و قامت چھوٹے سائز کے گدھے سے کم نہیں تھی۔ ان کے جبڑوں اور چہروں کی ساخت ہی بتا رہی تھی کہ وہ خونخواری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے چہرے پٹ بل ٹیریئر کی طرح تھے تاہم جسموں پر افریقن شکاری کتوں کی طرح دھبے بھی تھے۔ ان کی آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور حلق سے دل لرزا دینے والی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کتے کے حلق سے نہیں اس کے چوڑے چکلے سینے سے نکل رہی ہے۔

تین گرانڈیل محافظوں نے کتوں کی موٹی آہنی زنجیریں تھام رکھی تھیں اور ان زنجیروں کے ذریعے بے قرار کتوں کو بمشکل سنبھال رکھا تھا۔ یہ کتے اور ان کے رکھوالے ایک طویل کوریڈور کے ایک سرے پر کھڑے تھے۔ یہاں ان کے علاوہ وارلارڈ قسم کے افراد بھی تھے۔ ان کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے ہی لگتا تھا۔ انہوں نے روایتی لباس پہن رکھے تھے۔ فل بوٹ تھے جو ان کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ رنگ دار کوٹ اور ہیٹ نما ٹوپیاں تھیں۔ یہ بڑی بڑی سنہری مونچھوں والے افراد بڑی دلچسپی سے کتوں کی بے قراری کا منظر دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا کرنے لگے ہیں؟'' میں نے مول سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی سنگین قسم کا کھیل ہے۔ مجھے دو تین نیگرو افراد کی ڈری ڈری آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔''

''وہ نیگرو اسکرین پر تو نظر نہیں آ رہے؟''

''لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہیں۔'' مول نے پورے یقین سے کہا۔

مول کا یقین بے معنی نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک لرزہ خیز منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا۔ تین تنومند حبشی بردوں کو کوریڈور میں لایا گیا۔ یہ تینوں جواں سال تھے۔ ان کے جسموں پر بردوں والی مکمل وردی تھی۔ ان تینوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ وہ فریادی انداز میں محافظوں کی منت سماجت کر رہے ہیں۔ اس منت سماجت کے جواب میں انچارج گارڈ کا سر مسلسل انکار میں ہل رہا تھا۔ وہ انگلی سے بار بار کوریڈور کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس کے آخری سرے پر ایک دروازہ موجود تھا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ نیگرو افراد کو بتا رہا تھا کہ اگر وہ بھاگ کر اس دروازے کے پار پہنچ جائیں گے تو کتوں کے حملے سے بچ جائیں گے۔ بدنصیب بردے کبھی خوف زدہ نظروں سے کتوں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی اس دروازے کی طرف جو کم از کم پچاس میٹر دور تھا۔

اسی دوران میں منچلے لڑکوں کی ایک ٹولی بھی تماشا دیکھنے کے لیے موقع پر پہنچ گئی اور تماشائیوں میں شامل ہو گئی۔ ان نوعمر لڑکوں کو دیکھ کر کئی تلخ یادیں تازہ ہو گئیں۔ ایسے ہی لڑکے تھے جو ماسٹر اسمتھ کے ہم جولی تھے اور کوئی ڈیڑھ برس پہلے ماربا ٹرسٹ میں سنگین ترین مستیاں کیا کرتے تھے۔ قریباً دو تین منٹ مزید گزر گئے۔ محافظ روتے بلکتے حبشیوں کو کھیل کے قواعد و ضوابط سمجھا رہے تھے۔

پھر کھیل شروع ہوا۔ خدا کی پناہ...... وہ لرزہ خیز منظر تھا۔ تینوں حبشی پوری طاقت سے کوریڈور کے دوسرے سرے کی طرف بھاگے۔ جب وہ بھاگے تو پتا چلا کہ ان کا ایک ایک ہاتھ آپس میں زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ ان کے بھاگنے کے ایک دو سیکنڈ بعد محافظوں نے بھی اپنا کام کیا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ تینوں کتے چھوڑے جائیں گے لیکن حیرت ہوئی کہ صرف ایک کتا چھوڑا گیا۔ یہ دیوقامت کتا، کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح حبشیوں کے پیچھے دوڑا۔ بالکل یہی لگا کہ کوئی چیتا ہے جو ستر میل فی گھنٹا کی رفتار سے اپنے شکار پر جھپٹ رہا ہے۔ فقط تین چار سیکنڈ میں اس نے سب سے پچھلے شخص کو جا لیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ اس کے گرنے سے اگلے دونوں افراد بھی رک گئے۔ سفاک تماشائیوں نے مسرت کی چیخیں بلند کیں۔ ان کی مسرت سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ کوریڈور کا دروازہ صرف بیس پچیس قدم دور تھا۔ اگر کتے کو تھوڑی سی تاخیر ہوتی تو تینوں نوجوان دروازے تک پہنچ جاتے۔ تاہم اب بھی ان کا چانس موجود تھا۔ وہ پورا زور لگا کر اپنے گرے ہوئے ساتھی کو گھسیٹ رہے تھے اور دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن کتا بلائے بے اماں کی طرح ان سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے پنجے فرش میں گاڑ دیے تھے اور اپنی پچھلی

ٹانگوں کی پوری طاقت سے تینوں افراد کو روک رہا تھا۔ اس کی کوشش حیران کن تھی۔ جس شخص کو اس نے گرا رکھا تھا اس کی پنڈلی پوری طرح کتے کی گرفت میں تھی پھر اچانک اس نے پنڈلی چھوڑی اور بدنصیب شخص کی ناف پر حملہ آور ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص کی آنتیں فضا میں لہراتی نظر آئیں۔

باقی دونوں افراد نے وحشت زدہ ہو کر اندھا دھند زور لگایا اور اپنے نیم مردہ ساتھی سمیت گرانڈیل کتے کو گھسیٹتے ہوئے دروازے کے قریب لے گئے۔ امید پیدا ہوئی کہ وہ دروازے تک پہنچ جائیں گے لیکن یہاں کتے کی زبردست تربیت کا نتیجہ دیکھنے میں آیا۔ جب خوں خوار کتے نے دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکل رہا ہے...... اور وہ اپنے بڑے شکار کو روکنے میں ناکام ہو رہا ہے تو اس نے نیم مردہ شخص کو چھوڑا اور جست لگا کر درمیان والے شخص پر حملہ آور ہوا۔ انسانوں کی طرح پچھلے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو کر اس نے درمیان والے شخص کی شہ رگ دبوچی اور ایک ہی لمحے میں نرخرہ ادھیڑ کر رکھ دیا۔ بدنصیب افراد کی لرزہ خیز چیخوں اور کتے کی آوازوں سے کوریڈور گونج رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر دو افراد کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اب بس آخری شخص تھا۔ وہ اپنے نیم مردہ ساتھیوں اور ڈیڑھ من وزنی کتے کو گھسیٹ کر کیونکر دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔

یہی وقت تھا جب بے رحم شکاریوں نے باقی دونوں کتے بھی چھوڑ دیے۔ انہوں نے چند سیکنڈ کے اندر تینوں افراد کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ موت کے کوریڈور میں زندگی کے دروازے سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تینوں افراد خاک و خون میں لوٹ گئے۔ بنے کٹے محافظ دوڑتے ہوئے گئے اور انہوں نے بے قابو کتوں کو زنجیریں پہنائیں اور بمشکل کھینچتے ہوئے واپس لائے۔ کتے کیمرے کے قریب آئے تو ان کی تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں۔ کیمرا دور سے بدقسمت حبشیوں کا منظر دکھا رہا تھا۔ ایک یا دو جسموں میں تھوڑی بہت حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ ماسٹر اسٹی کے دوست ایک دراز قد لڑکے نے ایک گارڈ کے ہاتھ سے جدید آٹو میٹک رائفل لی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان خونچکاں جسموں کے قریب پہنچ گیا۔ بڑے کھلنڈرے انداز میں اس نے رائفل کو دونوں ہاتھ میں گھمایا اور پھر چند فٹ کے فاصلے سے جاں بلب افراد پر برسٹ مار دیا۔

ہوسٹل کے مکینوں کے لیے ایک "خوب صورت تفریحی پروگرام" ختم ہو گیا۔ میں اور موحل سکتے کی کیفیت میں اپنی جگہ بیٹھے تھے۔ میرے سینے میں شعلے رقص کر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ موحل کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔

☆☆☆

تو سیہ کی موت نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ تنہائی ملتے ہی اکثر میرا ذہن تو سیہ کی طرف منتقل ہو جاتا تھا۔ وہ بڑی تند مزاج لڑکی تھی۔ رہی سہی کسر اس کی تربیت نے پوری کر دی تھی۔ وہ سرتاپا ضد بن چکی تھی۔ وہ اپنی ضد کو سینے سے لگا کر زندہ رہی تھی اور ضد کو سینے سے لگا کر ہی مری تھی اور اس کا شوہر اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹروں کو اس کی انتڑیوں کا کچھ حصہ کاٹنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی قسم کی طبی پیچیدگیوں کا شکار تھا۔

ایک دن میں اسپتال میں باری کو دیکھ کر واپس آیا تو شام ہو چکی تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو موحل کو بستر پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم نظر آتا تھا۔ ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ یہ وہی خاص کیفیت تھی جو بس کبھی کبھار ہی اس پر طاری ہوتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ موحل پر یہ وجدانی کیفیت اکثر شام کے بعد ہی طاری ہوتی ہے۔ وہ بالکل گم صم ہو جاتا تھا۔ کوئی اس کے پاس بھی ہوتا تھا تو وہ اس کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کر دیتا تھا...... لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ میں اندر داخل ہوا تو موحل ایک دم چونک گیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے...... میرا دوست کچھ پریشان لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"بات ہی پریشانی کی ہے۔" وہ قدرے اداسی سے بولا "مجھے محسوس ہو رہا ہے جناب...... کہ وہ لڑکی نینا بڑی سخت مصیبت میں ہے۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے۔"

"کیا مجھے تفصیل بتاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ہاں میں بتاؤں گا۔ اس لیے کہ آپ میری باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اسے میرے دماغ کا خلل نہیں سمجھتے ہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "نینا کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جس کا اندیشہ تھا۔ نینا ٹیلی فون پر اپنی بہنوں کی آواز سننا چاہتی ہے۔ ان کی خیریت دریافت کرنا چاہتی ہے۔ پرنس داراب اسے مسلسل وعدوں پر ٹرخاتا رہا ہے۔ اب یہ سب کچھ نینا کی برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ وہ ایک بار پھر بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اس کا ٹوٹنا اس کے لیے عذاب بن گیا ہے۔ وہ بڑی بری حالت میں ہے جناب۔"

"پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے یا کچھ بتاؤ گے بھی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ اس نے کوئی ایسی شے کھائی ہے جس کے سبب اس کی خوب صورت آواز ختم ہو گئی ہے۔ گلے کا وہ جادو جو سر چڑھ کر بولتا تھا اب نینا کے پاس نہیں رہا ہے۔ ایک طرح سے یہ نینا کی انتقامی کارروائی ہے جو اس نے پرنس داراب کے خلاف کی ہے۔ پرنس داراب نینا کے شباب کے ساتھ ساتھ اس کی آواز کا بھی دیوانہ تھا۔ نینا نے مایوسی کے عالم میں وہ آواز ہی ختم کر لی ہے جو اس کی بربادی کا سبب بنی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ بول نہیں سکتی؟"

"بول سکتی ہے۔" موحل وجدانی لہجے میں بولا "لیکن بھرائی ہوئی اور بیٹھی ہوئی بہت مدھم آواز میں۔ نینا کے اس اقدام کا نتیجہ اس کے حق میں بہت برا نکلا۔ داراب ننگا ہو کر اس کے سامنے آ گیا ہے۔ اس نے نینا کو بری طرح مارا پیٹا ہے اور اب...... بالکل ہی تماشا بنا دیا ہے۔"

"تم پھر پہیلیوں میں بات کر رہے ہو۔" میں نے موحل کو ٹوکا۔

موحل کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ عجیب سے لہجے میں ڈرامائی انداز میں بول رہا تھا۔ کہنے لگا "مجھے لگتا ہے کہ نینا کچھ نوعمر اوباش لڑکوں کے قبضے میں ہے۔ وہ اس سے ناروا سلوک کر رہے ہیں۔"

موحل کی بات سے میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور قریباً ڈیڑھ برس پہلے ماریا ٹرسٹ میں دیکھے ہوئے کچھ انسانیت سوز مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ کنگ کی زیرِ زمین دنیا کے اصول نرالے تھے۔ کنگ کے خانوادے میں نئی نسل کو خاص قسم کی تربیت سے گزارا جاتا تھا۔ اس تربیت میں خیال رکھا جاتا تھا کہ نونہالوں میں بے رحمی...... سفاکی...... اور شیطانیت کی ساری صفات بدرجہ اتم موجود ہوں۔ کہیں کسی غفلت کے سبب ان میں نیکی اور انسان دوستی وغیرہ کے جذبات پروان نہ چڑھ جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اوائل عمر میں ہی انہیں حیوانیت کے سارے اسباق پڑھا دیے جاتے تھے۔ چھوٹی عمر میں لڑکوں کو جنسی تجربات کرا دیے جاتے تھے اور ہر طرح کی کھلی چھوٹ دی جاتی تھی۔ موحل کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

وہ بولا "نینا سے ناروا سلوک کرنے والے کنگ کے خانوادے ہی کے لڑکے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ نینا کو باندھ کر اور ہر طرح بے بس کر کے ان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ نینا کی دلدوز چیخیں...... دلدوز چیخیں میں صاف سن سکتا ہوں۔"

موحل کے تمتمائے ہوئے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

میں نے سگریٹ سلگا کر چند گہرے کش لیے "اگر جو کچھ تم محسوس کر رہے ہو وہ درست ہے تو پھر یہ واقعی بڑی المناک بات ہے۔ کاش یہ لڑکی بھی اپنی بہنوں کی طرح تھوڑی سی ہمت کر لیتی اور میرے ساتھ پرنس کے محل سے نکل آتی۔"

"لیکن...... ہونی کو کون ٹال سکتا ہے جناب۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ہم اس بدنصیب کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اپنے ساتھی زریں کے لیے کچھ نہیں کر سکے تو اس کے لیے کیا کریں گے۔ فی الحال تو ہر طرف مجبوری ہی نظر آ رہی ہے۔"

موحل اٹھا اور اس نے ٹی وی آن کر دیا۔ ٹی وی کی آواز اس نے بہت بلند رکھی تھی۔ اب میں اس کی عادت پہچان چکا تھا۔ جب اسے اپنے کانوں تک پہنچنے والی آوازوں سے پیچھا چھڑانا ہوتا تھا تو وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کا دھیان بٹا رہے۔

موحل کی خداداد صلاحیتوں پر مجھے پہلے بھی اعتماد تھا لیکن اب یہاں ہوسٹل میں دن رات اس کے ساتھ رہ کر اور اسے قریب سے دیکھ کر یہ اعتماد اور بڑھا تھا۔ مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ موحل نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ نینا کے بارے میں بتایا ہے وہ بالکل درست ہے۔

نینا کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کا اندیشہ پہلے سے ہی میرے دل و دماغ میں موجود تھا۔

وہ کنگ براؤن کے "ہم خصلت" دوست پرنس داراب کے ہتھے چڑھی تھی۔ یہ عیاش پرنس تینوں گاتی گڑیوں کو ایک ساتھ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ بالکل جیسے کچھ شوقین لوگ ٹکٹوں کے سیٹ جمع کرتے ہیں، وہ لڑکیوں کا سیٹ جمع کرنا چاہتا تھا۔ اپنی خواہش میں ناکام ہو کر اس نے شیشے کی گڑیا جیسی فنکارہ کو توڑ پھوڑ ڈالا تھا...... اور اب وہ اس جہنم کدے میں بدترین عذابوں سے گزر رہی تھی۔

ٹی وی کے پروگرام بھی موحل کی بے قراری کم نہیں کر سکے۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا اور میلا سا کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ قریباً آدھ پون گھنٹا اسی طرح گزر گیا پھر موحل نے کمبل ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ گندمی جلد پر جا بجا پسینے کی بوندیں نظر آ رہی تھیں "کیا بات ہے۔ تم کچھ زیادہ ہی پریشان لگتے ہو؟"

"وہ لڑکی...... مر گئی ہے۔ یا شاید بے ہوش ہو گئی ہے...... کنگ اپنے مجرموں کو زندگی اور موت کے درمیان لٹکا

دینا ہے......"

"ہم اب زیادہ دیر خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا مول۔"

"ہاں جناب..... ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا......"

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کے ذہن میں کوئی بات ہے۔ کچھ اٹکا ہوا ہے اس کے دماغ میں۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ میں نے اسے سوچنے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گہری سانس لے کر بولا "شاہ جہاں صاحب! پچھلے کچھ دنوں سے مجھے ایک شبہ ہو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا کوئی ایسا جانا پہچانا شخص یہاں موجود ہے، جسے میری مدد کی بہت ضرورت ہے۔ وہ شخص کون ہے؟ میں کچھ نہیں جانتا لیکن وہ موجود ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں وہ ہے۔ اگر میں اس کی مدد کرسکوں تو کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما ہوسکتی ہی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تبدیلی ہمارے حق میں ہو۔"

"تم کس تبدیلی کی بات کر رہے ہو؟"

وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا "میرے ذہن میں تصورات واضح نہیں ہیں۔ کچھ چیزیں ایک دم الجھ جاتی ہیں۔ ایک سایہ سا سامنے آتا ہے اور تفصیلات کو ڈھانپ لیتا ہے..... لیکن ایک بات میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا کوئی اپنا یہاں ہے اور مجھے اس کو کھوجنا ہے......"

میں اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اور چڑھی چڑھی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہم سی بات کر رہا تھا، لیکن لہجے میں پختہ یقین تھا۔ وہ کافی دیر خاموش رہا، پھر بولا "کیا ہم..... کسی طرح ان تہ خانوں میں جاسکتے ہیں، جو اے کلب کے نیچے واقع ہیں؟"

"تم جانتے ہو کہ اس طرف سیکورٹی بہت سخت ہے۔ کرنل ایڈی والے واقعے کے بعد تو معاملہ اور بھی گھمبیر ہوگیا ہے۔"

اپنا فقرہ مکمل کرنے کے فوراً بعد میرے ذہن میں ایک بات آئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ مول خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔

میں نے کہا "مول! آج 22 دسمبر ہے۔ دو دن بعد کرسمس ہے۔ تم نے محسوس کیا ہی ہوگا کہ یہاں کرسمس کی تیاری بہت زور و شور سے ہو رہی ہے۔ کرسمس سے ملتا جلتا ایک تہوار میں نے مار بار ٹرسٹ میں بھی دیکھا تھا۔ کنگ براڈن اور اس کے گماشتے عیش و طرب کے تہوار بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ماریا ٹرسٹ میں کئی من چرس پھونک دی گئی تھی اور ہزاروں لیٹر شراب پانی کی طرح بہائی گئی تھی۔ یہاں بھی تم نے پرسوں دیکھا ہی ہوگا۔ شراب کے سیکڑوں کریٹ مرکزی زندان میں لے جائے گئے تھے۔"

"شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تہوار کے موقع پر سیکورٹی کے انتظامات وہ نہیں رہیں گے جو اب ہیں۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ خاص طور سے کرسمس کی رات کو یہاں بے حد ہنگامہ ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"آپ کی بات میرے بھی دل کو لگ رہی ہے۔" مول نے کہا۔ "لیکن..... اے کلب کے تہ خانوں تک پہنچ کر ہم کریں گے کیا؟"

"سچ جانیے..... اس کا پتا ابھی تک خود مجھے بھی نہیں ہے لیکن اتنا میں جانتا ہوں کہ ہمیں وہاں جانا چاہیے۔ ہر صورت میں جانا چاہیے۔"

پھر دو دن مزید گزر گئے۔ ان دو دنوں میں مول مسلسل اضطراب اور پریشانی کا شکار رہا تھا۔ میں نے اکثر اسے رات کو کمرے کے اندر ہی بے قراری کے عالم میں گھومتے پایا۔ اس کا اندازہ تھا کہ نینا بدستور مصیبت میں ہے لیکن اس کا علاج معالجہ ہو رہا ہے۔ بعد ازاں میگی کی زبانی اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔ میگی نے نینا کو اسپتال کے ایک کمرے میں دیکھا تھا۔ اس کے گلے کے ایکسرے کیے جا رہے تھے۔ اس کے جسم اور چہرے پر خراشیں تھیں اس کے خوب صورت بال بے ڈھنگے طریقے سے کاٹ دیئے گئے تھے۔

آخر ہوسٹل اور کیمپس کے طول و عرض میں کرسمس کا تہوار شروع ہوگیا۔ یہ شیطان کی بسائی ہوئی بستی تھی۔ عام دنوں میں بھی یہاں شیطانیت ہی رقص کرتی تھی۔ یہ تو پھر لہو و لعب کا موقع تھا۔ شام ڈھلتے ہی ہر طرف خرمستیوں کا دور دورہ ہوگیا۔ میوزک، رقص، ساغر و مینا کی گردش، جوا خانوں کی رونق، لذت کام و دہن کے سلسلے۔ ہر شے عروج پر نظر آنے لگی۔

یہ آقاؤں کا جشن تھا۔ اس میں غلاموں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور نہ ان کا کوئی کردار تھا۔ اگر کردار تھا تو صرف اتنا کہ ان میں سے گنے چنے مرد و زن کو آقاؤں کی خدمت کرنا تھی۔ ان کے احکامات کو بجالانا تھا۔ باقی سارے بدنصیب..... تمام کے تمام غریب الوطن اپنی بیرکوں اور چہار دیواریوں میں بند تھے۔ ممکن تھا کہ انہیں بہتر کھانا کھلا دیا گیا ہو، یا روزمرہ کی کڑی مصروفیات میں انہیں تھوڑی سی ڈھیل دے دی گئی ہو، اس کے علاوہ کرسمس کی کوئی "برکت" کوئی

خوشی ان تک نہیں پہنچی تھی۔

رات دس بجے کے بعد جشن اپنے کلائمکس کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر طرف بہکے ہوئے قہقہے تھے، خوشی سے بھرپور چیخیں تھیں اور مرد و زن کی مستیاں تھیں۔ مول کی درخواست پر جیب ہارڈ ہمیں بھی کیمپس کی حدود میں لے گیا تھا۔ کیمپس میں ہر شے کا معیار ہوسٹل سے بلند تھا اور اے کلب، کیمپس کی بہترین جگہ تھی۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ آج سیکورٹی میں رخنے نظر آرہے ہیں۔ بہرحال یہ رخنے اتنے بڑے نہیں تھے جتنی ہم نے توقع کی تھی۔ ہمیں رات ڈھائی بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ آخر ایک نسبتاً بہتر موقع دیکھ کر ہم ان زینوں کی طرف بڑھے جو اے کلب کے تہ خانوں کی طرف جاتے تھے۔ راستے میں ہمیں کئی ہوش ربا مناظر دکھائی دیئے۔ ایک سفید فام لڑکی ایک نیگرو گارڈ کی آغوش میں گری ہوئی تھی۔ چند لیڈیز گارڈز اپنی ٹوپیاں اتارے، بال کھولے، رقص کر رہی تھیں اور یوں جشن میں شریک تھیں۔ راہداریوں میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں مدہوش جوڑے بھی پڑے تھے۔

ہم نے دو گارڈز دیکھے جو بکرے کی ایک بھنی ہوئی ران بھنبھوڑنے میں مصروف تھے ان کی نگاہ بچاتے ہوئے ہم زینوں سے نیچے اتر گئے۔ یہاں ہمیں ایک دیوہیکل گارڈ بالکل چوکس نظر آیا۔ ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے عقب میں پہنچا اور اس کا سر پورے زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا۔ یہ ایک ہی ضرب کافی ثابت ہوئی اور وہ حواس کھو کر میری بانہوں میں جھول گیا۔ مول نے اسے گھسیٹا اور سیڑھیوں کے نیچے خلا میں پہنچا دیا۔ تھوڑی بہت شراب یقیناً اس گارڈ نے بھی پی رکھی تھی۔ ایک بوتل میں سے کچھ شراب میں نے گارڈ کے لباس پر انڈیل دی اور پھر گارڈ کی سائلنسر لگی رائفل اس کے جبڑے کے نیچے رکھ کر گولی چلا دی۔ گولی گارڈ کا بھیجا پھاڑ کر نکل گئی۔ موسیقی کی سماعت شکن "دھاں..... دھاں" میں گولی کی آواز دب کر رہ گئی۔ اب سیڑھیوں کے نیچے سے گارڈ کی لاش برآمد ہونے کے بعد یہی سمجھا جانا تھا کہ نشے کے عالم میں اس کی رائفل سے گولی چلی اور اسے راہیٔ عدم کر گئی۔

مول کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ وہ میری کارروائی سے مطمئن نظر آتا تھا۔ کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد ہم مزید نیچے اترے۔ مول کی آنکھیں کسی اندرونی کیفیت کے زیر اثر چمک رہی تھیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا اس کی کیفیت شدید ہو رہی تھی۔ قریباً چالیس پچاس زینے طے کرنے کے بعد ہم ان تنگ و تاریک تہ خانوں میں پہنچ گئے جہاں ہر طرف پتھریلی دیواریں تھیں اور دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کی سامنے والی دیوار میں ایک مستطیل کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ یہ تہ خانے خستہ حالت میں تھے اور بدبودار تھے۔ یہاں سیلن تھی اور کہیں کہیں حشرات الارض بھی نظر آتے تھے۔ اے کلب اس زیر زمین دنیا کی خوب صورت ترین جگہ تھی...... اور اے کلب کے عین نیچے یہ بدحال اور بدبودار تہ خانے پائے جاتے تھے۔ کتنا بڑا تضاد تھا۔ شاید یہ تضاد جان بوجھ کر برقرار رکھا گیا تھا۔ ہم اسٹیل کے بنے ہوئے دو بڑے سلائیڈنگ ڈورز سے گزر کر یہاں پہنچے تھے۔ ساری خوب صورتی ان سلائیڈنگ ڈورز کی دوسری طرف رہ گئی تھی۔ ساری بدصورتی یہاں اس طرف جمع ہوگئی تھی۔ ان ٹھٹھرے ہوئے تہ خانوں کا فرش نم تھا اور اس نمی میں عجیب سی بے آرامی اور بدمزگی تھی۔

"بہت عجیب جگہ ہے۔" میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ابھی کچھ اور بھی عجیب تر نظر آنے والا ہے۔" مول کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور سنسنی کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے نے مجھے چونکا دیا۔ ان تہ خانوں میں ہمیں ایک اور گارڈ سے بھی نمٹنا پڑا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں مول نے رائفل کا آہنی دستہ بڑی قوت سے رسید کیا اور اسے انا غفیل کردیا۔ اس گارڈ کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ یہ دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں۔

ہمیں ان تہ خانوں میں ایسے افراد نظر آئے جو کنگ کے معتوب تھے اور انہیں بدترین حالت میں بس مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اوپر ہوسٹل کی بیرکوں میں جو قیدی نظر آتے تھے، ان کے لباس اور خوراک وغیرہ کا خوب دھیان رکھا جاتا تھا۔ انہیں بنایا سنوارا جاتا تھا اور مختلف حوالوں سے ان کی تربیت بھی کی جاتی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ لوگ "فروخت کا مال" تھے لیکن جو لوگ یہاں دکھائی دیئے تھے ان کا پرسان حال کوئی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بس گارڈز ہی کے رحم و کرم پر ہیں۔ جب ان میں سے کوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ زندگی سے خالی ہو جاتا ہوگا تو اسے انہی تاریکیوں میں کہیں گاڑ دیا جاتا ہوگا..... یا پھر شاید لاشیں تلف کرنے والی کسی بھٹی تک پہنچا دیا جاتا ہو۔ ان مفلوک الحال قیدیوں میں سے زیادہ تر کے چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ نیم پاگل نظر آتے تھے۔ کچھ اتنے لاغر اور بیمار تھے کہ بس چند دن کے مہمان محسوس ہوتے تھے۔ جس تاریکی اور نمی

کی وجہ سے انہیں جلدی بیماریاں بھی لاحق تھیں۔ ہم نے مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے ایک نابینا بوڑھے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کو کسی گرم شے سے داغا گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر بھی ایک گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کوئی سفید فام تھا اس کے دونوں پاؤں ٹخنے سے کٹے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ کاٹ دیئے گئے تھے۔ یہ زخم خراب ہو چکے تھے اور اس کے چہرے کا باقی گوشت بھی گلنا شروع ہو گیا تھا۔

ان مختصر کوٹھڑیوں کے اندر ہی رفع حاجت کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ غلاظت کی بو کے ساتھ فینائل کی بو گھل مل سی گئی تھی۔ میں نے سول کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی پراسرار کیفیت اب شدید تر ہو گئی تھی۔ وہ ان آفت زدہ چہروں میں سے کوئی چہرہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا ڈھونڈ رہے ہو۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''ابھی سب کچھ آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔'' وہ سخت ہیجانی لہجے میں بولا۔

اچانک وہ ایک کوٹھڑی کے سامنے رک گیا۔ بلب کی مدھم روشنی میں کوٹھڑی کا منظر ہماری نگاہوں کے روبرو تھا۔ ایک کمزور بدحال بوڑھا جس کے چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں کوٹھڑی سا بن کر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے جو پائجامہ پہن رکھا تھا وہ پائنچوں کی طرف سے تار تار تھا۔ اس کے جسم کا بالائی لباس بھی یہاں کی سردی کے لیے ناکافی تھا۔ دو میلے کچیلے کمبل کھانے کے کچھ معمولی برتن اور انجکشنوں کی دو چار خالی سرنجیں فرش پر نظر آ رہی تھیں۔ اپنی گردن پر سے کسی مچھر کو اڑانے کے لیے اس بدحال شخص نے چہرہ تھوڑا سا گھمایا۔ مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔

میں نے دیکھا سول کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا ''آپ جانتے ہیں یہ کون ہیں؟''

''مجھے صورت دیکھی ہوئی لگ رہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی میری نگاہ بدحال شخص کے کٹے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔ ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ بوکارلو تھا۔ شیطان صفت کنگ براؤن کا فرشتہ صفت بھائی بوکارلو۔ ایک بہت بڑا مصلح۔ روحانی پیشوا...... اور حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک۔ میرے ذہن میں یکایک وہ سارے مناظر تازہ ہو گئے جن کا تعلق ماربا ٹرسٹ اور بوکارلو سے تھا۔ کنگ براؤن اور بوکارلو وراثت میں برابر کے شریک تھے لیکن کنگ نے اپنے سادہ مزاج بھائی سے مسلسل زیادتیاں کی تھیں اور اسے ماریطانیہ کے ویرانوں میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بوکارلو نے سخت ریاض اور نفس کشی سے متاثر کن صلاحیتیں حاصل کی تھیں اور قبائلیوں کا ہردلعزیز روحانی پیشوا قرار پایا تھا۔ وہ آنکھوں کے جادو کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور اس کی یہ صلاحیتیں میں بھی ایک شاندار مظاہرے میں دیکھ چکا تھا۔ کنگ براؤن اور بوکارلو کی چپقلش درحقیقت تاریکی اور روشنی کی چپقلش تھی۔ یہ چپقلش ہمیشہ جاری و ساری رہی تھی۔ کنگ نے اپنے درویش صفت بھائی کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ بوکارلو کا کٹا ہوا ہاتھ بھی کنگ کی ستم ظریفیوں میں سے ایک ستم ظریفی تھا۔ اس ہاتھ پر کنگ کے انتہائی زہریلے بچھو نے زخم لگایا تو بعد ازاں زہر سارے ہاتھ میں سرایت کر گیا تھا اور یہ ہاتھ کاٹنا پڑا تھا۔ اس واقعے کے بعد ہزاروں مشتعل لارسیوں میں جو غم وغصہ نظر آیا تھا وہ مجھے آج بھی یاد تھا... پھر مجھے انسانوں کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بھی یاد تھا جس نے ماربا ٹرسٹ کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی۔ اس بپھرے ہجوم کی باگ ڈور بوکارلو کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب بوکارلو صرف ایک شخص کا نام نہیں رہا تھا۔ ہر بازو بوکارلو کا بازو بن گیا تھا، ہر آواز بوکارلو کی آواز ہو گئی تھی۔ وہ اکیلا ہو کر بھی لاتعداد ہو گیا تھا۔

لیکن آج..... آج وہی بوکارلو... ایک حقیر وناقابل شناخت شے کی طرح اس سیلن زدہ تہ خانے میں پڑا تھا۔ وہ زندگی سے بہت دور اور موت سے قریب نظر آتا تھا۔ چہرے کے بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس کی صورت پہچاننا بھی دشوار تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کوئی شدید چوٹ لگائی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا اٹھ کر بیٹھنا محال تھا۔ اچانک ہمیں اپنے دائیں جانب آہٹ سنائی دی۔ ہم اس قسم کی کسی بھی صورت حال کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ ہماری رائفلیں فوراً آواز کی سمت میں سیدھی ہو گئیں۔ ہمارے سامنے نیلی وردیوں والے چوکس گارڈز موجود تھے۔ ان کے ڈیل ڈول سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے کام میں ماہر ترین ہیں۔ ان کی خودکار رائفلیں بھی ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہماری طرح ان کی انگلیاں بھی ٹرائیگرز پر تھیں۔ ایسے موقعوں پر ذرا سی غلطی نہایت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ایک گارڈ نے بھاری بھرکم آواز میں پوچھا۔ اس کے شانے غیر معمولی طور پر چوڑے

تھے۔

"یہی سوال ہم تم سے پوچھ سکتے ہیں۔" میں نے ترت جواب دیا۔

"بکومت!" گارڈ گرجا "تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔ تم چوری چھپے یہاں پہنچے ہو۔"

"تم کون ہو؟" میں نے کہا۔

"ہماری یہاں ڈیوٹی ہے۔" چوڑے شانوں والے گارڈ نے اپنے کندھے کے بیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

لیکن پھر اچانک گارڈ کے تاثرات بدلے ہوئے نظر آئے۔ وہ بڑے غور سے موسل کی طرف دیکھنے لگا۔ موسل بھی یک ٹک گارڈ کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت تھے..... پھر یوں ہوا کہ گارڈ اور موسل کے چہرے پر بتدریج شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ گارڈ نے بے چینی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھا پھر وہ ہمارے قریب چلا آیا۔ اس کی رائفل کی نال جیسے خود بخود ہی جھک گئی تھی۔ موسل کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ گارڈ نے قریب پہنچ کر موسل سے لارسی زبان میں کچھ کہا۔ موسل نے بھی لارسی میں جواب دیا۔ پھر وہ دونوں ایک تاریک گوشے میں چلے گئے اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ میں اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک اپنی رائفل پر تھے۔ چوڑے شانوں والے گارڈ کا ساتھی بھی کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا موسل اور دوسرے گارڈ کے پاس پہنچ گیا۔

ان تینوں کی میٹنگ قریباً پانچ منٹ جاری رہی۔ میرے دل کو ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کسی جانب سے کوئی تیسرا گارڈ آ نکلے گا اور معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ بہرحال خیریت ہی گزری۔ میں ایک دیوار سے لگا کھڑا رہا اور نم ناک کوٹھری کے اندر کا منظر دیکھتا رہا جہاں لارسیوں کا عظیم رہنما بوکارلو قابل رحم حالت میں پڑا تھا۔ اس نے رخ پھیر کر میری طرف دیکھا بھی تھا لیکن اس کی جادو بھری آنکھوں میں اب شاید کسی کو پہچاننے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اسی دوران میں موسل میرے پاس چلا آیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ میرا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے بولا "جناب..... آپ نے پہچان ہی لیا ہوگا کہ اس پنجرے میں کون بند ہے؟ یہ وہ عظیم شخص ہے جس کے پاؤں کی خاک لارسی اپنی آنکھوں میں لگاتے ہیں اور اپنے ہونٹوں سے چومتے ہیں۔"

"ہاں..... میں نے اسے پہچان لیا ہے لیکن یہ تو موریطانیہ میں تھا' یہاں کیسے پہنچا؟"

"یہ کہانی تو بعد میں ہی پتا چلے گی جناب! فی الحال ہمیں محترم بوکارلو کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اس کے لیے دیوتاؤں کی طرف سے ایک سبب خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ اسے ہم معجزہ ہی کہہ سکتے ہیں۔ ابھی جس گارڈ نے مجھ سے بات کی ہے' اس کا نام موسابے ہے۔ میری اس کے ساتھ پرانی دوستی ہے۔ یہ شخص لارسی نہیں ہے لیکن محترم بوکارلو کے ساتھ اتنی ہی عقیدت رکھتا ہے جتنی کوئی بھی لارسی رکھ سکتا ہے۔ اصل میں یہ شخص پوشیدہ طور پر محترم بوکارلو کا دل و جان سے پیروکار ہے۔ اس کا ساتھی گارڈ رشتے میں اس کا کزن ہے۔ دونوں محترم بوکارلو کی قابل رحم حالت پر کڑھتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کنگ براؤن کے مجرموں کو بس مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کئی مر چکے ہیں اور کئی گل سڑ کر مرنے والے ہیں۔ گارڈز کا کہنا ہے کہ اگر محترم بوکارلو کو خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکال لیا جائے تو شاید کئی ہفتوں تک کسی ذمے دار شخص کو اس بات کا علم ہی نہ ہو سکے۔ موسابے اور اس کا کزن محترم بوکارلو کو یہاں سے نکالنے کے لیے تعاون کرنے پر پوری طرح آمادہ ہیں۔"

"یہاں سے نکال کر وہ محترم بوکارلو کو کہاں لے جائیں گے۔"

"ظاہر ہے کہ یہاں سے باہر نہیں نکال سکتے۔ محترم بوکارلو کو ہوسٹل یا کیمپس کے اندر ہی کہیں چھپانے کی کوشش کی جائے گی..... اگر محترم بوکارلو کسی طور ہماری مانند جیکب کے اپارٹمنٹ تک پہنچ جائیں تو یہ بڑی زبردست بات ہوگی۔"

"تم نے موسابے سے جیکب کے اپارٹمنٹ کا ذکر کیا ہے۔"

"ابھی تو نہیں کیا لیکن اگلی ملاقات میں کروں گا۔ موسابے نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کل کسی وقت مجھ سے ہوسٹل میں ملاقات کرے گا۔ اس ملاقات میں ہم ساری تفصیل طے کر لیں گے۔ میں نے موسابے کو ہلاک ہو جانے والے گارڈ کے بارے میں بتا دیا ہے اور بے ہوش ہونے والے کے بارے میں بھی۔ موسابے نے یقین دلایا ہے کہ وہ سب سنبھال لے گا۔ درحقیقت یہاں موسابے کی حیثیت سپروائزر کی سی ہے۔ وہ تعاون اور قربانی پر آمادہ بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ موسابے محترم بوکارلو کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب رہے گا۔"

موسل نے جو کہا وہ درست تھا۔ یہ اگلے روز رات

بارہ بجے کا ذکر ہے۔ میں اور موسل دیر تک بوکارلو کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد اونگھ رہے تھے۔ جب اچانک کوئی اپارٹمنٹ کے دروازے پر پہنچا۔ میں نے جا کر آٹو میٹک دروازہ کھولا۔ دوسری طرف دو افراد تھے۔ میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسٹیل کی ایک خوبصورت ہتھ ریڑھی پر ایک فریج رکھا ہوا تھا۔ فریج گتے کے ڈبے میں پیک تھا اور اوپر سے ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ ایک شخص نے معنی خیز لہجے میں کہا "یہ جناب جیکب ہارڈ کے لیے ہے..... مسٹر موسابے نے بھجوایا تھا۔"

میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ چند لمحے بعد موسل بھی دروازے پر آ گیا۔ ہم ہتھ ریڑھی کو چھ فٹ اونچے فریج سمیت اندر لے آئے۔ فریج کو ایک اندرونی کمرے میں لے جا کر کھولا گیا۔ فریج کے اندر جو کچھ موجود تھا وہ ہماری توقع کے عین مطابق تھا۔ یہ بدحال بوکارلو تھا۔ کشادہ فریج کے اندر گدیلا اور تکیے وغیرہ رکھ کر مدقوق بوکارلو کو اس طرح بٹھا دیا گیا تھا کہ اس کا سر اس کے تہ شدہ گھٹنوں پر دھرا تھا اور وہ گٹھڑی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے فریج میں سے نکالا اور ایک بستر پر لٹا دیا۔ نقل و حرکت سے بوکارلو کی ریڑھ کی ہڈی میں شدید تکلیف ہوتی تھی اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہیں نکل جاتی تھیں..... ہمیں بوکارلو کے دونوں بازوؤں پر انجکشن کی سوئیوں کے کئی نشانات نظر آئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اسے باقاعدگی سے کسی چیز کے انجکشن لگائے جاتے رہے ہیں۔

بوکارلو کو ہمارے سپرد کرنے کے بعد گارڈ موسابے کے آدمی واپس چلے گئے۔ ہم بوکارلو کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ اسے طبی امداد کی شدید ضرورت تھی۔ بہرحال جب تک جیکب ہارڈ گھر واپس نہ آ جاتا طبی امداد ملنا محال تھی۔ (موسل نے جیکب کو بوکارلو کے حوالے سے سب کچھ بتا دیا تھا۔ شروع میں تو جیکب اس سوال پر خاصی کشمکش میں نظر آیا تھا کہ بوکارلو کو اپارٹمنٹ میں لایا جائے یا نہیں لیکن پھر موسل کے اصرار پر وہ نیم رضامند ہو گیا تھا۔ موسل نے جیکب ہارڈ کو یقین دلایا تھا کہ محترم بوکارلو کی مدد کر کے وہ لوگ دراصل اپنی مدد کریں گے' یہ تھوڑی سی دشواری بعد ازاں ان کے لیے فائدے کا باعث بنے گی)

جیکب ہارڈ نے اپارٹمنٹ میں آتے ہی فوراً یونانی نژاد ڈاکٹر استاماس کو کال کیا۔ استاماس پر جیکب کو خاطر خواہ اعتماد تھا۔ وہ ہر طرح سے جیکب اور میکی کی رازداں تھی۔

اپارٹمنٹ کے اندرونی کمرے میں استاماس نے بوکارلو کا دیر تک طبی معائنہ کیا۔ وہ بوکارلو کی حالت کی طرف سے کچھ زیادہ پرامید نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بوکارلو کو انجکشن کے ذریعے بڑے تسلسل کے ساتھ ٹرنکولائزر دیے جاتے رہے ہیں۔ انجکشن دینے والوں کا مقصد یہی رہا ہے کہ مسٹر بوکارلو دماغی طور پر بے حد سست رہیں۔ وہ سوئے رہیں اور اگر جاگ بھی رہے ہوں تو ان کی ذہنی توانائیاں بالکل معدوم رہیں۔ ڈاکٹر استاماس کا کہنا تھا کہ ان نشہ آور ادویات کے مسلسل استعمال کے سبب مسٹر بوکارلو کی ذہنی حالت بھی جسمانی حالت کی طرح ابتر ہے۔

"جسمانی حالت کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر بولی "غذا اور دواؤں کی کمی کے سبب یہ بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔ ان کا ہارٹ بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی کمر کی چوٹ ہے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی بڑی سرجری کے طفیل یہ پچاس ساٹھ فیصد ٹھیک ہو جائیں ورنہ ان کے لیے اٹھ کر بیٹھنا یا چلنا ناممکن ہو چکا ہے۔"

"یہ کمر کی چوٹ کیسے آئی ہے؟" موسل نے پوچھا۔

"یہی لگتا ہے کہ انہیں کسی وزنی چیز مثلاً رائفل کے آہنی کندے وغیرہ سے ضرب لگائی گئی ہے۔"

ڈاکٹر نے چند ادویات لکھ دیں اور کچھ ہدایات بھی دیں۔ بہرحال مجموعی طور پر وہ بوکارلو کی حالت سے مایوس ہی نظر آتی تھی۔

ڈاکٹر اور جیکب وغیرہ کے جانے کے بعد موسل بولا "جناب' میں آپ سے کہتا تھا ناں کہ ان دیواروں کے درمیان کوئی موجود ہے۔ کوئی ایسا ہے جو غیر معمولی ہے اور جسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "محترم بوکارلو کا یوں اے کلب کے تہ خانوں سے برآمد ہونا واقعی ایک بڑی خبر ہے لیکن اس سے یہاں کی مجموعی صورت حال پر کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ بوکارلو کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ ہماری کوئی مدد کر سکے' اسے تو خود مدد کی اور زبردست نگہداشت کی ضرورت ہے بلکہ..... مجھے تو اندیشہ ہے کہ ہم اسے..... کہیں کھو نہ دیں۔"

موسل کے چہرے پر گہری پرچھائیاں تھیں۔ بوکارلو جیسے ہر دلعزیز روحانی پیشوا کی یہ قابل رحم حالت یقیناً موسل کے لیے بھی تکلیف دہ تھی۔ اس کے علاوہ میری طرح یقیناً موسل کو بھی یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ محترم بوکارلو اس حالت

اور انجام کو کیونکر پہنچے۔ جب میں ماریطانیہ سے لوٹا تو بوکا دلو ''کالونی'' میں تھا۔ سانبی عالی بھی اس کے ساتھ تھا۔ مقامی قبیلوں کے ہزاروں لاکھوں افراد ان دونوں کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے اور ان کے پسینے پر خون گرانے کو تیار نظر آتے تھے۔ اس ڈیڑھ برس کے عرصے میں یہ سب کچھ ہوا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

دو دن مزید گزر گئے۔ ڈاکٹر روزانہ آ رہی تھی اور بڑی رازداری کے ساتھ بوکا دلو کو انجکشن اور دوا وغیرہ دے رہی تھی۔ مسلسل نشہ آور ادویات کے جسم میں داخل ہونے سے بوکا دلو کی ذہنی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ جو بلا کا خطیب تھا جس کی جادو بیانی اور طلسم کاری ذہنوں کو مبہوت کر دیتی تھی۔ اب محض ایک عضو معطل نظر آ رہا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا جب بھی بستر پر کروٹ بدلنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب نظر آتا تھا۔ ایسے میں اس کے کٹے ہوئے ہاتھ کا منظر اور بھی دردناک نظر آنے لگتا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اے کلب کے تہ خانوں میں بوکا دلو کی عدم موجودگی ابھی تک راز ہی ہے۔ امید تھی کہ اگلے دو تین ہفتوں تک یہ راز ہی رہے گی۔ درحقیقت ان تہ خانوں کو اور تہ خانوں کے مکینوں کو گارڈز کے حوالے کر کے یکسر فراموش کر دیا گیا تھا۔ وہاں ذمے دار افراد کا جانا کم کم ہی ہوتا تھا۔

زرد بن گل کے حالات بھی جوں کے توں تھے۔ جیکب ہارڈ کے مکمل انچارج بن جانے کے بعد زرد بن گل کے لیے قید خانے میں آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ بھی توقع تھی کہ وہ پرنس داراب اور کنگ وغیرہ کے تشدد سے محفوظ رہے گا۔

نینا کے حالات کے بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ بہرحال سوٹل اس کی طرف سے قدرے مطمئن نظر آتا تھا۔ شاید اب اسے ہوا کے دوش پر نینا کی لرزہ خیز چیخیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ میگی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ نینا ابھی تک اسپتال میں ہے اور اس سے ڈاکٹروں کے سوا کسی کو ملنے نہیں دیا جاتا۔ پرنس داراب کی ایما پر نینا کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا' وہ نہایت شرمناک تھا۔ اسے اوباش لڑکوں کے ساتھ بند کر کے شیطان کو شرمایا گیا تھا۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے۔ میں جیکب ہارڈ کے ساتھ نجی گارڈ کی حیثیت سے کیمپس میں تھا۔ سوٹل بھی میرے ساتھ تھا۔ جیکب کیمپس کا انچارج نہیں تھا لیکن یہاں بھی اسے وہی تکریم اور وہی پروٹوکول دیا جاتا تھا جو ہوسٹل میں دیا جاتا تھا' وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اہم شخصیت سے اہم ترین شخصیت یعنی وی آئی پی بن گیا تھا۔ جیکب ہارڈ ایک زیر تعمیر دفتر کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب ڈاکی

تاکی کر اسے ایک اہم پیغام ملا۔ پیغام سننے کے بعد جس طرح جیکب کی رنگت بدلی اس سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی اہم پیغام ہے۔ جلد ہی اس امر کی تصدیق ہو گئی۔ جیکب ہمارے مالک ہوسٹل کے خاص الخاص علاقے ...... اے کلب ...... میں داخل ہوا۔ یہ آبشاروں اور مرغزاروں کی وہی مصنوعی دنیا تھی جس کی بہاریں رشک کرتی تھیں اور زندگی اپنے بہترین رنگوں کے ساتھ مسکراتی تھی۔ یوں تو پورا کیمپس ہی جدید ترین ہولتوں اور رنگوں سے آراستہ تھا لیکن اے کلب تو زمین پر جنت کا نمونہ تھا۔ یہ سب کچھ بصارت کا دھوکا تھا لیکن اتنا حقیقی اور خوبصورت تھا کہ نگاہیں اس میں جذب ہو کر رہ جاتی تھیں۔ ہم حقیقی آبشار کے قریب سے گزرتے ہوئے لکڑی کے ایک پل سے گزرے اور پھر اصلی پھول پتوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے مصنوعی ٹیلے کے دامن میں آ گئے۔ ٹیلے کی دوسری طرف ایک خوب صورت گراسی لان تھا۔ اس گراسی لان میں مصنوعی روشنیوں کے ذریعے شام سے پہلے کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ بالکل یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ وسیع و عریض لان کھلے آسمان تلے ہے اور اسے دور تک ہریالی نے گھیر رکھا ہے۔

قریباً ایک ایکڑ پر محیط اس لان کے بیچوں بیچ ایک شاندار چھتری تنی تھی۔ چھتری کے نیچے تین سفید کرسیاں رکھی تھیں اور سامنے بلوری میز نظر آ رہی تھی۔ دو چوکس گارڈز چھتری کے آس پاس موجود تھے۔ دو انتہائی خوب صورت خادمائیں نہایت مختصر لباس میں چھتری کے نیچے کھڑی تھیں۔ اس چھتری کے نیچے جو شخص پھیل کر بیٹھا ہوا تھا' وہ کنگ براؤن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم جیکب کے عقب میں چلتے ہوئے چھتری کے پاس پہنچ گئے۔ ابھی ہم چھتری سے بیس پچیس قدم دور ہی تھے کہ جیکب نے ہمیں رکنے اور اسی جگہ ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا۔ ہم اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ جیکب نہایت مؤدب انداز میں چلتا ہوا کنگ براؤن کے روبرو پہنچ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ رکھے تھے اور بے دام کا غلام نظر آتا تھا۔

دو تین منٹ تک اسی انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ کنگ بیٹھا رہا اور جیکب مؤدب انداز میں کھڑا رہا۔ پھر کنگ بھی اٹھ گیا اور جیکب کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگا۔ جب کنگ اٹھ کر کھڑا ہوا' مجھے اس کے ہاتھ پر وہی منحوس ٹھپکا نظر آیا۔ اس کی پہچان تھا۔ خوب صورت لیکن نہایت زہریلے پھپکے کی کھال ڈوبتے سورج (مصنوعی سورج) کی روشنی میں چمک رہی تھی اور اسی روشنی میں حسین خادماؤں کے کندنی جسم بھی دمک رہے تھے۔ خادمائیں اور محافظ وہیں ٹھہر گئے تھے جبکہ

کنگ اور جیکب آگے نکل گئے تھے۔ ہم اپنی جگہ پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ کنگ کو جہنم واصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میرے ہاتھ میں بھری ہوئی خودکار رائفل تھی۔ اس میں 26 گولیاں تھیں۔ میری انگلی کی ایک حرکت کنگ کو چھلنی کر سکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا' کیا میں ایسا کر گزروں؟ خدا کی اس زمین کو ایک نہایت غلیظ بوجھ سے پاک کر ڈالوں؟ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کنگ کے یوں ختم ہو جانے سے برائی کا یہ عظیم الشان درخت بھی گر جائے گا جس کی شاخیں یہاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جس کی جڑوں کا سلسلہ بھی نہ جانے کہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ کنگ کے مرنے سے کوئی اور شیطان زادہ کنگ بن کر برائی کے اس گھوڑے کی باگیں سنبھال لے؟

دل کا فیصلہ یہی تھا کہ نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کنگ اور اس کے گارڈز کو بھون ڈالوں لیکن عقل کچھ اور کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر تک یہ سنگین کشمکش جاری رہی لیکن پھر فیصلہ عقل کے حق میں ہوا۔

کنگ اور جیکب باتیں کرتے کرتے ہمارے قریب سے گزرے۔ درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم رہا ہو گا۔ مصنوعی طور پر چلائی گئی ہوا کا رخ بھی ہماری طرف تھا۔ کنگ اور جیکب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے کچھ اڑتے اڑتے فقرے ہمارے کانوں تک بھی پہنچے ...... کنگ کہہ رہا تھا ''گاڑی کی قیمت کچھ اور ہوتی ہے لیکن اگر ایک نئی گاڑی کے تمام پارٹس اچھے طریقے سے کھول دیے جائیں اور انہیں اچھے طریقے سے پیک کر کے فروخت کر دیا جائے تو یقیناً یہ زیادہ قیمت میں فروخت ہوتے ہیں۔''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں جناب!''

''ہم کوئی تھیوری پیش نہیں کر رہے ...... پریکٹیکل بات کر رہے ہیں۔ تم بازار سے مختلف پارٹس کے نرخ معلوم کر سکتے ہو۔ ایک نئی گاڑی کے تمام نئے پارٹس کی قیمت گاڑی کی قیمت سے زیادہ ہو گی۔''

باتیں کرتے کرتے وہ دور چلے گئے۔ سوٹل سرگوشی میں بولا ''کیا کنگ اب اسپیئر پارٹس کا کام شروع کرے گا؟''

''جو شخص ایک دن میں لاکھوں ڈالر کے بردے فروخت کر کے بھی مطمئن نہیں وہ گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس بیچ کر کیسے مطمئن ہو گا۔''

ہم بالکل اٹین شن کھڑے تھے۔ دائیں بائیں دیکھنے کے لیے ہم اپنے سر کے بجائے صرف اپنی آنکھوں کو حرکت دیتے تھے۔

جیکب کے ساتھ کنگ کی چہل قدمی قریباً دس منٹ جاری رہی۔ جیکب کا سر مسلسل اثبات میں ہل رہا تھا۔ پھپکا کنگ کے بائیں ہاتھ پر تھا۔ دایاں ہاتھ مسلسل پھپکے کی پشت پر گردش کرتا رہتا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی اہم نوعیت کی گفتگو صرف گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کے متعلق ہو رہی ہے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم جیکب کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس پہنچ گئے۔ جیکب کسی کام سے چلا گیا جبکہ ہم اے کلب کے ''سبزہ زار'' میں ہونے والی اہم گفتگو کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ جیکب کی واپسی ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیدھا ہمارے پاس چلا آیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہم سے کسی اہم معاملے میں بات کرنا چاہتا ہے ...... اور نہیں بھی کرنا چاہتا۔ کچھ دیر تک یہ کشمکش جاری رہی پھر اس کشمکش کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ جیکب نے وہسکی کے دو بڑے گھونٹ لیتے ہوئے اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹکا اور گہری سانس لے کر بولا ''کنگ براؤن ...... اپنے کاروبار میں نت نئے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ آج کل بھی وہ اپنے بزنس میں ایک جدت کا پلان بنا رہے ہیں۔ کنگ کا خیال ہے کہ اس جدت کے نتیجے میں وہ اپنے پرافٹ کو دوگنا اور سہ گنا کر سکیں گے۔ اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ ایسا کر گزریں گے۔''

''میں سمجھا نہیں'' میں نے کہا۔

جیکب نے ایک اور پیگ خالی کیا اور رازداری کے لہجے میں بولا ''کنگ ''مکمل انسانوں'' کے ساتھ ساتھ ان کے اعضا بھی فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک شعبہ ایسا قائم کر رہے ہیں جہاں صرف بردے ہی نہیں' بردوں کے پارٹس بھی بیچے جائیں گے۔''

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی ''تمہارا مطلب ہے کہ آنکھیں' گردے' جگر وغیرہ ......''

''ہاں ...... کنگ اور ان کے چند مشیر ایسا ہی سوچ رہے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے لمبا چوڑا ہوم ورک کیا ہے اور باقاعدہ ایک ورک پلان بنایا ہے ...... میرا اندازہ ہے کہ کنگ کے حتمی فیصلے کے بعد دو تین دن کے اندر اندر یہ کام شروع ہو سکتا ہے۔ کنگ نے جو کچھ بتایا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ بردوں کی نئی کھیپ کے اندر سے پانچ سو کے قریب بردے اس پراجیکٹ کے لیے منتخب کیے جائیں گے۔ یہ بردے شکل و صورت کے اعتبار سے اعلیٰ کوالٹی کے مال میں شمار نہیں ہوں گے۔ اعلیٰ کوالٹی کا مال سمجھ رہے ہو نا تم؟''

''یعنی شکل وصورت اور جسم کے لحاظ سے اچھی عورتیں اور مرد؟''

''بالکل یہی بات ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کو منتخب کیا جائے گا اور اسپیئر پارٹس کی شکل میں فروخت کیا جائے گا۔ یہ بات تو اب بالکل ڈھکی چھپی نہیں کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں انسانی اعضا کی ڈیمانڈ اور قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ انسانی اعضا کے بڑے بڑے سوداگر میدان میں آچکے ہیں اور بڑے منظم طریقے سے یہ کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔''

میں اور مول سناٹے کے عالم میں جیکب کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ سب کچھ بڑا لرزہ خیز تھا...... اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آرہی تھی کہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہم نے سرسبز لان میں کنگ براؤن کی منحوس زبان سے جو چند فقرے سنے تھے' ان کی اصل حقیقت کیا ہے؟

جیکب نے کہا ''کنگ نے میرے سپرد بردوں کو اکٹھا کرنے کا کام کیا ہے۔ پھر میرے ساتھ دو ڈاکٹرز کی ڈیوٹی لگائی جائے گی اور ایک تجربہ کار آفیسر چارلس بھی ہوگا۔ ہم چاروں ان بردوں میں سے پانچ سو افراد کو منتخب کریں گے۔ ان بردوں کو ماہر سرجنوں کی ایک آٹھ رکنی ٹیم کے سپرد کیا جائے گا۔ یہ ٹیم ان لوگوں کے آپریشن کرے گی اور اگلے ڈیڑھ دو مہینے کے اندر ان کے بیشتر اعضا جن میں پیٹ کے اندرونی عضلات اور آنکھوں وغیرہ کے علاوہ بون میرو...... اور ہاتھوں پاؤں کے جوڑ وغیرہ شامل ہوں گے' محفوظ کرلیے جائیں گے۔ سب سے آخر میں دل اور دماغ کی باری آئے گی اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ باقی جو کچھ بچے گا' اسے الیکٹرک بھٹیوں میں ڈال کر ختم کر دیا جائے گا۔ یعنی خاتمہ بالخیر۔''

سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن حقیقت کو جھٹلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم نے اپنے کانوں سے کنگ کی ذومعنی باتیں سنی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے یہاں سفاکی اور درندگی کے جو مظاہر دیکھے تھے وہ بھی تائید کرتے تھے کہ کنگ براؤن حیوانیت میں انتہا کو چھونے کا ملکہ رکھتا ہے۔

اسی روز شام کے بعد جیکب نے ہماری دلچسپی کے لیے ہمیں ایک مختصر ویڈیو فلم بھی دکھائی' اس فلم میں دو امریکی ڈاکٹرز نظر آئے۔ یہ آرتھوپیڈک ڈاکٹرز' ٹانگوں اور بازوؤں کے مختلف جوڑوں کو ہائی جینک طریقے سے محفوظ کرتے نظر آرہے تھے۔ اس کے علاوہ گردے اور آنکھوں کے کورنیا بھی محفوظ کیے جارہے تھے۔ بعد ازاں آپریشن تھیٹر میں پڑی ہوئی دو لاشیں دکھائی گئیں۔ یہ دونوں سیاہ فام افراد تھے۔ ایک مرد تھا' دوسری عورت۔ یہ لاشیں قابل رحم حالت میں تھیں' جیسے کسی چوری شدہ موٹر سائیکل کے تمام پارٹس ایک ایک کرکے فروخت کر دیے جائیں' آخر میں بس ایک بے ہنگم سے ''چیسی'' باقی رہ جائے۔ ہمارے سامنے آپریشن ٹیبل پر شاید دو انسانوں کی ''چیسیاں'' پڑی تھیں۔ کھوپڑیوں سے دماغ غائب تھے' آنکھوں سے پتلیاں۔ پیٹ خالی تھے' بازو اور ٹانگیں ندارد تھیں۔

''یہ سب کیا ہے جناب...... کیا قیدیوں کو قتل کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے؟'' مول نے جیکب سے دریافت کیا۔

''نہیں' یہ تو صرف تجرباتی کام تھا۔ ایسے چند مزید آپریشن پچھلے ایک مہینے میں کیے جا چکے ہیں لیکن اصل کام ابھی بس شروع ہی سمجھو۔ کنگ میری توقع سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کل یا پرسوں تک ڈیڑھ ہزار بردوں میں سے پانچ سو افراد کی چھانٹی کا کام شروع ہو جائے گا۔''

''یعنی خوب صورتی اور موزونیت میں سے بدصورتی کو علیحدہ کرلیا جائے گا پھر اس دو نمبر مال کو دوسرے طریقے سے فروخت کر دیا جائے گا'' میں نے کہا۔

جیکب صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کنگ براؤن کے ''کاروبار'' کے اس نئے شعبے کو اچھی نظر سے دیکھ رہا ہے یا نہیں...... بہرحال اس کے بارے میں ایک بات پورے یقین سے کہی جا سکتی تھی اور وہ یہ کہ وہ ہر صورت آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ آگے...... اور آگے' اس کی آنکھوں میں آگے بڑھنے کی حریصانہ چمک دیکھنے والے کو دور ہی سے نظر آجاتی تھی۔

جیکب نے درست کہا تھا۔ فقط دو روز بعد ہوسٹل کی وسیع و عریض بیرکوں میں بردوں کو چھانٹنے کا کام شروع ہوگیا۔ جن کو چھانٹا جارہا تھا' انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور کیوں؟ وہ بس بھیڑ بکریوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس طرف ہانکا جاتا تھا اسی طرف چلے جاتے تھے۔ چوتھے روز جیکب نے بتایا کہ ڈیڑھ سو عورتوں اور ساڑھے تین سو مردوں کو نئے ''پراجیکٹ'' کے لیے چن لیا گیا ہے۔ بعد ازاں اس نے ٹی وی پر ہمیں ان قریباً پانچ سو افراد کی جھلکیاں بھی دکھائیں۔ ان میں کچھ انڈین اور پاکستانی تھے۔ کچھ کا تعلق تھائی لینڈ اور ملائشیا وغیرہ سے تھا۔ نصف سے زائد افراد سیاہ فام تھے۔ وہ یقیناً تاریک براعظم سے یہاں لائے گئے تھے۔ ان لوگوں میں ہمیں کہیں کہیں سری لنکن اور

نیپالی بھی نظر آئے۔ ان سب میں ایک صفت مشترک تھی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ سب درمیانے یا نچلے درجے کے تھے۔ عورتیں بھی زیادہ تر ایسی تھیں جن میں جسمانی موزونیت نہیں تھی' بعض کی شکل وصورت بری نہیں تھی لیکن وہ بڑے فربہ تھیں یا دبلی تھیں۔ یہ سب کے سب بردوں کے مخصوص لباس میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں نیلے دھاتی کڑا نظر آتا تھا۔ اس کڑے میں بردے کے تمام کوائف کندہ کیے جاتے تھے۔

اسکرین پر بیرکوں کے مختلف مناظر نظر آرہے تھے۔ ایک منظر میں چند افراد روتے ہوئے نظر آئے۔ یہ تین چار خواتین تھیں' ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا بھی تھا۔ میں نے ایک دراز قد شخص کو دیکھا' وہ رونے والوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی آواز تو ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن چہرے کے تاثرات اور ہاتھوں کے اشاروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انہیں تسلی دے رہا ہے اور ان کا خوف پاس دور کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے انداز میں اور ہے کا اعتماد اور حوصلہ تھا۔ ویسے بھی وہ سارے قیدیوں میں سے نمایاں اور الگ نظر آتا تھا۔

میں نے جیکب سے پوچھا ''یہ نوجوان کون ہے؟''

وہ بولا ''تم اسے لیڈر کہہ سکتے ہو۔ قیدیوں اور خاص طور سے افریقیوں میں یہ بے حد مقبول ہے۔ یہ اس کی بات مانتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس شخص نے ہمارے لیے کافی آسانیاں پیدا کی ہیں۔ اس قسم کے دو چار لیڈر اور بھی یہاں موجود ہوں گے۔ یہ لوگ چونکہ بردوں کے ساتھی ہوتے ہیں لہٰذا انہیں سمجھانے بجھانے اور انہیں قابو میں رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔''

میں نے جیکب سے کہا ''ایسے لوگ ہمارے بھی بہت کام آسکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولا۔

''مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کھل کر کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو'' جیکب بولا۔

''مجھ سے کھل کر کہنے کی بات کررہے ہو لیکن خود نہیں کھلتے ہو'' میں نے جیکب کی آنکھوں میں دیکھا۔

جیکب میرے معنی خیز لہجے کو محسوس کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ایک خاص طرح کی چمک نمودار ہوئی تھی۔ یہ تو واضح حقیقت تھی کہ جیکب ہر دم آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اپنے سوا وہ کسی سے بھی مخلص نہیں تھا۔ کنگ براؤن سے بھی نہیں لیکن اس حقیقت کو وہ کھل کر بیان نہیں کرتا تھا۔ میں اس حوالے سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کررہا تھا۔

جیکب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ پھر اٹھ کر ایک کھلی ہوئی کھڑکی بند کی' پردہ کھینچ کر آگے کیا اور پھر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گرل فرینڈ میگی کو ہدایت کردی کہ وہ ایک اہم گفتگو میں مصروف ہے' اسے بالکل ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا۔

اگلے دو تین گھنٹے میں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بڑی اہم نوعیت کی تھی۔ مول بھی اس گفتگو میں شریک تھا اور میری خواہش کے مطابق میرا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ اس اہم گفتگو میں جیکب ہمارے سامنے پوری طرح کھل گیا اور ہم اس کے سامنے کھل گئے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ جیکب کے ذہن میں ایک منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح کنگ براؤن کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس قرب سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرلے۔ یا تو کنگ کا دستِ راست بن جائے یا پھر خود کنگ بن جائے۔ یہ مراحل طے کرنے کے لیے وہ ہر انتہا پر جانے کو تیار تھا۔ اس کے لیے وہ لمبا انتظار بھی کرسکتا تھا اور اگر فوری طور پر کوئی سنہری موقع میسر آجاتا تو اس سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں اسے یہاں جو کامیابیاں ملی تھیں انہوں نے جیکب کا حوصلہ بہت بلند کر دیا تھا اور اسے اگلی منزلیں آناً فاناً اپنے قدموں کے نیچے نظر آنے لگی تھیں۔

جیکب نے کھلے انداز میں بات شروع کی تو میں نے بھی واضح لہجہ اپنا لیا۔ میں نے کہا ''جیکب اگر تم تھوڑا سا تعاون کرو تو ہم یہاں ایک زبردست دھماکا کر سکتے ہیں۔''

''کیسا دھماکا۔''

میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے جو دراز قد نوجوان مجھے اسکرین پر نظر آیا تھا' اس میں کافی صلاحیت لگتی ہے۔ کیا تم کسی طرح اس سے میری ملاقات کرا سکتے ہو۔''

''کیا کرو گے اس سے مل کر؟'' جیکب نے پوچھا۔

''یہ سب کچھ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

''لیکن ایک بات یاد رکھنا......'' جیکب انگلی اٹھا کر بولا۔ ''کنگ براؤن کی نظروں میں میری حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ موجودہ اسٹیٹس میں نے سخت کوشش سے حاصل کیا ہے۔ اگر اس اسٹیٹس کو خطرہ لاحق ہوا تو مجھے اس کا دفاع کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں......''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے اس کا فقرہ مکمل کرتے

ہوئے کہا" ایسی صورت میں تم ہمیں شوٹ بھی کر سکتے ہو۔ ہم اس بارے میں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ امید ہے کہ تمہیں اس حوالے سے شکایت نہیں ہوگی۔"

ہمارے درمیان دیر تک تفصیلات اور شرائط وغیرہ طے ہوتی رہیں۔ موقل بھی اس گفتگو میں بھرپور حصہ لیتا رہا۔

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے۔ گیارہ بجے کا وقت تھا۔ جب ایک ایسے شخص کو اپارٹمنٹ میں لایا گیا جس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی لیڈر نما شخص تھا جو کل ہمیں ٹی وی اسکرین پر دکھائی دیا تھا۔ اس کی سانولی رنگت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق انڈیا کے کسی علاقے سے ہے۔ وہ مضبوط جسم کا مالک لیکن معمولی شکل و صورت کا تھا۔ یقیناً یہ معمولی شکل و صورت ہی تھی جس کے سبب وہ پانچ سو افراد میں شامل ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے ضرور معمولی تھا لیکن اس کا لب و لہجہ خوب صورت تھا اور وہ گفتگو کا فن بھی جانتا تھا۔ جب ہم نے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو وہ ہمارے سامنے کمرے کے اندر تھا۔ اس نے اپنا نام سفیان بتایا۔ اس کا تعلق بھوپال سے تھا۔ وہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا اور ایک اچھا مقرر بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی قسمت کی خرابی اسے گھیر گھار کر منوہرا دیوی تک لائی تھی۔ منوہرا دیوی کے ذریعے وہ اس قفس تک آ پہنچا تھا۔ وہ پچھلے تقریباً دو مہینے سے یہاں موجود تھا اور قیدیوں میں ہردلعزیز تھا۔ وہ اس کی بات پر بھروسا کرتے تھے۔ وہ اردو ہندی کے علاوہ انگریزی بھی بول سکتا تھا۔ میں نے اسے اعتماد میں لینے کے بعد بات چیت شروع کی۔

میں نے اردو میں کہا" سفیان! تم جانتے ہو، تمہیں ان نئی بیرکوں میں کیوں لایا گیا ہے؟"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں صاحب! لیکن مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔"

"کچھ نہیں ...... یہاں بہت سا کالا موجود ہے۔ میں ایک مخلص دوست اور خیرخواہ کی حیثیت سے تم سے مخاطب ہوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جن تقریباً پانچ سو افراد کو دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کیا گیا ہے اور جن میں تم بھی شامل ہو، ان کے قتل کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا ہے۔"

سفیان مضبوط اعصاب کا مالک نظر آتا تھا لیکن میری بات سن کر وہ ایکدم زرد پڑ گیا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے خود کو سنبھالا اور بولا" میں آپ کی بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا۔"

"تہ تک پہنچنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ بس جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہوں، وہ حرف بحرف صحیح ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اس پر کامل یقین کرو۔ دو تین دن کے اندر تم لوگوں کے قتل کی کارروائی شروع ہو جائے گی۔ روزانہ صبح سویرے پندرہ بیس افراد تم میں سے کم ہو جائیں گے اور یہ سلسلہ آ... تک چلے گا۔"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا" لیکن ایسا کیوں کیا جائے گا۔ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ ہمیں اسپتال میں بھیجا جا رہا ہے اور ہمارا علاج معالجہ کیا جائے گا۔ ہم سب کے خون، پیشاب وغیرہ کے ٹیسٹ لیے گئے تھے۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ وغیرہ ہوئے تھے۔"

"تمہیں اسپتال تو لے جایا جائے گا لیکن زندگی کے لیے نہیں، مارنے کے لیے" موقل نے شستہ اردو میں کہا۔

پھر وہ سفیان نامی اس انڈین کو تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ سفیان بے حد حیرت اور خوف کے عالم میں سن رہا تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ موقل کی باتوں پر یقین کر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے سفیان نامی اس نوجوان کا خوف ...... غم و غصے میں بدلنے لگا۔ وہ ہم سے مختلف سوالات بھی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کا چوڑا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو دوست! کنگ براؤن کی طرف سے موت تمہارا مقدر بنا دی گئی ہے۔ مرنا تو تمہیں ہے ہی... لیکن اگر زندگی بچانے کی ایک بھرپور کوشش کر لو تو شاید تقدیر پلٹا کھا جائے۔ تمہارے پاس اب مزید کھونے کو کچھ نہیں ہے۔ تمہاری کوشش کے نتیجے میں تمہیں کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہو سکتا ہے۔"

"آپ کس قسم کی کوشش کی بات کر رہے ہیں؟" سفیان نے پوچھا۔

"جس شخص کی موت یقینی ہو، جب وہ موت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ کوشش بڑی سرتوڑ ہوتی ہے۔ تم بھی ایک ایسی ہی سرتوڑ کوشش کی داغ بیل ڈال سکتے ہو" وہ مسلسل سوالیہ نظروں سے میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا" سب سے پہلا کام تو تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنے پانچ سو ساتھیوں تک یہ بات پہنچا سکتے ہو کہ انہیں اپنی جان بچانے کے لیے ایک دلیرانہ کوشش کرنا ہوگی۔"

سفیان نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور اس کی سانولی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیلنے لگیں۔ میں نے کہا" جب یہ بات تمہارے ساتھیوں تک پہنچ جائے تو پھر تم دس بیس قابل اعتماد ساتھیوں سے مل کر اپنی" دلیرانہ کوشش" کی تفصیلات طے کر سکتے ہو۔"

"لیکن... لیکن اس دلیرانہ کوشش کا موقع ہمیں ملے گا کیسے؟" سفیان نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"یہ موقع تمہیں ہم فراہم کریں گے" موقل نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر ذرا توقف سے بولا" ایک مقررہ وقت پر تمہاری بیرکوں کے تالے کھولے جائیں گے اور تمہیں ہتھیار وغیرہ بھی پہنچائے جائیں گے۔ اس کے بعد تمہاری رہنمائی بھی کی جائے گی کہ کس جگہ پر تمہارا کیا گیا حملہ زیادہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔"

سفیان کچھ دیر تک گہری سوچ میں رہا۔ پھر ٹھہرے ہوئے... انکشاف انگیز لہجے میں بولا" ان پانچ سو افراد میں پچاس ساٹھ افراد ایسے ضرور ہیں جو آزادی اور عزت کے لیے کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں۔ میری کوشش سے ان کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک پہنچ سکتی ہے۔ یہ لوگ حرکت میں آ گئے تو پھر باقی لوگ بھی اپنی جانیں بچانے کی خاطر جانیں لڑا دیں گے... لیکن..."

"لیکن...... کیا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ پر اعتبار کرنے کے باوجود میں ابھی تک خود کو یقین نہیں دلا پا رہا کہ واقعی ہم سب کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے۔ ہمیں تو کچھ اور ہی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔"

میں نے کہا" جو لوگ تمہیں تمہارے گھروں سے اٹھا سکتے ہیں اور ہزاروں میل دور یہاں لا کر تمہیں فروخت کر سکتے ہیں، وہ تمہیں کوئی بھی تصویر دکھا سکتے ہیں اور تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

وہ بولا" کیا آپ کو یقین ہے کہ ہماری یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی اور ہم یہاں سے نکل سکیں گے؟"

میں نے کہا" اگر جان ہتھیلی پر رکھنے والے پندرہ بیس افراد بھی دستیاب ہو جائیں تو ان دیواروں کو ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔ تم تو ڈیڑھ سو بندوں کی بات کر رہے ہو اور مجھے یقین ہے کہ یہ بندے ڈیڑھ سو ہی نہیں رہیں گے، جب تالے ٹوٹیں گے اور دروازے کھلیں گے تو ہر قیدی جنگجو نظر آئے گا۔"

"کیا اس سلسلے میں آپ لوگوں نے تفصیلی پلان بنا لیا ہے؟" سفیان نے پوچھا۔

"بہت سی باتیں طے ہو چکی ہیں، جو تھوڑی بہت رہ گئی ہیں، وہ بھی ایک آدھ دن میں طے ہو جائیں گی...... جو کچھ بھی ہوگا وہ پوری منصوبہ بندی سے ہوگا۔ اور یہ منصوبہ بندی کرنے والے عام لوگ نہیں ہیں۔ اس میں انتظامیہ کے کئی سرکردہ افراد شامل ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو تمہاری یہاں موجودگی ہے۔ ہم تمہیں سخت ترین پہرے سے بحفاظت نکال کر یہاں لائے ہیں اور چھوڑ کر بھی آئیں گے۔"

سفیان اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کی چمک نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔

کچھ دیر بعد سفیان کو واپس بھیج دیا گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور جیکب کے آدمی احتیاط سے اسے واپس لے گئے۔ انچارج کی حیثیت سے جیکب نے یقیناً یہی "شو" کیا ہوگا کہ اس شخص کو پوچھ گچھ کے لیے اپارٹمنٹ میں بلایا ہے۔ (بالکل جیسے حکومت، قبائل کے اندرونی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ کو بلاتی ہے)

سفیان کے جانے کے بعد جیکب اور اس کی ہوش ربا گرل فرینڈ ہمارے پاس آ بیٹھے۔ ہم نے انہیں سفیان سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ یہ گفتگو کافی حوصلہ افزا رہی تھی۔ جیکب کا حوصلہ بھی پہلے سے بلند نظر آنے لگا۔ ہم ایک منصوبے پر تفصیلی غور کرنے لگے۔ اس منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ ہفتے کی شب ان تقریباً پانچ سو افراد کو رہا کرا دیا جائے جن کے سروں پر یقینی موت منڈلا رہی ہے۔ یہ سارے قیدی چونکہ صرف چار بڑی بیرکوں میں بند تھے لہٰذا صرف چار تالے توڑ کر چار دروازے کھولنا بہت زیادہ دشوار نہیں تھا۔ جیکب کے ایک ساتھی انجینئر نے یقین دلایا تھا کہ وہ کارروائی کے وقت کلوز سرکٹ ٹی وی کی نشریات مطلوبہ علاقے میں معطل کر دے گا۔ بیرکوں سے نکلنے کے فوراً بعد ایک مقررہ جگہ سے ہتھیار قیدیوں کے ہاتھ میں آ جانا تھے۔ اس کے بعد انہیں ایک طویل کوریڈور میں بھاگتے ہوئے اس ریڈ لائن پر پہنچنا تھا جس سے آگے کیمپس کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ یہاں زبردست فائرنگ ہوگی۔ اگر سرکردہ قیدی ہم سے مل کر جم کر لڑتے اور بیس پچیس گارڈز کی لاشیں گرانے میں کامیاب ہو جاتے تو ریڈ لائن پار کر کے کیمپس میں گھسا جا سکتا تھا۔ کیمپس میں گھسنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم اے کلب کے نزدیک پہنچ گئے ہیں اور اے کلب میں ہی وہ شیطان چھپا بیٹھا تھا جسے دنیا کنگ براؤن کے نام سے جانتی تھی۔

اگلے دو روز اسی سوچ و بچار میں گزرے۔ منصوبے کی جزئیات طے کی گئیں۔ جیکب نے اپنے چار پانچ قابل اعتبار ساتھیوں سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور ان کا تعاون حاصل کیا۔ یہ سب کچھ ٹاپ سیکرٹ رکھا جا رہا تھا۔ میگی بھی اس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ اکثر جیکب کے ساتھ سرگوشیاں کرتی نظر آ رہی تھی لیکن اس کا کردار کیا تھا، اس بارے میں ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ جیکب کی گرل فرینڈ تھی اور اسی کے چارج میں تھی۔ جیل توڑ کر نکلنے والے قیدیوں نے جس روٹ سے ہو کر اے کلب تک پہنچنا تھا، وہ بھی طے کر لیا گیا تھا۔ اے کلب میں پہنچنے کے بعد کنگ براؤن اور اس کے

خاص الخاص ساتھیوں تک پہنچنے کے امکان روشن ہو جاتے تھے۔ درحقیقت یہی تیس چالیس مہرے داوان تھے جو اس وسیع و عریض شیطانی سیٹ اپ کے کرتا دھرتا تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہمارے حملے کے وقت یہ لوگ ہمیں ایک جگہ اکٹھے مل جائیں گے.... سارے نہ بھی ملتے تو نوے فیصد تو ضرور مل جاتے۔ دراصل ہم نے کارروائی کے لیے ہفتے کا دن منتخب کیا تھا اور یہ دن یہاں نئے سال کے جشن کے لیے مخصوص تھا۔ نئے سال کا تہوار کرسمس کے پانچ چھ روز بعد ہی آجاتا تھا لیکن یہاں یہ تہوار ذرا تاخیر سے منایا جا رہا تھا۔ دسمبر کی 31 تاریخ کو کنگ کے خاندان کے ایک بڑے بزرگ کی پہلی برسی آگئی تھی۔ اس برسی کے سبب جشن چند دن کی تاخیر سے منایا جا رہا تھا۔ مجھے بھروسا تھا کہ کرسمس کے تہوار کی طرح اب یہ نیو ائر کا تہوار بھی ہمارے لیے بڑا سودمند ثابت ہوگا۔ جب شراب خانہ خراب کی کارستانیاں عقلوں کو خبط کرتی ہیں اور نازنینوں کی ہیجان انگیز ادائیں آنکھوں پر پردے تانتی ہیں تو فرائض کی دھجیاں بکھرتی ہیں اور "ڈیوٹیاں" دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ غالب گمان یہی تھا کہ نیو ائر کے جشن کے موقعے پر کنگ اور اس کے قریبی حواری اے کلب کے مشہور و معروف گول کمرے میں موجود ہوں گے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کنگ پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا وقت آگیا ہے۔ کنگ کا یہ ڈیرہ مین سیٹ اپ ابھی تکمیل کے مراحل میں تھا۔ اس کے مختلف شعبوں میں ابھی باہمی رابطے اور نظم و ضبط کی کمی تھی۔ دفاعی نظام بھی ابھی پوری طرح اسٹینڈ نہیں ہوا تھا۔ ابھی یہاں کئی رخنے موجود تھے۔ ان رخنوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک خوفناک لڑاکا طیارہ ابھی رن وے پر ہو، اس کے اڑنے سے پہلے ہی اسے تباہ کر ڈالا جائے۔

ہماری پلاننگ میں مولی کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ زریں گل اور نینا کے علاوہ صابر ہادی کو بھی بچانے کی کوشش کرے گا۔ نینا اور ہادی تو اسپتال میں تھے لیکن زریں لاک اپ میں بند تھا۔ بقول زریں کے "لاک اپ میں پڑا ہوا تھا"۔ زریں خود تو مجھے نہیں مل سکا تھا لیکن اس نے لاک اپ سے اپنی لکھی ہوئی ایک پشتو نظم مجھ تک پہنچا دی تھی۔ اس پشتو نظم کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

"میں نے آپ کے ساتھ رہنا چاہا، آپ کے ساتھ رہنے کے لیے...

میں نے اپنی بیوی کو الوداع کہا، وہ بیوی جو خوبصورتی میں بالا سنہا سے کم نہیں

میں نے اپنے بچے کو چھوڑا جو بدر منیر کی طرح گول مٹول ہے

میں نے اپنا گھر چھوڑا... اور اپنا وی سی آر بھی

میں آپ کی دم بن کر آپ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا

لاہور کے تھیٹروں اور سینماؤں سے دور، میں صحراؤں میں بھٹکتا رہا

لیکن آپ نے میرے ساتھ وہی کیا

جو دلیپ کمار نے مدھو بالا سے کیا تھا، کنارے پر لا کر دھکا دیا تھا۔

زریں گل کی یہ الٹی سیدھی آزاد نظم دیر تک مجھے مسکرانے پر مجبور کرتی رہی۔

میں نے جواب میں لکھ دیا تھا۔ میں تم سے دور ہوں اس لیے مجبور ہوں ورنہ دل تو یہی چاہتا ہے کہ تم کو فروخت کر دوں اور تھوڑے سے پیسے اور ڈال کر کلر ٹی وی لے لوں۔

زریں کو اپنے منصوبے کے بارے میں ہم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ پلاننگ جتنے کم لوگوں کے علم میں ہوگی اتنی ہی محفوظ رہے گی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ہماری تیاریاں بھی تیز تھیں۔ جیکب کا خیال تھا کہ چار بیرکوں کے تالے توڑنے کے بعد چند اور بیرکوں کے تالے بھی توڑ دیے جائیں۔ تاکہ آزاد ہونے والے قیدیوں کی تعداد زیادہ ہو جائے لیکن میں نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ میں زیادہ لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ جن پانچ سو قیدیوں کو ہم رہا کرا رہے تھے ان کی بات اور تھی۔ وہ پہلے ہی موت کے شکنجے میں تھے۔ یقینی موت سے بچنے کے لیے ان کی جدوجہد کا رنگ ڈھنگ بھی اور تھا۔

ہم نے سفیان کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اس نے بڑے اچھے طریقے سے کیا تھا۔ سفیان کی کوشش کا نتیجہ ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا تھا۔ تقریباً ہر قیدی کو یہ علم ہو چکا تھا کہ اگر وہ آزادی کے لیے کوشش نہیں کرے گا تو اگلے چند روز میں بہرصورت موت کا شکار ہو جائے گا۔ قیدیوں میں قریباً ڈیڑھ سو افراد ایسے تھے جو ہر صورت لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ وہ صرف فیصلہ کن لمحات کا انتظار کر رہے تھے۔

اپنے منصوبے کے حوالے سے ایک خدشہ ایسا تھا جو مسلسل میرے ذہن میں موجود رہا تھا اور وہ خدشہ منصوبے کے افشا کا تھا۔ ایسے حالات میں اکثر کوئی مخبری ہو جاتی ہے۔ کوئی ڈبل کراس کر جاتا ہے یا اس طرح کا کوئی اور واقعہ ہو جاتا ہے۔ بہرحال شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک اس قسم کی کوئی پریشانی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ صرف ایک پہرے دار کو کچھ شبہات ا

ہوئے تھے اور اس نے انچارج گارڈ کو اپنے اندیشے کے متعلق بتایا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ انچارج گارڈ وہی فربہ اندام پولیس والا تھا جو چند ہفتے پیشتر جیکب ہارڈ کے ساتھ (اپنے ساتھیوں کو ہلاک کرنے کے بعد) یہاں پہنچا تھا۔ اس شخص نے اس بارے میں فوراً جیکب ہارڈ کو اطلاع دی تھی۔ اب وہ پہرے دار اس الیکٹرک بھٹی کا لقمہ بن چکا تھا جہاں لاش چند سیکنڈ میں بھاپ بن کر اڑ جاتی تھی۔

☆☆☆

اور یہ جشن کی شام تھی' عیش و طرب کی شام۔ ساز و آواز اور رقص و سرور کی شام۔ یہ نئے سال کا جشن تھا۔ ہوسٹل اور کیمپس میں سیکڑوں فرو محو رقص تھے۔ کچھ اکیلے تھے' کچھ جوڑوں کی شکل میں۔ ہر طرف مسرت سے بھرپور چیخیں تھیں اور بہکے ہوئے قہقہے تھے۔ ان چیخوں اور قہقہوں کے درمیان دھیرے دھیرے ایک منصوبہ حرکت کر رہا تھا۔ ایک خاموش لہر تھی جو بتدریج بلند ہو رہی تھی۔

رات کا ایک بجا تھا' جب پروگرام کے مطابق جیکب کے ساتھی انجینئر نے ایک خاص علاقے میں کلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم کو "جام" کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی جیکب کے ساتھی حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے چور بیرکوں کے تالے سائلنسر لگی رائفلوں کے ذریعے توڑ دیے اور قریباً پانچ سو مرد و زن کو رہا کرا دیا۔ کوریڈور میں کھانا لے جانے والی دو بڑی ٹرالیاں کھڑی تھیں۔ ان ٹرالیوں میں کھانے کے بجائے خودکار رائفلیں' پسٹل اور بھرے ہوئے میگزین تھے۔

میں نے اور موٹل نے دیکھا' قریباً دو سو افراد رہا ہوتے ہی نعرے لگاتے ہوئے ان ٹرالیوں کی طرف بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹرالیاں ہتھیاروں سے خالی ہو گئیں۔ میں اور موٹل وردی میں نہیں تھے۔ اگر وردی میں ہوتے تو شاید رہا ہونے والے قیدیوں کی طرف سے پہلا نشانہ ہمیں ہی بنایا جاتا۔ جس شخص نے گارڈز پر پہلی گولی چلائی' وہ سفیان ہی تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوسٹل کے طول و عرض میں کہرام مچ گیا۔ مسرت کی چیخیں' خوف کی چیخوں میں بدل گئیں۔ تھرکتے ہوئے جسم تھرا گئے' ہر طرف بھاگ دوڑ مچ گئی۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا' وہ لڑکھڑا کر گری اور بھاگنے والوں کے پاؤں تلے بری طرح کچلی گئی۔ ایک نہایت فربہ اندام شخص جو امریکن یا کینیڈین تھا' سینے میں گولی کھا کر میرے عین سامنے گرا اور اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا جام اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک دم ہی جہنم دھاڑ مچ گئی تھی۔ جب تک گارڈز کے حواس بحال ہوتے اور وہ اپنے ہتھیار سیدھے کرتے' کر رہیش میں گارڈز کی رائفلیں گر چکی تھیں اور وہ خود بھی لہولہان ہو کر زمین بوس ہو چکے تھے۔ میں نے درجنوں مسلح قیدیوں کو دیکھا' وہ سفیان کی قیادت میں اس ریڈ لائن کی طرف دوڑے جا رہے تھے' جو ہوسٹل کو کیمپس سے جدا کرتی تھی۔

اس ریڈ لائن پر خونریز معرکہ ہوا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ گارڈز زیادہ تربیت یافتہ تھے اور ان کا اسلحہ بھی بہتر تھا۔ انہوں نے درجنوں قیدیوں کو چند لمحے میں ہلاک کر دیا۔ میں نے سفیان کو دیکھا' اس کی گردن میں گولی لگی تھی اور تیزی سے خون نکل رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا لیکن میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے نعرے اس کے ساتھیوں کو گرماتے رہے تھے' اب اس کی آواز ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی مگر اس کا لہراتا ہوا بازو اس کی آواز کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔

میں نے اپنی دائیں جانب دیکھا' یہاں ایک چھوٹا سا کیبن سا بنا ہوا تھا۔ اس کیبن کے اندر سے ہونے والی فائرنگ قیدیوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہی تھی۔ موٹل نے بھی یہ صورتِ حال نوٹ کر لی تھی۔ وہ بولا "میں کیبن کی طرف جاتا ہوں۔"

میں نے اسے روک دیا "تمہاری ڈیوٹی یہاں نہیں ہے۔ تم اسپتال پہنچو۔ نینا اور باری کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔"

موٹل کو چونک کر اپنا فرض یاد آ گیا تھا۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا دائیں جانب کے کوریڈور کی طرف چلا گیا۔ میں کیبن کی طرف بڑھا۔ نئے سال کا جشن منانے والی ایک عریاں لڑکی کی لاش پھلانگ کر میں کیبن کی طرف گیا۔ میں نے سر جھکا رکھا تھا' گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر رہی تھیں۔ کیبن کے نزدیک پہنچ کر میں اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ کیبن کی کھڑکی میں سے بار بار رائفل کی نال جھانکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جاتی تھی۔ میں فرش پر کرالنگ کرتا ہوا کھڑکی کے عین نیچے پہنچ گیا۔ جونہی رائفل کی نال شعلے اگلنے کے لیے کھڑکی سے نکلی' میں نے اچھل کر نال پکڑی اور ایک طوفانی جھٹکا دیا۔ رائفل مین کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور اس کا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکل آیا۔ میری رائفل نے شعلہ اگلا اور "رائفل مین" ماتھے پر سرخ نشان لے کر وہیں کھڑکی کی چوکھٹ پر ڈھے گیا۔ ایک سیکنڈ بعد ایک لیڈی گارڈ کی صورت کھڑکی میں نظر آئی۔ میرے دوسرے فائر نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ حملہ آور قیدیوں کو

تھوڑی سی ڈھیل ملی' وہ للکارتے ہوئے آگے بڑھے اور گارڈز کو روندتے ہوئے ریڈ لائن کراس کر گئے۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی۔

کیمپس میں گھسنے کے بعد حالات سنگین تر ہو گئے۔ یہاں بہترین گارڈز بہترین پوزیشنوں پر موجود تھے۔ حملہ آور قیدیوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن یہاں قیدیوں کو ایک سہولت بھی ملی۔ دو تین بڑی رائفلیں ان کے ہاتھ لگ گئی تھیں۔ وہ انہیں چاروں طرف بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ نشے میں دھت افراد کو سوجھ بھی نہیں رہا تھا کہ کس طرف بھاگیں تاکہ جان بچ سکے۔ بہت سے کیمپس والے اپنے ہی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بھی بن رہے تھے۔ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ یہ وہی خوبصورت یونانی لڑکا تھا جسے منوہرا دیوی نے اپنے عشرت کدے میں "خاص خدمت" کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ لڑکا بپھرے ہوئے قیدیوں کے ایک گروہ سے جان بچانے کے لیے گارڈز کی طرف دوڑا۔ گارڈز نے اس کی پروا کیے بغیر فائر کھول دیا۔ سب سے پہلی گولیاں اسی لڑکے کو لگیں۔

چند منٹ کے اندر اندر باغی قیدی "اے کلب" تک پہنچ گئے۔ ہر طرف شیشے بکھرے ہوئے تھے اور دو تین جگہ لکڑی کو آگ لگی ہوئی تھی۔ جیکب خود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس سے ملے ہوئے اور اس کے خریدے ہوئے لوگ قیدیوں کے ساتھ مل کر دیوانہ وار لڑ رہے تھے۔ یہ سب لوگ جانتے تھے' یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے۔ ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جنگ ہارنے کی صورت میں اذیت ناک موت ان کا مقدر تھی۔ اے کلب کے اردگرد کم و بیش دس جگہوں پر باغیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں اور گارڈز کی خوفناک فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ اس خوفناک صورتِ حال کے دوران میں بھی کوئی میوزک سسٹم چلتا رہ گیا تھا اور اس کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

میں ایک چوکور ستون کی اوٹ میں تھا۔ یہاں سے میں "اے کلب" کے ایک بغلی دروازے پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اے کلب کے اندر موجود لوگوں نے سارے دروازے بند کر کے خود کو محصور کر لیا تھا۔ صرف دو چار افراد ایسے تھے جو شروع کی فائرنگ میں گولیوں کا شکار ہوئے تھے۔ ان سرخ جیکٹوں والے افراد کی لاشیں اب ایک دروازے کے باہر پڑی تھیں۔

اچانک میں نے اپنے عقب میں ایک آہٹ سنی۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹتا' ایک نہایت تنومند گارڈ نے مجھے عقب سے دبوچ لیا۔ اس نے اپنی خالی رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کرتے ہوئے میری گردن اس میں جکڑ لی تھی۔ یہ گرفت بڑی سخت تھی۔ مجھے اپنی گردن کی ہڈی ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے دفاع میں کچھ کرتا' مجھے ایک جاں فزا آواز سنائی دی۔ یہ میرے پیارے ...... راج دلارے زریں گل کی آواز تھی۔ اس نے بڑے حوصلہ افزا انداز میں کچھ کہا تھا۔ مجھے زریں کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا اس کا عملی نتیجہ سمجھ میں آ گیا۔ مجھے عقب سے دبوچنے والے گارڈ کے حلق سے کراہ نکلی تھی اور اس کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ پٹھان نشانہ باز نے عقب سے جو گولی گارڈ پر چلائی تھی وہ عین اس کی کنپٹی پر لگی تھی اور وہ زمین پر گرنے سے پہلے انتقال فرما گیا تھا۔

زریں جھک کر دوڑتا ہوا مجھ تک پہنچا اور ستون کی اوٹ میں آ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جوش کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا اور انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ وہ پیدائشی لڑاکا تھا' خونریز ہنگاموں میں پہنچ کر وہ ایسے ہی خوش ہو جاتا تھا جیسے مچھلی پانی میں پہنچ کر ہوتی ہے۔ "اوئے ...... تم کیسے چھوٹ گئے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"جس کو اللہ چھڑانے ...... اس کو کون پکڑ پائے؟" وہ قافیہ ملا کر بولا۔ دھماکوں کے شور میں اس کی آواز دبی ہوئی تھی۔

ایک بوسٹ ہمارے سروں سے کوئی رونٹ اوپر ستون میں لگا اور بہت سا پلاستر اکھڑ کر ہمارے سروں پر آن گرا۔ زریں گل دانت پیستے ہوئے بولا "استاد صیب' آپ ام کو اجازت دو ...... ام اپنا جان ہتھیلی پر رکھ کر گنگ تک پہنچنا چاہتا ہے۔"

"میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ تمہارا خون اپنے سر لوں" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فائر کیا۔ اور ایک گارڈ زخمی ہو کر اے کلب کی کھڑکی سے اوجھل ہو گیا۔

"ام کو بتاؤ' ام کیا کرے؟" زریں نے چاروں طرف رائفل گھماتے ہوئے کہا۔ اس کی بے چینی دیدنی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس مرکزی دروازے پر پڑی جس نے حملہ آوروں کا راستہ روک رکھا تھا۔ میں نے زریں سے کہا "اپنا نشانہ آزماؤ۔ دروازے کے آہنی قفل کو توڑ دو۔"

زریں نے دو فائر کیے۔ دونوں عین قفل کے سوراخ پر لگے۔ دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹڈی دل حملہ آوروں کا ایک جتھا نعرہ زنی کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر سے ایل ایم جی اور سیون ایم ایم رائفلوں سے شدید فائر ہوئے۔

ایک دو لاشیں چھوڑ کر حملہ آور واپس بھاگ آئے۔

یہ موقع کمک بلانے کا تھا۔ میں نے اپنے لباس میں سے واکی ٹاکی نکالا اور بلند آواز میں بولتے ہوئے جیکب کو مخاطب کیا "کہاں ہو تم؟"

"کلب کے بالکل سامنے ہوں۔"

"کمک کی ضرورت ہے۔ ایک دو بیرکوں کے تالے مزید توڑ دو۔ ان لوگوں کو جتنے ہتھیار دے سکتے ہو دے دو۔"

"ٹھیک ہے' میں بیرک نمبر 18 اور 20 کے دروازے کھلوا رہا ہوں۔ یہ سب مرد قیدی ہیں۔ جوان اور ہمت والے بھی ہیں' جم کر لڑیں گے۔"

میری اور جیکب کے درمیان بحث مباحثے کے بعد طے ہوا تھا کہ شروع میں صرف 500 قیدیوں کو چھوڑا جائے گا جو "سزائے موت" کے لیے منتخب کیے جا چکے ہیں اور جن کا آزادی کے لیے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگانا یقینی ضروری ہے۔ بعد ازاں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کچھ مزید قیدیوں کو چھوڑنے کا رسک بھی لے لیا جائے گا۔ اب چونکہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے جیکب کو کال کر دی تھی۔

اسی دوران میں میری نگاہ کھانے کی ایک ٹرالی پر پڑی۔ اسٹیل کی بنی ہوئی ایسی ٹرالیاں یہاں عام دیکھنے میں آتی تھیں۔ ان ٹرالیوں کے ذریعے "بردوں" کو تین وقت کھانے کی ترسیل کی جاتی تھی۔ یہ ٹرالیاں اونچائی میں تقریباً چار فٹ اور چوڑائی میں چھ سات فٹ کے قریب ہوتی تھیں۔ میں نے زریں کو اشارہ کیا۔ ہم دوڑ کر ٹرالی کی اوٹ میں پہنچے اور پھر اسے دھکیلتے ہوئے اے کلب کے دروازے کی طرف بڑھے۔ ٹرالی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ ابھی دروازہ کچھ فاصلے پر تھا کہ ٹرالی کا کوئی ایک پہیہ جام ہو گیا اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

"اب کیا ہوگا؟" زریں نے نیچے جھکے جھکے سرگوشی کی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں جیسے سوچ رہا ہو کہ ایسی سچویشن اس نے کس فلم میں دیکھی تھی۔

ہم نے زور لگایا لیکن ٹرالی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ہم نہ آگے جا سکتے تھے' نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ اچانک زریں کو جانے کیا ہوا' میں نے اس کے گول چہرے پر سرخی لہراتے دیکھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے تھامتا' وہ ٹرالی کے عقب سے نکلا اور اندھادھند فائرنگ کرتا ہوا دروازے کی طرف دوڑا۔ ان کا یہ ایکشن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر یہ کسی فلم کا سین ہوتا اور زریں کی دلیرانہ جھپٹ کا انداز سلوموشن میں دکھایا جاتا تو فلم بین اش اش کر اٹھتے۔

چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے صفدر کی جھپٹ یاد آ گئی۔ ... کبھی تو ماریا ٹرسٹ کے میدان کارزار میں ایک نازک ترین موقع پر ایسے ہی دیوانہ وار دشمن پر جھپٹا تھا۔ یہ جھپٹ اسے زندہ چھوڑ گئی تھی لیکن اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے لے گئی تھی۔ اپنی آنکھوں کی قربانی دے کر میرے یار غار نے شجاعت کی یادگار مثال قائم کر دی تھی۔ آج ایسا ہی ایک منظر مجھے پھر نظر آیا تھا۔ میرے دل سے زریں کی سلامتی کے لیے دعا نکلی۔

زریں دندناتا ہوا اور نعرے بلند کرتا ہوا اے کلب کے دروازے میں گھسا تھا۔ اس کا دروازے میں داخل ہونا درجنوں باغیوں کو حوصلہ دے گیا۔ وہ رائفلیں سونت کر شاہینوں کی طرح دروازے کی طرف جھپٹے۔ میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ چند لمحے میں ہم اے کلب کے اندر تھے۔ نے ورو کے شدار کی "دوہی زمینی جنت" جہاں اس نے دنیا کی ہر آسائش اور ہر تصوراتی سہولت مہیا کر رکھی تھی۔ اے کلب کے اندر یہ رات کا وقت تھا۔ مصنوعی آسمان پر مصنوعی چاند ڈھل چکی تھی۔ درختوں اور عمارتوں کے سائے طویل تھے۔ آسمان پر چمکنے ستاروں کے درمیان چند بدلیاں خاموشی سے تیر رہی تھیں۔ اس خونی ہنگامے سے بے خبر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھیں جو ان کے نیچے برپا تھا۔ فائرنگ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بڑے بڑے جہازی سائز کے شیشے اور آئینے چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ فانوس چکنا چور ہو کر بکھر رہے تھے۔ مصنوعی آبشاروں کے نیچے لاشیں اوندھی سیدھی پڑی تھیں۔ مجھے زریں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا "زریں' زریں" لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ سر بجز پٹھان سر پر دلیری کا کفن باندھ کر نہ جانے کہاں جا گھسا تھا۔ اس نے کئی ہفتوں تک قید و بند کی شدید صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ ذلت اور تکلیف جھیلی تھی۔ آج وہ آزاد تھا..... اور اس کے ہاتھ میں اس کی پسندیدہ وزنی گن تھی۔ آگ اگلتی ہوئی رائفل۔ وہ بارود اور دھوئیں کا شیدائی تھا۔ اس بارود اور دھوئیں میں ہی کہیں او جھل ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے سامنے آنے والے ایک گورے کو گولی ماری۔ وہ اپنی سرخ جیکٹ سمیت "بڑے کیسینو" کے دروازے کے عین سامنے گرا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چیخ کر آواز دی "زریں..... زریں' کہاں ہو تم؟" زریں کہیں نہیں تھا۔

اس دوران میں کمک بھی پہنچ گئی۔ تقریباً دو سو مزید قیدی دندناتے ہوئے اے کلب کے اندر داخل ہو گئے۔ ان میں

سے کچھ کے پاس رائفلیں تھیں' کچھ تیز دھار آلات سے مسلح تھے۔ ان کے چہرے اندرونی جوش سے انگارہ ہو رہے تھے۔ وہ اے کلب کے نہایت قیمتی پھول بوٹوں کو روندتے ہوئے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کنگ براؤن اور اس کے قریبی ساتھیوں نے خود کو محصور کر لیا ہے اور اب ہوسٹل سے پہنچنے والی بڑی کمک کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ بڑا قیمتی وقت تھا۔ ہمیں تازہ دم گارڈز کے پہنچنے سے پہلے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا تھا لیکن کیا' کیا جاتا' اسٹیل کے وزنی دروازے بند تھے۔ ان دروازوں پر بارود اثر کرتا تھا اور نہ کچھ اور۔

اچانک ایک سلائیڈنگ دروازہ کھلا اور سب ہکا بکا رہ گئے۔ میری حیرانی سب سے سوا تھی۔ دروازہ کھولنے والا زریں گل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دروازے بند ہونے سے پہلے ہی اندر گھس گیا تھا۔ بعد ازاں دو پہرے داروں کو قتل کر کے اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے خود بھی زخم آئے تھے اور اس کا لباس خونچکاں تھا مگر اس کا مورال بلند نظر آ رہا تھا۔ اس کے اندر دائی لالے سد جبریا بدر منیر کی روح حلول کر چکی تھی یا شاید دونوں روحیں بیک وقت اس کے اندر گھس گئی تھیں۔ وہ قیامت بنا ہوا تھا۔ شاید آج میں بھی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو وہ نہ رکتا۔

دو سیکنڈ کے اندر سیکڑوں لوگ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ان چیمبرز میں گھس گئے جہاں صدی کا سب سے بڑا بردہ فروش قیام فرماتا تھا۔ یہ پرآسائش ترین جگہ تھی۔ یہاں کا حسن نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ نقرئی دیواروں سے روشنی پھوٹتی تھی۔ خودکار دروازے بے آواز حرکت کرتے تھے۔ دنیا کا قیمتی ترین فرنیچر یہاں نظر آ رہا تھا۔ میرے اندر گھسنے سے پہلے ہی مجھے لرزہ خیز چیخیں سنائی دینے لگیں۔ یہ ان مرد و زن کی چیخیں تھیں جو کنگ براؤن کے قریبی ساتھی یا رشتے دار تھے۔ وہ سب یہاں سال نو کا جشن منانے اکٹھے ہوئے تھے اور ان کے مخمور جسم آناً فاناً گولیوں کی زد میں آ گئے تھے۔ جوابی فائرنگ بھی ہو رہی تھی لیکن حملہ آوروں کی فائرنگ اتنی شدید تھی کہ در و دیوار چھلنی ہو رہے تھے۔

اچانک میرے کندھوں پر کسی کا وزنی ہاتھ آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ جیکب ہارڈ تھا۔ کچھ کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ کر وہ پس پردہ نہیں رہ سکا تھا اور دو بدو آ گیا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا "کنگ بھاگ رہا ہے..... وہ دیکھو بھاگ رہا ہے۔"

میں نے جیکب کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ کنگ واقعی بھاگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نیم برہنہ لڑکی تھی۔ لڑکی کے سنہری بال روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ دونوں ایک نیلگوں تالاب کے کنارے دوڑتے ہوئے ایک مصنوعی غار کی طرف جا رہے تھے۔ ایک لائٹ پول کے قریب کنگ ایک ساعت کے لیے رکا اور پھر سے غار کی طرف دوڑا۔ تب میں نے دیکھا کہ قریباً بیس گز دور غار کا خودکار دروازہ سلائیڈ کر کے کھلنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ دروازہ فولاد کا تھا لیکن دیکھنے میں یہی لگتا تھا کہ پتھر کا ہے۔ ایک خوبصورت پتھر جو کھل جا سم سم کے انداز میں درمیان سے علیحدہ ہو رہا تھا۔ لائٹ پول پر رک کر کنگ نے اسی دروازے کو کھولنے کے لیے بٹن دبایا تھا۔

میں نے بھاگتے ہوئے کنگ کی ٹانگوں پر فائر کیا لیکن رائفل سے کھٹ کھٹ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی آیا کہ میں غار کا دہانہ بند کرنے کی کوشش کروں۔ میں لائٹ پول کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک سرخ رنگ کا بٹن تلاش کیا اور پش کر دیا۔ غار کا دہانہ بند ہونا شروع ہو گیا۔ کنگ اور نیم برہنہ لڑکی ابھی دہانے سے قریباً پندرہ گز دور تھے۔ دروازہ بند ہو رہا تھا۔ وہ دونوں دروازے کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ بڑا معمولی سا "مارجن" تھا۔ دروازہ پہلے بند ہو جاتا یا وہ دونوں پہلے دروازے تک پہنچ جاتے۔ وہ حتی الامکان تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ کنگ کا خوفناک LIZARD اس کے بائیں بازو پر تھا۔

پھر میری آنکھوں نے ایک عجب منظر دیکھا۔ لڑکی دروازے میں سے گزر گئی لیکن جب ایک ساعت بعد خونمند کنگ براؤن نے گزرنا چاہا تو وہ پھنس گیا۔ شاید سیکنڈ کے آٹھویں یا دسویں حصے کا فرق پڑا تھا۔ کنگ' جو زندگی کی دوڑ میں بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا' اس روز میں بس ایک ساعت کے فرق سے رہ گیا تھا۔ وہ بھاری بھرکم خودکار دروازے کے اندر پھنس گیا تھا۔ نہ آگے جا سکتا تھا' نہ پیچھے آ سکتا تھا۔ خودکار دروازے کا طاقتور میکنزم کنگ کو طاقت سے بھینچ رہا تھا۔ ہم دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچے' ان گنت انسانوں کو اپنے شکنجے میں کسنے والا آج خود شکنجے میں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خودکار دروازے کا زبردست دباؤ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک اس کے خوفناک چھپکلے نے جست کی۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا.... ہماری طرف آیا۔ میں کسی ایسے حملے کے لیے پہلے سے چوکس تھا۔ میری یہ چوکسی میرے ساتھ ساتھ جیکب کے بھی کام آئی۔ میں نے تڑپ کر خود کو چھپکلے کی زد سے بچایا' جونہی وہ زمین پر گرا..... ایک بار پھر اس کے جسم میں زبردست اچھال پیدا ہوا۔ اب وہ جیکب کی طرف گیا تھا۔ میں تب تک رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ چکا تھا اور جوابی

حملے کے لیے تیار تھا۔ جونہی تھپکلا فضا میں بلند ہوا' گھومتی ہوئی رائفل کی زوردار ضرب تھپکلے کے منہ پر لگی۔ یہ بے پناہ ضرب کھا کر تھپکلا پناخ کی آواز سے غار کی کھردری دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا مغز دیوار سے چپک کر رہ گیا اور وہ نیچے گر گیا۔

کنگ ابھی تک دروازے میں تھا اور نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ جیکب غضب کے عالم میں کنگ پر حملہ آور ہوا' اس کے ہاتھ میں خم دار خنجر تھا۔ اس نے پہلا وار کنگ کے سینے پر کیا اور خنجر دستے تک اندر گھسا دیا۔ اس کے بعد دروازے میں پھنسے ہوئے کنگ پر جیکب ہارڈ نے کم و بیش دس وار کیے اور اسے چیر کر رکھ دیا۔ یہ وہی کنگ براؤن تھا جس کے سامنے صرف چند دن پہلے جیکب نظریں جھکائے اور ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ دنت وقت کی بات ہوتی ہے اور ابن الوقت لوگوں کے لیے تو وقت ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ کنگ دروازے میں پھنسا ہوا تڑپ رہا تھا' پھڑک رہا تھا لیکن رہائی کہیں نہیں تھی۔ اس کا لباس لہولہان تھا اور سینے پر لٹکے ہوئے گوشت کے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔ صدی کا سب سے بڑا بردہ فروش موت کی دہلیز پر تھا۔

چند سیکنڈ بعد سیکڑوں مشتعل قیدی نعرے بلند کرتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے کنگ کے جاں بہ لب جسم کو یوں ڈھانپ لیا جیسے مکھیاں گڑ کی ڈلی کو ڈھانپتی ہیں۔ غضبناک چنگھاڑوں میں کنگ کی آخری آوازیں دب کر رہ گئیں۔

دس پندرہ منٹ بعد ہجوم چھٹا تو کنگ براؤن کی جگہ ایک خونچکاں لوتھڑا تھا جو بھاری بھرکم آہنی دروازے میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے لائٹ پول کے قریب پہنچ کر بٹن دبایا۔ دروازہ کھلنا شروع ہوا' لوتھڑا نیچے آ گرا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں اے کلب پر قیدیوں کا مکمل کنٹرول حاصل ہو چکا تھا۔ کنگ کے ساتھیوں کو کونے کھدروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جا رہا تھا اور گولیوں سے اڑایا جا رہا تھا۔ جشنِ مسرت' جشنِ مرگ میں بدل چکا تھا۔ زریں گل کے جسم پر کئی چھوٹے بڑے زخم آئے تھے لیکن وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ اپنے لباس پر خون کے چھوٹے بڑے دھبے دیکھ کر وہ یوں خوش ہو رہا تھا' جیسے یہ کوئی اعزازی نشانات ہوں۔ اس نے کنگ کی ناقابلِ شناخت لاش کو کئی ٹھوکریں لگائیں اور بولا "استاد صیب! آج ام کو لگ رہا ہے کہ یہ امارا زندگی کا سب سے خوبصورت دن ہے۔ آج ام خوش ہے' بہت ہی خوش ہے۔ کاش یہاں ساز موجود ہوں اور ام لہک لہک کر گا سکے۔ ام خوشی سے کیوں نہ گائے ... امارا دل بھی تو گا رہا ہے۔ ہاں جناب' یہی وہ بدبخت ہے جس کی وجہ سے امارے صیدر بھائی کا آنکھیں گیا۔ اور بات صرف صیدر بھائی کی ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں کتنی آنکھوں کا نور اس حرامی نے چھینا تھا... کتنی ماؤں کے کلیجے اس نے کاٹ کر پھینک دیے تھے۔"

اسی دوران میں جیکب بھی ہانپتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بتایا "ہم نے ہوسٹل میں موجود گارڈز کو ریڈ لائن پر روک لیا ہے۔ اب وہ کیمپس کی طرف نہیں آ سکیں گے... لیکن ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کنگ کے کچھ اہم ساتھی بھاگ گئے ہیں۔ ان لوگوں کا فوری طور پر پکڑا جانا ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ ابھی اے کلب کے اندر ہی موجود ہیں۔"

"اگر اے کلب میں ہیں تو ابھی تک پکڑے کیوں نہیں گئے؟"

"ضرور یہاں کوئی خفیہ پناہ گاہ موجود ہے۔ بالکل جس طرح یہ آرائشی غار تھا..." جیکب نے اس غار کی طرف اشارہ کیا جس کے خودکار دروازے میں پھنس کر کنگ ہلاک ہوا تھا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان بھگوڑوں کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے... ورنہ وہ بکھرے ہوئے گارڈز کو پھر سے منظم کر لیں گے۔" پھر جیسے ایکدم جیکب کے ذہن میں کوئی بات آ گئی' وہ بولا "اگر کوئی ایسی پناہ گاہ موجود ہے تو پرنس داراب کو اس کی خبر ضرور ہو گی۔ میں اسے کال کرتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" پرنس پکڑا نہیں گیا؟"

جیکب کے ہونٹوں پر معنی خیز چمک ابھری۔ وہ بولا "پرنس... اپنا ہی بندہ ہے۔"

میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ جیکب کے ہاتھ میں وہ خون آلود خنجر ابھی تک موجود تھا جس سے اس نے دروازے میں پھنسے ہوئے کنگ کو ان گنت زخم لگائے تھے۔ اس نے خنجر کو رومال سے صاف کرنے کے بعد اپنی پنڈلی میں اڑس لیا اور واکی ٹاکی پر پرنس سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔

جونہی رابطہ ہوا' وہ دھیمے لہجے میں بات کرتا دوسری طرف چلا گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ پرنس کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر رہا ہے۔ میں حالات کی اس کروٹ پر حیران تھا۔ آستینوں میں کیسے کیسے خنجر چھپے ہوتے ہیں۔ جو ایک دو الفاظ میرے کانوں میں پڑے ان سے اندازہ ہوا کہ جیکب... پرنس داراب کو فوراً اے کلب پہنچ کے لیے کہہ رہا ہے۔

واکی ٹاکی بند کرنے کے بعد اس نے اپنے دو

محافظوں کو بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ پرنس داراب کو اپنی حفاظت میں لے کر یہاں پہنچ جائیں۔

قریباً دس منٹ بعد پرنس داراب اے کلب میں تھا۔ وہ جیکب کی طرف بڑھا' اس سے ہاتھ ملایا اور پھر دونوں تیزی سے کلب کے اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ جیکب کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم ایک راہداری سے گزرے۔ یہاں حسیناؤں کے بے جان لاشے پڑے تھے' ہر طرف شیشے کے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان مناظر سے نگاہیں چراتے ہوئے ہم ایک نشست گاہ میں پہنچے۔ لیکن نشست گاہ میں بھی بیٹھنے کی کوئی جگہ دکھائی نہیں دی۔ ہر طرف خون بکھرا تھا اور بارود کی بو تھی۔ یہاں ہم نے وہ بہت بڑا پینل بھی دیکھا جس کے سامنے قریباً چار درجن... ایل ای ڈی اسکرینیں نصب تھیں۔ ان اسکرینوں پر ہوسٹل اور کیمپس کے مناظر ہی دکھائی نہیں دیتے تھے' دنیا بھر کے چینل بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ ہمیں بیشتر اسکرینیں ٹوٹی ہوئی نظر آئیں۔ جو بچ گئی تھیں ان میں سے بھی زیادہ تر تاریک ہی تھیں۔ کنٹرول پینل کے سامنے کرسی پر ایک لڑکی اوندھی پڑی تھی۔ اس کی کمر میں چھرا گھونپا گیا تھا۔ وہ پینل کے اوپر یوں گری پڑی تھی جیسے کام کرتے کرتے تھک گئی ہو۔

ہم نشست گاہ سے آگے بڑھ کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچے۔ یہاں بھی چند اسکرینز نظر آ رہی تھیں اور مواصلاتی آلات بھی موجود تھے۔ ایک طرف آرام دہ نشستیں موجود تھیں۔ شیشے کی خوبصورت تپائی پر وسکی کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی پرنس داراب اور جیکب بغل گیر ہو گئے۔

"جیکب! کامیابی مبارک ہو" پرنس بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

"شکریہ! یہ تمہاری بھی کامیابی ہے" جیکب نے کہا۔

میں ان کے مسرور چہرے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا' یہ دونوں نہ جانے کب اور کیسے ملے ہیں' چپکے چپکے انہوں نے کس طرح سازش کا جال بنا ہے۔ پرنس داراب کو کنگ کا قریبی دوست سمجھا جاتا تھا۔ دوسری طرف جیکب بھی کنگ کے ہونہار وفاداروں میں سے تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ جیکب نے پرنس داراب کو شیشے میں اتارا ہے۔ وہ بے حد کائیاں تھا' نگاہوں نگاہوں میں بندے کا ایکسرے کر لیتا تھا۔ شاید اس نے پرنس میں بھی بے وفائی اور لالچ کے جراثیم دیکھ لیے تھے اور اس کے قریب چلا آیا تھا۔

"کیسے مراد؟" پرنس داراب نے پوچھا۔

"ایسے!" جیکب نے اپنی پنڈلی میں سے خنجر کھینچتے ہوئے داراب کی آنکھوں کے سامنے لہرایا' "وہ دروازے میں پھنس گیا تھا' اسی حالت میں اس خنجر نے چیر ڈالا اسے۔"

پرنس داراب نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ جیکب نے خنجر پھر سے پنڈلی میں اڑس لیا۔

"کوئی بچا تو نہیں نورتنوں میں سے؟" پرنس داراب نے پوچھا۔

"اسی لیے تو تمہیں بلایا ہے؟ کم از کم سات آٹھ بندے بچ گئے ہیں۔ اسمتھ سینٹر اور اسٹیفن وغیرہ بھی ان میں شامل ہیں۔ مجھے ایک سو دس فیصد یقین ہے کہ وہ کلب کے اندر ہی کہیں موجود ہیں۔ کیا یہاں نیچے کوئی پناہ گاہ موجود ہے؟"

پرنس داراب نے اثبات میں سر ہلایا "ایک پناہ گاہ موجود ہے اور مجھے بھی ایک سو دس فیصد یقین ہے کہ وہ وہیں ہوں گے۔"

"پناہ گاہ کا راستہ جانتے ہو؟"

"مجھ سے زیادہ اور کون جانے گا؟" پرنس داراب نے کہا اور دیوار سے آویزاں خودکار رائفل اتار لی۔

"کدھر جانا ہے؟" جیکب ہارڈ نے پوچھا۔

"اس دائیں جانب والے کوریڈور میں۔"

"ممکن ہے کہ یہاں گارڈز وغیرہ چھپے ہوں؟" جیکب نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"گارڈز مجھے کچھ نہیں کہیں گے" پرنس داراب نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ رائفل پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔

"گارڈز کیوں تمہیں کچھ نہیں کہیں گے؟" جیکب نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "گارڈز مجھے اس لیے کچھ نہیں کہیں گے... کہ میں کنگ براؤن ہوں' ان کا ان داتا' ان کا پالن ہار......"

پرنس داراب کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آواز پر غور کیا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کنگ براؤن کی آواز تھی۔ وہی منحوس لب و لہجہ جسے سنتے ہی نفرت کا شدید احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا تھا۔ یہ آواز میرے کان ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتے تھے۔

میرے ہاتھ تیزی سے رائفل کی طرف بڑھے "خبردار!" کنگ یا پرنس..... وہ جو کوئی بھی تھا' حلق کے بل دہاڑا "انگلی بھی ہلائی تو مارے جاؤ گے۔"

میں اور جیکب اپنی اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت رہ گئے۔ جیکب کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا اور آنکھیں حلقوں

سے اہلی پڑ رہی تھیں۔

کنگ براؤن..... ہاں وہ کنگ براؤن ہی تھا۔ وہ الٹے قدموں چلتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ وہ جیسے بیک وقت کمرے کی ہر شے پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ کچھ بھی اوجھل نہیں تھا اس کی نظروں سے۔ وہ جیکب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھنکارا "تم دو ٹکے کے پولیس مین..... تم نے کیا سمجھا تھا' کنگ کو دھوکا دے لو گے؟ تمہارے جیسے کنگر کنگ کی ٹھوکروں میں رہتے ہیں۔ ہم تمہاری موت کو دوسروں کے لیے مثال بنا دیں گے۔ مثال بنا دیں گے ہم....." اس کی آواز دیواروں میں گونج رہی تھی اور ہر شے میں سرایت کر رہی تھی۔

کنگ میک اپ میں تھا..... اور ایسا میک اپ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لندن آنے کے بعد میں نے کنگ براؤن کو پرنس داؤاب کے روپ میں دس پندرہ مرتبہ دیکھا تھا اور چند بار تو بہت قریب سے دیکھا تھا لیکن مجھے کبھی اس کے چہرے یا آواز پر ذرہ بھر شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ کسی بہت بڑے ہنرمند کی ہنرمندی کا نتیجہ تھا۔ جدید ٹیکنالوجی کا بے مثال نمونہ۔

یک لخت برق سی کوندگئی۔ جیکب ہارڈ نے دروازے کی طرف جست لگانے کی کوشش کی تھی۔ کنگ نے اس کے گھٹنوں پر برسٹ مارا اور وہ دروازے کے سامنے گر کر تڑپنے لگا۔

"کیا تمہارا ابھی کوئی ایسا ارادہ ہے؟" کنگ نے ٹھہری ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور رائفل کندھے سے اتار کر نیچے گرا دی۔

کنگ نے اپنی پاکٹ میں سے چھوٹے سائز کا لیکن نہایت طاقتور واکی ٹاکی نکالا۔ چند سیکنڈ بعد وہ سیکورٹی کے کسی بڑے آفیسر سے بات کر رہا تھا۔ کنگ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کچھ اس طرح تھا' "کہاں ہو.....؟"

دوسری طرف سے جواب آیا "ہمیں ریڈ لائن پر روکا گیا ہے سر!"

"ریڈ لائن پر دو سو جوتے رسید کرو۔ وی ٹرین کر کے زون نمبر آٹھ کے گیٹ نمبر 3-A پر پہنچو۔ 3-A کے سامنے جو دو ہاتھ دوم بند رہتے ہیں' وہ دراصل خفیہ راستے کی "انٹرنس" ہیں۔ وہاں سے آگے بڑھو اور کیمپس میں داخل ہو کر اسے کلب کے عقب میں پہنچ جاؤ۔ جلدی کرو' تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اوکے سر۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔"

"کلب کے اندر فائرنگ کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی ان بدمعاشوں نے بہت نقصان کیا ہے۔ کوئی شیشہ کوئی دیوار سلامت نہیں..... تم نائن فائیو استعمال کرو گے۔ تمہارے ماسک تمہارے ساتھ ہونے چاہئیں۔"

نائن فائیو کا ذکر میں کنگ کی زبان سے پہلے بھی سن چکا تھا اور ایک دفعہ مائیکل نے بھی ماؤ یا ٹرسٹ میں اس کا ذکر کیا تھا۔ یہ ایک نہایت زود اثر اعصابی گیس تھی جو لمحوں میں بندے کو مفلوج کر کے رکھ دیتی تھی۔ کنگ کے حکم کا مطلب یہی تھا کہ ابھی پانچ دس منٹ میں اسے کلب اس خوفناک گیس کی زد میں آنے والا ہے۔

جیکب ماہی بے آب کی طرح قالین پر تڑپ رہا تھا۔ میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتا تھا کہ جیکب کے دونوں گھٹنے بے کار ہو چکے ہیں۔ گولیوں نے اس کے جوڑ چکنا چور کر کے رکھ دیے تھے۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ لیکن یہ ساؤنڈ پروف کمرا تھا۔ اس کی آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا تھا' اس کی خبر باہر کسی کو نہیں تھی۔ شاید ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

"تم کون ہو؟" کنگ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں جیکب صاحب کا....."

"بکواس بند کرو" کنگ دھاڑا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ ٹرائیگر پر دباؤ بڑھا دے گا اور گولیوں کی بوچھاڑ میری طرف روانہ ہو جائے گی۔ "تم جیکب کے گارڈ نہیں ہو۔" اس نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رائفل کا رخ میرے سر کی طرف ہو گیا "بتاؤ۔ کون ہو تم؟"

"م..... میں..... آپ کو بتاتا ہوں۔ میں بتاتا ہوں" جیکب نے کراہتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام..... شاہ جہاں ہے۔ یہ وہی ہے جسے پکڑ کر میں یہاں لایا تھا..... یہاں جو کچھ ہوا ہے' یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ یہ کرنل ایڈی کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ م..... میں بھی اس کی باتوں میں آ گیا تھا..... بہک گیا تھا۔"

جیکب کی خون آلود انگلی میری طرف اٹھی ہوئی تھی اور وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

جیکب کے ہونٹوں سے میرا نام سن کر کنگ کی آنکھوں میں بے پناہ چمک آ گئی تھی۔ مجھے لگا کہ رائفل پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے بولا "بہت خوب..... بہت خوب' ہمارا دل بھی گواہی دے رہا تھا کہ ہمارے سامنے کوئی معمولی گارڈ نہیں کھڑا ہے" کنگ نے چند لمحے توقف کیا' اس کی انگلی ٹرائیگر پر تھی اور رائفل کی نال عین میرے سینے کی طرف۔

''کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ تم ہی شاہ جہاں ہو؟''

میں نے اپنی اصل آواز میں بولتے ہوئے کہا ''میں شاہ جہاں ہوں...... لیکن خود نہیں آیا لایا گیا ہوں اور اس کا ذمے دار یہی پولیس والا ہے'' میں نے لہولہان ٹانگوں والے جیکب کی طرف اشارہ کیا۔

''ہم جانتے ہیں' تم لائے گئے ہو۔ لیکن نہ بھی لائے جاتے تو تم نے آ ہی جانا تھا۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے' تم نے جلد یا بدیر آنا ہی آنا ہے۔ خوش آمدید مسٹر شاہ جہاں! ہمارے کچھ حسابات بے باق ہونے سے رہ گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کام نمٹانے کا یہ بہت اچھا وقت ہے۔ تم اچھے وقت پر آئے ہو۔ ہم ایک بار پھر تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور ہاں' تمہارا ایک ساتھی بھی تو تھا۔ وہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی ابھی تمہارے سامنے حاضر ہو جائے گا۔''

اچانک مجھے شور سنائی دیا۔ یہ شور اسے کلب کی عقبی جانب سے اٹھ رہا تھا۔ پھر خودکار رائفل کے چند زوردار برسٹ چلے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ کنگ براؤن اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس کی رائفل نے بدستور مجھے نشانے پر لے رکھا تھا۔ کنگ نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک الماری کھولی اور اس میں سے ایک گیس ماسک نکال کر چہرے پر چڑھا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب جلد ہی ٹاکن فائیو اپنا کام دکھانے والی ہے۔ ٹاکن فائیو کی بو میری توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ میرے نتھنوں تک پہنچی۔ میں نے اپنی سانس روکی لیکن ایسا کتنی دیر تک ہو سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے ذہن پر ایک زرد سی دھند چھانے لگی۔ ہاتھ پاؤں پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کنگ براؤن' پرنس داراب کے روپ میں کھڑا تھا۔ ناقابلِ شکست چٹان کی طرح۔ ہاں' یہی وہ شخص تھا جو ستمگری کے ہزار ہا ڈھنگ جانتا تھا۔ مجھے گانی گڑیوں' نینا' روپ اور رینکی کا خیال آیا۔ آج تک ہم یہی سمجھتے رہے تھے کہ یہ دونای کے پرنس داراب کی ہوس کا شکار ہیں لیکن آج پتا چلا تھا کہ ان معصوم گڑیوں کا گناہ گار بھی یہی کنگ براؤن ہے۔ وہ جو کچھ نینا کے ساتھ کرتا رہا تھا' وہ قابلِ شرم تھا اور جو کچھ ان دونوں بہنوں کے ساتھ کرنا چاہتا تھا وہ بھی قابلِ صد ملامت تھا۔ ایسی نہ جانے کتنی عصمت مآب لڑکیاں کنگ کی ستمگری کا ایندھن بنی تھیں' کتنے شیر جوان' کتنے معصوم بچے' کتنی عورتیں اس بردہ فروش کے چنگل میں پھنسی تھیں اور پیوندِ خاک ہوئی تھیں۔ منظر دھندلاتا گیا۔ کنگ براؤن اپنی جگہ کھڑا رہا لیکن میری بصارت بے کار ہو گئی۔ ایک سیاہ چادر سی نگاہوں کے سامنے تن گئی۔

اعصاب دوبارہ بحال ہوئے تو سارا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ خود فراموشی یا نیم بے ہوشی کا عرصہ نہ جانے کتنا تھا۔ بس یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک گھنٹا اس کیفیت میں گزرا ہوگا۔ شاید اس سے تھوڑا سا زیادہ۔ میں نے خود کو ایک بہت بڑی مستطیل بیرک کے سامنے ایک لاک اپ میں پایا۔ بیرک میں کم و بیش دو سو افراد بند تھے۔ یہ سب کے سب وہی مرد قیدی تھے۔ جنہوں نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کے چہروں پر چوٹیں نظر آرہی تھیں۔ کچھ کے لباس پھٹے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب بڑے غمزدہ انداز میں سر جھکائے بیٹھے تھے یا دیواروں سے ٹیک لگا کر کھڑے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو ابھی تک گیس کے اثر میں تھے۔ وہ فرش پر اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ بیرک کے گیٹ کے سامنے کرخت چہروں اور گھنی مونچھوں والے چوکس پہرے دار ٹہل رہے تھے۔ دو تین پہرے داروں کے ہاتھوں میں رسی آنکڑے (پھندے نما حلقے) نظر آرہے تھے جن کے ذریعے قیدیوں کو سلاخوں سے باہر سے ہی قابو کیا جاتا تھا' کھینچ کر سلاخوں کے قریب لایا جاتا تھا اور پھر دل ہلا دینے والی سزا دی جاتی تھی۔ میرے تصور میں کی یوکو کی مہلک شامیں شائیں گونجنے لگی۔

میں جس لاک اپ میں تھا۔ اس میں میرے علاوہ زریں گل تھا۔ موٹل تھا اور تین مزید افراد تھے۔ ہم تینوں کی طرح یقیناً یہ بھی اسپیشل قیدی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں بیرک میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ مجھے جیکب ہارڈ کا خیال آیا۔ نیم بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے اسے بڑی بری حالت میں دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ زندہ بھی تھا یا نہیں؟ مجھے یقین تو کہ کنگ اسے معاف نہیں کرے گا۔ زریں سر جھکائے مغموم بیٹھا تھا۔ اس کی ٹھوڑی سے ابھی تک وقفے وقفے سے خون کا قطرہ گر پڑتا تھا۔ رکھی لہجے میں کہنے لگا ''استاد صیب! یہ سب کیا ہوا۔ وہ جس حرامی کو جیکب نے دروازے میں پھنسا کر رکھا تھا...... وہ کون تھا؟ کیا وہ کنگ کا ڈوبلیمنٹ تھا؟''

''ڈوپلیمنٹ نہیں ڈپلیکیٹ......'' میں نے زریں کی انگریزی درست کی۔

''چلو جو بھی تھا...... لیکن یہ تو امارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔''

''جو کھیل ہم سب کھیل رہے ہیں' یہ دھوکے اور عیاری کا ہی ہے...... کیا میں تمہیں اپنی اصل شکل میں نظر آرہا ہوں؟''

''اب کیا ہوگا امارے ساتھ؟''

''جو برے سے برا ہو سکتا ہے...... آگے جو اوپر والے کو منظور۔''

اگلے چوبیس گھنٹے تک ہم لاک اپ میں سخت غیر یقینی کیفیت کا شکار رہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ٹاکن فائیو نامی جو اعصابی گیس اسے کلب میں استعمال کی گئی تھی اس کے اثرات ابھی تک ہمارے دل و دماغ پر موجود تھے۔ سر بھاری ہو رہا تھا ہاتھ پاؤں پر ہلکے فالج زدگی کی کیفیت تھی۔

زریں گل بولا ''استاد صیب! ام کو آپ کی طبیعت کا تو پتا نہیں لیکن امارا طبیعت بالکل ویسا ہو رہا ہے جیسا اسد کی پیدائش سے پہلے کلثوم کا تھا۔ دل کچا ہو رہا ہے۔ اچار کھانے کو دل چاہتا ہے۔''

میں نے کہا ''ایسی طبیعت کے بعد کلثوم کو بچے کی پیدائش کے تکلیف دہ عمل سے گزرنا پڑا تھا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ ام پر بھی بہت سخت تکلیف آنے والا ہے؟'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ خود ہی بولا ''استاد صیب! آپ اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ کا ساتھ ہو تو ام بڑی سے بڑی تکلیف اور مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ام کو آپ ہی کا قسم ہے استاد صیب! اگر امارے جسم کو سو بار ٹکڑے کیا جائے اور سو بار جوڑا جائے تو ام پھر بھی مسکراتا رہے گا...... کاش ام آپ کو اپنا دل چیر کر دکھا سکتا۔'' دل چیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ چیر پھاڑ کے سارے کام یہ لوگ خود ہی کریں گے اور شاید اس میں اب زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں ہی یہ ساری کارروائی مکمل ہو جائے۔''

''ام تو چاہتا ہے استاد صیب! جو کام کل ہونا ہے وہ آج ہو بلکہ ابھی ہو...... امارا پورا جسم پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہو جائے...... لیکن...... استاد صیب! آپ ام سے ایک وعدہ کرے......'' وہ ایک دم جذباتی لہجے میں بولا۔

''کیسا وعدہ؟''

''اگر ام کو کچھ ہو جائے تو آپ کلثوم اور اسد کے سر پر اپنا ہاتھ رکھے گا۔ انہیں اماری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ اماری آنکھوں کا یہ سب سے سنہرا خواب ہے کہ اسد پل بڑھ کر ایک خوب صورت جوان بنے اور پھر ایک دن آپ کے شانہ بہ شانہ نظر آ رہا ہو۔''

''شانہ بہ شانہ نہیں...... شانہ بہ شانہ...... کاش کے جذبہ۔''

''جی ہاں استاد صیب! ام یہی چاہتا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا ''امارا دلی خواہش ہے کہ اگر ام کو کچھ ہو جائے تو آپ ہمیشہ اسد کے ساتھ رہے۔''

''تم اپنے بچے کے لیے غلط دعا مانگ رہے ہو۔''

''کیا مطلب جناب؟''

''مرنے کے بعد بندہ روح کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اور تم چاہتے ہو کہ ایک روح ہر وقت اسد کے ساتھ رہے۔ اور اسد کے سر پر روح کا سایہ رہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ آپ روح بن جائیں گے؟''

''ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد یہی ہوگا۔''

''نہیں نہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ امارا یقین ہے۔''

''اور امارا یقین ہے خوچے...... کہ ام دونوں کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے زریں کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آئی۔ آنکھیں گہری سوچ میں غرق رہیں۔ موٹل نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا ''اب تو میرا دل بھی یہی چاہتا ہے جناب! کہ جو کچھ ہونا ہے جلد ہو جائے...... لیکن پتا نہیں کیا بات ہے۔ ہر طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔''

''چیخیں تو بہت دور دور کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔''

''لیکن اس وقت کچھ بھی کانوں تک نہیں پہنچ رہا۔''

''شاید یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔'' میں نے کہا۔ موٹل خاموش ہو گیا۔ زریں خاموش ہو گیا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دیواروں میں خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو لوگ یہاں نظر آ رہے ہیں وہ بھی خاموشی ہی کا حصہ ہیں۔ خاموشی کے اس جسم میں ایک بہت بڑا اندیشہ دل بن کر دھڑک رہا تھا۔ یہ اذیت ناک موت کا اندیشہ تھا۔ خوف کی شریانوں میں جان لیوا سوچ خون کی طرح حرکت کر رہی تھی۔ یہاں سینکڑوں بے بس قیدی تھے لیکن سب کی سوچ شاید ایک ہی تھی۔ سب کے ذہن میں غالباً ایک ہی سوال تیغ بن کر گڑا ہوا تھا۔ کل اس صدی کا سب سے بڑا بردہ فروش ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟

میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ چہرے پر جلن سی تھی۔ یہ میک اپ اتارے جانے کی وجہ سے تھی۔ آج صبح ہی میرا اور موٹل کا میک اپ اتار دیا گیا تھا۔ زریں پہلے ہی اپنی اصل شکل صورت میں تھا۔ میں بیٹھا رہا۔ کل پیش آنے والے واقعات کی فلم ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا وہ حیران

کن تھا اور رونا ک بھی۔ نوجوان قیدی سفیان کی قیادت میں قریباً پانچ سو بپھرے ہوئے افراد نے اے کلب پر شدید ترین حملہ کیا تھا اور وہ اے کلب کے زبردست سیکورٹی سسٹم کو تہس نہس کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کنگ براؤن بھی آٹومیٹک دروازے میں پھنسا تھا اور قتل ہوا تھا لیکن پھر اچانک پانسا پلٹا تھا۔ ہم پر انکشاف ہوا کہ مرنے والا کنگ براؤن نہیں اور نہ ہی ہمیں حاصل ہونے والی فتح حقیقی ہے۔ وہ سب ایک سراب تھا۔ جو شخص جیکب کے ہاتھوں ٹکڑے ہوا وہ کنگ کے بھیس میں کوئی عام شخص تھا۔ اس کے چہرے کو میک اپ کے ذریعے نہیں بدلا گیا تھا۔ وہ کنگ کا ہم شکل تھا۔ کنگ کی سیکورٹی کے لیے پتا نہیں اسے کہاں سے اور کیسے ڈھونڈا گیا تھا۔ جو تھوڑا بہت فرق اس کی شکل میں تھا وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے پورا کر دیا گیا تھا۔ کنگ براؤن کے چہرے پر ایک شاندار میک اپ تھا۔ اس میک اپ نے اسے پرنس داراب بنا رکھا تھا اور اب یہی "پرنس داراب" ہمارے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

وہ بڑی کشمکش اور شدید تناؤ کی رات تھی۔ ہر قیدی جانتا تھا کہ کل اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ ہمارے لاک اپ کے سامنے مستطیل بیرک میں قریباً دو سو افراد بند تھے۔ ہماری ہی طرح یہ لوگ بھی کنگ کے باغی تھے اور انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کنگ کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ اب وہ بھی کل کے "انجام" میں ہمارے ساتھ شریک ہونے والے تھے۔ بیرک کے سامنے زبردست پہرہ تھا۔ اسی طرح ہمارے لاک اپ کے باہر بھی ایک درجن مسلح گارڈز موجود تھے۔ جس طرح قربانی سے ایک رات پہلے قربانی کے جانوروں کی زبردست حفاظت کی جاتی ہے، اسی طرح ہماری "نگرانی" بھی عروج پر تھی۔ یوں تو نیلی وردیوں والے گارڈز سفاکی میں اپنی مثال آپ تھے لیکن پھر بھی مجھے دو چار گارڈز کی نگاہوں میں اپنے لیے ترس اور رحم کی جھلکیاں نظر آئیں۔ اس کیفیت کا تعلق یقیناً ہمارے کل والے انجام سے تھا۔ کل ... جو پل پل ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے بڑھتے رہنا تھا۔ جو ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ میرے ذہن کے پردے پر بار بار علی احمد اور پاشا کی شبیہہ ابھرتی تھی۔ علی احمد کی لاش تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور کئی روز تک اپنے اس بچھڑے ساتھی کا سوگ منا چکے تھے، لیکن پاشا کے بارے میں ابھی تک یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کل اے کلب پر حملے کے وقت بھی میں نے پاشا کی تلاش میں بہت نظریں دوڑائی تھیں لیکن اس کی صورت دکھائی دی تھی اور نہ اس کا کچھ پتا چلا تھا۔ درحقیقت پچھلے دو تین ہفتے میں میں نے پاشا کے بارے میں جاننے کی کئی کوششیں کی تھیں لیکن سب ناکام ہوئی تھیں۔

ہم سب اپنی اپنی جگہ چپ تھے۔ اپنے اپنے پیاروں کی شکلیں نگاہوں میں گھومتی تھیں۔ اپنی اپنی محروقت نگاہوں کے روبرو تھی۔ یادوں کے البم آنکھوں کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔ ہاں یہ ایک گمبھیر سناٹا تھا۔ مجھے کئی برس پہلے کی ایک جیل یاد آگئی۔ جیل کی بیرکوں میں جب ایسا ہی سناٹا چھا تا تھا اور بام و در میں چاندنی سسکتی تھی اور گدلے فرش پر آہنی سلاخوں کے سائے رینگتے تھے تو اچانک ایک آواز خاموشی کو چیرتی ہوئی بلند ہوتی تھی اور رات کی جھیل میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ یہ درد بھری آواز ایک جیل کے پرانے قیدی نور محمد کی ہوتی تھی۔ وہ گاتا تھا کدی آمل وانجھن وے، میں لگ لگ نیر بہا لواں

"تجھے سب میرے دردی وے، کنوں دل دا حال سناواں"

آج بھی دل چاہ رہا تھا کہ کہیں سے نور محمد کی آواز بلند ہو۔ میں آنکھیں بند کر لوں۔

غزالہ کا تصور میرے ذہن کے پردے پر جم جائے اور میری آنکھوں کے گوشوں سے گرم گرم آنسو نکل کر میرے رخساروں پر لڑھکنے لگیں ..... لیکن یہاں نور محمد تھا، نہ اس کی آواز تھی، اور نہ ہی شاید گرم گرم آنسو باقی بچے تھے۔ سب ہی کچھ محروقت کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔ وقت کی گرد سے لدی ہوئی ایسی تیز آندھیاں چلی تھیں کہ کئی زمانے ان کے نیچے دفن ہو گئے تھے۔

اور پھر دن چڑھ گیا۔ سورج تو نجانے کن آسمانوں پر چمکتا تھا۔ ہمیں صرف گھڑیوں کے ذریعے ہی معلوم ہوتا تھا کہ دن طلوع ہوا ہے اور رات سر پر آ گئی ہے۔ حسب معمول بیرک میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ ہمارے لاک اپ کے سامنے بھی کھانے کی ٹرالی آ گئی۔ مغموم قیدیوں میں سے بہت کم نے کھایا۔ دس بجے کے لگ بھگ قیدیوں کو بیرک سے باہر نکالنے کا عمل شروع ہوا۔ قریباً ایک سو قیدیوں کو باہر نکالا گیا۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے، اور انہیں تین تین کی ٹولیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہمیں بھی لاک اپ میں سے نکالا گیا۔ ہم بھی تین تین کی دو ٹولیوں میں تھے۔ زریں گل اور موٹل ایک ٹولی میں تھے جبکہ میں دوسری میں تھا۔ آنے والے خطرے کی بو سونگھ کر کئی قیدیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے اور وہ گارڈز کی منت سماجت پر اتر آئے تھے۔ میں نے ایک لیے حبشی قیدی کو بھی دیکھا جو رو رہا تھا اور مایوسی کے عالم میں

سفیان کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو مصیبت ان پر نازل ہو رہی ہے اس کا سبب سفیان تھا۔ نہ وہ انہیں جوش دلاتا اور بھڑکاتا اور نہ وہ بغاوت میں شریک ہوتے۔ سفیان خود قیدیوں میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پرسوں کے معرکے میں زخمی ہوا تھا اور اب قیدی کی حیثیت سے اسپتال میں تھا۔

ہمیں گارڈز کے سخت پہرے میں اے کلب کے اندر لے جایا گیا۔ دو دن پہلے اے کلب کے اندر اور گرد و نواح میں جو زبردست ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اس کی مرمت وغیرہ کر دی گئی تھی پھر بھی کہیں کہیں شکست و ریخت کے آثار نظر آتے تھے۔ مرمت اور بحالی کا کام اب بھی تیزی سے جاری تھا۔ مختلف راستوں سے گزار کر ہمیں اے کلب کے مصنوعی سبزہ زار میں لایا گیا۔ اس سبزہ زار میں روشنیوں کی مدد سے دھوپ چھاؤں کا حیران کن منظر تخلیق کیا گیا تھا۔ بالکل دوپہر کا وقت دکھائی دیتا تھا۔ سبزہ زار میں ایک طرف درجنوں کرسیاں موجود تھیں۔ دوسری طرف سبزہ زار کے بیچوں بیچ لوہے کا ایک چوکور پنجرہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ پنجرہ بمشکل تین ضرب پانچ فٹ کا ہوگا۔ ایک ایسا ہی بڑا پنجرہ کرسیوں کے قریب موجود تھا۔ یہ ایک بڑی بیرک کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ تمام کے تمام سو قیدیوں کو اس بڑے پنجرے میں ٹھونس دیا گیا۔ ہم بھی ٹھونسے جانے والوں میں شامل تھے۔

جھل کھیل قریباً ایک گھنٹے بعد شروع ہوا۔ اس وقت تک تماشائیوں کی تمام کرسیاں پر ہو چکی تھیں۔ تماشائیوں میں کنگ براؤن خود بھی شامل تھا۔ وہ اب اپنی اصلی شکل و صورت میں پایا جاتا تھا۔ ایک بڑا کنٹینر بھی موقعے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کنٹینر میں درجنوں کتے بند تھے۔ یہ خوفناک شکلوں والے وہی جسیم کتے تھے جن کی کارکردگی ہم اس سے پیشتر ٹی وی اسکرین پر ملاحظہ کر چکے تھے۔ کتوں کو دیکھ کر بہت سے قیدیوں کے رنگ زرد پڑ گئے تھے اور ان کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بیٹھ گئے تھے اور ان میں سے بہت سوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

زریں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "کنگ جیسے شیطان سے ایسا ہی امید کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں وہی کچھ ہونے والا ہے جو چند دن پہلے ہم نے ٹی وی اسکرین پر ملاحظہ کیا تھا۔ شاید اب ہمارے ساتھ ہونے والا سلوک بھی دوسروں کو ٹی وی اسکرین پر دکھایا جائے گا۔"

"چلو اس بہانے تمہارا ٹی وی پر آنے کا شوق تو پورا ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

بدترین حالات کے باوجود موٹل کے خشک ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔ تین سیاہ فام بردوں کی ایک ٹولی کو ایک خوفناک کتے کے آگے چھوڑا گیا۔ تینوں بردوں کی ایک ایک کلائی ایک ہی زنجیر سے منسلک تھی۔ ان تینوں بردوں کو خوں خوار کتے سے اپنی جان بچانے کے لیے قریباً پچاس میٹر دور چھوٹے پنجرے تک پہنچنا تھا۔ اگر وہ پنجرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس جاتے تو ان کی جان بچ سکتی تھی۔ یہ پچاس میٹر کا فاصلہ دراصل زندگی اور موت کا فاصلہ تھا۔ جونہی تینوں بدنصیب قیدیوں کو چھوڑا گیا وہ تیزی سے پنجرے کی طرف لپکے اس کے ساتھ ہی جسیم کتا بھی بجلی کی طرح ان کے پیچھے گیا۔ یہ مقابلہ بڑا بھیانک ثابت ہوا۔ وحشت زدہ قیدیوں میں سے ایک چند گز آگے جا کر ہی منہ کے بل گرا۔ باقی دو ساتھیوں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کی مگر کتا آندھی کی رفتار سے ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے گرے ہوئے شخص کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ گارڈز نے اس یک طرفہ مقابلے کو ختم کرنے کے لیے باقی دونوں کتے بھی چھوڑ دیئے۔ لرزہ خیز چیخیں گونجیں کتے اور انسان گتھم گتھا ہوئے۔ ان کے درمیان سرخ رنگ اچھلتا ہوا دکھائی دیا اور ایک منٹ کے اندر اندر سب کچھ ختم ہو گیا۔ خون سے لتھڑی ہوئی تھوتھنیوں والے کتے زنجیروں کے ذریعے پیچھے کھینچ لیے گئے۔ ایک گارڈ نے خودکار رائفل سے چند راؤنڈ چلائے اور نزع کی حالت میں اینٹھتے ہوئے افراد ساکت ہو گئے۔

ہر طرف دہشت کی حکمرانی تھی۔ بیرک نما پنجرے میں بند افراد پتھرا ہوئے تھے۔ ان کے حلق چیخوں سے محروم ہو چکے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے خالی ہو چکی تھیں۔

اگلے دو گھنٹے میں یہی ہولناک منظر معمولی تبدیلی سے کم و بیش پندرہ مرتبہ دہرایا گیا۔ پندرہ سولہ ٹولیوں میں سے کوئی ایک بھی اپنی جان بچانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ چند افراد دروازے تک پہنچے بھی لیکن ان کے اندر گھسنے سے پہلے ہی باقی کتے بھی چھوڑ دیئے جاتے تھے، یوں ان بدنصیبوں کے ساتھ ٹوٹی کہاں کمند والا حساب ہو جاتا تھا۔ ہر دفعہ تین انسانوں کے مقابلے میں تین کتے جیتے اور سرخرو ہو کر واپس آئے۔

پنجرہ نما بیرک میں بند افراد میں سے آدھے لقمۂ اجل بن چکے تھے اور آدھے اپنی باری کے منتظر تھے۔ ان میں ہم بھی شامل تھے۔ ہمیں بھی تین تین کی ٹولیوں میں بانٹا جا چکا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں زریں گل اور موٹل مجھ سے علیحدہ تھے اور ایک دوسری ٹولی میں تھے۔

موٹل نے پتھرائے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے لگتا ہے

جناب! کہ ہماری باری آپ سے پہلے آئے گی۔''
''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' میں نے کہا۔
''آپ کے ذہن میں کوئی پلاننگ ہے؟'' موبل نے پوچھا۔
''وہی پلاننگ ہے جو ڈوبنے والے شخص کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اسے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا ہوتے ہیں..... اور بس۔''
''کتوں سے بھاگنے کی بجائے اگر رک کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ زنجیر وغیرہ سے ان کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی جائے..... ؟''
میں نے کہا ''یہ بات ذہن سے نکال دو کہ جو بچ کر پنجرے تک پہنچ جائیں گے کنگ انہیں چھوڑ دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اور ہم ان سو قیدیوں میں سے تو وہ کسی کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ناٹ ایٹ آل!''
''آپ کا مطلب ہے کہ انہیں شوٹ کر دیا جائے گا......''
میرے جواب دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی انچارج گارڈ نے گرج کر ہمیں خاموش کرا دیا۔
ایک نئی ٹولی کو بیرک نما پنجرے سے باہر نکالا جا رہا تھا۔ ان میں دو سری لنکن تھے اور ایک غالباً فلپائنی تھا۔ پستہ قد سانولے سری لنکن رو رو کر ہلکان ہو رہے تھے۔ وہ بار بار گارڈز کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے تھے اور ''بے رحم ٹھوکریں'' کھاتے تھے۔ تاہم فلپائنی حوصلے سے کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر اپنے انجام کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سری لنکن بے ہوش ہو گیا۔ گارڈز نے اسے ٹولی سے علیحدہ کر کے بیرک میں بند کر دیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا قیدی ٹولی میں شامل کر دیا۔ ان تینوں تیرہ بختوں کا انجام بھی وہی ہوا جو اس سے پہلے قریباً تین درجن افراد کا ہو چکا تھا۔
اور پھر قیامت کی گھڑیاں سر پر آ گئیں۔ اس ٹولی کی باری آ گئی جس میں زوبی اور موبل شامل تھے۔ گارڈز نے بیرک کے باہر سے ہی موبل کی گردن میں چین کا آنکڑا ڈالا اور اسے کھینچ کر بیرک کے دروازے کے پاس کر لیا۔ میں نے زوبی کا چہرہ دیکھا۔ وہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ اگر کہیں زندگی نظر آتی تھی تو وہ اس کی آنکھوں میں تھی۔ یہ آنکھیں بار بار میری آنکھوں سے چار ہوتی تھیں اور مجھ سے کچھ کہتی تھیں ''یہ درد..... یہ اذیت..... یہ موت..... کچھ نہیں ہیں استاد صیب..... یہ چیزیں ہزار گنا شدت کے ساتھ بھی آ جائیں تو آپ کے زوبی کے حوصلے کو توڑ نہیں سکتیں۔''

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ جنوبی میدان میں [illegible] کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔ یہ تین افراد بس برائے نام مزاحمت ہی کر سکے تھے..... اب زوبی، موبل اور ان کے ساتھی کی باری تھی۔ میں نے زوبی کو ہمیشہ دوسروں سے بچانا چاہا تھا۔ اسے دماغ ٹھنڈا رکھنے کی نصیحت کی تھی، مگر آج تو اس قسم کی نصیحت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔
اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ میں نے کنگ براؤن کو اپنی نشست سے اٹھتے دیکھا۔ اس کے اٹھتے ہی دیگر ''معززین'' نے بھی نشستیں چھوڑ دیں۔ محفل برخاست ہو رہی تھی۔ بیرک میں بند تمام بردوں کے پتھرائے ہوئے چہروں پر زندگی دوڑ گئی۔ کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن وہ موت سے بچ گئے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ موت چند گھنٹے آگے بھی چلی جائے تو انسان خوشی محسوس کرتا ہے۔ ''یہ کیا ہوا استاد صیب؟'' زوبی نے حیران لہجے میں پوچھا۔
''لگتا ہے کہ تمہاری قسمت میں تھوڑی سی اور نسوار کھانی لکھی ہوئی ہے۔''
''لیکن ام تو ایسا نہیں چاہتا ہے۔'' وہ تہہ دل سے بولا ''ام تو چاہتا ہے کہ جو ہونا ہے جلدی سے ہو جائے۔''
''مگر ہمیں مارنے والے ایسا نہیں چاہتے۔ وہ ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکا کر ہماری اذیت کو طول دینا چاہتے ہیں۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''
واقعی ہماری اذیت کو طول دیا گیا تھا۔ باقی کا تماشہ کل اسی سبزہ زار میں ہونا تھا۔ ہمیں ہمارے لاک اپ میں واپس پہنچا دیا گیا۔ باقی ماندہ قیدیوں کو بھی مستطیل بیرک میں بند کر دیا گیا۔ اب ایک اور دوبھر رات ہمارے سر پر تھی۔ ایک طویل اور بھاری بھرکم رات جس نے ہمیں روندتے ہوئے گزر جانا تھا..... اور پھر رات نے ہمیں روندنا شروع کر دیا۔ وہی پُراندیش خاموشی تھی، وہی دل خون کر دینے والا سناٹا تھا۔ کل پہلی باری شاید موبل اور زوبی ہی کی تھی۔ کتنا ہولناک خیال تھا یہ۔
پھر اس سناٹے کو چند لرزہ خیز چیخوں نے توڑا۔ کہیں پاس ہی کسی بیرک میں نوجوان عورتیں اور لڑکیاں چیخ رہی تھیں۔ ان چیخوں کے ساتھ گاہے گاہے مدہوش مردوں کے قہقہے بھی کانوں میں پڑتے تھے۔ ہمارے لاک اپ کے سامنے پہرہ دینے والے اکثر گارڈز کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹیں ابھر آئی تھیں۔ وہ آپس میں رازدارانہ تبصرے کر رہے تھے۔
''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے ایک گارڈ سے پوچھا۔

''جرم و سزا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''کون لوگ تھا یہ؟''
''جن کے مردوں نے جیل توڑی اور محترم کنگ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی جرأت کی۔''
میں خاموش ہو گیا۔ یہاں جنگل کا قانون تھا۔ یہاں بربریت کی حکمرانی تھی۔ یہاں سب کچھ ممکن تھا۔ بے بس عورتیں شرابی مردوں کے چنگل میں آہ و بکا کرتی رہیں۔ رات کے اس سناٹے میں شیطان ننگا ہو کر ناچتا رہا اور انسانیت سسکتی رہی۔ رونے پکارنے والی آوازوں میں کچھ نہایت کم سن محسوس ہوتی تھیں۔ ان کی فریاد سن کر کلیجہ شق ہو جاتا تھا۔
اچانک میری نگاہ موبل کے چہرے پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں اور آنکھیں بند تھیں۔ اس پر وہی ہیجانی کیفیت طاری تھی جو اس کی سوچ کو پر لگاتی تھی اور اس کی پرواز کو عقابی رنگ دیتی تھی۔ وہ اردگرد کے ماحول سے یکسر کٹا ہوا تھا۔ وہ کہیں اور تھا..... وہ یہاں نہیں تھا۔ ہرگز نہیں تھا۔ وہ کچھ اور دیکھ رہا تھا، کچھ اور سن رہا تھا۔ ایک لرزہ سا تھا اس کے چہرے پر۔ زوبی بھی حیرانی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔
''کیا بات ہے موبل؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
میری آواز سن کر بھی اس نے آنکھیں بند رکھیں۔ میں نے اپنے الفاظ دہرائے۔ ایک بار پھر دہرائے۔ موبل کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔
''وہ اٹھ رہے ہیں..... وہ حرکت کر رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں..... وہ میری آنکھوں کے بالکل سامنے ہیں۔''
''کون اٹھ رہے ہیں۔ کون تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے جیسے میری آواز سنی ہی نہیں۔ اسی کھوئے ہوئے لہجے میں بولا ''وہ اٹھنے میں ان کی مدد کر رہی ہے۔ انہیں سہارا دے رہی ہے۔ وہ خود بھی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی ہیں لیکن وہ اٹھ جائیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا اٹھنا ضروری ہے۔ اگر وہ اٹھ کر بیٹھ نہ سکے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ کچھ نہیں ہو سکے گا۔''
میں نے موبل کو شانوں سے تھام کر ہولے سے جھنجوڑا ''موبل! تم کس کی بات کر رہے ہو؟''
موبل کی بند آنکھوں میں تھوڑی سی درز پیدا ہوئی۔ خدا کی پناہ۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُراسرار چمک تھی اور وہ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا ''محترم بوکا رلو..... محترم بوکا رلو..... وہ اٹھ رہے ہیں۔ وہ حرکت میں آ رہے ہیں۔ استاماں انہیں سہارا دے رہی ہے۔''
میری آنکھوں کے سامنے ہڈیوں کا وہ ناقابل شناخت ڈھانچا گھوم گیا جسے چند روز پہلے ہم نے اے کلب کے نیچے واقع غلیظ تہ خانوں سے نکالا تھا۔ وہ محترم بوکا رلو تھا۔ اس قریب المرگ شخص کو ہم نے جیکب کے اپارٹمنٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اے کلب کے خونی معرکے کے بعد جب ہم سب پکڑے گئے تو محترم بوکا رلو تب بھی جیکب کے اپارٹمنٹ میں موجود تھا۔ اپارٹمنٹ کی اندرونی گیلری میں کاٹھ کباڑ کے پیچھے موبل نے محترم بوکا رلو کا بستر بچھا رکھا تھا اور بوڑھی ڈاکٹر استاماں روزانہ وہیں پر آ کر محترم بوکا رلو کو دیکھ رہی تھی۔
موبل اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ کچھ دیر بعد پھر پُراسرار انداز میں ہلنے لگے۔ سرسراتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی ''وہ بڑی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے جسم میں ہمت نہیں۔ وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر جتن کر رہے ہیں۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے ان کا بیٹھنا بہت ضروری ہے، لیکن..... لیکن ان کی ریڑھ کی ہڈی زخمی ہے۔ وہ بیٹھ نہیں پا رہے۔ ڈاکٹر انہیں سہارا دے رہی ہے۔ وہ بھی سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔ یہ بڑے مشکل لمحے ہیں جناب..... یہ بڑے مشکل لمحے ہیں.....''
موبل کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ اس کی سانولی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں اور بند پلکیں لرز رہی تھیں پھر اچانک اس کے چہرے پر بے پایاں طمانیت کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ لرزتی سرگوشی میں بولا ''وہ بیٹھ گئے ہیں۔ وہ دیوار کا سہارا لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں شانوں سے تھاما ہوا ہے۔''
چند سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ زوبی اور موبل سمیت، ہم لاک اپ میں کل چھ افراد تھے۔ ہم سب کے سب موبل کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ مصیبت زدہ لڑکیوں اور عورتوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں اور مدہوش مردوں کے قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے، لیکن ہمارے لیے یہ ساری آوازیں اب پس منظر میں چلی گئی تھیں۔ اچانک موبل نے اپنی گردن کو جھکایا اور سر گھٹنوں میں دے لیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی محویت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا سر غیر محسوس طور پر ہلتا تھا، جیسے وہ کچھ سن رہا ہو۔ جدید علوم، علم البدن اور سائنس وغیرہ کے حوالے سے دیکھا جاتا تو یہ سب واہمہ لگتا تھا لیکن یہ واہمہ نہیں تھا۔ تاریک براعظم کے سفر میں ایسا بہت کچھ میرے سامنے آیا

تھا جو ناقابلِ یقین ہونے کے باوجود ٹھوس حقیقت تھی۔ جو کیفیت موئل پر طاری تھی وہ میں پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے دو چند ایک موقعوں کو میں نے اسی احوال میں پایا تھا۔

موئل کے بدن پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ گمبھیر آواز میں بولا "ہم سب کو چھوٹے کمرے میں گھسنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

موئل جسے چھوٹا کمرا کہہ رہا تھا وہ دراصل لاک اپ کے اندر ہی ایک چھوٹا سا ٹارچر سیل تھا۔ یہ بالکل ایئر ٹائٹ تھا۔ میں نے کہا "چھوٹے کمرے میں کیا ہے؟"

وہ عجیب لہجے میں بولا "مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔ پلیز.... جو میں کہتا ہوں وہ کرتے جائیں۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

"لیکن....."

"پلیز.... کوئی سوال نہ کریں۔" اس نے خوابیدہ لہجے میں میری بات کاٹی "آپ سمجھیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ میں نہیں کہہ رہا کوئی اور کہہ رہا ہے۔ آپ نہیں جانتے یہاں کیا ہونے والا ہے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے شاید..... آپ کو خدا کا واسطہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرتے جائیں۔"

موئل کے لہجے میں کچھ ایسی التجا تھی اور کچھ اس طرح کا خوف تھا کہ میں خواہش کے باوجود کوئی سوال نہ کر سکا۔ زریں گل سمیت دیگر افراد بھی ہونقوں کی طرح موئل کو دیکھ رہے تھے۔

موئل نے پُرتشویش لہجے میں کہا "ہم سب کو چھوٹے کمرے میں جانا ہوگا۔ یہاں لاک اپ میں جو بچا کھچا کھانا ہے وہ بھی اندر لے جانا ہوگا.... اور پانی..... اور کمبل..... یہ سب کچھ جلدی کرنا ہوگا۔ جلدی کریں پلیز..... وقت بہت کم ہے..... میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کانوں سے سن رہا ہوں۔ ہمارے محترم بوکارلو..... عظیم بوکارلو.... بیٹھ چکے ہیں..... دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر اسناماں نے انہیں سہارا دے رکھا ہے..... محترم بوکارلو کا ہاتھ ان کے سینے پر ہے۔ دل کے مقام پر..... ان کی آنکھیں بند ہیں.... ان کا ذہن..... ان کا ذہن..... دوا کے نشے سے آزاد ہے۔ آج وہ سوچ سکتے ہیں۔ اپنے اندر کی بے بہا طاقت کو حرکت میں لا سکتے ہیں۔ وہ اس کو حرکت میں لانے والے ہیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے..... آپ جلدی کریں....." وہ ہیجانی انداز میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی باتوں کو نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔

لاک اپ میں کھانے کے چھ سات ڈبے پڑے تھے۔ ایک ڈبے کو تو ہاتھ ہی نہیں لگایا گیا تھا، باقیوں میں بھی کافی کھانا موجود تھا۔ میں نے لاک اپ کے ساتھیوں سے کہا "یہ کھانا کمرے میں پہنچا دو۔"

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے زریں کے ساتھ مل کر کمبل اور دیگر اشیا اندر پہنچا دیں۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے استاد صیب..... کیا موئل کو کسی طرح کا دماغی دورہ پڑا ہوا ہے؟" زریں نے پوچھا۔

"یہ دورہ نہیں ہے۔ تم اسے خاص قسم کی ذہنی حالت کہہ سکتے ہو..... باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔"

"کچھ ہو یا نہ ہو..... لیکن ام مرنے کی پوری تیاری کر چکا ہے استاد صیب۔ ام یہاں سے اپنا زندگی بچا کر نہیں لے جائے گا۔ ام کنگ کو مار دے گا اور خود بھی مر جائے گا۔"

"پھر وہی پٹھانوں والی بات کر رہے ہو۔ اگر کنگ مر گیا تو پھر تمہیں اپنی جان گنوانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم یوں کہہ سکتے ہو کہ کنگ کو مار دو گے یا خود مر جاؤ گے۔"

دو تین منٹ کے اندر ہم نے اپنی ضرورت کی بیشتر اشیا چھوٹے سے ٹارچر سیل میں ٹرانسفر کر دیں۔

اپنی عجیب ذہنی کیفیت کے زیرِ اثر موئل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں کو حرکت دی اور طائرانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کسی قریبی بیرک میں شیطانی کھیل ہنوز جاری تھا۔ شیطانی کھیل میں شریک ہونے والی کسی عورت کو کوئی بوکو سے بچا جا رہا تھا۔ گاہے گاہے جام ٹکرانے اور شیشے ٹوٹنے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ ایک دیوانہ سا میوزک بج رہا تھا۔ اس میوزک میں کراہیں دب دب کر رہ جاتی تھیں۔ یہ وحشت کی انتہا تھی اور مجھے پھر وہی جملہ یاد آ رہا تھا۔

"ظلم بڑھتے بڑھتے انتہا کو چھو لیتا ہے، اور جب انتہا ہو جاتی ہے تو پھر انقلاب آتے ہیں۔ حیران کن تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔"

موئل کے کندھوں پر کمبل تھا، وہ ڈگمگاتا ہوا سا لاک اپ کی سلاخوں کے پاس چلا گیا۔ اس نے گارڈز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم سب کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ یہ تمہارے لیے تو بہ کا وقت ہے۔ اگر خود کو بچانا چاہو تو اب بچا سکتے ہو میری بات کو مذاق نہ سمجھو۔ میں وہی کہہ رہا ہوں..... جو ہو..... رہا ہے..... جو ہونے لگا ہے۔"

گارڈز قدرے حیرت اور قدرے تجسس سے موئل کا منہ

ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ انچارج گارڈ نے ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے موئل کو جھڑک کر سلاخوں سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ موئل نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی جاودانی آواز میں گارڈز سے مخاطب ہو کر بولتا چلا گیا "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اس سامنے والی بیرک کے اندر چلے جاؤ اور اس کی سلاخوں کو ڈھانپ دو۔ ہاں ڈھانپ دو اس کی سلاخوں کو..... یہ بہت ضروری ہے..... ڈھانپ دو اس کی سلاخوں کو....."

سلاخوں کو ڈھانپنے سے موئل کی مراد یہ تھی کہ بیرک کی سلاخوں کے سامنے واقع شٹر کو نیچے گرا دیا جائے۔ یوں بیرک بھی بالکل بند ہو جاتی۔ کوئی شے بیرک کے اندر جا سکتی اور نہ باہر آ سکتی۔

گارڈز موئل کی بات سنی ان سنی کرتے رہے۔ اسے جھڑکتے رہے اور آنکڑے کی مدد سے اسے پیچھے دھکیلتے رہے۔ وہ وجد کے عالم میں بولتا رہا۔ اپنی بات پر اصرار کرتا رہا۔ زچ ہو کر انچارج گارڈ نے موئل کے چہرے پر چند ضربیں لگائیں اور اسے فرش پر گرا دیا۔

موئل چند لمحے ساکت رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اس بہتے ہوئے خون سے بالکل بے پروا تھا۔ اس کی آنکھیں کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں۔ بہت فاصلے پر..... اس کے زخمی ہونٹوں نے ہلنا شروع کیا "وہ آ رہے ہیں۔ وہ سب آ رہے ہیں۔ وہ حرکت کرنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔"

"کہاں چلنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے کمرے کے اندر.... جلدی کرو..... چھوٹے کمرے کے اندر۔"

وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم سب کمرے کے اندر تھے۔ لاک اپ کے سامنے موجود گارڈز الجھے الجھے انداز میں ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے چند نے موئل کی باتوں کو سنجیدگی سے لیا ہو لیکن اکثریت اسے دماغی فتور سمجھ رہی تھی۔ ٹارچر سیل میں گھستے ہی موئل نے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کا انداز ہیجانی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ ایک تیز چیخ سنائی دی۔ کوئی دوشیزہ وحشی بردہ فروشوں کے ہاتھوں اپنی آبرو سے محروم ہوئی تھی۔ ایک گندا قہقہہ اچھلا..... کسی نے خود کو فاتح محسوس کیا تھا..... کوئی مفتوح ہو کر رہ گیا تھا۔

چند لمحے کے لیے خاموشی رہی، پھر ایک عجیب سی صدا میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ یہ ایک گونج سی تھی۔ جیسے بہت سی آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی ہوں۔ ایک پُرشور لہر کی طرح یہ آواز دھیرے دھیرے واضح ہوتی گئی اور قریب آتی گئی۔ اچانک ہمارے جسموں میں سنسنی کی سرد لہریں دوڑ گئیں۔ واضح ہونے کے بعد یہ آواز قابلِ شناخت ہو گئی تھی۔ یہ ایک آواز نہیں تھی۔ یہ سیکڑوں آوازوں کا مجموعہ تھا۔ یہ ان خوفناک کتوں کا غصیلا شور تھا جو چند دن پہلے بڑے بڑے کنٹینروں میں یہاں لائے گئے تھے اور جن کی دہشت کی کچھ جھلکیاں ہم نے کل بھی دیکھی تھیں۔ یہ شور ایک سیلاب بے اماں کی طرح ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ سیکڑوں بھاری بھرکم جانوروں کے بھاگنے سے ایک گڑگڑاہٹ در و دیوار میں نمودار ہوئی تھی پھر یہ گڑگڑاہٹ اور گونج ایک ہی سمت میں بڑھنے کی بجائے چاروں طرف پھیلنے لگی۔ خونخوار جانوروں کی آوازیں اب دیواروں کو چیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کی آوازوں میں خونی پھنکار تھی اور حملہ کرنے کا انداز تھا۔ وہ حملہ کر رہے تھے۔ ان کے بھاری بھرکم وجود مختلف اشیا سے ٹکرا رہے تھے۔ ہر طرف توڑ پھوڑ مچی ہوئی تھی۔

"یہ سب کیسے ہو گیا موئل۔ یہ کتے تو پنجروں میں تھے۔ یہ کیسے نکل آئے؟" میں نے موئل سے پوچھا۔

اس نے جیسے میری آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ گہرے مراقبے میں تھا۔ اب یہ بات خود بخود میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے موئل نے ہمیں لاک اپ سے ٹارچر سیل میں منتقل ہونے کو کیوں کہا تھا۔ وہ پیش آمدہ لمحوں سے آگاہ تھا۔ یقیناً اپنی ماورائی صلاحیتوں کے طفیل وہ غیر موجود چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید چند برس پہلے کوئی مجھ سے مافوق الفطرت صلاحیتوں اور ماورائی حالات کے بارے میں بات کرتا تو میں اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیتا، لیکن گلگت کی وادی موت اور تاریک ہرا عظیم کی اسراریت دیکھنے کے بعد میری سوچوں کو انقلابی تبدیلی سے گزرنا پڑا تھا۔ میں ذہنی طور پر معترف ہو گیا تھا کہ اس کائنات میں ان گنت رازہائے سربستہ ایسے ہیں جن تک ابھی انسانی شعور کی پہنچ نہیں اور شاید ہزاروں برس تک نہ ہو۔ جسم کے حوالے سے ہمارا علم شاید کافی آگے جا چکا ہے لیکن ذہن اور روح کے حوالے سے ہم ابھی ایک بے کراں سمندر کے کنارے کھڑے ہیں۔ جو کچھ موئل محسوس کر رہا تھا اس کا ثبوت بڑی سرعت سے ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ نہ ماننے والے کے لیے تو بڑی سے بڑی حقیقت بھی افسانہ ہوتی ہے لیکن ہمارے لیے موئل کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

کتوں کی بھیانک آوازوں میں اب لرزہ خیز انسانی

چیخیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ یہ چیخیں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ گاہے گاہے فائرنگ کی آوازیں بھی آرہی تھیں پھر ہم نے محسوس کیا کہ خونخوار کتوں کی تھوتھنیاں ہمارے لاک اپ کے عین سامنے پہنچ گئی ہیں۔ بھاری بھرکم کتوں کے جسم دیوانہ وار آہنی سلاخوں سے ٹکرانے لگے۔ در و دیوار جھنجھنا اٹھے۔ وہ جیسے گوشت پوست کے جانور نہیں تھے ٹھوس لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے۔ جانور کتنا بھی غضبناک ہو اسے اپنے درد کا احساس تو ہوتا ہی ہے؟

زریں گل کی لرزاں آواز میرے کانوں میں پڑی ''استاد صیب! ام کو لگتا ہے کہ یہ سب کا سب جانور دیوانہ ہو چکا ہے......''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وحشی جانوروں کے دانت اور پنجے نہایت پُرشور آوازوں کے ساتھ سلاخوں سے ٹکرا رہے تھے لیکن سلاخیں پھر بھی سلاخیں تھیں۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کتے سلاخوں سے اندر آسکیں گے۔ یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا تھا۔ اگر کتے سلاخوں سے اندر نہیں آسکتے تھے تو پھر ہوگل ہمیں اس بند کمرے میں کیوں لایا۔ وہ ہمیں لاک اپ میں ہی رہنے دیتا؟

اس سوال کا جواب ہمیں ایک دو منٹ بعد ملا اور یہ جواب اتنا سنسنی خیز تھا کہ ایک بار پھر جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کچھ چیزیں زوردار آوازوں کے ساتھ ٹارچر سیل کے بند دروازے سے ٹکرائیں۔ ٹارچر سیل لرز اٹھا۔

زریں گل خوف زدہ آواز میں بولا ''ام کو تو لگتا ہے یہ کوئی زندہ چیز کیا ہیں۔''

''ٹھہرو آواز سنو۔'' میں نے کہا۔

ہم نے آوازوں پر کان لگائے۔ یہ باریک آوازیں تھیں اور کتوں کی ہرگز نہیں تھیں ''یہ تو پالتو بلیاں ہیں۔'' ہمارے ایک ساتھی نے چلا کر کہا ''اور شاید چند چھوٹے رنگین کتے بھی......''

یہ ناقابلِ شناخت آوازیں بلیوں کی ہی تھیں۔ وہ جنونی انداز میں چیخ رہی تھیں اور ٹارچر سیل کے بند دروازے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسی دوران میں ہمارا ایک ساتھی دہشت زدہ آواز میں چیخا اور تڑپ کر ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں چلا گیا۔ ٹارچر سیل کی چھت پر ہارڈ بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس ہارڈ بورڈ میں ایک باریک درز سی تھی۔ اسی درز میں سے تین چار سفید چوہوں کی چھوٹی چھوٹی سرخ تھوتھنیاں جھانک رہی تھیں۔ یہ چوہے بھی جیسے پاگل پن کا شکار تھے اور مختصر خلا میں سے اندر گھسنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے تھے۔ ان کے حلق سے باریک لیکن نہایت تیز آوازیں نکل رہی تھیں۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے استاد صیب؟'' زریں گل نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔

وہ واقعی بے حد خوف زدہ تھا۔ سامنے سے حملہ آور ہونے والی موت کا مقابلہ وہ ڈٹ کر کر سکتا تھا لیکن اس قسم کے حالات اسے ہمیشہ دہشت کے سمندر میں ڈبو دیتے تھے۔ میں خود بھی حواس باختہ ہو رہا تھا۔ زریں کی بات کا جواب نہ دینا۔ جو کچھ تھا ناقابلِ یقین تھا لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی غیر مرئی محرک نے ارد گرد موجود ہر حیوانی ذہن کو شدید ترین انتشار سے دوچار کر رکھا ہے۔ کوئی سحر ہے جس نے انسان کے سوا ہر ذی نفس کو اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر کہاں سے آیا تھا یہ سحر؟ اس کا جواب بھی واضح تھا۔ اس صورتِ حال کی طرف ہوگل نے کچھ دیر قبل ہی اشارہ کر دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ محترم بوکارلو کچھ کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے نیم مردہ جسم کو گھسیٹ کر اٹھا رہے ہیں اور اپنا آسن جما رہے ہیں۔ اس انداز ہو رہا تھا کہ واقعی آسن جما ہے، کچھ ہوا ہے۔ بڑھاپے کے جس نیم مردہ ڈھانچے کو بیکار شے کی طرح اسے کلب کے نیچے غلیظ تہہ خانوں میں پھنکوا دیا گیا تھا۔ وہ بیکار شے نہیں تھی۔ اس کے اندر ''آنکھوں کے جادو'' کا بے مثال ماہر اب بھی موجود تھا۔ اسے نشہ آور دواؤں کی بے رحم ڈوز دے کر ''زنجیر'' کیا گیا تھا، لیکن ان زنجیروں کے ٹوٹتے ہی، اس کا ذہن پھر بیدار ہو گیا تھا۔ وہی ذہن جو اپنی نگاہوں کی طاقت سے سب کچھ تہہ و بالا کر سکتا تھا۔ ہاں...... بوکارلو نے اپنے مرتے ہوئے جسم کی آخری توانائیوں کو اپنے ظالم بھائی کے خلاف استعمال کیا تھا اور اس کی تمام تر فتوحات کو ایک جان لیوا شکست میں بدل دیا تھا۔

زریں گل نے کانپتی آواز میں کہا ''استاد صیب! ام تو یہاں محفوظ ہے لیکن باہر کیا ہو رہا ہوگا۔''

''وہی جو ہونا چاہیے۔''

''لیکن استاد صیب...... اس کمرے سے باہر...... سارا لوگ تو برا نہیں ہے۔ ہمارا مطلب ہے۔ قیدی لوگ عورتیں اور بچے...... اور پھر ہمارا ساتھی ہاری صاحب بھی تو وہیں ہے اسپتال میں...... اور وہ کیا نام ہے اس سرکس والے کا ...... نینا ...... وہ بھی تو اسپتال میں تھی۔ کیا وہ سب لوگ......'' زریں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کبھی کبھی گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اسے

تو بعد میں ہی پتا چلے گا کہ کس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ابھی تو... خود ہمیں اپنا پتا بھی نہیں ہے۔"

تارچر سیل کا دروازہ بدستور تھرا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کئی طرح کی زندہ چیزیں تیز آندھی کے سبب دروازے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ہارڈ بورڈ کی درز میں موجود چوہے بھی بری طرح تڑپ پھڑک رہے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ہم جاگتی آنکھوں سے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہیں۔ سب کچھ ناقابلِ گمان تھا لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ مجھے ایک انگریزی کہانی "ڈے آف دی اینیملز" یاد آگئی تھی۔ جب ایک خاص کیفیت کے سبب ہر حیوان خطرناک جنون کا شکار ہوتا ہے اور آس پاس موجود انسانوں کے لیے موت کا پیغام بن جاتا ہے۔

شاید یہ بھی ڈے آف دی اینیملز تھا۔ ہمارے لاک اپ کے عین سامنے سیون ایم ایم رائفل کا ایک طویل برسٹ چلا، اس کے ساتھ ہی کسی گارڈ نے دہشت زدہ آواز میں اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے پکارا۔ ابھی اس کی پکار حلق میں ہی تھی کہ کتوں نے اسے دبوچ لیا، اس کی لرزہ خیز چیخیں ہمارے رونگٹے کھڑے کر گئیں۔ یہ چیخیں چونکہ بالکل قریب سے ابھری تھیں لہٰذا ان کا تاثر ہمارے لیے انتہائی واضح اور خوفناک تھا۔ کتوں کے جبڑوں سے پارہ پارہ ہونے والا یہ گارڈ بھی شاید ان گارڈز میں شامل ہوگا جو کچھ دیر پہلے بے بس عورتوں کو چیخنے چلانے پر مجبور کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے ایک درندگی یہاں کی بیرک میں ہو رہی تھی۔ اب ایک درندگی یہاں کے کوریڈورز اور کمروں میں ہو رہی تھی۔ بیرک میں جو درندے بنے ہوئے تھے، وہ اب "شکار" تھے اور اپنے ہی جیسے خون خوار پاگل درندوں کے آگے آگے جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ وہ فائرنگ کر رہے تھے۔ یقیناً ہر طرح کی مزاحمت کر رہے ہوں گے لیکن جو پاگل پن ان پر مسلط کیا گیا تھا، وہ کسی مزاحمت سے رکنے والے نہیں تھے۔ وہ لاتعداد تھے، لاتعداد درندے تھے۔ ہر طرف سے نمودار ہو رہے تھے۔ ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہماری چشمِ تصور قرب و جوار میں ہلاکت اور خون ریزی کا وہ تماشا دیکھ رہی تھی جسے الفاظ کے قالب میں ڈھالنا ممکن ہی نہیں۔

اچانک چھوٹے سائز کا ایک سفید چوہا تڑپ کر تارچر سیل میں آن گرا۔ گرتے کے ساتھ ہی وہ بلا کی رفتار سے ہمارے ساتھی حبشی پر حملہ آور ہوا۔ وہ اپنے ننھے سے جبڑے کی پوری طاقت سے حبشی کی پنڈلی سے چپک گیا۔ حبشی نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھینچ کر جدا کیا اور دیوار پر دے مارا۔ وہ پھر سنبھل کر ہماری طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میرے پاؤں نے اسے کچل ڈالا۔ اس دوران میں چھت کی درز پر چوہوں کی یورش جاری رہی تھی۔ تارچر سیل میں ایک ہی بوکو موجود تھا۔ میں نے اسے توڑا اور حبشی کے کندھے پر سوار ہو کر چھت کی درز میں فکس کر دیا۔ اب تم اڑ کر جنگجو چوہے تو ہم سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے تھے۔

ہوسٹل اور کیمپس کے مختلف حصوں میں ہونے والی فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ گارڈز کی مزاحمت دم توڑ رہی ہے۔ جوں جوں فائرنگ کی شدت کم ہو رہی تھی، درندوں کی چیخ و پکار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ چار سو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ہم ہر آواز پہچان رہے تھے۔ خودکار رائفل کی آواز... سروس پسٹل کی آواز... فائرنگ سے مرنے والے جانوروں کی آواز... جہنم رسید ہونے والے گارڈز کی آواز... اس کے ساتھ گھن کی طرح پس جانے والے قیدی کی آواز... شاید یہ طوفانِ نوح تھا اور ہم بے کراں موجوں پر اکلوتی کشتی کے سوار تھے۔

☆☆☆

کنگ کی ایمپائر غرق ہوگئی۔ وہ حیوان تھا۔ قدرت نے اس پر بدترین حیوانوں کو مسلط کر دیا۔ کنگ کی بسائی ہوئی بستی جلنا چور کر دی گئی۔ اس کے پالے ہوئے ہرکارے جیسے بھاگ رہے گئے۔ اس کا عظیم الشان سوا صلاتی نظام ملوث بھوت اپنی ہی آگ میں بھسم ہو گیا۔ اس کے عالمگیر نیٹ ورک کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر ہماری سماعت نے جو آوازیں سنیں وہ ہماری زندگی کی بدترین آوازیں تھیں۔ عجب تماشا تھا۔ ہم تارچر سیل کے اندر تھے لیکن یہاں راحت اور سلامتی تھی۔ تارچر سیل سے باہر کنگ کی ساری زمین درحقیقت تارچر سیل بنی ہوئی تھی۔ وہاں خون بہہ رہا تھا اور انسانی گوشت کے ٹکڑے فضا میں اچھل رہے تھے۔

ایک سوال پیچ کی طرح ہمارے ذہنوں میں گڑا ہوا تھا۔ کنگ کا انجام کیا ہوا؟ مگر اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد کتوں کی بھیانک آوازیں مدھم پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ ہاسٹل اور کیمپس کے طول و عرض میں جو کتے بلیاں چوہے اور دیگر جانور پاگلوں کی طرح چکرا رہے ہیں اور زندہ مردہ انسانوں پر جھپٹ رہے ہیں وہ اب نارمل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ان کے ہلاکت خیز جنون میں کمی ہو رہی ہے۔

میں نے موہل سے پوچھا تھا کہ ہم سیل کا دروازہ کھول کر باہر دیکھ سکتے ہیں؟ اس نے خوابیدہ نگاہوں سے میرا جائزہ لیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ ہم انتظار کر رہے تھے اور انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ ہماری گھڑیوں کے مطابق رات کے بارہ بجے تھے جب میں نے ایک بار پھر موہل کو مخاطب کیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے پلکیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ میں نے کہا "موہل! ہمیں کتنا انتظار کرنا ہوگا؟"

"آپ کو جلدی کیوں ہے؟" وہ کراہا۔

"ہوسکتا ہے، کچھ لوگ زخمی ہوں، انہیں ہماری مدد کی ضرورت ہو۔"

"نہیں جناب... ابھی نہیں۔ ہمیں کم از کم چار پہر مزید گزارنے ہوں گے، اس کے بعد ہی ہم نکل سکیں گے۔"

موہل کی آنکھوں کے نم گوشوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔ "کیا بات ہے، تم رو رہے ہو؟ محترم بوکارلو تو ٹھیک ہیں؟"

اس نے درد بھرے انداز میں اپنا سر نفی میں ہلایا۔

یہ اندیشہ کل رات سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ کیا وہ... زندہ نہیں ہیں؟"

اس نے ایک بار پھر سر نفی میں ہلایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے ریوالور سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اپنا سر اس نے گھٹنوں میں دے لیا۔ زریں گل نے اسے دلاسا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن میں نے زریں کو اشارے سے روک دیا۔ اسے رونا چاہیے تھا تاکہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ وہ روتے روتے بولا "بوکارلو مر گئے۔ انہوں نے اپنی جان دیوتاؤں کے حوالے کر دی۔ وہ ہم سب پر قربان ہو گئے۔ میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ زمین پر گرے ہوئے ہیں۔ ان کا جسم ساکت ہے۔ دل کی دھڑکن بہت دیر سے تھم چکی ہے لیکن ان کا اکلوتا ہاتھ ابھی تک سینے پر دھرا ہے..."

موہل نے چند لمحے توقف کیا پھر روتے روتے بات جاری رکھی "وہ چلے گئے لیکن جاتے جاتے، شیطانوں کے پر نوچ گئے، ان کی گردنیں مروڑ گئے۔ میں جو کچھ اپنے اردگرد دیکھ رہا ہوں، وہ بہت ہولناک ہے۔ آپ زخمیوں کو بچانے کی بات کر رہے ہیں، مجھے یہاں کوئی زخمی نظر نہیں آ رہا۔ بس ٹوٹے پھوٹے انسانی جسم ہیں اور لاشوں کے ٹکڑے ہیں... سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔"

"کیا کنگ بھی ختم ہو چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اس کی چیخیں کل رات میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔ اب کوشش کے باوجود مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ بھی کہیں لاشوں کے ڈھیر میں لاش کی طرح پڑا ہے۔"

"اور باری... نیاز وغیرہ......؟"

"ان کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ اگر وہ اسپتال میں تھے تو شاید زندہ نہیں بچے ہوں گے۔ اسپتال میں ہر طرف لاشیں ہیں اور خون کے لوتھڑے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص وجدانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

"یہاں قیدیوں اور نوکروں کے بچے بھی تو تھے۔ ان کا کیا بنا ہے؟"

"ان میں سے کچھ زندہ ہیں۔ کچھ مر گئے ہیں۔" موہل نے مبہم جواب دیا۔

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ تارچر سیل سے باہر کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ ایک کتا جو شاید جان بہ لب تھا اور بری طرح زخمی تھا، لاک اپ کے بالکل سامنے موجود تھا اور حلق سے مسلسل کرب ناک آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کی حالت کئی گھنٹے سے جوں کی توں تھی۔ لاک اپ کے اندر کچھ ناقابلِ بیان بدبو بھی آپس میں گتھی ہوئی تھیں اور دبی دبی آوازوں میں چیخ رہی تھیں۔

سخت سردی میں ہم کمبل لپیٹے سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ زریں گل کو ضرورت سے زیادہ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کا پیٹ خالی تھا۔ میں نے کہا "زریں! کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں جناب! بھوک تو ہے لیکن دل نہیں چاہ رہا۔ ہم کو یوں لگتا ہے کہ ہر طرف کچے گوشت اور خون کا بو پھیلا ہوا ہے۔"

میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجائی اور کہا "قصہ خوانی بازار میں بھی تو ایسا ہی ہوا تھا لیکن تمہارے لالے سدھیر نے لاشوں کے درمیان بیٹھ کر مزے سے چپلی کباب کھائے تھے۔"

زریں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ بے ڈھنگے انداز میں کھنچ کر رہ گئے۔

میں نے زریں اور دیگر ساتھیوں کو زبردستی کھانے پر مجبور کیا۔ بہرحال موہل پر میرا بس نہیں چلا، وہ اسی طرح دم سادھے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ دائیں ہاتھ کی پشت بالکل سرخ ہو رہی تھی۔ کل رات کہیں سے ایک موذی رینگتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ اس نے موہل کے ہاتھ کی پشت پر اتنی شدت سے کاٹا تھا کہ وہاں سے

خون نکال دیا تھا۔ یہ بات ذرا دیر بعد ہماری سمجھ میں آئی تھی کہ یہ حقیر کیڑا بھی ایک حیوان ہے۔ چاہے یہ کتنا بھی چھوٹا ہے لیکن اسی پُراسرار کیفیت کے زیرِ اثر ہے جس نے (انسان کے سوا) اندر کے ہر ذی نفس کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ ایسے ہی ایک دو اور حشرات نے ہم پر طبع آزمائی کی بھی لیکن یہ معاملہ زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ حشرات باتھ روم کی طرف سے وارد ہوئے تھے اور ہم نے ان کا راستہ بند کر دیا تھا۔

ایک ایک پل ایک پہاڑ کی طرح تھا اور یہ پہاڑ کسی طور آگے نہیں سرک رہے تھے۔ ہم اس مختصر جیل سے نکلنا چاہتے تھے۔ یہ جاننا چاہتے تھے کہ باہر کیا ہوا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر زرنگ کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ہمیں باری اور نینا کے بارے میں بھی فکرمندی تھی پھر ڈاکٹر اسامااں، مکی اور سفیان وغیرہ کے حالات کے بارے میں بھی ہم جاننا چاہتے تھے۔ جہاں تک جیتیب ہارڈ کا تعلق تھا اس کا انجام ہمیں نوشتۂ دیوار کے مانند نظر آ رہا تھا۔ ایے کلب کی لڑائی میں وہ بدترین طریقے سے زخمی ہوا تھا۔ کنگ نے خودکار رائفل کے برسٹ مار کر اس کے دونوں گھٹنے چکنا چور کر دیے تھے۔ دو چار گولیاں اس کے زیریں جسم میں بھی لگی تھیں۔ وہ موقع پر ہی نیم مردہ نظر آنے لگا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اب تک زندہ ہوگا۔

ہماری گھڑیوں کے مطابق دن کا ایک بجا تھا۔ اب ہمیں اپنے اردگرد سکون محسوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کتوں کی آوازیں اب بھی گاہے بگاہے ابھرتی تھیں لیکن اب ان میں وحشت کا عنصر نہیں رہا تھا۔ موٹل نے مزید چار پہر انتظار کرنے کا کہا تھا اور یہ چار پہر گزر چکے تھے بلکہ چار پہر سے زیادہ ہو گئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نکلنا چاہیے؟" میں نے موٹل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ نیم رضامند نظر آنے لگا۔

پہلا مرحلہ سیل سے باہر نکلنے کا تھا۔ ہم نے دروازہ کھولا۔ لاک اپ کا منظر نظر آیا۔ یہ پہلا منظر ہی دل ہلا دینے والا تھا۔ لاک اپ کی سلاخوں سے باہر لہو میں لتھڑی لاشیں پڑی تھیں۔ یہ سب کے سب گارڈز ہی تھے۔ ان کے چہرے مسخ ہو چکے تھے اور جگہ جگہ سے گوشت اُدھڑا ہوا تھا۔ ایک سفید فام کے پیٹ کے اندرونی اعضا فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

زریں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ دیکھیں جناب! ہمارے خیال میں یہ وہ کتا ہے جو ساری رات روتا رہا ہے۔" ایک جسیم کتا جس کے پیٹ میں گولی لگی تھی، سلاخوں کے عین سامنے مردہ پڑا تھا۔

جسیم کتے ہمارے لاک اپ کے اندر نہیں آ سکے تھے۔ وہ باہر ہی سلاخوں سے ٹکراتے رہے تھے۔ ہاں لاک اپ کے اندر دو چار چوہوں اور نیولوں کے بے جان جسم پڑے تھے۔ ان کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیوانگی کے عالم میں سیل کے اندر گھسنے کے لیے سیل کے دروازے سے ٹکراتے رہے اور بالآخر مردہ ہو کر گر گئے۔ ہم یکے بعد دیگرے باہر نکل آئے۔ اب ہمارا راستہ آہنی سلاخوں نے روک رکھا تھا۔ سامنے والی مستطیل بیرک بالکل خالی نظر آ رہی تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ اس بیرک کے مکین قیدی کیسے اور کب یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

زریں گل نے ایک مردہ گارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارا خیال ہے کہ یہ وہ حرامی ہے جس کی جیب میں ہمارے لاک اپ کا چابیاں تھا۔"

ہم نے اس گارڈ کو گھسیٹ کر سلاخوں کے قریب کیا اور اس کی خون آلود جیب سے خون آلود چابیاں نکال لیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم لاک اپ کھولنے میں کامیاب رہے۔ زریں نے سب سے پہلے ایک مردہ گارڈ کی ایڈورڈ رائفل حاصل کی۔ ایک دوسری رائفل اس نے موٹل کی طرف بڑھا دی پھر وہ گارڈز کی جیبیں ٹٹول کر ان میں سے فالتو میگزین برآمد کرنے لگا۔ اس دوران میں بھی ایک چھوٹی نال کی روسی رائفل حاصل کر چکا تھا۔

دو قوی ہیکل کتے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کی چال میں زیادہ تیزی نہیں تھی پھر بھی ہم الرٹ ہو گئے۔ زریں گل نے فوراً سے پہلے کتوں کا نشانہ لے لیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فائر کر دے گا۔ میں نے اسے روکا اور انتظار کرنے کے لیے کہا۔ کتے ہمارے نزدیک پہنچے اور پھر رک گئے۔ کچھ دیر تک حلق سے متذبذب آوازیں نکالتے رہے پھر لاتعلق نظر آنے لگے۔ ان کا جارحانہ انداز اب ختم ہو چکا تھا۔ زریں نے کہا "ان کی تھوتھنیاں سرخ نظر آ رہی ہیں۔ کیا خبر کل رات انہوں نے کتنے حرامی گارڈز کو جہنم رسائل (جہنم واصل) کیا ہے۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم انہیں گولی مار رہے تھے۔"

"آپ نے اچھا کیا ہم کو روک دیا۔"

زریں کا خوف اب مکمل طور پر دور ہو چکا تھا اور وہ شکاری جانور کی طرح چوکنا نظر آنے لگا تھا۔ ہمارے ارد گرد لرزہ خیز مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ گارڈز کے ساتھ ساتھ کچھ قیدیوں کے لاشے بھی نظر آ رہے تھے۔ ہماری آوازیں سن

ایک طویل بیرک میں بند افراد نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس بیرک کی سلاخوں کے آگے موجود شٹر بند کر دیا گیا تھا۔ یہ شٹر اٹھایا گیا تو سلاخوں کے پیچھے کوئی دو سو افراد دکھائی دیے۔ وہ بھی پرسوں رات سے یہاں سہمے سکڑے بیٹھے تھے۔ ان میں چار پانچ گارڈز بھی تھے۔ ان کی نیلی وردیاں سب سے جدا نظر آ رہی تھیں۔ درحقیقت یہ گارڈز اپنی جان بچانے کے لیے بیرک میں گھسے تھے۔ بعد ازاں انہوں نے بیرک کا شٹر بھی بند کر دیا تھا۔ اب گارڈز اور قیدی ایک ہی کشتی کے سوار نظر آ رہے تھے۔

ہمیں ان قیدیوں میں سفیان نظر آیا تو دلی خوشی محسوس ہوئی۔ سفیان کی گردن پر پٹی بندھی تھی اور ایک ہاتھ بھی سفید بینڈیج میں جکڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی سفیان ہمیں پہچان نہیں سکا۔ وجہ یہی تھی کہ اب ہم اپنی اصل شکل صورت میں تھے۔ سفیان کو اپنی شناخت کرانے اور سمجھانے میں تھوڑا سا وقت لگا۔ جب ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی امڈ آئی۔ وہ پہلے میرے اور پھر موٹل کے گلے سے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے اشک بار لہجے میں کہا "ہم ہار گئے جناب... لیکن قدرت نے ہماری حالت پر رحم کیا۔ اس اوپر والے نے ہمارا ہاتھ پکڑ لیا۔"

"ہاں، اس میں ہماری کوششوں کا بہت کم دخل ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن یہ سب ہوا کیسے مجھے ابھی تک اپنے حواس پر یقین نہیں ہو رہا۔ یہاں بیرک میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ افریقی قیدی بھی موجود ہیں۔ یہ ماردطانیہ کے رہنے والے ہیں۔ وہ کچھ عجیب باتیں کر رہے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کسی لارکی قبیلے کا نام لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لارکی قبیلے کا ہر فرد اپنی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا جادو لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کسی میں یہ جادو کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ، لیکن وہ ضرور ہوتا ہے۔ اس جادو کے کئی رُخ ہیں لیکن خاص طور سے یہ حیوانی ذہن پر بہت تیزی سے اثر کرتا ہے اور اسے اپنا تابع بنا لیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پچھلی دو راتوں میں یہاں جو کچھ ہوا ہے، سبز آنکھوں کے اسی جادو کا کرشمہ ہے۔"

"اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟" میں نے سفیان سے پوچھا۔

"جادو برحق ہے جناب! سبز آنکھوں کے اس جادو کے بارے میں میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ سن چکا ہوں۔

اپنی قید کے شروع کے دنوں میں ایک سیاہ فام لارکی سے اکثر میری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جلد ان کے قبیلے کا کوئی بڑا بزرگ ان کی مدد کو یہاں پہنچ جائے گا۔ ہوا، پانی اور جنگل کے جانور اس کا ساتھ دیں گے اور وہ نیلی وردی والے سارے ظالموں کو تہس نہس کر دے گا۔"

بیرک میں موجود اکثر قیدی سفیان ہی کی طرح ششدر اور سراسیمہ نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی عقلیں ابھی تک ان حالات کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو پچھلی دو راتوں میں سامنے آئے ہیں۔ وہ اپنے اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ناکام تھے۔ ان میں سے جو ان پڑھ تھے یا کٹر عقیدے کے تھے وہ اسے آسیب یا بھوت پریت کے حوالے سے دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا سمجھدار تھے وہ اس کے لیے کوئی ٹھوس جواز ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو نے اظہار خیال بھی کیا۔ ان کا خیال تھا کہ غالباً پندرہ دن پہلے استعمال کی جانے والی مہلک گیس نے جانوروں کے اعصابی نظام کو خراب کیا اور ان کے رویے میں شدید جارحیت آ گئی۔ کچھ کے نزدیک یہ کسی باغی گروپ کی زبردست منصوبہ بندی تھی۔ ہاسٹل میں موجود سیکڑوں خونخوار کتوں کی خوراک میں کوئی تیز نشہ آور دوا ملا دی گئی تھی۔ اس نشے کے زیرِ اثر یہ جانور دیوانگی کا شکار ہوئے اور اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہاسٹل اور کیمپس میں موجود کچھ بلیاں اور سانپ وغیرہ بھی ان خوراک سے متاثر ہوئے یا متاثر کیے گئے۔

اچانک ایک شخص دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔ وہ انڈین کرسچن تھا۔ بردوپ والا مخصوص لباس اس کے جسم پر تھا۔ دائیں کندھے سے کسی مردہ گارڈ کی رائفل لٹک رہی تھی۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے سینے پر کراس کا نشان بنایا اور دہشت زدہ آواز میں بولا "اینی اے کلب تک ہو گیا ہے۔ ہر طرف لاشیں ہیں صاحب... ہر طرف خون ہے۔ یسوع کی سوگند آنکھوں کو وشواس نہیں رہا۔ یہ ایشور کا چمتکار ہے اور... وڑی ہم سب یہ چمتکار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔" وہ ایک بار پھر اپنے سینے پر کراس کا نشان بنانے لگا۔

لمبے بالوں والا ایک پڑھا لکھا کورین قیدی فلسفیانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ لوگ خواہ مخواہ ذہن کو مشوش نہ کرو۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ سب اس منحوس گیس نائن فائیو کا رزلٹ ہے۔ اس نے پالتو جانوروں اور رکھوالی کے کتوں کو اعصابی طور پر متاثر کیا ہے..."

ایک ادھیڑ عمر جاپانی بولا "میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اگر یہ نائن فائیو کا رزلٹ ہوتا تو پھر ہم سب بھی متاثر ہوتے۔ یہ کوئی گہری منصوبہ بندی ہے۔ کتوں اور دیگر جانوروں کو منصوبے کے تحت نشہ آور دوا دی گئی ہے۔"

ایک تیسرے شخص نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "یہ بحث کا نہیں.... خدا کا شکر بجا لانے کا وقت ہے۔ بات یہ نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔"

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک لڑکی بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ شروع میں تو یہی لگا کہ شاید کوئی گارڈ یا کتا اس کے تعاقب میں ہے جس سے خوفزدہ ہو کر وہ چلا رہی ہے لیکن جلد ہی یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ لڑکی کے عقب میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی چیخوں میں بھی خوف کے بجائے سنسنی اور مسرت کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ قریب پہنچی اور اس نے ہندی میں چیختے ہوئے کہا "میں نے دیکھ لیا ہے۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ وہ مر گیا ہے.... وہ مرا پڑا ہے۔"

یکبارگی لہو رگوں میں اچھل گیا۔ سفیان نے امید بھرے لہجے میں پوچھا "کون مرا پڑا ہے؟"

"کنگ .... کنگ براؤن۔ اسے کلب کے بڑے دروازے کے سامنے میں خود اس کی لاش دیکھ کر آ رہی ہوں۔" لڑکی نے "خود" کا لفظ ادا کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور لفظ پر پورا زور دیا۔

وہ نیلی انڈیا کی بائیس چوبیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے لباس سے پتا چلتا تھا کہ یہاں موجود سیکڑوں خدمت گار لڑکیوں کی طرح وہ بھی انتظامیہ کے کسی عہدیدار کے ہاں "خدمت" کے فرائض انجام دیتی ہو گی۔ "خدمت" کی نوعیت لڑکی کے نہایت مختصر اور ہیجان خیز لباس سے عیاں تھی.... لڑکی کی اطلاع بم کا دھماکا ثابت ہوئی۔ ایک ایک کئی افراد لڑکی کی بتائی ہوئی سمت میں دوڑے۔ یوں دوڑنے والے زیادہ تر افراد کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ راہداریوں میں گراؤنڈ بل کتے گھوم رہے تھے۔ ان کتوں کی موجودگی میں ہاتھ میں رائفل وغیرہ کا ہونا تحفظ کی علامت تھا۔ ہم طویل کوریڈورز میں سے گزرے۔ ہر کوریڈور میں خونچکاں مناظر ہمارے حوصلے آزمانے کے لیے موجود تھے۔ کئی جگہ ہمیں گارڈز کی ایسی لاشیں بھی ملیں جن پر گولیوں کے زخم تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کیمپس کے طول و عرض میں کہرام مچنے کے بعد جو قیدی آزاد ہوئے انہوں نے خونخوار

کتوں کے ساتھ ساتھ نیلی وردی والوں کو بھی اپنا ازلی دشمن جانا اور ان پر فائرنگ کی۔ ایک راہداری میں قیامت کا منظر نظر آیا۔ یہاں درجنوں افراد کی لاشیں ایک ڈھیر کی طرح موجود تھیں۔ ان میں گارڈز کے علاوہ انتظامیہ کے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے۔ کنگ کے خانوادے کے دو چار افراد بھی پہچانے جا سکتے تھے۔ خون آشام کتوں سے بچنے کے لیے لوگ پاگلوں کی طرح دوڑے تھے۔ دروازہ تنگ تھا۔ ان کتوں نے ان لوگوں کو یوں ادھیڑا تھا کہ ناقابل شناخت بنا دیا تھا۔ ہر شخص کی پشت زیادہ ادھڑی ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آخر وقت تک یہ لوگ تنگ راستے میں سے گزرنے کی کوشش کرتے رہے اور کتے انہیں عقب سے بھنبھوڑتے رہے۔ ان مناظر پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے ہم اے کلب کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ چالیس پچاس میٹر آگے زریں گل نے ایک آوارہ سانپ کو شوٹ کیا اور چند کتوں کو راستوں سے ہٹانے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔ ریڈ لائن کے اندر تباہی کے آثار زیادہ تھے۔ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

جلد ہی ہم اے کلب کے صدر دروازے پر تھے۔ یہاں سے اس زیر زمین بستی کا خاص الخاص حصہ شروع ہوتا تھا۔ اس حد سے آگے جانے کے لیے خصوصی اجازت نامہ اور خصوصی لباس درکار تھا۔ اب بھی یہاں جو لاشیں نظر آ رہی تھیں، ان میں سے زیادہ تر سرخ جیکٹ میں تھیں.... اور پھر ہماری آنکھوں کو اپنا مطلوبہ نظارہ دکھائی دے گیا.... یہ کنگ براؤن کی لاش کا نظارہ تھا۔ بے شک وہ کنگ ہی تھا۔ اس کا منحوس چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ صدی کا سب سے بڑا بردہ فروش زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کا سارا نرم فر اور بدن اس کی جان کے ساتھ ہی اس کے جسم سے جدا ہو چکا تھا۔ مرتے وقت بھی اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور مٹھیاں کسی ہوئی تھیں۔ دیگر لاشوں کی طرح اس لاش کو بھی کتوں نے بھنبھوڑا تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کنگ کو یہاں سربراہ کا پروٹوکول حاصل ہے۔ ناہنجار جانوروں نے اس کی ہولناک کھنچائی کی تھی۔

ہم اس کی لاش کے سرہانے ساکت کھڑے تھے اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کنگ.... مردار میں بدل چکا ہے۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا۔ کنگ کا چہرہ ذرا بھیگا بھیگا نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی نے پانی کا چھڑکاؤ کیا ہو۔ کنگ فقط ایک نیکر میں تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اے کلب میں قیامت برپا ہونے سے پہلے وہ مساج کروا رہا تھا۔

"ہربل مساج" کنگ کے معمولات میں شامل تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے حسین دوشیزائیں رکھی ہوئی تھیں۔ کنگ کے جسم پر گولی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ ایک حیوان کی حیثیت سے اس کی جنگ صرف حیوانوں یعنی کتوں سے ہوئی ہے۔ کنگ کے اردگرد اس کے ذاتی محافظوں میں سے فقط دو کی لاشیں موجود تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ باقی "جانبازوں" نے اپنی پیاری جان بچائی اور جا کر چھپی تھی۔ مطلق العنان لوگ جب موت کے شکنجے میں پھنستے ہیں تو ان کے جانباز اپنی "جانبازی" پر دو حرف بھیج دیتے ہیں۔ لگتا تھا کہ یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔ ہم نے کنگ کے ذاتی محافظوں کی دلیری کی جو کہانیاں سنی تھیں، ان کے حساب سے تو کنگ کی لاش کے اردگرد پروانوں کی لاشوں کا ڈھیر ہونا چاہیے تھا......

کنگ کی اپنی رائفل بھی اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس میں ابھی چند راؤنڈ موجود تھے۔ حملہ آور کتوں نے غالباً سب سے پہلے کنگ کی ناف پر منہ مارا تھا اور اس کی آنتیں کھینچ کر باہر ڈال دی تھیں۔ اس کے بعد یقیناً کنگ بھاگا تھا اور دیگر لاشوں کی طرح اس کی پشت بھی تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں نے ادھیڑ دی تھی۔ میں نے تصور کی نگاہ سے کنگ کو کتوں کے جبڑوں میں تڑپتے پھڑکتے دیکھا...... ہاں یہ بالکل ویسا ہی منظر تھا جیسا کنگ دوران ڈنر سبزہ زار میں اپنی نشست پر بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔

جو انڈین لڑکی ہمیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی وہ بے حد نفرت سے کنگ کا لاشہ دیکھ رہی تھی۔ یہ نفرت اتنی شدید تھی کہ لڑکی کی خوبصورت آنکھوں میں جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے شاید نشہ بھی کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ زریں کا چہرہ بھی سرخ تھا۔ اس نے نفرت سے بے قابو ہو کر ایک ٹھوکر کنگ کی لاش کو رسید کی اور بولا "ہمارا خیال ہے کہ اس کی موت کو اور بھی دردناک ہونا چاہیے تھا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو اگلے جہان میں ہی اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔" اس نے ایک اور ٹھوکر کنگ کے سر پر رسید کی۔

"نہیں زریں گل!" میں نے اسے روکا "جو مر گیا سو مر گیا۔ اب یہ صرف ایک لاش ہے۔"

"لاش ہے تو کیا ہوا؟" زریں کے بجائے انڈین لڑکی چیخی "یہ انسان کی نہیں درندے کی لاش ہے۔ اس کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیے جائیں تو بھی کم ہے۔" اس نے آگے بڑھ کر ایک اور ٹھوکر کنگ کے سر پر رسید کی اور پھر ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "اس شیطان نے میرے منگیتر کو الیکٹرک بھٹی میں

ڈالا اور میری عزت لوٹی۔ اس کتے نے مجھے اپنے بستر کا کھلونا بنایا اور جب من بھر گیا تو ادھ کھائے شکار کی طرح مجھے اپنے ماتحتوں کے آگے پھینک دیا۔ اب تم کہتے ہو کہ اس کو ٹھوکر نہیں مارنی چاہیے۔ میں کہتی ہوں کہ اس کی لاش پر تھوکنا چاہیے۔ اس پر پیشاب کرنا چاہیے...... ہاں پیشاب کرنا چاہیے۔" اس نے زور سے چلا کر کہا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کے رونے میں دکھ کے ساتھ ساتھ خوشی کا عنصر بھی تھا۔ کچھ عجیب طرح کا رونا تھا اس کا۔ کبھی لگتا تھا کہ رو رہی ہے، کبھی محسوس ہوتا تھا کہ خوشی سے چیخ رہی ہے۔ اس نے اپنے لانبے بال مٹھیوں میں جکڑ رکھے تھے اور چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا پھر وہ روتے روتے بولی "اس کو ٹھوکر ہی نہیں مارنی چاہیے۔ اس پر پیشاب کرنا چاہیے...... اور میں نے کیا ہے...... میں نے کیا ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہاں موجود دیگر افراد کی کیفیت بھی یہی رہی ہو گی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کنگ کے چہرے پر نمی کیسی تھی۔ خبر نہیں کیا ہوا تھا اس لڑکی کے ساتھ جو وہ نفرت کے اس درجے تک پہنچی تھی۔ نفرت اور خوشی کے شدید احساسات میں لپٹی ہوئی وہ نیم پاگل لگ رہی تھی پھر وہ قہقہے بلند کرنے لگی۔ اس کے قہقہے بلند ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ میرے اشارے پر دو تین افراد نے اسے سنبھال لیا۔ ورنہ شاید وہ بے ہوش ہو کر گر جاتی۔

موٹل نے کہا "یوں لگتا ہے کہ یہاں کافی فائرنگ ہوئی ہے۔ بھاگنے سے پہلے کنگ کے محافظوں نے نمک حلالی کے طور پر بے دریغ گولیاں چلائی ہیں۔"

موٹل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دیواروں پر گولیوں کے لاتعداد نشانات تھے۔ یہاں ایک درجن کے قریب کتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ دو چار مردہ سانپ بھی ہم کو دکھائی دیے تھے۔ یہ سانپ یقیناً منو ہیرا کے سانپ گھر سے ہی نکلے تھے۔

موٹل کی آنکھیں مسلسل کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ بے قرار تھا۔ میں جانتا تھا اسے بوکارلو کی تلاش ہے۔ میں کنگ کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ میرے دل کی گواہی درست تھی۔ یہ سو فیصد کنگ براؤن ہی تھا۔ اچانک ایک انچارج گارڈ کلب کی مخالف سمت سے برآمد ہوا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی لیکن اس نے نال جھکا رکھی تھی۔ میری رائفل کی نال گارڈ کی طرف تھی۔ گارڈ کے پیچھے ہی پیچھے سفید بالوں والا اسمتھ سینئر بھی چلا آ رہا تھا۔ اس کی حیثیت کنگ کے قابل اعتماد ساتھی کی تھی۔ اس نے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا لیکن ریوالور کی نال جھکی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے ہتھیاروں کا جھکا

ہونا اس امر کی علامت تھا کہ وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں اور ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر چکے ہیں۔

اسمتھ سینئر نے میرے قریب آ کر اپنا ریوالور میرے حوالے کر دیا اور بولا "مسٹر شاہ جہاں! قیدیوں کا ایک بڑا جلوس اس طرف آ رہا ہے۔ ہماری جان کو ان کی طرف سے خطرہ ہے۔ اب آپ کی ذمے داری ہے کہ ہماری حفاظت کریں!"

"میں یہ ذمے داری کیسے لے سکتا ہوں؟"

"آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں شاہ جہاں.....!" اسمتھ سینئر نے درسانہ لہجے میں کہا "ماریا ٹرسٹ میں جو کچھ ہوا تھا اس کا مرکزی کردار آپ تھے اور یہاں بھی آپ ہی ہیں۔"

انچارج گارڈ نے اسمتھ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اگر آپ ان مظاہرین کو روک نہ سکے تو خون خرابہ ہوگا اور یہ کسی کے لئے بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔"

گارڈ کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ رائفل پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں نے گارڈ سے پوچھا "کس خون خرابے کی بات کر رہے ہو۔ یہاں خون خرابہ کرنے والے صرف تم دونوں ہو اور تم دونوں کیا کر سکتے ہو؟"

میرے تعنیفی لہجے نے انچارج گارڈ کو گڑبڑا دیا۔ وہ ہکلا کر بولا "تم.... میرا مطلب تھا کہ اگر گولی چل گئی تو...... دونوں طرف کا نقصان ہوگا۔"

وہ "دونوں طرف" کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ اس کی وضاحت نے مجھے مطمئن کرنے کے بجائے مزید چونکا دیا۔ میں نے انچارج گارڈ کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ بھینچ دیا "اصل بات بتاؤ کیا ہے؟" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

میرے انداز نے انچارج گارڈ کے علاوہ اسمتھ سینئر کا چہرہ بھی فق کر دیا۔ اس دوران میں میری "پیروی" کرتے ہوئے زریں نے اسمتھ کا گریبان بھی پکڑ لیا تھا۔ اسمتھ نے صورت حال بگڑتے دیکھی تو فوراً پسپائی کا راستہ اختیار کیا۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "مسٹر شاہ جہاں! آپ...... میرے ساتھ آیئے..... میں آپ کو..... سب کچھ بتاتا ہوں۔"

اسمتھ سینئر میرے ساتھ کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں چلا گیا۔ دو منٹ کے اندر اس نے مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

اے کلب کے اندر بڑے کیسینو کی بالائی منزل پر کچھ تقریباً تیس گارڈز موجود تھے۔ ان کے پاس درجنوں رائفلیں تھیں اور ایمونیشن بھی تھا۔ اگر مظاہرہ کرنے والے قیدیوں کا ہجوم ان گارڈز پر حملہ کرتا تو یہ فائر کھول دیتے۔ ایسی صورت میں دو دو چار نہیں، سیکڑوں قیدیوں کو ہلاک کر سکتے تھے۔

یہ ہمارے حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے موبل اور زریں گل کو ساتھ لیا۔ اس کے علاوہ دو مزید اسلحہ بردار بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اسمتھ سینئر کی رہنمائی میں ہم بڑی راز داری کے ساتھ کیسینو کے عقب میں پہنچے اور پھر وہاں سے ایک چور راستے کے ذریعے مورچے پر پہنچ گئے۔ یہ کیسینو کی تیسری منزل تھی۔ ایک بڑے ہال کمرے میں تقریباً ڈھائی درجن مسلح گارڈز نے پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ ان سب کے پاس جدید رائفلیں موجود تھیں اور میگزین کے ڈھیر لگے تھے۔ وہ سب کے سب کھڑکیوں میں بیٹھے تھے۔ ہماری طرف ان کی پشت تھی۔ یہ سفاک ترین لوگ تھے۔ ان کی نیلی وردیاں جبر اور قہر کی علامت تھیں۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق نہیں تھے کہ انہیں کوئی وارننگ دی جاتی یا کسی رعایت کی پیشکش کی جاتی اور ایسا کرنا خود ہمارے اپنے لئے بھی سخت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ہم نے بس "دیکھو اور مار دو" کے اصول پر عمل کیا۔ سب سے پہلے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایل ایم جی نے ہی شعلے اگلے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باقی رائفلیں بھی موت کے قہقہے بلند کرنے لگیں۔ جدید ترین ہتھیاروں سے ہونے والی یہ فائرنگ اتنی شدید اور مہلک تھی کہ چند سیکنڈ کے اندر ہر طرف گارڈز کی لاشیں بکھری نظر آنے لگیں۔ کسی کو جوابی کارروائی کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ شاید ہی دس پندرہ راؤنڈ ہم پر فائر ہوئے ہوں لیکن ایک شخص کے معمولی زخمی ہونے کے سوا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا......

..... قریباً پندرہ منٹ بعد ہم واپس کنگ کی لاش کے پاس پہنچ چکے تھے..... لیکن لاش..... اب کہیں نہیں تھی۔ لاش وجود ہی باقی نہیں رہا تھا۔ بس بوسیدہ انسانی گوشت کے چند لوتھڑے تھے جو مشتعل مظاہرین کے پاؤں تلے روندے رہے تھے۔ یہ درجنوں نہیں سیکڑوں قیدی تھے۔ ان میں ہر رنگ و نسل کے لوگ تھے۔ ان کی عمریں بھی مختلف تھیں۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی لیکن ایک چیز ان سب میں مشترک تھی۔ ان کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی اور ان کے چہرے اندرونی جوش سے تمتما رہے تھے۔

"بہت سے قیدی بچ گئے ہیں" موبل نے کہا۔ اس کی آواز میں خوشی اور اطمینان کی جھلک تھی۔

"لیکن یہ ہوا کیسے ہے؟" زریں نے کہا۔

"شاید یہ قدرت کا انصاف ہے۔ قیدی محفوظ بیرکوں کے اندر تھے۔ جبکہ گارڈز اور انتظامیہ کے لوگ باہر تھے۔ بپھرے ہوئے کتوں سے زیادہ نقصان بھی باہر والوں کو پہنچا" میں نے کہا۔

موبل نے سر ہلا کر میری بات سے اتفاق کیا۔ زریں نے کہا "خیر..... شاید اسی کو عمل پیہم کہتے ہیں۔"

"عمل پیہم نہیں مکافات عمل" میں نے تصحیح کی۔ زریں نے میری تصحیح سے مکمل اتفاق کیا۔

☆☆☆

ہمیں نینا اور ہاری وغیرہ کی تلاش تھی۔ اس کے علاوہ ہم بوکارلو کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ موبل تو اس حوالے سے بے حد بے قرار تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے بچھڑے ساتھی پاشا کی تلاش بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ کئی ذمے دار افراد سے پوچھ گچھ کے باوجود ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ اس کے متعلق آخری اطلاع یہی تھی کہ وہ علی احمد کے ساتھ لاک اپ میں بند تھا۔ ہم ایک بار پھر ریڈ زون کراس کر کے ہاسٹل میں پہنچے اور وہاں سے ایک طویل چکر کاٹ کر دوبارہ کیسینو کے اندر جیکب کے اپارٹمنٹ پر آ گئے۔ اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کئی بار دستک دی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ چند آوارہ کتے یہاں بھی موجود تھے اور کوریڈورز میں مسلسل شور مچا رہے تھے۔ بہرحال رائفلوں کی موجودگی میں وہ قریب آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

موبل سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے ایل ایم جی سے دروازے کے لاک پر فائرنگ کی۔ دروازہ ٹوٹ کر کھل گیا اور ہم اندر چلے گئے۔ اندر سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ فقط ایک دو آرائشی اشیا ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا اس معمولی ٹوٹ پھوٹ کا تعلق جیکب کی محبوبہ مکی سے تھا۔ جیکب کی گرفتاری کے بعد گارڈز جب مکی کو گرفتار کرنے اپارٹمنٹ میں گھسے تھے تو مکی کی مزاحمت کے سبب یہ نقصان ہوا تھا۔ میں موبل اور زریں بڑی احتیاط کے ساتھ اس کمرے میں پہنچے جہاں ہم نے پناہ گزینوں کی حیثیت سے کئی دن گزارے تھے۔ یہ کمرا پوری طرح ہماری نگاہوں میں رچ بس چکا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے خوبرو مکی کو سانپوں کے خوفناک نرغے سے نکالا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی اہم واقعات یہاں رونما ہوئے تھے۔ جن میں موبل کی محبوبہ بوب لڑکی کا مرنا بھی شامل تھا۔ کمرے میں گھستے ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی موجود ہے۔ بظاہر کمرا خالی تھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ جلد ہی ہم نے چھپنے والوں کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ ایک قد آدم الماری کے عقب میں تھے۔ انہیں دیکھ کر ہماری رائفلوں کے بیرل خود بخود جھک گئے۔ یہ دو خواتین تھیں۔ ان میں سے ایک تو نوجوان یونانی ڈاکٹر اسماں تھی۔ دوسری ایک درمیانی عمر کی ملازمہ تھی۔ نقاہت اور خوف کے سبب دونوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔

ہمیں پہچاننے کے بعد انہیں کچھ حوصلہ ہوا۔ پہچاننے میں کچھ دشواری بھی پیش آئی کیونکہ اب میں اور موبل اپنی اصل شکل صورت میں تھے۔ "بوکارلو کہاں ہیں؟" موبل نے غم زدہ لہجے میں ڈاکٹر اسماں سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں امید کی ہلکی سی کرن بھی تھی۔ جیسے اس کے دل کی گہرائی میں کہیں اب بھی یہ آس موجود ہو کہ بوکارلو زندہ ہوں گے۔

ڈاکٹر نے اوپر گیلری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ وہاں ہیں۔"

ڈاکٹر اسماں نے بوکارلو کے مرنے کا ذکر نہیں کیا تھا تاہم اس کے انداز سے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کیں بوکارلو کے بارے میں نہیں، بوکارلو کی لاش کے بارے میں بتا رہی ہے۔

ہم سیڑھی کے ذریعے اوپر گیلری میں گئے۔ آگے دول تھا۔ اس کے عقب میں، میں تھا اور آخر میں زریں۔ بوکارلو دیوار اور گدوں کے درمیان لڑھکے ہوئے تھے۔ بس ہڈیوں کا ایک نحیف و نزار ڈھانچہ تھا، جس کی جلد پر کھال منڈھی ہوئی تھی۔ ہم اپنے علم کی بنا پر اسے "بوکارلو" کہہ رہے تھے۔ بوکارلو کی بند آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ شاید شدید نقاہت کے سبب بے ہوش ہیں لیکن ڈاکٹر اسماں نے بتایا کہ وہ قریباً 30 گھنٹے پہلے ہی زندگی کو خیرباد کہہ گئے تھے۔ موبل نے اپنے عقیدے کے مطابق بوکارلو کے گھٹنوں پر ماتھا ٹیکا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا پھر ہڈیوں کے ناقابل شناخت ڈھانچے کو بڑے احترام کے ساتھ کپڑے میں لپیٹ کر گیلری سے نیچے اتار لیا گیا۔ کنگ اور بوکارلو دو بھائی تھے۔ دونوں اپنے اپنے انداز سے زندہ رہے تھے۔ اپنے اپنے انداز.... سے مرے تھے لیکن موت کے بعد ایک بھائی کی لاش کو احترام سجدے کئے جا رہے تھے۔ ایک بھائی کی لاش کو پاؤں تلے روندا جا رہا تھا۔

اب ہمیں ہاری اور نینا کی تلاش تھی۔ موبل کو وہیں اپنے روحانی پیشوا کی لاش کے پاس چھوڑ کر ہم اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسپتال کا تقدس وہی تھا جو موبل نے اپنی پیش گوئی میں پیش کیا تھا۔ اسپتال کے عملے نے دروازے تو بروقت بند کر لیے تھے لیکن اکثر عمارتوں کی طرح یہاں بھی

کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ دیوانے پن کا شکار گرانڈیل کتے شیشے توڑتے ہوئے اندر گھسے تھے اور کچھ بھی سلامت نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے میڈیکل اسٹاف اور مریضوں سے ایک جیسا سلوک کیا تھا۔ سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسپتال کے بستروں پر اور فرش پر ہمیں بے شمار دلدوز مناظر دیکھنے کو ملے۔ ہم صالح باری کو ڈھونڈ رہے تھے... اور پھر وہ جواں، جنا بازی ہمیں مل گیا۔ وہ اپنے سفید بستر پر لاش کی صورت میں پڑا تھا۔ اس کا نرخرہ ادھڑا ہوا تھا اور چھاتی اور چہرے پر لاتعداد زخموں کے نشانات تھے۔ آج اس کی ٹھوڑی کا بدنما نشان بھی ان نشانوں کے درمیان کہیں گم ہو گیا تھا۔ اب ”نشان والے دیو“ اس دنیا میں موجود تھے اور نہ نشان لینے والا۔ صالح باری کی موت نے مجھے افسردہ کر دیا۔ مجھے افسردہ دیکھ کر زریں بھی افسردہ ہو گیا۔

باری کی لاش کو سفید چادر سے ڈھانپ کر ہم اسپتال کے مرکزی حصے کی طرف بڑھے خون آلود راہداری میں ہمارے جوتے چپک رہے تھے۔ لاشوں سے ہلکی ہلکی باس اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ مرکزی حصے میں ہی وہ تھیٹر واقع تھا جہاں بردوں کے ”اسپیئر پارٹس“ نکالنے کے لیے تھوک کے حساب سے آپریشن کیے جاتے تھے۔ ہم ایک نرس کی لاش کو پھلانگتے ہوئے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے۔ اس نہایت جدید تھیٹر میں دو آپریشن ٹیبل موجود تھے لیکن یہ آپریشن ٹیبل ایک گھناؤنی پالیسی میں استعمال ہونے سے پہلے ہی بے کار ہو گئے تھے۔ اس آپریشن تھیٹر میں چند لاشیں موجود تھیں جن میں دو امریکی ڈاکٹرز تھے۔ انسانوں کو اسپیئر پارٹس میں بدلنے والے یہ ڈاکٹر پرسوں شب ”مکافات“ کے خونی ریلے میں بہہ گئے تھے۔

ہم قریباً پندرہ منٹ اس اسپتال میں رہے۔ اسپتال کے ایک بند کمرے میں سے چند افراد زندہ نکل آئے۔ ان میں میڈیکل اسٹاف کے پانچ افراد کے علاوہ تین چار مریض بھی تھے... مریضوں میں ایک چہرہ دیکھ کر میرے سینے میں اطمینان کی لہر دوڑی۔ یہ گائی گربانینا کا چہرہ تھا۔ اس کا رنگ لیموں کی طرح زرد تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ وہ سکڑی سہمی کھڑی تھی اور بالکل ہی مختصر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے اور گردن پر وہ ہولناک خراشیں ابھی تک موجود تھیں جو چند روز پہلے کیمپس میں آئی تھیں۔ پرنس داراب (کنگ براؤن) نے خفا ہو کر اسے اوباش لڑکوں کے حوالے کر دیا تھا اور انہوں نے اسے زخم زخم کر ڈالا تھا۔

میں نینا کے قریب پہنچا۔ وہ کربو میں میری اصلی شکل صورت دیکھ چکی تھی۔ مجھے پہچاننے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ چند لمحے تک ذرا تعجب سے میرا چہرہ تکتی رہی پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ میں نے اس کے دونوں بازو تھام لیے ”اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں نینا۔ تہ خانے میں رہنے والے بہت دکھ سہہ کر زندگی کی بازی ہار چکے ہیں۔ یہاں سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

وہ سہمی سہمی نگاہوں سے قرب و جوار کے خونچکاں منظر دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ میں نے اسے سہارا دیا۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس کی بکھری ہوئی لٹیں درست کیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں نے پھر کہا ”اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں نینا۔ پرنس داراب (کنگ) ختم ہو چکا ہے۔“

”آ...... آپ... مجھے جھوٹی تسلی دے رہے ہیں۔“ وہ ہکلائی۔

نینا کی آواز سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ اس کی آواز بھرائی اور بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ اس کی آواز لگتی ہی نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ انتقامی طور پر اپنی خوبصورت آواز کا خاتمہ کر چکی ہے۔ اس کی یہی انتقامی کارروائی تھی جس پر مشتعل ہو کر کنگ نے نینا کو بری طرح زدوکوب کیا تھا اور پھر بدترین حالات کے سپرد کر دیا تھا۔

کمرے سے برآمد ہونے والے لوگوں میں سے ایک ڈاکٹر نے بتایا ”جب بپھرے ہوئے کتے کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر یکے بعد دیگرے اندر آئے تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ ایک گارڈ نے چند فائر کیے پھر وہ بھی کتوں کی زد میں آ گیا۔ ایسے میں ہم چند لوگ اس اسٹور روم میں پہنچ گئے۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ یہاں بس لوہے کا ایک دروازہ ہے، کھڑکی کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کتوں کے شدید حملے سے محفوظ رہے...“

اس ڈاکٹر اور یہاں موجود دیگر افراد کا بھی یہی خیال تھا کہ فروخت کے لیے یہاں لائے گئے ان سیکڑوں کتوں کی خوراک میں کوئی ایسی زہریلی دوا ملا دی گئی تھی جس نے ان جانوروں کو شدید دماغی ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ وہ پنجرے توڑ کر باہر نکل آئے اور ہر طرف تباہی پھیلا دی۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد ہم برباد شدہ اسپتال سے رنگ رلیوں والے کلب میں آ گئے۔ ہمارے اس کلب میں پہنچنے تک جیک بارلو کی لاش برآمد ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں گھٹنے کرچی کرچی تھے اور گردن کو کسی کتے کے جبڑوں نے ادھیڑ ڈالا تھا۔ اس

کی چند انتہا عقیدت مندوں نے دریافت کی تھی اور اسے ٹھوکریں سید کرتے ہوئے اسی کلب تک لائے تھے۔ بوکارلو کی لاش بھی اب اسی کلب میں پہنچا دی گئی تھی۔ لاش سفید چادر میں لپٹی کر ایک بڑے اسٹریچر پر رکھی گئی تھی۔ لوگوں نے اس اسٹریچر کو پھولوں سے لاد دیا تھا۔ بوکارلو کی لاش کے ارد گرد دور جانی سو سیاہ فام قیدی جمع ہو چکے تھے اور اپنے اپنے رواج کے مطابق مارابطا نبے کے اس روحانی پیشوا کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر استاماں کو ڈھونڈا۔

ڈاکٹر استاماں نے بتایا ”محترم بوکارلو ایک دم مضطرب نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت منع کیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ان کی حالت اٹھنے کے قابل نہیں لیکن وہ اپنی بات پر مصر رہے۔ ان کی بے چینی انتہا کو چھونے لگی تھی۔ مجبوراً مجھے اٹھ کر بیٹھنے میں ان کی مدد کرنا پڑی۔ انہوں نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ میں انہیں سہارا دے کر رکھوں۔ جب میں نے انہیں اچھی طرح سہارا دے دیا تو انہوں نے ایک بار نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ جیسے آسمان کو تک رہے ہوں پھر انہوں نے چند طویل سانسیں لیں اور گہرے مراقبے میں چلے گئے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ان کا اکلوتا ہاتھ ان کے سینے پر دھرا تھا اور ہونٹ مسلسل کانپ رہے تھے...“

استاماں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ”عام ڈاکٹروں کی طرح میں روحانیت کی مخالف نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اردگرد بہت سی ایسی قوتیں موجود ہیں جنہیں ہم کوئی نام نہیں دے سکتے اور نہ ان کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ پرسوں رات جو کچھ ہوا... وہ چاہے کسی وجہ سے ہوا ہو لیکن اس میں روحانیت کا عمل دخل ضرور ہے...“

بوکارلو کی لاش کے اردگرد سیاہ فاموں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے عقیدت کی بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ ایک عجیب سا زمہر گداز احساس تھا جس نے اردگرد کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا... مناجات کی گونج چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

کوئی چار بجے کا وقت ہوگا۔ ہم چند جلیوں کی لاشوں کا معائنہ کر رہے تھے جب اسمتھ سینئر تیز قدموں سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ اسمتھ سینئر ہمارے ساتھ مکمل تعاون کر رہا تھا۔ اس کے قریبی ساتھی بھی پورا ساتھ دے رہے تھے۔ اسمتھ سینئر نے نزدیک آ کر میرے کان میں سرگوشی کی اور بولا ”ٹی وی پر ایک اہم نیوز آ رہی ہے۔ آپ دو منٹ کے لیے آ جائیں۔“

میں موٹل اور زریں گل وغیرہ کو چوکس کر کے اسمتھ کے ساتھ اسی کلب کے ایک اندرونی کمرے میں پہنچا۔ یہاں لندن کے ایک چینل پر بار بار ایک نیوز دکھائی جا رہی تھی۔ نیوز کے مطابق فلاحی ادارے ری ہوم کی مرکزی عمارت میں درجنوں کتوں نے زبردست تباہی مچائی تھی۔ جسیم نسل کے یہ کتے اچانک لنگر خانے کے کوریڈورز میں نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے درجنوں افراد کو زخمی کیا تھا۔ ان زخمیوں میں سے دو ہلاک ہو چکے تھے اور چند کی حالت تشویش ناک تھی۔ موقع پر موجود گارڈز نے بروقت فائرنگ کر کے کتوں کو پسپا کیا تھا ورنہ جانی نقصان کہیں زیادہ ہوتا۔ نیوز کاسٹر نے خبر کے اس پہلو کو نہایت تحیرخیز قرار دیا تھا کہ یہ بدمست کتے کہیں باہر سے نہیں آئے، عمارت کے اندر سے ہی برآمد ہوئے تھے۔

نیوز میں دو کتوں کی لاشیں بھی دکھائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ کوریڈور بھی دکھایا گیا جہاں سے کتے نمودار ہوئے تھے۔ ایک زخمی ملازم کا مختصر انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس نے بتایا کہ کتے بیسمنٹ کی طرف سے برآمد ہوئے۔ ایک ہوشیار گارڈ نے بیسمنٹ کا آٹومیٹک دروازہ فوراً بند کر دیا ورنہ خبر نہیں کہ کیا صورتِ حال پیش آتی۔ آخر میں نیوز کاسٹر نے پولیس آفیسر کے حوالے سے کہا ”ری ہوم کی انتظامیہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس ادارے کے پیچھے کچھ نہایت سنگین قسم کے حالات موجود ہیں۔ یاد رہے کہ ”ری ہوم“ کے وسیع و عریض کیمپس کے نیچے بہت بڑے بڑے بیسمنٹ موجود ہیں اور یہ کئی ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پولیس تیزی سے تفتیش کر رہی ہے۔ امکان ہے کہ آئندہ دو تین گھنٹوں میں سنسنی خیز انکشافات سامنے آئیں گے۔“

خبر ختم ہوئی تو اسمتھ پُرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دبے لہجے میں بولا ”میرا خیال ہے کہ اگر آپ لمبے چکروں میں پڑنا نہیں چاہتے تو آپ کو یہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔“

”اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا خیال تو آپ کے خیال کے ساتھ ہے۔ جیسا آپ کہیں گے میں کروں گا اور میرے ساتھی بھی۔“

”مجھے تو اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ پولیس حرکت میں آ چکی ہوگی۔ کیا یہاں سے نکلنے کا کوئی ایسا راستہ ہے کہ پولیس سے مڈبھیڑ نہ ہو؟“

”یقیناً ہے اور یہ راستہ آپ کا یہ خادم ہی آپ کو بتا سکتا

سب۔" اسمتھ نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

قریباً آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم اس زمین دوز شہر سے نکلنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ روبی گل اور موئل میرے ساتھ تھے۔ موئل نے بوکارنو کی پیشانی پر آخری بوسہ دے لیا تھا اور اب اٹھ گیا۔ آنکھوں نے ساتھ میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ بیگی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ خبر نہیں تھی کہ وہ پریکر ماں بن چکی ہے یا ان بھول بھلیوں میں کہیں موجود ہے۔ نینا سر جھکائے ایک طرف خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے حواس ابھی تک ٹھیک طور سے کام نہیں کر رہے تھے۔ کسی بھی نئے چہرے کو دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹک جاتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پرنس داراب (کنگ) اب بھی اس کے ارد گرد کہیں موجود ہے اور اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے گی تو وہ اسے بدترین سزا سے دوچار کر دے گا۔

میں نے اسے چلنے کو کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا "نینا! تمہیں اپنے خول سے باہر نکلنا ہوگا۔ تم ایک بار پھر وہی کر رہی ہو جو تم نے ونچسٹر کے محل میں کیا تھا۔ میری منت کے باوجود تم نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ قدرت نے تمہیں دوبارہ موقع دیا ہے اس بار موقع کھو دو گی تو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ چلو اٹھو نینا۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ ان پتھریلی دیواروں سے باہر، سری لنکا کے ساحلوں پر ایک بڑی بھرپور زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ تمہارا گھر تمہاری بہنیں وہ سب کچھ جو تم سے جدا ہو چکا ہے۔ اٹھو نینا۔ اب انکار مت کرو۔" میں نے اسے ہولے سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر جیسے برسوں پرانی برف پگھلتی ہے، جیسے پتھر سے چشمہ پھوٹتا ہے، جیسے صحرا میں بارش کی بوند گرتی ہے۔ ایک آنسو گالی گڑیا کی پتھریلی آنکھ سے نکلا اور اس کے زرد رخسار پر ڈھلک گیا۔ وہ چند لمحے ساکت رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

کنگ کی زیرِ زمین دنیا سے بحفاظت نکل آنا ایک خواب جیسا لگ رہا تھا..... اسمتھ سینئر ہمیں ایک تنگ اور طویل راستے سے گزار کر ایک ایسی جگہ لے آیا تھا جو دی ہوم ہرسٹ کے وسیع و عریض کیمپس سے دو تین فرلانگ کی دوری پر تھی۔ یہ ایک فارم ہاؤس تھا۔ سمندر یہاں سے دور نہیں تھا۔ لہروں کا شور ہم بآسانی سن سکتے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا۔ سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا۔ درختوں کے طویل سائے ہرے بھرے کھیتوں پر پڑ رہے تھے۔ کھیتوں سے پرے دور تک ایک نہایت ہموار گراسی میدان نظر آ رہا تھا۔ یہاں خوش رنگ لباس والے بچے اور ان کے ننھے منے کے کھیل کود میں مصروف تھے۔

کئی ہفتوں بعد یہ سب کچھ دیکھنا بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ دھوپ نے جیسے پیشانی کا بوسہ لیا۔ پھولوں کو چھو کر آنے والی تازہ ہوا نے کان میں سرگوشی کی۔ ابھی زندگی ہے، ہوا موجود ہے۔ ابھی کچھ لوگ تمہارا انتظار کرتے ہیں۔

کیمپس کے زیرِ زمین بھول بھلیوں سے نکلنے کے ٹھیک چار گھنٹے بعد ہم لندن میں تھے۔ ہمیں بحفاظت لندن تک پہنچانے کا کٹھن کام اسمتھ نے انجام دیا تھا۔ وہ ہماری توقع سے بڑھ کر معاون و مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ حالانکہ کیمپس سے نکلنے کے بعد وہ آزاد تھا۔ ہمارا ساتھ چھوڑ کر جا سکتا تھا لیکن وہ ساتھ دے رہا تھا۔ وہ ایک ٹینٹوں والی ٹیکسی کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پھر اس کو ڈرائیو کر کے ہمیں وسطی لندن تک لے آیا۔ اس وقت تک رات کا ایک بج چکا تھا۔ اسمتھ ہمیں اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر لے آیا۔ روبی، موئل اور نینا وغیرہ کے علاوہ اسمتھ کے قریباً دس بارہ ساتھی بھی کونسٹیبل ہمارے ساتھ آئے تھے۔ یہ بڑا آرام دہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارے کا سارا لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ راہداریوں کے صاف ستھرے خوبصورت فرش تھے۔ اسمتھ نے ٹی وی آن کیا۔ مختلف نیوز چینلز پر دہائی مچی ہوئی تھی۔ "دی ہوم" کی خبر کو بریکنگ نیوز کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ جو بھی نئی پیشرفت ہوتی تھی فوراً اسکرین پر آ جاتی تھی۔ پولیس اور اسپیشل کمانڈوز کے دستے ان پوشیدہ راستوں تک پہنچ گئے تھے جو ہرسٹ کو کنگ کی زیرِ زمین ایمپائر سے جدا کرتے تھے۔ اب ہر پل نیا انکشاف ہو رہا تھا۔ ہرسٹ کی آڑ میں جو وسیع و عریض دھندا چلایا جا رہا تھا اس کی تفصیلات سامنے آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ جو پراسرار تباہی وہاں مچی تھی اس کی جھلکیاں بھی دکھائی دینے لگی تھیں۔

نینا نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ روتے روتے بولی "خدا کے لیے... میرے صبر کا اور امتحان مت لیں۔ مجھے روپ اور پنکی سے ملا دیں۔ میں اپنی بہنوں کی صورتوں کو ترس گئی ہوں۔"

"بس نینا! برا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اچھے دن شروع ہونے والے ہیں۔"

"لیکن کب شروع ہوں گے اچھے دن... وہ بھی یہی کہتا تھا۔ بڑی دلیری سے جھوٹ بولتا تھا۔" وہ سسکی۔ اس کا اشارہ یقیناً پرنس داراب (کنگ) کی طرف تھا۔

"لیکن میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" میں نے نینا

کی۔ "اللہ نے چاہا تو تم چند گھنٹوں میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گی۔"

"کاش! میری مدد کرو... مدد کرو۔" وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

اس کی آواز بہت بھدی ہو چکی تھی لیکن انداز اب بھی زیادہ برا نہیں تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر گزر جانے والی قیامت کی نشانیاں تھیں۔ وہ سکڑی سمٹی واقعی ایک گڑیا کی طرح نظر آتی تھی۔ ایک ایسی گڑیا جسے شریر بچوں نے توڑ پھوڑ ڈالا ہو۔

میں نے اسمتھ سے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم نینا کی بات سری لنکا میں اس کی بہنوں سے کرا دیں۔" (یہ بات میں نے صرف نینا کی تسلی کے لیے کہی تھی)

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں صبح ہوتے ہی اس کا انتظام کر دوں گا۔ آپ مجھے فون نمبر وغیرہ دے دیں۔" نینا غیر یقینی نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔

اسمتھ کے اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ کر ہم خود کو کافی محفوظ تصور کرنے لگے تھے۔ جب بندہ خود کو فوری خطرات سے محفوظ محسوس کرتا ہے تو پھر اس کا دماغ کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی ترجیحات مقرر کرے۔ میری سب سے پہلی ترجیح یقیناً یہی تھی کہ میں عالم قریشی اور غزالہ تک پہنچوں۔ جس رات "لندن پولیس" نے مجھے گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن پہنچایا، غزالہ اپنی فیملی کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ درحقیقت میں نے اپنی گرفتاری اسی شرط پر دی تھی کہ عالم قریشی، غزالہ اور غزالہ کی فیملی کو اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کی اجازت دی جائے گی۔ غزالہ کی گہری سہیلی آفرین بھی غزالہ کے ساتھ تھی۔ چچا جلیس اور غزالہ جاتے جاتے چچی ناخرہ کو بھی اسپتال سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب ان سب لوگوں کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اسی طرح دونوں گائی گڑیوں یعنی روپ اور پنکی کے بارے میں بھی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اپنی گرفتاری سے پہلے میں نے دونوں بہنوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے دوست نصرت رحمانی کو سونپی تھی۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں ثابت ہو گیا کہ اسمتھ کا فراہم کیا ہوا ٹھکانہ ہمارے لیے محفوظ ترین ہے۔ اس کے علاوہ اسمتھ کی ہمدردی اور وفاداری بھی ثابت ہو رہی تھی۔ ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے میں نے چہرے میں تھوڑی بہت تبدیلی کی۔ ایسی تبدیلی سے آنکھوں کے قریب "کردیا" "جھریاں" نمودار ہو گئیں۔ بال بالکل سفید ہو گئے۔ اس قسم کی چند اور چھوٹی موٹی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ میں نے روبی کے چہرے کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا۔ تھوڑا سا وقت تو لگا لیکن ہم لندن میں گھومنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

مجھے عالم قریشی اور غزالہ کا کھوج لگانا تھا۔ اس حوالے سے اسمتھ کے ساتھ میری طویل بات چیت ہوئی۔ اسمتھ پیدائشی "لندنی" تھا۔ لندن کے نشیب و فراز کو وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح جانتا تھا۔ یہاں اس کے پاس ذرائع بھی تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے ساتھیوں کی تلاش میں میری مدد کرے۔ میں اسے منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ اسمتھ کو ہمارے بارے میں کافی کچھ معلوم تھا۔ وہ میرے علاوہ روبی گل کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے خبر تھی کہ کچھ عرصہ پہلے نوادرات کے جس عظیم الشان دفینے کا چرچا ہوا تھا اس کا تعلق ہمارے ساتھ ہی تھا۔ ہم ان تین کرداروں میں سے دو تھے جو اس دفینے کے بڑے حصے دار بنے تھے۔ لہٰذا جب میں نے اسمتھ کو منہ مانگا معاوضہ دینے کی بات کی تو یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے بظاہر تو معاوضے میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا تاہم میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اندر سے وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ ان دنوں جو سب سے دلچسپ بات ہوئی وہ یہ تھی کہ اسمتھ سینئر روبی کو سر کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ سر کے خطاب سے روبی بہت مسرور ہوا تھا۔ ایک "فرنگی" کے منہ سے اپنے لیے سر کا خطاب سننا اس کے لیے یقیناً بڑا روح پرور تھا۔

تیسرے روز شام کو اسمتھ آیا تو اس کے چہرے پر ہلکا سا ہیجان تھا۔ میں نے سمجھا شاید وہ غزالہ وغیرہ کے حوالے سے کوئی خبر لایا ہے لیکن بات دوسری تھی۔ اس نے بتایا "پولیس اور نیم فوجی دستے بالآخر ہرسٹ کے تہ خانوں میں گھس گئے ہیں اور انہوں نے قیدیوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا ہے۔ اس حوالے سے نیوز میڈیا پر سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ شام کی نیوز میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا نام بھی لیا گیا ہے۔ یہ خبر ثبوت کے ساتھ دی گئی ہے کہ کنگ کے "سیٹ اپ" کو زیر و زبر کرنے میں ایک بار پھر ہم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔"

"ثبوت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وڈیو فلمیں۔" اسمتھ نے جواب دیا "چند دن پہلے جب آپ کو پکڑنے کے بعد کنگ نے آپ کا میک اپ اتروایا تھا تو کلوز سرکٹ کے کیمروں نے آپ کی تصویریں بھی بنائی تھیں۔ یہ تصویریں ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔"

اسمتھ ان تمام واقعات کی تفصیلات بتانے میں مصروف ہو گیا جو ہرسٹ کے زیرِ زمین اور زیرِ تعمیر علاقے میں پیش آ رہے تھے۔ اسمتھ کی باتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ

ٹرسٹ کے تہہ خانوں میں تہلکہ مچانے والے سیکڑوں کنوں میں سے کسی طرح دو تین درجن کنے ایک کوریڈور سے گزر کر گراؤنڈ فلور پر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کی بریفنگ ختم ہوئی تو میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے عالم قریشی اور غزالہ کے کھوج کے بارے میں پوچھا۔ اس حوالے سے اسمتھ کا جواب حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ساتھی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی ینا بلند آواز سے رونے لگی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں چیخ رہی تھی ''تم سب کو۔ ہاں تم سب کو اپنی اپنی پڑی ہے.... آخر کب تک مجھے دھوکا دیتے رہو گے۔ کب تک مجھ سے جھوٹ بولتے رہو گے۔ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ میری بہنیں کہاں ہیں؟ وہ زندہ ہیں یا مر گئیں ہیں....''

اس کی آہ و بکا کربناک تھی۔ میں اندر سے ہل گیا۔ شاید واقعی ہم سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ میں بھی عالم قریشی اور غزالہ کی تلاش پر ہی زور دے رہا تھا.... اس لیے کہ وہ میرے اپنے تھے۔ مجھے ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے دل میں تہیہ کیا کہ میں خود بھی ہاتھ پیر ہلاؤں گا اور عشرت رحمانی کا کھوج لگانے کی کوشش کروں گا۔ رحمانی کے کھوج کا مطلب یہی تھا کہ روپ اور رینکی کا کھوج بھی لگ جاتا۔

☆☆☆

پچھلے چھتیس گھنٹے سے میں اور زریں لندن میں گھوم رہے تھے اور عشرت رحمانی کی تلاش میں تھے۔ رحمانی کا فلیٹ بند پڑا تھا۔ اس کے اہل خانہ کا بھی کوئی پتا نہیں تھا۔ شام کے آٹھ بجے تھے۔ میں اور زریں اونچی چھت والی ٹیکسی میں کوئین ویز سے ''بیس واٹر'' کی طرف جا رہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق عشرت رحمانی کا ایک عزیز بیس واٹر کے علاقے میں رہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید اس سے ملاقات ہو جائے۔ ہم ایک مصروف سڑک سے گزر رہے تھے۔ ٹیکسی کی رفتار خاصی سست تھی۔ اچانک ایک چہرے پر میری نگاہ پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں اس لڑکے کو بھول نہیں سکتا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کا یہ لڑکا منوہرا دیوی کے ان خوبرو خدمت گاروں میں شامل تھا جو نیمبس کے عشرت کدے میں منوہرا کے ارد گرد بھنوروں کی طرح منڈلاتے تھے۔ لڑکے کی نیلگوں آنکھیں ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھیں۔

''ٹیکسی روکو۔'' میں نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

''ایک منٹ سر۔'' اس نے ٹیکسی سائیڈ پر لگانے کی کوشش کی۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ لڑکا کسی بھی وقت بھیڑ میں گم ہو سکتا تھا۔ میں نے زریں گل کا بازو پکڑا اور چلتی ٹیکسی سے اتر گیا۔ جاتے جاتے میں نے دس پونڈ کا نوٹ ڈرائیور کی طرف اچھال دیا تھا۔ لڑکا دراز قد تھا لہٰذا رش کے باوجود ہم نے اسے جا لیا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ زریں حیران تھا ''کون ہے استاد جیب.... کہاں ہے؟'' وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

''جو بھی ہے ابھی سامنے آ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''کہیں.... سائیں عالی تو نہیں ہے؟''

''نہیں اس کا ایک جن ہے۔ پرستان کی ملکہ کا خدمت گار ہے۔ ملکہ کا پتا چل گیا تو ہو سکتا ہے کہ دونوں لڑکیوں کا پتا بھی چل جائے۔''

''خو ملکہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''منوہرا دیوی۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

دراز قد لڑکا ایک نیون سائن کے سامنے جا کر رکا۔ نیون سائن پر ''بوم کلب'' کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ دراصل ایک نائٹ کلب تھا۔ چھ سات باوردی بیرے کلب کے دروازے پر ہی موجود تھے۔ ابھی نو بجے تھے۔ کلب میں گہما گہمی شروع نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال لڑکا اندر داخل ہوا تو ہم بھی پچاس پچاس پونڈ کے دو ٹکٹ لے کر اندر گھس گئے۔ کلب کے اندر خواب ناک سا ماحول تھا۔ میوزک زور و شور سے بج رہا تھا۔ رنگ برنگی روشنیوں میں قریباً دو درجن لڑکیاں ایک دوسرے سے خرمستیاں کر رہی تھیں.... یا یوں کہہ لیں کہ امیر کبیر گاہکوں کے انتظار میں ٹائم پاس کر رہی تھیں۔ دو ہماری طرف بھی لپک کر آئیں لیکن میں نے معذرت کر لی۔ ہم کوک منگوا کر پیتے رہے اور صورت حال کا جائزہ لیتے رہے۔ لڑکا ایک اندرونی دروازے سے گم ہو گیا تھا۔ مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں کوئی دوسرا دروازہ بھی نہ ہو جہاں سے وہ نکل جائے اور ہم یہیں بیٹھے کوک پیتے رہیں۔ میں نے گھوم پھر کر مختصر کلب کا جائزہ لیا اور مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ کلب کا داخلی دروازہ بس ایک ہی ہے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں چند اور گاہک بھی کلب میں آ گئے۔ کچھ وہسکی سے شغل کرنے لگے کچھ لڑکیوں سے ہم آغوش ہو گئے۔ اسی دوران میں خوبرو لڑکا پھر نظر آیا۔ وہ کلب کے بار کاؤنٹر پر پہنچا۔ ایک خوبصورت ٹرے میں اس نے قیمتی شراب کی ایک بوتل رکھی۔ سگریٹ کا پیکٹ، سوڈا، گلاس اور دیگر لوازمات سجائے اور پھر اندرونی دروازے میں گم ہو گیا۔ شراب کا برانڈ میرے لیے توجہ کے قابل تھا۔

میں نے زریں سے کہا ''ملکہ کا سراغ لگ گیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہی کہ بدر منیر کو یاد کر لو اور ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

دو منٹ بعد ہم اپنی جگہ سے اٹھے اور اندرونی دروازے میں داخل ہو گئے۔ کلب میں ہلا گلا شروع ہو چکا تھا۔ افراتفری کی وجہ سے کسی نے ہمیں دروازے سے اوجھل ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک طرح سے ہمارے لیے اچھا ہوا اور کلب والوں کے لیے بھی۔ ہمارے سامنے ایک خم دار راہداری تھی۔ راہداری میں پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ایک نہایت طویل گارڈ سے ہمارا سامنا ہوا۔ وہ ایک دم الرٹ نظر آیا اور سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم نے اس سے وہی سلوک کیا جو چھوٹے بچوں سے کیا جاتا ہے ''تمہارے پیچھے کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کچھ نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید اسے نظر نہ آتا۔ وہ مڑتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کی لمبی گردن میرے بازو کی گرفت کے لیے بے حد موزوں ثابت ہوئی تھی۔ ہم نے اسے رائفل سمیت گھسیٹ کر ایک واش روم میں ڈال دیا۔

راہداری میں ہم پھر آگے بڑھے۔ یہ کلب کا لگژری پورشن تھا۔ ہر چیز فائیو اسٹار ہوٹل سے بڑھ کر دکھائی دے رہی تھی۔ اسٹیل کے ایک آٹو میٹک دروازے کے سامنے ایک اور گارڈ سے ہماری ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات بھی سنگین ثابت ہو سکتی تھی لیکن گارڈ کی کوئی پرانی نیکی کام آ گئی۔ اس نے ہمیں آڑی ترچھی نظروں سے ہمیں گھورا۔ فقط اتنا پوچھا ''آپ کو کس سے ملنا ہے سر؟''

''منوہرا دیوی سے۔''

''آپ نے وقت لیا ہوا ہے سر؟'' گارڈ نے پوچھا۔

گارڈ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں اور زریں دروازے میں داخل ہو چکے تھے۔ گارڈ ہمیں روکتا ہی رہ گیا۔ سامنے موٹے شیشے کی ایک خوبصورت دیوار تھی۔ دیوار کی دوسری طرف مجھے منوہرا کی جھلک نظر آئی۔ منوہرا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی کہ فون سن رہی تھی۔ سامنے شیشے کی تپائی پر وہی ٹرے پڑی تھی جو خوبرو لڑکا ابھی کاؤنٹر سے لے کر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ گارڈ ہم سے دست و گریباں ہونے کی کوشش کرتا۔ منوہرا نے ہمیں شیشے کی دوسری جانب سے دیکھ لیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے گارڈ کو دست درازی سے باز رکھا۔ فون سننے کے بعد اس نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اندر بلایا۔ ہم اندر پہنچے۔ وہ حیرت اور استعجاب سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ ''کون ہیں آپ....؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بزرگ شہری ہوں اور آپ سے حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں ملکہ صاحبہ۔''

''کیا بکواس ہے۔'' وہ ایک دم سیخ پا ہو گئی ''تمہیں کس نے آنے دیا اندر۔''

''مجھے کسی نے نہیں روکا۔ بزرگ شہری کو کون روک سکتا ہے۔''

وہ دھیان سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ایک دم ریڈ الرٹ نظر آنے لگی ''تم.... اپنی اصل شکل میں نہیں ہو۔ تم نے گیٹ اپ کر رکھا ہے۔ کون ہو تم؟''

میں نے وصل آواز میں بولتے ہوئے کہا ''اگر مجھے اپنا دوست سمجھ سکو تو دوست ہوں۔ بلکہ دوست سے بھی بڑھ کر ہوں۔''

وہ حیرت زدہ سی میری طرف تکتی رہی پھر اس نے مجھے پہچان لیا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔ میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی ''تم یہاں کیسے پہنچے؟''

''جیسے تم پہنچی ہو۔ نیمبس سے نزت یہاں آیا ہوں۔ ساتھ میں میرا دوست زریں ہے۔ نیمبس میں تم اس کی خوب خبر لیتی رہی ہو لیکن اسے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا، یہی کرتا پھر نیمبس میں تیخ زاونی نوسیہ سے میری جان چھڑا کر تم نے جو نیک کام کیا تھا۔ اس کے بدلے میں یہ خانزادہ تمہاری ساری زیادتی بھول چکا ہے۔ کیوں زریں گل، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟'' آخری الفاظ میں نے اردو میں کہے تھے۔

زریں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی فوراً ہی سر ہلا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم منوہرا دیوی کے ساتھ ایک شاندار نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ میں نے منوہرا کو اس بے ہوش گارڈ کے بارے میں بتا دیا تھا اور منوہرا نے اس کے لیے طبی امداد روانہ کر دی تھی۔ منوہرا کا رویہ دوستانہ تھا۔ وہ ایک دبنگ عورت تھی لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں نمی نظر آئی۔ وہ لرزاں لہجے میں بولی ''نیمبس میں تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اس نے مجھے تفریباً برباد کر ڈالا۔ تمہارے فرار کے بعد مجھ پر سنگین غفلت اور غیر ذمے داری کے الزامات لگائے گئے پھر سانپ گھر سے سانپ نکلنے والا واقعہ ہو گیا اور رنگ میرے لیے شعلہ جوالا بن گیا۔ مجھے نیمبس کی ذمے داریوں سے سبکدوش کر کے فیلڈ میں بھیج دیا گیا۔ یہ سب کچھ تکلیف دہ تو شاہ جہاں میں بہت ناراض بھی تھی تم سے۔ شاید چند دن پہلے میرا او

ہمارا سامنا ہوتا تو ہمارے درمیان اتنی ہی کشمکش ہوتی لیکن اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کنگ اور کنگ کا سارا سیٹ اپ تہس نہس ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ جاننا ہی تو نہیں کہ اس میں تمہارا کردار کتنا ہے لیکن مجھے وشواس ہے کہ تمہارا کردار اس میں موجود ہے۔ تم باہمت شخص ہو شاہ جہاں۔ میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔ میرا من چاہ رہا ہے کہ تمہیں ویل ڈن کہوں۔"

"تمہارا دل چاہ رہا ہے تو کہہ لو لیکن فرسٹ میں جو کچھ ہوا ہے۔ اس میں اصل کردار حالات نے ہی ادا کیا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ مجھ سے فرسٹ کے حالات سننے کے لیے بے تاب تھی۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا سے اسے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن وہ اندر کی باتیں جاننا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کے سوالوں کے جواب تفصیل سے دیے۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح منوہرا بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی کہ کتوں کی پراسرار یورش کا تعلق تو کارلو کے مراقبے سے تھا لیکن جب میں نے کئی چشم دید واقعات بتائے تو وہ کسی حد تک قائل نظر آنے لگی۔ وہ خود بھی پیراسائیکالوجی اور روحانی علوم میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس نے مجھ سے لارسیوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ پوچھا۔

منوہرا کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ کنگ براؤن کی شکست اور موت نے اسے دلی طور پر مطمئن کیا ہے۔ کنگ سے منوہرا کے تعلقات ان دنوں اتنے اچھے نہیں رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کنگ کے زیر عتاب تھی۔ حالات کی موجودہ حیران کن تبدیلی کے بعد وہ خود کو بہت محفوظ تصور کر رہی تھی۔

ہماری گفتگو رات کے دو بجے تک جاری رہی۔ اس دوران میں ہم نے کھانا بھی کھایا۔ منوہرا حسب عادت... مے نوشی کرتی رہی اور سگریٹ بھی پھونکتی رہی۔ خدمت گار لڑکے اس کے اردگرد منڈلاتے رہے۔ میں منوہرا سے روپ اور چنکی کے بارے میں پوچھنے کے لیے بے تاب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چند روز پہلے جب کنگ نے منوہرا کو کیمپس کی ذمے داری سے سبکدوش کر کے فیلڈ میں بھیجا تھا تو اس کے ذمے کیا کام لگایا تھا۔ منوہرا کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ دونوں گالی گڑیوں کا سراغ لگائے گی۔ نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ منوہرا نے اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کی ہوگی۔

منوہرا نے ایک جام خالی کیا اور مخمور نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "پچھلی مرتبہ جب ہم کیمپس میں ملے تھے تو تم "پینے" میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔ اب کیا ہوا ہے؟"

ایک دم میری نگاہوں میں رقص گاہ کے مناظر گھوم گئے۔ جھریوں بھرا نسوانی چہرہ... تھے... چیتا باب... ہاکاکل... میرے اندر ایک جھرجھری سی پھیل گئی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں... یونہی آج موڈ نہیں ہے۔" میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں اس نشے سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ چکا ہوں۔

وہ خاموش ہو گئی۔ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولی "میرے پاس تمہیں دکھانے کے لیے کچھ ہے۔ ایک سرپرائز۔"

میرا دل دھڑک اٹھا۔ نگاہوں میں روپ اور چنکی کے حسین معصوم چہرے گھوم گئے۔ میرے دل نے گواہی دی، منوہرا دونوں گالی گڑیوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکی ہے لیکن جب تک وہ دونوں سامنے نہ آ جاتیں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

منوہرا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی پھر اس نے مجھے اور زریں گل کو ساتھ لیا اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ بڑی متوالی چال چلتی ہوئی وہ ایک خوشبودار کوریڈور سے گزری اور ایک دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ذہن میں ایک سیکنڈ کے لیے خطرے کی گھنٹی بجی۔ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ پتلون کی جیب میں میرے ہاتھ کی گرفت منی سائز پسٹل پر سخت ہو گئی۔ کمرے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ سامنے بیڈ کے ساتھ صوفے پر کوئی بیٹھا میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دروازہ اس قدر بے آواز کھلا تھا کہ ورق گردانی کرنے والے کو میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اگر آسمان ٹوٹ کر میرے سر پر گر پڑتا یا کوئی لین پھاڑ کر کوئی دیو ہیکل مچھلی برآمد ہوتی اور کمرے میں تڑپنے لگتی یا اردگرد کی ہر شے ہوا میں معلق ہو کر قہقہے برسانے لگتی تو شاید مجھے اتنا شدید جھٹکا نہ لگتا جتنا غزالہ کو اپنے سامنے دیکھ کر لگا۔ ہاں وہ غزالہ ہی تھی۔ میری محبت... میری شریک حیات... میری زندگی... اس نے کہا تھا، ہم پھر کبھی ملیں گے... ایک بار تو ضرور ملیں گے... اور وہ مل گئی تھی۔ میرے سامنے تھی۔ ان لمحات میں میرے دل کی دھڑکن اور کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ میں غزالہ کے پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ وہ بڑی محویت سے میگزین پر جھکی ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں پیشانی پر جھول رہی تھیں۔ نیلے قالین پر سفید ننگے پاؤں خوبصورت پرندوں کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ سوچنے کی

مہلت نہیں تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچی۔ بس یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ موجود ہے۔

دو تین سیکنڈ کے اندر میں نے جیسے مسرت اور ترنگ سے بھری ہوئی دو تین زندگیاں جی لیں پھر میرے سینے میں شرارت کا شگوفہ کھلا۔ میں بہت ہولے سے غزالہ کے بالکل قریب پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتی۔ میں نے دھیرے سے "ہیلو" کہا۔ وہ صوفے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میگزین گر گیا تھا۔ وہ حیرت آمیز خوف سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میرے چہرے کی تفصیلات کو زیادہ اجاگر نہیں کر رہی تھی۔ "کون... ہیں... آپ؟" وہ ہکلائی۔

"آپ ہی کی طرح منوہرا دیوی کا مہمان ہوں۔" میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا "دراصل... مجھے خوبصورت لڑکیوں سے معذرت کرنے کا شوق ہے..."

"آپ... آپ ہیں کون؟" وہ بلند آواز سے بولی "اور یہاں آئے کیسے؟"

"میں نے بتایا تو ہے محترمہ، مجھے خوبصورت لڑکیوں سے معافی مانگنے کا شوق ہے۔"

"یہ... یہ... آپ نے ابھی معافی مانگی ہے؟" وہ چیخ کر بولی۔

"بڑی بھولی ہیں آپ... معافی مانگنے کے لیے گستاخی کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ میں نے گستاخی کی تھی۔ اب معافی مانگ رہا ہوں۔"

وہ تڑپ کر بولی "آپ... ہیں کون انکل... بڑے عجیب شخص ہیں آپ۔"

"عجیب ہی نہیں عجیب و غریب ہوں۔ لڑکیوں سے معافی ہی نہیں مانگتا اکثر ان کے پاؤں بھی پکڑتا ہوں... لیکن اس کے لیے مجھے ذرا بڑی گستاخی کرنا پڑتی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کے لیے مجھے معاف فرمائیں گی..." میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لیے اس کا منہ کھلا۔ غالباً وہ ملازم کو آواز دینے لگی تھی لیکن پھر ایک دم وہ ٹھٹک گئی۔ اسے میرے "گیٹ اپ" پر شبہ ہو گیا تھا۔ دھیان سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے ٹیبل لیمپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ٹیبل لیمپ کو میرے چہرے تک لا کر اس نے غور سے دیکھا پھر یکایک اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ ٹیبل لیمپ کانپ رہا تھا۔ میں نے لیمپ غزالہ کے ہاتھ سے لے کر واپس میز پر رکھ دیا۔ غزالہ میرے بالکل پاس چلی آئی۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں پیوست ہو گئیں۔ چند سیکنڈ یہی کیفیت رہی۔ تب اچانک ان حسین آنکھوں میں دریا امڈ آئے۔ اس کے لرزتے ہونٹوں نے کچھ کہا۔ یقیناً میرا نام ہی لیا ہوگا۔ جیسے شعلہ لپکتا ہے... جیسے برق تڑپتی ہے... وہ تڑپی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا... اور یوں بھینچ لیا کہ وہ میرے جسم کا حصہ بن گئی۔

"غزالہ۔" میں نے کہا۔ مجھے اپنی آواز کہیں دور سے... بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"جی۔" اس کی سرسراتی گرم سانسوں نے کہا۔

"میں آ گیا ہوں۔"

☆☆☆

اگلے ایک دو گھنٹے میرے اور زریں کے لیے بہت انکشاف انگیز تھے... ہمیں معلوم ہوا کہ غزالہ کے علاوہ تابی، آفرین اور چچا چچی بھی یہیں موجود ہیں۔ چچی کے سوا ان سب سے ملاقات ہوئی۔ چچا جلیس نے مجھے سینے سے لگایا اور دیر تک خوشی کے آنسو بہاتے رہے۔ جس رات ہم جدا ہوئے تھے حالات بے حد سنگین تھے۔ برٹش پولیس نے چچا کی رہائش گاہ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ خبر ہی نہیں تھی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ زندگی مجھ سے بہت دور اور موت نزدیک دکھائی دیتی تھی... لیکن آج اندیشوں کے بہت سے بادل چھٹ چکے تھے۔ میں موت کو جل دے کر واپس اپنوں کے درمیان آ گیا تھا۔

تابی دیر تک میری گود میں چڑھ کر بیٹھا رہا اور آنکھ میں انگلی چبھونے کا پرانا مشغلہ دہراتا رہا۔ آفرین بھی بے حد گرم جوشی سے ملی۔ چچی کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہیں میری اور غزالہ کی شادی کے بارے میں ابھی تک نہیں بتایا گیا۔ ان کی حالت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی۔ کسی وقت ان کا بلڈ پریشر ایک دم گر جاتا تھا اور انہیں انجکشن دینا پڑتا تھا۔

چچا جلیس نے اب تک کے حالات بتاتے ہوئے کہا۔ "اس رات ہم سیدھے اچھان پہنچے تھے۔ وہاں سے تمہاری چچی کو لے کر ہم سنڈ ماؤتھ چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی آفرین نے فون پر تمہیں اپنی خیریت کی اطلاع دے دی تھی۔ سنڈ ماؤتھ میں آفرین کا ایک کزن رہتا ہے۔ آفرین کو یقین تھا کہ ہم اس کے ہاں بالکل محفوظ رہیں گے۔ آفرین کا یہ یقین کافی حد تک درست ثابت ہوا۔ ہم سلیم نامی اس نوجوان کے فارم ہاؤس پر پانچ ہفتے تک بالکل سکون سے رہے۔ تاہم اس دوران میں تمہاری پریشانی نے بہت بے چین رکھا۔ غزالہ کا تو کچھ پوچھو ہی مت۔ کھانا پینا چھوٹا ہوا تھا۔ رات گئے تک فارم ہاؤس کی

...اب پر نسبتی رہتی تھی۔ مجھے تو فکر تھی کہ اس کے دماغ کو ہی کچھ نہ ہو جائے۔ میں بہت چاہتا تھا کہ یہ رو لے لیکن رو لی بھی نہیں تھی۔''

چچا جلیس نے چند لمحے توقف کیا پھر اپنے خیالات جمع کرتے ہوئے بولے ''غزالہ کی حالت دیکھ کر سہیم بھی بہت پریشان تھا۔ اس نے اپنے طور پر تمہارا پتا چلانے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ گرفتاری کی رات تمہیں برج کے پولیس اسٹیشن میں لے جایا گیا تھا۔ صرف سات دن بعد اس پولیس اسٹیشن پر ایک سنگین واقعہ ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے پولیس اسٹیشن کے اندر گھس کر اندھا دھند فائرنگ کی اور دستی بم بھی پھینکے۔ اس واقعے میں کم و بیش آٹھ افراد ہلاک ہوئے اور نقاب پوش حملہ آور تمہیں لاک اپ میں سے نکال کر لے گئے۔ اس واقعے کی خبر ٹی وی اور اخبارات میں نمایاں طور پر آئی۔ جب اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ واقعی کچھ لوگ تمہیں حوالات سے نکال کر لے گئے ہیں تو ہمیں کچھ تسلی ہوئی لیکن ہمیں آخر تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ حوالات سے نکلنے کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوا اور تم کہاں گئے......''

چچا کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا ''آپ سب لوگ منوہرا دیوی تک کیسے پہنچے؟''

''اس بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی منوہرا مائی اس عورت نے ہمیں بتایا ہے۔ دس بارہ روز پہلے رات پچھلے پہر اچانک بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں۔ ہمارے خون خشک ہوگئے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ پولیس پہنچ گئی ہے لیکن پھر چند مسلح نقاب پوش اندر آ گئے۔ انہوں نے گھر والوں کو تو کچھ نہیں کہا لیکن تمہاری چچی سمیت ہم سب کو گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آئے۔ جاتے جاتے انہوں نے سلیم کو سمجھا دیا کہ ہم بالکل خیریت اور حفاظت سے رہیں گے اور یہ جو کچھ کیا گیا ہے ہماری بہتری کے لیے ہے۔''

''آپ لوگوں نے منوہرا سے پوچھا نہیں کہ وہ آپ سے کیا چاہتی ہے؟''

''کئی بار پوچھا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پوچھا لیکن وہ کچھ بھی بتاتی نہیں تھی۔ ہاں یہ بات ماننا پڑے گی کہ یہاں ہمیں بے حد آرام اور حفاظت سے رکھا گیا ہے۔ ہمیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔''

''ہماری گفتگو کے دوران میں ہی منوہرا بھی وہاں پہنچ گئی۔ اب وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کا سرکش جسم باریک گاؤن سے جنگ و جدل کرتا نظر آتا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک خدمت گار لڑکا مؤدب انداز میں اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ جن سوالوں کے جواب منوہرا نے چچا وغیرہ کو نہیں دیے تھے وہ مجھے دے دیے۔ اس نے بتایا ''میں دونوں سری لنکن گلوکاراؤں کو تلاش کروا رہی تھی۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ انہیں تلاش کرنے کرتے میں تمہاری بیوی اور انکل وغیرہ تک پہنچ جاؤں گی۔ میرے کارندے لندن اور گرد و نواح میں ایسے ایشیائی باشندوں کی ٹوہ لگا رہے تھے جو حال ہی میں کسی ہوٹل یا گھر میں شفٹ ہوئے ہوں۔ اسی کام کے دوران میں وہ مسٹر سلیم کے فارم تک جا پہنچے۔ انہیں معلوم ہوا کہ یہاں دو ایشیائی لڑکیاں (غزالہ اور آفرین) موجود ہیں۔ میرے ان کارندوں میں سے ایک شخص پولیس کا حاضر ملازم بھی ہے۔ در پردہ وہ میرے لیے بھی کام کرتا ہے۔ چند ہفتے پہلے وہ اس ٹیم میں شامل تھا جس نے شادی کی رات کینٹ کے ایک گھر سے تمہیں گرفتار کیا تھا۔ اس نے غزالہ کو تمہاری دلہن کے روپ میں بھی دیکھ رکھا تھا۔ اس نے غزالہ کو دیکھا اور پہچان لیا۔ اس نے وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی اطلاع مجھے دی۔ ہم نے فوری طور پر تیاری کی اور اسی رات فارم پر ریڈ کر کے تمہارے پریوار (خاندان) کو اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ تم ان سے پوچھ سکتے ہو پچھلے دس بارہ روز میں انہیں یہاں ہر طرح کی سہولت اور شانتی ملی ہے۔''

''ہاں اس بات کا اعتراف تو یہ لوگ بھی کر رہے ہیں'' میں نے کہا۔

''شاید تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہو کہ میں نے یہ سب کیوں کیا...... اور میں اس سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہوں؟ اس کا سچا اور کھرا جواب یہ ہے کہ یہ بے لوث ہے۔ میری اس بات کی سچائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو کہ تمہارا پریوار پچھلے دس بارہ روز سے میرے پاس موجود ہے لیکن کنگ یا اس کے حواریوں کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور نہ ہی ہوتی تھی۔ اگر تم اس میں میرا کوئی مقصد تلاش کرنا چاہتے ہی ہو تو وہ صرف ایک ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ میں تمہارے ساتھ اپنے بگڑے ہوئے سمبندھ (تعلقات) ٹھیک کرنا چاہتی تھی...... ویٹس آل۔''

وہ قریباً ساری رات ہی جاگتے اور باتیں کرتے ہوئے گزری۔ غزالہ کی حسین آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ خوشی کی فراوانی ہو یا خوشی کی لیکن آنکھوں کو رونا ہی پڑتا ہے۔ رات پچھلے پہر تنہائی ملی تو غزالہ نے میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ اشکبار لہجے میں بولی ''بس شاہ جہاں! اب اور نہیں بھٹکنا۔ اب ہمیں ایک گھر چاہیے ایک ...

چاہیے۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے لیے صرف آپ کے لیے جینا چاہتی ہوں۔ پلیز شاہ جہاں! اب اور نہیں۔''

میں نے اس کے نرم ملائم ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے لرزاں ہاتھ گلاب کے دو پھولوں کی طرح میری ہتھیلیوں میں دبے ہوئے تھے۔ میں نے کہا ''غزالہ! وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو لیکن......''

''نہیں شاہ جہاں!'' اس نے بے قراری سے سر دائیں بائیں ہلایا ''اب اس 'لیکن' کو درمیان میں مت لائیں۔ بس اب میری بات مان لیں۔''

اس کے لہجے میں محبت اور منت کے ہزار انداز یکجا ہو چکے تھے۔ میں نے اس کی دلجوئی کے لیے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ آنسوؤں کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی ''بس اب ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔ کسی کو بتائے بغیر کسی یورپی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ کسی دور دراز شہر میں ایک گھر لے لیں گے۔ ایک کلینک لے لیں گے۔ ابو کے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے اکاؤنٹس چھیڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی جاننے والے سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی پچھلی زندگی سے کچھ نہیں چاہیے کچھ بھی نہیں۔ ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں شاہ جہاں...... آپ ایسا ہی کریں گے۔''

وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنا نرم بھیگا ہوا رخسار میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ اس کے ریشمی بال میرے بازوؤں پر بکھرے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد چچا سے بات ہوئی تو انہوں نے بھی یہی کچھ کہا۔ ''شاہ جہاں! اب پاکستان جانے کا نہ سوچو۔ ہمارے پاس ہالینڈ کے ویزے ہیں۔ تم مسٹر کلارک سے رابطہ کرو۔ وہ تمہارا بندوبست بھی کر دیں گے۔ ہم ہالینڈ چلے جاتے ہیں۔ کسی دور کے شہر میں ''سیٹل'' ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں کوئی جانتا نہ ہو پہچانتا نہ ہو۔ غزالہ نے پچھلے چند سالوں میں بہت دکھ دیکھے ہیں۔ میں اب اس کی آنکھوں میں مزید آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

''لیکن چچا جان! چند ہفتے پہلے تو ہمارے خیالات کچھ اور تھے۔ ہم پاکستان واپس جانا چاہتے تھے اور جلی کوٹ کی اجڑی حویلیوں کو آباد کرنا چاہتے تھے۔ ان بے آباد در و دیوار کو رنگوں اور روشنیوں سے سجانا چاہتے تھے۔''

''یہ سب جذباتی باتیں ہیں بیٹا۔ پاکستان میں تمہارے بے شمار دشمن ہیں۔ پھر پولیس بھی تمہاری تلاش میں ہے۔ تمہارے خلاف مقدمے بنائے جائیں گے۔ تمہیں ہر طرف سے پریشانیاں گھیر لیں گی۔ تم خود سمجھدار ہو۔ میرے خیال میں تمہیں وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا پھر بولے ''تمہیں اپنی چچی کی حالت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔ انہیں بہتر علاج کی ضرورت ہے اور یہ علاج شاید انہیں پاکستان میں میسر نہ آ سکے۔ ہمیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کرنا ہے۔''

ابھی تک میں چچی کے سامنے نہیں گیا تھا۔ انہیں میری آمد کے بارے میں بتایا بھی نہیں گیا تھا اور میرے خیال میں یہ بے خبری ہم دونوں کے لیے بہتر تھی۔

آفرین ان چند ہفتوں میں کافی دبلی ہوگئی تھی۔ وہ ایک بااثر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ دیر تک اس کے روپوش رہنے کی وجہ سے اس پر اور اس کے خاندان پر منفی اثرات پڑ سکتے تھے۔ وہ اپنے چچاؤں سے بمشکل اجازت لے کر اپنی سہیلی کی مدد کے لیے یہاں پہنچی تھی اور سہیلی کے ساتھ ساتھ خود بھی ناسازگار حالات میں پھنس گئی تھی۔ اب وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی۔ میرے یہاں پہنچنے سے اسے غزالہ کے حوالے سے بڑی تسلی ہوگئی تھی۔ اس نے ہمیں شادی کے بندھن میں بندھتے بھی دیکھ لیا تھا۔ اب اسے پیچھے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے منوہرا سے بات کی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ دو تین دن کے اندر آفرین کے ٹکٹ وغیرہ کرا کے اس کے یہاں سے روانہ ہونے کا انتظام کر دے گی۔

اب میرے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ روپ اور پنکی کی بازیابی کا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے عالم قریشی کے بارے میں بھی سخت فکرمندی تھی۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ پولیس کی حراست میں ہوتا اور کسی خفیہ جگہ پر رکھ کر اس سے تفتیش کی جا رہی ہوتی۔ میں اسمتھ کو یہاں منوہرا کے ٹھکانے ''بوم کلب'' میں بلانا چاہتا تھا مگر منوہرا کو اس سلسلے میں خدشات تھے۔ منوہرا سے مشورے کے بعد میں نے فون کے ذریعے اسمتھ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ میں اور نورین بالکل خیریت سے ہیں اور دو چار دن میں از خود اس سے رابطہ کریں گے۔ میں نے عالم قریشی کی تلاش کے سلسلے میں بھی اسمتھ کو کچھ ہدایات دیں۔

یہ چوتھے روز کی بات ہے۔ میں بوم کلب کے بیسمنٹ میں موجود تھا اور آفرین کو پاکستان کے لیے الوداع کہہ رہا

تھا۔ خزالہ، چچا جان اور زرینہ وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔ ابھی ہم نے نازفرین کو سی آف کیا ہی تھا کہ منوہرا کی صورت نظر آئی۔ کارڈلیس فون اس کے کان سے لگا تھا۔ اس نے فون پر آخری کلمات ادا کیے اور ہمارے پاس چلی آئی۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بولی "شاہ جہاں! ایک بڑی اہم خبر ہے۔ تمہیں بتایا تھا ناں کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں میرا ایک مخبر موجود ہے۔ اس کا نام ولسن ہے۔ ولسن نے ابھی خبر دی ہے کہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر چیلسی اسٹریٹ میں ایک مکان پر چھاپا مارا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہاں تمہارا پرانا ساتھی عالم قریشی چھپا ہوا ہے۔ چھاپے کے لیے پولیس عام طور پر نصف شب کے بعد کا وقت منتخب کرتی ہے۔ اس کیس میں بھی آدھی رات کے بعد ہی ریڈ کیا جائے گا۔ ویسے پولیس کے سفید پوشوں نے مطلوبہ مکان کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔"

یہ انتہائی بہت اہم اطلاع تھی اگر پولیس کا شبہ درست تھا اور وہاں عالم قریشی موجود تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ عشرت رحمانی والی گمشدہ لڑکیاں بھی وہاں پائی جاتی ہوں۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے منوہرا سے پوچھا۔

وہ بولی "یہ سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والی بات ہوگی۔ پولیس کے لیے بڑا دھچکا ہوگا۔ اگر ہم پولیس سے پہلے ہی بلہ بول دیں لیکن میرے اندازے کے مطابق ہم جتنی جلدی حرکت میں آئیں گے اتنا ہی فائدے میں رہیں گے۔ میری اطلاع کے مطابق فی الوقت چیلسی اسٹریٹ کے اس مکان کے گرد صرف تین پولیس والے موجود ہیں۔ ان کی پرائیویٹ گاڑی ایک آئس کریم اسٹور کے سامنے کھڑی ہے۔"

میں نے چند لمحے تک سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں اس مکان میں داخل ہونا چاہوں گا۔ زوبی گل بھی میرے ساتھ ہوگا۔ اگر تمہارے کارندوں میں سے کوئی اس کارخیر میں شریک ہونا چاہے تو بڑی اچھی بات ہے۔"

"اوکے!" منوہرا نے اثبات میں سر ہلایا "میں دو بہترین بندوں کا اور گاڑی کا انتظام کرتی ہوں۔"

منوہرا کے چہرے پر حوصلے کی چمک تھی۔ وہ نازک جثہ ناتیکہ ہر موقع پر ایک دبنگ اور ہنگامہ پسند عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس معاملے میں ہم نے کچھ مزید تفصیلات طے کیں اور کارروائی کے لیے تیار ہوگئے۔

میں بدستور ایک معمر شخص کے میک اپ میں تھا۔ زوبی کا میک اپ ایک اینگلو انڈین کا تھا۔ منوہرا نے جو دو افراد ہمارے ساتھ کیے وہ مارشل آرٹ کے ماہر اور اسلحہ شناس تھے۔ چیلسی اسٹریٹ حیران کن طور پر بوم کلب کے نزدیک ہی واقع تھی۔ بمشکل دو کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ہم ادھر اسٹیشن ویگن میں بیٹھے ادھر چیلسی اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ یقین نہیں آیا کہ کلاسیکل لاہوریا... کھابہ گیر عالم قریشی ہمارے اس قدر نزدیک موجود ہوسکتا ہے۔

چیلسی اسٹریٹ پر ہمارا آپریشن توقع سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا۔ لگتا تھا کہ ستاروں کی گردش ہمارے حق میں ہے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا موقع پر موجود پولیس والوں کو ایک بھاگتے چور کا تعاقب کرنے کے لیے پانچ چھ کلومیٹر دور جانا پڑا۔ وہ اپنی پرائیویٹ کار پر ایک ڈاٹسن پک اپ کے تعاقب میں گئے اور وہیں تاخیر کروا بیٹھے۔ ہم جب چیلسی اسٹریٹ کے مکان نمبر 8 میں داخل ہوئے ہمیں کسی قابل ذکر مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سب سے پہلے صفا چٹ سر والے ایک گیم تہیم شخص سے ہمارا واسطہ پڑا۔ اس کے منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ مجھے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں گھستے دیکھ کر وہ الماری کی طرف بھاگا۔ یقیناً ریوالور وغیرہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے للکار کر رکنے کو کہا۔

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ فانوس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے پہچان لیا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا یہ شخص کلاسیکل لاہوریا اور میرا پرانا یار عالم قریشی ہی تھا اس نے مجھے نہیں پہچانا اور ناک پھلا کر میرے بازو کی تال کو گھورتا رہا۔ "خبردار حرکت کی تو تمہاری توند پھاڑ کر سارا کھایا پیا باہر نکال دوں گا۔"

"کون ہو تم... اور کیا چاہتے ہو؟" عالم قریشی کے لہجے میں خالص پنجابی گرج تھی۔

میں جانتا تھا وہ نہتا ہونے کے باوجود کسی وقت کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں نے اپنی اصل آواز میں بولتے ہوئے کہا "دو بیویوں والے شخص کو مارتے ہوئے مجھے ہمیشہ بڑا ترس آتا ہے ایسا شخص تو پہلے ہی مرا ہوا ہوتا ہے۔"

میری آواز سن کر عالم قریشی اچھل پڑا۔ اس کا ذہن کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا تاہم اس کی آنکھیں بڑے دھیان سے میرا جائزہ لینے لگی تھیں۔ پھر یکایک اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھوں میں شناسائی کی حیران کن چمک ابھر آئی تھی۔

"تم... تم...؟" وہ انگلی اٹھا کر بولا۔

"ہاں... میں، شاہجہاں... تیرے پیٹ کی طرف

تیری آنکھوں پر بھی چربی چڑھ گئی ہے موٹے۔"

عالم قریشی مجھ سے لپٹ گیا۔ شدت جذبات کے سبب اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ اسی دوران میں زوبی گل نے بھی عقب سے آکر عالم قریشی کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

"ام زوبی گل اے قریشی صاب... آپ کا خادم آپ کا تابع نافرمان۔"

"تابع نافرمان نہیں... تابعدار" میں نے کہا۔

زوبی کی موجودگی نے اسے بے حد حیران کیا تھا۔ اسے پہلی بار معلوم ہو رہا تھا کہ زوبی بھی یہاں انگلینڈ میں موجود ہے۔

قریشی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ اس دوران میں منوہرا کے مسلح کارندے عالم قریشی کے تین ملازموں کو بھی گھیر کر لے آئے۔ ان میں سے ایک تو شکل سے ہی پاکستانی خانساماں نظر آتا تھا۔ باقی دو گھریلو ملازمائیں تھیں۔

میں نے عالم قریشی کے جن جپھے سے خود کو بمشکل چھڑاتے ہوئے کہا "اسی طرح مجھ کو پکڑے رکھو گے تو پھر پولیس بھی آکر پکڑ لے گی... ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں چار پانچ منٹ کے اندر یہاں سے نکل جانا ہے۔"

"کیا مطلب، یہاں پولیس آنے والی ہے؟"

"ہنڈرڈ پرسنٹ" میں نے کہا "بس اب نکلنے والی بات کرو۔"

دو تین منٹ کے اندر میں نے عالم قریشی کو ساری صورت حال سمجھا دی۔ وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ذہن میں خود بھی پولیس کی آمد کا خدشہ موجود ہے۔ غالباً تھوڑی بہت تیاری اس نے پہلے سے کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی کچھ ضروری اشیاء اپنی جیبوں میں ٹھونسیں اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ (میری اور زوبی کی سلامتی نے قریشی کو ایک امر مسرور کر رکھا تھا)

تینوں ملازم بھی جانے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ میں نے قریشی کو ایک طرف لے جا کر کہا "کیا تم ملازموں کو ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

"اگر پیچھے رہیں گے تو یہ حرامی پلیسے ان کو نمک کی طرح کوٹ کر رکھ دیں گے ویسے بھی ان میں سے دو ملازموں کو تو ہم کسی صورت پیچھے (یہاں) نہیں چھوڑ سکتے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ کون سے دو ملازم؟"

"یہ دونوں لڑکیاں" قریشی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"یہ مرغ حلیم بڑی اچھی بناتی ہیں اور میں نے انہیں اس کام کے لیے چار لکھ روپیہ ایڈوانس دے رکھا ہے۔" میں حیرت سے قریشی کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "میں مذاق کر رہا تھا شہزادے... لیکن ان دونوں کڑیوں کو ساتھ تو لے جانا ہی پڑے گا۔"

"مگر کیوں؟"

اس نے گہری سانس لی "یار! میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن تم تو پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ یہ کڑیاں وہ نہیں ہیں جو نظر آرہی ہیں۔"

اس دوران میں، میں نے غور سے دونوں ملازماؤں کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔ وہ سیاہ فام تھیں، بال گھنگھریالے تھے لیکن حقیقت میں وہ سیاہ فام نہیں اور نہ ہی بال گھونگھریالے تھے۔ وہ میک اپ میں تھیں۔ یہ شاندار میک اپ تھا۔ عالم قریشی بولا "یہ روپ ہے اور یہ چنگی... اسے میں لاڈ سے "چھوٹی" بھی کہتا ہوں۔"

میں اور زوبی دیکھتے رہ گئے۔ لڑکیاں پلکیں جھکائے خاموش کھڑی تھیں۔ قریشی بولا "اس خانساماں کو بھی تم چنگی طرح جانتے ہو۔ یہ ایوورلیڈی کا میک اپ مین ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ اس نے ایک دفعہ تمہارا میک اپ بھی کیا تھا۔"

"تم تو سرپرائز پر سرپرائز دے رہے ہو" میں نے کہا۔

زوبی بولا "خو بچے... ہمیں ایک سرپرائز ام کو پولیس بھی نہ دے ڈالے۔ ام کو اب نکلنا چاہیے۔"

میں نے روپ اور چنگی کو اپنے ساتھ لگایا اور تسلی آمیز انداز میں ان کی پیٹھ تھپکی۔ خانساماں یعنی ایوورلیڈی کے میک اپ مین کو علیحدہ بٹھا دیا گیا۔ روپ اور چنگی ہمارے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھیں۔ ہمارے ستاروں کی گردش واقعی ہمارے حق میں تھی۔ اوپر تلے دو تین کام یوں آپ سیدھے ہوگئے تھے۔ جب ہم باہر نکلے تو ایک سفید کار میں سے ایک دراز قد شخص باہر نکلتا دکھائی دیا۔ منوہرا کے کارندے نے کہا "یہ پولیس کی گاڑی ہے۔ ہم بڑے اچھے وقت پر نکل آئے ہیں۔"

ہم سفید کار کے بالکل قریب سے گزرے۔ پولیس والوں نے اچٹتی سی نگاہ ہم پر ڈالی لیکن وہ گاڑی کی ہیم تاریکی میں چہرے نہ پہچان پائے۔ کافی آگے آنے کے بعد اسٹیئرنگ ویل پر ہماری گرفت نرم پڑگئی۔ بوم کلب پہنچنے میں ہمیں چنداں دیر نہیں لگی۔ آناً فاناً ہم کلب کے گیراج میں تھے۔ چند گھنٹے پہلے ہم تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ جس عالم قریشی کو اور جن گمشدہ لڑکیوں کو ہم لندن میں دور دور تک ڈھونڈ رہے ہیں وہ ہمارے بالکل قریب ہی قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود

ہیں اور ہم انہیں اتنی آسانی سے حاصل بھی کر سکتے ہیں۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر آدھ گھنٹے کے مختصر آپریشن میں ہم انہیں پولیس کے سامنے سے نکال کر لے آئے تھے۔ زریں گل نے جھومتے ہوئے کہا ''منوہرا دیوی کا مخبر زندہ باد...... امارا دل چاہ رہا ہے کہ ام اس مخبر کو اپنے ساتھ پاکستان لے جائے اور اپنی فلم کمپنی میں کوئی بہت بڑا عہدہ دے ڈالے۔ مثلاً فلمساز کا عہدہ......''

''فلمساز کا کوئی عہدہ نہیں ہوتا...... اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری کوئی فلم کمپنی نہیں ہے۔''

''نہیں ہے...... لیکن بن تو جائے گا ناں۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امارے پاس ڈھیروں ڈھیر پیسا ہو۔ امارے ملک میں لانہ سد ھیر اور بدر منیر جیسا اداکار بھی ہو...... اور ام فلم کمپنی نہ بنائے۔ ام ضرور بنائے گا اور اس فلم کمپنی میں جو سب سے پہلا فلم بنے گا وہ دراصل آپ کا...... امارا...... اور ام سب کا کہانی ہوگا۔ ام نے اس کا نام بھی سوچنا شروع کر دیا ہے۔ چند نام تو اب بھی امارے ذہن میں موجود ہے۔ مثلاً ایک نام ہے باپ کا انتقام۔''

''باپ کا انتقام! ہماری کہانی میں باپ کا انتقام کہاں سے آگیا؟''

''اصل میں آپ فلمیں نہیں دیکھتا اس لیے آپ کو کچھ پتا نہیں۔''

''میں اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔''

وہ ان سنی کرتے ہوئے بولا ''یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فلم کا نام کہانی کے مطابق ہو...... یہ بہت پرانا رواج تھا' اب ختم ہو چکا ہے۔''

میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا ''تم نے تو ایک دفعہ کوئی اور نام سوچا تھا۔ شاید خزانے کی تلاش۔''

''ہاں ام نے کہا تھا...... لیکن بعد میں ام نے کچھ لوگوں سے مشورے کے بعد یہ ارادہ بدل دیا۔''

''کن حضرات سے مشورہ کیا تھا؟''

''حضرات نہیں تھے' ایک تو گلثوم تھی' دوسرا اماری لاہور والی کوٹھی کا چوکیدار دریا خان اور تیسرا امارا ڈرائیور راحت جان۔ وہ پشتو فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ دراصل یہ تینوں فلم کا زبردست انگریزی جشن رکھتے ہیں۔''

''الو کی دم انگریزی جشن نہیں ایکسپیرینس...... یعنی تجربہ۔''

''معافی چاہتا ہوں استاد صیب! بات آپ کی سمجھ میں آجاتا ہے ناں پھر آپ ام کو شرمندہ کیوں فرماتا ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں دنیا شرمندہ نہ کرے اس لیے خود کر لیتا ہوں۔''

ہم سنگین حالات سے گزر رہے تھے لیکن ان حالات میں بھی زریں کی وجہ سے شگوفے کھلتے رہتے تھے۔

یوم کلب میں پہنچ کر ہم نے منوہرا دیوی کو آپریشن کی کامیابی کی خوشخبری سنائی۔ نینا ایک طرف گم صم بیٹھی تھی۔ اچانک روپ اور چکی اس سے لپٹ گئیں۔ وہ کافی بھیگی مبینوں کو خود پر سوار دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ شاید اس نے یہ سمجھا ہو کہ نیڈی پولیس کی سادہ پوش اہلکار اس کی خبر لینے پہنچ گئی ہیں۔

بعد میں جب نینا نے اپنی بہنوں کی آوازیں پہچانیں اور اسے ان کے میک اپ کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ششدر رہ گئی۔ تینوں گالی گڑیوں کا ملاپ دیدنی تھا۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر یوں روئیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ دہل گیا۔ وہ ایک دوسرے کو چوم رہی تھیں اور لپٹ رہی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے وہ نارمل ہو گئیں۔ وہ تین گالی گڑیاں تھیں لیکن اب وہ تین نہیں رہی تھیں۔ اب وہ دو گالی گڑیاں رہ گئی تھیں۔ ایک صرف گڑیا تھی۔ اس کی آواز ختم ہو چکی تھی۔ وہ خود بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس کی روح اور اس کا جسم دونوں زخمی ہوئے تھے۔ کنگ براؤن نے اسے پرنس داراب کے روپ میں روند ڈالا تھا اور ناقابل فراموش رنج دیے تھے۔ شاید اسی گالی گڑیا کی آہ اسے لے ڈوبی تھی یا پھر شاید ایسی کئی گڑیاں اور گڈے تھے' ایسے کئی لوگ تھے جن کی آہوں اور سسکیوں نے کنگ براؤن کو اپنے اندر غرقاب کیا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے دونوں گالی گڑیوں کا میک اپ اتار دیا گیا۔ ان کے چہرے پہلے سے بہت دبلے ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے تاہم ان کے اندر کی خوبصورتی نے انہیں پھر بھی دلکش بنا رکھا تھا۔ وہ واقعی دلکش تھیں لیکن انہیں دیکھ کر ذہن میں کوئی سفلی جذبہ نہیں جاگتا تھا۔ کچھ ایسا ہی تاثر پیدا ہوتا تھا جیسا کسی خوبصورت پھول کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ ہاں وہ سری لنکا کے تین خوش رنگ پھول ہی تو تھے۔ ایک انٹرنیشنل ہوس کار نے ان پھولوں کی پتیاں اپنے ناپاک بستر پر بکھیرنا چاہی تھیں۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا لیکن پھر خود بکھر گیا تھا۔ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ تینوں معصوم بہنوں کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی' وہ بیان سے باہر تھی۔ پچھلے چند دنوں میں غزالہ کو گلے سے لگانے کے بعد یہ دوسری خوشی تھی جس نے مجھے اندر تک سیراب کر دیا تھا۔

دوبارہ ملنے کی خوشی کو میں نے اور عالم قریشی نے اپنے

مخصوص طریقے سے CELEBRAT کیا۔ ہم نے ایک دوجے کو گلے سے لگا کر بھینچا۔ ایک دوجے سے گتھم گتھا ہوئے۔ پنجابی انداز میں ایک دوسرے کو دھپ رسید کیے اور قاچیاں لگائیں۔ رات کو ایک زبردست پنجابی ڈنر کیا گیا۔ یہ کھانا غزالہ نے زریں گل کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا۔ کھانا دیکھ کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ عرصے بعد ایسا دسترخوان دیکھا تھا۔ پراٹھے تھے' بھنا ہوا دیسی مرغ' پالک گوشت' ماش کی دال اور قیمہ۔ اس کے علاوہ گرما گرم حلوہ تھا۔ کھانے کا مزہ آیا...... اور کھانے سے زیادہ عالم قریشی کو کھاتے دیکھنے کا مزہ آیا۔ کھانے میں قریشی کا خشوع وخضوع دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ تبصرے بھی کرتا جاتا تھا۔ ''دیکھو یار! ہر کھانے کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اب یہ باداموں والا حلوہ ہی دیکھو۔ ایک اس کی ظاہری شکل صورت ہے جس میں اس کا رنگ اس کی بناوٹ شامل ہے۔ ایک اس کی سیرت ہے جس میں اس کا سواد اور خوشبو وغیرہ ہے۔ جس طرح بعض لوگ دیکھنے میں چنگے نہیں لگتے لیکن اندر سے بڑے زبردست ہوتے ہیں۔ اسی طرح کھانے بھی ہوتے ہیں۔ پچھلی بسنت کو میں نے اپنی چھوپی (بیوی) سے جو تلی ہوئی مچھلی منوائی وہ بھی ایسی ہی تھی۔ دیکھنے میں کالی سیاہ اور سڑی ہوئی لگتی تھی لیکن اللہ معافی...... جو اس کا مزہ تھا...... تو بہ توبہ۔ آج تک زبان پر وہ سواد ٹھہرا ہوا ہے۔''

''لیکن تمہیں اس کا فائدہ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا ''میرا مطلب ہے کالی سیاہ مچھلی؟''

''اوئے یہ معرفت کی باتیں ہیں یار...... تمہیں پتا ہے کہ بسنت کے دن حویلی کی چھت پر تین چار درجن مہمان تو ہوتے ہیں۔ وہ تراوٹ مچھلی بس دو کلو تھی۔ اس سے کسی کا منہ بھی گیلا نہیں ہوتا تھا۔''

''اس لیے تم نے اکیلے ہی منہ گیلا کر لیا'' میں نے اس کی بات مکمل کی۔

کھانے کے بعد میں نے عالم قریشی سے کہا کہ وہ پاکستان فون کر کے وہاں کے حالات معلوم کرلے۔ وہ پہلے ہی یہ خواہش رکھتا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ صبح سب سے پہلا کام یہی کیا جائے گا کہ پاکستان فون کھڑکایا جائے گا۔ ہم الگ کمرے میں بیٹھے گئے۔ عالم قریشی کو ہمارے پاس آئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے لیکن ابھی تک اس نے تفصیلاً نہیں بتایا تھا کہ میری گرفتاری کے بعد سے اب تک کا وقت اس نے کیسے گزارا اور دونوں گالی گڑیوں تک اس کی رسائی کیسے ہوئی۔ اس حوالے سے میرے اور قریشی کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے۔

عالم قریشی نے چند روز تو ایک ہوٹل کے کمرے میں بند رہ کر گزارے پھر وہ ایک دوست کے ہاں شفٹ ہو گیا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی سوراخ میں گھس کر بیٹھا رہتا اور باقی ساتھیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا' ہونے دیتا۔ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر رحمانی اور غزالہ وغیرہ کو تلاش کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنا حلیہ بھی بدل لیتا تھا۔ دو تین ہفتے بعد اس کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ عشرت رحمانی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جو بریڈفورڈ کے دیہی علاقے میں ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں پناہ گزین تھا۔ عالم قریشی نے رحمانی کو دونوں لڑکیوں کی ذمے داری سے فارغ کر کے ''نون برج'' بھیج دیا اور خود لڑکیوں کے ہمراہ ایک گاؤں میں چلا گیا۔ آٹھ دس روز وہاں رہنے کے بعد قریشی کو محسوس ہوا کہ اسے اب ٹھکانا بدل لینا چاہیے' اس نے اپنی سیکرٹ ایجنسی کے ماہر میک اپ مین مسٹر یاٹ سے رابطہ کیا اور اسے گاؤں بلا لیا۔ وہیں پر دونوں گالی گڑیوں کو سیاہ فام لڑکیوں کا گیٹ اپ دیا گیا اور قریشی کی صورت میں بھی جزوی تبدیلیاں کی گئیں۔ گاؤں سے یہ لوگ سیدھے لندن کے وسطی علاقے میں آگئے۔ یہاں رحمانی کے ڈاکٹر دوست نے کرائے کے ایک مکان کا انتظام کر رکھا تھا۔ قریشی دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس مکان میں شفٹ ہو گیا۔

قریشی کی روداد سننے کے بعد میں نے اسے اپنے حالات سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ ٹرسٹ کے حالات اور کنگ براؤن کی تباہی کی خبریں میڈیا کے ذریعے قریشی تک پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ میری زبانی اسے اندرون خانہ باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ عام لوگوں کی طرح قریشی کا خیال بھی یہی تھا کہ ٹرسٹ کے زیر زمین دوزخ والے علاقے میں وحشی کتوں کا خوفناک حملہ اس اعصابی گیس کا نتیجہ تھا جس کے ذریعے باغیوں پر قابو پانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن میں نے قریشی کو جوکا دلو نے پراسرار مراقبے کے بارے میں بتایا اور اس کی ان پراسرار صلاحیتوں کے بارے میں بتایا جن کا مشاہدہ متعدد بار میں نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ قریشی قائل نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوف آمیز حیرت اتر آئی۔ شاید اسے بھی کلکتے کے پراسرار واقعات یاد آگئے تھے۔

اگلے روز قریشی نے پاکستان فون کیا۔ غیر متوقع طور پر وہ قریباً آدھ گھنٹا گفتگو میں مصروف رہا۔ میں کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ قریشی کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی' بہرحال اس کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کوئی اہم خبر موجود ہے۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید اس اہم خبر کا تعلق قریشی کے کاروبار یا نجی معاملات سے ہوگا لیکن فون کے بعد پتا چلا کہ بات کچھ اور ہے۔

عالم قریشی نے سگریٹ مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور بولا "تمہارا پرانا یار تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہاری دوری اس سے سہی نہیں جا رہی۔"

"صفدر کی بات کر رہے ہو؟"

"نہیں... شنکر کی... پتا چلا ہے کہ وہ لاہور اور آس پاس کے علاقوں میں تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس نے دو دن پہلے لاہور والی کوٹھی پر بھی حملہ بولا ہے اور کئی ملازموں کو زخمی کر دیا ہے۔ اگر وہاں سیکورٹی کا بڑا انتظام نہ ہوتا تو شاید زوبی کی بیوی اور بچے کو نقصان پہنچ جاتا۔ وہ صفدر کو بھی ڈھونڈتا پھر رہا ہے لیکن حالات کا رخ دیکھتے ہوئے صفدر بھی روپوش ہے۔ میرے منیجر فضل الٰہی نے میرے پرانے گھر کی سیکورٹی بہت سخت کر دی ہے۔ اس کو خطرہ ہے کہ وہاں بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"یہ تو بڑی خاص خبریں ہیں" میں نے کہا۔

"اب اس سے بھی زیادہ خاص خبر سنو" قریشی نے کش کھینچتے ہوئے کہا۔

"سناؤ... آج جو کچھ ہے سنا ڈالو۔"

"شنکر کو ٹوہ لگ گئی ہے کہ تم لندن میں ہو۔ آج سے تین دن پہلے وہ لندن پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اب تک وہ پہنچ بھی چکا ہو۔"

اسی دوران میں غزالہ بھی تالی کو اٹھائے ہوئے پہنچ گئی "کس کی بات کر رہے ہیں؟ کون لندن پہنچ گیا ہے؟" غزالہ کا لہجہ کھٹکا ہوا تھا۔

"قریشی اپنے ایک منیجر کی بات کر رہا ہے" میں نے بات گول کی۔

"نہیں... ابھی قریشی بھائی کہہ رہے تھے کہ ہماری ٹوہ لگ گئی ہے۔"

"ٹوہ لگنے کی بات تو کسی نے نہیں کی" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ قریشی نے بھی میرا ساتھ دیا۔

غزالہ نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ ہم سب کے لیے پریشان تھی۔ قریشی کے لیے، زوبی کے لیے، اپنی والدہ کے لیے اور شاید سب سے بڑھ کر میرے لیے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ جس کو بھی دیکھتی ہے اس کی پریشانیاں اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

شام کو میں اور عالم قریشی ہوٹل کے ساتھ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع گوناگوں تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ انہیں کس طرح اور کب واپس سری لنکا روانہ کیا جائے۔ ہماری گفتگو میں پاشا کا ذکر بھی آیا۔ پاشا کی بازیابی میرے اور زوبی کے لیے بہت اہم تھی۔ میں منوہرا سے بھی اس سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ منوہرا نے اس حوالے سے اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ اسی دوران میں منوہرا کا خدمت گار خوبرو لڑکا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ "دیوی" آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ میں منوہرا کے کمرے میں پہنچا۔ وہ آج خوشگوار موڈ میں تھی۔ ایک نئی ہندی فلم کا گانا سن رہی تھی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر اورنج جوس پی رہی تھی۔ ایک انگلش اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں پہنچا تو اس نے اپنی حنائی انگلی ایک اشتہار پر رکھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو۔"

اندرونی صفحے پر چھپنے والا یہ اشتہار ایک اسٹریٹ فائٹ کے بارے میں تھا۔ فائٹنگ کے یہ مقابلے ایک بہت بڑے کیسینو میں ہو رہے تھے۔ چند بڑے بڑے فائٹروں کے نام اس لسٹ میں شامل تھے۔

اس قسم کے مقابلے بڑے شہروں میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ امریکا، تھائی لینڈ وغیرہ میں بھی ان کا عام رواج ہے۔ ان مقابلوں پر بڑی بڑی شرطیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ میں نے اشتہار دیکھنے کے بعد کہا "اس قسم کے اشتہار تو اکثر آتے ہی رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ عام اشتہار نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص بات ہے" منوہرا بولی۔

"کون سی خاص بات" میں نے پھر اشتہار پر نظر جما دی۔

"بات اشتہار میں نہیں... یہاں میرے ذہن میں ہے یعنی میرے علم میں" اس نے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ ایک اور طویل کش لے کر بولی "یہ بہت خاص مقابلے ہیں لیکن اس بات کا علم صرف گنے چنے لوگوں کو ہے۔ بڑے بڑے گینگسٹرز... منشیات مافیا کے باس... انڈر ورلڈ کے ڈان اور اس قسم کے دوسرے لوگ ہی اس بارے میں جانتے ہیں۔ ہفتے کی شب ہونے والے ان مقابلوں میں ایک اہم شخص آ رہا ہے اور وہ شخص ہے جسے تم بھی بڑی اچھی طرح جانتے ہو... شنکر شکرا... اسٹریٹ فائٹنگ کا بے تاج بادشاہ۔ وہ ان مقابلوں میں حصہ لے گا اور کروڑوں ڈالر/

پاؤنڈز کی شرطیں لگیں گی۔"

میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ جو کچھ عالم قریشی نے بتایا تھا وہ میری سماعت میں گونجنے لگا۔ عالم قریشی نے بتایا تھا کہ شنکر لندن پہنچنے والا ہے یا پہنچ چکا ہے۔ اب میں یہ اشتہار دیکھ رہا تھا۔ اشتہار کے مطابق صرف تین دن بعد مقابلے ہونے والے تھے اور منوہرا کے مطابق ان مقابلوں میں شنکر بھی آ رہا تھا۔ میرے اور شنکر کے درمیان کئی کانٹے دار مقابلے ہو چکے تھے۔ کبھی اس کا پلہ بھاری رہا تھا، کبھی میرا۔ میں اس کی فائٹنگ اسپرٹ کو مانتا تھا لیکن اس کی کمینگی اور شیطانیت کو میں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا اور ہر جگہ خم ٹھونک کر اس کے سامنے آیا تھا۔

منوہرا کی زبان سے شنکر شکرا کے بارے میں سن کر نہ جانے کیوں میرے رگ و پے میں ترنگ سی دوڑ گئی۔ جی چاہا کہ ایک بار پھر میرا اور اس کا سامنا ہو۔ جب سے میں نے اس کی ٹانگ توڑی تھی، میرا حوصلہ کافی بڑھ چکا تھا۔ شنکر کو شکست فاش دینے کی تمنا دل میں مچلنے لگتی تھی۔

"کس سوچ میں کھو گئے شاہ جہاں" منوہرا نے ادا سے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ تم نے یہ اشتہار مجھے کیوں دکھایا ہے؟"

"اس کی ایک خاص وجہ ہے لیکن یہ وجہ میں تمہیں ابھی بتا نہیں سکتی، کم از کم آج تو ہرگز نہیں۔"

"تم خواہ مخواہ الجھن میں مبتلا کر رہی ہو" میں نے کہا۔

"جب میں تمہیں بتاؤں گی پھر تم مانو گے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا تم نے مجھے صرف الجھن میں ڈالنے کے لیے اشتہار دکھایا ہے۔"

"نہیں... یہ پوچھنے کے لیے کہ کیا تم ان مقابلوں میں شرکت کرنے کی خواہش رکھتے ہو؟"

"ایسے مقابلوں میں لوگ صرف دولت یا شہرت کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کے کرم سے مجھے ان دونوں میں سے کسی چیز کی خواہش نہیں۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "شاہ جہاں! مجھے تمہاری ساری کہانی ازبر ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ میں اس کہانی کو شروع سے پسند کرتی ہوں۔ غائبانہ طور پر مجھے تمہارے حالات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے... چند روز پہلے جب میں نے سٹر ماؤتھ کے فارم ہاؤس سے غزالہ اور اس کی فیملی کو ڈھونڈا تو مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اپنے جانے پہچانے لوگوں کو ڈھونڈا ہے اور اس طرح میں بھی تمہاری کہانی کا ایک کردار بن گئی ہوں۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں تمہارے ذہن میں جھانک سکتی ہوں۔ مجھے وشواس ہے کہ تم شنکر شکرا سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ یہاں لندن میں پایا جا رہا ہے تو تم اس کے سامنے آنے اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے کی خواہش ضرور رکھو گے۔"

"فرض محال اگر ایسا ہے بھی تو پھر؟"

"اس 'پھر' کا جواب میں تمہیں بعد میں دوں گی" وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا زریں گل تیزی سے اندر آیا۔ ہمیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر اس نے پلٹنا چاہا لیکن میں نے روک لیا "کیا بات ہے زریں؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایسا خاص بات نہیں پھر بتاؤں گا۔"

علیم الحق حقی کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی
اس بلائے بے درماں کی کہانی جس کا نام عالمی دہشت کی علامت ہے۔
ان بھٹکے ہوؤں کی داستان جو اپنے ہاتھوں دنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

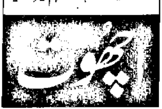

قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہاکر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں

"چلو جو بھی عام سی بات ہے وہ بتا دو۔"

"نہیں استاد صیب، امارا بات تو بالکل ہی عام ہے۔ آپ ناراض ہوگا۔ آپ اپنا بات جاری رکھے۔"

اس نے پھر پلٹنا چاہا لیکن اس مرتبہ منوہرا نے اسے روک لیا۔ "ٹھہرو زریں گل خان! ادھر آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔ جس طرح میں تمہارے استاد صیب کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں، اسی طرح تمہارے اور جمشید کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔"

"جمشید نہیں..... صفدر" میں نے منوہرا کی غلطی درست کی۔

"ہاں..... صفدر! آپ تینوں کے کردار میرے ذہن میں نقش ہو چکے ہیں۔"

"بہت شکریہ بیگم صاحب!" زریں نے خوشامدی انداز میں ہنسی نکالی۔

منوہرا نے کش لیتے ہوئے پوچھا "ہاں زریں! تم نے بتایا نہیں کہ کس لیے آئے تھے؟"

زریں پہلے تو ذرا تامل کرتا رہا پھر شرمیلے انداز میں بولا "بات بالکل معمولی سا ہے، بیوی صاحب! دراصل ایک شعر کے بارے میں غزالہ جی سے امارا بحث ہو گیا تھا۔ یہ انڈین گانے کا شعر ہے۔ وفا جن سے کی بے وفا ہو گئے۔ وہ وعدے محبت کے کیا ہو گئے۔ امارے خیال میں پہلا مصرع لکھتے ہوئے شاعر سے غلطی ہوا ہے۔ پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا۔ وفا جن سے کی بے وفا ہو گیا۔ آپ کو بھی تھوڑا بہت گرامر تو آتا ہی ہوگا۔ "جن" واحد ہے، اس کا جمع جنات ہوتا ہے۔ واحد کے ساتھ واحد ہی آئے گا۔ وفا جن سے کی بے وفا ہو گیا..... وہ وعدہ محبت کا کیا ہو گیا۔"

میں نے کہا "کاش آس پاس کوئی وزنی شے ہوتی جو میں تمہارے سر پر دے مارتا۔ اوئے لکڑی کے باندر! یہ وہ سائیں عالی والا جن نہیں ہے، یہ دوسرا جن ہے۔"

"جن دوسرا ہو یا تیسرا، جن تو جن ہی ہوتا ہے۔ ام کو یہ بات سائیں عالی نے بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ جنات میں....."

"اچھا تم اپنی چونچ بند کر دو تو یہ زیادہ بہتر ہے" میں نے اس کی بات کاٹی۔

منوہرا مسکراتے ہوئے بولی "سائیں عالی کا نام سن کر بہت کچھ یاد آ گیا ہے۔ انڈین فلم انڈسٹری میں آج بھی بہت مانا جاتا ہے سائیں عالی کو۔ جب بھی پتا چلتا ہے کہ سائیں جی بمبئی میں ہیں، ان کے عقیدت مندوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں۔ وہ واقعی مرد عجیب ہیں۔ میری جانکاری کے مطابق تمہارے ساتھ بھی انہیں کافی انس ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پچھلے پانچ چھ برسوں میں وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہی رہے ہیں۔"

"تمہاری دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی درست ہے" میں نے کہا "لیکن اب پچھلے دو چار ماہ سے مجھے سائیں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ ان سے آخری ملاقات سری لنکا میں ہی ہوئی تھی۔"

منوہرا نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولی "سائیں عالی کے بارے میں مجھے ایک ایسی بات معلوم ہے جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی..... شاید تمہیں بھی معلوم نہ ہو..." منوہرا نے ایک دو لمحے توقف کیا پھر بولی "تم سائیں جی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

میں نے مختصر لفظوں میں وہ سب کچھ بتا دیا جو میں جانتا تھا۔ منوہرا سنتی رہی اور اثبات میں سر ہلاتی رہی پھر بولی "لیکن اس میں وہ بات شامل نہیں جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں سائیں کے نجی جیون کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں" میں سوالیہ نظروں سے منوہرا کا چہرہ تکتا رہا۔ منوہرا نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "آج سے برسوں پہلے سائیں عالی کو ایک خوبصورت لڑکی سے پیار ہوا تھا۔ اس وقت سائیں عالی بھی جوان اور سندر تھا۔ وہ دہلی شہر میں اپنے پیر و مرشد بڑے سائیں "نیاز مند جی" کے آستانے پر رہتا تھا اور ان کی خدمت کرتا تھا۔ وہ ہندو لڑکی بڑے سائیں "نیاز مند جی" کے پاس اپنا کوئی مسئلہ لے کر آئی تھی۔ وہیں پر اس کی نگاہ نوجوان عالی پر پڑی اور وہ ہزار جان سے اس پر فدا ہو گئی۔ وہ اکثر نیاز مند جی کے آستانے پر آنے لگی اور اسی بہانے عالی کا دیدار کرنے لگی۔ پھر دھیرے دھیرے یوں ہوا کہ اس سندر لڑکی کے من میں جلتی ہوئی آگ کی کچھ چنگاریاں عالی کے دل کے دامن پر بھی آن گریں۔ دونوں ایک دوجے سے پریم کرنے لگے۔ پریم کی آگ بھڑکتی چلی گئی اور دونوں کو کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ وہ لڑکی عالی کی خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار ہو گئی لیکن دونوں کے ملاپ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی اور وہ یہ کہ شادی کی صورت میں عالی کو اپنے پیر و مرشد کا آستانہ چھوڑنا پڑتا اور اس کی وہ ساری تپسیا بھی اکارت ہو جاتی جو کئی برسوں سے جاری تھی۔ نوجوان سائیں عالی ایک کٹھن دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طویل اور جان لیوا کشمکش کے بعد بالآخر اس نے سنسار سے منہ موڑ لیا اور

اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں جا گرا۔ سائیں کے اس فیصلے نے جہاں اس سے بہت کچھ چھینا وہاں اسے بہت کچھ دیا بھی۔ وہ دست شفا بنا۔ اس کی زبان میں تاثیر آئی اور اس کی آنکھوں میں چمک جاگی۔"

منوہرا نے چند لمحے توقف کر کے نیا سگریٹ سلگایا اور بولی "شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو کہ سروج اسی ہندو لڑکی کی بیٹی ہے جس نے سائیں عالی سے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔"

"کیا تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ سروج سائیں کی بیٹی ہے؟"

"نہیں..... سائیں نے تو کبھی اپنی محبوبہ کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس لڑکی کی بعد میں شادی ہو گئی تھی۔ جس کے پتی کا تعلق بمبئی سے تھا۔ وہ اچھا شخص نہیں تھا۔ اس میں کئی عیب تھے..... وہ رنڈی باز بھی تھا لیکن بظاہر بھلا مانس ہی نظر آتا تھا۔ چار پانچ بچوں کی پیدائش کے بعد اس نے اپنی پتنی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور انبالے کی کسی طوائف کے ہاں رہنے لگا۔ گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال لیے اور دھیرے دھیرے سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس کی جوان بیٹیاں دو وقت کی روٹی کے لیے ترستی تھیں اور سر پر سے چھت سرک سرک جاتی تھی۔ بیٹیوں میں سے سروج کچھ اور مزاج کی نکلی تھی، سندر ہونے کے علاوہ یہ تیز طرار بھی بہت تھی۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ اسی دوران میں سروج کی ماں بیماریاں اور فاقے سہتی ہوئی موت کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی۔ سائیں عالی بمبئی میں ہی تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ عقیدت مند اس کے جوتوں کی خاک آنکھوں سے لگاتے تھے اور ان میں عام لوگ ہی نہیں تھے، انڈین فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے روشن ستارے سائیں کے گرد چکراتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے آخری دنوں میں سروج کی والدہ سائیں عالی کے آستانے پر جانے لگی تھی۔ وہ سائیں کے عقیدت مندوں کے درمیان گھنٹوں سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی موت سائیں کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ اس کی موت کے کئی ماہ بعد سائیں کو پتا چلا تھا کہ سروج اس عورت کی بیٹی ہے جس سے اس نے پہلا اور آخری پیار کیا تھا۔ تب تک سروج فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے لگی تھی اور اپنی بے باکی و آزاد خیالی کے سبب مشہور ہو چکی تھی۔ سائیں نے سروج کو اپنی نگہبانی میں لے لیا۔ سائیں نے سروج کی زندگی کا راستہ بدلنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت آگے نکل چکی تھی۔ پھر سائیں نے سوچا ہوگا کہ..... چلو جس راستے پر وہ چلنا چاہتی ہے، اسی راستے پر چلنے میں اس کی مدد کی جائے۔ سائیں نے سروج کے سر پر ہاتھ رکھا تو اسے فلموں میں بڑے رول ملنے لگے۔ وہ پیسا کمانے لگی اور مشہور بھی ہو گئی لیکن اس کے اندر کی حریص اور عیش پسند لڑکی نے اسے کبھی بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ شاید یہ خصلتیں اپنے باپ کی طرف سے اسے ورثے میں ملی ہیں۔ میں اسے بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تھوڑے سے وقت میں بہت سارا "جینا" چاہتی ہے چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

منوہرا دیر تک سروج اور سائیں عالی کی باتیں کرتی رہی اور میں ان کی زندگی کے نئے گوشوں سے آشنا ہوتا رہا۔ منوہرا دیوی انڈین فلم انڈسٹری کا ہر بھید جانتی تھی اور اس کی معلومات نہایت ٹھوس تھیں۔ سائیں عالی سے ملے ہوئے مجھے بھی کافی دن ہو چکے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب دیر تک سائیں عالی سے ملاقات نہیں ہوتی تھی تو میرے اندر ایک خلا سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک کمی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ خاص طور سے ساجی صاحب کی موت کے بعد اس کیفیت میں زیادہ شدت آ گئی تھی۔ اب بھی دل چاہ رہا تھا کہ اچانک سائیں کہیں سے نمودار ہو جائے۔ ایک نعرۂ مستانہ بلند کرے اور اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے ہمارے کان کھانا شروع کر دے۔ سروج عرف الو کی پٹھی کے بارے میں تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ابھی تک لندن میں ہی ہے لیکن سائیں عالی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

رات کو موٹل سے ملاقات ہوئی۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا اور "دی ہوم" میں پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات پر ایک تجزیاتی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ نیوز چینلز پر ابھی تک ان واقعات نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ سب سے..... اہم موضوع وہ پراسرار حالات تھے جن کی وجہ سے فرسٹ میں موجود سیکڑوں خونخوار کتے جنون میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے وہاں موجود لوگوں کے لیے قیامت صغریٰ برپا کر دی۔ اس حوالے سے نفسیات اور روحانیات کے کچھ ماہرین کے درمیان ایک "کشیدہ" مذاکرہ ہو رہا تھا۔ لارسی قبیلہ اور اس کے پراسرار افراد بھی بحث کا حصہ تھے۔ ایک "ماہر" جانوروں میں پیدا ہونے والے مختلف فوبیاز پر سیر حاصل بحث کر رہا تھا۔

میرے آنے پر موٹل نے ٹی وی بند کر دیا۔ موٹل کی آنکھیں ابھی تک سرخ اور سوگوار تھیں۔ میں اس کی آنکھوں میں بوکارلو کی موت کا غم پڑھ سکتا تھا۔ موٹل نے کہا "میں شکر شکرا کا تذکرہ سن رہا ہوں۔ میری معلومات کے مطابق وہ آپ کا پرانا حریف رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ وہ آپ کی تلاش میں ہے اور اس وقت لندن میں موجود ہے۔"

"سن تو میں بھی یہی رہا ہوں۔"

"کہا جا رہا ہے کہ یہاں کسی کیسینو میں بہت بڑا مقابلہ ہو رہا ہے۔ انڈر ورلڈ کے لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ وہاں شنکر بھی آئے گا۔" میں نے سر ہلا کر موبل کی معلومات کی تائید کی۔ وہ بولا "لیکن شاہ جہاں صاحب! یہ شنکر کی چال بھی تو ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کی ملی بھگت سے اس نے یہ ڈراما رچایا ہو۔ وہ جانتا ہے کہ آپ بھی لندن میں موجود ہیں۔ انڈر ورلڈ کے لوگوں میں پھیلی ہوئی یہ بات آپ تک بھی پہنچے گی کہ شنکر مقابلوں میں حصہ لے رہا ہے۔ اس صورت میں آپ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کہ اس جوا خانے کے اردگرد پولیس آپ اور اس کے ساتھیوں کی منتظر ہو؟"

"تمہاری بات میں وزن ہے" میں نے کہا "ویسے پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنے والا۔"

موبل سے کچھ دیر تک اس بارے میں بات ہوتی رہی۔ موبل کو بھی علم تھا کہ شنکر پاگل ہو رہا ہے۔ وہ لاہور میں زریں گل اور منصور کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہوا ہے اور قریشی کی پراپرٹی کے آس پاس بھی چکر لگاتا رہا ہے۔ اب وہ سینے میں آگ لیے ہوئے یہاں آ پہنچا تھا لیکن ابھی تک خود میں بھی پر یقین نہیں تھا کہ شنکر یہاں آیا ہے یا نہیں؟

وہ ہفتے کی رات تھی۔ لندن بارش کی زد میں تھا۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بادل گرجتے تھے۔ اس باد و باراں کے باوجود "ہوم کلب" میں ویک اینڈ کی رونقیں عروج پر تھیں۔ کلب کے ڈانسنگ ہال میں جو دھواں دھار میوزک بج رہا تھا' اس کی دھائیں دھائیں ہمارے رہائشی حصے تک میں محسوس کی جا رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا اور ٹرسٹ میں خوفناک تباہی کے مناظر دیکھ رہا تھا جو ایک نیوز چینل پر دکھائے جا رہے تھے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور غزالہ ہولے سے اندر آ گئی' تابی اس کے ساتھ تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا بات ہے' اس ننھے محافظ کو ہر جگہ ساتھ لیے پھرتی ہو؟"

"مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں" وہ میری بات سمجھتے ہوئے بولی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔

اس نے میرے کمرے کی ادھر ادھر بکھری ہوئی اشیا درست کیں۔ میری قمیص جو حسب معمول صوفے پر پڑی تھی' اٹھا کر ہینگر پر لٹکائی۔ پتلون میں سے بیلٹ نکال کر اسے بھی الماری میں رکھا' جرابیں سیدھی کر کے دراز میں رکھیں۔ میں اسے انہماک سے یہ کام کرتے دیکھتا رہا۔ وہ سراپا ایک خوبرو اور خدمت گار شریک حیات نظر آ رہی تھی۔ جی چاہا اسے کھینچ کر بانہوں میں سمیٹ لوں اور اس کے چہرے پر محبت نچھاور کر دوں۔ میرے دل میں اٹھنے والا خیال جیسے اڑ کر غزالہ تک پہنچ گیا۔ اس نے کام کرتے کرتے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے عارضوں پر سرخی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "جی چاہتا ہے کہ وقت کو پر لگ جائیں۔ وہ سہانی شام اڑ کر آ جائے جب چچا اور چچی تمہیں سرخ لباس میں میرے ساتھ رخصت کریں اور پھر تم آنکھیں بند کر کے میری بانہوں میں سما جاؤ۔ مجھے تمہارے سوا کچھ یاد نہ رہے' تمہیں میرے سوا کچھ یاد نہ رہے۔"

"آپ باتیں زیادہ کرتے ہیں" اس نے ڈھکے چھپے لہجے میں شکوہ کیا۔

"عنقریب تمہیں اعتراض ہونا ہے کہ میں عمل زیادہ کرتا ہوں۔"

اس کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا۔ ایک جواں سال ڈاکٹر کے بجائے وہ ایک نوعمر طالبہ نظر آئی لیکن جلدی سنبھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر بتدریج گہری سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے بے خیالی میں میرے رومال کو تہ کر کے اس پر ہاتھ پھیرا اور بولی "شاہ جہاں! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے' آپ جب پاکستان جانے اور رجل کوٹ کی حویلی کو آباد کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو میرا دل ہولنے لگتا ہے۔ آپ ان سب باتوں کو بعد کے لیے کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"کس کے بعد؟" میں نے دبی دبی شوخی سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے شرمیلا تاثر ابھرا لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولی "شاہ جہاں! جو لمحے گزر رہے ہیں' بس یہی ہمارے ہیں۔ نہ گزر جانے والے وقت پر ہمارا اختیار ہے نہ آنے والے وقت پر۔ آپ... آپ کیوں غیر ضروری باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ میں شنکر کے بارے میں سن رہی ہوں..... اور یہ سن رہی ہوں کہ وہ یہاں لندن میں کسی طرح کے مقابلوں میں حصہ لے رہا ہے۔ یہ اڑتی اڑتی بات بھی میرے کانوں تک پہنچی ہے کہ آپ اس سے لڑنا چاہتے ہیں۔ پلیز شاہ جہاں' میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب بہت ہو چکا

ہے۔ اب بھی اگر آپ ہمارے بارے میں سوچنے کے بجائے ان باتوں کے بارے میں سوچیں گے تو ..... تو اس کا مطلب ہو گا کہ ....." وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا گلا رندھ گیا اور ہونٹ تھرا کر رہ گئے۔

"تم کیا چاہتی ہو غزالہ!" وہ خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے کہا "غزالہ! جہاں اتنا انتظار کیا ہے' تھوڑا سا انتظار اور کر لیتے ہیں۔ چند دن پہلے تک میں بھی ڈانواں ڈول تھا لیکن اب تمہارے پاس واپس آنے کے بعد تمہاری اور اپنی محبت پر میرا یقین کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا' کوئی بھی نہیں..... میں تمہیں اسی طرح حاصل کروں گا جس طرح حاصل کرنے کا خواب میں نے جاگتی آنکھوں سے دن رات دیکھا ہے۔ پوری دھوم دھام سے' پورے چاؤ سے۔ ساری کی ساری محبتوں اور دعاؤں کے ساتھ۔"

"لیکن ہمارے لیے یہ سب کیسے ممکن ہے' ہم پاکستان کیسے جا سکتے ہیں؟"

"مجھے بس تھوڑا سا وقت دے دو غزالہ..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس دوران میں تم چچی جان کا ذہن بھی بنا لو۔ بس زیادہ سے زیادہ دس پندرہ دن کی بات ہے۔"

وہ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی "کیا آپ اب بھی پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"شاید ہاں..... شاید نہیں۔"

وہ روہانسی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ رودینی با اٹھ کر چلی جاتی' میں نے اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور اس کے ریشمی بالوں پر لگاتار کئی بوسے دیے۔ تابی دلچسپ نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ نمناک لہجے میں بولی "آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ شنکر وغیرہ کا خیال دماغ سے نکال دیں گے۔"

"ٹھیک ہے' وعدہ کرتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ کسمسائی' میں جانتا تھا کہ اب وہ کیا کہے گی۔ اس نے کہا تھا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اچانک زریں گل نے دروازے پر نمودار ہو کر میرے لیے یہ مرحلہ آسان کر دیا "لو تمہارا گول مٹول دیور آ گیا" میں نے کہا۔

غزالہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گئی۔

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | ڈاک خرچ 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

ناشر

القرائی پبلشرز اینڈ سیلرز، لاہور

اشاعت

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 7247414

اگلے چار پانچ گھنٹوں میں مجھے شنکر کے حوالے سے کچھ مزید معلومات مل گئیں اور ان مقابلوں کی تفصیل بھی معلوم ہوئی جو لندن کے ایک بڑے جواخانے میں ہونے والے تھے۔ یہ مقابلے نہایت خفیہ طریقے سے منعقد کیے جا رہے تھے۔ ان مقابلوں کا انتظام انگلینڈ کے ایک بہت بااثر اور طاقت ور "ڈان" نے کیا تھا جس کا نام نپولین ہی معلوم ہوا۔

کچھ دیر پہلے موّل نے میرے سامنے ایک اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا عین ممکن ہے کہ شنکر نے چال چلی ہو۔ وہ پولیس کی ملی بھگت سے مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانا چاہتا ہو کہ جونہی میں شنکر سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مقابلوں میں شرکت کروں، وہاں سفید پوش پولیس مجھے چھاپ لے۔ میں نے منوہرا کی مدد لی اور اس حوالے سے چھان بین کروائی۔ موّل کا یہ اندیشہ کافی حد تک غلط نکلا۔ منوہرا کے خاص کارندے نے اس بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان کے مطابق مذکورہ مقابلے واقعی منعقد ہو رہے تھے اور ان مقابلوں کے ذریعے اندر ورلڈ کے کچھ "بڑوں" کو کروڑوں ڈالر آمدن کی توقع تھی۔ بقینا یہ سارا سلسلہ پولیس کے علم میں بھی ہوگا لیکن یہ سب کچھ اتنی اعلیٰ سطح پر ہو رہا تھا کہ پولیس بھی چشم پوشی پر مجبور تھی۔ ممکن تھا کہ چند بڑے افسران کے منہ بند کرنے کے لیے انہیں خریدا بھی گیا ہو۔ جہاں کروڑوں کی آمدن متوقع ہو، وہاں دس بیس لاکھ کسی انٹی نوٹ کے لیے علیحدہ کر دینا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ بے شک لندن کی انتظامیہ میں کرپشن کم تھی لیکن ناپید تو نہیں تھی۔

شنکر شکرا کی شرکت کے سبب ان مقابلوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ یورپ اور امریکا کے کئی ابھرتے ہوئے اسٹریٹ فائٹر قسمت آزمائی کے لیے لندن پہنچ رہے تھے۔ ایک سیاہ فام فائٹر "بلیک راک" کا بہت نام لیا جا رہا تھا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ شخص فائنل راؤنڈ تک پہنچے گا۔ اس کے علاوہ بھی دو تین نام اہم تھے۔ میرے اندر کوئی شے مچلنے لگی تھی۔ کوئی لہر تھی جو سینے کی گہرائی سے بلند ہوئی تھی اور پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے مستقبل کو محفوظ بنانا چاہتا ہوں تو مجھے اپنے اس بڑے دشمن کو جہنم واصل کرنا ہوگا یا کم از کم جسمانی طور پر ناکارہ کر دینا ہوگا۔ عالم قریشی نے پاکستان فون کیا تھا اور اس فون کے نتیجے میں اسے جو تفصیلات معلوم ہوئی تھیں وہ بہت تشویش ناک تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مجھ سے دوری شنکر کو سخت بے قرار کیے ہوئے ہے اور وہ نیم پاگل ہو رہا ہے۔ میرے حوالے سے اسے جو شے بھی نظر آتی تھی وہ اسے برباد کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ درحقیقت چند ماہ پہلے اپنی ٹانگ ٹوٹ جانے کا دکھ شنکر کے اندر آتش فشاں کی

طرح دہک رہا تھا۔ وہ مجھ سے ہر صورت اس زخم کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ "ٹانگ ٹوٹنے" والے واقعے کے بعد کم سن لڑکیوں والے کلب میں شنکر کے ساتھ میری جو فائٹ ہوئی تھی اس میں بھی شنکر دیوانوں کی طرح میری ٹانگ کو ہی نشانہ بنانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ ہم بوم کلب کے ایک اندرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ عالم قریشی کے علاوہ موّل بھی اس اہم نوعیت کی گفتگو میں شریک تھا۔ منوہرا دیوی کلب کی بالائی منزل پر تھی اور اپنے اسٹاف کے ساتھ کسی میٹنگ میں مصروف تھی۔ ہماری گفتگو کا موضوع ہفتے کی رات "اسٹار اسٹار" نامی کیسینو میں ہونے والے فائٹنگ کے مقابلے تھے۔ زریں گل میں نے جان بوجھ کر اس گفتگو میں شریک نہیں کیا تھا۔ ایک تو وہ شنکر کے نام پر بہت جذباتی ہو جاتا تھا اور اس کی زبان فوراً شعلے اگلنے لگتی تھی، دوسرے وہ کسی وقت پیٹ کا ہلکا بھی ثابت ہو جاتا تھا۔ خاص طور سے غزالہ کے لیے یہ کام کافی آسان تھا کہ وہ بہلا پھسلا کر زریں سے اپنے مطلب کی بات پوچھ لے اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ شنکر کے نام کی بھنک بھی غزالہ یا چچا وغیرہ کے کانوں میں پڑے۔ غزالہ کسی صورت یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں یہاں لندن میں کسی بھی طرح کا رسک لوں، اور شنکر کے ساتھ میرے ٹکرانے کا تو خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ میں نے اپنے ارادے اس سے بالکل پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔

عالم قریشی نے سگریٹ مٹھی میں دبا رکھا تھا اور اپنے لاہوری اسٹائل میں کش لے رہا تھا۔ دھوئیں کا ایک مرغولہ فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا "شاہ جہاں! میں تو ایک بار پھر کہوں گا کہ اس کام کو چار پانچ مہینے آگے ڈال دو۔ کوئی ایسی ایمرجنسی نہیں ہے۔ نہ تم نے کہیں چلے جانا ہے نہ اس کتے کے پتر (شنکر) نے کہیں دوڑ جانا ہے۔ فی الحال تم چپ کر کے اپنا گھر بسا لو اس کے بعد ہم مل کر اس حرامی کا سواستیاناس کریں گے۔"

"لیکن قریشی ایک بات تم بھی بڑی اچھی طرح جانتے ہو شنکر جس طرح میرے لیے بے قرار ہو رہا ہے وہ آج نہیں تو کل مجھ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ مجھے دو چار مہینے بھی سکون سے رہنے دے گا۔ پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ جب تک شنکر موجود ہے میں شفقت اور انجم وغیرہ کو بھی اپنے پاس نہیں بلا سکتا اور یہ بات بھی تمہارے علم میں ہے کہ میری "فیملی" شفقت سے شروع ہو کر شفقت پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ جس خوشی میں میری اکلوتی بہن بھی شریک نہ ہو سکے میں اس خوشی کو کیا کروں گا۔"

"شاہ جہاں! یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ شنکر تمہیں ڈھونڈ ہی لے۔" قریشی نے کہا "کیا اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک جگہ بھی

ایسی نہیں جہاں تم دو چار مہینے سکون کے ساتھ گزار سکو۔ ہم کوئی نہ کوئی انتظام کر لیں گے۔ نہ ہوا تو مسٹر کلارک سے کہیں گے۔ وہ تمہیں چند گھنٹوں میں کسی بھی جگہ پہنچا سکتے ہیں۔"

"تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے قریشی لیکن میں شنکر کے خوف کے سائے میں رہنا نہیں چاہتا۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "مجھے یہ کسی صورت منظور نہیں کہ وہ حرامی مجھے ڈھونڈ رہا ہو اور میں اپنی دلہن کے ساتھ کہیں سر چھپا کر رہوں۔ پھر تمہیں ایک اور بات بھی سامنے رکھنی چاہیے۔ سیانے کہہ گئے ہیں کہ پیش قدمی سب سے بڑا دفاع ہوتی ہے۔ پیش قدمی کرنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔"

موّل نے کہا "آپ کی یہ بات تو واقعی سمجھ میں آتی ہے کہ مکار دشمن کے اچانک وار کا خطرہ مول لینے کے بجائے، کھلے میدان میں اس سے دو دو ہاتھ کر لینا زیادہ مناسب ہے لیکن قریشی صاحب کی باتوں میں بھی کچھ وزن ہے۔"

ہم نے قریباً دو گھنٹے تک اس معاملے پر بحث کی۔ آخر ہم ایک نتیجے پر پہنچ گئے اور یہ نتیجہ وہی تھا جو میں چاہتا تھا۔

☆☆☆

یہ ہفتے کی شام تھی۔ ہم لندن کے ایک بہت بڑے کیسینو "اسٹار اسٹار" میں موجود تھے۔ "اسٹار اسٹار" کا ایک زیر زمین ہال کسی چھوٹے موٹے اسٹیڈیم سے کم نہیں تھا۔ یہ گول تماشا گاہ دیکھنے میں بھی کوئی ان ڈور اسٹیڈیم ہی لگتی تھی۔ اس کی بہت بڑی چھت کسی گنبد کی طرح اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف آرام دہ کرسیاں تھیں۔ درمیان میں قریباً سو فٹ قطر کی خالی جگہ تھی جو مختلف (DEMONSTRATIONS) کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ آج اس جگہ پر لڑائی کے نہایت خطرناک مقابلے ہو رہے تھے۔ یہ مقابلے درحقیقت پہلے روز سے جاری تھے۔ فائٹرز مختلف مراحل سے گزر کر فائنل راؤنڈز تک پہنچے تھے۔ یہ اسٹریٹ فائٹنگ تھی۔ کوئی پروٹیکشن نہیں۔ ہاتھوں پر کوئی دستانہ نہیں۔ چہرے پر کوئی فیس گارڈ نہیں۔ یہ ایسی ہی لڑائی تھی جیسی گلیوں میں ہو جاتی ہے۔ چند سیکنڈ میں لڑنے والے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ ہونٹ پھٹ جاتے ہیں، چہرے نیلے ہو جاتے ہیں، پیٹ یا سینے پر چوٹ لگ جائے تو سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی رک بھی جاتی ہے۔ یہ لڑائی ایک طرح سے جوڈو کراٹے، باکسنگ، تھائی باکسنگ وغیرہ کا مکسچر ہوتی ہے۔ اس لڑائی میں لگی ہوئی چوٹیں اکثر بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

میرے ساتھ عالم قریشی اور زریں گل تھے۔ میرا اور زریں گل کا حلیہ تو پہلے سے تبدیل شدہ تھا، عالم قریشی کو تھوڑی سی

تبدیلی کرنا پڑی تھی۔ ہم جس وسیع و عریض ہال میں موجود تھے اس میں کئی بھاری بھرکم اور بااثر شخصیات موجود تھیں۔ یہ سب کے سب نہایت امیر کبیر لوگ تھے۔ شوقین مزاج صنعت کار، تاجر، سیاح اور پھر نامور کھلاڑی اور شوبز کے لوگ۔ یہاں ہزاروں لاکھوں ڈالر کی شرطیں لگائی جا رہی تھیں۔ شراب کے دور چل رہے تھے اور خوب رو ویٹرس نشستوں کے درمیان تتلیوں کی طرح چکراتی پھر رہی تھیں۔ بہت سے امرا کے ساتھ بیگمات ہوا کرتی ہیں لیکن یہاں بیگمات اور گرل فرینڈز کی تعداد کم ہی نظر آتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی میوزک شو یا ڈرامائی پروگرام نہیں تھا۔ یہاں خوں ریز لڑائیاں ہو رہی تھیں اور اکثر لڑائیوں کے دوران میں گالی گلوچ اور بلیک بازی بھی جاری تھی۔

ہمارے سامنے جو تین لڑائیاں ہوئیں ان میں دو افراد کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے۔ ایک فائٹر کو سینے پر شدید چوٹ لگی اور اسے خون کی قے ہوئی۔ ایسے افراد کو طبی امداد فراہم کرنے کا انتظام بھی موجود تھا۔ ابھی یہ مقابلے فائنل راؤنڈز تک نہیں پہنچے تھے پھر بھی ہر مقابلے میں بلا کی تیزی اور جارحیت موجود تھی۔ کھلاڑی کوارٹر فائنل تک پہنچنے کے لیے بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ مجھے وہ سیاہ فام فائٹر بلیک راک بھی نظر آیا جس کی سخت جانی کی دھوم تھی۔ اس نے اپنے انگریز حریف کو صرف بیس تیس سیکنڈ میں ناک آؤٹ کر دیا۔ سیاہ فام کا گھٹنا بڑے زور سے حریف کی پسلیوں میں لگا۔ تھائی باکسنگ کے مخصوص انداز میں مارا گیا یہ گھٹنا ہی انگریز فائٹر کے لیے کافی ثابت ہوا اور وہ نیم بے ہوش ہو کر RING میں گر گیا۔ بعد ازاں مزید پٹائی سے بچنے کے لیے اس نے خود ہی ہاتھ اٹھا کر مقابلے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

کوارٹر فائنل مقابلوں کے دوران میں شیطان ابن شیطان شنکر شکرا پر پہلی بار میری نگاہ پڑی۔ وہ حسب عادت چرمی جیکٹ اور سیاہ پتلون میں ملبوس تھا۔ جیکٹ کی کھلی ہوئی زپ میں سے اس کا کسرتی جسم جھانک رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ بالکل خاموش تھا اور پتلے پتلے ہونٹ مضبوطی سے بھینچے ہوئے تھے، لیکن آنکھیں خاموش نہیں تھیں۔ ان میں بلا کی سفاکی چنگھاڑ رہی تھی۔ وہ جدھر سے گزرتا تھا نگاہیں اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مقامی شوقین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے شنکر کی طرف اشارہ کیا اور کہا "کیا یہی شنکر شکرا ہے؟" مقامی انگریز نے اثبات میں سر ہلایا اور میری بات کی تائید کی۔ میں نے کہا "ابھی تک شنکر شکرا صاحب کی فائٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔"

انگریز نے کہا "شنکر شکرا براہ راست فائنل راؤنڈ میں ہے۔ یہ صرف دو مقابلے کرے گا۔ پہلے مقابلے کو آپ سیمی

فائنل کہہ سکتے ہیں، دوسرا فائنل ہوگا۔"

عالم قریشی نے پنجابی لہجے کی انگریزی بولتے ہوئے انگریز کو مخاطب کیا اور بولا "آپ کا کیا خیال ہے شنکر یہ مقابلے جیت جائے گا۔"

"اس کا امکان 80 فیصد سے زیادہ ہے۔" انگریز نے جواب دیا "یہی وجہ ہے کہ شرطوں میں شنکر کی ہار کا ریٹ تین کے مقابلے میں سو ہے۔"

عالم قریشی بولا "اس سے پہلے بمبئی اور دہلی وغیرہ میں بھی ایسے مقابلے ہوتے رہے ہیں، وہاں شاہ جہاں نامی ایک پستانی نژاد کرشنکر کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" عمر رسیدہ انگریز نے زور سے سر ہلا کر عالم کی بات کی تائید کی "ایسا ایک مقابلہ میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ وہ شخص صحیح معنوں میں شنکر کا مدمقابل تھا۔ ان دونوں کی فائٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسی ہی ایک فائٹنگ کی ریکارڈنگ میں نے پچھلے دنوں مہنگے داموں خریدی ہے۔ وہ، سنرکا پی ہے۔"

"بہت خوب! وہ تو واقعی خاصے کی چیز ہوگی۔" عالم قریشی نے کہا۔ وہ انگریز کی باتوں سے مزہ لینے کے موڈ میں نظر آتا تھا۔

انگریز کے ساتھ عالم قریشی کی گفتگو جاری رہی، زیر لب چپکے چپکے مسکراتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں اس انگریز تماشائی کو ایک زبردست سرپرائز ملنے والا ہے۔ ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق وقت کا انتظار کر رہے تھے، وہ وقت بس آنے ہی والا تھا۔

سیمی فائنل مقابلوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی میں نے عالم قریشی کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر اس گیلری کی طرف چلا گیا جہاں انتظامیہ کے لوگ بیٹھے تھے۔ وہ انتظامیہ کے ذمے دار لوگوں کو یہ اطلاع دینے جا رہا تھا کہ میں اس تماشا گاہ کے قریب ہی موجود ہوں اور فائنل مقابلوں میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر انتظامیہ تماشا گاہ سے میری محفوظ واپسی کی ضمانت دے سکتی ہے تو میں میدان میں آجاتا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ انتظامیہ کے لیے میری موجودگی کا انکشاف ازحد دھماکا خیز ثابت ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں غیر متوقع آمدن کی ایسی زبردست چمک نظر آئے گی کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور آگے چل کر یہی ہوا جو میں چاہتا تھا۔ مقابلوں کے منتظم اعلیٰ نپولین سے ملاقات کے بعد عالم قریشی نے مجھ سے شارٹ رینج کے وائرلیس پر رابطہ کیا اور مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

نپولین نے اس معاملے میں ذاتی طور پر زبردست دلچسپی لی تھی اور میری یہاں موجودگی پر بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا تھا۔ نپولین نے اپنی اور انتظامیہ کی طرف سے دعویٰ کیا تھا کہ یہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کا کوئی فرد پر بھی نہیں مار سکتا۔ نپولین نے ذاتی طور پر مجھے یہ گارنٹی فراہم کی تھی کہ مقابلے کے بعد مجھے مکمل حفاظت کے ساتھ میرے مطلوبہ ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے گا۔ ان ابتدائی یقین دہانیوں کے بعد میں نے خود جا کر نپولین نامی اس نژاد سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات ایک بند کمرے میں ہوئی۔ یہاں نپولین کے علاوہ اس کے دو اہم ساتھی بھی موجود تھے۔ میرے ساتھ عالم قریشی تھا۔ میں ابھی تک ادھیڑ عمر شخص کے میک اپ میں تھا۔ نپولین نے اپنے ساتھیوں سمیت اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد کام کی بات شروع ہوئی۔ نپولین نے کہا "مسٹر شاہ جہاں! میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ تم نے ایک اہم موقعے پر یہاں اپنی موجودگی کا اعلان کیا ہے۔ تمہارے اعلان نے یہاں حقیقی معنوں میں ایک ڈرامائی صورت پیدا کر دی ہے۔ ہم نے ہال کے تمام دروازے بند کروا دیے ہیں اور ایسا تمہاری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اب کوئی باہر جا سکتا ہے اور نہ اندر آ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میرے خیال میں یہ احتیاط میرے علاوہ آپ سب کے لیے بھی فائدہ مند ہوگی۔"

"ہم تمہاری یہاں موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور جو فائدہ حاصل ہوگا اس میں تمہارا ایک معقول شیئر ہوگا۔ ہمیں ننانوے فیصد توقع ہے کہ بڑا مقابلہ تمہارے اور شنکر کے درمیان ہی ہوگا۔"

"مجھے کتنے مقابلے کرنا ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں صرف دو۔ میں نے ابھی ابھی سیمی فائنلسٹ کھلاڑیوں سے بات کی ہے۔ ان میں سے ایک کھلاڑی بخوشی تمہارے حق میں دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"مجھے اور میرے ساتھیوں کو کتنی دیر یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہیں اپنے درمیان دیکھ کر ہم سب کو بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے اور ہم بہت EXCITED بھی ہیں۔ ہماری تو یہ خواہش ہوگی کہ تم زیادہ سے زیادہ دیر ہمارے ساتھ رہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم عجلت میں نظر آتے ہو۔" نپولین نے چند لمحے توقف کر کے سگار کا ایک طویل کش لیا اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا "صورت حال میں جو ڈرامائی تبدیلی آئی ہے اس کے

مطابق پروگرام ترتیب دینے کے لیے ہمیں کم از کم ایک گھنٹا تو مزید لگے گا۔ درحقیقت تمہارا اور شنکر کا مقابلہ اسٹریٹ فائٹ کے شائقین کو ہمیشہ بہت جذباتی کر دیتا ہے۔ اس وقت بھی جن لوگوں تک یہ بات پہنچ چکی ہے وہ بہت جذباتی نظر آ رہے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ اب پرانی ساری شرطیں منسوخ ہو جائیں گی اور نئی شرطیں لگائی جائیں گی۔ شرطوں کی شرح بدلے گی اور شرطوں کی مجموعی رقم کا حجم بھی بہت بڑھ جائے گا۔ ان ساری تبدیلیوں کے لیے ظاہر ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقت درکار ہوگا۔ اس وقت تک تم شنکر سے ایک ملاقات کر لو۔ ریفری اور جیوری ممبران بھی آ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر فائٹ کے قواعد و ضوابط طے کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک صاف ستھری فائٹ ہو اور شائقین کے لیے یادگار EVENT بن جائے۔

میرے اور نپولین کے درمیان قریباً پندرہ منٹ تک گفتگو ہوئی۔ نپولین ایک لمبا تڑنگا سخت مزاج شخص نظر آتا تھا لیکن اس کے ساتھ اصول پسند بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہ آسٹریلوی نژاد تھا اور بڑی مدلل گفتگو کرتا تھا۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد میں RING میں تھا۔ میں اپنا میک اپ صاف کر چکا تھا اور اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ تماشاگاہ میں کم و بیش دو ہزار افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب منتخب لوگ تھے۔ زیادہ تعداد لندن کے امرا اور معززین کی تھی۔ ڈیوکس، نائٹس، پرنس، لارڈز اور پتا نہیں کون کون۔ تماشائیوں کا جوش و خروش دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں جوش و خروش کی توقع تو کر رہا تھا مگر ایسے سنسنی خیز ماحول کی توقع مجھے نہیں تھی۔ نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ ان تماشائیوں میں اپنے زیادہ پرستار مجھے ملیں گے۔ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ رہے تھے اور مجھے RING میں اپنے سامنے دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ میری اس غیر متوقع پذیرائی کی وجہ یقیناً وہ خبریں تھیں جو پچھلے چند روز سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان خبروں کا تعلق ٹرسٹ کی تباہی اور اس تباہی میں میرے کردار سے تھا۔

میرا مقابلہ اسی سیاہ فام سے ہونا قرار پایا جس کا نام بلیک راک تھا۔ شنکر کا مدمقابل نسبتاً ایک آسان حریف تھا۔ بلیک راک ہی اس شخص سے میری لڑائی شروع ہوئی۔ وہ واقعی ایک سخت جان اور خطرناک حریف تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے کچھ مرعوب بھی نظر آتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے بڑی سودمند تھی۔ مقابلے کے شروع میں اس نے مجھے اپنے دونوں ہاتھ سے چند ضربیں لگائیں۔ اس کا مکا کسی ہیوی ویٹ ہیمر کی طرح تباہ کن تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ دیر پہلے اس کے ٹھینگے کی "خطرناک کارکردگی" بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ میں نے سیاہ فام کے ان دونوں حربوں سے خود کو بچائے رکھا اور کسی بہتر موقعے کی تلاش میں رہا۔

جب بھی میری کوئی ضرب حریف کے جسم پر لگتی تماشائیوں نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ ایسی صورتِ حال فائٹر میں زبردست ترنگ پیدا کرتی ہے، اس سے مجمع کی وابستگی اور ہمدردی کا خوشگوار احساس ہوتا ہے اور اس کا حوصلہ دوگنا ہو جاتا ہے۔ یہ پانچ پانچ منٹ کے تین راؤنڈز کا مقابلہ تھا۔ مجھے اپنا مطلوبہ موقع دوسرے راؤنڈ کے آخری منٹوں میں مل گیا۔ سیاہ فام دراصل تھائی باکسنگ کا ماہر تھا۔ یہ اسٹائل کراٹے اور باکسنگ کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ سیاہ فام نے ایک زوردار کک لگانے کے لیے ایک قدم آگے بڑھایا تو میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ جتنی تیزی سے آگے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے پیچھے گیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسری ٹھوکر پہلے والی جگہ پر رسید کی۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا اور یہی لمحے اس کی بدقسمتی پر مہر لگا گئے۔ اس کی گردن میرے دائیں بازو کی گرفت میں آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ تڑپ کر اس گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا، میرے بازو کے مخصوص دباؤ نے اس کی ساری جدوجہد یک لخت ختم کر دی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح میرے بازو میں جھول گیا۔ میں نے نیچے جھک کر اسے RING کے چوبی تختے پر پھینک دیا۔ ریفری نے فوراً گنتی شروع کی۔ اسے دس تک گننا تھا۔ وہ ایک سے دس تک گنتا تو بھی میرے مدمقابل کے جسم میں حرکت پیدا نہ ہوئی۔

تماشائیوں نے یک لخت آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ جوش و خروش سے ناچ رہے تھے۔ بہت سے لوگ RING کے قریب چلے آئے تھے اور مجھے براہِ راست مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے لوگوں کے ہجوم میں زریاب کو بھی دیکھا۔ وہ وجد کے عالم میں ناچ رہا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم عالم قریشی کا ہاتھ تھا۔ وہ اسے بھی ناچنے پر اکسا رہا تھا۔

اور پھر آدھ پون گھنٹے بعد قیامت کی گھڑی آ پہنچی۔

سیکڑوں پرجوش تماشائیوں کے درمیان شنکر میرے سامنے تھا۔ ہم دونوں رنگ کے بیچوں بیچ کھڑے تھے اور ایک دوسرے کو نگاہوں میں تول رہے تھے۔ آج ایک عرصے بعد وہ دشمنِ جاں پھر روبرو تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے خون کی پیاس تھی۔ اس کے منحوس چہرے پر میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے "انتقام" درج تھا۔ میں آج اس شخص پر فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اب اس شخص کا پرخوف سایہ مجھ پر اور میرے پیاروں پر مزید مسلط رہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو پاؤں گا یا نہیں مگر میں کوئی کسر اٹھا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

RING میں داخل ہونے سے پہلے میرے اور شنکر کے درمیان مختصر گفتگو بھی ہوئی تھی۔ اس گفتگو میں شنکر کے منہ سے حسبِ توقع شعلے ہی نکلے تھے۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا شخص تھا لیکن اب کچھ عرصے سے مجھے دیکھتے ہی اپنے طیش پر قابو رکھنا اس کے بس سے باہر ہو جاتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے اسے بدزبانی سے روکا تھا اور چند منٹ صبر کرنے کے لیے کہا تھا اور اب ہم دونوں اپنے حوصلے آزمانے کے لیے رنگ (RING) میں تھے۔ شنکر کے ایک ہاتھ کی انگلی کٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہ انگلی میرے ہاتھوں ہی دہلی کے ایک مقابلے میں ناپید ہوئی تھی اور میرے لیے اس واقعے کی یاد فرحت کا باعث تھی۔

تماشائیوں کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ جن لوگوں نے بھاری شرطیں لگا رکھی تھیں وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہے تھے۔ شنکر کی حمایت میں بھی بے شمار ہاتھ اٹھ رہے تھے لیکن میری حمایت واضح اکثریت لیے ہوئے تھی۔ یہ احساس بے حد خوشگوار تھا کہ لوگ ایک فائٹر کی حیثیت سے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھے جیتتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

"تمہاری بدقسمتی تمہیں بہت بری جگہ لے آئی ہے جہانی۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہاں سے اسٹریچر پر جاؤ گے، زندہ یا مردہ!"

"تمہارے منہ میں زبان نہیں... کتے کے جبڑے کا ٹکڑا ہے... اس ٹکڑے کے ذریعے تم پہلے بھی بہت ڈینگیں مارتے رہے ہو اور شرمسار ہوتے رہے ہو۔"

اچانک شراب کی ایک بوتل اڑتی ہوئی آئی اور شنکر کی کنپٹی پر لگی۔ چوٹ زوردار تھی، وہ ڈگمگا کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی تماشائیوں میں کچھ لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ یقیناً شنکر کے حمایتیوں نے بوتل مارنے والے کو پکڑ لیا تھا۔ جواب میں مارنے والے کے ساتھی بھی میدان میں آ گئے تھے۔ شنکر کی کنپٹی سے خون رسنے لگا تھا۔ بوتل ٹوٹ گئی تھی اور اس میں موجود شراب نے چاروں طرف چھینٹے اڑا دیے تھے۔

اس سے پہلے کہ منتظمین صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے، چند افراد بلا بول کر رنگ میں داخل ہو گئے۔ ایک شخص کے ہاتھ میں فولادی گھونسہ چمکتا دکھائی دیا تھا۔ اس گھونسے کی ایک ضرب میرے منہ پر لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے لوہے کی لٹھ گھما کر میرے بازو پر ماری۔ یہ میرے عقب سے لگائی گئی تھی لہٰذا میرے لیے دفاع کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میرا بایاں بازو کندھے سے ہاتھ تک جھنجھنا اٹھا۔ درد کی شدید ٹیسیں پورے جسم میں پھیل گئیں۔ میں نے ہاتھ سے ایک حملہ آور کے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور اسے دور پھینک دیا۔ اسی دوران میں درجنوں مسلح گارڈز رنگ میں گھس آئے اور انہوں نے زبردست لاٹھی چارج کر کے حملہ آوروں کو تتر بتر کر دیا۔ کچھ افراد کو سنگین چوٹیں بھی آئیں۔ چار پانچ منٹ کے لیے سخت افراتفری رہی پھر دھیرے دھیرے صورتِ حال قابو میں آنے لگی۔ دونوں طرف کے تماشائی مسلسل مخالفانہ نعرے بازی کر رہے تھے لیکن اب اتنا فرق پڑا تھا کہ وہ اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تھے اور تصادم کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

کیسینو کے مسلح گارڈز نشستوں کے درمیان گھومنے لگے۔ انہیں جو شخص بھی تشدد پر آمادہ نظر آتا تھا اس کی حیثیت کی پروا کیے بغیر اسے کھینچ کر باہر لے جاتے تھے۔ مجھے اور شنکر کو وقتی طور پر رنگ سے نیچے اتار لیا گیا اور ڈریسنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ میرے بازو میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جہاں چوٹ لگی تھی وہاں نیلگوں گومڑ سا بن گیا تھا اور خون بھی رس رہا تھا۔ چوٹ کا مقام کہنی سے قریباً چھ انچ اوپر تھا۔ موقعے پر موجود ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ دی۔ نجانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ ہڈی کو بھی تھوڑا بہت نقصان پہنچا ہے۔ بہرحال انگلیاں وغیرہ ٹھیک حرکت کر رہی تھیں، ہڈی کی موومینٹس بھی ٹھیک تھیں۔

آدھ پون گھنٹے تک حالات معمول پر آ گئے۔ ہم دونوں کو دوبارہ رنگ میں اتارنے کی تیاری ہونے لگی۔ عالم قریشی بھی ڈریسنگ روم میں موجود تھا اور میری چوٹ کو تشویش کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا "شاہ جہاں! اگر زیادہ تکلیف ہے تو "ودڈرا" کر جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ چوٹ اور بھی خراب ہو جائے۔"

ڈاکٹر نے بھی دبے لفظوں میں اس سے ملتی جلتی بات کی تھی۔ میں نے چند لمحے کے لیے سوچا۔ چند سیکنڈ کے اندر ذہن کی تختی پر سیکڑوں دلیلوں کی جمع تفریق ہوئی۔ کئی مصلحتیں ذہن میں آئیں اور گئیں۔ بازو میں درد کی لہریں مسلسل اٹھ رہی تھیں۔ "چوٹ جوں جوں ٹھنڈی ہو رہی ہے درد بڑھتا جا رہا ہے شہزادے۔" عالم قریشی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے چہرے کے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے کہ جب جسم گرم ہوگا تو چوٹ بھی گرم ہو جائے گی اور درد کم ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟"

"دیکھو شہزادے! لڑنا تمہیں ہے مجھے نہیں۔" قریشی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

دس منٹ بعد میں اور شنکر ایک بار پھر اکھاڑے یعنی رنگ میں تھے۔ ہال میں موجود افراتفری ختم ہو چکی تھی لیکن تماشائیوں کا جوش و خروش پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ مخالفانہ نعرے بازی سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ میری حمایت شنکر سے زیادہ ہے۔ میں نے

کچھ سکھ حضرات کو بھی اپنی حمایت میں اچھلتے کودتے دیکھا۔ یہ بڑی بات تھی کہ وہ شنکر شکرا عرف شنکر بھاؤنی کے مقابلے میں مجھے سپورٹ کر رہے تھے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ حسب توقع مقابلے کا آغاز ہی دھواں دھار تھا۔ شنکر نے چھوٹتے ہی تابڑتوڑ حملے کیے۔ میں نے اس کے وار بڑی صفائی سے بچائے اور جوابی طور پر اسے دو تین ضربیں بھی لگائیں۔ شنکر کے بھی ایک دو مکے میرے جبڑے پر لگے۔ تشویش کی بات یہ تھی کہ ان مکوں کی تکلیف مجھے جبڑے سے زیادہ بازو پر محسوس ہوئی۔ جسم کو جھٹکا لگنے سے بایاں بازو سنسنا اٹھا۔ شنکر ایک کائیاں اور نہایت عیار فائٹر تھا۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس نے نوٹ کر لیا کہ میں بائیں بازو میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ میرے بائیں بازو اور بائیں پہلو پر مرکوز کر دی۔ پہلے راؤنڈ کے آخر تک میرے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا اور میری ایک زوردار ٹکر کھانے سے شنکر کے بھی اگلے دانت ہل گئے تھے۔ یہ راؤنڈ تقریباً "برابر" ہی ختم ہوا۔ تماشائیوں کے شور وغل نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اپنا ایک بازو فضا میں بلند کیا تو جواب میں سیکڑوں پرجوش بازو لہرائے۔ شنکر رنگ کے وسط میں کھڑا تھا اور دونوں بازوؤں کو والہانہ حرکت دے کر اپنے حمایتیوں میں جوش وخروش پیدا کر رہا تھا۔

دوسرے راؤنڈ کے آغاز میں میں نے شنکر پر چند حملے کیے۔ ان حملوں کے بعد مجھے واضح طور پر احساس ہوا کہ میرا بایاں بازو میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے شنکر پر غلبہ پانے کے لیے اپنی ہمت سے بڑھ کر کوشش کرنا ہوگی۔ راؤنڈ کے وسط میں شنکر نے ایک غلطی کی۔ میرے پیٹ میں ایک زوردار لات رسید کرنے کی کوشش میں وہ اپنا بیلنس کھو بیٹھا اور گر گیا۔ یہ ایک لمحہ کی مہلت میرے لیے بہت تھی۔ میں نے جست کی اور شنکر کو اٹھنے سے پہلے ہی جھاپ لیا۔ اب وہ منہ کے بل فرش پر تھا اور میں اس کے اوپر تھا۔ یہ صورت حال میرے خیر خواہوں کے لیے بڑی خوش کن تھی۔ انہوں نے شور وغل کی انتہا کر دی۔

میں نے کوشش کی کہ اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھاؤں اور شنکر کی منحوس گردن کو اپنے بازو کی مخصوص گرفت میں لے آؤں لیکن وہ شیطان ابن شیطان تھا۔ اس کی مکاری اور چوکسی کسی بھی شبے سے بالاتر تھی۔ وہ اپنی گردن کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا (بالکل جس طرح میں اس کے گھٹنے کی تباہ کن ضرب سے غافل نہیں ہوتا تھا) بیس سیکنڈ تک رنگ کے فرش پر میرے اور شنکر کے درمیان جان لیوا کشمکش جاری رہی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید شنکر نیچے دبا ہونے کے باوجود اس کی دھجیاں اڑا دیتا۔ لیکن میں اس کے مہلک داؤ پیچ سے بخوبی آشنا تھا۔ میں نے اوندھے پڑے شنکر کی پسلیوں پر گھٹنوں کی کئی سخت ضربیں لگائیں اور وہ کراہنے پر مجبور ہو گیا لیکن پھر دفعتاً شنکر کی عیاری نے کام دکھایا۔ اس نے ایک کہنی اپنے پیٹ کے نیچے سے آزاد کیا اور کہنی کی طوفانی ضرب میرے بازو کے عین اس حصے پر لگائی جہاں چوٹ لگی تھی۔ میری آنکھوں میں تارے سے ناچ گئے۔ یہ ناقابل برداشت ضرب تھی۔ میری گرفت شنکر پر نرم پڑی۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھے پیچھے اچھال دیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر دوبارہ کھڑا ہوتا اس نے لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر میرے سینے پر چوٹ لگائی اور مجھے رسوں تک اچھال دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ فائٹ کا "ٹرننگ پوائنٹ" تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں شنکر نے مجھے سنبھلنے کا قطعاً موقع نہیں دیا۔ اس نے وحشیانہ طاقت کے ساتھ تابڑتوڑ حملے کیے اور میرا چہرہ لہولہان کر ڈالا۔ شنکر نے میرے زخمی بازو کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا تھا اور یہ بازو جیسے اب میرے ساتھ ہی نہیں تھا۔ شنکر کا دوسرا اور اہم ترین ٹارگٹ میری ٹانگ تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کانوں میں تماشائیوں کے حوصلہ افزا نعرے گونج رہے تھے۔ میں سنبھلتا تھا لیکن وہ موذی سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخ پردہ سا تن گیا تھا۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے تھے۔ آوازیں کچھ فاصلے پر چلی گئی تھیں، چہرے دھندلا رہے تھے۔

"کیا میں ہار رہا ہوں۔ کیا میں شنکر سے ہار رہا ہوں؟" سوال کسی چیخ کی طرح میرے ذہن میں ابھرا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے بازی پلٹنا ہوگی۔ ان گنت پرستاروں کے سامنے میں شنکر کے ہاتھوں پٹ نہیں سکتا اور پھر یہاں زرین گل ہے، عالم قریشی ہے۔ میں ان کو شرمسار کیسے کر سکتا ہوں۔" ان کے ساتھ ہی غزالہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ کیا میں ایک "شکست خوردہ" حیثیت سے اس کے سامنے جاؤں گا؟

میں نے اپنی رہی سہی قوت جمع کی اور ایک بار پھر شنکر کے حملوں کا جواب حملوں سے دینے کی کوشش کی۔ مجھے اس میں تھوڑی سی کامیابی بھی ملی لیکن اسی دوران میں شنکر نے پھر بے دردی سے میرے زخمی بازو کو نشانہ بنایا اور مجھے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران میں دوسرا راؤنڈ بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑی سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے گر رہے تھے۔ ایک آنکھ اس بری طرح سوج گئی تھی کہ اس میں سے کچھ نظر نہیں آتا

تھا۔ دوسری آنکھ سے بھی مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ میری جو انگلی چند روز پہلے زخمی ہوئی تھی وہ پھر سے زخمی ہوئی تھی اور میری جسمانی تکلیف کو بڑھانے کا سبب بن رہی تھی۔

دوسرے راؤنڈ کے اختتام پر شنکر کے حمایتیوں کا جوش عروج پر تھا اور شور وغل کے حوالے سے بھی ان کا پلا بھاری لگنے لگا تھا۔ دوسری طرف میری حمایت میں نعرے بلند کرنے والے کچھ دبے دبے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے اگلی قطاروں میں زرین گل کو دیکھا۔ وہ بڑی فریادی نظروں سے مجھے تک رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "استاد صیب! پھر بھی ہار جانا لیکن آج مت ہارنا۔ آج اس حرامی کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے اس اکھاڑے میں لمبا لٹا دو۔ اگر آج تم ایسا نہ کر سکا تو ہمارا کلیجہ دکھ سے پھٹ جائے گا اور ہمارا سر شرمندگی کے سبب ہمارے پاؤں سے جا لگے گا۔" پھر میری نگاہ عالم قریشی پر پڑی، وہ بھی حسرت ویاس اور پریشانی کی تصویر نظر آتا تھا۔

میں نے اپنی بچی کھچی قوت جمع کی اور اپنی تمام تر ہمت کو یکجا کرتے ہوئے تیسرے راؤنڈ کے لیے شنکر کے مقابل آ گیا۔ عیار شنکر نے اپنی تمام توجہ ہر طرف سے ہٹا کر صرف اور صرف میرے زخمی بازو پر مرکوز کر دی تھی۔ وہ مسلسل بازو کو نشانہ بنا رہا تھا اور مجھے سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دے رہا تھا۔ اب تک کئی مرتبہ بڑے بڑے ورجنوں سے میرا آمنا سامنا ہوا تھا لیکن بے بسی کی ایسی صورت حال پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہار رہا ہوں۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ سنبھلنے کا وقت گزر چکا ہے۔ ایک منٹ کے اندر اندر میرے جسم کا ہر حصہ شنکر کی فولادی ضربوں کی زد میں آ گیا۔ قوت سماعت متاثر ہو رہی تھی۔ اپنے پرستاروں کی آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان آوازوں میں اب جوش سے زیادہ کرب کی کیفیت تھی۔ مجھے لگا جیسے میرے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور نچلا ہونٹ شنکر کی طوفانی ضربوں سے کٹ کر لٹک گیا ہے۔ فلم کے ایسے مناظر میں اکثر ہیروئن بھاگی ہوئی آتی ہے، چیخ چیخ کر اپنے محبوب کا حوصلہ بڑھاتی ہے مگر یہاں صورت حال مختلف تھی۔ شاید غزالہ آ بھی جاتی تو میرے لیے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا مشکل تھا۔ ایک واضح شکست اپنی مکمل صورت میں میرے سامنے کھڑی تھی اور حقیقتیں اکثر تلخ ہی ہوا کرتی ہیں۔

انسان کی قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا ہے۔ میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ڈوبتے ذہن اور ڈوبتے حواس کے ساتھ میں نے خود کو سیدھا رہنے کی کوشش کی۔ شاہ جہاں! تم نے اپنی کوششوں میں اپنی طرف سے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ آخر تم گوشت پوست کے انسان ہو۔ انسان شکست بھی کھاتا ہے، مرتا بھی ہے۔ تمہارے دوستوں تمہارے خیر خواہوں کا دکھ یقیناً قابل فہم ہے۔ تاہم وہ بھی تو جانتے ہیں کہ سب کچھ انسان کے بس میں نہیں ہوتا اور نہ ہی سب کچھ ان کی توقع کے مطابق ہوتا ہے۔

اب آخری راؤنڈ کے آخری منٹ تھے۔ آنکھوں میں بھرنے والے خون کے سبب میری نگاہ کام نہیں کر رہی تھی، بایاں بازو جیسے جسم کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے شنکر کو سینے پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔ میرے پاؤں کا بالائی حصہ قوت کے ساتھ شنکر کے سینے پر پسلیوں کے درمیان ٹکرایا۔ شنکر تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ میں نے گدی کی طرف سے اس کی گردن دبوچی۔ میرے حمایتیوں کی دم توڑتی ہوئی آوازیں ایک بار پھر بلند ہوئیں۔ ان سیکڑوں آوازوں میں بھی زرین گل کی چیختی اور روتی ہوئی آواز میں نے الگ سے پہچان لی۔

اپنے خونچکاں جسم کی رہی سہی توانائی کو جمع کر کے میں نے پورا زور لگایا اور شنکر کو نیچے جھکانا چاہا۔ اگر وہ فرش پر اوندھے منہ گر جاتا تو میں اس قابل ہو سکتا تھا کہ اس کی گردن پر اپنا مخصوص داؤ لگا سکتا۔ کامیابی کا امکان سو میں سے پانچ دس سے زیادہ نہیں تھا مگر میں ہارنے سے پہلے ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے جسم کا سارا وزن شنکر کی گردن پر ڈال دیا لیکن اس لڑائی کا فیصلہ شاید تین چار منٹ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ شنکر جیسے "سخت جان" کو فرش تک لانے کے لیے جو قوت درکار تھی وہ اب میرے رگ و پے میں نہیں تھی۔ فرش تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ میرے لہولہان چہرے پر چند مزید اندھا دھند ضربیں لگیں اور میں گھٹنوں پر جا گرا۔ شنکر مجھے ناک آؤٹ کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے شنکر کو اس آخری کامیابی سے محروم رکھنے کے لیے اپنا چہرہ اپنے دونوں بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ آخری چند سیکنڈ تک اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کے لیے میں نے اپنے بدن کے ریزے ریزے سے توانائی کشید کر کے اپنی پنڈلیوں اور گھٹنوں میں جمع کر لی تھی۔

آخر گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی، میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریفری اور دیگر افراد بپھرے ہوئے شنکر کو کھینچ کھینچ کر مجھ سے دور لے جا رہے ہیں۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ وہ میری ٹانگ کو گرفت میں لینے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

RING کے اندر آ کر مجھے سب سے پہلے سہارا دینے والوں میں عالم قریشی اور زرین گل شامل تھے۔ جن لوگوں نے

شنکر کی جیت پر شرطیں بدی تھیں ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔ جب میں ڈریسنگ روم کی طرف جا رہا تھا، میری دھندلائی ہوئی نگاہ ایک ہجوم پر پڑی۔ یہ ہجوم خوشی سے ناچ رہا تھا۔ ہجوم میں سے ہی کچھ لوگوں نے شنکر جنگرا کو کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ شنکر جیت چکا تھا۔ شاید اس کی "عیار۔فطرت" جیت چکی تھی۔

☆☆☆

اگلے تین چار روز میں نے منوہرا کے یوم کلب میں ہی گزارے تھے۔ شکست ایک اٹل حقیقت تھی اور میں نے اسے تسلیم کیا تھا، لیکن ذہن کسی طور مطمئن ہونے میں نہیں آ تا تھا۔ میرے ساتھی میرے اندر کی شدید ہلچل سے آگاہ تھے۔ وہ بڑی دانش مندی سے مجھے تسلی تشفی دینے میں مصروف تھے اور اس کوشش میں تھے کہ اس واقعے کا صدمہ جلد از جلد میرے ذہن سے محو ہو جائے۔ عالم قریشی کو اس بات کا دکھ تھا کہ مقابلے سے پہلے زخمی ہو جانے کے باوجود میں نے مقابلے میں حصہ کیوں لیا۔ (اور یہ حقیقت تھی کہ قریشی کے بار بار منع کرنے کے باوجود میں میدان میں اتر گیا تھا)

مجھے تسلی تشفی دینے کے حوالے سے غزالہ کا کردار اہم ترین تھا۔ میں اس کی دانائی [illegible] بات دلی کا قائل ہو گیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں ا[illegible] نے محبت اور اپنائیت سے میرے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ [illegible] میں اس کرا اٹھا تھا۔ اب بھی ناشتے سے پہلے وہ میرے [illegible] ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے زخمی بازو پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ غزالہ نے میرا زخمی ہاتھ اپنے نرم ملائم ہاتھ میں تھام لیا اور بولی "یاد ہے ایک بار آپ ہی نے کہا تھا کہ لڑے بغیر ہارنے سے لڑ کر ہارنا کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق مزاحمت کرنا چاہیے اور پھر قدرت کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔"

"تو میں اپنے کہے سے کب مکر رہا ہوں؟"

"لیکن آپ کے چہرے کی چمک کب واپس آئے گی جناب؟" اس نے میرا ہاتھ ہولے سے دبایا۔

"جبڑا تو ٹوٹنے سے بچا ہے۔ مزید بھی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ پہلے ڈینٹنگ ہوگی پھر پینٹ پالش تو آخر میں ہوگی اور چمک پالش کے بعد ہی آتی ہے۔"

"آپ دل کی بات مجھ سے چھپا نہیں سکتے۔ زبان سے آپ کچھ بھی نہیں کہیں، لیکن آپ کے دل میں اس واقعے کا ملال ضرور ہے۔"

"تم زیادہ غیب دان بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"دیکھیں شاہ جہاں! آپ جب بھی مجھ سے کوئی بات چھپاتے ہیں، گڑبڑ ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی "آپ شنکر کی طرف بھی چوری چھپے ہی گئے تھے نا۔ اگر مجھے بتا کر جاتے تو میں مصلیٰ بچھا کر بیٹھ جاتی اور جب تک آپ واپس نہ آتے بیٹھی رہتی۔ دعاؤں میں بڑا اثر ہوتا ہے جناب۔"

"ٹھیک ہے، اگلی دفعہ بتا کر جاؤں گا۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "نہیں شاہ جہاں! اب آپ ایسا کوئی کام نہیں کریں گے۔ پلیز اب میری بات مان لیں۔ اب بہت ہو چکا پلیز پلیز!"

"ٹھیک ہے بھئی۔ جیسا تم کہتی ہو۔"

"کیا کہتی ہوں؟"

"یہی کہ شنکر کے چکر میں نہ پڑو۔ اب یہ چیپٹر کلوز کر دو۔"

"اور کیا کہتی ہوں؟"

"اور یہ کہ اب اس حرامی سے میرا حساب برابر ہو گیا ہے۔ روجھا پور میں میں نے اس کی ٹانگ توڑ کر اسے ہرایا یہاں لندن کے کیسینو میں اس نے مجھے ہرا دیا فنش!"

غزالہ نے پریشانی سے نفی میں سر ہلایا "نہیں شاہ جہاں! صرف شنکر کی بات نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سب کچھ چھوڑ دیں۔ اب ہمیں کچھ دیر اپنے لیے بھی جینا ہے۔ یہ دھاڑ، یہ خون خرابا، یہ مار دھاڑ اور زخم۔ اب میرا دم گھٹتا ہے ان چیزوں سے۔ اب ہمیں کچھ نہیں لینا دینا ان باتوں سے۔ کہیں دور چلیں۔ بہت دور۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں شاہ جہاں۔ اب آپ وہی کریں گے جو میں کہوں گی۔"

میں نے کہا "وعدہ کرنے کے لیے منہ ہلانا پڑتا ہے اور میرا جبڑا بہت دکھ رہا ہے۔"

"دیکھیں آپ بات کو مذاق میں ٹال رہے ہیں۔"

"اچھا بھئی نہیں ٹالتا، لیکن پہلے مجھے ناشتا تو کرا دو۔" میں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتی رہی پھر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ابھی اس بات کے لیے موقع مناسب نہیں ہے۔

مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے غزالہ سے اس لہجے میں بات کی۔ وہ میرا بہت خیال رکھ رہی تھی اور جو کچھ ہوا اس میں غزالہ کا کیا قصور تھا۔ اگر کسی کا قصور ہو سکتا تھا تو وہ میرا تھا۔ میں دلی طور پر یہ تسلیم کر رہا تھا کہ مجھ سے کچھ جلد بازی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی خوشیوں کو مکمل اور حتمی بنانے کے لیے شنکر سے جان چھڑانے کی کوشش کی تھی اور ناکام ہوا تھا۔

میں اس واقعے کو بھلانے کا پورا جتن کر رہا تھا مگر ابھی اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال مجھے یقین تھا کہ جوں جوں وقت گزرے گا میری اندرونی کیفیت کی شدت میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ زریں گل نے اس واقعے کا بہت اثر لیا تھا اور تقریباً "بیمار" ہی پڑ گیا تھا۔ میرے حوالے سے زریں کے جذبات ہمیشہ عجیب رخ پر رہے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے "مافوق الفطرت" درجے تک پہنچا دیتا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بڑی پختگی سے بیٹھا ہوا تھا کہ میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ لندن کے "اسٹار اسٹار کیسینو" میں ہفتے کی شب یقیناً اس کا یہ تصوراتی محل زمین بوس ہو گیا تھا۔

اور یہ صدمہ صرف زریں پر ہی نہیں گزرا تھا۔ مجھے تماشا گاہ میں بیٹھے ہوئے وہ سیکڑوں چہرے یاد تھے جن پر میں نے گہری مایوسی کا دھواں دیکھا تھا اور وہ بے شمار آوازیں بھی یاد تھیں جن میں چیخوں کا آہنگ تھا۔ بہرطور یہ سب کچھ PART OF THE GAME تھا۔ جب دو شخص مقابلے پر اترتے ہیں تو ان میں سے ایک کو ہارنا ہوتا ہے۔ غزالہ، زریں اور قریشی کی یہ بات میرے دل کو بھی لگتی تھی کہ اگر شنکر نے مجھے لندن کے کیسینو میں ہرایا ہے تو میں نے بھی روجھا پور کے مضافات میں اسے شکست فاش دی تھی۔

کیسینو میں مقابلے کے بعد یقیناً شنکر کے حوصلے بلند ہوئے تھے اور یہ اندیشہ ذہن میں آتا تھا کہ وہ پھر کوئی کارستانی دکھائے گا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دل کی بھڑاس نکلنے کے بعد وہ کچھ عرصے کے لیے بالکل خاموش ہو جائے۔ اب میرے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ میں شفتا اور راجم کو ان کی پناہ گاہ سے نکالوں یا نہیں۔ جب تک شنکر میرے اردگرد دندنا رہا تھا، میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے کسی بھی وقت شدید خطرہ بن سکتا تھا۔ دوسری طرف میری یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی کہ غزالہ کی رخصتی کی تقریب پاکستان میں ہو اور ہماری پرانی حویلی میں ہو۔ چچا کسی بھی صورت اس بات کے لیے آمادہ نہیں تھے بلکہ سوائے عالم قریشی کے کوئی بھی اس پر آمادہ نہیں تھا۔ چچا کا کہنا تھا کہ مجھے جذباتی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ اپنی ایک خوشی کے لیے سب کی سلامتی کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے۔ چچا کی بات میں وزن تھا۔ مجھے شنکر وغیرہ سے فوری خطرہ نہ بھی ہوتا تو پاکستان میں میرے اور کئی چھوٹے بڑے جانی دشمن موجود تھے۔ اس کے علاوہ ملکی قانون نے بھی ابھی مجھے پوری طرح کلیئر نہیں کیا تھا۔ دو تین ایسے مقدمات اب بھی مجھ پر تھے جن پر گرفتاری عمل میں آ سکتی تھی۔ ان ساری باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں چچا اور غزالہ وغیرہ کے کہنے پر عمل کروں۔ رخصتی کی تقریب لندن ہی کے کسی فلیٹ میں سادگی کے ساتھ منعقد کر لی جائے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس تقریب کے فوراً بعد مسز جی کلارک سے رابطہ کروں۔ ان کے ذریعے چچی کو لندن کے کسی اچھے اسپتال میں ایڈمٹ کرواؤں اور ان کا قرار واقعی علاج ہو۔

پچھلے پانچ چھ دنوں میں جہاں میں کچھ صدمات سے دوچار رہا تھا، وہاں ایک اہم کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ غزالہ نے مجھ پر ایک اور احسان کیا تھا۔ اس نے چچی فاخرہ کو راضی کر لیا تھا۔ اپنی ماں کے پاؤں پکڑ کر اس کے سامنے رو بلک کر آخر اس نے اپنا حق منوایا تھا۔ وہ حق جو خدا اور مذہب نے ہمیں دیا تھا اور جو اب تک چچی ہی کی وجہ سے سلب ہوتا رہا تھا۔ چچی کو رضامندی کی منزل تک لانے کے لیے غزالہ نے پچھلے چند ہفتوں میں کانٹوں بھرے راستے پر ننگے پاؤں جو سفر کیا تھا اس کی اذیت کچھ میں ہی جانتا تھا۔ کبھی ماں سے ناراض ہو کر، کبھی اس کی گود میں سر رکھ کر، کبھی اس کی خدمت کر کے، کبھی آنسوؤں سے اس کے پاؤں بھگو کر وہ بس سر جھکا کر اپنے کام میں لگی ہی رہی تھی۔ میں روز دیکھتا تھا کہ یہ کام اس کا خون نچوڑ رہا ہے، اسے اندر سے ریزہ ریزہ کر رہا ہے، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور آخر کامیاب ہو گئی تھی۔

دانا ٹھیک ہی کہتے ہیں، ہر تاریک رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے ہر بڑا غم درحقیقت ایک بڑی خوشی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ہفتے کی رات مجھے ایک زخم لگا تھا۔ یہ شنکر کا لگایا ہوا بھاری زخم تھا مگر اگلی صبح غزالہ ہی کی زبانی مجھے یہ بڑی خوش خبری بھی ملی تھی۔ جب میں اپنے ٹوٹے ہوئے بازو پر پلاستر چڑھوا کر اور زخموں پر پٹی کروا کر واپس آیا تھا تو غزالہ نے مجھے یہ خبر سنائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے امی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔

اس بات کو اب سات آٹھ روز گزر چکے تھے۔ آج غزالہ اور چچا مجھے چچی فاخرہ سے ملانا چاہتے تھے۔ میرے لیے یہ ایک سنسنی خیز موقع تھا۔ چچی کے ساتھ میری ملاقات کبھی بھی خوش کن ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ایسی ملاقاتوں کے نتائج میرے اور غزالہ کے لیے اکثر سنگین ہی نکلے تھے۔ شاید اس وجہ سے آج بھی دل دھڑک رہا تھا۔

یوم کلب کی ایک بالائی منزل پر چچی فاخرہ ایک کشادہ اور نہایت آرام دہ کمرے میں موجود تھیں۔ اس کمرے کو مکمل طور پر ساؤنڈ پروف بنایا گیا تھا اور اسپتال کے کمرے کی سی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک سینئر پاکستانی ڈاکٹر اور ایک نرس ہمہ وقت چچی

کے پاس موجود رہتے تھے۔ ہم کمرے تک پہنچے تو چچا باہر ہی رہے۔ میں اور غزالہ اندر داخل ہوئے۔ چچی کافی کمزور ہو چکی تھیں۔ چہرے پر غضب کی سرخی کی جگہ ایک عاجزی سی زردی تھی۔ آنکھوں میں چمک کی جگہ خفیف سی دھندلاہٹ تھی۔ ان کی شخصیت کی کرختگی اور مزاج کا کھردرا پن بیماری کے ریلے میں بھیگ کر ہلکا اور نرم پڑ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ برے سے برے حالات میں بھی انسان کے لیے بہتری کا کوئی پہلو موجود ہوتا ہے۔ شاید بیماری اور تکلیف بھی کبھی کبھی بندے کے میل کچیل کو دھونے کا کام کرتی ہے۔ چچی کو دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بدل گئی تھیں ہاں یہ لگ رہا تھا کہ اب ان میں وہ تواتائی نہیں رہی جو تند و تیز رویے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

میں سلام کر کے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میں نے اپنا سر ان کے کندھے سے لگا دیا۔ وہ کچھ دیر تک تو بے حرکت بیٹھی رہیں پھر انہوں نے آہستگی سے اپنا ایک ہاتھ میرے رخسار پر رکھ دیا "جیتے رہو" انہوں نے ہولے سے دعا دی۔

میری آنکھوں سے دو گرم آنسو نکلے اور چچی کے کندھے میں جذب ہو گئے۔

مجھے لگا کہ برسوں پہلے مجھے اور شفقتا کو گرم چمٹے سے داغنے کے بعد چچی نے آج میری اذیت محسوس کی ہے۔ میں نے اپنا سر چچی کے کندھے سے لگائے رکھا۔ چچی کا ہاتھ میرے رخسار پر ٹھہرا رہا۔ غزالہ نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ چچی نے اپنا دوسرا ہاتھ غزالہ کے سر کی طرف بڑھا دیا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ چچی کچھ کہیں لیکن وہ خاموش تھیں۔ شاید چچی کو بھی اندیشہ تھا کہ اگر وہ بولیں تو کوئی ایسی بات ان کی زبان سے نکل جائے گی جو اس خوشگوار ماحول کو نقصان پہنچا دے گی۔

"شگفتہ (شفقتا) کہاں ہے؟" کافی دیر بعد چچی نے پوچھا۔

"وہ بھی جلد آپ کے پاس ہو گی۔" میں نے کہا۔

"تم نے اس کا رشتہ کر دیا اور ہمیں معلوم تک نہ ہوا۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ میرا گناہ تو معمولی ہے۔ آپ نے تو رشتے کے نام پر میری "بچپن کی محبت" کو عیاش شیخ کے حوالے کر دیا تھا اور مجھے خبر تک نہ ہونے دی تھی لیکن میں یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں یہ کہتا تو یہ بیمار چچی کو تکلیف دینے والی بات ہوتی۔ میں نے بس اتنا کہا "میں اس بات کے لیے بھی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

کچھ دیر تک چچی کے پاس بیٹھنے کے بعد میں اور غزالہ باہر آ گئے۔ میں اپنی موجودگی سے چچی کو زیادہ دیر تک بے چین رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے چین ہیں۔

ہم چچا کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے کہا "کہاں جا رہے ہو تم ادھر آؤ۔"

میں اور غزالہ چچا کے کمرے میں داخل ہوئے۔ چچا نے غزالہ سے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نے تمہیں نہیں بلایا۔ میں اپنے داماد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جھینپ کر غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ "سوری ابو" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ میں چچا کے سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ چچا نے چچی سے ملاقات کا احوال پوچھا۔ کچھ دیر کی گفتگو ہوئی پھر اصل موضوع پر آ گئے "شاہ جہاں! میں نے دو چھوٹے چھوٹے بنگلوں کا انتظام کر لیا ہے۔ دونوں کے درمیان بمشکل ایک کلومیٹر فاصلہ ہو گا۔ بے حد محفوظ اور پرسکون جگہ ہے۔"

"دو بنگلے کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک میں ہم رہیں گے، دوسرے میں تم اور غزالہ۔ مطلب یہ کہ ایک رہائش گاہ غزالہ کے میکے کے طور پر استعمال ہو گی دوسری سسرال کے طور پر۔"

"آپ خوامخواہ خرچا کر رہے ہیں چچا۔"

"کوئی خرچا نہیں ہے شاہ جہاں۔ میرے بس میں ہوتا تو یہ تقریب اتنی دھوم دھام سے کرتا کہ اپنی پونجی کی آخری پائی تک لٹا دیتا لیکن تم جانتے ہو کہ بے شمار مجبوریاں ہمارے راستے کی رکاوٹ ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ چچا بھی خاموش رہے پھر انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں نے غزالہ سے پوچھا تھا، تمہارے بازو کا پلاستر اگلے ہفتے کے آخر تک اتر جائے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے اس سے اگلے ہفتے کی تاریخ رکھ لیں۔"

میں چچا کو مسلسل ٹال رہا تھا۔ اب ٹالنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی بھی بے شمار مجبوریاں تھیں۔ میرے ساتھ انہوں نے بھی بہت دکھ جھیلے تھے۔ اب اپنی بات پر اڑ کر میں انہیں مزید دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے۔ انسان کے سارے خواب تو پورے نہیں ہوتے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ "غزالہ کی رخصتی" کو اپنے سنہرے خوابوں کے مطابق ڈھالتے ڈھالتے غزالہ ہی مجھ سے دور ہو جاتی۔

میں نے اپنی ٹھنڈی سانس کو سینے میں ہی دبایا اور چچا سے کہا "چچا! آپ جو دن بھی مناسب سمجھیں رکھ لیں۔ میں تیار ہوں۔"

چچا کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے مجھے گلے سے لگا لیا۔

☆☆☆

دس بارہ روز بعد میں بنگلے میں تھا۔ یہ بنگلہ اکسیس ٹاؤن کے علاقے میں واقع تھا۔ واقعی بڑی پرسکون جگہ تھی۔ یہاں زیادہ تر ملازمت پیشہ افراد اور درمیانے سائز کے گھروں اور فلیٹس وغیرہ میں رہتے تھے۔ انڈین اور پاکستانی بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ چھوٹا سا بنگلہ صرف تین کمروں اور ایک کچن پر مشتمل تھا۔ تعمیر مکمل طور پر لکڑی کی تھی۔ میرے علاوہ زریں اور موٹل بھی یہیں مقیم تھے۔ زریں کی طبیعت ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی۔ وہ مسلسل سر درد کی شکایت کر رہا تھا۔ بلڈ پریشر بھی گاہے بگاہے بڑھ رہا تھا۔ وہ ہر چیز سے بیزار نظر آتا تھا۔ یہاں تک کہ کئی بار پاکستان سے کلثوم کا فون بھی اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ موٹل کی مخصوص شوخی اور مسکراہٹ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ابھی تک بوکارلو کی موت کے صدمے سے نہیں نکل سکا تھا۔ ٹرسٹ میں گنگ کے سیٹ اپ کو تباہ کرنے کے لیے بوکارلو نے اپنے کمزور جسم سے جس طرح زندگی کو نچوڑا تھا اور داؤ پر لگایا تھا وہ موٹل کے لیے ناقابلِ فراموش تھا اور صرف موٹل ہی کی بات نہیں تھی، ہم سب بھی اب تک اس واقعے کے اثر میں تھے۔

میرے بازو کا پلاستر اتر چکا تھا۔ اندر سے ایک کمزور سا تولا سا بازو برآمد ہوا تھا۔ زر کی ہڈی ہر جگہ سے ٹوٹی تھی۔ اب ہڈی جڑ چکی تھی لیکن بازو کی حرکات بحال نہیں ہوئی تھیں۔ شام ہوتے ہی ہلکا ہلکا درد بھی ہونے لگتا تھا۔

مجموعی طور پر یہ بے کیف سے دن تھے۔ موسم بھی اچھا نہیں تھا۔ دھند چھائی رہتی یا بارش ہوتی رہتی تھی۔ یہی لندن کا پرانا روگ جو لندن کے باسیوں کو بیزار کر رہا ہے۔ غزالہ اور چچا چچی دوسرے مکان میں شفٹ ہو چکے تھے۔ یہ بنگلہ نما گھر بھی تقریباً اتنا ہی بڑا تھا تاہم اس کے ساتھ چھوٹا سا لان بھی تھا۔ غزالہ کوشش کر رہی تھی کہ آفرین چند دن کے لیے انگلینڈ واپس آ جائے..... وہ چاہتی تھی کہ کوئی سہیلی تو ہو جو اس کی خوشی میں شرکت کرے۔ شادی کی تاریخ دس بارہ روز بعد کی تھی۔ توقع نہیں تھی کہ آفرین اس مختصر وقت میں لندن آ سکے گی۔

شام کو میں اور زریں کمرے میں بیٹھے تھے۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بندہ منصوبے تو بہت بناتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والے کو منظور ہوتا ہے۔"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا تو کوئی منصوبہ ادھورا نہیں رہا۔ تم نے گنگٹ میں کلثوم کو دیکھتے ہی اس کی گود میں ایک بچہ دینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اب تمہارا یہ منصوبہ کامیاب ہو چکا ہے اور تم نے اس منصوبے کا نام اسد رکھا ہوا ہے۔ تمہارا دوسرا منصوبہ لالے سدھیر اور بدر منیر کے ساتھ فلم بنانے کا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے تم اس دوسرے منصوبے کو بھی عملی جامہ پہنا سکتے ہو۔"

"خو آپ مذاق فرما رہا ہے لیکن ام مذاق کا بات نہیں کر رہا۔ ام آپ کی خانہ آبادی کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ آپ کی طرح امارا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ آپ کا شادی پاکستان میں ہو، بالکل پاکستانی اسٹائل میں..... ام آپ کی شادی پر ضرورت مندوں اور غیر مستحق لوگوں کے لیے اپنی تجوری کا دروازہ کھول دے۔"

"تمہارے فقرے میں دو غلطیاں ہیں۔" میں نے کہا "خیرات غیر مستحق لوگوں کو نہیں مستحق لوگوں کو دی جاتی ہے۔ دوسرے تم نے محاورہ بھی غلط بولا ہے۔ تجوری کا دروازہ نہیں کھولا جاتا..... تجوری کا منہ کھولا جاتا ہے۔ بلکہ اس فقرے میں ایک اور غلطی بھی ہے۔ تم نے صرف ایک تجوری کی بات کی ہے جبکہ تمہارے پاس تو کئی تجوریاں ہیں۔ تمہیں کہنا چاہیے تھا کہ تم تجوریوں کے منہ کھول دو گے.....!"

"ٹھیک ہے استاد صیب! تجوریاں ہی سہی..... امارا ارمان تھا کہ ام آپ کی شادی پر اتنا کھانا پکائے..... اتنا کھانا پکائے کہ.....!"

"عالم قریشی کے ہوتے ہوئے بھی بچ جائے۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔

"نہیں جناب..... ام چاہتا تھا کہ پورے شہر کے مسکین اور غریب لوگ آپ کی شادی پر کھانا کھائیں..... اور کئی دن تک کھاتے رہیں..... لیکن یہ ارمان کئی دوسرے ارمانوں کی طرح امارے دل میں ہی رہ گیا۔ خیر ام بھی پٹھان کا بچہ ہے، اپنی اس خواہش کو بھولے گا نہیں، کبھی نہ کبھی ضرور پورا کرے گا۔"

اسی دوران میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ زریں گل نے ہارن پہچانتے ہوئے کہا "امارا خیال ہے کہ آپ کا سسرالی رشتے دار آیا ہے۔"

زریں کا اندازہ درست تھا۔ یہ چچا ہی تھے۔ ہم جب سے اس گھر میں منتقل ہوئے تھے وہ یہاں نہیں آئے تھے۔ غالباً وہ دیکھنے آئے تھے کہ ہم یہاں کس طرح رہ رہے ہیں۔ غزالہ بھی ساتھ ہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک درمیانی عمر کی ملائشین خاتون بھی تھی۔ چچا نے خاتون کے بارے میں بتایا کہ یہ یہاں گھریلو ملازمہ کے فرائض انجام دے گی اور کھانا وغیرہ پکایا کرے گی۔ خادمہ کی ضرورت ہمیں واقعی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چچا کا شکریہ ادا کیا۔

چچا اور غزالہ گھر کا معائنہ کرنے لگے۔ چچا اسے بتانے لگے، یہ واش روم ہے، یہ ہال ہے، یہ کچن..... وہ دیکھ رہی تھی اور

کچھ شرمائی شرمائی بھی نظر آتی تھی۔

پھر غالباً اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہی اس نے ایک ڈاکٹر کا "لبادہ" اوڑھ لیا۔ اس نے پوچھا "آپ کا بازو کیسا ہے؟"

میں نے بازو اس کے آگے کر دیا۔ وہ معائنہ کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ ہدایات بھی دیتی رہی۔ اس دوران میں چچا نے ملازمہ سے چائے کی فرمائش کی تو غزالہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی "چائے میں خود بناتی ہوں۔" اس نے کہا اور تیزی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

میں اور چچا باتیں کرتے رہے۔ زرین بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا تھا۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے کچن بھی دکھائی دے رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے میں کن انکھیوں سے کچن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ اپنی اس رہائش گاہ میں غزالہ کو یوں کچن میں مصروف دیکھنا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ غزالہ اور چچا کے آنے سے ذہن پر کئی دنوں سے چھائی ہوئی پژمردگی ذرا کم ہوگئی تھی۔ اچانک میں چونکا۔ کچن میں غزالہ نے ملازمہ کی نظر بچا کر کوئی چیز اپنی اوڑھنی میں چھپائی تھی۔ میں اس شے کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شام کا اخبار تھا۔ اخبار ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا تھا اور زرین نے کچن کے کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ یہ سوال تیزی سے ذہن میں ابھرا کہ غزالہ نے اخبار کیوں چھپایا ہے؟

کیا اس میں کوئی ایسی خبر تھی جو غزالہ چھپانا چاہتی تھی؟ یہ خبر کیا ہوسکتی تھی؟ میرا ذہن تیزی سے گردش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر لے آئی۔ ہم چائے پینے لگے اور ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ میرا ذہن مسلسل اخبار والی بات میں الجھا ہوا تھا۔ چچا کی موجودگی میں غزالہ سے کچھ پوچھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب چچا اور غزالہ چلے گئے تو میں نے کچن میں جا کر دیکھا۔ شام کا تازہ اخبار واقعی موجود نہیں تھا۔ میں نے ملازمہ کے ذریعے اخبار منگوایا۔ اخبار کو بغور دیکھنے کے فوراً بعد مجھے پتا چل گیا کہ غزالہ کی حرکت کا سبب کیا تھا۔

اخبار کے اندرونی صفحوں پر ایک خبر موجود تھی۔ یہ خبر میرے اور شنکر کے اس مقابلے کے حوالے سے تھی جو چند ہفتے پہلے "اسٹار اسٹار" نامی جواخانے میں ہوا تھا۔ نیوز رپورٹر نے اس خبر کو ایک انکشاف کے طور پر رپورٹ کیا تھا اور سرخی یوں جمائی تھی......

"مکمل ثبوت مل گئے...... پچھلے ماہ دس تاریخ کو "اسٹار اسٹار" میں مارشل آرٹ کے جو مقابلے ہوئے ان میں استاد جہانی اور شنکر پر کروڑوں ڈالر کی شرطیں لگیں۔"

خبر کے متن میں کافی تفصیل موجود تھی، اس کے علاوہ دو تصویریں بھی تھیں۔ ایک تصویر میں مجھے لہولہان ہو کر زمین پر گرنے دکھایا گیا تھا۔ میری دونوں آنکھوں میں چوٹوں سے بہنے والا خون بھر گیا تھا اور ایک آنکھ سوج کر بالکل بند ہوچکی تھی۔ شنکر فاتحانہ انداز میں میرے سر پر کھڑا تھا اور ریفری نے اسے میری طرف بڑھنے سے روکا ہوا تھا۔ دوسری تصویر میں شنکر کو اس کے پرستاروں کے کندھوں پر دکھایا گیا تھا۔ سیکڑوں افراد شنکر کے اردگرد خوشی سے ناچ رہے تھے۔ خبر کے متن میں شنکر کی برتری کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ ایک ذیلی سرخی کچھ اس طرح تھی "شاہ جہاں نیم بے ہوش ہو کر گرا تو اس کے سیکڑوں پرجوش حامیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ انتظامیہ نے بپھرے ہوئے شنکر سے بمشکل جہانی کی جان بچائی۔"

اس خبر کے نیچے دو کالمی باکس میں ایک اور چھوٹی سی خبر موجود تھی۔ شنکر کے ایک قریبی دوست نے دعویٰ کیا تھا کہ شنکر نے متعلقہ لوگوں کے ذریعے جہانی کو "لور بریٹ" مقابلے کا چیلنج کیا ہے اور جہانی شنکر کے خوف سے کہیں چھپ بیٹھا ہے (لور بریٹ کے اصطلاح انڈر ورلڈ میں ایسے مقابلوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی جن میں ایک حریف کے مرنے یا ناک آؤٹ ہونے تک مقابلہ جاری رہتا ہے) خبر کے ایک حصے میں اس بدنظمی اور بلے گلے کا ذکر بھی تھا جو مقابلے سے پہلے دیکھنے میں آیا۔ اس کے علاوہ مقابلے کے بعد کے حالات بھی درج تھے۔ ان حالات کے مطابق دو گروہوں میں مسلح تصادم ہوا تھا اور کئی افراد کو سنگین چوٹیں آئی تھیں۔ رپورٹر نے لکھا تھا "ڈان نپولین نے چونکہ جہانی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ مقابلے کے بعد وہ اسے بحفاظت کلب سے نکالے گا اور رازداری سے محفوظ مقام تک پہنچائے گا...... لہٰذا مقابلے کے بعد جہانی اور اس کے ساتھی شنکر کی دستبرد سے محفوظ رہے۔"

زرین گل نے بھی اخبار میں میرے زخمی چہرے والی تصویر دیکھ لی تھی۔ ایک دم اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ پہلے تو اول فول بولتا رہا اور شنکر کو اردو اور پشتو میں بے نقط سناتا رہا پھر اس نے اخبار میرے ہاتھ سے لے کر اس کے ٹکڑے کر دیئے اور ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اگر اس وقت شنکر اس کے سامنے ہوتا تو وہ خود مر جاتا یا کسی طرح شنکر کو مار دیتا۔ اخبار پھینکنے کے بعد بھی وہ مسلسل بولتا رہا۔ میں نے اسے جھڑکا کہ وہ کیوں خوامخواہ اپنا اور دوسروں کا تماشا بناتا ہے۔ میری جھڑک سن کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کو وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ بارہ بجے کے قریب مجھے سول نے بتایا کہ زرین کے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں زرین کے کمرے میں پہنچا۔ وہ واقعی سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔

میں نے چچا کی طرف فون کیا۔ ان کے پاس گاڑی اور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ ڈاکٹر کا انتظام کر کے اسے یہاں لا سکتے تھے۔ سوئے قسمت فون پر چچا سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ ہم نے تھوڑی دیر مزید انتظار کیا۔ گھر میں موجود دواؤں سے کام چلانے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً باہر جانے کا رسک لینا پڑا۔ ہم اب اپنی اصل شکل و صورت میں تھے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کسی بھی وقت ہمیں پہچانا جا سکتا تھا۔ ہم ایک ٹیکسی کے ذریعے قریبی کلینک پہنچے۔ یہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا اور جدید سہولتوں سے آراستہ۔ زرین گل کو ضروری ٹریٹمنٹ دی گئی اور وہ بہتر نظر آنے لگا۔ زرین کو ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ ڈرپ نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ختم ہونا تھا۔ اس اثناء میں مجھے زرین کے پاس ہی بیٹھنا تھا۔ میں نے فون پر سول کو زرین کی خیریت کی اطلاع دے دی تھی۔

میں کلینک میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں چھت تک دیوار گیر شیشہ لگا تھا۔ شیشے کی دوسری جانب رواں دواں ٹریفک تھی۔ ٹریفک کی دوسری طرف ایک نائٹ کلب تھا۔ نائٹ کلب کے شیشوں میں سے نائو نوش اور رقص وغیرہ کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ آرکسٹرا کسی افریقی گیت کی دھن بجا رہا تھا۔ نجانے کیوں یہ دھن سن کر مجھے سوریطانیہ کے گھنے جنگل یاد آگئے اور اس کے ساتھ ہی صفدر اور دریا کا طوفانی عشق بھی یاد آ گیا۔ کیسے دن تھے وہ؟ اب تصور کرتا تھا تو حیرت ہوتی تھی...... اچانک ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ وہ لمبا تڑنگا مضبوط جسم کا شخص ہاتھ میں جام لیے ایک میز پر بیٹھ گیا اس کے سر پر ہیٹ تھا، پھر بھی میں اس کا چہرہ دیکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ پاشا تھا۔ ہارون پاشا...... اس نے پچھلے چند مہینوں میں میرے پسینے پر خون بہایا تھا اور دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ "دی ہوم" ٹرسٹ میں پاشا کہیں کھو گیا تھا۔ ہم سے جدا ہوگیا تھا۔ ہم نے اسے بہت ڈھونڈا تھا لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی ذہن میں یہ روح فرسا خیال بھی آتا تھا کہ شاید علی احمد کے ساتھ وہ بھی ٹرسٹ کے جبر کا شکار ہو چکا ہے۔

آج دو تین ماہ بعد اس کی صورت دیکھ کر دل شاد ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں زرین کے پاس سے اٹھتا اور سڑک پار کر کے پاشا تک پہنچتا، مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ نہایت مختصر لباس میں ایک لڑکی اپنے جسم کی چکاچوند سے نگاہوں کو خیرہ کرتی سازندوں کے عقب سے برآمد ہوئی اور پاشا کے پاس چلی آئی۔ لڑکی نے اپنے بالائی جسم کو اس قدر رنمایاں کر رکھا تھا کہ نگاہ اٹک کر رہ جاتی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر پاشا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ لڑکی نے بلا تکلف پاشا کو چوما اور پھر اسے دھکیلتی ہوئی دیوار تک لے گئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی اور وارفتگی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ پاشا لمبا تڑنگا تھا لیکن لڑکی بھی کچھ کم لمبی تڑنگی نہیں تھی۔

میں نے لڑکی کو پہچان لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس اطالین لڑکی کو کئی بار شنکر کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ایک طرح سے یہ شنکر کی رکھیل بھی تھی۔ یہ ایک بہت بڑے تاجر کی بیٹی تھی۔ ہیروں کا یہ تاجر اپنی بیٹی کے عشق کے ہاتھوں عاجز آ گیا تھا اور اس نے بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ لڑکی شنکر کی بے دام کنیز تھی۔ شنکر چند سال پہلے ہر جگہ اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اب وہ اس پر پہلے جیسی توجہ نہیں دیتا تھا اس کے باوجود وہ شنکر کی وفادار تھی۔ جینی نامی اس لڑکی کو پاشا کے ساتھ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ پاشا...... شنکر کی نگاہ میں ہے۔ اب اگر میں پاشا سے ملتا تو اس کا مطلب تھا کہ اپنے، غزالہ اور چچا وغیرہ کے لیے خطرہ پیدا کر لیتا۔ ہم سب ایک نازک وقت سے گزر رہے تھے۔ ایسے میں رسک لینا ٹھیک نہیں تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر میں نے اٹھنے اور پاشا تک پہنچنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں وہیں بیٹھا اپنے باہمت دوست کو پاشا کی داشتہ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا ایک لمبی کار نائٹ کلب کے دروازے پر رکی۔ اس میں باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ شعلہ بدن لڑکی نے اپنے نہایت مختصر لباس کو اوورکوٹ میں چھپایا اور پاشا کے ساتھ باہر نکل آئی۔ دو منٹ بعد ہی وہ دونوں کار میں بیٹھ کر ہوا ہوگئے۔ میں صرف گاڑی کا نمبر ہی نوٹ کر سکا تھا۔

پاشا میری آنکھوں کے عین سامنے آ کر پھر دور چلا گیا تھا۔ پاشا سے نہ ملنے کا افسوس تو ہوا لیکن اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ پاشا زندہ سلامت ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے پاشا کے متعلق ان گنت اندیشے ہمارے ذہنوں میں کلبلاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب کبھی اسے دیکھ نہیں سکیں گے...... اور پاشا (عرف چیتا) ہمارے ذہنوں میں فقط ایک یاد بن کر رہ جائے گا۔

زرین کی نحیف آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا "ہم کو بہت تیز پیشاب آ رہا ہے استاد صیب۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارا میزانیہ پھٹ جائے گا۔"

وہ مثانہ کو میزانیہ بول رہا تھا لیکن اس کی غلطی کو درست

کرنے کا وقت نہیں تھا، ورنہ بستر خراب ہونے پر ڈاکٹر ہمیں درست کر دیتا۔ میں نے گلوکوز کا بیگ اسٹینڈ سے اتار کر ہاتھ میں لیا اور زریں گل سہارا دے کر باتھ روم کی طرف لے گیا۔ جب ہم باتھ روم میں داخل ہو رہے تھے تو باتھ روم کے دروازے کے ساتھ صوفے پر پھر وہی اخبار پڑا نظر آیا جو میں نے آج شام گھر میں دیکھا تھا اور جسے غزالہ نے میری نظروں سے اوجھل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اخبار کے ایک گوشے میں میری لہولہان تصویر بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اخبار پر زریں کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ دوسری صورت میں زریں گل کا بلڈ پریشر اوپر کی طرف ایک اور بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔

یہ چوتھے پانچویں روز کی بات ہے۔ میں اور زریں گل گھر پر تھے۔ موٹل اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ لندن کے بے ڈھنگے موسم کی وہی چال تھی۔ فضا دھندآلود...... ہلکی ہلکی بارش جو زندگی کو بے رنگ کر کے رکھ دیتی ہے۔ کل شام ہی لاہور سے آفرین کا فون آیا تھا، وہ اس تقریب میں شرکت کے لیے لندن نہیں آ سکتی تھی۔ دور پار کے جن دو عزیزوں نے ہمارے نکاح کی تقریب میں شرکت کی تھی انہوں نے بھی آنے سے معذرت کر رکھی تھی، اس کا مطلب تھا کہ غزالہ کی رخصتی پر اتنی رونق بھی نہیں ہو سکے گی جتنی نکاح کے موقع پر تھی۔ یہ صورت حال میرے تصور کے مطابق ہرگز نہیں تھی، بہرحال یہ خوشی ہی بہت تھی کہ غزالہ مجھے مل رہی تھی۔ میں اس حقیقت کو نظر انداز کر کے ناشکرا بننا نہیں چاہتا تھا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد غزالہ کو میرے گھر آ جانا تھا۔ میں خود کو اس کے تصور میں گم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شفتا کا غم زدہ چہرہ بار بار میری نگاہوں میں آ جاتا تھا۔ وہ اداس لہجے میں پوچھتی تھی۔ بھیا...... آپ میرے ایک ہی تو بھائی ہیں۔ ساری زندگی آپ کی خوشی کے سپنے دیکھے تھے۔ آج خوشی کا وہ موقع آیا ہے لیکن میں آپ سے ہزاروں میل دور ہوں۔ نہ میں نے ہاتھوں پر مہندی رچائی ہے، نہ رنگ برنگ کپڑے پہنے ہیں، نہ سہیلیوں کے ساتھ مل کر آپ کو چھیڑا ہے۔ اس دن کے لیے کیا کیا سوچ رکھا تھا میں نے...... سب پھر دل میں ہی رہ گیا ہے چلو۔ یہ تو جو ہوا سو ہو گیا، لیکن بھیا...... کیا میں ہمیشہ اسی طرح کسی اندھیرے گوشے میں پڑی رہوں گی۔ اسی طرح ڈر ڈر کر جیتی رہوں گی۔ ہر آہٹ پر چونکتی رہوں گی...... کیا بے خوفی سے جینا اور کھل کر ہنسنا میری قسمت میں کبھی نہیں ہوگا بھیا؟

میں ٹاپ بلب کی روشنی میں خاموش پڑا رہا۔ کھڑکیوں سے باہر گارڈینیا اور اشوکا کے پودے دم سادھے بارش میں بھیگتے رہے۔ میرے بازو میں پھر ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ زریں گل میرے پاس آ بیٹھا۔ اس کو اب بھی چکر آتے تھے لیکن اپنی طبیعت سے زیادہ اسے میرے بازو کا درد پریشان رکھتا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ میرے عقب میں بیٹھ گیا اور ہولے ہولے میرا کندھا دبانے لگا۔ ''استاد صیب! اب آپ کو واقعی غزالہ بی بی کا بات ماننا ہوگا۔ اب آپ کو تھوڑا سا اپنے لیے بھی جینا چاہیے۔ آخر کب تک آپ اپنا جان ہتھیلی پر لیے اسی طرح خطروں کے آگے بھاگتے رہیں گے اور سوچنے کا بات یہ ہے استاد صیب، کہ اس ساری بھاگ دوڑ کے صلے میں ام کو ملا کیا؟ ام یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ ام کو پھولوں کا...... ہار ڈالا جائے، ام کو کندھوں پر اٹھایا جائے لیکن ام کو عزت اور آزادی سے جینے کا موقع تو دیا جاتا۔ آپ نے عیسیٰ جان، شیخ عاصم، ابن مبارک اور سنگ براؤن جیسے حرامی مجرموں سے ٹکر لیا اور ان کا بیڑا غرق فرمایا...... کسی اور ملک میں کسی اور نے ایسا کیا ہوتا تو اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ اس کی ساری بھول چوک معاف کر کے اسے کوئی بڑا عہدہ دے دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کا کوئی بڑا افسر بنا دیا جاتا لیکن...... لیکن آپ کا اور امارا اب بھی یہ حال ہے کہ ام مفرور مجرموں کی طرح اپنے ہی وطن سے دور رہنے پر مجبور ہے۔ اپنے پیاروں کی شکلیں نہیں دیکھ سکتا، سر چھپانے کے لیے جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ امارا سارا دولت جو ام نے اپنی محنت سے حاصل کیا تھا وہ بھی امارے لیے ایک دم بے کار بنا ہوا ہے۔ خدا کی قسم استاد صیب! ام تو چاہتا ہے کہ کوئی ام سے سب کچھ لے لے، بس ام کو وہ پہلے سا آزادی دے دے۔ ایک چھوٹا سا مکان...... ایک چھوٹا سا دکان...... اور ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ اچھے برے وقت کے لیے......''

میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ''لگتا ہے یہ تقریر تم نے کسی فلم کے اینڈ سے لی ہے اور مجھے سنانے کے لیے رٹی ہے۔''

''نہیں استاد صیب! امارا دل رو رہا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولتا چلا گیا ''ام کو شفتا اور انجم بی بی کا خیال آتا ہے۔ ساہی صاحب کی شہادت کا خیال آتا ہے۔ صدر بھائی کی اندھی آنکھوں کا خیال آتا ہے پھر ام آپ کے زخمی جسم کو دیکھتا ہے۔ کیا یہی اماری کوششوں کا صلہ ہے۔ کولمبو میں ام کو ایک اخبار کی خبر سے پتا چلا تھا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر امارے اوپر مقدمات ہیں، اگر ام عدالتوں میں پیش نہ ہوئے تو امارے سارے اساثہ جات (اثاثہ جات) ضبط ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے کر لو سب کچھ ضبط...... اگر اس طرح تم لوگوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو اس طرح کر لو۔'' زریں کے ہاتھ بدستور

میرے کندھے کو دبا رہے تھے۔

میں نے کش لیتے ہوئے کہا ''تمہارے مکالموں میں جان ہے زریں گل۔ لیکن وہ محمد علی والا اسٹائل تو تم نہیں لا سکتے ہو نہ۔''

وہ آبدیدہ انداز میں بولا ''آپ خود کو خوش ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ام اچھی طرح جانتا ہے کہ اندر سے آپ کتنا خوش ہے۔''

اچانک گھر کے دروازے پر ایک موٹر سائیکل کی آواز آئی۔ میں ٹھٹک گیا۔ یہ بھاری بھرکم موٹر سائیکل پولیس کی بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے زریں گل کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے پر پہنچا ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جس کے سونڈھے پر دھون ہے۔'' (جس کے کندھوں پر گردن ہے) جانی پہچانی آواز میں جواب ملا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ سائیں عالی کی آواز تھی۔ وہ حسب معمول اور حسب توقع، حیران کن طریقے سے ہی نازل ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے سوراخ میں سے جھانکنے کے بعد دروازہ کھولا، سائیں عالی موٹر سائیکل پر سوار تھا، عقب میں کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ سائیں موٹر سائیکل سمیت ہی اندر گھس آیا۔ سائیں نے ایک بڑا ''رین کوٹ'' پہن رکھا تھا۔ کوٹ کی ٹوپی نے اس کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ عقب میں جو براجمان تھا وہ بھی کیا عجب ہیئت کذائی میں تھا...... یہ سروج المعروف ہ الو کی بچی تھی۔ وہ بھی رین کوٹ میں تھی، اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا، صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔

اندر برآمدے میں پہنچتے ہی سائیں نے اوورکوٹ اتار پھینکا۔ نیچے اس کا مخصوص لباس یعنی سیاہ گودڑی تھی۔ پنڈلیاں حسب معمول ننگی تھیں۔ گلے میں گھنٹیاں اور مالائیں...... اور پتا نہیں کیا کیا کچھ۔

سائیں کی آمد نے ہم سب کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ جب کبھی بھی نمودار ہوا تھا اس کی آمد نے حالات میں ہلچل پیدا کی تھی اور نئی نئی باتیں سامنے آئی تھیں...... زریں نے بڑے احترام سے پوچھا ''سائیں جی...... آپ کہاں تھے۔ ام سب آپ کے لیے پریشان تھے۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا ''میں ذرا بمبئی تک گیا ہوا تھا۔ بنا کماری کی موت کے بعد سے دھرمیندر بہت پریشان تھا۔ بیبا کو دھرمیندر کی ضرورت ہے...... وہ سمجھتی ہے کہ دھرمیندر ہی اس کو مصیبتوں سے نکال سکتا ہے لیکن دھرمیندر کو تو اپنا ہوش ہی نہیں ہے۔ میں الو کے خون سے پیپل کے پتوں پر کچھ تعویز لکھ کر بہا کو دے آیا ہوں۔''

''سائیں جی! اپنا استاد صیب بہت پریشان ہے۔ آپ دوسروں کے لیے بہت کچھ کرتا ہے، امارے لیے بھی کچھ کریں۔'' زریں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تمہارے استاد صیب کو بھی تعویز لکھ دیتا ہوں۔ تمہارے ہوتے ہوئے...... خون کے لیے...... الو ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

زریں نے بتیسی نکال دی۔ سائیں آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ چکا تھا۔ سروج مؤدب انداز میں اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے سروج کو غور سے دیکھا۔ میں نے اسے سیکڑوں بار دیکھا تھا لیکن آج میں اسے مختلف نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ سروج اس عورت کی بیٹی ہے جس نے کبھی سائیں عالی سے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ سائیں اور سروج کا اصل رشتہ صرف گرو اور چیلی کا رشتہ نہیں تھا۔

سائیں کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ اپنی آتشیں آنکھوں سے مجھے بس گھورتا ہی چلا جا رہا تھا ''میں جانتا ہوں شفیع محمد...... تجھے پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ یہ پریشانیاں اور بڑھ رہی ہیں۔ میں تیرے چاروں طرف گھیرا دیکھ رہا ہوں۔''

''کیسا گھیرا؟'' میں نے پوچھا۔

''جنات کا گھیرا۔ ان میں سے زیادہ تر انگریز جن ہیں۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو جنات میں بھی، انگریز، حبشی اور چینی وغیرہ ہوتے ہیں۔''

سائیں کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ذہن میں وسوسہ اٹھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ''کینٹ'' والے واقعے کی طرح یہاں بھی پولیس نے مجھے گھیرنا شروع کر دیا ہو؟ سائیں اشارے کنایوں میں اکثر اہم باتیں کہہ جاتا تھا۔

سائیں کی بات سن کر زریں کا منہ بھی کھلا رہ گیا تھا۔ سائیں نے ہمارے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد زور سے قہقہہ لگایا اور بولا ''تم دونوں تو پریشان ہو گئے ہو، گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور بندے کو گھبرانا چاہیے بھی نہیں۔ اپنا دل مضبوط رکھنا چاہیے۔ دل مضبوط رکھنے کے لیے میرا نسخہ بڑا مفید ہے۔ کالی مکھی کا شہد...... اور بعد میں آدھا کلو مونگ پھلی چھلکوں سمیت اور اگر گرمی کا موسم ہو تو پھر گنڈیریاں گائے کے دودھ میں ابال کر چوسنی چاہئیں......''

سائیں نے دو لمحے توقف کیا اور بولا ''بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے ساتھ یہاں موجود ہوں۔ اب جنات کی پوری فوج بھی آ جائے تو میں نبٹ لوں گا۔''

سائیں نے آنکھیں بند کیں اور گہرے مراقبے میں

چلا گیا۔ اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ میں نے سرورج سے پوچھا "تم لوگوں کو یہاں کا پتا کیسے چلا؟" سرورج نے چپکے سے سائیں کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اس بارے میں سائیں ہی جانتے ہیں۔ میں نے سرورج سے پوچھا "یہاں آتے ہوئے اپنے تعاقب کا خیال تو رکھا ہے؟"

"سائیں جی نے اس بارے میں مجھے خاص ہدایت کر رکھی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے آئے ہیں۔" سرورج نے ہولے سے کہا۔

سائیں کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ وہ ہولے ہولے آگے پیچھے جھوم رہا تھا پھر اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھولیں اور حسب عادت زور سے نعرہ لگایا "دل دھڑکا شفیع محمد کا دل دھڑکا... ہا دل دھڑکا... ہا ہا دل دھڑکا۔"

اچانک مجھے یاد آیا، منوہرا ہوبی نے مجھے چند روز پہلے سائیں عالی کی جو کہانی سنائی تھی اس میں منوہرا نے بتایا تھا کہ سائیں عالی کا اصل نام شفیع تھا..... بعد میں وہ شفیع عالی اور پھر سائیں عالی کہلایا۔ سائیں مجھے ہمیشہ شفیع محمد کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اور صفدر نے کئی بار سائیں سے پوچھا بھی تھا مگر سائیں عالی ایسی باتوں کا جواب اگر سیدھے طریقے سے دے دے تو پھر اسے سائیں عالی کون کہے۔

سائیں عالی نے بڑے اطمینان کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائی اور اپنی گدڑی کے اندر سے پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا ڈبا نکال لیا۔ ایسے ڈبوں میں بچے اکثر اپنا لنچ لے کر اسکول جاتے ہیں۔

سائیں نے کہا "دراصل آج کل میں ناشتا رات کو کرتا ہوں۔ رات کا کھانا صبح کو کھالیتا ہوں۔ اس سے طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے۔"

اس نے لنچ باکس کھولا۔ اس میں کوئی براؤن سی چیز تھی۔ خوشبو بھی اچھی تھی۔ بولا "یہ کھجور کا حلوا ہے۔ اسے گنے کے رس میں پکایا گیا ہے اور ادرک بھی ڈالا گیا ہے۔ بڑی مزے دار چیز ہے....."

لنچ باکس کے اندر ہی چھوٹا سا چمچ بھی موجود تھا۔ سائیں نے ایک چمچ بھرا اور بڑی محبت سے بولا "لو تم بھی چکھو شفیع محمد۔"

"شکریہ۔ میں نے ابھی کھانا کھایا ہے۔"

وہ ایک دم خفا نظر آنے لگا "دیکھو، میں جب بھی تمہیں کھانے کو کچھ کہتا ہوں تم برے برے منہ بنانے لگتے ہو۔ پتا نہیں ایسا کیوں کرتے ہو تم؟ پچھلی دفعہ جب میں نے تمہیں ربڑی سوں کا ملک شیک پینے کو کہا تھا تو تب بھی تم نے ایسی ہی شکل بنائی تھی۔" سائیں نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"اچھا یار..... کیا ہے۔" میں نے سائیں کا دل رکھنے کے لیے چمچ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ غیر متوقع طور پر حلوا خوش ذائقہ تھا، بس ادرک کی ہلکی سی ترشی تھی۔ سائیں نے ایک اور چمچ مجھے کھلایا پھر خود کھانے لگا۔ کھاتے ہوئے وہ مسلسل باتیں بھی کر رہا تھا۔ وہی پرستان، جنات اور جنات کی سیاست کی اوٹ پٹانگ باتیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اب پرستان میں امن و امان ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں۔ پرستان سے اس کی مراد غالباً سیور ہیلانیہ کا وہ علاقہ تھا جہاں سائیں اور مسٹر کلارک کی کوششوں سے ایک نئی دنیا آباد ہوئی تھی۔ مفلس اور نادار قبائلیوں کو ایک خوش حال زندگی ملی تھی۔ اس کو کالونی کہا جاتا تھا۔

سرورج سائیں کی باتیں تو سن رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سائیں عالی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے حق ہو کا نعرہ بلند کیا۔ بچے کھچے حلوے میں اس نے پانی ڈالا۔ اسے انگلی سے گھولا اور دو بڑے گھونٹوں میں پی گیا۔ اس کے بعد وہ موٹر سائیکل پر جا بیٹھا

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے سائیں سے پوچھا۔

"تمہارے سسرال...... ان کو بھی ذرا حوصلہ تسلی دے لوں۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے رین کوٹ پہنا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی۔ وہ رکنے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا کہنا سننا بھی فضول تھا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

ذرا دیر کی سرورج میرے قریب چلی آئی۔ وہ ابھی تک لمبے رین کوٹ میں تھی۔ کوٹ کی ٹوپی اس نے پیچھے کی طرف پھینک رکھی تھی۔ وہ بولی "شاہ جہاں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ سائیں جی کیا کر رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، بھگوان خیر کرے۔"

"ڈر کیوں لگ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے سائیں جی کی باتوں سے شک ہو رہا ہے کہ مقامی پولیس کو تمہارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے۔ اور اگر پتا نہیں چلا تو کم از کم شبہ ضرور ہو گیا ہے۔ سائیں جی تمہیں اس نئی مصیبت سے چھٹکارا دینے کی باتیں کر رہے تھے۔ اب پتا نہیں وہ کس طرح چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں....." آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سرورج کے لہجے میں اندیشے بڑھ گئے۔

میں نے چونک کر پوچھا "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ کچھ دیر تک ہچکچاتی رہی پھر بولی "سائیں جی کے کپڑوں

میں ایک اور لنچ باکس بھی ہے۔ اس میں بھی ویسا ہی حلوا ہے جیسا تم نے کھایا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ سائیں جی وہ حلوا غزالہ کو کھلائیں گے....."

میری رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ میں نے کہا "کیا تم کہنا چاہتی ہو کہ حلوے میں کچھ ملایا گیا ہوگا۔"

"یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی بے ہوشی وغیرہ کی دوا ہو۔ سائیں تمہیں بے ہوشی کی حالت میں کہیں لے جانا چاہتے ہو..... یا پھر..... یا پھر۔"

وہ کہتے کہتے لرز کر خاموش ہوگئی۔

"شاید تم کہنا چاہتی ہو کہ اس حلوے میں ہماری موت کا سامان بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی بات مکمل کی۔

"نہیں..... نہیں، یہ بات نہیں۔ ایسا سوچنا بھی پاپ ہے۔ سائیں ایسے سخت دل نہیں ہو سکتے۔ تم..... میرا مطلب ہے..... کہ....." وہ ہکلا کر خاموش ہو گئی۔

صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کشمکش میں ہے۔ وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔

اسی دوران میں میرا حلق خشک ہونا شروع ہو گیا۔ سینے میں جلن ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے تاثرات سرورج پر ظاہر نہیں ہونے دیے اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ایک فون کرنے کا بہانا بنایا تھا۔ کمرے میں پہنچنے کے فوراً بعد ہی صورت حال ابتر ہو گئی۔ میرے حلق اور سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔ سائیں عالی ایک ایسا شخص تھا جس کے بارے میں کوئی بھی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا تھا۔

ایک دم میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے چاچا اور غزالہ وغیرہ کو مطلع کر دینا چاہیے کہ سائیں ان کی طرف آ رہا ہے۔ میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ چاچا کا فون تو خراب پڑا ہے۔ میرا سر چکرانا شروع ہو گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ اب مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں سرورج کے پاس پہنچا۔ وہاں زریں گل اور موتی بھی تھے۔ زریں گل اور سرورج کے درمیان حسب توقع جھڑپ شروع ہو چکی تھی۔ دونوں کے چہرے سرخ نظر آ رہے تھے لیکن پھر جب دونوں کی نگاہ میرے چہرے پر پڑی تو وہ اپنی لڑائی بھول گئے۔

"استاد صیب! کیا ہوا؟" زریں نے قریباً چیخ کر پوچھا۔

سرورج نے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کا چہرہ خوف سے تاریک پڑ گیا تھا۔ میں نے دروازے کا سہارا لینے کی کوشش کی پھر صوفے پر ڈھیر ہو گیا..... میں زریں کو مخاطب کر کے اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ غزالہ کے پاس پہنچے..... لیکن زریں کو یہ بات سمجھانا اب میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میری سانس سینے میں رک رہی تھی پھر ایک دم آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ چادر سی پھیلتی چلی گئی۔ دھندلاتے ہوئے ذہن میں ایک اندیشہ تیر کی طرح پیوست تھا۔ کہیں..... سائیں عالی نے مجھے..... اور غزالہ کو زندگی سے محروم کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟ اس نے ہمیں مصیبتوں سے نکالنے کی بات کی تھی۔ کہیں مصیبتوں سے نکالنے کا مطلب کچھ اور تو نہیں تھا؟

میری بے ہوشی کافی طویل تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ بے ہوشی کی اس حالت میں ہی میں نے کافی طویل سفر بھی کیا ہے۔ یہ غالباً ہوائی سفر تھا۔ ایک دو بار مجھے اپنا بازو دور سے اٹھائے جانے کا احساس بھی ہوا تھا۔ ایک بار مجھے یوں لگا تھا کہ میرے نتھنوں میں اسپرٹ کی بو گھس رہی ہے، پھر انجکشن کی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ کسی وقت دور دراز آوازیں میرے کانوں میں پڑتی تھیں..... میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں غزالہ کا خیال بھی تھا۔ سرخ لباس میں لپٹی ہوئی غزالہ..... وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی تھی۔ اس کی کلائیوں میں ہفت رنگ چوڑیاں تھیں۔ آنکھوں میں رنگین خواب لیے وہ میری طرف دیکھ رہی تھی "کب آئیں گے؟ آپ کب آئیں گے؟"

میں قریباً 72 گھنٹے بعد اپنے مکمل حواس میں واپس آیا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ چھت پر پڑی تھی۔ چھت پر رنگ دار نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ یہ چھت میری دیکھی بھالی سی تھی۔ کہاں دیکھی تھی میں نے یہ چھت؟ کب دیکھی تھی؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی جو دوسرا احساس مجھے ہوا وہ یہ تھا کہ میں بہت دیر بعد اپنے حواس میں آیا ہوں اور اس جگہ سے بہت فاصلے پر ہوں جہاں بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کے سارے حالات نے ایک دم دماغ پر یورش کر دی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ میں ایک کشادہ کمرے میں تھا۔ میرے سامنے پرانی طرز کے صوفے تھے اور میں خود ایک "نوازی" پلنگ پر تھا۔ یہ انگلینڈ تو ہرگز نہیں تھا۔ یہ پاکستان تھا..... اور پاکستان کا بھی کوئی دیہاتی علاقہ تھا شاید۔ مجھے اپنے اردگرد مانوس بو باس محسوس ہو رہی تھی..... میں نے دیکھا۔ آرام کرسی میں میرے عین سامنے سائیں عالی بیٹھا تھا۔ وہ حسب عادت فرش پر آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ روشن دان سے آنے والی دھوپ اس کے گلے کی گھنٹیوں پر منعکس ہو رہی تھی۔

"سائیں! میں کہاں ہوں..... ؟ اور باقی لوگ کہاں

ہیں؟" میں نے خشک گلے کے ساتھ بمشکل اپنا فقرہ مکمل کیا۔

"وہ سب بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اور کچھ پہنچ بھی چکے ہیں۔۔۔۔ باقی رہا یہ سوال کہ تم کہاں ہو؟ تو اس بارے میں خود غور کرو۔"

میں نے ایک بار پھر چونک کر در و دیوار کو دیکھا۔ میرے ذہن میں جھلملاتی بجلیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔۔۔ کچھ یاد آ رہا تھا۔۔۔۔ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ یہ تو میری دیکھی بھالی جگہ تھی۔ یہاں تو میں نے آنکھ کھولی تھی، یہاں تو میرا بچپن گزرا تھا، یہاں غزالہ ملی تھی۔ یہاں باغوں میں جھولے پڑے تھے، یہاں برساتوں میں دھومیں مچائی تھیں، یہاں جاڑوں کی سنہری دھوپ میں آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ یہ تو میرا جبل کوٹ تھا۔۔۔۔ یہ تو میرا گھر تھا۔۔۔۔ میری حویلی۔۔۔۔ میرے در و دیوار۔۔۔۔ میں اٹھ کھڑا ہوا، میں نے بے قراری سے چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔ ہاں یہی وہ رنگین شیشوں والی کھڑکی تھی جس کے سامنے بید کی کرسی پر بیٹھ کر میں ہوم ورک کیا کرتا تھا۔۔۔۔ اور یہاں وہ قالین تھا جس پر ننھی شفقا اوندھی سیدھی لیٹ کر پرندوں اور پھولوں کی تصویریں دیکھا کرتی تھی۔۔۔۔ اور پھر ایک دم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے لگا کہ ابھی کمرے کا کہنہ سال دروازہ کھلے گا اور امی۔۔۔۔ ہاتھ میں دودھ کے دو گلاس لیے نمودار ہوں گی "اٹھو بچو۔۔۔۔ پہلے دودھ پی لو۔۔۔۔ اٹھو شاباش۔"

"نہیں امی۔۔۔۔ میں نے نہیں پینا۔" ننھی شفقا کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

بیس برسوں کا فاصلہ طے کر کے امی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "نہیں بیٹا ضد نہیں کرتے۔۔۔۔ اس سے ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں، دماغ روشن ہوتا ہے۔۔۔ دیکھو جہانی دودھ پیتا ہے ناں۔۔۔۔ یہ شیر بن جائے گا۔۔۔ میری بیٹی کمزور سی بلی رہ جائے گی۔"

"لیکن امی۔۔۔۔" شفقا ٹھنکی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ابو کو آواز دیتی ہوں۔" امی نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دینے والا انداز بنایا۔ شفقا نے جھپٹ کر گلاس پکڑ لیا۔

یہ پورا منظر دو تین سیکنڈ کے مختصر وقفے میں ذہن میں گھوم گیا اور یہ کوئی ایک منظر نہیں تھا، ایسے سیکڑوں منظر تھے جو قطار اندر قطار میرے ذہن کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ مختلف آوازیں تھیں، مختلف واقعات تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کوئی انہونا سپنا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے گھوم کر سائیں عالی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح اطمینان سے بیٹھا تھا۔

"میں یہاں کیسے آیا ہوں سائیں۔۔۔۔ باقی سب لوگ کہاں ہیں اور غزالہ کہاں ہے۔۔۔؟" میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ سائیں عالی کے میلے کچیلے چہرے پر ایک شریری مسکان تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی زبردست "سرپرائز" کی زد میں ہوں۔

یہی وقت تھا جب کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور لڑکیوں کا ایک جتھا بلہ بول کر اندر گھس آیا۔ رنگ برنگ لباسوں والی یہ لڑکیاں۔۔۔ چہکارتی چڑیوں کی طرح شور مچاتی میری طرف بڑھیں۔۔۔ ان لڑکیوں میں سب سے آگے ایک ایسی لڑکی تھی جسے دیکھ کر میرے جسم و جاں کی ساری توانائی میری آنکھوں میں سمٹ آئی۔ کچھ دیر کے لیے تو میں جیسے سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ میری نظریں میری پیاری بہن شفقا پر تھیں۔ وہ زرد لباس میں تھی۔ چمکیلی زرد اوڑھنی پر ستارے تھے اور ان ستاروں نے شفقا کے چاند چہرے کو گھیر رکھا تھا۔ وہ ایک خوش رنگ پرندے کی طرح اڑتی ہوئی میری طرف آئی اور لپٹ گئی۔ میں اس کے سر پر بوسے دیتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں ساون کی بارش کی طرح برس رہی تھیں، بدن خوشی اور جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا "بھیا۔۔۔۔ میرے بھیا۔۔۔ آپ کہاں چلے گئے تھے۔" وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

شفقا کو میں نے آخری بار لاہور ایئرپورٹ پر دیکھا تھا۔ وہ نقاب میں تھی، اپنے ساس صاحب کے ساتھ مجھے "ویلکم" کرنے کے لیے آئی تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اس کے ہاتھوں میں ہی سوکھ گئے تھے۔ مجھے اور زرد ریگل کو پکڑ لیا گیا تھا۔ بعد ازاں ہم پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی اپنوں سے بہت دور چلے گئے تھے۔

"اب میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی بھیا۔" وہ مجھے بانہوں میں جکڑتے ہوئے بولی۔

ایک دم ہمارے سروں پر بجلی کے پنکھے نے گردش کی اور گلاب کی ڈھیروں پتیاں ہمارے سروں پر نچھاور ہونے لگیں۔ لڑکیوں کے شور و غل میں شفقا کی جذباتی سرگوشیاں دب کر رہ گئیں۔ لڑکیوں نے مجھے کھینچ کر ایک مسند پر بٹھا دیا اور وہ سارا ہنگامہ شروع ہو گیا، جو مہندی اور ابٹن وغیرہ کی رسموں پر ہوتا ہے۔ نقرے بازی، کھینچا تانی۔۔۔۔ مہندی کی لیپا پوتی۔ شریر لڑکیوں کا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا۔ اس ہنگامے سے جان چھڑا کر میں کمرے سے باہر نکلا تو اپنی آبائی حویلی اپنی پوری آن بان کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ ہمارا حویلی نما مکان قمقموں سے روشن تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ رنگینی تھی۔ پکوانوں کی خوشبو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ کہیں پاس کے کمرے سے ڈھولک بجنے کی آواز

آ رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہے سائیں عالی! تم کہاں لے آئے ہو مجھے، میں کیسے آیا ہوں یہاں؟''

''جنات کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا شفیع محمد... جنات کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے، اور اگر جنات اپنے طیارے میں سفر کریں تو پھر اس کی رفتار کتنی تیز ہوگی، اس کا اندازہ تم خود ہی لگاؤ۔ تم بس پلک جھپکتے میں یہاں پہنچ گئے ہو۔ وہاں لندن میں کچھ برے جنات نے شیطانوں کے ساتھ مل کر تمہیں زنجیریں ڈالنے کا ارادہ کیا تھا، میرے ایک جاسوس جن نے مجھے وقت سے پہلے ہی بتا دیا۔ بس میں نے تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا انتظام کر لیا۔ تمہیں اور غزالہ کو وہاں سے پہلے نکالا گیا بعد میں دوسروں کو بھی نکال لیا گیا۔''

اچانک کوئی تیزی سے آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ صفدر تھا۔ میرا پیارا یار... میرا راز دار... میرا جان جگر...... ہم دیر تک بغل گیر رہے۔ صفدر میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ وہ لرزتی انگلیوں سے میرے خدو خال ٹٹول رہا تھا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اور منہ سے خوشی و شادمانی کے پھول جھڑ رہے تھے۔

''صفدر... یہ کیا ہنگامہ ہے یار؟'' میں نے کہا۔ میرا اشارہ حویلی کی صورت حال سے تھا۔

''یہ آپ کی شادی کا ہنگامہ ہے جناب۔ ٹھیک دس دن بعد غزالہ دلہن بن کر آپ کے گھر میں آ رہی ہے۔''

''کہاں ہے غزالہ...؟ اور چچا...... اور زرینہ وغیرہ...؟''

''غزالہ... چچا اور چچی اپنے گھر میں ہیں۔ ان کے ہاں بھی مہمانوں کی بھرمار ہے۔ زرینہ آپ کے لاری سائیں سوال کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی ہے...... آپ جناب قریباً چوبیس گھنٹے پہلے یہاں پہنچے ہیں اور شاید یہ بات آپ کے لیے حیرت کا باعث ہو کہ لندن سے استنبول تک کا سفر آپ نے ایک چارٹرڈ طیارے میں کیا ہے۔ وہاں سے ایک دوسرے چارٹرڈ طیارے کے ذریعے آپ پاکستان پہنچے ہیں اور شاید آپ کے لیے یہ بات بھی حیرت کا سبب بنے کہ آپ کی شادی مبارک کے انتظامات آپ کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔''

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ کس نے کیا؟''

اس سے پہلے کہ صفدر جواب میں کچھ کہتا سائیں نے نعرہ لگایا۔ ''اوپر والا'' ہم دونوں نے کیا اور کس نے کیا۔ بس اوپر والے نے مدد کی اور ہم نے کر دیا۔ میرے ساتھی کو تم بھی اچھی

طرح جانتے ہو وہ امریکن ''جن'' ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ بدمعاش ہے۔ بڑا بھلا مانس ہے اور کوئی عام جن بھی نہیں ہے۔ ایک دم ادب پتی ہے۔ امیر ہونے کے باوجود بڑی انسانیت ہے اس جن میں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔''

صفدر نے ہولے سے سرگوشی کی'' سائیں! مسٹر جی کلارک کی بات کر رہا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ شفقتا تیزی سے میرے پاس آئی ''بھائی جان! آپ کا فون ہے۔''

میں شفقتا کے ہمراہ ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ ریسیور میز پر پڑا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی محبوب آواز کانوں میں پڑی ''ہیلو شاہ جہاں... کیسے ہو؟'' یہ مسٹر جی کلارک کی آواز تھی۔

میں نے کہا ''میں بالکل ٹھیک ہوں جناب... آپ کی آواز سننے کے لیے بہت دن سے بے چین تھا۔ آپ تو پتا نہیں کہاں گم ہو گئے تھے۔''

''میں دور ہوتے ہوئے بھی تمہارے پاس تھا شاہ جہاں! تمہارے پل پل کی خبر تھی مجھے۔ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے گنگ کا نیٹ ورک توڑنے کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کی دھوم ہر جگہ مچی ہوئی ہے۔ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب تمہاری خدمات کو ACKNOWLEDGE کیا جا رہا ہے۔ لوگ سمجھنا شروع ہو گئے ہیں کہ یہ کتنا بڑا کام ہوا ہے اور اس کے لیے کچھ لوگوں نے جانوں کو کس طرح ہتھیلی پر رکھا ہے۔ شاید تمہارے علم میں نہ ہو گک براؤن... مادر ٹرسٹ...... اور دی ہوم کے حوالے سے برطانیہ کے تھنک ٹینک میں بھی زبردست حرکت پائی جاتی ہے۔ یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر بردہ فروشی کے کاروبار پر کاری ضرب لگائی ہے ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے۔ اس کاروائی کے تانے سے اگر ان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں! قانون پر زد پڑی ہے تو ان معاملے پر ہمدردی سے غور کیا جائے۔ تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پاکستان میں کچھ ذمے دار لوگ بھی اسی ڈگر پر سوچ رہے ہیں۔''

''آپ کیسے جانتے ہیں جناب!''

''تمہاری غیر موجودگی میں میں نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ہے۔ اب یہاں تمہارے لیے اور تمہارے ساتھیوں کے لیے حالات پہلے کی نسبت بہت بہتر ہیں۔ اس کا اندازہ تمہیں مقامی ڈپٹی کمشنر اور پولیس کے رویے سے بھی ہو جائے گا جو کیس اور مقدمات تم پر ہیں ان سے جان چھڑانے کے سلسلے میں بھی موثر انتظام کرا دیا گیا ہے۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے جناب...! آپ کے احسانوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ میں سوچتا ہوں تو دبا سا جاتا ہوں۔''

''اپنوں پر کوئی احسان نہیں ہوتا۔ تم میرے لیے جو کچھ کرتے رہے ہو وہ احسان نہیں تھا تو یہ بھی نہیں ہے۔ دفینے کے نوادرات تک پہنچنا اور انہیں اپنے ہاتھوں سے چھونا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ تمہاری وجہ سے یہ خواہش پوری ہوئی اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا......'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور بولے'' اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے شاہ جہاں تمہاری انگلینڈ میں موجودگی کے دوران میں میں نے جو کچھ کیا ہے یہ اکیلے میں نے نہیں کیا۔ سائیں عالی بھی ان کوششوں میں برابر کا شریک ہے۔ سائیں کی دلی خواہش تھی کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پاکستان میں ایک محفوظ مستقبل ملے اور اس راہ میں جو بھی قانونی دشواریاں ہیں وہ جلد از جلد دور ہوں۔ سائیں عالی تم سے بہت محبت کرتا ہے شاہ جہاں! تمہیں اور غزالہ کو جیون ساتھی کے روپ میں دیکھنا اس کی زندگی کی ایک خواہش ہے۔ شاید تمہیں...... اور شاید غزالہ کو بھی معلوم نہیں کہ سائیں کے اندر تم دونوں کے لیے کتنی چاہت اور تڑپ ہے۔ وہ عجیب انسان ہے شاہ جہاں! مجھے مردم شناسی کا دعویٰ ہے میں نے بڑے بڑے پیچیدہ لوگوں کو سمجھا ہے لیکن سائیں کے اندر جھانکنا ناممکن ہے۔''

''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں جناب!'' میں نے کہا۔

''میری خواہش ہے شاہ جہاں کہ آئندہ زندگی میں تم سائیں کا خیال اسی طرح رکھو جس طرح تمہارے معاشرے میں بچے اپنے بوڑھے والدین کا رکھتے ہیں۔ بے شک وہ اول جلول ہے کسی وقت ناقابل برداشت بھی ہو جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم جیسے میاں بیوی کے لیے یہ ایڈجسٹمنٹ زیادہ مشکل نہیں ہوگی میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں جناب! لیکن ہو سکتا ہے سائیں صاحب ہماری رائے سے اتفاق نہ کریں۔ سائیں تو ایک سیلانی روح ہے جو انہیں اڑائے پھرتی ہے۔ ہاں اگر وہ خود چاہیں گے تو یہ میرے لیے اور ہم سب کے لیے بڑی سعادت کی بات ہوگی۔''

ہمارے درمیان اس حوالے سے تھوڑی سی گفتگو ہوئی پھر میں نے پوچھا ''آپ شادی پر تشریف لا رہے ہیں نا؟''

''میں پوری کوشش کروں گا شاہ جہاں لیکن وعدہ نہیں کرتا۔ یہاں ایک دو ایسے مسئلے ہیں جن سے نمٹنا کسی اور کے بس کا کام نہیں ہے۔ میرے خیال میں مجھے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میں تمہاری شادی میں شرکت کی کتنی شدید خواہش رکھتا تھا اور رکھتا ہوں۔''

اچانک میرے ذہن میں اس نوعمر لڑکی کرسٹی کا خیال آیا جو کچھ عرصہ پہلے مسٹر جی کلارک کے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ وہ ان سے قریباً چالیس برس چھوٹی تھی لیکن ان سے شادی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میرے دل میں آیا کہ میں کلارک صاحب کے کرسٹی کی موجودہ صورت حال کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر جھجک سی آڑے آ گئی۔ میں نے یہ تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ (اس بات کا پتا مجھے اگلے روز صفدر کی زبانی چلا کہ اس لڑکی نے مسٹر کلارک کو زیر کر کے چھوڑا ہے۔ اس فتنہ ساماں کی مسلسل دھمکیوں اور خودکشی کی کوششوں کے بعد مسٹر کلارک نے اس سے شادی کر لی ہے۔ صفدر نے بتایا کہ حیرت انگیز طور پر وہ شادی کے بعد بالکل سدھر گئی ہے اور اب ایک بچے کی ماں بھی بننے والی ہے کلارک صاحب اسی کی وجہ سے آج کل اپنی نہایت اہم مصروفیات ترک کرنے پر مجبور ہیں)

مسٹر جی کلارک سے گفتگو ختم کرنے کے بعد میں نے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دل میں یادوں کے کئی شگوفے کھل گئے۔ یہی کھڑکی تھی جسے میں کھولتا تھا تو کچھ فاصلے پر غزالہ کا گھر دکھائی دیتا تھا۔ ان کا گھر قدرے بلندی پر تھا۔ اس گھر کی روشن کھڑکیاں مجھے بہت بھاتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کھڑکیوں میں مجھے غزالہ حرکت کرتی نظر آتی تھی۔ چھم سے ڈوبتی چھم سے ابھرتی۔ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی۔ میں پہروں اس کھڑکی میں بیٹھا دیکھتا رہتا تھا جیسے چاند چکور کو دیکھتا رہتا ہے۔ آج پھر دل چاہا کہ کھڑکی کھولوں۔

میں نے ہاتھ بڑھائے اور کھڑکی کھول دی وہاں آج بھی غزالہ کا گھر نظر آ رہا تھا۔ آج یہ گھر بھی ہمارے گھر کی طرح بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بے شمار رنگدار روشنیاں تھیں جو جل بجھ رہی تھیں۔ تمام در و دیوار سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ ایک دم سائیں عالی میرے اور میرے نظارے کے درمیان آ گیا۔ وہ مجھ سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور ناچ رہا تھا۔ یہ مسرت کا رقص تھا۔ قصبے کے کچھ اور لڑکے بالے بھی سائیں کے گرد ناچنے لگے تھے۔ پھر مجھے ان میں زرین گل بھی نظر آیا۔ اس کی کلائیوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔ سر پر گول ٹوپی تھی آنکھوں میں سرمہ تھا۔ گھیردار شلوار کے نیچے چمکتی پشاوری چپل اور ہاتھوں میں سرخ رومال۔ زرین کا رقص والہانہ تھا۔ پھر میری نگاہ عالم قریشی پر پڑی زرین اسے بھی کھینچ کر رقص کرنے والوں کے درمیان لے

آیا۔ پکار کر بولا ''اپنے استاد صیب کا شادی ہے۔ ام اب بھی نہ ناچے گا تو کب ناچے گا۔''

عالم قریشی نے بھی اپنے کیم شیم جسم کو حرکت دی اور زریں کا ساتھ دینے لگا۔ ڈھول کی آواز دھما کا خیز ہو گئی۔ ناچنے والے ہوش و خرد سے بیگانہ ہونے لگے اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کچھ کمی ہے۔ کوئی خلا سا ہے ہاں صفدر، صفدر کہاں ہے؟ وہ شخص کہاں تھا جسے اس رونق کو چار چاند لگا دینے تھے۔ جسے ان خوشیوں کو دوبالا کرنا تھا۔ ہاں کہاں تھا وہ.... میرا یار جانی؟

میں دائیں بائیں اسے تلاش کرنے لگا۔ شفقا نے مسکراتے ہوئے اپنی پہلی شرارت کی ''وہ آج آپ کو کہیں نظر نہیں آئیں گی بلکہ اگلے آٹھ دس دن بھی نظر نہیں آئیں گی۔'' (وہ غزالہ کی بات کر رہی تھی)

''نہیں میں صفدر کو ڈھونڈ رہا ہوں'' میں نے کہا۔

''صفدر بھائی تو شاید اوپر تھے'' شفقا نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی' میں اپنی جانی پہچانی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنی جانی پہچانی چھت پر پہنچ گیا۔ صفدر ایک کونے میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ سامنے میز پر ٹرانزسٹر ریڈیو پڑا تھا۔ وہ کرکٹ میچ کی رننگ کمنٹری سن رہا تھا۔ میں دس پندرہ قدم کے فاصلے پر کھڑا خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی دو لٹیں اس کی فراخ پیشانی پر جھول رہی تھیں۔

جب سے ''ویرا'' نے اس سے بے وفائی کی تھی وہ خاموش سا ہو گیا تھا۔ ویرا طوفان کی طرح اس کی زندگی میں آئی تھی اور آندھی کی طرح نکل گئی تھی۔ موریطانیہ میں جھیل زار کے کناروں پر صفدر کو چند ناقابل فراموش راتوں کا ساتھ دے کر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ مجھے موریطانیہ کے وہ شب و روز آج بھی بھلائے نہیں بھولتے تھے جب صفدر ویرا کی جدائی میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا تھا۔ وہ نیم پاگل ہو گیا تھا۔ قیامت کے ان دنوں میں کئی بار تو مجھے ایسے محسوس ہوا تھا کہ میں صفدر کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا لیکن پھر صفدر کی بے پناہ اندرونی توانائی اس کے کام آئی تھی اور وہ بتدریج سنبھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اب ان واقعات کو ایک عرصہ گزر چکا تھا پھر بھی صفدر پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا۔ کسی وقت ہم سب کی گفتگو میں موریطانیہ' سگ براؤن اور ریز ٹرسٹ کا ذکر آتا تھا تو صفدر کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ مجھے صاف محسوس ہوتا تھا کہ کرب کی ایک بلند و بالا لہر نے اسے جھنجوڑ دیا ہے۔

میں نے صفدر کے پاس جا کر دوسری کرسی سنبھال لی ''کیا بات ہے صفدر! تم یہاں بیٹھے ہو؟''

''بس یونہی تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔ انڈیا اور آسٹریلیا کے درمیان بڑا زبردست ون ڈے ہو رہا ہے'' اس نے خوش نظر آنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ریڈیو بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ''صفدر' تمہیں پتا ہے کہ ہم نے آج تک ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا۔ ہمیں اب بھی نہیں چھپانا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں...... شاہ جہاں صاحب!''

میں نے چند لمحے توقف کر کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تمہیں یاد ہے ناں کہ ہم نے اکٹھے مل کر کچھ خواب دیکھے تھے ان میں سے ایک خواب یہ بھی تھا کہ ہم زندگی کی اہم خوشیاں ایک ساتھ دیکھیں گے؟''

''شاید آپ کی مراد شادی کی خوشی سے ہے؟''

''ہاں ہم نے سوچا تھا کہ غزالہ اور انجم ایک ساتھ دلہنیں بنیں گی۔''

وہ ہولے سے مسکرایا ''شاید آپ کو معلوم نہیں' وہ دونوں ساتھ ہی تو دلہن بن رہی ہیں۔ آج غزالہ کی طرح انجم نے بھی زرد جوڑا پہن رکھا ہوگا۔ وہ چچا جلیس کے گھر میں ہی ہے۔''

یہ میرے لیے واقعی ایک خوش کن انکشاف تھا۔ شاید صفدر کے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے کہا ''تم غلط تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''سو فیصد درست کہہ رہا ہوں جناب!'' اس نے شوخ لہجے میں کہا ''فرق بس صرف اتنا ہے کہ انجم کا دولہا میں نہیں ہوں۔''

میں صفدر کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر غم و دکھ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کتنی ہی دیر تک ہم دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی۔ اس خاموشی میں بس ڈھولک کی آواز اور لڑکیوں کے دور افتادہ قہقہے تھے۔ یہ قہقہے گھر کی نچلی منزل پر بلند ہو رہے تھے۔ شوخ دیہاتوں کی کوئی ٹولی مل کر گا رہی تھی۔ ''تیرے باجرے دی راکھی...... اڑیا میں نہ بیندی آں وے۔''

میں نے غمناک لہجے میں کہا ''صفدر یہ تم نے کیا کیا؟''

''وہی جو کرنا چاہیے تھا'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''انجم میرے بچپن کی محبت تھی لیکن پتا نہیں' کب' کیسے یہ محبت...... ویرا کی محبت میں ڈھل گئی۔ میں نے انجم سے بے وفائی کی اور ویرا کا ہو گیا میرا سب کچھ ویرا کا ہو گیا۔ اور ویرا سب کچھ مجھے سونپ دی۔ جھیل زار کے کنارے بے وفا

محبت کی وہ کہانی آپ بھی تو بھولے نہیں ہوں گے نا؟''

''وہ ایک اچانک واقعہ تھا صفدر..... سمجھ لو ایک طوفانی جذبہ تھا۔ وہ انجم سے بے وفائی نہیں تھی۔''

''وہ بے وفائی ہی تھی جناب!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا ''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے جناب کہ ویرا کو کھو کر اب میں ایک بار پھر انجم سے محبت کا ڈھونگ رچاؤں۔ ہاں شاہ جہاں صاحب! اب یہ ڈھونگ ہی ہوگا۔ ساری زندگی انجم ایک جھوٹ کے سائے میں جیے گی اور میں بھی۔ پچھلے چند مہینوں میں میں نے اس بارے میں بہت سوچا جناب! اور آخر اس فیصلے پر پہنچا کہ انجم کی خواہش کے باوجود میں انجم کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکتا اور نہ داخل ہونے کے قابل ہوں۔ اس کے بعد میں نے انجم کو سمجھانا بجھانا شروع کیا۔ یہ ایک بہت طویل عمل ثابت ہوا۔ لیکن خوشی یہی ہے کہ مجھے اس میں ناکامی نہیں ہوئی اور آج صورت حال یہ ہے کہ انجم اپنے بچپن کے ساتھی' اپنے چچا زاد محسن کی شریک حیات بننے جا رہی ہے۔''

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''یہ تم نے کیا کیا میرے یار!''

''بس جناب! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اس کے بارے میں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں..... اور جو کچھ ہوا ہے یہ اچھا ہی ہوا ہے جناب! محسن کی صورت میں انجم کو ایک محبت کرنے والا شوہر مل رہا ہے اور مجھے یہ ''خوشگوار احساس'' مل رہا ہے کہ میں نے زندگی کی ''پہلی'' سب سے بڑی غلطی کرنے کے بعد ''دوسری'' سب سے بڑی غلطی نہیں کی۔''

میں صفدر کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ تاریک شیشوں والی عینک کے پیچھے اس کی بے نور آنکھوں میں نہ جانے کون سا جذبہ تھا۔ نیچے لڑکیوں کی ایک ٹولی کورس کی شکل میں گا رہی تھی ''زندگی کا سفر ہے سہانا..... یہاں کل کیا ہو کس نے جانا۔''

☆☆☆

اگلے روز میں انجم سے بھی ملا۔ اس نے بھی جیسے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ شفقا اسے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مصروف تھی۔ وہ کبھی مسکرا دیتی تھی' کبھی جواباً کوئی بات کہہ دیتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں کے اندر گہرائی میں کہیں غم کی جھلک بھی دکھائی دیتی تھی۔ میری ملاقات شفقا کے ہونے والے شوہر ڈاکٹر سے بھی ہوئی۔ وہ خوش باش تھا۔ اس کی ٹانگ جو ایک موقع پر بیکار ہو گئی تھی' اب بالکل ٹھیک تھی۔ وہ روزمرہ کے کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے والد کے کلینک میں بھی بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آرہی کر رہا تھا۔ دوپہر کو میں' حمزہ' صفدر اور زریں گل وغیرہ کے ساتھ قبرستان پہنچا۔

ابا جان اور امی کی قبروں کے سامنے دیر تک بیٹھا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔ نگاہوں کے سامنے یادوں کے دفتر کھلتے رہے۔

اسی روز شام کو میری ملاقات اپنے پرانے ساتھی پروفیسر اللہ دتا اور ان کی بیٹی شائستہ سے بھی ہوئی۔ موریطانیہ کے سفر میں ان کے ساتھ ہمارا طویل ساتھ رہا تھا۔ اب کافی عرصے بعد باپ بیٹی سے ملاقات ہوئی تھی۔ پروفیسر کا چہرہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ پیشانی ایک طرف سے پچکی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک آنکھ بھی کچھ چھوٹی لگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چہرے اور ہاتھوں پر کئی چھوٹے بڑے زخموں کے نشان تھے۔ شائستہ کی ٹھوڑی پر بھی گہری چوٹ کا نشان تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پتا چلا کہ ان کے دونوں بازوؤں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں میں سرجری کے ذریعے پلیٹیں لگائی گئی تھیں۔ باپ بیٹی کی یہ ساری درد ناک ٹوٹ پھوٹ شنکر اور اس کے حواریوں کے غیظ و غضب ہی کا نتیجہ تھی۔ موریطانیہ سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد باپ بیٹی شنکر کے زبردست تشدد کا شکار ہوئے تھے اور مرتے مرتے بچے تھے۔ آج اس بہیمانہ تشدد کے نشانات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

میرا دل ایک دھیمی دھیمی آنچ دینے لگا تھا۔ اس آنچ کو مزید بڑھاوا حمزہ کی باتوں سے ملا۔ صفدر اور زریں وغیرہ نے تو مجھ سے چھپا لیا تھا لیکن حمزہ کے منہ سے روانی میں کچھ باتیں نکل گئیں۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ میری یہاں غیر موجودگی میں شنکر نے پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈا۔ میں لندن میں تھا' اس نے صفدر پر باقاعدہ حملہ کیا تھا۔ اس حملے میں صفدر کو کچھ چوٹیں بھی آئی تھیں اور سر کے زخم میں ٹانکے لگانے پڑے تھے۔ خوش قسمتی سے جب یہ واقعہ ہوا' زریں گل اپنے گارڈز کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ دو طرفہ فائرنگ ہوئی جس میں زریں کے دو گارڈز شدید زخمی ہوئے' اسی دوران میں پولیس کی گاڑیاں بھی موقع پر پہنچ گئیں اور شنکر نے راہ فرار اختیار کی۔

اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے بعد میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب ہو گئی تھی۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ رونق تھی ہلا گلا تھا لیکن میرا دل و دماغ مسلسل شنکر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ میں شنکر کے خطرے کو ایک ایسی تلوار کے مانند محسوس کر رہا تھا جو عین میرے سر پر لٹک رہی تھی اور کسی بھی وقت ہم سب کی خوشیوں کا خون کر سکتی تھی۔ شفقا' انجم' غزالہ' صفدر اور میں..... ہم سب اس تلوار کی زد میں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے یہ ساری خوشیاں گہنائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ میں خود کو سمجھانے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر دل سے یہی آواز آتی تھی

کہ اگر میں نے شنکر کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی خوشیوں کی طرف رخ پھیرا تو وہ آئے گا اور عقب سے میری پشت میں خنجر پیوست کر دے گا۔ تو کیا میں اس کا انتظار کرتا رہوں؟ اس کے انتظار میں اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اندیشوں کی دیمک لگاتا رہوں؟ روز مرتا اور جیتا رہوں، پھر اس موذی کا انتظار کرنے کے بجائے خود اس کو ڈھونڈ لوں اور اس سے حساب کتاب کروں لیکن ایسا کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شاید چچا، غزالہ، عالم قریشی، زریں گل اور سائیں عالی وغیرہ کو بھی اس بات کا اندازہ تھا۔ ان کے دلوں میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ میں شنکر سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ خاص طور سے چچا جلیس اور عالم قریشی تو سائے کی طرح میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ وہ شادی سے پہلے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے نگاہوں سے اوجھل کرنے کو تیار نہیں تھے۔

عجب صورت حال تھی۔ میرے دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ ایک طرف یہ سوچ تھی کہ خوشی کے اس موقعے کو یونہی گزر جانے دوں۔ اس کے بعد جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا لیکن دوسری طرف ایک اور سوچ تھی۔ یہ سوچ مجھ سے کہتی تھی کہ میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند مت کروں۔ خوشی اسی وقت خوشی ہوگی جب میرا دل مطمئن ہوگا اور میرا دل اس وقت مطمئن ہوگا جب شنکر سے حساب بے باق ہو جائے گا۔ میں اور میرے پیارے شنکر کے غیظ و غضب سے محفوظ ہو جائیں گے۔ میں جانتا تھا کہ شنکر کا غیظ و غضب اب انتہا پر پہنچ چکا ہے۔ اسے اب مجھ پر ختم ہو جانا ہے یا اپنی زد میں آنے والوں کو جلا کر راکھ کر دینا ہے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شنکر کا تصور میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس رات ایک انکشاف نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ انکشاف زریں اور موہل نے کیا۔

زریں مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے موہل کو لاہور کے اہم مقامات دکھانے کے لیے لے گیا تھا۔ رات کو انہوں نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ڈنر کیا۔ یہیں پر زریں کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جسے وہ چند روز پہلے لندن میں دیکھ چکا تھا۔ لندن کے اسٹار کلب میں میرے اور شنکر کے درمیان ہونے والے مقابلے میں یہ شخص کئی بار رنگ میں نظر آیا تھا۔ اس کا شمار مقابلے کے منتظمین میں ہوتا تھا۔ اس کی ناک کی ہڈی کسی زوردار چوٹ کی وجہ سے پچکی ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کے چہرے اکثر یاد رہ جاتے ہیں۔ زریں اور موہل نے بھی اسے فوراً پہچان لیا۔ اس سیاہ فام شخص کا نام پیٹر تھا۔ پیٹر نشے میں تھا۔ جلد ہی وہ موہل اور زریں سے گھل مل گیا۔ خاص طور سے موہل کے ساتھ اس کی بے تکلفی ہو گئی کیونکہ موہل بھی افریقی تھا۔ وہ زریں اور موہل کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہیں پر پیٹر نے ان دونوں کو ایک ایسی بات بتائی جو ششدر کرنے والی تھی۔ اس نے بتایا کہ "اسٹار اسٹار" میں مقابلے کے روز چند تماشائیوں کی طرف سے مجھ پر کیا جانے والا حملہ "طے شدہ" تھا۔ یہ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا۔ پہلے رنگ کے باہر بدنظمی پیدا کی گئی۔ اس کے بعد مجھ پر حملہ کیا گیا۔ ایک شخص نے آہنی راڈ سے میرے بازو پر شدید چوٹ لگائی اور مقابلے سے پہلے ہی مجھے زخمی کر دیا۔ پیٹر کے مطابق وہ شخص شنکر کے ایک قریبی ساتھی کرشن کمار کا ملازم تھا لیکن بعد میں لین دین کے معاملے میں کرشن سے اس کی سخت ناچاقی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آج کی اتفاقیہ ملاقات میں اندر کی بات موہل اور زریں کو بتائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ اس کی اطلاعات کے مطابق شنکر لندن سے واپس آ چکا ہے اور انڈیا میں کہیں موجود ہے یا پھر سری لنکا میں ہے۔

اس اطلاع کے بعد زریں اور موہل بہت پرجوش نظر آنے لگے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ شنکر سے اپنی "شکست" کا داغ دھونے کے لیے میں شنکر سے ایک اور مقابلہ کروں۔ اس مقابلے سے پہلے اس سازش کو بھی بے نقاب کیا جائے جو شنکر نے کی تھی لیکن وہ چاہتے تھے کہ یہ سب کچھ تھوڑے عرصے کے بعد ہو۔ فی الوقت تو ان کی توجہ صرف اور صرف شادی کی تقریب پر تھی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ موجودہ حالات میں شنکر سے میرا سامنا ہو۔ اس اطلاع کے بعد کہ شنکر انڈیا میں موجود ہے، میرے سلسلے میں اور بھی چوکس نظر آنے لگے تھے۔

صبح تک عالم قریشی اور چچا کو بھی ساری حقیقت معلوم ہو گئی۔ چچا نے پہلی فرصت میں مجھے ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا اور سمجھایا کہ میں اپنے دل و دماغ کو جذبات کے ریلے میں نہ بہنے دوں اور شنکر کے ناتے سے کوئی ایسا کام نہ کروں جس سے برسوں بعد آنے والا خوشی کا یہ موقع اندیشوں کے حوالے ہو جائے۔

میں سب کی باتیں سن رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔ ان باتوں میں وزن بھی تھا لیکن میرا دل کسی طور ماننے کو تیار نہیں تھا۔ خبر نہیں کیا ہو گیا تھا میرے اندر کے موسم کو۔ میرا دل خوشی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس خوشی سے پہلے وہ ایک نہایت کٹھن مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ایک عجیب سی نفسیاتی کیفیت تھی۔ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں شنیتا کو اسی وقت بھری بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہوں اور غزالہ کو اسی وقت اپنی بانہوں میں سمیٹ سکتا ہوں جب شنکر کا سایہ اپنے اوپر سے ہٹا دوں۔

کر دوں۔ اس کی برتری کا بت چکنا چور کرنے تک میں مکمل خوشی حاصل کر ہی نہیں سکتا تھا شاید۔

چچا کی دور اندیش نظروں نے شاید میرے اندر کی الجھن کو دوسروں سے زیادہ بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر چند گارڈز کا انتظام کیا جو ہماری حویلی کے دروازے پر پہرا دینے لگے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی حویلی پر بھی گارڈز کا انتظام کر دیا۔ دوسرا کام چچا نے یہ کیا کہ عالم قریشی اور موہل کو مستقل طور پر میرے ساتھ چپکا دیا۔ صورت حال یہ ہو گئی کہ میں باتھ روم میں ہوتا تھا تو بھی قریشی دروازے سے باہر کھنگورے مار رہا ہوتا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ میں کسی روشندان میں سے نکل جاؤں گا اور شنکر کو ڈھونڈ کر اس سے معرکہ شروع کر دوں گا۔

اگلی رات چاندنی میں حویلی کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے اور کھیتوں کھلیانوں کو دیکھتے دیکھتے اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دل میں یہ امید پیدا ہو گئی کہ شنکر میرے روبرو آ سکتا ہے۔ زیادہ نہیں تو پچاس، ساٹھ فیصد امید اس بات کی ضرور تھی کہ میری تدبیر کامیاب رہے گی۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں، میں نے اپنی سوچ کو عملی شکل دے دی۔ عالم قریشی بھی ہوا خوری کے بہانے چھت پر چلا آیا تھا اور میرے قریب ہی چارپائی پر بیٹھا چمچ سے حلیم کھا رہا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "قریشی! شادی میں ایک شخص کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو گی؟"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" قریشی نے پوچھا۔

"پاشا کی" میں نے جواب دیا۔

"ہاں، کمی تو ہمیں بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے بلکہ اس کا خیال آتا ہے تو دل میں ٹیس سی اٹھ جاتی ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہے۔ پاکستان آ چکا ہے یا ابھی لندن میں ہی کہیں ہے یا پھر... ؟"

درحقیقت میں نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں تھا کہ لندن میں ایک پرائیویٹ کلینک کے اندر بیٹھے بیٹھے میں نے ایک نائٹ کلب کے ویڈیو گیم شیشے کی دوسری جانب کیا دیکھا تھا؟ میں نے پاشا کو دیکھا تھا، زندہ سلامت اور صحت مند۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" قریشی نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ پاشا کا پتا کیا جائے..... وہ شادی میں شریک نہ ہو سکا تو مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔"

"لیکن پتا کیسے کیا جائے۔ اگر تمہارے ذہن میں یہ خیال ہے کہ میں تمہیں یہاں سے کہیں جانے دوں گا تو یہ بھول جاؤ بلکہ یہ سوچ ہی چھوڑ دو۔ ہاں اگر تمہارے پاس کوئی پتا ٹھکانا ہے تو بتاؤ، وہاں سے اس کا پتا کروا لیتے ہیں۔"

میں نے لاہور میں پاشا کے دو تین ٹھکانے قریشی کو بتا دیے اور یہ بھی سمجھا دیا کہ ان ٹھکانوں سے پاشا عرف چیتا کا پتا کس طور کیا جا سکتا ہے۔ قریشی نے مجھے یقین دلایا کہ میری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرے گا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر پاشا یہاں جل کوٹ تک پہنچ گیا تو پھر شیطان ابن شیطان شنکر بھی ضرور پہنچ جائے گا۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ پاشا، شنکر کی نگرانی میں ہے۔ نائٹ کلب میں پاشا کے ساتھ جو لڑکی میں نے دیکھی تھی، وہ شنکر کی دست راست تھی۔ یہ بات سو فیصد یقینی تھی کہ اسے میری تلاش کے لیے شنکر نے ہی پاشا کے پیچھے لگا رکھا ہے۔

وہ بڑے خواب ناک دن تھے۔ میں جیسے جاگتی آنکھوں سے ایک رنگین و سنگین خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف شادی کی تیاریاں تھیں، شور و غل تھا، مہمانوں کی آمد تھی، دوسری طرف مجھے کسی کا انتظار تھا۔ میری آنکھیں اپنے ازلی دشمن کی راہیں تک رہی تھیں۔ میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ چچا میرے پل پل کی نگرانی کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے انہوں نے مجھ پر کڑی پابندیاں لگائی تھیں اور میں یہ پابندیاں توڑ کر ان کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مدتوں بعد مجھے لگا تھا کہ میرے سر پر کسی بڑے کا مہربان سایہ ہے۔ اس سائے کی قیمت مجھے اپنی جان دے کر چکانا پڑتی تو بھی چکا دیتا۔ پابندیوں کا لحاظ کرنا تو ایک معمولی سی قربانی تھی۔ اس کے علاوہ اس حوالے سے غزالہ نے بھی مجھے نصیحتیں کی تھیں اور ہر طرح میرے پاؤں کو زنجیر کرنے کی کوشش کی تھی۔

اگلے دو تین روز میں نے صفدر اور زریں کے ساتھ قصبے کی گلیوں میں گھومتے ہوئے گزارے۔ یہ میرا قصبہ تھا، یہ میرے گلی کوچے تھے۔ یہاں ہر ہر قدم پر میرے بچپن کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں بے شمار دوستوں سے ملا، بے شمار باتیں کیں، ڈھیروں ڈھیر پیار پایا۔ بڑی بوڑھیوں نے میرا سر چوما۔ بزرگوں نے گلے سے لگایا اور دعائیں دیں۔ ہر طرف ایک ہی فقرے کی گونج تھی "بابو وقار کا بیٹا آیا ہے۔"

میں دنیا کے بے شمار ملکوں میں گیا تھا، حسین ترین جگہوں سے گزرا تھا اور خوبصورت ترین لوگوں سے ملا تھا لیکن کچی پکی دیواروں والے اس قصبے کے سادہ مزاج لوگوں سے مل کر جو خوشی ہوئی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ محبت اور چاہت کا ایک دریا تھا جس میں میں بہا چلا جا رہا تھا۔ میرے تذکرے ہر زبان پر تھے۔ ان تذکروں میں ایک طرح کی حیرت بھی موجود تھی۔ قصبے کے قریباً تمام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ان گلیوں میں کھیلنے والا جانی ایک

بہت بڑا آدمی بن چکا ہے۔ اخباروں اور ٹی وی پر اس کی خبریں آتی ہیں۔ وہ بہت امیر کبیر ہو چکا ہے۔ وہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ جہانگی اور اس کا چچا پھر اس قصبے میں آئیں گے۔ اپنی ویران حویلیوں کو آباد کریں گے اور ان حویلیوں پر شادی کی روشنیاں جگمگائیں گی۔ اب ہم ان کے درمیان آتے تھے تو انہوں نے ہم پر چاہتوں کی بارش کر دی تھی۔

میں اپنے اسکول کے بوڑھے ماسٹر تاج دین صاحب کے گھر کے سامنے رک گیا۔ تاج دین حیات تھے لیکن بہت کمزور اور منحنی ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں پہچان پایا۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور میرے جسم پر بے شمار بوسے دیے۔ شفقت نے بتایا تھا کہ ماسٹر تاج دین اتنے نرم خو ہو چکے ہیں کہ ذرا سی بات پر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ میرے گلے سے لگ کر بھی انہوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ پرانی باتیں یاد کرنے لگے۔ بھولے بسرے لوگوں کی یادیں، میلوں ٹھیلوں کا ذکر، ساون کی بارشوں کا ذکر اور سرما کی دھوپ کا ذکر۔ وہ بولتے چلے گئے۔ میں سنتا چلا گیا۔ سیکڑوں لوگ ہمارے ارد گرد کھڑے رہے اور ایک گزرا ہوا دور اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ ہوتے دیکھتے رہے۔ ماسٹر صاحب کی بیوی جنہیں ہم بے وجہ استانی جی کہا کرتے تھے مسلسل میری بلائیں لیتی چلی جا رہی تھیں۔ بھوکتی سی گرم روٹی، شلجم کا سالن اور بہت سی لسی لے آئیں۔ میں ناشتا کر کے آیا تھا لیکن یہ دونوں بزرگ مجھے اتنی محبت سے کھلا رہے تھے کہ زہر بھی دیتے تو مجھے کھانا پڑتا۔ میں نے ہردم نبار دکامران' کھا بہ گیر عالم قریشی کو اپنے ساتھ ملایا اور کھانے سے انصاف کیا۔

یہاں بھی چوکس گارڈز ہمارے ارد گرد موجود تھے۔ بظاہر تو یہ گارڈز ہماری حفاظت کے لیے تھے لیکن چچا جان ان گارڈز سے دہرا کام لے رہے تھے۔ یہ گارڈز ہر دم مجھ پر نگاہ بھی رکھے ہوئے تھے۔ غزال کی طرف سے بھی دو تین بار یہ تاکیدی پیغام آ چکا تھا کہ میں رخنہ ڈالنے کی کوشش نہ کروں اور اچھے بچوں کی طرح چچا جان کی ہدایت پر عمل کروں۔

کھانے کے دوران میں ہی ایک شخص آیا اور اس نے عالم قریشی کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ عالم قریشی کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ کوئی اہم خبر ہے۔ میرا یہ اندازہ درست تھا۔ عالم قریشی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "لو بھئی! تمہاری ایک اور خواہش پوری ہو گئی۔ پاشا کا کھوج لگ گیا ہے۔"

ٹھیک تین گھنٹے بعد پاشا ہمارے پاس جل کوٹ میں موجود تھا۔ پاشا سے ہماری ملاقات طویل اور جذباتی رہی۔ پاشا نے وہ واقعات سنائے جو اسے ڈی ہوم نرسٹ میں پیش آتے تھے۔ علی احمد کی موت کا واقعہ پاشا کے سامنے ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اس واقعے کے دکھ کو محسوس کر رہا تھا۔ "بی ہوم" میں کتوں کی خونخوار یلغار کے دوران میں ہی پاشا کو چند دوسرے افراد کے ساتھ غالوں سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ لندن میں تھا اور صرف ایک ہفتہ پہلے پاکستان لوٹا تھا۔ کل شام قریشی کے ایک کارندے نے پاشا سے رابطہ کیا اور پاشا کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہوا۔ پاشا کی روداد سننے کے بعد ہم نے بھی پاشا کو وہ حالات تفصیل سے بتائے جن سے اب تک ہم گزرتے رہے تھے۔

جل کوٹ میں پاشا کی آمد کے ساتھ ہی میری چھٹی حس دہائی دینے لگی تھی کہ جل کوٹ کی فضاؤں میں شنکر شکرا کی نحوست شکل نظر آنے والی ہے۔ اس مصیبت کو میں نے خود دعوت دی تھی۔ اس کا مقابلہ بھی مجھے ہی کرنا تھا۔ تن تنہا اور قطعی طور پر کسی کی شراکت کے بغیر۔ پاشا کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ وقت کی بساط پر کون سی چال کا حصہ بنا ہے۔ میں اسے فی الحال بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

پاشا کے جل کوٹ پہنچتے ہی میں نے ضروری حفاظتی [illegible]

Scanned by Waqar Azeem Uploaded By Nadeem

اور چچا لی تھی۔ میں نے وہاں موجود گارڈز کو ضروری ہدایات دے دیا اور موقل اور پاشا کو ضروری مشورے دے کر ایک ایسے مکان میں ٹھہرا دیا جو چچا کی حویلی کے عقب میں واقع تھا۔ اپنی حویلی کے پچھواڑے بھی میں نے حفاظتی انتظامات کر دیے۔ چچا اور عالم قریشی میرے اس اضطراب پر قدرے حیران تھے۔ یہ اندیشہ تو انہیں بھی رہا ہو گا کہ شنکر یا میرا کوئی اور دشمن میری ٹوہ پا کر یہاں پہنچ سکتا ہے لیکن ان کے نزدیک یہ ایک موہوم سا اندیشہ ہی تھا۔

عالم قریشی نے جل کوٹ پہنچتے ہی مجھے ایک "اے کے 56" رائفل مہیا کر دی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایک پسٹل اور ایک رائفل گھر میں موجود تھی۔ میں نے اس اسلحے کو چیک کر کے تیار حالت میں کر لیا۔ اگلے تین روز تک میں نے بے حد شدت سے شنکر کا انتظار کیا لیکن اس کا دور دور پتا نہیں تھا۔ میں رات آخری پہر تک اپنے حویلی نما مکان کی چھت پر موجود رہتا تھا۔ چاندنی راتیں تھیں۔ میری نگاہیں دور دور تک کھیتوں کھلیانوں میں بھٹکتی تھیں اور کوئی ایسا اشارہ ڈھونڈتی تھیں جو شنکر کی آمد کا پتہ دے۔ تیسرے روز میری امید دم توڑنے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا میری کوشش شاید ناکام رہی ہے۔ اگر پاشا واقعی شنکر کی نگرانی میں تھا تو پھر اب تک شنکر کو اپنی رونمائی کرا دینا چاہیے تھی۔

بہرحال کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ "جینز"

سائیں وہ لڑکی لندن میں ہی پاشا کا پیچھا چھوڑ چکی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ویسے ہی افغانیہ پاشا سے نگرانی ہو اور اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑی گئی ہو۔ کئی اور امکان بھی تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سب کچھ جان جانے کے باوجود شنکر ابھی میرے مقابل آنا ہی نہ چاہتا ہو۔ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ الجھتا رہا اور سوچتا رہا۔

میرے دوست خاص طور سے قریشی اور زریں گل کی خواہش تھی کہ شادی کی ہر خوشی بھرپور طریقے سے منائی جائے۔ وہ رسوم وغیرہ کے چکر میں تھے لیکن میں نے اور صفدر نے اس کی مخالفت کی۔ ہماری تجویز تھی کہ اگر خوشی منانا ہی ہے تو اس طریقے سے منائی جائے کہ قصبے کے عام لوگ بھی اس میں شریک ہو سکیں۔ آخر یہ تجویز ہی سب کے لیے قابل قبول ٹھہری۔

شادی سے تین روز پہلے عالم قریشی نے اپنے دیرینہ پروگرام کے مطابق دل کھول کر کھانا پکوایا۔ میں نے حویلی کی چھت سے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ گورنمنٹ اسکول کے وسیع و عریض میدان میں جہاں ہم کبڈی اور والی بال کھیلا کرتے تھے اور جہاں ماسٹر تاج دین ہمیں ڈرل کروایا کرتے تھے۔ حد نگاہ تک دیگیں نظر آ رہی تھیں۔ لگ بھگ سو دیگیں تو ہوں گی۔ درجنوں [illegible]

پکی دیگوں کی مہک کام کرنے والوں کی بھاگ دوڑ سب کچھ جشن سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک طرف ڈھائی تین درجن بکرے ذبح کیے جا رہے تھے۔ ایک طرف چارپائیوں پر بھیگے ہوئے چاول پڑے تھے۔ تین چار ہزار افراد کے کھانے کا انتظام تھا۔ ان کے لیے شامیانے لگانا اور کرسیاں وغیرہ رکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ قریباً ایک ایکڑ رقبے میں قناتیں لگا دی گئی تھیں اور دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ امیر غریب کا کوئی فرق نہیں رکھا گیا تھا۔ سب کو زمین پر بیٹھ کر کھانا تھا۔ بے تکلفی کا ماحول تھا۔ بہت سے فنکار ڈھولچی نمودار ہو گئے تھے اور دو دن سے مسلسل ڈھول بج رہے تھے۔ قریبی گاؤں سے چند ویلے گاچے والوں نے بھی اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر رکھی تھیں۔ چوہدری شرافت کی ہدایت پر قصبے کے لڑکے بالوں نے ہمارے گھر کی قریبی گلیاں جھنڈیوں اور سنہری پنیوں سے سجا دیا تھا۔ یہ بڑی سادہ سجاوٹیں تھیں لیکن ان میں اپنی مٹی کی مہک اور رنگ تھے۔ ہم اپنے نواب ہو کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کروڑوں خرچ کر لیتے لیکن جو مزہ اس میں تھا وہ سب سے جدا تھا۔

دوپہر کے وقت میں نے اور عالم قریشی نے حویلی کی چھت سے دیکھا۔ سائیں عالی ناچتا ہوا گلیوں سے گزر رہا تھا۔ اس کے پیچھے مقامی ملنگوں کی ایک ٹولی تھی۔ ان کے عقب میں قصبے کے شوخ لڑکے بالے تھے۔ وہ سب ناچ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گجرے تھے اور لباس صاف ستھرے تھے۔ آنکھوں میں چمک، چہروں پر دیہاتی معصومیت تھی۔

اچانک سائیں عالی نے زوردار نعرہ لگایا "دل دھڑکا شفیع محمد کا... ہا دل دھڑکا... ہا ہا دل دھڑکا... ہا ہا دل دھڑکا۔"

کئی لڑکے بھی سائیں کی تقلید میں نعرے لگانے لگے "دل دھڑکا... ہا ہا دل دھڑکا"

عالم قریشی پچھلے پندرہ منٹ میں دیگوں کا سالن "چیک" کرتے کرتے دو ڈھائی کلو چکن کھا چکا تھا۔ اس نے ایک اور سالم بوٹی منہ میں رکھتے ہوئے کہا "بادشاہ جہاں! ایک بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ سائیں تجھے شفیع محمد کیوں کہتا ہے؟" جب بھی یہ ایسا کرتا ہے اس کی آنکھوں میں عجیب سا اشارہ نظر آنے لگتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کا بس ایک ہی جواب سمجھ میں آتا ہے اور یہ جواب بھی بس چند دن پہلے سمجھ میں آیا ہے۔ لندن میں منوہرانے سائیں کی ہسٹری کے بارے میں جو انکشاف کیے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سائیں کا پورا نام شفیع عالی ہے۔ اسے شروع میں سائیں شفیع بھی کہا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ سائیں کے [illegible] پاس کوئی حوالہ موجود ہو اور وہ اس حوالے سے مجھے اپنے نام سے پکارتا ہو۔"

اس سے پہلے کہ قریشی کوئی مزید سوال پوچھتا، سائیں نے ہوا میں دو فٹ تک اچھلتے ہوئے ایک زوردار نعرہ لگایا "قاتل آ گیا... قاتل آ گیا... ہاہا... ہاہا... قاتل آ گیا دل دھڑکا کا قاتل کا... ہا... دل دھڑکا۔"

"یہ کیا نعرہ ہے؟" عالم قریشی نے کہا۔

مجھے اپنے جسم میں عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ سائیں نے یہی نعرہ لگایا تھا کہ اور اس کے بعد ایک سنگین واقعہ پیش آ گیا تھا۔

میری نگاہ بھٹکتی ہوئی کھیتوں کی طرف گئی اور پھر اچانک خون میری رگوں میں تڑپ گیا۔ میں نے دو بڑی جیپیں دیکھیں۔ یہ نیم پختہ راستے پر دھول اڑاتی تیزی سے جل کوٹ کی طرف آ رہی تھیں۔ جیپوں پر مسلح افراد سوار تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ لوگ کسی اچھی نیت سے قصبے میں داخل نہیں ہو رہے۔

کھانے کا وقت ہونے والا تھا۔ جل کوٹ کے علاوہ ارد گرد کے دیہات سے بھی سیکڑوں افراد گلیوں میں اور ہماری حویلی کے گرد موجود تھے۔ دونوں جیپیں ہجوم کے درمیان سے راستہ بنانی

ہوئی حویلی کے سامنے پہنچ گئیں۔

"اوہ خدایا! یہ تو شنکر ہے" عالم قریشی کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

تب تک میں بھی شنکر کا منحوس تھوبڑا دیکھ چکا تھا۔ وہ اگلی جیپ کی اگلی نشست پر بڑے رعب سے بیٹھا تھا۔ اس نے "بلیک بیلٹ" لگا رکھی تھی۔

میرے رگ پٹھے تن گئے۔ یہ وہی کیفیت تھی جو شنکر کو دیکھ کر اکثر مجھ پر طاری ہوتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر تن جاتی تھی اور دل کا موسم خون کا رنگ اوڑھ لیتا تھا۔ میں نے جیب تھپتھپا کر پستول کی موجودگی کا اندازہ کیا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ عالم قریشی میرے عقب میں تھا اور مسلسل مجھے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب عالم قریشی تو کیا پورا جل کوٹ بھی ہوتا تو مجھے روک نہ سکتا۔ میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو زریں اور موسل وغیرہ نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی برآمدے کی طرف سے خواتین کی چیخیں ابھریں۔ ان میں شفتا کی چیخ سب سے نمایاں تھی۔ وہ مجھے ٹھہرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس سے بہت پہلے کہ شفتا مجھ تک پہنچ سکتی، میں گھر سے باہر تھا۔

شنکر بھی جیپ میں سے نکل آیا تھا۔ اس کے عقب میں مسلح افراد تھے۔ ہجوم میں سنسنی کی بلند و بالا لہر دوڑ گئی تھی۔ عالم قریشی کا اشارہ پا کر ہمارے گارڈز نے شنکر اور اس کے ساتھیوں پر رائفلیں تان لیں۔ دوسری طرف شنکر کے ساتھ آنے والے درجن بھر افراد نے بھی ایسا ہی کیا۔ مہلک ترین اسلحہ دھوپ میں چمکنے لگا اور اسلحہ برداروں کے چہرے تمتمانے چلے گئے۔ عالم قریشی، زریں، باشا اور موسل وغیرہ کے پوشیدہ ہتھیار بھی ان کے ہاتھوں میں نظر آ رہے تھے۔ فضا ایک دم ہی نہایت کشیدہ ہو گئی تھی۔ ایک معمولی سی غلطی سے شعلے لپک سکتے تھے اور خون اچھل سکتا تھا۔ کسی ٹریگر پر انگلی کی ایک ..... فقط ایک جنبش، قیامت برپا کر سکتی تھی۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے شنکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"بدلہ..... آنکھ کا بدلہ آنکھ ..... کان کا بدلہ کان ..... ٹانگ کا بدلہ ٹانگ" اس نے آخری الفاظ پر خصوصی زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا بدلہ چکانے کے لیے تمہیں یہی موقع ملا تھا؟"

"اس موقعے میں کون سی برائی ہے؟ بلکہ یہ تو ویسا ہی موقع ہے جیسا روجھاپور میں تھا۔ ایسا ہی دیہاتی ماحول تھا، ایسا ہی دیہاتی ہجوم تھا۔"

"تم خون خرابا چاہتے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ بھگوان کی سوگند نہیں" وہ عجیب جنونی انداز میں مسکرایا۔ "تم اپنی ٹانگ میرے حوالے کر دو۔ میں اسے بڑی احتیاط سے توڑ دیتا ہوں اور خاموشی سے چلا جاتا ہوں۔ باقی حساب کتاب پھر چلتا رہے گا۔ جیسے اب تک چلتا رہا ہے۔ دوسری صورت میں تمہارے پران بھی جا سکتے ہیں" اس کے ساتھ ہی اس نے غزالہ اور میری شادی کے حوالے سے ایک ایسا فقرہ اچھالا جو کسی طور قابلِ سماعت نہیں تھا۔

میں نے اپنی گرم چادر اتار کر ایک طرف ڈالی۔ اپنی کلائی گھڑی اتار کر زریں کے حوالے کی۔ جیبیں بھی خالی کر دیں۔ اس کے بعد میں شنکر کی طرف بڑھ گیا۔ ایک وحشت زدہ سراسیمگی نے قرب و جوار کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ارد گرد سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ کھڑکیوں میں، چھتوں پر اور گلیوں میں۔ ہر آواز ساکت، ہر چہرہ تصویر تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور شنکر آمنے سامنے تھے۔ سورج تقریباً نصف النہار پر تھا۔ اس کی سنہری دھوپ میں ہمارے سائے ہمارے قدموں سے لپٹے ہوئے تھے۔ چشمِ فلک بھی جیسے تھوڑی دیر کے لیے باقی کام چھوڑ کر محوِ نظارہ ہو گئی تھی۔

پہلا وار شنکر نے ہی کیا۔ اس نے جھکائی دی پھر اس کی ٹانگ بجلی کی طرح حرکت میں آئی اور میرے سینے کو نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے بروقت اپنی جگہ چھوڑ کر یہ وار خالی دیا اور شنکر کے چہرے پر مکا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ مگر یوں لگا کہ اس کے جسم کے ہر حصے میں اسپرنگ لگے ہیں۔ دیوار سے ٹکراتے ہی وہ اچھل کر میری طرف آیا۔ اس کے سر کی ٹکر میرے سینے پر اتنی شدید اور اچانک تھی کہ مجھے سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی حویلی کے بیرونی دروازے سے جا ٹکرایا۔ پشت دروازے سے لگی تو عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے شنکر اپنے جارحانہ رویے کے ذریعے مجھے زندگی کے راستے پر دھکیلتا ہوا میرے گھر کے دروازے تک لے آیا ہے۔ میری پشت پر میرے گھر کا دروازہ تھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جس کے پیچھے میرے گھر کی خواتین تھیں۔ میری بہن شفتا تھی [illegible]۔ اب میں اور پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ میں نے نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر شنکر پر جست کی اور اس سے لپٹ گیا۔ اگلے دس پندرہ منٹ تک میرے اور شنکر کے درمیان خوفناک جدوجہد ہوئی۔ یہ ایک ایسی لڑائی تھی جس کی شدت اور خونخواری کو لفظوں میں بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ بس ایک بے نام وحشت تھی جس نے مجھے گھیر لیا تھا اور شاید شنکر کو بھی۔ کہتے ہیں کہ شراب جتنی پرانی ہو اس کا نشہ اتنا تیز ہوتا ہے۔ شاید نفرت

بھی جتنی پرانی ہو اتنی ہی زہرناک ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ ہمارے چہرے لہولہان ہو گئے۔ ہونٹ پھٹ گئے، انگلیاں چٹخ گئیں۔ لباس تار تار ہو گئے۔ کئی موقعوں پر جب میں زیر ہوا، ہجوم میں سے میرے کچھ خیر خواہوں نے آگے بڑھنا چاہا لیکن عالم قریشی اور زریں وغیرہ نے انہیں روک دیا۔ ان دونوں کو اس لڑائی کے قواعد و ضوابط اچھی طرح معلوم تھے۔ باہر سے کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی ہم دونوں میں سے کوئی کسی طرح کا ہتھیار استعمال کر سکتا تھا۔

یہ بڑی خوفناک جدوجہد تھی۔ یہ بہت بڑی آزمائش کے لمحے تھے۔ میرا پرانا ساتھی، میرا وفادار یار، میرا رام پوری خنجر میری پنڈلی کے ساتھ موجود تھا لیکن میں اس کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے خالی ہاتھ لڑنا تھا، جینا تھا یا مرنا تھا۔ میری سماعت میں تماشائیوں کے للکارے تھے۔ ان کا دبا دبا جوش و خروش ظاہر ہو رہا تھا۔ میں اپنوں کے درمیان تھا۔ اپنوں کے سامنے شکست زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آج میں ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں جیتنا چاہتا تھا لیکن جیتنا آسان نہیں تھا۔ دنیا کے چند عیار اور بدترین فائٹروں میں سے ایک میرے سامنے تھا۔ میں جانتا تھا مقابلے کے دوران میری کوئی چھوٹی سی بھول بھی معاف نہیں کی جائے گی۔ بالکل جیسے آج میں شنکر کی کوئی خطا بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ بس موقع ملنے کی دیر تھی، صرف ایک موقع۔ یہ موقع مجھے شنکر کے خلاف ملتا یا شنکر کو میرے خلاف۔ اس کا نتیجہ فوری موت تھا۔ تماشائیوں میں سے ایک بدنصیب شخص جذبات سے بے قابو ہو کر نہ جانے کیسے شنکر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے شنکر کو چوٹ لگانے کی کوشش کی۔ شنکر کا گھٹنا بجلی کی طرح متحرک ہوا اور اس شخص کی ٹانگوں کے درمیان لگا۔ یہ وہی مہلک وار تھا جس نے مارشل آرٹ کے میدان میں بڑے بڑے سخت جان لڑاکوں کی جان لی تھی۔ میرا یہ نادان خیر خواہ تو کوئی چیز ہی نہیں تھا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح اینٹوں کے فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں اسے دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔

اسٹاپ اسٹار کلب کی طرح شنکر کی توجہ ایک بار پھر میری ٹانگ پر تھی۔ وہ کسی بھی طرح میری ٹانگ کی ہڈی چکنا چور کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ دشمنی پالنے والا اور عداوتوں کی پرورش کرنے والا شخص تھا۔ اس کا قول تھا کہ دشمن کو جان سے مار دینا کوئی سزا نہیں ہے۔ شاید اس کے کسی وار سے میری موت واقع ہو جاتی تو بھی اسے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی میری ٹانگ توڑ کر ہونا تھی۔

زندگی بھر میرے دل میں حسرت رہی تھی کہ کسی معرکے میں شنکر کی منحوس گردن میرے مخصوص شکنجے میں آ سکے لیکن یہ حسرت پوری نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسی طرح شیطان ابنِ شیطان کے دماغ میں بھی یہ کسک تھی کہ وہ مجھ پر اپنے گھٹنے کا مہلک وار آزما سکے لیکن وہ بھی نامراد تھا۔ کم از کم آج تک تو نامراد ہی تھا۔

میں اور شنکر لڑتے لڑتے اس میدان میں پہنچ چکے تھے جہاں ان گنت رنگین دیگیں دہکتے کوئلوں پر تھیں۔ ہم گر رہے تھے، اٹھ رہے تھے، پھر گر رہے تھے۔ چند سیکنڈ پہلے میری ایک نہایت خوفناک ٹکر شنکر کے عین چہرے پر لگی تھی اور اس کے سامنے کے دو دانت اسے داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ اب وہاں ایک تاریک خلا نظر آتا تھا۔ مجھے بھی صاف پتا چل رہا تھا کہ میرا زخمی بازو پھر سے زخمی ہو چکا ہے۔ عین ممکن تھا کہ فریکچر پھر نمودار ہو گیا ہو۔ کندھے سے ہاتھ تک درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سیکڑوں آوازوں کے شور میں ایک دردناک چیختی ہوئی آواز بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ یہ زینی گل کی آواز تھی۔ وہ میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ للکار للکار کر مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے آج شکست نہیں کھانی ہے۔ ہم جس طرف بڑھ رہے تھے لوگوں کا ہجوم بھی ہمارے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ درحقیقت ہم دونوں نیم جان ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں وہ موقع حاصل کر سکتا ہوں جس کے لیے برسوں سے منتظر ہوں۔ وہ بڑا انکشاف انگیز لمحہ تھا۔ اس لمحے میں، اس سنہری لمحے میں مجھے محسوس ہوا کہ دنیا کے عیار ترین فائٹر کی پوری توجہ میری ٹانگ پر ہے۔ وہ میری ٹانگ کو گرفت میں لینا چاہ رہا ہے۔ اس ایک لمحے میں وہ شاید باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ اگر میں اسے اپنی ٹانگ کی طرف جانے دیتا تو مجھے وہ "ایڈوانٹیج" مل سکتا تھا جس کا میں نے برسوں انتظار کیا تھا۔ میری ٹانگ کی طرف جاتے ہوئے شیطان ابنِ شیطان کی گردن ایسے رخ پر آ جاتی کہ میں اسے اپنے بازو کی گرفت میں لے لیتا۔ اس امر کا نوے فیصد امکان تھا کہ شنکر کی مطلوبہ پکڑ میں آنے کے بعد میری ٹانگ نہیں بچے گی لیکن اپنی ٹانگ کے بدلے میں شنکر کی نحس گردن کو اپنے ہلاکت خیز شکنجے میں لے سکتا تھا۔ ایک سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میں نے یہ سارا حساب کتاب کیا، سارا تخمینہ لگایا۔ سارے امکانات کو بھانپا اور دوسرے سیکنڈ میں میں نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ زندگی اور موت کا داؤ تھا۔ نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا لیکن دنیا میں کوئی ایسی کامیابی نہیں جو "رسک" کے بغیر حاصل کی جا سکے۔

ہاں وہ بڑے کانٹے کے لمحے تھے۔ میں نے اپنے پوز میں تبدیلی کرتے ہوئے شنکر کو اپنی ٹانگ کی طرف بڑھنے دیا اور وہ بڑھ گیا۔ ایک برق سی چمکی! اس برق کی نہایت مختصر روشنی میں میں نے شنکر کی گردن اور اپنے بازو کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں

دبکھی۔ یہی وہ ساعت تھی جو مجھے درکار تھی۔ یہی وہ ثانیہ تھا جس کی راہ میں مدت سے دیکھ رہا تھا۔ ہاں! اس لمحے شنکر ہار گیا۔ یہ مقابلہ بھی اور شاید یہ زندگی بھی۔ یہ میرا لمحہ تھا۔ یہ "وقت کا ٹکڑا" میرا مفتوحہ تھا۔ میری بائیں ٹانگ شنکر کی گرفت میں آ چکی تھی لیکن ابھی شنکر کے ہاتھوں نے اس پر دباؤ بڑھانا شروع نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے دائیں بازو کو حرکت دی۔ شنکر کی گردن میرے بازو میں تھی لیکن اس سے پہلے کہ گردن میری مکمل پکڑ میں آتی اور شنکر زندگی کی آخری ہچکی لیتا، ایک انہونی ہوئی۔ ایک عجیب واقعہ۔ کوئی بلا کی رفتار سے میری طرف آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ گدڑی لہرائی۔ دھکا لگنے سے میں چند فٹ پیچھے ہٹا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کوئی شنکر سے لپٹ گیا تھا۔ یہ سائیں عالی تھا۔ وہ توپ سے نکلنے والے گولے کی طرح شنکر سے ٹکرایا تھا۔ میری ٹانگ شنکر کے مہلک داؤ سے نکل گئی تھی۔ شنکر اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ سائیں عالی اس کی پشت پر سوار تھا۔ وہ کسی سیاہ تیندوے کی طرح اس سے چمٹ گیا تھا۔

میری سماعت میں پولیس کاروں کے سائرن گونج رہے تھے۔ میں سائیں عالی کو شنکر کی جان لیوا زد سے بچانے کے لیے آگے بڑھا "سائیں!" میں نے چیخ کر کہا۔

اس سے پہلے کہ میرے ہاتھ سائیں تک پہنچتے، دو خودکار رائفلوں کے بیرل میری گردن سے آ لگے۔ یہ ایجنسی پولیس کا دستہ تھا جس نے تیزی سے آگے بڑھ کر مجھے گھیر لیا تھا۔ کچھ پولیس کمانڈوز رائفلیں تان کر شنکر کی طرف بڑھے۔ شنکر اپنے گھٹنوں کے زور سے اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن سائیں عالی بدستور چمگادڑ کی طرح اس سے چمٹا ہوا تھا۔ شنکر اسے خود سے جھٹکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن ناکام تھا۔ سائیں شنکر کے جسم کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ [illegible] کی طرح وہ شنکر کی پشت پر سوار تھا اور اس کے ہاتھوں نے بڑی مضبوطی سے شنکر کے چہرے کو جکڑ رکھا تھا۔ نڈھال شنکر کے جسم میں اب وہ طاقت نہیں تھی کہ فوری طور پر سائیں کو پشت سے جھٹک سکتا۔ یوں لگتا تھا کہ سائیں کی گرفت سے شنکر کا سانس گھٹنا شروع ہو گیا ہے۔

پولیس والے سائیں پر جھپٹے۔ وہ نیم جان شنکر کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ تب میں نے دھیان سے دیکھا اور مجھے پتا چلا کہ شنکر کے چہرے کو بکرے کی غلاظت سے لتھڑی اوجڑی نے ڈھانپ رکھا ہے۔ اس اوجڑی کے اوپر سائیں نے اپنے بازوؤں کا نہایت مضبوط حلقہ قائم کر رکھا تھا۔ زخموں سے چور شنکر سانس لینے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر وہ چکرا کر گر گیا۔ پولیس والے شنکر کو سائیں کی گرفت سے چھڑانے کے لیے اس پر رائفلوں کے کندے اور لاٹھیاں برسانے لگے لیکن سائیں تو جیسے پتھرا چکا تھا۔ اس پر شنکر کی مہلک ضربوں نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ پولیس والوں کی چوٹیں کیا کرتیں؟ چند سیکنڈ بعد یوں لگا کہ شنکر کی سانس بند ہو گئی ہے اور وہ جان کنی کی کیفیت میں تڑپ رہا ہے۔ درجنوں پولیس اہلکار سائیں کو کھینچ رہے تھے، مار رہے تھے، نوچ رہے تھے لیکن وہ شنکر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایس ایس پی چیختا ہوا خود آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس نے بڑی بے رحمی سے سائیں کے سر پر چوٹیں لگائیں لیکن یہ چوٹیں جیسے گوشت پوست کے انسان کو لگی ہی نہیں تھیں۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا مگر پولیس اہلکار چیونٹیوں کی طرح مجھ سے چمٹے ہوئے تھے۔

سائیں کے نیچے شنکر تڑپ تڑپ کر ساکت ہو گیا۔ بس اس کی ایک ٹانگ میں ہلکی سی جنبش باقی رہ گئی تھی پھر یہ جنبش بھی ختم ہو گئی۔ چند منٹ بعد ان تھک کوششوں سے کھینچ کھینچ کر سائیں کو شنکر کے جسم سے علیحدہ کیا گیا۔ شنکر کا چہرہ اوجڑی کی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا، وہ دم توڑ چکا تھا، ہاں وہ نہیں رہا تھا۔ سائیں عالی بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کی ناک سے خون جاری تھا۔

سائیں کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پولیس کی بھاری جمعیت نے جل کوٹ کو گھیر لیا تھا۔ شنکر کی لاش تحویل میں لے کر لاہور روانہ کر دی گئی۔ شنکر کے تمام ساتھی موقع سے غائب ہو گئے تھے۔ پچیس منٹ کی خوفناک لڑائی میں شنکر کی طرح میرے جسم پر بھی کئی سنگین چوٹیں آئی تھیں۔ جبڑے اور بازو کی چوٹیں تازہ ہو گئی تھیں۔ بازو کی حالت سے عیاں تھا کہ نیم پختہ ہڈی پھر سے ہل گئی ہے۔ اینٹوں پر گرنے سے میرا ایک گھٹنا بھی بری طرح گھائل ہوا تھا اور مسلسل خون اگل رہا تھا۔ دانتوں اور ہونٹوں سے بھی خون جاری تھا لیکن یہ ساری چوٹیں مجھے کچھ تکلیف نہیں دے رہی تھیں۔ اس ساری اذیت پر یہ احساس غالب تھا کہ زمین اب شنکر کے بوجھ سے نجات پا چکی ہے۔ میں جانتا تھا میں نے شنکر کو شکست دی ہے۔ کوئی بھی نہ جانتا لیکن مجھے معلوم تھا۔ دوسروں کے جاننے نہ جاننے کی مجھے پروا نہیں تھی۔ میرا دل مطمئن تھا میرا دل فاتح تھا۔ ماردھاڑ کی اب تک کی زندگی میں وہ لمحہ میری زندگی کا حاصل تھا جب شنکر کی گردن میرے بازو کے ساتھ "ان گارڈ" ہوئی تھی۔ یقیناً اس لمحے شنکر نے بھی جان لیا ہو گا کہ وہ آخری سانس لے چکا ہے۔ وہ میرے لیے مکمل فتح اور شنکر کے لیے شکست فاش کا لمحہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک علیحدہ موضوع تھا۔ سائیں عالی کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا لیکن اس کے قول و فعل کے پیچھے زبردست

مقاصد جھلک دکھاتے رہتے تھے۔ لڑائی کے آخری لمحوں میں وہ جنونی طاقت کے ساتھ ہم دونوں کے درمیان آیا تھا اور بلائے ناگہانی بن کر شنکر سے لپٹ گیا تھا۔ اس وقت تک شنکر بھی میری ہی طرح نیم جان ہو چکا تھا۔ سائیں نے کھانے کے لیے ذبح کیے جانے والے بکروں میں سے ایک کی خالی اوجڑی اٹھا رکھی تھی۔ یہ اوجڑی اس نے شنکر کے چہرے پر چڑھا دی تھی اور اوپر سے اپنے بازوؤں کا حلقہ یوں کسا تھا کہ شنکر کی سانس بند ہو گئی تھی۔ شنکر کی موت کے بعد بھی بڑی کوششوں سے سائیں کے بازوؤں کا حلقہ توڑا جا سکا تھا۔

اب میری جگہ سائیں عالی شنکر کا قاتل تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ سائیں نے شنکر کے قتل کا بوجھ اپنے سر لیا تھا۔ اگر یہ بوجھ میرے سر ہوتا تو میں ایک اور قانونی چکر میں پھنستا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ یوں ایک بار پھر اپنے پیاروں سے میری دوری ہزاروں لاکھوں میل کی ہوتی۔ ایسے میں وہ ساری کامیاب کوششیں بھی بے کار ٹھہرتیں جو پچھلے چند مہینوں میں سائیں اور مسٹر کلارک نے مجھے پاکستان میں قانونی پیچیدگیوں سے بچانے کے لیے کی تھیں۔

شنکر کے قتل کے فوراً بعد پولیس کے وہ افسران حرکت میں آ گئے تھے جن کے سیاسی صاحب کے ساتھ اچھے تعلقات رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ پولیس مجھے اور میرے ساتھیوں کے لیے پریشانیاں پیدا نہ کرے۔ ان کی یہ کوششیں سودمند ثابت ہوئیں۔ شنکر کا معاملہ انٹرپول سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ مسٹر جی کلارک کے انٹرپول میں بااثر لوگوں سے رابطے تھے۔ توقع تھی کہ انٹرپول بھی ہم پر کوئی ناروا پابندیاں نہیں ڈالے گی۔

میرے ساتھ شنکر کی لڑائی کے دوران میں ایک شخص بدقسمتی سے شنکر کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے قتل کا کیس شنکر اور اس کے ساتھیوں کے خلاف درج ہوا۔ متوفی ایک لاوارث شخص تھا لیکن پورے قصبے نے کسی عزیز رشتے دار کی موت کی طرح اس کی موت کا دکھ محسوس کیا۔

دوسرے دن دوپہر کی بات ہے، فون کے ذریعے پتا چلا کہ سائیں عالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ لاہور کے ایک پرائیویٹ کلینک میں ایڈمٹ تھا۔ اس کے سر کی چوٹوں کا علاج ہو رہا تھا۔ میں بذریعہ کار عالم قریشی، پاشا اور گارڈز کے ہمراہ شام کے بعد اسپتال پہنچا۔ سائیں عالی کے کمرے کے باہر بھی پولیس کا پہرہ موجود تھا۔ صرف مجھے اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ صفدر رات ہی سے یہاں موجود تھا۔ وہ سائیں کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ سائیں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ سر کی ضربات کی وجہ سے دونوں آنکھوں کے اردگرد کی جلد گہری نیلی پڑ گئی تھی۔ آنکھیں بے حد ورم زدہ بھی تھیں۔ سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر دکھ ہوا۔ سائیں نے اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کی درز سے مجھے دیکھا اور بولا "دیکھ شفیع محمد! یہ تیرا یار ابھی تک اس چھوکری کو بھولا نہیں۔ اس کو امرود کا ملک شیک پینا چاہیے۔ اس سے اس کا پیٹ صاف ہو گا اور بے ہودہ خیال دماغ سے نکل جائیں گے۔"

میں اور صفدر جواباً خاموش رہے۔ سائیں عالی کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ نحیف آواز میں بولا "میرا کام تو سمجھانا تھا بچہ جی۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ آنکھیں بڑی نعمت ہوتی ہیں۔"

"آنکھوں کا ذکر یہاں کیسے آ گیا؟" میں نے کہا۔

"بس ویسے ہی آ گیا جیسے خوشی کے موقع پر بجلی کا ناجائز بل آ جاتا ہے۔ بس آ گیا سو آ گیا۔ تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" سائیں نے تنک کر کہا۔

"اس موقع پر مزید سوال جواب لمبی بحث کا سبب بن سکتے تھے۔ اور سائیں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے باتوں میں الجھایا جاتا۔

میں خاموش رہا۔ صفدر بھی خاموش رہا پھر صفدر خود ہی اٹھ گیا "بیٹھیں شاہ جہاں صاحب! آپ بات کریں۔"

میں سائیں کے بیڈ کے قریب تیمارداری کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سائیں نے بلایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ سائیں خود ہی بات شروع کرے گا۔ وہ ایک دو منٹ خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا "شادی کا کیا پروگرام ہے؟"

"سوچ رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ میرا تو خیال ہے کہ تاریخ کچھ آگے کر دی جائے۔ اس دوران میں پولیس کی آمدورفت بھی ختم ہو جائے گی اور تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"بالکل نہیں۔" وہ گرج کر بولا "خبردار جو کوئی ایسی بات کی تو کوہ قاف میں دو ہفتے سے ڈھولک بج رہی ہے۔ پرستان میں پرسوں سے جشن منایا جا رہا ہے اور تم کہتے ہو کہ شادی آگے کر دیں۔ ہرگز ہرگز نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ باقی سب کچھ بھی ٹھیک ہے۔ میرے بس میں ہو تو تمہاری شادی آج ہی کرا دوں لیکن چلو کوئی بات نہیں کل تک اور انتظار کر لیتے ہیں۔ کل شادی وقت پر ہی ہونی چاہیے۔" اس نے آخری فقرے کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانا مناسب سمجھا۔ سائیں اپنی آنکھوں کی درز میں سے خاموشی کے ساتھ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولا "شفیع تجھے کیا پتا، تیری اور ڈاکٹر کی شادی میرے لیے کتنی اہم ہے۔ تجھے کیا پتا؟"

میں چونک کر سائیں کی طرف دیکھنے لگا "اس کی آنکھوں

کے گوشے نم تھے۔ ان کے لہجے میں ایسی سنجیدگی تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے سائیں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "خود کو پریشان نہ کرو سائیں! وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔"

"شادی کے بعد میرے پاس آنا، میں تمہیں..... میں تمہیں دعا دوں گا۔" سائیں کا لہجہ الجھا عجیب تھا۔

مجھے پہلی بار سائیں پر پیار سا آیا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ میں سائیں کو سینے سے لگا لوں اور دیر تک لگائے رکھوں۔ اس سے کہوں سائیں اپنے سینے کے سارے دکھ مجھے دے دے میں انہیں سنبھال لوں گا۔ تو اپنی بوڑھی جان کو جوکھم میں نہ ڈال۔ در بدر بھٹک کر خود کو ہلکان نہ کر۔"

لیکن میں کہہ نہ سکا۔ بس سائیں کو دیکھتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے سائیں کی گدلی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک نظر آئی۔ وہ میرے ہاتھ کو دبا کر گرم ناک لہجے میں بولا "پیار پانا بڑا مشکل ہے شفیع محمد۔ بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اپنا پیار مل رہا ہے۔ اب اور بے برنہ کرنا اب اور دیر نہ کرنا۔"

سائیں کے لہجے میں عمر رفتہ کے دکھ تھے، کہنہ پچھتاوے تھے اور گئے زمانے کی کہانی تھی۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جس سے سائیں نے پیار کیا تھا اور پھر اپنے مرشد کی خاطر اس سے منہ پھیر لیا تھا میں سائیں کی زندگی کے اس المناک دور کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن پھر ایک دم سائیں نے موضوع بدل دیا بولا "سروج کہاں ہے شفیع محمد؟"

"مجھے پتا نہیں۔ میں نے اسے لندن میں تمہارے ساتھ ہی دیکھا تھا پھر تمہارے گجوری حلوے نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں۔"

"اوہو میرے دماغ سے نکل گیا۔ میں نے خود ہی اسے پرستان بھیجا تھا میری مسواک وہاں رہ گئی تھی۔ چلو کوئی بات نہیں۔ وہ آ جائے گی آج رات تک تمہاری شادی میں بھی شریک ہوگی۔ اس کے بارے میں تم سے کچھ کہنا ہے مجھے۔"

"کہو، میں سن رہا ہوں۔" میں نے سائیں کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے دفینے کی تلاش میں بڑی محنت کی تھی۔ میرے خیال میں اس میں تھوڑی بہت محنت سروج کی بھی شامل ہے۔ اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو دفینے کی رقم میں سے کچھ حصہ سروج کو بھی دے دو۔"

"کیوں نہیں سائیں۔" میں نے کہا "تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں اس بارے میں سوچ چکا ہوں۔ ہم کل ہی ایک معقول رقم اس کے لیے علیحدہ کر دیتے ہیں۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ دراصل..... دراصل میں چاہتا ہوں کہ سروج کے ساتھ واپس وہیں چلا جاؤں جہاں سے آیا تھا میرا مطلب ہے کالونی میں..... وہ صحرا کے لوگ اوپر سے کالے لیکن اندر سے سفید ہیں۔ ویسے بھی ان لوگوں کو میری بہت ضرورت ہے مگر میری ضرورت ایک اور جگہ بھی ہے اور کچھ ضرورت پرستان میں بھی ہے۔ شاہ جنات کی طرف سے بھی نیلی گرام پر نیلی گرام آ رہے ہیں۔ اب دیکھیں کس طرف کا رخ ہوتا ہے۔"

اسی دوران میں ڈاکٹروں کا گروپ راؤنڈ پر آ گیا۔ میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سینئر نیورو فزیشن دھیان سے سائیں عالی کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ دیگر ڈاکٹروں سے ساتھ مکالمہ بھی کر رہا تھا۔ سائیں کے سر کے پچھلے حصے کی آپ یٹوٹ زیادہ تکلیف تھی اور یہ شگر کی وجہ سے آئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا دوبارہ نیا انجکشن کرانے کی بات ہو رہی ہے پھر بعد ڈاکٹر واپس چلے گئے۔

سائیں عالی نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں ہے بالکل ٹھیک ہوں میں۔ یہ ویسے ہی دیوانے ہو رہے ہیں۔"

پھر ان نے انگلی میری طرف اٹھائی اور بڑی تاکید سے بولا "شفیع محمد! اب میں دوبارہ تمہاری شکل دیکھوں تو تمہارے ساتھ دلہن ہونی چاہیے، سن لیا ہے؟ دلہن ہونی چاہیے۔"

کل میں نے جل کوٹ سے ہی مرہم پٹی کروائی تھی۔ آنا اسی لیے لاہور آ ہوا تھا۔ یہ کلینک بھی اچھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چوٹوں کی ڈریسنگ کروائی۔ ایک آرتھوپیڈک ڈاکٹر نے بازو کے معائنے کے بعد اس پر چھوٹا سا پلاستر بھی چڑھا دیا۔

واپسی کے سفر میں ہم سب سائیں عالی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ ایک جیتا جاگتا کرشمہ تھا لیکن اسرار کی دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی کرشمہ کاری کو محسوس کرنے کے لیے خاص قسم کے ذہن کی ضرورت تھی۔ باتوں باتوں میں سائیں کے جنات کا ذکر ہونے لگا۔ وہ بات بات پر جنات کے حوالے دیتا تھا۔ میرا اور صفدر کا متفقہ خیال تھا کہ یہ جنات دراصل سائیں کی ماورائی صلاحیتیں ہیں۔ اپنے اندر کی روحانی نوازشوں کو وہ جنات اور پری زادوں کے نام سے پکارتا ہے اور سننے والوں کی حیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ باقی ساتھیوں نے بھی اس بات سے اتفاق کیا۔ پورے راستے میں ہمارا موضوع سائیں عالی ہی رہا۔

☆☆☆

اگلے روز رات کو غزالہ میری دلہن بن گئی۔ وہ غالباً تاریخ میں ایک یادگار شادی تھی۔ عالم قریشی آج کے دن دلہن والوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے اتنا کھانا پکوایا تھا کہ سب اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ اردگرد کے علاقے میں ہر کسی کو دعوت عام تھی۔ براتیوں اور کچھ خاص مہمانوں کے لیے ایک احاطہ علیحدہ سے مخصوص کیا گیا تھا۔ باقی سب لوگ شامیانوں اور قناتوں کے ایک وسیع و عریض گھیرے میں موجود تھے۔ اتنے بڑے اژدحام کے باوجود یہاں مثالی ڈسپلن بھی موجود تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ خود ہی مہمان اور خود ہی منتظم تھے۔ پورا جل کوٹ قمقموں سے روشن تھا اور رات میں دن کا سماں ہو گیا تھا۔ زریں گل نے کئی درجن ہیوی ڈیوٹی جنریٹروں کا انتظام کر رکھا تھا تاکہ کسی بریک ڈاؤن کی وجہ سے بدمزگی نہ ہو۔ یہ تقریب سادگی اور جوش و خروش کا عجیب امتزاج تھی۔ اپنی حویلیوں کو کچھ تو ہم نے سجایا تھا، باقی کی کسر جل کوٹ کے باسیوں نے خود پوری کر دی تھی۔ عالم قریشی (کلاسیکل لاہوریے) نے بھی کسی کو شوق پورا کرنے سے روکا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حویلیاں سج سج کر "دلہن کے رکشے" جیسی ہوئی تھیں۔ یعنی ان میں ہر طرح کی سجاوٹ نظر آ رہی تھی۔ قمقمے، جھنڈیاں، کاغذی پھولوں کی جھالریں، اصلی پھولوں کے گجرے، جلنے بجھنے والی مرچیں، سنہری پنیاں اور پتا نہیں کیا کچھ..... لوگوں کے مختلف گروپ اپنے اپنے انداز میں اس خوشی کو CELEBRATE کر رہے تھے۔ تاہم یہ ساری CELEBRATION دیسی انداز کی تھی۔ ڈھول تاشے، بھنگڑا، چمٹا نوازی، لڈی، لوک گیت اور اسی طرح کی دیگر تفریحات۔ والد صاحب اور چچا کے پرانے دوست، ساتھی اور ساتھ کام کرنے والے دور دور سے آئے تھے اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے جو محبت ہمیں مل رہی تھی وہ ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں اور شفقتا اس دھرتی کے بچھڑے ہوئے بھولے ہوئے بیٹے تھے۔ اس مٹی نے ہمیں یوں گلے لگایا تھا کہ نہال کر دیا تھا۔

اور پھر وہ رات آئی جس کا مدتوں سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ وہ گھڑیاں جنہیں دیکھنے کے لیے میں نے اپنے جسم میں سیکڑوں کانٹے توڑے تھے۔ وہ محبت آفریں لمحے جن کی قیمت چکانے کے لیے میں پارہ پارہ ہوا تھا۔ مرا تھا، جیا تھا۔ پھر مرا تھا پھر جیا تھا۔ غزالہ میرے پاس تھی۔ وہ محبت کی تکمیل کی شب تھی۔ وہ زندگی کی معراج کا دورانیہ تھا۔ وہ ایک خواب نہیں تھا لیکن ان حسین ترین خوابوں سے بڑھ کر تھا جو انسانی تصور میں آ سکتے ہیں۔ وہ کوئی نشہ نہیں تھا لیکن اس نے خمار میں ساری دنیا ڈوب گئی تھی۔ وہ کوئی سحر بھی نہیں تھا لیکن اس نے ساری کائنات کو مبہوت کر دیا تھا۔ وہ سرخوشی ہزاروں لاکھوں برس میں بھی سمٹ نہیں سکتی تھی۔ وہ کیفیت کروڑوں الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ "احساس" اظہار کے ہر مروجہ طریقے سے بالاتر تھا۔ تعیب وقت یہ زبان حال کہہ رہا تھا "قدرت انتظار کا صلہ ایک دن ضرور دیتی ہے، قدرت محبت کے لیے پھیلی ہوئی جھولی ایک دن ضرور بھرتی ہے۔ شرط صرف پختہ ارادہ ہے، شرط صرف اندر کی سچائی ہے۔"

وہ ریشم ریشم خوشبو خوشبو گھڑیاں تھیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا "غزالہ! آج اس گھڑی، اس جگہ موت بھی آ جائے تو پھر پروا نہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی نکھری ہوئی اور بڑی اجلی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہم سب سے پہلے سائیں عالی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ زریں گل کی بالکل نئی پجارو میں ہم لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔ صفدر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ شادی کے ہنگامے میں، میں نے ایک لمحے کے لیے بھی صفدر کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ ہر پل میرے ساتھ رہا تھا اور خوش نظر آ رہا تھا۔ ہماری پجارو کے پیچھے عالم قریشی کی گاڑی تھی۔ آگے آگے پولیس کی جیپ جا رہی تھی۔ آئی جی صاحب کی ہدایت پر ایس ایس پی نے مستقل طور پر جل کوٹ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس وقت بھی وہ ہمارے ساتھ ہی لاہور جا رہے تھے۔ غزالہ اور میں درمیانی نشست پر بیٹھے تھے۔ زریں گل اور کلثوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کلثوم نے غزالہ سے مسلسل چھیڑ چھاڑ جاری رکھی ہوئی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "ام زیب کو استوصیب کہتا ہے کیا ام غزالہ بی بی کو استانی صیب کہہ سکتا ہے؟"

"تم غزالہ سے پوچھو۔" میں نے کہا۔

کلثوم شوخ سوالیہ نظروں سے غزالہ کی طرف دیکھنے لگی۔ غزالہ بولی "ہرگز نہیں۔ میں تم سے اتنی بڑی تو نہیں ہوں۔"

"لیکن آپ عقل میں تو بڑی ہیں۔" زریں گل نے لقمہ دیا۔

"عقل تو تم دونوں کے پاس بھی ہے لیکن تم اسے نئی نکور زیرو میٹر رکھنا چاہتے ہو۔" میں نے کہا۔

تانی ہمارے ساتھ تھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ہنس رہا تھا۔ اس کی ادائیں سب کو بھا رہی تھیں۔ انہی باتوں کے دوران میں ہم اسپتال پہنچ گئے۔ سروج جیسے بندے سے یہاں مل گئی۔ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ یہاں کب اور کیسے پہنچی۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ سائیں کی طبیعت

اچھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں شاید آپریشن کرنا پڑے۔

میں اور غزالہ سائیں کے کمرے میں پہنچے۔ سائیں کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں گہری نیلی ہوئی تھیں لیکن چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ہم دونوں کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ کمرے میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سائیں نے ہاتھ بڑھایا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر سائیں نے دوسرا ہاتھ بڑھایا، یہ غزالہ نے تھام لیا۔ وہ بے حس و حرکت پڑا ہم دونوں کو تکتا رہا۔ تب اس کی آنکھوں میں آنسو نمودار ہوئے اور آنکھوں کے گوشوں سے لڑھک کر کانوں تک چلے گئے۔ وہ نحیف آواز میں بولا "آج میں خوش ہوں۔ سب ہی بہت خوش ہیں۔ اس دنیا سے لے کر پرستان تک اور پرستان سے لے کر کوہ قاف تک شادیانے بج رہے ہیں۔ شاہ جنات نے کوہ قاف میں عام چھٹی کا اعلان کر دیا ہے۔ غریب جنات میں کھانا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ تمہاری شادی کی وڈیو فلم پرستان کے دارالحکومت میں جگہ جگہ چلائی جا رہی ہے۔ میں بہت خوش ہوں شیخ محمد آج میں نے وہ پالیا جو میں چاہتا تھا ہاں میں نے پالیا۔" پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور یوں لگا کہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی ہے۔ ہم باہر آگئے۔

آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ سائیں کا آپریشن ہوگا۔ سی ٹی اسکین کے مطابق اس کے دماغ کے ایک حصے میں خون کا لوتھڑا جم گیا تھا۔ اس لوتھڑے کو نکالنا ضروری تھا۔ یہ لوتھڑا دراصل شدید چوٹ کا نتیجہ تھا۔ یوں تو سائیں کے سر پر لاٹھیاں بھی برسائی گئی تھیں لیکن یہ شدید چوٹ شیطان ابن شیطان ننکر ہی کی دی ہوئی تھی۔ سائیں کو اپنے عقب سے جھٹکنے کی کوشش میں ننکر بری طرح تڑپا مچلا تھا۔ اس نے الٹے قدموں پیچھے کو جاتے ہوئے سائیں کو ایک پختہ دیوار سے بھی ٹکرایا تھا۔ یہ چوٹ اسی تصادم کا نتیجہ تھی (اس شدید ضرب کے باوجود سائیں بدستور ننکر سے پیوست رہا تھا)

ایک گھنٹے بعد سائیں کا آپریشن ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بہت جلدی ہوا۔ آپریشن کے صرف ڈیڑھ گھنٹے بعد سائیں چل بسا۔ وہ مرگیا۔ اس کی دکھی روح اس کے زخمی جسم سے پرواز کرگئی۔ وہ زندگی بھر ناقابل فہم رہا تھا۔ اس کی موت بھی ناقابل فہم انداز میں ہوئی تھی۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹر اس کی حالت کو بہتر قرار دے رہے تھے مگر اچانک حالت بگڑی اور وہ چلا گیا۔ جیسے کوئی فقیر خاموشی سے اپنی گدڑی جھاڑ کر اٹھے اور ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

"فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے"

سائیں نے ساری زندگی دنیا سے کچھ نہیں لیا تھا۔ ہر طرح کی راحتوں اور لذتوں سے منہ موڑا تھا جس طرح زندگی اسے کوئی راحت نہیں دے سکی تھی۔ اسی طرح موت بھی اسے کوئی خاص تکلیف نہ دے سکی۔ وہ بڑی ادا سے ہر اذیت کو چکمہ دے کر اس پار چلا گیا۔ سروج دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میرا سائیں چلا گیا، میرا باپ چلا گیا۔ غزالہ نے اسے گلے سے لگایا اور اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ہر آنکھ نم تھی، ہر دل فگار تھا۔ اسپتال کے باہر لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ پھر یہ ہجوم بڑھتا چلا گیا بڑھتا چلا گیا۔ فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں، پیغام رساں دوڑنے لگے۔ لاہور سے دہلی اور دہلی سے بمبئی تک ہر جگہ ہلچل محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہتا ہے۔ حالات اور واقعات کو پیچھا کرتا ہوا اپنی ڈگر پر چلتا رہتا ہے۔ اب ہم لاہور میں تھے۔ سائیں کو جل کوٹ میں دفن کیا گیا تھا، اس کی آخری رسومات میں کئی سو لوگ شامل ہوئے تھے۔ تاہم یہ تذکرہ یہاں طوالت کا باعث بنے گا۔ سائیں کے جہلم کے فوراً بعد میں نے اور صفدر نے سروج کو بلایا تھا اور مجموعی طور پر قریباً دو کروڑ کے اثاثے سروج کے حوالے کیے تھے۔ سروج لندن میں رہنا چاہتی تھی لہٰذا وہاں اس کے لیے عالم قریشی نے ایک بنگلے کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ سروج ظاہری طور پر بہت بدلی ہوئی نظر آتی تھی لیکن یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مستقبل میں کیا طرز زندگی اپنائے گی۔ اس کے خوب صورت جسم میں ایک آگ بگولا عورت چھپی ہوئی تھی اور آگ تو آگ ہی ہوتی ہے۔ ایک چنگاری کی شکل میں بھی باقی رہ جائے تو پھر سے بھڑک سکتی ہے۔ بہرحال ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

وقت رخصت سروج نے مجھے سائیں عالی کی چند اشیا دکھائی تھیں۔ ان میں ایک بوسیدہ سا صندوق اور سائیں کے ذاتی استعمال کی کچھ چیزیں تھیں۔ ان چیزوں میں ایک نہایت خستہ حال نوٹ بک بھی تھی۔ یہ نوٹ بک سروج نے میرے پاس رہنے دی۔ اس میں سائیں عالی نے کئی اوٹ پٹانگ ٹوٹکے اور نسخے لکھ رکھے تھے۔ سیب کا پلاؤ، مچھلی کا حلوا، مرچوں والی جلیبیاں، اورک اور پودینے کی کھیر، شہد والی کانجی، اوجڑی ملک شیک اور جانے کیا کچھ۔ ایک حصے میں بوسیدہ ورق پر کچھ شعر لکھے تھے۔ پنجابی، اردو اور سنسکرت کے یہ شعر بیس پچیس سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ان شعروں میں درد کی جھلک اور جدائی کا رنگ تھا۔

کچھ صفحات پر سائیں نے روزنامچے لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن بعد میں یہ کام ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ایک دو جگہوں پر جنات اور پری زادوں سے لین دین کا حساب درج تھا۔ مثلاً کوہ قاف کے جن احمد حسن نے اپنی بیوی کے آپریشن کے لیے اٹھانوے کروڑ بیس لاکھ روپے ادھار لیے ہیں۔ پرستان کی مہروز بانو نے امانت کے طور پر 18 ارب 74 کروڑ روپے رکھوائے ہیں۔ اگلے سال اپنی بچی کی شادی پر واپس لے گی...... اس طرح کی درجنوں اوٹ پٹانگ تحریریں موجود تھیں۔ ان تحریروں کے بظاہر تو کوئی معنی نہیں تھے لیکن کیا پتا کہ کوڈ ورڈز میں ان کے کچھ معنی بھی ہوں (جیسے سائیں نے مجھے اور غزالہ کو دولھا دلہن کے روپ میں دیکھ کر کہا تھا کہ میں نے پالیا جو میں چاہتا تھا میں نے پالیا بظاہر تو یہ الفاظ بھی بے محل تھے لیکن یقین سے اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا) سائیں کی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی کچھ معلومات یہاں درج تھیں۔ یہ معلومات حسب توقع تعجب خیز تھیں۔ سائیں عالی کی نوٹ بک نے دل آزردہ کر دیا۔

روانگی کے وقت سروج چپ تھی۔ عین روانگی کے وقت جب اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے کہا تو ایک دم وہ جذبات کے رقت آمیز ریلے میں بہہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی اور میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ "میرا کہا سنا معاف کرنا شاہ جہاں...... میں تمہیں اور زرین کو بہت ستاتی رہی ہوں۔ اسے بھی کہنا کہ مجھے شما کردے۔" وہ اشک بار لہجے میں بولی۔

"معافی تو مجھے بھی مانگنی چاہیے۔" میں نے کہا "پچھلے برسوں میں مجھ سے کئی کوتاہیاں ہوئی ہوں گی، کئی غلطیاں، کئی ناوانیاں اور کئی غفلتیں اپنی طرف سے کبھی کسی کا دل دکھانے کی کوشش نہیں کی، اعتماد پر پورا اترنے کی سعی کی ہے، اپنا فرض نبھانا چاہا ہے۔ پھر بھی انسان خطا کا پتلا ہے...... تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

وہ نفی میں سر ہلاتی رہی اور میرے کندھے سے لگ کر روتی رہی۔ پھر وہ رخصت ہوگئی۔

لاہور آنے کے بعد میں نے زریں محل کی عالی شان کوٹھی کے ساتھ ہی ایک وسیع کوٹھی خرید لی۔ چچا اور چچی بھی اس کوٹھی کے ایک حصے میں مقیم تھے۔ کوٹھی اتنی کشادہ تھی کہ چچا اور چچی کسی دوسرے گھر میں مقیم محسوس ہوتے تھے۔ صفدر بھی وقتی طور پر میرے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ یہ انتظام "سیکیورٹی" کے لحاظ سے بھی بہتر تھا...... زریں محل نے انگلینڈ سے اسمتھ سینئر کو اپنے پاس بلالیا تھا اور بھاری معاوضے پر اسے پرسنل سیکریٹری رکھ لیا تھا۔ اسمتھ سینئر نے وی ہوم ٹرسٹ کے معرکے میں ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔ اس کے علاوہ لندن میں اسمتھ کی یہ ادا زریں کو بہت پسند آئی تھی کہ وہ اسے سر کہہ کر بلاتا تھا۔ ایک فرنگی سے خود کو سر کہلوانا زریں کے لیے بڑی کشش کی بات تھی۔ اسمتھ نے علاوہ بھی اس نے انگلینڈ سے قریباً ڈیڑھ درجن سول اور فوجی ملازم "امپورٹ" کیے تھے۔ ان لوگوں کو خدمت گاروں کی حیثیت سے اپنے ارد گرد دیکھ کر زریں کو جو راحت ہوتی تھی اس کے بارے میں کچھ شیں ہی جان سکتا تھا۔

ہماری شادی کے چند دن بعد مسٹر کلارک بھی پاکستان پہنچے تھے۔ وہ کٹھن سفر کر کے اچانک جل کوٹ آئے تھے اور ہمیں سرپرائز دیا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ مسز کلارک یعنی نوعمر کرسٹی بھی ہمراہ تھی...... سائیں کی موت کے دکھ کو مسٹر کلارک نے بھی دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا۔ وہ سیدھے سائیں کی قبر پر گئے تھے اور وہاں دیر تک خاموش کھڑے رہے تھے۔ کرسٹی میرے اور غزالہ کے لیے بہت سے تحائف بھی لے کر آئی تھی۔ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت میں یہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ مسٹر کلارک دو روز جل کوٹ میں مقیم رہے۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی طویل نشستیں ہوئیں۔ اسی گفتگو میں جو موضوع زیر بحث آئے، ان میں دفینے کا موضوع بھی تھا۔ یہ دفینے کا تجسس ہی تھا جس نے ہم سب کو اکٹھا کیا تھا اور پھر اس تجسس میں بے شمار دوسرے تجسس اور واقعات شامل ہوتے گئے تھے۔ قریباً آدھا دفینہ ابھی تک لاپتا تھا۔ مسٹر کلارک نوادرات کے شیدائی تھے، وہ اپنے طور پر کھوج لگاتے رہے تھے...... لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب تو ان کا خیال بھی یہی تھا کہ باقی کے نوادرات اور دیگر اثاثہ جات کہیں سمندر میں ضائع ہو چکے ہیں۔ بہرحال حتمی طور پر تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں نے اپنا کاروبار دیکھنا شروع کر دیا تھا اور غزالہ بھی اپنا ذاتی کلینک پھر سے جوائن کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس نے شفقا کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ غزالہ کا ساتھ میری توقعات سے بڑھ کر حسین اور زندگی بخش ثابت ہو رہا تھا۔ غزالہ کی محبت اس دولت کی طرح تھی جو خرچ کرنے پر بھی بڑھتی ہی رہتی ہے۔ میں اس کو جتنا جان رہا تھا اتنا ہی اس کی محبت میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایک دلگداز کتاب، جس کا ہر صفحہ پڑھنے کے بعد اس سے وابستگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل اور اندیشوں کے باوجود زندگی اپنے حسین ترین روپ میں میرے سامنے تھی۔ جو دو بڑے غم گاہے گاہے میرے ذہن کو گھیرتے تھے، ان کا تعلق سائیں عالی اور صفدر سے تھا۔ سائیں کی اچانک موت کا غم ابھی تک دل و دماغ کو متاثر کیے ہوئے تھا۔ اس کی صورت اکثر نگاہوں میں گھومتی رہتی تھی۔ اس کی

تھیں۔ اس کے قہقہے، اس کی قابلِ فہم ادائیں، اب بھی کسی وقت لگتا تھا کہ وہ اچانک کسی گوشے سے نمودار ہو جائے گا۔ زوردار نعرہ لگائے گا اور ہمارے اردگرد ناچنے لگے گا۔ جیسے وہ دور دراز مقامات کا فاصلہ غیر متوقع طور پر پاٹ دیتا تھا ایسے ہی موت سے زندگی تک کا فاصلہ بھی پاٹ لے گا اور چھلانگ لگا کر ہمارے درمیان آ جائے گا۔

دوسرا غم صفدر کا تھا۔ ہماری ساری کوششیں، ساری دولت، سارے وسائل صفدر کی آنکھیں واپس لانے میں ناکام ہوئے تھے اور مسئلہ صرف آنکھوں کا ہی نہیں تھا وہ تو زندگی سے بھی منہ موڑے ہوئے تھا۔ ہم سب نے علیحدہ علیحدہ اور مل کر کوشش کی تھی لیکن وہ کسی طور پر شادی پر رضامند نہیں ہوا تھا۔ انجم کی شادی کے بعد تو اس کا دھیان ہی جیسے اس موضوع سے ہٹ گیا تھا۔ غزالہ... زریں، عالم قریشی، چچا جیسیں، مسٹر کلارک سب ہی کوشش کر کے ہار گئے تھے۔

چچی کی طبیعت کسی وقت بہتر ہو جاتی تھی، کسی وقت وہ زیادہ نقاہت محسوس کرنے لگتی تھیں۔ انہوں نے جیسے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میرا اور چچا کا پروگرام تھا کہ ان کی حالت ذرا مستحکم ہو جائے تو انہیں علاج کے لیے لندن شفٹ کر دیا جائے۔

شادی کے بعد شروع کے چند ہفتوں میں غزالہ اصرار کرتی رہی تھی کہ ہم بھی مستقل طور پر لندن یا کسی دوسرے یورپی شہر میں منتقل ہو جائیں لیکن میرے ارادے دیکھ کر وہ بتدریج خاموش ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے غزالہ کو سامنے بٹھا کر بڑی اچھی طرح سمجھایا تھا۔ میں نے کہا تھا "غزالو! ہر پودا ہر زمین پر سرسبز نہیں رہ سکتا۔ میرا خمیر اس مٹی سے اٹھا ہے۔ میں یہیں پر زندہ رہ سکتا ہوں۔ یہ میرا ملک ہے۔ بے شک یہاں بے شمار الجھنیں ہیں۔ ان گنت خامیاں، مسائل اور خطرات ہیں لیکن یہ سب کچھ میرا ہے۔ بالکل جیسے یہاں کی خوب صورتیاں، رنگینیاں اور یہاں کے رنگین موسم میرے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ ہی جینا ہے غزالہ، میں ان کے ساتھ ہی جینا چاہتا ہوں۔"

وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے میرا ہاتھ تھام کر ہولے سے دبایا تھا "جیسے آپ کی مرضی شاہ جہاں۔" اس نے کہا۔

"غزالہ! تم جانتی ہو کہ میں اردگرد کے حالات سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر مجھے اپنے اردگرد کوئی ناانصافی ہوتی دکھائی دے گی، کوئی ظلم نظر آئے گا تو میں آنکھیں بند نہیں رکھ سکوں گا۔ خدا نے مجھے جو بھی تھوڑی بہت عقل اور ہمت دی ہے اس کے مطابق ناانصافی کا راستہ روکنا میرا فرض ہے اور ہم سب کا فرض ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے اس فرض کی ادائی سے روکو گی نہیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے غزالہ... اور اس کا مشاہدہ ہم سب نے بہت قریب سے کیا ہے۔ کیا ہے نا؟"

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اپنا رخسار میرے کندھے سے لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

موئل اور پاشا نے میری شادی میں بھرپور شرکت کی تھی... میں نے پاشا کو ذرا تک نہیں بتایا کہ شنکر کو اپنے مقابل لانے کے لیے میں نے اسے "ذریعے" کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسے یہ بتانا ضروری بھی نہیں تھا۔ پاشا ایک نہایت ذہین اور چوکس شخص کا نام تھا لیکن کبھی کبھی ہوشیار ترین لوگوں سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ یہ غلطی ہی تو تھی کہ پاشا اپنی نگرانی سے بے خبر تھا۔ پچھلے چند ہفتوں میں موئل اور پاشا کے درمیان گہری دوستی ہو گئی تھی۔ پاشا بھی موئل کی پراسرار صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ موئل اب سوئٹزرلینڈ واپس جانا چاہ رہا تھا۔ پاشا کا بھی اس کے ساتھ جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ پاشا کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جائے۔ اس پر بھی کچھ مقدمات تھے اور وہ پولیس کو مطلوب بھی تھا۔ میں نے نیویارک میں مسٹر جی کلارک سے رابطہ کیا اور ان کے ذریعے موئل اور پاشا کی سوئٹزرلینڈ روانگی کا انتظام کر دیا۔

زریں اور کلثوم آج کل بہت خوش تھے۔ زریں کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اردگرد "جی سر... جی سر" کہنے والے ڈرائیور موجود تھے۔ جبکہ کلثوم کی خوشی کی وجہ اس کی بہن تاشا تھی۔ یہ ترچھی وضع کی لڑکی کئی ماہ پہلے کلثوم کے پیچھے گلگت سے لاہور آئی تھی اور اپنے تیکھے پن کی وجہ سے یہاں کچھ مصائب کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں ایک امیرزادہ ہلاک ہو گیا تھا اور اسے جیل جانا پڑا تھا۔ بہرحال اب یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو چکا تھا۔ تاشا کو انصاف ملا تھا۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا اپنے دفاع میں کیا۔ عدالت سے اس کی باعزت رہائی عمل میں آ چکی تھی۔ چند روز تک وہ رہا ہو کر جیل سے گھر آنے والی تھی۔

شنکر کی اچانک موت نے دور دور تک تہلکہ مچا دیا تھا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر اس خبر کو نمایاں جگہ ملی تھی۔ بکرے کی اوجھڑی کے ذریعے دم گھٹ کر ہلاک ہو جانے والی بات ہر کسی نے تعجب اور عبرت آمیز دلچسپی سے سنی تھی... جیل کوٹ میں ہزاروں دیہاتیوں کے سامنے ہونے والے "میرے اور شنکر کے مقابلے" کی روداد بھی زبان زدِ عام تھی۔ اس مقابلے میں میری برتری کا ذکر بھی تھا لیکن یہ ذکر کہیں نہیں تھا کہ مقابلے کے آخری لمحوں میں، میں شنکر کو شکستِ فاش دے چکا تھا۔ یہ

بات صرف میں جانتا تھا یا میرے قریبی دوست زریں، عالم قریشی اور پاشا وغیرہ جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مقابلے کے آخری لمحات میں میری ٹانگ توڑنے کے جنون میں شبھان ابن شبھان کی گردن میرے مہلک داؤ میں آ چلی تھی۔ مجھے شاید سیکنڈ کا چوتھائی حصہ بھی اور مل جاتا تو یہ داؤ شنکر کی موت بن جاتا۔

کسی موقع شناس نے اس لڑائی کے بیشتر حصے کی وڈیو فلم بھی بنائی تھی۔ یہ فلم نہ جانے کس سے ہوتی ہوئی ایک غیر ملکی ٹی وی چینل تک بھی جا پہنچی تھی۔ اس پرائیویٹ چینل نے مارشل آرٹ کے حوالے سے بار بار یہ فلم دکھائی تھی۔ اس فائٹ کو دیکھنے کے بعد "اسٹریٹ فائٹ" کے کچھ جغادری استادوں نے فائٹ کے آخری لمحات کے TWIST کو نوٹ کیا تھا... اور خیال ظاہر کیا تھا کہ شنکر نے یہ فائٹ ہار دی تھی۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ہمارا بیڈروم بالائی منزل پر تھا۔ دیوار گیر کھڑکیوں میں سے روشن لاہور کے نشیب و فراز دور تک نظر آ رہے تھے۔ میں کاٹن کے ہلکے پھلکے سفید لباس میں تھا۔ کولمبو سے کالی گڑیوں نے مجھے اپنے گانوں کا ایک خوب صورت البم بھیجا تھا۔ الفاظ ہماری سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن موسیقی تو ایک عالمگیر زبان ہے۔ کیسٹ کی مدھم آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں تابی کو سلانے کے بعد غزالہ میرے پاس چلی آئی۔ وہ شب خوابی کا ہلکا گلابی گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ بال شانوں پر بکھرے تھے۔ ایک کلائی میں گجرا مہک رہا تھا۔ وہ ایک دلکش تصویر نظر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہر گزرنے والا دن اس میں اور نکھار پیدا کر رہا ہے۔ جیسے پودا اپنے من پسند موسم میں پھل پھول رہا ہے، وہ بھی اسی طرح پھل پھول رہی تھی۔

میری جرابیں اتارنے کے لیے اس نے میرے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے پاؤں سمیٹ لیے "نہیں... رہنے دو... زیادہ مشرقی بیوی بننے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مسکرائی "اور آپ کو بھی زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ نے پاؤں پیچھے کیوں ہٹایا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"یہ مطلب ہے۔" اس نے میری پنڈلی سے بندھے ہوئے رام پوری خنجر کو انگلی سے چھوا۔

"تم سے کچھ چھپانا ناممکن ہے۔" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"آپ سے بھی کچھ منوانا ممکن نہیں۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

"یہ "رام پوری" میری زندگی کا ساتھی ہے غزالو۔ میں تمہاری اجازت سے اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرا کر میری بانہوں میں آ گئی "جو آپ کو پیارا ہے... وہ جیسا بھی ہے... مجھے بھی پیارا ہے۔" اس نے آنکھیں موند کر کہا۔

"اچانک مجھے یاد آیا۔ میں نے کہا" صفدر نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"ہاں... ابھی تھوڑی دیر پہلے زبردستی کھلایا ہے۔ کہہ رہا تھا آج بھوک نہیں ہے۔"

"اب کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ چھت پر گیا ہے۔"

"چلو آؤ... ذرا اسے دیکھیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں سلیپر پہنے اور آہستہ آہستہ زینے چڑھتے ہوئے چھت کی طرف بڑھے۔ زینوں کے موڑ پر غزالہ نے سائیں جاں کی ایک بڑی تصویر خوب صورت فریم میں آویزاں کر رکھی تھی۔ آتے جاتے اس تصویر پر نظر پڑتی رہتی تھی اور اس مردِ عجیب کی یاد آتی رہتی تھی۔

ہم بالائی دروازہ کھول کر اس کمرے میں آ گئے جسے برساتی بھی کہا جاتا تھا۔ چھت کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر میں نے دیکھا، صفدر چھت پر ہی موجود تھا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھا تھا، ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ آنکھوں میں تاریک شیشوں کا چشمہ تھا۔ وہ کسی گہری... بہت گہری سوچ میں نظر آتا تھا۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا... اس کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ وہ جیسے مغربی افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاندنی میں نہایا ہوا مغربی افق... ہاں اس رخ پر وہ سرزمین واقع تھی جسے سوربلانہ کہا جاتا تھا... تاریک براعظم کا وہ تاریک ملک... جہاں صفدر کو ایک روشن ستارہ ملا تھا۔ اس کا نام دیبا تھا... وہ چند دن پورے زور و شور سے صفدر کے آسمانِ محبت پر چمکا تھا۔ پھر ٹوٹ کر کہیں روپوش ہو گیا تھا... مجھے لگا جیسے صفدر کی اندر کی آنکھیں، دور مغرب میں اسی ستارے کو ڈھونڈ رہی تھیں... وہ اس ستارے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اسے بھی یقین ہے کہ وہ لوٹے گی... کبھی نہ کبھی واپس آئے گی۔

غزالہ نے غم زدہ لہجے میں کہا "صفدر اب کیوں ضد کر رہا ہے؟ کیوں پریشان خوابوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ وہ مجبور ہے

اسے اب حقیقت کو محسوس کرنا چاہیے۔"
"حقیقت کیا ہے۔ یہ ہمیں خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" غزالہ نے کہا۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ چھت پر سے صفدر ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا "وہی بات جو ہم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں غزالہ ..... اور سن بھی چکے ہیں۔ اس دنیا میں بہت کچھ ایسا ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ شاید انسان کی ذہنی پیش رفت ابھی اس درجے پر نہیں پہنچی جہاں وہ دبیز پردوں کے پیچھے ماورائی دنیا میں جھانک سکے۔ جدید علوم پر یقین رکھنے کے باوجود ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ابھی بہت کچھ تاریکی میں ہے۔"

غزالہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے جھمکے مدھم روشنی میں چمک رہے تھے۔

میں نے کہا "تمہیں یاد ہوگا، سائیں کے زخمی ہونے کے بعد دوسرے روز میں اسپتال آیا تھا۔ جب میں اسپتال پہنچا تھا، صفدر اور سائیں عالی باتوں میں مصروف تھے۔ میری آمد پر وہ خاموش ہوگئے تھے۔ بعد میں صفدر نے مجھے بتایا کہ سائیں عالی پر اس روز بڑی عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ ان کے چہرے پر ایک ایسی چمک تھی جو پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ سائیں نے صفدر سے کہا..... تم دو میں سے ایک چیز لے سکتے ہو۔ اپنی آنکھیں لے سکتے ہو یا پھر اپنی آس کو باقی رکھ سکتے ہو۔ صفدر نے اس بات کی وضاحت چاہی تو سائیں نے کہا..... تمہاری نگاہیں تمہیں واپس مل سکتی ہیں لیکن اس صورت میں تمہیں اپنی آس سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اگر درا کی آس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو پھر آنکھوں کو بھول جاؤ..... پتا نہیں کہ صفدر نے سائیں کی بات پر کس حد تک یقین کیا..... لیکن اس نے فوری طور پر یہ بات کہی کہ درا کی آس اسے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے..... سائیں نے صفدر کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم نے ایک اچھی چیز چنی ہے....."

میری بات ختم ہوئی تو کمرے میں گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ غزالہ کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا۔ شاید وہ سائیں عالی کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ کچھ تبصرہ کرنا چاہتی تھی لیکن جھجک بھی رہی تھی۔ ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے ٹک ٹک صفدر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نہ جانے کن دنیاؤں میں کھویا تھا۔ غزالہ نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا "آخر کب تک..... کب تک انتظار کرے گا وہ؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں بہت سوچتی ہوں شاہ جہاں....." وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "ان باتوں کے بارے میں بھی کبھی پہروں غور کرتی رہتی ہوں۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ سائنس سے باہر جو چیز بھی ہے وہ وہم اور دھوکا ہے۔ ہماری حسیات میں سے کسی ایک حس کا ILLUSION ہے۔ کوئی زیادہ طاقت ور اور کوئی کم طاقت ور..... ٹھوس علم تو وہی ہوتا ہے جسے ہم TEST کر سکیں۔ مخصوص اسباب کے ذریعے مخصوص نتیجہ پیدا کر سکیں....."

"نہیں یہ بات نہیں ہے غزالہ..... ہم اپنے موقف کو اتنا سخت نہیں کر سکتے۔ ہمیں لچک رکھنا پڑے گی۔ انہونیوں کے لیے اپنے دل و دماغ میں گنجائش پیدا کرنا پڑے گی۔ اس صورت میں ہمارا علم آگے بڑھ سکتا ہے....." میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "ٹھہرو، میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس چیز کو دیکھنے کے بعد تمہارے موقف کی سختی خود بہ خود کم ہوگی۔"

میں نے الماری سے وہی بوسیدہ نوٹ بک نکالی جو چند روز پہلے سائیں عالی کے سامان میں سے سرورج نے مجھے دی تھی۔ میں نے احتیاط سے ورق گردانی کرتے ہوئے وہ صفحہ نکالا جس پر سائیں عالی نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ اندراجات کیے تھے۔ کہنہ سال صفحہ میرے سامنے تھا اور اس کا تحریر مدھم روشنی میں دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے نا کہ سائیں عالی نے مجھے ہمیشہ شفیع محمد کے نام سے پکارا ہے؟" میں نے کہا۔ غزالہ نے میری بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو..... یہاں لکھا ہے، سائیں عالی کا اصل نام بھی شفیع تھا..... شفیع عالی..... اور یہ دیکھو۔" میں نے دوسرا صفحہ الٹتے ہوئے کہا "یہ سائیں عالی کے والد کا نام ہے۔ وہی نام جو ابا جان کا تھا..... وقار احمد..... اور یہ دیکھو یہ سائیں عالی کے دادا کا نام ہے۔"

غزالہ نے آگے جھک کر غور سے نام دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں۔ دادا کا نام سیف اللہ لکھا تھا۔ میرے اور غزالہ کے دادا کا نام بھی سیف تھا۔

غزالہ کے ہاتھوں میں نوٹ بک کپکپانے لگی تھی "یہ سب..... کیا ہے شاہ جہاں۔" وہ سرسراتے لہجے میں بولی۔

"تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ جب کہ میں چاہتا ہوں تم مجھے کچھ بتاؤ۔"

غزالہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

"اب میں تمہیں ایک اور چیز دکھاتا ہوں۔ ذرا کلیجا تھام کر رکھنا۔" میں نے کہا۔

"غزالہ سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "تمہیں بتایا تھا نا غزالہ..... کہ سائیں کو ایک لڑکی سے عشق ہوا تھا۔ وہ بھی اس کے عشق میں دیوانی تھی۔ اس لڑکی کا نام پتا ہے کیا تھا؟"

"کیا تھا؟"

میں نے ایک اور بوسیدہ صفحہ الٹا اور پرانی روشنائی سے لکھا ہوا نام دکھایا۔ نام تھا غزالہ سنبھا۔

غزالہ جیسے لڑکھڑا کر صوفے پر بیٹھ گئی "یہ سب..... یہ سب..... کیا ہے..... شاہ جہاں....."

"مجھے اس کا پتا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔ سمجھو کہ یہ سوال بھی ان سوالوں میں سے ہے جن کے جواب ہم کو کبھی نہیں مل سکتے۔ ہم خود کو تسلی دینے کے لیے اسے ایک اتفاق کہہ سکتے ہیں..... مماثلت کہہ سکتے ہیں، کوئی بھی وجہ پہنا سکتے ہیں لیکن ہمارے ذہنوں میں یہ بات ہمیشہ موجود رہے گی کہ اس کے پیچھے کوئی اسرار تھا، کوئی انہونی تھی..... ہم دونوں کی محبت کسی حوالے سے..... شاید سائیں کی محبت ہی کا عکس تھی....."

غزالہ خاموش رہی، میں بھی خاموش رہا، کھڑکیوں سے باہر رات چپ چاپ لیٹی رہی اور اس کے پہلو میں چاندنی بے آواز سستاتی رہی۔ صفدر اسی طرح بے حرکت بیٹھا تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن شاید وہ دیکھ رہا تھا۔ افق کے اس پار..... موریطانیہ کے تاریک جنگلوں میں..... وہاں اس کا کوئی کھو گیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا..... اور سائیں عالی نے اس کے انتظار کے بارے میں کہا تھا "تم نے ایک اچھی چیز چنی ہے۔"

بڑی دیر بعد میں نے کہا "غزالہ! جس طرح ہم اس نوٹ بک کی تحریر کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح صفدر کے "انتظار" کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے دل و دماغ میں خوب صورت انہونیوں کے لیے گنجائش رکھنی پڑے گی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" غزالہ نے کہا اور بیٹھے بیٹھے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہم دونوں کھڑکی میں سے صفدر کو دیکھتے رہے..... اور صفدر نہ جانے کہاں دیکھتا رہا..... ایک عجیب سی خنکی اور اسراریت نے ہم دونوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خاموشی کی لہروں پر کہیں دور سے کوئی نغمہ ابھر رہا تھا۔

کوئی کلا پایا نہ نکلے گا، بے در کے اس گنبد سے
کوئی سمجھ پایا نہ سمجھے گا، جیون ایک پہیلی ہے
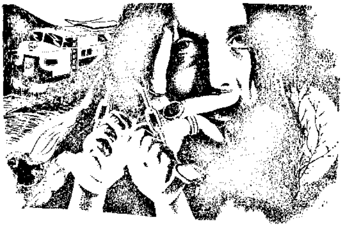
☆======ختم شد======☆